جاسوسی ڈائجسٹ کا منفرد و مقبول سلسلہ

ایک کفن بردوش نوجوان کی داستانِ حیرت

معاشرے کے رِستے ہوئے ناسوروں کا مرقعِ عبرت

شکاری

راوی : سکندر بخت

مصنف : احمد اقبال

اب میں بالکل مطمئن اور پرسکون تھا۔ بے یقینی، ذہنی انتشار اور خوف کے سلسلے وار مرحلوں سے گزر جانے کے بعد میں اس فیصلے پر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اس انتہائی اقدام پر تامل اور تاسف کا اب کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہوتا تھا۔ وقت کی بساط پر عقل کی ہر بازی مات ہو چکی تھی۔ سازگار حالات کی امید میں سنمتی ایام کو جھیلنے سہنے کا حوصلہ تمام ہو چکا تھا۔ اور خلش جو آزار جسم و جان بن گئی تھی، تقاضا کرتی تھی کہ اس پر آشوب داستان کا آخری باب میں اپنے خون سے لکھوں۔ تقدیر نے مجھے اس کے قتل کا فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میر شرافت علی کی فرصت عمر لمحہ لمحہ تمام ہو رہی تھی۔ اور شاید میری بھی جہاز اب لاہور کی طرف مائل پرواز تھا اور یہ ثبوت تھا ایک زبردست دستِ غیب کے انتظام کا جس نے میری منزل کی مسافت کو سمیٹ کر مزید مختصر کر دیا تھا۔ بالفاظ دیگر میری شرافت کی زندگی کو مزید مختصر کر دیا تھا۔

ابھی کچھ دیر پہلے لاؤڈ اسپیکر کی زبان سے ایئر ہوسٹس نے اپنی بات کا آغاز کیا تھا تو مجھے اس کی آواز خلافِ معمول مترنم، مہربان اور ریشم کی طرح ملائم لگی تھی۔ "خواتین و حضرات ہم بے حد معذرت خواہ ہیں کہ طوفان باد و باراں کے سبب طیارہ اسلام آباد انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر اترنے کے بجائے لاہور میں اترے گا یعنی حالات موافق ہوتے ہی ہم جلد از جلد آپ کو منزلِ مقصود تک پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ ہم آپ سے تعاون کے طلبگار ہیں اور ایک بار پھر معذرت چاہتے ہیں۔ شکریہ۔!"

"ڈیم اٹ" میرے دائیں ہاتھ پر بیٹھے ہوئے کالے صاحب نے کہا جو ولایت میں سات سال رہ کے خود کو گورا سمجھنے لگا تھا اور وہ کوا تھا جو ہنس کی چال چلنے کی مضحکہ خیز کوشش کر رہا تھا۔ "صاف کیوں نہیں کہتے یہ لوگ کہ پلین کریش کر رہا ہے" پھر اس نے منہ بنا کے کھڑکی سے باہر دیکھا اور شاید بادلوں کے غبار سے جہاز کی بلندی کے فرق کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ کرنے کی کوشش کی کہ اب تک جہاز کتنا گر چکا ہے۔ دورانِ سفر اس نے مجھ سے بصد افسوس کہا تھا کہ انڈو پاک میں مورل گر گیا ہے۔ ویلیوز گر گئی ہیں۔ آدمی کے ساتھ پیسے کی قدر گر گئی ہے پیداواری صلاحیت گر گئی ہے۔ اور اب اس کا خیال تھا کہ جہاز گر رہا ہے۔ میں نے اس سے اتفاق کیا۔

میرے دوسرے پڑوسی ہمسفر میر پور کے اصیل باشندے تھے اور ولایت کے ایک بہت بڑے ہوٹل میں ڈش واشر کے منصب اعلیٰ ... پر برسوں فائز رہنے کے بعد وطنِ مالوف کو مراجعت پر مجبور ہو گئے تھے۔ کیونکہ سرمنڈے گوروں کے ایک غول بیابانی نے ان کی دو پسلیاں اور دو دانت توڑ دیے تھے اور بشرط زندگی بقیہ دانت اور پسلیاں توڑنے کے عزم کا اظہار بھی کیا تھا

انکی زوجہ نے جو اللہ میاں کی بھینس تھی اور سامنے کی تین نشستوں پر بمعہ اولاد فروکش تھی اپنے لائق فائق سرتاج سے اعلان کو سلیس اردو میں ترجمہ کرنے کو کہا۔ سرتاج مذکور نے فرمایا "لاہور جانا تھا... پہلے کپتان کو یاد نہیں رہا" اور میری طرف تائید طلب نظروں سے دیکھا۔ میں نے ان سے بھی اتفاق کیا۔ زوجہ مذکورہ نے اس فروگذاشت پر، کفتان نامراد، بزبان میرپلو، کوسنا شروع کیا۔ بقیہ مسافروں کا ردِ عمل بھی اپنی اپنی ذہنی کیفیت کا عکاس تھا۔ معقول امید پرست اور پُراعتماد قسم کے لوگوں نے اس اعلان کو زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ کم عقل۔ قنوطی اور ناتجربے کار مسافروں نے جن کی اکثریت خواتین پر مشتمل تھی۔ واویلا شروع کیا کہ اسلام آباد کے ٹکٹ پر ان کو عدم آباد پہنچایا جارہا ہے۔ اور پھر جہاز کے علاوہ جہاز کے موجد کو اور کپتان تک سب کو ایک جیسی گالیاں دیں۔ جہاز کا واحد مسافر جسے منزل کی یہ تبدیلی بھی نوشتہ تقدیر لگی تھی میں تھا۔ میں نے افسوس سے ان بے گناہ مسافروں کو دیکھا جو شامتِ اعمال کے باعث میرے ہمسفر ہوئے اور مارے گئے۔ مجھے فلموں اور جرائم کی کہانیوں کے علاوہ حقیقی زندگی کے بہت سے ڈراموں کے بہت سے واقعات یاد تھے جن میں ایک آدمی کی جان لینے کے لیے جہاز گرادیا گیا تھا۔ امکانات لامحدود تھے۔ ممکن ہے پائلٹ کو جہاز میں کسی ٹائم بم کی موجودگی کا شبہ ہوگیا ہو اور ٹائم صرف اتنا ہو کہ جہاز کو لاہور میں گرنے کو ترجیح دی ہو یا ایسی ہی کوئی نامعقول وجہ ہو۔ لیکن یہ بات میں علی الاعلان کہہ دیتا تو کالے صاحب کی نظر میں گر جاتا۔ جسے یقین تھا کہ جہاز کے ساتھ ہی وہ بھی گر رہا ہے۔

ایسا ہی خیال مجھے لندن کے ہیتھرو ایئرپورٹ پر روانگی کے وقت آیا تھا۔ یعنی یہ کہ جہاز سفرِ آخرت پر روانہ ہو رہا ہے۔ میں حقیقت پسند آدمی ہوں اور میری سوچ میں مقتول ہونے کی نفسیاتی خواہش کو قطعی دخل نہیں تھا۔ ان تمام واقعات کے باعث جو ایک مختصر مدت میں مسلسل پیش آئے۔ مجھے ہر قدم پر خطرہ نظر آنے لگا تھا۔ ایک بار کی تو کوئی بات نہیں لیکن سانپ باربار کاٹنے لگے تو کیا رسّی سے ڈرنے کا جواز پیدا نہیں ہو جاتا۔ بقول غالبؔ۔ ڈرتا ہوں آدمی سے کہ مردم گزیدہ ہوں۔ تو اس کے ذمے دار حالات ہیں۔ سرمنڈے گورے جو رنگدار ایشیائی کو ملک میں اپنی بے روزگاری کا ذمے دار قرار دیتے تھے۔ میرے لیے کوئی خطرہ نہیں تھے۔ کیونکہ تعلیم کی تکمیل کے بعد میرا قطعی ارادہ نہ تھا کہ کسی گورے کے پیٹ پر لات ماروں۔ نسلی منافرت سے بڑھتی ہوئی کشیدگی کے باعث میں نے فارغ التحصیل ہو کے واپس وطن لوٹ جانے کا فیصلہ کیا تھا اور فرنگیوں کے دیس میں میرے قیام کی مدت سال بھر بھی نہ رہی تھی میرے ذہن میں بہت سے منصوبے تھے۔ کثیر المقاصد منصوبے۔ ان سے بیک وقت ملک و قوم اور خلقِ خدا کے علاوہ اپنی ذات کو بھی فائدے حاصل ہوتے تھے مثلاً میں ایک تعمیراتی فرم بنانا چاہتا تھا اور اس کے منافع سے مری میں ایک گردشی پزیر ریسٹورنٹ بنانا چاہتا تھا جیسے میں نے باہر دیکھے تھے کہ آپ کسی پہاڑ کی چوٹی پر شفاف شیشوں کی عمارت میں بیٹھے ہیں اور آپ کو قطعی احساس نہیں کہ وہ پوری عمارت کچھوے کی چال سے اپنے مدار پر گھوم رہی ہے تاکہ وہیں بیٹھے بیٹھے آپ ملاقات اور مدارات کے ساتھ مضافات کو ہر سمت سے گھوم کر دیکھ لیں۔ پھر میرا خیال اس ریسٹورنٹ کی آمدنی سے وادئ کاغان میں جھیل سیف الملوک کے برفپوش رہنے والے کناروں پر ہوٹل تعمیر کرنے کا تھا اور پھر ہوٹل اور ریسٹورنٹ کے مشترکہ منافع سے کراچی میں ساحل سے دور سمندر کی تہہ میں شفاف شیشے کا واٹر پروف دیواروں والا کیفے بنانا تھا جہاں سے آبی دنیا کے حسن کا نظارہ ہو۔ علیٰ ہذا القیاس یہ سب ایک انڈے سے ملک کا سب سے بڑا پولٹری فارم بنانے کے اور کروڑپتی بننے کے خواب تھے۔ لیکن انڈا ٹوٹ گیا چنانچہ خواب بھی ٹوٹ گیا اور پھر حقیقت کا وہ روپ سامنے آیا جو موت کی طرح خوفزدہ کرنے والا اور ناقابلِ فہم تھا اور حالات و واقعات کا وہ ناقابلِ یقین سلسلہ شروع ہوا جس نے میری منزل ہی نہیں راستے بھی بدل دیے ساری گڑبڑ یہیں سے شروع ہوتی ہے کہ آدمی خود اپنی منزل کا اور اپنے راستوں کا تعیّن کرنے لگتا ہے جب کہ یہ اس کے اختیار میں نہیں ہے تدبیر کند بندہ تقدیر کند خندہ!

اگر میں دائیں بائیں بیٹھے ہوئے کالے صاحب یا معزز ڈش واشر کو بتاتا کہ میں جو صورت سے اتنا محترم اور معتبر نظر آتا ہوں بحکم سرکارِ ملکہ برطانیہ۔ بصد ذلت و رسوائی اپنے ناکردہ گناہوں کی پاداش میں ولایت سے واپس بھیجا گیا ہوں اور یہ سب چکر ایک لڑکی نے چلایا تھا۔ تو کیا وہ مانتے کہ میں بے گناہ ہوں! اور یہ برطانوی حکومت کی لاقانونیت ہے کہ اس نے مجھے زبردستی پارسل کر دیا ہے سرمنڈے گوروں کی بات الگ ہے۔ برطانوی جمہوریت میں کسی قانون کے بغیر محض رنگ دار ہونے کے جرم میں جلاوطن کرنے کی گنجائش نہیں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ آلام و مصائب اور آفات و حادثات کا یہ سلسلہ (جس کا نتیجہ ادھوری تعلیم چھوڑ کے حدود سلطنت

برطانیہ سے میرے اخراج کی صورت میں ظاہر ہوا تھا۔ ایک ایسی لڑکی نے شروع کیا تھا جسے میں صورت آشنا بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ یہ تقریباً چھ مہینے پہلے کی بات تھی۔ ہوسٹل میس میں ناشتے کی ٹرے اٹھا کر میں ہال کی ہر میز کا جائزہ لے رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ کہاں بیٹھوں۔ اِکادُکا کرسیاں تو بہت خالی تھیں لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ اس وقت میرے بے تکلف دوستوں میں سے کون کہاں موجود ہے۔ اچانک کسی نے چلّا کے کہا۔

"کبیر داس..... تمہارا فون ہے"

میں نے پلٹ کر کبیر داس کہنے والے کو گالی دی۔ میرے قریب سے گزرنے والا میرے بچپن کا دوست سید محسن رضا زور سے ہنسا اور اس نے ٹرے میرے ہاتھ سے لے لی "کبیر خاں صاحب غصہ تھوک دیجئے اور بات کیجئے۔ ناشتہ میں کرتا ہوں......"

محسن نے کہا اور میں نے مجبوراً ٹرے اسے تھما دی اور اسے دائیں میز پر بیٹھ کے ناشتا کرتا چھوڑ کر منہ لبسورتا آگے بڑھا۔ سلف سروس کے اس نظام میں ٹرے اٹھا کے لائن میں کھڑے رہنا اور باری آنے پر ناشتہ لے کر آنا اور پھر جگہ بنا کے بیٹھنا یہ سب مرحلے وار عمل تھا۔ جو اب مجھے پھر شروع کرنا تھا۔ تاہم فون کال کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ کون جانے شام کی ہم رقص بننے کی دعوت کس نے قبول کرلی ہو۔ درخواست تو کوئی نصف درجن کے قریب دلیسی اور ولایتی لیلاؤں کے زیرِ غور تھی اور میں ان سب کا اکلوتا مجنوں تھا۔ چنانچہ میں نے آخری گوشے میں رکھے ہوئے فون کا ریسیور اٹھا کے محتاط لہجے میں کہا "ہیلو"

خلافِ توقع ایک اجنبی مردانہ آواز نے کہا "تم کبیر خاں ہو! وزیر خاں کے بیٹے؟"

"ہاں" میں نے کہا۔ "تم کون ہو! میرا مطلب ہے میرے اس نام سے کیسے واقف ہو؟"

"کیوں؟" جواب ملا "کیا تمہارا یہ نام نہیں تھا؟ مسٹر سکندر بخت"

"تھا" میں نے فکرمند ہو کے کہا "بچپن میں تھا اور یہ بہت پرانی بات ہے۔ یہاں لوگ مجھے سکندر بخت کے نام سے جانتے ہیں"

"میں نے کسی کو کچھ نہیں بتایا" وہ ہنسا۔ "میں نے بھی کہا تھا کہ مجھے سکندر بخت سے بات کرنی ہے"

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ محسن کبھی موج میں آکے مجھے کبیر داس یا کبیر خاں کہہ دیتا۔ مگر لوگ اسے مذاق کی بات سمجھتے تھے۔ "خیر یہ بتاؤ بات کیا ہے۔ مگر نام پہلے"

"نام میں نہیں بتانا چاہتا۔ اصرار کرو گے تو کچھ بتا بھی دوں گا" وہ بولا "تمہارے لیے بات زیادہ اہم ہے"

"پہلے تو میں سمجھا کہ کوئی دوست آشنا ہی مذاق کے موڈ میں ہے لیکن سنجیدگی سے مجھے کبیر کے نام سے مخاطب کرنے والا یہاں کوئی نہ تھا۔ سوائے میرے باپ کے جو بہت دور پاکستان میں بیٹھا اس دن کے خواب کی تعبیر کیلئے عمر کے بوجھ کو گھسیٹ رہا تھا جب میں کامیاب انجینئر بن کے لوٹوں گا اور وہ زندگی کے رہے سہے ارمان پورے کرے گا۔ گھر میں بہو لانے کے۔ پوتوں کو کھلانے کے۔ اور مرنے سے پہلے مجھے خوشحال مستقبل کی راہ پر گامزن دیکھنے کے۔ زمانہ لاکھ بدلے والدین کے خواب وہی پرانے ہوتے ہیں"

"میر شرافت علی کو جانتے ہو تم؟"

"ہاں۔ اس حد تک کہ وہ میرے والد کا بزنس پارٹنر ہے اور لاہور میں رہتا ہے۔" میں نے کہا۔

"کب سے پارٹنر بنا ہے وہ؟ اور اس کاروبار کی نوعیت کیا ہے؟" وہ بولا۔

"مجھے..... مجھے نہیں معلوم..." میں نے کہا "مجھے والد نے یہی بتایا تھا کہ امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس ہے"

"اس کا آفس کہاں ہے؟" وہ بولا "میر شرافت علی رہتا کہاں ہے؟"

"دیکھو یہ سب باتیں ایسی ہیں کہ میں نے اپنے والد سے قبل از وقت پوچھنی ضروری نہیں سمجھیں" میں نے کہا۔

"قبل از وقت؟" وہ ہنسا "خدانخواستہ آج اگر تمہارے والد کو کچھ ہو جائے۔ تو تم کیا کرو گے! تم وزیر خاں کے اکلوتے بیٹے ہو۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ تم نے کبھی اس مسئلے پر غور ہی نہ کیا ہو"

"آخر تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" میں نے کہا۔ "اور یہ سب باتیں مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"حقیقت یہ ہے کہ تمہیں کچھ معلوم نہیں۔....." اس نے میری بات نظر انداز کر دی "تمہیں عمداً بے خبر رکھا گیا ہے"

میں الجھن میں پڑ گیا۔ عمداً.... میرے والد نے تو ہمیشہ بزنس کی بات ٹال دی تھی۔..... ابھی پڑھو کبیر خاں.... عمر پڑی ہے ان فکروں کے لیے..... جب تک میں ہوں یہ سوچنا تمہارا کام نہیں کہ کل کیا ہوگا۔ ہوتا وہی ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔ لیکن یہ بات واقعی عجیب تھی۔ کل کے بارے میں جانتا تو کوئی نہیں کہ کل کیا ہوگا۔ مگر کل کی فکر تو سب ہی کرتے ہیں اور یہ بات اتنے وثوق کے ساتھ کون کہہ سکتا ہے کہ اس کے مقدر میں آنے والے دن کے سورج کا اجالا بھی ہے۔ جب

آدمی وقت کی راہ گزر پر چلتا ہے تو موت کے نامہ بر لمحے کو ساتھ رکھتا ہے اور اجل کا انتظار ہر سانس کے ساتھ کرتا ہے۔

میرا تجسس اب تشویش میں بدلنے لگا تھا۔ "میں تمہارے اتنے پراسرار اندازِ گفتگو سے کیا نتیجہ اخذ کروں۔ میری سمجھ میں تو نہیں آتا کہ یہ کیا ڈرامہ ہے آخر؟" میں نے جھنجھلا کے کہا۔ "اپنا نام تک نہیں بتایا ہے تم نے۔"

"نام کچھ بھی فرض کر لو... مثلاً فوما پخو۔ نام میں کیا ہے سکندر بخت۔ میری بات دھیان سے سنو۔ ورنہ بعد میں افسوس کرو گے تو کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ میر شرافت علی ایبٹ روڈ پر قدیم طرز کی ایک کوٹھی میں رہتا ہے جو متروکہ املاک تھی۔ جس ہندو نے یہ کوٹھی بنوائی تھی وہ اب شرافت علی کی میرٹھ والی کوٹھی میں رہتا ہے۔ ایبٹ روڈ کی کوٹھی کا نام ہے زرین بسیرا۔ کتھئی اور سفید رنگ کی۔"

"شرافت علی بھی میرٹھ سے آیا تھا۔" میں نے اس انکشاف پہ چونک کے کہا۔ "اور اس نے جائداد کا تبادلہ کر لیا تھا؟"

"ہاں اب اس کا دفتر بیڈن روڈ پر امرتسری حلوائی کی دکان سے ذرا آگے دائیں جانب ہے۔ اوپر کی دوسری منزل پر میروزیر اینڈ کو، تمہیں بورڈ نظر آجائے گا۔ اس سے تمہیں کاروبار کی نوعیت معلوم ہو سکتی ہے۔"

"تم بہت کچھ جانتے ہو۔" میں نے اعتراف کیا۔ "جو مجھے واقعی معلوم نہیں۔ ایسا کیوں نہیں کرتے کہ کہیں مجھ سے مل لو، ہم اطمینان سے بیٹھ کے باتیں کریں گے۔"

"سوری بوائے۔ میں ایئر پورٹ پر ہوں اور میرے جہاز کی روانگی میں چند منٹ رہ گئے ہیں۔" وہ بولا۔ "ورنہ میں آجاتا۔"

"اچھا تو اپنا پتہ بتا دو... میں تم سے خط و کتابت رکھوں گا۔" میں نے کہا۔ "تم مجھے تفصیل سے وہ باتیں لکھ کر بتا سکتے ہو..."

"میں دوبارہ کہوں گا سوری۔ میں لکھ کر کچھ نہیں دے سکتا۔ میرا اصول یا میری مجبوری۔ جو چاہو سمجھ لو۔ اور میں نہیں صرف راستہ دکھا رہا ہوں۔ باقی سب تمہاری عقل اور ہمت پر چھوڑ رہا ہوں۔" میرے خیر خواہ نے کہا۔

"اچھا تم کس فلائٹ سے جا رہے ہو؟ اور کہاں؟" میں نے مایوسی سے کہا... مجھے اب اس شخص پر اعتبار آنے لگا تھا۔

وہ ہنسا۔ "تم واقعی ذہین ہو مگر میں بھی اتنا بیوقوف نہیں سکندر بخت۔ ایک آخری بات۔ یہ بتاؤ تمہارے والد کا آخری خط کب آیا تھا؟"

"ابھی چند روز پہلے۔" میں نے حیران اور کچھ پریشان ہو کے جواب دیا۔

"اس میں کیا لکھا تھا انہوں نے؟ کوئی قابلِ تشویش بات تھی؟"

"نہیں... بالکل خیریت کا خط تھا۔" میں نے کہا۔ "صحت اچھی ہے۔ کاروبار چل رہا ہے۔ خوش رہو اور کسی بات کی فکر مت کرو... وغیرہ وغیرہ... ان کے سب خط ایسے ہی ہوتے ہیں۔"

"اور آخری بار تم نے انہیں کب دیکھا تھا؟" اس نے پوچھا

"یہی کوئی سال بھر پہلے۔" میں نے جواب دیا۔ "عید... نہیں بقر عید پر گیا تھا میں۔ گویا سوا سال ہو گیا۔"

"اچھا تو نوٹ کر لو... تمہارے والد بالکل خیریت سے نہیں ہیں۔" اس نے کہا۔ "اور تم خود بھی محتاط رہو۔"

"وکس سے محتاط رہوں؟" میں نے کہا۔ "ہیلو۔ ہیلو۔" میں نے چلا کے کہا۔ مگر لائن کٹ چکی تھی۔ میں کچھ دیر ریسیور ہاتھ میں تھامے کھڑا رہا۔ اس اجنبی کی آواز اب بھی میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ "تمہارے والد بالکل خیریت سے نہیں ہیں۔" اب میں اس نادیدہ خیر خواہ کی بات کو مذاق سمجھ کے نہیں ٹال سکتا تھا کہ اس کو میری نجی زندگی کے بارے میں وہ باتیں معلوم تھیں جو خود میں نہیں جانتا تھا۔ لیکن تصدیق کیے بغیر میں کہہ سکتا تھا کہ اس نے جھوٹ نہیں بولا۔

"میروزیر اینڈ کمپنی" کا دفتر مجھے معلوم تھا۔ مگر میر شرافت علی کے بارے میں اس کی فراہم کردہ معلومات نئی تھیں کسی خاص مقصد کے تحت اس نے مجھ سے رابطہ قائم کیا تھا اور میرے تجسس کو ایک سمت عطا کر کے باقی سب مجھ پر چھوڑ دیا تھا۔ وہ لہجے سے سنجیدہ اور متین آدمی لگتا تھا۔ چنانچہ میرا ذہن ہر بات کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

میں کچھ دیر خالی ٹرے بے دف کی طرح بجاتا رہا اور سوچتا رہا کہ اتنی خوشگوار صبح کا یہ آغاز مبارک ہے یا کسی نحوست کا پیش خیمہ۔ پھر میرے پیچھے والے لڑکے نے مجھے آگے دھکیلا...

"یہ قطار موسیقی کا ریاض کرنے کی جگہ نہیں ہے سرکار۔ آپ ایک طرف بیٹھ کے شوق سے ٹرے بجائیے۔ ورنہ ناشتا لیجئے۔" وہ ایک ہندوستانی طالب علم تھا۔ جس کے ساتھ میری کبھی نہیں بنی تھی۔ وہ باکسر تھا تو میں جوڈو اور کراٹے کے ایک جاپانی اسکول میں تربیت کے آخری مرحلے میں تھا۔ اور آئے دن ایسی ہی فضول باتوں پر ہماری ٹھن جاتی تھی۔ پہلے میں مارکھاتا تھا۔ مگر اب میرا پلہ بھاری تھا

"یہ طبل جنگ بج رہا تھا۔ طنبورے۔" میں نے کہا۔ "مگر اچھا کیا جو مجھے یاد دلا دیا کہ مجھے ناشتہ بھی کرنا ہے۔"

ناشتہ اٹھا کے میں اس میز پر جا بیٹھا جہاں محسن اب ایک ولایتی گڑیا سے چکنی چپڑی باتیں کر رہا تھا۔ "آپ کہیں اور تشریف رکھ سکتے تھے۔" اس نے چیں بہ جبیں ہو کے کہا۔

"جی نہیں۔ ہم یہاں اس لیے تشریف لائے ہیں کہ نہایت اہم اور سنگین نوعیت کے مسائل پیدا ہو گئے ہیں جو واحد حاضر فرنگن کے عشقِ خانہ خراب سے زیادہ آپ کی توجہ کے طالب ہیں۔" میں نے کہا۔ فرنگن اردو کی گفتگو کو بدتہذیبی کی علامت قرار دیتے ہوئے اٹھ گئی۔

"کر دیا آپ نے سب معاملہ چوپٹ۔ اب فرمائیے معاملہ کیا ہے؟" محسن نے جل بھن کے کہا۔

"معاملہ بہت عجیب ہے۔" میں نے ناشتے کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ "عرض کرتا ہوں۔ توجہ ذرا میری طرف رکھیے۔ تھینک یو۔"

اس کے بعد میں نے عرض کیا اور محسن سنتا رہا۔ اسی روز میں نے محسن سے طویل صلاح مشورے کے بعد ٹرنک کال بک کرائی جو لندن میں آدھی رات کے وقت اور پاکستان کے وقت کے مطابق سات بجے ملی۔ میرے والد بالکل خیریت سے تھے اور میرے بار بار پوچھنے پر کہ تشویش کی کوئی بات تو نہیں۔ خاصے تشویش میں مبتلا ہو گئے تھے۔

"تشویش سے کیا مراد ہے بیٹا تمہاری؟" انہوں نے کہا۔ "یہ اچانک تمہاری زبان تشویش کی تکرار کیوں کرنے لگی ہے؟"

فوما پخو نے مجھے منع کر دیا تھا کہ اصل سبب نہ بتاؤں چنانچہ میں نے کہا۔ "دیکھیے نا۔ آپ سے اتنی دور ہوں! تشویش تو ہر وقت رہتی ہے۔ آپ کی صحت کیسی ہے۔ کاروبار کیسا ہے؟"

"دونوں ٹھیک ہیں۔ الحمد للہ۔" والد نے کہا۔ "خرابی ہو گی تو تمہیں ہی لکھوں گا۔"

ایک شبے نے میرے ذہن میں سر اٹھایا کہ وہ غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں۔ مجھے ان کے لہجے میں اعتماد کی کمی محسوس ہونے لگی تھی۔ "آپ میری پریشانی کے خیال سے کچھ چھپا تو نہیں رہے ہیں؟" میں نے کہا۔

"لاحول ولا قوۃ۔ یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو آج! پیسے کی ضرورت ہے کیا؟" لہجہ بدستور کھوکھلا تھا۔ یا صرف میرے وہم کی بات تھی؟

"پیسہ!" میں نے سر کھجا کے کہا۔ "یہ بڑا پیچیدہ مسئلہ ہے اباجی۔ آج تک کوئی طے نہیں کر سکا کہ پیسے کی ضرورت ختم ہوتی ہے تو کہاں؟ معاشیات میں ضروریات کی جو تعریف ہے..."

"اچھا اچھا میں ڈرافٹ بھیج دوں گا۔" انہوں نے کہا پھر وقت ختم ہو گیا۔ میں نے اور محسن نے ٹاس کیا اور فیصلہ وہی ہوا جو ہم پہلے ہی کر چکے تھے یعنی میرا وہ نادیدہ خیر خواہ جس نے فون پر سنسنی خیز مکالمے بولے تھے کوئی شر پسند تھا جس کا مقصد مجھے پریشان کرنے کے سوا کچھ نہ تھا۔ مذاق میں بعض لوگ حد سے بڑھ جاتے ہیں۔

لیکن اس فیصلے کے باوجود میں چند روز اطمینانِ قلب سے محروم رہا۔ کیونکہ ایک بے نام سی خلش کا آزار ختم نہیں ہوا تھا۔ دن تو مصروفیت کی نذر ہو جاتا تھا۔ مگر جب میں رات کو سونے کے لیے لیٹتا تھا تو میرے ذہن میں وہی سوالات گردش کرنے لگتے تھے جن کا جواب کہیں نہ تھا کہ وہ اجنبی کون تھا اور اگر وہ اتنا جانتا تھا تو اسے کیا ضرورت تھی مجھ سے اس قسم کی باتیں کرنے کی۔ اس نے کیوں کہا تھا کہ محتاط رہو... تمہیں عمداً بے خبر رکھا گیا ہے... جھوٹ اس نے بولا تھا یا میرے والد نے اور اگر وہ سچا تھا تو نام تک بتانے سے گریز چہ معنی دارد؟ اتنے کم وقت میں بھلا میں کیا بتاتا کہ اپنے والد کے کاروباری امور سے ناواقفیت کے اسباب کیا ہیں۔ برسوں پر محیط داستان چند منٹ میں کیسے سمیٹی جا سکتی تھی۔ اگر وہ مجھ سے ملتا یا مجھے اپنا پتہ ہی دے جاتا تو صورتِ حالات کو سمجھنے اور سمجھانے میں مدد ملتی مگر وہ تو اپنی بات کہہ کر اڑن چھو ہو گیا تھا۔ ایک شعر سو فیصد حسبِ حال تھا۔ گئے دنوں کا سراغ لے کر کہاں سے آیا۔ کدھر گیا وہ۔ اور... اور پتہ نہیں کیا... عجیب گمنام اجنبی تھا مجھے تو حیران کر گیا وہ۔

ایک ماہ بعد جب میں اس واقعے کو بالکل بھول چکا تھا دوسرا واقعہ پیش آیا یعنی فوما پخو کی واپسی۔ مگر مجھے ہر حال میں ایک لڑکی سے ملاقات کے لیے جانا تھا وہ ایک انتہائی خر دماغ۔ متعصب اور تنگ نظر لارڈ کی بیٹی تھی۔ جس کا باپ غلام ہند کے کسی صوبے میں لفٹیننٹ گورنر رہ چکا تھا۔ میری اور محسن کی حکمتِ عملی کا خلاصہ یہ تھا کہ ڈیڑھ سو سال ان گوروں نے ہم پر حکومت کی۔ اب ہم کو ڈیڑھ سال تک انہی کے ملک میں آکے ان کے غرور کو شکست دینے کا حق حاصل ہے۔ وہ تجارت کے بہانے آئے تھے۔ ہم تعلیم کے بہانے آئے ہیں۔ اب وہ نفرت کرتے ہیں تو ہم محبت کا چکر چلائیں گے اور منزل ہماری تھی بکنگھم پیلس! اب عین اس وقت جب میں ہیلمٹ کو تاجِ شاہی کی طرح سر پر سجا کے نکل رہا تھا۔ ایک اور لڑکی نے پکار کے کہا۔ "مسٹر الیگزنڈر... فون پلیز..." اور اس نے ریسیور کو لہرا کے مجھے بلایا اور خود بھی لہرائی۔

"پورا نام ہے الیگزنڈر دی گریٹ۔" میں نے اسے تنبیہ کی اور ریسیور لے کر انگریزی قاعدے کے مطابق کہا۔ "بخت بول رہا ہوں۔"

"مسٹر کبیر" میرے لیے یہ مانوس آواز اس بجلی کی طرح تھی جس کا جھٹکا پہلے بھی لگ چکا ہو۔

"تم..... ! " میں نے چلا کر کہا اور گالی دینے کی خواہش پر بڑی مشکل سے قابو پایا "تم پھر آ گئے ؟"

"ہاں" وہ بولا "میرا خیال ہے تم بہت بدگمان ہو۔ کیا اس لیے کہ میں نے جھوٹ بولا تھا ؟"

"ہاں..... اور اس جھوٹ پر مجھے ٹرنک کال کرنی پڑی۔ میں پہلے ہی کنگال تھا۔ میرا اپھڑا ہو گیا" میں نے برہمی سے کہا۔

"اچھا اب میں وضاحت کر سکتا ہوں" وہ میری بات کاٹ کے بولا "میرا اسٹاپ اوور ہے۔ ایک رات کے لیے۔ تم مجھ سے مل لو" اس نے مجھے ہوٹل کا نام اور کمرے کا نمبر بتایا۔

"سوری" میں نے کہا "مجھے..... مجھے اس وقت بہت بڑا معرکہ درپیش ہے۔ کل آ سکتا ہوں ؟"

"بے وقوف مت بنو۔ میں تمہیں بہت سے خطرات سے خبردار کرنا چاہتا تھا" وہ بولا "صبح تو میری فلائٹ سات بجے ہے" پھر فون میرے جواب سے قبل ہی بند ہو گیا۔ میں کشمکش میں پڑ گیا۔ ایک طرف اس الزبتھ ٹیلر سے زیادہ حسین اور پرکشش حسینہ کے قرب کی سدا بہار آرزو تھی۔ دوسری طرف بہت سے سوالات کا جواب ملنے کی امید تھی۔ اور اس پُراسرار شخص سے مل کر وہ حالات جاننے کی خواہش تھی جن سے مجھے عمداً بے خبر رکھا گیا تھا۔ حسبِ معمول میں نے سید محسن رضا سے رجوع کیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے مشیرِ اعلیٰ بھی تھے۔ معاون و محافظ بھی تھے۔ ناصح بھی تھے غمگسار بھی تھے اور بقول شاعر ہم پیشہ و ہم مشرب و ہمراز۔ دیارِ غیر میں تو سب ہم زباں ایک ہو ہی جاتے ہیں۔ مگر محسن سے رشتہ ایک تناور درخت تھا جس کی جڑیں گزرے ہوئے وقت کی زمین میں ہر طرف بیس برسوں کی گہرائی تک اتری ہوئی تھیں۔

محسن کہیں جانے کے لیے تیار ہو چکا تھا "مسئلہ اگر اس لفٹیننٹ گورنر کی اولاد سے آباؤ اجداد کی محکومی کا انتقام لینے کا ہے تو اس محاذ پر میں بھی لڑ سکتا ہوں۔ میرا خیال ہے تو جا۔"

"محسن رضا۔ مجھے اس سے سچا عشق ہونے کا اندیشہ ہے" میں نے کہا "میں صرف اطلاع دینے آیا تھا کہ سند رہے اور وقتِ ضرورت کام آئے۔ اگر میں لوٹ کر نہ آؤں تو پتہ کر لینا۔ وہ آدمی مجھے فو مانچو ناپ لگتا ہے۔ نام پوچھنا تو یاد نہیں رہا مجھے۔"

"فو مانچو آپ ہیں قبلہ" محسن نے کہا "یہ بات اپنی سمجھ میں تو نہیں آتی کہ ایک آدمی ہوٹل کا نام کمرے کا نمبر بتا دے اور اپنا نام نہ بتائے کیا معلوم نہیں ہو سکتا اس سے..... یہ کوئی چکر ہے سکندر بخت اور مجھے تیری یہ مارگریٹ بھی بالکل پسند نہیں۔"

مجھے اپنی نادانی پر حیرت ہوئی "یار یہ تو ٹھیک کہتا ہے۔ میں ابھی معلوم کرتا ہوں۔ مارگریٹ کا مسئلہ یہ ہے دوست کہ میں کمبل کو چھوڑتا ہوں کمبل مجھے نہیں چھوڑتا۔"

میں نیچے آیا تو چند منٹ قبل تک ہنستا بولتا فون مر چکا تھا۔ یعنی ڈیڈ تھا۔ میں نے باہر آ کے موٹر سائیکل نکالی اور ابھی زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ مجھے ایک پبلک ٹیلی فون کا بوتھ خالی مل گیا میں نے ایک سکہ ڈالا اور ہوٹل کا نمبر ملایا "روم نمبر تھری زیرو ٹو پلیز" میں نے آپریٹر کی نغمہ ریز آواز پر کہا۔

"واٹ" آپریٹر نے یوں کہا۔ جیسے میں نے اس کو فحش ترین گالی دے دی ہو "کس سے بات کرنی ہے! کیا کام ہے ؟"

"کام میں تمہیں نہیں بتا سکتا" میں نے خفگی سے کہا۔ لیکن اس دوران میں نے محسوس کیا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے آپریٹر نے کسی سے کہا تھا کہ کمرہ نمبر ۳۰۲ کی کال ہے۔ کیا کروں۔

میرے خدشات درست ثابت ہوئے "آپ کون ہیں اور کہاں سے بول رہے ہیں ؟" ایک مردانہ آواز نے کہا جس میں ترنم نہیں تھا۔ مگر شائستگی ضرور تھی جو یہاں پولیس کی طرۂ امتیاز تھی مگر اس کے باوجود لہجہ تفتیش کی چغلی کھاتا تھا۔

"میں—!" میں نے سوچ کر کہا "میں مسٹر فو مانچو کا بھانجا ہوں اور عالمِ بالا سے بول رہا ہوں۔"

"دیکھو بیٹے..... " ایک سخت اور کرخت آواز آئی..... "مذاق بعض اوقات خطرناک بھی ہو جاتا ہے۔ اگر تم پبلک کال آفس سے نہ بول رہے ہوتے تو ہم تمہیں عملی سبق دیتے..... یہ قتل کا کیس ہے۔ سمجھے..... ؟"

"قتل !" میں نے چیخ کر کہا..... "کس کا قتل ؟..... کمرہ نمبر تین سو دو میں رہنے والے کا ؟" مگر وہ پولیس مین جو شاید تفتیش پر مامور تھا فون پٹخ کے جا چکا تھا..... میں نے ریسیور پھینکا اور باہر نکلتے ہی ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو کے بھاگا پولیس والے پانچ منٹ میں پبلک کال آفس بھی پہنچ سکتے تھے یہ بھی ممکن تھا کہ مجھ سے بات کرتے کرتے وہ کسی کو پیغام دے چکا ہو۔ اسکاٹ لینڈ یارڈ والے واقعی بہت کائیاں لوگ ہوتے ہیں۔ ذرا سی عقل مندی سے کام لے کر میں بال بال بچ گیا تھا۔ خطرے کی حدود سے دور آ کے میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اگر یہ فون میں نے ہوسٹل سے کیا ہوتا تو آدھ گھنٹے بعد یقیناً سازش کے اس جال میں گرفتار ہو جاتا جو کسی نے بہت ہی چالاکی سے بچھایا تھا۔ غلطی اس سے صرف یہ ہوئی تھی کہ اس نے اپنا نام نہیں بتایا تھا۔ ورنہ میں سیدھا ہوٹل جاتا اور تفتیش کے چکر میں آ جاتا۔ اسی بھول نے جو نادانستگی میں ہوئی تھی مجھے بچا لیا تھا۔

موٹر سائیکل کو پارکنگ ایریا میں چھوڑ کے میں اُوپر گیا تو محسن رضا کے کمرے کا دروازہ بند تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ بھی انگریز سے اس کے دورِ حکومت کے مظالم کا بدلہ لینے جا چکا ہے۔ انگریز نے ہماری نسلوں کو۔ ہماری اخلاقی اقدار کو اور ہماری تہذیب کو خراب کیا تھا۔ اب ہماری باری ہے۔ یہ بات میں نے اور محسن نے سرِعام اتنی بار کہی کہ بالآخر ہوسٹل کے سخت گیر۔ بوڑھے اور برطانوی قدامت پسندی کے علمبردار سپرنٹنڈنٹ تک پہنچ گئی تھی اور اس نے دو بد باطن گوروں کی تحریری شہادت پر مجھے اور محسن رضا کو لکھ کر وارننگ دی تھی کہ ہم نسل منافرت اور تشدد پسندانہ سیاسی خیالات کے اظہار سے باز نہ آئے تو ہمیں ہوسٹل سے خارج کر دیا جائے گا۔ نسلی منافرت کی فضا تو تھی مگر اس کا الزام صرف ہم پر نہیں آتا تھا۔ دوسری بات سراسر لغو اور بے بنیاد تھی۔ غیر سنجیدگی سے کہی جانے والی بات سے یہ نتیجہ اخذ کرنا ایک متعصب ذہنیت کی مذموم سازش تھی۔ دونوں بد باطن گورے گواہوں کی گوشمالی بڑے تزک و احتشام کے ساتھ کی گئی تھی۔ اور اس کارِ خیر میں تمام اختلافات بھلا کے سب ایشیائی طالب علموں نے بڑے جوش و خروش سے حصہ لیا تھا۔ اگلے دن گوروں کی ایک ٹیم نے جوابی کارروائی کا پروگرام بنایا تھا۔ مگر نسلی فسادات پھیل جانے کے ڈر سے پرنسپل اور مقامی انتظامیہ نے مل جل کر معاملہ رفع دفع کرا دیا تھا۔ اس امکانی فساد کا ذمے دار بھی ہم ہی سمجھے گئے تھے لیکن سزا سے محفوظ رہے تھے— ہوسٹل سپرنٹنڈنٹ کالج کے پرنسپل کو بھی یقین دلا چکا تھا کہ ہم دونوں خطرناک ایشیائی ہیں جو برطانیہ کی ساکھ کی جڑیں کھوکھلی کر رہے ہیں۔ اگر آج میں قتل کے اس کیس میں ملوث ہو جاتا تو میرا سابقہ ریکارڈ دیکھ کر وہ دونوں اتفاقِ رائے سے تسلیم کر لیتے کہ قتل کی واردات میں ہمارے ملوث ہونے کے امکانات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اپنے کمرے کے دروازے پر پہنچ کے میرے قدم رک گئے۔ دروازہ جسے میں قفل کر کے گیا تھا کھلا ہوا تھا۔ اس کے ڈور لاک میں ایک معمولی سی خرابی یہ پیدا ہو گئی تھی کہ اگر اسے شرافت سے بند کیا جاتا تھا تو چند سیکنڈ بعد پٹ اور چوکھٹ جدا ہو جاتے تھے۔ صحیح طرح سے بند کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ دروازے کو دھکیل کر دھڑ سے مارا جائے اس وقت پٹ اور چوکھٹ جُدا تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ اندر جانے والا دروازہ

بند کر کے مطمئن ہو گیا تھا اور اسے احساس بھی نہیں تھا کہ دروازہ پھر کھل گیا ہے۔ میرے کمرے کی واحد چابی میرے ہاتھ میں تھی۔ جس کے بغیر دروازہ کھل ہی نہیں سکتا تھا۔ میں نے آہستہ سے پٹ کو دھکا دیا۔ دروازے کے زنگ خوردہ پرانے قبضے چرچرائے۔ اور میں اندر داخل ہوا تو ایک لڑکی جو میری میز کی درازوں میں کچھ تلاش کر رہی تھی تیزی سے پلٹی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کا رنگ فق ہو گیا۔

"ہیلو۔ کون ہو تم؟" میں نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہاں کیا کر رہی ہو؟"

وہ اپنی مٹھی میں کچھ دبائے خاموش کھڑی رہی۔ اس کی عمر پچیس سال سے کم تھی۔ مگر آنکھوں کے گرد قبل از وقت نمودار ہو جانے والے حلقوں۔ چہرے کی پژمردگی، بھونڈے میک اپ کی دبیز تہہ سے جھانکتے والی چھائیوں کے نشانات اور ڈھلکے ہوئے جسم کے باعث وہ پینتیس سال سے زائد کی لگتی تھی۔ پھر اس کی صورت پر دہ بے باک۔ حیا سے عاری اور گناہ آلود مسکراہٹ نمودار ہوئی جو اس کے لباس کی طرح اسکے پیشے کا اشتہار دیتی تھی۔

میں ایک ایک قدم آگے بڑھتا گیا۔ "میری میز کی درازوں میں سے کیا نکالا ہے تم نے؟" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

اس نے اچانک دونوں ہاتھ بڑھا کے مجھے دھکا دیا۔ میں لڑکھڑا کے پیچھے ہٹا اور اسٹول سے ٹکرا کے نیچے گرا۔ اس عورت نے جست لگا کے مجھ پر سے گزر جانے کی کوشش کی۔ اس کا رخ دروازے کی طرف تھا۔ لیکن میں نے لیٹے لیٹے اس کا ایک پاؤں گرفت میں لے لیا۔ میرے ہاتھ میں ایک زنانہ جوتا آیا۔ لیکن وہ خود منہ کے بل گر گئی۔ اس کے حلق سے ایسی زبردست چیخ برآمد ہوئی کہ میں حیران رہ گیا۔ مگر اسے اٹھنے کا موقع دیے بغیر میں اس پر جا پڑا۔ وہ عورت شیرنی کی طرح مجھ سے گتھم گتھا ہو گئی۔ اس کے لمبے لمبے ناخنوں سے میرے چہرے پر خراشیں پڑ گئیں۔ میرے کپڑے تار تار ہو گئے۔ اور میرے بال اس کے ہاتھوں میں آ گئے۔ غصے نے مجھے پاگل کر دیا۔ میرے ہاتھوں کی وحشی قوت نے چند منٹ میں اسے زیر کر لیا مگر اس جدوجہد میں عورت کے کپڑے بھی پھٹ گئے اور اس کے جسم پر بھی خون کی سرخ لکیریں پھیل گئیں۔ میں تہیہ کر چکا تھا کہ اس عورت کو فرار نہیں ہونے دوں گا۔ اور پولیس خود ہی معلوم کرے گی کہ یوں چوروں کی طرح وہ میرے کمرے میں کیا لینے آئی تھی۔ عورت مسلسل چیخ رہی تھی۔ "بچاؤ۔ بچاؤ۔" اور میں ادھر ادھر سے دوڑ کر آنے والوں کے قدموں کی آواز سن رہا تھا۔ پھر ایک عجیب بات ہو گئی۔ وہ عورت پلک جھپکتے میں میری گرفت سے نکل گئی۔ اور دروازے کی طرف بھاگنے کی بجائے میرے بستر پر جا گری۔

دروازہ دھڑ سے کھلا اور بیک وقت بہت سے لوگ اندر آ گئے۔ یہ سب ہوسٹل میں رہنے والے ملکی اور غیر ملکی باشندے تھے۔ دو افراد نے مجھے قابو کر لیا کیونکہ میں پھر اس عورت کی طرف لپکا تھا اس نے آخری دلدوز چیخ ماری اور دو گوروں نے آگے بڑھ کے اسے سنبھال لیا۔ "خدا کے لیے مجھے بچاؤ۔" وہ دیوانہ وار چلائی۔ "یہ کالیا مجھے دھوکے سے لے آیا۔ یہ میری آبرو لوٹنا چاہتا تھا۔" وہ دہاڑیں مار مار کے روتے ہوئے بولی۔

میں خوف اور صدمے سے سن کھڑا رہ گیا۔ اس فاحشہ کو سنبھالنے والے وہی دونوں بدباطن گورے تھے جنہوں نے ایک بار۔۔ میرے اور محسن کے خلاف تحریری شہادت دی تھی۔

میرے حمایتی وہ سب ایشیائی طالب علم تھے جو مجسم سوال بنے بے بس کھڑے تھے۔

"خدا کی قسم یہ جھوٹ ہے۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "میں ابھی ابھی باہر سے آیا ہوں تو یہ میرے کمرے میں گھسی ہوئی کچھ تلاش کر رہی تھی۔ میں نے اسے پہلے کبھی دیکھا تک نہیں۔"

لیکن صاف ظاہر تھا کہ میری اس وضاحت نے کسی کو مطمئن نہیں کیا ہے۔ میری قوت آزمائی کے نشانات اس کا تار تار لباس اور خود میری حالت میرے جرم کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ وہ عورت جسے یقیناً کسی نے سازش کے تحت بھیجا تھا اپنے مقصد میں کامیاب رہی کیونکہ وہ بہت اچھی اداکارہ بھی تھی۔ وہ اب ہسٹریا کی کیفیت میں چلا رہی تھی۔ "خدا کے لیے۔ یسوع مسیح کے لیے مجھے اس کالے حیوان سے بچاؤ۔" اور اس پر واقعی بیہوشی غالب آ رہی تھی۔ میں جانتا تھا یہ مکر و فریب کے حربے ہیں لیکن دیکھنے والے حالات کی پوری تصویر دیکھ رہے تھے اور انہیں عورت کی مظلومیت کا اور میری فطری خباثت کا یقین آ رہا تھا۔

دونوں بدباطن گوروں مجھے ایک غلیظ گالی دی اور دانت پیس کر آگے بڑھے۔ دو ایشیائی ان کی راہ میں فوراً حائل ہو گئے۔ عین ممکن تھا میرا وہ کمرہ نسلی فساد کی خونی آماجگاہ بن جاتا مگر اسی وقت مجمع کو چیر کر ہوسٹل کا یہودی سپرنٹنڈنٹ اندر آ گیا۔ اس نے ایک نظر میں بھانپ لیا کہ معاملہ کیا ہے۔

"مسٹر بخت۔" اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی اور رک گیا پھر اس نے پلٹ کر ایک گورے سے کہا۔ "جاؤ اور پولیس کو اطلاع دو باقی لوگ باہر۔" اس نے چٹکی بجائی: "آؤٹ!"

"تھینک یو سر۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "میں بھی یہی چاہتا تھا۔ اور اپنے کپڑے بدلنے کے لیے پلٹا مگر سپرنٹنڈنٹ نے مجھے روک دیا۔ کمرے سے آخری لڑکا بھی باہر نکل گیا تھا۔

"پہلے پولیس کو یہ سب کچھ دیکھ لینے دو۔ جیسا ہے۔ جہاں ہے۔" سپرنٹنڈنٹ نے طنز سے کہا۔ صورت حال اتنی سنگین ہو گئی تھی کہ اب میرے لیے بوڑھے یہودی کو دھکا دے کر باتھ روم میں گھس جانا۔ اور ہاتھ منہ دھو کے کپڑے بدلنا کوئی مشکل کام نہ تھا اور اس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ میں برطانوی پولیس کے سامنے شریفانہ حلیے میں جانا چاہتا تھا۔ مگر مجھے اس کی مہلت ہی نہیں ملی۔ سپرنٹنڈنٹ کے احکامات ملنے سے قبل ہی کوئی پولیس کو فون کر چکا تھا اور وہ برطانوی پولیس تھی۔ جائے واردات پر پہنچنے کو میں چند منٹ لینے والی۔ دروازہ اسی وقت کھلا اور دو پولیس مین اندر آ گئے۔ ان میں سے ایک نے عادتاً ریوالور نکال لیا تھا۔ وہ بھی مجھے اسی مضحکہ خیز حلیے میں لے جانا چاہتے تھے۔ مگر میں نے سفارتخانے سے رجوع کرنے کی دھمکی دی تو انہوں نے مجھے لباس تبدیل کرنے کی اجازت دے دی۔ نہ جانے کس نے اس عورت کو بھی زنانہ کپڑوں کا ایک جوڑا لا دیا تھا۔ جب ہم پولیس کی معیت میں روانہ ہوئے تو چشم دید گواہوں کا ایک مجمع ہمرکاب تھا اس وقت تک میں پرسکون ہو گیا تھا اور مجھے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں دیر نہ لگی کہ مجھے فون کر کے بلانے کا مقصد ایک تیر سے دو شکار کرنا تھا۔ ایک طرف میں قتل کی واردات کی تفتیش میں پھنس جاتا۔ دوسری طرف یہ عورت اپنا کام کر کے نکل جاتی۔ اسے بھیجنے والوں کو کہاں معلوم تھا کہ میں ویسے بھی ایک معرکہ سر کرنے جا رہا تھا۔ آدھی رات سے پہلے میرے لوٹنے کا امکان نہیں تھا۔ مگر نامعلوم دشمنوں نے کمرے سے میری عدم موجودگی کو یقینی بنانے کے لیے ٹیلی فون کیا تھا۔ کون جانے میں اس ہوٹل میں پہنچ جاتا تو کمرہ نمبر تین سو دو میں ہونے والے ایک ایسے شخص کے قتل کا الزام بھی مجھ پر ثابت ہو جاتا جسے میں نے کبھی دیکھا تک نہ تھا اور جس کے نام سے بھی میں ناواقف تھی۔ قانون تو اندھا ہوتا ہے اور ثبوت شہادت کے سوا کچھ نہیں جانتا۔ نہ جانے وہاں میرے خلاف کتنے ثبوت ملتے اور کتنے گواہ پیدا ہو جاتے۔ محض تصدیق کرنے کے باعث میں بچ گیا تھا اور آدھے راستے ہی سے لوٹ آیا تھا۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ میں نے کمرے میں غیر متوقع طور پر پہنچ کر اس عورت کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا جو میرے کمرے میں کسی کی ہدایت پر کچھ رکھنے آئی تھی۔ یا درازوں میں سے کچھ نکال کرے جانے کیلئے۔ خود کو محصور پا کے اس نے جو کچھ کیا تھا۔ اس کا اپنا فعل تھا۔ لیکن انجام وہی ہوا تھا جو دشمن چاہتے تھے۔ میں اب پولیس کی تحویل میں تھا۔ اور مجھ پر عصمت دری کی کوشش کا انتہائی سنگین جرم تھا۔ ثابت مجھ پر قتل کا جرم بھی نہ ہوتا۔ ثابت یہ بھی نہ ہو گا کہ میں اس پیشہ ور عورت کو خود دھوکے سے اپنے کمرے میں لایا تھا۔ لیکن فیصلہ ہونے تک جتنا نقصان ہونا تھا ہو جائے گا۔

محسن کو میں نے پولیس اسٹیشن پہنچنے کے بعد دیکھا۔ میں نے اس سے چند منٹ تخلیے میں بات کرنے کی اجازت مانگی جو مجھے تھوڑے سے تامل کے بعد مل گئی "تو یہاں کیسے پہنچ گیا؟" وہ بولا۔

میں نے اسے مختصراً ساری بات بتا دی۔

"ٹھیک ہے۔" وہ بولا "یہ تیرا بال بیکا نہیں کر سکتے۔ بس اس پراسرار شخص کے ٹیلی فون کی بات مت کرنا۔ یہ کہنا تو میرے ساتھ تھا۔"

"اور تو کہاں تھا؟" میں نے اس نکتے پر غور کرتے ہوئے کہا۔

محسن نے جیب سے آپیرا کے دو ٹکٹ نکالے "وہ نہیں آئی نا۔۔۔!" اس نے ذرا خفت زدہ ہو کے کہا "مگر اب ہمارے پاس ثبوت ہے ہم دونوں آپیرا دیکھ رہے تھے آدھا حصہ میں ابھی جا کے پھینک دوں گا۔ اور صبح ہونے دے۔ میں وکیل کے ساتھ آؤں گا۔ اس سے پہلے اسکاٹ لینڈ یارڈ کا چیف بھی آئے نا تو بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ ان سب کی ایسی تیسی۔"

ضمانت کے لیے صبح مجھے ایک مقامی جج کے سامنے پیش کیا گیا سب سے پہلے میرا بیان ہوا۔ پھر پہلی گواہی ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ نے دی۔ اس نے جو کچھ دیکھا تھا وہ بیان کرنے کے بعد میرے سابقہ شورش پسند ریکارڈ کا حوالہ دیا۔

"جناب والا۔" میرے وکیل نے اعتراض اٹھایا۔ "مقدمہ زیر سماعت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔" عدالت نے اعتراض تسلیم کر لیا اور سپرنٹنڈنٹ کو خاصی مایوسی ہوئی۔ اس کے بعد چھ گواہوں کی۔۔۔ فہرست پیش کی گئی۔

"جناب والا۔" وکیل صفائی نے دوسرا اعتراض کیا۔ "ان میں سے دو گواہ ناقابل اعتبار ہیں۔ ان کے اور میرے مؤکل کے درمیان عناد اور اختلافات کے اسباب پہلے سے موجود ہیں۔"

دونوں بدباطن گوروں کا نام گواہوں کی فہرست سے خارج کر دیا گیا۔ باقی چار گواہ بھی صرف وہی بتا سکے جو انھوں نے کمرے میں داخل ہونے کے بعد دیکھا تھا۔ اس سے پہلے کے واقعات کے بارے میں وہ کسی سوال کا جواب نہ دے سکے۔ جس سے ثابت ہوتا کہ میں عصمت دری کی کوشش کا مرتکب بھی ہوا تھا۔ آخری اور سب سے اہم بیان محسن رضا کا تھا۔ جس نے دو نصف ٹکٹ پیش کیے اور ثابت کیا کہ میں اور وہ آپیرا دیکھ کے۔۔۔۔ اکٹھے واپس آئے تھے وہ اپنے کمرے کی طرف چلا گیا تھا اور میں اپنے کمرے کی طرف۔ دو منٹ بعد ہنگامے کی آواز آئی تو دوسروں کے ساتھ پہنچ کے۔ اس نے بھی وہی دیکھا تھا جو سب نے دیکھا تھا۔

پھر میڈیکل رپورٹ پیش کی گئی جس سے محض دست درازی ثابت ہوئی تھی یا مدافعت۔

اسکے بعد وکیلِ صفائی نے جو خود ایک پاکستانی تھا۔ اور محسن رضا کا کزن تھا۔ اپنی آتش فشانی شروع کی۔ "جناب والا میرے مؤکل کی گرفتاری کا یہ رسوا کن اقدام سراسر بدنیتی پر مبنی ہے۔" اس نے کہنا شروع کیا۔ "اس اقدام سے میرے مؤکل کو شدید ذہنی اذیت اٹھانی پڑی ہے۔ پولیس نے ایک قانون پسند شہری کو تحفظ فراہم کرنے کی بجائے ہراساں کیا۔ پولیس نے ایک بدکردار عورت سے ناجائز طور پر میرے مؤکل کے کمرے میں داخل ہونے پر باز پرس نہیں کی۔ اس نے یہ نہیں پوچھا کہ وہ مؤکل کی تصویریں کیوں چرانے آئی تھی۔ جو اس کے ہینڈ بیگ سے برآمد ہوئی ہے؟ صرف اس لیے کہ میرا مؤکل ایک رنگدار ایشیائی ہے اور اس پر الزام عائد کرنے والی ایک سفید فام عورت ہے کیا قانون.....؟

استغاثہ کے وکیل نے ان ریمارکس پر شدید احتجاج کیا۔ میرے وکیل نے اپنے الفاظ واپس لے کر اس عورت کو جرح کیلئے طلب کر لیا۔ اس نے اپنا نام اور پتہ خود بتایا۔ پھر وکیل کے سوالات کی یلغار نے اسے بوکھلا دیا۔ بہت جلد اس نے تسلیم کر لیا کہ اسنے جھوٹ بولا تھا۔ اور پھر مجھ پر غلط الزام لگایا تھا۔

"مجھے مسٹر بخت کی تصویریں لانے کا معاوضہ پچاس پونڈ ادا کیا گیا تھا۔" اس نے اعتراف کیا۔

"یہ معاوضہ ادا کرنے والا کون تھا؟" وکیل نے کہا جو اتنی جلدی کامیابی حاصل کرنے پر خوش تھا۔

"میں انہیں جانتی نہیں۔ ایک ایشیائی تھا۔ دوسرا اس کا نوکر لگتا تھا۔ انہوں نے میرے گھر آ کے مجھے ایک چابی دی اور کہا تھا یہ معمولی کام ہے۔ چابی سے کمرے کا قفل کھل جائے گا۔ انہوں نے بعد میں مزید پچاس پونڈ دینے کا وعدہ بھی کیا تھا۔" اس نے روتے ہوئے بتایا۔

"وہ تصویر کو کس مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے؟"

"میں نے نہیں پوچھا۔ انہوں نے تو اپنا نام تک نہیں بتایا تھا اور کہا تھا اپنے کام سے کام رکھو۔" وہ بولی۔

"اور تم نے ناجائز ہونے کے باوجود یہ کام کرنا قبول کر لیا؟"

"میں سو پونڈ کو کیسے ٹھکراتی۔ میں غریب..... عورت ہوں..... اب میری آمدنی بھی نہیں رہی۔ اس کے علاوہ مجھے یقین دلایا گیا تھا کہ مسٹر بخت کے آجانے کا کوئی امکان نہیں۔" وہ ہچکیاں لیتے ہوئے بولی۔

"مسٹر بخت پر عصمت دری کا الزام بھی تم نے ان کے کہنے پر لگایا تھا؟"

عورت نے اقرار میں سر ہلایا۔ "اس نوکر ٹائپ نے کہا تھا کہ بفرضِ محال مسٹر بخت آجائیں تو میں دوسرا حربہ استعمال کروں۔ کامیابی کی صورت میں مجھے مزید سو پونڈ ملیں گے۔"

"پھر اب تم ان کے خلاف بیان کیوں دے رہی ہو؟" وکیل نے کہا۔

"اس لیے کہ وہ دونوں پچاس پونڈ دے کر غائب ہو گئے ہیں۔" وہ چلا کے بولی۔ "ان میں سے کوئی میری خبر لینے تک نہیں آیا۔"

عدالت نے مجھے باعزت طور پر بری کر دیا اور اس عورت کو جیل بھیج دیا۔ مجھے تھوڑا سا رنج ہوا کہ وہ پچاس پونڈ کی خاطر میرے دشمنوں کا ساتھ دینے پر مجبور ہو گئی۔ جسم کے خریدار ملتے تو وہ ضمیر کو کیوں بیچتی۔ اب وہ لندن کے لاکھوں ایشیائی باشندوں کی آبادی میں گم ہو گئے تھے اور ناکامی کی سزا اس کا مقدر بن گئی تھی۔

⬟

"میں اب تک نہیں سمجھ سکا سکندر کہ وہ بدمعاش کون ہیں اور کیا دشمنی ہے ان کو تیری ذات سے۔" محسن رضا نے عدالت سے نکل کے ہوسٹل کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

"میں یہ سوچ رہا ہوں بھائی محسن رضا کہ اگر میں اس ہوٹل کے کمرہ نمبر تین سو دو میں پہنچ جاتا تو کیا ہوتا۔" میں نے کہا۔ "کیا اس قتل کے ذمہ دار بھی وہی تھے؟"

"نہیں۔" محسن رضا نے کہا۔ "اخبار میں اس قتل کی تفصیلات آ چکی ہیں۔ قاتل اسی ہوٹل کا ایک ویٹر تھا جس نے کافی میں خواب آور دوا ملائی تھی۔ مقدار کچھ زیادہ ہو گئی۔ مقتول ایک جوہری تھا جسے ویٹر نے لوٹ لیا تھا۔"

"مگر مجھے وہاں بھیجنے کا مقصد کیا تھا؟ جھوٹے گواہوں سے قتل کا الزام مجھ پر ثابت کرنا؟"

محسن ہنسا۔ "نہیں یار۔ اب اتنی دھاندلی بھی نہیں ہے۔ میرا تو خیال ہے وہ دونوں اسی ہوٹل میں مقیم ہیں یا تھے اور قتل کے بارے میں ان کو ہم سے پہلے اطلاع مل گئی تھی۔ انہوں نے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ تُو وہاں پہنچ جاتا تو تفتیش وغیرہ کے چکر میں پھنس جاتا اور خاصی دیر کمرے سے باہر رہتا۔ اب لعنت بھیج سب پر۔ آئندہ کی سوچ۔ جو اس حد تک درپے آزار ہیں۔ کیا وہ ایک ناکامی پر حوصلہ ہار کے بیٹھ جائیں گے! وہ پھر کچھ کریں گے سکندر بخت۔"

اس نے موٹر سائیکل ہوسٹل کے دروازے پر روکی۔ میرا سامان دروازے کے باہر ڈھیر ہوا پڑا تھا۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے چوکیدار سے کہا۔ حالانکہ سوال کرنے سے پہلے ہی بات میری سمجھ میں آچکی تھی۔ چوکیدار نے ایک ٹائپ کیا ہوا کاغذ مجھے تھما دیا۔ اس میں لکھا تھا کہ سپرنٹنڈنٹ نے اپنے خصوصی اختیارات سے کام لیتے ہوئے مجھے ہوسٹل سے خارج کر دیا ہے۔ کیونکہ میں فتنہ و فساد کا باعث اور بدنامی کا سبب ہو رہا ہوں۔

"آئی ایم سوری سر۔" چوکیدار نے کہا۔ "میں آپ کو ایک راز کی بات بتاتا ہوں۔ آپ کو کالج سے بھی نکال دیا گیا ہے۔ سپرنٹنڈنٹ کے مشورے پر۔ کل آپ کالج جائیں گے تو شرمندہ ہوں گے۔ لوگ ویسے بھی آپ کے دشمن ہو رہے ہیں۔"

"ہم اب عدالت میں جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "اور اس گوراشاہی نظام کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔"

لیکن کل دور تھی اور ہم جانتے تھے کہ اپنے حقوق کے تحفظ کی یہ طویل قانونی جنگ ہم نے جیت لی تب بھی اس کالج میں اور ہوسٹل میں رہنا شیر کے کچھار میں رہنے کے مترادف ہو گا چنانچہ ہم نے سامان اٹھایا اور محسن نے مجھے اپنے ایک ہپی دوست کے ساتھ ایک کمرے کے فلیٹ میں فٹ کر دیا۔ اگلا غور طلب مسئلہ تعلیم جاری رکھنے کا تھا۔

"جہاں تک میرا خیال ہے تیرے لیے کسی اور کالج میں داخلہ لینا خاما مشکل مرحلہ ہو گا۔" محسن رضا نے کہا۔ "ہاں اگر مارگریٹ تیری مدد کرے۔" اس لارڈ کی بیٹی کا باپ انڈیا کے کسی صوبے کا لفٹیننٹ گورنر تھا۔ "اور وہ تجھ پر مرتی ہے۔"

"مگر یہ داخلے سے بھی مشکل کام ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ کینہ متعصب بڈھا تو مجھے برطانیہ سے نکلوا دے۔ میں ابھی اباجی کو کچھ نہیں لکھوں گا۔ بیکار رہنے کی بجائے میں کالج اور ہوسٹل سے اخراج کے خلاف اور پولیس کے خلاف مقدمات لڑوں گا۔ اور مقدمات کی فیس ادا کرنے کے لیے نوکری کرونگا۔"

اس پروگرام پر عملدرآمد کی نوبت اس لیے نہیں آئی کہ اگلے ایک ماہ میں میرے ساتھ مسلسل ایسے واقعات پیش آئے جو بالآخر برطانیہ سے مجھے ڈی پورٹ کرنے کے احکامات کا سبب بنے۔ سب سے پہلے تو ہوسٹل کے اس کمرے میں بم پھٹا جہاں میں مقیم تھا۔ بم معمولی تھا۔ مگر دھماکے سے قدیم سال خوردہ عمارت کی خستہ حال دیواریں گر گئیں اور دو افراد ہلاک ہوئے۔ اس سے پہلے کہ محسن یہ خبر مجھے پہنچاتا۔ پولیس کے دو سراغرساں آپہنچے۔ اور مجھے ساتھ لے گئے۔ دو دن تک وہ مجھ سے پوچھ گچھ کرتے رہے کہ میری انتقامی کارروائی تو نہیں ہے۔ کچھ اخبارات نے حادثے کی خبر دیتے ہوئے میرا تذکرہ بھی کر دیا تھا چنانچہ یہ تفتیش ناگزیر ہو گئی تھی۔ جب مجھے اس جج کے سامنے پیش کیا گیا تو غیر جانبدار اور فراخدل ہونے کے باوجود مجھ سے پوچھنے پر مجبور ہو گیا کہ مسٹر بخت۔ کیا اس واردات کا تمہارے ساتھ پیش آنے والے ناخوشگوار واقعات سے کسی قسم کا تعلق ہو سکتا ہے؟

"یہ معلوم کرنا پولیس کا کام ہے یور آنر۔" میں نے کہا۔ "میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ ایک باقاعدہ سازش کے تحت مجھے ان واقعات میں ملوث کیا جا رہا ہے۔"

"کیوں مسٹر بخت؟" جج نے کہا۔ "کیا تمہارے پاس یہ فرض کرنے کی کوئی معقول وجہ ہے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "ابھی تک میں کسی پر الزام نہیں عائد کر سکتا اور اس کا کوئی سبب بتانے سے بھی قاصر ہوں۔" جج نے مجھے بری کر دیا لیکن اس مرتبہ باعزت طور پر نہیں۔ شک کا فائدہ دیتے ہوئے۔

میری پریشانی تو برحق تھی۔ مگر محسن مجھ سے زیادہ پریشان تھا۔

"یار سکندر..... یہ کیا چکر ہے؟" اس نے شام میرے ساتھ ایک پارک میں بنچ پر بیٹھے بیٹھے کہا۔

"میری سمجھ میں کچھ آئے تو بتاؤں۔" میں نے کہا۔ "مجھے تو اندیشہ یہ لاحق ہو رہا ہے کہ پاکستان میں میرے والد بھی کسی مصیبت میں مبتلا نہ ہوں۔ تجھے یاد ہے اس فوما نچو نے پہلی بار فون پر کیا کہا تھا۔ اس نے یہ اطلاع دی تھی کہ تمہارے والد بالکل خیریت سے نہیں ہیں۔ اور اس نے مجھ سے بھی کہا تھا کہ محتاط رہو۔ اس کی یہ وارننگ غلط نہیں تھی تو وہ اطلاع کیسے غلط ہو سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے اباجان نے مجھے صحیح بات نہ بتائی ہو۔"

"میرا خیال ہے تو واپس چلا جا۔" محسن نے کہا۔ وہ خاصا متفکر نظر آتا تھا۔

"واپس چلا جاؤں! یعنی ڈر کے بھاگ جاؤں! یہ معلوم نہ کروں کہ یہ سب کون کر رہا ہے اور کیوں؟" میں نے کہا۔

محسن نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہم رات کا اندھیرا پھیل جانے تک وہیں بیٹھے مختلف خیالات کا اظہار کرتے رہے۔ اپنی اپنی عقل کے مطابق توجیہات تلاش کرتے رہے اور غیر یقینی مستقبل کے لیے بے بنیاد منصوبے بناتے رہے۔ اچانک بارش شروع ہو گئی۔ اور ہم دونوں اٹھ کر بھاگے۔ میرے کمرے تک پہنچتے پہنچتے بارش نے شدت اختیار کر لی۔ میں نے محسن کو اپنے کپڑے دیے۔ اور اس نے رات وہیں رُک جانے کا فیصلہ کیا۔ کمرے کا مالک یعنی محسن کا وہ ہپی دوست غائب تھا۔ اور اس کے آنے یا نہ آنے کے امکانات برابر تھے۔ وہ اکثر راتوں کو غیر حاضر ہو جاتا تھا۔ رات گیارہ بجے تک ہم نے فریج میں رکھی ہوئی چیزوں سے اپنا پیٹ بھرا۔ اور کافی پیتے رہے۔ ٹی وی

دیکھتے رہے۔ اور پھر سو گئے۔ محسن نے بیڈ پر قبضہ کر لیا اور مجھے صوفے کے ساتھ قالین پر جگہ بنانی پڑی۔

آدھی رات کے بعد محسن کی زبردست چیخ سے میری آنکھ کھلی میں ہڑبڑا کے اٹھا تو اندھیرے میں ایک سایہ لپکا۔ اور مجھ پر سے گزر گیا۔ میں نے دروازے کی طرف جست لگائی۔ دروازہ دھڑ سے بند ہوا۔ اور کسی نے باہر سے کنڈی لگا دی۔ محسن نے صرف ایک بار چلا کے مجھے آواز دی تھی اور خاموش ہو گیا تھا۔ خوف سے ڈوبتے دل اور کانپتے ہاتھوں سے میں نے لائٹ آن کی ایک لمحے کے لیے وہ کمرہ میری نظر سے اوجھل ہو گیا اور میں نے محسوس کیا کہ میں نے تیزی سے چلتی ہوئی گاڑی سے زمین پر چھلانگ لگا دی ہے۔ میں نے بڑی سخت جدوجہد سے اپنا توازن بحال کیا اور دوڑ کر بیڈ تک پہنچا۔ "محسن!" میں نے چیخ کر کہا۔ پھر میں نے وہ خنجر دیکھا جو محسن کے سینے میں پیوست تھا۔ لیکن نشانہ خطا ہو جانے کے باعث دل سے بہت اوپر شانے کے قریب لگا تھا۔ خون تیزی سے بہہ کر بستر کو تر کر رہا تھا۔ میں نے پھر دروازے کی طرف دوڑ لگائی اور اسے زور زور سے بلانے لگا۔ دو منٹ بعد کسی نے کنڈی کھول دی۔ اس عمارت کے دوسرے مکین بھی شور پر متوجہ ہو کے باہر آنے لگے تھے میں نے بلا توقف نیچے کا رخ کیا جہاں ہال میں فون رکھا تھا۔ پہلے ڈاکٹر کو اور پھر پولیس کو بلانے کے بعد میں واپس کمرے میں آیا۔ اس وقت تک کمرے میں چار افراد جمع ہو چکے تھے۔ ان میں سے ایک نے زخم پر تولیہ رکھ کے خون روکنے کی واجبی سی کوشش کی تھی۔ باقی لوگ وہ تفصیلات جاننا چاہتے تھے جو خود مجھے معلوم نہیں تھیں۔

محسن کا زخم خطرناک نہیں تھا۔ آدھے گھنٹے بعد مجبوراً میں نے اسے ہسپتال میں چھوڑا کیونکہ پولیس مجھ سے تفتیش کے لیے بے چین تھی۔ ایک بار پھر میرا واسطہ اسی سراغرساں سے پڑا جس نے مجھے پہلی مرتبہ گرفتار کیا تھا۔ "مسٹر بخت!" وہ مجھے غور سے دیکھ کر بولا۔ "تم شیطان کی طرح شہرت حاصل کرنے لگے ہو۔ یہ چکر کیا ہے؟"

"چکر کچھ نہیں۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "لندن کی پولیس نااہل ہے تم سب کالوں کے قاتل ہو۔"

اس نے سوچے سمجھے بغیر میرے تھپڑ رسید کر دیا۔ میرا دماغ آؤٹ ہو گیا۔ اور میں نے جواب میں اس کے جوڈو کا ایک ہاتھ مار دیا۔ وہ کرسی پر ہی ڈھیر ہو گیا۔ اور مجھے حوالات میں بند کر دیا۔ صبح میں تیسری بار اس جج کے خدمت میں حاضر ہوا جس نے مجھے دوبارہ رہا کیا تھا۔ وکیل نے یہ تو ثابت کر دیا کہ محسن پر حملہ دراصل مجھ پر حملہ تھا۔ محسن میرے کمرے میں میرے بستر پر اور میرے کپڑوں میں تھا۔ چنانچہ وہ نامعلوم حملہ آوروں کا نشانہ بنا۔ لیکن خوش قسمت تھا کہ زندہ بچ گیا۔ تاہم وہ عدالت کو یہ نہ بتا سکا کہ حملے کا شک کس پر کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر واقعی میں سازش کا شکار ہوں تو سازش کا مقصد کیا ہے۔ بغیر وجہ کے کوئی کسی سے دشمنی کیسے کر سکتا ہے۔ محسن کے بیان سے میری پوزیشن مزید صاف ہو گئی۔ مگر ایک پولیس افسر پر حملہ کرنے کے جرم میں مجھے ایک ماہ قید محض کی سزا سنا دی گئی۔ جسے جج نے معطل رکھا۔ اور کہا کہ اگلی مرتبہ ایسی ہی واردات میں ملوث ہونے پر مجھے سیدھا جیل بھیج دیا جائے گا۔

عدالت سے باہر آتے ہی مجھے وکیل نے روک لیا۔ "مسٹر سکندر بخت!" اس نے کہنا شروع کیا۔ "یہ.... یہ جو کچھ ہو رہا ہے میں یہ نہیں کہتا کہ اس میں تمہاری نیت کو دخل ہے۔ ....یا تم غلط کہتے ہو۔ مگر میں آئندہ تمہارے کسی معاملے میں وکالت نہیں کر سکوں گا۔ پولیس کے پاس تمہاری فائل موٹی ہوتی جا رہی ہے اور وجہ کچھ بھی ہو۔ لیکن حقیقت وہی ہے جس کے اظہار پر کل تم نے اس پولیس افسر کو ناک آؤٹ کر دیا تھا۔ تم واقعی شیطان کی طرح شہرت حاصل کر رہے ہو۔"

"مجھے معلوم ہے۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "اب تک تم نے میری مدد کی اس کا شکریہ۔"

"ایک اور بات۔" وکیل نے کہا۔ "میں محسن کا کزن ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہاری وجہ سے اس کی زندگی کو بھی خطرہ لاحق ہو۔ وہ کھاتے پیتے والدین کا لڑکا ہے۔ تعلیم محض شوقیہ حاصل کر رہا ہے۔ شوق کی خاطر جان سے جانے میں کوئی عقلمندی نہیں۔ میں اس کے والدین کو فون کر رہا ہوں کہ وہ محسن کو لے جائیں۔ تمہیں کوئی اعتراض ہے؟"

"محسن میرا بچپن کا سب سے عزیز دوست بھی ہے اور محسن بھی۔ میں اعتراض کیسے کر سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میرے کہنے سے شاید وہ نہ جاتا۔ اچھا ہے۔ اس کے والد آ کے اسے زبردستی لے جائیں۔"

تین دن بعد محسن کے والد یعنی انکل شیروانی جو ڈپٹی سیکرٹری تھے محسن کو اس کے احتجاج کے باوجود اپنے ساتھ لے گئے۔ میں اس کے جہاز کی پرواز کے بعد ہیتھرو ایئرپورٹ پر یوں کھڑا رہ گیا۔ جیسے میرے اردگرد سنسان جنگل ہے جس سے میرے لیے سلامتی کی منزل کا ایک ہی راستہ تھا جو اب نہیں رہا۔ پہلی بار میں نے خود کو تنہا۔ بے بس اور خوفزدہ محسوس کیا۔

آخری واقعہ دو ہفتے بعد آیا۔ میں بارش سے بے نیاز سردی میں بھیگتا ہوا۔ آدھی رات سے کچھ پہلے ایک جگہ ملازمت کی کوشش میں کامیاب ہو کے لوٹ رہا تھا۔ ایک پاکستانی تاجر نے جس کا لندن میں بہت بڑا اسپیر اسٹور تھا۔ اور دوسرے شہروں میں برانچیں تھیں میرے حالات سن کر مجھے سیلز مین رکھنا منظور کر لیا تھا۔ اس سے پہلے انگریز تو انگریز خود میرے ہم وطن اور بہت سے ایشیائی بڑی شرافت اور اخلاق کے ساتھ 'سوری' کہہ کے یہ واضح کر چکے تھے کہ وہ کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتے لیکن یہ تاجر اثر رسوخ رکھنے والا اور جرأت مند آدمی تھا۔ اس نے کہا۔ "سکندر بخت! ابتدا میں مجھے بھی ان گوروں کی متعصب حاکمانہ ذہنیت کا سخت مقابلہ کرنا پڑا تھا لیکن اب میں ایک معزز شہری ہوں۔ میں ان کے ہتھکنڈے سمجھتا ہوں۔ اس لیے مار نہیں کھاتا۔ تم فکر مت کرو۔ ایک بار یہ معلوم ہو جائے کہ تمہارے وہ دشمن کون ہیں۔ پھر میں ان کا بندوبست کروں گا کہ سب کا دماغ درست ہو جائے گا۔ میرا خیال ہے وہ کرائے کے آدمی ہیں۔ یہ چکر یہاں بہت عام ہے لیکن لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ ادھی جیر پاس بھی ہیں سفید کتے۔ جو نوٹ دیکھتے ہی گورے کالے کا فرق بھول جاتے ہیں۔ میں اپنے خیالات میں غلطاں تیز تیز قدموں سے چلتا رہا تھا کہ اچانک ایک ویران موڑ پر مجھے اپنے پیچھے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا ہی تھا کہ ایک سایہ سا مجھ پر لپکا۔ میرے سر پر لوہے کی سلاخ جیسی کوئی چیز پڑی اور میں چکرا کے گر پڑا۔ ہوش کی کیفیت کا آخری احساس یہ تھا کہ مجھے زمین پر گرتے ہی اٹھا لیا گیا ہے۔

آہستہ آہستہ میرے حواس بحال ہوئے میں بالکل دوسری جگہ سڑک پر پڑا تھا۔ آنکھیں کھول کر دیکھنے پر مجھے کچھ لوگ نظر آئے جو حلقہ بنائے کھڑے تھے ان سب کے ہاتھوں میں چھتری تھی۔ سوائے ایک پولیس مین کے جو میرے سر کے قریب بجلی کے کھمبے کی طرح استادہ تھا۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر ایک عورت سیدھی لیٹی تھی۔ اور بارش اس کے ساکت و صامت جسم پر مسلسل گر رہی تھی۔ اس کی کھلی آنکھیں مجھے اپنی طرف دیکھتی محسوس ہوئیں۔ پھر اسٹریٹ لائٹ کے مدھم سے دھندلے اجالے میں میری یادداشت نے ایک صورت کے خدوخال تراشنے شروع کر دیے بالآخر میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ وہی عورت تھی جس نے ہوسٹل میں مجھ پر عصمت دری کی کوشش کا الزام لگایا تھا اس کے آس پاس خون کا نام و نشان نہیں تھا اور اس کے جسم پر کسی زخم یا چوٹ کا پتہ بھی نہیں چلتا تھا۔ مگر اس میں شک کی کوئی بات نہ تھی کہ وہ مر چکی ہے۔

میں نے سر اٹھانے کی کوشش کی مگر اسی وقت سائرن سنائی دیے اور مجمع خود بخود چھٹ گیا۔ ایک ایمبولینس اور ایک پولیس کار میرے بہت قریب آ کے ٹھہری مستعد ہاتھوں نے پیشہ ورانہ مہارت کے ساتھ مجھے اسٹریچر پر ڈالا۔ اور ایمبولینس میں سرکا دیا۔ پھر دوسرا اسٹریچر اندر آیا اور ایمبولینس کا پچھلا دروازہ بند ہو گیا۔ اب میں ایک لاش کے ساتھ مسلح محافظوں کی نگرانی میں سفر کر رہا تھا۔ اور مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ میری منزل کیا ہے۔ اپنی بے گناہی کا ناقابل تردید ثبوت فراہم کرنے تک میں قانون کی نظر میں اس عورت کا قاتل تھا۔ ہسپتال پہنچنے کے بعد مجھے ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا اور وہ بدبخت عورت جو پچاس پونڈ کے چکر میں جان سے گئی تھی شاید مردہ خانے پہنچی۔ طبی معائنے کے دوران اور بعد میں ایک پولیس افسر اور سراغرساں ہمہ وقت سائے کی طرح میرے ساتھ رہے۔

ایک ہفتے کی تفتیش کے دوران میں نئے انکشافات نہیں ہوئے۔ اس عورت کو گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا تھا مگر اس کی گردن پر میری انگلیوں کے نشانات نہیں پائے گئے تھے۔ میں نے الزام کی صحت اور اعتراف جرم سے صاف انکار کر دیا لیکن اس بات کی وضاحت نہیں کر سکا کہ مجھے بیہوش کر کے لاش کے قریب ڈال جانے کی کارروائی بھی میرے خلاف سازش تھی تو سازش کے محرکات کیا تھے اور سازش کرنے والے کون تھے۔

اسکاٹ لینڈ یارڈ کے ایک انتہائی سرد مزاج، صورت سے بے وقوف نظر آنے والے مگر بہت ذہین اور عیار سراغرساں نے میرے خلاف تمام واقعات کی ایک ضخیم فائل مرتب کر لی تھی جس میں ترتیب وار ہوسٹل میں مقتول عورت کی ہنگامہ آرائی سے قبل تک کے تمام واقعات اور بیانات وغیرہ شامل تھے۔ میرے خلاف الزامات کی فہرست بہت طویل تھی۔

"مسٹر سکندر بخت!" اس نے صبح موقع پاتے ہی فائل کی ورق گردانی کرتے ہوئے کہا۔ "تمہیں ہوسٹل میں نسلی منافرت اور تشدد پسندانہ خیالات کے اظہار پر وارننگ دی گئی تھی۔"

"وہ ایک تنگ نظر متعصب بوڑھے یہودی کی معاندانہ کارروائی تھی۔" میں نے کہا۔

"پھر یہ مقتول عورت کا ہنگامہ تمہارے کمرے میں ہوا جو ہوسٹل کی تاریخ میں پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔" سراغرساں نے بات جاری رکھی۔

"عدالت نے مجھے اس مقدمے سے باعزت طور پر بری کر دیا تھا۔ سزا مقتو... اس عورت کو ہوئی تھی۔"

"لیکن اس کے بعد پلا شک میں اس کمرے میں بیٹھا جہاں سے تم کو نکالا گیا تھا اور تم شک کے فائدے پہ چھوڑ دیے گئے۔" سراغرساں نے صفحہ پلٹ کے کہا۔ "واردات میں دو افراد ہلاک ہوئے تھے۔ ہوسٹل کی تاریخ میں ایسی واردات کبھی پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔"

میرا ضبط کا حوصلہ جواب دینے لگا۔ "گویا میری تاریخ ساز شخصیت..."

"پلیز شٹ اپ۔" سراغرساں نے کہا۔ "اس واردات کے

بعد تمہیں نیک چلنی کی ضمانت پر رہا کر دیا گیا تھا لیکن ہوسٹل سے نکال دیا گیا تھا۔ تم نے ایک منشیات کے عادی اور منشیات کے دھندے میں ملوث ہپی کے گھر میں پناہ لی۔"

"یہ میرے لیے ایک انکشاف ہے۔" میں نے کہا۔ "میں اس ہپی کو جانتا نہیں تھا۔"

"وہیں تم قاتلانہ حملے کی ایک اور واردات میں ملوث ہوئے۔ پھر تم نے تفتیش کرنے والے پولیس آفیسر پر حملہ کیا چنانچہ تمہیں ایک ماہ قید کی سزا دی گئی، جو معطل رکھی گئی تھی۔" اس نے مزید چند صفحات پلٹ کے کہا۔

"اس پولیس افسر نے مجھے گالی دی تھی۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "اور جو شخص زخمی ہوا تھا وہ میرا عزیز ترین دوست تھا۔ حملہ مجھ پر کیا گیا تھا۔"

"تم جج کے اس سوال کا جواب نہیں دے سکے تھے کہ تمہارے خلاف سازش کا جواز کیا ہے؟" وہ اسی سرد مہری سے بولا۔ "اور خود تمہارے وکیل نے آئندہ کے لیے تمہاری پیروی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔"

"اس کی خدمات رضاکارانہ تھیں۔" میں نے برہمی سے کہا۔

"اب تازہ ترین حادثہ اس عورت کا قتل ہے جس نے پہلی بار تم پر ایک سنگین الزام عائد کیا اور اس طرح وہ تمہارے ہوسٹل کے اخراج کا اور تمہارے تعلیمی کیریر کے خاتمے کا سبب بنی تھی۔" سراغرساں نے فائل رکھ کے اور مجھ پر نظر جما کے کہا "کیا یہ فرض نہیں کیا جا سکتا کہ تم نے سامنا ہوتے ہی انتقامی جذبات سے مغلوب ہو کے اس کا گلا گھونٹ دیا۔ تم اب تک یہ ثابت نہیں کر سکے ہو کہ تم پر کسی نامعلوم شخص نے جائے واردات سے دور حملہ کیا تھا۔"

"تو میرے سر پر ڈنڈا یا سریا کس نے مارا تھا، خود میں نے؟" میں نے جھنجھنا کر کہا۔

سراغرساں نے نفی میں سر ہلایا اور فائل کا ایک اور صفحہ پلٹا۔ "میڈیکل رپورٹ میں سریے ڈنڈے کا کوئی ذکر نہیں۔ تمہارے سر پر پتھر لگا تھا۔ غالباً یہ چوٹ گرنے سے آئی تھی۔ تم مسٹر اقبال سے واقف ہو؟"

"ہاں۔" میں نے جوش سے کہا۔ "وہ بہت بڑے بزنس مین ہیں۔ انہوں نے مجھے سیلز مین کی جگہ دی تھی۔"

"اور تم رات گیارہ بجے کے قریب ان کے گھر سے رخصت ہوئے تھے۔" سراغرساں نے مزید صفحات پلٹے۔ "ان کے بیان کے مطابق تم گیارہ بج کر پانچ منٹ پر گئے تھے۔ یہ واردات ان کے گھر سے دو سو گز کے فاصلے پر ہوئی ہے، اور میڈیکل رپورٹ میں واردات کا وقت گیارہ سے بارہ کے درمیان متعین کیا گیا ہے۔ تمہارا کمرہ اس جگہ سے دو میل دور ہے، ٹیکسی سے صرف دس منٹ کی مسافت پر۔ مگر تمہارا بیان ہے کہ تم پر حملہ بارہ بجے کے قریب ہوا۔"

"میں پیدل گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "اور ٹیکسی کی طرح دوڑ نہیں سکتا تھا۔ میں سیر کرنا چاہتا تھا۔"

"بارش کے باوجود؟" سراغرساں طنز سے مسکرایا۔ "شاید یہ بات تمہیں یاد نہیں رہی؟"

"مجھے بارش میں پیدل چلنے کا خبط ہے۔" میں نے کہا۔ "کیا میرا شوق خلافِ قانون ہے؟ ویسے میں ٹیکسی تلاش کر رہا تھا۔"

سراغرساں مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھتا رہا۔ "تم نے اس عورت کو قتل کیا ہے۔" اس نے قطعی لہجے میں کہا۔

"تم کسی طرح مجھے اعترافِ جرم پر مجبور نہیں کر سکتے۔" میں نے کہا۔ "میرے وکیل نے سفارت خانے کو بھی مطلع کر دیا ہے۔ تم اپنے تھرڈ ڈگری کے طریقے استعمال نہیں کر سکو گے۔ آخر تم لوگ شرلاک ہومز کے طریقے کیوں نہیں استعمال کرتے؟"

"تمہارے لیے ایک اطلاع ہے۔" اس نے جیب سے سگریٹ نکال کے جلایا۔ "سفارت خانے کی رضا مندی سے برطانوی حکام تمہیں ڈی پورٹ کر دینے کے امکانات کا جائزہ لے رہے ہیں۔"

"سفارت خانے والے ایسے کسی انتقامی اقدام کی حمایت نہیں کر سکتے۔" میں نے کہا۔

"انہیں تمہاری حکومت کے ایک اعلیٰ افسر کی طرف سے یہ درخواست موصول ہوئی ہے۔" وہ سگریٹ کا کش لیکر بولا۔ "وہ افسر تمہاری وزارتِ خارجہ کا ڈپٹی سیکرٹری ہے اور تمہارے دوست سید محسن رضا کا باپ ہے جو پہلے ہی پاکستان جا چکا ہے۔"

یہ انکشاف واقعی افسوسناک تھا۔ محسن نے خلوصِ نیت سے میری ذلت و رسوائی کا سامان کر دیا تھا۔

"اگر تم پر یہ الزام ثابت نہ ہوا، جس کا امکان بہت کم ہے، تو تم رہائی کے فوراً بعد ناپسندیدہ شخص قرار دے کر نکال دیے جاؤ گے ورنہ جیل کاٹنے کے بعد۔" اس نے اپنے رویے کی بے نیازی کا انداز برقرار رکھا۔ "ایک بات اور بھی ہے۔ مقتول عورت سوہو کے علاقے کی ایک تھرڈ ریٹ کسبی تھی اور ایک ماہ کی جیل کاٹ کے پیرول پر رہا ہوئی تھی۔ صرف ایک دن پہلے۔ یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ سزا اس کو تم پر الزام تراشی کے جرم میں ہوئی تھی۔"

"تم نے اپنے نظامِ انصاف کی غیر جانبداری دیکھی؟" میں نے تلخی سے کہا۔ "جرم مجھ پر ثابت ہو جاتا یا کر دیا جاتا تو مجھے کتنی لمبی جیل کاٹنی پڑتی؟ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ مقتول عورت نے خود ہی اقبالِ جرم کر لیا تھا مگر اس کے باوجود ایک سازش میں ساتھ دینے، میری رسوائی کا سبب بننے، میرے کمرے میں ناجائز طور پر داخل ہونے اور دیگر جرائم کی مرتکب ثابت ہونے کے باوجود اسے کم سے کم سزا دی گئی جو اس نے نصف کاٹی۔"

"کل رات دو افراد اس سے ملنے آئے تھے۔" سراغرساں نے میری بات سننے کے بعد کہا۔ "پڑوس کی ایک مخبوط الحواس بڑھیا نے ان کو دیکھا تھا جس کی بصارت اور سماعت بھی قابلِ اعتبار نہیں، اس کے کہنے کے مطابق وہ دونوں ایشیائی تھے۔ ایک دراز قد اور خوشحال۔ دوسرا پستہ قد اور نوکر ٹائپ۔ جھگڑے کی آواز پر بڑھیا متوجہ ہوئی تھی۔ اس نے چیخ کر کہا تھا کہ ہاں۔ میں نے سب کچھ بتا دیا ہے کیونکہ تم نے بدعہدی کی تھی۔ جواب میں دراز قد نے کہا تھا کہ ہم بہت جلد تمہارا حساب بے باق کر دیں گے۔ ان دونوں کا حوالہ مقتولہ نے مقدمے کی سماعت کے دوران بھی دیا تھا۔ کیا تم اس سلسلے میں کچھ بتا سکتے ہو۔ تمہاری ذات ان معاملات سے متعلق رہی ہے۔"

"متعلق تو اس جج کی ذات بھی رہی ہے۔ تم نے اس سے پوچھا؟" میں نے جل بھن کر کہا۔

ایک ہفتے بعد تفتیش کے مراحل تقریباً مکمل ہو چکے تھے اور مجھے فردِ جرم کے ساتھ عدالت میں پیش کرنے کے انتظامات ہو رہے تھے کہ رات کے وقت مجھے ملاقات کے لیے علیحدہ کمرے میں لے جایا گیا۔ اس کمرے میں صرف وکیل کو مجھ سے تخلیے میں بات کرنے کا حق حاصل تھا اور وکیل ایک بار مجھ سے ملاقات کر کے جا چکا تھا۔ اس وقت یوں بھی ملاقات خلافِ ضابطہ تھی چنانچہ میں سوچ رہا تھا کہ آنے والا کون ہو سکتا ہے۔ کمرے میں قدم رکھتے ہی میں نے ستر برس کے دراز قامت اور دبلے پتلے انگریز کو دیکھا جس نے انتہائی بیش قیمت سوٹ پہن رکھا تھا اور جو ہاتھ میں عصا لیے بالکل سیدھا کھڑا تھا جس کا سرخ و سفید متکبر چہرہ حاکمیت کے جلال اور دولت مندی کے ۔۔۔ نسلی برتری کے احساس کا آئینہ دار تھا۔ میں نے اسے فوراً پہچان لیا۔ وہ سابق غلام ہندوستان کے ایک صوبے کا وہی متعصب اور تنگ نظر لیفٹیننٹ گورنر تھا۔ "مسٹر سکندر بخت!" اس نے بڑی نخوت کے ساتھ مصافحہ کیے بغیر کہا۔ "تم نے شاید مجھے پہچانا نہیں۔"

"میں نے پہچان لیا ہے اور اسی لیے میں حیران ہوں۔" میں نے کہا۔ "آپ کیا تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے آئے ہیں؟"

اس کا چہرہ بگڑ گیا۔ "کاش یہ ممکن ہوتا۔" وہ بولا۔ "لیکن میری ایک لڑکی ہے، صرف ایک۔"

"میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔" میں نے مسکرا کے کہا۔ "اس کا نام مارگریٹ ہے۔ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔"

"یہی تو میری بدقسمتی ہے۔" اس نے منہ دیوار کی طرف رکھتے ہوئے کہا۔ "کہ وہ اپنی ماں پر گئی ہے۔ اس کی ماں بھی ایک سینٹو پرنس کے ساتھ جانا چاہتی تھی۔ اب زندگی میں دوسری بار میری عزت خطرے میں ہے۔"

"تم اس خطرے کا وہی تدارک کر سکتے ہو۔ پہلی بار عزت کیسے بچائی تھی تم نے؟"

اس کی صورت پر ایک تاریک سایہ پھیل گیا۔ "بیوی کو میں نے باعزت طور پر دفن کرا دیا تھا۔"

"پھر تو کوئی مسئلہ نہیں، اب بیٹی کو زیادہ باعزت طور پر دفن کرا دو۔" میں نے تلخی سے کہا۔

اس نے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا۔ "شادی تو میں نے دوسری کر لی تھی، اب میں مجبور ہوں اتنی بڑی بیٹی کہاں ملے گی؟"

"افسوس کہ برطانیہ کے عام شہری قوانین تم کو حاکم تسلیم نہیں کرتے۔" میں نے کہا۔ "اور تم مجھے دفن نہیں کرا سکتے۔ وہ غلام ہندوستان تھا جہاں تم حاکم تھے اور قانون سے بالاتر تھے۔"

اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ فرطِ اشتعال سے اس کا بدن لرزنے لگا تھا مگر وہ ضبط کر رہا تھا۔ "سکندر بخت! میں اب بھی بہت کچھ کر سکتا ہوں۔ آدمی جو کرنا چاہے ہر جگہ ہر وقت کر سکتا ہے۔ کوئی قانون کسی سزا کا خوف اس کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتا۔ میری زندگی کے کتنے دن باقی ہیں؟ میں تمہیں اسی وقت شوٹ کر کے خودکشی بھی کر سکتا ہوں مگر اس کا خمیازہ بھی وہی بے وقوف لڑکی بھگتے گی اور جب اسے تم سے بچانے والا بھی کوئی نہ رہے گا۔ تو۔۔۔ مگر خیر۔۔۔ یہ بتاؤ کیا وہ تم کو اپنی زندگی سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ تم بھی شادی کرنا چاہتے ہو اس سے؟"

میں نے اس کی مزید تذلیل کے لیے قہقہہ مارا۔ "میں اب غلام نہیں، آزاد ملک کا خوددار شہری ہوں سر! میں کسی بھی تم جیسے لارڈ کی بیٹی سے جوتے تو صاف کرا سکتا ہوں مگر شادی کا شوق اسے ہے۔"

"شٹ اپ!" وہ چلایا۔ "یہ مت بھولو کہ میں ایک باپ ہوں۔ میں تم سے ایک سودا کرنے آیا ہوں اور اس لیے تمہاری بکواس سن رہا ہوں کہ مجھے تم جیسے شیطان سے نجات کی دو صورتیں نظر آتی ہیں جس میں میری عزت بھی محفوظ رہے گی، اور تم پر میرا احسان بھی رہے گا۔ لک ہیئر۔ میں تمہیں اس الزام سے بچا سکتا ہوں۔ سمجھے؟"

میں نے غور سے اسے دیکھا۔ "میں تمہارے احسان کے مقابلے میں سزائے موت کو ترجیح دوں گا۔"

"آل رائٹ۔ گولی مارو احسان کو۔" وہ چیخ کر بولا اور سنتری نے دروازہ کھول کے اندر جھانکا۔ اس کا اشارہ پاتے ہی وہ دروازہ بند کر کے غائب ہو گیا۔ "اگر تم یہاں سے دفع ہو جاؤ، اس ملک سے نکل جاؤ، تو میں گواہی دے سکتا ہوں کہ جب تم پر حملہ کیا گیا تھا تو میں ادھر سے گزر رہا تھا۔ میں نے کسی کو تم پر حملہ کرتے اور پھر اٹھا کے گاڑی میں ڈال کر فرار ہوتے دیکھا تھا لیکن میں دور تھا اور پیدل تھا۔ آس پاس کوئی پولیس مین نہیں تھا اور جائے واردات پر کوئی خون وغیرہ نہیں تھا اس لیے میں خاموش رہا۔"

"ایک عیار سراغرساں تم سے پوچھے گا، سر! شاید آپ کو یاد نہیں رہا اس وقت بارش ہو رہی تھی، اور آپ لارڈ ہیں آپ پیدل کیوں تھے؟" میں نے طنز اور تمسخر کے ساتھ کہا۔

"مائی فٹ۔ کوئی سراغرساں مجھ سے کچھ نہیں پوچھے گا۔ مجھے خبط ہے بارش میں پیدل چلنے کا۔ ستر سال کا بڈھا خبطی اور سنکی ہوتا ہے۔ اب بولو، تم یہاں جیل میں رہنا چاہتے ہو یا ڈی پورٹ ہونا؟" وہ بولا۔

"ڈی پورٹ ہونا میرے لیے باعث مسرت ہوگا۔" میں نے کہا۔ "بشرطیکہ مارگریٹ میرے فراق میں خودکشی نہ کرلے۔"

اس نے اطمینان کی ایک گہری سانس لی اور چھڑی کو بڑے وقار سے گھماتا دروازے کی طرف بڑھا۔ "اسے میں سمجھا لوں گا۔"

"لارڈ جیمز!" دروازے کے قریب میں نے اسے روک لیا۔ "آئی ایم سوری سر!" میں نے صدق دل کے ساتھ کہا۔ "اور میں آپ کے اس احسان کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ انسانی رشتوں کی آبرو کا رنگ سے کوئی تعلق نہیں۔"

اس نے رک کر مجھے دیکھا۔ ہاتھ بڑھا کے مجھ سے مصافحہ کیا اور باہر نکل گیا۔

❁

جب مجھے ڈی پورٹ کیا گیا تو الوداع کہنے کے لیے آنے والے افراد صرف دو تھے۔ ایک لارڈ جیمز اور دوسری اس کی بیٹی مارگریٹ۔ اور وہ اتنی افسردہ تھی کہ میرے لیے اس سے نگاہ ملانا بھی دشوار تھی۔ میرے ذہن میں وہ شام تھی جب ایک احمقانہ کمینی خواہش کے تحت میں نے اس سے اپنے آباؤ اجداد کی محکومی کا انتقام لینے کے بارے میں سوچا تھا۔ جہاز کے ٹیک آف کرنے میں آدھا گھنٹہ باقی تھا جب اچانک اناؤنسر کی آواز نے ہر سمت سے مجھے پکارنا شروع کیا۔ "مسٹر سکندر بخت جہاں بھی ہوں پی آئی اے کے کاؤنٹر پر آجائیں۔ ہیلو۔ اٹینشن مسٹر سکندر بخت۔۔!!"

کاؤنٹر پر ایک ناک چڑھی لڑکی نے غور سے مجھے دیکھا۔ "آپ سکندر بخت ہیں؟" وہ تقریباً ڈانٹ کر بولی۔

"جی۔ اپنا پاسپورٹ دکھاؤں؟" میں نے کہا۔ "یا حلف نامہ داخل کروں؟"

جواب دیے بغیر اس نے ایک لمبوترا سا خاکی لفافہ میری طرف بڑھا دیا۔ "آپ کے لیے۔"

میں نے لفافہ لے لیا۔ اس پر میرا ہی نام لکھا ہوا تھا "یہ کس نے دیا ہے؟" میں نے کہا۔

"ایک بچہ تھا۔" ناک چڑھی لڑکی نے کہا۔ "میں نے اس کا نام نہیں پوچھا۔"

"یہ بھی نہیں پوچھا کہ اس کو یہ خط کس نے دیا تھا؟" میں نے کہا۔

"جی نہیں، ویسے آپ اس کو لینے کے پابند نہیں ہیں۔" ناک چڑھی لڑکی نے کہا۔

اس منطق کا کوئی جواب نہیں تھا اس لیے میں نے لفافہ جیب میں ڈال لیا۔ اس میں صرف کاغذات تھے چنانچہ تشویش کی بات کوئی نہیں تھی۔ لفافے کی بجائے پیکٹ ہوتا تو میں خود اس ناک چڑھی سے کہتا کہ میں اسے لینے کا پابند نہیں اور اگر بعد میں وہ پارسل دھماکے سے پھٹ جاتا تو مجھے قطعی افسوس نہ ہوتا۔ شاید نئے کاؤنٹر پہ آنے والی نئی لڑکی زیادہ خوبصورت اور کم بد اخلاق ہوتی۔ جہاز جب برطانیہ کے قیام کی خوشگوار اور ناخوشگوار یادوں کی سرحد سے بھی دور نکل گیا تب مجھے وہ لفافہ یاد آیا۔

لفافے میں سے ٹائپ کیے ہوئے چند صفحات پر مشتمل ایک خط برآمد ہوا جو مجھے مخاطب کر کے لکھا گیا تھا لیکن خط کے آخر میں لکھنے والے نے اپنا نام و نشان کچھ نہیں دیا تھا۔ چند سطور پڑھنے کے بعد مجھے اندازہ ہو گیا کہ ٹائپ کرنے کا مقصد اپنے ہاتھ کی تحریر دینے سے گریز کے سوا کچھ نہیں تھا۔ عبارت ٹھیک تھی مگر ٹائپ کی غلطیاں بے شمار تھیں۔ اس نے لکھا تھا۔

"ڈیئر کبیر خاں!

میں نے ایک بار ٹیلیفون کر کے تمہیں بتانے کی کوشش کی تھی کہ تمہارے والد خیریت سے نہیں ہیں اور تمہیں فوراً وطن جا کے حالات کو سنبھالنا چاہیے لیکن تم نے میری بات پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا۔ میں نے تمہیں محتاط رہنے کا مشورہ دیا تھا، جسے تم نے اہمیت نہیں دی۔ نتیجہ یہ کہ تمہارے خلاف سازش کا جال پھیلانے والے تمہارے لیے مسلسل پریشانی کے اسباب پیدا کرتے رہے۔ یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ اندازوں کی غلطی اور اتفاقات کے باعث تم خیر و عافیت کے ساتھ واپس لوٹ رہے ہو۔ تاہم تمہارے عزم و ہمت اور صبر و استقامت کی آزمائش کے مرحلے تمام نہیں ہوئے اور تم بدستور خطرات کے حصار میں ہو۔ اگر تم میرے دوسری بار فون کرنے پر ہوٹل کے کمرہ نمبر دو سو تین میں آجاتے تو یہ خط لکھنے کی ضرورت نہ پڑتی اور میں بالمشافہ تمہیں بہت کچھ بتا دیتا۔ شاید بروقت اصل حقائق سے باخبر ہو جانے کے بعد تمہارے شکوک رفع ہو جاتے اور تم فوری طور پر کوئی قدم اٹھاتے تو بہتری کی صورت پیدا ہو جاتی۔ افسوس یہ ہے کہ تم نے مجھے اپنا خیر خواہ تسلیم نہیں کیا۔ ممکن ہے تمہیں بدظن کر دیا گیا ہو۔ لندن سے آتے جاتے میں نے بہت سے خطرات مول لے کر تمہیں خبردار کرنا چاہا تھا مگر مجھے ناکامی ہوئی۔ اب تیسری بار لندن سے گزرتے ہوئے مجھے تمہارے حالات کے مزید ابتر ہو جانے کی اطلاع ملی تو میں افسوس کے سوا کچھ نہ کر سکا۔ مجبوراً یہ خط ارسال کر رہا ہوں جس کے بارے میں مجھے بہت کم امید ہے کہ تم تک پہنچ جائے گا۔ اور اگر پہنچا تو عین ممکن ہے اس کی خبر بھی دشمنوں تک پہنچ جائے۔ خط کو پڑھ کے جلا دینا اور میرے لیے مغفرت کی دعا کرنا۔ بشرطِ زندگی تم سے کبھی نہ کبھی ملوں گا تو وہ باتیں بھی بتا دوں گا جو اس وقت نہیں بتا سکتا کیونکہ وقت بہت کم ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ تمہارے ساتھ ایک کرائے کے قاتل کو روانہ کیا گیا ہے۔ اس کے بارے میں تفصیلات کا مجھے علم نہیں کہ وہ کون ہے یا اس کا حلیہ کیا ہے اور وہ اپنا کام سفر کے دوران کرے گا یا منزل پر پہنچنے کے بعد۔ بہرصورت تمہیں ہر اجنبی سے محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔

دوسری اطلاع تمہارے لیے زیادہ افسوسناک ہے۔ تمہارے والد جن کو تم ماڈل ٹاؤن کی کوٹھی میں چھوڑ کر گئے تھے اب اس کوٹھی میں نہیں ہیں۔ وہ کوٹھی بھی ان کی نہیں ہے۔ تمہارے جانے کے بعد رفتہ رفتہ کاروبار ان کے ہاتھ سے نکل گیا اور ان کی آمدنی کے ذرائع مسدود ہو گئے۔ مجبوراً انہوں نے کوٹھی فروخت کر دی اور خود قلعہ گوجر سنگھ کے ایک کرائے کے مکان میں اٹھ گئے۔ کوٹھی کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم بھی زیادہ عرصہ ساتھ نہ دے سکی۔ انہوں نے تمہاری تعلیم کی تکمیل کے لیے کچھ رقم ایک غیر ملکی بنک میں جمع کرا دی تھی جو ان کی ہدایات کے مطابق ہر ماہ تم کو ایک بندھی رقم بنک ڈرافٹ کی صورت میں بھیجتا رہا۔ ذاتی ضروریات کی تکمیل کے لیے انہوں نے ایک سیٹھ کے پاس چوکیدار کی ملازمت قبول کر لی۔ یہ سیٹھ ایک زمانے میں تمہارے والد کا ملازم تھا اور غبن کے بعد روپوش ہو گیا تھا۔ جب بعد میں وہ پکڑا گیا تو اس کے خلاف کوئی الزام ثابت نہ ہو سکا اور اسی رقم سے کاروبار کر کے وہ لکھ پتی بن گیا تاہم وہ قدرت کے نظام انصاف سے نہ بچ سکا اور جب تمہارے والد اس کے پاس نوکری کے لیے گئے تو وہ دنیا میں تنہا تھا۔ اس کے بیوی بچے مری سے لوٹتے ہوئے کار کے ایک حادثے میں ہلاک ہو گئے تھے۔ اس نے ترس کھا کر اپنے سابق آقا کو نوکر رکھ لیا۔ بیماری کے باعث وہ کوئی سخت محنت طلب کام نہیں کر سکتے تھے چنانچہ ان کو کمروں کی اور فرنیچر کی جھاڑ پونچھ کے کام پر لگا دیا گیا۔ اس کے عوض وہ نمک حرام تمہارے

والد کو تین سو روپے دیتا تھا اور بچا کھچا کھانا انہیں وہیں سرونٹ کوارٹر کا ایک کمرہ مل گیا تھا جس میں وہ اب بھی رہائش پذیر ہوں گے۔ میری آخری اطلاع کے مطابق ایک مہینہ پہلے وہ اسی کمرے میں اور شدید علیل تھے۔ ان کو گٹھیا کا مرض لاحق تھا لیکن علاج معالجے کے لیے اچھے ڈاکٹروں کی خدمات حاصل کرنا ان کی استطاعت سے باہر تھا۔ وہ مشکل ایک سرکاری ڈسپنسری تک جاتے تھے اور اس برائے نام علاج سے فائدے کی بجائے انکو نقصان ہو رہا تھا۔ یہ سب کچھ قبل از وقت جان لینا تمہارے لیے بے حد ضروری ہے تاکہ خدانخواستہ تم دیال سنگھ کالج ہوسٹل اور نواب مظفر علی قزلباش کے محل کے درمیان واقع چوہدری چراغ دین کی کوٹھی جس کے دروازے پر سی۔ سی۔ ڈین کی تختی لگی ہوئی ہے، کے سرونٹ کوارٹر میں پہنچو اور تمہیں معلوم ہو کہ وزیر خاں کا انتقال ہو چکا ہے اور تمہارے لیے یہ صدمہ غیر متوقع نہ ہو۔ خدا کرے وہ زندہ ہوں اور تمہیں وہ سب کچھ بتا سکیں جو میں نہ بتا سکا۔ انہوں نے یہ سب کچھ تمہیں صرف اس لیے نہیں لکھا تھا کہ تمہاری تعلیم میں ہرج واقع نہ ہو اور یہ نہ ہو کہ تم سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے واپس لوٹ آؤ۔ اس طرح ان کی تمام ریاضت رائیگاں جاتی۔ ان کی زندگی کی واحد قابلِ فخر کامیابی تم ہو۔

کبیر! ان کی موجودہ حالت کا سبب صرف ایک شخص ہے، میر شرافت علی۔ جو اُن کا بزنس پارٹنر تھا۔ شاید تمہیں علم ہو گا کہ یہ شخص ۱۹۵۶ء میں پاکستان پہنچا تھا۔ اس وقت تک کاروبار کے مالک صرف تمہارے والد تھے۔ تین سال کے مختصر عرصے میں انہوں نے کلیم میں ملنے والی ایک دکان کے اندر لوہا کوٹتے کوٹتے برانڈرتھ روڈ پر وہ فاؤنڈری قائم کر لی تھی جہاں لیتھ مشین کے پارٹ بنانے سے کام شروع ہوا تھا اور پھر مکمل لیتھ مشین تیار ہونے لگی تھی۔ اس کے ساتھ ہی پاور ڈرل اور متعلقہ آلات بھی بنتے تھے اور ان مصنوعات کی ساکھ بہت اچھی تھی۔ اسکی آمدنی سے تمہارے والد نے کلیم میں ملنے والے مکان کو چھوڑ کر کنال بنک کی کوٹھی کرائے پر لی تھی اور

پھر ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی خریدی تھی۔ میر شرافت علی کے آنے کے تین سال بعد میر وزیر اینڈ کمپنی ۱۹۵۹ء میں قائم ہوئی اور جیسے انگریز تجارت کے بہانے ہندوستان آئے تھے اور ہندوستان کے مالک بن بیٹھے تھے۔ ایسے ہی شرافت علی پارٹنر بن کے شامل ہوا اور سارے کاروبار پہ قابض ہو گیا۔ کاغذی دستاویزات میں ہر سال درج ہونے والے منافع کا آدھا حصہ تمہارے والد کو ملتا رہا لیکن صرف اس حد تک کہ وہ منافع کی وصولی کے کاغذات پر اپنے دستخط ثبت کرتے تھے۔ منافع کی رقم شرافت علی کے کسی اکاؤنٹ میں چلی جاتی تھی جو اس نے مختلف بنکوں میں اپنی بیوی کے اور بچوں کے نام سے کھول رکھے تھے۔ اس طرح میر شرافت علی پر بلیک میلنگ کر کے کوئی رقم وصول کرنے کا الزام نہیں آتا تھا۔ تمہارے والد نے ۳۰ جون ۱۹۶۵ء کو آخری بار کمپنی کے حسابات میں بحیثیت پارٹنر اپنے دستخط ثبت کیے تھے۔ نفع نقصان کی بیلنس شیٹ دیکھی تھی جس کے مطابق ان کے حصے کا منافع تمام اخراجات وضع کرنے کے بعد نقد ساڑھے تین لاکھ روپے بنتا تھا اور اپنے سرونٹ کوارٹر کو لوٹ آئے تھے۔ تیس ہزار ماہانہ کی آمدنی کا مالک تین سو روپے ماہوار پر اپنے ایک ملازم کا ادنیٰ ملازم تھا۔ تمہارے والد نے اپنے حالات کو سب سے چھپائے رکھا اور کمپنی کے نمک خوار بھی یہی سمجھتے ہیں کہ پرانے مالک بیماری کے باعث معذور ہو گئے ہیں چنانچہ سب کاروبار میر شرافت علی کے سپرد کر چکے ہیں جو غلط بھی نہیں، لیکن اصل اسباب کا کسی کو علم نہیں۔

مجھے امید ہے اسباب تم خود معلوم کر لو گے اور میر شرافت علی سے اپنے والد کی حق حلال کی کمائی کے اس پیسے پیسے کا حساب لے سکو گے جس پر تمہارا حق تھا مگر جو میر شرافت علی نے بلیک میلنگ سے ہتھیا لیا۔ وقت آنے پر میں بتاؤں گا کہ تمہارا یہ خیر خواہ کون تھا۔"

جب میں یہ خط پڑھ رہا تھا تو میرا وجود اس جہاز میں دوسروں کے لیے اس نوجوان آدمی کی صورت میں ضرور باقی رہ گیا تھا جو ہاتھ میں کچھ کیے ہوئے چند صفحات پر نظر جمائے ساکت و صامت بیٹھا تھا۔

اور ایک بار عبارت کو آخر تک پڑھ لینے کے بعد پھر حرفِ آغاز پر آ جاتا تھا۔ صدمے سے میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ماؤف ہو گئی تھی اور میرا ذہن بھیانک حقائق کے جوالا مکھی کے پھٹنے سے جھلس رہا تھا۔ میرے خون کا ہر قطرہ تیزاب بن کے لہو میں آگ کی طرح پھیل رہا تھا اور انتقام۔ انتقام پکارنے لگا تھا۔ میرا دل چاہتا تھا میں چیخ چیخ کر سڑکوں اور دنیا کو بتاؤں کہ میں وہ بدنصیب اور جہنمی بیٹا ہوں جس کے لیے دنیا و عقبیٰ میں روسیاہی کے سوا کچھ نہیں۔ خون کا یہ آخری رشتہ تھا جو سلامت رہ گیا تھا۔ میں نے اس کی قدر نہ کی۔ ایک بار تقدیر نے جدا کیا تھا تو ملا بھی دیا تھا۔ دوسری بار میں نے اپنا مستقبل سنوارنے کی تدبیر کی اور سات سمندر پار سفید فاموں سے دو سو سال پہلے کے مظالم کا بدلہ لینے کے بہانے انگریز لڑکیوں سے معاشقے لڑاتا رہا۔ یہاں اپنے ہم وطن جو میرے باپ کے دشمن تھے اس پر انسانیت سوز مظالم ڈھاتے رہے۔ اس نے اپنی زندگی کے یہ تمام مصائب اور آلام قبول کیے مگر حرفِ شکایت زبان پر نہ لایا کہ کہیں اس سے میرے مستقبل کے خواب پریشان نہ ہو جائیں۔ وہ مجھے باقاعدگی سے اتنی رقم بھیجتا رہا کہ جو میری تعلیم کے علاوہ میری عیاشی کے لیے بھی کم نہ تھی اور خود محرومیوں کے عذاب میں گرفتار رہا۔ بچے کھچے ٹکڑوں سے پیٹ بھرتا رہا اور اپنے نوکروں کا نوکر بن کے صبر و شکر کے ساتھ ہر ذلت برداشت کرتا رہا۔ تمہیں عمداً بے خبر رکھا گیا تھا کبیر۔ ایک نادیدہ خیر خواہ کی آواز میرے ذہن میں گونجی۔ صحت اور کاروبار دونوں ٹھیک ہیں الحمدللہ۔ میرے والد کی آواز نے ہزاروں میل کی مسافت طے کر کے ٹیلی فون کی زبان سے جھوٹ بولا۔ خدانخواستہ آج تمہارے والد کو کچھ ہو گیا تو تم کیا کرو گے سائس نادیدہ خیر خواہ نے کہا۔ جب تک میں ہوں یہ سوچنا تمہارا کام نہیں کہ کل کیا ہو گا۔ میرے والد نے ہنس کر ٹال دیا۔ تیس ہزار روپے ماہانہ کی آمدنی کا مالک۔ وہ بوڑھا، جس کا اکلوتا بیٹا لندن میں اعلیٰ تعلیم کے بہانے عیش کر رہا تھا، وزیر خاں جو ماڈل ٹاؤن کی ایک کوٹھی سے کار میں بڑی شان سے نکلتا تھا جو میر وزیر اینڈ کمپنی کا مالک تھا۔ مالک ہ میر شرافت علی نے قہقہہ مار کے کہا۔ وہ بوڑھا جو کندھے پر جھاڑن رکھے سارا دن صوفے اور میز کرسیاں، گلدان اور سامانِ آرائش، کھڑکیوں کے شیشے اور فانوس جھاڑتا پھرتا ہے ہ جو گٹھیا کے لیے خیراتی شفاخانے سے رنگدار پانی اور اسپرین کی گولیاں لا کے شفا کی امید رکھتا ہے ہ امید کیا ہے ہ خود فریبی کا جال۔ وہ بوڑھا اپنے اکلوتے بیٹے کے سنہرے مستقبل کے لیے زمانے کی ٹھوکروں میں رہا۔ مستقبل تو

سراب تھا۔ اور ان حالات کا ذمے دار صرف ایک شخص تھا۔

بہت دیر بعد جب غیظ و غضب تاسف اور ملال اور پشیمانی و پریشانی کے جذبات کی تباہ کن لہر کا زور ٹوٹا تو میں ایک بالکل مختلف اور بدلا ہوا انسان تھا۔ میرے خیالات و احساسات بدل چکے تھے۔ میری ذہنی کیفیت میں وہ انقلاب آ چکا تھا جس نے مجھے زندگی کے مقاصد کا نئے سرے سے تعین کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ پہلے میں خوابوں کے محل تعمیر کر رہا تھا۔ اب میں بے رحم حالات کی آندھی میں منہدم ہو جانے والے گھر کے ویران کھنڈر پر کھڑا نوحہ خواں تھا۔ مجھے اسی ویرانے میں اپنی گمشدہ جنت بنانی تھی اور تعمیر کے خواب کو تعبیر دینے سے پہلے ان سب کے خون سے بنیادوں کی آبیاری کرنی تھی جو اس تباہی و بربادی اور تخریب کے عمل میں شریک تھے اور بھول گئے تھے کہ آنے والا دن یومِ مکافات بھی ہو سکتا تھا۔ میری فہرست میں پہلا نام میر شرافت علی کا تھا اور دوسرا چراغ دین کا جو اب سی۔ سی۔ ڈین ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے آپ سے عہد کیا کہ اس گمنام خط کے مندرجات درست ثابت ہوتے اور مجھے اپنے باپ کی قدم بوسی کے لیے سی سی ڈین کی کوٹھی کے سرونٹ کوارٹر کی بجائے اس کی قبر پہ فاتحہ پڑھنے کے لیے جانا پڑا تو میر شرافت علی کو اس قتل پر اپنے ہاتھوں سے سزائے موت دوں گا اور چراغ دین سے سی سی ڈین بن کے میرے باپ کی تذلیل کرنے والے کو وہ سزا دوں گا کہ اس کی ذلت کا تماشا باعثِ عبرت ہو۔ اس فیصلے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ غم و اندوہ کے اچانک ٹوٹ پڑنے والے کوہ گراں کا بار اتنا ہلکا ضرور ہو گیا ہے کہ میں سانس لے سکوں۔

میر پور کے اصیل باشندے یعنی محترم ڈش واشر نے میری حالت کے تغیر کو محسوس نہیں کیا تھا یا درخورِ اعتنا نہیں سمجھا تھا۔ مگر کالا صاحب میرے انہماک اور میری صورت کے تاثرات کا بغور مشاہدہ کرتا رہا تھا۔ "آر یو آل رائٹ؟" اس نے بہت دیر بعد کہا جب میں خط کو جیب میں رکھنے کے بعد آنکھیں بند کیے نیم دراز تھا۔ "اس خط میں کوئی بہت تشویش کی بات تھی؟" اس نے کہا۔ "مجھے اندیشہ تھا کہیں تمہیں ہارٹ اٹیک نہ ہو جائے۔"

"میرا دل پتھر کا ہو گیا ہے۔" میں نے کہا۔ "میں خود ایک پتھر ہوں۔ شیشے کے انسانوں کو مجھ سے ڈرنا چاہیے۔"

کالے صاحب کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اس نے باہر دیکھتے رہنے کو ترجیح دی۔ میں نے اس کا نام مشتبہ افراد کی فہرست میں سے کاٹ دیا اور باقی مسافروں پر ایک نگاہ ڈالی کہ ان میں سے کون صورت سے کرائے کا قاتل لگتا ہے، لیکن سب چہرے ایک جیسے اجنبی تھے۔ ملکی و غیر ملکی۔ سفید فام۔ گندمی رنگ والے۔ زرد رو اور سیاہ

فام۔ جوان اور بوڑھے۔ سب اپنے اپنے خیالات میں محو تھے مگر کسی صورت پر قاتل کا گمان نہ ہوتا تھا اور سب قاتل لگتے تھے۔

"بائی دی وے" کالے صاحب نے اچانک کہا۔ "کیا میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں؟" مدد کے جذبے سے زیادہ یہ تجسس کا جذبہ تھا جو اسے دخل در معقولات پر اکسا رہا تھا۔

"ہاں" میں نے ایک سرد آہ بھر کے کہا۔ "آپ بتا دیں کہ میں نے کمرہ نمبر تین سو تین کو تین سو دو سمجھنے کی غلطی کیوں کی تھی اور اگر ادھر کا ہندسہ ادھر نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔ اور کیا نہ ہوتا؟"

"میں کچھ سمجھا نہیں" کالے صاحب نے چکرا کے کہا۔

"ادھر کا ہندسہ ادھر"

"میں بھی نہیں سمجھا تھا کہ تو ما بخو میرا خیر خواہ ہے" میں نے افسوس سے سر ہلا کے کہا۔ "کاش میں تو ما بخو سے مل لیتا۔"

راستے میں حکمنی تو در کنار میں نے سونگھی تک نہ تھی چنانچہ کالے صاحب کے لیے مجھے نشے میں فرض کرنا محال تھا۔ اس نے مجھے مخبوط الحواس قسم کا نامعقول انسان قرار دیتے ہوئے مزید گفتگو سے احتراز کرنا بہتر سمجھا۔ کئی گھنٹے بعد جب جہاز کا رخ اسلام آباد سے لاہور کی طرف کیا گیا تو انہوں نے مزید ایک جملہ ارشاد کیا تھا کہ پلین کریش کر رہا ہے تو صاف کیوں نہیں بتایا جاتا مگر مجھ سے مخاطب ہو کے نہیں۔ آخری بات لاہور ایئر پورٹ پر ہوئی جب انہوں نے ناگواری سے کہا کہ اگر میرا ارادہ جہاز ہی میں بیٹھے رہنے کا ہے تو میں ان کو گزرنے کا راستہ دے دوں اور میں نے حیران ہو کے دیکھا تو جہاز واقعی لاہور ایئر پورٹ پر کھڑا تھا۔ سیٹ بیلٹ جو میں نے غیر شعوری طور پر باندھ لی تھی ابھی تک میرے جسم پر کسی ہوئی تھی۔

میں نے اپنے سفر کو لاہور ہی میں ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ جب میں نے اپنا اسباب اور دستاویزات وغیرہ کو کسٹم کی چیکنگ کے لیے پیش کیا تو مجھے اپنے ساتھ چند اور مسافر بھی نظر آئے۔ ایک بوڑھا انگریز اور اس کی نسبتاً جوان بیوی۔ وہ سیاح یا ریسرچ اسکالر وغیرہ ہو سکتے تھے جو موہنجوداڑو یا ٹیکسلا کے گڑے مردے اکھاڑنے آتے رہتے ہیں۔ دوسرا ولایتی جوڑا انداز و اطوار کی بے فکری اور لاابالی پن سے ہنی مون منانے کے موڈ میں نظر آتا تھا اور انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ جہاز کہاں اترا ہے۔ وہ بحر الکاہل یا ماؤنٹ ایورسٹ پر بھی اتنے ہی خوش نظر آتے۔ باقی دو انگریز نیشن صورت اور معزز قسم کے کاروباری یا سفارتی عملے کے اعلیٰ ارکان ہو سکتے تھے۔ ان کو میں نے فرسٹ کلاس سے برآمد ہوتے دیکھا تھا۔ ان میں سے کسی کو کرائے کا قاتل سمجھنا بڑی غیر منطقی سی بات لگتی تھی۔ ان سے دو گنی تعداد میں پاکستانی مسافر تھے جن کو شاید میری طرح لاہور ہی آنا تھا۔ صرف تین کے ساتھ ان کا کنبہ بھی تھا۔ باقی میری طرح تنہا بھی تھے۔ میں نے بغور ان کی صورتوں کو ملاحظہ کیا مگر قاتل اگر پیشہ ور ہو تو چہرہ دوہرے نقاب میں رکھتا ہے۔ اپنی باری آنے پر میں نے کسٹم کی رسمی کارروائی پوری کی۔ میرے پاس ڈیکلیئر کرنے کو کچھ نہیں تھا۔

"کمال ہے۔ آپ تین سال لندن میں رہے اور اپنے ساتھ کچھ نہیں لائے؟" عملے کے ایک رکن نے ناقابل یقین مشتبہ لہجے میں کہا۔

"مثلاً کیا! کوئی میم وغیرہ۔۔۔!" میں نے کہا۔ "میں نے سنا تھا۔ اس پر ڈیوٹی بہت زیادہ ہے۔ خواہ مخواہ ضبط ہو جاتی۔"

بادل نخواستہ انہوں نے مجھے جانے کی اجازت دی۔

"ٹیکسی سر؟" ایک مستعد قسم کے شخص نے مجھے کارڈ آف آنر پیش کرنے کے بعد کہا۔ اور مجھے تعجب ہوا کہ صرف تین سال میں میرے ملک کے ٹیکسی ڈرائیور اتنے مہذب اور شائستہ ہو چکے ہیں۔ لیکن ریلوے اسٹیشن جانے کا کرایہ اس نے سو روپے مانگا اور رازدار لہجے میں کہا کہ زر مبادلہ کی صورت میں پانچ پونڈ بھی قبول ہوں گے۔ تو میری خوش فہمی دور ہو گئی۔ اسی وقت دوسری ٹیکسی میرے سامنے آ رکی۔ اور ایک بار پھر مجھے تعجب ہوا۔ کیونکہ دوسرے ٹیکسی ڈرائیور نے کوئی سودا نہیں کیا۔

"جو میٹر بتلائے گا جناب عالی وہی لیں گے" اس نے کہا۔ راستے میں اس نے ملک کو بدنام کرنے والے لٹیرے ٹیکسی ڈرائیوروں کے خلاف لیکچر دیا۔ لیکچر کا حصہ دوم جس میں رزق حلال کی اہمیت کا ذکر تھا۔ ابھی جاری تھا کہ ٹیکسی نے شملہ پہاڑی کا موڑ کاٹا تو میرے دل کی دھڑکن یکلخت تیز ہو گئی۔ ابھی ایک مہینہ قبل میں نے ان سے بات کی تھی اس کے بعد مجھے ڈرافٹ موصول ہوا تھا۔ محسن یہاں آ کے میرے والد سے ضرور ملا ہو گا۔ کوئی ایسی ویسی بات ہوتی تو وہ ضرور لکھ دیتا۔ مگر اس نے تو ایک خط بھی نہیں لکھا تھا۔ اور خود میرے والد کا آخری خط کب آیا تھا؟

"کہاں جانا ہے آپ کو جناب عالی؟" ٹیکسی ڈرائیور نے آہستہ سے بریک لگائی اور پلٹ کر کہا۔

میں نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔ یکلخت میری نگاہ سیاہ پلاسٹک کی تختی پر ابھرے ہوئے سفید پلاسٹک کے روشن حروف پر گئی۔ "سی، سی، ڈین۔" میں نے زیر لب کہا۔ "بس یہیں جانا تھا۔" پھر مجھے ایک اور خیال آیا۔ "تم نے یہاں ٹیکسی کیوں روکی! میں نے تو ریلوے اسٹیشن کہا تھا۔"

"تو ریلوے اسٹیشن لے چلتے ہیں جناب عالی" ٹیکسی ڈرائیور نے ٹھیٹھ لاہوری لہجے میں کہا۔ "ناراض ہونے کی تو کوئی بات نہیں۔ آپ نے جہاز سے اتر کر گڈی پر چڑھنا تھا!"

میں نے اس ٹیکسی ڈرائیور کو دو پونڈ دیے جو اصل کرائے کے دگنے سے بھی زیادہ تھے۔ چنانچہ اس نے خوشی خوشی رکھ لیے اور میرا سامان اتروا کر کوٹھی کے دروازے تک بھی لے گیا۔ ابھی میں کال بیل بجا کے کسی کے نمودار ہونے کی انتظار کر ہی رہا تھا کہ میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو انجن اسٹارٹ کرنے کی ناکام کوشش کے بعد بونٹ کھولتے اور بڑبڑاتے دیکھا۔ دو منٹ بعد میں نے چوتھی بار گھنٹی کا بٹن دبا دیا تو وہ بونٹ بند کر کے راہگیروں سے درخواست کر رہا تھا کہ گاڑی کو دھکا لگا دیں۔

گیٹ کے اندر کا ایک چھوٹا گیٹ کھول کر جو شخص سخت برافروختگی کے عالم میں باہر آیا اس کے کپڑوں کے داغ اور اس کے جسم سے پھوٹنے والی ہر خوشبو خبر دیتی تھی کہ وہ خانساماں ہے۔ وہ پچاس پچپن سال کا پہلوان ٹائپ شخص تھا۔

"گھنٹی پر گھنٹی۔ گھنٹی پر گھنٹی۔ بندے کو اندر سے باہر آنے میں وقت تو لگتا ہے۔ کچھ صبر بھی کرنا چاہیے۔ معلوم ہوتا ہے۔ ولایت سے آ رہی ہے سواری" اس نے طنز سے کہا۔

"میں واقعی ولایت سے آیا ہوں۔" میں نے کہا۔ "مجھے وزیر خاں سے ملنا ہے۔"

اس کی صورت کے تاثرات ایک لمحے میں بدل گئے۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ اگر تمہیں معلوم ہو کے وزیر خاں کا انتقال ہو چکا ہے تو تمہارے لیے یہ صدمہ غیر متوقع نہ ہو۔ مجھے خط کے الفاظ یاد آئے مگر اس کے باوجود صدمہ غیر متوقع ثابت ہو رہا تھا۔

"کون ہو تم برخوردار؟" خانساماں نے نرمی سے کہا۔ "بڑی دیر سے آئے۔"

میں نے سہارے کے لیے ادھر ادھر ہاتھ پھیلائے۔ میری نظروں کے سامنے سرخ اندھیرا پھیلنے لگا تھا اور زمین ڈوبنے لگی تھی۔ گیٹ پوسٹ کی دیوار نے مجھے سہارا فراہم کر دیا۔ "میں ان کا بدبخت بیٹا ہوں" میں نے بمشکل تمام کہا۔

"کون؟ سکندر بخت! جو ولایت میں پڑھ رہا تھا؟" بوڑھے خانساماں نے اپنا لہجہ ہمدردانہ رکھنے کی واجبی سی کوشش کی مگر اس لہجے میں ملامت کا رنگ غالب تھا۔ "اب آنے کی کیا ضرورت تھی برخوردار! اس غریب کو ہم ایک ہفتہ پہلے میانی صاحب کے قبرستان میں دفن کر چکے ہیں۔"

"مجھے۔۔۔ مجھے بالکل معلوم نہیں تھا۔۔" میں نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا۔ آنسو میری آنکھوں سے نکل کر فرش خاک پر گرتے رہے۔ "انہوں نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔"

"یہی تو فرق ہے زمانے کا" خانساماں بولا۔ "اس نے سارے دکھ اٹھائے اور اس لیے خاموش رہا کہ بیٹے کی تعلیم میں خلل نہ پڑے۔ بیٹا تھا وہ سے ولایت جا کے بیٹھ گیا، صاحب بننے کے لیے۔ سال میں ایک بار بھی خبر لینے نہیں آیا۔ قصوروار تو مرنے والا ہی ہوا نا۔ کہ تم کو بے خبر رکھا۔ تمہارا فرض کہاں تھا اس کی خبر رکھنا" اس نے ایک گہری سانس لی اور میرے دونوں سوٹ کیس اٹھا لیے۔ "خیر اب رونے دھونے کی بجائے اس کی مغفرت کی دعا کرو۔ آؤ میرے ساتھ۔ چلو شاباش۔ صبر کرو۔"

میں نے آستین سے آنسو خشک کیے اور اس کوٹھی میں داخل ہو گیا جو میرے والد کے ایک نمک حرام ملازم نے غبن کی کمائی سے کھڑی کی تھی اور جہاں ملازم نے آقا کو تین سو روپے ماہانہ پر ذلیل کرنے کے لیے رکھ لیا تھا۔ وہ میری وجہ سے مجبور نہ ہوتا تو بے غیرتی کی اس زندگی پر بہت پہلے موت کو گلے لگا چکا ہوتا، لیکن زندگی کے سارے سہاروں کی شکست کے باوجود وہ میرے لیے زندہ رہا۔ میرے نادیدہ خیر خواہ کے خیال کے مطابق ان کی زندگی کی واحد قابل فخر کامیابی میں تھا۔ اس خانساماں ٹائپ شخص کے پیچھے چلتے ہوئے میں سوچتا رہا کہ میرے نام اور میرے لندن میں زیر تعلیم ہونے کے علاوہ اس کو حقائق کا علم کس حد تک ہے۔ کیا وہ جانتا ہے کہ وزیر خاں پہلے کیا تھا اور چراغ دین یا شرافت علی جیسے لوگوں نے ضمیر فروشی کے اس المیے میں کیا کردار ادا کیا ہے؟ اگر وزیر خاں نے حالات پر راضی برضا رہنے کی مجبوری کو میری وجہ سے قبول کیا تھا تو کیا اس نے یہ دکھڑا دوسروں کے سامنے رویا ہو گا؟ نہیں۔ ایسے تو بات پھیل جاتی اور کوئی چھٹی لکھ مارتا تو اس کی ریاضت واقعی رائیگاں جاتی۔

خانساماں نے کہا۔ "یہ اپنا کوارٹر ہے برخوردار۔ میں باورچی ہوں۔ سلامت شاہ۔ اسی کے ایک کمرے میں وزیر خاں میرے ساتھ رہتا تھا۔"

میں نے کوٹھی کے عقب میں بنے ہوئے ویران اور خستہ حال سرونٹ کوارٹر کو دیکھا اور اس کوٹھی کا تصور کیا جس میں میرے ولایت جانے سے پہلے میرے والد مقیم تھے۔ میرے ذہن میں ایک تصویر ابھر آئی جس میں پوری کوٹھی کے ہر کمرے کا نقشہ تھا اور میرے والد کے تمام معمولات تھے۔ پرانی وضع کی کھڑکیاں۔ بلند اور نیم دائرے کی شکل کے رنگین شیشوں والے دروازے۔ محرابی دروازے جن کی پالش سے دمکتی سطح پر

جڑی ہوئی پیتل کی کیلیں سونے کی لگتی تھیں۔ عشق پیچاں کی چھت تک پہنچنے والی بیلیں جن کے تنے موٹی رسیوں کی طرح آپس میں بل کھاکے الجھ گئے تھے اور جس میں نیلے پھول مسکراتے رہتے تھے۔ اس کے سامنے والا لان جس پر بیٹھ کے میرے والد سبزے اور پھولوں کی مہک میں لمبے لمبے سانس لے کر بڑی فرحت محسوس کرتے تھے۔ اخبار پڑھتے تھے اور شام کی چائے پیتے تھے جو ٹرالی میں سجا کے ایک ملازم ان کے پاس چھوڑ جاتا تھا۔ میں اکثر دیکھتا تھا کہ خدا کی عطا کی ہوئی ان سب نعمتوں کا احساس ان کو کتنی طمانیت اور مسرت بخشتا تھا۔ وہ کوٹھی کو۔ پورچ میں کھڑی ہوئی کار کو۔ آراستہ کمروں کے پُرآسائش لوازمات کو اور زندگی کے اس حسنِ انتظام کو دیکھ دیکھ کر زیرِ لب مسکراتے رہتے تھے لیکن کبھی کبھی میں دیکھتا تھا کہ یہ مسکراہٹ یکلخت کافور ہوگئی ہے۔ یوں جیسے چودھویں شب کی چاندنی کو بادل کا ایک ٹکڑا چھپادے۔ وہ کہتے تھے۔ ”سکندر۔ کتنا اچھا ہوتا اگر آج ہم دونوں کے ساتھ وہ سب بھی ہوتے۔ ان کی خوشی سے ہماری خوشی میں کتنا اضافہ ہوتا۔“ وہ سب میرے بھائی بہن تھے اور میری ماں تھی اور ایک بوڑھی دادی تھی۔ موت سے کس کو رستگاری ہے مگر وقت کی اس بے رحمی کا داغ کہاں جاتا ہے جس کا ایک قاتل لمحہ زندگی کے سفر میں ساتھ دینے والوں کو یوں سمیٹ کرلے جائے جیسے تیز آندھی خشک پتوں کو اڑا کرلے جاتی ہے۔

میں اس ویران مدفن جیسے کمرے کی سپاٹ دیواروں پر اس زندگی کا ہر عکس دیکھ رہا تھا جو خواب فردا کی طرح بے وجود ہوگئی تھی اور میرے لیے یہ تصور کرنا دشوار تھا کہ جس شخص نے اپنے عزم و استقلال سے تنہا اور بے سہارا رہ جانے کے باوجود جدوجہد کا آغاز ملبے کے ڈھیر سے کیا ہو اور کامیابیوں کی قابلِ رشک عمارت کھڑی کرلی ہو وہ ایسی کسمپرسی، بے چارگی۔ معذوری اور محرومی اور ذلت و رسوائی کے ساتھ اس کال کوٹھری میں مفلسی کا عذاب جھیلتے چپ چاپ مرگیا۔ اس نے ایک بار بھی تو نہیں کہا کہ بیٹا اب میں بوڑھا ہوں اور بیمار ہوں اور ہر طرف سے دشمنوں کا حصار تنگ ہوتا جارہا ہے۔ جوان بیٹا بڑھاپے کی لاٹھی ہوتا ہے۔ آؤ اب مجھے سہارا دو اور یہ محاذ سنبھالو۔ یہ توقعات تو سب ہی والدین رکھتے ہیں کہ اولاد بڑی ہوگی تو ان کے ہر دکھ کو سکھ میں بدل دے گی۔ وزیر خاں تم نے ایسا کیوں نہیں کیا؟ میں اتنے بڑے احسان کی سزا کا مستحق تو نہ تھا۔

”بس کرو برخوردار۔“ سلامت شاہ نے ہمدردی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”آؤ ادھر میرے کمرے میں بیٹھو۔“

آدھے گھنٹے بعد وہ میرے لیے چائے بناکے لاچکا تھا اور اپنی جھلنگا چارپائی پر میرے سامنے بیٹھا تھا۔ کمرے میں لکڑی کی ایک ہی کرسی تھی جس پر تکیہ رکھ کے اس نے مجھے بٹھادیا تھا۔

”میرے والد کے آخری ایام میں آپ ہی ان کے سب کچھ تھے۔“ میں نے طبیعت سنبھل جانے کے بعد کہا۔ ”آپ نے یقیناً بہت کچھ کیا ہوگا اور اس احسان کا اجر خدا دے سکتا ہے۔ میں یہ دعوے کس منہ سے کروں کہ اس کا بدلہ چکا دوں گا۔“

”اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں۔“ سلامت شاہ نے کہا۔ ”خدا کو یہی منظور تھا۔ ورنہ یہی سب کچھ میرے ساتھ ہوتا تو وہ میرے کام آتا اور وہ لڑکا کیا کرتا جو ولایت میں۔۔۔ کرسوں دور بیٹھا ہے۔“

میں چونکا۔ ”آپ کا بھی کوئی لڑکا ہے باہر؟“

”ہاں جی۔ ایک ہی بیٹا ہے۔ ڈاکٹری کرچکا تھا۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے گیا ہوا ہے۔“ وہ فخر سے بولا اور اس کی آنکھوں میں غرور کی وہی پُرمسرت چمک اتر آئی جو میں نے اپنے والد کی آنکھوں میں بھی دیکھی تھی۔ ”ہمارے حالات بہت حد تک ایک جیسے تھے۔ میرا بھی اس بیٹے کے سوا دنیا میں کوئی نہیں۔ لیکن میں نے وہ دکھ نہیں جھیلے جو وزیر خاں نے اٹھائے۔ میرا بھی ایک بیٹا جس کی ماں بدبخت میرا ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ ایک سیٹھ کا بگڑا ہوا لونڈا اسے ورغلا کے بمبئی لے گیا تھا۔ معلوم نہیں وہاں اس پر کیا بیتی۔ مجھے اس کا کوئی رنج نہیں۔ یوں پل بھر میں میرا پورا خاندان چٹ پٹ ہوجاتا تو میں دیوانہ ہوگیا ہوتا۔“

اس کے بعد وہ مجھے اپنے والد کے آخری ایام کی روداد سناتا رہا جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ جو کچھ اسے معلوم ہے وہ حقیقت کا ایک حصہ ہے۔ بے ضرر اور پردہ دار۔ جو سوال میں پوچھنا چاہتا تھا یہ تھا کہ میرے والد نے آخری ایام میں اس بے ضمیر شخص کے پاس ملازمت کیوں کی جو ان کے اعتماد کو دھوکا دے چکا تھا اور قانون کی گرفت سے بچ گیا تھا لیکن ان کا مجرم تو تھا۔ سارے شہر میں ان گنت لوگ ایسی ہی کوٹھیوں میں آباد تھے اور ان میں سے کوئی بھی ترس کھاکے ان کو گھر میں ملازم رکھ سکتا تھا۔ چراغ دین سے نوکری کی بھیک مانگنے اور کل تک اپنے ٹکڑوں پر پلنے والے ایک معمولی ملازم کے ہاتھوں ذلت قبول کرنے میں انہوں نے کیا مصلحت دیکھی تھی۔ کیا وہ چراغ دین کو سزا دینا چاہتے تھے۔ جو اس دنیا کا نظام انصاف نہ دے سکا کیونکہ شہادت ناکافی تھی۔ مگر وہ خود زبان کی نہیں دل کی گواہی سے قائل تھے کہ چراغ دین مجرم ہے اور عمر نے وفا نہ کی ورنہ اسے یہ سزا ضرور ملتی۔ میرے والد ہمیشہ کہتے تھے۔ ”اعتماد کو دھوکا دینے سے بڑھ کے گناہ کوئی نہیں۔ ہمت ہے تو دن دھاڑے ڈاکہ ڈالو۔ مگر معاملہ اعتماد کا ہو تو پائی پائی کی حفاظت امانت جان کے کرو۔“ چراغ دین نے ان کے اعتماد کو زک پہنچائی تھی۔ کیا انہوں نے خواہشِ انتقام سے مغلوب ہو کے اس کے پاس ملازمت قبول کی تھی کہ موقعہ ملے تو۔ اس خیال پر مجھے بڑی ندامت ہوئی۔ میرے والد اس قماش کے آدمی نہ تھے۔

”سلامت چاچا۔“ میں نے کہا۔ ”میرے ابا جی نے کبھی یہ بتایا تھا کہ وہ یہاں آکے کیوں نوکر ہوئے تھے؟“

”ہاں برخوردار۔ جس سیٹھ کے پاس وہ پہلے ملازم تھے اس سنگدل نے وزیر خاں کی خدمت گزاری کا یہ صلہ دیا تھا کہ گٹھیا کا عارضہ لاحق ہوتے ہی جواب دے دیا تھا۔“ سلامت شاہ نے آہ بھرکے کہا۔ ”پیٹ کی خاطر کہیں تو نوکری کرنی ہی تھی۔ خدا بھلا کرے چراغ دین صاحب کا۔ انہوں نے وزیر خاں کو رکھ لیا۔“

میرے دل میں ایک خلشِ خار خار جاگ اٹھی۔ ”آپ کب سے ہیں یہاں؟ سیٹھ چراغ دین پہلے کیا کرتے تھے؟“

”میں سات سال سے ہوں برخوردار۔ اس سے پہلے سیٹھ صاحب ولایت میں تھے اور کوئی کاروبار کرتے تھے۔“ سلامت شاہ بولا۔

”اب ان کا کیا کاروبار ہے؟“ میں نے کہا۔

”پہلے شاہدرے میں تولیے اور کھیس بنانے کی فیکٹری تھی اب کپڑے کا ایک بڑا مل بھی قائم کرلیا ہے۔“ سلامت شاہ بولا۔

”اچھا اگر میں تمہارے سیٹھ صاحب سے گھر پر ملنا چاہوں تو کس وقت مل سکتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”آجکل تو وہ مری میں ہیں۔ ہر سال دس دن بیوی بچوں کی قبر پر حاضری دیتے ہیں۔“ سلامت شاہ نے کہا۔ ”ساری قبریں آگی کوٹھی کے احاطے میں ہیں۔ چار قبریں۔“ اس نے توبہ کے انداز میں کانوں کو ہاتھ لگایا۔

”میں نے سنا ہے چراغ دین کا سارا خاندان ایک حادثے کی نذر ہوگیا تھا۔“ میں نے بے نیازی سے کہا۔

”ہاں برخوردار۔ بڑا خوفناک حادثہ تھا۔ گاڑی خود چراغ دین سیٹھ کا چھوٹا بھائی چلا رہا تھا۔ دو پیارے پیارے پھول سے بچے تھے۔ سینے سیا اسکول میں پڑھتے تھے اور ان کی ماں بھی تھی جو ایک بہت بڑے افسر کی بیٹی تھی شیروانی صاحب کی۔ وہ بھی آج کل مری گئے ہوں گے۔ ایک دن کے لیے وہ بھی جاتے ہیں۔“

”شیروانی صاحب؟ کون شیروانی؟ کچھ معلوم ہے کہ کس محکمے کے افسر ہیں؟“ میں نے سر اٹھا کے پوچھا۔

سلامت شاہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ”محکمہ تو میں نہیں جانتا۔ یہ سنا ہے اب وہ کسی ملک میں سفیر ہوکے جانے والے ہیں۔“

”ان کا تعلق وزارتِ خارجہ سے ہے؟“ میں اٹھ بیٹھا۔ ”کوئی لڑکا ہے ان کا محسن رضا؟“

”ایک لڑکا ولایت میں پڑھتا تھا۔“ سلامت شاہ نے کہا۔ ”وہاں کسی گورے نے اس کو چاقو مار دیا۔ شیروانی صاحب نے واپس بلا لیا۔ اسی کی سب سے بڑی بہن تھی۔“

میرے ذہن میں بم کا دھماکہ ہوا جس نے میرے وجود کی پوری عمارت کو اندر سے تہس نہس کردیا۔ چراغ دین کی بیوی محسن رضا کی بہن تھی۔ کیسے کمال کی بات ہے کہ مجھے محسن کے بہنوئی کا نام معلوم نہ تھا۔ تین سال پہلے یہ اطلاع لندن پہنچی تھی کہ اس کا رشتہ ایک ٹھیکیدار سے طے کردیا گیا ہے تو میں نے محسن سے پوچھا تھا کہ یہ رشتہ مریم کو پسند ہے؟ اور محسن رضا نے تلخی سے کہا تھا۔ ”مریم کو پسند ہو نہ ہو ڈیڈی کو پسند ہے تو بات ختم۔ نہ ممی اختلاف کرسکتی ہیں نہ میں بول سکتا ہوں۔ ڈیڈی خود سر آدمی ہیں اور ان کی مرضی کے آگے کسی کی مرضی نہیں چلتی۔ میں نے تو صرف اتنا سنا ہے کہ لڑکا اچھا ہے اور خاصا کما رہا ہے۔ اس سے زیادہ مجھے کچھ نہیں معلوم۔“

”یار محسن۔“ میں نے تھوڑے سے تامل کے بعد کہا تھا۔ ”مریم تو شاید اس پروفیسر کو پسند کرتی تھی جو شاعر اور کچھ افسانہ نگار وغیرہ تھا۔“

”پھر کیا ہوا۔ وہ تو اس عمر میں سب لڑکیاں کسی نہ کسی قلاش دانشور، کرکٹر یا شہزادہ گلفام کو پسند کرنے لگتی ہیں کیونکہ زنانہ ناولوں کے مطالعے سے مثالی شریکِ حیات کی یہی تصویر بنتی ہے۔“ محسن رضا نے اسی تلخی سے کہا تھا۔ ”بعد میں سب کچھ بھول جاتی ہیں اور اس حقیقت کو تسلیم کرلیتی ہیں کہ کامیاب ازدواجی زندگی کا تصور اس چیز کے بغیر ناممکن ہے جسے فقیر ہاتھ کا میل کہتے ہیں اور دولت مند اپنی جدوجہد کا انعام۔ رومانٹک ہیرو بدستور ناولوں میں خوبصورت ڈائلاگ بول رہے ہیں اور آسمان کے چاند تارے توڑ کر لانے کے دعوے کررہے ہیں۔ ان کی سابق محبوبائیں کاروں میں گھوم رہی ہیں اور ٹھیکیدار ٹائپ شوہروں کی دولت سے گرمیوں کا سیزن مری میں گزار رہی ہیں۔“

ہم لوگ اس شادی میں شریک نہیں ہوئے تھے۔

ایک سال قبل جب ہمیں مریم کی موت کی خبر ملی تھی تو مجھے محسن کی تین سال پہلے کی بات یاد آئی تھی۔ مریم سیزن گزارنے مری

سے لوٹتے ہوئے کار کے کھڈ میں گر جانے سے ہلاک ہوگئی تھی۔ بعد میں لوگوں نے ہمیں بتایا کہ اس کی کار بریک فیل ہو جانے کے باعث کئی ہزار فٹ گہرے کھڈ میں لڑھکتی ہوئی نیچے پہنچی تھی تو اس میں آگ لگ چکی تھی۔ تلاش کرنے والوں کو ادھر اُدھر سے لاشوں کے پرزے اور چار مختلف جسموں کے اعضا ملے تھے جن کو اکٹھا کر کے اندازے سے چار قبروں میں دفن کر دیا گیا تھا۔ محسن بہت رویا تھا۔ بڑی بہن اسے تمام بہن بھائیوں سے زیادہ چاہتی تھی۔ شادی کے کارڈ میں مریم کے ہونے والے شوہر کا کیا نام لکھا ہوا تھا۔ اس پر میں نے غور ہی نہیں کیا تھا۔ اہم صرف مریم کا نام تھا جس سے میری جذباتی وابستگی صرف ایک یاد سے وابستہ تھی۔

ایک بار اس نے کھانے کی میز پر سب کے درمیان بیٹھ کر مجھ سے سرگوشی میں کہا تھا۔ "سکندر میں شرط لگا سکتی ہوں کہ تم اور فوزیہ ایک دوسرے کو چاہتے ہو۔"

"جی"۔ میں اچھل پڑا تھا۔ "جی ہاں۔" میں نے اِدھر اُدھر دیکھ کر اور بوکھلا کے کہا تھا۔ اس ہڑبڑاہٹ میں میرے ——— ہاتھ سے چمچہ گر گیا تھا۔ ایک گلاس الٹ گیا تھا اور نوالہ میرے حلق میں یوں پھنس گیا تھا کہ سانس رکنے سے میرے آنسو نکل آئے تھے چنانچہ سب لوگ ہنسنے لگے تھے جن میں فوزیہ بھی شامل تھی۔ جب مریم کے مرنے کی خبر ملی تھی تو مجھے ایسا محسوس ہوا تھا، جیسے مجھے فوزیہ سے ملانے والا ایک قابلِ اعتماد پل گر گیا ہے۔ میں نے بڑے حیلوں بہانوں سے یہ پوچھا تھا کہ مرنے والوں میں فوزیہ تو نہیں تھی۔ اور اس وقت بھی مریم کے شوہر کا نام اگر سنا تھا تو غیر اہم سمجھتے ہوئے نظر انداز کر دیا تھا۔ مجھے محسن رضا کی ایک اور بات یاد تھی۔ جو وہ بار بار کہتا تھا۔ "یار سکندر۔ گاڑی نئی تھی۔ ابھی دو مہینے پہلے ہی خریدی گئی تھی۔ چند دن قبل پنڈی کی سروس ورکشاپ گئی تھی۔ اس کے بریک کیسے فیل ہو گئے۔" حقائق سے بے خبری کے باعث اس وقت میں نے روایتی جواب یہ دیا تھا کہ موت کا ایک دن معین ہے جو کسی طرح بھی ٹالا نہیں جا سکتا۔

سلامت شاہ میرے خیالات کی رو سے بے خبر اس حادثے کی تفصیلات بتانے میں مگن تھا جو مجھے پہلے ہی معلوم تھیں۔

"سلامت چاچا۔" میں نے کہا۔ "میرے والد نے کچھ سامان تو چھوڑا ہوگا۔"

سلامت شاہ کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ "ہاں۔ ایک بستر اور چند کپڑے تو اب بھی کمرے میں موجود ہیں۔ چند دن پہلے اس نے مجھے ایک لاکر کی چابی دی تھی۔ جو میرے پاس محفوظ ہے۔ دوسری چابی صندوق کی تھی۔ مجھے نہیں معلوم اس صندوق میں کیا تھا جو وزیر خاں کے پلنگ کے نیچے ہمیشہ مقفل رہتا تھا اگر میں نے کھول کر دیکھ لیا ہوتا تو اچھا تھا۔" وہ اچانک چپ ہو گیا۔

"پھر کیوں نہیں دیکھا؟" میں نے غور سے اس کی صورت دیکھ کر کہا۔

"بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی برخوردار۔" وہ کچھ دیر بعد بولا۔ "بہت سی باتیں ہیں۔ ایک تو یہ وزیر خاں کی صحت تو اسی نامراد گٹھیا کے عارضے سے خراب تھی۔ لیکن جوڑوں میں درد کے سوا جو سردیوں میں بڑھ جاتا تھا اور گرمیوں میں کبھی کبھار تکلیف دیتا تھا اسے اور کوئی مرض لاحق نہیں تھا۔ اس کا بھی وہ عادی ہو گیا تھا وہ آہستہ آہستہ چلتا تھا اور سیڑھیاں نہیں چڑھ سکتا تھا لیکن معذور نہیں ہوا تھا۔ وہ تو سرکاری ڈسپنسری تک لاٹھی ٹیکتا پیدل ہی جاتا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ رات کو وہ بھلا چنگا سویا تھا۔ صبح کیوں مر گیا۔ مرنے والی کوئی بات تو نہ تھی۔"

میں کچھ دیر اس انکشاف پر انگشت بدنداں بیٹھا رہا۔ میرے ذہن میں امکانات کے ہزار در وا ہو گئے تھے جو سب شکوک و شبہات کے آسیب زدہ اندھے تہہ خانوں میں اترتے تھے۔ "چاچا سلامت۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ میرے ابا جی کی موت کے اسباب طبعی نہ ہوں۔ انہیں قتل کیا گیا ہو۔"

سلامت شاہ بھونچکا رہ گیا۔ "قتل!۔۔۔ یہ کیا کہہ رہے ہو برخوردار ہے۔" اس نے گھبرائے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

"ہاں ہاں قتل۔ میں پوسٹ مارٹم کروا سکتا ہوں۔ لاش دوبارہ قبر سے نکالی جا سکتی ہے۔" میں نے کہا۔

"توبہ۔ توبہ۔ استغفار۔" وہ دہشت زدہ ہو کے بولا۔ "یہی سب کرنے آئے تھے تم ولایت سے؟ کہ مرنے کے بعد بھی اس کو چین نہ ملے۔ اس کی لاش کی بے حرمتی ہو۔ خدا کا خوف کرو سکندر۔ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ ڈاکٹر نے کہا تھا ہارٹ فیل ہو گیا۔"

میرے لیے سلامت شاہ سے نظر ملا کے بات کرنا دشوار ہو گیا۔ جذبات کی رو میں بہہ کر میں یہ بھول گیا تھا کہ میں لندن میں نہیں ہوں لاہور میں ہوں اور کسی سراغرساں سے نہیں ایک خانساماں سے مخاطب ہوں جس کے لیے عام آدمی کی طرح لاش کو تدفین کے بعد پھر چیر پھاڑ کے لیے نکال لینے کا تصور ہی لرزہ خیز تھا۔ میرے شکوک برقرار تھے۔ مگر مصلحت کا تقاضا تھا کہ میں اپنے ولایت پلٹ ذہن کے قابلِ صد ملامت خیالوں پر شرمندگی کا اظہار کروں۔ اگر بعد میں مجھے اس اچانک موت کو قتل ثابت کرنے کے لیے عدالت سے رجوع کرنا پڑا اور لاش نکلوانے کے احکامات حاصل کرنے ضروری ہوئے تو یہ کام خود مجھے اپنی ذمے داری پر کرنا ہوگا۔

"میں معافی چاہتا ہوں چاچا سلامت۔ صدمے سے میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ خدا مجھے معاف کرے۔" میں نے کہا۔ "تم اس صندوق کا ذکر کر رہے تھے۔"

"ہاں۔" سلامت شاہ نے اطمینان کا سانس لیا۔ "سوئم کے بعد اگلے دن میں نے صبح اٹھ کر دیکھا تو وزیر خاں کے کمرے کا تالا ٹوٹا ہوا تھا۔ میں حیران اور پریشان کمرے میں گیا تو مجھے کمرے میں ہر چیز بے ترتیب نظر آئی۔ صندوق کا تالا بھی ٹوٹا ہوا تھا اور تمام سامان باہر بکھرا پڑا تھا۔ پرانی تصویریں تھیں ریشمی اور زری کے بیچ کام کے پرانے جوڑے تھے۔ میرا خیال ہے تمھاری ماں کے ہوں گے۔ ان کو آج کوئی استعمال نہیں کر سکتا۔ مگر زری گوٹا خاصا مہنگا بک جاتا ہے۔ اس سے زیادہ حیرانی کی بات یہ تھی کہ صندوق میں بہت قدیم زیورات تھے۔ پرانا سونا تو میں آنکھوں سے دیکھ کر پہچان سکتا ہوں۔ وہ سب فرش پر پڑے تھے معلوم نہیں کوئی کیا لینے آیا تھا اور کیا لے گیا۔ تم دیکھ کر اندازہ کر سکتے ہو۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں نے کبھی اس صندوق میں کبھی جھانکا نہیں تھا۔ جب میں اپنے باپ کے ساتھ پاکستان آیا تھا تو ابا جی کے ساتھ یہی صندوق تھا جو پنڈت دیانا تھ نے سنبھال کے رکھ لیا تھا۔ بچا تو بہت کچھ نہ تھا مگر ابا جی نے پرانے وقتوں کی ان یادوں کو سمیٹ کر ایک صندوق میں ڈال لیا تھا اور یہ اندوختہ میری زندگی کے بعد ان کو سب دنیا سے عزیز تھا۔ یہ تقسیم سے پہلے کی بات ہے۔"

"مجھے وزیر خاں نے اس بارے میں کبھی کچھ نہیں بتایا۔" سلامت شاہ نے کہا۔ "جب بھی بیوی بچوں کی بات کی تو ایک آہ بھر کے یہی کہا کہ سب اللہ کو پیارے ہو گئے۔"

اس کے بعد میں نے سلامت کو وہ سب بتایا جو شنیدہ بھی تھا اور دیدہ بھی۔ اس دوران میں سلامت شاہ نے کھانا بھی پکایا اور میری بات بھی سنی۔ میں نے بتایا کہ سیاہ بختی کے سائے کب سے میرے تعاقب میں ہیں اور سختیٔ ایام کے ایک دور سے اس وقت بھی گزر چکا ہوں۔ جب میں حالات سے نمٹنا تو کیا حالات کو سمجھنے کا دعویٰ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ شنیدہ یہ ہے کہ غلام ملک تقسیم ہوا تو بہت کچھ تقسیم ہو گیا۔ خاندان تقسیم ہو گئے۔ آزادی کی جنگ میں انگریز کے خلاف شانہ بشانہ لڑنے والے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ مذہب اور اخلاق پر مبنی دوستی — ہمسائیگی اور انسانیت کے معیار تقسیم ہو گئے۔ اور جب تقسیم کا یہ عمل جشنِ آزادی بمرگِ انبوہ کی صورت میں جل رہا تھا تو میں آٹھ سال کا تھا۔ میری یادداشت میں میرٹھ چھاؤنی کا وہ گھر موجود ہے جہاں میں اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے ساتھ مقیم تھا۔ شنیدہ یہ بھی ہے کہ ایک رات بلوائیوں نے اس کٹر مسلم لیگی یعنی میرے والد کا خانہ خراب کرنے کا فیصلہ کیا جو مصلحت کے تقاضوں کو مدِنظر رکھنے کا مشورہ دینے پر برہم ہو جاتا تھا اور جان دینے پر تیار تھا مگر مسلم لیگ کا جھنڈا اتارنے پر تیار نہ تھا۔ میں اپنے ایک غیر مسلم دوست کے گھر میں ریڈیو کے سامنے انگشت بدنداں بیٹھا تھا۔ ریڈیو ان دنوں بہت کمیاب تھا اور سائنس کی یہ انقلاب آفریں ایجاد صرف امرا تک محدود تھی جس میں سے سینکڑوں ہزاروں میل دور کے انسانوں کے ہنسنے بولنے اور گانے بجانے کی اور کوئل کی کوک سے بادلوں کی گرج تک ہر آواز برآمد ہوتی تھی۔ میری ناقص عقل کے مطابق ریڈیو کی زبان یعنی لاؤڈ اسپیکر اس اعتبار سے تخلیق کا بہتر کارنامہ تھا کہ آدمی کی زبان کبھی روسی، کبھی لاطینی انگریزی نہیں بول سکتی۔ ساز نہیں بجا سکتی اور ہر جانور کی اور ہر مشین کی آواز نہیں نکال سکتی وغیرہ وغیرہ۔ اس وقت میں یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ سب سے برتر وہ عقلِ سلیم ہے جو تخلیق کے وقت انسان کو عطا کی گئی۔ شنیدہ یہ بھی ہے کہ بلوائیوں نے میرے تمام خونی رشتوں کو خنجر آبدار سے منقطع کیا۔ میرے پانچ بھائی اور میری ماں سرخرو ہوئے۔ چھٹی ہماری سب سے بڑی اور اکلوتی بہن تھی جو یوں سرخرو ہوئی کہ موقع پاتے ہی آنگن کے کنویں میں اتر گئی اور اس کی متعفن لاش ساتویں دن نکال کے نہ جانے کس بے نشاں قبر میں سپردِ خاک کر دی گئی۔ شنیدہ یہ بھی ہے کہ اس فتح و کامرانی کے بعد بلوائی جاتے وقت وہ جھنڈا اتارنا بھول گئے جس کی آبرو پر ایک خاندان نے قربان ہونا منظور کیا تھا۔

میرے والد اپنے بھائی سے ملنے دہلی گئے تھے اور خبر یہ آئی تھی کہ دہلی اسٹیشن پر وائسرائے کی ٹرین آنے سے پہلے بم پھٹا جس میں وہ ہلاک ہو گئے۔ اور شنیدہ یہ بھی ہے کہ اس قتل و غارت گری کو میرے دوست کے غیر مسلم باپ نے بچشم تر دیکھا اور گھر پہنچتے ہی مجھے اس کمرے میں سلا دیا گیا جہاں میرا دوست موہن اور اس کی بہن موہنی سوتے تھے۔ میں اماں کے خوف سے واپس جانا چاہتا تھا مگر انھوں نے کہا کہ ہم بات کر آتے ہیں اور رشوت کے طور پر وہ ریڈیو اٹھا کے اس کمرے میں رکھ دیا جہاں مجھے سونا تھا۔ ظاہر ہے اس کے بعد اماں کی جھڑکیوں کا خوف دل سے نکل گیا اور رات بھر اس طلسمی ڈبے کے کان مروڑ کے ہر طرح کی آوازیں نکالنے کا شوق غالب آ گیا۔ میں اور موہن متعجب تھے کہ کیا دنیا میں رات بھر لوگ سوتے نہیں ہیں کیونکہ ہم نے جب بھی سوئی کو گھمایا کہیں نہ کہیں سے مضحکہ خیز — ناقابلِ فہم باتوں یا دلکش موسیقی کی آواز آنے لگی — مجھ پر موہن کے باپ پنڈت دیانا تھ کا پہلا احسان یہ ہے کہ اس نے مجھے اپنے خاندان کے تمام افراد کی سربریدہ خون آلود اور مسخ شدہ لاشوں کا دلدوز نظارہ نہیں کرنے دیا۔ ورنہ یہ بتانا مشکل ہے کہ اس بھیانک منظر کا نقش میرے ذہن

پر اور بعد میں میری شخصیت پر کیا منفی اثرات مرتب کرتا۔ اُس نے تین دن مجھے اپنے گھر میں مقید رکھا۔ دُوسرے دن ریڈیو کی رشوت نہیں چل سکتی تھی چنانچہ انھوں نے طاقت استعمال کی۔ میں نے موہن کی ماں جسے میں چاچی کہتا تھا کا یہ بیان مسترد کر دیا تھا کہ میرے گھر والے مجھے چھوڑ کر دہلی چلے گئے ہیں اور یہ کہہ گئے ہیں کہ کبیر کو بعد میں بھیج دینا۔ جب میں نے گلا پھاڑ کر رونا شروع کیا تو چاچا دیا ناتھ نے میرے ایک چانٹا لگایا۔ میری آواز فوراً بند ہوگئی۔ وہ بڑے دبنگ قسم کے آدمی تھے۔ چھ فٹ قد۔ کسرتی بدن۔ لمبی لمبی مونچھیں۔ پولیس میں حوالدار تھے اس لیے اُن سے میں بہت ڈرتا تھا۔ "اب اگر آواز بھی نکلی تو ہتھکڑی لگا کے حوالات میں بند کر دُوں گا۔" انھوں نے گرج کر کہا۔ میری سٹی گم ہوگئی اور میں نے موہن اور موہنی کے ساتھ (اور اس ریڈیو کے ساتھ) تین دن ایک کمرے میں گزارنے کو ترجیح دی۔

پنڈت دیا ناتھ بڑے میٹر آف فیکٹ قسم کے اِنسان تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ جھوٹ زیادہ دِن نہیں چلے گا اور خود اُن کے لیے مجھے چھپائے رکھنا مشکل سے مشکل تر ہوتا جائے گا۔ تیسرے دن جب میں حالات سے عارضی سمجھوتہ کیے خاصا مطمئن اور خوش تھا۔ انھوں نے مجھے اپنے پاس بٹھا کے بہت سی باتیں سمجھائیں۔ مثلاً یہ کہ میرے گھر والے دہلی کیوں گئے ہیں۔ "یہاں اُن کے بہت سے دشمن پیدا ہو گئے تھے۔" انھوں نے کہا۔ "اگر وہ یہاں رہتے نا تو مارے جاتے۔" (اُس روز شام کے وقت وہ مجھے گھر کا مقفل دروازہ دکھا کے بھی لائے جہاں اب کچھ بھی نہیں تھا۔)

"دہلی میں میرے چچا کا گھر ہے۔" میں نے کہا۔ "ابا وہیں گئے ہیں۔"

"اچھا!" انھوں نے خوش ہو کر کہا۔ "پھر تو کوئی مسئلہ نہیں رہا۔ پتہ معلوم ہے تمھیں؟"

"جی۔" میں نے کہا۔ "تانگے میں بیٹھ کے جاتے ہیں۔ اُن کے گھر کے سامنے رنگریز کی دکان ہے۔ ہر وقت رنگ برنگے کپڑے سوکھتے رہتے ہیں۔ اور اُن کے گھر کا دروازہ نیلا ہے۔ اوپر کبوتروں کی چھتری ہے۔"

موہن جو عمر میں ہم سے بڑا تھا ہنستے ہنستے بے حال ہو گیا۔ موہنی احمقوں کی طرح دیکھتی رہی۔

"یہ نہیں بیٹا کبیر۔" چاچا دیا ناتھ نے کہا۔ "نام کیا ہے اُس محلّے کا۔ یا سڑک کا۔ گلی کا اور مکان کا نمبر۔"

ظاہر ہے یہ سب مجھے یاد ہوتا تو میں ایسا اوٹ پٹانگ پتہ کیوں بتاتا۔

"اچھا اب یُوں کرتے ہیں۔" چاچا دیا ناتھ نے سوچتے ہوئے کہا۔ "تمھیں موہن کے ماما کے گھر بھیج دیتے ہیں۔ وہ بہت قابل ہیں اور تمھارے چچا کا مکان تلاش کر لیں گے۔ وہ بھی دِلّی میں رہتے ہیں۔ جاؤ گے نا؟"

"میں اکیلا نہیں جاؤں گا۔" میں نے اعلان کیا۔ "موہن اور موہنی بھی میرے ساتھ جائیں گے اور یہ ریڈیو بھی۔" میں نے صُورتِ حال سے پُورا پُورا فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی۔ معلوم نہیں اس رات میاں بیوی کے درمیان کانفرنس کب تک جاری رہی لیکن صبح ہوئی تو مجھے بتایا گیا کہ میری سب شرائط انھیں منظور ہیں لیکن اُن کی بھی ایک شرط ہے۔ جب تک میرے چچا کا پتہ نہیں چلے گا میں کسی کو اپنے گھر والوں کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ نہ یہ کہ میرے ابا کا نام کیا ہے اور چچا کون ہیں۔ بھائی بہنوں کے نام بھی کسی کو معلوم ہوئے تو وہ جو میرے گھر والوں کے دشمن ہیں فوراً پہنچ جائیں گے۔ اور وہ بہت بے رحم لوگ ہیں۔ "آدمی کو مشین میں ڈال کر قیمہ نکال لیتے ہیں اور ڈبے میں بند کر دیتے ہیں اور پھر وہ ڈبے اِدھر اُدھر بک جاتے ہیں اور کھانے والے بکرے کے گوشت کا قیمہ سمجھ کر کھا جاتے ہیں۔" چاچا دیا ناتھ نے واضح کیا۔

میں دہل گیا اور پُورا ایک سال دِلّی میں موہن کے ماما کے گھر میں رہا۔ جو دہلی میں نہیں راستے کے ایک چھوٹے سے قصبے مراد نگر میں تھا اور ایک آرڈی ننس فیکٹری کی وجہ سے مشہور تھا۔ پُوری آبادی سرکاری ملازمین کی تھی چنانچہ فتنہ و فساد سے محفوظ الگ تھلگ جگہ تھی۔ یہ باتیں میری سمجھ میں بہت بعد میں آئیں کہ میری جان بچانے کے لیے اس پُورے خاندان کی مشترکہ کوشش کتنی زبردست تھی۔ موہن اور موہنی کے والدین نے سال بھر کے لیے بچّوں سے دُوری قبول کی۔ خطرات مول لیے۔ میری ہر ضد پُوری کی (مثلاً ریڈیو ساتھ لے جانے کی جو انھوں نے بڑی مشکل سے خریدا تھا) دونوں بچوں کے ساتھ ریڈیو کے چلے جانے سے خود اُن کا گھر سنسان ہوا مگر انھوں نے اپنے مقصد کو عزیز تر جانا اور کامیاب رہے۔ موہن کے ماما جی نے سال بھر تک مجھے بہلانا جاری رکھا اور روز نت نئے بہانوں سے میرے چچا اور ابا کی تلاش میں ناکامی کا اعتراف کرتے رہے لیکن مجھے امید بھی دلاتے رہے کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آہستہ آہستہ انھوں نے شبہات کا اظہار شروع کر دیا کہ کہیں وہ پاکستان نہ چلے گئے ہوں۔ میں رو دھو کے خاموش ہونے کے سوا کیا کر سکتا تھا مگر سال بھر بعد موہن کے ماما جی کو یہ خطرہ لاحق ہونے لگا کہ کہیں میں بھاگ نہ جاؤں یا اعلانِ حق نہ کر دُوں چنانچہ موہن کے پتا ہم سب کو واپس لے گئے۔ مجھے بتایا گیا کہ ابا نے لاہور سے خط لکھا ہے اور وہ بہت جلد مجھے لینے آئیں گے مگر اُن کے آنے تک مجھے اپنی زبان ویسے ہی بند رکھنی ہو گی ورنہ وہ قیمہ بنا کے پیک کرنے والے دشمن۔۔۔

اِس کے بعد ایک معجزہ رُونما ہوا۔ یہ بات شنید نہیں دید ہے۔ تقریباً سوا سال بعد جب میں تقریباً نا امید ہو کے موہن کے خاندان کا ایک مستقل فرد بنتا جا رہا تھا اور اُن کی کوششوں کے طفیل بچھڑ جانے والوں کو تقریباً بھول چکا تھا۔ میرے ابا مجھے سچ مچ لینے آ گئے۔ دروازے پر دستک ہوئی تو میں خود دیکھنے گیا تھا۔

"چاچا دیا ناتھ۔۔۔!" میں نے چیخ کر کہا۔ "ابا آ گئے۔۔۔ ابا مجھے پاکستان سے لینے آ گئے۔" پھر میں ابا سے لپٹ گیا اور چلّا چلّا کے رونے لگا۔ پنڈت دیا ناتھ اخبار دیکھتے دیکھتے بھاگے دُوسری طرف سے اُن کی پتنی ہانپتی کانپتی آئیں۔

"وزیر خاں۔۔۔!" پنڈت دیا ناتھ کے حلق میں آواز پھنس گئی۔ "تم۔۔۔ تمھارے۔۔۔ تو۔۔۔"

"مجھے سب معلوم ہو گیا ہے۔" ابا نے آنسو پونچھ کے مجھے الگ کیا۔ اور سکون سے کہا۔ "میں اپنے گھر گیا تھا۔" پھر وہ اور چاچا دیا ناتھ پھوٹ پھوٹ کر کے رونے لگے۔ چاچی دور کھڑی رو رہی تھی اور ہم سب بچے دُور کھڑے سہمی ہوئی نظروں سے دیکھتے رہے۔

"تم۔۔۔ تم زندہ ہو وزیر خاں۔" دیا ناتھ نے بہت دیر بعد کہا۔ "ہم نے سُنا تھا تم بم کے دھماکے سے مارے گئے۔"

"دھماکہ ہوا تو میں ایک سُتون کی اوٹ میں تھا اس لیے بچ گیا تھا۔" ابا نے کہا۔ "پکڑ دھکڑ شروع ہوئی تو میں بھی دھر لیا گیا۔ دو سال کی قید بامشقت کاٹ کے پرسوں جیل سے رہا ہوا ہوں۔"

"ہمارے مکان میں کوئی اور رہتا ہے ابا!" میں نے کہا۔

پنڈت دیا ناتھ نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ان کا خیال تھا میں حالات سے بالکل بے خبر ہُوں مگر میں اپنی عمر کے بچّوں سے کچھ زیادہ ہی ہوشیار تھا۔ میں نے موہن اور اس کی بہن موہنی سے بہت کچھ پوچھ لیا تھا۔ انھوں نے جو کچھ چوری چھپے اور کسی سے نہ کہنے کے وعدے پر۔۔۔ اپنی ماں سے سُنا تھا مجھے بتا دیا تھا چنانچہ میں نے بہت سے حقائق کو تسلیم کر لیا تھا۔ مثلاً یہ کہ ہندو مسلم فسادات جس میں میرے ابا کے سوا سب مارے گئے تھے کیوں ہوئے تھے۔ میرے ابا کے بارے میں موہن اور موہنی کا خیال تھا کہ وہ واقعی پاکستان چلے گئے تھے اِس لیے بچ گئے ہوں گے اور کسی نہ کسی دِن ضرور واپس آئیں گے لیکن اُس وقت تک مجھے چھپ کر رہنا ہو گا کیونکہ میں مسلمان ہُوں۔ کسی بدمعاش ہندو کو معلوم ہو گیا تو مجھے بھی مار ڈالے گا اور ایک مسلمان کو چھپانے کے جرم میں چاچا دیا ناتھ کو بھی مار ڈالے گا۔ اس زمانے میں میرا نام میرے بہت کام آیا۔ کبیر کو اکثر لوگ کبیر داس سمجھتے تھے اور بعد میں تو خود مجھ میں اتنی عقل آ گئی تھی کہ کوئی اجنبی پوچھ بیٹھتا تو اپنا یہی نام بتاتا تھا۔

"تم نے اپنی ماں اور اپنے بہن بھائیوں کے بارے میں نہیں پوچھا کبیر!" چاچا دیا ناتھ نے مجھے غور سے دیکھ کر کہا۔

"مجھے معلوم ہے چاچا وہ سب مارے جا چکے ہیں۔" میں نے اطمینان سے کہا۔ ایک بار پھر ابا کا حوصلہ جواب دے گیا اور پنڈت دیا ناتھ مجھے گلے لگا کے رونے لگے۔ بہت رونے دھونے کے بعد بالآخر تیسرے دن ہم رخصت ہوئے تو دیا ناتھ نے وہ صندوق تانگے میں رکھا جو ابا نے بہت سی چیزوں میں سے کچھ چیزیں منتخب کر کے بھرا تھا۔ پنڈت دیا ناتھ نے ہمارا زیادہ تر سامان نکال لیا تھا لیکن ابا نے کہا۔ "اب اس کا میں کیا کروں گا۔ تم نے ایک بیٹے کو بچا کے مجھے زندہ رہنے کا سہارا دے دیا ہے۔ باقی یادیں ہیں جو میں ساتھ لے جا رہا ہوں۔ زندگی اتنی کم رہ گئی ہے اور فاصلے اتنے بڑھ گئے ہیں دیا ناتھ کہ بس اس احسان کے بدلے کچھ کرنے کی بات بھی نہیں کر سکتا۔"

اور آج بھی وہ وقت میری نظر میں تصویر کی طرح موجود ہے جب تانگہ روانہ ہوا تھا اور میرا ماضی ان صورتوں کی طرح مجھ سے دور ہوتے ہوتے کھو گیا تھا جو دروازے میں اشکبار تھیں۔

اس وقت تک حالات بہت حد تک معمول پر آ گئے تھے اور مذہب کے مقدس نام پر انسانیت کا لہو بہانے والے درندے جو سڑکوں پر دندناتے پھرتے تھے، اب چھپ چھپا کر اِکا دُکا واردات کر رہے تھے۔ کشیدگی برقرار تھی مگر قتل و غارتگری کا پُرآشوب دور گزر چکا تھا۔ چنانچہ ہم بخیر و عافیت لاہور پہنچے تو ایک سال پریشانیوں کی نذر ہو گیا۔ پنڈت دیا ناتھ نے اپنے طور پر مجھے انگریزی حساب اُردو وغیرہ پڑھا کے اس قابل کر دیا تھا کہ میں نے دو سال بعد میٹرک کا امتحان پاس کر لیا۔ مشن اسکول کے بعد ابا نے مجھے لارنس کالج گھوڑا گلی بھیجا اور وہاں سے فارغ ہوا تو میں ولایت چلا گیا۔"

"تمھارا باپ بڑا صابر آدمی تھا۔" سلامت شاہ نے خاموشی کے طویل وقفے کے بعد کہا۔ "کہتا تھا پاکستان قربانی مانگتا تھا۔ میں نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ اب رونا کس بات کا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو یہ صدمہ اُسے پاگل کر دیتا مگر اس نے جتنے حوصلے سے حالات کا مقابلہ کیا اور جیسے تمھیں اعلیٰ ڈگری دلوائی یہ اُسی کا دم تھا۔ جو بات میری سمجھ میں نہیں آتی برخوردار! یہ ہے کہ تم کو اس نے ہمیشہ دُور کیوں رکھا؟ ایک بیٹا تو آنکھوں کا نور ہوتا ہے تعلیم کیا لاہور کے کالج میں پوری نہیں ہو سکتی تھی کہ تم۔۔۔ بابا"

"وہ۔۔۔ میرا خیال ہے ابا کو کچھ شوق تھا۔ جنون کی حد تک کہ تعلیم کا معیار اعلیٰ ہو۔" میں نے وضاحت کرنی چاہی۔

"تو اپنے لاہور کا یہ گورنمنٹ کالج کیا کم ہے۔ جدھر علامہ اقبال صاحب نے پڑھا اور بڑے بڑے لوگوں نے پڑھا۔ اور ایف سی کالج ہے۔ چیف کالج سے بڑا کالج ہے کیا لارنس کالج؟ انجینئر لوگ یہاں

بھی بن رہے ہیں ۔"

اصل صورتِ حال خود مجھ پر اُس وقت عیاں ہوئی تھی جب کفِ افسوس ملنے کے سوا میں کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اگر مجھے علم ہوتا کہ ابا نے عمداً مجھے حالات سے بے خبر رکھنے کے لیے یہ چال چلی ہے تو میں لاہور سے جانے سے انکار کر دیتا۔ انھوں نے مجھے مجبور کر دیا۔۔۔ اور ماں کے جذبات کے سامنے میری عقل کی دلیل نہ چلی۔ انھوں نے کہا اعلیٰ تعلیم انسان کو بناتی ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ یہ مقصد یہاں رہ کے حاصل ہو سکتا ہے۔ اس لیے میری خواہش ہے اور میرا حکم ہے کہ جاؤ — میں نے ان کی بات مان لی۔ انھوں نے کہا، کل کی فکر مت کرو۔ ابھی میں زندہ ہوں اور خدا کا دیا سب کچھ ہے۔ میں نے یہ بات بھی مان لی — انھوں نے کہا سب خیریت ہے۔ میں نے یہ بات بھی مانی۔ انھوں نے کہا صحت اور کاروبار دونوں اچھے ہیں الحمدللہ۔ اور میں نے یہ بات بھی مانی وہ تنِ تنہا اپنے حالات کی مجبوریوں سے لڑے اپنے دشمنوں سے نبرد آزما رہے اور مجھے اس جنگ کی پرچھائیوں سے بھی دور رکھا۔ آخر کیوں؟ ایسی کیا مجبوری تھی انہیں؟ کس بات کا ڈر تھا انھیں؟

رفتہ رفتہ یہ خیال میرے دل میں جڑ پکڑ رہا تھا کہ میر شرافت علی کے پاس ناقابلِ تردید حقائق کی کوئی ایسی زنجیر تھی جس میں اس نے وزیر خاں کو بُری طرح جکڑ رکھا تھا اور وزیر خاں بے بس نہ ہوتا تو اس زنجیر کو توڑنے کی کوشش تو کرتا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ کوشش بے سود ہو گی۔ تمام عمر کون بلیک میل ہو سکتا ہے۔ تنہا آدمی کا جینا کیا اور مرنا کیا۔ زندگی یوں بھی تیدِ بامشقت تھی۔ اگر وہ میر شرافت علی کو قتل کر کے جیل یا تختۂ دار پر پہنچ جاتا تو اس طویل پُرعذاب انجام سے بچ جاتا۔ اُس میں اتنی ہمت بھی تھی کہ اسے قتل کر سکتا۔ میں جانتا تھا میرے باپ کے خون میں بُزدلی کے جراثیم نہیں تھے۔ پھر وہ کیوں خاموشی سے بلیک میل ہوتا رہا؟ اس کا جواب صرف ایک ہی ممکن تھا کہ اسے اپنی نہیں میری زندگی عزیز تھی۔ بات کوئی ایسی تھی کہ جس کے تباہ کن اثرات میرے مستقبل پر نحوست کے سائے پھیلا سکتے تھے۔

بہت سر مارنے کے باوجود میں کبھی نہ سمجھ پایا تھا کہ میرا باپ جو اصول پرست محنتی اور ایماندار تھا کس جرم کا مرتکب ہوا تھا جس کی سزا اس کو میر شرافت علی نے دی۔ اس کی زندگی کا کون سا گناہ تھا جس کی پاداش میں وزیر خاں کو اپنا سب کچھ دے کر رازداری کا سودا کرنا پڑا۔ وہ کون سا راز تھا جو وہ اپنے ساتھ لے کر قبر میں چلا گیا۔ کیا اس راز سے پردہ اٹھانے کا نتیجہ مرنے کے بعد اس کی رسوائی اور میری تباہی کی صورت میں نکلے گا؟ کیا افشائے راز کے بعد میری نظر جس اصل وزیر خاں کو دیکھے گی وہ میرے لیے قابلِ صد احترام انسان کے برعکس کسی شیطان کا روپ ہو گا؟ — نہیں — یہ ناممکن ہے — میں نے طے کیا — وہ گردشِ حالات کا شکار ہو سکتا ہے —

سازش کا شکار ہو سکتا ہے اور غلط فہمی کا شکار ہو سکتا ہے۔ شکاری چراغ دین جیسے لوگ تھے۔ شکاری میر شرافت علی تھا جس نے موت کی حد تک اس کا تعاقب کیا۔ اور شکاری وہ نادیدہ دشمن تھے جو اب میرے پیچھے لگ گئے تھے اور ہر طرف جال پھیلا رہے تھے — ان شکاریوں نے اپنے ایک مقصد میں کامیابی حاصل کر لی تھی یعنی وہ مجھے برطانیہ سے انتہائی رسوا کُن طریقے سے نکلوا کے اپنی شکارگاہ تک لے آئے تھے — جیسے ہانکا کرنے والے شیر کو گھیر کر مچان پر بحفاظت بیٹھے ہوئے شکاری کے نشانے پر لے آتے ہیں۔

اور تب وہ لمحہ میرے مقابل آ کھڑا ہوا جو فیصلے کا طلبگار تھا۔ کہ سکندر بخت فیصلہ کرو — کیا تم میں حقیقت کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہے؟ مرنے والے کی نیکی بدی اس کے ساتھ گئی روزِ محشر میں وہ اپنی فردِ عمل خود پیش کرے گا — لیکن کیا تم انھیں معاف کر دو گے جو اس کے قاتل ہیں؟ جو اس کے ہر قطرۂ خون سے کتنی مجبوری کا خراج وصول کرتے رہے۔ کیا تم آہوئے صیاد دیدہ کی طرح بھاگتے رہو گے شکاری تو اب بھی تمھارے تعاقب میں ہیں اور اس وقت تک رہیں گے جب تک تمھارا وجود ان کے لیے باعثِ خطر ہے۔ وہ خود کو اسی وقت محفوظ خیال کریں گے جب تمھیں بھی شکار کر لیں گے۔ بولو تم کیا ہو؟ شکار؟ — یا شکاری؟

"میں؟" میں نے اس لمحے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "میں شکاری ہوں — ان سب کا جواب تک خود کو شکاری سمجھتے آئے ہیں — خبردار انھیں۔۔۔ کہ اب وہ میرا شکار ہیں۔ اب یہ کھلی جنگ ہے۔ وقت بتلائے گا کہ شکاری کون تھا اور شکار کون —" گر بازی عشق کی بازی ہے جو چاہو لگا دو ڈر کیسا۔ گر جیت گئے تو کیا کہنا ہارے بھی تو بازی مات نہیں۔ یہی ہار جیت تو زندگی ہے۔

"چاچا سلامت —" میں نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ "شام ہو رہی ہے۔ مجھے ایک ٹرنک کال کرنی تھی اسلام آباد —"

"شوق سے کرو —" سلامت شاہ نے کہا۔ "ٹیلی فون کوٹھی میں ہے۔ میں چوکیدار سے کہہ کے تالا کھلوا دیتا ہوں۔"

تقریباً آدھے گھنٹے بعد محسن رضا نے چلا کر کہا۔ "کون — کمینے کس جہاں سے تو آ گیا؟ کب آیا؟"

"آیا نہیں لایا گیا ہوں —" میں نے کہا۔ "آج ہی پہنچا ہوں — مجھے ڈی پورٹ کر دیا گیا تھا۔ تیرے ڈیڈی نے تجھے کچھ نہیں بتایا؟"

"ڈیڈی نے؟" وہ حیران ہو کر بولا۔ "کیا تو نے اُن کو فون پہ اطلاع دے دی تھی؟"

"نہیں —" میں نے بات کو گول کر دیا۔ "وہ خارجہ امور سے منسلک ہیں نا! میں نے سوچا شاید سفارت خانے نے اُن کو مطلع کر دیا ہو — میرا مطلب ہے اُن کے محکمے کو۔"

"نہیں یار —" محسن بولا۔ "وہ تو خود بہت حیران ہوں گے سُن کے۔ کیا حالات بہت بگڑ گئے تھے؟"

"ہاں۔۔۔ کچھ ایسی ہی بات تھی —" میں نے کہا۔ "جہاز موسمی حالات کی خرابی کے باعث اسلام آباد میں نہیں اُتر سکا اور لاہور آ گیا ورنہ میں سیدھا تیرے پاس پہنچتا۔ بہت سی باتیں کرنی ہیں تجھ سے جو فون پہ نہیں کی جا سکتیں۔ میں کل پنڈی آ رہا ہوں۔ مری چلیں گے۔"

"مری؟" محسن رضا نے کہا۔ "کوئی خاص کام ہے؟"

"ہاں — وہ تیرے بہنوئی ہیں نا — ہی سی ڈین۔ وہ بھی وہیں ہیں اتفاق سے۔" میں نے کہا۔ "مجھے مریم باجی کی اور ان کے بچوں کی قبر پر فاتحہ بھی پڑھنی ہے۔"

"یار سکندر! اپنی اس چوہدری چراغ دین سے کبھی نہیں بنی۔ اور اب تو کوئی رشتہ ہی نہیں۔ اس سے کیا مِلنا پھر کبھی چلے جائیں گے جب وہ نہیں ہو گا۔" محسن رضا نے کہا۔

"نہیں یار — اس سے وہیں ملنا ہے۔" میں نے کہا۔ "ایک پرانا حساب چکانا ہے، وہیں آ کے بتاؤں گا۔"

"تیری مرضی۔" محسن نے مجبور ہو کے کہا۔ "یہ بتا ابا کا کیا حال ہے؟"

"ابا —" میں نے بے خیالی میں کہا۔ "ان کے انتقال کو ایک ہفتہ ہو گیا سید محسن رضا!"

"کیا!" وہ چلایا۔ "وزیر چچا گزر گئے؟ کب؟ کیسے سکندر؟"

"میں آؤں گا تو سب بتا دوں گا محسن! مجھے بھی یہاں پہنچنے کے بعد ہی علم ہوا۔ اگر میں نہ آتا تو شاید کوئی بھی مجھے اطلاع نہ دیتا۔" میں نے دل زدہ لہجے میں کہا۔

"دیکھ سکندر! تو مجھ سے گلا کر رہا ہے؟ خدا کی قسم میرا وہ زخم ابھی تک بالکل مندمل نہیں ہوا ہے۔ اگر میں ٹھیک ہوتا تو ضرور اُن سے ملتا۔" محسن نے کہا۔

"چھوڑ محسن! میں تجھ سے کیا گلا کروں گا۔ گلا زیادہ سے زیادہ تقدیر سے کیا جا سکتا ہے مگر اس سے بھی کیا حاصل۔ میں تو کہتا ہوں اچھا ہی ہوا۔ کہ تو اُن سے نہیں ملا۔" میں نے کہا۔ "اب میں قبرستان جاؤں گا اور پھر میر شرافت علی سے ملنے جاؤں گا۔"

"کاروباری معاملات طے کرنے ہیں یا کوئی اور مسئلہ ہے؟" محسن نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔

"مسئلہ کوئی نہیں۔" میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ "اور ہے تو اتنا آسان نہیں کہ ایک ملاقات میں طے ہو جائے۔"

"سکندر! اس وقت تیرا دماغ ٹھکانے ہے یا نہیں؟ میری مان، تو ابھی سیدھا یہاں آ جا۔ میر شرافت علی سے ملنا ہو تو میرے ساتھ چلنا۔ تو اکیلا جائے گا تو نہ جانے کیا ہو جائے۔"

"کچھ بھی نہیں ہو گا محسن —" میں نے کہا۔ "کیا میری باتوں سے تجھے شبہ ہو رہا ہے کہ میں ہوش میں نہیں۔"

"ان حالات میں کوئی بھی ہوش میں ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔" محسن نے کہا۔ "مجھے خطرے کی بُو محسوس ہو رہی ہے۔"

"پاگل کے بچے! ابھی وہ ٹیلی فون ایجاد نہیں ہوئے جن پر خوشبو بھی آنے لگے۔ آواز یا زیادہ سے زیادہ تصویر آ سکتی ہے۔" میں نے کہا۔ "تو فکر نہ کر۔ میں صبح کی ریل کار سے آ رہا ہوں۔ خدا حافظ۔" میں نے ریسیور رکھ دیا۔

سلامت شاہ مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔ "آپ سیٹھ صاحب کو پہلے سے جانتے ہیں؟"

برخوردار اور تم سے اچانک آپ پر آ جانا اس کے رویے کی نمایاں تبدیلی تھی۔ "ہاں۔ بس ایسے ہی۔ اب تم میرے ساتھ قبرستان چلو گے سلامت چاچا۔ وہاں سے میں چلا جاؤں گا میر شرافت علی سے ملنے۔"

"یہ میر شرافت علی کون ہے؟ تمھارے ابا کا کوئی دوست؟" سلامت شاہ نے کہا۔

"دوست؟" میں نے کہا۔ "یہ لفظ تو بہت بدنام ہو گیا ہے سلامت چاچا۔ دشمن جو سامنے آ کے وار کرتا ہے اس دوست سے تو اچھا ہوتا ہے جو دوستی کا فریب دے کر مارے۔ مگر یہ بات تمھارے سمجھنے کی نہیں ہے۔"

قبرستان جاتے ہوئے میں نے سلامت شاہ سے کہا کہ وہ فی الحال بنک کے لاکر کی چابیاں بھی اپنے پاس رکھے کیونکہ وراثت کا سرٹیفکیٹ حاصل کیے بغیر میں لاکر نہیں کھول سکوں گا۔ صندوق کے بارے میں بھی میں اسلام آباد سے واپس آ کے طے کروں گا کہ کیا کرنا ہے۔ میرا سب سامان یہیں رہے گا اور میں صرف ایک بریف کیس لے کر جاؤں گا۔ خیال یہی ہے کہ دو دن میں لوٹ آؤں چنانچہ کپڑوں کے دو جوڑے بہت ہوں گے البتہ صبح صبح ریل کار پکڑنے کے لیے اسٹیشن پہنچنے کا مسئلہ ہو گا۔ وقت پر آنکھ کھل گئی تو کوئی مسئلہ نہیں۔ اسٹیشن تک پیدل بھی چند منٹ کی مسافت ہے۔ سلامت شاہ نے کہا کہ وہ فجر کی نماز کے لیے الارم کے بغیر اٹھتا ہے مجھے بھی اٹھا دے گا۔ اس نے چراغ دین سے میرے تعلق کے بارے میں پھر پوچھا۔ تو میں نے بتا دیا کہ محسن جو میرا بچپن کا دوست ہے، چراغ دین اس کا بہنوئی تھا۔ سلامت شاہ نے حیرانی کا اظہار کیا کہ وزیر خاں نے کبھی یہ نہیں بتایا۔ میں میانی صاحب کے قبرستان سے نکلا تو شام کا بوجھل اندھیرا رات کے گہرے دھندلکے میں ڈھل رہا تھا۔ میں اب بہت پُرسکون تھا لیکن یہ سکون اس خاموشی کی طرح تھا جو کسی طوفان کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ جب میں اپنے باپ کی قبر پر دُعا کے لیے ہاتھ اٹھائے کھڑا تھا تو ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کر کے میں نے اُن کی صورت کا تصور کیا جو میں نے سال بھر پہلے دیکھی تھی اور اُس وقت میرے کانوں میں اُن کی مانوس آواز آئی۔ بالکل واضح اور صاف۔ "اپنے فیصلے پر قائم

رہنا سکندر۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔"

میں چونک پڑا اور میں نے آنکھیں کھول کے دیکھا تو سلامت شاہ نروس اور خوف زدہ سا اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اس کی حیران آنکھوں میں ایک سوال تھا جیسے وہ پوچھنا چاہتا ہو کہ کیا تم نے کچھ کہا؟ ارد گرد ویران قبروں پر شہرِ خموشاں کا سکوت طاری تھا اور ہم دونوں کے آس پاس فاتحہ پڑھنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ شاید آواز صرف میرا ہی وہم نہیں تھی۔ سلامت شاہ بھی اسے اپنا وہم سمجھ رہا تھا۔ وہم کیا ہے اور حقیقت کیا ہے۔ عقل کا پھیر۔ فریبِ نظر۔ فریبِ سماعت۔ فریبِ خیال۔ کون کس سے پوچھے کہ وہ سب جو نظر آتا ہے اور سنائی دیتا ہے اور احساس بن جاتا ہے ہمیشہ سچ کیوں نہیں ہوتا اور سراب کیوں نظر آتے ہیں؟ خواب کیوں بکھر جاتے ہیں اور کیسے سچ ہو جاتے ہیں۔

اسمبلی کے پیچھے ایبٹ روڈ کے چوراہے سے میں نے پیدل چلنا شروع کیا۔ یہ سڑک جو آگے جا کے میکلوڈ روڈ سے مل جاتی تھی سینما گھروں کی وجہ سے نصف شب کے بعد بھی آباد رہتی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف کھمبوں پر ٹیوب لائٹس لگی ہوئی تھیں۔ اور ٹریفک کی ہیڈ لائٹس سے بھی اتنی روشنی تھی کہ میں نے کیفی اور سفید رنگ کی کوٹھی کو آسانی سے تلاش کر لیا۔ قریب جا کے دیکھنے پر مجھے گیٹ لائٹس کے نیچے آدمی کے قد سے ذرا بلند ستون پر نصب سنگِ مرمر کی تختی بھی نظر آ گئی۔ جس پر "رین بسیرا" کے حروف زیادہ نمایاں تھے۔ دوسرے ستون کی تختی پرانی تھی اور اس پر بھی حروف ہندی رسم الخط میں سابق مالک کے نام اور سنِ تعمیر کے ساتھ موجود تھے۔ آس پاس دوسری کوٹھیاں بھی ایسی ہی تھیں چار چار کنال پر پھیلی ہوئی اور پرانے درختوں میں گھری ہوئی۔ گیٹ سے ذرا فاصلے پر ٹیلی فون کا کھمبا نصب تھا اور ایک تار آٹھ فٹ اونچی فصیل کے اوپر درختوں میں سے گزرتا ہوا اندر کوٹھی کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ آٹھ بج کے بیس منٹ ہو رہے تھے۔ ٹریفک میں تھوڑا سا وقفہ آیا۔ جب فٹ پاتھ پر بھی کوئی میرے قریب نہ تھا۔ میں ایک ہی بار میں دیوار پر چڑھ گیا۔ ٹیلی فون کی لائن اب بھی میری دسترس سے چند انچ اوپر تھی۔ دیوار کی دوسری جانب نیچے دیکھنے پر مجھے پھولوں کے تختے نظر آئے۔ میں نے پنجوں کے بل کھڑے ہو کر اوپر چھلانگ لگائی اور دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔ ٹیلی فون کا تار میری گرفت میں آ گیا میرے وزن سے جھولا اور جھٹکے سے ٹوٹ گیا۔ میں سیدھا کیاری میں اترا۔ تار کے جھکنے سے میرے گرنے کی رفتار کم ہو گئی تھی اور میرے قدموں سے دب جانے والے پھول نرم مٹی میں آ گئے ہوئے تھے۔ چنانچہ میں توازن برقرار رکھنے میں کامیاب رہا ورنہ میرے کپڑے مٹی میں بھر جاتے۔

لان عبور کر کے میں اطمینان سے کوٹھی کے پورچ میں پہنچا جہاں ایک مرسیڈیز بڑی رعونت سے ٹیوب لائٹ کی روشنی میں جھلمل کر رہی تھی۔ ایک کتا بہت چھوٹے قد کا لمبے لمبے سفید بالوں اور لٹکے کانوں والا۔ مجھے دیکھ کر بھونکا۔ اندر سے کسی نے کہا۔ "کیا ہے ٹامی!" پھر جالی والا دروازہ کھلا اور سفید زین کی پتلون اور بُش کوٹ پہنے شوفر ٹائپ آدمی باہر آ گیا۔ اس کی عمر پینتالیس سال کے لگ بھگ تھی مگر صحت میں میرے جیسے نوجوانوں سے بہتر تھا۔ "کون ہو تم" اس نے مشتبہ نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے گستاخانہ لہجے میں کہا۔

"تمہیں کیا نظر آتا ہوں، انسان یا چوپایہ؟" میں نے ڈانٹ کے کہا۔ "اپنا لہجہ درست رکھو اور یہ بتاؤ مسٹر کہ اپنا یار میر شرافت علی گھر پر ہے؟"

شوفر ٹائپ آدمی محتاط ہو گیا۔ "جی۔۔ وہ تو ہیں۔۔" اس نے ایک نظر بند گیٹ کو دیکھا۔ "آپ کا نام؟"

"سیٹھ سکندر بخت لندن والا" میں نے کہا۔ "نام سنا ہے کہ نہیں۔ خیر چلو بتاؤ وہ کہاں ہے؟"

"وہ۔۔ جناب۔۔ میرا مطلب ہے ان کو بتا دوں پہلے۔۔" شوفر نے تھوڑا سا تامل کیا۔

"ابے چل" میں نے بے تکلفی سے کہا۔ "میں اس سالے کو ذرا حیران کرنا چاہتا ہوں۔"

شوفر ٹائپ شخص میرے بعد اندر آیا۔ "آگے جا کے تیسرا کمرہ انہی کا ہے۔ وہ ناراض ہوں گے جناب! میرا ذکر مت کیجئے گا۔" وہ بولا اور پلٹ کر غائب ہو گیا۔ میں نے دس قدم چل کے تیسرے دروازے پر دستک دی اور جواب کا انتظار کیے بغیر ہینڈل گھما کے اندر داخل ہو گیا۔

یہ میر شرافت علی کا شاہانہ بیڈ روم تھا۔ وہ صوفے پر نیم دراز اخبار دیکھ رہا تھا۔ پچاس سال کے لگ بھگ عمر کا اور اوسط قد و قامت کا اسمارٹ سا آدمی جس نے موٹے شیشوں والی سیاہ فریم کی عینک لگا رکھی تھی۔ اس کے سر کے بال ہیئر کلر کے استعمال سے سیاہ اور چمکیلے تھے۔ چنانچہ اس کی عمر دیکھنے میں چالیس سال بھی نہیں لگتی تھی۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر اس نے سر گھما کے دیکھا اور کسی نوکر کے بجائے ایک اجنبی کو دیکھ کر حیران ہوا۔ اس وقت مجھے چہرے پر طوطے جیسی خمیدہ ناک اور عقاب جیسی تیز آنکھوں کی چمک نظر آئی۔ چند سیکنڈ تک کمرے میں ایئر کنڈیشنر کی ہلکی سی سرسراہٹ کے سوا کوئی آواز نہ سنائی دی۔ پھر میں نے مسکرا کے کہا۔ "انکل شرافت علی! آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟" اور ہاتھ پھیلا کے گلے لگنے کے لیے آگے بڑھا۔

میر شرافت علی کی صورت پر ناگواری کے آثار زیادہ نمایاں ہو گئے۔ اس نے ہاتھ بڑھا کے مجھے روک لیا اور صرف ہاتھ ملانے پر اکتفا کی۔ یہ مصافحہ بھی مجبوری کے تحت یک طرفہ کارروائی تھی۔ "کون ہیں آپ؟ یوں بے تکلفی سے میرے بیڈ روم تک بہت کم لوگ

آتے ہیں۔ اور اگر میری آپ سے پہلے کبھی ملاقات ہوئی ہے تو مجھے یاد نہیں۔" اس نے میری صورت پر نظر جما کے کہا۔ پھر اس نے بیڈ سائڈ پر لگا ہوا ایک بٹن دبایا۔

"کمال ہے انکل! میں نے آپ کو دیکھتے ہی پہچان لیا۔ آپ تو مجھے پیرٹھ سے جانتے ہیں۔" میں نے کہا۔

ایک خادم اندر داخل ہوا۔

"تم... تم وزیر خاں کے بیٹے ہو؟... سکندر بخت...؟" اس نے اچانک کہا۔ پھر وہ خادم کی طرف متوجہ ہوا۔ "مہمانوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کے مجھے اطلاع دینے کا دستور کب سے ختم ہوا ہے؟" وہ گرج کر بولا۔ "کیا اس سے پہلے لوگ بتائے بغیر سیدھے میرے بیڈ روم میں آتے ہیں؟"

حواس باختہ ملازم نے بمشکل تمام جواب دیا کہ اسے بالکل خبر نہیں شاید چوکیدار بتا سکے۔

"دروازے پر کوئی چوکیدار نہیں تھا۔" میں نے کہا۔ "میں گھنٹی بجاتا رہا اور پھر گیٹ پر سے اندر آ گیا۔"

"وہ گیا ہوگا نماز پڑھنے کے لیے۔" میر شرافت علی نے وال کلاک پر نظر ڈالی۔ "خیر۔ اب آپ تشریف لے چلیے ڈرائنگ روم میں۔ باقی باتیں وہیں ہوں گی۔ کمال ہے برسوں ولایت میں رہ کے بھی تم ادب آداب کے کورے رہے۔"

میں نے محسوس کیا کہ خوف سے وہ نروس ہو گیا ہے۔ خادم نے لپک کر دروازہ کھولا اور میں اس کے پیچھے پیچھے راہداری میں نکل آیا۔ جس کی بلند چھت میں تین فانوس معلق تھے۔

"بے تکلفی اور بدتہذیبی میں کچھ تو فرق ہونا چاہیے۔ وہاں تو باپ بیٹا بھی دستک دیے بغیر ایک دوسرے کے کمرے میں داخل نہیں ہوتے۔" وہ اس انداز برہمی اور پریشانی میں حق بجانب تھا۔ میں یہ ظاہر کرتا رہا جیسے میں سخت شرمندہ ہوں۔ ڈرائنگ روم پہلا دروازہ تھا اور وسیع و عریض ہال تھا جس میں قدم رکھتے ہی سامانِ آرائش میں نوادرات کی کثرت حیران کرتی تھی۔ خادم نے ایک بٹن دبا کے چار وال لائٹیں روشن کر دیں پھر درمیان کا عظیم الشان فانوس جلایا۔ ایئر کنڈیشنر آن کیا اور دبے پاؤں قالین پر بلی کی طرح چلتا نکل گیا۔

"بیٹھو اور بتاؤ کب آئے تم؟" میر شرافت علی نے صوفے کی طرف اشارہ کیا لیکن میں دوسری طرف بیٹھ گیا۔

"میں؟... میں آج ہی آیا ہوں۔" میں نے دونوں ہاتھوں کو آپس میں رگڑا اور ادھر ادھر دیکھا۔

"اپنے... والد سے نہیں ملے ابھی؟" اس نے میرا خوشگوار موڈ دیکھ کر اندازے کی بنیاد پر کہا۔

"مل آیا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میاں صاحب کے قبرستان میں سوئے تھے وہ۔"

میر شرافت علی چونکا اور اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کے لیے اس نے میز پر سے سگریٹ اٹھا کر جلائی۔ "تو گویا تمہیں ان کے انتقال کی خبر مل گئی تھی؟" اس نے اخروٹ کی لکڑی کا منقش باکس میری طرف کھسکا دیا۔

میں نے باکس میں سے دوسری سگریٹ اٹھائی۔ سونے کے نازک سے لائیٹر سے جلائی اور لائیٹر جیب میں رکھ لیا۔ "نہیں۔ یہ تو مجھے یہاں آ کے معلوم ہوا کہ تم نے اسے قتل کر دیا ہے۔" میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

میر شرافت علی بے اختیار کھڑا ہو گیا۔ "تمہارا... تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے؟"

"ہاں۔" میں نے بھی اٹھتے ہوئے کہا۔ "ہو گیا ہے۔ اور اب میں تمہارا دماغ درست کرنے آیا ہوں۔"

اس نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر دیوار پر لگی کال بیل کی طرف دیکھا جو میرے پیچھے تھی چنانچہ اس کی دسترس میں نہ تھی اور پھر چلا کر کسی کو بلانے کے لیے منہ کھولا مگر میں نے ایک جست میں اس کی گردن دبوچ لی۔ اس کا بدن میرے ہاتھوں کی گرفت میں لرزنے لگا اور خوف سے اس کا چہرہ لاش کی طرح سفید ہو گیا۔

"میر شرافت علی!" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "میری جیب میں بھرا ہوا ریوالور ہے۔ ابھی تک کسی کو معلوم نہیں کہ میں پاکستان میں ہوں۔ میں تمہیں اور تمہارے مددگاروں کو قتل کر کے صبح کی فلائیٹ سے لندن واپس جا سکتا ہوں لیکن میں ابھی ایسا نہیں کروں گا بشرطیکہ تم شرافت سے بیٹھے رہو اور جو کچھ میں پوچھوں سچ سچ بتاتے رہو۔" میں نے اسے دھکا دیا اور وہ صوفے پر گر کر ہانپنے لگا۔

"تم... تم میرے گھر میں ہو...؟" میر شرافت علی نے بہت جلد خود کو سنبھال لیا۔ "اس گھر میں تین نوکر موجود ہیں اور ان میں سے... کسی کو بھی شبہ ہوا تو وہ پولیس کو فون کر دے گا۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "تمہارا فون خراب ہے۔ اور اس بات کا خیال تم خود رکھو کہ اندر کوئی نہ آنے پائے ورنہ یہ ممکن ہے کہ میں انتہائی اقدام پر مجبور ہو جاؤں۔ پولیس کا ابھی کوئی کام نہیں۔ مناسب وقت پر میں خود بھی پولیس سے ہی رجوع کروں گا اور اس وقت تم چاہو گے کہ ایسا نہ ہوتا۔ ابھی تو میرے اور تمہارے درمیان جو گفتگو ہوگی، آڈیو ریکارڈ ہوگی۔ جھوٹ بالکل نہیں چلے گا کیونکہ بیشتر حقائق وہ پردہ اٹھ جانے کے بعد سامنے آ گئے ہیں جو میری عقل پر اور نظر پر پڑا ہوا تھا۔"

"سکندر!... تم آخر چاہتے کیا ہو؟" میر شرافت علی نے بے بسی سے کہا۔

"چاہتا تو میں یہ تھا کہ تمہارا خون پی جاؤں۔" میں نے کہا۔ "بالکل اسی طرح جیسے تم نے میرے باپ کا خون پیا۔ اس کے وجود کا ایک ایک قطرہ نچوڑ لیا۔ تمہاری قسمت نے تمہارا بہت ساتھ دیا شرافت! لیکن تم حد سے بڑھ گئے۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ میں ٹھنڈے دماغ کا آدمی ہوں ورنہ اب تک تمہاری گردن توڑ کے جا چکا ہوتا۔ ابھی میں کچھ پوچھنا چاہتا ہوں تاکہ تمہارا جرم دنیا پر ثابت کر سکوں اور تمہیں تختۂ دار تک پہنچنے سے پہلے ذلت و رسوائی کے طویل ترین عذاب سے گزرنا پڑے۔"

"یہ... یہ تم کیا کہہ رہے ہو... میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ کسی نے غلط بتایا ہے تمہیں...؟" وہ ہکلا کر بولا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا اور ٹہلتا ہوا اس شوکیس تک گیا جس پر مہاتما بدھ کا ایک قدیم مجسمہ رکھا ہوا تھا۔

"میر شرافت علی! تم اب میر وزیر اینڈ کمپنی کے بلا شرکت غیرے مالک ہو؟"

"ہاں۔ تمہارے والد کے انتقال کے بعد ہی میں پارٹنر رہ گیا ہوں یہ مجسمہ رکھ دو۔ بہت قیمتی ہے۔" وہ بولا۔

"اچھا!" میں نے مجسمے کو الٹ پلٹ کے دیکھا۔ "میرے والد نے حسابات پر آخری بار جون میں دستخط کیے تھے یعنی تین ماہ قبل۔ ان کے حصے کا منافع تقریباً ساڑھے تین لاکھ تھا یہ رقم انہیں ادا کر دی گئی تھی؟"

"ہاں۔ وصولیابی کے دستخط..."

"دستخط؟" میں نے مجسمہ دیوار پر دے مارا۔ "میں ادائی کی بات کر رہا ہوں۔ دستخط تو تم نے بہت لیے ہیں۔"

میر شرافت علی پھر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا تھا اور وہ مجسمے کے ٹکڑوں کو گھور رہا تھا۔ "تم... تم بدمعاشی سے مجھے ہراساں کرنے آئے ہو... تمہیں معلوم ہے اس مجسمے کی قیمت کیا ہے؟"

"پتھر کا مجسمہ تھا۔ جیتا جاگتا آدمی تو نہیں تھا۔ تم بتلاؤ میرے باپ کی زندگی کی کیا قیمت تھی؟" میں نے جیڈ کا بنا ہوا نفیس کامدار رتھ اٹھا لیا جس کے آگے دو منہ زور گھوڑے جتے ہوئے تھے۔

"اسے رکھ دو خبیث!" شرافت علی چلایا۔ "یہ بہت نایاب ہے۔ بیس ہزار کا ہے۔"

"پھر کیا ہوا؟" میں نے رتھ کو اوپر اٹھایا۔ اس کا وزن دو سیر کے قریب تھا۔ "یہ ہے تو میرے باپ کا مال۔ تم کیوں پریشان ہوتے ہو۔ اسے تو اپنی قبر پر معمولی سنگ مرمر کا کتبہ تک میسر نہ آیا۔"

میں نے رتھ کو ماربل ٹاپ میز پر دے مارا۔ شرافت علی کے حلق سے ایک چیخ نکلی اور وہ دروازے کی طرف لپکا۔ میں نے اس کے منہ پر الٹا ہاتھ رسید کیا۔ وہ گھوم کر واپس صوفے پر گرا۔ اس کے ہونٹ کا ایک کنارا پھٹ گیا تھا اور خون رسنے لگا تھا۔

"میں اپنے تمام سوالات کا جواب لیے بغیر نہ جاؤں گا اور نہ جانے دوں گا۔" میں نے کہا۔ شوفر ٹائپ شخص ایک دم دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ ایک نظر میں اس نے صورتِ حال کو بھانپ لیا۔

"پکڑ لے اس بدمعاش کو شیدے!" شرافت علی نے چیخ کر کہا۔ "یہ مجھے قتل کرنے آیا تھا خالی ہاتھ۔ دیکھ کتنا نقصان کر دیا ہے اس نے کہتا تھا میرے باپ کا مال ہے۔"

شیدے نے بڑے بدمعاشوں کی طرح آستین سے منہ صاف کیا اور جیب سے ایک کمانی دار خنجر نکال لیا۔ میں اس وقت تک جیڈ کا ایک اور مجسمہ اٹھا چکا تھا۔ اگر میں خنجر کے جواب میں اس مجسمے سے وار کرتا تو شیدے کا سر پھٹ جاتا۔ چنانچہ میں نے مجسمہ کرسٹل گلاس کے فانوس کی طرف اچھال دیا۔ ایک زبردست چھناکا ہوا اور کمرے میں ہر طرف شیشہ بکھر گیا۔ شرافت علی کے حلق سے ذبح کیے جاتے بکرے کی طرح آواز نکلی۔ اور شیدے کے ساتھ ہی اس نے دیوانہ وار مجھ پر جست لگائی۔ میں نے شیدے کے وار کو دائیں ہاتھ سے اس کی کلائی تھام کے روکا اور کلائی کو ذرا سا جھٹکا دیا۔ ہڈی کے چٹخنے ہی شیدا بلبلایا۔ خنجر اس کے ہاتھ سے نیچے گرا اور وہ درد سے دہرا ہوا تو میں نے نیچے سے گھٹنا مار کے اس کو اٹھایا اور دوسرے ہاتھ کی مدد سے الٹ کر دور پھینک دیا۔ وہ تقریباً اڑتا ہوا گیا اور شیشے کے ایک اور شوکیس سے ٹکرایا۔ شفاف شیشے کے بکھرتے ہی اندر رکھے ہوئے نوادرات اس کے اوپر گرے پھر اس کے بھاری وجود کے تصادم سے شوکیس کا توازن بگڑ گیا۔ شوکیس پیچھے کی دیوار سے ٹکرا کر آگے آیا۔ اور اوپر رکھے ہوئے نوادرات سمیت شیدے پر الٹ گیا۔

شرافت علی جو میری طرف لپکا تھا صدمے سے سن پتھر کے بت کی طرح منجمد کھڑا رہا۔ اس کے نوادرات کا بیش بہا ذخیرہ جو شاید اس نے برسوں میں جمع کیا تھا پل بھر میں نیست و نابود ہو گیا تھا۔ اگر وہ ایک مجسمہ واقعی بیس ہزار کا تھا تو اس حساب سے میں نے اس کا لاکھوں کا نقصان کر دیا تھا اور یہ ذہنی اذیت اسے پاگل کر دینے کے لیے کافی تھی۔ وہ پھر مجھ پر حملہ آور ہوا۔ اس کے لبوں سے کف جاری تھا اور اس کی زبان سے فحش ترین گالیوں کا سیلاب امڈ آیا تھا۔ میں نے اطمینان سے وہیں کھڑے کھڑے اسے ہاتھوں کے اشارے سے اوپر اٹھایا اور پھر صوفے پر پھینک دیا۔

● انجینئر بننے کے ساتھ ساتھ میں شوقیہ جوڈو اور کراٹے

بھی سیکھ رہا تھا۔" میں نے کہا۔ "اور میں کوئی بلیک بیلٹ تو نہیں ہوں مگر ایک ماہرِ فن کا ست سے ہونہار شاگرد ضرور تھا۔ اب میں پھر اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔ مائی ڈیئر میر شرافت علی! تم کب سے وزیر خاں کو بلیک میل کر رہے ہو؟" میں نے شیشے کا خنجر اٹھایا... اور ایک آئل پینٹنگ کے نیچے جا کھڑا ہوا۔ "یہ مصوری کا شاہکار بھی بیش قیمت ہوگا۔"

"سکندر! خدا کے لیے تم مجھے مار لو۔" وہ گھگھیا کر بولا۔ "میں بوڑھا آدمی ہوں تمھارے باپ کا ہم سن۔ اپنے جوان بازوؤں کی طاقت سے میری ہڈیاں توڑ دو مگر ان چیزوں کو تباہ مت کرو۔"

"کیوں؟" میں نے تصویر کو نوکِ خنجر سے چاک کر دیا۔ ایک کونے سے دوسرے مخالف کونے تک وتر کی صورت میں کٹ جانے والا کینوس بوسیدہ ٹاٹ کی طرح لٹکنے لگا۔

میر شرافت علی بلک بلک کر رونے لگا۔ "یہ... یہ میری تمام عمر کی کمائی ہے..."

"میرے باپ کی تمام عمر کی کمائی کیا تھی؟ رسوائی اور ذلت۔ مفلسی اور فاقہ کشی اور بے چارگی کی موت؟ مجھے معلوم ہے میر وزیر اینڈ کمپنی قائم ہونے کے بعد اس نے اپنے حصے کے منافع پر صرف دستخط ثبت کیے ہیں۔ رقم تمھارے حساب میں جمع ہوتی رہی۔ حسابات دیکھ کر میں معلوم کر لوں گا کہ کل رقم کتنی بنتی ہے جو اس کو ملنی تھی۔ یہ رقم بمعہ سود مجھے تم سے وصول کرنی ہے۔ آج کا سارا نقصان اس میں سے منہا کر دو۔ باقی بشرطِ زندگی میں تم سے پھر لے لوں گا۔"

اُسے اپنے نقصان پر اتنے عذاب سے روتے دیکھ کر مجھے بڑی تسکین حاصل ہو رہی تھی۔ غالباً شور پر متوجہ ہو کے دوسرا خادم اندر آیا جو ہمیں ڈرائنگ روم تک چھوڑ گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ فرار ہوتا میں نے ہاتھ بڑھا کے اُسے کھینچ لیا۔ وہ دہشت سے چلّایا۔ مگر میں نے اس کی کنپٹی پر ایک ہلکا سا ہاتھ مارا اور چھوڑ دیا۔ وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح گر کے ڈھیر ہو گیا۔ میر شرافت علی کے حلق سے نکلنے والی آواز بند ہو گئی۔

"تم نے کوٹھی میں تین ملازموں کا ذکر کیا تھا۔" میں نے ہاتھ جھاڑ کے کہا۔ "دو یہاں لیٹے ہیں تیسرا چوکیدار نماز پڑھ کے لوٹ آیا ہوگا تو دروازے پر کھڑا ہوگا چنانچہ اب کسی کی مداخلت کا ڈر نہیں رہا اور ہم اطمینان سے بات کر سکتے ہیں۔ یہ بتاؤ قانونی طور پر تم فرم کے مالک بن چکے ہو؟"

میر شرافت علی نے اقرار میں سر ہلایا۔

"جھوٹ۔" میں نے خنجر سے ایک اور پینٹنگ کے پرخچے اڑا دیے۔ "یہ قانونی کارروائی اتنے کم وقت میں مکمل نہیں ہو سکتی۔ میرے والد اپنی زندگی میں اس حق سے دستبردار ہوتے ہوتے تو تین مہینے پہلے حسابات پر دستخط کرنے کیوں آتے۔ اس کا مطلب یہی نکلتا ہے کہ قانونی دستاویزات میں وہ اب بھی فرم کے ایک مالک ہیں۔"

میر شرافت علی نے اقرار میں سر ہلایا اور پینٹنگ کو گھورتا رہا۔ یوں جیسے یہ اُس کے جوان بیٹے کی لاش ہو۔

"پارٹنرشپ کے معاہدے کی دستاویزات وزیر خاں کے پاس بھی ہوں گی؟" میں نے کہا۔ "سر مت ہلاؤ۔ جواب دو۔"

"ہاں۔" میر شرافت علی کے حلق سے مضحکہ خیز آواز نکلی۔ "اُس کی موت کے بعد..."

"اُس کے قتل کے بعد۔" میں نے لات مار کر چھوٹا شوکیس گرا دیا۔ "کہو اُس کے قتل کے بعد۔"

"اچھا۔ اچھا۔" میر شرافت علی تھر تھر کانپتے ہوئے بولا۔ "خوف سے زیادہ یہ صدمے کا اثر تھا۔" اس کے قتل کے بعد میں نے عدالت میں درخواست دائر کی تھی۔"

"وہ اب غیر مؤثر ہو جائے گی۔ وزیر خاں کا قانونی وارث اب تمھارا پارٹنر ہوگا یعنی میں۔" میں نے کہا۔ "انہی دستاویزات کے لیے تم نے اُس کے سرونٹ کوارٹر کا تالا توڑا اور اس صندوق کی تلاشی لی تھی۔"

"کس سرونٹ کوارٹر کا تالا؟ کیسا صندوق؟..." اُس نے جھوٹ بولنے کی فضول سی کوشش کی۔ میں نے ایک تصویر کو فریم سمیت کھینچ لیا۔ گھٹنے پر مار کے فریم کے ٹکڑے کیے اور اس کی طرف اچھال دیے۔

"بے وقوف!" وہ پھر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ "یہ ایک تصویر ایک لاکھ کی تھی۔"

"ایک بے جان تصویر کے لیے اتنا رونا؟" میں نے کہا۔ "اور ایک زندگی کی تباہی پر اظہارِ ندامت تک نہیں میر شرافت علی! وہ دستاویزات ایک بینک کے لاکر میں محفوظ ہیں۔ میرا وکیل عدالت میں پیش کرے گا۔ تم اس تمام نقصان کی تلافی کے لیے جانے کا مقدمہ الگ کر سکتے ہو۔ اب ایک آخری سوال۔ میرے والد کو کس بات پر تم ساری عمر بلیک میل کرتے رہے؟ کیا کیا تھا اس نے جس کی اتنی بڑی قیمت تھی؟"

میر شرافت علی نے روتے روتے سر اٹھایا اور ایک قہقہہ مارا۔ وہ صدمے سے پاگل ہو چکا تھا۔ "سکندر بخت تمھارے ہاتھ میں خنجر ہے۔" وہ اچانک اٹھا اور میرے سامنے دو زانو ہو گیا۔ "جیسے چاہو مجھے قتل کر دو میرے ٹکڑے کر کے کتوں کے آگے پھینک دو۔ میرا قیمہ کر دو۔ لیکن یہ بات تم مجھ سے معلوم نہیں کر سکو گے۔ تم چاہو تو اس گھر کو آگ لگا دو۔ اس گھر کی ایک ایک چیز کو تباہ کر دو۔ مگر میں تمھیں کچھ نہیں بتاؤں گا۔" اس نے پھر قہقہہ مارا۔ "یہ بات اپنے باپ کی قبر پر جا کے پوچھو۔ چلّا چلّا کے۔ شاید وہ سن لے۔"

اس کی دیوانی ہنسی کسی ویران مرگھٹ میں چڑیلوں کی ہنسی کی طرح بھیانک تھی۔ خنجر میرے ہاتھ سے گر گیا۔

"اچھا میر شرافت علی!" میں نے کہا۔ "میں جا رہا ہوں۔ اس وعدے کے ساتھ کہ میں پھر آؤں گا۔ یہ سب معلوم کر لینے کے بعد۔ تم نے میرے والد کو قتل کیا تھا۔ اس کی سزا تمھیں قانون دے گا۔ میں ثابت کر دوں گا کہ تم قاتل ہو۔ میں خود تمھیں مار کے یہ موقع فراہم نہیں کروں گا کہ میرے پھانسی چڑھ جانے کے بعد تمھارے سارے کاروبار کے بلا شرکتِ غیرے مالک بن جائیں میں تمھارا پارٹنر ہوں اور مجھے تم سے اپنا آبائی قرض وصول کرنا ہے۔"

میں نے دروازہ کھولا اور باہر آ گیا۔ باہر آنے کے بعد میں نے ڈرائنگ روم کا دروازہ باہر سے بند کیا اور بیرونی دروازے سے گزر کر پورچ میں پہنچا۔ اطمینان سے چلتا ہوا گیٹ تک گیا، جہاں اب چوکیدار موجود تھا۔ اس نے ادب سے مجھے سلام کیا اور گیٹ کھول دیا۔ پریشانی کی کوئی بات نہ تھی۔ میر شرافت علی کے چیخنے چلّانے کی آواز گیٹ تک نہیں پہنچ سکتی تھی اور وہ فون کر کے پولیس کو طلب نہیں کر سکتا تھا۔

باہر نکل کے میں نے میکلوڈ روڈ کا رخ کیا جہاں لوگوں کی بھیڑ بھاڑ اب کم ہو گئی تھی کیوں کہ آخری شو شروع ہو چکے تھے۔ میر شرافت علی کی کوٹھی 'رین بسیرا' سے چند قدم کے فاصلے پر مجھے ایک ٹیکسی نظر آئی جس کا ڈرائیور بونٹ اٹھائے انجن میں سر ڈالے کھڑا تھا۔

"بھئی ماڈل ٹاؤن تک جانا ہے۔" میں نے کہا۔

"جانا تو اس وقت ہوگا جناب عالی! جب گاڑی جائے گی۔" وہ سر نکال کے بولا۔

"تم؟" میں نے اس اتفاق پر حیران ہو کے کہا۔ "ابھی تک گاڑی دھکے پر چل رہی ہے؟"

"اب تو دھکے پر بھی نہیں چل رہی ہے جناب عالی! اچھی یونہی کی تھی آپ نے۔" وہ پھر انجن میں غرق ہو گیا۔ ——— اسی وقت ایک رکشا خالی گزرا جسے میں نے دس روپے زیادہ دینے کے وعدے پر ماڈل ٹاؤن کے لیے راضی رضامند کر لیا۔ رات کے وقت ایک رکشا ٹیکسی والے ادھر جاتے ہوئے گھبراتے تھے۔ عموماً انھیں خالی واپس آنا پڑتا تھا اور لٹنے کا ڈر الگ رہتا تھا۔

ساڑھے دس بجے میں سی سی ڈین کی کوٹھی کے دروازے پر اترا اور دگنا کرایہ بتانے والے میٹر سے بھی دس روپے زیادہ دے کر عقبی حصے کے سرونٹ کوارٹر میں پہنچا تو سلامت شاہ کھانا لیے بیٹھا تھا اور میرا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے بھوک نہیں تھی مگر اس کا دل رکھنے کو میں نے چند لقمے نگلے پھر سکون آور گولیاں کھائیں اور... سلامت شاہ کو صبح جگا دینے کی ہدایت کر کے سو گیا۔ سکون بخش گولیوں کا سہارا میں نے پہلے کبھی نہیں لیا تھا چنانچہ آدھے گھنٹے بعد مجھے نیند نے آ لیا جو نیم بے ہوشی جیسی تھی۔

صبح سلامت شاہ نے مجھے فجر کے وقت جگایا تو میری آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں اور بدن تکان سے ٹوٹ رہا تھا۔ میں نے بغیر دودھ کی چائے کے دو کپ پیے اور بریف کیس اٹھا کے روانہ ہو گیا۔ ریل کار کا ٹکٹ ایک قلی کی عنایت سے عین اس وقت دستیاب ہوا جب ریل کی روانگی میں صرف دس منٹ رہ گئے تھے۔

ابھی میں سیٹ پر بیٹھا ہی تھا کہ مجھے شیدے کے ساتھ میر شرافت علی کا دوسرا ملازم نظر آیا۔ میرا ماتھا ٹھنکا مگر اس سے پہلے کہ میں اٹھتا، دونوں جانب سے پولیس اندر آ گئی۔

"یہی ہے وہ شخص؟" انسپکٹر نے شیدے کو مخاطب کر کے کہا۔

"جی سر۔" شیدے نے کہا اور دوسرے ملازم کی طرف دیکھا۔ اس نے تائید میں سر ہلایا۔

"آپ سکندر بخت ولد وزیر خاں مرحوم ہیں؟" انسپکٹر نے کہا۔

"ہاں۔ کیا بات ہے؟" میں نے دوسرے مسافروں سے نظریں چرا کے کہا۔

"تم پر الزام ہے کہ تم نے گزشتہ رات میر شرافت علی کو خنجر کے وار کر کے قتل کر دیا۔" انسپکٹر نے کہا اور اپنے ساتھ آنے والوں کو اشارہ کیا کہ میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دیں۔

تھانیدار کی آمد اور میری گرفتاری ان سب کے نقطۂ نظر سے بے حد سنسنی خیز واقعہ تھی جو مجھے بھی اپنے جیسا شریف ہمسفر سمجھے ہوئے تھے اور انھوں نے بعد میں بارہا ایک قاتل کے فرار کی ناکام کوشش کا آنکھوں دیکھا حال حاشیہ آرائی اور فصاحت و بلاغت کے ساتھ سنایا ہوگا اور ہر بار زیب داستان کے لیے ڈرامائی تاثرات کا اضافہ کیا ہوگا تو سامعین ونگ رہ گئے ہوں گے۔ تھانیدار کے ساتھ چشم دید گواہ بھی تھے چنانچہ مزاحمت بے سود تھی اور اس کو دلائل سے قائل کرنے کی کوشش کا کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ اس کا فرض تھا کہ قتل جیسی سنگین واردات میں ہر مشتبہ شخص سے پوچھ گچھ کرے اور پھر معاملہ نظامِ انصاف کے سپرد کر دے۔ سب انسپکٹر پینتالیس پچاس سال کا خرانٹ آدمی تھا۔ عمر کا اندازہ خاصی میلی ٹوپی کے نیچے دکھائی دینے والی ...... سفید بالوں کی جھالر سے ہوتا تھا۔ اس کی شخصیت میں مونچھوں کے بعد سب سے زیادہ متاثر کرنے والی چیز اس کے پیٹ کی جسامت تھی جس کے نشیب پر نافرمان بیلٹ مسلسل پھسلتی رہتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک حوصلہ شکن بے حسی تھی جس پر بے رحمی کا گمان ہوتا تھا اور اس کی صورت کے نقوش میں وہ کرختگی تھی جو عمر کے تجربات نے عطا کی تھی جس شخص کا واسطہ ہی چور ڈاکو، قاتل اور دس نمبری بدمعاشوں سے ہو۔ وہ فرض کی ادائیگی میں تہذیب اور شائستگی کے تقاضے کیسے پورے کر سکتا ہے۔ میں اندازہ کر سکتا تھا کہ بیس پچیس سال قبل وہ کانسٹیبل بھرتی ہوا ہوگا۔ اس طویل عرصے میں اگر وہ صرف سب انسپکٹر کے عہدے تک ترقی پا سکا تو یہ بھی اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ اس کی ذہانت اور کارکردگی کا معیار کیا ہوگا۔ اگر افسرانِ بالا خفا نہ ہوں تو مدتِ ملازمت کو دیکھتے ہوئے ازراہِ بندہ پروری بھی ترقی بخش دی جاتی ہے اور اس نے بھی شاید ایسے ہی ترقی پائی تھی۔

متجسس چہروں اور سوالیہ نظروں کی پروا کیے بغیر میں ریلوے اسٹیشن کی عمارت سے باہر آیا تو میری منزل بدل چکی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں اسی راستے پر چلتا ہوا آیا تھا تو میرے تصور میں محسن کا مخلص چہرہ تھا اور فوزیہ کی تابانیٔ حسن تھی اور میں مری جا کے مریم کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کے علاوہ چراغ دین سے بہت سے تصفیہ طلب امور پر گفتگو کی سوچ رہا تھا۔ اب میرے تصور میں حوالات تھی۔ دیسی پولیس کے طریقۂ تفتیش کے لرزہ خیز مناظر تھے۔ عدالتی کارروائی کے صبر آزما مرحلے تھے اور وہ انجام تھا جس کا خیال بھی روح فرسا تھا۔ میرے ہاتھوں میں اب بریف کیس نہیں تھا ہتھکڑی تھی۔ بریف کیس حوالدار نے تھام رکھا تھا جس کی پیٹی سے ہتھکڑی کی زنجیر کا دوسرا سرا بھی منسلک تھا۔ حوالدار اپنے باس سے عمر میں بھی کم تھا اور حجم میں بھی۔ شاید کسی بیماری کے چکر میں وہ سکڑ گیا تھا کہ وردی بھی اس کے جسم سے بہت بڑی لگتی تھی۔ کانسٹیبل بالکل نوعمر تھا اور کسی دیہات سے وارد ہوا تھا۔ شہر میں اس اعلیٰ اختیارات کے حامل منصب پر فائز ہونے سے اس کی گردن اکڑ گئی تھی۔ جب تھانیدار نے اسے ٹیکسی روکنے کے لیے کہا تو اس نے بڑے بارعب انداز میں ایک ڈرائیور کو اشارہ کیا لیکن ڈرائیور بھاگ گیا۔ لاقانونیت کے اس مظاہرے پر وہ بہت جزبز ہوا اور دوسری ٹیکسی کے سامنے خودکشی کے انداز میں کھڑا ہو گیا چنانچہ ٹیکسی رک گئی۔

"تھانیدار صاحب" میں نے مصلحت کے تقاضے کو مدِنظر رکھتے ہوئے عاجزی سے کہا۔ "آپ کی بڑی مہربانی ہوگی سامنے ہی ایک کوٹھی ہے۔ اس میں ایک خانساماں سلامت شاہ رہتا ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اس سے دو باتیں کر لوں۔"

"دو نہیں دس باتیں کر لینا شہزادے" تھانیدار نے ایک مونچھ کو بل دے کر میری طرف دیکھے بغیر کہا "اسے بھی تھانے منگوا لیں گے۔"

مجھے خاصی مایوسی ہوئی۔ یہ لندن کی پولیس نہیں تھی۔ ان سے بحث نہیں کی جا سکتی تھی کسی فعل کا جواز نہیں پوچھا جا سکتا تھا اور انھیں اپنے ولایت پلٹ ہونے کا حوالہ دے کر متاثر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اپنے تعلیم یافتہ ہونے کا ذکر ان کو جاہل کہنے کے مترادف تھا اور ولایت کی بات کرنا ان کے احساسِ محرومی میں اضافہ کرنا تھا جو مختلف قصبوں کے تھانوں کے علاوہ کہیں نہیں گئے تھے اور سب تھانے اتنے ہی بیزار کن اور ہولناک ہوتے ہیں کہ اس ماحول میں بیس پچیس سال گزارنے والا ان ملزموں کو خوش قسمت سمجھتا ہوگا جو چند دن حوالات میں یا چند برس جیل میں کاٹ کے رہا ہو گئے۔

"بندہ دیکھ لیا ہے نا چنگی طرح؟" تھانیدار نے ٹیکسی کے اگلے دروازے سے خود کو سیٹ پر گرانے کے بعد کہا۔ "نہ ہو بعد میں وَخت پڑ جائے۔ چل پُتر تو رکشا پھڑ لے۔" یہ آخری جملہ پانچویں سواری یعنی ٹیکسی روکنے والے جانباز کانسٹیبل سے کہا گیا تھا۔

"او جی تھانیدار صاب غلطی کیسے ہو سکتی ہے" چشم دید گواہ نے یقینِ کامل سے کہا۔ "اس بدمعاش نے تو کل رات اپنا بھی خانہ خراب کر دیا تھا۔ آپ تو دیکھ چکے ہیں جنابِ عالی۔ کتنی چوٹیں لگی ہیں میرے" پھر اس نے تفصیل سے بتانا چاہا کہ میں نے 'گرڈا' کہاں مارا تھا اور ہاتھ کہاں مگر میرے دائیں جانب بیٹھنے والے حوالدار نے غرا کے کہا کہ چودھری صاحب جتنی بات پوچھیں اتنا ہی جواب دیا جائے اور کتے کی طرح بھونکنے سے گریز کیا جائے۔ کتا دم دبا کے بیٹھ گیا۔

"لو جی چودھری صاب۔ اب اس کا رکشا والے سے جھگڑا شروع ہے" حوالدار نے سر گھما کے پیچھے دیکھا۔

"اوئے یار خواجہ۔ کیا نام ہے اپنے اس منشی کا؟" تھانیدار نے مڑ کر دیکھے بغیر کہا۔ "اس کو سمجھاؤ۔ سپاہی ہوا ہے کوئی گورنر نہیں ہو گیا ہے۔ بھئی کوئی طریکا ہوتا ہے بات کرنے کا۔ بھا دیں سالے شہر کو ڈک دو۔ پر طریکے سے۔ ورنہ بے عزتی خراب ہوتی ہے" وہ عادتاً قاف کی جگہ کاف بولتا تھا چنانچہ طریقہ اس کے لہجے کے باعث "طریکا" سنائی دیتا تھا۔

خلافِ توقع تھانے کی بجائے ٹیکسی 'رین بسیرا' پہنچی اور گیٹ سے اندر داخل ہو گئی۔ اندر پولیس کی ایک جیپ۔ ایک ایمبولینس اور ایک موٹر سائیکل کھڑی تھی۔ دونوں گاڑیوں کے ڈرائیور باہر کھڑے گپ لگا رہے تھے۔ دو اور پولیس مین کوٹھی کے دائیں بائیں جانب کاہلی سے اس رسمی کارروائی کو دیکھ رہے تھے جو ان کے لیے نئی نہ تھی۔ گیٹ سے گزرتے ہوئے میں نے ٹیلی فون کا وہ تار بھی دیکھ لیا تھا جو ٹوٹ کر باہر ہی گر گیا تھا۔ مجھے یہاں لانے کا مقصد یہی ہو سکتا تھا کہ ابتدائی تفتیش جائے واردات پر ہی مکمل کی جائے اور وہاں میری موجودگی کے مزید ثبوت حاصل کیے جائیں۔ میرے اندر کودنے سے کیاری کی نرم مٹی میں بننے والے نقش پا بالکل واضح ہو گئے۔ شاید لان پر سے ہو کے اندر جاتے ہوئے میں نے کوٹھی کے صاف فرش پر بھی قدموں کے نشان چھوڑ دیے ہوں گے۔ ان سے میرے جوتوں کا موازنہ ضروری ہوگا۔ فنگر پرنٹ تو میں نے اس خنجر کے دستے پر بھی چھوڑے تھے جو میں نے ایک حملہ آور سے چھینا تھا اور وحشی تصاویر کا کینوس پھاڑنے کے لیے استعمال کیا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ جانے سے پہلے میں نے وہ خنجر خود ہی قالین پر پھینک دیا تھا۔ اس وقت میں یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ میرے جانے کے بعد کوئی میر شرافت علی کو قتل کر دے گا اور حالات و واقعات، ثبوت اور گواہ سب مل کر قانون کی نظر میں مجھے مجرم بنا دیں گے۔

ڈرائنگ روم کی بجائے مجھے سامنے والے دروازے سے ایک ایسے کمرے میں لے جایا گیا جو مہمانوں کا بیڈ روم بھی تھا اور مقتول میر شرافت علی کا پرائیویٹ آفس بھی۔ دائیں جانب مسہری پر ایک شکن بھی نہ تھی مگر سیاہ فارمیکا والی سائڈ ٹیبل پر گرد کی تہہ تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ مدت سے اس بیڈ کو کسی نے استعمال نہیں کیا۔ بائیں جانب کونے میں ٹیک وڈ کی کرسی اور لکھنے کی میز تھی جس کی سبز مخمل کی سطح پر اونیکس کا مکمل رائٹنگ سیٹ موجود تھا۔ دوسرے کونے میں باتھ روم کا دروازہ تھا اور درمیان میں دیوار کے ساتھ ساتھ اسفنج جیسے کپڑے کے کور اور فوم ربر کے گدوں والا صوفہ سیٹ تھا۔ درمیانی صوفے پر ایک جوان اور اسمارٹ آدمی ٹانگ پر ٹانگ رکھے بڑی متانت سے بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ پولیس کی وردی کی بجائے اس نے دھاری دار قمیص اور فان کلر کی پتلون پہن رکھی تھی۔

ایس آئی چودھری نے جس کا نام اس کی وردی کی جیب پر حشمت خاں لکھا ہوا تھا پتلون کو سنبھال کے اور جوتوں کی ایڑیاں ملا کے سلیوٹ کیا۔ اس کے پیچھے رہنے والے اور مجھے لے کر آنے والے حوال دار نے زیادہ آواز سے پیر مارا۔

"ملزم حاضر ہے جناب" ایس آئی حشمت نے کہا اور اسی وقت حوال دار نے مجھے دھکیل کر آگے کیا۔ صوفے پر بیٹھا ہوا شخص اسی اطمینان سے سگریٹ پیتا رہا اور مجھے دیکھتا رہا۔ بہت دیر بعد اس نے مجھ سے میرا نام پوچھا اور پھر خاموش ہو گیا۔

"میرا نام طارق جمیل ہے" اس نے بالآخر کہا۔ "اور میں اس علاقے کا اے ایس پی ہوں۔ اس قتل کی تحقیقات کے لیے مجھے خصوصی طور پر نامزد کیا گیا ہے۔"

"یہ میرے لیے بڑے اطمینان کی بات ہے" میں نے انگریزی میں کہا۔

"بلاوجہ انگریزی مت بولو" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "مجھے معلوم ہے تم کئی سال لندن میں رہ کے آئے ہو۔ یہ قتل کیوں کیا ہے تم نے؟"

"میں نے یہ قتل نہیں کیا ہے" میں نے پورے اعتماد کے ساتھ کہا۔ "اور اس بیان کی صداقت تختۂ دار تک نہیں بدل سکتی۔"

"اس گھر میں تین چشم دید گواہوں نے بیان دیا ہے کہ تم نے رات کو زبردستی گھر میں گھس کے بہت توڑ پھوڑ کی۔ سب کو مارا پیٹا اور پھر میر شرافت علی کو قتل کر کے فرار ہو گئے" اے ایس پی نے کہا۔

"ان گواہوں نے مجھے توڑ پھوڑ کرتے یقیناً دیکھا ہوگا" میں نے کہا۔ "میں نے مار پیٹ بھی کی تھی لیکن ان میں سے کس نے کہا ہے کہ قتل بھی میں نے کیا تھا؟ کسی نے واقعی مجھے قتل کرتے اور فرار ہوتے دیکھا تھا یا ان کا خیال ہے کہ قاتل

میرے سوا کوئی نہیں ہو سکتا ؟"

"ان کے خیال میں قاتل تمھارے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔" اے ایس پی نے کہا: "تمھارے خیال میں قاتل کون ہے ؟"

"فی الحال میں کسی کا نام نہیں لے سکتا۔" میں نے کہا "لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ کسی نے موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میرے جانے کے بعد قتل کر دیا۔"

"گویا تمھارے یہاں آنے کا کسی کو علم تھا؟ قاتل اگر اس گھر کے نوکر نہیں تھے تو وہ ہوگا جو یہ بات جانتا تھا۔"

میں نے نفی میں گردن ہلائی "صرف دو افراد یہ بات جانتے تھے۔ ان میں سے ایک محسن رضا ہے جو لندن میں میرا کلاس فیلو تھا اور اسلام آباد میں ہے۔ اس کے والد مسٹر شیروانی ڈپٹی سیکرٹری ہیں۔ محسن کو یہ بات میں نے کل رات بتائی تھی۔ وہ اڑ کے بھی یہاں نہیں پہنچ سکتا تھا۔ دوسرا وہ شخص ہے جس کے پاس میں نے لندن سے واپسی پر قیام کیا تھا۔ مسٹر چراغ دین کا خانساماں سلامت شاہ۔ وہ میر شرافت علی کے نام سے بھی واقف نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ محسن کو اور سلامت شاہ کو میری گرفتاری کی اطلاع دے دی جائے۔ ان کے بیانات سے آپ کو بھی تفتیش میں مدد ملے گی اور مجھے بھی ان سے مشورہ کرنا ہے۔"

"ان کا پتہ لکھوا دو۔" اے ایس پی نے روکھے لہجے میں کہا۔ "اگر ہم مناسب سمجھیں گے تو بلا لیں گے۔ یہ بتاؤ۔ تمھارے والد کیا کرتے تھے ؟ مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ بھی اسی چراغ دین کے ایک ملازم تھے۔" یہ سب معلومات وہ پہلے ہی حاصل کر چکا تھا۔

"بدقسمتی سے یہ بات ٹھیک ہے۔" میں نے کہا "لیکن یہ بھی ٹھیک ہے کہ وہ 'میروز پیرا اینڈ کمپنی' میں میر شرافت علی کے پارٹنر تھے۔" اے ایس پی کے لیے یہ انکشاف تھا "پارٹنر؟ بزنس پارٹنر ؟"

"جی۔" میں نے تلخی سے کہا "کاروبار میرے والد مرحوم کا ہی تھا۔ میر شرافت علی بعد میں شامل ہوا تھا۔ مرتے وقت تک وہ برابر کے پارٹنر تھے۔"

"تو اس کوٹھی میں جھاڑ پونچھ کے کام پر کیوں ملازم تھے ؟" اے ایس پی نے طنز آمیز بے یقینی سے کہا۔

"جب میں انگلینڈ گیا تھا۔ وہ ماڈل ٹاؤن کی کوٹھی میں رہتے تھے جو اُن کی ذاتی ملکیت تھی۔ ان کے پاس کار تھی اور خدا کا دیا وہ سب کچھ تھا جو انھوں نے مسلسل محنت سے ترقی کر کے حاصل کیا تھا۔ میں تحریری طور پر اپنے بیان میں سب کچھ بتاؤں گا کہ وہ کس زمانے میں کہاں رہتے تھے۔ ان کے پاس کون سی گاڑی تھی۔ ان کا ٹیلی فون نمبر دو ماہ قبل کیا تھا اور اب کیا ہے۔ آپ دستاویزات سے بھی تصدیق کر سکتے ہیں اور ان لوگوں سے بھی جو میرے والد کو جانتے تھے۔ ان میں 'میروز پیرا اینڈ کمپنی' کے پرانے ملازم بھی ہیں جو پچیس سال سے فرم میں ہیں۔"

اے ایس پی کی نظریں مجھے دیکھتی رہیں۔ شاید وہ سوچ رہا تھا کہ میری بات کس حد تک قابلِ اعتبار ہے اور یہ سب سچ ہے تو کیسے سچ ہے۔ "تصدیق تو کرنی پڑے گی کہ ایک فرم کا مالک اس عمر میں ایسی نوکری کیوں کر رہا تھا۔" اے ایس پی نے کہا "یہ کیا ڈراما ہے۔ وہ کار اور کوٹھی دو مہینے میں کیسے ختم ہو گئے ؟ تم کہتے ہو وہ اب بھی پارٹنر تھے۔ تمھیں کچھ اندازہ ہے کہ ان کی سالانہ آمدنی کیا تھی ؟"

"جی۔ ان کا اس سال کا منافع تمام اخراجات وضع کرنے کے بعد ساڑھے تین لاکھ بنتا تھا۔" میں نے اطمینان سے کہا "مگر کتنے دکھ کی بات ہے کہ اس شخص کو گزر اوقات کے لیے گھر کی صفائی کا حقیر کام قبول کرنا پڑا۔ وہ بیماری میں خیراتی شفاخانوں سے علاج کراتا رہا۔"

"کیوں ؟" اے ایس پی نے میز پر ہاتھ مارا "کہاں گئے وہ ساڑھے تین لاکھ۔ وہ کار۔ کوٹھی۔" وہ اب مشتعل ہو رہا تھا اور اس کی جھنجلاہٹ سے اندازہ ہوتا تھا کہ اسے میری بات کا یقین نہیں آ رہا ہے۔ "اُلو بناتے ہو مجھے ؟"

"اڑا دیا ہوگا عیاشی میں جناب عالی۔" سب انسپکٹر نے پھر پتلون کو اوپر کھینچا۔ "شوقین مزاج آدمی ہوگا۔ جوئے میں ہار گیا ہوگا یا کسی رنڈی کے کوٹھے پر اُڑا دیے ہوں گے۔"

"بکواس بند کرو۔" میں نے غصے کو ضبط کر کے کہا "اگر میرے ہاتھ آزاد ہوتے اور یہ بات کسی دوسرے شخص نے کہی ہوتی تو میں ....."

"تو میں اس کو بھی قتل کر دیتا۔ ہیں ؟" تھانیدار نے میری بات کاٹ کے میرے منہ پر الٹا ہاتھ مارا۔ اس کے بھاری ہاتھ میں بلا کی قوت اور پھرتی تھی جو برسوں کی مشق اور مہارت کا نتیجہ تھی۔ خون کا نمکین ذائقہ مجھے اپنے ہونٹوں پر محسوس ہوا اور میں لڑکھڑا کے پیچھے ہٹا ہی تھا کہ حوالدار نے مجھے آگے دھکا دے دیا۔ اے ایس پی یوں بیٹھا رہا جیسے اس نے کچھ نہیں دیکھا اور خاموش رہا۔

"میرا باپ تمام عمر نمازی اور پرہیزگار رہا ہے۔" میں نے تھانیدار کو خون آشام نظروں سے گھور کے کہا "اس کو جاننے والے سب زندہ ہیں اور میری بات کو جھوٹ یا بکواس قرار دینے سے پہلے ان سب سے پوچھ لو کہ وہ کیسا آدمی تھا۔ معلوم کر لو کہ اس نے ساڑھے تین لاکھ کی آمدنی پر انکم ٹیکس ادا کیا تھا یا نہیں ؟ اس کی کوٹھی کس نے خریدی ہے اور کار کس نے ؟ کیا یہ سب ریکارڈ پر نہیں ہوگا۔ لاہور میونسپل کارپوریشن، محکمۂ انکم ٹیکس، موٹر وہیکل آفس اور پارٹنرشپ ڈیڈ۔ ان دستاویزات کو میرا وکیل عدالت کے سامنے بھی پیش کرے گا۔ یہ مت سمجھو انسپکٹر کہ تم کسی لاوارث، جاہل اور غریب آدمی کے ساتھ جو سلوک کرتے ہو وہی میرے ساتھ بھی کر سکو گے۔ باپ کی موت کے بعد میں قانونی طور پر 'میروز پیرا اینڈ کمپنی' کا مالک ہوں۔ واحد مالک۔ کیونکہ میر شرافت جو دوسرا پارٹنر تھا وہ اب نہیں ہے۔ میں انگلینڈ میں انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہا تھا اور کسی وظیفے پر نہیں۔ مجھے میرے والد نے اپنے خرچ پر بھیجا تھا۔ میں کوئی معمولی آدمی نہیں ہوں۔ سمجھے ؟ ایک معزز اور تعلیم یافتہ شہری ہوں۔"

اے ایس پی کی صورت پر ناگواری کے آثار نمودار ہوئے۔ "اس کی آواز کم کرو۔ اور اسے بتاؤ کہ یہ ولایت نہیں ہے۔" وہ سگریٹ کو مسل کر بجھاتے ہوئے بولا۔ سب انسپکٹر حشمت نے اِدھر اُدھر دیکھا اور باتھ روم کے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ حوالدار نے مجھے یوں دھکیلا کہ میں منہ کے بل گرا۔

"آخر یہ کیا ہے ؟ تم تشدد سے اعترافِ جرم کرانا چاہتے ہو؟" میں نے گھٹنوں کے بل اٹھ کے کہا "تمھیں اس کی جواب دہی کرنی ہوگی۔ عدالت میں اس بیان کی کوئی حیثیت نہیں۔" انسپکٹر حشمت اور حوالدار نے مجھے گھسیٹ لیا۔ ایک کانسٹیبل نے بڑی مستعدی سے باتھ روم کا دروازہ کھول دیا تھا۔

"اے ایس پی صاحب۔ آپ کی موجودگی میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے ؟" میں نے چیخ کر کہا اور خود کو چھڑانے کے لیے حشمت کو پوری قوت سے دھکا دیا۔ وہ ڈگمگا کے دیوار سے ٹکرایا۔ منحنی حوالدار کو میں نے یوں کھینچ لیا جیسے انجن کسی بوگی کو کھینچتا ہے۔ پلک جھپکتے میں ہتھکڑی سمیت میں اے ایس پی کے سامنے تھا۔ "ابھی مجھ پر الزام ہے۔ میں مجرم ثابت نہیں ہوا ہوں۔ تم نے میرا بیان تک نہیں لیا ہے۔" میں نے چلاتے ہوئے کہا "میں تم پر کیس کروں گا۔ میں بڑے سے بڑا وکیل کر سکتا ہوں۔ مسٹر شیروانی میرے انکل ڈپٹی سیکرٹری ہیں۔"

لیکن اس سے زیادہ بولنے کی مجھے مہلت نہ ملی۔ حشمت نے مشتعل ہو کے مجھے پیچھے سے پکڑا اور حوالدار نے زنجیر کو جھٹکا دیا تو میں پیچھے گرا۔ میرا سر بیڈ کے کنارے سے لگا اور میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ وہ مجھے مردہ کتے کی طرح گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔ گالیوں کی بوچھاڑ کے ساتھ میرے جسم پر حوالدار کے خشک اور سخت لکڑی جیسے ہاتھ اور سب انسپکٹر حشمت کے گرز جیسے ہاتھ بھی مسلسل پڑ رہے تھے۔ باتھ روم کا دروازہ بند کر کے انھوں نے ہتھکڑی سے پیچھے بندھے ہوئے ہاتھوں کو پانی کے نل سے باندھ دیا۔ اس وقت میں ہوش میں آ چکا تھا اور اس ذلت آمیز سلوک پر غصے سے پاگل ہو کے پولیس کو ماں سے بڑھ کر گالیاں اور خطرناک نتائج کی دھمکیاں دے رہا تھا لیکن وہ اس کے عادی تھے اور میں بے بس تھا۔ حوالدار نے بڑی پھرتی سے کونے میں رکھی ہوئی ٹین کی بالٹی اٹھائی اور میرے سر پر ٹوپی کی طرح الٹی رکھ دی۔ میرا منہ گردن تک بالٹی میں غائب ہو گیا۔ اب میرے چلانے کی آواز اسی بالٹی میں گونج رہی تھی اور میرے کانوں تک بھی یوں پہنچ رہی تھی کہ خود میں ڈبے ڈبے شور میں کسی لفظ کو واضح طور پر نہیں سن سکتا تھا اور نہ وہ سن سکتے تھے۔

"کتے۔ ہمارے افسروں کے سامنے بھونکتا ہے .... ؟" انسپکٹر حشمت نے میرے پیٹ میں مکا مارا۔ میں درد کی شدت سے دہرا ہو گیا۔ "دھمکی دیتا ہے کیس کرنے کی۔ ؟" اس نے چند مغلظات کا اضافہ کیا اور تابڑ توڑ میرے پیٹ پر گھونسے ملے۔ اعلان کیا کہ وہ عدالت میں لے جائے بغیر میری قبر تھانے کے احاطے میں بنا سکتے ہیں جہاں فرش کے نیچے ان گنت مردوں کے ڈھانچے ہیں۔ آج تک کسی کو معلوم نہیں کہ پولیس کی حوالات سے فرار ہو کے وہ کہاں گئے۔ ابھی تک میرا حوصلہ برقرار تھا چنانچہ میں بالٹی کے اندر سے چیختا رہا کہ حبس بے جا اور تشدد کے الزام میں ان سب کو نوکری سے ہاتھ دھونے پڑیں گے اور ایک بے گناہ کو قتل کا مجرم بنانے کی اس غیرقانونی کوشش کا خمیازہ جیل جا کے بھگتنا پڑے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔ پھر حوالدار نے میری پتلون اتارنے کی کوشش کی اور میں نے اس کے ایک لات رسید کی۔ وہ بلبلا کے فرش پر لڑھک گیا لیکن اس کے بعد میرے پاؤں بھی باندھ دیے گئے اور ان دونوں نے مل کر میرے کپڑے اتار لیے۔ میری ہمت جواب دینے لگی۔ اپنی حالت کے تصور نے مجھے خود اپنی نظر میں رسوا کر دیا۔ میں کوئی معزز۔ قانون پرست شہری یا شریف آدمی نہیں تھا۔ پولیس کے لیے میں صرف ایک قاتل تھا اور کسی طرح بھی ایک مسٹری تھیٹر بدمعاش کے ساتھ ہونے والے سلوک سے بہتر سلوک کا مستحق نہ تھا۔ اچانک بالٹی پر کسی ڈنڈے کی ضرب پڑی اور ٹین کی چادر دیواروں میں اس کا شور بم کے دھماکے سے زیادہ محسوس ہوا۔ میرے کان سائیں سائیں کرنے لگے اور میرا دماغ سن ہو گیا۔ پھر دوسری بار بالٹی پہ ڈنڈا پڑا اور اس کے بعد بالٹی کوٹنے کا عمل تیز ہو گیا۔ شور سے میرا دماغ پھٹنے لگا۔ "خدا کے لیے بس کرو۔" میں چلایا مگر اس شور میں میری

آواز دب کے رہ گئی۔ ہر ضرب بالٹی کی بجائے مجھے اپنے سر پر محسوس ہو رہی تھی اور میرے کان کے پردوں کے درد کی شدت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ میں دیوانہ وار چیخنے لگا اور اچھلنے لگا مگر میرے ہاتھ بہت مضبوط زنجیر کے ساتھ لوہے کے نل سے بندھے ہوئے تھے۔ اب میں ان کو خدا رسولؐ کے واسطے دے رہا تھا۔ وعدہ کر رہا تھا کہ کوئی بدتمیزی نہیں کروں گا۔ ان کی ہر بات مانوں گا اور کوئی دھمکی نہیں دوں گا لیکن وہ ایک نہیں سن رہے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ بہت جلد میرے دماغ کی کوئی رگ پھٹ جائے گی اور وہ مجھے واقعی تھانے کا فرش کھود کے گاڑ دیں گے۔ ابھی تک ریل کار میں جانے والے مسافروں کے سوا کسی کو میری گرفتاری کا علم نہیں تھا۔ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے اس کے گواہ صرف چار افراد ہیں: ایک اے ایس پی۔ ایک سب انسپکٹر۔ ایک حوالدار اور ایک کانسٹیبل۔ محسن یا سلامت شاہ کو کچھ خبر نہیں۔ یکلخت وہ شور تھم گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرا سارا جسم لرز رہا ہے اور میں اپنے پیروں پر سیدھا کھڑا نہیں رہ سکتا۔ میں نیچے گر گیا تھا لیکن زنجیر سے بندھے ہوئے ہاتھوں کے باعث فرش پر نہیں لیٹا تھا بلکہ سر جھکائے رکوع کی حالت میں جھول رہا تھا۔ اعصاب پر دماغ کا کنٹرول ختم ہو جانے کے باعث میرے لبوں سے ٹوٹے پھوٹے مبہم الفاظ رک رک کر یوں نکل رہے تھے جیسے میری زبان پر فالج کا اثر ہے۔ جب بالٹی میرے سر پر سے ہٹائی گئی تو مجھے دنیا کو پہچاننے میں بڑی دقت پیش آئی۔ مجھے اندازہ نہ تھا کہ میرا سر کدھر ہے اور میرے پیر کدھر ہیں۔ فرش نیچے ہے یا اوپر اور چھت بار بار نیچے آ رہی ہے یا فرش اوپر اٹھ رہا ہے۔ حوالدار نے مجھے دوبارہ کپڑے پہنائے تو میرے ہاتھ پیر قابو میں نہ تھے پھر آہستہ آہستہ میرے حواس بحال ہونے لگے اور میں سہارے سے سیدھا کھڑا ہو گیا۔ سب انسپکٹر حشمت خاں کچھ دور کھڑا مونچھوں کو بل دے رہا تھا اور حسبِ عادت پتلون کی بیلٹ سنبھالنے میں لگا ہوا تھا۔ حوالدار نے میرے ہاتھوں کو پانی کے نل سے بندھی ہوئی زنجیر کھول کے آزاد کیا مگر کمر کے پیچھے ہتھکڑی سے باندھے رکھا۔

"کیوں شہزادے؟" سب انسپکٹر حشمت خاں نے کہا۔ "آواز کچھ کم ہوئی؟ سمجھ آ گئی ہے کہ یہ ولایت نہیں۔۔؟" میں نے بمشکل تمام اقرار میں سر ہلایا۔ وہ باتھ روم کا دروازہ کھول کے مجھے باہر لے آئے۔ اے ایس پی بدستور اسی پوز میں بیٹھا۔ سگریٹ کے کش لگا رہا تھا اور تازہ اخبار دیکھ رہا تھا۔ بند کمرے کے دروازے کے باہر پولیس کے کسی آدمی یا میر شرافت علی کے ان تین نوکروں کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا تھا جو سب کے سب صفِ دشمناں میں شامل تھے چنانچہ میری فریاد و فغاں بے اثر رہی تھی۔

"یس مسٹر سکندر بخت" اے ایس پی نے متانت آمیز خوش دلی سے کہا۔ "کیا حال ہے اب؟ ولایت کا نشہ کچھ اترا؟"

"آئی۔۔۔ آئی ایم۔۔۔ سو۔۔۔ سوری۔۔۔ سر۔۔۔" میں نے لڑکھڑاتی زبان سے الفاظ کے ٹکڑوں کو جوڑ کر سخت کوشش کے بعد جملہ مکمل کیا۔ سب انسپکٹر حشمت خاں نے اپنی کارکردگی پر تعریف طلب نظروں سے اپنے افسرِ اعلیٰ کو دیکھا اور حوالدار خفیف سا مسکرایا۔

"آل رائٹ۔ بیٹھ جاؤ۔" اس نے لکھنے کی میز کے ساتھ پڑی ہوئی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ میں کرسی پر گر پڑا اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ کسی نے ہاتھ بڑھا کے پانی کا ایک گلاس میرے لبوں سے لگا دیا۔ میں نے سڑ سڑ کر کے آدھا پانی پیا اور آدھا گرایا مگر اس سے میری حالت میں نمایاں تبدیلی آئی۔ میری آنکھیں اس منظر کو واضح طور پر دیکھنے لگیں جو پیشِ نظر تھا۔ میرے کان ہر لفظ کو سننے۔۔۔ اور سمجھنے لگے۔ میرے ذہن نے صورتِ حال کی سنگینی کو قبول کرنا شروع کیا اور مجھ پر یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہونے لگی کہ میں برطانوی پولیس کی تحویل میں نہیں ہوں اور یہاں کا قانون جو کتابوں میں لکھا ہے مجھے کوئی تحفظ فراہم نہیں کر سکتا کیونکہ ہم ذہنی طور پر اب بھی آزاد نہیں اور دھن دھاندلی یا دھونس کے حربے قانون کی بے بسی کا آج بھی مذاق اڑاتے ہیں۔ قانون تو آدمی خود اپنے آپ پر نافذ کرتا ہے۔ قانون تو اپنا ضمیر ہے اور جو اپنے ضمیر کی آواز کا احترام نہیں کر سکتا وہ قانون کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے جائز اور ناجائز سب طریقے اختیار کر سکتا ہے۔ میں اذیت رسانی کے ان بھیانک طریقوں سے واقف تھا جو کسی میڈیکل رپورٹ سے ثابت نہیں کیے جا سکتے۔

"مسٹر سکندر بخت۔ کیا تم کسی عدالت میں ثابت کر سکتے ہو کہ ہم نے تم پر تشدد کیا ہے؟" اے ایس پی نے کہا۔

میں نے نفی میں گردن ہلا دی۔ انھوں نے ابھی صرف ایک نمونہ پیش کیا تھا۔ تاکہ میں قائل ہو جاؤں۔ وہ اس سے کہیں زیادہ کرنے کے اہل تھے۔ "ویری گڈ۔ تم نے بہت جلد بات سمجھ لی۔" اے ایس پی نے کہا۔ "اب ایک اور بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ یہاں تین افراد نے یہ بیان دیا ہے کہ تم چوکیدار کی عدم موجودگی میں دیوار پر سے کودے اور اندر آئے۔ تمھارے فنگر پرنٹ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے۔ اندر آ کے تم پہلے زبردستی میر شرافت علی کے بیڈ روم میں گھسے اور پھر اس کے ساتھ ڈرائنگ روم میں گئے تو وہاں تم نے بہت سے نوادرات کو تباہ کیا۔ شور سن کر آنے والے دو خادموں کو مارا۔ اس وقت تمھارے ہاتھ میں ایک خنجر تھا جس سے تم نے متعدد تصاویر پھاڑیں اور پھر اسی خنجر کے وار سے میر شرافت علی کو قتل کر کے نکل گئے۔ میر شرافت علی نے مرنے سے پہلے پولیس کو ٹیلی فون کیا تھا بتایا تھا کہ ایک شخص جس کا نام سکندر بخت ولد وزیر خاں ہے اچانک لندن سے آ گیا اور اس نے کوٹھی میں گھس کے بہت ہنگامہ کیا۔ لاکھوں کے نوادرات کا نقصان کیا۔ اس نے گھر کے دو ملازموں کو بھی بہت مارا جو شور سن کے جان بچانے آئے تھے۔ اس کے ہاتھ میں ایک خنجر تھا اور اس پر خون سوار تھا۔ اس نے جاتے جاتے قتل کی دھمکی بھی دی تھی۔ میر شرافت علی نے اس اندیشے کا اظہار بھی کیا تھا کہ سکندر بخت گیا نہیں ہے بلکہ ممکن ہے وہ کوٹھی کے آس پاس کہیں دانا نہیں چھپا ہوا ہو۔ تھانے سے اسے کہا گیا تھا کہ وہ باضابطہ رپورٹ لکھا دے تو مزید کارروائی کی جا سکتی ہے اور شرافت علی نے کہا تھا کہ پہلے وہ ملازمین کے لیے ڈاکٹر کو طلب کرے گا اور پھر موقع ملتے ہی پولیس اسٹیشن آ جائے گا لیکن اس کے ساتھ ہی فون کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور رپورٹ لکھنے والے کا خیال ہے کہ اس نے کچھ چیخنے چلانے یا کراہنے کی آوازیں سنی تھیں جو غالباً ریسیور کے لٹکے رہ جانے سے سنائی دی ہوں گی۔ رات کے ڈھائی بجے سب انسپکٹر حشمت خاں گشت سے واپس آیا تو یہ بات اسے بتائی گئی اور وہ ساڑھے تین بجے جائے واردات پر پہنچا تو ایک ملازم کو ہوش آنے لگا تھا مگر شرافت علی کی لاش خون میں لت پت تھی۔ شکستہ اور تباہ شدہ سامان کے درمیان پڑی تھی لاش پر خنجر کے چھ زخم تھے اور خنجر دل کے مقام پر پیوست تھا۔ خوش قسمتی سے تھانے کے محرر کو شرافت علی نے یہ بتا دیا تھا کہ تم کہاں مقیم ہو اور اس نے پتہ نوٹ کر لیا تھا۔ حشمت بیگ اس پتے پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ تم چند منٹ پہلے ریلوے اسٹیشن جا چکے ہو۔ تم چاہو تو میو اسپتال جا کے لاش کو دیکھ سکتے ہو۔"

بجلی کی طرح میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ میں نے شرافت علی کو یہ کب بتایا تھا کہ میں سلامت شاہ کے پاس ٹھہرا ہوا ہوں۔

"جنابِ والا" میں نے اپنی زبان کی لکنت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "لاش کو چھوڑیے۔ کیا مجھے ایک بات پوچھنے کی اجازت ہے؟" اے ایس پی نے سر ہلایا۔ "آئی ڈونٹ مائنڈ۔"

"میر شرافت علی کا پیغام کس نے وصول کیا تھا؟ اور کتنے بجے؟" میرا لہجہ کمزور تھا مگر ایک غیر متوقع بات نے مجھے نیا اعتماد عطا کر دیا تھا۔ "نائٹ ڈیوٹی پر موجود ایک محرر نے۔" اے ایس پی نے کہا۔ "رات کے ایک بجے۔ قتل غالباً ایک اور دو بجے کے درمیان ہوا۔"

"کیا وہ محرر میر شرافت علی کی آواز پہچانتا تھا؟" میں نے کہا۔ "اور اس نے چیخنے کراہنے کی جو آوازیں سنیں ۔۔ وہ شرافت علی ہی کی تھیں؟"

"نان سنس" اے ایس پی نے کہا۔ "کیا اس نے غلط سنا تھا؟"

"یس سر۔۔ اس نے بالکل غلط سنا تھا۔ رات نو بجے سے پہلے جب میں اس گھر کے اندر داخل ہوا تھا تو میں نے باہر کی دیوار کے اوپر سے آنے والا ٹیلی فون کا تار توڑ دیا تھا۔ میر شرافت علی یہاں سے فون کر ہی نہیں سکتا تھا۔" میں نے کہا۔

اے ایس پی کی صورت کا تاثر یکلخت بدل گیا۔ وہ کچھ دیر میری صورت کو گھورتا رہا اور کچھ سوچتا رہا۔ پھر اس نے سب انسپکٹر حشمت کی طرف سوالیہ نظریں اٹھائیں۔ "حشمت خاں۔ کیا ٹیلی فون کی لائن ٹوٹی ہوئی ہے؟"

"میں چیک کرتا ہوں جناب۔" حشمت خاں نے پتلون سنبھالی اور پلٹ کر کہا۔ "حوالدار۔ جا کے دیکھو۔" حوالدار اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی جا چکا تھا۔

"ٹیلی فون کرنے والا میر شرافت علی نہیں تھا سر۔" میں نے کہا۔ "یہ قتل کرنے کے بعد قاتل نے کسی اور جگہ سے فون کیا۔ اور آپ کے محرر کو یقین دلانے میں کامیاب ہو گیا ہے کہ وہ شرافت علی ہے۔ اس کے علاوہ میں نے تو شرافت علی کو نہیں بتایا تھا کہ میں کہاں مقیم ہوں۔"

"اگر شرافت علی زندہ ہوتا تو ہم تصدیق کر لیتے۔" اے ایس پی نے طنز اور تمسخر سے کہا۔

"ایک آخری سوال جناب۔" میں نے کہا۔ "قتل کی واردات تو ایک بجے کے بعد ہوئی ہے۔ چشم دید گواہوں کا کیا بیان ہے؟ انھوں نے مجھے کس وقت آتے جاتے دیکھا تھا؟"

"انھیں وقت کا اندازہ نہیں۔" اے ایس پی نے کہا۔ "وہ تمھارے آنے کے کچھ دیر بعد سو گئے تھے اور پھر شور سے جاگے تھے۔"

"وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ چوکیدار بتا سکتا ہے کہ جب میں گیا تھا تو وہ عشا کی نماز پڑھ کے آیا ہی تھا۔" میں نے کہا۔ "اس وقت نو بھی نہیں بجے تھے۔ اسی نے مجھے سلام بھی کیا تھا۔"

دس منٹ بعد صورتِ حال خاصی بدل چکی تھی۔ چوکیدار نے تصدیق کر دی تھی کہ میں نو بجے کے قریب کوٹھی کے گیٹ سے باہر گیا تھا۔ اس نے مجھے ایک ٹیکسی ڈرائیور سے بات کرتے بھی

دیکھا تھا لیکن میں اس ٹیکسی میں بیٹھا نہیں تھا۔ سب انسپکٹر کے سوال پر اس نے تسلیم کیا کہ میرے حویلی پیچھے کوٹھی میں کسی اور سمت سے کود جانے کے امکانات کو بعید از قیاس نہیں سمجھا جا سکتا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میرا اعلانیہ گیٹ سے باہر جانا اور ٹیکسی ڈرائیور سے بات کرنا محض ڈرامہ ہو۔ تاہم حوالدار کی رپورٹ نے اے ایس پی کو مزید الجھن میں ڈال دیا۔ ٹیلی فون کی لائن ایک ایسی جگہ سے ٹوٹی تھی کہ تار کا وہ حصہ جو کوٹھی کے اندر لان پر سے اور درختوں میں سے گزرتا تھا اب بھی سلامت نظر آتا تھا اس کو کسی درخت کی شاخ نے گرنے نہیں دیا تھا۔ نسبتاً چھوٹا حصہ دیوار کے باہر پول کے ساتھ لٹکا ہوا تھا۔ میرے نقشِ قدم دیکھنے والوں کو دیوار کے اوپر تار کی عدم موجودگی کا احساس نہیں ہو سکا تھا اور چونکہ کسی نے بعد میں ٹیلی فون بھی استعمال نہیں کیا تھا اس لیے اب تک یہ بات کسی کو معلوم نہ تھی۔ اے ایس پی نے اس کے باوجود یقین نہیں کیا کہ ٹیلی فون لائن نو بجے سے پہلے کٹ چکی تھی۔ اگر میرا گھوم پھر کے دوبارہ کوٹھی میں داخل ہو جانا ممکن تھا تو کیا یہ فرض نہیں کیا جا سکتا کہ جیسے ہی میر شرافت علی پولیس کو فون کر کے فارغ ہوا میں نے اسے قتل کر دیا اور جاتے جاتے ٹیلی فون کا "تار کاٹ گیا۔"

"قتل تم نے اس وقت کیا جب تم پھر چپکے سے اندر آئے تھے۔" وہ بولا۔

میں نے ہمت نہیں ہاری۔ "ابھی ایک گواہ باقی ہے مسز چراغ دین کا خانساماں، سلامت شاہ آپ کو بتا سکتا ہے کہ میں کس وقت اس کے کوارٹر میں پہنچا تھا۔ ہم نے کھانا ایک ساتھ کھایا تھا۔"

"یہ سب تو بعد میں ہوتا رہے گا۔" اے ایس پی نے کہا۔ "فی الحال ہمارے پاس تمھیں گرفتار رکھنے کی معقول وجوہات ہیں۔ گواہوں کے بیانات کے علاوہ خود تمھارے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ میر شرافت علی کے مر جانے سے تم پورے کاروبار کے مالک بن گئے ہو۔ اگر وہ زندہ رہتا تو تم پارٹنر ہوتے۔ تم خود اعتراف کر چکے ہو کہ تم نے توڑ پھوڑ اور مار پیٹ کی۔"

"اس کی وجہ کچھ اور ہے جناب۔ میں میر شرافت علی کو سزا دینا چاہتا تھا۔" میں نے کہا۔ "اس نے میرے والد کو بلیک میل کیا تھا اور ان سے وہ سب کچھ چھین لیا تھا جس کے وہ مالک تھے۔ کار، کوٹھی۔ ساڑھے تین لاکھ کا منافع۔"

"اچھا؟ مگر بلیک میلر تو ہمیشہ مجرم ہوتے ہیں۔" اے ایس پی نے کہا۔ "خواہ یہ جرم کسی نے دانستہ کیا ہو یا اس سے نادانستگی میں سرزد ہوا ہو۔ کیا تمھیں معلوم ہے کہ میر شرافت علی نے تمھارے والد کو کیوں بلیک کیا تھا؟"

میں نے آہستہ سے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ اور ایسی بہت سی باتیں ابھی مجھے معلوم نہیں۔ جن کا میرے پاس ثبوت تک نہیں ہے۔"

"جب تفتیش ہو گی تو سب معلوم ہو جائے گا۔" سب انسپکٹر حشمت خاں نے موقعہ پلٹتے ہی کہا اور اپنی ایک مونچھ کو بل دیا۔

"مجھے اپنا بیان ریکارڈ کرانا ہے۔" میں نے کہا۔ "تفتیش کرنے والے افسر کی حیثیت سے آپ کے لیے یہ بیان بہت اہم ہو گا کیونکہ بہت سے واقعات جن کا تعلق اس واردات کے پس منظر سے ہے میں نے ابھی بیان نہیں کیے۔"

"آل رائٹ۔ مگر یہ بیان میں کل ریکارڈ کروں گا۔" اے ایس پی نے گھڑی پر نگاہ ڈال کے کہا۔ "ابھی مجھے ڈی آئی جی صاحب کو رپورٹ دینی ہے۔ اور اخبار والوں کے سوالات کا جواب دینا ہے۔ وہ یقیناً اب تک پہنچ چکے ہوں گے۔ میر شرافت علی مشہور آدمی تھا۔ ایک بار پھر میں یہ پوچھوں گا کہ تم نے میر شرافت علی کو قتل کیا ہے؟ اگر تم اعتراف کر لو گے تو خود بھی پریشانی سے بچو گے اور ہمیں بھی بچا لو گے۔"

"میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔" میں نے کہا۔ "میں اسے سزا دینا چاہتا تھا اور مجھے یہ خیال بار بار آیا تھا کہ اسے قتل کر دوں مگر میں نے اسے بخش دیا تھا۔ یہ کسی اور نے مجھے مجرم بنانے کی سازش کی ہے۔ اعترافِ جرم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

اے ایس پی جانے کے لیے اٹھا ہی تھا کہ میں نے کہا۔ "جناب اے ایس پی صاحب۔ میرے والدین اور بہن بھائی تو ہیں نہیں۔ یہاں جو کچھ ہیں مسٹر شیروانی ہیں اور سلامت شاہ ہے۔ میں چاہتا ہوں ان کو اطلاع دے دی جائے۔"

"مسٹر شیروانی؟ وہی ڈپٹی سیکرٹری۔۔۔؟" اے ایس پی رک گیا۔ "اچھا کوئی فون نمبر ہے تو سب انسپکٹر حشمت خاں کو دے دو۔" وہ چلتے چلتے حشمت خاں سے مخاطب ہوا۔ "کل اس سلامت شاہ کو بلا کے اس کا بیان بھی لے لو۔ اور ملزم کو مقتول کی لاش دکھا دو۔ اس کے فنگر پرنٹ وغیرہ فائل میں رکھو۔ ہو سکتا ہے آلۂ قتل کے بارے میں فنگر رپورٹ کل مل جائے۔ سائٹ پلان بالکل مکمل ہونا چاہیے۔ جائے واردات پر موجود ہر چیز کا بیان تفصیل سے ہو۔ تصاویر میں فرق نہ آئے۔" وہ دس منٹ تک تفتیش کے دیگر امور سے متعلق ہدایات دیتا رہا اور پھر باہر نکل گیا۔

جب آدھے گھنٹے بعد میں پولیس کی جیپ میں روانہ ہوا تو گیٹ پر تین فوٹو گرافرز نے میری تصویر اتاری۔ میں نے چشم تصور سے اگلے دن کے اخبار کی ایک ایک سنسنی خیز سرخی دیکھی:

"میر شرافت علی کا قاتل گرفتار کر لیا گیا۔"

"میر شرافت علی کا قاتل فرم کے ایک پارٹنر کا بیٹا ہے۔"

"پولیس اسٹیشن سے ملزم کی ڈرامائی گرفتاری۔ فرم پر قبضہ کرنے کے لیے مرحوم باپ کے پارٹنر کو قتل کرنے والا ملزم لندن سے آیا تھا۔"

چشم تصور سے میں نے خبر کے ساتھ شائع ہونے والی تصویر دیکھ کر فوزیہ کو چونکتے اور خبر پڑھ کے لاش کی طرح سفید پڑتے دیکھا۔ وہ کسی شرابی کی طرح ڈولتی اٹھی اور اپنے کمرے کی طرف بھاگی۔ دروازہ بند کر کے وہ بستر پر اوندھی گر گئی اور دوپٹہ منہ میں ٹھونس کر زار و قطار رونے لگی۔ میں نے محسن کی ماں کو بھی دیکھا جس نے بیٹی کی حالت میں اس تشویش ناک تغیر کو دیکھ کر اخبار اٹھا لیا تھا اور اب پھٹی پھٹی آنکھوں سے قتل کی اس لرزہ خیز واردات کی تفصیلات پڑھ رہی تھی۔ میں نے محسن کے پاپا کا چہرہ بھی دیکھا۔ وہ سخت متفکر تھے اور سگار لبوں میں دبائے نائٹ گاؤن کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اپنی اسلام آباد والی کوٹھی کے لان میں کھڑے سوچ رہے تھے کہ اب وہ کیا کریں۔

میں ان دونوں میاں بیوی کے خیالات کا بھی اندازہ کر سکتا تھا۔ کل تک ان کی بیٹی انگلینڈ میں زیرِ تعلیم ایک انجینئر سے منسوب تھی اور ان کے لیے بڑے فخر کی بات تھی کہ ہونے والا داماد اپنی انجینئرنگ فرم کا مالک ہو گا کیونکہ وہ باپ کا اکلوتا بیٹا ہے۔ آج ان کی بیٹی ایک مبینہ قاتل کی منگیتر بن گئی تھی۔ کچھ کہنا یا کرنا قبل از وقت تھا لیکن انھیں دنیا کو بہرحال منہ دکھانا تھا۔ جس میں حاسد زیادہ ہیں اور خیر خواہ کم ہیں جو خوشی میں دل کی کدورت پر مسکراہٹ کی روشن چھاپ ڈال کے شریک ہوتے ہیں تو دکھ میں دل کی مسرت پر غم زدہ چہرہ سجا کے ہمدردی کرنے آ جاتے ہیں۔ "مسٹر شیروانی۔ میں نے سنا ہے۔ اوہ آف کورس یہ سب غلط ہو گا۔ آپ پریشان کیوں ہوتے ہیں۔ یہ تو قانونی معاملات ہیں اور یہاں تو سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ ثابت کرنا کوئی مشکل نہیں۔ بس ذرا دباؤ پڑنا چاہیے پیسے کا یا سفارش کا۔ پولیس سب کچھ کر لیتی ہے۔ گواہ منحرف ہو جاتے ہیں۔ شہادت بے بنیاد ثابت ہوتی ہے اور بیانات میں تضاد نکل آتا ہے۔ وکیل اچھا ہونا چاہیے۔ فوجداری مقدمات میں اچھی شہرت ہو۔ اور سپریم کورٹ تک جا سکے۔ بے شک وہ ایک لاکھ لے لے گا مگر دیکھیے نا معاملہ آپ کی لڑکی کے مستقبل کا ہے۔ بائی دی وے۔ آپکا کیا خیال ہے۔ نہیں نہیں۔ خدانخواستہ یہ مطلب نہیں تھا میرا۔ میں جانتا ہوں آپ نے اپنی بچی سے اس کی منگنی بغیر دیکھے نہیں کی ہو گی۔ ماشاءاللہ انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن گیا ہوا تھا۔ سنا ہے باپ کسی فیکٹری کا مالک ہے؟ نہیں بھائی ماں باپ کوئی نہیں؟ پھر تو واقعی آپ کی خوش قسمتی ہے ورنہ آج کل اچھے رشتے کہاں ملتے ہیں۔ لڑکی راج کرے گی۔ ایک طرح سے گھر داماد ہی ہو گا۔

ابھی نہیں۔ یہ میرا خیال نہیں۔۔۔ وہ ہوم ڈیپارٹمنٹ کے شیخ صاحب ہیں نا۔ ابھی بڑا ہی کم ظرف آدمی ہے۔ اس نے اپنے بیٹے کا رشتہ مانگا تھا نا؟ وہی کہتا پھرتا ہے کہ شیروانی صاحب کی تو لاٹری نکل آئی ہے۔ ہمارے ڈاکٹر بیٹے میں کیا خرابی تھی۔ مگر ایک طرف صنعت کار ہو تو ڈاکٹر کو کون پوچھتا ہے اور سچ پوچھیے تو شیروانی صاحب یہ سب مقدر کے کھیل ہیں۔ اس نے اپنے بیٹے کا جہاں رشتہ کیا وہ بھی صنعت کار کی بیٹی ہے۔ فیصل آباد کی ٹیکسٹائل مل کے مالک ہیں۔ وہ تو بہت خوش ہو گا۔

آئی سی۔۔۔ یہ مجبوری ہے۔ مبینہ قاتل آپ کے مرحوم دوست کا بیٹا ہے اور بچپن کی منگنی ہے؟ اور یہ سب لوگ جو ایک ہی قبیل کے کم ظرف اور تنگ نظر لوگ ہیں۔ بے خبر لوگ اور متعصب اور پست ذہنیت رکھنے والے لوگ جو رشتوں کو ——— دولت کے پیمانوں سے پرکھتے آئے ہیں۔ ظاہر کو باطن سے چھپائے رکھنے والے یہ ریاکار اور منافق لوگ جو اخلاق کے دوہرے معیار پر یقین رکھتے ہیں۔ ایک وہ جو ان کی اپنی زندگی کے لیے ہے۔ دوسرا وہ جس پر باقی سب کو پورا اترنا چاہیے۔ ان کو بھلا کیا معلوم کہ محبت ہمارے معصوم جذبوں کی زمین سے پھوٹنے والی کونپل تھی جسے ہم نے برسوں زمانے کی ہوا سے بچا کے رکھا اور اس کی آبرو کو حاصلِ زندگی جانا۔ یہ ننھا منا پودا ہمارے خلوص کی اجلی دھوپ میں پروان چڑھا۔ اسے ہمارے ارمانوں کی برکھا نے سینچا اور ہم نے اس کے گرد خوابوں کا وہ حصار قائم رکھا جس پر ہمیں زندگی کے آخری سانس کی رفاقت تک ہر لمحے سے ایک پُرمسرت پُرسکون اور پُرامید مستقبل کی عمارت اٹھانی تھی۔ اپنے لیے۔ اپنے بچوں کے لیے۔ پھر ان کے بچوں کے لیے۔ دو بچپن کے دوستوں نے یہ منگنی طے کرتے وقت سوچا ہو گا کہ وہ دوستی کے رشتے کو ایک انشورنس پالیسی دے رہے ہیں جو پندرہ بیس سال بعد ان کی خوشیوں کو دو چند کر دے گی لیکن انھوں نے اس جذباتی فیصلے کے منفی پہلوؤں پر بھی غور کیا ہو گا۔ آنے والے دن کا کیا بھروسہ۔ لڑکا نالائق نکلے۔ لڑکی نافرمان ہو۔ دونوں اس صدی کی پیداوار ہیں ایک صدی پہلے کے دقیانوسی طریقے پر ہونے والی منگنی کو تسلیم نہ کریں۔ آخر کیا سمجھ رکھا ہے آپ نے ہمیں۔ ہم کوئی بھیڑ بکریاں تھے کہ آپ نے ہم سے پوچھے بغیر یہ سودا کر لیا۔ آپ اپنی دوستی کو اپنی ذات تک محدود رکھتے اور اپنے جذبات پر دوسروں کی

زندگی قربان نہ کرنے تو اچھا تھا۔" یہ سب باتیں اس دور میں بعید از امکان نہ تھیں ۔ مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔ آہستہ آہستہ جذبات کے رشتوں کا وہ تعلق جو چھوٹی سی فوزیہ کے ساتھ تھا۔ عہدِ شباب میں محبت کا وہ لازوال خزانہ بن گیا تھا جسے میں اپنی خوش بختی کا انعام سمجھتا تھا ۔ وہ ننھی منی کونپل اب ایک تناور درخت تھی جسے بڑے سے بڑا طوفان نہیں جھکا سکتا تھا۔ اس محبت نے مخالفت اور مخاصمت کے اتنے صبر آزما دور دیکھے تھے کہ اب ہر آزمائش بے معنی تھی ۔ لیکن شیروانی صاحب جو اعلیٰ افسر ہیں۔ عزت دار ہیں اور زمانے کے نشیب و فراز دیکھ چکے ہیں ۔ کیا وہ اس آزمائش میں پورے اتریں گے ۔ اب تک انھیں اپنے فیصلے پر ناز تھا ۔ اپنی قوتِ فیصلہ پر غرور تھا اور اپنی دوراندیشی کا ذکر وہ یوں کرتے تھے جیسے انھیں غیب کا علم تھا۔ ان کی بیوی کو اس سے بڑی مایوسی ہوئی تھی کیوں کہ ان کے بھائی کا لڑکا جو پروفیسر تھا قسم کھا چکا تھا کہ اس کی شادی فوزیہ سے نہ ہوئی تو وہ تمام عمر شادی نہیں کرے گا اور اس شادی کا کوئی امکان اس لیے نہ تھا کہ میں اور فوزیہ ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے ۔ ہمارے والد ایک دوسرے کے تمام عمر کے رفیق تھے ۔ فوزیہ کو مجھ سے بہتر شوہر اور مجھے فوزیہ سے بہتر شریکِ حیات نہیں مل سکتی تھی ۔ اگر میں کسی طرح بھی معیار پر پورا نہ اترتا ۔ بالفرضِ محال میں اعلیٰ تعلیم یافتہ ۔ دولت مند ۔ اکلوتا لڑکا اور دنیا کے نقطۂ نظر سے ہینڈسم اور اسمارٹ نہ ہوتا تو کسی ایک خامی پر بھی وہ مجھے مسترد کرکے فوزیہ کا ہاتھ اپنے مرحوم بھائی کے بیٹے ایاز کے ہاتھ میں دینا پسند کرتیں جس کو فوزیہ سے محبت بھی تھی بس وہ تنخواہ دار کم آمدنی والا شخص تھا مگر یہ خامی ایسی نہ تھی کہ قابلِ درگزر نہ ہو۔ پروفیسر کی تنخواہ معقول ہوتی ہے اور تنخواہ دار تو شیروانی صاحب بھی تھے بلکہ جب ان کی شادی ہوئی تھی تو وہ درجہ دوم کے اکاؤنٹ آفیسر تھے ۔ میرے لیے ایک لمحۂ فکریہ شیروانی صاحب کی بیگم کا خیال تھا۔ کیا اب وہ موقعے سے فائدہ نہیں اٹھائیں گی ۔ شیروانی صاحب کو قائل نہیں کرسکیں گی کہ چھوڑو بچپن کی منگنی کا احمقانہ خیال ۔ اس کو تو پھانسی ہونی ہی ہے ۔ ہماری بیٹی کیوں سولی چڑھے ۔ کل پرسوں تک دولہا بنا بلاؤ اور رخصتی کردو ۔ غضب خدا کا ۔ پہلے ولایت جاکے بیٹھ گیا۔ اب آیا تو قتل کے الزام میں پکڑا گیا ۔ ہم تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہے ۔ یہ مقدمہ نہ جانے کتنے سال چلے اور انجام پھانسی نہ ہوا عمر قید تو ہوگا ۔ کیا اس وقت تک فوزیہ بیٹھی رہے گی ؟ آج تو ایاز بھی کہتا ہے کہ عمر بھر شادی نہیں کرے گا مگر آدمی کے جذبات ہمیشہ ایک نہیں رہتے ۔ سال دو سال بعد وہ بھول گیا یہ بات اور اس نے فوزیہ کا خیال چھوڑ دیا تو رشتہ نہیں ملے گا۔ سب کہیں گے لڑکی منحوس ہے ۔ شادی سے پہلے ہی منگیتر کو پھانسی لگوادی ۔ جس گھر پر اپنا نحس سایہ ڈالے گی وہاں قبرستان بنائے گی ۔ عورتوں کی زبان اور عورتوں کی منطق اور ان کی باتیں ۔ کیا شیروانی صاحب ان دلائل کا مقابلہ کرلیں گے مصلحت کے تقاضوں کو جذباتی رشتے پر قربان کردیں گے ؟ حقیقت سے نظریں چرا کے ایک موہوم سی امید کا دامن تھامے بیٹھے رہیں گے ؟ زمانے کی ہرزہ سرائی اور انگشت نمائی سے خوف زدہ نہیں ہوں گے ؟ میں نے محسوس کیا کہ زمین میرے قدموں کے نیچے ایک خلا میں تبدیل ہوگئی ہے اور میں اس سنسان ۔ تاریک اور لامحدود خلا میں گرتا جارہا ہوں ۔ میرا ہاتھ تھامنے والا کوئی نہیں اور میری مدد کی پکار بے صدا ہوگئی ہے ۔ یہ بڑی عجیب بات تھی کہ تھانے جاتے ہوئے میں اپنے انجام کے بارے میں نہیں اپنی محبت کے انجام کے بارے میں سوچ سوچ کر خوف زدہ ہورہا تھا ۔

ہم تھانے پہنچے تو سب انسپکٹر حشمت خاں کے رویّے میں ایک خوش گوار تبدیلی رونما ہوئی جس کا اثر دوسروں کے رویّے پر بھی پڑا ۔ یہ بڑی حیران کن بات تھی کیونکہ میر شرافت علی کے گھر میں جو کچھ میرے ساتھ ہوا تھا۔ تھانے میں اس سے کہیں زیادہ ہوسکتا تھا۔ تھانہ چودھری حشمت خاں کی سلطنت تھی جہاں اس کا حکم قانون تھا اور تھانے میں آنے والے خراج گزار رعیت تھے جو اس کی طاقت اور دبدبے کے سامنے دم مارنے کی جرأت نہیں کرسکتے تھے ۔ میر شرافت علی کے گھر میں ایک افسرِ اعلیٰ کے سامنے وہ مکمل طور پر بااختیار نہ تھا مگر اس کے باوجود حشمت نے مجھ پر چودہ طبق روشن کردیے تھے ۔ مجھے امید تھی کہ اپنی تمام سرکشی ۔ گستاخی اور خوش فہمی کی اصل سزا اب مجھے تھانے کی حدود کے اندر اور قانون کی دسترس سے باہر ہوجانے کے بعد ملے گی ۔ لیکن گاڑی رکنے کے بعد تھانے دار نے قطعی بدلے ہوئے لہجے میں کہا ۔

"لیجیے حوالدار صاحب ۔ ذرا ان کو ادھر لاؤ ۔ کیا نام ہے ان کا ۔ اپنے سکندر صاحب کو" اور سیدھا چلتا ہوا آخری اٹھ کے ایک کمرے میں داخل ہوگیا۔ حوالدار نے زنجیر کھینچ کر مجھے تصورات کی اور غیر موجود اندیشوں کی دنیا سے حقائق کی زمین پر اتار لیا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے گاڑی سے نکلا تو مجھے تھانے کی آسیب زدہ ہیبت ناک اور خستہ حال عمارت نظر آئی ۔ پولیس اسٹیشن میں نے لندن میں بھی دیکھے تھے جہاں لوگ مدد کے لیے پورے اعتماد کے ساتھ آتے تھے ۔ یہ سوچ کے قدم نہیں رکھتے تھے کہ دیکھو اب نکلنا کب ہو، کیسے ہو اور لینے کے دینے نہ پڑ جائیں وہاں بچے آتے تھے کہ "آفیسر! میری گیند جھاڑیوں میں گم ہوگئی ہے اور میرا ہاتھ اوپر تک نہیں پہنچتا ۔ کیا تم میری مدد کرسکتے ہو؟" عام گھریلو عورتیں آتی تھیں کہ "آفیسر ۔ مجھے اچانک جانا پڑ رہا ہے ۔ میری عدم موجودگی میں ڈرائی کلینر کپڑے لائے گا ۔ وہ لے کر رکھ لینا ۔ میں واپسی میں لے لوں گی ۔ ۔ ۔ ۔ رات کو مجھے ایک ہفتے کے لیے باہر جانا ہے۔" ان سب باتوں کا تصور یہاں کتنا افسانوی اور مبالغہ آمیز لگتا تھا ۔

تھانے کی سیڑھیوں کے پاس ایک کانسٹیبل دقیانوسی رائفل کے سہارے کھڑا تھا۔ اس نے مجھے قطعی لفٹ نہیں دی۔ برآمدے میں دائیں جانب بیٹھے ہوئے محرر اور ایک اے ایس آئی نے دو زیرِ حراست قیدیوں کو مرغا بنا رکھا تھا اور ان کے پھٹے ہوئے کپڑے اور پریشان بال گواہی دیتے تھے کہ ان سے تفتیش کی گئی ہے ۔ بنچ پر بیٹھے ہوئے تین افراد نے جو خود بھی سہمے ہوئے تھے اور شکایت کنندہ معلوم ہوتے تھے مجھے قابلِ رحم نظروں سے دیکھا ۔ یہی لوگ جو عام زندگی میں ہر چور ڈاکو اور بدمعاش کے دشمن تھے تھانے میں ان کی حالت دیکھتے تھے تو ان پر ترس کھاتے تھے اور ان کے ہمدرد بن جاتے تھے ۔ حوالات کی سلاخوں کے پیچھے دو افراد گھٹنوں میں سر دیے بیٹھے تھے۔ ایک مزے سے سگریٹ پی رہا تھا اور دوسرا فرش پر یوں پڑا تھا جیسے مر چکا ہو ۔ بہت جلد مجھے بھی انھی کے درمیان پہنچنا تھا اور آج کی رات اپنے پریشان کن خیالات کی رفاقت میں بسر کرنی تھی ۔ حوالدار نے چق اٹھائی اور میرے ساتھ اندر قدم رکھا۔ نیم تاریک کمرے میں بھدی سی میز کی دوسری طرف سب انسپکٹر کا بھاری بھرکم وجود ایک چرچراتی کرسی میں پھنس چکا تھا۔ حوالدار نے سامنے کی دو کرسیوں میں سے ایک اپنے لیے منتخب کی اور دوسری پر مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا ۔

"تسلی سے بیٹھو اپنے سکندر صاحب" حشمت خاں نے ٹوپی اتار کے میز پر رکھی۔ "اب تھانے تو پہنچ ہی گئے ہیں ہوتی رہے گی تفتیش بھی ۔ یہ بتاؤ کچھ کھایا پیا ہے ؟ صبح سے یہ وخت ہوگیا ۔"

"ہاں جی ۔ دھکے کھائے ہیں ۔ خالی مار کھائی ہے اور گالیاں کھائی ہیں ۔" میں نے تلخی سے کہا "اور بھی مقدر میں جو ہے وہ ضرور ملے گا " میں اتنا کند ذہن نہیں ہوں کہ ان کی بات نہ سمجھ پاتا ۔ بالفاظِ دیگر اس کا مطلب یہ نکلتا تھا کہ بتاؤ کیا کھلا پلا سکتے ہو ؟

"بات کو سمجھنے کی کوشش کریں سکندر صاحب" حشمت خاں نے برا مانے بغیر کہا۔ "اپنے افسرِ اعلیٰ کے سامنے ہم بھی مجبور ہوتے ہیں ورنہ ہمارا دل تو نہیں چاہتا کہ کسی شریف آدمی کی بے عزتی خراب کریں۔ اب اپنے حوال دار صاب ۔ یہ جو اپنے اے ایس پی صاحب ہیں نا ۔ کتنے سخت آدمی ہیں ۔ اونچی بات بھی نہیں سنتے ۔ کیا کہا تھا آخر انھوں نے ؟ کوئی گالی تو نہیں دی تھی ۔ مگر ان کا پارا چڑھ گیا۔ ہم تو اشارہ سمجھتے ہیں ان کی نظر کا۔ ماتحت جو ہوئے ۔"

"ہاں چودھری صاب ۔ نوکری تو کرنی ہے جی ۔ بیوی بچوں کی خاطر" حوال دار نے ایک سرد آہ بھری۔

"چلو جی مٹی پاؤ ۔ اپنے سکندر صاحب کے لیے چائے وائے کا انتظام کرو ۔ بھئی یہ بڑے آدمی ہیں ولایت سے آئے ہیں اور بے چارے یہاں آتے ہی مصیبت میں گرفتار ہوگئے ۔" تھانیدار کا لہجہ ناقابلِ یقین حد تک دوستانہ ہوگیا تھا اور میں اس کا سبب سمجھ رہا تھا "کیا نام بتایا تھا جی آپ نے کون سی کمپنی کے مالک ہیں آپ ؟"

"میروز برادرز اینڈ کمپنی ۔ لیتھ مشین ۔ ہینڈ پریس اور ڈرل مشین وغیرہ کا کارخانہ ہے ۔" میں نے اپنے لہجے میں وقار پیدا کیا۔

"اچھا اچھا ۔" اس نے یوں سر ہلایا جیسے ۔ سمجھ گیا ہو ۔ "لیجیے حوالدار صاب ۔ اوئے یاد ان کے ہاتھ تو کھول دو ۔ یہ کیا نس چلے ہیں ۔"

بات صرف اعتبار کی نہیں تھی ۔ میں نس کے یعنی بھاگ کے جا ہی نہیں سکتا تھا ۔ میری راہ میں متعدد رکاوٹیں تھیں ۔ خود حشمت خاں کے پاس ریوالور تھا۔ جسے وہ ضرورت پڑنے پر بلا تردد استعمال کرسکتا تھا اور ایک سپاہی باہر بھی مسلح کھڑا تھا۔ حشمت خاں نے ایک قاتل کو فرار کے مواقع فراہم کرکے معطل ہونے کا خطرہ مول نہیں لیا تھا۔ اس نے حفاظتی انتظامات کو کافی سمجھتے ہوئے مجھے یہ رعایت اس لیے دی تھی کہ اب مجھ سے سودا کیا جاسکتا تھا۔ تھانے میں کوئی تکلیف اٹھائے بغیر زیرِ تفتیش رہنے کا معاوضہ وصول کیا جاسکتا تھا اور بہتر رویّے کی قیمت مانگی جاسکتی تھی۔ ان کے نقطۂ نظر سے میں موٹی آسامی تھا۔ سونے کا انڈا دینے والی مرغی ۔ چنانچہ وہ 'باغباں بھی خوش رہے، راضی رہے صیاد بھی' والے مقولے پر عمل پیرا تھا ۔

ایک گھنٹے بعد میں ہوٹل سے بہترین کھانا ، منگوا کے کھا چکا تھا اور کھلا چکا تھا جو حوال دار سائیکل پر جاکے لایا تھا اور اس قدر واہیات تھا کہ اسیری کی مجبوری نہ ہوتی تو میں بھوکا رہنے کو ترجیح دیتا مگر میں نے سوچا کہ دوبارہ نہ جانے

کب موقع ملے۔ زندہ تو رہنا ہی ہے اور تفتیش کا سامنا بھی کرنا ہے۔ ذہن کے ساتھ جسم کی توانائی بھی برقرار رہنی چاہیے۔ میں نے پچاس رُپے کا بل ادا کرتے ہوئے سوچا کہ یہ کھانا "لارڈز" یا شیزان سے تو نہیں آیا تھا؟ پھر مجھے خیال آگیا کہ تھانے میں ہر چیز کی قیمت میں سو دو سو یا ہزار فیصد تک "رعایتی سرچارج" بھی تو شامل ہوتا ہے۔ اس کے بعد میں نے اپنے بریف کیس میں سے سو سو کے پانچ نوٹ ایک لفافے میں ڈال کے سب انسپکٹر حشمت خاں کو اور ایسے ہی دو نوٹ حوالدار کو پیش کیے کہ آپ نے آج جو کارنامہ سرانجام دیا ہے اور میرا جو حشر کیا ہے اس کی خوشی میں یہ حقیر نذرانہ بچوں کی مٹھائی کے لیے حاضر ہے۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف۔ اس کے بعد میں نے اطمینان سے تھانے کے فون پر پہلے محسن سے بات کی۔

"کبیر داس" محسن نے کہا "خبیث میں تیرے انتظار میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔"

"دیکھ محسن۔ میں صبح ریل کار سے پنڈی جانے کے لیے روانہ ہونے والا تھا مگر ایک آفت میں پڑ گیا۔" میں نے تمہید کے طور پر کہا۔

"آفت؟ پھر کوئی آفت آگئی۔؟"

"ہاں محسن۔ مجھے ریل کار میں پولیس نے گرفتار کر لیا۔"

"گرفتار کر لیا؟" وہ چلایا "وہ کیوں؟ کس الزام میں؟"

"مجھ پر الزام ہے کہ میں نے میر شرافت علی کو قتل کر دیا ہے۔" میں نے سکون سے کہا۔

"سکندر۔ خدا کی قسم مجھے کچھ ہو گیا ہے میرے کان غلط سننے لگے ہیں۔ دیکھ یہ مذاق ہے تو۔۔۔"

"محسن میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔" میں نے کہا "میں اس وقت پولیس کی تحویل میں اور زیر تفتیش ہوں۔"

"اوہ۔ اور سکندر" محسن نے بہت دیر بعد کہا۔ جبکہ میں سمجھ رہا تھا کہ لائن کٹ گئی "تو نے یہ قتل کیا ہے؟"

"نہیں۔ میں نے یہ قتل نہیں کیا۔ میں اس سے ملنے ضرور گیا تھا اور میں نے اس کے دو ہاتھ بھی رسید کیے تھے۔ بالکل معمولی سے ہاتھ جن سے اس کے خراش تک نہیں آئی تھی اور جب میں رخصت ہوا تھا تو وہ سو فیصد زندہ اور تندرست و توانا تھا۔ یہ حرکت کسی نے بعد میں کی اور مجھے پھنسا دیا۔ تو سارے حالات سے باخبر ہے۔ مجھے یہ وہی پرانا چکر لگتا ہے میں تفصیل سے فون پر نہیں بتا سکتا۔ مجھے تیری مدد کی ضرورت بھی ہے اس لیے تو فوراً آجا۔ تیرا زخم ٹھیک ہے نا۔ چلنے پھرنے میں کوئی خرابی تو نہیں ہو گی؟" میں نے کہا۔

"نہیں نہیں۔ وہ سب ٹھیک ہے۔ سکندر اس وقت چار بجے ہیں۔ اگر میں پانچ بجے والی بس یا ویگن پکڑ دوں تو رات بارہ بجے لاہور پہنچ کے تجھ سے مل سکتا ہوں۔" محسن نے کہا اور میں نے اسے متعلقہ تھانے کا نام پتہ لکھوایا۔ "اچھا سکندر۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ اگر تو بے گناہ ہے تو کوئی تیرا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ ہم اوپر تک جا سکتے ہیں۔ ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ تک جھوٹ سچ سامنے آجاتا ہے اور کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں ہو سکتی۔ بس ذرا صبر و تحمل سے حالات کا مقابلہ کرنا ہو گا۔"

"صبر و تحمل کے علاوہ مقابلے کے لیے مالی وسائل بھی غیر محدود ہونے چاہئیں۔" میں نے کہا "نیچے سے اوپر تک قدم قدم پر پیسہ چلتا ہے۔ جتنا بڑا وکیل ہو گا اتنی بڑی فیس لے گا۔ ابھی تو اپنی پوزیشن یہ ہے کہ تقریباً پانچ ہزار میں نکال لایا تھا۔ کچھ پرانا زیور ہے وہ بیچ دوں گا۔ وراثت کا سرٹیفکیٹ ملنے کے بعد تو "میرو ز برادرز کمپنی" میری ہو گی اور میں اس کے اکاؤنٹ میں سے جتنا پیسہ چاہوں گا نکلوا لوں گا لیکن یہ سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کے لیے ہائی کورٹ میں الگ درخواست دینی ہو گی اور وقت بہرحال لگے گا۔"

"ان سب باتوں کو چھوڑ۔ بعد میں سوچیں گے۔ ابھی تو بنک بند ہیں مگر میں چیک دے کر ادھار لے سکتا ہوں میرے حساب میں تقریباً چودہ ہزار ہوں گے۔ میں پندرہ ہزار کا بندوبست کر کے آؤں گا۔" محسن نے کہا "صبح میں سارے معاملات کو سنبھال لوں گا مجھے شاید علم نہیں۔ وہیں لاہور میں اپنے دو کلاس فیلو بڑے اچھے وکیل ہیں۔ ایک تو لڑکی تھی ہمارے ساتھ رابعہ۔ اب رابعہ قاری ہے۔ دوسرا وہ ہماری یونین کا شعلہ بیاں مقرر اور صدر عبدالودود منظر ہے۔ یاد آیا اس تخلص سے۔ ان سے بات کریں گے تو امید ہے فیس وغیرہ کا مسئلہ بھی نہیں رہے گا۔ دنیا کا خون سفید ہو گیا ہے مگر دوستی کا نام ابھی زندہ ہے۔"

"محسن میں لمبی بات نہیں کر سکتا۔ یہ بتا۔۔۔ فوزیہ تو نہیں ہے آس پاس۔"

"فوزیہ؟" محسن نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ "نہیں۔ کچھ کہنا ہے اس سے؟"

"نہیں۔۔۔ مجھے کچھ نہیں کہنا ہے۔ جو کہنا ہے تو خود کہہ دے۔ اسے بتا دے کہ میں بے گناہ ہوں اور یہ بھی بتا دے کہ میرے ساتھ کیا چکر ہے۔ کل وہ اخبار میں میری تصویر اور خبر دیکھ لے گی۔ اسے زیادہ صدمہ ہو گا۔ تو آج ہی اسے سمجھا دے اور یقین دلا دے کہ میں نے واقعی کچھ نہیں کیا ہے۔"

"الو کے پٹھے۔ میرے یقین دلانے یا نہ دلانے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اگر ساری دنیا ایک طرف ہو کے کہے کہ تو نے قتل کیا ہے تب بھی وہ نہیں مانے گی۔ ان لڑکیوں کی عقل ایسی ہی ہوتی ہے۔ خیر میں اسے بتا دوں گا۔" محسن نے کہا۔

"بتا دینا کافی نہیں۔ اسے اعتماد اور حوصلے سے کام لینے کی تاکید کرنا۔ اس کی دعا ہر دوا سے زیادہ کارگر ہو گی۔"

محسن ہنسا۔ "اچھا ڈائلاگ ہے۔ یہ بھی سنا دوں گا اسے۔ مگر یار سکندر یہ جو کچھ ہوا۔ غلط اور بے بنیاد ہی سہی۔ اچھا نہیں ہوا۔"

"تو اپنی ممی کی بات کر رہا ہے؟" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا "کہ اب وہ کیا کریں گی۔"

"ہاں۔ بات میرے دل میں تھی اور تو نے سمجھ لی؟" محسن نے حیرانی سے کہا "میں واقعی سوچ رہا ہوں کہ اب وہ کیا کریں گی۔"

"یہ میں نے بھی سوچا تھا۔ مگر مجھے فوزیہ پر۔ تجھ پر اور تیرے پاپا پر اعتماد ہے۔" میں نے کہا "ابھی اس فکر میں مبتلا ہونے سے کچھ حاصل بھی نہیں ہو گا۔ تو اپنے پاپا سے بات کر اور ان سے کہہ کہ وہ اپنے تعلقات اور اثر و رسوخ کو کام میں لائیں۔ کم سے کم یہاں تفتیش میں کسی کا رویہ مخالف نہ رہے اور میرے ساتھ کوئی زیادتی نہ ہو۔ تو جانتا ہے ثبوت و شہادت کے مرحلے کیسے سر ہوتے ہیں۔"

"ہاں ہاں۔ وہ میں کر لوں گا۔" محسن نے کہا "اب باقی باتیں ملاقات پر۔ اور کچھ تو نہیں کہنا ہے نا؟"

"نہیں۔ تجھ سے بات ہو گئی۔ آدھا غم دور ہو گیا۔ تو آجائے گا تو میں اکیلا نہیں رہوں گا ورنہ یہاں کون ہے میرا۔ خدا حافظ۔" میں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

"آپ نے تو سو روپے کی ٹرنک کال کر لی سکندر صاحب۔" تھانیدار حشمت خاں نے دانتوں میں خلال کرتے ہوئے کہا۔ وہ اب تک میری گفتگو کا ایک ایک لفظ غور سے سن رہا تھا۔

میں نے فوراً سو کا ایک نوٹ شکریے کے ساتھ آگے بڑھا دیا اور دوسرا نمبر ملانے لگا۔

"ہیلو۔" کسی نے تیسری گھنٹی بجنے کے بعد ریسیور اٹھایا۔ "کی رسی سڑین" چراغ دین مری سے واپس آگیا تھا۔

"مسٹر چراغ دین" میں نے محتاط ہو کے کہا "آپ کے بنگلے میں ایک خانساماں ہے سلامت شاہ۔ مجھے اس سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔"

"کون ہو تم؟" چراغ دین نے کہا "کیا نام ہے تمہارا؟"

"میں؟ میرا نام ہے کبیر۔" میں نے سوچ کر کہا اس امید میں کہ شاید میرے والد نے اپنی داستانِ حیات کے اوراق سے اقتباسات سناتے ہوئے سلامت شاہ کو یہ بھی بتا دیا ہو کہ میرے پایر کا نام کبیر تھا۔ "میں اس کا بھتیجا ہوں۔"

"اپنا نمبر بتاؤ۔ وہ بات کر لے گا۔" چراغ دین نے کہا۔ "بازار گیا ہوا ہے۔ آئے گا تو میں بتا دوں گا۔"

سلامت شاہ کا فون آدھے گھنٹے کے انتظار کے بعد آیا۔ اس نے کبیر کو پوچھا اور حشمت خاں نے ریسیور مجھے تھما دیا۔

"سکندر بخت" اس نے کہا "تم تو اسلام آباد گئے تھے مگر صبح پولیس تمہیں پوچھتی ہوئی آئی تھی۔ تمہارے جاتے ہی۔ کیا۔۔۔"

"ہاں چاچا" میں نے کہا "میری بدقسمتی ہے کہ جا نہیں سکا۔ اس وقت تھانے میں بند ہوں۔ تم پتہ لکھ لو اور فوراً آجاؤ۔ کوئی ایسا بہانہ کرو کہ چراغ دین کو شبہ نہ ہو۔ یہاں آؤ گے تو سب بتا دوں گا۔ اور ہاں اپنے ساتھ وہ چابیاں لیتے آنا۔ وہی جن کے بارے میں پہلے میں نے کہا تھا کہ ابھی اپنے پاس رکھو۔ ہاں۔ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔" میں نے ریسیور رکھ دیا۔

"اپنی تو آج دہری ڈیوٹی ہو گئی ہے۔" سب انسپکٹر حشمت نے منہ پھاڑ کے جماہی لی۔ "آٹھ دن وخت پڑ جاتا ہے اس بیگار کا۔ میری جگہ میر محمد کو آنا تھا مگر ہے کہیں اس کا پتا؟ اوئے یار حوالدار۔۔۔ او دیکھ میاں میر محمد صاحب کیوں نہیں آئے؟ آج کون مر گیا ہے ان کا۔ ماما کہ مامے کا ماما۔" اس کی پکار پر ایک نئے حوالدار نے چق اٹھا کے جھانکا اور غائب ہو گیا۔

"بس جی آپ کی قسمت اچھی ہے کہ ہم بیٹھے ہیں۔" حشمت خاں نے کہا "میر محمد ہوتا تو آپ کو کب کا اندر کر چکا ہوتا اور وہ بڑا۔۔۔ ہے۔" اس نے ایک فحش گالی سے میر صاحب کا تعارف مکمل کیا۔ "وہ اپنے باپ کو کسی سے نہ ملنے دے۔ یہ جو آپ کا دوست آ رہا ہے نا اپنے اسلام آباد سے اس کو بھی ڈک دیتا۔ اور تمہارے چاچا سلامت شاہ کو بھی۔ اس کا تو کام ہی یہ ہے کہ پہلے سب کو ڈک دو۔ جو سامنے آئے بند کر دو۔ بعد میں چھڑانے والے کیا کر لیں گے۔ زیادہ سے زیادہ چھڑا کے لے جائیں گے۔ تو ایسے ہی یہ ہے کہ پہلے سب کو ڈک دو۔ آزادی کی قیمت دیں گے تو لے جائیں گے۔ منہ کو حرام لگ گیا ہے اس کے سکندر صاحب۔ اللہ معاف کرے۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے کانوں کو چھوا۔

ساڑھے پانچ بجے مجھے سلامت شاہ کا متوحش چہرہ نظر آیا۔ اس وقت تک میں کرسی پر بیٹھے بیٹھے بھی تھک چکا تھا۔

سلامت شاہ نے ڈرتے ڈرتے تھانیدار کو دیکھا اور سلام کے لیے ہاتھ اٹھایا۔ "مائی باپ! اسے کیوں پکڑ لیا ہے آپ نے؟" اس کی صورت رُونے والی ہو رہی تھی۔

"تو یہ ہے تمہارا چاچا سلامت شاہ؟" تھانیدار نے سلامت شاہ کو بغور دیکھا۔ "اسی نے تو ہمیں بتایا تھا کہ تم ریلوے اسٹیشن گئے ہوئے۔"

میں نے سلامت شاہ کو مختصراً وہ سب کچھ بتا دیا جو میرے نقطۂ نظر سے اس پر اپنی گرفتاری کے اسباب واضح کرنے کے لیے ضروری تھا۔ تقریباً یہی باتیں میں نے ٹیلی فون پر محسن سے بھی کی تھیں اور ان میں کوئی بات تھانیدار کے لیے نئی نہ تھی چنانچہ وہ بیزار ہو رہا تھا۔ چند منٹ بعد جب اسے یقین آ گیا کہ میں ایک معمولی خانساماں کے ساتھ مل کر فرار ہونے کا کوئی منصوبہ نہیں بنا رہا ہوں تو اس نے حفظِ ماتقدم کے طور پر میرے ہاتھوں کو پھر مقفل کیا اور کہا کہ ایس ایچ او صاحب کا کیا ہے کسی وقت بھی آ جائیں۔

"ایس ایچ او کون ہے؟" میں نے رضا کارانہ طور پر ہاتھ آگے بڑھا کے کہا۔

"آج کل تو دھاندلی میں میر محمد بنا ہوا ہے۔" وہ ہتھکڑی کا قفل لگا کے مطمئن ہو گیا۔ "اصل ایس ایچ او کو لائن حاضر کر دیا گیا تھا۔"

"لائن حاضر؟" میں نے اس اصطلاح سے بے خبری کے باعث کہا۔ "یعنی معطل؟ کیا غلطی ہوئی تھی ان سے؟"

"غلطی تو کوئی نہیں ہوئی تھی، تفتیش کے دوران ایک بندہ مر گیا تھا۔ وہ تھا بھی اتنا کمزور اور بیمار۔ اخبار والوں نے کیس خراب کر دیا۔" اس نے ٹوپی اٹھا کے سر پر جمائی۔ بہ آوازِ بلند حوالدار سے کہا کہ باہر بیٹھ کے حرام خوری کرنے کی بجائے اندر آ کے بیٹھے اور خود باہر نکل گیا۔

میں نے چند منٹ کے اس وقفے سے فائدہ اٹھایا۔ "چاچا! وہ چابیاں لائے ہو؟" میں نے آہستہ سے کہا۔

سلامت شاہ نے اقرار میں سر ہلایا اور جیب سے چابیاں برآمد کیں۔ "تم اپنے پاس رکھو گے؟"

"سب نہیں۔" میں نے کہا اور صرف لاکر کی چابیاں اٹھا کے اپنی پینٹ کی سامنے والی خفیہ جیب میں رکھ لیں۔ اسی وقت حوالدار اندر آ گیا اور سب انسپکٹر حشمت خاں کی کرسی پر جا بیٹھا۔ وہ نیا آدمی تھا اور اسے کوئی نذرانہ نہیں ملا تھا، چنانچہ اس کا انداز بہت جارحانہ تھا۔

"یہ چابیاں تم اپنے ہی پاس رکھو۔" میں نے کہا۔ "اس میں صندوق کی چابیاں ہیں نا۔ کل صبح تم صندوق میں سے سب پرانا زیور نکال کے بیچ دو اور رقم اپنے پاس رکھو۔"

"کیسا زیور؟" حوالدار نے کہا۔ "مال مسروقہ تو نہیں ہے جسے ٹھکانے لگا رہے ہو؟"

"زیور میری ماں کا ہے اور اسے میری دادی نے بنوا کر دیا تھا۔ وہ دونوں فوت ہو چکی ہیں۔" میں نے سکون سے کہا۔ "ورنہ معلوم ہو جاتا۔"

اسی وقت حشمت خان حق اٹھا کے اندر آیا۔ اس نے اپنی ٹوکری کو ایک غلیظ گالی دی اور ٹوپی اٹھا کے میز پر دے ماری۔

"چلو بس کرو۔" وہ گرج کے بولا۔ "چل بڈھے! دفع ہو۔ بہت باتیں کر لیں۔ اور کل صبح تھانے حاضر ہو جانا۔ اے ایس پی صاحب کے سامنے بیان ہو گا۔ آ جائے گا یا ڈنڈا ڈولی اسی وقت؟"

"آؤں گا کیوں نہیں مائی باپ! آنکھ کھلتے ہی سیدھا آ جاؤں گا۔" سلامت شاہ نے عاجزی سے کہا۔ وہ پولیس والوں کے عتاب سے محفوظ رہنے کا گر جانتا تھا۔ آنکھ کھلتے ہی اس کے آنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ ناشتہ وغیرہ بنا کے اسے زیور فروخت کرنا تھا چنانچہ وہ دس گیارہ بجے سے پہلے حاضر نہیں ہو سکتا تھا۔ تھانیدار نے کہا کہ وہ سات بجے تک آ جائے اور ایک بار پھر اسے دفع ہو جانے کا حکم دیا۔

"کیا بات ہے تھانیدار صاحب؟" میں نے اس کی واپسی اور بوکھلاہٹ دیکھ کے کہا۔

"تمہارا باپ ایس ایچ او آ رہا ہے۔" اس نے غرا کے کہا۔ "اٹھ اوئے بدمعاش ادھر سے۔ چل ملزم کو لے جا اور حوالات میں بند کر دے۔" اس نے حوالدار کو مخاطب کر کے کہا۔ خلوت میں نذرانے کی بدولت حاصل ہونے والی مراعات کا وقت ختم ہو گیا تھا اور اب میں سکندر صاحب سے پھر ملزم بن گیا تھا۔ سلامت شاہ نے مجھے خدا حافظ کہا اور بڑی عجلت میں روانہ ہو گیا۔ تھانیدار اسے بند کر دیتا تو کام خراب ہو جاتا۔

"تھانیدار صاحب! میرا یہ بریف کیس..." میں نے کہا۔ "یہ کس کی تحویل میں رہے گا؟"

"اسے امانت خانے میں رکھوا دیتے ہیں۔" اس نے بریف کیس کو دلچسپی سے دیکھا جس میں سے اس کے سامنے میں نے پانچ جمع دو پورے سات سو کے نوٹ نکالے تھے اور اب بھی کم سے کم دس گنا مالیت کے نوٹ ایک گڈی کی صورت میں موجود تھے۔

"اس میں چار ہزار تین سو روپے ہیں۔ میرا پاسپورٹ ہے۔" میں نے کہا۔

"فکر مت کرو، کوئی چیز ادھر سے ادھر نہیں ہو سکتی۔ یہ تھانہ ہے، مخول نہیں۔" وہ مونچھ پر ہاتھ پھیر کے بولا اور پھر حوالدار پر گرجا۔ "چل تو کیا منہ دیکھ رہا ہے۔ ابھی وہ میر محمد آ گیا تو سب کا خانہ خراب کرے گا۔"

چند منٹ بعد میں حوالات کی آہنی سلاخوں کے پیچھے تھا اور فرشِ خاک پر آلتی پالتی مارے یوں بیٹھا تھا جیسے لندن میں اپنے فلیٹ کے قالین پر دوستوں کے ساتھ مل کر تاش کی بازی جمانے کے لیے بیٹھتا تھا۔ میری جیب میں چالیس پینتالیس روپے تھے اور سگریٹ کا آدھے سے زیادہ پیکٹ تھا۔ میں نے سگریٹ جلانے کا ارادہ کیا اور ترک کر دیا۔ کون جانے میر محمد کو یہ بھی ناگوار گزرے اور وہ سگریٹوں کا پیکٹ بحق سرکار ضبط کرے تو رقم بھی ساتھ جائے۔ رات گزارنے کا یہ سہارا بھی نہ رہے اور رات کے کھانے کا بل تو شاید ادا ہو جائے۔ مگر ایک پیکٹ سگریٹ کا منگوانا پڑا۔ اور وہ بھی رات کے وقت تو شاید بیس کا ملے اور مجھے بریف کیس میں سے مزید رقم نکلوانی پڑے۔ یکلخت مجھے احساس ہوا کہ بریف کیس سرکاری تحویل میں چھوڑ کے میں نے عقلمندی کا ثبوت نہیں دیا۔ کم سے کم نوٹوں کی وہ گڈی مجھے اپنی جیب میں رکھ لینی چاہیے تھی مگر اب وقت ہاتھ سے نکل چکا تھا۔

سب انسپکٹر میر محمد جو قائم مقام ایس ایچ او بھی تھا، حشمت خاں کے مقابلے میں جوان آدمی تھا چنانچہ مجھے حشمت خاں کی معاندانہ گفتگو اور دھاندلی کی شکایت کا سبب معلوم ہو گیا۔ میر محمد بہت مضبوط قد اور کاٹھی کا جلاد صفت آدمی تھا جس کی صورت سے کمینگی ٹپکتی تھی اور یوں لگتا تھا، جیسے ساری دنیا کے خلاف بغض، حسد اور عداوت کے جذبات سے اس کی آنکھوں میں نفرت کا ایک جوالا مکھی بھڑک رہا ہے جس کے تاریک سایوں نے اس کے چہرے کو مسخ کر دیا ہے۔ اس نے حوالات میں موجود سب لوگوں پر ایک نگاہ ڈالی۔ رعونت سے مجھے کو دیکھا اور کچھ کہے بغیر اس کمرے میں گھس گیا جس پر 'ایس ایچ او' کی تختی لگی ہوئی تھی۔ چند منٹ بعد میں نے حشمت خاں کو ٹوپی جما کے اور بیلٹ کس کے اسی کمرے میں جاتے دیکھا اور سمجھ گیا کہ وہ اب میرے بارے میں معلومات حاصل کرے گا۔ پھر آدھے گھنٹے تک میں گرد و پیش کا مشاہدہ کرتا رہا۔ وہ دونوں زیرِ تفتیش ملزم جو مرغا بنے ہوئے تھے اب اندر دھکیل دیے گئے تھے۔ دنگا فساد اور مار پیٹ کے مقدمات لے کر آنے والوں کے دو گروہ اجتماعی طور پر ایک سو سات ستر کے تحت رپورٹ لکھوا کے زیرِ دفعہ ایک سو اکیاون بند ہوئے۔ مدعی اور مدعا علیہ میں کوئی فرق نہ رہا اور میں اس نظامِ انصاف کا مزید قائل ہوا جس میں شیر اور بکری ایک ہی گھاٹ کا یعنی حوالات میں رکھے ہوئے ڈرم کا پانی پی رہے تھے۔ دو افراد ایک سو نو میں آوارہ گردی کے ملزم بن کر مہمانِ سرکار ہوئے اور رات ہونے تک اس حوالات میں جملہ حاضرین کی تعداد بیس کے لگ بھگ ہو گئی۔ تھانے پہنچتے ہی میں نے جس شخص کو مرغے کی طرح پڑا دیکھا تھا وہ چوری کے شبے میں تین دن سے 'زیرِ تفتیش' تھا۔ جو حضرات گھٹنوں میں سر دیے بیٹھے تھے سٹہ کھیلتے پکڑے گئے تھے اور وہ جو مزے سے سگریٹ پی رہا تھا بنک ڈکیتی کی ایک واردات میں ملوث تھا۔ سنگین ترین جرم یعنی قتل کا اعزاز میرے ہی حصے میں آیا تھا اور جب میں نے دوسری سگریٹ سلگائی تو بنک ڈکیتی کے ملزم نے مجھ سے دوستانہ مراسم استوار کرتے ہوئے ایک سگریٹ مانگا۔ مجھ سے پوچھا کہ مجھ پر کیا الزام ہے اور قتل کی بات سن کے متاثر ہوا۔ تاہم عذرِ بے گناہی پر اس نے کہا کہ یہ تو سب کو کہنا پڑتا ہے مگر جو کچھ ان... کو کہلوانا ہوتا ہے۔ اس نے اسم صفت کے طور پر پولیس کے لیے اپنی لغت سے ایک نئی گالی کا استعمال کیا۔ وہ یہ کہلوا لیتے ہیں اور اگر آدمی سادے کاغذ پر انگوٹھا لگا دے تو بڑی بچت ہو جاتی ہے۔ اس نے مجھے بہت سے مفید مشورے بھی دیے جو سابقہ تجربات کا حاصل تھے اور جب میں نے اسے بتایا کہ میں نے اپنا بریف کیس چار ہزار تین سو روپے سمیت پولیس کے امانت خانے میں رکھوا دیا ہے تو وہ ہنستے ہنستے بے حال ہو گیا۔

"اوئے بھولے شہنشاہو! یہاں سالم بندا بلبلے کی طرح غائب ہو جاتا ہے، تمہارا بریف کیس کیا ہے۔ اوئے کھوتے... وہ چار ہزار تو اپنے سامنے میر کو دیتا تو تیری مشکل آسان ہو جاتی۔ تو آج رات تفتیش سے بچ جاتا۔" وہ پھر قہقہہ مار کے ہنسا۔

"تو کیا وہ امانت خانے میں محفوظ نہیں رہے گا؟" میں نے احمقوں کی طرح کہا۔

"کیسا امانت خانہ کہاں کا امانت خانہ۔ وہ دونوں... کے خصم آپس میں بانٹ لیں گے۔" وہ بولا۔ "ساتھ سو حوالدار کے، باقی تھانیدار کے۔ تیرے پاس کیا ثبوت ہے پیارے کہ تو کوئی بریف کیس لایا تھا، اور لایا تھا تو اس میں رقم بھی تھی؟"

میرے اندیشے بہت جلد درست ثابت ہو گئے تھے۔

"کیا یہاں رات کو بھی تفتیش ہوتی ہے؟" میں نے ڈوبتے دل کے ساتھ کہا۔

ڈکیتی کا ملزم پھر ہنسا۔ "کہاں سے آ رہا ہے تو پاگل دے پتر؟ ولایت سے؟ اوئے تفتیش رات کو نہیں تو کیا دن میں ہوگی سب کے سامنے؟"

اس گرگِ باراں دیدہ نے غلط نہیں کہا تھا۔ حشمت خاں کے جانے کے بعد میر ایک گھنٹے بیٹھا ضابطے کی کارروائیوں میں مصروف رہا۔ پھر اس نے کہا کہ وہ گشت پر جا رہا ہے اور ایک گھنٹے کے بعد آئے گا۔ ایس پی یا ڈی ایس پی صاحب کا فون آئے تو انہیں بتا دیا جائے کہ ڈکیتی کے باقی ملزموں کے بارے میں ایک مخبر کی اطلاع پر کہیں گئے ہیں۔ آٹھ بجے کے قریب حوالاتیوں کا کھانا آیا جسے کسی نے کھانا قبول نہیں کیا۔ بیشتر لوگوں نے گھر سے آئے ہوئے کھانے بھی لوٹا دیے جو اُن کے عزیزوں نے رشوت دے کر اندر پہنچائے تھے۔ پکڑے جانے والوں کے عزیز و اقارب مسلسل آتے جاتے رہے اور تھانے کے باہر جمع رہے۔ ساڑھے نو بجے میر پھر نمودار ہوا اور اس نے بہت سے افراد کو شرفِ باریابی بخشا۔ ڈکیتی کے ملزم نے مجھے مطلع کیا کہ یہ آج رات تفتیش سے بچانے کے مذاکرات ہو رہے ہیں۔ دس بجے کے قریب میں نے ایک شخص کو اندر جاتے دیکھا جس نے اپنا چہرہ دوسری جانب کر لیا تھا مگر وہ برآمدے کا زینہ چڑھ رہا تھا تب مجھے اوپر لگے ہوئے بلب کی زرد روشنی میں ایک لمحے کے لیے اُس کی صورت دکھائی دی تھی۔ نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگا جیسے میں نے اس کو پہلے بھی دیکھا ہے۔ میں نے ذہن پر بہت زور دیا مگر مجھے کچھ یاد نہ آیا۔ جب دس منٹ بعد وہ چق اٹھا کے باہر نکلا تو میں نے اس کی صورت پھر غور سے دیکھی۔ وہ پھر چہرہ چھپا کے تیزی سے برآمدہ عبور کر گیا تھا مگر اب میں نے اسے شناخت کر لیا۔ یہ وہی ٹیکسی ڈرائیور تھا جو مجھے ایئرپورٹ سے چراغ دین کی کوٹھی تک لے گیا تھا اور پھر میر شرافت علی کی کوٹھی کے باہر نظر آیا تھا تو میں اسے اتفاق سمجھا تھا۔ یکلخت میری آنکھوں پر سے وہ پردہ ہٹ گیا جو مفروضات اور حقائق کے درمیان حائل تھا۔

"سنتری! روکو اس شخص کو۔" میں نے حوالات کی سلاخوں کو تھام کر چلاتے ہوئے کہا۔ تھری نٹ تھری کی رائفل کو لاٹھی کی طرح تھام کر کھڑا ہوا سنتری اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ حوالات میں موجود بہت سے لوگوں نے دیوانگی کے اس مظاہرے پر سہم کر مجھے دیکھا۔ "محرر صاحب!" میں پھر چلایا۔ "یہ شخص کون تھا... یہ جو ابھی ابھی نکلا ہے؟"

"حوالدار!" میر شیر کی طرح کمرے میں سے دہاڑا۔ "یہ کون کتا بھونک رہا ہے؟" پھر وہ چق اٹھا کے باہر نکلا اور سیدھا میری طرف آیا۔ کچھ پوچھے بغیر اس نے باہر سے ہی میرے منہ پر ایک مکا رسید کیا۔ میں اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا۔ جب میں اٹھا تو میری ناک سے بہنے والا خون قطرہ قطرہ میری قمیص پر ٹپک رہا تھا۔

"یہ کس گستاخی کی سزا ہے؟" میں نے خون کو ہاتھ سے صاف کیا۔ "میں نے یہی تو پوچھا تھا کہ جو شخص ابھی ابھی آپ کے پاس سے اٹھ کر گیا ہے وہ کون تھا؟"

"کیوں پوچھا تھا؟ کون ہے تو؟ میرا باپ یا افسر؟" میر نے حسبِ ضرورت درمیان میں گالیوں کا اضافہ کرتے ہوئے گرج کر کہا۔

"اس شخص کا میرے مقدمے سے براہِ راست تعلق ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھ پر قتل کا الزام ہے اور مجھے شبہ ہے کہ اصل قاتل یہی ہے۔"

میر نے مجھے ایک درجن خوفناک گالیاں دیں۔ "تو نے سمجھ کیا ہے خود کو... تفتیشی افسر ہے تو یا ملزم؟ تیرے کہنے سے میں تھانے میں آنے والے ہر معزز شریف آدمی کو پکڑ کے بند کر دوں؟ تیرا کیا ہے، تو ڈی ایس پی صاحب کو کہہ دے گا کہ یہ اصل قاتل ہے۔"

"کیا یہ شخص ڈی ایس پی تھا؟" میں نے کہا۔ ڈکیتی کے ملزم نے میرا ہاتھ دبا کے مجھے خاموش ہو جانے کا سگنل دیا۔

"کون شخص؟" وہ دہاڑا۔ "یہاں تو میں پچاس آدمیوں سے مل چکا ہوں اور پچاس ابھی باہر کھڑے ہیں۔"

"یہ جو بھاری بدن والا، گھنگھریالے بالوں اور تلوار مارکہ مونچھوں والا ابھی ابھی نکلا تھا، جس نے ایک کان میں مندری پہن رکھی تھی۔ کالی لال دھاریوں والی قمیص اور شلوار" میں نے بضد رہتے ہوئے کہا اور خطرے کے سگنل نمبر دو کو بھی نظرانداز کر دیا۔ "کیا نام تھا اس کا؟ میں اسے جانتا ہوں، یہ ٹیکسی ڈرائیور ہے اور اس کی ٹیکسی کا نمبر ہے فور تھری فور تھری۔ ایل ای..."

میرے سر پر کوئی چیز توپ کے گولے کی طرح لگی۔ میر نے قریب سے گزرنے والے ایک کانسٹیبل سے لکڑی کا ڈنڈا لے کر اتنی پھرتی سے کھینچ مارا تھا کہ مجھے حیران ہونے کی فرصت بھی نہ ملی تھی۔ ایک لمحے کے لیے میری نظروں کے سامنے اندھیرے کے سوا کچھ نہ رہا۔ میر کی آواز کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ "اس... کو لاؤ ذرا... یہ کیا کہتا ہے۔ ذرا ہم اچھی طرح سمجھیں اور نئی بات بھی سمجھا دیں۔"

حوالات کا قفل کھلا اور دو ہاتھوں نے مجھے اٹھا لیا۔ میں نے سر کو جھٹکا اور دھندلکا کچھ کم ہوا۔ ڈکیتی کے ملزم کی آواز آئی۔ "اوئے کھوتے! کتنی دیر سے سمجھا رہا تھا میں۔ پہلی بار تھانے آیا ہے کچھ اپنی عقل سے نہیں تو دوسروں کی عقل سے کام لے۔"

میں نے محسوس کیا کہ حوالات میں رہ جانے والوں کی دہشت زدہ نظریں مجھے یوں دیکھ رہی ہیں جیسے مجھے تختۂ دار کی جانب لے جایا جا رہا ہے۔ سفر کا انجام نیم روشن برآمدے کے آخری دروازے پر ہوا جو ایک طرح سے تفتیش کی ریسرچ لیبارٹری تھی اور جو سامان میں نے وہاں مستعمل دیکھا اگر وہ لندن کے اسکاٹ لینڈ یارڈ کے سراغرساں بھی دیکھتے تو ہماری پولیس کی ذہانت، جدتِ طبع اور صلاحیت پر دنگ رہ جاتے۔ مجھے وہاں لانے والے کانسٹیبل اور ہیڈ کانسٹیبل سادہ کپڑوں میں تھے اور اپنی صورت شکل سے بالکل آدم خور لگتے تھے۔ انہوں نے مجھے دھکا دے کر ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ یہ لوہے کی مضبوط کرسی تھی جس کے پائے سیمنٹ کے فرش میں نصب تھے۔ میرے احتجاج اور سوال کرنے سے ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ گالیاں ان کے لیے زبان و کلام کا ناگزیر جزو تھیں، اور انہیں احساس بھی نہیں ہوتا تھا کہ وہ فحش زبان استعمال کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ مجھ پر مکوں اور تھپڑوں کی بارش بھی ہو رہی تھی۔ اگر میں مشتعل ہو جاتا تو جوڈو کے ایک معمولی سے داؤ سے ان دونوں کو لمبا لٹا دیتا مگر اس کے بعد میرے لیے اس عذاب سے کہیں مفر نہ تھا جس کا معمولی سا نمونہ میں دیکھ چکا تھا۔ میں تھانے سے نکل کے بھاگ نہیں سکتا تھا اور بفرضِ محال بھاگ جاتا تو چھپ کے کہیں بھی نہیں رہ سکتا تھا۔

ایک بار پھر مجھے تمام کپڑوں سے محروم کر کے کرسی کے ساتھ یوں جکڑ دیا گیا کہ سر کے سوا میں جسم کے کسی حصے کو جنبش تک نہیں دے سکتا تھا۔ پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ سرِعام بے لباس ہوتے ہی آدمی خود اپنی نظر میں کتنا بے آبرو ہو جاتا ہے، کتنا گر جاتا ہے اور عزتِ نفس نہ رہے تو خود اعتمادی بھی نہیں رہتی۔ بے عزت کر کے ننگا کر دینے کا یہ نفسیاتی حربہ کسی بھی شریف آدمی کی ذہنی قوتِ مزاحمت کو شکست دے سکتا ہے۔ بات صرف جگر کی یا رویے کی ہے ورنہ کسی ڈاکٹر کے سامنے میڈیکل چیک اپ کے لیے کپڑے اتارنے والا میرے جیسا شخص اپنے صحت مند جسم پر کسی احساسِ ندامت میں نہیں احساسِ تفاخر میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ کمرے میں دو کرسیاں اور بھی تھیں جو ایک چھوٹی سی میز کے ساتھ لگی ہوئی تھیں۔ وسط میں بنچ ٹائپ لمبی سی میز تھی اور اس کے پائے بھی فرش میں پیوست تھے۔ ایک کونے میں خون آلودہ رسیاں اور زنجیریں پڑی تھیں۔ وہیں ایک گز لمبے دستے والا ایک چمچہ بھی کھڑا تھا۔ چمچے کی جگہ اس کے آخری حصے میں لوہے کا گول پیالہ تھا۔ اس کے علاوہ لکڑی کے چھوٹے بڑے پتلے اور موٹے، لچکدار اور چکنے ہر قسم کے ڈنڈے رکھے تھے۔ دیوار کی جانب مجھے لوہے کی چار بالٹیاں بھی معلق نظر آئیں جن کے سرخ پینٹ پر سفید رنگ سے 'فائر' لکھا ہوا تھا مگر ان میں سے کسی میں ریت نہ تھی اور پانی نہ تھا کہ ان کو آگ بجھانے کے لیے استعمال کیا جا سکتا۔ یہ سب 'سامانِ تفتیش' تھا، جس کا تھانے کے باہر سڑک پر گزرنے والا آدمی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ مجھے فرش اور دیواروں پر مختلف قسم کے داغ نظر آئے جو اس نیم روشن کمرے کے آسیب زدہ ماحول میں مجھے لہو کے داغ لگے۔ ان سب کا لہو جو یہاں تفتیش کے لیے لائے اور لے جائے گئے۔ مُردہ یا نیم مُردہ۔ اسٹریچر پر یا مرے ہوئے کتے کی طرح ٹانگ سے گھسیٹ کر۔ مجھے دیواروں کے وجود میں ان گنت چیخوں اور کراہوں کے خونی ٹکڑے دفن نظر آئے۔

اسی وقت میر اندر آیا اور اس نے دروازے کو اندر سے بند کر کے چٹخنی لگا دی۔ میں اب ذہنی طور پر تشدد کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے بعد محسن آ جائے گا۔ اس کے باپ نے اب تک یقیناً کسی نہ کسی کو فون کر دیا ہوگا ورنہ محسن خود کسی کے نام رقعہ لے کر آئے گا۔ صبح وکیل آ جائے گا اور لاقانونیت کا یہ سلسلہ میرے لیے تمام ہو جائے گا۔ دوسروں کے لیے چلتا رہے گا۔

"میر صاحب!" میں نے کہا۔ "صبح تک آپ کو معلوم ہو جائے گا..." ابھی میرا جملہ بھی مکمل نہیں ہوا تھا کہ اس کا ہاتھ میرے منہ پر پڑا۔ میرا سر جھٹکے سے کرسی کی پشت پر لگا اور کمرہ میرے سامنے ڈولنے لگا۔

"ہاں بھئی، کیا پتہ چل جائے گا؟" وہ بولا۔ اس نے زمین پر سے ایک ڈنڈا اٹھایا اور اپنے دونوں مددگاروں کو اشارہ کیا جو اس کی خاموش زبان کا مفہوم سمجھتے تھے۔ ان میں سے ایک نے دونوں ہاتھوں سے میری ناک اور ٹھوڑی

کو کھینچ کر میرا منہ کھولا۔ میر نے وہ ڈنڈا میرے حلق میں ٹھونس دیا۔

"ہاں بول استاد! کیا معلوم ہوگا؟ صبح تو بہت دور ہے ابھی بتا دے...." وہ ڈنڈے پر دباؤ بڑھاتا گیا۔ ڈنڈا اب میرے حلق میں پھنس گیا تھا اور اذیت سے میرا جسم اینٹھ رہا تھا۔ ڈنڈے کا سرا گول اور چکنا تھا چنانچہ میرے حلق میں کہیں زخم نہیں آیا تھا مگر مجھے یوں لگتا تھا جیسے میرے معدے سے ہر چیز حلق کے راستے باہر آجائے گی۔ ایک منٹ بعد اس نے ڈنڈا واپس کھینچا تو میں نے گہرا سانس لیا اور بے سدھ ہوگیا۔ تھک کر میرا جسم پسینے میں ڈوب گیا تھا جیسے میں نے چلچلاتی دھوپ میں پہاڑ کی چوٹی تک سفر کیا ہے۔

"میر محمد...." میں نے کہا "تمہیں کتنا پیسہ چاہیے.... بولو اس آدمی کا نام بتانے کی قیمت کیا ہے۔ وہ ٹیکسی ڈرائیور...."

"میں ایسے کسی آدمی کو نہیں جانتا۔" وہ چیخ کر بولا۔ "کون ٹیکسی ڈرائیور؟ آج کوئی مندری والا، کوئی لال کالی دھاریدار قمیص والا مجھ سے ملنے نہیں آیا۔" اس نے میرے منہ پر تھوک دیا۔

"تم جان بوجھ کے اس کی پشت پناہی کر رہے ہو۔" میں نے کہا۔ "جتنا پیسہ اس نے دیا ہے میں اس سے دُگنا دوں گا۔"

اس کے بعد میرے ساتھ وہ ہوا جس کا ذکر ہی ذلت آمیز ہے۔ غصے اور صدمے سے میرا دماغ ماؤف ہوگیا۔ میں نے خود کو اس غلاظت سے بچائے رکھنے کی بھرپور جدوجہد کی مگر میں بندھا ہوا تھا اور میرا چہرہ میر کے ماتحت گوریلے نے اتنی سختی سے پکڑ رکھا تھا کہ میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میں بھول گیا کہ میں لندن میں انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والا فوزیہ کا ہونے والا شوہر۔ میر وزیر اینڈ کمپنی کا ہونے والا مالک ہوں۔ میں حیوانیت کی نچلی سطح سے بھی نیچے ہوگیا جب یہ سزا تمام ہوئی تو الٹیاں کرنے سے میرا سارا جسم غلاظت سے لتھڑ چکا تھا اور میرے جسم کی توانائی اس حد تک زائل ہوچکی تھی کہ میرے لیے سر کو سیدھا رکھنا دشوار تھا۔

"ہاں بھئی! کس کا پوچھ رہا تھا تو؟" میر نے اطمینان سے سگریٹ جلائی اور جلتی ہوئی تیلی کو میری ٹانگوں کے درمیان لے آیا۔ میرے نتھنوں میں بال جلنے کی بُو آئی۔

"وہ.... میں.... اسے بس.... اسے میں پہچانتا ہوں میر صاحب....!" میں نے بمشکل تمام کہا۔

"میر شرافت علی کو کیوں قتل کیا تھا تو نے؟" وہ سگریٹ کا کش لے کر بولا۔ "کیا دشمنی تھی تیری، اور کون تھا تیرا ساتھی؟"

"کوئی.... کوئی نہیں.... وہ.... وہ میرے باپ کا قاتل.... تھا.... بلیک میلر تھا.... مگر میں نے اسے نہیں

مارا۔" میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔

لوہے کی ایک بالٹی میرے سر پر آگئی۔ میں نے کسی پاگل کتے کی طرح رونا شروع کیا۔ میں جانتا تھا اب کیا ہو اور اس بے بسی کے عالم میں گالیاں اور دھمکیاں دینے کے سوا میں کیا کر سکتا تھا لیکن اس مرتبہ کسی نے بالٹی کو نہیں کوٹا اور میں پہلی ضرب کے انتظار میں ہی رہا۔ مگر چند لمحوں کا انتظار ایک گھڑی کا اندوہناک عذاب بن گیا۔ پھر ایک عجیب سی بُو آئی۔ بالٹی کے کنارے میرے کندھوں تک آگئے تھے چنانچہ میں اس کنگ سائز، فولادی ترکی ٹوپی کے اندر سر کو ادھر اُدھر گھمانے کے باوجود کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا کیا ہو رہا ہے اور مجھ پر کیا تازہ ستم ٹوٹنے والا ہے۔ پھر وہ ایک دستے والا چمچہ عین بالٹی کے نیچے آگیا جس میں سے دو گاڑھا دھواں اٹھ رہا تھا۔ یہ دھواں سیدھا اوپر اٹھا اور بالٹی میں بھرنے لگا۔ کڑچھے کے دہکتے ہوئے انگاروں کی حدت میرے چہرے تک پہنچ رہی تھی اور میں سُرخ انگاروں کی چمک دیکھ بھی رہا تھا لیکن سر کو ادھر اُدھر ہلا کے دھوئیں سے بچنا محال تھا۔ اس دھوئیں کی بدبُو سے میرا دماغ پھٹنے لگا۔ بالٹی میں دھواں ہی دھواں ہوگیا تو تازہ ہوا کی جدوجہد میں میرا سینہ دھونکنی کی طرح چلنے لگا۔ میرا جسم دم گھٹنے سے اینٹھنے لگا اور میں سر کو اس قاتل دھوئیں سے بچانے کے لیے ادھر پٹخنے لگا جیسے مجھ پر حال طاری ہو لیکن اس طرح اپنے سر کو بالٹی کے اندر بجانے سے مجھے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ مجھ پر بے ہوشی طاری ہونے لگی۔ یا شاید میری زندگی کا چراغ گل ہونے لگا۔ اس نزع کے عالم میں ایک آواز مسلسل مجھ سے سوال کر رہی کہ میں نے میر شرافت علی کو کیوں قتل کیا؟

چند منٹ بعد مجھے پھر ہوش آیا تو وہ بدبودار دھواں ختم ہوچکا تھا مگر بالٹی اسی طرح میرے سر پر سوار تھی۔ وہ بدبو میرے حواس پر چھا گئی تھی اور میرے دماغ میں اس طرح بس گئی تھی کہ مجھے متلی سی محسوس ہوتی تھی لیکن میرے پیٹ میں جو کچھ تھا وہ پہلے ہی نکل چکا تھا۔ اب میرا حلق خشک ہو رہا تھا اور میں "اوق.... اوق...." کر کے ابکائیاں لے رہا تھا۔

"میر صاحب.... میر صاحب...." میں نے بالٹی کے اندر گنگنا کر کہا۔ "قسم خدا کی.... اس کے رسولؐ کی اور اس کی کتاب کی.... اگر آپ مسلمان ہیں.... تو یقین کیجیے میں نے میر شرافت علی کو قتل نہیں کیا....۔" ہر لفظ میں نے رک رک کر بڑی کوشش سے ادا کیا تھا۔

جواب میں مغلظات کا سیلاب امڈ آیا۔ "یہی بکواس کیے جاتا ہے۔ اے ایس پی صاحب کا حکم ہے کہ ملزم جب تک قتل کا اعتراف نہ کرے اور تحریری بیان نہ دے پوچھ گچھ جاری رکھو اور اگر تو نے اقبال جرم نہ کیا تو اندر باہر سے فرق نہیں پڑتا۔ تجھے زندہ نہیں چھوڑا جائے گا۔"

"یہ دھمکی ہے یا اے ایس پی صاحب کا حکم ہے؟" میں نے اپنی ذہنی توانائی کو مجتمع کر کے سوچا۔ کیوں؟ کیا انہیں علم نہیں کہ زبردستی حاصل کیے جانے والے اس اعترافِ جرم کی کوئی اہمیت نہیں؟ اور انہیں صرف اقبالِ جرم ہی سے کیوں دلچسپی ہے اصل قاتل کی گرفتاری سے کیوں نہیں....؟

"میں.... میں بات کروں گا.... میر صاحب.... آپ بتائیں...." میں نے گڑگڑا کے کہا۔ "کیا کہنا ہے.... کیا لکھنا ہے مجھے؟"

بالٹی میرے سر پر سے اتر گئی اور میں نے دیکھا کہ کمرے میں اب چار ملزم اور بھی لائے گئے ہیں جو کھڑے کانپ رہے ہیں۔ ان میں دو وہی تھے جن کو میں نے مرغا بنا دیکھا تھا اور دو میری آمد کے وقت حوالات میں گھٹنوں میں سر دیے بیٹھے تھے۔ میر محمد نے ایک پیر کرسی کی بجائے میری ران پر رکھا۔

"میر شرافت علی تیرے باپ کو بلیک میل کرتا تھا اس لیے تو نے اسے قتل کر دیا۔ یہ بیان نہیں چلے گا۔ بیان یہ ہوگا کہ میں پوری فرم کا مالک بننا چاہتا تھا۔ اس کے سوا ایک لفظ نہیں۔ کسی کا نام کسی کا حوالہ نہیں۔"

اتنے لوگوں کی موجودگی میں اپنی قابلِ رحم حد تک مضحکہ خیز حالت کے احساس نے مجھے پھر مشتعل کر دیا۔ "میر صاحب۔" میں نے کہا۔ "یہاں آپ دس بار مجھ سے اپنی مرضی کا بیان لے لیں عدالت میں میرا بیان وہی ہوگا جو حقیقت پر مبنی ہوگا اور اس میں بہت سے نام اور بہت سے حوالے آئیں گے۔ بہت سے واقعات کا تذکرہ ہوگا۔ میرے باپ کو بلیک میل ہی نہیں قتل بھی کیا گیا ہے۔ میں یہ بھی معلوم کروں گا کہ وہ مندری والا کون تھا۔ جس کی تلوار مار کر مونچھیں تھیں اور جو سُرخ سیاہ دھاریوں کی قمیص پہن کے آیا تھا۔ میں اس کی ٹیکسی کا نمبر نہیں بھول سکتا....!"

میر بڑا اچھا ایکٹر تھا۔ وہ میری ساری بات یوں سنتا رہا جیسے میں کوئی دلچسپ لطیفہ سنا رہا ہوں اور مسکراتا رہا۔ پھر اس نے اچانک سر کے بال پکڑ کے مجھے جھٹکے دینے شروع کیے اور میرے سر کو کرسی کی پشت سے ٹکرانے لگا۔ اس کے دوسرے ہاتھ نے میرے جسم کے حصّوں کو شکنجے کی طرح جکڑ کے مروڑنا شروع کیا۔ میں بُری طرح بلبلایا، لیکن اس نے اپنا عمل جاری رکھا۔ مجھے یوں لگتا تھا کہ میرے سر کے بال ٹوٹ کر اس کے ہاتھ میں آجائیں گے اور میں ہمیشہ کے لیے ناکارہ ہو جاؤں گا۔ وہ اپنے کام کا ماہر تھا اور جانتا تھا کہ آدمی کی قوتِ برداشت کہاں تک ساتھ دیتی ہے۔ میں بُری طرح چیخنے اور اچھلنے لگا تو کسی تیسرے ہاتھ نے میرے حلق سے نکلنے والی آوازوں کو روکنے کے لیے میرے منہ میں کوئی چیز ٹھونس دی۔ میں نے دیکھا تو وہ گوبر سے بنے ہوئے خشک اُپلے تھے جو تھانے میں حقہ گرم کرنے کے علاوہ اس دوسرے کام کے لیے بھی جمع رہتے تھے۔ خشک گوبر میرے حلق سے سانس کی نالی میں بھی اتر گیا اور میں سانس لینے کی جدوجہد میں بُری طرح کھانسنے چھینکنے لگا۔ پھر وہ عذاب ایک دم تمام ہوگیا۔

جب میں نے پھر آنکھیں کھول کے دیکھا تو مجھے یوں لگا جیسے میں جہنم میں جنت کا خواب دیکھ رہا ہوں۔ صحرا میں پیاس سے دم توڑنے والے کو بھی تو پانی نظر آتا ہے، جب کہ اس کی حدِ نگاہ میں جھلستی ریت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ میں نے آنکھیں پھر بند کرلیں اور دوبارہ کھولیں تو منظر وہی تھا۔ میں اس کمرہ تفتیش میں لکڑی کی بینچ پر الٹا پڑا تھا اور میر محمد کے دونوں معاون پانی کی بالٹی سے لوٹا بھر بھر کے مجھ پر ڈال رہے تھے۔ یہ نیم گرم پانی تھا جو میرے درد سے ٹوٹتے بدن کو بڑی راحت دے رہا تھا اور میرے بندھے ہوئے جسم کے وہ اعضا جو کرب میں زور لگانے سے پکے ہوئے پھوڑے کی طرح دُکھتے تھے اس غسلِ صحت سے شفا پا رہے تھے۔ بڑی پھرتی سے انہوں نے میرے جسم سے ساری غلاظت دھو ڈالی۔ پھر ایک نے کسی زیرِ تفتیش ملزم کے کپڑوں سے رگڑ کے میرے بدن کو خشک کیا۔ میں نے ان کے کام میں کسی قسم کی مداخلت یا مزاحمت نہیں کی۔ میرا ناک منہ چہرہ سب صاف ہوگئے تھے لیکن میرے احساس میں ہر بدبو اور تمام غلاظت بدستور موجود تھی۔ میں خود کو آدمی کے بجائے گٹر کے گندے پانی کا کیڑا سمجھ رہا تھا اور قطعی بے حسی کے ساتھ اس انسانیت سوز منظر کو دیکھ رہا تھا جو میرے روبرو تھا۔ آہنی کرسی پر اب میری جگہ دوسرا شخص بیٹھا تھا اور جو کچھ میرے ساتھ ہوچکا تھا وہ اس کے ساتھ ہو رہا تھا۔

میر جا چکا تھا اور تفتیش کا یہ سلسلہ ایک نئی ٹیم کی نگرانی میں چل رہا تھا جس کی قیادت رات کے آخری حصے میں ڈیوٹی پر آنے والے ایک باریش اے ایس آئی نے سنبھال رکھی تھی۔ اس کمرے کے دوسرے کونے میں بیک وقت دو افراد

سے تفتیش ہو رہی تھی۔ یہ وہی دونوں تھے جن کو میں نے مُرغا بنا دیکھا تھا۔ تفتیش کے اس عمل میں پسی ہوئی سُرخ مرچ، سرسوں کا تیل اور وہ ڈنڈے جس طرح استعمال ہو رہے تھے اس کو دیکھ کر ہی میرے بدن میں لرزہ طاری تھا مگر وہ جو تختۂ مشق بنے ہوئے تھے چلا بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ ان کے منہ میں کچھ ٹھونس دیا گیا تھا اور ان کو بالکل گٹھری بنا کے باندھ دیا گیا تھا یوں کہ ان کے سر ان کی گردن کے ساتھ جا لگے تھے اور جب انھیں چھوڑا جاتا تھا تو وہ فرش پر لوٹن کبوتر ہو جاتے تھے۔

میرے مددگار اس سب سے بے نیاز اپنے کام میں مصروف تھے۔ ان میں سے ایک کپڑے لے کر آیا۔ دوسرے نے جیب سے دو گولیاں نکالیں اور پانی کے ایک گلاس کے ساتھ ہتھیلی پر رکھ کے آگے بڑھائیں۔ میں نے ہاتھ مار کے گلاس اور گولیاں نیچے گرا دیں۔ مجھے یقین تھا کہ وہ کوئی ایسا زہر ہوگا جس سے میرے جسم کے اندرونی اعضا کو ناقابلِ تلافی نقصان ہوگا یا میں ان کو کھا کے سخت اور ناقابلِ برداشت قسم کی تکلیف میں مبتلا ہو جاؤں گا۔ کانسٹبل نے مجھے گندی گالی دی اور پھر پانی کا گلاس بھر کے لایا۔ جیب سے مزید دو گولیاں برآمد کیں اور اس بار میرے جبڑے کھول کے زبردستی حلق سے یوں اتار دی گئیں جیسے جانوروں کو دوا دی جاتی ہے۔

"یہ زہر نہیں اسپرین ہے۔ درد مٹانے والی گولی ــ" دوسرے شخص نے نسبتاً معقولیت سے کہا جو میرے کپڑے اٹھا کے لایا تھا۔ میرے سامنے اس نے جیبوں کی تلاشی لے کر تمام رقم اپنی جیب میں منتقل کی۔ سگریٹ کی ڈبیہ اور لائٹر اس نے دوسرے ساتھی کو پیش کر کے اپنی سخاوت کا مظاہرہ کیا اور مجھ سے کہا کہ میں کپڑے پہن لوں۔ وہ دونوں میری ڈبیہ سے ایک ایک سگریٹ سلگا کے کھڑے ہو گئے اور میں نے نقد رقم پر بھی لعنت بھیجی کیونکہ اصل چیز یعنی لاکر کی چابی بچ گئی تھی اور میری کلائی کی گھڑی موجود تھی۔ ابھی میں کپڑے پہن ہی رہا تھا کہ ایک شخص چائے کی ٹرے لیے اندر آیا۔ چائے کے ساتھ بسکٹ بھی تھے "یہ کھا پی لو فٹافٹ" وہ بولا۔

کپڑے پہنتے ہی میری حالت میں زبردست انقلاب رونما ہوا۔ میں ایک بار پھر خود کو آدمی سمجھنے لگا۔ معزز، تعلیم یافتہ اور شریف آدمی۔ اسپرین کی گولیوں کے اعجازِ مسیحائی نے جلدی اپنا اثر دکھایا اور میرے جسم کا درد کم ہونے لگا۔ میں نے بدذائقہ بسکٹ نگلے اور گرم چائے ایک سانس میں چڑھا گیا۔ میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت تیزی سے بحال ہونے لگی اور جب میں نے گھڑی دیکھی تو 'تفتیش' کے تمام ہو جانے کا اور اس مہمان نوازی کے بدلے ہوئے انداز کا مطلب میری سمجھ میں آگیا۔ رات کے ایک بج کر دس منٹ ہوئے تھے یقیناً محسن آ پہنچا تھا اور اب پولیس مجھے اس کے سامنے بالکل تر و تازہ اور صحت مند حالت میں پیش کر کے یہ ثابت کرنا چاہتی تھی کہ میرے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہیں ہوئی۔ یہ ان کے روز کا معمول تھا اور میرے جیسے لوگ جو کبھی اس عقوبت خانے میں نہیں پہنچے تھے اس وقت بھی اپنے اپنے گھروں میں چین سے سو رہے تھے یا بڑے بڑے ہوٹلوں اور کلبوں میں بیٹھے تھے یا کسی لالہ رُخ کے کاشانے میں دادِ عیش دے رہے تھے یا کاروں میں ان خوبصورت لڑکیوں کے ساتھ گھوم رہے تھے جن کے رنگیں پیرہن سے رات کا ہر لمحہ رنگین تھا اور جن کی زلفوں کی مہک سانسوں میں نشہ بن کے اترتی تھی معصوم بچے سوتے میں خواب دیکھ کر ہنس رہے تھے اور ٹرینوں میں خوابیدہ مسافر، ہوائی جہازوں میں محوِ پرواز مسافر اور سمندری جہازوں پر محوِ تماشا مسافر سب اپنی اپنی منزلوں کی طرف بڑھ رہے تھے ــ کارخانوں کی نائٹ شفٹ چل رہی تھی، ہسپتالوں میں انسان مر رہے تھے اور جنم لے رہے تھے اور یہ سب کل بھی ایسے ہی تھا جیسے آج ہے یا پھر کل ہوگا۔ سوائے ان سب کے لیے جو زیرِ تفتیش نہیں یہ دنیا بدستور خوبصورت اور یہ زندگی جینے کی آرزو کے قابل ہے۔

میرے جسم پر ایک خراش بھی نہیں تھی۔ کسی چوٹ کا نشان نہیں تھا اور کوئی نیل نہیں پڑا تھا۔ میرے بالوں میں کنگھی کر دی گئی تھی۔ میں اپنے کپڑوں میں بالکل ویسا ہی سکندر بخت تھا جسے ریل کار سے اتارا گیا تھا۔ جب میں دو سپاہیوں کی معیت میں اس کمرے سے نکلا اور برآمدے میں آیا تو میرے ہاتھوں پر ہتھکڑی تھی۔ وہ مجھے حوالات کی طرف لے جانے کی بجائے ایس ایچ او کے آفس کی طرف لے گئے جہاں میری توقعات کے عین مطابق محسن رضا موجود تھا وہ بڑی بے تابی سے اٹھا اور میرے گلے لگ گیا "سکندر! تو ٹھیک ہے نا...؟" اس نے مجھے اپنے ہاتھوں سے ٹٹول کر دیکھا۔ "تجھے کچھ ہوا تو نہیں ہے نا؟ میں ذرا دیر سے پہنچا لیکن تو فکر نہ کر۔ میں نے سب ٹھیک کر لیا ہے..." وہ مجھے بولنے کا موقع دیے بغیر بولتا جا رہا تھا اور اس کی حرکات و سکنات سے اس کی دلی بے قراری کا اظہار ہوتا تھا "آخر یہ ہوا کیا؟"

"آپ خواہ مخواہ پریشان تھے" میر نے بڑی عیاری سے مسکرا کے کہا "ہم پر خواہ مخواہ گرم ہو رہے تھے۔ دیکھ لیا

کچھ نہیں ہوا ہے ان کو"

"محسن!" میں نے اطمینان اور سکون کی گہری سانس لے کر کہا۔ "جو کچھ میرے ساتھ ہوا ہے وہ میں تجھے بعد میں تفصیل سے بتاؤں گا۔ تو آگیا، یہ میرے لیے سب سے بڑا سہارا ہے ورنہ اتنے بہت سے موذی اور سفاک درندوں اور بے ضمیر دشمنوں کے درمیان میں بہت اکیلا تھا۔ میں ان سب سے قانونی جنگ لڑ سکتا ہوں اور وہ سامنے آ کے مقابلہ کریں تو اکیلا ہی دس سے نمٹ سکتا ہوں مگر وہ دوسرے ہتھکنڈے آزما رہے ہیں۔ سازش کا مقابلہ سازش اور جوڑ توڑ کا مقابلہ جوڑ توڑ سے کیا جا سکتا ہے لیکن جس شخص کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ہے وہ آدھا آدمی بھی نہیں ہے بلکہ سرے سے آدمی ہی نہیں ہے صرف ملزم ہے۔ تو ابھی باہر ہے اور آزاد ہے چنانچہ تجھے بہت کچھ کرنا ہے۔ آج تو میں مجبور تھا۔ کل ہم بھی دھن، دھونس اور دھاندلی کی طاقت آزمائیں گے اور قانون کا سہارا لیں گے، پھر پتہ چلے گا کون سُورما ہے اور کون کتنے پانی میں ہے۔"

میر بالکل بے تعلق بیٹھا زیرِ لب مسکراتا رہا جیسے وہ کچھ اور سوچ رہا ہے اور یہ بات نہیں سن رہا ہے جس کا تعلق اس کی اپنی ذات سے ہے۔ میرے لہجے میں غیر ارادی طور پر وہ درد و کرب اتر آیا تھا جو تفتیش کے عذاب نے دیا تھا اور یہ بات محسن سے چھپی نہ رہ سکی۔

"مسٹر میر محمد!" وہ بولا "نظر ملا کے بات کرو۔ کیا تم نے سکندر پر تشدد کیا ہے، بقسم خدا کی...!"

"رہنے دے محسن!" میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "اکیلا چنا بھاڑ کو نہیں پھوڑ سکتا۔ جو ہونا تھا ہو چکا اور تو اب اپنی توانائی کو اور اپنی صلاحیت کو آئندہ کے لیے محفوظ رکھ۔ یہی کیا کم ہے کہ میں اس وقت زندہ سلامت تیرے سامنے موجود ہوں اور تجھے سب کچھ بتا سکتا ہوں ورنہ میرے باپ کی قبر نے تو مجھے کچھ نہیں بتایا۔ تجھے بھی میری لاش مُردہ خانے میں ملتی تو کیا بتاتی۔ حشمت کی طرح میر صاحب بھی یہی کہیں گے کہ افسرانِ بالا کے حکم کے سامنے ہم مجبور ہیں اور نہیں بھی نوکری تو کرنی ہے۔ اپنا پیٹ اور بیوی بچوں کو تو پالنا ہے۔ ان سے کچھ نہ پوچھو۔ یہ بے چارے ہم سے زیادہ مظلوم اور بے بس ہیں۔ ناحق ان مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی ــ الزام ہے تھانیداری کا۔"

"مسٹر میر محمد! میں سکندر بخت سے علیحدگی میں بات کرنا چاہتا ہوں" محسن نے اسے گھور کے کہا۔

میر نے نفی میں سر ہلایا "جب تک ملزم ہماری تحویل میں ہے قواعد و ضوابط ـــ"

"کون سے قواعد و ضوابط؟" محسن نے سو کا ایک نوٹ میز پر رکھا اور ایک ہاتھ سے دبا لیا۔ اس کا دوسرا ہاتھ ٹیلیفون کی طرف گیا "فیصلہ کر لو کہ کیا چلے گا، یہ... یا یہ؟"

میر کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر اس نے اطمینان سے نوٹ جیب میں رکھا، زیرِ لب مسکرایا اور باہر نکلنے ہی والا تھا کہ میں نے اسے روک لیا۔

"انسپکٹر میر محمد!" میں نے کہا "جب میں یہاں آیا تو میرے پاس ایک بریف کیس تھا جو میں نے سب انسپکٹر حشمت خاں کے کہنے پر امانت خانے میں رکھوا دیا تھا اس میں چار ہزار تین سو روپے نقد تھے، میرا پاسپورٹ تھا اور کچھ کپڑے تھے۔"

میر رک گیا اور اس کی صورت چغلی کھانے لگی کہ چار ہزار تین سو کی خطیر رقم نہ ملنے کا اور حشمت خاں کے ہاتھ لگ جانے کا اسے کتنا صدمہ ہوا ہے۔ "تھانے میں تو کوئی امانت خانہ نہیں ہوتا" وہ بولا "حشمت صبح آ جائے گا، اسی سے پوچھ لینا۔"

"اس کا جواب غالباً یہ ہوگا کہ وہ بریف کیس گھر تو نہیں لے گیا تھا، تھانے ہی میں تھا۔ میر سے پوچھو" میں نے تلخی سے کہا "مجھے ایک قانون شکن مجرم نے بتا دیا تھا کہ یہاں کا قانون کیا ہے اور مجھے اب اس رقم سے ہاتھ دھو لینے چاہئیں، لیکن ذرا اپنے ان دونوں آدمیوں کو بلاؤ جو مجھے لائے تھے۔"

میر نے بادلِ ناخواستہ ان کو طلب کیا۔ "اس شخص کی جیب میں وہ رقم ہے جو میری اس جیب میں تھی" میں نے اشارے سے واضح کیا "اور اس دوسرے کی جیب میں میرا سگریٹ کا پیکٹ ہے لیکن میں دونوں چیزوں کی ملکیت کا دعویٰ نہیں کروں گا کیونکہ ان پر میرا نام نہیں لکھا ہوا ہے۔ لیکن ان کو چور ثابت کرنے کے لیے وہ سگریٹ لائٹر ضرور مانگوں گا جس پر میرا نام ہے" میں نے چٹکی بجائی "لاؤ"

آہستہ آہستہ اس شخص کا ہاتھ جیب میں گیا اور اس نے لائٹر نکال کے مجھے تھما دیا۔ میر نے ان سے کوئی بازپرس نہیں کی۔ جاتے جاتے وہ ایک حوالدار کو حکم دے گیا کہ دروازے پر موجود رہے اور کسی قسم کا اندیشہ محسوس کرے تو لحاظ کیے بغیر گولی مار دے۔ ایک گھنٹے بعد ملزم کو واپس حوالات میں پہنچا دے اور صبح رپورٹ دے۔ میر محمد آسانی سے مرعوب ہو جانے والا آدمی نہیں تھا اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ اب وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، مجھے دبانے کے نفسیاتی حربے آزما

رہا تھا۔ اس کے چلے جانے کے بعد میں نے حوالدار کو طلب کیا۔ سو کے ایک اور نوٹ کے عوض اس نے ایک گھنٹے کے لیے میرے ہاتھوں کو آزاد کر دیا اور ہمیں کہیں سے 'اسپیشل' چائے بھی منگوا دی۔ ہم نے اسے یقین دلانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی کہ ہم فرار ہونے کی کوشش کر کے اس کی نوکری کو خطرے میں ڈالنے کی قطعی نیت نہیں رکھتے اور اتنے احسان فراموش نہیں کہ اس کی 'شرافت' کا بدلہ یوں دیں۔ ہم نے یہ بھی وعدہ کیا کہ میر صاحب یا کسی اور صاحب کے آنے کی خبر پاتے ہی از خود ہتھکڑی اپنے ہاتھوں میں ڈال لیں گے۔

محسن کی دی ہوئی سگریٹ سلگا کے میں نے اپنی بپتا یعنی گذارشِ احوالِ واقعی شروع کی اور وہ سب کچھ بتا دیا جو میں نے سلامت شاہ سے سنا تھا۔ جو گزشتہ رات چراغ دین کے گھر سے محسن کو فون کرنے کے بعد پیش آیا تھا اور ریل کار میں اپنی گرفتاری سے اب تک کے یہ سب واقعات بیان کرنے میں ایک گھنٹے سے زیادہ صرف ہو گیا۔ حوالدار نے اس دوران میں صرف ایک بار جھانک کے دیکھا اور ہماری طرف سے "سب خیریت ہے" کا سگنل پا کے لوٹ گیا۔ ساری بات سننے کے بعد محسن بہت دیر تک خاموش بیٹھا کچھ سوچتا رہا۔

"سکندر!" اس نے بالآخر کہا۔ "تیرا کیا خیال ہے قتل اس مُندری والے ٹیکسی ڈرائیور نے کیا ہے؟ وہ جو میر محمد سے ملنے آیا تھا؟"

"سو فیصد یقین کے ساتھ ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس مندری والے کا اس واردات سے اور تمام معاملات سے قریبی تعلق ہو سکتا ہے۔ آخر اسے کیا ضرورت تھی تھانے آنے کی اور میر کیوں انکار کرتا ہے کہ اس حلیے کا کوئی آدمی ہی نہیں آیا۔ اگر وہ کہتا کہ ایک ایسا شخص آیا تو تھا لیکن مجھے نہیں معلوم وہ کون تھا، تو شاید مجھے شبہ نہ ہوتا۔ صرف مایوسی ہوتی، لیکن اس صریح انکار سے اور اس سفید جھوٹ سے تو میرے شبہات اور بڑھ گئے ہیں۔"

"کیا شناخت میں غلطی کا کوئی امکان نہیں، ممکن ہے وہ ملتی جلتی صورت کا کوئی آدمی ہو؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں نے اسے ایک ہی دن میں دو بار دیکھا۔ ایکبار اس کی ٹیکسی میں ایئرپورٹ سے چراغ دین کی کوٹھی تک گیا، اس سے باتیں کیں اور جب اس نے میرا سامان اتار کے رکھا اور میں نے اسے کرایہ ادا کیا تب بھی اس کی صورت مجھے روزِ روشن میں صاف نظر آئی تھی۔ دوسری بار میں نے اسے رات کے وقت دیکھا، مرکری لیمپ کی روشنی میں تھا اور میں نے پھر اس سے بار... تھی تو اس نے بونٹ سے سر نکال کے دیکھا تھا۔ میں... اسے پہچان لیا تھا۔ آج بھی میں نے اس کی صورت... دیکھی ہے۔ ایکبار اس کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے... دوسری بار باہر نکلتے وقت۔ پیتل یا سونے کی مندری اس... دائیں کان کی لَو میں ہے۔ اس کی مونچھیں تلوار مار کہ... ہوئے گال، تھوڑی سی کنجی آنکھیں، مکرانیوں جیسے بال... کچھ میں نے نوٹ کر لیا تھا۔ اس کے علاوہ اب میں غور... تو مجھے بہت سی باتیں جو پہلے غیر اہم تھیں انہی واقعات... سلسلے کی کڑیاں لگتی ہیں۔ مثلاً ایئرپورٹ پر اس ٹیکسی... کا رضاکارانہ طور پر آگے آ کے جائز کرایہ طلب کرنا کہ میں... پس و پیش اس کی ٹیکسی میں بیٹھ جاؤں۔ پھر اس کا عین چراغ... کے بنگلے پر رک جانا۔"

"تیرا مطلب ہے وہ پہلے سے ایئرپورٹ پر اسی... موجود تھا؟" محسن نے کہا۔ "اسے کیسے معلوم ہوا کہ تو لاہور... رہا ہے؟"

"کچھ لوگوں کو یہ بات یقیناً معلوم تھی۔" میں نے کہا۔ "گمنام مسٹر فومانچو نے اپنے خط میں مطلع کیا تھا کہ ایک... کا قاتل جہاز میں میرے ساتھ ہے۔ غالباً اس کی معلومات... تھیں یا انتظامات بدل گئے۔ جہاز پر دشمنوں کا ایک مخبر... جس نے راستے میں مجھ پر نظر رکھی۔ اسے معلوم تھا کہ میں اسلا... سے لاہور جاؤں گا۔"

"تجھے پاکستان پہنچنے سے پہلے یہ خبر کہاں تھی کہ چچا... خان کا انتقال ہو چکا ہے اور وہ ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی میں نہیں ہیں بلکہ چراغ دین کی کوٹھی کے سرونٹ کوارٹر میں ہیں... اطلاع تجھے جہاز میں ایک گمنام خط کے ذریعے ملی لیکن... کچھ اس خط میں لکھا تھا وہ تو تیرے سوا کوئی نہیں جانتا تھا" محسن نے کہا۔

بجلی کی طرح میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ "کالا صاحب" میں نے کہا۔

"کالا صاحب؟" محسن نے حیرانی سے کہا۔ "کون کالا صاحب؟"

"وہ جہاز میں میرے ساتھ بیٹھا تھا۔ جب میں خط پڑھ رہا تھا تو وہ مجھے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے میرے چہرے میں رونما ہونے والے تغیر کو بھی محسوس کیا تھا اور میری خیریت بھی پوچھی تھی۔" میں نے کہا۔ "لیکن محسن! میرا خیال ہے اس نے بھی پورا خط پڑھ لیا تھا۔ دوسری جانب تو وہ میرلوری کا ڈ...

واشر تھا جسے بیوی کے نخروں اور بچوں کی شرارتوں پر باغ باغ ہونے سے فرصت نہ تھی لیکن وہ کالا صاحب میری طرف متوجہ تھا۔ اس نے مجھ سے بات کرنے کی کوشش کی تھی اور جب میں خط پڑھ رہا تھا تو خط میرے سامنے کھلا ہوا تھا۔ اس نے یقیناً سب کچھ دیکھا ہو گا۔ دو گھنٹے پہلے ہی یہ بات معلوم ہو گئی تھی کہ جہاز اسلام آباد میں نہیں اتر سکے گا۔ ممکن ہے اس نے لاہور ایئرپورٹ پر پیغام بھجوا دیا ہو۔ کسی بھی کوڈ میں۔ مثلاً یہ کہ مال لاہور پہنچ رہا ہے اور اگر کوئی شخص اسلام آباد میں مال کی وصولیابی کے لیے نامزد کیا گیا تھا تو یہ انتظام بے مصرف ہو گیا تھا۔ فوری طور پر لاہور میں میرے استقبال کے لیے وہ انتظامات کیے گئے جو شاید چند گھنٹے بعد کیے جاتے، جب میں دوسری فلائٹ سے لاہور پہنچتا۔ آنا مجھے بہرصورت لاہور تھا۔ فرض کرو کالے صاحب نے یہ بھی بتا دیا کہ مال اب ماڈل ٹاؤن نہیں چراغ دین کی کوٹھی پر جائے گا اور شاید اس کے بعد میر شرافت علی کے گھر۔ یہی وجہ ہے کہ ٹیکسی ڈرائیور مجھے سیدھا ریلوے اسٹیشن نہیں لے گیا۔ میں نے اس سے پوچھا بھی تھا مگر اس نے گول مول جواب دے کر مجھے مطمئن کر دیا۔ دراصل میں اپنے خیالات میں محو تھا اور ٹیکسی ڈرائیور پریشانی میں مبتلا ہو گیا کہ چراغ دین کی کوٹھی تو گزرنے والی ہے اور سواری چپ بیٹھی ہے۔ اس نے ٹیکسی روک کے جلد بازی سے اپنی حماقت کا ثبوت دیا ورنہ وہ سیدھا اسٹیشن جا رکتا تو کیا تھا۔ میں کہتا کہ سوری بھئی واپس چلو، اور پھر لوٹ کر چراغ دین کی کوٹھی پر ہی آتا۔ اس کے بعد وہیں ٹیکسی کا خراب ہو جانا بھی بے سبب نہیں تھا۔ اسے مجھ پر نظر رکھنی تھی۔ وہ یقیناً رات تک کسی نہ کسی بہانے آس پاس ہی منڈلاتا رہا اور میرا خیال ہے قبرستان تک اس نے ہمارا تعاقب کیا۔ پھر چراغ دین کی کوٹھی تک میرے پیچھے پیچھے گیا۔ مجھے شبہ ہوتا تو میں دھیان دیتا کہ کوئی میرا تعاقب کر رہا ہے۔ عین ممکن ہے اس نے پہلے چراغ دین کی کوٹھی کے اندر گھس کے میری اور سلامت شاہ کی ساری باتیں سنی ہوں اور اس کے بعد میر شرافت علی کی کوٹھی میں کسی کھڑکی سے لگا سب دیکھتا اور سنتا رہا ہو۔ جب میں باہر نکلا تو وہ پھر ٹیکسی کے بونٹ میں منہ چھپائے کھڑا تھا۔ اس کا خیال ہو گا کہ میں بونٹ اٹھا ہوا دیکھوں گا تو ٹیکسی کو خراب دیکھ کے اس کی طرف جاؤں گا ہی نہیں لیکن اس کی بدقسمتی کہ میں نے ارد گرد کوئی ٹیکسی نہ دیکھی تو اس سے بات کرنے چلا گیا۔ اس امید پر کہ ٹیکسی دھکا دینے سے یا کسی معمولی خرابی کے دور ہو جانے سے اسٹارٹ ہو جائے تو اچھا ہے۔ اور میں نے اسے پہچان لیا۔ اس سے وہ یقیناً تشویش میں مبتلا ہوا ہو گا لیکن یہ بات اس نے اپنی ذات تک محدود رکھی ہو گی۔ اگر اس کی خلعت حاصل کرنے والے شکاریوں کو معلوم ہو جاتا کہ شکار نے صیاد کو پہچان لیا ہے تو ٹھیکہ منسوخ ہو جاتا۔ ٹیکسی ڈرائیور کو میر شرافت علی کے قتل کا معاوضہ نہ ملتا اور عین ممکن ہے اس کا اپنا کام تمام کرنے کا سامان کیا جاتا۔ اس کا وجود شکاریوں کے لیے خطرے کی بات ہے۔ میں اب اس کو جہاں دیکھوں گا پہچان لوں گا مگر یہ بات شکاری نہیں جانتے۔ انہیں صرف اتنا معلوم ہے کہ ان کا مقصد پورا ہوا اور جس شخص کو معاوضہ ادا کیا گیا تھا اس نے اپنا کام بحسن و خوبی انجام دیا۔ یوں کہ موردِ الزام میری ذات ہو گئی۔ ہر شہادت میرے خلاف ہے۔ آلۂ قتل پر میرے فنگر پرنٹ موجود ہوں گے۔ وجۂ قتل جو خود میں نے فراہم کی تھی یعنی یہ کہ میر شرافت علی میرے والد کو بلیک میل کر رہا تھا اپنی جگہ۔ ایک وجہ وہ پہلے ہی ایجاد کر چکے تھے یعنی یہ کہ میں پورے کاروبار پر قابض ہونا چاہتا تھا۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ میر شرافت علی کا قتل کیا جانا طے تھا۔" محسن نے کہا۔

"ہاں، اگر اس نے میرے والد کو بلیک میل کیا اور مجھے ٹھکانے لگانے کا پروگرام بنایا تو دوسری طرف کچھ اور لوگ بھی تھے جو میر شرافت علی کو قتل کر کے ایک تیر سے دو شکار کرنے کا منصوبہ بنا چکے تھے۔ ایک شکاری میرے پیچھے تھا اور اس حقیقت سے بے خبر تھا کہ دوسرے زیادہ عیار شکاری اس کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ میر شرافت علی کے پیشِ نظر ایک مقصد تھا یعنی میرا خاتمہ۔ دوسرے شکاری یہی مقصد بہتر طور پر حاصل کرنا چاہتے تھے یعنی میر شرافت علی کا قتل اور اس قتل میں میری پھانسی۔ اس خیال کو یوں بھی تقویت پہنچتی ہے کہ جب میں خود میر شرافت علی کے گھر پہنچا تو وہ مجھے دیکھ کر بھونچکا رہ گیا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ میں پاکستان آ پہنچا ہوں۔ لیکن کچھ لوگ یقیناً یہ جانتے تھے، اور اپنے منصوبے پر عمل پیرا ہو گئے تھے۔ غالباً انہی لوگوں نے پولیس سے بھی رابطہ قائم کر رکھا ہے۔ اے ایس پی کا رویہ اس بات کا غماز ہے۔ میر محمد نے تو صاف کہہ دیا تھا کہ اے ایس پی صاحب کیا چاہتے ہیں۔ اعترافِ جرم۔ تھانے میں بھی اور باہر بھی۔ بصورت دیگر مجھے زندہ نہیں چھوڑا جائے گا۔ ایک غیر جانبدار پولیس افسر یہ دھمکی کیوں دے گا؟"

"ہم ان سب سے نمٹ لیں گے۔" محسن نے کہا۔ "میں

رابعہ قاری سے ملتا ہوں اور منظر سے بھی۔ صبح مجسٹریٹ کے سامنے پولیس تیرا جسمانی ریمانڈ حاصل کرنے کی کوشش کرے گی ہم جوڈیشنل ریمانڈ پر زور دیں گے۔ پھر ضمانت کی درخواست داخل کریں گے اور چالان پیش ہونے تک صورت حال اور واضح ہو جائے گی۔ مقدمے کی باقاعدہ سماعت شروع ہونے پر ہم یہ سارے حقائق عدالت کے سامنے رکھیں گے تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔ قتل رات ایک بجے کے قریب ہوا ہے تو دس بجے چراغ دین کی کوٹھی کے سرونٹ کوارٹر میں واپس پہنچ چکا تھا اور اس کی گواہی سلامت شاہ دے گا۔ باقی معاملات وکیل سنبھال لیں گے۔"

"محسن! عدالت شخصی ضمانت مانگے گی اور نقد بھی۔۔"

میں نے تذبذب سے کہا "تو کتنی رقم لایا ہے؟"

"پندرہ ہزار۔" محسن نے کہا "تیرے پاس کچھ ہے۔ ہو سکتا ہے نقد پچاس ہزار کی ضرورت پڑے۔"

"میرے پاس ابھی تو کچھ نہیں۔ وہ چار ہزار گئے۔ سلامت شاہ سے امید ہے کہ میری ماں کے پرانے زیورات بیچ کر دس ہزار ضرور لے آئے گا۔" میں نے مایوسی سے کہا "ویسے تو لاکھوں کا مالک ہوں مگر اس وقت نہیں۔"

"اچھا تو فکر نہ کر۔ میں پاپا سے بات کروں گا، ورنہ ایک اور ذریعہ بھی ہے۔ پہلے میں وکیلوں سے بات کروں۔" محسن نے کہا۔

"ان سے دو اور معاملات کی بات بھی کر لینا۔" میں نے کہا۔ "ایک یہ کہ مجھے وراثت کا سرٹیفکیٹ چاہیے۔ فوراً۔ جتنی جلدی ممکن ہو، اس سے مجھے دو فائدے ہوں گے۔ ایک تو یہ کہ میں کمپنی کے حسابات میں سے رقم نکلوا سکوں گا۔ دوسرا یہ کہ وہ لاکر کھول سکوں گا جس کی چابی سلامت شاہ کے پاس تھی اور اب میرے پاس ہے۔ اس لاکر میں بہت اہم دستاویزات ہو سکتی ہیں۔"

"اور دوسرا، بلکہ تیسرا مقدمہ؟" محسن نے کہا اور ایک سگریٹ جلا کے باقی پیکٹ مجھے تھما دیا۔

"تیسری درخواست کل ہی لگائی جا سکتی ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے شبہ ہے کہ میرے والد کی موت طبعی نہیں تھی ان کو قتل کیا گیا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ قبر کھود کے لاش نکالی جائے۔ اور پوسٹ مارٹم کیا جائے۔"

محسن کا چہرہ فکر و تردد کا آئینہ بن گیا "سوچ لے سکندر! یہ بہت۔۔۔ مشکل اور خطرناک کام ہے۔۔"

"ہاں مجھے معلوم ہے اور میں نے بہت سوچ سمجھ کے یہ فیصلہ کیا ہے۔" میں نے کہا۔

حوالدار نے دوسری بار یاد دہانی کے لیے اندر جھانکا۔ کے نوٹ کی تاثیر ختم ہونے لگی تھی۔ میں نے پتلون کی جیب سے لاکر کی چابی نکالی اور محسن کے ہاتھ پر رکھ دی "یہ میں سلامت شاہ سے لی تھی۔ تجھے معلوم کرنا ہو گا کہ یہ کس برانچ کا ہے۔ میرا خیال ہے قریب ہی کی برانچ ہو گی۔ بحفاظت اپنے پاس رکھنا یا وکیل کے پاس رکھوا دینا۔ رقم اپنے پاس رکھ۔ سلامت شاہ جو کچھ لائے گا وہ بھی تجھے دے دوں گا۔ اس سب رقم کو ساتھ لے کر مت۔ بیڈن روڈ پر میرا ایک بہت پرانا اکاؤنٹ ہے میرے نام سے۔ نمبر یاد نہیں لیکن برانچ حبیب بنک کی ہے۔ میں نے اسی زمانے میں کھولا تھا جب۔۔۔ باجی مریم کی ہوئی تھی، بلکہ ہونے والی تھی۔"

"لیکن ہم تو شادی میں شریک نہیں ہوئے۔" وہ اداسی سے بولا۔

"ہاں ہم مارچ میں گئے تھے۔ شادی ستمبر میں ہوئی۔ سکندر بخت نام کے دو چار ہی اکاؤنٹ ہولڈر ہو سکتے۔ کوشش کرنے سے کوئی نہ کوئی تجھے وہ اکاؤنٹ نمبر بتا۔ رقم اس میں جمع کرا دینا تاکہ محفوظ رہے اور اس دوسرے۔ سے بھی کوشش کر لینا۔" میں نے کہا۔

"دوسرا ذریعہ؟" اس نے خالی خالی نظروں سے دیکھا اور پھر چونک کر خفت سے مسکرایا "ہاں۔۔۔ ہاں وہ میں کر لوں گا۔"

"محسن! شخصی ضمانت کا کیا ہو گا؟" میں نے کہا "پاپا نے کیا کہا ہے؟"

"ایک ضامن تو خود پاپا ہوں گے۔" محسن نے کہا۔ "دوسرے کا انتظام وہ یہاں آ کے کریں گے۔ وہ کل آ۔ گے یعنی صبح۔ انہوں نے مجھے ایس ایس پی ضامن رضوی کا دیا تھا۔ یہاں آتے ہی میں نے ان سے بات کی۔ تو بہت سخت بدمعاش ہے۔ خود رضوی صاحب سے با۔ کر کے اور جھاڑ کھا کے سیدھا ہوا۔ اچھا اب میں چلتا۔" اس نے گھڑی پر نگاہ ڈالی جس پر صبح کے ساڑھے چار۔ رہے تھے۔ "یہ سو روپے اپنے پاس رکھ، اور یہ رضوی۔ کا نمبر۔" اس نے نوٹ اور اپنے والد کا کارڈ مجھے تھما دیا۔ "ایسی ویسی بات ہو تو ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ اچھا اب۔ وقت کم ہے، میں عدالت میں ملوں گا۔" وہ دروازے تک گیا اور واپس آیا "ایک بات تو میں بھول ہی گیا۔ فوزیہ۔

کہا ہے۔ ایسی کی تیسی۔ کہا کیا ہے یہ رقعہ دیا ہے۔" اس نے پرچہ میرے ہاتھ میں تھما دیا اور نکل گیا۔ اس پر فیض کا ایک قطعہ لکھا ہوا تھا

گر آج اوج پہ ہے طالعِ رقیب تو کیا
یہ چند روزہ خدائی تو کوئی بات نہیں
جدا ہیں آج اگر ہم تو کل بہم ہوں گے
یہ چار دن کی جدائی تو کوئی بات نہیں

جب حوالدار نے مجھے پھر ہتھکڑی لگائی تو مجھے یوں لگا جیسے یہ فولاد و آہن کی زنجیر گراں بار نہیں کچے سوت کے دھاگے ہیں اور اب مجھ میں اتنی قوت ہے کہ در و دیوارِ زنداں اور طوق و سلاسل مجھے اس زندگی سے جدا نہیں کر سکتے جو میرا حق ہے۔ جو انصاف کی علامت ہے اور فوزیہ کی محبت ہے۔ میں اب اکیلا نہیں تھا۔ محسن رضا، مسٹر شیرازی ڈپٹی سیکرٹری ایس ایس پی ضامن رضوی۔ میرے دو کلاس فیلو جو ہائیکورٹ اور سپریم کورٹ کے وکیل ہیں۔ رابعہ قاری اور عبدالودود منظر۔ سلامت شاہ کی گواہی۔ وہ سب رقم جو میری دسترس میں ہے، میر فدیر اینڈ کمپنی کا حق وراثت اور فوزیہ کا نامۂ تجدید وفا۔ ایک پُرعذاب شب کی سحر ہونے تک میں کتنا طاقتور ہو چکا تھا۔ مجھے اپنے خلاف سازش کرنے والے اور ان کے زرخرید سب بہت حقیر اور بہت چھوٹے محسوس ہو رہے تھے۔

علی الصبح میں نے پچاس روپے کے عوض ناشتہ حاصل کیا۔ حوالات میں شب بھر کے درماندہ، وہ سب جو مراعات کا استحقاق خرید نہیں سکے تھے، نیم جاں لائے جا رہے تھے اور سنگیں فرش پر سسک رہے تھے۔ ڈکیتی میں ملوث ملزم لمبی تان کے سو رہا تھا اور بالکل بے فکر تھا۔ میں نے محسن کے دیے ہوئے سگریٹ پھونک پھونک کے صبح کی اور اپنے کان اور اپنی آنکھیں ان سب کی طرف سے بند کر لیں جو میرے اردگرد ظالم و مظلوم کے فرق کو کسی ثبوت کے بغیر ثابت کر رہے تھے۔ سات بجے دن کا اجالا حوالات کی ستم رسیدہ دنیا کے مکینوں پر بھی اترا اور نئی امیدوں کے ساتھ وہ دن شروع ہوا جس سے آنے والی رات کا دامن بندھا ہوا تھا۔ میری طرح اور بھی تھے جو عدالت کے روبرو پیش ہونے کی آس لگائے وقت گزار رہے تھے۔ میر محمد اچانک نمودار ہوا۔ اس وقت وہ قمیص پتلون کی بجائے پوری وردی میں تھا اس نے سیدھا حوالات کا رخ کیا اور میرے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"چلا گیا تمہارا وہ حمایتی تیس مار خاں؟" وہ طنز سے بولا۔

میں نے سگریٹ کا ایک کش لیا اور اس کی طرف دھواں چھوڑ دیا "ابھی وہ انتیس مار خاں ہے۔" میں نے کہا "تیسواں نمبر تمہارا ہے۔"

"سکندر بخت! اس نام کی خوش فہمی کا شکار مت رہنا۔" وہ آگ بگولا ہو کے بولا۔ "سکندر دنیا کو فتح کرنے نکلا تھا، مگر جب دنیا سے گیا تو اس کے دونوں ہاتھ خالی تھے۔ میں ایک بار پھر اے ایس پی صاحب کا پیغام دینا چاہتا ہوں۔ تم اعتراف جرم کر لو گے تو تمہاری ہر ممکن مدد کی جائے گی اور تمہیں کم سے کم سزا ملے گی۔ جیل میں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ بصورت دیگر تمہارا انجام بُرا ہو گا۔"

"تم اپنی کہہ چکے؟" میں نے کہا۔ "اب دفع ہو جاؤ اور اپنے اس اے ایس پی سے کہہ دو کہ یہی بات عدالت میں مجھ سے مخاطب ہو کر کہے اور اگر کل کو خدانخواستہ تمہاری یا خود اے ایس پی کی نوکری نہ رہے تو میرے پاس آ جانا۔ میر فدیر اینڈ کمپنی میں جھاڑو دینے کے لیے رکھ لوں گا، سمجھے؟"

"سمجھ گیا۔" وہ خوں آشام نظروں سے مجھے گھور کر بولا۔ "تم زندہ رہنا نہیں چاہتے۔" اور پلٹ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ایک گھنٹے بعد حشمت خاں نمودار ہوا اور میں نے ان کے زور زور سے باتیں کرنے کی آواز سنی۔ نزاع کا سبب میرا بریف کیس تھا۔ ابھی یہ جھگڑا چل ہی رہا تھا کہ اے ایس پی کی جیپ تھانے کے احاطے میں داخل ہوئی اور رائفل والے کانسٹیبل نے اسے پیر بجا کے زبردست سلیوٹ جھاڑا۔

دس منٹ بعد مجھے اس کے سامنے پیش کیا گیا۔ آج وہ وردی میں تھا مگر اس کی پُرسکون متانت میں کوئی فرق نہ تھا۔ اس نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ شاید یہ اطمینان کرنے کے لیے کہ تفتیش کی شکست و ریخت کے آثار تو نہیں نظر نہیں آتے۔

"تو تم اپنے موقف پر قائم ہو۔" اس نے پیکٹ سے ایک سگریٹ نکال کر اس کے دونوں کنارے ٹھونکتے ہوئے کہا۔ یہ سوال نہ تھا بلکہ اظہار عدم اطمینان تھا۔ "کہ تم نے قتل نہیں کیا۔ کسی اور نے قتل کر کے تمہیں پھنسا دیا ہے۔۔؟"

"جی۔ اور اگر سب انسپکٹر میر اس شخص کا نام پتا بتا دیں جو کل شام اندھیرا ہونے کے بعد ان سے ملنے آیا تھا۔" میں نے کہا۔ "جو دائیں کان میں پیتل یا سونے کی مندری پہنے ہوئے تھا۔ گہرا سانولا رنگ۔ سبھی آنکھیں تلوار جیسی مونچھیں۔ کمرائیوں جیسے بال۔ کالی لال دھاریوں کی قمیص پہنے ہوئے۔ تو شاید یہ بھی معلوم ہو جائے کہ میرے خلاف سازش کرنے والے کون ہیں۔"

اے ایس پی طارق جمیل نے اسی پُرسکون انداز میں میر محمد کی طرف دیکھا۔ "یہ کون شخص تھا؟"

میر محمد نے نفی میں سر ہلایا۔ "مجھے تو نہیں معلوم سر۔ ابھی سنا ہے میں نے اس کی زبان سے پہلی بار۔ مجھ سے کل تو کوئی ایسا آدمی نہیں ملنے آیا تھا۔"

"تم بکواس کرتے ہو جھوٹ بولتے ہو۔" میں نے بے خوفی سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔ "وہ ایک ٹیکسی ڈرائیور ہے جس کی ٹیکسی کا نمبر میں تمہیں بتا چکا ہوں۔"

"تمہیں اس کی ٹیکسی کا نمبر کیسے معلوم ہوا؟" اے ایس پی نے کہا۔ "اور اس کے بعد کیا ہے۔؟"

"اس کے بعد اے بی سی ڈی۔ کچھ تھا جو مجھے یاد نہیں۔ مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ فور تھری فور تھری نمبر ہر سیریز میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ آپ بخوبی جانتے ہوں گے کہ موٹر سائیکلوں کی اور پرائیویٹ کاروں کی سیریز الگ ہے کمرشل گاڑیوں میں بھی آپ کو صرف ٹیکسی دیکھنی ہے۔ بس یا ٹرک اور ویگن نہیں۔ لاہور میں شاید اس نمبر کی ایک ہی ٹیکسی ہوگی۔ دو یا بالفرض محال چار بھی ہوئیں تو میں ان سب کے ڈرائیوروں کو دیکھ کر اندھیرے میں بھی بتا سکوں گا کہ وہ شخص کون ہے۔" میں نے کہا۔

"آل رائٹ۔ میر یہ حلیہ اور یہ نمبر لکھ لو۔"

"ایک منٹ سر۔" میر نے سر پر یوں ہاتھ رکھا جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ "اس نمبر سے مجھے شبہ ہوتا ہے شاید ہمارے پاس چوری کی ایک رپورٹ ہے۔ مزنگ میں رہنے والا کوئی حاجی تھا۔ میں نے سنا تھا کہ چند روز قبل اس کی ٹیکسی ہمارے علاقے میں چوری ہو گئی ہے۔ میں روزنامچہ دیکھتا ہوں۔" وہ واقعی اچھا اداکار تھا۔ اسے شروع سے معلوم تھا کہ اس ٹیکسی کی چوری کی رپورٹ تھانے میں آئی ہے مگر یہ بات اس نے مجھے نہیں بتائی۔ یہ ترپ کا پتا اس نے اپنے ہاتھ میں رکھا تاکہ میری چال کو ناکام بنا سکے۔

"حشمت خاں! تم نے سلامت شاہ کا بیان لیا؟" اے ایس پی نے میر شرافت علی کے قتل کی فائل دیکھتے ہوئے کہا۔ "ملزم نے اس کا حوالہ دیا تھا اور ملزم اس کے پاس ٹھہرا ہوا بھی تھا۔"

"وہ۔ دراصل سر۔ سلامت شاہ تو کل آیا تھا مگر میں نے اسے تاکید کی کہ صبح آ جائے اور آپ کے سامنے بیان دے۔" حشمت نے کہا۔

"کیوں؟ کیا تمہیں بیان لینا نہیں آتا؟" اے ایس پی نے ماتھے پر بل ڈال کے کہا۔ "کتنی نوکری ہو گئی ہے تمہاری؟"

"سر تفتیشی افسر تو آپ ہیں۔" حشمت خاں نے کہا۔ "اس بڈھے نے کہا تھا کہ وہ آنکھ کھلتے ہی سیدھا تھانے آئے گا۔"

"گڈ۔" اے ایس پی نے کہا۔ "اور کتنے بجے کھلتی ہے وہ آنکھ؟ یہ پوچھا تھا تم نے؟"

حشمت نے بے بسی سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ "میں نے اس سے کہا تھا کہ زیادہ سے زیادہ سات بجے پہنچ جائے۔"

"اب کیا وقت ہوا ہے حشمت خاں؟" اے ایس پی نے کہا اور فائل رکھ کے میر محمد کی طرف متوجہ ہو گیا جو خالی ہاتھ لوٹ آیا تھا۔

"وہ مجھے غلط فہمی ہوئی سر۔ کیس ہمارا نہیں تو کہاں کا ہے۔" وہ میری طرف دیکھے بغیر بولا۔ "میں پوچھتا ہوں۔"

اس نے ٹیلی فون نمبر ملانا شروع کیا۔ حشمت خاں نے مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک حوالدار اور ایک کانسٹیبل کو روانہ کر دیا تھا کہ اس خبیث بوڑھے کو باندھ کر جوتے مارتے ہوئے اٹھا لائیں۔ باہر سے اس کی آتش فشانی کا تھوڑا سا شور اندر بھی پہنچ رہا تھا۔

میر نے نمبر ملا کے کہا کہ اے ایس پی طارق جمیل صاحب بات کریں گے اور ریسیور آگے کر دیا۔ چند منٹ کی گفتگو کے بعد جو حقائق سامنے آئے وہ میرے اندازے سے مختلف نہ تھے۔ ٹیکسی کا اصل مالک ساٹھ سال کا ایک پابندِ صوم و صلوٰۃ بوڑھا تھا جو ظہر کے وقت نماز پڑھنے کی غرض سے ٹیکسی مسجد کے دروازے پر کھڑی کر گیا تھا مگر واپس آیا تو ٹیکسی غائب تھی۔ ٹیکسی کا ابھی تک سراغ نہیں ملا تھا۔

"اے ایس پی صاحب۔" میں نے ٹیلی فون کی گفتگو ختم ہوتے ہی کہا۔ "آپ خود بھی ایک ذہین پولیس افسر ہیں۔ اتنا اندازہ کر سکتے ہیں کہ ٹیکسی کسی نے ایک واردات کے لیے چوری کی تھی اور کل پرسوں تک کہیں لاوارث کھڑی ہوئی مل جائے گی۔ ایسا عموماً ہوتا ہے۔ میں اس ٹیکسی کے مالک کی نہیں اس شخص کی بات کر رہا ہوں جو ٹیکسی چلا رہا تھا جس کا حلیہ میں تفصیل سے بیان کر چکا ہوں۔"

اے ایس پی نے ایک دم اٹھ کے میرے منہ پر تھپڑ رسید کیا اور پھر فوراً بیٹھ گیا۔ "تم پڑھے لکھے اور چالاک آدمی ہو۔ واقعات ہی نہیں کردار بھی بنا لیتے ہو۔ اس خوش فہمی کے باعث کہ اس طرح تفتیش کو غلط رخ پر ڈالا جا سکتا ہے۔"

"غلط رخ؟" میں نے طنز سے کہا۔ "تفتیش کا صرف ایک رخ ہوتا ہے اور اس کا عملی مظاہرہ کل رات کے بعد آپ نے ابھی ابھی کیا ہے۔"

"اگر تم چاہو تو ایس ایس پی ضامن رضوی کو بتا سکتے ہو کہ میں نے تمہیں تھپڑ مارا ہے۔" وہ بے نیازی سے بولا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "میرا خیال ہے یہ تھپڑ تم نے خود اپنے منہ پر مارا ہے۔ یہ تمہاری بے بسی کا مظہر ہے کیونکہ کل کے اور آج کے سکندر بخت میں بہت فرق ہے۔ آج تم سکندر بخت کا منہ بند نہیں کر سکتے کیونکہ وہ لاوارث نہیں۔ میری پیروی کے لیے دو بہت بڑے وکیل پیش ہوں گے۔ رابعہ قاری اور عبدالودود منظر۔ وہ پچاس ہزار تک نقد ضمانت داخل کر سکیں گے اور شخصی ضمانت دینے والا ایک تو ہوگا ڈپٹی سیکرٹری حکومت پاکستان۔ دوسرا ضامن شاید اس سے بھی بڑا ہو۔ سلامت شاہ کے بیان کے بعد یہ کیس کتنے دن چلے گا لیکن کچھ اور کیس چلیں گے جن کی تفصیل میں فی الحال تمہیں بتاؤں گا۔"

"یو باسٹرڈ۔" اے ایس پی نے چیخ کر کہا۔ "تم دھمکی دے رہے ہو مجھے؟ کیا کر دو گے تم؟ ہتک عزت کا کیس لے جاؤ گے۔ ذہنی و جسمانی اذیت کے ہرجانے کا دعویٰ، مجھے نوکری سے نکلوا دو گے؟ جیل بھجوا دو گے؟ مائی فٹ۔ تم ہو کیا؟"

"میں میرو وزیر اینڈ کمپنی کا مالک ہوں جس میں تمہارے برابر تنخواہ پانے والے دربان ہیں اور فراش ہیں۔" میں نے غرور سے کہا۔

اے ایس پی کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور اسے یوں ذلیل کر کے مجھے بڑی تسکین ملی۔ گذشتہ چوبیس گھنٹوں کے دوران جتنی ذلت اور بے آبروئی میں نے برداشت کی تھی۔ یہ اس کے عشر عشیر کا عشر عشیر بھی نہیں تھی مگر تسکین اس احساس میں تھی کہ وقت کی بساط پر میں اب کوئی بے حیثیت پیادہ نہیں ہوں۔ حشمت خاں نے واپس آ کے مطلع کیا کہ سلامت شاہ بہت جلد حاضر کر دیا جائے گا مگر کسی نے اس کی طرف توجہ نہ دی۔ "میر محمد۔" اے ایس پی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "تم ملزم کو مجسٹریٹ کے سامنے پیش کرو اور اس کا چودہ دن کے لیے جسمانی ریمانڈ حاصل کر لو۔ اس وقت تک تفتیش مکمل ہو گئی تو چالان پیش کر دیا جائے گا ورنہ ریمانڈ مزید چودہ دن کے لیے بڑھایا جا سکتا ہے۔"

"جناب اے ایس پی صاحب۔" میں نے کہا۔ "کل گرفتاری کے وقت میرے پاس ایک بریف کیس تھا جس میں پانچ ہزار روپے نقد تھے۔"

"پانچ ہزار۔" حشمت خاں نے غیر ارادی طور پر کہا اور پلکیں جھپکا کے مجھے دیکھا۔

"ہاں۔" میں مسکرایا۔ "مگر شام تک میں سات سو روپے خرچ کر چکا تھا۔ چنانچہ اس میں چار ہزار تین سو بچے تھے۔ اس میں میرا پاسپورٹ اور دیگر دستاویزات، کپڑے اور سامانِ ضرورت تھا۔ یہ بریف کیس آپ کے سب انسپکٹر حشمت خاں نے مجھ سے امانت خانے میں رکھوانے کے لیے لیا تھا۔ مجھے یہ بریف کیس کسی تحریری درخواست کے بغیر نہیں واپس دیا جائے گا یا اس کے لیے بھی عدالت سے رجوع کرنا ہوگا؟"

"واٹ نان سنس؟" اے ایس پی نے کہا۔ "یہاں کوئی امانت خانہ نہیں ہوتا۔ امانت خانے کی کوئی رسید ملی تھی؟"

"نہیں۔ مگر آپ کے انسپکٹر حشمت خاں نے تو کہا تھا کہ ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ "میں نے بریف کیس اسی کے حوالے کیا تھا۔"

"حشمت خاں۔" اے ایس پی نے سوالیہ لہجے میں کہا۔ "یہ کیا چکر ہے؟"

"بریف کیس۔ وہ۔۔۔ میرا خیال ہے۔؟" حشمت خاں نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ "تھا تو سہی ان کے پاس۔ جب میں گیا تو یہاں میز پر رکھا تھا۔"

میر محمد نے نفی میں سر ہلایا۔ "جب میں نے چارج لیا تو میز پر ایسی کوئی چیز موجود نہیں تھی؟"

"تم تسلیم کرتے ہو حشمت خاں کہ بریف کیس ان کے پاس تھا۔" اے ایس پی نے کہا۔ "اور ملزم لاک اپ میں تھا؟"

"یس۔ یس سر۔" حشمت خاں کو لبوں سے نکل جانے والے غلط لفظ پر افسوس ہو رہا تھا۔ اس کے لیے یہ تسلیم کرنا مشکل تھا کہ میں شام تک اس کے کمرے میں بیٹھا رہا تھا۔ میں نے وہیں کھانا کھایا اور کھلایا تھا۔ وہیں سے فون کیے تھے اور سلامت شاہ بھی وہیں ملا تھا۔

"حشمت خاں۔ دیکھو وہ بریف کیس کہاں ہے۔" اے ایس پی نے مختصراً کہا۔

"بریف کیس کہاں جائے گا سر۔" حشمت خاں نے تمسخر آمیز لہجے میں کہا۔ "اگر یہ دس کہتے تو ہم دس بریف کیس ان کو دیدیتے۔" مطلب صاف ظاہر تھا۔ اپنی پوزیشن بچانے کے لیے مجھے نیا بریف کیس خرید کے دینا بھی کیا مشکل تھا۔ زیادہ سے زیادہ اس ہزاروں کی رقم میں سے دو سو خرچ ہو جاتے۔ فائدے میں بہر صورت حشمت خاں رہتا۔ باہر سے ایک کار کے رکنے اور پھر دروازے کھلنے، بند ہونے کی آواز آئی۔ چند منٹ بعد دروازے کی چق ہلی اور ایک عورت اندر آگئی۔ اس نے سفید شلوار قمیص پر سیاہ کوٹ پہن رکھا تھا اور سنہرے فریم کی نازک سی عینک لگا رکھی تھی۔ وہ تیس سال کی بھرپور عورت تھی جس کے بدن کی اٹھان اس کاروباری قسم کے غیر دلکش لباس میں بھی نمایاں تھی۔ اس کا قد ساڑھے پانچ فٹ سے کچھ نکلتا ہوا تھا۔ صحت مند چہرہ میک اپ کے بغیر بھی حسین تھا۔ بے داغ رخسار کی جلد اتنی صاف اور ریشمی تھی کہ حسن افزا صابن بنانے والے اسے فخر سے اپنے اشتہار میں پیش کر سکتے تھے۔ غیر معمولی طور پر سیاہ روشن آنکھیں اس کے چہرے کی مناسبت سے کچھ بڑی تھیں مگر اس کے کندھوں تک پہنچ کے خم کھا جانے والے پھسلتے، سرسراتے، چمکیلے کالے بالوں سے بہت میچ کرتی تھیں۔ میری یاد داشت سے اس صورت کے نقوش مٹ چکے تھے مگر اس کے پیچھے پیچھے محسن کو آتے دیکھ کر میرے لیے اندازہ کرنا مشکل نہ تھا کہ وہ رابعہ قاری ہے۔ اے ایس پی سمیت تھانے کا تمام عملہ یکلخت چوکنا ہو گیا۔

"رابعہ قاری۔" میں نے مسرت سے کہا۔ یوں جیسے میرے اور اس کے تعلقات بے تکلفانہ ہیں۔ اس حد تک کہ میں اس کو مس یا مسز کہنے کا تکلف بھی نہیں کرتا جب کہ حقیقت یہ تھی کہ مجھے اس کے شادی شدہ یا غیر شادی شدہ ہونے کے بارے میں معلوم ہی نہ تھا اور نہ یہ کہ قاری اس کا باپ تھا یا شوہر ہے۔

"سکندر بخت۔" اس نے عینک ہٹا کے کہا۔ "تم نے پہچان لیا مجھے، نائٹی بوائے۔ تم کلاس میں مانیٹر ہونے کا سب سے زیادہ رعب مجھ پر جھاڑتے تھے۔" اس کے لہجے میں اعتماد، خلوص اور یگانگت کی خوش دلی تھی۔ محسن کا چہرہ مسرت سے دمکنے لگا۔ میں ہنس پڑا۔ "اچھا! ۔ مجھے یاد تو نہیں لیکن تم کہتی ہو تو اب سوری۔ شرارتوں کا انجام دیکھ لو۔" میں نے بندھے ہوئے ہاتھ اوپر اٹھائے۔

"ویل اٹ۔" وہ بولی۔ "یہ سب ٹھیک ہو جائے گا کل تک۔" پھر وہ اے ایس پی سے مخاطب ہو گئی۔ "طارق جمیل صاحب۔ آپ اس کیس کی تفتیش کر رہے ہیں۔ آپ کے علم میں ہو گا کہ ملزم کی گرفتاری کو چھبیس گھنٹے سے زائد ہو گئے ہیں۔ مجسٹریٹ کے سامنے کیس کیوں نہیں پیش کیا گیا۔"

"ایف آئی آر میں کیا وقت لکھا ہے میر۔" طارق جمیل نے سکون سے کہا۔ "وکیل صاحبہ کے سوال کا جواب دو۔"

"ابھی چوبیس گھنٹے بھی نہیں ہوئے سر۔" میر محمد نے کہا۔ "گرفتاری گیارہ بجے عمل میں آئی تھی۔ بارہ بجے کا اندراج ہے ایف آئی آر میں۔"

"انسپکٹر حشمت۔ تم نے رپورٹ میں یہ تو یقیناً لکھا ہو گا کہ ملزم کو اس وقت گرفتار کیا گیا جب وہ ریل کار سے پنڈی فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔" رابعہ نے اپنی قیمتی کلائی گھڑی دیکھی۔ "اس وقت ساڑھے نو ہو رہے ہیں۔"

"ریل کار کا میں نے ذکر کیا ہے۔" حشمت خاں نے کہا۔ "پلیٹ فارم نمبر کا حوالہ بھی ہے۔"

"ویری بیڈ۔" رابعہ نے اے ایس پی کی طرف دیکھا۔ "آپ کا میر محمد آپ کے سامنے جھوٹ بولتا ہے اے ایس پی صاحب۔ ایک ریل کار صبح جاتی ہے۔ جس کے حساب سے چوبیس گھنٹے ہو چکے۔ دوسری دوپہر کے بعد جاتی ہے جو ایف آئی آر کے اندراج کے مطابق بعد میں گئی۔ اب آپ بلا تاخیر ملزم کو مجسٹریٹ کے سامنے پیش کر دیں۔ ورنہ ہم حبس بیجا کی رٹ دائر کرتے ہیں۔" اس نے بریف کیس میز پر رکھ کے کھولا اور ایک کاغذ نکالا۔ "سکندر یہ وکالت نامہ ہے۔ دستخط کر دو۔" اس نے مجھے اپنا قلم پکڑایا اور میں نے جھک کر بدقت تمام وکالت نامے پر اپنے دستخط ثبت کر دیے۔

حشمت خاں کا رنگ اڑ گیا تھا اور اے ایس پی اسے یوں دیکھ رہا تھا جیسے وہ دنیا کا سب سے بڑا احمق ہے جہاں نہ سہی کسی مرحلے پر ان کے لیے یہ وضاحت مشکل ہو جاتی کہ ملزم کو صبح گرفتار کیا گیا تھا تو ایف آئی آر میں دوپہر کا وقت کیوں ہے۔ رابعہ نے وکالت نامے کو فائل میں لگایا اور فائل پھر بریف کیس میں رکھ لی۔ "دوسرے وکالت نامے پر مجسٹریٹ کے سامنے دستخط کر دینا۔" وہ بولی۔ "منظر صاحب تمہاری طرف سے ضمانت کی درخواست فائل کر رہے ہیں۔ ایک گھنٹے بعد ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کے سامنے پیش کر دی جائیگی۔ محسن رضا نے مجھے خاصی معلومات فراہم کر دی ہیں جو کیس کے اس مرحلے پر کارآمد ہیں۔ باقی تفصیلات بعد میں۔ اب میں چلتی ہوں۔ اے ایس پی صاحب آپ کتنی دیر میں علاقہ مجسٹریٹ کے پاس پہنچ رہے ہیں؟"

"میں تو شاید نہ آؤں مس قاری۔" طارق جمیل نے شائستگی سے کہا۔ "میر محمد ایک گھنٹے تک ملزم کو لے آئے گا۔"

رابعہ نے اطمینان سے سر ہلایا۔ مسکرا کے میری طرف دیکھا اور ساتھ ہلا کے باہر نکل گئی۔ "یہ تو بالکل نہیں بدلی یار۔" میں نے محسن سے مخاطب ہو کے کہا۔

"مگر وہ منظر تو بالکل گینڈا ہو گیا ہے۔" محسن نے کہا۔ "منظر اینڈ کمپنی بنالی ہے۔ چھ ماتحت وکیل ہیں اور چھ ہی بچے ہیں اس کے۔ مگر درخواست ضمانت کی پیروی کرنے وہ خود آئے گا۔"

عین روانگی سے قبل سلامت شاہ کو ملائی چیک کرنے لانے والی پولیس پارٹی لوٹ آئی اور اس حوالدار نے جو گذشتہ روز میری گرفتاری میں پیش پیش تھا اپنے مشن کی ناکامی کا اعلان کیا۔ "وہ ۔۔۔ صبح صبح تالا مار کے کہیں بھاگ گیا ہے۔ چراغ دین کو بھی معلوم نہیں جس کے پاس وہ کام کرتا ہے۔"

"اس سے ہم نمٹ لیں گے۔" انسپکٹر حشمت خاں نے فلمی ولن کی طرح کہا۔ "بچ کے کہاں جائے گا۔ تم دیکھو ملزم کا بریف کیس کہاں ہے۔ اے ایس پی صاحب کا حکم ہے کہ فوراً لایا جائے۔" اس نے لفظ حکم پر زور دے کر کہا۔ حوالدار نے مجھ پر ایک نگاہ قہر و غضب ڈالی اور چند منٹ بعد بریف کیس لیے نمودار ہوا۔ بریف کیس کو اس نے برآمد ہونے والے مال مسروقہ کی طرح سب کے درمیان میز پر رکھ دیا۔

"پہلے پہچان لیجیے یہی ہے آپ کا بریف کیس؟" اے ایس پی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"بظاہر تو میرا ہی ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن کھول کر دیکھے بغیر میں یقین کے ساتھ کیسے کہہ سکتا ہوں۔ بازار میں ایسے بریف کیس عام ہیں۔"

بریف کیس میں سب کچھ تھا سوائے نقد رقم کے۔ "اس میں چار ہزار تین سو روپے کم ہیں۔" میں نے کہا۔ "حسب توقع۔"

"تم نے بہت بڑے وکیل کیے ہیں۔" اے ایس پی نے چلتے چلتے کہا۔ "اگر وہ عدالت کے سامنے اس سے دس گنا رقم کی موجودگی بھی ثابت کر سکے تو میں یہ رقم خود ادا کر دونگا۔ وہیں چیک کاٹ دوں گا تمہیں۔"

"یہ جذبہ قابل قدر ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن عدالت شاید پوچھے کہ ایک اے ایس پی نے اتنی کم مدت ملازمت میں اتنا کیسے پس انداز کر لیا تو ممکن ہے کہ تنتالیس ہزار مجھے دے کر تم محاسبے کے چکر میں آجاؤ۔ اس لیے میں یہ پیشکش مسترد کرتا ہوں۔"

مجسٹریٹ کے سامنے میری پیشی کا جلوس تین ٹیکسیوں میں روانہ ہوا۔ پہلی ٹیکسی میں دونوں انسپکٹر ان کے ساتھ ملزم یعنی یہ خاکسار تھا اور ایک مسلح سپاہی تھا جس نے ہتھکڑی کو اپنی بیلٹ سے باندھ رکھا تھا۔ دوسری ٹیکسی محسن رضا نے کی تھی۔ اس میں حوالدار کے ساتھ ایک اور کانسٹیبل بھی بیٹھ گیا تو محسن اتر گیا اور اس نے تیسری ٹیکسی کر لی۔ محسن رضا ساری رات جاگا تھا اور معلوم نہیں اس نے ناشتہ بھی کیا تھا یا ایسے ہی کھائے پیے بغیر بھاگ دوڑ میں مصروف تھا۔ تھکن اور ذہنی کشیدگی کے آثار اس کی صورت سے ہویدا تھے۔ چار پانچ گھنٹوں میں اس نے دونوں وکیلوں سے رابطہ قائم کر لیا تھا۔ شاید اسے منہ اندھیرے ہی دونوں کے گھر جانا پڑا ہو گا۔ پرانی دوستی کے نام پر یا بعد میں منہ مانگا معاوضہ ادا کرنے کے وعدے پر اس نے دونوں وکیلوں کو تیار کر لیا ہو گا کہ وہ میرے کیس پر فوری توجہ دیں۔ اسی جدوجہد کا نتیجہ تھا کہ رابعہ پولیس اسٹیشن آپہنچی تھی اور منظر نے گیارہ بجے تک ضمانت کی درخواست سیشن کورٹ میں پیش کرنے کا وعدہ کر لیا تھا۔

"ملزم سکندر بخت۔" انسپکٹر حشمت خاں نے ٹیکسی کے روانہ ہوتے ہی زہر آلود لہجے میں کہا۔ "اے ایس پی صاحب کے سامنے تم نے پانچ ہزار روپے کا مسئلہ اٹھا کے اچھا نہیں کیا۔"

"مسئلہ چار ہزار تین سو کا تھا۔" میں نے کہا۔ "سات سو تو خرچ ہوئے تھے۔ خرچ کی نوعیت میں نے کہاں بتائی؟"

"تم اے ایس پی کو گدھا سمجھتے ہو؟" حشمت خاں برافروختہ ہو کے بولا۔ "ملزم جو لاک اپ میں بند ہو سات سو روپے کہاں خرچ کر سکتا ہے۔ اس شکایت کا انعام ہم تمہیں واپسی پر دیں گے۔ آج رات بھی تو تم ہمارے مہمان رہو گے۔"

"آج ہی کیوں؟" میر بولا "ریمانڈ مہینے بھر کا ضرور ملے گا۔ چودہ دن کا اور پھر مزید چودہ دن کا۔ اس عرصہ میں تمہیں سچ بولنا آ جائے گا۔ تمہارے اتنے بڑے وکیل تمہاری مدد نہیں کر سکیں گے سکندر اعظم۔"

"ہم نے بڑے بڑے طرم خاں دیکھے ہیں۔ چالان پیش ہونے تک ان کا سارا کس بل نکل جاتا ہے۔" حشمت خاں نے کہا۔ "اور چالان کا کیا ہے۔ ہم دو دو سال پیش نہیں کر پاتے تفتیش ہوتی رہتی ہے۔ جوڈیشل ریمانڈ پر تم جیل کاٹتے رہو گے۔"

"سال سال تو ہم حاضری نہیں دیتے۔" میر محمد نے غرور سے کہا۔ "عدالت سمن جاری کرتی رہتی ہے جو وصول نہیں ہوتے۔ پھر وارنٹ نکال دیتی ہے جو دو چار مہینے بعد ناقابل ضمانت ہو جائیں تو ہم ایک پیشی بھگت لیتے ہیں کہ تفتیش مکمل نہیں ہوئی۔"

"اس خوش فہمی میں مبتلا نہ ہونا کہ تمہاری ضمانت ہو جائے گی۔" حشمت خاں نے کہا۔

"یہ تم دونوں کیا قوالی گا رہے ہو ل کے۔" میں نے تنگ آ کے کہا۔ "دیکھو ٹیکسی والے نے کیا حسب حال شعر لکھا ہے۔

مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔"

ضلع کچہری کے پُرہجوم احاطے میں تینوں ٹیکسیاں آگے پیچھے رک گئیں۔ زیر سماعت مقدمات میں پیش ہونے والے ملزموں کے گواہوں، ضامنوں، وکیلوں اور خیر خواہوں کا ہر عدالت کے سامنے اژدہام تھا۔ ان سب نے صرف ایک بار مجھے دلچسپی سے دیکھا اور پھر بے نیاز ہو گئے۔ جو اس ماحول کے عادی تھے ان کے لیے ایک اور زنجیر بدست ملزم کی تشریف آوری کوئی واقعہ ہی نہ تھی۔ باقی لوگوں کو اپنی اپنی پڑی تھی۔ مجھے برآمدے میں چھوڑ کے انسپکٹروں کی جوڑی عدالت کے آفس میں داخل ہو گئی۔ محسن نے ریڈر سے معلوم کیا اور پانچ روپے کے عوض اس نے یہ اطلاع فراہم کر دی کہ مس رابعہ قاری ساڑھے گیارہ کا ٹائم لکھوا کے گئی ہیں۔ میرے محافظ سخت بیزار کھڑے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

"یار محسن۔" میں نے کہا۔ "یہ سلامت شاہ نہیں آیا ابھی تک۔"

"آ جائے گا۔" محسن نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا اور دو سگریٹیں جلانے لگا۔ ایک اس نے میرے منہ میں لگا دی۔ "آج کون سی گواہی ہے اس کی۔"

"یہ بات نہیں۔" میں نے کہا۔ "مجھے معلوم ہے کہ وہ ... دین کو بتائے بغیر کہاں گیا ہوگا۔ اسے میری ماں کا وہ ... بیچنا تھا جو میرے باپ نے اس پرانے صندوق میں چھوڑا ...

"اتنی صبح سناروں کی دکانیں کہاں کھلتی ہیں۔" محسن نے سوچتے ہوئے کہا۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ سونا ویسے ہی کوئی خریدے۔" ... نے کہا۔ "پرانا سونا ہے جس میں کھوٹ نہیں ہوتا تھا یا ہوتا ... تو ایک آنہ دو آنہ۔ بیٹیوں کا جہیز بنوانے والے شوق سے خریدتے ہیں۔ سنار بنوائی اور گلائی وغیرہ کے حساب ... رقم کاٹ لیتے ہیں۔"

"پھر پریشانی کی کیا بات ہے۔" محسن نے کہا۔ "اچھا ... اگر زیادہ پیسے مل جائیں۔"

"یار تو سمجھتا کیوں نہیں۔ سلامت شاہ کو تھانے بھی ... تھا۔" میں نے کہا۔ "اگر وہ بعد میں پہنچا تو وہاں جو لوگ بیٹھے ... وہ اس کو دس جوتے مارکے ڈک دیں گے۔ اور پھر اس ... وہی انجام ہوگا جو میری بریف کیس والی رقم کا ہوا۔"

محسن کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر اس نے کہا کہ ابھی آتا ہوں اور بھیڑ میں غائب ہو گیا۔ دس منٹ بعد وہ پھر نمودار ہوا ... نے تھانے فون کیا ہے کہ سلامت شاہ آئے تو اسے ... بھیج دیا جائے۔ میں نے کہا میں میر محمد بول رہا ہوں۔ اس کی ... کی نقل کی تھی جو کامیاب رہی۔" اس نے وانت نکال کے کہا۔

دونوں انسپکٹر ایک طرف سے منظر اور رابعہ قاری دوسری ... سے نمودار ہوئے۔ عبدالودود منظر کلاس میں میرا بہت بے تکلف دوست تھا اور قدر مشترک تھی ہم دونوں کی چلبلی طبیعت جس سے سب عاجز تھے مگر ہماری متحدہ قوت کے سامنے کسی کی نہ چلتی تھی۔ جب ہم لڑتے تھے تو میرا پلہ بھاری رہتا تھا۔ چنانچہ ہمارے درمیان طاقت اور سرمائے کے استعمال کا ایک ایسا معاہدہ طے پا گیا تھا جس میں دونوں کا فائدہ تھا۔ وہ ... ماں باپ کا بیٹا تھا اور میری عیاشی کے اخراجات بھی برداشت کر سکتا تھا۔ (عیاشی یعنی کھانا پینا، تفریح چائے اور سینما) ... مانیٹر تھا اور جسمانی طور پر اس کی حفاظت کے علاوہ اس کے دشمنوں کی گوشمالی کر سکتا تھا۔ اور میں نے اسے نالائقی کے باوجود سیکنڈ مانیٹر بھی بنوا لیا تھا۔ بچپن کی یہ سیاست اب مجھے عملی زندگی میں ہر قدم پر کارفرما نظر آتی تھی۔ منظر اب واقعی بہت پھیل گیا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے حلق سے خاصی دبنگ آواز نکالی۔ "ابے سکندر۔ مانیٹر کی دُم۔" پھر اس نے قہقہے کے ساتھ میرے کندھے پر ہاتھ مارا۔ "یہ کیا رونی شکل بنا رکھی ہے۔ قتل ...

کر دیا ہے؟ پھر کیا ہوا قتل مرد ہی کرتے ہیں۔ چھوڑ فکر یونی کے۔ پہلے تو ہمیں بچاتا تھا۔ اب دیکھ ہم احسان کا بدلہ کیسے چکاتے ہیں۔" محسن اور رابعہ پاس کھڑے مسکراتے رہے۔ میر محمد اور حشمت خاں اپنی متانت اور دبدبے کو برقرار رکھنے کی بے سود کوشش میں مصروف رہے۔ عدالت میں جانے سے پہلے منظر نے وکالت نامے پر میرے دستخط لیے۔

بڑے وکیلوں کی موجودگی چھوٹی عدالت میں کیا نفسیاتی اثر ڈالتی ہے اس کا اندازہ مجھے پیشی کے بعد ہوا۔ ان کے مقابل بھی ایل ایل بی تھا مگر وہ پراسیکیوشن سب انسپکٹر ہونے کے باعث اسے اپنی بدبختی سمجھتا تھا کہ وہ پولیس کے ساتھ ہے اس نے واجبی سے دلائل دیے جو رابعہ اور منظر نے چٹکیوں میں اڑا دیے۔ پی ایس آئی میں برابر کا مقابلہ کرنے کی نہ ہمت تھی اور نہ وہ اس کی ضرورت محسوس کرتا تھا کیونکہ حکومت اسے تنخواہ دیتی تھی فیس نہیں۔ میر محمد اور حشمت خاں پیچ و تاب کھاتے رہے اور خون کے گھونٹ پیتے رہے کیونکہ میں نے اپنے بیان میں بتا دیا تھا کہ حوالات میں مجھ پر کس قسم کا غیر انسانی تشدد کیا گیا تھا۔ کس طرح میری رقم خرد برد ہو گئی تھی اور مجھے کیسی دھمکیاں دی گئی تھیں۔ میر محمد نے ان الزامات کی صحت سے انکار کیا اور میرے وکیلوں نے کہا کہ ثبوت ناکافی ہونے کے باعث ان تمام الزامات کے تحت ہم کسی قسم کی قانونی کارروائی کا ارادہ تو نہیں رکھتے مگر ان حالات میں ملزم کو پولیس کے ریمانڈ پر رکھنا ظلم ہوگا اور اگر ایسا کیا گیا تو اس کے خلاف سیشن کورٹ کے بعد ہائی کورٹ میں بھی درخواست ضرور دی جائے گی۔ نتائج خاطر خواہ برآمد ہوئے اور مجسٹریٹ نے مجھے جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا بریف کیس محسن کے حوالے کر دیا گیا۔

"مجھے افسوس ہے انسپکٹر میر اور حشمت خاں کہ تمہیں مایوسی ہوئی اور آج تمہیں میری میزبانی کا شرف حاصل نہ ہو سکا۔" میں نے باہر آتے ہی کہا۔ "انشاء اللہ کل پرسوں تک میری ضمانت کے بعد تمہاری وہ سب قوالی بکواس ہو جائے گی جو تم نے راستے میں کی تھی۔"

"ابے چھوڑ۔ ان کے منہ مت لگ۔" منظر نے فوراً مداخلت کی۔ "مجھ سے بات کر۔ تیری ضمانت کی درخواست کا وقت ساڑھے بارہ بجے ہے۔ انشاء اللہ آج ہی اے پی پی کو نوٹس جاری ہو جائے گا۔ آج کی رات ذرا جیل دیکھ آ۔ کل سماعت ہوگی اور اس کے بعد ضمانت۔ محسن نے سب انتظام کر لیا ہے۔"

"درخواست میں کیا لکھا ہے منظر؟" میں نے کہا۔

"ابھی دوں گا ایک چھانپڑ۔ یہ وکیلوں کے معاملات ہیں۔ ہم پر چھوڑ دے۔" منظر بولا "مختصراً بتا دیتا ہوں۔ بنیاد تیرے خلاف ایک سازش کو بنایا گیا ہے جس کا مقصد تجھے سزائے موت یا عمر قید دلانا ہے اور ناکامی کی صورت میں قتل کر دینا ہے اور اس ضمن میں مختلف واقعات کا حوالہ ہے جو لندن میں پیش آئے۔ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ تیرے والد کو بلیک میل کے بعد قتل کیا گیا اور یہ بھی انہی سازشی عناصر کی کارروائی تھی جو ہنوز روپوش ہیں اور اس ضمن میں یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ لاش کو نکلوا کے پوسٹ مارٹم کروانے کی درخواست الگ سے ڈی ایم کی عدالت میں پیش کی جا رہی ہے۔ تیسرا نکتہ سلامت شاہ کی گواہی کا ہے جو سب سے اہم ہے اور جس کے مطابق واردات کے وقت تیرا جائے واردات سے بہت دور ہونا ثابت ہوتا ہے۔"

"منظر صاحب، یہ سب مفروضات ہیں۔" میر محمد نے مداخلت کی۔

"یار تھانیدار بادشاہ۔" منظر نے پلٹ کر کہا۔ "تم دخل در معقولات مت کرو۔ سمجھے۔ تمہیں کیا معلوم کیا ہوگا کیا نہیں۔ اگر ابھی خواہ مخواہ تمہارے خلاف تشدد، حبس بے جا، غبن اور اختیارات کے ناجائز استعمال کی عدالتی تحقیقات کا چکر چل گیا تو لائن حاضر ہو گے۔ کیا فائدہ اس تھانیداری سے بھی جاؤ گے۔ جاؤ عیش کرو۔" اس کے بعد ان دونوں میں سے کوئی بھی نہیں بولا منظر مجھے اپنی سابقہ زندگی کے بارے میں بتاتا رہا۔ خصوصاً اپنی بیوی کے بارے میں جو بقول اس کے شادی سے پہلے نقش چغتائی تھی تو اب تجریدی آرٹ کا نمونہ۔ "غضب خدا کا یار۔ شادی کو ہوئے ہیں صرف پانچ سال۔ پہلے جوڑی لڑکوں کی۔ پھر دو لڑکیاں۔ پچھلے سال ڈبل لڑکے۔ حجم میں اور وزن میں میری برابری پر آمادہ ہے چنانچہ مستقبل سخت مخدوش ہے۔ میں تو سوچ سوچ کے ہلکان ہوتا ہوں۔ بیویاں شادی کے بعد بیس تیس سال تو ساتھ نبھا ہی جاتی ہیں۔" محسن، میں اور رابعہ ہنستے رہے۔ "ہنستے ہو؟ کچھ شرم کرو یار۔ پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں۔ ارے بھائی آپس میں ہی ٹاس کر لو۔ اچھی خاصی فلمی مثلث ہے۔ ہیرو۔ ہیروئن۔ ولن۔"

ساڑھے بارہ بجے سیشن جج کی عدالت میں میری پیشی ایک رسمی کارروائی تھی جس کے بعد اے پی پی کو نوٹس جاری کرنے کے احکامات صادر ہو گئے اور جیل سے سماعت کے لیے ملزموں کو لے کر آنے والی گاڑی مجھے بھی لے کر روانہ ہو گئی۔ محسن نے کہا کہ وہ سلامت شاہ سے رابطہ قائم کرنے کی پوری کوشش کرے گا۔ شام کو اسے اپنے پاپا سے بھی ایئرپورٹ پر ملنا تھا اور پھر دوسرے

ضامن کا انتظام کرنا تھا۔ میں نے اسے پھر یاد دلایا کہ اس نے ایک اور ذریعے سے رقم کی فراہمی کا ذکر بھی کیا تھا۔ نہ جانے کیوں پھر محسن کا چہرہ اتر گیا اور اس نے صرف اقرار میں سر ہلا یا۔ اس سے اگلے دن صبح عدالت میں ہی ملاقات کا امکان تھا مگر رابعہ نے کہا کہ وہ شام کو مجھ سے جیل میں ملے گی، اور اس پورے کیس کے بارے میں مزید معلومات حاصل کریگی۔

پھر دیو ہیکل بس ٹائپ ٹرک کا آہنی دروازہ بند ہو گیا جس کے باہر دو مسلح سپاہیوں پر مشتمل گارڈ بیٹھی تھی اور پھر دوسرا دروازہ تھا۔ اس ڈبے میں بیس کے قریب قیدی بھر دیئے گئے تھے اور گرمی سے سب کا برا حال تھا۔ ہوا کا راستہ ان آہنی جالیوں کے سوا کہیں نہ تھا جو آٹھ فٹ لمبے چھ فٹ چوڑے اور مشکل سے پانچ فٹ اونچے ڈبے کی چھت کے ساتھ ساتھ چند انچ چوڑے روشندانوں کی طرح نظر آتی تھیں۔ اگر قیدیوں کے دم گھٹ کے مر جانے کا ڈر نہ ہوتا تو شاید اتنا تکلف بھی نہ کیا جاتا۔ جب در زنداں کھلا اور لاری سے باہر آ کے میں نے کھلی ہوا میں سانس لیا اور کمر سیدھی کر کے دیکھا تو مجھے جیل کا احاطہ دکھائی دیا۔ وقتی طور پر بھاگنے کی عقوبت گاہ کے مقابلہ میں یہ پناہ گاہ ضرور تھی مگر فوری طور پر جو خیال مجھے آیا وہ کم لرزہ خیز نہ تھا۔ کون جانے اس جیل ہی میں کسی صبح سورج کے طلوع ہونے سے قبل تختۂ دار پر میری زندگی کا سفر تمام ہو اور میری لاش اندھے کنویں سے نکال کے محسن رضا کے حوالے کر دی جائے۔ کہ صفتِ دشمناں کو خبر کر دو مرے چارہ گر کو نوید ہو۔ اور فوزیہ سے کہو کہ وہ جو قرض رکھتے تھے جان پر وہی قرض آج چکا دیا۔ اور یہ بھی نہ ہوا تو ایک عمر ان ہی دیواروں کے بے رحم حصار میں گذر جائے۔ وہ عمر جو زندگی کا سب سے گراں مایہ ٹکڑا تھی اور جس کا ایک ایک لمحہ خواہشات کا خزینہ تھا۔ خواہش ستاروں پر کمند ڈالنے کی۔ خواہش خوشبوئے گل کو زیر دام کر لینے کی۔ خواہش قوس قزح کے رنگ سمیٹ لینے کی۔ ہر بے وفا خواہش جو صرف جواں دل میں گھر کرتی ہے اس عمر کے گذر جانے کے بعد کہاں ہو گی۔ کسی اور دل میں جیسے فوزیہ کسی اجنبی گھر میں ہو گی اس گھر سے بالکل مختلف گھر میں جس کی حسرت تعمیر ہمارے خواب عشق کا حاصل تھی۔ میں نے دل ہی دل میں خدا سے پناہ مانگی پناہ ان خیالات کی جلا دی سے۔ پناہ اندیشوں سے اور وسوسوں سے جو مجھے تنہا پاتے ہی شیاطین کے لشکر کی طرح مجھ پر یلغار کریں گے۔ مجھے سکون دے یقین دے اور استقامت دے میرے معبود۔!

شام کو چار بجے جب میں جیل کی روٹی کا ذائقہ چکھ کے سوچ رہا تھا کہ ابھی سورج کو آسمان کی کتنی مسافت طے کرنی ہے اور کل کا دن کتنی صدیوں کے فاصلے پر ہے مجھے جیلر کے آفس لے جایا گیا۔ وہاں ایک کرسی پر رابعہ بیٹھی تھی۔ صبح کی اور اس وقت کی رابعہ میں اتنا فرق تھا کہ میں دنگ رہ گیا اس نے گلابی ساڑی باندھ رکھی تھی جس میں آتشیں سرخ گلاب کھلے ہوئے تھے۔ شعلہ رنگ بلاؤز اس کے گداز صحت مند جسم پر خوب سج رہا تھا۔ اور اس کا مرمر جیسا بے داغ رنگ کچھ اور نمایاں ہو گیا تھا۔ اس نے ہلکا سا میک اپ بھی کیا تھا اور نظر کی عینک کی جگہ ہلکے سبز رنگ کے شیشوں والی عینک لگا رکھی تھی۔ اس کی شخصیت میں ایسا وقار اور ایسی تمکنت تھی کہ عام آدمی اس کے رعب حسن کے مقابل گستاخ نگاہی کی جرات بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس پیشے نے تعلیم نے اور اعلیٰ خاندانی پس منظر نے اس کے انداز و اطوار میں بے پناہ اعتماد پیدا کر دیا تھا۔ میں نے اس کے مقابلے میں فوزیہ کا تصور کیا جو ایک بہت گھریلو قسم کی۔ سادہ لوح و سادہ دل۔ خوبصورت خوابوں سے بہل جانے والی۔ بے بنیاد اندیشوں پر رو دینے والی تخیلات و تصورات کی دنیا میں گم رہنے والی۔ جذباتی۔ بزدل اور کم ہمت۔ جس کے لیے گھر کے باہر ہوس پرست شکاری مردوں کی دنیا ایسی ہی تھی جیسے معصوم ہرنی کے لیے خونخوار بھیڑیوں کا جنگل۔ رابعہ حسین ہونے کے باوجود فوزیہ کا پاسنگ بھی نہ تھی کم سے کم میری نظر میں۔ مگر یہ حسن کے انداز کا فرق تھا۔ فوزیہ بے ضرر اور پالتو سیامی بلی تھی جو گود کی پناہ میں دبک کے صرف پیار پیار مانگتی ہے۔ رابعہ جوان شیرنی تھی جو اپنے رنگ روپ کی چمک دمک۔ چال کے بانکپن اور قوت تسخیر کے غرور میں کسی طرف نظر اٹھا کے دیکھ لے تو اسے مسحور کر کے تسکار کرلے.... فوزیہ بارش کی رات میں طوفانی ہواؤں سے محفوظ گھر کی دیواروں میں نرم روشنی دینے والی موم بتی کا اجالا تھی۔ رابعہ اسی رات کے آسمان پر کوندنے والی بجلی۔

"ایسے کیا منہ اٹھائے کھڑے ہو۔" وہ مسکرا کے بولی۔ "کیا دیکھ رہے ہو؟"

"تمہیں۔" میں نے ہمت سے کام لے کر سچ بول دیا۔ "صبح کی اور اس وقت کی رابعہ کا فرق دیکھ رہا ہوں اور سوچ رہا ہوں وہ لوگ کتنا غلط سوچتے ہیں جن کا خیال ہے کہ وکالت اکاؤنٹس اور انجینئرنگ جیسے پیشوں سے عورت کی نسوانیت کا حسن مجروح ہوتا ہے۔"

اس نے بے تکلفی سے ہاتھ ملایا اور میں اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ "شاعری پھر کبھی کر لینا۔ میں تم سے مفصل گفتگو کرنے کے لیے آئی ہوں۔ ذرا اپنے جانے اور نکالے جانے کا قصہ سناؤ۔ آخر یہ سازش کا کیا چکر ہے۔"

ایک گھنٹے تک میں بولتا رہا اور وہ سنتی رہی۔ میں نے ان تمام واقعات کا ذکر کر دیا جو میرے ساتھ لندن میں پیش آئے تھے اور جن کی ابتدا میرے کمرے میں ایک اجنبی لڑکی کی ہنگامہ آرائی سے ہوئی تھی اور انتہا میرے لندن سے ڈی پورٹ کیے جانے پر۔ میں نے اس شبہے کا اظہار بھی کیا کہ وہ لڑکی میری تصویر لینے ہرگز نہیں آئی تھی۔ "تصویر ایسا بڑا مسئلہ نہیں ہو سکتی اور راہ چلتے یوں کھینچی جا سکتی تھی کہ مجھے خبر ہی نہ ہو۔" میں نے کہا۔ "غالباً وہ میرے خطوط کی تلاش میں تھی۔"

"تمہارے خطوط سے اس کو کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔" رابعہ نے کہا۔

"رابعہ اگر میں یہ فرض کر لوں۔ میرے پاس تو یقین کرنے کی وجوہات بھی معقول ہیں کہ میرے والد کو بلیک میل کرنے کے بعد قتل کر دیا گیا۔" میں نے کہا۔ "تو ذرا مجرموں کے نقطۂ نظر سے سوچو کسی مجبوری یا کمزوری۔ ماضی کی کسی ایسی غلطی کے باعث جس کا اثر مستقبل پر بھی پڑ سکتا ہو۔ خواہ یہ غلطی دانستہ ہوئی ہو یا نادانستگی میں سرزد ہوئی ہو۔ مجرم میرے والد کا لہو چوستے رہے میرے والد فرشتہ نہیں تھے انسان تھے چنانچہ کسی داغ گناہ سے ان کے دامن کی آلودگی کو میں ناممکن نہیں سمجھتا لیکن جو بات غور طلب ہے وہ بلیک میلنگ پر ان کی خاموشی ہے۔ انہوں نے کسی قابل اعتماد دوست پر مثلاً شیروانی صاحب پر۔ کیا مجھ پر بھی اعتماد نہیں کیا۔ جو شخص زندگی میں ایک مقصد کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر چکا ہو اور جدوجہد آزادی کو اپنے تمام تر رشتوں کا لہو دے چکا ہو اور اتنا باہمت ہو کہ اتنا بڑا صدمہ جھیل کے پاگل نہ ہوا ہو بلکہ نئے سرے سے زندگی کی دوڑ میں شریک ہو گیا ہو اور جو اپنی دنیا کو ایک بار مکمل تباہی سے دوچار ہوتے دیکھ کر بھی مایوسی کا شکار نہ ہوا ہو اور جس نے گردش روزگار سے شکست قبول کرنے سے انکار کر دیا ہو۔ جو تعمیر نو کے مقصد میں کامیابی حاصل کر چکا ہو اسے بے بسی کے ساتھ سب کچھ ہار دینا کیوں قبول ہو گا؟ اس لیے کہ وہ بزدل تھا یا اسے اپنی زندگی سے بہت پیار تھا؟ نہیں رابعہ۔ نہ وہ بزدل تھا اور نہ خود غرض۔ اس کی جدوجہد کا حاصل اور اس کا سرمایۂ حیات میں تھا۔ اس عمر میں اسے اپنا نہیں میرے مستقبل کا تحفظ عزیز ہو سکتا تھا۔ وہ یوں مرنے کی بجائے ایک ہی بار مرنے یا مارنے کو ترجیح دیتا وہ اپنی بدنامی اور رسوائی کے خیال سے یا اپنے ماضی کے کسی جرم کے افشا ہونے کے احساس سے یا کسی گناہ کی تشہیر کے خوف سے بھلا کیوں بلیک میل ہوتا۔ میرا خیال ہے کہ اس کی خاموشی کا سبب ہی یہ تھا کہ وہ مجھے بچائے رکھنا چاہتا تھا۔ اسے یہ منظور نہیں تھا کہ اس کے ماضی کا آسیب میری زندگی پر سایہ فگن ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے مجھے اپنے سے دور رکھا۔ اگر میں قریب ہوتا تو یہ سب کچھ کہاں برداشت کرتا اور دشمنوں کے ہاتھوں اس کی تباہی کا خاموش تماشائی کیسے بنا رہتا۔ میں اس سے پوچھتا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے۔ یہ ناممکن تھا کہ مجھے پتا نہ چلتا۔ وہ نہ بتاتا تو میں خود معلوم کر لیتا۔ اسی مجبوری کے باعث اس نے مجھے بہت دور کے کالج میں پڑھایا اور انجینئرنگ کی تعلیم کے لیے برطانیہ بھیج دیا۔ ذرا خود سوچو۔ کیا لاہور میں اچھے کالج نہ تھے اور اب وہ پرانا زمانہ تو ہے نہیں کہ اعلیٰ تعلیم کے لیے رئیس زادے ولایت چلے جاتے تھے۔ اب زیادہ سے زیادہ تعلیم کے مواقع ملک میں ہی حاصل ہیں۔ انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم بھی ملک ہی میں حاصل کی جا سکتی ہے۔ بہت اعلیٰ سطح پہ ڈاکٹر یا انجینئر کسی فیلڈ میں اسپیشلائز کرنے کی خاطر تو باہر چلے جاتے ہیں مگر میں نے تو انجینئرنگ کی سند بھی حاصل نہیں کی تھی۔ صرف بی ایس سی کیا تھا کہ ابا نے مجھے چلتا کیا۔ بہانہ یہ کہ اعلیٰ تعلیم کا جو معیار اور تصور وہاں ہے یہاں نہیں۔ میں کم عقل اور ناتجربہ کار تھا اور میرے ذہن میں یہ سب کچھ نہیں تھا جو آج ہے کہ مجھے باہر بھیجنا حالات سے لاعلم رکھنے کی سازش ہے۔ میں لالچ میں آ گیا کہ چلو ولایت میں عیش کریں گے اور دنیا دیکھیں گے آج یہ سوچ کر میرا دل خون کے آنسو روتا ہے کہ میرے باپ نے کس طرح میری زندگی کے لیے تھوڑا تھوڑا کر کے قتل ہونا قبول کیا۔ اس نے اپنی ساری کمائی لٹا دی اور مجھے خبر نہ ہونے دی۔ اس کا منافع ایک دستخط پر دوسروں کے کھاتے میں چلا گیا۔ وہ مجھے لکھتا رہا 'سب خیریت ہے'۔ اس کی کوٹھی کا رس بک گئے۔ اس نے لکھا مگر کوئی بات نہیں۔ وہ ایک نمک حرام خادم کے ادنیٰ خادم کی حیثیت سے ملازم ہو گیا مگر اس نے مجھے لکھا کہ ٹیلی فون بدل گیا ہے نوٹ کر لو۔ وہ گھر میں جھاڑ پونچھ کرتا رہا۔ بچے کھچے ٹکڑے سمیٹتا رہا اور گنٹھیا میں مبتلا ہونے کے باوجود علاج کو ترستا رہا مگر اس نے مجھے محرومی کا احساس نہیں ہونے دیا۔ یہ کیسے ممکن ہے رابعہ کہ کوئی شخص اتنا بڑا راز سینے میں لے کر قبر میں جا سوئے۔ مجھے یقین ہے ابھی اس کا مرنے کا ارادہ نہیں تھا۔ اس نے سوچا ہو گا کہ جب اجل کے نامہ بر کے آنے کا وقت ہو گا اد۔

اس کے قدموں کی آہٹ سنائی دینے لگے گی تو وہ اپنے بیٹے کے سامنے اعتراف کرے گا کہ اس نے تمام عمر اسے بے خبری کے اندھیرے میں کیوں رکھا۔ یہ وقت اس کے خیال میں ابھی دور تھا۔ میری تعلیم کا زمانہ پورا نہیں ہوا تھا اور اس کی بیماری کی نوعیت ایسی نہ تھی کہ وہ کچھ دن اور اسی زندگی کو اور اس کی مجبوری کو لے کر نہ چلتا رہتا۔ وہ اس وقت تک مجھے کچھ نہ بتاتا جب تک میری تعلیم مکمل نہ ہوتی اور ظاہر ہے کہ میں واپس آتا تو وہ کیسے چھپاتا کہ اس نے اپنا سب کچھ کہاں اور کیسے ہار دیا۔ اسے ڈر ہوگا کہ ابھی یہ بات مجھے معلوم ہوئی تو میرا ردعمل انتقامی ہوگا اور میں تعلیم اور مستقبل پر لعنت بھیج کر اس کے دشمنوں کے خلاف صف آرا ہو جاؤں گا۔ ایسی صورت میں اس کا مشن ادھورا رہ جاتا اور یہ اس کی سب سے بڑی ناکامی ہوتی۔ لیکن اس کے دشمن بہرحال اس اندیشے میں مبتلا ہوں گے کہ بڈھے نے خاموشی کے وعدے کے باوجود کہیں اپنے بیٹے کو سب کچھ نہ لکھ مارا ہو۔ اتنا تو وہ بھی سمجھتے ہوں گے کہ جب آدمی کے پاس ہارنے کو کچھ نہ رہے تو وہ زندگی بھی داؤ پر لگا دیتا ہے۔ وہ لڑکی یہی دیکھنے آئی ہوگی کہ کہیں میرے خطوط میں کوئی ایسی تحریر تو نہیں جس میں بلیک میلنگ کا شکار ہونے والے نے شکاری کا کچا چٹھا بیان کر دیا ہو۔ اگر میرے والد کو موت کا یقین ہوتا تو وہ مجھے لکھ دیتے کہ ان سے کیا غلطی سرزد ہوئی تھی جس کی انہوں نے اتنی بھاری قیمت ادا کی۔ زندگی میں نہ سہی مرنے سے پہلے باپ اپنے بیٹے کو یہ راز بتا کے اپنی روح پر کوئی بار گناہ نہ رکھتا۔ مگر ان کی موت اچانک واقع ہوگئی۔

کیوں؟ کیسے؟ ان سوالوں کا جواب تو دوبارہ پوسٹ مارٹم سے مل ہی جائے گا۔ باقی سوالات کا جواب میں بشرط زندگی خود معلوم کر دوں گا کہ ان کی زندگی کا وہ کون سا راز تھا جسے انہوں نے مجھ پر بھی افشا نہ کیا۔ اگر وہ بدترین جرم یا گناہ ہوا تب بھی ان کی عزت و توقیر میری نظر میں کم نہ ہوگی کیونکہ ایک باپ کی حیثیت سے جو کچھ انہوں نے میرے لیے کیا وہ بہت خوش نصیب بیٹوں کا مقدر ہوتا ہے اور ایسے باپ بہت کم ہوتے ہیں۔ شاید نہیں ہوتے۔"

خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا جس میں جیلر نے دوسری بار سر اندر ڈال کے اور کھنکار کے یاد دلایا کہ وقت بہت ہو چکا ہے۔ رابعہ نے ایک سرد آہ بھری اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ "میں تمہارے مفروضات کے منطقی جواز سے پوری طرح اتفاق کرتی ہوں۔ واقعات کو دیکھتے ہوئے اسباب کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ تم ان خونخوار درندوں کو تلاش کر لوگے جنہوں نے تمہارے والد کی جان لی۔ تم بڑے شکاری ہو اور تمہارے ساتھ قدرت کے نظام انصاف کی قوت ہے۔ خیر و شر کی ازلی و ابدی جنگ میں اگر آخری فتح خیر کی نہ ہوتی تو آج اس دنیا کا وجود نہ ہوتا۔ میں اپنی بساط، استطاعت اور استعداد کے مطابق تمہاری مدد کر دوں گی۔"

"میرے لیے سب سے بڑا سہارا یہی ہے۔" میں نے کہا۔ "کہ میرے ساتھ محسن ہے۔ تم ہو، منظر ہے اور سلامت شاہ ہے۔"

"سلامت شاہ تمہارا ٹرمپ کارڈ ہے۔" وہ بولی۔ "اس کی گواہی تمہیں بے گناہ ثابت کر سکتی ہے ورنہ اب تک حالات کی اور واقعات کی تمام شہادت تمہارے خلاف ہے۔ یہ تو تم بھی تسلیم کرتے ہو کہ آلۂ قتل پر تمہارے فنگر پرنٹ ہوں گے۔ پھر رہ کیا جاتا ہے۔ وجہ قتل تک بالکل واضح ہے۔ کل تمہاری ضمانت ضرور ہو جائے گی۔ میں نے اپنے طور پر اس کو یقین بتا دیا ہے۔ میرے ڈیڈی کے بھی کچھ تعلقات تھے۔ وہ لوگ ابھی زندہ ہیں اور پرانے تعلق سے مجھے بیٹی بھی سمجھتے ہیں۔ پرانے وضعدار لوگ ہیں نا۔ ان کی کوشش اضافی مدد ہے۔ پھر ہم سپریم کورٹ تک لڑیں گے۔"

"تھینک یو۔ تھینک یو ویری مچ رابعہ۔" میں نے کہا۔ "زندہ رہا تو تم سب کے احسانات کا بدلہ ضرور چکا دوں گا۔"

وہ مسکرائی۔ "زندہ تو خیر تم رہو گے۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی کے احسان کا بدلہ نہ ادا کر سکو۔"

"ایک بات پوچھوں رابعہ۔ بلکہ دو باتیں؟" میں نے کہا۔ "ان کا تعلق تمہاری ذات سے ہے۔"

"پوچھو۔" وہ بولی۔ "میرا خیال تھا تمہارا کبھی مجھ سے ذاتی تعلق نہیں رہا۔ اسکول اور کالج تک بہرحال نہیں تھا۔ یا تھا تو یک طرفہ۔"

میں نے اس کی صورت کو غور سے دیکھا۔ "یہ بتاؤ تم مجھے کیا سمجھتی ہو؟ مجرم یا بے گناہ؟"

"اگرچہ میرا اپنا یقین کوئی معنی نہیں رکھتا لیکن میری نظر میں تم قاتل نہیں ہو۔ یہ میرا ایمان ہے اور ایمان کا جواز عقل سے نہیں ملتا۔" وہ بولی۔

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ یہ احساس بھی بڑی نعمت تھا کہ میرا ساتھ دینے والے مجھے گناہگار نہیں سمجھتے۔

"اب جلدی سے وہ دوسری بات بھی پوچھ لو۔" اس نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔

"دوسری بات۔" میں نے تھوڑے سے تامل کے بعد کہا۔ "تم نے اب تک شادی کیوں نہیں کی۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہو سکتی کہ تم نے کسی کو یا کسی نے تمہیں پسند نہ کیا ہو۔ تمہاری خوش قسمتی شبہے سے بالاتر ہے۔"

"یہ لمبی کہانی ہے۔" اس کی صورت پر بادل کے سائے کی طرح اداسی کا آسیب پھیلا اور گذر گیا۔ "اب میں کیسے کہوں کہ تم سو فیصد صحیح کہتے ہو اور سو فیصد غلط بھی یہی بات ہے۔ ابھی ذہن کو اس معمے میں الجھانے کی ضرورت نہیں۔ کسی روز میں خود ہی بتا دوں گی۔ اور یہی سوال تم سے بھی کروں گی۔"

"شب بخیر۔ آج کی رات میں جیل کیا کانٹوں کی اور انگاروں کی سیج پر بھی سکون سے سو سکتا ہوں۔" میں نے اس کا ہاتھ تھاما اور چھوڑ دیا۔

پھر در زنداں بند ہوا اور رات آئی۔ اپنی تنہائی کا حصار قائم کر کے میں نے خوبصورت لمحوں کی اور حسین یادوں کی، خیالوں کی اور تصورات کی انجمن سجائی اور میں نے دیکھا کہ روشن جمال یار سے ہے انجمن تمام۔ ہر نقش خیال تھا کہ فروزاں ہوا۔ ہر احساس کی مشعل تھی کہ جل اٹھی۔ وہ چاند چہرہ ستارہ آنکھیں۔ وہ زینوں کے اجلے لمحے۔ محبتوں کے امین اجالے۔ سب کنج زنداں میں اتر آئے۔ اندھیرا کہیں نہ رہا۔ نہ مایوسی کا نہ ذلت کا نہ بے کسی کا۔ سوتے جاگتے میں نے خواب دیکھے۔ فوزیہ ایک گھڑی کی مہمان رہی۔ میں نے کہا۔ میری فرد جرم دیکھو۔ دیکھو کہ میرے ہاتھوں میں زنجیر ہے اور میں مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا ہوں۔ وہ ہنسی اور بولی۔ "جہاں پر ہم تم کھڑے ہیں دونوں سحر کا روشن افق یہیں ہے۔ سحر جو شب سے عظیم تر ہے۔ یقیں جو غم سے کریم تر ہے۔" پھر رابعہ نے آکے ہاتھ ملایا اور کہا۔ تمہارا تو کبھی مجھ سے ذاتی تعلق نہیں رہا یا رہا تو یکطرفہ۔ نائی لوائے۔ تم کلاس میں مانیٹر ہونے کا سب سے زیادہ رعب مجھ پر جھاڑتے تھے۔ اور اب؟ آئے تو یوں کہ جیسے ہمیشہ تھے مہرباں۔ بھولے تو یوں کہ گویا کبھی آشنا نہ تھے۔ رات کے آخری پہر میں جیلر نے کہا۔ تمہارا بلیک وارنٹ موصول ہو گیا ہے۔ کل تمہاری لواحقین سے آخری ملاقات کرا دی جائے گی اور صبح طلوع آفتاب سے قبل تمہیں پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا۔ تمہیں کوئی وصیت کرنی ہے؟

میں چونک کر جاگا تو پسینے میں تر بتر تھا اور میرا وجود دہشت سے کانپ رہا تھا۔ صبح ہو چکی تھی۔ میں نے ذہن سے اس بھیانک خواب کو جھٹکنے کی کوشش کی جس کی تعبیر بعید از قیاس نہ تھی۔ جب آج کے دن پیش ہونے والے قیدیوں کو بھر کے گاڑی پھر جیل خانے سے روانہ ہوئی تو مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ اسیری کتنی پر عذاب مجبوری ہے۔ یہ صرف ایک رات تھی جس نے مجھے آزاد انسانوں کی دنیا سے الگ کر دیا تھا۔ اگر یہ بات عمر قید کی حد تک پھیل گئی تو کیا باہر آنے کے بعد میں دنیا کو پہچان سکوں گا یا دنیا مجھے پہچانے گی؟ عدالت کے ہجوم میں سب سے پہلے مجھے محسن کا منتظر مضطرب چہرہ دکھائی دیا۔ میری نگرانی پر مامور محافظ بدل چکے تھے چنانچہ اس نے مجھے عدالت کی کینٹین پر لے جا کر ناشتہ کرایا۔ وہاں جو کچھ دستیاب تھا جیل کے ناشتے سے لاکھ درجہ بہتر تھا۔ محافظوں نے ناشتے میں برابری کی شرکت کے بعد اپنا نذرانہ وصول کیا اور مجھے واپس عدالت کے برآمدے میں لے گئے۔ محسن نے بتایا کہ ڈیڈی آ گئے ہیں اور ایمبیسڈر ہوٹل میں ٹھہرے ہیں۔ دس بجے تک اپنے کسی دوست کے ہمراہ آئیں گے۔ جو ریلوے ہیڈ کوارٹرز آفس میں کوئی بڑا توپ قسم کا افسر ہے۔ وہ دونوں میرے ضامن ہوں گے۔

"رابعہ نے بھی کوئی چکر چلایا ہے۔" میں نے اسے مطلع کیا۔ "وہ کل شام جیل میں مجھ سے تفصیلی گفتگو کے لیے آئی تھی۔ اسے پورا یقین تھا کہ ضمانت ہو جائے گی۔ لیکن یار وہ نقد رقم کی پوزیشن کیا ہے۔"

"نقد رقم کی پوزیشن کچھ ایسی ہے کہ بہت زیادہ اطمینان بخش نہیں کہی جا سکتی۔" وہ سوچ کے بولا۔ "سلامت شاہ سے رابطہ نہیں ہو سکا۔"

"کیوں؟" میں نے کہا۔ "اگر وہ ملا نہیں تھا تو اس کے لیے پیغام چھوڑ دینا تھا کہ سیدھا عدالت آ جائے۔"

"آج صبح پیغام تو چھوڑ آیا ہوں۔" وہ بولا۔ "مگر چراغ دین نے بتایا ہے کہ وہ ابھی تک لاپتا ہے۔ چوبیس گھنٹے سے اس کے کوارٹر میں تالا پڑا ہوا ہے اور اس کی خیر خبر بھی نہیں ملی۔"

"یہ تو تشویشناک بات ہے۔ سلامت شاہ ایسے کہاں جا سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ مجھے پیسے کی کتنی سخت ضرورت ہے۔ ضرورت سنگین نہ ہوتی تو میں وہ زیور بیچتا جو میرے پرکھوں کی نشانی تھا اور میری ماں نے چھوڑا تھا۔"

"یار یہ نہیں ہو سکتا کہ سلامت شاہ کی نیت خراب ہو گئی ہو۔" محسن نے کہا۔ "وہ زیور لے کر بھاگ گیا ہو۔"

"ناممکن تو دنیا میں کچھ نہیں مگر میرا دل کہتا ہے سلامت شاہ بے ضمیر آدمی نہیں۔ دس پندرہ ہزار کے زیور کی خاطر وہ نوکری

چھوڑ دے گا اور مجھے مصیبت میں چھوڑ کے بھاگ جائیگا۔"
میں نے نفی میں سر ہلایا۔"اس سے زیادہ امکانات مجھے یہ نظر آتے ہیں کہ وہ کسی حادثے کا شکار ہو گیا۔ٹریفک کا حادثہ نہیں وہ حادثہ جو میرے کسی بھی مددگار کے ساتھ پیش آسکتا ہے۔ خصوصاً اس گواہ کے ساتھ جس کی گواہی پر مقدمے کے فیصلہ کا دارومدار ہو۔اس کا پتا آج نہیں تو کل تک بہر حال چل جائیگا یہ بتا پندرہ ہزار کے علاوہ کتنے ہوئے؟"

"دس ہزار ڈیڈی نے دیے ہیں۔" وہ بولا۔"اور کہا ہے کہ تمہاری ممی کو پتا نہ چلے۔" وہ طنز سے ہنسا۔"یہ ہوئے پچیس ہزار۔"

"تو نے اپنے کسی ذریعے کا ذکر بھی کیا تھا" میں نے کہا۔

محسن کا رنگ ایک بار پھر متغیر ہوا مگر اس نے فوراً خود کو سنبھال لیا۔"اس ذریعہ سے بھی دس ہزار مل گئے ہیں۔" اس نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"محسن"۔میں نے کہا۔"مجھ سے نظر ملا کے بات کر۔ یہ ذریعہ کون ہے؟ اس کے ذکر سے تیرے چہرے پر ہوائیاں کیوں اڑنے لگی ہیں۔ تو نے قرض لیا ہے کسی سود خور پٹھان سے؟ کوئی چیز گروی رکھی ہے۔ کچھ بیچا ہے؟ تجھے قسم ہے اس دوستی کے رشتے کی۔ سچ بتا بات کیا ہے؟"

وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر اس نے کہا۔"قسم مجھے فوزیہ نے بھی دی تھی۔ایسی کی تیسی تم دونوں کی قسم کی۔آخر میں کیا کروں؟"

"کچھ نہیں۔تو مجھے بتا دے۔میں فوزیہ کو نہیں بتاؤں گا کہ تو نے اس سے کیا ہوا وعدہ نہیں توڑا" میں نے کہا۔

"اچھا" وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بولا۔"قسم کھا۔ فوزیہ کی، میری دوستی کی۔ یہ بات تیرے اور میرے درمیان رہے گی۔"

"میں قسم کھاتا ہوں" میں نے ڈوبتے دل کے ساتھ کہا۔"اس کا ذکر تک کسی کے سامنے نہیں کروں گا۔"

"فوزیہ نے مجھے اپنا تمام زیور دے دیا تھا۔" وہ منہ پھیر کے بولا۔" اور کہا تھا کہ ضرورت پڑنے پر سب بیچ دوں مگر تجھے نہ بتاؤں۔"

مجھے یوں لگا جیسے ایک آتشیں تیر میرے دل میں پیوست ہو گیا ہے اور اس کی انگارہ نوک میرے دل میں ٹوٹ گئی ہے میں نے صدمے اور اشتعال کے آتش فشاں کا دہانہ بڑی سخت جدوجہد کے بعد بند کیا ورنہ میرا دل چاہتا تھا کہ میں محسن سے لڑ پڑوں اور اس رقم کی ضمانت پر رہا ہونے سے انکار کر دوں

اس سے کہوں کہ وہ واپس جائے اور دس کے بارہ پندرہ دیکر بھی فوزیہ کا زیور واپس لے آئے۔"محسن۔" میں نے کہا۔

"تو قسم کھا چکا ہے سکندر۔" اس نے میری بات کاٹ دی۔" ہم تینوں اپنی اپنی جگہ مجبور ہیں۔"

اسی وقت میں نے ہجوم میں ایک آشنا صورت دیکھی۔

"محسن"۔میں چلایا۔"وہ دیکھ، اُدھر۔ وہ۔ وہ جو زرد جرسی اور چاکلیٹی پتلون میں ہے۔ یہ وہی ہے۔ پکڑ اسے۔" میری بات ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ زرد جرسی والے نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کے مکرانیوں جیسے بالوں اور کنجی آنکھوں سے زیادہ اس کے دائیں کان میں پڑی ہوئی سونے کی مندری دیکھ کے محسن چونکا۔

مندری والا یکلخت خطرے کے احساس سے مضطرب ہو کے بھاگا۔محسن نے اس کے پیچھے دوڑ لگائی اور لوگوں سے ٹکراتا۔دھکیل کر بھیڑ میں سے راستہ بناتا اور راستے کی رکاوٹوں کو پھلانگتا اس کی جانب لپکا مگر مندری والا ٹیکسی ڈرائیور بہت پھرتیلا تھا اور کچہری کے پُرپیچ راستوں سے واقف تھا۔ وہ لوگوں کی اور عدالت کے اہلکاروں کی پروا کیے بغیر مختلف کمروں سے گذرا اور محسن کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔دس منٹ بعد محسن کو ایک حوالدار نے پکڑ لیا اور وہ بڑی مشکل سے پیچھا چھڑا کے واپس ہوا عدالتوں کو بطور ریس کورس استعمال کرنے کا ہرجانہ پچاس روپے ادا کرنے کے بعد وہ نکل گیا یار۔" وہ ہانپتے ہوئے بولا۔"اگر تو خاموشی سے بتا دیتا تو میں اس کو پیچھے سے جاکے دبوچ لیتا۔"

"بس میں جذبات پر قابو نہ رکھ سکا۔" میں نے افسوس سے کہا۔اب میرا شبہ ایک ناقابل تردید حقیقت میں ڈھل چکا تھا کہ اس مندری والے کا میرے معاملات سے کوئی قریبی تعلق ضرور ہے۔وہ عدالت کے ریڈر سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر ریڈر کے گرد پانچ چھ آدمی کھڑے تھے چنانچہ اسے موقع نہیں مل رہا تھا کہ آگے جاکے بات کرے میں ذرا ضبط سے کام لیتا اور محسن کو اشارا کر دیتا تو وہ چپکے سے پیچھے جا کھڑا ہوتا۔یہ بھی سن لیتا کہ وہ کیا کہنے آیا ہے اور پھر اسے پکڑ لیتا۔خود ریڈر کو بتانا پڑتا کہ وہ کیا چاہتا تھا مگر میری غلطی سے اس کو فرار کا موقع مل گیا اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ہم اسے پہچانتے ہیں۔اب وہ حلیہ بدل لے گا یا غائب ہو جائے گا یا غائب کر دیا جائے گا۔

دس بجے شیروانی صاحب اپنے دوست کے ہمراہ کار سے اترے اور انہوں نے بڑی شفقت اور محبت سے مجھے تسلی دی کہ فکر اور پریشانی کی کوئی بات نہیں۔انشاءاللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔یہ بات ایک رسمی ضرورت کے تحت سب کو کہنی پڑتی تھی۔ان کو بھی جو واقعی مخلص تھے اور انہیں بھی جو نہ دوست تھے نہ دشمن۔مگر یہ بات ہر بار میرے حوصلے کو تھوڑا سا بڑھا دیتی تھی۔گیارہ بجے رابعہ اور منظر ایک ساتھ نمودار ہوئے اور انہوں نے مجھے بتایا کہ درخواست ضمانت کس ایڈیشنل سیشن جج کی عدالت میں ہے۔اے پی پی نے بارہ بجے کا وقت دیا تھا اور رابعہ نے مجھے چپکے سے بتایا کہ اس سے بات ہو گئی ہے۔اس کے بعد عبوری ضمانت تو آج ہی ہو جائے گی۔توثیق ہوتی رہے گی۔ایک مہینے بعد ہو یا دو مہینے بعد۔یہ بڑی حوصلہ افزا خبر تھی جو ایک گھنٹے بعد سچ ثابت ہوئی۔اے پی پی نے بھی بے دلی سے مخالفت کی اور بالآخر رابعہ اور منظر کے دلائل سے اتفاق کرتے ہوئے اپنے اعتراضات واپس لے لیے۔عدالت نے مجھے ۲۰ ہزار روپے کی مالی ضمانت کے ساتھ دو افراد کی شخصی ضمانت فراہم کرنے کا حکم دیا۔نقد رقم اسی وقت جمع کرادی گئی اور شیروانی صاحب اور ان کے دوست نے ضمانت نامے داخل کر دیے۔دستاویزات کی تصدیق اور تکمیل ہونے تک میں قید رہا اور ہتھکڑی سمیت عدالت کے باہر محسن کے ساتھ کھڑا رہا۔بالآخر یہ قانونی کارروائی مکمل ہوئی اور میرے ہاتھوں سے وقتی طور پر وہ زنجیر جدا ہو گئی جس نے اڑتالیس گھنٹے تک میری آزادی کو سلب رکھا تھا۔مٹھائی کے پیسے لے کر محافظ رخصت ہوئے۔

"جا بھئی عیش کر۔ایک متھ اور کرتے۔" منظر نے عدالت سے باہر آتے ہی میرے کندھے پر ہاتھ مار کے کہا اور رخصت ہو گیا۔اسے دوسری عدالت میں جانا تھا۔

پھر مجھے میر محمد نظر آیا جو اے ایس پی کے ساتھ جیپ میں بیٹھنے جا رہا تھا۔ان دونوں کی صورت شکست خوردگی کے احساس کی غماز تھی۔میں تیزی سے آگے بڑھا اور ان کی راہ میں حائل ہو گیا۔"اسلام علیکم حضرات۔" میں نے بڑی جرأت سے کہا۔اگر رابعہ میرے ساتھ نہ ہوتی تو شاید اس سلام کے جواب میں وہ مجھے گالی دیتے اور مجھ سے مصافحہ کیے بغیر نکل جاتے۔"آپ میں سے کسی نے مجھے ضمانت پر رہا ہونے کی مبارک باد نہیں دی۔"

"مسٹر سکندر بخت۔" اے ایس پی نے متانت سے انگریزی میں کہا۔"عبوری ضمانت سے باعزت رہائی کی منزل بہت دور ہے۔بہر حال تم اصرار کرتے ہو تو۔مبارک ہو۔" وہ جیپ میں بیٹھا اور اسی اطمینان سے کسی طرف دیکھے بغیر عدالت کے احاطے سے نکل گیا۔شیروانی صاحب اپنے دوست کے ہمراہ چلے گئے اور تاکید کر گئے کہ میں محتاط رہوں کسی مرحلے پر عدم دلچسپی اور عدم توجہی کا ثبوت نہ دوں اور شام کو ان سے ہوٹل کے کمرے میں مل لوں۔وہ رات کی فلائٹ سے واپس چلے جائیں گے رابعہ نے مجھے بتایا کہ ابھی دو مقدمات اور دائر کرنے ہیں۔وراثت کے سرٹیفکیٹ کا مقدمہ وہ خود فائل کرے گی۔والد کی لاش کو نکلوا کے دوبارہ پوسٹ مارٹم کرانے کا کیس منظر نے لیا ہے چنانچہ میں بلا ناغہ دونوں سے رابطہ قائم رکھوں۔اس نے مجھے اپنا کارڈ دینے کے بعد یہ بھی کہا کہ مجھے جب بھی فرصت ملے میں اس سے گھر آکے ملوں۔شام سات آٹھ بجے تک وہ اپنے آفس میں رہتی ہے جو کوٹھی کے ایک حصے میں ہے مگر اس کے بعد عموماً فارغ ملتی ہے اس کے دو ماتحت وکیل ہیں جو اس کی ہدایات کی روشنی میں اگلے دن کے لیے کیس تیار کرتے ہیں اور ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ خود اسے بھی رات تک ان کے ساتھ لگ کے کام کرنا پڑے۔میں نے اور محسن نے اس کا شکریہ ادا کرنے کی کوشش کی اور شرمندہ ہوئے۔وہ اپنی گاڑی میں ہمیں مال پر چھوڑ کے چلی گئی۔

"یار محسن" میں نے ـــــــــ مجرمانہ ماحول سے نجات پا کے ماں کی خوبصورت دنیا میں سانس لیتے ہی کہا۔ "یہ دنیا کتنی بدل گئی ہے بلکہ میں نے تو محسوس کیا ہے کہ دنیا ہر روز بدلتی رہی ہے۔ جب میں لندن سے واپسی پر لاہور ایئرپورٹ پر اترا تھا تو یہ دنیا کچھ اور تھی۔ صرف ایک گھنٹے میں دنیا وہ نہ رہی۔ اس سے اگلے دن جب میں حوالات میں تھا تو دنیا کا رنگ کچھ اور تھا اور آج پھر یہ دنیا عجیب سی لگ رہی ہے۔"

"یہ احساس کی عینک کا کمال ہے۔" محسن نے کسی فلسفی کی طرح کہا۔ "بچپن میں ہم ایک سیدھے سادھے کھلونے میں یہی تماشا دیکھتے تھے۔ بڑا مشکل سا نام ہے اس کا۔ کلیڈا اسکوپ، مگر وہ ہے کیا۔ وہ نلکی جس کے اندر شیشے کے رنگین ٹکڑے بھر دیئے جاتے ہیں اور اس نلکی کے تین طرف آئینہ ہوتا ہے رنگ برنگے بے ترتیب کناروں والے شیشے کے ٹکڑوں سے تینوں آئینوں کا عکس ایک جیسا نظر آتا ہے تو کیسا خوبصورت پیٹرن بنتا ہے۔ ادھر نلکی ذرا سی گھمائی اور پیٹرن بدل گیا۔ نئی ترتیب سے نیا ڈیزائن۔ . . . تو برادر یہ دنیا وہی کلیڈا اسکوپ ہے۔ اور واقعات وگردشِ حالات سے پیٹرن بدلتے ہیں تو دنیا کبھی کچھ لگتی ہے کبھی کچھ۔"

میرا بریف کیس میرے ہاتھ میں تھا اور میں آزاد تھا مگر اس آزادی کے احساس میں اعتماد کا فقدان تھا۔ رسن ودار کے سائے میرے ہمرکاب تھے اور وقت کا نقیب صدا دیتا تھا کہ یہ مہلت بے ثبات ہے۔ میرے سامنے بہت سے چیلنج تھے۔ مجھے زندگی کا حق ہی نہیں حاصل کرنا تھا۔ نظروں سے اوجھل رہ کے میرے لیے ہر قدم پر دام تعزیر بچھانے والے شکاری کو بھی تلاش کرنا تھا۔ مجھے ثبوت فراہم کرنا تھا کہ میرا باپ ان ہی کی شیطانی چالوں کا شکار ہوا اور شاید پھر اپنے دام میں صیاد آ گیا۔ شرافت علی انہی کی ریشہ دوانیوں کا شکار ہوا، جنہوں نے اس کے کندھے پر رکھ کے بندوق چلائی تھی۔ چنانچہ اب مجھے وزیر خاں کے . . . . قاتلوں کو تلاش کرنا تھا اور ان سے پوچھنا تھا کہ وہ وزیر خاں کو کیوں ڈراتے تھے اور اب اس کے بیٹے سے کیوں ڈرتے ہیں۔ ہے کہاں روز مکافات اے خدائے دار وگیر۔

"کیا سوچ رہا ہے سکندر؟" محسن نے کہا۔ "چل کہیں بیٹھ کے کھانا کھاتے ہیں۔ پھر میں فوزیہ کو فون کروں گا اور اس کے بعد ہم سلامت شاہ کی خبر لیتے چلیں گے۔ شام کو ڈیڈی کا لیکچر بھی سننا ہے۔"

"رات کو ہم سی سی ڈین سے ملیں گے۔" میں نے کہا۔ ...
کہاں رہے گا اپنا؟"

ابھی محسن نے میرے سوال کا جواب بھی نہیں دیا تھا ... بچہ پیچھے سے دوڑتا ہوا آیا۔ "بوٹ پالش سر۔" وہ قریب ... بولا۔ اس نے کندھے پر ایک چھوٹا سا لکڑی کا صندوق ... رکھا تھا اور بارہ چودہ سال کے اس بچے کے میلے کپڑوں ... اور جسم سے پالش کی بو اٹھ رہی تھی۔

"نہیں بھئی۔" میں نے کہا۔ "یہ جوتے اس قابل نہیں ..." مگر وہ بچہ ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ ہم اب بیڈن روڈ پر ... "پالش کرا لیجیے صاحب۔ صرف ایک روپیہ۔ اچھا اٹھنی ..." وہ بولتا گیا۔ پھر اچانک اس نے جیب سے ایک رقعہ نکالا ... "لیں صاحب۔"

اس نے سرگوشی میں کہا۔ "بس ذرا سی دیر رک جائیے ... آپ کے جوتے مفت پالش کرتا ہوں۔"

محسن اور میں ٹھٹک کر رک گئے۔ اس نے ... سے اپنا باکس گلے سے اتار کے نیچے رکھا اور جوتے پالش کر... سامان نکال لیا۔ "یہ رقعہ ایک صاحب نے دیا تھا جو ٹیکسی ... کے چلے گئے۔" اس نے محسن کے پاؤں کو جوتے سمیت باکس ... رکھا۔ "انہوں نے کہا۔ وہ جو صاحب جا رہے ہیں ان کو ... مگر رازداری سے کسی کو پتا نہ چلے۔ انہوں نے مجھے پچاس ... دیا۔ میں نے کہا آپ خود کیوں نہیں دیتے۔ میں غریب آدمی ... کوئی چکر تو نہیں ہے یہ؟ انہوں نے کہا بیٹا مجھے تم سے کیا ... دشمنی ہے۔ اس میں کوئی خطرے کی بات نہیں۔ بس میں ... سلام دعا نہیں ہے ان صاحب سے۔ پھر وہ ٹیکسی میں بیٹھ ... میرا خیال ہے انہوں نے جھوٹ بولا تھا صاحب۔ لائیے ... پیر۔ دیکھیے کیا لشکارا مار رہا ہے جوتا۔ پچاس روپے کا نوٹ ... بہت بڑا ہوتا ہے اور بلاوجہ کوئی نہیں دیتا۔ یہ کیا معاملہ ہے ..."

میں اور محسن ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہے۔ "وہ ... جوان تھے۔ صحت مند۔ کان میں مندری۔ گھنگھریالے بال ..."

"نہیں صاحب۔" لڑکے نے زور زور سے جوتا ر... ہوئے کہا۔ "ساٹھ ستر سال کا دبلا پتلا بڈھا تھا۔ شیروانی او... ترکی ٹوپی میں۔ کارٹون لگتا تھا۔ آپ جانتے ہیں ان کو دو... صاحب تھے۔ میں کسی مشکل میں تو نہیں پڑ جاؤں گا پچاس ... لے کر۔ ایسا تو فلموں میں ہوتا ہے۔"

"اللہ پر بھروسہ رکھو، کچھ نہیں ہوگا۔" محسن نے رقعہ ... دیا۔ "وہ بڑے اچھے آدمی تھے اور ان سے واقعی ہماری سلام ... نہیں۔"

محسن کی آڑ میں رقعہ لے کر میں نے یوں کھولا کہ کوئی نہ دیکھ سکے۔ اس پر صرف تین سطریں بال پوائنٹ سے گھسیٹی گئی تھیں۔

"آج رات کو دس بجے دھرمپورے سے باغبانپورہ جانے والی نہر کے اس کنارے پر ملو جس پر محکمۂ انہار کے دفتر ہیں۔ ملاقات ہوئی یا نہ ہو سکی، بہر صورت کل کی ڈاک سے چراغ دین کے چوکیدار محبت خاں کی معرفت تمہیں ایک لفافہ ملے گا جس پر تمہاری بجائے گلاب خاں کا نام ہوگا چوکیدار سے یہ لفافہ لے لینا مگر اس طرح کہ کسی کو معلوم نہ ہو . . . . . . فومانچو!"

میں نے رقعے کو منہ میں رکھ لیا اور چیونگم کی طرح چبانے لگا۔ "تم بہت اچھے ایکٹر ہو بیٹا! اس لیے تم کسی مشکل میں نہیں پڑو گے۔" میں نے کہا۔

"کدھر اچھے ایکٹر ہیں صاحب! اچھے ایکٹر ہوتے تو جوتے پالش کرتے؟ ہیرو نہ بن جاتے۔" وہ محسن کے جوتوں پر پالش ختم کرتے ہوئے بولا۔ "دن بھر میں دس جوڑے پالش کرتے ہیں تو مشکل سے دس روپے ملتے ہیں۔ پچاس کا نوٹ دیکھ کر لالچ میں پڑ گیا ورنہ انکار کر دیتا۔"

میں نے اپنا پاؤں اس کے باکس پر رکھ دیا۔ "اب اچھے بچوں کی طرح اس پر پالش کرو اور بعد میں ہم جو کچھ دیں وہ سلام کر کے رکھ لینا۔"

"جی صاحب!" وہ بولا اور پورے انہماک سے جوتوں پر پالش لگانے لگا۔ "بدمعاشی کے دھندے تو بہت ہیں جو میرے جیسے لڑکے کرتے ہیں۔ راکٹ گولی اور سفید چڑیا بیچتے ہیں چرس کے سگریٹ فراہم کرتے ہیں اور دوسرا مال بھی۔ مال سمجھتے ہیں نا صاحب آپ؟ مگر وہ پکڑے بھی جاتے ہیں۔ میں پکڑے جانے سے ڈرتا ہوں۔ اندھی ماں ہے۔ ایک چھوٹا بھائی ہے اسکول میں پڑھتا ہے۔"

محسن نے اسے سو کا نوٹ یوں تہہ کر کے دیا کہ ایک کا نوٹ نظر آئے۔ "یہ تو تمہارا انعام۔ اس نوٹ پر ایک ٹیلی فون نمبر لکھا ہوا ہے۔ کبھی ضرورت پڑے تو بات کر لینا۔ کوئی بھی مسئلہ ہو۔ ملازمت کا، رہائش کا، تعلیم کا۔"

"اچھا صاحب۔" لڑکے کا چہرہ مسرت سے دمکنے لگا۔ "بس آپ اتنا کرا دیں کہ ہمیں اپنی کوٹھری سے کوئی نہ نکالے۔ باپ کے مرنے کے بعد بدمعاش ہماری جگہ پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ ویسے تو شریف آدمی کہلاتے ہیں مگر بدمعاش ہی ہوتے نا جی! بیوہ اور یتیم کو پریشان جو کرتے ہیں۔ کہتے ہیں پانچ سو ہزار لے لو گھر خالی کر دو۔ ہمیں اپنے گھر کو بڑا کرنا ہے۔ گیراج نکالنا ہے۔ ہم پانچ سو ہزار لے کر کہاں جائیں گے صاحب! وہ دھمکی دیتے ہیں کہ شرافت سے جگہ نہ دی تو بند کرا دیں گے۔ چوری کا الزام لگا دیں گے۔ آپ کچھ مدد کر سکتے ہیں صاحب؟"

"تم فون پر بات کر سکتے ہو نا؟ بات کر لینا۔ تمہارا گھر تم سے کوئی نہیں چھین سکتا۔" محسن نے کہا۔ لڑکے نے پالش ختم کی سلام کیا اور لوٹ گیا۔ اس لڑکے نے ذرا سی دیر کے لیے مجھے اپنے آپ کو بھول جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

"فومانچو۔" میں نے محسن کے ساتھ 'کیری ہوم' ریسٹورنٹ میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ "شیروانی اور ترکی ٹوپی والا کارٹون، کتنی عجیب بات ہے یار محسن رضا! بڈھا زندہ دل ہے۔ کیا فرضی نام بتایا تھا اپنا۔ خود کو ابنِ بطوطہ یا حاجی لق لق بھی تو کہہ سکتا تھا۔"

"ہاں۔ آدمی وضعدار بھی ہے۔ وضعدار لوگ عموماً مسخرے بھی ہوتے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "آج رات مل کے معلوم ہو جائیگا۔"

"اسی سڑک پر ذرا آگے میری کمپنی کا، بلکہ یوں سمجھیے محسن

صاحب کو میرا آفس ہے۔" میں نے کہا۔" آپ جانتے ہیں ناکہ میں میر وزیر اینڈ کمپنی کا مینجنگ ڈائریکٹر ہوں۔ میرا خیال ہے اس کا نام اب وزیر اینڈ سنز کر دیا جائے اور آپ کو وائس چیئرمین بنا دیا جائے۔"

"میرا خیال ہے کبیر! اس کہ تمہاری عقل تو پہلے ہی گھاس چرنے چلی گئی ہے۔ تم بھی چلے جاؤ۔" محسن نے کہا۔" ورنہ کھانا کھاؤ اور چلو۔"

چراغ دین کہیں گیا ہوا تھا چنانچہ ہمیں چوکیدار سے بات کرنے کا موقع مل گیا اور اس سے ہمیں اندازہ ہوا کہ وہ صورت سے تو مجھے پہچانتا ہے کیونکہ اس نے سلامت شاہ کے کہنے پر کوٹھی کا تالا کھول کے مجھے فون کرنے کا موقع فراہم کیا تھا مگر اسے بعد کے واقعات کا کچھ علم نہیں۔ سلامت شاہ کے غائب ہو جانے پر وہ تھوڑا سا فکر مند تھا۔

"جی ہمارا سمجھ میں نہیں آتی صاب کہ شاہ جی کدھر گیا۔" اس نے کہا۔" ادھر تو اس کا باپ بھائی چاچا، کوئی نہیں۔"

"خاں صاحب!" میں نے کہا۔" وہ پہلے کبھی اس طرح بغیر بتلائے کہیں گیا ہے؟"

محبت خاں نے نفی میں سر ہلایا اور ہمیں مزید معلومات فراہم کیں مثلاً یہ کہ گزشتہ تین سال کے عرصے میں جب سے وہ ملازم ہوا ہے سلامت شاہ سال کے سال بری امام صاحب کے مزار پر حاضری دینے ضرور جاتا رہا ہے مگر اور کہیں نہیں گیا۔ اس کا لاہور میں کوئی دوست رشتے دار ایسا نہیں جس کے پاس وہ قیام کر سکے۔ میری بجائے محسن نے کہا کہ کل گلاب خاں کے نام اس کی معرفت ایک خط آئے گا اسے وہ سنبھال کے رکھے کیونکہ اس میں بہت اہم کاغذات ہیں۔ میں نے مزید وضاحت یوں کی کہ گلاب خاں ایک لین دین کے مقدمے میں پیش ہونے کے لیے پنڈی سے آیا تھا اور یہاں اس کا کوئی ایسا پتہ نہیں جس پر وہ ڈاک منگوا سکے۔ چند کاغذات رہ گئے تھے جو اس نے ڈاک سے منگوانے کے لیے میرا پتہ دے دیا تھا مگر مجھے یہاں کوئی نہیں جانتا چنانچہ میں نے سلامت شاہ سے ذکر کیا تو اس نے کہا محبت خاں کی معرفت منگوا لو۔ ڈاکیہ آتا ہے تو گیٹ پر ہی ڈاک دے جاتا ہے۔ محبت خاں مطمئن ہو گیا اور اس نے کہا کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ کاغذات بالکل محفوظ رہیں گے۔ اس نے محسن سے بحیثیت گلاب خاں مصافحہ بھی کیا۔ پھر میں نے کہا کہ میں ایک نظر سلامت شاہ کا کوارٹر دیکھنا چاہتا ہوں۔ محبت خاں نے کہا کہ اسے کوئی اعتراض نہیں۔

کوارٹر بدستور مقفل تھا۔ صحن کی دیوار کے اوپر سے جھانکنے کے لیے میں نے منڈیر تھام کر خود کو اوپر کھینچا۔ اندر سلامت شاہ کا کمرہ بھی کھلا پڑا تھا اور وہ کمرہ بھی جو وزیر خاں کا کمرہ تھا کھلے دروازے سے مجھے وہ صندوق بھی نظر آیا جو میرے والد نے چھوڑا تھا۔ فوری طور پر مجھے خیال آیا کہ میں چند منٹ میں اندر جا کے سونے کا وہ زیور لے کر واپس آ سکتا ہوں جو میری ماں کی ملکیت تھا۔ قانونی طور پر میں اس کا مالک تھا اور اپنی ہی چیز کو جائز ضرورت کے لیے حاصل کرنے کا یہ طریقہ غلط ضرور تھا مگر اسے چوری یا کوئی اخلاقی جرم نہیں کہا جا سکتا تھا۔ میں نے محسن سے کہا کہ وہ چوکیدار پر نگاہ رکھے اور خود اندر کود گیا۔ اس وقت میرے ذہن میں واحد خیال یہ تھا کہ میں اس زیور کے بدلے فوزیہ کا زیور واپس حاصل کروں تو میرے ضمیر پر رکھا ہوا دس ہزار کی رقم کا یہ بوجھ اتر جائے۔ اگر میں اپنی ماں کی یہ نشانی تحفے میں فوزیہ کو دے سکتا تو مجھے زیادہ خوشی ہوتی لیکن یہ ابھی ناممکن تھا چنانچہ اس زیور کا بہترین استعمال یہی ہو سکتا تھا جو میں نے سوچا تھا۔ فوزیہ کا زیور لینے والا بخوشی یہ پرانا سونا قبول کر لیتا جس کی مالیت بھی کہیں زیادہ تھی۔ خلاف توقع مجھے قفل کھلا نظر آیا اور مجھے ایک لمحے کے لیے مایوسی ہوئی۔ کیا سلامت شاہ زیور نکال کرلے جا چکا ہے۔ میں نے بے خیالی میں ڈھکنا اٹھایا اور چھوڑ دیا۔ بدبو کا ایک بھبکا میری ناک سے ٹکرایا اور میں بے تحاشا بھاگا دروازے تک پہنچ کے رکا اور واپس گیا۔ لرزتے ہاتھوں سے میں نے رومال نکالا اور اس صندوق کے ہینڈل کو صاف کر دیا پھر اپنی متلی کے احساس کو روکتا واپس ہوا اور دیوار پر سے کودنے کی کوشش میں بھد سے نیچے گرا۔ محسن نے دوڑ کر مجھے اٹھایا۔

"سکندر...." وہ میری صورت دیکھ کے بولا۔" کیا... کیا بات ہے، کیا ہوا ہے تجھے؟"

میں نے محسن کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا۔" محسن... چل... یہاں سے نکل... اندر... اندر لاش... سلامت شاہ کی لاش...."

"کیا؟" محسن نے مجھے جھنجھوڑا۔" تو ہوش میں ہے نا؟"

"ہاں..." میں نے بیٹھی ہوئی آواز میں سرگوشی کی۔ "میں جھوٹ نہیں کہتا۔ سلامت شاہ کی لاش اس صندوق میں ہے... جو میرے والد نے چھوڑا تھا... میں نے ڈھکنا کھول کے دیکھا تھا۔ وہ... وہ مجھے گھور رہا تھا۔ اس کا سر... ہاتھ پیر الگ تھے...."

چند لمحے ہم دونوں پتھر کے بت کی طرح کھڑے رہے پھر محسن نے کہا۔" دیکھ، اگر چوکیدار تیری یہ حالت دیکھے گا تو اسے شک ہو جائے گا۔" زیادہ دیر ٹھہرنا بھی ہمارے حق میں خطرناک تھا۔ میں نے کپڑوں کی گرد جھاڑی۔ ایک نل سے چند گھونٹ پانی کے پیے اور اپنے دلی جذبات کو شگفتہ مسکراہٹ کے نیچے چھپائے محبت خان کو خدا حافظ کہتا ہوا باہر نکل آیا۔ دس قدم سکون سے چلنے کے بعد مجھے اسٹیشن کی طرف سے خالی ٹیکسی آتی دکھائی دی اور ہم دونوں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔" باغ جناح۔" محسن نے کہا اور ڈرائیور نے اتنے تھوڑے سے فاصلے کی تھوڑی سی آمدنی کو ناکافی سمجھتے ہوئے واضح کیا کہ دس روپے ہوں گے۔ محسن کا اور میرا موڈ سخت قاتلانہ ہو رہا تھا چنانچہ چڑیا گھر کے دروازے پر اتر کے ہم نے اس کے ہاتھ پر پانچ روپے رکھے اور ابھی اس نے احتجاج کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے پھاڑ کھانے کے انداز میں کہا کہ بکواس کی ضرورت نہیں۔ ہم ماریں گے اور یہ پانچ روپے بھی چھین کر تھانے میں بند کر دیں گے تو ایک ایک سو کا پتا لیے بغیر نہیں چھوڑیں گے۔ اس نے ہمیں غور سے دیکھا اور بھاگ لیا۔ اسے یقین آ گیا تھا کہ آج اس نے پولیس افسروں سے کرایہ لینے کے علاوہ بدتمیزی کا جو مظاہرہ کیا ہے وہ بہت سنگین جرائم میں شمار ہوتا ہے۔ میں اور محسن شملہ پہاڑی کے نیچے ایک بنچ پر بیٹھے رہے۔ پھر اٹھ کر ادین ایئر ریسٹورنٹ کی آخری میز پر چلے گئے۔ ابھی شام نہیں ہوئی تھی چنانچہ ہمارے علاوہ صرف ایک لڑکا اور ایک لڑکی بہت دور پہاڑی کے دامن میں بیٹھے تھے۔ خلوت کی ضرورت انہیں بھی تھی اور ہمیں بھی گو اسباب جدا تھے۔

"یار محسن!" میں نے بالآخر لب کھولے۔" یہ تو بہت برا ہوا۔"

محسن نے اقرار میں سر ہلایا۔" ہمیں پہلے ہی اندازہ کر لینا چاہیے تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ سلامت شاہ دفاع کا سب سے اہم اور شاید واحد گواہ تھا۔ میر شرافت علی کے نوکر ویسے ہی دشمن ہو رہے ہیں۔ ان سے سچ کی توقع عبث ہے۔ وہ پولیس کے لیے چشم دید گواہ بھی بن جائیں گے، اور شاید پولیس کے دباؤ میں یہ بیان تک دینے پر مجبور ہو جائیں کہ انہوں نے تجھے جرم کا ارتکاب کرتے دیکھا ہے۔"

"مجھے تو تیری فکر لاحق ہو رہی ہے محسن! تو بہت بڑھ چڑھ کے میری مدد کر رہا ہے۔" میں نے کہا۔

"مدد تو بہت سے لوگ کر رہے ہیں۔" وہ بولا۔" مگر وہ اصل مجرموں کے لیے خطرے کا سبب نہیں بن سکتے۔ سلامت شاہ بہت سی ایسی باتیں جانتا ہو گا جو کسی کو معلوم نہیں مثلاً یہ کہ آخری دنوں میں چچا وزیر خان سے کون لوگ ملنے آتے تھے۔ وہ انہیں شناخت کر سکتا تھا۔ اس کی موت کا فوری سبب بہرحال یہ ہے کہ صفائی کا واحد گواہ نہ رہنے دیا جائے۔"

چشم تصور سے میں ابھی تک اس صندوق میں بند لاش کے ٹکڑے دیکھ رہا تھا اور میرے دماغ میں سڑنے والی لاش کا وہ تعفن بس گیا تھا جس کا پہلا مقید جھونکا صندوق کھولتے ہی مجھ پر حملہ آور ہوا تھا۔" میرا خیال ہے محسن کہ پرسوں رات جب سلامت شاہ مجھ سے تھانے میں مل کر گیا تو قاتل اس کے منتظر تھے۔ انہوں نے سلامت شاہ سے پوچھا ہو گا کہ وہ مجھ سے کیوں ملا تھا اور اس نے مجھے کیا کچھ بتا دیا ہے۔ اسی رات وہ قتل کے بعد سلامت شاہ کو صندوق میں ڈال گئے ہوں گے اور وہ سب زیور بھی لے گئے ہوں گے جو سلامت شاہ کو فروخت کرنا تھا۔ اس صندوق کا سامان نکالے بغیر اس میں لاش نہیں ڈالی جا سکتی تھی۔ وہ سامان ان کے کام کا نہیں تھا، ممکن ہے وہیں پلنگ کے نیچے ڈھیر ہو۔ میں نے دیکھا نہیں۔ میں تو لاش دیکھتے ہی بدحواس ہو کے بھاگا تھا۔ غنیمت ہے مجھے فنگر پرنٹ صاف کر دینے کا خیال رہا۔ اب سوال یہ ہے کہ اس قتل پر سے پردہ کب اٹھے گا؟ جب لاش کا تعفن پھیلے گا اور گرد و نواح میں بسنے والوں کو بھی محسوس ہونے لگے گا؟"

"ہاں، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آج کل میں چراغ دین اپنے خانساماں کی گمشدگی کی رپورٹ لکھوا دے اور پولیس وہاں جا پہنچے۔"

"ہمارا پھر وہاں جانا خطرے سے خالی نہیں۔" میں نے کہا۔" اگر محبت خاں نے آج ہی چراغ دین سے ذکر کر دیا تو بعد میں ہمارے لیے وضاحت مشکل ہو جائے گی۔ اور کل ہم گلاب خان معرفت محبت خان کے پتے پر آنے والا خط کیسے وصول کریں گے؟"

ویٹر کو آتا دیکھ کر محسن خاموش ہو گیا۔ جب وہ چائے کے برتن رکھ کے چلا گیا تو محسن نے کہا۔" خط کے سلسلے میں تو اب کوئی نیا چکر چلانا پڑے گا۔ یا تو ڈاک خانے جا کے سارٹنگ میں اس علاقے کے پوسٹ مین کا پتا کرنا پڑے گا اور جھوٹ بولنا پڑے گا کہ میں گلاب خان ہوں۔ میرا ایک خط ہو گا ڈاک میں وہ دے دو۔ مجھے ابھی ٹرین سے کراچی جانا ہے۔ دس بیس خرچ کر کے کام چل جائے گا ورنہ یہ

کہ ڈاک کی تقسیم کے وقت اس کا انتظار کرنا ہوگا۔ چراغ دین کا چوکیدار دروازے پر موجود نہ ہوا پھر تو کوئی مسئلہ نہیں۔ ہم گیٹ پہ خود ڈاک وصول کر لیں گے۔ وہ موجود ہوا تو پوسٹ مین کو راہ میں روک لیں گے۔ ویسے میرا خیال ہے کل تک قتل کا راز افشا نہیں ہوگا۔"

"اور اگر ہو گیا؟" میں نے کہا۔ "گلاب خان تو بچ جائے گا، سکندر بدبخت کیا دوسرے مقدمہ قتل میں ملوث ہو جائے گا؟"

محسن نے اچانک چٹکی بجائی۔ "ابے تو بچ گیا۔ صاف بچ گیا۔ کیسا گلاب خان اور کہاں کا گلاب خان۔ چوکیدار محبت خان نشے میں ہوگا۔ میرا نام ہے سید محسن رضا۔ میں کسی جائیداد کے مقدمے میں پنڈی سے نہیں آیا۔ شام کو ڈیڈی سے ملنا ہے۔ انہیں یہ صورتِ حال بتا دیں گے۔ ایمبیسیڈر ہوٹل میں ان کا نام پتا لکھا ہوا ہے۔ سیدھی بات یہ ہے کہ دوپہر دو بجے سے رات تک ہم وہیں تھے۔ وہ خفا تو ہوں گے کہ ہم کیا ہر مشکل کو گلے لگاتے پھرتے ہیں مگر ہمارا کیا قصور ہے یار۔ کیا ہمیں معلوم تھا کہ سلامت شاہ ہمیں اس صندوق میں ٹکڑے ٹکڑے ملے گا۔ وہ معاملے کی سنگینی کو دیکھتے ہوئے ضرورت پڑنے پر بیان دے دیں گے کہ عدالتی کارروائی کے بعد رہائی پاتے ہی میں ان کے بیٹے محسن رضا کے ساتھ گیا تھا۔ ہم نے اکٹھے کھانا کھایا تھا اور رات کی فلائیٹ سے ان کے اسلام آباد واپس جانے تک ہم انہی کے ساتھ رہے تھے۔ ایک لمحے کے لیے ادھر اُدھر نہیں ہوئے تھے۔ رابعہ یا منظر سے یہ بات کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔"

"جھوٹ بھی بعض اوقات باعثِ رحمت بن جاتا ہے۔" میں نے اطمینان کا سانس لے کر کہا۔ "اب ایک بات اور سن لے۔ انکل شیروانی سے بھی نومانجو کے رقعے اور اس کی دعوت کا بالکل تذکرہ مت کرنا ورنہ وہ کہیں گے کوئی ضرورت نہیں اس سے ملاقات کے لیے چوری چھپے جانے کی۔ پولیس کو اطلاع کر دیتے ہیں۔ وہ نومانجو کو اٹھا لائے گی اور پھر جو کچھ اس سے پوچھنا ہے پوچھ لیا جائے گا لیکن محسن رضا! پولیس کی موجودگی میں وہ سچ کہاں بولے گا۔ وہ سب کچھ کہاں بتائے گا جس کے بتانے سے زندگی کے لالے پڑ جائیں۔"

"یہ تو ٹھیک ہے لیکن کیا یہ کوئی عقلمندی ہے۔" محسن بولا۔ "میرا مطلب ہے ان حالات میں ہمارا اس ویران علاقے میں جانا اور وہ بھی خالی ہاتھ۔ اگر یہ دشمن کی چال ہوئی تو ہماری لاشیں کل نہر سے برآمد ہوں گی۔"

"مجھے یہ چال اس لیے نہیں لگتی کہ وہ رقعہ نومانجو کی اپنی تحریر تھا۔ میں اسے پہچان گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "تاہم کوئی شبہ نہیں کہ ہمیں خطرہ درپیش ہوگا۔ خدا نخواستہ کس نومانجو کو بھی دیکھ لیا ہوگا تو ہمارے پہنچنے سے پہلے قصہ پاک ہو جائے گا اور ہم بہادر بن کے شیر کی طرح گے تو مچان پر مورچہ قائم کرنے والے شکاری کی طرح بڑی بہادری سے مار ڈالیں گے۔"

"کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ۔" میں نے ارشاد

"مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی۔"

"علامہ مرحوم نے ذکر کیا ہے مومن کا جو سپاہی آپ چشم بددور کچھ نہیں ہیں۔ پچیس فیصد احمق ہیں۔ پچیس فیصد مجنوں ہیں اور باقی پچیس فیصد انجینئر ہیں تو پچیس شاعر وغیرہ۔" محسن رضا نے جل کے کہا۔

"تو نے بلیک بیلٹ کے نمبر بالکل نہیں دیے میں نے کہا اور ہاتھ کو سیدھا کھڑا کیا۔ "جو مجھے مل تو نہ مگر مل سکتی تھی اگر اجازت ہو تو مظاہرہ کروں۔ ایک میں میز کے دو ٹکڑے۔"

"میں نے پچیس فیصد حماقت کے نمبر دے دیے اس لیے مظاہرے کی ضرورت نہیں۔" وہ بولا۔ "آج ڈیڈی کی ڈانٹ ڈپٹ سن آئیں اور انہیں سی آف ایئرپورٹ سے واپسی پر سوچیں گے۔"

"ایک دو مسائل اور بھی توجہ طلب ہیں۔" میں

"مثلاً ایک تو یہی کہ ہمیں یا کم سے کم مجھے غیر مسلح نہیں لیکن ریوالور سے پہلے لائسنس حاصل کرنا آسان کام نہیں بغیر لائسنس کا ریوالور رکھ کر پھرنا جرائم میں ایک اور جرم کا اضافہ کرنا ہے۔ دوسرا مسئلہ قیام کا ہے۔ تیسرا مسئلہ کہ سلامت شاہ کے بعد کون گواہی دے گا کہ میرے قبر کون سی ہے۔"

"آج رات تو ہم بھی ایمبیسیڈر ہوٹل میں قیام کر محسن نے کہا۔ "میں کوشش کرتا ہوں کہ کمرہ گزشتہ دن سے نام بک نہ ہو سکے تو آج دوپہر سے بک دکھا دیا جائے آج ایک بجے کے بعد کوئی نیا مسافر نہیں آیا ہوگا تو یہ کو نہیں ہوگا اور بعد میں ہمارے لیے ایک دستاویزی ثبوت بن جائے گا۔ ہم ثابت کر سکیں گے کہ عدالت سے سی یہاں آئے تھے۔ رات کو میں ایئرپورٹ پہ دیکھوں واقف مل گیا تو ہمارا گواہ بن جائے گا۔ قیام کا مستقل ہے کہ کہیں کوئی کرائے کی جگہ دیکھی جائے۔ جب تک چلے گا ہمیں یہاں رکنا ہوگا اور اس پتے سے عدالت

مطلع کرنا ہوگا۔ ہم ہیں چھڑے چھانٹ۔ کوئی شریف آدمی جس کی بیوی یا لڑکی جوان اور خوبصورت ہوگی وہ ہمیں کب کرایہ دار رکھے گا۔ یہ مسئلہ منظر یا رابعہ حل کر سکتے ہیں۔ ریوالور کے حصول میں ایس ایس پی ضامن رضوی سے مدد لی جا سکتی ہے۔ قبر کی نشاندہی کرنے والے تین گواہ جنازے کے شرکا ہوتے ہیں۔ ان کے نام چراغ دین بتا سکتا ہے۔"

شیروانی صاحب کے پاس ہم لنچ کے لیے کمرہ بک کرا کے پہنچے۔ محسن نے انہیں لندن کے واقعات بھی تفصیل سے بتائے تھے اور جو کچھ لاہور پہنچنے کے بعد ہوا تھا وہ بھی بتا دیا تھا مگر ان کے نقطۂ نظر سے بہت سی باتیں وضاحت طلب تھیں۔ میرے والد کی موت کے بارے میں انہوں نے بہت افسوس کا اظہار کیا۔ "اگر وہ بندۂ خدا مجھے اشارہ بھی کر دیتا کہ... کہ اس کے حالات اس حد تک دگرگوں ہیں تو میں کچھ نہ کچھ کرتا۔"

"میرا خیال ہے انکل کہ اس صبر و تحمل کے ساتھ تمام مصائب کو اکیلے رہ کر جھیلنے کی کوئی معقول وجہ ضرور ہوگی۔" میں نے کہا۔ "کیا آپ اس پر روشنی ڈال سکتے ہیں کہ انہوں نے مجھے یا آپ کو بھی اعتماد کے قابل کیوں نہیں سمجھا؟ میرا مطلب ہے وہ اعتماد کرتے ہوئے کیوں ڈرتے تھے؟ آپ انہیں ایک زمانے سے جانتے ہیں۔ کیا آپ کے علم میں کوئی ایسی بات ہے؟ مثلاً یہ کہ ان سے کبھی نادانستگی میں کوئی ایسی غلطی ہوئی ہو جس کا کفارہ ادا نہ ہوا ہو؟ اور ان کے پرانے بدخواہ یہ بات جانتے ہوں کہ وہ غلطی کیا تھی؟"

شیروانی صاحب نے نفی میں سر ہلایا۔ "وزیر خاں نے مجھ سے کبھی کچھ نہیں چھپایا۔ بالکل اسی طرح جیسے تم اور محسن ایک دوسرے سے کچھ نہیں چھپاتے۔ لیکن میں اسکے امکانات کو یکسر مسترد نہیں کرتا۔ آدمی خطا کا پتلا ہے اور بعض اوقات حالات اس کے خلاف سازش کر لیتے ہیں تو سوچ سمجھ کر ہر قدم اٹھانے والے کی عقل بھی ساتھ نہیں دیتی۔ کیا کہا جا سکتا ہے کہ وہ کیا غلطی تھی جو اس نے مجھ سے بھی چھپائی۔"

"آپ ان کے پرانے دوست احباب کو اور ملنے والوں کو جانتے ہوں گے۔ ان میں سے پاکستان آنے والے کون تھے اور کیا آپ کو معلوم ہے کہ وہ لوگ کہاں ہیں؟" میں نے کہا۔ "مثلاً میر شرافت علی کے بارے میں آپ کی معلومات کیا ہیں؟"

"زیادہ نہیں۔" وہ سوچتے ہوئے بولے۔ "میرٹھ میں بھائی وزیر خاں مرحوم کے پاس آتا جاتا تھا لیکن وہ اس کو پسند نہیں کرتے تھے، کمینہ آدمی تھا مگر کیا کرتے، گھر آئے ہوئے کو دھتکارا بھی تو نہیں جا سکتا۔"

"اس تعلق کی نوعیت کیا تھی، میرا مطلب ہے وہ کبھی پاس پڑوس میں رہتا تھا۔ والد مرحوم کے ساتھ کام کرتا تھا یا انکے کسی دوست کا دوست تھا؟ سنا ہے میرٹھ میں اس کی کوئی کوٹھی تھی؟"

"ہاں کوٹھی تو تھی۔" شیروانی صاحب نے کہا "اور باقی سب کل مجھے اس لیے علم نہیں کہ میرٹھ میں میرا قیام سرکاری ملازمت کے سلسلے میں بہت مختصر رہا۔ پھر میری ایک ہندو افسر سے لڑائی ہو گئی اور اس نے مجھے دہلی ٹرانسفر کرا دیا۔ نئی نئی ملازمت تھی، ہندو اعلیٰ ملازمتوں پر قابض تھے اور ان کی حالت میں عملاً فٹ بال بنا رہا۔ ایک کک میں ادھر دوسری میں ادھر۔ ہر سال بستر باندھنا پڑتا تھا۔ بڑی مشکل سے ایک انگریز کی مداخلت پر یہ چکر ختم ہوا۔ تقریباً چھ سال بھائی وزیر خاں مرحوم سے کوئی تعلق نہ رہا۔" پھر انہوں نے میرٹھ کے چند لوگوں کے نام بتائے جو والد صاحب کو جانتے تھے۔ ان میں سے دو مر چکے تھے۔ ایک کے بارے میں انہیں خبر تھی کہ ہانگ کانگ چلا گیا۔ باقی نہ جانے کہاں تھے کہ پھر کبھی نہیں ملے۔ انہوں نے میرے دوبارہ پوسٹ مارٹم کے خیال کو پسند نہیں کیا لیکن میں نے کہا کہ دوبارہ کیا ان کا تو سرے سے پوسٹ مارٹم ہوا ہی نہیں تھا اور قبرستان میں گورکن کے رجسٹر میں موت کی وجہ "ہارٹ فیل" لکھی ہوئی ہے جو بظاہر غلط ہے اس لیے کہ والد مرحوم کو گٹھیا کا عارضہ تو تھا مگر بلڈ پریشر جیسی کوئی شکایت نہ تھی۔ تو شیروانی صاحب نے کہا "پھر ٹھیک ہے۔" اس کے بعد میں نے تازہ ترین واردات سے پیدا ہونے والے مسئلے کا ذکر کیا۔ وہ حسب توقع پہلے توجہ سے سنتے رہے اور پھر برہم ہوئے کہ آخر اس حماقت کی کیا ضرورت تھی۔ موجودہ حالات میں تو مجھے نامعقولیت سے قطعی اجتناب کرنا چاہیے اور تجربات سے سبق حاصل کرنا چاہیے وغیرہ وغیرہ۔ پھر انہوں نے کہا کہ اب مجبوری ہے تو وہ جھوٹ بھی بولیں گے، خواہ اس سے فائدہ ہو یا نہ ہو۔

"مجھے تو بہت افسوس ہے کہ تم نے اپنی تعلیم بھی مکمل نہیں کی۔" انہوں نے کہا۔ "محسن خود اپنی ضد سے گیا تھا، کیونکہ تم والد کی ضد سے مجبور تھے۔ میں اس کو ہرگز واپس نہ بلاتا مگر اس کی ماں... تم جانتے ہو عورتوں کے لیے منطق بے معنی چیز ہے، اس کو یقین تھا کہ محسن لندن میں رہا تو قتل ہو جائے گا۔ پھر میں کیا کرتا۔ وہ تو اب بھی مصر تھی کہ واپسی میں لڑکے کو ساتھ لے آنا، مگر میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ تم دونوں نے رہائش کا کیا انتظام کیا ہے؟"

ہم نے انہیں مطلع کیا کہ آج رات تو اسی ہوٹل میں قیام کریں گے۔ کل بندوبست ہو جائے گا۔ ایک دوست کے مکان کا اوپر والا حصہ خالی ہے۔" محسن نے ان کی نظر بچا کے مجھے آنکھ ماری اور جب شیروانی صاحب نے پتا نہیں مانگا تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ پھر گھڑی دیکھ کے انہوں نے روم سروس سے تین افراد کا کھانا طلب کیا اور جب کھانا آ گیا تو میں نے ڈرتے ڈرتے دوسرا مسئلہ بیان کیا۔ خلاف امید وہ خفا نہیں ہوئے اور کہا کہ ان حالات میں اپنی حفاظت کا انتظام ضروری ہے... لائسنس کے لیے میں ضامن رضوی سے بات کر لوں گا۔" انہوں نے کہا۔ "مگر ریوالور ہاتھ میں آ جائے تو دنادن گولیاں مت چلاتے پھرنا۔ جب آدمی کے ہاتھ میں طاقت ہو تو اسے زیادہ محتاط رہنا پڑتا ہے۔" اس کے بعد ہم انہیں سی آف کرنے ایئرپورٹ گئے اور چلتے چلتے انہوں نے پھر تاکید کی کہ ہم عقل اور احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔ وکیلوں سے مشورہ کیے بغیر کوئی قدم نہ اٹھائیں اور انہیں وقتاً فوقتاً فون کرتے رہیں۔ جب جہاز ٹیک آف کر گیا تو ہم واپس ہوئے۔ ایئرپورٹ پر تلاش کرنے کے باوجود کوئی آشنا نہ ملا جسے ہم گواہ بنا سکتے۔

"یار سکندر!" محسن نے ایئرپورٹ کی عمارت سے باہر آ کے کہا۔ "واقعی اس وقت ڈیڈی کو بتاتے کہ خیر سے واپسی پر، ہم ایک اور معرکہ سر کرنے کا پروگرام رکھتے ہیں تو وہ ضامن رضوی کو فون کرتے اور کہتے کہ ان دونوں کو آج رات کہیں بند رکھو اور اس فوماچو کو اٹھوا لو۔ مگر اب یہ سوچ لے۔ خدانخواستہ وہاں کوئی گڑبڑ ہو گئی تو ڈیڈی کی حمایت حاصل نہیں رہے گی۔"

"ایسے یہ جتنے باپ ہوتے ہیں سب باہر سے سخت ہوتے ہیں اندر سے ان کا دل اولاد کے لیے موم ہوتا ہے۔ بالکل تربوز کی طرح۔" میں نے کہا۔ "ان کی سب سے بڑی مجبوری ہی یہ ہوتی ہے کہ اچھے ہوں یا برے کسی بیٹے کو چھوڑ نہیں سکتے اور اس کمزوری کے باعث بلیک میل بھی ہوتے ہیں۔"

"مگر وہ بھی ہوتے ہیں جو بوجہ نافرمانی جائداد منقولہ غیر منقولہ سے عاق کر دیتے ہیں۔" محسن نے کہا۔

"نہ وہ انکل شیروانی جیسے والد ہوتے ہیں اور نہ ہم جیسے بیٹے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ اسی وقت میری نگاہ میر پر پڑی جو ٹیکسی میں بیٹھنے والا تھا۔

"ارے میر صاحب!" میں نے چلا کر کہا اور اس کی طرف یوں دوڑا جیسے برسوں کے بچھڑے ہوئے دوست سے بغلگیر ہونا چاہتا ہوں۔ میر محمد ٹھٹھک کر رہ گیا۔

"تم؟ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ فرار ہونا چاہتے تھے لاہور سے؟"

"فرار تو واقعی ہونا ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر لاہور سے نہیں لاہور کی طرف۔ یہاں محسن کے والد کو سی آف کرنے آئے تھے۔ وہی جو وزارت خارجہ کے ڈپٹی سیکرٹری ہیں۔ وہی شیروانی صاحب جو میرے ضامن نمبر ایک تھے۔ دیکھا تو جیب میں پیسے نہیں ہیں۔ اچانک تم نظر آ گئے اور ہمارا مسئلہ حل ہو گیا۔ ہمیں ایمبیسیڈر ہوٹل چھوڑ دینا۔ ہم وہیں مقیم ہیں۔ مہنگا ہے مگر اچھا ہوٹل ہے۔ بڑے لوگ وہیں ٹھہرتے ہیں۔"

"بڑی اچھی بات ہے۔" وہ ٹیکسی میں بیٹھ کے بولا۔ "ایمبیسیڈر ہوٹل تک مارچ کرنے سے بڑے لوگوں کی صحت بھی اچھی رہتی ہے۔"

ٹیکسی کے جاتے ہی میں نے قہقہہ مارا اور محسن سے ہاتھ ملایا۔ "کیسی بے سروپا بکواس کی میں نے؟ سوچتا ہوگا نشے میں ہیں یا محض چھیڑ خانی کر رہے ہیں، مگر میں نے سب کچھ بتا دیا۔"

"یار یہ قابل اعتبار گواہ نہیں۔" محسن نے ہنستے ہوئے کہا۔ "لیکن چالاکی سے کام لے کر اس کی گواہی حاصل کی جا سکتی ہے۔ مثلاً کسی معتبر شخص کے سامنے اس سے پوچھیں کہ رات کو ایئرپورٹ پر کیوں گھوم رہے تھے؟ یہ چڑ جائے گا اور جواب کچھ بھی دے مگر وہ اعتراف کے مترادف ہوگا کہ ہم سے ایئرپورٹ پر ملا تھا اور اگر ہم کہیں کہ... ہمیں ایمبیسیڈر ہوٹل چھوڑ دیتے تو کیا ٹیکسی گھس جاتی؟ ظاہر ہے وہ کہے گا تمہارے جوتے گھس گئے کیا؟ یا ایسی ہی کوئی بات۔ مگر وہ معتبر شخص گواہ ہوگا تو میر کیسے انکار کرے گا کہ ہم سے ایئرپورٹ پر ملا ہی تھا۔"

"یہ سب تو ٹھیک ہے اور بعد کی بات ہے۔" میں نے ایک ٹیکسی کا دروازہ کھول کر بلا اجازت بیٹھتے ہوئے کہا۔ "ابھی کی فکر کرو۔"

"کہاں جانا ہے جی آپ کو؟" ڈرائیور نے ناگواری سے کہا۔ "پہلے پوچھ لینا چاہیے..."

"پوچھیں گے تم سے بعد میں۔" میں نے غرا کر کہا۔ "چلو دھرمپورہ پولیس اسٹیشن۔ اور میٹر ڈاؤن کر لو۔"

سو دو سو روپے کی سواری اٹھانے کی امید میں کھڑے ہوئے ڈرائیور نے میٹر ڈاؤن کرتے ہوئے تقدیر کو یقیناً کوسا ہوگا کہ ملے بھی تو پولیس والے، اور خدا کا شکر ادا کیا ہوگا کہ اصول پسند تھے ورنہ میٹر کا کرایہ دینے کی بجائے کسی بہانے اپنا نذرانہ بھی وصول کر لیتے۔ دھرمپورہ پولیس اسٹیشن پر ڈرائیور کو بیس روپے دے کر ہم نے پیدل چلنا شروع کیا۔ بہت پہلے میں

یہاں اپنے ایک دوست سے ملنے آتا تھا۔ یادداشت پر بھروسہ کرتے ہوئے میں نے دھرمپورہ کے بازار کو عبور کیا جو چھوٹی سی تنگ سڑک تھی۔ پھر ایک لق ودق میدان آ گیا جس میں لکڑی کی ایک ٹال موجود پا کے میں نے اپنی سمت کے صحیح ہونے کا اندازہ کیا۔ موڑ پر مجھے رتن اسٹریٹ نمبر ۱۹ کا نیلا بورڈ نظر آیا جس پر سفید حروف چمک رہے تھے۔ ہم پرانی اینٹوں کے فرش والی گلی سے گزرے۔ محسن کچھ تشویش کا شکار تھا کہ یہ ہم کہاں جا رہے ہیں مگر میں نے کہا کہ یہ راستہ شارٹ کٹ ہی نہیں کہ ہمارے لیے بہت محفوظ بھی ہے۔ اگر ہمارے دشمن منتظر ہوئے تو سڑک پر ہوں گے۔ ہم پیچھے سے ان کو جا لیں گے۔ گلی کے اختتام پر بائیں جانب دیوار تھی جو نہر کے دفاتر کے عقبی حصے کو دھرمپورے کی اس آبادی سے جدا کرتی تھی مگر بیرون جو بچے رہنے والوں نے اس دیوار میں ایک شگاف بنا لیا تھا اور اس غار کے دہانے جیسے شگاف سے گزر کے وہ براہِ راست سڑک پر طلوع ہوتے تھے، جہاں سے دن میں رکشہ وغیرہ مل جاتے تھے۔ کبھی نہر کے محکمے والے مستعد ہوتے تھے تو شگاف بند کر دیا جاتا تھا اور لوگوں کو تقریباً پون میل چل کے سڑک تک پہنچنا پڑتا تھا لیکن خود نہر کے محکمے کے اپنے ملازم جو سرونٹ کوارٹرز میں رہتے تھے چند روز بعد دیوار کی اینٹیں پھر نکال دیتے تھے کیونکہ خود انہیں دھرمپورے کے بازار تک پہنچنے کے لیے دیوار پر سے کودنا یا ایک میل کا چکر کاٹنا گوارا نہ تھا۔

میں اور محسن سر جھکا کے دیوار کے خلا سے گزر گئے۔ دور دیہ سرونٹ کوارٹرز کی پتلی سی گلی کو طے کر کے ہم عین اس جگہ پہنچے، جہاں فومانچو نے ہمیں بلایا تھا۔ نہر کے دفاتر بند تھے اور لوگ باہر چارپائیاں ڈالے سو رہے تھے۔ نہر کا گدلا پانی جس میں سارا دن بچے بڑے نہاتے تھے اور ہوا بھری ٹیوب پر تیرتے تھے، اب سکون سے بہہ رہا تھا۔ مخالف کنارے پر صرف ایک آدمی تھا جس نے تن کے کپڑے دھو کر پھیلائے تھے اور خود اندھیرے کی ستر پوشی سے مطمئن بیٹھا تھا۔ میں نے دائیں جانب چلنا شروع کیا۔ آگے نہر کا کنارہ بالکل سنسان ہو جاتا تھا اور کچی پکی سڑک پر جھاڑ جھنکاڑ بڑھ جاتے تھے۔ مغلپورہ جانے والے دوسرے کنارے کی بڑی سڑک پر سفر کرتے تھے۔ فومانچو نے ملاقات کے لیے بہت محفوظ اور بہت خطرناک جگہ کا انتخاب کیا تھا۔ میں نے محسن سے کہا کہ وہ الگ ہو جائے اور دس قدم پیچھے چلے۔ میں اب بہت محتاط تھا اور کوئی غیبی آواز یا میری چھٹی حس بتا رہی تھی کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں ترکی ٹوپی اور شیروانی پہننے والا وضعدار بوڑھا فومانچو۔ جو آج دیکھنے والوں کو کارٹون لگتا ہے، مجھے مل سکتا ہے زندہ یا مُردہ۔ رات بالکل سیاہ اور ویران تھی۔ اور پر ستارے بکھرے ہوئے تھے اور نیچے چند جھاڑیوں میں جگنو یوں دمک رہے تھے جیسے آسمان سے گر کے ستارے پتوں میں الجھ گئے ہیں۔ خاموشی میں جھینگروں کے وائلن بجانے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ کہتے ہیں جھینگر کی آواز لمبی مونچھ کو مونچھ پر رگڑنے سے پیدا ہوتی ہے اور آدمی نے اسی کو دیکھ کر وائلن ایجاد کیا۔ اچانک پیچھے سے محسن نے چلا کر مجھے پکارا۔

میں نے پلٹ کر دیکھنے میں دیر نہیں لگائی تھی مگر حملہ آور جو نہر کے کنارے کی جھاڑیوں میں چھپے بیٹھے تھے ایک جست میں اتنے قریب آ گئے تھے کہ محسن نے وارننگ دینے میں ایک لمحے کی تاخیر کی ہوتی تو وہ مجھے بے خبری میں پیچھے سے آ لیتے اور مجھے مقابلے کی مہلت نہ ملتی۔ حفظِ ماتقدم کے طور پر محسن کا دس قدم پیچھے چلنا ہماری زندگی کا ضامن بن گیا تھا۔ محسن کی آواز پر ان تینوں میں سے ایک لٹو کی طرح گھوما اور محسن کی طرف لپکا۔ دو نے مجھے یوں گھیرا کہ ایک میرے دائیں ہاتھ پر تھا تو دوسرا بائیں جانب اور میرے پیچھے ڈم ڈم کی جھاڑی تھی۔ اندھیرے میں ان کی صورتوں کے نقوش واضح نہ تھے۔ ان میں سے ایک نے اچھل کے میری گردن دبوچنی چاہی میں نے اس کو غوطہ مار کے ایک ہاتھ سے اوپر اچھالا اور وہ نہر کے کنارے پر گرا۔ دوسرے نے لات گھمائی جو میرے منہ پر پڑ جاتی تو میرے جبڑے ٹوٹ جاتے یا دانت ہل جاتے مگر تھوڑا سا جھک جانے کے باعث بوٹ کی ٹھوکر میرے شانے پر لگی۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے کندھے کی ہڈی ٹوٹ گئی ہو مگر میں نے درد کی شدت کو برداشت کرتے ہوئے اس شخص کی ٹانگ پکڑ لی۔ پنجہ گرفت میں آتے ہی میں نے اسے پوری قوت سے گھمایا اور وہ شاٹ پٹ کے گولے کی طرح اپنے اس ساتھی سے ٹکرایا جو نہر کے کنارے سے اٹھ کر مجھ پر پیچھے سے حملہ کرنے آ رہا تھا۔ وہ دونوں ایک ساتھ گرے اور ان کے اٹھنے تک میں نے ایک نظر محسن کو دیکھا۔ اس کا حریف کچھ بھاری پڑ رہا تھا اور محسن پسپا ہونے لگا تھا۔ میرے دونوں حریف بجلی کی طرح پھر اٹھے اور ان میں سے ایک نے ہاتھ گھمایا تو مجھے اندھیرے میں بھی خنجر کے آبدار پھل کی دبی دبی چمک نظر آئی۔ میں نے اس کے وار کو کلائی پر روکا اور اپنی لات نصف دائرے میں گھمائی جو اس کے دوسرے ساتھی کے پیٹ پر پڑی۔ وہ کراہ کر پیچھے گرا اور میں نے خنجر بدست حملہ آور کے شانے پر کھڑی ہتھیلی کا بھرپور وار کیا۔ وہ درد سے بلبلایا... خنجر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گرا اور میں نے پاؤں کی ٹھوکر ماری تو خنجر غڑاپ سے پانی میں ڈوب گیا۔ وہ دونوں اچھل کے چند قدم دور جا کھڑے ہوئے اور مجھے نرغے میں لینے کے لیے میرے گرد گھومنے لگے۔ اب دوسرے بدمعاش نے اپنا خنجر نکال لیا تھا۔ اس نے زمین پر تھوک کے مجھے ایک غلیظ گالی دی۔ ”تم اس منشی سے ملنے آئے تھے نا؟“ وہ حقارت آمیز تمسخر سے بولا۔ ”وہ تو گیا۔ نمک حرام۔“ اور اس وقت میں نے دیکھا کہ ان کے چہروں پر سیاہ جالی دار نقاب چپکے ہوتے ہیں۔

”اور یہ خط دے گیا۔“ دوسرے نے میری نظروں کے سامنے ایک لفافہ لہرایا۔ ”ہمت ہے تو چھین لو۔“

”لفافے کی فکر مت کرو۔“ میں نے ان پر نظر رکھتے ہوئے کہا کہ کہیں وہ باتوں میں لگا کے میری توجہ نہ بٹانا چاہتے ہوں۔ ”اس کی ایک نہیں دو نقلیں کل ڈاک سے مل جائیں گی۔“ میں سمجھ گیا تھا کہ منشی سے ان کی مراد فومانچو سے تھی۔ کنکھیوں سے میں نے محسن کو دیکھا۔ اس نے اپنے مدمقابل کو ایک بار پیچھے دھکیل دیا تھا مگر دوسری بار اس نے سر جھکا کے محسن کو بیل کی طرح ٹکر ماری۔ محسن ایک جھٹکے سے پیچھے ہوا اور نہر میں جا گرا۔ اسی وقت وہ دونوں پھر ایک ساتھ حملہ آور ہوئے۔ خنجر لے کر چھلانگ لگانے والا ذرا آگے تھا۔ میں نے عین وقت پر غوطہ مارا اور وہ میرے سر پر سے گزرتا ہوا جھاڑی میں جا گرا۔ دوسرے کا مکا میرے سر پر لگا اور ذرا سی دیر کے لیے مجھے دنیا گھومتی ہوئی نظر آئی۔ پھر میں نے سر کو جھٹکا اور اس کے پیٹ پر لات ماری۔ وہ کراہ کر دوہرا ہوا تو میں نے دونوں ہاتھ ملا کر اس کی ٹھوڑی پر نیچے سے اوپر کی جانب ضرب لگائی۔ وہ اچھلا اور سر کے بل نہر میں گیا۔ جھاڑی میں گھس جانے والا اب محتاط تھا اور خنجر کی نوک سامنے کیے آہستہ آہستہ میری طرف بڑھ رہا تھا۔ میں ایک ایک قدم پیچھے ہٹتا گیا تاکہ محسن کے قریب ہو سکوں جسے اس کا حریف نہر کے پانی سے نکلنے کا موقع نہیں دے رہا تھا۔ جیسے ہی وہ کنارے کی طرف آتا تھا وہ لات مار کے محسن کو پھر پانی میں گرا دیتا تھا۔ شاید محسن نے اس کا پاؤں پکڑنے کی کوشش کی تھی کہ اس کا جوتا اتر گیا تھا ورنہ جوتوں سمیت بر لگ سے محسن کا حلیہ بگڑ جاتا۔

خنجر والے نے اچانک جھک کر زمین پر سے کوئی چیز اٹھائی۔ ”یہ... یہ دیکھو...“ وہ خباثت سے بولا۔ ”کیا ہے یہ؟“ میرا خیال تھا اس نے زمین پر سے کوئی پتھر اٹھایا ہے اور میں نے خود کو ضرب سے بچانے کے لیے سر کے سامنے ایک ہاتھ کو ڈھال بنا لیا تھا۔ مگر میری نظروں کے سامنے دو ہاتھ تھے۔ ایک ہاتھ میرے دشمن کا تھا۔ دوسرا ہاتھ کسی کا بھی نہیں تھا۔ صرف ایک ہاتھ تھا، کلائی کے پاس سے کٹا ہوا۔ میں نے نظر جما کے دیکھا۔ شاید مجھے ایک کے دو نظر آنے لگے ہیں مگر یہ نگاہ کا دھوکا نہیں تھا۔ میرے مدمقابل کے ایک ہاتھ میں خنجر تھا اور دوسرے ہاتھ میں اس نے انگلی کی پور سے ایک سالم انسانی ہاتھ تھام رکھا تھا۔ وہ ہاتھ جو کسی بازو سے منسلک رہا ہوگا اور وہ بازو کسی جسم کا حصہ ہوگا اور وہ جسم کسی میرے جیسے ہی انسان کا ہوگا۔ مگر اب میری نظر کے سامنے وہ ایک ہاتھ تھا جو نقش فریادی تھا۔ انصاف کا طالب تھا۔ ظلم و بربریت پر نوحہ کناں تھا۔

”کس کا ہاتھ ہے یہ... پہچانا؟“ وہ بولا۔ ”یہ ایک غدار نمک حرام کا ہاتھ ہے۔ اس ہاتھ سے اس نے خط لکھا تھا۔ تمہیں رقعہ پہنچایا تھا۔“ وہ ہاتھ فضا میں بلند ہوا۔ آسمان کی طرف اٹھا، فریاد کرتا ہوا، احتجاج کے انداز میں۔ مدد کے لیے۔ پھر نیچے آیا اور پانی میں یوں گرا کہ آواز پہ مجھے قہقہے کا گمان ہوا۔ دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو۔ میں صرف ایک ہاتھ ہوں۔ ستر سال تک میں نے منشی گیری کی۔ قلم سے بہی کھاتے لکھتا رہا۔ اعداد و شمار سے نفع و نقصان کے گوشوارے بناتا رہا۔ میں نے کسی کا حق نہیں چھینا، کسی کی عزت نہیں لوٹی اور کسی کی جان نہیں لی۔ میں سقراط کا ہاتھ ہوں جس نے سچ بولنے پر زہر کا پیالہ اٹھایا تھا۔ میں نے یہی جرم کیا تھا کہ سچ لکھا تھا۔ سچ کیا ہے۔ یہ تم کل جان لو گے۔ مگر کل صرف تمہارے لیے آئے گی یا ان کے لیے جنہوں نے مجھے جسم سے اور جسم کو جان سے جدا کیا۔

صدمے اور اشتعال کی ایک لہر نے مجھے پاگل کر دیا۔ میں بجلی کی طرح اس سفاک درندے پر ٹوٹ پڑا جس کے ہاتھ میں ایک انسانی ہاتھ کسی آدم خور بھیڑیے کے منہ میں دبا ہوا نظر آتا تھا۔ مجھے خنجر کی نوک اپنے شانے سے بازو تک خراش ڈالتی ہوئی محسوس ہوئی، لیکن اب وہ میری گرفت میں تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام کے کلائی پر سے موڑا اور اس کی ہڈی کے ٹوٹنے کی آواز صاف سنائی دی۔ وہ چلایا اور میں نے اس کی پسلیوں پر گھٹنا مارا۔ ”خونی، درندے۔“ میں نے کانپتے ہوئے کہا اور پلک جھپکتے میں اس کو سر پر سے گھما کر نیچے دے مارا۔ میرے متواتر مکوں نے اسے نیم جاں کر دیا۔

میں اب اس کے سینے پر سوار تھا اور عین ممکن تھا کہ میں اس وحشت کے عالم میں اس کا گلا گھونٹ دیتا یا اس کی گردن توڑ دیتا، مگر اسی وقت محسن نے چلا کے مجھے پکارا اور میں ہوش میں آ گیا۔ محسن زمین پر پڑا ایڑیاں رگڑ رہا تھا اور اس کا حریف گھٹنوں سے اس کی کمر دبائے محسن کا سر اوپر اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اگر وہ کامیاب ہو جاتا تو محسن کی گردن ٹوٹ جاتی۔ میں نے گھما کر اس کے سر پہ لات ماری اور وہ بھد سے منہ کے بل گرا۔ میں نے اسے مردے کی طرح ساکت پڑا دیکھا اور محسن کو اٹھایا۔

"تو... تو ٹھیک ہے نا؟" میں نے کہا اور محسن نے اقرار میں سر ہلایا۔ اس کو پھر زمین پر لٹا کے میں نے پیچھے دیکھا خنجر لے کر حملہ کرنے والا پہلا شخص نہر میں گرا تھا تو پھر نہیں نکلا تھا۔ وہ ڈوب گیا تھا یا پانی کے بہاؤ کے ساتھ تیرتا ہوا فرار ہو گیا تھا۔ دوسرا شخص مہلت سے فائدہ اٹھا کے نہر میں کود گیا تھا اور تیرتا ہوا دوسرے کنارے کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے محسن کو سیدھا کر کے لٹایا اور اس سے کہا کہ میں ابھی آتا ہوں وہ میرا انتظار کرے۔ پھر کچھ سوچ کے میں نے بے ہوش پڑے ہوئے شخص کو جھاڑی کے پیچھے ڈالا اور محسن کو دوسری جھاڑی کے پیچھے لٹایا۔ اب اتفاق سے کسی گزرنے والے کو کچھ دکھائی نہیں دے سکتا تھا۔ پھر میں نہر میں کود گیا۔

وہ شخص نہر کے دوسرے کنارے پر اتر کے سڑک عبور کر چکا تھا اور اس میدان کی طرف بھاگ رہا تھا جس میں جھاڑ جھنکاڑ کے درمیان ایک پرانے مقبرے کی خستہ حال عمارت کے سوا کچھ نہ تھا۔ ایک کمرہ اور اس پر ایک گنبد۔ دروازوں کی جگہ خلا اور پرانی اینٹوں کی بوسیدہ دیواریں جن کا مسالہ نکلتا جا رہا تھا اور اینٹوں کے درمیان گہری لکیریں سی نمودار ہو رہی تھیں۔ یہ جگہ میں نے پہلے بھی دیکھی تھی مگر یہ معلوم نہ ہو سکا تھا کہ مقبرہ کس کا ہے جسے آثار قدیمہ والوں نے بھی درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ اس ویرانے میں رات کے وقت وہ تنہا عمارت بھوتوں کا مسکن لگتی تھی اور اندھیرے میں مجھ سے سو قدم کے فاصلے پر وہ شخص دوڑ رہا تھا جس کے بارے میں میرا خیال تھا کہ وہی مندری والا ہے۔ اس کے چہرے کی نقاب میرے مکوں سے پھٹ گئی تھی اور جب میں نے اس کے سر کے بالوں کو پکڑ کر جھٹکا تھا تو مجھے وہ بال گھنگھریالے لگے تھے۔ ایک بار مجھے یہ شبہ بھی ہوا تھا کہ میرا ہاتھ کان کی لو پر کسی دھات سے ٹکرایا ہے جو کانوں کے مقابلے میں ٹھنڈی تھی۔ یہ دھات وہی پیتل یا سونے کی مندری ہو سکتی تھی۔ اچانک مجھے ٹھوکر لگی اور میں نظر نہ آنے والے ایک گڑھے میں گرا۔ میرے پیر میں موچ آ گئی تھی یا ر... قریب سے پیر مڑ گیا تھا کہ میں نے اٹھنے کی کوشش کی... کی ٹیس نے میری ٹانگ کو مفلوج کر دیا۔ میں مشکل... سے نکلا اور اس ویران مقبرے کی طرف بڑھا۔ دشمن اگر... کی تاریکی میں نہیں تھا تو فرار ہو چکا تھا۔ چند قدم کے... پر مجھے مقبرے کے سیاہ وجود میں دھندلے سے اجالے کا... ہوا جو اس کے بغیر پٹ والے دروازے کے خلا میں پھیلا... تھا۔ میں لنگڑاتا ہوا چبوترے پر چڑھا تو شبے کی کوئی بات... مقبرے میں کسی موم بتی کا یا دیے کا اجالا تھا۔ اندر سے... کے چلانے اور پھڑپھڑا کے اڑنے کی آوازیں آ رہی تھیں... یاد آیا کہ آج جمعرات ہے۔ یہ کسی فقیر کا مسکن تھا یا کسی... نے اپنی مراد مانگنے کے لیے اس قبر پہ ایک دیا کے ساتھ... جلا دیا تھا۔

دروازے سے اندر قدم رکھتے ہی میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ دیا آخری گوشے میں روشن تھا اور ایک... کے سرہانے رکھا تھا جو فرش خاک پر گھاس پھوس تنکوں... اور اینٹوں پر چت لیٹی تھی۔ یوں جیسے کوئی ہاتھ پیر پھیلا... سکون کی گہری نیند میں ہو۔ ساٹھ ستر سال کے اس بوڑھے... نے میلی سیاہ شیروانی پہن رکھی تھی جس کے بٹن ادھڑے... تھے۔ علی گڑھ کٹ پجامہ اور پالش سے بے نیاز براؤن... سر کو ڈھانپے رکھنے والی ترکی ٹوپی ڈبے کے قریب پڑی... اور لاش کا دایاں ہاتھ غائب تھا۔ میں اپنی جگہ منجمد... اور میری رگوں میں دوڑنے والا لہو بھی منجمد ہو گیا۔ وقت... ہو گیا اور اچانک اس لاش نے ٹنڈ منڈ کلائی اٹھا کے... "السلام علیکم جناب سکندر بخت صاحب! آپ نے... کر دیا۔ یعنی یہ خوب ہے کہ کمرہ نمبر دو سو تین کی بجائے... تین سو دو سمجھتے رہے۔ بھئی خوب سمجھے ماشاء اللہ۔ یہ... دو ہی کا کیس تھا۔ خوب رہی یہ ملاقات بھئی۔ اجی آپ... کیا سوچ رہے ہیں حضت، پہچان نہیں پائے مجھے شا... خاکسار کو نوما پنجو کہتے ہیں۔ منشی بھی کہتے تھے لوگ۔ د... تھا پورا کارٹون۔ ہاہاہا... کیا خیال ہے آپ کا قبلہ... میں پلٹ کر بھاگا۔ چمگادڑیں چیخ چیخ کر مجھ... بھننے لگیں۔ میں نے ادھر ادھر نگاہ ڈالی کہ کہیں وہ د... پھر بے خبری میں مجھ پر حملہ نہ کر دے مگر وہ تو رات کے اند... میں تحلیل ہو چکا تھا۔ میں نے لنگڑاتے ہوئے نہر تک... فاصلہ طے کیا اور ایک بار پھر چند گز کا فاصلہ تیر کر طے...

کے بعد دوسرے کنارے پر پہنچا جہاں محسن آنکھیں کھولے لیٹا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ اٹھ بیٹھا۔ میں دھڑام سے اس کے پاس گر گیا۔

"سکندر!" اس نے مجھے جھنجھوڑا۔ "سکندر... کیا بات ہے... تو زخمی ہے؟" اس نے میرے بازو سے ہاتھ پہ لگ جانے والے خون کو دیکھا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا اور لمبی لمبی سانسیں لیتا رہا۔ آہستہ آہستہ میرے ہوش و حواس بحال ہونے لگے۔ میں نے اپنے وجود کو گھسیٹ کر نہر کے قریب کیا اور سبزے پر پیر پھیلا دیے۔ "محسن!" میں نے کہا۔ "محسن انہوں نے... انہوں نے نوما پنجو کو بھی مار دیا۔"

"مار دیا؟" محسن کے حلق سے دہشت آمیز سرگوشی نکلی۔ "کب... کہاں...؟"

میں نے اسے کم سے کم الفاظ میں تعاقب کی روداد سنا دی۔ "میرا خیال ہے محسن! یہ وہی مندری والا ٹیکسی ڈرائیور تھا۔"

محسن خاموش بیٹھا رہا۔ میرے اور اس کے خیالات، وسوسے اور اندیشے ایک تھے جن کی بازگشت ہمارے کان ہر سمت سے سن رہے تھے۔ "اس خط کا کیا ہوا سکندر جو... جو نوما پنجو ہمیں دینا چاہتا تھا؟" اس نے بالآخر کہا۔

"وہ... وہ لے گیا۔" میں نے کہا۔ "اس نے مجھے خط دکھایا تھا... اور نوما پنجو... اس غریب منشی کا ہاتھ۔ صرف ہاتھ۔ اگر وہ میرے ہاتھ آ جاتا تو میں اسے قتل کر دیتا۔"

دس منٹ بعد ہم نے مجموعی صورت حال کا جائزہ لیا۔ تین دشمنوں میں سے ایک نہر میں ڈوب گیا تھا یا تیر کر نکل گیا تھا۔ دوسرا مقبرے کی جانب فرار ہوا تھا اور تیسرا ابھی تک کنارے پہ بے ہوش پڑا تھا۔ میرے شانے پر گہری خراش آئی تھی جس میں سے اب بھی لہو رس رہا تھا اور میرے کپڑوں کو تر کر رہا تھا۔ محسن کو بھی چوٹیں آئی تھیں اور اس کا ایک بازو بے کار ہو رہا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے میرا ایک پاؤں بے کار ہو گیا تھا۔ ہمارے کپڑے بھیگے ہوئے تھے اور اس حالت میں ہم سڑک تک چل کے جاتے تو یقیناً پکڑے جاتے۔ کوئی گشت کرنے والا سپاہی یا چوکیدار ہماری حالت دیکھ کر ہمیں سیدھا تھانے لے جاتا۔ ہمارا کسی رکشہ میں بیٹھ کے ایمبیسیڈر ہوٹل جانا بھی ناممکن تھا۔ رکشہ بھی ہمیں علامہ اقبال روڈ پہ پل تک پہنچے بغیر نہیں مل سکتا تھا۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ میرے پاس رابعہ کا کارڈ ہے۔ اسے فون کرنا ممکن ہوتا تو کوئی مسئلہ نہ تھا مگر اس وقت قرب و جوار میں فون کہیں نہ تھا۔ میں کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر میں نے محکمہ نہر کے دفتروں کو دیکھا جن کے دروازے بند پڑے تھے اور برآمدوں میں بلب جل رہے تھے۔

"محسن!" میں نے کہا۔ "ان دفتروں کا کوئی چوکیدار ضرور ہوگا اور اس کے پاس کمروں کی چابی ہوگی۔ کسی افسر کے کمرے میں ٹیلیفون بھی ہوگا۔ میں چل نہیں سکتا۔ تو ہمت کر اور کسی چوکیدار کو دیکھ۔ وہ کسی برآمدے میں پڑا سو رہا ہوگا۔ اسے پچاس روپے یا سو روپے دے اور کسی افسر کا کمرہ کھلوا۔ میرے بریف کیس میں رابعہ کا کارڈ ہے، اسے فون کر دے۔ آدھے گھنٹے تک گھنٹی بجنے دینا۔ کوئی تو اٹھے گا۔ اگر رابعہ خود آئے تو اس کو بتا دینا کہ ہم کہاں ہیں ورنہ اسے بلوا لینا۔ کہنا زندگی اور موت کا مسئلہ ہے... وہ کار لے کر آ جائے گی اور ہمیں لے جائے گی۔ اس کے سوا ہمارے یہاں سے نکلنے کی کوئی صورت نہیں۔"

محسن نے بریف کیس کھولا لیکن اندھیرے میں ایک کارڈ کو تلاش کرنا مشکل تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ بریف کیس ساتھ لے جائے اور برآمدے کی روشنی میں اطمینان سے کارڈ تلاش کر لے۔ اس نے سر ہلایا اور بریف کیس بند کر کے چل پڑا۔ میں اسے سو گز دور نہر کے دفتر کی جانب بڑھتے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ جب رابعہ آئے گی تو ہم اسے کیا بتائیں گے؟ اپنی اس حالت کا کیا سبب بیان کریں گے؟ کیا اسے تمام واقعات سے باخبر رکھنا دانشمندی ہوگی؟ کہتے ہیں ڈاکٹر سے اور وکیل سے بات چھپائی جائے تو کیس بگڑ جاتا ہے۔ رابعہ خاموش رہنے پر رضامند نہ ہوئی تو کیا ہوگا؟ وہ پولیس کو فون کرے گی کہ فلاں جگہ مقبرے میں ایک لاش پڑی ہے۔ فلاں جگہ دیکھو شاید نہر میں ایک آدمی ڈوبا ہوا ملے۔ وہیں کنارے پر تیسرا آدمی بے ہوش پڑا ہوگا۔ پھر پولیس آئے گی، تفتیش شروع ہوگی اور ہم کیا بتائیں گے کہ ہم اس میں کیسے ملوث ہوئے۔ شیروانی صاحب تو بعد میں پوچھیں گے کہ مجھ سے یہ بات کیوں چھپائی تھی۔ پہلے پولیس سوال کرے گی کہ ہمیں کیوں نہیں بتایا؟ اگلا مرحلہ سلامت شاہ کی لاش کے بارے میں انکشاف کا ہوگا۔ مجھے تسلیم کرنا پڑے گا کہ میں اس گھر میں کودا تھا اور محبت خان گواہی دے گا۔ پھر اس خط کا کیا بنے گا جو کل کی ڈاک سے آنے والا ہے؟ میں نے محسوس کیا کہ سوالات کی بھرمار سے میرا دماغ ماؤف ہونے لگا ہے۔

میں نے اٹھ کر اس شخص کو دیکھا جو میری لات لگنے سے بے ہوش ہو گیا تھا۔ وہ ابھی تک بے حس و حرکت پڑا تھا میں

نے جھک کر اس کی نبض دیکھی۔ اس کی نبض ساکت تھی۔ اس کے دل کی دھڑکن بھی خاموش تھی۔ اس کی سانس کی آمد و رفت بھی بند تھی۔ دنیا میری نظروں کے سامنے یوں گھومنے لگی جیسے میں چکر کھانے والے ہنڈولے میں بیٹھا ہوں۔ پھر میں نے اپنی حالت پر قابو پایا اور لنگڑاتا ہوا اس جگہ سے دور بھاگنے لگا جہاں میرے ہاتھوں مارے جانے والے کی لاش پڑی تھی۔ ایک قتل کا الزام مجھ پر پہلے ہی تھا۔ یہ دوسرا قتل میں نے واقعی کیا تھا۔ اپنے دفاع میں کیا جانے والا قتل بھی تو قتل ہی ہوتا ہے۔ صفائی تو بعد میں پیش ہو گی۔ پہلے تو میری ضمانت منسوخ ہو جائے گی اور میں پھر جیل میں بند ہو جاؤں گا۔ محسن مجھے راستے میں ملا۔ "وہ آ رہی ہے۔" محسن نے مجھے مطلع کیا۔ "چوکیدار نے سو روپے لیے ہیں۔"

"تو نے اسے تفصیلات تو نہیں بتائی ہیں؟" میں نے کہا۔ محسن نے نفی میں سر ہلایا۔

"میں نے صرف یہ کہا تھا کہ بدمعاشوں سے مقابلے میں ہم زخمی ہو گئے ہیں۔" محسن بولا۔

"ٹھیک ہے۔ اس سے زیادہ کچھ بتانا بھی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ شخص جو نہر کے کنارے پڑا تھا نا... وہ مر گیا ہے۔"

"یہ تو بہت برا ہوا یار!" محسن نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ "اگر وہ نہر میں گرنے والا بھی ڈوب گیا ہو گا تو یہ دونوں قتل ہماری فردِ جرم میں شامل ہو جائیں گے۔"

"ہماری نہیں صرف میری۔" میں نے کہا۔ "ان دونوں کی موت کا سبب میں ہوں۔"

"فضول باتیں مت کر۔" محسن نے کہا۔ "حملہ ہم دونوں پر ہوا تھا۔ ہم نے اپنا دفاع کیا۔ جنگ میں دشمن کی جان لینے میں قانون کے خوف سے تامل کرنے کا مطلب ہے خودکشی۔ جیسے تو نے میرے دشمن کو مار کے میری جان بچائی ایسے ہی یہ بھی ممکن تھا کہ مجھے موقع ملتا تو میں تجھ پر دشمن کو غالب پاتا تو اس کو مار دیتا، یا انہیں موقع ملتا تو صورتِ حال اس کے برعکس ہوتی اور اس وقت ہم دونوں کی لاشیں یہاں پڑی ہوتیں۔ ہمارے دشمن ایک تھے۔ ان کے خلاف ہماری جنگ بھی ایک تھی۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بچ جانے والا بے گناہ ٹھہرے اور بچانے والا مجرم بن جائے۔"

"تیری دلیل مان لی جائے تب بھی دفاع میں قتل کرنے پر قانون کی رعایت حالات کی شہادت پر ملتی ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ کیسے ثابت ہو گا کہ ہم پر حملہ کیا گیا تھا اور [اس] کے دوران وہ مارے گئے؟ کون گواہ ہو گا اس بات کا، او[ر] اس کے لیے سب سے پہلے تو یہ ضروری ہے کہ ہم یہاں [سے] سیدھے تھانے جائیں۔ تمام واقعات بیان کریں اور [خود] کو قانون کے حوالے کر دیں۔ اس کے بعد قانونی کارروا[ئی کا] سلسلہ شروع ہو گا اور پولیس کا ہی نہیں پریس اور پبلک [کا] ردِ عمل کیا ہو گا۔ میر شرافت علی کے مبینہ قاتل نے ضمانت [پر] رہا ہونے کے چند گھنٹے بعد دو افراد کو موت کے گھاٹ [اتار] دیا۔ اس بار میری ضمانت نہیں ہو سکے گی محسن! اس کے بعد مقدمے کی سماعت کے دوران میرا سابقہ ریکارڈ [عدالت] کے سامنے رکھا جائے گا۔ میری وجہ سے لندن میں ایک [شخص] قتل ہوئی اور میں ایک گواہ کی معتبر شہادت پر بچ گیا۔ مجھ [پر] ہوسٹل کے کمرے میں بم رکھنے کا الزام ناکافی ثبوت کی بنا [پر] ثابت نہ ہو سکا۔ مجھے لندن سے ڈی پورٹ کیا گیا اور لاہور پہنچتے ہی میں نے میر شرافت علی کے گھر میں گھس کر مار پیٹ کے بعد اسے قتل کر دیا۔ انصاف کرنے والے مجھے تیری نظر سے نہیں دیکھیں گے۔ لوگ کہتے ہیں کہ جہاں سے دھواں اٹھتا ہے وہاں آگ تو ہوتی ہی ہے۔ آخر میرے ساتھ پے در پے یہ واقعات کیوں پیش آتے ہیں؟ کیا ان سے میری معصومیت کی دلیل ملتی ہے؟ شریف آدمی تو بلاوجہ ایسے معاملات میں ملوث نہیں ہوتے۔"

"پھر اب کیا کریں؟" محسن نے کہا۔ "رابعہ کو کچھ نہ بتانا بھی مشکل ہے، اور بتانا بھی۔"

"میرے ذہن میں نجات کی ایک ترکیب ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم اس دوسرے شخص کو بھی نہر میں ڈال دیں۔"

"اس سے کیا ہو گا؟" محسن نے کہا۔ "لاشیں تو پولیس کو کل ایک ساتھ مل جائیں گی۔ یہ بھی ثابت ہو جائے گا کہ قتل ایک ہی وقت میں ہوئے۔"

"ہاں، مگر کسی نے قتل ہوتے تو نہیں دیکھا۔" میں نے کہا۔ "کسی نے ہمیں لڑتے ہوئے تو کیا آج سے پہلے ہمیں کبھی ان کے ساتھ تک نہیں دیکھا۔ اگر ان کے جسم پر ہمارے فنگر پرنٹ وغیرہ ہوں گے تو پانی میں مٹ جائیں گے۔ دوسری بات یہ کہ کسی خنجر پر ہمارے فنگر پرنٹ نہیں ہیں۔ ایک خنجر نہر کے کنارے پڑا ملے گا تو اس پر انہی میں سے ایک کے فنگر پرنٹ ہوں گے۔ دوسری بات یہ کہ ان میں سے کوئی خنجر کے یا گولی کے زخم سے ہلاک نہیں ہوا۔ ایک مار پیٹ کے دوران نہر میں جا گرا اور دوسرا غالباً سر کی اندرونی چوٹ سے مرا۔ پوسٹ مارٹم میں یہی بات سامنے آئے گی کہ دونوں کے جسم پر مار پیٹ کے نشانات پائے گئے۔ غالباً ان کا آپس میں کسی بات پر جھگڑا ہوا جس میں ایک نے خنجر بھی نکالا مگر اس کے حریف نے وار کامیاب نہ ہونے دیا اور کلائی کی ہڈی توڑ دی۔ پھر ان میں سے ایک پانی میں جا گرا اور شاید دوسرا سر کی چوٹ سے بے ہوش ہوا اور کیونکہ وہ کنارے پر تھا اس لیے مرا تو نہر میں نہ گرا۔ نہ ان کے پاس ہماری کوئی چیز تھی اور نہ جائے واردات پر ہماری موجودگی ثابت ہوتی ہے۔ پولیس جو نتیجہ چاہے اخذ کرے جس شخص کے پاس فومانچو کا خط تھا وہ تو خط لے کر بھاگ گیا ہے اور ظاہر ہے ہمارے خلاف رپورٹ نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے وہ سامنے آنے پر مجبور ہو گا اور یہ معاملات اس کے گلے پڑ جائیں گے۔"

"کل صبح تین لرزہ خیز قتل ہونے کی خبر خاصی سنسنی پھیلائے گی۔ اور اگر سلامت شاہ کی لاش بھی مل گئی تو چار قتل۔"

"میرا خیال ہے پہلے یہی دو لاشیں نہر سے ملیں گی۔" میں نے کہا۔ "فومانچو کی لاش شاید کل نہ ملے، یا دیر سے ملے تو خبر شاید کل نہ آ سکے۔ یہی صورتِ حال سلامت شاہ کی ہے۔ ہو سکتا ہے کل پرسوں تک کسی کو تعفن کا احساس نہ ہو۔ لاش صندوق میں بند ہے اور کوٹھیاں ایک دوسرے سے بہت دور ہیں۔ ان چاروں کے درمیان پولیس کوئی تعلق قائم نہ کر سکے گی۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔" محسن نے سوچ کر کہا۔ "تو چلیں پھر اسے ٹھکانے لگا دیں۔ رابعہ آتی ہی ہو گی۔"

ہم دونوں واپس ہوئے۔ چند قدم کے فاصلے پر وہ شخص ابھی تک جھاڑیوں کے پیچھے اوندھا پڑا تھا۔ ہم نے اسے اٹھا کے نہر میں پھینکا اور وہ لکڑی کے لٹھے کی طرح پانی میں گرا۔ ہم نے اپنی پوری قوت صرف کر دی تھی چنانچہ وہ کنارے سے کچھ دور ہو گیا تھا اور اب نہر کے خاموش، بہتے پانی کے رحم و کرم پر تھا جو دوسری لاش کو بہا کر آگے لے جا چکا تھا۔ واپس ہونے سے پہلے میں نے خنجر تلاش کیا اور اسے بھی نہر میں پھینک دیا۔

"رابعہ کو اب صرف یہ بتانا ہے کہ حملہ آور ہمیں لوٹنا چاہتے تھے مگر کامیاب نہ ہو سکے اور ہم نے مقابلہ کیا تو بھاگ گئے۔" میں نے کہا۔

"اور پرسوں صبح کے اخبار میں وہ دیکھے گی کہ دو لاشیں وہیں سے دستیاب ہوئی ہیں جہاں سے وہ ہمیں لے گئی تھی تو کیا اسے یہ خیال نہیں آئے گا کہ دونوں مقتول وہی ہیں جو ہمیں لوٹنا چاہتے تھے؟" محسن نے کہا۔ "اسے شک نہیں ہو گا کہ ہم نے جھوٹ بولا تھا؟ اور ڈاکو فرار نہیں ہو سکے تھے بلکہ ہمارے ہاتھوں مارے گئے تھے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "پہلی بات تو یہ کہ اب دونوں لاشیں ایک جگہ نہیں رہیں گی۔ آدھے پونے گھنٹے کے فرق سے آگے پیچھے بہتی جا رہی ہیں۔ صبح کا اجالا پھیلنے تک لاشیں اس آباد علاقے سے گزر کے چھاؤنی کی طرف جانے والی نہر میں ایک دو میل ضرور جا چکی ہوں گی۔ اور دریافت ہونے تک نہ جانے کہاں ہوں گی۔ یہاں ہر شخص اتنا فرض شناس اور قانون پرست شہری نہیں ہے کہ لاشوں کو دیکھتے ہی سیدھا پولیس اسٹیشن جا کے رپورٹ کرے۔ زیادہ تر لوگ دہشت زدہ ہو کے بھاگ لیں گے اور خواہ مخواہ پولیس کے چکر میں پڑنے سے گریز کریں گے۔ بالآخر لاشیں مال روڈ کے پل کے جنگلے میں اٹک جائیں گی اور وہاں مجمع اکٹھا ہو گا تو کوئی پولیس کو بھی بلائے گا۔ پولیس سے یہ توقع مت رکھ کہ وہ نہر کے ساتھ ساتھ کئی میل واپس آ کے ایک ایک انچ کا علاقہ اس امید میں چھان مارے گی کہ کہیں جدوجہد کا سراغ ملے۔ لہو کے داغ یا شکستہ جھاڑیاں اور روندی ہوئی زمین دکھائی دے تو وہ اصل جائے واردات کا تعین کر لے گی۔ نہر میلوں لمبی ہے اور دونوں کنارے ملا کر سینکڑوں میل کا علاقہ خوردبین سے نہیں دیکھا جا سکتا۔"

"میرا خیال ہے اس سے آگے جانا ٹھیک نہیں۔" محسن نے رکتے ہوئے کہا۔ "نہر کا پل اب مشکل سے سو گز دور رہ گیا تھا۔ رابعہ ادھر آئے گی تو کار کی ہیڈ لائٹس میں ہمیں دیکھ لے گی۔"

"مجھے تو فومانچو کی موت کا افسوس ہے۔" میں نے رکتے ہوئے کہا۔ "آخر وہ دشمنوں کے ہتھے کیسے چڑھ گیا۔"

"انہوں نے یقیناً عدالت سے ہمارا تعاقب کیا ہو گا۔" محسن بولا۔ "یہ دیکھنے کے لیے کہ ضمانت پر رہائی کے بعد ہم کدھر جاتے ہیں۔ ہم رابعہ کی کار میں تھے۔ شاید فومانچو ٹیکسی میں ہمارے پیچھے تھا اور وہ فومانچو کے پیچھے۔ انہوں نے دیکھ لیا ہو گا کہ فومانچو نے ہمیں کوئی پیغام دیا ہے اور وہ اسے پکڑ کے لے گئے ہوں گے۔ اگر وہ کامیاب ہو جاتے تو ہماری لاشیں بھی وہیں پڑی ملتیں۔ وہ دیا انہوں نے اسی لیے روشن کیا ہو گا کہ ہمیں اس ویرانے میں لے جا کر اذیت دیں۔ ہم سے پوچھیں کہ ہم کیا کچھ جانتے ہیں اور پھر قتل کر کے چھوڑ جائیں۔ اس دیے کی روشنی باہر سڑک پر سے گزرنے والا کوئی شخص دیکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ ہماری فریاد و فغاں کسی کے

کانوں تک کہاں پہنچتی ہے؟"

"معلوم نہیں نوما یجو مرحوم کس کا منشی تھا؟" محسن نے کہا "اگر یہ بات معلوم ہو جائے تو کچھ پیش رفت ہو سکتی ہے۔"

اسی وقت گڑھی شاہو کی طرف سے ایک کار نمودار ہوئی جو اس سے پہلے نظر آنے والی اکا دکا کاروں کی طرح دھرم پورے کی طرف جانے کی بجائے نہر کا پل عبور کرتے ہی بائیں جانب مڑ گئی اور میں نے پل پر لگی ہوئی اسٹریٹ لائٹ کے اجالے میں رابعہ کی سرخ فاکس ویگن کو پہچان لیا۔ ہم دونوں نے کار کے قریب آتے ہی سڑک کے وسط میں آ کے ہاتھ کا اشارہ دیا اور کار ہمارے پاس آ کے رک گئی۔

رابعہ سوتے سے اٹھ کر آئی تھی چنانچہ اس کی آنکھوں میں نیند کا اثر باقی تھا۔ سیٹ کیے ہوئے بالوں کو برش کیے بغیر وہ سادہ سوتی شلوار قمیض میں چپل پہن کے نکل آئی تھی۔ کار کو پچاس پچپن سال کا ایک بوڑھا شوفر چلا رہا تھا۔

"تم... تم تو زخمی ہو... بہت زیادہ چوٹ آئی ہیں کیا؟" وہ اترتے ہی بولی۔ پھر اس نے ہمارے بھیگے ہوئے کپڑوں کا جائزہ لیا جو مار پیٹ میں کئی جگہ سے پھٹ گئے تھے۔

"تشویش کی کوئی بات نہیں۔" میں نے کہا۔ "پہلے ہمیں گھر لے چلو۔ پھر سب بات بتا دیں گے۔"

"میں تمہیں گھر لے جانے کے لیے ہی آئی ہوں۔" وہ بولی۔ "مگر مجھے یہ تو بتاؤ کہ ہوا کیا تھا؟"

"ایسی کوئی خاص بات نہیں۔" میں نے کہا۔ "دو بدمعاش تھے ہمیں لوٹنا چاہتے تھے۔"

"مگر تم اتنی رات گئے یہاں کیا کر رہے تھے؟" وہ مشتبہ لہجے میں بولی۔ "اور وہ بدمعاش کہاں گئے؟"

"ہم نے مقابلہ کیا تو بھاگ گئے۔" محسن نے کہا۔ "انہوں نے دور سے ایک تانگہ آتے دیکھ لیا تھا۔"

"یہاں میرا ایک دوست رہتا ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم محسن کے ڈیڈی کو ایئرپورٹ چھوڑنے گئے تھے۔ واپسی پر اس سے ملنے چلے گئے تھے۔"

رابعہ نے دروازہ کھول کے سیٹ آگے کی اور ہم دونوں پیچھے والی نشست پر بیٹھ گئے تو رابعہ پھر ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ "زخم خطرناک نہیں ہیں تب بھی پولیس میں رپورٹ لکھوانی ضروری ہے۔" وہ بولی۔ "پولیس سرجن سے میڈیکل رپورٹ لینی ہوگی۔"

"نہیں مس رابعہ!" میں نے کہا۔ "اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔"

"لیکن سکندر! یہ رہزنی اور اقدامِ قتل کا کیس ہے" وہ اصرار کرتے ہوئے بولی۔

"ہاں مگر مجھے نقصان تو کوئی نہیں ہوا۔ [illegible] آج ہی... میرا مطلب ہے گزشتہ روز ہی میری ضمانت ہوئی ہے۔ اب میں کسی کیس میں ملوث نہیں ہونا چاہتا۔ تمہارے گھر میں ڈیٹول وغیرہ تو ہوگی۔ ہم خود مرہم پٹی کر لیں گے۔"

وہ مطمئن نہیں ہوئی لیکن خاموش ہو گئی۔ میں اور محسن اپنے اپنے خیالات کے سمندر میں غوطہ زن رہے۔ باہر رات کے آخری پہر میں شہر کی فراواں مخلوق فکرِ فردا و غمِ دوش سے بے نیاز لذتِ خوابِ سحر میں ڈوبی ہوئی تھی۔ گڑھی شاہو کی دکانوں کے تھڑوں پر چارپائیاں ڈال کے لیٹے ہوئے لوگ، کوچہ و بازار کے بام و در، سائن بورڈ اور اسٹریٹ لائٹس کے ٹمٹماتے بلب۔ درخت اور ٹیلی فون کے کھمبے — فٹ پاتھ، گلیاں اور چوراہے سب سوتے پڑے تھے۔ کبھی کبھار کوئی دودھ کے ڈرم لے جانے والا کوئی ریڑھا گزر جاتا تھا جس کے گھوڑے کے سُم خالی سڑک پر دیر تک گونجتے رہتے۔ جا بجا آوارہ کتے اور فقیر فرشِ خاک پر لیٹے ہوئے تھے۔ بس سروس کی ایک بس دھواں چھوڑتی ہوئی کھڑکھڑاتی گزر گئی۔ گشت کرنے والے دو سپاہی رائفلیں اٹھائے ٹہلتے نظر آئے۔ دو نوجوان سڑک خالی پا کے سائیکل پر تیز رفتاری کے مقابلے میں مصروف بڑے جوش و خروش سے پیڈل چلاتے گزر گئے۔ دونوں اخبار فروش لگتے تھے۔ کار کراؤن سینما کے چوک سے بائیں جانب مڑی۔ سینما کی رنگین روشنیوں سے جگمگانے والی، تماش بینوں کے اژدہام سے گونجنے والی اور پُرکشش پوسٹروں سے مزین عمارت سنسان پڑی تھی اور احاطے میں صرف ایک لائٹ جل رہی تھی۔ کار فرلانگ بھر چلنے کے بعد ایک کوٹھی کے گیٹ پر رکی۔ ڈرائیور نے نیچے اتر کے بند پھاٹک کھولا، کار کو آگے لے گیا۔ اتر کے واپس پھاٹک بند کرنے گیا اور کار کو پورچ میں لے جا کر روک دیا۔

"بابا!" رابعہ نے شوفر سے کہا۔ "دیکھو مہمانوں کا کمرہ صاف کر دیا گیا ہے یا نہیں۔" اور نیچے اتر گئی۔ پھر ہم نے سیٹ کو آگے کیا اور باری باری باہر آئے۔ رابعہ کا گھر پرانی وضع کی کوٹھی تھی۔ پورچ کے دونوں طرف تین تین کمرے تھے۔ ہر کمرے کی ایک کھڑکی اور ایک دروازہ تھا۔ دروازے پر محراب سی بنی ہوئی تھی جس کے نیچے رنگین شیشے کے ٹکڑوں سے بنے

نصف دائرے جیسے روشن دان تھے۔ اوپر کی منزل شاید بعد میں تعمیر ہوئی تھی چنانچہ نقشہ بھی تھا مگر اوپر کے ہر کمرے میں لوہے کی گرل والی اور بڑے بڑے شیشوں کے پٹ والی جدید طرز کی ایک ایک کھڑکی تھی۔ پوری عمارت کا رنگ ایک ہی تھا یعنی ہلکا نیلا مگر کہیں کہیں سے نیچے کا پرانا پیلا رنگ جھانکنے لگا تھا۔ پورچ میں ایک ٹیوب لائٹ تھی جس کا اجالا سامنے پھیلے ہوئے مختصر سے باغ اور لان پر بھی پھیل گیا تھا۔ نیچے کے دو اور اوپر کے ایک کمرے میں بھی ٹیوب لائٹس ہی روشن تھیں۔ کار کی آواز پر پچاس پچپن برس کی ایک فربہ بدن اور صحت مند عورت باہر آئی جس نے سر کو پیشانی تک دوپٹے میں لپیٹ رکھا تھا۔

"یہ میری ماں ہیں۔" رابعہ نے کہا۔ "اور ماں! یہ دونوں اسکول اور کالج میں میرے ساتھ تھے۔ یہ محسن ہے۔ اس کے ڈیڈی وزارتِ خارجہ میں ڈپٹی سیکرٹری ہیں۔ اور یہ سکندر ہے۔ اس کے والد میروزیر اینڈ کمپنی کے مالک تھے۔ حال ہی میں انتقال ہوا ہے۔ یہ دونوں لندن میں تھے۔"

ہمارے سلام کا شفقت سے جواب دے کر رابعہ کی ماں نے اطمینان کا سانس لیا کہ رات کے آخری پہر میں وارد ہونے والے مہمان جیل سے فرار ہونے والے قیدی نہیں ہیں یا کوئی سنگین جرم کر کے اس کی وکیل بیٹی کے پاس مدد کے لیے پہنچنے والے لوگ نہیں بلکہ اچھے گھروں کے شریف اور اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد ہیں۔ اس کی ابتدائی تشویش بے وجہ نہ تھی۔ رابعہ کتنی ہی بڑی وکیل کیوں نہ سہی، تھی تو ایک جوان لڑکی اور اگرچہ ابھی تک یہ بات کسی نے نہیں بتائی تھی لیکن اندازہ یہی تھا کہ رابعہ کا باپ نہیں ہے۔ ہوتا تو سامنے ضرور آتا۔ زیادہ امکانات یہی تھے کہ اس کا انتقال ہو چکا ہے لیکن اس کے دوسرا گھر بسانے کے بعد پہلی بیوی اور بیٹی کو چھوڑ دینے کے خیال کو بھی مسترد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ رابعہ نے وکالت شروع کی ہی تھی کہ وہ مر گیا اور رابعہ کے سوا ماں کے پاس کوئی نہیں تھا۔ اس کا ایک بھائی تعلیم کے لیے لندن گیا تھا مگر اس نے روایت نبھاتے ہوئے ایک انگریز لڑکی سے شادی کر لی تھی اور وہیں آباد ہو گیا تھا۔ بوڑھے شوفر کی بیوی بھی اسی گھر میں ملازم تھی اور باورچی خانہ سنبھالتی تھی۔ گھر کی صفائی دونوں مل کر کرتے تھے — اکثر رابعہ یا اس کی ماں بھی ان کا ہاتھ بٹا دیتے تھے۔ دونوں میاں بیوی بیس برس سے اسی گھر کا نمک کھا رہے تھے چنانچہ بے حد قابلِ اعتماد تھے۔ اور ان کی حیثیت بھی نوکروں کی نہیں گھر کے افراد جیسی تھی۔

رابعہ روانگی سے پہلے ہی کہہ گئی تھی کہ مہمانوں والا کمرہ کھول کے صاف کر دیا جائے۔ رابعہ کی ماں خود ہمیں کمرے میں پہنچانے گئی اور ہم سے کہا کہ پہلے ہم غسل وغیرہ کر لیں اور کپڑے بدل لیں۔ رابعہ ڈاکٹر کو فون کرنے گئی ہے۔ ہم نے واجبی سا احتجاج کیا کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی مگر اس نے کہا کہ معمولی زخموں کو بھی نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔ اس نے ہم سے یہ نہیں پوچھا کہ آخر یہ زخم کیسے آئے۔ جب وہ دروازہ بند کر کے چلی گئی تو میں نے محسن سے کہا۔ "یار کپڑوں کا تو مسئلہ ہوگا۔ میرے بریف کیس میں صرف دو جوڑے ہیں۔ ایک پتلون قمیض، ایک شلوار قمیض۔"

"پھر مسئلہ کیسا ہے؟" محسن نے کہا۔ "شلوار قمیض مجھے دے دے، تیرے میرے سائز میں فرق تو نہیں ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔" میں نے بریف کیس کھول کے کہا۔ "اس کے بعد کیا ہوگا؟ میرا تمام سامان تو سلامت شاہ کے کوارٹر میں پڑا تھا۔ معلوم نہیں اب ہے یا نہیں۔ خیر جا پہلے تو نہا لے۔" میں نے اسے شلوار قمیض تھما کے غسل خانے کی طرف اشارہ کیا اور بریف کیس میں سے اپنا شیونگ کا سامان بھی نکالا۔

"پہلے تو جا کے اپنے اس زخم کو دھو۔" محسن نے کہا۔ "دیر کی تو خراب ہو جائے گا۔ شاید اندر ڈیٹول ہوگی ورنہ صابن سے صاف کر لینا۔ ابھی ڈاکٹر آ ہی رہا ہوگا۔ میرا خیال ہے رابعہ نے سوچ سمجھ کے کسی قابلِ اعتبار آدمی کو ہی بلایا ہوگا۔"

غسل خانے میں ٹھنڈے اور گرم پانی کے نل الگ الگ تھے۔ میں نے کپڑوں کو جسم سے الگ کیا تو قمیض کی آستین بازو پر خون کے خشک ہو جانے سے چپک گئی تھی۔ میں نے اسے گرم پانی ڈال کے الگ کیا اور آہستہ آہستہ مل کے خون کے سارے داغ دھو ڈالے۔ میرا زخمی ہاتھ درد کے باعث پوری طرح حرکت نہیں کر سکتا تھا چنانچہ مجھے غسل کے دوران ایک ہی ہاتھ پر انحصار کرنا پڑا۔ باتھ روم میں ڈیٹول موجود تھی۔ اس جراثیم کش محلول سے زخم کو دھوتے ہوئے میں نے زخم کی کیفیت دیکھی۔ خنجر کی نوک نے شانے کے گوشت کو تقریباً آٹھ انچ تک بڑی صفائی سے کاٹ دیا تھا اور اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ خنجر کی دھار شیونگ بلیڈ کی طرح تیز تھی۔ زخم کی گہرائی آدھے انچ کے قریب تھی۔ گوشت کے دونوں جدا ہونے والے حصے انجمادِ خون کے بعد آپس میں مل گئے تھے۔ دھونے سے زخم کا منہ پھر کھل گیا اور خون رسنے لگا۔ میں نے اتاری ہوئی قمیض میں سے کپڑے کی ایک پٹی پھاڑ کے واش بیسن میں دھوئی، اور

ڈیٹول کے پانی میں بھگو کے ہاتھ پر مضبوطی سے باندھ لی۔ تھوڑا سا خون پٹی کے باہر تک پہنچا مگر اس کے بعد لہو کے واقع کا پھیلاؤ رک گیا۔ میں نے آئینے میں اپنی صورت ملاحظہ کی تو مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ اب تک مجھے اندازہ نہ تھا کہ گزشتہ تین دن میں میرا چہرہ کتنا بدل گیا ہے۔ میری شیو بڑھنے سے باقاعدہ داڑھی کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ میری آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نمودار ہو گئے تھے اور میرے جھاڑ جھنکاڑ بالوں میں گرد کے علاوہ خس و خاشاک نظر آتے تھے۔ واہ میاں سکندر بخت! دیکھو کہ فلک کج رفتار کی گردش نے تمہیں کیا سے کیا کر دیا اور کہاں پہنچا دیا۔ عبرت پکڑو کہ تم جو دنیا کو تماشا گاہ اور خود کو تماشائی سمجھتے تھے، آج خود تماشہ ہو اور سوچو کہ آنے والے دن کے لیے تقدیر کا نوشتہ سرخروئی ہے کہ روسیاہی!

شیو اور غسل کے دوران میں مجھے فوماپخو یعنی ملنشی کی لاش کا خیال بھی آیا جو ایک مجرم ہاتھ سے محروم بے گور و کفن پڑی تھی۔ اس کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ سچ پر پڑا ہوا پردہ اٹھانا چاہتا تھا۔ محض اس لیے کہ بچپن میں ماں باپ نے کہا تھا "بیٹا ہمیشہ سچ بولو"۔ بزرگوں کا قول تھا کہ "سچ عبادت کا درجہ رکھتا ہے"۔ مذہب نے حق گوئی کو جہاد قرار دیا تھا اور کتابوں میں لکھا تھا کہ سچ کا بول بالا ہوتا ہے۔ اگر وہ مذہب و اخلاق کی تعلیمات کا علمبردار اور عقل و دانش کے اقوالِ زریں پر یقین نہ رکھتا تو وہ مرنے والوں کی بجائے مارنے والوں میں شامل ہوتا۔ اس کی شیروانی بوسیدہ اور اس کی قمیص پھٹی ہوئی نہ ہوتی اور وہ اس وقت بہترین سوٹ پہنے کار میں زر خرید سیم تن کے ساتھ مال پر سے گزر رہا ہوتا یا فلیٹیز جیسے کسی ہوٹل کے لاؤنج میں ایک نئے، پرمسرت اور کامیاب دن کے آغاز کا جام تجویز کر رہا ہوتا یا اپنے عالی شان گھر کی آراستہ خواب گاہ میں سویا پڑا ہوتا۔ مگر اس نے سچ بولا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں اسے سچ کا کوئی انعام نہ دے سکوں گا۔ کوئی خلعت یا جاگیر عطا نہیں کروں گا اور یہ کارنامہ اس کی لوحِ مزار پر سنہرے حروف سے نہیں لکھا جائے گا۔ اس سے میرا کوئی جذباتی رشتہ نہیں تھا اور اسے میرے یا میرے آباؤ اجداد کے کسی احسان کا قرض نہیں چکانا تھا، مگر اس نے سچ بولا۔ اور اب میرے لیے اسے عام آدمی کی طرح عزت و احترام کے ساتھ آغوشِ لحد کے سپرد کرنا بھی ممکن نہیں۔ جب اس حق پرست کی لاش سڑنے لگے گی اور اس پر چیل کوے منڈلانے لگیں گے تو پولیس اپنے ساتھ بھنگی لے کر آئے گی جو اس کوڑے کو سمیٹ کر گاڑی میں ڈال دیں گے اور پوسٹ مارٹم کی قانونی یا کاغذی کارروائی کے بعد لاوارث لاش میڈیکل کالج کے ان طلباء کے حوالے کر دی جائے گی جو مستقبل کے انسان کی صحت اور درازیٔ عمر کے لیے جدوجہد اور تحقیق میں مصروف ہیں۔ اگر وہ ہم لاش لے گئے تو بہ امرِ مجبوری تدفین میں شریک ہونے والے عزیز پکڑیں گے اور منہ بھر کر کہیں گے کہ بھائی آدمی کو اس کے گناہوں کی سزا ضرور ملتی ہے۔ خدا معاف کرے مگر مرنے والے کو دیکھو موت آئی تو کہاں اور کس حال میں۔ ہم فانی انسان جو بصیرت نہیں رکھتے نیکی و بدی کے فتوے کتنے اعتماد سے دیتے ہیں۔ خیال مجھے اس بوٹ پالش کرنے والے لڑکے کا بھی آیا۔ اور میں نے خدا سے دعا مانگی کہ ایک اندھی ماں اور ایک چھوٹے بھائی کی پرورش کرنے والا وہ چھوٹا سا جوانمرد زندہ رہے۔ مجھے یہ امید ضرور تھی کہ محض ایک رقعہ پہنچانے پر میرے دشمن اس کی جان نہیں لیں گے جسے یہ بھی علم نہ تھا کہ مکتوب کیا ہے اور مکتوب الیہ کون ہے۔ اسے کون بھیج رہا ہے اور کون دیکھ رہا ہے۔

جب میں نے لباس بدلنے کے بعد پھر آئینہ دیکھا تو اپنے آپ کو پہچان کر خوش ہوا۔ پرانا سکندر بخت جو گرد و غبار اور جھاڑ جھنکاڑ کے صاف ہو جانے کے بعد غسل خانے سے برآمد ہوا کمرے میں موجود کم سے کم دو افراد یعنی رابعہ اور محسن کے لیے بھی باعثِ حیرت و مسرت بنا۔ رابعہ مسکرائی اور محسن نے ہنس کر کہا "کبیر داس، تو پھر شریف آدمی نظر آنے لگے"۔

"نظر آنے لگا ہوں کا کیا مطلب؟" میں نے خوش دلی سے احتجاج کیا۔ "کیا میں ہوں نہیں؟"

کمرے میں موجود تیسرے شخص کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہیں پڑا جو اپنی متانت سے ہی نہیں انداز اور ساز و سامان سے بھی ڈاکٹر لگتا تھا۔ وہ محسن کا معائنہ کر چکا تھا اور اس کا تجویز کردہ نسخہ میز پر رکھا تھا۔ اب اس نے مجھے اس سے کے زیادہ تفصیل سے دیکھا کیونکہ میں واقعی زخمی تھا۔ اس نے بازو پر لپٹی ہوئی پٹی کی فرسٹ ایڈ پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا، اور پھر نئے سرے سے زخم کی صفائی کے بعد کوئی پاؤڈر غالباً "نیومائی سین" چھڑک کے باضابطہ قسم کی صاف ستھری پٹی باندھی۔ ایک انجکشن گھونپا اور اپنے بیگ میں سے ایک شیشی نکال کے نسخے پر رکھ دی۔ شیشی میں کیپسول تھے جو میرے اندازے کے مطابق اینٹی بایوٹک تھے اور زخم کے زہریلے اثرات کو جسم میں پھیلنے سے روکنے کیلئے تھے۔ پھر اس نے چاندی کی طرح چمکتا ہوا ایک انگلی جتنا لمبا المونیم کا اسٹرپ نکالا جس کے شفاف پلاسٹک کور میں دس گولیاں مقید تھیں۔ یہ محض سکون آور "ڈائزاپام" فائیو ملی گرام کی گولیاں تھیں۔ میرا اور محسن کا نسخہ ایک ہی تھا۔ چلتے چلتے اس نے عادتاً کہا کہ تشویش کی کوئی بات نہیں، اور چند دن کی باقاعدہ ڈریسنگ سے زخم ٹھیک ہو جائے گا بشرطیکہ اس دوران میں قوتِ بازو کا غیر ضروری مظاہرہ نہ کیا۔ وہ انتہائی کم گو، خلیق اور صورت سے قابلِ اعتماد نظر آنے والا بوڑھا آدمی تھا۔ رابعہ نے مجھے بعد میں بتایا کہ یہ ڈاکٹر اس کے والد کا دوست تھا جسے وہ بچپن سے "ڈاکٹر انکل" کہتی آئی تھی، چنانچہ رابعہ کا فون ملتے ہی وہ آ پہنچا تھا اور رابعہ کے اس بیان سے مطمئن ہو گیا تھا کہ ہم اس کے دوست ہیں جو راہ چلتے ایک مظلوم کی حمایت کے لیے لڑائی میں کود پڑے تھے اور اب خود بھی مظلوم تھے تاہم غنیمت ہے کہ مقتول نہیں تھے۔

محسن باتھ روم سے نکلا تو رابعہ نے بورڈ پر لگی ہوئی ایک گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ گھنٹی شاید باورچی خانے میں بجی جہاں اس کی ہدایات کے مطابق کافی پہلے ہی تیار تھی۔ چند منٹ کے بعد شوفر کی زوجہ "ماسی" ٹرے اٹھائے نمودار ہوئی، اور درمیان کی میز پر رکھ کے رخصت ہو گئی۔ جاتے جاتے اس نے پھر ہمیں مشکوک نظروں سے دیکھا اور زیر لب وظیفہ پڑھنے کے انداز میں کوئی بات کی جو یہ بھی ہو سکتی تھی کہ موئے خدائی خوار دن دیکھیں نہ رات منہ اٹھائے چلے آتے ہیں۔ اور کوئی دعائے خیر بھی۔ کافی وقت کی اہم ترین ضرورت تھی، جسے میں نے اسپرین نگلنے کے لیے بھی استعمال کیا۔ پھر میں نے رابعہ سے معذرت کی کہ ہم ایسے غلط وقت پر اس کے لیے باعثِ زحمت بنے اور اس کی مدد اور مہمان نوازی پر شکر گزاری کا اظہار کرنے کے بعد میں نے تجویز کیا کہ صبح تو ہونے والی ہے مگر ایک دو گھنٹے آرام کر لینا ہم سب کے لیے بہتر ہوگا۔ رابعہ نے اپنی اعصابی مریض ماں کو پہلے ہی سُلا دیا تھا۔ وہ ناشتے کی میز پر دوبارہ ملاقات کا وعدہ کر کے رخصت ہوئی اور جاتے ہوئے دروازہ بند کر گئی۔ میں نے اطمینان کا گہرا سانس لیا اور بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ خدا کا شکر بجا لایا جس نے ہمیں تحفظ و عافیت کے ساتھ اس گھر کی چھت کے نیچے پہنچایا اور آسمان پر نہیں اٹھایا۔

"مسٹر محسن رضا!" میں نے بیڈ پر نیم دراز ہو کے سگریٹ سلگایا اور تکیے کو سر کے نیچے ایک فٹ اونچی بیڈ سائڈ پر رکھ لیا۔ "کتنی خوشی کی بات ہے کہ اس وقت تمہاری لاش نہر میں بہتی ہوئی نہیں جا رہی ہے۔"

"جی۔" محسن نے دوسری طرف کی بیڈ سائڈ پر دوسرا تکیہ رکھ کے میری تقلید کی اور پیر میری طرف پھیلا دیے۔ اب ہم آمنے سامنے اور ایک دوسرے کے متوازی نیم دراز تھے۔ "یہ کیا کم خوشی کی بات ہے کہ تمہاری لاش اس ویران مقبرے میں فوماپخو کی لاش کے ساتھ نہیں لیٹی ہوئی ہے۔"

"اب ہم فوری توجہ طلب مسائل پر مذاکرات کا آغاز کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "پہلی بات تو یہ کہ اب تک ہم نے سو فیصد جھوٹ بولا ہے اور ہر جھوٹ بولنے والے کی طرح اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ یہ سب سچ لگتا ہے۔ رابعہ اتنی نادان نہیں ہے۔ ہمیں اس جھوٹ میں پچاس فیصد تخفیف کرنی ہوگی۔"

"کیا مطلب؟" محسن نے کہا۔ "یعنی اب نئے بیان میں تسلیم کرنا ہوگا کہ حملہ آور ایک تھا، یا یہ کہ حملہ ہم میں سے ایک پر ہوا تھا؟"

"جھوٹ میں پچاس فیصد تخفیف کا مطلب بات میں پچاس فیصد صداقت کا اضافہ ہرگز نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "بہت غور و خوض کے بعد میں نے طے کیا ہے کہ صبح پہلے تو رابعہ کے سامنے ڈھٹائی سے تسلیم کیا جائے کہ اس وقت ہم ہوش میں نہیں تھے اور مصلحت کے غلط تقاضے کے پیشِ نظر ہم نے جھوٹ بولا تھا۔ اس کا ایک نفسیاتی فائدہ یہ ہوگا کہ بعد میں ہم جو کچھ برقائمی ہوش و حواس کہیں گے رابعہ کے لیے واقعی سچ بن جائے گا۔ اب اصل کہانی یوں ہوگی کہ ہم نے سلامت شاہ سے کہا تھا کہ وہ زیورات فروخت کر کے رقم ہمیں پہنچا دے۔ پھر ہم فوماپخو کا حلیہ بیان کر کے کہہ سکتے ہیں کہ جب ہم دوپہر کا کھانا کھانے جا رہے تھے تو بیڈن روڈ پر اس نے ہمیں پک اپ کیا تھا۔ ہم وہاں پہنچے تو بجائے سلامت شاہ کے تین افراد ہمارے منتظر تھے اور بظاہر وہ ہمارے قتل پر مامور کیے گئے تھے۔ ایک زبردست معرکے میں ہماری مشترکہ کمان نے وہ دادِ شجاعت دی کہ دشمن فرار ہونے پر مجبور ہوئے۔ دشمنوں میں سے ایک شخص کو ہم نے پہچانا۔ وہ گھنگھریالے بالوں، کنجی آنکھوں اور دائیں کان میں پیتل یا سونے کی مندری پہننے والا ٹیکسی ڈرائیور..."

"زبردست۔" محسن نے کہا جو میری بات بہت غور سے سن رہا تھا۔ "یہ کثیر المقاصد بیان واقعی خوب رہے گا۔"

"ہاں۔ ایک تو اس سے سلامت شاہ کے نہ آنے پر تشویش کا اظہار کرنا ممکن ہوگا۔" میں نے کہا۔ "اور بعد میں آج کل یا پرسوں جب بھی اس کی لاش ملے گی تو رابعہ کو

اس حادثے اور ہمارے بیان میں مطابقت نظر آئے گی۔ دوسری بات یہ کہ جب فوما بخو کی لاش ملے گی تو رابعہ قیاس آرائی کی بنیاد پر سمجھے گی کہ وہ کیوں مارا گیا، ورنہ ہم سمجھا دیں گے کہ فوما بخو کو ہمارے خلاف سازش کرنے والے دشمنوں نے آلہ کار بنایا اور مقصد پورا ہونے کے بعد اس لیے مار دیا کہ وہ سازشیوں کو پہچانتا تھا، یا اسے معلوم ہو گیا تھا کہ سازشی عناصر کے عزائم کیا ہیں چنانچہ اس کا وجود یقیناً باعثِ خطر تھا۔ تیسرا فائدہ یہ ہوگا کہ مندی والا ٹیکسی ڈرائیور اس قاتلانہ حملے کا ایک ملزم قرار پائے گا۔ ہم بتائیں گے کہ وہ کس سمت میں فرار ہوا تھا۔ اسی سمت سے فوما بخو کی لاش کی دستیابی ہمارے مفروضات کی صداقت کا ثبوت بن جائے گی، لیکن ان حالات کے پیش نظر ہم رابعہ سے کہہ سکیں گے کہ فی الحال کسی قانونی چارہ جوئی کی ضرورت نہیں۔ ہم پر ناکام قاتلانہ حملہ ہوا تھا جس میں مارا کوئی نہیں گیا۔ گزشتہ را صلوٰۃ و آئندہ را احتیاط۔"

"اور ان دو لاشوں کا کیا بنے گا جو نہر سے برآمد ہوں گی؟" محسن نے کہا۔

"وہ پولیس کا کام ہے کہ واردات کو جو رنگ چاہے دے۔" میں نے کہا۔ "ہمارا ان سے کیا تعلق۔ جب فوما بخو کی لاش ملے گی تو مدعی خود پولیس ہوگی اور رابعہ رضاکارانہ طور پر بیان دے کر لینے لیے اور ہمارے لیے قانونی الجھن پیدا کرنے سے گریز کرے گی۔ اس کے بعد سلامت شاہ کی لاش دریافت ہو گی تو اسباب رابعہ کے سامنے ہوں گے مگر ہمارا موقف یہ رہے گا کہ وہ صفائی کا واحد گواہ تھا چنانچہ ہمارے دشمنوں نے اسے مروا دیا۔ پولیس کو زیورات وغیرہ کا حوالہ دینے کی ضرورت ہی نہ ہوگی۔ یہ تو تھا مسئلہ نمبر ایک اور اس کا قابلِ تعریف حل۔ دوسرا مسئلہ ہے ستر پوشی کا۔ میرے سارے کپڑے سلامت شاہ کے کوارٹر میں رکھے ہیں اور میرا خیال ہے کہ ابھی لے آؤں۔ اسی وقت جا کے۔"

"تجویز یہ بھی قابلِ تعریف ہے۔" محسن نے طنز سے کہا۔ "جاتے وقت آپ رابعہ کو بتا جائیں کہ کہاں جا رہے ہیں۔ سی سی ڈین کے دروازے پر آپ کو محبت خان نام کا ایک چوکیدار ملے گا اور چونکہ چراغ دین مری سے واپس آ چکا ہے اس لیے وہ بقلم خود آپ کے استقبال کے لیے حاضر ہوگا۔ آپ عرض مدعا کیجیے اور وہ آپ کو بڑی نیازمندی سے سلامت شاہ کے سرونٹ کوارٹر میں لے جائے گا۔ آپ اس کے سابق آقا کے فرزندِ ارجمند ہیں نا۔

آپ کے بارے میں اخبارات کی باتصویر خبروں کا دو... نہیں دے گا۔ آخر مروت اور اخلاق بھی کوئی چیز ہے۔ آپ کا تمام اسباب وہ خود اپنی کار میں رکھے گا۔ اگر کریں گے تو وہ صندوق بھی جو چچا نذیر خان مرحوم گئے تھے کہ سلامت شاہ کا تابوت بنے، اور آپ ... چھوڑ کر ہنسی خوشی لوٹ جائے گا۔"

"بکواس بند کرو۔" میں نے کہا۔ "ابھی پانچ... سات بجے سے پہلے چراغ دین بھی سو کر نہیں اٹھے گا۔ ... بھی عموماً رات کو گیٹ کے پاس یا برآمدے میں ... ڈال کے سو جاتے ہیں۔ بفرضِ محال وہ فرض شناس ... ڈنڈا لیے دروازے پر کھڑا ملا تو میں ساتھ والے گھر ... داخل ہو جاؤں گا۔ چراغ دین کے گھر سے پہلے والے ... والے گھر میں۔ ضروری تو نہیں کہ ہر گھر میں چوکیدار گیٹ ... پر موجود ملے۔ چراغ دین کے گھر اور ساتھ والے دونوں ... کے بیچ میں دائیں بائیں دو دیواریں حائل ہیں۔ میں ... دیوار کے آخری حصے کو پھاند کر کوٹھی کے عقبی حصے ... عین سلامت شاہ کے کوارٹر کے قریب لینڈ کروں گا ... کوارٹر کے اندر اترنا ذہنی طور پر نہ سہی جسمانی طور پر ... زندہ سلامت شاہ کسی کے لیے کچھ نہ کر سکا تو اس کا ... بے جان اور مقید جسم کیا کرے گا۔ ویسے میں ادھر دیکھوں ... بھی نہیں، اور سلامت شاہ مرحوم کے کمرے سے اپنا ... سوٹ کیس جڑا کے بھاگ آؤں گا۔ آنے جانے کا راستہ ... ایک ہی ہوگا اور دس منٹ بعد بھی حالات ... ہی ملیں ...

"اگر تو ساتھ والے گھر میں پکڑا گیا تو کس کس ... ملاقات ہو گی؟" محسن نے کہا۔

"پکڑے گا کون؟" میں نے کہا۔ "کوٹھیوں کے مکین ... مالک تو سوتے پڑے ہوں گے۔ نوکر ہوئے تو باورچی خانہ ... میں ہوں گے۔ کسی کتے یا چوکیدار کا احتمال ہے تو فکر مت کر ... میں اپنی آنکھیں اور اپنے کان کھلے رکھوں گا۔"

"اور رابعہ سے کیا کہا جائے گا؟ یہ سوٹ کیس ... دے گیا ہے، وہی حملہ آور؟"

"اب بیچ میں بولا تو جھانپڑ دوں گا۔" میں ... بھنا کر کہا۔ "پہلے پوری بات سن لے۔ ریلوے کا کلرک ... صبح پانچ بجے کھلتا ہے اور چراغ دین کی کوٹھی سے کلرک ... پانچ منٹ کی مسافت پر ہے۔ رابعہ سے کہا جائے گا کہ ... پنڈی جانے سے پہلے فاضل سامان کلرک روم میں رکھ ... دیا تھا تو یہ بالکل منطقی بات ہوگی۔ ہم آج دن میں کسی وقت ...

سوٹ کیس اٹھا لائیں گے۔ فی امان اللہ۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا اور کھڑکی کھول کے باہر اتر گیا۔

باہر رات کا اندھیرا اب بھی صبح کے لشکر کی یلغار روکے ہوئے تھا۔ میں نے گیٹ تک کا فاصلہ کسی آہٹ کے بغیر طے کیا اور چار فٹ کی دیوار پر سے سڑک پر کود گیا۔ دایس کرادن سینما والی سڑک سے علامہ اقبال روڈ کے چوک تک پہنچنے میں مجھے دس منٹ لگے۔ پھر اسٹیشن کی سمت جانے والے ایک رکشا نے اس تھوڑے سے فاصلے کے عوض پانچ روپے کی شرط پر مجھے بٹھا لیا اور مزید دس منٹ بعد میں سی سی ڈین کی کوٹھی سے چند قدم کے فاصلے پر جا اترا۔ سڑک پر ٹریفک کچھ بڑھ گئی تھی مگر زیادہ تر رکشا اور تانگے اسٹیشن کی جانب رواں تھے۔ مجھے یاد آیا کہ یہی وقت تھا جب میں راولپنڈی جانے کے لیے پورے اعتماد کے ساتھ اس گھر سے نکلا تھا۔ جس میں اب مجھے چوروں کی طرح داخل ہونا تھا اور وہ سلامت شاہ جس نے مجھے جگا کر چائے بنا کر دی تھی صرف تین دن قبل فجر کی نماز پڑھ کے فارغ ہوا تھا تو یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس کے لیے کتنی بھیانک موت گھات میں ہے۔ میں نے سڑک سے ہٹ کے فٹ پاتھ کے بعد ہر کوٹھی کے احاطے کے سامنے پھیلے ہوئے گھاس کے تنگ قطعے پر چلنا شروع کیا جس میں جھاڑیاں اور درخت بے ہنگم طریقے پر اگے ہوئے تھے۔ اب میں سڑک سے کافی دور تھا اور دیوار کے سائے میں ہونے کے باعث... نمایاں نہ تھا۔ چراغ دین کے گھر سے پہلے والے گھر کا گیٹ کھلا ہوا تھا۔ اندر کوٹھی میں مکمل سکوت تھا اور اندھیرا تھا۔ پورچ میں کھڑی ہوئی کار بھی سوئی سوئی لگتی تھی۔ میں دبے پاؤں اندر داخل ہوا ہی تھا کہ قریب کی مسجد سے مؤذن کی صدا بلند ہوئی۔ آؤ نیکی کی طرف۔ آؤ نماز کی طرف۔ کوٹھی کے پورچ میں ایک لائٹ جلی اور دروازہ کھول کے تہبند اور کرتے میں ملبوس ایک سفید ریش شخص سر پہ کپڑے کی گول ٹوپی رکھے نمودار ہوا۔ میں تیزی سے واپس ہوا، اور مخالف سمت میں چلنے لگا۔ چراغ دین کی کوٹھی کے بند گیٹ اور احاطے کی دیوار کو عبور کر کے میں نے گھوم کر دیکھا۔ وہ شخص جو نماز کے لیے مسجد جانے کے ارادے سے نکلا تھا دروازے کے باہر کھڑا مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس نے ایک اجنبی کو گیٹ کے اندر آتے اور پلٹ کر جاتے دیکھ لیا ہوگا اور شبے میں پڑ گیا ہوگا کہ آنے والا چور تھا یا غلطی سے اندر آ گیا تھا۔ نماز قضا ہو جانے کے خیال نے اسے میرے

تعاقب یا ہنگامہ آرائی سے باز رکھا اور وہ سڑک عبور کر کے اسٹیشن کی طرف چل پڑا۔ اس وقت تک میں چراغ دین کی کوٹھی سے متصل دوسری کوٹھی کے دروازے تک پہنچ گیا تھا۔ گیٹ کے اوپر سے جھانکنے پر مجھے اپنا منصوبہ چوپٹ ہوتا نظر آیا۔ گیٹ کے اندر بکرے جتنا السیشین کتا بڑے وقار سے ٹہل رہا تھا۔ تقریباً اتنے ہی وقار سے لان پر ایک پہلوان ٹائپ شخص ورزش میں مصروف تھا۔ میں فوراً واپس ہوا اور اب میں نے چراغ دین کے گھر کے پھاٹک کی جھری میں سے اندر جھانک کے دیکھا۔ محبت خان برآمدے میں چارپائی پر ہاتھ کا تکیہ بنائے دیوار کی طرف منہ کیے سو رہا تھا۔ یہ طے کرنا مشکل تھا کہ وہ تھک کر لیٹا ہے یا گہری نیند میں ہے۔ ہمت کر کے میں گیٹ کے ستون پر چڑھا اور کوئی آواز کیے بغیر اندر اتر گیا۔ پھونک پھونک کر ہر قدم رکھتے ہوئے میں نے چند قدم کا وہ فاصلہ طے کیا جو خطرناک علاقہ تھا۔ کوٹھی کی سائڈ میں پہنچ کے میں چوکیدار کی نظر کے راڈار سے محفوظ ہو گیا اور کسی پریشانی کے بغیر سلامت شاہ کے سرونٹ کوارٹر تک جا پہنچا۔ صبح کاذب کا اجالا اٹھنے لگا تھا، اور چند منٹ میں اس رات کی سحر کا آغاز ہونے کو تھا۔ میں نے بلا تذبذب کوارٹر کی دیوار پھاندی اور چند سیکنڈ صحن میں کھڑا رہا۔ میرے سامنے دونوں کمروں کے دروازے کھلے پڑے تھے۔ ایک دروازے میں سے مجھے وہ صندوق بھی صاف نظر آ رہا تھا جس میں آبا و اجداد کی نشانیوں کی جگہ سلامت شاہ کے ٹکڑے بھرے ہوئے تھے۔ گھر میں گونجنے والا آسیب میرے رگ و پے میں کمزوری کی لہر بن کے پھیلنے لگا۔ تاریکی میں سلامت شاہ کا ہیولا سا ابھرا اور دروازے کے فریم میں ٹھہر گیا۔ "سکندر بخت!" اس نے کہا۔ "ڈرتے کیوں ہو؟ اس گھر کے دروازے اسی لیے تو کھلے چھوڑے تھے میں نے۔ مجھے معلوم تھا کہ تم آؤ گے۔ ان دونوں کمروں میں سے کسی میں داخل ہونے کے لیے تمہیں کسی کی اجازت مطلوب نہیں۔ ایک میں تمہارا باپ رہتا تھا، دوسرے میں اس کا دوست، رازدار اور تمہارا چچا۔ اب یہ دونوں کمرے خالی ہیں۔ ایک کا مکین لحد میں اتار دیا گیا ہے۔ دوسرا اس کے انتظار میں ہے۔ تم اپنی امانت سمیٹو اور جاؤ۔ دیر مت کرو۔ تمہیں ہمارا نہیں اپنی زندگی کے وقت کا ساتھ دینا ہے۔" میں چونکا اور آگے بڑھا۔ سلامت شاہ کے کمرے کی دیوار کے ساتھ میرے دونوں سوٹ کیس کھڑے تھے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے ان دونوں کو اٹھایا۔ کمرے کی

ویرانی میں اس کی تاریک دیواریں مجھ پر جھک آئیں اَن گنت غیر مرئی آنکھیں ہر سمت سے مجھے گھورنے لگیں اور باہر اچانک پرندوں نے ہر درخت کی شاخ سے چلانا شروع کیا۔ چور... چور۔ چور، قاتل... پکڑو۔ پکڑو۔ میں سوٹ کیس لے کر بھاگا اور یکے بعد دیگرے دونوں سوٹ کیس دیوار پر رکھے۔ مجھے یوں لگا جیسے حیرمین پیچھے کوئی میرے تعاقب میں تھا اور مجھے گردن سے دبوچنے ہی والا تھا میں نے ایک بار پلٹ کر دیکھا اور دیوار پر چڑھ گیا۔ دوسرے لمحے میں اس مُردہ خانے کی حدود سے باہر تھا۔ سوٹ کیس اٹھا کے میں نے کوٹھی کی طرف دیکھا ایک باتھ روم کے روشن دان میں لائٹ نظر آ رہی تھی جس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ چراغ دین جاگ گیا ہے اور یہ بھی کہ چوکیدار باتھ روم میں گیا ہو۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ آگے بڑھا۔ چوکیدار چارپائی پر سیدھا بیٹھا چلم والا پشاوری حقہ سلگا رہا تھا اور اس کی نگاہ گیٹ کی طرف تھی۔

پوری احتیاط کے ساتھ میں واپس ہوا۔ سوٹ کیس سرونٹ کوارٹرز کی دیوار کے ساتھ رکھ کر میں نے ساتھ والی پہلی کوٹھی کی دیوار پر سے جھانکا جس میں سے نکل کے ایک شخص نماز پڑھنے گیا تھا۔ وہ مجھے دس منٹ پہلے ملا تھا۔ دس منٹ میں اس کا مسجد تک جانا وضو کرنا، نماز پڑھنا اور واپس آنا۔ نہیں... میں نے حساب لگایا۔ وہ بیس منٹ سے پہلے واپس نہیں آ سکتا تھا۔ باقی کوٹھی پر آغازِ صبح کا سکوت طاری تھا اور درختوں میں چہچہانے والے پرندوں کے سوا کوئی آواز کہیں سے سنائی نہ دیتی تھی۔ بظاہر اس ایک پابندِ صوم و صلوٰۃ شخص کے سوا دوسرے گھر والے ہنوز خوابِ غفلت میں تھے۔ میں نے دونوں سوٹ کیس دیوار پر رکھے اور دوسری طرف کود گیا۔ پھر خشک پتّوں اور سوکھی ٹہنیوں پر سے سوٹ کیس لے کر گزرا اور ایک جھاڑی کے پیچھے چلنے لگا جو قد آدم انتہائی گھنی اور ہموار تراشی ہوئی تھی۔ گیٹ تک میں سرسبز دیوار کے پیچھے چل سکتا تھا ابھی میں گیٹ سے چند قدم دور تھا کہ میں نے اسی ٹوپی والے سفید ریش شخص کو سڑک عبور کر کے دروازے کی طرف بڑھتے دیکھا۔ میں سانس روک کر منجمد ہو گیا۔ وہ سیدھا میری طرف آیا اور ایک لمحے کے لیے مجھے شبہ ہوا کہ شاخوں اور پتوں کی گھنی چادر کے پیچھے بھی اس نے مجھے دیکھ لیا ہے لیکن بالکل قریب آ کے وہ مڑ گیا۔ اس نے تازہ کھلے ہوئے گلاب کا ایک پھول توڑا اور اسے سونگھتا ہوا ٹہلتا ہوا اندر چلا گیا۔ چند سیکنڈ بعد میں جھاڑی کے پیچھے سے نکلا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا سڑک پر آ گیا۔ آخری وقت تک مجھے دھڑکا لگا رہا کہ کہیں پیچھے سے کوئی چلانے نہ لگے یا چراغ دین کا چوکیدار گیٹ کھول کر باہر نہ آ جائے۔

پچاس قدم دور آ جانے کے بعد میں نے خود کو محفوظ تصور کیا۔ اب میں ایک مسافر نظر آتا تھا جو فاصلہ کم ہونے کے باعث کوٹھی سے نکلا تھا اور اسٹیشن کی جانب پیدل روانہ ہو گیا تھا۔ ایک بار پھر مجھے تین دن پہلے کی وہ صبح یاد آئی جب میں ایسے ہی صرف اپنا بریف کیس لیے آن پہنچا تھا اور آفات و حادثات کے ایک ایسے جال میں گرفتار ہو گیا تھا جو بڑے شاطر، مکر و فریب کے ہتھکنڈوں سے آشنا اور اپنی طاقت کے زعم میں مبتلا شکاری نے بچھایا تھا۔ یہ سامنے آ کر مقابلہ کرنے والا نہیں، چھپ کر وار کرنے والا کینہ پرور شکاری تھا جسے ہر ناکامی نے جھنجھلاہٹ کے اشتعال میں زیادہ خطرناک بنا دیا تھا مگر شکاری خوفزدہ بھی تھا کہ کہیں ذرا سی بھول چوک کے نتیجے میں وہ خود شکار نہ ہو جائے۔

کلاک روم تک دس منٹ میں پیدل پہنچ جانے کے بعد، میں سامان کو محسن رضا کے نام سے جمع کرا کے اور رابعہ کا پتہ لکھوا کے باہر نکلا تو افق پر سورج کے اجالے کا ہر اول دستہ شفق کے سنہرے اُودے قرمزی بادلوں کے رنگ میں اتر رہا تھا۔ میں نے رسید سنبھال کے جیب میں رکھی اور پھر پانچ کے نوٹ کی ضمانت پر ایک رکشا والے کو گڑھی شاہو تک چلنے پر رضامند کیا۔ عین رابعہ کی کوٹھی کے دروازے پر اترنے کی بجائے میں نے کراؤن سینما سے ذرا آگے رکشا رکوا لیا اور باقی فاصلہ پیدل طے کرتے ہوئے احتیاطاً سگریٹ کا ایک پیکٹ خرید لیا۔

جب میں نے رابعہ کے گھر کی دیوار پھاندی تو سورج طلوع ہو چکا تھا۔ رابعہ کو لان میں ٹہلتے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔ اس نے نظر اٹھا کے مجھے حیرانی سے دیکھا اور دوسرے لمحے میں نے خود کو سنبھال لیا۔ میں نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور سنہرے ہلکے جیسی سیل کے کنارے کو کھینچ کر بیرونی شفاف پلاسٹک کی جھلی کو الگ کیا۔ رابعہ نے وہی رات والے کپڑے پہن رکھے تھے اور قریب پہنچ کے میں نے دیکھا کہ اس کے چپل لان کے کنارے ساتھ ساتھ یوں رکھے تھے جیسے سبز گھاس پر سفید کبوتروں کا جوڑا بیٹھا ہو۔ اس کے گلابی پاؤں شبنم کی نمی سے بھیگے ہوتے تھے۔

"میں ذرا سگریٹ پینے چلا گیا تھا" میں نے معذرت اور وضاحت کے طور پر کہا۔

"میں تو سمجھی تھی تم سو رہے ہو" وہ بولی۔ "آنے جانے کے لیے لان میں گیٹ کا استعمال آؤٹ آف فیشن ہو گیا ہے کیا؟"

"وہ... دراصل..." میں نے کہا۔ "میرا خیال تھا رات کو سب کی نیند خراب ہوئی، اب صبح صبح پھر کال بیل بجا کے سب کو جگا دینا مناسب نہیں۔"

اخلاقاً وہ خاموش ہو گئی۔ یہ میرے دل کا چور تھا یا اس کی خاموشی سے واقعی یہ تاثر ملتا تھا کہ جو کچھ میں نے کہا ہے وہ قابلِ یقین تو نہیں مگر وہ بے یقینی کے اظہار کو ادب آداب، مصلحت یا ضرورت کے تقاضوں کے خلاف سمجھتی ہے۔ "تم ہر روز اسی وقت اٹھتی ہو؟" میں نے اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

"نہیں" وہ بولی۔ "عموماً سات بجے سے پہلے آنکھ نہیں کھلتی۔ بس، نیند نہیں آئی بعد میں۔"

"کیوں، کیا سوچتی رہیں؟" میں نے کہا۔ "اور کس کے بارے میں؟"

وہ میرے لہجے کی شوخی سے متاثر نہیں ہوئی اور اسی متانت کے ساتھ ٹہلتی رہی۔ "سکندر! ایک بات کہوں، برا تو نہیں مانو گے؟"

"دنیا میں ایسے لوگوں کی تعداد نصف درجن بھی نہیں جن کی کسی بات کا میں برا مان ہی نہیں سکتا" میں نے جواب دیا۔ "ان میں ایک تم ہو۔"

"میرا خیال ہے سکندر تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو" وہ رک کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "حقیقت وہ نہیں جو تم نے بیان کی تھی۔"

"اس شک کی وجہ؟" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا، اور شبنم سے مہکتی گھاس پر بیٹھ گیا۔ وہ اسی طرح ٹہلتی رہی۔

"وجہ، وجہ بظاہر تو کوئی نہیں" وہ بولی۔ "احساس بعض اوقات بے سبب بھی ہوتا ہے۔ بس مجھے یوں لگتا ہے جیسے تمہارے لہجے میں قائل کر دینے والی صداقت نہیں ہے۔ پرانے لوگ مثلاً میرے ابا کھرے کھوٹے چاندی کے سکے کو اچھال کے آواز سے پہچان جاتے تھے۔ تمہاری آواز میں کھرے پن کی وہ کھنک نہیں ہے۔ یا شاید میرے کان فریبِ سماعت کا شکار ہیں مگر میں نے تم سے جیل میں ملاقات کے دوران ایسا محسوس نہیں کیا تھا۔"

"قصور تمہارے کانوں کا نہیں ہے" میں نے چند سیکنڈ کے بعد ایک طویل کش کا دھواں خارج کرتے ہوئے کہا۔ "میں تمہاری جھوٹ سچ کو پرکھنے کی اس صلاحیت کا اعتراف نہ کر دوں تو یہ ایک اور جھوٹ ہو گا۔ اس صلاحیت کی بدولت تو تم کو فوراً معلوم ہو جاتا ہو گا کہ اپنی بے گناہی کا مقدمہ تمہارے پاس لے کر آنے والا کوئی موکل جھوٹا ہے یا سچا۔"

وہ ہنسی۔ "ایسی بات بھی نہیں ہے۔ دنیا میں ایک سے ایک ایکٹر پڑا ہے۔"

میں نے اس کی بات میں چھپے ہوئے لطیف سے طنز کو محسوس کر لیا۔ "وسیع تر فلسفیانہ نقطۂ نظر شیکسپیئر کا تھا جس نے کہا تھا کہ دنیا اسٹیج ہے اور ہم سب ایکٹرز ہیں، لیکن جھوٹ بولنے والے اور ایک ایکٹر میں فرق ہے۔ ایکٹر یہ اصرار تو نہیں کرتا کہ اس کے ڈائیلاگ کو سچ سمجھ کے قبول کرو میں ایکٹر نہیں ہوں۔ جھوٹ میں نے عمداً بولا تھا۔ اس وقت ذہنی طور پر میں یہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھا کہ مجھے جھوٹ بولنے سے فائدہ ہو گا یا نقصان اور میں اس جھوٹ کو نبھا بھی سکوں گا یا نہیں، جو بات میں نے سوچے سمجھے بغیر کی غلط تھی۔ اس وقت میرا خیال تھا کہ یہ بے ضرر سا جھوٹ بولنے سے معاملہ ختم ہو جائے گا۔ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ میں تمہیں قائل نہ کر سکا۔ خود مجھے بعد میں احساس ہوا کہ تمہارے اعتماد کے جواب میں یہ عدم اعتماد کا مظاہرہ بہت نامناسب ہے۔ اس کا ذکر میں نے محسن سے بھی کیا تھا اور اس نے مجھے شرمندہ کیا چنانچہ میں نے محسن سے وعدہ کر لیا تھا کہ صبح ناشتے کی میز پر یا بعد میں موقع پاتے ہی تمہیں اصل حالات بتا دوں گا۔"

"ڈاکٹر اور وکیل کو حقیقت نہ بتائی جائے تو کیس بگڑ جاتا ہے۔ یہ بات تو سنی ہو گی تم نے" وہ بولی۔

"ہاں۔ اور اسی لیے میں یہ سب کچھ بتا رہا ہوں" میں نے کہا۔

پھر میں نے طے شدہ پروگرام کے مطابق جھوٹ میں پچاس فیصد تخفیف کی اور وہ کہانی سنائی جو سچ اور جھوٹ کے تانے بانے سے تیار کی گئی تھی۔ یہ کہانی سناتے ہوئے میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا تھا کہ میں ایک جھوٹ پر دوسرے سوچے سمجھے بہت بہتر قسم کے جھوٹ کا پردہ ڈال رہا ہوں، اور مجھے اعتماد سے بے وقوف بناتے ہوئے شرم بھی آئی لیکن میں نے مصلحت کے تقاضے کو پیش نظر رکھا اور خود کو اس دلیل سے مطمئن کیا کہ ناگزیر حالات میں انتہائی مجبوری کے تحت ناجائز کو جائز اور حرام کو حلال سمجھنے میں کوئی گناہ

نہیں ہوتا۔ رابعہ انتہائی ذہین عورت تھی اور اس کی زندگی کے شب و روز سچی کہانیوں میں جھوٹ اور جھوٹے واقعات میں سچ کے عنصر کی تلاش کا عملی تجربہ کرتے گزرے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ کتنے ہی ایک جو اپنی مظلومیت اور معصومیت کو صورت سے اور لہجے سے ثابت کرتے ہیں۔ در اصل کتنے سفاک اور بے ضمیر مجرم ہوتے ہیں اور کتنے گواہ جو عملاً کتابِ مقدس کو ہاتھ میں لے کر بڑے خشوع و خضوع سے حلف اٹھاتے ہیں کتنے جھوٹے ہوتے ہیں اور کتنے بے گناہ ہوتے ہیں جو ایسی ہی شہادتوں کے باعث ہر نگاہ میں مجرم ٹھہرتے ہیں میں نے اداکاری کا بہترین مظاہرہ کیا اور اپنی آواز میں کھرے پن کی کھنک بھی پیدا کی۔ اس نے پوری توجہ اور یقین کے ساتھ میری بات سنی۔ تاہم میرے یقین میں آئینے کی طرح بال تھا اور جب بھی میں رابعہ کی آنکھوں سے خود کو دیکھتا تھا تو رابعہ کے الفاظ کی بازگشت سنائی دینے لگتی تھی "دنیا میں ایک سے ایک ایکٹر پڑا ہے۔" میں نے دل ہی دل میں عہد کیا کہ جیسے ہی گردشِ ایام نے مہلت دی میں رابعہ سے صدقِ دل اور خلوصِ نیت کے ساتھ معافی مانگ لوں گا کہ یہ عدم اعتماد کا مظاہرہ نہیں مجبوری کی بات تھی اور میں کمینہ، کم ظرف یا احسان فراموش نہیں ہوں۔ رابعہ عام عورت نہیں۔ وہ مجبوری کی ہر ضرورت کے تقاضے کو سمجھنے کی اہل ہے۔ جب میں نے اپنی بات ختم کی تو وہ مجھ سے کچھ دور بیٹھی گھاس کا تنکا چباتے ہوئے کچھ سوچ رہی تھی۔

"تمہارے خیال میں سلامت شاہ کے نہ آنے کا کیا سبب ہو سکتا ہے؟" اس نے بالآخر کہا۔

"حقیقت جسے تسلیم کرتے ہوئے میرا دل ڈرتا ہے۔" میں نے کہا۔ "سلامت شاہ کی پُراسرار گمشدگی بے سبب نہیں، ہو سکتا ہے مجھ سے تھانے میں ملاقات کے بعد رات کو وہ گھر پہنچا تو یہی لوگ اس کے انتظار میں ہوں جو آج ہمیں منتظر ملے تھے۔ وہ کسی بہانے سے یا زبردستی سلامت شاہ کو اپنے ساتھ لے گئے اور اس سے پوچھ لیا۔ بوڑھے آدمی کی قوتِ برداشت زیادہ نہیں ہوتی۔ شاید انہوں نے سلامت شاہ سے ایک پیغام لکھوایا اور اپنے نامہ بر کے ہاتھ ارسال کر دیا۔ گمانِ غالب یہ ہے کہ بعد میں سلامت شاہ اور وہ نامہ بر دونوں ختم کر دیے گئے۔ اس لیے کہ ان کا بے مصرف وجود باقی رکھ کے خطرہ مول لینے میں کوئی فائدہ نہ تھا۔ یہ امکان مجھے بہت کم نظر آتا ہے کہ سلامت شاہ زندہ ہو اور کہیں محبوس ہو۔ وہ آج تک بتائے بغیر یوں غائب نہیں ہوا۔"

"یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟" رابعہ نے اچانک کہا۔

"میں نے چراغ دین سے فون پر بات کی تھی۔" میں نے کہا اور اپنا لہجہ بالکل نارمل رکھا۔ اگر میں ذرا بھی چوکتا تو نادانستگی میں لبوں سے نکل جانے والے غلط الفاظ میرے جھوٹ کی قلعی کھول دیتے۔ "کل شام کو اور پھر آج صبح اگر تو ہمیں دوپہر کے بعد ملا تھا۔"

اس نے سر ہلایا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ "سلامت شاہ ہمارا سب سے اہم گواہ ہے۔ اس کے بیان کے بغیر استغاثہ کے خلاف ہمارا موقف بے بنیاد ہو جاتا ہے۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ کسی مصلحت کے پیشِ نظر غائب ہو گیا ہو؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں خوش فہمیوں سے امید کا دامن باندھنے کو دور اندیشی نہیں سمجھتا۔ وہ ایک معمولی ملازم ہے، کوئی سیاست داں نہیں۔" ہم دونوں ساتھ ساتھ گھر کی طرف چلنے لگے۔

"اگر... اگر فی الحقیقت ویسا ہی ہوا۔" اس نے تھوڑی دیر سے تذبذب کے ساتھ کہا۔ "جیسا تم نے سوچا ہے... تو یہ اچھا نہیں ہوگا۔ میں آج حقِ وراثت کے سرٹیفکیٹ کے اجرا کا کیس تیار کر لوں گی اور کل یہ کیس فائل کر دیا جائے گا۔ منظر صاحب بھی آج کل میں ایس ڈی ایم کے سامنے قبر کھدا کے لاش کا پوسٹ مارٹم کرنے کی درخواست لگا دیں گے مگر یہ سب کیس ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔"

"کیوں؟" میں نے کہا۔ "کیا لاکر سے کوئی ایسی دستاویز برآمد نہیں ہو سکتی جس سے میرے والد کے اور میرے خلاف سازش کا اور سازش کرنے والوں کا پتہ چل جائے۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے قتل ثابت ہو گیا تو یہ زبردست واقعاتی شہادت ہو گی۔"

وہ کوئی تبصرہ کیے بغیر گھر میں داخل ہو گئی۔ "امی جاگ گئی ہوں گی۔ ناشتہ تو آٹھ بجے کے قریب ہوگا۔ کہو تو تمہارے لیے بھی چائے بھجوا دوں۔ یا کافی۔" وہ مہمانوں کے بیڈ روم کے دروازے پر رک کے بولی۔ میں نے کہا کہ چائے کافی ہو گی اور اسے متوازن قدم اٹھاتے، اطمینان اور اعتماد کے ساتھ راہداری سے گزر کے مڑتے اور زینے پر جاتے دیکھتا رہا۔ یہ بات بڑی عجیب لگتی تھی کہ گھر میں عام عورت کی طرح رہنے والی مگر ادائے حسن اور عالمِ شباب میں عام عورت سے کہیں زیادہ پُرکشش نظر آنے والی یہ حسین و جمیل لڑکی ابھی سفید شلوار قمیض پر سیاہ کوٹ پہن کے اور بریف کیس میں فائلیں لے کر عدالت میں حاضر ہو گی تو چوری ڈاکے قتل، اغوا اور آبرو ریزی کے مقدمات پر مدلل بحث کرے گی۔ ملک کی اعلیٰ عدالتوں کے فیصلوں کے اقتباسات پیش کرے گی اور دنیا بھر کی اعلیٰ ترین عدالتوں کے مقدمات کو نظیر بنا کے لائے گی۔ وکیلِ استغاثہ کی ہر دلیل پر اعتراض اٹھائے گی اور اپنے موکل کے خلاف پیش ہونے والے ہر گواہ کے جھوٹ کا اپنی جرح سے پورا پوسٹ مارٹم کر کے رکھ دے گی۔ شاعروں اور افسانہ نگاروں کی تصوراتی عورت سے اور فلموں کی تخیلاتی ہمہ صفت محبوبہ سے یہ عورت کتنی مختلف ہے جو زندگی کی عملی جد و جہد میں شریک ہے مگر کیا اس سے رابعہ کی نسوانیت کی دلآویزی اور حسن کی ساحری اور فطرت کی خوبصورتی کا طلسم مجروح ہوا؟ نہیں، اگر کسی کو علم نہ ہو کہ وہ اتنی سینئر ایڈووکیٹ ہے تو وہ اس کے عشق میں اتنا ہی رسوا و خراب ہو سکتا ہے جتنا کہ لیلیٰ کے لیے مجنوں ہوا۔ میں نے اس کمالِ بے مثال اور جمالِ باکمال کے اعتراف کے طور پر سر ہلایا اور کمرے میں داخل ہو گیا۔ محسن یوگا کے آسن میں آلتی پالتی مارے بستر پر سیدھا بیٹھا تھا اور یوں لگتا تھا کہ جو دھواں اس کے نتھنوں سے خارج ہو رہا ہے سگریٹ کا نہیں اس کے دل سے اٹھ رہا ہے۔

"یہ منہ کیوں سوجا ہوا ہے؟ معلوم ہوتا ہے تو چھپ کر دیکھ رہا تھا؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ یہ صبح صبح باغ میں کیا شوٹنگ ہو رہی تھی؟" اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ "کیا نظر نواز فلمی سیٹ تھا۔ عالمِ خلوت ہے، سبز شبنمی گھاس ہے، شفق کا سنہرا اجالا ہے۔ رنگِ پیراہن ہے اور عارض کے گلاب ہیں۔ میں تنگ آ گیا ہوں ایسے رنگین فلمی مناظر کو دیکھ دیکھ کر۔ ایک گھنٹے سے برداشت کر رہا تھا میں۔"

"یہ مس رابعہ قادری ایڈووکیٹ اور ملزم سکندر بخت کی سو فیصد قانونی اور جائز ملاقات تھی۔" میں نے کہا۔ "جو بدقسمتی سے جیل کی بجائے صحنِ چمن کے روح پرور ماحول میں ہو گئی۔ قصور رابعہ کا ہے کہ جب میں اندر کودا تو وہ لان پر ٹہل رہی تھی۔"

"اور اس نے تجھے پکڑ لیا، رنگے ہاتھوں، پوچھا تو ہو گا کہ یہ کیا غیر شریفانہ آمد و رفت ہے؟" محسن اچانک نارمل ہو گیا۔

"ہاں۔" میں نے کہا اور اسے ساری بات بتا دی۔ اس دوران "ماسی" نمودار ہوئی اور چائے کی ٹرے بیچ میں پٹخ کے پھر زیرِ لب کچھ کہتی ہوئی چلی گئی۔ محسن کا خیال تھا کہ وہ کوئی وظیفہ پڑھتی ہے۔ میں نے کہا کہ وظیفہ نہیں ہم پر سفلی عمل کرتی ہے۔ اسے ہماری صورت اچھی نہیں لگی۔"

"سوٹ کیس تو اب میں لے آؤں گا۔" محسن نے چائے پیتے ہوئے فرمایا۔ "لیکن برادرِ نسبتی! اس خط کا حصول مسئلہ ہو گا۔"

"سالارِ جنگ!" میں نے کہا۔ "یہ خیال مجھے بار بار آ رہا تھا کہ ابھی تک ہم نے رابعہ کو اس خط کے بارے میں کچھ نہیں بتایا حالانکہ وہ خط ہمارے لیے بے حد اہم ہے۔ اگر ہم اس کے حصول میں کامیاب رہے تو رابعہ سے کیا کہیں گے کہ خط کہاں سے آیا اور کیسے آیا؟ فوما یجو اگر دشمن کا نامہ بر بنا تھا تو ہمارا مددگار کیوں ہوا؟"

"پیسہ۔" میں نے کہا۔ "اس کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ فوما یجو غریب مگر باضمیر آدمی تھا۔ کچھ لوگوں نے پیسے کا لالچ دے کر اسے اپنے مقاصد کے حصول کی خاطر استعمال کیا مگر اس نے ضمیر کی آواز پر لبیک کہنے کی مہلک غلطی کی۔ خط ہمیں ہوٹل میں ملا۔ تو یہ بھول رہا ہے کہ ایمبیسیڈر ہوٹل میں ابھی تک ہمارا کمرہ بک ہے۔"

"مگر مقفل پڑا ہے۔" میں نے کہا۔ "اور کسی اسٹیج پر ہم یہ ثابت نہیں کر سکتے کہ گزشتہ شب ہم ہر جائے واردات سے دور اپنے ہوٹل کے کمرے میں مقیم تھے۔ ہمیں آج قیام کا مستقل بندوبست بھی کرنا ہے۔ ہم یہاں زیادہ نہیں ٹھہر سکتے۔"

"رابعہ کی ماں نے ہمارا استقبال بڑی شفقت اور محبت سے کیا تھا۔" محسن بولا۔

"جب کسی ماں کی بیٹی رابعہ کی عمر کی ہو جائے اور اس کا گھر آباد نہ ہو تو ہم جیسے ہر مہمان کی ایسے ہی پذیرائی ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔

"تیری تو ایڈوانس بکنگ ہو چکی ہے۔" محسن بولا۔ "مگر میں کہہ سکتا ہوں کہ میرے دل کے مکان پر "ٹو لیٹ" کا بورڈ آویزاں ہے۔"

"TO LET" کے بورڈ پر بیچ میں آئی لگا دے۔" میں نے کہا۔ "پھر شاید کوئی آجائے، ویسے تو مشکل ہے۔"

ناشتے کی میز پر رابعہ کی ماں سے پھر ملاقات ہوئی اور اس نے تفصیل سے ہمارا حسب نسب پوچھا۔ مختصراً وہ بھی سنی جو ہم پر بیت چکی تھی اور گزشتہ شب کی واردات کا احوال بھی دریافت کیا۔ پھر گفتگو الگ الگ ہونے لگی۔ رابعہ نے مجھے بتایا کہ منظر صاحب کو کیس فائل کرنے کے لیے تین افراد کے حلف نامے درکار ہوں گے جو تدفین میں شریک رہے ہوں اور قبر کی نشاندہی کر سکیں اور یہ کام ایس ڈی ایم

نہیں۔"

شی موجودگی میں ہوگا۔ میڈیکل بورڈ جس میں پولیس سرجن کے علاوہ بھی دو ڈاکٹر ہوں گے عدالت نامزد کرے گی اور وہ وہیں قبرستان میں پوسٹ مارٹم کریں گے جس کی رپورٹ بعد میں براہ راست عدالت کو دی جائے گی۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ فنگر پرنٹ کی رپورٹ عموماً چوبیس گھنٹے کے اندر اندر تیار کر لی جاتی ہے مگر اس کے بعد کاغذی کارروائی کا سلسلہ لامتناعی بھی ہو سکتا ہے تاہم کوشش سے کیا نہیں ہوتا۔ رپورٹ، سماعت کی اگلی تاریخ پر چالان کے ساتھ بھی پیش کی جا سکتی ہے بشرطیکہ چالان چودہ دن میں مکمل ہو جائے جس کا امکان بہت کم ہے۔ اگر ایک مہینے کے بعد چالان پیش کرانا مقصود ہو تو اس کے لیے خصوصی وسائل کو بروئے کار لانا پڑتا ہے۔ محسن اس عرصے میں رابعہ کی ماں سے باتیں کرتا رہا تھا۔ جب ہم متوجہ ہوئے تو وہ میری اور فوزیہ کی نسبت کا ذکر بڑی معصومیت سے کر رہا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ اس بات کا مقصد شوشہ چھوڑنے کے سوا کچھ نہیں لیکن اس کا ردِعمل دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ سب سے پہلے تو میں نے رابعہ کی صورت کے تغیر کو محسوس کیا۔ اس کا نکھرا ہوا گلابی رنگ صرف ایک لمحے کے لیے بے رنگ ہوا۔ یوں جیسے برقی رو کے دباؤ میں کمی سے بلب کی روشنی کم ہو اور بڑھ جائے۔ اس نے فوراً خود کو سنبھال لیا اور مسکرائی۔

"کمال ہے امی!" وہ بولی۔ "ابھی تک ان دونوں میں سے کسی نے اعتراف نہیں کیا تھا کہ دوستی کے علاوہ بھی ان کا کوئی رشتہ ہے۔"

"یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی۔" میں نے جھینپ کر کہا۔ "اور اس کا موقعہ بھی کہاں ملا۔"

رابعہ اپنی ذہنی و جذباتی کیفیت کو چھپانے پر پوری طرح قادر تھی اور اب اس کی صورت یا اس کے رویے سے کسی تاثر کا اظہار نہیں ہو رہا تھا مگر میں اس ایک ثانیے کے تغیر پر غور کر رہا تھا اور دبانے کی پوری کوشش کے باوجود ایک سوال میرے ذہن میں سر ابھار رہا تھا۔ کیا یہ مایوسی کا ردِعمل تھا اور رابعہ کو اس اطلاع سے صدمہ ہوا تھا؟ اس ایک سوال کے کشکول میں بہت سے سوال تھے جو سنپولیوں کی طرح کلبلا رہے تھے اور دیکھتے دیکھتے بڑھ رہے تھے۔ یہ مایوسی کیوں؟ یہ صدمہ کیسا؟ کیا اس نے مجھ سے توقعات وابستہ کر لی تھیں؟ نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں فقط ایک ملزم زیرِ سماعت ہوں۔ اس کا ایک موکل۔ ماہ و سال کے پرانے رشتوں کے درمیان وقت کی خلیج حائل ہے۔ تمہارا مجھ سے کوئی ذاتی تعلق کبھی نہ تھا؟ رابعہ نے کہا تھا، یا تھا تو یکطرفہ؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ یکطرفہ تعلق ختم نہ ہو۔ لوگ کہتے ہیں آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔ کیا تجدیدِ تعلق کے لیے کوئی ان نامساعد حالات سے بھی تائید اور جواز حاصل کر سکتا ہے؟ رابعہ نے کورٹ جانے کے لیے تیاری کرنے کا عذر پیش کیا اور اٹھ گئی۔ رابعہ کی ماں کی دلچسپی کا محور محسن کی ذات ہو گئی تو میں اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا اور اس نئی صورتِ حال پر غور کرنے لگا جو محسن کی شرارت سے یک لخت سامنے آ گئی تھی۔ لیل پر کوئی شریر بچہ اچانک پردہ کھینچ کر چوری چھپے کسی ولی یا اجنبی کو دیکھنے والی لڑکی کو بے نقاب کر دے۔ مجھے جیل میں رابعہ سے اپنی ملاقات یاد آئی۔ اس نے کہا تھا کہ تم سو فیصد ٹھیک بھی کہتے ہو اور غلط بھی۔ اس بات کا کیا مطلب تھا؟ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ لمبی بات ہے پھر کبھی بتاؤں گی۔ قیاس آرائی کی مدد سے اس لمبی بات کا اندازہ کرنا محال تھا۔ میں نے محسن کی اس حرکت کو دوسرے زاویے سے دیکھنا شروع کیا۔ کہیں محسن سچ مچ رابعہ میں دلچسپی تو نہیں لینے لگا ہے؟ صبح اس نے مجھے اور رابعہ کو ایک گھنٹے تک باتیں کرتے دیکھا تھا تو کوفت میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اس کی جھنجھلاہٹ کسی ردِعمل کی غماز تھی؟ کیا اسے اپنی بہن کے منگیتر اور محبوب کا کسی دوسری حسین و پرکشش عورت سے ایسے ماحول میں باتیں کرنا ناگوار گزرا تھا۔ اسے فوزیہ کا خیال تھا یا خود اپنا؟ لاحول ولا قوۃ۔ میں نے ذہن کے فاسد خیالات پر لعنت بھیجی۔ یہ کیا فلمی مثلث بن رہی ہے۔ خدانخواستہ یہ اندیشے غلط نہ ہوں تو کتنی افسوس ناک صورتِ حال پیدا ہو گی۔ محسن کو احساس ہو گا کہ رابعہ میری وجہ سے اس کو نہیں چاہتی۔ رابعہ کو احساس ہو گا کہ فوزیہ کی وجہ سے میں اس کی چاہت کا جواب چاہت سے نہیں دے سکتا۔ فوزیہ کو احساس ہو گا کہ اس کے علاوہ بھی کوئی عورت ہے جو برسوں سے مجھے چاہتی ہے۔ رقابتوں کے احساس سے نیتوں کے خلوص میں رخنے پڑ سکتے ہیں۔ بدگمانیوں کے الاؤ بھڑک سکتے ہیں اور نفرتوں کی بادِ سموم انہیں ہوا دے سکتی ہے۔ نہیں۔ میں نے اپنے آپ سے کہا۔ یہ صرف میرے غیر متوازن ذہن کے بے سرو پا خیالات کی بے عناں پرواز ہے اور میری غیر حقیقت پسندانہ سوچ ہے جس کا سبب میری پریشانی ہے۔

اور کچھ دیر بعد جب محسن نے کمرے میں داخل ہوتے ہنستے ہنستے کہا۔ "او بھیا سکندر بخت۔ بھاگ لے یہاں سے ورنہ قسمت کا ہوا میرا جھٹکا۔ وہ بڑھیا تو مجھ پر ایسی فریفتہ ہوئی ہے کہ بس چلے تو اپنا نکاح پڑھوا لے مجھ سے۔" تو میرے تمام اوٹ پٹانگ خیالات جھاگ کی طرح ختم ہو گئے اور میں یہ سوچ کر شرمندہ ہوا کہ ابھی کچھ دیر پہلے میں کیا سوچ رہا تھا۔

"شرم کرو محسن۔" میں نے کہا۔ "وہ تیری اماں سے بھی بڑی ہے۔ اور رابعہ بھی تیری مریم باجی کے برابر تو ہو گی۔" معلوم نہیں یہ آخری بات میں نے کیوں کہی۔ محسن سے مریم صرف دو سال بڑی تھی لیکن رابعہ کے بارے میں کہنا مشکل تھا کہ وہ محسن سے دو سال بڑی ہے یا دو سال چھوٹی۔

رابعہ روانہ ہونے سے پہلے خدا حافظ کہنے آئی تو اس نے پوچھا کہ آج ہمارا پروگرام کیا ہے۔

"سب سے پہلے تو مجھے لاک روم سے اپنا سوٹ کیس لینا ہے۔ محسن کا سوٹ کیس بھی وہیں جمع ہے۔" میں نے کہا۔ "اس کے بعد میرا ارادہ ہے کہ چراغ دین سے شرفِ ملاقات حاصل کروں۔"

"وہ کس لیے؟" رابعہ نے حیرانی سے کہا۔ "کوئی نئی مصیبت کھڑی کرنی ہے؟"

"نہیں بھئی۔" میں نے کہا۔ "اس سے پوچھنا ہے کہ والد مرحوم کے جنازے میں کون لوگ شریک تھے؟ سلامت شاہ بتا سکتا تھا اور ایک گواہ بھی بن سکتا تھا مگر وہ لاپتہ ہے۔ مجھے ایک بار وہی میانی صاحب کے قبرستان لے گیا تھا اور وہ بھی شام کے وقت جب اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ شاید میں خود دوبارہ وہاں نہ پہنچ سکوں۔ قانوناً بھی میری نشاندہی کی کوئی حیثیت نہیں۔"

"اس کے علاوہ ہمیں اپنی مستقل رہائش کے لیے بھی جگہ تلاش کرنی ہے۔" محسن نے کہا۔

"کیوں؟" وہ بولی۔ "یہاں کوئی تکلیف ہے تمہیں؟ گھر میں جگہ ہے۔ اور امی کو بھی کوئی اعتراض نہیں۔"

"وہ سب ٹھیک ہے۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "لیکن ہمارا یہاں رہنا ناممکن ہے۔ یہ عقل کے اور مصلحت کے تقاضوں کے سخت خلاف ہو گا اور اخلاقاً بھی یہ غلط سی بات ہے۔ جتنی مدد تم نے کی اور آئندہ کرو گی وہی بہت ہے۔ ہم اس سے زیادہ تمہارے لیے باعثِ زحمت نہیں بن سکتے۔"

"تم رسمی باتوں کے ایکسپرٹ ہو۔" رابعہ نے مسکرا کے کہا۔ "مجھے یہ باتیں بالکل بناوٹی لگتی ہیں۔"

"دیکھو رابعہ۔" میں نے لاجواب ہو کے کہا۔ "ہمارا تعلق کاروباری ہے تو اچھا ہے۔ ہم سب کا مفاد اسی میں ہے۔"

"شاید تم ہی ٹھیک کہتے ہو۔" وہ میری طرف دیکھے بغیر بولی۔ "اس کاروباری دنیا میں مفاد پرستی کے سوا تعلق کی کوئی بنیاد نہیں ہونی چاہیے۔" وہ پلٹی اور ایک بار پھر مجھے حیرانی اور پریشانی میں مبتلا چھوڑ کے چل گئی۔ اس مرتبہ اس کے طنز کی تلخی اتنی واضح تھی کہ خود محسن بھی ہکا بکا کھڑا رہا۔

بظاہر اس نے اپنی پیشکش مسترد کیے جانے پر برا مانا تھا لیکن اس بات سے متعدد مفہوم اخذ کیے جا سکتے تھے۔ بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی تھیں اور ان گنت مشکل مسائل پیدا ہو سکتے تھے۔ جذباتی۔ معاشرتی یا قانونی مسائل چنانچہ ہم نے اتفاقِ رائے سے اپنے فیصلے پر قائم رہنا منظور کیا خواہ اس سے رابعہ کی یا اس کی ماں کی حوصلہ شکنی ہو یا دل آزاری۔

پہلا اہم ترین مسئلہ اس خط کے حصول کا تھا جو گلاب خان معرفت محبت خان ارسال کیا گیا تھا۔ اصل خط وہ منڈی والا لے کر بھاگ گیا تھا اور منشی مرحوم یعنی فوما نچو نے جو کچھ بھی لکھا تھا وہ ہمارے دشمنوں کو ہم سے پہلے معلوم ہو گیا تھا۔ فوما نچو کی دانش مندی اور دور اندیشی شبہے سے بالاتر تھی۔ حفظِ ماتقدم کے طور پر اس نے خط کی ایک نقل بنا کے ہمیں ڈاک سے بھیج دی تھی لیکن اس سے یہ بھی ثابت ہوتا تھا کہ فوما نچو اپنی ذات کو درپیش خطرات سے بے خبر نہیں تھا۔ اس نے رقعے میں ملاقات نہ ہونے کے امکان کی طرف بھی اشارہ کیا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ حصار کو اپنے گرد تنگ سے تنگ تر ہوتے دیکھ رہا تھا۔ شاید کسی مرحلے پر اس کا راز افشا ہو گیا تھا اور اس کی کسی حرکت نے دشمنوں پر واضح

کر دیا تھا کہ وہ مجھ سے مل گیا ہے۔ اس نے صرف دو بار مجھے فون کیا تھا اور وہ بھی لندن میں۔ کیا اس وقت تک کوئی سن رہا تھا اور کیا سننے والے کو محض فوما نچو کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔؟ زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ خود فوما نچو بھی دشمنوں کا ایک ادنیٰ کارکن اور نچلی سطح کا تنخواہ دار تھا۔ ایک بہت بڑی مشینری کا بہت چھوٹا سا حقیر پرزہ۔ معاشی مجبوری یا کسی اور دباؤ کے باعث وہ ان کے لیے کام کرنے پر مامور تھا اور لندن میں اس کے آقا وہ تھے جو میرے لیے تباہی و بربادی اور ذلت و رسوائی کا سامان فراہم کرنے پر مامور تھے۔ شاید انھی میں سے کسی نے اس کی گفتگو سن لی تھی اور منشی زیرِ عتاب آ گیا تھا۔ منڈی والے ٹیکسی ڈرائیور نے اسے دو بار نمک حرام کہا تھا شاید ایک بار غدار بھی کہا تھا۔ اگر وہ چاہتے تو لندن ہی میں اس کو سزا دے سکتے تھے اور جیسے اب اس کی لاش ایک گمنام ویران مقبرے میں سامانِ عبرت بنی پڑی ہے۔ ایسے ہی لندن کی کسی سڑک پر بھی کچلی ہوئی مل سکتی تھی مگر تشکاری چالاک تھے۔ انھوں نے منشی کو جال کے طور پر استعمال کیا۔ اسے موقع فراہم کیا کہ وہ ہم سے رابطہ قائم کرے اور اس پر نگاہ رکھی۔ ٹھیک وقت پر انھوں نے منشی کو اٹھا لیا اور اس سے سب کچھ پوچھ لیا۔ اس کے بعد ہمارا کی ضرورت نہ رہی اور منشی کا مقدر وہ سزا ہوئی جو ایک ضرورت کے باعث التوا میں تھی۔

دوا فراد کے عملے پر مشتمل ایک ڈاک خانے سے ہمیں اس پوسٹ آفس کا پتہ معلوم ہوا جہاں سے علاقے کی ڈاک تقسیم ہوتی تھی۔ ہم نے اس پوسٹ آفس میں قدم رکھا تو ساڑھے نو بج چکے تھے۔ کاؤنٹر سے ہٹ کر دائیں جانب ایک دروازے سے اترنے والا زینہ میل سارٹنگ آفس کا راستہ ثابت ہوا۔ نیچے ایک خاصے بڑے ہال میں دیوار کے ساتھ لکڑی کے خانوں والے شیلف لگے ہوئے تھے جو بالکل کبوتر خانے لگتے تھے۔ شیلف کے ساتھ ساتھ میز کی اونچائی کے برابر کاؤنٹر تھا جو کمرے کی تین دیواروں پر محیط تھا۔ اس کاؤنٹر کے سامنے لکڑی کے اسٹولوں پر بوسیدہ میلی اور خاکی رنگ کی وردیوں والے درجنوں پوسٹ مین بیٹھے تھے اور ڈھیروں خطوط کو ادھر سے ادھر خانوں میں ڈال رہے تھے یا نکال رہے تھے اور ترتیب سے رکھنے میں مصروف تھے۔ ان کی باتوں کے شور سے کمرہ گونج رہا تھا اور جب ہم ان کے درمیان سے گزرے تو کسی نے نظر اٹھا کے بھی ہماری طرف نہیں دیکھا حالانکہ اوپر زینے کے شروع میں ہی لکھا تھا کہ غیر متعلقہ افراد کا داخلہ منع

ہے۔ ایک چرچر پوسٹ مین نے چلا کر دوسرے چرچر پوسٹ مین سے کہا۔ "یار محمد بھائی۔ یہ تمھارے علاقے کا خط پھر ادھر آ گیا۔ ابھی میں نے ادھر رکھا تھا۔" اور محمد بھائی نے خط کے پتے کو اپنے علاقے میں شامل سمجھنے سے انکار کیا۔ ان کی بحث کا آغاز ہونے سے پہلے ہی میں نے دخل در معقولات کرتے ہوئے کہا۔ "پوسٹ مین وہ پوسٹ مین کہاں ہے؟ کیا نام ہے اس کا۔ وہ جو ادھر ڈاک لے جاتا ہے۔" میں نے چراغ دین کی کوٹھی کا پتہ بتایا۔

"بالو۔" محمد بھائی نے ادھر ادھر نظریں دوڑا کے کہا۔ "وہاں دیکھو۔" اس نے انگلی سے ایک کونے کی طرف اشارہ کیا جو اسٹول کے برابر تھا۔ ہم اس کونے میں پہنچے اور میں نے قبل از فارغ ہو جانے والے یا سرے سے کام شروع ہی نہ کرنے والے اس پوسٹ مین کو مخاطب کیا جو اسٹول کے مختصر سے تختے پر آلتی پالتی مارے اور اپنا توازن برقرار رکھے۔ بیڑی پی رہا تھا۔ اس نے ہمیں مطلع کیا کہ بالو جا چکا ہے لیکن اس کا مطلب سمجھا جائے کہ وہ اس وقت ڈاک تقسیم کر رہا ہوگا۔ اگر وہ کینٹین میں نہ ہوا تو مستری سائیکل والے کے پاس اخبار پڑھ رہا ہوگا۔ ڈاک تو وہ بارہ بجے دے گا۔ یہ صورتِ حال ہمارے لیے باعثِ تشویش ہونے لگی تھی۔ کینٹین میں بالو نام کا کوئی پوسٹ مین نہیں ملا تو ہم نے مستری سائیکل والے سے دریافت کیا۔ اس نے قسم کھا کے کہا کہ بالو ادھر کا رخ بھی کرے تو وہ اس کی ٹانگ "بائٹ" کر دے۔ "اخبار پڑھنے کے بہانے چیزیں مارتا رہتا ہے۔ پانے غائب ایک پلاس۔ تین پیچ کس۔ لو جی لو۔ اچھا ہے۔ نیکی کر اور نیکی کرنے والے کو دریا میں ڈال۔" مستری نے ارشاد کیا۔ اس بیان سے بالو ڈاکیے کی فطرت کا ایک پہلو تو سامنے آ گیا یعنی یہ کہ وہ کوئی ایمان دار خدا ترس قسم کا آدمی نہیں ہے اور ایسا آدمی دس بیس روپے کے عوض آسانی سے وہ خط راستے ہی میں دے دے گا۔ شاید سو روپے میں ساری ڈاک دے دے کہ جاؤ عیش کرو۔ ہم بھی گھر جا کے سوتے ہیں اور آرام کرتے ہیں۔

ہم نے مزید وقت ضائع کیے بغیر چراغ دین کی کوٹھی کا رخ کیا۔ دو گھنٹے میں یہ میرا دوسرا پھیرا تھا اور ابھی کسی کے آثار ناپید تھے۔ سلامت شاہ کی لاش دریافت نہیں ہوئی تھی ورنہ کوٹھی کے دروازے پر پولیس کی ایک آدھ جیپ ہوتی یا کوئی کانسٹیبل کھڑا ہوتا اور اندر آنے جانے والوں کے علاوہ دروازے کے سامنے پُرتجسس اور بیکار لوگوں کا اجتماع ہوتا۔ محسن کو چراغ دین کی صورت دیکھنا بھی گوارا نہ تھا۔ "تم اندر جا کے اس سے بات کرو۔" وہ بولا۔ "میں باہر

بیٹھا انتظار کرتا ہوں۔ اول تو راستے ہی میں خط اچک لوں گا ورنہ بجت خان کے سامنے جا کے لے لوں گا۔ بجت خان تو مجھے گلاب خان ہی سمجھے گا نا۔ اس کا خیال تو یہ ہے کہ میرا چراغ دین سے کوئی رشتہ نہیں۔ کتنا اچھا ہوتا اگر یہ رشتہ واقعی نہ ہوتا۔" اس نے نفرت کے زہر سے بھری نظر اس کی کوٹھی پر ڈالی۔ پھر ہم دونوں پچاس قدم دور خشک گھاس پر بیٹھ گئے۔

"یار محسن۔" میں نے کہا۔ "جب یہ رشتہ ہو رہا تھا تو تو اتنا مشتعل نہیں تھا۔ اعتراض اگر تجھے تھا تو صرف اس بات پر کہ شادی مریم کی پسند سے نہیں ہوئی تھی۔ جہاں تک مجھے علم ہے اس نے مریم کو کسی قسم کی ذہنی اور جسمانی اذیت نہیں دی اور مریم کو بھی اس سے کوئی شکایت نہیں تھی بلکہ خود تو نے ایک بار حیرت کا اظہار کیا تھا کہ وہ خوش ہے۔ اب یہ رشتہ ختم ہو جانے کے بعد چراغ دین کے خلاف تیرے دل میں کیا کدورت آ گئی ہے۔ اس کے نام پہ تو نفرت کے اتنے شدید ردِ عمل کا شکار کیوں ہو جاتا ہے۔"

محسن خلا میں دیکھتا رہا۔ "مجھے شک ہے کہ چراغ دین نے اسے قتل کیا تھا۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ "تیرا دماغ جرائم کی فلموں اور جاسوسی ناولوں نے خراب کر دیا ہے۔ آخر شک کی کوئی وجہ بھی ہوتی ہے۔"

"لوگ بیویوں کو کیوں قتل کرتے ہیں۔؟" وہ بولا۔ "میرے ذہن میں اس کے تین ہی اسباب آتے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ خود کسی دوسری عورت کے چکر میں پڑ جائیں۔ دوسرے یہ کہ بیوی کو بد چلن سمجھتے ہوں۔ چراغ دین کے بارے میں میرا خیال ہے کہ وہ کسی عورت کے چکر میں ہوتا تو اب تک دوسری شادی کر چکا ہوتا۔ کیا تیرے خیال میں مریم باجی کے کردار کی خرابی اس کا سبب ہو سکتی ہے؟"

"ناممکن۔" میں نے کہا۔ "میں جانتا ہوں وہ کتنی مضبوط کردار کی عورت تھی۔ اس کا اپنی ذات پہ اعتماد قابلِ رشک تھا۔"

"اگر یہ ناممکن ہے تو تیسری وجہ وہی رہ جاتی ہے جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔" محسن بولا۔ "مریم باجی کی زندگی کا بیمہ پچاس ہزار روپے کا تھا حادثاتی موت کی صورت میں رقم دگنی یعنی پورے ایک لاکھ۔ گاڑی کا اس نے الگ پورا بیمہ کرا رکھا تھا۔ تھرڈ پارٹی انشورنس نہیں۔ چنانچہ کمپنی نے اسے نئی کار لے دی۔ ایک لاکھ کیا ہوتے ہیں مگر تو چراغ دین کو جانتا ہے۔ پیسے کیلئے اس نے وزیر خاں چچا کے ساتھ

کیا کیا؟"

"مگر محسن۔ اس حادثے میں چراغ دین کا اپنا بھائی بھی ہلاک ہوا تھا۔" میں نے اس کی دلیل کو یکسر مسترد کرتے ہوئے کہا۔

"وہ ایک اتفاق تھا۔ جسے قدرت کے نظامِ انصاف کا نمونہ بھی کہا جا سکتا ہے۔" محسن تلخ لہجے میں بولا۔ "اس حادثے کے بعد شوفر نے روتے روتے مجھے بتایا تھا کہ مالک مجھ بدبخت کو حادثے کا ذمے دار سمجھتے ہیں۔ اس کی بدبختی یہ تھی کہ پروگرام کے مطابق جس روز انھیں روانہ ہونا تھا وہ ملیریا میں مبتلا ہو گیا۔ اس کو ایک سو چار درجے بخار تھا لیکن ملیریا تو ایک دن میں ٹھیک ہو جاتا ہے۔ سفر ایک دن کے لیے ملتوی بھی کیا جا سکتا تھا۔ چراغ دین کا بھائی صرف دو دن کے لیے مری گیا تھا۔ اس نے خود کار ڈرائیو کرنے کا فیصلہ کیا اور اصل شوفر سے کہہ دیا گیا کہ وہ بعد میں بس سے آ جائے۔ چراغ دین بعد میں اس بات کو روتا تھا کہ بھائی نے یہ حماقت کیوں کی اور اس نے شوفر کو بہت گالیاں دی تھیں۔ اور پھر اسے برطرف کر دیا تھا۔ حالانکہ اس کا قصور کوئی نہ تھا۔ بیمار وہ اپنی مرضی سے تو نہیں ہوا تھا مگر چراغ دین نے اس سے چیخ چیخ کر کہا کہ مرنا تجھے تھا بڈھے۔ قضا تیری آئی تھی۔ تو نے میرے جوان بھائی کی جان لے لی میرے بچوں کو مار ڈالا۔ اس نے شوفر کو مریم کی موت کا ذمے دار قرار نہیں دیا۔ بعد میں مجھے ایک اور عجیب بات معلوم ہوئی۔ چراغ دین نے بھائی کو اس لیے بھیجا تھا کہ وہ بچوں کو نتھیا گلی تک لے جائے اور وہ سب دو دن بعد بس یا ویگن سے لاہور آ جائیں۔ شوفر کو حکم تھا کہ وہ تمام سامان سمیت صرف مریم کو لے کر روانہ ہو۔ شوفر کی بیماری سے پروگرام گڑبڑ ہو گیا۔ نتھیا گلی جانا اتنا اہم نہیں تھا۔ مریم نے اور چراغ دین کے بھائی نے کہا کہ چلو آئندہ سال سہی اور وہ تو چراغ دین کا سب کو لے کر چل پڑا۔ اسے نئی کار کو مری سے لاہور لانے کا بہت شوق تھا کہتے ہیں کہ جسے خدا رکھے اسے کون چکھے۔ بچوں کے اور چراغ دین کے بھائی کی جگہ شوفر بس سے آیا اور بچ گیا۔ جن کو چراغ دین بچانا چاہتا تھا وہ مارے گئے۔ یہ بات مجھے خاص طور پر کھٹکتی ہے کہ جب سیزن ختم ہو رہا تھا تو چراغ دین نے اپنے بھائی کو نتھیا گلی کا خصوصی پروگرام بنا کے کیوں بھیجا۔ پھر یہ کہ اس نے صرف بچوں کو نتھیا گلی لے جانے کی بات کیوں کی۔ اگر مریم بھی دو چار دن کے لیے نتھیا گلی ہو آتی تو کیا ہوتا۔ سامان واپسی میں بھی اٹھایا جا سکتا تھا۔ مجھے شک کرا یہ پندرہ ستمبر تک کا لوا کیا گیا تھا مگر سیزن کے لیے

کوٹھی لینے والے دو چار دن اوپر گزار لیں تو کوئی برا نہیں مانتا۔ وہ کوٹھی اس نے بعد میں خریدی تھی۔ غور طلب بات یہ بھی ہے کہ اس نے پورے سیزن میں مریم سے نہیں کہا کہ چلو نتھیا گلی گھوم آئیں یا یہ کہ تم بچوں کو نتھیا گلی دکھا لاؤ۔ مریم باجی خود بھی بہترین ڈرائیونگ کرتی تھیں آخری دنوں میں یہ پروگرام بنانے کا مقصد آخر کیا تھا؟ میری سمجھ میں صرف ایک بات آتی ہے۔ وہ اپنے بچوں کو بچانا چاہتا تھا چنانچہ اس نے بھائی کو بھیج دیا تھا۔ مریم اور شوفر حادثے کا شکار ہو جاتے تو اس کے لیے صدمے کی بات نہ ہوتی۔ جو کار نیچے گر کر چورا ہو جائے اس کے بارے میں کون ماہر یہ رپورٹ دے سکتا ہے کہ اس کے بریک فیل ہو گئے تھے۔ چراغ دین کو یہ بات کس نے بتائی؟ بچنے والا تو کوئی تھا نہیں۔"

"یہ سوال تو نے کبھی چراغ دین سے کیا تھا؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ مگر اس سے پہلے میں نے شوفر سے پوچھا تھا۔"

محسن بولا۔ "وہ خود حیران تھا کہ بریک کیوں فیل ہوئے۔ پولیس کی تفتیش میں اس کا کہیں ذکر نہ تھا اور صرف یہ بتایا گیا تھا کہ مری سے راولپنڈی آتے ہوئے سترھویں میل کے قریب کار حادثے کا شکار ہوئی جس کا عینی گواہ کوئی نہیں مگر دو منٹ کے وقفے سے دوسری کار آئی جس میں ایک اور فیملی مری سے لوٹ رہی تھی۔ انھوں نے کار کو قلابازیاں کھاتے نشیب کی طرف جاتے دیکھا۔ ظاہر ہے وہ اوپر سے یہ دہشت ناک منظر دیکھنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ چند منٹ میں مخالف سمت سے دوسری کار نمودار ہوئی جو مری جا رہی تھی۔ اس کے مسافروں نے مری پہنچتے ہی پولیس کو اطلاع دی اور پولیس وہاں حادثے کے ایک گھنٹے بعد پہنچی تو کچھ نہیں بچا تھا۔ پہلی کار اس وقت تک پنڈی پہنچ گئی تھی اور وہاں بھی پولیس کو مطلع کر دیا گیا تھا چنانچہ دوسری پولیس پارٹی پونے دو گھنٹے بعد پہنچی۔ یہ سب تو رپورٹ میں ہے۔ وقت، وہ تاریخ دن اور نقشے کے مطابق حادثے کا صحیح مقام۔ حادثے کے عینی شاہدوں کے بیانات۔ انشورنس کمپنی کی سروے رپورٹ حادثے کے ممکنہ اسباب۔ لیکن کہیں بھی یقین کے ساتھ بریک فیل ہو جانے کی بات نہیں کی گئی ہے۔ یہ بات صرف چراغ دین نے کہی۔ جب میں نے اس سے پہلی بار پوچھا تھا کہ حادثہ کیسے ہوا تو اس نے دیوار کو گھورتے ہوئے کہا تھا کہ گاڑی کے بریک فیل ہو گئے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا تھا سکندر۔ حادثے کے ممکنہ اسباب تو بہت سے ہو سکتے ہیں۔ مثلاً گاڑی تیز رفتاری کے باعث بے قابو ہو جائے۔ آگے کا کوئی ٹائر برسٹ ہو جائے۔ ٹائی راڈ کھل جائے۔ اگر ٹوٹ جائے۔ جب کسی نے حادثے کے سبب کا تعین کیا ہی نہ تھا تو چراغ دین نے کیسے کہہ دیا کہ بریک فیل ہو گئے تھے۔ سبب اس کے ذہن میں یہ بات تھی جس کا اسے پورا یقین تھا کہ حادثہ کیوں ہوا اور غیر شعوری طور پر اس نے میرے سامنے یہ بات کہہ دی۔ میں نے ڈیڈی سے ذکر کیا۔ انھوں نے کہا اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ حادثے کا اصل سبب کیا تھا جو ہونا تھا ہو گیا اور موت ایسے ہی بہانے ڈھونڈتی ہے۔ شوفر جو بدبخت نہیں خوش قسمت تھا برطرفی کے بعد اور ملازم ہو گیا تھا۔ مجھے اس کا پتا ہی نہ ملا کہ میں اور کچھ تفتیش کرنے والوں نے قتل کے امکان کو مدنظر رکھا ہی نہ تھا چنانچہ لاشوں کی تدفین ہو گئی۔ گاڑی کا ملبہ انشورنس کمپنی والے اٹھا کے لے گئے اور اس کے پرزے کباڑیے کو فروخت کر لے گئے۔ کیس ضروری رسمی کارروائی کے بعد ختم ہو گیا۔ آل دفتر را گاؤ خورد۔ گاؤ را قصاب برد اور قصاب ہم مرد۔

یہ بات جواب تک محسن کے دل میں کانٹے کی خلش کی طرح موجود تھی آج اچانک اس کی زبان پر آ گئی تھی اور اب میں بھی اس حادثے کو ایک نئے زاویے سے دیکھ رہا تھا چراغ دین کے خلاف نفرت کا لاوا میرے دل میں بھی پک رہا تھا لیکن مجھے علم نہ تھا کہ ایسے ہی نفرت کے ببول محسن کے دل کی زمین پر بھی پھیلے جا رہے ہیں۔ میری نظر میں وہ اس لیے مجرم تھا کہ میرے باپ کی پیٹھ میں سب سے پہلے خنجر گھونپنے والا ہاتھ اس کا تھا اور اس کا یہ ٹھاٹھ باٹھ اسی پیسے کی بدولت تھا جو میرے باپ کے اعتماد سے ناجائز فائدہ اٹھا کے چراغ دین نے اس کی تجوری سے چرایا تھا۔ وہ قانون کے سامنے چور ثابت نہیں ہو سکا تھا لیکن اس سے چراغ دین کے جرم کی سنگینی ختم نہیں ہوئی تھی۔ محسن کی نگاہ میں وہ اس کی بڑی بہن کا قاتل تھا جس نے اس کی زندگی کے عوض لاکھ روپے وصول کر لیے تھے۔ قدرت نے اسے بہت بڑی سزا دی تھی لیکن دنیا کی نظر میں وہ بدستور معزز اور معتبر تھا۔ قانون کی نگاہ میں وہ اتنا ہی بے گناہ تھا جتنے ہم مگر ہم سمجھتے تھے وہ بدترین سزا کا مستحق ہے۔ چراغ دین کے بارے میں ہماری جذباتی کیفیت ایک جیسی تھی۔ ہم دونوں کو اس کے لبوں سے اعتراف جرم سننا تھا اور پھر وہ حساب بے باق کرنا تھا جو کسی کتاب میں نہ تھا۔

"محسن۔" میں نے کہا۔ "ابھی تو میں چراغ دین سے یوں ملوں گا جیسے مجھے اس سے کوئی گلہ نہیں۔ مجھے اس کی گواہی ...

... مکار ہے اور عیار آدمی کے خلاف موثر حربہ عیاری کا ہی ہو سکتا ہے۔ اگر میں نے کھل کر اس سے عداوت کا اظہار کیا تو وہ میرے دشمنوں میں شامل ہو جائے گا۔ ابھی اس کو میری ذات سے کسی قسم کا خطرہ محسوس نہیں ہونا چاہیے۔ میں اس سے ملوں گا تو یہ تاثر دوں گا جیسے میں کچھ نہیں جانتا۔ پہلے درجے کا بے وقوف ہوں اور حالات کا تجزیہ کر کے کسی نتیجے پر پہنچنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا۔ اپنے عاجزانہ لہجے اور مسکین صورت سے میں اسے اپنے بے ضرر ہونے کا پورا یقین دلا دوں گا تو وہ بہت سی باتیں بتائے گا۔ جو اس کے نقطۂ نظر سے غیر اہم ہوں گی۔ وہ حتی الامکان میری مدد سے بھی گریز نہیں کرے گا لیکن وہ بدک گیا تو مجھ سے بات تک کرنے کا روادار نہ ہو گا اور الٹا مجھے پھنسا دے گا۔ جو شخص پہلے ہی ملزم و گنہگار ہو اس پر کون پتھر نہیں اٹھا سکتا۔ مناسب وقت پر ہم اس سے ایک ساتھ ملیں گے اور وہ حقیقت کا اعتراف خود کرے گا۔ اب پوسٹ مین کے آنے کا وقت ہو رہا ہے۔ میں چراغ دین کو باتوں میں لگانا چاہوں۔ کوشش کروں گا محبت خان کو بھی الجھائے رکھوں۔ تو خط لینے میں کامیاب ہو جائے تو انتظار مت کرنا۔" میں نے اپنی پتلون کی جیب میں سے لاک روم کی رسید نکال کر اسے دی۔ "دونوں سوٹ کیس لے کر رابعہ کے گھر پہنچ جانا۔ میں فارغ ہو کے سیدھا وہیں آؤں گا۔ شام کو بیلا کا انتظام نہ ہوا ایک دن ایمبیسیڈر ہوٹل میں اور سہی۔ مگر شام کو اپس ایس پی ضامن رضوی صاحب سے مل کر دونوں باتیں کر لیں گے ریوالور کے لائسنس کی بھی اور رہائش کے مسئلے کی بھی۔ وہ بااثر رسوخ والے آدمی ہیں۔ کچھ نہ کچھ کر دیں گے۔"

جب میں پورے اعتماد سے مارچ کرتا ہوا سی سی ڈین کی نیم پلیٹ والی کوٹھی پر پہنچا تو میوزیکل کال بیل کے جواب میں خود محبت خان دروازہ کھولنے آیا۔ "آؤ آؤ" اس نے بڑے اخلاق سے کہا۔ "تم اس چٹھی کا واسطے آیا ہے نا؟ ابھی وہ خانہ خراب بابو پوسٹ مین نہیں آیا۔ مرضی کا بادشاہ ہے۔ خو ابھی آ جائے گا۔ تم بیٹھو۔" وہ مجھے برآمدے میں لے گیا۔

"محبت خان۔" میں نے کہا۔ "وہ چٹھی گلاب خان خود لے جائے گا۔ میں تمھارے صاحب چراغ دین سے ملنے آیا ہوں۔" محبت خان کی صورت پر حیرت کے آثار نمودار ہوئے۔ "دین صاحب سے ملے گا؟ تم جانتا ہے اس کو؟ کیا کام ہے؟"

"کام میں انھی کو بتا دوں گا۔" میں نے مسکرا کے کہا۔

"وہ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔ تم انھیں بتا دو سکندر بخت آیا ہے۔"

"خو کیسے بتائے کس کو بتائے۔" وہ بولا۔ "دین صاحب کدھر ہے کہ بتائے۔ ابھی رو بی کا واسطے آئے گا تو بتائے گا۔"

"اچھا اچھا۔" میں نے سر ہلایا۔ "لنچ کے وقفے میں آئیں گے وہ۔ اچھا سلامت شاہ سے مل لیتا ہوں میں۔ وہ کچن میں ہو گا نا؟"

محبت خان نے سر پہ ہاتھ مارا۔ "کچن میں؟ خو مارا سلامت شاہ کا کس کو پتا ہے۔ غریب زندہ ہے کہ مر گیا۔ کتنا روز ہو گیا آج اس کو؟" اس نے انگلیوں پر گن کے حساب لگایا۔ "دین صاحب نے اس کا کوارٹر میں دیکھا۔"

"اچھا!" میں نے چونک کر کہا۔ "کوارٹر میں تو تالا پڑا ہوا تھا۔" اور چارپائی پر بیٹھ گیا۔

"ہاں۔ وہ ہم کو بولا۔ ہم اوپر سے دیکھا۔ سب سامان موجود۔ دروازہ کھلا پڑا ہے۔ ہوتا تو سامنے نظر آتا۔ خو آدمی ہے چوہے کا بچہ تو نہیں ہے۔ ہم صاب کو بولا صاب پولیس کو بولو اس کا پتا چلائے۔ اتنا بڑا شہر ہے۔ ورنہ غریب لوگ لاری کے اور ویگن کے یا کار کے نیچے آ کے مرتا ہے۔ غریب کا نسا ماں کا لاش مردہ گھر میں پڑا ہو۔ لاوارث ہم ادھر کب تک انتظار کرے گا۔" محبت خان اپنی رو میں بولتا گیا۔ "دین صاحب نے کہا آج پرچا کٹائے گا۔"

میں نے محسوس کیا جیسے یہ ضرورت سے زیادہ عقل مند بننے کی کوشش کا نتیجہ ہے کہ میں خود چل کے خطرے کے اس حصار میں داخل ہو گیا ہوں اور پولیس کسی بھی لمحے پہنچ سکتی ہے۔ اگر چراغ دین نے فون کیا ہو گا تب بھی وہ کوارٹر کو ایک نظر دیکھنے ضرور آئیں گے اور اندر قدم رکھتے ہی تعفن خود سلامت شاہ کی لاش کا پتا دے گا۔ آنے والے اسی تھانے کے لوگ ہوں گے جو مجھے پہچانتے ہیں۔ وہ پھر مجھے لے جائیں گے شبہے میں نہ سہی عینی گواہ بنا کے۔ میرا بیان لینے کے لیے۔ وہ سوالات سے میری زندگی عذاب کر دیں گے۔ تم وہاں کیا لینے گئے تھے؟

ائیرپورٹ سے تم سیدھے سلامت شاہ کے پاس پہنچے تھے۔ کیا سامان تھا تمھارے ساتھ؟ وہ سامان اب کہاں ہے؟ گرفتاری کے وقت تو تمھارے پاس صرف ایک بریف کیس تھا۔ لاک روم والی بات نہیں چلے گی۔ اس پر محسن رضا کا نام اور آج ہی کی تاریخ ہے۔ میں انکار بھی نہیں کر سکتا کہ لندن سے صرف بریف کیس لایا تھا۔ محسن رضا تو بعد میں آیا تھا۔ سامان اس کے پاس کیسے پہنچا؟ آج لاک روم میں سامان رکھنے کا کیا مقصد تھا؟ اب تک یہ سامان کہاں تھا؟

جس صندوق میں لاش ہے وہ تمھارے والد کی ملکیت تھا۔ اس میں کیا سامان تھا؟ تم نے نہیں دیکھا تھا؟ صندوق مقفل تھا تو چابیاں۔ چابیوں کے بارے میں تو شاید میں نے تھانے میں بھی بات کی تھی۔ محبت خان بتائے گا کہ میں ایک روز پہلے بھی گلاب نامی ایک شخص کے ساتھ سلامت شاہ کے کوارٹر کی طرف گیا تھا۔ گلاب خان بعد میں محسن رضا ثابت ہوگا تو اس جھوٹ کا ہم کیا جواز پیش کریں گے۔ میرا ذہن ماؤف ہونے لگا۔ سوالات مشین گن سے فائر ہونے والی گولیوں سے بھی زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ نکلتے چلے آ رہے تھے اور میرے لیے دلی خوف و اضطراب کی کیفیت کو چھپانا مشکل ہو رہا تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا کہ چراغ دین خود پولیس کے ساتھ نمودار ہونے ہی والا ہے۔ میں نے ایسے وقت میں یہاں آ کے سخت حماقت کی تھی اب بچت کی یہی ایک صورت تھی کہ میں بھاگ جاؤں اور بعد میں ہر بات سے صاف انکار کردوں۔ نہ میں نے والد کا چھوڑا ہوا صندوق دیکھا۔ نہ سلامت شاہ نے اس کی بات کی اور نہ میں نے تھانے میں اس کی چابیوں کا ذکر کیا۔ نہ میں بعد میں یہاں آیا۔ میں کسی گلاب خان کو نہیں جانتا۔ میرا سامان اسی روز محسن نے سلامت شاہ سے لے کر ہوٹل میں رکھ لیا تھا۔ آج کمرہ خالی کرنا تھا۔ اس لیے لاک روم میں عارضی طور پر رکھوایا تھا۔

"خانہ خراب ابھی تک نہیں آیا" چوکیدار نے داڑھ میں نسوار دبا کے کہا۔

"کو... کون؟" میں چونک پڑا لیکن محبت خان نے مجھے چونکتے نہیں دیکھا۔ وہ نسوار کی ڈبیا کے آئینے میں خود کو دیکھ رہا تھا۔

"وہ بالو" محبت خان نے نسوار کی ڈبیا واسکٹ میں رکھ کے کہا "اب نہیں آئے گا۔ تمھارا بھتیجی"

"میرا نہیں خان۔ وہ گلاب خان کا بھتیجی ہے۔ مجھے اس سے کیا" میں نے کہا "میں اب چلتا ہوں"

اس سے پہلے کہ محبت خان میری بات پر تبصرہ کرتا کار کا ہارن بجا اور میرا دل اچھل کے حلق میں آ گیا "آ گیا دین صاحب" محبت خان دروازہ کھولنے لپکا۔ جب کار میں وہ اکیلا اندر آیا تو میری جان میں جان آئی۔

"اسلام علیکم جناب" میں نے آگے بڑھ کے چراغ دین سے مصافحہ کیا اور پھر عقیدت سے ایک ہاتھ سینے پر رکھا۔

"وعلیکم السلام" چراغ دین نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا "تم... تم سکندر بخت ہو؟ وزیر خاں... کے بیٹے...؟"

"جی جناب عالی" میں نے عاجزی سے کہا "میں کا شکریہ ادا کرنے بھی آیا تھا"

"شکریہ؟" چراغ دین نے مشتبہ لہجے میں کہا "کس بات کا شکریہ...؟"

"جی۔ وہ آپ نے آخری دنوں میں والد صاحب کی بہت مدد کی..." میں نے غم زدہ لہجے میں کہا "ان کو چھپنے کی جگہ دی۔ وہ آپ کی شرافت کے بہت قائل تھے۔ میرے پاس لندن میں ان کے خط آتے رہتے تھے۔ لکھا تھا اس پریشانی کے زمانے میں ایک شخص کے سوا کوئی کام نہ آیا۔ دوستوں نے بھی نظریں پھیر لیں۔ مگر وہ شخص جس کو میں نے ہمیشہ غلط سمجھا میرا سہارا بنا"

چراغ دین کے لیے یہ سب باتیں بہت نا... یقینی تھیں مگر وہ میری صورت یا میرے لہجے سے کسی شک میں مبتلا نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ سب اداکاری ہے میں طنز اور تمسخر سے ایسی گفتگو کر رہا ہوں۔ وہ سخت ... کا شکار تھا۔

"پریشانی تو بہت اٹھائی انھوں نے" وہ کچھ ... بعد بولا "تمھیں اور کیا لکھا تھا۔ اپنی پریشانی کے بارے میں"

"یہی کہ کاروبار چوپٹ ہو گیا ہے اور گھر کے علاوہ ایک ایک چیز قرض خواہوں کی نذر ہو گئی ہے۔ تن کے ... کے سوا کچھ نہیں بچا اور اوپر سے بیماری نے آ لیا ہے۔ ... پرانے نمک خوار نے دو وقت کی روٹی اور سر چھپانے کا ... دے دیا ہے اور اب مجھے معلوم ہوا ہے کہ جسے میں کوڑا ... سمجھتا تھا وہ ہیرا تھا اور جن کو ہیرے کی طرح عزیز رکھا تھا وہ پتھر تھے" میں نے بے حد دکھی لہجے میں کہا "انھوں نے لکھا تھا کہ بیٹا میرا اب کوئی بھروسہ نہیں۔ میں تمھارے اخراجات کہاں سے پورے کروں۔ جتنا زیور تمھاری ماں کا ... سب بیچ کے پیسہ ہمیشہ تمھیں بھیجا لیکن اب کوئی صورت نہیں رہی۔ تم واپس آ جاؤ۔ میں نے واپسی میں کچھ دیر کی۔ کیا خبر تھی..." میں نے ٹھس ٹھس کر کے خشک آنکھیں ...

"اچھا اچھا" چراغ دین نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے تھپکی دی "صبر کرو۔ خدا کو یہی منظور تھا۔ آؤ" وہ پوری طرح مطمئن ہو گیا تھا کہ مجھے یہاں کے حالات کی رتی بھر خبر نہیں اور میرے والد نے عمداً کچھ نہیں بتایا۔ نہ اپنے بارے میں اور نہ اس چراغ دین کے بارے میں جو محبن کر کے نوکر سے آقا بن گیا تھا۔ وہ سمجھتا رہا کہ وزیر خان نے اپنا دکھ اپنی ذات تک محدود رکھا اور اپنے بیٹے کو اپنے مصائب کے اصل اسباب اور زندگی کے آخری پرآشوب دور کی تفصیلات سے آگاہ نہیں کیا تاکہ بیٹا تفکرات سے محفوظ رہے۔ اسے میری اور سلامت شاہ کی گفتگو کا یا میری، میر شرافت علی سے آخری ملاقات میں ہونے والی باتوں کا کیسے علم ہو سکتا تھا۔

"وہ... میں نے اخبار میں دیکھا تھا" اس نے مجھے ڈرائنگ روم میں لے جا کر کہا "تم پر کوئی مقدمہ وغیرہ قائم ہو گیا ہے میر شرافت علی کے قتل کا۔ اور تم نے کہا ہے کہ میر شرافت علی نے تمھارے والد کو بلیک میل کیا تھا۔ اور یہ کہ ان کی موت بھی طبعی نہیں۔ یہ کیا چکر ہے؟"

"میں کیا عرض کروں جناب عالی" میں نے احمقوں کی طرح کہا "مجھے لوگوں نے پھنسا دیا۔ معلوم نہیں کسی کو مجھ سے کیا دشمنی تھی جب میں لندن سے روانہ ہونے والا تھا تو ایک شخص مجھ سے ملنے آیا۔ صورت سے بھلا مانس لگتا تھا شیروانی اور ترکی ٹوپی لگا کے آیا تھا۔ بوڑھا آدمی تھا پھر بھی بے لحاظ لوگ اس کے حلیے پر ہنسنے لگے۔ اس نے قسم کھا کے مجھ سے کہا کہ میر شرافت علی نے میرے والد کو بلیک میل کر کے ان سے سب کچھ چھین لیا ہے"

"تم نے اس سے پوچھا نہیں کہ میر شرافت علی نے کیسے بلیک میل کیا۔ کوئی وجہ تو ہوگی"

"میں نے پوچھا تھا جناب۔ مگر اس نے کہا وجہ تو مجھے نہیں معلوم" میں نے کہا "وہ یہاں تھانے میں بھی مجھ سے ملنے آیا تھا اور اس نے یہی کہا تھا کہ تمھارے والد کو قتل کیا گیا ہے۔ اس نے قسم کھا کے کہا تھا کہ یہ بات جھوٹ نہیں"

"اور اس شخص کے کہنے پر تم نے عدالت میں بیان دے دیا؟" چراغ دین نے مجھے افسوس سے دیکھا۔

"اور میں کیا کرتا۔ مجھ پر قتل کا جھوٹا الزام جو لگا دیا گیا ہے" میں نے کہا "اس نے قسم کھا کے ایک بات کہی تھی میں نے وہی بات کہہ دی"

"لاحول ولا قوة۔ تم تو عقل سے بالکل پیدل ہو یار" چراغ دین بولا "اگر ایسی بات ہوتی تو والد تمھیں نہ لکھتے۔ تم نے تو خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار لی ہے۔ قتل کی ایک وجہ فراہم کر دی ہے۔ قسم کیا چیز ہوتی ہے۔ اور قتل کا کیا سوال۔ تمھارے والد بیمار تھے۔ میں خود گواہ ہوں اس بات کا کہ ان کی موت بیماری کا نتیجہ تھی۔ عمر کون سی کم تھی ان کی — جب میرے پاس آئے تو ان کی حالت تباہ تھی۔ میں جانتا تھا ایک زمانے میں وہ مجھ سے کتنے بدگمان تھے۔ شاید تمھیں علم نہیں کہ بدخواہوں کی باتوں میں آ کے انھوں نے مجھ پر کتنا سنگین الزام عائد کیا تھا مگر اب اس کا کیا ذکر۔ میں نے ان کا نمک کھایا تھا۔ سب نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا تھا لیکن میرے ضمیر نے گوارا نہ کیا۔ یہ تو وقت کا انقلاب ہے۔ عزت اور ذلت۔ تقدیر کے کھیل ہیں۔ میں اس شخص کو کیسے دھتکار دیتا جو میرے پاس پناہ کے لیے آیا تھا۔ میں نے ان سے کہا یہ گھر حاضر ہے شوق سے رہیے مگر وہ خوددار آدمی تھے اور خیرات لینا قبول نہ کرتے تھے چنانچہ مجبوراً میں نے ان کو گھر میں معمولی سا جھاڑ پونچھ کا کام دے دیا اور اس کے عوض وہ مجھ سے ایک ہزار روپیہ ماہانہ قبول کرتے تھے..."

میں نے دل ہی دل میں اس جھوٹ پر چراغ دین کو رقم سے بڑی گالی دی۔

"... اس کے علاوہ بھی مجھ سے جو بن پڑا میں نے کیا... دوا علاج... ہمدردی... حوصلہ افزائی" وہ بولتا رہا۔ "مگر ان کی حالت دن بدن بگڑتی چلی گئی۔ سلامت شاہ سے چھپ کر میں انھیں اپنے ساتھ کھانا کھلاتا تھا... مجبوری تھی... دوسرے نوکر اصل بات کہاں جانتے تھے۔ وہ اس سلوک کی توقع رکھتے تو غلط ہوتا۔ تاہم مجھے صاف نظر آ رہا تھا کہ ان کے دن پورے ہو چکے ہیں... میں نے انھیں مشورہ دیا کہ اب بیٹے کو بلوا لو... کچھ تو سہارا ہوگا۔ یہ سب بکواس ہے کہ انھیں قتل کیا گیا۔ تم کیسے ثابت کرو گے؟ لاش نکلواؤ گے؟... توبہ کرو یار توبہ۔ لاش کی بے حرمتی ہوتی ہے۔ ان کی مغفرت کی دعا کرو" اچانک اسے کچھ خیال آیا "محبت خان" اس نے صدا لگائی۔

محبت خان نے دروازے میں سے جھانکا "کیا ہے صاحب جی؟"

"دیکھو وہ گاڑی میں کھانا رکھا ہے۔ وہ یہاں ہم دونوں کے لیے نکال لاؤ۔ سلامت شاہ کا کچھ پتا چلا؟"

"نہیں صاب۔ آج ہم ادھر کوارٹر کا طرف گیا تو ہم کو بدبو آیا" محبت خان نے کہا "خبر نہیں کوئی کتا بلی مر گیا ہے اُدھر یا کوارٹر میں سے آتا ہے۔ کل تھانے سے ایک آدمی اس کو بلانے کو آیا تھا۔ بیان کا واسطے"

"اچھا؟" چراغ دین نے تشویش میں مبتلا ہو کے کہا۔ "مجھے یاد نہیں رہا۔ اب واپسی پر پہلے پولیس اسٹیشن جاؤں گا۔ خدا خیر کرے کوئی اور مصیبت نہ نازل ہو جائے" اور

کا لفظ یہ ظاہر کرتا تھا کہ میرا لندن سے سیدھا اس کے پاس آنا پہلی مصیبت تھا۔

کھانا کھاتے ہوئے میں نے بڑے دھیمے لہجے میں پوچھا۔ "آپ تو والد مرحوم کی تدفین میں شریک ہوئے ہوں گے جناب؟"

"میں؟ نہیں یار۔" وہ کچھ اور سوچ رہا تھا اس لیے میرے سوال پر چونک پڑا۔ "بدقسمتی سے میں مری جا چکا تھا۔ اسی روز۔"

"محبت خان تو جنازے میں شامل ہوگا!" میں نے کہا۔

"ہاں۔ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟" اس نے کہا۔ وہ کچھ چوکنا ہو گیا تھا۔

"وہ جناب عالی۔ ابھی تک والد کی قبر پہ حاضر نہیں ہو سکا۔ کیسا بدبخت بیٹا ہوں جسے باپ کی قبر کا بھی علم نہیں۔ سوچا تھا اگلے روز سلامت شاہ کے ساتھ چلا جاؤں گا مگر اس کا موقعہ ہی نہ ملا۔ اب موقعہ ملا ہے تو سلامت شاہ غائب ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "یہ بڑی عجیب بات ہے۔ محبت خان نے مجھے اور پریشانی میں مبتلا کر دیا ہے کہ ادھر سے بدبو آ رہی ہے ابھی میں خود جا کے دیکھتا ہوں۔ کہیں کسی نے اسے مار کے اندر نہ ڈال دیا ہو۔"

"کیا جی؟" میں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا اور یہ ظاہر کیا کہ لقمہ میرے حلق میں پھنس گیا ہے۔ میں نے فوراً پانی کے دو گھونٹ لیے۔ "یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔"

"تم... نہیں سمجھتے یار۔ دنیا میں کیا نہیں ہو سکتا۔" وہ جھنجلا کے بولا۔ "میرا خیال ہے میرا اندر جانا ٹھیک نہیں۔ پولیس خود دیکھ لے گی۔ بڑی غلطی ہوئی مجھ سے کہ رپورٹ لکھوانے میں دیر کی۔ خیر میں ابھی فون کرتا ہوں۔"

میں نے آخری لقمہ نگل کے پانی پیا اور کھڑا ہو گیا۔ "آپ کا بہت بہت شکریہ جناب عالی۔" میں نے دونوں ہاتھ آگے بڑھا کے اس کا ہاتھ تھاما اور مصافحے کے بعد ایک ہاتھ پھر سینے پر رکھا۔ "آپ اجازت دیں تو میں محبت خان کو اپنے ساتھ قبرستان لے جاؤں۔؟"

"ابھی؟۔ اسی وقت؟۔ خیر لے جاؤ۔" وہ بولا۔ "مگر دیکھو۔ اس سے کہنا کہ تمھیں قبر تک پہنچا کے فوراً لوٹ آئے۔ میں اب واپس نہیں جا رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے پولیس فوراً آ جائے۔"

میں وہاں سے جان بچا کے نکلا تو میری پریشانی بہت کم ہو گئی تھی۔ اب اس بات کے امکانات پیدا ہو چلے تھے کہ چراغ دین میرے آنے کا پولیس سے ذکر ہی نہ کرے۔ اس کے خیال کے مطابق میں اس کا شکریہ ادا کرنے آیا تھا اور محبت خان کو ساتھ لے جانے کے لیے تاکہ اپنے والد کی قبر تک پہنچ سکوں۔ اس بات کا سلامت شاہ کی لاش کے ملنے سے کوئی تعلق نہیں تھا اور چراغ دین یا محبت خان میں سے کسی کو یہ خیال آ ہی نہیں سکتا تھا کہ مجھے اس اندوہناک واقعے کی پہلے سے خبر تھی۔ پولیس کے سامنے یہ بیان کہ میں اسے پوچھتا ہوا آیا تھا کوئی خطرے کی بات نہیں تھی۔ ظاہر ہے وہ میرے لیے صفائی کا واحد گواہ تھا میرے والد کے آخری ایام کا ساتھی تھا اور یہاں اس کے سوا میرا کوئی نہیں تھا چنانچہ اس کی گم شدگی سے میں بھی پریشان تھا۔ مجھ پہ الزام آنے کا کیا سوال۔ اس کے قتل سے میرے خلاف سازش کے موقف کی تائید ہو گی۔ ابھی میں برآمدے میں ہی تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے کی آواز آئی اور پھر چراغ دین کی۔ "کون۔ سب انسپکٹر حشمت خان۔" یہ نام سنتے ہی میرے قدم رک گئے۔ "ہاں۔ میں بول رہا ہوں۔" چراغ دین نے کہا۔ "ہاں کل کوئی آیا تھا۔ نہیں میں موجود نہیں تھا۔ مجھے چوکیدار نے ابھی ابھی بتایا ہے۔ ارے یار تھانے دار صاحب۔ ٹھیک ہے آپ کو بیان لینا ہے مگر میں اسے کہاں سے بھیج دوں۔ ہاں۔ ابھی تک اس کا کوئی پتا نہیں۔ میں تو خود رپورٹ لکھوانے کے لیے آ رہا تھا۔ اچھا کیا آپ نے فون کر لیا...."

میں تیزی سے آگے بڑھا اور محبت خان کے پاس جا پہنچا جو کار کی غیر ضروری صفائی سے فارغ ہوا ہی تھا میں نے اسے بتایا کہ دین صاحب سے میری بات ہو گئی ہے اور انھوں نے اجازت دے دی ہے کہ میں چوکیدار کو قبرستان تک اپنے ساتھ لے جاؤں کیونکہ مجھے اپنے والد کی قبر معلوم نہیں۔ اس نے واسکٹ میں سے پھر نسوار کی ڈبیا نکالی اور ایک چٹکی نسوار کی واڑھ میں دبائی۔ آئینے میں اپنی صورت ملاحظہ کی اور کچھ سوچتا رہا۔ "خو یارا۔ تم سلامت شاہ کے ساتھ نہیں گیا تھا قبرستان؟" میرے انکار پر اس نے تعجب کا اظہار کیا اور بدستور تذبذب میں مبتلا رہا۔ اندر چراغ دین مسلسل اونچی آواز میں ٹیلی فون پر حشمت خان کو رپورٹ لکھوا رہا تھا اور مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں وہ محبت خان کا اجازت نامہ منسوخ نہ کر دے۔ پولیس والے ٹیلی فون پر رپورٹ کہاں لکھتے ہیں۔ وہ چراغ دین سے کہیں گے تھانے آؤ۔ میں نے محبت خان کو بتایا کہ دین صاحب کا واپس جانے کا ارادہ نہیں ہے اور اسی لیے انھوں نے تمھیں یہ اجازت دی ہے۔ اس نے سر ہلایا اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ محبت خان کو میری بات کا یقین آ گیا۔ وہ تصدیق کے لیے جاتا تو چراغ دین یقیناً اسے روک لیتا اور کہہ دیتا کہ کل چلے جانا۔ سڑک پر آ کے میں نے اپنے سامنے سے ایک رکشا کو گزرتے دیکھا اور چلا کر اسے روکا۔ رکشا ابھی روانہ ہوا ہی تھا کہ پلٹ کر دیکھنے پر مجھے چراغ دین نظر آیا جو کوٹھی کے دروازے پر کھڑا تھا اور اس میں شبہے کی کوئی بات نہیں تھی کہ وہ چوکیدار کو منع کرنے آیا تھا اس کے بعد بھی مجھے اندیشہ لاحق رہا کہ کہیں وہ کار لے کر ہمارے پیچھے نہ آئے مگر ٹریفک میں جس طرح رکشا آگے نکلتا ہے کار نہیں نکل سکتی شاید یہی سوچ کے وہ رک گیا۔ اسے یہ بھی امید ہو گئی کہ چوکیدار ایک ڈیڑھ گھنٹے میں لوٹ آئے گا۔

قبرستان کے طویل راستے کو طے کر کے۔ ہار پھول اور اگربتیاں خرید کے میانی صاحب کے وسیع و عریض قبرستان میں آخری گوشے تک پہنچنے میں پورا ایک گھنٹہ صرف ہوا۔ اس ایک گھنٹے میں محبت خان سے مجھے بہت سی کارآمد باتیں معلوم ہوئیں مثلاً یہ کہ میرے والد آخری وقت تک کس ڈاکٹر کے زیر علاج رہے تھے۔ وہی ڈاکٹر اس روز صبح کے وقت آیا ہو گا جب وزیر خان کی موت کا انکشاف ہوا تھا لیکن وہ یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ ڈاکٹر کو لانے والا سلامت شاہ تھا اور اس نے صرف یہ بتایا تھا کہ ڈاکٹر نے دیکھتے ہی موت کی تصدیق کر دی تھی۔ کفن دفن کا انتظام ان دونوں نے مل کر کیا تھا اور تدفین شام کے وقت ہوئی تھی۔ عصر سے ذرا پہلے۔ چراغ دین اسی روز صبح سات بجے مری جانے کے لیے راولپنڈی گیا تھا۔ ایک حادثے کے بعد وہ کار میں مری جاتے ہوئے ڈرتا تھا۔ وزیر خان کی موت کا پتا آٹھ نو بجے چلا تھا۔ پھر سلامت شاہ نے فون کیا تھا اور جنازے میں جو لوگ شریک ہونے آئے تھے۔ ان میں سے محبت خان کسی کو نہیں پہچانتا تھا کیونکہ وہ پہلے کبھی نہیں آئے تھے۔ وہ سب کسی کمپنی کے لوگ تھے جو بہت افسردہ تھے۔ محبت خان نے ایک دو کو روتے بھی دیکھا تھا۔ اکثر لوگ افسوس کر رہے تھے کہ بیچارے کا بیٹا بھی لندن میں بیٹھا ہے۔

"محبت خان۔" میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا۔ "جنازہ کہاں سے اٹھایا گیا تھا۔ کوٹھی سے کہ سرونٹ کوارٹر سے۔"

"کوٹھی سے۔" محبت خان نے جواب دیا جو میری توقعات کے عین مطابق تھا۔ "دین صاب تو ادھر تھا نہیں۔ سلامت شاہ نے خود ہی میت کو ادھر رکھوایا۔ بولتا تھا ادھر جگہ کم ہے۔"

سلامت شاہ سمجھدار آدمی تھا۔ اس نے مرنے والے کی عزت کا بھرم نہیں ٹوٹنے دیا۔ اس کے جنازے کو کندھا دینے کے لیے آنے والے بھی سمجھے ہوں گے کہ میر وزیر اینڈ کمپنی کا ایک پارٹنر جو مدت سے بیمار تھا اور دفتر یا کارخانے میں نظر تک نہیں آیا تھا اب اس کوٹھی میں مقیم تھا اگر وہ اسے سرونٹ کوارٹر میں دیکھتے تو یقیناً شکوک میں مبتلا ہو جاتے اور تجسس انھیں مجبور کرتا کہ وہ وزیر خان کی زبوں حالی کے اسباب معلوم کریں مگر......

وہ ایک شایانِ شان کوٹھی میں مرا تھا چنانچہ وہ سب مطمئن ہو کے لوٹ گئے تھے کہ بیماری کی خبریں بے بنیاد نہ تھیں۔ اگر کسی نے گیٹ پر "سی سی ڈین" کے نام کی تختی دیکھی ہو گی تو کہاں سمجھا ہو گا کہ یہ وہی نمک حرام چراغ دین ہے شاید انھوں نے سوچا ہو گا کہ وزیر خان نے اتنی بڑی کوٹھی کو اپنی ضروریات سے زائد سمجھتے ہوئے اس کا ایک حصہ کسی انگریز یا کرسچین اینگلو انڈین کو کرائے پر دے رکھا ہے۔ تاہم اس سے ایک بات ثابت ہوتی تھی۔ وزیر خان نے سلامت شاہ کو بتا دیا تھا کہ وہ کون ہے۔ چراغ دین کون تھا اور حالات کے کس انقلاب نے اسے نوکر کا نوکر بنا دیا ہے۔ ممکن ہے بلیک میلنگ والی بات نہ بتائی ہو اور اپنی تباہی کو اپنی حماقت سے ہونے والے کاروباری نقصان کا نتیجہ قرار دیا ہو مگر یہ بات سلامت شاہ کو یقیناً معلوم تھی کہ وزیر خان اب بھی اس کمپنی کے مالکوں میں شامل ہے گو عملی طور پر اس کی حیثیت کچھ نہیں۔ سلامت شاہ نے مجھے بھی کچھ نہیں بتایا تھا تو اس کا سبب یہی ہو سکتا تھا کہ وزیر خان نے اسے بہت سخت قسم کی قسم دے رکھی تھی کہ اس بات کو وہ اپنی ذات تک محدود رکھے گا پھر بھی مرنے کے بعد وزیر خان کا جنازہ اسی شان سے اٹھا جس شان سے مالکوں کے جنازے اٹھتے ہیں۔ کوٹھیوں میں جھاڑ پونچھ کرنے والوں کے نہیں۔ ایک بار پھر مجھے سلامت شاہ کے ناقابل تلافی نقصان کا شدت سے احساس ہوا۔

محبت خان مجھے قبر تک پہنچا کے اور فاتحہ پڑھ کے رخصت ہو گیا تو میں ایک پختہ قبر کے کنارے پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ تدفین میں شریک ہونے والوں سے رابطہ کیسے قائم کروں۔ اگر میر وزیر اینڈ کمپنی کا دفتر مقفل نہ ہوتا تو میں خود

وہاں پہنچ جاتا یا فون پر بات کر لیتا اور وہاں زیادہ تر میرے ہمدرد تھے۔ وہ میری مدد کرتے ہوئے نہ ہچکچاتے۔ شرافت علی کی موت کے بعد کمپنی لاوارث ہو گئی تھی اور تاوقتیکہ نئے وارث انتظام نہ سنبھالیں آفس اور فیکٹری کے ملازمین اپنے مستقبل کے بارے میں بے یقینی کا شکار رہیں گے۔ ان میں سے بیشتر عمر کی اس حد سے گزر چکے ہوں گے کہ کسی نئی ملازمت کے لیے اہل متصور کیے جائیں۔ قانونی طور پر وہ برطرف بھی نہیں ہوئے تھے اور اپنے واجبات وصول کرنے کے مجاز تھے لیکن ابھی تک ان میں سے کسی نے عدالت سے رجوع کرنے کا سوچا بھی نہیں ہو گا۔ انہیں امید ہو گی کہ مینیجر وغیرہ پھر کاروبار کو سنبھال لیں گے جو بڑے منظم خطوط پر چل رہا تھا اور ایک میر شرافت علی کے نہ ہونے سے اس نظام کا شیرازہ نہیں بکھر سکتا تھا جس سے سب کا معاشی مفاد وابستہ تھا۔ انہیں یہ بھی امید ہو گی کہ میں لندن سے واپسی پر وزیر خان کے وارث کی حیثیت سے کاروبار کی نگرانی کی ذمے داری سنبھال لوں گا مگر میں نے آتے ہی اس شخص کو بھی قتل کر دیا تھا جو اکیلا کاروبار کو چلا رہا تھا اور اب ضمانت پر رہائی کے بعد لاپتا تھا۔ میر شرافت علی کا کوئی دور کا وارث ہے یا نہیں۔ اس کا علم مجھے نہیں تھا تو ملازموں کو کیا ہو گا۔ وہ دعا کرتے ہوں گے کہ بیوی بچے نہیں تو شرافت علی کا کوئی بھائی ہو گا چچا تایا ہو گا یا رشتے کا بھائی ہو گا۔ کوئی تو سامنے آئے گا۔ ممکن ہے اسی امید میں وہ ہر روز یہی دیکھنے آتے ہوں کہ کسی نے تالہ بندی ختم کی یا نہیں۔ یہ خیال بڑا حوصلہ افزا تھا۔ میں دفتر کے اوقات میں میر وزیر اینڈ کمپنی کے دروازے پر یا سامنے کھڑا رہ کے ان پر نظر رکھ سکتا تھا۔ عموماً دفاتر آٹھ سے نو بجے کے درمیان شروع ہوتے ہیں۔ آٹھ سے دس بجے تک انتظار کرنے میں ایک دو افراد سے ملاقات یقینی تھی۔ ان سے دوسرے ساتھیوں کے پتے معلوم کیے جا سکتے تھے اور یہ پوچھا جا سکتا تھا کہ آخری رسوم میں کون شریک ہوا تھا جو بطور گواہ پیش ہو کے وزیر خان کی قبر کی نشان دہی کر سکے۔

مسئلہ حل ہو گیا تھا چنانچہ میں نے قبر کی جائے وقوع کو ذہن نشین کیا اور پھر قبروں کے درمیان سے طویل پر پیچ راستہ طے کر کے میانی صاحب کے بڑے دروازے سے باہر آ گیا۔ جہاں پھول بیچنے والوں کی بہت سی دکانیں تھیں اور رکشہ آ آ کے ٹھہر رہے تھے۔ ایک میت گاڑی سے جنازہ اتارا جا رہا تھا۔ دوسرا لوگوں کے کندھوں پر اندر مسجد میں نماز کے لیے پہنچ چکا تھا۔ شام کے چار بجنے والے تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ محسن کو میرا انتظار کرتے ہوئے تین گھنٹے ہو چکے ہیں۔ اس میں شبہے کی کوئی بات نہ تھی کہ وہ بالو پوسٹ مین سے خط حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ میری واپسی میں تاخیر سے وہ یقیناً اندیشوں کا شکار ہو گا۔ اب مجھے تشویش لاحق ہونے لگی کہ کہیں وہ چراغ دین کی کوٹھی پر نہ پہنچ جائے جہاں پولیس پہنچ گئی ہو گی تو سلامت شاہ کی لاش کی دریافت سے کہرام بپا ہو گا۔ میں نے رکشہ پکڑا اور سیدھا رابعہ کی کوٹھی پر پہنچا۔ رابعہ کی کار اندر پورچ میں کھڑی تھی اور رابعہ لان پر کرسی ڈالے خاموش بیٹھی کسی سوچ میں گم تھی۔ کوٹھی کا رخ مشرق کی جانب تھا چنانچہ سہ پہر کو دو منزلہ عمارت کا سایہ لان پر پھیل جاتا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرائی اور میں نے اسے سرتاپا زرد لباس میں دیکھا جس پر سرخ نیلے اور گلابی شگوفے کھلے ہوئے تھے تو مجھے سرسبز گندم کے لہلہاتے کھیتوں میں سرسوں کے پھولوں کی یاد آئی۔ لباس کے رنگ کا عکس اس کی صورت پر محسوس ہوتا تھا۔ رنگ بڑے نظر فریب ہوتے ہیں۔ بے داغ سفید رنگ طہارت، پاکیزگی اور معصومیت کا احساس جگاتے ہیں۔ گہرے سرخ رنگ حیوانی جذبات کو ابھارتے ہیں۔ شاید اسی لیے کہ یہ رنگِ حنا اور لباسِ عروسی کا رنگ ہے۔ نیلا رنگ فرحت اور تازگی عطا کرتا ہے تو سیاہ رنگ حسن کے وقار اور متانت کے تاثر کو گہرا کرتا ہے۔ یہ میرے ذاتی تجربات کی بات تھی۔ زرد رنگ میں رابعہ مجھے کچھ زیادہ ہی اداس لگی۔ "میں سخت تھکا ہوا ہوں اور فوراً چائے نہ ملی تو... تو پانی پی کے گزارا کروں گا۔" میں نے دوسری کرسی پر گر کے کہا۔

وہ ہنس پڑی۔ "میں بھی چائے کا ہی انتظار کر رہی ہوں۔ تم کہاں سے آ رہے ہو؟"

"قبرستان سے۔" میں نے کہا۔ پھر میں نے اسے بتایا کہ میں چراغ دین سے کیسے ملا تھا۔ وہ ہنستی رہی۔ ذکر ہی سے میں نے خط کی اور سلامت شاد کی بات گول کر دی۔ میں نے یہ بھی بتا دیا کہ میں جنازے میں شریک ہونے والوں سے کیسے رابطہ قائم کروں گا پھر میں نے محسن کے بارے میں پوچھا اور مجھے یہ جان کر مایوسی ہوئی کہ وہ دوپہر کے کھانے کے لیے آیا تھا مگر دو بجے ایمبیسیڈر ہوٹل چلا گیا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ منظر صاحب نے قبر کھدوا کے پوسٹ مارٹم کروانے کی درخواست لگا دی ہے اور اس کی سماعت کل ہی ہو جائے۔ ایک گواہ اگر محبت خان

تو باقی گواہ مجھے کل ہی تلاش کر لینے چاہئیں جو عدالت میں حاضر ہو کے بیان اور حلف نامہ دے سکیں۔ دو تین دن میں جب میڈیکل بورڈ پوسٹ مارٹم کرے گا تو ان سب کو گورکن کے ہمراہ قبرستان میں موجود رہنا ہو گا۔ میں نے کہا کہ انشاءاللہ کل صبح مجھے گواہ مل جائیں گے اور ممکن ہے عدالت کے ذریعے میں اس ڈاکٹر کو بھی طلب کروں جس نے میرے والد کا علاج اور آخری بار معائنہ کیا تھا۔ آخر قبرستان کے رجسٹر میں یہ کیسے لکھ دیا گیا کہ انتقال حرکتِ قلب بند ہو جانے کے باعث ہوا۔ پھر میں نے رابعہ سے کہا کہ میں جلد از جلد ہوٹل پہنچنا چاہتا ہوں چنانچہ چائے پھر سہی۔ میں اس خط کے بارے میں تفصیلات جاننے کے لیے سخت بے چین تھا۔

"یہ کیا افراتفری ہے؟" وہ حیران ہو کے بولی "محسن ایسے بھاگا جیسے یہاں پولیس چھاپہ مارنے والی ہے۔ تم ابھی کہہ رہے تھے کہ فوراً چائے نہ ملی تو پتا نہیں کیا ہو جائے گا۔ اب چائے چھوڑ کے بھاگنا چاہتے ہو۔ ایسی کیا جلدی ہے؟"

"اچھا۔" میں نے ہتھیار ڈالنے کے انداز میں کہا۔ "اس سے فون پر تو بات کر لوں۔ اس کے بعد جب تک تم نہیں کہو گی میں نہیں جاؤں گا۔"

"ابھی وقت ہے اپنے الفاظ واپس لے لو۔" وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی۔ "تم یہ قول نبھا نہیں سکو گے۔"

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ رابعہ نے میرے الفاظ کے جال میں مجھے فوراً بند کر لیا تھا۔ میں نے اس کی نظروں کے سوال کو پڑھ لیا اور اس بات کو سمجھ لیا جو الفاظ کے پردے میں نہاں تھی۔ اگر میں نے نہ کہا تو؟ تو کیا تم یہیں رہ جاؤ گے؟ مطلب بالکل صاف تھا اور میرے لیے اپنے الفاظ کو واپس لینے کے سوا چارہ نہ تھا۔

"میرا مطلب صرف آج سے تھا۔" میں نے خفت سے ہنس کے کہا اور کھڑا ہو گیا۔

وہ ہنسی۔ "ذہین تو تم شروع سے ہو۔ بڑی جلدی فرار کی راہ نکال لی۔ اچھا جلدی سے بات کر آؤ۔ بابا چائے لاتا ہی ہو گا۔"

اندر جا کے میں نے ماسی سے پوچھا کہ ٹیلی فون کس کمرے میں ہے اور اس نے کہا "اوپر بھی ہے بی بی کے کمرے میں اور نیچے ڈرائنگ روم میں بھی ہے۔" اور ہاتھ سے ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ اس دروازے کی طرف جانے سے پہلے میں نے حسبِ عادت ماسی کو زیرِ لب کچھ کہتے سنا۔ وہ غالباً خود کلامی کی عادی تھی اور ہر بات سنسر کرنی ہوتی تھی۔ وہ اپنے آپ سے کہہ کے مطمئن ہو جاتی تھی۔ ایمبیسیڈر ہوٹل کا نمبر ملا کے میں نے آپریٹر سے کمرہ نمبر تین سو تیرہ مانگا۔ ایک منٹ بعد محسن نے ہیلو کہا۔

"محسن، میں سکندر بول رہا ہوں۔ رابعہ کے گھر سے۔" میں نے کہا۔ "تو ہوٹل کیوں بھاگ گیا؟"

"میں نے مناسب سمجھا کہ لاک روم سے سامان سیدھا ہوٹل پہنچا دوں۔ رابعہ کو تنگ ہی نہ ہو۔" وہ بولا۔

"وہ خط مل گیا ہے نا تجھے؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔" وہ بولا۔ "خط آج کی ڈاک میں نہیں تھا۔ بالو پوسٹ مین کا خیال ہے کہ وہ خط دیر سے پوسٹ کیا گیا ہو گا۔ آج نکلے گا تو کل ملے گا۔ تو بتا وہاں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی۔"

"نہیں۔" میں نے سوچ کر کہا۔ "ایسی کوئی بات نہیں۔ جو ہے وہ میں ملاقات پر بتاؤں گا۔"

"ابھی آنے کا ارادہ نہیں ہے کیا؟" وہ بولا۔ "وہاں کیا کر رہا ہے تو؟"

"رابعہ سے باتیں۔" میں نے کہا۔ "سو فی صد قانونی مسائل پر۔ اس کے بعد مجھے ایک ڈاکٹر سے ملنے جانا ہے۔ میں رات تک آؤں گا۔ ظاہر ہے تو کمرے میں قید نہیں رہ سکتا۔ تو ضامن رضوی صاحب سے ملنے چلا جا۔ دونوں باتیں کر لے۔ میں آٹھ بجے سے نو بجے کے درمیان ضرور آ جاؤں گا۔"

میں نے ریسیور رکھا ہی تھا کہ رابعہ کی آواز آئی۔ "یہ دوسری عہد شکنی۔ ابھی کہا تھا کہ مطلب آج سے تھا۔ آج کا دن آٹھ نو بجے تو ختم نہیں ہوتا۔"

میں نے خفت سے سر کھجایا۔ "غلطی ہو گئی۔ میں بھول گیا تھا کہ عہد ایک وکیلن سے کیا تھا۔ بقولِ چچا کے۔ بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات۔ عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا۔"

وہ ہنسی۔ "چلو اب زیادہ باتیں مت بناؤ۔ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔" اور یہ بات کہتے ہوئے اس کے رخسار کا رنگ گلابی ہوا تو میں اسے احمقوں کی طرح دیکھتا رہا۔ آخر اس اچھی بھلی ذہین، باشعور، سنجیدہ اور ہوش مند عورت کو کیا ہو رہا ہے؟ یہ آغازِ شباب کا پہلا عشق کرنے والی لڑکی کی طرح میرے الفاظ کو غلط معانی کیوں پہنانے لگی ہے اور باتوں کا وہ مطلب کیوں نکالنے لگی ہے جو میرے ذہن میں نہیں مگر اس کے دل میں ہے۔ کیا عورت واقعی عورت

رہتی ہے۔ جذباتی طور پر آتش فشاں جو برسوں اندر ہی اندر سلگتا رہتا ہے اور کسی روز اچانک پھٹ پڑتا ہے۔ ذہنی برتری کے تمام بلند بانگ دعووں کے باوجود جذباتی طور پر بے حد کمزور۔ دل کے معاملات میں عقل کو بالائے طاق رکھ دینے والی۔ نکہت و نور اور رنگ روپ کی دہکتی آگ جس کی تپش قریب آنے والوں کی نظروں کو خیرہ کر دے اور بے خطر اس آگ میں بھی کود پڑنے پر مجبور کر دے۔ وہ وکیل ہو۔ ڈاکٹر انجینئر۔ جنرل یا خلا نورد۔ خود سپردگی کے سیلِ بے عناں میں فقط عورت ہے۔ اس کے ساتھ واپس لان پر لوٹتے ہوئے میں نے سوچا کہ اگر ایسا ہے تو کیا غلط ہے۔ جنس تو ایک حیوانی جذبہ ہے۔ آبرو ریزی کے واقعات کی خبریں اس بات کا ثبوت ہیں کہ اس جذبے کی درندگی سے مغلوب اور عقل و ہوش سے بیگانہ ہو جانے والے وہ سب کر گزرتے ہیں جس پر انسانیت کا سر شرم سے جھک جائے مگر جنسی تشدد کے واقعات میں عورت کی ذات کہاں ملوث ہوتی ہے۔ اسے تو اپنے جذبات کی سرکشی پر پورا اختیار حاصل ہے مگر اس کے باوجود وہ مجبور بھی ہے۔ پھر میں نے کہا میاں سکندرِ اعظم۔ ہوش کے ناخن لو۔ یہ تم کیا خود کو یوسفِ ثانی اور زبردست "لیڈی کلر" سمجھ رہے ہو۔ ہو سکتا ہے سب تمہاری اپنی عقل و نظر کا پھیر ہو۔ بھلا رابعہ تم پر کیوں مرنے لگی۔ اس پر مرنے والے کیا کم ہوں گے۔

تجدیدِ تعلق کو جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے۔ پھر مجھے یہ خوش فہمی کیوں ہے کہ وہ برسوں سے جس یوسفِ گم گشتہ کی بازدید کے لیے چشم براہ تھی وہ میں ہی ہوں۔ میں جسے پیار کا انداز سمجھ بیٹھا ہوں۔ یہ تبسم یہ تکلم تیری عادت ہی نہ ہو!

ان دلائل کے بعد میری عقل جو گھاس چرنے چلی گئی تھی لوٹ آئی۔ میں نے رابعہ سے کہا۔ "تمہاری امی نظر نہیں آ رہی ہیں؟"

"ان کو کبھی کبھی ڈپریشن کا دورہ پڑتا ہے۔" وہ بولی۔ "قنوطیت۔ مایوسی۔ بیزاری اور مکمل عدم دلچسپی۔ یہ سب کیفیات مل کر بھی اس ایک لفظ کا متبادل فراہم نہیں کرتیں۔ ڈپریشن۔"

"کب سے ہے یہ شکایت؟" میں نے رسماً پوچھا۔ "اس کی وجوہات تو صرف نفسیاتی ہوتی ہیں۔"

"ہاں۔ وہ نفسیاتی وجہ میں ہوں۔" وہ بولی۔ "اور یہ شکایت انہیں اس وقت سے ہے۔ خیر چھوڑو۔" اس نے چائے کی پیالی میری طرف بڑھائی۔

"پوری بات کرتے ہوئے تم کس سے ڈرتی ہو؟" میں نے اسے غور سے دیکھ کر کہا۔ "مجھ سے یا اپنے آپ سے۔ آخر تم ان کے مرض کی وجہ کیوں ہو؟"

"اس لیے کہ بامحاورہ اردو کے مطابق ابھی تک میرے ہاتھ پیلے نہیں ہوئے۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

"اگر مرض یہ ہے تو علاج کیا ہے؟" میں نے کہا۔ "تم کو اچھی طرح معلوم ہے۔ قصور پھر کس کا ہے؟"

"ہاں۔ غور طلب بات یہ ہے کہ قصور پھر کس کا ہے۔" وہ تلخی سے بولی۔ "یہ سوال اکثر عدالت میں اٹھایا جاتا ہے۔ عدالت میں ہر قسم کے کیس آتے ہیں۔ اغوا اور آبرو ریزی کے بھی۔ اور ان سب کی پیروی کرتے ہوئے میں صرف وکیل رہ جاتی ہوں۔ بڑی بے شرمی سے میں اپنے موکل کا دفاع کرتی ہوں اور میرے دلائل سن کے مرد دانتوں تلے انگلی داب لیتے ہیں اور بڑی بے حیائی سے ہنستے ہیں اور ایک دوسرے کو فحش اشارے کرتے ہیں لیکن ڈاکٹر اور وکیل کا پیشہ ہی ایسا ہے کہ حقائق کو بے لباس کر کے تلاش کرنا پڑتا ہے اور دوسروں کو بھی دکھانا پڑتا ہے۔ تم نے جو سوال کیا ہے اس میں اپنی موکل میں خود ہوں اور اپنا کیس تمہاری عدالت میں ایک وکیل کی طرح پیش کروں تو مجھے کہنا ہوگا کہ حضور والا۔ میں ایک بہت فرماں بردار۔ نیک اور مشرقی ماحول کی پروردہ لڑکی تھی جس کی شادی میرے والدین نے روایتی طور پر مجھ سے پوچھے بغیر طے کر دی تھی اور میں نے ان کے فیصلے کو بلا چون و چرا قبول کیا تھا۔ حالانکہ اس وقت بھی میں وکیل تھی مگر حقیقت یہ ہے کہ میں نے اپنے ہونے والے شوہر کو دیکھا تک نہ تھا۔ منگنی کے ایک سال بعد میرا نکاح ہوا۔ پھر دوسرا سال گزر گیا۔ پھر تیسرا... پھر چوتھا مگر رخصتی کی نوبت نہ آئی۔ پانچویں سال میں اس نے مجھے طلاق دے دی۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ "کیوں۔؟ اس کا دماغ خراب تھا کیا؟"

"نہیں مائی لارڈ۔ وہ بہت ذہین سی ایس پی افسر تھا۔ اس نے بعد میں بہت ترقی کی۔ اس کا دماغ خراب کیسے ہو سکتا ہے۔" وہ اسی سپاٹ اور تند لہجے میں بولتی گئی۔ "مدعا علیہ کے اس انداز کے متعدد اسباب ہو سکتے ہیں۔ اسے یہ شادی یعنی میری موکلہ پسند نہ تھی۔ اسے میری موکلہ کے کردار کے بارے میں شر انگیز اطلاعات فراہم کی گئیں۔ بدخواہوں نے سفلی عمل کے ذریعے علیحدگی کرا دی۔ مدعا علیہ کسی اور سے عقد کرنے کا

خواہش مند تھا۔"

"لیکن ان میں سے ایک وجہ صحیح ہوگی۔" میں نے کہا۔

"صحیح وجہ یہ ہے جنابِ والا کہ مدعا علیہ شادی کے قابل ہی نہیں تھا۔" اس نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔ "کیونکہ تااطلاعِ ثانی اس نے عقدِ ثانی بھی نہیں کیا ہے۔ ماں باپ کے دباؤ میں آ کے اس نے یہ شادی کی تھی اور اس وقت وہ ذہنی طور پر اتنا بالغ نہیں تھا کہ اس حقیقت کا اعتراف کر سکتا۔ وہ رخصتی کو ٹالتا رہا یہاں تک کہ ماں باپ اسی حسرت کو دل میں لیے دنیا سے رخصت ہو گئے۔ پھر اس نے میری موکلہ کو طلاق دے دی۔ ویسے وہ شریف آدمی تھا کہ اس نے بہت جلد مجھے آزاد کر دیا۔" اس نے اپنا لہجہ بدل لیا۔" اس نے کہا کہ ابھی چند روز پہلے میں نے اسے فون کیا تھا۔ تمہاری ضمانت کے سلسلے میں مجھے اس کے اثر و رسوخ سے کام لینا تھا۔ اس نے یہ کام کر دیا۔"

میں اس انکشاف پر ہکا بکا بیٹھا رہا۔ "اس طلاق کے بعد.....!"

"اس کے بعد میں شادی کے نام سے متنفر ہو گئی۔" وہ بولی۔ "یہ ایک قدرتی ردِعمل تھا۔ میرے لیے کئی پیغام آئے جو میں نے مسترد کر دیے اور اب بھی میں کسی رشتے کو نامنظور کرتی ہوں تو ماں پر ڈپریشن کا دورہ پڑ جاتا ہے۔"

"کیا آج بھی تم نے کوئی رشتہ نامنظور کیا ہے؟" میں نے ہمت سے کام لے کر پوچھ لیا۔

"ہاں۔" وہ بولی۔ "ماں نے کہا تھا محسن اچھا لڑکا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

"محسن واقعی اچھا لڑکا ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ بہترین رفیقِ حیات بن سکتا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔ مگر اس نے کہا میری تو نسبت طے ہو چکی ہے۔" وہ تلخی سے ہنسی۔ "اس نے جھوٹ بولا اور وہاں سے بھاگ گیا۔ بتاؤ قصور کس کا ہے؟"

میں ایک دم کھڑا ہو گیا۔ "رابعہ۔" میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "میں اب چلتا ہوں۔" اور وہاں سے بھاگ آیا۔ میں نے بہت احمقانہ سوال کیا تھا کہ قصور کس کا ہے۔ قصور کبھی کسی کا نہیں ہوتا۔ تقدیر کا بھی نہیں کیونکہ جو کچھ تقدیر میں ہے وہ ناگزیر ہے اور اٹل ہے۔ رابعہ۔ اس کی ماں۔ اس کا سابق شوہر۔ محسن اور میں۔ سب اپنی اپنی مجبوریوں کے باعث قصوروار ہیں۔ کیا میں خود رابعہ کی ماں کا ڈپریشن ختم نہیں کر سکتا تھا؟

لیکن میرے پاس فوزیہ سے جذباتی وابستگی کا عذر تھا۔

محسن کے پاس عذر تھا کہ یہ مسئلہ وہ اپنے والدین خصوصاً اپنی ڈکٹیٹر ٹائپ ماں کی رضامندی کے بغیر خود طے کرنے کا مجاز نہیں اور ان کے بارے میں یقین کے ساتھ کہا جا سکتا تھا کہ وہ رابعہ کی عمر کو اور اس کے پیشے کو طوعاً و کرہاً قبول کر لیتیں تو اس لڑکی کو کبھی قبول نہ کرتیں جسے شوہر نے گھر بیٹھے بیٹھے طلاق نامہ بھیج دیا ہو۔ شاید یہ سچ بھی ان کے لیے قابلِ قبول نہ ہوتا کیونکہ اس معاشرے میں قصوروار صرف عورت ہے۔ رابعہ میں ہو گی کوئی نہ کوئی ایسی خامی اور بے حیا اب اپنے منہ کی سیاہی اس کی صورت پر ملتی پھرتی ہے۔ سارے زمانے کی آنکھ میں دھول جھونکنے کے لیے۔ ان کا حتمی فیصلہ ہوتا۔ محسن نے رابعہ کو یقیناً پسند کیا تھا مگر وصالِ یار فقط آرزو کی بات نہیں۔ اس انکشافِ حقیقت نے اسے فرار پر مجبور کر دیا۔ مجھے رابعہ پر ترس آیا۔ ترس کھانے کے سوا میں کیا کر سکتا تھا۔ اس نے متعدد عدالتوں میں دوسروں کی مظلومیت کے مقدمات جیتے ہوں گے حق دار کو اس کا حق دلوایا ہوگا اور ناانصافی کا مرتکب ہونے والے کو سزا دلوائی ہو گی مگر خود اپنے حق کی خاطر وہ کسی عدالت میں اپنا مقدمہ نہ لے جا سکی۔ اپنی زندگی کے ساتھ ہونے والی ناانصافی پر کسی کو فریق بنا کے ملزموں کے کٹہرے میں نہ لا سکی۔ مجھے اس کی بزدلانہ بے بسی پر سخت جھنجلاہٹ محسوس ہوئی۔ وہ کیوں خاموش رہی۔ معاشرتی اقدار کی ان زنجیروں کو توڑ کے اس سی ایس پی افسر کا گریبان کیوں نہیں تھاما اور اسے کھینچ کر عدالت تک کیوں نہیں لے گئی؟ اس نے پانچ سال کے انتظار کے کرب کا ہرجانہ کیوں نہیں وصول کیا؟ اس کو دنیا کے سامنے ننگا کیوں نہیں کیا جس نے اپنی عزت پر جھوٹا پردہ ڈالے رکھنے کے لیے منگنی اور نکاح کا جھوٹا ڈرامہ کیا اور پانچ سال لوگوں کی امیدوں سے ارمانوں سے اور جذبات سے کھیلتا رہا۔ لوگ جن میں اس کے اپنے ماں باپ رابعہ اور اس کی ماں سب شامل تھے۔ شاید رابعہ اپنی ماں کی وجہ سے مجبور تھی ورنہ کسی گناہ کے بغیر پانچ سال کی نظربندی کے خلاف آواز ضرور اٹھاتی۔ یہی تو مشرقی عورت کا المیہ ہے۔ ہوتی امریکی معاشرے کی کوئی لڑکی تو اسے شوٹ کر دیتی اور معاشرہ اس فعل کے جواز کو تسلیم کرتا۔ رابعہ کہتی ہے کہ وہ شریف آدمی ہے۔ کون شریف ہے اور کون نہیں ہے۔ اگر اس کی سند دینے والوں کے معیار ہی غلط ہیں تو پھر خود یہ غلطی کیوں کرتی ہے۔ میں نے رابعہ کو بہت سی مروجہ گالیاں دیں۔ احمق۔ عاقبت نااندیش۔ بزدل۔ عورت ذات ناقص العقل

وغیرہ وغیرہ۔

جب میں نے ریلوے ہوسٹل کے اس ڈاکٹر کے پرائیویٹ کلینک میں قدم رکھا جس نے آخری ایام میں میرے والد کا علاج کیا تھا تو شام کے سائے ڈھل چکے تھے۔ اس کا یہ کلینک گڑھی شاہو کی ایک بغلی سڑک پر اپنے ہی گھر کے ایک کمرے میں واقع تھا۔ ابھی مریضوں کے آنے کا وقت نہیں ہوا تھا یا اس کی پریکٹس ہی کم چلتی تھی کہ کمرے میں صرف ایک عورت اپنے بچے کو دکھا رہی تھی۔ جب وہ فارغ ہوا تو اس نے مجھے دوسرا مریض سمجھ کے اپنے قریب پڑے ہوئے اسٹول پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اسٹول پر بیٹھ کے میں نے اپنا تعارف کرایا۔

"اچھا اچھا" وہ سر ہلا کر بولا "تم پر تو قتل کا ایک مقدمہ بھی چل رہا ہے۔ میں نے اخبار میں دیکھا تھا۔ مگر تم نے یہ کیا احمقانہ بیان دیا ہے کہ وزیر خان کو قتل کیا گیا تھا اور ان کی موت طبعی نہیں تھی"

"ڈاکٹر صاحب" میں نے سکون سے کہا "عدالت کا فیصلہ ہونے سے قبل کسی مقدمے پر ایسا تبصرہ توہین عدالت کے زمرے میں آتا ہے۔ میں نے لاش نکلوا کے پوسٹ مارٹم کرانے کے لیے درخواست دے دی ہے۔ ابھی یہ طے ہونا باقی ہے کہ میرا خیال احمقانہ تھا یا نہیں" اس کے جارحانہ رویے نے مجھے مجبور کر دیا تھا کہ میں بھی شرافت کو بالائے طاق رکھ دوں۔

"خیر چھوڑو اس بات کو۔ یہاں کیوں آئے ہو؟" وہ غصے کو ضبط کرتے ہوئے بولا۔

"مجھے یہ پوچھنا تھا کہ کیا میرے والد وزیر خان مرحوم کو گٹھیا کے سوا بھی کوئی عارضہ لاحق تھا!" میں نے کہا۔

"اگر تھا تو اس کا علاج میں نہیں کر رہا تھا" وہ بولا۔

"آپ کے خیال میں گٹھیا سے کسی کا ہارٹ فیل ہو سکتا ہے؟" میں نے کہا۔

"ہارٹ فیل کسی کا بھی ہو سکتا ہے" گٹھیا کی کوئی شرط نہیں" اس نے عمداً اصل بات کے اعتراف سے گریز کیا۔

"مجھے ان ایک ہزار ایک اسباب سے سروکار نہیں" میں نے سخت لہجہ اختیار کیا "مجھے یہ بتاؤ کہ کیا گٹھیا کے باعث کسی کی حرکت قلب بند ہو سکتی ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے یہ بیماری بھی ابتدائی مرحلے میں تھی اور وہ خود چل کے آپ کے پاس آتے تھے"

"میرے پاس نہیں۔ ریلوے کے ہسپتال" وہ طنز سے بولا "تمھارے سوال کا جواب ہے کہ نہیں۔ گٹھیا ہارٹ فیل ہونے کا سبب نہیں بن سکتا"

"ان کے انتقال کے بعد آپ ہی ان کو دیکھنے گئے تو آپ کے خیال میں ان کی موت کا سبب کیا تھا؟"

"میں نے کوئی رائے نہیں دی تھی۔ موت کو دو گھنٹے ہو چکے تھے"

"قبرستان میں یعنی لاہور میونسپل کارپوریشن کے دفتر پیدائش و اموات کے ریکارڈ پر موت کا سبب ہارٹ فیل درج ہے"

"وہ میں نے نہیں لکھا۔ اس کا کوئی ثبوت نہیں"

"اس بات کے گواہ موجود ہیں" میں نے اسے یاد دلایا "ہو سکتا ہے تمھیں عدالت میں وضاحت کرنی پڑے"

"جب وقت آئے گا تو میں عدالت کو جواب دے لوں گا" وہ چراغ پا ہو کے بولا "تم کون ہوتے ہو مجھے دھمکی دینے والے گیٹ آؤٹ" میں نے اس کی گردن دبوچ لی "میں مرنے والے کا وارث ہوں۔ اس کا بیٹا"

اس نے ایک جھٹکے سے اپنی گردن چھڑا لی "تم ایک قاتل ہو۔ اور بدمعاش" اس نے ہانپتے ہوئے کہا اور ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھایا "میں ابھی پولیس کو فون کرتا ہوں میرے کلینک میں آ کے غنڈہ گردی"

میں نے لات مار کے ٹیلی فون کا تار توڑ دیا "میرے یہاں سے چلے جانے کے بعد اس تار کو جوڑ کے پولیس سے جو چاہو کہنا۔ خودکشی کر کے کہہ دینا کہ وزیر خان کا بیٹا قتل کر گیا۔ یہاں سے نکل جانے کے بعد میں بالکل محفوظ ہوں۔ ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے دو بہت سینئر وکیل گواہی دیں گے کہ میں ان کے پاس بیٹھا اپنے کیس کی بات کر رہا تھا۔ ایس ایس پی ضامن رضوی بھی کہہ سکتے ہیں کہ میں ان کے ساتھ تھا کیونکہ وہ میرے انکل کے دوست ہیں جو وزارت خارجہ کے ڈپٹی سیکرٹری اور میرے ضامن ہیں۔ اس کے علاوہ میں اس وقت "فلیٹیز" کے سوٹ نمبر چار میں موجود ہوں" میں نے عمداً ہوٹل کا نام غلط بتایا اور اسے چھوڑ دیا "اگر تمھارے حلق سے آواز نکلی تو بات سمجھ لو۔ میں جوڈو جانتا ہوں۔ ایک معمولی سا ہاتھ رسید کروں گا اور تم آدھے گھنٹے کے لیے جام ہو جاؤ گے۔ اس لیے اب میں چلتا ہوں۔ پھر کورٹ میں ملیں گے"

میرا خیال ہے وہ واقعی ڈر گیا تھا چنانچہ وہ مجھے جاتے دیکھ کر بھی نہیں ہلا اور میرے رخصت ہو جانے کے بعد بھی اس نے چیخ پکار نہیں مچائی ورنہ مجھے واقعی جوتے بغل میں دبا کے بھاگنا پڑتا اور شاید وہاں میری موجودگی کے عینی گواہ پیدا ہو جاتے۔ وہ بہت خبیث آدمی تھا اور اسی سلوک کا مستحق تھا۔ میں نے خطرناک علاقے سے نکل کے طے کیا اور کراؤن سینما کے راستے رابعہ کی کوٹھی کے سامنے سے گزر کر پیدل چلتا ہوا ایمبیسڈر ہوٹل پہنچ گیا۔ ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں بہت سے لوگ موجود تھے مگر مجھے ان میں محسن کا چہرہ دکھائی نہ دیا۔ وہ اوپر کمرے میں بھی موجود نہیں تھا اور کاؤنٹر کلرک نے بورڈ پر نگاہ ڈال کے مجھے مطلع کیا کہ وہ چابی چھوڑ کے کہیں گئے ہیں۔ میں نے کھانے کا فیصلہ کیا اور ڈائننگ ہال کے ایسے حصے میں جا بیٹھا جہاں سے میں باہر بھی دیکھ سکتا تھا اور دروازے سے اندر آنے والوں کو بھی۔ دن بھر کی مشقت کا حاصل جسمانی تھکن اور کوفت کے سوا کچھ نہ تھا۔ چراغ دین نے کوئی کام کی بات نہیں بتائی تھی۔ محسن کو وہ خط نہیں مل سکا تھا جو گلاب خان کے نام پر آنے والا تھا۔ رابعہ کی داستان حیات کا المیہ مجھے بھی ڈیپریشن میں مبتلا کر رہا تھا اور اب اس ڈاکٹر نے عملاً انکار کر دیا تھا کہ وزیر خان نام کے کسی مریض کو اس نے وفات سے پہلے اور وفات کے بعد کبھی دیکھا ہی نہیں۔ "اپنا غم تیرا غم جہاں کا غم۔ ہم بھی رکھتے ہیں زاد راہ عدم" اپنی کیفیت کے حسب حال یہ شعر یاد کر کے میں نے سوچا کہ منزل عدم کی فکر میں مبتلا ہونے سے مسافت عدم میں کمی بیشی نہیں ہوتی۔ آنے والے دن سے کیا ملے گا۔ رنج یا راحت۔ دکھ سکھ۔ امید اور ناامیدی۔ کامیابی یا ناکامی۔ یہ آج کیسے طے کیا جا سکتا ہے۔ وہ خط پوسٹ ہوا تھا یا نہیں۔ پوسٹ ہوا تھا تو کل کیسے ملے گا۔ نہیں ملا تو ہمارے ذہن میں الجھن پیدا کرنے والے سوالات کا کوئی جواب فراہم کرے گا یا نئے سوالوں کو جنم دے گا۔ رابعہ جو خواہشوں کے طلسم اور خوابوں کے فریب میں مبتلا ہے اس حقیقت کو تسلیم کرے گی کہ ڈیپریشن کا شکار اس کی ماں نہیں وہ خود ہے اور آخر کب تک وہ سرابوں سے جذبات کے رشتے استوار کرتی رہے گی؟ سلامت شاہ کی عدم موجودگی میں (جس کی لاش شاید اب تک صندوق سے نکال کے مردہ خانے کی کسی میز پر ڈھیر کر دی گئی ہو گی) کیسے ثابت کروں گا کہ وزیر خان کا علاج کرنے والا اور موت کے بعد ان کی موت کے غلط اسباب کا تعین کرنے والا ڈاکٹر کون تھا۔ اور بالآخر یہ ثبوت کیسے فراہم کروں گا کہ جس وقت میر شرافت علی کا قتل ہوا میں سلامت شاہ کے ساتھ تھا۔ ذہن پر یلغار کرنے والے یہ سوال دشت کی تنہائی میں اکیلا مسافر کو گھیر لینے والے غول بیابانی کی طرح تھے جو فراغت

کی گھڑی دیکھتے ہی لاشعور کے ہر نہاں خانے

سے نمودار ہو جاتے تھے اور ان کا سلسلہ سرطان کے خلیوں کی طرح پھیلتا تھا۔ ایک سے دو۔ دو سے چار۔ چار سے آٹھ۔ سولہ۔ بتیس۔ پھر چونسٹھ۔ میرے لیے اماں کہیں نہ تھی اور اپنے دفاع کی سب سے مؤثر صورت یہ تھی کہ خود کو مصروفیت کے حصار سے باہر نہ آنے دوں۔ بقول انگریز کے۔ خالی دماغ شیطان کی ورکشاپ بن جاتا ہے۔ تو دماغ کو حتی الامکان کام سے لگائے رکھوں۔ میں نے مینو کا یوں مطالعہ شروع کیا جیسے اول تا آخر حفظ کرنے کا ارادہ ہے اور جب مشرق و مغرب کے طعام پر چینی کھانوں کی ترجیح کا فیصلہ ہوا تو دس منٹ گزر چکے تھے۔ آرڈر کی تعمیل تک میں نے صورتوں کا مطالعہ کیا۔ ہر چہرہ ایک کتاب تھا۔ کچھ کتابی چہرے تھے۔ کچھ آفتابی۔ چشم و ابرو میں اور رنگ لب و رخسار میں لندن، پیرس اور نیویارک کے میک اپ کا طلسم تھا۔ سولہ سنگھار جب محاورتاً تھے تو مبالغہ سمجھے جاتے تھے۔ اب ہیلن کرٹس۔ الزبتھ آرڈن۔ میکس فیکٹر اور درجنوں سامان آرائش بنانے والوں کی مصنوعات کی فہرست حیران کرتی ہے۔ پیر کی چھوٹی انگلی سے لے کر زلفوں تک سنگھار کے سولہ سو اسباب۔ سولہ سو رنگ۔ سولہ سو انداز۔ ایک بار کسی کیٹلاگ کو دیکھ کر میں نے سوچا تھا کہ کیا یہ سب اشیاء ایک عورت استعمال کر سکتی ہے اور پھر کسی تقریب میں شرکت کے لیے چوبیس گھنٹے میں تیار ہو سکتی ہے۔ ایسا ہی احمقانہ خیال مجھے کھانے کا اور محسن کا انتظار کرتے ہوئے پھر آیا۔ کہ کاش میرے لیے کسی غیبی قوت کے ذریعے ہر چہرہ پڑھنا ممکن ہوتا اور میں دیکھ سکتا کہ ہر شوخ ادا کے پیچھے کتنا کرب ہے اور ہر مسکراہٹ کے پیار میں نفرت کا کتنا زہر ہے اور مسرت میں جو آنکھوں میں ستارۂ سحری کی طرح جھلملاتی ہے کتنے دکھوں کا نوحہ ہے۔ باوردی مہذب ویٹر بڑی مستعدی سے ہر ٹیبل پر سے برتن ہٹا رہے تھے اور پیر آرڈر پریس سرکرتے ادھر سے ادھر آ جا رہے تھے۔ کوئی ان کی صورت نہیں دیکھتا تھا۔ ہر ٹیبل کا ایک نمبر تھا اور یہ نمبر... پلاسٹک کے رنگین تکونے ٹکڑوں سے بنے چھوٹے سے اسٹینڈ پر سفید حروف میں نمایاں تھے۔ بارہ نمبر ٹیبل پر کون ہے!۔ ویٹر۔ ویٹر۔ ادھر چوبیس نمبر کا آرڈر کس نے لیا تھا!۔ مثلاً مجھے یاد آیا کہ مجھے بھی آرڈر دیے ہوئے دس منٹ تو ہو چکے ہیں۔ لاحول ولاقوۃ۔ معلوم نہیں کون تھا وہ۔ آخر یہ سب بیرے وردی میں ایک جیسے کیوں ہو گئے ہیں۔ بس یہ احساس سا رہتا ہے کہ بہت لمبا ہے۔ یا موٹا ہے اور لمبی لمبی مونچھیں ہیں۔ نگاہ مینو پر رہتی ہے۔ ایک چکن کارن سوپ۔ ایک چکن۔ نہیں فرائیڈ پران اینڈ رائس۔ ابھی اگر میں اس

سے پوچھتا کہ میاں ذرا اپنا نام تو بتا دیجیے کہ پھر بلانا ہو تو کیسے پکاریں۔ تو ویٹر کتنے افسوس سے سر ہلاتا کہ ایسے اعلیٰ درجے کے ہوٹلوں میں کیسے کباڑی لوگ آنے لگے ہیں۔ ایک دم پینڈو۔ کیا آواز لگانے کا خیال ہے کہ بھیا اسلم۔ اے بھئی چودھری اسلم صاحب۔ وہ میں نے کچھ فرمائش کی تھی۔ ابھی آرڈر دیا تھا آپ کو۔ کیا بھول گئے!" اب وہ بھول بھی گیا تھا تو میرے لیے میز پر چمچہ بجانے اور "ویٹر ویٹر" پکارنے کے سوا چارہ نہ تھا۔ عین اسی وقت ویٹر نے میز پر کھانا لگانا.. شروع کیا اور میں نے نیپکن گھٹنوں پر پھیلاتے ہوئے ویٹر سے تاخیر کی شکایت کہنے کی بجائے کھانوں کی انتہا انگیز خوشبو سے مجبور ہو کے چھری کانٹے کا اسلحہ اٹھایا اور کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ کھانا بہت اچھا تھا چنانچہ میری نظر گردوپیش پر نہ رہی۔ میں نے شیشوں سے باہر بھی نہیں دیکھا اور دروازے پر بھی نگاہ نہیں رکھی جس سے مجھے محسن کے آنے کا علم ہوتا۔

جب میں کھانے سے فارغ ہوا تو ساڑھے نو ہو چکے تھے۔ تشویش کی کوئی بات نہیں تھی کیونکہ محسن میرے خیال کے مطابق ایس ایس پی ضامن رضوی صاحب سے ملنے گیا تھا جو اس کے ڈیڈی کے دوست تھے۔ عین ممکن ہے انھوں نے کام کی بات سننے کے بعد محسن کو کھانے پر روک لیا ہو۔ دس ساڑھے دس بجے تک اس کا انتظار کیا جا سکتا تھا۔ میں نے اطمینان سے بیٹھ کے سگریٹ سلگائی اور ویٹر کو کافی کے لیے کہا۔ ہال میں اب پہلے جتنے لوگ نہیں رہے تھے مگر اس کے باوجود آدھے سے زیادہ ہال بھرا ہوا تھا۔ یہ سب سوسائٹی میں اعلیٰ مقام رکھنے والے شریف لوگ تھے جو نجی اور کاروباری ہر قسم کی گفتگو میں مصروف تھے اور کسی کو کسی دوسرے کے معاملات سے سروکار نہ تھا۔ میرے جیسے نہ ہونے کے برابر تھے جو اکیلے بیٹھے تھے چنانچہ دوسروں کو دیکھ رہے تھے دوسروں کی سن رہے تھے اور دوسروں کے بارے میں سوچ رہے تھے۔

دس منٹ انتظار کرنے کے بعد میں نے ویٹر کو یاد دلایا کہ میں نے کافی کے لیے کہا تھا۔ اس نے شائستگی سے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ وہ دوسری ٹیبل کا ویٹر ہے تاہم وہ چوبیس نمبر کو بتا دے گا۔ مزید دس منٹ کے بعد میں نے کاؤنٹر کا رخ کیا۔ "آخر یہ کیا بدنظمی ہے۔ بیس منٹ پہلے میں نے کافی کا آرڈر دیا تھا۔ کیا کافی برازیل سے امپورٹ کی جائے گی؟"

میں نے مینیجر کے شفاف شیشوں والے کیبن میں جا کے کہا اور ہاتھ اٹھا کے انگلی سے اس میز کی طرف اشارہ کیا جہاں میں بیٹھا تھا۔ لیکن پلٹ کر دیکھتے ہی مجھے کافی میز پر رکھی ہوئی نظر آئی۔ میں نے تھوڑا سا خفیف ہو کے کہا کہ غالباً ویٹر تھا کہ میں شکایت کرنے اٹھوں اور وہ کافی رکھ دے نے میری مسکراہٹ کے جواب میں مسکرا کے رسماً اظہار کیا کہ مجھے زحمت ہوئی۔ واپس لوٹتے ہوئے میں نے کاؤنٹر کلرک کے پیچھے نمبروں والے اس بورڈ پر نگاہ ڈالی جس کے خانوں میں کچھ لوگوں نے اپنے کارڈ لگا دیے تھے تاکہ کسی کو علم نہ ہو تو ہو جائے کہ فلاں صاحب کس کمرے میں ہیں۔ وہیں خالی کمروں کی چابیاں لٹک رہی تھیں اور وہ چابیاں بھی جو مہمان جاتے ہوئے چھوڑ گئے تھے۔ محسن کی چابی اب غائب تھی جس کا مطلب یہی نکالا جا سکتا تھا کہ وہ آیا اور ڈائننگ ہال پر نگاہ ڈالے بغیر سیدھا چلا گیا۔ اور کھانا تو وہ کھا کے آیا ہوگا چنانچہ اب لیٹا چھت کو ملاحظہ کر رہا ہوگا اور میری طرح انتظار میں ہوگا۔ سبحان اللہ۔ کیا بے خبری ہے کہ ایک چھت کے نیچے موجود ہے دوسرا چھت کے نیچے اور دونوں ایک دوسرے کی باہر سے واپسی کے منتظر ہیں۔ میں نے خاصی عجلت میں کافی ختم کی جو عجیب بدذائقہ جوشاندے جیسا مشروب تھا۔ یہ اتنے اچھے ہوٹل کی ہدایات کی صریح خلاف ورزی تھی۔ میں نے مینیجر کو اور ساری انتظامیہ کو معاف کر دیا۔ آدمی خطا کا پتلا ہے۔ کیا معلوم کافی برازیل کی بجائے کھٹمنڈو سے منگوائی گئی ہو اور بنانے والے نے عشق یا کسی ذہنی عارضے میں مبتلا ہو کر اس میں سفید زیرہ بھی ڈال دیا ہو۔ "ویٹر" میں نے چلا کے کہا۔ "بل لاؤ۔" اور چونکہ ویٹر کا آس پاس کہیں وجود نہ تھا اس لیے متعدد افراد نے لاؤڈ اسپیکر کو پھر مجھے گھورا۔ کافی ٹھنڈی تھی۔ خیر۔ کھٹمنڈو سے آنے والی کافی اور کیا ہوگی۔ برفانی علاقے کی کافی تھی۔ میں نے کاؤنٹر کا رخ کرتے ہوئے طے کیا۔ پھر میں نے ایک مختصر سی تقریر کی جس کا موضوع تھا ویٹر نمبر چوبیس جو چوبیس منٹ بعد کافی اس وقت لایا تھا جب میں حکام بالا سے رجوع کر چکا تھا۔ پھر جو کافی وہ لایا اگر وہ واقعی برازیل کی تھی تو اس سے چین کے اور برازیل کے تعلقات پر برا اثر پڑ سکتا ہے اور اب میں بل کے لیے گلا پھاڑ رہا ہوں مگر چوبیس نے ابھی تک لبیک نہیں کہا۔ وغیرہ وغیرہ۔ کاؤنٹر کلرک نے روایتی شائستگی سے معذرت چاہی اور کہا کہ بل مسٹر محسن کے کمرے میں بھجوا دیا جائے گا۔ انشاءاللہ آلیں رات۔

محسن کے کمرے کا دروازہ بند تھا لیکن مقفل نہیں تھا اور اندر سے لائٹ نظر آ رہی تھی۔ میں نے قفل کے گول دستے کو

گھمایا اور دروازہ کسی تردد کے بغیر وا ہو گیا۔ "مسٹر محسن رضا" میں نے جوتوں سمیت بستر پر دراز ہو کے کہا۔ "تو نے رابعہ کا رشتہ نامنظور کر دیا۔ ناخلف۔" محسن رضا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ باتھ روم میں تھا اور واش بیسن میں ہاتھ یا منہ دھو رہا تھا۔ "قطع نظر اس بات کے کہ رابعہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ وہ بہت اچھی وکیل بھی ہے اور ہمارا انکار کرنا بہت سے قانونی مسائل پیدا کر سکتا ہے مثلاً یہ ہتک عزت کا کیس ہے۔ دھوکا دہی کا کیس بن سکتا ہے کہ تو نے اسے ورغلا کے شادی کا جھانسا دیا اور بھاگ گیا۔ وہ ذہنی اذیت کا ہرجانہ طلب کر سکتی ہے۔ اور چاہے تو دیگر ناشائستہ الزامات کے تحت تم پر دو مقدمات قائم کر سکتی ہے جو مجھ پر بھی نہیں۔ پھر ہم تم ساتھ ہوں گے۔ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔" آخر یہ کیا چکر ہے کہ میں مسلسل بکواس کر رہا ہوں اور اندر مسلسل پانی گر رہا ہے مگر نہ محسن باہر آتا ہے۔ نہ اس کا جواب آتا ہے۔ میں نے اٹھ کے غسل خانے کا رخ کیا۔ ابھی میں باتھ روم کی دہلیز پر ہی تھا کہ کسی نے مجھے پیچھے دھکا دیا اور میں روم کے اندر گیا تو پیچھے کھٹ سے دروازہ بند ہو گیا۔ میں نے خود کو تصادم سے بچانے کی خاطر زبردست بریک لگائے مگر غسل خانے کا فرش چکنا اور گیلا تھا۔ میں پھسلتا ہوا گیا اور دیوار پر منطبق ہو گیا۔ اسی وقت مجھے اپنے جسم میں پیچھے کی طرف کولہے کے پاس چبھن سی محسوس ہوئی۔ میں نے سنبھلنے کے لیے ہاتھ پھیلائے اور شاور کو پکڑ لیا۔ دوسرے ہاتھ سے پیشانی کو سہلاتے ہوئے میں نے پلٹ کر دیکھا تو باتھ روم میں محسن کی جگہ مجھے ایک اجنبی چہرہ نظر آیا۔ وہ تقریباً میرا ہم عمر آدمی تھا جو صورت سے بن مانس لگتا تھا اس کی صحت بھی مجھ سے بہت بہتر تھی اور وہ یقیناً پھرتیلا بھی تھا۔ جیسے ہی میں دیوار سے ٹکرا کے واپس ہوا تھا اس نے انجکشن سرنج کی سوئی آگے کر دی تھی اور سوئی خود ہی گوشت میں اتر گئی تھی میرے پلٹ کر دیکھنے تک اس نے انجکشن کا زہر میرے جسم میں اتار دیا تھا۔ بات فوراً میری سمجھ میں آ گئی۔ اس کا ایک ساتھی کمرے میں موجود تھا اور شاید کسی پردے کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ اس نے دبے پاؤں میرے پیچھے آ کے ٹکر ماری تھی۔ دوسرا باتھ روم کے اندر کھلے دروازے کے پیچھے انجکشن سے مسلح کھڑا انتظار میں تھا کہ پانی گرنے کی آواز اور محسن کا جواب نہ ملنے پر میں باتھ روم میں جھانکنے آؤں تو میرے قدم رنجہ فرماتے ہی وہ اپنا کام کر گزرے۔ ان دونوں کے کمرے میں داخل ہونے کی ایک صورت یہ تھی کہ وہ پچھلی جانب سے کھڑکی کا شیشہ توڑ کے کمرے میں کود جاتے مگر اس میں پکڑے جانے کے خطرات بھی تھے چنانچہ زیادہ جرأت اور چالاکی سے کام لے کر انھوں نے رش میں کاؤنٹر کلرک سے چابیاں لے لی تھیں جو لیں بھی محسن رضا کو کہاں شناخت کر سکتا تھا۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی تھی کہ وہ محسن رضا کے پیچھے پیچھے کمرے میں آ گئے اور اسے ٹھکانے لگا کے میرا انتظار کرتے رہے۔ ٹھکانے لگانے کا مطلب اسے بے ہوش یا بے بس کر کے بیڈ کے نیچے یا الماری میں ڈالنا بھی ہو سکتا تھا اور اس کا خاتمہ بھی۔

یہ سب خیالات چند سیکنڈ کی پیداوار تھے۔ جیسے بہت سی جزئیات پر مشتمل ایک منظر لمحہ بھر کے لیے ٹیلی وژن کے اسکرین پر دکھائی دے اور غائب ہو جائے۔ پھر مجھے محصور ہو کے مرنے سے پہلے مار دینے کی حیوانی جبلت نے مغلوب کر لیا۔ مجھے احساس ہوا کہ دشمن بالآخر اپنی چالاکی سے مجھے اسیر کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ زہر میرے وجود میں خون کی گردش کے ساتھ پھیل رہا ہے۔ میری زندگی کے صرف چند منٹ باقی رہ گئے ہیں اور میں کسی کو مدد کے لیے بھی نہیں پکار سکتا کیونکہ دروازہ باہر سے بند ہے۔ میرے چلانے کی آواز دوسرے کمروں کے مکینوں تک نہیں پہنچے گی اور کون جانے ساتھ والے کمرے خالی ہیں کہ مکین باہر گئے ہوئے ہیں۔ دروازہ توڑ کے باہر نکلنا اس سے بھی زیادہ مشکل کام تھا اور میرے لیے چند منٹ کی مہلت بہرحال اتنی کم تھی کہ نہ میں خود اپنی کوئی مدد کر سکتا تھا اور نہ کوئی دوسرا۔ میں نے اس وحشی درندے کی طرح حملہ کیا جس کے لیے فرار کے تمام راستے مسدود ہوں مگر شکاری سامنے ہو۔ شکاری کے لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی مگر وہ مقابلے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ اس نے بڑی صفائی سے خود کو بچا لیا اور میں اپنے ہی زور میں باتھ ٹب کے اندر جا گرا جو لبالب بھرا ہوا تھا اور اسی میں پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی جس پر مجھے گمان گزرا تھا کہ محسن منہ ہاتھ دھو رہا ہے۔

شکاری نے قہقہہ لگایا۔ "اگر ٹب خالی ہوتا تو تمھارا سر پھٹ جاتا۔ تمھیں شکر گزار ہونا چاہیے ہمارا۔"

میں نے اسے ایک غلیظ گالی دی اور ٹب میں سے نکل آیا۔ میری حالت سوٹ بوٹ سمیت سوئمنگ پول میں غوطہ مارنے والے شخص کی طرح ہو رہی تھی۔ پانی میری جیبوں میں۔ میرے جوتوں میں اور بالوں میں بھر گیا تھا اور سوٹ گیلا ہونے کے بعد بھاری ہو کے میرے جسم سے چپک گیا تھا چنانچہ میرے لیے آزادانہ نقل و حرکت کی راہ میں رکاوٹ بن رہا تھا۔ اس کے باوجود نہ میرا حوصلہ کم ہوا تھا اور نہ اعتماد۔ گرد پڑا اس وقت

ہوئی جب میں نے اچانک قدموں کے نیچے زمین کو ہلتا محسوس کیا اور مجھے زلزلے کا خیال آیا۔ میں نے پھر ہاتھ پھیلائے اور گرنے سے بچ گیا۔

شکاری پھر ہنسا۔ "آؤ۔ ہمت ہے تو کرو حملہ۔" اس نے مجھے اشارے سے اپنی طرف بلایا۔ میں نے پھر جست لگائی مگر خود میں نے یہ محسوس کیا کہ میری حرکت سلوموشن کا نمونہ تھی۔ اتنی مضحکہ خیز کہ میں حیران رہ گیا۔ میرے ہاتھ پیر میرے قابو میں نہ رہے تھے اور کرکٹ کی اصطلاحات کے مطابق میری "لینگتھ اور ڈائریکشن" دونوں غلط ہو گئی تھیں چنانچہ میرے حریف نے بولڈ ہونے کی بجائے مجھے زبردست فلاسٹ لگایا اور میں بال بن کے باؤنڈری کی طرف بڑھا جو باتھ روم کی دیوار تھی اور اس سے ٹکرا کے رک گیا۔ زمین کے ساتھ ساتھ اب آسمان بھی ہلنے لگا تھا اور دیواریں شرابی کی طرح جھوم رہی تھیں "انجکشن کا اثر اتنی جلدی کیسے ہو سکتا ہے" میں نے سوچا۔ اگر انٹروینس انجکشن ہوتا یعنی دوا براہِ راست کسی شریان میں داخل کر دی جاتی تو ڈھائی تین منٹ میں دورانِ خون مکمل ہونے تک میرا کام تمام ہو جاتا مگر گوشت میں اتنی سرعت سے نہیں ہوتا۔ میں آہستہ آہستہ پلٹا۔ باتھ روم کے میدان کارزار میں ہم دو ہی حریف تھے۔ نہ کوئی ریفری تھا نہ امپائر اور میں "فاؤل پلے" کا شکار ہوا تھا لیکن فاؤل کون دیتا۔ کافی۔ مجھے اچانک خیال آیا۔

"سؤر کے بچے ... تم ... تم نے کافی میں کچھ ملایا تھا۔" میں نے ملکا تان کے آگے بڑھنے کی کوشش کی۔

شکاری میری لڑکھڑاتی چال پر ہنسا۔ "ہاں۔ اچھا ہوا تم خود ہی اٹھ کے آگئے ورنہ ہم تمہیں محسن کا پیغام دے کر بلواتے۔ یہ انجکشن تو اضافی تھا۔ کسی وجہ سے تم نے کافی نہ پی ہوتی تو تم کو یہاں قابو کیا جا سکتا تھا۔"

"اوہ۔ اوہ محسن۔ کیا تم نے ... اسے ...." اب میری زبان بھی لڑکھڑانے لگی تھی۔

جواب میں اس کا ایک اور قہقہہ سنائی دیا۔ باتھ روم کا بلب میری نظروں کے سامنے جلنے بجھنے لگا اور میں ڈگمگایا۔ میرے ہاتھوں نے کسی غیر موجود شے کو تھامنے کی بے سود کوشش کی۔ فرش تیزی سے اوپر آیا اور میں نے گرتے ہوئے آخری جدوجہد اپنے سر کو ضرب سے بچانے کے لیے کی۔ میں گھٹنوں کے بل بیٹھا اور چت ہو گیا۔ چھت آسمان سے بھی اوپر نکل گئی اور میرے گرد وہی رات محیط ہو گئی جو باہر مشرق اور مغرب میں اور شمال و جنوب میں سینکڑوں میل تک پھیلی ہوئی تھی۔ آخری احساس یہ تھا کہ منزلِ راہِ عدم آگئی جس کے بارے میں ابھی کچھ

دیر پہلے میں نے سوچا تھا کہ کل کی بات ہے تو اس کے لیے زیادہ تردد کیوں۔ اپنا غم، تیرا غم جہاں کا غم۔ زادِ راہ عدم

جب مجھے رفتہ رفتہ ہوش آنے لگا تو مجھے یوں لگا جیسے میرا جنازہ میرے لواحقین کے کندھوں پر ہے اور مجھے تدفین کے لیے تابوت میں ڈال کے شہرِ خموشاں کی جانب لے جایا جا رہا ہے۔ مگر تابوت چہ معنی دارد۔ میں عیسائی تو نہیں ہوں اور میری وفات لندن میں نہیں ہوئی تھی۔ اصولاً مجھے کفن پوش ہونا چاہیے۔ ایسے سلنڈر نما شب کفن جن کو بھاڑ کے بول بھی نہ سکے کہ عزیزا ابھی تو میں جوان ہوں اور بقیدِ حیات ہوں۔ کفن ایسے ہرگز نہیں ہوتے۔ میں نے ہاتھ پیر ہلانے کی کوشش کی لیکن میں واقعی سلنڈر میں ملفوف تھا۔ ملفوف اس لیے کہ وہ سلنڈر ٹین کا یا کسی دھات کا نہیں تھا بلکہ اونی ریشمی قسم کی ساخت کا تھا جسے میرے گرد یوں لپیٹ دیا گیا تھا کہ میں الف کی طرح سیدھا لیٹا تھا۔ اور الف نما تھا۔ چنانچہ سب سے پہلے تو میں نے اپنی وفات کے خیال کو رد کیا اور اس خیال سے مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ میرے حواس آہستہ آہستہ بحال ہو رہے تھے یک لخت بیدار ہو گئے۔ جنازے کا منظر میرے تصور سے غائب ہو گیا جو عجیب لایعنی منظر تھا کہ آگے سیاہ جنازہ گاڑی ہے جس کے گھوڑے اور کوچوان تک سب سیاہ ہیں اور تابوت کے گرد اعزا کی عدم موجودگی میں فوزیہ اور رابعہ ہیں۔ سیاہ لباس میں ان کے حسن کی روشنی نگاہوں کو خیرہ کر رہی ہے اور دوسری طرف محسن ہے اور شہزاد صاحب ہیں۔ جنازہ گاڑی کے دونوں جانب پھول ہیں یا طباق جیسی پھولوں سے بنی ہوئی چادریں آویزاں ہیں۔ ماتم کنندگان بشمول منظر صاحب۔ چراغ دین۔ بابو پوسٹ مین اور حشمت خان اینڈ کمپنی پیچھے سرنگوں چل رہے ہیں۔ اس تصور میں قصور لندن کے قیام کا تھا جس میں ایسے ہی منظر اکثر دیکھنے کو ملتے تھے۔ اب میں نے آوازوں پر غور کیا۔ یہ آواز انجن کی تھی جو کار کا انجن نہیں ہو سکتا تھا اور ہیلی کاپٹر یا جہاز کا بھی نہیں۔ یہ ٹرک کا انجن تھا۔ میں ایک قالین میں لپٹا ہوا تھا اور قالین ٹرک میں رکھا تھا اور ٹرک نہ جانے کدھر جا رہا تھا۔ سمت کا یا وقت کا تعین ناممکن تھا۔ میں کیسے اندازہ کرتا کہ میں اس حالت میں کتنا سفر کر چکا ہوں۔ میں نے منتشر خیالات کی سپاہ کو منظم کیا اور واقعات کو ترتیب کے مطابق یاد کرنے کی کوشش کی۔ دشمنوں کو معلوم ہو گیا تھا کہ میں کہاں قیام پذیر ہوں۔ انھوں نے دو یا زیادہ افراد کو میرے اغوا پر مامور کیا۔ ان افراد نے مجھے کافی میں بے ہوشی کی دوا دی۔ ایمبیسڈر ہوٹل کا عملہ اس میں براہِ راست ملوث نہیں

ہو سکتا چنانچہ یہ حرکت کسی ضمیر فروش نے بھاری معاوضہ لے کر کی یا کسی نے نظر بچا کے کافی میں دوا ڈال دی۔ باورچی خانے میں یا نیچے تک کافی کے پہنچنے سے قبل۔ انھی افراد نے محسن کے کمرے تک رسائی حاصل کی۔ ناجائز طریقے سے تالا کھول کے یا زبردستی۔ محسن کو خاموش کرنے کے بعد انھوں نے مجھے بلوانے کا انتظام کیا تھا مگر شامتِ اعمال کے باعث میں خود کمرے میں اور پھر باتھ روم میں جا پہنچا۔ کمرے کے کسی پردے کے پیچھے پوشیدہ ایک فرد نے مجھے غسل خانے میں دھکیلا اور باہر سے دروازہ بند کیا تو دوسرے نے مجھے انجکشن دیا لیکن اس وقت کافی کی دوا کا اثر ہو چکا تھا چنانچہ میں مقابلہ نہ کر سکا۔ نتیجہ یہ کہ اب مجھے قالین میں لپیٹ کر کہیں لے جایا جا رہا ہے۔ اس کے بعد سوالات تھے۔ نمبر ایک یہ کہ کیا محسن بھی دوسرے قالین میں میرے ساتھ ہی ٹرک میں لیٹا ہے۔ نمبر دو کیا وہ بھی ہوش میں ہے یا مر چکا ہے۔ نمبر تین۔ یہ ہوٹل کے قالین ہیں تو ہوٹل والوں نے ان کی برآمدگی کیوں نہیں۔ اتنے بڑے قالین کسی کی نظر بچا کے کیسے نکالے جا سکتے ہیں۔ خصوصاً وہ قالین جن میں سالم آدمی لپیٹے گئے ہوں اور ہر آدمی کا وزن ڈیڑھ دو سو پونڈ ہو۔ ایسے ایک قالین کو اٹھانے کے لیے اور لفٹ سے اتار کے ٹرک میں چڑھانے کے لیے بھی چار آدمی بہرحال درکار ہوں گے اور یہ جلوس کاؤنٹر کے سامنے سے ضرور گزرے گا۔ ہوٹل کے عملے کا اس سازش میں شریک ہونا بعید از قیاس تھا۔ یہ بھی ناممکن تھا کہ انھوں نے قالین کی قیمت ادا کر کے قالین لے جانے کی اجازت حاصل کر لی ہو۔ ایسے تو جس کو جو چیز پسند آئے گی کمرے سے اٹھا کے لے جائے گا اور معاوضہ ادا کر دے گا۔ ہوٹل والے روز سامان خرید کے کمروں کی آرائش کرتے رہیں گے۔ یہ بھی ناممکن تھا کہ انھوں نے ریوالور دکھا کے یہ "اسباب" نکالا ہو۔ ہوٹل کے اندر اور باہر اتنے لوگ ہوتے ہیں اور سڑک تک اتنا فاصلہ ہوتا ہے کہ یہ کام اسٹین گن کی مدد سے بھی نہیں کیا جا سکتا۔ بنک لوٹنے والے صرف ایک راستے کو کنٹرول کرتے ہیں اور ایک ہال کے محدود سے عملے کو۔ پھر یہ کیسے ممکن ہوا؟

اب میں پوری طرح ہوش میں تھا چنانچہ میں نے ممکنات اور ناممکنات کے اسباب پر غور ملتوی کیا۔ جو ہونا تھا ہو چکا اب غور طلب مسئلہ مستقبل کا تھا۔ یعنی کیا ہونے والا ہے۔ کیا اغوا کرنے والے مجھے اور محسن کو قتل کر دیں گے۔ نہیں۔ قتل کرنا مقصود ہوتا تو کافی میں بے ہوش کرنے والی دوا کی جگہ زہر بھی ملایا جا سکتا تھا۔ اور انجکشن سے ہلاک کرنے کے بعد تو لاش اٹھانے کا تردد بھی فضول تھا۔ وہ

مجھے وہیں باتھ روم میں چھوڑ کے رخصت ہو جاتے۔ محسن کا مسئلہ ہنوز غیر یقینی تھا۔ کہیں وہ مزاحمت کرتا ہوا نہ مارا گیا ہو یا چشم دید گواہ ہونے کے باعث سزائے موت کا مستحق نہ ٹھہرا ہو۔ اصل شکار میں تھا اور شکاری مجھے بالآخر زیرِ دام لانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ وہ مجھے مارنا نہیں، زندہ پکڑنا چاہتے تھے۔ مجھے زندہ رکھنے کا بھی کوئی مقصد یقیناً ہوگا۔ تفتیش یا تصدیق — کہ مجھے کیا معلوم ہے اور کیا نہیں معلوم۔ یا کسی دستاویز پر میرے دستخطوں کا حصول۔ مجھے کسی بات کے اقرار پر مجبور کرنا۔ وغیرہ وغیرہ۔ میرے انجام کے بارے میں آخری فیصلہ بھی انھی کا تھا اور علمِ غیب سے محرومی کے باعث میں قبل از وقت معلوم نہیں کر سکتا تھا۔ اگر میں شروع سے ہوش میں رہتا تو شاید وقت کی مدد سے اندازہ کر سکتا کہ مجھے ایمبیسڈر ہوٹل سے کتنی دور لے جایا گیا ہے اور ممکن ہے ٹرک کے دائیں بائیں مڑنے سے اندازہ کر سکتا کہ ٹرک کس سڑک سے گزر کے کس سمت رواں ہے — مگر اپنی موجودہ کیفیت میں یہ سب اندازے میرے اختیار کی بات نہ تھے۔ میں انتظار کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ ہر مجبور ان سے امید کا دامن باندھے رکھنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا اور مارنے والے سے بچانے والے کے ہاتھ کے زبردست ہونے پر یقین رکھنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میں چلا بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ میرے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا گیا تھا۔

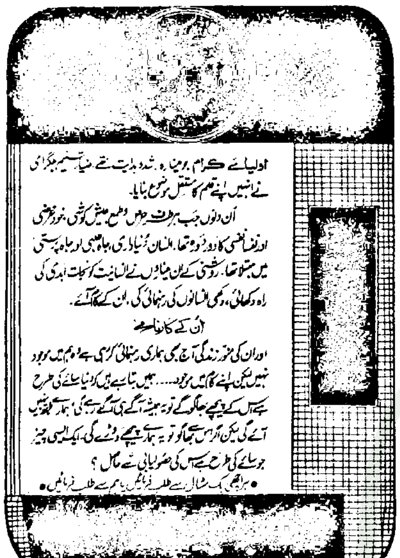

ٹرک بالآخر رک گیا اور مجھے اس خول سمیت گھسیٹا گیا جس کے اندر میں یوں بند تھا۔ جیسے ریشم کا کیڑا کوئے میں۔ قالین کو آگے پیچھے سے اٹھایا گیا تو میں کمان ہو گیا۔ قالین بھد سے نیچے گرا اور بیک وقت دو افراد نے ایک دوسرے کو حرام خوری کا الزام دیا۔ قالین کی کئی تہوں میں لپٹے ہوئے ہونے کے باعث مجھے چوٹ نہیں آئی تھی۔ کسی تیسرے شخص نے غرا کے کہا کہ یہ وردیاں نہیں کاشانی قالین ہیں اور دوسری بار مجھے اٹھایا گیا تو اس نے درمیان میں سہارا فراہم کیا۔ میں نے قلوپطرہ کا تصور کیا جسے اسی طرح قالین میں لپیٹ کر شاہی دربار میں پیش کیا گیا تھا۔ قالین کو ایک کنارہ تھام کے جھٹکا دیتے ہیں قلوپطرہ لکڑی کے لٹھے کی طرح لڑھکتی ہوئی عین شاہ کے قدموں میں پہنچی تھی اور اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ لیکن میرے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ چند منٹ بعد مجھے پوری احتیاط کے ساتھ فرش پر رکھ دیا گیا اور مجھے لانے والوں نے اجرت پر احتجاج کیا۔ وہ کرائے کے ٹرک کے ڈرائیور اور کلینر تھے جو سو کے بجائے دو سو کا مطالبہ کر رہے تھے۔ "اتنا قیمتی قالین ہے بادشاہو۔ اپنے تو مونڈھے بھی وزن سے ٹوٹ گئے ہیں۔ کچھ نکل آیا ہے۔ لتاں ڈنگیاں ہو گیاں جے۔" انھوں نے عاجزی سے دلائل اور فریاد کا سلسلہ دراز کیا تو انھیں سو سو کا نوٹ بھی مل گیا۔ مجھے اسمگل کرنے والے اب جلد از جلد ان سے نجات پانا چاہتے تھے۔ کسی نے ٹھوکر مار کے قالین کو دھکیلا اور میں گھومنے لگا۔ آخری بل کھلتے ہی میں نے دیکھا کہ میں ایک کوٹھی کے برآمدے میں لیٹا ہوا ہوں برآمدہ عقبی حصے کا تھا کیونکہ مجھے وہ سیڑھیاں نظر آئیں جن کے سامنے ٹرک رکا تھا۔ مجھے اٹھانے والوں نے تین زینے طے کیے تھے۔ کہیں نہ کہیں وہ دروازہ بھی ہونا چاہیے تھا جس سے گزر کے ٹرک اندر آیا تھا۔ اس برآمدے کے گرد لکڑی کا جنگلا سا تھا جو خاصا پرانا اور بے رنگ تھا۔ اوپر چھت میں گول ٹیوب لائٹ کا روشن حلقہ تھا۔ میرے دائیں ہاتھ پر وہی شخص ریوالور لیے کھڑا تھا جس نے مجھے باتھ روم میں انجکشن لگایا تھا۔ بائیں جانب کھڑا ہوا شخص فلموں اور کارٹونوں میں دکھائے جانے والے الہ دین کے طلسماتی چراغ کے جن کا نسبتاً چھوٹا ماڈل تھا لیکن اس کے باوجود دیوزاد لگتا تھا۔ اس کا قد سوا چھ فٹ کے لگ بھگ تھا اور وزن کسی صورت ساڑھے تین سو پونڈ سے کم نہ تھا یعنی مجھ سے دگنا۔ وزن اور قد کی مناسبت سے اس کے جسمانی اعضا بھی جناتی قسم کے تھے۔ مزید نفسیاتی تاثر کے لیے اس نے محض ایک جانگیا پہننے پر اکتفا کی تھی چنانچہ اس کا لق و دق چٹان جیسا سینہ۔ مشک جیسا پیٹ۔ کسی رومن عمارت کے ستونوں جیسی ٹانگیں اور [illegible] جیسے ہاتھ بہت نمایاں تھے۔ اس نے سر منڈوا کے خود کو [illegible] بنا لیا تھا کیونکہ اتنے بڑے جسم پر اتنا چھوٹا سا سر بہت مضحکہ خیز لگتا تھا۔ لمبی لمبی مونچھوں اور ٹھوڑی تک محدود داڑھی نے اسے بچوں کے لیے تو واقعی خوفناک بنا دیا تھا مگر مجھے وہ [illegible] کارٹون لگا۔ ریوالور والے کے اشارے پر وہ آگے بڑھا اور اس نے دانتوں میں دبے ہوئے خنجر کو ہاتھ میں تھام کے ایک [illegible] سے وہ رسیاں کاٹ دیں جو میرے ہاتھوں اور پیروں کے گرد لپٹی ہوئی تھیں۔ یہ بھی ڈراما تھا اور میں سمجھ گیا کہ یہ گوریلا محض نمائشی چیز ہے۔ اس کا بدن ٹھوس نہیں تھا۔ اس کے جسمانی غدود بچپن سے زیادہ فعال رہے ہوں گے چنانچہ تھوڑا [illegible] کے بھی وہ بہت پھیلا تھا۔ اس جسمانی پھیلاؤ کو بیماری کہا جاسکتا ہے جو آدمی کو جن بنا دیتا ہے۔ گوشت کا یہ پہاڑ خوراک کا ذخیرہ نگلنے سے قائم تھا۔ جب اس نے میرے منہ سے [illegible] بھی نکال دیا تو میں نے ایک گہری سانس لی اور اپنے ہاتھوں پیروں پر رسی کے بل سے پڑ جانے والے نشانات کو ملا۔ پھر میں اٹھ بیٹھا۔ میرے جسم پر لباس کا ایک تار تک نہ تھا چنانچہ میں کھڑا نہیں ہوا۔ "ہیلو" میں نے ریوالور والے سے کہا۔ "کیا دوسرا راؤنڈ یہاں ہوگا۔ آؤ گے میری طرح میدان میں؟"

ریوالور والے نے مجھے گالی دی۔ "دوسرا راؤنڈ تمھارے باپ سے ہوگا۔"

"اس کے لیے تمھیں قبر میں گاڑنا پڑے گا۔" میں نے کہا۔ "میانی صاحب کے قبرستان میں۔"

"ٹائیگر۔" وہ دیوزاد سے مخاطب ہو کے بولا۔ "اس کو سنبھالنا۔ میں اس کے کپڑے لاتا ہوں۔" وہ برآمدے کے ایک دروازے سے اندر چلا گیا۔ اندر کسی کمرے میں اسٹیریو بج رہا تھا۔ پھر کوئی عورت کھل کھلا کے ہنسی۔ میں نے ناکام [illegible] میں آس پاس کی آبادی کا تعین کرنا چاہا مگر تاحد نظر [illegible] اور تاریکی کے سوا کچھ نہ تھا اور رات کا سکوت اتنا گہرا تھا کہ دور سے ایک مینڈک کے ٹرانے کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔

"ٹائیگر۔" میں نے کہا۔ "یہ کیا نام ہوا بھلا؟ تمھارے [illegible] سرکس میں تھے کیا؟"

"بھونکنے کی ضرورت نہیں۔" ٹائیگر نے مجھے خون خوار نظروں سے گھورا۔

"ٹائیگر میرے ایک کتے کا نام تھا۔ جو خارش میں مبتلا ہوا اور پاگل ہو کے مرا۔" میں نے کہا۔ "وہ بالکل تمھارا ہم شکل تھا۔ اس کی روح تم میں سما گئی ہے شاید۔ تم غرانے بھی ویسے

ہی ہو۔ مروگے بھی ویسے ہی۔"

"بکواس بند کرو نہیں تو تھپڑ مار کے بتیسی مٹھی میں رکھ دوں گا۔" وہ مشتعل ہو کے بولا۔

چونکہ میرا مقصد ہی اسے مشتعل کرنا تھا اس لیے میں نے کہا۔ "ویسے وہ بھی دیکھنے ہی دیکھنے کا تھا۔ بزدل اتنا تھا کہ بلی سے ڈرتا تھا۔ اور اس بلی سے نہیں جو شیر کی خالہ تھی۔ بلکہ وہ جو نو سو چوہے کھا کے حج کو گئی تھی۔ تم بھی اس چوہے سے ڈرتے ہو۔ کیا نام ہے اس کا؟"

"دلاور۔" ٹائیگر نے مجھے ایک غلیظ گالی دی اور آگے بڑھا۔ بے خیالی میں وہ مجھے نام بتا چکا تھا۔

"گینڈے کے بچے۔ قریب آیا تو مکا مار کے یہ ڈھول جیسا پیٹ پھاڑ دوں گا۔" میں نے اسے چیلنج کیا۔

وہ یک لخت مجھ پر لپکا اور اس کے حلق سے حقے جیسی آواز نکلی۔ میں بالکل تیار تھا۔ ابھی وہ مجھ تک پہنچا ہی تھا کہ میں گھٹنوں کے بل کھڑا ہوا اور میں نے اس کے پورے وجود کو دونوں ہاتھوں پر سنبھال کے سر سے گزار دیا۔ وہ اپنے ہی زور میں آگے گیا اور برآمدے کی دیوار سے ٹکرایا۔ دھماکے سے دیوار ہل گئی اور ٹائیگر کے حلق سے جو کراہ بلند ہوئی وہ بھینسے کے ڈکرانے سے مشابہ تھی۔ وہ دو فٹ کی بلندی سے فرش پر گرا اور ساکت ہو گیا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے۔" دلاور نے اچانک دروازے میں نمودار ہو کے کہا۔ "مجھے حکم ہے کہ بلا تامل گولی مار دوں۔"

"ضرور مارو دلاور بھائی۔" میں نے ٹائیگر کی طرف دیکھ کے کہا۔ "مجھ سے شرط لگا رہا تھا کہ سر کی ٹکر سے دیوار گرا سکتا ہوں۔ غنیمت ہے یہ جھوٹ تھا ورنہ ابھی تم اندر ملبے میں دفن ہو جاتے۔"

"میں تمھاری بات کر رہا تھا۔" دلاور نے میرے کپڑے میرے منہ پر کھینچ مارے۔

"اچھا اچھا۔" میں نے کپڑے کھینچ لیے اور پہننے لگا۔ "گولی میں ریوالور ہے۔ گولی میں ریوالور؟ لاحول ولا قوۃ۔ دماغ الٹ گیا ہے میرا۔ ابھی اگر قمیص کی جگہ پتلون اور پتلون کی جگہ قمیص پہن لوں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ یہ بتاؤ میرا محسن کہاں ہے؟"

"تمھارا کون محسن ہے۔ ہم کسی محسن کو نہیں جانتے۔ زیادہ کامیڈین بننے کی ضرورت نہیں۔" دلاور چراغ پا ہو کے بولا مگر مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ وہ محسن سے واقف نہیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ محسن خیریت سے ہے اور جب مجھے لایا گیا اس وقت تک وہ آیا ہی نہیں تھا۔

"سوری مسٹر دلاور۔" میں نے کہا۔ "اجازت ہو تو ایک بات پوچھوں؟ یہ مجھے اور میرے کپڑوں کو الگ الگ کیوں لایا گیا ہے؟"

"اس لیے کہ کپڑوں کے بغیر تم راستے میں کہیں فرار نہیں ہو سکتے تھے۔" دلاور بولا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "اگر میرے ہاتھ پیر بندھے ہوئے نہ ہوتے تو تمھارا اندازہ غلط ہو جاتا۔ میں بغیر کپڑوں کے میراتھن ریس لگاتا تو پوری انارکلی اور پوری مال روڈ پر سے گزر جاتا۔ اب لگاتے ہو شرط؟"

دروازہ پھر کھلا اور اس بار جو شخص نمودار ہوا اسے دیکھ کر میں ساری شوخی بھول گیا۔ میرا خیال تھا کہ ٹائیگر سے نمٹنے کے بعد دلاور کو بھی چت کیا جاسکتا ہے مگر مندری والے ٹیکسی ڈرائیور کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ میں پیشہ ور اور سفاک قاتلوں کے ٹھکانے پر ہوں جہاں میری موجودگی کی خبر کسی کو نہیں اور نہ ہوگی۔ یہ شہر کی چار میں سے کسی ایک سمت کا مضافاتی علاقہ تھا جہاں ایک کوٹھی کا دوسری سے فاصلہ بھی پتا نہیں چلتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اس کوٹھی کے ارد گرد محض جنگل ہو اور صبح کا اجالا پھیلنے کے باوجود اس ویرانے میں امید کی ایک کرن بھی نہ ملے۔

"ٹانگر کو کیا ہوا ہے؟" مندری والے نے اپنا ریوالور بھی نکال لیا۔

"اس نے دیوار کو ٹکر ماری تھی۔ خود لوٹ گیا۔" میں نے کہا۔ اسی وقت ایک فائر ہوا اور میں غیرارادی طور پر جھک گیا۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ مندری والے نے عمداً میرا نشانہ نہیں لیا تھا یا غوطہ مارنے سے گولی سیدھی نکل گئی۔ اس وقت مجھے ایسا ہی محسوس ہوا تھا۔ جیسے مندری والے نے مشتعل ہو کے میرے سر پر گولی چلا دی تھی میرے کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی۔ مندری والا آگے بڑھا۔ اس کی کنجی آنکھیں نفرت سے دہکتے انگاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ میرا خیال تھا ابھی وہ اسی رفتار سے دو قدم اور اٹھائے گا مگر اس نے اچانک اچھل کے میرے منہ پر پوری قوت سے تھپڑ مارا۔ میرا گال جلنے لگا۔ ٹانگر نے کراہ کر کروٹ لی اور اٹھ بیٹھا۔ اندر اسیٹریو بند ہو گیا۔

"چودھری دلاور کے سامنے اتنی ہی بات کرنا ہے جتنی ضروری ہو۔" مندری والا بولا۔ "چلو اندر۔"

تھپڑ کے ردِ عمل کے طور پر میں اپنا ہاتھ اٹھاتے اٹھاتے رہ گیا۔ ایک نہیں دو دو ریوالوروں کی سرد سفاک نالیں مجھے گھور رہی تھیں اور ان کے اندر اشارے کی منتظر بیٹھی ہوئی ہر گولی میرے دل اور میرے سر میں اتر جانے کے لیے تیار تھی۔ میں نے دروازے کی طرف قدم بڑھایا اور وہ دونوں میرے پیچھے ہو گئے۔ یہ میرے لیے انکشاف تھا کہ چودھری دلاور وہ ہے جس کے سامنے مجھے اب پیش ہونا ہے۔ وہ نہیں جسے میں دلاور سمجھے ہوئے تھا ٹانگر نے میری بات کا مطلب غلط سمجھا تھا وہ سمجھا تھا میں کوٹھی کے مالک کا نام پوچھ رہا ہوں اور اس کے آقا کو چچا کہہ رہا ہوں۔ لکڑی کا پالش کیا ہوا بیرونی دروازہ پورا کھلا ہوا تھا۔ اندر کے جالی والے فلائی پروف دروازے کو دھکیل کر میں نے خود کو ایک خواب گاہ میں پایا جس کی تزئین و آرائش سے رئیسانہ ٹھاٹھ باٹھ کا پتا چلتا تھا لیکن اس بیڈ روم میں کوئی نہیں تھا۔ میں کمرے کے وسط میں رک گیا۔

"سیدھے آگے چلو دائیں جانب۔" مندری والے نے حکم دیا جو مجھ سے چار قدم پیچھے تھا۔

میں نے دائیں ہاتھ کے دروازے کا پردہ ہٹایا اور ایک وسیع و عریض ڈرائنگ روم میں پہنچا۔ اس میں ... میر شرافت علی کے ڈرائنگ روم کی طرح نوادرات کا ذخیرہ تو نہ تھا مگر قالین، فرنیچر، فانوس اور دوسرا سب سامان انتہائی بیش قیمت تھا۔ ڈرائنگ روم کا آخری حصہ کچھ دائیں جانب پھیلا ہوا تھا اور یہ کچھ انگریزی حرف ایل کی شکل بنتی تھی۔ چھوٹے حصے میں کھانے کی طویل میز کے گرد کمرے کرسیاں تھیں۔ دونوں حصوں کو ایک محرابی دروازہ جدا کرتا تھا اور اس میں بڑے بڑے رنگین منکوں کی مالائیں پردے کے طور پر استعمال کی گئی تھیں۔

"بیٹھ جاؤ۔" مندری والے نے ایک صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ "اور اس بات کا خیال رکھو کہ تم چودھری دلاور کی کوٹھی میں ہو۔ اگر ہیرو بنو گے تو کتے کی موت مارے جاؤ گے اور تمہاری بوٹیاں کتوں کو ڈال دی جائیں گی۔"

"گویا تم تینوں مل کے مجھے کھا جاؤ گے۔ دیری بیڈ۔" میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "چودھری صاحب بھی آدم خور نسل سے ہیں؟"

مندری والا ایک قدم آگے بڑھا اور رک گیا۔ میری خواہش تھی کہ ان میں سے کوئی قریب آ کے مجھ پر حملہ کرے۔ میں اسے ڈھال بنا کے باقی سب سے نمٹ لوں مگر وہ میرے عزائم کو سمجھ گیا تھا اور اگر وہ حکم سے مجبور نہ ہوتا تو کب کا مجھے قتل کر چکا ہوتا۔

"تم نے سلامت شاہ کا انجام نہیں دیکھا ابھی۔" مندری والا بولا۔ "مگر منشی کا حشر دیکھ چکے ہو۔"

"ہاں اور اسی لیے میں حشر سے نہیں ڈرتا۔" میں نے کہا۔ "میدانِ حشر میں صورتِ حال اس کے بالکل برعکس ہو گی۔"

مندری والے نے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا کہ سامنے آ جائے۔ ٹانگر میرے پیچھے آ کھڑا ہوا۔ مندری والے نے ان سے کہا کہ اگر میں صوفے سے اٹھنے کی کوشش بھی کروں تو مجھے گولی مار دی جائے یا ٹانگر ڈنڈے سے میرا سر پھاڑ دے۔ ڈنڈا شاید اس نے ہوش میں آنے کے بعد اندر آتے ہوئے اٹھا لیا تھا یا اس کا حوالہ محض مجھے دہشت زدہ کرنے کے لیے دیا گیا تھا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ چودھری دلاور کے حکم کے بغیر وہ مجھے نہیں مار سکتے ـــــ چودھری دلاور نے کسی خاص مقصد کے تحت مجھے ملاقات کے لیے بلوایا تھا اور اس مقصد کو حاصل کیے بغیر مجھے قتل کرنا ہوتا تو وہ اتنا تردد ہی کیوں کرتے۔

"یار میں غلط سمجھا تھا۔ تم تو ذرا بھی دلاور نہیں ہو۔" میں نے ریوالور والے سے کہا۔ "چاہوں تو ابھی تمہیں اٹھا کے پھینک دوں اس توپ سمیت مگر مجھے اب چودھری صاحب سے ملنے کا واقعی اشتیاق ہے۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے یہ سب ڈھونگ ہے۔ تمہیں اختیار ہی نہیں کہ مجھ پر گولی چلا سکو۔ اور اس تربوز کا ڈنڈا تو میں ..." میری بات نامکمل رہ گئی۔ مندری والا ایک سرچ لائٹ اٹھائے ہوئے نمودار ہوا جو اس نے مخالف دیوار کے پلگ سے لگا دی۔ ایسی لائٹس میں نے فلموں کے سیٹ پر اسٹوڈیوز میں دیکھی تھیں یا فوٹو گرافروں کی دکان پر۔ سرچ لائٹ ایک اسٹینڈ پر نصب تھی اور جب مندری والے نے اس کو اوپر نیچے کرنے کے بعد صحیح زاویے پر لا کے آن کیا تب مجھے یوں لگا جیسے آدھی رات کو سورج سوا نیزے پر آ گیا ہو مال روشنی کے پیچھے کیا اس کے دائیں بائیں بھی اب مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ مندری والے نے چند منٹ کے بعد دوسری سرچ لائٹ کمرے کے دوسرے کنارے پر لگائی اور میرے سامنے دونوں گوشوں سے امڈنے والے بے رحم روشنی کے اس سیلاب نے مجھے اندھا کر دیا۔ روشنی میری آنکھوں میں یوں چبھنے لگی جیسے آنکھوں میں شیشے کا بُرادہ پڑ گیا ہو۔ ان کی تمازت مجھے چند فٹ دور تک محسوس ہونے لگی اور اگرچہ کمرہ ائیر کنڈیشنڈ تھا مگر میرے جسم پر پسینہ اتر آیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں کسی سجے سجائے ڈرائنگ روم میں نہیں لق و دق صحرا کی تپتی دھوپ میں تنہا ہوں۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ "بس ایسے ہی بیٹھے رہو گے تو کچھ نہیں ہو گا۔" ایک اجنبی نے کہا جس کا لہجہ ٹھہرا ہوا، پُراعتماد اور واضح تھا۔

"تم چودھری دلاور ہو؟" میں نے کہا۔ "یا اُن کے نقیب؟"

"میں ہی چودھری دلاور ہوں۔" وہ بولا۔ "کیا تم نے کبھی میرا نام سنا ہے؟"

"دلاوروں کا نام تو اکثر سنا ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر تم صرف نام کے دلاور ہو۔ درحقیقت بزدل جو اندھیرے کی پناہ میں رہتا ہے اور روشنی سے ڈرتا ہے۔"

کوئی چیز گولی کی طرح میرے سر سے ٹکرائی اور غائب ہو گئی۔ میں نے اس کو روشنی کے اس بحرِ ذخار میں کسی سیاہ چٹان کی طرح سایہ بن کے نمودار ہوتے دیکھا اور یہ سایہ ایک لمحے کے سویں حصے کے لیے میری بند آنکھوں کے سامنے پھیلا۔ سرچ لائٹس کی روشنی آنکھیں بند کر لینے کے باوجود پپوٹوں کے سامنے اجالے کی ایک دیوار کی طرح موجود تھی اور یہ سیاہ ہیولا اسی میں ابھرا تھا۔ اس کی ضرب اتنی شدید تھی کہ میرے دماغ کے اندر دھماکا سا ہوا اور وہ سب مادہ جو قدرت نے کاسۂ سر میں بھرا تھا اچھل کے اِدھر سے اُدھر ہو گیا۔ اگرچہ ایسا ہونا ناممکن ہے مگر مجھے ضرب کے بعد یہی لگا تھا کہ میرا مغز اندر تک ہل گیا ہے۔ میں نے آنکھوں کے سامنے رنگین عکس سے بنتے دیکھے جو ایک دوسرے میں خلط ملط ہو رہے تھے۔ اس طرح جیسے دنیا کے نقشے میں ملکوں کی نشان دہی الگ الگ رنگوں سے کی جاتی ہے مگر مجموعی تاثر بے ہنگم اور بے ترتیب رنگین دھبوں کا ہوتا ہے۔ میرے کانوں میں شور گونجنے لگا۔ پتھروں پر ٹین کے صندوق گھسیٹنے کا شور، طوفان کی رات میں پاگل ہوا کے شاخوں سے چیختے ہوئے گزرنے کا شور، زلزلے سے منہدم ہونے والی عمارتوں کا شور اور مکینوں کی آہ و بکا کا شور۔ بریک لگانے سے جام ہونے والے گاڑیوں کے آہنی پہیوں کی ریلوے لائن پر رگڑ کا شور اور تصادم میں تباہ ہو جانے والی گاڑیوں کے مسافروں کی چیخ پکار کا شور۔ میں خلا میں قلابازیاں کھاتا رہا۔ جیسے ساری کائنات کسی قیامت آفریں زلزلے سے تہ و بالا ہو رہی ہو۔ پھر رفتہ رفتہ آوازوں کا ہجوم مٹنے لگا، رقص کرتے ہوئے رنگ ساکت ہونے لگے اور زمین و آسمان ٹھہر گئے۔ صرف وہ روشنی باقی رہی جو مٹائی نہیں جا سکتی تھی۔ ایک اور چیز تھی جو اس روشنی میں سے پل بھر کے لیے ابھرتی تھی اور سن سے میری آنکھوں پر سایہ کرتی گزر جاتی تھی میرے چہرے سے صرف چند انچ کے فاصلے سے۔ یہ سخت قسم کے ربڑ کی ٹھوس گیند تھی جو کرکٹ کی بال سے کچھ چھوٹی ہو گی اور اس کا رشتہ نائلون کی ایک مضبوط ڈور سے قائم تھا۔ روشنی کے پیچھے کوئی ہاتھ اس گیند کو مسلسل دائرے میں حرکت دے رہا تھا اور بال کے زور سے ڈور تنی ہوئی تھی۔ یہ دو متضاد قوتوں کا توازن تھا۔ ایک وہ جو بال کو دور پھینکتی ہے اور دوسری وہ جو اسے ایک محدود دائرے سے باہر نہیں نکلنے دیتی۔ بال مجھے صرف آدھے چکر کے دوران نظر آتی تھی جب سرچ لائٹس کے پیچھے سے روشنی میں طلوع ہوتی تھی اور میری آنکھوں کے سامنے سے تیرتی ہوئی پھر اسی تیرگی میں ڈوب جاتی تھی۔ بال کو گھمانے والا ہاتھ بڑا طاقت ور تھا اور زبردست نشانے باز اور ماہر تھا کہ بعض اوقات گیند چھ انچ کے فاصلے سے گزرتی رہتی تھی اور یہ فاصلہ نہ ایک سوت کم ہوتا تھا نہ زیادہ۔ پھر اچانک گھٹ کر دو انچ رہ جاتا تھا لیکن میں سر کو پیچھے نہیں ہٹا سکتا تھا کیونکہ سر کے پیچھے صوفے کی پشت تھی۔ میں دیکھتا تھا کہ وہ متحرک گیند جس کی ضرب شاید باکسنگ کے عالمی چیمپئن کے مکے سے بھی زیادہ تباہ کن تھی صرف دو انچ دور ہے اور اگر میں ذرا بھی ہلا تو میری ناک کا چورا ہو جائے گا یا میرے جبڑے ٹوٹ جائیں گے اور میرے ایک طرف کے دانت جڑ سے اکھڑ جائیں گے۔ پھر اچانک بال کی گردش ختم ہو گئی۔

"کیا حال ہے اب؟" دلاور کی آواز آئی۔ "میں نے تم

سے شرافت کی زبان میں بات کرنے کی کوشش کی تھی۔"

"میں نے بھی کوئی غیر شریفانہ جواب نہیں دیا تھا۔" میں نے کہا۔ "یہی کہا تھا کہ دلاور ہو تو سامنے آ کے بات کرو۔"

"فی الحال اس کی ضرورت نہیں۔" وہ بولا۔ "تمھیں اب تک بخوبی اندازہ ہو چکا ہو گا کہ میں سامنے آئے بغیر بھی کیا کچھ کر سکتا ہوں۔"

"ہاں۔ مگر مجھے حیرت ہے کہ تم نے سب کچھ نہیں کیا۔ مثلاً یہ کہ مجھے اٹھوانے کے بجائے تم نے میرا جنازہ نہیں اٹھوایا۔" میں نے کہا۔

"بات ضرورت کی ہے۔" وہ بولا۔ "میں کوئی غیر ضروری قدم نہیں اٹھاتا۔"

"تمھارا میرے سامنے نہ آنا قطعی غیر ضروری ہے۔" میں نے کہا۔ "نہ میں تمھیں جانتا ہوں نہ پہچانتا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم تمھارا اصل نام چودھری دلاور ہے یا نہیں اور یہ جگہ کون سی ہے، جہاں تم نے ملاقات کا اتنا اہتمام کیا۔"

"میرے نقطۂ نظر سے جو کچھ میں کر رہا ہوں وہی ضروری ہے۔" اس نے اصرار سے کہا۔ "آج تم واقعی نہ مجھے جانتے ہو نہ پہچانتے ہو لیکن کل کا کیا بھروسہ کہ تم غلط جگہ اور غلط وقت پر مجھے پہچان لو۔"

"تم اتنے طاقت ور ہو۔ پھر یہ ڈر کیسا؟ اگر میں تم کو شناخت کرنے کی غلطی کروں تو کیا تم مجھے سزا نہیں دے سکتے؟"

"سکندر بخت۔" وہ چڑ کے بولا۔ "میں نے تمھیں فضول بحث کے لیے نہیں بلایا ہے۔ تم ابھی جوان ہو اور جذباتی ہو۔ زندگی کے بہت سے فیصلے نفع نقصان دیکھ کے کرنے پڑتے ہیں۔ آج اگر تمھیں انتخاب کا ایک موقع دیا جائے کہ ایک طرف تمھاری زندگی ہے جو بہت کم گزری ہے اور بہت سی باقی ہے۔ اور دوسری طرف وہ سب کچھ ہے جو آج تمھارے پاس ہے۔ تو تم کیا دینا پسند کرو گے...؟"

"غالباً زندگی۔" میں نے غور کرنے کے بعد کہا۔ "اس لیے کہ زندگی بے ثبات، غیر یقینی اور اختیار سے باہر ہے۔ اس کا لینا دینا بھی مشکل ہے۔ اگر وہ لمحہ جسے کاتبِ تقدیر نے نقطۂ اختتام لکھا ہے تمھارے تصرف میں ہے تو میں اپنے انتخاب سے جینے کا حق نہیں پا سکتا اور اگر وہ وقت ابھی دور ہے تو میرے دینے کے باوجود تم میری زندگی نہیں لے سکتے۔"

"تم فلسفی بھکی اور احمق ہو۔" دلاور نے برہمی سے کہا۔ "مجھے سیدھا صاف جواب چاہیے۔ ورنہ..." اس نے عمداً بات ادھوری چھوڑ دی۔ وہ ٹھوس ربر کی سخت گیند اندھیرے میں سے اچانک نمودار ہوئی اور میری طرف بڑھی۔ میں نے بے اختیار سر نیچے کرنا چاہا مگر گیند تیر کی طرح سنسناتی ہوئی میری ناک کو رگڑ کر گزر گئی۔ میرے سنبھلنے سے پہلے دوبارہ روشنی میں آئی اور زیادہ برق رفتاری سے میرے بالوں کو مس کر کے نکل گئی۔ وہ گیند ایک ایک سیکنڈ کے وقفے سے جھلک دکھاتی اور غائب ہو جاتی تھی۔ ہر بار اس کی رفتار مجھے پہلے سے زیادہ لگتی تھی اور مجھے اتنی مہلت نہ ملتی تھی کہ میں الٹی قلابازی کھا کے صوفے کے پیچھے جا گروں۔ "ٹائیگر" کہلانے والے دلیر کو اپنی لپیٹ میں لے لوں اور اس شخص سے نمٹ لوں جو ہاتھ میں لیے کھڑا تھا اور مجھے ایمبیسڈر ہوٹل سے لانے کا ذمے دار تھا۔ اس میں خطرہ یقیناً تھا اور اس کے ریوالور کی گولی میرا کام تمام کر سکتی تھی مگر نشانہ خطا ہو جانے کی صورت میں بچ جانے کے امکانات بھی تھے۔ اس کے برعکس میرے اوپر پیچھے ہٹنے سے اس گیند کا میرے سر، منہ یا سینے پر لگ جانا یقینی تھا۔ بار جو ضرب لگی تھی وہ شدید نہیں تھی ورنہ سر کی اندرونی رگوں سے نکلنے والا خون میری کھوپڑی میں منجمد ہو جاتا تو میں بے ہوشی کے عالم میں دو چار گھنٹے دو چار دن یا ہفتے گزار کے انتقال کر جاتا۔ سینے پر چوٹ لگتی تو صرف پسلیاں ہی نہیں اندرونی اعضا تک سب ٹوٹ پھوٹ جاتے۔ پیٹ پر پڑتی تو معدہ اور آنتیں ناقابلِ استعمال ہو جاتے۔ چنانچہ میں دم سادھے بیٹھا رہا۔ گیند کی حرکت جس طرح اچانک شروع ہوئی تھی اسی طرح اچانک ہی ختم ہو گئی۔ میری آنکھیں بند رہیں مگر مجھے اس کا احساس تھا۔

"تم چاہتے ہو کہ میں میرو زیرا اینڈ کمپنی پر حق وراثت کے دعوے سے دستبردار ہو جاؤں؟" میں نے اطمینان کا گہرا سانس لینے کے بعد کہا۔ "یہ تم نے پہلی معقول بات کی ہے۔"

"اپنی ذہانت کا ثبوت دیا ہے۔" دلاور نے پرمسرت لہجے میں کہا۔ روشنی ایک دم بہت کم ہو گئی جس سے میری آنکھوں کو بڑا سکون ملا لیکن اس کے باوجود میں روشنی کے پیچھے اس کی صورت دیکھنے سے قاصر رہا۔

"اور اسی مقصد کے حصول کی خاطر تم نے مجھے لندن سے ڈیتھ رپورٹ کرا کے یہاں بلوایا تھا؟" میں نے کہا اور دکھتی ہوئی آنکھیں ملیں۔ "بہت سے نتائج تم اپنی عقل سے اخذ کر سکتے ہو۔" دلاور نے کہا۔

"کیا میں یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہوں کہ اسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے میرے والد کو قتل کیا گیا؟" میں نے کہا۔

"پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے معلوم ہو جانے کا کہ تمھارے والد کو قتل کیا گیا تھا؟" وہ سکون سے بولا۔

"کیا یہ ممکن نہیں کہ تم اس تکلیف دہ روشنی کو گل کر دو اور مجھے دہشت زدہ کیے بغیر مذاکرات جاری رکھو؟" میں نے کہا۔

"کیوں نہیں۔" وہ بولا اور اس کے ساتھ ہی دونوں سرچ لائٹس آف ہو گئیں۔ کمرے میں صرف وال لائٹس کی نرم روشنی رہ گئی۔ میں نے کچھ دیر کے لیے ہتھیلیوں سے دونوں آنکھیں بند رکھیں۔ جب میں نے پھر ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں تو مجھے یہ جان کے اطمینان ہوا کہ میری بصارت کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا ہے۔ میں اب اپنے سامنے بالکل صاف طور پر دیکھ سکتا تھا۔ کمرہ وہی تھا جیسا میں نے اندر قدم رکھتے ہی دیکھا تھا مگر بیچ کے محرابی دروازے کی لڑ لوہے کے سامنے ایک اسکرین رکھ دیا گیا تھا۔ لکڑی کے فریم کا وہ اسٹینڈ جسے عموماً پارٹیشن کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک لائٹ آخری دیوار پر بھی تھی چنانچہ دلاور کا سایہ اس سفید نائلون کے اسکرین پر صاف پڑ رہا تھا اور میں اس کے جسمانی قد و خال کو اور حرکات و سکنات کو واضح طور پر دیکھ سکتا تھا۔ وہ بھاری بھرکم آدمی تھا۔ اوسط قد و قامت کا مالک وہ بازوؤں والی کرسی پر سیدھا بیٹھا تھا لیکن اس کا سر پشت کے سائے سے زیادہ اوپر نہیں تھا۔ اس نے سگریٹ کا کش لیا اور راکھ جھاڑی تو سفید اسکرین پر سیاہ سائے کی ایک ایک حرکت کا تاثر ڈرامائی طور پر نمایاں رہا۔ میں نے اس کے ہاتھوں کو، انگلیوں کو اور چہرے کو حرکت کرتے صاف دیکھا اور پھر دھوئیں کا مرغولہ سا اسکرین کے اوپر نمودار ہوا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ دلاور انتہائی عیار اور خطرناک حد تک ذہین شخص ہے جو ہپناٹزم یا مسمریزم کرنے والوں کے کلینک کی مخصوص نفسیاتی فضا پیدا کرنے کے حربے جانتا ہے اور زبان یا ہاتھ کی قوت سے کام لینے اور طاقت سے یا تشدد سے مطلب نکالنے کے بجائے اپنے حریف کو ذہنی طور پر مفلوج، کمزور اور بے بس بنا کے فائدہ اٹھانے کا ماہر ہے۔ سرچ لائٹ کے پیچھے اس شخص کا کیس پتا نہ تھا جو موت کا نکولا گھما رہا تھا لیکن مندری والا موجود تھا اور اس کے ہاتھ میں ریوالور بھی تھا۔

"مسٹر دلاور۔" میں نے بالآخر کہا۔ "تمھارے خیال میں ایک آدمی کی زندگی کی قیمت کیا ہوتی ہے۔"

"یہ سوال احمقانہ ہے۔" دلاور نے کہا اور کرسی پر پہلو بدلا۔ "فٹ پاتھ پر لیٹے ہوئے فالج زدہ بھیک مانگنے والے لاوارث بوڑھے کی زندگی کی کوئی قیمت نہیں۔ تمھاری زندگی اس سے زیادہ قیمتی ہے۔ میرے پیمانے سے میری اپنی زندگی تمھارے مقابلے میں زیادہ بیش قیمت ہے اور یقیناً ایسے بہت سے لوگ ہیں جن کی زندگی مجھ سے کہیں زیادہ قیمت کی ہے۔"

"اچھا۔ میں براہِ راست ایک سوال کرتا ہوں۔ کیا یہ سودا تم میرے باپ سے نہیں کر سکتے تھے؟" میں نے کہا۔

"کر سکتے تھے۔ اگر وہ رضا مند ہو جاتا تو اپنے لیے تمھارے لیے اور ہمارے لیے بہت سے مسائل پیدا نہ کرتا۔" دلاور نے کہا۔ "مگر وہ ضد پر قائم رہا کہ سب کچھ دے سکتا ہوں مگر وہ کاروبار نہیں دے سکتا جس سے میرے بیٹے کا مستقبل وابستہ ہے۔"

"چنانچہ تم نے اسے قتل کرا دیا؟" میں نے اچانک کہا۔

"اس سوال کا جواب میں پہلے بھی دے چکا ہوں۔" وہ اسی سکون سے بولا۔ "اگر اس کی جگہ تم ہوتے تو کیا کرتے؟"

"میں بے معنی مفروضات پر کیا جواب دوں۔" میں نے کہا۔ "جو ہونا تھا ہو چکا۔"

"اچھا تو بامعنی مفروضات پر بات کرو۔" وہ طنز سے بولا اور غالباً مسکرایا۔ "تم کیا کرو گے؟ فرض کرو انتخاب تمھارے ہاتھ میں ہو۔"

"میں وہی کروں گا جو میرے باپ نے کیا تھا۔" میں نے کہا۔ "یعنی انکار۔ میں اپنے دعوے سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔"

"تمھارا ابھی یہی خیال ہے کہ تمھارے مستقبل کا دار و مدار اس کاروبار پر ہے؟" دلاور نے سگریٹ کا کش لیا اور چٹکی بجا کے راکھ جھاڑی۔

"میں تقدیر کو تدبیر سے وابستہ رکھنے کا قائل نہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن اقرار کا مطلب ہو گا میرے والد کی روح کے لیے شکست کا وہ صدمہ جو انہوں نے زندگی میں نہیں اٹھایا تھا۔ میں اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کا پابند ہوں خواہ یہ نقوش مجھے بھی اُسی منزل تک لے جائیں۔"

"اس نے تو صرف اپنی زندگی گنوائی تھی۔" دلاور نے کچھ دیر بعد کہا۔ "کیونکہ اس کے پاس گنوانے کو کچھ تھا ہی نہیں تم زیادہ نقصان اٹھاؤ گے۔ مثلاً تمھارا ایک دوست ہے۔ محسن رضا۔ اگر تمھیں اس کے جنازے کو کندھا دینا پڑا؟"

میرے ذہن میں ایک تصویر بنی اور مٹ گئی۔ اس کے باوجود میں خاموش رہا۔

"اور بفرضِ محال تم نے جواں مردی سے یہ صدمہ بھی جھیل لیا۔" دلاور نے مناسب وقفہ دے کر کہا۔ "تو وہ لڑکی ہے جس سے تم واقعی محبت کرتے ہو۔ فوزیہ۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے

کہ ہم اسی اسٹیج پر اس کو تمہارے سامنے پیش کریں — اور تمہیں وہ مناظر دیکھنے کو ملیں کہ تم ہزار بار مرنے کی آرزو میں کرو اور موت نہ آئے۔"

میرے دل کی دھڑکن رک گئی اور میری نظریں بھر آگئیں اسی وقت دونوں سرچ لائٹس جل اٹھیں اور میں نے بے اختیار دونوں آنکھیں بند کرلیں مگر وہ مناظر جن کا ذکر دلاور نے کیا تھا میرے تصور میں زندہ رہے اور دہشت سے میرے جسم کا رُواں رُواں کانپ رہا تھا۔ فوزیہ کی جگر خراش چیخوں سے میری روح کے عذاب میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ بے ضمیر سفاک درندوں کے ہاتھ میں تھی اور میں اتنا بے بس تھا کہ نہ اسے قتل کرسکتا تھا نہ اپنی جان دے سکتا تھا اور نہ ان شیطان صفت جلادوں کا کچھ بگاڑ سکتا تھا جو اپنے مقصد کے حصول کی خاطر فوزیہ پر ہر انسانیت سوز، ناقابلِ بیان حد تک شرمناک اور موت سے زیادہ عذاب دہ ظلم کر رہے تھے۔ وہ اسے جلا رہے تھے، نوچ رہے تھے، کاٹ رہے تھے اور اس کے حسن و شباب کے آئینے کو کرچی کرچی کر رہے تھے۔ خوب صورت، نازک اندام اور گل بدن فوزیہ ایک مکروہ بدہیئت اور مسخ شدہ لاش بن رہی تھی۔ زوم۔ زوم۔ زوم۔ وہ گیند میری ناک کو چھوتی ہوئی گزر رہی تھی۔ میں بے حسی کی برف کے نیچے دفن ہونے لگا تھا۔

عقل نے بروقت جذبات پر قبضہ حاصل کرلیا تھا۔ سوچو سکندر سوچو۔ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ بہادر دشمن کا مقابلہ ہو تو بہادری کام آتی ہے۔ دشمن مکر و فریب کے سب جائز و ناجائز ہتھکنڈے استعمال کرتا ہو اور اخلاقیات کے اصولوں کو جنگ میں حماقت قرار دیتا ہو تو بہادری کے روایتی معیار سے ہٹ کے لڑنا ضروری ہو جاتا ہے۔ کیا تمہارے پاس عیاری کا اسلحہ نہیں ہے؟ تم کو اینٹ کا جواب پتھر سے دینا نہیں آتا؟ تم ذہانت سے اور سیاست سے کام نہیں لے سکتے؟ مصلحت کے تقاضوں کو نہیں سمجھ سکتے؟؟؟

لائٹس یک لخت گل ہوگئیں اور جب میں پھر دیکھنے کے قابل ہوا تو دلاور اسی طرح سایہ بن کے اسکرین پر موجود تھا۔

"دلاور" میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "فیصلہ تم اسی وقت چاہتے ہو؟ کیا تم مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت نہیں دے سکتے؟"

"نہیں.... میرا مطلب ہے مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔" وہ بولا۔ "لیکن غور کرنے کے لیے قابلِ غور مواد بھی تو ہونا چاہیے۔ اس مہلت سے فائدہ اٹھانا ہے تو چند تجاویز اور حقائق کو سامنے رکھو۔ ایک یہ کہ میروزیر اینڈ کمپنی سے دستبرداری کی صورت میں تمہارے خلاف تمام مقدمات ختم ہو جائیں گے۔ نمبر دو یہ کہ تمہیں پانچ لاکھ روپے نقد یا اس کے مساوی غیر ملکی کرنسی اور شہریت کے حقوق دلوا دیے جائیں گے۔ مزید ... واپس لندن جا کے تعلیم مکمل کرنا چاہو تو اس کا انتظام ... گا اور بعد میں تمہارے لیے وہیں ملازمت اور قیام کا بھی ... رقم بڑھائی بھی جا سکتی ہے۔"

"اگر میں اپنے قانونی دعوے سے دستبردار ہو گیا تو ... کاروبار تمہارے ہاتھ میں کیسے آئے گا؟" میں نے کہا۔

"ہم میر شرافت علی کا ایک وارث سامنے لے آئیں ... وہ ہمارا اپنا آدمی ہے۔" دلاور نے کہا۔

"تم جمع کا صیغہ استعمال کر رہے ہو۔" میں نے کہا۔ "... مطلب کیا ہے۔؟"

"ہم کا مطلب ہے ہم۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔" اس نے کہا۔ "نمبر تین بات یہ کہ تم کاروبار سے الگ ہو جانے کے ... بھی کاروبار میں شریک رہ کے اس سے کہیں زیادہ کما سکتے ہو ... میروزیر اینڈ کمپنی کے مالک کی حیثیت سے کماؤ گے۔ تم ... میں ہماری نمائندگی کر سکتے ہو اور سالانہ دس لاکھ تک منافع حاصل کر سکتے ہو۔ مگر یہ ہماری رضامندی کی بات ہے ... تم خاموشی سے الگ بھی رہ سکتے ہو۔"

میرا دماغ چکرا گیا۔ "میری سمجھ میں تمہاری بات نہیں آ رہی ہے۔" میں نے کہا۔ "تم مجھے پانچ لاکھ ... دے کر الگ بھی کرنا چاہتے ہو اور مجھے دس لاکھ روپے منافع کمانے کی پیشکش بھی کر رہے ہو۔ جہاں تک میری ... کا تعلق ہے میرے والد کو ان کے حصے کا منافع ساڑھے ... لاکھ روپے ملتا تھا جو ایک چال باز دستاویزات پر ان کے ... لے کر ہضم کر گیا۔ اب یہ منافع بڑھ کے دس لاکھ فی کس ہو جائے گا اور تم دس لاکھ تو مجھے دینے کی بات کر رہے ہو ... منافع کم سے کم دگنا تو ضرور ہوگا۔ بیس لاکھ فی کس معلوم ... ہم سے تمہاری مراد کیا ہے مگر میں فرض کرلوں کہ تمہارا ... ایک ساتھی اور ہے تو اس کے بیس لاکھ ملا کر سالانہ منافع ... کم سے کم پچاس لاکھ ہو جاتا ہے۔ یہ کاروبار اتنا بڑا تو نہیں ..."

"تم نے ابھی تک صرف کتابیں پڑھی ہیں۔" وہ ... "اور کتابی علم صرف راستہ دکھاتا ہے۔ منزل تک پہنچنے کے ... راستے پر چلنا پڑتا ہے جو عملی تجربہ ہے اور اس کے بغیر ... بے مصرف ہے۔ یہ دنیا بھی ویسی نہیں ہے جیسی تمہیں نظر ... ہے۔ ایک دنیا کا ذکر کتابوں میں ملتا ہے اور یہ دنیا ... ہے جیسا دنیا کو ہونا چاہیے۔ دوسری دنیا کا ذکر کسی کتاب میں نہیں تھا اور اس میں تم نے ابھی تک قدم نہیں رکھا۔ یہ وہ دنیا ہے جو عملاً تمہارے اردگرد موجود ہے۔ میروزیر اینڈ کمپنی کے نام کی بڑی اچھی ساکھ ہے۔ گڈول۔ اس انجینئرنگ فرم کے تیار کردہ آلات کی مانگ میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ چنانچہ میروزیر اینڈ کمپنی کے روابط دنیا کے مختلف ممالک میں پھیل رہے ہیں لیکن انجینئرنگ کے آلات میں ہم کیا کما سکتے ہیں۔ ہمارے مقابل جاپان ہے۔ جرمنی اور فرانس ہیں۔ برطانیہ اور امریکہ ہیں۔ ان کی ساکھ ہم سے بہت بہتر ہے اور معیار کے علاوہ یہ مسائل سیاسی تعلقات کے ہیں۔ ہم دنیا کے بازار میں نیک نام ضرور ہیں مگر اپنا مال ان کی قیمت پر نہیں بیچ سکتے۔ خریدار کے سامنے ایک ہی قیمت ہو تو وہ جرمن یا انگلش سامان کو معیار کی بنیاد پر ترجیح دے گا۔ قیمت کا مسئلہ ہوگا تو ہمیں جاپان سے بھی نیچے جانا پڑے گا۔ یہ مقابلہ دن بدن سخت تر ہوتا جا رہا ہے لیکن فائدہ اٹھانے کے مواقع ان کے لیے کم نہیں جو فائدہ اٹھانا جانتے ہوں۔ اس کاروبار کے روابط سے اور اپنی ساکھ سے ہم دیگر بے شمار فوائد حاصل کر سکتے ہیں — اور کر رہے ہیں۔ میروزیر اینڈ کمپنی کا نام ایک جائز کاروبار کا پردہ ہے اس کی آڑ میں زیادہ منافع بخش کاروبار چلتے ہیں۔"

"اسمگلنگ؟" میں نے چلا کر کہا۔ "تم اسمگلر ہو!— میروزیر اینڈ کمپنی کے نام پر اسمگلنگ کرتے ہو؟ اور مجھے بھی اپنا پارٹنر بنانا چاہتے ہو۔ کیا اسمگل کرتے ہو تم؟ سونا؟ منشیات؟ اسلحہ؟؟"

وہ ہنسا۔ "تم واقعی بچے ہو۔ عمر کا عقل سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس حقیقت کی زندہ مثال۔ تمہیں ابھی معلوم ہی نہیں کہ اسمگلنگ کسے کہتے ہیں۔ میں نے تو زیادہ منافع بخش کاروبار کا ذکر کیا تھا۔ تمہارا ذہن اسمگلنگ کی طرف کیوں چلا گیا؟ کاروبار تو صرف کاروبار ہوتا ہے۔ اس میں جائز کیا ہے اور ناجائز کیا۔ یہ تفریق کا معیار ہر جگہ الگ ہے نیکی بدی یا حسن کے معیار کی طرح۔ مثلاً ترکی میں افیون کی کاشت حکومت کی نگرانی میں ہوتی ہے۔ بہت سے ممالک میں شراب کی کشید اور فروخت پر پابندی نہیں۔ مونٹی کارلو میں دنیا کے سب سے بڑے جوئے خانے ہیں جو حکومت کی اجازت اور سرپرستی میں چلتے ہیں اور اس چھوٹی سی ریاست کی بیشتر آمدن جواریوں کی بدولت ہے۔ بہت سے ممالک میں طوائفوں کو کاروبار کے لیے باقاعدہ لائسنس جاری کیے جاتے ہیں۔ لیکن کیا ہمارے اور دنیا کے بیشتر ممالک کے نقطہ نظر سے یہ کاروبار جائز ہیں۔ اخلاقاً، مذہباً اور قانوناً افیون کی پیداوار، شراب کی کشید، جوا اور عصمت فروشی ممنوع ہیں۔ یہی صورتِ حال عام کاروبار کی ہے۔ ایک ملک کی تجارتی یا معاشی پالیسی میں کسی چیز کی درآمد یا برآمد پر پابندی عائد ہو تو کاروبار ناجائز ہو جاتا ہے۔ پالیسی بدل جائے تو جائز کہلانے لگتا ہے۔"

میں سمجھ گیا کہ یہ سب بکواس ہے۔ اس نے اندازہ کرنا چاہا تھا کہ میں اس ناجائز کاروبار میں شرکت کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو سکتا ہوں یا نہیں لیکن میں ایک دم بدک گیا۔ یہ میری غلطی تھی۔ اگر میں عیاری سے کام لیتے ہوئے دلچسپی کا اظہار کرتا تو شاید وہ کاروبار کی اصل نوعیت بتانے پر بھی رضامند ہو جاتا مگر بُرا ہو میری تربیت کے مزاج کا۔ میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند۔ میری اخلاقیات میں دلاور کے اصولوں کے لیے صرف نفرت تھی چنانچہ میں نے جس ردِعمل کا مظاہرہ کیا وہ غیر ارادی تھا۔ دلاور نے فوراً سمجھ لیا کہ میں اپنی سوچ کے اعتبار سے کبھی اس کا ہم خیال نہیں ہو سکتا۔ اس نے بدنما حقیقت کو خوب صورت لفظوں کے ہیر پھیر میں گم کر دیا اور اصل بات گول کر گیا جواب بھی وہی تھی یعنی میروزیر اینڈ کمپنی کے جائز کاروبار کی آڑ میں ناجائز

کاروبار چل رہا تھا اور اس انکشاف کے بعد بہت سی باتیں ازخود واضح ہو گئی تھیں۔ مثلاً یہ کہ وزیر خان کی عملی طور پر کاروبار سے علیحدگی کا سبب کیا تھا۔ وہ کاروبار میں مختارِ کُل بن کے رہنا چاہتے تھے اور وزیر خان کی اخلاقی اقدار کو اپنے منافع کی راہ میں حائل نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔ شاید انھیں ڈر تھا کہ وزیر خان کو حقیقت کا علم ہوا تو وہ ان کا دھندا چوپٹ کر دے گا۔ اس کا وجود کروڑوں روپے سالانہ کی آمدنی کے لیے ایک مستقل خطرہ تھا۔ عین ممکن ہے کہ وزیر خان کے شکوک ہی اس کی بے وجہ اور ناوقت موت کا سبب بنے ہوں۔ تاہم ایک بات اب بھی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ دلاور نے یہی فراخ دلانہ پیشکش میرے والد کو کیوں نہیں کی تھی۔

”دلاور۔“ میں نے کہا۔ ”شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔ عملی زندگی کا مجھے کوئی تجربہ نہیں۔ یہ بتاؤ مجھے پانچ لاکھ دے کر الگ کر دینے کے بجائے تم مجھے ایک پارٹنر کیوں نہیں بنا لیتے۔ تم مجھے دس لاکھ سالانہ لندن میں دے سکتے ہو تو یہاں کیوں نہیں دے سکتے؟“

”تمھیں آم کھانے سے غرض ہونا چاہیے۔ پیڑ کے گننے سے نہیں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن میں تم سے ایک رعایت ہی تو مانگ رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”کہ میں کاروبار سے مکمل طور پر دستبردار نہیں ہوتا۔ تمھیں اپنے ساتھ شریک کر لیتا ہوں خود ایک تہائی یا ایک چوتھائی مالک رہ جاتا ہوں۔ تم بھی مالک ہو جاتے ہو اور میں بدستور ایک بے ضرر مالک بن کے تمھارا ساتھ دیتا رہتا ہوں۔ اس میں کیا قباحت ہے۔ خواہ میرا منافع دس لاکھ ہی رہے مگر ذہنی طور پر مجھے یہ احساس تو رہے گا کہ میں تمھارا ملازم یا کمیشن ایجنٹ نہیں ہوں۔ جو کچھ مجھے ملے گا میرا حق ہو گا اور یہ میرے لیے تھوڑے سے اطمینان کی بات ہو گی۔“

اسکرین پر سائے نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”کاروبار سے عملی طور پر تمھارا کوئی تعلق ہمارے لیے قابلِ قبول نہیں۔ ایک فیصد بھی نہیں۔“

”پھر مجھے واقعی سوچنا پڑے گا کہ دونوں تجاویز میں سے میرے لیے کون سی زیادہ قابلِ قبول ہے۔“ میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”یعنی میں دس لاکھ روپے سالانہ کے منافع پر تمھارے لیے کام کروں۔ یا پانچ لاکھ لے کر لندن واپس چلا جاؤں۔ اگر پانچ کی جگہ دس لاکھ ہوتے تو میں ابھی قبول کر لیتا۔“

”دس لاکھ۔“ اس نے کہا۔ ”گویا تم دگنی رقم مانگ رہے ہو۔ خیر۔ اس پر غور کریں گے۔ میرا خیال تھا پانچ کی بجائے چھ یا سات تک تو ممکن ہے۔ شاید میں بھی اسی وقت منظور کر لیتا۔ مگر دس لاکھ کے مسئلے پر مجھے مشورہ کرنا ہو گا۔“

”میرا خیال ہے ہمارے درمیان مذاکرات تسلی بخش طور پر آگے بڑھے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”آیندہ ملاقات کب اور کہاں ہو گی؟“

”تمھیں سوچنے کے لیے ایک ماہ کی مہلت کافی ہو گی۔“ وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ ”اس کے بعد ہم خود تمھیں بلا لیں گے۔ جہاں مناسب سمجھیں گے۔“

”ایک دو باتیں میرے لیے وضاحت طلب ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”ایک یہ کہ کاروبار سے باعزت طور پر علیحدہ ہونے کی یہ پیشکش میرے والد کو کیوں نہیں کی گئی تھی؟ اگر وہ پانچ لاکھ لے کر میرے پاس لندن آجاتے تو کیا تھا؟“

”مجھے نہیں معلوم میر شرافت علی سے ان کی کیا بات ہوئی تھی۔“ دلاور نے کہا۔ ”اور حقیقت یہ ہے کہ میرا ان سے کبھی براہِ راست تعلق ہی نہیں رہا۔ ممکن ہے اس پیشکش کو وہ مسترد کر چکے ہوں۔“

”اور خطرے کا باعث بن گئے ہوں۔؟“ میں نے کہا۔ ”چنانچہ میر شرافت علی نے انھیں قتل کرا دیا تاکہ بات بڑھ نہ جائے۔“

”میں نے کہا نا کہ میر شرافت علی اور وزیر خان کے معاملات سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا۔“ وہ عیاری سے کام لیتے ہوئے بولا۔ ”اگر اس نے قتل کرایا ہو گا تو معلوم ہو جائے گا۔ تم نے تو اس پر بلیک میلنگ کا الزام بھی عائد کیا ہے۔“

”دلاور۔ تم ایسے انجان بن رہے ہو جیسے میر شرافت علی کی اصلیت کو بالکل نہیں سمجھتے۔“ میں نے کہا۔ ”جب تمھارے اور اس کے درمیان اتنا قریبی کاروباری تعلق تھا تو کیا یہ باتیں تم سے پوشیدہ تھیں؟“

”ہمارا میر وزیر اینڈ کمپنی کے اصل کاروبار سے کوئی تعلق نہیں تھا اور چونکہ وزیر خان بھی غیر متعلق رہا اس لیے مجھے یہ سب واقعی معلوم نہیں۔“ دلاور نے کہا۔ ”میر شرافت علی زندہ ہوتا تو بتا سکتا تھا۔ وہ ہمارا ایک بزنس پارٹنر تھا۔“

”کیا تم بتا سکتے ہو کہ اسے قتل کرنے والا میرے علاوہ کون ہو سکتا ہے؟“ میں نے اچانک کہا۔

سائے نے پھر انکار میں گردن ہلائی۔ ”میری معلومات اخبار کی حد تک ہیں۔ اور اخبارات سے پتا چلتا ہے کہ قتل تم نے کیا ہے۔“

”کیا کاروباری رقابت میں قتل ناممکن ہے؟“ میں نے غصے کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ”اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ خود تم نے قتل نہیں کیا؟“

”ثبوت تو کوئی نہیں۔“ وہ سکون سے بولا۔ ”نہ میرے پاس نہ تمھارے پاس لیکن یہاں تمھارے سامنے مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟ نہ میں تم سے ڈرتا ہوں نہ مجھے یہ اندیشہ ہے کہ میرے اعترافِ جرم کا کوئی گواہ پیدا ہو جائے گا۔ اس لیے میں یہ بتانے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا کہ میر شرافت علی کو نہ میں نے قتل کیا ہے نہ قتل کرایا ہے۔ اس سے ہمیں کوئی شکایت یا پرخاش نہیں تھی۔ کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔“

”اگر وہ زندہ ہوتا تو خود مجھ سے بات کرتا؟“ میں نے کہا۔

”ظاہر ہے۔ میرا تو تم سے کبھی واسطہ نہیں رہا۔“ دلاور نے پھر کرسی پر پہلو بدلا۔

میں ہکا بکا رہ گیا۔ مجھے اس کے جھوٹ نے نہیں اس کے اعتماد نے حیران کیا۔ جتنے اعتماد سے اس نے جھوٹ بولا تھا اتنے یقین کے ساتھ میں سچ بھی نہیں بول سکتا تھا۔ میر شرافت علی کے لیے میری آمد قطعی غیر متوقع تھی۔ وہ مجھے اچانک اپنے سامنے دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا تھا۔ اگر وہ مجھے بلوانے والوں میں شامل ہوتا اور اسے مجھ سے یہی بات کرنا ہوتی جو دلاور نے کی تو وہ اس کے لیے تیار ملتا۔ اب میرے لیے یقین مشکل تھا کہ دلاور کی بات میں جھوٹ کیا ہے اور سچ کیا؟ اس نے سب جھوٹ بولا تھا۔ وہ یقیناً جانتا تھا کہ وزیر خان کیوں مارا گیا۔ اسے علم تھا کہ قاتل کون ہے۔ اسے یہ بھی معلوم ہو گا کہ میر شرافت علی کو قتل کس نے کیا۔ اور کیوں؟ مگر وہ بہت شاطر آدمی تھا اور اپنی زبان سے نکلنے والے ہر لفظ پر اتنا ہی غور کرتا تھا جتنا شطرنج کا کھلاڑی کسی چال پر کرتا ہے۔ اس کا کھیل دفاعی نوعیت کا اور محتاط تھا۔ وہ کاروباری بات کے علاوہ کوئی بات کرنا چاہتا ہی نہیں تھا۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی کچھ بتانے سے گریز کر رہا تھا۔ وہ بہت خطرناک دشمن تھا۔

”گویا میر شرافت علی کا قتل تمھارے لیے بھی غیر متوقع تھا۔“ میں نے کہا۔ ”میں بھی تمھارے سامنے بے خوفی سے ایک بات کہہ سکتا ہوں۔ میں نے شرافت علی کو قتل نہیں کیا۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ یہ حرکت کس کی ہو سکتی ہے۔ تمھیں اس کے دوستوں کا اور دشمنوں کا علم ہو گا۔ کاروبار میں اس کی رقابت کس سے تھی۔ اس کا حریف کون تھا۔ کیا کبھی اس کے کاروبار سے کسی کے مفادات مجروح ہوئے تھے؟ کسی کے دل میں اس کے خلاف رنجش تھی؟“

”میرا خیال ہے میر شرافت علی کا قتل ذاتی دشمنی کا نتیجہ تھا اور اس کے اسباب نجی ہیں۔“ وہ سوچ کر بولا۔ ”مجھے اس کے نجی معاملات کی زیادہ خبر نہیں تھی۔ کاروبار میں نہ اس کی کسی سے رنجش تھی اور نہ دشمنی۔ حریف تو سب ہی ہوتے ہیں اور دنیا میں کسی کاروبار پر ایک ہی فرد کی اجارہ داری نہیں ہے مگر وہ ایک دوسرے کے دشمن نہیں ہوتے۔“

دلاور سے سچ اگلوانا بھی اتنا ہی مشکل تھا جتنا اس کے منہ پر اسے جھوٹا کہنا۔

”تم نے ابھی کہا تھا کہ میں نے تمھاری تجاویز سے اتفاق کیا تو مجھے ایک فائدہ ہو گا کہ میرے خلاف مقدمات ختم ہو جائیں گے۔“ میں نے کہا۔ ”یہ کیسے ممکن ہے جب کہ تم نہ اصل قاتل سے واقف ہو نہ قتل کے اسباب سے۔“

”میں تمھیں پھر مشورہ دوں گا کہ آم کھانے سے غرض رکھو، پیڑ مت گنو۔“ وہ بولا۔ ”ضروری نہیں کہ میں اپنے قول و فعل کی وضاحت بھی کروں۔ ہر بات کا جواز بھی فراہم کروں اور تمھیں مطمئن کرنا لازمی سمجھوں۔ اب تم جا سکتے ہو۔ اس گفتگو کا حوالہ کہیں نہیں دو گے تو فائدے میں رہو گے۔ ورنہ تم دیکھ چکے ہو کہ میری رسائی ہر جگہ ہے۔ میرے ہاتھ اتنے لمبے ہیں کہ تمھیں لندن سے کھینچ لائے۔ تم مجھ سے بچ کے کہیں نہیں جا سکتے اور کرۂ ارض پر تمھیں چودھری دلاور کے عتاب سے کہیں پناہ نہیں مل سکتی۔ ایک مہینہ بہت ہوتا ہے تم آج کی بات کے ہر لفظ پر اچھی طرح غور کر سکتے ہو۔ اور مجھے امید ہے تمھارا حافظہ اچھا ہے۔ اس لیے تم کوئی لفظ بھولو گے نہیں۔“ وہ ایک دم پلٹا۔ پھر پیچھے والی روشنی گل ہو گئی اور اسکرین پر سے اس کا سایہ بھی مٹ گیا۔ وہ اندھیرے ہی میں کہیں گم ہو گیا اور میرے سامنے وہ مندری والا کھڑا رہ گیا۔ جیسے الٰہ دین کے چراغ کا جن تھا اور وہ شخص جو مجھے انجکشن لگا کے لایا تھا۔

”کھڑے منہ کیا دیکھ رہے ہو؟“ میں نے ڈانٹ کر کہا۔ ”سنا نہیں چودھری صاحب کا حکم۔؟ ہمیں اسی تزک و احتشام کے ساتھ واپس اپنی قیام گاہ پر پہنچا دیا جائے۔“ پھر میں نے اطمینان سے سگریٹ نکالی اور جلانے کے بعد دیا سلائی کو پھونک مار کر بجھانے ہی ٹائیگر کے پیٹ میں لگا دیا۔ وہ بلبلایا اور اپنے عظیم الشان پیٹ کو یوں ملنے لگا جیسے اس

کی املاک کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے۔" میں نے قہقہہ مارا۔
"ابھی یہ غبارہ پھٹ جاتا۔ خیر۔ پھر بھی سہی۔" مندری والے نے آگے بڑھ کے میرے لبوں سے سگریٹ نکال لی اور فرش پر ڈال کے مسل دی۔ "بڑے بد اخلاق لوگ ہو تم۔ نہ جانے کو پوچھا اب سگریٹ بھی چھین لی۔"

"چلو۔" اس نے مجھے گدی کے ساتھ ایک دھکا دیا۔

"یہ نہ ہو میں تمھاری زبان ہمیشہ کے لیے خاموش کر دوں۔"

"چودھری دلاور کے کتے۔" میں نے چلتے ہوئے کہا۔

"تو صرف بھونک سکتا ہے۔ مجھے کاٹ نہیں سکتا۔ ٹائیگر تو تیرا نام ہونا چاہیے۔ یہ دوسرا تو گینڈا ہے اور وہ کمپاؤنڈر صاحب! اس کی شکل بن مانس سے ملتی ہے۔" مندری والے نے پیچھے سے میرے ایک زبردست لات رسید کی۔

"افسوس یہ ہے۔" میں نے رک کر اور گھوم کر کہا۔ "کہ میں لڑنے بھڑنے کے موڈ میں نہیں ہوں ورنہ چودھری دلاور کو ریفری بناتا اور تم تینوں کتوں کو ایک ساتھ لڑنے کی دعوت دیتا۔ ویسے تم میرے ہاتھوں پٹنا چاہو تو تمھاری مرضی۔ کہاں پٹو گے؟ یہاں یا باہر۔؟"

مندری والے نے تیسری بار حملہ کیا تو میں بالکل تیار تھا۔ پلک جھپکنے میں وہ قالین پر چت پڑا تھا۔ "چلو اٹھ جاؤ۔ شاباش۔" میں نے کہا اور دروازہ کھول کے باہر نکل گیا۔ میرے لیے ڈرنے کی کوئی بات نہیں رہی تھی۔ جب تک میں ان کی جان کے لیے خطرہ نہ بنتا۔ وہ میری جان نہیں لے سکتے تھے۔

خلافِ توقع واپسی پر میرا سفر لباسِ قدرت میں نہیں ہوا۔ میری آنکھوں پر پٹی نہیں باندھی گئی لیکن میرے ہاتھ باندھے گئے اور منہ میں کپڑا بھی ٹھونسا گیا۔ میں نے قطعی مزاحمت نہیں کی۔ پھر نہ جانے کہاں سے ایک ٹیکسی نمودار ہوئی اور میں اس کی پچھلی سیٹ پر بن مانس ٹائپ کمپاؤنڈر اور مندری والے کے ساتھ تشریف رکھنے پر مجبور کر دیا گیا۔ میں نے ہیڈ لائٹس کی روشنی میں غور سے کوٹھی کے محلِ وقوع کو دیکھا اور فوری طور پر مجھے خیال آیا کہ یہ لوگ مجھے جانتے بوجھتے چودھری دلاور کی کوٹھی کا راستہ دیکھنے کا موقع کیوں فراہم کر رہے ہیں۔ وہ مجھے بے لباس نہ سہی آنکھوں پر پٹی باندھ کے تو لا سکتے تھے۔ جواب فوراً میری سمجھ میں آ گیا۔ یہ کوٹھی چودھری دلاور کی ہرگز نہیں تھی۔ شاید یہاں میں سے کسی کی بھی نہیں تھی۔ انھوں نے کسی بھی خالی کوٹھی پر قبضہ کر لیا تھا جس کے مکین کراچی یا مری یا بیرونِ ملک کہیں بھی ہو سکتے تھے۔ اگر کوئی چوکیدار ہوگا تو صبح بندھا پڑا ملے گا لیکن میں کسی کو ساتھ لے کر آیا تو اصل مجرم کہیں نہ ہوں گے۔ میں خود مجرم بن جاؤں گا۔ ہاتھوں پیروں کا باندھنا ضروری تھا تاکہ میں راہ میں کوئی مسئلہ نہ بنوں اور میرا منہ بند رکھنا بھی ضروری تھا کہ میں شور نہ مچا سکوں مگر میری آنکھیں بند رکھنا ضروری نہیں سمجھا گیا تھا۔ ان کے لیے مجھے ہوٹل سے نکال کے لانا مشکل تھا۔ یہاں سے واپس ہوٹل بھیجنا مشکل کام نہ تھا۔ ٹیکسی جن راستے سے بھی گزری وہ میرے ذہن میں رہا مگر اب اس کی کوئی اہمیت نہیں رہی تھی۔ ملتان روڈ کی اس کوٹھی پر مجھے لوٹ کر نہیں آنا تھا۔ ٹیکسی شملہ پہاڑی کی طرف سے گزری تو ریڈیو پاکستان کی عمارت سے ذرا آگے ایک ویران جگہ رک گئی۔ مندری والا باہر نکلا اور اس نے مجھے باہر گھسیٹ کر سڑک کے کنارے ڈال دیا۔ پھر وہ ٹیکسی میں بیٹھا اور ٹیکسی ہوا ہو گئی۔ میں نے سر اٹھا کے اس کا نمبر دیکھنے کی کوشش کی لیکن ٹیکسی کی لائٹس آف تھیں۔ مجھے اندھیرے میں کچھ دکھائی نہ دیا۔ رات کے دو بج رہے تھے اور سڑک بالکل سنسان تھی لیکن مجھے امید تھی کہ چند منٹ میں کوئی نہ کوئی ادھر سے ضرور گزرے گا۔ میں نے خود کو گھسیٹ کر فٹ پاتھ پر لانے کے بجائے سڑک پر ہی پڑے رہنے کا فیصلہ کیا۔ میں ایک کنارے پر تھا اور اس بات کا امکان بہت کم تھا کہ کوئی گاڑی مجھ پر سے گزر جائے۔

تقریباً دس منٹ بعد ریڈیو پاکستان کی پرانی عمارت کی جانب سے ایک کار نمودار ہوئی۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی سیدھی مجھ پر پڑی اور جب کار سیدھی آ کے میرے قریب پہنچی اور آہستہ ہوئی تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ کار سے اترنے والا نوجوان کچھ دیر مجھے حیرانی سے دیکھتا رہا۔ اس کے ساتھ کار میں ایک لڑکی یا نوجوان عورت بھی بیٹھی تھی۔

"گاڑی کیوں روک لی۔ خواہ مخواہ کوئی مشکل نہ گلے پڑ جائے۔" وہ سہم کر بولی۔

"تم ٹھہرو ڈارلنگ۔" نوجوان نے اسے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ "میں دیکھتا ہوں یہ کیا گڑبڑ ہے۔" پھر اس نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کے میرے ہاتھوں اور پیروں کی رسیاں کھولنے سے پہلے میرے منہ میں ٹھنسا ہوا کپڑا نکالا۔ میں نے ایک طویل گہری سانس لی۔

"تھینک یو۔" میں نے کہا۔ "میں کسی فرشتۂ غیب کے نمودار ہونے کا انتظار ہی کر رہا تھا۔" عورت نے پھر شوہر کو...

"خاتون سے کہہ دیجیے پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ بس میرے ہاتھ کھول دیجیے اور جائیے پھر اس بات کو بھول جائیے۔" ...

کو میں یاد رکھوں گا۔"

نوجوان کچھ نروس سا تھا۔ اس نے فقط سر ہلایا اور تھوڑی سی جدوجہد کے بعد میرے ہاتھوں کو آزاد کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کی بیوی یا محبوبہ آدھی رات کے وقت اس سنسنی خیز منظر سے خاصی پریشان اور دہشت زدہ تھی اور اسے بار بار مجبور کر رہی تھی کہ خدا کے لیے یہاں سے نکل چلو' معلوم نہیں یہ کیا چکر ہے۔ میری بات سن کے اس نے یہی بہتر سمجھا کہ وہ جلد از جلد جائے واردات سے فرار ہو جائے۔

اس نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا کہ میرے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا ہے اور اس حرکت کے ذمے دار کون لوگ ہیں۔ بظاہر میں نہ زخمی تھا اور نہ بیمار کہ وہ مجھ سے مزید ہمدردی کا عملی مظاہرہ کرنے کے لیے رکتا۔ میں نے اس کا دوبارہ شکریہ ادا کیا اور وہ کار میں بیٹھ کے رخصت ہوگیا۔ میں نے عمداً رسمی تکلفات سے گریز کیا، نہ اس کا نام پوچھا اور نہ اسے اپنا نام بتایا۔ پیروں کو آزاد کرتے ہی میں اٹھ کھڑا ہوا۔ قریب ترین ٹیلی فون' ریڈیو پاکستان میں تھا مگر وہاں داخلہ مشکل تھا۔ میں نے رسی کو باہر ایک جھاڑی کے پیچھے پھینکا اور دروازے پر کھڑے ہوئے پہرے دار سے کہا کہ مجھے ایک انتہائی ضروری فون کرنا ہے۔ اس نے پہلے تو پس و پیش کیا کہ یہ سرکاری ٹیلی فون ہے اور عام لوگوں کے لیے نہیں ہے مگر میں نے کہا کہ بھیا ایک موت کی خبر دینا ہے۔ آخر تم بھی تو مسلمان ہو۔ تمھیں بھی تو مرنا ہے ہم سب کی طرح۔ تو اس نے میرے ساتھ جا کے قریب کے ایک آفس کا دروازہ کھول دیا لیکن خود میرے سر پر سوار رہا۔ میں نے ایمبیڈر ہوٹل کا نمبر ملایا اور محسن کے کمرے کی لائن مانگی۔ مجھے امید تھی کہ وہ جاگ رہا ہوگا۔ پہلی گھنٹی پر ہی اس نے ریسیور اٹھا لیا۔

"محسن" میں نے کہا۔ "میں تمھارا ماما بول رہا ہوں' سکندر بخت۔"

"سکندر بخت" محسن نے چلا کر کہا اور جواب میں دو ناقابلِ تحریر گالیاں دیں جو چوکیدار نے نہیں سنیں۔ "کہاں مر گیا تھا تو۔؟"

"بیٹا میں یہاں ریڈیو پاکستان سے بول رہا ہوں۔" میں نے غم زدہ لہجے میں اداس صورت بنا کے کہا۔

"ریڈیو پاکستان!" محسن نے کہا۔ "ابے بھائی یہ رات دو بجے کون سی محفل چل رہی ہے' دن میں کوئی موقع نہیں دیتا کہ رات کو گانے بیٹھ گیا ہے بے وقت کا راگ؟ معلوم ہے میں کتنا پریشان ہوں۔ رابعہ کتنی پریشان ہے۔ اور۔"

"ہاں بیٹا۔ بڑی پریشانی کی بات ہے۔ اللہ بھلا کرے یہ ریڈیو پاکستان کے سنتری صاحب ہیں۔ انھوں نے اجازت دے دی کہ تم سے فون پر بات کروں۔ اپنے وہ سہاگ شاہ کے چچا سسر تھے نا میر خرافت علی۔ وہ فوت ہوگئے ہیں۔"

"سکندر۔ تو ہوش میں ہے نا۔؟ محسن کی تشویش میں ڈوبی ہوئی آواز آئی "یہ کسی نے کچھ کھلا پلا دیا ہے؟ یا مارا ہے؟"

"نہیں سکندر۔ میر شرافت علی صاحب کا وقت پورا ہوگیا تھا۔" میں نے کہا۔ "بس بیٹھے بیٹھے چھینک آئی پٹ سے زمین پر گرے اور ختم۔ اب تو ایسا کر کہ گھر آجا۔ ہاں ہاں ریڈیو پاکستان سے ذرا آگے ڈین صاحب کی کوٹھی سے تیسرا مکان۔ ہاں۔ میں وہیں ہوں۔" میں نے فون بند کر دیا۔ سکندر سمجھ گیا تھا کہ میرا مقصد اسے بلانا ہے اور کوئی بات ایسی ہے جو میں ٹیلی فون پر نہیں کر سکتا۔ چوکیدار نے میرے شکریے کے جواب میں زور سے "قالوا انا للہ" پڑھا اور دروازہ بند کر لیا۔ وہ کچھ حیران ضرور تھا کہ وہ بھانجا کتنا بڑا ہے جسے میں نے بڑے بوڑھوں کی طرح بیٹا کہہ کے فون کیا تھا۔ میں خود بڑا بوڑھا کہاں لگتا تھا۔ باہر آکے میں نے وہ رسی پھر اٹھا لی۔ سکندر آدھے گھنٹے بعد نمودار ہوا جب میں ایک درخت کی اوٹ میں کھڑا تھا۔ ذرا دیر پہلے گشت کرنے والے دو سپاہی گزرے تھے۔ اگر وہ مجھے بے مقصد کھڑا دیکھ لیتے تو دفعتاً ایک سو نو میں چالان کر کے حوالات پہنچا دیتے۔ محسن پیدل آیا تھا۔ میں نے اس کے ساتھ پیدل چلتے ہوئے اپنے اغوا کی، چودھری دلاور سے مذاکرات کی اور واپسی کی روداد کم سے کم الفاظ میں سنا دی۔ وہ غور سے سنتا رہا اور خاموشی سے میرے ساتھ اسٹیشن کی جانب رواں رہا۔ اسٹیشن کے ایک معمولی سے ہوٹل میں بیٹھ کے ہم نے وہ چائے پی جو عام حالات میں ہمارا معدہ کبھی قبول نہ کرتا لیکن اس وقت یہی گرم چائے بڑی نعمت ثابت ہوئی۔ محسن میرے اغوا کے بعد پہنچا تھا اور اسے حیران پریشان کاؤنٹر کلرک نے بتایا کہ چابیاں تو ابھی کچھ دیر پہلے آپ لے گئے تھے۔ محسن کو یہ بھی معلوم ہوا کہ بعد میں سکندر صاحب نے کہا تھا کہ کھانے کا اور کافی کا بل کمرے میں بھجوا دیا جائے لیکن ویٹر بل لے کر گیا تو کمرے میں کوئی نہیں تھا چنانچہ وہ لوٹ آیا۔ پھر کلرک خود محسن کے ساتھ گیا اور جب محسن کو اطمینان ہوگیا کہ اس کی کوئی چیز غائب نہیں ہے تو اس نے کلرک کی درخواست قبول کر لی کہ اس بات کا ذکر مینیجر سے نہیں کیا جائے گا۔ اس کا عذر قابلِ قبول تھا کہ ہم سب مسافروں کو صورت سے کہاں پہچان سکتے ہیں اور پھر رش سے میں کوئی بھی آدمی اطمینان سے کسی کا نام لے کر چابی مانگے، چابی موجود ہو اور نام، نمبر بھی درست ہوں تو یہ شبہہ کیسے ہو سکتا ہے کہ چابی مانگنے والا غلط آدمی ہے۔ اس کے علاوہ چابیاں بھی کمرے میں موجود تھیں جس کا مطلب یہ نکالا جا سکتا تھا کہ کسی نے عمداً شرارت کی یا کرنا چاہتا تھا مگر کسی وجہ سے ناکام لوٹ گیا۔ بخیر گزشت والی بات تھی۔ محسن نے کہا کہ جاؤ معاف کیا لیکن بعد میں کمرے کے اندر کوئی ٹائم بم پھٹے تو تم بھی مغفرت کی دعا کرنا۔ حواس باختہ کلرک شکریہ ادا کر کے لوٹ گیا تھا۔ محسن کو قطعی اندازہ نہ ہو سکا تھا کہ مجھے اس کمرے سے ہائی جیک کیا گیا ہے۔

"سوچنے کی بات یہ ہے محسن کہ وہ مجھے قالین میں لپیٹ کر کیسے لے گئے؟" میں نے کہا۔ "وہ کاؤنٹر کے سامنے سے گزرے ہوں گے۔ کسی نے ان کو دیکھا بھی ہوگا۔ پھر ان کو روکا کیوں نہیں گیا۔ اس کا جواب صرف ایک ہو سکتا ہے۔ وہ قالین اُن کا اپنا تھا اور وہ پہلے سے ہوٹل کے کسی کمرے میں موجود میرا انتظار کر رہے تھے۔ اب میں ثابت کیسے کر سکتا ہوں کہ قالین کے اندر میں بھی تھا۔ اور ثابت کرنے کا فائدہ بھی کیا لیکن مجھے دوسری بات معلوم کرنا ہے۔ آخر کافی میں بے ہوشی کی دوا کس نے ملائی تھی اور کس کی مدد سے ملائی تھی۔ اس میں مجھے کسی ویٹر یا کسی باورچی خانے کے کارکن کا ہاتھ معلوم ہوتا ہے جس نے پیسے کے لالچ میں یہ حرکت کی۔ یا اس حرکت سے چشم پوشی کی۔"

"ہوٹل والے کبھی نہیں مانیں گے۔" محسن نے کہا۔ "ان کی نیک نامی متاثر ہوتی ہے۔"

"لیکن میں معلوم کر کے رہوں گا۔ اسی لیے میں نے تجھے بلایا ہے ورنہ آزادی کے بعد تو میں خود بھی ہوٹل پہنچ سکتا تھا۔ میرے ذہن میں ایک اسکیم ہے۔ ابھی ڈیوٹی پر وہی لوگ ہوں گے جو رات کے وقت تھے۔ ویٹر، کلرک، مینیجر سب کی شفٹ صبح چھ بجے سے پہلے ختم نہیں ہو سکتی۔ اب تو ایک کام کر۔ ہم اکٹھے چلتے ہیں۔ تو مجھے کسی گمنام گوشے میں باندھ کے ڈال دینا اور اپنے کمرے میں جا کے سو جانا۔ اگر نیند نہ آئے تب بھی لائٹ آف رکھنا۔ میں اپنی رسٹ واچ اور پرس وغیرہ سب تیرے حوالے کر دوں گا۔"

"یہ کیا ڈراما ہے برادر نسبتی؟" محسن رضا نے سگریٹ نکال کے مجھے پیش کی۔

"سالارِ اعظم۔ ذرا صبر و تحمل سے کام لیجیے۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟" میں نے سگریٹ لے کر کہا۔ "جو ہوگا آپ کے سامنے آجائے گا۔"

"برادر نسبتی۔ میں ایسے کسی ڈرامے میں کوئی پارٹ نہیں لے سکتا جس کے پلاٹ کا مجھے علم نہ ہو۔ اور انجام کے بارے میں اطمینان نہ ہو۔" محسن نے کہا۔ "اگر وہ کوئی طبعی حماقت ہوئی جسے آپ اپنی ذہانت سمجھ رہے ہیں تو کیا ہوگا۔ ابھی تو میں صحیح مشورہ دے سکتا ہوں۔ بعد میں رونا عبث ہوگا۔" میں نے بتا دیا کہ میرا ارادہ کیا ہے۔ پلاٹ سے مطمئن ہو کے محسن نے ہاتھ ملا کے مسرت سے کہا۔ "وِش یُو گڈ لک" اور میرے ایک دھپ رسید کیا۔ پھر ہم دونوں نے کچھ اور سیر کی یعنی ایمبیڈر ہوٹل تک مارننگ واک کیا۔ صبح کے ساڑھے چار بجے تھے اور یہی وقت تھا جب ہمیں رابعہ نے نہر کے پل پر سے پک اپ کیا تھا۔ محسن نے اس خیال کا اظہار کیا کہ ہم اسی طرح علی الصبح سیر کرتے رہے تو خدا ہمیں صحت' عقل اور دولت سب عطا کرے گا۔ میں نے اسے یاد دلایا کہ انگریزی محاورے کے مطابق عقل مند' دولت مند اور صحت مند بننے کے لیے صبح دم جاگنا ہی نہیں سرِ شام سو جانا بھی ضروری ہوتا ہے۔

ایمبیڈر ہوٹل میں داخلے کے لیے ہم نے شریفانہ راستہ اختیار نہیں کیا۔ دروازے پر سیلوٹ کرنے والا دربان موجود تھا جو ہمیں اتنی صبح غلط سمت سے آتے اور غلط سمت میں جاتے دیکھتا تو تشکک میں مبتلا ہو جاتا۔ ہم نے ایک دیوار پھاندی اور باغیچے میں گرے جہاں اس وقت کوئی بھی موجود نہ تھا۔ تھوڑا سا سروے کرنے کے بعد میں نے "جائے واردات" تلاش کی اور برضا و رغبت لیٹ کر محسن کو موقعہ فراہم کیا کہ وہ مجھے باندھ دے اور میرے منہ میں میرا ہی رومال بھی ٹھونس دے۔ محسن نے دو منٹ میں یہ کارروائی مکمل کی اور غائب ہوگیا۔ کمرے میں پہنچتے ہی اسے کاؤنٹر کلرک کو فون کرنا تھا کہ سکندر نام کے جو مہمان اس کی عدم موجودگی میں آئے تھے اور اپنا بل بھجوانے کے لیے کہہ گئے تھے کیا وہ جاتے وقت کوئی پیغام دے گئے تھے۔ اور کلرک کا جواب سن کے اسے حیرانی' پریشانی اور تشویش کا اظہار کرنا تھا اور سو جانا تھا۔ پانچ بجنے والے تھے۔ مجھے امید تھی کہ چھ بجے تک صبح کا اجالا نمودار ہو جائے گا اور اس کے بعد کوئی نہ کوئی مجھے ضرور دیکھ لے گا۔ لان پر لیٹنا مجھے بہت اچھا لگتا ہے خصوصاً پھولوں کے درمیان صبح کی شبنمی فضا میں جو مہک ہوتی ہے اس کا

مقابلہ کوئی فرنچ پرفیوم اور لیوڈی کلون نہیں کر سکتے مگر اس حالت میں لیٹنا ایک مختلف تجربہ تھا۔ جسے قطعی خوش گوار نہیں کہا جاسکتا۔ میں نے خود ہی محسن سے کہا تھا کہ رعایت نہ برتنے ورنہ ڈرامہ حقیقی نہیں رہے گا چنانچہ اس نے میری مشکیں ویسی کَسی تھیں جیسے فرمانِ شاہی پر معتوب حضرات کی کَسی جاتی ہوں گی۔ اتنا سخت تو مجھے چودھری دلاور کے چمچوں نے بھی نہیں باندھا تھا لیکن اب مجھے یہ ایک گھنٹہ اسی کس مپرسی اور بے بسی کے عالم میں گزارنا تھا۔ اس رات کا تجربہ بھی نوعیت کے اعتبار سے منفرد تھا سوائے ان کے جو میری زبان پر اعتبار کرنے تھے کوئی یہ نہ مانتا کہ میں نے یہ رات کہاں اور کیسے گزاری۔ نہ کوئی اس بات کا گواہ تھا کہ مجھے اغوا کر کے کیسے لے جایا گیا تھا اور نہ اس بات کا شاہد تھا کہ چودھری دلاور سے میری کیا بات ہوئی تھی اور کس ماحول میں ہوئی تھی۔ میں پھر اسی ہوٹل کے کمرے میں پہنچ جاتا تو یہ بھی ثابت نہ ہوتا کہ میں کمرے سے گیا تھا۔ میں پولیس کو رپورٹ کرتا تو پولیس میری رہنمائی میں ملتان روڈ کی اس کوٹھی تک جاتی لیکن وہاں کون ملتا جو میری کہانی کو سچ مانتا۔ اگر مجھے اس ٹرک کا نمبر یاد ہوتا جس میں قالین لے جایا گیا تھا اور پولیس اسے ڈھونڈھ نکالتی تو وہ ڈرائیور اور کلینر کب تسلیم کرتے کہ قالین میں کوئی آدمی بھی تھا۔ وہاں لیٹے لیٹے میں نے یہ بھی سوچا کہ مندری والے ٹیکسی ڈرائیور نے مجھ سے ایک رات پہلے کے واقعات کے بارے میں کوئی بات کیوں نہیں کی۔ شاید ابھی خود اسے بھی معلوم نہ ہو کہ اس کے ساتھ آنے والے وہ چمچے نہر میں ڈوب مرے ہیں۔ فرمانجو یعنی منشی کے اور سلامت شاہ کے حشر کا حوالہ اسے دھمکی کے طور پر ضرور دیا تھا۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ سلامت شاہ کی لاش دریافت ہو چکی ہے اور یہ خبر بھی پھیل گئی ہے یا مندری والے کو علم ہے کہ میں لاش دیکھ چکا ہوں۔ ؟ مگر اسے کیسے علم ہو سکتا ہے ؟ شاید وہ بھی یہی دیکھنے گیا ہو کہ لاش موجود ہے یا غائب ہو گئی ؟ اور اس نے میرا سامان غائب پایا ہو تو سمجھ گیا ہو کہ میں آیا تھا۔ یہ ناممکن تھا کہ کوارٹر میں داخل ہونے والا لاش دریافت نہ کرے۔"

میں خیالات کی رو میں بہتا جا رہا تھا کہ کوئی چیز دھڑام سے مجھ پر گری۔ اگر میں بندھا ہوا نہ ہوتا تو اچھل پڑتا اور میرا منہ بند نہ ہوتا تو میرے حلق سے کوئی صدائے احتجاج بھی بلند ہوتی۔ اسی طرح جیسے مجھ سے ٹکرا کے سجدہ ریز ہو جانے والے نے بلند کی تھی۔ وہ ہوٹل کا ہی کوئی ملازم تھا جو ہاتھ پر چائے کی ٹرے اٹھائے نہ جانے کس کو بیڈ ٹی پہنچانے کے لیے شارٹ کٹ سے کہیں جا رہا تھا۔ ٹھوکر کھاتے ہی ٹرے اس کے ہاتھ سے اڑ گئی اور برتن ایک چھناکے سے بکھر گئے۔ پیچھے کپ اور پرچ زمین پر پھیل گئے۔ ایک کپ میرے سر پر لگا۔ چائے دانی مجھ سے چند فٹ دور اوندھی ہو گئی اور میرے نتھنوں میں مہکتی چائے کی دل نواز خوشبو آئی۔

"یا میرے مولا" گرنے والے نے سنبھل کے کہا اور مجھے غور سے دیکھا۔ پھر اس نے زور سے "ہو" کی۔ اگر رات کا اندھیرا ہوتا تو یہ "ہو" ایک چیخ بن جاتی۔ وہ سمجھا کہ اس کی راہ میں کوئی لاش حائل ہو گئی ہے لیکن میں دیدے کھولے اسے پٹر پٹر دیکھ رہا تھا۔

"او... او بھائی صاحب... آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟" وہ ہکلا کے بولا۔ پھر اسے اپنے احمقانہ سوال کا احساس ہوا "میرا مطلب ہے کہ جناب... یہاں کیوں پڑے ہیں کس نے باندھ کے ڈالا ہے آپ کو ؟..." بد حواسی کے باعث سوال اس کے لبوں تک آ گئے تھے اور اسے یہ خیال نہیں رہا تھا کہ میں جواب دے ہی نہیں سکتا۔ بقولِ شاعر۔ واں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں۔ یاں ایک خامشی مری سب کے جواب میں۔ اس کا ہاتھ رسیوں کی طرف بڑھا پھر میرے منہ کی طرف۔ کپڑا نکلتے ہی میں نے تیسری بار سکون کا سانس لیا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ مجھے بہت مناسب گواہ فراہم کیا۔

"یس... تھینک یو" میں نے کہا "کون ہو تم...؟ ابھی رسیاں مت کھولو"

"جی... ؟ میں ویٹر ہوں سر۔ عبدل" اس نے میرے تحکمانہ لہجے سے مرعوب ہو کے کہا۔

"اچھا عبدل۔ شور مچانے کی ضرورت نہیں" میں نے کہا "جاؤ اپنے مینیجر صاحب کو خاموشی سے بلا لاؤ۔ فوراً کسی اور نے دیکھا تو ہوٹل کی بدنامی ہو گی۔ میں اس ہوٹل میں مقیم ہوں۔ اور کاؤنٹر کلرک سے کہو مسٹر محسن رضا کو لے آئے۔"

"یس... یس سر..." حواس گم کردہ عبدل نے دوڑ لگائی اور چند منٹ میں مینیجر کے ساتھ آ پہنچا۔ یہ وہی مینیجر تھا جس سے میں نے گزشتہ رات کافی دیر سے آنے کی شکایت کی تھی۔

"آپ ؟... یہ کیا معاملہ ہے سر؟..." مینیجر نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کے پریشانی سے ادھر اُدھر دیکھا "دیکھو عبدل کوئی نظر نہیں رہا ہے۔ آخر آپ بندھے رہنے پہ کیوں مصر ہیں سر؟"

"میں یہ چاہتا تھا کہ پہلے تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لو" میں نے برہمی سے کہا "اب تم میری رسیاں کھول سکتے ہو۔ اس کے بعد میں تمہیں بتاؤں گا کہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے۔ تمہیں کیا میں پولیس کو بتاؤں گا۔ وہ خود معلوم کر لیں گے۔"

"او گاڈ" مینیجر نے مزید پریشان ہو کے کہا "عبدل۔ عبدل ایڈیٹ۔ صاحب کی رسیاں کھولو"

ابھی وہ دونوں رسیاں کھول ہی رہے تھے کہ محسن اور کاؤنٹر کلرک آ پہنچے۔ مسٹر سکندر بخت۔ محسن نے چلّا کے کہا "یہ کیا ؟"

"پلیز۔ پلیز... ذرا آہستہ..." مینیجر نے کہا "مہمان جاگ چکے ہیں۔ کوئی آ جائے گا... او گاڈ" اس نے آخری گانٹھ محسن کے ساتھ مل کر کھولی "آیئے... آیئے میرے آفس میں" وہاں بتایئے مجھے کہ بات کیا ہے۔ اس کے بعد پولیس کی ضرورت محسوس ہو گی تو میں خود طلب کروں گا۔ مگر پہلے مجھے..."

"یہ پولیس کیس ہے" محسن رضا نے چراغ پا ہو کے کہا۔ "مسٹر سکندر بخت رات کو مجھ سے ملنے آئے تھے۔ یہ کلرک جانتا ہے۔ انہوں نے کھانا بھی کھایا تھا۔ اور کہا تھا کہ بل میرے کمرے میں بھجوا دیا جائے" اس آخری بات پر کلرک کا رنگ فق ہو گیا۔

"یس سر... یس سر... مجھے سب معلوم ہے... لیکن اندر چل کے۔ پلیز... یہ گڈ ول کا معاملہ ہے۔ ہوٹل کی بدنامی ہوتی ہے اگر کوئی اسکینڈل بنے۔ میں آپ کو پوری طرح مطمئن کروں گا... جیسے آپ چاہیں گے" مینیجر نے کہا۔ "میں آپ سے پوری طرح تعاون کروں گا۔ آپ مجھ سے تعاون کیجیے۔ یہ شرفا کا ہوٹل ہے۔ آئی ایم ویری سوری... ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا..."

دو منٹ بعد ہم مینیجر کے کمرے میں بیٹھے تھے ایئرکنڈیشنڈ کمرے میں شیشے کا بہت زیادہ استعمال ہوا تھا۔ چنانچہ اندر آواز باہر سنائی نہ دیتی تھی۔ عبدل کو کافی اور سینڈوچ لانے کا حکم دے کر اس نے کلرک سے کہا کہ وہ کاؤنٹر سنبھالے اور ہم سے مخاطب ہوا "یس سر۔ اب بتایئے۔ آپ کے ساتھ یہ زیادتی کس نے کی ؟"

"مینیجر" میں نے کہا "شاید تمہیں یاد ہو گا کہ میں تمہارے پاس ایک شکایت لے کر آیا تھا"

"یس۔ کافی آنے میں کچھ تاخیر کا مسئلہ تھا" اس نے کہا "مگر کافی آ گئی تھی"

"یس۔ کافی آ گئی تھی۔ اس کافی کا ذائقہ بہت عجیب تھا" میں نے کہا "بالکل جوشاندے کی طرح۔ جوشاندہ پیا ہے کبھی ؟"

"یس... یس سر... مگر ہم تو بہترین کافی استعمال کرتے ہیں۔ میکسویل ہاؤس"

"ہاں۔ آپ لوگوں کی کافی ہمیشہ بہت اچھی ہوتی ہے کل اس کے بد ذائقہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ اس میں بے ہوشی کی دوا ملا دی گئی تھی" میں نے اطمینان سے کہا۔

مینیجر اچھل پڑا "بے ہوشی کی دوا۔ ؟ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ؟ یہ ناممکن ہے۔ قطعی ناممکن"

"ہاں" میں نے میز پہ ہاتھ مارا "مجھے کافی میں بے ہوشی کی دوا دی گئی تھی۔ تم چیلنج کرتے ہو تو میں ابھی پولیس کو رپورٹ ——— کرتا ہوں۔ وہ مجھے میو ہسپتال بھیج دیں گے۔ وہاں میرے معدے میں موجود غذا کا کیمیائی تجزیہ ہو گا تو یہ ثابت ہو جائے گا..."

"نو۔ نو سر" مینیجر نے بوکھلا کے کہا "میں قطعی چیلنج نہیں کر رہا ہوں میرا مطلب تھا یہ کیسے ممکن ہے۔ خیر اس ابھی پوچھتا ہوں... آپ آگے بتایئے... اس کے بعد کیا ہوا؟"

"اس کے بعد مجھے کاؤنٹر کلرک نے بتایا کہ مسٹر محسن رضا آ گئے ہیں۔ اس نے خود مسٹر محسن رضا کو چابیاں دی ہیں چنانچہ میں اوپر گیا اور کمرے میں جا کے بے ہوش ہو گیا" میں نے کہا "میرا مطلب ہے مجھ پر بے ہوشی سی طاری ہونے لگی"

"میں رات کو گیارہ بجے آیا تھا تو کاؤنٹر کلرک نے اپنی غلطی تسلیم کی تھی۔ وہ میرے ساتھ کمرے تک گیا بھی تھا مگر میرا نقصان کوئی نہیں ہوا تھا اور چابیاں بھی موجود تھیں اس لیے میں نے شکایت نہیں کی" محسن نے کہا "وہ بے چارا معمولی کلرک ہے"

"مگر یہ اصولاً غلط ہے" مینیجر نے ایک بٹن دبایا اور کاؤنٹر کلرک کو انٹرکام پر بات کر کے طلب کیا۔ "دیکھیے نا کچھ بھی نہیں ہوا اچھا ہوا۔ لیکن فرض کیجیے وہ چابیوں کے پرنٹ لے گئے۔ یا فرض کیجیے وہ ٹائم بم لگا جاتے۔ آپ کو رپورٹ کرنا چاہیے تھی"

"فرض کرنے کی بات چھوڑو" میں نے کہا "جو ہوا ہے اس کی بات کرو۔ کمرے میں دو افراد موجود تھے۔ وہ مجھے ایک قالین میں لپیٹ کر باہر لے گئے۔ میں نہیں جانتا وہ

کون لوگ تھے مگر کاؤنٹر کلرک نے ان کو یقیناً دیکھا ہوگا۔ ایک قالین جس میں عالم آدمی لپٹا ہوا ہو معمولی سا پارسل نہیں ہوتا کہ کوئی جیب میں ڈال کے گزر جائے۔"

مینیجر نے پھر انٹر کام کا بٹن دبایا۔" یو باسٹرڈ۔ میں تمھیں برطرف نہیں کروں گا، گولی مار دوں گا۔ ابھی تک آئے نہیں تم؟"

"باہر ایک ٹرک تھا۔" میں نے اپنی بات جاری رکھی۔" قالین ٹرک میں رکھا گیا اور ٹرک مجھے لے گیا۔ معلوم نہیں کہاں۔ اس وقت تک مجھے کچھ ہوش تھا۔ دوبارہ ہوش میں آنے پر میں نے دیکھا کہ میں ہوٹل کے باغیچے میں لیٹا ہوں۔ میری جیب میں دس ہزار روپے تھے جو اَب نہیں ہیں۔ علاوہ رسٹ واچ کے اور کچھ رقم کے جو پرس میں تھی۔ تقریباً پچاس ساٹھ روپے۔ مجھے شک ہے کہ اس ڈکیتی میں وہ ویٹر شامل ہے جس نے مجھے چوبیس نمبر ٹیبل پر سرو کیا تھا۔"

"کیا؟" مینیجر ایک دم اٹھا اور پھر بیٹھ گیا۔ میرے آخری جملے کا اثر بجلی کے جھٹکے سے کم نہیں ہوا تھا۔ "چوبیس یس... مجھے یاد ہے آپ نے چوبیس نمبر ٹیبل کی طرف اشارہ کیا تھا۔ او گاڈ۔ یہ سب کیا ہے... وہ... وہ تو غائب ہے۔ بالکل غائب ہے۔"

کاؤنٹر کلرک مجرموں کی طرح اندر داخل ہوا اور سر جھکا کے کھڑا ہوگیا۔ اسی وقت عبدل کافی اور سینڈوچ لے کر اندر آیا۔" غائب ہے؟" میں نے کہا۔" کیا مطلب؟ عبدل چوبیس نمبر ٹیبل پر رات کون تھا؟"

"مطلب یہ کہ وہ اس واقعے کے فوراً بعد غائب ہوگیا۔ بغیر بتائے کہیں چلا گیا۔" مینیجر نے سر تھام کے کہا۔" تم جاؤ۔" اس نے عبدل کو اشارہ کیا۔ پھر وہ کلرک پر برس پڑا۔" گدھے۔ نالائق آدمی کو دیکھے بغیر چابی تھما دی۔ میں تمھیں پولیس کے حوالے کر دوں گا۔ کون تھے وہ۔ ہوٹل میں ڈکیتی۔ مائی گڈنس۔ کسی بھی مہمان کے کمرے میں جو چاہے گا گھس جائے گا؟؟"

"میرا خیال ہے اس کا قصور نہیں۔" محسن نے کہا۔" اس وقت رش تھا۔ میں کل ہی آیا ہوں۔ یہ مجھے پہچانتا نہیں۔"

کاؤنٹر کلرک نے شکر گزار ہو کے محسن رضا کو دیکھا۔" ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا سر۔ اور آئندہ بھی نہیں ہوگا۔"

"یہ بتاؤ تمھارے سامنے سے کوئی قالین لے کر گزرا تھا لپٹا ہوا قالین۔؟" مینیجر نے کہا۔

"کاؤنٹر کلرک بولا۔" ایک صاحب صبح آئے تھے۔ دوپہر کو شاپنگ کے لیے گئے تو کارپٹ خرید کے لائے تھے۔ اور پھر کمرہ نمبر تین سو دس میں پہنچایا تھا۔ وہ رات کو کمرہ خالی کر گئے۔ جاتے وقت قالین بھی لے گئے تھے۔ چار لوگ اٹھا رکھا تھا۔ دو کسی ٹرک کے ڈرائیور اور کلینر تھے۔ چہرہ میں نے نہیں دیکھا۔ قالین کے دوسری طرف تھا۔"

میری کہانی واقعات کی شہادت اور گواہوں کے بیان سے درست ثابت ہو رہی تھی۔" اچھا تم جاؤ۔" مینیجر نے کاؤنٹر کلرک سے کہا۔" اس بار صاحب کے کہنے پر معاف کیا۔ اور ذرا چوکیدار کو بلاؤ۔ اور دیکھو وہ شریف کہاں ہے۔ رات کو چوبیس نمبر ٹیبل پر تھا۔ اس کا کچھ پتا چلا کر اس کے گھر بھیجو۔"

بعد میں چوکیدار نے بھی تصدیق کر دی کہ ایک ٹرک میں خاصا بڑا لپٹا ہوا قالین لے جایا گیا تھا لیکن اس نے ٹرک کا نمبر وغیرہ نوٹ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ وہ ویٹر جس کا نام شریف تھا۔ بدستور غائب تھا اور عجیب کی بات یہ تھی کہ جب وہ کسی کو کچھ بتائے بغیر گیا تھا تو کسی نے اس کو جاتے ہوئے بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے غائب ہو جانے سے سروس میں خلل پڑا تھا تو مینیجر برہم ہوا تھا اور اس نے سب سے پوچھا تھا لیکن کسی کو کچھ معلوم ہوتا تو بتاتا۔ شریف کا کوئی مہمان آیا تھا نہ پیغام۔ اور آتا بھی تو وہ اتنا غیر ذمے دار بہرحال نہیں تھا کہ ڈیوٹی پر لعنت بھیج کے چل دیتا۔

میں نے مینیجر کو مشورہ دیا کہ باہر کے بجائے شریف ویٹر کو بھی تلاش کیا جائے اور اگر کمرہ نمبر تین سو دس خالی ہے تو اس کے باتھ روم میں بھی جھانک لیا جائے۔

مینیجر نے تشویش سے میری تجویز پر غور کیا۔ ایک بار پھر کاؤنٹر کلرک کو طلب کیا اور اسے مکمل رازداری کے ساتھ کمرہ نمبر تین سو دس کا جائزہ لینے کا اور پھر خاموشی سے رپورٹ دینے کا حکم دیا۔" مجھے بھی اب دال میں کالا نظر آنے لگا ہے۔ وہ جو آپ کو لے گئے تھے۔ انھوں نے ویٹر شریف کی وردی پہن لی۔ پھر کافی میں دوا ملائی۔ اپنے قالین میں آپ کو لپیٹا اور۔ مگر سوال یہ ہے سر کہ انھوں نے ایسا کیوں کیا؟ اس نے کافی کے ساتھ سینڈوچ آگے بڑھائے۔

"کیا اب بھی شک کی گنجائش ہے۔" میں نے کہا۔" وہ مجھے لوٹنا چاہتے تھے۔"

"لوٹنے کا یہ طریقہ بہت عجیب... اور ذرا مشکل ہے۔ خدانخواستہ آپ کے کوئی دشمن تو نہیں تھے؟" وہ بولا۔

"دشمن ہوتے تو مجھے زندہ چھوڑتے؟" میں نے کہا۔ "میں نہ کسی قبیلے کا سردار ہوں۔ نہ سیاسی لیڈر۔ نہ بدمعاش۔ میرا دشمن کون ہوگا۔ یہ صرف ڈکیتی کی منظم واردات تھی۔ انھوں نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کام کیا۔ شاید ان کا طریقہ واردات ہی یہ ہوگا۔ یہ کیس بہت سنگین ہے اور پولیس کو نہیں اسپیشل پولیس کو اس کی تحقیقات کرنا چاہیے۔ آدمی خطا کا پتلا ہے۔ کون جانے ویٹر شریف یا کوئی اور ان سے مل گیا ہو۔ لالچ بڑی بلا ہے۔ عموماً گھر کے بھیدی لنکا ڈھاتے ہیں۔"

مینیجر نے بڑے اصرار سے نفی میں سر ہلایا۔" ویٹر شریف واقعی شریف ہے۔ پرانا آدمی ہے۔ اور ہم آدمی دیکھ کر رکھتے ہیں۔ ہوٹل کے عملے کا کوئی رکن یہ جرأت نہیں کر سکتا۔"

"پولیس خود معلوم کرلے گی۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔" بعض اوقات اندازے غلط ہو جاتے ہیں۔"

"دیکھیے دیکھیے۔ یہی میں عرض کر رہا ہوں۔" مینیجر نے جلدی سے کہا۔" پولیس اس مسئلے کو حل نہیں کر سکتی۔ آپ کے لیے اور میرے لیے مزید پریشانی کا باعث بن سکتی ہے وہ بدمعاش تو گئے۔ پولیس انھیں کہاں تلاش کر سکے گی۔ آپ تو جانتے ہیں، پولیس والے کتنے بدنام ہیں۔ خود مجرموں کی سرپرستی کرتے ہیں۔ بفرضِ محال، پولیس نے انھیں پکڑ لیا تب بھی مال کہاں برآمد ہوگا۔ اور ہوا تو آپ کو کہاں ملے گا۔ نو سر۔ میں ذاتی طور پر اس کے حق میں نہیں کہ پولیس کو رپورٹ کی جائے۔ وہ تو شریف ویٹر کو ہی نہیں کاؤنٹر کلرک کو بھی پکڑ کے لے جائیں گے۔ بے چارا معمولی کلرک ہے۔ اور پولیس تو آدمی اٹھاتی ہے۔ وہ مجھے بھی لے جائیں گے۔ باورچی خانے والوں کو بھی اٹھا لیں گے جتنے آدمی پکڑے جائیں گے اتنا ہی ان کا فائدہ ہے۔ ہوگا کچھ نہیں، وہ سب کو حسبِ حیثیت جوتے مار کے اور پیسہ لے کر چھوڑ دیں گے اور کیس داخلِ دفتر کر دیں گے مگر اس پکڑ دھکڑ میں ہوٹل کی کتنی بدنامی ہوگی۔ اور مالک کو علم ہوگا تو عتاب مجھ پر نازل ہوگا۔ آپ اگر اتفاق کریں تو... تو میری ایک تجویز ہے۔ باہمی مفاد کی بات ہے۔ میں آپ کا سب نقصان پورا کر دیتا ہوں۔ کتنی رقم تھی؛ دس ہزار۔ رسٹ واچ اور پرس کی رقم ملا کے مزید ایک ہزار، کل گیارہ ہزار۔ اگر میں چیک پیش کر دوں تو؟"

"اور جو پریشانی مجھے اٹھانا پڑی۔ لاقانونیت، غنڈہ گردی اور بدنظمی کے باعث۔" میں نے میز پر ہاتھ مارا۔

"وہ... وہ میں... میں اس پر معافی کا خواست گار اور بے حد شرمندہ ہوں۔ بس بات یہیں ختم کیجیے۔" مینیجر نے کہا۔ "آپ کے قیام و طعام کے تمام اخراجات ہمارے ذمے۔ جب تک آپ کا دل چاہے رہیے۔ میں آپ کو دوسرا بہتر کمرہ دے دیتا ہوں۔ پورا سوٹ۔"

"یہی تو مصیبت ہے۔" میں نے گویا اس کی مجبوری کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔" آپ جیسے لوگ بدنامی کے خوف سے پولیس کیس نہیں بننے دیتے۔ اور وہ بدمعاش اس کمزوری سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اب کسی اور ہوٹل میں چلے گئے ہوں گے۔ پاکستان میں ایک ہزار ہوٹل تو ہوں گے۔ سب میں واردات کریں گے۔ خبر ایک بھی نہیں آئے گی۔ سب کہیں گے آج تک ایسا نہیں ہوا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے سر... لیکن ہماری مجبوری بھی دیکھیے۔ سارا کاروبار متاثر ہوتا ہے۔ اور پھر یہ اخبارات والے جو صرف سنسنی خیز خبریں چھاپتے ہیں۔ خیر، میں چیک پیش کرتا ہوں۔" اس نے کھٹ سے دراز کھول کے چیک بک نکالی اور گیارہ ہزار کی رقم کا بیرر چیک بنا کے مجھے پیش کیا جسے میں نے محسن کی طرف دیکھ کر بادلِ ناخواستہ اور قدرے تامل کے ساتھ قبول کیا۔ مینیجر ہمارا بہت احسان مند بھی ہوا مگر میں جانتا تھا کہ اتنی بڑی واردات پر اپنی سمجھ بوجھ کے باعث پردہ ڈال دینے کا انعام وہ مالک سے وصول کرے گا اور مالک اس کی معاملہ فہمی اور تدبر کا مزید قائل ہو جائے گا کہ گیارہ ہزار میں ہوٹل کی ساکھ بچالی۔ میں نے چیک جیب میں رکھا ہی تھا کہ کاؤنٹر کلرک یوں کمرے میں آیا جیسے اس کے تعاقب میں بھوت ہو۔ بمشکل تمام اس نے بتایا کہ ویٹر شریف واقعی کمرہ نمبر تین سو دس کے باتھ روم میں سو رہا ہے بے ہوش پڑا ہے یا وفات پا چکا ہے۔ وردی اوپر لٹک رہی ہے۔ خود نیچے لیٹا ہے۔

ویٹر شریف صرف بے ہوش تھا۔ ہوش میں آنے پر اس نے بتایا کہ کمرہ نمبر تین سو دس میں رہنے والوں نے اسے طلب کیا تھا۔ معلوم نہیں انھیں نام کس نے بتایا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ چوبیس نمبر ٹیبل پر سروس کر رہا ہے تو اسے کہا گیا کہ بل کی رقم کمرے سے ملے گی۔ وہ لوگ کھانا کھا کے اٹھے ہی تھے چنانچہ شریف دو منٹ بعد ان کے کمرے میں جا پہنچا۔ انھوں نے سو کا نوٹ دیا اور پھر کہا کہ کافی لاؤ اس نے کہا کہ چوبیس نمبر ٹیبل پر جو صاحب کھانا کھا رہے ہیں ان کو کافی پہنچاتے ہی وہ روم سروس سے کافی کے لیے کہہ دے گا اور بل کی باقی رقم بھی بھجوا دے گا۔ اتنا سنتے ہی ان میں سے ایک نے شریف کو دبوچ کے بے قابو کر دیا اور فرش

پر لٹا دیا۔ دوسرا اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا پہلے نے شریف کا منہ دبا رکھا تھا کہ وہ آواز نہ نکال سکے۔ دوسرے نے جیب سے انجکشن سرنج نکال کے شریف کا بایاں بازو دبا لیا اور اس کی نس میں کوئی انجکشن لگا دیا۔ وہ بے ہوش ہوگیا اور ہوش آیا تو باتھ روم میں تھا۔ اس کی وردی اوپر ٹنگی ہوئی تھی اور کمال یہ کہ اس میں وہ سو کا نوٹ بھی تھا۔ ویٹر شریف یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اس کے ساتھ یہ غیر شریفانہ سلوک کیوں کیا گیا اور منیجر یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ باورچی خانے میں یا ہال میں کسی نے ویٹر کی صورت پر غور کیوں نہیں کیا۔ میں نے اسے سمجھانے کے لیے شریف سے ایک سوال کیا اور شریف نے تسلیم کیا کہ ان میں سے ایک اپنے قد و قامت اور رنگ کے اعتبار سے شریف جیسا تھا اس کی مونچھیں بھی ویسی ہی تھیں۔ یہ بات منیجر اپنے تجربے کے باعث جانتا تھا کہ رش کے اوقات میں کوئی کسی کی طرف نگاہ اٹھا کے نہیں دیکھتا۔ سب کے ہاتھ پر ٹرے اس طرح رکھی ہوتی ہے کہ پورا چہرہ نظر بھی نہیں آتا اور بالکل ایک جیسی وردی میں اسی قد و قامت اور رنگ کا آدمی آجائے تو غور سے صورت دیکھے بغیر کوئی فرق محسوس نہیں کر سکتا۔ رات کے کھانے کے دوران جب ہال بھرا ہوا تھا لوگ آجا رہے تھے اور ویٹر مصروف تھے کمرہ نمبر تین سو دس والے میرے قریب ہی بیٹھے رہے چنانچہ انھیں بھی شریف ویٹر نے ہی سرو کیا۔ میں اپنے خیالات میں اتنا منہمک تھا کہ میں نے کسی پر توجہ نہیں دی۔ میرا مطلب ہے سوائے ان چہروں کے جو توجہ کے مستحق تھے۔ کافی دیر میں آنے کا سبب ہی یہ تھا کہ ویٹر تبدیل ہوا۔ پھر اس جعلی ویٹر نے کافی میں والا ملائی اور میری عدم موجودگی میں کافی میز پر رکھ کے چلا گیا۔ وہ اسی انتظار میں رہا کہ میں تاخیر کی شکایت کرنے اٹھوں تو وہ ٹرے رکھ جائے۔ اس نے دس منٹ کے لیے شریف کی وردی استعمال کی۔ پھر واپس اپنے کمرے میں جا کے لباس بدلا اور شریف کی وردی وہیں باتھ روم میں رہ گئی۔ انھوں نے شریف کو بھی باتھ روم میں پہنچایا اور میرے کمرے میں جا پہنچے۔

مجھے بے ہوش کرنے کے بعد وہ یقیناً اپنے کمرے میں اٹھا کے لے گئے ہوں گے جہاں انھوں نے دن میں ایک قالین لا کے رکھ دیا تھا۔ اپنے کمرے سے سامان اور قالین اٹھا کے وہ کمرہ خالی کر گئے اور جب نے چارج لیا اس نے کمرے پر ایک نگاہ ڈال کے کمرہ مقفل کر دیا۔ جب کاؤنٹر کلرک نے مجھے بتایا کہ کمرہ چودھری دلاور کے نام سے بک کرایا گیا تھا تو مجھے فوراً ایک خیال آیا لیکن میں نے بات کو زبان تک آنے سے پہلے روک لیا۔ جب اس تمام بک بک جھک جھک سے فارغ ہو کے ہم کمرے میں پہنچے تو صبح کے پورے آٹھ بج رہے تھے۔ منیجر نے اپنے طور پر تمام معاملات طے کر لیے تھے اور بہت مطمئن تھا۔ فرداً فرداً اس نے عملہ، شریف کو اور کاؤنٹر کلرک کو بھی سمجھا دیا کہ انھوں نے کسی سے کوئی بات کی تو اچھا نہیں ہوگا۔ یہ بات وہ خود بھی سمجھتا چنانچہ منیجر کے لیے تشویش کی کوئی بات نہ رہی تھی۔

"واہ برادر نسبتی" محسن نے کمرے کا دروازہ بند کرتے ہی ایک زبردست قہقہہ اور دھپ مار کے کہا "اب تو عیش ہے۔ ہو عمر بھر"

"سالارِ اعظم" میں نے کہا "عقل مندوں نے کہا ہے لالچ بری بلا ہے۔ سامان اٹھائیے اور خیریت سے نکل جائیے"

"کیوں؟" محسن نے حیرانی سے کہا "ہم نے کوئی دھوکے بازی نہیں کی۔ اس ہوٹل میں تجھے جس مصیبت کا سامنا کرنا پڑا اس کا معاوضہ گیارہ ہزار کچھ نہیں"

"یہ بات نہیں" میں نے کہا "تجھے کچھ اندازہ ہے شریف کی وردی پہننے والا کون ہو سکتا ہے؟ وہی منڈی والا"

"تم نے تو دیکھا ہی نہیں، تمھیں کیسے معلوم ہوا؟" محسن نے کہا۔

"آخر وہ میرے سامنے آنے سے کیوں گریز کر رہا تھا" میں نے کہا "اسے ڈر تھا کہ کہیں میں اسے شناخت نہ کر لوں اور یہ ڈر صرف ایک ہی شخص کو ہو سکتا تھا جسے میں دیکھ چکا تھا۔ انجکشن لگانے والا تو میرے لیے اجنبی تھا البتہ منڈی والا اپنے دل کے چور سے ڈر رہا تھا حالانکہ منڈی، ویٹر کی پگڑی کے نیچے آگئی ہوگی۔ ورنہ وہ فوراً نمایاں ہوجاتا مگر اس کے باوجود وہ انتظار کرتا رہا کہ میں اٹھوں تو کافی رکھی جائے۔ وہی میرے کمرے میں پردے کے پیچھے چھپا ہوا کھڑا رہا ہوگا اور اس نے ہی مجھے دھکا دے کر باتھ روم میں کیا ہوگا"

"تیری بات سمجھ میں آتی ہے" محسن نے کہا "لیکن اب فرار ہونے کا مقصد!"

"میں بہت گمنام آدمی نہیں ہوں محسن" میں نے کہا "میرا نام اور میری تصویر اخبارات کی زینت بن چکے ہیں آج اگر سلامت شاہ کے بارے میں خبر آئی تو عین ممکن ہے کوئی رپورٹر اس کا رشتہ ڈھونڈ ڈھونڈ نکالے اور پھر تصویر چھاپ دے کہ میر شرافت علی کے مبینہ قاتل کو پناہ دینے والا قتل کر دیا گیا یا اس مقدمے کے سب سے اہم گواہ کو قتل کر دیا گیا غنیمت ہے کہ اب تک کسی نے مجھے نہیں پہنچانا مگر مزید خطرہ مول لینے سے کوئی فائدہ نہیں۔ ابھی ٹرمپ کارڈ ہمارے ہاتھ میں ہے۔ ہم واک آؤٹ کر جاتے ہیں کہ جس ہوٹل میں شرفا محفوظ نہیں وہاں ہم مفت نہیں رہ سکتے۔ نو بجے چیک کیش کراؤ اور چلو کسی دوسرے ٹھکانے پر۔ ہمارے جانے کے بعد سب ہمیں بھول جائیں گے مگر یہاں رہتے ہوئے پولیس آگئی تفتیش کے لیے تو سب کھیل بگڑ جائے گا۔ حشمت خان اینڈ کمپنی کا کوئی اعتبار نہیں"

آدھے گھنٹے کے اندر اندر ہم تیار ہو کے کاؤنٹر پر پہنچ چکے تھے۔ یہاں صبح کی شفٹ میں آنے والا کلرک بیٹھا تھا۔ صبح کی شفٹ کا منیجر بھی اپنے کمرے میں موجود تھا اور انھیں ساری بات بتائی گئی تھی یا نہیں مگر اتنا ضرور بتا دیا گیا تھا کہ ہم انتظامیہ کے مہمان ہیں چنانچہ ہم ہاتھ ملا کے رخصت ہوگئے۔ ٹیکسی نے نو بجے ہمیں بنک کے دروازے پر اتارا۔ میں ٹیکسی میں بیٹھا رہا اور محسن دس منٹ بعد کیش لے کر نمودار ہوا تو ہم نے ٹیکسی کو پوسٹ آفس کی طرف لے چلنے کا حکم دیا۔ فاصلے بہت کم تھے چنانچہ ٹیکسی ڈرائیور کو یہ انتظار اور ہمارا تحکمانہ لہجہ بہت گراں گزر رہا تھا مگر وہ اسی لہجے کے باعث دبا ہوا تھا۔ پوسٹ آفس پہنچ کے ہم نے اسے دس کا نوٹ دیا تو اس کی شکایت رفع ہوگئی اور اس نے ہمیں سلام بھی کیا۔ یہ وہی وقت تھا جب ہم گزشتہ روز آئے تھے۔ میں نے اس اندیشے کا اظہار کیا کہ بابو پوسٹمین پھر نہ نکل گیا ہو مگر وہ موجود تھا۔ ایک پوسٹ مین نے ادھر ادھر دیکھ کے ایک دبلے پتلے نوجوانی میں بوڑھا نظر آنے والے پوسٹ مین کی طرف اشارہ کیا جو سارے زمانے سے بیزار اسٹول پر اکیلا بیٹھا تھا اور کچھ بھی نہیں کر رہا تھا۔

"ارے بابو بھائی" میں نے قریب جا کے کہا "ہم کل بھی آئے تھے"

بابو نے سر گھما کے ہمیں دیکھا اور محسن کو پہچان لیا۔ "ہاں ہاں۔ کل بھی ملے تھے تم۔ اسی چٹھی کے لیے آئے ہوگے"

"بابو بھائی یہ کیا ہوا؟" میں نے اس کی سوجی ہوئی ناک اور آنکھ کے نیچے نظر آنے والے نیل کی طرف اشارہ کیا "مستری سائیکل والے سے جھگڑا ہوگیا کیا؟"

"اچھا" وہ چونکا "اس نے تمھیں بھی بتا دیا؟" پھر اس نے خاصی بامحاورہ گالی دی۔

"وہ بڑا کمینہ ہے بابو بھائی" میں نے کہا "کہتا تھا بابو اخبار پڑھنے کے بہانے پانے، پلاس اور پیچ کس وغیرہ مارتا ہے۔ ہم نے کہا جانے دو استاد۔ بابو شریف آدمی ہے اگر اسے معلوم ہوا تو تمھیں چھوڑے گا نہیں"

بابو نے مستری سائیکل والے کو مزید بے نقط سنائیں اور دعویٰ کیا کہ وہ اس کا حلیہ کرا لے گا۔ ہم نے اس دعوے کی صداقت کو چیلنج نہیں کیا اور کہا کہ زمانہ شرافت کا نہیں ہے۔ اس کے بعد ہم بابو کو چائے پلانے کے لیے کینٹین لے گئے اور مجبوراً اس کے ساتھ غلیظ ٹیبل پر بیٹھ کے وہ بد ذائقہ محلول زہر مار کیا جسے سب لوگ چائے سمجھ کر نوشِ جان کر رہے تھے۔ اس مرحلے کے بعد بابو بھائی سے ہمارے مراسم اتنے اچھے ہوگئے کہ ہم نے صرف دس روپے دے کر وہ خط حاصل کر لیا اور ابھی ہم دھڑکتے دل کو سنبھالے لفافہ بریف کیس میں رکھ کے فرار ہونے ہی والے تھے کہ بابو بھائی نے ایک انکشاف کیا "ابھی کوئی اور بھی آیا تھا اسی خط کے لیے۔ مگر میں نے کہا چلو چلو۔ ہم ایسے ڈاک نہیں دیتے پھرتے۔ گھر پر مل جائے گی رجسٹری"

ہمارے قدم رک گئے۔ میں نے محسن کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا "اس نے اپنا نام بتایا تھا؟" میں نے پوچھا۔

بابو نے نفی میں سر ہلایا۔ "پوچھ رہا تھا گلاب خان معرفت محبت خان جو رجسٹری ہے وہ کس کے پاس ہے مجھے شریف آدمی نہیں لگا۔ ذمے داری کا کام ہے نا جی"

"اس کا حلیہ بتا سکتے ہو؟" میں نے کہا "دراصل ایک دوست ہے جو یہ حرکت کر سکتا ہے۔ غلط قسم کا آدمی ہے"

بابو بھائی نے اس کا جو حلیہ بتایا وہ میرا خون خشک

کر دینے کے لیے کافی تھا۔ یہ حلیہ اس مندری والے ٹیکسی ڈرائیور کا تھا۔ اب شبہے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ وہ اکیلا یا اپنے ساتھیوں سمیت، باہر ہمارے انتظار میں ہوگا۔ خط لینے میں ناکامی کے بعد وہ ہمیں آتا دیکھ چکا ہوگا اور وہ ہر قیمت پر یہ خط حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ وقت بہت کم تھا اور ہم مشورہ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ محسن بھی یہ بات سمجھتا تھا کہ اب ہم اس راستے سے نہیں جا سکتے جس راستے سے آئے تھے۔ ہمارے لیے اندر انتظار کرنے کے سوا چارہ نہ تھا۔ دس منٹ بعد میں نے بابو بھائی سے کہا کہ وہ ہماری وجہ سے کام کا حرج نہ کریں۔ ہم تو ابھی کچھ دیر یہیں بیٹھ کے انتظار کریں گے اسی بدمعاش دوست کا۔ بابو بھائی نے ہاتھ ملایا اور رخصت ہو گئے۔

"محسن" میں نے موقعہ پاتے ہی کہا "اس کینٹین سے نکلنے کا دوسرا راستہ بھی ہوگا۔ تو بریف کیس لے کر پیچھے سے نکل جا۔"

"اور اگر وہ ادھر بھی موجود ہوئے تو؟" محسن نے کہا۔

"تو کہیں پناہ لے لینا۔ کسی بھی دکان میں، دفتر میں گھس جانا۔ رکشا، ٹیکسی جو نظر آئے پکڑ لینا۔" میں نے کہا۔ "تجھے جان بچا کے بھاگنا ہے۔ جو مناسب ہو کرنا۔ تو خود بھی عقل مند ہے۔"

"اور تو۔ تو کیا کرے گا" محسن نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"میں واپس ڈاک خانے میں جاتا ہوں" میں نے کہا "انھیں یہ تاثر دینے کے لیے کہ ابھی خط ہمیں نہیں ملا۔ ہم یہاں خط کی بات کر رہے تھے۔ اگر یہ چال کامیاب رہی تو میں بھی کسی اور طرف سے نکل آؤں گا۔ اس وقت ہم مقابلے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ ہمیں تو خود کو اور خط کو بحفاظت نکال کے لے جانا ہے اور رابعہ کے گھر پہنچانا ہے۔ مگر ایسے نہیں کہ کوئی تعاقب میں ہمارے ساتھ پہنچے۔ خدا حافظ"

میں کینٹین سے نکلا اور ادھر ادھر دیکھے بغیر پھر ڈاک خانے کی عمارت میں داخل ہو گیا۔ ابھی میں نے پہلے زینے پر قدم رکھا ہی تھا کہ مجھے مندری والا نظر آ گیا۔ وہ بابو بھائی سے بات کر رہا تھا اور غالباً اس نے کوئی دھمکی دے دی تھی کہ بابو بھائی برہم تھے۔ مستری سائیکل والے نے بھی ان کی ڈبری ٹائٹ کر دی ہوگی۔ چنانچہ مندری والا پہلی بار ناکام لوٹا تھا مگر ہم نے چالاکی سے کام لے کر پہلے بابو بھائی کا موڈ ٹھیک کیا تھا اور پھر خط لے لیا تھا۔ میں فوراً الٹے قدم واپس ہوا۔ مندری والے کے گرد دوسرے لوپوسٹ مین جمع ہونے لگے تھے اور ہنگامہ بڑھ جاتا تو مندری والا ممنوعہ علاقے میں داخل ہونے پر پھنس جاتا۔ اس نے بھی کھسکنے کی کوشش کی۔ اس نے مجھے اوپر سے نیچے آنے والے زینے پر دیکھ لیا۔ میں بے تحاشا بھاگا۔ مندری والا میرے پیچھے دوڑا۔ تاہم اب میرے لیے فکر کی بات نہیں رہی تھی۔ مجھے یہ اطمینان حاصل ہو گیا تھا کہ محسن خط سمیت بخیروعافیت نکل گیا۔ میں خالی ہاتھ بھی تھا اور تھوڑا سا آگے بھی تھا۔ ذرا دیر میں مندری والا زینے چڑھ کر اوپر آیا میں بہت سے لوگوں سے ٹکراتا۔ ایک شخص کو چت کرتا اور ہنگامے کو نظر انداز کرتا باہر آ چکا تھا۔ سڑک عبور کرتے ہی مجھے ایک بس اپنے سامنے سے گزرتی دکھائی دی۔ میں بس کے پیچھے دوڑا اور ڈنڈا پکڑ کے چلتی بس میں سوار ہو گیا۔ بہت سے لوگوں نے مجھے اس طرح جان پر کھیل کے بس پکڑنے پر شرمندہ کیا لیکن کوئی اصل بات کو نہیں سمجھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو مجھے مندری والا سڑک پر کھڑا نظر آیا۔ وہ رکشا ٹیکسی کی تلاش میں تھا یا دیکھ رہا تھا کہ میں کدھر غائب ہو گیا ہوں۔

"شاہ نور اسٹوڈیو" میں نے کنڈکٹر کو پانچ کا نوٹ تھما کے کہا۔ مجھے معلوم تھا بس آدم جی بازار جا رہی ہے۔

"لوجی کر لو بات۔ کدھر ہے شاہ نور اسٹوڈیو۔ دیکھے بنا پوچھتے ہیں اور چڑھ جاتے ہیں" کنڈکٹر نے جھلا کر کہا "اگلے اسٹاپ پر اتر کے دوسری طرف مڑ جانا" اس نے مخالف سمت میں اشارہ کیا۔ میں نے خفت سے ان سب کو دیکھا جو مجھے احمق سمجھ رہے تھے اور اگلے اسٹاپ پر اتر گیا۔ وہیں ایک اخبار فروش اخبار پھیلائے بیٹھا تھا۔ میں نے ہر اخبار کی ایک ایک کاپی لے لی۔ پھر میں ایک تانگے میں بیٹھ گیا اور مزے سے اخبار پڑھنے لگا۔ مغلپورہ نہر سے دو لاشیں برآمد ہوئی تھیں۔ پولیس کا بیان ہے کہ دونوں جرائم پیشہ تھے۔ ایک اخبار نے ان کو ہسٹری شیٹر بھی لکھا تھا۔ سلامت شاہ کی لاش ملنے کی خبر شاید اخبار چھپنے تک کسی کو نہیں ملی تھی اور فرمانجو یعنی منشی کی لاش بھی ابھی تک دریافت نہیں ہوئی تھی۔ رابعہ کے گھر کے سامنے میں نے تانگہ روک لیا۔ اندر محسن میرا منتظر تھا اور رابعہ کی ماں سے باتیں کر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ آگے بڑھا۔ مجھے اس کی صورت پر وحشت کے آثار دکھائی دیے۔

"یار سکندر بخت" وہ آہستہ سے بولا "اس لفافے میں تو سادہ کاغذ ہیں۔ کورے فل اسکیپ سائز کے کاغذ"

"سادے کاغذ" میں نے بے یقینی کے ساتھ کہا "یہ کیسے ہو سکتا ہے"

رابعہ کی ماں کچھ فاصلے پر حیران کھڑی ہم دونوں کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی محسن نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی، اور میری طرف یوں لپکا تھا جیسے میری صورت اسے برسوں بعد نظر آئی ہے یا میں کوئی بدتمیز بھک منگا ہوں جو صدا لگانے کے بجائے سیدھا اندر آ گیا ہو۔ محسن کا یہ ردعمل فطری تھا۔ اس کی جگہ میں ہوتا تو شاید میں بھی سکون سے نہ کھڑا رہتا۔ اس کے ذہن کو پہلا صدمہ تو لفافے سے برآمد ہونے والے سادہ کاغذ کو دیکھ کر ہوا تھا۔ پھر وہ میری طرف سے تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا کہ میں دشمنوں کو دھوکا دے کر یا ان سے مقابلہ کر کے نکل آنے میں کامیاب ہوتا ہوں کہ نہیں۔

"یہ تم دونوں نے کیا کانفرنس شروع کر دی ہے" رابعہ کی ماں نے مشکوک لہجے میں کہا۔

"ہم بعد میں بات کریں گے" میں نے آہستہ سے کہا اور ہم پلٹ کر رابعہ کی ماں کے پاس چلے گئے۔ وہ ہمیں اندر لے گئیں۔

"اس وقت رابعہ تو ہوتی نہیں" وہ بولی "پھر تم کیسے آ گئے ہو؟"

"بس ایسے ہی" میں نے کہا "ادھر سے گزر رہے تھے، سوچا آپ سے ہی مل لیں۔"

"جھوٹ" وہ بولی "مجھ بڑھیا سے کون ملنے آتا ہے"

"رابعہ نے بتایا تھا کہ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے" محسن نے یقین دلانے کے لیے کہا۔

"طبیعت کا کیا ہے بیٹا!" وہ سرد آہ بھر کے بولی "عمر کے روگ ہیں۔ ایک بار لگ جاتے ہیں تو جان لیے بغیر کہاں چھوڑتے ہیں۔"

"ایسی مایوسی کی باتیں کیوں کرتی ہیں" میں نے کہا۔ "ابھی آپ کی اتنی زیادہ عمر تو نہیں ہوئی ہے۔"

"تم نہیں سمجھو گے بیٹا" وہ بولی "عورت جب اکیلی رہ جاتی ہے تو کیا ہوتا ہے۔ زندگی کا ایک دن گزرتا ہے تو اس کی عمر کے دو دن گھٹ جاتے ہیں۔ رائی جتنا صدمہ اسے پہاڑ جتنا لگتا ہے۔ مرد کا ساتھ حوصلہ دیتا ہے اور پناہ دیتا ہے۔ جوان بیٹا ہوتا تو شاید میں بہت سکھی ہوتی۔"

"آپ کی رابعہ دو جوان بیٹوں سے زیادہ باہمت اور نڈر ہے" میں نے کہا "بیٹے نکمے اور ناخلف ہوں تو بہت دکھ دیتے ہیں۔"

"تم تو ایسی باتیں کرتے ہو جیسے میری طرح جوان بیٹی کے باپ ہو" وہ تلخی سے مسکرائی "تمہارے لیے باتیں کرنا بہت آسان ہے۔ یہ بتاؤ کیا عورت کو ذمے داریوں کا ہی بوجھ اٹھائے رکھنا چاہیے۔ کیا مجبوری کو خوشی سمجھنے سے مجبوری ختم ہو جاتی ہے؟ میری تو جیسے گزرنا تھی گزر گئی کہ میں نے بیک وقت رابعہ کے باپ کی ذمے داریوں کا بوجھ بھی اٹھایا لیکن مجھے بتاؤ کیا رابعہ کے لیے کامیاب زندگی کا تصور یہی ہے کہ وہ اپنے پیشے میں کامیاب ہے؟ وہ کل اگر ہائیکورٹ کی جج بن گئی اور پھر سپریم کورٹ کی تو اس کی خوشیوں کی تکمیل ہو جائے گی؟ کیوں؟ کیا وہ عورت نہیں ہے۔ اس پیشے میں کامیاب مردوں کو دیکھو، کیا ان کے گھر نہیں ہیں؟"

میں اور محسن ایک مجرمانہ خاموشی کے ساتھ سنتے رہے اور ایک دوسرے سے اور رابعہ کی ماں سے نظریں چراتے رہے پھر میں نے جانتے بوجھتے انجان بن کے ڈھٹائی سے کہا۔ "رابعہ جیسی لڑکی کو رشتوں کی کمی تو ہونا نہیں چاہیے۔ ہاں ایسا شخص جو ہر لحاظ سے اس جیسی خوبیوں کا مالک ہو۔"

"بیٹا! مرد میں عورت جیسی خوبیاں کہاں تلاش کرتا ہے کوئی" رابعہ کی ماں بولی "مرد کو تو مرد ہونا چاہیے۔ وہ عورت کا ساتھ دے سکے۔ اس کی حفاظت کر سکے، گھر بنا سکے عزت دار ہو اور عزت کرنا جانتا ہو۔ رشتے مل جائیں گے مگر رابعہ بھی مانے۔"

یہ جھوٹ قابل احترام تھا کیونکہ یہ حالات کا المیہ تھا۔ معاشرے کی ناانصافی کا شکوہ تھا اور اپنی بے چارگی کا اعتراف تھا چنانچہ یہ ضروری تھا کہ ہم اس کا بھرم رکھیں اور کچھ نہ کہیں۔ ہم خود مسائل کی دلدل سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ ہم سے دستگیری کی توقع کسی راہ گم کردہ مسافر سے منزل کا پتا پوچھنے کے مترادف تھی۔ شاید خود رابعہ کی ماں نے بھی محسوس کر لیا کہ ہم رابعہ کے کلاس فیلو اور اس کے موکل ہیں جو اس سے مدد لینے آئے ہیں، اس کی مدد کرنے نہیں۔ اس نے خفت آمیز ہنسی میں اپنے جذبات کو چھپا لیا۔

"میں بھی کیا باتیں لے بیٹھی۔ تم آتے ہو گے اپنے کسی کام سے" وہ اٹھتے ہوئے بولی "میں تمہارے لیے چائے منگواتی ہوں۔"

جب وہ چلی گئی تو میں نے اطمینان کا سانس لیا "محسن وہ خط کہاں ہے؟"

محسن نے بریف کیس کھولا اور لفافہ نکال کے مجھے

تھمادیا۔ یہ تقریباً دس انچ لمبا اور آٹھ انچ چوڑا براؤن پیپر کا لفافہ تھا جس پر اضافی وزن کے لیے عام رجسٹرڈ لفافے سے زیادہ کی مالیت کے ٹکٹ لگائے گئے تھے۔ اس کے اندر سے فل اسکیپ سائز کے کاغذات کا پلندہ برآمد ہوا جو دوہرے کرکے لفافے میں ڈالے گئے تھے۔ کاغذات کو دائیں جانب اوپر کے کونے پر اسٹیپل کیا گیا تھا جس کا مطلب یہ نکالا جاسکتا تھا کہ تحریر ہوتی تو اردو میں ہوتی۔ لیکن تمام صفحات اوّل تا آخر کورے تھے۔ میں نے ایک ایک صفحہ پلٹ کر دیکھا مگر مجھے کہیں پنسل سے لکھی ہوئی سطر بھی دکھائی نہ دی۔ یہ بڑی عجیب بات تھی۔ لکھنا ختم کرنے سے پہلے کوئی صفحات کو اسٹیپل نہیں کرتا اور مخصوص تعداد میں صفحات اسٹیپل کرکے کوئی لکھنا شروع نہیں کرتا۔ سادہ اسٹیپل کیے ہوئے صفحات کو دیکھ کر یہی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا تھا کہ یہ اصل مسودے کی جگہ لفافے میں اس لیے ڈالے گئے ہوں گے کہ جب لکھنے والا رجسٹری کرانے جائے تو اسے وزن یا حجم کے فرق کا پتہ نہ چلے۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ نوما یعنی نلشی مرحوم نے تقریباً اتنے ہی صفحات میں کوئی سرگزشت لکھی تھی اور لفافہ بند کردیا تھا، یہ فرض کیا جاسکتا تھا کہ اس نے رات کو مضمون مکمل کیا اور سو گیا۔ یا مضمون مکمل کرلینے کے بعد وہ نامعلوم اسباب کی بنا پر خط کو فوراً پوسٹ نہ کرسکا اور درمیانی وقفے میں کسی نے موقعہ پاکے اصل تحریر کی جگہ سادہ کاغذ رکھ دیے اور لفافہ پھر پہلے کی طرح بند کردیا۔ میں نے اور محسن نے ایسے ہی متعدد مفروضات پر بحث کی اور بالآخر کاغذات کو واپس لفافے میں ڈال دیا۔

”غور طلب بات یہ ہے محسن کہ جب لفافے میں کچھ بھی نہیں تھا تو ہمارے دشمن اس کے حصول کے لیے اتنے پریشان کیوں تھے؟“ میں نے کہا۔

”ہاں یار!“ محسن نے کہا۔ ”اس سے تو یہی نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ اس حقیقت سے وہ بھی بے خبر ہیں۔“

”ہاں۔ اور اسی لیے وہ بدستور ہم سے یہ خط حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہیں گے۔“ میں نے کہا۔

”اور ہماری زندگی اس خط کے باعث بدستور خطرات کے حصار میں رہے گی۔“ محسن نے کہا۔ ”اور بفرضِ محال وہ ہمیں پکڑ کے لے جانے میں کامیاب ہوجاتے ہیں اور ہم سے خط کی واپسی کا مطالبہ کرتے ہیں یا ہم سے پوچھتے ہیں کہ اس خط میں کیا تھا تو ہم انہیں کیا بتائیں گے؟“

”وہ کبھی نہیں مانیں گے کہ اس تمام جدوجہد کا مقصد سادہ کاغذوں کے ایک پلندے کا حصول تھا۔“ میں نے ہنس کے کہا۔ ”خواہ سچ اگلوانے کی کوشش میں وہ ہماری جان لے لیں انہیں کبھی اعتبار نہیں آئے گا کہ ہم سچ بول رہے ہیں۔“

”خط میں یقیناً کوئی ایسی بات لکھی گئی تھی جس نے انہیں تشویش میں مبتلا کردیا تھا۔ وہ ہم سے زیادہ فکر مند ہیں کہ خط انہیں مل جائے۔“ محسن نے کہا۔ ”اپنی کوشش میں ناکامی کے بعد وہ ہمیں اس وقت تک نہیں مار سکتے جب تک خط ان کو نہیں مل جاتا اور ہم انہیں دھوکے میں رکھ سکتے ہیں کہ ہمیں بہت کچھ معلوم ہوچکا ہے، اور صرف ہمیں ہی نہیں ہماری زبانی دوسروں کو بھی اصل حالات کا علم ہوچکا ہے۔“

”جبکہ اصل حالات ایک رازِ سربستہ ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”تاہم یہ تاثر دینا کہ خط حاصل کرنے کی کوشش کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا ہمارے تحفظ کی ضمانت بھی ہو۔ کہہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ خط ان کی دسترس سے باہر ہے اور بالکل محفوظ بھی۔ اس کی ایک نہیں دس نقلیں بنوا کے دس جگہ فراہم کی جاسکتی ہیں۔ ہم اس خط کو یہیں چھوڑ جائیں گے۔“

”لیکن سکندر! یہ جوا خطرناک بھی ثابت ہوسکتا ہے۔“ محسن نے کہا۔ ”وہ طے کرسکتے ہیں کہ پہلے ان دونوں کا کام تمام کیا جائے۔ دوسروں سے بعد میں نمٹ لیا جائے گا خلاف اور...“

”یار محسن!“ میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”تیرے نکلنے کے بعد اس مندری والے نے مجھے بس میں سوار ہوتے دیکھ لیا تھا۔ اگر اس نے تعاقب کیا ہوگا تو... تو اسے معلوم ہوچکا ہوگا کہ ہم کہاں ہیں اور خط کہاں ہے۔ اور عین ممکن ہے وہ باہر ہمارے منتظر ہوں۔ ہم نے اپنے ساتھ رابعہ کے لیے بھی خطرات پیدا کردیے ہیں۔“

”انہیں پہلے سے علم ہوگا کہ ہمارے مراسم رابعہ سے ہیں۔“ محسن نے کہا۔ ”اور رابعہ سے ہی کیا۔ عبدالودود منظر صاحب سے ہیں۔ ضامن رضوی ایس ایس پی سے ہیں۔ مگر یہ سب معمولی حیثیت کے لوگ نہیں ہیں۔ میں اور تو عام آدمی ہیں جو اغوا بھی ہوجاتے ہیں اور قتل بھی ہوجائیں تو مقامی اخبار کے صفحے پر دو سطروں کی خبر لگتی ہے لیکن سپریم اور ہائیکورٹ کے کسی ایڈووکیٹ کا مسئلہ ہو تو ہر جگہ بار ایسوسی ایشن ہنگامہ برپا کرسکتی ہے اور پریس کے ذریعے بھی حکومت اور پولیس کے اعلیٰ حکام پر زبردست دباؤ پڑتا ہے۔ ضامن رضوی جیسے سینئر پولیس آفیسر پر بھی کوئی ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔“

”یہ تو ٹھیک ہے پھر ہم خط یہیں رکھوا دیتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ایک بے نام سی خلش تھی جو کہتی تھی کہ حیثیت

سے کیا فرق پڑتا ہے۔ عورت تو عورت ہی رہتی ہے مگر میں نے اس کا اظہار نہیں کیا۔ اسی وقت رابعہ کی ماں ایک خادمہ کے ساتھ چائے کی ٹرے لے کر آئی اور ہم نے جلد از جلد چائے ختم کی۔ محسن نے وہ لفافہ بند کرکے رابعہ کی ماں کے حوالے کیا اور کہا کہ اسے بحفاظت رابعہ کو دے دیا جائے۔

”اتنی جلدی کیا تھی؟“ رابعہ کی ماں نے لفافے کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور رکھ لیا۔ ”رابعہ کچھ دیر میں آجائے گی۔ تم خود ہی دے دیتے۔“

”ہمیں ایک ضروری کام نہ ہوتا تو ضرور ٹھہر جاتے۔“ میں نے کہا۔ ”اس لفافے کے بارے میں رابعہ کے سوا کسی کو علم نہیں ہونا چاہیے۔ اگر کوئی شخص فون پر بھی پوچھے تو لاعلمی کا اظہار کیجیے۔ کوئی ہمارا نام لے کر مانگنے آئے یا ہمارا رقعہ لے کر، یہ لفافہ کسی کو واپس نہیں کرنا ہے۔ لینا ہوگا تو ہم دونوں میں سے کوئی آئے گا۔“

رابعہ کی ماں نے صرف سر کو ہلایا اور کسی تجسس یا تشویش کا اظہار نہیں کیا۔ یہ بات مجھے بڑی عجیب لگتی تھی کہ رابعہ کی ماں نے کبھی ہم سے ہمارے مسائل کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ یہ نہیں پوچھا کہ ہم کیا کرتے ہیں اور کس چکر میں ہیں۔ یقیناً اسے رابعہ نے منع کردیا ہوگا کہ ہم سے براہِ راست کچھ نہ پوچھے۔ موکل کے اور وکیل کے درمیان کاروباری اعتماد کا وہی رشتہ ہوتا ہے جو ڈاکٹر اور مریض کے درمیان ہوتا ہے اور جس میں مکمل رازداری شرطِ اوّل رہتی ہے۔ گیٹ تک آتے ہوئے میں نے محسن سے کہا۔ ”اگر وہ مندری والا باہر موجود ہوا تو ہمارے لیے اس کو شناخت کرنا مشکل نہیں ہوگا مگر اس کے ساتھ دوسرے لوگ بھی ہوئے تو ہم انہیں نہیں پہچان سکیں گے۔ وہ ہمارا تعاقب کریں گے۔ ان کو غچہ دے کر نکلنے کی ایک صورت ہے۔ ہم کراؤن سینما کے چوک تک اکٹھے پیدل جائیں گے۔ وہاں عموماً رکشا کھڑے مل جاتے ہیں۔ اگر ایک ہی رکشا ہوا تو فکر کی کوئی بات نہیں۔ ہم اکٹھے نکل جائیں گے لیکن دو رکشا ہوں تو ہم الگ الگ اور مخالف سمتوں میں روانہ ہوں گے۔“

ہم دونوں بے نیازی سے چلتے ہوئے باہر آتے اور اپنے اپنے طور پر ہم دونوں نے ماحول کا غور دبین نظروں سے جائزہ لیا۔ بظاہر سب خیریت تھی اور دنیا کے کاروبار معمول کے مطابق چل رہے تھے مگر خطرے کا احساس تو ہمارے دل میں تھا چنانچہ ہمیں ہر گام پر خطرہ صدا دیتا سنائی دیتا تھا۔ ”اگر اتفاق سے تین رکشے یا کوئی ٹیکسی بھی موجود ہو تو انتظار

کرنا تاوقتیکہ دو سواریاں نہ رہ جائیں اور جب ہم روانہ ہوں تو تعاقب کرنے والوں کو فوراً کچھ نہ ملے۔ ہم دوبارہ ٹاؤن شپ مارکیٹ کے اسٹاپ پر ملیں گے مگر وہاں پہنچنے کے لیے سیدھا راستہ مت اختیار کرنا۔“

”برادرِ نسبتی! میں بچہ نہیں ہوں۔“ محسن نے کہا۔ ”اپنی عقل کا اسٹاک ایسے ہی مت ضائع فرمایئے۔ میں ان کو چکر دے سکتا ہوں۔“

”سالارِ اعظم! تقدیر کا چکر بُرا ہے۔ احتیاط اور مشورہ اچھی چیز ہے۔“ میں نے کہا اور ایک دکان سے سگریٹ لینے کے بہانے رک گیا کیونکہ چوک پر ایک قطار میں تین رکشے کھڑے تھے۔ سگریٹ لینے اور پیکٹ کھول کے ایک ایک سگریٹ جلانے تک ایک رکشا کم ہوگیا۔ محسن اور میں ایک ساتھ آگے بڑھے۔ محسن نے ایک رکشا پر قبضہ کیا اور مجھے نہیں معلوم اس نے رکشا والے سے کہاں چلنے کے لیے کہا۔ میں دوسرے رکشا میں بیٹھنا ہی چاہتا تھا کہ دوسری طرف سے ایک اور شخص تیزی سے آگے آیا اور مجھے تقریباً دوڑ کر رکشا میں سوار ہونا پڑا۔ ”مغلپورہ۔“ میں نے کہا۔

”ایئرپورٹ۔“ دوسرے شخص نے مایوس ہونے کے باوجود کہا اور رکشا والے نے ایئرپورٹ کی سواری کو زیادہ فاصلے کے باعث اور میٹر سے زیادہ کرائے کی امید میں ترجیح دینے کی کوشش کی، لیکن میں اڑ گیا۔ رکشہ والے نے یہ سوال بھی اٹھایا کہ میں نے بیٹھنے سے پہلے اس سے پوچھا کیوں نہیں تھا۔ ”دیکھو پہلے میں بیٹھا تھا۔ اور میں اس لیے بیٹھا تھا کہ تم میٹر اپ کیے کھڑے تھے۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ”مجھے تمہاری اجازت کی ضرورت نہیں تھی، سمجھے؟ شرافت سے چلو۔ میں تمہیں ایئرپورٹ کا کرایہ دے دوں گا۔“ میرے لہجے اور میری پیش کش کے بعد رکشا والا مجبور ہوگیا اور اس نے رکشا کو اسٹارٹ کرکے موڑا۔ میں نے ناکام ہوجانے والے شخص کو غور سے دیکھا۔ وہ سخت جھنجلاہٹ کا شکار تھا۔ اضطراب کے عالم میں اس نے دونوں طرف سے آنیوالے ہر رکشا کو دیکھا مگر مجھے یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ ہر رکشا اس کے اشارے کے باوجود سیدھا گزر گیا۔ نہر کے پل پر پہنچ کے میں نے رکشا والے سے کہا کہ وہ سیدھا چلے اور انفنٹری روڈ کے راستے مال روڈ پر فورٹریس اسٹیڈیم سے سیدھے ہاتھ پر گھوم جائے۔ رکشا والے نے صرف ایک بار حیرانی سے مجھے دیکھا اور ذہن میں آنے والے سوالات کو غیر ضروری قرار دے کر خاموش رہنا بہتر سمجھا۔ رکشا نے وہ پل عبور کیا

جس پر سے بائیں جانب لاہور کینٹ کا پورا اسٹیشن نظر آتا تھا، اور پھر مال روڈ کی پوری مسافت طے کر کے ٹالنٹن مارکیٹ پہنچا تو محسن میرا منتظر تھا۔ رکشا والے کو اب کوئی شکوہ نہ تھا کہ میں نے منگھورہ جانے کا ارادہ کیوں ترک کیا اور اتنے لمبے راستے سے انارکلی جانے میں کیا مصلحت دیکھی۔ اتفاقِ رائے سے ہم نے ملتان روڈ جانے کے لیے ٹیکسی لی اور کئی بار پلٹ کر دیکھنے کے بعد بالآخر ہمیں یقین آیا کہ ہمارے تعاقب میں کوئی نہیں ہے۔ راستہ میری یادداشت میں محفوظ تھا، اور مجھے یقین تھا کہ جیسے ہی وہ کوٹھی دکھائی دی جہاں مجھے قالین میں لپیٹ کر لایا گیا تھا میں اسے پہچان لوں گا۔

میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے رفتار کم رکھنے کے لیے کہا اور غور سے دونوں جانب کی کوٹھیوں کو دیکھتا رہا۔ مطلوبہ کوٹھی پر نگاہ پڑتے ہی میں نے محسن کا ہاتھ دبایا اور ایک فرلانگ آگے جانے کے بعد ٹیکسی والے کو کرایہ دے کر چلتا کیا۔ پھر ہم ویران سڑک پر پیدل چل کے اس کوٹھی تک پہنچے جس کے گیٹ پر سیاہ بھاری قفل پڑا ہوا تھا۔ دروازے پر سرخ پلاسٹک کی دو انچ چوڑی پٹی پر ڈیڑھ انچ کے سفید حروف سے صاحبِ خانہ کا نام لکھا گیا تھا۔ مجھے یہ نام کچھ مانوس لگا۔ ذہن پر زور دینے سے مجھے یاد آیا کہ یہ فلمی دنیا کے ایک نامور کیمرہ مین کا نام ہے جو ترقی کر کے ڈائریکٹر آف فوٹوگرافی بن گیا تھا اور بلاشبہ بلیک اینڈ وائٹ فلموں کی عکاسی میں اس کے کمالِ فن کا ثانی نہیں تھا مگر یہ دور تمام ہوا تو رنگین عکاسی میں دوسرے لوگ زیادہ کامیاب ہوئے اور اس نے فوٹوگرافی چھوڑ کے ہدایت کاری کو اپنا لیا۔ اس میدان میں بھی وہ کئی کامیاب فلمیں بنا کے شہرت حاصل کر چکا تھا۔ کوٹھی کے اندر فلیش لائٹس کی موجودگی کا سبب مجھے معلوم ہو گیا تھا۔ اس سے میرے خیال کی تائید بھی ہوتی تھی کہ دلاور نے کوٹھی کو خالی پا کے ایک خاص مقصد کے لیے استعمال کیا۔ اب اس کے یہاں ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ ہدایت کار شاید کسی لوکیشن شوٹنگ پر گیا ہو گا اور دلاور کو اطمینان ہو گا کہ اس کی ڈرامائی کارروائی میں خلل انداز ہونے کے لیے کوئی نہیں آ سکتا۔ بڑے گیٹ میں ایک چھوٹا گیٹ اکیلے آدمی کے آنے جانے کے لیے تھا اور یہ ہو سکتا تھا کہ کوئی چوکیدار اس کو اندر سے بند کیے بیٹھا ہو۔ میں نے کال بیل کا بٹن دبایا۔ کوٹھی کے اندر کہیں سے گھنٹی جیسے دو سُریلے بول سنائی دیے لیکن دروازہ کھولنے کوئی نہیں آیا۔ میں نے چھوٹے گیٹ کو آہستہ سے دھکیلا۔ گیٹ کھل گیا اور اس پٹ کے وا ہو جانے سے بڑے گیٹ میں دو فٹ چوڑا خلا نمودار ہو گیا۔ میں نے پہلے محسن کی طرف اور پھر آس پاس دیکھا۔ الم[illegible] ہی ویران نظر آنے والی کوٹھیوں، ایک پھل فروش اور دو چار راہ گیروں کے سوا جو بہت دور تھے، سڑک پر کوئی نہ تھا اور ہماری طرف کون متوجہ ہوتا جبکہ ہم صورت اور حلیے سے شریف اور معزز نظر آتے تھے۔

اندر داخل ہوتے ہی میں نے گیٹ اندر سے بند کر دیا۔ پورچ کی سیڑھیوں کے بعد برآمدے میں وہ دروازہ تھا جس سے گزر کے میں گزشتہ شب باہر لایا گیا تھا۔ بظاہر بند نظر آنے والا یہ دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔ میں اور محسن چوروں کی طرح محتاط اور گوش بر آواز تھے لیکن کوٹھی میں [illegible] خاموشی تھی جو آسیب زدہ لگتی تھی۔ اچھے خاصے آراستہ کمروں کی دیواریں بھی مجھے سوگوار لگیں۔ اس گھر کی دیواروں کی طرح جہاں سے کوئی جنازہ اٹھا ہو۔ یہ سب مجھے اپنے ذہن کی ناخوشگوار یادوں کی کرشمہ سازی محسوس ہوئی۔ محسن کے ساتھ میں نے ایک ایک کمرہ دیکھا۔ میں نے وہ قالین بھی پہچان لیا جس میں لپیٹ کر مجھے لایا گیا تھا۔ ڈرائنگ روم کا اور "ایل" کی شکل کے ڈائننگ روم کا پورا نقشہ وہی تھا اور میں نے محسن کو وہ صوفہ بھی دکھایا جس پر بیٹھ کے میں نے دلاور سے بات کی تھی اور وہ جگہ بھی دکھائی جہاں سرچ لائٹس رکھی گئی تھیں اور دلاور بیٹھا تھا۔ اندر ایک خواب گاہ میں مجھے عالی شان ڈبل بیڈ کی سبز ریشمی چادر پر ہر شکن گزشتہ رات کا افسانہ سنانے لگی کیونکہ وہیں سرہانے کی میز پر جام و سبو رکھے تھے۔ پی کے دادِ عیش دینے والے اس زندگی کے عادی تھے چنانچہ انہوں نے مفت کی سمجھ کے بے حساب نہیں پی تھی۔ ایک بوتل آدھی سے کچھ زیادہ اور دوسری کچھ کم تھی۔ کانچ کے دو ساغر بھی پہلو بہ پہلو رکھے تھے۔ مخالف گوشوں میں وہ اعلیٰ قسم کے اسپیکر بھی رکھے تھے جن کی آواز میں نے رات کو سنی تھی۔

ایش ٹرے میں بجھے ہوئے سگریٹ کے ٹکڑوں کا ڈھیر تھا اور ایک خالی پیکٹ چُرمُر کر کے ڈال دیا گیا تھا۔ میں نے جاسوسی کی کہانیوں میں اکثر پڑھا تھا کہ جائے واردات پر پائے جانے والے کسی ایک سگریٹ کے ٹکڑے یا کسی ٹوٹے ہوئے بٹن سے سراغ رساں نے مجرم کو پکڑ لیا۔ حقیقی زندگی میں صورتِ حال مختلف تھی۔ نہ میں پولیس کو بلا کے بتا سکتا تھا کہ میرے ساتھ کیا ہوا تھا اور نہ ان کے لیے دلاور کا سراغ لگانا ممکن تھا۔ سگریٹ ولز فلٹر تھے جو ہر قدم پر، ہر گاؤں اور شہر کی ہر دکان

پر ملتے تھے۔ چند ٹکڑوں پر لپ اسٹک کا رنگ ہونے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ شراب کی بوتلوں پر اور شیشے کے جام پر انگلیوں کے واضح نشانات موجود ہوں گے لیکن اول تو پولیس کے پاس ہر چھوٹے بڑے جرم میں ملوث ہونے والے کا کوئی ایسا ریکارڈ نہیں جیسا ایف بی آئی یا اسکاٹ لینڈ یارڈ جیسے اداروں کے پاس ہے اور لاکھوں فنگر پرنٹس میں سے ایک نکالنا ہو تو یہ کام کمپیوٹر ایک سیکنڈ میں انجام دیتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ دلاور یا وہ مندری والا کسی جرم میں پکڑے ہی نہیں گئے ہوں گے تو ان کا نام پتا اور حلیہ بھی پولیس کی کسی فائل میں نہیں ملے گا۔ اور آخری بات یہ کہ پولیس ان کو پکڑے گی ہی کیوں؟ بڑے مجرم تو رائے عامہ کے مطابق خود پولیس کی سرپرستی میں اپنا کاروبار جاری رکھتے ہیں اور اس چشم پوشی کا معاوضہ ادا کرتے رہتے ہیں۔ بڑے پیمانے پر جوئے اور سٹے کے اڈے چلانے والے، منشیات کا دھندا کرنے والے، اسمگلر اور نامی گرامی بدمعاش، پولیس ان کا دیا کھاتی ہے چنانچہ ان پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں کر سکتی۔ پکڑے جاتے ہیں چھوٹے موٹے چور، اٹھائی گیرے، لفنگے اور لاوارث، یا وہ شریف آدمی جو اپنے جان و مال یا عزت و آبرو کی خاطر مرنے مارنے پر مجبور کر دیے جاتے ہیں۔

میں اپنے خیالات میں اس قدر محو تھا کہ میں نے اپنے پیچھے قدموں کی آہٹ سنی تو یہی سمجھا کہ محسن ہو گا جو ساتھ والے کمرے کا سرسری جائزہ لے رہا تھا اور اس خیال کا اظہار کر چکا تھا کہ ہمارا تجسس بے سود ہے۔ معمولی مجرم بھی کہیں اتنے واضح سراغ نہیں چھوڑتے کہ ان کی نشاندہی کر دیں اور پولیس مارچ کرتی ہوئی سیدھی ان کے دروازے پر دستک دینے آ جائے۔

"میرا خیال ہے محسن کہ یہاں مزید وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم پہلے ہی غیر قانونی طور پر اندر داخل ہونے کا جرم کر چکے ہیں۔ کوئی آ گیا تو مصیبت میں گرفتار ہو جائیں گے۔"

"وہ تو تم ہو چکے ہو۔" ایک اجنبی آواز نے پیچھے سے کہا، اور میں تیزی سے پلٹا۔ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر ایک شخص ڈھاٹا باندھے کھڑا تھا۔ اس کا منہ سر چادر میں لپٹے ہوئے تھے اور آنکھوں کے سوا اس کے چہرے کا کوئی حصہ نظر نہ آتا تھا لیکن میں نے اسے کپڑوں سے شناخت کر لیا۔ میں نے آج ہی صبح اس کو پوسٹ آفس میں دیکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا جس کی نالی پر سائلنسر فٹ تھا۔ سوچے سمجھے بغیر اس پر حملہ کر دینا خودکشی کے مترادف ہوتا، چنانچہ میں نے اپنے حواس کو قابو میں رکھا اور اس سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

"تو تم یہاں بھی آ گئے۔" میں نے کسی قسم کی گھبراہٹ کے بغیر کہا۔ "منہ چھپانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ تم کو میں اتنی مرتبہ دیکھ چکا ہوں کہ اب تم مجھے دھوکا نہیں دے سکتے۔"

"وہ خط کہاں ہے؟" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"خط بھی مل جائے گا۔" میں نے کہا۔ "پہلے کچھ باتیں ہو جائیں۔ آج ہی تو موقع ملا ہے مجھے اور تمہیں آمنے سامنے ہو کے اکیلے میں بات کرنے کا۔"

"میں فضول بکواس سننے نہیں آیا ہوں۔" وہ غرا کے بولا۔ "سیٹھ دلاور نے کہا ہے کہ خط واپس نہ کیا گیا تو ایک مہینے کی مہلت نہیں ملے گی۔ فیصلہ آج کسی وقت ہو جائے گا۔"

"اچھا۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "لیکن مجھے معلوم نہیں تم کس خط کی بات کر رہے ہو؟"

"تمہیں اچھی طرح معلوم ہے۔" وہ لہجے کو خطرناک بنا کے بولا۔ "جب تم نے بابو پوسٹ مین سے خط لیا تھا تو ہم دیکھ رہے تھے۔ یہ تم جانتے ہو۔"

"وہ خط میرے پاس نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "تم چاہو تو میری تلاشی لے سکتے ہو۔"

"استاد پیڈ. . ." ساتھ والے کمرے کے دروازے میں نمودار ہونے والا یکلخت رک گیا۔ غیر ارادی طور پر اس کے لبوں سے مندری والے کا نام نکلنے والا تھا۔ "وہ حرامزادہ تو یہاں نہیں ہے۔"

مندری والے نے اسے ایک گالی دی۔ "زبان پر قابو رکھ۔ تیرا باپ اندر آیا تھا تیرے سامنے یا نہیں بے؟"

"آیا تو تھا استاد!" گالی کھانے والے نے دبے دبے لہجے میں کہا۔ "مگر اب نہیں ہے۔ میں نے اچھی طرح دیکھ لیا ہے۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ محسن کسی اجنبی کی آواز سنتے ہی کہیں چھپ گیا تھا۔ وہ مسلح تو نہیں تھا لیکن عقل سے کام لینا جانتا تھا۔ "استاد پیڈرو!" میں نے نامکمل نام کو مکمل کیا اور مندری والے کو چونکتے دیکھا۔ بہت پہلے میں نے اس نام کی ایک ہندوستانی فلم دیکھی تھی جس میں شیخ مختار نے استاد پیڈرو کا کردار ادا کیا تھا، اور یہ نام خاصا مقبول ہوا تھا۔ "اب تو تمہارا نام بھی معلوم ہو گیا۔"

وہ مسکرایا لیکن اس کا ہنسنا صرف آنکھوں کے بدلے ہوئے نظر سے چلتا تھا۔ "تم اتنے چالاک نہیں ہو جتنا خود کو سمجھتے ہو۔"

"ہاں۔" میں نے کہا۔ "میں اس سے کچھ زیادہ ہی چالاک ہوں۔ طبیعت میں انکساری ہے اس لیے بڑائی نہیں جتاتا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ تمہارا اصل نام کچھ اور ہو، مثلاً مختار یا شیخ مختار۔ عرف استاد پیڈرو۔" میں نے محسوس کیا کہ تیر نشانے پر بیٹھا ہے۔ مندری والا کچھ نروس ہو رہا تھا۔

"جا کے دیکھ لے، وہ کہاں ہے۔" وہ اپنے ساتھی پر برس پڑا جو اپنی غلطی کے نتائج پر حیران پریشان کھڑا تھا۔ "وہ آدمی ہے، جن بھوت نہیں کہ دیوار میں گھس گیا۔ باہر بھی وہ جانے سے رہا۔ گیٹ کے اندر..." یہ جملہ اس کے لبوں پر نامکمل رہ گیا۔ کوئی چیز توپ کے گولے کی طرح اس کے سینے پر لگی۔ اس کا سانس رک گیا اور وہ لڑکھڑا کے ایک قدم پیچھے ہٹا۔ یہ وقفہ مجھے متحرک کرنے کے لیے کافی تھا۔ میں نے غوطہ مارا اور ایک گولی میرے سر کے اوپر سے گزر کے شیشے کے بہت بڑے گلوب پر لگی جو عین وسط میں چھت سے معلق تھا۔ استاد پیڈرو یعنی مندری والے کے اور میرے درمیان چند قدم کا فاصلہ کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے لڑنے والے بیل کی طرح اس کے پیٹ میں ٹکر ماری اور پلک جھپکتے میں پیڈرو کو اوپر اٹھا کے پھینک دیا۔ وہ دیوار سے لگ کے نیچے گرا اور ابھی اٹھا بھی نہ تھا کہ دوسرے نے مجھ پر حملہ کیا۔ اس نے بیڈ کے سرہانے سے شراب کی ایک بوتل گردن سے پکڑ کے انتہائی اور پوری قوت سے میرے سر کا نشانہ لے کر پھینکی۔ پیڈرو جیسے بھاری بھرکم آدمی کو پھینکنے کے لیے مجھے خاصی جسمانی قوت صرف کرنا پڑی تھی اور قدرتی طور پر میں خود بھی جھٹکے سے پیچھے ہو گیا تھا۔ شراب کی بوتل راکٹ کی طرح سنسناتی ہوئی میری ناک کے قریب سے گزری اور دیوار سے ٹکرا کے پاش پاش ہو گئی۔ شراب کے چھینٹے میرے منہ پر بھی آئے اور کمرے میں گلوب کے ٹکڑوں کے ساتھ ہی مئے ارغوانی کی بوتل کے ٹکڑے بھی پھیل گئے۔ اس شخص نے بیڈ سائڈ سے لکڑی کا ٹیبل لیمپ اٹھا لیا اور اس کا تار کھینچ کر توڑ دیا۔ ٹیبل لیمپ کا نچلا حصہ لکڑی سے تراشا گیا تھا لیکن بالکل چٹان کی طرح نظر آتا تھا۔ اوپر کا حصہ قصے کہانیوں کی طرح اس روایتی مخلوق جیسا تھا جسے انگریزی میں "مرمیڈ" کہتے ہیں اور جس کا آدھا نچلا دھڑ مچھلی کا ہوتا ہے تو اوپر کا آدھا جسم کسی انتہائی حسین عورت کا۔ مجھ پر حملہ کرنے والے نے ٹیبل لیمپ کا بلب نکال کے پھینک دیا تھا جو موم بتی جیسا تھا اور وہ ٹیبل لیمپ کو الٹا پکڑ کے آگے بڑھ رہا تھا تاکہ مجھ پر وار کرے تو چٹان کی طرح نظر آنے والے لکڑی کے نچلے حصے کی ضرب ہتھوڑے کی طرح پڑے۔

پیڈرو، فرش پر گرتے ہی قلابازی کھا کے بیڈ کے پیچھے ہونا چاہتا تھا مگر محسن اسی دروازے میں سے نمودار ہوا جس میں سے پیڈرو کا ساتھی اندر آیا تھا اور اس نے ایک جست بیڈ پر لگائی۔ اگر ریشمی چادر پر اس کا پیر نہ پھسلتا تو وہ دوسری جست میں بیڈ عبور کرکے پیڈرو پر جا پڑتا لیکن پیر پھسل گیا تو وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور نہایت بے ڈھب طریقے پر پیڈرو کے سامنے جا لیٹا۔ پیڈرو نے پیشہ ورانہ مہارت کے ساتھ اس کے سر پر ریوالور کا دستہ مارا اور میں نے محسن کے کراہنے کی آواز سنی۔ پیڈرو کا ساتھی بیڈ کے ادھر کے آگے آیا لیکن میں اس سے نمٹنے کے لیے بالکل تیار تھا اور اگر مجھے اس پر ایک بھرپور وار کرنے کا موقع مل جاتا تو اس کا کام تمام ہو جاتا لیکن پیڈرو نے مسہری کے نیچے سے گولی چلائی جس کا نشانہ یقیناً میں تھا۔ پیڈرو کا ساتھی متحرک ہونے کے باعث بروقت سامنے آ گیا اور گولی اس کے شانے میں لگی۔ اس نے کراہ کر دونوں ہاتھ بلند کیے اور ٹیبل لیمپ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر کھڑکی کی طرف گیا۔

"بس۔" میں نے کھڑکی کا شیشہ بکھرنے کی آواز کے ساتھ پیڈرو کی آواز سنی۔ "اب تم نے ذرا بھی حرکت کی تو سر میں سوراخ کر دوں گا۔" میں جہاں تھا وہیں منجمد ہو گیا اور پیڈرو مسہری کے نیچے سے نکل کے میرے مقابل آ گیا۔ اس کا ڈھاٹا کھل گیا تھا اور مندری والے میکسیکن ڈاکو کا چہرہ اب میرے سامنے بے نقاب تھا۔ اس کا ساتھی شانے کے زخم سے بہنے والے خون کو روکنے کی کوشش میں مصروف تھا اور اس نے ایک ٹیبل کور کھینچ کر زخم پر رکھ کے ہاتھ سے دبا رکھا تھا۔ اس کے حلق سے درد کی ٹیس کے ساتھ خود بخود سسکی نکل جاتی تھی۔

"زیادہ نخرے مت کر۔" پیڈرو نے غرا کے کہا۔ "معمولی سا زخم ہے۔ مرے گا نہیں تو۔ ادھر آ کے کسی چیز سے اس کے ہاتھ پیر باندھ دے۔" اس نے بے ہوش پڑے ہوئے محسن کی طرف اشارہ کیا۔

بازو کی تکلیف کے باوجود اس کے ساتھی نے پیڈرو کے حکم کی تعمیل کے لیے ریشمی چادروں کو لمبی پٹیوں کی شکل میں پھاڑا۔ گولی اگر شانے کی ہڈی میں لگی ہوتی تو وہ ا

ہاتھ کو حرکت تک نہیں دے سکتا تھا لیکن زخم غالباً بیرونی گوشت تک محدود رہا تھا۔ ریشمی چادریں بہت مضبوط تھیں مگر اس نے کناروں کو ڈریسنگ ٹیبل پر سے بلیڈ لے کر کاٹا اور کونے کو پیر کے نیچے دبا کے اس ہاتھ سے کھینچ لیا جو زخمی نہیں تھا۔ ان پٹیوں سے جو ریشم کی رسی جیسی تھیں اس نے محسن کے ہاتھوں کو کمر کے پیچھے کر کے کئی بل دیے پھر دوسری پٹی سے پیروں کو ملا کر باندھا اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔ میرے علاوہ پیڈرو نے بھی اس تمام کارروائی کو بغور دیکھا تھا لیکن ایک لمحے کے لیے بھی وہ دوسری طرف سے غافل نہیں ہوا تھا۔

"اب تم اپنا منہ دیوار کی طرف کر لو۔" پیڈرو نے حکم دیا۔ "مجھے قتل کرنے کا حکم نہیں ہے مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ میں اپنی جان دے کر تمہیں بچاؤں۔ دیر مت کرو۔"

میں نے اپنا منہ دیوار کی طرف کر لیا۔ "تمہیں یقین تھا کہ ہم یہاں آنے کی حماقت ضرور کریں گے؟"

"ہم اس وقت سے تمہارے پیچھے ہیں جب سے تم وہ لفافہ لے کر فرار ہوئے تھے۔" وہ بولا۔

"اب تمہارا سیٹھ دلاور اس لفافے کے لیے اتنا فکرمند کیوں ہے۔ اس میں جو کچھ تھا وہ تو ہمیں معلوم ہو گیا۔" میں نے کہا۔

"اچھا۔" پیڈرو نے تمسخرانہ لہجے میں کہا۔ "چلو پھر تو تمہارے لیے بھی وہ خط اہم نہیں رہا۔ لاؤ وہ لفافہ ہمیں دے دو۔"

"تم بھی اسے لے کر کیا کرو گے؟" میں نے کہا۔ "اس کی ایک ایک نقل بہت سے لوگوں کے پاس پہنچ چکی ہے۔"

"وہ کون کون لوگ ہیں؟" پیڈرو نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔ "ہمیں بھی تو پتا چلے۔"

"تم مذاق سمجھ کے خوش ہو نا۔" میں نے کہا۔ "لیکن تم ان لوگوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ایک نقل ہے ہمارے وکیل... مسٹر منظر ایڈووکیٹ کے پاس۔ ایس ایس پی ضامن رضوی کو ایک نقل شام تک پہنچ جائے گی۔"

"گولی مارو نقلوں کو۔" وہ یکلخت سنجیدہ ہو گیا۔ "سارے شہر میں بانٹ دو اس کی نقلیں۔ ہمیں اصل چاہیے۔"

"اصل... وہ تو ہمارے پاس نہیں ہے۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں۔" میں نے کہا۔ "محسن سے پوچھ کے دیکھو۔"

"جب یہ اندر داخل ہوئے تھے تو محسن کے پاس بریف کیس تھا۔" پیڈرو نے اپنے ساتھی کو مخاطب کیا۔ "تو ادھر آ کے اسے سنبھال۔ میری طرف سے کھلی چھٹی ہے۔ اگر یہ سر گھما کے بھی دیکھے تو گولی چلا دینا۔"

میں بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ میرا اندازہ تھا کہ پیڈرو سے اس کا نائب زیادہ خطرناک ہے۔ ایک تو اسی وجہ سے کہ وہ مجھے بچاتے ہوئے زخمی ہو گیا تھا۔ دوسری وجہ یہ بھی کہ

وہ نسبتاً نوآموز تھا۔ ناتجربہ کار اور نوجوان آدمی جیسے اپنے جذبات پر بیڈرو کی طرح قابو رکھنے کی مشق نہ تھی۔ وہ ذرا بھی مشتعل ہوتا تو بیڈرو کے عطا کردہ خصوصی اجازت نامے سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے مجھے شوٹ کر دیتا۔ میں نے اس سے بات کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ انتظار کا ایک ایک منٹ ایک گھنٹے کے برابر ہو گیا۔ میں سوچتا رہا کہ کیا بیڈرو بریف کیس تلاش کرے گا۔ محسن کو اتنا وقت ضرور ملا تھا کہ اجنبی آواز سنتے ہی وہ ساتھ والے کمرے میں روپوش ہو گیا تھا۔ کسی پردے کے پیچھے۔ بیڈ کے نیچے یا وارڈروب میں اور بیڈرو کے ساتھی نے پوری کوٹھی کے ہر کمرے میں سرسری نگاہ ڈال کے اپنا اطمینان کر لیا تھا۔ اگر وہ تفصیل سے اور اطمینان سے تلاشی لیتا تو محسن کہاں چھپا رہ سکتا تھا یہی اس کے ناتجربہ کار ہونے کی دلیل تھی۔ محسن نے بالکل مناسب وقت پر ایش ٹرے پھینکی تھی جو بیڈرو کے سر میں لگتی تو اس وقت وہ لیٹا ہوتا۔ اس کا نشانہ خطا گیا تھا یا اس نے عمداً سر کو نشانہ نہیں بنایا تھا کہ کہیں سر پھٹنے سے وہ مر ہی نہ جائے۔ اس کی کارروائی کے خاطر خواہ نتائج نہیں نکلے تھے تو یہ ہماری بدقسمتی تھی۔ بریف کیس چھپانے کی مہلت اسے کہاں ملی ہو گی۔ میں نے سوچا۔ اور میرا خیال درست تھا۔ اسی وقت بیڈرو نمودار ہوا اور اس نے محسن کا بریف کیس بیڈ پر الٹ دیا۔ کاغذات کے الٹنے پلٹنے اور اس کے بڑبڑانے کی آواز سے میں نے اندازہ لگایا کہ لفافہ نہ ملنے پر وہ جھنجھلاہٹ کا شکار ہے۔

"میں جھوٹ نہیں بولتا۔" میں نے دیوار کو مخاطب کر کے کہا۔ "لفافہ ہمارے پاس نہیں ہے۔"

بیڈرو نے مجھے گالی دی اور میرے پیچھے آ کے میرے سر پر مکا رسید کیا۔ میری پیشانی دیوار سے ٹکرائی اور ذرا سی دیر کے لیے مجھے اپنا وجود اندھیرے میں ڈوبتا محسوس ہوا زمین میرے قدموں کے نیچے ہلنے لگی تو میں نے ہاتھ پھیلا کے دیوار کا سہارا لینا چاہا۔ اسی وقت بیڈرو نے میرے سر پر ریوالور کا دستہ مارا اور میں کٹے ہوئے درخت کے تنے کی طرح فرش پر گرا۔ اس ضرب نے پل بھر میں مجھے ہوش سے بیگانہ کر دیا۔ یہ میرا تجسس تھا جس نے میرے ساتھ محسن کو بھی گرفتار بلا کیا تھا۔

پھر مجھے احساس ہوا کہ موسلا دھار بارش ہو رہی ہے اور پانی مجھے اور میرے کپڑوں کو تر کرتا ہوا جسم پر بہہ رہا ہے رفتہ رفتہ حواس بحال ہونے لگے۔ یہ کوئی خواب نہیں تھا اور یہ بارش نہیں تھی باتھ روم کے شاور کا پانی تھا جو مجھ پر گر رہا تھا۔ میں نے آنکھیں کھول کے سر کو جھٹکا اور اٹھ بیٹھا ... نے مجھے سہارا دینے کی کوشش کی اور شاور کو بند کر دیا۔ ... حال ہے برادرِ نسبتی؟" محسن بولا۔

"حال... ٹھیک ہے۔" میں نے سر کے ناقابلِ ... درد کو دباتے ہوئے کہا۔ "مگر سالارِ اعظم..." میں نے اِدھر ... دیکھا۔

"سوالات کی ضرورت نہیں۔" محسن بولا۔ "جوابات ... ہیں۔ ہم اسی کوٹھی کے باتھ روم میں تشریف فرما ہیں ... استاد بیڈرو اور اس کے دونوں رفیق جاتے وقت ہمیں ... بند کر گئے تھے۔ پہلے میں بیہوش ہوا تھا اس لیے ہوش ... بھی پہلے آیا۔ تم آدھے گھنٹے بعد..."

"اس کے ساتھ دو آدمی تھے؟" میں نے کہا۔ "تیسرا ... کون تھا؟"

"وہ باہر موجود رہا تھا۔" محسن بولا۔ "جب انہوں نے ... مجھے گھسیٹ کر اندر ڈالا تو مجھے تھوڑا تھوڑا ہوش آ گیا ... تھا۔ میں نے باہر سے اس کی آواز سنی تھی۔ غالباً وہ جیپ ... چلا کے لایا ہو گا۔ باہر سے جیپ اسٹارٹ ہونے کی آواز ... بھی آئی تھی۔"

"تیرے تو ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے۔" میں نے ...

"اور اس سور کے بچے نے باندھا بھی بہت سخت تھا۔ ...

"میں نے پرانا طریقہ استعمال کیا۔" محسن نے کہا۔ "... کے گرد سیمنٹ کے کنارے خاصے تیز ہیں۔ میں دروازے ... سے پشت لگا کے ہاتھوں کو اوپر نیچے رگڑتا رہا۔ تھوڑی ... کھال بھی چھل گئی مگر کپڑا اچھا، جلد کٹ گیا۔ ایک بل ... پڑا تو ہاتھ خود ہی آزاد ہو گئے۔"

"اور اب کیا پوزیشن ہے؟" میں نے کہا۔ "ہمارے ... کے امکانات کیا ہیں؟"

"امکانات بہت روشن ہیں۔" محسن نے کہا۔ "ایک ... صورت تو یہ ہے کہ ہم روشن دان میں منہ ڈال کے ... شروع کریں۔ ہماری آواز کسی نہ کسی کے کانوں تک ... جائے گی اور فی الحال تو ہمیں آزادی مل جائے گی۔ ... بات ہے کہ اس کے بعد ہمیں حوالات جانا پڑے اور ... کرنا پڑے کہ ہم اس باتھ روم میں کیسے بند ہوئے۔ ... طریقہ یہ ہے کہ ہم کوئی دیوار توڑ کے نکل جائیں یا دروازہ ... اکھاڑ دیں لیکن ہم دونوں میں سے کوئی ٹارزن نہیں ... کسی کے پاس کوئی مافوق الفطرت قوت نہیں۔ دروازہ ... کو باہر سے ٹکر مارنے سے اندر کی چٹخنی نکل جاتی ہے ... کھل جاتے ہیں مگر اندر سے ٹکر مارنے کے تو پوری چوکھٹ ... گرانا پڑتی ہے جو ناممکن ہے۔"

"روشندان میں یہ سلاخ نہ ہوتی تو ہم اس میں سے گزر سکتے تھے۔" میں نے اوپر نگاہ ڈالی۔ "کیا اس سلاخ کو موڑ کر نکالا نہیں جا سکتا؟"

محسن نے مایوسی سے انکار میں سر ہلایا۔ "یہ مسئلہ عقل سے حل ہو گا طاقت سے نہیں۔" اس نے باتھ روم کیبنٹ کو کھولا۔ "اس میں کچھ دوائیں ہیں۔ میں نے سر کے زخم پر ٹنکچر آیوڈین لگائی ہے۔ معمولی زخم ہے۔ تیرے سر پر صرف گومڑ بنا ہے۔" اس نے ایک پیکٹ میں سے اسپرین کی تین گولیاں نکالیں اور ہتھیلی پر رکھ کے مجھے پیش کیں۔ "یہ لیجیے اور مگ سے پانی نوش فرمائیے۔ میں کھا چکا ہوں اور یقین کیجیے اس وقت یہ جادو کی گولیاں بڑی موثر ثابت ہوئی ہیں۔"

اسپرین نگلنے کے بعد میں نے اور محسن نے دیوار سے ٹیک لگا کے پیر فرش پر پھیلا دیے اور ایک دوسرے کو سگریٹ پیش کی۔ دوپہر کے بعد اب سہ پہر بھی ڈھلنے لگی تھی۔ خالی پیٹ میں سگریٹ کا تلخ دھواں تیر کی طرح لگا۔ مجھے ابھی یہ فکر نہیں تھی کہ ہم اس قید خانے سے کیسے نکلیں گے۔ زیادہ تشویشناک بات یہ تھی کہ گھر کے مکین لوٹ آئے تو کمرے کی حالت دیکھتے ہی سمجھ جائیں گے کہ ان کی عدم موجودگی میں وہاں عیش و عشرت اور جنگ و جدل کے کیسے کیسے مناظر کی شوٹنگ ہوئی ہے اور اس کے بعد ہمیں پولیس نکالے گی تو پھر بند کرنے کے لیے۔ میں نے باتھ روم کے اسباب کا جائزہ لیا۔ روشندان والی دیوار کے مقابل دوسری دیوار کے ساتھ باتھ ٹب تھا، جس پر گرم اور ٹھنڈے پانی کی ٹونٹیاں نصب تھیں۔ فلاش کے ایک اور نل تھا اور شاور۔ اس کے سامنے واش بیسن اور واش بیسن کے اوپر پلاسٹک کے سلائیڈنگ ڈور والا باتھ کیبنٹ، باتھ کیبنٹ میں بھی صابن، شیمپو اور ٹوتھ پیسٹ جیسی چیزوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ کوئی ہتھوڑی کلہاڑی یا سریے جیسی چیز سرے سے مفقود تھی۔ بلیڈ یا ریزر سے نہ دروازہ کاٹا جا سکتا تھا اور نہ دیوار میں شگاف کیا جا سکتا تھا پھر کیبنٹ کے اوپر ہاتھ ڈال کے ٹٹولنے سے مجھے انگلیوں پر لوہے کے سرد لمس کا احساس ہوا۔ دوسرے لمحے میں نے وہ چیز اتاری اور کچھ دیر ہکا بکا کھڑا رہا۔ میرے ہاتھ میں اعشاریہ تین دو کا ریوالور آ گیا تھا۔

"محسن..." میں نے کہا۔ "یہ... یہ تو اصلی ریوالور ہے۔" میں نے کہا اور ریوالور اس کی طرف بڑھا دیا۔ "اور بھرا ہوا ہے۔"

"ہاں یار۔" محسن نے ریوالور کو الٹ پلٹ کے دیکھا۔ "کسی نے خاصی محفوظ جگہ سمجھ کے چھپایا تھا۔"

"سوال یہ ہے کہ کس نے؟" میں نے کہا۔ "خود صاحبِ خانہ نے یا اس کے گھر کے کسی فرد نے، کسی ملازم نے یا آنے جانے والے کسی نے؟"

"اس سے تو کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ریوالور کس کا ہے۔" وہ بولا۔ "فرق اس بات سے پڑتا ہے کہ جائز ملکیت ہے یا ناجائز۔ جہاں تک میرا خیال ہے یہ بغیر لائسنس کا ہو گا اور اسی لیے باتھ روم میں چھپایا گیا تھا۔ لائسنس ہو تو لوگ ریوالور ساتھ رکھتے ہیں یا دراز میں مقفل کر کے۔"

"اور اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ ہم اسے لے جا سکتے ہیں۔ اس سے مالک کو مالی نقصان کے سوا کوئی پریشانی نہیں ہو گی۔" میں نے کہا۔

"بلکہ ہو سکتا ہے صاحبِ خانہ کو علم ہی نہ ہو کہ اس کے گھر میں ناجائز اسلحہ پوشیدہ ہے۔" محسن بولا۔

"ہم اسے پریشانی سے بچا سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"اور اگر یہ اسی کا ہوا تو اس کے لیے نہ مسئلہ پیدا ہو گا نہ پریشانی ہو گی۔" محسن بولا۔ "وہ دوسرا حاصل کر لے گا۔" ہم نے جنس کے ہاتھ ملایا۔ اس وقت جب ہم معمولی خنجر کی جستجو کر رہے تھے ایک ریوالور کا مل جانا ایسا ہی تھا کہ ہم آگ لینے کو جائیں اور پیمبری مل جائے۔ دستِ غیب نے ہمیں بن مانگے اپنے دشمنوں سے لڑنے کے لیے مسلح کر دیا تھا۔ حوصلے کے ساتھ طاقت بھی دے دی تھی اور غیر متوقع خطرات کے خلاف تحفظ کا ایک وسیلہ فراہم کر دیا تھا لیکن میرے اور محسن کے ذہن میں یہ احساس بھی تھا کہ ریوالور اپنے قبضے میں کر کے ہم اخلاقی اور قانونی طور پر خود بھی مجرم بن رہے ہیں۔ ہم کسی اور کے گھر میں تھے جہاں ہم اس نیت سے ہرگز نہیں آئے تھے کہ صاحبِ خانہ کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کچھ اٹھا لے جائیں۔ قطع نظر اس سے کہ ریوالور کسی نے جائز طور پر اور جائز مقصد کے لیے حاصل کیا یا نہیں ہم خود بھی اس کو ناجائز طریقے پر حاصل کرنے کی سوچ رہے تھے۔

شرافت کا تقاضہ تو یہی تھا کہ ہم نے اسے جہاں سے اٹھایا ہے پھر وہیں رکھ دیں اور بھول جائیں۔ دوسری طرف ہمارے حالات تھے جو سنگین تر ہوتے جا رہے تھے اور ہمارے مقابل خطرناک مجرم تھے جن کا مقابلہ خالی ہاتھ اور شرافت سے نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ضامن رضوی کی سفارش کے باوجود مجھے ریوالور کا لائسنس ملنے کے بارے میں بہت زیادہ پُرامید

نہیں تھا۔ ایسے ہی یہ ریوالور ملنا غیبی امداد کے سوا کیا سمجھا جا سکتا تھا۔ اتفاقات کا یہ طویل سلسلہ کس کا انتظام تھا جس نے ہمیں دوبارہ اس کوٹھی میں آنے پر مجبور کیا۔ دشمنوں کو ہمارے تعاقب میں پہنچایا۔ وہ جاتے ہوئے ہمیں اسی جگہ بندھا ہوا نہیں چھوڑ کر گئے جہاں سے ہم ہوش میں آتے ہی اٹھ کر باہر جا سکتے تھے اور انہوں نے ہمیں قید بھی کیا تو اسی باتھ روم میں۔

میرا ذہن ان دلائل کو تسلیم کرنے پر بضد تھا لیکن ایک خلش سی باقی تھی کہ کوئی جواز ہمارے جرم کو بے گناہی کی سند نہیں دے سکتا۔ حالات خواہ کیسے بھی ہوں چوری اور ناجائز اسلحہ رکھنے کی سزا پر اثر انداز نہیں ہوتے۔ شاید میں ریوالور کو واپس وہیں رکھ دیتا مگر محسن نے اچانک کہا "یار سکندر! میرا خیال ہے یہ وہی ریوالور ہے جو استاد بیڈرو کے ہاتھ میں تھا۔ تونے تو زیادہ قریب سے دیکھا تھا۔"

میں نے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔ "لاحول ولا قوۃ۔ یہ تو مجھے پہلے سوچنا چاہیے تھا۔ سائلنسر لگا دیا جائے تو یہ وہی ریوالور ہے۔"

"اتنا تو مجھے بھی خیال ہے کہ وہ اعشاریہ تین دو کا کچھ اسی قسم کا ریوالور تھا۔" محسن نے کہا اور ریوالور میری طرف بڑھایا۔ "بس سائلنسر ہٹا لیا گیا ہے۔"

میں نے ریوالور کو غور سے دیکھا "اس نے دو گولیاں چلائی تھیں۔ اگر اس کے چیمبر میں دو گولیاں کم ہوئیں تو یہ ایک ثبوت ہوگا۔" لیکن چیمبر کھول کر دیکھنے پر مجھے دو کی جگہ تین گولیاں کم نظر آئیں۔ پھر میں نے ریوالور کا دستہ دیکھا تو مجھے اس پر خون کا ہلکا سا نشان نظر آیا۔ یہ خون مکمل طور پر خشک نہیں ہوا تھا۔ میں نے اس کو انگلی سے چھو کر دیکھا اور میرا شک یقین میں بدل گیا۔ میری انگلی پر ایک بال بھی آ گیا جس کا رنگ ہلکا بھورا تھا بالکل محسن کے بالوں جیسا۔

"یہ ہم بعد میں سوچیں گے محسن کہ وہ لوگ ریوالور یہاں کیوں چھپا گئے تھے۔" میں نے کہا۔ "ریوالور وہی ہے۔"

"اس سے وہ مسئلہ تو حل نہیں ہوتا جو فوری طور پر درپیش ہے یعنی بخیر و عافیت باہر نکلنے کا۔" محسن نے کہا۔

"دو فائر کر کے نٹ بولٹ اڑائے جا سکتے ہیں۔" میں نے جھوٹ موٹ کا نشانہ لیا۔ "اس سے باہر کی کنڈی ٹوٹ جائے گی لیکن فائر کی آواز پر کوئی آ گیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ ہمیں خاموشی سے نکلنا ہے اور باہر سے اپنا سامان بھی سمیٹنا ہے وہ سب کچھ جو انہوں نے لفافے کی تلاش میں بریف کیس میں سے بیڈ پر الٹ دیا تھا۔"

"تیرا کیا خیال ہے وہ سب چیزیں وہیں پڑی ہوں گی؟" محسن نے کہا۔ "وہ نقد رقم تو ضرور لے گئے ہوں گے۔"

"یہ سب تو باہر نکل کے پتا چلے گا۔" میں نے کہا۔ "اس دروازے کی ساخت پر غور کر۔ اس میں نیچے سے اوپر تک بارہ پینل بنے ہوئے ہیں۔ پورا پٹ ایک نہیں ہے۔ ہر پینل تقریباً ایک فٹ لمبا اور چوڑا ہے۔ درمیان میں سے ابھرا ہوا اور کناروں پر سے کچھ گہرا۔ اگر ہم کنڈی کے نیچے یا اوپر والے کسی پینل کو توڑ سکیں تو ہاتھ باہر نکال کے کنڈی کھول سکتے ہیں اور پینل کے کنارے کچھ پتلے ہیں۔"

"ہاں۔ مگر اس کے باوجود مکا مارنے سے نہیں ٹوٹیں گے۔" محسن نے کہا۔ "اگر ہمارے پاس کوئی چیز ہوتی...." اس کی نظر غسل خانے کا طواف کرتے ہوئے ایک جگہ ٹھہر گئی۔ وہ آگے بڑھا۔ "ڈبلیو سی" کے اوپر فلش ٹینک اسٹین لیس اسٹیل کا تھا۔ محسن نے اس کا ڈھکن اوپر اٹھایا تو ٹینک کا پانی تیزی سے خارج ہوا۔ ڈھکن خاصا وزنی تھا اور اس کے نیچے کی طرف ربر کے واشر والا وہ پسٹن جیسا اسٹاپر تھا جو ایک بلر ہینڈل گھمانے سے اٹھتا تھا تو ٹینک کا پانی نیچے والے پائپ سے بہنے لگتا تھا۔ خالی ہو جانے کے بعد یہ پسٹن پھر سوراخ کو بند کر دیتا تھا اور ٹینک دوبارہ بھرنے لگتا تھا۔ اندر والے حصے میں لمبی سی ڈنڈی سے منسلک وہ المونیم کا ہلکا پھلکا گولا بھی تھا جو پانی کی سطح کے ساتھ بلند ہوتا تھا اور ایک خاص سطح تک اٹھنے کے بعد ٹونٹی بند کرتا تھا مگر اس نازک سی چیز کو مگدر کی طرح استعمال کیا جاتا تو گولا پچک جاتا۔ فلش ٹینک کا ڈھکنا موزوں ترین چیز ثابت ہوا۔ محسن نے اس کے ہینڈل جیسے حصے کو موڑ دیا اور ڈھکن کو لمبائی کے رخ پکڑ لیا۔ اس کے مڑے ہوئے کناروں نے ڈھکن کو خاصی مضبوطی عطا کر دی تھی۔ محسن نے ناپ تول کے پہلی ضرب لگائی اور اس سے اتنی آواز پیدا ہوئی کہ ایک لمحے کے لیے ہم خود ٹھٹھک کر رک گئے۔ پھر میں نے پینل کو دیکھا۔ اس کی لکڑی پر چوٹ سے نشان پڑ گیا تھا۔ میں نے محسن سے کہا کہ شور تو ہوگا لیکن تذبذب میں تاخیر ہوگی اور اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ محسن نے سر ہلایا اور پوری قوت کے ساتھ لکڑی کے پینل پر حملہ آور ہوا۔ پینل درمیان میں سے کریک ہوا اور پھر اس کا آدھا حصہ نکل کے باہر جا گرا۔

محسن نے جلدی سے ڈھکن نیچے رکھا اور باہر ہاتھ نکال کے کھٹ سے کنڈی کھول دی۔ شور نے ابھی تک کسی کو متوجہ نہیں کیا تھا۔ ہم نے تیزی سے بیڈ کا رخ کیا جس پر بریف کیس اوندھا پڑا تھا اور تمام سامان بکھرا ہوا تھا خلافِ توقع وہ سب کچھ چھوڑ گئے تھے۔ استاد بیڈرو وہ مجرم تھا جو ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ کام کرتے ہیں اور ایک وقت میں ایک مقصد کے لیے۔ اس کو لفافے کی جستجو تھی نوٹوں کو اس نے نظر انداز کر دیا تھا۔ اس کی جگہ دوسرا ہوتا تو جاتے جاتے مالِ مفت ضرور سمیٹ کر لے جاتا۔ میں نے سب چیزوں کو بریف کیس میں ڈالا اور ہم اس کمرے سے نکل آئے جو زلزلے کے بعد کی تباہی کا منظر پیش کر رہا تھا۔ شام کے چار بجنے والے تھے۔ بیرونی دیوار اور کوٹھی کی دیوار کے درمیان پتلی سی گلی تھی جس میں رنگین طوطوں کے دو پنجرے تھے لیکن ایک پنجرہ خالی تھا۔ دوسرے میں زرد اور نیلے پروں والا ایک ہی طوطا اداس بیٹھا تھا۔ معلوم نہیں وہ نر تھا یا مادہ تھی جس کا ساتھی داغِ مفارقت دے گیا تھا۔ قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں۔ مرزا غالب نے مجھے یاد دلایا۔ اسیر ہم سب ہیں۔

"السلام علیکم!" کسی نے تیز باریک آواز میں یوں کہا کہ میں اچھل پڑا۔ مگر سلام کرنے والا ایک دیسی طوطا تھا جو گنبد نما پنجرے میں جھول رہا تھا۔ اس نے جواب نہ پایا کے پھر حیرت انگیز طور پر انسانی آواز سے ملتی جلتی آواز میں کہا۔ "السلام علیکم!"

"وعلیکم السلام!" میں نے پنجرے کے قریب جا کے کہا۔ "کیا حال احوال ہیں جناب کے؟"

"کس سے ملنا ہے آپ کو؟" طوطے نے فوراً جواب دیا۔ کسی نے بڑی محنت سے یہ جملے رٹائے تھے۔

"اس طوطے کو ریسپشن پر بیٹھ کے آنے جانے والوں کو ٹالنے کی تربیت دی گئی ہے۔" میں نے کہا۔

"خدا حافظ۔" طوطا بولا۔ "گھر پر تو کوئی نہیں ہے۔"

میں اور محسن ہنس پڑے۔ "کمال ہے یار!" میں نے کہا "دروازے کے باہر کوئی سنے تو یہی سمجھے کہ انٹرکام پر کوئی بچہ بول رہا ہے۔"

"ہاں بہت سے لوگ کال بیل کے ساتھ ہی یہ سسٹم رکھتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "تاکہ گیٹ تک بلا وجہ نہ آنا پڑے اندر ہی سے سب پوچھ لیا جائے۔ یہ کام یہاں طوطا کر رہا ہے۔" ہم دونوں آگے چل پڑے۔ طوطے نے مزید کچھ نہیں کہا۔

"لیکن یار! آج جب ہم اندر آئے تھے تو اس نے کچھ نہیں پوچھا تھا۔" محسن بولا۔ "میں نے تو اس کی آواز بھی نہیں سنی۔"

"میرا خیال ہے پنجرہ پہلے گیٹ کے پاس ہوگا۔" میں نے کہا۔ "کل رات دلاور اینڈ کمپنی نے اس کو وہاں سے ہٹا کے ادھر لٹکا دیا ہوگا۔ طوطے نے ان سے بھی بات کی ہوگی۔" راہ میں چلتے چلتے رک گیا۔ آٹھ فٹ چوڑی گیلری میں انڈر گراؤنڈ ٹینک بھی تھا لیکن اس کا ڈھکنا کھلا ہوا تھا جو غیر معمولی بات تھی۔ لوگ ٹینک کے پانی کو گرد و غبار اور کوڑے کچرے سے صاف رکھنے کے لیے ہمیشہ بند رکھتے ہیں۔ میں نے دو فٹ کے مربع سوراخ سے اندر جھانکا تو مجھے پانی میں آسمان کی نیلاہٹ اور درختوں کی سرسبزی کے درمیان اپنا عکس دکھائی دیا۔ پھر میرے ذہن کو بجلی کا جھٹکا سا لگا۔ میں نے اپنی صورت کو پہچاننے میں غلطی کی تھی۔ وہ میرا چہرہ نہیں تھا۔ میں بے اختیار پیچھے ہٹ گیا۔

"محسن!" میں نے کہا۔ "تو جھانک کے دیکھ اس میں۔ یہ میری نظر کا دھوکا ہے یا...؟"

محسن نے جھک کر دیکھا اور میں نے اس کی صورت کے تغیرات کو دیکھا۔ ایک منٹ بعد وہ سیدھا ہوا تو میں نے پھر جھانکا اور اس مرتبہ مجھے پانی میں تیرتے ہوئے شخص کا چہرہ صاف دکھائی دیا۔ اس کی کھلی آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔ وہ چالیس پینتالیس سال کا اور اوسط قد و قامت کا آدمی تھا جس نے خاکی رنگ کی واسکٹ اور پتلون پہن رکھی تھی۔ ٹینک چھ فٹ گہرا تھا مگر اس میں پانی کی گہرائی آدھی بھی نہ تھی چنانچہ اس کی لاش بڑے مضحکہ خیز انداز میں تہہ سے جا لگی تھی۔ یوں کہ اس کے دونوں پیر ایک دیوار پر ٹک گئے تھے اور پانی سے باہر تھے۔ غور سے دیکھنے پر مجھے پانی کا رنگ بھی سرخی مائل نظر آیا اور میں نے اس کی کنپٹی کے پاس سیاہی مائل سرخ دھبہ سا دیکھا۔ چیمبر میں تین گولیاں کم ہونے کی وجہ اب میری سمجھ میں آ گئی تھی۔ پہلی گولی کا نشانہ گزشتہ رات یہ چوکیدار بنا تھا جو خالی کوٹھی کی حفاظت پر مامور تھا۔

"السلام علیکم۔" طوطے نے کہا اور ہم یوں چونکے جیسے اس نے نہیں گھر کے کسی فرد نے ہمیں اس فرض شناس جاں نثار کی لاش کا تماشا کرتے پکڑ لیا ہے۔ ہم تیز تیز قدموں سے دروازے کی طرف لپکے۔ "کس سے ملنا ہے آپ کو؟" طوطے نے چلا کر کہا۔ ہم گیٹ کھول کر باہر آ گئے اور خاموشی سے

سڑک پر چلنے لگے۔ دور سے طوطے کی آواز آئی "گھر پر کوئی نہیں ہے۔" "ہاں۔ گھر پہ کوئی نہیں ہے۔ سوائے ایک لاش کے۔"

"اب تو ساری بات صاف ہوگئی ہے۔" محسن نے کافی دور نکل آنے کے بعد کہا "کہ دلاور نے اتنی بے خوفی کے ساتھ یہاں تمہارے ساتھ ڈرامہ کیسے کیا تھا۔ چوکیدار کو شاید مزاحمت کا موقعہ ہی نہیں ملا ہوگا۔ کسی نے پیچھے سے آکے اسے دبوچ لیا ہوگا اور کنپٹی پر ریوالور رکھ کے فائر کر دیا ہوگا۔ غریب کے حلق سے آواز بھی نہ نکل سکی ہوگی۔"

"اور ریوالور کو باتھ روم میں چھپانے کا مقصد بھی اب سمجھ میں آتا ہے۔" میں نے کہا "انہوں نے چوکیدار کو مار کے ٹینک میں ڈال دیا اور ریوالور باتھ روم میں ایسی جگہ رکھ گئے کہ لاش کی دریافت کے بعد پولیس تلاشی لے تو آلۂ قتل برآمد ہو جائے۔ الزام کسی پر نہ آئے۔ گھر کا مالک تو ثابت کر سکتا ہے کہ وہ کہاں لوکیشن شوٹنگ میں مصروف تھا اور اس کے کتنے گواہ ہیں۔ پولیس عموماً ذاتی دشمنی کا کیس بنا کے نامعلوم قاتلوں کو تلاش کرتی ہے اور واجبی سی کارروائی کے بعد داخلِ دفتر کر دیتی ہے۔"

"دلاور کو یہ بات معلوم ہوگی کہ صاحبِ خانہ کے کب تک لوٹنے کا امکان نہیں ہے۔" محسن بولا "عموماً فلمی صفحے پر اخبارات مختصر خبر دے دیتے ہیں کہ فلمی دنیا کی مصروفیات کیا ہیں۔ شاید اس ہدایت کار کے بارے میں بھی خبر ہوگی کہ ان کا یونٹ کہاں گیا ہے۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ کسی نے ہمیں اس واردات میں ملوث کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بیڈ رو اور اس کے ساتھی ناکام ہو کے جاتے وقت ہمیں قتل بھی کر سکتے تھے یا ہمیں اس طرح باندھ کے جا سکتے تھے کہ ہم ہل بھی نہ پاتے اور پولیس آجاتی۔ وہ جانتے ہوں گے کہ ہم ہوش میں آکے نکل جائیں گے لیکن فوراً نہیں۔"

"دلاور نے مجھے ایک مہینے کی مہلت دی ہے۔ آدمی قول کا پکا معلوم ہوتا ہے۔" میں نے تلخی سے کہا۔ ایک فرلانگ سے زیادہ پیدل سفر کرنے کے بعد ہمیں جھونپڑے جیسا ایک تندور ملا جو ایک خالی پلاٹ پر ناجائز قبضہ کر کے تعمیر کیا گیا تھا۔ عارضی قسم کی دیواریں جو دھوئیں سے سیاہ ہو رہی تھیں اور ٹین کی پرانی چادروں کی چھت جس پر خالی کریٹ، پرانے ٹائر اور خشک پتوں کے ڈھیر تھے۔ تندور کے مالک کو تجربہ ہوگا کہ کبھی نہ کبھی پلاٹ کا مالک کوٹھی کا نقشہ لے کر آپہنچتا ہے تو تعمیر سے پہلے تخریب کا عمل شروع ہوتا ہے اور بزنس کو کسی دوسرے خالی پلاٹ پر لے جانا پڑتا ہے چنانچہ بائیدلی تزئین و آرائش پر وقت توانائی اور پیسہ صرف کرنا فضول ہے۔ اس نے ایک ٹین پر "خانہ بدوش ہوٹل" بقلم خود لکھوا دیا تھا۔ باقی اشتہار وہ خود تھا۔ جب ہم نے اس جائے سرائے فانی میں قدم رکھا تو مزدور اور فقیر ٹائپ لوگ کھانا نوش فرما کے جا چکے تھے اور اندر مکمل تخلیہ تھا۔ بنچوں پر آمنے سامنے بیٹھ کے ہم نے مدہوش شرابی کی طرح ڈولتی میز پر سے المونیم کا میلا جگ اٹھایا اور اس سے میچ کرتے ہوئے گلاس میں پانی پیا جسے مالک ہوٹل ہذا نے ہینڈ پمپ سے تازہ تازہ برآمد کیا تھا۔ وہاں بچی ہوئی نیم گرم روٹیاں اور چنے کی دال فرائی۔ کھا کے ہمیں جو لطف آیا وہ اچھے سے اچھے ریسٹورنٹ میں پُر تکلف لنچ کھا کے نہیں آیا تھا۔ بھوک سے ہمارا برا حال تھا اور نفسیاتی محاذ پر دشمنوں کو ایک شکست دے کے ہم خاصے مطمئن تھے۔ ہم ایک خطرناک صورت حال سے بچ کر نکل آئے تھے اور اب زخمی بھی نہیں تھے۔ کھانے کے بعد ہم نے چائے پی جس میں ہر چیز خوب تھی۔ اسے خوب ابالا گیا تھا۔ اس میں خوب چینی ڈالی گئی تھی اور خوب دودھ ڈال کے مضرِ صحت ہونے کے بجائے ایک ٹانک بنا دیا گیا تھا۔ ہم نے چائے کی جگہ مجبوراً یہ ٹانک پیا جس کی حرارت ہمارے جسم میں منتقل ہوئی تو ہم نے خود کو بہت تازہ دم محسوس کیا۔ اس دوران ہم نے دن بھر کا مسلا ہوا کھنچا کھنچا سمیٹا ہوا سمیٹ کر کھولا ہوا داغ داغ، شکن شکن اور خستہ تن اخبار دیکھا اور میں نے محسن کی توجہ ان دو بدمعاشوں کی نہر سے برآمد ہونے والی لاشوں کی خبر کی طرف دلائی۔ محسن نے خبر کو دو مرتبہ غور سے پڑھا اور اخبار رکھ دیا۔

"یار سکندر! وقت کتنا ستم ظریف ہے۔" محسن نے اداس ہو کے کہا "کتنے دن کی بات ہے کہ ہم بے فکری سے ولایت میں تعلیم کے نام پر عیش کرتے تھے اور اپنی خوش بختی پر ناز کرتے تھے۔ انگریز لڑکیوں سے معاشقے لڑاتے تھے اور فردا و غمِ دوش، دونوں سے ناآشنا تھے۔"

"ہاں۔" میں نے گزرے ہوئے وقت کی یادوں کے دھندلکے میں گم ہو کے کہا "اور اب میں ایک قاتل ہوں۔ قانون کی نظر میں صرف ایک میر شرافت علی کا، لیکن درحقیقت کئی لوگوں کا خونِ ناحق میری گردن پر ہے۔ سلامت شاہ میری وجہ سے مارا گیا۔ منشی جسے ہم کسی آشنائی کے بغیر بے تکلفی سے مذاق میں فوما چو کہتے رہے میری خاطر جان سے گیا۔ یہ دو بدمعاش بھی انسان تو تھے جو میرے ہاتھوں قتل ہوئے اور وہ چوکیدار جس کی لاش اس وقت بھی۔۔۔"

"سکندر! دل چھوٹا نہ کر اور مایوسی کی باتیں نہ کر۔" محسن نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا "حالات پر کس کا اختیار ہے۔ ہم مجبور تھے یا کر دیے گئے تھے۔ بقا کی جنگ ہو تو ہر قانون ہمیں اپنے تحفظ کے لیے جدوجہد کا حق دیتا ہے، خواہ وہ ملک کا ہو یا معاشرے کا۔ اخلاقی ہو یا مذہبی۔ ہم آج بھی کوشش کر رہے ہیں کہ ہمارے ساتھ انصاف ہو، ظالموں کو سزا ملے اور ہمیں ہمارا حق ملے۔ کیا ہم غلط کر رہے ہیں؟ ہم نے کب چاہا تھا کہ اس زندگی کی روش بدلے جو اچھی گزر رہی تھی۔ آج بھی اگر کوئی غیبی قوت اس سب کو بے وجود اور بے حقیقت کر دے جو ہو چکا ہے اور ہمیں وہی زندگی لوٹا دے۔ سب پھر ویسا ہی ہو جائے جیسا تھا۔ آنکھ کھلے تو ہم دیکھیں کہ اسی ہوسٹل کے کمرے میں ہیں اور صبح ہو چکی ہے۔ چیپل کے گھنٹے بج رہے ہیں اور شبِ گزشتہ کا خوابِ پریشان ہو چکا ہے۔ تو کیا اس احساس سے حاصل ہونے والے اطمینان کی مسرت سے بڑی دولت کوئی ہو سکتی ہے؟"

"ہاں، یہی تو ہمارا عذاب ہے کہ ہم خواب سے نہیں گزر رہے ہیں۔" میں نے کہا "میں تو آنے والے دن سے بہت ڈرنے لگا ہوں محسن۔ معلوم نہیں مقدر کی یہ سختی اور آزمائش و ابتلا کا یہ دور مستقبل پر کہاں تک محیط ہے۔"

"ہماری نیت صاف ہے اور ہمارے عزائم غلط نہیں، ہم اپنے دفاع کی جنگ لڑ رہے ہیں لیکن سفاک خون آشام درندے نہیں بنے ہیں۔ ہم اندر سے آج بھی وہی ہیں۔ ہمارے یقین اور اعتقاد کے سب معیار پرانے ہیں اور ہمارے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں۔"

"اپنے آپ کو خود اپنی نظر سے مت دیکھ۔" میں نے کہا۔ "یہ دیکھ کہ دنیا کو ہم کیا نظر آتے ہیں اور دنیا ہمیں کس نظر سے دیکھتی ہے۔ تیرا تو پھر بھی ایک گھر ہے اور تجھے رشتوں کا تحفظ حاصل ہے۔ میری دنیا کیا ہے۔ خوف اور بے یقینی اور عدم اعتماد۔ اگر میں اپنے آپ کو قانون کی نظر میں بے گناہ ثابت نہ کر سکا تو یہ سہارے بھی سوت کے دھاگے ثابت ہوں گے، جو آج میسر ہیں۔ سزائے موت شاید

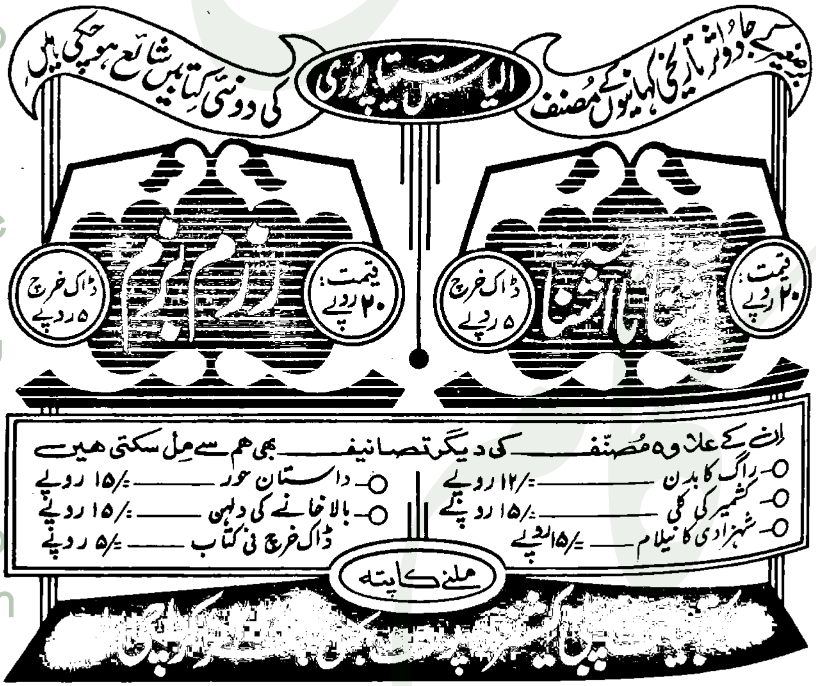

بچے نہ ہو مگر عمر قید یا سات سال کی قید بامشقت تو ضرور ہوگی۔ سات سال تک کون سا رشتہ استوار رہے گا۔ ایک تیری دوستی کا۔ تو مجھ سے ملنے آتا رہے گا۔ ہفتے میں ایک بار، پھر مہینے میں ایک بار، پھر سال چھ مہینے میں ایک بار، اور جب بالآخر میری رہائی کا دن آئے گا تو میں باہر کی دنیا میں آکے سوچوں گا کہ اب کدھر جاؤں۔ تو اپنے گھر میں آباد ہوگا۔ تجھے تیرے بیوی بچوں کے سامنے شرمسار کروں؟ نہیں۔ فوزیہ اپنے شوہر کے ساتھ مطمئن زندگی بسر کر رہی ہوگی اور سکندر بخت کے خیال سے خوف زدہ رہنا بھی بھول گئی ہوگی۔ اس کے سامنے جا کے اسے دہشت زدہ کروں؟ نہیں۔ عبدالودود منظر ہائیکورٹ کا جج ہوگا۔ سزا کاٹ کے جیل سے نکلنے والا مجرم اس سے چیمبر میں جا کے برسوں پرانے تعلق کی بنیاد پر گلے ملنے کی جرأت کر سکتا ہے؟ نہیں۔ اور رابعہ۔ اس کی ماں نے کہا تھا وہ بھی تو عورت ہے۔ اگر اسے کوئی شریکِ سفر نہ ملا تو وہ پتھر کی چٹان بن چکی ہوگی۔ جذبات سے عاری اور بے حس۔ پی ایل ڈی کی ایک جلد۔ ضابطۂ فوجداری و تعزیرات کی دفعات کا چلتا پھرتا مجموعہ۔"

"چل اٹھ یہاں سے۔ تجھ پر شدید قنوطیت کا دورہ پڑ گیا ہے۔" محسن نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"قنوطیت؟ کیا تیرا خیال ہے میں حقیقت کی بات نہیں کر رہا تھا۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا؟" میں نے اسے روک لیا۔ "یا نہیں ہوگا؟"

وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ "ہو سکتا ہے۔" اس نے میرا ہاتھ تھام کے کہا۔ "لیکن پُرامید رہنا اچھا ہے کہ ہوگا نہیں۔"

شام تک ہم اس سرونٹ کوارٹر میں منتقل ہو گئے جو ضامن رضوی صاحب کی کوٹھی کے عقب میں گیراج کے ساتھ واقع تھا۔ دو کمروں کے اس کوارٹر میں تمام ضروریاتِ زندگی فراہم تھیں۔ ایک کمرہ پہلے سے ان کے ڈرائیور کے تصرف میں تھا چنانچہ ہم دونوں کو ایک ہی کمرے میں دو چارپائیاں لا کے ڈالنا پڑیں، گدے اور تکیے خریدنے پڑے۔ اپنی ضرورت کا بہت سا اسباب ہم نے رات ہونے سے پہلے فراہم کیا جس میں چائے وغیرہ بنانے کا سامان شامل تھا۔ اتفاقِ رائے سے ہم نے طے کیا کہ ناشتہ خود بنائیں گے اور دونوں وقت کا کھانا باہر کھائیں گے۔ ضامن رضوی کا ڈرائیور ایک کانسٹیبل تھا جو رات تک غیر حاضر رہتا تھا اور اس کا کھانا پینا شاید رضوی صاحب کے گھر پر تھا چنانچہ باورچی خانہ خالی تھا۔ ہم نے یہ مناسب نہیں سمجھا کہ ان پر بوجھ بنیں۔ وہ اخلاقاً ہمیں جگہ دینے پر رضامند ہو گئے تھے لیکن ان سے زیادہ توقعات کرنا غلط ہوتا کیونکہ وہ بہرحال ایک ذمے دار پولیس افسر تھے اور اپنی حدود سے تجاوز کر کے ہمارے لیے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ کھانے پکانے کا جھنجھٹ ہمارے بس کی بات نہ تھی لیکن ناشتہ آسان تھا اور وقت بے وقت چائے یا کافی کی خاطر دور کہیں جانے سے باورچی خانے تک جا کے اپنی ضرورت پوری کرنا بھی آسان کام تھا۔ کوٹھی ایک پُرسکون چھوٹی سی سڑک پر واقع تھی جسے کچھ لوگ بالنوں والی سڑک بھی کہتے تھے اور جو دھرمپورہ ریلوے کراسنگ کے بعد دائیں طرف نکلتی تھی تو سیدھی گورنر ہاؤس تک جاتی تھی۔ اس سڑک پر سب کوٹھیاں وسیع و عریض باغ یا لان اور چار دیواری کے حصار میں تھیں اور سڑک کے بائیں کنارے پر واقع تھیں۔ دائیں جانب میو گارڈن کی سرسبز فصیل تھی جس میں خاردار تاروں کی باڑھ الجھی ہوئی تھی اور یہ ریلوے کے اعلیٰ افسروں کی سرکاری رہائش گاہوں کا علاقہ تھا۔ اندر صاف ستھری سڑکوں پر مرکری لائٹس جلتی تھیں اور داخل ہونے والے ہر راستے پر "پرائیویٹ روڈ" یا پھر "یہ شارع عام نہیں ہے" کے بورڈ نظر آتے تھے۔ قریب ترین چائے خانہ بھی دو فرلانگ دور اسکواش کورٹس کے پاس تھا اور گڑھی شاہو کا بازار تقریباً ایک میل دور تھا تاہم یہ جگہ رابعہ کے گھر ریلوے اسٹیشن اور مال روڈ سے دور نہیں تھی اور تھوڑا سا چل کے ہمیں ضلع کچہری جانے کے لیے سواری مل سکتی تھی۔

رات نو بجے کھانے سے فارغ ہو کے میں نے محسن سے کہا کہ کیوں نہ رابعہ کو فون کر لیں۔ اس وقت جانا تو کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ دو جگہ سے مایوس ہونے کے بعد ایک کیمسٹ نے ہمیں ایک روپیہ لے کر فون استعمال کرنے کی اجازت دی۔ گھنٹی دو بار بجی۔ پھر کسی نے ریسیور اٹھایا اور میں نے اپنا نام بتایا تو رابعہ کو دے دیا۔ "سکندر!" وہ بولی۔ "عجیب آدمی ہو تم بھی، تمہیں اس طرح غائب نہیں ہونا چاہیے۔ اگر مجھے رابطہ قائم کرنا ہو تو کیسے کروں؟"

"آئی ایم سوری۔" میں نے کہا۔ "دن میں جب میں آیا تھا تو بہت جلدی میں تھا۔"

"کیوں؟ آج کہاں بیٹھی تھی؟" وہ بولی۔ "میرا مطلب ہے کون سا معرکہ سر کرنا تھا؟"

"مجھے رہائش کا انتظام کرنا تھا۔" میں نے کہا۔ "اب میں ضامن رضوی ایس ایس پی کی کوٹھی میں ہوں۔ تم فون پر رابطہ قائم کر سکتی ہو۔"

"یہ بتاؤ اس لفافے کا کیا چکر ہے جو تم امی کے پاس چھوڑ گئے تھے؟" وہ بولی۔ "اس میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔"

"ہاں بظاہر کچھ بھی نہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن اسے پھاڑ کے پھینکا بھی نہیں جا سکتا تھا۔"

"کیوں؟ تمہارے خیال میں اس پر نظر نہ آنے والی سیاہی سے کچھ لکھا ہوا ہے؟" رابعہ نے کہا۔

اس بات نے کچھ دیر کے لیے مجھے مبہوت کر دیا۔ "یہ خیال تو مجھے آیا ہی نہیں تھا۔ یہ تو واقعی ہو سکتا ہے۔ یہ ناممکن نہیں ہے۔"

وہ ہنسی۔ "مگر اس میں کوئی نظر نہ آنے والی تحریر بھی نہیں ہے۔ میں اسے گرم کر کے دیکھ چکی ہوں۔ عموماً لوگ پیاز کا عرق استعمال کرتے ہیں جو گرم کرنے سے براؤن ہو جاتا ہے۔"

"تم نے تو میرے ذہن کو اس مسئلے کا حل بتا دیا ہے جو اک معمہ تھا سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔" میں نے کہا۔ "اب میں دوسرے امکانات پر بھی غور کر رہا ہوں۔"

"ٹیلی فون لائن پر کب تک غور کرو گے؟" وہ ہنسی۔ "یہاں کیوں نہیں آجاتے۔ ہم دونوں مل کے غور کریں گے۔"

جس انداز سے اس نے "ہم دونوں" کے الفاظ استعمال کیے تھے وہ ایک واضح اشارہ تھا کہ دعوت صرف مجھے دی گئی ہے اور عقلمند را اشارہ کافی است، چنانچہ مجھے محسن کو ساتھ نہیں لانا چاہیے۔ لیکن میں اس قسم کی صورتِ حال سے بچنا چاہتا تھا چنانچہ میں نے کہا۔ "اس وقت؟ تمہیں کوئی کام نہیں ہے یا نیند نہیں آ رہی ہے؟"

"دونوں باتیں ہیں۔" وہ بولی۔ "امی کی طبیعت بھی کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ شاید مجھے رات بھر جاگنا پڑے۔"

"اچھا۔" میں نے مجبور ہو کے کہا۔ "میں آتا ہوں۔" میں نے ریسیور رکھ دیا۔ دکان سے باہر آکے میں نے محسن سے کہا کہ مجھے رابعہ نے بلایا ہے۔

محسن ذہین آدمی ہے اس نے نوٹ کر لیا کہ میں نے "ہمیں" کے بجائے "مجھے" کا لفظ استعمال کیا ہے لیکن اس نے صورت سے کسی تاثر کا اظہار نہیں ہونے دیا۔

"تو چلا جا بھیا۔" اس نے جماہی لے کر کہا۔ "ہم تو تھک گئے ہیں لمبی تان کے سوئیں گے۔ ویسے بھی وہ لڑکی تیرے چکر میں ہے۔"

میں چلتے چلتے رک گیا۔ "کیا بکواس کر رہا ہے؟" میں نے کہا۔

محسن ہنسا۔ "کیا چہرے کی داڑھی اور تنکے والا کیس ہے؟ میں تو صرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ اسے صرف تجھ سے کام ہے۔"

"نہیں، تو جھوٹ بول رہا ہے۔ تیرا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا۔" میں نے کہا۔ "یہ شک مجھے بھی ہے کہ رابعہ میرے چکر میں ہے۔"

"یہ بڑا غلط چکر ہے۔" محسن نے کہا۔ "تو پہلے ہی بہت سے چکروں میں ہے۔ مجھے تو اعتماد ہے تجھ پر لیکن..."

"لیکن کیا محسن؟" میں نے کہا۔ "لیکن کے بعد کیوں رک گیا تو؟ اس کے بعد بھی جو کہنا تھا کہہ دے۔ تجھے ڈر ہے کہ میرے حوصلہ شکن رویے کا اثر مقدمے پر پڑے گا؟ اول تو یہ بات بعید از قیاس ہے کہ رابعہ مجھ سے مایوس ہو تو مجھے بچانے کی کوشش ترک کر دے اور خدانخواستہ اس کی محبت نفرت میں بدل جائے تو وہ میری دشمنِ جاں ہو جائے۔ بلاشبہ عورت ذات سے اس قسم کے انتقامی ردِ عمل کی توقع کی جا سکتی ہے، لیکن برادر اول تو رابعہ اس قسم کی لڑکی نہیں۔ اس کے علاوہ، مرد ہو یا عورت، کوئی وکیل اپنے ذاتی جذبات کو اپنی اخلاقی و قانونی ذمے داریوں پر حاوی نہیں آنے دیتا۔"

"یہ سب ٹھیک ہے۔ پھر بھی تیرے لیے ایک جذباتی الجھن تو پیدا ہو سکتی ہے؟"

"الجھن ہمیشہ قوتِ فیصلہ یا خود اعتمادی میں کمی کا نتیجہ ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔ "میں ابھی تک کسی الجھن کا شکار نہیں۔ جب تک خود فوزیہ کی طرف سے یا اس کے والدین کی طرف سے الجھن پیدا کرنے والی بات نہیں ہوگی میں یہ سوچوں گا بھی نہیں کہ کل کیا ہوگا۔ سیدھی صاف بات ہے محسن کہ میں اس معاشرے کے ہر فرد کی مجبوریوں کو سمجھتا ہوں۔ میں کسی سے یہ توقع نہیں رکھتا کہ وہ —— مروجہ اخلاقی نظام کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دے۔ مجھے سزا ہو گئی تو یہ قصور میرا ہوگا۔ ایک سزا یافتہ شخص سے کوئی بھی عہدِ وفا استوار رکھنے کا پابند نہیں۔ کچھ رشتوں کی آبرو ہی سب کچھ ہوتی ہے اور اس کو قربان نہیں کیا جا سکتا۔ کسی کی خاطر بھی نہیں۔"

"تیری حقیقت پسندی پہ مجھے رشک آتا ہے سکندر! تو ہر صدمہ جھیلنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ خوابوں کی جنت میں رہنے والے عملی زندگی کے مسائل سے دوچار ہوتے ہیں تو جی نہیں پاتے۔" محسن نے کہا۔ "ایک بات کہتا ہوں جو تیرے مفاد میں ہے۔ اس سے کوئی غلط مطلب نہ نکالنا۔ ابھی رابعہ کے جذبات کی دنیا پر اپنی حقیقت پسندی کا ایٹم بم مت پھینکنا۔ یہ دنیا، کوئی بھی دنیا جب تک آباد رہے اچھا ہے۔"

"تیرا مطلب ہے کہ اسے جھوٹی امیدوں کے طلسم میں گرفتار

رکھوں۔ میں نے یہ دھوکا دینا نہیں سیکھا محسن!"

"کوئی جھوٹی امیدوں کے آسرے پر زندہ ہو تو اسے قبل از وقت ناامیدی کا زہر دے کر مارنے سے کیا حاصل۔ سرطان کے مریض کو یہ کون بتاتا ہے کہ اسے اب کتنے دن اور جینا ہے؟" محسن نے کہا "اور کیا جھوٹی امیدوں کا سچ ہونا اتنا ہی ناممکن ہے، جتنا سورج کا مغرب سے طلوع ہونا؟"

وہ اچانک پلٹا اور چلا گیا۔ میں اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا اور اس کی بات کا صحیح مطلب سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ غالباً اس نے مجھے بتا دیا تھا کہ فوزیہ نہیں ہو گی تو رابعہ میرا سہارا بن سکے گی۔ فوزیہ کا نہ ہونا بعید از امکان نہیں۔ محسن کے الفاظ میں اتنا ناممکن نہیں جتنا سورج کا مغرب سے طلوع ہونا۔ مجھے محسن پر ترس آیا جو دوستی کے رشتے اور خون کے رشتے کی کشاکش میں خود کو سلامت رکھنے کی کوشش کر رہا تھا، بیوقوف۔ دنیا کی سوچ کا دھارا حالات کے ساتھ بدلتا ہے۔ اس کا ذمے دار وہ خود کو کیوں سمجھتا ہے۔

رابعہ کے گھر میں اوپر کے ایک کمرے کی لائٹ جل رہی تھی۔ نیچے اس کے آفس اور اسٹڈی روم میں روشنی تھی مگر وہ خود لان پر کرسی ڈالے اور دوسری کرسی پر پاؤں پھیلائے بیٹھی تھی۔ برائے نام اجالے میں جو اِدھر اُدھر سے منعکس ہو رہا تھا میں نے اسے دیکھا ہی نہیں اور سیدھا اندر جانے کی کوشش کی۔ اس نے مجھے آواز دی تو میں چونک کر پلٹا اور لان پر جا پہنچا۔

"یہ اندھیرے میں کیا ہو رہا ہے؟" میں نے کہا "گیان دھیان یا فکرِ سخن؟"

"اس وقت تو دل چاہ رہا تھا کہ بالکل خالی الذہن ہو کے بیٹھوں۔" وہ ہنسی۔ "آدمی کبھی کبھی اپنے خیالات سے بھی نجات چاہتا ہے۔"

"لوگ تو زندگی کے مسائل سے گھبرا کے خیالوں کی دنیا میں پناہ لیتے ہیں۔" میں نے کہا اور تیسری کرسی پر بیٹھ گیا۔

"ان کے خیالوں کی دنیا مختلف ہوتی ہے۔" وہ بولی۔ "میں سارا دن جن مسائل پر سوچتی ہوں وہ ذہن کو ماؤف کر دیتے ہیں۔ جب ان مسائل سے فرصت ملتی ہے تو میرے پاس کوئی بھی دوسری زیادہ خوبصورت خیالات کی دنیا نہیں ہوتی جو مجھے پناہ دے سکے۔ تنہائی میں ذہن پر یلغار کرنے والے خیالات کون سا سکون دیتے ہیں یا خوشی کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ اس سے تو کچھ نہ سوچنا اور خالی الذہن رہنا کہیں بہتر رہتا ہے۔ ویسے بھی مجھے اندھیرے سے پیار ہے۔"

"اس عمر میں تمہارے منہ سے یہ باتیں اچھی نہیں لگ[تیں]

رابعہ!" میں نے کہا۔ "اندھیرا خود تم نے اپنے گرد مسلط کر ر[کھا ہے]۔ اجالا اگر تمہاری دسترس میں ہے تو اسے کیوں دور سمجھتی [ہو۔] نکل کے دیکھو دنیا کتنی خوبصورت ہے اور خوبصورتی [زندگی] کی نعمتوں کا نام ہے جو تمہیں میسر ہیں۔ عزت، دولت [...] سارا زمانہ ان چیزوں کے حصول کے لیے دیوانہ وار سر[گرداں] ہے۔ تمہارے پاس کار ہے، کوٹھی ہے، ذہانت ہے، حسن ہے [...] تمہاری خوش قسمتی پر حسد کرتے ہوں گے۔ تم نے یہ راہبانہ [...] کیوں اختیار کر لی ہے؟"

"اپنی زندگی کے تجربات کے آئینے میں میری ز[ندگی] کا عکس مت دیکھو سکندر!" وہ بولی۔ "تم مرد ہو۔ تمہارے لیے اکیلا رہنا آسان ہے۔ میرے اردگرد کی دنیا میں اکیلی [عورت] کی حیثیت بھیڑیوں میں گھر جانے والی بھیڑ جیسی ہے۔ میں [کیا] کروں۔ کار لے کر سڑکوں پر آوارہ گردی کروں؟ اکیلی کسی [...] میں جا بیٹھوں؟ کسی کلب میں لاوارث پھروں۔ میں نے ایک بار یہ غلطی کی تھی۔ میں سمجھی تھی کہ پڑھے لکھے لوگ [...] فراخدل ہوتے ہیں اور عورت کی عزت کر سکتے ہیں۔ میرے کچھ ہم پیشہ افراد واقعی تعلیم یافتہ، روشن خیال اور شریف [...] ان کے ساتھ میں نے کبھی شام کی چائے پی لی یا رات کا کھا[نا] کسی ہوٹل میں کھا لیا تو کیا بہت غیر اخلاقی اور غیر شریفانہ حرکت کی؟ کیا انہوں نے اخلاقاً اپنا فرض سمجھتے ہوئے [...] کر دیا تو اس کا یہ مطلب نکالا جا سکتا ہے کہ مجھے توفیق [...] لیکن مشہور یہی ہوا، گویا میں نے خود کو ایک وقت کے کھا[نے] کے عوض بیچ دیا۔ کمینے لوگوں نے جو باتیں کیں مت پوچھو [...] مجھ پر انکشافات ہونے لگے کہ میرے فلاں جج سے اور فلاں جج کے وکیل بھائی سے مراسم ہیں اس لیے میں فلاں مقدمہ جیت گئی۔ اس کے علاوہ ہمارے جاہل اور دولت مند [...] ہیں۔ میرے فرسٹ اور سیکنڈ کزن۔ انہوں نے کبھی [...] نہیں لگایا تھا اور میں ان کے کردار سے بخوبی واقف [...] بعد میں وہ ڈھیٹ بن کے آ پہنچے اور میں نے ان کو دھ[تکارا] نہیں۔ ان کی ہر ممکن مدد کی اور ان کے وقت بے وقت [آ] جانے کا برا نہیں مانا۔ اس حوصلہ افزائی کا غلط نتیجہ یہ نکلا [کہ] ان کی مائیں پیغام لے کر آ گئیں۔ ان کے گھروں کا ماحول [...] کہ وہاں میں شوہر کے پاؤں کی جوتی ہوتی۔ ساس کی [...] کی خانہ جنگی کا شکار ہوتی اور دو چار سال بعد دو چار بچے [ہو] جاتے تو شوہر بہادر حکم صادر فرماتے کہ بس بہت ہو [چکی] وکالت۔ اب گھر کی ذمے داریاں سنبھالو۔ وہ دعدہ [...]

[...] کے لیے نہیں تھا کہ پریکٹس پر پابندی نہیں ہو گی۔ میں کیا کرتی؟ اپنا طلاق کا حق مہر کا اور بچوں کی ملکیت کا مقدمہ لڑتی ہوئی وکالت کے [...] یہ سب کو چھوڑتی یا سب کے لیے وکالت کو؟ ان سب کو انکار کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ پہلے سے زیادہ ہماری عزت کے دشمن ہو گئے اور جس نے جو چاہا مشہور کیا۔ میں نے کسی کی تردید نہیں کی۔ لیکن اس کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ اکیلی رہوں گی۔"

"میں اس فیصلے کے خلاف نظرِ ثانی کی اپیل دائر کرتا ہوں۔" میں نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ یہ لڑکی واقعی مظلوم اور میری مدد کی مستحق ہے۔ یہ قنوطیت اس کو دنیا نے عطا کی تھی اور اس کو رہبانیت اختیار کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ پند و نصائح اور نفسیاتی عوامل کا زبانی تجزیہ کرنے کے بجائے اسے عملی طور پر زندگی کے حسن کا احساس دلانے کی ضرورت تھی۔ میرے اس فیصلے کا محرک کوئی جذباتی ردِعمل نہیں تھا۔ میرے ذہن میں ایک سوال عقل کی پوری توانائی اور منطقی استدلال کی ساری قوت کے ساتھ ابھر آیا تھا۔ اگر یہ عورت کسی غرض کے بغیر تمہاری زندگی بچانے کی بھرپور جدوجہد کر رہی ہے تو کیا تم اس کی زندگی بچانے کے لیے کچھ نہیں کرو گے؟ میں اتنا خودغرض اور احسان فراموش نہیں تھا کہ اس سوال سے روگردانی کر سکتا اور اس ذمے داری سے بچ سکتا۔

رابعہ نے تعجب سے میری طرف دیکھا۔ "تم؟ تم یہ اپیل کیوں کر رہے ہو؟ اور فیصلہ تو خود میری اپنی عدالت کا ہے۔"

"آئی سی۔" میں نے کہا۔ "یہ قانونی نکتہ ہے۔ گویا سماعت تم خود نہیں کرو گی۔ آل رائٹ۔ میں تمہاری طرف سے اپیل دائر کرتا ہوں اور خود اس مقدمے کی سماعت کرتا ہوں۔ تو مسماۃ رابعہ قاری! تم ہو مدعی اور مدعا علیہ۔ یہ بتاؤ تم دنیا سے کیوں ڈرتی ہو۔ اس دنیا کے چند بے ضمیر، کمینے اور گھٹیا کردار کے مالک افراد نے تمہیں بدنام کیا۔ کیا اس بدنامی سے تم نے کچھ کھویا؟ اپنی نظر میں اپنا مقام؟ اپنا عزم اور حوصلہ؟ اپنی ذہانت اور صلاحیت؟ اپنے ضمیر پر اعتماد؟"

"نو مائی لارڈ!" رابعہ ہنسی۔ "مجھے اس قسم کا کوئی نقصان نہیں ہوا کیونکہ یہ بدنامی بے بنیاد تھی۔"

"رائٹ۔ مسماۃ رابعہ قاری! کیا کتوں کے بھونکنے سے قافلہ رک جاتا ہے؟" میں نے کہا۔ "کیا یہ بہتر نہ ہوتا اگر تم کتوں کے بھونکنے کو نظرانداز کر دیتیں؟"

"مجھے کتوں سے بہت ڈر لگتا تھا مائی لارڈ!" وہ مسکرائی۔ "خصوصاً بھونکنے والے کتوں سے۔"

"گویا تمہیں علم نہیں تھا کہ جو بھونکتے ہیں وہ کاٹتے نہیں؟" میں نے کہا۔ "کیا تمہارا اس بات پر اعتقاد نہیں کہ عزت، ذلت منجانب اللہ ہے اور چاند پر تھوکا جائے تو تھوک اپنے منہ پر آتا ہے؟ دنیا میں کون ہے جس کی کامیابی پر حسد کرنے والوں کی تعداد خوش ہونے والوں سے زیادہ نہیں؟ لیکن بدخواہوں کی بددعا میں اثر ہوتا تو کسی ماں کا بیٹا زندہ نہ رہتا۔"

"تجربہ بہت بڑا استاد ہے یور آنر! سانپ کا کاٹا رسی سے ڈرتا ہے تو ٹھیک کرتا ہے۔"

"وہ غلط کرتا ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ نفسیاتی مریض ہو جاتا ہے۔ اگر وہ کہے کہ مجھے رسی نے کاٹ لیا ہے اور میں زہر پھیلنے سے مر رہا ہوں تو دنیا اس پر ہنستی ہے لیکن وہ واقعی مر جاتا ہے۔ کیا تم میں اتنی عقل نہیں ہے کہ رسی سے ڈرنا چھوڑ دو؟ بھونکنے والے کتوں سے ڈر کے پیچھے مت ہٹو۔ آگے بڑھ کے ان کو دھتکار دو۔ وہ سب بھاگ جائیں گے۔ بدنام کرنے والوں سے کہو تھینک یو ویری مچ۔ مجھے نیک نامی نہیں چاہیے۔ وہ سخت مایوس ہوں گے۔ اپنی نظر آسمان کے ستاروں پر رکھو۔ زمین کے کیڑوں کی طرف مت دیکھو۔ دنیا پر ثابت کر دو کہ اکیلی عورت بھی معاشرے میں اپنا مقام خود پیدا کر سکتی ہے، اور اس کی ترقی کی راہ میں کوئی حائل نہیں ہو سکتا۔ تم اکیلی بھی کہاں ہو۔"

"آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" رابعہ نے کہا۔ "ان باتوں کا مقصد کیا ہے، محض باتیں؟"

"نہیں، دراصل آج مجھ پر بھی قنوطیت سوار تھی۔" میں نے کہا۔ "اس کا احساس مجھے محسن نے دلایا۔ یہاں آ کے دیکھا تو تم قنوطیت میں مبتلا ہو۔ دو منفی قوتیں مساوی ہیں، ایک مثبت قوت کے۔ چلو کہیں باہر چلتے ہیں۔ ایک مدت سے میں نے بھی دنیا کے حسن کو نظر بھر کے نہیں دیکھا۔" میں نے بہت ہمت کر کے یہ بات کہہ دی تھی۔ "ان اندھیروں کو یہیں چھوڑ دو۔"

رابعہ اسی طرح خاموش بیٹھی رہی اور دوسری طرف دیکھتی رہی۔ "اندھیرا تو کل بھی ہو گا۔"

"صاف کہتے ہوئے ڈرتی ہو کہ تمہیں اتنی رات گئے ایک غیر مرد کے ساتھ جانا منظور نہیں۔" میں نے کہا۔ "اعتماد تمہیں کس پر نہیں ہے؟ مجھ پر یا اپنے آپ پر، ایڈووکیٹ رابعہ قاری؟"

"مجھے تم پر اعتماد ہے، لیکن۔۔۔"

"لیکن باہر کوئی دیکھے گا کہ رابعہ قاری ایک ایسے شخص کے ساتھ پھر رہی ہے جو قتل کے الزام میں ملوث ہے۔۔۔"

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "بہت ڈر چکی ہیں دنیا سے۔ اور تم نے ٹھیک کہا ہے کہ میں اسی طرح ڈرتی رہی تو دستی کے کاٹنے سے بھی مر جاؤں گی۔ چلو، لیکن ایک نظر ماں کو دیکھ لوں اور ذرا یہ کپڑے بھی بدل لوں۔"

"ماں کو کیا ہوا ہے؟" میں نے کہا۔ "اسی ڈیپریشن کا شکار ہیں۔"

"ماں کی طبیعت دو بار بگڑ چکی ہے۔ دل گھبراتا ہے اور کمزوری محسوس ہوتی ہے۔" وہ بولی۔ "میں نے ویلیم دے کر سلا دیا ہے۔ تم یہیں بیٹھو۔"

میں نے انتظار میں دس منٹ صرف کیے اور ایک سگریٹ ختم کی۔ میرے جذبات کی کیفیت بہت عجیب تھی۔ ایک بار تو مجھے یوں لگا جیسے فوزیہ میرے سامنے کھڑی مجھے ملامت آمیز نظروں سے دیکھ رہی ہے اور اس کی آنکھوں میں آنسو ہیں جو چھلکنے ہی والے ہیں۔ 'بے وقوف لڑکی! یہ جو کچھ کر رہا ہوں میرا فرض ہے۔ اس کا تعلق دماغ سے ہے دل سے نہیں۔ وہ آدمی قابلِ نفرت ہوتا ہے جو خود غرضی کے باعث چاہتا ہے کہ سب اس کے لیے سب کچھ کریں مگر وہ کسی کے لیے کچھ نہ کرے۔' میں نے فوزیہ کو سمجھایا۔ 'تمہارے حقوق الگ ہیں مگر اس احسان کے بدلے جو رابعہ مجھ پر کر رہی ہے اس کا بھی کچھ حق بنتا ہے۔' فوزیہ نے بالکل زنانہ بات کی۔ 'تم کیا جانو رابعہ جیسی عورتیں غرض کے بغیر کوئی احسان نہیں کرتیں۔' میں نے کہا۔ 'لاحول ولا قوۃ۔ مجھے ہو جائے گی جیل تو رابعہ کو مجھ سے کیا ملے گا؟ اسے تو فیس ملنے کی امید بھی نہیں۔' وہ کہنے لگی۔ 'خواہ مخواہ یہ فرض اور محبت کا چکر مت چلاؤ۔ یہ دماغ اور دل کے رشتے ایک ہی ہو جاتے ہیں۔' میں نے جھنجھلا کر کہا۔ 'اچھا دیکھوں گا تم میرا انتظار کرتی ہو یا نہیں سات سال تک۔'

"کس سوچ میں ہیں جناب؟" رابعہ نے کہا اور میں چونکا۔ میں نے دیکھا کہ اس نے اتنے کم وقت میں وہی ساڑی باندھ لی ہے جو باندھ کے وہ مجھ سے جیل میں ملنے آئی تھی، اور میں پھر اسے دیکھتا رہ گیا۔ اس نے ہلکا سا میک اپ بھی کر لیا تھا اور جب میں کار میں اس کے ساتھ بیٹھا تو مجھے ایک سحر آفریں خوشبو کا احساس ہوا۔ گاڑی سڑک پر آ گئی تو رابعہ نے کہا۔ "کہاں چلیں؟"

"کہاں چلیں؟" میں نے کہا۔ "یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ باغِ جناح چلو۔ وہاں اچھا موسم ہوگا۔ یا ایسے ہی سڑک پر چلتی رہو۔"

وہ ہنسی۔ "مجھے اپنی ہنسی بھی اجنبی لگ رہی ہے۔ نہیں کیوں۔ کبھی تمہیں ایسا احساس ہوا ہے زندگی میں؟"

"ہاں۔" میں نے کہا۔ پھر میں نے اسے بتایا کہ کس طرح ایک متعصب انگریز لارڈ مجھ سے کاؤنٹی جیل میں ملنے آیا تھا اور کیسے اس نے مجھ سے ایک سودا کیا تھا۔ "اس وقت مجھے اپنی ہنسی اجنبی لگی تھی۔ معلوم نہیں میں اپنے آپ پر ہنس رہا تھا یا اس لارڈ کے غرور کی شکست پر۔"

"تمہیں اس کی بیٹی سے واقعی محبت تھی یا سوال الٹ دوں؟"

"اس کی بیٹی مجھے واقعی چاہتی تھی۔" میں نے اعتراف کیا۔ "لیکن... لیکن ہندوستان میں رہنا تھا۔ تمام زندگی میں ان متعصب اور تنگ نظر لوگوں کے درمیان کیسے گزار سکتا تھا جو میرے رنگ سے نفرت کرتے تھے اور وہ لڑکی اس ماحول میں نہیں رہ سکتی تھی۔" میں بولتا رہا، وہ سنتی رہی۔ پھر وہ بولتی رہی اور میں سنتا رہا۔ ہم نے گاڑی باغِ جناح میں پارک کی اور اس کی ٹھنڈی مہکتی سڑکوں پر چلتے ہوئے رات کا حسن جواں ہوتے دیکھتے رہے۔ وہاں ہم جیسے اور بھی تھے لیکن ہم سب کے درمیان اور سب سے الگ باتیں کرتے رہے۔ اس نے مجھے اپنی گزشتہ زندگی کی یادوں کے البم سے ان گنت تصویریں نکال کے دکھائیں۔ میں نے محسوس کیا کہ بہت عرصے بعد آج اسے باتیں کرنے کا موقع ملا ہے۔ بولتی تو وہ ہر روز تھی اور ہر عدالت میں بے تکان بولتی تھی مگر باتیں کسی سے نہیں کر سکتی تھی۔ وہ باتیں میں محسن سے کر لیتا تھا اس کے دل میں جمع ہو رہی تھیں۔ برسوں کا غبار تھا جو آہستہ آہستہ نکل رہا تھا اور میں اس کے اعتماد کا اہل ثابت ہونے کی کوشش میں مصروف تھا۔ میں نے اسے فوزیہ کے بارے میں بھی بتا دیا۔ یہ بھی بتا دیا کہ میں اس سے منسوب ہوں اور اس اندیشے کا اظہار بھی کر دیا کہ یہ نسبت اب خطرے میں پڑ گئی ہے اور میں فوزیہ سے یہ توقع بالکل نہیں رکھتا کہ وہ فلمی ہیروئن کی طرح ظالم سماج کے یا والدین کے خلاف بغاوت کا علم بلند کر دے گی۔ رات کے بارہ بجے ہم ایک اعلیٰ قسم کے ہوٹل کے ریستوران میں گئے اور اوپن ایئر گارڈن لاؤنج میں بیٹھ کے کافی پیتے رہے۔ میں نے محسوس کیا کہ غلط فہمی پیدا کیے بغیر میں اپنے مقصد کے حصول میں کامیاب رہا ہوں۔

رابعہ خوش تھی اور اس خوشی کا آئینہ دار رابعہ کا چہرہ تھا۔ اس کی مسکراہٹ تھی اور اس کی آنکھوں میں اتری ہوئی والی مسرت کی چمک تھی۔ مسرت جس کا سرچشمہ دل کی گہرائی سے پھوٹتا ہے عورت کی ہر ادا میں رنگ بھر دیتا ہے۔ اس وقت وہ صرف ایک عورت تھی، حسین اور جوان۔ پُرکشش اور نازک ادا۔ صرف خوشبو اور رنگ اور نغمگی، اپنی قوتِ تسخیر پر نازاں، پُراعتماد۔ چاہنے اور چاہے جانے کی خواہش سے مغلوب اور حسن کو خراجِ تحسین پیش کرنے والی ہر نگاہ سے آشنا۔ اس وقت کوئی رابعہ سے پوچھتا کہ تم کون سی عورت رہنا چاہو گی؟ وہ جو تم اس وقت ہو، یا وہ جو سیاہ کوٹ پہن کے قانون کی ضخیم کتابوں کے حوالے دیتی ہے اور اپنے مؤکل کی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے دلائل اور اپنے زورِ خطابت سے، اپنی صلاحیت اور اپنی استعداد سے اور اپنی ذہانت سے سب پر چھا جاتی ہے۔ تو وہ یقیناً اس لمحے کی سب کو مسحور کر لینے والی فاتح عورت بننا پسند کرتی۔ وہ عدالت میں اپنی کامیابی پر اس کامرانی کو ترجیح دیتی جس نے اسے ایک بھولی بسری مگر بہت خوبصورت مسرت عطا کی تھی۔ جو اس کا حق تھی مگر اس نے اپنے احساسِ محرومی کو اپنا مقدر جان کے قبول کر لیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ ذہنی سطح پر وہ عام عورت سے بہت اوپر ہے۔ شاید اسی لیے وہ نک چڑھی، خرد ماغ اور مغرور مشہور تھی۔ اس کی کلاس فیلوز نے ہمیشہ اسے افلاطون بننے کا طعنہ دیا اور اپنے احساسِ کمتری کے باعث اس کا بائیکاٹ کیے رکھا۔ یہی صورتحال اس کے خاندان کی دوسری لڑکیوں کے ساتھ بھی پیدا ہوئی جو بی اے ایم اے کر کے بھی فلم اور فیشن سے آگے بات ہی نہیں کرتی تھیں۔ بعد میں یہ لڑکیاں دولت مند گھروں میں بیاہی گئیں اور ان کی زندگی کے زاویے کچھ اور بدل گئے چنانچہ ان کے اور رابعہ کے درمیان فاصلہ بھی بڑھ گیا اور وہ تنہا رہ گئی۔ مرد اسے ہمیشہ وہ ملے جن کے لیے طوائف سے لے کر ہائیکورٹ کی ایڈووکیٹ تک ہر عورت ان کی جائز و ناجائز خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ تھی۔ محکوم تھی اور ان سے کمتر درجے کی مخلوق تھی۔ مرد کا یہ فطری احساسِ برتری اس معاشرے کی اقدار پر حاوی تھا اور جو عورت اس کو قبول نہیں کرتی تھی وہ اپنی ذات کے حصار میں قید ہو کے تو رہ سکتی تھی مگر ہر خوشی کو اپنا حق سمجھ کے نہیں حاصل کر سکتی تھی۔

"کیسی عجیب بات ہے۔" اس نے واپسی پر کہا جب ہم باتیں کر کے تھک چکے تھے اور خاموشی سے اپنے اپنے خیالات کی زبان میں محوِ گفتگو تھے۔ "برسوں میں ذہنی ہم آہنگی اور رفاقت کا یہ احساس مجھے کبھی نہیں ہوا جو تم سے برسوں بعد مل کے اور تین گھنٹے تک تم سے باتیں کرنے کے بعد آج ہوا ہے۔ کیا یہ احساس کل بھی باقی رہے گا جب میرے اور تمہارے درمیان صرف وکیل اور مؤکل کا رشتہ رہ جائے گا؟"

"کیوں نہیں رہے گا۔" میں نے بے خیالی میں کہا۔ "کیا احساس کبھی فنا ہو سکتا ہے؟ میں اور تم تو وہی ہوں گے جو اس وقت ہیں۔"

"تھینک یو۔" وہ میرے ایک بازو پر ہاتھ رکھ کے بولی۔ "میں یہی چاہتی ہوں۔ تم مجھے صرف ایڈووکیٹ نہ سمجھو، مجھے ایک قابلِ اعتماد ساتھی کی ضرورت ہے۔ میرا دوست کوئی نہیں۔ مجھے کوئی اپنا نہیں سمجھتا۔ بس ایسے ہی کبھی کبھی مجھ سے باتیں کر لیا کرو۔ میری سن لیا کرو اور جب مجھ پر مایوسی اور قنوطیت طاری ہو تو اسی طرح سہارا فراہم کر دیا کرو جیسے آج کیا۔ میں اس سے زیادہ تم سے کچھ نہیں طلب کروں گی۔ اور اس سرحد کو عبور کرنے کی کوشش کبھی نہیں کروں گی جہاں سے فوزیہ کی ملکیت کی حد کا آغاز ہوتا ہے۔ میں تم سے فوزیہ کو نہیں چھینوں گی۔ وعدہ!"

"مگر کیا یہ ممکن ہوگا؟" میں نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ 'میں تو اس وقت بھی رابعہ کی گرفت میں ہوں مگر فوزیہ میری گرفت سے دور ہونے لگی ہے۔ حالات میرے گرد مکڑی کے جالے کی طرح مجبوریوں کا جال بُن رہے ہیں۔ محسن نے کہا تھا ابھی رابعہ کے جذبات کی دنیا پر اپنی حقیقت پسندی کا ایٹم بم نہ پھینکنا۔ رابعہ وعدہ کر رہی ہے کہ وہ مجھ سے فوزیہ کو نہیں چھینے گی۔ وہ کسے دھوکا دے رہی ہے اور کیوں؟ محسن کسے دھوکا دے رہا ہے۔ میں کسے دھوکا دے رہا ہوں؟' میں نے محسوس کیا کہ رابعہ کے ساتھ آ کے میں نے ایک جذباتی حماقت کی ہے۔ مجھے صرف اپنی زندگی سے سروکار رکھنا چاہیے تھا۔ انگریزی محاورے کے مطابق دو کشتیوں میں قدم رکھنے والا ڈوب جاتا ہے۔

گاڑی پھر رابعہ کی کوٹھی میں داخل ہوئی تو میں چونکا۔

"یہ تم... میرا مطلب ہے اگر مجھے راستے میں ڈراپ کر دیتیں تو اچھا تھا۔" میں نے کلائی کی گھڑی دیکھی جس میں رات کے دو بج رہے تھے۔

"اگر تمہیں ایک رات بھی گیسٹ بیڈ میں گزارنے پر شدید اعتراض ہے تو میں تم کو چھوڑ آتی ہوں۔" وہ کچھ بُرا مانتے ہوئے بولی۔ اور میں نے ایک گہری سانس لے کر خاموش ہو جانے کے سوا چارہ نہ دیکھا، لیکن گاڑی کے رکتے ہی خادمہ بدحواسی کے عالم میں باہر نکلی۔

"چھوٹی بی بی! کہاں چلی گئی تھیں آپ؟" اس نے ملامت آمیز خفگی سے کہا۔ "بیگم صاحبہ کی طبیعت بہت خراب ہے۔" میں نے رابعہ کے دمکتے ہوئے شگفتہ چہرے کو یوں مرجھاتے اور بے رنگ ہوتے دیکھا جیسے پھول کو شاخِ گل سے جدا کر کے انگاروں پر پھینک دیا جائے۔

"کیا ہوا ہے امی کو؟" اس نے خادمہ کو جھنجھوڑا جو دوپٹے کے پلو سے آنکھوں کے آنسو صاف کر رہی تھی۔

"پتہ نہیں جی۔ ڈاکٹر صاحب بیٹھے ہیں۔ آپ دیکھ لیں اوپر جا کے۔" وہ بولی۔

رابعہ مجھے بھول کے اندر لپکی اور میں اس کے ساتھ رہا۔ زینے سے اوپر جاتے ہوئے ایک بار اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔ اس ایک نظر میں سوال بھی تھا کہ کیا میں نے مسرت کے تین گھنٹے مانگ کے کوئی گناہ کیا تھا جس کی سزا قدرت اب دے رہی ہے؟ اس نظر میں التجا بھی تھی کہ مجھے سہارا دو۔ ندامت بھی تھی اور دکھ بھی تھا۔ پریشانی بھی تھی اور پشیمانی بھی۔ میں نے فقط سر ہلایا اور اس کے ساتھ ساتھ اوپر چلتا گیا۔ کمرے کا دروازہ کھول کے وہی ڈاکٹر طاہر آیا جس نے میرے زخم کی ڈریسنگ کی تھی۔ اس نے ایک نظر ہم دونوں کو غور سے دیکھا۔

"فون کرو اور ایمبولنس طلب کرو۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔ "تمہاری امی پر دل کا دورہ پڑا ہے۔"

"دل کا دورہ؟" رابعہ نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "شدید یا معمولی؟"

"میں اسے معمولی بھی نہیں کہہ سکتا۔" وہ اسی خشک لہجے میں بولا۔ "اہمیت اس بات کی ہے کہ ان کو جلد از جلد ہوسپٹل پہنچا دیا جائے۔ پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے۔ بے وقوف لڑکیوں کی طرح رونے دھونے کی ضرورت نہیں۔"

"فون کدھر ہے؟" میں نے کہا اور رابعہ نے ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے اسے اپنی ماں کی خواب گاہ میں داخل ہوتے دیکھا۔ ایک نظر ڈاکٹر کی طرف دیکھا اور رابعہ کے بیڈ روم میں داخل ہو گیا۔ ٹیلیفون اس کے بیڈ سائڈ کی ٹیبل پر رکھا تھا۔ دوسری طرف ایک ٹیبل لیمپ روشن تھا۔ میں نے ایک ٹیوب لائٹ جلا کے اور رابعہ کے بستر پر بیٹھ کے وہ ڈائرکٹری اٹھائی جو ٹیلی فون کے نیچے والے خانے میں رکھی تھی۔ کمرے میں عجیب سی فضا قائم تھی۔ اس کے ریشمی پردوں کے رنگ۔ قالین اور اندازِ آرائش میں نسوانیت کا سحر انگیز تاثر تھا اور حواس پر چھا جانے والی نرم و لطیف خوشبو بسی ہوئی تھی۔ وہی جو رابعہ کے ساتھ اس کی گاڑی میں بیٹھ کر محسوس ہوئی تھی۔ میں نے شروع کے صفحات پر ایمرجنسی کا نمبر دیکھے اور ایک نمبر ڈائل کر کے ایمبولنس طلب کی۔ پھر جب رابعہ کی ماں کے کمرے میں پہنچا تو رابعہ بستر کے سرہانے کھڑی رومال سے آنسو خشک کر رہی تھی اور ماں کو دیکھ رہی تھی جو آنکھیں بند کیے سیدھی لیٹی کراہ رہی تھی۔

"ایمبولنس ابھی آ جاتی ہے۔" میں نے اسے تسلی دینے کے لیے کہا۔ "ماں ٹھیک ہو جائے گی۔ خدا پر بھروسہ رکھو۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا اور میرے کندھے پر سر رکھ کے رونے لگی۔ "یہ سب تو میری غلطی ہے سکندر! مجھے ماں کو اس حالت میں ہرگز چھوڑ کے نہیں جانا چاہیے تھا۔ میں ماں کو چھوڑ کے گھومنے نکل گئی حالانکہ مجھے معلوم تھا ماں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" وہ اب آہستہ آہستہ ہسٹریا کی طرف بڑھ رہی تھی۔ میں نے اس کا سر اپنے کندھے پر سے ہٹایا اور اس کا بازو تھام کے جھٹکا دیا۔ •

"رابعہ! تمہارا دماغ خراب ہو رہا ہے۔ اس وقت میں تمہیں سنبھالوں؟" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "یا تمہارا فرض ہے کہ میرے ساتھ مل کے ماں کو سنبھالو۔ کیا میں چلا جاؤں؟"

"نہیں نہیں۔" وہ فوراً سنبھل گئی۔ "آئی... آئی ایم سوری... ہونے والی بات تو ہوتی ہے۔" وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ "لیکن سکندر! خدانخواستہ ماں کو کچھ ہو گیا تو کیا میں تمام عمر اپنی اس کوتاہی پر خود کو موردِ الزام نہیں سمجھوں گی؟"

"پھر وہی حماقت کی بات۔ زندگی اور موت تمہارے ہاتھ میں ہے کیا؟" میں نے کہا۔ "یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ تم اپنے کمرے میں سوتی پڑی رہ جاتیں۔ تمہاری عدم موجودگی میں یہ تو ہوا کہ خادمہ نے ماں کا خیال رکھا اور ڈاکٹر کو بلالیا۔ اب دعا کرو اور خدا سے نیک امید رکھو۔"

بیس منٹ بعد جب ہم نے رابعہ کی ماں کو اسٹریچر پر ڈالا اور ایمبولنس میں منتقل کیا تو وہ بدستور بے ہوش تھیں۔ ایمبولنس نے سائرن بجاتے ہوئے لاہور کی سڑکوں پر دوڑنا شروع کیا۔ یہ آواز سکوتِ شب میں بالکل موت کی بھیانک پکار بن کے گونجنے لگی اور ویران راستوں سے پہلے گزرنے کا حق مانگنے لگی۔ ڈرائیور نے عادتاً سائرن کو آن کر دیا تھا ورنہ اس وقت زندہ اور صحت مند انسان ایمبولنس کی راہ میں حائل نہیں ہو رہے تھے۔ اس سے فضا کچھ اور دہشت ناک ہو رہی تھی اور یہ بین کرتی ہوئی آواز خود میرے اعصاب کو متاثر کر رہی تھی۔ بالآخر ایمبولنس میو ہوسپٹل میں ایمرجنسی کے روشن سائن بورڈ والے دروازے پر جا رکی۔ رابعہ قادری کے نام سے زیادہ اس کے کارڈ پر لکھے ہوئے "ایڈووکیٹ ہائیکورٹ" کے الفاظ نے جادو کا اثر کیا۔ ایک کے بعد دوسرے ڈاکٹر نے "ای سی جی" کا معائنہ کیا اور آدھے گھنٹے بعد رابعہ کی ماں کو داخل کر لیا گیا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ ان کی حالت تشویشناک ہے، چنانچہ چوبیس گھنٹے تک انہیں خصوصی توجہ اور مشاہدے کے وارڈ میں رکھا جائے گا اور اگر اس مدت میں کوئی شدید تر دورہ نہ پڑا تو ان کے جانبر ہونے کے خاصے روشن امکانات ہوں گے۔ تاہم اس کے بعد بھی ان کو بہت عرصے تک مکمل آرام اور علاج کی ضرورت ہوگی۔ اس وارڈ میں کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی چنانچہ رابعہ نے ڈاکٹروں کو اپنے گھر کا فون نمبر دیا اور ہم ہسپتال سے نکلے تو صبحِ کاذب کا اجالا پھیل رہا تھا۔ میں نے رابعہ سے کہا کہ مجھے ضامن رضوی کی کوٹھی پر ڈراپ کر دے۔ مجھے احساس تھا کہ محسن میری رات بھر کی غیر حاضری کے باعث پریشان ہوگا۔

"میں آج شاید کورٹ نہ جا سکوں۔" وہ مجھے اتار کے بولی۔ "آج تمہارا حقِ وراثت کا کیس فائل کرنا تھا۔"

"وہ سب ہوتا رہے گا۔" میں نے کہا۔ "تم چلو۔ ہم دونوں ابھی دو گھنٹے کے اندر اندر آتے ہیں۔ پھر ہسپتال چلیں گے۔"

اس نے احسان مند نظروں سے مجھے دیکھا اور کار آگے بڑھا دی۔ میں اس کی گاڑی کو خالی سڑک کے آخری موڑ تک جاتا ہوا دیکھتا رہا اور پھر اندر چلا گیا۔ حسبِ توقع محسن جاگ رہا تھا۔

"برادرِ نسبتی! پھر ایک برمحل سفر یاد آ گیا ہے۔" وہ اٹھ بیٹھا۔ "یہ اُڑی اُڑی سی رنگت...؟"

"یار کیا بتاؤں۔" میں نے دوسری چارپائی پر دھم سے گر کے کہا۔ "رابعہ کی ماں پر میری موجودگی میں ہی خاصہ شدید دل کا دورہ پڑ گیا اور اب اسے ہسپتال میں داخل کرا کے آ رہا ہوں۔"

"یہ تو بڑی تشویش کی بات ہے۔" محسن سنجیدہ ہو گیا۔ "اگر بڑی بی کو کچھ ہو گیا تو رابعہ اکیلی رہ جائے گی۔"

"یہ خیال اب آیا ہے۔" میں نے کہا۔ "پہلے کیوں نہیں آیا۔ اس وقت تو جان بچا کے بھاگ آیا تھا جب بڑی بی نے..."

"دیکھ سکندر!" محسن نے میری بات کاٹ دی۔ "میں تسلیم کرتا ہوں کہ رابعہ سے اچھی رفیقِ حیات مجھے نہیں مل سکتی لیکن ایک تو انتخاب کا حق مجھے حاصل نہیں۔ میرے پاپا سے زیادہ میری ماما کو ہے۔ اس کے علاوہ کیا رابعہ سے کسی نے پوچھا ہے کہ اس کے ذہن میں مثالی شوہر کا تصور کیا ہے؟"

"کتابی فلسفہ مت جھاڑ۔" میں نے بھنا کر کہا۔ "کیا اب تجھے مثالی شریکِ حیات ملے گی؟ تیری اماں تجھ سے پوچھے بغیر کسی کا ہاتھ بھی تیرے ہاتھ میں تھما دیں گی کہ لے بیٹا! اب گزار مثالی ازدواجی زندگی۔ یہی رابعہ کی ماں نے کیا تھا۔ اور جب تجھ میں ہمت نہیں ہے اپنی زندگی اپنی مرضی سے گزارنے کا حق مانگنے کی تو لڑکیوں سے کیوں توقع رکھتا ہے کہ وہ اپنا حق حاصل کر سکتی ہیں۔ نہ فوزیہ نہ رابعہ۔ یہ سب اللہ میاں کی گائے سے زیادہ بے بس اور بے زبان مخلوق ہیں اور ان کی خرید و فروخت کے جملہ حقوق بحقِ والدین محفوظ ہیں۔ اگر ہمت ہے تو مجھ سے بات کر۔ میں بات کرتا ہوں انکل خیردانی سے اور وہ بات کریں گے رابعہ کی ماں سے۔ رابعہ کی ماں بات پکی کر دے گی اور اس کے بعد میں شرط لگا سکتا ہوں کہ تم دونوں ایک دوسرے کے لیے بہترین رفیقِ زندگی بنو گے اور تمہاری ازدواجی زندگی پر دنیا رشک کرے گی۔ بول منظور ہے؟"

محسن کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ "نہیں سکندر! مجھ میں اس کی ہمت نہیں ہے۔"

"جب تک تو لندن میں تھا تیرے خیالات کچھ اور تھے۔" میں نے کہا۔ "مریم کی شادی پر تو نے ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا اور احتجاجاً شریک بھی نہیں ہوا تھا۔ تو کہتا تھا کہ شادی کے بعد والدین کتنے دن ساتھ رہتے ہیں۔ دو چار یا زیادہ سے زیادہ دس بیس سال۔ پھر وہ خود تو قبر میں جا لیٹتے ہیں اور والدین کی پسند کا عذاب بھگتنے کے لیے بیٹا پچاس سال تک ان کو دعائیں دیتا رہتا ہے۔"

"میرے خیالات اب بھی وہی ہیں سکندر! لیکن حالات وہ نہیں ہیں۔" محسن بولا۔ "اب میں مجبور ہوں ورنہ تیری بات مان لیتا۔"

"تجھے کیا مجبوری ہے۔ تو لڑکی ہے کیا؟" میں نے کہا۔ "بیٹے تو ضد کر کے بھی ماں کو منا لیتے ہیں۔"

محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں ان سے ضد کر کے کوئی حق نہیں چھین سکتا۔ جو بات مجھے یہاں آ کے معلوم ہوئی ہے اس نے مجھے ہی نہیں ہم سب کو، ہمارے گھر کے سب افراد کو مجبور کر دیا ہے کہ ان کی زندگی کے آخری چند ایام میں ان کو ہر خوشی فراہم کریں۔"

"آخری چند ایام؟" میں نے حیرانی سے کہا۔ "کیا ہوا ہے انہیں؟"

"وہی مرض جس کا علاج نہیں اور جس میں مسیحا کوئی بھی ہو امیدِ شفا نہیں دیتا، یہ بتا دیتا ہے کہ رخصتِ سفر باندھنے کے لیے قدرت زیادہ سے زیادہ کتنی مہلت دے سکتی ہے۔" محسن نے کہا۔ "ممی کو دو ماہ قبل قطعی طور پر بتا دیا گیا تھا کہ ان کو مہلک قسم کے سرطان کا عارضہ لاحق ہے اور ان کی زندگی کے چھ مہینے باقی ہیں۔ آٹھ بھی ہو سکتے ہیں لیکن اس سے زیادہ نہیں۔ دو مہینے تو گزر چکے ہیں اور باقی ہیں وہی چھ ماہ۔ وہ سخت گیر ماں اور گھر میں ڈکٹیٹر قسم کی حاکم ضرور رہی ہیں مگر انہوں نے ہم سب کے مفادات کی نگرانی نہ کی ہوتی تو ہم سب وہ نہ ہوتے جو آج ہیں۔ ڈیڈی اپنی کارکردگی کے اعتبار سے اچھے افسر یقیناً ہوں گے لیکن ایک فائل اور ایک گھر میں بہت فرق ہوتا ہے۔ دیکھا جائے تو گھر کی ذمے داریوں سے سبکدوش کرکے دفتری امور کو یکسوئی سے نمٹانے میں بھی ممی کی مدد شامل تھی۔ پاپا گھر کی طرف سے ہمیشہ بے فکر رہے اپنے کام میں لگے رہے اور ترقی کرتے گئے۔ ہمیں کبھی توجہ یا محبت کی کمی محسوس نہ ہوئی۔ اب ممی چاہتی ہیں کہ وہ اپنا آخری فرض بھی اپنی زندگی میں ہی پورا کر دیں تو ہم انہیں کیسے روک سکتے ہیں؟ یہ تو خود غرضی اور کمینگی کی انتہا ہوگی کہ جب تک وہ ہم سب کی زندگی سنوارنے کی جدوجہد کرتی رہیں اور ہمارے لیے مستقبل کی خوشی کو یقینی بنانے کے لیے کوشاں رہیں ہم نے ان کے اختیارات کو چیلنج نہیں کیا۔ اور اب وہ مرنے سے پہلے ایک خوشی مانگتی ہیں تو ہم یہ سوال کریں کہ تم مر رہی ہو تمہیں زندہ رہنے والوں پر اپنی مرضی مسلط کرنے کا کیا اختیار ہے؟"

میں ہکا بکا بیٹھا رہا۔ محسن کی صورت پر اس کا سارا دکھ سمٹ آیا تھا۔ "تو نے اب تک مجھے کیوں نہیں بتایا تھا؟"

"مجھ میں اس کی ہمت نہیں تھی۔" محسن نے دیوار کو گھورتے ہوئے کہا۔ "ابھی تک کسی نے ممی کو بھی کچھ نہیں بتایا ہے۔"

یکلخت ساری بات میری سمجھ میں آگئی۔ میری نظریں حقیقت کو روزِ روشن کی طرح دیکھنے لگیں۔ میں نے محسوس کیا کہ اتنی بڑی مجبوری کے سامنے میں خود بھی بے بس ہوں۔ فوزیہ، محسن اور شیروانی صاحب کی طرح میں بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ محسن نے کہا تھا کہ ہم یہ سوال کیوں کریں۔ اس نے اپنی ہی بات نہیں کی تھی۔ اپنے ساتھ فوزیہ کی بات بھی کی تھی۔ میں اس بات کا مطلب سمجھ گیا جو محسن نے گزشتہ شب کی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ ایک بات کہتا ہوں جو تیرے مفاد میں ہے۔ اس نے کہا تھا سرطان کے مریض کو یہ کون بتاتا ہے کہ اسے اب کتنے دن اور جینا ہے۔

"صاف بات یہ ہے سکندر کہ ممی نے میری اور فوزیہ کی شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔" محسن نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ "اس فوری فیصلے کا سبب یہ نہیں کہ ان کو اپنے انجام کی خبر مل گئی ہے۔ اگر تو ان الجھنوں میں نہ پڑتا اور تیرے لیے قانونی مسائل زندگی کو لاحق خطرات اور رسوائی کے اندیشے نہ ہوتے تو اس سال اپنی تعلیم مکمل کرکے لوٹ آنے کے بعد طے شدہ پروگرام کے مطابق سب کچھ ہوتا مگر اب ان کا ذہن حالات سے خوفزدہ ہے۔ انہیں معلوم ہو گیا ہے کہ انکل وزیر خان کا انتقال کسمپرسی کے عالم میں اور ایسے پراسرار حالات میں ہوا کہ تجھے قتل کا شبہ ہے اور اسی پر بس نہیں، خود تجھ پر قتل کا الزام ہے اور ممی سارے معاملات کو میری یا تیری نظر سے نہیں، ایک بیٹی کی ماں کی نظر سے دیکھتی ہیں۔ انہیں یقین نہیں کہ تو سزا سے بچ جائے گا لیکن وہ کہتی ہیں کہ سزا ہو یا نہ ہو رسوائی تو ہو چکی۔ لوگ تمام عمر میری بیٹی کو طعنے دیں گے کہ اس کا شوہر قاتل تھا۔ دنیا میں کتنے ہی قاتل ثبوت نہ ہونے کے باعث یا جھوٹی شہادتوں سے اور دس چکر چلا کے قانون کی گرفت سے نکل جاتے ہیں۔ انہوں نے فوری طور پر فوزیہ کی شادی پروفیسر ایاز سے کرنے کا فیصلہ اسی لیے کیا ہے۔ تین مہینے کے اندر اندر۔ ابھی تک فوزیہ کو اس فیصلے کا علم نہیں مگر ممی جانتی ہیں کہ وہ اس فیصلے کے خلاف آواز اٹھا ہی نہیں سکتی۔ تیرے خلاف دینے کے لیے ان کے پاس دلائل کی کمی نہیں اور فوزیہ کسی دلیل سے یہ ثابت نہیں کر سکتی کہ پروفیسر ایاز میں کوئی خامی ہے۔ ابھی تو انہوں نے میرے کندھے پر بندوق رکھ کے چلائی ہے یعنی میرے رشتے کی بات کی ہے اور کہا ہے کہ لڑکی والے اس شرط پر راضی ہیں کہ منگنی اور شادی سب فوراً کر دی جائیں۔ تیاری لڑکی والے کرتے ہیں۔ ممی یہ شرط قبول کریں گی مگر یہی شرط بہانہ بن جائے گی فوزیہ کی ڈولی بھی ساتھ ہی اٹھانے کا۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بہن بیٹھی رہ جائے اور بھائی کی برات آ جائے۔ دونوں کام ایک ساتھ نمٹائے جائیں گے۔ دِس از فائنل، نو آرگومنٹ۔" وہ کچھ دیر کے لیے رکا۔ "ظاہر ہے ہم جو حقیقت سے زیادہ باخبر ہیں اختلاف کی جرأت نہیں کر سکتے۔ یہ بات ہے جو آدمی کو بزدل بناتا ہے اور قدم پیچھے ہٹانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ خود ایسا کون چاہتا ہے۔"

ہر نئے دن کا سورج پہلے بھی ان گنت انسانوں کی زندگی کا فیصلہ کرتا تھا۔ آج کے دن کے سورج نے مجھے خبر دی کہ

کس کی زندگی کا فیصلہ ہو چکا۔ فوزیہ کی ممی کے علاوہ اور بھی بہت سے فیصلے ہو چکے تھے جن سے میں بے خبر تھا۔ ان میں فوزیہ بھی تھی اور میں خود بھی تھا، محسن بھی تھا۔ شاید رابعہ بھی تھی اور اس کی ماں بھی تھی۔ وقت کے منصف نے یہ فیصلہ محفوظ کر لیا تھا لیکن شبہے کی کوئی بات نہ تھی کہ یہ فیصلہ کیا ہے۔ اس کے رسمی اعلان کا انتظار باقی تھا مگر اس کے خلاف اپیل کی گنجائش باقی نہ تھی۔ میں بہت دیر تک دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھے لیٹا رہا اور چھت کو گھورتا رہا جو سینما کے اس خالی اسکرین کی طرح رہ گئی تھی جس پر فلم ٹوٹ جانے سے بالکل حقیقی زندگی کی طرح دکھائی دینے والا رنگین منظر یکلخت غائب ہو جائے اور ذہن ایک جھٹکے سے تاریکی میں خلا کی ویرانی پر مرتکز رہ جائے۔ خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا۔ اب اس کا کیا ذکر کہ کیا دیکھا تھا اور کیا سنا تھا۔ آدمی اگر اپنے نوشتۂ تقدیر کو خود پڑھ سکتا، تو خدا ہوتا۔ اس کی خدائی کو نہ مانتا۔ وہ صرف لمحۂ گزراں کی شناخت کر سکتا ہے۔ کسی کمپیوٹر سے یہ نہیں پوچھ سکتا کہ آنے والا لمحہ اس کا دوست ہے یا دشمن۔ قاتل ہے یا مسیحا۔ پس میں تقدیر کے اس فیصلے کے آگے سرِ تسلیم خم کرتا ہوں کیونکہ میں آنے والے لمحے سے بچ کے نہیں نکل سکتا۔

میں نے محسن کی طرف دیکھا۔ وہ ... دل آزردہ، اور شرمندہ بیٹھا تھا۔ آہستہ سے اس نے ایک قطرۂ اشک کو انگلی پر لے کر جھٹک دیا۔

"محسن!" میں نے کہا۔ "تجھے کیا ہوا ہے بھائی؟ یہ سب یوں ہونا تھا تو یوں ہی ہونا تھا۔ تو نے تو کچھ نہیں کیا جو روتا ہے۔"

محسن زبردستی مسکرایا۔ "میں کہاں رو رہا ہوں۔ مجھے تجھ پر اعتماد تھا۔ میں نے کل کہا تھا نا کہ تجھ میں ہر صدمہ جھیلنے کی قابلِ رشک صلاحیت ہے۔ میں نے سوچا تھا، رات کو تو واپس آئے گا تو تجھے سب بتا دوں گا۔"

"سوری یار! میں نے رات بھر تجھے انتظار کے عذاب میں مبتلا رکھا۔" میں نے دل شکستگی کے درد کو دبا کے خوشدلی سے کہا۔ "بہتر ہوتا اگر تو اس اعتماد کا اظہار دیر سے نہ کرتا۔ ہم نے تو ہمیشہ دکھ بانٹے ہیں۔ تو غم کے اس پہاڑ کو اکیلا کیوں اٹھائے پھرتا رہا۔ میرے ستارے گردش میں تھے اور مجھے پہلے سے اندازہ ہونے لگا تھا کہ تقدیر میرے ساتھ آخری سنگین مذاق کیا کر سکتی ہے اس لیے میں یہ صدمہ اٹھانے کے لیے بھی تیار تھا۔ جینے والوں کے لیے سکھ کے پھول اور دکھ کے کانٹے چننا اپنے اختیار کی بات نہیں۔ چل اب بھول جا اس بات کو۔ یہ بتا وہ بدبخت کون ہے جس پر تجھے تھوپا جا رہا ہے؟"

محسن مسکرایا۔ "مجھے نہیں معلوم یار! ہوگی کسی ڈپٹی سیکرٹری کی یا امپورٹر ایکسپورٹر کی بیٹی۔ انہی کے حلقے میں سے کوئی۔ اتنا میں جانتا ہوں کہ ممی کی ترجیحات کیا ہوں گی۔ پہلے خاندان پھر شکل صورت، پھر تعلیم اور سلیقہ وغیرہ۔ اب میں کیا بولوں؟"

"انہیں خوش رکھنا ایک مقدس فریضہ ہے۔" میں نے کہا۔ "اس میں تھوڑی سی شرکت میں بھی چاہتا ہوں۔ اس طرح کہ ان کے دل میں فوزیہ کے معاملے میں میرے ساتھ ہونے والی کسی زیادتی کا احساس بھی نہ رہے اور خود فوزیہ کے دل میں یہ خلش نہ رہے کہ وہ میرا ساتھ نہ نبھا سکی۔ میں تو ہوں میٹر آف فیکٹ قسم کا آدمی۔ لڑکیاں، خصوصاً فوزیہ جیسی لڑکیاں خلش کو روگ بھی بنا لیتی ہیں۔"

"کیا چاہتا ہے تو؟" محسن نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں سمجھا نہیں؟"

"ڈرامہ۔" میں نے کہا۔ "ابھی فوزیہ کو تیری ممی کے فیصلے کا علم نہیں ہے نا۔ کسی طرح اس کو بتا دے کہ میں رابعہ کے چکر میں پڑ گیا ہوں۔ اپنی ممی سے فون پر بات کرتے ہوئے یہ بات کہہ دے۔ وہ خود فوزیہ کو بتا دیں گی۔ فوزیہ تجھ سے بات کرے گی۔ یا مجھ سے۔ اور میں یہ کہہ دوں گا کہ سوری۔ شریک حیات کے بارے میں میرے تصورات بدل گئے ہیں۔ اور میں گھریلو ٹائپ دیسی لڑکیوں سے الرجک ہو گیا ہوں جو امور خانہ داری کے سوا کچھ نہیں جانتیں اور شوہر کو مجازی خدا اور خود کو اس کے پاؤں کی جوتی سمجھتی ہیں۔ مائی فٹ! مجھے الٹرا ماڈرن قسم کی بیوی چاہیے۔ بیسویں صدی کا تازہ ترین ماڈل جس کے ساتھ مجھے کہیں شرمندہ نہ ہونا پڑے۔ تو کہہ سکتا ہے کہ رابعہ کس قماش کی عورت ہے۔ وکیل ہے، کار چلاتی ہے۔ بس اتنا کافی ہوگا۔ یہ پرانا مجرب نسخہ ہے جو ہمیشہ کارگر ثابت ہوا ہے۔ موردِ الزام ہوگی میری ذات مگر ایک عورت کی زندگی پُرسکون رہے گی، دوسری کی موت۔ یہ کوئی مشکل کام تو نہیں۔"

"ہاں۔" محسن نے بے خیالی میں دہرایا۔ "یہ کوئی مشکل کام تو نہیں۔ اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے۔"

"چل اب رابعہ کی خبر لینی ہے۔" میں نے کہا۔ "اسے ماں کی فکر کے ساتھ یہ بھی فکر تھی کہ میرے وراثت کے سرٹیفکیٹ کا مقدمہ آج فائل نہ ہو سکے گا۔ اخبار دیکھنا ہے کہ سلامت

شاہ کیس کا کیا بنا۔ منظر صاحب سے پوچھنا ہے کہ پوسٹ مارٹم کرانے کے کیس کا کیا بنا۔ لیکن سب سے پہلے آج مجھے میر وزیر اینڈ کمپنی جانا ہے۔ ابھی ہم یہاں سے نکلیں گے تو ساتھ ہی، پھر تو رابعہ کے ساتھ ہسپتال چلے جانا۔ میں وہیں آجاؤں گا اور اس کے بعد باقی پروگرام۔"

ساتھ والے کمرے سے کانسٹبل اٹھ کے ہم سے شرفِ ملاقات حاصل کرنے آیا اور اس نے پندرہ منٹ تک ہمیں اپنے نام، جائے سکونت، تعدادِ ازدواج و پیداوار، بحیثیت ڈرائیور ایس ایس پی صاحب کے پاس اپنی اہمیت اور اپنی نظر میں ہماری حیثیت کے بارے میں غیر ضروری معلومات فراہم کیں۔ یہ کہا کہ وہ ہمارے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے اور معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ پھر ڈیوٹی کا عذر پیش کر کے اس نے ہمیں بخشا اور غسل خانے میں گھس گیا جہاں سے اس کے حلق میں سے برآمد ہونے والی عجیب و غریب آوازیں پندرہ منٹ تک سنائی دیتی رہیں۔ صفائی کے اس پُرشور عمل سے فارغ ہو کے اس نے کمرہ مقفل کیا اور ہاتھ ملا کے رخصت ہو گیا۔ آدھے گھنٹے بعد ہم بھی تیار ہو کے نکلے تو وہ جیپ کے قریب ٹہل رہا تھا، اور سگریٹ کو چلم کی طرح انگلیوں میں پھنسا کے کش لے رہا تھا۔ اسی وقت ضامن رضوی صاحب برآمد ہوئے اور انہوں نے ہمیں بلا لیا۔ بڑے مشفقانہ انداز میں ہاتھ ملانے کے بعد انہوں نے شکایت کی کہ کل سے اب تک ہم ملنے کیوں نہیں آئے۔ یہ پوچھا کہ ہم نے کھانے کا کیا انتظام کیا ہے اور خفا ہوئے کہ ہم نے باہر... کھانے کا فیصلہ کیا ہے۔ ہماری ایک نہ چلی ــ انہوں نے اپنے خانساماں کو طلب کیا اور اسے احکامات جاری کیے کہ ہمارے ناشتے اور دونوں وقت کے کھانے کا بندوبست رکھے۔ ناشتہ تو صبح پہنچا دے اور کھانا جس وقت بھی ہم آئیں طلب کیے بغیر لے جائے۔ میں نے ایک مرتبہ نظر بچا کے گھڑی دیکھی۔ ہمیں کھڑے کھڑے باتیں کرتے بیس منٹ ہو گئے تھے۔ ان کے دو بچے بستے لیے نکلے اور جیپ میں بیٹھ گئے۔ ضامن رضوی صاحب نے ان کو ڈانٹا کہ انکل کو سلام نہیں کیا۔ بچوں کو اور شوہر کو سی آف کرنے کے لیے ان کی بیگم نکلیں تو ہم نے آداب کیا ــ ضامن رضوی صاحب نے کہا کہ اس وقت تو انہیں جانا ہے مگر وہ شام کو ہم سے مفصل ملاقات کریں گے چنانچہ ہم رات کا کھانا ان کے ساتھ ان کے گھر پر کھائیں۔ پھر انہوں نے ہمیں بھی ساتھ بٹھا لیا اور رابعہ کے گھر کے دروازے پر ڈراپ کر کے سیدھے نکل گئے۔ اس وقت تک ان کا کانسٹبل ڈرائیور ان تمام حالات پر نظرِ ثانی کر چکا تھا جن کا اظہار اس نے نادانستگی میں کسی بحالم کیا تھا۔ اب حیثیت اور اہمیت کے بارے میں اپنی معلومات کے اس حد تک ناقص ہونے پر سخت شرمندہ تھا۔ آسمان پر اب گہرے سیاہ بادل پھیل گئے تھے اور بارش کے آثار تھے۔

میں نے رابعہ سے ہسپتال میں ملنے کا وعدہ کیا اور محسن کو وہیں چھوڑ کے بیڈن روڈ پہنچا۔ رکشا کو میں نے زریگر اینڈ کمپنی والے کنارے پر روکا اور باقی فاصلہ پیدل طے کر کے ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے اس جگہ پہنچا جس کے ماتھے "میر وزیر اینڈ کمپنی" کا سائن بورڈ آویزاں تھا۔ دفتر ایک دو منزلہ عمارت کے اوپر والے حصے میں واقع تھا۔ نیچے چار دکانیں تھیں جو ابھی بند تھیں۔ دروازہ ان کے بیچ میں سے نکالا گیا تھا۔ اس طرح کہ دو دکانیں ایک طرف تھیں تو دو دوسری طرف۔ زینے میں کھلنے والے دروازے کا ایک پٹ تھا جو جدید قسم کا فلش ڈور تھا۔ اوپر کا آدھا پٹ شفاف شیشے کا تھا جس کے گرد بالشت بھر چوڑا لکڑی کا حاشیہ تھا اور اس کی لکڑی کے رنگ کے فارمیکا والی سطح پر پالش چمک رہی تھی۔ ڈور لاک بھی خودکار ٹائپ تھا لیکن حفاظتی انتظامات کی تکمیل باہر کی جانب لوہے کی سمٹنے والی گرل لگا کے کی گئی تھی جو اس وقت مقفل تھی۔ پرانی عمارت میں یہ نیا انتظام بالکل الگ نظر آتا تھا۔ اوپر کی منزل میں بھی کھڑکیاں تبدیل کی گئی تھیں۔ یہی بڑے بڑے شیشوں والی کھڑکیوں کی جگہ پہلے پرانی طرز کی لکڑی کے پٹ والی اور سلاخوں والی کھڑکیاں ہوں گی جو آس پاس کی دوسری عمارتوں میں اب بھی موجود تھیں۔ "میر وزیر اینڈ کمپنی" کے دفاتر کے باہر گرل لگائی گئی تھی جس پر سیاہ کلر تھا۔ کسی امپورٹ ایکسپورٹ کمپنی کے آفس میں یہ غیر معمولی حفاظتی انتظام مجھے غیر معمولی لگا۔ شاید اس کی وجہ وہ شکوک تھے جو کاروبار کی نوعیت کے بارے میں پہلے سے میرے ذہن میں موجود تھے۔ سائن بورڈ آفس کی کل طوالت کے برابر اور کھڑکیوں کی دہلیز تک چوڑا تھا۔ گہرے نیلے رنگ پر چمکنے والے فلورسینٹ زرد رنگ کے حروف میں کمپنی کا نام تھا نیچے سائز میں آدھے اور سفید رنگ کے حروف سے "امپورٹر اینڈ ایکسپورٹر۔ ٹولز اینڈ مشینری" لکھا گیا تھا۔ بارش پر وقت شروع ہوئی اور میں نے ایک بند دکان کے پھیلے ہوئے سائبان کے نیچے پناہ لی جو اس زینے کے بالکل مقابل تھا۔ دس منٹ تک میں اپنے سامنے سے گزرنے والے

سائیکل اور موٹر سائیکل سواروں اور پیدل چلنے والوں کو دیکھتا رہا جو سب اپنے اپنے دھیان میں مگن تھے۔ بارش سے بچنے کے لیے کسی کی طرف دیکھے بغیر جلد از جلد منزل تک پہنچنے کی فکر کر رہے تھے اور ادھر اُدھر پناہ لے رہے تھے۔ پھر ایک شخص میرے ساتھ آ کھڑا ہوا۔ وہ نوجوان تھا لیکن اس کی صحت اچھی نہیں تھی۔ پٹتے ہوئے چہرے پر بڑھی ہوئی شیو کے باعث وہ کچھ بیمار سا لگتا تھا۔ اس نے لنڈا بازار کی دھاری دار قمیص اور سرج کی گہرے نیلے رنگ کی پتلون پہن رکھی تھی اور اس بات سے خاصا مطمئن تھا کہ دونوں چیزیں اس کو فٹ آنے کے بعد دیکھنے والوں کو لنڈا بازار کی نظر نہیں آتی ہوں گی۔ ہم نے صرف ایک بار ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر اپنے جیسا پناہ گزیں سمجھ کے نظر انداز کر دیا۔ کچھ دیر بعد میں مایوس ہونے لگا۔ یہ محض مفروضہ تھا کہ میر وزیر اینڈ کمپنی کے ملازم آتے ہوں گے اور چلے جاتے ہوں گے۔ اگر کسی کو آنا ہوتا تو اب تک ضرور آتا۔ نو بجے کے بعد تو کوئی دفتر نہیں کھلتا۔ "کیا مصیبت ہے۔" میرے قریب کھڑے ہوئے نوجوان نے بڑبڑا کے اپنے آپ سے کہا۔

"آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟" میں نے اس کی طرف دیکھا مگر وہ سامنے کے مقفل گرل والے دروازے کو دیکھ رہا تھا کہ اسے میرا بات کرنا بھی ناگوار گزرا۔ اس نے جھنجلا کے نفی میں سر ہلایا اور اس کا متفکر اور پریشان چہرہ دیکھ کر مجھے فوری طور پر ایک خیال آیا۔

"میرا خیال ہے آپ اس کمپنی میں کام کرتے ہیں؟" میں نے سامنے کی طرف اشارہ کیا۔

"کرتا تھا جی۔" وہ مایوس اور شکایت آمیز لہجے میں بولا۔ "بڑی مشکل سے یہ نوکری ملی تھی۔ چھ مہینے بھی نہیں رہی۔"

"کیوں؟" میں نے محتاط لہجے میں کہا تاکہ میرے شوق اور تجسس سے وہ شک میں مبتلا نہ ہو۔ "نکال دیا ہے تمہیں؟"

"نہیں جی! کمپنی ہی بند ہو گئی۔ مجھے کیا معلوم تھا یہ پرچون کی دکان ہے۔ مالک مر جاتے ہیں تو کوئی کمپنی بند ہوتی ہے؟" وہ بولا۔

"نہیں۔ مالکوں کے وارث چلاتے رہتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ورنہ منیجر ہوتے ہیں۔ مالک ہو نا ہو، کاروبار جاری رکھتے ہیں۔"

"یہی تو مصیبت ہے جی۔" وہ بولا۔ میرے ہمدردانہ لہجے نے اسے اپنی پریشانی بیان کرنے پر مجبور کر دیا۔ "منیجر صاحب دو ہفتے کے دورے پر باہر گئے ہوئے تھے۔ یہاں مالک کا کسی نے خون کر دیا۔ منیجر کو کل آ جانا چاہیے تھا مگر یہاں تو تالے پڑے ہوئے ہیں۔"

"تم تو خواہ مخواہ مایوس ہو رہے ہو۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "منیجر آ جائے گا آج کل میں۔"

"رب جانے جی۔ آفس کی چابیاں ان کے پاس ہوتی تھیں یا منیجر کے پاس۔" وہ بولا۔ "ایک چلا گیا باہر، دوسرا اوپر۔ میں گھر چلوں۔ کل دیکھوں گا۔" اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ بارش کچھ کم ہو گئی تھی۔ اس نے سر جھکایا اور تیز تیز قدموں سے روانہ ہو گیا۔ ابھی وہ چند ہی قدم گیا ہوگا کہ اسے ایک اور شخص نے روک لیا جو نسبتاً عمر رسیدہ تھا۔ انہوں نے آپس میں کوئی بات کی۔ نوجوان نے نفی میں سر ہلایا اور چل پڑا۔ دوسرا شخص تھکے تھکے قدموں سے چلتا ہوا میرے ساتھ آ کھڑا ہوا۔ وہ چالیس سے زیادہ عمر کا فربہ بدن آدمی تھا۔

"آپ مجھے پرانے آدمی لگتے ہیں۔" میں نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔ "کب سے ملازم ہیں یہاں؟"

وہ شخص چونکا۔ "جی... جی ہاں، سات سال ہو گئے ہیں مجھے۔ میں یہاں اکاؤنٹنٹ ہوں۔" وہ شخص مجھے غور سے دیکھنے لگا۔

"کیا منیجر کو کسی نے اطلاع نہیں دی کہ مالک کے انتقال کے بعد آفس بند پڑا ہے۔ اسے اپنا دورہ مختصر کر کے واپس آ جانا چاہیے تھا۔" میں نے بڑے وقار اور متانت کے ساتھ اپنے لہجے کو کچھ تحکمانہ رکھتے ہوئے کہا۔ "لوگ آ کے واپس جا رہے ہیں۔ کیا نام ہے آپ کا اکاؤنٹنٹ صاحب؟"

"غلام علی... غلام علی جناب!" وہ بولا۔ "کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کون ہیں اور یہ سب... میرا مطلب ہے آپ کا ان معاملات سے کیا تعلق ہے؟" وہ حد سے زیادہ تابعدار قسم کا غریب اور مسکین نظر آنے والا منکسر مزاج شخص تھا۔ کچھ نروس ٹائپ۔

"اس کمپنی کے ایک مالک تھے وزیر خان۔" میں نے نگاہ روبرو رکھتے ہوئے کہا۔ "ان سے واقف ہیں آپ؟"

"کیوں نہیں جناب۔ وہ تو بڑے مہربان تھے۔ میرے محسن تھے۔ اللہ جنت نصیب کرے ان کو۔ مجھے انہوں نے بڑے برے وقت میں سہارا دیا تھا۔" غلام علی نے کہا۔ "میں بے روزگار تھا۔ دس سال کی ملازمت کے بعد ایمانداری کے جرم میں مجھے نکال دیا گیا تھا۔ میں پی ڈبلیو ڈی میں ملازم تھا۔ میری

بدقسمتی کہ مجھے اسٹور میں بھیج دیا گیا، میرے انکار کے باوجود۔ میں جانتا تھا یہ سازش ہے۔ وہاں سب کھاتے تھے اور خوب غبن کرتے تھے۔ انہوں نے مجھے اپنے جیسا بنانے کی کوشش کی لیکن میں نے اپنا ایمان کبھی نہیں بیچا تھا۔ میں نے کھانے والوں کی شکایت کی نیچے سے اوپر تک سب کو بتایا۔ مگر کچھ نہیں ہوا۔ الٹا میرے خلاف محاذ بن گیا۔ میں اکیلا کیا کر سکتا تھا۔ انہوں نے مجھے متعدد الزامات میں ملوث کر دیا اور تحقیقات ان کے سپرد ہوئی جو نیچے والوں سے لے کر کھاتے تھے۔ انہوں نے مجھے خطرناک سمجھتے ہوئے بدعنوانی کا مرتکب قرار دیا اور برطرف کر دیا۔ میں نے مرحوم وزیر خان کو سب کچھ بتا دیا۔ وہ آدمی کو پہچانتے تھے۔ انہوں نے کہا فکر نہ کرو غلام علی! بندے کا خدا جب تک ہے اس کا رزق کون بند کر سکتا ہے۔ اگلے دن سے مجھے اتنی ہی تنخواہ پر نوکری مل گئی۔"

"آپ ان کے جنازے میں تو شریک ہوئے ہوں گے۔" میں نے کہا۔

"اب اتنا بھی ہم نہ کرتے تو لعنت ہمارے انسان ہونے پر۔" اس نے الفاظ تلاش کرتے ہوئے کہا۔ "آدمی احسان مند ہو، نمک کھایا ہو اس نے اور اس میں اتنی شرافت بھی نہ ہو تو اس سے کتا ہونا اچھا۔" وہ ضرورت سے زیادہ باتونی اور جذباتی آدمی تھا اور غالباً بلڈ پریشر کا شکار۔

"اچھا غلام علی صاحب! مجھے آپ سے کچھ باتیں کرنا ہیں، کہیں بیٹھ سکے؟" میں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ "آپ غائبانہ طور پر مجھ سے ضرور متعارف ہوں گے۔ میں سکندر بخت ہوں۔ مرحوم وزیر خان کا بیٹا۔"

"آپ..." وہ چلایا اور اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ "آپ لندن سے آئے ہیں... مگر میں نے تو سنا تھا..."

"آپ نے ٹھیک سنا تھا۔" میں نے کہا۔ "لیکن جو کچھ سنا تھا اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ جیسے آپ ایک سازش کا شکار ہوئے تھے ایسے ہی میں بھی ایک سازش کے جال میں پھنس گیا ہوں۔ اور مجھے شبہ ہے کہ میرے والد مرحوم بھی کسی سازش کا شکار ہوئے تھے۔ میں اصل حالات پر سے پردہ اٹھانے کی کوشش کر رہا ہوں اور خاصا پُرامید بھی ہوں کیونکہ مجھے والد کے مخلص دوستوں کا تعاون حاصل ہے اور کچھ میرے ہمدرد بھی ہیں جو سمجھتے ہیں کہ یہ کیا چکر ہے۔ کیا آپ میری کچھ مدد کریں گے؟"

"کیوں نہیں جی۔ اپنے سکندر صاحب! مجھ پر تو ایک احسان کا قرض ہے۔ میرا بال بال اس قرض میں بندھا ہوا ہے اور میرے بیوی بچے بھی دعا دیتے ہیں اس نیک بندے کو، جس نے مجھے ایسے وقت میں پناہ دی جب سارا زمانہ سمجھتا تھا کہ میں بے ایمان اور بدنیت ہوں اور مجھے چپراسی کی جگہ رکھنے کو بھی تیار نہ تھا۔ کسی کو مجھ پر اعتبار نہ تھا۔" غلام علی نے جذباتی لہجے میں کہا۔

"یہی پوزیشن آج میری ہے غلام علی۔" میں نے کہا۔

کوٹھی نیشنل شیراز قریب ترین ریسٹورنٹ تھا۔ چند منٹ بعد ہم اس کی پرسکون فضا میں مہکتی گرم چائے کا لطف اٹھا رہے تھے اور میں اسے بتا رہا تھا کہ میرے اور میرے والد کے خلاف سازش کی نوعیت کیا ہے۔ میں نے اسے تمام واقعات نہیں سنائے بلکہ وہی باتیں بتائیں جن کا تعلق میر وزیر اینڈ کمپنی کے حالات سے تھا۔ میں نے بتایا کہ کس طرح میر شرافت علی نے کاروبار میں ایک شریک کی حیثیت سے داخل ہو کے تمام کاروبار پر قبضہ کیا کیسے میرے والد کو کسی نامعلوم طریقے پر بلیک میل کیا اور انہیں عضوِ معطل بنا کے الگ کر دیا۔ ان کے بارے میں مشہور کیا گیا کہ وہ بیماری کے باعث معذور ہیں اور ان سے جعلی دستخط لے کر ان کا منافع ہضم کر لیا گیا۔ کسی کو یہ بات معلوم نہ ہو سکی مگر وزیر خان مرحوم کوڑی کوڑی کو محتاج ہو کے اس کوٹھی میں معمولی ملازم کی حیثیت سے کام کرتے رہے جہاں سے ان کا جنازہ اٹھا۔ اس پرانے نمک خوار کے لیے یہ بات ناقابلِ یقین ثابت ہوئی کہ وہ کوٹھی جہاں وزیر خان کا انتقال ہوا تھا ان کی ملکیت نہیں تھی۔ تاہم میں نے اسے یقین دلایا کہ اب میں آ گیا ہوں تو سب معلوم کر لوں گا کہ ایسا کیوں ہوا جبکہ اگر سچ کی ہوتی ہے تو مجھ پر قتل کا جھوٹا مقدمہ کرنے والے ناکام ہوں گے اور میں نمک حراموں کو بے نقاب کر کے عبرت ناک سزا دوں گا۔ مجھے اب شک نہیں یقین ہے کہ وزیر خان مرحوم کے انتقال کا سبب گٹھیا کا مرض نہیں تھا جیسا کہ اب ان کے دشمنوں نے مشہور کیا ہے بلکہ انہیں قتل کیا گیا ہے۔ اس راز پر سے پردہ اٹھانے کے لیے میں نے عدالت میں درخواست دی ہے کہ لاش کو قبر سے نکال کے اس کا پوسٹ مارٹم کیا جائے۔ عدالت میں مجھے تین گواہ پیش کرنے ہوں گے جو حلفیہ بیان دے سکیں کہ وہ تدفین کے وقت موجود تھے اور قبر کی نشاندہی کریں۔ ایک گواہ چراغ دین کا چوکیدار ہے۔ اگر دوسرا گواہ غلام علی ہو جائے تو صرف ایک اور گواہ کی کمی رہ جاتی ہے۔ اسے یقیناً علم ہوگا کہ جنازے میں اور کون لوگ شریک تھے اور کس کی گواہی پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ غلام علی نے کہا کہ یہ کوئی مسئلہ نہیں، کمپنی کے تمام پرانے نمک خوار میرے ساتھ ہوں گے، اور مقررہ تاریخ پر گواہی کے لیے بھی حاضر ہو جائیں گے۔ غلام علی کے لیے یہ انکشاف اتنا سنسنی خیز اور ناقابلِ یقین تھا کہ وہ احمقوں کی طرح منہ کھولے بیٹھا تھا اور بار بار مجھے اس کو متوجہ کرنا پڑتا تھا کہ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ ایک بار اس نے کہا۔ "گولی مار و جی چائے کو سکندر صاحب! میرا تو خون کھول رہا ہے۔" میں نے اس سے کہا کہ یہ مسئلہ جذبات پر قابو رکھ کے اور عقل سے کام لے کر حل ہوگا۔ پھر میں نے اسے بتایا کہ یہ سارا چکر اس لیے چلایا گیا تھا کہ مجھے اس کاروبار سے الگ کر دیا جائے۔ مرحوم وزیر خان کے بعد میں ہی کاروبار کا وارث ہوں اور کچھ لوگ جو اس جائز کاروبار کی آڑ میں ناجائز کاروبار کر رہے ہیں اس لیے خوفزدہ ہیں کہ کہیں مجھے اس ناجائز کاروبار کی نوعیت کا علم نہ ہو جائے۔" وہ بھونچکا رہ گیا۔

"یہ شک آپ کو کیسے ہوا جناب کہ کمپنی کوئی ناجائز کاروبار کر رہی ہے؟" غلام علی نے کہا۔

"مجھے ایک پیشکش کی گئی تھی۔" میں نے سوچ کے کہا۔ "کہ میں کاروبار پر اپنے قانونی حق سے دستبردار ہو جاؤں تو مجھے ایک معقول رقم دی جائے گی۔ مجھے واپس لندن جا کے رہنے کا موقع فراہم کر دیا جائے گا اور میرے خلاف تمام مقدمات بھی ختم کر دیے جائیں گے۔"

"کس نے کی تھی یہ پیشکش، میر صاحب نے؟" غلام علی رازدارانہ انداز میں آگے جھک کے بولا۔

"ہاں۔" میں نے پھر سوچ کر کہا۔ "یہی سمجھ لو۔"

"اور اس کے بعد ان کو قتل کرا دیا گیا۔ سنا یہی بات ہے؟" وہ پرجوش لہجے میں بولا۔

"کچھ ایسی ہی بات ہے۔" میں نے دلاور کے ذکر کو گول کر دیا۔ "عدالت میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔ مجھے تو لندن میں پارٹنر بننے کے لیے بھی کہا گیا تھا۔ یعنی میں مالک نہ رہوں، ان کا ایجنٹ بن کے ان کے ناجائز اسمگلنگ میں شامل ہو جاؤں۔ ظاہر ہے میں نے انکار کر دیا اور اب میں وراثت کا سرٹیفکیٹ لینے کے لیے مقدمہ کر رہا ہوں۔ انشاءاللہ بہت جلد کمپنی ویسے ہی چلے گی جیسے مرحوم وزیر خان کے زمانے میں چلتی تھی۔ یہ بتاؤ میر شرافت علی نے کس کس کو برطرف کیا تھا۔ تمہارے سامنے وہ اپنے کون کون سے آدمی لایا ہے وہ کیسے لوگ ہیں؟"

"لوگ تو میر شرافت علی کے رویے سے بھی نالاں تھے۔" غلام علی نے کچھ دیر بعد بات شروع کی۔ "وہ ان کے ساتھ بہت ذلت کا سلوک کرتا تھا۔ وفاداری کا مطلب اس کے نزدیک غلامی تھا۔ وزیر خان مرحوم کہتے تھے تم سب اس عمارت کے ستون ہو۔ وہ سب کو اپنا ساتھی سمجھتے تھے، ملازم نہیں۔ ان کے زمانے میں مینجر تھے علوی صاحب۔ ان کے مستعفی ہونے کے بعد یہ مینجر آیا۔ یہ بھی بس میر شرافت علی ہی ہے۔ آدمی کو آدمی نہیں سمجھتا۔ کسی کی عزت نہیں کرتا۔ ظاہر ہے اس کی عزت بھی کچھ نہیں۔ سب ڈرتے ضرور ہیں مگر پیٹھ پیچھے گالیاں دیتے ہیں۔ جوان اور اسمارٹ آدمی ہے لیکن عیاش ہے۔ پینے پلانے کا شوقین۔ شادی نہیں کی ہے مگر ہر وقت کسی نہ کسی کو ساتھ رکھتا ہے۔ ایک تو یہاں رہتی ہے۔ سیکرٹری بن کے۔ سال بھر بعد رخصت کر دی جاتی ہے۔ بہت سے قصے مشہور ہیں کہ کس کس نے اسے بلیک میل کرنے کی کوشش کی۔ پتا ہی نہیں چلا کہ وہ کہاں گئیں۔"

"اچھا؟" میں نے دلچسپی اور حیرانی سے کہا۔ "کس بات پر بلیک میلنگ کرنے پر اتر آتی تھیں وہ؟"

"بہت بھولے ہیں آپ سکندر صاحب۔" وہ ہنسا۔ "اجی جب ایک جوان خوبصورت سیکرٹری ہر وقت کمرے میں رہے گی تو آخر کیا نتیجہ برآمد ہوگا؟ کس بات پر بلیک میلنگ کرے گی وہ؟"

"اچھا اچھا، میں سمجھ گیا۔ کیا نام ہے ان مینجر صاحب کا۔ کہاں رہتے ہیں؟" میں نے کہا۔ "اور کتنا عرصہ ہوا ہے ان کو آئے ہوئے؟"

"ان کو آئے ہوئے دو سال ہوئے ہیں یا ہونے والے ہیں۔" غلام علی نے کہا۔ "گوا کے رہنے والے ہیں۔ مسٹر ڈی سلوا۔ اسی زمانے میں پاکستان آئے تھے جب انڈین گورنمنٹ نے گوا کا الحاق کیا تھا۔ چھاؤنی کے علاقے میں کہیں رہتے ہیں۔"

"اچھا غلام علی! مجھے تم سے مل کر اس لیے بہت خوشی ہوئی ہے کہ تم صحیح معنوں میں قابلِ اعتماد دوست ہو۔ باضمیر انسان ہو اور معاملات سے خاصے باخبر ہو۔" میں نے کہا۔ "مجھے تمہاری مدد کی ضرورت پڑے گی۔ اگر تم واقعی اس احسان کا قرض اتارنا چاہتے ہو جو میرے والد نے تم پر کیا تھا تو مجھ پر احسان کر کے اتار سکتے ہو۔ وقتاً فوقتاً مجھے تم سے رابطہ قائم کرنا ہوگا اور وہ باتیں معلوم کرنا ہوں گی جو میں براہِ راست معلوم نہیں کر سکتا۔ آفس میں یقیناً ایسے لوگ ہوں

گے جو وہاں میری موجودگی برداشت نہیں کریں گے تاوقتیکہ میں قانونی طور پر مالک بن کے قدم نہ رکھوں۔ اب تم ایک کام کرو۔ مجھے تمام نئے پرانے کارکنوں کے نام اور پتے لا دو۔"

"لیکن آفس تو بند پڑا ہے سر!" اس نے پہلی بار مجھے سر کہا۔ ذہنی طور پر اس نے مجھے وزیر خان کی طرح کمپنی کا مالک مان لیا تھا۔

"بھئی غلام علی صاحب! یہ سر وغیرہ نہیں چلے گا میرے ساتھ۔" میں نے کہا۔ "آپ والد کے ساتھیوں میں سے ہیں۔ وہ آپ پر اعتماد کرتے تھے اور آپ وفادار اور وضعدار آدمی ہیں۔ میرے لیے آپ قابل تعظیم ہیں۔ مجھے صرف سکندر کہیے۔ آفس تو ایک دو دن میں کھل جائے گا۔ ہر دفتر کی طرح یہاں اسٹاف کے بارے میں تمام کوائف کسی رجسٹر میں موجود ہوں گے۔ میرا خیال ہے یہ رجسٹر شروع سے اب تک وہی ہوگا۔ اس کی نقل بنانا ویسے تو مشکل ہوگا۔ اگر آپ فوٹو اسٹیٹ کاپی بنوا لیں تو آدھے گھنٹے میں یہ کام ہو سکتا ہے۔ آپ کو رجسٹر باہر لانے میں دشواری تو نہیں ہوگی؟"

"دشواری کیسی سکندر صاحب!" وہ بولا۔ "سب میرے پاس ہے۔"

"اس میں ان لڑکیوں کے نام بھی ہوں گے نا؟" میں نے کہا۔ "جو منیجر کے ساتھ رہیں اور پھر بدنام ہو کے چلی گئیں یا نکالی گئیں۔"

"سب ہے جناب! نام پتا، تقرری کی تاریخ، دفتر چھوڑنے کی تاریخ اور اسباب۔ استعفٰی، برطرفی یا انتقال وغیرہ۔ یہاں تک کہ تاریخ پیدائش اور ولدیت بھی ہے۔" غلام علی نے کہا۔

"اب میرا پتا اور ٹیلی فون نمبر لکھ لو۔" میں نے کہا۔ "ایک نمبر ہے ایس ایس پی ضامن رضوی صاحب کے گھر کا، دوسرا مسٹر عبدالودود منتظر کا اور تیسرا مس رابعہ قاری کا۔ یہ دونوں ہائیکورٹ اور سپریم کورٹ کے ایڈووکیٹ ہیں اور میرے مقدمات کے وکیل ہی نہیں میرے کلاس فیلوز اور دوست بھی ہیں۔"

"واہ سکندر صاحب! اتنے بڑے بڑے لوگ آپ کے ساتھ ہیں، آپ کا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے۔" اس نے جیب سے ایک پرس نکالا۔ اس میں سے ایک خستہ حال ٹیلی فون نمبر بک برآمد کی اور بہت سے نمبروں کی قطار کے آخر میں میرا نام اور میرے دیے ہوئے نمبر لکھ لیے۔ پھر اس نے ایک پرزے پر اپنا نام پتا لکھ کے میرے حوالے کیا۔ "میں تو غریب آدمی ہوں جی!

گھر پہ کوئی فون نہیں لیکن میں نے جو فون نمبر لکھا ہے وہ ... کے قریب ایک کیمسٹ کا ہے۔ یہ میرے بھائی کی دکان ... میں نے پرزے کو دیکھا اس پر "انعام کیمسٹ" کا فون ... جو کرشن نگر میں سودی بلڈنگ کے پاس تھا۔ وہیں ... کا مکان بھی تھا۔ میں نے پرزے کو احتیاط سے جیب ... رکھ لیا۔ پھر مجھے ایک اور بات یاد آئی۔

"غلام علی! یہ کمپنی اب کس قسم کی مشینیں اور آلات ... رہی ہے؟" میں نے کہا۔ "فیکٹری کہاں ہے۔ فیکٹری تو بند ... ہوگی۔"

"فیکٹری کیوں بند ہوگی جناب!" غلام علی نے کہا۔ ... کے مالک تو فوت نہیں ہوئے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" میں نے کہا۔ "فیکٹری کا مالک ... اور ہے؟"

"آپ کو تو کچھ بھی معلوم نہیں۔" اس نے حیرانی سے ... دیکھا۔ "جناب فیکٹری اب شاہدرے میں ہے لیکن اسے ... دو سال پہلے فروخت کر دیا گیا تھا۔ معلوم نہیں ایسا کیوں ... گیا۔ پہلے ہم خود اپنی مشینیں اور آلات بناتے تھے اور ... بیچتے تھے۔ خراد مشین، ڈرل مشین اور ان کے پرزے ... آلات۔ اب ہم صرف برآمد کرتے ہیں اور ایک طرح ... ڈسٹری بیوٹر رہ گئے ہیں۔ ہو سکتا ہے فروخت کے معاہدے ... میں کوئی ایسی شق ہو کہ کمپنی کے سوا کوئی ان مشینوں کو فروخت ... برآمد نہیں کرے گا۔"

"اگر فیکٹری واقعی بک چکی ہے تو معاہدے میں ایسی کوئی ... نہیں رکھی جا سکتی جس کی رو سے نیا مالک اپنا مال ہمارے ... سے نکالنے کا پابند ہو۔" میں نے مایوسی سے کہا۔ "ممکن ... تمہیں غلط فہمی ہوئی ہو۔ بیچنے کے بجائے فیکٹری کو کسی ... پارٹنر کے سپرد کر دیا گیا ہو جو اپنے طور پر فیکٹری کے امور کا ... ہو۔ فرض کرو میر شرافت علی نے کاروبار کے تین حصے کر ... اور ہر حصے کا نگراں الگ کر دیا۔ پروڈکشن الگ، سیلز الگ، ... اکاؤنٹس الگ۔ سیلز، مارکیٹنگ اور سیل پروموشن کا شعبہ ... اس نے اپنے پاس رکھا ہو اور اکاؤنٹس کا ذمے دار ... والد مرحوم وزیر خاں کو بنا دیا ہو۔ صرف دستاویزات ... حسابات پر دستخط کرنے کے لیے کیونکہ اکاؤنٹس کے سربراہ ... پاس اپنی میز پر بیٹھ کے جمع تفریق کے اعداد و شمار دیکھتے ... رہنے کے سوا کچھ کام نہیں ہوتا اور یہ کام بھی ماتحت کرتے ... ہیں یا مشینیں کرتی ہیں۔ اہم شعبے پروڈکشن اور سیلز کے ... سیل پروموشن کے نام پر وہ دنیا میں ہر جگہ جا سکتا تھا ...

بجٹ مقرر کر سکتا تھا اور اس طرح اپنے رابطے استوار کر سکتا تھا تاکہ اس کا ناجائز کاروبار پھیلے۔ پروڈکشن والے مشینوں کی جگہ کچھ اور باہر بھیجتے ہوں گے۔ ناجائز کاروبار اسمگلنگ کا ہی ہو سکتا ہے اور یہاں سے یورپ اور امریکہ کیا اسمگل کیا جا سکتا ہے؟"

"میری عقل تو اندازہ کرنے سے قاصر ہے جناب!" غلام علی نے خشک حلق کو تر کرنے کے لیے تھوک نگلا۔ "بلکہ ماؤف ہے۔ کتنے اطمینان سے میں یہاں ملازمت کر رہا تھا اور خوش تھا کہ رزق حلال کھا رہا ہوں۔ بدبختوں نے اپنے ساتھ میری عاقبت بھی خراب کی۔ اسمگلنگ! توبہ توبہ۔"

"تم نے نادانستگی میں ایسا کیا تھا غلام علی! خدا نیت کو دیکھتا ہے اور تم اسمگلنگ میں ملوث نہیں ہوتے۔" میں نے کہا۔ "یہاں سے نہ سونے کی اسمگلنگ ہوتی ہے نہ ملکی مصنوعات کی، نہ آرٹ کی اور نہ نوادرات کی۔ ملک دشمن عناصر کرنسی کی اسمگلنگ کرتے ہیں اور سماج دشمن بلکہ انسانیت دشمن عناصر منشیات کی اسمگلنگ۔ منشیات میں خطرات زیادہ ہیں مگر یہی کاروبار اتنے منظم پیمانے پر ہوتا ہے اور اس میں منافع بھی اتنا ہی زیادہ ہے۔ چرس، حشیش، ہیروئن کے دھندے میں لاکھوں سے کروڑوں بنائے جاتے ہیں اور یہ ہو سکتا ہے کہ مشینوں کے کریٹ کسی طرح منشیات باہر بھیجنے کے لیے استعمال ہو رہے ہوں۔"

"یا میرے معبود۔" غلام علی نے دونوں کانوں کو ہاتھ لگا کے فریادی لہجے میں کہا۔ "مجھے ہر آفت سے بچا۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچوں کا والی وارث تو ہی ہے۔"

"گھبراؤ نہیں غلام علی! اطمینان سے کام کرتے رہو جیسے آج تک کرتے آئے تھے۔" میں نے کہا۔ "اب تک تم بےخبری کے اندھیرے میں تھے۔ اب خدا نے تمہیں ہوش دیا ہے کہ اس برائی کا خاتمہ کرنے کے لیے اپنی عقل اور توانائی کا صحیح استعمال کر سکو۔ تم میرے ہاتھ مضبوط کرو۔ انشاء اللہ تم کو اس کا صلہ ملے گا۔ خدا کی طرف سے بھی اور میں۔۔۔ میں اسے صلہ تو نہیں کہوں گا لیکن میں کامیاب ہوا تو مجھے پرانی "وزیر خاں اینڈ کمپنی" قائم کرنے کے لیے ایک مخلص، ایماندار اور قابل اعتماد آدمی کی ضرورت ہوگی جس کی کمان تم کرو گے۔ تقدیر نے ساتھ دیا اور میں مالک بنا تو تم منیجر بنو گے۔"

غلام علی کا چہرہ فرط جذبات سے تمتمانے لگا۔ "انشاءاللہ جی! انشاء اللہ۔" اس نے بمشکل تمام کہا۔

"میں نے جو کام بتائے ہیں یاد رکھنا۔ فون تم کسی بھی وقت کر سکتے ہو اور پیغام چھوڑ سکتے ہو۔ اگر میں نہ ملوں،" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "ہاں یہ بتاؤ تمہیں کچھ معلوم ہے فیکٹری کا مالک کون ہے؟"

"جی۔۔۔" اس نے پھر جیب میں سے وہی اڑے ہوئے رنگ والا چرمی پرس نکالا۔ "ان کا یہ کارڈ ہے۔ اس میں سب کچھ ہے۔ نام پتا فون نمبر۔"

کارڈ پر نظر ڈالتے ہی میری نگاہوں کے سامنے ایک خیرہ کن روشنی آ گئی۔ پھر دوسری سرچ لائٹ کی جیکا چوند نے میرے سامنے اندھیرے کی چادر تان دی اور اس چادر سے ایک ہاتھ نکلا جو نائلون کی ڈور سے بندھی ہوئی کارک کی سخت گیند کو بڑی مہارت سے ایک دائرے میں گردش دے رہا تھا۔ میں پھر بیٹھ گیا۔ کارڈ پر لکھا تھا۔ "چوہدری دلاور۔ پروپرائٹر ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس۔"

"سکندر صاحب!" غلام علی کی پرتشویش آواز آئی۔ "آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

میں فوراً سنبھل گیا۔ "ہاں۔۔ طبیعت کو کیا ہونا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کارڈ کو جیب میں رکھ لیا۔ "دراصل مجھے خیال آ گیا کہ ہم بل ادا کیے بغیر جانے کے لیے کھڑے ہو گئے تھے۔ بات تو کچھ نہیں مگر سبکی ہوتی ہے۔"

نروس ٹائپ غلام علی نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ آسانی سے شک میں مبتلا ہو جانے والا شخص تھا اور اتنا سادہ دل اور سادہ لوح کہ آسانی سے مطمئن بھی ہو جاتا تھا۔ جب ویٹر بل کی بقایا رقم لانے گیا ہوا تھا تو یکلخت مجھے ایک اور خیال آیا اور میں نے کارڈ نکال کے دیکھا۔ "غلام علی! یہ ایم ڈبلیو تو پہلے بھی تھا۔ میر وزیر۔ ڈی اس میں دلاور کے نام کا ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ ایم ڈبلیو ڈی ایک ہی کمپنی ہے اور یہ تینوں اس کے حصے دار ہیں۔ میرا اندازہ درست تھا۔ تم اپنا کام کل تک مکمل کر لو گے؟"

"وہ تو جناب منیجر کے آنے پر ہے۔" غلام علی نے کہا جو میرا اندازہ درست ہونے سے بھی متاثر ہوا تھا۔ "دیکھ لیتے ہیں اگر وہ آج آ گیا تو کل تک فہرست آپ کو مل جائے گی۔"

منیجر آ گیا تھا۔ جب ہم واپسی پر "میر وزیر اینڈ کمپنی" کے سامنے سے گزرے تو نیچے سڑک کے کنارے ایک نیلے رنگ کی ٹویوٹا کراؤن گاڑی کھڑی تھی۔ غلام علی نے مجھے بتایا کہ یہ چاروں دکانیں جو آفس کے نیچے ہیں اپنی ہی ہیں اور گودام کے طور پر استعمال ہوتی ہیں۔ پہلے ان کو کرائے پر حاصل کیا گیا تھا۔ پھر خاصی قیمت دے کر خرید لیا گیا لیکن ان کو آج تک کھلتے بند ہوتے نہیں دیکھا گیا۔ غالباً آفس کے اندر

ہی سے کوئی راستہ ہے نیچے اترنے کا۔ میں نے یہ بات نوٹ کرلی اور غلام علی سے کہا کہ وہ ایک گھنٹے بعد آئے کیونکہ میں منیجر سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ غلام علی سیدھا نکل گیا تو میں نے دروازے کو دھکیل کر زینے پر قدم رکھا اور اوپر پہنچا۔ زینے کے دائیں بائیں دو دروازے تھے۔ دونوں ایک جیسی پالش کی ہوئی پلائی وڈ کے بنے ہوئے تھے۔ دونوں میں اوپر صرف ایک فٹ چوڑا شیشے کا فریم تھا۔ بائیں جانب کے شیشے پر سرخ رنگ سے لکھا ہوا تھا "آفس" اور دائیں طرف والے دروازے پر "ڈائریکٹرز"۔ میں نے ڈائریکٹر کے کمرے کا دروازہ دھکیلا اور اندر سے بند پاکے دستک دی۔ دو منٹ بعد ایک لڑکی نے دروازہ کھول کے مجھے حیرانی اور خفگی سے دیکھا۔ وہ کوئی اینگلو انڈین تھی یا گوا کی رہنے والی۔ اسکرٹ پہنے ہوئے بائیس چوبیس سال کی سانولی سی اور بھرے بھرے بدن والی لڑکی جس کے لیے لباس بدن کی نمائش کا ذریعہ تھا۔ اس کے بال شانوں تک کٹے ہوئے اور کسی ماہر ہیئر ڈریسر کی محنت سے بنا ہوا مصنوعی ریشم کا ڈھیر تھے جو پھسل کر پھیلتا تھا اور سر کی ایک جنبش سے پھر سمٹ جاتا تھا۔ اس نے لپ اسٹک ابھی ابھی ٹھیک کی تھی۔

"یس؟" وہ انگریزی میں بولی۔ "کیا چاہیے تمھیں؟"

"مجھے مسٹر ڈی سلوا سے ملنا ہے۔" میں نے کہا۔

"سوری۔ وہ ابھی یورپ کے دورے سے واپس آئے ہیں اور آج کسی سے نہیں مل سکتے۔" وہ بولی۔ "لیکن میں ان سے پوچھ کے آپ کو کل کے لیے اپائنٹمنٹ دے سکتی ہوں۔ آپ یہاں انتظار کریں گے؟"

"کرنا ہی پڑے گا۔" میں نے کہا اور وہ تھوڑا سا مسکرا کے واپس ہوئی۔ دس سیکنڈ بعد میں اندر داخل ہوگیا اور اس طرح کہ اسے خبر بھی نہ ہوئی۔ قالین پر بے آواز قدموں سے چلتا ہوا میں تقریباً اس کے ساتھ ہی ڈی سلوا کے کمرے میں داخل ہوگیا۔ ڈی سلوا گھومنے والی کرسی پر بیٹھا تھا اور اس کے پاؤں میز پر رکھے تھے۔ اس نے کوٹ اتار کے کرسی کی پشت پر لٹکا دیا تھا اور ٹائی ڈھیلی کرکے قمیص کا اوپر والا بٹن کھول لیا تھا۔ اس کی سیکرٹری نے ایک دبی سی چیخ ماری جو برہمی، افسوس اور پریشانی کی علامت تھی۔ وضاحت کرنا چاہی کہ مجھے اس نے روکا تھا پھر مجھ سے مخاطب ہوئی کہ میں نے نامعقولیت کا ثبوت کیوں دیا پھر ڈی سلوا نے اسے روک دیا۔ میز پر سے پیر نیچے کیے اور سیدھا بیٹھ گیا۔ "تم پڑھے لکھے اور مہذب آدمی نظر آتے ہو۔" اس نے ایک گلاس کے باقی ماندہ مشروب کو حلق سے اتار کر "تمھیں تجربہ نہیں ہوا کبھی کسی بزنس ایگزیکٹیو کے کمرے میں جانے کا؟"

"اکثر ہوا ہے۔" میں نے کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "میں چار سال انگلینڈ میں بھی رہا ہوں اور ہر جگہ میں نے یہی دیکھا ہے کہ مالک کبھی اپنے ماتحتوں کے کمرے میں جانے کے لیے ان سے اپائنٹمنٹ نہیں لیتے۔"

"ناؤ لک ہیئر مین!" اس نے برا سا منہ بنایا۔ "تمھیں کوئی کام ہے مجھ سے تو بولو۔"

"مسٹر ڈی سلوا۔" میں نے اسی بے نیازی کے ساتھ جیب سے سگریٹ نکال کے لائٹر سے جلائی۔ "مجھے یہاں کی صورتِ حال دیکھ کر مایوسی ہوئی۔ آفس بند ہے، اسٹاف غائب ہے۔ کیا تمھیں دلاور نے اطلاع نہیں دی تھی کہ شرافت علی کو قتل کر دیا گیا ہے اور تمھیں فوراً واپس آجانا چاہیے۔ اگر نہیں دی تھی تو وہ سخت غیر ذمے دار آدمی ہے اور دی تھی تو تم...."

"واٹ از آل دس نان سنس؟" وہ میز پر مکا مار کے بولا۔ "ہو دی ہیل آر یو؟"

"ٹیک اٹ ایزی مسٹر ڈی سلوا!" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "میں اس کمپنی کا مالک ہوں۔ وزیر خان کا بیٹا سکندر بخت۔"

حسبِ توقع یہ ڈرامائی اعلان بم کا دھماکہ ثابت ہوا۔ ایک لمحے کے لیے ڈی سلوا کا سانس رک گیا اور اس کی آنکھیں مجھ پر جمی رہ گئیں۔ اس کی سیکرٹری کا رنگ اڑ گیا۔ اس نے فوراً مراجعت اختیار کی اور نکلتے ہوئے دروازہ بند کر گئی۔ ایئر کنڈیشنر ابھی ابھی چلایا گیا تھا چنانچہ کئی دن بند رہنے والے آفس میں محبوس ہوا کا اثر باقی تھا۔ "تمھیں یقین نہیں آرہا ہے کیا؟" میں نے نیم سنجیدہ لہجے میں کہا۔

ڈی سلوا ہوشیار اور ذہین آدمی تھا۔ اس نے فوراً خود کو سنبھال لیا اور مسکرایا۔ "نہیں، یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں مسٹر سکندر!" اس نے قطعی بدلے ہوئے لہجے میں کہا اور ہاتھ بڑھایا۔ "ویلکم ٹو پاکستان۔" وہ بڑا اچھا اداکار بھی تھا۔

"اوہ نو۔" میں نے ہاتھ ملا کے کہا۔ "کاش میں پاکستان نہ آیا ہوتا۔ میر شرافت علی کا قتل...."

"مجھے اس کا بہت افسوس ہے۔" وہ ہاتھ ملا کے بولا۔ "جب ہمبرگ میں مجھے دلاور کا کیبل ملا کہ اس کو کسی نے قتل کردیا ہے تو مجھے بالکل یقین نہیں آیا۔ اس کا تو کوئی دشمن نہیں تھا۔ ویری نائس مین۔ پرفیکٹ جنٹل مین۔ مگر میں فوراً واپس نہیں آسکتا تھا۔"

میں نے غور سے اس کی صورت دیکھی۔ "کیا تمھیں معلوم نہیں کہ اس کے قتل کا الزام مجھ پر ہے؟"

ڈی سلوا اچھل پڑا۔ "آپ پر.... اوہ نو!" اس نے سینے پر انگلی سے صلیب کا نشان بنایا لیکن اداکاری اچھی ہونے کے باوجود میں سمجھ گیا کہ وہ جانتے بوجھتے انجان بن رہا ہے۔ "یہ کیسے ہوسکتا ہے، آپ تو لندن میں تھے؟"

"ہاں، وہ پرانی بات ہے۔ تازہ ترین بات یہ ہے کہ پولیس نے قتل کا الزام مجھ پر عائد کیا تھا اور مجھے گرفتار کر لیا تھا لیکن میں ضمانت پر رہا کر دیا گیا اور اب مقدمہ چلے گا۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "لیکن اس سے یہ حقیقت نہیں بدلتی کہ میں اس کمپنی کا مالک ہوں۔"

"آف کورس...." وہ بولا۔ "لیکن مسٹر سکندر! آپ میری قانونی مجبوریوں کو درگزر کریں گے۔ اگر آپ نے قانونی کارروائی کے بعد عدالت سے وراثت کا سرٹیفکیٹ حاصل کرلیا ہے تو میں آپ کو مالک تسلیم کرتے ہوئے آپ کا ہر حکم ماننے کا پابند ہوں۔ آپ وہ سرٹیفکیٹ مجھے دکھا دیجیے۔ اس کی عدم موجودگی میں اگر میں آپ کو اس دفتر کی حدود میں قدم رکھنے سے بھی روکنا چاہوں تو اس کا مجاز ہوں۔"

"آف کورس۔" میں نے اسی کے لہجے میں کہا۔ "میں خود کوئی غیر قانونی کام پسند نہیں کرتا اور اس فرض شناسی کے مظاہرے کا بالکل برا نہیں مانوں گا۔ ویسے تمھاری اطلاع کے لیے.... وراثت کے سرٹیفکیٹ کے لیے کیس فائل کر دیا گیا ہے۔ اس میں وقت تو لگے گا مگر زیادہ نہیں۔ بہت سینئر ایڈووکیٹ میری پیروی کر رہے ہیں۔"

"وہ سب ٹھیک ہے۔" ڈی سلوا نے کہا۔ "آپ کے حقِ ملکیت کو کوئی چیلنج نہیں کر رہا ہے، لیکن وہ مرڈر چارج بہت سیریس ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ فیصلہ کیا ہوگا۔ میری خواہش ہوگی کہ آپ باعزت طور پر بری ہوجائیں مگر یہ قانونی معاملہ ہے کوئی بات قبل از وقت آپ بھی نہیں کہہ سکتے۔"

"ہاں پھانسی ہوگئی تو اور بات ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن عمر قید کی صورت میں بھی مالک میں رہوں گا۔"

"تاہم میں کسی الجھن یا قانونی چکر میں نہیں پڑنا چاہتا۔" اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ "آج تو آپ سیدھے اندر آگئے لیکن اگلی مرتبہ یہ خیال رکھیے کہ وراثت کا سرٹیفکیٹ ہاتھ میں ہونا چاہیے ورنہ آپ کو ٹریس پاس کرنے کے جرم میں پولیس کے حوالے کر دیا جائے گا۔"

"ایک موقع کیوں دے رہے ہو؟" میں نے کہا۔ "اسی وقت کوشش کیوں نہیں کرتے؟"

وہ کچھ دیر میری طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس نے جھک کر کھلی دراز میں سے کوئی چیز اٹھائی۔ جب اس کا ہاتھ سامنے آیا تو اس میں ایک ریوالور تھا۔ اس نے ریوالور کو میز پر رکھ دیا۔ "ناؤ۔ پلیز گیٹ آؤٹ۔" وہ بولا۔

"جیسی تمھاری مرضی۔" میں نے دونوں ہاتھ پھیلا کے اٹھتے ہوئے کہا۔ "یو آر دی باس۔"

میرا لہجہ اتنا نارمل اور شریفانہ تھا کہ میں نے اچانک میز الٹی تو وہ سنبھل نہ سکا۔ ریوالور پھسل کر نیچے گرا اور میز کا کونا لگنے سے وہ کرسی سمیت پیچھے گیا مگر کرسی کے گھوم جانے سے گرا نہیں۔ میز پھر سیدھی ہوگئی لیکن اس پر رکھا ہوا تمام سامان ٹیلیفون سمیت نیچے گیا تو آوازوں کا ملا جلا شور بلند ہوا۔ ڈی سلوا نے چیخ کر کہا۔ "یو باسٹرڈ۔" لیکن اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کرسکا۔ میں میز کے گرد گھوم کر اس کے مقابل جا کھڑا ہوا تھا اور اس نے جھک کر پھر ریوالور اٹھانا چاہا تو میں نے اپنا پاؤں اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اس کا دوسرا ہاتھ اوپر اٹھ گیا تھا۔ میں نے اس ہاتھ کو پکڑ کے جھٹکا دیا تو وہ الٹ کر کرسی کے پیچھے جا گرا۔ اسی وقت دروازہ دھماکے سے کھلا اور اس کی سیکرٹری بدحواسی کے عالم میں اندر داخل ہوئی۔ ڈی سلوا نے اٹھنے میں بڑی پھرتی دکھائی اور اٹھتے ہوئے.... میرے پیٹ میں مکا مارا جو کسی پیشہ ور باکسر کا مکا تھا اور کسی عام آدمی کے پیٹ پر پڑتا تو وہ وہیں ڈھیر ہوجاتا لیکن میں بروقت یہ وار سہنے کے لیے تیار ہوگیا تھا۔ مجھے بدستور اپنے قدموں پر کھڑا دیکھ کے ڈی سلوا حیران ہوا۔ اسی وقت میں نے اپنے دائیں ہاتھ کی کھڑی ہتھیلی سے اس کے شانے پر وار کیا۔ وہ کراہا اور اس کا دایاں آدھا جسم درد کی شدت سے مفلوج ہوگیا۔ وہ سہارے کے لیے جھکا اور کرسی پر گر گیا۔ اس کی سیکرٹری کو اچانک احساس ہوا کہ اس کے فرائض چیخ مارنے پر ختم نہیں ہوجاتے۔ وہ واپس پلٹ کے بھاگنے والی تھی کہ میں نے اس کو جا لیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کے اسے ڈی سلوا کی طرف پھینک دیا۔ اس نے دوسری چیخ بلند کی جو بالکل حقیقی خوف کی وجہ سے نکلی تھی۔ وہ میز سے ٹکرائی اور قالین پر گر گئی۔ "تمھاری سیکرٹری نازک اور نااہل ہے۔" میں نے کہا۔ "اس کو باہر کے کمرے سے ہی پولیس کو فون کرنا چاہیے تھا اور تم مالکوں کو کبھی شہزادہ مت

سمجھو مسٹر منیجر! بعض مالک اپنی حیثیت کو قانون کی مدد... کے بغیر بھی تسلیم کرانا جانتے ہیں۔ زورِ بازو سے۔ میں نے بلیک بیلٹ کے لیے کوشش نہیں کی ورنہ لے سکتا تھا مگر میں ہتھیار کے بغیر لڑنے کے فن سے اچھی طرح واقف ہوں۔"

"مجھے اب یقین آگیا ہے کہ تم نے میر شرافت علی کو ضرور قتل کیا ہوگا۔" وہ مجھے خون آشام نظروں سے گھورتا رہا۔ "لیکن میں تم سے سمجھ لوں گا۔ میرا نام ڈی سلوا ہے۔"

"اور میرا نام سکندر ہے۔ الیگزینڈر دی گریٹ کے نام پر۔" میں نے ریوالور اٹھاتے ہوئے کہا۔ "تم اگر اس یقین کی بنیاد پر عدالت میں میرے خلاف بیان دینے کے لیے آنا چاہو تو ضرور آنا۔ تمہاری یہ سیکرٹری دس منٹ میں اٹھ کھڑی ہوگی۔ اس وقت تک تم بھی ہلنے جلنے کے قابل ہو جاؤ گے۔ چاہو تو پولیس کو فون کر دینا۔ تمہارے لیے کچھ ثابت کرنا ذرا مشکل ہوگا کیونکہ اس وقت میں دوسری جگہ ہوں جہاں میری موجودگی کے گواہ وکیل اور ڈاکٹر قسم کے معتبر لوگ ہیں۔" میں نے ریوالور کو خالی کر کے گولیاں جیب میں ڈالیں۔ ریوالور کو رومال سے صاف کیا اور ڈی سلوا کی طرف پھینک دیا۔ اعشاریہ بتیس کی یہ گولیاں ہمارے کام آسکتی تھیں مگر اس وقت میں نے ان کو مٹھی میں یوں رکھا جیسے میرا ارادہ باہر جا کے ان کو پھینک دینے کا ہے۔ اس کے بعد میں اطمینان سے نیچے اتر گیا۔ مال روڈ چند قدم کے فاصلے پر تھی اور ریگل کے بس اسٹاپ پر مجھے رکشا مل گیا جس نے گیارہ بجے مجھے میو ہسپتال پہنچا دیا۔ ہسپتال کے اندر پھرنے والے ایک بچے سے میں نے دو اردو کے اور ایک انگریزی کا اخبار خریدا اور امراضِ قلب کے وارڈ میں پہنچا تو مجھے محسن اور رابعہ برآمدے میں کھڑے دکھائی دیے۔

"ابھی تک تو سب خیریت ہے۔" رابعہ نے میرے پوچھنے پر کہا۔ "ڈاکٹر چوبیس گھنٹے پورے ہونے سے قبل کوئی بات یقین کے ساتھ بتانے کے لیے تیار نہیں اور نہ ایک نظر دیکھنے کی اجازت دینے کے لیے۔"

"میرا خیال ہے تم گھر جاؤ۔ کچھ دیر آرام کر لو۔" میں نے کہا۔ "رات بھر جاگتی رہی ہو۔ شام کو آجانا۔"

"جاگتے تو تم بھی رہے ہو۔" وہ بولی۔ لیکن میرے اور محسن کے اصرار پر وہ جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ میں نے کہا کہ ہم ابھی تو یہاں موجود ہیں اور اگر گئے بھی تو ایک ساتھ نہیں جائیں گے یا وقفے وقفے سے چکر لگاتے رہیں گے۔

اس کے جانے کے بعد محسن اور میں برآمدے کے سامنے مختصر سے پارک میں لگی ہوئی بنچ پر جا بیٹھے جس کے اوپر ایک درخت چھتری کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ اخبار دینے کے بجائے میں نے اسے ڈی سلوا سے اپنی مڈبھیڑ اور غلام علی سے حاصل ہونے والی معلومات کے بارے میں بتایا۔ "پہلے شک تھا اب یقین ہے کہ منیجر اسی گروہ کا ایک اہم رکن ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر شرافت علی اور دلاور مل کر یہاں کے معاملات کو سنبھالتے تھے تو ڈی سلوا آگے لائن ملاتا ہے اور کلیئر رکھتا تھا۔ وہ یورپ کا دورہ کر کے لوٹا ہے جو ظاہر ہے اپنے ناجائز کاروبار کے فروغ کے لیے ہوگا۔ اس نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی کہ اسے میرے بارے میں کچھ نہیں معلوم... یار! جب وہ تسلیم کرتا ہے کہ اسے دلاور کا کیبل ہیمبرگ میں ملا تھا جس میں قتل کی اطلاع دی گئی تھی تو کیا یہ ہو سکتا ہے کہ واپس آ کے وہ دلاور سے نہ ملے۔ تفصیلات نہ پوچھے اور اطمینان سے اپنے پرائیویٹ آفس میں شراب و شباب کے شغل فرمانے لگے۔ مجھے ڈی سلوا بھی دلاور سے کم خطرناک نہیں لگتا۔ فرق صرف یہ ہے کہ ڈی سلوا نوجوان اور جوشیلا ہے، دلاور ٹھنڈے دل و دماغ کا آدمی ہے۔ اگر اس نے فون کر کے دلاور کو بتایا کہ سکندر سے مارپیٹ ہو گئی ہے تو دلاور اسے ہی قصوروار ٹھہرائے گا کہ مشتعل ہونے کی کیا ضرورت تھی اور وہ معاملے کو آگے نہیں جانے دے گا۔ ڈی سلوا سے ملنے کا مقصد تو صرف یہ تھا کہ غلام علی نے جو کچھ بتایا ہے اس کی تصدیق ہو جائے۔"

"ہاں، یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ وہ جھوٹا آدمی ثابت ہوتا۔" محسن نے کہا۔ "مگر غلام علی سے ملنا بہت اچھا رہا۔ میں نے یہاں سے فون پر بات کی تھی منظور صاحب نے بتایا ہے کہ پوسٹ مارٹم کے لیے کیس فائل کر دیا گیا ہے اور ایک دو دن میں سماعت ہوگی۔ گواہ تیار رہیں۔ ویسے سکندر! جانے کیوں یہ مجھے ٹھیک نہیں لگتا۔ ایک اندیشہ ہے کہ پوسٹ مارٹم سے کچھ ثابت نہیں ہوگا۔ اور فرض کرو ہوا بھی تو قتل کا شبہ کس پر ظاہر کیا جائے گا؟ میر شرافت علی تو مر گیا۔ دلاور یا ڈی سلوا وغیرہ کو براہِ راست ملوث نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے خلاف ہمارے پاس کوئی شہادت نہیں۔ میں بھی زیادہ پُرامید نہیں۔"

"مسئلے کے دو پہلو ہیں محسن!" میں نے کہا۔ "ایک یہ کہ متوفی وزیر خان کی موت طبعی اسباب کا نتیجہ تھی یا نہیں اور دوسرا یہ کہ موت طبعی نہیں تھی تو قاتل کون ہے۔ دوسرے سوال کا جواب اتنا اہم نہیں جتنا ایک سازش کے وجود کو ثابت

کرنے کے لیے میرے والد کی موت کا قتل ثابت ہونا۔ اس سے میرے کیس کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ یہ تو ثابت ہو ہی جائے گا کہ ایک لکھ پتی کیسی غربت میں مرا اور کس طرح مالک کے پرانے نمک خواروں کو اندھیرے میں رکھا گیا۔ اس کا ذمے دار کوئی تو تھا؟"

"ہاں! اور جب یہ طے ہو جائے گا کہ میر شرافت علی تھا تو یہی تیرے خلاف انتقامی کارروائی کے الزام کا ناقابلِ تردید ثبوت بھی بن جائے گا تو یہ سوچ کہ جس بیٹے کو اچانک معلوم ہو کہ ایک شخص نے بلیک میل کر کے اس کے بوڑھے باپ کو لکھ پتی سے فقیر کر دیا۔ ذلت و رسوائی کی اس حد تک پہنچایا اور پھر قتل کرا دیا۔ اس کا ردِعمل کیا ہوگا؟" محسن نے کہا۔

"مجھے خدا پر بھروسہ ہے۔" میں نے کہا۔ "مظلوم میرا باپ بھی تھا اور میں بھی ہوں۔ ظالم کی رسی کہاں تک دراز ہو گی؟"

محسن نے مزید کچھ نہیں کہا اور مجھ سے ایک اخبار لے لیا۔ دوسرا اخبار میں نے دیکھا۔ اس میں شہر کی خبروں کے صفحے پر دو خبریں تھیں۔ ایک میں چراغ دین کی کوٹھی کے سرونٹ کوارٹر سے ملنے والی سلامت شاہ کی لاش کا ذکر سیاق و سباق کے حوالے سے تھا چنانچہ اس میں میرا نام بھی آیا تھا تاہم مجھ پر کسی قسم کے شبہے کا اظہار نہ پولیس نے کیا تھا جن کے نزدیک وہ صفائی کا سب سے اہم گواہ تھا اور نہ چراغ دین نے۔ اس نے اور گلاب خان چوکیدار نے اپنے بیان میں یہی کہا تھا کہ متوفی بہت ہی شریف النفس انسان تھا اور اس سے کسی کی دشمنی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ حسبِ معمول پولیس نے نامعلوم قاتلوں کے خلاف مقدمہ درج کر کے تفتیش شروع کر دی تھی۔ دوسری بہت مختصر خبر ایک گمنام مزار کے کھنڈر سے ملنے والی کسی فقیر کی مسخ شدہ لاش کے بارے میں بھی تھی جس کی شناخت نہیں ہو سکی تھی۔ فقیر۔ نوما نجو نے میرے کان میں کہا۔ فقیرانہ آئے صدا کر چلے۔ میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے۔ لوگ ہمیں ملنگی اور ہم خود کو نوما نجو کہتے تھے۔ ویسے تھے فقیر۔ مزاج کے اعتبار سے بھی، مالی طور پر بھی، حلیے سے بھی، صورت سے بھی۔ ہوئے مر کے ہم جو رسوا تو کیا ہوا۔ زندگی میں کون سے عزت دار تھے؟

"سکندر!" محسن نے اخبار رکھ کے کہا۔ "تو نے دلاور کی صورت تو نہیں دیکھی تھی نا! پھر تو اسے کیسے پہچانے گا؟"

"پہچان لوں گا۔ وہ آواز سے شناخت ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔ "بے شک وہ اس وقت آواز بنا کے بول رہا ہوگا مگر پھر بھی کہیں نہ کہیں لہجہ چغلی کھائے گا۔ اس کے علاوہ میں دیکھوں گا کہ وہ کس حد تک شاک پروف ہے۔"

"میرا خیال ہے اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔" محسن نے کہا۔ "اوّل تو مجھے تیرا یہ دعویٰ مبالغے پر مبنی نظر آتا ہے کہ تو اسے آواز اور لہجے کی کسی لغزش سے پہچان لے گا۔ پھر یہ کہ تو نے اسے پہچان لیا اور اس نے مان لیا کہ میں ہی چوہدری دلاور ہوں فرمائیے آپ کی کیا خدمت کروں تو تو کیا کہے گا اس سے کہ ذرا چلیے تھانے آپ سے کچھ اعترافِ جرم کرانا ہے؟ کیا ثبوت ہے تیرے پاس کہ اس رات تجھے ہوٹل سے اٹھا کے لے جانے والا یہی چوہدری دلاور تھا۔ وہ کہے گا جناب آپ پیے ہوئے تو نہیں ہیں۔ اس رات میں فلاں جگہ برتھ ڈے پارٹی میں شریک تھا اور اس ہدایت کار کسی کو ٹھی کا کیا مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ اس نام کا کوئی ہدایت کار ہے۔ ہدایت کار ہوتا کیا ہے ویسے؟ کیا جواب دے گا تو اسے؟ اگر حماقت میں آپ نے ایک قدم آگے بڑھاتے ہوئے یہ کہا کہ بدمعاش! اس چوکیدار کو کس نے مارا تھا جس کی لاش انڈر گراؤنڈ واٹر ٹینک میں پڑی ہے تو وہ کہے گا اچھا؟ آپ نے دیکھی ہے؟ پھر تو فوراً پولیس کو بتانا چاہیے۔"

میں ہنس پڑا۔ "یہ سب امکانات میرے ذہن میں ہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن میں ایسی کوئی بات نہیں کروں گا۔ میں اس سے خود کو متعارف کراؤں گا۔ اسی طرح جیسے میں نے خود کو ڈی سلوا سے متعارف کرایا تھا۔ اس سے معلوم کروں گا کہ ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس کے حصے داروں کی قانونی پوزیشن کیا ہے۔ اس کے کتنے مالک بن گئے تھے۔ اور وزیر خان مرحوم اگر پارٹنر تھے تو ظاہر ہے ان کا وارث میں ہوں اور میں اس لیے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے وراثت کے سرٹیفکیٹ کے لیے کیس فائل کر دیا ہے۔ اداکاری مجھے کرنی ہے اور اسے یقین دلانا ہے کہ میں جانتے بوجھتے اسے یہ بتانے آیا ہوں کہ میرا حقِ وراثت سے دستبردار ہونے کا کوئی ارادہ نہیں۔ میں اس کی دی ہوئی ایک مہینے کی مہلت کی پروا نہیں کرتا چنانچہ میں نے حقِ وراثت کا کیس فائل کر کے اسے چیلنج کر دیا ہے کہ اب وہ جو چاہے کرے میں اس سے نہیں ڈرتا۔ وہ مشتعل ہوگا، اور اس کا ردِعمل فوری ہوا تو وہ وہیں مجھے بتا دے گا۔ دوبارہ مجھے دھمکی دے گا کہ برخوردار! میں نے کہا تھا، کسی خوش فہمی میں مبتلا مت ہونا کہ ایک بار یہاں سے نکل گئے تو ہماری دسترس میں نہیں رہو گے۔ قانون کا تحفظ تمہیں بچا لے گا یا تم اپنی ذہانت اور چالاکی سے کام لے کر بچ جاؤ گے۔ وہ اپنا کمرہ بند کر کے مجھ سے یہ بات کہہ سکتا ہے لیکن وہ بہت ٹھنڈے دل و دماغ سے کام لے گا تو اس وقت کچھ ظاہر نہیں ہونے دے

گا مگر آج کل میں پھر کوئی قدم اٹھائے گا۔"

"یعنی تو چاہتا ہے کہ استاد پیڈرو اینڈ کمپنی تجھے پھر اٹھا لے جائے اور ایک مرتبہ پھر وہی سبق بہتر طور پر دے۔" محسن نے کہا

"ہاں۔ پہلی بار انہوں نے بے خبری میں مجھے آ لیا تھا۔ اور میں خالی ہاتھ تھا۔" میں نے کہا۔ "اس مرتبہ میں ان کا انتظار کروں گا اور میرے پاس بھی بھرا ہوا ریوالور ہوگا۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ناجائز طور پر حاصل ہونے والا اسلحہ استعمال کرنے سے ایک اور مصیبت کھڑی ہوسکتی ہے چنانچہ میں اس سے فائر کروں گا بھی تو کسی کو نشانہ نہیں بناؤں گا مگر فائدہ پورا اٹھاؤں گا ہاتھ میں ریوالور ہو تو گولی چلائے بغیر بھی حریف پر غلبہ حاصل رہتا ہے۔ میں چاہتا ہوں ان میں سے کوئی میرے ہاتھ لگ جائے تو میں بھی اس سے کچھ پوچھوں۔ وہ سب باتیں جو میرے لیے جواب طلب ہیں۔ قانون کی مدد سے میں ان کو کسی اعترافِ جرم پر مجبور نہیں کرسکتا اور ان کو کسی انصاف کی عدالت میں کھینچ کر نہیں لے جا سکتا اس لیے کہ میرے پاس ثبوت، شہادت اور گواہ نہیں۔ میں ان کو انہی کے طریقے آزما کے زیرِ دام لانا چاہتا ہوں۔ دیکھنا یہ ہے کہ بڑا شکاری کون ہے۔ اگر ملاقات کے دوران میں خود دلاور نے اپنے آپ کو مجھ پر ظاہر کردیا تو یہ کھلی جنگ ہوگی ورنہ اگلی مرتبہ کی شوٹنگ کہیں اور ہوگی محسن! کردار جگہ بدل لیں گے۔ استاد پیڈرو کی جگہ تو لے سکتا ہے۔ دلاور کی جگہ میں اور میری جگہ دلاور۔ ہم بھی کوئی خالی کوٹھی تلاش کرلیں گے۔"

"تو دلاور کو اغوا کرنے کا پروگرام بنا رہا ہے؟" محسن نے کہا۔ اس کی دلچسپی اچانک بڑھ گئی تھی۔

"ابھی تک بنایا تو نہیں مگر بنایا جاسکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "پہلے میں اسے پہچان لوں۔ شکاری کو بہت محتاط ہوکے جال پھیلانا چاہیے اور اپنے شکار کی نفسیات کو سمجھ کے وقت اور مقام کا انتخاب کرنا چاہیے ورنہ وہ خود شکار ہو جاتا ہے۔ یہ آنکھ مچولی ہے جو شکار اور شکاری کے درمیان آخری معرکے تک چلتی ہے۔ پہلے میں شکار تھا اب شکاری ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ زبردست ہوں۔ دلاور چیتے کی طرح چالاک، عیار اور سفاک ہے لیکن میں خود کو اس سے کمتر نہیں سمجھتا۔ وہ نہ سہی استاد پیڈرو میرے ہاتھ آجائے۔ تفتیش کے سارے طریقے میں جانتا ہوں۔ دیکھ چکا ہوں اور بھگت چکا ہوں۔ کتابوں میں پڑھ چکا ہوں اور ایجاد کرسکتا ہوں۔ قسم خدا کی اگر وہ پتھر کا مجسمہ بھی ہو تو میں اسے سچ بولنے پر مجبور کردوں گا۔ ان حرامزادوں نے ایک بوڑھے بیمار کے ساتھ

جو کچھ کیا ہے اس کے بعد شرافت کے کسی سلوک کی گنجائش کہاں رہی ہے۔" میں بات کرتے ہوئے سخت مشتعل ہوگیا تھا۔ میرے کانوں کی لویں گرم ہوگئی تھیں اور خون کے سر میں کھنچ کر آجانے سے میرا چہرہ دہکنے لگا تھا۔

"تیرے دماغ کا ریڈی ایٹر گرم ہوگیا ہے۔" محسن نے کہا۔ "ایسے گاڑی نہیں چلے گی۔ بات کرتا ہے عقل اور ذہانت کے کھیل کی اور جذبات کی لہر آتی ہے تو خود پر قابو نہیں رہتا۔ شکاری کی دم! پہلے اپنی نفسیات تو ٹھیک رکھ۔ کسی اور کی نفسیاتی کمزوری سے فائدہ اٹھانے سے پہلے یہ دیکھ لے کہ تیری اپنی کمزوری کیا ہے ورنہ وہی ہوگا کہ شکار کھیلنے گیا اور شکار ہوکے چلے۔"

"معاف کرنا یار! آج پہلی مرتبہ ایسا ہوا ہے۔" میں نے کہا۔ "پہلے کبھی مجھے مشتعل ہوتے دیکھا تو نے؟ مگر آدمی ہوں لہٰذا خطا سے مبرا نہیں۔ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ سالارِ اعظم اقبال نے فرمایا ہے کہ اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل۔ تو میرا پاسبانِ عقل ہے۔"

"مگر اگلے مصرعے میں شاعر نے فرمایا ہے ۔ لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے۔ تو برادرِ نسبتی! دلاور سے ملنے آپ اکیلے جائیں گے۔ اسے براہِ راست مجھ سے غرض نہیں اور تیرے ساتھ جا کے میں اعلانیہ اس جنگ میں شریک ہونا اچھا نہیں سمجھتا۔"

"میں جاؤں گا کھانے کے وقفے کے بعد۔" میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ "ابھی ایک بجا ہے۔ چل ہم بھی کہیں ماحضر تناول فرماتے ہیں۔ اس کے بعد تو واپس اسپتال آ میں شاہدرہ چلا جاؤں گا مگر پہلے بڑی بی کے بارے میں پوچھ لیں۔"

ہم نے ایک ڈاکٹر سے ملاقات کی۔ اس نے کہا کہ صورتِ حال زیادہ تبدیل تو نہیں ہوئی ہے لیکن کچھ امید پیدا ہوچلی ہے کہ خطرہ ٹل گیا ہے۔ رات تک افاقہ جاری رہا تو کل صبح ان کو اس یونٹ سے پرائیویٹ وارڈ میں منتقل کردیا جائے گا۔ اس کے بعد ایک نظر دیکھنے کی اجازت ہوگی مگر بات کرنے کی نہیں۔ ہمارے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ شاید دس دن بعد ان کی حالت اس حد تک بہتر ہوجائے کہ وہ بات کرسکیں لیکن کم سے کم ایک مہینے تک ان کو بستر سے اٹھنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ یہ مدت چھ ماہ بھی ہوسکتی ہے۔ سیڑھیاں چڑھنے، وزن اٹھانے، محنت مشقت کا کوئی کام کرنے اور فکر و غم سے بچنے کی احتیاط تو تمام عمر کرنی ہوگی۔

میں اور محسن ہسپتال کے عقبی دروازے سے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کی طرف والی سڑک سے نیلا گنبد تک گئے۔ نعمت کدہ پہنچنے کے لیے انارکلی کے دوسرے کنارے تک جانے کے بجائے میں نے پاک ٹی ہاؤس کو ترجیح دی اور ہم بائیں جانب ہوسٹل کی عمارت کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ بنک اسکوائر کی طرف سے کاریں مسلسل آجا رہی تھیں۔ اچانک میرے قدم رک گئے۔ میں پلٹ کر نیلے رنگ کی اس ٹویوٹا کراؤن کار کو دیکھنے لگا جو چند سیکنڈ میں مال روڈ کی طرف سے آکے سیدھی انارکلی کے چوک کی طرف نکل گئی تھی۔ آگے بھیڑ تھی چنانچہ میں یہ نہ دیکھ سکا کہ وہ کار دائیں جانب مڑی یا سیدھی اس سڑک پر گئی جو لاء کالج کے سامنے سے گزر کے ضلع کچہری والی سڑک سے جا ملتی تھی اور پھر بائیں طرف وہی راستہ تھا جو بادشاہی مسجد اور منٹو پارک کی طرف سے راوی کے پل کی طرف جاتا تھا۔ پل کے دوسری طرف سے شاہدرہ کا علاقہ شروع ہوتا تھا جہاں "ایم ڈبلیو ڈی" انجینئرنگ کمپلیکس بھی تھا۔

"کیا بات ہے؟" محسن نے اخبار لپیٹ کر ڈنڈے کی طرح میرے شانے پر بجایا۔

"ابھی ایک کار گزری تھی، نیلے رنگ کی ٹویوٹا کراؤن۔" میں نے کہا۔ "غالباً وہ ڈی سلوا کی کار تھی۔ ڈی سلوا کو میں نہیں دیکھ سکا مگر مجھے شک یہ ہوا کہ اس میں پیڈرو بیٹھا تھا۔"

"نیلے رنگ کی ٹویوٹا کراؤن؟ ایسی گاڑیاں تو شہر میں دو چار ہی ہوں گی۔ اگر ایک ہی ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔" محسن بولا۔ "نمبر یاد نہیں؟"

"نمبر یاد تو ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس وقت نہیں دیکھ سکا۔"

دو بجے میں نے محسن سے کہا کہ آنے جانے اور چوہدری دلاور سے ملاقات کرنے میں زیادہ سے زیادہ تین گھنٹے صرف ہوں گے اور میں شام پانچ بجے تک لوٹ آؤں گا۔ امید ہے اس وقت تک رابعہ بھی آجائے گی اور ہم رات کو رابعہ کو اس کے گھر پر چھوڑ کے ضامن رضوی صاحب سے کیے ہوئے فیصلے کے مطابق رات کا کھانا ان کے گھر پر ان کے ساتھ کھا سکیں گے۔ پھر محسن واپس چل پڑا اور میں نے وہیں سے رکشا پکڑا۔ رکشا والے نے فراخدلانہ پیشکش کی کہ میں پچیس روپے سکہ رائج الوقت علاوہ کرایے کے ادا کروں تو وہ مقبرۂ جہانگیر کے باہر ایک گھنٹہ میرا انتظار کرے گا مگر میں نے کہا کہ مجھے شاہدرہ میں چھوڑ کے وہ جب تک چاہے جہانگیر کے مقبرے کے باہر میرا کا چاہے انتظار کرے۔ چونکہ مجھے جہانگیر کے مقبرے جانا

ہی نہیں، اس لیے میں کرایہ بمطابق میٹر نذر کرسکتا ہوں اور کچھ نہیں۔ بعد میں یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ میٹر کی رفتار رکشا کی رفتار سے کتنی زیادہ تھی اور میٹر کس حد تک مالک کے ذہن کے تابع تھا۔ اس نے جو کرایہ ظاہر کیا وہ اصل سے تقریباً پچیس روپے زیادہ ہی تھا۔ ابھی میرا احتجاج اور اس احتجاج پر ڈرائیور کا احتجاج شروع ہی ہوا تھا کہ ایک سارجنٹ نمودار ہوا جسے میں نے فوراً پہچان لیا۔ "ارے حشمت خان!" میں نے صدا لگائی اور ڈرائیور نے بعجلت تمام فرار ہونے میں بہتری دیکھی۔ اس نے یہ نہیں دیکھا کہ حشمت خان نے اس بے تکلفی سے پکارے جانے کا کتنا برا منایا ہے۔ اس نے دھواں دھار بھاری بھرکم موٹر سائیکل ایک طرف روک لی۔

"کیا بات ہے؟" اس نے خالص تھانیداری لہجے میں پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ بس تمہاری خیریت پوچھنی تھی۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس سے رکشا والے کو نقصان ہوگیا۔ جائز کرایہ تک چھوڑ کے بھاگ گیا ورنہ پچیس روپے زیادہ مانگ رہا تھا۔"

حشمت خان نے رکشا والوں کی شان میں چند الفاظ کہے۔ مجھے خوشخبری دی کہ انشاءاللہ چودہ دن بعد چالان پیش کردیا جائے گا اور امید ظاہر کی کہ اب فیصلے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ میں اس کا اشارہ سمجھ گیا۔ اسے سلامت شاہ کے مارے جانے کے بعد میرے تختۂ دار تک پہنچنے کے امکانات خاصے روشن نظر آنے لگے تھے۔ پھر چلتے چلتے اس نے پوچھا کہ میں کہاں پھر رہا ہوں اور میں نے کہا مقصد ایصالِ ثواب و فاتحہ خوانی ہے کہ مزار مبارک میرے جدِ امجد کے آقائے ولی نعمت فرمانروائے اقلیم ہند شیخو عرف سلیم پسرِ جلال الدین الموسوم بہ ..."

"اچھا اچھا۔" حشمت خاں نے کہا۔ "بابا شیخو کے مزار پر فاتحہ پڑھنے آئے ہو۔ یہاں کسی سے پوچھ لو۔ مجھے تو معلوم نہیں۔" اور روانہ ہوگیا۔ میں نے مقبرۂ جہانگیر کے پرشکوہ میناروں پر نگاہ ڈالی جن کی بلندی درختوں کی سرسبزی اور سرفرازی میں بھی نمایاں تھی اور ہندوستان کے اس عظیم انصاف پرور شہنشاہ کی روح سے معذرت چاہی کہ اگر بیسوی صدی کا ایک تھانیدار اتنا جاہل ہے تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ پھر میں نے "ایم ڈبلیو ڈی" انجینئرنگ کمپلیکس کی جستجو کا آغاز کیا۔ اکثر لوگ پی ڈبلیو ڈی کا پتا بتانے پر آمادہ ہوئے

لیکن بالآخر ایک خضرِ راہ نے میری منزل تک رہنمائی کی اور مجھے تقریباً ایک ایکڑ پر محیط کارخانے کے دروازے تک پہنچا گیا۔ فیکٹری آدھے رقبے پر پھیلی ہوئی تھی اور مخروطی چھت والی چار لمبی لمبی بیرکوں کے علاوہ سرخ اینٹوں کی ایک عمارت پر مشتمل تھی۔ جس کا رنگ گہرا سرخ تھا۔ بند گیٹ کے اوپر نیم دائرے کی صورت میں سائن بورڈ نصب تھا اور بائیں طرف کی دیوار پر "کوئی جگہ خالی نہیں ہے" کا بورڈ آویزاں تھا جو کامل بے حسی کے ساتھ تمام بیروزگار اور تلاشِ معاش میں سرگرداں لوگوں کو کسی اور در پر جانے کا مشورہ دے رہا تھا جہاں اسی قسم کے دوسرے بورڈ پہلے سے موجود تھے۔ گیٹ کے باہر آٹھ فٹ لمبا چوڑا پختہ کیبن تھا جس کی کاؤنٹر ٹائپ کھڑکی کے پیچھے ایک اسمارٹ نوجوان بیٹھا جیمز بونڈ کا نیا ناول پڑھ رہا تھا۔

"مجھے چوہدری دلاور سے ملنا ہے۔" میں نے صاحب کے لفظ کو عمداً گول کر دیا اور بلاوجہ مسکرایا۔

نوجوان نے چونک کر مجھے دیکھا۔ "کیا نام ہے آپ کا؟" اس نے ناول رکھ کے انگریزی میں کہا۔ "اور کام کیا ہے ان سے؟"

"کیا؟" میں نے کہا۔ "ذرا اردو میں یا پنجابی میں بتاؤ۔ مجھے انگریزی نہیں آتی۔"

نوجوان نے مجھے مشتبہ نظروں سے دیکھا اور اپنی بات دہرائی اور میرے جواب کا انتظار کرنے لگا۔

"نام اور کام بتلائے بغیر ملاقات نہیں ہو سکتی؟" میں نے کہا۔ نوجوان نے نفی میں سر ہلایا۔

"ابھی یہاں نیلے رنگ کی ایک کار آئی تھی ٹویوٹا کراؤن؟" میں نے اندھیرے میں تیر چلایا جو نشانے پر بیٹھا۔

"وہ ڈی سلوا صاحب کی گاڑی تھی۔ وہ چلے گئے۔" نوجوان نے مجھے مطلع کیا۔ میرا رویہ اس کے لیے پُراسرار ہونے لگا تھا۔

"ہاں۔ ان کے ساتھ کوئی اور بھی تھا۔ تم نے دیکھا تھا؟" میں نے اپنے پُراسرار رویے کو برقرار رکھا۔

"کوئی تھا تو سہی۔ میں نے غور نہیں کیا کون تھا۔" نوجوان بولا۔

"تمہیں غور کرنا چاہیے۔ تمہیں یہاں اسی لیے بٹھایا گیا ہے۔ آئن فلیمنگ کے جاسوسی ناول ضرور پڑھو مگر غور ضرور کرو۔ وہ آدمی میں تھا۔ کیا اب میں جا سکتا ہوں؟"

نوجوان نروس ہو گیا تھا۔ اس نے کھڑکی سے منہ نکال کے چوکیدار کو آواز دی کہ صاحب کو جانے دو۔ میں ... گیٹ کے درمیان کھل جانے والے چھوٹے گیٹ ... احاطے میں داخل ہوا اور الٹے ہاتھ پر بنی ہوئی ... کی سرخ عمارت کے برآمدے میں چلنے لگا جو ... کے دروازے پر "ڈائریکٹر" کا بورڈ تھا۔ میں نے دروازے کو دھکا دیا اور اندر داخل ہو گیا۔ ایئرکنڈیشنڈ کمرے ... کسی آواز کے بغیر آہستہ آہستہ خود بند ہو گیا۔ کمرہ ... ہال کے چوتھائی حصے کے برابر لمبا تھا جسے لکڑی اور ... والے دارا اندھے شیشے کی پارٹیشن سے چوڑائی کے ... گیا تھا اور میرے سامنے پندرہ فٹ تک پھیلا ہوا ... شروع کے حصے میں قالین والے فرش پر دیوار کے ساتھ ایک صوفہ سیٹ تھا اور اس کے مقابل پارٹیشن ... آخری حصے میں چھ فٹ چوڑی گلاس ٹاپ ٹیبل پر بہت ... کاغذات پھیلے ہوئے تھے اور دو ٹیلی فون رکھے تھے ... انٹرکام تھا اور ایک ٹائپ رائٹر۔ ٹیوب لائٹ میز کے ... وسط میں چھت سے آویزاں تھی۔ خود میز پر بیٹھنے والا ... تھا۔ اس کی خالی کرسی کے پیچھے اسٹیل کی ایک الماری ... دو فائل کیبنٹ تھے۔ میں نے پارٹیشن وال کے درمیانی ... سے بقیہ تین چوتھائی ہال میں قدم رکھا جو اب پندرہ فٹ چوڑا اور بیس فٹ لمبا کمرہ بن گیا تھا۔ اس کمرے میں ... ٹو وال کارپٹ تھا جس کا رنگ زرد تھا اور اس میں ... پھول تھے۔ کھڑکیوں اور دروازے پر گہرے نیلے ریشمی ... تھے جن میں سرخ لکیریں سی جھلملاتی تھیں اور اوپر ... رنگ کی جھالر تھی۔ بائیں ہاتھ کے گوشے میں لمبی سی ... ٹیبل کے گرد دو صوفہ سیٹ لگے ہوئے تھے اور میز ... گل دستہ رکھا تھا —— بائیں گوشے میں ... تین فٹ چوڑی میز تھی جس کی شکل کچھ انسانی گردے ... ملتی جلتی تھی۔ اس قوس کے پیچھے ایک گھومنے والی کرسی تھی اور دوسری طرف مہمانوں کے لیے چھ کرسیاں نیم ... بناتی تھیں۔ ایک شخص میز پر ہاتھ رکھ کے جھکا ہوا اس کو کچھ سمجھا رہا تھا جو کرسی پر بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھنے نے باتوں کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ جو شخص کھڑا تھا ... ہی ہو سکتا تھا یعنی باہر کے کمرے میں بیٹھنے والا۔ کرسی ... ہوئے شخص نے اطمینان سے پشت کا سہارا لے لیا۔

میرے ذہن میں دلاور کی صورت کا کوئی تصور ... میں نے صرف اس کا متحرک سایہ دیکھا تھا جس کی حرکات ... سکنات واضح تھیں۔ اس کے سگریٹ پینے، سر ہلانے

کرنے کا اور پہلو بدلنے کا انداز میرے ذہن میں تھا اور ان سب باتوں کو ذہن میں رکھ کے میں یہ کہہ سکتا تھا کہ کرسی پر بیٹھا ہوا شخص قد و قامت اور جسمانی ساخت کے اعتبار سے وہی چوہدری دلاور ہے۔

"چوہدری دلاور؟" میں نے اس کے سوالیہ نشان بن جانے والے چہرے کو دیکھ کر کہا۔ "میں سکندر بخت ہوں۔"

کلین شیو، سرخ و سفید صحت مند چہرے پر آہستہ آہستہ مسکراہٹ پھیلی اور وہ اطمینان بلکہ کاہلی سے تھوڑا سا اٹھا۔ "آیئے آیئے۔" اس نے ہاتھ بڑھا کے نیم خواندہ پنجابی لہجے میں کہا۔ "ابھی ابھی اپنے وہ آئے تھے۔ کی ناں اے اوناں دا، ڈی سلوا صاحب؟" اس نے میز پر ہاتھ مارا اور نام بروقت یاد آ جانے پر داد طلب نظروں سے سیکرٹری کو دیکھا۔ "وہ آخ گئے تھے۔ بوت کچھ۔ کیوں بھئی؟" سیکرٹری نے اقرار میں سر ہلایا۔

"اچھا اچھا۔" میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "وہ شکایت کرنے آئے ہوں گے۔"

دلاور بے ڈھنگے پن سے ہنسا۔ "شکایت تو سارے زمانے کو سارے زمانے سے ہے۔ کیوں بھئی؟" اس نے سیکرٹری کی طرف دیکھا اور وہ عادی معلوم ہوتا تھا چنانچہ اس نے فوراً سر ہلا کے تائید کی۔ "چھڈو پراں۔ میں نے کہا اوئے تو بھی تو بڑی گرمی کھاتا ہے۔ تھوڑی نرمی بھی رکھ مزاج میں۔ پر وہ تھوڑا اسرور میں تھا۔ سمجھ گئے ناں آپ؟ اپنا دیسی صاب ہے نا۔ چسکی مُسکی لگا لیتا ہے کبھی۔"

"مجھے اندازہ ہو گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "چسکی اور مُسکی دونوں سے دفتر ہی میں شوق کر رہے تھے۔ غالباً یورپ میں بلانے رکھتے رہے۔"

دلاور نے فلک شگاف قہقہہ مارا۔ "او بھئی کمال کر گل کیتی اے۔ روزے۔ ہاہاہا... چسکی اور مُسکی۔ ہاہاہا۔" پھر ہنسی اچانک یوں بند ہوئی جیسے بجلی جانے سے ریڈیو بند ہوتا ہے۔ "تو کی سُن ریا ایں بھئی، جا پُتر! اپنا کام کر باہر بیٹھ کے اور کوئی لسی پانی بھیج اندر۔ کیوں بھئی اپنے سکندر صاب! آپ تو ادھر ولایت سے آئے ہو۔ لسی تو ہم دیسی بندے پیتے ہیں۔ آپ بور جائے چلے گی کہ کافی؟"

"اگر کافی مل جائے تو..." میں نے سیکرٹری کی طرف دیکھ کے کہا جو روانہ ہو کے رک گیا تھا۔ میری بات سن کے وہ پھر چل پڑا۔

"اس کو سمجھا دیا ہے میں نے۔ آپ بالکل فکر مت کرو۔" دلاور نے پھر مجھ سے مخاطب ہو کے کہا۔ "میں نے کہا او یار! پہلے ہی آنی تھانہ کچہری ہو رہی ہے اس غریب کے ساتھ۔ چھڈ پراں۔ بات ختم کرنی چاہیے۔ اب اپنی سمجھ میں تو کچھ آتی نہیں۔ قانونی معاملہ ہے۔" قانونی معاملہ اس نے یوں کہا کہ مجھے کنونی ماملا سنائی دیا۔ "ہم کیا بولیں کیوں جی؟ وہ جو آپ کے والد صاب تھے نا۔ ان سے اپنی بس ایک بار ملاقات ہوئی تھی۔ ادھر میر صاب مرحوم کے دفتر میں۔ بھلے مانس لگے ہمیں تو اور لوگ بڑی تعریف کرتے تھے۔ اللہ جنت نصیب کرے۔ بڑا افسوس ہوا تھا ان کے فوت ہونے کا۔ اور ابھی کتنے دن کی بات ہے۔ اس کے بعد میر صاب۔" اس نے ایک گہری ٹھنڈی سانس بھری۔ "آدمی کا کچھ بھروسہ نہیں جی۔ شام کو ہے، صبح نہیں ہے۔ جو مرضی مولا کی ہو تو بندہ کیا کرے۔"

دلاور کے بارے میں پہلی ملاقات کے دوران میرا تاثر یہ تھا کہ وہ بڑا اچھا اداکار ہے اور اس نے جس پُراسرار ڈرامائی ماحول میں ڈرامائی انداز میں مکالمے بولے تھے، وہ اس کی اداکارانہ صلاحیت کا ثبوت تھے۔ اگر یہ دلاور وہی تھا تو میرا تاثر بھی پھر وہی تھا کہ اس کے بولنے کا، ہنسنے کا، آہ بھرنے کا، بے تکلف گفتگو کا اور نیم خواندہ لہجے میں بات کرنے کا سارا انداز اس کا اصل انداز نہیں بلکہ اداکاری ہے۔ میں شش و پنج میں پڑ گیا۔ اگر وہ اداکاری تھی تو یہ اداکاری نہیں ہو سکتی تھی۔ ایک شخص جو فیکٹری میں مالک کی حیثیت رکھتا ہو، ہر روز اپنے تمام ماتحت ملازموں کے سامنے اداکاری کیوں کرے گا۔ عملاً یہ ناممکن سی بات تھی۔ اور قطعی غیر ضروری بھی۔ دلاور کی اصل شخصیت یہی تھی جو اس وقت میرے سامنے تھی۔ اگر اس نے اپنے سیکرٹری کے سامنے اچانک لہجہ، آواز یا انداز بدلے ہوتے تو سیکرٹری ضرور حیران ہوتا مگر وہ بالکل نارمل رہا تھا۔ مشکل یہ تھی کہ جس دلاور کا تاثر میرے ذہن میں تھا، اس پر میرے مقابل بیٹھے ہوئے دلاور کی شخصیت کسی زاویے سے منطبق نہیں ہوتی تھی۔ میری ساری خوش فہمی رفع ہو گئی تھی۔ میں نے محسن سے کہا تھا کہ میں انداز و اطوار کی ذرا سی مماثلت بھی دیکھوں گا تو چوہدری دلاور کو شناخت کر لوں گا۔ اس نے میرے دعوے کو مبالغہ آمیز قرار دیا تھا اور یہ بات صحیح ثابت ہو رہی تھی۔ اگر اس رات دلاور نے اپنی شخصیت بدلی تھی تو یہ تبدیلی ناقابلِ یقین حد تک مکمل تھی۔ اس رات مجھ سے پس پردہ رہ کے بات کرنے والے دلاور کی شخصیت

سو فیصد غلط تھی۔ وہ مہذب، تعلیم یافتہ، پرسکون رہ کے نرم، ٹھہرے ہوئے پُراعتماد لہجے میں بات کرنے والا دلاور تھا۔ اس کی کوئی جھلک مجھ سے مخاطب دلاور میں نہیں تھی اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ اس رات چوہدری دلاور نے اداکاری کا بہترین نمونہ پیش کیا تھا یا کسی اور کی خدمات حاصل کی تھیں کہ وہ مؤثر طریقے پر مجھے سب سمجھا دے یا وہ کوئی اور تھا جس نے چوہدری دلاور کا نام استعمال کیا تھا۔ لیکن کوئی اور چوہدری دلاور مجھ سے یہ مطالبہ کیوں کرے گا کہ میں حقِ وراثت سے دستبردار ہو جاؤں۔ دو مالک مر گئے تھے۔ ان میں سے ایک لاوارث تھا۔ چوہدری دلاور کے بلا شرکتِ غیرے کاروبار پر قابض ہونے کے لیے یہ ضروری تھا کہ دوسرے واحد وارث کو راستے سے ہٹنے پر مجبور کر دیا جائے یا بہ جبر ہٹا دیا جائے۔

”لو جی اپنے سکندر صاب! آپ بھی کس خیال میں گم ہو گئے۔ کوئی شاعری مائری کرتے ہو گے۔“ دلاور ہنسا۔ ”ہم تو چٹے ان پڑھ لوگ ہیں لوہا کوٹنے والے۔“

”معاف کیجیے گا۔“ میں نے کہا۔ ”آپ نے والد صاحب کا ذکر کیا تو مجھے ان کی یاد آ گئی۔ اب یہ تمام کاروبار آپ ہی کو سنبھالنا پڑ رہا ہو گا؟ آپ کی ذمے داریوں میں تو بہت اضافہ ہو گیا ہے۔“

”دِقت پڑ گیا ہے جی! اپنے وزیر خان مرحوم حساب کتاب دیکھ لیتے تھے۔“ اس نے کافی بنانی شروع کی جو نہ جانے کون اندر رکھ کے چلا گیا تھا۔ ”میر صاب تھے، باہر کا سارا بزنس سنبھالتے تھے۔ ہم اِدھر مزے سے فیکٹری کو دیکھتے تھے اور بس۔ اب معلوم نہیں کیا ہو گا؟“

”آپ فکر نہ کریں۔ میں بہت جلد آپ کی مدد کے لیے حاضر ہو جاؤں گا۔“ میں نے کہا۔ چوہدری دلاور نے حیران، سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا اور کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ ”میں آپ کا مطلب سمجھ گیا۔ آپ پوچھنا چاہتے ہوں گے کہ مجھ پر تو قتل کا مقدمہ چل رہا ہے، میں کاروبار کیسے سنبھال سکتا ہوں۔ آپ کا اندیشہ بجا لیکن مجھے میرے وکیلوں نے یقین دلایا ہے کہ کیس بوگس ہونے کی وجہ سے اتنا کمزور ہے کہ سزا ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بے شک بیشہ ور وکیل موکل سے ہمیشہ یہی کہتے رہتے ہیں۔“

”ہاں جی۔“ وہ ہنسا اور اس نے کافی میرے سامنے رکھی۔ ”وہ ایک لطیفہ ہے نا جناب کہ تھا کوئی ہمارے جیسا پینڈو اور اسے وکیل مل گیا کوئی چلتا پرزہ۔ تین سو سات کا کیس تھا جو اس کی پیروی سے تین سو چار کا بن گیا۔ موکل نے دہائی دی تو اس نے کہا دیکھو اپیل میں کیا ہوتا ہے۔ اپیل میں تین سو دو کا ہو گیا اور پھانسی کی سزا ہو گئی تو موکل چلانے لگا۔ وکیل نے کہا اوبے وقوف! تیرے سامنے میری کوشش سے پانچ نمبر کم ہو گئیں۔ ذرا مہلت اور ملتی تو باقی دفعات بھی ختم کرا دیتا مگر تیرا ٹائم اور تیری فیس دونوں ختم ہو گئے۔“

جب وہ لطیفہ سنا رہا تھا تو میں نے اس کی پہلی غلطی پکڑی۔ ابھی وہ خود کو ”چٹا ان پڑھ“ کہہ رہا تھا اور لطیفے میں اس نے قانون کی دفعات کے حوالے بڑی روانی سے دیے۔ تین سو سات کا مطلب تھا اقدامِ قتل۔ تین سو چار غیر ارادی قتل اور تین سو دو قتلِ عمد کی دفعات تھیں۔ مگر بالکل جاہل شخص ان سے کیسے واقف ہو سکتا ہے اور لطیفے میں حوالے کے طور پر کسی غلطی کے بغیر کیسے استعمال کر سکتا ہے۔ یہ لطیفہ وہ ہر روز تو کسی کو نہیں سناتا ہو گا اور یہ کوئی ایسی مؤثر دلیل نہ تھی جس سے میری بے یقینی ختم ہو جاتی۔

لطیفہ ختم ہوا تو میں یوں ہنسا جیسے میں نے واقعی یہ لطیفہ پہلی بار سنا ہو۔ ”دراصل وکیل میرے بچپن کے دوست ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”دونوں ہائیکورٹ اور سپریم کورٹ کے وکیل ہیں اور فیس دینے کا کیا سوال۔ میں فیس کی بات بھی کروں تو ناراض ہو جائیں۔“

”اچھا اچھا۔“ اس نے عدم دلچسپی سے اخلاقاً کہا۔ ”اچھا ہے جی! آپ آ جاؤ تو کچھ کام بنے۔ آپ ولایت رہ آئے ہو۔ ماشاء اللہ نوجوان اور پڑھے لکھے ہو۔ ڈی سلوا تو ہے ملازم۔ آپ کی بات اور ہے۔ رب کرے یہ سب جھوٹ ہو۔“

”دلاور صاحب!“ میں نے کہا۔ ”جب میں انگلینڈ گیا تھا تو کاروبار کے دو شریک تھے۔ میرے والد اور میر ذوالفقار علی۔ آپ تیسرے شریک کی حیثیت سے اس کاروبار میں کب شامل ہوئے۔ پہلے آپ کیا کرتے تھے؟“

چوہدری دلاور کا چہرہ یکلخت سنجیدہ ہو گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کی حالت کے تغیر کا سبب میرا ادھورا سوال ہے۔ ”وہ جی میں نے کہا تھا نا کہ ہم تو لوہا کوٹنے والے بندے ہیں۔ تو یہی بات ہے کہ لوہا کوٹتے کوٹتے مستری بن گئے۔ فورمین ہو گئے۔ سب اللہ کی دین ہے کہ جو دیکھتے ہیں ادھر فٹ ہو جاتے تھے۔“ اس نے سر کو انگلی سے بجایا۔ ”مشین کے پرزے ایک دفعہ کھول کے ڈال دیے تو دوبارہ جوڑنے میں کبھی دشواری نہیں ہوئی۔ یہ لونڈے جو انگریزی کی موٹی کتابیں پڑھ کے انجینئر صاب بن جاتے ہیں، میرے جوتے صاف کرنے کے قابل نہیں تھے۔ مشین بگڑ جائے تو ان کو دیکھنی پڑتی ہیں کتابیں۔ نقشے، چارٹ اور ڈایاگرام۔ پھر یہ ٹکھی پہ ٹکھی مارتے ہیں خراب پرزے کی جگہ نیا پرزہ لگا دیا۔ پرزہ تو خود ایک مشین ہوتا ہے۔ دیکھنا پڑتا ہے کہ اس کی شکل صورت، ناک نقشہ بدل کے اچھا کیا جا سکتا ہے، جس سے کام اور اچھا ہو۔ کبھی پرزہ نخرے کرتا ہے تو اس کی مدد کے لیے اپنی طرف سے کوئی پرزہ بھی جوڑنا پڑ جاتا ہے۔ جیسے گدھا اڑ جاتا ہے اکیلا چلتے ہوئے۔ کیا کہتے ہیں اس کو۔ ردوبدل۔ ہاں جی ہم نے مشینوں میں ردوبدل کر کے اصل سے بہتر بنا دیا۔ سوچو ذرا ہزاروں قسم کے ماڈل اور سائز ہیں مختلف ملکوں کی مختلف مشینوں کے۔ سب تجربے اور اللہ کی مہربانی سے سمجھ میں آتے تھے۔ آپ دیکھ لیں۔ یہ جو پرانے استاد ہوتے ہیں نا موٹر مکینک۔ جو بچپن سے گیراج میں جوتیاں سیدھی کرنی شروع کرتے ہیں اور مار کھا کھا کے پیچ کستے کستے ایسے ماہر ہو جاتے ہیں کہ ہر ماڈل کی کار کا انجن تصویر کی طرح ان کی کھوپڑی میں رہتا ہے۔ یہ پڑھے لکھے بابو ٹائپ آٹو انجینئر کہلانے والے لونڈے ان کے مقابلے میں ایسے ہی ہیں جی جیسے... جیسے بچے۔“ اس کے دماغ میں فوراً کوئی مناسب تشبیہ نہیں آئی تھی۔ ”تو جناب ہم نے بھی ایسے ترقی کی تھی۔ میر صاحب نے کہا ادھر فیکٹری لگائی ہے، کچھ مال ہے تو نکالو۔ بس جی ہم نے جو تھوڑا بہت بچایا تھا وہ دے کر پارٹنر بن گئے۔“

میں بڑے غور سے اس کی باتیں سن رہا تھا اور میرا وہ یقین متزلزل ہو چکا تھا کہ میں اسی دلاور سے ہمکلام ہوں جس نے مجھے اغوا کیا تھا۔ جو ایک نامعلوم شخص کی کوٹھی پر چوکیدار کو قتل کر کے قابض ہوا تھا۔ جو اس رات اسٹیریو سن رہا تھا اور کسی عورت کے ساتھ دادِ عیش دے رہا تھا، اور جس نے مجھے انتہائی خطرناک انداز میں کھلی دھمکی اور ایک ماہ کی مہلت دی تھی۔ یہ سیدھا سادا۔ مستری سے فورمین اور بالآخر ”ایم ڈبلیو ڈی“ انجینئرنگ کمپلیکس کا مالک بن جانے والا ان پڑھ اور صاف گو آدمی کوئی اور تھا۔

”چوہدری صاحب!“ میں نے کہا۔ ”پہلے آپ نے کہاں کہاں سے تجربہ حاصل کیا تھا؟ میرا مطلب ہے آپ مستری کہاں تھے فورمین کہاں تھے؟“

اس سوال کا جواب وہ اپنی باتوں میں گول کر گیا تھا۔ ”اب کیا پوچھتے ہو سکندر صاب! پرانی باتیں ہیں۔ جہاں کا آب و دانہ تھا وہاں رہے۔ کبھی یہاں کبھی وہاں۔ لاہور، فیصل آباد، کراچی۔“ اس نے بڑی صفائی اور پورے اعتماد کے ساتھ سابقہ حوالے بتانے سے گریز کیا۔ یہ شک پیدا کرنے والی دوسری بات تھی۔ اتنی صاف بات کرنے والا کہہ سکتا تھا کہ میں فلاں فونڈری میں اتنے سال مستری رہا۔ پھر اس نے ’بیکو‘ یا ’اتفاق‘ جیسے اداروں میں بحیثیت فورمین کام کیا ہوتا یا ورکشاپ میں رہا ہوتا تو فخر سے بتاتا مگر نام لینے سے اس کا ماضی کریدا جا سکتا تھا۔ وہ اپنے ماضی کا سراغ دینے کے لیے بالکل تیار نہیں تھا اور میں یہ بات اس سے زبردستی نہیں پوچھ سکتا تھا۔

”ڈی سلوا صاحب کو کون لایا تھا؟“ میں نے کہا۔ ”کوالیفیکیشن کیا ہے ان کی؟“

”میں نے سنا ہے کہ وہ ڈگری ہے۔ کی ناں اسے کہندے ہاں۔ ایم بی اے۔“ وہ بولا۔ ”اپنے میر صاحب لائے تھے۔“

پھر وہ بات ہوئی جس نے ایک دم میرے شکوک کی توثیق کر دی۔ ”ابھی ان کے ساتھ کوئی آیا تھا؟“

”ہاں جی، وہی مِسکی۔“ وہ ہنس کے بولا اور میں نے فوراً اس کا جھوٹ پکڑ لیا۔ میں نے بنک اسکوائر کی طرف سے آنے والی نیلے رنگ کی ٹویوٹا کراؤن گاڑی کو اِدھر ہی آتے دیکھا تھا اور مجھے اس میں پیڈرو کی صورت دکھائی دی تھی۔ گیٹ پر جیمز بونڈ کا ناول پڑھنے والے نوجوان نے تصدیق کی تھی کہ ان کے ساتھ کوئی تھا۔ چوکیدار نے یقیناً گاڑی کو دیکھتے ہی گیٹ کھول دیا تھا اور گاڑی رکے بغیر سیدھی گزر گئی تھی۔ ڈی سلوا کے ساتھ غیر متعلقہ شخص اندر کیسے جاتا اور جاتا تو چوہدری دلاور یہ بات کیوں چھپاتا۔ وہ کہہ سکتا تھا کہ ان کے ساتھ ان کے کوئی دوست تھے، میں نہیں جانتا۔ لیکن اس نے جھوٹ بولا، جانتے بوجھتے۔ میں نے گیٹ پر روکنے والے نوجوان سے کہا تھا کہ وہ شخص میں ہوں اور اس نے مان لیا تھا۔ وہ صورت نہیں دیکھ سکا تھا مگر اس نے یہ خود دیکھا تھا کہ ان کے ساتھ کوئی مرد تھا۔ اگر لڑکی ہوتی تو وہ مجھے میرے جھوٹ پر بے عزت کر دیتا۔ چوہدری دلاور نے اپنی طرف سے ذہانت کا مظاہرہ کیا تھا۔ آخر مینیجر کے ساتھ کون آئے گا؟ اس کی سیکریٹری جیسے چُبکی مُسکی کے ذکر پر میں نے جپٹی سے الگ کر کے مُسکی کہا تھا تو وہ بہت لطف اندوز ہوا تھا۔ اب میرے لیے شک کی قطعی گنجائش نہ رہی کہ میری آنکھوں نے غلط نہیں دیکھا تھا۔ ڈی سلوا

کے ساتھ پیڈرو آیا تھا اور دلاور نے یہ بات چھپالی تھی۔

بے شک میں گیٹ کے چوکیدار سے پوچھ کے مزید تصدیق کرسکتا تھا مگر میں نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی۔

"اچھا دلاور صاحب! میں ایک نظر فیکٹری دیکھنا چاہتا تھا۔" میں نے کہا۔ "ہم کیا بناتے ہیں کیسے بناتے ہیں؟"

"جم جم دیکھو جی۔ آپ مالک ہو، پوچھنا کیسا۔" وہ بولا۔

"مگر آج نہیں۔ میں نے اپنی وومنٹی سے کہا تھا کہ جلدی آجاؤں گا تو اس کو داتا صاحب لے جاؤں گا۔ اس نے چادر چڑھانی ہے۔ آپ کل پرسوں جب دل کرے آؤ۔ ویسے بھی اب چھٹی ہونے والی ہے۔ آپ کیسے آتے ہیں؟ میرا مطلب ہے... مطلب ہے کہاں قیام ہے آپ کا اگر گاڑی نہیں ہے تو میں چھوڑ دیتا ہوں۔"

بے شک میں مشینوں کی تیاری۔ پیکنگ، اسٹور اور گودام کے تمام شعبے دیکھ کر اندازہ کرنا چاہتا تھا کہ گڑبڑ ہو رہی ہے تو کہاں مگر ملاقات کا اصل مقصد کچھ اور تھا جو پورا ہو چکا تھا۔ دوسرا مقصد اب پورا ہوسکتا تھا کہ میں چوہدری دلاور کا گھر دیکھ لوں۔

"یہ تو بڑا اچھا ہوگا۔" میں نے کہا۔ "آپ مجھے اپنا گھر بھی دکھا دیں اور پھر مجھے میرے گھر پہ ڈراپ کر دیں۔ میں ایس ایس پی ضامن رضوی صاحب کے ساتھ ٹھہرا ہوا ہوں۔" کنکھیوں سے میں نے اس نام کا ردعمل دیکھا مگر اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔

"وہ کہاں رہتے ہیں؟" اس نے میز کی دراز میں سے گاڑی کی چابیاں نکالتے ہوئے کہا۔

"بانسوں والی سڑک پر، میو گارڈن کے پیچھے۔" میں نے کہا اور اس نے فقط سر ہلایا۔ باہر آکے اس نے سیکرٹری کو ٹھیٹھ لاہور کی پنجابی میں بتایا کہ وہ گھر جا رہا ہے اور دفتر بند کر کے وہ بھی جانا چاہے تو چلا جائے۔" اور دیکھ پُتّر! اوہ ڈرائیور کتھے اے۔ او نوں لب کے لیا۔" اس نے جابیاں سیکرٹری کی طرف اچھال کے کہا۔ "اوس نواب دے پُتّر نے سُتے آنا اے اپنے ٹیم تے۔" اور سیکرٹری نے پانچ بجے گاڑی لے کر آنے والے ڈرائیور کو چار بج کے دس منٹ پہ حاضر کر دیا۔

میں دلاور کے ساتھ پیچھے والی سیٹ پر بیٹھ گیا اور جب گیٹ کھلا تو مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ چوکیدار کے علاوہ جیمز بونڈ کا ناول پڑھنے والے نوجوان نے بھی بڑی مستعدی سے اٹھ کے سلام کیا اور یہ دیکھا کہ میں واقعی

کوئی وی آئی پی ہوں جسے چوہدری صاحب اپنی گاڑی اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں اور وہ بھی قبل از وقت۔ مجھے یقین تھا کہ آئندہ کوئی ان میں سے میرا راستہ نہیں روکے گا۔ میری یہ خوشی اس وقت خاک میں مل گئی جب زمزمہ یعنی بھنگیوں کی توپ کی طرف سے کار مال روڈ پر آئی تو دلاور نے اپنے شوفر کو حکم دیا کہ سیدھا چلے اور کشمیر روڈ کی طرف جائے۔ پہلے سکندر صاحب کو چھوڑنا ہے۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ مجھے ٹالنا چاہتا ہے چنانچہ میں نے بھی اس کا گھر دیکھنے پر اصرار نہیں کیا۔ یہ کسی سے بھی معلوم کیا جا سکتا تھا کہ چوہدری صاحب کی رہائش کہاں ہے۔ جب کار مجھے ضامن رضوی صاحب کی کوٹھی کے دروازے پر چھوڑ کے سیدھی نکل گئی تو میں واپس ہوا اور چوک تک پہنچا بھی نہ تھا کہ پیچھے سے ایک خالی رکشا آیا جسے میں نے گزرنے سے پہلے روک لیا اور میو ہوسپٹل چلنے کے لیے کہا۔ رکشہ کی سواری کرنا خاصی جسمانی مشقت کا صبر آزما کام تھا مگر لاہور میں ٹیکسیوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ کم سے کم مجھے کبھی ضرورت پڑنے پر ٹیکسی نظر ہی نہیں آئی۔

ہسپتال میں مجھے محسن کو تلاش کرنا پڑا کیونکہ ملاقاتیوں کے آنے کا وقت ہو چکا تھا اور میو ہسپتال کے ہر وارڈ میں سینکڑوں کے حساب سے ہر بیمار کو دیکھنے کے لیے آنے والے مردوں، عورتوں اور بچوں کا ہجوم تھا، جو برآمدوں میں بھی جمع تھے۔ محسن نے خود ہی مجھے دیکھ لیا اور تیر کی طرح میری طرف آیا۔ "رابعہ نہیں آئی؟" میں نے پوچھا۔

محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "تیری ملاقات ہو گئی چوہدری دلاور سے؟"

"ہاں۔" میں نے کہا۔ "میں نے غلط نہیں دیکھا تھا۔ نیلی کار میں جو ڈی سلوا کی تھی وہی استاد پیڈرو بیٹھا تھا۔" پھر میں نے اسے چوہدری دلاور سے ملاقات کا حال تفصیل سے سنایا۔ اس وقت وہ بنچ خالی نہیں تھی جس پر ہم ملاقات کے وقت بیٹھے تھے۔ لان پر بھی حضرات اور خواتین براجمان تھے جو نسبتاً صحت مند مریضوں کو وارڈ سے باہر کھینچ لائے تھے اور انہیں درمیان میں بٹھا کے ان سے اپنی اپنی سنا رہے تھے اور اپنی اپنی لائی ہوئی چیزیں کھلانے میں مصروف تھے۔ میں اور محسن ان سے دور ایک درخت کے گرد بنی ہوئی اینٹوں کی دو فٹ اونچی اور ایک فٹ چوڑی بنچ پر بیٹھ رہے۔ ملاقات کا وقت ختم ہو گیا اور نرسنگ آرڈرلی سیٹیاں بجا بجا کے تمام کو روانگی اختیار کرنے کا حکم دینے لگے۔ اکثریت معقول لوگوں

کی تھی جو سیٹی سنتے ہی اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ ڈھیٹ قسم کے لوگ اس وقت تک ٹکے رہے جب تک کہ ہسپتال کے عملے نے ان کو بے عزت کرنا شروع نہیں کیا۔ دو چار نے جواب میں گرمی دکھائی لیکن بالآخر تمام مریض وارڈوں میں پہنچ گئے اور ہسپتال خالی ہو گیا۔ میں نے اور محسن نے اندر رہنے کا آسان طریقہ دریافت کر لیا تھا۔ کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے لڑکے صبح ہر وقت وارڈوں میں پھرتے تھے۔ کیس ہسٹری دیکھنا، اور ڈاکٹروں کی مدد کرنا ان کی تعلیمی سرگرمیوں کا ایک حصہ تھا۔ زائد از نصاب سرگرمی وہ نرسوں کے انتخاب میں دکھاتے تھے جو چالاک ہوتی تھیں وہ فائنل ایئر کے لڑکوں میں سے کسی کو پھانس کر شادی کرنے میں کامیاب ہوتی تھیں تو باقی عمر عیش کرتی تھیں۔ ناتجربہ کار اور بے وقوف قسم کی نرسیں اسی امید میں کبھی ایک کے ساتھ اور کبھی دوسرے کے ساتھ دل لگی کے اسباب پیدا کرتی تھیں اور دل لگی ختم ہوتی تھی تو روتی تھیں کہ

اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی

انہی کی حوصلہ افزائی کے باعث وہ لڑکے بھی بے مقصد گھومتے پھرتے نظر آتے تھے جو پہلے یا دوسرے سال کے طالب علم ہوتے تھے اور ان کی کسی وارڈ میں ڈیوٹی نہیں ہوتی تھی۔ میں اور محسن صورت شکل، حلیے اور عمر کے باعث بہت سینئر طلبا میں شامل ہو سکتے تھے چنانچہ جب بھی کسی نے پوچھا تو ہم نے ہنس کے ٹال دیا کہ ہم ڈیوٹی پر ہیں۔ اس وقت بھی ایک چوکیدار ٹائپ شخص نے ہمارے قریب آکے کہا۔ "ٹائم ختم ہو گیا ہے جی، آپ جائیں۔"

"کہاں جائیں؟ ہوسٹل؟" میں نے کہا۔ "تم ڈاکٹر صاحب کو جواب دے دینا کہ میں نے اپنے حکم سے ان کی چھٹی کر دی۔" وہ کچھ شرمندہ ہو کے دانت نکالتا ہوا چلا گیا۔ "یار سکندر! رابعہ کیوں نہیں آئی؟"

"ٹیلیفون کر لے۔" میں نے کہا۔ "کسی وارڈ سے ڈائریکٹ لائن تو ملے گی نہیں۔ ہسپتال کا ایکسچینج ملائے گا۔"

ہم دونوں امراض قلب کے جنرل وارڈ میں گئے۔ ایک نرس نے ہمیں گھور کے دیکھا مگر جس اعتماد سے ہم نے بغیر پوچھے فون اٹھایا تھا اس سے وہ کشمکش و پیچ میں پڑی اور خاموش رہی۔ نمبر مانگ کے ہم نے نرس سے کہا کہ کال ملے تو ہمیں بلا لے اور بلا وجہ وارڈ کا ایک چکر لگایا۔ جب ہم واپس آئے تو نرس نے ہمیں مطلع کیا کہ نمبر نہیں ملا۔ آپریٹر کہتا ہے کہ رنگ جا رہی ہے ریسیور کوئی نہیں اٹھاتا

ہم نے سر ہلایا اور باہر چلے گئے۔

"رابعہ کے نہ آنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟" محسن نے باہر آکے کہا۔

"میری سمجھ میں تو کوئی وجہ نہیں آتی۔" میں نے کہا۔

"وہ ماں کی طرف سے بہت زیادہ فکر مند تھی۔ ہو سکتا ہے خود اس کی اپنی طبیعت بگڑ گئی ہو۔"

"اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کسی مشکل میں پڑ گئی ہو۔" محسن نے کہا۔ "اس خط کی وجہ سے۔"

"مجھے بھی ایک خلش سی ہے کہ یہ اتحادِ ثلاثہ بے مقصد نہیں۔ ڈی سلوا، پیڈرو اور دلاور..." میں نے کہا۔ "ان کا یہ ہنگامی اجتماع جیہ معنی دارد؟"

میں اور محسن فکروں اور اندیشوں کا شکار ٹہلتے ہوئے کنٹین تک گئے اور دگنی قیمت پر چائے کہلانے والا ایک گرم مشروب پی کے لوٹ آئے۔ رابعہ ابھی تک نہیں آئی تھی اور ہمارے لیے خود گھر جاکے اس کی خیریت پوچھنے کے سوا چارہ نہ رہا تھا۔

"میں رابعہ کی طرف جاتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "تو گھر جا اور ریوالور لے آ۔ ذرا احتیاط سے چھپا کے۔"

"ریوالور تو میرے پاس ہے۔" محسن نے کہا۔ "اور میں نے کتنی احتیاط سے چھپا رکھا ہے اسی سے اندازہ کر لے کہ خود تجھے معلوم نہیں۔"

ایک بار پھر ہم نے رکشا میں تہہ و بالا ہوتے ہوئے میو ہسپتال کے دروازے سے کراؤن سینما تک کا سفر کیا اور سینما کے باہر شوق نظارۂ جمال رکھنے والوں کے ہجوم میں شامل ہو کے ایک دروازے سے اندر گئے اور دوسرے سے باہر آگئے۔ چند قدم پیدل چلنے کے بعد ہم نے رابعہ کی سُرخ فاکس ویگن دیکھی جو اپنی کوٹھی کے گیٹ سے تقریباً سو گز دور فٹ پاتھ سے لگی ہوئی دوسری کوٹھی کے احاطے کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے آگے پرائیویٹ ڈاٹسن کار تھی اور پیچھے ٹویوٹا کرولا کے نئے ماڈل کی ٹیکسی۔ فاصلے سے اندازہ ہوتا تھا کہ پرائیویٹ کار بعد میں آگے آکے رکی تھی۔ ٹیکسی البتہ چند انچ کے فاصلے پر تھی چنانچہ ظاہر تھا کہ بعد میں فاکس ویگن کے پیچھے آکھڑی ہوئی۔ ڈرائیور کسی گاڑی میں نہیں تھا۔ میں نے کوٹھی کے گیٹ پر لکھے ہوئے نمبر کو اور نام کی تختی کو دیکھا اور میں گھنٹی کا بٹن دبا کے یہ پوچھنے ہی والا تھا کہ مس رابعہ یہاں ہیں؟ ہیں تو انہیں بتا دیجیے کہ سکندر بخت صاحب اور محسن صاحب ہسپتال سے آئے ہیں اور وہ جب بھی فارغ

ہوں اپنے گھر آجائیں۔ مگر اسی وقت محسن نے مجھے روک لیا۔
"سکندر! یہ دیکھو۔" اس نے چاروں طرف نگاہ ڈال کے مجھے بلایا اور میں نے دوسری طرف جاکے بند شیشے سے جھانکا تو مجھے محسن کی تشویش کا سبب معلوم ہو گیا۔ چابیاں کار ہی میں تھیں اور اگنیشن سوئچ سے جھول رہی تھیں۔ "اس کا کیا مطلب ہے؟"
"اس کا مطلب یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ رابعہ چابیاں نکالنی بھول گئی ہو۔" میں نے کہا۔
محسن نے انکار میں سر ہلایا۔ "گاڑی بند کر کے چابی نکال لینا ایک لاشعوری عادت بن جاتی ہے۔ ذہنی پریشانی میں بھی چابیاں کوئی نہیں بھولتا۔"
ایک فوری خیال کے تحت میں نے پیچھے والی ٹیکسی میں جھانکا اور جب مجھے اس کی چابیاں بھی سوئچ سے لگی ہوئی نظر آئیں تو میرا دل ڈوبنے لگا۔ اب بجا طور پر یہ فرض کیا جا سکتا تھا کہ رابعہ کے ساتھ کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آیا ہے۔ میں اور محسن کچھ دیر کھڑے سوچتے رہے کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ ہمارا ذہن اس خیال کو قبول کرتے ہوئے ڈرتا تھا کہ رابعہ اغوا ہو گئی ہے لیکن آثار یہی تھے کہ وہ اپنے گھر سے نکلی تو کسی نے ٹیکسی میں اس کا پیچھا کیا اور اسے یہاں رکنے پر مجبور ہونا پڑا۔ ٹیکسی چوری کی تھی چنانچہ اغوا کرنے والے اسے بھی چھوڑ گئے اور کسی تیسری گاڑی میں رابعہ سمیت روانہ ہو گئے جو پروگرام کے مطابق یہاں موجود ہوگی۔ یہ سب کچھ اتنے کم وقت میں ہوا ہوگا کہ کسی نے کچھ نہیں دیکھا ہوگا یا دیکھا ہوگا تو غیر اہم سمجھ کے نظر انداز کر دیا ہوگا۔ آمنے سامنے صرف کوٹھیاں تھیں چنانچہ کچھ دیکھنے والے راہرو ہی ہو سکتے تھے۔ کاروں والے ڈرائیونگ کرتے ہوئے نگاہ سڑک پر رکھتے ہیں اور ان کو عموماً گرد و پیش کی خبر نہیں ہوتی۔ پیدل چلنے والے یا سائیکل سوار کار کا تعاقب کرنے کی سوچتے بھی نہیں۔ دال میں کالا نظر آئے تب بھی کوئی کسی کے جھگڑے میں نہیں پڑتا۔
"کیا خیال ہے محسن! اس کوٹھی والوں سے پوچھیں؟" میں نے کہا۔ "لیکن اس طرح بات پھیل جائے گی۔ وہ پوچھ سکتے ہیں کہ کون رابعہ قاری ایڈووکیٹ۔ جن کی یہ کار ہے؟ اور وہ نہ ہوئی تو مسئلہ الجھ جائے گا۔"
"پھر کیا کریں؟" محسن بولا۔ "انتظار کریں یا پولیس سے رابطہ قائم کریں؟ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہے۔"
"ہاں لیکن پولیس کو ابھی ہم کیا بتا سکتے ہیں۔ ہمارے مفروضات ان کے لیے حقائق تو نہیں ہو سکتے۔ یہ میں... اغوا، وہ بھی ایک عورت کا، اور عورت بھی وہ جو ایک ایڈووکیٹ ہے۔ مسئلہ بہت سنگین ہو جائے گا اور ہم سے ایسے سوالات کے جوابات دینے پڑیں گے جو ابھی ہمیں معلوم نہیں مثلاً یہ کہ وہ گھر سے کب نکلی تھی؟ ساتھ تھی؟ گھر پر اسے کوئی پیغام ملا تھا یا کوئی... گھنٹہ بھر پہلے کی بات ہوئی تو پولیس ہمیں صبر کرنے کا... دے گی۔ آپ جلدی اغوا کا کیس درج کرانے آ پہنچے... لوگ؟ کیوں؟ کس نے دیکھا تھا اغوا ہوتے؟ آپ کو... طرف سے اندیشہ تھا؟ کسی نے دھمکی دی تھی؟ دی تھی... کیوں نہیں بتایا؟ یہ لمبا چکر ہے محسن! اور خطرناک بھی۔"
"ہاں۔" محسن نے سوچتے ہوئے کہا۔ "اگر دلاور... اسے اغوا کر کے لے گئی ہے تو پولیس کی مدد لینا خطرناک... ہو سکتا ہے مگر ہم ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے تو نہیں رہ..."
"میرا خیال ہے اغوا کنندہ وہی ہوتے تو بہت... ہم سے رابطہ قائم کریں گے۔" میں نے کہا۔
باہمی صلاح مشورے کے بعد میں نے کار کا دروازہ کھولا۔ میری ناک میں رابعہ کی خوشبو کے بجائے ایک عجیب سی ناگوار گزرنے والی چبھتی ہوئی تیز بو آئی۔ "یہ کیسی بو ہے محسن؟" میں نے چابیاں نکال کے کہا۔
"کلوروفارم۔" محسن نے کہا۔ دروازہ کھلتے ہی... کے نتھنوں تک بھی پہنچ گئی تھی۔ میں نے اسٹیئرنگ... کے نیچے کلچ پیڈل کے پاس سے ایک رومال اٹھایا... خشک ہو چکا تھا لیکن یہ مردانہ رومال تھا اور وہ تیز... میں سے اٹھ رہی تھی۔ یہ رومال رابعہ کے ساتھ پیش آ... والے سانحے کی پوری روداد سنا رہا تھا۔
"میرا خیال ہے کار ہمیں مقفل کر دینی چاہیے..." کہا۔ "اور گھر چل کے خادمہ سے پوچھتے ہیں، لیکن اسے... اور کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔" محسن نے اتفاق کرتے... سر ہلایا۔ میں دروازہ بند کرنے لگا تو مجھے رابعہ کے ہینڈ بیگ... نے متوجہ کر لیا جو معمول کے مطابق ساتھ والی سیٹ پر نہیں... بلکہ پیچھے رکھا تھا۔ میں نے محسن کو اشارہ کیا اور خود... سیٹ پر بیٹھ گیا۔ محسن گھوم کر دوسری طرف سے آیا... آگے والی سیٹ کو جھکا کے پیچھے جا بیٹھا۔ میں نے... اسٹارٹ کی اور احتیاط سے یوٹرن لے کر گھمائی۔ کوٹھی... ٹھہرنے کے بجائے میں کار کو مخالف سمت میں سو گز دور... گیا۔ محسن نے اس اثنا میں ہینڈ بیگ کھول لیا تھا۔ ... دیکھتے ہی اس نے ایک کاغذ کا پرزہ آگے بڑھایا۔ "یہ ہینڈ بیگ میں سے نکلا ہے۔" محسن نے کہا۔ "باقی سب چیزیں موجود ہیں۔"

میں نے کاغذ پر پنسل سے لکھے ہوئے پیغام کو پڑھا۔
"رابعہ ہماری تحویل میں ہے اگر تم نے ہماری ہدایات پر عمل کیا اور پولیس سے رجوع نہ کیا تو رابعہ کو کچھ نہیں ہوگا۔ ہدایات کی خلاف ورزی کرو گے تو خود بھی نقصان اٹھاؤ گے اور رابعہ بھی محفوظ نہیں رہے گی۔ تمہارے مقابلے میں اس کی ذات دہرے خطرات سے دوچار ہے جان کے اور آبرو کے۔ کس کا نقصان ناقابل تلافی ہے؟ امید ہے تم جرأت اور ذہانت کا کوئی ایسا مظاہرہ نہیں کرو گے جو بعد میں حماقت ثابت ہو۔ سکون سے رابعہ کے گھر بیٹھ کے ہمارے دوسرے پیغام کا انتظار کرو۔"
میں نے پیغام کے مضمون کو اتنی مرتبہ پڑھا کہ اس کا ایک ایک لفظ مجھے ازبر ہو گیا۔ میرے جسم کا سارا خون کھنچ کر میرے سر میں آگیا اور آتشِ غضب سے میرا چہرہ دہکنے لگا۔ میرے کانوں کی لویں جلنے لگیں اور کنپٹی پر ایک رگ پھڑکنے لگی۔ میں کاغذ کے اس پرزے کو دونوں ہاتھوں میں تھامے بیٹھا رہا اور وہ چار انچ چوڑا چھ انچ لمبا سفید کاغذ پھیل کے سینما کا اسکرین بن گیا۔ میرے تصور میں ایک پروجیکٹر چلنے لگا اور میں نے وہ مناظر دیکھنے شروع کیے جو میں نے جرائم کی اور تشدد کی فلموں میں دیکھے تھے اور میرے لاشعور کا ایک حصہ تھے۔ زیرِ زمین نم آلودہ، متعفن اور تنگ و تاریک تہ خانے، سنسان پہاڑوں کے اندر پھیلے ہوئے خوفناک غار جن کی سیلن زدہ پتھر کی دیواروں پر بڑے بڑے عقرب رینگ رہے تھے، اور دہشت ناک مکڑیاں جالے بنتی ہوئی چل رہی تھیں سائیں سائیں کرتے ہوئے ویران جنگل جن میں بدروحیں اور عفریت شیطانی رقص کرتے ہیں... اور رابعہ... دیوارِ زنداں کے طوق و سلاسل میں اسیر۔ فرشِ خاک پر بے لباس، کسی درخت سے بندھی ہوئی۔ خاموش۔ فریاد بلب۔ نیم جاں۔ مناظر بدلتے گئے۔ ہر منظر ایک سلائیڈ کی طرح آتا تھا اور غائب ہو جاتا تھا۔ "تم ہماری مٹھی میں ہو ہیرو۔" چوہدری دلاور نے اپنی پُرسکون آواز میں اور ٹھہرے ہوئے پُراعتماد لہجے میں، ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا اور اس کے سائے نے کرسی پر پہلو بدلا۔ "ہم تمہیں حقیر چیونٹی کی طرح مسل دینے پر قادر ہیں۔ چوہدری دلاور نے تمہیں ایک مہینے کی مہلت دی تھی۔ تم نے اس سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اس لیے تمہیں یہ دوسرا سبق دینا ضروری ہو گیا تھا۔" سائے کی جگہ دوسرے حقیقی چوہدری دلاور نے لے لی۔ "تو جی اپنے سکندر صاب!" اس نے قہقہہ مار کے کہا۔ "آپ بھی کس خیال میں گم ہو گئے۔ کوئی شاعری مائری کرتے ہو گے۔ ہم تو جٹ ان پڑھ ہیں۔ لوہا کوٹنے والے۔ مگر لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ کیوں بھئی!" سیکرٹری نے فوراً تائید میں سر ہلایا۔ اسکرین پر پھر ڈی سلوا نمودار ہو گیا۔ "یو باسٹرڈ! میں تم سے سمجھ لوں گا۔ میرا نام ڈی سلوا ہے۔"
"حرامزادو۔ سور کے بچو۔ نامرد بزدلو! عورت کو ڈھال بنا کے لڑتے ہو۔" میں نے چیخ کر کہا۔
"سکندر!" محسن نے مجھے جھنجھوڑ کے کہا۔ "پاگل ہو گیا ہے تو! کوئی سنے گا تو کیا کہے گا۔ ہوش میں آ۔"
میں ہوش میں آگیا۔ میرا بدن غصّے سے لرز رہا تھا اور میرا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ "میں ان سب کو قتل کر دوں گا محسن!" میں نے کہا۔
"کر دینا، لیکن وہ ہیں کہاں؟ کون ہیں؟" محسن نے کہا۔ "پہلے یہ تو معلوم ہو جائے۔ یہ چیخنے چلانے سے معلوم نہیں ہوگا۔ تیری آواز ان کے کانوں تک کیا راہ گیروں تک بھی نہیں پہنچی۔ عقل اور اعصاب پر قابو رکھ۔ ہم ابھی بالکل بے بس ہیں۔ کوئی غلط قدم اٹھایا تو نقصان رابعہ اٹھائے گی۔ فی الحال خاموشی سے انتظار کرنے کے سوا ہم کچھ کر ہی نہیں سکتے۔ چل اندر چلتے ہیں۔"
"اگر ان کو ہم سے وہ خط ہی حاصل کرنا تھا تو رابعہ کو یرغمال بنائے بغیر بھی کر سکتے تھے۔" میں نے کہا۔
"خط تو وہ رابعہ سے یہیں لے سکتے تھے۔" محسن نے کہا۔ "اس کو ساتھ لے جانا ضروری نہیں تھا۔"
"ہاں، اور ابھی تک تو وہ خط بھی ایک معمّہ ہی ہے۔ بظاہر سادہ کاغذ۔ اس پر نظر نہ آنے والی کوئی تحریر ہے تو ابھی تک ہم اسے پڑھنے کا راز معلوم نہیں کر سکے۔" میں نے کہا۔ "پھر وہ رابعہ کو کیوں لے گئے؟"
"ہو سکتا ہے رابعہ نے یہ راز معلوم کر لیا ہو۔ اگر رابعہ کا وجود ان حقائق سے آگاہی کے بعد ان کے لیے باعثِ خطرہ ہو گیا ہے تو اب وہ اسے زندہ چھوڑنے کا خطرہ ہرگز مول نہیں لیں گے۔" محسن نے کہا۔ "ہمیں بلانے کا مقصد بھی یہی ہو سکتا ہے کہ تشدّد کے ذریعے ہم سے سچ اگلوایا جائے۔ رابعہ نے تو کہا ہوگا کہ انہیں کچھ نہیں معلوم مگر وہ

کب اعتبار کریں گے۔ وہ ہم سے ہی پوچھیں گے۔"

"ابھی تک رابعہ کو اس خط کی تحریر پڑھنے کا موقعہ نہیں ملا تھا۔" میں نے کہا۔ "اس نے مضمون پڑھ لیا ہوتا یا اسے طریقہ معلوم ہو جاتا تو وہ مجھ سے ذکر نہ کرتی؟ میرا تو خیال ہے اس نے خط دینے سے انکار کیا ہوگا۔ یہ کہا ہوگا کہ خط کے بارے میں اسے کچھ معلوم نہیں۔"

"شاید تو ٹھیک کہتا ہے۔" محسن بولا۔ "رابعہ نے خط کو کہیں چھپا دیا ہوگا یا کہا ہوگا کہ خط اس نے واپس کر دیا۔ اگر یہ بات ہوگی تو معلوم ہو جائے گی۔ انہوں نے رابعہ کو لے جانے سے پہلے گھر کی تلاشی ضرور لی ہوگی۔"

"اور ناکام ہو جانے کے بعد یہی طے کیا ہوگا کہ رابعہ کو یرغمال بنا کے لے جائیں اور پھر ہم سے سودا کریں۔" میں نے کہا۔ "لیکن محسن! خود ہمیں بھی تو معلوم نہیں کہ رابعہ نے خط کہاں رکھا ہے۔ ہم کیا بتائیں گے انہیں؟"

"اس کی تو یہی ایک صورت ہے کہ ہم رابعہ سے ملیں اور اسے کہیں کہ وہ خط کی خاطر جان کی بازی نہ لگائے اور خط واپس کر دے۔" محسن نے کہا۔

"رابعہ سے کیسے ملیں؟" میں نے کہا۔ "ہمیں کیا معلوم وہ رابعہ کو کہاں لے گئے ہیں۔" اور گاڑی سے اتر آیا۔ محسن نے میری تقلید کی۔

"ہاں، مگر انہوں نے پیغام میں کہا ہے کہ وہ پھر رابطہ قائم کریں گے۔" محسن نے کہا۔ "اس کی ایک صورت تو یہی ہے کہ وہ فون کریں۔ یہاں وہ برطانیہ، امریکہ کی پولیس تو ہے نہیں کہ ٹیلیفون کال سے تین منٹ میں ملزم کو جا پکڑے۔ وہاں بھی اغوا کرنے والے ہیں جو بھاری معاوضہ طلب کرتے ہیں ورنہ جان سے مار دینے کی دھمکی دیتے ہیں۔ وہ کہیں سے بھی کال کریں، ایک منٹ سے زیادہ بات نہیں کرتے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ٹیلی فون ایکسچینج والے فوراً پولیس کو بتا دیں گے کہ فون کہاں سے کیا گیا تھا اور قریب ترین پولیس کار کو وائرلیس پر پیغام ملے گا تو وہ بات ختم ہونے سے پہلے مجرم کو جا لے گی۔"

"یہ سب یہاں کہاں محسن؟" میں نے مایوسی سے کہا۔ "اول تو ٹیلی فون والے ہی اس وقت تک کچھ نہیں کریں گے جب تک پولیس نہیں کہے گی۔ پولیس رپورٹ لکھے بغیر کچھ کرنے کو تیار نہیں ہوگی۔ رپورٹ ہم لکھوا نہیں سکتے۔ پھر ضامن رضوی سے مدد لیں تب بھی کیا ہوگا۔ جب وہ فون کریں گے تو ٹیلی فون ایکسچینج میں آپریٹر سوتے رہ جائیں گے۔ نمبر نوٹ کر لیا انہوں نے تو پولیس کو بتانے سے کیا ہوگا وہ کون سے وائرلیس پر ہدایات جاری کر دیں گے۔ تھانے میں کسی نے سنی بھی تو آدھے گھنٹے بعد ہل کر کمر سے نکلنے کے قابل ہوگا اور کمرے سے نکلا تو سڑک پر کھڑا ہو جائے گا کہ بیگار میں کسی رکشا، ٹیکسی کو پکڑے۔ تھانیداروں تک کے پاس گاڑی نہیں۔ کسی کے پاس اپنا پرائیویٹ اکھڑ نظر آ جاتا ہے ورنہ سرکاری موٹر سائیکل ہے بھی تو ٹریفک کے کسی کسی سارجنٹ کے پاس۔ میرا خیال ہے وہ بھی اس صورتِ حال سے بے خبر نہیں ہوں گے اور اطمینان سے فون پر ہی بات کریں گے۔ خطرے کی کوئی بات نہیں۔" ہم دونوں رابعہ کے گھر کی طرف چلنے لگے۔

"کمال ہے کہ یہاں کے مجرم ذہانت میں غیر ملکی مجرموں سے کم نہیں۔" محسن نے چلتے چلتے کہا۔ "وہ جدید ترین وسائل سے استفادہ کرتے ہیں۔ پبلک شور مچاتی ہے کہ فلموں سے اور ٹی وی سے جرائم کا رجحان پھیل رہا ہے اور غیر ملکی لٹریچر سے نوجوانوں کے ذہن متاثر ہو رہے ہیں۔ یہ سوال کوئی نہیں کرتا کہ پولیس متاثر کیوں نہیں ہو رہی ہے۔ جرائم کی فلموں میں سدِباب کے جو طریقے اختیار کیے جاتے ہیں اور پولیس یا سراغرساں جس طرح کام کرتے ہیں، اس سے پولیس میں بہتری کا رجحان کیوں نہیں پیدا ہوتا۔ وہ دن بدن زیادہ نااہل اور بدعنوان کیوں ہوتے جا رہے ہیں۔ کیا وہ فلمیں نہیں دیکھتے اور ان کے گھروں میں ٹی وی نہیں ہیں؟ ہے نا الٹی بات کہ مجرم تو بہت کچھ سیکھ رہے ہیں، اور پولیس وہ بھی بھول رہی ہے جو اسے سکھایا گیا تھا۔"

گھنٹی بجانے کے دو منٹ بعد رابعہ کی خادمہ نے دروازہ کھولا۔ ہمیں دیکھتے ہی ایک لمحے کے لیے اس کا رنگ اڑ گیا۔ "آپ... صاب جی؟ خیریت تو ہے، بڑی بی بی... آپ ہسپتال سے آئے ہیں نا؟" وہ ایک طرف ہو گئی اور ہم گزر گئے تو اس نے دروازہ بند کر دیا۔

"ہاں ہاں۔" میں نے اس کو تسلی دی۔ "وہ خیریت سے ہیں۔ رابعہ بی بی کہاں ہیں؟"

اس کی صورت پر پریشانی کی جگہ حیرانی کی خبر دینے لگی۔ "وہ بھی ہسپتال گئی ہیں۔ آپ کو نہیں ملیں؟ ایک ... ہو گیا۔"

"ہم چار بجے ایک کام سے چلے گئے تھے۔" میں نے کہا۔ "اس لیے ملاقات نہیں ہو سکی۔ تم ایک کام کرو، جائے بنا کے لاؤ اور اگر کچھ کھانے کو ہے تو وہ بھی۔ ہم نے دوپہر کو کچھ نہیں کھایا۔"

"ہم اوپر بڑی بی بی کے کمرے میں ہیں۔ ممکن ہے ہسپتال سے کوئی فون آئے۔" محسن نے کہا۔

خادمہ کے لیے شک کی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ دیکھ چکی تھی کہ ہماری حیثیت اس گھر کے ایک فرد کی سی ہے اور اس وقت ہم ہی حالات کو سنبھال رہے ہیں۔ گھر کی خادمہ ہونے کے باعث اسے یہ معلوم نہ تھا کہ گھر میں ہماری آمد و رفت کیوں شروع ہوئی اور رابعہ سے رابطے کے اسباب کیا تھے۔ وہ یہ کیسے فرض کر سکتی تھی کہ مجھ پر قتل کا الزام ہے اور رابعہ میری وکیل ہے۔ وہ پُرتجسس شکی مزاج اور کوئی چالاک قسم کی عورت نہیں تھی جو معاملات کو کریدنے اور جاننے کی کوشش کرے کہ اچانک نمودار ہو کے اتنی اہمیت حاصل کرنے والے یہ اجنبی کون ہیں؟ اگر اس نے پوچھا ہوگا تو اسے مطمئن کر دیا گیا ہوگا اور جو بات بھی اسے بتائی گئی ہوگی اس نے بلاچوں وچرا قبول کر لی ہوگی۔

جب وہ باورچی خانے کی طرف چلی گئی تو میں نے آہستہ سے رابعہ کے بیڈ روم کا دروازہ کھولا۔ لائٹ جلانے سے پہلے ہی میری نظر نے کمرے کی حالت دیکھ لی تھی۔ کمرے کی تلاشی لی گئی تھی اور سارا سامان بڑی بے دردی سے تباہ کیا گیا تھا۔ میز کی درازیں کھینچ کر نیچے الٹ دی گئی تھیں۔ سب درازیں اور درازوں کا تمام سامان قالین پر بکھرا ہوا تھا۔ بک شیلف کی تمام کتابیں باری باری کھول کے دیکھی گئی تھیں کہ ان کے درمیان وہ خط نہ چھپا دیا گیا ہو۔ کتابوں کے گرد پوش تک پڑے تھے اور تمام کتابیں کسمپرسی کے عالم میں بے قدروں کے ہاتھوں اپنی توہین پر نوحہ کناں تھیں۔ تلاشی لینے والوں نے بستر ہی نہیں الٹا تھا، اس کا استر تک ادھیڑ دیا تھا۔ تکیوں کے غلاف بھی پھاڑ دیے گئے تھے کہ ان میں وہ صفحات چھپائے گئے ہوں تو برآمد ہو جائیں۔ وہ اپنے کام کے ماہر تھے اور ان کا ذہن تلاشی کے دوران میں پوری طرح مستعد رہا تھا۔ انہوں نے تمام امکانات کو مدِنظر رکھا تھا اور چند صفحات پر مشتمل ایک خط کو چھپانے کی ہر ممکنہ جگہ کو دیکھ لیا تھا یہاں تک کہ انہوں نے قالین کے نیچے کسی خفیہ خانے کی موجودگی کو بھی بعید از قیاس نہیں سمجھا تھا۔

"وہ لوگ کافی دیر یہاں مصروف رہے۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "آخر کس وقت؟ اگر رابعہ کو واپس گھر آنے کے بعد یہ نقشہ نظر آتا تو وہ فوراً پولیس کو رپورٹ نہ کرتی، ہمیں ضرور بتاتی۔ خادمہ سے تو پوچھتی، لیکن خادمہ کو کسی بات کی خبر نہیں۔"

"ہاں، اور اس کا مطلب یہی نکالا جا سکتا ہے کہ جب وہ اپنی کارروائی کر رہے تھے تو رابعہ ان کے قبضے میں تھی۔" محسن نے کہا۔ "گن پوائنٹ پر یا بیہوش یا بندھی ہوئی۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "کلوروفارم والا رومال ہمیں گاڑی میں ملا تھا۔ وہ اسے یہاں سے بے ہوش کر کے کیسے لے جا سکتے تھے۔ ایک گھنٹہ پہلے جب رابعہ گھر سے نکلی تو باہر نکلتے ہی اسے کلوروفارم سنگھا کر بے ہوش کر دیا گیا تھا۔ شاید وہ شخص جس نے یہ کارنامہ سرانجام دیا پہلے سے گاڑی کی پچھلی سیٹ کے اور اگلی سیٹ کے درمیان فرش پر موجود تھا۔ فاکس ویگن میں اتنی جگہ تو نہیں ہوتی، مگر جلدی میں کوئی پیچھے نگاہ ڈالے بغیر ڈرائیونگ کے لیے بیٹھ جائے تو اسے معلوم نہیں ہو سکتا۔ معلوم ہو جاتا تب بھی وہ شخص رابعہ کو دبوچ لیتا۔ اب اس نے باہر جا کے اطمینان سے اپنا کام کیا ہوگا۔

باقی لوگ بھی اگر پہلے سے گھر میں موجود تھے تو رابعہ بے خبر تھی۔ اتنے بڑے گھر میں جہاں صرف دو عورتیں ہوں کوئی بھی چھپا رہ سکتا ہے یا جو شخص رابعہ کے ساتھ تھا وہ رابعہ کو دوسروں کے سپرد کر کے لوٹ آیا۔ رابعہ کو وہ اپنی گاڑی میں ڈال کر لے گئے اور تلاشی لینے والے اطمینان سے اپنا کام کرتے رہے۔ خادمہ کچن میں نہ ہو تو اپنے کمرے میں رہتی ہے جو کچن کے ساتھ ہی ہے۔ اتنی احتیاط انہوں نے ضرور کی ہوگی کہ آواز نہ ہو۔ دو افراد ایک گھنٹے میں پورا گھر الٹ کے دیکھ سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے یہی کیفیت دوسرے کمروں کی بھی ہوگی۔"

"ہاں اور خدا کا شکر ہے کہ ابھی تک خادمہ نے کچھ نہیں دیکھا۔" محسن بولا۔ "کیوں نہ ہم اس کی حالت درست کر دیں۔"

"اگر ہم کچھ دیر پہلے آ گئے ہوتے تو ہماری ان سے ملاقات ہو سکتی تھی۔" میں نے افسوس سے کہا۔ "یہیں تصفیہ ہو جاتا۔"

محسن نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کے ایک دراز میں بکھرا ہوا سامان ڈالنا شروع کیا ہی تھا کہ دروازہ کھلا اور خادمہ اندر آ گئی۔ اس وقت میں سوچ ہی رہا تھا کہ محسن کو اس کام میں وقت ضائع کرنے سے منع کر دوں۔ اس سے زیادہ آسان تو یہ ہوتا کہ ہم تمام کمرے مقفل کرا دیتے۔ خادمہ اسے حفاظتی انتظام سمجھتی اور بعد میں کمرے کھول کر کبھی نہ دیکھتی۔ اب رابعہ کے بیڈ روم میں داخل ہوتے ہی جو منظر اس نے دیکھا

وہ اسے دہشت زدہ کر دینے کے لیے کافی تھا۔ وہ کچھ دیر پھٹی پھٹی آنکھوں سے کمرے کی حالت دیکھتی رہی۔

"صاحب جی...!" وہ چلائی "یہ... یہ آپ نے کیا... کیا جا ہیے آپ کو؟" اس کے بے ربط الفاظ اس کی گھبراہٹ کا نتیجہ تھے مگر یکلخت مجھے احساس ہوا کہ وہ اس تمام کاروائی کا ذمے دار ہمیں سمجھ رہی ہے۔ اور اس کا ایسا سمجھنا جائز بھی تھا۔ گھنٹہ بھر پہلے رابعہ نے جاتے وقت اس سے کچھ نہیں کہا تھا۔ اس دوران میں کوئی آیا بھی نہیں تھا۔ ہم غیر متوقع طور پر آ پہنچے تھے۔ ہم نے اسے چائے کے بہانے کچن میں بھیجا تھا۔ اس سے کہا تھا کہ ہم بڑی بی بی کے کمرے میں ہوں گے لیکن ہم رابعہ کے بیڈ روم میں گھس آئے تھے۔ اصولاً ہمیں ڈرائنگ روم یا آفس میں بیٹھنا چاہیے تھا۔ فون وہاں بھی تھا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ محسن ایک دراز لیے سامنے رکھے بیٹھا تھا اور اسکے ہاتھ میں رابعہ کے زیورات تھے جو خط کی جستجو میں آنے والوں نے ڈریسنگ ٹیبل کی دراز سے نکال کے باہر پھینک دیے تھے کیونکہ انہیں اس مال کی ضرورت نہیں تھی۔ محسن نے پہلے انہی چیزوں کو سمیٹ کر محفوظ کرنا چاہا تھا مگر خادمہ نے دیکھا تو وہ اس کو زیورات رکھنے کی بجائے نکالتا ہوا دکھائی دیا۔ خادمہ کے آتے ہی محسن منجمد ہو گیا تھا اور میں اپنی جگہ بت بنا رہ گیا تھا۔ ہماری حالت اچانک پکڑے جانے والے چوروں سے مختلف نہیں تھی۔

"آپ... آپ لوگ چوری کر رہے ہیں؟" خادمہ نے ہسٹریا کے عالم میں چلاتے ہوئے کہا "گھر کے مالک مر رہے ہیں اور گھر کے بھیدی ڈاکا ڈال رہے ہیں۔ ہمدرد بن کے لوٹ رہے ہیں۔ بے غیر تو! شیطانو! ڈوب مرو شرم سے۔ اس گھر میں ایک بڑھیا بیوہ ہے۔ وہ بھی ہسپتال میں پڑی ہے۔ اسی لیے رہ گئے تھے تم اسے۔ اس کی بیٹی پر اسی لیے ڈورے ڈال رہے تھے۔ مار ڈالو اب مجھے..."

وہ دھاڑیں مار کے رونے لگی تھی۔ اسے سمجھانے کے لیے کوئی دلیل مؤثر ثابت نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے تمام شکوک اور اندیشے الفاظ میں ڈھل کے زبان تک آ رہے تھے۔ وہ گھر کی پرانی نمک خوار تھی لیکن اسے احساس تھا کہ وہ خود بھی ایک بوڑھی اور بے بس عورت ہے جو ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ ہسٹریا کا سیلاب اس کی عقل اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو بہا لے گیا تھا۔

میں نے آہستہ سے اسکے منہ پر الٹا ہاتھ رسید کیا اور وہ نیچے گر گئی۔ اس کی آواز ایک دم بند ہو گئی اور وہ قالین پر گر کے اٹھی تو اس کا چہرہ لاش کی طرح سفید تھا۔ وہ متوحش نظروں سے مجھے دیکھنے لگی "خدا کے لیے مجھے مت مارو..." وہ گھگھیا کے بولی۔

"معاف کرنا ماسی!" میں نے کہا "تم نے بات ہی ایسی کی تھی کہ مجھے غصہ آگیا۔ تمہاری جگہ کوئی مرد ہوتا تو میں اس کی زبان گدی سے کھینچ لیتا اور اس قسم کی بات کہنے پر پچھتانے کے لیے اسے زندہ نہ چھوڑتا۔ تم بوڑھی عورت ہو اس لیے تھوڑا سا خیال رہا۔ تم بہت وفادار اور نمک خوار ہو مگر ہم گھر کے مالک ہیں۔ اگر شک ہے تو چھوٹی بی بی سے یا ان کی امی سے واپسی پر پوچھ لینا۔"

"مجھے... مجھے معاف کر دیں صاب جی! غلطی ہو گئی، میں غلط سمجھی تھی۔" وہ ہاتھ جوڑ کے بولی اور پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔

میں نے اسے بازو پکڑ کے سہارا دیا اور بستر پر بٹھا دیا۔ محسن کی نگاہیں مجھ سے سوال کر رہی تھیں کہ اس عورت کو جسے حالات کی خبر ہی نہیں مطمئن کرنے کے لیے کس قسم کی وضاحت مطلوب ہو گی۔

"دیکھو ماسی! جو تم نے کہا غلط تھا اور ہم نے سن لیا غلطی میں نے بھی کی مگر اب جو کچھ میں بتانا چاہتا ہوں وہ بھی غور سے سنو۔" میں نے کہا "ہمیں اوپر آتے ہوئے کتنی دیر ہوئی تھی۔ زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ۔ کیا اتنی دیر میں ہم یہ سب کچھ کر سکتے تھے جو تمہیں نظر آ رہا ہے، یہ سب تمہارے رابعہ بی بی کے جانے کے بعد کسی نے کیا تھا۔ ہم دروازہ کھلا دیکھ کر رک گئے تھے۔ پھر ہماری نظر نے کمرے کی یہ حالت دیکھی۔ ہم نے ابھی دوسرے کمرے نہیں دیکھے۔ تم نے بھی نہیں دیکھے ہوں گے لیکن ہمارا اندازہ ہے کہ بڑی بی بی کے کمرے، ڈرائنگ روم اور رابعہ بی بی کے آفس کی حالت بھی ایسی ہی ہو گی۔ ثبوت اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتی ہو تو ہمارے ساتھ چلو۔ تم خوش قسمت ہو کہ جب یہاں کچھ لوگ یہ کام کر رہے تھے تو تم نہیں آئیں۔ اگر تم آ جاتیں تو اس وقت کسی کمرے میں سامان کے درمیان تمہاری لاش بھی پڑی ہوتی۔"

خادمہ کے بدن میں ایک لرزش ہوئی "وہ... کون لوگ صاب جی! کون آیا تھا یہاں؟" وہ کانپتے ہوئے بولی۔ وہ ایک وکیل کی خادمہ تھی اور یہ جانتی تھی کہ اس کی مالکن قتل جیسے معاملات میں ملوث لوگوں سے ملتی ہے، لاشیں دیکھنے جاتی ہے اور کہیں قتل ہو جائے تو وہ وہاں جا کے ہونے والی چیزوں کا معائنہ کرتی ہے۔ چوروں ڈاکوؤں قاتلوں کے

مقدمات لڑتی ہے اور مجرموں کو بچانا اس کا پیشہ ہے جس کی خاطر وہ مجرموں سے تعلق رکھنے پر مجبور ہے مگر یہ خیال اس کے لیے انتہائی روح فرسا تھا کہ اسی کے گھر میں مجرم دن دھاڑے یہ تباہی پھیلاتے رہے اور وہ گھر میں موجود ہو کے بھی بے خبر رہی تھی۔

"یہ میں بعد میں بتاؤں گا کہ وہ کون لوگ ہیں۔" میں نے کہا "پہلے دوسرے کمروں کی حالت دیکھ لو تاکہ تمہیں یقین آ جائے کہ ہم نے غلط نہیں کہا۔" وہ اب خاصی شرمسار تھی مگر میں اسے اپنے ہمراہ رابعہ کی ماں کے کمرے میں لے گیا۔ دروازہ کھلتے ہی جو نظارہ اس نے دیکھا وہ رابعہ کے کمرے کے نظارے سے مختلف نہیں تھا۔ پھر ہم نیچے گئے اور میں نے اسے ڈرائنگ روم کی حالت دکھائی۔ تلاشی کے دوران توڑ پھوڑ سے نقصان نہیں ہوا تھا مگر سامان کے الٹنے پلٹنے سے ترتیب و آرائش کا بیڑہ غرق ہو گیا تھا۔ سب سے بری حالت آفس کی ہونی چاہیے تھی مگر رابعہ نے آفس کے لیے خصوصی حفاظتی انتظامات کر رکھے تھے۔ لکڑی کا فلش دروازہ ہی بہت مضبوط تھا۔ پھر اس میں خودکار قفل تھا اور باہر کی طرف لوہے کی پھیل جانے والی گرل تھی جس میں سیاہ رنگ کا مضبوط تالا نظر آ رہا تھا۔ باقی کھڑکیوں میں بھی اندر کی طرف گرل تھی، چنانچہ تلاشی لینے والے لائبریری میں داخل ہی نہیں ہو سکے تھے۔ ان کے لیے زیادہ دیر ٹھہرنا بھی مشکل تھا۔ رابعہ کے معمولات پر نگاہ رکھنے والوں سے یہ بات پوشیدہ نہ ہو گی کہ شام کو رابعہ کا ایک معاون وکیل اس سے اگلے دن پیش ہونے والے مقدمات کی فائلوں پر بریفنگ لینے آتا ہے۔ رابعہ کا چیمبر جہاں مؤکل اس سے رابطہ قائم کرتے تھے ہائیکورٹ کے سامنے ایک کمرشل بلڈنگ کی دوسری منزل پر تھا اور وہاں اس کے دو معاون وکیل اور عملے کے دیگر ارکان ہر شام پانچ بجے سے نو بجے تک موجود رہتے تھے۔ اگر وہ چاہتے تو خادمہ کو اور شام کے بعد آنے والے مددگار وکیل کو قابو میں کر کے لائبریری کی تلاشی بھی لے سکتے تھے مگر یہ کام آسان نہ تھا۔ لائبریری میں سینکڑوں مجلد اور ضخیم قانونی کتب کے علاوہ بہت سی فائلوں کے ڈھیر تھے جو الماریوں میں بند تھے اور درازیں تھیں جو کاغذات سے پر تھیں۔ انہوں نے مجبوراً وہ مشکل لیکن مؤثر طریقہ اختیار کیا جس میں کامیابی یقینی ہو جاتی تھی۔ اس کا بندوبست وہ کر کے آئے تھے لیکن ان کو مطلوبہ چیز مل جاتی تو شاید وہ رابعہ کو لے جانے کا خطرہ مول نہ لیتے۔

خادمہ کو دہری شرمندگی تھی۔ ایک سوچے سمجھے بغیر بولنے پر اور دوسری مجھ سے ایک جھانپڑ کھانے پر۔ اس نے بمشکل تمام وضاحت کی کہ وہ تو ہم سے چائے کے بارے میں پوچھنے آئی تھی اور یہ اس کی بے وقوفی تھی کہ اس نے غلط سمجھا اور اس کی سزا بھی بھگت لی۔ اب اس بات کا ذکر رابعہ بی بی اور بڑی بی بی سے نہ کیا جائے۔ میں نے کہا کہ یہ تو معمولی بات تھی زیادہ اہم مسئلہ یہ ہے کہ جو کچھ اس نے دیکھا وہ کسی کو معلوم نہ ہو۔

"تم جانتی ہو ماسی کہ رابعہ بی بی عدالتوں میں مجرموں کی پیروی کرتی ہیں۔" میں نے کہا "یعنی ان کو چوری ڈاکے قتل اور اغوا کے علاوہ ایسے ہی بہت سے الزامات سے بچاتی ہیں۔ بعض اوقات یہ الزامات درست ہوتے ہیں تو مجرموں کو سزا ہو جاتی ہے اور وہ بے گناہ ہوں تو بچ جاتے ہیں لیکن کبھی کبھی مجرم دشمنی میں شریف آدمیوں کو بھی پھنسا دیتے ہیں۔ شہر میں دو بدمعاش ہوں تو ایک کی کوشش ہوتی ہے کہ دوسرا نہ رہے۔ یہ بھی ایسا ہی معاملہ ہے۔ رابعہ بی بی ایک ایسے شخص کو بچا رہی ہیں جس کے پیچھے بدمعاش لگے ہوتے ہیں اور جو ثبوت رابعہ بی بی کو ملے ہیں وہ ایسے ہیں کہ ان کی کامیابی یقینی ہے۔ وہ بدمعاش اسی لیے آئے تھے کہ چند اہم کاغذات چرا کے لے جائیں مگر انہیں کامیابی نہیں ہوئی۔ وہ کاغذات دوسرے دفتر میں تھے یا اس دفتر میں جو محفوظ رہا۔ چوری کچھ نہیں ہوا ہے اس لیے پولیس کو رپورٹ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ رابعہ بی بی تو آج راولپنڈی گئی ہیں۔"

"رابعہ بی بی پنڈی گئی ہیں؟" خادمہ نے حیرانی اور پریشانی سے کہا "مجھے کیوں نہیں بتایا انہوں نے؟"

"نہیں بتایا؟" میں نے بے حد تعجب کا اظہار کیا "کمال ہے۔ بھول گئی ہوں گی جلدی میں۔ وہاں ایک بہت بڑے ڈاکٹر ہیں۔ ان کو لے کر آئیں گی۔ ہو سکتا ہے ڈاکٹر صاحب ایکدم نہ آ سکیں۔ کل کے بجائے پرسوں آئیں۔"

"مگر صاب جی! میں یہاں اکیلی کیسے رہوں گی؟" خادمہ نے پریشان لہجے میں کہا۔

"ہاں یہ تو مسئلہ ہے۔" میں نے کہا "ہم رات کو ہسپتال چلے گئے تو تم بالکل اکیلی رہ جاؤ گی۔ یہ بتاؤ تمہارا کوئی رشتے دار ہے یہاں؟"

"میرا داماد ہے جی!" وہ بولی "میں اس کے پاس چلی جاتی ہوں دو دن کے لیے۔"

"یہ ٹھیک ہے۔" میں نے کہا "مگر پہلے وہ چائے، جھک سے ہمارا برا حال ہے۔ اور ایک بار پھر معافی۔ تم میری ماں کے برابر ہو۔"

اس کے جانے کے بعد میں نے اور محسن نے اطمینان کا سانس لیا۔ "یہ خواہ مخواہ کی مصیبت گلے پڑی" محسن بولا۔

"شکر کرٹل گئی" میں نے کہا۔ "ماسی کی سمجھ میں آگئی ورنہ ایک مسئلہ بن جاتا۔ اس کی زبان بند رکھنے کے لیے کوئی تدبیر تو کرنی ہی تھی۔ خواہ اسے دعوتِ اسٹور میں بند رکھنا پڑتا۔"

"اس سے بڑا مسئلہ رابعہ کی ماں کا ہے سکندر!" محسن نے کہا "جب وہ ہوش میں آئے گی تو پوچھے گی کہ میری بیٹی کہاں ہے۔ ایک دن تو ٹال سکتے ہیں۔ دوسرے دن کیا بہانہ کریں گے کہ وہ کیوں نہیں آئی؟"

"مجھے امید ہے کہ دوسرے دن کی نوبت نہیں آئے گی۔" میں نے کہا۔ "رابعہ اس سے پہلے لوٹ آئے گی، یا پھر کبھی نہیں آئے گی۔"

"فرض کرو اس میں تین چار دن لگ گئے؟" محسن نے کہا۔ "ایک ہفتہ لگ گیا۔ نا ممکن کچھ نہیں ہوتا۔"

"تو ہم ڈاکٹروں سے مدد لیں گے۔ بڑی بی کوئی صدمہ جھیلنے کے قابل کہاں ہیں۔ ہم کوشش کر سکتے ہیں کہ انھیں سلائے رکھیں۔ اگر ڈاکٹر نہ مانے تو کسی نرس سے مدد لی جا سکتی ہے۔ ڈائزی پام کا ایک انجکشن روز۔ کبھی صبح، کبھی دوپہر، کبھی شام، اور جب وہ مسلسل کئی گھنٹے سونے کے بعد یہ سوال کریں تو ان سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ صبح یا شام آتی ہے، ابھی ابھی گئی ہے۔ اگر جائز طریقے سے یہ کام نہ ہوا تو میں ناجائز طریقے سے کرا لوں گا ورنہ خود کر لوں گا۔ مجھے انجکشن دینا آتا ہے۔ ڈائزی پام کے زیرِ اثر سوتے رہنے سے نقصان نہیں فائدہ ہو سکتا ہے۔ جاگ کے تشویش میں مبتلا ہونے سے نقصان یقینی ہے۔ میں شرط لگاتا ہوں کہ اس وقت بڑی بی کو اغوا کی خبر ملے تو اسی وقت ان کا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔ میں یہ خطرہ کیسے مول لے سکتا ہوں؟"

"سکندر!" محسن نے کان لگا کے کہا۔ "لائبریری میں گھنٹی بج رہی ہے فون کی۔ گھنٹی اوپر بھی بج رہی ہوگی۔"

گھنٹی واقعی بج رہی تھی لیکن ہمارے اوپر پہنچنے تک خاموش ہو گئی۔ میں نے مایوسی سے محسن کی طرف دیکھا۔ "دیر ہو گئی ہمیں۔"

"کوئی بات نہیں۔ وہ پھر فون کریں گے۔" محسن نے کہا اور ہم رابعہ کے بیڈ پر بیٹھ گئے۔ گدے کا استر پھٹا ہوا تھا لیکن اندر کا فوم سلامت تھا۔ مجھے یاد آیا گزشتہ رات دو بجے میں نے اسی کمرے میں قدم رکھا تھا تو مجھے اس کی نظر نواز فضا نے اور دلنواز مہک نے کس طرح مسحور کر لیا تھا۔ مجھے تعجب ہوا کہ کچھ دیر پہلے میں محسن کے ساتھ آیا تھا تو مجھے اس خوشبو کا احساس کیوں نہیں ہوا تھا۔ ساری بات احساس کی کرشمہ سازی ہے۔ اس وقت میرے حواس پر مختلف کیفیت کا غلبہ تھا۔ میرا دھیان رابعہ اور اس کی سحر آفریں خوشبو کی طرف نہیں۔ اب پھر مجھے اس کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے دیکھا کہ محسن کسی اور خیال میں گم ہے۔ وہ خوشبو کے بارے میں نہیں، اس پیغام کی نوعیت پر غور کر رہا تھا جو موصول ہونے والا تھا۔ رابعہ کے گھر میں دو ٹیلیفون تھے۔ ایک جو رابعہ قادری ایڈووکیٹ کے نام پر تھا، نیچے آفس میں لگا ہوا تھا اور اسی کی ایکسٹینشن اوپر رابعہ کے بیڈ روم تک تھی۔ دوسرا رابعہ کے والد کے نام پر تھا جو ان کے گھر کا پرائیویٹ نمبر تھا اور اس کی دو لائنیں ڈرائنگ روم اور رابعہ کی ماں کے کمرے میں تھیں۔ ٹیلی فون کی گھنٹی کے انتظار میں ہم دونوں کی نگاہ بار بار اس بے جان آلے کی طرف جاتی تھی جس نے یکلخت زندگی اور موت کے نامہ بر کی حیثیت اختیار کر لی تھی لیکن فون خاموش تھا۔ وقت۔ سیکنڈ، منٹ، گھنٹے۔ دن ہفتے اور ماہ و سال۔ سب احساس کے پیمانے ہیں جو ذہن کی بدلتی ہوئی کیفیت کا نام ہے۔ جیل میں پھانسی کی تاریخ کا انتظار کرنے والے کے لیے وقت پر لگا کے اڑتا ہے۔ محبوب کے ایفائے عہد کی امید میں چشم براہ منتظرِ دید کے لیے وقت کتنا سست خرام ہو جاتا ہے اور جب وصل کی ساعتِ نایاب میسر آتی ہے تو وہی وقت یکلخت برق رفتار ہو جاتا ہے۔ میں نے ایک اور سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسل دیا۔ محسن نے ایک اور سگریٹ سلگایا۔ خادمہ چائے کی ٹرے رکھ گئی جس میں حلوہ تھا جو اس نے ابھی ابھی بنایا تھا۔ شاید وہ یہی پوچھنے آئی تھی کہ اور کھانے کی کوئی چیز نہیں جو چائے کے ساتھ رکھی جا سکے۔ میں نے چائے بنائی اور محسن کو دی۔ محسن نے بُرا سا منہ بنایا اور چائے میں چینی ڈالنے لگا۔ جب میں نے چائے کا پہلا گھونٹ لیا تو میں نے بھی بُرا سا منہ بنایا۔ محسن کے کپ میں چینی بھی میں نے اپنے ہی کپ میں ڈال لی تھی۔ میں نے وہ شیرا پی لیا اور دوسرا کپ بنایا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی نہیں بجی۔

"کیا مصیبت ہے۔" محسن نے کہا اور خود بھی چائے کا ایک اور کپ تیار کرنے لگا۔ چائے پینا وقت گزارنے کا ایک ذریعہ بھی تھا۔

"لاحول ولا قوۃ۔" میں نے دوسرا کپ خالی کر کے

گھڑی کے بعد ٹیلی فون کی طرف دیکھا۔ اسی وقت گھنٹی بجی اور ہم دونوں نے ایک ساتھ ہاتھ بڑھایا لیکن ریسیور میرے ہاتھ میں آ گیا۔ "کراچی سے خیبر میل وقت پر آ رہی ہے؟" کسی عورت نے کہا۔

"رانگ نمبر۔" میں نے ریسیور رکھ دیا۔ محسن کا چہرہ اتر گیا۔ میں ایسی اعصابی کشیدگی کا شکار تھا کہ عورت نہ ہوتی تو میرے منہ سے گالی نکلتی۔

خادمہ اسی وقت اندر آئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔ "یہ دے گیا ہے کوئی صاب جی!" اس نے آہستہ سے کہا۔

"کون؟" میں نے لفافہ جھپٹتے ہوئے کہا۔ "کب آیا تھا؟ کیا کہا تھا اس نے کسے دینا ہے لفافہ؟ ہمیں کیوں نہیں بتایا تم نے؟"

خادمہ بوکھلا گئی۔ "وہ... صاب جی! مجھے وقت ہی نہیں ملا۔ کوئی بچہ تھا دس بارہ سال کا۔ مجھے تو نوکر لگتا تھا کسی کا۔ اس نے لفافہ دے کر کہا کہ یہ رابعہ بی بی کے لیے ہے۔ وہ نہ ہوں تو گھر میں کسی کو بھی دے دینا۔"

"اچھا۔ آیندہ اجنبی ہو تو خود اس سے بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ پکڑا جائے گا کوئی بم اور تم لے لو گی۔" محسن نے جھلا کر کہا۔

خادمہ کی پوزیشن اور خراب ہو گئی تھی۔ "صاب جی! اب اجازت دیں تو میں جاؤں، اپنے داماد کے گھر۔ میرا جی ٹھیک نہیں ہے۔" وہ بولی اور میں نے محسوس کیا کہ اس کی حالت واقعی غیر ہو رہی ہے۔

"جاؤ۔" میں نے کہا۔ "چابیاں دے جاؤ تاکہ ہم کو جانا ہو تو گھر کھلا نہ پڑا رہے۔"

سادے لفافے پر کسی کا نام نہیں تھا۔ اس کے اندر سے کاغذ کا دوسرا پرزہ برآمد ہوا جو اسی چار انچ چھ انچ سائز کا تھا اور اس پر پنسل سے وہ تحریر تھی جس کا نمونہ پہلے پیغام میں تھا۔ لکھائی سے اندازہ ہوتا تھا کہ کسی نے عمداً سیدھے ہاتھ کے بجائے الٹے ہاتھ سے لکھنے کی کوشش کی ہے۔ خط کسی تمہید کے بغیر شروع ہوتا تھا۔

"ابھی تک تم نے عقل سے کام لیا ہے اور پولیس کو رپورٹ نہیں کی اس لیے رابعہ بھی خیریت سے ہے۔ غلطی سے بھی فون کا غلط استعمال مت کرنا ورنہ ہمیں معلوم ہو جائے گا۔ جو بات ابھی تک رابعہ کی ماں کو معلوم نہیں وہ اسے معلوم ہو جائے گی۔ خدانخواستہ اس کا دل یہ صدمہ برداشت نہ کر سکا تو رابعہ قصوروار تمھیں سمجھے گی۔

اب تک تم نے اندازہ یقیناً کر لیا ہوگا کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔ ہمیں وہ لفافہ چاہیے جو تم نے بابو پوسٹ مین سے ہتھیا لیا تھا۔ اس میں سے سادہ کاغذات برآمد ہوتے تھے نا؟ کوئی بات نہیں۔ وہی سادے کاغذات ہمارے حوالے کر دو۔ رابعہ پر آنچ نہیں آئے گی ورنہ یہ سمجھ لو کہ وہ تمھارے خیال کی دسترس سے بھی باہر ہے اور پولیس کیا، جتنے بھی سراغ لگانے والے ادارے ہیں سب مل کر بھی ہم تک نہیں پہنچ سکتے۔ اگر تم نے ضد میں رابعہ کی ماں کو اور رابعہ کو قربان کر دیا تب بھی یہ کامیابی عارضی ہوگی۔ ہم وہ لفافہ بعد میں حاصل کر لیں گے جس کے بارے میں ابھی تک تمھیں کچھ نہیں معلوم کہ اس میں کیا لکھا ہے۔ تمھاری وہ بات مضحکہ خیز تھی کہ بہت سے لوگ اس کے بارے میں جانتے ہیں اور تم نے اس کی نقلیں بنوا کے تحفظ کی ضمانت حاصل کر لی ہے۔ اس خط کی فوٹو اسٹیٹ کاپی بھی سادے کاغذات کے سوا کیا ہو گی جس پر کچھ لکھا ہوا نظر ہی نہ آتا ہو۔ منشی مرحوم نے مرتے وقت اعتراف کیا تھا کہ اس سے ایک بھول ہو گئی تھی یعنی وہ لفافے میں پرچہ ترکیبِ استعمال ڈالنا بھول گیا۔ یہ بھول کی بات نہیں تھی۔ وہ شاید تمھیں ٹیلی فون پر بتا دیتا یا الگ خط ڈالتا۔ تاہم اس نے وہ بات ہمیں بتا دی جو تمھیں نہیں بتا سکا تھا۔ تم اسے اب بھی کسی کیمسٹری کے پروفیسر یا کسی کیمیکل لیبارٹری میں لے جاؤ تو وہ یقیناً پورا مضمون پڑھنے میں تمھاری مدد کر سکیں گے لیکن اب وقت نہیں رہا۔ رابعہ کے کہنے کے مطابق وہ خط گھر میں ہی موجود ہے۔ اس سے زیادہ وہ کچھ بتانے کے لیے تیار نہیں۔ سوائے دفتر اور لائبریری کے ہم نے گھر کا کونا کونا دیکھ لیا تھا۔ ہمارا خیال ہے کہ تم رابعہ سے بہتر طور پر پوچھ سکتے ہو کہ خط لائبریری

میں ہے تو کہاں ہے اور اگر وہاں بھی نہیں ہے تو اس نے کس کے پاس رکھوایا ہے۔ بہتر ہم نے اس لیے کہا کہ ہمارے پوچھنے کے طریقے ذرا مختلف ہیں۔ رالعہ سمجھتی تو ہے مگر وہ بہادر بن رہی ہے اور اسے خوش فہمی ہے کہ وہ اپنی ضد پر قائم رہ سکتی ہے۔ اسے سمجھاؤ کہ یہ ناممکن ہے۔ یہ تم سب کے مفاد میں ہے کہ پڑھے بغیر وہ لفافہ ہمیں دے دو۔

گھر سے نکل کے رالعہ کی فاکس ویگن تک جاؤ جو کراؤن سینما کی طرف سڑک کے کنارے کھڑی ہے اس کے پیچھے ایک ٹیکسی ہے ٹیکسی میں چابیاں موجود ہوں گی۔ اس ٹیکسی کو گڑھی شاہو کی طرف لے جاؤ اور دائیں طرف مڑ کے ریلوے کراسنگ تک سیدھے جاؤ۔ پھر نہر کے بائیں کنارے پر اسی شکستہ مزار کی طرف مڑھو جہاں سے پولیس کو منشی کی (ایک گمنام فقیر کی مسخ شدہ) لاش ملی تھی۔ اس سڑک پر دو افراد تمہیں روکیں گے۔ ان کے لباس ایک جیسے ہوں گے۔ کسی اور کو بٹھاؤ گے تو قدرتی طور پر ہم شک میں مبتلا ہو جائیں گے۔ مزید ہدایات وہ دونوں مسافر دیں گے۔

یہ مت بھولنا کہ تم ہر لحظہ ہماری نگاہ میں ہو۔"

میں نے خط کو محسن کی طرف بڑھا دیا۔ کاغذ کا پرزہ دونوں طرف لکھنے سے بھر گیا تھا لیکن میری طرح محسن نے بھی اس عبارت کو پانچ منٹ میں دو بار پڑھ لیا۔ "یہ لوگ ڈاج کر رہے ہیں سکندر!" محسن نے کہا۔ "ابھی تک انہیں علم نہیں کہ رابعہ کی فاکس ویگن اب وہاں نہیں ہے جہاں یہ لوگ سمجھ رہے ہیں۔ ان کے کسی آدمی کی ہم پر نگاہ نہیں۔ یہ سب ہمیں نفسیاتی طور پر مرعوب کرنے کے لیے لکھا گیا ہے۔"

"کیا اس سے یہ نتیجہ بھی نکالا جا سکتا ہے کہ ٹیلی فون بھی کوئی ٹیپ نہیں کر رہا ہے؟" میں نے کہا۔ "کیونکہ فون یا تو ایکسچینج میں ٹیپ ہوتا ہے یا گھر کی قریب ترین لائن سے مگر اس کے لیے پول پر چڑھنا پڑتا ہے اور پول پر کوئی کب تک ٹنگا رہ سکتا ہے۔ یہ تو ہم فوراً باہر نکل کے بھی دیکھ سکتے ہیں۔"

"فون ٹیپ کرنے کے بہت سے سائنٹیفک طریقے ایجاد ہو چکے ہیں۔" محسن بولا۔ "لائن کے علاوہ جنکشن باکس بھی ہوتے ہیں۔ ہم نے تو یہ بھی نہیں دیکھا کہ باہر کہیں فون کی لائن سے تار تو نہیں جوڑ رکھا ہے۔"

"ہو سکتا ہے خط بھی رالعہ کی فاکس ویگن کے پہلے لکھا گیا ہو۔" میں نے کہا۔ "ہم خطرات مول لینے میں نہیں رہے محسن! انہوں نے ایک دھمکی اور دی ہے کہ رالعہ کی ماں کو رالعہ کے اغوا کے بارے میں بتا دیا جائے گا۔ وہ واقعی مر جائے گی اور آج ظلم کے خلاف سینہ سپر ہونے والی رالعہ کو بھی کل یہ خیال ضرور آئے گا کہ اس نے اپنی ماں کو اپنی ضد پر قربان کر دیا۔"

"بعض اوقات حصولِ مقصد میں کامیابی یقینی ہو تو آدمی اپنی پیاری سے پیاری چیز قربان کر کے بھی نہیں پچھتاتا۔" محسن نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

میں فوراً سمجھ گیا کہ محسن کی بات کا مطلب کیا ہے۔ "رالعہ کا دماغ خراب ہو رہا ہے تو کیا۔ میں تو ہوش میں ہوں۔" میں نے کہا۔

"اچھا خدا حافظ۔" محسن نے کہا۔ "یہ بتا، رالعہ نے تیری بات نہ مانی۔ لفافے کا پتا نہ بتایا تو کیا ہوگا؟"

"یہ میں جانے سے پہلے ہی کیسے بتا سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "تو میرا یہیں انتظار کرنا۔ صبح تک۔ اس کے بعد"

"اس سے پہلے یا اس کے بعد جو کچھ کرنا ہوگا وہ میں اپنی پرائیویٹ عقل کی مدد سے کروں گا۔ آپ تشریف لے جائیں۔" محسن چڑ کے بولا۔

"صاب جی! میں جا رہی ہوں۔" خادمہ نے چائے کی ٹرے میز پر رکھ کے کہا۔ وہ اپنا بوسیدہ برقع اور میلی پوٹلی بغل میں دبائے کھڑی تھی۔

"تمہارا داماد کہاں رہتا ہے ماسی؟" محسن نے اسے سر سے دیکھ کے کہا۔ "کیسے جاؤ گی؟"

"چلی جاؤں گی بس سے۔ وہ صدر میں رہتا ہے۔ کے پیچھے والی گلی میں۔" وہ بولی۔

محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "تم سکندر صاحب کے ساتھ چلی جاؤ۔ یہ تمہیں ٹیکسی میں لے جائیں گے۔"

"اس تکلیف کی ضرورت نہیں صاب جی! میں آتی جاتی رہتی ہوں۔" خادمہ نے عاجزی سے کہا۔

"تکلیف کیسی۔ یہ بھی ادھر ہی جا رہے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "سکندر! ماسی کو عین ان کے گھر کے دروازے تک پہنچانا ہے۔ آج تم نے ان کے ساتھ بہت بدتمیزی کی ہے۔" محسن کا انداز تحکمانہ اور فیصلہ کن تھا۔ خادمہ کی نظر بچا کے محسن نے مجھے آنکھ ماری تو میں سمجھ گیا کہ اس کے ذہن میں کچھ اور ہے۔ میں اسے منع بھی کرنا چاہتا تھا کہ وہ کسی چکر میں نہ پڑے اور پوچھنا بھی چاہتا تھا کہ اس نے کیا سوچا ہے لیکن میں مجبور تھا کہ خاموشی سے اس کی بات مانوں۔ نہ وہ ماسی کے سامنے کچھ بتاتا اور نہ میرے منع کرنے سے مانتا۔ میں نے ماسی کو ساتھ لیا اور کوٹھی سے باہر آیا تو وہ ذرا سی دیر کے لیے رکی۔ اس خیال سے کہ شاید میں کسی گزرتی ہوئی ٹیکسی کو روکوں لیکن میں نے کہا، اپنی ٹیکسی آگے کھڑی ہے تو وہ پھر چل پڑی۔

محسن نے ماسی کو کیا سوچ کے میرے ساتھ کیا تھا، یہ میں ابھی طے نہیں کر سکا تھا۔ شاید اس کا مقصد نگرانی کرنے والوں کو گمراہ کرنا تھا۔ اگر وہ واقعی دیکھ رہے ہوں گے تو فوراً چوکنے ہو جائیں گے اور تعاقب کیا تو صدر تک جا کے انہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ کیا محسن اس مہلت سے فائدہ اٹھانے کے بارے میں کوئی فیصلہ کر چکا ہے؟ یقیناً بات یہی ہوگی۔ میں نے ٹیکسی کا دروازہ کھولتے ہوئے سوچا۔ ماسی کو پیچھے والی سیٹ پر بٹھا کے میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور انجن اسٹارٹ کیا۔

یہ احساس بہت عجیب تھا کہ میں ایک چوری کی ٹیکسی میں اتنے اعتماد کے ساتھ دن دہاڑے شہر کی سڑکوں پر رواں تھا۔ چوری کی رپورٹ اب تک درج کرا دی گئی ہوگی۔ باعثِ اطمینان پولیس کا وہی نااہل انتظام تھا۔ ابھی چوری ہونے والی ٹیکسی کا نمبر ہر تھانے کو بتایا جائے گا اور وہ مجبوراً لکھ لیں گے گشتی پولیس، اور ٹریفک پولیس کی چوکیوں میں آرام سے بیٹھ کے گپ لگانے والے بھی نمبر نوٹ کر کے مطمئن ہو جائیں گے۔ یہ نہیں ہوگا کہ وہ فوراً سڑک پر نکل کھڑے ہوں اور سڑک پر سے گزرنے والی ہر ٹیکسی کا نمبر پڑھیں۔ لیکن ان کے پاس تو ایک طویل فہرست ہوتی ہے جو ہر روز چوری ہونے والی اور بہت کم پھرنے والی کاروں کی تعداد کے باعث طویل سے طویل تر ہوتی جا رہی ہے۔ ان کا ذہن کون سا خودکار کمپیوٹر ہے کہ سارے نمبر یاد رکھے اور جیسے ہی کوئی مسروقہ کار سامنے سے گزرے کھٹ سے سگنل دے دے۔ خود کوئی موٹر سائیکل سوار ٹریفک سارجنٹ دیکھ کر پیچھے لگ جائے تو الگ بات ہے ورنہ چوراہوں اور ادھر ادھر کھڑے ہوئے عام سپاہی تو دیکھ کر بھی منہ پھیر لینے کے سوا کیا کر سکتے ہیں۔ تاہم ایک اندیشہ اپنی جگہ تھا کہ میں پکڑا گیا تو کیا جواب دوں گا۔ ماسی کی نظر میں تو میری حیثیت مصدقہ خطرناک مجرم کی ہو جائے گی۔ پولیس والے گمشدہ کار کی تلاش ہمیشہ اس امید کے ساتھ شروع کرتے ہیں کہ چوری یا تو کسی لونڈے نے ایڈونچر کی خاطر کی ہوگی یا پیشہ ور مجرموں نے کسی خاص مشن کی خاطر اور کار کہیں نہ کہیں لاوارث کھڑی مل جائے گی۔ پچاس فیصد صورتوں میں ان کا اندازہ درست ثابت ہوتا ہے۔ باقی پچاس فیصد اندازوں کے غلط ہونے کے بعد وہ مالک کو شہر کی سڑکوں اور گلیوں کی سیر کراتے ہیں اور خود بھی پھرتے ہیں چنانچہ کھانے اور چائے، سگریٹ، پان وغیرہ کے اخراجات شکایت کنندہ سے وصول کرتے ہیں۔ ظاہر ہے آدمی خالی پیٹ رکے بغیر تو گشت نہیں کر سکتا۔ مشین بھی آرام اور ایندھن مانگتی ہے۔ جو گاڑیاں نہ ملیں وہ مشتبہ طور پر غیر علاقے پہنچا دی جاتی ہیں یا ان کے اجزائے ترکیبی منتشر ہو کے بصورت اسپیئر پارٹ چور بازار میں پہنچ جاتے ہیں اور مالک کو صبر کرنے یا دوسری گاڑی خریدنے کا سنہری مشورہ دے کر پولیس اپنے فرائضِ منصبی سے بحسن و خوبی عہدہ برآ ہو جاتی ہے۔

"بس بیٹا ادھر ہی روک لینا ٹیکسی۔" ماسی نے پیچھے سے کہا اور میں نے ٹیکسی روک لی۔ ماسی کے اترتے ہی ایک بالشتیے بڑے میاں، اپنے مچھندر بیٹے کے ساتھ لپکے۔ دونوں میں فرق صرف عمر اور مونچھوں کا تھا۔

"ابے اسٹیشن جانا ہے۔ چھاؤنی کے اسٹیشن۔" بڑے میاں نے کہا اور چیخ کر اپنے مچھندر بیٹے سے کہا کہ وہ ٹین کے صندوق کا بوجھ اپنے سر پر سے ٹیکسی کی چھت پر رکھ دے لیکن بیٹا ابھی سڑک کے دوسرے کنارے پر کھڑا تھا۔

"میں ٹیکسی ڈرائیور نظر آتا ہوں تمہیں؟" میں نے غرا کے کہا۔ بڑے میاں نے منہ دوسری طرف کر کے صدا لگائی۔ ایک فارغ کھڑا ہوا سپاہی ڈنڈا ہلاتا، وقت گزاری اور آمدنی کا وسیلہ پیدا ہونے پر مسکراتا آگے آیا۔ مچھندر بیٹے نے اتنی دیر میں ٹین کا صندوق چھت پر پھینک دیا تھا۔

"اے! ہٹاؤ اس مصیبت کو۔" میں نے خوفناک لہجے میں کہا۔ "ورنہ اسے بھی لے جاؤں گا۔"

"کیا؟" بڑے میاں نے چیخ ماری۔ "دیکھ رہے ہیں آپ سنتری صاحب! یہ دیدہ دلیری۔ مسافر کو بٹھانے سے انکار۔ اور پھر یہ دھمکی۔"

"اٹھاؤ۔" میں نے دھاڑ کر کہا۔ "مجھے ایس ایس پی صاحب رضوی کی بیگم کو لینے جانا ہے۔ یہ ان کی ٹیکسی ہے۔ تمہارے باپ کی کار نہیں ہے۔"

سنتری کی پیش قدمی اور جارحانہ عزائم کا خاتمہ ہو گیا۔ "ارے چچا! ہم دلواتے ہیں آپ کو دوسری ٹیکسی۔" اس نے خود باکس اتارتے ہوئے کہا اور اس کی یہ بات نہیں

سنی کہ گھنٹے بھر کے بعد تو ایک ٹیکسی آئی تھی وہ دوسری کہاں سے دلوئے گا۔ میں نے میٹر ڈاؤن کیا اور کسی کی طرف دیکھے بغیر طوفانی رفتار سے ٹیکسی موڑی۔ حالات کی سنگینی کے باوجود مجھے اس ایک ایکٹ کے چھوٹے سے مزاحیہ ڈرامے پر ہنسی آئی۔ واپس دھرمپورے کی طرف مڑتے ہی مجھے ریلوے کراسنگ پر انتظار کرنا پڑا۔ یہ پھاٹک شاذونادر ہی بند ہوتا تھا۔ دس منٹ بعد جب مال گاڑی کے چند ڈبوں کو بادلِ ناخواستہ کھینچ کر لے جانے والا کالا انجن دھواں چھوڑتا گزر گیا تو میں پھر آگے بڑھا۔ اگلا ریلوے کراسنگ جس پر سے کراچی جانے اور آنے والی گاڑیاں گزرتی تھیں پھر بند تھا مگر مجھے اس سے پہلے ہی سیدھے ہاتھ کی طرف مڑ جانا تھا۔ میں نے اپنی رفتار کم کر دی۔ اب شام کا دھندلکا گہرا ہونے لگا تھا اور کچھ گاڑیاں پارکنگ لائٹ جلا کے چل رہی تھیں۔ میں نے اپنی نگاہ سڑک پر رکھی جس پر پیدل چلنے والے ناپید تھے۔ سامنے سے ایک کار نمودار ہوئی اور زوم سے گزر گئی۔ باغبانپورے یا مغلپورے جانے والا ٹخ ٹخ کرتا ایک تانگہ پیچھے رہ گیا۔

وہ دونوں مخالف سمت سے نمودار ہوتے۔ سڑک کے دونوں کناروں پر آمنے سامنے دو درخت تھے۔ وہ انہی کے پیچھے چھپے کھڑے تھے۔ مجھے بے ساختہ ہنسی بھی آئی اور مجھے فوراً بریک بھی لگانے پڑے۔ ان کے ایک جیسے لباس پرانی وضع کے سفید لٹھے کے شٹل کاک ٹائپ برقعے تھے اور وہ سڑک کے بیچ میں کھڑے ہوتے بھوت نظر آتے تھے۔ پلک جھپکتے میں وہ دونوں کار کے پچھلے دروازے کھول کے بیٹھ گئے۔

"چلتے رہو۔" ان میں سے ایک نے کہا۔ "پلٹ کر مت دیکھنا۔"

"مہذب ٹیکسی ڈرائیور پردہ نشیں بیبیوں کو آنکھ اٹھا کے بھی نہیں دیکھتے۔" میں نے کہا۔ "ریوالور کی دھمکی کی ضرورت نہیں۔"

یہ فرض کرنا محال تھا کہ وہ پہلے سے برقعے اوڑھے کھڑے تھے۔ ہر راہ گیر سڑک کے دونوں طرف کھڑی ہوئی خواتین کو دیکھ کر شک میں مبتلا ہو سکتا تھا۔ وہ برقعے بغل میں دبا کے کھڑے ہوں گے۔ ٹیکسی کو دیکھتے ہی انہوں نے پیراشوٹ کی طرح کھٹ سے برقع کھول کے سر پر ڈال لیا۔ جدید وضع کا ٹو پیس برقع ہوتا تو ان کو بند باندھنے پڑتے، اور بٹن بند کرنے پڑتے۔ یہ فوراً کام آنے والا آسانی سے

دستیاب ہونے والا اور پوری طرح چھپا لینے والا لباس ہر قسم کے نقاب یا ماسک سے بہتر تھا جو ہمارے ملک کے اور یورپ کے مجرم استعمال کر رہے تھے۔ شالیمار سے مجھے ٹکسال کی طرف چلنے کا حکم دیا گیا۔ ٹکسال سے پہلے اسی قسم کے برقعے والی ایک خمیدہ کمر بڑی بی نے مجھے روکنا چاہا جو کوئی پوٹلی یا باسکٹ رکھے کھڑی تھیں۔ "ارے اماں،" میں نے کہا۔ "یک نہ شد دو شد والا کیس پہلے ہی ہے۔ تم تیسری کیا کرو گی۔" داروغہ والا کا علاقہ گزر گیا۔

"ٹیکسی کو یہیں سڑک کے کنارے روک لو۔" مجھے حکم ملا۔ "چابیاں اسی میں چھوڑ دو۔"

داروغہ والا کے بعد آبادی اب بہت کم رہ گئی تھی اور جو گھر بنے ہوئے تھے وہ بھی دور دور تھے۔ ان میں جدید وضع کی کوٹھیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ ان کی ہدایات کے مطابق میں نے آگے آگے چلنا شروع کیا۔ برقع پوش خواتین میرے پیچھے رہیں کہ شرفاء کا قاعدہ یہی ہے۔ اگر یہاں مجھے اپنا کوئی لندن کا دوست دیکھ لے تو بھونچکا رہ جائے کہ وہ یہاں جو روشن خیالی اور آزادی کا اتنا بڑا مبلغ تھا اپنے وطن جا کے کیا ہو گیا۔ اس کے پیچھے دو عورتیں عین قدامت پسندی کا شاہکار بنی چل رہی تھیں۔ مائی گڈنس۔ ان میں سے ایک تو اس کی بیوی ہو گی اور کون جانے دونوں ہوں۔ اولڈ فیشن مسلم چار بیویوں پر یقین رکھتے ہیں آج بھی۔ اوہ مائی لارڈ شاید میری انگریز کلاس فیلو لڑکیاں صدمے کی شدت سے بیہوش ہو جاتیں اور اس لارڈ کی بیٹی کا کیا حال ہوتا۔ اس کا باپ کہتا دیکھو! یہ حشر ہوتا تمہارا اس بلڈی نیٹو کے ساتھ جا کے اصل صورتِ حال کتنی مختلف تھی۔ یہ میں کسی کو بتا بھی نہیں سکتا تھا کہ اس بندۂ مجبور کے پیچھے اس کی زوجگان نہیں، اس کے قاتل ہیں اور برقعے کے اندر مؤنث نہیں مذکر ہیں اور وہ بھی مسلح۔ کسی کو شک ہونے کا سوال ہی نہ تھا اور میرے لیے کوئی کارنامہ سرانجام دے کر ان کو بے نقاب کرنا محال تھا۔ میں روبوٹ کی طرح ان کے اشارے پر دائیں بائیں ہوتا گیا اور کھیتوں کی منڈیر پر چلتا گیا۔ انہوں نے وسیع میدان کے وسط میں کھڑی ہوئی ایک کوٹھی کے نامکمل ڈھانچے کی پہلے ہی نشاندہی کر دی تھی۔ کوٹھی کا نچلا حصہ مکمل تھا لیکن اس پر پلاسٹر کی نوبت نہیں آئی تھی۔ انہوں نے اپنی خباثت کے مظاہرے کے لیے جو جگہ منتخب کی تھی وہ ہر لحاظ سے موزوں تھی۔

کوٹھی کے گیٹ کے اندر داخل ہو کے بھی انہوں نے

برقعوں کے نقاب نہیں اٹھائے۔ میرے سامنے ایک مختصر سا برآمدہ تھا جس کے دونوں دروازے بند تھے۔ کوٹھی کے بائیں ہاتھ پر سامنے کی طرف جو جگہ لان کے لیے چھوڑی گئی تھی اس میں دیوار کے ساتھ ساتھ سیمنٹ کی دو سو سے زائد بوریاں رکھی ہوئی تھیں۔ وہ سریا پڑا تھا جو ابھی استعمال ہونا باقی تھا اور درمیان میں پانی کا وہ عارضی تالاب تھا جو تعمیر کے لیے پانی ذخیرہ رکھنے کی غرض سے بنایا جاتا ہے۔ اس طرف نچلی منزل میں کھڑکیوں کی چوکھٹ موجود تھی لیکن پٹ لگنے باقی تھے چنانچہ خالی کمروں کا اندھیرا اور پلاسٹر کا رنگ ایک نظر آتے تھے۔ اوپر کی منزل پر سریے دیواروں میں لگے ہوئے لگتے تھے اور ایک جانب چھجے کی شٹرنگ کو سہارا دینے والے بدنما لکڑی کے ستون نہ جانے کب سے ایسے ہی کھڑے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ تعمیر کا کام رکا ہوا ہے۔ اکثر لوگ عمارت بنواتے وقت جو تخمینہ ذہن میں رکھتے ہیں وہ تکمیل کے آخری مراحل طے کرتے کرتے غلط ہو جاتا ہے اور پھر مزید سرمایہ فراہم ہونے تک تعمیر کے عمل کو ایسے ہی روکنا پڑتا ہے۔ کوٹھی کا مالک اسی پریشانی میں مبتلا ہو گا اور شاید دن میں ایک بار چکر لگا کے نامکمل گھر پر حسرت کی نظر ڈال کے لوٹ جاتا ہو گا۔ وہ ملک سے ہی باہر ہوا تو یہاں اس کے بھائی، ماں باپ یا بیٹے خط پہ خط ڈال رہے ہوں گے کہ جو پیسہ تم دے گئے تھے وہ تو ختم ہوا اب اور بھیجو کہ باقی رہ جانے والا کام بھی پورا ہو۔ لیکن باہر رہ کے کمانے والے بھی ڈاکا تو نہیں ڈال سکتے۔ انہیں مزید کما کے بچانے میں وقت لگتا ہے۔

"سیدھے ہاتھ والے دروازے سے اندر چلو۔" ایک برقع پوش نے مجھے دھکیلا اور میں لڑکھڑا کے گرتے گرتے بچا، کیونکہ فرش بہت ناہموار تھا اور ادھر ادھر آدھی پوری اینٹوں کے علاوہ پتھر بھی پڑے تھے۔

"اندر آٹھ عدد دروازے ہیں۔ چار ایک طرف چار دوسری طرف۔ تم الٹے ہاتھ کے آخری دروازے سے اندر جاؤ گے۔" دوسرے نقاب پوش نے کہا۔

میں نے راستے میں بھی ان کی آواز پر اور لہجے پر غور کیا تھا اور اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ ان میں سے ایک یقیناً استاد بیڈرو ہے لیکن وہ بھی اصل آواز اور لہجے میں بات نہیں کر رہا تھا۔ دوسرے کے بارے میں ابھی تک میں بے یقینی کا شکار تھا کہ وہ دلاور یا ڈی سلوا میں سے کوئی ہے یا بیڈرو کا سابقہ مددگار۔ برقعے نے ان کی صورت کو ہی نہیں قد و قامت کو بھی بڑی خوبی سے چھپا لیا تھا اور ان کے لباس کو بھی۔ میں

نے ان میں سے ایک کو ریوالور لے کر دائیں طرف کی گلی میں جاتے دیکھا اور دروازے کے قریب رک کے پیچھے نگاہ ڈالی۔ ایک برقع پوش مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر ریوالور کا رُخ میری طرف کیے فائر کرنے کی پوزیشن میں تیار کھڑا تھا۔ اگر میں چاہتا تو راستے میں کوئی موقع پیدا کر سکتا تھا۔ یہی برقع جس نے ان کو چھپائے رکھا تھا ان کے لیے وبالِ جان بن جاتا اور وہ اس میں الجھتے تو آسانی سے قابو میں آ جاتے مگر میں نے عمداً ایسی کوئی کوشش نہیں کی تھی کیونکہ اس سے رابعہ کو فائدے کے بجائے نقصان ہو سکتا تھا۔ اگر میں ان دونوں کو یرغمالی بنا لیتا تب بھی بے کار تھا۔ وہ دونوں بے وقعت لوگ تھے جن کی خدمات منہ مانگے معاوضے ادا کرنے کے بعد حاصل کی جاتی ہیں۔ تحفظ کی کسی ضمانت کے بغیر۔ اگر وہ مارے جائیں تو کسی کو فرق نہیں پڑتا۔ ان کی جگہ دوسروں کی خدمات حاصل ہو جاتی ہیں۔ جو ان کا نعم البدل ثابت ہوتے ہیں۔ ان کی حیثیت اشیائے صرف سے زیادہ نہیں ہوتی جو خریدی اور بیچی جاتی ہیں۔ ٹوٹ جاتی ہیں اور ختم ہو جاتی ہیں اور ناکارہ ہوں تو بدل دی جاتی ہیں لیکن میرے لیے رابعہ صرف رابعہ تھی۔ اس کے بدلے میں دلاور سمیت ایک ایک بدمعاش کو چن چن کے مار ڈالتا تب بھی رابعہ کا نقصان پورا نہیں ہو سکتا تھا۔ خواہ وہ جان کا ہوتا یا آبرو کا۔ چنانچہ میں نے ان کی ہدایات پر عمل کیا تھا اور جرأت یا ذہانت کا کوئی ایسا مظاہرہ نہیں کیا تھا جو میری حماقت کا ثبوت بن جاتا۔ میں مسکرایا اور ہینڈل گھما کے اندر داخل ہو گیا۔ اب میرے سامنے ایک نیم تاریک گلی تھی۔ اس کاریڈور میں جو کوٹھی کو دو حصوں میں تقسیم کرتا تھا واقعی آٹھ دروازے تھے جو سب کے سب بند تھے۔ کاریڈور کی اونچائی کمروں کی چھت کے برابر یعنی بارہ فٹ تھی لیکن چوڑائی صرف چھ فٹ تھی۔ بجلی کے پوائنٹ یہ ظاہر کرتے تھے کہ بعد میں راہداری کو دن میں بھی سیلنگ لائٹ سے روشن رکھنا ضروری ہو گا۔ ابھی سیمنٹ کے سیاہ رنگ کے باعث بھی روشنی کم ہو گئی تھی۔ اس راہداری کے آخر میں بھی ایک دروازہ تھا جو کھلا پڑا تھا اور عقبی حصے کے مختصر سے صحن کا نظارہ پیش کرتا تھا۔ دوسرا برقع پوش جو دائیں جانب چلا گیا تھا اب گھوم کر اس دوسرے دروازے کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ اس نے برقعے کے اندر ہی سے ریوالور میری طرف تان رکھا تھا۔

میں نے کسی اور دروازے کو کھول کر جھانکنے کی کوشش نہیں کی اور بائیں ہاتھ کے آخری دروازے کے ہینڈل کو گھما

کے اندر داخل ہوگیا۔ اندر گھُپ اندھیرا تھا جس میں چند لمحوں کے لیے مجھے کچھ دکھائی نہ دیا۔ ابھی میں اس تاریکی سے مانوس ہونے کی کوشش ہی کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اس کمرے میں اتنی تاریکی کیوں ہے کہ ایک ہاتھ نے مجھے آگے دھکیلا۔ میرے پیچھے دروازہ کھٹ سے بند ہوگیا اور میں نے محسوس کیا جیسے دن کے اجالے سے ایک دم میں آدھی رات کی ایسی تاریکی میں دھکیل دیا گیا ہوں جہاں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کے ماچس نکالی اور دیا سلائی روشن کرنے سے پہلے میں نے گہری سانس لے کر سونگھا لیکن کمرے میں صرف تازہ پلاسٹر کی نمی اور چھلی ہوئی لکڑی کی خوشبو تھی، کسی گیس کی بو نہیں تھی۔ اندھیرا یقیناً مصنوعی تھا اور کھڑکی دروازے بند کر کے اور شیشوں پر سیاہ پردے یا رنگ پھیلا کے پیدا کیا گیا تھا ورنہ ایسا کمرہ کون بناتا ہے جس میں صرف ایک دروازہ ہو۔ میں نے ایک دیا سلائی روشن کی۔ اس کی مدھم روشنی میں مجھے اندازہ ہوا کہ کمرے میں واقعی روشندان کے سوا یا اس دروازے کے سوا باہر کے اجالے کے اندر آنے کی کوئی راہ نہیں۔ دروازہ بند ہوگیا تھا اور شاید باہر سے مقفل بھی کر دیا گیا تھا۔ روشندان میں جو کھٹ پر تختے جڑ دیے گئے تھے۔ پہلی دیا سلائی بجھ گئی۔ میں نے دوسری تیلی جلائی۔ کمرہ آٹھ فٹ چوڑا اور پندرہ فٹ لمبا اسٹور تھا جس میں دیوار کے ساتھ ساتھ شیلف بنے ہوئے تھے۔ ایک دیوار کے آخر میں دروازے جیسا خلا تھا۔ میں نے قدم آگے بڑھاتے اور تیلی بجھنے سے پہلے اس خلا تک پہنچ گیا۔ خلا سے تہہ خانے میں سیڑھیاں اتر رہی تھیں۔ میں تیسری تیلی جلانے ہی والا تھا کہ کسی نے صاف آواز میں کہا۔ ”نیچے اتر جاؤ، رابعہ تمہاری منتظر ہے۔“

میں اچھل پڑا۔ آواز کی گونج بتاتی تھی کہ مجھ سے بات کرنے والا کوئی انسان نہیں، لاؤڈ اسپیکر ہے۔ اور یہ لاؤڈ اسپیکر میرے سر پہ روشندان میں نصب تھا۔ میں نے اوپر دیکھا اور پھر تیسری دیا سلائی کی روشنی میں تہہ خانے کی بغیر پلاسٹر والی سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگا۔ زینے پر ایک موڑ آیا اور دیا سلائی ختم ہوگئی۔ میں نے باقی زینہ مکمل اندھیرے میں سنبھل سنبھل کے قدم اٹھاتے ہوئے طے کیا۔ آخری زینے سے فرش پر قدم رکھتے ہی میں نے کہا۔ ”رابعہ!“ اور میری آواز اس تہہ خانے میں گنبد کی طرح گونجی۔ ”رابعہ!“ میں نے پھر کہا اور ماچس جلائی مگر وہ تیلی خراب تھی۔ ”کیا بات ہے رابعہ جواب دو۔ کدھر ہو تم؟“

”ابھی تک تمہاری نظر رابعہ کو نہیں دیکھ سکی؟“ لاؤڈ اسپیکر نے میرا مسخر اڑاتے ہوئے کہا۔

میں نے خوف کی سرد لہر کو ریڑھ کی ہڈی میں اترتے محسوس کیا اور دوسری تیلی روشن کی۔ یکلخت میری نظروں نے رابعہ کو دیکھ لیا۔

وہ فرشِ خاک پر بے حس و حرکت پڑی تھی۔ مجھے پہلی نظر میں ہی اس کے تار تار لباس پر خون کے دھبے نظر آگئے۔ ”رابعہ!“ میں چلایا اور میری آواز کی بازگشت کے ساتھ لاؤڈ اسپیکر بڑی خباثت سے ہنسا۔ میں نے دوڑ کر چند قدم کا فاصلہ طے کیا اور نیم پختہ فرش کی گرد پر بیٹھ گیا۔ ”رابعہ! رابعہ! میری جان! کیا ہوا ہے تمہیں؟“ میں نے اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا اور اندھیرے میں اس کے گالوں کو آہستہ آہستہ تھپکنے لگا۔ ”رابعہ... دیکھو میں سکندر ہوں۔“ لیکن رابعہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کے اور پھر کان لگا کے دیکھا۔ اس کے دل کی دھڑکن ٹھیک تھی۔ پھر میں نے اس کی نبض دیکھی۔ یوں جیسے میں واقعی نبض دیکھ کے اس کی حالت کا صحیح اندازہ کر لوں گا۔ میرے ہاتھوں پر اس کے خون کی نمی آگئی اور میری انگلیاں چپکنے لگیں۔ میں نے رابعہ کا سر آہستہ سے زمین پر رکھ دیا۔ اس کے پریشان بال خاک میں پہلے ہی اٹے ہوئے تھے۔ پہلی نظروں میں مجھے رابعہ کی ظاہری حالت کے صدمے نے وقتی طور پر دیوانہ کر دیا تھا۔ مجھے یوں لگا تھا کہ وہ مر چکی ہے۔ اس کے پھٹے ہوئے کپڑے اور خون میں لتھڑے ہوئے جسم کو لاش کی طرح پڑا دیکھ کر میں اور کیا اندازہ کر سکتا تھا۔ اب مجھے یکلخت یہ اطمینان حاصل ہوگیا کہ وہ زندہ ہے اور یہ اطمینان بہت حوصلہ افزا ثابت ہوا۔

”کیا بات ہے؟ رابعہ نے کچھ بتایا نہیں کہ اسے کیا ہوا ہے؟“ لاؤڈ اسپیکر بولا۔

”حرامزادو!“ میں نے چیخ کر کہا۔ ”تم نے مجھے بتایا تھا کہ رابعہ خیریت سے ہے۔ تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اس پر آنچ نہیں آئے گی۔“

”تو ہم نے کون سی وعدہ خلافی کی ہے؟“ لاؤڈ اسپیکر نے جواب دیا۔ ”رابعہ صحیح سالم اور زندہ ہے۔“

”تم سب نامرد ہو۔ عورت پر یہ ظلم کر کے خود کو دلاور کہتے ہو۔“ میں نے کہا۔ ”چوہدری دلاور، استاد پیدا ہوا کون ہے جو سامنے آ کے مجھ سے بات کرنے کی ہمت رکھتا ہے۔ بے ضمیر شیطانو! تم خود کو بدمعاش کہتے ہو۔ بدمعاش سمجھتے ہو۔ بدمعاشی کے لیے بہت بڑا دل چاہیے، ظرف چاہیے اور حوصلہ چاہیے۔ کیا ملا تمہیں اس عورت کے ساتھ یہ سلوک کر کے۔ کیا مقابلہ اس کا اور تمہارا؟“

”کوئی مقابلہ نہیں۔ یہ بات ہم نے بھی اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔“ لاؤڈ اسپیکر ہنسا۔ ”مگر عورت ذات ہوتی ہی ناقص العقل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم خود بھی اپنے آپ کو بدمعاش نہیں سمجھتے۔ کیا ہم نے کبھی یہ دعویٰ کیا ہے۔ اگر یہ ہم سے تعاون کرتی تو اس کی یہ حالت کیوں ہوتی؟ ہم کبھی اس کے ساتھ یہ سلوک نہ کرتے۔“

میں نے سخت جدوجہد کے بعد پاگل کر دینے والے جذبات کی سرکش لہر پر قابو پایا۔ ”کیا چاہتے تھے تم لوگ؟“

”ہم چاہتے تھے کہ ہمیں وہ لفافہ واپس مل جائے۔“ لاؤڈ اسپیکر نے کہا۔ ”لفافہ رابعہ کے پاس ہی تھا نا؟“

میں نے محسوس کیا کہ لاؤڈ اسپیکر کی آواز اسی چوہدری دلاور کی آواز ہے۔ اس نے پہلے بھی مجھے نفسیاتی طور پر متاثر کرنے کے لیے ایک ڈرامائی طلسماتی ماحول پیدا کیا تھا اب پھر اس نے مجھے ایک دہشت زدہ کرنے والے ماحول میں بات کرنے کے لیے قید کر لیا تھا۔ اس کا پُرسکون ٹھہرا ہوا پُراعتماد لہجہ وہی تھا۔ آواز کا فرق اس لیے محسوس ہوتا تھا کہ وہ براہِ راست مجھ سے مخاطب نہ تھا۔ لاؤڈ اسپیکر سے نکلنے والی آواز خاصی بدل جاتی ہے۔ تہہ خانے اور کمرے کی دیواریں بالکل سپاٹ تھیں۔ اندر ایک کنکر بھی نہ تھا جو میں لاؤڈ اسپیکر پر مار سکتا۔ میری آواز باہر کسی کے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی تھی اور میں دلاور کی اجازت کے بغیر اس قید خانے سے تاقیامت نہیں نکل سکتا تھا۔ محسن کو اور دنیا میں میرے یا رابعہ کے کسی جاننے والے کو معلوم نہیں تھا کہ ہم کہاں ہیں۔ انہوں نے ٹھیک لکھا تھا کہ رابعہ تمہارے خیال کی دسترس سے بھی باہر ہے۔ اگر وہ ہمیں چھوڑ کر چلے جاتے تو ہم یہیں بھوک پیاس سے تڑپ تڑپ کے مر جاتے اور ہماری لاشیں نہ جانے کب دریافت ہوتیں، لیکن میں جانتا تھا ان کا مقصد ہمیں قتل کرنا نہیں ہے۔

”وہ لفافہ میں نے رابعہ کی والدہ کو دیا تھا۔“ میں نے کہنا شروع کیا۔

”ہاں۔ رابعہ بھی یہی کہتی ہے کہ لفافہ امی کے پاس ہے۔“ لاؤڈ اسپیکر نے کہا۔ ”لیکن ہمارا خیال ہے کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ اس نے تسلیم کیا ہے کہ لفافہ اور سادے کاغذ ماں نے اسے دیے تھے۔ اس نے کاغذات کو گرم کر کے پڑھنے کی کوشش بھی کی تھی اور تم سے اسی موضوع پر بات بھی کی تھی لیکن اسے یا تمہیں کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔“

”یہ ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اگر ان کاغذات پر کوئی نظر نہ آنے والی تحریر ہے تو ہم ابھی تک اسے پڑھ نہیں سکے ہیں۔“

”یہ بڑی اچھی بات ہے اور تمہاری خوش قسمتی ہے، ورنہ تمہیں جو ایک ماہ کی مہلت ملی تھی، وہ آج تمام ہو جاتی۔“ لاؤڈ اسپیکر بولا۔ ”بہتر یہی ہے کہ پڑھے بغیر وہ خط ہمیں واپس کر دو۔“

”میں کوشش کر سکتا ہوں کہ رابعہ ہوش میں آ جائے تو اس کو لفافہ اور وہ کاغذات واپس کرنے پر رضامند کر لوں۔ اور مجھے امید ہے، رابعہ مان جائے گی۔“

”یہی تو مصیبت ہے۔ جتنا سچ ہم اس سے اگلوا سکتے تھے ہم نے اگلوا لیا۔“ لاؤڈ اسپیکر نے کہا۔ ”اب رابعہ کہتی ہے کہ لفافہ اس نے اپنی ماں کو واپس دے دیا تھا حفاظت سے رکھنے کے لیے۔“

”تمہارا خیال ہے، رابعہ جھوٹ بول رہی ہے؟“ میں نے خلا سے مخاطب ہو کے کہا۔

”نہیں، رابعہ سچ بول رہی ہے۔“ اسپیکر نے کہا۔ ”اس کے لیے جھوٹ بولنا ممکن ہی نہ تھا۔ سوال یہ ہے کہ رابعہ کی ماں سے لفافہ کیسے حاصل کیا جائے اور اسی لیے تمہیں بلایا گیا ہے۔ تم اس بڑھیا سے پوچھ سکتے ہو کہ لفافہ کہاں رکھا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”جیسے ہی اسے ہوش آیا، میں اس سے یہ بات معلوم کر لوں گا۔ کیا تم وعدہ کرتے ہو کہ اس کے بعد ہمیں رہا کر دو گے اور جب تک میں تمہیں لفافہ لا کر نہ دوں، تم رابعہ کا خیال رکھو گے؟ اسے میڈیکل ایڈ دو گے؟“

”رابعہ کا پورا خیال رکھا جائے گا۔ واپسی پر وہ تمہیں مسکرا کے خوش آمدید کہے گی۔“ لاؤڈ اسپیکر نے کہا۔ ”اس کے بعد تم جا سکو گے۔ ہم خود تمہیں بحفاظت پہنچا دیں گے۔“

”تھینک یو ویری مچ۔“ کسی اور کی آواز نے کہا۔ ”میرا خیال ہے نیک کام میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ ہاتھ ذرا اوپر رکھو۔“

میں یوں اچھل پڑا جیسے کسی نے اس تہہ خانے میں بم پھینک دیا ہو کیونکہ یہ تیسری آواز محسن کی تھی!

میری ذہنی کیفیت اس مسافر سے مختلف نہ تھی جس کی پیاسی آنکھیں تاحدِ نظر پھیلے ہوئے ریگ زار میں پانی کے سراب کا شکار ہوں۔ کیا یہ آرزو کا فریب ہے، مایوسی کی اس تاریکی میں کہیں امید کی ایک کرن اب بھی روشن تھی کہ شاید کوئی معجزہ رونما ہو، تائیدِ ایزدی سے اچانک کوئی فرشتہ غیب بن کے پہنچے جو مجھے اس بے بسی کی قید سے اور اس بےکسی کے دام سے چھڑا کے لے جائے، لیکن اس وقت یہاں کسی کا میری مدد کے لیے آجانا اتنا ہی بعید از امکان تھا جتنا ان دیواروں کو قوتِ ارادی سے گرا کے رابعہ سمیت اس زندان سے نکل جانا۔

"کون ہو تم؟" مجھ سے گفتگو کرنے والے نے چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد کہا۔ اس کا لہجہ بدستور پُرسکون رہا۔ "اس طرح منہ اٹھا کے کسی کے گھر میں گھس آنے اور اس لہجے میں بات کرنے کا مقصد کیا ہے؟"

"میں ان دونوں برقع پوش خواتین کی والدہ ہوں جن کے ساتھ سکندر بخت دس منٹ پہلے یہاں پہنچا ہے۔" محسن نے کہا۔

"تم بہت بے وقوف آدمی ہو۔" اس شخص نے کہا۔

"ہم یہاں ایک سودا کر رہے تھے۔ تمہارے دخل در معقولات سے خرابی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ بہتر ہوگا اگر تم الٹے قدم لوٹ جاؤ اور ہمیں معاملے کی بات کرنے دو۔"

"شریفانہ معاملات پر شرافت سے بات کی جا سکتی ہے۔" محسن نے کہا۔ "اس کے لیے ہم باہر کہیں بھی بیٹھ کے معاملات طے کر سکتے ہیں۔ تم ہمیں بلاؤ گے تو ہم سر سے کفن باندھ کے بھی آئیں گے اور سر کے بل بھی۔ اور تم غریب خانے کی عزت بڑھانے آؤ گے تو ہمیں چشم براہ پاؤ گے لیکن جو طریقہ تم نے اختیار کیا ہے وہ نامردوں کا طریقہ ہے اور ہم اپنی عزت و غیرت کے بدلے کوئی سودا کر ہی نہیں سکتے۔ تم سکندر بخت اور رابعہ کو نکل جانے دو، پھر میں تم سے بات کروں گا۔"

"تم آخر کیا ہو، سکندر بخت کے وکیل؟" اس شخص نے تحقیر اور تمسخر کے ساتھ کہا۔ "یہ دعویٰ کس ضمانت اور کس برتے پر ہے؟ تم ہو کون؟"

"تمہیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے کہ میں کون ہوں۔" محسن نے کہا۔ "ضمانت جان کی ہے۔ میری زبان پر اعتبار کرو گے تو میں سکندر اور رابعہ کے جاتے ہی ہتھیار ڈال دوں گا اور خود کو تمہارے حوالے کر دوں گا۔ سکندر اس سودے کا پابند ہوگا جو تم مجھ سے کرو گے۔ قولِ مرداں جان دارد۔"

وہ شخص ہنسا۔ "اور اگر میں تمہاری بات ماننے سے انکار کر دوں؟ تمہیں یقین ہے کہ تم بچ کے نکل جاؤ گے؟"

"اپنی زندگی کے بارے میں تو تمہیں بھی کوئی خوش فہمی نہیں ہونی چاہیے۔" محسن نے کہا۔ "تم اس وقت بھی میرے ریوالور کی زد میں ہو اور مجھے اس بات کی بالکل فکر نہیں ہے کہ بعد میں میرا اپنا انجام کیا ہوگا۔ ممکن ہے تمہارے ساتھی مجھے مشین گنوں سے بھون کے رکھ دیں لیکن وہ تمہیں اس گولی سے نہیں بچا سکتے جو تمہاری کھوپڑی کے پرخچے اڑا چکی ہوگی۔ میں تمہیں وارننگ دیتا ہوں کہ اپنی جگہ سے ہلنے کی یا غیر ضروری مستعدی کا مظاہرہ کرنے کی حماقت مت کرنا۔ اگر تم نے کسی کو مدد کے لیے پکارا یا اشارہ کیا تو میں بلا تامل تمہیں شوٹ کر دوں گا۔ جہاں میں ہوں وہاں سے تم میری آواز تو سن سکتے ہو لیکن سامنے آئے بغیر میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ جب تک میرے ریوالور میں گولیاں ہیں کوئی میرے سامنے آ کے زندہ نہیں بچ سکتا۔ میرا نشانہ آج تک خطا نہیں ہوا۔"

میں دریائے حیرت میں غوطہ زن تھا اور یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ محسن یہاں کیسے آیا۔ پہلے میرا ارادہ تھا کہ محسن کو دخل در معقولات سے روکوں اور کہوں کہ وہ لوٹ جائے۔ یہ لوگ جیسے بھی تھے اپنی بات کے پکے تھے۔ دلاور نے مجھے ایک ماہ کی مہلت دی تھی اور بظاہر اس مہلت کے تمام ہونے سے پہلے دلاور کا ارادہ میرا کام تمام کرنے کا نہیں تھا۔ رابعہ کے بدلے وہ مجھ سے اس خط کی واپسی چاہتے تھے اور میں فیصلہ کر چکا تھا کہ خط واپس کر دوں گا۔ اس خط کے اسرار و رموز میرے لیے رابعہ کی زندگی سے زیادہ اہم نہیں تھے لیکن ایک تو محسن کے آجانے سے بلامقابلہ شکست تسلیم کر لینے کا ارادہ متزلزل ہو چکا تھا، اس کے علاوہ محسن کے پُراعتماد لہجے نے میرا اعتماد بحال کر دیا تھا اور اگر وہ دشمن کے مقابلے میں بہتر پوزیشن لیے بیٹھا تھا تو یہ میرے لیے اطمینان اور مسرت کی بات تھی کہ اس کی اپنی زندگی کو خطرہ درپیش نہیں اور دشمن اپنی تمام تر عیار فطرت اور بے ضمیری کے باوجود اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ہماری زندگی لینے سے پہلے دشمن کو اپنی زندگی داؤ پر لگانی ہوگی۔ محسن نے ایک کمال یہ کیا تھا کہ اپنی باتوں سے ہی دشمن کو نفسیاتی طور پر مرعوب اور دہشت زدہ کر لیا تھا ورنہ میں جانتا تھا کہ اس کا نشانہ اتنا بے خطا نہیں۔ مجھے یہ بھی یقین نہ تھا کہ محسن نے پہلے کبھی ریوالور چلایا ہے۔ اس نے شکار کے دوران میں میرے ساتھ شکاری رائفل ضرور چلائی تھی لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ ریوالور اور بندوق میں کتنا فرق ہے۔ تاہم دشمن اپنی بے خبری کے باعث محسن کی دھمکی کو سچ ماننے پر مجبور تھا۔

"ہم اس مکان کو بم سے بھی اڑا سکتے ہیں۔" دشمن نے قدرے توقف کے بعد کہا لیکن یہ لہجہ کھوکھلا تھا۔

"اپنا برا بھلا تم خود سوچ سکتے ہو۔" محسن نے بے نیازی سے کہا۔ "ہم ایک ساتھ دفن ہو کے مر جائیں گے ورنہ ملبے سے نکال کو بچا لئے گئے تو قانون کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔ تم نے سوچ لیا ہے کہ تمہارا جواب کیا ہوگا؟ میرا خیال ہے تم بلف کر رہے ہو مسٹر ہشیار احمد خاں! تم نے اس زیرِ تعمیر کوٹھی پر بھی عارضی اور ناجائز قبضہ کیا ہے جو تمہارے باپ کی جاگیر نہیں ہے۔ تمہارے پاس خنجر اور ریوالور کے علاوہ زیادہ سے زیادہ سب مشین گن ہو سکتی ہے۔ تم کچھ نہ کرنے کے باوجود گرفتار ہوئے تو ناجائز اسلحہ رکھنے کے علاوہ ایک عورت اور بہت سینئر وکیل کے اغوا اور انہیں حبسِ بے جا میں رکھنے کے سنگین جرائم میں ملوث ہو گے۔ سکندر بخت کا اغوا، حبسِ بے جا، کسی اور کے گھر میں بلا اجازت داخل ہونا، تشدد، قتل کی دھمکی اور ایسے ہی متعدد دیگر جرائم کے مقدمات الگ ہوں گے۔ اس کے برعکس اپنے دفاع میں گولی چلانا . . ."

اس کا جملہ نامکمل رہ گیا اور تہہ خانے میں لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے فائر کی آواز پہنچی۔

"محسن . . . !" میں نے چیخ کر کہا۔

"کون ہے سکندر!" محسن کی آواز آئی۔ اسے میری آواز نے حیران کر دیا تھا۔ "تو کہاں ہے؟"

"میں ایک تہہ خانے میں ہوں۔ رابعہ کے ساتھ۔" میں نے کہا۔ "تو خیریت سے ہے نا؟"

"ہاں، مجھے کیا ہونا ہے۔ میں نے وارننگ فائر کیا تھا۔" محسن بولا۔ "شاید ان حرامزادوں کو غلط فہمی ہو گئی تھی کہ میرے پاس ریوالور نہیں ہے یا میں اس کھلونے کا استعمال نہیں جانتا۔" پھر وہ میری بجائے ان سے مخاطب ہو گیا جن کی کامیابی کا سارا غرور اس غیر متوقع دخل اندازی سے ناکامی میں ڈھل گیا تھا۔ "تم خوش قسمت ہو کہ میری عقل ٹھکانے رہی اور میں نے عمداً نشانہ لے کر فائر کرنے سے گریز کیا ورنہ اس وقت تمہاری جگہ فرش پر تمہاری لاش پڑی ہوتی۔ دوسری غلطی کو میں غلطی شمار نہیں کرتا چنانچہ معاف بھی نہیں کرتا۔"

"تم . . . تم کو ابھی اندازہ نہیں ہے کہ تم خود بھی میرے ایک آدمی کے نشانے پر بیٹھے ہو۔" وہ بولا۔ "جسے تم نہیں دیکھ سکتے۔"

محسن ہنسا۔ "میں کھلی چھت پر ہوں اور روشندان میں سے تمہیں دیکھ سکتا ہوں تو اپنے اردگرد دو فرلانگ تک اڑتی چڑیا کے پر بھی گن سکتا ہوں۔ اگر تمہارا کوئی آدمی ہیلی کاپٹر لے کر آجائے تو الگ بات ہے۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ رابعہ اور سکندر بخت کو اس کمرے میں میری نظروں کے سامنے لاؤ۔ دیر کرو گے تو نقصان میں رہو گے۔ ابھی گھنٹے، آدھے گھنٹے میں کوئی میرے قریب سے گزرا تو میں چلا کے اسے متوجہ کر لوں گا اور کہوں گا کہ ایس پی ضامن رضوی صاحب کو فون کر دے۔ فون نہ کر سکے تو کسی بھی پولیس مین کو بتا دے کہ ایس پی ضامن رضوی کے بیٹے کو یہاں ڈاکوؤں نے قید کر رکھا ہے۔ ان کو آنے میں اور تمہیں محصور کرنے میں دیر نہیں لگے گی۔"

"رابعہ اور سکندر بخت جس تہہ خانے میں قید ہیں وہاں گیس چھوڑی جا سکتی ہے۔"

"میں بتا چکا ہوں کہ زندگی اور موت کی میرے لیے کوئی اہمیت نہیں۔" محسن نے غرا کے کہا۔ "اگر وہ دونوں بخیر و عافیت نہ ملے تو تمہارے بعد میں ایک ایک کو چن چن کر ماروں گا۔ تم نہیں، یہ جو زبیرے کی اولاد تمہارے سامنے موجود ہے، دھاری دار بنیان والا، اس سے کہو ان دونوں کو لے آئے۔ تم اسی طرح لیٹے پڑے رہو۔ اٹھنے کی کوشش بھی کی تو دنیا سے اٹھ جاؤ گے۔"

میں نے اندازہ لگایا کہ محسن کے پہلے فائر کے ساتھ ہی وہ شخص فرش پر گر گیا تھا جس سے محسن مخاطب تھا۔ یہ ایک قدرتی ردِعمل تھا مگر اب وہ اسی حالت میں لیٹا ہوا خود کو زیادہ بے بس محسوس کر رہا ہوگا۔

"ٹھیک ہے، میں تم سے بعد میں بھی نمٹ لوں گا۔" اس نے جملے کا اختتام ایک غلیظ گالی پر کیا۔ "آج تم بچ کر نکل گئے تو کیا۔ اس شہر، اس ملک اور اس پوری دنیا کے کسی بھی گوشے میں تم ہماری دسترس سے دور نہیں رہ سکتے۔ تمہیں یہ بہادری بہت مہنگی پڑے گی۔ پیڈرو! جا ان دونوں کو لے آ۔ میرا منہ کیا دیکھتا ہے۔" اس نے ماں کی گالی دی۔

صورتِ حال ڈرامائی طور پر بدل گئی تھی۔ بظاہر محسن کا مورچہ بہت مضبوط تھا اور اس نے دشمن کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا تھا مگر اس کے باوجود میرے دل کے کسی گوشے میں خوف کے مہیب سائے اب بھی منڈلا رہے تھے اور مجھے یوں لگتا تھا کہ عارضی کامیابی کا یہ طلسم جھوٹا ہے اور فریبِ خیال ہے۔ صورتِ حال جو ہمارے حق میں ہے یکلخت ہمارے خلاف ہو جائے گی۔ محسن کی آواز کچھ ہلکی سنائی دیتی تھی۔ شاید اسی طرح محسن بھی میری آواز مدد سے سن رہا ہوگا۔

"سکندر!" محسن نے کہا۔ "اپنے استاد پیڈرو تیرے

پاس آ رہے ہیں۔ ہوشیار رہنا اور کسی قسم کی گڑبڑ ہو تو۔۔"
اس کی آواز اچانک بند ہو گئی۔ ایمپلی فائر بند کر دیا گیا تھا اور اب میرا محسن سے مواصلاتی رابطہ ٹوٹ چکا تھا۔ اس کا واضح مطلب یہی نکالا جا سکتا تھا کہ استاد پیڈرو کی نیت میں فتور ہے اور وہ محسن کے احکامات کی تعمیل کرتے ہوئے ہمیں اس کمرے تک پہنچانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ میں چوکنا ہو گیا۔ اب دوسرے محاذ پر مجھے اپنی عقل اور ہمت سے کام لینا ہوگا۔ یہ تو محسن نے بھی سمجھ لیا ہوگا کہ براہِ راست گفتگو کے ذریعے سے محروم کرنا کسی شر انگیز کارروائی کا پیش خیمہ ہے اور اپنے طور پر اس نے بھی طے کر لیا ہوگا کہ دھمکی کارگر نہ ہوئی تو اسے کیا مؤثر جوابی اقدامات کرنے ہوں گے۔ یہ گھر ایک ایسا جنگل تھا جس میں خون آشام درندے ایک دوسرے کی گھات میں تھے۔ یہ تقدیر کا کھیل تھا اور فنا و بقا کی جنگ تھی جس کے کوئی اصول نہیں ہوتے۔ وہ فیصلہ کن لمحہ کسی کی گرفت میں نہ تھا اور ہنوز سفر میں تھا جسے فیصلہ دینا تھا کہ شکار کون ہوا اور شکاری کون بنا۔ میں نے ایک نظر رابعہ کو دیکھا اور اوپر کی طرف جانے والے زینے کی طرف لپکا۔ مجھے یقین تھا کہ پیڈرو کو دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی قابو کیا جا سکتا ہے۔ وہ سمجھے گا کہ میں تہہ خانے میں بے بس و لاچار اور بیہوش رابعہ کو سنبھالے ہوئے ملوں گا۔ وہ محتاط ہوگا بھی تو زینے سے اترتے ہوئے لیکن زینے پر اس کی نگاہ مجھے بلندی سے دیکھے گی۔ اگر اس کے پاس ٹارچ لائٹ بھی ہوئی تو میں براہِ راست اس کے ریوالور کی زد میں آجاؤں گا۔ میں نے دیا سلائی جلائے بغیر ایک جست میں دو دو سیڑھیاں طے کر لیں۔ جب میں تہہ خانے میں اترا تھا تو میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کی عادی نہیں تھیں اور مجھے آگے بڑھتے ہوئے ہر قدم پر تاریکی گہری ہوتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ اب معاملہ برعکس تھا اور مجھے اوپر کے خلا سے اترنے والی روشنی کے پس منظر میں راستہ زیادہ واضح طور پر نظر آ رہا تھا۔ ابھی میں دروازے تک پہنچا ہی تھا کہ پیڈرو اندر آیا۔ ریوالور اس کے ہاتھ میں تھا مگر وہ مجھ سے براہِ راست تصادم کے لیے تیار نہیں تھا۔ میں نے بڑی پھرتی سے غوطہ مارا اور پیڈرو سمیت دروازے سے جا لگا۔ دروازہ ایک دھماکے سے بند ہوا اور اس کے ریوالور سے نکلنے والی گولی کی آواز کے ساتھ مل کر یہ دھماکہ اس ویران کمرے کی اور تہہ خانے کی دیواروں میں یوں گونجا جیسے دستی بم پھٹ گیا ہو۔ پیڈرو نے خود کو سنبھالا اور میرے سر پر ریوالور کا دستہ مارنا چاہا۔ میں نے پیڈرو کو سر کے اوپر سے اچھال کے پیچھے پھینک دیا۔ اس کے ریوالور کی ضرب میری کمر کے نچلے حصے پر پسلیوں کے قریب پڑی اور درد کی شدت سے مجھے یوں لگا جیسے میری ہڈی چور چور ہو گئی ہے۔ ایک لمحے کے لیے میرا سانس رک گیا اور میری آنکھوں کے سامنے اندھیرے میں جگنو سے اڑنے لگے۔ میں نے اپنی قوت ارادی کو بروئے کار لاتے ہوئے درد کو نظر انداز کیا اور تمام جسمانی قوت کو مجتمع کر کے پیڈرو پر جا پڑا جو پکے فرش پر چت گرا تھا اور اب اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میری ٹھوکر اس کے منہ پر پڑ جاتی تو اس کے دانت باہر آ گرتے لیکن اس نے بروقت سر کو بچا لیا اور ایک ہاتھ سے میرے پنجے کو پکڑ کے کھینچ لیا۔ میں اپنے ہی زور میں اس کے سامنے گرا اور خود بخود میرے ہاتھ نے اس کی کلائی تھام لی۔ ایک جھٹکے میں وہ بل کھا کے الٹا ہوا اور ریوالور اس کی گرفت سے نکل گیا۔ اس کے ہاتھ کی پانچوں انگلیاں میرے ہاتھ میں آگئیں اور وہ درد سے بلبلایا۔ میں نے گھٹنوں کے بل کھڑے ہو کر اس کی گردن پر کھڑی ہتھیلی کا وار کرنا چاہا مگر اس کا دوسرا ہاتھ بیچ میں آگیا اور ضرب اس کی کہنی سے ذرا نیچے پڑی۔ وہ ایک جھٹکے سے اوپر اٹھا اور اس نے اپنا گرز جیسا مکا میرے پیٹ پر رسید کیا۔ میں پیچھے گرا تو وہ لپک کر اوپر آیا۔ میں نے دونوں پیر ہوا میں اٹھائے اور پیڈرو کے وجود کو اپنے اوپر سے یوں گزار دیا کہ وہ اپنے ہی زور میں تیرتا ہوا گیا اور دیوار سے ٹکرا کے فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ ریوالور ایک کونے میں جا گرا تھا۔ میں نے ایک جست میں اس پر قبضہ کیا اور تیزی سے اس کا رخ پیڈرو کی طرف کر دیا لیکن وہ بالکل بے حس و حرکت ہو چکا تھا۔

اس وقت میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ پیڈرو کے ساتھیوں نے ایمپلی فائر آف کر دیا تھا ورنہ مار پیٹ اور فائرنگ کی آوازیں میرے دوست اور دشمن دونوں سن لیتے۔ نہ جانے محسن ان آوازوں کا کیا مطلب نکالتا اور مشتعل ہو کے کیا کر بیٹھتا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ پیڈرو کو حکم دینے والا اپنی چال کے ناکام ہو جانے کے بعد کوئی انتہائی قدم اٹھاتا، لیکن اب فکر کی کوئی بات نہ تھی۔ دشمن یہی سمجھے بیٹھے تھے کہ پیڈرو اپنے زورِ بازو اور اپنے ریوالور کی مدد سے مجھے بہ آسانی زیر کر لے گا۔ اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا تو مجھے اس کمرے میں پہنچا دیا جاتا جہاں محسن مجھے دیکھنا چاہتا تھا لیکن رابعہ کو شاید وہ کسی دوسرے کمرے میں لے جاتے، جہاں اس پر وحشت اور بربریت کے تمام انسانیت سوز حربے آزمائے جاتے اور اسے ہوش میں لانے کے بعد اس کی دلخراش چیخوں کی

[ڈر] سنوا کر محسن کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا جاتا۔ ایک عورت [کے] ساتھ حیوانیت کے مظاہرے میں آدمی شیطان کو بھی پیچھے چھوڑ [سکتا] ہے۔ میں خود رابعہ پر ہونے والے لرزہ خیز مظالم کی تاب نہ [لا] کے محسن سے کہہ دیتا کہ وہ چلا جائے۔ وہ دھمکی دیتے کہ ہم رابعہ [کے] بدن کو جلا جلا کے راکھ کر دیں گے یا اس کے ہاتھوں کی اور [پی]روں کی انگلیاں کاٹتے جائیں گے اور رابعہ کو ماریں گے نہیں لیکن اسے تمام عمر کے لیے جینے کا عذاب سہنے کے لیے ٹوٹے پھوٹے بدوضع اور نامکمل اعضا پر مشتمل گوشت کا ڈھیر بنا کے پھینک دیں گے تو اس دھمکی کے بعد یہ ناممکن تھا کہ میں مزاحمت [ک]ر سکتا۔ میں اپنی جان پر یہ ظلم جھیل جاتا مگر رابعہ کو اپنے دشمنوں [ک]ے جذبۂ انتقام کی بھینٹ کبھی نہ چڑھنے دیتا۔ اس وقت تک [م]یرے ذہن میں دشمن کا یہی منصوبہ تھا جسے میں نے ناکام بنا دیا تھا۔

ریوالور کو جیب میں اڑس کر میں پھر تہہ خانے کا رخ [ک]رنے ہی والا تھا کہ مجھے ایک اور خیال آیا۔ میں نے دو منٹ [ک]ے اندر اندر پیڈرو کے کپڑے پہنے۔ پہلے اس کو اپنے کپڑے پہنانے کا سوچا، پھر اسے تضیعِ اوقات سمجھ کے چھوڑ دیا۔ تاہم [ا]س کی قمیص کو پھاڑ کے دو حصے کر لیے۔ ایک سے میں نے پیڈرو کے پاؤں باندھے اور دوسرے سے اس کے ہاتھوں کو کمر کے پیچھے کس دیا۔ پھر میں تہہ خانے میں اترا اور بے ہوش رابعہ [ک]و اپنے بازوؤں پر سنبھال کے اوپر لے آیا۔

اچانک اسپیکر جاگ اٹھا۔ "پیڈرو! کیا بات ہے؟ [د]یر کس لیے ہے؟" ایک فائر کی آواز آئی اور پیڈرو کو مخاطب [کر]نے والے نے گالی دی۔ میں نے پیڈرو کی آواز پہلے بھی سنی تھی۔ [ما]ئیکروفون کے راستے ایمپلی فائر تک پہنچنے والی آواز لاؤڈ اسپیکر [میں] منتشر ہوتی ہے تو کسی حد تک بدل جاتی ہے۔ اس کا بھی مجھے [اند]ازہ تھا۔ "استاد۔۔۔" میں آواز کو اور لہجے کو پیڈرو کی [طرح] بلکہ کربناک طریقے پر چلایا۔ پھر حلق سے یوں آواز [نکا]لی جیسے زبردست وار سے وہ بات پوری نہیں کر سکا اور [کرا]ہنے پر مجبور ہو گیا ہو۔

"تیری اور تیرے استاد کی ایسی تیسی۔" میں نے اپنی اصل [آواز میں] کہا۔ "آج ہی سب معلوم ہو جائے گا۔" پھر میں نے [ک]ھوکھلی آواز بنا کے ہائے ہائے کی۔ دروازہ کھول کے دھڑام سے [...] "بھاگ گیا سؤر کا بچہ۔" میں نے اپنی آواز میں کہا اور [...] پکارا۔ "محسن! پیڈرو مجھے بند کر کے نکل گیا ہے۔" جواب [میں خا]موشی رہی۔ لاؤڈ اسپیکر کی ہلکی سی سرسراہٹ بتاتی تھی [کہ ایم]پلی فائر اب بھی آن ہے۔ "محسن!" میں نے چلا کے کہا۔

خاموشی کے تسلسل میں کوئی فرق نہیں آیا۔ میرا دل ڈوبنے لگا کہ کیا محسن ان مکار مجرموں کی کسی سازش کا شکار ہو گیا ہے۔ میں نے دروازہ کھول کے باہر جھانکا۔ کوٹھی کے نیم تاریک در و دیوار کا سناٹا کسی ویران مقبرے کی طرح لگتا تھا۔ میں دبے پاؤں آگے بڑھا۔ ریوالور میرے ہاتھ میں فائر کے لیے بالکل تیار تھا۔ پہلے کمرے کا دروازہ کھولنے کے لیے میں نے ہینڈل پر ہاتھ رکھا اور پھر ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کے اندر داخل ہو گیا۔ اندر کچھ بھی نہیں تھا۔ فرش پر مٹی میں لکڑی کے گول سفید چھلکے سے پڑے تھے اور خالی دیواریں جو انتظار میں تھیں کہ گھر کے مکین آئیں،

دیواروں کو خوبصورت رنگوں، روغنی تصاویر اور ——
پھولوں سے سجائیں — گھر کو اجالا اور زندگی کا احساس دیں۔ وہ اب اجنبی دشمنوں کو ایک خونی کھیل کھیلتے دیکھ کر دکھ اور حیرت سے دم بخود کھڑی تھیں۔ میں نے دروازہ بند کیا اور مقابل کے دوسرے دروازے کو کھول کے اندر جھانکا۔ اس میں دیواروں کے ساتھ ساتھ سیمنٹ کی بوریاں چنی ہوئی تھیں۔ میں تیسرے دروازے کی طرف لپکا اور پھر چوتھے کی طرف جو تقریباً وسط میں تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا اور میں یوں رک گیا جیسے دیوار سے ٹکرا گیا ہوں۔ کمرے کے درمیان میں ایک خون آلودہ لاش پڑی تھی۔ سامنے کی دیوار کی کھڑکی کے قریب فرش پر ایک چھوٹا سا ایمپلی فائر ریسیور سیٹ رکھا تھا اور اس کی تاریں کھڑکی سے باہر جا رہی تھیں۔ یہ اندازہ کرنا دشوار نہ تھا کہ تاروں کا سلسلہ اس کمرے کے مائیکروفون اور اسپیکر سے جا ملتا ہوگا جہاں سے میں نے پہلے دشمنوں سے اور پھر محسن سے گفتگو کی تھی۔ میں نے جھک کر لاش کی صورت کو غور سے دیکھا۔ میرے لیے اس کی صورت اجنبی تھی۔ یہ شاید انہی دونوں میں سے ایک تھا جو برقعے پہن کر مجھے اغوا کر لائے تھے۔ میں نے اس کے کپڑوں کی تلاشی لی مگر اس کے پاس سے کسی قسم کا اسلحہ یا کاغذ کا ایک پرزہ تک برآمد نہ ہوا۔

خطرے کی گھنٹی مجھے صاف سنائی دینے لگی تھی۔ وہ رابعہ کو چھوڑ گئے اور محسن کو لے گئے۔ ایک خطرے کے مقابلے میں میرے لیے ان دونوں کی زندگی کا کوئی مول نہ تھا۔ دشمن جانتے تھے کہ مجھے رابعہ کی طرح محسن کی دوستی بھی کتنی عزیز ہے۔ "تم کو ابھی اندازہ نہیں ہے کہ تم خود بھی میرے ایک آدمی کے نشانے پر بیٹھے ہو جسے تم نہیں دیکھ سکتے۔" ان الفاظ کی بازگشت ابھی تک میرے ذہن میں موجود تھی۔ محسن نے اسے کھوکھلی دھمکی سمجھتے ہوئے نظر انداز کر دیا تھا۔ خلوص، وفا اور دوستی کے نام پر

جان کی بازی لگا دینے والا محسن بے خطر آتش نمرود میں کود گیا تھا۔ اس نے کہہ دیا تھا کہ مجھے اپنے انجام کی پروا نہیں ہے۔ شاید اس کی جگہ میں بھی یہی کرتا اور میرا انجام بھی یہی ہوتا۔ اس کی نظر چھپ کر حملہ کرنے والے کو نہ دیکھ سکی ہوگی۔ یہ میرے صبر، حوصلے اور استقامت کا ایک اور سخت ترین امتحان تھا۔ محسن دنیا میں میرا سب کچھ تھا۔ بھائی، دوست، ناصح، غمگسار، راز داں، اور راہ نما۔ وہ فوزیہ کا بھائی تھا اور شیردانی صاحب کا بیٹا تھا، جن کو میں بچپن سے انکل کہتا آیا تھا اور جو میرے محسن بھی تھے۔ میں اتنا کمینہ اور خود غرض نہیں تھا کہ جان سلامت لے کر رابعہ کے ساتھ نکل جاتا تو خدا کا شکر بجا لاتا اور فکر کے سوا محسن کے لیے کچھ نہ کرتا۔ میں اس کے بدلے بہ خوشی اپنے آپ کو پیش کر سکتا تھا اور اس میں مبالغے کی کوئی بات نہیں۔ اب ایک طرف مجھے رابعہ کی فکر لاحق تھی جو اسٹور روم کے ٹھنڈے، سخت اور مٹی سے اٹے ہوئے فرش پر لیٹی تھی اور میری نظر میں اس کے لہو آلودہ پیرہن کا ہر تار تھا جو زخموں سے لالہ زار بدن پر ڈھائے جانے والے مظالم کی پوری تصویر پیش کرتا تھا۔ کمرے سے باہر آ کے میں نے چند سیکنڈ تذبذب اور کشمکش میں گزارے۔ پھر میں نے اوپر جا کے دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ گفتگو سے میں نے اندازہ کیا تھا کہ محسن چھت پر ہے اور کسی روشن دان سے دشمن کو نشانے پر رکھے اردگرد دو فرلانگ تک دیکھنے کی پوزیشن میں ہے۔ رابعہ نہ جانے کب سے بے ہوش تھی اور اس کے سانس کی اور نبض کی رفتار دیکھ کے میں نے محسوس کیا تھا کہ اس کی حالت تشویشناک نہیں۔ اسے چند منٹ اور اسی حالت میں چھوڑا جا سکتا تھا۔ راہداری سے باہر آ کے میں نے اوپر جانے کا راستہ تلاش کیا۔ آر سی سی کے زینے کا اسٹرکچر مکمل تھا اور پانی کے مختصر سے عارضی تالاب کے بعد عمارت کے آخری گوشے میں نظر آ رہا تھا۔ وہیں سیمنٹ کی کم سے کم دو سو بوریاں ایک دیوار کی طرح چنی ہوئی تھیں۔ میں اینٹوں اور سریوں کو پھلانگتا آگے بڑھا۔ ابھی میں نے زینے کا پہلا موڑ ہی کاٹا تھا کہ مجھے کسی کے کراہنے کی آواز سنائی دی۔ میرے قدم رک گئے اور میں نے پلٹ کر نیچے دیکھا لیکن کراہنے والا مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ چند سیکنڈ کے توقف کے بعد میں نے باقی ماندہ زینہ طے کیا اور اس چھت پر پہنچا جو پلستر سے محروم سیمنٹ کی ناہموار کھردری سطح تھی اور جس میں جگہ جگہ عمارت کو سنبھالنے والے ستونوں کے سریے کسی صحرا میں اُگے ہوئے کیکٹس لگتے تھے۔ چھت کے چاروں طرف چھجے کا دو فٹ چوڑا حاشیہ تھا لیکن روشن دان کوئی نہیں تھا۔ یہ سمجھ میں نہ آنے والی بات تھی۔ ایک روشن دان تو خود

میں نے دیکھا تھا جس میں لاؤڈ اسپیکر فٹ تھا۔ دوسرا... کون سا تھا جس میں سے محسن ریوالور نکالے دشمن کو زد پر... اسے اپنے احکامات کی تعمیل پر مجبور کر رہا تھا۔ میں نے... لیٹ کے نیچے جھانکا اور اپنی عقل پر ماتم کیا۔ چھجے... ہی اس لیے جاتے ہیں کہ روشن دان بارش کی بوچھاڑ سے... رہیں۔ چھجے کے نیچے ہر کمرے کا کھلا روشن دان ایک تاریک خلا کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے وہ تار بھی نظر... جو ایک کھڑکی سے نکل کے اسٹور روم کے روشن دان تک پہنچ رہے تھے۔ ظاہر ہے یہ کھڑکی اسی کمرے کی تھی جہاں ایک شخص کی لاش پڑی تھی۔ میں نے چند فٹ کے فاصلے... اسی کمرے کے روشن دان سے جھانک کے دیکھنا چاہا... نیچے جھکتے ہی مجھے اس جگہ محسن کی موجودگی کے ثبوت مل گئے۔ ناہموار سطح پر تقریباً اتنی ہی جگہ صاف نظر آ رہی تھی جتنی... ایک آدمی کا جسم گھیرتا ہے۔ محسن اسی جگہ لیٹا تھا اور... کے بعد سر جھکا کے کمرے کے روشن دان میں سے کمرے کا منظر دیکھ رہا تھا۔ عملی تجربے سے میرے خیال کی تصدیق ہو گئی... روشن دان میں سے مجھے وہ لاش نظر آ گئی جو کمرے کے وسط میں پڑی تھی۔ محسن کھلی چھت پر تھا۔ غالباً وہ روشن دان پر جھکا... ریوالور سے دشمن کو زد میں لیے لیٹا رہا تھا۔ اس کی نظر میں... بھی تھا۔ چنانچہ اسے یقین تھا کہ کوئی اس تک براہ راست نہیں پہنچ سکتا اور یہ بھی غلط نہ تھا کہ وہ اردگرد دو فرلانگ تک کا منظر دیکھ سکتا تھا لیکن محسن نے ایک امکان کو نظر انداز کر دیا تھا کہ زینے کے علاوہ بھی چھت پر چڑھنے کے بہت سے طریقے ہیں۔ شاید کوئی پچھلی طرف سے رسی کا پھندا کسی ستون کے اوپر نکلے ہوئے سریوں میں ڈال کر چھت پر جا پہنچا تھا اور لیٹے لیٹے ہوئے محسن کو خبر بھی نہ ہو سکی تھی... نے تقریباً دوڑتے ہوئے چھت کے دوسرے کناروں کو دیکھا اور ایک جگہ مجھے وہ رسی نظر آ گئی جس کا پھندا بڑی مضبوطی سے کونے والے ستون کے دو سریوں میں پھنس گیا تھا۔ رسی ابھی تک لٹک رہی تھی لیکن محسن غائب تھا۔ قیاس آرائی کی بنیاد پر میں یہ نتیجہ اخذ کر سکتا تھا کہ محسن کو حملہ آور کے آنے کی خبر بہت دیر سے ہوئی اور اسے اٹھنے یا پلٹ کر گولی چلانے کا موقع نہیں مل سکا۔

مزید وقت ضائع کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ میں زینے سے اترنے لگا تو مجھے کسی کے کراہنے کی آواز پھر سنائی دی اور اس مرتبہ میں آواز کی سمت کا تعین کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ آواز سیمنٹ کی بوریوں سے بنی ہوئی پشتے جیسی دیوار

کے پیچھے سے آئی تھی۔ آخری سیڑھی سے کود کر میں سیدھا گزر گیا اور سیمنٹ کی بوریوں پر چڑھنے لگا۔ بوریوں کو اس طرح چنا گیا تھا کہ آخری گوشے کی دو دیواریں مل گئی تھیں اور پیچھے ایک تکونی جگہ خالی رہ گئی تھی۔ جیومیٹری کی زبان میں دو دیواریں ایک زاویہ قائمہ بنانے والی مثلث کے دو ضلعے تھیں تو سیمنٹ کی بوریوں نے تیسرے ضلعے یعنی وتر کو مکمل کیا تھا۔ اوپر سے دیکھنے پر مجھے محسن نظر آیا جو ریت کے ڈھیر پر پڑا تھا۔ اس تکونی خالی جگہ کو چھنی ہوئی ریت جمع رکھنے کے لیے استعمال کیا گیا تھا اور محسن کو اوپر سے اچھال دیا گیا تھا لیکن ریت پر گرنے سے جو تقریباً چار فٹ کی اونچائی تک پھیلی ہوئی تھی۔ اسے چوٹ نہیں آئی تھی۔ میں نیچے کودنے ہی والا تھا کہ نامکمل عمارت کے اندر ہی سے کار کے اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ پھر عمارت کے عقبی حصے سے ایک نیلے رنگ کی ٹویوٹا کراؤن کار گولی کی طرح نکلی اور کھلے گیٹ سے سیدھی گزر گئی۔ میں نے سیمنٹ کی بوریوں کے اوپر سے چھلانگ لگانے سے پہلے ریوالور نکال کے فائر کیا مگر گولی گیٹ سے ٹکرائی اور میرے گیٹ تک پہنچنے سے پہلے کار کچے راستے پر دوڑتی ہوئی اتنی دور جا چکی تھی کہ میں اس کے عقبی حصے کے سوا کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ نمبر پلیٹ موجود ہی نہ تھی اور ہوتی بھی تو میں اتنے فاصلے سے نمبر نہیں پڑھ سکتا تھا۔ کار کے شیشوں پر پردے نہیں تھے مگر بند شیشوں کے اندر اجالا کم تھا چنانچہ میں کسی کی صورت کو شناخت نہیں کر سکا تھا۔ مجھے صرف اتنا احساس تھا کہ کار میں چار افراد تھے اور اب میں بے وقوفوں کی طرح ریوالور ہاتھ میں لیے سڑک پر پہنچ جانے والی کار کو نگاہوں سے اوجھل ہوتا دیکھ رہا تھا۔ چالاک مجرم مجھے دھوکا دے کر نکل گئے تھے اور میں خود کو قصوروار سمجھ رہا تھا جس نے ان کو یہ مہلت فراہم کی۔ میں محسن کو دیکھنے کے لیے اوپر نہ جاتا تو انہیں خاموشی سے ساری کارروائی مکمل کر کے فرار ہونے کا موقع کہاں ملتا، لیکن یہ بھی کیسے ہو سکتا تھا کہ رابعہ کی طرف سے مطمئن ہو جانے کے بعد میں محسن کی خیر خبر نہ لیتا۔

پھر مجھے ایک اور خیال آیا اور اس کا ردِ عمل اتنا شدید تھا کہ میں اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا۔ "رابعہ!" میں چلایا اور اس دروازے میں سے طوفان کی طرح گزر گیا جو راہداری میں کھلتا تھا۔ آخری کمرے تک کا فاصلہ مجھے ایک جنت کا فاصلہ لگا۔ لیکن دروازہ کھولتے ہی میری نظروں میں دنیا اندھیر ہو گئی۔ میں نے آنکھیں مل کے دیکھا اور خود کو یقین دلانے کی ناکام کوشش کی کہ میں گھبراہٹ اور پریشانی میں وہ دیکھ رہا ہوں

جو حقیقت نہیں ہے اور یہ میرا خوف ہے جو غیر یقینی اور بے بنیاد خیالات کا عکس بن کے سامنے آ گیا ہے مگر اٹل اور بے رحم سچائی کو جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا۔ اس کمرے میں اب کوئی نہیں تھا۔ وہ رابعہ اور پیڈرو کو نکال کے لے جانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ جیسے کسی نے آتے ہوئے نہیں دیکھا ہوگا ایسے ہی کسی نے ان کو جاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ کسی نے دور سے ایک نیلے رنگ کی کار دیکھی بھی ہوگی تو وہ کیا بتائے گا کس کو شناخت کرے گا اور کیسے شناخت کرے گا؟

وہ اپنی موجودگی کے تمام آثار بھی مٹا گئے ہوں گے۔ بازار میں ملنے والے ایک عام قسم کے ایمپلی فائر اور اسپیکر سے کسی کے جرم کی گواہی تو نہیں ملتی۔ فنگر پرنٹس اول تو ملیں گے نہیں، اور ملے تو ان کا موازنہ کس کے فنگر پرنٹس سے کیا جائے گا؟ پولیس کے ریکارڈ پر دلاور، پیڈرو یا ڈی سلوا کے فنگر پرنٹ تو ہونے سے رہے۔ لاش پھر کسی لاوارث غیر معروف سے بدمعاش کی ثابت ہوگی جس کی خدمات معاوضے پر حاصل کی گئی ہوں گی۔ رپورٹ کے بغیر پولیس اس مکان میں آئے گی نہیں اور زیر تعمیر مکان پر چھاپہ مار کے انہیں کیا ملے گا۔ اصل مالک کے فرشتوں کو خبر تک نہ ہوگی کہ اس کے گھر میں کیا خونی ڈراما کھیلا جا چکا ہے۔ کسی ثبوت کے بغیر نہ دلاور کے خلاف رپورٹ لکھوائی جا سکتی ہے نہ ڈی سلوا کے خلاف۔ وہ بااثر اور پیسے والے لوگ ہیں۔

محسن کی کوشش کے باوجود بازی مات ہو گئی تھی۔ میں شکست خوردہ اور تھکے ہوئے قدموں سے چلتا ہوا واپس ہوا۔ میرا ذہن یہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھا کہ محسن نے مداخلت کر کے اچھا کیا یا برا۔ اس کی نیک نیتی پر شک نہیں کیا جا سکتا تھا مگر اس کے آ جانے سے وہ بات ختم ہو گئی تھی جو نتیجہ خیز ثابت ہو رہی تھی۔ رابعہ کی وجہ سے میں مجبور ہو گیا تھا کہ تصادم کی راہ چھوڑ کے ان کے جائز و ناجائز ہر حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دوں اور اس خط کے بعد وہ جان بھی مانگیں تو نذر کر دوں۔ شاید وہ مجھ سے معاہدہ کر لیتے کہ میں ہسپتال جا کے رابعہ کی ماں سے اس خط کے بارے میں معلومات حاصل کروں اور اپنے وعدے کے مطابق کسی کو اطلاع دیے بغیر واپس آ کے خط ان کے حوالے کر دوں تو وہ بھی ایفائے عہد کرتے ہوئے مجھے رابعہ کے ساتھ نکل جانے دیں گے۔ میرا اُن سے مقابلہ کرنے کا یا پولیس سے مدد حاصل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا چنانچہ مجھے قوی امید تھی کہ خط مل جانے کے بعد وہ رابعہ کو یرغمال نہیں رکھیں گے۔ کیونکہ اس سے انہیں مزید کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔

الٹا اس بات کا خطرہ تھا کہ ایک سینئر خاتون ایڈوکیٹ کی پُراسرار گمشدگی کا مسئلہ کوئی سنگین صورت حال پیدا نہ کر دے لیکن اب بات پھر وہیں آ پہنچی تھی جہاں سے شروع ہوئی تھی۔ وہ پھر رابعہ کو اغوا کر کے لے گئے تھے اور جاتے جاتے ایک لاش چھوڑ گئے تھے۔ محسن کے دامن پر ایک قتل کا داغ آ گیا تھا اور حاصل کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ اب جلد از جلد یہاں سے نکل جانے میں ہی خیریت تھی۔ اس کے بعد ہمیں پھر انتظار کرنا تھا۔ انتظار کہ وہ ہمیں ایک موقع اور فراہم کریں۔ ہم سے پھر رابطہ قائم کریں اور ملاقات کے لیے سخت تر شرائط پیش کریں۔ اور زیادہ محفوظ مقام کا انتخاب کریں۔

میں گیٹ بند کر کے واپس آیا۔ محسن اسی طرح پڑا تھا، لیکن اس کے کراہنے اور ہلنے جلنے سے اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ کچھ کچھ ہوش میں آنے لگا ہے۔ میں نے اسے دونوں ہاتھوں سے اٹھا کے سیمنٹ کی بوریوں کے اوپر رکھنے کی کوشش کی مگر دیوار بہت اونچی تھی۔ میں نے محسن کو پھر ریت پر لٹا دیا اور دوبارہ سیمنٹ کی بوریوں کی دیوار پر چڑھا۔ ایک قطار کی سب سے اوپر والی بوری کو دھکیل کر گرانے سے اس کی بلندی تقریباً ایک فٹ کم ہو گئی۔ چار بوریاں گرانے سے اس دیوار میں ایک کھڑکی سی بن گئی جو ریت کی سطح سے تقریباً چار فٹ اونچی تھی۔ دوسری کوشش آسان ثابت ہوئی اور میں محسن کو کندھے پر ڈال کے پانی کے ٹینک کے کنارے لے آیا جس کے اوپر پانی کا نلکا موجود تھا۔ کھولنے پر نلکے سے صاف پانی بہہ کر ٹینک میں گرنے لگا۔ میں نے محسن کے منہ پر پانی ڈالا اور اسے اپنے چلو سے پانی پلانے کی کوشش بھی کی۔ اس کی بے ہوشی کا سبب سر کی چوٹ تھی، اور پچھلی جانب ہاتھ لگانے سے بالوں کے درمیان اُبھار سا محسوس ہوتا تھا لیکن اطمینان کی بات یہ تھی کہ سر کی چوٹ سے خون نہیں نکلا تھا۔ عدم اطمینان کا پہلو یہ تھا کہ اندرونی چوٹ سے دماغ کے متاثر ہونے کی صورت میں سنگین نتائج چوبیس گھنٹے میں کسی بھی وقت ظاہر ہو سکتے تھے۔

آہستہ آہستہ محسن نے آنکھیں کھولیں۔ وہ کچھ دیر مجھے اجنبی نظروں سے تکتا رہا، جیسے مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

"محسن!" میں نے کہا۔ "میں سکندر ہوں۔ پہچانا مجھے؟" میں نے اس کے گالوں کو تھپکا۔

محسن نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا۔ "سکندر... سوری یار...!" اس نے کراہ کر اپنا سر تھام لیا۔

"ایسی باتیں مت کر۔ وہ لوگ جا چکے ہیں اور اب ہمیں فوراً یہاں سے نکلنا ہے۔" میں نے اسے سہارا دے کر بٹھا دیا۔

"وہ... رابعہ... رابعہ کہاں ہے...؟" اس نے لمبے لمبے گہرے سانس لیتے ہوئے کہا۔ وہ خود کو سنبھالنے کی بھرپور جدوجہد کر رہا تھا اور بظاہر درد کے سوا چوٹ کے اثرات زائل ہونے لگے تھے۔

"وہ بدمعاش پھر اسے لے گئے محسن!" میں نے کہا۔ "ان میں سے ایک کی لاش اندر پڑی ہے۔ تو نے مارا ہے اسے؟"

محسن نے پھر سر ہلایا۔ "میں اور کیا کرتا۔ اس نے فرار ہونے کی کوشش کی تھی... اتفاق ہے کہ اسے گولی لگ گئی۔"

"میں نے پیڈرو کو قابو کر لیا تھا۔" میں نے ریوالور کی [illegible] کرتے ہوئے کہا۔ "مگر ذرا سی چوک ہو گئی۔ میں تجھے تلاش کرنے نکلا تھا، وہ عقبی حصے میں ڈی سلوا کی گاڑی لیے موجود تھے۔ وہ دوسری طرف سے پیڈرو اور رابعہ دونوں کو اٹھا کے لے گئے۔ انہوں نے رابعہ پر بہت تشدد کیا ہے محسن! اس کا سارا جسم لہولہان تھا۔ کپڑے پھٹے ہوئے تھے اور وہ بے ہوش تھی۔"

"تو نے انہیں روکنے کی کوشش بھی نہیں کی؟" خاموشی کا مختصر سے سوگوار وقفے کے بعد محسن نے سر اٹھایا۔

"کی تھی۔ نشانہ خطا ہو گیا۔" میں نے افسوس سے کہا۔ "میں کچھ نہیں کر سکا۔"

"میں بھی کچھ نہیں کر سکا یار!" محسن نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "نہ جانے کس نے اچانک پیچھے سے آ کے مجھ پر وار کر دیا۔"

"وہ پچھلی طرف سے رسی کے سہارے اوپر آ گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "رسی ابھی تک موجود ہے۔"

اسی وقت کسی نے زور زور سے دروازہ بجانا شروع کیا۔

"سائیں... او سائیں! کی گل اے بھئی... اج بوا بند لے؟"

"یہ سائیں کون ہے؟" میں نے سرگوشی میں کہا۔ یہ سوال نہیں تھا خیال تھا جو الفاظ میں ڈھل گیا تھا۔

"سائیں شاید کوئی بدنصیب چوکیدار ہوگا۔" محسن نے اظہارِ خیال کیا۔

"اچھا تو ٹھہر۔ میں دیکھتا ہوں۔" میں نے کہا اور جب رک گیا۔ میں نے پیڈرو کے کپڑے پہن رکھے تھے اس غیر ملکی لباس میں اعتبار قائم کرنا مشکل کام تھا۔ میں نے محسن کی طرف دیکھا اور وہ سمجھ گیا کہ میں کس تذبذب کا شکار ہوں۔ میں نے اسے سہارا دے کر کھڑا کیا اور گیٹ تک لے گیا۔ اس عرصے میں گیٹ پر دستک دینے والا مسلسل سائیں کو پکارتا رہا اور دروازہ بند ملنے پر تعجب کا اظہار کرتا رہا۔ محسن نے گیٹ کھول کے باہر جھانکا۔

"کیا بات ہے بھئی! کس سے ملنے آئے ہو؟" محسن نے متانت اور وقار سے کہا۔ "کیا ہنگامہ ہے یہ؟"

"وہ... وہ جی میں سائیں چوکیدار..." ملاقاتی نے بوکھلا کر مؤدب اور معذرت آمیز لہجے میں کہا۔ "وہ شہر گیا تھا جناب!"

"وہ ابھی واپس نہیں آیا ہے۔" محسن نے کہا۔

"اچھا جی معاف کرنا۔ میں نے سوچا تھا بڑے شاہ صاحب کی خیریت معلوم کروں۔ اللہ شفا دے۔ بڑی لمبی بیماری لگ گئی ہے ان کی جان کو۔" وہ بولا۔ "آپ کا کیا رشتہ ہے جی بڑے شاہ صاحب سے؟"

"میں ان کے بھائی کا لڑکا ہوں۔" محسن نے کہا۔ "ولایت میں تھا۔ میں اسی کا انتظار کر رہا ہوں۔"

"معاف کرنا جی! تسلی ضروری ہوتی ہے۔ چھوٹے شاہ صاحب کو دیکھتے ہی رہتے ہیں یہاں۔ آپ کو پہلی بار دیکھا تھا۔ میں یہیں رہتا ہوں۔" اس نے ہاتھ سے اپنے پیچھے اشارہ کیا۔ "اچھا جی سلاما لیکم۔"

ہم اسے جاتا ہوا دیکھتے رہے۔ "گویا بڑے شاہ صاحب اس زیرِ تعمیر کوٹھی کے مالک ہیں۔" میں نے گیٹ بند کر کے کہا۔ "اور تعمیر کے رک جانے کا سبب ہے ان کی طویل علالت۔ ان کا کوئی بیٹا وقتاً فوقتاً آتا رہتا ہے۔"

"اور سائیں چوکیدار ہے۔ سائیں اگر اس کا نام پڑ گیا ہے تو وہ یقیناً عمر رسیدہ آدمی ہوگا۔" محسن نے کہا۔ "آدمی نمک حلال ہوگا کہ یہاں سے شہر جا کے مالک کی خیریت معلوم کرتا ہے۔"

"اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اکیلا ہے۔" میں نے کہا۔ "اس کے بیوی بچے ہوتے تو وہ اس خالی کوٹھی میں اپنے ساتھ رکھ سکتا تھا جس کی فنش باقی ہے تاہم اس میں رہائش اختیار کی جا سکتی ہے۔ اب یہاں سے نکل چلو سا... صاحبزادے!" نہ جانے کیوں پہلی مرتبہ اس کو سالارِ اعظم کہتے ہوئے میری زبان رک گئی۔ میں نے لاشعور پر غالب آ جانے والے اس خیال کو کہ سالا محسن اب صرف میرا دوست رہ گیا ہے۔ یہ بہت بڑا، بہت مقدس اور بہت مضبوط رشتہ تھا مگر اس احساس کو میں کیسے جھٹلاتا کہ اب فوزیہ میری منگیتر نہیں رہی وہ اب کبھی میری شریکِ حیات نہیں ہوگی اور محسن اور میں سالے بہنوئی کے رشتے سے ایک نہیں ہوں گے۔ میں نے زبان کے لڑکھڑا جانے کے باوجود بات بنانی چاہی تھی لیکن یہ احساس مجھے فوراً ہو گیا کہ بات بنی نہیں۔ محسن نے جواب میں کچھ نہیں کہا اور ہم گیٹ سے باہر آ کے ویران کھیتوں کے پگڈنڈی جیسے راستوں پر چلنے لگے۔

رکشا ہمیں سڑک پر پہنچتے ہی مل گیا اور چالیس منٹ بعد ہم رابعہ کی کوٹھی میں تھے۔ ہمارے آنے سے پہلے بھی اس گھر میں رہنے والوں کی زندگی نفسیاتی مسائل کے تانے بانے میں الجھی ہوئی تھی مگر یہ مسائل ہی تو زندگی کی جدوجہد میں کامیابی کی امنگ پیدا کرتے ہیں۔ ہمارے آنے کے بعد زندگی گھر والوں سے روٹھ گئی۔ آباد گھر ویران ہو گیا اور اب اس پر موت کے آسیب زدہ سایوں کا راج تھا۔ وہ عورت جس نے یہ گھر بنایا تھا زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہسپتال کے بستر پر پڑی تھی اور ان تمام واقعات سے بے خبر تھی جو اس کی بے ہوشی کے دوران میں پیش آئے۔ اگر وہ ہوش کی کیفیت میں اپنی بیٹی کے اغوا کی خبر سن لیتی یا اپنی آنکھوں سے اس کی وہ حالت دیکھ لیتی جو میں نے دیکھی تھی تو اس کا کلیجہ پھٹ جاتا اور کسی مسیحا کی چارہ گری سے پہلے ہی وہ دکھ کی آخری سرحد سے گزر جاتی۔ درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا۔ اب اگر خدا کو منظور ہوا تو اس کے گھر لوٹنے سے پہلے ہی بیٹی بھی گھر واپس آ جائے گی۔ بصورتِ دیگر ہم تمام عمر اس دہرے قتل کا بار اپنے ضمیر پر لیے پھرتے رہیں گے اور اس احساس سے دامن نہ چھڑا سکیں گے کہ جو بھی ہوا ہماری وجہ سے ہوا۔ زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں سہی مگر نہ جانے یہ ہمارے کون سے اعمال کی سزا تھی کہ ہم تباہی و بربادی کے نامہ بر ہوئے۔ میں نے محسن کو ٹیلی فون کے قریب لٹا دیا۔ دشمنوں کی طرف سے دوسرا پیغام کسی بھی وقت موصول ہو سکتا تھا۔ میں نے واپسی پر اس شبہے کا اظہار کیا تھا کہ ان کے کسی آدمی نے ہمارا تعاقب ضرور کیا ہوگا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ ہم کدھر جاتے ہیں اور محسن نے اتفاق کیا تھا مگر دارِ غہ والا سے شالیمار تک ہمارے پیچھے اتنی ٹریفک تھی کہ کسی رکشا، ٹیکسی یا کار پر شبہ کرنا اندھیرے میں تیر چلانے کے مترادف تھا۔ نہر کے کنارے کے ساتھ ساتھ جیل کے علامہ اقبال روڈ سے ملنے والی سڑک پر ٹریفک بہت کم رہ گئی تھی مگر اس کے باوجود ایک ٹیکسی نے ہمیں اوور ٹیک کیا اور ایک رکشا تقریباً فرلانگ بھر کے فاصلے سے پیچھے چلتا رہا۔ دوسرا اس سے بھی سو گز پیچھے آیا اور جب ہم ریلوے کراسنگ کی طرف مڑ گئے تو پھر ریلوے اسٹیشن اور صدر کی طرف سے آنے اور جانے والی ٹریفک کے رش میں سب گڈمڈ ہو گیا۔

"اگر انہوں نے ہمیں رابعہ کے گھر میں آتے دیکھ لیا ہوگا تو یہ خبر بہت جلد اوپر پہنچا دی جائے گی۔" میں نے ہسپتال کا ٹیلی فون نمبر ملاتے ہوئے کہا۔ "اور وہ ہم سے فون پر بات کریں گے۔ انہیں علم ہوگا کہ گھر میں ہمارے سوا کوئی نہیں اور

ہم پولیس اسٹیشن بھی نہیں گئے۔ وہ ہم سے ایک بار پھر سودا کرنے کی کوشش کریں گے۔"

"اور اب ہم سودا کرنے پر پہلے سے زیادہ مجبور ہوں گے۔" محسن نے چھت کو گھورتے ہوئے کہا۔

"ہیلو۔" میں نے کہا۔ "دیکھیے میں کارڈیالوجی میں ڈاکٹر آن ڈیوٹی سے بات کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے آپریٹر کے جواب دیتے ہی کہا۔ "مجھے نہیں معلوم اس وقت جو ڈاکٹر موجود ہے اس کا نام کیا ہے۔"

"اس وقت تو بہت سے ڈاکٹر ڈیوٹی پر ہیں سر!" جھگی آپریٹر نے بیزار لہجے میں کہا۔

"مجھے انٹینسو کیئر یونٹ کا نمبر دے دو۔" میں نے جھلا کر کہا۔ "میں خود بات کروں گا۔"

خصوصی نگہداشت کے شعبے میں ریسیور فوراً اٹھا لیا گیا۔

"دیکھیے مجھے ایک خاتون کے بارے میں معلوم کرنا تھا۔ وہ مس رابعہ قادری ایڈووکیٹ ——— کی والدہ ہیں۔ انہیں دل کے شدید دورے کے بعد داخل کر لیا گیا تھا۔ میں ان کے گھر سے بول رہا ہوں۔"

"آئی سی! میں ڈاکٹر درانی بول رہا ہوں۔ کیا نام بتایا آپ نے اپنا؟"

"سوری۔ میں نے ابھی تک نام نہیں بتایا تھا۔" میں نے کہا۔ "میں سکندر بجنت ہوں۔"

"تو مسٹر سکندر بجنت!" ڈاکٹر درانی نے کہا۔ "مجھے آپ لہجے سے معقولیت پسند اور تعلیم یافتہ آدمی لگتے ہیں، اس لیے مجھے امید ہے کہ آپ صاف بات سننا پسند... میرا مطلب ہے صاف بات سننے کو ترجیح دیں گے۔ فیکٹ از فیکٹ۔"

میرا دل تیزی سے دھڑکا۔ "آپ کا مطلب یہ تو نہیں... کہ خدانخواستہ... یہ"

"نہیں، وہ ابھی زندہ ہیں اور ہوش میں بھی ہیں۔" ڈاکٹر درانی نے کہا۔ "لیکن آئی ایم سوری۔ ان کی حالت انتہائی نازک ہے۔ ان کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ غالباً یہ کہنا درست ہوگا کہ اب انہیں دوا سے زیادہ دعا کی ضرورت ہے۔"

"ڈاکٹر درانی!" میں نے چند سیکنڈ خاموش رہنے کے بعد کہا۔ "کیا میں... ہم ان سے بات کر سکتے ہیں؟"

"میں اجازت تو نہیں دے سکتا۔ اگر آپ خطرہ مول لینا چاہتے ہیں تو... ویل... اٹ از اے میٹر آف چانس۔" وہ بولا۔

"میں سمجھ گیا ڈاکٹر صاحب، لیکن انتہائی مجبوری کے باعث میں یہ درخواست کر رہا ہوں۔ دراصل یہ ایک ستازی [illegible] کا معاملہ ہے۔" میں نے کہا۔ "ان سے کچھ پوچھنا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" ڈاکٹر نے مختصراً کہا۔ "آپ آجائیے۔" اس نے ریسیور رکھ دیا۔

"تقدیر کی کیا ستم ظریفی ہے محسن!" میں نے ریسیور رکھ کے کہا۔ "ماں مر رہی ہے اور بیٹی اس کو مرنے سے پہلے دیکھ بھی نہیں سکتی۔"

"قصور میرا ہے سکندر، اگر میں مداخلت نہ کرتا تو شاید اس وقت تک وہ رابعہ کو رہا کر چکے ہوتے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "تو نے جو کچھ کیا ٹھیک کیا۔ تیری جگہ میں ہوتا تو میں بھی یہی کرتا۔ تقدیر کے نوشتے کو ٹالا نہیں جا سکتا۔ اگر رابعہ کی ماں بتا دیتی کہ خط کہاں ہے اور بفرض محال میں وہ خط ان کو پہنچا دیتا تب بھی اس بات کی ضمانت کوئی نہیں تھی کہ وہ مجھے اور رابعہ کو چھوڑ دیتے۔ اگر وہ قتل نہ کرتے تب بھی بے ہوش کر کے ضرور ڈال جاتے تاکہ ہم ان کا تعاقب نہ کر سکیں اور پھر کون جانے ہم کتنی دیر وہیں کسمپرسی کے عالم میں پڑے رہتے۔ اگر ہمارے ہوش میں آنے سے پہلے سائیں چوکیدار آجاتا تو پولیس کا لمبا چکر پڑ جاتا جس سے پریشانی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوتا۔ تیرے آنے سے یہ تو ہوا کہ ہم بخیر و عافیت نکل آئے اور ان کو بھی اندازہ ہو گیا کہ ہم آسانی سے شکار ہونے والے نہیں۔"

"یہ اندازہ تو ان کو پہلے بھی تھا۔" محسن بولا۔ "لیکن اب رابعہ کی زندگی کو لاحق خطرات بہت بڑھ گئے ہیں۔"

"رابعہ کی زندگی کو کوئی خطرہ نہیں۔" میں نے کہا۔ "وہ اب تک جتنا ظلم و تشدد کر سکتے تھے سو کر چکے اور انہیں معلوم یہ ہوا کہ رابعہ کو کچھ معلوم نہیں۔ اگر کچھ معلوم ہے تو رابعہ کی ماں کو۔ اب وہ رابعہ کو اس خط کے حصول کا ذریعہ ضرور بنائیں گے لیکن اسے قتل نہیں کریں گے۔ وہ جانتے ہیں کہ ایک سینئر ایڈووکیٹ کا قتل ایسا معاملہ نہیں ہوگا جسے دبایا جا سکے۔ فی الحال وہ مجھے بھی قتل نہیں کریں گے۔ گھی اگر سیدھی انگلیوں سے نکلتا ہو تو بلا وجہ ٹیڑھی انگلیوں سے کیوں نکالا جائے۔ اگر میں اپنی مرضی سے یا دباؤ میں آکر اپنے قانونی حق وراثت سے دستبردار ہونا قبول کر لیتا ہوں یا ان کا پارٹنر بن کے لندن میں رہنے کی تجویز منظور کر لیتا ہوں تو ان کے لیے بھی قانونی مسائل پیدا نہیں ہوتے۔ بصورت دیگر ان کو ایک جھوٹا وارث پیدا کرنا پڑے گا اور اسے سچا ثابت کرنا ہوگا۔ یہ معاملہ اتنی آسانی سے طے نہیں ہوگا چنانچہ وہ مجھے مہلت دے رہے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ میں اپنے اور ان کے فائدے کو دیکھتے ہوئے اس غیر قانونی کاروبار میں ان کا معاون و مددگار بن جاؤں۔ وہ نفسیاتی طور پر دباؤ بڑھاتے جا رہے ہیں اور مجھ پر اپنی طاقت ——— کی دہشت بٹھا کے اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل چاہتے ہیں۔ میں اتنی آسانی سے خوفزدہ ہونے والا نہیں — مجھے وہ قتل تو کر سکتے ہیں لیکن اپنی بات ماننے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ پہلا مسئلہ رابعہ کی رہائی کا ہے۔ میں اب ہسپتال جاتا ہوں اور بڑی بی سے پوچھتا ہوں کہ خط کو انہوں نے کہاں چھپا رکھا ہے۔ خدا ان کو زندگی کی اتنی مہلت دے اور اتنی قوت گویائی ضرور عطا کرے کہ وہ چند الفاظ بول کے اپنی بیٹی کو اس مصیبت سے نجات دلا سکیں جس کے ذمے دار ہم ہیں۔ تو یہاں لیٹا رہ۔ وہ آج ہی پھر بات کریں گے۔ ان کو بتا دینا کہ میں کہاں اور کس کام سے گیا ہوں۔ جانے سے پہلے میں دیکھتا ہوں کچن میں چائے کافی اور کھانے پینے کے لیے کچھ ہے یا نہیں۔"

کچن میں سب کچھ تھا۔ میں نے الیکٹرک کیتلی کا پلگ لگایا اور سلائیڈنگ ڈور والی کیبنٹ میں سے دو مگ نکالے۔ کافی کی شیشی تو مجھے فوراً نظر آگئی۔ چینی کے لیے مجھے کئی ڈبے کھول کر دیکھنے پڑے۔ فرج میں انڈے تھے جو ابالے جا سکتے تھے یا فرائی کیے جا سکتے تھے مگر میں نے آدھی بچی ہوئی ڈبل روٹی اور مکھن کو ترجیح دی۔ مجھے الماری میں سے کریم ویفرز کا ایک پیکٹ بھی مل گیا۔ یہ سب سامان میں نے ایک ٹرے میں سجایا اور محسن کے پاس آگیا جو رابعہ کے بیڈ پر لیٹا تھا۔

"محسن!" میں نے کافی بناتے ہوئے اور میکسویل ہاؤس کی تازگی بخش مہک سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔ "تو وہاں کیسے آ پہنچا تھا؟ یہ تو میں نے پوچھا ہی نہیں۔"

"جب تو شالیمار سے آگے نکل گیا تھا۔" محسن نے کہا۔

"تو ایک برقع پوش عورت نے تجھے ہاتھ دے کر روکنے کی کوشش کی تھی۔ کچھ یاد ہے، خمیدہ کمر بڑھیا تھی۔ ایک ٹوکری رکھے کھڑی تھی۔"

"ہاں۔" میں بھونچکا رہ گیا۔ "وہ تو تھا؟"

محسن ہنسا۔ "ہاں۔ بہت سوچ بچار کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ وہ تجھے باغبانپورے کی طرف نہیں لے جا سکتے۔ انجینئرنگ یونیورسٹی سے آگے کا تمام علاقہ آباد ہے لیکن دوسری طرف شالیمار باغ سے آگے، پاکستان منٹ اور داروغہ والا کی جانب آبادی کم ہونے لگتی ہے۔ میں تیرا تعاقب کرنا چاہتا تھا لیکن تعاقب آسان نہ تھا۔ وہ فوراً مجھے پہچان جاتے اور اپنا پروگرام بدل دیتے۔ رابعہ کی فاکس ویگن میں پیچھا کرنا بھی ناممکن تھا۔ بھیس بدلنے کی بھی کوئی صورت نہ تھی۔ اس وقت اچانک مجھے ایک خیال آیا۔ تجھ سے میں نے اس لیے ذکر نہیں کیا کہ تو میرے ارادے کی راہ میں حائل ہونے کی کوشش کرتا۔ رابعہ کے گھر کے بکھرے ہوئے کپڑوں کا اور سامان کا جائزہ لیتے ہوئے میں نے ایک برقع بھی باہر پڑا دیکھا۔ سفید خیمہ ٹائپ برقع جو پرانے وقتوں کی بڑی بی پہلے استعمال کرتی ہوں گی۔ تجھے رابعہ کی خادمہ کے ساتھ بھیجنے کا مقصد ہی یہ تھا کہ دشمن جو تجھ پر نگاہ رکھے کھڑے ہوں، تیرے پیچھے پیچھے صدر تک جائیں۔ ان کے لیے تشویش کی بات تو ہوگی کہ تو ایک برقع پوش کے ہمراہ کہاں روانہ ہو گیا ہے مگر تو نے ماسی کو اس کے گھر کے دروازے پر اتار کے واپسی اختیار کی ہوگی تو ان کی تشویش دور ہو گئی ہوگی۔ اس مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے رابعہ کی ماں کا برقع سر پر ڈالا اور گھر سے نکل آیا۔ اپنی مردانہ چال اور جوتوں کو چھپانے کا بہترین طریقہ یہ تھا کہ میں بوڑھی عورتوں کی طرح کمر جھکا کے چلوں۔ باہر آتے ہی مجھے رکشا مل گیا اور میں نے اس سے باغبانپورے کی طرف چلنے کے لیے کہا۔ میرا ارادہ تھا کہ شالیمار باغ سے ذرا آگے جا کے رکشا روک لوں گا اور اسے دس بیس روپے کا لالچ دے کر انتظار کرنے کو کہوں گا اور جب تیری ٹیکسی گزرے گی تو رکشا والے سے کہوں گا کہ چل بھائی۔ رکشا والا مجھے کوئی خبطی بڑھیا سمجھتا۔ میری بلا سے۔ فکر کی بات یہ تھی کہ کہیں وہ میرے بناتے ہوئے زنانہ لہجے سے شک میں مبتلا نہ ہو جاتے لیکن بوڑھی عورتوں کی آواز میں وہ نرمی، لوچ اور شعلہ سا لپک جاتا ہے آواز تو دیکھو والی بات کہاں ہوتی ہے ——— ابھی میں نے نہر کے کنارے کنارے جانے والی سڑک آدھی طے کی تھی کہ مجھے ایک رکشا سڑک کے کنارے رکتا دکھائی دیا۔ رکشا میں کوئی سواری نہیں تھی اور رکشا والا حاجت رفع کرنے کی غرض سے نیچے اتر رہا تھا۔ میں نے اپنا رکشا روک لیا اور رکشا والے کو دس کا نوٹ دے کر چلتا کیا۔ وہ حیران تو ہوا مگر دو روپے کی جگہ دس روپے کا نوٹ مل جانے کی خوشی اس حیرت پر غالب آگئی۔ وہ بھی کچھ اپنے کام سے کام رکھنے والا ہکا بکا قسم کا شخص تھا ——— اس نے دس کا نوٹ جیب میں رکھا اور روانہ ہو گیا۔ اس کے ایک فرلانگ دور چلے جانے کے بعد میں نے دیکھا تو سڑک سے نیچے اتر جانے والا رکشا ڈرائیور ایک جھاڑی کی طرف منہ کیے بیٹھا تھا۔ میں نے پلک جھپکتے میں رکشا اسٹارٹ کیا اور روانہ ہو گیا۔ رکشہ والا ازار بند تھامے شور مچاتا دوڑا مگر فوری طور پر اس کی مدد کرنے والا وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ بعد میں کسی نے اسے لفٹ دی ہوگی یا کسی ہم پیشہ رکشا ٹیکسی

ڈرائیور نے اس کی فریاد سنی ہو گی تو وہ تھانے گیا ہوگا۔ سڑک پر رکشا کون تلاش کرتا پھرتا ہے۔ تھانے والوں نے اسے گھنٹہ بھر تو بٹھائے رکھا ہوگا اور بڑی مشکل سے اس کی بات پر یقین کیا ہوگا کہ ایک بڑھیا اس کا رکشا لے گئی جو سفید لٹھے کا شٹل کاک برقع اوڑھے کھڑی تھی۔ رکشا میں بیٹھتے ہی میں نے برقع سر سے ہٹا کے پیچھے ڈال دیا اور گولی کی طرح باغبانپورے سے شالیمار جانے والی سڑک پر جا پہنچا۔ شالیمار سے آگے جہاں تو نے مجھے دیکھا تھا میں نے رکشا کو سڑک سے دور ہٹا کے کھڑا کیا اور ادھر دیکھ کر موقع ملتے ہی پھر برقعے میں روپوش ہو گیا۔ ڈوکری تو گھر سے لے کر نکلا تھا۔ جب میں نے تجھے ٹیکسی میں آتے دیکھا تو تجھے روکنا چاہا مگر یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس میں بھی میرے جیسی ہی دو برقع پوش خواتین تشریف فرما ہیں۔ میرے لیے اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ برقعے میں مسلح افراد ہیں۔ اس اتفاق پر مجھے بے اختیار ہنسی آئی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ دشمن بھی بھیس بدلنے کے لیے وہی طریقہ اختیار کریں گے جو میں نے کیا، اور ان کو بھی خیال تک نہ آیا ہوگا کہ انہی کی طرح میں برقعے میں چھپ کر سائے کی طرح ان کے پیچھے لگ جاؤں گا۔ جب ٹیکسی گزر گئی تو میں پھر رکشا کی طرف بڑھا۔ مجھے معلوم نہیں اس وقت کوئی مجھے دیکھ رہا تھا یا نہیں۔ میں نے برقع ہٹا کے رکشا کو دوڑایا اور چند منٹ میں ٹیکسی کو جا لیا۔ جب ٹیکسی رکی تو میں سو گز پیچھے تھا۔ میں نے تجھے اتر کے دونوں برقع پوشوں کے آگے جاتے دیکھا۔ بخدا یہ اتنا نیچرل منظر تھا کہ کوئی شک کر ہی نہیں سکتا تھا۔ ایک شریف آدمی دو شریف پردہ نشیں بیبیوں کے ساتھ جا رہا ہے۔ اس میں عجیب بات کیا ہے مرد آگے ہی چلتے ہیں۔ یہ تو میں ہی جانتا تھا کہ مرد آگے چلنے پر مجبور کر دیا گیا ہے اور پیچھے برقعے کے اندر دو مرد ہیں جو ریوالور تانے ہوئے ہیں۔ ان کی چال فدا بھی زنانہ نہیں تھی لیکن وہاں اس بات پر غور کرنے والا کون تھا اور جو تھا اس نے دیکھا نہیں۔ اِدھر اُدھر نگاہ ڈال کے میں نے جیسے ہی موقع پایا دوبارہ برقع اوڑھ کے میں اسی راستے پر ہو لیا جس پر تو گیا تھا۔ مجھے تھوڑی سی دیر اس لیے ہوئی کہ میں سو گز پیچھے تھا اور روانہ بھی اس وقت ہوا جب تو اس زیرِ تعمیر گھر میں داخل ہو چکا تھا۔ اندر ایک شخص نے، جو برقع پہن کے باہر آ رہا تھا مجھ سے پوچھا تھا کہ تم کون ہو مگر میں نے غرا کے کہا 'تمہارا باپ' تو وہ خاموش ہو گیا۔ اس کے باہر نکل جانے کے بعد میں نے عمارت کا جائزہ لیا۔ وہ نیلی کار دائیں طرف گلی کے آخر میں موجود تھی ــــ کمال ہے کہ تو نے نہیں دیکھی تھی ــــ نہ جانے کیوں مجھے خیال ــــ آیا کہ اندر داخل ہونے کے بجائے میں چھت پر جا کے اندر اترنے کا راستہ تلاش کروں یا اوپر مورچہ قائم کروں تاکہ وہ رابعہ کو اور تجھے لے جانے کی کوشش کریں یا فرار ہونا چاہیں تو میں خود محفوظ رہتے ہوئے ان کا راستہ روک سکوں۔ اوپر سے اندر اترنے کا راستہ تو مجھے نہیں ملا مگر ایک روشن دان میں سے مجھے آواز سنائی دی۔ میں نے جھک کر دیکھا اور تاروں کو کھڑکی سے نکل کر وہ سے روشن دان تک پہنچتے دیکھا تو سب سمجھ گیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا تو جانتا ہے۔"

اس سرگزشت کے دوران کئی بار مجھے بے اختیار ہنسی آئی اور صورتِ حال کی سنگینی کے باوجود ہم نسوانیت کے پردہ دار برقعے کے اس مردانہ استعمال پر محظوظ ہوئے بنا نہ رہ سکے۔ کافی اور اسپرین نے محسن کو نارمل کر دیا تھا۔ میں نے اسے یاد دلایا کہ رات کا کھانا ہمیں عنان رضوی صاحب کے ساتھ کھانا تھا، جس کے لیے انہوں نے ہمیں خصوصی تاکید کی تھی۔ اب رات ہو چکی تھی۔ ہم اب بھی پہنچ سکتے تھے اور دیر سے پہنچنے پر کوئی معقول سا عذر پیش کر کے معافی مانگ سکتے تھے مگر بات صرف کھانے کی نہیں تھی۔ ہمیں معلوم تھا کہ کھانے کے بعد جو نشست چلے گی وہ گھنٹوں برخاست نہیں ہو گی اور ہمارے پاس سب سے اہم مسئلہ وقت کا تھا۔ ٹیلیفون کال تو محسن بھی ریسیو کر سکتا تھا اور "ایک آخری موقع" فراہم کرنے والوں کو بتا سکتا تھا کہ سکندر بخت اسی کام سے ہسپتال گیا ہوا ہے لیکن دوسری طرف رابعہ کی ماں کی فرصتِ عمر تمام ہو رہی تھی اور یہ کہنا بھی مشکل تھا کہ میرے پہنچنے سے پہلے ان کی آخری سانسوں میں ہوش و حواس کس حد تک ان کا ساتھ دیں گے۔

میں ہسپتال پہنچا تو رات کے دس بج رہے تھے۔ میں نے ڈاکٹر درانی کے بارے میں دریافت کیا اور اپنا نام بتایا۔

"اوہ مائی گڈنس۔" ڈاکٹر نے سر پہ ہاتھ مار کے کہا۔ "آپ نے اتنی دیر کیوں کی؟"

میرا دل بیٹھنے لگا۔ "کیا... ؟" میں نے بمشکل تمام کہا۔

"نہیں نہیں، آپ آئیے میرے ساتھ۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ "رابعہ کون ہے؟"

"رابعہ قاری ــ وکیل۔" میں نے کہا۔ "میں نے آپ کو بتایا تھا۔"

"اوہ یس، مگر وہ خود کہاں ہیں؟" ڈاکٹر نے برآمدے میں میرے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ "بیہوشی میں وہ کئی بار ان کو یاد کر چکی ہیں۔"

"بدقسمتی سے وہ ایک قانونی معاملے میں اپنے موکل

...مدد کے لیے راولپنڈی چلی گئی ہیں۔" میں نے مجبوراً جھوٹ کا ...سہارا لیا۔ "میں نے فون تو کر دیا تھا لیکن ان کا کل سے پہلے آنا ...مشکل ہے۔"

ڈاکٹر نے افسوس سے سر ہلایا۔ "اچھا ہوتا اگر آخری وقت ...میں بیٹی بھی ماں کے سرہانے ہوتی۔"

"آپ کا مطلب ہے وہ رات نہیں کاٹ سکیں گی؟" ...میں نے ناامیدی سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔

ڈاکٹر نے پھر نفی میں سر ہلایا۔ "نو ہوپ۔" اور انٹینسو کیئر ...وارڈ کا دروازہ کھولا۔ ہر بستر پہ لیٹے ہوئے مریض صبح کے انتظار ...میں تھے لیکن کسی کو خبر نہ تھی کہ آنے والی صبح کا سورج کسے دیکھنا ...ہے اور اس کے بعد وہ کون سی ایسی ہی رات ہو گی جس کا سورج ...سب کے لیے طلوع ہوگا۔ سوائے ان کے۔ ہر بستر پر موت سایہ ...فگن تھی۔ ان کی زندگی مانگنے والوں کی ملتجی، پُرامید اور دل زدہ ...نظروں سے بے نیاز۔ میں دونوں جانب کھنچے ہوئے پردوں ...سے نظر آنے والے مناظر دیکھتا چلا گیا۔ خون، گلوکوز اور آکسیجن ...دینے والے آلات کامل بے حسی کے ساتھ ہر جگہ ایستادہ تھے۔ ...ان کی اندھی آنکھوں نے ان گنت مریضوں کو انہی گنے چنے ...بیڈز پر آتے جاتے دیکھا تھا۔ اس وارڈ میں آنے والوں میں ...بہت کم ہوتے تھے جو اپنے جسم و جاں کا رشتہ سلامت لے ...جانے میں کامیاب ہوتے تھے۔ بیشتر کے صرف جسم لے جائے ...جاتے تھے۔

ڈاکٹر درانی رک گیا۔ اس نے پردہ کھینچا اور برابر کر دیا۔ رابعہ ...کی ماں آکسیجن ماسک چڑھائے لیٹی تھی۔ اس کے سرہانے رکھی ...ہوئی ایک الیکٹرانک مشین کے گول ڈائل پر روشنی کا ایک ...نقطہ اوپر نیچے ہوتا، بائیں سے دائیں جانب سفر کرتا ہوا دل ...کے ہنوز زندہ اور مصروفِ کار ہونے کی خبر دے رہا تھا۔ "بیپ ...بیپ... بیپ..." کی ہلکی سی آواز اس خبر کو نشر کر رہی تھی۔ ...ڈاکٹر درانی نے چارٹ اور گراف دیکھے۔ نرس سے کچھ کہا اور ...جھک کر رابعہ کی ماں کی آنکھوں کے بند پپوٹے کھول کر دیکھنے ...لگا۔

"مسٹر سکندر بخت! میں ایک رسک لے رہا ہوں۔ ...کیا آپ مجھے اپنی مجبوری کی نوعیت بتا سکتے ہیں؟" ڈاکٹر ...نے کہا۔

"میں تفصیل میں تو نہیں جا سکتا۔" میں نے تھوڑے ...سوچ بچار کے بعد ڈاکٹر کے سامنے جزوی حقیقت کا اعتراف ...کرنے کا فیصلہ کیا۔ "ان کے پاس ایک خط ہے۔ کسی کو معلوم نہیں ...وہ خط انہوں نے کہاں رکھا ہے۔ ہم پورے گھر میں ہر جگہ تلاش کر چکے ہیں۔ اس خط سے ان کی اکلوتی بیٹی کے مستقبل کا تحفظ وابستہ ہے۔ کچھ لوگ اس خط کو حاصل کرنے کی ناکام کوشش کر چکے ہیں۔ اگر اس خط کے بارے میں کچھ بتائے بغیر ان کا انتقال ہو گیا تو رابعہ کے لیے بہت خطرات پیدا ہو جائیں گے۔ اگر ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ خط انہوں نے کہیں چھپا رکھا ہے یا بصورتِ دیگر جلا دیا ہے تو یہ ہمارے لیے خاصے اطمینان کی بات ہو گی۔ ہم وہ خط جلا دیں گے۔ مگر خط ہمیں نہ مل سکا تو ممکن ہے دشمن اس کا سراغ لگا لیں۔"

"آپ کا ان سے اور مس رابعہ قاری سے کیا رشتہ ہے؟" ڈاکٹر درانی نے یکلخت سوال کر دیا جو میری بات بڑے غور سے سن رہا تھا۔

اور تب مجھے وہ جھوٹ بولنا پڑا جو ناگزیر تھا۔ اس کے بغیر ڈاکٹر درانی میری مدد کرنے کے لیے کوئی رسک لینے پر تیار نہ ہوتا۔ میں نے کہا۔ "میں مس رابعہ کا منگیتر ہوں اور فرسٹ کزن۔ چار سال انگلینڈ میں رہ کے ابھی کچھ عرصہ پہلے واپس آیا ہوں۔"

ڈاکٹر درانی کو میرے جواب نے پوری طرح مطمئن کر دیا۔

"انگلینڈ میں کاروبار تھا آپ کا؟"

"نہیں، میں انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم کے لیے گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "میرا بزنس یہیں ہے۔ ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس۔"

"آپ کو اندیشہ ہے کہ وہ خط غلط لوگوں کے ہاتھ میں پڑ گیا تو وہ مس رابعہ قاری کو بلیک میل کریں گے؟" ڈاکٹر درانی نے کہا۔ "وہ بہت سینئر ایڈووکیٹ ہیں۔ کیا پولیس ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتی؟"

"بدقسمتی سے وہ وکیل ایک عورت بھی ہے۔" میں نے کہا۔ "اور ہماری اخلاقی اقدار کے پیمانے مرد اور عورت کے لیے الگ الگ ہیں۔ عورت کی عزت شیشہ ہے جس میں بال بھی پڑ جائے تو نہیں جاتا۔ پھر ہمارے ملک کی زرد صحافت کے علمبردار ہیں، جو خبر میں تشہیر کے سامان تلاش کرتے ہیں یا فراہم کر دیتے ہیں۔ رابعہ کے ساتھ ایک مسئلہ اس کی پریکٹس کے متاثر ہونے کا بھی ہے۔"

"میں سمجھ گیا۔" ڈاکٹر درانی نے کہا۔ "اور اس لیے میں یہ نہیں پوچھوں گا کہ اس خط میں کیا ہے۔ ہم سب انسان خطاکار ہیں اور کبھی کبھی حالات کی سازش کا شکار بھی ہو جاتے ہیں۔"

اسی وقت نرس اندر آئی اور اس نے ڈاکٹر کو ایک انجکشن تھما دیا۔

"اب آپ اچھی طرح ایک بات سمجھ لیجیے مسٹر سکندر بخت!" اس نے انجکشن سرنج کو اوپر کی طرف کرکے پسٹن کو تھوڑا سا دبایا۔ "میں آپ کی مدد کر رہا ہوں، آپ پر اعتماد کرتے ہوئے۔ اس انجکشن کے بعد تین منٹ کے اندر اندر یہ ہوش میں آجائیں گی اور آپ سے چند منٹ باتیں کر سکیں گی۔ بقائمی ہوش و حواس۔ لیکن یہ چند منٹ کا وقفہ ان چند گھنٹوں کے بدلے ملے گا جن کے بعد خاتون کو بہر حال جینے کے حق سے دستبردار ہونا ہی تھا۔ میں ان کی نزع کی تکلیف کے چند گھنٹوں کو سمیٹ کر مختصر کر رہا ہوں۔ ایک مقصد کے حصول کے لیے۔"

"اور چند منٹ بعد؟" میں نے کہا۔ "ہوش کے اس وقفہ کے بعد؟"

"فوری خاتمہ۔" ڈاکٹر درانی نے کہا۔ "انتخاب آپ کے ہاتھ میں ہے۔ جلدی بولیے۔ اگر ان کی بیٹی صبح تک پہنچ سکتی ہیں اور یہ رسک لیے بغیر کام چل سکتا ہے تو اس انجکشن کی ضرورت نہیں۔"

فرشتۂ اجل نے میری بے بسی پر قہقہہ لگایا۔ فیصلہ تو بہت پہلے ہو چکا تھا۔ وقت کا تعین تو بہت پہلے ہو چکا تھا مجھے روح قبض کرنے کا حکم تو بہت پہلے دیا جا چکا تھا۔ تم کیا سوچ رہے ہو۔ کیا زندگی اور موت تمہارے قبضۂ قدرت میں ہے؟

"آل رائٹ۔" میں نے رابعہ کی ماں کی موت کے فرمان پر دستخط ثبت کر دیے۔ زندگی کے یہ چند بے مصرف لمحات اگر اس عورت کی اپنی بیٹی کی زندگی بچانے کے کام آسکتے ہیں تو تذبذب کیسا۔ رابعہ کے لیے آخری وقت میں ماں کے سرہانے موجود ہونا تو بعید از قیاس ہے۔ شاید اولاد کو ممتا کا یہ آخری نذرانہ دے کر اس کی روح کو سکون ملے۔ ڈاکٹر نے انجکشن لگا دیا۔

"آپ اگر اکیلے میں بات کرنا چاہیں تو میں باہر چلا جاتا ہوں۔" ڈاکٹر درانی نے نرمی سے کہا۔

"اس کی کوئی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔ "میں چاہتا ہوں آپ گواہ رہیں کہ میں نے آپ سے جھوٹ نہیں بولا تھا۔"

پپ... پپ... پپ... ہر لمحہ صدا دیتا گزرتا گیا۔ دل اب بھی دھڑک رہا تھا۔ اس مشین نے بہت پہلے ایک نوزائیدہ بچے کے جسم میں خون پمپ کرنا شروع کیا تھا۔ اب اس کی مشینری پرانی اور ناقص ہو چکی تھی۔ ناقابلِ مرمت اور ناکارہ قرار دی جا چکی تھی۔ اب یہ مشین بند ہونے والی تھی۔ ایک بار میں نے اپنے دوست سے سنا تھا کہ اس کے باپ نے نیویارک سے ایک بحری جہاز خریدا ہے جو بمبئی پر مال اتار کر کراچی آرہا ہے جہاں گڈاب میں اسے توڑ کر پرزہ پرزہ کر دیا جائے گا اور میں نے حیران ہو کے کہا تھا۔ اچھے بھلے چلتے ہوئے جہاز کو توڑ دیا جائے گا۔ اس میں کون سی عقلمندی ہے۔ میرے دوست نے مجھے سمجھایا تھا کہ عالمی قواعد و ضوابط کے مطابق ہر بحری جہاز کی ایک لائف ہوتی ہے۔ جب لائف پوری ہو جائے تو اس کا وجود ختم کر دیا جاتا ہے خواہ وہ ابھی مزید دس سال کے لیے سفر کے قابل ہو۔ یہ دل بھی اسی جہاز کی طرح تھا۔ اس کی لائف پوری ہو چکی تھی۔ یہ دل آخری چند گردش کے لیے خون کو جسم کی شریانوں کے سفر پر روانہ کر چکا تھا۔ وہ لمحہ بہت دور نہیں تھا۔ جب یہ مشین رک جائے گی اور خون کا ہر ذرہ جہاں ہوگا وہیں ٹھہر جائے گا۔

رابعہ کی ماں نے حرکت کی اور کراہی۔ ڈاکٹر درانی نے آکسیجن ماسک ہٹا دیا۔ "اب آپ ان سے بات کر سکتے ہیں۔"

"آنٹی!" میں نے جھک کر کہا اور فرش پر گھٹنوں کے بل بیٹھ کے ان کے کانوں کے قریب اپنے منہ کو کر لیا۔ "میری بات... دیکھیے... دیکھیے میں سکندر بخت ہوں..."

رابعہ کی ماں نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں۔ "سکندر..." اس نے سرگوشی میں کہا۔ "رابعہ..."

"دیکھیے آنٹی! رابعہ آنے والی ہے۔" میں نے کہا۔ "اس نے آپ کو ایک خط دیا تھا... وہ خط کہاں ہے؟ سنا آپ نے، میں کیا کہہ رہا ہوں؟ آپ کو معلوم ہے وہ خط کہاں ہے؟ یاد کیجیے... مجھے بتائیے۔"

رابعہ کی ماں نے کرب میں سر کو ادھر سے ادھر ہلایا۔ "رابعہ... میری بچی! اسے بلاؤ... رابعہ کو بلاؤ۔"

"رابعہ... رابعہ!" میں نے پکار کے کہا۔ یوں جیسے وہ باہر کھڑی ہے۔ "دیکھو امی بلا رہی ہیں تمہیں..." "وہ آ رہی ہے آنٹی! آپ نے سنی اس کی آواز؟ اس نے کہا ہے ابھی آتی ہوں۔ اب مجھے بتائیے وہ خط..."

"رابعہ..." رابعہ کی ماں چلائی۔ اس آواز میں درد تھی۔ شکایت تھی اور مایوسی تھی۔ میں یکلخت اٹھا اور باہر نکل آیا۔ "ڈاکٹر درانی!" میں نے کہا۔ "ایک منٹ..." ڈاکٹر درانی پردہ ہٹا کے نمودار ہوا۔ "یس!" اس نے کلائی کی گھڑی دیکھی۔ "ٹائم از ویری شارٹ۔"

"آئی نو۔" میں نے کہا۔ "پلیز میری تھوڑی سی مدد کیجیے۔ آپ نے اتنا کچھ کیا ہے تو یہ بھی سہی۔ آپ جانتے ہیں رابعہ یہاں نہیں ہے مگر وہ رابعہ کے سوا کسی کو کچھ بتانے کو تیار نہیں۔ کیا آپ کسی رابعہ کو لا سکتے ہیں؟"

"کسی رابعہ کو؟" ڈاکٹر درانی نے مجھے غور سے دیکھا... "واٹ ڈو یو مین؟"

"ہر لڑکی رابعہ ہو سکتی ہے۔" میں نے کہا۔ "شاید اس وقت وہ جھوٹ اور سچ میں تمیز نہیں کر سکیں گی۔"

"یہ صرف آپ کا خیال ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "ہو سکتا ہے وہ پہچان جائے۔ آخری وقت میں اس سے جھوٹ بول کے اسے دکھ پہنچانے سے کیا فائدہ؟"

"اٹ از لسے میٹر آف چانس۔" میں نے ڈاکٹر ہی کے الفاظ میں کہا۔ "میں یہ رسک لینا چاہتا ہوں۔ پلیز، کسی نرس یا کسی مریض کی وارث کوئی عورت یہاں آکر ایک جملہ بولنے پر تیار ہو جائے۔ وہ پوچھ لے۔ امی وہ خط کہاں ہے؟"

ڈاکٹر خاموش کھڑا میری صورت دیکھتا رہا۔ "میں کسی نرس کو یہ حکم نہیں دے سکتا۔ تمہاری یہ مدد کر سکتا ہوں کہ تمہیں ایک لڑکی کے بارے میں بتا دوں۔" اس نے انگلی سے اشارہ کیا۔ "باہر برآمدے میں ایک لڑکی کھڑی ہے۔ وہ بیس نمبر کے ساتھ ہے مگر اسے اندر آنے کی اجازت نہیں۔ وہ نیک دل لڑکی ہے۔ اس سے بات کر کے دیکھو۔ اگر وہ آجائے تو مجھے اعتراض نہیں۔"

میں باہر بھاگا۔ وارڈ سے باہر نکلتے ہوئے میں نے پھر گھڑی دیکھی۔ چار منٹ گزر چکے تھے۔ وہ لڑکی برآمدے کے آخر میں دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ مجھے اپنی طرف آتے دیکھ کر وہ کچھ نروس ہو گئی۔

"خاتون! آپ بیس نمبر کے ساتھ ہیں نا؟" میں نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔

"جی ہاں جی۔" وہ بولی اور اس کا رنگ ذرا سی دیر کے لیے متغیر ہوا۔ "وہ میرے والد ہیں۔"

"انیس نمبر پر میری والدہ ہیں۔" میں نے جھوٹ بولتے ہوئے کسی قسم کے تذبذب کا مظاہرہ نہیں کیا۔ "ان کا آخری وقت آگیا ہے۔ وہ چار منٹ باقی ہیں اور وہ اپنی بیٹی کو یاد کر رہی ہیں۔ میں آپ کو انسانیت اور شرافت کا واسطہ دیتا ہوں کہ چل کے ان سے صرف ایک بات کر لیجیے۔ ڈاکٹر درانی اندر موجود ہیں۔ وہ آپ کو بعد میں ساری بات بتا دیں گے۔ آپ چل کے صرف اتنا کہہ دیجیے کہ ماں! میں رابعہ ہوں۔ وہ پہچاننے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ ان سے اتنا پوچھ لیجیے کہ وہ خط کہاں ہے۔ پلیز۔ آئیے۔" میں نے بدحواسی میں اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ لڑکی تذبذب کا شکار تھی مگر میں اسے گھسیٹ کر لے گیا، اور اس نے معمولی سی کوشش کے بعد مزاحمت ترک کر دی سچائی میرے چہرے پر پڑھی جا سکتی تھی اور اس نے پڑھ لی تھی۔

"ویری لیٹ۔" ڈاکٹر درانی نے کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی۔ "سات منٹ ہو چکے ہیں۔"

میں نے پردہ ہٹایا اور اس اجنبی وحشت زدہ لڑکی کو رابعہ کی ماں کے بیڈ پر بٹھا دیا۔ "رابعہ آگئی ہے۔ یہ دیکھیے۔"

"امی!" لڑکی نے میرے ساتھ جھک کر کہا۔ "میں آگئی ہوں... آپ کی بیٹی رابعہ... مجھے بتائیے وہ خط کہاں ہے؟"

رابعہ کی ماں نے آنکھیں کھولیں۔ اب اس کی سانس اکھڑ چلی تھی۔ اس نے نظر جما کے اپنے سامنے بیٹھی ہوئی لڑکی کو دیکھا اور اس کی کھلی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ آخری سانس جسم سے رخصت ہوئی۔ آخری جھوٹ رائیگاں گیا۔ دنیا کے تمام ماہرین جو الیکٹرانک آلات سے بال کی کھال نکال لیتے ہیں اور ذرے کا دل چیر کے دیکھ لیتے ہیں اور آدمی کے وجود میں یوں جھانک لیتے ہیں جیسے کھلی کھڑکی سے تاروں بھری رات کا ہر ستارہ دیکھا جا سکتا ہے۔ نفسیات داں، دنیا کے سارے علوم پر عبور رکھنے کا دعویٰ کرنے والے اس آخری لمحے میں یہ نہیں بتا سکتے تھے کہ رابعہ کی ماں نے مرتے وقت اپنے مقابل کسے دیکھا تھا۔ رابعہ کو یا ایک اجنبی لڑکی کو جو رابعہ کا نام لے کر اسے دھوکا دینا چاہتی تھی۔ وہ لڑکی یکلخت اٹھی اور ہسٹریا کی کیفیت میں روتی ہوئی باہر بھاگ گئی۔

"آئی وش... کہ تم نے یہ سب نہ کیا ہوتا۔" ڈاکٹر درانی نے کہا۔ "یہ جھوٹ کس کے نامۂ اعمال میں لکھا جائے گا؟"

میں نے اپنا سر بستر پر ٹکا دیا اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ "مجھے معاف کر دینا آنٹی! مجھے معاف کر دینا میرے معبود!"

"میں ڈیتھ سرٹیفکیٹ بنا دیتا ہوں۔" ڈاکٹر درانی نے کہا۔ "لاش تم لے جاؤ گے؟"

میں نے اقرار میں سر ہلایا اور ڈاکٹر کو پردے پار کر کے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ پانچ منٹ بعد جب دو نرسنگ آرڈرلی ایک اسٹریچر لیے نمودار ہوئے تب بھی میں اسی طرح بیٹھا تھا اور مجھے معلوم نہ تھا کہ میں رو رہا ہوں۔ انہوں نے رابعہ کی ماں کو بستر پر سے اٹھا کے اسٹریچر پر لٹایا اور بے آواز قدموں سے اسٹریچر کو دھکیلتے ہوئے لے گئے۔ میں خالی بستر پر نظریں جمائے کھڑا رہ گیا۔ میں نے رابعہ کی ماں کی زندگی کے آخری چند گھنٹوں کو سمیٹ کر چند منٹوں میں ختم کر دیا تھا۔ میں نے ایک عورت کو مرتے وقت دھوکا دینے کی کوشش کی

تھی۔ میں نے ایک اجنبی اور بے گناہ لڑکی کو ایک ایسا جھوٹ بولنے پر مجبور کر دیا تھا جس کا بوجھ وہ ہمیشہ اپنے ضمیر پر محسوس کرے گی۔ میں نے ایک شریف النفس ڈاکٹر کو خلاف اصول مدد پر آمادہ کر لیا تھا اور احساسِ جرم و پشیمانی کے سوا کسی کو کچھ حاصل نہیں ہوا تھا۔ ایک نرس آ کے بستر کو ٹھیک کرنے لگی۔

"آپ کو ڈاکٹر درانی بلا رہے ہیں۔" اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ "اپنا سامان ساتھ لیتے جایئے۔"

میں نے سر ہلایا اور آفس کی طرف چل پڑا۔ جب میں رسمی کارروائی کے بعد ڈیتھ سرٹیفکیٹ لے کر باہر نکلا تو لاش ایمبولنس میں رکھی جا رہی تھی اور وہ اجنبی لڑکی اسی طرح دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ میں تھکے تھکے قدموں سے اس کی طرف گیا۔ "مجھے معاف کر دینا بہن! خدا نیتوں کا حال جانتا ہے۔ وہ میرے گناہ کی سزا تم کو نہیں دے گا۔" میں نے کہا۔ وہ اسی طرح بت بنی کھڑی خلا میں دیکھتی رہی۔ میں آج بھی تصور میں ایک منجمد صورت کو دیکھتا ہوں۔ نہ جانے وہ لڑکی کب تک اس دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی رہی ہوگی۔ میں سوچتا ہوں، پتھر کی دیواروں نے اسے کب تک سہارا دیا ہوگا۔

ایمبولنس کا دروازہ بند کر دیا گیا تھا مگر اسٹریچر لانے والے کچھ سوگوار اور کچھ پُرامید نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ اوہ! مجھے بروقت خیال آ گیا اور میرا ہاتھ پرس نکالنے کے لیے جیب میں گیا۔ پرس میں ایک ایک کے دو نوٹ تھے اور سو کا ایک نوٹ تھا۔ میں نے رابعہ کی ماں کا ہینڈ بیگ کھولا جسے میں تھرماس اور ایک باسکٹ میں موجود دوسری چیزوں کے ساتھ تھامے کھڑا تھا۔ اس میں سے دس دس کے نوٹ نکالتے ہوئے مجھے اچانک کسی بھاری سے پیکٹ کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے اسے نکال کے دیکھا۔ یہ وہی خط تھا۔ میں چند سیکنڈ ساکت و صامت کھڑا رہا۔ پھر میں نے دونوں اسٹریچر لانے والوں کو دس دس کا ایک ایک نوٹ دیا۔ اور ایمبولنس میں آ کے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ایک بار پہلے بھی میں نے رابعہ کے ساتھ آدھی رات کے بعد شہر کی ان ویران سڑکوں پر اسی ایمبولنس میں سفر کیا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس روز ایمبولنس کا سائرن چلا چلا کے راستہ مانگ رہا تھا کیونکہ تاخیر میں ایک زندگی کے زیاں کا امکان تھا۔ اب سائرن خاموش تھا۔ اس خاموشی میں میرے ساتھ صرف میرے خیالات تھے۔ وہ خط میں نے اپنی جیب میں رکھ لیا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اگر رابعہ کی ماں بقائمی ہوش و حواس بتا دیتی کہ خط اس کے ہینڈ بیگ میں ہے اور میں سب کے سامنے خط نکال لیتا تو کیا ہوتا

شاید میں فوراً اندر کے کاغذات بھی نکال کے دیکھتا اور جب ڈاکٹر درانی دیکھتا کہ اس لفافے میں سادہ کاغذوں کے سوا کچھ بھی نہیں تو وہ مجھے کیا سمجھتا؟ جھوٹا، دھوکے باز یا پاگل؟

لاش کو اتروانے کے بعد میں نے اور محسن نے اس سنگین صورتِ حال پر غور کیا۔ حسبِ توقع ایک ٹیلیفون کال موصول ہوئی تھی اور محسن نے جواب میں وہی کہہ دیا تھا جو میں نے اسے بتایا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ ہم پھر رابطہ قائم کریں گے لیکن اس بات کو دو گھنٹے ہو چکے تھے۔ اگر اب ان کا پیغام موصول ہو جاتا تو یہ مسئلہ حل ہو سکتا تھا جس میں ہماری پوزیشن بڑی عجیب تھی۔ ہم اب کفن دفن کے انتظامات کی ذمے داری قبول کر چکے تھے۔ ہمارا کام تھا کہ رابعہ کے اور اس کی ماں کے تمام رشتے داروں کو اطلاع دیں۔ ان سے رابعہ کی ماں کے تعلقات اچھے تھے یا برے۔ یہ ناممکن تھا کہ ان کو بتائے بغیر ہم تدفین کرا دیں لیکن ہمیں ان میں سے کسی کا نام پتہ معلوم نہ تھا۔

"ان کی ملازمہ کو خبر کرنی بھی ضروری ہے۔" محسن نے فکرمندی سے کہا۔ "اس کی نظر میں ہم پہلے ہی مشتبہ کردار ہیں، خصوصاً میں۔" میں نے کہا۔ "رابعہ کی ماں کو جس رات دل کا دورہ پڑا تھا رابعہ اس کے پاس موجود نہ تھی۔ اسے ہم اپنے ساتھ لے گیا تھا اور زبانی عقیدہ اپنی جگہ کہ زندگی اور موت خدا کے اختیار کی بات ہے۔ وہ موت کا یہی سبب بتائے گی کہ بڑی بیگم صاحبہ کو وقت پر ہسپتال نہیں پہنچایا گیا تھا ورنہ وہ بچ جاتیں۔"

"رابعہ کے تعلقات ہمسائے میں کس کس سے تھے؟" محسن بولا۔ "یہ بھی خادمہ ہی بتا سکتی ہے اور تم اسے لا سکتے ہو۔ شاید اسے ایک آدھ رشتے دار کا گھر بھی معلوم ہو۔ اس سے آگے دوسروں کا پتہ معلوم ہو جائے گا۔"

"یہ سب تو ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن ہم اس سوال کا کیا جواب دیں گے کہ رابعہ کہاں ہے؟ کس کس سے جھوٹ بولیں گے اور کیا سب ہمارے جھوٹ کو تسلیم کر لیں گے۔ رابعہ بہت بڑی وکیل ہے۔ اس کے ماتحت وکیل بھی ہیں۔ ان کو بے وقوف نہیں بنایا جا سکتا۔ اس کے علاوہ ہم پیشہ وکیلوں کو اطلاع دینی ہوگی۔ صبح نو بجے کے بعد جب کورٹ کے بار روم میں یہ خبر پہنچے گی تو وہ ہم سے پوچھیں گے تدفین کس وقت ہوگی۔ ان میں سے بہت سے مقدمات ملتوی کر کے جنازے میں شرکت کے لیے آ جائیں گے۔ اس وقت رات کا ایک بجا ہے۔ اگر ہم صبح ہوتے ہی تدفین کے انتظامات شروع کریں تب بھی دوپہر سے پہلے تدفین مشکل ہے۔ لوگوں سے پہلے تو ہمسائے آ جائیں گے۔ دوسرے سب لوگوں سے تو یہی کہا جا سکتا ہے جو ڈاکٹر درانی سے کہا تھا کہ رابعہ کسی کیس کے سلسلے میں راولپنڈی گئی ہے مگر اس کے ماتحت وکیل سمجھ جائیں گے کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ ان کا پیشہ ہی ایسا ہے کہ انہیں ہر شریف آدمی مجرم نظر آتا ہے اور ذرا بھی شک ہو تو ان کے لیے پولیس کو بلا کے تفتیش کا چکر چلانا مشکل نہیں ہوتا۔ ہم پہلے ہی اتنے چکروں میں پڑے ہوئے ہیں کہ مزید چکروں کے متحمل نہیں ہو سکتے۔"

"اگر ہم وکیلوں کو اطلاع ہی نہ دیں۔" محسن نے کہا۔ "یہ کہہ دیں کہ آخری رسوم میں خاندان کے افراد شریک تھے۔"

"خاندان کے افراد کا مسئلہ پھر بھی باقی رہتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر صبح سے پہلے پہلے ہم خط دے کر رابعہ کو لانے میں کامیاب ہو گئے پھر تو کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔ میں رابعہ کو اس کے کمرے میں سلا دوں گا۔ میں ڈاکٹر کو بلا کے بتا دوں گا کہ ابھی رابعہ کو ماں کی موت کا علم نہیں ہونا چاہیے اور بہتر یہی ہے کہ وہ سوتی رہے۔"

"بات آ گئی سمجھ میں۔" محسن نے اچانک کہا۔ "رابعہ اپنے کمرے میں سوتی رہے گی۔ ہم کسی کو اس کے کمرے میں نہیں جانے دیں گے کہ ڈاکٹر نے سختی سے منع کیا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ رابعہ پر صدمے کا شدید اثر ہے۔"

میں کچھ دیر محسن کی بات سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ "لیکن رشتے دار خواتین، پاس پڑوس کی عورتیں یا خادمہ اگر کمرے میں جا کے صرف ایک نظر دیکھنے پر مصر ہوئیں تو کیا ہوگا؟"

"ایک جھوٹ کو نبھانے کے لیے دوسرے جھوٹ کا سہارا تو لینا ہی پڑتا ہے۔" محسن نے کہا۔ "اور جھوٹ تو جھوٹ ہی ہے۔ کیا بڑا کیا چھوٹا۔ ہم کمرے کا دروازہ کھول کے بھی دکھا سکتے ہیں۔ یوں کہ دور سے دیکھنے والوں کو رابعہ واقعی سوتی ہوئی نظر آئے۔"

"رائٹ۔" میں نے چٹکی بجا کے اٹھتے ہوئے کہا۔ "وقت بہت کم ہے۔ ہمیں کام فوراً شروع کر دینا چاہیے۔"

رابعہ کے بیڈ روم کو سیٹ کر دینے کے بعد میں نے کسی فلم کے ہدایت کار کی طرح سوچنا شروع کیا جو غیر حقیقی مناظر کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ دیکھنے والے اسے حقیقت سمجھ کے تسلیم کرتے ہیں جیسے باغ میں پانی دینے والے فوارے سے بارش کا منظر دکھانا۔ رابعہ کے بیڈ پر چادر کے نیچے تکیے اور دوسرے کپڑے رکھ کے یہ تاثر دینا بہت آسان تھا کہ یہ رابعہ ہے جو چادر اوڑھے لیٹی ہے۔ ہم یہ بھی دکھا سکتے تھے کہ وہ چادر میں منہ سر لپیٹے سو رہی ہے مگر میں نے زیادہ حقیقی تاثر دینے کا انتظام کیا۔ رابعہ کی وارڈروب میں سے میں نے ایک وگ نکالی۔ اس میں مصنوعی بالوں کے بنے بنائے جوڑے بھی رکھے تھے جو رابعہ نے میرے سامنے تو کبھی استعمال نہیں کیے تھے۔ شاید یہ اس دور کی یادگار تھے جب اس کی شادی ہوئی تھی۔ صرف شادی جسے خانہ آبادی ہرگز نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ہر سہاگن کی طرح وہ سولہ سنگھار کرتی ہوگی۔ بالوں کی آرائش کے انداز بدلتی ہوگی اور خود کو آئینے میں دیکھ کے اپنے حسن کی قوتِ تسخیر پر غرور کرتی ہوگی اور اپنے خیالوں، خوابوں اور تصورات کا عکس دیکھ کے شرم و حیا سے اس کا چہرہ گلنار ہو جاتا ہوگا۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!
سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں

میں نے ایک سرد آہ بھر کے لمبے سیاہ چمکیلے بالوں کی وگ کو پھیلایا۔ کچھ تکیے پر کچھ چادر کے اوپر۔ وگ کے نیچے ایک جوڑا رکھا اور چادر کا کونا تھوڑا سا آگے کھسکا دیا۔ پھر میں نے دروازے کے قریب جا کے دیکھا۔ محسن نے تائید میں سر ہلایا۔ تاثر مکمل تھا۔ دن میں سارے پردے برابر ہوں گے اور ٹیبل لیمپ بھی آف ہوگا تو کمرے کا دروازہ کھول کے اندر آنے والے کو بھی یہی نظر آئے گا کہ رابعہ کروٹ لیے اور منہ دیوار کی طرف کیے سو رہی ہے۔ کیا کہا تھا امیر خسرو نے۔ "گوری سوئے سیج پر مکھ پر ڈالے کیس۔ چل خسرو گھر آپنے سانجھ بھئی چہو دیس۔"

رابعہ اٹھ بیٹھی۔ یہ سب نظر کا دھوکا ہے۔ ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے۔ رابعہ نہیں ہے۔ یہ سب دامِ خیال ہے اور میں نے کہا۔ عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے۔

محسن نے میرا کندھا پکڑ کے ہلایا۔ "کس سوچ میں پڑ گیا ہے سکندر! وقت نہیں ہے ہمارے پاس۔"

میں چونکا۔ "ہاں۔" میں نے کہا۔ "ہاں۔ ہم سب کے پاس وقت نہیں ہے۔ نہ جینے کا نہ مرنے کا۔"

محسن نے فائنل ٹچ یہ دیے تھے کہ رابعہ کی ایک ساڑی اور بلاؤز بیڈ کے قریب کرسی پر یوں ڈال دیے تھے جیسے سونے سے پہلے رابعہ نے اسی لباس کو بدلا تھا۔ بیڈ کی دوسری جانب ساڑھی سے میچ کرتے ہوئے سینڈل رکھ دیے تھے جو دروازے میں سے داخل ہونے والے کو سامنے نظر آ جائیں۔ بیڈ کے سرہانے ٹیبل لیمپ کے ساتھ ہی ایک ہینڈ بیگ رکھا تھا اور کلائی کی ایک گھڑی رکھی تھی۔ یہ سب کچھ محسن نے وارڈروب میں سے نکالا تھا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کے باہر کھینچ لیا۔

"میرا خیال ہے بلکہ یقین ہے کہ یہ ڈرامہ چل جائے گا۔" محسن نے کہا۔ "اس وقت رات کا ایک بجا ہے۔ اگر انہوں نے چھ گھنٹے کے اندر اندر رابعہ کو واپس کر دیا تو ہم خیالی رابعہ کی جگہ حقیقی رابعہ کو سُلا دیں گے۔ باقی انتظامات اپنے ہی ہیں گے یعنی ہم رابعہ سے کسی کو ملنے کی اجازت نہیں دیں گے اور رابعہ کو بھی معلوم نہیں ہونے دیں گے کہ اس کی ماں مر چکی ہے۔"

"وہ بیٹی کو رخصت کرنے کے لیے زندہ تھی۔" میں نے کہا۔ میرا موڈ سخت قنوطی ہو رہا تھا۔ "اور اب بیٹی زندہ ہے، ماں رخصت ہو رہی ہے۔"

"یہ تقدیر کے کھیل ہیں سکندر!" محسن نے کہا۔ "خدا جانتا ہے کہ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں اور کر رہے ہیں، خلوص، نیک نیتی اور راستی کے ساتھ کر رہے ہیں۔"

"رابعہ مجھے معاف کر دے گی محسن؟" میں نے کسی بچے کی طرح سوال کیا جس سے نادانستگی میں کوئی سنگین جرم سرزد ہو گیا ہو۔

"نہیں۔" محسن بولا۔ "معاف تو اسے کیا جاتا ہے جس پر کوئی الزام ہو۔ کیا تو نے ابھی تک اس حقیقت کو تسلیم نہیں کیا کہ وہ تجھ سے محبت کرتی ہے اور وہ تیری خاطر دنیا کو الزام تو دے سکتی ہے مگر ساری دنیا کے کہنے سے بھی تجھے موردِ الزام نہیں سمجھ سکتی۔"

میں ڈرائنگ روم کی طرف جاتے جاتے پلٹ گیا اور ہال کے کمرے کی طرف چلنے لگا جہاں اس کا جسدِ خاکی اپنے اور رابعہ کے اور سارے جہاں کے اندیشوں سے بے نیاز، انتظارِ سفر میں تھا۔ میں نے محسن کی آواز سنی جس نے کہا تھا کہ وہ کچن سے کافی بنا کے لا رہا ہے اور میں ٹیلیفون کا خیال رکھوں۔ پُر آسیب ماحول کی کشیدگی نے مجھے ذہنی جسمانی طور پر بُری طرح تھکا دیا تھا۔ میں ایک کرسی پر گر پڑا اور اپنے پیر دراز کر کے دوسری کرسی پر رکھ دیے۔ سر سے پیر تک سفید چادر میں چھپی ہوئی لاش میرے بائیں ہاتھ پر تھی اور ٹیلی فون دائیں جانب اسٹینڈ پر رکھا تھا۔ دونوں کی خاموشی کا انداز ایک جیسا اعصاب شکن تھا۔ کمرے کا سناٹا اتنا بوجھل تھا اور میں اپنے خیالات میں اتنا ڈوبا ہوا تھا کہ گھنٹی بجی تو میں اچھل پڑا۔ رابعہ کا تصور ایک آرزو میں ڈھل گیا اور میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ ریسیور اٹھایا۔ "ہیلو۔" میں نے کہا اور اس وقت مجھے اپنی آواز بھی اجنبی لگی۔

"دیکھیے، مجھے سکندر بخت سے بات کرنی ہے۔" ایک عورت نے کہا۔ "کیا وہ یہاں ہیں؟"

میں نے ریسیور کو ہٹا کے غور سے دیکھا حالانکہ اس میں ریسیور کا کوئی قصور نہیں تھا۔ "میں... میں بول رہا ہوں۔"

"سکندر! میں نے پہلے ضامن رضوی صاحب کو فون کیا تھا۔ انہوں نے کہا وہ تو غائب ہے۔ رات کے کھانے کا وعدہ کر کے گیا تھا مگر آیا نہیں۔ پھر انہوں نے یہ فون نمبر دیا۔"

"اس وقت ایسی کون سی ضروری بات کرنی تھی آپ کو۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "آدھی رات کو...؟"

"وہ بات ایسی ہی تھی سکندر کہ میں تیرے انکل کے سامنے کرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اس وقت سوئے ہوئے ہیں۔ مجھے... مجھے محسن سے معلوم ہوا تھا کہ... کہ تو... تجھے فوزیہ کا رشتہ منظور نہیں۔" شیروانی صاحب کی بیگم نے کہنا شروع کیا۔ بظاہر ان کے لہجے سے بہت دکھ کا احساس ہوتا تھا مگر میں جانتا تھا کہ یہ دکھ جھوٹا ہے۔ "میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آیا اگر تیرے انکل کو معلوم ہو جاتا تو بہت بُرا ہوتا۔ وہ بلڈ پریشر کے مریض ہو گئے ہیں۔" میں نے محسن سے کہا ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟

میں بہت کچھ کہہ سکتا تھا۔ میرا ذہنی توازن برقرار نہیں تھا۔ میں دل زدہ اور پشیمان رابعہ کی ماں کے بے جان جسم کے سامنے مجرم بنا بیٹھا تھا اور سوچ رہا تھا کہ نہ جانے اس وقت رابعہ پر کیا بیت رہی ہوگی، وہ کہاں اور کس حال میں ہوگی۔ میرے لیے یہ خیال ہی محال بلکہ ناممکن تھا کہ ایسے وقت میں ہزار میل کے فاصلے سے ایک آواز میرے دل کے ان زخموں میں انگارے بھرنے آ جائے گی جن کی کسک کو بدلتے ہوئے حالات اور وقت نے دبا رکھا تھا۔ مجھے ایک جنازہ اٹھانے سے پہلے اپنی ازدواجی زندگی کے مستقبل کا فیصلہ کرنا ہوگا اور اس محبت کو دفن کرنا ہوگا جسے میں نے خود اپنے ہاتھوں موت کی نیند سُلا دیا تھا۔

"بولو سکندر! کیا یہ سچ ہے؟" فوزیہ کا چہرہ ویرانیٔ شب میں سولھویں رات کے چاند کی طرح ابھرا۔ افسردہ اور مضمحل اجالے سے ہولے ہولے دمکتا ہوا۔ پھر اس کی جگہ رابعہ کی صورت نے لے لی۔ "بولو سکندر! کیا یہ سچ نہیں ہے۔ تم مجھے ہی چاہتے ہو نا؟"

"نہیں سکندر! تم مجھ سے محبت کرتے تھے۔ تم مجھ سے محبت کرتے ہو اور کرتے رہو گے۔" فوزیہ نے بضد ہو کے کہا۔

"سکندر! کہہ دو اس لڑکی سے کہ یہ صرف اس کا خیال تھا۔" رابعہ نے پُرخون آلودہ تارِ پیراہن کو لہرا کے کہا۔

"یہ جھوٹ ہے۔ سکندر اور میں بچپن سے ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔" فوزیہ کا چہرہ اب بھی پُر اعتماد تھا۔

"سچ یہ بھی ہے کہ میں نے تم سے پہلے سکندر کو چاہا۔"

رابعہ نے اس کی دلیل مسترد کر دی۔

"بولتے کیوں نہیں لڑکے! کون ہے یہ رابعہ؟" فوزیہ کی ماں نے کہا۔ "کیا تو واقعی اس سے محبت کرنے لگا ہے؟"

"جی۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "میں واقعی اس سے محبت کرنے لگا ہوں۔"

"کوئی بات نہیں۔ میں سب سنبھال لوں گی۔ میں کہہ دوں گی، میں اپنی بیٹی کی شادی سکندر سے نہیں کروں گی...۔"

میں نے ریسیور رکھ دیا۔ کہنے سننے کو اب کچھ نہیں رہا تھا۔ میرے دل پر رکھا ہوا سنگِ گراں ایک کوہِ گراں میں ڈھل گیا۔ مجھے احساس تھا کہ میں نے ایک معصوم سیرت، محبت کی تقدیس پر ایمان رکھنے والی اور اعتماد کے رشتوں کا دامن تھام کے اپنے خوابوں کے ہفت رنگ آسمان پر اڑنے والی لڑکی سے اس کا سب کچھ چھین لیا ہے۔ اس کے خوابوں کا شیش محل چکنا چور کر دیا ہے جس میں وہ خود کو سارے زمانے کی دسترس سے دور، میری محبت کے سایۂ تحفظ میں، تمام اندیشوں سے بے نیاز سمجھے بیٹھی تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے صرف اس ظلم کا احساس تھا جو فوزیہ پر ہوا۔ مجھے یہ احساس نہیں تھا کہ میں نے جھوٹ بولا۔ جھوٹ کیا ہے؟ سچ کیا ہے؟ وقت اور حالات کے بدلتے ہوئے پیمانے۔ پھر کیا ازلی و ابدی سچائی کچھ نہیں، کہیں نہیں۔ اس ایک رات میں سچ اور جھوٹ کا مفہوم کتنی بار بدلا تھا۔ ہر جھوٹ، سچ تھا۔ سچائی کو کس نے پہچانا ہے۔ گوتم بدھ نے؟ سقراط نے؟ ولیوں اور پیغمبروں نے؟ میں نے محسوس کیا کہ خیالات کا انتشار مجھے پاگل کر دے گا۔

"کس کا فون تھا؟" محسن نے کافی کے دو مگ لے کر اندر آتے ہوئے کہا۔

"رانگ نمبر۔" میں نے ہپناٹزم کے زیرِ اثر بولنے والے کی طرح کہا۔ "رانگ کال، رانگ پرسن۔ ایٹ رانگ ٹائم۔"

"پھر تو کیا باتیں کر رہا تھا اتنی دیر تک؟" محسن نے حیران ہو کے کہا۔

"کچھ نہیں، دامن چھڑا رہا تھا۔" میں نے کہا اور کافی کا مگ لے لیا۔ کن ارادوں کو کامیاب کہوں، کس حقیقت کو سراب کہوں؟ خونِ فرہاد برسرِ فرہاد۔ ہر تمنا کو بے ثواب کہوں؟ کہنے کو اب کچھ بھی نہیں رہا۔

ایک بار پھر ٹیلیفون پکارنے لگا۔ میں نے اس کمینے، بدصورت آلے کو دیکھا جس نے فاصلوں کو بیکراں کر دیا تھا۔ مجبوریوں اور دوریوں کو لازوال کر دیا تھا۔ جو محبتوں کا قاتل تھا اور دلوں میں نفرتوں کا زہر گھولتا تھا۔ جو نحوست کی زبان تھا اور اجل کی آواز تھا۔ جس نے مقدس رشتوں کو قتل کیا تھا، اور خواب سے خوبصورت جذبوں کو بے رحم حقائق کی لحد میں اتار دیا تھا۔ مگر یہ سب میری اپنی ذہنی کیفیت کا عکس تھا۔ کیا اسی ٹیلی فون پر لوگ اظہارِ محبت نہیں کرتے اور دائمی رفاقتوں کے عہد و پیماں نہیں کرتے؟ خوشیوں کے سندیسے نہیں دیتے۔ امید، حوصلہ اور اعتماد عطا کرنے والے الفاظ نہیں سنتے اور دور ہو کے بھی اپنوں کے قریب نہیں رہتے؟ ریسیور محسن نے اٹھایا تھا لیکن مجھے اس کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

"سکندر!" محسن نے مجھے جھنجھوڑ کے کہا۔ "کیا ہو گیا ہے تجھے؟ لے بات کر، وہی حرامزادے ہیں۔"

میں چونکا تو کرسی کے بازو پر رکھا ہوا کافی کا مگ نیچے گرا اور ٹوٹ گیا۔ "ہیلو۔" میں نے میکانکی انداز میں کہا۔

"دیکھو سکندر بخت!" ایک مرد کی بھاری بھرکم آواز میرے کانوں میں پہنچی۔ "میں نے پہلے بھی فون کیا تھا۔"

"مجھے معلوم ہے۔" میں نے کہا۔ "مطلب کی بات کرو۔"

"مطلب کی بات کرنے سے پہلے تعزیت کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے رابعہ کی ماں کی موت کا افسوس ہے۔"

"اچھا؟" میں نے کہا۔ "وہ کیوں؟ تم تو رابعہ کو بھی موت کے گھاٹ اتارنا چاہتے ہو۔"

"نہیں، ہم یہ بالکل نہیں چاہتے۔" وہ بولا۔ "اگر ہم ایسا چاہتے تو تمہیں رابعہ کی جگہ اس کی لاش ملتی اور ہم نہ ملتے۔ ہم ایک آخری موقع دینا چاہتے ہیں۔ ہم سے سودا کر لو۔ صبح ہونے میں ابھی دیر ہے۔ اگر وہ خط ہم تک پہنچ جاتے تو رابعہ اپنی ماں کا آخری دیدار کرنے کے لیے پہنچ جائے گی۔"

"خط میرے پاس ہے۔" میں نے کہا۔ "رابعہ کہاں ہے؟"

"رابعہ ہمارے پاس ہے۔" وہ بولا۔ "تم خط لے کر آ جاؤ اور اسے لے جاؤ۔ لیکن اپنے اس بے وقوف دوست سے کہو کہ بلاوجہ ٹانگ اڑا کے تمہارے اور رابعہ کے لیے مشکلات پیدا نہ کرے۔ ہمارا اس سے کوئی جھگڑا نہیں۔ وہ خودکشی پر کیوں کمربستہ ہے؟"

"وہ مداخلت نہیں کرے گا۔" میں نے کہا۔ "یہ میرا وعدہ ہے اور یہ وعدہ میں رابعہ کی ماں کی لاش کے سامنے بیٹھ کے کر رہا ہوں۔ اگر تم میں ذرا سی بھی شرافت اور انسانیت ہے تو...۔"

"سکندر بخت! ڈائیلاگ مت بولو۔" اس نے بیزاری سے کہا۔ "یہ عقل کا سودا ہے، جذبات کا نہیں۔ خط تمہیں مل گیا ہے تو دیر مت کرو۔ اکیلے، خالی ہاتھ اور پیدل روانہ ہو جاؤ، کسی کو کچھ بتائے بغیر۔ راستہ وہی ہوگا۔ ہم تمہیں پک کریں گے۔"

"اس بات کی کیا ضمانت ہے...؟"

"ضمانت کسی بات کی نہیں دی جا سکتی۔ جیسے خیرات اپنی مرضی سے نہیں ملتی۔" اس نے کہا اور فون بند ہو گیا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں رابعہ کو لینے جا رہا ہوں محسن۔" میں نے جیب سے پیڈ، ریوالور نکال کے اس کے حوالے کیا۔ "میرے پیچھے مت آنا۔" پھر میں باہر نکل آیا۔ سڑک سنسان تھی اور دور دور تک میرے سوا کوئی راہ گیر نہ تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں ذرا بھی نروس نہیں ہوں اور بالکل خوف زدہ نہیں ہوں۔ مجھے کسی خطرے کے وجود کا احساس نہیں، اور یہ فکر نہیں کہ میرے بڑھتے ہوئے قدم مجھے کس منزل پر پہنچائیں گے۔ جال پھیلانے والے بہت ہوشیار شکاری تھے۔ اور انہیں اپنی ذہانت اور طاقت پر ناز تھا تو بجا تھا۔ میں جانتے بوجھتے شکار ہونے کے لیے جا رہا تھا اور ان کے پھیلائے ہوئے جال میں گرفتار ہونے کے خیال سے قطعی پریشان نہیں تھا۔ اس اطمینان کی وجہ بھی مجھے معلوم تھی۔ اگر دشمنوں نے خط لینے کے بعد مجھے اور رابعہ کو قتل کر کے نہر میں پھینک دیا تو نہ ہم ہوں گے نہ غم ہو گا۔ ہمارے ساتھ دنیا جو چاہے کرے اور ہمارے بغیر جو چاہے کرے۔ بصورتِ دیگر انہوں نے وہ منحوس خط لے کر رابعہ کو واقعی آزاد کر دیا تو یہ میری کامیابی ہو گی، ناکامی نہیں۔

میں کراؤن سینما کے سامنے سے گزرا اور دائیں طرف گھوم کے سڑک کے کنارے کنارے چلتا گیا۔ ایک سگریٹ سے دوسری سگریٹ جلاتا گیا، اور دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے خیالات میں کھویا ہوا قدم بڑھاتا گیا۔ ریلوے کراسنگ کے بعد نہر آ گئی۔ اس کا خاموش گدلا پانی آہستہ آہستہ دونوں کناروں کی قید میں سفر کر رہا تھا۔ اس میں لہو کی سرخی تھی جسے صرف میری نگاہ دیکھ سکتی تھی۔ ایک رات اس کے دوسرے کنارے پر رابعہ مجھے لینے آئی تھی، اور اس وقت میں لہولہان تھا۔ اب میں رابعہ کو لینے آیا تھا اور میرے تصور میں اس کا وہی لہو سے لالہ زار بدن تھا جسے میں نے ایک تہہ خانے کے اندھیرے میں فرشِ خاک پر سے اٹھایا تھا۔ وقت کی بساط الٹ گئی تھی۔

میرے سامنے دور سے ایک کار کی ہیڈ لائٹس نمودار ہوئیں۔ روشنی تیزی سے میری طرف آئی۔ میں رک کر انتظار کرنے لگا مگر کار سیدھی نکل گئی۔ میں کچھ دیر اندھیرے کو گھورتا رہا اور پھر چل پڑا۔ دوسری بار ایک اور کار کی روشنی میرے پیچھے جھلملائی۔ میں نے گھوم کر ایک نظر دیکھا لیکن میرے قدم نہیں رکے۔ یہ کار بھی میرے پاس سے گولی کی طرح گزر گئی۔ جب پچاس گز دور جا کے کار نے زبردست بریک لگائے تو مجھے یقین آیا کہ یہ وہی کار ہے جو پہلی بار سامنے سے آئی تھی۔ کار کی پیچھے والی سفید لائٹس روشن ہوئیں اور کار تیزی سے ریورس گیئر میں میری طرف آئی۔ چند سیکنڈ بعد کار کے رکتے ہی اس کا پچھلا دروازہ کھلا۔ ایک شخص نے نیچے اتر کے دروازہ تھام لیا۔ وہ شخص کا پتلا لگتا تھا۔ اس نے چست پتلون اور بنیان کے ساتھ جوتے پہن رکھے تھے اور اس کے منہ پر سیاہ نقاب تھی۔ میں بلا تامل بیٹھ گیا۔ سیٹ پر ویسا ہی دوسرا سیاہ پوش لگا بیٹھا تھا۔

دروازہ کھولنے سے کار کے اندر کوئی لائٹ نہیں جلی تھی۔ غالباً اس کی سیلنگ لائٹ کا کنکشن نکال دیا گیا تھا۔ سیاہ پوش کے بیٹھتے ہی کار روانہ ہو گئی۔ مجھے کار کی اگلی سیٹ پر بھی بالکل انہی جیسے کالی مٹی کے مجسمے رکھے دکھائی دیے۔ سب کے مسلح ہونے کے بارے میں مجھے قطعی کوئی شبہ نہ تھا۔

"خط لائے ہو؟" میرے دائیں ہاتھ پر بیٹھے ہوئے سیاہ پوش نے کہا۔

"ہاں۔" میں نے کہا اور جیب کے اندر ہاتھ ڈالا۔ بائیں طرف بیٹھے ہوئے سیاہ پوش نے ایک تیز دھار والا لمبا سا خنجر میری پسلیوں کے درمیان دل کے مقام پر رکھ دیا۔ اس کے ہاتھ کا ذرا سا دباؤ خنجر کو میرے دل میں پیوست کر سکتا تھا۔ لفافہ اس شخص کو دے دیا گیا جو آگے ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ اس نے کھولے بغیر لفافے کو ڈیش بورڈ کے اوپر رکھ دیا۔ کار تیز رفتاری سے سڑک پر دوڑتی رہی۔

"تم دیکھو گے نہیں کہ یہ وہی لفافہ اور خط ہے..." میں نے کہا۔

"دیکھیں گے۔" اس شخص نے میری بات کاٹ دی۔ "تمہاری موجودگی میں دیکھیں گے۔ مگر یہاں کیا دکھائی نظر آئے گا یہاں؟"

وہ جانتے تھے کہ لفافے میں سادے کاغذ ہیں اور ان پر لکھی ہوئی تحریر نظر نہیں آتی۔

دائیں جانب بیٹھے ہوئے سیاہ پوش نے نیچے ہاتھ ڈالا اور ایک سیاہ کپڑا نکالا۔ "ہم نہیں چاہتے کہ تم راستہ نوٹ کرو۔ یہ نقاب ڈالو گے چہرے پر اپنی مرضی سے یا ہم زبردستی آنکھوں پر پٹی باندھ دیں؟"

"تم کو پٹی باندھنے کی اجازت ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے اس وقت راستہ نوٹ کرنے سے قطعی دلچسپی نہیں۔ ضرورت ہو گی تو میں پٹی باندھ کے یہ راستہ تلاش کر لوں گا۔ شکار کی رہنمائی اس کی چھٹی حس کرتی ہے۔ اور شکار خود اپنا سراغ بن جاتا ہے۔" دنیا میری نظر سے اوجھل ہو گئی۔ صرف حرکت کا احساس باقی رہ گیا۔ ان دونوں میں سے ایک نے جو میرے ساتھ بیٹھے تھے، وہی کپڑا میری آنکھوں پر باندھ دیا۔ میں نے کار کو بائیں طرف موڑ کاٹتے محسوس کیا اور اندازہ لگایا کہ اس مرتبہ وہ شالیمار کی طرف نہیں بلکہ باغبانپورے کی طرف جا رہے ہیں۔ اس کے بعد کار نے اتنے موڑ کاٹے اور اس کی رفتار میں اتنی مرتبہ کمی بیشی ہوئی کہ میرے تمام اندازے خلط ملط ہو گئے۔ تین بار مجھے ایسا لگا جیسے کار مسلسل دائیں طرف گھومی ہے اور کسی ایک مقام سے دوبارہ گزری ہے۔ دس منٹ بعد کار ایسے ہی تین مرتبہ بائیں جانب مڑی۔ وہ باغبانپورے کی خالی گلیوں میں سے گزر رہے تھے اور غیر ضروری پر پیچ راستہ اختیار کر رہے تھے تاکہ میں وقت یا رفتار سے فاصلے کا اندازہ نہ کر سکوں اور یادداشت کی مدد سے موڑ کاٹتا ہوا اس کے قرب و جوار میں بھی نہ پہنچ سکوں، جہاں وہ مجھے لے جا رہے تھے۔ اس کے باوجود میں سمت کا تعین کرنے اور کسی حد تک فاصلے کا حساب رکھنے کی کوشش میں مصروف رہا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ہم گھوڑے والے پیر کے مزار سے آگے نکل آئے ہیں۔ گھوڑے والے پیر کا مزار انسان کی لامحدود خواہشات اور بے حساب تمناؤں کا مظہر ہے۔ وہ سب جو اپنی کوششوں سے بامراد نہ ہوتے اور دعاؤں کے مستجاب نہ ہونے کے اندیشے میں مبتلا ہوتے، اس مزار پر ایک گھوڑا لے کر حاضر ہوتے۔ ہر گھوڑا ایک منت کا مادی پیکر تھا۔ یہ زندہ گھوڑے نہیں، دو ڈھائی انچ کے ننھے منے کھلونے تھے۔ مٹی سے لے کر سونے چاندی تک ہر چیز کے بنے ہوئے۔ سونے چاندی کے گھوڑے میں نے دیکھے نہیں تھے۔ شاید مجاور ان کو اپنی تحویل رکھتے ہوں گے۔ مٹی کے لاکھوں گھوڑے مزار کی دیوار کی ہر منڈیر پر، ہر گوشے، ہر کنارے، ہر محراب اور ہر دروازے پر، سایہ دار دیوار میں اور فرش پر ڈھیر نظر آتے تھے۔ انگلی کے برابر چار پیروں اور ایک گردن نما حصے پر مشتمل جسے علامتی طور پر گھوڑا فرض کر لیا جاتا تھا ورنہ وہ چوپایا کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ ان میں سے کتنے من کی مراد پا کے شادکام ہوئے اور وہ کون سا گھوڑا تھا جس کی نذر قبول ہوئی۔

کار یکلخت رک گئی۔ میری آنکھوں پر سے پٹی ہٹاتے ہی دونوں سیاہ پوش بڑی پھرتی سے نکل کے باہر کھڑے ہو گئے۔ اگر میں چاہتا تو ان کو سنبھلنے کا موقع دیے بغیر چت کر دیتا جب وہ سر جھکا کے دروازے سے اتر رہے تھے تو دونوں ہاتھ کے ایک ایک وار سے ان کی گردنیں بھی توڑی جا سکتی تھیں اور ایک بار ان کا ریوالور ہاتھ میں آ جاتا تو آگے بیٹھے ہوئے دونوں سیاہ پوش کچھ نہ کر پاتے کیونکہ ان کو اترنے میں وقت لگتا تھا مگر اس سب کا نتیجہ رابعہ کے حق میں برا نکلتا۔ میں ایک عہد کر چکا تھا اور تاوقتیکہ دشمن بد عہدی کا مرتکب نہ ہو میں وعدہ خلافی کا گنہگار ہونا نہیں چاہتا تھا کیونکہ یہ وعدہ میں نے فولاد جیسے کسی بدمعاش کو نہیں، بلکہ رابعہ کی ماں کے بے جان جسم کو گواہ بنا کے کیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ رابعہ جلد از جلد اپنے گھر پہنچ جائے تاکہ اس کی عدم موجودگی سے شکوک و شبہات پیدا ہونے کی نوبت نہ آئے۔ میرے ارد گرد رات کی تاریکی میں کسی احاطے کی دیوار پھیلی ہوئی تھی۔ احاطے میں مختلف قسم کے وزن اٹھانے والے ٹرک، فورک لفٹ ٹرک، ڈمپ ٹرک، کرین اور کنکریٹ مکسر کھڑے تھے جو اندھیرے میں سائنس فکشن فلموں کی عجیب و غریب اعضا والی مخلوق دکھائی دیتے تھے۔ ایک دیوار کے ساتھ خالی ڈرم، ناکارہ ٹائر اور تعمیراتی ساز و سامان کا ڈھیر تھا۔ یہ کسی کنسٹرکشن کمپنی کا یارڈ تھا جو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میرا جغرافیائی اندازہ غلط ہو گیا تھا اور چار دیواری کے باعث گرد و پیش کو دیکھ کر بھی کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ میں کہاں ہوں۔ کار کو میں نے اترتے ہی دیکھ لیا تھا۔ یہ ڈی سلوا کی نیلی ٹویوٹا کراؤن یا دلاور کی گاڑی نہیں تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ یہ جگہ بھی ان کی نہیں۔

"یہاں بھی کوئی چوکیدار تو ہو گا؟" میں نے طنز سے کہا۔ "تمہارے آنے سے پہلے۔"

"اب بھی ہے۔" کار چلانے والے سیاہ پوش نے کہا۔ "یہ چوکیدار زیادہ سمجھدار ثابت ہوا اور ہم سے تعاون کرنے پر تیار ہو گیا۔ جاتے وقت ہم اسے معقول انعام دے کر جائیں گے۔ بفرضِ محال تم دوبارہ یہاں آئے تو چوکیدار آج کی رات کے تمام واقعات سے قطعی لاعلمی کا اظہار کرے گا۔"

وہ اس بیرک کی طرف چلنے لگے جو تقریباً احاطے کے وسط میں بنی ہوئی تھی۔ اٹھارہ فٹ لمبی اور نو دس فٹ چوڑی جس کے دو حصے تھے اور اس پر ٹین کی عارضی چھت ڈال دی گئی تھی۔ دو بند کھڑکیاں شاید دو کمروں کی تھیں اور ان میں سے ایک کے شیشے روشن تھے۔ دروازہ بجانے پر کسی نے اندر سے سوال کیا۔ "کون ہے؟" اور اسے جواب ملا۔ "تمہارے باپ۔" دروازہ کھل گیا اور میں نے دیکھا کہ اندر ایک چارپائی پر بستر لگا ہوا تھا۔ ایک دیوار کے ساتھ میز تھی جس پر سے تمام سامانِ ضرورت ہٹا دیا گیا تھا۔ یہ سب سامان اب میز کے نیچے فرش پر پڑا تھا۔ کھانے پکانے کے چند برتنوں اور مٹی کے تیل سے جلنے والے

ایک چولے کے ساتھ۔ کمرے میں اس شخص کے سوا کوئی نہیں تھا۔ جس نے دروازہ کھولا تھا اور وہ بھی ویسا ہی سیاہ لباس پہنے ہوئے تھا جیسا مجھے ساتھ لانے والے چار افراد نے پہن رکھا تھا۔ اس میں ان کی آنکھوں کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ میں نے رابعہ کی تلاش میں اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں اور اس بند مقفل دروازے کو دیکھا جو دوسرے کمرے میں کھلتا تھا۔

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" ایک سیاہ پوش نے کہا۔ اب یہ تخصیص بھی نہ رہی تھی کہ ان میں سے کون میرے ساتھ بیٹھا تھا اور کون کار کی اگلی سیٹوں پر تھا۔ وہ سب قد و قامت میں بھی برابر تھے اور مجھے شک یہ تھا کہ سب کو آواز بدل کے بات کرنے کی ہدایت تھی چنانچہ ان کی شناخت محال تھی۔ "جب ثابت ہو جائے گا کہ خط وہی ہے جو تمہیں منشی نے بھیجا تھا تو رابعہ بھی آجائے گی۔"

"یہ کیسے ہوگا؟" میں نے کہا۔ "اور کتنی دیر میں ثابت ہوگا؟"

"آنجہانی منشی نے ویسے تو زندگی میں بہت سی غلطیاں کی ہوں گی۔" ایک سیاہ پوش نے لفافے میں سے کاغذات کا پلندا نکالا۔ "مگر مرتے وقت جس غلطی کا ان کو بہت ملال تھا، وہ یہی تھی کہ انہوں نے پرانے نسخے آزما کر ایک تحریر تو لکھ دی جسے کوئی نہ دیکھ سکتا تھا اور نہ پڑھ سکتا تھا مگر وہ پڑھنے کی ترکیب استعمال ارسال کرنا بھول گئے۔ وفات سے قبل انہوں نے علاوہ دیگر باتوں کے اس بات کا اعتراف بھی کیا تھا کہ زندگی نے وفا نہ کی ورنہ وہ دوسرا خط بھی پوسٹ کر دیتے جس میں خفیہ تحریر کو پڑھنے کی ہدایات ہوتیں اور تمہیں فون پر مطلع کر دیتے کہ خط آرہا ہے۔ مگر اس میں خود کو الزام دینا تو غلط ہے کہ یہ سب باتیں انہوں نے ہمیں بتائیں اور مر گئے۔ یہ سب تو نوشتۂ تقدیر تھا اور ایسے ہی ہونا تھا۔ اب تم دیکھو، ہم منشی کے آخری الفاظ پر عمل کر کے تمہارے سامنے جادو کا کیا کھیل دکھاتے ہیں۔"

اس نے خط کے صفحات دوسرے سیاہ پوش کی طرف بڑھا دیئے۔ اس نے ایک بیگ کھولا جسے میں نے ابھی تک نہیں دیکھا تھا۔ یہ ڈاکٹروں کے استعمال میں آنے والا سیاہ چمڑے کا ڈبے جیسا بیگ تھا۔ اس نے بیگ میں سے ایک اسپرٹ لیمپ نکالا اور میز پر رکھ کے روشن کر دیا۔ پھر اس نے ایک شیشی نکالی جس میں کوئی بے رنگ محلول تھا۔ محلول کو اس نے ایک فرائی پان میں انڈیل دیا، جو چوکیدار کے ساز و سامان میں شامل تھا لیکن اس مقصد کے لیے خاص طور پر صاف کیا گیا تھا۔ چند منٹ میں محلول اُبلنے لگا اور کمرے میں عجیب سی ناگوار بُو پھیل گئی۔ سائنسی تجربہ کرنے والے نے بیگ میں سے صاف روئی اور ایک چمٹی نکالی۔ چمٹی کی مدد سے روئی کو محلول میں ڈبو کر اس نے کاغذات کا پلندا لیٹ کر پھیر رکھا اور پہلے صفحے پر بڑی احتیاط سے روئی پھیرنے لگا۔ اس سے کاغذ گیلا نہیں ہوا۔ وہ کیمیائی محلول بہت تیزی سے اُڑ کر خشک ہوتا جا رہا تھا۔ کاغذ پر ابھی تک کسی تحریر کے نقوش نمایاں نہیں ہوئے تھے لیکن وہ سب صبر و سکون اور خاصی دلچسپی کے ساتھ یہ کارروائی دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے دو میرے دائیں بائیں پستول لیے بھی کھڑے تھے اور ان کو یقیناً حکم ہوگا کہ گڑبڑ کی صورت میں بلا تامل مجھے شوٹ کر دیں۔ درمیان میں ایسے متعدد وقفے آئے جب میں نے نوٹ کیا کہ ان کی توجہ مجھ پر نہیں ہے مگر میں نے فائدہ اٹھانے کی کوشش ہی نہیں کی۔ اگر مجھے رابعہ کے دوسرے کمرے میں بحفاظت موجود ہونے کا یقین ہوتا تو میں زندگی کی بازی لگا کر یہ جوا ضرور کھیلتا اور شاید جیت بھی جاتا۔ اس کے لیے تو میں اب بھی تیار تھا کہ خدانخواستہ میں نے کسی کی نیت میں فتور دیکھا تو مرنے سے پہلے ایک ایک سے نمٹنے کی کوشش ضرور کروں گا۔

یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ کمرے میں کل پانچ آدمی تھے۔ دو تو مسلح محافظ میرے ہاتھوں اور پیروں کی ایک جنبش میں لپیٹ جاتے۔ باقی کو اپنا اسلحہ نکالنے میں کچھ وقت لگتا اور اس بات کے امکانات ففٹی ففٹی تھے کہ میں ان کی گولی کا نشانہ بن جاتا یا وہ اس سے پہلے ہی میرا شکار ہو جاتے۔ مجھے گولی لگنے کی صورت میں بھی صرف زخمی ہونے کے امکانات پچاس فیصد تھے چنانچہ یہ خطرہ مول لیا جا سکتا تھا۔ لیکن رابعہ نہ جانے کہاں تھی۔ میری ایک غلط حرکت کا خمیازہ اسے نہ جانے کیا بھگتنا پڑتا اور بات بنتے بنتے ایک بار بگڑ جاتی تو شاید پھر بنائے نہ بنتی۔

سائنسی تجربے میں مصروف سیاہ پوش نے احتیاط سے اسپرٹ لیمپ کو بجھایا۔ فرائی پان کے باقی محلول کو واپس بوتل میں ڈالا۔ حفظِ ماتقدم کے طور پر فرائی پان کو تھوڑا سا پانی ڈال کے کھنگالا اور پانی کو بھی بوتل میں ڈال دیا۔

"یہ سب بعد میں بھی ہوتا رہے گا۔" اس سیاہ پوش نے غرا کے کہا جس نے کاغذات کا وہ پلندا لیا تھا۔

"یس... یس باس!" سائنسداں سیاہ پوش بولا۔ "احتیاط اچھی چیز ہے۔ بس اب دو منٹ کی بات ہے۔" اس نے فرائی پان کو بھی بیگ میں ٹھونسنا چاہا مگر اس کا ہینڈل اَڑ گیا۔ اس نے ہینڈل کو موڑ کے کام چلایا اور بیگ میں سے ایک اور بوتل نکالی۔ اس کا منہ بند کرنے والا کارک ہٹا کے اس نے تھوڑی سی روئی کو منہ پر رکھا اور بوتل کو الٹا۔ پھر اس نے بھیگی ہوئی روئی کو انہی کاغذوں پر آہستہ آہستہ پھیرنا شروع کیا اور میرے دیکھتے دیکھتے کاغذات پر سطریں نمایاں ہونے لگیں۔ یوں جیسے ہموار زمین کے سینے پر ہل کے چلنے سے لکیریں بنتی جاتی ہیں۔ دس منٹ بعد وہ کاغذات اس شخص کے ہاتھ میں آ گئے جسے باس کہہ کے مخاطب کیا گیا تھا۔ اس نے پلنگ پر بیٹھ کے پہلا صفحہ پڑھنا شروع کیا۔ دُور سے میں سُرخی مائل سبز روشنائی سے لکھے ہوئے باریک حروف کے سوا کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا۔

"اگر تمہارا ارادہ یہ داستانِ امیر حمزہ پڑھ کے فیصلہ کرنے کا ہے..." میں نے کہا۔

باس ہنس پڑا۔ "اتنے بے تاب کیوں ہو۔ میرے لیے بھی اس میں کوئی نئی اور دلچسپی کی بات نہیں۔" اس نے ایک صفحہ الٹ کے چند سطریں پڑھیں۔ پھر دوسرا اور تیسرا صفحہ الٹ کے محض ایک سرسری نگاہ ڈالی۔ "پاگل کا بچہ۔" اس نے زیرِ لب کہا۔ یہ بات اس نے منشی مرحوم کے بارے میں کہی تھی۔ "وقت اور عمر دونوں کو ضائع کیا۔" اس نے جیب سے لائٹر نکالا اور ایک کاغذ کے کونے کو الگ الگ کر کے جلانے لگا۔ کاغذ کے پورا جل جانے تک وہ انتظار کرتا تھا اور پھر راکھ کو جوتے سے مسل دیتا تھا۔

تو یہ تھا انجام۔ اس تمام جدوجہد کا جو منشی مرحوم نے ہمیں ماضی کے رازہائے سربستہ سے آشنا کرنے کی خاطر کی تھی۔ نہ جانے منشی نے کتنا عرصہ ذہنی کشمکش، خلفشار، بے یقینی اور خوف کے عالم میں گزارا ہوگا۔ وہ یقیناً کوئی ایسا شخص تھا جسے اب اس کا ضمیر پریشان کرنے لگا تھا۔ ممکن ہے وہ وزیر خان مرحوم کے نمک خواروں میں شامل نہ ہو اور ان کا دوست بھی نہ ہو۔ وہ کسی لالچ یا مجبوری کے باعث وزیر خان کے خلاف سازش کا جال پھیلانے والوں کا ساتھی رہا ہو مگر ظلم کی انتہا اور وزیر خان کی ناقابلِ رحم موت نے اسے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہو کہ خدا ظالم کی رسی کہاں تک دراز کرے گا اور یومِ حساب سے پہلے دنیا میں ہی یومِ مکافات آ گیا تو اس کا انجام کتنا عبرتناک ہوگا۔ یہ عمر کا تقاضا تھا یا حالات کی تبدیلی جس نے اسے عاقبت کے خوف میں مبتلا کر دیا ہو اور وہ سوچنے لگا ہو کہ کسی طرح اپنے نامۂ اعمال کی سیاہی اور اپنے بارِ گناہ کو کچھ تو کم کر لے۔ اور جب اس نے یہ فیصلہ کیا ہوگا تو اسے یہ خیال بھی ضرور آیا ہوگا کہ یہ نیکی اس کا جرم بن گئی تو افشائے راز کو غداری سمجھنے والے اسے کیا سزا دیں گے اور اس کے باوجود سابقہ غلطیوں کا کفارہ ادا کرنے کا جذبہ غالب رہا ہوگا تو اس نے سوچ سمجھ کے عملی قدم اٹھایا ہوگا۔ ایک بار اس نے مجھے فون کیا اور میں اس سے نہ مل سکا۔ دوسری بار وہ ہوٹل میں میرا انتظار کرتا رہا اور کمرے کا نمبر غلط یاد رہ جانے کے باعث اس سے رابطہ قائم نہ ہوا۔ پھر اس نے طے کیا ہوگا کہ ماضی کی کتاب میں سے تمام یادداشتوں کے اقتباسات ترتیب کے ساتھ لکھ دینا بہتر ہوگا جن سے مجھے اپنا حق حاصل کرنے، اپنا تحفظ کرنے اور ظالموں کے خلاف انصاف کے عمل کو مؤثر بنانے میں عملی مدد مل سکے۔ اس نے تمام ممکنہ احتیاطی تدابیر اختیار کی تھیں مگر ایک چھوٹی سی بھول نے اسے شکست سے دوچار کر دیا۔ جب جسمانی تشدد کی تاب نہ لا کے اس نے اعترافِ جرم کیا ہوگا تو اس کے لیے یہ ذہنی عذاب کتنا شدید ہوگا کہ وہ سب جدوجہد رائیگاں گئی جو اس نے دیر آید درست آید کے مقولے پر عمل کرتے ہوئے کی تھی اور مرتے وقت اُسے یقین ہوگا کہ جو کچھ اُس کے ساتھ ہوا وہی دنیا میں اس کے اعمال کی سزا تھی۔ جس سے بچا نہیں جا سکتا تھا۔ آخرت کا عذاب اس زندگی کے بعد شروع ہونا تھا۔

مجھے وہ تمام تگ و دو یاد آئی جو ہم نے اور ہمارے دشمنوں نے اس خط کے حصول کی خاطر کی۔ جس میں بابو پوسٹ مین سے رابعہ قاری ایڈووکیٹ تک، سب نے ہمارا ساتھ دیا مگر انجام کیا ہوا۔ اس سعیٔ لاحاصل اور گزرے ہوئے وقت کے مکروہ چہرے سے نقاب اٹھانے کی کوشش میں منشی اور بہت سے دوسرے رزقِ خاک ہوئے۔ ان کا نشان بھی ایسے ہی مٹ گیا تھا جیسے اس بے نشان تحریر کا اور فرش پر رہ جانے والے سیاہ راکھ کے دھبے کسی کے لہو کا سراغ نہیں دے سکتے تھے۔ نہ جانے کیوں مجھے فوزیہ یاد آئی جس نے لکھا تھا ؎

گر آج اوج پہ ہے طالعِ رقیب تو کیا
یہ چند روزہ خدائی تو کوئی بات نہیں

کتنا حوصلہ عطا کیا تھا مجھے اس کی بات نے۔ ناکامیوں سے دل آزردگی کیسی۔ خدا کی خدائی میں دیر تو ممکن ہے، اندھیر ممکن نہیں۔

"تمہیں یقین ہے کہ جو کچھ اس خط میں لکھا تھا، وہ ہمیں کسی اور ذریعے سے معلوم نہیں ہوا ہے؟" میں نے کہا۔ "یا یہ کہ ہمارے پاس اس کی دوسری نقل موجود نہیں ہے؟"

"ہاں۔" سیاہ پوش بولا۔ "منشی میں جھوٹ بولنے کا حوصلہ نہیں رہا تھا۔ اس کی قوتِ برداشت بہت پہلے جواب دے گئی تھی۔ بعد میں اس نے جو کچھ بتایا اس میں شک و شبے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ اس کے سوا یہ باتیں تمہارے کسی خیر خواہ کو معلوم نہیں۔ اس نے کسی اور کو نہیں بتائیں کہ تمہیں بعد میں بتا دے اور اس خط کی نقل کوئی بنا ہی نہیں سکتا۔"

"اس اطمینان کے بعد تمہارے لیے رابعہ کو یرغمال رکھنے کا کوئی جواز نہیں۔" میں نے کہا۔

"اگر ہم اپنے وعدے سے پھر جائیں تو تم کیا کرو گے؟" سیاہ پوش نے نیم سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"زندہ رہوں گا تو یہاں سے خالی ہاتھ نہیں جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "مرنا پڑا تو اکیلا نہیں مروں گا۔"

سیاہ پوش ہنس پڑا۔ "فکر مت کرو۔ ہم بزدل نہیں ہیں کہ وعدہ خلافی کریں۔ ہم نے ویسے بھی تمہیں ایک مہینے کی مہلت دے رکھی ہے۔" اس نے سائنسی تجربات کرنے والے کو اشارہ کیا۔ "ڈاکٹر! اپنا سامان اٹھاؤ اور باہر گاڑی میں میرا انتظار کرو۔ یہ دونوں تمہارے ساتھ جائیں گے۔" اس نے دونوں سیاہ پوشوں کی طرف اشارہ کیا۔ ان میں سے ایک میرے ساتھ بیٹھ کر آیا تھا اور ریوالور لیے دروازے کے قریب کھڑا تھا۔ دوسرا شاید گاڑی کا ڈرائیور تھا۔ تین سیاہ پوش نکل گئے۔ کمرے میں ایک تو وہی رہ گیا جسے سب باس کہہ کے مخاطب کر رہے تھے۔ دوسرا میرے بائیں ہاتھ پر ریوالور لیے کھڑا رہا۔

"تم نے پیڈرو کے کپڑے پہن رکھے ہیں۔" باس کہلانے والے سیاہ پوش نے کہا۔ "انہیں اتار دو۔"

"انہیں اتار دوں؟" میں نے برافروختہ ہو کے کہا۔ "اور خود کیا کروں؟ ننگا کھڑا رہوں؟"

"ہم پیڈرو کو بھی ننگا ہی لے کر آئے تھے۔" وہ بولا۔ "تمہارے کپڑے وہیں پڑے ہیں جہاں سائیں کی لاش پڑی ہے۔"

"سائیں کی لاش؟" میں اچھل پڑا۔ "اس کمرے میں تو کوئی لاش نہیں تھی۔ تم نے مار دیا تھا اسے؟"

"ہاں، لاش دوسرے کمرے میں تھی جہاں سے ہم بات کر رہے تھے، جہاں پہلی فائر پڑا تھا۔" وہ بولا۔ "لیکن اب اسٹور میں پڑی ہے۔"

میرا خون خشک ہونے لگا۔ صبح کے بعد جب اس چوکیدار کی لاش ملے گی تو پولیس میرے کپڑوں کو بھی قبضے میں لے لے گی۔ ان کپڑوں میں میرا پتہ دینے والی کوئی چیز نہیں تھی، سوائے میرے بدن کی بو کے۔ شہر میں مسلسل ہونے والی قتل کی پُراسرار وارداتوں کے بعد پولیس نے اتنا واویلا مچایا تھا کہ پولیس کی خصوصی ماہرین پر مشتمل ٹیم ان کا سراغ لگانے کے لیے تشکیل دی گئی تھی۔ اگر انہوں نے تربیت یافتہ کھوجی کتے استعمال کیے تو وہ کپڑوں کی بو سونگھ کے میرا نشان تلاش کر لیں گے۔ میں نے سنا تھا کہ پولیس کے پاس ایک مخصوص قسم کے ایسے کتے ہیں جو تین دن بعد بھی آدمی کی بو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، خواہ وہ آدمی سیکڑوں کے مجمع میں سے گزر کے میلوں دور کیوں نہ چلا گیا ہو۔ یہ انتہائی تشویشناک بات تھی تو دوسری طرف

قابلِ اطمینان بات یہ تھی کہ جو شخص مارا گیا تھا وہ محسن کی گولی کا نشانہ نہیں بنا تھا۔ غالباً اس کا نشانہ خطا گیا تھا اور وہ شخص بھاگنے میں کامیاب ہو گیا تھا جسے محسن ریوالور کی زد پر لیے کھڑا تھا۔ مرنے والا چوکیدار سائیں تھا جسے خود وہ لوگ مار آئے تھے۔

"تم اگر صبح تک ایسے ہی کھڑے سوچتے رہو گے تو ہمارا کوئی نقصان نہیں ہو گا۔" سیاہ پوش بولا۔

میں نے بے بسی سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اس امید میں کہ شاید بعد میں مجھے پہننے کے لیے چوکیدار کے کپڑے مل جائیں لیکن انہوں نے عمداً وہاں سے سب کپڑے ہٹا دیے تھے۔ کوئی ازار، چادر، میز پوش یا پردہ تک نہیں چھوڑا تھا۔ مقصد صاف ظاہر تھا۔ میں بغیر کپڑوں کے ان کا پیچھا نہیں کر سکتا تھا اور کار کے پیچھے سڑک پر دوڑ نہیں لگا سکتا تھا۔

"تم نے... تم نے یہاں کے چوکیدار کو بھی مار دیا ہو گا؟" میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا۔

سیاہ پوش ہنسا۔ "تمہیں شاید یقین نہیں آ رہا ہے کہ اس نے ہم سے تعاون کیا ہو گا۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔ پہلوان سے مل لو۔" وہ درمیانی دروازے کی طرف بڑھا اور اس کے قفل کو ایک چابی سے کھول دیا۔ کنڈی کھول کے وہ پیچھے ہٹ گیا۔ "آ جاؤ بھئی پہلوان! ہمارا کام ختم ہو گیا۔"

دروازہ آہستہ سے کھلا اور ایک شخص تھر تھر کانپتا اندر آ گیا جسے پہلوان کہنا "برعکس نہند نام زنگی کافور" والی بات تھی۔ اس کا اصل نام یقیناً کچھ اور ہو گا اور سیاہ پوش اسے تمسخر و تضحیک سے پہلوان کہہ رہا تھا۔ وہ بائیس چوبیس سال کا انتہائی لاغر اور پستہ قامت، مختصر قسم کا نوجوان تھا جس کی جوانی بھی بڑھاپے کے لیے باعثِ شرم تھی مگر اس سے زیادہ شرمناک بات یہ تھی کہ وہ مادر زاد برہنہ تھا۔

"دیکھا تم نے؟" سیاہ پوش نے قہقہہ مارا۔ "اس سے زیادہ کوئی کیا تعاون کرے گا۔"

"جنابِ عالی!" پہلوان نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "اب تو میرے کپڑے دے دیں۔"

"کیا کرو گے اب تم کپڑوں کا پہلوان!" سیاہ پوش نے جیب سے سو کے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی۔ "البتہ یہ انعام لے لو۔"

اس نے نوٹوں کی گڈی اپنے پیروں کے پاس ڈال لی۔ "پورے دس ہزار ہیں۔ نئے کپڑے بنوا لینا۔" اس کے لہجے میں کوئی بات ایسی تھی جس نے مجھے چوکنا کر دیا۔ میں نے چلا کر اس بے وقوف عاقبت نااندیش اور لالچی نوجوان کو خبردار کرنا چاہا مگر وہ آگے

بڑھ چکا تھا اور اس کی پُرہوس نظریں دس ہزار کی گڈی پر جم کے رہ گئی تھیں۔ وہ گڈی اٹھانے کو جھکا ہی تھا کہ سیاہ پوش کا ہاتھ بجلی کی طرح اس کی گردن پر پڑا۔ میں نے واضح طور پر گردن کی ہڈی کے ٹوٹنے کی آواز سنی اور اس جواں مرگ کو فرش پر لڑھکتے دیکھا۔ صدمے سے میرا ذہن ماؤف ہو گیا اور میں نے کچھ کر گزرنے کی خواہش پر بڑی سخت جدوجہد کے بعد قابو پایا۔ لیکن اس قتل نے میرے اندر کے اس آدمی کو جھنجھوڑ دیا جو اب تک رابعہ کی خاطر مصلحت کے تقاضے اور مجبوری کے باعث خاموشی سے ہر جائز و ناجائز بات مان رہا تھا۔ کمرے میں اب دو ہی آدمی تھے اور ان کو چابکدستی سے قابو میں کیا جا سکتا تھا۔ مجھے صرف اتنی یقین دہانی کی ضرورت تھی کہ رابعہ بھی یہیں دوسرے کمرے میں موجود ہے۔ یہ بات مجھے فوراً ہی معلوم ہو گئی۔

"رابعہ کو لے جانے میں تم خود دیر کر رہے ہو۔" چوکیدار کا قاتل سیاہ پوش سپاٹ لہجے میں بولا۔ "اگر تم چاہتے ہو کہ وہ ماں کا آخری دیدار کر لے اور کسی کو کچھ معلوم بھی نہ ہو تو جاؤ۔ رابعہ ساتھ والے کمرے میں موجود ہے۔ مگر ایسے نہیں، اپنے کپڑے ہمارے حوالے کر جاؤ۔"

میں نے تعمیل کا ارادہ کیا اور آہستہ آہستہ جرسی اتارنے لگا۔

"لاؤ اِدھر پھینک دو احتیاط سے۔" سیاہ پوش نے کہا۔

میں نے جرسی کے بعد بنیان کو اس کی طرف اچھال دیا اور اس عرصے میں میرا ذہن مسلسل مصروفِ عمل رہا لیکن حالات کے سامنے میں بے بس تھا۔ ایک شخص ریوالور کا رُخ میری طرف کیے ذرا سے شبے پر مجھے شوٹ کر دینے کے لیے پہلے تیار کھڑا تھا۔ اور اب اس کے دل نے بھی ریوالور نکال لیا تھا۔ میں نے پتلون اتار کے اس کی طرف پھینکی جو اس نے مجھ پر سے نظر ہٹائے بغیر اُچک لی۔ اب میرے جسم پر ایک مختصر سا انڈروئیر رہ گیا تھا یا میرے جوتے تھے۔ انڈروئیر سے پہلے میں نے جوتے اور موزے اتارے۔ ابھی تک میرے دماغ میں کوئی ترکیب نہیں آئی تھی جس سے میں ان پر غلبہ حاصل کر سکتا اور اس کے مواقع بھی ناپید تھے۔ مگر اسی وقت باس نے اپنا ریوالور جیب میں رکھا اور میرے جوتوں اور کپڑوں کی گٹھری لے کر دروازے کی طرف چل پڑا۔ چلتے چلتے اس نے اپنے آخری ساتھی کو حکم دیا کہ وہ مجھ سے میرا انڈروئیر بھی لے لے اور پھر دروازے کو باہر سے کنڈی لگا کے آ جائے۔ ماتحت نے ریوالور کا رُخ میری طرف رکھا اور گھوم کر دروازے کی سمت آ گیا جہاں سے اس کا باس نکل کر باہر جا چکا تھا۔

"دیکھو، کچھ تو شرم و حیا کرو۔" میں نے کہا۔ "یہ ایک کپڑا تو چھوڑ دو میرے جسم پر۔"

"بکواس کرنے کی ضرورت نہیں۔ باس جو کہہ گیا ہے وہی

ہو گا۔" سیاہ پوش غرایا۔ باس کے جاتے ہی وہ خود باس ہو گیا تھا۔

"تمہاری مرضی۔" میں نے کہا۔ پھر میں نے تھوڑا سا جھکتے ہوئے اپنا انڈروئیر بھی اتارا اور یہ دیکھا کہ وہ کچھ جھینپ گیا ہے۔ اس کی نظر ایک پل کے لیے ہٹی تھی کہ میں نے انڈروئیر اس کے منہ پر کھینچ مارا اور غوطہ لگا گیا۔ باہر سے گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز ریوالور کے فائر کے ساتھ ہی سنائی دی۔ سیاہ پوش نے بینیترا بدل کے کونے کی طرف ہونا چاہا مگر میں نے اسے مہلت نہ دی۔

"یہ کیا ہے...؟" باہر سے کسی نے چیخ کر جملے کا اختتام ایک غلیظ گالی پر کیا۔ اس وقت تک میں نے سیاہ پوش کو اوپر اٹھا لیا تھا۔

میں نے ایک غلیظ تر گالی دی۔ "ابھی بتاتا ہوں کہ کیا ہوا ہے...!" میں نے سیاہ پوش کے کچھ بولنے سے پہلے چلا کر کہا۔ سیاہ پوش نے ایک اور گولی چلائی جو زمین پر لگی۔ میں نے سیاہ پوش کو اٹھا کے دیوار پر دے مارا۔ وہ بلبلایا۔ اس کا اثر خاطر خواہ ہوا۔ باہر گاڑی میں بیٹھے ہوئے باقی افراد نے فرض کر لیا کہ ان کا ایک ساتھی میرے ہاتھوں مارا گیا۔

"گاڑی چلاؤ۔" اسی شخص نے چیخ کر کہا جو باس بنا ہوا تھا۔ "مرنے دو اس حرامزادے کو۔"

گاڑی کے روانہ ہونے کی آواز سنتے ہی پیچھے رہ جانے والے کا حوصلہ جواب دے گیا۔ اس نے اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی مگر میری لات اس کے سینے پر پڑی اور وہ دیوار کے پاس لاش کے قریب جا گرا۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے پہلے ہی نکل گیا تھا۔ وہ عوامل بہت سے تھے جنہوں نے مجھے پاگل کر دیا۔ میرے ذہن میں رابعہ پر ہونے والے تشدد کی یاد بھی تھی۔ وہ صدمہ بھی تھا جو رابعہ کی ماں کے بیٹی کو دیکھے بنا مر جانے سے ہوا تھا۔ اپنی بے بسی اور بے چارگی کا ردِ عمل بھی تھا۔ اپنی بے حجابی سے ہونے والی تذلیل کا احساس بھی تھا۔ میں نے اس پر تابڑ توڑ حملے کیے۔ لاتیں اور گھونسے مار مار کے میں نے اسے تقریباً مار ڈالا تھا کہ اچانک میرے ایک وار سے وہ اچھل کر ریوالور کے قریب جا پڑا۔ لیکن ریوالور پر قبضہ کرتے ہی اس کے ہاتھ نے میرا نہیں خود اپنا نشانہ لیا۔ میں اس وقت بھی حرکت میں تھا اور اس پر جست لگا چکا تھا۔ اس نے خود کو میرے مقابلے میں بہت کمزور اور بے بس و تنہا پا کے فیصلہ کیا تھا کہ اپنے ہاتھوں اپنی زندگی کا خاتمہ کر لے مگر میں نے اس کی یہ آرزو بھی پوری نہیں ہونے دی۔ جو گولی وہ اپنی کنپٹی پر چلانے والا تھا وہ میرے اس پر جا پڑنے سے شانے

میں لگی۔ ریوالور پھر اس کی گرفت سے نکل گیا۔ میں نے اس کے سر کو بالوں سے پکڑ کے فرش پر مارا۔ وہ آخری بار کراہا اور بے حس و حرکت ہوگیا۔

میری وحشت اور دیوانگی اس خیال کے ساتھ ہی کافور ہوگئی کہ وہ مر چکا ہے — میں اسے چھوڑ کے کھڑا ہوگیا۔ اس کے شانے کے زخم سے بہنے والا لہو میرے بے لباس بدن پر لگ گیا تھا اور خود سیاہ پوش کے لبادے کو تر کر رہا تھا۔ ایک بار پھر مجھے گرم انسانی خون کی مہک سے ابکائی آئی اور میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ ایک گھڑونچی پر چھوٹا سا مٹکا اور ڈھکنے پر سلور کا مگ رکھا تھا۔ میں نے مگ سے پانی نکالا اور اپنے جسم پر سے خون کو دھو دیا۔ نشان نہ رہنے کے باوجود وہ بو میرے دماغ میں بسی رہی۔ پھر میں نے انڈرویئر پہنا اور اس سیاہ پوش کو جھک کر دیکھا۔ وہ زندہ تھا اور گولی سے صرف شانے کا گوشت اُدھڑا تھا۔ میں نے پھر گھڑونچی کے پاس آکے ایک مگ بھرا اور دو گھونٹ پانی پی کے باقی سے اپنے منہ پر چھینٹے مارے۔ میرا دہکتا ہوا چہرہ ٹھنڈا پڑنے لگا اور میں سر جھٹک کے دوسرے کمرے کی طرف بڑھا۔ دروازے سے کمرے میں قدم رکھتے ہی میں نے رابعہ کو دیکھا۔ وہ ایک کھڑکی سے یوں بندھی بیٹھی تھی کہ اس کے دونوں ہاتھ ایک ساتھ باندھ کے کھڑکی کی سلاخوں کے ساتھ جکڑ دیے گئے تھے۔ پیر دوسری رسی سے باندھے گئے تھے اور دوسری رسی کا آخری سرا ایک دروازے کے ہینڈل میں بندھا ہوا تھا۔ دروازہ بند تھا اور غالباً دوسری طرف سے باہر جانے کا راستہ تھا۔ اس پوزیشن میں رابعہ کے لیے دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھنا ہی ممکن تھا۔ نہ وہ لیٹ سکتی تھی اور نہ کھڑی ہوسکتی تھی۔ اس کے منہ میں ایک میلا سا کپڑا ٹھونس دیا گیا تھا چنانچہ اس کے حلق سے آواز بھی نہیں نکل سکتی تھی لیکن سب سے زیادہ شرمناک اور باعثِ ذلت بات یہ تھی کہ وہ رابعہ کو بھی بے لباس چھوڑ گئے تھے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میرے جسم پر نام کو ہی سہی ستر پوشی کے لیے کچھ تو ہے ورنہ میرے لیے رابعہ کا سامنا کرنا کہیں زیادہ دشوار ہوتا۔

اس کمرے میں آنے والی روشنی وہی تھی جو دوسرے کمرے سے دروازے کے راستے پہنچ رہی تھی۔ میں نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کے رابعہ کے منہ سے کپڑا نکال دیا۔ رابعہ نے ایک گہری سانس لی اور کچھ کہا جو میں نے نہیں سنا۔ میں لپک کر واپس دوسرے کمرے میں جا پہنچا تھا۔ وہاں میں نے میز کے نیچے پڑے ہوئے سامان میں سے چھری اٹھائی اور واپس بھاگا۔ ذرا سی دیر میں ساری رسیاں کٹ گئیں۔ جس بات نے مجھے حیران کیا وہ یہ تھی کہ رسی کی ہر گرہ تو سخت تھی مگر کلائی پر یا ٹخنوں کے پاس رسی ڈھیلی رکھی گئی تھی۔ صرف اس حد تک کہ جلد پر نشان نہ پڑیں مگر حلقہ اتنا بڑا بھی نہ ہو کہ رابعہ زور لگا کے ہاتھوں یا پیروں کو نکال لے۔

"رابعہ! میری جان!" میں نے بے اختیار اس کے سر کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ "مجھے معاف کردو۔ میری وجہ سے تمھیں بڑا ظلم سہنا پڑا۔ بہت دکھ اٹھانے پڑے۔ میں سخت گنہگار ہوں، تمہارا مجرم ہوں۔"

"سکندر..." وہ آہستہ آہستہ سسکتے ہوئے بولی۔ "کیسی باتیں کرتے ہو۔ تمہارا کیا قصور ہے اس میں؟"

"یہ سب میرا قصور ہے۔ میری وجہ سے تم پر یہ آفات آئیں۔ نہ میں تمہارے پاس آتا نہ یہ سب کچھ ہوتا۔" میں نے اس کی بند آنکھوں سے بہتے ہوئے خاموش آنسوؤں کو نرمی سے صاف کیا۔ اس وقت ہم میں سے کسی کو احساس تھا تو اپنے اپنے جذبوں کی صداقت کا اور اپنے خلوص کا اور اپنی نیک نیتی کا۔ ہمارے جذبات میں پاکیزگی اور طہارت کی خوشبو تھی اور وہ آلائش کہیں نہ تھی جو جسموں کے بے حجابانہ اتصال سے جنم لیتی ہے۔ مجھے خوشی تھی کہ میں نے رابعہ کی زندگی بچالی اور خود اپنی نظر میں رسوا نہیں ہوا۔

"میں تمام عمر خود کو معاف نہیں کرسکوں گا۔" میں نے اس کے سر کو تھپکا۔ "میری وجہ سے تم پر اتنا ظلم ہوا۔ لیکن رابعہ! خدا کی قسم! میں تمہارے جسم سے بہنے والے ہر قطرۂ خون کا انتقام لوں گا۔ میں ان درندوں کو معاف نہیں کروں گا۔"

رابعہ نے نظر اٹھا کے مجھے دیکھا۔ "تم جذبات میں پاگل ہو رہے ہو۔ مجھ پر کسی نے تشدد نہیں کیا۔ انھوں نے دو مرتبہ مجھے کلوروفارم سنگھا کے بیہوش ضرور کیا تھا۔ ایک اغوا کرتے وقت، ایک مرتبہ بعد میں۔ یا اس وقت..." اس کا چہرہ لال ہوگیا۔ "مگر اس وقت بھی انھوں نے باندھنے کے سوا کچھ نہیں کیا اور وہ بھی بہت معذرت کے ساتھ۔"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟" میں نے حیرانی سے کہا۔ "گزشتہ بار میں نے تمھیں دوسری جگہ دیکھا تھا۔ اُدھر وادو محمد والا کی طرف ایک زیرِ تعمیر کوٹھی کے تہہ خانے میں، تو تم لہولہان تھیں!"

"لہولہان؟" وہ مجھ سے زیادہ حیران ہو کے بولی۔ "انھوں نے تو مجھ پر انگلی بھی نہیں اٹھائی۔ مجھے بہت آرام سے رکھا اور بار بار معافی مانگتے رہے کہ وکیل صاحب! ہم اس خط کو حاصل کرنے کے لیے آپ کو لانے پر مجبور تھے۔ خط مل جائے گا تو ہم آپ کو گھر بھی چھوڑ آئیں گے۔ انھوں نے کہا کہ سکندر پر کسی طرح دباؤ نہیں ڈالا جاسکتا۔ میں نے تو انہیں بتا دیا تھا کہ سکندر اس طرح دباؤ میں نہیں آئے گا مگر تم تو ذرا مزاحمت نہیں کر سکتے۔"

"مزاحمت میں کیسے کرتا رابعہ!" میں نے پلکیں جھپکائے بغیر اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں نے تو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ تمہارا لباس تار تار تھا اور خون میں تر تھا۔"

"تمھیں دھوکا ہوا ہوگا سکندر!" وہ بولی۔ "یا انھوں نے تمھیں دھوکا دینے کے لیے مجھے بے ہوش کرنے کے بعد مجھ پر رنگ، سرخ روشنائی یا کسی جانور کا خون وغیرہ ڈال دیا ہوگا۔ مجھے تو جب دوبارہ ہوش آیا تھا تو میں وہیں لیٹی تھی جہاں مجھے پہنچایا گیا تھا اور میرے کپڑے بھی وہی تھے۔ بالکل صاف۔ میرے جسم پر یا لباس پر خون کا ایک داغ تک نہیں تھا۔"

'ڈرامہ۔' میں نے دل ہی دل میں اپنے آپ سے کہا۔ 'یہ سب مجھے دہشت زدہ کرکے اپنی بات منوانے کے لیے کیا گیا تھا۔' ایسا ڈرامہ دلاور کا شاطر ذہن ہی اسٹیج کرسکتا تھا۔ وہ نفسیاتی طریقے استعمال کرکے ذہن پر مسلط ہونا جانتا تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس بار بھی وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا۔ زیادہ باتوں کا وقت نہیں تھا۔

"وہ خط تو میں نے ان کو دے دیا۔" میں نے کہا۔

"خط دے دیا؟" رابعہ نے کہا۔ "لیکن خط تو امی کے پاس تھا۔"

"میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا اور میں اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ ملا نے ان... ان سے لے لیا تھا۔ اور اب اس کی راکھ بھی نہیں۔"

"لیکن کیوں سکندر!" وہ میرا ہاتھ تھام کے بولی۔ "تم نے ایسا کیوں کیا؟"

"میں مجبور تھا رابعہ!" میں نے کہا۔ "اس لیے کہ مجھے تمہارے حالات کا احساس تھا۔ بلکہ اس لیے کہ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔ تمھیں صرف تمہاری خاطر چاہنے لگا ہوں۔ تمھیں اگر یقین نہیں آتا تو ایک دن ضرور آجائے گا۔ ایک بار میں نہ سہی ایک سال میں۔ ایک سال میں نہ سہی، ایک عمر میں۔ کل تک مجھے بھی اپنے آپ پر اعتبار نہ تھا مگر آج میں یہ بات پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں۔"

"مجھے معلوم تھا ایک دن تمھیں یہ احساس ضرور ہوگا۔" وہ آنکھیں بند کرکے بولی۔ "لیکن یہ معلوم نہ تھا کہ ایسے غلط وقت اور ایسی غلط جگہ پر ہوگا۔"

میں خفت زدہ ہو کے اٹھ کھڑا ہوا۔ "وہ لوگ جاتے وقت میرے اور تمہارے کپڑے بھی لے گئے ہیں تاکہ ہم فوراً ان کا تعاقب کرنے کے لیے نہ نکل سکیں۔"

"یہاں کوئی چیز تو ہوگی؟" رابعہ نے کہا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہاں ایک چوکیدار تھا۔ وہ اسے بھی مار گئے ہیں اور اس کے کپڑوں کے علاوہ بالشت بھر کا رومال تک چھوڑ کر نہیں گئے تھے، لیکن میں نے تھوڑی سی ہمت کرکے ان کا ایک آدمی رکھ لیا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ اس کے کپڑے پہن کے میں باہر نہیں نکل سکتا۔ وہ سر سے پاؤں تک سیاہ لباس میں تھا اور یہ لباس بھی اب خون آلودہ ہے۔ مجھے پولیس گھیر کر تھانے لے جائے گی تو خواہ مخواہ وقت ضائع ہوگا۔"

"اور اس لباسِ فاخرہ میں باہر نکلو گے تو کوئی کچھ نہیں کہے گا؟" وہ بولی۔

"نہیں۔ وہ میں نے سوچ لیا ہے۔ اب تم اطمینان سے یہاں بیٹھو، میں آدھے پون گھنٹے میں واپس آتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "دوسرے کمرے میں مت جانا، وہاں ایک لاش پڑی ہے اور ایک یرغمالی بیہوش پڑا ہے۔ اس کا میں بندوبست کر جاؤں گا۔"

میں نے سیاہ پوش کو انھی رسیوں سے باندھا جو میں نے رابعہ کے ہاتھوں اور پیروں پر سے کھولی تھیں۔ اس کے زخم سے رسنے والا خون منجمد ہو کے رک گیا تھا اور اس کی موت کا کوئی خطرہ نہ تھا۔ البتہ یہ خطرہ ضرور تھا کہ وہ ہوش میں آجائے تو فرار ہونے کی کوشش کرے یا اس کے وہ ساتھی جو افراتفری میں فرار ہوگئے تھے لوٹ کر اس کی لاش لے جانے کے لیے نہ آجائیں۔ جلدی میں انھوں نے فرض کرلیا تھا کہ وہ مارا گیا۔ بعد میں ان کو خیال آسکتا تھا کہ وہ مرا نہ ہو، صرف زخمی ہوا ہو۔ ایسی صورت میں وہ اسے زندہ یا مُردہ ہر صورت میں ساتھ لے جانے کی کوشش کریں گے، اور لے جا نہ سکے تو مار جائیں گے مگر پولیس کے یا ہمارے ہاتھ نہیں پڑنے دیں گے کہ وہ کسی ساتھی کے بارے میں کچھ بتا نہ سکے۔ میں نے اس کا ریوالور لیا اور پھر رابعہ کے پاس آگیا۔

"افسوس یہ ہے کہ یہاں تاریکی کے سوا تمہارے لیے کوئی لباس نہیں۔" میں نے کہا۔ "اندھیرے میں تمھیں کوئی نہیں دیکھ سکتا لیکن تم باہر دیکھ سکتی ہو۔ یہ بتاؤ ریوالور چلانا آتا ہے؟"

"آتا ہے۔" وہ بولی۔ "میرے پاس اپنا ریوالور بھی ہے اور لائسنس بھی۔"

"تو یہاں کھڑکی کے پاس بیٹھ جاؤ۔" میں نے ایک کرسی

کی بھدی سی کرسی گھسیٹ کر کہا "یہاں سے تم گیٹ پر نظر رکھ سکتی ہو۔ اگر وہ اپنے ساتھی کو لے جانے کے لیے آئیں گے، تو گاڑی میں آئیں گے اور اسی راستے سے آئیں گے۔ میں باہر سے دروازہ مقفل کر جاؤں گا تاکہ وہ آسانی سے اندر نہ آسکیں۔ جو بھی دروازے کے قریب آنے کی اور تالا توڑنے کی کوشش کرے اسے بے دریغ گولی مار دینا۔ غنیمت ہے کہ اس میں سائلنسر لگا ہوا ہے ورنہ اب تک تو یہاں مجمع لگ چکا ہوتا نشانہ کیسا ہے تمہارا؟"

"ٹارگٹ شوٹنگ کلب کے مقابلوں میں گزشتہ سال میرا دوسرا نمبر تھا۔" وہ بولی۔

"تو یہ دیکھنا کتنے آدمی آئے ہیں؟" میں نے اپنی بات جاری رکھی "ریوالور میں چار گولیاں ہیں۔ اگر دو ہی آدمی آئے تو تم باقی دو گولیاں گاڑی کو ناکارہ بنانے میں صرف کرنا۔ دو ٹائر فلیٹ کر دینا کم سے کم۔ تین ہوں تو ایک ٹائر پھاڑ دینا۔ ویسے تو مجھے امید ہے کہ ایک کے گرتے ہی وہ بھاگنے کی کوشش کریں گے لیکن گاڑی کو روکنا بے حد ضروری ہے۔ وہ اگر مارے نہ جائیں اور زخمی ہو کے گر جائیں تو مزید بہتر۔ یہ تمہاری ٹارگٹ شوٹنگ پریکٹس کا امتحان ہوگا۔ جرأت اور ہمت تو تم میں اچھے اچھے مردوں سے زیادہ ہے۔ اب میں جاتا ہوں۔ واپسی پر سب انتظام کر کے لوٹوں گا۔ اس وقت صبح کے چار بجے ہیں۔ اگر پانچ کے بجائے چھ بھی بج جائیں تو گھبرانا نہیں۔ میرا خیال ہے آٹھ نو بجے سے پہلے یہاں کوئی نہیں آتا ہوگا۔"

لائٹ آف کرنے کے بعد جب میں چوکیدار کی چابی سے دروازے کو مقفل کر کے باہر نکلا تو میں نے آسمان پر صبح کے ستارے کو روشن دیکھا "خداوندا! میں نے دعا مانگی "تیری مدد سے میں ایک آزمائش سے کامیاب گزرا۔ مجھے استقلال اور استقامت دے کہ میں اس امتحان میں پورا اتروں جو مجھے درپیش ہے۔ ابھی رابعہ کو یہ معلوم نہیں ہے کہ اس کی ماں مر گئی ہے اور اسے یہ صدمہ برداشت کر لینے کی توفیق دینے والا بھی تو ہی ہے۔ اسے زندگی کے لیے حوصلہ اور صبر دے اور مجھے اس کا ساتھ دینے اور اس کی حفاظت کرنے کے قابل بنا۔" دعا مانگ کے میں نے منہ پر ہاتھ پھیرا اور پلٹ کر دیکھا تو مجھے کھڑکی کے اندھے خلا میں ایک سائے کے وجود کا احساس ہوا۔ یہ محض میرے تصور کا کرشمہ تھا ورنہ وہاں پر کچھ نظر آ ہی نہیں سکتا تھا۔ میرے لیے رابعہ کا حوصلہ انتہائی حیرت انگیز تھا۔ اتنا کچھ برداشت کر لینے کے بعد بھی وہ کسی خوف کے مہیٹریا میں مبتلا نہیں ہوئی تھی۔

اور اس وقت بھی ایک اندھیرے اور مقفل کمرے میں اور ایک زخمی مجرم کے ساتھ جس حالت میں بیٹھی تھی اور جس مزاجی اور قوتِ برداشت کے ساتھ اس دہشت ناک صورت حال کا مقابلہ کر رہی تھی، وہ کسی عام عورت کے بس کی بات نہ تھی جو ان حالات میں خود بیہوش پڑی ہوتی۔ عورت تو عورت خاصے مردوں کی اس وقت گھگھی بندھ جاتی ہے لیکن وہ اپنے لیے مسلح ہو کے آنے والے دشمنوں سے اکیلی نمٹنے کے لیے تیار بیٹھی تھی۔ بے بس آدمی کا اعتماد کتنا کم ہو جاتا ہے، یہ تلخ تجربہ ایک رات مجھے ہو چکا تھا۔ رابعہ عورت تھی اس کے لیے یہ کہیں زیادہ صبر آزما مرحلہ تھا مگر اس نے حقائق کو تسلیم کر لیا تھا کہ یہ فنا اور بقا کی جنگ ہے جس میں وہ بھی برابر کی ایک فریق ہے، اور ہم دونوں میں اب کوئی فرق نہیں رہا۔

احاطے سے نکلتے ہوئے مجھے ایک اور خیال آیا۔ میں نے گیٹ کو اندر سے بھاری کنڈی لگا کے بند کیا اور پھر دروازے کے اوپر سے باہر کود گیا۔ اب کوئی گاڑی لے کر آئے گا تو سیدھا اندر نہیں جا سکے گا۔ اسے روک کر دروازہ کھولنا ہوگا اور رابعہ کو تیار ہونے کے لیے وقت مل جائے گا۔ سڑک پر آکے میں نے دونوں طرف نگاہ دوڑائی۔ تاحدِ نظر کوئی ذی الروح متحرک نہ تھا۔ صرف میں تھا جو ایک اندھیرے ویرانے میں ننگے پیر تارکول کی ٹوٹی پھوٹی سڑک پر چل رہا تھا۔

ابھی میں نے سو گز کا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ مجھے ٹیلیفون کا کھمبا نظر آیا۔ میری نظر نے ٹیلیفون لائن کے ساتھ ساتھ سفر کیا۔ لائن ایک دو منزلہ مکان تک گئی تھی جو تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں نے ہمت کر کے کال بیل دبائی۔

"ڈنگ ڈانگ..." اندر سے میوزیکل بیل کے دلربا بول سنائی دیے۔ پھر خاموشی پہلے کی طرح مسلط ہو گئی۔ میں نے کال بیل کے بٹن کو بار بار دبایا۔ بالآخر اوپر کی منزل پر ایک کھڑکی کے پٹ روشن ہوئے۔ کسی نے ایک پٹ کھولا اور پوچھا

"کون ہے اس وقت بھائی؟ ڈاکٹر صاحب گھر پر نہیں ہیں۔" لہجہ کچھ جھلایا ہوا اور بزرگانہ تھا۔

بولنے والا لوہے کی گرل میں سے سر نکال کے مجھے دیکھ سکتا تھا ورنہ میری ہیئت کذائی دیکھتے ہی وہ مجھ سے ڈر کے پولیس کو فون کر دیتا۔ "مجھے ڈاکٹر صاحب سے نہیں ملنا جناب ایک ضروری فون کرنا ہے۔" میں نے منہ اوپر اٹھا کے کہا۔

"لاحول ولا قوۃ۔ یہ بھی کوئی پبلک کال آفس ہے؟ آگئے شریفوں کی نیند حرام کرنے۔" کھڑکی دھڑ سے بند ہو گئی۔ میں نے پھر پش بٹن کو دبایا۔ کھڑکی سخت برہمی کے عالم میں کھول دی گئی "اب جاتے ہو یا..."

"حضور مجھے کسی کے انتقال کی خبر دینی تھی۔" میں نے بزرگوار کے کچھ اور ارشاد فرمانے سے پہلے کہا۔

انہوں نے بڑی قرأت کے ساتھ انا للہ پڑھی اور لہجہ بدل کے بولے "معاف کرنا بھائی! فون خراب ہے۔ ذرا آگے تھانیدار حشمت خان رہتا ہے۔ اس کے گھر سے کر لو۔" کھڑکی پھر بند ہو گئی۔

تھانیدار حشمت خان؟ وہی خبیث؟ وہ یہاں رہتا ہے۔ میں نے اس انکشاف پر حیران ہو کے سوچا۔ ان بزرگوار نے دوسرا ناقابلِ تردید اور معقول عذر پیش کر کے مجھے فون تو نہیں کرنے دیا تھا مگر بڑی کارآمد بات بتا دی تھی۔ اب یہ معلوم ہو گیا تھا کہ میں کہاں ہوں۔ حشمت خان کا پتہ معلوم کیا جا سکتا تھا اور اس کے گھر سے سو گز دور وہ یارڈ تھا۔ میں کچھ دیر تذبذب کی کیفیت میں کھڑا رہا اور سوچتا رہا کہ اس وقت حشمت خان کو جگانا مناسب ہوگا یا نہیں؟ وہ فون تو کرنے دے گا مگر تفتیش بھی کرے گا اور بہت سی باتیں جو میں کسی کو بتانا نہیں چاہتا تھا اسے بتانی پڑیں گی۔

میں نے چلتے رہنے کا فیصلہ کیا۔ مجھے یہ خیال بھی آیا تھا کہ کوئی شریف آدمی نظر آجائے تو اسے اپنی "بپتا" سنا کے اس کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کروں لیکن سڑک پر کوئی تھا ہی نہیں۔ ابھی میں چند قدم ہی چلا تھا کہ میرے کانوں نے گھوڑوں کی ٹاپوں کی ہلکی سی آواز سنی۔ آواز قریب ہوتی گئی اور پھر اندھیرے میں گھڑ سوار گشتی پولیس کے دو سپاہی نمودار ہوئے۔ میں کمر پر ہاتھ رکھ کے سڑک کے بیچ میں کھڑا ہو گیا۔ وہ چوکنے ہو گئے۔

"کون ہے میاں؟" ان میں سے ایک نے قریب آکے اترتے ہوئے کہا۔ دوسرے نے تکلفاً رائفل کا رخ میری طرف رکھا۔

"تمہیں کیا نظر آتا ہوں؟" میں نے کہا "آدمی یا گھوڑا؟"

"بک بک کرتا ہے حرامی؟" نیچے اتر آنے والے نے مشتعل ہو کے کہا "صورت سے ہی چور لگتا ہے۔"

"آج ہاتھ آیا ہے۔" دوسرے نے بڑی موٹی گالی دے کر کہا کیونکہ اس کا عہدہ ایک لال فیتے کے برابر اونچا تھا "ہم بھی کہتے تھے، اس علاقے میں اچانک چوری کی وارداتیں کیوں بڑھ گئی ہیں؟"

"اور تمہیں افسوس ہوگا کہ یہ کون ہے جو تمہارا حصہ نہیں پہنچا رہا ہے؟" میں نے طنز سے کہا "بڑا زبردست اور کامیاب چھاپہ مار کر تم نے بالآخر اسے گرفتار کر ہی لیا۔ آفرین ہے تمہاری ذہانت اور فرض شناسی کو۔"

اب ہیڈ کانسٹیبل بھی نیچے اتر آیا "بھونکتا ہے کتے!" اس نے رائفل کا بٹ اٹھایا۔

"بکواس بند کرو۔" میں ایک قدم پیچھے ہو گیا "اور مجھ سے ہوش میں رہ کے بات کرو۔ میں ایس پی ضامن رضوی کا چھوٹا بھائی ہوں۔ تھانیدار حشمت خان یہیں رہتا ہے۔ اس سے پوچھنا چاہتے ہو تو پوچھ لو۔ یہ میں تم سے بعد میں پوچھوں گا کہ تم گشت کر رہے تھے یا کہیں سو رہے تھے۔"

ان دونوں نے بے وقوفوں کی طرح ایک دوسرے کو دیکھا "کوئی واردات ہو گئی ہے جناب؟" کانسٹیبل نے لہجہ فوراً بدل لیا۔

"جی جناب!" میں نے تلخ لہجے میں کہا "اس سڑک پر دو ڈاکو راہ گیروں کو ایک گھنٹے تک لوٹتے رہے۔ انہوں نے میرے کپڑے تک اتروا لیے۔ تم اتنی دیر تک کہاں رہے؟ اور اب آتے ہو تو ایک شریف آدمی کو گالی دے کر بات کرتے ہو؟"

"ہم... ہم معافی... معافی چاہتے ہیں جناب عالی!" ہیڈ کانسٹیبل کی سٹی گم ہو گئی۔ اسے فوراً اپنی لال پٹی کے اتر جانے اور اپنے دوبارہ کانسٹیبل کے عہدے پر مراجعت کے خیال نے ہراساں کر دیا تھا "ہم آپ کی کیا مدد کریں؟"

"کچھ نہیں، بس مجھے تھانے لے چلو۔ مجھے گھر فون کرنا ہے۔" میں نے کہا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے فوراً مجھے اپنا گھوڑا پیش کیا لیکن میں نے اس کے پیچھے بیٹھنا بہتر سمجھا۔ راستے میں انہوں نے مجھ سے درخواست کی کہ میں ان کے غلط رویے کی کسی سے شکایت نہ کروں "ہم بیوی بچوں والے ہیں۔ نوکری سے جائیں گے تو فاقے کرنے پڑیں گے۔" ہیڈ کانسٹیبل بولا۔

"کیوں؟" میں نے کہا "محنت مزدوری کرتے شرم آتی ہے کیا؟ یا تن آسانی اور حرام خوری کی عادت ہو گئی ہے؟"

"آپ کا جتنا نقصان ہوا ہم پورا کر دیتے ہیں جناب عالی! بس ہمیں معاف کر دیں۔" ہیڈ کانسٹیبل پر رقت طاری ہونے لگی اور میں نے انتہائی فراخدلی سے کام لیتے ہوئے ان کو معاف کر دیا۔

دس منٹ بعد میں جس شان سے تھانے میں اترا اس نے ڈیوٹی پر متعین عملے کو بھی حیران کیا اور اندازہ تو انہوں نے بھی یہی —— لگایا تھا کہ گشتی پولیس کے مستعد جوان کسی شرابی آوارہ گرد یا چور کو پکڑ لائے ہیں مگر مجھے لے کر آنے والوں نے نظروں ہی نظروں میں ان کو ایسا اشارہ کیا جو میں نہ دیکھ سکا اور استقبال کے لیے آگے بڑھنے والے یکلخت محتاط ہو گئے۔ میں نے سیدھا ایس ایچ او کے کمرے کا رخ کیا جہاں ایک

سب انسپکٹر ڈیوٹی پر تھا۔ مجھے یوں بے باکانہ اور اس حلیے میں اندر آتے دیکھ کر اس کا منہ بگڑ گیا مگر میں نے کرسی گھسیٹی اور بیٹھ گیا۔

"کون ہو تم؟" وہ غرا کے بولا۔

"ایس پی ضامن رضوی صاحب کے گھر کا نمبر ملاؤ۔" میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "میں ان کا بھائی ہوں۔" سب انسپکٹر کا موڈ مجھ سے فون نمبر پوچھنے کے بعد بدلا۔ نمبر ملا کے اس نے ریسیور مجھے تھما دیا اور میری طرف غور سے دیکھنے لگا۔

تقریباً تین منٹ بعد رضوی صاحب نے ریسیور اٹھایا اور ان کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز آئی "ضامن رضوی۔"

"میں سکندر بخت بول رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"سکندر!" وہ چونک کر بولے "کہاں سے بول رہے ہو اس وقت...؟"

"میں پولیس اسٹیشن سے بول رہا ہوں۔ باغبانپورہ..."

"آخر یہ کیا مصیبت ہے؟" ان کا پارہ ایک دم چڑھ گیا۔ "آتنی رات کو تم وہاں کیا کر رہے ہو؟ شام سے رات تک ہم کھانے پر تمہارا انتظار کرتے رہے۔ اسلام آباد سے شیروانی صاحب کی وائف نے فون کیا تھا۔"

"وہ جوڈیشی سیکرٹری ہیں۔" میں نے سب انسپکٹر کو سنانے کے لیے ایک احمقانہ بات کی۔

"لاحولا ولاقوۃ۔ اور کتنے شیروانی ہیں جن کی بیویاں مجھے فون کر کے تمہارا پتہ پوچھیں گی؟"

"ان سے بات ہو گئی تھی میری۔" میں نے کہا۔ "دراصل مجھے موقع ہی اب ملا ہے آپ کو اطلاع دینے کا کہ میں رات کو کھانے کے وقت گھر کیوں نہیں پہنچ سکا۔ آپ رابعہ قاری ایڈوکیٹ سے واقف ہیں نا ـــ ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا ہے۔ جنازہ دو بجے اٹھایا جائے گا۔"

"انا للہ وانا علیہ راجعون۔" ضامن رضوی صاحب نے کچھ دیر بعد کہا۔ "وہ کیسے؟"

"ان پر دل کا دورہ پڑا تھا۔ ہسپتال میں تھیں۔ میں لاش لے کر گھر بہت دیر سے پہنچا مس رابعہ کے گھر۔" میں نے کہا۔

"اور اب وہاں تھانے میں کیا کر رہے ہو؟"

"مجھے مجبوراً یہاں آنا پڑا۔" میں نے کہا۔ "آپ کو فون کرنے کے لیے۔ میں انتقال کی اطلاع دینے آیا تھا اِدھر۔ واپسی پر سواری نہیں ملی اور ایک چھوٹی سی واردات ہو گئی۔"

"کیسی واردات؟" وہ پریشانی سے بولے۔ "تم خیریت سے ہو نا؟"

"جی میں بالکل خیریت سے ہوں۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔ دو بدمعاشوں نے مجھے اکیلا پا کے لوٹ لیا تھا۔"

"تو میں گاڑی بھیج دیتا ہوں۔" انہوں نے کہا۔

"نہیں آپ گاڑی نہ بھیجیں۔ میں محسن سے کہہ دیتا ہوں، وہ رابعہ کی گاڑی لے کر آ جائے گا۔ بس آپ کو اطلاع دینی مقصود تھی۔" میں نے کہا۔ "میں یہاں سے رابعہ کے گھر جاؤں گا اور تدفین تک وہیں رہوں گا۔ آپ آئیں گے؟"

"میں تدفین میں ضرور آؤں گا۔ کون ہے ڈیوٹی پر۔ فون دو ذرا اسے۔"

"ایس پی صاحب بات کرنا چاہتے ہیں۔" میں نے ریسیور انسپکٹر کی طرف بڑھا دیا۔ واردات کے ذکر سے ہی وہ پریشان ہو گیا تھا۔ ریسیور لیتے ہی وہ بوکھلا گیا اور معلوم نہیں رضوی صاحب نے اس سے کیا کہا۔ اس کے حلق سے "یس سر" کے سوا کچھ نہ نکلا۔

ریسیور رکھ کے اس نے اطمینان کا سانس لیا اور مجھ سے واردات کی تفصیل پوچھنی چاہی تاکہ رپورٹ لکھی جا سکے لیکن میں نے کہا کہ میرا ارادہ کوئی رپورٹ لکھوانے کا نہیں ہے۔ ایک کپڑوں کے جوڑے اور ڈیڑھ سو دو سو روپے کی خاطر میں کسی جھنجٹ میں نہیں پڑنا چاہتا۔ پھر میں نے سب انسپکٹر کی اجازت کے بغیر رابعہ کے گھر کا نمبر ملایا۔

"محسن!" میں نے ریسیور اٹھانے کی آواز سنتے ہی کہا۔ "میں سکندر بول رہا ہوں۔"

"سکندر!" محسن نے مضطرب لہجے میں کہا۔ "کیا ہوا، کہاں ہے تو؟ رابعہ ملی؟"

"ہاں۔" میں نے کہا۔ "اب تو ایسا کر کہ رابعہ کی گاڑی لے کر آجا، چابیاں گاڑیاں میں موجود ہوں گی۔ آتے وقت میرے لیے کپڑوں کا ایک جوڑا لیتے آنا اور ایک جوڑا زنانہ کپڑوں کا بھی۔ کتنی دیر میں آئے گا تو؟"

"میں؟ میرا خیال ہے زیادہ سے زیادہ چالیس منٹ۔ بشرطیکہ گاڑی وہیں ملی جہاں کھڑی تھی اور چابیاں بھی موجود ہوئیں۔ بصورتِ دیگر ٹیکسی لینے میں دیر ہو جائے گی۔" محسن نے کہا۔

محسن کے آنے تک تھانے میں خاصا ہنگامہ رہا۔ سب انسپکٹر نے گشت کرنے والے سپاہیوں کو ان کی غفلت پر جھاڑ پلا کے اپنی افسرانہ ذمے داری پوری کی۔ پھر میرے لیے اسپیشل چائے منگوائی۔ مجھے یہ پیش کش بھی کی گئی کہ میں چاہوں تو یہیں سے گاڑی کا اور ضرورت کی تمام چیزوں کا بندوبست کر دیا جائے لیکن میں نے انکار کر دیا۔ شاید تھانے کی تاریخ کا یہ پہلا واقعہ ہو گا جب ایک ننگ دھڑنگ شخص کے ساتھ یہ وی آئی پی جیسا سلوک کیا گیا اور اس کی واقعی عزت افزائی ہوئی ورنہ مجھے وہ رات بھی یاد تھی جب میں انتہائی شریفانہ اور معزز حلیے میں حشمت خان اینڈ کمپنی کے ہاتھوں دوسرے تھانے میں ذلیل ہوا تھا۔

محسن ٹھیک چالیس منٹ بعد فاکس ویگن کو ریس کار کی طرح دوڑاتا تھانے میں داخل ہوا تو آواز پر میں کمرے سے باہر آ گیا۔ میرا حلیہ دیکھ کر محسن ہونقبکا رہ گیا۔ لیکن میں نے اسے تسلی دی کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ لباس تبدیل کیا اور سب انسپکٹر سے ہاتھ ملا کے گاڑی میں بیٹھ گیا۔

"اب ادھر۔" میں نے محسن کو اشارے سے بتایا۔ "رابعہ کو لینا ہے۔ ریوالور لایا ہے تو؟"

"ہاں۔ کوئی خطرے کی بات ہے کیا؟" وہ بولا۔

"ہو بھی سکتی ہے۔" میں نے کہا۔ فاکس ویگن اتنی دیر میں یارڈ تک پہنچ چکی تھی۔ خلافِ توقع مجھے بیرونی پھاٹک کھلا ہوا نظر آیا۔ "بلکہ شاید ہے۔ تو کار یہیں روک لے، اور ریوالور مجھے دے دے۔"

"آخر بات کیا ہے؟" محسن نے جھنجھلا کے کہا۔

"بات لمبی ہے، پھر بتاؤں گا۔" میں نے کہا اور ریوالور لے کر دیوار پر چڑھ گیا۔ اندر اترتے ہی مجھے وہ گاڑی دکھائی دی جس میں مجھے یہاں لایا گیا تھا۔ میں دبے پاؤں آگے بڑھا۔ گاڑی ایسی پوزیشن میں کھڑی تھی کہ صاف معلوم ہوتا تھا گاڑی میں آنے والوں نے بھاگنا چاہا تھا مگر اگلا ٹائر برسٹ ہونے سے گاڑی بے قابو ہو گئی اور جھاڑیوں میں سے گزر کے خالی ڈرم کے ڈھیر میں گھس گئی۔ اگر اس میں کوئی ہوتا تو مجھے آسانی سے نشانہ بنا سکتا تھا کیونکہ میں کھلے میدان میں تھا اور صبح کاذب کے اجالے میں صاف نظر آتا تھا۔ قریب جا کر دیکھنے پر مجھے کار کے اندر بھی کوئی نہیں ملا۔ میں نے اس کا کلوز کمپارٹمنٹ کھولا اور اس میں سے تمام کاغذات نکال لیے۔ پھر میں گیٹ سے باہر گیا اور محسن کے ساتھ کار میں اندر پہنچا۔ بیرک کا دروازہ بدستور مقفل دیکھ کر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ رابعہ نے شاید اپنی فاکس ویگن دیکھ لی تھی۔ اس کی روشنی بہت کم تھی لیکن پھر بھی مجھے دروازے کے قریب خون نظر آ گیا اور میں سمجھ گیا کہ رابعہ نے ٹارگٹ شوٹنگ کا مظاہرہ کرتے ہوئے کسی نہ کسی حملہ آور کو زخمی کر دیا ہو گا۔ باقی جان بچا کے بھاگ گئے اور انہوں نے دانستہ بوجھ کے نکل جانے کی کوشش کی۔ مگر رابعہ نے ان کی یہ کوشش بھی ناکام بنا دی۔ قفل کھول کے اندر جانے کے بعد جب میں نے لائٹ جلائی تو محسن بھی میرے ساتھ تھا۔ میں نے رابعہ کے کپڑے دروازے میں سے اندر پھینک دیے۔

"یہ کون لوگ ہیں؟" محسن نے کہا اور فرش پر سے دس ہزار کے نوٹوں کی گڈی اٹھا لی۔

"ایک تو وہ لالچی ہے جو انہی نوٹوں کی خاطر مارا گیا۔" میں نے کہا۔ "میں نے ابھی تک نوٹ نہیں کیا تھا کہ وہ جاتے وقت یہ رقم اٹھانا بھی بھول گئے ہیں۔ خیر... حق بحقدار رسید۔ ہم معلوم کریں گے کہ چوکیدار کے لواحقین کون ہیں اور یہ رقم ان کو پہنچا دیں گے۔ دوسرا شخص اب تک شکاری تھا لیکن اب ہمارا پہلا شکار ہے۔ اسے ہم اپنے ساتھ لے جائیں گے اور دیکھیں گے کہ ہم اپنے طریقۂ تفتیش سے کیا کچھ معلوم کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔"

رابعہ کپڑے پہن کر دروازے میں نمودار ہوئی۔ اس کا رنگ اب بھی حیا سے لال ہو رہا تھا۔

"وہ آئے تھے اپنے ساتھی کو لے جانے کے لیے؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔" وہ بولی۔ "میں نے ایک کی ٹانگ میں گولی ماری، باقی اسے لے کر بھاگ گئے۔ ٹائر برسٹ ہو جانے کے باوجود وہ نکل گئے۔"

"محسن!" میں نے کہا۔ "اگر اس وقت میں یہ کہوں کہ رابعہ سے زیادہ حوصلہ مند عورت میں نے نہیں دیکھی تو یہ مبالغہ قطعی نہیں ہو گا۔ اب ذرا میری مدد کر۔ پہلے تو جنگی قیدی کو شفٹ کر دیں اور پھر خود بھی فوراً نکل جائیں۔"

"اسے ہم رکھیں گے کہاں؟" محسن نے سوچتے ہوئے کہا۔ "ہم پولیس کے پاس تو جا نہیں سکتے۔"

"میرے خیال میں رابعہ کا گھر کافی بڑا ہے۔" میں نے کہا۔ "رابعہ کے دل کی طرح۔ مگر اسے وہاں رکھنا ٹھیک نہیں۔"

"دل میں تو کوئی خوش قسمت ہی رہ سکتا ہے۔" محسن نے کہا۔ "گھر میں بھی چوری کا مال رکھنا شاید ایک وکیل کے اصولوں کے خلاف ہو۔"

"عمر کے ایک دور میں ہر شخص اصولوں کے معاملے میں بڑا آئیڈیلسٹ ہوتا ہے۔" رابعہ بولی۔ "میں بھی سمجھتی تھی کہ اصول ہی سب کچھ ہوتے ہیں اور دنیا اصولوں پر ہی چل رہی ہے، بے اصول لوگ بہت کم ہیں چنانچہ قوتِ ارادی اور استقامت سے ان کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ باتیں کتنی کتابی ہیں۔ اس کا تجزیہ عملی زندگی میں آ کے ہوا۔ زندگی صرف اپنی ذات کے مفادات کے تحفظ کی جنگ ہے اور آدمی ایک خودغرض حیوان سے زیادہ کچھ نہیں جسے اپنی بقا سب سے زیادہ عزیز ہے۔ وہ جو کہتے ہیں نا کہ محبت اور جنگ میں سب اصول خارج از نصاب ہو جاتے ہیں، وہ غلط نہیں

کہتے:"

"باالفاظِ مختصر مس رابعہ قاری ایڈووکیٹ ہائیکورٹ کو یہ مالِ غنیمت اپنے گھر میں رکھنے پر کوئی اعتراض نہیں" محسن نے کہا۔

"مجھے یہ تو بتا دو کہ تم اس شخص کا کرو گے کیا؟ میرا مطلب ہے تفتیش کے بعد؟" رابعہ نے کہا۔

"ایک بار میں ڈیرہ اسماعیل خان گیا تھا" میں نے کہا "وہاں شکاری کھیتوں سے تیتر پکڑتے ہیں اور اس کے لیے بڑے دلچسپ طریقے اختیار کرتے ہیں۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ تربیت یافتہ مادہ کو نیکر کھڑی فصلوں میں چھپ جاتے ہیں اور یہ مادہ وہ آوازیں نکالتی ہے جس سے نر تیتر متوجہ ہوتے ہیں اور شکاری کے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس جاتے ہیں۔ پھر نر تیتر اپنی آواز سے ترغیب دیتا ہے اور مادہ تیتر اس پُر فریب آواز کا شکار ہونے آجاتی ہیں، تو ہم بھی تفتیش کے بعد اس سے وہی کام لیں گے جو ڈیرہ اسمٰعیل خان کے شکاری استعمال کرتے ہیں۔ اس پر شکار کو بُلائیں گے۔ یہ خطرناک کام ہے۔ ممکن ہے وہ ہمارے دام میں نہ آئیں۔ اُلٹا اسے چھڑا کے لے جانے کے لیے طاقت کا استعمال کرنے کی کوشش کریں۔ ہم چوبیس گھنٹے قلعہ بند ہو کے مورچہ سنبھالے تو نہیں بیٹھے رہ سکتے۔"

"لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے سکندر! کہ ان کے لیے یہ آدمی غیر اہم ہو" محسن نے کہا۔ "نچلی سطح کا کوئی معمولی سا کارکن ہو جسے اوپر والوں کے بارے میں زیادہ معلوم ہی نہ ہو۔"

"اگر ایسا ہوتا تو وہ اسے چھڑا کے لے جانے کے لیے دوبارہ آنے کا خطرہ مول نہ لیتے۔" میں نے کہا۔

"پھر تو یہی بہتر ہوگا کہ ہم اسے کل کہیں اور شفٹ کر دیں۔" محسن نے کہا۔ "آج تو وہ لوگ آنے سے رہے۔ کل تک دیکھیں گے کہ کون سی جگہ مناسب رہے گی۔ آج اسے میڈیکل ایڈ وغیرہ کی ضرورت بھی ہوگی۔"

آج کے ذکر پر مجھے خیال آیا کہ آج کے دن ہمیں رابعہ کی ماں کو سپردِ خاک کرنا ہے اور یہ خبر رابعہ کو دینی ہے۔ پھر اور بہت سے لوگوں کو دینی ہے۔ وقتی کامیابی کی خوشی میں ہم یہ بھول گئے تھے کہ رابعہ کے گھر میں بھی ایک لاش پڑی ہے جس کو سفرِ آخرت درپیش ہے اور ہمارے لیے آج کا دن بہت سی اعصاب شکن آزمائشوں کا دن ہے۔ صبحِ صادق کا اُجالا پھیلنے لگا تھا اور ہمیں جلد از جلد گھر پہنچنا تھا۔

"رابعہ!" میں نے کہا۔ "تم نے ابھی تک اپنی امی کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا۔"

"اس لیے کہ تم خود اس ذکر سے گریز کر رہے تھے" رابعہ نے سکون سے کہا۔ "تم نے بھی بہت کچھ کہا مگر ان کے بارے میں ایک لفظ نہیں کہا۔ جانتے بوجھتے۔ کیا ان کی حالت بہت بگڑ گئی ہے؟"

میں نے مجرموں کی طرح محسن کی طرف دیکھا اور ہم دونوں نے سر جھکا لیا۔ خاموشی کا ایک طویل سوگوار وقفہ آیا۔

"تو گویا وہ اب دنیا کے غم و اندوہ، ساری مصیبتوں اور تمام الجھنوں سے نجات حاصل کر چکی ہیں" رابعہ نے بالآخر اس سکوت کو توڑا اور ایک بار پھر ہماری خاموشی کو سمجھ لیا۔ "خدا کو یہی منظور تھا سکندر! ڈاکٹروں نے مجھے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ کوئی چانس نہیں ہے۔"

"تمہیں ڈاکٹروں نے بتا دیا تھا؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"تم نے اصرار کیا ہوگا؟"

"میں جھوٹی تسلیوں کی قائل نہیں" وہ خلا میں دیکھتے ہوئے بولی۔ "جب تک میں اسیر رہی، مجھے ہر لمحہ ان کا خیال تھا اور میں نے ان سے صرف ایک درخواست کی تھی۔ ان کے شریفانہ طرزِ عمل کو دیکھتے ہوئے۔ اور انہوں نے میرے وعدے پر اعتبار کرتے ہوئے مجھے فون پر ڈاکٹر سے بات کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ کوئی ڈاکٹر درانی تھا۔ میری اس سے نو بجے کے قریب بات ہوئی تھی۔"

میں احمقوں کی طرح اسے دیکھتا رہا۔ "تم نے کیا بتایا تھا اسے۔ تم کہاں سے بول رہی ہو اور کون ہو؟"

"میں نے اسے اپنا صحیح نام بتایا تھا۔ رشتہ بھی بتایا تھا اور یہ بھی کہ میں گھر سے بات کر رہی ہوں" وہ بولی۔ "وہ بڑا اچھا آدمی تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ مجھ میں ہر تلخ اور سنگین حقیقت کا سامنا کرنے کی ہمت ہے، اس لیے بے خوف و خطر مجھے سچ بتا دو۔ میں ہسٹریا میں مبتلا نہیں ہوں گی اور اس نے مجھے صاف بتا دیا کہ وہ رات نہیں کاٹ سکیں گی۔ اس کے بعد میں نے کہہ دیا تھا کہ ناگزیر وجوہ کی بنا پر میں شاید ہسپتال نہ جا سکوں۔ اگر خدانخواستہ امی کا انتقال ہو جائے تو سکندر بخت یا محسن نام کے کسی بھی شخص کو لاش دے دی جائے۔ اس نے پوچھا تھا یہ آپ کے کون ہیں۔ میں نے اسے مطمئن کرنے کے لیے کہہ دیا تھا کہ میرے کزن ہیں۔"

میں ہکا بکا کھڑا رہا۔ ڈاکٹر درانی کو سب معلوم تھا۔ اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا اور خود ہی سب کچھ سمجھ لیا مگر اپنے رویے سے کسی شک کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ کچھ لوگ کتنے معقولیت پسند اور اعتماد کرنے والے ہوتے ہیں۔ اس نے بلا چوں و چرا ہمیں بھی قانونی وارث مان لیا تھا۔ لیکن اپنی تسلی کے لیے یا محض تجسس کے باعث یہ بھی پوچھا تھا کہ آپ کا مس رابعہ سے کیا

رشتہ ہے اور میں نے جو رشتہ بتایا تھا وہ رابعہ نے نہیں بتایا تھا، تاہم اس نے یقین اس لیے کر لیا تھا کہ لڑکیاں ایسی باتیں خود نہیں بتاتیں اور کزن بھی منگیتر ہو سکتے ہیں۔ نو بجے وہ رابعہ کو سب کچھ بتا چکا تھا۔ میں نے اسے اور بھی بہت کچھ بتایا جو رابعہ نے نہیں بتایا تھا اور وہ انجان بنا رہا جیسے وہ کچھ نہیں جانتا اور جاننا چاہتا بھی ہے تو صرف مدد کرنے کے لیے۔ عجیب آدمی تھا۔ رابعہ نے بھی اس سے کہا تھا کہ میں گھر سے بول رہی ہوں۔ میں نے بھی کہا تھا کہ مس رابعہ کے گھر سے بول رہا ہوں۔ رابعہ نے کہا تھا کہ میں نہیں آ سکتی اور میں نے کہا تھا وہ راولپنڈی چلی گئی ہیں۔ کہیں نہ کہیں سے میرے اور رابعہ کے بیانات کے درمیان مطابقت کا رشتہ قائم ہو گیا تھا۔ باقی باتیں اس کے لیے غیر اہم تھیں مگر کسی نتیجے پر پہنچ کے وہ میری مدد کے لیے تیار ہو گیا تھا۔

"اب کیا سوچ رہے ہو؟" رابعہ نے کہا۔

"میں؟ کچھ نہیں" میں نے کہا۔ "سوچ رہا تھا کہ تمہارا یہ رُوپ کتنا مختلف ہے۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ تم اتنی غیر جذباتی انداز میں بھی سوچ سکتی ہو اور تمہارے اعصاب اتنے مضبوط ہیں۔ میرا خیال تھا تم وکیل ہونے کے باوجود ایک کمزور اور جذباتی لڑکی ہو۔"

"یہ تو ایک حیوانی جبلت ہے" وہ بولی۔ "خطرے کے وقت اور ہنگامی حالات میں قدرت کا فراہم کردہ دفاعی نظام ہماری مدد کرتا ہے۔ بلی بھی شیر ہو جاتی ہے۔"

ہم تینوں ایک ساتھ باہر نکلے۔ میں نے عمداً دروازہ کھلا چھوڑ دیا اور بیرونی گیٹ بھی تاکہ لوگ جلد از جلد متوجہ ہو جائیں اور اس نوجوان کی لاش بے گور و کفن نہ پڑی رہے جس نے جانے کتنی تمناؤں کو تکمیل کا رنگ دینے کے لیے دس ہزار روپے سمیٹنے چاہے تھے اور جب وہ اپنے ہر خواب کی تعبیر کو دسترس میں دیکھ رہا تھا تو تقدیر اس پر خندہ زن تھی۔ پلک جھپکتے میں وہ دس ہزار کی رقم تک پہنچتے پہنچتے مادی خواہشات کی اس دنیا سے دور وہاں پہنچ گیا جہاں کوئی آرزو کوئی احساس کوئی امید نہیں ہوتی۔ رابعہ ڈرائیونگ کرنا چاہتی تھی مگر میں نے اسے اجازت نہیں دی اور وہ میرے ساتھ بیٹھ گئی۔ محسن پچھلی سیٹ پر اس سیاہ پوش کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا جو اب کراہنے لگا تھا اور ہوش میں آ رہا تھا۔ محسن نے اسے سیدھا پکڑ رکھا ورنہ وہ آگے کو لڑھک جاتا۔

"ہم پہلے رابعہ کو گھر پر چھوڑیں گے" میں نے کہا۔ "اس شخص کو کسی ایسی جگہ بند کریں گے جہاں اسے کوئی نہ دیکھ سکے اور جہاں سے اس کی آواز بھی کسی کے کانوں تک نہ پہنچے۔ پھر تم گھر ٹھہرنا اور میں خادمہ کو لینے جاؤں گا۔ خادمہ کو رابعہ کے پاس پہنچا کے ہم دونوں ذرا سی دیر کے لیے وہیں جائیں گے۔ داروغہ والا سے آگے اسی زیرِ تعمیر کوٹھی میں۔"

"وہ کیوں؟" رابعہ نے کہا۔ "کسی نئی مشکل میں گرفتار ہونے کے لیے؟" اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی اور وہ چپکے چپکے رو رہی تھی۔

"دراصل میں نے ایک حماقت کی تھی" میں نے کہا۔ "میں اپنے کپڑے وہاں چھوڑ آیا تھا۔ وہاں ایک لاش پڑی ہے جو سائیں چوکیدار کی ہے۔ میرے کپڑوں کا وہاں موجود ہونا میرے لیے مشکلات کا باعث بن سکتا ہے۔"

"وہ... وہ سائیں چوکیدار تھا؟" محسن نے پیچھے سے کہا۔ "تجھے کیسے معلوم ہوا؟"

"مجھے انہی لوگوں نے بتایا تھا جو اسے قتل کر کے ڈال گئے تھے۔" میں نے کہا۔ "جو ہر جگہ یہی کرتے ہیں۔ تو نے جس کو فرار ہوتا دیکھ کر گولی چلائی تھی وہ تو بچ کے نکل گیا تھا۔"

گھر پہنچنے تک ہم میں سے کسی نے کوئی بات نہیں کی۔ اس وقت تک افق پر صبح کے آثار پیدا ہو چلے تھے اور اُجالا پھیل گیا تھا۔ آسیب زدہ نظر آنے والی کوٹھی پر موت سایہ فگن تھی۔ در و دیوار سوگوار دکھائی دیتے تھے اور لان میں درخت بھی اداس اور سرنگوں کھڑے تھے۔ میں رابعہ کو اوپر لے گیا اور محسن نے سیاہ پوش کو اتارا جس کی صورت نقاب ہٹ جانے کے بعد سامنے آ گئی تھی لیکن ہمارے لیے اجنبی تھی۔ ماں کو دیکھتے ہی رابعہ کے صبر و ضبط کا پیمانہ چھلک گیا۔ وہ بے اختیار ماں کی لاش پر گر گئی اور اس سے چمٹ کر رونے لگی۔ میں نے اسے رونے دیا۔ اس کے اعصاب کی کشیدگی اسی طرح کم ہو سکتی تھی۔ اس نے بڑی ہمت سے جسمانی و ذہنی عذاب برداشت کر لیا تھا مگر انسانی جسم فولاد کی مشین نہیں ہے کہ متاثر ہی نہ ہو۔ قوتِ برداشت سے کام لے کر ہر سختی جھیل جانا واقعی بہادری ہے مگر غم سے ذہن کو متاثر نہ ہونے دینا گوشت پوست کے بنے ہوئے آدمی کے لیے ناممکن ہے۔ رابعہ کے دل میں بھی غم اور رنج و الم کے جذبات کا آتش فشاں ابل رہا تھا جو بالآخر پھٹ گیا اور وہ روتے روتے بیہوش ہو گئی۔ میں نے اسے دونوں ہاتھوں سے اٹھایا اور اس کے اپنے بیڈ روم میں لے گیا۔

"کیا ہوا ہے اسے؟" محسن دروازے سے نمودار ہوا۔

"کچھ نہیں" میں نے کہا۔ "شدتِ غم سے بیہوش ہو گئی ہے۔ تو ایسا کر، کافی بنا لا اور رابعہ کے لیے چینی کی بجائے گلوکوز ڈال کے لانا۔ شاید کچن یا فرج میں ہو۔ میں اس کے پاس بیٹھا ہوں۔"

محسن کے کافی لے کر آنے سے پہلے ہی رابعہ کو ہوش آ گیا۔ میں نے زبردستی کی حد تک اصرار کر کے اسے کافی پلائی جس سے

اس کی طبیعت فوری طور پر سنبھل گئی۔ "سکندر! میں بہت بدبخت ہوں۔ ماں نے آخری وقت میں مجھے یاد تو کیا ہوگا؟"

میں نے کسی تذبذب کے بغیر نفی میں سر ہلا دیا۔ "میں انتقال کے وقت وہیں تھا۔ انہیں ہوش آیا ہی نہیں۔" یہ جھوٹ اس کے احساسِ غم میں اضافہ کرنے والے سچ سے بہتر تھا اور مجھے یقین تھا کہ خدا نے اسے جھوٹ شمار نہیں کیا ہوگا۔

"میرا خیال ہے اب ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔" محسن نے کہا۔ "ہمیں بہت سے کام کرنے ہیں۔"

"تو نے اس شخص کو کہاں رکھا ہے؟" میں نے کہا۔ "اس کے نکل بھاگنے کا تو کوئی امکان نہیں؟"

"میں نے اسے اسٹور میں ڈال دیا ہے ہاتھ پیر باندھ کے۔" محسن نے کہا۔ "لیکن اسے علاج معالجے کی ضرورت ہے سکندر! ورنہ وہ ہمیں کچھ بتانے سے پہلے ہی مر جائے گا۔"

"یہ تو بڑا مسئلہ ہوگا۔" میں نے کہا۔ "ڈاکٹر آئے گا تو بہت سے سوالات کرے گا۔"

"ڈاکٹر کو میں بلالیتی ہوں۔" رابعہ نے کہا۔ "ہم اسے جو کچھ بتائیں گے وہ مان لے گا۔ بشرطیکہ وہ خود نہ بولے۔"

"اس کو خاموش رکھا جا سکتا ہے اگر مارفیا وغیرہ کا ایک انجکشن دے دیا جائے۔" میں نے کہا۔

"مارفیا تو نہیں لیکن ڈائزی پام کا انجکشن ہے۔" رابعہ نے کہا۔ "سرنج وغیرہ بھی ہے۔ جب امی پر ڈیپریشن کا شدید دورہ پڑتا تھا اور وہ سو نہیں پاتی تھیں تو... تو میں لگا دیتی تھی۔ وہ کسی حد تک اس کی عادی ہو گئی تھیں۔ میں مجبور تھی۔"

میں نے اور محسن نے نیچے آکے اس سیاہ پوش کے کپڑے بدلے اور اسے شریفانہ لباس میں لاتے ہوئے ہمارے ہاتھ منجمد خون میں بھر گئے۔ یہ خون محسن کی قمیص کے شانے پر بھی تھا۔ اس نے کوشش کی تھی کہ رابعہ کی گاڑی کی سیٹ پر داغ نہ آئے اور اس کوشش میں کامیاب رہا تھا۔ وہ شخص اب بولنے لگا تھا اور ہماری منت سماجت کر رہا تھا کہ وہ اسے جانے دیں لیکن اس کے لبوں سے الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر نکل رہے تھے۔ "خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔ مجھے جانے دو... وہ مجھے مار ڈالیں گے...!" کے سوا وہ کچھ نہیں کہہ پا رہا تھا۔ میں نے اس کو بڑی احتیاط سے انجکشن دیا اور وہ چند منٹ کے اندر اندر بے سدھ ہو گیا۔ میں نے محسن نے اسے گیسٹ بیڈ میں منتقل کیا اور اتفاقِ رائے سے ایک کہانی تیار کی۔ یہ شخص ہمیں دروازے پر اسی طرح پڑا ملا تھا۔ معلوم نہیں کوئی اسے وہاں ڈال گیا تھا یا وہ خود چل کے رابعہ کے گھر تک آ پہنچا تھا۔ ہوش میں آئے گا تو معلوم ہوگا کون ہے؟

پولیس کو ہم اس لیے رپورٹ نہیں کرنا چاہتے کہ آج ہمیں تمام دن رابعہ کی ماں کے کفن دفن کے انتظامات میں گزارنا ہے۔ کل تک یہ ہوش میں آجائے گا تو خود ہی بتا دے گا۔

رابعہ اس عرصے میں اپنے کچھ رشتہ داروں کو فون کر رہی تھی اور ان سے درخواست کر رہی تھی کہ وہ اپنے قریب رہنے والے دوسرے لوگوں کو اطلاع کر دیں۔ جب ہم پھر اوپر اس کے بیڈ روم میں پہنچے تب بھی وہ فون کر رہی تھی۔

"اب میں جا کے ماسی کو لاتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "مجھے آنے جانے میں آدھے گھنٹے سے زیادہ نہیں لگے گا اور اس وقت صبح کے ساڑھے چھ بجے ہیں۔ سات بجے اگر میں اور محسن گئے تو ساڑھے آٹھ تک واپس آجائیں گے۔"

"میرا تو خیال ہے تم غلطی کر رہے ہو۔" رابعہ نے کہا۔ "پھر پتا نہیں کیا ہوتا ہے؟"

"جس انداز سے انہوں نے مجھے یہ اطلاع دی تھی اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مجھے دھمکی دے رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "کہ ہم یہ بات پولیس کو بتا سکتے ہیں اور پولیس کھوجی کتوں کی مدد سے سیدھی یہاں آسکتی ہے۔ مشکل یہ ہے کہ ایک شخص ہمیں وہاں دیکھ چکا ہے۔ اس نے محسن سے باتیں بھی کی تھیں۔"

"ٹھیک ہے۔" رابعہ نے کہا۔ "جاؤ، مگر دیکھو خدا کے لیے عقل سے کام لینا۔ اس وقت میں کوئی اور صدمہ برداشت نہیں کر سکتی۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ میں اکیلی رہ گئی ہوں۔"

"یہ کیسی باتیں شروع کر دیں تم نے؟" میں نے کہا۔ "تم تو ہماری مددگار ہو۔ ہمیں بچا رہی ہو۔"

"میرا مشورہ تو یہی ہے کہ اس شخص کو پولیس کے حوالے کر دیا جائے۔" وہ بولی۔ "وہ خود معلوم کر لیں گے کہ مجھے اغوا کر کے لے جانے والے کون تھے۔"

"وہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ پوچھیں گے مثلاً اغوا کا مقصد۔ اور ہمیں بہت سی ایسی باتیں بتانی پڑیں گی جو ہم بتانا نہیں چاہتے۔" میں نے کہا۔ "خط کا معاملہ ختم ہوا۔ تم بخیر و عافیت واپس آگئیں۔ اب تمہیں بلاوجہ خبر کا عنوان بنانے سے کیا حاصل ہوگا۔ اگر پولیس کے حوالے کرنا ہی پڑا تو ہم کوئی اور کیس بنا دیں گے جس میں تمہارا نام نہ آئے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ میرے دشمنوں کا آدمی ہے اور اس نے مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ اس کے ساتھی اس کو زخمی چھوڑ کے فرار ہو گئے۔ ابھی تم اس کی فکر مت کرو۔ تمہاری ذات کو فی الحال کوئی خطرہ لاحق نہیں اور یہی بہت اطمینان کی بات ہے۔ ہم نے وہ خط تمہارے پاس

رکھوا کے غلطی کی تھی اور تمہیں بھی اپنے ساتھ براہِ راست ملوث کر لیا تھا۔ میں اس غلطی کا اعادہ نہیں کروں گا۔ کل میں اس کو کسی ایسی جگہ شفٹ کر دوں گا، ممکن ہوا تو آج ہی شام کو، جہاں وہ آسانی سے نہ پہنچ سکیں اور تم محفوظ رہو۔ تم عدالت کی حد تک میرے قانونی معاملات کی مشیر رہو گی۔ باقی معاملات سے تمہارا دور ہی رہنا اچھا ہے کیونکہ جو کھیل ہم کھیل رہے ہیں وہ بہت خطرناک ہے۔"

"یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی طرح تم خطرات کے اس جنگل سے نکل آؤ۔" رابعہ بولی۔ "عزت اور حفاظت کے ساتھ۔"

"اگر یہ میرے اختیار کی بات ہوتی تو میں تمہارا حکم نہ ٹالتا۔" میں نے کہا اور یہ نہیں دیکھا کہ محسن مجھے کتنے غور سے دیکھ رہا ہے۔ "جتنی ضرورت تمہیں میری ہے اتنی ہی مجھے تمہاری بھی ہے۔ لیکن بہت سی باتیں ایسی ہیں جو ابھی تمہیں معلوم نہیں۔ کسی دن میں سب کچھ تمہیں بتا دوں گا لیکن ابھی نہیں۔ اس لیے نہیں کہ مجھے تم پر اعتماد نہیں۔ نہیں، میں تمہارے لیے مزید پریشانیاں پیدا کرنا نہیں چاہتا۔ میں ناگزیر مجبوریوں کی زنجیر سے بندھا ہوا ہوں اور یہ معاملات ایسے ہیں جن میں قانون میری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ اپنی مدد میں آپ کر سکتا ہوں چنانچہ مجھے یقین ہے کہ خدا میری مدد کرے گا۔ بات صرف صبر، حوصلے اور استقامت کی ہے۔"

"اب تو جا۔" محسن نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ میں نے سر ہلایا اور دروازے کی طرف بڑھا۔

"محسن!" میں نے دروازے کے قریب رک کر کہا۔ "عین ممکن ہے وہ ہمارے تعاقب میں آئے ہوں یا ان کے کسی آدمی نے ہمیں دروازے سے کار میں اندر آتے دیکھا ہو اور انہیں اطلاع کر دی ہو۔ اگر وہ میری عدم موجودگی میں آئیں تو حالات کو سنبھال لینا اور رابعہ کو محفوظ رکھنا۔"

"میں اپنی حفاظت خود کر سکتی ہوں۔" رابعہ نے سائڈ ٹیبل کی دراز میں سے ریوالور نکالا۔ "اور میرا نشانہ محسن سے اچھا ہے۔"

"اگر قتل و خونریزی نہ ہو آج تو بہت اچھا ہے۔" میں نے کہا۔ "تم ایسا کیوں نہیں کرتیں کہ آس پاس کے گھروں میں ابھی اطلاع کرا دو۔ کچھ لوگ آجائیں گے تو ان کی موجودگی میں کسی کی ہمت نہ ہوگی۔"

"تم باہر جاتے ہوئے ساتھ والی دونوں کوٹھیوں میں بتا جاؤ۔" رابعہ نے کہا۔ "جب ماسی آجائے گی تو میں باقی گھروں میں بھی خبر پہنچا دوں گی۔"

پندرہ منٹ بعد میں نے ماسی کے دروازے پر کار روکی۔ وہ اتنی صبح مجھے دیکھتے ہی سمجھ گئی کہ میرے آنے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے، اور اس کا رنگ اڑ گیا۔ جب میں نے اس کے خدشات کی تصدیق کی تو اس نے رونا شروع کر دیا اور اس کے ساتھ گھر کی دیگر عورتیں بھی ایک جواں سال لڑکے کو لے کر کار میں بیٹھ گئیں۔ ماسی تمام راستہ روتی رہی اور اس کے ساتھ آنے والی ایک ہم عمر اور ایک نوجوان عورت اسے تسلی دیتی رہی۔ میں نے یہ پوچھنا مناسب نہیں سمجھا کہ باقی لوگ کون ہیں اور دس منٹ بعد ان کو رابعہ کی کوٹھی پر اتار دیا جہاں ابھی خیریت تھی۔ ماسی کے رونے پیٹنے کی آواز سے گھر کی فضا یکلخت ماتمی ہو گئی۔ اندر مجھے دو اجنبی خواتین کے چہرے بھی دکھائی دیے جو غالباً پاس پڑوس سے آئی تھیں۔

محسن مجھے نیچے ہی ملا اور گیسٹ بیڈ روم میں لے گیا جہاں ڈاکٹر، ہمارے جنگی قیدی کی مرہم پٹی کر رہا تھا۔

"یہ... یہ تو گولی کا زخم ہے۔" ڈاکٹر نے ہم میں سے کسی کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ہم دونوں خاموش رہے۔ "لیکن کیا یہ بات عجیب نہیں ہے کہ دروازے پر خون کا کوئی داغ نہیں۔ کس نے اٹھایا تھا اسے؟"

"میں نے۔" محسن نے کہا۔ "میں نے غور نہیں کیا تھا۔ اس وقت اندھیرا ابھی تھا۔"

"رابعہ نے مجھے فون پر یہی بتایا تھا۔" وہ پٹی لپیٹتے ہوئے بولا۔ "چنانچہ میں نے آتے وقت دروازے کو غور سے دیکھا تھا۔"

ہمارے بیان کی ایک فاش غلطی کو ڈاکٹر نے پکڑ لیا تھا لیکن اطمینان کی بات یہ تھی کہ وہ گھر کا ڈاکٹر تھا۔ اس سے یہ اندیشہ نہیں تھا کہ وہ ہم سے بات کیے بغیر پولیس کو فون کرے گا۔ ہم نے کہا کہ اصل بات کچھ اور ہے جو ہم بعد میں بتائیں گے۔ کیونکہ آج اس کا موقع نہیں اور اندیشہ یہ ہے کہ اس سے رابعہ کی بدنامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اس نے ناگواری سے سر ہلایا اور کچھ کہے بغیر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں اس کا بیگ لے کر دروازے تک گیا۔ محسن میرے ساتھ رہا۔

"تھینک یو۔" اس نے کار میں بیٹھنے کے بعد کہا۔ "ایک بات یاد رکھو۔ ڈاکٹر اور وکیل سے حقیقت چھپائی جائے تو کیس بگڑ جاتا ہے اور وہ صحیح مدد بھی نہیں کر سکتے۔ میں پھر آؤں گا دو بجے۔ جنازے میں شرکت کے لیے۔" اس نے کار کو بیک کیا اور ابھی اس کی گاڑی باہر نکلی ہی تھی کہ ایک ٹیکسی اندر آگئی۔ اس میں رابعہ کے کچھ رشتے دار آئے تھے۔ میں نے ٹیکسی کو روک لیا۔ محسن نے مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"میں نے پروگرام میں تھوڑی سی تبدیلی کی ہے۔" میں نے کہا۔ "میں رابعہ کی کار لے کر جاؤں گا۔ کار کو سڑک پر چھوڑ دوں

گا اور گھوم کر پچھلی طرف سے اس زیرِ تعمیر کوٹھی میں جاؤں گا۔ تو ٹیکسی میں میرے پیچھے رہنا لیکن رکنے کی بجائے ٹیکسی کو آخر تک لے جانا۔ ڈرائیور کچے راستے پر جانے کے لیے تیار نہ ہو تو اسے کچھ دے دینا۔ دس بیس اوپر۔ مسلح ہم دونوں ہوں گے۔"

"اس کا فائدہ؟" محسن نے کہا۔ "تیرا خیال ہے وہاں اب بھی کوئی خطرہ ہے؟"

"ہاں، میں نے رابعہ کے سامنے اس کا ذکر نہیں کیا تھا۔" میں نے کہا۔ "اس کے سامنے تو میں نے کہا تھا کہ دشمنوں نے دھمکی کے انداز میں بات کی ہے لیکن حقیقت مجھے برعکس لگتی ہے۔ انہوں نے جال پھیلایا ہے۔ میرے ذہن سے کپڑوں کا خیال نکل گیا تھا۔ انہوں نے مجھے یاد دلایا کہ میرے کپڑے ایک چوکیدار کی لاش کے پاس پڑے ہیں۔ یہ یاد دلانے کا کیا مقصد ہو سکتا ہے۔ یہی کہ میں اپنے کپڑے لینے جاؤں اور پکڑا جاؤں۔ انہیں یقین ہوگا کہ اب میں ضرور آؤں گا اور وہ میرے منتظر ہوں تو تعجب کی بات نہیں۔"

"الگ الگ جانے میں کون سی عقلمندی ہے؟" محسن بولا۔ "ایک ساتھ ہوں گے تو مقابلہ کر لیں گے۔"

"میں ایک چانس لے رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "ان کو بھی خیال ہوگا کہ میں آیا تو صبح دم آؤں گا۔ اس سے پہلے کہ دن چڑھے اور کوئی اندر آ کے لاش کو دیکھے۔ آٹھ بجے تک کوئی خطرہ نہیں اور ہم وہاں آٹھ بجے تک ہی پہنچیں گے۔ وہ بے چینی سے ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے اور جب رابعہ کی فاکس ویگن کو سڑک پر رکتے اور مجھے گاڑی سے اتر کر اکیلا آتے دیکھیں گے تو مطمئن ہو جائیں گے کہ میرے ساتھ اور کوئی نہیں۔ انہیں یہ خیال بھی آئے گا کہ محسن کو میں نے رابعہ کے پاس یا اس جنگی قیدی کی حفاظت کی خاطر پیچھے چھوڑا ہے۔ ایسے میں اگر تیری ٹیکسی بعد میں نمودار ہوئی اور کچے راستے پر چل کے ادھر آئی تو انہیں یہ شک نہیں ہوگا کہ اس میں تو ہو گا۔ ادھر دوسرے گھر بھی ہیں جو ذرا فاصلے پر ہیں۔ وہاں بھی لوگ آتے ہی رہتے ہیں۔ تو ٹیکسی کو کسی اور مکان کی طرف لے جانا اور پھر وہاں سے سیدھا دروازے کے راستے اندر۔ امید ہے میں نیچے ہی مذاکرات میں مصروف ملوں گا یا پھر اپنے کپڑے سمیٹ کر نکلنے والا ہوں گا۔ خدا نے چاہا تو ہم نو بجے تک واپس آ جائیں گے۔"

روانہ ہونے سے پہلے حفظِ ماتقدم کے طور پر میں نے اپنا ریوالور خالی کیا اور محسن نے اپنا ریوالور پورا لوڈ کر لیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ میرے اندیشے درست ثابت ہوئے اور دشمن مجھے منتظر ملا تو اندر قدم رکھتے ہی مجھے ہتھیار ڈالنے پڑیں گے۔ میرا ارادہ ایک چھوٹا سا جوا کھیلنے کا تھا۔ اگر میرے ہاتھ میں اندر جاتے وقت ریوالور ہوا تو وہ سب سے پہلے مجھے محصور کریں گے اور پھر کہیں گے ریوالور پھینک دو۔ ممکن ہے وہ شخص جو اپنے ریوالور کی زد پر مجھے اس حکم کی تعمیل پر مجبور کرے۔ میرا ریوالور اٹھا لے۔ دونوں ہاتھوں میں دو ریوالور کون رکھتا ہے۔ اگر اس نے اپنا ریوالور جیب میں ڈال لیا اور میرا اسلحہ میرے ہی خلاف استعمال کر کے اسے اپنی فتح سمجھا تو دھوکے میں مارا جائے گا۔ عملاً وہ غیر مسلح ہو گا لیکن یہ بات اسے گولی چلانے کی نوبت آنے تک معلوم نہیں ہو گی۔ میں یا محسن تھوڑی محفوظ رہیں گے اور جتنی دیر میں اسے ریوالور کے خالی ہونے کا احساس ہو گا اور کوئی دوسرا اپنا ریوالور نکالے گا ہمیں کافی مہلت مل جائے گی۔ میرے حریف جوڈو یا کراٹے کے داؤ پیچ نہیں جانتے تھے جو میں جانتا تھا۔ میں دو منٹ میں چار افراد کو کسی بھی طریقے پر لٹا بھی سکتا تھا اور کسی مہلک وار سے ختم بھی کر سکتا تھا۔

دوسری احتیاط محسن نے کی۔ اس نے اپنا حلیہ تھوڑا سا بدل لیا۔ گھر کے اندر ہی اسے چارخانے کی ایک لنگی مل گئی جسے اس نے پتلون کے اوپر لپیٹ لیا۔ جوتوں کی جگہ اس نے چپل پہن لیے۔ رابعہ پڑھتے وقت عینک استعمال کرتی تھی۔ محسن نے اس کے شیشے توڑ کے خالی فریم کو ناک پر فٹ کر لیا اور یہ زنانہ فریم اس کے مردانہ چہرے پر بہت مضحکہ خیز نظر آنے لگا۔ اس کے بعد قمیص اتار کے وہ صرف بنیان میں رہ گیا۔ یہ ساری کارروائی اس نے تمام لوگوں سے چھپ کر گیسٹ بیڈ روم میں کی۔ یہاں تک کہ رابعہ کو بھی اس کی خبر نہ ہوئی۔ پھر وہ بڑی پھرتی سے ٹیکسی میں جا بیٹھا۔ میں نے بڑے رعب سے ٹیکسی ڈرائیور کو پچاس روپے کا نوٹ دیا اور اسے بتایا کہ کہاں جانا ہے۔ "باقی پیسے رکھ لینا۔" میں نے بے نیازی سے کہا اور ڈرائیور کے ہکا بکا چہرے کو نہیں دیکھا جس کے لیے ٹپ کی رقم کرائے سے زیادہ ہو گئی تھی۔

میں نے ایک کام یہ بھی کیا کہ اپنے اسیر کو دوبارہ اسٹور روم میں شفٹ کر دیا اور اسے باندھنے کے علاوہ اس کے حلق میں کپڑا بھی ٹھونس دیا تاکہ خدانخواستہ وہ ہوش میں آ جائے تو چلانے نہ لگے۔ اس کے سیاہ نقاب اور خون آلودہ لباس کو جوتوں سمیت میں نے ردی کاغذ میں لپیٹا اور مٹی کے تیل میں بھگو کے پلاسٹک کی ایک تھیلی میں ڈال لیا۔ میرا ارادہ تھا کہ اسے راہ میں جہاں موقع ملا نذرِ آتش کر دوں گا۔

جب میں کار لے کر نکلا تو ٹیکسی غائب ہو چکی تھی۔ محسن کا حلیہ بہت اطمینان بخش تھا۔ بنیان، چارخانے کی دھوتی، چپل اور عینک میں وہ وہیں کا کوئی مزدور نظر آتے گا اور اس وقت تک نہیں پہچانا جائے گا جب تک سامنے آ کے ریوالور نہیں نکال لے گا۔ نہر کے کنارے چلتے ہوئے ایک مختصر وقفہ ایسا

آیا جب مجھے آگے پیچھے کوئی گاڑی دکھائی نہ دی۔ میں نے فاکس ویگن روکی۔ نیچے اتر کے کپڑوں کی تھیلی سڑک سے ذرا دور رکھی اور ماچس کی تیلی دکھاتے ہی بھاگ کھڑا ہوا۔ دو منٹ بعد جب میں نے کار اسٹارٹ کی تو مجھے دور بنے ہوئے ریلوے کے افسروں کے ایک بنگلے میں سے کوئی شخص اس آگ کی طرف بڑھتا ہوا نظر آیا۔ مگر خطرے کی کوئی بات نہ تھی۔ فاکس ویگن اتنی دور جا چکی تھی کہ وہ نمبر نوٹ نہیں کر سکتا تھا اور اس کے پہنچنے تک آگ کا سب کچھ جلا کے خاک کر دینا یقینی تھا۔

بیس منٹ بعد میں نے سڑک پر ایسی جگہ کار روکی جہاں سے وہ زیرِ تعمیر عمارت صاف نظر آتی تھی۔ نہ جانے کیوں مجھے شبہ ہی نہیں یقین ہو چلا تھا کہ دشمن کی آنکھیں مجھے دیکھ رہی ہیں۔ کسی دریچے کسی روزنِ دیوار یا کسی دروازے کی جھری سے شکاری کی نظریں اپنے شکار کو دامِ فریب میں گرفتار ہونے کے لیے قدم قدم آگے بڑھتا دیکھ کر مطمئن ہیں۔ ایک یرغمالی کو ہم چھڑا کے لے گئے تھے اور اب الٹا دشمن کا ایک آدمی ہمارے قبضے میں تھا۔ اس کی رہائی کے لیے وہ مجھے یا محسن کو رکھ کے یہ سودا کر سکتے تھے کہ تم ہمارا آدمی چھوڑ دو۔ ہم تمہارا آدمی چھوڑ دیتے ہیں۔

مجھے کچھ دیر ہو گئی تھی۔ محسن کے روانہ ہو جانے کے بعد میں نے رابعہ کے گھر پر چند ضروری امور کو نمٹانے میں اور پھر راستے میں رک کر کپڑوں کے بنڈل کو جلانے میں تھوڑا سا اضافی وقت لیا تھا لیکن اس چند منٹ کی دیر نے مجھے بچا لیا۔ اگر میں نے ٹیکسی کے ساتھ اپنی کار دوڑائی ہوتی تو میں اور محسن تقریباً ساتھ ساتھ اس نامکمل گھر میں پہنچتے جہاں سائیں چوکیدار کی لاش پڑی تھی، لیکن ہوا یہ کہ محسن وہاں پہلے جا پہنچا اور اس نے خطرے کو فوراً محسوس کر لیا۔ ابھی میں فاکس ویگن سے اتر کے چند قدم ہی چلا تھا کہ میں نے اسے تیز تیز قدموں سے اپنی طرف آتے دیکھا۔ بدلے ہوئے حلیے کے باعث میں اسے فوراً نہ پہچان سکا۔ پھر کوٹھی کے اندر سے ایک مختصر سا جلوس برآمد ہوا جس میں چار پولیس والوں سمیت شکل سے درجن بھر افراد ہوں گے۔ وہ محسن کے پیچھے پیچھے سڑک کی طرف بڑھے۔ محسن نے ایک بار پلٹ کر دیکھا اور اپنی رفتار تیز تر کر دی۔ میں بھی اب رک گیا تھا اور محسن کے قریب آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے مجھے واپس جانے کا اشارہ کیا اور میں الٹے پاؤں واپس ہوا۔ میرے بیٹھتے ہی محسن نے بھی کار کا دوسرا دروازہ کھولا۔ "چل یہاں سے۔" وہ میرے ساتھ بیٹھتے ہوئے بولا۔ "ان لوگوں نے قریب سے ہمیں دیکھا تو پہچان جائیں گے۔"

میں نے کار کو اسٹارٹ کرنے کے لیے چابی گھمائی۔ انجن ایک دفعہ ہلکے سے غرایا اور خاموش ہو گیا۔ دوسری اور تیسری بار میں بھی میری کوشش بے سود ثابت ہوئی۔ محسن نے تشویش سے میری صورت کو اور پھر جلوس کو دیکھا جو آہستہ آہستہ سڑک کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نے چابی گھمانے کا عمل جاری رکھا لیکن اس سے بیٹری کمزور پڑنے لگی۔ انجن اسٹارٹ ہوتا تھا اور پھر بند ہو جاتا تھا۔

"معلوم نہیں کیا ہو گیا ہے۔" میں نے پریشانی سے کہا۔ "غالباً اوور ہو گئی ہے۔" پیٹرول کی بو سے میں یہی اندازہ کر سکتا تھا۔

"ٹھہر جا، سیلف مارنے سے بیٹری بالکل بیٹھ جائے گی تو دھکے سے بھی فائدہ نہیں ہو گا۔" محسن نے اترتے ہوئے کہا۔ پولیس والے اور چار دیگر افراد اب اتنے قریب آ گئے تھے کہ میں ان کی صورتوں کو صاف دیکھ سکتا تھا۔ پولیس والوں نے ایک ایسے شخص کو ہتھکڑی ڈال رکھی تھی جو میرے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ اور دیوانہ تھا۔ اس کے لمبے لمبے جٹا دھاری بال جو الجھے ہوئے اور دھول سے خاکستری ہو رہے تھے، داڑھی کے بالوں سے جا ملے تھے اور بالوں کے اس خودرو جنگل میں اس کے وحشت زدہ چہرے پر متحرک آنکھیں بہت بے قرار لگتی تھیں۔

"دے داتا۔" دیوانے نے اچھل کے ایک نعرۂ مستانہ لگایا۔ "سب نوں دے۔" معلوم نہیں وہ دینے والے سے سب کے لیے کیا طلب کر رہا تھا۔ یہی دیوانگی جس نے اسے فکر و غم سے بیگانگی عطا کی تھی۔ دولتِ فقر جس کی نگاہ میں شانِ سکندری کچھ نہیں۔ سنگ و دشنام اور ذلت کا آزار دینے والوں کے لیے بھی یہی آزار ہے یا ان سب کے لیے عفو و درگزر جو نہیں جانتے تھے کہ وہ کیا کر رہے ہیں؟

محسن نے دھکا لگایا اور چھوٹی سی کار سڑک کے معمولی سے نشیب پر روانہ ہو گئی۔ میں نے کلچ چھوڑا تو کار نے ایک جھٹکا لیا۔ انجن کھانسا اور پھر یوں گرجا کہ کار نے ایک دم اسپیڈ پکڑی۔ میں نے بریک پر پاؤں رکھا اور محسن دوڑتا ہوا آ کے پھر میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ "خدا کا شکر ہے۔" وہ ہانپتے ہوئے بولا۔ پھر اس نے سر گھما کے دیکھا۔ مجھے اپنے سامنے لگے ہوئے شیشے میں نظر آ رہا تھا کہ ایک دیوانے کو قاتل سمجھ کے پکڑ لینے والے سڑک تک پہنچ چکے تھے۔ وہ اب کسی ٹیکسی کے انتظار میں تھے۔

"دے مولا... سب نوں دے۔" دیوانے کی صدا آئی اور زنجیر نے کھنک کر اس کا ساتھ دیا۔ وہ اب رقص کے انداز میں پیر پٹخ رہا تھا۔ مجھے اس کی دیوانگی پر رشک آیا جسے نہ الزام کی خبر تھی نہ انجام کا اندیشہ۔ نہ غمِ دوش تھا نہ فکرِ فردا تھی اور جسے زندگی کے متاعِ بے بہا ہونے کا احساس ہی نہ تھا کہ موت کا ڈر

ہوتا۔ کار گھوم کے تیزی سے ان کے سامنے سے گزر گئی اور اس ایک لمحے میں جب کسی کی نظر مجھے دیکھ سکتی تھی، ہمارے درمیان ایک ڈبل ڈیکر بس حائل ہو گئی جو داروغہ والا کی طرف سے آئی تھی۔

"اس پاگل کو پکڑ لیا ہے قتل کے الزام میں۔" میں نے خطرے کی حدود سے نکل آنے کے بعد کہا۔ "اس لیے کہ وہ میرے کپڑے پہن چکا تھا۔"

"ہاں۔" محسن بولا۔ "جس شخص نے تجھ سے بات کی تھی اس نے کپڑے دیکھ کر کہہ دیا کہ یہ بندہ تو وہی لگتا ہے۔ پولیس کو خدا موقع دے اپنی کارکردگی اور مستعدی دکھانے کا۔ اسی گواہی پر ان کے لیے ضابطے کی کارروائی پوری ہو گئی اور انہوں نے گویا قاتل کو جائے واردات پر ہی پکڑ لیا حالانکہ وہ خود بھی جانتے ہوں گے کہ اگر یہ شخص پاگل ہے تو عدالت سے اسے کوئی سزا نہیں ہو سکتی۔ ایک شخص نے کہا بھی تھا کہ یہ تو پاگل ہے۔ کل تک ننگا گھومتا تھا۔ پولیس والوں نے کہا تھانے میں سب معلوم ہو جائے گا۔ ایسے تو سب ہی پاگل بن کے ہمیں پاگل بناتے ہیں۔ شامت کا مارا سونے کے لیے اندر جا گھسا ہو گا اور کپڑے پڑے دیکھے ہوں گے تو اٹھا کے پہن لیے ہوں گے۔"

"مگر پولیس کا اس وقت موجود ہونا یہ ثابت کرتا ہے کہ قتل کی اطلاع انہیں بہت پہلے نہیں صبح دی گئی ہے۔ اندازاً دو گھنٹے قبل۔" میں نے کہا۔ "اور میرا خیال ہے کہ رابعہ کو اسیر رکھنے والوں نے فرار ہونے کے بعد کہیں سے پولیس کو فون کیا ہو گا۔ انکو یقین ہو گا کہ میں اپنے کپڑے لینے پہنچوں گا تو میر شرافت علی کے بعد قتل کے اس دوسرے الزام میں ملوث ہو جاؤں گا۔ یک نہ شد دو شد والی بات ہو گی۔ مجھ پر دباؤ بڑھ جائے گا اور میرے لیے تمام مقدمات ختم کرا دینے کی پیشکش کو قبول نہ کرنا دشوار تر ہو جائے گا مگر ایک دیوانے نے ہماری بلا اپنے سر لے لی۔"

رابعہ کے گھر میں تعزیت کے لیے آنے والوں کی تعداد زیادہ ہو گئی تھی۔ لوگ ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے اور لان پر جمع تھے۔ میں نے کار کو دروازے کے سامنے روکا تو بہت سے لوگوں کی نظریں اٹھیں۔ وہ رابعہ کی کار کو پہچانتے تھے لیکن مجھے نہیں جانتے تھے۔ خود میرے لیے سب ناآشنا چہرے تھے جن میں رابعہ کے عزیز، ہمسائے جان پہچان رکھنے والے اور رفقائے کار سب شامل ہوں گے۔ میں کسی کی طرف دیکھے بغیر رسماً اور اخلاقاً "السلام علیکم" کہتا گزر گیا۔ سوالیہ نگاہیں میرے تعاقب میں رہیں کہ گھر کے ایک فرد کی طرح گھر میں گھس جانے والا یہ شخص کون ہو سکتا ہے جسے پہلے کبھی گھر میں نہیں دیکھا گیا۔ پانچ منٹ کے وقفے سے محسن آیا جو ابھی تک بنیان اور دھوتی میں ملبوس تھا۔ میری طرح وہ بھی سلام کرتا گزرا مگر قابلِ غور نہیں سمجھا گیا کیونکہ حلیے سے وہ گھر کا ملازم لگتا تھا۔

میں نے سب سے پہلے اپنے جنگی قیدی کے زندان میں موجود ہونے کا یقین کیا اور پھر محسن کے ساتھ مل کر تجہیز و تکفین کے انتظامات کی طرف متوجہ ہوا لیکن ہماری عدم موجودگی میں وارد ہونے والے دو بوڑھوں اور دو نوجوانوں کی کمیٹی تشکیل پا چکی تھی اور یہ ذمہ داری انہوں نے اپنا اوّلین حق سمجھتے ہوئے سنبھال لی تھی۔ بوڑھے کس رشتے سے رابعہ کے چچا اور ماموں ثابت ہوتے اور نوجوان دور کے کزن جن کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات مجھے خود رابعہ نے فراہم کی تھیں۔ اس فرض سے سبکدوشی ہمارے حق میں بہتر تھی۔ اب ہم پس منظر میں رہ کر آنے جانے والوں پر نظر رکھ سکتے تھے۔ مجھے یہ اندیشہ لاحق تھا کہ مجمعِ عام میں وہ لوگ بھی شامل نہ ہو جائیں جو جنازے میں شرکت کے بہانے اپنے قیدی کو چھڑا کے لے جانا چاہتے ہوں تاہم ان لوگوں کو شناخت کرنا بھی اتنا ہی ناممکن تھا جتنا کسی ثبوت کے بغیر ان کو الگ کر کے نکالنا۔ ہر شخص زیادہ سے زیادہ غمزدہ نظر آنے کی کوشش میں مصروف تھا اور آنے والوں کے لیے یہ طے کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ وہ تعزیت کس سے کریں کیونکہ رابعہ اوپر اپنے کمرے میں تھی اور خادمہ کے سرکاری اعلان کے مطابق صدمے کے باعث اس کی حالت غیر تھی چنانچہ ڈاکٹر نے اسے انجکشن دے کر سلا دیا تھا۔ بلاشبہ رابعہ ذہنی جسمانی اذیت کے جس دور سے گزری تھی وہ ایک عام عورت کے اعصاب کو اس حد تک متاثر کر سکتا تھا کہ اس کا ہسٹریا عارضی طور پر دماغ کی خرابی کا سبب بن جاتے مگر رابعہ نے غیر معمولی عقل، جرأت اور حوصلے کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ اتنی تھکی ہوئی تھی کہ اس میں ہر ایک سے ملنے، ان کو اوّل تا آخر ماں کی موت کے اسباب و واقعات اور علاج معالجے کی تفصیلات بار بار سنانے اور سب کے ساتھ رونے کی ہمت نہیں تھی۔ میں نے اسے کمرے میں محصور کر کے چائے اور اسپرین فراہم کی۔ دونوں چیزیں مجھے باہر سے لانی پڑیں۔ وہ اکیلی پڑی روتی رہی اور دو گھنٹے بعد کمرے سے نکلی تو اس کی حالت قدرے بہتر تھی۔ محسن نے اسٹور روم کے آس پاس پہرہ دینا جاری رکھا۔ بھرا ہوا ریوالور اس کے پاس تھا۔ وہ ادھر ادھر کے کمروں سے کسی دیوار کی اوٹ سے یا ٹہلتے ہوئے دیکھ رہا تھا کہ تعزیت کے لیے جمع ہونے والوں میں سے کون گھر کے اس دور افتادہ حصے تک آتا ہے۔ ایک گھنٹے بعد اس نے ریوالور مجھے تھما دیا اور خود ڈرائنگ روم میں جا بیٹھا۔ ہم میں سے کوئی اپنی مسلسل غیر موجودگی سے شبہات پیدا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ محسن نے اپنے پرانے کپڑے پہن لیے

تھے۔ اس شریفانہ لباس میں دیکھ کر بہت سے لوگ چکرائے ہوں گے کہ یہ وہی خادم ٹائپ شخص ہے جو بنیان اور دھوتی پہنے گزرا تھا یا اس کا کوئی ہمشکل۔ دو نوجوان جو تدفین کمیٹی کے رکن تھے آؤٹ ڈور ڈیوٹی کے لیے موٹر سائیکل لے کر جا چکے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ کفن دفن کا سامان لانے کے لیے انہیں رابعہ کی کار مل جاتی مگر چابی کا مسئلہ پیدا ہوا تو انہیں میں نہ ملا۔ چنانچہ وہ بادلِ نخواستہ اپنی پرانی موٹر سائیکل پر گئے۔ ضامن رضوی صاحب اور رابعہ کے ماتحت وکیل کے آنے کے بعد ہماری پوزیشن بہتر ہو گئی۔ انہوں نے ہم سے تفصیلی معلومات حاصل کیں جو دوسروں کے کانوں تک بھی پہنچیں۔ رفتہ رفتہ جملہ حاضرین پر واضح ہو گیا کہ رابعہ کی ماں کی تیمارداری اور خبرگیری میں شروع سے آخر تک ہماری خدمات کیا تھیں۔

جنازے کی روانگی میں کچھ وقت باقی تھا جب میں نے ایک شخص کو خاصے پُراسرار انداز میں نمودار ہوتے دیکھا۔ میں قید خانے کے طور پر استعمال ہونے والے اسٹور روم کے سامنے والے کمرے کا دروازہ نیم وا کیے کھڑا تھا کہ وہ شخص دبے پاؤں آیا اور اس نے مقفّل دروازے سے کان لگا کے کچھ سننے کی کوشش کی۔ تالے کو ہاتھ میں لے کر دیکھتا رہا اور کچھ سوچتا رہا۔ میں نے اس کی صورت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا۔ میں اسے مزید کارروائی کا موقع دینا چاہتا تھا اور میری عین خواہش تھی کہ وہ قفل کھولے تو اسے بے خبری میں جا لوں۔ اس کے حلق سے آواز تک نہ نکلتی اور دوسرا شکار ہاتھ آ جاتا لیکن اسی وقت کہیں کھٹکا ہوا اور کسی کی آواز یا سنائی دی کہ وہ چونک کر پلٹا اور جدھر سے آیا تھا اُدھر ہی غائب ہو گیا۔ میں نے پوری احتیاط برتی اور اس کو نکل جانے کا موقع دیا۔ جب میں نے باہر نکل کے دیکھا تو وہ لان پر کھڑا ایک وکیل سے بات کر رہا تھا۔

ان کے بہت قریب ہو جانے کے باوجود میں ان کی باتیں نہ سن سکا۔ وہ بہت آہستہ بول رہے تھے لیکن ماحول ایسا تھا کہ سب ہی دبے دبے لہجے میں بات کر رہے تھے۔ میں نے کچھ اور قریب ہونا چاہا لیکن عبدالودود منظر کی مداخلت نے مجھے روک دیا۔ وہ رابعہ سے ملنا چاہتا تھا چنانچہ میں اسے اوپر لے گیا۔ دیگر تفصیلات اور دوسرے مسائل پر بات کرنے کا نہ وقت تھا اور نہ موقع۔ ابھی میں چند قدم ہی چلا تھا اور منظر رابعہ کی ماں پر پڑنے والے جان لیوا دل کے دورے کے بارے میں بتا رہا تھا کہ یک لخت مجھے ایک اور خیال آیا۔ میں نے چلتے چلتے پلٹ کر دیکھا اور پھر چل پڑا۔

"منظر!" میں نے کہا۔ "ابھی پیچھے نہ دیکھنا۔ ہمارے پیچھے لان پر ایک شخص کھڑا ہے۔ تقریباً وہیں جہاں میں کھڑا ہوا تھا۔ اس نے سلیٹی رنگ کی قمیص اور پتلون پہن رکھی ہے۔ اس کے مقابل ایک وکیل کھڑا ہے۔ تم اس وکیل کو جانتے ہو؟ نام سے یا صورت سے؟"

منظر نے سر ہلایا اور برآمدے میں میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کھڑا ہو گیا۔ بڑی صفائی سے پہلو بدل کے اس نے دیوار سے ٹیک لگائی اور بظاہر مجھ سے محوِ گفتگو رہا مگر اس کی آنکھوں نے لان کا سروے کر لیا۔

"میں نے اسے بار روم یا کسی کورٹ میں تو نہیں دیکھا۔" منظر بولا۔ "لیکن ایسے تو بہت سے نئے وکیل آتے رہتے ہیں اور میں سب کو نہیں پہچانتا۔ دو چار سال پرانے ہوں تو صورت آشنا ضرور ہو جاتے ہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ بھیڑ کی کھال اوڑھ کے بھیڑیے بھی آ گئے ہیں۔" میں نے کہا۔ "صرف کالا کوٹ پہن لینے کے بعد ان وکیلوں میں کوئی بدمعاش آ جائے تو یہ کیا مشکل ہے۔"

"ہے تو مشکل۔" منظر بولا۔ "مگر ناممکن نہیں۔ میں نے دیکھ لیا ہے اسے۔ رابعہ کے ماتحت وکیلوں سے پوچھتا ہوں، وہ بھی اپنے دوستوں سے معلوم کر سکتے ہیں۔ فراڈ ہو گا تو دھر

یں گے بعد میں۔ پہلے ذرا رابعہ سے مل لوں۔"
رابعہ کے پاس دس منٹ ٹھہرنے کے بعد منظر نیچے آگیا۔ میں اسے ٹہلتے ہوئے اِدھر سے اُدھر جاکے مختلف لوگوں سے بات کرتے دیکھتا رہا۔ ان میں سے بیشتر وکیل ہی تھے۔ مزید دس منٹ بعد میں اور وہ ایک دوسرے کے سامنے سے گزرے تو اس نے کہا۔ "ابھی تک تو کسی نے اسے شناخت نہیں کیا ہے۔ تمہارا خیال ٹھیک ہی لگتا ہے مجھے، وہ کوئی جعلساز ہے۔" میں صورت سے کسی تاثر کا اظہار کیے بغیر مخالف سمت میں نکل گیا اور گیٹ کے بالکل سامنے سے فاکس ویگن ہٹا کے لوٹ آیا۔ دوبارہ دیکھنے پر مجھے وہ سلیٹی پتلون قمیص والا اور نقلی وکیل ایک دوسرے سے بہت دور بالکل اجنبی کی طرح کھڑے نظر آئے۔
اچانک کسی نے میری قمیص کی آستین پکڑ کے کھینچی۔ میں نے گھوم کے دیکھا تو وہ آٹھ دس سال کا بچّہ تھا۔ تعزیت کے لیے آنے والی بہت سی عورتوں کے ساتھ بچّے بھی آئے تھے۔
"کیا بات ہے بیٹے؟" میں نے جھک کر کہا۔ بچّے نے جواب دینے کے بجائے کاغذ کا ایک پُرزہ میری طرف بڑھا دیا۔ وہ اپنا فرض پورا کرکے جانے ہی والا تھا کہ میں نے اسے روک لیا۔ اس غیر متوقع گرفتاری سے وہ کچھ گھبرا گیا۔
"ایک بات بتاؤ بیٹے!" میں نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیر کے نرمی سے کہا۔ "کس نے دیا ہے یہ تمہیں؟" بچّے نے بے بسی سے اِدھر اُدھر دیکھا اور اس عرصے میں میرے ہاتھ نے پرچے کو کھول لیا۔ اس میں لکھا تھا:۔
"اگر جنازہ اٹھنے سے پہلے ہمارے آدمی کو نہ چھوڑا
گیا تو ہم گھر کو اُڑا دیں گے۔"
میں نے پرچہ جیب میں رکھ لیا اور بچّے کی طرف دیکھا۔ اس کی نظر کالے کوٹ والوں پر جا رہی تھی مگر اس صورت کو تلاش کرنے سے قاصر تھی جس نے اسے یہ پیغام پہنچانے کی خدمت سونپی تھی اور غائب ہوگیا تھا۔ شاید اس نے بچّے کو ایک روپیہ دیا ہوگا کہ "وہ دیکھو، وہ جو سفید پتلون اور گہری نیلی قمیص والے انکل کھڑے ہیں نا، یہ ان کو دے آؤ شاباش۔" اور اب بچّہ پریشان تھا کہ میرے سوال کا کیا جواب دے۔ میں نے اس کو تھپکی دی۔ "جاؤ کھیلو، کوئی بات نہیں۔" میں نے کہا۔ بچّے نے اطمینان کا سانس لیا اور اوپر بھاگ گیا۔ میرا ذہن ایک ایک لفظ کو دہراتا رہا اور صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ کرتا رہا۔ جنازہ اٹھنے سے پہلے؟ کسے معلوم ہے کہ جنازہ اٹھنے میں کتنی دیر ہے؟ پندرہ منٹ یا آدھا گھنٹہ... اور یہ مہلت اسی تناسب سے بہت کم رہ گئی تھی۔ 'اڑا دیں گے'، سے بھی

کچھ واضح نہیں ہوتا تھا کہ وہ کیا کریں گے۔ کیا وہ اندر کہیں ڈائنامیٹ لگا چکے ہیں۔ باہر کاریں ہی کاریں کھڑی تھیں۔ بہت سے لوگ بریف کیس لے کر آئے تھے اور ان میں وہ جعلی وکیل بھی تھا۔ اس گہما گہمی میں کسی کا کوٹھی کے کسی حصے میں چھپ کے اپنی کارروائی میں مصروف رہنا ناممکن نہیں تھا۔ اس سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جاسکتا تھا کہ وہ دستی بم پھینک کے نکل جائیں گے اور ان کا آدمی کچھ بتانے سے پہلے ہی نیست و نابود ہوجائے گا مگر اس کے ساتھ یہ گھر، اس کے سوگوار وارث، وارثوں کے ہمدرد، میں اور محسن، یہ سب بھی نیست و نابود ہوں گے۔ رابعہ کی ماں کا جسدِ خاکی عزت و آرام کے ساتھ اپنی ابدی آرام گاہ تک پہنچنے سے پہلے ہی پُرزہ پُرزہ ہوکے بکھر جائے گا۔ میرے لیے اس منظر کا تصور ہی اتنا لرزہ خیز تھا کہ چند سیکنڈ میں مفلوج کھڑا رہا۔ وقت بہت کم تھا اور میں اکیلا کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ نہ حفاظتی اقدامات، نہ نگرانی، نہ مقابلہ اور نہ بات چیت۔ انہوں نے واضح الفاظ اور دو ٹوک لہجے میں قطعی الٹی میٹم دیا تھا اور رعایت کی بالکل گنجائش نہیں رکھی تھی۔ ضامن رضوی صاحب کا چہرہ امید کی کرن بن کے میرے سامنے آگیا۔ وہ ایک گوشے میں کھڑے سگار جلانے میں مصروف تھے۔ میں نے کوئی بات کیے بغیر پرچہ ان کے سامنے کردیا۔
"تفصیل میں بعد میں بتاؤں گا انکل!" میں نے کہا۔ "لیکن آپ اسے مذاق یا محض دھمکی نہ سمجھیں۔ کچھ لوگ گھر کے اندر موجود ہیں اور انہوں نے ایک بچّے کے ذریعے یہ پیغام پہنچایا ہے۔ ان میں سے دو کو میں شناخت کرسکتا ہوں۔ ان کا آدمی ہمارے پاس قید ہے۔"
ضامن رضوی پرانے، ذہین اور جہاندیدہ پولیس آفیسر تھے اور ہر قسم کی ہنگامی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ فوری فیصلے کرنے اور صحیح قدم اٹھانے کی قابلِ رشک صلاحیت رکھتے تھے۔ انہوں نے میری صورت سے میری پریشانی کو بھانپ لیا تھا۔ انہوں نے سگار جلانے کا عمل جاری رکھا مگر ایک سطر کی وہ عبارت پڑھ لی جسے میں نے ذرا سی دیر کے لیے پھیلا کے سمیٹ لیا تھا۔
"تجہیز و تکفین کا انتظام کرنے والوں سے کہو جنازہ ایک گھنٹے کے بعد اٹھے گا۔" انہوں نے بالآخر سگار سلگا لیا۔ "اسلام آباد سے مسٹر اور مسز شیروانی کے آجانے کے بعد۔ یہ پھیلا دو۔ فون کہاں ہے؟"
"اوپر رابعہ کے کمرے میں۔" میں نے چلتے چلتے کہا۔ بظاہر اتنے کم وقت میں نہ میں نے ان کو کچھ دکھایا تھا اور نہ

بتایا تھا لیکن ضامن رضوی صاحب نے بھی کمال کیا تھا کہ صورت سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ پانچ منٹ بعد بھی میں نے دیکھا تو وہ اسی جگہ منہ میں سگار دبائے کھڑے تھے اور بجانے کس سے گفتگو میں مصروف تھے۔ ایک منٹ بعد میں نے دیکھا تو وہ غائب تھے۔ میں نے قریب ہی حلقہ بنا کے کھڑے ہونے والوں سے کہا۔ "آپ لوگ تشریف رکھیں نا۔" میں نے گھڑی دیکھی۔ "بس اسلام آباد کی فلائٹ پہنچنے ہی والی ہے۔"
"کون آرہا ہے اسلام آباد سے؟ کوئی عزیز؟" ایک شخص نے سوال کیا۔ کچھ اور لوگ بھی متوجہ ہوئے۔
"اسلام آباد سے مسٹر اور مسز شیروانی پہنچ رہے ہیں۔" میں نے اونچی آواز میں کہا۔ "محسن کے والدین۔ بس انہی کا انتظار ہے۔"
"اس کا مطلب ہے گھنٹہ بھر تو اور لگے گا۔" کسی نے اظہارِ خیال کیا۔ پھر کسی اور نے پوچھا کہ کیا ابھی ایک گھنٹہ اور لگے گا؟ میں نے پھر وضاحت کی۔ بات اب لان پر پھیلنے لگی تھی۔ میں نے ڈرائنگ روم کا رُخ کیا اور اسی معذرت آمیز انداز میں تاخیر کی وجہ بیان کی۔ تجہیز و تکفین کمیٹی کے دو بزرگ ارکان میں سے ایک نے مجھے آلیا۔ "میاں برخوردار! کیا نام ہے تمہارا؟ یہ تم سے کس نے کہا ہے؟ جنازہ تو تیار ہے۔"
"مگر چچا! رابعہ اجازت نہیں دے گی۔ جب تک انکل شیروانی نہیں آجاتے۔" میں نے ان کی بات کاٹ دی۔ "اور پھر ایک گھنٹے کی تاخیر سے کیا فرق پڑتا ہے۔"
تدفین کمیٹی کے دوسرے عمر رسیدہ رکن نے تدفین میں جلدی کرنے کے مسائل کا حوالہ دیتے ہوئے شرع کے مطابق اس کے فضائل بیان کیے۔ میں نے سعادت مندی سے اتفاق کرتے ہوئے اختلاف جاری رکھا۔ یہاں تک کہ وہ اسلام آباد سے آنے والوں کا انتظار کرنے پر مجبور ہوگئے۔ پھر موقع پاتے ہی میں نے محسن سے رابطہ قائم کیا اور اسے پوری بات بتائی۔
"یار اگر ایسا ہوا تو بہت بُرا ہوگا۔" محسن نے تشویش سے کہا۔ "ایک گھنٹے کی مہلت سے کیا ہوگا۔ ہمیں رابعہ کو نکالنا ہے، خود نکلنا ہے مگر یہ تب ہی ممکن ہے جب میّت کے ساتھ باقی سب لوگ بھی گھر سے نکل جائیں۔"
"اس کے بعد بھی گھر میں عورتیں موجود ہوں گی۔" میں نے کہا۔ "وہ جاتے جاتے ہی جائیں گی۔ کیا یہ زیادہ آسان نہیں کہ ہم ان کے آدمی کو نکال کر کہیں اور لے جائیں اور خطرہ یہاں سے ٹل جائے۔ میں نے انکل رضوی سے بات کی ہے۔ دیکھیں وہ کیا کرتے ہیں۔"
رضوی صاحب نے اچانک کمرے میں قدم رکھا۔ "ان

کا وہ آدمی کہاں ہے؟ اسٹور میں؟ ہوش میں ہے؟"

"جی" میں نے کہا۔ "اور میرا خیال ہے اسے یہاں سے منتقل کر دیا جائے۔ مثلاً آپ اسے اپنی تحویل میں لے لیں۔"

"میں یہی کر رہا ہوں۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "لیکن یہ بتاؤ کہ اپنے مقصد میں ناکامی کے بعد وہ کیا کریں گے؟ ظاہر ہے وہی جس کی انہوں نے دھمکی دی ہے۔ تم نے کہا تھا کہ دو افراد کو شناخت کر سکتے ہو۔ اگر ان سے رابطہ قائم کیا جائے؟"

"ان میں سے ایک تو وکیل ہے۔ بظاہر جعلی، دوسرا اصل آدمی ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ مجھے نظر آیا تو میں سامنے آئے بغیر اسی بچے کے ذریعے یا کسی اور بچے کے ہاتھ جواب ارسال کر کے ردِ عمل دیکھ سکتا ہوں۔"

"ابھی کچھ دیر بعد سادہ کپڑوں والے پولیس مین ہر طرف پھیل جائیں گے۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "وہ اپنے کام کے ماہر ہیں۔ سکیورٹی والے جو حفاظتی انتظامات کے وقت پورے مجمع پر نظر رکھ سکتے ہیں۔ ذرا سی مشتبہ حرکت بھی ان سے چھپی نہیں رہ سکتی۔ تم اس آدمی کو لے کر جاؤ۔ اگر ممکن ہو تو پیغام دے دو کہ اپنے آدمی کو کہیں وصول کر لیں۔ ظاہر یہی کرو کہ تم دھمکی سے ڈر کے ان کی بات ماننے پر مجبور ہو۔ وہ تمہارے پیچھے آئیں گے اور تم انہیں دور لے جاؤ گے۔ آگے میرے آدمی ہوں گے۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے آدمی کو یہیں ٹھکانے لگا دیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ابھی تک ہمیں پوچھ گچھ کرنے کا موقع نہیں ملا ہے مگر وہ پولیس کے پاس ہوگا تو ان کی دسترس میں نہیں رہے گا۔" میں نے کہا۔

"یہاں گولی چلانے والا بچ کے نہیں نکل سکے گا۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "وہ تم کو مجھ سے بات کرتے دیکھ چکے ہیں۔ سادہ کپڑوں کے باوجود وہ سکیورٹی والوں کو پہچان جائیں گے اور یہ حماقت نہیں کریں گے کہ ایک کو چھڑانے آئیں تو چار پکڑے جائیں۔ انہیں جو کچھ کرنا ہوگا باہر کچھ دور جا کے کریں گے۔ جب وہ مطمئن ہو جائیں گے کہ واقعی کوئی ان کا پیچھا نہیں کر رہا ہے اور یہ اطمینان دلانا بہت ضروری ہے۔ اس لیے میرے آدمی تمہارے جانے کے بعد اندر آئیں گے۔ وہ دو کام کریں گے۔ ایک تو یہ چیک کریں گے کہ گھر میں کہیں آتش گیر مادہ تو موجود نہیں، دوسرا یہ کہ جنازہ فوراً باہر پہنچا دیں گے۔ تم نے ایک گھنٹے کی بات کی ہے، جنازہ پندرہ منٹ بعد باہر ہوگا۔ باقی لوگوں کے روانہ ہو جانے کے بعد وہ خواتین سے گھر خالی کرا لیں گے۔ رابعہ کو میں لے جاؤں گا۔ میرا مطلب ہے شوفر میرے گھر لے جائے گا۔"

"اور میں اس شخص کو لے کر کہاں جاؤں؟" میں نے پوری اسکیم پر غور کرتے ہوئے کہا۔

"ایمبیسیڈر ہوٹل کی طرف۔ ذرا آگے کوڑے کا ایک ڈرک سڑک کے کنارے الٹا پڑا ہے۔ میرے آدمی اس کے اندر ہوں گے اور ٹھیک وقت پر باہر نکلیں گے، جب انہیں یقین ہوگا کہ اب تمہارے لیے خطرے کی کوئی بات نہیں اور ملزم بھی باقاعدہ حراست میں لیے جا سکتے ہیں۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "وہ اندر ٹرانسمیٹر ریسیور لیے بیٹھے ہوں گے اور ہر بات سنتے رہیں گے۔ ملزموں کا راستہ اور آگے روکا جائے گا جب وہ اپنے آدمی کو لے کر روانہ ہو جائیں گے۔ اگر وہ تمہیں بھی لے جائیں تو محتاط رہنا اور اپنی جان بچانے کی خود بھی کوشش کرنا۔ بس اب دیر مت کرو اور ہاں... اسے یعنی اپنے قیدی کو ذرا چھپا کے نکالنا۔ یوں کہ صرف دیکھنے والے دیکھ سکیں۔" وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔

"یار میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔" محسن نے کچھ دیر بعد کہا۔ "اگر ہم معاملات کو اپنے ہاتھ ہی میں رکھتے تو بہتر تھا۔"

"سوچا تو میں نے بھی یہی تھا مگر... ایک تو مجھے یہ مشکل لگا۔ پھر میں نے رضوی صاحب سے بات کر لی... اب اور کچھ نہیں ہو سکتا۔" میں نے کہا۔ "بظاہر تو کوئی خامی نہیں مگر دشمن بھی بے وقوف نہیں۔ یہ ففٹی ففٹی کا چانس ہے جو لینا ہی پڑے گا۔"

میں نے دو سطر کا جوابی پیغام لکھا۔

"ہم اس وقت مجبور ہیں۔ تمہارا آدمی رہا کیا جا رہا ہے۔ کوئی ہنگامہ کرنے کی ضرورت نہیں۔"

گھر میں بہت سے بچے ایسے بھی تھے جو ماحول سے اور بڑوں کی ڈانٹ ڈپٹ سے بے نیاز کھیل کود میں مصروف تھے۔ فطرتاً ان کے لیے نچلا بیٹھنا مشکل تھا۔ ایک بچہ زینے کی ریلنگ پر گھوڑے کی طرح سوار پھسلتا ہوا نیچے آیا۔ یہ وہی بچہ تھا۔ ریلنگ کے آخری کنارے پر اس نے بریک لگائی اور لکڑی کے ستون سے نہیں ٹکرایا۔ میں نے اس کا بازو تھام لیا۔ بچے کا رنگ اڑ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ اب میں بھی دوسروں کی طرح سرزنش کا مظاہرہ کرنے پر اسے شرمندہ کروں گا۔ لیکن میں نے کہا۔ "تم تو بڑے سمجھدار بچے ہو۔" پھر میں نے جیب سے ایک روپے کا نوٹ نکالا۔ "یہ لو میرا بھی ایک چھوٹا سا کام کر دو۔ یہ پرچہ ایک آدمی کو دینا ہے مگر اسے کچھ نہیں بتانا ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔"

بچہ خوشی خوشی میرے ساتھ چل پڑا۔ وکیل کی صورت مجھے کہیں دکھائی نہ دی لیکن سلیٹی رنگ کے کپڑوں والا نظر آ گیا۔ وہ لان کے آخری حصے پر کھڑا کوٹھی کے عقبی حصے کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ بچے نے اس مرتبہ چالاکی سے کام لیا اور پرچہ اس کو تھماتے ہی بھاگ نکلا۔ میں نے دیکھا کہ سلیٹی کپڑوں والے نے ایک سطر کے جواب کو پڑھا اور کاغذ کو جیب میں ڈال لیا پھر اس نے سر ہلایا۔ شاید اس کے ساتھی بھی وہیں تھے اور یہ اشارہ ان کے لیے تھا کہ جواب مثبت ہے۔ یا وہ مجھے بتانا چاہتا تھا کہ ٹھیک ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں۔ میں لوٹ کر اندر گیا۔ رضوی صاحب کی دی ہوئی پندرہ منٹ کی مہلت میں سے پانچ منٹ گزر چکے تھے۔

میں کاریڈور میں کھڑا رہا اور محسن نے اسٹور کا دروازہ کھولا۔ میری نگاہ ہر طرف تھی اور خالی ہاتھ ہونے کے باوجود میں پوری طرح چوکس تھا۔ اگر دشمن اس موقعے سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے تو انہیں سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا اور بات وہی ہوتی جو رضوی صاحب نے کہی تھی یعنی وہ ایک کو چھڑا کے لے جانے کے بجائے کم سے کم دو کو ہاتھوں پیروں سے معذور یا بے ہوش چھوڑ جاتے۔ شاید یہ بات وہ بھی سمجھتے تھے کہ آتشیں اسلحہ استعمال کیے بغیر وہ مجھ پر قابو نہیں پا سکتے تھے لیکن فائرنگ سے وہ سب کو متوجہ کر لیتے تو محصور ہو جاتے۔ یہاں سب دہشت زدہ اور سراسیمہ ہو کے بھاگنے والے نہیں تھے۔

چند منٹ بعد ہمارا اجنبی قیدی دروازے سے نمودار ہوا۔ وہ اب ہوش میں تھا مگر اس کے لیے سیدھا کھڑا رہنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ محسن اسے مقابل کے کمرے میں لے گیا اور ریوالور نکال کے کھڑا رہا۔ میں نے اسے مخاطب کیا۔ "دیکھو تمہارے ساتھی تمہیں لینے آئے ہیں۔ یہاں بہت سے لوگ جمع ہیں، لیکن ان کو شناخت کرنے والا کوئی نہیں۔ انہوں نے دھمکی دی ہے کہ تم کو رہا نہ کیا گیا تو وہ اس گھر کو اڑا دیں گے۔ یہاں ایک میت تیار رکھی ہے اس لیے ہم کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ ہاتھ منہ دھو لو اور اطمینان سے اپنے پیروں پر چل کے باہر جاؤ۔ تمہارے آگے یا پیچھے ہم ہوں گے۔ باہر سرخ رنگ کی ایک فاکس ویگن کار کھڑی ہے۔ تم کو اس میں لے جایا جائے گا۔ ایسی کوئی حرکت نہ کرنا جس سے صورتِ حال مشتبہ ہو جائے۔"

"لیکن... لیکن وہ... وہ مجھے مار ڈالیں گے۔" وہ لڑکھڑا کے دہشت زدہ لہجے میں بولا۔ "میں... نہیں جاؤں گا۔"

میں نے سوالیہ نظر سے محسن کو دیکھا۔ یہ بات قطعی غیر متوقع تھی مگر غلط نہیں تھی۔ "تمہارے ساتھ وہ کیا کرتے ہیں۔ اس سے ہمیں کوئی سروکار نہیں۔ ہمیں یہاں امن و امان رکھنا ہے، اس لیے تم کو جانا پڑے گا۔"

"میں نہیں جاؤں گا۔" وہ ذبح ہونے والے بکرے کی طرح بلبلایا اور دروازے کی طرف لپکا۔ محسن نے بڑی پھرتی سے اپنی ٹانگ اڑا دی اور وہ منہ کے بل گرا۔ میں نے اسے دبوچ لیا۔ اس کے حلق سے دوسری آواز نہ نکل سکی۔ میں نے ایک وار میں اس کو پھر عالمِ بے ہوشی میں پہنچا دیا اور اسے بے حس و حرکت پڑا چھوڑ کے اٹھ کھڑا ہوا۔ عام حالات میں ہم اسے زبردستی جلادوں کے حوالے نہ کرتے لیکن ہم اس سے زیادہ مجبور اور بے بس تھے۔

"اب تو اسے اٹھا کے ہی لے جانا پڑے گا۔" میں نے کہا۔ "اور سب کے بیچ میں سے گزار کے۔"

"پچھلے حصے میں ایک طرف تو کچن ہے۔" محسن نے کہا۔ "دوسری طرف ماسی کا کمرہ ہے اور اس کا ایک دروازہ پیچھے کھلتا ہے۔ اس گلی میں جو مشکل سے دو گز چوڑی ہے۔ اس کے بعد ساتھ والے گھر کی دیوار ہے۔ اگر میں اس کو لے کر دوسری طرف اتر جاؤں اور ساتھ والی کوٹھی کے دروازے سے نکلوں تو کوئی نہیں دیکھے گا۔"

"ساتھ والی کوٹھی میں رہنے والے تو دیکھیں گے۔" میں نے کہا۔ "اگر کسی نے شور مچا دیا؟"

محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ سب یہاں موجود ہوں گے۔ کوئی نوکر دیکھ سکتا ہے مگر یہ خطرہ تو مول لینا ہی پڑے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "میں ادھر سے آتا ہوں۔ سب کے بیچ میں سے گزر کے، جو لوگ ایفائے عہد کے منتظر ہیں وہ دیکھ ہی لیں گے اور تیار ہو جائیں گے۔ اتنی دیر میں تو اس حرامزادے کو لے کر آ جائے تو میں خاموشی سے روانہ ہو سکتا ہوں۔"

مین گیٹ سے نکل کر میں گلی میں آیا۔ اس دوران محسن اسے گلی میں لے آیا تھا۔ اس نے بے ہوش آدمی کو میرے حوالے کر دیا۔ درمیانی دیوار آٹھ فٹ کے قریب اونچی تھی۔ محسن اس پر سے پلک جھپکتے میں کود گیا۔ میں نے اس کی سیٹی سنی جو "آل کلیئر" کا سگنل تھی۔ میں نے کندھے پر جھولنے والے شخص کو اوپر اٹھایا اور اچھال دیا۔ وہ تقریباً دیوار کو چھوتا ہوا گیا اور میں نے اس کے دوسری طرف دھپ سے گرنے کی آواز سنی۔ پھر میں پلٹا اور تیزی سے دروازہ بند کر کے راہداری کو عبور کیا اور کسی کی طرف دیکھے بغیر ڈرائنگ روم سے گزر گیا۔ مجھے یقین تھا کہ دشمنوں کی نگاہیں میرا تعاقب کر رہی ہوں گی اور انہوں نے مجھے مین گیٹ سے باہر جاتے دیکھا ہوگا۔ میں نے فاکس ویگن کا دروازہ کھولا جو اب ساتھ والی کوٹھی کے گیٹ سے قریب تھی۔ سڑک کے دونوں کناروں پر اتنی کاریں کھڑی تھیں اور ان میں اتنے لوگ مصروفِ انتظار تھے کہ میں کسی کو ہوشیار ہوتے نہ دیکھ سکا۔ میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہی تھا کہ دوسرے

گیٹ سے محسن نمودار ہوا۔ فاصلہ بہت کم تھا پھر بھی بہت سی نظروں نے ایک بے ہوش آدمی کو رابعہ کی گاڑی میں ڈالنے کا منظر دیکھا۔

"محسن!" میں نے کار کو اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ "اگر رضوی صاحب کے آدمی جنازہ بخیر و عافیت اٹھانے میں کامیاب ہو جائیں تو سب سے پہلے رابعہ کی فکر کرنا۔ اسے رضوی صاحب کی گاڑی میں پہنچانا تیرا کام ہے۔ ہم تدفین میں شرکت کی کوشش کریں گے لیکن بدقسمتی کے باعث شریک نہ ہو سکے تو کوئی بات نہیں، دوسرے لوگ بہت ہیں۔ تجھے میری واپسی کا انتظار کرنا ہے۔"

محسن نے سر ہلایا اور سیدھا نکل گیا۔ میں نے کار کو اسٹارٹ کرنے کے لیے چابی گھمائی۔ انجن صبح کی طرح غرایا اور خاموش ہو گیا۔ دوسری اور تیسری بار کی کوشش بھی بے سود ثابت ہوئی۔ میں نے پریشانی سے اپنے ہمسفر کو دیکھا جو پچھلی سیٹ پر لاش کی طرح پڑا تھا اور گاڑی کو دھکا نہیں لگا سکتا تھا۔ گاڑی میں اسٹارٹنگ کی کوئی معمولی سی خرابی پیدا ہو گئی تھی میں نیچے اترا اور آگے پیچھے کی گاڑیوں کا جائزہ لیا۔ ایک گاڑی خالی تھی۔ دوسری میں دو نوجوان پیچھے والی سیٹ پر براجمان سگریٹ پی رہے تھے۔ میں نے اسٹیرنگ سنبھالا اور انہوں نے مجبوراً دھکا لگایا۔ میں نے کلائی کی گھڑی پر نگاہ ڈالی تو مجھے اندازہ ہوا کہ رضوی صاحب کی دی ہوئی مہلت سے بھی پانچ منٹ زیادہ گزر چکے تھے۔ کلچ چھوڑتے ہی انجن نے جھٹکا لیا، اور اسٹارٹ ہو گیا۔ جنازہ ابھی تک باہر نہیں آیا تھا۔ میں نے کار کو سڑک کے وسط میں روکا۔ نیچے اترا اور ان نوجوانوں کا شکریہ ادا کرنے کے بہانے مزید دو منٹ ضائع کیے۔ جب میں نے پھر اپنی جگہ بیٹھ کے پیڈل دبایا تو فاکس ویگن آگے بڑھی اور اسی وقت مجھے سامنے کے آئینے میں پیچھے کا منظر دکھائی دیا۔ جنازہ باہر آ گیا تھا اور لوگ بڑی عجلت میں کاروں سے نکل نکل کے ان لوگوں میں شامل ہو رہے تھے جو رابعہ کی کوٹھی کے دروازے سے ہجوم کی شکل میں نکل رہے تھے۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا اور کار آگے بڑھائی۔ جنازے کو میاں میر صاحب کے قبرستان جانا تھا چنانچہ سب خالی کاریں وہیں کھڑی رہ گئی تھیں۔ سوائے ایک کار کے جو قطار میں سے نکل کے میرے پیچھے آئی تھی کسی نے اس پر غور نہیں کیا تھا کیونکہ وہاں کھڑی ہوئی سب کاریں جنازے میں شرکت کے لیے آنے والوں کی نہیں تھیں۔

میں نے محسن سے بھی نہیں کہا تھا کہ میں کیا کرنا چاہتا ہوں۔ اس وقت تک خود مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں کیا کروں گا لیکن میرے ذہن میں محسن کی بات ٹوٹ کر رہ جانے والے کانٹے کی خلش بن کر موجود تھی۔ خود میں بھی محسن کا ہم خیال تھا کہ معاملات اگر ہمارے ہاتھ میں رہتے تو بہتر تھا۔ نہ جانے کیوں میرا دل بھی کہتا تھا کہ رضوی صاحب کے حفاظتی اقدامات آخری وقت میں بے کار ثابت ہوں گے۔ اب جنازہ آبرو کے ساتھ اٹھ چکا تھا اور مجھے یقین آنے لگا تھا کہ محسن نے بھی رابعہ کو نکال لیا ہو گا۔ کسی بہانے سے، قائل کر کے یا زبردستی۔ اور باقی رہ گئی ہوں گی وہ عورتیں جو سوائے چند ایک کے خود بھی رضاکارانہ رہی ہوں گی۔

میں نے اس کار کو دیکھا جو میرے پیچھے آ رہی تھی ۔۔۔ میں اس کا نمبر نہیں دیکھ سکا تھا لیکن وہ سفید رنگ کی ٹویوٹا تھی۔ سڑک سے میں نے کارپوریشن کے کوڑا اٹھانے والے اس ٹرک کو بھی دیکھا جو نہ جانے کب سے ایسے ہی سڑک کے کنارے اٹھا پڑا تھا۔ کسی لاوارث لاش کی طرح۔ فیصلہ میرے ذہن میں یوں آیا جیسے زلزلہ آتا ہے کہ لمحہ بھر پہلے زمین ساکت اور پُرسکون ہوتی ہے اور دوسرے ہی لمحے دستِ غیب سب کچھ تہہ و بالا کر دیتا ہے۔ میں نے گاڑی کو تیزی سے ایک کوٹھی کے گیٹ میں موڑ لیا۔ سفید ٹویوٹا نے یک لخت رفتار میں اضافہ کیا اور گولی کی طرح میرے پیچھے آئی۔ کوٹھی کا صرف ایک ہی گیٹ تھا۔ پرانی وضع کی ایک منزلہ کوٹھی کے برآمدے میں دو عورتیں بید کے فرنیچر پر درمیان میں چائے کے برتن رکھے بیٹھی تھیں۔ ان دونوں نے بیک وقت حیرانی و پریشانی سے سرخ فاکس ویگن کو دیکھا لیکن میں پورچ تک جانے والے راستے کو چھوڑ کر دائیں طرف گھوم گیا۔ اس وقت تک میں طے کر چکا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میں پھولوں کو بیدردی سے روندتا ہوا لان پر سے گزرا جو گھر کی مناسبت سے مختصر تھا۔ عورتوں نے بیک وقت خوفزدہ ہو کے چیخ ماری اور میں نے آنکھیں بند کر کے ایکسیلیٹر کو دبا دیا۔ کار نے ایک جنانہ قوت کے ساتھ جست لگائی اور اس کا انجن زبردست طاقت کا اظہار کرتے ہوئے گرجا۔ گاڑی توپ سے فائر ہونے والے گولے کی طرح بڑھی اور میں نے خود کو سنبھال کے اسٹیرنگ کو مضبوطی سے تھام لیا۔ احاطے کی دیوار سے تصادم کی آواز کے ساتھ ہی مجھے جھٹکا لگا مگر بمپر نے پرانی دیوار کو بلڈوزر کے بلیڈ کی طرح گرا دیا تھا اور اینٹوں کے ڈھیر ہونے سے پہلے گاڑی اگلی سڑک پر آ چکی تھی۔ اس وقت میں نے یہ نہیں دیکھا کہ اگلے یا پچھلے حصے پر اینٹوں سے کتنے ڈینٹ پڑے ہیں اور پچھلی سیٹ پر لیٹے ہوئے شخص کا کیا حال ہوا ہے۔ سب سے پہلے میں نے اپنے آپ کو دیکھا۔ مجھے کوئی گزند نہیں پہنچا تھا اور ونڈ اسکرین سلامت رہا تھا ورنہ اس کا شیشہ بکھر تا تو مجھے زخمی کر سکتا تھا اور میرے چہرے پر لگتا تب مجھے اندھا بھی کر سکتا تھا۔ اس کے بعد میں نے سفید ٹویوٹا کو اسی کوٹھی کے گیٹ میں داخل ہوتے دیکھا اور مسکرایا۔ ان کے راستے میں ٹوٹی ہوئی دیوار کا ملبہ حائل تھا اور ان کے لیے باہر نکلنے کے دو ہی راستے تھے۔ یا تو وہ ریورس گیئر میں واپس ہوں اور پھر گیٹ سے نکلیں۔ یا دوسری جگہ سے دیوار شق کر کے میری تقلید کرتے ہوئے سڑک پر آ جائیں لیکن میرے مقابلے میں ان کی مشکلات زیادہ تھیں۔ لان پر پانی دیا گیا تھا اور اس بات کا امکان تھا کہ ریورس گیئر میں گاڑی کے پہیے دھنس جائیں اور وہیں گھومنے لگیں تو کار پھنس جائے۔ فاکس ویگن کے پہیے بڑے تھے اور میں پوری رفتار سے گزر گیا تھا۔ ٹویوٹا کے ڈرائیور نے تذبذب کا مظاہرہ کیا اور رک کر واپس ہونا چاہا تو شاید کامیاب نہ ہو۔ اگر اس نے بھی دیوار میں سے گزرنا چاہا تو میرے مقابلے میں ان کے لیے خطرات پھر زیادہ ہوں گے۔ ٹویوٹا لمبی کار تھی اور اس کی پک اپ فاکس ویگن جتنی نہیں تھی کہ ملبہ اوپر گرنے سے پہلے رکاوٹ عبور کر جائے۔ اس کا ونڈ اسکرین ٹوٹنے اور توازن بگڑنے کے امکانات بھی زیادہ تھے۔ مجھے فاکس ویگن کے بمپر نے بھی بچایا تھا جو کافی آگے نکلا ہوا ہوتا ہے اور ایک فائدہ مجھے یہ بھی حاصل تھا کہ انجن پیچھے تھا جسے نقصان نہیں پہنچ سکتا تھا۔ ٹویوٹا کا انجن آگے تھا چنانچہ تصادم کے بعد اس کا بند ہو جانا بھی ممکن تھا۔ ان باتوں کے علاوہ مجھے یقین تھا کہ عورتیں فاکس ویگن کا نمبر تو شاید نہ دیکھ سکی ہوں مگر ٹویوٹا کا نمبر وہ یقیناً دیکھیں گی کیونکہ فون ہوا تو فوراً اندر بھاگ گئی ہوں گی۔ دشمن کی کار پھنس گئی تو وہ اس کو چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہوں گے اور مجھے کچھ مہلت مل جائے گی۔ کسی کا برا میں نے کبھی نہیں چاہا لیکن اس وقت بے اختیار میرے دل سے دعا نکلی جو بددعا تھی کہ کاش ان کی گاڑی پھنس جائے اور وہ زخمی ہو جائیں۔

جب میں ٹیڑھی میڑھی کار کو دوڑاتا ہوا واپس جا رہا تھا تو مجھے سڑک کے کنارے ایک سپیرا نظر آیا۔ وہ مزے سے بین بجاتا اپنی پٹاری کو پڑالے پیدل جا رہا تھا۔ بجلی کی طرح میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور میں نے بریک لگا کے گاڑی کو بالکل سپیرے کے پاس روک لیا۔ وہ کچھ سہم کر ایک طرف ہو گیا اور اس کی بین رک گئی۔

"دیکھو، ادھر آؤ۔" میں نے اسے انگلی کے اشارے سے قریب بلایا۔ "یہ جو سانپ ہیں تمہارے پاس، یہ خطرناک ہیں؟"

سپیرا ڈرتا ڈرتا قریب آیا۔ "نہیں بادشاہو! ہم پیٹ پالنے کے لیے تماشا کرنے والے جوگی ہیں۔ سانپ کا زہر پہلے ہی ختم کر دیتے ہیں۔ بچوں کو بڑوں کو ہم سے اور ہمارے سانپ سے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا اور ہمارے پاس تو ایک ہی سانپ ہے سرکار!" وہ مجھے مجسٹریٹ یا پولیس افسر وغیرہ سمجھ کر وضاحت کر رہا تھا کہ اس کے پاس کوئی ایسا سانپ نہیں جس سے کسی کی جان جانے کا اندیشہ ہو۔

"اچھا اچھا۔" میں نے کہا۔ "یہ بتاؤ کتنے میں بیچو گے اسے۔ مجھے ایک ہی سانپ چاہیے۔"

وہ کچھ دیر ہکا بکا کھڑا میری صورت دیکھتا رہا۔ "یہ نہیں بیچتے نہیں ہم جوگی۔ یہ تو اپنی روزی ہے۔"

"ارے بابا! تم دوسرا لے لینا۔ جہاں سے بھی ملے تمہیں معلوم ہو گا کہاں ملتے ہیں۔" میں نے جھنجھلا کے کہا۔ "قیمت بتاؤ۔ دو سو، چار سو۔۔۔" اس کی آنکھیں حیرت سے اور پھیل گئیں۔ میرا اندازہ تھا کہ اس نے سانپ جنگل سے پکڑا ہو گا اور وہ دوسرا بھی آسانی سے حاصل کر لے گا۔

لیکن اس نے دیکھا کہ میری ضرورت اشد ہے اور میں منہ مانگی قیمت بھی دے سکتا ہوں۔ "نہ دو نہ چار بادشاہو! پورے ایک ہزار۔" اس نے انگلی اٹھائی۔

میں نے اپنا پرس نکالا۔ اس میں صرف سات سو روپے تھے۔ حرامزادہ ۔۔۔ میں نے دل ہی دل میں اسے گالی دی۔ پھر مجھے اس شخص کا خیال آیا جو پیچھے لیٹا تھا۔ جب ہم اسے قیدی بنا کے لائے تھے تو محسن نے دس ہزار کی ایک گڈی بھی اٹھا لی تھی۔ یہ رقم ہمیں مقتول چوکیدار کے وارثوں کو ارسال کرنی تھی۔ محسن نے یہ گڈی گلوز کمپارٹمنٹ میں ڈال دی تھی۔ ایک منٹ بعد میں سو سو کے دس نوٹ دے کر اور پٹاری لے کر پھر روانہ ہو چکا تھا اور سپیرا ہاتھ میں نوٹ پکڑے وہیں کھڑا رہ گیا تھا۔ ایک فضول سے بے ضرر سانپ کے بدلے اسے منہ مانگی دولت مل گئی تھی۔ جتنی شاید وہ پورا مہینہ جھک مار کر بھی نہ کما پاتا۔ اسے افسوس ہو رہا ہو گا کہ کاٹھ کا الو پھنسا تھا اور اس نے دو ہزار یا دس ہزار حاصل کرنے کا سنہری موقع گنوا دیا۔

گاڑی کو پھر اسی جگہ روک کے میں نے پیچھے دیکھا۔ کوئی شکستہ حال ٹویوٹا سڑک پر دور دور تک نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں نے دروازہ کھول کے اس شخص کو گھسیٹا اور کندھے پر ڈال کے ساتھ والی کوٹھی میں داخل ہو گیا۔ قدرت خود ساز گار حالات فراہم کر رہی تھی۔ باہر کوئی نہیں تھا اور مجھے اس بیہوش شخص کو جھاڑیوں کے پیچھے ڈالتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا۔ رابعہ کی کوٹھی کے دروازے سے اکا دکا خواتین باہر آ رہی تھیں میں

پھر باہر بھاگا۔ کار کا بونٹ پچک گیا تھا اور ہاتھ لگاتے ہی اٹھ گیا۔ فاضل ٹائر اور جیک وغیرہ کے علاوہ اس میں سے مضبوط نائلون کی رسی بھی برآمد ہوئی جو شاید اس لیے رکھی گئی تھی کہ کہیں گاڑی بالکل ہی جواب دے جائے تو اس کو کسی دوسری گاڑی کے پیچھے باندھ کر لایا جا سکے۔ میں نے بڑی پھرتی سے بیہوش شخص کی مشکیں کسیں اور پٹاری سمیت رابعہ کے گھر میں کود گیا۔ رضوی صاحب کے آدمی اگر پوزیشن سنبھال چکے تھے تو شاید کمرے میں اور کوٹھی کے سامنے والے حصے میں مصروف تھے۔ ان میں سے ایک نے مجھے اوپر جاتے دیکھا اور میرا راستہ روکنے کی کوشش کی۔ میں نے اسے بتایا کہ میں گھر کا آدمی ہوں اور وہ ضامن رضوی صاحب کی ہدایات کے مطابق اپنا کام جاری رکھیں۔ یہ حوالہ مجھے معتبر ثابت کرنے کے لیے کافی تھا۔ پٹاری کو میں نے پیچھے کر لیا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس میں کتنا بڑا سانپ ہے لیکن وزن سے اندازہ ہوتا تھا کہ سانپ چھوٹا ہی ہے۔ تاہم اس کی دہشت خواتین کے مجمع کو جتنی جلدی منتشر کر سکتی تھی اتنی جلدی اسٹین گن بھی نہیں کر سکتی تھی۔ موقع ملتے ہی میں نے رابعہ کے کمرے کا دروازہ کھولا اور سانپ کو باہر نکالا۔ وہ مٹیالے سے رنگ کا چار فٹ لمبا اور ایک انچ سے کچھ موٹا سانپ تھا۔ میں نے اسے گردن سے دبوچ لیا اور اس کی دُم کو دوسرے ہاتھ میں پکڑ کے باہر دیکھا۔ باہر کوئی نہیں تھا۔ میں نے سانپ کو رابعہ کے کمرے کی سمت اچھال دیا جہاں سب خواتین جمع تھیں صرف ایک منٹ بعد کسی عورت نے دہل کر دل ہلا دینے والی چیخ ماری ”سانپ...“ اس کا ساتھ دیگر دو عورتوں نے دیا۔ پھر بھگدڑ مچ گئی۔ سانپ بے حس و حرکت پڑا تھا لیکن عورتیں اپنے بچے اور برقعے سمیٹ کر سخت بدحواسی کے عالم میں فرار ہو رہی تھیں۔ تاہم کچھ خوف کے باعث کمرے سے ہی باہر نہیں آ رہی تھیں۔ میں اطمینان سے آگے بڑھا اور میں نے خواتین کے سامنے سانپ کو لات مار کے دور پھینک دیا۔

”اب آپ لوگ نکل جائیں۔“ میں نے سانپ کے اور دروازے کے درمیان کھڑے ہو کر کہا۔ چند منٹ میں گھر کے اندر ماسی سمیت کوئی عورت نہیں رہی تھی۔ صرف ضامن رضوی صاحب کے چار آدمی مجھے گھور رہے تھے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ میں نے سانپ کا چکر کیوں چلایا تھا۔

”کہیں کوئی آتش گیر مادہ، ٹائم بم یا ڈائنا میٹ ملا؟“ میں نے اطمینان سے پوچھا جیسے میں ان کا افسر ہوں۔

ایک شخص نے نفی میں سر ہلایا۔ دوسرے نے کہا۔ ”ہم نے چیک کر لیا ہے۔“

”اچھا، تو آپ لوگوں کا کام ختم۔ آپ لوگ جا سکتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”وہ دھمکی جھوٹی ثابت ہو گئی تھی۔“

میرے لہجے سے وہ کچھ دب گئے۔ ”کیا ہم باہر موجود رہیں جناب؟“

”نہیں، تم لوگ جاؤ۔“ میں نے مزید تحکمانہ انداز اختیار کیا۔ ”میں کوٹھی کو لاک کر رہا ہوں۔“

انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور نیچے اتر گئے۔ میں نے نیچے جا کے دیکھا تو وہ دروازے پر کھڑے ہوئے لوگوں کو بھگا رہے تھے جو حواس باختہ خواتین کو فرار ہوتے دیکھ کر تجسس کے باعث رک گئے تھے۔ محسن نے ان کے نکلتے ہی گیٹ بند کر دیا۔

”تو نے رابعہ کو نکال دیا ہے نا؟“ میں نے کہا۔

”اسے تو رضوی صاحب کا شوفر لے گیا۔“ وہ بولا۔ ”تو نے یہ کیا ڈرامہ کیا ہے؟“

”میں سب کو چکر دے آیا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”قیدی بدستور ہمارے پاس ہے۔ برابر والی کوٹھی میں جھاڑیوں کے پیچھے پڑا ہے۔ وہ...“

اس سے پہلے کہ میں کچھ اور کہتا۔ کوٹھی کی دیوار پر یکے بعد دیگرے تین افراد نمودار ہوئے۔ ان میں وہ سلیٹی پتلون قمیص والا بھی تھا لیکن اس کے چہرے پر خون کی لکیریں سی نظر آ رہی تھیں۔ اس سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا کہ انہوں نے بھی میری طرح گاڑی نکالنی چاہی تھی مگر ناکام رہے تھے اور شاید ان کے اتنی دیر سے پہنچنے کا سبب یہی تھا کہ وہ پیدل دوڑتے ہوئے آئے تھے۔ میں نے چلا کر محسن سے بھاگنے کو کہا مگر ہمارے بھاگنے سے پہلے سلیٹی قمیص والے کے ہونٹوں سے ایک غلیظ گالی نکلی اور اس نے اندر کودتے کودتے ریوالور نکال کر فائر کر دیا۔ گولی نہ جانے کدھر گئی۔ اگلے فائر سے پہلے ہم اندر پہنچ چکے تھے۔ میں نے ہاتھ بڑھایا اور محسن نے پلک جھپکنے میں ریوالور مجھے تھما دیا۔ میں نے کھلے دروازے سے ایک فائر کیا جس کا مقصد محض دشمن کی پیش قدمی کو روکنا تھا۔ پھر میں زینے کی طرف لپکا۔ میں آدھے راستے میں تھا کہ وہ اندر آ گئے۔ محسن بالکل دروازے کے پیچھے تھا۔ اس نے پہلے شخص کو ٹانگ اڑا کے گرا دیا۔ وہ جیبیں کے بیچے فرش پر یوں گرا کہ اس کے پیچھے پیچھے آنے والا بھی نہ سنبھل سکا۔ لیکن پہلے والے نے فوراً اٹھ کر میرا نشانہ لیا اور میں نے دو زینے کود کے گولی چلائی۔ وہ چیخ کے ساتھ تیورا کے گرا۔ دوسرے نے محسن کی طرف گھومنا چاہا تھا کہ میں نے نشانہ لے کر فائر کیا۔ گولی اس کے شانے پر لگی اور اس کا اپنا نشانہ خطا ہو جانے سے محسن کی جان بچ گئی۔ محسن بھاگا اور اس نے پہلے چیت ہو جانے والے کے ریوالور کو فٹ بال کی طرح کک ماری۔ ریوالور چکنے فرش پر بڑی آواز کے ساتھ دور تک پھسلتا گیا۔ میں نے دفعتاً پوزیشن سنبھال کے محسن کو بچانے کے لیے دوسرے کا نشانہ لیا جو ایک شانہ زخمی ہو جانے کے باوجود ریوالور اٹھا رہا تھا اگر وہ حرکت نہ کرتا تو گولی اس کے دوسرے شانے میں لگتی مگر اس کے لڑکھڑا جانے کے باعث گولی اس کے سر میں گھس گئی۔ محسن سیدھا نکل گیا تھا اور میں سمجھ گیا کہ وہ پھر آخری حصے میں ماسی کے کمرے سے عقبی گلی میں نکل جائے گا اور پھر ساتھ والی اسی کوٹھی میں کود جائے گا جہاں ہمارا قیدی بندھا پڑا تھا لیکن اب صورت حال خاصی مخدوش ہو گئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ گولیاں چلنے کی آواز سڑک تک ضرور پہنچی ہو گی۔ عین ممکن ہے ساتھ والی کوٹھی میں رہنے والے بھی باہر نکل آئیں اور محسن کو اندر کودتا دیکھ لیں۔ اس کا راستہ تو شاید کوئی نہ روکے مگر اس قیدی کو وہاں سے نکالنا مسئلہ بن جائے گا۔ میں نے سوچا۔ اسی وقت ایک اور شخص اندر آیا۔ یہ سلیٹی رنگ کی قمیص پتلون والا تھا۔ اس نے کاریڈور میں دوڑ لگائی اور میں نے زینے پر سے جھک کے فائر کیا مگر وہ اسٹور روم کے دروازے تک جا پہنچا تھا جو پھر مقفل تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اسے غلط فہمی ہے۔ اس کے خیال میں ان کا آدمی ابھی تک اس قید خانے میں موجود تھا۔ تالہ توڑنا یا کھولنا ناممکن تھا چنانچہ مجھے امید تھی کہ وہ گولی چلا کے تالے کو اڑا دے گا مگر گولی کی آواز کے بجائے ایک خوفناک دھماکہ ہوا۔ گرد اور دھوئیں کا طوفان سا اٹھا اور مجھے اس گھر کی دیواریں گرتی نظر آئیں۔ میں دوسری طرف بھاگا۔ دھماکہ دستی بم کا تھا جس نے اسٹور روم اور اس سے ملحق کمروں کی چھت بٹھا دی تھی۔ میں ایک کھڑکی میں سے باہر لٹک گیا جو رابعہ کے کمرے سے نچلی منزل کے چھجے پر کھلتی تھی۔ اسی وقت دوسرا دھماکہ ہوا اور میرے ہاتھ خود بخود چھوٹ گئے۔ میں بارہ فٹ کی بلندی سے نیچے گرا۔ میری نظروں کے سامنے ذرا سی دیر کے لیے اندھیرا پھیل گیا۔ گرد اور دھوئیں میں مجھے سانس لینا دوبھر ہونے لگا۔ میں دیوار کا سہارا لے کر بھاگا اور سوچے سمجھے بغیر ساتھ والے گھر کی دیوار پھاند گیا۔ رابعہ کا گھر اب شعلوں کی لپیٹ میں تھا۔ افشائے راز کے خوف اور ایک آدمی کے لیے دشمنوں نے ایک گھر تباہ کر دیا تھا مگر مجھے کامیابی نے نیا حوصلہ عطا کر دیا تھا۔ میت اپنے مدفن کی طرف پورے سکون کے ساتھ محوِ سفر تھی۔ رابعہ ضامن رضوی کے گھر کی محفوظ پناہ گاہ میں پہنچ چکی تھی اور دشمن جس نے اپنے تین آدمی گنوا دیے تھے، ایک اسیر کو چھڑانے میں ناکام رہا تھا۔

دوسری طرف کودتے ہی مجھے محسن نظر آیا۔ ہم ایک ساتھ گیٹ کی طرف لپکے۔ کوٹھی کے مکین شاید خوفزدہ ہو کے اندر جا چھپے تھے میں نے جھاڑیوں کے پیچھے پڑے ہوئے شخص کو رسی تھام کے گھسیٹ لیا۔

”خیال رکھنا محسن! جو قریب آئے گولی مار دینا۔“ میں نے ریوالور اس کی طرف اچھال دیا اور اس شخص کو اٹھا کے گاڑی کی طرف دوڑا۔ رابعہ کی کوٹھی کے دروازے پر لوگوں کا ہجوم ہو رہا تھا اور شعلے مزید بلند ہو گئے تھے لیکن اس سے پہلے کہ کوئی ہماری طرف متوجہ ہوتا، میں اور محسن اپنے جنگی قیدی کو لے کر محاذِ جنگ سے فرار ہو چکے تھے۔ رابعہ کے گھر کے کھنڈر کو شعلے کھا رہے تھے لیکن اس کو اب یہاں لوٹ کے کب آنا تھا۔

”تو نے رابعہ کو سب بتا دیا تھا؟“ میں نے خطرے کی حدود سے نکلتے ہی کہا۔

”مجبوری تھی۔“ محسن بولا۔ ”وہ تیرے بارے میں متفکر تھی۔ کہنے لگی کہ سکندر کا جانا کیا ضروری تھا۔ ضامن رضوی صاحب کا کوئی آدمی بھی تو یہ کام کر سکتا تھا۔ میں نے کہا کہ شاید دشمن اعتبار نہ کرتے۔ پولیس کے درمیان میں پڑنے سے شکوک پیدا ہو جاتے۔ تو اب کیا وضاحت پیش کرے گا؟ تدفین کے بعد یہ لوگ واپس جائیں گے اپنی اپنی کار لینے تو وہ گھر جہاں سے جنازہ اٹھا تھا جل کے راکھ ہو چکا ہو گا۔“

”میں قبرستان میں رضوی صاحب سے بات کر لوں گا۔“ میں نے کہا۔ ”بہتر یہی ہے کہ وہ اور ہم سب کسی سے کچھ نہ کہیں۔ پولیس کو تفتیش کرنے دیں۔ حقائق جو سب کے سامنے آئیں گے، ہمیں بھی معلوم ہو جائیں گے۔“

”لیکن انہوں نے فون پر احکامات دیے تھے۔“

”اپنی ناکامی کا اعتراف کرنے کے بعد وہ مجبور ہوں گے کہ ان احکامات سے بھی لاتعلقی ظاہر کریں۔“ میں نے کہا۔ ”جو انہوں نے اپنے اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے جاری کر دیے تھے۔ سرکاری طور پر ان احکامات کا جواز پیش کرنا ان کے لیے اختیارات کے ناجائز استعمال کا مسئلہ بھی کھڑا کر دے گا۔ وہ اور ان کے ماتحت ملوث ہونے سے گریز کریں گے۔ یہ معاملات ہی ایسے ہیں۔“

میں نے گاڑی کو میاں میر صاحب کے قبرستان جانے والے انفنٹری روڈ کی طرف موڑنے کے بجائے اس کا رخ دھرمپورہ والی سڑک کی طرف کر دیا۔ فائر بریگیڈ والوں کی دو گاڑیاں گھنٹی

بجاتی ہمارے سامنے سے نمودار ہوئیں اور سیدھی گزر گئیں۔ میں نے جگہ دیکھ کر کار کو موڑا اور ایک بنک کے بند دروازوں سے چند قدم کے فاصلے پر دیوار سے یوں لگا کے کھڑا کیا کہ محسن کو میری طرف والے دروازے سے باہر آنا پڑا۔ کار کسی گھر کے سامنے نہیں تھی اور سڑک سے بھی دور تھی۔ ہمارا قیدی اگلی اور پچھلی سیٹوں کی درمیانی جگہ پر بندھا پڑا تھا اور فوری طور پر اس کے ہوش میں آنے کا خطرہ نہیں تھا۔ تاوقتیکہ بلاوجہ کوئی بند شیشوں سے ناک چپکا کے نہ دیکھتا کسی کو کچھ معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ الگ تھلگ کھڑی ہوئی خستہ حال کار میں کوئی آدمی بھی پڑا ہے۔ مزید احتیاط میں نے یہ کی کہ پچھلی سیٹ کو نکالا اور الٹا کر کے رکھ دیا اور پھر کچھ آگے بڑھا کے آگے والی سیٹوں سے ملا دیا۔ ہمارا قیدی اس کے نیچے آگیا اور گاڑی یوں نظر آنے لگی جیسے زیرِ مرمت ہے۔ سیٹ کے اسپرنگ دکھائی دے رہے تھے۔ نیچے سے بیٹری نمودار ہوگئی تھی اور سامنے کی ٹوٹ پھوٹ دیکھ کر مجموعی تاثر کچھ ایسا ہوتا کہ گاڑی مدت سے چلی نہیں۔ میں نے رومال سے چہرہ صاف کیا لیکن اس سے کام نہ بنا۔ ایک گلی سے شارٹ کٹ اختیار کرتے ہوئے مجھے مسجد نظر آئی اور میں وضو کرنے والی جگہ سے ہاتھ منہ دھو کے لوٹا تو وہ گرد و غبار صاف ہوا جو رابعہ کے گھر میں میرے چہرے اور بالوں پر بیٹھ گیا تھا۔ چلتے چلتے میں نے بالوں میں کنگھی پھیری اور ہم چند منٹ بعد الفنڈری روڈ پر طلوع ہوئے۔ قبرستان میں داخل ہوتے ہی ہمیں دو جگہ اجتماع دکھائی دیے۔ دور کے اجتماع میں کالے کوٹ نمایاں تھے۔ میں اور محسن خاموشی سے لحد کے گرد حلقہ بنا کے کھڑے ہونے والوں میں شامل ہوگئے۔ میری نظر نے ضامن رضوی صاحب کو تلاش کیا۔

وہ مجھے ہی دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں سوال دیکھ کر میں نے مایوسی سے سر ہلایا۔ رضوی صاحب کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ نامعلوم طریقے پر وہ پیچھے ہٹے اور ان کی نظر کا اشارہ پا کے میں بھی پیچھے ہوا اور گھوم کر ان کے قریب جا پہنچا۔ اب ہم لوگوں سے چند قدم دور کھڑے تھے۔ "سوری انکل!" میں نے سرگوشی میں کہا۔ "آپ کا انتظام فیل ہوگیا۔"

"کیا مطلب؟" انہوں نے میری طرف دیکھے بغیر کہا اور دونوں ہاتھ باندھے پیر پھیلائے سکون سے کھڑے رہے۔

"انہوں نے مجھے گھر سے نکلتے ہی آ لیا تھا۔" میں نے کہا۔ "سفید رنگ کی ٹویوٹا کار تھی۔ مجھے روکنے کے لیے انہوں نے فائرنگ کی تو مجھے جان بچا کے فرار ہونا پڑا۔"

"تم وہاں تک بھی نہیں پہنچے جہاں میرے آدمی موجود تھے؟ اس لیٹے ہوئے ٹرک تک؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں اس سے پہلے ایک کوٹھی میں گھس گیا تھا۔ اس کا دوسرا گیٹ ہی نہیں تھا۔ مجھے دیوار توڑ کے نکلنا پڑا کیونکہ وہ بھی لعاقب میں اندر آگئے تھے۔ غالباً ان کی کار وہیں پھنس گئی۔ میں واپس گھر گیا۔"

"وہاں بھی کوئی نہیں تھا؟" رضوی صاحب کے ماتھے کی شکنیں گہری ہوگئیں۔

"وہاں چار آدمی تھے۔ میں نے انہیں رخصت کر دیا۔" میں نے کہا۔ "میرا خیال تھا اب ان کی ضرورت نہیں رہی۔ کوٹھی میں ایک سانپ نکل آنے سے عورتیں خوفزدہ ہو کے بھاگ گئی تھیں۔"

"سانپ؟" رضوی صاحب نے حیرانی سے کہا۔ "سانپ کہاں تھا؟"

"اوپر، جہاں میت رکھی تھی۔ وہیں برآمدے میں کسی عورت نے دیکھا تھا۔ بےضرر سا سانپ تھا۔ میں نے مار دیا، مگر عورتیں چلی گئیں تو میں نے مناسب سمجھا کہ گھر کو لاک کر دوں۔"

"اور وہ آدمی؟ جسے وہ مانگ رہے تھے؟" رضوی صاحب کا ذہن تمام صورتِ حال کو سمجھنے کے لیے کوشاں تھا۔

"وہ ہمارے پاس ہی تھا... ہے...۔" میں نے کہا۔ "ہم چلنے ہی والے تھے کہ وہ اندر آگئے۔ انہوں نے گھر تباہ کر دیا۔ غالباً دستی بم مارے تھے۔ ہم بڑی مشکل سے یہاں پہنچے ہیں۔"

فکر و تردد کے آثار رضوی صاحب کی صورت سے عیاں تھے۔ "یہ معاملہ تو بہت سنگین ہوگیا ہے۔ مجھے بھی مشکل میں ڈال دیا ہے تم نے۔" ان کا موڈ خراب ہونے لگا تھا۔ "میں کیا جواب دوں گا؟"

"کچھ نہیں انکل! آپ نے زبانی احکامات دیے تھے۔" میں نے کہا۔ "وہ لوگ بعد میں پہنچے۔ بہتر یہی ہے کہ آپ اسے بھی دشمن کی چال کہیں۔ میرا مطلب ہے کوئی پوچھے تو قطعی لاعلمی کا اظہار کر دیجیے۔ کسی نے آپ کی آواز بنالی ہوگی۔"

"بالفاظِ دیگر میں جھوٹ بولوں۔" رضوی صاحب نے خفگی سے کہا۔ "قصوروار ماتحتوں کو بنا دوں کہ وہ تصدیق کیے بغیر کیوں آگئے۔ یا پھر ان سے بھی کہوں کہ وہ میرے احکامات اور تعمیل کرنے کے معاملات سے لاعلمی کا اظہار کریں۔ سکندر! تم نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا۔"

"دشمن تو وہ میری جان کے ہو رہے ہیں انکل! آپ کا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے۔" میں نے جانتے بوجھتے برا ماننے کے انداز میں کہا۔ "اگر آئندہ میں آپ سے مدد کی درخواست کروں تو آپ

انکار کر دیں۔" میں آگے بڑھ کے لوگوں میں شامل ہوگیا۔ غالباً رضوی صاحب کو بعد میں احساس ہوا کہ قصوروار میں نہیں اور جو کچھ ہوا اس کا اندازہ تو وہ خود بھی نہیں کر سکتے تھے۔

جب تدفین سے فارغ ہو کے لوگ واپس ہو رہے تھے تو وہ عمداً پیچھے رہے۔ "سکندر!" انہوں نے میرے ساتھ چلتے چلتے کہا۔ "میں تم سے اتفاق کرنے پر مجبور ہوں۔ مشکل یہ ہے کہ میں تم سے بےتعلق بھی نہیں رہ سکتا۔ گھر چل کے تم مجھے تفصیل سے بتاؤ گے کہ یہ آدمی تمہارے ہاتھ کیسے آیا۔ کون ہے اور اب اس کا کیا کرو گے؟"

"اسے تو میں اب آپ کے حوالے نہیں کر سکتا۔" میں نے کہا۔ "ورنہ آپ کے گھر پر بھی حملہ ہو سکتا ہے۔ ویسے میرا خیال ہے کہ اب وہ لوگ مطمئن ہو چکے ہیں۔ ان کو یقین ہے کہ وہ آدمی رابعہ کی کوٹھی میں ہی ہلاک ہوگیا۔ جل گیا یا دفن ہوگیا۔ یہ تو آپ کو رابعہ بہتر طور پر بتا سکتی ہے کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔ اسے سب معلوم ہے۔"

وہ مطمئن تو نہیں ہوئے لیکن مجھ سے مزید گفتگو کو انہوں نے لاحاصل سمجھا۔ محسن نے مجھے اور ان کو باتیں کرتے دیکھ لیا تھا اور دور دور چلتا رہا تھا۔ رضوی صاحب کے جدا ہوتے ہی وہ قریب آیا لیکن دوسری طرف سے منظر نے مجھے پہلے ہی آلیا۔

"یار! میں تم سے بات کرنا چاہتا تھا۔" وہ پھولی ہوئی سانس کے ساتھ بولا۔ وہ اتنا پیدل چلنے کا عادی نہیں تھا اور اپنے بھاری بھرکم وجود کا بوجھ گھسیٹنا اس کے لیے محنت طلب کام تھا۔ "رابعہ کے گھر پر موقع نہیں تھا، لیکن یہ تو دنیا کے معاملات ہیں۔ ایسے ہی چلتے ہیں۔ تمہارا وہ کیس تھا نا، دوبارہ والد مرحوم کا پوسٹ مارٹم کروانے کی درخواست، اس پر احکامات صادر ہونے سے پہلے تمہارا بیان ہوگا اور تین گواہ....."

"گواہوں کا مسئلہ حل ہوگیا ہے۔" میں نے کہا۔ "ایک تو چراغ دین کا چوکیدار ہے گلاب خان، دوسرا ایم ڈبلیو ڈی کا ایک اکاؤنٹنٹ مل گیا ہے غلام علی، وہی تیسرا گواہ بھی لائے گا۔"

"پی ڈبلیو ڈی کے اکاؤنٹنٹ کا اس کیس سے کیا تعلق؟" منظر بولا۔ "کوئی جاننے والا تھا؟"

"پی ڈبلیو ڈی نہیں، ایم ڈبلیو ڈی۔" میں نے کہا۔ "میر نذیر دلاور اینڈ کمپنی۔ فرم میں ایک تیسرا پارٹنر بھی شامل ہوگیا تھا۔ میر شرافت علی، وزیر خان اور چوہدری دلاور۔ فرم اب ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس کہلاتی ہے اور شاہدرہ میں ہے۔"

منظر نے سر ہلایا۔ "پرسوں کی تاریخ پڑی ہے۔ تم کو گواہوں سمیت حاضر ہونا ہے۔ ان کی نشاندہی پر قبر کھودی جائے گی۔"

"کہاں حاضر ہونا ہے؟" میں نے کہا۔ "اور کس وقت؟"

"صبح نو بجے ڈی ایم کی کورٹ میں۔" وہ بولا۔ "پھر عدالت میڈیکل بورڈ تشکیل دے گی اور ایس ڈی ایم کی موجودگی میں وہیں قبرستان میں دوبارہ پوسٹ مارٹم کرنے کے لیے تاریخ دی جائے گی۔ دو چار دن کے اندر اندر۔"

ہم سب سے پیچھے تھے۔ آگے چلنے والے رابعہ کے مکان پر پہنچے تو وہاں ایک ہجوم تھا جو سڑک کے دوسرے کنارے پر کھڑا فائر بریگیڈ کو پائپ سمیٹتے دیکھ رہا تھا۔ پورا گھر ایک جلا ہوا کھنڈر بن کے رہ گیا تھا جس کے گرد پولیس نے محاصرہ قائم کر رکھا تھا۔ لوگ ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ یہ کیا ہوا لیکن جواب دینے والا صرف وہی پولیس انسپکٹر تھا جس کی کمان میں ایک حوالدار اور دو کانسٹیبل آئے تھے۔ وہ سب قریب آنے والوں کو منتشر کرنے میں مصروف تھے تاکہ آگ بجھانے والوں کے کام میں خلل نہ پڑے لیکن اب انسپکٹر اچانک وکیلوں کے مجمع میں گھر گیا تھا اور اس کی نفری کے لیے ان کو ڈنڈے مار کے بھگانا مشکل تھا۔ اسے بار بار بتانا پڑ رہا تھا کہ اسے کچھ نہیں معلوم۔ وہ نہیں جانتا کہ مکان کس کا ہے اور مس رابعہ قاری ایڈووکیٹ کا ہے تو وہ یہ بتانے سے قاصر ہے کہ وہ اندر تھیں یا نہیں۔ اسے تو اطلاع ملی تھی کہ کراؤن سینما سے ذرا آگے ایک کوٹھی میں گولیاں چلی ہیں اور دو دھماکے ہوئے ہیں اور یہاں آ کے اس نے دیکھا تو فائر بریگیڈ پہنچا ہی تھا۔ اس وقت آگ ہی آگ تھی جو غنیمت ہے کہ دور تک نہیں پھیلی ورنہ یہاں اتنی گاڑیاں کھڑی تھیں کہ ایک کا پیٹرول ٹینک پھٹ جاتا تو دوسری کا بھٹہ بیٹھ جاتا اور دوسری سے تیسری کا کباڑا ہو جاتا۔ بظاہر اسے یہ شکایت تھی کہ آخر لوگوں کے پاس اتنی گاڑیاں کیوں ہیں اور آگ سے ہونے والے نقصان کی فکر نہیں تھی۔ پھر اس نے ضامن رضوی صاحب کو دیکھ لیا اور اس کا رویہ "اٹین شن" والا ہوگیا۔ رضوی صاحب کی نظریں ملبے کا جائزہ لے رہی تھیں اور خاموشی کے باوجود میں ان کی ذہنی کیفیت کا اندازہ کر سکتا تھا۔ دوسرے لوگوں کو تشویش تھی، ان کو پریشانی بھی تھی اور غصہ بھی تھا۔ ان پر جو لاقانونیت کا یہ مظاہرہ کر کے قانون کو چیلنج دے گئے تھے، مجھ پر اور محسن پر جنہوں نے اپنی "حماقت" سے اس مصیبت کو دعوت دی تھی

اور کچھ اپنے انتظامات کے ناکافی ثابت ہونے پر انہوں نے لوگوں کو مطمئن کیا کہ غالباً رابعہ کو ان کا شوفر لے گیا ہوگا۔ کیونکہ انہیں اپنی گاڑی نظر نہیں آ رہی ہے اور رابعہ کے اکیلے رہ جانے کے خیال سے وہ ہدایات دے گئے تھے کہ وہ ان کی واقف کے ساتھ چلی جائے۔ ایک ہمسائے نے تصدیق کی پیشکش کی اور رضوی صاحب نے اسے اپنے گھر کا نمبر بتایا۔ دس منٹ بعد یہ بات سب کو معلوم ہو چکی تھی کہ مس رابعہ خیریت سے ہیں۔ جانے والے اب سو باتیں کر رہے تھے۔ عام خیال یہی تھا کہ اس موقعے پر یہ انتقامی کارروائی انتہائی شرمناک حرکت ہے اور غالباً ذمے دار کوئی ایسا مؤکل ہوگا جس کا مقدمہ رابعہ جیت نہیں سکی ہوگی۔ ممکن ہے کسی پھانسی پر لٹک جانے والے قاتل کے وارثوں نے وکیل صاحبہ کو ان کی نااہلی کی سزا دی ہو جن کو فیس اس لیے دی گئی تھی کہ مؤکل کی جان بچائیں۔ وکلاء کی برادری کا نقطۂ نظر اور مطالبہ تقریباً ایک ہی تھا اور وہ بار کے اجلاس میں احتجاج کی اور پریس کانفرنس کی غنڈہ گردی کے بڑھتے ہوئے واقعات کی، پولیس کی نااہلی کے مقابلے میں قانون شکن عناصر کی روزافزوں وارداتوں کی باتیں کرتے رخصت ہو رہے تھے۔

دوبارہ ضامن رضوی صاحب کے روبرو ہونے سے پیشتر ہمارا غائب ہو جانا بہتر تھا۔ سب لوگوں کی طرح ہم بھی حیرت اور غم و غصے کے اظہار میں پیش پیش تھے اور ان معتبر گواہوں کی تعداد کافی تھی جو پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے تھے کہ ہم تدفین سے پہلے یہاں موجود تھے۔ ہمہ وقت جنازے کے ساتھ رہے اور سب کے ساتھ واپس آئے تھے۔ ضامن رضوی صاحب اب تفتیش کے لیے ہدایات جاری کر رہے تھے اور ایک اخبار کے رپورٹر سے بھی الجھ رہے تھے جو خبر پا کر یا محض اتفاق کے باعث آ پہنچا تھا۔ میں اور محسن ان کی نظر بچا کے ایک وکیل کی کار میں بیٹھ گئے۔ "ہمیں ذرا نہر کے پل پر اتار دیجیے گا۔" میں نے کہا۔ اس شریف آدمی کو جانا تو مخالف سمت تھا لیکن اتنے کم فاصلے کے لیے وہ اخلاق اور مروت کے تقاضوں کو نظرانداز کر کے انکار نہیں کر سکتا تھا۔

نہر کے پل پر اتر جانے کے بعد ہم نے تھوڑا سا فاصلہ پیدل طے کیا اور اس مقام تک پہنچے جہاں ہم نے رابعہ کی فاکس ویگن چھوڑی تھی۔ اس کو نمایاں کرنے والا ایک تو ٹماٹر جیسا چمکتا ہوا گہرا لال رنگ تھا۔ اب سامنے سے بمپر کے پچک جانے بونٹ کے دب جانے اور مڈگارڈوں کے بدنما ہو جانے سے اس کار کو شہر میں ہر جگہ دور سے پہچانا جا سکتا تھا۔ کار وہیں موجود تھی اور اسی حالت میں کھڑی تھی، جس طرح ہم نے چھوڑا تھا۔ دروازہ کھولنے تک مجھے یہ شک نہیں ہوا کہ کسی نے کار کا دروازہ کھولا ہوگا۔ اب شام کے سائے پھیلنے لگے تھے اور کار کے بند شیشوں سے اندر کا منظر نسبتاً کم روشنی کے باعث دکھائی نہیں دیتا تھا۔ مجھے اور محسن کو تشویش لاحق ہو چلی تھی کہ ہمارا قیدی زخمی ہونے کے علاوہ صبح سے بھوکا پیاسا بندھا پڑا ہے اور مرتا جا رہا ہے۔ کچھ بتانے سے پہلے ہی سختی کی تاب نہ لا کے دم توڑ دے۔ لیکن سیٹ کو اٹھاتے ہی شبہے کی گنجائش نہ رہی۔ میں نے پلٹ کر محسن کو دیکھا اور میری صورت دیکھتے ہی محسن سمجھ گیا کہ ہمارے اندیشے سچ ہو گئے ہیں۔ میں نے سیٹ کو سیدھا کر کے فٹ کیا اور محسن نے میری جگہ آ کے وہ خون دیکھا جو اگلی اور پچھلی سیٹوں کے درمیان بچھے ہوئے قالین پر جمع ہو گیا تھا۔

خون اس زخم سے نکلا تھا جو دل کے مقام پر نظر آ رہا تھا اور اب بھی رس رہا تھا۔ زخم اس خنجر کا تھا جس کا صرف دستہ سینے کے باہر تھا۔ اس کا پھل سینے سے گزر کے دل میں پیوست ہو چکا تھا۔ عالمِ بےہوشی میں ہی دستِ قاتل اپنا کام کر گیا تھا۔

"یہ حرکت کسی نے ابھی ابھی کی ہے سکندر۔" محسن نے کہا اور جھک کے دیکھنے لگا۔ "یہ . . . یہ ابھی مرا نہیں ہے۔" وہ کچھ دیر بعد چلایا۔ "بس اب یہاں سے بھاگنے کی کر۔ کوئی دیکھ لے گا تو ہم مارے جائیں گے۔"

محسن نے انجن میں چابی گھمائی اور انجن فوراً اسٹارٹ ہو گیا۔ تب مجھے خیال آیا کہ کچھ دیر پہلے ہم جان بچا کے اور اس قیدی کو لے کر رابعہ کے گھر سے فرار ہوئے تھے تب بھی کار کو دھکا لگانے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی حالانکہ صبح سے دو بار ایسا ہو چکا تھا۔ وہ نقص جو وقتی تھا دور ہو گیا تھا مگر مجھے یوں لگا جیسے وفادار گاڑی صورتِ حال کی نزاکت سمجھتی ہے اور وقت کے تقاضے کے مطابق ساتھ دیتی ہے۔ محسن نے کار کو نہر کے کنارے سے بائیں جانب موڑ دیا۔ ہمارا پہلا مقصد اس جگہ سے دور نکل جانا تھا۔

"گھر کو تباہ کر دینے کے باوجود وہ مطمئن نہیں ہوئے تھے۔" محسن نے رفتار بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے بعد میں بھی ہمارا تعاقب جاری رکھا۔" میں نے کہا۔

"لیکن یار! میں نے کسی کو پیچھے آتے دیکھا نہیں تھا۔" محسن بولا۔

"انہوں نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ بھاگ کر ہم کہاں جا سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "باقی سب لوگ اپنی گاڑیاں چھوڑ کر پیدل گئے تھے۔ ہم یہ گاڑی لے کر قبرستان جاتے تو سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی واحد کار کو سب دیکھتے اور پہچان کے حیران بھی ہوتے۔ شاید انہوں نے ہمیں پیدل قبرستان تک جاتے بھی دیکھا ہو۔ معمولی سی تلاش سے کار ان کو مل گئی ہوگی۔"

"پھر وہ اپنے آدمی کو کیوں نہیں لے گئے؟" محسن نے سوچتے ہوئے کہا۔

"ایک تو ان کے لیے یہاں اس کار میں سے کسی دستِ و بالتہ آدمی کو نکالنا آسان نہیں تھا۔ ٹریفک آتی ہے کہ مجمع اکٹھا ہو جاتا۔" میں نے کہا۔ "دوسری بات یہ کہ ان کو یہ تردد کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس سے زیادہ آسان کام خنجر گھونپ کے نکل جانا تھا۔ اس آدمی کا وجود ان کے لیے خطرناک ہو گیا تھا۔ جسے دیکھا تو ہم نے ہی تھا مگر دشمن کا خیال ہوگا کہ پولیس والے بھی دیکھ چکے ہیں اور ہو سکتا ہے تصویریں اور فنگر پرنٹ لے چکے ہوں۔ ایسے بےمصرف اور بےوقعت آدمی کے زندہ رہنے میں خطرہ تھا مگر اسے مار کے یہ خطرہ بھی ختم کیا جا سکتا تھا اور ہمارے لیے ایک مصیبت بھی کھڑی کی جا سکتی تھی۔"

"تیرا مطلب ہے وہ پولیس کو فون کر چکے ہوں گے؟" محسن نے چونک کر کہا۔ "کہ فلاں جگہ گاڑی میں لاش پڑی ہے؟"

"دشمن کو بےوقوف سمجھنا بےوقوفی ہے محسن! اتنے تجربات کے بعد بھی ان کی فطرت کا اندازہ کرنے میں غلطی نہیں کرنی چاہیے۔ اگر ہم وہاں سے فرار نہ ہوتے تو ذرا سی دیر میں پولیس پہنچ جاتی۔ ہم کیا وضاحت کرتے۔ سارا زمانہ دیکھ چکا ہے کہ صبح سے ہم یہ گاڑی لیے پھر رہے ہیں۔ ہم کیا بتاتے کہ باندھ کر قتل کرنے کے بعد ہم یہ لاش کہاں لے جانا چاہتے تھے اور ہم نے اسے مارا کیوں تھا؟"

"ارعائی گاڈ! ہم تو اس شخص کا نام بھی نہیں جانتے۔" محسن نے کہا۔ "ذرا دیکھ، ہمارے پیچھے کوئی ہے؟"

ہمارے پیچھے کوئی نہیں تھا چنانچہ میں نے محسن کو سڑک کے کنارے گاڑی روک لینے کے لیے کہا۔ سڑک پر سے کبھی کبھار کوئی گاڑی گزر جاتی تھی ورنہ سڑک ویران ہی تھی۔ میں نے اور محسن نے اس شخص کو اٹھا کے باہر نکالا اور کار کے پیچھے زمین پر لٹا کر اس کی رسیاں کھول دیں۔ وہ قریب المرگ تھا اور لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ میں دوڑ کر نہر تک گیا اور دونوں ہاتھوں کے پیالے میں پانی بھر لایا۔ ایک کار میرے پیچھے سے گزر گئی کسی نے کار کے پیچھے کا منظر نہیں دیکھا۔ میں نے زخمی شخص کے حلق میں پانی ٹپکایا اور باقی اس کے منہ پر گرنے دیا۔ وہ کراہنے لگا اور دو چار مرتبہ سر کو ادھر سے ادھر جھٹکنے کے بعد اس نے نیم وا آنکھوں سے مجھے دیکھا۔

"دیکھو . . . میری بات سنو . . . میری آواز آ رہی ہے نا؟" میں نے جھک کر کہا۔ اس شخص نے بمشکل تمام اقرار میں سر ہلایا۔ "ایک بات سمجھ لو . . . تم بہت زیادہ زخمی ہو . . . تم جانتے ہو کہ تمہیں مارنے والے کون ہیں . . . ہم تمہارا انتقام لے سکتے ہیں۔ ہمیں ان کا نام بتا دو۔ کون لوگ ہیں وہ؟ تمہارا بچنا بہت مشکل ہے . . . لیکن مرنے سے پہلے تم ایک نیکی کر سکتے ہو۔"

ایک بار پھر اس نے جسم کی ختم ہوتی ہوئی قوت کو مجتمع کیا۔ اس کے لب کانپے مگر الفاظ اس کے حلق سے خرخراہٹ بن کے نکلے۔ ایک مرتبہ پھر میں پانی بھر کے لایا مگر میرے ہاتھوں کے کاسۂ گدائی کا پانی موت سے مزید مہلت حاصل نہ کر سکا۔ محسن نے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا اور میں نے ہاتھ چھوڑ دیے۔ پانی خشک زمین میں جذب ہو گیا۔ اس خون کی طرح جو ایسے ہی خاک راہ گذر کو سیراب کر رہا تھا۔ ایک آدمی کے خون سے بھی کہیں زمین کی پیاس بجھتی ہے۔ زمین تو ازل سے ہر جگہ ہر وقت کے ذرّے پر وہ خون پیتی رہی ہے جو آدمی نے بہایا اور آدمی کا تھا۔ پتھر کے زمانے سے ایٹم بم کے زمانے تک لاکھوں کروڑوں اربوں مرنے والوں کا خون مٹی کا رنگ تک نہیں بدل سکا۔

"کچھ نہیں بتایا اس نے؟" میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"بتایا ہے۔" محسن بولا۔ "معلوم نہیں میں نے غلط سنا یا صحیح۔ اور وہ دمِ آخر ذہن میں آنے والے بےربط خیالات تھے یا ان الفاظ سے کوئی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔ ایک لفظ تو راج یا راجہ تھا۔ راج گڑھ یا راجہ گڑھ۔"

"راج گڑھ ایک محلہ ہے۔" میں نے کہا۔ "اور؟"

"کرامت . . . دوسرا لفظ مجھے کرامت سنائی دیا تھا۔ تیسرا لفظ غالباً سراج تھا۔ سرج تو ہو نہیں سکتا۔ سراب بھی مشکل ہے۔"

"کرامت اور سراج؟" میں نے کہا۔ "یہ تو نام ہو سکتے ہیں مگر راج گڑھ تو بہت بڑا علاقہ ہے۔ وہاں صرف نام سے کیسے تلاش کیا جا سکتا ہے۔ معلوم نہیں وہاں کتنے کرامت علی کرامت حسین اور کرامت دین ہوں۔"

سڑک کو خالی پا کے ہم نے لاش کو وہیں چھوڑا اور کار لے کر چل پڑے۔ یہ کار بھی اب ہمارے لیے چلتا پھرتا خطرہ بن گئی تھی۔ ایک اندیشہ یہ تھا کہ دشمنوں نے پولیس کو فون کیا ہوگا تو کار کا نمبر وغیرہ ضرور لکھوایا ہوگا۔ دوسرا اندیشہ یہ بھی تھا کہ ہم جس بنگلے کی دیوار توڑ کے نکل آئے تھے وہاں بھی خواتین نے نمبر دیکھ لیا ہو۔ اس خطرے سے نجات کی بہترین صورت یہی ہو سکتی تھی کہ گاڑی سے نجات حاصل کر لی جائے۔ میں نے اسے تقریباً دو میل آگے لے جا کر سڑک سے نیچے اتار دیا۔ اس کے گلوز کمپارٹمنٹ

میں سے نو ہزار رُپے کی گڈی کے علاوہ ہم نے کچھ نہیں نکالا تاکہ پولیس کو مالک کا سراغ لگنے میں آسانی ہو۔

رابعہ نے ضامن رضوی صاحب کو اپنے اغوا کیے جانے کی اور بازیابی کے لیے ہماری کوششوں کا تمام ماجرا بتادیا تھا۔ ہم رکشا سے اترے تو سورج غروب ہوچکا تھا مگر رضوی صاحب لان پر بیٹھے تھے۔ بالکل اکیلے اور اپنے خیالات میں غرق۔ ان کے سامنے کی تین کرسیاں خالی تھیں اور میز پر چائے کے برتن رکھے تھے۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ رابعہ آرام کررہی ہے۔ اور بہتر ہوگا اگر ہم اسے مزید پریشان کرنے کے بجائے ہاتھ منہ دھو کے یا غسل کرکے چائے کے لیے حاضر ہوجائیں۔ چائے کا تو بہانہ تھا، وہ ہمیں جھاڑ پلانا چاہتے تھے جس کے ہم مستحق تھے چنانچہ میں نے اور محسن نے سعادت مندی سے "جی" کہا اور اندر چلے گئے مگر نہانے دھونے کے بجائے رابعہ کے پاس جا پہنچے۔ اس وقت رضوی صاحب سے کہنا مشکل تھا کہ وہ رابعہ کی کار کے چوری ہونے کی رپورٹ لکھوانے میں ہماری مدد کریں۔ رابعہ ہماری بات سمجھ سکتی تھی اور رضوی صاحب کو سمجھا سکتی تھی۔

آدھے گھنٹے بعد ہم غسل وغیرہ سے فارغ ہو کے اور کپڑے بدل کے حاضر ہوئے تو رابعہ بھی ایک کرسی پر بیٹھی تھی اور تازہ چائے آچکی تھی۔ رضوی صاحب نے ٹیلی فون کرکے اپنے علاقے کے ایک تھانیدار کو بلوالیا تھا اور بہت برہم تھے۔ ان کی تمام برہمی کا نشانہ ہم ہی بن سکتے تھے۔ وہ خوب گرجے برسے "مذاق بنا لیا ہے قانون کو، ہیرو ہوگئے ہیں کل کے لونڈے صرف فلمیں دیکھ دیکھ کے۔ ہم نے جھک ماری ہے۔ کیا ضرورت تھی معاملات کو اپنے ہاتھ میں لینے کی، وہ خط اگر فوراً پولیس کے حوالے کردیا جاتا تو لیبارٹری میں کوئی نہ کوئی اسے پڑھ لیتا۔ معلوم ہوجاتا کہ یہ کیا اسٹنٹ ہے۔ سب دھر لیے جاتے۔ کیا ملا طرم خاں بننے سے۔ رابعہ کا گھر تباہ ہوگیا، ایک اسکینڈل کھڑا ہوگیا، کل اخبارات میں سنسنی خیز سرخیاں بھری پڑی ہوں گی۔ تحقیق و تفتیش کرنے والے جھک مارتے رہیں گے۔ ہم جانتے بوجھتے حقائق کی پردہ پوشی کریں گے۔ آئندہ کے لیے نوٹ کرو...!"

ایک اے ایس آئی نے مودبانہ سیلوٹ مار کے ہماری جان بخشی کرادی۔ رضوی صاحب کو خاموش ہونا پڑا۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ آخری رپورٹ جو چوری کے بارے میں تھی دو بج کر دس منٹ پر درج کی گئی تھی۔ رابعہ کی کار کی چوری کی رپورٹ کا وقت تین بجے کے قریب لکھا گیا۔ کار جنازہ اٹھ جانے کے بعد رضوی صاحب کے گھر کے دروازے پر سے چوری ہوئی تھی دوسرے واقعات بعد میں پیش آئے تھے۔ رپورٹ خود مس رابعہ نے لکھوائی تھی۔ اے ایس آئی نے رابعہ کے دستخط لیے سیلوٹ کیا اور رخصت ہوگیا۔

"ایک اور جھوٹ" رضوی صاحب نے چراغ پا ہو کے کہا "یہ چکر بڑا غلط ہے۔ ایک جھوٹ کو چھپانے کے لیے دس جھوٹ بولنے پڑتے ہیں اور کبھی نہ کبھی ایک جھوٹ پکڑا جاتا ہے تو جھوٹ کا پورا قلعہ ریت کی دیوار کی طرح گر پڑتا ہے" وہ بولتے رہے۔ میں اور محسن یہ سوچتے رہے کہ جب رضوی صاحب کو معلوم ہوگا کہ کار میں قتل ہوا ہے اور جو خون اس میں سے ملا ہے وہ اسی شخص کا ہے جس کی لاش نہر کے کنارے پڑی ملی تھی تب کیا ہوگا۔ میں نے بہتر سمجھا کہ یہ بات ان سے چھپانا اپنی پوزیشن کو ان کی نظر میں بھی مشتبہ بنانے کے مترادف ہوگا اور ہمیں ان کی مدد کی آئندہ بھی ضرورت تھی۔ میں نے ہمت کرکے اس بدقسمت شخص کے انجام کے بارے میں بھی بتادیا۔

"آئی سی" انہوں نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ "کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ تم اس شخص کو لے کر نہر کی طرف بھاگنے کے بجائے کسی ہسپتال لے جاتے۔ شاید اس کی جان بچ جاتی اور پولیس کو بھی بتادیتے جو سچ تھا۔"

"اس کی جان بچنے کا امکان ہوتا تو ہم یہ حماقت واقعی نہ کرتے" میں نے کہا "لیکن ہمارے سچ سے نقصان کسے ہوتا؟ اور فرض کیجیے وہ شخص ہوش میں آکے ہمارے خلاف بیان دے دیتا۔ مرنے والے کا بیان سچ سمجھا جاتا ہے۔ قانون ہم پر فردِ جرم عائد کردیتا۔ رابعہ کے اغوا کی کہانی بھی سنسنی خیز صحافت کو فروغ دینے والے نمک مرچ لگا کے چھاپتے۔ زیبِ داستاں کے لیے بھی بہت کچھ ملاتے اور رائی کا پہاڑ بنادیتے۔ میں یا آپ کس کس کی تردید کرتے۔ کس کس کو ہتکِ عزت کا نوٹس دیتے اور کیا یہ اسکینڈل نجی زندگی کے علاوہ رابعہ کی پیشہ وارانہ ساکھ کو ختم نہ کردیتا۔ میرا کیا ہے۔ مجھ پر ایک قتل کا الزام پہلے سے ہے، دشمن ویسے بھی میرے پیچھے لگے ہوتے ہیں اور آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ دشمن میں نے خود پیدا کیے ہیں۔ حقیقتِ حال سے واقف ہونے کے باوجود آپ سمجھتے ہیں کہ میری مدد سے آپ کی نیک نامی متاثر ہوگی تو صاف بتادیجیے۔ میں اپنا سامان اٹھا کے کہیں اور چلا جاتا ہوں۔"

میری بات کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ ضامن رضوی صاحب کھڑے ہوگئے۔ چلتے چلتے انہوں نے میرے کندھے پر تھپکی دی۔ "تم نوجوان جوشیلے اور جذباتی ہو۔ میری بات کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ میں تم سے یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ جاؤ جو دل چاہے کرتے پھرو، میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میری بھی کچھ مجبوریاں ہیں۔ قانونی، اخلاقی اور گھریلو، بس ان کا لحاظ کرو۔ اور مجھے کچھ نہیں کہنا ہے" وہ جانے کے لیے مڑے اور پھر رکے "یہ غلام علی کون ہے؟ دو مرتبہ فون آچکا ہے اس کا۔ تم سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتا ہے۔"

"میرا ایک دوست ہے" میں نے اٹھتے ہوئے کہا "میں خود بات کرلیتا ہوں۔"

اندر جا کے میں نے غلام علی کے کیمسٹ بھائی کی دکان کا نمبر ملایا۔ "انعام کیمسٹ" کسی نے کہا۔

"مجھے مسٹر غلام علی سے بات کرنی ہے" میں نے کہا "میں سکندر بخت بول رہا ہوں۔"

"اچھا اچھا جی! بڑا اچھا ہوا آپ نے فون کرلیا۔ بھائی جان پھر آئے بیٹھے تھے، آپ سے بات کرنے کے لیے۔"

"سکندر صاحب!" چند سیکنڈ بعد غلام علی نے فرطِ جذبات سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا "مجھے وہ سب مل گیا ہے۔"

"اچھا۔ بڑی خوشی کی بات ہے" میں نے ضامن رضوی صاحب کو موجود پا کے گول مول بات کی "کل پھر کہاں مل رہے ہو؟"

"جہاں آپ کہیں سر! میں تو آج ہی حاضر ہوجاتا مگر آپ سے بات ہی نہ ہوسکی۔"

"ہاں بھئی، وہ ہماری ایک عزیزہ ہیں، ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا تھا۔ سارا دن وہیں گزر گیا۔ خیر کل 'گارڈینیا' میں آجاؤ... ہاں... شام کا وقت رکھ لو یا صبح کا... گیارہ بجے ٹھیک رہے گا... تو پھر خدا حافظ" اگرچہ اس کے بعد غلام علی نے ریسیور رکھ دیا تھا مگر میں نے ظاہر کیا کہ بات جاری ہے۔ "ہاں... اچھا! کل ہی چلے جاؤ گے؟ ایک آدھ دن اور ٹھہر جاتے یار... گنجائش نہیں؟ پھر تو مجبوری ہے" میں نے ریسیور رکھ دیا۔ رضوی صاحب مطمئن ہو کے جاچکے تھے۔ انہیں یقین آگیا تھا کہ غلام علی واقعی کوئی ایسا دوست ہے جو رخصت ہونے سے پہلے آخری ملاقات کرنا چاہتا ہے۔ میں باہر آیا تو رابعہ اندھیرا ہوجانے کے بعد بھی وہیں بیٹھی تھی اور اکیلی تھی۔

"محسن کہاں گیا؟" میں نے بیٹھتے ہوئے کہا لیکن رابعہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ چپکے چپکے آنسو بہا رہی تھی۔ الفاظ کی تسلی بے معنی تھی۔ اس سے نہ نقصانات کی تلافی ہوسکتی تھی اور نہ دل کے درد کو درماں ملتا تھا۔ وقت کے یہ زخم وقت کی بھلائی گی ہی مندمل ہوسکتے تھے۔ چنانچہ میں خاموش بیٹھا رہا۔ یہ خاموشی بھی لاتعلقی یا بے حسی نہیں تھی۔ رفاقت اور غمگساری کے، ایک دوسرے کے دکھ کو سمجھنے اور اپنانے کی خواہش کے اور ذہنی ہم آہنگی کے احساس نے ہمیں جذبات کی زبان میں بات کرنا اور سمجھنا سکھادیا تھا۔ یہ زبان صدا نہیں سکوت مانگتی تھی جس میں دل کا ہر خیال وسیلہ اظہار کے بغیر دوسرے کے دل میں اتر جائے۔ بقول شاعر ؎

'میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے'——— والی بات ہو——— میری ایک مجبوری یہ بھی تھی کہ میں بات کرتے ہوئے ڈرتا تھا۔ اگر میں کہتا کہ رابعہ مجھے معاف کردو، تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا، اس کا ذمے دار میں ہوں۔ میں نے وہ خط تمہارے پاس پہنچایا تھا جس نے ہمیں ذہنی وجسمانی اذیت میں مبتلا کیا۔ تمہاری عدم موجودگی میں تمہاری ماں مر گئی اور ابھی جسدِ خاکی ابنی ابدی قیام گاہ تک بھی نہیں پہنچا تھا کہ وہ گھر نہ رہا جس میں اس کی زندگی کا سب سے طویل اور عزیز دور گزرا۔ اس سب کی سزا مجھے ملنی چاہیے تھی نہ کہ تمہیں۔ تو رابعہ کہتی کہ سکندر! کیا (نعوذ باللہ) تم دعویٰ کررہے ہو کہ میرا نوشتۂ تقدیر تمہاری تحریر تھا یا تم اس کو بدلنے پر قادر تھے؟ کیا میں فرض کرلوں کہ تمہاری نیت کے خلوص میں کھوٹ ہے اور تم میرے خیر خواہ نہیں تھے؟ معافی مانگ کے تم مجھے اور دکھی دیکھنا نہیں چاہتے تو ایسی فضول باتیں کیوں سوچتے ہو؟ میں نے کہا احساس کے عذاب سے میں کیسے نجات پاؤں؟ وہ بولی۔ 'کوئی بات کرو۔ کب تک چپ بیٹھے میری صورت دیکھتے رہو گے؟' اس نے اب اپنے آنسو سمیٹ لیے تھے۔

"تم نے کچھ سوچا ہے، رہائش کے مسئلے پر؟" میں نے کہا۔

"سوچا تھا، لیکن رضوی صاحب نے مجبور کردیا کہ مت سوچو" وہ بولی "وہ مجھے اس گھر سے جانے نہیں دیں گے۔"

"اس سے بہتر کوئی صورت نہیں ہوسکتی" میں نے کہا "یہاں تم محفوظ رہو گی۔"

"جب یہ تفتیش وغیرہ ختم ہوجائے گی اور حالات معمول پر آجائیں گے تو میں اس گھر کا ملبہ صاف کرادوں گی" وہ بولی۔ "ایک نہ ایک دن میں وہاں پھر اپنا گھر بناؤں گی۔ بنا تو کل بھی سکتی ہوں لیکن ابھی اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

'ہاں' میں نے پھر زبانِ خامشی میں کہا 'جب اس کی ضرورت پیدا ہوگی تو میں بھی تمہارا ساتھ دوں گا۔ وہ تمہارا نہیں ہمارا گھر ہوگا۔'

اس رات میں اور محسن لائٹ آف کیے اپنے اپنے بستر پر خاموش لیٹے رہے۔ ہم اپنے اپنے خیالات کے جنگل میں بھٹک رہے تھے مگر اس کے باوجود ایک دوسرے کے ساتھ تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ محسن کیا سوچ رہا ہے اور محسن کو یہ بتانا ضروری نہیں

تھا کہ میرے خیالات کا دھارا کس سمت میں بہہ رہا ہے۔ صرف ایک بار میں نے کہا تھا "یار سگریٹ ختم ہو گئے" اور محسن نے کہا تھا "ہاں یار! سگریٹ ختم ہو گئے" ہم دونوں ایک ساتھ اٹھے اور باہر آ گئے۔ نصف شب کی چاندنی اپنا جادو جگا رہی تھی مگر میرا تصور ویرانوں میں بھٹک رہا تھا۔ مجھے چاندنی ایک قبر کے مرجھائے ہوئے پھولوں پر نظر آئی، میں نے چاندنی کو ایک جلے ہوئے مکان کے کھنڈر پر روتے دیکھا۔ پلٹ کر دیکھنے پر مجھے دوسری منزل پر خواب گاہ کی ایک کھڑکی کھلی نظر آئی۔ اس کے فریم میں ایک سایہ رابعہ کے خدوخال کی خبر دے رہا تھا۔ شاید وہ بھی چاندنی کو وہیں دیکھ رہی تھی اور ویسے ہی دیکھ رہی تھی جیسے میں نے دیکھا تھا۔ میں اور محسن مضمحل اور بے حد تھکے ہوئے تھے اور ہمارے جسم سکون کی نیند مانگتے تھے مگر نیند تو ذہن کے دریچوں سے اترتی ہے اور یہ دریچے منتشر خیالات کی کثرت سے بند تھے۔ افریقہ کے جنگلوں کی زمین کی طرح جہاں درختوں اور شاخوں پر برگ و بار کی کثرت سورج کی ایک کرن کو بھی راہ نہیں دیتی۔ ہم ریلوے اسٹیشن تک گئے۔ چائے کے دو کپ پی کر بھی بنچوں پر بیٹھے رہے اور پھر سگریٹ کے پیکٹ خرید کے لوٹ آئے۔

میری آنکھ لگی تو دور سے صبح کی اذان کی آواز آ رہی تھی۔ پھر ایک لمحے کے دو حصے ہو گئے۔ پہلے حصے میں فوزیہ نے میرے سامنے آ کے کہا: "سکندر! کیا یہ سچ ہے کہ تم رابعہ کو چاہنے لگے ہو؟" دوسرے حصے میں فوزیہ کی جگہ رابعہ آ گئی۔ "آخر تم کب تک جھوٹ بولتے رہو گے اور بھاگتے رہو گے۔ آگے تو راستے بھی بند ہیں" اور مؤذن نے کہا "دلوں کے راستے بند نہیں ہیں۔ آؤ بھلائی کی طرف آؤ... آؤ بھلائی کی طرف، سچائی کی طرف۔ اس کی رحمت کے دروازے تو کھلے رہتے ہیں" میں اٹھ بیٹھا۔ وضو کر کے قبلہ رو ہو گیا۔ اس روز نماز کے اعجاز مسیحائی نے مجھے وہ سکون دیا جس کا میں طالب تھا اور جو مجھے کوئی بھی نہیں دے سکتا تھا خواہ اس کے اختیار میں تمام دنیاوی وسائل ہوتے۔

ساڑھے دس بجے میں ریگل کے اسٹاپ پر اترا تو زندگی کی ہر رونق اور تمام گہما گہمی عروج پر تھی۔ گزرے ہوئے دن اور یادِ رفتگاں کا خیال کسی کی راہ میں حائل نہ تھا اور میں نے بھی سڑک عبور کی تو میں صرف غلام علی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ "گارڈینیا" کے شفاف شیشوں والے دروازے پر ابھی تک پلاسٹک کی سفید تختی آویزاں تھی جس پر سرخ حروف سے "کلوزڈ" لکھا ہوا تھا۔ اس معیار کے ریستوران ساڑھے گیارہ بجے تک ہی کھلتے ہیں۔ میں ایک بک اسٹال پر کتابیں دیکھتا رہا۔ دس منٹ بعد میں نے ہر اخبار کی ایک ایک کاپی طلب کی تو دکاندار نے مجھے غور سے دیکھا اور زیر لب مسکرایا۔ میں پروا کیے بغیر مخالف سمت کے بس اسٹاپ پر مردانہ حصے کی بنچ پر جا بیٹھا۔ ہر اخبارات نے شہر کی مشہور وکیل کے مکان میں دھماکوں کا اور آتش زدگی کا ذکر کیا تھا۔ تصاویر شائع کی تھیں اور حالات کے پُراسرار ہونے پر تبصرہ کیا تھا کیونکہ یہ سب کچھ وکیل رابعہ قادری کی والدہ کا جنازہ اٹھتے ہی ہوا تھا اور اتفاق سے وہ خود گھر سے جا چکی تھیں۔ اخبار میں رابعہ کی تصویر تھی۔ ضامن رضوی صاحب کی تصویر بھی ایک اخبار نے الگ چھاپی تھی کہ انہوں نے تفتیش کے موقع پر نگرانی کی اور مس رابعہ قادری سردست انہی کے ساتھ قیام پذیر ہیں۔ مزید تصویریں تین سوختہ لاشوں کی تھیں جو ملبے سے برآمد ہوئی تھیں اور پہچانے جانے کے قابل نہیں رہی تھیں۔ گولیاں چلنے کا ذکر کہیں نہیں تھا اور یہ غالباً رضوی صاحب کی ذاتی کوشش کے طفیل ممکن ہوا تھا۔ اخبارات نے اسے بے ضمیر لوگوں کی انتقامی کارروائی قرار دیا تھا اور حکومت سے سخت اور فوری اقدامات کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ صرف ایک اخبار نے رابعہ قادری ایڈووکیٹ کی کار کے چوری ہونے کی خبر کے ساتھ کار کی تصویر بھی چھاپ دی تھی اور قیاس آرائی کی بنیاد پر کار میں ملنے والے خون کے نشانات کو اس لاش سے منسوب کر دیا تھا جو پولیس کو اسی سڑک پر دو میل دور ملی تھی۔ رپورٹر نے خیال ظاہر کیا تھا کہ حملہ آور بھاگتے وقت گاڑی بھی لے گئے اور کسی آپس کے اختلاف کے باعث انہوں نے اپنے ہی ایک ساتھی کو بھی قتل کر کے پھینک دیا۔ صرف ایک اخبار نے اس بنگلے کی تصویر چھاپی تھی جس میں ایک چوری کی سفید ٹویوٹا میں آنے والے ایک مرسڈیز فاکس ویگن کا تعاقب کرتے ہوئے پہنچے تھے لیکن کار چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

جب میں نے اخبار سمیٹے تو گیارہ بج کے دس منٹ ہو چکے تھے۔ "گارڈینیا" کے بند دروازوں پر وہی تختی پلٹ دی گئی تھی اور اب "اوپن" کے الفاظ خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ میں نے اخبار کو وہیں چھوڑا اور ریسٹورنٹ میں داخل ہو گیا۔ جہاں اندھیرے اجالے کا نرم امتزاج بڑا سکون بخش تھا۔ ہر میز خالی تھی اور میں اندر قدم رکھنے والا پہلا شخص تھا۔ مجھے کچھ مایوسی ہوئی۔ میرا خیال تھا غلام علی مجھے انتظار کرتا ملے گا مگر وقت کی پابندی نہ کرنا ہماری قومی عادت ہے۔ خود میں بھی دس منٹ دیر سے پہنچا تھا۔ غلام علی کو آدھے گھنٹے کی دیر بھی ہو سکتی تھی۔ میں نے چائے کا ایک کپ ختم کیا اور سگریٹ جلائی تو ساڑھے گیارہ میں پانچ منٹ کم تھے۔ میری نظر شیشوں سے گزر کے مال روڈ کی ٹریفک پر چلی گئی اور اچانک میں نے غلام علی کو دیکھا۔ وہ سڑک پار کرنے کے لیے ایک بس کے گزر جانے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کی بغل میں زرد رنگ کا زپ والا بیگ تھا جسے اس نے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ اس نے آدھی سڑک عبور کی اور ایک کار کو گزر جانے کا موقع دینے کے لیے رک گیا۔ پیچھے میری نظروں کے سامنے اس کار نے یکلخت رخ بدلا اور غلام علی کو خبر تک نہ ہوئی۔ کار نے اسے ٹکر مار کے اچھالا، وہ مضحکہ خیز طریقے پر اوپر گیا اور پھر سڑک پر گرا۔ کار پلک جھپکتے میں اس کے اوپر سے گزر گئی۔ میں نے جیب سے ایک نوٹ نکال کے رکھا اور باہر بھاگا۔ میں نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ وہ دس کا نوٹ تھا یا سو کا۔ میرے پہنچنے سے پہلے غلام علی کے گرد مجمع اکٹھا ہو گیا تھا لیکن وہ کار غائب ہو چکی تھی۔

ادھر ادھر سے دوڑ کر آنے والے بے بسی سے خاک و خون میں غلطاں اس ٹوٹے پھوٹے، بدنما گوشت کے پھڑکتے ہوئے ڈھیر کو دیکھ رہے تھے جو ابھی چند لمحے پہلے انہی کی طرح سو فیصد جیتا جاگتا آدمی تھا مگر اسے قطعی خبر نہ تھی کہ ان خوبصورت چمکتی دمکتی اور قیمتی کاروں میں سے ایک فرشتۂ اجل کا دھوکا دینے والا روپ ہے۔ موت اتنی مکار اور بدصورت ہوتی ہے۔ وہ خود کو اور ان بہت سی کاروں کو دیکھ رہے تھے جو اب بھی بچ بچ کے گزرتی جا رہی تھیں۔ یہ کون سوچ سکتا ہے کہ آدمی کی قاتل کار ہو سکتی ہے۔ شمشیر و سناں، خنجر، بھالے، بم، بندوق، زہر ہلاہل یا خون آشام درندوں سے تو موت کا تصور ابھرتا ہے مگر کار، جس میں خوش نصیب خوش پوش اور خوش باش لوگ۔ خوب صورت لڑکیوں کے ساتھ پھرتے ہیں اور جسے خریدنے کے لیے ہزاروں لاکھوں روپے جمع کرنے پڑتے ہیں، جائز و ناجائز ذرائع کا خیال کیے بغیر۔ اور جس سے آدمی کو عزت اور خود پر غرور کی مسرت ملتی ہے۔ اس کار میں اور دل میں پیوست ہو جانے والے خنجر میں اور سر کو پاش پاش کرنے والی گولی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ کچھ لوگ اسے حادثہ کہہ رہے تھے۔ جیسے ہر روز ہر گاڑی سے منزل تک پہنچنے والے ہزاروں مسافروں میں سے ایک اسی گاڑی کے نیچے آ جائے یا کوئی اسی بجلی کے جھٹکے سے ہلاک ہو جائے جو آپریشن تھیٹر میں جان بچانے والوں کے لیے چراغ روشن رکھتی ہے۔ کچھ لوگوں نے اسے سڑک پار کرنے کی کوشش کرتے بھی دیکھا تھا اور ان کا خیال تھا کہ غلام علی نے جلدی کی چنانچہ مرنے کی غلطی کی۔ حالانکہ آدمی مرنے میں اس وقت تک جلدی نہیں کرتا جب تک کہ اس کا خیال خودکشی کا نہ ہو۔ خیال ہی نہیں عزم مصمم نہ ہو۔ باقی لوگ یہ سمجھے ہوئے تھے کہ بالآخر پہلے سے طے شدہ وقت پر سب کو ایسے ہی اچانک نازل ہو کر راستہ روک لینے والے لمحے کے سامنے زندگی کا سفر ختم کرنا ہے جو کہیں بھی آ سکتا ہے اور اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آدمی منتظر ہے یا نہیں اور بستر پر لیٹا مستقبل کے خواب دیکھ رہا ہے یا سڑک پر چل رہا ہے۔ بہت سے لوگ کار والوں کو گالیاں دے رہے تھے کہ اندھے ہو کے چلاتے ہیں اور آدمی کو زمین پر رینگنے والا کیڑا سمجھتے ہیں اور افسوس کر رہے تھے کہ کسی نے کار کا نمبر تک نہیں دیکھا تھا۔

اس مجمع میں شاید میرے سوا کوئی نہیں تھا جس کو یقین ہو کہ غلطی کسی کی نہیں تھی۔ غلام علی نے وہ کار دیکھ لی تھی اور رک گیا تھا۔ کار والے نے غلام علی کو دیکھ لیا تھا اور اس کے اوپر سے گزر گیا تھا۔ دونوں نے وہی کیا جو ان کو کرنا تھا۔ میرے پہنچنے تک سڑک کے وسط میں بیس پچیس افراد جمع ہو چکے تھے۔ موٹر سائیکلوں پر گزرنے والے گردن بڑھا کے ذرا سی دیر کے لیے پاؤں ٹکا کے رکتے تھے اور چلے جاتے تھے۔ سڑک پر لوگوں کا مرنا معمول ہے۔ کسے فرصت ہے کہ غمزدہ ہو یا غمگساری اور تعزیت کرتا پھرے۔ مغفرت کی دعا مانگے یا لواحقین کے لیے صبر جمیل۔ آدمی کا آدمی سے رشتہ ایک نظریاتی بات ہے۔ آفس وقت پر پہنچنے کی ضرورت ایک عملی حقیقت ہے۔ میں نے ایک سارجنٹ کو دیکھا جو ٹریفک میں پڑنے والے خلل سے پریشان تھا اور لوگوں کو ڈانٹ ڈپٹ کے بھگا دینا چاہتا تھا۔ "چلو دفع ہو جاؤ، کوئی تماشا ہو رہا ہے یہاں؟" اس نے گرج کے کہا۔ تماشا تو تھا مگر خدا سمجھے ان پولیس والوں سے جو نہ جینے دیتے ہیں نہ مرنے دیتے ہیں۔ مرنے کا تماشا تک مفت نہیں دیکھنے دیتے۔

پسپا ہونے والوں میں ایک دبلا پتلا نوجوان بھی تھا، جس کی ناک طوطے کی طرح تھی۔ اس کی بغل میں مجھے زرد رنگین کا زپ والا بیگ نظر آیا۔ میں نے اسے غور سے دیکھا اور ایک لمحے کے لیے ہماری نگاہیں ملیں۔ اس کی آنکھوں میں خوف تھا اور وہ نامعلوم طریقے پر مجمع سے الگ ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرا شک یقین میں بدل گیا۔ میں اس کی طرف بڑھا تو وہ بس اسٹاپ کی طرف چلنے لگا۔ میں نے اپنی رفتار بڑھائی۔ وہ تقریباً دوڑنے لگا۔ اس کی نگاہیں کسی رکشا یا ٹیکسی کو تلاش کر رہی تھیں۔ میں اس کے پیچھے دوڑا تو وہ بے تحاشا بھاگا۔ مجھ سے بیس قدم آگے ہونے کا فائدہ یہ ہوا کہ وہ ایک بس میں چڑھ گیا جو روانہ ہونے کے بعد رفتار پکڑ چکی تھی۔ میں نے بے بسی سے ادھر ادھر دیکھا۔ کوئی مجھے لفٹ دینے کو بھی تیار نہ تھا۔ پھر ایک موٹر سائیکل والے نے رفتار کم کی۔ "کہاں تک جانا ہے؟" اس نے کہا۔ اس کی موٹر سائیکل بہت پرانے ماڈل کی تھی۔

"بس زمزمہ تک پہنچا دیں۔ میری بس نکل گئی ہے۔" میں نے

جواب دینے سے پہلے پیچھے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ٹالنٹن مارکیٹ کے اسٹاپ تک پہنچا سکتا ہوں" وہ بولا اور موٹر سائیکل نے دو افراد کا بوجھ اٹھا کے دوڑنا شروع کیا تو مجھے اس کی رفتار سے مایوسی ہوئی لیکن ٹالنٹن مارکیٹ سے پہلے اس بس کو کم سے کم دو جگہ رکنا پڑا جبکہ میری فلائیٹ نان اسٹاپ تھی۔ جی پی او کے اسٹاپ پر موٹر سائیکل اور بس ساتھ ساتھ پہنچے تھے۔ پھر بس پیچھے رہ گئی اور میں نے سر گھما کے دیکھا۔ اترنے والوں میں وہ شخص نہیں تھا۔ یونیورسٹی کے سامنے ٹالنٹن مارکیٹ کے بس اسٹاپ پر میں پہلے پہنچا اور جب ایک ہجوم بس پر حملہ آور ہوا تو میں نے ادب و آداب کو بالائے طاق رکھ کر بزور بازو جگہ بنائی اور دروازے کے قریب کھڑے رہنے کی جگہ بنانے میں کامیاب ہوا۔ بس کو سمن آباد تک جانا تھا چنانچہ میں نے آخری اسٹاپ کا ٹکٹ لے کر اس شخص کو تلاش کرنے کی کوشش کی پنجوں کے بل اونچا ہو کر دیکھنے سے بھی میرے لیے سب کے سروں پر سے آخری سیٹ تک ہر چہرہ دیکھنا مشکل ثابت ہوا۔ مزید یہ کہ لوگ مخالف سمت میں یعنی ادھر ہی منہ کیے کھڑے تھے جدھر بس جا رہی تھی۔ اسٹاپ گزرتے گئے۔ میں نے اوپر سے آنے والوں پر بھی نگاہ رکھی اور اس گول عدسے کی طرح بنے ہوئے آئینے میں بھی جھانکا جس سے اوپر کی منزل کی ہر سیٹ دکھائی دیتی تھی۔ میں کچھ مایوس ہونے لگا تھا کہ وہ اچانک اوپر سے نیچے آیا اور میں دبک کر پیچھے ہو گیا کہ اس کی نظر مجھ پر نہ پڑے۔ وہ اگلے اسٹاپ پر اترنے کی تیاری کر رہا تھا اور مطمئن تھا کہ مجھے پیچھے چھوڑ آیا ہے۔ یہ خیال اسے ضرور ہوگا کہ میں رکشا یا ٹیکسی لے کر تعاقب کر سکتا ہوں چنانچہ وہ محتاط تھا۔

اس نے بس کے رکنے سے پہلے ہی چھلانگ لگا دی اور میں عین وقت پر دو پہلوان ٹائپ افراد کے درمیان پھنس گیا۔ جو میری راہ میں چٹان کی طرح کھڑے تھے اور ہلنے پر آمادہ نہ تھے۔ میں نے غوطہ مار کے ان کے فربہ بدن کی دیوار کو شق کیا۔ دونوں طرف کہنی مار کے مزید گنجائش پیدا کی۔ ایک پہلوان نے ہنکار کے کہا۔ "اوئے کون اے شودا تخم؟" اور دوسرے نے کہا۔ "خیر ہوئے پہلوان جی!" اور مجھے دبوچنے کی فضول سی کوشش کی۔ ایک منحنی نوجوان کو دھکیل کر میں نے دروازے میں سے چھلانگ لگائی تو بس کافی آگے جا چکی تھی۔ "سالا جیب کترا۔" منحنی نوجوان نے کہا۔ میرے اترنے کا انداز واقعی جیب کتروں جیسا تھا میں سڑک پر گرا اور قلابازی کھا کے کھڑا ہو گیا۔ زرد بیگ والا پچاس قدم پیچھے مخالف سمت میں جا رہا تھا۔ اچانک اس نے پلٹ کر دیکھا اور مجھ پر نظر پڑتے ہی بھاگا۔ یہ رہائشی علاقہ تھا، جہاں ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ ایک گلی میں سو گز کی دوڑ لگانے کے بعد درمیانی فاصلہ آدھا ہو گیا تھا کہ وہ گھوم گیا۔ میں اس موڑ تک پہنچا تو وہ یوں غائب ہو گیا تھا جیسے ہوا میں تحلیل ہو چکا ہو۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ کسی گھر میں گھس گیا ہے۔ ایک منٹ کے فرق سے وہ زیادہ دور نہیں جا سکتا تھا لیکن میرے لیے شروع کے گھروں کا دروازہ بجا کے پوچھنا بھی ناممکن تھا کہ یہاں کوئی زرد بیگ والا آیا ہے۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں گلی کے موڑ پر جس مکان کے سامنے کھڑا ہوں وہ مقفل ہے اور غیر آباد لگتا ہے۔ گلی میں ایک طرف دو بچے کھیل رہے تھے۔ دوسری طرف ایک سبزی والا اپنی ریڑھی کو دھکیلتا اپنی آمد کا اعلان کرتا جا رہا تھا۔ اس کا منہ دوسری طرف تھا لیکن کسی بھی دروازے سے کوئی عورت سبزی خریدنے نکل سکتی تھی۔ میں نے خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے اوپر سے نیچے آنے والے زنگ خوردہ لوہے کے پائپ کو دیکھا اور دو منٹ بعد چھت پر جا پہنچا۔ نیچے گلی میں سبزی والے کو عورتوں نے گھیر لیا تھا مگر ان کی توجہ آلو بینگن وغیرہ کی طرف تھی۔ ارد گرد چھتوں پر کپڑے سوکھ رہے تھے۔ میں نے فوراً کونے کی تین دیواروں کے حصار میں پناہ لی جو بیت الخلا تھا اور لاہور کے اکثر پرانے مکانوں کی طرح چھت پر اوپن ایئر بنایا گیا تھا۔ گلی کی طرف کی دیوار کے ایک موکھے سے میں نے زرد بیگ والے کو سر نکال کر جھانکتے دیکھا۔ وہ دو گھروں کے درمیان واقع چھوٹی سی مسجد میں گھس گیا تھا۔ اب اس کے حیران ہونے کی باری تھی کہ تعاقب کرنے والا بلکہ چھلاوہ بن کے کہاں غائب ہو گیا۔ میں دلچسپی سے اس کا مشاہدہ کرتا رہا۔ چند منٹ بعد جب اسے یقین آنے لگا کہ میں واپس جا چکا ہوں تو وہ مسجد کے محرابی دروازے کی پناہ سے نکلا۔ میں نے موقعے کا خیال کیے بغیر پھر پائپ کی مدد سے لینڈ کیا۔ چڑھنے کی نسبت اترنے کا عمل بہت آسان تھا۔ کسی نے چلا کے مجھ سے کچھ کہا مگر میں پھر زرد بیگ والے کے پیچھے دوڑا اور اس ریس میں دخل انداز ہونے کی کوشش سب سے پہلے سبزی والے نے کی لیکن آگے والا بلا کا پھرتیلا تھا۔ سبزی والا ایک دھکے میں نیچے گرا، زیادہ مشتعل ہو کے اس نے ریڑھی کی مدد سے میرا راستہ بلاک کرنا چاہا۔ مجبوراً مجھے ریڑھی الٹ کے راستہ بنانا پڑا۔ وہ چیخ پکار کرتا ہوا ایک دو قدم دوڑا پھر رک گیا۔ وہ ریس میں شریک ہو کے ناکام واپس لوٹتا تو تمام گھریلو خواتین سیلف سروس کر کے ایک دن کی بھاجی مفت پکانے کے لیے لے جاتیں۔

وہ ایک بغلی سڑک پر طلوع ہوا اور میں نے ایک فرلانگ

تک اس کا پیچھا کیا۔ اس کا اسٹیمنا بھی کمال تھا کہ ایک میل سے زیادہ دوڑ لینے کے باوجود تھکن سے اس کی رفتار میں کمی نہیں آئی تھی، مگر میرا سانس پھولنے لگا تھا۔ بغلی سڑک ایک اور سڑک سے جا ملی جو کچھ بڑی تھی اور پھر ایک دلچسپ اتفاق ہوا۔ وہ شخص ایک موٹر سائیکل سے بچنے کی کوشش میں کھمبے سے ٹکرایا اور گر گیا۔ موٹر سائیکل دوسری جنگ عظیم کے زمانے کی "ٹرائمف" ملٹری ماڈل تھی اور اسے ایک پولیس والا چلا رہا تھا جس نے موٹر سائیکل روک کے مشتبہ طور پر فرار ہونے والے کو روک لیا۔ میں نے غور سے دیکھا تو پولیس مین حشمت خان تھا۔ تھانے سے باہر غیر معمولی حالات میں میری اس سے یہ دوسری ملاقات تھی۔ وہ اب زرد بیگ والے نوجوان سے کچھ پوچھ رہا تھا۔ اور اس کا زرد بیگ ہاتھ میں لے چکا تھا۔ زرد بیگ والے نے میری طرف دیکھا تو میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ سخت تذبذب میں پڑ گیا۔ اس کے لیے آگے کھائی پیچھے خندق والا مسئلہ تھا۔ پھر شاید پولیس کو بڑی مصیبت سمجھتے ہوئے اس نے مجھ سے نمٹنے کو ترجیح دی۔ میرے اشارے کا مطلب کچھ یہی نکلتا تھا کہ انسپکٹر کو کچھ معلوم نہ ہونے پائے اور اس سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جا سکتا تھا کہ میں اسے پولیس سے نجات دلانے کے موڈ میں ہوں۔ وہ ہم دونوں کا مشترکہ دشمن تھا اور ہمارا وقتی اتحاد اس کا مقابلہ کرنے کے لیے ضروری تھا۔ زرد بیگ والے نے یہ بات سمجھ لی۔ گر وہ الٹا مطلب نکالتا اور تعاون نہ کرتا تو مجھے کوئی نقصان نہ ہوتا۔ میں پاس جا کے کہا۔ "ہیلو حشمت خان! بھئی خوب ملے۔ کیا حال ہے؟" حشمت خان سودا کرنے والا آدمی تھا اس سے بیگ کا سودا کیا جا سکتا تھا اور اس چور کو بند کرنے کا بھی۔

جب میں نے حشمت خان کو پیچھے سے دبوچا اور اس کی کنپٹی پر ہاتھ مار کے بے سدھ کر دیا تو اسے بالکل خبر نہ ہوئی کہ حملہ آور کون تھا۔ بیگ قابو میں کر کے میں نے اس نوجوان کی طرف دیکھا۔ "بیٹھو میرے ساتھ ورنہ دونوں پکڑے جائیں گے۔" میں نے چلا کر کہا اور حشمت خان کی موٹر سائیکل پر جا بیٹھا جس کا انجن چل رہا تھا۔ نوجوان خوفزدہ اور ہکا بکا کھڑا تھا اور گلی میں پڑے ہوئے حشمت خان کے ڈھیر کو گھور رہا تھا۔ دوسری طرف سے دو آدمی ہڑبڑ مچاتے آ رہے تھے۔ "پاگل کے بچے مجھے بھی مروا دو گے۔" میں نے موٹر سائیکل کو گیئر میں ڈالا اور نوجوان اچھل کر پیچھے بیٹھ گیا۔ اس عجیب الخلقت موٹر سائیکل کو سنبھالنا اور چلانا آسان نہیں تھا مگر میں نے اسے جان ہتھیلی پر رکھ کے یوں چلایا جیسے بازیگر موت کے کنوئیں میں چلاتے ہیں۔ سمت کا خیال کیے بغیر میں تین میل دور نکل گیا۔ اتنی دیر میں مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ میرے ساتھ بیٹھا ہوا نوجوان نو آموز ہے، پیشہ ور نہیں ورنہ اب تک وہ خنجر یا پستول نکال چکا ہوتا۔ ایک سنسان جگہ موٹر سائیکل روک کے میں نے اس نوجوان کو دیکھا۔

"تم نے اس پولیس والے کو کچھ بتایا تھا اپنے بارے میں؟" میں نے پوچھا۔

"صرف نام، مگر وہ بھی غلط تھا۔" وہ بولا۔ "خدا کے لیے یہ بیگ مجھے دے دو۔"

"خدا کے لیے؟" میں نے حیرانی سے کہا۔ "خدا کو اس بیگ کی کیا ضرورت ہے۔ جن کو ضرورت ہے ان کو خدا کہنا کفر ہے۔ تمہیں کچھ معلوم ہے وہ کون لوگ ہیں اور اس بیگ میں کیا ہے؟"

"مجھے... مجھے کچھ نہیں معلوم۔" وہ بولا۔

"جھوٹ بولو گے تو اس سے زیادہ برا حشر کر دوں گا۔" میں نے حشمت خان کے حوالے سے کہا۔ "ایک وار میں گردن بھی توڑ سکتا ہوں میں۔ وہ تو اٹھ کھڑا ہوگا تھوڑی دیر میں۔ تم یہیں پڑے رہ جاؤ گے۔" میں نے ایک درخت کی خاصی موٹی شاخ کو جھکایا اور اس پر ہاتھ مارا۔ شاخ درمیان سے ٹوٹ گئی۔

وہ خوف سے کانپنے لگا۔ "قسم خدا کی، میں کسی کو نہیں جانتا، کچھ نہیں جانتا۔ مجھ سے تو ایک آدمی نے کہا تھا کہ ریگل کے بس اسٹاپ پر کھڑے رہنا ساڑھے دس بجے۔ وہاں ایک حادثہ ہوگا۔ جو شخص حادثے کا شکار ہوگا اس کے پاس ایک فائل ہوگی۔ فائل کسی بیگ یا بریف کیس میں بھی ہو سکتی ہے۔ تم کو وہ فائل لے کر کھسکنا ہے۔ کامیاب رہے تو دس ہزار روپے ملیں گے۔"

"کہاں ملیں گے؟ کون دے گا؟" میں نے کہا۔ "کیا تم اسی کے پاس جا رہے تھے؟" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ اس نے کہا تھا ہم خود تمہارے گھر آ کے فائل لے لیں گے مگر میں نے کہا میں گھر کا پتہ نہیں بتا سکتا۔ وہاں ایک تو میرا چھوٹا بھائی ہے جی! اسے پولیو ہو گیا تھا اور ٹانگیں بیکار ہو گئیں۔ ڈاکٹروں نے کہا علاج سے کوئی فائدہ نہیں۔ بیٹھ کے کرسیاں بن لیتا ہے۔ ایک ماں ہے۔ میری آمدنی سے گزارا نہیں ہوتا—" وہ رونے کے قریب ہو گیا تھا۔

"تم خود کچھ نہیں کرتے؟" میں نے کہا۔

"صبح اخبار تقسیم کرتا ہوں جی! اس کے بعد کالج چلا جاتا ہوں۔ شام کو ٹیوشن بھی پڑھاتا ہوں۔" وہ بولا۔

"اور یہ دس ہزار لے کر تم کیا کرتے؟" میں نے کہا۔

"بھائی نے کہا تھا دکان لے دو۔ کام زیادہ چلے گا، زیادہ آمدنی ہوگی۔ تم پڑھتے رہنا۔" وہ رونے لگا۔ "اب وہ مجھے مار ڈالیں گے۔ یہ لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔"

میں نے بیگ کی زپ کھولی۔ اس میں کوئی فائل نہیں تھی۔ ساٹھ ستر فل اسکیپ سائز کے صفحات کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں تھیں۔ فوراً مجھے وہ ترکیب سوجھ گئی جس سے کالج میں پڑھنے والے اس ناتجربہ کار اور کم عقل لڑکے کا مستقبل اور اس کی زندگی سب محفوظ رہتے تھے اور ہم دونوں کے مقاصد بھی پورے ہو جاتے تھے۔ میں نے اسے پھر موٹر سائیکل پر بٹھایا اور دس منٹ بعد ہم ایک فوٹو اسٹیٹ مشین شاپ کے سامنے جا رکے۔ میں نے تمام صفحات کی دو دو نقلیں بنوائیں۔ ایک نقل اسی زرد بیگ میں رکھی جس کے بدلے نوجوان کو دس ہزار مل سکتے تھے۔ "اب تم اطمینان سے گھر جاؤ۔" میں نے کہا۔ "وہ خود تمہارے گھر آئیں گے اور یہ کاغذات لے جائیں گے۔ تمہارے نہ جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ انہیں تمہارے گھر کا پتہ معلوم ہے۔ ان کو ہر سوال کا جواب پورے اعتماد کے ساتھ نفی میں دینا ہے۔ کسی نے بیگ اٹھاتے دیکھا تھا، نہیں۔ غائب ہوتے دیکھا تھا، نہیں۔ کوئی تعاقب میں آیا تھا، نہیں۔ تمہیں کوئی پولیس سارجنٹ نہیں ملا، میں نہیں ملا۔ میرے اور تمہارے درمیان کوئی ریس نہیں ہوئی، سب گول۔ بس تم ریگل سے بس پر سوار ہوئے اور گھوم پھر کے گھر آ گئے اور تم کر بھی کیا سکتے تھے۔ تم نے اپنے طور پر تسلی کر لی تھی کہ کوئی بھی پیچھے نہیں آیا ہے۔ اس امتحان میں پورے اترے تو دس ہزار مل جائیں گے، کسی پریشانی کے بغیر۔ لیکن ایک بات اچھی طرح سمجھ لو۔ خوش نصیبی بار بار ساتھ نہیں دیتی اور خدا ایک غلطی کو ضرور معاف کر دیتا ہے بشرطیکہ بندہ صدقِ دل سے اس کا اعادہ نہ کرنے کا عہد کرے۔ پھر ایسے کسی معاملے میں پڑو گے تو بوڑھی ماں اور معذور بھائی کو اپنے سہارے سے خود محروم کرو گے۔ تم مارے نہ گئے تو جیل جاؤ گے اور وہ مارے جائیں گے۔ محنت کرتے رہو گے تو کامیابی دیر سے ہوگی مگر باعزت ہوگی اور بے خطر ہوگی۔ اب جاؤ، بھاگ جاؤ۔"

"یس... یس سر!" اس نے بیگ لیا اور ایک قدم چل کے رکا۔ "مگر وہ تھانیدار جناب... وہ مجھے دیکھ چکا ہے۔"

"اس کا باپ بھی صرف ایک بار کسی کی صورت دیکھ کر اس شہر میں اسے تلاش نہیں کر سکتا۔" میں نے کہا۔ "لیکن خدانخواستہ ایسی ویسی کوئی بات ہوتا تو میں ایک فون نمبر بتا رہا ہوں۔ اسے صرف یاد رکھو، لکھنا نہیں۔ کہنا... " میں سوچ میں پڑ گیا۔ "کہ کبیر سے بات کرنی ہے۔ میں نہ ملوں تو پیغام چھوڑ دینا کہ زرد بیگ کی بات کرنی تھی۔ میں سمجھ جاؤں گا اور مجھ سے جو ہو گا وہ کروں گا۔ گڈ لک۔"

میں اسے ڈگمگاتے قدموں سے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس نے کئی بار مجھے پلٹ کر دیکھا۔ مجھے یقین تھا کہ ہماری ملاقات کا علم دشمن کے کسی ایجنٹ کو نہیں۔ اگر ریگل بس اسٹاپ پر کوئی تھا تو وہیں سے مطمئن ہو کے چلا گیا تھا کہ لڑکا بس میں نکل گیا اور میں رہ گیا۔ اس کے گھر کا پتہ میں نے اسی لیے نہیں پوچھا تھا کہ بعد میں میرا اور اس کا تعلق اس خاندان کے لیے مصیبت کا باعث نہ بنے جو بڑی ہمت کے ساتھ سخت حالات کا مقابلہ کر رہا تھا۔ مجھے امید تھی کہ اس سبق کے بعد یہ محنت کرنے والا لڑکا کبھی لالچ میں آ کے صراطِ مستقیم کو نہیں چھوڑے گا۔ یہ دس ہزار تو اسے ملنے ہی چاہئیں۔ اس نے حماقت ضرور کی تھی مگر خطرہ بھی مول لیا تھا اور محنت بھی کی تھی۔ واپس آتے ہوئے مجھے حشمت خان کا خیال کر کے بے اختیار ہنسی آئی۔ میں اس پر بلائے ناگہانی کی طرح نازل ہوا تھا۔ وہ ہوش میں آ کے اٹھے گا تو اسے اپنے گرد تمسخر اڑانے والے چہرے نظر آئیں گے جو ہمدردی بھی کریں گے تو یوں کہ بے عزتی محسوس ہو۔ وہ چیخے گا، چلائے گا اور گالیاں دے گا۔ "میں جانتا ہوں اس علاقے کے ایک ایک بدمعاش کو۔ مجھے معلوم ہو جائے گا یہ کون حرامزادہ تھا۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

حشمت خان سے ہٹ کے میرا دھیان غلام علی کی طرف چلا گیا۔ ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے۔ ہم جو خلوص اور جذبۂ احسان مندی کے اظہار کے مجرم تھے۔ پاس وفا رکھتے تھے، دشمن کسی کے نہ تھے۔ حقِ نمک کا قرض تھا سو ہم نے اُس خون سے ادا کر دیا جس میں وہ نمک شامل تھا۔ غلام علی کے انجام نے مجھے اداس کر دیا تھا اور یہ سوچنے پر بھی مجبور کر دیا تھا کہ دشمن کو اس کی اور میری ملاقات کا اور مقصدِ ملاقات کا علم کیسے ہوا؟ کیا وہ غلام علی پر نظر رکھے ہوئے تھے؟ ڈی سلوا کو شک ہو گیا تھا کہ پرسنل فائلیں آفس سے باہر لے جائی گئی ہیں؟ کیسے؟ غلام علی نے جذباتی ہو کے احتیاط کے تقاضوں کو ملحوظ نہیں رکھا تھا؟ کسی نے اسے فائلیں واپس لاتے ہوئے اور اپنی اپنی جگہ رکھتے دیکھ لیا ہو جس کی اسے خبر نہ ہوئی ہو۔ یہ سب قیاس آرائی تھی مگر جو بات میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا تھا، یہ تھی کہ منامن رضوی صاحب کا فون ٹیپ کیا گیا ہے ورنہ کسی کو کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ آج صبح گیارہ بجے میں نے کسی کو "گارڈینیا" میں ملنے کا وقت دیا ہے۔

اس سے بھی زیادہ فکر کی بات یہ تھی کہ میرے لیے گواہوں کا مسئلہ پیدا ہو گیا تھا۔ غلام علی وہ گواہ تھا جس نے مزید گواہ لانے کا وعدہ کیا تھا جو مجھے اگلے ہی روز پیش کرنے تھے۔ یہ انتہائی خود غرضانہ سوچ تھی اور مجھے اپنی کمینگی پر شرم بھی آئی۔ غلام علی اپنی جان سے گیا اور وہ بھی میری خاطر، وزیر خان مرحوم کی خاطر جن کا وہ احسان مند تھا اور مرتے مرتے اپنا فرض بھی چکا گیا لیکن مجھے خیال تھا تو ایک گواہ کے نہ رہنے کا۔ حقیقت بہرحال ناقابلِ تردید تھی۔ غلام علی کے مرنے کا دکھ اپنی جگہ کم نہ تھا مگر مجھے آنے والے دن کی فکر بھی کرنی تھی۔ گلاب خان چوکیدار کے علاوہ بھی مجھے دو گواہ مطلوب تھے۔ میرے لیے اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ میں "ایم ڈبلیو ڈی" کے آفس جاؤں اور علی الاعلان پوچھوں کہ وزیر خان مرحوم کے جنازے میں کون کون نمک حلال شریک ہوا تھا۔ جواب سامنے آنے کی ہمت رکھتا ہو۔

لیکن ڈی سلوا مجھے دھمکی دے چکا تھا کہ قانونی حقِ ملکیت کی سند کے بغیر میں نے دفتر میں قدم رکھا تو وہ مجھے پولیس کے حوالے کر دے گا۔ اس جیسا شخص مجھے واقعی دفعہ چار سو اکیاون ضابطہ فوجداری کے تحت بند کرا سکتا تھا۔ "لوہا لوہے کو کاٹتا ہے۔" میرے دل کی آواز نے کہا۔ "جائز ذرائع سے جائز کام کا حق بھی نہ ملتا ہو تو ناجائز ذرائع بھی جائز ہیں۔"

میں گھر پہنچا تو محسن رات بھر جاگنے کے بعد اب سو رہا تھا۔ بستر کو دیکھ کر خود میرا دل بھی چاہتا تھا کہ آنکھیں موند کر لیٹ جاؤں مگر میں جانتا تھا کہ آنکھ لگ گئی تو وہ وقت سونے میں گزر جائے گا جس سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ خود راحت بھی کوئی بڑی تھی۔ میں نے محسن کو جگایا اور اسے غلام علی کی المناک موت کی خبر دینے کے بعد اپنے پروگرام سے آگاہ کیا۔ اس کے اندر جا کے کھانا کھانے سے پہلے میں نے باہر کا ایک چکر لگایا اور ٹیلیفون لائن کا معائنہ کیا۔ ٹیلیفون لائن سے ایک کنکشن زیرِ زمین لے جایا گیا تھا۔ تار ایک درخت کی کھال سے چپکا ہوا تھا اور اوپر شاخوں میں گم ہو گیا تھا۔ میں نے کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔ یہ ضروری تھا کہ رضوی صاحب خود اپنی آنکھوں سے یہ "حسنِ انتظام" دیکھ لیں۔

سوا دو بجے ہم ایک ساتھ باہر نکلے۔ غلام علی کے فراہم کردہ کاغذات کی ایک نقل ہمارے پاس تھی، دوسری کو میں نے رضوی صاحب کی رائٹنگ ٹیبل کی سب سے نیچے والی دراز میں ڈال دیا تھا۔ محسن نے اخبارات دیکھ لیے تھے اور گھوڑے والے پیر سائیں کے قریب واقع کمپنی کے یارڈ سے ملنے والی چوکیدار کی لاش کا احوال بھی پڑھ لیا تھا۔ اس نے دس ہزار روپے ایک لفافے میں ڈال لیے تھے۔

"بیڈن روڈ پر تیرا کام بہت مختصر ہے۔" میں نے کہا۔ "تو اوپر جا کے یہ فوٹو اسٹیٹ کاغذات ڈی سلوا کی سیکرٹری کو دے دینا کہ صاحب کو پہنچا دے۔ جتنی دیر میں وہ اندر جا کے آئے تو غائب ہو جانا۔ وہ تجھے نہیں پہچانتی۔ اس کے بعد تو یہ دس ہزار اس چوکیدار کے گھر دینے چلے جانا۔ وہاں کے معاملات میں طے کروں گا۔"

"میں کچھ دیر نیچے انتظار کروں گا، چھپ کر۔" محسن بولا۔ "خطرے کی کوئی بات ہوئی...."

"خطرے کی کوئی بات نہیں ہوگی۔" میں نے پورے اعتماد کے ساتھ کہا۔ "مجھے اپنے والد کے پرانے وفاداروں سے ہی تو ملنا ہے۔"

ساڑھے تین بجے محسن نیچے اترا تو میں نے بیڈن روڈ کے ایک پبلک ٹیلیفون بوتھ سے ڈی سلوا کا نمبر ملایا۔

"ڈی سلوا صاحب!" میں نے اس کی آواز پہچان کے کہا۔ "کیا حال ہے۔ میں نے ایک تحفہ ارسال کیا تھا، مل گیا؟"

"کیا مقصد ہے اس کا؟" ڈی سلوا نے غصے سے پھٹتے ہوئے کہا۔ "بلیک میلنگ؟"

"وہ بعد میں دیکھی جائے گی۔" میں نے خوش اخلاقی سے کہا۔ "ابھی تو یہ تمہارے رویے پر منحصر ہے۔ اس مرتبہ میں نے احتیاطاً اتنی کاپیاں بنوالی ہیں اور ایسی ایسی جگہ رکھوا دی ہیں جہاں تمہارے خیال کی بھی رسائی نہیں۔"

"فضول بکواس کے بجائے یہ بتاؤ کہ چاہتے کیا ہو؟"

"کچھ نہیں۔ ابھی میں آفس میں قدم رنجہ فرماؤں گا۔" میں نے کہا۔ "وزیر خان مرحوم کے پرانے ملازموں سے ملاقات کے سوا کوئی مقصد نہیں۔ تم خوش آمدید کہو نہ کہو۔ اعتراض بھی نہیں ہونا چاہیے۔"

"تم کیوں ملنا چاہتے ہو ان سے؟" وہ کچھ دیر بعد بولا۔ "کیا بات کرنی ہے؟"

"بات میں تمہاری موجودگی میں بھی کر سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "مجھے معلوم کرنا ہے کہ میرے والد کے جنازے میں کون کون شریک ہوا تھا اور کچھ نہیں۔"

"یہ معلوم کر کے تمہیں کیا فائدہ ہوگا؟" وہ مشتبہ لہجے میں بولا۔ "تمہارے ارادے کچھ اور معلوم ہوتے ہیں۔"

"میں نے شرافت سے تمہیں بتا دیا ہے کہ میں کیا چاہتا ہوں تو تم مجھے زبردستی غلط سمجھنے پر تلے ہوئے ہو۔" میں نے برافروختہ ہو کے کہا۔ "میں آرہا ہوں اور دیکھتا ہوں تم مجھے کیسے روکتے ہو۔" میں نے ریسیور رکھ دیا۔ ایک روپیہ اس باکس میں ڈالا جو دکاندار نے اسی مقصد کے لیے رکھا تھا۔ اس شرح پر وہ یقیناً فائدے میں رہتا ہوگا خواہ ٹیلیفون والے بھی بل بناتے ہوئے اپنے حقِ خود ارادیت کا بھرپور مظاہرہ کریں۔ پانچ منٹ بعد میں نے زینے پر قدم رکھا اور میر وزیر اینڈ کمپنی کے آفس میں دائیں طرف مڑنے کے بجائے بائیں دروازے سے داخل ہوگیا۔ یہ کمرہ نہیں ہال تھا جس میں میزوں کی دو قطاریں تھیں۔ بالکل اسکول میں لگی ہوئی ڈیسکوں کی طرح۔ ان سب کا رُخ دروازے کی طرف تھا۔ آخر کی ایک میز غالباً انچارج کے لیے تھی کہ اس کا رخ مخالف سمت میں تھا تاکہ وہ اپنی قطار کے ہر ماتحت پر نظر رکھ سکے۔ میزوں پر دس کلرک مصروفِ کار تھے مگر انچارج ٹائپ شخص ایک ہی تھا۔ اس کے ساتھ والا دوسرا انچارج موجود نہیں تھا۔ اور اس کی عدم موجودگی کے اسباب ابھی صرف میں جانتا تھا۔ دوسرے انچارج کی مسخ شدہ لاش میو ہسپتال کے مُردہ خانے میں پڑی تھی اور چند قدم دور ریگل بس اسٹاپ پر اس کے لہو کا ہر داغ تارکول کی سیاہ سڑک پر گزرنے والی گاڑیوں کی رگڑ سے مٹتا جا رہا تھا۔

بیک وقت کئی نظریں سوالیہ انداز میں میری طرف اٹھیں۔ ان میں انچارج کی نظر بھی شامل تھی۔ میں کچھ دیر تذبذب اور گومگو کی کیفیت کا اظہار کرتا رہا اور ہاتھ باندھے ہر طرف اس دیہاتی کی طرح دیکھتا رہا جو بیل گاڑی سے اتر کے کاروں کے شوروم میں گھس گیا ہو۔ دیکھنے کی وہاں کوئی چیز نہ تھی۔ ماحول کسی بھی آفس سے مختلف نہ تھا۔ فائلیں، فائل کیبنٹ اور الماریاں۔

"جی؟" انچارج سے بالآخر صبر نہ ہو سکا۔ "کیسے تشریف لانا ہوا؟" اس کے طنزیہ مسخر آمیز انداز پر اس کے ماتحت مسکرائے۔

"یہاں ایک غلام علی صاحب ہیں۔" میں نے خالی کرسی کی طرف دیکھا۔ "آج ان کا انتقال ہوگیا۔"

کاروں کے شوروم میں داخل ہونے والے دیہاتی نے یکلخت فائر کر کے سب کو اپنی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے اور کرسی پر بیٹھنے کے بجائے واحد انچارج کے سامنے اس کی میز پر ٹک گیا۔

"لیس جنٹلمین!" میں نے ان سب کو مخاطب کیا جو میری طرف منہ اٹھائے بیٹھے تھے۔ "وہ ایک حادثے میں مارا گیا۔ گڈ مین دی لالٹین۔ ریگل پر ایک کار کے نیچے آگیا۔ اچھے آدمی عموماً ایسے ہی مارے جاتے ہیں۔"

پیچھے کا دروازہ کھلا اور پلٹ کر دیکھنے پر مجھے ڈی سلوا کا چہرہ نظر آیا۔ اس کی خون آشام نظریں مجھے گھور رہی تھیں۔ میں نے اسے قطعی نظر انداز کر دیا اور اپنی بات جاری رکھی۔ "یہ بات تو آپ کو آج نہ سہی کل معلوم ہو جاتی۔" میں نے کہا۔ "یہ اتفاق ہے کہ جس وقت غلام علی کے ساتھ یہ حادثہ پیش آیا تو میں وہاں موجود تھا۔ وہ میرا رشتے دار یا دوست کچھ نہیں تھا۔" میں ڈرامائی طور پر گھوم کر ڈی سلوا سے مخاطب ہوا۔ "مسٹر ڈی سلوا! آپ کو نہ حیرانی ہوئی ہے نہ صدمہ ہوا۔ کیا آپ غلام علی کو نہیں جانتے؟ یا مہلک حادثے کا مطلب نہیں سمجھتے؟ آپ نے حادثے کی نوعیت بھی نہیں پوچھی؟"

ڈی سلوا کا رنگ لمحہ بھر کے لیے اڑا اور بحال ہوگیا۔ "مجھے پولیس نے فون کر کے بتا دیا تھا۔"

"اچھا؟" میں نے حیرانی سے کہا۔ "اور یہ اتنی غیر اہم اطلاع تھی کہ آپ نے اپنی ذات تک محدود رکھی۔ اس کے ساتھیوں کو نہیں پہنچائی؟"

دفتر والوں کے لیے ڈی سلوا کے ساتھ میرا رویہ ناقابلِ فہم تھا۔ ڈی سلوا نے محسوس کیا کہ چیخنے دھاڑنے سے سب کے سامنے اس کی اور سبکی ہوگی۔ اس نے ضبط سے کام لیتے ہوئے اپنا لہجہ پُرسکون رکھا۔ "میں بتانے ہی والا تھا۔ مجھے بھی ابھی معلوم ہوا ہے۔"

"خیر۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "میرے آنے کا مقصد کچھ اور تھا۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ میں سے کسی نے مجھے نہیں پہچانا اس لیے میں خود بتا دیتا ہوں۔ میں فرم کے سابق مالک وزیر خان کا واحد وارث ہوں۔ میرا نام سکندر بخت ہے۔" صورتوں کے تاثرات ایک دم بدل گئے۔ یہ دوسرا دھماکا پہلے انکشاف سے زیادہ سنسنی خیز رہا۔ "اپنی قانونی حیثیت میں اب میں بھی ایک مالک ہوں۔" میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ "اور حقِ وراثت کے لیے..."

"کیا تم یہی اعلان کرنے آئے تھے؟" ڈی سلوا نے میری بات کاٹ دی۔

"مسٹر ڈی سلوا!" میں نے پُرسکون رہتے ہوئے ناگواری سے کہا۔ "میں مداخلت پسند نہیں کرتا۔ اگر آپ خاموش نہیں رہ سکتے تو اپنے کمرے میں جا کر بیٹھیے۔" میں پھر عملے سے مخاطب ہوگیا جو میرے "مالکانہ" رویے سے پوری طرح مرعوب ہو چکا تھا۔ "تو میں کہہ رہا تھا کہ میں نے حقِ وراثت کے لیے قانونی کا

آغاز کر دیا ہے اور میرے مشیرانِ قانونی اس رسمی سی کاغذی کارروائی کو بہت جلد مکمل کر لیں گے۔ تاہم اس وقت آنے کا مقصد یہ اعلان کرنا بھی نہیں تھا۔" اعلان کے لفظ پر میں نے ذرا سی دیر کے لیے ڈی سلوا کو دیکھا۔ "وزیر خان کے انتقال کے وقت میں لندن میں زیرِ تعلیم تھا اس لیے جنازے میں شرکت نہ کر سکا۔ آپ لوگ تو یقیناً گئے ہوں گے؟"

"بالکل سر!" میرے پیچھے سے انچارج نے کہا۔ اس خوشامد پرست ابن الوقت کا لہجہ اب قطعی مختلف تھا۔ "ہم سب گئے تھے۔"

"اچھا۔ جانا بھی چاہیے تھا۔" میں نے کہا۔ "غیر کی تدفین میں شرکت کا بھی ثواب ہے۔ کیا نام ہے آپ کا؟" میں نے نوٹ بک نکالی۔ "ذرا پتہ بھی لکھوا دیجیے۔"

اس وقت کسی کو اندازہ نہ تھا کہ نام پتے لکھ کے میں کیا کروں گا۔ ان کا خیال یہی تھا کہ میں سب سے واقفیت حاصل کرنے یا ان کے بارے میں مفصل معلومات رکھنے کے موڈ میں ہوں۔ صرف ڈی سلوا جانتا تھا کہ اس کارروائی کا مقصد کیا ہے لیکن وہ مجھے روک نہیں سکتا تھا۔ مقصد کا اعلان میں نے نوٹ بک جیب میں رکھنے کے بعد کیا۔

"اب میں آپ میں سے صرف تین حضرات کو زحمت دوں گا۔" میں نے کہا۔ "کل مجھے ڈی ایم کے سامنے تین گواہ پیش کرنے ہیں جو کہہ سکیں کہ وہ آخری رسوم میں شریک تھے اور قبر کی نشاندہی کر سکیں۔ دراصل میں نے عدالت سے لاش نکلوا کے پوسٹ مارٹم کروانے کی درخواست کی تھی کیونکہ مجھے یقین ہے کہ ان کی موت کے اسباب طبعی نہیں تھے بلکہ ان کو قتل کیا گیا تھا۔"

یہ دھماکا سب سے بڑا تھا۔ میرے سامنے اب دس افراد منجمد بیٹھے تھے۔ ان سب کا رنگ اڑ چکا تھا اور آنکھوں سے زیادہ ان کے لیے اپنے کانوں پر اعتبار کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ غلام علی کی ہلاکت، وزیر خان کا قتل، قبر سے لاش نکالنا، یہ سب بہت ہولناک باتیں تھیں۔۔۔ ابھی میرے اس کمرے میں قدم رکھنے سے پہلے وہ کتنے انہماک اور اطمینان سے اپنی روزمرہ کی کلرکی میں مصروف تھے۔

"آپ لوگوں کے لیے یہ کوئی پریشانی کی بات نہیں۔" میں نے کہا۔ "اس گواہی کے بعد آپ میں سے کسی کو کہیں بیان نہیں دینا ہوگا اور کسی عدالت میں نہیں جانا پڑے گا۔ اخلاقاً بھی قتل کی تفتیش میں مدد کرنا آپ کا فرض ہے اور قانوناً بھی آپ سب بازمن تعمیل کرائے جا سکتے ہیں۔ اس سے تاخیر تو ہو سکتی ہے ایک دو دن کی مگر تعاون نہ کرنے والے کے بارے میں میری رائے اچھی نہیں رہے گی۔"

"کسی کو دھمکی دینے کی ضرورت نہیں۔" ڈی سلوا کے لیے ضبط کرنا مشکل ہوگیا۔

"تم عادی معلوم ہوتے ہو مالکوں کی بات کاٹنے کے اور غالباً وزیر خان کے شریفانہ رویے نے تمہیں بدتمیز بنا دیا ہے۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "میں ڈسپلن مانگتا ہوں مسٹر ڈی سلوا۔"

"آج تمہیں یہاں حکم چلانے کا کوئی حق حاصل نہیں۔" وہ انگریزی میں بولا۔

"یہ حق مجھے بہت جلد حاصل ہو جائے گا اور اس وقت تم فائدے میں نہیں رہو گے مسٹر ڈی سلوا۔" میں نے اسی لہجے میں کہا۔ "میں چار سال لندن میں رہ کے آیا ہوں۔ دو باتوں کی کوشش کبھی مت کرنا۔ ایک مجھ سے بہتر انگریزی بولنے کی، دوسری مجھے بے عزت کرنے کی۔ میں ہتکِ عزت کا مقدمہ دائر نہیں کرتا، موقع پر فیصلہ کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے تم اس کا عملی ثبوت مانگنے کی حماقت نہیں کرو گے۔"

ڈی سلوا کا رنگ غصے اور ذلت کے احساس سے زرد پڑ گیا۔ وہ پلٹا اور دروازہ دھڑام سے مار کے چلا گیا۔ کمرے میں مکمل سکوت غالب رہا۔ میں پھر ان سب سے مخاطب ہوا۔ یوں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ "ایک تو آپ تشریف لے آئیے۔" میں نے انچارج سے کہا۔ "اور آپ... آپ اور آپ..." میں نے چٹکی بجا کے تین افراد کو کھڑا کر لیا۔ "ایک کا زیادہ ہونا بہتر ہے۔ میں صبح گاڑی لے کر آؤں گا اور یہیں ملوں گا۔ آفس کی فکر مت کریں۔ عدالت میں حاضری ڈیوٹی شمار کی جاتی ہے۔"

ڈی سلوا کی غیر موجودگی نے ماحول کی کشیدگی کو کم کر دیا تھا۔ پہلے انچارج نے اور پھر دوسرے لوگوں نے باری باری اٹھ کے مجھ سے مصافحہ کیا۔ وہ سب بہت سے سوالات کرنے کے لیے بے تاب تھے مثلاً یہ کہ مجھے اپنے والد کی موت پر قتل کا شبہ کیوں ہے اور کس پر ہے؟ میرے بارے میں جو کچھ اخبارات میں آچکا ہے کس حد تک درست ہے کہ میں نے میر شرافت علی کو قتل کیا۔ کیا مجھے میر صاحب پر ہی شک تھا؟ وغیرہ وغیرہ۔ اور بہت کچھ بتانا بھی چاہتے تھے مثلاً یہ کہ مرحوم وزیر خان مدت سے بیمار تھے اور کمپنی کے معاملات سے بے تعلق ہو چکے تھے اور سنا ہے وہ کوٹھی ایک نمک حرام چراغ دین کی تھی جہاں ان کا انتقال ہوا، وغیرہ وغیرہ۔ لیکن میں نے ان کی کسی بات کا جواب نہیں دیا اور کہا کہ وقت آنے پر حقائق سب کے سامنے آجائیں گے کیونکہ معاملات عدالت میں زیرِ سماعت ہیں،

اس لیے ان پر اظہارِ رائے بھی توہینِ عدالت کے زُمرے میں آتا ہے۔ خدا نے چاہا تو بہت جلد حالات درست ہوجائیں گے اور میں کمپنی کو بہتر خطوط پر منظم کروں گا۔ مالی حالات کا جائزہ لوں گا اور انشاء اللہ منافع کما کے دینے والوں کو اس میں سے زیادہ حصّہ ملے گا۔ بونس کے علاوہ میں گرانی کو مدِنظر رکھتے ہوئے تنخواہوں میں بھی کمپنی کی مالی استطاعت کے مطابق معقول اضافہ کروں گا۔ ان سب باتوں کا مجموعی تاثر خوشگوار ہوا اور جب میں ان سے رخصت ہوا تو وہ ذہنی طور پر مجھے ایک اچھا مالک تسلیم کرچکے تھے۔

میں باہر نکلا ہی تھا کہ ڈی سلوا کی خوش شکل، خوش لباس اور خوش اطوار سیکرٹری نے ریشم جیسے ملائم لہجے میں مجھ پر برقِ تبسم گراتے ہوئے درخواست کی کہ میں مسٹر ڈی سلوا سے ملاقات کرکے جاؤں۔ ڈی سلوا نے اسے دروازے پر اسی کام کے لیے مامور کر رکھا تھا کہ میں نکلنے نہ پاؤں۔ میں نے اس کو بے رُخی کے انداز میں یکسر نظرانداز کرتے ہوئے متانت سے سر ہلایا اور دوسرے کمرے سے گزر کے ڈی سلوا کے پاس جا پہنچا۔ اس کا رویّہ سابقہ ملاقات کے رویّے سے بالکل مختلف تھا۔ اس نے مہذب بلکہ مودّب طریقے پر مجھے ریسیو کیا اور تشریف رکھنے کو کہا۔ پھر انٹرکام پر چائے کے لیے کہا اور اس وقت غیرارادی طور پر وہ ایک غلطی کر بیٹھا جس نے مجھے ہوشیار کردیا کہ یہ تبسم یہ تکلّم عادت کی بات نہیں بلکہ شکاری نے میرے لیے جال پھیلایا ہے۔ انٹرکام پر بات کرنے کے لیے سیٹ کا ایک بٹن دبانا پڑتا ہے اور جب اسے چھوڑا جاتا ہے تو ہلکی سی آواز آتی ہے۔ ایک شبہ تو مجھے یہ ہوا کہ ڈی سلوا نے بٹن دبایا ہی نہیں۔ پھر مجھے آواز سنائی نہیں دی اور میں نے ڈی سلوا کی نظر بچا کے دیکھا تو مجھے انٹرکام کا وہ بٹن ایک پیپر ویٹ سے دبا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے میرے سامنے فائلوں کا انبار رکھ دیا تھا کہ مجھے یہ انتظام نظر نہ آئے اور میں بے خوف ہو کے جو کچھ کہوں اس کی دلرُبا سیکرٹری اپنے کمرے میں سُنے اور ریکارڈ کرلے۔ مجھے سیکرٹری کی "یس سر" کے بعد کوئی آواز سنائی نہ دی۔ کوئی آہٹ بھی نہیں تھی، وہ دم سادھے خاموش بیٹھی تھی۔

"مسٹر سکندر بخت!" ڈی سلوا نے بڑی نرمی سے کہا۔ "آخر ان کاغذات کو بھجوانے کا مقصد کیا تھا؟"

"کاغذات؟" میں نے حیران لہجے میں کہا۔ "کون سے کاغذات؟"

"وہ فوٹو اسٹیٹ کاغذات جو ابھی کچھ دیر پہلے مجھے ملے ہیں۔ جن کے بارے میں آپ نے فون بھی کیا تھا۔" وہ بولا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "تمہیں کوئی غلط فہمی ہے۔"

"غلط فہمی کیسی مسٹر سکندر!" وہ بولا۔ "آپ میری سیکرٹری کو وہ کاغذات دے کر غائب ہوگئے تھے۔ اس کے بعد آپ نے فون پر پوچھا تھا۔"

"نان سنس۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "نہ میں یہاں پہلے آیا اور نہ میں نے آج تم سے فون پر بات کی۔ کدھر ہے تمہاری وہ سیکرٹری۔ بلاؤ اسے۔ میرے سامنے بات کرو اس سے۔"

سیکرٹری فوراً حاضر ہوگئی۔ "کیا میں تمہیں کچھ دیر پہلے کاغذات دینے آیا تھا، مسٹر ڈی سلوا کے لیے؟ غور سے دیکھو اور بتاؤ کیا وہ آدمی میں ہی تھا؟"

سیکرٹری کے لیے مجھ سے نظر ملا کے جھوٹ بولنا مشکل تھا۔ "نو... نو سر... آپ تو نہیں آئے تھے۔ ایک اور شخص تھا۔"

"ڈیم اٹ۔" میں نے میز پر مکا مارا۔ "میں نے صرف اپنے بارے میں پوچھا تھا۔ یہ نہیں کہ آج کون آیا، کون گیا۔ جاؤ۔"

سیکرٹری کا رنگ فق ہوگیا تھا کیونکہ وہ ڈی سلوا کی آنکھوں کی شرر افشانی بھی دیکھ چکی تھی۔

"تم چالاک بننے کی کوشش کررہے ہو۔" ڈی سلوا غرّایا۔ "وانٹ ٹو پلے اے ڈرٹی ٹرک..."

"شٹ اپ۔" میں نے کہا۔ "مجھے دکھاؤ وہ کون سے کاغذات ہیں؟"

عالمِ اشتعال میں ڈی سلوا نے لفافہ میری طرف پھینک دیا۔ "تم مجھے بلیک میل کرنا چاہتے ہو۔ میں پولیس کو رپورٹ کردوں گا۔"

میں نے لفافہ اٹھایا۔ پھر خود اٹھا اور ہاتھ مار کے میں نے انٹرکام پر رکھا ہوا پیپر ویٹ ہی نہیں انٹرکام بھی نیچے گرا دیا۔ "یو ڈرٹی سوائن۔" میں نے کہا۔ "تم مجھے ٹریپ کرنا چاہتے تھے۔ ہاں میں نے یہ کاغذات بھجوائے تھے لیکن اس مقصد کے لیے نہیں جو تم سمجھ رہے ہو۔ میں نے فون پر کہا تھا وہ بعد کی بات ہے۔ ابھی مجھے بہت کچھ معلوم کرنا ہے۔ تم نے غلام علی کو مروا دیا مگر تمہارے سیاہ کارناموں کی تفصیل مجھے معلوم ہوچکی ہے۔ میں قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے والا آدمی نہیں ہوں جس روز تم عدالت میں ملزموں کے کٹہرے میں پہنچو گے تو تمہیں اپنے خلاف گواہی دینے والے سب بتادیں گے۔" میں کھڑا ہوا تھا، اور بالکل مستعد تھا۔ ڈی سلوا سمجھ گیا تھا کہ اس کی چال ناکام ہوگئی ہے لیکن وہ ایک بار پہلے جسمانی مقابلے کا انجام دیکھ چکا

تھا۔ تب وہ اکیلا تھا مگر اس وقت دوسرے کمرے میں پورا اسٹاف موجود تھا۔ ان سب کے سامنے وہ تماشا بننا نہیں چاہتا تھا۔ "یہ تم نے اچھا کیا کہ اپنی زبان کے سوا کچھ استعمال کرنے کی کوشش نہیں کی۔" میں نے دروازے کا رُخ کرتے ہوئے کہا۔ "ورنہ میں تمہاری نازک ہڈیاں توڑ دیتا۔ اور مسٹر ڈی سلوا! کسی کو معلوم بھی نہ ہوتا کہ تمہاری مدد کے لیے آتا یا تمہارا گواہ بنتا۔" میں باہر والے کمرے میں آیا اور سیکرٹری نے یہ ظاہر کیا کہ وہ اپنے کام میں مصروف ہے۔ اس کی میز پر ایک ٹیپ ریکارڈر موجود تھا۔ "تم کو بہت جلد فیصلہ کرلینا چاہیے مس! کہ تم اس آدمی سے وفادار رہنے کو ترجیح دوگی یا فرض سے وفاداری کو۔" میں نے اسے مخاطب کرکے کہا اور باہر نکل گیا۔ پھر اندر آیا اور وہ لفافہ اس کے سامنے پھینک دیا۔ "یہ اپنے باس کو دے دینا۔ چاہے تو مزید فوٹو اسٹیٹ کاپیاں بنوا لے۔ یہ اسی کا ریکارڈ ہے جو میری تحویل میں نہیں۔ اس سے میرے خلاف کوئی کیس نہیں بنتا۔"

واپسی پر میں نے گلاب خان سے ملاقات کی اور بتایا کہ اسے گواہی کے لیے جانا ہے۔

"ہم جانے گا، ضرور جائے گا۔ جائے گا کیسے نہیں۔" اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ "اس خانہ خراب کو پھانسی ہوگا تو ہمارا دل کو ٹھنڈک پڑے گا اور ہم اس سے پوچھے گا خنزیر! تیرا کیا نقصان کیا تھا وزیر خان نے۔ وہ بڈھا آدمی اِدھر اکیلا رہتا تھا۔ پنج وقت نماز پڑھتا تھا۔ وہ کسی کا دل بھی نہیں دکھایا اور سلامت شاہ، اللہ مغفرت کرے۔ وہ اتنا نیک آدمی۔ جس شیطان داؤس نے اس کو مارا وہ ہم کو مل جائے تو خدا کا قسم، ہم اس کا بھی ٹکڑے کردے۔ تم نہیں دیکھا سکندر بابو! ہم اپنی گنہگار آنکھوں سے دیکھا۔" اس نے توبہ کے انداز میں دونوں کانوں کو چھوا۔ "ہم بزدل نہیں ہے صاحب! دشمن کا سینے میں گولی مار سکتا ہے۔ ہمارا باپ دس فرنگی قتل کیا، سب کو جہنم میں بھیجا، پھر شہید ہوگیا۔ گلاب خان کے سامنے آئے کوئی بہادر ہے تو۔ بہادر ایسا کرتا ہے، چھُپ کر بوڑھا آدمی کو ایسے ذبح کرتا ہے جیسے وہ جانور ہے۔ اس کا ٹکڑا کرکے بکس میں ڈال دیا اور بھاگ گیا۔ خانہ خراب ہووے اس کا۔ اِدھر ہمارا ساتھ دو آدمی تھا، اب ہم اکیلا ہے۔ ہم کو یہ دل تنگ کرتا ہے۔ بولتا ہے گلاب جانا! تم— اِدھر بندوق لے کر گدھے کی طرح کھڑا رہا اور ایک کے بعد ایک دو آدمی کا قتل ہوگیا۔ لعنت تمہارا دوستی پر اور تمہارا بندوق پر—" وہ سخت مشتعل اور جذباتی ہورہا تھا۔ میں نے اسے تسلّی دی کہ خدا انصاف کرنے والا ہے اور ظلم کی رسّی دراز نہیں ہوگی۔ جو جیسا کرتا ہے، ویسا ہی اس کا پھل بھی پاتا ہے۔ اس جہان میں بھی اور دوسرے جہان میں بھی۔ پولیس نے گلاب خان کو— بھی بہت پریشان کیا تھا مگر چراغ دین نے اس کی جان بچائی تھی کہ یہ آدمی قابلِ اعتماد اور بھروسے کا ہے۔ چراغ دین گھر پر نہیں تھا۔ گلاب خان نے مجھے مطلع کیا کہ ہمارا اصاب شادی کررہا ہے۔

"چراغ دین شادی کررہا ہے؟" میں نے کہا۔ "دوسری شادی؟ خود اس نے بتایا ہے تم کو؟"

"ہاں۔ اچھا ہے نا۔ ابھی کتنے دن اکیلا رہے گا۔" گلاب خان بولا— "پہلا بی بی مرگیا، اللہ کا مرضی۔" اس نے سر اوپر اٹھا کے کہا۔ "شادی تو سنّتِ رسولؐ ہے۔ گناہ سے بچاتا ہے۔ گھر آباد ہوگا تو ہم بھی خوش ہوگا۔ ابھی تو ہم سارا دن دیواروں کی رکھوالی کرتا ہے۔ بی بی ہوگا تو ہم خدمت کرے گا۔ پھر اس کا بچہ ہوگا تو ہم اس کو کھلائے گا۔ وہ ہمارے ساتھ کھیلے گا۔ ہمارا رُوح خوش ہوگا۔ ابھی ہمارا رُوح بہت دکھی ہے۔ ہم قبرستان کا چوکیدار ہے۔ اِدھر کوئی زندہ نہیں رہا۔ ہم گھر میں رہنا چاہتا ہے۔ جدھر کوئی انسانوں کا آبادی ہو، رونق ہو۔"

چوکیدار کی جذباتی آزردگی بجا تھی۔ خود کو قبرستان کا چوکیدار کہہ کے اس نے سب کچھ کہہ دیا تھا۔ گھر کی مالکن اللہ کو پیاری ہوگئی تھی۔ اس کے بچے بھی لوٹ کر نہیں آئے تھے۔ دو نیک دل بوڑھے اس کی تنہائی کے رفیق تھے۔ وہ بھی ایک ایک کر کے ساتھ چھوڑ گئے تو وہ اس گھر کی ویرانی، نحوست اور آسیب کی طرح ڈرانے والی یادوں کے درمیان اکیلا رہ گیا۔ اکیلے آدمی کے لیے دکھ کا عذاب بھی شدید تر ہوتا ہے۔ اب خانہ آبادی چراغ دین کی ہورہی تھی اور خوش چوکیدار تھا۔ وہ مجھے چائے پلانے پر بھی مصر تھا مگر میں ضروری کام کا بہانہ کرکے چلا آیا۔ ابھی میں چند قدم دور ہی گیا تھا کہ مجھے گلاب خان نے آواز دی اور واسکٹ کی جیب میں کچھ ٹٹولتا میری طرف بڑھا۔

"ہم باتوں میں بھول گیا صاب!" وہ ایک لفافہ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "آپ کا نام یہ خط دے گیا تھا ایک شخص، گاڑی میں آیا تھا۔ بولتا تھا صرف انہی کا ہاتھ میں دینا ہے۔"

میں نے جیب میں پڑے رہنے سے چرمُر ہوجانے والے لفافے کو دیکھا۔ اس پر میرا ہی نام لکھا ہوا تھا۔ اندر سے ایک لیٹر پیڈ کا کاغذ برآمد ہوا۔ یہ اسی ڈاکٹر کا لیٹر پیڈ تھا جس نے میرے والد کی وفات پر "ڈیتھ سرٹیفکیٹ" جاری

کیا تھا۔ گڑھی شاہو کا وہ بدتمیز اور بدزبان ڈاکٹر جس نے دیکھے بغیر لکھ دیا تھا کہ موت طبعی حالات میں ہوئی ہے۔ اس کا پیغام چند سطروں پر مشتمل تھا۔ انگریزی میں اس نے لکھا تھا:۔

"ڈیئر مسٹر سکندر!

مجھے اپنے اس دن کے رویے پر افسوس ہے۔

کیا یہ ممکن ہے کہ آپ ایک بار پھر زحمت

کریں۔ میرا خیال ہے ہم اس مسئلے پر مصالحانہ

گفتگو کر سکتے ہیں۔"

"حرامزادہ!" میں نے خط پڑھ کے اسے بے اختیار گالی دی۔ اس نے اب بھی عیاری سے کام لیا تھا۔ حوالہ "اس دن" کا تھا۔ ذکر صرف "مسئلے" کا تھا اور اس نے اپنے دستخط بھی نہیں کیے تھے۔ خط ٹائپ کیا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ مجھے کوئی ایسی تحریر نہیں دینا چاہتا تھا جسے میں کسی بھی مرحلے پر قانون کی جنگ میں اس کے خلاف استعمال کر سکوں۔ اس کے باوجود وہ "مصالحانہ گفتگو" کرنا چاہتا تھا جس کا مطلب تھا مجھ سے سودے بازی۔ شاید اسے معلوم ہو گیا تھا کہ لاش واقعی دوبارہ پوسٹ مارٹم کے لیے نکالی جا رہی ہے۔ میں نے اس خط کو پرزہ پرزہ کر کے پھینک دیا۔ پھر ان پرزوں کو چنا اور لفافے میں ڈال کے حیرت زدہ چوکیدار کو وہ لفافہ تھما دیا۔

"اب وہ آئے نا تو اس سے کہنا کہ یہ ہے خط کا جواب اور میری طرف سے اجازت ہے کہ اسے بے عزت کر کے بھگا دو۔" میں نے کہا۔

محسن مجھ سے پہلے گھر پہنچ چکا تھا۔ جتنی دیر میں میں غسل سے فارغ ہوا اس نے مجھے چوکیدار کے گھر جا کے دس ہزار روپے دینے کی افسوسناک روداد سنائی۔ ایک آدمی کتنے کا ہوتا ہے؟ ایک بار کسی سائنسداں نے حساب لگا کے بتایا تھا کہ ڈھائی روپے کا۔ اس میں جسم کے فاسفورس، کیلشیم، فولاد، دیگر معدنیاتی اجزاء اور چربی وغیرہ سب کی قیمت شامل تھی۔ پھر وہ کیا چیز ہوتی ہے جس کے لیے لوگ وہی آدمی مانگتے ہیں، ڈھائی روپے کا۔ اس کے عوض ڈھائی لاکھ ڈھائی کروڑ کچھ قبول نہیں کرتے۔ نہ روپے نہ ڈالر نہ پونڈ۔ محسن کو وہ دس ہزار دینے کے لیے جھوٹ بولنا پڑا تھا کہ یہ مرحوم کی امانت تھی جو انھوں نے اسی خیال سے رکھوائی تھی کہ بیوی بچوں کے کام آئے۔ بنک میں اس لیے نہیں رکھی تھی کہ وہ سود کے قائل نہیں تھے۔

میں غسل خانے میں محسن کی آواز سنتا رہا جو ایک خاندان کی تباہی کا نظارہ کر کے لوٹا تھا اور بہت اداس تھا۔ باہر آ کے میں نے ڈی سلوا سے ملاقات کی روداد سنائی اور ہم تھوڑا سا ہنسے۔ اور اس ہنسی پر حیران بھی ہوئے اور شرمندہ بھی۔ نہ جانے کتنے دن سوگ اور غم کے گزرے تھے کہ ہم ہنسنا تک بھول گئے تھے اور ہنسنے پر شرمندہ ہوتے تھے۔ جتنی دیر میں محسن نے اپنے پرائیویٹ کچن میں چائے بنائی، میں نے اسے چراغ دین کے چوکیدار سے ہونے والی گفتگو کا خلاصہ سنایا اور یہ اطلاع دی کہ چراغ دین دوسری شادی کر رہا ہے۔

محسن نے اسے بے اختیار گالی دی۔ "کس بدبخت کی شامت آئی ہے؟"

"یہ تو مجھے نہیں معلوم۔" میں نے کہا۔ "ورنہ میں اس لڑکی کو بتا دیتا کہ نیک بخت کوئی اور بر دیکھ لے۔ چراغ دین تو وہ مجرم ہے جو قانون کی آڑ لے کر بچ گیا۔ مگر مجھ سے بچ کر کہاں جائے گا وہ۔ یہ نہ ہو کہ سزا ملے چراغ دین کو اور گھر خراب ہو اس سے شادی۔۔"

"کس کی شادی کی بات ہو رہی ہے؟" رابعہ نے دروازے میں نمودار ہو کے کہا۔ "کہاں ہو تم دونوں صبح سے؟"

میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ کل کی نسبت آج اس کی حالت بہت بہتر تھی۔ مگر اس کے حسن میں سوگواری کا تاثر دل پر اثر کرتا تھا۔ جیسے سولھویں اور سترھویں شب کو طلوع ہونے والے ماہ کامل کا بجھا بجھا چہرہ۔ جس کی چاندنی برف باری کی رات میں سنسان پہاڑوں پر اترے۔

"ہم آج معروف رہے۔" میں نے سنبھل کر کہا۔ "ابھی ابھی آئے ہیں۔ بیٹھو، تم بھی چائے پیو۔"

وہ ایک پلنگ پر بیٹھ گئی۔ "گھر میں سوئم کے لیے مہمان آئے ہوئے ہیں۔ ان سے نہیں ملو گے؟"

"کل ہو گا نا سوئم۔" محسن نے کہا۔ "میرا خیال ہے جان پہچان والے محدود لوگوں کو بلایا جائے۔"

"جان پہچان والے ہی ہوں گے۔" وہ بولی۔ "مثلاً وہ جو ابھی اسلام آباد سے پہنچے ہیں۔"

"امی اور پاپا؟" محسن نے کہا۔ "وہ آ گئے؟ اور کون آیا ہے؟"

"مسٹر اور مسز شیروانی آئے ہیں اور فوزیہ آئی ہے۔" رابعہ نے کہا۔ چائے کا مگ میرے ہاتھ سے گر گیا۔

رابعہ نے صرف ایک نظر میری طرف دیکھا اور محسن سے مخاطب ہوئی۔ "تمہاری یہ چھوٹی بہن مجھے بڑی پیاری لگی۔ بڑی محبت کرنے والی۔"

محسن چونکا۔ "ہاں۔۔۔ ہاں۔" اس نے میری طرف دیکھا میں ٹوٹے ہوئے مگ کے ٹکڑے چن رہا تھا۔ "سکندر ابھی ذرا ممی اور پاپا کو سلام کر آئیں۔"

مجھے جواب کا موقع دیے بغیر وہ نکل گیا۔ مجھے معلوم تھا وہ اس صورت حال سے فرار چاہتا تھا۔ جذبات کا بھنور صرف میرے گرد رہ گیا۔ "خود غرض!" میں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ اس وقت وہ اگر مجھے اکیلا نہ چھوڑتا تو کیا تھا۔ میں نے دوسرے مگ کو چائے سے بھرا۔ خاموشی گہری اور طویل ہوتی گئی۔ برف کی طرح اندر باہر جمتی گئی۔ شیشے کی دیوار کی طرح اٹھتی گئی۔ احتیاط! مبادا ایک غلط لفظ کا پتھر دلوں کے شیشے توڑ دے۔ اور شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں۔ جو ٹوٹ گیا سو ٹوٹ گیا۔ خاموشی پھر زبان بن گئی۔ رابعہ نے کہا۔ "یوں چپ کیوں بیٹھے ہو۔ کچھ تو کہو۔" میں نے کہا۔ "مجھے بتاؤ میں کیا کروں۔ اعتراف جرم کہ اقرار وفا۔ محبت کیا ہے؟ خزاں کی باد سموم جو امیدوں کی فصل اجاڑ دیتی ہے یا خزاں رسیدہ تمناؤں کے ہر نخل کو بہار نو کا سندیسہ دینے والی ہوا؟" رابعہ ہنسی۔ "کیا عجیب سوال ہے۔ پوچھ رہے ہو کہ محبت زہر ہے یا امرت؟" میں نے کہا۔ "ہاں ہاں۔ یہی پوچھ رہا ہوں۔ بقائمی ہوش و حواس پوچھ رہا ہوں۔ آدھے سوال کا جواب فوزیہ ہے تو باقی آدھے کا تم۔ غلط نہ تم کہو گی نہ وہ بتائے گی۔ آزمائش تو میری ہے جو پل صراط کے درمیان ہے اور نہیں دیکھ سکتا کہ میرے لیے جنت کدھر ہے اور جہنم کس طرف۔" رابعہ نے کہا۔ "ہر آدمی کی اپنی جنت ہے اور اپنا جہنم ہے۔" میں نے جھلا کر کہا۔ "یہ مجھے معلوم نہیں ہے اور یہی خیال تو مجھے کچھ کہنے نہیں دیتا۔ تم کہتی ہو کچھ کہو۔"

وقت اگر احساس کا نام ہے تو اس کا احساس نہ مجھے تھا نہ رابعہ کو۔ ہم ایک مختصر سے کمرے میں بچھی ہوئی چارپائیوں پر آمنے سامنے بیٹھے رہے تھے اور اندھیرا چپکے چپکے ہمارے گرد حصار قائم کرتا گیا تھا۔ اچانک دروازے کے فریم میں ایک سایہ سا نمودار ہوا جس کے خدوخال جانے پہچانے تھے۔ اس کے سراپا کی خوشبو اس کے وجود کی طرح منجمد ہو گئی تھی۔ وہ پلٹ کر جانے ہی والی تھی کہ میں نے کہا۔ "فوزیہ!" اور سوئچ دبا کے لائٹ آن کر دی۔ فوزیہ رک گئی۔ اس کی آنکھوں میں نہ کوئی شکایت تھی نہ سوال تھا۔ "آ کے جا رہی ہو؟"

"مجھے۔۔۔ مجھے معلوم نہیں تھا۔۔" فوزیہ نے کہا اور سنبھل گئی۔ "میرا مطلب ہے انکل نے بتایا تھا تم یہاں ملو گے۔"

رابعہ نے خالی مگ نیچے رکھا۔ اس کا چہرہ اپنے جرم کی تفسیر سے دہکنے لگا تھا۔ "آؤ فوزیہ۔۔۔ میں تو بس جا ہی رہی تھی۔"

میں نے بھی اپنا خالی مگ نیچے رکھا اور کہا۔ "میں بھی بس آنے ہی والا تھا فوزیہ۔"

رابعہ یوں نکل گئی جیسے وہ غلطی سے کسی دوسرے کے گھر میں داخل ہو گئی ہو۔ وضاحت بے سود تھی۔ عذر گناہ بدتر از گناہ۔ فوزیہ نے ہمیں اندھیرے میں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے دیکھ لیا تھا۔ اس نے وہ گفتگو بھی سن لی تھی جو ہم دل کی زبان میں کر رہے تھے۔ فوزیہ کے دل میں بھی جذبات کی لہروں کو ریسیو کرنے کا بڑا حساس نظام تھا جس کی فریکوئنسی بدلی نہیں تھی۔ فوزیہ دیر میں صحن میں کھڑی رہی۔

"وہ۔۔۔ بس اتنی دیر ہو گئی۔" میں نے خفت سے کہا۔ "اور معلوم ہی نہیں ہوا۔"

"مگر مجھے معلوم ہو گیا ہے۔" فوزیہ نے دوپٹے کو انگلی پر بل دے کے لپیٹتے اور کھولتے ہوئے کہا۔ "واقعی بہت دیر ہو چکی ہے۔"

"فوزیہ! میں نے درد کی ٹیس سے تڑپ کر کہا۔" اور شرمندہ کرنے آئی ہو؟"

"نہیں سکندر!" وہ سر جھکا کے بولی۔ "اب تو میں اپنے وجود سے بھی شرمندہ ہوں۔"

"ایسا مت کہو فوزیہ! زندگی کے دکھوں کے ساتھ جینا سیکھو۔ آدمی خود اپنی تقدیر کا خالق نہیں ہے۔ دکھ سب کا ورثہ ہیں۔"

"دکھ کے کنکر مارنے والوں کو تو معاف بھی کیا جا سکتا ہے۔" وہ اسی کھوکھلے لہجے میں بولی۔ "سنگسار کرنے والوں سے معافی نہیں مانگی جا سکتی۔ غم کا پہاڑ اگر اتنا بڑا ہو کہ آدمی اس کے نیچے دب کر سانس بھی نہ لے سکے تو جینے کی آرزو سے کیا ہوتا ہے۔"

"تم کو جو کچھ کہنا ہے صاف کہو۔" میں نے دل کے ایک نامعلوم خوف کو دبا کر کہا۔

"صاف بات ہے سکندر کہ میں تمہاری بے وفائی کا صدمہ جھیل کر اکیلی تو جی سکتی تھی۔ اس خیال سے کہ میں نہ سہی تم تو خوش ہو، لیکن میں چراغ دین سے شادی نہیں کروں گی۔ میں مر جاؤں گی سکندر! مر جاؤں گی، تم دیکھ لینا۔" اس کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا اور وہ دیوار پر سر رکھ کے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

صدمے نے مجھے زلزلے کے پہلے جھٹکے کی طرح مفلوج سا کر دیا تھا۔ "چراغ دین؟" میں نے جھپٹ کر اس کا چہرہ اپنی طرف کیا۔

"ہاں، چراغ دین۔ اس نے میرا رشتہ مانگا تھا۔" فوزیہ نے اپنا منہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔

"اور تمہارے ممی پاپا؟ انہوں نے منظور کر لیا؟" میں نے اسے جھنجوڑ کر کہا۔ "تم نے...؟"

فوزیہ نے خود کو چھڑا لیا۔ "تم بھول رہے ہو کیا کہ میں وہ لڑکی ہوں جس کی نسبت ٹوٹ چکی ہے۔ ٹھکرائی ہوئی بے وقعت چیز۔"

"لیکن تمہاری ممی اس پروفیسر کو مجھ پر ترجیح دیتی تھیں۔"

"ترجیح دینے والوں کا معیار کس آسمانی صحیفے میں ہے؟" وہ تلخی سے بولی۔ "چراغ دین سب سے بہتر ہے کیونکہ وہ زیادہ دولت مند ہے۔ وہ میری بڑی بہن سے بہت محبت کرتا تھا۔ اب تک اس کی قبر کا مجاور ہے۔ اس سے زیادہ محبت مجھ سے کون کرے گا۔ مریم بہت خوش تھی۔ میں بھی بہت خوش رہ سکتی ہوں۔"

"اس... اس حرامزادے کے ساتھ؟ جس نے نمک حرامی کی، غبن کیا، میرے باپ کو لوٹا۔ جس تھالی سے کھاتا تھا اسی میں چھید کیا اور آج اس کی دولت باعث فخر ہے؟" میرے غصے کا آتش فشاں یک لخت پھٹ گیا۔ "وہ عزت دار ہے جس نے میرے باپ کی عزت کو خاک میں ملانے، اسے تباہ کرنے اور قتل کرنے والوں کی قیادت کی۔ جس نے اس پر پہلا وار کیا۔ مریم خوش تھی؟ مجھے تو اس کے دامن پر مریم کے خون کے داغ بھی نظر آتے ہیں۔ وہ تمہیں بھی زندہ نہیں چھوڑے گا فوزیہ! میں اسے قتل کر دوں گا۔"

"تم پاگل ہو رہے ہو سکندر!" وہ خوفزدہ ہو گئی تھی۔ "خدا کے لیے آہستہ بولو۔"

"نہیں فوزیہ! مجھے کسی کا ڈر نہیں۔ میں تم کو اس لیے بتا رہا ہوں فوزیہ کہ جو کچھ مجھے کرنا ہے، وہ میں ضرور کروں گا۔" میں نے کہا۔ "مجھے آزمائش میں مت ڈالنا کہ ایک طرف میرے باپ کے لہو کا قرض ہو اور دوسری طرف تمہارے سہاگ کی آبرو اور میں فیصلہ نہ کر پاؤں۔"

"فیصلہ تو میں کر چکی ہوں اور تمہیں یہی بتلانے آئی تھی۔" وہ دروازے کی طرف بڑھی۔ "میں اس سے شادی نہیں کروں گی، خودکشی کر لوں گی۔"

وہ دوڑتی ہوئی اندھیرے میں گم ہو گئی۔ میں وہیں کھڑا رہا۔ میری حالت دیوانوں جیسی ہو رہی تھی۔ میری مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں اور دانت آپس میں جڑ گئے تھے۔ نفرت کے زہر سے میرا بدن سلگ رہا تھا۔ یہ خبر تو مجھے چراغ دین کے چوکیدار گلاب خان نے ہی دی تھی۔ اس وقت میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ جس دوسری شادی کا ذکر کر رہا ہے، وہ فوزیہ سے ہونے والی ہے۔ نہیں گلاب خان! تم اگر قبرستان کے چوکیدار نہیں رہ سکتے تو کسی دوسرے گھر کی دربانی کرو۔ تم جس مالکن کی خدمت کرنا چاہتے ہو وہ فوزیہ نہیں ہو سکتی۔ جن بچوں کے ساتھ کھیلنا چاہتے ہو، جن بچوں کو کھلانا چاہتے ہو، وہ چراغ دین اور فوزیہ کے بچے نہیں ہو سکتے۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ ابھی اس کی باری نہیں لیکن اب مجھے پہلے اس سے ہی نمٹنا ہو گا۔ اس سے پائی پائی کا حساب پہلے لینا ہو گا جو اس نے میرے باپ کی محنت کی کمائی سے چرائی اور جس سے اس نے انصاف خریدا، عزت خریدی اور مریم کے بعد اب فوزیہ کو خریدنا چاہتا ہے۔

اس فیصلے کے بعد میں پرسکون ہونے لگا۔ میں آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھا۔ صحن سے باہر قدم رکھتے ہی میں نے محسن کو دیکھا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا اور اندھیرے میں سیاہ پتھر کا بت نظر آتا تھا۔

"محسن!" میں نے اس کا کاندھا ہلا کے کہا۔ "تو کب سے کھڑا ہے؟"

محسن چونکا۔ "میں؟ بہت دیر سے۔" وہ کھوکھلے لہجے میں بولا۔ "تم باتیں کر رہے تھے۔ میں رک گیا۔"

"تو... تو نے وہ سب سن لیا ہو گا۔" میں نے کہا۔ "جو کچھ فوزیہ نے کہا۔"

محسن نے اقرار میں سر ہلایا۔ "سکندر! میری ایک ہی بہن ہے۔ اس کی زندگی میری زندگی ہے اور میں جانتا ہوں وہ کتنی ضدی لڑکی ہے۔ اسے ضدی میں نے بنایا ہے۔ اس کی ہر بات مان کے، ہر خواہش پوری کر کے۔ اس نے جو مانگا میں نے اسے دیا۔ اگر وہ میری جان بھی مانگتی تو میں انکار نہ کرتا لیکن اب وہ موت مانگ رہی ہے۔ حد سے بڑھ گئی ہے۔"

"فکر کیوں کرتا ہے محسن! فوزیہ میرے لیے نہ سہی تیرے لیے زندہ رہے گی۔" میں نے اس کے شانے پر اعتماد کے ساتھ ایک ہاتھ رکھا۔

"ہاں سکندر! اگر وہ بے بس اور بے زبان ہے تو کیا میں تو بے بس نہیں ہوں۔ چل آ، ممی اور پاپا سے مل لے۔ انہوں نے ہی مجھے بھیجا تھا کہ تجھے بلا لاؤں۔" محسن نے کہا۔ "تیری صورت سے کچھ پتہ نہیں چلنا چاہیے۔"

جب میں نے رابعہ اور فوزیہ دونوں کی موجودگی میں انکل شیروانی اور ان کی بیگم کی خدمت میں حاضر ہو کے آداب عرض کیا تو میری صورت سے واقعی کچھ پتہ نہیں چلتا تھا۔ میری آواز اور میرا لہجہ نارمل تھے اور میں بالکل پرسکون تھا۔ مسز شیروانی بڑے غور سے مجھے اور رابعہ کو دیکھتی رہیں۔ رابعہ کے چہرے پر اداسی کے سوا کوئی تاثر نہ تھا۔ میرے جذبات کا اندازہ کرنے کی کوشش بھی رائیگاں گئی اور وہ کچھ دیر بعد اٹھ گئیں۔ اگر موقع ہوتا تو وہ خود مجھے بتاتیں کہ انہوں نے فوزیہ کے سلسلے میں کتنا دانشمندانہ فیصلہ کیا ہے کہ انہوں کو صرف فوزیہ کی خوشی کے لیے چھوڑ دیا اور چراغ دین کو قبول کر لیا۔ مریم کی جدائی کے زخم کا مرہم فوزیہ کو بنا دیا اور فوزیہ کا مقدر بھی سنوار دیا۔ تعزیتی وفد کے ایک رکن کی حیثیت سے وہ کسی اور موضوع پر بات نہیں دے سکتی تھیں تاہم مجھے یقین تھا کہ واپسی سے قبل وہ مجھے یہ "خوشخبری" میرے منہ پر جوتا مارنے کی نیت سے ضرور سنائیں گی۔ کھانے کے بعد رابعہ اور فوزیہ نے اپنے اپنے بیڈروم کا رخ کیا۔ میں اور محسن، رضوی صاحب اور شیروانی صاحب نصف شب تک ان تمام مسائل پر اظہارِ خیال کرتے رہے جو میری واپسی سے پیدا ہوئے تھے۔ بہت سی باتیں شیروانی صاحب کے لیے انکشاف سے کم نہ تھیں مثلاً چوہدری دلاور کا کردار، ڈی سلوا کی حیثیت۔ خصوصاً ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس کے نام پر ہونے والے ناجائز کاروبار کی نوعیت۔ باتیں ساری رات میں ختم نہ ہوتیں مگر مجھے صبح عدالت میں حاضر ہونا تھا۔ میں نے رضوی صاحب سے کہا کہ مجھے ایک دن کے لیے گاڑی چاہیے۔ اپنے گواہوں کو لانے لے جانے اور وقت پر حاضر کر دینے کے لیے۔ انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ وہ سرکاری جیپ میں چلے جائیں گے لیکن کار کو ان کا شوفر ڈرائیو نہیں کرے گا۔ اس شرط کی وجہ صاف ظاہر تھی۔ قانون کی نگاہ میں میں ایک مجرم تھا اور اگر ایس ایس پی کا پولیس مین کی وردی والا ڈرائیور مجھے لے کر پھرتا تو رضوی صاحب کی پوزیشن جو پہلے ہی خراب تھی، مزید خراب ہو جاتی۔ انہوں نے مجھے جگہ دے رکھی تھی اور اب رابعہ کو بھی لے آئے تھے جو میری وکیل تھی۔ کسی اخبار والے کے لیے جو ان کو بدنام کرنا چاہتا، یہ اجتماع ایک سنسنی خیز انکشاف اور دلچسپ خبر کا عنوان بن سکتا تھا۔ رضوی صاحب وضعدار، بااصول اور جرأت مند آدمی تھے کہ انہوں نے ملازمت کے تحفظ پر رشتوں کی آبرو کو قربان نہیں کیا۔ انہوں نے جو کچھ کیا تھا وہ اس سے مطمئن تھے اور کوئی غلط کام بھی نہیں کیا تھا اس لیے مخالفت یا بدخواہوں کے خوف سے بے نیاز تھے۔

اچانک مجھے ٹیلی فون کو ٹیپ کرنے والے تاروں کا خیال آیا جو میں نے اور محسن نے دریافت کیے تھے۔ اس خیال سے میرا دل ڈوبنے لگا کہ ممکن ہے ہماری گفتگو کا ایک ایک لفظ ان کے کانوں نے سن لیا ہو جن کے بارے میں ہم بے خوفی سے اظہارِ خیال کر رہے تھے۔

"انکل رضوی!" میں نے کہا۔ "کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ کا فون ٹیپ ہو رہا ہے؟"

"نہیں بھئی! معلوم تو نہیں تھا مگر آج شام محسن نے بتایا۔" وہ بولے۔ "میں تو حیران رہ گیا۔ اس سے پہلے متعدد بار ایسا ہوا تھا کہ میں نے خفیہ طور پر ہدایات جاری کیں اور وہ مخبر متعلقہ لوگوں تک پہنچ گئیں۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ "اس درخت پر کیا تھا جس پر تار جا رہا تھا؟ کوئی ٹرانسمیٹر؟"

"ہاں۔ بہت چالاکی سے سب کیموفلاج کیا گیا تھا۔" وہ بولے۔ "نہ تار نظر آتے تھے، نہ پتوں میں چھپا ہوا چھوٹا سا ٹرانسمیٹر۔ اور نہ اس کا ایریل جو درخت کی چوٹی کے قریب تھا۔ اس سے ٹرانسمیٹر کی رینج بہت بڑھ گئی ہو گی۔ دس میل کے دائرے میں وہ کسی بھی ریڈیو ریسیور پر ٹیلی فون کے ذریعے ہونے والی سب گفتگو سن سکتے تھے۔ تم دیکھو گے؟ صبح میں پولیس کے حوالے کر رہا ہوں۔" انہوں نے ایک شوکیس پر رکھا ہوا چھوٹا سا پورٹیبل ٹرانسمیٹر درمیان میں رکھ دیا۔ اس کا ایریل ٹرانسسٹر ریڈیو کے ایریل کی طرح تھا کہ کھینچنے سے ایک میٹر سے زیادہ باہر نکل آتا تھا۔

"یہ یہاں تو نہیں ملتا۔" شیروانی صاحب بولے۔ "اور اس کا رکھنا بھی سخت جرم ہے۔"

رضوی صاحب ہنسے۔ "تو بھائی یہ ہے بھی کسی مجرم کا۔ وہ کیا چیز اسمگل کر کے نہیں لا سکتے۔" شیروانی صاحب نے اشتیاق کا مظاہرہ کیا تو رضوی صاحب نے اسے آپریٹ کر کے دکھایا۔ "تم دوسرے کمرے میں جا کے سنو، ٹرانسسٹر ریڈیو پر۔ وہ رکھا ریڈیو۔"

میں نے موقعے سے فائدہ اٹھایا اور انکل شیروانی کو ٹرانسسٹر ریڈیو کے ساتھ رائٹنگ ٹیبل والے کمرے میں لے گیا۔ وہاں میں نے ٹرانسسٹر ریڈیو کو ٹیون کیا۔ ایک جگہ اچانک رضوی صاحب کے بولنے کی آواز آئی، پھر محسن ہنسا، شیروانی صاحب بچوں کی طرح خوش ہوئے۔

"بڑے کام کی چیز ہے۔ وائرلیس فون ایسے ہی کام کرتے ہوں گے۔" انہوں نے کہا اور میں نے ان سے اتفاق کیا جب وہ واپس ڈرائنگ روم کی طرف جا رہے تھے تو میں نے اجازت لی اور باہر جانے کے لیے مخالف سمت کے دروازے کی طرف بڑھا۔ شیروانی صاحب کے نکلتے ہی میں پلٹا اور میں نے میز کی سب سے نیچے والی دراز میں سے وہ فوٹو اسٹیٹ کاغذات نکال لیے جن کی قیمت غلام علی نے جان دے کر ادا کی تھی۔ اپنے کمرے کی طرف آتے ہوئے مجھے وہ ڈائیلاگ یاد آئے جو میں

نے یکطرفہ طور پر بولے تھے۔ غلام علی اس وقت ریسیور رکھ چکا تھا جب میں رضوی صاحب کو مطمئن کرنے کے لیے بولتا رہا تھا "کل ہی چلے جاؤ گے۔ ایک آدھ دن اور ٹھہر جاتے یار! گنجائش نہیں ہے پھر تو مجبوری ہے۔" رات کے سناٹے میں یہ الفاظ بازگشت کی طرح میرے کانوں میں گونجے اور خوف کی ایک سرد لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں اتر گئی۔ میرا کہا سچ ہو گیا تھا۔ اس کے پاس واقعی ایک دن اور اس دنیائے آب و گل میں رکنے کی گنجائش نہ تھی۔

اپنے کمرے میں آنے کے بعد میں سونے کے ارادے سے لیٹ گیا۔ گزشتہ رات بھی پلک جھپکائے بغیر گزری تھی اور آج مجھے نیند کی اشد ضرورت تھی۔ شاید میں کوشش کرتا تو کچھ دیر بعد فوزیہ اور رابعہ کے تصور سے اور تمام پریشان کن خیالات سے دامن چھڑا کے سو بھی جاتا۔ میں نے سگریٹ نہیں جلائی تھی اور لائٹ آف کر کے لیٹتے ہی آنکھیں موند لی تھیں مگر یکلخت ایک خیال مجھے ایسا آیا کہ نیند کا خیال غائب ہو گیا۔ میں اٹھ بیٹھا اور بہت دیر تک سوچتا رہا۔ تمام دلائل جو میرے ذہن نے دیے تھے میرے حق میں تھے۔ پھر میں قائل کیسے نہ ہوتا۔ میں دوبارہ اس وقت لیٹا جب مجھے باہر سے محسن کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ "سکندر!" محسن نے اندر آ کے کہا۔ "سو گیا کیا؟"

میں آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔ اب میں چاہتا تھا کہ محسن بھی سو جائے۔ نہ جانے کتنی دیر تک وہ سگریٹ جلائے لیٹا رہا۔ پھر میں نے اسے کروٹ بدل کے سوتے دیکھا اور انتظار کرتا رہا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد میں اٹھا تو چارپائی چرچرائی لیکن محسن نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ میں نے سگریٹ کا پیکٹ میز پر سے نیچے گرایا۔ محسن بے حس و حرکت پڑا رہا۔ پھر میں نے اسے آواز دی لیکن وہ سو رہا تھا۔ میں دبے پاؤں اٹھا اور آہٹ کیے بغیر باہر نکل گیا۔ سرونٹ کوارٹر سے کوٹھی تک میں اطمینان سے چلتا گیا۔ مجھے دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ گھر میں میزبان اور مہمان سب سو چکے تھے۔ میری توقع کے مطابق وہ دروازہ کھلا رہ گیا تھا جس سے میں باہر آیا تھا۔ میں نے دروازے کو آہستہ سے دھکیلا۔ وہ کسی آواز کے بغیر وا ہو گیا۔ اندر کاریڈور میں ٹیوب لائٹ جل رہی تھی اور اس کا مدھم سا اجالا اس کمرے تک بھی پہنچ رہا تھا۔ روشنی رضوی صاحب کے کمرے میں بھی تھی اور فوزیہ کے کمرے میں بھی لیکن باہر سے نظر نہیں آتی تھی۔ غالباً فوزیہ جاگ رہی تھی اور رو رہی تھی۔ اچانک رضوی صاحب کے کمرے کا دروازہ کھلا اور وہ لباس شب خوابی میں باہر آئے۔ میں کاریڈور سے پلٹا اور پھر اسی کمرے میں چلا گیا۔ رضوی صاحب نے مجھے نہیں دیکھا تھا کیونکہ باتھ روم مخالف سمت میں تھا۔ تقریباً پانچ منٹ بعد وہ لوٹے اور ان کے کمرے کی لائٹ آف ہو گئی۔ میں اطمینان سے ڈرائنگ روم کی طرف بڑھا۔ وہ پورٹیبل ٹرانسمیٹر پھر وہیں رکھا جہاں سے اس کو رضوی صاحب نے اٹھایا تھا۔

ٹرانسمیٹر کو پلاسٹک شیٹ میں یا سیلوفین میں لپیٹنا ضروری تھا۔ اس کے لیے میں نے ڈرائنگ ٹیبل پر پڑی ہوئی شیٹ استعمال کی جو ٹرانسمیٹر سے سوگنا بڑی تو ہو گی لیکن میرے نقطۂ نظر سے فائدہ مند تھی۔ میں نے ٹرانسمیٹر کو اس میں اچھی طرح لپیٹ لیا اور بغل میں دبا کے ڈرائنگ روم کے اس دروازے سے باہر آ گیا جو برآمدے کی جانب کھلتا تھا۔ یہ ڈبل دروازہ تھا۔ ایک فلائی پروف جالی والا اور دوسرا فلش ڈور۔ فلائی پروف دروازے اندر کی طرف کھلتے تھے، چنانچہ ان کی چٹخنی عموماً نہیں لگائی جاتی تھی لیکن اسی کی وجہ سے باہر کے فلش ڈور کی کنڈی کا کھلا رہ جانا بعید از امکان نہ تھا۔ مجھے اپنے نقشِ قدم کا خیال آیا۔ پھر مجھے اس بات سے اطمینان حاصل ہوا کہ رضوی صاحب صبح اٹھتے ہی ڈرائنگ روم میں نہیں آئیں گے اور ان کے آفس جانے سے پہلے خادمہ پورے فرش کو گیلا کپڑا مار کے صاف کر چکی ہو گی۔

اب مجھے زمین کھودنے کے لیے کسی اوزار کی ضرورت تھی۔ خواہ وہ لوہے کی سلاخ ہی کیوں نہ ہو۔ عقبی حصے میں دیوار کے ساتھ باغبانی کے آلات موجود تھے۔ میں نے صرف ایک کھرپی لی اور سرونٹ کوارٹر کے پیچھے چلا گیا۔ نرم زمین تلاش کرنے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ شاید پہلے کسی نے اس حصے میں دھنیا پودینا وغیرہ کاشت کیا تھا۔ چھوٹی چھوٹی کیاریوں میں اب صرف گھاس رہ گئی تھی یا ٹماٹر کے پرانے بے ثمر پودے۔ میں نے پوری احتیاط کے ساتھ زمین کھودنی شروع کی۔ ایک فٹ گہرا گڑھا لمبائی میں ڈیوڑھا اور چوڑائی میں تقریباً اتنا ہی تھا۔ پلاسٹک شیٹ کے کفن میں لپٹے ہوئے ٹرانسمیٹر کو اس لحد میں اتار کے میں نے مٹی برابر کی اور پیروں سے دبا کے اوپر خشک پتے بکھیر دیے۔ اب نیچے کی نم آلود مٹی صبح سورج طلوع ہونے کے بعد ایک گھنٹے میں باقی زمین سے الگ نظر نہیں آ سکتی تھی۔ اپنے کام سے فارغ ہو کے میں نے اس جگہ کی نشانی تلاش کی۔ سرونٹ کوارٹر کی عقبی دیوار کے ایک کنارے سے یہ پندرھویں اینٹ کے سامنے کی جگہ تھی۔ دیوار سے چار فٹ کے عمودی فاصلے پر۔

کھرپی کو صاف کر کے اپنی جگہ رکھنے کے بعد میں کوارٹر میں آیا تو رات کے تین بج رہے تھے۔ میں اطمینان سے باتھ روم گیا اور ہاتھوں کو دھو کر صاف کیا۔ باتھ روم کی روشنی میں جوتوں اور کپڑوں پر سے مٹی جھاڑی۔ اب کسی کے جاگ اٹھنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ رات کو کسی کا سوتے سے اٹھ کر باتھ روم جانا کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ تولیے سے ہاتھ صاف کر کے کمرے میں واپس پہنچنے تک میں بہت مطمئن اور خوش تھا۔ جو کامیابی میں نے حاصل کی تھی وہ بے حد کارآمد تھی کسی مرحلے پر پیغام رسانی کا بہترین ذریعہ ثابت ہو سکتی تھی اور بالکل بے ضرر بھی تھی۔ مجھ پر کسی کے شک کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ چوری کو انہی سے منسوب کیا جائے گا جو غائبانہ مجرم تھے۔ رضوی صاحب ایک منطقی نتیجہ یہ اخذ کریں گے کہ ٹرانسمیٹر کی نشریات کا سلسلہ منقطع ہوتے ہی وہ سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ فنی خرابی کا نتیجہ نہیں، ان کے آلات برآمد کر لیے گئے ہیں اور وہ تصدیق کے لیے آئے ہوں گے تو گھر کی تلاشی کے دوران انہیں مطلوبہ چیز صاف سامنے رکھی ہوئی مل گئی ہو گی۔ وہ خود کو قصوروار سمجھیں گے کہ انہوں نے ایسی چیز کو بحفاظت مقفل کر کے کیوں نہیں رکھا اور پھر شامت آئے گی نوکر کی، جس نے کنڈی کھلی چھوڑ دی یا سنتری کی جو حرامخوری کے باعث سوتا رہ گیا۔ تاہم ڈانٹ ڈپٹ سے زیادہ ان کو سزا نہیں ملے گی۔ وہ عادتاً قسم کھانے کو تیار ہو جائیں گے کہ ان سے کوئی غفلت نہیں ہوئی۔ ویسے آدمی خطا کا پتلا ہے۔ اتنا تو رضوی صاحب بھی سمجھتے ہیں۔

کمرے میں قدم رکھتے ہی میری نظر محسن کے بستر پر گئی۔ میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا اور میرے قدم رک گئے۔ یہ میری نظروں کا دھوکا نہیں تھا۔ محسن کا بستر واقعی خالی پڑا تھا۔ اس کے جوتے موجود تھے مگر جوتے نہیں تھے۔ وہ کہاں جا سکتا ہے؟ میں نے بستر پر بیٹھ کے سوچا۔ کیا اس کے ذہن میں بھی یہ خیال آیا ہے کہ ایک ٹرانسمیٹر حاصل کرنے کا یہ مناسب ترین موقع ہے؟ نہیں۔ اگر وہ بھی اسی نیت سے نکلا ہوتا تو اب تک لوٹ آیا ہوتا۔ اگر اتفاق سے میں اور وہ کوٹھی کے اندر نہیں ملے تھے تو زیادہ سے زیادہ دس منٹ بعد اس کو لوٹ آنا چاہیے تھا۔ یہ ناممکن ہے کہ وہ ابھی تک کوٹھی کے ایک ایک کمرے میں گھومتا پھر رہا ہو۔ میں نے ٹرانسمیٹر کو دفن کرنے میں آدھا گھنٹہ تو لگایا ہی تھا۔ مجھے غائب پا کے اس کا حیران ہونا اور واپسی کا انتظار کرنا لازمی تھا۔ مجھ سے چھپ کے وہ کہاں جا سکتا ہے؟ ایک جگہ، صرف ایک جگہ، کسی غیبی آواز نے کہا: "اس کے پاس بھرا ہوا ریوالور بھی ہے۔ وہ اپنی بہن کے لیے زندہ رہنے کا حق حاصل کرنے جا سکتا ہے۔ وہ چراغ دین کو آج رات ہی قتل کر دے تو کیا عجب۔ اس کی جذباتی کیفیت کا بحران خطرناک تھا۔"

اس خیال نے مجھے خوف زدہ کر دیا۔ حالانکہ میں خود بھی یہی کرنا چاہتا تھا مگر میں محسن کو اس کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ چراغ دین میرا دشمن تھا اور اس کی دشمنی مجھے ورثے میں ملی تھی۔ اس کے ناپاک وجود کو ختم کرنے کا حق پہلے مجھے ملنا چاہیے۔ محسن کا حق میرے بعد آتا ہے۔ وہ چراغ دین کو اس کے ارادے کی سزا دینا چاہتا تھا جس کی تکمیل ایک جان کے زیاں کا سبب بن سکتی ہے۔ میں اسے ایک جرم کی سزا دینا چاہتا ہوں جو ایک جان کے زیاں کا سبب بن چکا ہے۔ اسے ایک خطرے کا انسداد کرنا ہے۔ مجھے ایک ظلم کا انتقام لینا ہے۔ وہ مجھ سے میرا حق کیسے چھین سکتا ہے۔ میں بگولے کی طرح اٹھا اور طوفان کی طرح باہر نکل گیا۔ ڈیڑھ ڈھائی میل کی مسافت میرے قدموں نے آدھے گھنٹے میں طے کی۔ پونے چار بجے میں چراغ دین کی کوٹھی کے سامنے تھا۔ گلاب خان برآمدے میں چارپائی پر سو رہا تھا۔ چراغ دین کی کار پورچ میں کھڑی تھی، اور کوٹھی پر مکمل سکوت تھا۔ مجھے کوئی ایسی ترکیب نہیں سوجھ رہی تھی جس سے میں کوٹھی کے اندر چراغ دین کے زندہ یا مردہ ہونے کا یقین کر سکوں۔ میں چوکیدار کو جگا کے نہیں کہہ سکتا تھا کہ جاؤ دیکھو تمہارا صاحب سو رہا ہے یا مر چکا ہے۔ مجھے یہ بھی اندازہ نہ تھا کہ چراغ دین کی خواب گاہ کون سی ہے اور وہاں تک میری رسائی ممکن ہے یا نہیں۔ بفرضِ محال میں خواب گاہ میں داخل ہو جاتا تب بھی چراغ دین کو جگائے بغیر کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ وہ ہمیشہ کی نیند نہیں سو چکا ہے۔

طریقہ مجھ پر وحی کی طرح نازل ہوا۔ چند قدم کی مسافت پر ریلوے اسٹیشن تھا اور وہاں ایک پبلک بوتھ تھا۔ ٹیلیفون نمبر مجھے یاد تھا۔ اس نمبر کو اپنے والد کی کوٹھی کا نمبر سمجھتے ہوئے میں نے لندن سے کئی بار ٹرنک کال کی تھی۔ ٹیلی فون بوتھ کے باہر "آؤٹ آف آرڈر" کا نوٹس آویزاں نہیں تھا جو بڑی غیر معمولی بات تھی۔ ایک غیر معمولی بات یہ ہوئی کہ پلیٹ فارم ٹکٹ کے کاؤنٹر سے مجھے ایک روپے کا نوٹ لے کر خوش اخلاقی کے ساتھ سکے بھی دے دیے گئے حالانکہ میری معلومات کے مطابق ریلوے کوئی "ہفتۂ خوش اخلاقی" نہیں منا رہی تھی۔ میں نے چراغ دین کا نمبر ملایا اور ریسیور تھامے کھڑا رہا۔ گھنٹی بجتی رہی۔ پورے دو منٹ بعد چراغ دین کی آواز آئی "سی سی ڈی ین۔"

"چراغ دین!" میں نے آواز بدل کے کہا۔ "تو زندہ ہے ابھی تک چور۔ آج تیری زندگی کی آخری رات بھی ہے۔"

"یہ... یہ کیا بکواس ہے۔" چراغ دین نے نروس لہجے میں کہا۔ "کون الو کا پٹھا ہے تو؟"

"تمہارا باپ۔" میں نے خوفناک لہجے میں کہا۔ "اور تمہارا قاتل ان چیف۔" پھر میں نے ریسیور رکھ دیا۔ اطمینان کی بات یہ تھی کہ وہ ابھی تک قتل نہیں ہوا تھا اور اب اس کا صبح تک قتل ہونا بھی ناممکن تھا۔ میں جانتا تھا اب وہ سو نہیں سکے گا۔ میں نے محسن کے عزائم کو ناکام بنانے کی جو کوشش کی تھی وہ کامیاب رہی تھی۔ یا محض غلط فہمی کے باعث میں نے ایک بے مقصد حرکت کی تھی۔ محسن اگر ادھر نہیں آیا تو کدھر گیا تھا۔ یہ سوال واپسی پر میرے ذہن میں گردش کرتا رہا۔

مزید حیرانی مجھے اس وقت ہوئی جب واپس پہنچتے ہی مجھ پر محسن نے سوال داغ دیا۔ "کس مشن پر تشریف لے گئے تھے جناب۔" وہ بستر پر آلتی پالتی مارے بیٹھا چائے پی رہا تھا۔

"تمہیں ڈھونڈنے گیا تھا۔" میں نے سچ بولتے ہوئے کہا۔ "جناب کی سواری آدھی رات کو کہاں گئی تھی؟"

"میں؟ میں تو کہیں بھی نہیں گیا تھا۔" محسن نے حیران ہو کے کہا۔

"تو جھوٹ بول رہا ہے۔ تیرا بستر خالی تھا۔ مجھے تشویش لاحق ہو رہی تھی۔" میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"بستر تیرا خالی تھا۔" محسن نے کہا۔ "میں دیکھنے اٹھا تھا۔ ویسے بھی مجھے نیند نہیں آ رہی تھی، تو باتھ روم میں تھا۔ میں باہر گھوم کے لوٹ آیا اور بس، تب سے جاگ رہا ہوں اور انتظار کر رہا ہوں۔ ابھی چائے بنائی ہے، گرم ہوگی۔" میں نے سر ہلایا اور باورچی خانے میں جا کے اپنے لیے چائے بنانے لگا۔ اس کی وضاحت سے مجھے مطمئن ہو جانا چاہیے تھا۔ میں واقعی باتھ روم میں تھا اور عین اسی وقت محسن باہر نکل گیا۔ لیکن نجانے کیوں مجھے یوں لگا کہ وہ مجھ سے کچھ چھپا رہا ہے۔ واپسی پر میں نے اسے ٹرانسمیٹر کے حصول کے مشن میں کامیابی کی اطلاع دی۔ اس نے بے حد مسرت کا اظہار کیا۔

"اب ہم باقاعدہ جیمز بانڈ ایجنٹ زیرو زیرو سیون ہیں۔" اس نے اعلان کیا۔ "میڈ ان پاکستان۔ ہمارے پاس ریوالور بھی ہیں اور خفیہ پیغام رسانی کے لیے ٹرانسمیٹر بھی۔"

"اس کے بعد ضرورت رہ جاتی ہے ایک کوڈ کی۔" میں نے چائے پیتے ہوئے ارشاد کیا۔ "ایک خفیہ زبان ایجاد کرنی پڑے گی تاکہ ہمارا سگنل کہیں اور ریسیو ہو جائے تو مجذوب کی بڑ معلوم ہو۔ یہ مسئلہ سنجیدگی سے غور طلب ہے مگر آسان نہیں ہے۔"

"ہاں، کافی ریسرچ اور غور و خوض کرنا پڑے گا۔" محسن نے تائید کی۔ "رازداری کی شرط بھی بے حد اہم ہے۔ ہم دونوں کے سوا کسی کو اس کوڈ کا پتہ نہیں چلنا چاہیے اور ہمیں بھی کوڈ یاد ہونا چاہیے۔ تحریر کے چوری ہو جانے کا خطرہ رہتا ہے۔"

محض وقت گزارنے کیلیے ہم صبح کا اجالا پھیلنے تک کوڈ کے چیدہ چیدہ نمونے کے طور پر پیش کرتے رہے مثلاً میں نے کہا "سکندر اعظم مقدونیہ کا رہنے والا تھا چنانچہ میں پیغام دیتے وقت کہہ سکتا ہوں۔ ریڈیو مقدونیہ۔"

"اور ٹرانسمیٹر میرے پاس ہو پھر؟" محسن نے کہا۔

میں نے غور فرمانے کے بعد کہا "تو شیروانی ہے۔ اس کی جگہ تو اچکن کہہ سکتا ہے، یا ٹرکش کوٹ۔" اس غیر سنجیدہ گفتگو کا مقصد یہ تھا کہ ہم سنجیدہ مسائل پر بات کرنے سے گریز کرنا چاہتے تھے۔ یہ مسائل غنیم کے لشکر جرار کی طرح ہمارے گرد حصار قائم کرتے جا رہے تھے۔ میر شرافت علی کا قتل، وزیر خان کی موت، ایم ڈبلیو ڈی کے معاملات، رابعہ کے گھر کی تباہی۔ فوزیہ کا مستقبل، پوسٹ مارٹم۔ بے فکری کی پرانی زندگی خواب و خیال ہو گئی تھی۔

آٹھ بجے میں ضامن رضوی صاحب کی کار لے کر روانہ ہوا تو شیروانی صاحب میرے ساتھ تھے۔ پہلے ہمیں گلاب خان کو لینا تھا چنانچہ چراغ دین کی کوٹھی میں صورت حال بڑی عجیب ہو گئی۔ شیروانی صاحب جو سابق سشن جج تھے ایک بار پھر اس منصب پر فائز ہونے کی سوچ رہے تھے اور سالے بہنوئی کا جو رشتہ میرے اور محسن کے درمیان قائم ہونے والا تھا وہ اب دوبارہ محسن اور چراغ دین کے درمیان قائم ہو رہا تھا کم سے کم اس کی تجویز ضرور زیر غور تھی۔ چراغ دین نے ہمارا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ وہ شیروانی صاحب کے قدموں میں لوٹنے کو تیار تھا اور میں محسن کی صورت کے بدلتے ہوئے رنگ دیکھ رہا تھا۔ چائے پینے کے لیے وقت نہیں تھا جس کا سی ڈی کو بڑا ملال تھا۔ اس نے کہا کہ جناب آپ نے بڑی غیریت برتی کہ آنے کی اطلاع تک نہیں دی۔ میں لینے حاضر ہو جاتا اور یہ آپ کس کی گاڑی میں پھر رہے ہیں، گھر کی گاڑی ہے۔

اس سے پہلے کہ شیروانی صاحب انکار کرتے میں نے کہا۔ "یہ ٹھیک ہے انکل! ایس ایس پی کی کار بھی نہ ہو تو اچھا ہے۔ اسے واپس کر دیتے ہیں۔ چراغ دین صاحب کی گاڑی لے لیتے ہیں۔" چراغ دین کی پیش کش رسمی اخلاق کا مظاہرہ تھی مگر شیروانی صاحب قائل ہو گئے۔ محسن نے مجھے حیرانی سے دیکھا مگر خاموش رہا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اس بات کا بھی کوئی مقصد ضرور ہے۔ میں نے چراغ دین سے چابیاں لیں اور اپنے ساتھ شیروانی صاحب کو اور پیچھے گلاب خان کو بٹھا لیا۔ محسن سے میں نے کہا کہ وہ رضوی صاحب کی گاڑی گھر چھوڑ کے سیدھا کورٹ آ جائے اس کے بعد میں کار کو سیدھا شملہ پہاڑی کی طرف لے گیا۔ دائیں ہاتھ گھوم کر ہم واپڈا ہاؤس اور اسمبلی کے پیچھے سے مال روڈ پر طلوع ہوئے۔ بیڈن روڈ سے صرف دو گواہ بیٹھے۔ باقی دو اپنی یا ڈی سلوا کی مرضی سے آفس ہی نہیں آئے تھے۔ ان میں وہ ابن الوقت انچارج بھی شامل تھا تاہم مجھے تین ہی گواہوں کی ضرورت تھی جو فراہم ہو گئے تھے۔

عبدالودود منظر نے قانونی کارروائی کے مراحل میں بڑی مستعدی کا مظاہرہ کیا اور دوپہر کے بعد عدالت سے ڈاکٹر نامزد کر دیے گئے اور اگلے روز صبح نو بجے پوسٹ مارٹم کے لیے احکامات صادر ہوئے۔ ایک اے سی ایم کی موجودگی میں گواہوں کو قبر کی نشاندہی کرنی تھی۔ اور ڈاکٹروں کو قبرستان میں ہی لاش نکلوا کے پوسٹ مارٹم مکمل کرنا تھا۔ جب ہم عدالت سے نکلے اور گواہ رخصت ہو گئے تو مجھے فضا بدلی بدلی سی لگی۔ سوگوار اور ماتم کناں سکوت جس میں موت کی ہیبت تھی۔ درختوں کی سرسراہٹ میں آسیب پکار رہے تھے، گاڑیاں بے آواز گزر رہی تھیں اور لوگ سہمے سہمے چل رہے تھے۔ میرے دل پر ایک بوجھ تھا اور میرے تصور میں اپنے باپ کا وہ چہرہ تھا جو میں نے آخری بار دیکھا تھا لیکن یہ چہرہ ایک جھلک دکھا کے اندھیرے میں ڈوب جاتا تھا۔ پھر اندھیرے میں ایک ڈھانچہ جھومنے لگتا تھا۔ اس کی ہڈیاں روشن نظر آتی تھیں۔ کڑکڑاتی تھیں۔ یوں جیسے وہ ڈھانچہ بول رہا ہو۔ تم نے پہچانا مجھے سکندر! میں ہی تمہارا باپ ہوں، جب تک زندہ تھا۔ اب تو میں وہی ہوں اور ویسا ہی ہوں جیسے میرے ارد گرد رہنے والے شہر خموشاں کے باسی ہیں۔ بچپن میں قبرستان کتنے پراسرار لگتے تھے اور دھنسی ہوئی قبریں جن کے تاریک خلا میں جھانکنے پر شوق مجبور کرتا تھا اور خوف منع کرتا تھا۔ پرانی قبروں کی دراڑوں میں رات کو روشنی نظر آتی ہے۔ ہڈیوں کا فاسفورس چمکتا ہے۔ یہ بکواس ہے جی۔ میاں اعمال نیک ہوں تو قبر میں اجالا رہتا ہے، ورنہ گناہوں کا اندھیرا۔ روحوں کے قصے، سر کٹے گھوڑے کی روایت، نو گزے کی قبر جو تقریباً ہر شہر قصبے میں دستیاب تھی اور اب یہ سامنے کہ بیٹا خود سرہانے موجود ہوگا۔ ایک مجسٹریٹ کی موجودگی میں لاش نکلوائے گا اپنے باپ کی۔ اکثر لوگوں کے نقطہ نظر سے لاش کی بے حرمتی۔ مرنے والے کی روح کے لیے عذاب۔ مگر قانون کی نظر میں ایک ضرورت۔ کیسا اسرار اور کہاں کا آسیب۔ جو حقیقت زمین میں دفن ہو گئی تھی اب عیاں ہو گی۔ بے شک ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے۔

یہی اداسی اور بوجھل پن سب کے مزاج پر حاوی تھا۔ محسن چپ تھا اور شیروانی صاحب اپنے سامنے دیکھ رہے تھے۔ میری طرح وہ بھی ان یادوں کی پرچھائیوں میں گم تھے جو مرنے والے اور خود ان کے اپنے ماضی کا مشترک سرمایہ تھیں۔

"سکندر! تم نے یہ سب نہ کیا ہوتا تو اچھا تھا۔" وہ اچانک بولے۔ پھر انہوں نے ایک گہری ٹھنڈی سانس لی اور پھر وہ خاموش ہو گئے۔

"پہلے بھی کبھی ایسا ہوا تھا صاب!" گلاب خان نے کہا۔ "ہمارا علاقہ میں اب بھی یہ نہیں ہو سکتا۔ اللہ ہم سب کو معافی دے۔"

حسب توقع ضامن رضوی صاحب اپنے کمرے میں ہونے والی چوری پر برافروختہ تھے۔ انہوں نے چوری کی باقاعدہ رپورٹ درج کرائی تھی۔ اور تفتیش کرنے والوں نے ہر جگہ دیکھی تھی۔ وہ جہاں سے تاروں کو ٹیپ کیا گیا تھا، وہ جہاں سے تار زمین میں دبائے گئے تھے اور وہ درخت جہاں سے ٹرانسمیٹر برآمد ہوا تھا۔ تلاشی لینے والوں نے گھر کا کونا کونا چھان مارا تھا۔ رضوی صاحب نے مقفل الماریوں اور صندوقوں کے سوا ان کو ہر جگہ دیکھنے کی اجازت دی تھی۔ الماریاں اور صندوق انہوں نے خود دیکھے تھے مگر کہیں سے کچھ نہیں ملا تھا۔ ان کی بیگم، پولیس افسر کی بیوی ہونے کی

وجہ سے ضابطے کی کارروائی کو سمجھتی تھیں لیکن شیروانی صاحب کی بیوی حیران تھیں کہ ٹیلی فون جیسی کوئی چھوٹی سی چیز گم ہو گئی ہے تو اتنا ہنگامہ کس لیے۔ بازار میں مل جائے گی اور اب تو خیر سے باہر کی ہر چیز دستیاب ہے۔ ہماری عدم موجودگی میں سرونٹ کوارٹر کی تلاشی بھی لی گئی تھی جس کا ہمیں ڈر تھا چنانچہ ہم ریو اور اپنے ساتھ چھپا کے لے گئے تھے۔ رابعہ کو کچھ شک تھا۔ چنانچہ اس نے مجھ سے علیحدگی میں پوچھا بھی تھا کہ یہ حرکت ہماری تو نہیں ہے۔ میں نے کہا ”لاحول ولا قوۃ۔ میں کوئی غیر ملکی ایجنٹ ہوں۔ میں ٹرانسمیٹر کا کیا کروں گا۔“

اس نے کہا ”تم ہو نا ذرا ہیرو ٹائپ۔ ایڈونچرس۔“

میں نے کہا ”ہاں، وہ تو ہم ہیں لیکن فلمی ٹائپ نہیں ہیں۔ دل کا ٹرانسمیٹر استعمال کرتے ہیں اور ٹیلی پیتھی سے وائرلیس کا کام لیتے ہیں، جس سے دل ملا ہوا ہو اس سے بات ویسے ہی ہو جاتی ہے۔“ جب وہ مسکرائی تو مجھے دلی مسرت ہوئی۔ رابعہ ایک گھر میں تھی اور اپنوں میں تھی۔ اگر اس کا پرانا گھر جل کے خاک نہ ہوتا تب بھی وہ اکیلی وہاں رہتی تو پاگل ہو جاتی۔ اس کی کار مل گئی تھی مگر ابھی پولیس کے قبضے میں تھی۔ اے سی ایم سے ریلیز آرڈر دو چار دن میں مل جانے کے بعد وہ اس کو ڈیٹا بینٹ کرنے کی سوچ رہی تھی۔ میں نے کہا کہ نئی لے لو تو بولی میں ذرا قدامت پسند ہوں خصوصاً رشتوں کے معاملے میں خواہ وہ انسانوں سے ہوں یا چیزوں سے۔ اس کا ایک ثبوت میں خود بھی تھا جس سے اپنے جذباتی رشتے کو وہ برسوں سے دل میں یوں چھپائے بیٹھی تھی جیسے تہہِ آب میں کوئی صدف ایک موتی لیے برسوں سے موجود ہو مگر کسی کو اس کی خبر نہ ہو۔

وہ اعلیٰ پولیس افسر اس سے تفتیش کے سلسلے میں بیان لینے آئے تھے اور دو گھنٹے تک اس سے مختلف نوعیت کے سوالات کرتے رہے تھے۔ رابعہ نے کہا تھا کہ میرا کوئی دشمن نہیں۔ میں کسی پر شک نہیں کر سکتی۔ انہوں نے ملبے سے برآمد ہونے والوں کی تصویریں بھی دکھائی تھیں۔ رابعہ نے کہا تھا کہ میں ان میں سے کسی کو نہیں جانتی۔ فوزیہ اور اس کی ماں نے یہ کارروائی دیکھی اور سنی تھی چنانچہ بعد میں فوزیہ کی ماں نے رابعہ کے بارے میں کہا تھا کہ کمال عورت ہے۔ کیسی فر فر انگریزی بولتی ہے اور پولیس والوں سے کیسے بات کرتی ہے جیسے ان کی افسر ہے۔ رضوی صاحب کی بیگم نے اس میں تعریف کے پہلو کو نوٹ کیا تھا اور کہا تھا کہ اتنی بڑی وکیل ہے ڈرے گی کیوں اور ساتھ ہی رابعہ کی شرافت، نیکی اور سادگی کی خوبی کو سراہا تھا جس کا مسز شیروانی نے مزید برا مانا تھا۔ ان کے لیے رابعہ کو آوارہ، بدکردار اور بے شرم سمجھنے اور کہنے کے مواقع تو ختم ہو ہی گئے تھے۔ بحیثیت شریکِ حیات اس کو میرے مقدر کی خرابی قرار دینا بھی ممکن نہ رہا۔ اسی روز سوئم تھا جس میں عورتوں کے لیے اندر اور مردوں کے لیے لان میں انتظام کیا گیا تھا۔ میں نے نوٹ کیا کہ شریک ہونے والے مردوں کی تعداد بہت زیادہ ہے مگر ان میں سب وکیل ہیں، خواتین میں بھی وکیل اور دو جج تھیں لیکن خود رابعہ کے خاندان نے سوئم کا بائیکاٹ کیا تھا صرف اس لیے کہ اپنوں کے ہوتے ہوئے رابعہ غیروں کے گھر کیوں منتقل ہوئی۔ رابعہ نے افسوس کے بجائے اطمینان کا اظہار کیا۔ وہ آتے تو اپنی جہالت اور تنگ نظری کے مظاہرے کے سوا کیا کرتے۔ ان کی بے سر و پا قیاس آرائیوں پر مبنی باتیں سن کے دل آزاری کے سوا کیا حاصل ہوتا اور طعنوں کے سوا وہ کیا دیتے۔

تعزیت کے لیے آنے والوں میں ہائی کورٹ کے معزز جج صاحبان بھی تھے جو آ نہیں سکے تھے انہوں نے ٹیلی فون پر اظہار ہمدردی کیا تھا۔ رابعہ کو دوستوں اور مخلص مددگاروں کی کمی نہ تھی۔ مسز شیروانی اس سے مرعوب ہونے کے بعد اپنی فوزیہ کے بارے میں شدت سے احساسِ کمتری کا شکار ہو گئیں۔ ان کو میرا فوزیہ کو چھوڑ کے رابعہ کو اپنانے کا فعل غیر شریفانہ تو لگا مگر بے جواز نہیں، چنانچہ انہوں نے خود کو بے عزت محسوس کیا۔ وہ فوزیہ کو چراغ دین سے بیاہ دینے کی خبر ایسے سنانا چاہتی تھیں کہ مجھے اپنی حماقت کا احساس ہو اور میں خود کو بے عزت محسوس کروں لیکن معاملہ الٹا نکلا تھا۔ ان کے معیار سے رابعہ بہت اعلیٰ و ارفع ثابت ہوئی تھی۔ تعلیم، دولت، حسنِ صورت و سیرت میں انہوں نے رابعہ کو فوزیہ سے برتر دیکھا۔ یہ ان کی عقل کا قصور تھا۔ نہ میں انہیں سمجھا سکتا تھا کہ دل کے معاملات میں عقل کے معیار نہیں چلتے اور نہ اپنا دل چیر کے دکھا سکتا تھا کہ وہ میری مجبوریوں کو اپنی نظر سے دیکھ لیں۔ یہ لوگ رات کی فلائٹ سے جانے والے تھے۔ محض فوزیہ کے مقابل نہ ہونے کی خاطر میں گھر سے نکل گیا اور قبرستان جا پہنچا۔ بوڑھے گورکن نے ہمیشہ کی طرح انعام کی امید میں قبر پر پانی کا ایک ٹین چھڑکا اور میں نے اسے دس روپے دیے۔ پھر میں نے گلاب کے پھولوں کی پتیاں قبر پر ڈالیں۔ اگربتیاں سلگائیں اور دست بدعا ہو گیا۔ نہ جانے کتنی دیر میں عالمِ استغراق میں آنکھیں بند کیے ہاتھ اٹھائے کھڑا رہا۔ یہ ایک وجدانی ذہنی کیفیت تھی جس میں میرا رابطہ مادی دنیا کے گرد و پیش سے کٹ گیا تھا اور میں لامکاں سے لامکاں میں پہنچ کے اپنے والد سے ہمکلام تھا۔ ان سے اس گستاخی پر معافی کا طلب گار تھا کہ میں نے انہیں مرکے بھی چین نہ لینے دیا۔ زندگی میں بھی میں ان کے لیے کچھ نہ کر سکا تھا۔ خدمت گزاری کی سعادت کا وقت آنے سے پہلے وہ دنیا سے اور مجھ سے بہت دور چلے گئے تھے۔ میرے والد کا خیالی پیکر میرے مقابل تھا اور وہ مجھے تسلی دے رہے تھے، حوصلہ دے رہے تھے اور سمجھا رہے تھے کہ انہیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں۔ انہیں مجھ پر فخر ہے۔ بوڑھے گورکن نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا تو میں نے آنکھیں کھولیں۔ میں اسی قبرستان میں قبر کے سرہانے کھڑا تھا۔ یہ میرے اپنے دل کی بات تھی جو تصور میں ڈھل گئی۔ میں یہ کیسے فرض کر سکتا تھا کہ وہ برہم ہیں اور مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ خبردار جو قبر میں مجھے چھیڑا۔ آنسو میری آنکھوں سے بہہ کر رخساروں پر سے پھسل کر قبر کی مٹی پر گر رہے تھے۔

”چلو بیٹا!“ بوڑھے گورکن نے کہا ”صبر کرو۔ مردے کے سرہانے رونے سے اس کی روح کو تکلیف ہوتی ہے۔“

”یہ میرے والد تھے بابا! میں اپنی بدقسمتی پر رو رہا ہوں کہ ان کی خدمت نہ کر سکا۔“ میں نے کہا۔

”چلو اب ان کی مغفرت کے لیے جو کچھ کر سکتے ہو کرو۔ باپ کا سایہ سر سے اٹھ جاتے تو سب کو ہی یہ احساس ہوتا ہے۔ زندگی میں بیٹے بہت کچھ کر سکتے ہیں مگر نہیں کرتے۔“ گورکن بولا۔ اس سے مجھے یوں لگا جیسے وہ میرے حالات سے واقف ہے۔ جانتا ہے کہ میں کیا کر سکتا تھا جو میں نے نہیں کیا۔

صبح نو بجے پولیس نے قبر کے گرد قناتوں کی عارضی دیوار کھڑی کر لی تھی۔ ڈپٹی مجسٹریٹ ساڑھے نو بجے پہنچا اور اس نے متعلقہ گواہوں کو قبر کی نشاندہی کے لیے کہا۔ مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اپنی آنکھوں سے قبر کھودنے والوں کو ایک ڈھانچہ نکالتے دیکھوں اور تمام عمر اس کے تصور کی اذیت اٹھاؤں چنانچہ میں قنات سے باہر محسن کے ساتھ کھڑا رہا۔ دو ڈاکٹروں میں سے ابھی ایک پہنچا تھا۔ وہ ہمارے پاس آ کھڑا ہوا۔ گلاب خان، پولیس والے اور مجسٹریٹ کے علاوہ دونوں غربت زدہ سہمے ہوئے گواہ قنات کے اندر تھے۔

”ڈاکٹر صاحب؟“ میں نے کہا ”میں آپ کی پیشہ ورانہ ذمے داریوں میں مداخلت نہیں کر سکتا اور نہ آپ کی رائے پر اثرانداز ہونے کی کوشش کر سکتا ہوں۔ صرف معلومات کے لیے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔“

نوجوان ڈاکٹر بڑی بے نیازی سے سگریٹ پی رہا تھا۔ اس کے لیے یہ کوئی جذباتی مسئلہ نہیں تھا۔ ”پوچھیے۔“ وہ بولا۔

”اس قسم کے پوسٹ مارٹم میں۔“ میں نے کہا ”جہاں صرف ہڈیاں رہ گئی ہوں۔ اگر کسی مہلک ضرب وغیرہ کا نشان مل جائے تو اور بات ہے لیکن کیا موت کے دیگر اسباب کا تعین بھی آسانی سے ہو جاتا ہے؟“

”میڈیکل سائنس اب بہت ترقی کر گئی ہے۔“ وہ بولا۔ ”ہمارے پاس جدید ترین طریقے ہیں۔ آدمی کے ناخن اور بال بہت عرصے تک باقی رہتے ہیں اور زہر خورانی وغیرہ کا پتہ دے سکتے ہیں، مثلاً آرسینک کے اثرات۔“

”کتنے عرصے تک؟“ میں نے کہا۔

”پانچ سے دس سال بعد تک۔ اس کا انحصار حالات پر ہے۔“ وہ بولا۔ اسی وقت دوسرا ڈاکٹر نمودار ہوا۔ پھر گورکن کی تلاش شروع ہوئی۔ اس وقت تک دس بج چکے تھے۔ ایک کانسٹیبل قبرستان میں اس کے خستہ حال مکان تک گیا اور گورکن کے بجائے ایک نوجوان کے ساتھ واپس آیا۔ ”یہ گورکن کا لڑکا ہے جناب۔“ کانسٹیبل نے مجسٹریٹ سے کہا ”وہ بڈھا تو معلوم نہیں کہاں چلا گیا ہے۔“

”کیوں؟“ مجسٹریٹ نے جیں بر جبیں ہو کے کہا ”کیا اسے احکامات نہیں پہنچائے گئے تھے کہ قبر کھودنی ہے؟“

کسی نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ متعلقہ تھانے کا ایس ایچ او یہ بہتر طور پر بتا سکتا تھا مگر وہ موجود نہیں تھا۔ گورکن کا لڑکا آگے آیا۔ ”بابا کا شام کو جی خراب تھا سرکار! وہ دوا لینے شہر گئے تھے۔ رات ہو گئی تھی۔ حکم ہو تو میں...“

”تم کر سکتے ہو یہ کام؟“ مجسٹریٹ نے دست بستہ نوجوان کی طرف دیکھا۔ سر کے اشارے سے اس نے اپنی رضامندی ظاہر کی۔

”اب تو میں ہی کرتا ہوں سرکار! بابا بوڑھے ہو گئے ہیں۔“ نوجوان نے گورکنی کے آلات سنبھالتے ہوئے کہا۔ مٹی پر پڑنے والی کدال کی ہر ضرب مجھے اپنے دل پر محسوس ہوتی تھی۔ محسن نے کئی بار مجھے ہمت سے کام لینے کی تاکید کی حالانکہ اس کی اپنی حالت غیر تھی۔

آدھے گھنٹے تک مکمل خاموشی میں صرف قبر کے کھودے جانے کی آواز سنائی دیتی رہی۔ پھر ایک چیخ سنائی دی۔

پُرسکوت

قبرستان کے دہشت زدہ کر دینے والے ماحول میں یہ چیخ مجھے زیادہ بھیانک محسوس ہوئی۔ صرف ایک لمحے کے لیے میں نے حیران ہو کے سوالیہ نظروں سے محسن کو دیکھا۔ جو لوگ اس کارروائی میں شریک تھے عاقل و بالغ تھے اور اگر ان کو یہ کام آدھی رات کے ویران سناٹے میں کرنا پڑتا تب بھی کسی قبر میں سے برآمد ہونے والے ڈھانچے کو دیکھ کر کوئی اس طرح چیخ نہ مارتا۔ پھر ایک گورکن کا جوان بیٹا جو اسی شہرِ خموشاں کا ایک مکیں تھا اور جس کا پیشہ ہی انسانوں کو سپردِ خاک کرنا تھا، کس بات سے خوفزدہ تھا؟

میں اور محسن ایک ساتھ قنات کی عارضی چار دیواری میں داخل ہوئے تو میں نے مجسٹریٹ اور ڈاکٹروں کو تازہ مٹی کے ڈھیر پر سے قبر میں جھانکنے کی کوشش کرتے دیکھا۔ انکی حیرت اور تجسّس کے جذبات ان کی صورتوں پر تحریر تھے۔ نوجوان گورکن کا متوحش چہرہ مجھے ان کی ٹانگوں کے درمیان دکھائی دیا وہ باری باری اوپر سے جھانکنے والوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں پوری احتیاط کے ساتھ ایک ایسی جگہ جا کھڑا ہوا جہاں سے مجھے قبر کے اندر کی گہرائی صاف نظر آتی تھی۔ زمین ابھی مشکل سے تین فٹ کھودی گئی تھی اور مٹی میں سے دو انسانی ہاتھ نمودار ہو گئے تھے۔ یہ کسی ڈھانچے کے نہیں، جیتے جاگتے انسان کے ہاتھ لگتے تھے۔ گوشت پوست کے بنے ہوئے اور بے کفن۔ ہاتھوں سے عمر کا یا رنگ کا اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ جلد پر مٹی کی تہہ تھی جس نے ان ہاتھوں کو ہمرنگِ زمیں کر دیا تھا۔

نوجوان گورکن ابھی قبر کے تختوں پر کھڑا تھا چنانچہ مجھے اس کے خوف کا سبب جاننے میں دیر نہ لگی۔ یہ میرے والد کی نہیں کسی اور شخص کی لاش تھی جسے اس قبر میں ڈال کے مٹی میں دبا دیا گیا تھا۔

"میں... میں نے تو پہلے ہی کہا تھا جنابِ عالی..." گورکن نے فریاد کناں لہجے میں کہا۔ "کہ مٹی نرم ہے..."

ایک ڈاکٹر نے اس کے کندھے پر تھپکی دی۔ "گھبراتے کیوں ہو، ابھی معلوم ہو جائے گا کہ یہ کیا چکر ہے۔" اسی ڈاکٹر نے کہا جو کچھ دیر پہلے مجھ سے بات کر رہا تھا۔ "مجسٹریٹ صاحب موجود ہیں۔"

"گواہوں نے قبر کی شناخت میں غلطی کی ہے۔" مجسٹریٹ نے گویا فیصلہ صادر کیا۔

"اس کا فیصلہ تو بعد میں بھی کیا جا سکتا ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "پہلے آپ یہ تو دیکھیے کہ برآمد کیا ہو رہا ہے اور کس طرح؟" اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔

مجسٹریٹ نے اپنے وقار اور متانت میں فرق نہیں آنے دیا۔ "ہاں ہاں۔ پہلے اسے نکالو، یہ جو بھی ہے۔ لیکن ذرا احتیاط سے۔"

"بیلچہ رکھ کے باقی مٹی ہاتھ سے ہٹاؤ۔" دوسرے ڈاکٹر نے حکم دیا۔ گورکن نے تعمیل کی۔ ہاتھوں کے آس پاس سے مٹی کے ہٹتے ہی ایک انسانی سر نمودار ہوا جس پر بالوں نے بھی مٹی کا رنگ اختیار کر لیا تھا۔ ابھی مجھے یہ خیال ہی آیا تھا کہ نوجوان گورکن چلّایا۔

"یہ تو... یہ تو میرا بابا ہے۔" اس نے سر کو اوپر اٹھایا۔ پھر وہ پوری قوت سے چیخا۔ "بابا!" اور دیوانہ وار مٹی ہٹانے لگا۔

بوڑھا گورکن قبر کے ایک گوشے میں یوں بیٹھا تھا کہ اس کا سر گھٹنوں پر تھا اور گھٹنے سینے کے قریب تھے۔ اپنے دونوں ہاتھ اس نے سر پر یوں اٹھا کے رکھ لیے تھے جیسے سر کو مٹی پتھر کے بوجھ سے اور ضربات سے بچانا چاہتا تھا۔ مجسٹریٹ کے حکم پر دونوں سپاہیوں نے گورکن کی مدد کی اور ان سب نے مل کر بوڑھے کو اوپر کھینچا۔ اس کے جسم، کپڑوں اور بالوں میں مٹی یوں بھر گئی تھی کہ وہ مٹی کا مجسمہ لگتا تھا، لیکن اس کا چہرہ صاف رہا تھا کیونکہ اس کا رخ نیچے کی طرف تھا۔ حیرانی مجھے یہ دیکھ کر ہوئی کہ بوڑھے کی لاش اکڑ کر سخت نہیں ہوئی تھی اور جب اسے اٹھایا گیا تو وہ یوں اٹھا جیسے وہ مرا نہیں ہے صرف بے ہوش ہے۔ چند منٹ بعد دونوں ڈاکٹروں نے اس بات کی تصدیق کر دی۔ بوڑھے کی نبض اور سانس کی رفتار بہت مدّھم تھی لیکن وہ زندہ تھا۔ کچھ دیر کے لیے وہ سب جو ایک پرانی لاش کا ڈھانچہ نکالنے اور اس کی موت کے اسباب کا تعین کرنے کے لیے جمع ہوئے تھے، سب کچھ بھول کے اس ناقابلِ یقین حد تک سنسنی خیز واقعے کی طرف متوجہ ہو گئے۔ نوجوان گورکن جو باپ کی موت پر چلا چلا کے رونے لگا تھا اب اس کو زندہ پا کے خوشی سے رو رہا تھا اور گھٹنوں کے بل زمین پر ڈاکٹروں کے سامنے ہاتھ جوڑے بیٹھا تھا، التجا کر رہا تھا کہ اس کے باپ کی زندگی بچا لی جائے۔ بالآخر ڈاکٹروں نے اسے دھکیل کر ایک طرف کیا۔

"اگر تم نے ہمیں کچھ نہ کرنے دیا تو یہ مر جائے گا۔" ایک ڈاکٹر نے سخت لہجے میں کہا۔ "زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں نہ ہوتی تو یہ اب تک کب کا مر چکا ہوتا۔" سوائے ان دو ڈاکٹروں کے جو بوڑھے کو بچانے کے لیے واقعی کوشاں تھے باقی سب اس غیر متوقع صورتِ حال پر حیران و پریشان کھڑے تھے۔ تینوں گواہ بوڑھے گورکن کے قبر میں سے زندہ نکلنے کو خدا کی قدرت کا معجزہ قرار دے رہے تھے لیکن دل کی بات کو زبان پر لانے سے گریز کر رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ انہوں نے صحیح قبر کی نشاندہی کی ہے مگر وزیر خان مرحوم کی لاش سے پہلے ایک زندہ لاش کا نکلنا چہ معنی دارد؟ کیا اس سے میرے شبہات کی تصدیق نہیں ہوتی؟ اور کیا مجھے اپنے والد کے انتقال پر قتل کا جو گمان تھا وہ بے سبب تھا؟ اس پُراسرار واردات نے ایسے بہت سے سوالات کو جنم دیا تھا جو میرے ذہن سے بالواسطہ طور پر دوسروں کے ذہن میں منتقل ہو گئے تھے۔

ڈاکٹروں نے ہنگامی طور پر ایک زندگی کو بچانے کے اقدامات کیے اور انہوں نے اپنے ماتحت عملے کو حکم دیا کہ گورکن کو فوراً گاڑی میں پہنچا دیا جائے۔ نگرانی کرنے والے مجسٹریٹ نے کچھ دیر سوچنے کے بعد باقی لوگوں کو انتظار کرنے کے لیے کہا اور خود بھی ڈاکٹروں کے ساتھ ہو لیا۔ "باقی کارروائی آج ہی مکمل ہو گی۔" اس نے چلتے چلتے کہا۔ "ہم ابھی واپس آئیں گے۔"

"ہم یہ کیس ایمرجنسی کے سپرد کرنے سے پہلے واپس نہیں آ سکتے۔" ایک ڈاکٹر نے گھڑی دیکھی۔ "اس کے بعد لنچ کا وقت ہو جائے گا۔"

"مجھے بھی تو ایمرجنسی وارڈ میں پولیس کا پہرہ بٹھانا ہے۔" مجسٹریٹ نے کہا۔ "تاکہ کوئی غیر متعلقہ شخص اس کے قریب نہ جائے اور نہ اس سے بات کرے۔ اس مقدمے کی تفتیش الگ ہو گی۔"

"پولیس سرجن اپنی ذمّے داریاں سمجھتا ہے۔" اسی ڈاکٹر نے کہا۔ ان کے درمیان یہ اختلافِ رائے صرف اس بات پر تھا کہ مجسٹریٹ بھی ڈاکٹروں کے ساتھ جانے پر مصر تھا۔ میں ان کے پیچھے ہو لیا اور ساتھ چلنے لگا۔

"میں عینی شاہد ہوں۔ مجھے پولیس سرجن کو نہیں متعلقہ ایس ایچ او کو ہدایات دینی ہیں، ایف آئی آر کے سلسلے میں۔" مجسٹریٹ نے کہا۔ "اگر خدانخواستہ یہ راستے میں یا ہسپتال میں پولیس کے آنے سے پہلے مر گیا اور مرنے سے پہلے اس نے کوئی بیان دینا چاہا تو میرے سامنے دے سکے گا۔"

"مجسٹریٹ صاحب!" میں نے کہا۔ "جس نے بھی اس بوڑھے گورکن کی جان لینی چاہی تھی وہ ہسپتال میں بھی اس کو قتل کر سکتا ہے، یا کرا سکتا ہے۔ خدا کرے یہ زندہ بچ جائے تاکہ چند صورتوں کو شناخت کر سکے۔"

"کن صورتوں کو؟" مجسٹریٹ نے میرے دخل در معقولات پر برا مان کے کہا۔ "تم جانتے ہو کسی کو؟"

"فی الحال میں کسی کا نام نہیں لے رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اگر یہ زندہ رہا اور اس کی جان کی حفاظت کے انتظامات غیر موثر ثابت نہ ہوئے تو میں کچھ لوگوں کو یا ان کی تصویر پیش کر سکوں گا۔"

"واٹ نان سنس۔" ایک ڈاکٹر نے کہا۔ "ہسپتال میں قتل کرنا اور کرانا، یہ سب فلموں میں ہوتا ہے۔"

"دس از ناٹ آل نان سنس۔" میں نے کہا۔ "آپ کو اصل حقائق کا علم ہوتا تو آپ کبھی ایسی بات نہ کہتے لیکن آپ کا کیا قصور، آپ نے صرف فلمیں دیکھی ہیں یا پوسٹ مارٹم کیے ہیں جن سے زندگی کے حالات کا پتہ نہیں چلتا۔"

"ٹھہر جایئے مسٹر سکندر!" مجسٹریٹ نے اپنے قانونی اختیارات استعمال کیے۔ "یہ ٹھیک ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو ان حالات کا علم نہیں جن کی وجہ سے یہ قبر دوبارہ کھودنے کے احکامات جاری کیے گئے تھے، لیکن ذرا عقل سے کام لیجیے۔ ہسپتال میں پولیس کی موجودگی میں کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ میں جو حفاظتی انتظامات کروں گا وہ کیسے غیر موثر ہو سکتے ہیں؟"

"اس کا بہتر جواب ایس ایس پی ضامن رضوی دے سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور وہ مجسٹریٹ اور جج صاحبان بھی دے سکتے ہیں جنہوں نے مس رابعہ قادری ایڈووکیٹ کے گھر کی تباہی کا منظر دیکھا ہے۔ میرا خیال ہے خبر تو آپ نے پڑھی ہو گی؟"

"آل رائٹ۔" مجسٹریٹ نے لاجواب ہو کے کہا۔ "کیا چاہتے ہیں آپ؟"

"جو کچھ میں چاہتا ہوں، بتا چکا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اس شخص کو بعد میں زندہ رکھنا آپ کی ذمّے داری ہے۔ یہ خود اپنے کیس میں اور میرے کیس میں استغاثہ کا سب سے اہم گواہ ہے۔ اور اسی لیے مجھے اندیشہ ہے کہ قاتل پھر کوشش کریں گے۔"

"کس کے قاتل؟ کون قاتل؟" مجسٹریٹ نے کہا۔ "نام لو ان کا۔ میں ان کو ہسپتال بلوا لیتا ہوں، تمہاری موجودگی میں۔"

ایک ڈاکٹر کی کار بوڑھے گورکن کو لے کر جا چکی تھی دوسرے ڈاکٹر نے مجسٹریٹ کے لیے اپنی کار کا دروازہ کھول رکھا تھا اور انجن اسٹارٹ کیے منتظر تھا۔ میں نے اشارے سے اس کو جانے کے لیے کہا۔ "میں مجسٹریٹ صاحب کو اپنی گاڑی میں لے کر آتا ہوں۔" میں نے کہا۔ مجسٹریٹ نے تھوڑا سا منہ بنایا مگر ڈاکٹر نے فوراً دروازہ بند کیا اور کار روانہ ہو گئی۔

"میں ڈاکٹر کے سامنے کوئی بات نہیں کر سکتا تھا۔" میں نے کہا۔ "تمام واقعات کا خلاصہ پیش کرنا بھی ناممکن ہے لیکن میں ایک بات پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میرے والد کے قاتل اور گورکن کو زندہ درگور کرنے والے ایک ہی ہیں۔ اس کا ثبوت میں بعد میں دوں گا اور گورکن زندہ رہا تو

عین ممکن ہے ان کو پہچان بھی لے۔ میں ان کے نام آپ کو لکھ دوں گا اور آپ اگر قانون کی طاقت اور تمام وسائل استعمال کر کے انہیں گورکن کے سامنے لے آتے۔۔۔"

"اگر کا کیا سوال ہے؟" مجسٹریٹ نے چڑ کر کہا۔

"مجسٹریٹ صاحب، میں بڑے تلخ تجربات کے بعد یہ بات کہہ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اوّل تو وہ آئیں گے نہیں، شاید ملیں گے ہی نہیں اور اگر ملیں گے تو اس وقت جب وقت گزر چکا ہوگا۔ وہ گورکن کی زندگی میں اس کے سامنے نہیں آئیں گے۔ وہ اس کے مرنے کے بعد تو آ سکتے ہیں مگر اس سے پہلے نہیں۔ اب آپ کوشش کر دیکھیے۔ گورکن کو زندہ رکھنے کی اور انہیں بلوانے کی۔ میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ دیر تو آپ کو ہو ہی گئی ہے۔ چند منٹ کی تاخیر اور سہی۔"

مجسٹریٹ نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ لوگ ہسپتال پہنچ جائیں گے۔ میں ابھی یہیں کھڑا ہوں۔"

"میں آپ کو بلاوجہ نہیں روک رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ میری باتوں کو اہمیت دیں اور یہ سمجھ لیں کہ معاملات کتنے سنگین ہیں۔ اس بات کو اپنی ذات تک محدود رکھیے گا۔ حفاظتی انتظامات مس رابعہ قاری کے گھر کو بچانے کے لیے بھی کیے گئے تھے اور بظاہر بہت اطمینان بخش تھے۔ نامعلوم افراد نے دھمکی دی تھی کہ وہ رابعہ قاری ایڈووکیٹ کی والدہ کا جنازہ اٹھنے سے پہلے ہی گھر کو اڑا دیں گے اور یہ دھمکی خاموشی سے دی گئی تھی چنانچہ حفاظتی انتظامات بھی رازداری سے کیے گئے تھے لیکن وہ سب بے سود ثابت ہوئے۔"

"تم مجھ سے کیا توقع رکھتے ہو؟" مجسٹریٹ اب برہم ہونے لگا تھا۔ "میں خود توپ لے کر کھڑا ہو جاؤں یا فوج کو طلب کر لوں؟"

"یور آنر! آپ ایک نظر قبر میں جھانک لیں۔" میں نے یکلخت لہجہ بدل کے کہا۔ "میرا خیال ہے پھر آپ کو واپس نہیں آنا پڑے گا اور یہ لوگ بھی بھوکے پیاسے قبرستان میں کھڑے رہنے اور بلاوجہ انتظار کرنے کی تکلیف سے بچ جائیں گے۔ قبر میں اب کچھ بھی نہیں ہے۔"

مجسٹریٹ کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا اور اس نے مجھے یوں دیکھا جیسے اسے میری ذہنی کیفیت کے نارمل ہونے پر شبہ ہے۔ "قبر تقریباً کھودی جا چکی ہے۔" میں نے اسی لہجے میں کہا۔ "ایک تختہ ہٹا کے دیکھنے سے معلوم ہو جائے گا کہ میری بات کس حد تک درست ہے اور اس کے بعد آپ کے لیے میرے اندیشوں پر اعتبار کرنا ضروری ہو جائے گا۔"

"تمہارا مطلب ہے۔۔۔ تمہارے والد کی لاش قبر میں نہیں ہوگی۔۔۔"

"جی۔" میں نے کہا۔ "میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ گزشتہ رات کچھ لوگ گورکن کے پاس آئے، انہوں نے زبردستی گورکن کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ قبر کھودے اور میرے والد کی لاش کا ڈھانچہ ان کو نکال دے۔ ان کو خبر مل چکی ہوگی کہ صبح قانونی طور پر لاش کو نکال کے دوبارہ پوسٹ مارٹم کرنے کے احکامات جاری کیے جا چکے ہیں۔ دوبارہ پوسٹ مارٹم ہوتا تو یہ ثابت ہو جاتا کہ میرے والد کی موت طبعی نہیں تھی بلکہ ان کو واقعی قتل کیا گیا تھا۔ گورکن نے ایک دو تختے ہٹا کے ڈھانچہ کفن سمیت کھینچ لیا ہوگا اور ان لوگوں کے حوالے کر دیا ہوگا مگر بوڑھا گورکن خود باہر نہ آ سکا۔ اگر یہ کام اس نے لالچ میں کیا تھا تو انعام کی جگہ اس کو یہ صلہ ملا کہ اپنے ہی بیلچے کی ایک ضرب نے اسے بے ہوش کر دیا اور مارنے والے اس پر مٹی ڈال کے اور قبر کو پھر برابر کر کے چلے گئے۔ اس یقین کے ساتھ کہ گورکن خود ہی مر جائے گا، مگر قدرت کے کسی معجزے نے اسے زندہ رکھا۔ عین ممکن ہے گورکن سے یہ کام زبردستی کروایا گیا ہو، ریوالور دکھا کے۔ جب وہ ہوش میں آئے گا تو اس کا بیان میرے خیال کی تائید کرے گا۔ مگر اس کا ہوش میں آنا اور زندہ رہنا یقینی نہیں، کم از کم میرے لیے۔ لیکن قبر میں دیکھنے کے بعد تو آپ کو یقین کر لینا چاہیے کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں بقائمی ہوش و حواس کہہ رہا ہوں۔"

مجسٹریٹ کچھ دیر میری صورت دیکھتا رہا اور تذبذب کے عالم میں کھڑا رہا۔ پھر اس نے سر ہلایا۔ "بات ایک نظر دیکھنے کی ہے تو میں پانچ دس منٹ کی تاخیر کا خطرہ مول لے سکتا ہوں۔" اس نے قبرستان کی طرف پلٹتے ہوئے کہا۔ جو لوگ ہمارے قبرستان سے رخصت ہو جانے کے بعد مایوسی اور ناگواری کے جذبات کا شکار تھے اور یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ اب دو گھنٹے سے پہلے ہماری واپسی کا کوئی امکان نہیں، کچھ حیران ہوئے۔ ان سب کی موجودگی میں قبر کے دو تختے ہٹائے گئے جن پر سے گورکن کو ہٹایا گیا تھا۔ نیچے بے نسبتاً کم چوڑے اور زیادہ تاریک خلا میں جھانکنے والا پہلا شخص خود مجسٹریٹ تھا۔ اس نے چند منٹ اندھیرے میں گھورنے کے بعد جیب سے لائٹر نکال کر سلگایا اور ہاتھ کو نیچے لے گیا۔ پھر اس نے سر کو خالی جگہ میں ڈالا۔ یوں کہ وہ خود گھٹنوں کے بل اوپر کے تختوں پر رہا۔

[...] کے ایک ہاتھ نے قبر کی دیوار کا سہارا لیے رکھا اور اس نے [...]یا لاش تک کے لائٹر کی روشنی میں باقی ماندہ تختوں کے نیچے [...] دیکھی۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ باہر آ کے اس نے میری طرف [...]جھے بغیر صرف سر ہلایا اور دوسرے گواہوں کو طلب کیا۔

"آپ لوگوں کے حلفیہ بیان کے مطابق یہ قبر وزیر خان مرحوم [...] رئیس خان مرحوم کی ہے۔" اس نے فائل میں سے پڑھنا شروع [...] جو پیشکار نے آگے بڑھا دی تھی۔ "لیکن واقعاتی شہادت سے [...]بات ثابت نہیں ہوتی۔ میں دیکھ چکا ہوں اور اب آپ [...] باری باری نیچے اتر کے میری طرح دیکھ سکتے ہیں کہ قبر میں [...]ی مدفون نہیں ہے۔"

باقی کارروائی دس منٹ میں پوری ہو گئی۔ مجسٹریٹ نے فائل [...] مختصراً لکھا کہ عدالت کے حکم پر وزیر خان ولد رئیس خان کی [...]ش کا پوسٹ مارٹم کرنے کے لیے قبر کھودی گئی۔ میڈیکل بورڈ کے [...]علاوہ قبر کی نشاندہی کرنے والے تینوں افراد کی موجودگی میں [...] قبر کے اندر سے گورکن برآمد ہوا جسے بظاہر کسی نے قبر کھود کے [...] دیا تھا۔ وہ زندہ پایا گیا چنانچہ ہسپتال لے جایا گیا اور اس [...]قدمے کے سلسلے میں مزید کارروائی جاری رکھی گئی جس کے نتیجے [...] تمام گواہوں نے وزیر خان مرحوم ولد رئیس خان مرحوم [...] لاش کو غیر موجود پایا چنانچہ پوسٹ مارٹم کے احکامات [...]منسوخ کیے جاتے ہیں۔ لاش کی عدم موجودگی اور گورکن پر اقدام [...] کے سلسلے میں نامعلوم افراد کے خلاف تفتیش اور مقدمہ درج [...] کرنے کے احکامات صادر کیے جاتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔۔۔

فائل پر باری باری ہم سب نے اپنے دستخط ثبت کیے [...]لیکن سب سے پہلے محبت خان نے کہا۔ "قسم خدا کا، ہم پاگل [...] ہے مگر ہو جائے گا۔ اللہ ہم سب کو معاف کرے۔ بندہ [...] غلطی کر سکتا ہے لیکن ہم تو رات کا وقت بھی اس قبر پہ آیا ہے۔ [...] زندگی میں دھوکا نہیں کھا سکتا۔" تقریباً انہی خیالات کا اظہار [...] بعد میں دوسرے گواہوں نے بھی کیا لیکن محبت خان زیادہ ہی [...] ہو رہا تھا۔ اس نے مجسٹریٹ کی طرف سے کارروائی ختم [...]ہونے کا اعلان سن کے بھی بولنا جاری رکھا۔ "او یارا! قیامت [...] آئے گا۔ وزیر خان مر گیا، سلامت شاہ قتل ہو گیا، اس کو [...] ظالموں نے ٹکڑے ٹکڑے کر کے بکس میں ڈال دیا۔ اب وزیر خان [...] لاش لے گیا۔ ملعون، خنزیر، شیطان کا بچہ۔ قسم خدا کا ہم کو [...] کبھی مل جائے تو ہم اس کا ایک ہزار ٹکڑا کر دے، اس کی [...] آنتوں کو ڈال دے، اس کا خون پی جاتے، اس کا سارا خاندان [...] خانہ خراب ہو۔۔۔"

دوسرے لوگوں نے اسے خاموش رکھنے کی بے سود کوشش کی مگر مجسٹریٹ نے اس کی باتوں کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ دھمکیاں ذہن کے شدید صدمے سے متاثر ہونے کا نتیجہ ہیں۔ وہ سیدھا صاف دل، صاف گو آدمی تھا جو مصلحت کے تقاضے سمجھنے سے زیادہ اپنے حقیقی جذبات کے اظہار پر مجبور تھا۔ اس کا دل انسان کی بے ضمیری اور اخلاقی دیوالیہ پن پر خون کے آنسو رو رہا تھا تو وہ کیسے خاموش رہ سکتا تھا۔

دوسری بار قبرستان سے باہر آ کے میں نے اپنے گواہوں سے معذرت چاہی کہ میں ان کو واپس کار میں نہیں لے جا سکتا کیونکہ مجھے مجسٹریٹ صاحب کے ساتھ جانا ہے۔ میں نے انہیں ٹیکسی کا کرایہ پیش کیا اور شرمندہ ہوا۔ انہوں نے کانوں کو ہاتھ لگایا اور توبہ توبہ کرتے چلے گئے۔ قبرستان میں پولیس والے قناتیں سمیٹ رہے تھے اور باہر ایک ٹرک کھڑا تھا۔ میں نے پیچھے کا دروازہ کھولا اور محسن نے ڈرائیونگ شروع کی۔ میں مجسٹریٹ کے ساتھ پیچھے کی سیٹ پر اس لیے بیٹھا تھا کہ مجھے اس سے باتیں کرنی تھیں۔

"تمہاری باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ تم ذہین آدمی ہو۔" مجسٹریٹ نے کہا۔

"ذہین یا بدقسمت۔" میں نے تلخی سے کہا اور ہنسا۔ "کس باپ کے بیٹے نے یہ ذہنی اذیت برداشت کی ہوگی۔"

"میرا مطلب کچھ اور تھا۔" مجسٹریٹ نے جلدی سے کہا۔ "تم نے ثابت کر دیا ہے کہ تمہارے اندازے غلط نہیں ہیں۔ اب مجھے اس گورکن کی حفاظت کے لیے واقعی سخت اقدامات کرنے پڑیں گے۔"

"خود توپ لے کر بیٹھنا پڑے گا یا فوج کو طلب کرنا پڑے گا۔" میں نے طنز سے مجسٹریٹ کے الفاظ دہرائے۔

"تم مجھے وہ نام تو بتا دو۔ میں پوری کوشش کروں گا کہ مشتبہ افراد کو گورکن کے ہوش میں آتے ہی طلب کروں۔" مجسٹریٹ نے خفت سے بچنے کے لیے میری بات کو نظر انداز کر دیا۔ "اگر تم ایف آئی آر میں ان کے نام لکھوانا چاہو۔۔۔"

"نو سر!" میں نے کہا۔ "میں کسی کا نام ایف آئی آر میں نہیں لکھواؤں گا۔ اس لیے کہ مجھے اپنی توانائی اور ذہنی و جسمانی صلاحیت، مزید مشکلات اور الجھنوں میں پڑنے کی خاطر صرف کرنے کا کوئی شوق نہیں۔ میں جانتا ہوں اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ ہوگا وہی جو میں بتا چکا ہوں۔ یہ علم غیب کا دعویٰ نہیں، قیاس آرائی کی بات ہے۔ نام میں آپ کو بتا دیتا ہوں۔ آپ چاہیں تو پتہ بھی نوٹ کر لیں لیکن ایک بات ذہن میں رکھیں۔ میں نے آپ سے کوئی بات نہیں کی۔ نہ

قبرستان میں نہ باہر آ سکے۔ میں تو آپ کے ساتھ کار میں بھی اس لیے بیٹھ گیا تھا کہ مجھے بھی ہسپتال جانا تھا اور محسن میرا دوست آج صبح کسی سے یہ کار مانگ لایا تھا۔"

"پھر میں کسی کو کیسے بلا سکتا ہوں؟" مجسٹریٹ نے بے بسی سے کہا۔ "میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ مجھ پر وحی نازل ہوئی تھی۔"

"اگر وہ گورکن ہوش میں آجائے تو کوئی مسئلہ نہیں۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس نے یہ نام خود دیے تھے اور اس نے ایک کار کا نمبر بھی یاد رکھا تھا جو آپ نے نوٹ کر لیا۔ آپ چند منٹ اس کے ساتھ اکیلے رہ کے باہر آ سکتے ہیں۔ کوئی آپ کی بات کو غلط نہیں کہہ سکتا۔" میں نے کہا۔

مجسٹریٹ نے نفی میں سر ہلایا۔ "گورکن کہہ سکتا ہے کہ یہ سب جھوٹ ہے کیونکہ نہ اس نے کسی کا نام لیا تھا نہ کسی کار کا نمبر بتایا تھا۔ پھر میں کیا جواز پیش کروں گا؟" مجسٹریٹ نے سگریٹ جلائی۔ "کہ میں نے ان لوگوں کو کیوں بلایا تھا۔ اگر تم بلاوجہ مشکل میں پڑنے سے ڈرتے ہو تو مجھ سے کیوں توقع رکھتے ہو کہ میں اپنے اختیارات سے تجاوز کا خطرہ مول لوں گا۔ میں سرکاری ملازم ہوں لیکن اس سے پہلے میں ایک منصف ہوں۔ میرا کام انصاف کرنا ہے۔ تم انصاف مانگ سکتے ہو اگر تم میں ہمت ہو۔ ہمت نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں خود اپنی بات پر یا اپنی ذات پر اعتماد نہیں ہے۔ پھر میں تم پر کیسے اعتبار کروں؟"

منطقی اعتبار سے مجسٹریٹ کی بات غلط نہیں تھی۔ میں کچھ دیر سوچتا رہا۔ میرا ذہن یہ جوا کھیلنے سے پہلے ہار جیت کے امکانات کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ اگر میرا اندازہ غلط ہوا تو کیا ہوگا؟ اگر ڈی سلوا، چوہدری دلاور یا استاد پیڈرو سامنے آگئے اور گورکن نے ان کو شناخت نہ کیا۔ جانتے بوجھتے بھی وہ انکار کر سکتا ہے۔ اسباب وہی ہو سکتے ہیں یعنی وہ بک گیا ہو یا خوف سے مجبور ہو جاتے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان تینوں نے چہرہ چھپا کے رکھا ہو یا وہ خود واقعی سامنے نہ آتے ہوں۔ انہوں نے کسی اور کو بھیجا ہو۔ آخر وہ تینوں کیا کریں گے؟ یہی کہیں گے نا کہ میں نے ذاتی دشمنی کی بنا پر ان کا نام لیا؟ زیادہ سے زیادہ مجھ پر ہتکِ عزت کے ہرجانے کا ایک اور کیس کر دیں گے۔

"آپ نام پتہ نوٹ کر لیں۔" میں نے اچانک کہا۔ "میں اس کی ذمے داری قبول کرتا ہوں۔ میں ایف آئی آر میں بھی ان کا نام مشتبہ افراد کی فہرست میں لکھوانے کے لیے تیار ہوں، اس لیے کہ وہ مشتبہ ہیں۔ میرے خیال کے مطابق یہ حرکت انہی میں سے کسی کی ہو سکتی ہے۔ مجھے شبہ ہے کہ میرے والد کو قتل کروانے والوں میں بھی وہی لوگ شامل ہیں۔ ایک نہ ایک دن تو مجھے دنیا کے سامنے اور عدالت میں اپنی انگلی اٹھا کے ان پر یہ الزام عائد کرنا ہی ہے۔ خواہ میں نظامِ انصاف کے تقاضوں کے مطابق ان کو ملزم ثابت نہ کر سکوں۔"

"کسی بھی معزز اور شریف یا بے قصور آدمی پر الزام عائد کرنا اور ثبوت پیش نہ کرنا بھی جرم بن جاتا ہے مسٹر سکندر۔" مجسٹریٹ نے کہا۔

"ہاں، مجھے معلوم ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن مجھ پر تو قتل کا الزام ہے۔ اس کے مقابلے میں یہ جرم کیا ہے۔ جہاں سیر، وہاں سوا سیر۔"

"سکندر۔" محسن نے پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر کہا۔ "کوئی لاش کو لے کر کہاں جا سکتا ہے؟"

"کہیں بھی جا سکتا ہے۔ ہڈیاں دریا میں بہائی جا سکتی ہیں، جلائی جا سکتی ہیں، دبائی جا سکتی ہیں۔" میں نے کہا۔

"مسئلہ آسانی سے حل ہونے والا ہو تو مشکل طریقہ کوئی اختیار نہیں کرتا۔" محسن بولا۔ "آدھی رات کو دریائے راوی کے کسی ویران کنارے پر جانا یا کسی جگہ ہڈیوں کا الاؤ روشن کرنا دونوں مشکل کام ہیں۔ دفن کر دینا زیادہ آسان ہے اور اگر کھدی ہوئی قبر مل جائے تو یہ بوجھ ڈھونے کی بھی کیا ضرورت ہے۔"

"کیا مطلب ہے تیرا؟ انہوں نے ہڈیاں اسی قبرستان میں دفن کر دی ہوں گی؟" میں نے غور کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ میں نے ایک بات نوٹ کی تھی۔" محسن نے سڑک پر نظر رکھی۔ "جب تو کچھ دیر کے لیے باہر آگیا تھا تو میں ٹہلتا ہوا آگے چلا گیا تھا۔ میرا خیال تھا سب لوگ دو گھنٹے سے پہلے کیا واپس آئیں گے۔ آگے دو تیار قبریں ہیں۔ کھدی ہوئی مگر خالی۔ یوں سمجھ لے کہ ریڈی میڈ قبریں۔ اگر اچانک کوئی میت آجائے یا کوئی قبر کھدوانے کے لیے آئے تو اسے دکھا دی جائیں۔ گورکن فارغ ہوں تو یہ کام کر لیتے ہیں۔ بعض اوقات تمام دن خالی گزر جاتا ہے۔ کسی روز چار چھ جنازے آجاتے ہیں تو مشکل پڑ جاتی ہے۔ اوسطاً ساڑھے چھ فٹ لمبی قبریں تھیں۔ یہ بات گورکن بتا سکتا ہے کہ کل شام ریڈی میڈ قبروں کی تعداد کیا تھی، تین یا دو؟"

کار کے میو ہسپتال کے احاطے میں داخل ہونے تک ہم میں سے کسی نے کوئی بات نہیں کی۔ محسن نے جو کچھ کہا تھا بالکل واضح تھا۔ میرے والد وزیر خان مرحوم کی لاش اگر قبر سے نکال کے دوسری جگہ دفن کر دی گئی تھی لیکن اس

دوسری قبر کو کھودنا تقریباً ناممکن تھا۔ یہ صرف قیاس آرائی کی بات تھی۔ میرے یا محسن کے یقین سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ تین گواہ حلفیہ بیان دے کر وزیر خان کی قبر کی نشاندہی کر چکے تھے۔ دوسری قبر کے بارے میں حلفیہ بیان دینے کون آتا کہ یہ بھی وزیر خان کا مدفن ہے۔ میں کیسے ثابت کر سکتا تھا کہ لاش منتقل کر دی گئی ہے۔ عدالت ثبوت مانگتی ہے، شہادت طلب کرتی ہے اور قانون بہرحال ضابطوں کا پابند ہے۔ بالفرضِ محال یہ سارے مرحلے طے ہو جاتے تو اس دوسری قبر سے نکلنے والے ڈھانچے کو وزیر خان مرحوم کون ثابت کرتا اور کیسے؟ باہر کے ملکوں میں تو ماہرین کے پاس ریکارڈ ہوتا ہے۔ فنگر پرنٹ زندگی میں ثبوت فراہم کرتے ہیں تو مرنے کے بعد ہڈیوں کے خاک ہونے تک دانتوں کی ساخت سے شناخت کی جاتی ہے اور ہر شخص کے دانتوں کی ساخت کی فلمیں اس کے ڈینٹسٹ کے پاس رہتی ہیں بلکہ جدید طریقہ فنگر پرنٹ کا نہیں، "ڈینٹل اسٹرکچر" کے ریکارڈ کا ہے۔ یہاں کامیاب دندان ساز فٹ پاتھ پر بیٹھتے ہیں اور بی ڈی ایس گھاس کھودتے ہیں۔ طلسماتی منجن بھی اس وقت لگایا جاتا ہے جب دانت کا درد رات بھر دوسروں کو جگاتے رکھے۔ پولیس کے پاس فنگر پرنٹس کا کمپیوٹرائزڈ ریکارڈ نہیں۔ میں نے "ڈینٹل اسٹرکچر" کی بات کی تو اچھے خاصے معقول لوگ شرمندہ کریں گے کہ میاں لندن میں نہیں بیٹھے ہو۔

محسن نے میرے کندھے پر تھپکی دی تو میں چونکا۔ کار ایمرجنسی وارڈ کے پارکنگ ایریا میں کھڑی تھی اور مجسٹریٹ باہر کھڑا مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔ "محسن!" میں نے کہا۔ "وہ جو بات کی تھی نا تو نے، تین ریڈی میڈ قبریں تھیں کل رات یا دو؟ اس کو بھول جا۔ میں تجھے بتا سکتا ہوں کہ کل رات تین قبریں تھیں مگر فائدہ؟ جھوٹ تو خود بخود ثابت ہو جائے گا مثلاً یہ کہ لاش کسی نے دوسری قبر میں منتقل نہیں کی لیکن یہی بات سچ ہو تب بھی سچ نہیں ثابت کی جا سکتی۔"

"آف دی ریکارڈ۔" مجسٹریٹ نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "مجھے تم سے ہمدردی ہے اور میرا بھی خیال یہی ہے کہ تمہارے دوست نے صحیح سمت میں قیاس آرائی کی ہے، لیکن... یہ میرے لیے اطمینان کی بات ہے کہ تمہیں میری مجبوریوں کا احساس ہے۔ آئی وِش... کہ میں کچھ کر سکتا۔" وہ اچانک پلٹا اور تیز تیز قدموں سے چلتا اندر غائب ہو گیا۔ وہ بھی عام انسانوں کی طرح اچھا آدمی تھا چنانچہ مجبور تھا۔

بوڑھے گورکن کو اس عرصے میں صاف ستھرے بستر پر منتقل کر دیا گیا تھا۔ اس کے جسم کی ساری غلاظت صاف کی جا چکی تھی اور اس کا غلیظ لباس اتار کے اسے ہسپتال کے کپڑے پہنا دیے گئے تھے۔ ڈاکٹروں کی ایک ٹیم نے اس کی جان بچائی تھی اور اسے آکسیجن دی جا رہی تھی۔ وہ ایک علیحدہ کمرے میں تھا جہاں دو ڈاکٹروں کی مدد کے لیے تین نرسیں موجود تھیں اور ان میں سے ایک گلوکوز کی ٹیوب لگانے کے بعد اسٹینڈ سے معلق تھیلی کو ٹھیک کر رہی تھی۔ دونوں ڈاکٹروں میں سے ایک پولیس سرجن تھا۔ تقریباً دس منٹ بعد وہ ہماری طرف متوجہ ہوا۔

"ڈاکٹر صاحب! پولیس کو طلب کیا ہے آپ نے؟" مجسٹریٹ نے کہا۔ "میں اس علاقے کا مجسٹریٹ ہوں۔"

ڈاکٹر نے سر ہلایا۔ "میں نے حالات معلوم ہوتے ہی کیس درج کر لیا تھا، لیکن یہ آپ کے تھانے والے... میں نے یہاں فون کیا تو جواب ملا کہ واردات میانی صاحب کے علاقے میں ہوئی ہے۔ وہاں کے تھانے میں رپورٹ درج کرائی جائے۔ ابھی تک تو کوئی آیا نہیں ہے۔"

"ان کو میں بلوا لیتا ہوں ابھی۔" مجسٹریٹ نے کہا۔ "یہ بتائیے مریض کی کیا پوزیشن ہے؟"

"اوہ ہی اِز آؤٹ آف ڈینجر۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "بڈھا بہت سخت جان ہے۔ شام تک بات کر سکے گا۔"

"آپ کے خیال میں یہ کتنی دیر تک دفن رہا؟" میں نے انگریزی میں کہا۔ "اور بچ کیسے گیا؟"

ڈاکٹر نے پلٹ کر مجھے غور سے دیکھا اور اپنے مخصوص انداز میں کندھے ہلائے۔ "کیا کہا جا سکتا ہے اسے؟ معجزہ؟ خدا کی قدرت؟ ایسے غیر معمولی واقعات ہوتے رہتے ہیں جن سے آدمی کو زندگی اور موت پر اپنا اختیار نہ ہونے کا احساس ہے۔ زلزلے میں عمارت مسمار ہو جاتی ہے اور ملبے میں سے ایک بچہ انگوٹھا چوستا برآمد ہوتا ہے جسے خراش تک نہیں آتی۔ گھر میں آگ لگ جاتی ہے اور سب کچھ جل کے راکھ ہو جاتا ہے سوائے ایک قرآن مجید کے۔ اس کیس میں بھی عقل کی مدد سے کوئی یقینی وضاحت ناممکن ہے۔ صرف اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ زمین میں کہیں کسی جانور نے سرنگ بنا رکھی تھی، مثلاً بجو نے یا نیولے نے، یا کسی چوہے نے یا گرگٹ نے بل بنا لیا تھا جس میں سے تازہ ہوا پہنچتی رہی، لیکن اصل مدد تقدیر نے کی۔ اس کا چہرہ صاف تھا اور مجھے بتایا گیا ہے کہ یہ کس پوز میں بیٹھا تھا۔ اس کے منہ پر مٹی نہیں پڑی تھی اور

سانس لینے کے لیے اس کی ناک اور منہ کے راستے کھلے رہے تھے۔ اگر یہ قبر میں سیدھا کمر کے بل لیٹا ہوتا تو چند منٹ میں دم گھٹنے سے ہلاک ہو جاتا مگر وہ جو کہتے ہیں نا کہ جسے خدا رکھے اسے کون چکھے۔ سو دیٹ از دیٹ۔"

"میں فون کہاں سے کر سکتا ہوں؟" مجسٹریٹ نے پوچھا۔ "میرے آنے تک آپ کسی کو یہاں مت آنے دیں۔"

"میں نے ابھی تک کسی کو نہیں آنے دیا ہے۔" پولیس سرجن نے کہا۔ "فون باہر کاؤنٹر پر بھی ہے اور میرے کمرے میں بھی۔"

"میں مسلح گارڈ طلب کر رہا ہوں۔" مجسٹریٹ نے کہا۔ "یہ بہت سیریس کیس ہے۔ کسی غیر متعلقہ شخص پر شبہ بھی ہو تو..."

"یہاں کوئی غیر متعلقہ شخص نہیں۔ آپ لوگوں سے تو میں ناواقف ہوں۔" پولیس سرجن نے میری اور محسن کی طرف دیکھا۔ "مگر آپ مجسٹریٹ صاحب کے ساتھ آئے ہیں تو متعلقہ افراد ہی ہوں گے۔ باہر ایک شخص خود کو اس کا بیٹا بتاتا ہے۔ بظاہر غلط نہیں کہتا۔ یہاں میرے ساتھی دوسرے ڈاکٹرز ہیں۔ ان کو میں دو سال سے جانتا ہوں۔ باقی رہیں دو نرسیں۔"

"تین نرسیں۔" میں نے کہا۔ "جب میں کمرے میں آیا تھا تو یہاں تین نرسیں تھیں۔"

"یہ غلط ہے۔" پولیس سرجن نے سخت لہجے میں کہا۔ "ایک نرس شہلا گل ہے، دوسری تمیم، تیسری کوئی نہیں۔ کیوں ڈاکٹر صدیقی! کیا میں غلط بیانی کر رہا ہوں؟" دوسرے ڈاکٹر نے جو زیادہ عمر رسیدہ تھا، حیرانی سے انکار میں سر ہلایا۔

"غالباً یہ ٹھیک ہے۔" مجسٹریٹ نے کہا۔ "میں نے بھی تین نرسیں دیکھی تھیں۔"

"او کے۔ وہ تیسری نرس کون تھی، کہاں گئی؟ یہاں تو ان دو کے سوا کوئی نہیں اور ہم نے صرف دو ہی کو ساتھ رکھا تھا۔ شاید ان دونوں میں سے کسی نے دیکھا ہو۔ مس تمیم! مس شہلا! اور کون آیا تھا یہاں؟" پولیس سرجن نے برہمی سے پوچھا۔

"ہم نے تو کسی کو نہیں دیکھا سر۔" ان دونوں نے ایک ساتھ کہا اور مسکرائیں۔

"آپ سب کی توجہ مریض پر مرتکز تھی۔ آپ نے نہیں دیکھا مگر پیچھے وہ تیسری نرس گلوکوز کی تھیلی ٹھیک کر رہی تھی۔" میں نے کہا۔ "آپ لوگوں نے اس لیے بھی نوٹ نہیں کیا کہ آپ سب کے لباس ایک جیسے ہیں مگر میں اپنے اندیشوں کا اظہار کر چکا ہوں۔ آپ مریض کو پھر دیکھیے، پلیز۔" میں نے مجسٹریٹ کی طرف دیکھا اور اس نے میرے لہجے سے مجبور ہو کے میری تائید میں سر ہلایا۔ اور اس وقت اچانک مجھے خیال آیا کہ اس تیسری نرس کو دیکھتے ہی مجھے ایسا کیوں لگا تھا جیسے اس کی صورت میں نے پہلے بھی دیکھی ہے۔ سب نرسیں اپنی سفید وردی میں ایک سی لگتی ہیں اور میرا ذاتی تجربہ ہے کہ بہت کم واقعی حسین ہوتی ہیں۔ وہ تیسری نرس بلاشبہ حسین تھی، مگر وہ کون تھی؟ صورت آشنا کیوں لگی تھی اور یکلخت کہاں غائب ہو گئی۔ میں سوچنے پر مجبور تھا اور میرے اندیشے یقین میں ڈھل رہے تھے۔

ڈاکٹروں نے بادلِ ناخواستہ بیڈ کا رُخ کیا۔ "ڈاکٹر صدیقی ابھی چند منٹ پہلے ہی تو ہٹے ہیں بیڈ کے پاس سے مگر آپ لوگ مصر ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" پولیس سرجن نے کہا۔ دونوں نرسیں خود بخود بیڈ کے دوسرے کنارے کی طرف ہو گئیں اور میں پیروں کی طرف کھڑا رہا۔ مجسٹریٹ فون کرنے کے لیے جا چکا تھا۔ پولیس سرجن نے گورکن کے ماتھے پر اپنا ہاتھ رکھا۔ شاید یہ دیکھنے کے لیے کہ جسم گرم ہے یا نہیں لیکن میری نظریں گورکن کے ساکت جسم پر تھیں۔ وہ آنکھیں بند کیے لیٹا تھا اور کمبل کے نیچے اس کے سانس کا خفیف سا زیر و بم بھی محسوس نہ ہوتا تھا۔ پولیس سرجن نے گورکن کی نبض دیکھنے کے لیے اس کی کلائی پر انگلیاں رکھیں۔ پھر اس نے ڈاکٹر صدیقی کی طرف دیکھا اور ایک جھٹکے سے کمبل ہٹا دیا۔ "اسٹیتھوسکوپ سے چیک کیجیے۔" پولیس سرجن نے کہا۔ تشویش کے آثار اس کی صورت سے بھی عیاں تھے اور اس کے لہجے سے بھی۔

دوسرے ڈاکٹر نے جھک کر سینے کے اندر دھڑکنے والے دل کی آواز سننے کی بے سود کوشش کی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ یہ آواز خاموش کی جا چکی ہے۔ نرسوں نے بھی اندازہ کر لیا تھا کہ صورتِ حال یکلخت بدل گئی ہے۔ ان کی وہ مسکراہٹ کافور ہو گئی جو ایک بے بنیاد اعتماد کی مظہر تھی۔ ڈاکٹروں کے یقین کی طرح جو کسی تیسری نرس کی موجودگی سے یکسر منکر تھے لیکن وہ تیسری نرس اپنا کام کر گئی تھی جسے صرف میری نگاہ نے دیکھا تھا یا مجسٹریٹ کی آنکھوں نے۔ وہ بھی اس لیے کہ ہم اچانک اور غیر متوقع طور پر آ پہنچے تھے۔ اگر ہم دو چار منٹ بعد آتے تو ہم بھی دو ہی نرسوں کو دیکھتے۔ اسے کمرے سے جاتے ہوئے ہم بھی نہ دیکھ سکے تھے۔ میرے لاشعور نے ہنگامی طور پر ایک تصویر کو ذہن کے پردے پر پھیلا دیا۔

"ہی از ڈیڈ۔" پولیس سرجن نے کسی سے مخاطب ہوئے بغیر کہا۔ کمرے میں خاموشی کے چند ہولناک سیکنڈ ان الفاظ کی بازگشت بن کے موجود رہے۔

"آپ نے چند منٹ پہلے کی بات کی تھی ڈاکٹر صاحب!"
میں نے انگریزی میں کہا۔ "آدمی تو چند سیکنڈ میں بھی مر جاتا ہے۔"
"ہاؤ ڈی ہیل..." وہ ایک دم میری طرف پلٹا۔ یوں جیسے میں نے اس کی تذلیل کر دی ہو۔ پھر اس نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنے آپ پر قابو پالیا۔ "وہ تیسری نرس کون تھی۔ میں معلوم کروں گا اور تم اسے شناخت کرو گے۔ میں پورے ہوسپٹل کی تمام نرسوں کو، ٹیڈوا نٹھوں، ٹرینی اسٹاف، ہر وارڈ کی بھنگن تک کو لائن اپ کر دوں گا۔"
"اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا "وہ ان میں نہیں ملے گی۔ وہ جان بچانے والوں میں سے نہیں تھی۔ جان لینے والوں کی آلۂ کار تھی۔ وہ اپنا کام کر کے جا چکی ہے۔ دو بے حد فرض شناس ڈاکٹروں اور دو بے حد اسمارٹ نرسوں کی بے حد چوکس آنکھوں میں دھول جھونک کے۔ تمہارا خیال تھا کہ وہ میری نظر کا دھوکا تھی؟ میں "ہیلوسی نیشن" (HELLKCINATION) میں مبتلا نہیں تھا ڈاکٹر صاحب! اور ثبوت تمہارے سامنے ہے۔ اس گلوکوز کی تھیلی کو اتار لو اور تجزیے کے لیے بھیج دو۔ لیکن رپورٹ ابھی اسی وقت مجھ سے لے لو۔ اس میں کوئی مہلک زہر شامل کر دیا گیا تھا جو قطرہ قطرہ گلوکوز کے ساتھ خون میں شامل ہوتا رہا۔ پانچ سی سی کا ایک انجکشن اگر سائنائڈ ہو تو کتنی دیر میں ایک آدمی کی جان لے سکتا ہے؟ ہوتا اور اس محلول میں شامل ہو تو؟ زیادہ سے زیادہ ایک منٹ۔"
پولیس سرجن نے گلوکوز کی تھیلی اتار لی۔ "آر یو اے ڈاکٹر؟" وہ خفت زدہ لہجے میں بولا۔
"نو۔ بٹ آئی ایم ناٹ این ایڈیٹ آئدر۔" میں نے کہا "چیک اٹ۔ کیا اس میں کوئی سوراخ ہے انجکشن کا اور کیا اس محلول میں سے کڑوے باداموں کی بو آ رہی ہے؟ یہ قتلِ عمد کا کیس ہے اور قتل آپ سب کی موجودگی میں ہوا ہے لیڈیز اینڈ جنٹلمین!"
سوراخ ڈاکٹر صدیقی نے دریافت کیا۔ ننھا سا یہ سوراخ محلول کی سطح سے ذرا اوپر تھا۔ پولیس سرجن نے تھیلی کا کنارہ کاٹ کے محلول کو سونگھا۔ "سائنائڈ۔" اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ دونوں نرسوں کا چہرہ خوف سے زرد پڑ گیا۔
"تمہیں میرا شکر گزار ہونا چاہیے مس شہلا اور مس شمیم کہ میں نے اس تیسری نرس کو دیکھ لیا تھا ورنہ یہ قتل کا الزام تم پر ہی آتا۔" میں نے کہا۔ "کسی ڈاکٹر پر نہیں۔"
اسی وقت میں نے مجسٹریٹ کو دیکھا۔ وہ دروازے میں منجمد کھڑا تھا۔ اس نے میری بات سن لی تھی اور ایک نظر میں مجموعی صورتِ حال کو بھانپ لیا تھا۔ اس کی صورت پر بھی شکست خوردگی کے آثار نمایاں تھے۔ میں نے اسے قبل از وقت بتا دیا تھا کہ بوڑھے گورکن کی جان کو ہسپتال میں کیے جانے والے حفاظتی انتظامات کے باوجود خطرہ لاحق رہے گا اور میری بات پر ایک ڈاکٹر نے کہا تھا کہ ہسپتال میں قتل کرنا یا کرانا صرف فلموں میں ممکن ہے۔ اب وہ حفاظتی انتظامات کیلیے اپنے اختیارات استعمال کر کے اور احکامات جاری کر کے لوٹا تھا مگر ان پر عمل درآمد سے پہلے ہی بوڑھا گورکن قتل کر دیا گیا تھا۔ یہ تقدیر کا کتنا بے رحم مذاق تھا کہ وہ مُردوں کی طرح دفن کیے جانے کے باوجود زندہ رہا، اس لیے کہ کاتبِ تقدیر نے اس کی زندگی کے اختتام کا جو وقت مقرر کیا تھا، وہ ابھی نہیں آیا تھا۔ اس کو چند گھنٹے بعد مرنا تھا چنانچہ وہ مرا تو وہاں جا کے جہاں فانی انسان ہر زندگی کو بچانے کی جدوجہد ہمہ وقت جاری رکھتے ہیں اور کامیابی کو اپنی صلاحیت سے منسوب کرتے ہیں تو ناکامی کو مشیتِ ایزدی سے۔
"پولیس آ رہی ہے۔" مجسٹریٹ نے اندر آ کے کہا "حفاظت کا مقصد تو ختم ہوا لیکن اس قتل کے مقدمے کی رپورٹ باقی ہے اور میں ایف آئی آر میں آپ حضرات کا نام لکھوانے پر مجبور ہوں جن کی غفلت کے باعث قاتل کو موقع ملا۔"
"یہ زیادتی ہے مجسٹریٹ صاحب!" پولیس سرجن نے کہا۔ "ہم اپنے کام میں اتنے منہمک تھے... ہم پر غفلت کا الزام کیسے آ سکتا ہے؟ یہ قتل ایک نرس نے کیا ہے جسے آپ نے بھی دیکھا تھا۔" اس نے مختصراً مجسٹریٹ کو گورکن کی موت کا سبب بتایا۔
"مگر وہ نرس کہاں ہے؟ کیا نام تھا اس کا؟ آپ نے تو اس کے وجود سے بھی انکار کر دیا تھا۔ اگر وہ مل جاتی ہے تو فردِ جرم اس پر عائد کرنے کے بعد یہ ثابت کرنا استغاثہ کا کام ہے کہ وہ قاتل تھی لیکن وہ نہ ملی تو الزام کس پر عائد کیا جائے گا؟ یہ طبعی موت تو نہیں ہے ڈاکٹر صاحب! آپ نے ہدایات دیں۔ نرسوں نے گلوکوز لگایا، اس میں آپ کی تجویز کردہ دوائیں شامل کیں اور یہ سب آپ کی نگرانی میں ہوا۔ سائنائڈ کہاں سے آیا اور کیسے گلوکوز میں شامل ہو گیا، اگر کسی غیر متعلقہ فرد نے یہ حرکت کی تو آپ لوگوں نے دیکھا کیوں نہیں؟ اسے منع کیوں نہیں کیا؟ اسے جانے کیوں دیا؟ آپ نے میرے سامنے دو غلط اور متضاد بیانات دیے ہیں۔ ایک یہ کہ کمرے میں کوئی غیر متعلقہ شخص نہیں آیا، دوسرا یہ کہ کمرے میں صرف دو نرسیں تھیں۔ بعد میں آپ کو اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع ضرور ملے گا لیکن اس وقت میں حقائق سے روگردانی نہیں کر سکتا۔" مجسٹریٹ نے وقار اور متانت کے ساتھ کہا۔ پھر وہ مجھ

[...] میں نے ابھی مسٹر ڈی سلوا کو فون کیا تھا۔ وہ استاد [...] نام کے کسی شخص سے واقف نہیں لیکن وہ خود آ رہا ہے [...] اس نے کہا کہ وہ قانون کی مدد کے لیے ہر وقت، ہر جگہ حاضر ہو سکتا ہے۔"
"پرفیکٹ۔" میں نے تلخی سے ہنس کر کہا۔ "ہر مہذب، شائستہ اور تعلیم یافتہ شخص کی طرح وہ قانون سے تعاون کو اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہے۔ اس لیے کہ اب قانون سے ڈرنے کی ضرورت نہیں اور خطرے کی کوئی بات نہیں۔ اس نے یہ بھی نہیں کہا کہ مجسٹریٹ صاحب میرے لیے سمن وارنٹ کچھ نہیں، پھر مجھے فون پر طلب کر کے کیا آپ اپنے اختیارات سے تجاوز نہیں کر رہے؟"
"اس نے کوئی سوال نہیں کیا، نہ کیس کی تفصیلات کے بارے میں اور نہ میرے بارے میں۔" مجسٹریٹ بولا۔ "کہ میں مجسٹریٹ ہوں بھی یا نہیں۔ یہ بات میرے لیے واقعی حیران کن تھی۔ اس نے مجھے چوہدری دلاور کے آفس کا نمبر بھی دیا۔"
"اور چوہدری دلاور نے بھی کہا ہوگا کہ جنابِ عالی ہم تو حکم کے غلام ہیں لیکن یہ استاد بیڈرو کیا بلا ہے؟" میں نے کہا۔
"آپ ان کے کردار... میرا مطلب ہے ان کو اچھی طرح جانتے ہیں۔" مجسٹریٹ بولا۔
"اگر میں دعویٰ کروں کہ مجھ سے بہتر نہ ان کو کوئی جانتا ہے نہ جان سکتا ہے تو اس میں قطعی مبالغہ نہ ہوگا۔" میں نے کہا۔
آدھے گھنٹے بعد جب لاش مردہ خانے پہنچائی جا چکی تھی اور پولیس والے ضابطے کی کارروائی میں مصروف تھے تو پہلے ڈی سلوا نمودار ہوا۔ اس نے بہترین سوٹ پہن رکھا تھا اور میچ کرتی ہوئی ٹائی بڑے سلیقے سے باندھ رکھی تھی۔ وہ کار کی چابیاں گھماتا، پُر اعتماد انداز میں قدم اٹھاتا، بے نیازی سے اِدھر اُدھر دیکھتا ہمارے قریب آ کے رک گیا۔
"تم؟" اس نے تھوڑا سا حیران ہو کے کہا۔ "تم مجسٹریٹ کب سے بن گئے؟ تم نے یہ فون کا بیہودہ مذاق کیا تھا؟"
"مجسٹریٹ میں ہوں۔ میں نے فون کیا تھا۔" مجسٹریٹ نے کہا۔
"اوہ۔" وہ تیزی سے پلٹا۔ "معاف کیجیے گا، میں سمجھا آپ ڈاکٹر ہوں گے۔ یہ تو کوئی پولیس کیس لگتا ہے۔"
"جی۔ دراصل یہاں ایک مریض کو کسی نے دوا میں زہر ملا کے ہلاک کر دیا ہے۔" مجسٹریٹ بولا۔ "وہ ایک بوڑھا گورکن تھا جسے کل رات کسی نے قبر میں زندہ دفن کر دیا تھا۔ آج اس قبر کو کھودا گیا تو وہ زندہ نکلا۔ چنانچہ اسے یہاں بھیج دیا گیا تھا۔"
"یہ تو معجزہ ہو گیا۔" ڈی سلوا بولا۔ "قبر کس سلسلے میں کھودی گئی تھی؟"
"مسٹر سکندر بخت کے والد کی لاش نکال کے پوسٹ مارٹم کرنا تھا۔" مجسٹریٹ بولا۔ "لیکن لاش نہیں ملی۔"
"نہیں ملی کا کیا مطلب؟" ڈی سلوا نے اپنا سکون اور بے نیازی کا انداز برقرار رکھا۔ "وہ کسی اور کی قبر تھی؟"
"چشم دید گواہوں کے بیان کے مطابق قبر کی نشاندہی غلط نہیں ہوئی تھی۔" مجسٹریٹ بولا۔ "ان کو اب بھی یقین ہے کہ قبر وہی تھی۔ کسی نے اس میں سے لاش... یوں سمجھ لیجیے چرا لی اور یہ کام گورکن سے کرانے کے بعد اس کو دفن کر دیا۔"
"آئی سی۔" ڈی سلوا نے حیرت سے سیٹی بجائی اور چابی جیب میں ڈال لی۔ میں نے اس کی اداکاری اور خود اعتمادی کا دل ہی دل میں اعتراف کیا۔ خوفزدہ یا پریشان ہونا تو درکنار، وہ بہت زیادہ حیران تک نہ تھا۔ اس کی حیرت واجبی سی تھی، جیسے یہ روز ہونے والے جرائم میں سے ایک جرم کی خبر ہے۔ لوگ ہر روز قتل ہوتے ہیں اور کرتے ہیں۔ حادثات میں مارے جاتے ہیں اور اندر کے صفحے پر اخبار میں چند سطور کی خبر کسی کے لیے صدمے، تعجب یا دلچسپی کا باعث نہیں ہوتی۔ وہ انگریزی میں بات کر رہا تھا اور اس کا لہجہ اینگلو انڈین سے زیادہ برطانوی نژاد انگریز کا تھا۔ "مجھے مسٹر سکندر بخت سے ہمدردی ہے۔ لیکن یہ بتائیے، مجھے کس سلسلے میں طلب کیا گیا ہے؟"
"مسٹر ڈی سلوا!" مجسٹریٹ نے کہا۔ "یہ سوال آپ نے فون پر کیوں نہیں کیا تھا؟"
"کیوں نہیں کیا تھا؟" وہ ماتھے پر شکن ڈال کے بولا۔ "کیا میں نے غلطی کی تھی؟ اگر میں اختیارات یا جواز کا مسئلہ اٹھائے بغیر یہاں آ گیا تو کیا میرا یہ تعاون قانونی طور پر کوئی جرم بھی بن سکتا ہے؟"
"نتیجہ آپ اخذ کر رہے ہیں مسٹر ڈی سلوا!" مجسٹریٹ نے سخت لہجے میں کہا۔ "ہر شخص جو آپ کی طرح ذہین اور تعلیم یافتہ ہوگا قدرتی طور پر اپنا اطمینان کیے بغیر ڈرائیونگ کر کے اتنی دور نہیں جائے گا۔"
"آل رائٹ! میں نے غلطی کی۔ آئی ایم اے فول۔" ڈی سلوا نے بھی لہجہ بدل لیا۔ "اب مجھے مطمئن کر دیا جائے۔"
"مسٹر سکندر بخت نے الزام عائد کیا ہے کہ یہ سب کچھ آپ نے کیا ہوگا۔" مجسٹریٹ نے کہا۔ ماحول کی کشیدگی

اور یہ تلخ گفتگو سب کے اعصاب کو متاثر کرنے لگی تھی۔

"سب کچھ کیا؟" ڈی سلوا نے گھوم کر ایک بار مجھے خون آشام نظروں سے دیکھا اور پھر مجسٹریٹ سے مخاطب ہو گیا۔

"یہ... لاش کی چوری، گورکن کو مار کر دفن کرنا اور یہاں اس کو قتل کروانا۔" مجسٹریٹ کچھ پریشان ہو گیا۔

ڈی سلوا قہقہہ مار کے ہنسا۔ اس کی ہنسی میں تمسخر، حقارت اپنی طاقت کے غرور اور ہماری بے بسی پر مسرت کے جذبات شامل تھے۔ "یور آنر! کیا آپ جانتے ہیں کہ مسٹر سکندر کے دل میں میرے لیے کس قسم کے جذبات ہیں؟ ان پر اپنے والد کے پارٹنر کو قتل کرنے کے الزام میں مقدمہ چل رہا ہے اور دوسرا مقدمہ یہ چلا رہے ہیں کہ ہم نے یعنی باقی بزنس پارٹنرز نے مل کر ان کے والد کو بلیک میل کیا اور قتل کر دیا، یا کرا دیا۔ انگلینڈ میں تعلیم کے بہانے جو کچھ یہ کرتے رہے ہیں اس کا ریکارڈ الگ ہے لیکن میں اس کا ذکر نہیں کروں گا۔ تاہم یہ گلی میں مرنے والے کتے سے لے کر سڑک پر کار کے نیچے آنے والے کسی آدمی کی موت کا ذمے دار بھی مجھے قرار دیں تو اس میں تعجب کی کونسی بات ہے؟ یہ الزام آپ تو لگانے سے رہے۔ ابھی ہماری فرم کا ایک اکاؤنٹنٹ غلام علی حادثے میں مارا گیا تھا۔ یہ الزام عائد کر سکتے ہیں کہ مار کے بھاگ جانے والا ڈرائیور میں ہی تھا۔"

"دس از اے ڈیم فیکٹ۔" میں نے شدتِ جذبات سے بے قابو ہو کے کہا۔ "اور فرم تمہاری نہیں ہے۔ تم پارٹنر نہیں، ملازم ہو۔ سمجھے؟"

"مگر فیکٹ؟ جو تم کہتے ہو وہ فیکٹ ہوتی ہے؟"

وہ پھر حقارت سے ہنسا۔ "مجھے معلوم نہیں تھا کہ حقیقت کی تعریف اب یہ ہو گئی ہے کہ جو کچھ مسٹر سکندر بخت فرمائیں۔"

"آپ دونوں بکواس بند کریں۔" مجسٹریٹ نے برہمی سے کہا۔ "مسٹر ڈی سلوا! میں جانتا ہوں کہ حقیقت کا ثبوت ملنا چاہیے اور کسی کے الزام عائد کر دینے سے کوئی مجرم نہیں بن جاتا۔ مجھے صرف جوابی بیان چاہیے۔ یس یا نو۔"

"نو... سو مرتبہ نو۔ ایک ہزار مرتبہ نو۔" ڈی سلوا نے متاثر ہوئے بغیر کہا۔

"واہ جی واہ۔ سو مرتبہ نو ہو گئے نو سو۔ سو مرتبہ ہزار ہو گئے کتنے؟ ہاں، نو ہزار۔" چوہدری دلاور نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا اور تب ہمیں احساس ہوا کہ وہ کمرے میں موجود ہے۔ کسی کو اس کے اندر آنے کی خبر نہیں ہوئی تھی اور میرا اپنا خیال ہے کہ وہ دروازے سے داخل ہوتے ہی اسکرین کے پیچھے کھڑا ہو گیا تھا۔ ہسپتال کے عملے نے لاش کے گرد لکڑی کا اسٹینڈ والا پردہ کھڑا کر دیا تھا جو لاش کے مُردہ گھر جانے کے بعد بھی موجود تھا۔ نہ جانے کب سے وہ تمام گفتگو سن رہا تھا اور بالکل صحیح وقت پر اس نے ڈرامائی انداز میں سامنے آ کے یہ ظاہر کیا جیسے وہ ابھی ابھی پہنچا ہے۔ اس کردار کی طرح جو پس پردہ ڈائلاگ سنتا رہے اور عین اس وقت نمودار ہو جب اس کے ڈائلاگ بولنے کی باری آ جائے۔ "کیا قصہ چل رہا ہے یہاں؟ اوہ۔" اس نے اوہ کو کھینچ کر حیرانی اور مسرت کا اظہار کیا۔ "یہاں تو اپنے سکندر صاحب بھی موجود ہیں مجسٹریٹ پھر آپ ہی ہوں گے، کیوں جنابِ عالی؟"

مجسٹریٹ نے وہی سوال دوبارہ دلاور سے پوچھنے کی غلطی نہیں کی جو اس نے ڈی سلوا سے کیا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ سنجیدہ رہ کے بھی غیر سنجیدگی سے بات کرنے والا یہ شخص اس کو چٹکیوں میں اڑا دے گا۔ اس نے کم سے کم الفاظ میں بتا دیا کہ اسے کیوں طلب کیا گیا ہے۔

وہ کچھ دیر یوں کھڑا رہا جیسے بات کو ذہن میں بٹھانے کی سخت کوشش کر رہا ہے اور وہ معمولی عقل و ذہانت کا مالک شخص ہے جس کے لیے غیر معمولی بات کو سمجھنا مشکل مسئلہ بن جاتا ہے۔ پھر وہ آہستہ آہستہ میری طرف پلٹا۔

"اپنے سکندر صاحب! مجسٹریٹ صاحب نہ ہوتے تو میں کہتا آپ بکواس فرما رہے ہیں، مگر یہ گستاخی میں ان کی شان میں کیسے کر سکتا ہوں۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں رک رک کے بولا۔ "پھر بھی آپ سے تو پوچھ سکتا ہوں بندہ پرور کہ غلام کے بارے میں آپ نے یہ کیسے فرما دیا؟ یہ رائے ہے آپ کی میرے بارے میں؟ آپ تو میرے برابر کے پارٹنر ہیں میرے خلاف یہ عدم اعتماد کا اظہار؟" اس نے افسوس سے نفی میں سر ہلایا۔ "اللہ مجھے معاف کرے کہ خلقِ خدا مجھے کیا سمجھتی ہے اور آپ کو... آپ کو بھی معاف کرے۔ معلوم نہیں کس نے آپ کو ورغلایا ہے تاکہ شراکت ٹوٹ جائے۔ یا آپ خود اتنے عاقبت نااندیش ہیں۔ میں اتنا ذلیل اور بے ضمیر نہیں ہوں اپنے سکندر صاحب!" اس کا دکھ بھرا لہجہ اور رقت آمیز اندازِ گفتگو ڈرامہ تھے، اس کی پوری شخصیت ایک ڈرامہ تھی مگر اس کو حقیقت سے الگ کر کے دیکھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی۔ مجسٹریٹ اب مجھے ملامت آمیز نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کو یقین آنے لگا تھا کہ میں واقعی ایک کم عقل، نوجوانی کے جذبات سے مغلوب ہو جانے والا کینہ پرور آدمی ہوں۔ اس وقت مزید مشتعل ہونا اپنی کمزوری

کا اعتراف کرنے کے مترادف تھا چنانچہ میں نے کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔

"دلاور صاحب! یہ جذبات کا نہیں قانون کا مسئلہ ہے۔" میں نے کہا۔ "اس میں ہمارے ذاتی تعلقات یا کاروباری تعلقات کہیں نہیں آتے۔ ایک بیان میں نے دیا تھا، دوسرا آپ نے دے دیا۔ یہ صرف ابتدائی تفتیش ہے۔ آپ کو پورا حق حاصل ہے کہ مجھ پر ہتکِ عزت کے ہرجانے کا دعویٰ دائر کر دیں۔ مدعی اور مدعا علیہ کی حیثیت سے ثبوت اور دفاع کے معاملات کو مجھ پر چھوڑ دیں۔" پھر میں مجسٹریٹ سے مخاطب ہوا۔ "میرا خیال ہے اب آپ مجھے اجازت دیں گے۔ ضابطے کی اس کارروائی میں میری موجودگی کی اب ضرورت نہیں رہی۔" محسن نے جو بالکل خاموش اور الگ تھلگ کھڑا رہا تھا میرے اشارے کے جواب میں سر ہلایا اور ہم دونوں دروازے کی طرف بڑھے۔

"مجسٹریٹ صاحب!" محسن نے دروازے میں رک کر کہا۔ "میں نے ابھی ایک نرسنگ آرڈرلی سے سنا ہے کہ گورکن کی جیب میں سے ایک ہزار روپے نکلے ہیں۔ سو سو کے دس نوٹ۔ آپ ان کو سائن کر دیں کیونکہ ہو سکتا ہے ان پر فنگر پرنٹ مل جائیں۔"

بیک وقت ڈی سلوا اور چوہدری دلاور نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ایک لمحے کے ہزارویں حصے کے لیے ان دونوں کا رنگ اڑ گیا تھا۔

"اور اگر فنگر پرنٹ ملیں تو موازنے کے لیے آپ تیسری نرس کے وجود کو ذہن میں رکھیں۔" میں نے اس انسپکٹر سے کہا جو محسن کی بات پر ہماری طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ "ہو سکتا ہے اک زنانہ فنگر پرنٹ مسٹر ڈی سلوا کی سیکرٹری کے ہوں جو کسی سرنج یا گلوکوز کے بیگ یا کمرے میں اور دروازے کے ہینڈل پر مل جائیں۔ کیا نام ہے اس کا ڈی سلوا صاحب؟ ذرا بتا دیجیے گا پولیس کو۔ خدا حافظ۔"

میری آخری بات کے ردِعمل کو مجسٹریٹ نے بھی نوٹ کیا۔ چوہدری دلاور کو اپنے اعصاب پر زیادہ قابو تھا۔ وہ بے حس و حرکت کھڑا رہا لیکن اس کا چہرہ ویران ہو گیا تھا۔ ڈی سلوا چونکا اور اس کی آنکھوں میں آتشِ غضب کا کوندا سا لپکا۔ ان دونوں کی نگاہوں نے دہلیز کے باہر قدم رکھنے تک میرا تعاقب کیا۔ میرے لاشعور کے نہاں خانوں سے نکل کر وہ تصویر اچانک سامنے آ گئی تھی جس کی تلاش میں حافظہ سرگرداں تھا۔ مجھے اس تیسری نرس کی صورت سے آشنائی کا احساس بے سبب نہیں ہوا تھا۔ وہ ڈی سلوا کی نظر نواز سیکرٹری تھی اور نرس کا لباس پہن کے نرسوں میں یوں شامل ہو گئی تھی جیسے بھیڑ کا لبادہ اوڑھ کے بھیڑیا گلے میں شامل ہو جائے اور میں اسے فوراً اسی لیے شناخت نہیں کر سکا تھا۔ بے وقوف لڑکی! میں نے افسوس سے سوچا۔ اپنی جذباتی کمزوری کے باعث ڈی سلوا جیسے گرگِ باراں دیدہ کی آلۂ کار بن گئی تھی اور قتل جیسا سنگین جرم کرنے پر تیار ہو گئی تھی۔ شاید اسی ایک وعدے پر جو ڈی سلوا پہلے بھی ایسی ہی عاقبت نااندیش لڑکیوں سے کئی بار کر چکا تھا اور کئی بار توڑ چکا تھا مگر اسے یہ سب کہاں معلوم ہو گا۔ اسے تو یقین ہو گا کہ اگر وہ اپنے باس کو نہیں اپنے مستقبل کے شریکِ حیات کو دشمنوں سے بچانے میں کامیاب ہو گئی تو اس کا انعام بہت بڑا ہو گا۔ شاید ڈی سلوا نے کہا ہو گا کہ ڈارلنگ تم یہ کام کر دو تو سارے بگڑے کام بن جائیں اور اس خطرے کے دور ہوتے ہی ہم جیون ساتھی بن جائیں۔ ہنی مون کے لیے پیرس روانہ ہو جائیں یا تمہیں سوئٹزرلینڈ پسند ہو تو... یا ممکن ہے اس نے اپنی سیکرٹری کو کسی سابقہ جذباتی غلطی کے حوالے سے بلیک میل کیا ہو۔ دیکھو ڈیئر! ابھی تک تو کسی کو معلوم نہیں کہ تم ایک جرم پہلے بھی کر چکی ہو اور معلوم ہو گا بھی نہیں اگر تم یہ آخری بات مان لو۔ بس اس کے بعد ہم اور تم ایک دوسرے کے ہو جائیں گے۔ وہ مجبور ہو گئی ہو گی۔

"یہ تو بہت برا ہوا سکندر!" محسن نے اچانک ڈرائیونگ کرتے کرتے کہا۔ "اب تو وزیر خان چچا کی قبر بھی نہیں رہی۔"

میں اپنے خیالات سے چونکا۔ "قبر؟ قبر کیا ہوتی ہے محسن! ٹوٹے ہوئے جذباتی رشتوں کو استوار رکھنے کا ایک ذریعہ ہے آدمی کے ساتھ تو اس کے اعمال جاتے ہیں اور رہ جاتی ہے تو یاد۔ مگر وہ قبر میں نہیں دل میں رہتی ہے۔ یاد دل میں نہ ہو تو قبر پر بھی لوٹ کر کوئی نہیں آتا۔ مٹی کے ان ڈھیروں کا کیا ہے جو بارش میں بیٹھ جاتے ہیں اور زلزلوں سے مٹ جاتے ہیں۔ لندن سے واپس آنے کے بعد اگر مجھے کسی غلط قبر پر لے جا کر کھڑا کر دیا جاتا تو میں پوری جذباتی وابستگی کے ساتھ وہیں دست بدعا رہتا۔ باپ کی مغفرت کے لیے دعائیں اب بھی کرتا رہوں گا اور میرا وہ عہد قائم رہے گا جو میں نے قاتلوں سے انتقام لینے کے لیے کیا ہے۔ البتہ مجھے بوڑھے گورکن کی موت کا افسوس ہے۔"

"مجھے اس کی موت کا کوئی افسوس نہیں۔" محسن نے کہا۔ "وہ اپنے لالچ کے باعث اس انجام کو پہنچا۔ یہ کتنی بے ضمیری کی بات ہے سکندر کہ انسان اب مُردوں کے ساتھ بھی دھوکا

کرنے لگا ہے۔ ہزار روپے میں ان کی ہڈیاں اور اپنا ایمان بیچ دیتا ہے۔ دوسرے پیشوں میں تو بد معاشی ہوتی ہی تھی، یہ گورکن بھی اب کتنی برائیوں میں ملوث ہو گئے ہیں۔ قبر کی زمین کے لیے ایک کے ہزار وصول کرنا، ایک ہی قبر کو کئی کئی بار فروخت کرنا، لاشیں میڈیکل کے طلبہ کو بیچنا، کفن چرانا بیشک اکثریت اب بھی خدا سے ڈرتی ہے مگر ایسے بھی کم نہیں جن کے گناہ دیکھ کر شیطان کا سر بھی شرم سے جھک جاتے۔"

"میرا خیال ہے محسن کہ اب ڈی سلوا سیکرٹری کی زندگی غیر یقینی ہو گئی ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے اس کا نام نہیں لینا چاہیے تھا۔"

"کیا ہم یہ بات اسے بتا کے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے؟" محسن نے سوچتے ہوئے کہا۔ "ہو سکتا ہے وہ ہم پر اعتماد کر لے۔"

"اگر اس نے اعتماد کر لیا تو وہ بہت سی ایسی باتیں بتا سکے گی جو ہمیں معلوم نہیں۔" میں نے کہا۔ "اور استغاثہ کی ایک اہم گواہ ہو جائے گی۔"

"اسے یقین دلایا جا سکتا ہے کہ اس نے ہماری نہ مانی تو اس کا انجام کیا ہوگا۔" محسن بولا۔ "ہمارے پاس دستاویزی ثبوت ہیں۔ ہم اسے بتا سکتے ہیں کہ اب تک ڈی سلوا کتنی بار سیکرٹری بدل چکا ہے۔"

"میں نے ابھی تک وہ فائل دیکھی تو نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر غلام علی نے جو کچھ زبانی بتایا تھا، غلط نہیں تھا۔ اگر ہم کسی طرح ان لڑکیوں سے رابطہ قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں ...۔"

محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ کچھ نہیں مانیں گی وہ اپنے گنہگار ماضی سے تمام رشتے توڑ چکی ہیں اور اس ماضی کے آسیب سے نکل چکی ہیں۔ شاید ان میں کچھ نئے سرے سے نئی زندگی کا آغاز کر چکی ہوں گی اور نئی امیدوں کے ساتھ نئے ہمسفر منتخب کر چکی ہوں گی۔ وہ یہ خطرہ کیوں مول لیں گی کہ ہم گڑے مردے اکھاڑ کے ان کے مستقبل کا خانہ خراب کر دیں۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے محسن کہ ان میں سے کچھ آرزوِ انتقام سے مغلوب ہوں لیکن اپنی بے بسی اور کمزوری کے باعث کچھ نہ کر سکی ہوں۔ اگر انہیں اعتماد ہو کہ... کہ ہم سے تعاون میں ان کے لیے خطرے کی کوئی بات نہیں اور ہم ان کی مدد سے بہت کچھ کر سکتے ہیں... تو شاید وہ اپنے ساتھ ہونے والے ظلم کا افسانہ کہہ سکیں۔" میں نے کہا۔ "اب تو نے ایک بات کہی ہے تو اس سے مجھے ایک لائن مل گئی ہے۔ فرض کرو میں کسی طرح ڈی سلوا کی سیکرٹری سے رابطہ قائم کرتا ہوں، کسی طرح اسے تنہائی میں ایک بار ملنے پر رضامند کر لیتا ہوں۔ خوفزدہ وہ یقیناً ہوگی کیونکہ اس نے ایک قتل کیا ہے اور وہ ایک نادان لڑکی ہے، کوئی پیشہ ور مجرم نہیں ہے۔ ایک بار وہ ملنے آ گئی تو میں اسے بہت کچھ بتا دوں گا، مثلاً یہ کہ میں نے اسے نرس کے روپ میں بھی شناخت کر لیا تھا اور اب اس کی ذات کو کتنے سنگین خطرات درپیش ہیں۔ ڈی سلوا کے کردار کو بے نقاب کر کے میں اسے سمجھا سکتا ہوں کہ اب خدا کے بعد ہمارے سوا اس کو بچانے والا کوئی نہیں۔ اگر اس نے اعتبار نہ کیا تو میں اس کو ڈی سلوا کی کسی سابقہ سیکرٹری سے ملوانے کا انتظام کر لوں گا اور اس کے بعد وہ ہمارا ساتھ دینے پر مجبور ہوگی۔"

"اور ہم اسے تحفظ، یا تحفظ کی ضمانت کیسے فراہم کریں گے؟"

"یہ بعد میں سوچیں گے۔" میں نے کہا۔ "خدا کی دنیا بہت بڑی ہے۔ ایک لڑکی کو چھپانا مقصود ہو تو ایک گوشہ کافی ہوتا ہے جو کہیں نہ کہیں مل جائے گا۔ ویسے بھی مارنے والے سے بچانے والا ہاتھ زبردست ہوتا ہے۔ ہم نیک نیتی سے اس لڑکی کو بچانا چاہتے ہیں جو نادانی کے باعث سفاک اور پیشہ ور مجرموں کے جال میں پھنس گئی ہے اگر ہم اس کی مدد سے مجرموں کو کیفرِ کردار تک پہنچانا چاہتے ہیں تو یہ بھی کوئی غلط مقصد نہیں۔ خدا پر بھروسہ رکھو اس نے ہی اب تک ہماری حفاظت کی ہے ورنہ ہم کیا کر سکتے تھے۔ وہ ہمارا مددگار ہوگا۔"

ظاہر ہے اس کے بعد محسن کے لیے کچھ کہنے کی گنجائش نہ تھی۔ چراغ دین کی کوٹھی میں کار داخل ہوئی تو میں نے سب سے پہلے گلاب خان کو دیکھا اور پھر چراغ دین کو جو برآمدے میں کرسی ڈالے بیٹھا تھا اور گلاب خان سے قبرستان میں پیش آنے والے واقعات سن رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اس وقت اپنے رقیبِ روسیاہ کی صورت بھی نہ دیکھوں مگر وہ ہمیں زبردستی ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ محسن نے بہت کوشش کی وہیں سے کار کی چابی اس کے حوالے کر کے نکل جائے لیکن اس کی ایک نہ چلی۔ چراغ دین دوبارہ سالے کے منصب پہ فائز ہو جانے والے محسن کی خاطر مدارت پہ کمربستہ تھا۔ طوعاً و کرہاً ہم نے چائے پی اور اس دوران میں چراغ دین کے سوالات کے جوابات بھی مجبوراً دیے۔ وہ سخت حیرانی اور پریشانی کا اظہار کرتا رہا۔ محسن کا موڈ چراغ دین کے خوشامدانہ اخلاق کے باعث زیادہ خراب ہوتا جا رہا تھا

اور خود میں نفرت کے دُہرے جذبات کا شکار تھا۔ اس شخص نے میرے باپ کے اعتماد کو دھوکا دیا تھا۔ وہ دنیا میں اس کی خرابی، رسوائی اور تباہی کا ذمہ دار بنا تھا لیکن میرے سامنے اپنی شرافت کا ڈھونگ رچا کے اپنے جرائم پر پردہ ڈالنا چاہتا تھا۔ اس نے میرے باپ کی کمائی سے غبن کر کے یہ سب کچھ کھڑا کیا تھا جو دنیا میں شرافت اور عزت کی سند تھا اور پھر اس نے اپنے آقا کو اپنا ملازم بنا کے مزید تحقیر و تذلیل کا ناقابلِ معافی جرم کیا تھا اور اب وہ میری محبت کا خون کرنا چاہتا تھا۔ بے شک فوزیہ کو ایک بار اپنی زندگی پر اختیار سے محروم کرنے کے بعد مجھے یہ حق حاصل نہیں رہتا تھا کہ اس کے مستقبل کے کسی فیصلے کی راہ میں حائل ہو سکوں مگر فوزیہ نے کہا تھا کہ وہ مجھے بھول کے جینے کی مجبوری کو قبول کر لے گی مگر چراغ دین سے شادی کر کے جینا قبول نہیں کرے گی۔ میں نے فوزیہ کے ارمانوں کا خون کیا تھا تو ایک عظیم تر مقصد کی خاطر لیکن میں کسی اور کو فوزیہ کی زندگی سے کھیلنے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ میرے باپ کے بعد چراغ دین کو فوزیہ کی جان لینے کی مہلت دینا میرے لیے ناممکن تھا۔ ابھی تک میں نے طے نہیں کیا تھا کہ چراغ دین کو سزا کیا دی جائے کیونکہ اس سے پہلے دوسرے مجرم تھے جن سے پہلے نمٹنا ضروری تھا لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ چراغ دین کی سزا کو التوا میں رکھنا بھی مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا ہے۔ محسن کے جذبات بھی مجھ سے مختلف نہ تھے اور وہ صاف کہہ چکا تھا کہ فوزیہ کو زندہ رکھنے کے لیے وہ چراغ دین کو قتل کر دے گا۔ ابھی تک اس نے مجھے بتایا نہیں تھا کہ وہ اس مسئلے سے کیسے نمٹنا چاہتا ہے مگر اس کے عزائم بھی خطرناک تھے۔

اچانک محسن نے گلاب خان کو دس کا نوٹ دے کر کہا۔ "ایک پیکٹ سگریٹ کا لے آؤ ذرا۔ معلوم ہے نا ئیں کون سے سگریٹ پیتا ہوں؟ تھری کاسل۔ بیس کا پیکٹ ملے گا دس کا نہیں۔"

"تھری کاسل؟" گلاب خان نے تذبذب کے ساتھ کہا۔ "ادھر تو شاید ہی ملے۔"

"تو اسٹیشن تک ہو آؤ۔" محسن نے کہا۔ "تکلیف تو ہوگی تمہیں...۔"

بات تکلیف کی نہیں تھی۔ سگریٹ میری جیب میں موجود تھے۔ تھری کاسل ان دنوں ناپید ہو گئے تھے چنانچہ محسن کا مقصد صرف چوکیدار کو گھر سے رخصت کرنا تھا۔

"مسٹر چراغ الدین!" محسن نے چوکیدار کے جاتے ہی کہا۔ "مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی تھی اس لیے میں نے گلاب خان کو باہر بھیج دیا ہے۔"

چراغ دین پہلے تھوڑا سا برا ماننے کے باوجود مسکرایا۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ یہ سالے کا مذاق نہیں تھا اور محسن کے لہجے کی متانت اور اس کی صورت دیکھ کر وہ چوکنا ہو گیا۔ "ایسی کون سی بات ہے محسن میاں؟"

"میں لگی لپٹی رکھنے کا قائل نہیں ہوں۔" محسن نے اسی لہجے میں کہا۔ "اس لیے صاف بات سن لو۔ مجھے فوزیہ سے تمہاری شادی منظور نہیں۔" چراغ دین کی صورت پر بارہ بج گئے تھے۔ وہ کچھ دیر محسن کو یوں دیکھتا رہا جیسے اس کی بات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ پھر اس کی نگاہ مجھ پر آ کے ٹھہر گئی لیکن اسے زیادہ مایوسی ہوئی۔ میری آنکھوں میں اس کے لیے نفرت کے جذبات شدید تر تھے۔

"میں تمہاری بات سمجھا نہیں محسن میاں!" اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ وہ اب سنبھل گیا تھا۔

"مسٹر سی ڈین! میں نے انگریزی میں تو بات نہیں کی۔" محسن نے تلخ طنزیہ لہجے میں کہا۔

"سوال یہ ہے مسٹر محسن کہ آپ کون ہوتے ہیں یہ رشتہ منظور یا نامنظور کرنے والے؟" چراغ دین نے تیز ہو کر کہا۔

"میں فوزیہ کا بڑا بھائی ہوں۔" محسن نے سکون سے کہا۔ "کیا تمہیں معلوم نہیں؟"

"لیکن تم اس کے سرپرست نہیں ہو، تم والدین کے فیصلے کو نہیں بدل سکتے اور نہ میرے فیصلے کو۔ سمجھے؟" چراغ دین بولا۔

"سمجھ گیا۔" محسن نے کہا۔ "اور تم بھی اچھی طرح سمجھ لو کہ میرا فیصلہ کیا ہے۔ مریم کے معاملے میں بھی مجھے والدین سے اختلاف تھا مگر میں چھوٹا بھائی تھا۔ اس کے علاوہ خود مریم کو اعتراض نہیں تھا لیکن اب فوزیہ کو یہ رشتہ منظور نہیں، اس لیے میں خاموش نہیں رہ سکتا۔"

"فوزیہ کو رشتہ منظور نہیں؟" چراغ دین نے اپنے آپ سے کہا۔

"ہاں۔ یہ بات خود اس نے مجھ سے کہی ہے کہ وہ مر جائے گی لیکن تم سے شادی نہیں کرے گی۔ اس لیے میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ میں تم کو قتل کر دوں گا لیکن یہ شادی نہیں ہونے دوں گا۔" محسن اٹھ کھڑا ہوا۔ "مجھے اپنی بہن کی زندگی بچانے کے لیے والدین سے نافرمانی کا الزام اور پھانسی دونوں منظور ہیں۔"

چراغ دین کا رنگ لاش کی طرح سفید پڑ گیا۔ "تم۔ تم نے ہی مجھے ٹیلیفون پر بھی دھمکی دی تھی؟"

"ٹیلی فون پر؟" محسن نے حیرانی سے کہا "کیوں چراغ دین! کیا میں تم سے ڈرتا ہوں؟ میں یہ دھمکی تمہارے منہ پر دے رہا ہوں اور یہ بھی بتا رہا ہوں کہ اسے خالی دھمکی مت سمجھنا۔"

میں اور محسن اسے پتھر کے بُت کی طرح منجمد بیٹھا چھوڑ کے باہر آگئے۔ میں نے اپنی زبان بند رکھنے کی سخت جدوجہد کی تھی اور کامیاب رہا تھا ورنہ میرا دل چاہتا تھا کہ میں بھی اس سے دل کی بات صاف صاف کہہ دوں۔ اسے بتا دوں کہ بالفرض محال محسن نے تمہیں بخش بھی دیا یا خود تم نے زندگی کو اس رشتے سے عزیز تر سمجھتے ہوئے اپنا ارادہ تبدیل کر دیا تب بھی میرے ارادے میں فرق نہیں آئے گا۔ میں نمک کا وہ قرض ضرور وصول کروں گا جو میرا باپ وصول نہ کر سکا۔ سارے زمانے کو چھوڑ کر اس نے تم جیسے نمک حرام کی ملازمت کی ذلت قبول کی تھی تو اسکی صرف ایک ہی وجہ میری سمجھ میں آتی ہے۔ وہ تمہیں سزا دینا چاہتا تھا مگر زندگی نے وفا نہ کی۔ اب اس کا وارث میں ہوں تو یہ سب ذمہ داریاں بھی مجھ کو ہی پوری کرنی ہیں جو میرا باپ پوری نہ کر سکا۔ میں نے اس بات کو پھر کسی وقت کے لیے اٹھا رکھنا بہتر خیال کیا کیونکہ یہ لمبی بات تھی اور گلاب خان آنے ہی والا تھا۔ جب ہم کوٹھی سے نکلے تو شام کے سائے پھیلنے لگے تھے۔

رابعہ بے چینی سے میرا انتظار کر رہی تھی۔ دوپہر کے بعد ضامن رضوی صاحب نے پولیس سرجن کو فون کیا تھا اور انہیں تمام واقعات کا علم ہو گیا تھا۔ شام سے پہلے ہی انہوں نے رابعہ کو فون کر دیا تھا مگر وہ خود کسی مصروفیت کے باعث ابھی تک گھر نہیں پہنچے تھے۔ ان کی بیگم لان کی گارڈن چیئرز پر بیٹھی تھیں۔ میں ہاتھ کو سرہانے رکھ کے گھاس پر لیٹ گیا اور گہرے نیلے آسمان کی وسعت کو گھورنے لگا۔ محسن نے خاتین کو ہسپتال میں پیش آنے والے واقعات بتانے شروع کیے جو بیگم رضوی کے لیے سنسنی خیز کہانی کی طرح تھے اور رابعہ کے لیے ایک قانونی الجھن۔ اس کا سارا دن اپنے گھر کی آتش زدگی اور کار کی چوری کے معاملات کی تفتیش کرنے والوں کے سوالوں کے جواب اور بیانات دیتے گزر گیا تھا۔ میرے اپنے سر میں شدید درد تھا چنانچہ جب چائے آئی تو میں نے پوچھا کہ کیا گھر میں اسپرین مل سکے گی؟ نوکر نے مجھے اسپرین لا کے دی جو میں نے پانی کے پورے گلاس کے ساتھ نگل لی اور پھر وہیں بیٹھا چائے پیتا رہا۔ کچھ دیر بعد بیگم رضوی معذرت کر کے اٹھ گئیں۔ وہ کم گو اور کم آمیز مگر طبعاً نیک دل خاتون تھیں جو نوکروں کے ہوتے ہوئے بھی شوہر کے تمام ذاتی کام اپنے ہاتھوں سے کرتی

تھیں اور اس وقت بھی ان کو دیکھنا تھا کہ رضوی صاحب کا جو سوٹ ڈرائی کلین ہو کے آیا ہے اس پر استری ٹھیک ہے یا نہیں، انہیں رات کو کسی تقریب میں شرکت کے لیے جانا تھا۔ محسن کے بھی سر میں درد تھا مگر وہ اسپرین کے استعمال کے خلاف تھا اور اس کا علاج نیند سے کرتا تھا۔ میں اپنے منتشر خیالات سے بچنے کی جدوجہد میں آنکھیں بند کیے لیٹا تھا اور سکون چاہتا تھا۔ سر کا درد کم ہوا تو تھکن کا احساس غالب آگیا اور نہ جانے کیسے میری آنکھ لگ گئی۔ میری آنکھوں نے ایک خواب دیکھا۔ خواب بڑے جادوگر ہوتے ہیں۔ کبھی حال کے رشتے ماضی سے جوڑ دیتے ہیں تو کبھی مستقبل سے۔ خواب پر ریسرچ کرنے والوں نے یہ تو معلوم کر لیا کہ خواب تشنہ کام آرزوؤں کا رُوپ ہوتے ہیں مگر یہ سوال اب بھی جواب طلب ہے کہ خوابوں میں وقت کتنا صرف ہوتا ہے۔ گھنٹوں یا دنوں پر محیط مناظر کو خواب میں دیکھتے ہوئے چند منٹ لگتے ہیں تو کیسے اور ایک رات میں ایک عمر کے خواب کیسے سما جاتے ہیں؟

میں نے دیکھا کہ میرے چاروں طرف حدِ نگاہ تک سرسوں کے زرد پھولوں کا ایک سمندر سا ٹھاٹھیں مار رہا ہے اور میرے سر پہ شوخ نیلا آسمان ہے جس میں صرف ایک بادل کا ٹکڑا تیر رہا ہے۔ پھر وہ ٹکڑا نیچے اترا اور میرے گرد پھیل گیا وہ خوشبو کا بادل تھا اور یہ خوشبو ہوا کے جھونکے کی طرح مجھے اڑا کے لے گئی۔ یکلخت مجھے احساس ہوا کہ میرے ہاتھ میں رابعہ کا ہاتھ ہے اور وہ بھی میرے ساتھ بادل پر بیٹھی ہے، اداس اور دل گرفتہ۔ "تم؟" میں نے کہا "تم یہاں کیوں آئی ہو؟"

"اور کہاں جاؤں؟" وہ بولی "میرا کوئی گھر موجود نہیں ہے۔"

"تمہارا کوئی بھی گھر نہیں ہے؟" میں نے ہمدردی سے پوچھا "تو کیا اب تم بادلوں میں رہو گی؟ پہلے کہاں رہتی تھیں تم؟"

رابعہ نے نیچے دیکھا "وہاں" اس نے انگلی سے دھوئیں کے ایک مرغولے کی طرف اشارہ کیا جو اوپر اٹھتا چلا آ رہا تھا "دیکھو سکندر! یہ دھواں مجھے نگل لے گا۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" وہ چلائی۔

"ڈرو نہیں۔ میں تمہارے ساتھ ہوں" میں نے اسے اپنے قریب کر لیا "مگر یہ دھواں کیسا ہے؟ کیا تھا یہاں؟"

"یہاں میرا گھر تھا" وہ افسردگی سے بولی۔

"جھوٹ" میں نے قہقہہ لگا کے کہا "تمہارا گھر تو وہ ہے" میں نے انگلی سے دوسری جانب اشارہ کر کے کہا۔

"وہ سفید اجلی دھوپ میں جگمگانے والا بے داغ گھر جس کے شفاف شیشوں والے دریچوں کے پیچھے ریشمی پردے پڑے ہیں۔ جس کے گرد ہفت رنگ پھولوں کی جھالر ہے اور سبزے کا قالین بچھا ہوا ہے۔ جہاں وہ دونوں شریر بچے ہیں خصوصاً لڑکی۔"

"مگر... مگر یہ تو گھر تمہارا ہے..." رابعہ نے پلک جھپکائے بغیر دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم نے دیکھا نہیں، اس بچی کی صورت تم سے کتنی ملتی ہے" میں نے دلیل دی۔

"لیکن لڑکا تو ہوبہو تم جیسا ہے" رابعہ نے کہا۔

پھر خواب ختم ہو گیا اور میں نے آنکھیں کھول کے دیکھا۔ وہ خوشبو کا بادل اب بھی میرے آس پاس ہی کہیں موجود تھا اور یہ خوشبو مجھے مقید کیے ہوئے تھی۔ رابعہ میرے قریب لان پر بیٹھی تھی اور اس کا ایک ہاتھ میری پیشانی پر تھا۔ اس نے جو لباس پہن رکھا تھا اس پر نیلے رنگ کی زمین میں سرسوں جیسے زرد پھول چمک رہے تھے۔ یہ سب کچھ مل کے میرا خواب بن گئے تھے۔ میں اٹھ بیٹھا "کتنی دیر تک سوتا رہا ہوں میں؟" میں نے اپنی گھڑی دیکھی۔ پانچ منٹ پہلے محسن سونے گیا تھا تب بھی میں نے گھڑی دیکھی تھی۔

"تم سو رہے تھے؟ میں سمجھی سر میں زیادہ درد ہے" وہ خفت سے بولی "اندر جا کے سو جاؤ، تمہیں سکون کی ضرورت ہے۔"

"سکون تو ایسے زیادہ مل رہا تھا" میں نے کہا اور رابعہ کے چہرے کو سرخ پڑتے دیکھا "سر کا درد ٹھیک ہو گیا ہے اور سونا میں چاہتا نہیں ہوں ابھی۔ مجھے تم سے باتیں کرنی ہیں۔ ضروری یا غیر ضروری، جو چاہو سمجھ لو۔"

"اچھا" وہ بولی "تو یوں کرتے ہیں باہر چلتے ہیں ہمت ہے ساتھ دینے کی؟"

بات کے ذومعنی ہو جانے کا احساس رابعہ کو دیر سے ہوا۔

"میری ہمت تو تمہارے ساتھ رہنے کا ہی نام ہے" میں نے کہا "تم بتاؤ؟"

"میں کیا بتاؤں" وہ اٹھ کھڑی ہوئی "مجھے تو ہمت آزمانے والے ہی ملے ہیں جب ملے ہیں۔ تم بھی آزما لو۔"

"تم سیریس ہونے لگی ہو" میں بھی کھڑا ہو گیا "میں تو تمہیں بتانا چاہتا تھا کہ ابھی میں کتنا خوبصورت خواب دیکھ رہا تھا۔ بالکل فلمی۔"

"تم بھی خواب دیکھتے ہو؟ اور وہ بھی... فلمی قسم کے؟" وہ مسکرائی۔

"خدا کا شکر ہے کہ تمہارے لبوں پر بھی مسکراہٹ آئی۔"

میں نے کہا "یہ بڑی نیک فال ہے۔ گردشِ حالات کا شکار ہم دونوں رہے ہیں رابعہ! اور تقدیر کے عطا کردہ زخم ہم دونوں کا ورثہ ہیں۔ کون جانے ابھی اس کے ترکش میں کتنے تیر باقی ہیں مگر جو کچھ ہونا ہے اس سے مفر نہیں اور نہ قبل از وقت پریشانی اس کا علاج ہے۔ اب ایک شاعر نے تو فرمایا ہے کہ آ عندلیب مل کے کریں آہ وزاریاں۔ جو میرے خیال میں وقت اور انرجی ضائع کرنے والی بات ہے۔ چنانچہ دوسرا نقطہ نظر مثبت ہے یعنی عرض کیا ہے ؎

آؤ کہ کوئی خواب بُنیں کل کے واسطے
ورنہ یہ رات آج کے سنگین دور کی
ڈس لے گی جان و دل کو کچھ ایسے کہ جان و دل
تا عمر پھر نہ کوئی حسین خواب بُن سکیں

رابعہ ہنس پڑی "تم بھی کمال آدمی ہو کہ ان حالات میں شاعری سوجھ رہی ہے۔ مگر اب چلو گے بھی یا...!"

"بس دو منٹ۔ ذرا میں شیو کر لوں اور کپڑے بدل لوں" میں نے کہا "یہ بتاؤ جانا کہاں ہے؟"

"میں جانا چاہتی تھی خاکِ آشیاں دیکھنے گر کی تھی جس پر کل بجلی۔"

"نہیں" میں نے کہا "ہم گزرے ہوئے دن پر آنسو بہانے کہیں نہیں جائیں گے۔ ہم امید کی جانب سفر کریں گے۔ ایک دوسرے کا سہارا بن کے۔ تم یہاں بیٹھو، میرا خیال کہیں اور جانے کا ہے۔"

غسل کے دوران ہی میں نے شیو بنائی اور بیس منٹ بعد کپڑے پہن کے تیار ہو گیا۔ اس عرصے میں میرے خیالات کا محور رابعہ کی ذات رہی۔ وہ واقعی بہت غیر معمولی لڑکی تھی۔ نہ صرف یہ کہ اس نے تن تنہا اپنے حالات کا مقابلہ کیا تھا بلکہ میرا ساتھ دینے کی سزا کو بھی انتہائی صبر و استقامت کے ساتھ برداشت کیا تھا۔ ماں کی موت کے ساتھ ہی اس کا گھر تباہ ہو گیا تھا مگر وہ ان صدمات سے پاگل نہیں ہوئی تھی اور اتنی پُرسکون تھی کہ اس کا حوصلہ میرے لیے عزم و امید کا رختِ سفر ثابت ہو رہا تھا۔ وہ رابعہ جو باہر سے دنیا کو ایک کامیاب وکیل اور پتھر کی چٹان جیسی سخت جان لگتی تھی اندر سے ایک عام عورت تھی۔ جو اپنے وجود کی زمین میں پیار کو یوں چھپائے رکھتی ہے جیسے صدف کی آغوش میں کوئی دُرِ شہوار۔ اور انتظار کرتی رہتی ہے کہ کوئی آئے اور اس کے دل کی گہرائی میں اتر کے اس گوہر نایافت کو حاصل کرے۔ جیسے زمین اپنی کوکھ میں بیج دبائے منتظر ہو کہ برکھا برسے اور دھوپ اترے تو نخلِ آرزو پھوٹے۔ زندگی کے

بے سمت سپاٹ صحرا میں چلتے چلتے رابعہ کو یکلخت میں نے ایک نخلستان کا ٹھنڈا پرسکون سایہ فراہم کر دیا تھا اور اب وہ مجھے چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ میرے لیے سب کچھ کرنے کو تیار تھی۔ میری خوشی کے لیے اس نے اپنا غم بھلا دیا تھا اور مجھے بتا دیا تھا کہ مجھ سے زیادہ اسے اپنی ذات پر بھی اعتماد نہیں۔ اگر اندر سے اس کا دل رو رہا تھا تب بھی وہ میری خاطر مسکرا رہی تھی۔ وقت ہر دکھ کا درماں ہے مگر وقت کو چارہ گری کا موقع ہی کہاں ملا تھا۔ رابعہ کو میرے مصائب و آلام کا اندازہ تھا اور وہ مجھے ہر احساسِ جرم و پشیمانی سے محفوظ رکھنا چاہتی تھی چنانچہ وہ ظاہر کر رہی تھی کہ اس میں ہر صدمہ جھیلنے کا حوصلہ ہے اور یہی حوصلہ مجھ میں بھی ہونا چاہیے۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ میں اسے مایوس کر دوں۔

میرا دل چاہتا تھا کہ اس وقت رابعہ کے ساتھ باغِ جناح کے کسی معطر اور سرسبز گوشے میں، کسی پہاڑی پر نصب نیل گوں روشنی بکھیرنے والے کھمبے کے نیچے پتھر کی بنچ پر جا بیٹھوں، ریلوی کے کنارے چاندنی اور درختوں کے سایوں میں ٹھہری ہوئی کشتی لوں اور دریا کی نرم لہروں پر بہتا کامران کی بارہ دری کے طلسماتی جزیرے پر جا اتروں جس کے ہر طرف راوی بہتی ہے۔ یا کسی روشنی سے جگ مگ کرتے قہقہوں سے معمور اور نکہت و رنگ سے مخمور فضاؤں والے ہوٹل کی گہما گہمی میں کھو جاؤں۔ لیکن وقت کے تقاضے تلوار بن کے میرے سر پر لٹک رہے تھے۔ محسن گہری نیند میں تھا۔ میں نے غلام علی مرحوم کی دی ہوئی فائل نکالی اور اس کے چند اوراق پر سرسری نگاہ ڈالی۔ اس نے بہت سی کار آمد معلومات کو یکجا کرنے کے لیے سخت محنت کی تھی اور وفا شناسی میں احتیاط کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنا بھی بھول گیا تھا۔ وہ خود کو مقروض سمجھتا تھا کیونکہ میرے باپ نے اس کے ساتھ ایک نیکی کی تھی۔ اب نیکی کا یہ قرض وہ مجھ پر چھوڑ کے مر گیا تھا۔ ابھی میں کاغذ کے ایک پرزے پر ضروری تفصیلات نوٹ کر ہی رہا تھا کہ رابعہ دروازے میں آ کھڑی ہوئی۔

"ابھی تک جناب کے دو منٹ پورے نہیں ہوئے؟" وہ بولی اور میں جواب دینے کے بجائے اسے دیکھتا رہ گیا۔ اس نے لباس بدل لیا تھا اور وہی ساری باندھ لی تھی جو اس نے پہلی بار مجھ سے جیل میں ملاقات کرتے وقت باندھی تھی اور جسے دیکھ کر موسمِ گل، صبحِ بہاراں اور صحنِ گلشن جیسے استعارے ذہن میں آتے تھے۔ پھول ہی پھول کھل اٹھے میرے ویرانے میں جیسے شعر یاد آتے تھے اور گلبدن، گل پیرہن جیسے مفہوم واضح ہوتے تھے۔

"ایسی حیرانی سے کیا دیکھ رہے ہو؟" وہ بولی۔ "ہم عورتیں تو تیاری کے معاملے میں خواہ مخواہ بدنام ہیں۔"

"تم میں جو بات ہے وہ کچھ اور ہے۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اور تیار کیا ہم نہیں ہیں؟"

رابعہ کو ابھی تک کار واپس نہیں ملی تھی۔ اسے سی ایم سے ریلیز آرڈر رہے سے ملے تھے اور پولیس کوشش کے باوجود اسی دن ضابطے کی کارروائی پوری نہ کر سکی تھی۔ کار کا حلیہ تو ٹکریں مارنے سے بگڑ چکا تھا اور ڈینٹنگ پینٹنگ کرائے بغیر اس کو دن کے وقت چلانا لوگوں کو خاصی تفریح فراہم کرتا مگر رات کو یہ کار وسیلۂ سفر بننے کے علاوہ خلوت فراہم کر سکتی تھی۔ کار میں بیٹھا ہوا آدمی ہجوم سے الگ ہو جاتا ہے۔ اور خود کو اتنا ہی محفوظ تصور کرنے لگتا ہے جتنا اپنے کمرے کی چار دیواروں پر قائم چھت کے نیچے۔ ہم باہر نکلے اور میں نے احتیاطاً خالی سڑک پر دونوں جانب نگاہ ڈالی لیکن رات کا اندھیرا اتنا گہرا ہو چکا تھا کہ مجھے کچھ دکھائی نہ دیا۔ رابعہ سے چھپا کے میں نے بھرا ہوا ریوالور ساتھ رکھا تھا مگر کوئی بے خبری میں آ لیتا تو یہ حفاظتی انتظام بے مصرف ثابت ہوتا۔ اسی احتیاط پسندی کے باعث میں نے اس ٹیکسی ڈرائیور کو غور سے دیکھا، جس نے ہمیں دیکھ کر ٹیکسی روک لی تھی۔ رابعہ کے ساتھ پیچھے بیٹھ کے میں نے ڈرائیور کو نسبت روڈ چلنے کے لیے کہا اور اگرچہ وہ صحیح راستے سے جا رہا تھا لیکن میں ریوالور نکالنے کی پوزیشن میں مستعد بیٹھا رہا۔ جب وہ ہمیں نسبت روڈ پر اتار کے اور کرایہ لے کر رخصت ہو گیا تب بھی میں ٹیکسی کو دور جاتے دیکھتا رہا۔

"کیا بات ہے سکندر؟" رابعہ نے کہا۔ "راستے بھر تم بہت خاموش اور کشیدگی کا شکار رہے ہو؟"

"سانپ کا کاٹا رسی سے ڈرتا ہے۔ یہ بات بڑے تلخ تجربات کا نچوڑ ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے ایک ڈر تو اپنی جان کا تھا، دوسرا جانِ جاناں کا۔"

"کیا اس بات کو نسبت روڈ سے کوئی نسبت ہے؟ میں نے راستے میں پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔"

"یہاں ہم کسی سے ملنے آتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ایک لڑکی سے جو پہلے ڈی سلوا کی سیکرٹری تھی۔"

"بہت خوبصورت تھی کیا؟" رابعہ نے شوخی سے کہا اور ہم ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ "یہ عالم شوق کا۔"

"خوبصورت تو یقیناً ہو گی ورنہ ڈی سلوا کی سیکرٹری

نہ ہوتی۔" میں نے کہا۔ "لیکن دیکھے بغیر میں یہ شرط بہرحال لگا سکتا ہوں کہ تم سے زیادہ نہیں ہوگی۔ دیکھنا اب یہ ہے کہ وہ کس حال میں ہے۔ ممکن ہے وہ کسی کی بیوی ہو۔ یا ایک بھولی بسری کہانی کے سوا کچھ بھی نہ ہو جسے کوئی دہرانا بھی گوارا نہ کرے۔ جب اسے ڈی سلوا نے رخصت کیا تھا تو اس کے ماتھے پر کلنک کا ایک ٹیکہ سجا دیا تھا کہ سند ہے۔ لوگ وفادار لوٹا بعد لو ملازم کو الگ کرتے ہیں تو کوئی سرٹیفکیٹ ضرور دیتے ہیں لیکن ڈی سلوا کی عطا کردہ سند نے اس لڑکی کو کیا دیا ہ بدنام مستقبل کا اکیلا پن یا بے غیرتی کی موت۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سمجھداری سے کام لیا ہو تو اس لڑکی نے کلنک کے ٹیکے کو ملنے کا جھومر بنا لیا ہو اور اپنے ماضی سے دامن چھڑا کے بھاگ گئی ہو کسی ایسی جگہ جہاں اس ماضی کی پرچھائیاں بھی نہ پڑیں۔ لیکن وہ مل جائے تو اچھا ہے۔ میں اس سے مکمل رازداری کے وعدے کیساتھ یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ ڈی سلوا نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا، اس کا سارا کچا چٹھا معلوم کرنا چاہتا ہوں۔"

"اور تمہارا خیال ہے وہ تمہیں فوراً بتا دے گی؟"

"نہیں، مجھے ایسی کوئی خوش فہمی نہیں۔" میں نے کہا۔ "اسی لیے میں تم کو ساتھ لایا ہوں۔ اپنا اعتبار قائم کرنے کے لیے۔" میں نے کہا۔

"بالفرضِ محال اس نے بتا دیا کہ ڈی سلوا شیطان ہے اور اس کی خباثت کی داستان بھی سنا دی تو اس کا فائدہ؟"

"میں اس کو بطور گواہ استعمال کروں گا۔ کسی قانونی عدالت میں نہیں، ایک اور لڑکی کے سامنے، جو اب ڈی سلوا کی سیکرٹری ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے اندیشہ ہے کہ اس کی زندگی کا انجام بھی بد تر ہوگا بلکہ بدترین ہوگا۔ وہ کل تک زندہ رہی تو ڈی سلوا کی اصلیت معلوم ہو جانے کے بعد سمجھ جائے گی کہ اس نے بیوقوفی یا نادانستگی میں ڈی سلوا کے لیے ایک قتل کر دیا ہے مگر ڈی سلوا نے اس سے محبت کے نام پر جو وعدے کیے ہیں، وہ کتنے بے حیثیت ہیں۔ اور جیسے لوگ آلۂ قتل کو فوراً ٹھکانے لگانے کی فکر کرتے ہیں، ایسے ہی ڈی سلوا کے لیے اس کو ٹھکانے لگانا ضروری ہو گیا ہے کیونکہ نہ صرف یہ کہ میں نے اسے شناخت کر لیا تھا بلکہ شدتِ جذبات میں اس کا اظہار بھی کر دیا تھا۔"

"سکندر، تم اس لڑکی، ڈی سلوا کی موجودہ سیکرٹری کو ابھی خبردار نہیں کر سکتے؟" رابعہ پریشان ہو کے بولی۔ "تمہیں پتہ معلوم ہے اس کا؟"

"اس کا نام ہے شہلا۔ معلوم نہیں کرسچین ہے، ہندو ہے یا مسلمان۔ ماں اور ایک چھوٹے بھائی کے ساتھ گلبرگ میں رہتی ہے۔ باپ شاید مر چکا ہے یا الگ ہو گیا ہے۔" ذہن نے جیب سے کاغذ کا پرزہ نکالا جس پر دونوں پتے لکھے ہوئے تھے۔ "اگر ہم الماس یعنی اس سابقہ سیکرٹری سے بات کرنے میں کامیاب ہو گئے تو گلبرگ بھی چلے جائیں گے۔ وہاں بھی تمہیں آگے جا کے بات کرنی ہوگی۔ مجھے تو وہ دیکھتے ہی بدک جائے گی۔ رابعہ، سمجھو کہ میں بھی تمہیں آلۂ کار ہی بنا کے ساتھ لایا ہوں مگر میرے مقاصد نیک ہیں۔ اگر ڈی سلوا کی موجودہ سیکرٹری شہلا اس سے بدظن ہو گئی تو وہ ہمارا ساتھ دینے پر مجبور ہوگی اور ایسی بہت سی باتیں بتا سکے گی جو ڈی سلوا کو بے نقاب کرنے میں معاون ثابت ہوں۔ بشرطیکہ ہم اسے تحفظ کی ضمانت فراہم کر سکیں اور یقین دلا سکیں کہ ہم واقعی اس کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ میں جانتا ہوں آج تمہارا موڈ تفریح کا تھا اور خود میں بھی یہی چاہتا تھا کہ ان مسائل سے دامن چھڑا کے تمہارے ساتھ رہوں اور دوسری باتیں کروں، مگر یہ بات ایک لڑکی کی زندگی اور موت کے درمیان حائل ہے۔ اگر میں یہ کام کل پر اٹھا کے رکھتا تو شاید میری محنت رائیگاں جاتی۔ مجبوراً میں تفریح کے ساتھ اس مقصد کو شامل کر رہا ہوں۔"

"پھر تمہاری وضاحت میں معذرت کا انداز کیوں ہے؟" رابعہ نے کہا۔ "تفریح ایک زندگی کو بچانے کے مشن سے زیادہ اہم تو نہیں ہے لیکن میرا خیال ہے تمہیں پہلے یہاں آنے کے بجائے شہلا کے پاس جانا چاہیے تھا۔ فوری خطرہ تو اس کی ذات کو لاحق ہے۔ اگر تم اسے شناخت کر چکے ہو تو ڈی سلوا کو پہلے اس کی طرف سے تشویش لاحق ہوگی۔ الماس ابھی محفوظ ہے۔"

میں چلتے چلتے رک گیا۔ "کہتی تو تم ٹھیک ہو لیکن شہلا مجھے جانتی ہے۔ وہ تمہیں بھی جانتی ہے۔ اگر کسی طرح الماس خود اس سے بات کرنے پر رضامند ہو جائے تو ہماری کامیابی کے امکانات روشن ہو جاتے ہیں۔"

"مگر کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے؟" وہ میرا بازو تھام کے بولی۔ "دلائل دینا تو میرا پیشہ ہے اور تم بھی قائل کرنا جانتے ہو۔ وہ ذرا بھی سمجھدار ہوگی تو یقین کرے گی کہ اس کی پوزیشن کتنی خراب ہو گئی ہے۔ وہ ڈی سلوا کی سیکرٹری ہے، اس کے کردار کو پہچانتی ہو گی۔"

"آل رائٹ۔" میں نے کہا۔ "میں یہ چانس لیتا ہوں، لیکن میری صورت دیکھتے ہی اس نے دروازہ بند کر لیا تو؟"

"یہ اس کی بدبختی کی دلیل ہوگی۔ ہم لوٹ آئیں گے۔" رابعہ بولی۔ "ویسے تدبیر چارہ گر ہو تو ہر بند دروازہ کھل جاتا ہے۔"

رابعہ نے میری سوچ کی سمت بدل دی تھی۔ اس نے ٹھیک کہا تھا کہ خطرے میں شہلا کی زندگی ہے تو مجھے پہلے اس کی فکر کرنی چاہیے۔ ابھی الماس کی طرف ڈی سلوا کا دھیان کیسے جا سکتا ہے۔ اس کی گواہی شہلا کو قائل کرنے کے لیے ضروری تھی لیکن یہ ناممکن نہیں تھا کہ شہلا اس کے بغیر ہی قائل ہو جائے۔ بصورتِ دیگر ہم الماس کو شہلا کے رو برو کر سکتے ہیں۔ دوبارہ ٹیکسی میں بیٹھ کے گلبرگ جاتے ہوئے میں طے کر چکا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ دروازہ بند پا کے لوٹ آنے کا خیال میرے لیے ناقابلِ قبول تھا لیکن میں نے اس کا اظہار رابعہ پر نہیں کیا۔ آدھے گھنٹے بعد میں نے ٹیکسی کو سڑک پر چھوڑا اور ہم ایک "بائی لین" تک پیدل گئے۔ متمول لوگوں کی یہ بستی ویران پڑی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے یہاں انسان نہیں رہتے، کاریں رہتی ہیں جو ہر گھر کے سامنے کھڑی تھیں اور مسلسل آ جا رہی تھیں۔ بستی کے مکیں اپنے پُر تکلف، پُر آسائش گھروں کے بیڈ روم میں محوِ استراحت تھے۔ ڈائننگ روم میں انواع و اقسام کے کھانوں سے ڈنر ٹیبل سجائے بیٹھے تھے اور ڈرائنگ روم میں مہمانوں کی مدارات کر رہے تھے یا ٹیلی وژن پروگرام دیکھنے میں محو تھے۔ ایک ایک اور دو دو کنال کی شاندار کوٹھیاں مکمل۔۔۔ لاتعلقی اور غرور کے ساتھ ایک دوسرے سے اتنی ہی دور تھیں جتنی ان کے اندر رہنے والے ہمسائیگی کے احساس سے دور تھے۔ کسی فرم کے منیجر کی سیکرٹری کا اپنی قلیل تنخواہ کے ساتھ یہاں رہنا بعید از قیاس تھا لیکن شہلا کے بارے میں فرض کیا جا سکتا تھا کہ اس کے اخراجات کی عاشقانہ ذمے داری ڈی سلوا نے قبول کر رکھی ہوگی یا خود شہلا کو بھی اس ناجائز کاروبار کی آمدنی میں شریکِ کار کی حیثیت سے معقول منافع مل رہا ہوگا۔ شہلا کا گھر دس مرلے پر تھا مگر اس کے باوجود نیا اور خوبصورت تھا۔ گیٹ لائٹس آف تھیں لیکن پورچ میں روشنی تھی جہاں ہم ملیشئے سائز کی اور کچھ پرانی فیئٹ کار کھڑی تھی۔ دروازے کے باہر کوئی نیم پلیٹ نہیں تھی مگر کال بیل کا بٹن موجود تھا۔

"معلوم نہیں یہ کار کس کی ہے؟" میں نے تھوڑے سے تذبذب کے ساتھ کہا۔ "اگر مہمان موجود ہوئے تو معاملہ بگڑ جائے گا۔"

"کار شہلا کی بھی تو ہو سکتی ہے۔" رابعہ نے کہا۔ میں نے سر ہلایا اور پش بٹن پر انگلی رکھ دی۔ چند سیکنڈ بعد گیٹ

لائٹ جل گئی جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ گھنٹی کی آواز جو باہر سنائی نہیں دی تھی اندر کسی نے سُن لی ہے۔ پھر میں نے کار کے عقب سے شہلا کو نمودار ہوتے دیکھا۔ میں پیچھے ہٹ گیا اور رابعہ نے ہینڈ بیگ میں سے اپنا کارڈ نکال لیا۔ شہلا نے گیٹ کو تھوڑا سا کھول کے رابعہ کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ رابعہ نے اپنا کارڈ آگے بڑھا دیا۔

"میں سوچ رہی تھی کہ آپ کو پہلے کہاں دیکھا ہے۔" شہلا نے کارڈ کو دیکھ کر کہا۔ "آپ سکندر بخت کی وکالت کر رہی ہیں نا؟ پھر یہاں کس لیے تشریف لائی ہیں؟"

"مجھے تم سے بات کرنی تھی۔" رابعہ نے کہا۔ "اور بات ایسی تھی کہ...!"

"بات کچھ بھی ہو۔" شہلا نے کہا۔ "میں تم سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔"

"لیکن اس بات کا تعلق سکندر بخت سے نہیں، تمہاری اپنی ذات سے ہے۔ یہ تمہارے فائدے کی بات ہے۔"

"میں کوئی بات یہاں کرنے کے لیے تیار نہیں۔" شہلا نے بے رخی سے کہا۔ "نہ نفع کی نہ نقصان کی۔ تم چاہو تو کل دفتر آ سکتی ہو۔"

"یہ بات دفتر میں کرنی ہوتی تو میں تمہیں گھر سے فون کر لیتی۔" رابعہ نے کہا۔

"آئی ایم سوری۔" شہلا نے کہا اور گیٹ بند کرنا چاہا۔ اسی وقت میں سایۂ دیوار سے نکل آیا اور میں نے اس کی کوشش ناکام بنا دی۔ گیٹ کو ذرا سا دھکیلنے سے شہلا پیچھے ہٹی۔ اس نے چلانے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے اسے دبوچ لیا اور میرے ایک ہاتھ نے اس کی آواز کو حلق سے نہیں نکلنے دیا۔ میرا یہ اقدام رابعہ کے لیے بالکل غیر متوقع تھا مگر اس نے حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے گیٹ کو اندر سے بند کر دیا۔

"ہم بات کرنے آئے ہیں تو بات کر کے ہی جائیں گے مس شہلا!" میں نے کہا۔ "تم جانتی ہو میں کس قسم کا آدمی ہوں۔"

اسے یقیناً میری اور ڈی سلوا کی ملاقاتیں یاد آ گئی ہوں گی کیونکہ اس نے خود کو چھڑانے کی معمولی سی جدوجہد کے بعد مزاحمت ترک کر دی۔

"میں اس شخص کے بارے میں بات کرنے آیا ہوں جسے آج تم نے زہر دے کر قتل کر دیا ہے۔" میں نے شہلا کے منہ پر سے ہاتھ ہٹائے بغیر کہا۔ "میں نے تمہیں نرس کے لباس میں بھی پہچان لیا تھا مس شہلا! ابھی تک یہ بات کسی کو معلوم نہیں لیکن تم نے میری بات نہ سنی تو زمانہ سنے گا، پولیس سنے گی اور وہ بدمعاش بھی سنے گا جس کی خاطر تم نے عاقبت نااندیشی کا یہ ثبوت دیا ہے کیونکہ تمہیں یقین تھا کہ وہ تمہیں بچا لے گا۔ وہ تو خود کو بھی نہیں بچا سکتا مس شہلا! مجھ سے بات کر کے تم بچ سکتی ہو ورنہ وہ خود تمہیں مار ڈالے گا۔ اس لیے کہ وہ جانتا ہے کہ میں نے تمہیں شناخت کر لیا ہے۔ اگر تم اطمینان سے میری بات سننے کا اور شور نہ مچانے کا وعدہ کرو تو میں تمہیں چھوڑ سکتا ہوں ورنہ یقین کرو میں تم کو یہیں سے اٹھا کے لے جاؤں گا اور وہ سب کچھ ضرور کہہ دوں گا جو مجھے کہنا ہے۔"

شہلا نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا اور میں نے پوری احتیاط سے کام لیتے ہوئے اس پر اپنی گرفت کم کی۔ شہلا نے ایک لمبی گہری سانس لی۔ پھر اس نے سر کو ایک سرکش ادا سے جھٹک کر ہمیں پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ "تم واقعی بہادر ہو۔ افسوس یہ ہے کہ میرے گھر میں کوئی مرد نہیں ہے جو زورِ بازو سے تمہیں منہ توڑ جواب دے سکے۔ اس لیے یہ وعدہ کرو کہ بات زبان سے کرو گے، ہاتھوں سے نہیں۔"

"اس کا انحصار تمہارے رویے پر ہے۔" میں نے چلتے ہوئے کہا۔ "اگر مجھے تم سے یا کسی اور سے خطرہ محسوس ہوا تو میں اس کا سدِباب ضرور کروں گا۔" میں نے اطمینان سے ریوالور نکالا۔ الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر جیب میں رکھ لیا۔ "میرے حفاظتی اقدامات مکمل ہیں، اس لیے تم اپنی یا کسی اور کی زندگی کو داؤ پر لگانے کی حماقت نہ کرنا۔ ہم ایسے دوستانہ ماحول میں بھی بات کر سکتے ہیں کہ تمہاری ماں اور چھوٹے بھائی کو بھی پتہ نہ چلے اور تمہارے حق میں بہتر یہی ہے کہ ان کو کچھ معلوم نہ ہو ورنہ وہ خواہ مخواہ پریشان ہوں گے۔"

ریوالور دیکھتے ہی شہلا کا رنگ فق ہو گیا تھا اور خود رابعہ چلتے چلتے ٹھٹک کر رک گئی تھی۔ "ہم تمہارے دوست بن کر آئے ہیں شہلا! دشمن بن کر نہیں۔" رابعہ نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ "یقین کرو یا نہ کرو۔"

شہلا کے ساتھ ہم ایک ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے جو زیادہ بڑا تو نہیں تھا مگر خوبصورت اسبابِ آرائش اور فرنیچر سے بھرا پڑا تھا۔ "یہاں کسی کے آنے کا امکان تو نہیں ہے؟" میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"میری ماں یا بھائی جاگ رہے ہوتے تو ضرور آتے۔" شہلا مجھے گھورتے ہوئے بولی۔ "بھائی سرِشام سو جانے کا عادی ہے۔ ماں بیمار ہے۔"

"باہر سے بھی کوئی آئے گا تو تم سے پہلے ہم دیکھیں

گے کہ آنے والا ڈی سلوا تو نہیں۔" میں نے کہا۔ "تم بہت بے وقوف ہو مس شہلا! وہ یہاں آئے گا تو تمہیں قتل کرنے کے لیے کیونکہ اس کے لیے تمہاری افادیت ختم ہو چکی ہے۔ الٹا تمہارا وجود اس کے لیے باعثِ خطر ہے۔"

"ایسی باتیں کر کے تم مجھے ڈی سلوا سے بدظن نہیں کر سکتے۔" شہلا نے کھڑے کھڑے کہا۔ "اس سے حسد کرنے والے بہت ہیں اور تم تو اس کے دشمن ہو۔"

"یہ ٹھیک ہے کہ میں اس کا دشمن ہوں مگر میں تمہارا دشمن نہیں ہوں اور نہ تم دشمنی کا سبب ہو۔" میں نے کہا۔ "تم کو جذبات نے اندھا کر دیا ہے۔ اس لیے تم ڈی سلوا کا اصل چہرہ دیکھنے سے قاصر ہو۔ تمہیں اس کی محبت کے وعدوں پر یقین ہے لیکن ایسے ہی وعدے وہ پہلے بھی کئی لڑکیوں سے کر چکا ہے۔ میں تمہیں ان سب سے ملوا سکتا ہوں۔ وہ تمہیں بتائیں گی کہ ڈی سلوا نے ان کے ساتھ کیا دھوکا کیا، کس طرح ان کو سنہرے خوابوں اور میٹھی میٹھی باتوں کے جال میں گرفتار کیا اور ان کو عقل و ہوش سے اس حد تک بیگانہ کر دیا کہ وہ اس کی خاطر سب کچھ کرنے کو تیار ہو گئیں۔ پھر تمہاری طرح ان سے بھی کوئی ایسا جرم سرزد ہوا کہ ڈی سلوا نے ان کو بلیک میل کیا۔ وہ اپنے تمام وعدوں سے پھر گیا اور ان لڑکیوں کو نکال باہر کیا۔ وہ رونے دھونے کے سوا کچھ نہ کر سکیں کیونکہ وہ مجبور تھیں۔ ڈی سلوا کا آلۂ کار بن کے وہ قانون کی نگاہ میں مجرم ہو گئی تھیں۔"

"لیکن... لیکن میں نے تو کوئی جرم نہیں کیا۔" وہ بے خوفی سے بولی۔ "مجھے کوئی کیسے بلیک میل کر سکتا ہے؟"

"یہ جھوٹ تم اتنی بے باکی سے میرے سامنے تو بول سکتی ہو۔" میں نے کہا۔ "لیکن پولیس کے پاس اقبالِ جرم کرانے کے لیے صرف ہاتھ نہیں ہوتے اور وہ باتوں یا لاتوں پر ہی اکتفا نہیں کرتے، مجھے اس کا تجربہ ہو چکا ہے۔ تم تو ایک عورت ہو، تمہاری قوتِ مزاحمت تو ریت کی دیوار سے بھی زیادہ ناپائیدار ثابت ہو گی۔ وقتی طور پر تم نرس کے لباس میں ان سب کی نظروں کو دھوکا دینے میں کامیاب ہو گئی تھیں جنہوں نے تم کو پہلے نہیں دیکھا تھا لیکن تمہاری بدقسمتی کہ عین وقت پر میں پہنچ گیا اور میں نے تمہیں ارتکابِ جرم کرتے دیکھ لیا۔ تم نے اس بوڑھے گورکن کو دیے جانے والے گلوکوز میں سائنائیڈ ملا دیا تھا۔ ایک انجکشن کے ذریعے۔ بڈھا مر چکا ہے اور اس کی موت کا سبب بھی معلوم ہو چکا ہے۔ تمہارے جائے واردات سے فرار ہونے کے بعد بڈھے کی موت ایک معما بن گئی تھی اور الزام ان پر آ رہا تھا جو اس کی جان بچانے کی کوشش کر رہے تھے اور وہ یقیناً کامیاب ہو جاتے۔ یہ ڈر نہ ہوتا تو ڈی سلوا تمہیں ایسے سنگین اقدام پر مجبور نہ کرتا۔"

"یہ جھوٹ ہے۔" شہلا نے بازو کا سہارا لیا اور صوفے پر ٹک گئی۔ "میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہو گی۔"

"غلط فہمی؟" میں ہنسا۔ "پہلے تو مجھے یاد ہی نہیں آیا تھا کہ ایک نرس کی صورت مجھے جانی پہچانی کیوں لگی تھی اور جب وہ نرس پُراسرار طور پر غائب ہو گئی جس کا عملے سے کوئی تعلق نہیں تھا تو مجھے اچانک یاد آ گیا کہ نرس کے بھیس میں تم اپنا کام کر گئی ہو۔ اب تک اس کمرے میں سب کے فنگر پرنٹ لے لیے گئے ہوں گے۔ اگر ان میں تمہارے فنگر پرنٹ بھی ملے تو تم کیسے انکار کرو گی کہ تم نے اس کمرے میں قدم ہی نہیں رکھا۔ میں نے اپنے شک کا اظہار کر دیا تھا اس لیے پولیس موازنے کے لیے تمہارے فنگر پرنٹ لینے ضرور آئے گی۔"

"پولیس میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔" شہلا نے ہٹ دھرمی کے لہجے میں کہا۔ "تم ڈی سلوا کو نہیں جانتے۔"

"میں جو اسے تم نہیں جانتیں مس شہلا!" میں نے طنز اور تلخی سے کہا۔ "میرا خیال تھا کہ اب تک وہ تم کو یہ سب کچھ بتا چکا ہو گا لیکن وہ ابھی تک آیا نہیں تو اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ پورا بندوبست کر کے آئے۔ وہ کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا مس شہلا! کیا ضرورت ہے اسے اپنی سیکرٹری کے لیے بدنام ہونے کی۔ وہ اپنا اثر و رسوخ، اپنے تعلقات اور اپنی دولت تم جیسی لڑکیوں کو بچانے میں کیوں صرف کرے گا جو ایک ڈھونڈو ہزار ملتی ہیں؟ پہلے بھی ملتی رہی ہیں اور آئندہ بھی ملتی رہیں گی۔ وہ اپنا دامن بچائے گا اور اس کے لیے تمہارا منہ ہمیشہ کے لیے بند کرنے سے بھی گریز نہیں کرے گا۔"

"تم جھوٹ کہتے ہو، تم مجھے دہشت زدہ کرنے آئے ہو۔ ڈی سلوا مجھ سے محبت کرتا ہے۔ اس نے مجھ سے شادی کا وعدہ کیا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ شادی کے بعد ہم اس ملک سے ہی چلے جائیں گے۔ ڈی سلوا کو ہر جگہ بڑی اچھی ملازمت مل سکتی ہے۔" وہ ہسٹریائی مغلوب ہونے لگی تھی۔ "تمہارے یا پولیس کے کہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔"

"مجھے معلوم تھا کہ تم اعتبار نہیں کرو گی۔ اعتبار تو تمہیں اس وقت آئے گا جب ڈی سلوا خود تمہارے خلاف گواہی دے گا۔" میں نے اپنے لہجے کے طنز کو برقرار رکھا۔ "وہ

کہے گا کہ مجھے تو اس لڑکی کے کردار پر ابتدا ہی سے شبہ تھا اور میں اسے برطرف کرنے والا تھا۔ میں نہیں جانتا کہ اس نے ایک بوڑھے گورکن کو کیوں قتل کیا۔ یہ نرس کا لباس کہاں سے لائی اور اس نے سائنائیڈ کیسے حاصل کر لیا۔ میرا تو اس سے تعلق دفتری معاملات کی حد تک تھا اور اب وہ بھی نہیں۔ آپ کو اختیار ہے جیسے چاہیں تفتیش کریں۔ مس شہلا! وہ عزت دار آدمی ہے۔ اپنے اثر و رسوخ اور اپنے پیسے کی طاقت کو اپنی عزت داری کا بھرم رکھنے کے لیے استعمال کرے گا، تمہارے بچاؤ کے لیے نہیں۔ کل تمہاری جگہ کوئی اور لڑکی لے لے گی، جیسے تم سے پہلے بہت سی آئیں اور چلی گئیں اور وہ ان سب کو بھول گیا۔ اب شاید اسے کسی کا نام تک یاد نہ آتا ہوگا۔ ایسے ہی تم بھی اس کے لیے ایک داستانِ ماضی بن جاؤ گی۔ تمام عمر اپنی حسرتوں پر آنسو بہاتی رہو گی جو پوری نہ ہوئیں اور اپنی جذباتی حماقت پر احساسِ پشیمانی میں مبتلا رہو گی اور ایک جھوٹے دغاباز اور مکار آدمی سے انتقام لینے کی خواہش میں تڑپتی رہو گی مگر اس کا کچھ نہ بگاڑ سکو گی۔ مگر یہ سب کچھ بھی اس وقت ہو گا جب تمہیں جینے کی مہلت ملے۔ سب سے پہلے تو خود ڈی سلوا تمہارے وجود کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دے گا لیکن اس نے کچھ نہ کیا تب بھی قانون کے لمبے ہاتھ تمہاری گردن تک پہنچ جائیں گے اور ڈی سلوا... وہ قانون کے ساتھ ہوگا، تمہارے ساتھ پیرس یا سوئٹزرلینڈ میں ہنی مون نہیں منا رہا ہوگا۔"

میں نے نوٹ کر لیا تھا کہ شہلا کے ذہن کی مزاحمت بھی ختم ہونے لگی ہے اور جذبات پر عقل کے دلائل غالب آنے لگے ہیں۔ وہ پتھر کے مجسمے کی طرح بے حس و حرکت بیٹھی تلخ حقائق کو سمجھنے اور قبول کرنے کی بھرپور سعی کر رہی تھی اور اس کا چہرہ بالکل سپاٹ، جذبات سے عاری اور لاش کی طرح سفید پڑ گیا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہیں وہ بیہوش نہ ہو جائے۔

"کیا ثبوت ہے تمہارے پاس اس بات کا کہ... کہ جو کچھ تم نے ڈی سلوا کے بارے میں کہا ہے وہ تمہاری ذاتی دشمنی کے جذبات پر مبنی نہیں ہے؟" اس نے بمشکل تمام کہا۔ "میں کیسے مان لوں؟"

"ثبوت تو وہ لڑکیاں بھی فراہم کر سکتی ہیں جو ڈی سلوا کی بے ضمیری کا شکار ہوئیں، لیکن تمہیں انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ بہت جلد۔ شاید آج ہی رات کو وہ خود تمہیں ثبوت فراہم کرنے آئے گا۔"

اور اس وقت ایک حیرت انگیز اتفاق ہوا۔ باہر سے کسی کار کے اندر آ کر رکنے کی آواز آئی۔

"غالباً وہ آ گیا ہے۔" میں نے اٹھتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔ "اسے بالکل معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ ہم یہاں ہیں۔ اگر تم تھوڑے سے صبر و تحمل سے کام لو تو وہ خود ان سب باتوں کی تصدیق کر دے گا۔"

"تم اس ساتھ والے کمرے میں چلے جاؤ۔ خدا کے لیے جلدی کرو۔" شہلا گھبرا کے بولی۔

"یہ بات یاد رکھنا کہ ڈی سلوا کے آنے کا مقصد غلط بھی ہو سکتا ہے۔" میں نے رابعہ کے ہمراہ ساتھ والے کمرے میں غائب ہوتے ہوئے کہا۔ "لیکن ڈرنا نہیں اور بالکل نارمل نظر آنے کی کوشش کرنا۔ ہمارے ہوتے ہوئے ڈی سلوا تمہیں گزند نہیں پہنچا سکتا۔" شہلا نے اقرار میں سر ہلایا اور دروازے کی طرف بڑھی جس پر ڈی سلوا مسلسل دستک دے رہا تھا۔ وہ اسی طرح خود گیٹ کھول کر اندر پہنچ جانے کا عادی معلوم ہوتا تھا۔ جب شہلا نے دروازہ کھولا تو ہم ڈرائنگ روم سے متصل کمرے کی تاریکی میں روپوش ہو چکے تھے لیکن ڈرائنگ روم کا پورا منظر میری نظروں کے سامنے تھا۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات دوسرے حصے میں ملاحظہ فرمائیں

جاسوسی ڈائجسٹ کا منفرد و مقبول سلسلہ

شکاری

دوسرا حصّہ

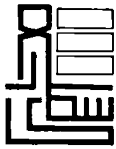

سو پیکاں تھے پیوست گلو جب چھیڑی شوق کی لے ہم نے
سو تیر ترازو تھے دل میں جب ہم نے رقص آغاز کیا

○ ○

معاشرے کے ان ناسوروں کی روداد جو گوشت و پوست سے گزر کر انسانی ہڈیوں میں اتر رہے تھے۔ ایک کفن بردوش نوجوان کی کہانی جس کے شب و روز موت کی بستی میں گزر رہے تھے۔ جلتے دن سلگتی راتیں۔ آس و یاس خوف و ہراس۔ شیریں خواب تلخ حقیقتیں

○

نئی سوچ۔ نیا رنگ، نیا لہجہ، نیا آہنگ

"کیا بات ہے؟" ڈی سلوا نے اندر آتے ہوئے کہا۔

"تم سو رہی تھیں یا رو رہی تھیں؟ یا دونوں کام ایک ساتھ کر رہی تھیں؟"

"میں... دراصل میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔" شہلا نے تھکے تھکے لہجے میں کہا اور زبردستی مسکرانے کی ناکام کوشش کی۔

"تمہاری حالت سے تو یہ لگتا ہے کہ تم برسوں کی بیمار ہو۔" ڈی سلوا بے تکلفی سے ایک صوفے پر دراز ہو گیا۔ "یا خدانخواستہ کوئی بھوت وغیرہ دیکھ لیا ہے۔"

"پریشانی تو مجھے تمہارے چہرے پر بھی نظر آ رہی ہے، خیریت تو ہے نا؟" شہلا بولی اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ کوئی ناخوشگوار صورت حال پیدا نہیں ہوئی، ورنہ وہ ڈی سلوا کے اندر قدم رکھتے ہی اس کو ہمارے بارے میں بتا دیتی تو مجھے فوراً سامنے آنا پڑتا۔ میری باتوں نے شہلا کو اس حد تک ضرور قائل کر لیا تھا کہ وہ خود ڈی سلوا کی زبان سے کچھ سننا چاہتی تھی۔

"پریشانی تو پیدا ہو گئی ہے ڈیئر!" ڈی سلوا نے جیب سے سگریٹ نکالی اور لائٹر سے جلائی۔ اس کے ماتھے پر تفکرات کی ہر شکن اس کے ذہنی انتشار کی آئینہ دار تھی۔ وہ سگریٹ کے دھوئیں سے چھلے بناتا رہا اور انہیں اوپر اٹھ کے ہوا میں بکھرتے دیکھتا رہا۔ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"پریشانی بہت بڑی ہے شہلا ڈارلنگ! اس الو کے پٹھے نے مصیبت کھڑی کر دی ہے۔"

"میں سمجھی نہیں۔" شہلا نے سب کچھ سمجھنے کے باوجود معصومیت سے کہا۔

"وہ بدمعاش سکندر بخت۔" اس نے پلٹ کر تیز لہجے میں کہا۔ "معلوم نہیں وہ ہسپتال کیسے آ پہنچا اور اس نے عین وقت پر تمہیں دیکھ لیا۔"

"میں تو اس کے آتے ہی نکل گئی تھی۔" شہلا نے گھبرا کے کہا۔ "اس کی طرف میری پشت تھی۔ اس نے میری صورت کہاں دیکھی تھی۔ اس کے علاوہ میرا لباس..."

"یہ صرف تمہاری خوش فہمی ہے۔" ڈی سلوا نے برہمی سے کہا۔ "وہ بہت چالاک شخص ہے۔ تمہیں معلوم نہیں ہوا، لیکن اس نے تمہارے چہرے کی ایک جھلک دیکھ لی اور پہچان گیا۔ زیادہ گڑبڑ اس لیے ہوئی کہ اس کمرے میں ڈاکٹروں کے ساتھ صرف دو نرسیں تھیں، تیسری کوئی نہیں تھی لیکن سکندر نے اور اس کے ساتھ آنے والے مجسٹریٹ نے اصرار کیا کہ نرسیں تین تھیں۔ تمہارے غائب ہو جانے سے معاملہ اور پُراسرار ہو گیا۔ میں سکندر بخت کو تو جھٹلا دیتا مگر اس مجسٹریٹ کو کیسے جھٹلاتا۔ اب قتل کا مقدمہ درج کر

لیا گیا ہے، جس میں ہسپتال کے عملے کے ساتھ میں اور تم بھی ملوث ہو گئے ہیں۔"

"وہ کیسے ڈی سلوا؟" شہلا نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ اب وہ اداکاری نہیں کر رہی تھی بلکہ واقعی خوفزدہ تھی۔

"وہ ایسے کہ سکندر نے براہِ راست مجھ پر شبے کا اظہار کیا۔" ڈی سلوا کمرے میں چکر لگاتا رہا۔ اس کی حرکات و سکنات سے شدید بے چینی اور اضطراب کا اظہار ہوتا تھا۔" مجھ پر وہ کیا ثابت کرے گا لیکن تمہارا نام لے کر اس نے مجھے بھی مصیبت میں ڈال دیا ہے اور تمہارے لیے بہت بڑا خطرہ پیدا کر دیا ہے اور یہ سب تمہاری تھوڑی سی بے احتیاطی کا نتیجہ ہے۔ کیا تم یہ کام جلدی ختم کر کے وہاں سے نہیں نکل سکتی تھیں؟ کیا ضرورت تھی اتنی دیر کرنے کی؟" اس کے لہجے پر جھنجھلاہٹ غالب تھی۔" دومنٹ کا کام تھا۔"

"لیکن ڈی سلوا میں سوچے سمجھے بغیر کوئی قدم کیسے اٹھاتی؟" شہلا نے کہا۔" دومنٹ کا کام بھی اتنا آسان تو نہیں تھا۔ میں مناسب موقع کے انتظار میں رہی۔"

"خاک انتظار میں رہیں۔" ڈی سلوا مشتعل ہو کے بولا۔ "اگر تمہیں موقع کا خیال ہوتا تو تم ایسے وقت میں نہ جاتیں جب وہاں پہلے سے دو نرسیں موجود تھیں۔ اگر دو کے بجائے تین کا چکر نہ ہوتا تو الزام تمہارے بجائے ان دونوں نرسوں یا دونوں ڈاکٹروں پر آجاتا مگر اب وہ شک کی بنا پر صاف بچ گئے ہیں کیونکہ ایک تیسری نرس کی موجودگی کا گواہ خود مجسٹریٹ ہے۔ ان پر زیادہ سے زیادہ فرائض میں غفلت برتنے کا یا بے پروائی کا الزام آجائے گا لیکن میں جانتا ہوں اس سے ان کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ نرسوں کی حمایت ڈاکٹر کریں گے اور ڈاکٹروں کے خلاف قتل کا الزام ثابت کرنا بہت مشکل ہے۔ پھنس جاؤ گی تم، جس کا نام سکندر نے لکھوا دیا ہے۔"

"لیکن کسی کے کہنے سے تو کوئی مجرم نہیں بن جاتا۔ قتل کے الزام کو ثابت بھی کرنا پڑتا ہے۔" شہلا نے مردہ آواز میں کہا۔

"فضول باتیں مت کرو۔" ڈی سلوا نے سگریٹ کو فرش پر ڈال کر جوتے کی ایڑی سے مسل دیا۔" ایک قانون وہ ہے جو کتابوں میں لکھا ہے۔ دوسرا قانون پولیس کا اپنا وضع کردہ ہے انہیں اختیار حاصل ہے کہ وہ جسے چاہیں شک میں پکڑ لیں، اور تفتیش کے لیے تھانے لے جائیں، خصوصاً قتل جیسے سنگین ... تمہیں معلوم ہے تھانہ کیا ہوتا ہے اور وہاں تفتیش کیسے کی جاتی ہے؟ وہاں وہ لندن یا امریکی پولیس کے افسر در سراغ رساں نہیں بیٹھے ہیں، جلاد بیٹھے ہیں جو کسی بھی

شخص سے کسی بھی جرم کا اعتراف کرا سکتے ہیں۔ تم کیا اور تمہاری اوقات کیا۔ بڑے بڑے جی دار اور پیشہ ور قسم کے بدمعاش ایک رات کا عذاب نہیں جھیل سکتے۔ تم فوراً سب کچھ تسلیم کر لو گی اور اپنے ساتھ مجھے بھی مروا دو گی۔"

"لیکن... لیکن تم نے تو... تم نے تو کہا تھا کہ پولیس کچھ نہیں کر سکتی۔" شہلا پر بری طرح دہشت سوار تھی۔" تم نے کہا تھا کہ میرے بہت تعلقات ہیں اور میں پیسے سے سب کا منہ بند کر سکتا ہوں۔"

"ہاں، لیکن اس وقت مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ تم اپنی حماقت کے باعث سکندر بخت کے سامنے آجاؤ گی۔" ڈی سلوا نے مشتعل ہو کے کہا۔" میں نے تمہیں ایک نرس کی یونیفارم فراہم کی۔ زہر لا کے دیا اور یہ کوئی آسان کام نہیں تھے اگر تم نے ذرا بھی عقل اور احتیاط سے کام لیا ہوتا...."

"میں نے اپنی طرف سے پوری احتیاط کی تھی۔" شہلا نے دونوں ہاتھوں میں منہ کو چھپا کر رونا شروع کر دیا۔" مجھے کیا معلوم تھا کہ سکندر ایک مجسٹریٹ کے ساتھ وہاں پہنچ جائے گا۔ مجھے تم پر بھروسہ تھا۔"

"دیکھو یہ رونے دھونے کا ڈرامہ مت کرو۔" ڈی سلوا چراغ پا ہو کے بولا۔" تمہاری وجہ سے میں بھی مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ اس کیس میں میرا نام بھی آجائے گا تو میری کتنی بدنامی ہو گی۔ ایف آئی آر سے نام خارج کرانا کوئی آسان کام ہے؟"

"یہ تو تمہیں پہلے سوچنا چاہیے تھا کہ معاملہ الٹا گلے بھی پڑ سکتا ہے۔" شہلا نے روتے روتے سر اٹھایا۔" مجھے بتاؤ کہ اس بڈھے گورکن نے تمہارا کیا بگاڑا تھا جو ویسے بھی لبِ گور تھا؟"

"اگر میں اسے نہ مرواتا تو خود مارا جاتا اور پہلے خود میں نے ہی کوشش کی تھی مگر وہ خبیث قبر میں دفن ہونے کے بعد بھی زندہ نکل آیا اور میرے لیے جان کا خطرہ بن گیا۔" ڈی سلوا نے کہا۔

"چنانچہ تم نے اپنی جان کا خطرہ میری جان کو منتقل کر دیا۔" شہلا نے آنسو پونچھ کر کہا۔" میں نے تمہارے لیے سب کچھ کیا اور اب تم مجھے ہی الزام دے رہے ہو کہ غلطی میں نے کی؟ مجھے یہ بتانے آئے ہو کہ تم میرے لیے کچھ نہیں کر سکتے؟ تمہیں ایف آئی آر میں سے اپنا نام خارج کرانے کی فکر ہے لیکن میرے انجام کی فکر نہیں ہے۔ نہیں ڈی سلوا! یہ قتل تمہارے ایما پر ہوا ہے۔ تم بھی برابر کے شریکِ جرم ہو۔ پھانسی کے

تختے تک تمہیں میرا ساتھ دینا ہو گا۔"

میں اور رابعہ دم سادھے یہ سب گفتگو سن رہے تھے اور اس جھری میں سے سب کچھ دیکھ رہے تھے جو نیم وا دروازے کے درمیان تھی۔ نتائج میری توقعات سے بہتر نکلے تھے اور مجھے افسوس تھا تو ایک ٹیپ ریکارڈر کے موجود نہ ہونے کا، ورنہ میں اس پورے اعترافِ جرم کو ریکارڈ کر لیتا۔ شہلا کی بات کا ردعمل فوراً ہوا۔ ایک لمحے کے لیے ڈی سلوا کا چہرہ سرخ پڑ گیا مگر اس نے اپنی حالت پر قابو پا لیا۔" دیکھو ڈیئر! یہ ہم دونوں کا مسئلہ ہے۔ ایسے حل نہیں ہو گا۔" وہ شہلا کے پاس بیٹھ کے بولا۔ اب اس کا لہجہ قطعی بدلا ہوا تھا۔ اس کا غصہ کافور ہو گیا تھا اور یہ تبدیلی بے سبب نہیں تھی۔ ڈی سلوا جانتا تھا کہ شہلا کا ایک بیان اسے تباہ کر سکتا ہے۔" تمہیں اندازہ ہونا چاہیے کہ میں کتنا بڑا خطرہ مول لے کر یہاں آیا ہوں۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں میرے آنے سے پہلے پولیس یہاں نہ پہنچ چکی ہو۔ میں نے اور دلاور نے کہہ دیا تھا کہ دفتری فائلوں میں مس شہلا کا پرانا پتہ لکھا ہوا ہے۔ حال ہی میں وہ بادامی باغ کے علاقے سے گلبرگ کی طرف کہیں چلی گئی ہے جو کوئی غلط بات بھی نہیں مگر یہ پولیس والے بڑے کائیاں لوگ ہوتے ہیں۔ کوئی پتہ نہیں وہ اسی وقت نارمل ہو جائیں۔ میری کار باہر کھڑی ہے، میں کیا جواز پیش کروں گا اس وقت یہاں اپنی موجودگی کا؟ میں تو کہہ چکا ہوں کہ مجھے مس شہلا زیدی کا پتہ معلوم نہیں ہے اور میرا ان سے تعلق بھی دفتر کی حد تک ہے۔"

"شہلا زیدی؟" رابعہ نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ "یہ تو مسلمان ہے۔"

"عشق کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔" میں نے جواباً کسی فلسفی کی طرح کہا۔" خدا کے لیے خاموش رہو۔"

"تمہارے پاس آج رات کی مہلت ہے شہلا۔" ڈی سلوا نے دوسری سگریٹ جلا کے اپنی بات جاری رکھی۔" ظاہر ہے کہ تم صبح دفتر آؤ گی تو گرفتار ہو جاؤ گی اور معاملہ سنگین ہو جائے گا۔ کیونکہ جہاں تک مجھے یقین ہے تم نے اسپتال میں اس کمرے کے اندر کہیں نہ کہیں اپنے فنگر پرنٹ ضرور چھوڑے ہوں گے۔ تم نے دستانے پہننے کی احتیاط جو نہیں کی تھی۔ اس کے علاوہ دفتر کے کچھ لوگ تمہارے نئے پتے سے ضرور واقف ہوں گے۔"

"نیا پتہ تو خود میں نے اپنی پرسنل فائل پر لکھ دیا تھا۔" شہلا نے کہا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ صبح پولیس یہاں بھی آپہنچے گی۔" ڈی سلوا نے فکرمندی سے کہا۔" دفتر کھلنے کے بعد زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے کے اندر اندر۔ تمہارے لیے اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ تم غائب ہو جاؤ۔"

"غائب ہو جاؤں؟" شہلا نے بے یقینی سے دہرایا۔ "کہاں؟ اور کیسے؟ میں اکیلی تو نہیں ہوں۔ میرے ساتھ وہ بھی ہیں جن کو میں اپنی ماں اور اپنا بھائی کہتی ہوں۔"

"مگر تم جانتی ہو کہ وہ تمہارے کچھ بھی نہیں ہیں۔" ڈی سلوا نے چڑ کر کہا۔" تمہیں ان کی فکر کیوں ہے۔ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو اور اپنی جان بچاؤ۔ وہ تمہارے والدین کے ادنیٰ ملازم تھے۔"

"میں اتنی کم ظرف اور بے ضمیر نہیں ہوں ڈی سلوا۔" شہلا نے مضبوط لہجے میں کہا۔" اس وقت جب دنیا میں میرا کوئی نہ تھا، سوائے میری جان کے دشمنوں کے جو میری جائداد ہتھیانا چاہتے تھے، تو انہی نمک خواروں نے میری جان بچائی اور مجھے زندہ رکھا۔ آج بھی جب میں اپنے پاؤں پر کھڑی ہوں اور بالغ ہو چکی ہوں، میں ان سہاروں کے بغیر نہیں رہ سکتی کیونکہ تمہارا یہ مہذب معاشرہ اکیلی عورت کو عزت سے جینے کا حق نہیں دیتا۔ انہوں نے مجھے ماں کا اور بھائی کا پیار ہی نہیں دیا تحفظ بھی فراہم کیا ہے۔ مجھے بتاؤ اگر میرے آس پاس رہنے والے شریف اور عزت دار لوگوں کو معلوم ہو جاتا کہ میں ایک نوکرانی اور اس کے لڑکے کے ساتھ اس کوٹھی میں اکیلی رہتی ہوں تو کیا وہ مجھے یہاں اسی طرح رہنے دیتے؟ کبھی نہیں۔ اب تک نہ جانے کتنے ہوس پرست ہاتھ میرے دامنِ عزت کو تار تار کرنے کے لیے بڑھ چکے ہوتے۔ مشہور کر دیا جاتا کہ میں بدکردار اور فاحشہ ہوں۔ قحبہ خانہ چلاتی ہوں اور نوکری کے نہیں عزت بیچنے جاتی ہوں اور یہ جائداد جو میرے باپ نے چھوڑی تھی حرام کی کمائی کا نتیجہ ہے حالانکہ اس کی مالک بھی میں انہی کے طفیل ہوں جن کے بارے میں تم کہہ رہے ہو کہ میں ان کو چھوڑ کے اپنی فکر کروں۔ مجھے بتاؤ کیا بعد میں پولیس ان کو پریشان نہیں کرے گی؟ محلے والے تو کہیں گے کہ یہ شہلا کی ماں ہے اور اگر میں ان سب کے ساتھ غائب ہو جاؤں تو غائب ہو کے کہاں جاؤں؟ مجھے مفرور قرار دے دیا جائے گا۔ پولیس آفس سے میری تصویر حاصل کرے گی اور ہر اخبار میں دے دے گی۔ میں کب تک چھپی رہ سکوں گی؟"

ڈی سلوا کے ضبط کا پیمانہ چھلک گیا۔" پھر تم کیا کرو گی؟ انتظار کرو گی کہ پولیس آئے اور تمہیں لے جائے؟"

"اس کے سوا میں اور کر ہی کیا سکتی ہوں۔" شہلا نے کہا۔" باقی تو تمہیں کرنا ہے جس کا تم نے وعدہ کیا تھا۔"

"میں نے تم سے ایسا کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔" ڈی سلوا نے بھڑک کر کہا۔

غیر متوقع طور پر اور اچانک شہلا کا تھپڑ ڈی سلوا کے چہرے پر پڑا۔ "ذلیل... کمینے... اتنی جلدی سارے وعدے بھول گیا؟" لیکن اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی ڈی سلوا کا بھرپور ہاتھ شہلا کے منہ پر لگا اور وہ صوفے سے نیچے جا گری۔ اس کا سر میز کے کونے سے ٹکرایا۔

"ذلیل لڑکی!" ڈی سلوا نے حقارت اور نفرت کے زہر سے بجھے لہجے میں کہا۔ "تجھے اندازہ نہیں ہے کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں نے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ میرا اپنی سیکرٹری کی نجی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔"

شہلا زخم خوردہ ناگن کی طرح اس پر حملہ آور ہوئی۔ "بدمعاش کتے! میں بھی کہہ سکتی ہوں کہ اس قتل پر تو نے مجھے مجبور کیا تھا۔ میں ساری دنیا کو چیخ چیخ کر بتا سکتی ہوں..."

ڈی سلوا نے اس کے دوسرا ہاتھ رسید کیا۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹی اور دیوار سے ٹکرائی۔ سنبھلنے کی کوشش میں اس کا ہاتھ کونے کے اونچے اسٹول پر لگا جس پر وینس کا مجسمہ بڑے وقار، اندازِ تمکنت اور بے حسی کے ساتھ استادہ تھا۔ پلک جھپکتے میں شہلا نے گرتے ہوئے مجسمے کو پکڑ لیا اور ڈی سلوا پر کھینچ مارا مگر اس کا نشانہ خطا گیا اور دیوار سے ٹکرانے والا مجسمہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گیا۔ ڈی سلوا اتنی دیر میں ریوالور نکال چکا تھا۔ "بھونکنے سے پہلے ہی میں تیری زبان ہمیشہ کے لیے بند کر دوں گا کتیا! اور پولیس میرے بیان پر یقین کرے گی کہ کسی آشنا نے تجھے رقابت میں یا انتقام کی خاطر مار ڈالا ہوگا کیونکہ تو اپنی نوکرانی کے ساتھ اکیلی رہتی تھی۔"

"بس مسٹر ڈی سلوا!" میں نے دروازے کے پیچھے سے کہا۔ "اب اپنا ریوالور نیچے پھینک دو کیونکہ تم براہِ راست میرے اشانے کی زد میں ہو۔ اگر تم نے ذرا بھی غلط حرکت کی تو میں تمہاری کھوپڑی کے پرخچے اڑا دوں گا اور یہاں سے نکل جاؤں گا۔ یہ معمہ بعد میں پولیس حل کرتی رہے گی کہ تم اپنی کار میں اکیلے یہاں کیوں آئے تھے۔ قانوناً مس شہلا کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی عزت پر حملہ آور ہونے والے کسی بھی شخص کو گولی مار دیں۔ میرے ہاتھ میں جو ریوالور ہے وہ مس شہلا زیدی کا ہی ہے۔" یہ آخری بات جھوٹ تھی مگر یہ جھوٹ ناگزیر تھا۔ ڈی سلوا میری آواز پر یوں اچھلا تھا جیسے بے خبری میں کسی نے اس کے کان کے پاس فائر کر دیا ہو اور پھر اس طرح بے حس و حرکت ہو گیا تھا، جیسے وہ آدمی نہیں پتھر کا بے جان مجسمہ ہے۔ شہلا کے گھر میں میری موجودگی کا تصور کرنا بھی اس کے لیے محال تھا۔ اسے بہت دیر تک یقین نہ آیا کہ میری آواز اور میرے الفاظ اس کے کانوں کا دھوکا نہیں ہیں۔ پھر اس نے شہلا کو مسکراتے دیکھا۔ اس مسکراہٹ میں نفرت کا جتنا زہر تھا اور جتنی حقارت تھی اس نے ڈی سلوا کو اس تمام صورتِ حال کا نئے سرے سے جائزہ لینے پر مجبور کر دیا۔ وہ اس کے سوا کیا سمجھ سکتا تھا کہ شہلا نے اس سے بے وفائی کی ہے۔ میرے ورغلانے پر یا از خود ڈی سلوا کی اصلیت کو سمجھ لینے کے بعد وہ اس کے دشمنوں سے مل گئی ہے مگر اب وہ نہ شہلا سے کوئی شکایت کر سکتا تھا اور نہ اسے کسی قسم کا الزام دے سکتا تھا۔ پہل خود اس نے کی تھی اور تقدیر کی ایک غلط چال نے صورتحال کو یک لخت اس کے خلاف کر دیا تھا۔ صیاد خود اپنے پھیلائے ہوئے جال میں گرفتار ہو گیا تھا۔ اس کے ہاتھ سے ریوالور چھوٹ گیا اور میں دروازے سے نکل کر سامنے آ گیا۔ پھر وہ ہوا جس کی مجھے ذرا بھی امید نہ تھی۔ ڈی سلوا نے انتہائی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک جست لگائی اور کھلے دروازے سے باہر نکل گیا۔ اگر مجھے ریوالور کے فائر کی آواز سے دوسروں کے متوجہ ہونے کا ڈر نہ ہوتا تو میں بلا تامل اسے گولی مار دیتا۔ میں نے اسے پکڑنے کی کوشش کی۔ چند سیکنڈ کے فرق سے وہ پہلے نکل گیا اور جاتے جاتے دروازے کو باہر سے بند کر گیا۔ میں اپنے ہی زور میں دروازے سے ٹکرایا۔ سنبھل کر اٹھنے اور کھڑکی کھول کر باہر کودنے میں مجھے مزید تیس سیکنڈ لگے ہوں گے مگر اتنی دیر میں ڈی سلوا اپنی کار کا انجن اسٹارٹ کر چکا تھا اور جب میں دوڑتا ہوا باہر نکلا تو اس کی کار کسی راکٹ کی طرح گیٹ کا رُخ کر رہی تھی۔ ایک بار پھر میں نے ریوالور اٹھایا کہ کار کے پچھلے ٹائر کو برسٹ کر دوں مگر مجبوری کے خیال سے رک گیا۔ اگر میں اپنی کوشش میں کامیاب ہو جاتا تو میرے لیے بہت سے مسائل پیدا ہو جاتے۔ میرے لیے شہلا کے گھر میں اپنی موجودگی کی وضاحت کرنا مشکل ہو جاتا اور ناجائز طور پر حاصل کردہ ریوالور سے ڈی سلوا پر گولی چلانے کی ضرورت کا جواز پیش کرنا اس سے بھی زیادہ مشکل ہوتا۔

جب میں واپس کمرے میں آیا تو رابعہ نے شہلا کو سنبھال لیا تھا جو اس جذباتی بحران سے گزر کے اپنی تمام ذہنی و جسمانی توانائی زائل کر چکی تھی اور اب اس پر ہسٹریا کا زبردست دورہ پڑا تھا۔ اس کی مٹھیاں بند تھیں اور وہ آنکھیں موندے صوفے پر لیٹی ہچکیاں لے رہی تھی اور بار بار ایک ہی بات دہرا رہی تھی۔ "میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ وہ مجھے کیا سمجھتا ہے۔"

میں نے ریوالور کو جیب میں رکھ لیا۔ "کیسی عجیب بات ہے۔ شہلا کے گھر میں اتنا ہنگامہ ہوا اور کوئی دیکھنے تک نہیں آیا۔" میں نے کہا۔ "شہلا کی ماں نے بھی نہیں دیکھا۔"

"شہلا نے کہا تھا کہ وہ بیمار ہے۔" رابعہ بولی۔ "میں دیکھتی ہوں۔"

"نہیں تم یہاں شہلا کے پاس ٹھہرو۔ میں دیکھتا ہوں۔" میں نے اندر کا رخ کرتے ہوئے کہا۔

ایک کمرہ تو وہی تھا جس میں رابعہ اور میں چھپے ہوئے تھے۔ لائٹ جلا کر دیکھنے پر مجھے دو دروازے نظر آئے۔ باتھ روم کا دروازہ باہر کھلا ہوا تھا مجھے رات کا اندھیرا ہر سو محیط دکھائی دیا۔ میں نے اسے بند کیا اور دوسرے دروازے سے ایک بیڈ روم میں داخل ہوا جو غالباً شہلا کا بیڈ روم تھا۔ خوبصورت، پُر تکلف اور حسن و آرائش کا مرقع۔ بالکل رابعہ کے کمرے کی طرح زنانہ استعمال کے سامان کی خوشبو سے بھرا ہوا۔ نسوانیت کے لطیف احساس سے معمور۔ کمرے میں صرف ایک ٹیبل لیمپ روشن تھا۔ دو میں سے ایک دروازہ غالباً باتھ روم کا تھا۔ دوسرے دروازے کے نیچے روشنی کی ایک لکیر چمک رہی تھی۔ میں نے اس دروازے کو کھولا اور ٹھٹک کر رک گیا۔ یہ بھی ایک بیڈ روم تھا مگر اس میں ایک ضعیف عورت آنکھیں کھولے یوں پڑی تھی کہ پہلی ہی نظر میں اس کا وجود زندگی کی ہر علامت سے محروم لگتا تھا۔ وہ کم سے کم ستر سال کی تھی اور ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گئی تھی۔ اس کے بال بالکل سفید اور چاندی کے تار ہو گئے تھے اور عمرِ گزشتہ کا ہر سال اس کی صورت پر ایک شکن چھوڑ گیا تھا۔ اس کا آدھا دھڑ مفلوج تھا چنانچہ وہ کسی سہارے کے بغیر اٹھ کر بیٹھ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کے بیڈ سے ذرا فاصلے پر معذوروں والی وھیل چیئر موجود تھی۔ خوف اس کی کھلی آنکھوں میں ایک سوال بن گیا تھا۔

"تم... تم کون ہو؟" وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ "میری شہلا کہاں ہے؟"

"شہلا بالکل خیریت سے ہے ماں جی!" میں نے گھٹنوں کے بل اس کے پاس جھک کر کہا۔ "میں شہلا... کے پاس کام کرتا ہوں۔"

"کیا... عدنان آگیا ہے؟" بڑھیا نے پوچھا۔ "ابھی... ابھی میں نے کچھ آوازیں سنی تھیں۔"

"عدنان کون ہے ماں جی؟ ابھی تو ڈی سلوا آیا تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"ہاں۔" میں نے اس کی کار کی آواز سنی تھی۔" وہ اطمینان کا سانس لے کر بولی۔ "میں سمجھی عدنان پھر پی کے آگیا ہے... خدا اسے ہدایت دے۔ میں اسے بددعا بھی تو نہیں دے سکتی۔ وہ میرا ایک ہی بیٹا ہے۔"

میں سکتے میں رہ گیا۔ شہلا نے مجھ سے یہ جھوٹ بھی بولا تھا کہ گھر میں صرف اس کا بھائی ہے جو سرِ شام سو جانے کا عادی ہے۔ وہ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی کہ گھر میں اس کے سوا صرف ایک معذور عورت ہے۔ وہ بھائی تھا یا نہیں تھا مگر وہ گھر کے اندر اس کی موجودگی کا نفسیاتی سہارا لینا چاہتی تھی۔ ایک معذور عورت اور اس کا بدچلن شرابی بیٹا۔ اگر وہ گھر میں موجود ہوتا تب بھی کسی کا کیا بگاڑ لیتا مگر اس نے مجھے یہ تاثر دیا تھا کہ اس کا محافظ بھائی گھر میں موجود ہے اور کسی بھی وقت اٹھ کے آسکتا ہے۔ ہر غیرت مند بھائی کی طرح وہ بہن کی آبرو کا کھوالا ہے۔ یہ تھا خوش شکل، خوش پوش اور خوش باش نظر آنے والی شہلا زیدی کی خوبصورت زندگی کا پس منظر۔ خون کے رشتے ختم ہو جانے کے بعد اس نے جذبات کے رشتوں کو استوار رکھا تھا مگر یہ رشتے بھی سُوت کے دھاگے تھے۔ ایک جھٹکے میں ٹوٹ جانے والے۔ ناقابلِ اعتماد اور جھوٹے۔ مگر اس نے انہی

کا بھرم رکھ کے زندگی سے مفاہمت کر لی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں نے خوبصورت گلرنگ اور ریشمی پردہ ہٹا کے گندی گلی کا منظر دیکھ لیا ہے جہاں غلاظت، تعفن اور پست ترین سطح پر جینے والی مخلوق کی زندگی کی تمام بدصورتی موجود ہے۔

"ماں جی!" میں نے کہا۔ "کیا عدنان کو معلوم ہے کہ شہلا اس کی بہن نہیں ہے؟"

"کون کہتا ہے شہلا اس کی بہن نہیں ہے۔" میری بات نے جیسے اس بوڑھی عورت کے زخمِ دل پر انگارہ رکھ دیا۔ "وہ میری بیٹی ہے تو عدنان کی بہن ہی ہوئی نا۔ سمجھنے کا کیا مطلب؟" میں سمجھ گیا تھا کہ زندگی کے اس راز کو شہلا نے ڈی سلوا کے سوا کسی پر افشا نہیں کیا تھا۔ وہ ڈی سلوا پر کتنا اعتماد کرتی تھی اور ڈی سلوا کے بعد یہ بات صرف مجھے اور رابعہ کو معلوم ہو گئی تھی۔

"تم... اس نے بتا دیا ہے تم کو۔ یہ... شہلا نے اچھا نہیں کیا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ کسی کو یہ بات معلوم ہو۔ اگر ممکن ہوتا تو میں شہلا کو بھی پتہ نہ چلنے دیتی۔ جب اس کے والدین گھر میں آگ لگ جانے سے مر گئے تھے تو وہ اکیلی رہ گئی تھی۔ عدنان چار سال کا تھا مگر شہلا کی عمر دس سال تھی۔ اسے سب یاد ہے حالانکہ تیرہ سال بیت چکے ہیں اس بات کو۔" اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ میں نے دل ہی دل میں اس عظیم عورت کی محبت اور مامتا کے جذبات کو سلام کیا۔ اس نے شہلا پر اپنی زندگی قربان کر دی تھی۔ اس نے اپنے بیٹے کو بھی کچھ نہیں بتایا تھا اور شاید اسی لیے عدنان کے ہاتھوں شہلا کی عزت محفوظ رہی تھی۔ سترہ سال کی عمر میں شراب کا عادی ہو جانے والا عدنان یقیناً صحبتِ بد میں تباہ ہوا تھا۔ اسے برے بھلے کی تمیز کہاں ہو گی۔ شاید وہ اس کوٹھی کو اور اس گھر کی ہر چیز کو باپ کی ملکیت سمجھتا ہوگا اور بہن کی کمائی پر اینڈتا ہوگا۔ قابلِ تعریف شہلا کا حوصلہ اور ظرف بھی تھا۔ اس نے ڈی سلوا کو صاف جواب دے کر بڑی اخلاقی جرأت کا مظاہرہ کیا تھا۔

"ماں جی!" میں نے کہا۔ "آپ کو چند دن کے لیے یہاں سے جانا ہوگا، میرے ساتھ۔"

"نہیں۔" وہ چلائی۔ "میں شہلا کو، اپنی بیٹی کو چھوڑ کے کہیں نہیں جاؤں گی۔"

"شہلا آپ کے ساتھ چلے گی۔ ہمارے ساتھ رہے گی ماں جی! یہاں کچھ بدقماش لوگ اس کی جان کے دشمن ہو رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ اس کو نقصان پہنچانے کی کوشش کریں۔"

دروازے میں رابعہ کے ساتھ شہلا نمودار ہوئی۔ رابعہ نے اتنی دیر میں اس کو خاصا سنبھال لیا تھا اور شاید اسے یقین دلانے میں کامیاب ہو گئی تھی کہ ان حالات میں اس کا یہاں رہنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔

"یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں اماں! ہم یہاں نہیں رہ سکتے۔" شہلا نے کہا۔ مایوسی اور افسردگی اس کی صورت سے بھی عیاں تھی۔

"مگر کیوں؟ آخر ہم کہاں جائیں گے؟" شہلا کی ماں نے ایک ہاتھ کے سہارے پر اٹھنا چاہا۔

اس وقت تک میں طے کر چکا تھا کہ شہلا کو اور اس کی ماں کو کہاں چھپایا جا سکتا ہے۔ رابعہ کی خادمہ کا گھر اس کے لیے موزوں ترین جگہ تھی۔

"میں نے شہلا سے کہا ہے کہ وہ ماسی کے گھر میں بالکل محفوظ رہے گی۔ رابعہ نے جیسے میرے خیالات کو پڑھ لیا۔

"میں نے بھی یہی سوچا تھا۔" میں نے کہا۔ "اب دیر کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ڈی سلوا واپس بھی آ سکتا ہے۔"

"لیکن مجھے کچھ تو بتاؤ کہ یہ دشمنی کرنے والے کون ہیں؟ کیا چاہتے ہیں؟" بوڑھی عورت نے فریادی لہجے میں کہا۔ "اگر خطرہ کی کوئی بات ہے تو پولیس کو اطلاع کیوں نہیں دیتے؟ ایسے گھر بار چھوڑ کے بھی کوئی بھاگتا ہے؟"

"یہ بہت لمبی بات ہے ماں جی!" میں نے کہا۔ "اور بہت سی باتیں ایسی ہیں جو آپ کی سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ ہم پر اعتماد کیجیے جیسے ہی حالات ٹھیک ہوئے ہم واپس آ جائیں گے۔"

"اور عدنان؟ اس کا کیا ہوگا؟ وہ کہاں جائے گا؟" شہلا کی ماں نے کہا۔

یہ مسئلہ میرے ذہن میں بھی تھا اور مجھے اندیشہ تھا کہ ماں اپنے بیٹے کو خطرات میں تنہا چھوڑ کے جانے پر رضامند نہیں ہو گی۔ اس مسئلے کا صرف ایک ہی حل تھا۔ "میں یہاں عدنان کا انتظار کروں گا۔" میں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ "اور اسے بعد میں اپنے ساتھ لے آؤں گا۔ آپ رابعہ کے ساتھ جائیں۔"

"یہ تمہاری بیوی ہے؟" شہلا کی ماں نے کہا۔

رابعہ کا چہرہ سرخ پڑ گیا لیکن اس سے پہلے کہ میں وضاحت یا تردید کرتا، شہلا نے کہا۔ "ہاں اماں! اور یہ بہت بڑی وکیل ہیں۔" پھر اس نے ہماری طرف یوں دیکھا جیسے ضرورت کے تحت بولے جانے والے اس جھوٹ کی اہمیت ہم پر واضح کرنا چاہتی ہے۔ اس نے پرانے وقتوں کی اس بوڑھی عورت کی نظروں میں ہماری عزت کم نہیں ہونے دی تھی اور ہمیں زیادہ اعتبار کے قابل بنا دیا تھا۔ اگر اسے معلوم ہوتا کہ اس گھر میں پہلی بار نظر آنے والے اجنبی مرد کے ساتھ ایک غیر شادی شدہ لڑکی آئی ہے تو ہم دونوں کا کردار اس کے اخلاقی معیار کے مطابق مشکوک ہو جاتا۔

"نئی نئی شادی ہوئی ہے کیا؟" شہلا کی ماں نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "بہت شرماتی ہے۔"

"شہلا تم ایک سوٹ کیس میں ضرورت کا تھوڑا بہت سامان لے لو۔" میں نے جلدی سے موضوع بدل دیا۔ "اگر زیورات یا نقد رقم ہے تو یہاں مت چھوڑنا اور ایسے کاغذات بھی لے لینا جو اہم ہوں۔ اپنی اسناد، چیک بک، ڈائری اور خطوط وغیرہ۔"

بیس منٹ بعد میں شہلا کی معذور ماں کو گود میں اٹھا کر شہلا کی پرانی کار کی پچھلی سیٹ پر لٹا چکا تھا۔ شہلا نے گھر کی چابیاں میرے حوالے کیں اور انجن اسٹارٹ کیا۔

"سکندر! تم اس لڑکے عدنان کے لیے کوئی پیغام چھوڑ دیتے۔" رابعہ نے کار میں بیٹھنے سے پہلے کہا۔ "مجھے تمہاری طرف سے پریشانی رہے گی۔ تم یہاں اکیلے ہو۔"

"پھر کیا ہوا۔" میں نے ہنس کے کہا۔ "عدنان کے آتے ہی میں بھی روانہ ہو جاؤں گا۔"

"اور اس سے پہلے ڈی سلوا یا اس کے آدمی آ گئے...؟"

"میں اپنی حفاظت کرنا جانتا ہوں رابعہ!" میں نے پیار سے اس کے کندھے پر تھپکی دی۔ "خالی ہاتھ بھی میں ان سے نمٹ سکتا ہوں اور میرے پاس بھرا ہوا ریوالور بھی ہے۔"

"زیادہ شیخی میں مت آؤ سکندر!" وہ بولی۔ "میں جانتی ہوں تم بڑے ہیرو ہو لیکن تم پر پہلے ہی کم آفات نہیں ہیں کہ تم کسی نئی مصیبت میں پڑو۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"بزدل تو تم نے مجھے بھی بنا دیا ہے۔ پہلے میں صرف اپنے لیے جیتا تھا اور اکیلا آدمی مرنے سے نہیں ڈرتا۔" میں نے جذباتی ہو کے کہا۔ "لیکن اب میں تمہاری خاطر زندہ رہوں گا۔ تمہیں میری خاطر کسی نئی آزمائش کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔" میں نے اسے کار میں بٹھا کے دروازہ بند کر دیا اور کار کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ میں نے گیٹ کو کھلا چھوڑ دیا اور اندر لوٹ آیا۔ ڈرائنگ روم کی لائٹس آف کر کے میں نے شہلا کے بیڈروم کی ہر لائٹ جلا دی۔ ٹیلیویژن آن کر کے اس کی آواز اتنی اونچی کر دی کہ باہر سنی جا سکے۔ نہ جانے کیوں میرا دل گواہی دیتا تھا کہ ڈی سلوا پھر آئے گا۔ اس کے لیے خطرہ پہلے سے کہیں زیادہ ہو گیا تھا جس کا فوری تدارک ضروری تھا۔ میری موجودگی میں اسے پسپائی اختیار کرنی پڑی تھی تاہم اس کے لیے یہ فرض کرنا مشکل تھا کہ میں جاتے وقت شہلا اور اس کی ماں کو بھی لے جاؤں گا۔ یہ بات یقینی تھی کہ وہ پھر آیا تو بہت زیادہ قوت کے ساتھ حملہ آور ہوگا اور مجھ ... ہوتے صرف جرأت سے ہی نہیں ہوشیاری سے بھی کام لینا ہوگا۔ میں باہر ایک تاریک گوشے میں بیٹھا بے چینی سے عدنان کی واپسی کا منتظر رہا۔ اگر وہ بے وقوف لڑکا آ جاتا تو میں اس کے ساتھ بحفاظت نکل سکتا تھا پھر مجھے ایک اور خیال آیا۔ اگر میں عدنان کے ساتھ چلا گیا اور حملہ آور بعد میں آئے تو انہیں سخت مایوسی ہو گی اور مایوسی کے ردعمل کا نتیجہ انتقامی کارروائی کی صورت میں نکل سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ شہلا کے گھر کو بھی اسی طرح تباہ و برباد کر دیں جیسے انہوں نے رابعہ کے گھر کو نیست و نابود کیا تھا۔ گھر میں ٹیلیفون ہوتا تو میں ضامن رضوی صاحب کو بتا دیتا اور وہ کوئی نہ کوئی حفاظتی بندوبست کر دیتے یا میں پولیس اسٹیشن فون کر دیتا۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو اسٹریٹ لائٹس کے اجالے میں مجھے ٹیلی فون کے تار کی مدھم سی سیاہ لکیر دکھائی دی جو ساتھ والے گھر سے ملی ہوئی تھی۔ وقت کم تھا اور سوچنے میں نہیں گنوایا جا سکتا تھا۔ درمیان کی دیوار زیادہ اونچی نہیں تھی۔ میں نے خود کو تھوڑا سا بلند کیا اور دوسری طرف جھانکا۔ گیٹ کھلا ہوا تھا، لیکن دو کنال کی اس کوٹھی کے ویران احاطے میں سوائے دو کاروں کے اور کچھ نہیں تھا۔ گھوم کر جانے میں زیادہ وقت صرف ہوتا چنانچہ میں دیوار پر سے کود گیا۔

اندر والے دروازے تک پہنچنے سے پہلے ہی میری ملاقات سولہ سترہ سال کے ایک لڑکے سے ہو گئی جو چابیاں گھماتا باہر آ رہا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں ساتھ والے گھر سے آیا ہوں اور میرا ٹیلی فون خراب ہے۔ نوجوان جلدی میں تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ ایک فون اندر کوریڈور میں رکھا ہے اور میری طرف دیکھے بغیر نکل گیا۔ حسبِ توقع یہاں رہنے والے اپنے ہمسائے کو بھی نہیں پہچانتے تھے۔ نوجوان کو یہ کہاں معلوم ہوگا کہ ساتھ والے گھر میں کتنے افراد رہتے ہیں اور فون ہے یا نہیں۔ اس نے یقین کر لیا کہ اتنے اعتماد سے اندر آ جانے والا اور حلیہ سے شریف اور معزز دکھائی دینے والا ہمسایہ ہی ہو سکتا ہے۔ ٹیلیفون کوریڈور میں دیوار پر نصب نازک سے اسٹینڈ پر رکھا ہوا تھا۔ اندر کسی کمرے میں اسٹیریو بج رہا تھا اور دھمک بتاتی تھی کہ اسپیکر سو سو واٹ کے ضرور ہیں۔ کسی اور کمرے میں کوئی ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ کوریڈور میں آویزاں فانوس کی روشنی میں دو نوکر ایک دروازے سے نکل کر دوسرے دروازے میں غائب ہو گئے لیکن کوئی میری طرف متوجہ نہ ہوا۔ میں نے اطمینان سے پولیس اسٹیشن کا نمبر ملایا اور شہلا کے گھر کا نمبر دیا۔ میں نے کہا کہ میں شہلا کا ہمسایہ بول رہا ہوں اور میں نے ابھی ابھی اس گھر میں فائرنگ کی آوازیں سنی ہیں۔ وہاں ایک مفلوج عورت اپنی بیٹی

کے ساتھ رہتی ہے۔ اگر پولیس چیک کرے تو اچھا ہے۔ مجھ سے بات کرنے والے پولیس انسپکٹر نے میرا نام پوچھا اور میں نے کہا کہ میں ایس ایس پی ضامن رضوی کا چھوٹا بھائی ہوں۔ میں نے ٹیلیفون نمبر بھی ضامن رضوی صاحب ہی کا دیا۔ اس کے بعد کس کی مجال تھی کہ تصدیق کرتا یا اس رپورٹ کو نظر انداز کرتا۔ گلبرگ میں رہنے والے یوں بھی عام لوگ نہیں ہوتے کہ ان کی شکایت پر ایکشن میں تاخیر ممکن ہوتی۔ میں ٹیلی فون کے ریسیور کو کریڈل پر رکھ کر کسی کا شکریہ ادا کیے بغیر باہر نکلا اور دیوار پھاندنے کے بجائے گیٹ سے باہر آیا۔ شہلا کے گھر کے دروازے تک پہنچنے میں مجھے مشکل سے پانچ منٹ لگے ہوں گے۔ کچھ سوچ کر میں دروازے پر ہی رک گیا۔ جب بھی کوئی کار نمودار ہوتی تھی تو ہیڈ لائٹس سے بچنے کے لیے میں گیٹ پوسٹ کے پیچھے ہو جاتا تھا۔ تقریباً دس منٹ بعد ایک کار سیدھی اندر آئی اور پورچ میں رک گئی۔ یہ ایک ٹیکسی تھی جس میں چار افراد بیٹھے تھے۔ ان میں سے ایک ڈرائیور کی جگہ انجن اسٹارٹ کیے بیٹھا رہا اور تین نیچے اتر آئے۔ ان سب نے چہرہ چھپانے کے لیے منہ پر اسکارف لپیٹ رکھے تھے اور وہ سب سیاہ رنگ کی پتلونوں پر چست سیاہ بنیانیں پہنے ہوئے تھے۔

"میرا خیال ہے وہ اندر ہی ہے۔" ڈرائیور نے باہر منہ نکال کے کہا۔ "اور جاگ رہی ہے۔ احتیاط سے کام لینا ورنہ وہ شور مچا دے گی۔ اس کے پاس ریوالور بھی ہے۔" اس کا تحکمانہ لہجہ بتاتا تھا کہ وہ ان بدمعاشوں کا لیڈر ہے۔

"فکر کی کوئی بات نہیں استاد!" ان تینوں میں سے ایک نے کہا۔

"ہم ابھی ان سب کو سمیٹ لاتے ہیں۔" دوسرے نے ہاں میں ہاں ملائی اور وہ تین مختلف سمتوں میں پھیل گئے۔ ایک سامنے والے دروازے سے اندر چلا گیا۔ باقی دو نے دائیں، بائیں جانب سے گھر کو حصار میں لینے کی کوشش کی۔ گھر کے دونوں طرف ساتھ والی کوٹھیوں کی دیواریں چند فٹ کے فاصلے پر تھیں۔ چنانچہ دونوں طرف گلیاں سی بن گئی تھیں اور آخری حصے میں دونوں طرف بیڈ روم، کچن اور اسٹور کے دروازے کھلتے تھے۔ میں دبے پاؤں بائیں طرف چلنے لگا۔ ٹیکسی میں آنے والا ایک شخص مجھ سے دس قدم آگے تھا اور میرے لیے چھپنے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ اگر وہ ایک بار بھی پلٹ کر دیکھ لیتا تو خود کو بچانے کے لیے مجھے اس پر گولی چلانی پڑتی ورنہ یہ دس قدم کا فاصلہ طے کرنے سے پہلے ہی وہ مجھے شوٹ کر دیتا چنانچہ میں بہت محتاط تھا۔ میرے اور اس کے درمیان فاصلہ کم ہوتا جا رہا تھا لیکن تیز رفتاری کے باوجود اسے میرے قدموں کی چاپ سنائی نہیں دے رہی تھی پھر میرے پیروں کے نیچے ایک خشک پتہ چرچرایا اور اس سکوت میں وہ آواز بادل کی گرج کی طرح لگی۔ ہم دونوں ایک ساتھ رکے اور اس نے بجلی کی طرح پلٹ کر فائر کیا۔ میں اس کے لیے تیار تھا پھر جسم کے خود کار دفاعی نظام نے مجھے بروقت غوطہ مار کر گولی کے راستے سے ہٹا دیا اور اسی کے ساتھ جوابی فائر پر مجبور کر دیا۔ وہ شخص گلا پھاڑ کے چلایا اور پلٹ کر پیچھے گرا۔ اسی وقت وہ دروازہ کھلا جو کچھ دیر پہلے میں نے ہی کھولا تھا۔ سیدھا اندر داخل ہو جانے والے شخص نے چیخ کر کہا۔ "یہ کیا ہے؟" اور مجھے صرف اس کا سر دکھائی دیا۔ مجھے یقین تھا کہ اس دوسرے شخص کے ہاتھ میں بھی ریوالور ضرور ہوگا اور اسے ایک لمحے کی مہلت دینا خودکشی کے مترادف ہوگا۔ میں نے پوری قوت سے جست لگائی اور اپنے حریف کو کچھ سمجھنے یا سنبھلنے کا موقع دیے بغیر باہر کھینچ لیا۔ میرے ہاتھ اس کے بالوں پر پڑے تھے۔ ایک جھٹکے میں وہ سامنے کی دیوار سے ٹکرایا۔ میں نے اس کی گردن پر کھڑی ہتھیلی کا وار کیا۔ میں اس کی گردن توڑنا نہیں چاہتا تھا لیکن عجلت میں ہاتھ سخت پڑ گیا یا اس کی گردن ایسے زاویے پر آ گئی کہ میں نے ہڈی ٹوٹنے کی آواز صاف سنی اور وہ زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ افسوس کرنے کی فرصت نہ تھی کیونکہ ابھی دو دشمن باقی تھے۔ اس میں شبہے کی کوئی گنجائش نہ تھی کہ یکے بعد دیگرے ہونے والے دو فائروں کی آواز سے وہ بھی مقابلے کے لیے دوڑ پڑے ہوں گے۔ میں کھلے دروازے کے اندر پہنچ گیا۔ کمرے میں بدستور اندھیرا تھا۔ میں پوری قوت کے ساتھ اس شخص سے ٹکرا گیا جو دوڑتا ہوا دروازے کی طرف آ رہا تھا اور غالباً یہ وہی شخص تھا جو دائیں طرف سے گھر میں گھسا تھا۔ ہم ایک ساتھ گرے۔ اس نے اندھیرے میں ایک کرسی اٹھا کے مجھ پر پھینکی جو میرے شانے پر لگی اور ریوالور میرے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر گیا۔ پھر میں نے اس شخص کو دونوں ہاتھوں سے سنبھال کر اوپر اٹھایا اور گھما کر دیوار پر دے مارا۔ شاید اس کا ریوالور تصادم کے وقت اس کی گرفت سے نکل گیا تھا ورنہ وہ کرسی پھینک کر مارنے کے بجائے مجھے گولی مار دیتا۔ اب وہ دیوار کے قریب الٹا پڑا تھا اور مجھے اس آخری آدمی کے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں جو ان کا لیڈر تھا اور جسے میں نے ٹیکسی میں ڈرائیور کی جگہ بیٹھے دیکھا تھا۔ اگر میں لائٹ جلاتا تو وہ سیدھا ادھر آ جاتا۔ میں نے اندھیرے ہی میں ہاتھوں اور پیروں کے بل چلتے ہوئے فرش پر ریوالور تلاش کیا اور کامیاب بھی رہا لیکن جو ریوالور میرے ہاتھ میں آیا وہ میرا نہیں تھا بلکہ اس دوسرے شخص کا تھا۔ میں نے اسے بھی جیب میں ڈالا اور اپنا ریوالور ڈھونڈتا رہا۔ اس پر میرے فنگر پرنٹ تھے اور میں اسے یہاں چھوڑنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ چوتھا آدمی اپنے ساتھیوں کو پکارتا آگے بڑھ رہا تھا اور جواب نہ ملنے پر انہیں گالیاں دے رہا تھا۔ پھر اس کا سایہ دروازے کے فریم میں نمودار ہوا اور میں جہاں تھا وہیں رک گیا۔ کمرے کے اسباب کے درمیان میرے وجود کا پتہ نہیں چلتا تھا لیکن خفیف سی حرکت بھی میری موجودگی کی خبر دے سکتی تھی اور وہ وہیں کھڑے کھڑے میرا نشانہ لے کر مجھے کتے کی موت مار سکتا تھا۔ وہ چند سیکنڈ تک بے حس و حرکت کھڑا اندھیرے میں کچھ دیکھنے کی جدوجہد کرتا رہا۔ پھر شاید اسے یقین آ گیا کہ اس کے ساتھیوں میں سے کمرے میں کوئی نہیں ہے۔ میں نے اسے پلٹ کر جاتے ہوئے دیکھا۔ چند سیکنڈ بعد مجھے اپنا ریوالور مل گیا اور میں تیزی سے دروازے کی طرف لپکا۔ اسی وقت میرے کانوں میں ٹیکسی کے انجن کے غرانے کی آواز آئی۔ وہ میری توقعات سے زیادہ چالاک ثابت ہوا تھا۔ اپنے کسی ساتھی کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ وہ کسی نادیدہ دشمن کے ہاتھوں مارے جا چکے ہیں یا گرفتار ہو چکے ہیں۔ اس نے مقابلے کا ارادہ ترک کر کے فرار ہو جانا بہتر سمجھا تھا۔ میں دوڑتا ہوا باہر آیا تو ٹیکسی دروازے سے نکل رہی تھی۔ میں نے فائر کیا۔ گولی ٹائر میں لگنے کی بجائے ٹیکسی کے پچھلے شیشے پر لگی۔ شیشہ بکھر گیا لیکن ٹیکسی غائب ہو گئی۔ میں نے اس کا نمبر نوٹ کر لیا تھا صرف اس لیے کہ ٹیکسی میں سے کسی کے فنگر پرنٹ مل سکتے تھے ورنہ میں جانتا تھا کہ ٹیکسی چوری کی ہوگی اور پولیس کو ایک دو روز بعد کہیں نہ کہیں لاوارث کھڑی ہوئی مل جائے گی۔ میں ابھی ریوالور ہاتھ میں لیے کھڑا واپس اندر جانے اور گھر میں پڑے ہوئے تین افراد کی جامہ تلاشی لینے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ میں نے پولیس کی ایک جیپ کو دروازے پر رکتے دیکھا۔ تین پولیس والے رائفلیں اٹھائے اطمینان سے اترے اور دروازے سے اندر کی طرف آنے لگے۔ ذرا سی دیر کے لیے میں تذبذب کا شکار ہوا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں سامنے جا کر کہہ سکتا تھا کہ فون میں نے کیا تھا۔ میری رپورٹ درست ثابت ہو چکی تھی لیکن شہادت اور بیان سے میں نئے چکروں میں پڑ جاتا اور مجھے رابعہ کی بات یاد تھی جو اس نے رخصت ہوتے وقت کہی تھی کہ مجھ پر پہلے ہی کم آفات نہیں ہیں چنانچہ میں نے تمام واقعات سے بے تعلق رہنا بہتر سمجھا اور اس سے پہلے کہ پولیس کی نگاہ مجھ پر پڑتی پر اسی کوٹھی میں کود گیا جہاں سے میں نے فون کیا تھا۔ دو کنال کے رقبے کی وجہ سے یہ کوٹھی شہلا کے گھر سے کافی دور تھی۔ درمیان میں باغ کا وسیع علاقہ حائل تھا۔ اس کے علاوہ کوٹھی کے رہنے والے اپنے اپنے کمروں میں اسٹریو اور ٹی وی لگائے بیٹھے تھے۔ ان کے کانوں تک فائرنگ کی آواز پہنچی بھی ہوگی تو انہوں نے طے کر لیا ہوگا کہ یہ کسی کار کے بیک فائر کی آواز ہے۔ یوں بھی اپنی تفریح چھوڑ کے ایسی باتوں پر توجہ دینے کی فرصت یا ضرورت کسے ہوتی ہے۔

میں اطمینان سے چلتا ہوا دوسری بار گیٹ سے نکلا اور مخالف سمت میں چل دیا تقریباً سو گز چلنے کے بعد مجھے وہ ٹیکسی سڑک کے ایک کنارے پر کھڑی ہوئی نظر آئی جس کا پچھلا شیشہ گولی سے ٹوٹ گیا تھا اور ٹوٹے ہوئے شیشے کا خلا شفاف جلد پر زخم کے بدنما داغ کی طرح لگتا تھا۔ ٹیکسی کو یہاں تک لانے والا اسے چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہو گیا تھا کیونکہ اپنی موجودہ حالت میں یہ ٹیکسی پولیس کو فوراً متوجہ کر لیتی۔ قریب سے دیکھنے پر مجھے فٹ بورڈ کے پاس خون کے قطرے نظر آتے۔ میں نے رومال نکالا اور اس سے ہینڈل کو تھام کر دروازہ کھولا۔ خون کے داغ سیٹ کی پشت پر بھی تھے جس سے میں نے اندازہ کیا کہ میری گولی شیشے سے گزرنے کے بعد ڈرائیور کے شانے میں دائیں طرف لگی ہوگی اور اس کے لیے ڈرائیونگ کرنا بھی مشکل ہو گیا ہوگا۔ میں نے دروازہ پھر بند کیا اور روانہ ہو گیا۔

ایک ٹیکسی نے مجھے صدر بازار میں اتارا تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ سڑک سے گلی میں داخل ہو کے میں نے ماسی کے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ خود ماسی نے کھولا اور ایک طرف ہو گئی۔ دو کمروں کا یہ چھوٹا سا غریب خانہ، ان کوٹھیوں سے زمین اور آسمان کے فرق کا نمونہ پیش کرتا تھا جن کے رہنے والے اس وقت یہاں پناہ گیر تھے۔ رابعہ کی خادمہ یعنی ماسی کے لیے اپنی چھوٹی بی بی کا آنا اور خدمت کا موقع فراہم کرنا ایک سعادت سے کم نہ تھا اور اپنی حیثیت کے مطابق وہ میزبانی کے سارے آداب نبھانے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی۔ اس نے شہلا کی ماں کو ایک بستر پر نئی چادر بچھا کر لٹا دیا تھا اور اب کھانے کے اہتمام میں لگی ہوئی تھی۔ بھوک ہم میں سے کسی کو بھی نہیں تھی۔ میرے نہ آنے سے رابعہ اور شہلا دونوں ہی پریشان تھیں مگر ان کے لیے عدنان کی ماں کو مطمئن رکھنا زیادہ مشکل مسئلہ بنا ہوا تھا۔ وہ بہت کچھ پوچھ رہی تھی جس کا جواب نہ رابعہ دے سکی تھی اور نہ شہلا۔ میں نے طے کیا کہ اس وقت تمام واقعات کو گول کر کے ایک جھوٹ سے سب کو مطمئن کرنا مصلحت کے تقاضوں کے عین مطابق ہوگا۔

"اتنی دیر کیوں کی تم نے؟" وہ مجھے دیکھتے ہی بولی۔ "عدنان کیوں نہیں ہے تمہارے ساتھ؟"

"پریشانی کی کوئی بات نہیں۔" میں نے مسکرا کے پرسکون لہجے میں کہا۔ "عدنان آیا تھا اور میں نے اسے بتادیا تھا کہ تمہاری ماں اور بہن ایک ضرورت کے تحت میرے گھر چلی گئی ہیں اور شاید چند روز باہر ہی رہیں گی لیکن اس نے میرے ساتھ آنے کے بجائے اپنے کسی دوست کے گھر جانا پسند کیا۔"

شہلا کی ماں کے چہرے پر اطمینان کے آثار نظر آئے۔ "تم نے اچھا کیا کہ اسے زیادہ کچھ نہیں بتایا۔"

میں نے اس بوڑھی عورت کو تو مطمئن کر دیا تھا لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ میرے جواب نے رابعہ اور شہلا کو شک میں ڈال دیا ہے۔ کچھ دیر بعد جب ہم کھانے کے رسمی تکلف سے فارغ ہو گئے تو شہلا نے سوٹ کیس میں سے دوائیں نکال کر ماں کو دیں۔ غالباً ان میں کوئی خواب آور دوا بھی تھی کہ بیس منٹ بعد وہ مفلوج عورت سو گئی۔ میں نے شہلا اور رابعہ کو دوسرے کمرے میں آنے کا اشارہ کیا۔ چونکہ ماسی وہیں بیٹھی چائے بنانے میں مصروف تھی پھر بھی میں نے انگریزی میں بات کی، اور ان دونوں کو وہ سب واقعات سنا دیے جو ان کی روانگی کے بعد پیش آئے تھے۔

"اب ایک بات اچھی طرح سمجھ لو۔" میں نے کہا۔ "شہلا بی بی تم کسی کے سامنے یہ ذکر نہیں کرو گی کہ میں اور رابعہ تمہارے گھر آئے تھے اور ہمارے درمیان کیا باتیں ہوئی تھیں۔ تمہیں ڈی سلوا کے آنے اور اس سے ہونے والی گفتگو کا حوالہ دینے کی ضرورت بھی نہیں۔ تم یہاں خاموشی سے گمنامی میں رہو۔ پولیس خود یہ مفروضہ قائم کرے گی کہ تمہیں اغوا کر لیا گیا ہے کیونکہ ان کو پہلے سے فائرنگ کی رپورٹ مل گئی تھی۔ وہاں ایک آدمی تو یقیناً مر گیا۔ دوسرے کے بارے میں مجھے معلوم نہیں لیکن تیسرا صرف بے ہوش ہوا۔ پولیس اپنے طور پر تفتیش کر کے جو معلوم کرنا چاہے گی معلوم کرے گی اس سے اصل پریشانی ڈی سلوا کو ہو گی جس نے وہ آدمی بھیجے تھے اور دیکھنا یہ ہے کہ اب وہ کیا کرتا ہے... اور تم رابعہ بی بی!" میں نے رابعہ سے مخاطب ہو کے کہا۔ "تم آج رات یہیں رہو گی۔"

"لیکن اس سے رضوی صاحب کو شک نہیں ہو گا؟" رابعہ بولی۔

"شک کس بات کا؟ میں اور تم ایک ساتھ نکلے تھے۔ تم نے ایک نظر اپنے گھر کو دیکھا اور ہم کچھ دیر وہاں رک کر اس کی تعمیر نو کے مسائل پر بات کرتے رہے۔ پھر کھانا کھانے چلے گئے۔ کھانا ہم نے لارڈز میں کھایا۔ تم نے کھانے کے بعد خواہش ظاہر کی کہ ماسی سے ملنا ہے اور نو بجے میں تمہیں یہاں لے آیا جہاں ماسی نے اصرار کر کے تمہیں روک لیا اور میں فلم دیکھنے چلا گیا۔ معلوم ہے اس وقت رات کے ساڑھے بارہ بجے ہیں۔ رضوی صاحب یقیناً پریشان ہوں گے اور ہم اس وقت اکٹھے پہنچے تو خواہ کہانی کچھ بھی سنائیں وہ ہمارے آدھی رات تک باہر پھرنے کو سخت معیوب سمجھیں گے اور ناراض بھی ہوں گے۔ اس میں کوئی بری بات نہیں کہ تم رات کو ماسی کے گھر رہیں یا میں فلم کا آخری شو دیکھنے چلا گیا۔ کل کی کل دیکھی جائے گی۔"

"لیکن عدنان کا کیا بنے گا؟" شہلا نے کھوکھلی آواز میں کہا۔

"وہ تو آتے ہی پولیس کے جال میں پھنس جائے گا۔"

"اگر وہ پہلے سے جائے واردات پر موجود ہوتا تو یقیناً مشکل میں پڑ جاتا۔" میں نے کہا۔ "لیکن وہ پولیس کی موجودگی میں آئے گا تو اس کی بے خبری ہی اس کی بے گناہی کا ثبوت بن جائے گی۔ اس کے علاوہ کہیں نہ کہیں اس کی موجودگی کے گواہ بھی ہوں گے۔ خواہ وہ گواہ کچھ بھی کر رہے ہوں۔ یہ تو بتا سکیں گے کہ عدنان کب سے کب تک ان کے ساتھ تھا۔"

"وہ... وہ بے راہ رو اور نو عمر ہی نہیں، احمق بھی ہے۔" شہلا نے افسردہ لہجے میں کہا۔

"مس شہلا! تم اس کو واقعی بھائیوں کی طرح چاہتی ہو، ان تمام خرابیوں کے باوجود جو اس کی ذات سے منسوب ہیں؟" میں نے کہا۔

"آپ نہیں جانتے اسے سکندر صاحب! وہ برا ہے تو دنیا کے لیے۔ میرے لیے وہ بالکل ویسا ہی بھائی ہے جیسے دنیا میں بہنوں کے بھائی ہوتے ہیں۔ وہ دل کا برا اچھا ہے لیکن یہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے کہ قدم بہت جلد بھٹک جاتے ہیں اور جو ایک بار غلط راستوں پر چل نکلیں وہ اس وقت تک صراطِ مستقیم کی طرف نہیں لوٹتے جب تک انہیں کوئی تلخ تجربہ نہ ہو جائے۔ اور... اور ان کے اعمال کی سزا اس دنیا ہی میں نہ ملے۔ میں اس دن سے ڈرتی ہوں..." وہ یکلخت چپ ہو گئی۔

"کس دن سے؟" میں نے کہا۔ "جب زندگی اسے کوئی سبق سکھائے گی؟ اور وہ شرافت کی راہ اختیار کرے گا؟"

"یہ سزا بہت سخت بھی تو ہو سکتی ہے۔" وہ مجھ سے نظر ملائے بغیر بولی۔

ماسی نے ہمارے درمیان ابلتی چائے رکھ دی۔

"خدا سے نیکی کی توقع رکھو۔" میں نے شہلا سے کہا۔ "وہ جو کچھ کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔ آج بھی ہم تمہاری طرف آنے کے بجائے الماس کی طرف جانے والے تھے۔ الماس پہلے ڈی سلوا کی سیکرٹری تھی۔ ہم چاہتے تھے کہ اسے گواہ بنا کر لائیں تاکہ تم کو ہماری بات کا اعتبار آجائے مگر عین وقت پر انہوں نے مجھے روک لیا اور کہا پہلے شہلا کی فکر کرنی چاہیے اور یہ خدا کی مصلحت نہیں تھی تو کیا تھا کہ ہم الماس کے دروازے تک پہنچ کے لوٹ آئے۔ یہ اندازہ تم خود بھی کر سکتی ہو کہ ہم نہ آتے تو کیا ہوتا۔"

"آپ دونوں نے مجھے تباہی کی دلدل سے نکال لیا۔ میں اس احسان کا بدلا تمام عمر کیسے ادا کروں گی کہ ہر قسم کا خطرہ مول لے کر بھی آپ نے محض انسانی ہمدردی کی بنیاد پر مجھے ڈی سلوا کا اصلی چہرہ دکھا دیا۔" شہلا نے جذباتی ہو کے کہا۔

"اگر برا نہ مانو تو ایک بات پوچھوں؟" میں نے کہا۔ "تمہارے بارے میں نام سے مذہب کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ اب مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ تم شہلا زیدی ہو۔ تم نے ڈی سلوا کے وعدوں پر کیسے اعتبار کر لیا۔ میرا مطلب ہے...؟"

"اس نے ایک وعدہ یہ بھی کیا تھا کہ وہ میری خاطر اپنا مذہب بدل لے گا۔" شہلا نے نظر جھکا کے کہا۔

"چلو اب بھول جاؤ ان سب باتوں اور وعدوں کو۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "یہی تجربات تو جینے کا سلیقہ سکھاتے ہیں۔"

جب میں اجازت لے کر رخصت ہوا تو ماسی اس مسئلے پر سخت پریشان اور شرمندہ تھی کہ وہ اپنے معزز مہمانوں کے لیے سونے کا کیا انتظام کرے۔ گھر میں صرف ایک ہی چارپائی تھی اور اتنی رات گئے پاس پڑوس کے کسی گھر سے چارپائی مانگنا مشکل تھا۔ رابعہ اور شہلا نے بڑی مشکل سے اسے قائل کیا کہ وہ ایک رات فرش پر بستر بچھا کے بھی سو سکتی ہیں اور اس میں تکلیف کی کوئی بات نہیں۔ میں باہر نکلا تو سڑک پر ویرانی کے سوا کچھ نہ تھا۔ تمام دکانیں بند ہو چکی تھیں گھروں کے ہر دریچے کی ہر روشنی گل ہو گئی تھی۔ دنیا سکون کی گہری نیند میں تھی۔ سڑک پر صرف رات کے پہریدار نظر آرہے تھے اور میرا خیال تھا کہ اب گھر تک دو میل کا فاصلہ مجھے پیدل ہی طے کرنا ہو گا لیکن آرام باغ بازار کی طرف سے ایک رکشا کی آواز آئی۔ اتفاق سے رکشا خالی تھا اور میرے اشارے پر ڈرائیور نے رکنے کی زحمت بھی گوارا کر لی۔ تاہم مجھے منزل تک پہنچانے کا معاوضہ اس نے دس روپے طلب کیا اور میرے احتجاج پر کہ مشکل سے دو میل جانے کا وہ دگنا کرایہ لے تب بھی کم بنتا ہے، اس نے کسی فلسفی کی طرح ارشاد کیا کہ وقت... دولت ہے اور آدمی جو کچھ کرتا ہے، اپنے آرام کی خاطر کرتا ہے۔ "اگر مجھے پیسہ بچانا ہے تو میں اسی طرح چلتا رہوں، دس منٹ کے بجائے پون گھنٹے میں پہنچ ہی جاؤں گا بشرطیکہ مجھے راستے میں پولیس نے آوارہ گرد سمجھ کے بند نہ کیا اور پاگل کتے نے نہ کاٹا۔"

اس بات تونی شخص کے دلائل میں بڑا وزن تھا مگر وہ خود ان دلائل سے زیادہ وزنی تھا چنانچہ میں رکشا میں بیٹھ گیا۔ رضوی صاحب کے گھر کے دروازے پر اتر کر میں نے کہا۔ "اس وقت میں نے تمہاری بات کا جواب اس لیے نہیں دیا تھا کہ میں مجبور تھا، معذور نہیں۔ میں پیدل چل سکتا ہوں مسلسل دس میل، مگر میں آج واقعی بہت تھکا ہوا تھا۔ اب یہ بتاؤ کہ تم اپنے فلسفے کے مطابق وقت بچاؤ گے یا پیسہ؟ کیونکہ یہ دروازہ ایس پی ضامن رضوی کے گھر کا ہے۔" پھر میں نے باری باری دونوں جیبوں سے ریوالور نکالے۔ "میرے پاس دینے کے لیے یہ کرایہ بھی ہے چنانچہ یہاں تم مجبور ہو۔"

رکشا ڈرائیور کی حالت غیر ہو گئی۔ اس کے حلق سے "حضور، حضور..." کے سوا کچھ نہ نکلا۔ میں نے اس کے ہاتھ پر دس کا نوٹ رکھا اور اسے دفع ہو جانے کو کہا۔ "میں صرف اپنا وعدہ پورا کر رہا ہوں ورنہ جیسے تم لوگوں کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہو ایسے ہی میں تم کو وہ سبق دے سکتا تھا جو تمہیں عمر بھر یاد رہتا۔"

وہ سلام کر کے بری طرح بھاگا اور میں اتنی خونریزی اور پریشانی کے واقعات سے بھرپور شام کے بعد اس چھوٹے سے لطیفے پر مسکراتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ رضوی صاحب واقعی پریشان تھے۔ میں نے ان کو مطمئن کیا اور اپنے کوارٹر کی طرف چلا گیا جہاں محسن میرے انتظار میں سگریٹ پھونک رہا تھا۔

"کہاں مر گیا تھا تو؟" وہ بولا۔ "اپنے ساتھ رابعہ کو کیوں لے گیا تھا؟"

"یہ بہت لمبی کہانی ہے۔ جب میں گیا تھا تو جناب گھوڑے بیچ کر سو رہے تھے۔ اب مجھے اجازت ہو کہ باقی ماندہ گھوڑے گدھے بیچ کر سو جاؤں کیونکہ میں سخت تھکا ہوا ہوں۔ صبح بشرطِ زندگی پوری بات عرض کر دوں گا۔" میں نے بستر پر گرتے ہوئے کہا۔

"صبح میں پنڈی جا رہا ہوں۔" وہ بولا۔ "نادر شاہی حکم جاری ہوا ہے کہ فوراً گھر آجاؤ، ورنہ ہم پاپوش لے کر حاضر ہوتے ہیں۔"

میں اٹھ بیٹھا۔ "یہ... یہ اسی چراغ الدین کی کارستانی ہے؟"

"ہاں۔ اس بدمعاش نے فون پر میری ماں سے بات کی اور بہت نمک مرچ لگا کے بتایا کہ کس طرح میں تمہارے ساتھ گیا اور اس کو قتل کی دھمکی دی۔ سارا الزام اس نے تم پر عائد کیا ہے کہ میں نے تمہارے بہکانے پر یہ حرکت کی۔ ڈیڈی تو اس سے کہتے کہ میاں میرا بیٹا عاقل و بالغ ہے کوئی بچہ نہیں کہ بہکانے

سے بہک جاتے۔ لیکن ممی کو تم جانتے ہو۔ اس وقت وہ چراغ دین کی حمایت کرنے پہ تلی ہوئی ہیں اور تم نے ثابت کر دیا ہے کہ تم دنیا کے سب سے کمینے آدمی ہو۔ انہوں نے یہاں انکل رضوی کو فون کیا اور مجھ سے تو بات نہیں ہوئی مگر رضوی صاحب سے انہوں نے سب کچھ کہہ دیا۔ یہ بھی کہ وہ لڑکی رابعہ کچھ اچھے کردار کی معلوم نہیں ہوتی۔ پتہ نہیں رضوی صاحب نے اس کا کیا جواب دیا۔ میرے بارے میں ممی نے کہا کہ اسے سکندر تباہ کر رہا ہے، کیا وہ اس کے ساتھ پھانسی چڑھے گا دوستی میں؟ اسے فوراً گھر بھیج دیا جائے۔“

”آئی سی۔“ میں نے غور فرمانے کے بعد کہا۔ اب میری نیند پھر اڑ گئی تھی چنانچہ میں نے سگریٹ جلا لی۔ ”اور تو نے کیا فیصلہ کیا ہے؟“

”بتا تو چکا ہوں کہ صبح گھر جا رہا ہوں۔“ محسن بولا۔ کچھ دیر میرے اترے ہوئے مایوس چہرے کو دیکھتا رہا اور پھر مسکرایا۔ ”لیکن میں کل ہی واپس بھی آجاؤں گا۔ مجھے دو یا تین باتیں لگی لپٹی رکھے بغیر کہنی ہیں۔ ایک یہ کہ فوزیہ کی شادی میرے جیتے جی چراغ دین سے نہیں ہو سکتی۔ دوسری یہ کہ میں سکندر بخت کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا۔ اس کے بعد خواہ مجھے عاق کر دیا جائے، ناخلف اور نافرمان قرار دے کر۔ یا گھر چھوڑنا پڑے، میں اپنے فیصلے پر قائم رہوں گا۔ مجھے معلوم ہے ممی چیخ پکار مچائیں گی۔ طعنے اور کوسنے دیں گی اور شاید مر جانے کی دھمکی بھی دیں لیکن ڈیڈی زیادہ معقول رویہ اختیار کریں گے۔ وہ نرم مزاج، جمہوریت پسند اور اصول پرست آدمی ہیں۔ بے شک بیوی سے دبتے ہیں مگر اتنے بھی نہیں کہ مجھے عاق نامہ تھما دیں۔ وہ زبردستی نہیں کریں گے۔ نہ فوزیہ کے معاملے میں اور نہ تیرے معاملے میں۔ اس لیے مجھے امید ہے کل شام یا رات تک میں پھر حاضر ہو جاؤں گا ورنہ پرسوں تو یقینی ہے۔“

اس کے بعد میرے لیے وہ سب واقعات دہرانا ضروری ہو گیا جو شہلا کی کوٹھی میں پیش آئے تھے۔ اس نے بے حد اطمینان کا اظہار کیا اور مجھے مشورہ دیا کہ شہلا کو چھپائے رکھنے کے لیے احتیاط سے کام لوں۔ خود ادھر نہ جاؤں تاکہ کوئی بے خبری میں میرا تعاقب کرتا ہوا اس ٹھکانے تک نہ پہنچ جائے اور رابطے کے لیے ماسی کی خدمات سے استفادہ کروں۔ اس کا مشورہ معقول تھا اور احتیاط پسندی کا تقاضا بھی یہی تھا۔ میں نے محتاط رہنے کا وعدہ کیا اور سو گیا۔ صبح میری آنکھ ذرا دیر سے کھلی۔ میں نے گھڑی دیکھی تو ساڑھے دس بج رہے تھے۔ محسن جا چکا تھا اور میں کئی دن کی تھکن دور کر کے اب بالکل تازہ دم تھا۔

میں غسل کر رہا تھا کہ رابعہ آ پہنچی۔

”ہیلو۔“ میں نے باتھ روم میں سے کہا۔ ”گڈ مارننگ۔ آپ بیڈ روم کو ڈرائنگ روم سمجھ کے تشریف رکھیں بلکہ بہتر ہوگا کچن میں جا کے چائے بنانے کا عملی تجربہ حاصل کریں۔“

وہ ہنسی۔ ”مسٹر سکندر اعظم! شرط یہ ہے کہ وہ تجرباتی چائے آپ کو بھی پینی پڑے گی خندہ پیشانی سے۔“

”خندہ پیشانی سے ہم حقے کا پانی بھی پی سکتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”بشرطیکہ آپ کے دست عنایت سے مسکراہٹ کے ساتھ پیش کیا جائے۔“

میں باتھ روم سے نکلا تو رابعہ باورچی خانے سے برآمد ہوئی۔ وہ خود تو ماسی کے گھر سے ناشتہ کر کے آئی تھی مگر میرا بھوک سے برا حال تھا۔ میں نے اسے رضوی صاحب کے گھر سے کھانے کی کوئی چیز لانے بھیج دیا اور خود وہ اخبار دیکھنے لگا جو رابعہ اپنے ساتھ لائی تھی۔ چونکہ اخبار والوں کو قبرستان پہنچنے کا موقع نہیں ملا تھا اس لیے میرے والد کی لاش کے غائب ہونے کی خبر کہیں نہیں تھی۔ صرف ایک اخبار کا رپورٹر گھومتا پھرتا ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ جا پہنچا تھا اور اس نے گورکن کی موت کی خبر چھاپ دی تھی۔ گورکن کے لڑکے نے اسے بتایا تھا کہ اس کا باپ کس طرح قبر سے زندہ برآمد ہوا تھا اور کس طرح ہسپتال میں مر گیا تھا۔ پھر اس نے ڈاکٹر سے انٹرویو لیا تھا اور قتل کی بقیہ تفصیلات حاصل کر لی تھیں۔ مجھے امید تھی کہ اگلے شمارے میں وہ اس سنسنی خیز کہانی سے متعلق دیگر حقائق کو بھی بے نقاب کرے گا۔ دوسری زیادہ اہم خبر شہلا کے گھر میں پیش آنے والے واقعات کے بارے میں تھی۔ جن میں سے دو افراد مارے گئے تھے۔ ایک کی گردن ٹوٹ گئی تھی اور دوسرے کے سر میں گولی لگی تھی مگر تیسرا کو زندہ مل گیا تھا لیکن وہ ہسپتال میں بے ہوش پڑا تھا اور پولیس اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ ابھی تک کسی نے ڈی سلوا کی سیکرٹری مس شہلا زیدی کا نام نہیں لکھا تھا اور ایک دن پہلے ہونے والے گورکن کی مبینہ قاتل نرس کی مس شہلا سے مشابہت کا کوئی حوالہ نہیں دیا تھا لیکن میں جانتا تھا یہ بات چھپی نہیں رہ سکتی۔ مجھے ڈی سلوا کا خیال آیا۔ نہ جانے یہ خبر پڑھ کے اس کی کیا حالت ہوئی ہوگی۔ وہ ان کرائے کے بدمعاشوں کی موت کے بعد زیادہ مشتعل ہوگا یا محتاط ہو جائے گا۔

رابعہ ایک ٹرے میں بہت سی چیزیں رکھ کے لے آئی اور میرے سامنے بیٹھ گئی۔ اس وقت میں نے صفحہ پلٹا اور میری نظر نے ایک چھوٹی سی مگر اہم خبر پڑھ لی۔ کسی جگہ جوا کھیلتے ہوئے ایک شخص ہلاک اور ایک زخمی ہو گیا۔ جھگڑے میں چار افراد

ملوث تھے۔ پولیس کو دو گرفتار ہونے والے جواریوں سے معلوم ہوا تھا کہ مرنے والا ایک بدقماش نوجوان تھا اور اس کا نام عدنان تھا۔ نوالہ میرے حلق میں اٹک گیا۔ عدنان ایسا نام نہیں تھا جو بہت عام ہو۔ میں نے وہ خبر رابعہ کو دکھائی۔

”اب کیا ہوگا؟“ رابعہ نے پریشان ہو کے کہا۔ ”اس کی ماں تو مر جائے گی۔“

”میرا خیال ہے ابھی اسے کچھ نہ بتایا جائے۔“ میں نے چائے ختم کرتے ہوئے کہا۔ ”شہلا کو بتا دیا جائے، وہ جیسا مناسب سمجھے گی کرے گی۔ اگر پولیس کو عدنان کے بارے میں تفصیلات مل گئیں تو وہ اس کے گھر پہنچیں گے اور یہی نتیجہ اخذ کریں گے کہ عدنان کے قاتلوں کا اس گھر میں مارے جانے والوں سے کوئی تعلق ضرور ہے۔“

اسی روز شام کے وقت میں اور رابعہ پھر نسبت روڈ پہنچے۔ الماس ایک دو منزلہ مکان کے اوپر والے حصے میں کرائے پر رہتی تھی۔ رابعہ کو مالک مکان سے جھوٹ بولنا پڑا کہ وہ الماس کے بچپن کی کلاس فیلو ہے۔ الماس کا شوہر کراچی گیا ہوا تھا۔ الماس نے ہمیں بڑے اخلاق سے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ اس کی گود میں دو سال کا ایک شریر بچہ بھی تھا۔ گھر کے اسباب سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ زیادہ خوشحال نہیں۔ تاہم ایک قناعت پسند روایتی مشرقی بیوی کی طرح الماس اپنے گھر میں یقیناً خوش تھی۔

”دراصل مجھے آپ سے ایک کام تھا۔ ایک ضروری بات کرنی تھی جس کے لیے مجھے یہ جھوٹ بولنا پڑا۔ میں آپ سے کبھی نہیں ملی۔ میں رابعہ قاری ایڈووکیٹ ہائیکورٹ ہوں۔“ اس نے اپنا کارڈ آگے بڑھا دیا۔

الماس کی صورت سے پریشانی جھلکنے لگی۔ ”دیکھیے، آپ پھر کبھی آجایئے گا۔ دو چار دن بعد...“

رابعہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ”جو بات مجھے کرنی تھی وہ آپ کے شوہر کے سامنے نہیں کی جا سکتی۔ یہ بڑا اچھا ہوا کہ وہ کراچی گئے ہوئے ہیں ورنہ مجھے پھر کسی وقت آپ سے علیحدگی میں بات کرنے کے لیے بہانہ اور موقع تلاش کرنا پڑتا۔“

الماس اب نروس ہو گئی تھی۔ ”آپ... آپ لوگ کون ہیں؟ ایسے کیوں آئے ہیں؟“

”میں کل پھر آسکتی ہوں۔“ رابعہ نے کہا۔ ”کل تک آپ میرے بارے میں جو تحقیق و تفتیش کرنا چاہیں کریں۔ مثلاً یہ کہ میں واقعی رابعہ قاری ایڈووکیٹ ہائیکورٹ ہوں یا نہیں؟ یہ بات آپ کا اطمینان ہو جانے کے بعد بھی کی جا سکتی ہے مگر اتنا ضرور سمجھ لیجیے کہ آپ کے شوہر کے کانوں میں اس بات کی بھنک بھی پڑی تو خود آپ کے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔“

”یہ تو آپ مجھے دھمکی دے رہی ہیں؟“ الماس نے تیز ہو کر کہا۔ ”اگر آپ کو ایسی ہی پرائیویٹ بات کرنی تھی تو کیا آپ اکیلی نہیں آسکتی تھیں؟ اور پھر مجھ سے آپ کبھی ملی نہیں تو میرے بارے میں ایسی کون سی بات معلوم ہو گئی ہے آپ کو؟ کس نے بتائی ہے یہ بات؟ اپنے شوہر کو ساتھ لے کر آنے کا کیا مقصد ہے؟“ گھبراہٹ میں وہ جواب کا موقع دیے بغیر سوالات کرتی جا رہی تھی اور شاید یہ سمجھنے میں حق بجانب تھی کہ ہم کوئی نوسرباز ہیں جو اس کے شوہر کی عدم موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے گھر میں گھس کے کوئی غلط کام کرنا چاہتے ہیں۔

”الماس! میں بھی تو کسی گھر میں رات کے وقت اکیلے جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔“ رابعہ نے کہنا شروع کیا۔

”دیکھیے خاتون! میں ان کا شوہر نہیں ہوں۔“ میں نے بروقت مداخلت ضروری سمجھی ورنہ الماس چلانے لگتی۔ ”حقیقت یہ ہے کہ مجھے ڈی سلوا کے بارے میں بات کرنی تھی۔ آپ ایک زمانے میں اس کی سیکرٹری تھیں۔ بات کا تعلق اسی زمانے میں پیش آنے والے واقعات سے ہے۔ اگر میں اکیلا آتا تو آپ سے بات کیسے کرتا؟ آپ کے اطمینان کے لیے میں ایک عورت کو ساتھ لایا ہوں اور وہ عورت بھی عام عورت نہیں ہے، ایک بیرسٹر ہے جس کی شرافت اور نیک چلنی کی ضمانت جج صاحبان تک دے سکتے ہیں۔“

ڈی سلوا کا نام سنتے ہی الماس کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا اور اب یوں لگتا تھا کہ وہ بے ہوش ہو جائے گی۔ ”تم... تم لوگ مجھے بلیک میل کرنے آئے ہو؟“ وہ خوفزدہ لہجے میں بولی مگر اب اس کی آواز بہت پست تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ ہمارے آنے کا مقصد کیا ہے۔ وہ ساکت و صامت بیٹھی رہی اور سہمی سہمی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔ اس کی گود میں ہمکنے والا بچہ دودھ کی بوتل منہ میں لیے لیے سو گیا تھا۔

”میرے ساتھ ڈی سلوا نے کوئی زیادتی نہیں کی۔“ وہ اپنے ہسٹریا سے لڑتے ہوئے بولی۔ ”اور اگر کی تھی تو میں تمہیں کیوں بتاؤں؟ میں کسی ڈی سلوا کو نہیں جانتی۔ میں کبھی اس کی سیکرٹری نہیں رہی۔ میں وہ سب باتیں بھلا چکی ہوں اور بھولے سے بھی ایسی کوئی بات زبان پر نہیں لانا چاہتی جس سے میرا گھر برباد ہو جائے۔ میرے شوہر کے اعتماد کو ٹھیس پہنچے۔“

”یہ تو میں بھی نہیں چاہتا اور اسی لیے میں آج کے موقعے کو مناسب ترین سمجھتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”سوال ایک اور لڑکی کی زندگی کا ہے جو اب ڈی سلوا کی سیکرٹری ہے اور اسکے خوبصورت

وعدوں کے جال میں گرفتار ہو کے بہت سی غلطیاں کر چکی ہے۔"

"تمہیں کیوں ہمدردی ہے اس لڑکی سے؟" الماس نے کہا۔ "تمہاری کیا لگتی ہے وہ؟"

"کچھ نہیں، مگر ایک انسانی جان بچانا بھی بڑا ثواب ہے۔" میں نے کہا۔

"تم اپنے ثواب اور عذاب سے غرض رکھو اور میرے ثواب و عذاب میرے لیے چھوڑ دو۔ اس لڑکی نے بھی اگر حماقت کی ہے تو کوئی تو اس کو سزا ملنی چاہیے۔ غلطی پر سزا تو ملتی ہی ہے۔ پھر تم کیوں فکرمند ہو۔ سارے جہاں کا درد تمہارے جگر میں کیوں ہے؟" الماس بولتی گئی۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے بات ختم کرنے کے انداز میں کہا۔ "میں اس وقت آؤں گا جب تمہارا شوہر بھی موجود ہوگا اور میں ڈی سلوا کو ساتھ لے کر آؤں گا تاکہ تمہیں بھی اس غلطی کی سزا مل جائے جس سے تم اب تک بچی ہوئی تھیں اور بچی رہ سکتی تھیں۔ میں دیکھوں گا کہ ڈی سلوا کے سامنے تم اس سے تعلق سے کیسے انکار کرو گی۔ مجھے یہاں آنے اور بات کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا کیونکہ بعد میں یہ ایک قانونی معاملہ بن جائے گا۔ ڈی سلوا کی موجودہ سیکرٹری نے ایک قتل کر دیا ہے۔ اس نے یہ غلطی نادانستگی میں کی ہے اور میں ڈی سلوا کا دشمن ہوں کیونکہ ڈی سلوا میرے باپ کے قاتلوں میں شامل ہے۔ اس کو کیفرِ کردار تک پہنچانا میرا فرض ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ میرا فرض یہ بھی ہے کہ شہلا کی زندگی بچاؤں۔ شہلا اس لڑکی کا نام ہے جس کو ڈی سلوا نے آلۂ کار بنایا۔ اس کا یہ راز فاش ہو چکا ہے اس لیے عین ممکن ہے وہ شہلا کو ختم کر دے، مگر میں یہ نہیں ہونے دوں گا۔ تاکہ ضرورت پڑنے پر وہ ڈی سلوا کے خلاف گواہی دینے کے لیے آ سکے اور زندہ رہے۔" میں نے رابعہ کو چلنے کا اشارہ کیا۔

"ٹھہرو۔" الماس چلائی۔ "مجھے یہ تو بتاتے جاؤ کہ کیا مجھے بھی کسی عدالت میں گواہی کے لیے آنا پڑے گا؟"

"اگر تم اس وقت ہمیں ڈی سلوا کے بارے میں وہ سب کچھ بتا دو گی جو تم جانتی ہو تو اس کی ضرورت نہیں رہے گی۔" میں نے کہا۔ "مجھے ڈی سلوا کے خلاف ثبوت چاہیے۔ تم اپنا دامن بچا کے ثبوت فراہم کر سکتی ہو۔ تمہارے بعد اور بھی بہت سی لڑکیاں اس کی ہوس اور شیطانی فطرت کے جال میں پھنس کے نقصان اٹھا چکی ہیں اور میں ان سے بھی ملوں گا۔"

"خدا کے لیے مجھے بخش دو۔" وہ منت کرتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر بولی۔ "اگر میرے شوہر کو معلوم ہو گیا؟"

"کسی کو کچھ معلوم نہیں ہوگا۔" میں نے کہا۔ "تمہیں میرے وعدے پر اعتبار کرنا ہی ہوگا الماس! یہاں سے مجھے شہلا کے پاس جانا ہے اور اسے بھی قائل کرنا ہے کہ وہ کتنی خطرناک سازش کا شکار ہوئی ہے۔ اسے احساس نہیں لیکن اس کی زندگی تک کو خطرہ لاحق ہے۔ مجھے اس کو بتانا پڑے گا کہ ڈی سلوا پہلے کتنی لڑکیوں کا مستقبل تباہ کر چکا ہے۔ میرے پاس وقت کم ہے۔"

الماس نے بچے کو دوسرے کمرے میں لے جا کر بستر پر لٹا دیا۔ میں نے اسے بچے پر کمبل پھیلا کے اس کے ماتھے پر مامتا کی مہر ثبت کرتے دیکھا۔ اس نے وہ آنسو خشک کیے جو کسی ارادے کے بغیر آنکھوں میں اتر آئے تھے۔ اس نے خود کو [illegible] دورے کی اولین اور تند ترین لہر کے زور سے بچا لیا تھا اور اب ازدواجی زندگی کو لاحق خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گئی تھی۔ یہ اس کے لیے سخت ترین آزمائش تھی۔ وہ اعترافِ جرم سے بھی ڈرتی تھی اور خاموشی کے نتائج سے بھی۔ جب [illegible] میں لوٹ کر آئی تو ایک بار پھر مجھے اور رابعہ کو اپنی نیک نیتی اور اس کے مستقبل کو تحفظ کی ضمانت حاصل ہونے کا یقین دلانے کی سخت جدوجہد کرنی پڑی۔

"دیکھو الماس!" رابعہ نے کہا۔ "تمہارے بعد وہ بہت لڑکیوں کو ذلیل و خوار کر چکا ہے۔ وہ سب بزدل ہیں یا کمزور، اس سے انتقام نہیں لے سکیں مگر سکندر بخت کا معاملہ مختلف ہے۔ یہ انگلستان میں زیرِ تعلیم تھے جب ڈی سلوا نے کچھ لوگوں کے ساتھ مل کر ان کے والد کو بلیک میل کیا اور ان کا سب [illegible] چھین کر انہیں مرنے پر مجبور کر دیا۔ جب یہ پاکستان آئے اور ان کو اصل حالات کا علم ہوا تو ان کو قتل کے ایک جھوٹے مقدمے میں پھانس لیا گیا اس لیے کہ ڈی سلوا اور اس کے ساتھی پیسے والے، اثر و رسوخ کے مالک اور بدمعاش تھے۔ ان کے مقدمات میں پیروی میں کر رہی ہوں اور میرے ساتھ دوسرے وکیل منظر صاحب ہیں۔ عبدالودود منظر، ہم تینوں بچپن میں ایک ساتھ پڑھتے تھے اور ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ دو لڑکیاں تمہارے چلے جانے کے بعد اس کی سیکرٹری بنیں، ان کا کیا انجام ہوا۔ ایک نے خودکشی کی اور دوسری پُراسرار طور پر غائب ہو گئی۔ تیسری کا پتہ ہمارے پاس موجود ہے اور ہم اس سے بھی ملیں گے۔ شاید وہ بھی کچھ بتا سکے اور پھر ہم شہلا کے پاس جا کر اس کو خبردار کر سکیں۔ اسے بتائیں کہ وہ کسی خوش فہمی میں مبتلا نہ رہے اور اپنی جان بچا کے نکل جائے ورنہ اس کا انجام زیادہ بُرا ہوگا۔ ڈی سلوا اس کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ ہو سکتا ہے وہ ہماری بات نہ مانے۔ عشق میں آدمی اندھا بہرا اور پاگل ہو جاتا ہے۔ اگر اس نے سمجھا کہ ہم ڈی سلوا کی دشمنی میں ایسی باتیں کہہ

رہے ہیں تو ہم اسے تمہارے پاس لے آئیں گے اور اس دوسری لڑکی سے بھی ملوا دیں گے۔ پھر وہ یقین کرنے پر مجبور ہوگی اور ہمیں ڈی سلوا کے بارے میں وہ سب باتیں بتا دے گی جو صیغۂ راز میں ہیں۔ سکندر بخت نے اس بدمعاش سے انتقام لینے کی قسم کھائی ہے۔ کیا تمہیں اس سے انتقام لینے کی خواہش نہیں ہے؟ یقیناً ہوگی مگر تم مجبور ہو۔ تمہارا گھر آباد ہو چکا ہے اور تمہارے شوہر کو کچھ معلوم نہیں۔ ظاہر ہے تم کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتیں مگر تم اتنا تو کر سکتی ہو کہ..."

"میں بہت کچھ کر سکتی ہوں۔" الماس نے قطعی بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں اس کو تباہ کر سکتی ہوں۔ اسی طرح جیسے اس نے مجھے دھوکا دیا اور خراب کیا۔ میں بے وقوف اور جذباتی تھی کہ اس کی باتوں میں آ گئی اور اس کے لیے وہ کچھ کرتی رہی جو قانون کی نظر میں جرم ہے۔ مذہب کے لیے گناہ اور معاشرے میں ناقابلِ معافی۔ میں نے بھی سوچا تھا کہ میں مر جاؤں یا اس شیطان کو مار دوں، لیکن میں کچھ بھی نہ کر سکی۔ پھر قدرت کو مجھ پر رحم آ گیا اور اس نے میری غلطیوں کو معاف کر کے مجھے جینے کے مواقع فراہم کر دیے۔ وہ باتیں بہت پرانی ہو چکی ہیں لیکن میں کچھ بھی نہیں بھولی ہوں۔ زخم اگر مندمل ہو گئے ہیں تو کیا۔ ان کے داغ بہت گہرے ہیں..."

وہ اب مخالف جذبات کی رو میں بہنے لگی تھی اور اپنے تمام اندیشوں اور وسوسوں کو بھول کر ہمیں ہر بات بتانے کے لیے تیار تھی کیونکہ ہم اس کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ اس نے ہمیں بتایا کہ تقریباً پانچ سال پہلے اس کی ملاقات ڈی سلوا سے ہوئی تھی۔ اس کے والدین کا انتقال بچپن میں ہو چکا تھا چنانچہ اس کی پرورش حقیقی چچا نے کی تھی۔ چچا کو مرحوم بھائی کے احسانات کا بہت پاس تھا۔ بڑے بھائی نے باپ بن کر ان کو پالا تھا۔ انہوں نے الماس کو محبت اور شفقت دی، اس کی ضروریات کو اپنا پیٹ کاٹ کے پورا کیا اور اسے بی اے تک تعلیم دلوائی۔ یہ سب چچی کو سخت گراں گزرتا تھا، چنانچہ شوہر کی عدم موجودگی میں وہ اپنے دل کی بھڑاس نکالتی تھی۔ اسے ڈائن کہتی تھی جو ماں باپ کو کھا کے ان کے گھر میں آ گھسی ہے۔ اس کے بچوں کا حق مارنے آ گئی ہے اور ایسے منہ پھاڑ کے ہر چیز مانگتی ہے جیسے اس کا باپ خزانہ چھوڑ گیا تھا۔ [illegible] چچا کے مالی حالات کبھی زیادہ اچھے نہیں رہے تھے اور الماس کے باپ نے واقعی کچھ نہیں چھوڑا تھا چنانچہ چچی کی باتیں اس کے دل پر تیر کی طرح لگتی تھیں۔ ان باتوں کا اثر گھر کے بچوں پر بھی [illegible] چھوٹے ہونے کے باوجود اسے بے عزت کرنے سے نہیں چوکتے تھے۔ اسے منحوس، مصیبت اور بلا کہتے تھے۔ بات بات پر احساس دلاتے تھے کہ یہ ہمارے باپ کا گھر ہے، تمہارے باپ کا نہیں۔ الماس نے دو ایک مرتبہ ان کو اس بدتمیزی پر ہلکا سا تھپڑ رسید کر دیا تو انہوں نے کہرام مچا دیا اور چچا کے سامنے یہ کہا گیا کہ الماس نے بچوں کو بلاوجہ انتہائی بے رحمی سے مارا ہے۔ چچا بہت کچھ سمجھنے کے باوجود بہت سی باتیں نہیں سمجھتے تھے مثلاً یہ کہ بیوی تو الماس کے خلاف جھوٹا الزام عائد کر سکتی ہے مگر بچے جھوٹ نہیں بول سکتے۔ ایسے متعدد مواقع آئے جب چچا نے بھی غصے میں اسے لعن طعن کی۔ گو بعد میں انہوں نے پیار سے تلافی بھی کی مگر الماس کے دل میں یہ احساس جڑ پکڑتا گیا کہ اسے اپنا گھر بنانا ہے۔ سارا دن پورے گھر کی نفرت کا شکار رہنے کے بعد شام کو گھر آنے والے چچا کی شفقت اس کے دکھ کا مداوا نہیں کر سکتی تھی۔

پانچ سال پہلے وہ ایک ایسے گھر میں رہتی تھی جو سڑک کے کنارے بازار میں تھا۔ وہ اکثر بالکونی میں آ کھڑی ہوتی تھی اور بازار کی چہل پہل دیکھتی رہتی تھی۔ بالکونی کے عین مقابل سڑک کے دوسرے کنارے پر ایک بنک تھا۔ ایک روز وہ حسبِ عادت باہر دیکھ رہی تھی کہ بینک کے سامنے سیاہ رنگ کی لمبی سی کار آ کے رکی۔ جس چیز نے الماس کو متوجہ کیا، وہ کار کے شیشے تھے جن میں سے اندر کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس کے سامنے تین افراد کار کے پچھلے دروازے کھول کر اترے اور چوتھا انجن اسٹارٹ کیے ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھا رہا۔ الماس یہ دیکھ کر اور حیران ہوئی کہ تینوں افراد نے ایک جیسے بریف کیس اٹھا رکھے تھے، ایک جیسے لباس پہن رکھے تھے اور ان کا حلیہ بھی تقریباً ایک جیسا تھا۔ انہوں نے ملیشیا کی گھیردار شلواریں اور لمبے لمبے کرتے پہن رکھے تھے۔ سب کے سروں پر پگڑیاں تھیں اور وہ ایک ہی عمر کے صحت مند جوان مرد تھے جن کے بارعب چہروں پر مشت بھر سیاہ داڑھی تھی۔ ان کی صورتوں اور حلیوں کی مماثلت دیکھ کر یہ خیال آتا تھا کہ وہ تینوں بھائی ہیں۔ الماس کے سامنے وہ تینوں بنک میں داخل ہوئے اور دروازے پر کاہلی سے کھڑے ہوئے گارڈ نے بھی ان کو محض دلچسپی سے دیکھا۔ ابھی مشکل سے دو منٹ گزرے ہوں گے کہ بنک میں سے گولیاں چلنے کی آواز آئی اور الماس کی دہشت زدہ نگاہوں نے گارڈ کو باہر گرتے دیکھا۔ وہ بندوق جس کو گارڈ سہارے کے لیے بطور لاٹھی استعمال کر رہا تھا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر اندر گر گئی۔ بنک کے اندر ایک چیخ پکار مچی ہوئی تھی اور دروازے کے باہر وہ گارڈ تڑپ رہا تھا جس کے سینے میں کم از کم دو گولیاں لگی

تھیں۔ اس کا خون پکے ٹائل کے فرش پر بہہ رہا تھا اور چھینٹے بنک کی بیرونی دیوار پر بھی نظر آرہے تھے۔ بازار میں بھی لوگوں نے فائرنگ کی آواز سنی تھی۔ وہ شخص جو کار میں بیٹھا رہا تھا، فوراً باہر نکل آیا اور بنک کے دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک مشین گن تھی اور وہ چیخ چیخ کر لوگوں کو خبردار کر رہا تھا کہ قریب کوئی نہ آئے۔ یہ سب کچھ اتنی عجلت میں ہوا اور اتنا غیر متوقع تھا کہ الماس خوف اور حیرت سے سُن کھڑی رہ گئی۔ اسے خیال ہی نہ آیا کہ وہ دوڑ کر ساتھ والے گھر میں جائے اور پولیس کو فون کرکے بنک میں ڈاکا پڑنے کی اطلاع کرے۔ اس نے دیکھا کہ وہ چوتھا آدمی جو مشین گن لیے باہر کھڑا تھا صورت شکل اور حلیے میں باقی تین افراد سے بالکل مختلف تھا۔ اس نے سیاہ پتلون پر سفید دھاریوں والی سُرخ جرسی پہن رکھی تھی۔ اور گہرے سیاہ شیشوں والا دھوپ کا چشمہ لگا رکھا تھا۔ شاید کار سے اترنا اس کے پروگرام میں شامل نہیں تھا۔ تاوقتیکہ صورتحال ہنگامی نہ ہو جائے۔ تین چار منٹ میں اندر جانے والے دوڑتے ہوئے باہر آئے۔ سیاہ چشمے اور سرخ جرسی والا نوجوان پھر کار کی طرف لپکا اور اس نے اپنی سیٹ پر بیٹھ کر دروازہ بند کر لیا۔ اس کے باقی تینوں ساتھی ایک کے پیچھے ایک بھاگتے آرہے تھے۔

الماس پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس منظر کو دیکھ رہی تھی جو کسی سنسنی خیز فلم کی طرح تھا مگر حقیقی زندگی کا منظر تھا۔ اچانک دم توڑتے ہوئے گارڈ نے جسم کی ختم ہوتی ہوئی قوت مجتمع کرکے دونالی بندوق کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس وقت تک ایک ڈاکو کار کا پچھلا دروازہ کھول کے بیٹھ چکا تھا۔ گارڈ نے دوسرے پر گولی چلائی اور وہ وہیں سڑک پر گر گیا۔ الماس نے نوٹ کیا کہ واپسی پر بریف کیس تینوں کے ہاتھ میں نہیں تھے اور اس نتیجہ پر پہنچی کہ وہ ان میں اسلحہ اندر لے گئے تھے۔ غالباً وہ سب مشین گن جس کے ٹکڑے الگ کیے جاسکتے ہیں اور ان کو جوڑ کر پھر پوری مشین گن بنائی جاسکتی ہے۔ واپسی پر کار میں سب سے پہلے بیٹھنے والا بھی بریف کیس کے بجائے مشین گن لیے نکلا تھا اور اس کا دوسرا ساتھی بھی جو مارا جاچکا تھا۔ بریف کیس صرف ان کے تیسرے ساتھی کے ہاتھ میں تھا جو سب سے پیچھے تھا۔ خون میں لت پت گارڈ نے ایک بار پھر بندوق اٹھائی اور دوسری گولی چلائی مگر اس کے ہاتھوں کی قوت جواب دے رہی تھی اور شاید اس کی نظر بھی دھندلا چکی تھی کہ وہ نالی کو پورا نہ اٹھا سکا اور گولی بریف کیس والے شخص کی ٹانگ میں لگی۔ مالِ غنیمت یقیناً بریف کیس میں تھا۔ وہ ایک بار گرا اور پھر اٹھ کر بھاگا۔ کار میں بیٹھے ہوئے ڈرائیور نے بدحواسی میں چلا کر اسے جلدی کرنے کو کہا اور گاڑی آہستہ آہستہ کھسکنے لگی اس کا ایک پچھلا دروازہ اب بھی کھلا ہوا تھا۔ زخمی ٹانگ کا بلیف ساتھ بھاگنے والے شخص نے کار تک پہنچنے کی بھرپور کوشش کی مگر وہ کار کے پچھلے حصے سے ٹکرا کے گر گیا۔ تاہم اس نے بریف کیس پر اپنی گرفت مضبوط رکھی۔ ڈاکوؤں میں سے ایک نے چیخ کر اسے گالی دی اور بریف کیس پھینکنے کے لیے کہا مگر رہ جانے والا جانتا تھا کہ اس نے بریف کیس پکڑا دیا تو اس کے ساتھی خود اسے گولی مار کر وہیں چھوڑ جائیں گے۔ اس نے ایک ہاتھ آگے بڑھایا لیکن بریف کیس کو پیچھے رکھا۔ کار میں بیٹھے ہوئے شخص نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کار میں گھسیٹنے کی کوشش کی لیکن کار کی رفتار بڑھ چکی تھی۔ بریف کیس والا سڑک پر گر گیا پھر اچانک ہوا کے زور سے کار کا دروازہ بند ہو گیا اور سائرن سے پولیس کی ایک جیپ نمودار ہوئی۔ الماس کا خیال بھی یہی تھا کہ پولیس ڈاکے کی اطلاع پا کر آئی ہے مگر وہ کہیں چھاپہ مارنے جارہے تھے۔ ڈاکو ان کو دیکھتے ہی ایسے بدحواس ہوئے کہ انہوں نے ایک شیشہ کھول کر مسلسل ہوائی فائر کیے۔ پولیس کی جیپ فوراً ایک گلی میں گھس گئی اور بازار میں بھگدڑ مچ گئی۔ سیاہ کار تیزی سے بڑھی اور بریف کیس والا سڑک پر پڑا رہ گیا۔ ساتھیوں کو بے وفائی کرکے اپنی جان بچانے کی خاطر فرار ہوتے دیکھ کر پاگل ہو گیا اور اٹھ کر بے تحاشہ ان کے پیچھے چلاتا ہوا دوڑا۔ "خدا کے لیے... مجھے چھوڑ کے مت جاؤ۔" اسے وہ ٹرک بھی دکھائی نہ دیا جو سامنے سے آرہا تھا۔ وہ سڑک کے وسط میں اپنی زخمی ٹانگ کا لہو پھیلاتا، دیوانہ وار چلاتا ہوا بھاگ رہا تھا۔ ٹرک ڈرائیور نے اسے بچانے کی پوری کوشش کی مگر ٹرک کی رفتار بہت زیادہ تھی، پلک جھپکتے میں ٹرک اس کے اوپر سے گزر گیا۔ لوگ ہر طرف سے دوڑ پڑے اور لاش کے گرد ایک جمگھٹا لگ گیا۔

الماس نے سارا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اسے ایک چکر سا آیا اور وہ اندر کی طرف بھاگی۔ بستر پر گر کے وہ ذرا سی دیر کے لیے بے ہوش ہو گئی۔ دہشت سے اس کا سارا بدن کانپ رہا تھا اور ٹھنڈا پسینہ اس کے جسم پر پانی کی طرح بہنے لگا تھا اور اس کے خشک حلق میں کانٹے سے پڑ گئے تھے۔ ہوش میں آتے ہی اس نے خود کو سنبھالا اور اٹھ کر پانی کا ایک گلاس پیا۔ اس کا چچا آفس میں تھا۔ بچے اسکول گئے ہوئے تھے اور چچی شاپنگ کے لیے چلی گئی تھی کچھ دیر بعد جب الماس کے ہوش ٹھکانے آئے تو اس نے سوچا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے اور بالآخر اس فیصلے پر پہنچی کہ اس کے حق میں خاموش رہنا ہی بہتر ہوگا ورنہ وہ مشکل میں پھنس جائے گی۔ اسے بیان کے لیے تھانے جانا پڑے گا اور نہ جانے کب تک

کے لیے عدالت میں حاضری دینی پڑے گی، اس کے چچا اور چچی کو یہ ہرگز منظور نہ ہوگا کہ پولیس ان کے گھر کے چکر لگائے اور آئے دن عدالت جس لیے دروازے پر موجود ہو۔ سیاہ چشمہ اور سُرخ جرسی والے ڈرائیور کی صورت اس کے دل میں نقش ہو گئی تھی۔ باقی تین جانتے بوجھتے ایک جیسا حلیہ بنا کے آئے تھے تاکہ کسی کے بارے میں کوئی بھی چشم دید گواہ واضح بیان نہ دے سکے۔ دیکھنے والے بہت تھے چنانچہ الماس نے طے کیا کہ وہ اس جھنجھٹ میں نہیں پڑے گی بلکہ واپسی پر چچی نے پوچھا تو وہ کہہ دے گی کہ میں سو رہی تھی اور مجھے کچھ معلوم نہیں کہ باہر کیا ہو گیا۔

مگر اسی وقت الماس کو یوں لگا جیسے کوئی دھم سے صحن میں کودا۔ صحن کا ایک دروازہ پچھلی طرف کی تنگ گلی میں بھی تھا۔ وہ کمرے سے نکلی اور نیچے اتری۔ نیچے کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ نچلی منزل کے باورچی خانے کے سامنے سے گزر کے کمرے میں جانا چاہتی تھی کہ اچانک کسی نے اس کو باورچی خانہ میں گھسیٹ لیا۔ الماس کی چیخ اس کے حلق میں گھٹ کے رہ گئی۔ اس کی آنکھوں نے ایک اجنبی کو دیکھا جس کے دوسرے ہاتھ میں تیز دھار والا لمبا اور پتلا خنجر تھا۔ خنجر باورچی خانہ کی کم روشنی میں چمک رہا تھا اور اس کی نوک الماس کے حلق سے چند سوت کے فاصلے پر تھی۔

"اگر آواز نکالی تو یہیں ذبح کر دوں گا۔" وہ بولا اور اس نے الماس کو آزاد کر دیا۔ الماس سہم کر دیوار سے لگ گئی۔ "تمہارے سوا گھر میں کون کون ہے؟" اس شخص نے پوچھا۔ وہ تیس چالیس سال کا تندرست آدمی تھا۔ کلین شیو اور سفید شلوار قمیص پہنے ہوئے۔ الماس نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"کوئی... کوئی نہیں۔" الماس نے حلق میں پھنس جانے والے الفاظ کو بڑی مشکل سے ادا کیا۔

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔" وہ بولا۔ "دیکھو لڑکی! میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا۔ بس تم اپنی زبان بند رکھو اور مجھے یہ بتاؤ کہ میں کچھ دیر تک کہاں چھپا رہ سکتا ہوں؟"

"ایک... ایک گھنٹے بعد اسکول سے بچے آجائیں گے۔" الماس نے کانپتے ہوئے کہا۔ "اس وقت تک تمہیں کوئی خطرہ نہیں... لیکن تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟"

"کچھ نہیں۔" وہ درشتی سے بولا۔ "تمہیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے کہ میں کون ہوں۔ آج کے بعد بھولے سے بھی اس بات کا تذکرہ کسی سے مت کرنا۔ پولیس میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی لیکن میں رات کو سوتے میں اس خنجر سے تمہاری یہ نازک اور خوبصورت گردن کاٹ جاؤں گا... ایسے۔" اس نے ہوا میں خنجر کو حرکت دی۔ "تمہارے بھائی بہن ماں باپ سب کے سر تن سے جدا کر جاؤں گا۔"

دہشت سے الماس کی حالت غیر ہو گئی۔ اجنبی نے اسے وہیں چھوڑا اور باہر نکل کر دروازے کی کنڈی لگا گیا۔ الماس سوچنے لگی کہ کیا وہ چلا گیا؟ مگر اس نے تو ایک گھنٹہ چھپے رہنے کی مہلت مانگی تھی۔ اگر وہ مجھے اسی طرح چھوڑ گیا تو میں چچی کو کیا بتاؤں گی کہ مجھے باورچی خانے میں کس نے بند کیا تھا۔ اسی وقت دروازہ کھل گیا اور الماس نے اجنبی کا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھا۔ "تم واقعی سمجھدار لڑکی ہو۔" وہ بولا۔ "میں تمہیں آزما رہا تھا کہ موقع ملنے کے بعد تم شور مچاتی ہو یا نہیں۔ میرا خیال ہے مجھے ایک گھنٹہ ٹھہرنے کی ضرورت نہیں۔ پچھلی گلیوں کی طرف سے نکل جانے میں خطرے کی بات نظر نہیں آتی۔"

وہ بولتا جا رہا تھا اور الماس کی نظر اس بریف کیس پر تھی جو اب اجنبی کے ہاتھ میں تھا۔ چند منٹ کے اندر یہ بریف کیس وہ باہر سے نہیں لا سکتا تھا۔ بریف کیس گھر میں ہی موجود تھا اور شاید اس نے خود اندر کودنے سے پہلے صحن میں پھینک دیا تھا۔ یہ وہی بریف کیس تھا جو ٹرک کے نیچے آجانے والے ڈاکو کے پاس تھا۔ اس کی ساخت اور اس کا رنگ بالکل وہی تھا۔ اس پر سڑک کی کھردری سطح پر گھسیٹے جانے سے خراشیں پڑ گئی تھیں اور براؤن رنگ کی شارک اسکن جیسی بیرونی سطح کئی جگہ سے پھٹ گئی تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ صاف کر دینے کے باوجود اس پر اب بھی خون کے داغ تھے۔ جب وہ چلا گیا تو الماس بہت دیر تک منجمد کھڑی رہی۔ اپنی انتہا کو پہنچ کر خوف ختم ہو گیا تھا اور یہ قدرت کی عطا کردہ حیوانی جبلت کا کرشمہ تھا جو ایسے ہی حالات میں زندہ رہنے کے لیے قوت اور حوصلہ فراہم کر دیتی ہے۔ جسم میں جمع شدہ ایڈرینالین خون میں شامل ہو کے بلی کو بھی شیر کے مقابلے پر آجانے کی ہمت دیتی ہے۔ الماس کی سوچنے سمجھنے کی قوت اچانک بحال ہو گئی تھی۔ وہ سمجھ گئی کہ بریف کیس اجنبی کے پاس کیسے پہنچا۔ جب ڈاکو ٹرک کے نیچے آیا تو سب کی توجہ حادثے کی طرف تھی، سوائے اس اجنبی کے، جس کی نگاہ نے بریف کیس کو دور گرتے دیکھ لیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بریف کیس میں کیا ہے چنانچہ وہ مجمع کی نظر بچا کر اور بریف کیس اٹھا کر بھاگ نکلا۔ سب سے پہلا گھر الماس کا تھا، جس کی دیواریں کچھ نیچی تھیں۔ اسے ڈر ہوگا کہ لوگ اس کو بریف کیس سمیت بھاگتا دیکھ چکے ہوں گے اور ممکن ہے اس کے تعاقب میں بھی آتے ہوں۔ وہ اس گھر میں چھپ گیا اور جب یہ اندیشہ نہ رہا کہ کوئی اس کے پیچھے ہے تو وہ بریف کیس لے کر اطمینان سے نکل گیا۔

الماس کی آنکھوں نے ستم ظریف تقدیر کا وہ تماشہ دیکھا تھا جو ایک درسِ عبرت تھا۔ اس دولت کی خاطر ڈاکا ڈالنے کا پروگرام بنانے والے اور جان دینے والے لوگ دوسرے تھے مگر یہ دولت ایک ایسے شخص کی جھولی میں آگری تھی جس نے حادثے کے وقت سے چند سیکنڈ قبل بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ اتنی دولت کا مالک بننے والا ہے۔

الماس اس بات کو بھول گئی اور اس نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔ بعد میں یہ اس لیے بھی مشکل ہو گیا کہ اسے چچا اور چچی کی ناراضگی کا ڈر تھا جو اس بات پر یقیناً خفا ہوتے کہ اس نے اتنی بڑی بات جھوٹ بول کر کیوں چھپائی۔ وہ ان دنوں بی۔ اے کا امتحان دے کر فارغ ہوئی تھی اور نتیجے کا انتظار کر رہی تھی۔ چونکہ اسے پاس ہو جانے کا یقین تھا اس لیے چوری چھپے اس نے کئی جگہ ملازمت کی درخواستیں بھجوا رکھی تھیں۔ اس کی بڑی آرزو تھی کہ وہ اس گھر کے رسوا کن احسانات کا بار جلد از جلد اتار دے۔ وہ اپنے پاؤں پہ کھڑے ہونے کی آرزو مند بھی کیونکہ اس میں ذلت برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔

تقدیر نے اس کی مدد کی اور ابھی نتیجہ آیا بھی نہ تھا کہ اس کو میروزیر اینڈ کمپنی کی طرف سے ملازمت کا پروانہ مل گیا۔ نجانے کیوں ڈی سلوا کو دیکھتے ہی اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے وہ پہلے بھی اس کی صورت کہیں دیکھ چکی ہے۔ اسے ملازمت کرتے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا کہ اس کے شبہات کی تصدیق ہو گئی۔ ایک روز دفتر میں ایک شخص ڈی سلوا سے ملنے آیا جس کا استقبال ڈی سلوا نے بڑی گرمجوشی سے کیا۔ اس شخص کا نام چوہدری دلاور تھا۔

"چوہدری دلاور!" میں نے بے اختیار کہا اور اتنی اونچی آواز میں کہ الماس نے مجھے تشویش سے دیکھا۔ "کیا تم اسے پہچان سکتی ہو؟ میرا مطلب ہے کہ اس کا حلیہ بیان کر سکتی ہو؟"

الماس نے کسی دشواری کے بغیر مجھے چوہدری دلاور کے بارے میں تمام تفصیلات فراہم کر دیں اور میرے لیے شبے کی کوئی گنجائش نہ رہی کہ چوہدری دلاور وہی ہے جو بعد میں میروزیر اینڈ کمپنی کا تیسرا پارٹنر بنا۔ صاف ظاہر تھا کہ کاروبار میں وہ اس مالِ غنیمت کی وجہ سے شامل ہوا تھا جو لاٹری کے انعام کی طرح اسے غیر متوقع طور پر مل گیا تھا۔ الماس کے بیان کے مطابق بینک لوٹنے والے فرار ہو گئے تھے اور اپنے دو ساتھیوں کی لاشیں چھوڑ گئے تھے جن سے پولیس کچھ معلوم نہیں کر سکی ہو گی۔ پولیس کے ریکارڈ سے ڈکیتی کی اس واردات کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنا مشکل ضرور تھا مگر ناممکن نہیں تھا۔ اخبارات کی بہت سی فائلیں دیکھنے سے بھی بہت کچھ معلوم ہو سکتا تھا کہ ڈاکو کتنی رقم لے گئے تھے اور ان کے باقی ساتھی بعد میں گرفتار ہوئے تھے یا نہیں۔

لیکن اس سے یہ ثابت کرنا یقیناً بہت مشکل تھا کہ چو دلاور کا سرمایہ اسی رقم پر مشتمل تھا جو بینک سے لوٹی گئی تھی نے میر شرافت علی کو یا میرے مرحوم والد کو اپنی دولت مند جھوٹی کہانی سنا کر مطمئن کر دیا ہو گا اور یہی کہا ہو گا کہ اس دولت اپنی محنت سے کمائی ہے یا باپ سے ورثے میں حاص ہے۔ تاہم بہت سی باتیں واقعاتی شہادت کا حصہ بن سکتی تھ مثلاً یہ کہ اس زمانے میں جب ڈکیتی کی یہ واردات ہوئی تو چوہدری دلاور کہاں قیام پذیر تھا اور یہ کہ وہ کتنے سرمایہ کاروبار میں شریک ہوا تھا۔ الماس کو بعد میں چشم دید گواہ طور پر سامنے لایا جا سکتا تھا لیکن ابھی سے اس کا نام لینا دا نہ ہوتا اور الماس کی زندگی کے لیے فوری خطرات پیدا کر دیتا ج رخصت ہوتے وقت میں نے اس سے کہا کہ وہ اس ملاقات تذکرہ کسی سے نہ کرے۔ اپنے شوہر سے بھی نہیں۔

"ان سے میں کوئی بات کیسے کہہ سکتی ہوں۔" وہ شرما سے نظر جھکا کر بولی۔

"میرا مطلب یہ تھا کہ آپ میرے یا رابعہ قاری کے سے آشنائی کا حوالہ بھی نہ دیں۔" میں نے کہا۔ "یہ تو ظاہر کہ آپ اپنے اور ڈی سلوا کے تعلقات کے بارے میں ا شوہر کو کچھ نہیں بتائیں گی مگر میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ کسی حوالے سے بینک میں پڑنے والے ڈاکے کی بات نہ کریں بال اسی طرح جیسے اس وقت آپ نے اپنے گھر میں تذ نہیں کی تھی۔ بعد میں کسی مرحلے پر آپ کی گواہی چوہدری دلاو شناخت کرنے میں بنیادی کردار ادا کرے گی۔"

"میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میں کسی عدالت میں کو بیان نہیں دینے جاؤں گی۔" وہ نروس ہو کے بولی۔

"میں نے یہ کب کہا ہے؟" میں نے فوراً اس کو مطم کر دیا۔ "یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی پولیس افسر ڈکیتی کی واردات ملوث سمجھے جانے والے مشتبہ افراد کی تصویریں لے کر آ جا جن میں چوہدری دلاور کی تصویر بھی ہو اور آپ اسے شناخ کر لیں۔ اس کے بعد زیادہ سے زیادہ ایک بار آپ کو کے سامنے بھی ملزم کو شناخت کرنے کے لیے طلب کیا جا ہے تو وہ کوئی ایسی بات نہیں۔ اپنے شوہر سے بھی آپ کہہ ہیں کہ خوف کے باعث اس واردات کا ذکر آپ نے کبھی کس سامنے نہیں کیا تھا۔ ویسے آپ چاہیں تو اپنے شوہر کو واپسی کے بعد کسی بھی بہلانے یہ واقعہ بتا سکتی ہیں۔ اس طرح ان کو عدم اعتماد کی شکایت بھی نہیں رہے گی اور اگر آپ کو گواہی کے لیے عدالت میں حاضر ہونا بھی پڑا تو ان کو صدمہ یا اعتراض نہیں ہو گا۔ اس گواہی میں ڈی سلوا کا نام کہیں نہیں آئے گا لیکن آپ اپنے شوہر کو کچھ بتائیں تو یہ ضرور سمجھا دیں کہ رازداری کتنی اہم ہے۔"

وہ پوری طرح مطمئن نہیں ہوئی تھی اور کچھ پشیمانی کے احساس کا شکار نظر آتی تھی کہ اس نے اتنی جلدی ہم پر اعتبار کیوں کر لیا اور ہمیں اپنی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کا موقع کیوں فراہم کر دیا۔ میری نیت بالکل صاف تھی اور میں ہرگز یہ نہیں چاہتا تھا کہ اس لڑکی کا مستقبل کسی طرح بھی اس کے ماضی کے آسیب کا شکار ہو۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ اس کی گواہی کے بغیر بھی میں چوہدری دلاور کو قانون کے حوالے کرنے میں کامیاب ہو گیا تو اسے بلاوجہ ان معاملات میں ملوث نہیں کروں گا لیکن مجھے ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ ڈی سلوا سے کیوں ڈرتی ہے اور اس کے خلاف انتقامی جذبات کے اسباب کیا ہیں۔ کیا ایسی کوئی بات ہے جسے ڈی سلوا بلیک میلنگ کے لیے استعمال کر سکے؟ میرا یہ سوال ہی غلط تھا کیونکہ ایسی کوئی بات نہ ہوتی تو الماس کے لیے ڈرنے کی کوئی وجہ بھی نہ ہوتی مگر خود اپنی زبان سے جرم کا اعتراف کرنا اس کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔

"دیکھو الماس! زندگی میں کون غلطی نہیں کرتا۔ جو غلطی نہ کرنے کا دعویٰ کرے وہ فرشتہ تو ہو سکتا ہے انسان نہیں۔ ہم ہر قدم پہ ہر روز غلطی کرتے ہیں اور ان تجربات کی روشنی میں مستقبل کی راہیں متعین کرتے ہیں۔ غلطیوں سے ہم سبق سیکھتے ہیں۔ اور کامیاب وہ رہتے ہیں جو ایک ہی غلطی دو بار نہیں کرتے۔ اس کے باوجود معاف کر دینا ہر ایک کے بس کی بات نہیں اور انسانوں میں شیطان بھی ہیں جو دوسروں کی کمزوری کو اپنی شہ زوری بنا لیتے ہیں۔ تم نے صرف یہ غلطی کی کہ ڈی سلوا کی باتوں پہ اعتبار کیا۔ میرے نقطۂ نظر سے یہ کوئی غلطی نہیں۔ تمہیں معلوم نہیں تھا کہ ڈی سلوا فریبی اور دھوکے باز آدمی ہے۔ خود تم نے کبھی کسی کو دھوکا نہیں دیا تھا اس لیے تم سمجھتی تھیں کہ دنیا میں کوئی کسی کو دھوکا نہیں دیتا۔ یہ قصور ہمارے معاشرے کا ہے جہاں عورت کی چھوٹی سی غلطی تمام عمر کے لیے بہت بڑی سزا بن جاتی ہے۔ مرد حاکم ہے اور زبردست ہے۔ وہ چاہے تو سو بار بھی مجبور لڑکیوں کی عفت و عصمت کا دامن تار تار کر دے مگر خود اس کا دامن داغدار نہیں ہوتا۔ وہ کنوارا کی شادی بھی ہو جاتی ہے اور اسے کوئی خوف نہیں ہوتا کہ ان مجبور لڑکیوں میں سے کوئی اسے بلیک میل کر سکے گی۔ کیونکہ وہ آخری لڑکی جو اس کی بیوی بنتی ہے وہ بھی تو آخر مجبور ہی ہوتی ہے اور کسی کا ذکر کیا خود اپنے ماں باپ کے گھر کے دروازے اس پر بند ہو جاتے ہیں چنانچہ وہ کہیں نہیں جا سکتی، کسی سے انتقام نہیں لے سکتی اور شوہر کیسا بھی ہو صبر و شکر کے ساتھ اس کا ہر ظلم سہنے اور اسی کی پناہ میں رہنے پر مجبور ہوتی ہے۔ تمہارا بھی یہی کیس ہے لیکن تم خوش قسمت ہو اور عقلمند ہو کہ سنبھل گئیں مگر ان سب کا سوچو جن کی ایک غلطی کو کسی نے معاف نہیں کیا اور وہ اب تک اس کی سزا بھگت رہی ہیں۔ ان کے گھر آباد نہیں ہو سکے کیونکہ انہوں نے خاندانی شرافت کے لباس پر اپنی بدنامی کا داغ لگا دیا تھا۔ وہ خود یا ان کے خاندان والے، قانون کے محافظ اور انصاف کرنے والے سب مل کر بھی اس داغ کو مٹا نہیں سکتے۔ تم کہو گی کہ مجھے ان سے کیا، ان کی خاطر میں اپنا گھر کیوں برباد کروں۔ ٹھیک ہے تم کچھ مت کرو جو کچھ کرنا ہے وہ میں خود کر لوں گا اور تم پر آنچ نہیں آئے گی۔ ڈی سلوا جیسے آدمی نے صرف گناہ ہی نہیں جرم بھی کیے ہوں گے۔ ایسے جرائم جن کا تعلق تمہاری ذات سے نہیں ہو گا۔ اگر تم مجھے کوئی بھی بات بتا سکو تو باقی سراغ میں لگا لوں گا اور انجام تم خود دیکھ لو گی۔ ابھی تو میرے پاس بھی ثبوت نہیں ہے کہ وہ میرے والد کے قاتلوں میں شامل ہے لیکن قانون کی عدالت میں یہ جرم اس پر ثابت نہ ہو سکا تب بھی میں تہیہ کر چکا ہوں کہ اپنے یقین کی بنیاد پر خود اپنے ضمیر کی عدالت میں ہر مجرم کو کھینچ لاؤں گا اور انصاف خود کروں گا۔"

میں نے الماس کو قائل کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی اور

اس کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے اپنا تمام زورِ بیان صرف کر دیا تھا۔ مجھے اس مقصد میں خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی۔ الماس نے پہلے تو وہ کہانی سنائی جس میں کوئی غیر متوقع بات نہیں تھی۔ یہ آپ بیتی کسی بھی الماس کی ہوسکتی تھی۔ ڈی سلوا نے اسے دو درجن لڑکیوں میں سے صورت دیکھ کر منتخب کیا تھا۔ ابتدائی چند ہفتوں میں ڈی سلوا نے خود کو ایک سنجیدہ مزاج شریف اور قابلِ اعتماد باس ثابت کرنے کے لیے احتیاط سے کام لیا تھا، الماس کے کام سے کام رکھا تھا، اس کی خامیوں کو نظر انداز کیا تھا اور دفتری امور میں اس کی رہنمائی کے لیے مشفقانہ رویّہ اختیار کیا تھا جو بعد میں ہمدردانہ ہوگیا اور رفتہ رفتہ دوستانہ۔ پھر بالکل نامعلوم طریقے پر یہ رویّہ عاشقانہ ہوا اور ڈی سلوا نے الماس کو اپنی محبت کے جال میں گرفتار کر لیا۔ اس میں وہ سب خوبیاں تھیں جو ایک فلمی ہیرو میں ہوتی ہیں اور جب لڑکی کو زندگی میں کوئی مرد ایک مثالی شوہر نظر آنے لگے تو اپنی خوش بختی پر ناز کرتے ہوئے وہ مصلحت کے تمام تقاضوں کو بھول کر دنیا کی انگشت نمائی کی پروا نہیں کرتی اور اپنا سب کچھ لٹا دیتی ہے۔ اپنا سب کچھ لٹا دینے کے بعد الماس کے پاس ندامتوں کے سوا کچھ نہیں رہا تھا۔ آنکھ سے فلمی ہیرو نظر آنے والا عملی زندگی میں ولن ثابت ہوا تھا اور وہ جس نے زندگی کی آخری سانس تک ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا، الماس کو ناامیدی اور دل شکستگی کے صحرا میں بھٹکنے کے لیے تنہا چھوڑ گیا تھا جہاں خوابوں کے سراب تھے، پاؤں کے پُرخار ریگزار تھے اور بدنامی کی کڑی دھوپ تھی اگر ایک فرشتۂ رحمت اس کا ہاتھ نہ تھامتا تو وہ اس صحرا میں بھٹکتے بھٹکتے مر جاتی۔ الماس کا شوہر واقعی فرشتہ سیرت تھا اس نے کبھی الماس کے ماضی کو نہیں کریدا تھا لیکن وہ بہرحال ایک مرد تھا جو شادی کے بعد عورت کو صرف اپنی ملکیت سمجھتا ہے اگر اسے معلوم ہوجائے کہ اس کے ساتھ دھوکا ہوا ہے اور دنیا کہہ کر اسے سیکنڈ ہینڈ مال دے دیا گیا ہے تو اس کی سزا بھی وہ اصل مجرم کو نہیں بیوی کو ہی دیتا ہے۔ مرد کی فطرت کا یہ تضاد کتنا عجیب ہے کہ وہ پاکباز اور وفا شعار بیویوں کو چھوڑ کر طوائفوں کو گھر میں ڈال لیتے ہیں مگر بیوی کے بارے میں بدخواہوں کی زبان سے جھوٹ بھی سن لیں تو ان کی غیرت و حمیت خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ الماس نے اعتراف کیا کہ ڈی سلوا سے جذباتی وابستگی کے زمانے کی چند تصویریں اور الماس کے خطوط اب بھی ڈی سلوا کے پاس ہیں۔ اس نے یہ بتانے سے گریز کیا کہ تصویریں کس قسم کی ہیں مگر الماس کی

صورت گواہی دیتی تھی کہ ان کا ذکر بھی اسے شرم سے پانی پانی کر رہا ہے۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ میں یہ تصویریں اور خط واپس لینے کی پوری کوشش کروں گا مگر یہ کوشش اسی وقت کامیاب ہوسکتی ہے جب میرے ہاتھ میں بھی کوئی ٹرمپ کارڈ ہو۔

بہت سوچ کر الماس نے مجھے ایک بات بتائی۔ اسے ملازمت کرتے ہوئے ایک سال ہونے والا تھا اور یہ زمانہ وہ تھا جب الماس پوری طرح ڈی سلوا کے قبضے میں تھی۔ اسے سو فیصد یقین تھا کہ ایک مہینے بعد وہ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوجائیں گے۔ ڈی سلوا نے الماس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسلام قبول کرے گا اور جیسے ہی اس کے والدین یورپ کے دورے سے واپس آئیں گے وہ ان کو اپنے فیصلے سے آگاہ کردے گا۔ اس کے ماں باپ روشن خیال اور فراخدل ہیں اس لیے فکر کی کوئی بات نہیں۔ یہ تو بعد میں معلوم ہوا کہ ڈی سلوا کے والدین کا کہیں وجود بھی نہیں۔ ڈی سلوا کا ماضی ایک تاریک خلا کی طرح تھا جس کے بارے میں کوئی بھی کچھ نہیں جانتا تھا۔

ایک روز شام کے وقت کسی نے دروازے پر دستک دی۔ اتفاق سے دروازہ خود الماس نے کھولا تو اسے اپنے سامنے ایک اجنبی نظر آیا۔ ”مس الماس!“ وہ شخص آہستہ سے بولا۔ ”یہ خط ڈی سلوا صاحب نے دیا ہے۔“ خط لانے والا ایک عمر رسیدہ اور حلیے سے غریب نظر آنے والا شخص تھا۔ الماس نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن اس نے بڑی آسانی سے الماس کو پہچان لیا تھا۔ خط میں صرف دو سطریں لکھی ہوئی تھیں۔ ڈی سلوا نے ایک ہنگامی ضرورت کے باعث الماس کو طلب کیا تھا اور مکمل رازداری کی ہدایت کی تھی۔ الماس عجیب الجھن میں پڑ گئی۔ تحریر ڈی سلوا ہی کے ہاتھ کی تھی لیکن اسے کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ ہنگامی ضرورت کیا ہے، اسے کہاں جانا ہے اور کتنی دیر کے لیے جانا ہے۔ آدھے گھنٹے کی تو کوئی بات نہیں تھی لیکن اس سے زیادہ دیر تک گھر سے باہر رہنا اس کے گھر والوں کے لیے باعثِ تشویش ہوسکتا تھا۔ وہ رات کو اکیلی باہر نہیں گئی تھی لیکن خط میں رازداری کی شرط تھی چنانچہ وہ چھوٹے بھائی کو بھی ساتھ نہیں لے جاسکتی تھی۔ اس بوڑھے نے بھی الماس کو کچھ بتانے سے انکار کر دیا کیونکہ ڈی سلوا نے صرف خط دینے کی تاکید کی تھی۔ اس نے کہا کہ گاڑی گلی کے آخر میں سڑک پر کھڑی ہے اگر وہ ڈی سلوا صاحب کی گاڑی کو پہچانتی ہے تو آجائے وہ آدھے گھنٹے تک انتظار کرے گا اس کے بعد وہ رخصت ہوگیا اور الماس نے

دروازہ بند کرکے دو سطروں کے پیغام کو جلا کر راکھ کر دیا خط کا مضمون اسے ازبر ہوچکا تھا اور وہ شدید کشمکش میں مبتلا تھی۔ عقل کے تقاضے دل کی آواز سے برسرِپیکار رہتے اور اسے جلد فیصلہ بھی کرنا تھا کہ وہ گھر والوں کو دھوکا دے کر ایک اجنبی کے ساتھ کیسے جائے؟ بالآخر جیت دل کی ہوئی۔ اس نے بڑی چالاکی سے ساتھ والے گھر جاکر اپنی ایک قابلِ اعتماد سہیلی کو فون کیا کہ وہ فوراً آجائے، ایک منٹ کی تاخیر کیے بغیر کیونکہ بات ایسی ہے جو فون پر نہیں بتائی جاسکتی۔ یہ سہیلی الماس کی رازدار تھی اور پہلے بھی کتنی بار ڈی سلوا اور الماس کی ملاقاتوں کا وسیلہ بن چکی تھی۔ اس کے علاوہ دونوں گھروں کے تعلقات بہت قریبی تھے اس لیے شک کی کوئی نوبت نہیں آئی تھی۔ ڈی سلوا نے اب آدھے گھنٹے کا وقت دیا تھا جو تیاری کے علاوہ مناسب بہانہ بنانے کے لیے بھی کم تھا۔ الماس بےچینی سے انتظار کرتی رہی۔ اس کی سہیلی بیس منٹ بعد نمودار ہوئی۔ مزید دس منٹ الماس کے والدین کو یہ سمجھانے میں لگ گئے کہ وہ ایک تقریب میں شرکت کے لیے الماس کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آئی ہے۔ اس کا ذکر وہ اس سے اس لیے نہیں کر سکی تھی کہ وہ خود بےحد مصروف تھی۔ مزید دس منٹ بعد جب وہ دونوں سڑک تک پہنچیں تو الماس کا خیال تھا کہ وہ شخص جا چکا ہوگا کیونکہ اس نے آدھے گھنٹے کا ٹائم دیا تھا اور الماس چالیس منٹ بعد پہنچی تھی لیکن ڈی سلوا کی کار موجود تھی اور وہ شخص ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھا اطمینان سے سگریٹ پی رہا تھا۔ اتنی دیر میں الماس نے اپنی سہیلی کو تمام صورتِ حال سمجھا دی تھی تاکہ اسے واپسی میں دیر ہوجائے تو بات نہ بگڑے۔ ڈی سلوا سے ملاقات کے لیے جاتے ہوئے الماس کبھی خوف میں مبتلا نہ ہوئی تھی لیکن نہ جانے کیوں اس روز یہ احساس غالب تھا کہ اس طرح گھر سے نکل کر اس نے اچھا نہیں کیا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی الماس کو معلوم ہوگیا کہ یہ گاڑی باہر سے دیکھنے میں بالکل ڈی سلوا کی گاڑی جیسی تھی مگر اندر سے بالکل مختلف۔ کار کے کسی دروازے میں شیشے اتارنے چڑھانے یا دروازہ کھولنے کے لیے ایک بھی ہینڈل نہیں تھا چنانچہ یہ دروازے صرف باہر سے کھولے جاسکتے تھے اور بند شیشوں سے الماس کے چلانے کی آواز بھی کسی کے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ خوف سے الماس بالکل مفلوج بیٹھی تھی اور گاڑی کو مختلف راستوں سے گزرتا دیکھ رہی تھی۔ اطمینان کی بات صرف یہ تھی کہ راستے اس کے ... اگر اسے ذرا بھی اندیشہ ہوتا کہ گاڑی غلط

راستے پر جا رہی ہے تو وہ کچھ نہ کچھ ضرور کرتی مثلاً وہ پیچھے سے ڈرائیور کے گلے میں ہاتھ ڈال کر اسے گاڑی روکنے پر مجبور کرتی خواہ اس سے گاڑی کے بے قابو ہونے، الٹ جانے یا کسی سے ٹکرا جانے کا خطرہ ہی کیوں نہ ہوتا۔ یا وہ کسی کھڑکی کا شیشہ توڑنے کی کوشش کرتی۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ خالی ہاتھ کی ضرب سے اس شیشے کو توڑنا مشکل ہوتا ہے۔ ڈرائیور نے جو سامنے کے شیشے میں سے اس پر نگاہ رکھے ہوئے تھا صرف ایک بار کہا۔ "گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔"

"تم نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا تھا کہ ڈی سلوا صاحب نے اپنی گاڑی بھیجی ہے؟" الماس بولی۔

"جھوٹ کہاں ہے بی بی؟ کیا تم کار کے ماڈل اور رنگ سے واقف نہیں ہو؟" وہ جذبات سے عاری لہجے میں بولا۔ "اور میں غلط آدمی تو نہیں ہوں؟"

"یہ مجھے کیا معلوم۔ میں نے تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔" الماس نے کہا۔

"ابھی تم نے دنیا میں بہت کچھ نہیں دیکھا۔" وہ بولا۔ "تمہاری عمر ہی کیا ہے۔"

"لیکن میں نے ڈی سلوا صاحب کی کار دیکھی ہے۔ اس کے اندر سارے سینڈل وغیرہ موجود تھے۔"

"ضرور ہوں گے۔ مگر ضرورت کے وقت یہ چیزیں ہٹائی بھی جاسکتی ہیں۔" وہ بولا۔ "آدھے گھنٹے میں پھر سب لگ جاتی ہیں اور چیزیں ہی کیا آدمی بھی بدلے جاسکتے ہیں اور ایسے غائب کیے جاسکتے ہیں کہ دنیا کو نظر نہ آئیں۔ سب ضرورت کی بات ہے۔"

الماس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا لیکن وہ ان باتوں سے مزید دہشت زدہ ہوگئی۔ "اچھا تم مجھے یہ بتا دو کہ جانا کہاں ہے؟ ڈی سلوا صاحب کے گھر؟ میں خود پہنچ جاؤں گی کسی ٹیکسی میں۔"

"کار کے ہوتے ہوئے ٹیکسی میں جانے کی کیا ضرورت ہے؟" بڈھے نے خشک لہجے میں کہا۔

"ضرورت ہے یا نہیں۔" الماس نے چیخ کر کہا۔ "میں کار کا نمبر دیکھنا چاہتی ہوں۔ کہیں تم نے میرے ساتھ دھوکا تو نہیں کیا؟ آخر کیا ضرورت تھی مجھے ایسے قید کر کے لے جانے کی؟ اگر مجھے اطمینان ہوگیا کہ نمبر وہی ہے تو مجھے تمہارے ساتھ جانے میں کوئی اعتراض نہیں۔ ویسے تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ جو لڑکی میرے ساتھ کار تک آئی تھی اسے سب معلوم ہے اور وہ بہت ذہین لڑکی ہے... اس نے نمبر ضرور دیکھا ہوگا۔

اس کا باپ پولیس میں ہے۔" الماس اب خوف کے سبب بُری طرح مبتلا تھی۔ اسے یقین آچکا تھا کہ وہ کسی سازش کا شکار ہوئی ہے۔ وہ جھوٹ سچ بول کر اس بڈھے ڈرائیور کو خوفزدہ کرنے کی بے سود کوشش میں مصروف تھی لیکن وہ بڈھا ذرا بھی متاثر نہیں ہوا تھا اور گاڑی روکنے کے لیے تیار نہ تھا۔

"تم بہرے ہوگئے ہو کیا؟" الماس نے چیخ کر کہا۔ "میں کہتی ہوں کہ گاڑی روکو۔ میں ڈی سلوا صاحب کے گھر فون کروں گی اور تصدیق کروں گی۔"

"کیا تصدیق کرو گی؟ کیا وہ تحریر کسی اور کی تھی؟" ڈرائیور نے کہا۔

"کسی اور کی نہیں تھی تو تمہیں ڈر نہیں ہونا چاہیے۔" الماس نے لرزتے ہوئے کہا۔ "وہ دیکھو اس دکان میں فون ہے" لیکن کار کی رفتار میں اضافہ ہوگیا۔ کار کا رخ اب بھی ڈی سلوا کے بنگلے کی طرف تھا۔ الماس کو یہ شبہ بھی نہیں تھا کہ وہ خط ڈی سلوا کی اپنی ہینڈ رائٹنگ میں نہیں ہے مگر اسے یقین آچکا تھا کہ خود ڈی سلوا بھی کسی سازش کا شکار ہو لیے۔ عین ممکن ہے کسی نے اس سے یہ تحریر زبردستی حاصل کر لی ہو۔ وہ یک لخت ڈرائیور پر حملہ آور ہوئی۔ گاڑی اب بازاروں سے گزر کے شہر کے مضافات میں داخل ہو چکی تھی۔ ڈرائیور اس حملے کے لیے بالکل تیار تھا۔ اس نے ایک دم بریک لگائے تو زبردست جھٹکے سے الماس آگے آ گری۔ اس کا ایک ہاتھ کار کے اسٹیئرنگ پر لگا جس سے گاڑی بے قابو ہو کر فٹ پاتھ پر چڑھ گئی لیکن اس نے بڑی مہارت سے اسے روک لیا اور ایک کوٹھی کی دیوار سے نہیں ٹکرانے دیا۔ الماس کا سر ڈیش بورڈ سے لگا تھا اور وہ آگے یوں گری کہ اس کا سر ہی نیچے جھکا تھا۔ ابھی وہ سنبھل بھی نہ پائی تھی کہ اس کے سر پر کسی بھاری چیز کی ضرب پڑی جس کے بعد اسے کسی بات کا ہوش نہ رہا۔

جب اس کی آنکھ کھلی اور اس نے گرد و پیش پر نگاہ ڈالی تو یہ دیکھ کر اس کا سارا خوف مٹ گیا کہ وہ ڈی سلوا کے بنگلے میں اور اس کے بیڈ روم میں لیٹی ہوئی تھی۔ کمرے کی کوئی بھی چیز الماس کے لیے اجنبی نہیں تھی۔ اس کے دیوار، سامانِ آرائش۔ قالین اور پردے، بیڈ اور نائٹ لیمپ کا نرم اجالا، خواب آفریں فضا کا اندھیرا اور ریشمی چادر کا سحر آفریں لمس... سب الماس کو پہچانتے تھے۔ کہیں کوئی چیز بدلی ہوئی نہ تھی۔ الماس کو اپنی جلد بازی پر افسوس ہوا۔ خطرہ محض فریبِ خیال ثابت ہوا تھا اور اس کے

تمام اندیشے بے بنیاد تھے۔ وہ بڈھا ڈرائیور کوئی غلط ارادہ نہیں رکھتا تھا سب شکوک اسکے اپنے ذہن کی پیداوار تھے لیکن وہ گاڑی.....!

وہ اٹھ بیٹھی۔ بے اختیار اس کی نگاہ وال کلاک پر چلی گئی۔ کچھ دیر وہ گھڑی کی سوئیوں کو بے یقینی کے ساتھ دیکھتی رہی۔ کیا یہ بھی نظر کا دھوکا ہے؟ گھڑی میں صبح کے ساڑھے تین بج رہے تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ چھ گھنٹے سے بھی زیادہ دیر تک بے ہوش رہی ہے۔ الماس کا دل خوف سے بیٹھنے لگا۔ یہ پوری رات اس نے گھر سے باہر گزار دی تھی۔ صبح ہونے سے پہلے اس کے لیے گھر پہنچنا ناممکن تھا۔ معلوم نہیں گھر والوں میں سے کوئی اس کی سہیلی کے پاس پہنچا یا نہیں اور پہنچا تو کیا وہ انہیں مطمئن کرنے میں کامیاب رہی؟ ڈی سلوا کہاں گیا؟ اس نے تو مجھے ایک ہنگامی ضرورت کے تحت بلایا تھا۔ اس ضرورت کی وضاحت کیے بغیر وہ کہاں جاسکتا ہے۔ اس نے ڈی سلوا کو آواز دی لیکن اس مختصر سے بنگلے کی خاموشی میں کوئی جواب نہ آیا۔ اس نے دوسرے کمروں میں جھانکا اور باتھ روم تک دیکھ ڈالے لیکن ڈی سلوا کہیں ہوتا تو ملتا۔ الماس پھر بیڈ روم میں لوٹ آئی۔ ایک بار پھر خوف کے بے رحم ہاتھ اس کے دل کو جکڑنے لگے۔ الماس نے سب دروازے اندر سے بند کیے اور شدید اعصابی کشیدگی کا شکار اور ان گنت نئے اندیشوں کی یلغار سے ہراساں بیٹھی رہی اور انتظار کرتی رہی کہ ڈی سلوا کسی کام سے باہر گیا ہو تو لوٹ آئے۔ رفتہ رفتہ پردوں کے پیچھے کھڑکی کے شیشوں پر صبح کا دھندلکا پھیلنے لگا۔ اور الماس کا یہ شک یقین کی صورت اختیار کرنے لگا کہ ڈی سلوا کے ساتھ بھی کوئی حادثہ پیش آچکا ہے ورنہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ الماس کو بلواتے اور اسے گھر میں اکیلا چھوڑ کے غائب ہو جائے۔ تاہم اس کا ذہن واقعات سے حقائق کا اندازہ لگانے اور کسی نتیجے پر پہنچنے سے قاصر تھا۔

دن کی روشنی کے پھیلتے ہی وہ گھر کو کھلا چھوڑ کے فرار ہوگئی۔ اپنی راز داں سہیلی کے گھر پہنچ کے اس کی جان میں جان آئی۔ الماس کے گھر سے کوئی بھی کچھ پوچھنے نہیں آیا تھا۔ سہیلی کے گھر والے اتنی صبح الماس کو دیکھ کے بہت حیران ہوئے لیکن الماس نے ان کو مطمئن کر دیا اور اپنی سہیلی کے ساتھ واپس گھر پہنچی۔ ناشتہ انہوں نے ایک ساتھ کیا اور پھر الگ الگ اپنے کام پر روانہ ہوگئیں۔

ڈی سلوا آفس میں بھی نہیں تھا۔ الماس نے گیارہ بجے تک اس کا انتظار کیا پھر اس نے غلام علی کو بلایا جو اسی فرم

میں اکاؤنٹنٹ تھا اور اس سے ڈی سلوا کے بارے میں پوچھا۔ غلام علی کے جواب پر وہ بے ہوش ہوتے ہوتے رہ گئی۔ اسے معلوم ہوا کہ ڈی سلوا تو دو دن پہلے فرم کے کسی کام سے لندن جا چکا ہے اور شاید ایک ہفتہ بعد واپس آئے گا۔ غلام علی خود بھی حیران ہوا کہ ڈی سلوا اپنی سیکرٹری کو کچھ بتا کر کیوں نہیں گیا۔ معاملات الماس کی سمجھ سے باہر تھے اور حالات کے اس معمے کا کوئی حل نہ تھا۔ خود ڈی سلوا ہی سے کسی وضاحت کی امید کی جاسکتی تھی۔ لیکن اس میں بھی الماس نے خود اپنے لیے ایک مشکل پیدا کر لی تھی۔ اس نے ڈی سلوا کی طرف سے موصول ہونے والے پیغام کو جلا دیا تھا۔ اب اس کے پاس اپنے یقین کے سوا اس بات کا کوئی ثبوت نہیں رہا تھا کہ وہ تحریر ڈی سلوا ہی کے ہاتھ کی تھی۔ وہ کوئی تحریر شناسی کی ماہر نہیں تھی اور جلدی میں اس نے تحریر پر بہت زیادہ غور بھی نہیں کیا تھا چنانچہ جعلسازی کے امکانات کو یکسر مسترد کرنا بھی مشکل تھا۔ بنانے والے تو سب کچھ بنا لیتے ہیں۔ تحریر کیا چیز ہے کرنسی نوٹ تک چھاپ لیتے ہیں۔ دوسری طرف اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا کہ الماس کو دھوکے سے ساتھ لے جانے والے، اسے بخیر و عافیت ڈی سلوا کے بیڈ روم میں چھوڑ کر کیوں چلے گئے تھے۔ شام کو الماس نے ٹرنک کال بک کرائی اور لندن میں ڈی سلوا سے بات کی۔ اس نے بے حد ندامت کا اظہار کیا کہ وہ عجلت میں الماس کو اپنی روانگی کے پروگرام کے بارے میں مطلع نہ کر سکا لیکن الماس نے اس سے اور کوئی بات نہیں کی۔ وہ صرف اس بات کا یقین کرنا چاہتی تھی کہ ڈی سلوا واقعی لندن میں ہے اس کی واپسی پر الماس نے پہلی فرصت میں اس کو تمام واقعات سنائے۔ وہ سخت حیران ہوا اور تشویش کا شکار بھی کیونکہ اس نے الماس کو بلوانے کے لیے کوئی تحریری پیغام نہیں بھیجا تھا۔

"بھلا مجھے ایسی کون سی ہنگامی ضرورت لاحق ہوسکتی تھی؟" ڈی سلوا نے کہا۔ "اور ہوتی تو کیا میں خود نہیں آسکتا تھا؟ لیکن میں تو یہاں تھا ہی نہیں۔"

"اور تمہارا گھر؟ وہ کیوں کھلا پڑا تھا؟" الماس نے بیوقوفوں کی طرح کہا۔

"کھلا پڑا تھا؟ گھر کو میں مقفل کر کے چابیاں اپنے ساتھ لے گیا تھا۔" ڈی سلوا نے تردید کرتے ہوئے کہا۔ "واپسی میں مجھے گھر اسی طرح مقفل ملا جیسا میں چھوڑ گیا تھا۔"

"کیا دروازوں کے ہر قفل کی دوسری چابی تمہارے پاس تھی؟" الماس نے بے یقینی سے پوچھا۔

"ایک کے ساتھ دوسری چابی اپنے پاس بے وقوف

رکھتے ہیں۔" ڈی سلوا بولا۔" دوسرا سیٹ میری آفس ٹیبل کی دراز میں رہتا ہے۔" ثبوت کے طور پر اس نے چابیوں کا ایک گچھا اپنی جیب سے اور دوسرا میز کی سب سے نیچے والی دراز میں سے نکال کے رکھ دیا۔ اس نے الماس کو لانے والے کسی بڈھے ڈرائیور کے بارے میں بھی قطعی لاعلمی کا اظہار کیا اور یہ بھی بتایا کہ جاتے وقت وہ اپنی گاڑی کو گیراج میں بند کر کے اور شٹر گرا کے مقفل کر گیا تھا چنانچہ وہ گاڑی دوسری ہوگی جسے رنگ، ماڈل اور ساخت کی یکسانیت کے باعث الماس پہچان نہ سکی۔ الماس اسے جھوٹا نہیں کہہ سکتی تھی۔ دنیا میں ڈی سلوا سے زیادہ قابلِ اعتماد کون ہو سکتا تھا مگر اس کے دل میں ایک خلش سی تھی جیسے کوئی کانٹا نکل جائے مگر نوکِ خار ٹوٹ کر رہ جائے اور نظر نہ آنے کے باوجود باعثِ آزار بنی رہے کیونکہ اس کی سہیلی نے واقعی کار کا نمبر نوٹ کیا تھا اور یہ نمبر ڈی سلوا کی کار کا تھا لیکن وہ مزید سوالات کرتی تو زیادہ بے وقوف بنتی۔ ڈی سلوا کہتا کہ تمہارا دماغ خراب ہے۔ تم ہی بتاؤ کہ میری نمبر پلیٹ کوئی اپنی گاڑی پر کیسے لگا سکتا ہے جبکہ میری گاڑی بدستور گیراج میں کھڑی رہی اور کسی نے قفل کو چھوا تک نہیں۔ الماس کیا کہتی کہ خرابی میرے دماغ کی نہیں بلکہ اتفاق سے نمبر ایک تیسرے شخص نے نوٹ کیا تھا۔ الماس کی سہیلی نے عادت کے مطابق احتیاط پسندی کا مظاہرہ کیا تھا اور مطمئن ہونے کے باوجود الماس کو ایک اجنبی کے ساتھ گاڑی میں رخصت کرتے وقت ایک نظر نمبر پلیٹ پر بھی ڈال لی تھی۔ کوئی منطقی نتیجہ اخذ کرنا یا عقل کے دلائل سے کچھ ثابت کرنا ناممکن تھا۔ حد سے زیادہ الجھن اور پریشانی کا انجام تعلقات میں کشیدگی کا سبب بنتا۔ مجبوراً وہ خاموش ہوگئی۔

ایک ہفتہ بعد وہ صبح دفتر پہنچی تو ڈی سلوا نے اسے کمرے میں بلوا لیا اور اندر سے دروازہ بند کرنے کے بعد ٹیلی فون پر اپنے ماتحت غلام علی سے کہا کہ وہ کسی سے نہیں ملے گا اور اگر ٹیلی فون پر بھی اسے کوئی پوچھے تو کہہ دیا جائے کہ ڈی سلوا صاحب نہیں آئے۔ غلام علی کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ڈی سلوا جب بھی "ضروری کام" میں مصروف ہوتا تھا تو ایسی ہی ہدایات جاری کر دیتا تھا لیکن الماس کے لیے ڈی سلوا کی گھبراہٹ اور پریشانی ایک نیا تجربہ تھی۔ وہ سخت بدحواس اور بوکھلایا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ ہاتھ منہ دھوئے بغیر اور ناشتہ کیے بغیر آفس آ گیا ہے اور شاید رات بھر جاگتا رہا ہے۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں، بال پریشان تھے اور کپڑے بے ترتیب تھے۔ اس نے الماس کو حوصلہ رکھنے اور سکون سے پوری بات سننے کی تاکید کی حالانکہ خود اسے سکون اور حوصلہ کی ضرورت تھی۔ وہ الماس کے سامنے بیٹھا آدھی آدھی سگریٹوں کو ایش ٹرے میں مسل کر بجھاتا رہا اور پھر نئی سگریٹ جلاتا رہا۔ اس کی ہر حرکت سے دلی اضطراب عیاں تھا اور یوں لگتا تھا کہ اسے بات کرنی مشکل ہو رہی ہے۔ بالآخر جو کچھ اس نے بتایا وہ ہیروشیما پر گرنے والے پہلے ایٹم بم کے دھماکے سے کم نہ تھا۔

اس نے بتایا کہ ایک ہفتہ پہلے الماس کو اغوا کر کے لانے والے اس کے پرانے کاروباری حریف تھے جنھوں نے اس کے ذاتی دشمنوں سے الحاق کر کے ایک سازش کی تھی۔ انہوں نے ڈی سلوا کی عدم موجودگی میں اس کے گھر کے دروازوں کی چابیاں بنوائیں، گیراج سے اس کی کار بھی نکال لی اور اس کی تحریر بنا کر الماس کو ایک پیغام ارسال کر دیا۔ الماس کو لانے والا دیکھنے میں بڈھا لگتا ہے مگر وہ بہت سے جوانوں سے زیادہ پھرتیلا اور طاقتور ہے اور جوڈو کراٹے کے علاوہ خنجر کے استعمال میں بھی ماہر ہے۔ وہ لوگ ایک خاص مقصد کے تحت الماس کو لائے تھے۔ الماس چھ گھنٹے بے ہوش نہیں رہی تھی بلکہ اسے خواب آور دوا کے زیرِ اثر بے ہوش رکھا گیا تھا ورنہ چوٹ سے تو وہ کچھ دیر بعد ہوش میں آ جاتی۔ بے ہوشی کے اس وقفے میں انہوں نے الماس کی بہت سی تصویریں اتار لیں۔ یہ تصویریں ایسی ہیں کہ کوئی شریف آدمی ان کو ایک نظر دیکھنا تک گوارا نہیں کر سکتا۔ اس سے پہلے نہ جانے کب وہ اسی بیڈ روم میں سوتے ہوئے ڈی سلوا کی تصویریں لے چکے تھے۔ چونکہ ڈی سلوا کے گھر میں اس کے سوا کوئی بھی نہیں ہوتا اور خود اسے بھی یاد... کپڑے پہن کر سونے کی عادت نہیں ہے اس لیے خاص زاویے سے لی ہوئی یہ تصاویر بھی قابلِ اعتراض سمجھی جا سکتی ہیں۔ لیکن اسی پر بس نہیں۔ کیمرہ ٹرک اور فوٹوگرافی کے کمال سے ڈی سلوا اور الماس کی چند تصویروں کو یکجا کر کے کچھ ایسی تصویریں بھی بنا لی گئی ہیں جن کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جو تصویریں الگ الگ ہیں ان میں بھی بیڈ روم ایک ہی ہے اور جعلسازی کوئی نہیں چنانچہ باقی تصویروں کو جعلی ثابت کرنا آسان کام نہیں ہے جو کسی ماہر فوٹوگرافر نے تیار کی ہیں۔ جعلی ثابت کرنے کے لیے بھی مقدمہ کرنا پڑتا ہے اور عدالت میں فیصلہ ہونے تک ساری دنیا نقل کو اصل مان چکی ہوتی ہے چنانچہ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہ خود اپنی رسوائی کا سامان کرنے کے مترادف ہوگا وغیرہ وغیرہ۔

جب الماس کے حواس بحال ہوئے تو اس نے بے شمار سوالات کیے اور ان کے جواب میں ڈی سلوا نے بتایا کہ دشمن الماس کے ذریعے اسے بلیک میل کرنا چاہتے ہیں۔ ان لوگوں نے ڈی سلوا سے رابطہ قائم کیا تھا کہ وہ فرم کے کام سے باہر رہتا ہے اگر اس مرتبہ وہ اپنے ساتھ ایک سوٹ کیس لے جائے تو اس کو یہاں دس لاکھ روپیہ نقد ادا کیا جا سکتا ہے یا اس کے نام سے باہر ایک لاکھ ڈالر کا اکاؤنٹ کھولا جا سکتا ہے۔ اتنے بڑے معاوضے کی پیش کش پر ڈی سلوا کو شک ہونا لازمی تھا اور تصدیق کرنے پر معلوم ہو گیا کہ سوٹ کیس میں ایک کروڑ روپے کی ہیروئن ہے۔ ڈی سلوا نے ان کو پکڑوانے کی غرض سے حامی بھر لی لیکن دوسری طرف کسٹم والوں کو اس کی اطلاع دے دی۔ کسٹم والے سب ایماندار اور فرض شناس تو نہیں ہوتے۔ انہوں نے اس رپورٹ کی خبر متعلقہ افراد تک پہنچا دی جنھوں نے آخری وقت میں سوٹ کیس بدل دیا۔ ائیرپورٹ پر دوسرا سوٹ کیس لانے والا پکڑا گیا مگر سوٹ کیس میں سے پھٹے پرانے کپڑوں کے سوا کچھ نہیں نکلا اور وہ شخص بھی بے گناہ ثابت ہوا جو سوٹ کیس لایا تھا۔ وہ کسی کو چھوڑنے آیا تھا کہ ایک ٹیکسی ڈرائیور نے اسے سوٹ کیس دیا اور اشارے سے بتایا کہ وہ صاحب جلدی میں بھول گئے تھے اور اس شخص نے کسی شک و شبہ کے بغیر سوٹ کیس ڈی سلوا کے حوالے کر دیا۔

"اب ان ہی لوگوں کا پیغام مجھے ملا ہے۔" ڈی سلوا نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام کر کہا۔" ان کے ایک آدمی نے کل رات مجھ سے لفٹ مانگی اور اترتے وقت سیٹ پر ایک لفافہ چھوڑ گیا، جسے میں نے گھر پہنچ کے دیکھا یقین کرو کہ مجھے ہارٹ اٹیک ہوتے ہوتے رہ گیا۔ نہ جانے کتنی دیر تک میں ان تصویروں کو دیکھتا رہا جو لفافے میں سے برآمد ہوئی تھیں۔ میری ذہنی کیفیت ایسی تھی کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ غصے اور صدمے نے مجھے پاگل کر دیا تھا۔ رات کے ایک بجے ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور کسی بدمعاش نے کہا۔" مسٹر ڈی سلوا تصویریں پسند آئیں؟" میں نے جواب میں اس کو سیکڑوں گالیاں دیں اور کہا کہ میں ایک ایک سے نمٹ لوں گا۔ مگر وہ ہنستا رہا۔ اور کہنے لگا کہ ڈی سلوا صاحب تم کچھ نہیں کر سکتے۔ تم نے ہمارے ساتھ دھوکا کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ اسی کی سزا تھی۔ اب تم وہی کام کرو گے لیکن بلا معاوضہ۔ اور انکار کرو گے تو اپنے ساتھ الماس کی زندگی بھی خراب کرو گے۔ بے حیائی کی زندگی تم گزار سکتے ہو کیونکہ تم تو کہیں بھی جا سکتے ہو لیکن الماس لعنتی زندگی سے خودکشی ہی کر سکتی ہے یا بالآخر کسی کوٹھے پر بیٹھ سکتی ہے۔ میرا دماغ الٹ گیا اور میں نے دیوانگی میں ٹیلی فون کو زمین پر دے مارنے کے علاوہ بھی بہت کچھ کیا مگر صبح ہوتے ہوتے میری عقل ٹھکانے آ گئی اور میں نے ایسے اوچھے ہتھیاروں کے مقابلے میں شکست تسلیم کرنے کے بجائے فیصلہ کیا کہ انہیں ایسی عبرتناک سزا دوں جو ان کو تمام عمر یاد رہے۔"

الماس کے لیے اس فیصلے کی مخالفت کرنا بھی مشکل تھا اور حمایت بھی۔ اسے ہر صورت میں اپنا مستقبل تاریک نظر آتا تھا کیونکہ اس مقابلے میں جیت بھی ہار تھی۔ الماس نے کہا کہ مصالحت کی کوئی صورت سب سے بہتر رہتی مگر ڈی سلوا نے اس کی بات کو مسترد کر دیا۔ مصالحت شریف لوگ کرتے ہیں یا مجبور لوگ اور اس مرحلے پر مصالحت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اس نے بتایا کہ گزشتہ شب ملنے والی تصویریں تو اس نے جلا ڈالیں تھیں لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ نیگیٹیو دشمن کے پاس ہیں جن سے وہ جتنی نقلیں چاہے تیار کر سکتا ہے اور یہ مسئلہ یوں حل نہیں ہوگا۔ لوہے کو لوہا ہی کاٹتا ہے چنانچہ بدمعاشی کا جواب بھی بدمعاشی سے ہی دیا جا سکتا ہے۔ اس نے الماس کو بتایا کہ اس بڈھے کی ایک بیٹی ہے جو کسی اسکول میں پڑھاتی ہے۔ باقی بات الماس خود ہی سمجھ گئی۔

"اب تم بھی یہی کرو گے؟" وہ دیوانوں کی طرح چلائی۔" تم بھی اسے دھوکے سے اٹھا کر لاؤ گے؟ تم بھی اس کی تصویریں اتارو گے؟ کیا تم بھی انتقام کے جذبے میں شیطان بن گئے ہو؟ تمہارا ضمیر بھی مر گیا ہے کیا؟ سڑک پر پاگل کتا تمہیں کاٹ لے گا تو کیا تم بھی پاگل کتے کو کاٹنے کے لیے اس کے پیچھے دوڑو گے؟"

"تم نے ابھی میری پوری بات نہیں سنی۔" ڈی سلوا نے سخت لہجے میں کہا۔" تم پاگل ہو رہی ہو۔۔۔"

"ہاں میں پاگل ہو رہی ہوں۔" الماس چلائی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔" مجھے پاگل ہی ہو جانے دو۔ یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے اور اب مجھے ذلت اور رسوائی سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ تم مجھے غیرت سے قتل کر دو۔ میرے مرنے کے بعد اگر کوئی رسوائی بھی ہوئی تو کیا ہوگا۔ کوئی مجھ سے کیا چھین لے گا لیکن میں یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ میرے جیتے جی میری وجہ سے ایک ایسی لڑکی کی زندگی خراب ہو جس کا ان معاملات سے کوئی تعلق نہیں اور جو بالکل بے قصور ہے۔ ہر غیرت مند لڑکی اتنی رسوائی پر موت کو ترجیح دے گی مگر میں اس کی موت کا الزام قبول کر کے کیسے زندہ رہوں گی؟ میرے لیے تو یہ دوسری سزا ہوگی کہ ایک جنازہ میری خاندانی

عزت و ناموس کا اٹھے اور دوسرا اس ٹیچر کا... نہیں ڈی سلوا! تم اسے بخش دو۔ مجھے مرجانے دو اور اسے جینے دو۔ ایک کی جگہ دو قتل مت کرو...“

ڈی سلوا نے پانی کا گلاس الماس کے منہ پر پھینک دیا جس کا ہسٹریا ایک جنونی کیفیت اختیار کرنے لگا تھا۔ ”تم صرف اپنی بات کیوں کرتی ہو۔ یہ بتاؤ کہ تمہارے بغیر میں کیسے زندہ رہوں گا؟ دوسری صورت یہ ہے کہ میں ان سب کو چن چن کر قتل کر دوں جو تمہاری عزت سے کھیلنا چاہتے ہیں لیکن پہلی صورت پر تم نے غور نہیں کیا۔ اس صورت میں ہم سب زندہ رہ سکتے ہیں اور عزت و آبرو کے ساتھ۔ میں نے یہ کب کہا ہے کہ میں اس لڑکی کو اغوا کر کے اس کی بھی ویسی ہی تصویریں بنانا چاہتا ہوں۔ میری بات ختم ہونے سے پہلے ہی تم نے نتائج اخذ کر لیے اور مجھے بے ضمیر شیطان سب کچھ کہہ دیا۔ بیوقوف لڑکی! اگر اس دنیا میں طاقت کا توازن بگڑ جائے تو امن قائم نہیں رہ سکتا۔ دشمن اسی وقت وار کرتا ہے جب اسے یقین ہو کہ دوسرا حریف اس کا کچھ نہیں کر سکتا۔ گولی چلانے والے کو معلوم ہو کہ دوسرے شخص کے ہاتھ میں بھی بندوق ہے تو اس کا ہاتھ رک جاتا ہے۔ مگر دوسرا فریق خالی ہاتھ ہونے کے باوجود یہ تاثر دے سکے کہ وہ بھی مسلح ہے تو بھی دشمن آسانی سے کامیاب نہیں ہوتا۔“ پھر جیسے جیسے الماس کا ہسٹریا کم ہوتا گیا ڈی سلوا کی باتیں اس کی سمجھ میں آتی گئیں۔

”میں یہ چاہتا ہوں کہ تم کسی بہانے اس لڑکی کو میرے پاس لے آؤ۔“ ڈی سلوا نے اپنی اسکیم کی تفصیلات بتاتے ہوئے کہا۔ ”ایک ہفتے کے اندر اندر تم اس سے دوستی بڑھا سکتی ہو اور اسے ایک ایسی جگہ لا سکتی ہو جہاں تمہارا کام ختم ہو جائے گا اور باقی کام میرا ہو گا۔ میں چند گھنٹے یا زیادہ سے زیادہ ایک دن اس لڑکی کو قید میں رکھوں گا۔ قید کا مطلب یہ نہیں کہ میں اس کو باندھ کر رکھوں گا یا اس پر کوئی ظلم کروں گا۔ وہ آرام سے ایک گھر میں رہے گی اور تم اس کے ساتھ رہو گی۔ تم دیکھو گی کہ میں اس لڑکی کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہیں کروں گا اور اس کی کوئی تصویر نہیں اتاروں گا۔ لیکن میں اس کے باپ سے فون پر یہی کہوں گا کہ جو جیسا بوتا ہے ویسا کاٹتا ہے۔ اس نے کسی کی بیٹی کی عزت کا سودا کرنا چاہا تھا اور یہ بھول گیا تھا کہ اس کی اپنی بھی ایک جوان بیٹی ہے۔ وہ اس وقت ہمارے اسٹوڈیو میں موجود ہے اور ہم زیادہ اچھی فوٹوگرافی کر رہے ہیں۔ اس نے تو ساکت تصویروں پر ہی اکتفا کی تھی لیکن ہم فلم بنا رہے ہیں جسے دیکھ کر اس کی اور دیگر شائقین کی طبیعت باغ باغ ہو جائے گی۔ اگر وہ چاہتا ہے کہ یہ فلم ریلیز نہ ہو تو وہ تمام نیگیٹو اور پرنٹ لے کر آ جائے اور اس بات کو ذہن میں رکھے کہ بے ایمانی کا خیال اگر اسے آیا تو دوسرے کو بھی آئے گا۔ اگرچہ ہو گا کچھ بھی نہیں لیکن اس دھمکی کے بعد بڈھے کے لیے ہتھیار ڈالنے کے سوا چارہ نہ ہو گا۔“

غور کرنے پر الماس کو اس پورے منصوبے میں بدی کا کوئی پہلو دکھائی نہ دیا۔ صرف دھمکی دینے سے بگڑے ہوئے معاملات سنور سکتے ہوں تو کوشش کرنے میں کیا ہرج ہے۔ پہل تو اس بڈھے نے ہی کی تھی۔ اسے اتنی سزا ضرور ملنی چاہیے کہ آئندہ دوسروں کے دامنِ عزت پر ہاتھ نہ اٹھانے سے پہلے اپنا دامن بچانے کی فکر کرے۔ ڈی سلوا نے اسے پوری طرح مطمئن کر دیا کہ وہ جارحانہ عزائم بالکل نہیں رکھتا اور جو کچھ وہ کر رہا ہے، صرف اپنا دفاع ہے۔ باقی تفصیلات سمجھ لینے کے بعد الماس نے اس کی مدد کی۔ ایک ہفتہ کے اندر اندر اس نے بڈھے کی لڑکی سے دوستی کر لی۔ یہ لڑکی جس کا نام ”گل رخ“ تھا طبعاً بہت سیدھی سادی لڑکی تھی اور اس سے تعلقات بڑھانے میں الماس کو زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ ایک بار ڈی سلوا کی جوابی کارروائی میں شریک ہونے کے بعد خود الماس کے جذبات انتقامی ہو گئے تھے۔ اس کے ساتھ کون سا شریفانہ سلوک ہوا تھا کہ وہ رعایت کرے۔ اگر وہ خودکشی کر لیتی تو گل رخ کے باپ کا کیا نقصان ہوتا؟ اسے یہ سبق کون دیتا کہ جیسے کو تیسا ضرور ملتا ہے۔ اس نے ڈی سلوا پر اعتبار کر لیا تھا کہ اس تمام کارروائی کا مقصد اور کچھ نہیں۔ وہ ڈی سلوا کی ذہانت اور جرأت کی زیادہ قائل ہو گئی تھی جس نے صرف اس کی خاطر ہار نہیں مانی تھی۔ غلط کام نہیں کیا تھا اور گل رخ کے ساتھ بھی وہ کوئی زیادتی نہ کرنے کا وعدہ کر چکا تھا۔ ایک رات اپنی بیٹی گھر سے غائب رہے گی تو اس خبیث بڈھے کا دماغ درست ہو جائے گا۔ غصے سے الماس کا خون کھولنے لگتا تھا۔ پھر غصہ اتر جاتا تھا اور وہ خود اپنے تصور کی ہر تصویر دیکھ کر شرم سے پانی پانی ہو جاتی تھی۔ خوف سے کانپنے لگتی تھی کہ بات پھیل گئی یا ڈی سلوا کی چال ناکام رہی تو کیا ہو گا۔ ایک ہفتے کے دوران میں الماس کو بہت سی باتیں معلوم ہوئی تھیں۔ گل رخ کی شادی اب تک اس لیے نہیں ہو سکی تھی کہ جو اس کا پیغام لے کر آتا اس کی کسی چھوٹی بہن کو پسند کر لیتا تھا لیکن اب اس کے سوا گھر میں کوئی نہیں رہا تھا اور خدا نے والدین کی دعائیں قبول کرتے ہوئے اس کے لیے بھی ایک رشتہ بھیج دیا تھا چنانچہ اس سال کے آخر تک وہ شادی کے بعد اسکول میں پڑھانا چھوڑ دے گی۔ اس کا شوہر اعلیٰ سرکاری افسر ہے اور والدین کے پاس بھی خدا کا دیا سب کچھ ہے چونکہ الماس کو ان باتوں سے دلچسپی نہیں تھی اس لیے اس نے کبھی گل رخ کے ہونے والے شوہر کا نام نہیں پوچھا اور یہ نہیں پوچھا کہ اس کا باپ کیا کرتا ہے۔ اپنے بارے میں بھی اس نے گل رخ کو ہر بات غلط بتائی۔ اپنا نام بھی اپنے خاندان اور گھر والوں کے بارے میں بھی۔ ڈی سلوا نے کہا تھا کہ نہ وہ اس کے گھر جائے نہ اسے اپنے گھر یا دفتر کا پتہ بتائے ورنہ بعد میں گڑبڑ بھی ہو سکتی ہے۔ الماس اس کی ہدایات پر عمل کر رہی تھی اور بہت محتاط تھی۔

بالآخر ایک روز وہ گل رخ کو اپنے ساتھ لے جانے میں کامیاب ہو گئی۔ طے شدہ مقام پر ڈی سلوا کی کار موجود تھی۔ وہ گل رخ کے ساتھ قریب سے گزری تو اچانک دروازہ کھلا اور دو زبردست ہاتھوں نے تقریباً ایک ساتھ ان کو اندر گھسیٹ لیا۔ گاڑی کا انجن پہلے ہی چل رہا تھا۔ دروازہ بند ہوتے ہی گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھی۔ گل رخ کے حلق سے چیخ نکلنے بھی نہ پائی تھی کہ ایک ہاتھ نے اس کے منہ پر کلوروفارم میں بھیگا ہوا رومال رکھ دیا۔ اندر گرتے ہی الماس نے دیکھ لیا تھا کہ پچھلی سیٹ پر دو آدمی ہیں جو ایک جیسے تنومند ہیں اور دونوں نے چہرے پر جوکر کی وہ رنگین تصویر چڑھا رکھی ہے جس سے بچے کھیلتے ہیں۔ اس کے سوراخوں میں سے وہ سب کچھ دیکھ سکتے تھے مگر خود ان کی صورت ”گتے“ کی تصویر کے پیچھے نظر نہیں آتی تھی۔ الماس کا خیال تھا کہ یہ سب ڈرامہ ہے چنانچہ اندر گرنے کے بعد بھی وہ خوفزدہ نہیں ہوئی تھی مگر دوسرے ہاتھ نے اس کو دبوچ کر اس کی ناک پر بھی رومال رکھ دیا تو ہوش کے آخری لمحے میں حقیقت اس پر یوں عیاں ہوئی کہ وہ خوف سے ہی بے ہوش ہو گئی۔ یہ وہی گاڑی تھی جس کے اندر کوئی ہینڈل نہ تھا اور گاڑی چلانے والا وہی بوڑھا تھا، جو الماس کو لے گیا تھا۔

ہوش میں آنے پر اسے سخت متلی اور سر درد کا احساس ہوا۔ اس نے خود کو بالکل اجنبی جگہ دیکھا۔ یہ گودام جیسی سیمنٹ کی بیرک تھی جس میں گل رخ اس کے قریب ہی سخت فرش پر پڑی تھی۔ جو لوگ وہاں موجود تھے ان میں وہ بڈھا شامل نہیں تھا۔ الماس نے ڈی سلوا کے بارے میں سوال کیا۔

”ڈی سلوا!“ ایک نقاب پوش نے قہقہہ لگایا۔ ”وہ کیا ہوتا ہے۔ کیا پوری طرح ہوش نہیں آیا ابھی؟“ اس کے اشارے پر دوسرے نے ٹھنڈے پانی کی بھری ہوئی بالٹی الماس پر

”تم... تم لوگ کون ہو؟“ وہ ہانپتے اور سردی سے کانپتے ہوئے بولی۔ ”ڈی سلوا تم کو قتل کر دے گا جب اسے معلوم ہو گا...“

الماس کے منہ پر زبردست طمانچہ پڑا۔ ”یہ نام پھر مت لینا۔“ پہلے شخص نے کہا اور الماس کی طرف ایک لفافہ پھینک دیا۔ ”یہ ہیں تمہاری تصویریں۔ باقی تصویریں ابھی بن کے آجائیں گی۔“

”باقی تصویریں؟“ الماس نے دہشت زدہ ہو کے چیخ ماری۔ ”کیا تم نے اس کی بھی...؟“ اس نے فرش پر لیٹی ہوئی گل رخ کی طرف دیکھا۔

”ہاں۔ ہم نے اس کی بھی کچھ تصویریں بنا لی ہیں۔“ وہ شخص بولا۔ ”اس کا منگیتر کسٹم آفیسر ہے۔ ہمیں اس سے ایک کام لینا تھا۔ تم نے ہماری مدد کی۔ اب تم برابر کی شریکِ جرم ہو۔“

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“ الماس نے ڈوبتی آواز میں کہا مگر اس کو جواب دینے کے لیے خود ڈی سلوا اندر آ گیا۔ وہ بے تحاشا ڈی سلوا کی طرف بھاگی۔ ”ڈی سلوا! یہ سب کیا ہے؟“

”تمہاری عقل کا فتور۔ تمہاری تقدیر کا چکر۔ تمہاری شامتِ اعمال۔“ ڈی سلوا نے اسے دھکیل دیا۔ ”میں نے تم سے سب جھوٹ بولا تھا۔ تم کو میرے ایما پر میرے ہی آدمی اغوا کر کے لے گئے تھے۔ تم کو اس معاملے میں کوئی خوش فہمی نہیں رہنی چاہیے کہ میں تمہیں ایک مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہتا تھا۔ دوسرا مقصد تم سے نجات حاصل کرنا تھا۔ تم مجھ سے شادی کے معاملے میں سیریس ہوتی جا رہی تھیں۔ کسی دن بھی کہہ سکتی تھیں کہ تم میرے بچے کی ماں بننے والی ہو۔“

”حرامی... کمینے...“ وہ اس پر حملہ آور ہوئی۔ ”کیا یہ جھوٹ ہو گا؟ میں تجھے قتل کر دوں گی۔“ مگر ڈی سلوا کے تھپڑ سے وہ پھر نیچے جا گری۔

”اگر کچھ ہو گا بھی تو وہ جھوٹ سمجھا جائے گا۔“ ڈی سلوا نے حقارت سے کہا۔ ”اس لیے کہ میں اسے جھوٹ کہوں گا اور دنیا میری بات تسلیم کرے گی۔ میں ایک معزز آدمی ہوں۔ تو کیا ہے؟ دو ٹکے کی چھوکری... فاحشہ... یہ تصویریں تیرے ہی خلاف ثبوت فراہم کریں گی۔ پھر ان میں میری کوئی تصویر نہیں ہو گی۔ بیڈروم کا وہ سب سامان اور رنگ روغن بدلا جا چکا ہے جو تصویر میں نظر آتا ہے اور یہ تصویریں بھی دوسرے لوگوں کے پاس ہوں گی۔ تیرے خلاف یہ لڑکی بھی گواہی دے گی کہ تو اسے ورغلا کے یہاں لائی تھی اور تو نے اپنا نام، پتہ سب غلط بتایا تھا تو تو خودکشی بھی نہیں کر سکتی کیونکہ اس

سے تیرے گھر والوں کی عزت پر آنے والا بدنامی کا داغ نہیں مٹے گا۔ تیرے بعد دنیا تیرے ماں باپ کے منہ پر تھوکے گی اور تیری بہنیں ساری عمر کنواری بیٹھی رہیں گی۔"

فرش پر پڑی ہوئی الماس نے نیم بے ہوشی کے عالم میں یہ سب باتیں سنیں۔ تقدیر کی اس بے رحمی پر اور اپنی بے لبسی پہ روتے روتے اس کے آنسو بھی خشک ہو گئے اور ڈی سلوا کی دغا بازی پر خودکشی سے قتل تک لے تمام اقدامات کو ناقابل عمل سمجھنے کے بعد اس نے ڈی سلوا کے لیے کام کرنا منظور کر لیا۔ ڈی سلوا نے اسے یقین دلا دیا تھا کہ اس نے کوئی حماقت اور حکم عدولی نہ کی تو اسے معاف کر دیا جائے گا اور اس کے خلاف تمام ثبوت ختم کر دیے جائیں گے۔ پھر ڈی سلوا نے اسے گل رخ کے منگیتر سے رابطہ قائم کرنے کے لیے کہا جو کسٹم آفیسر تھا اور ڈی سلوا کو خاصا نقصان پہنچا چکا تھا۔ رشوت قبول نہیں کرتا تھا اور دو مرتبہ ڈی سلوا کے آدمیوں کو مار کے بھگا چکا تھا۔ الماس اس کے پاس ایک مخبر بن کے پہنچی۔ کسٹم آفیسر بہت ذہین آدمی تھا۔ اس نے سب سے پہلے الماس سے یہی پوچھا کہ بظاہر وہ ایک شریف لڑکی نظر آتی ہے۔ اس کا اسمگلروں سے کیا تعلق ہے؟ اور اسے ان کے بارے میں معلومات کیسے حاصل ہوئیں؟ الماس نے کہا کہ وہ اچھے گھر کی لڑکی ہے مگر اس کا بھائی صحبتِ بد میں پڑ کے خاندان کی عزت کو خاک میں ملانے پر تل گیا ہے۔ اس کے پاس مشکوک چال چلن اور صورت سے بدقماش نظر آنے والے افراد کا آنا جانا ہے۔ وہ ان کے ساتھ جاتا ہے تو کئی کئی دن لوٹ کر گھر نہیں آتا اور آتا ہے تو نوٹوں سے بھرا ہوا بریف کیس لے کر آتا ہے۔ شروع میں والدین نے سختی سے پوچھا تھا کہ وہ کیا کرتا ہے اور اتنا پیسہ کہاں سے لاتا ہے مگر اس نے کہا کہ آم کھانے سے غرض رکھو پیڑ مت گنو۔ اب والدین بھی حرام کی اس کمائی سے عیاشی کے عادی ہو چکے ہیں۔ لیکن چند روز سے وہ دیکھ رہی ہے کہ سادہ کپڑوں میں کچھ لوگ مسلسل ان کے گھر کے گرد منڈلاتے رہتے ہیں۔ وہ بھائی کو نہیں، گھر کی عزت کو بچانا چاہتی ہے۔ وہ چند افراد کو بھی شناخت کر سکتی ہے اور ان کے ٹھکانے سے بھی واقف ہے جو اس کے خیال میں وہ اڈا ہے جہاں سے سامان آتا جاتا ہے۔ کسٹم آفیسر پھر بھی مطمئن نہیں ہوا۔ اس نے پوچھا کہ ایسی صورت میں پولیس سے رجوع کرنے کے بجائے وہ اس کے پاس کیسے آ گئی؟ الماس کے پاس بہت معقول جواب تھا۔ وہ گل رخ کی سہیلی ہے اور اس کے ساتھ ہی اسکول میں پڑھاتی ہے۔ گل رخ نے کہا تھا کہ تھانے جاؤ گی تو خود بھی مشکل میں پڑ جاؤ گی۔ میرا منگیتر کسٹم آفیسر ہے۔ اسے اطمینان سے ساری بات بتا دو۔

گل رخ کا حوالہ آتے ہی کسٹم آفیسر کا رویہ بدل گیا۔ اس کے دل میں یہ خیال بھی آیا کہ الماس کی مدد کے ساتھ ساتھ وہ اپنی فرض شناسی اور مستعدی کے مزید ثبوت فراہم کر سکتا ہے۔ اس نے الماس کو حراست میں نہیں لیا۔ اپنے آدمی اس کے پیچھے نہیں لگائے اور رات کو اس سے ایک مقررہ جگہ پر ملنے کا وعدہ کر لیا۔ الماس جب واپس پہنچی تو گل رخ کا کہیں پتہ نہ تھا۔ ڈی سلوا نے اسے بتایا کہ وہ بخیر و عافیت اپنے گھر پہنچ چکی ہے اور اسے بھی اچھی طرح سمجھا دیا گیا ہے کہ عدم تعاون یا پولیس کے پاس جانے کا انجام کیا ہوگا۔ وہ کسٹم آفیسر اس سے اتنی محبت کرتا ہے کہ اس کی بات نہیں ٹال سکتا۔ وہ اسے نوکری چھوڑنے پر مجبور کر دے گی۔ اس نوکری میں ہر وقت جان کو خطرہ لاحق رہتا ہے کیونکہ واسطہ پڑتا ہے اسمگلروں سے جو انتہائی مجبور ہو جائیں تو ایک کی جگہ دس کو قتل کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ گل رخ اسے کاروبار کے لیے سرمایہ فراہم کرے گی اور اس کسٹم آفیسر سے صاف کہہ دے گی کہ وہ نوکری اور شادی میں سے ایک کا انتخاب کرے۔ اگر وہ اس کو قائل کر کے اپنی بات منوانے میں کامیاب ہو گئی تو اس کی تمام تصویریں واپس کر دی جائیں گی لیکن وہ ناکام رہی تو ہم یہ تصویریں اس کی شادی کے بعد استعمال کریں گے۔ ابھی تو خود گل رخ کو بھی معلوم نہیں کہ اس کی تصویریں اتاری گئی ہیں اور اسے کچھ معلوم ہونا بھی نہیں چاہیے۔

الماس خود کو چالاک سمجھنے اور لتنے تلخ تجربات سے گزر کے محتاط ہو جانے کے باوجود ڈی سلوا کے پھیلائے ہوئے دوسرے جال میں گرفتار ہو گئی۔ اسے یہ سوچنا چاہیے تھا کہ جو شخص ایک بار اپنے کیے ہوئے تمام وعدے اتنی ڈھٹائی سے توڑ سکتا ہے، وہ دوسری بار بھی ایسا کر سکتا ہے۔ اس کا ذہن ویسے بھی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکا تھا اور اس کی تمام تر خواہش یہ تھی کہ وہ عزت و آبرو کے ساتھ جلد از جلد اس دلدل سے نکل جائے۔ اسے اپنی رسوا کن تصویریں اور ان کے نیگیٹو مل جائیں اور وہ خطرہ ٹل جائے جو اس کی، خاندان کی اور چھوٹی بہنوں کی زندگی تباہ کر سکتا تھا۔ یہ فنا اور بقا کی جدوجہد کا مسئلہ تھا چنانچہ الماس نے خود غرض بن کے تمام اخلاقی قدروں کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ اب گل رخ پر کیا گزرتی ہے، اس کسٹم آفیسر کے ساتھ کیا ہوتا ہے اس کے بارے میں خود کو موردِ الزام سمجھنے کی شرمندگی بھی نہیں رہی تھی۔ ڈی سلوا کے آدمی الماس کو اور اس کسٹم آفیسر کو کسی نامعلوم جگہ لے گئے جہاں ایک بار پھر الماس کے ساتھ وہ ہوا جو پہلے بھی ہو چکا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس مرتبہ بیڈ روم بدل گیا تھا اور اس کا پارٹنر ایک کسٹم آفیسر تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد الماس نے دیکھا کہ وہ کسٹم آفیسر ایک کرسی پر بیٹھا ہے، ڈی سلوا اسے سمجھا رہا تھا کہ وہ عقل سے کام لے اور ان کی مدد کرے تو اس میں دونوں کا فائدہ ہے ورنہ نقصان صرف کسٹم آفیسر کا ہوگا۔ اسے الماس کی پہلے والی تصویریں دکھا کر یقین دلا دیا گیا تھا کہ جو عورت اسے پھانس کر لائی ہے وہ ایک بدکردار طوائف ہے جس کے شریفانہ حلیے سے لوگ دھوکا کھا جاتے ہیں۔ اس کی چند قابلِ اعتراض تصویریں اتاری گئی ہیں جن سے ثابت کیا جا سکتا ہے کہ وہ عیاش اور بدقماش آدمی ہے۔

"ان تصویروں پر اور تمہاری باتوں پر کوئی یقین نہیں کرے گا۔" کسٹم آفیسر بولا۔

ڈی سلوا ہنسا۔ "دنیا برائی پر بہت جلدی یقین کر لیتی ہے۔ تمہاری منگیتر گل رخ بھی ضرور یقین کرے گی۔ الماس نے اس کو اپنا نام پتہ سب غلط بتایا تھا۔ کیا کوئی شریف لڑکی بغیر وجہ کے ایسا کرتی ہے؟ جب وہ الماس کی سابقہ تصویریں دیکھے گی جو کسی اور مرد کے ساتھ کسی اور گھر میں لی گئی تھیں تو شبے کی گنجائش کہاں باقی رہے گی۔ تم کیا بتاؤ گے کہ تم کہاں گئے تھے؟ اگر یہ کہو گے کہ مخبری کرنے یا چھاپہ مارنے کے لیے اسمگلروں کے اڈے کا سراغ لگانے گئے تھے تو پوچھنے والے پوچھیں گے کہ وہ اڈا کہاں تھا؟ کس کا تھا؟ اور وہاں تمہیں کیا ملا؟ جب یہ تصاویر تمہارے محکمے کو ارسال کی جائیں گی تو تمہارے چھاپہ مارنے کی کہانی سفید جھوٹ بن جائے گی۔ اتفاق سے یہ گھر بھی ایک پرانے کسٹم آفیسر کا ہے جو زبردست راشی اور عیاش تھا۔ تمہارا اس کے گھر میں ملنا خود تمہارے خلاف ثبوت فراہم کرے گا کہ تم بھی مختلف نہیں تھے۔ جس کا یہ گھر ہے وہ متعدد مقدمات میں ماخوذ ہونے کے بعد روپوش ہو گیا ہے۔ تم سے پوچھا جائے گا کہ کیا وہ تمہارا دوست تھا۔ دوست نہیں تھا تو تمہیں گھر کی چابیاں کیسے سونپ گیا تھا کہ تم وہاں ایک چھوٹی کہانی گھڑ کے عیاشی کے لیے جا پہنچے۔ پولیس تمہیں بھی تفتیش میں شامل کر لے گی... لیکن تمہارے خلاف سب سے بڑا اور ناقابلِ تردید ثبوت تمہارا بینک اکاؤنٹ ہوگا۔ تمہاری ملازمت شروع ہوئے ابھی ایک سال بھی نہیں ہوا لیکن اس میں ایک لاکھ روپے سے زیادہ نقد رقم جمع ہے۔"

"جھوٹ ہے۔" کسٹم آفیسر نے کہا۔ "میرے اکاؤنٹ میں صرف دو ہزار روپے ہیں۔"

"ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔" ڈی سلوا بولا۔ "کسی کے حساب میں سے رقم نکلوانا مشکل کام ہوتا ہے۔ رقم جمع کرنے کے لیے صرف اکاؤنٹ نمبر معلوم ہونا کافی ہوتا ہے۔ تمہیں معلوم نہیں لیکن گزشتہ ماہ کی گیارہ، سترہ اور چوبیس تاریخ کو تم نے بالترتیب پچیس ہزار، پینتیس ہزار اور چالیس ہزار جمع کرائے۔ ان کا تم کیا حساب دو گے؟ نتیجہ یہی نکالا جائے گا کہ نئی نوکری تھی اس لیے تم پہلے محتاط رہے اور کچھ فرض شناسی کا مظاہرہ بھی کرتے رہے لیکن بعد میں تجربہ کار ہو گئے تو اسی رنگ میں رنگے گئے جس میں دوسرے بھی رنگے ہوتے تھے۔ سب اوپر والے ہمارے ساتھ ہیں اور تم اگر ہمارے کاروبار کو نقصان پہنچا رہے ہو تو ان کی آمدنی میں بھی رکاوٹ ڈال رہے ہو۔ انہیں صرف بہانہ چاہیے کہ تمہیں بدعنوانی کے مقدمات میں الجھا کر الگ کر سکیں۔ چشم دید گواہ وہ خود بھی پیدا کر سکتے ہیں اور ہم بھی انہیں فراہم کر سکتے ہیں۔ ہم تمہیں مار بھی سکتے تھے لیکن ہم گڑ سے مرنے والے کو زہر دینے کے قائل نہیں ہیں۔ تمہارے حق میں بہتر ہے کہ ملازمت چھوڑ دو اور کاروبار کرو۔ جانا چاہو تو ملک سے باہر چلے جاؤ۔ ہم تمہاری مدد بھی کریں گے۔ بصورتِ دیگر نہ تمہاری ملازمت رہے گی، نہ تم گل رخ سے شادی کر سکو گے اور نہ اس کو رسوائی سے بچا سکو گے۔ ابھی تم جوان ہو۔ اصول پرستی کے چکر میں مت پڑو۔ خود بھی جیو اور دوسروں کو بھی جینے دو کا فلسفہ سب سے اچھا ہے۔"

اس کے بعد کسٹم آفیسر کے لیے مخالفت کی گنجائش نہ رہی۔ اس نے فائدے کا سودا کیا اور وہیں سب کچھ طے ہو گیا۔ ڈی سلوا نے اسے مزید دو لاکھ فراہم کرنے اور گل رخ سمیت لندن میں سکونت اختیار کرنے کی گارنٹی دی اور کہا کہ تمام معاملات خوش اسلوبی سے طے ہو جانے کے بعد تصاویر نیگیٹو کے ساتھ واپس کر دی جائیں گی اور آئندہ ان کا کسی سے یا کسی کا ان سے کوئی تعلق نہیں رہے گا۔ جب وہ کسٹم آفیسر چلا گیا ڈی سلوا نے الماس سے کہا کہ وہ اس کے کام سے بہت خوش ہے اور اس کی تمام تصویریں اور نیگیٹو اس کے حوالے کر دیے کہ وہ اپنے ہاتھ سے جلا دے۔ الماس نے تسلیم کیا کہ تصدیق کی خاطر اس نے تصویریں دیکھی ضرور تھیں لیکن یہ بات کہتے ہوئے احساسِ ذلت سے اس کا چہرہ زرد پڑ گیا اور اس کے ماتھے پر عرقِ ندامت کی نمی آ گئی۔ اس کے بعد الماس کا ڈی سلوا سے کوئی رابطہ نہیں رہا اور تین بعد جب اس کی شادی ہوئی تو

وہ اپنے بھیانک ماضی کی ہر یاد کو ذہن کے نہاں خانوں کی انتہائی گہرائی میں دفن کر چکی تھی۔ اس کا دل اپنے پروردگار کے لیے شکر کے جذبات سے معمور تھا۔ جس نے الماس کی توبہ قبول کر لی تھی اور اسے باعزت زندگی گزارنے کا موقع عطا کیا تھا۔ الماس نے کبھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ گل رخ اور اس کسٹم آفیسر کا بعد میں کیا ہوا، لیکن ڈی سلوا سے انتقام کی آرزو کبھی نہیں مری تھی۔

میں اور رابعہ دم بخود بیٹھے تھے اور الماس نے خود ہی اپنی داستانِ ماضی کا ہر حرف دہرا دیا تھا۔ ہم نے ان زخموں کو چھیڑ دیا تھا جو بظاہر وقت کی چارہ گری سے مندمل ہو گئے تھے، جب دل کے یہ ناسور پھر رسنے لگے تو ہر قطرۂ خوں نے اپنی داستانِ الم خود کہہ دی۔

"تمہیں اس کسٹم آفیسر کا نام معلوم ہے؟" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔

"نام؟" الماس نے کہا۔ "اب تو یاد نہیں۔"

"اچھا گل رخ کے گھر کا پتہ تو تمہیں معلوم ہوگا۔" میں نے کہا۔ "ہم وہاں سے پوچھ لیں گے۔"

الماس نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں کبھی اس کے گھر نہیں گئی تھی۔ ڈی سلوا نے مجھے سختی سے منع کر رکھا تھا۔"

"سکندر!" رابعہ نے اچانک کہا۔ "اس اسکول سے تو گل رخ کا پتہ مل ہی سکتا ہے جہاں وہ پڑھاتی تھی۔"

"تم اسے یہاں لاؤ گے؟" الماس نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

"اوّل تو اس کی کوئی ضرورت ہی نہیں۔" میں نے کہا۔ "اگر وہ تمہارے سامنے آ بھی جائے گی تو کچھ نہیں ہوگا اس لیے کہ وہ تمہارے اصل نام سے واقف نہیں اور تم اسے پہچاننے سے صاف انکار کر سکتی ہو۔ اس کے علاوہ جتنی خوفزدہ تم ہو اتنی ہی وہ بھی ہو گی کہ کہیں تم نہ مل جاؤ۔ البتہ تمہیں ضرورت پڑنے پر یہ باتیں ایک ایسی لڑکی کو بتانی ہوں گی جو آج تک ڈی سلوا کے فریب کا شکار رہی تھی۔"

"خدا کے لیے مجھے ان معاملات سے الگ رکھو۔" الماس ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔

"ہم پہ اعتبار کرو الماس!" رابعہ نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔ "میری کوئی بہن نہیں لیکن یقین کرو تمہارا ازدواجی مستقبل بھی مجھے اتنا ہی عزیز ہے جتنا اپنی سگی بہن کا ہوتا۔ ہم پر اعتماد نہیں تو خدا پر بھروسہ رکھو جس نے اب تک تمہاری حفاظت کی اور آئندہ بھی کرے گا۔"

ہم رات کا اندھیرا پھیلنے سے بہت پہلے آ گئے تھے اور جب رخصت ہوئے تو رات کے دس بجنے والے تھے۔ میں نے رابعہ کو ضامن رضوی کے گھر کے دروازے پر اتار دیا اور خود غائب ہو گیا۔ میں نے رابعہ کو سمجھا دیا تھا کہ رضوی صاحب کی نظر میں ہماری پوزیشن خراب نہیں ہونی چاہیے۔ اگر وہ پوچھیں تو رابعہ کہہ دے کہ میں آفس چلی گئی تھی اور مجھے سکندر کا پتہ نہیں۔ میں آدھے گھنٹے بعد آؤں گا اور انہوں نے مجھ سے پوچھا تو اپنی وضاحت خود پیش کر دوں گا۔ رابعہ کی شکستہ حال سرخ فوکس ویگن بھی کوٹھی کے احاطے میں کھڑی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ رضوی صاحب کے اثر و رسوخ کے باعث پولیس نے کار کو اصل مالک تک پہنچانے میں بڑی مستعدی کا ثبوت دیا تھا۔ میرے ہاتھوں اس کی جو درگت بنی تھی سو بنی تھی، باقی گاڑی کا کچھ نہیں بگڑا تھا۔ اور اس کی کوئی چیز بھی غائب نہیں ہوئی تھی۔ جب میں نے پہلی بار اسے دیکھا تھا تو اس کا رنگ و روغن بڑا چمکیلا تھا اور اس پر ایک خراش بھی نہ تھی۔ اب دو چار ہزار خرچ کیے بغیر اس کو دوبارہ اپنی اصل حالت پر لانا مشکل تھا۔ جب رابعہ اندر چلی گئی تو میں اسی ٹیکسی میں صدر پہنچا۔ حسبِ معمول میں نے ٹیکسی کو سڑک پر چھوڑا اور اِدھر اُدھر اچھی طرح دیکھنے کے بعد اس گلی میں داخل ہو گیا جس میں شہلا مقیم تھی۔ وہ تمام دن سخت اضطراب اور بے چینی کا شکار رہی تھی لیکن باہر جاتے ہوئے ڈرتی تھی۔ اس نے اخبار میں وہ سب واقعات پڑھ لیے تھے جو اس کے گلبرگ والے گھر میں پیش آئے تھے۔ صبح کے اخبارات کو زیادہ تفصیلات نہیں مل سکی تھیں مگر شام کے ایک اخبار نے ان لاشوں کی تصویریں بھی چھاپ دی تھیں جو پولیس کو گھر کے اندر اور باہر سے ملی تھیں۔ یہ سب بدمعاش اور ہسٹری شیٹر تھے چنانچہ پولیس نے یہ مفروضہ قائم کیا تھا کہ وہ ڈاکا ڈالنے آئے تھے اور غیر متوقع طور پر ان کو کسی ایسے شخص سے مقابلہ کرنا پڑا جو اُن سے زیادہ طاقتور ثابت ہوا۔ اس نے تینوں کو ٹھکانے لگا دیا مگر خود بھاگ گیا۔ یہ نامعلوم شخص کون تھا؟ اس کے بارے میں پولیس کئی نظریات رکھتی تھی۔ ایک یہ کہ وہ چوکیدار تھا جسے گھر والے کہیں جاتے وقت حفاظت کے خیال سے چھوڑ گئے تھے اور وہ پولیس کی کارروائی سے بچنے کے لیے روپوش ہو گیا۔ دوسرا نظریہ یہ تھا کہ واردات کے وقت گھر میں کوئی مہمان موجود تھا جس نے ڈاکوؤں کو ٹھکانے لگا دیا اور گھر والوں کو ساتھ لے گیا تاکہ وہ ان واقعات سے اپنی بے خبری اور لاتعلقی ثابت کر سکے۔ ابھی تک مکینوں کا پتہ نہیں چل سکا ہے۔ آس پاس کے رہنے والوں نے صرف یہ بتایا ہے کہ گھر میں ایک مفلوج بڑھیا اپنی غیر شادی

شدہ لڑکی اور نوجوان داو باش لڑکے کے ساتھ رہتی تھی اور ان کا کسی سے ملنا جلنا نہیں تھا۔ پولیس کے لیے پریشانی کے اور بھی سبب تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ٹیلیفون پر رپورٹ دینے والے نے خود کو ایس ایس پی ضامن رضوی صاحب کا چھوٹا بھائی بتایا تھا اور کہا تھا کہ وہ پڑوس میں رہتا ہے لیکن تفتیش کرنے پر دونوں باتیں غلط ثابت ہوئیں۔ ضامن رضوی صاحب گلبرگ میں نہیں رہتے۔ انہوں نے پوچھنے پر بتایا کہ ان کا چھوٹا بھائی کوئی نہیں ہے چنانچہ یہی بات زیادہ قابلِ اعتبار لگتی ہے کہ فون بھی اسی نامعلوم شخص نے کیا ہوگا جس نے حملہ آوروں کا مقابلہ کیا اور انہیں مارنے کے بعد اپنی اور گھر والوں کی جان بچا کر صاف نکل گیا لیکن یہ نامعلوم شخص گھر میں رہنے والی مس شہلا زیدی کا نوعمر بھائی نہیں ہو سکتا۔ پولیس کو رپورٹ دینے کے بجائے روپوش ہو جانے کا مطلب یہ بھی نکالا جا سکتا ہے کہ کوئی اس گھر میں اپنی اس وقت موجودگی کو ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا، وغیرہ وغیرہ۔

مجھے معلوم تھا کہ اگلے دن کے اخبارات مزید بال کی کھال نکالیں گے۔ یہ معلوم ہو جائے گا کہ مس شہلا زیدی کہاں کام کرتی تھی۔ جوا کھیلتے ہوئے قتل ہو جانے والے عدنان کی خبر کو شہلا کے گھر پر حملے کی خبر سے مربوط کر دیا جائے گا اور تفتیش سے کچھ اور نتائج سامنے آئیں گے۔ اگر ضامن رضوی صاحب کو معلوم ہوا کہ میں نے شہلا کو کہاں چھپا رکھا ہے تو وہ فوراً سمجھ جائیں گے کہ جس نامعلوم نوجوان نے تین ڈاکوؤں کو مار دیا اور پھر ضامن رضوی صاحب کا نام لے کر پولیس کو فون کیا وہ میرے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ وہ یہ بھی سمجھ لیں گے کہ مارے جانے والے ڈاکا ڈالنے نہیں آتے تھے بلکہ ڈی سلوا کے آدمی تھے۔ اس کے بعد ان کے لیے سخت ترین آزمائش کا مرحلہ درپیش ہوگا۔ یعنی وہ فرض شناسی کا ثبوت دیتے ہوئے پولیس کو حقائق سے آگاہ کر دیں یا خاموش رہیں کیونکہ میرے اور رابعہ کے انکار کی صورت میں کچھ بھی ثابت نہیں ہوتا لیکن اب تک جو کچھ انہوں نے میرے لیے اور رابعہ کے لیے کیا تھا وہ سب خاک میں مل جاتا اور یہ نیکی برباد گناہ لازم والی بات ہوتی۔ یہ بھی ناممکن تھا کہ وہ مسلسل چشم پوشی سے کام لیں اور ایک کے بعد ایک میری ہر مصیبت کو اپنی مصیبت سمجھ کے قبول کرتے جائیں۔ انہوں نے مجھے پناہ دی تھی۔ میرے ساتھ محسن کو رکھا تھا، پھر رابعہ کو اپنے گھر میں بیٹی کی طرح جگہ دی تھی۔ اب شہلا اور اس کی مفلوج ماں کا بار ان پر ڈالنا ظلم ہوتا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد میں نے اس مسئلے کو التوا میں رکھنا مناسب سمجھا کیونکہ فوری مسئلہ عدنان کا تھا جس کے بارے میں شہلا نے ابھی تک ایک اخبار کی چھوٹی سی خبر کے سوا کچھ نہیں دیکھا تھا۔ یہ اخبار بھی اس نے ماسی کے ذریعے پڑوس کے کسی گھر سے منگوائے تھے۔ مجھے اندازہ تھا کہ عدنان کی لاش اس وقت سرکاری مردہ خانہ میں بہت سی لاوارث لاشوں کے درمیان پڑی ہوگی اور پولیس منتظر ہوگی کہ کوئی وارث آئے تو اسے تفتیش کے جال میں جکڑ لے۔ شہلا کا وہاں جانا بعید از قیاس تھا کیونکہ ہمیں تو ظاہر کرنا تھا کہ حملہ آور اس کو اغوا کر کے لے گئے تھے اور مناسب وقت تک اس کو چھپائے رکھنا تھا۔ دوسری طرف یہ بھی ضروری تھا کہ عدنان کی لاش حاصل کر کے اس کی تدفین کی جائے ورنہ بہت سی لاوارث قرار دی جانے والی لاشوں کی طرح یہ لاش بھی میڈیکل کالج کے طلبہ کو فروخت کر دی جاتی جن کو تکمیل و تحصیلِ علم کے لیے وہ تجربات کرنے پڑتے ہیں جو زندہ انسانوں پر نہیں کیے جا سکتے مگر جن پر مردے کبھی معترض نہیں ہوتے۔ میں عدنان کا وارث نہیں تھا اور یہ بھی ناممکن تھا کہ میں عدنان کی ماں کو پہلے یہ جان لیوا خبر سناؤں اور پھر اسے ساتھ لے کر ہسپتال جاؤں۔

شہلا کی ماں گولی کھا کے سو چکی تھی۔ میں نے شہلا سے انگریزی میں کہا کہ وہ ماسی کو بھی سو جانے دے اور اپنے آپ کو ایک بہت بڑی خبر سننے کے لیے تیار کر لے۔ مجھے بھوک بالکل نہیں تھی۔ چنانچہ میں نے صرف ایک پیالی چائے پی، اور ماسی سے کہا کہ وہ دوسرے کمرے میں شہلا کی ماں کے پاس سو جائے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ شہلا کی حالت غیر ہو رہی ہے اور وہ جلد از جلد وہ بُری خبر سننا چاہتی ہے۔

"بات یہ ہے شہلا!" میں نے موقع پاتے ہی کہا۔ "کہ زندگی میں ہر آدمی کو ناقابلِ تصور صدمات جھیلنے پڑتے ہیں۔ ہر بار وہ سمجھتا ہے کہ یہ صدمہ برداشت سے باہر ہوگا لیکن وقت آنے پر نہ صرف یہ کہ وہ صدمہ جھیل کر زندہ رہتا ہے بلکہ کچھ عرصے بعد اس کے نقش تک مٹ جاتے ہیں مثلاً والدین کے لیے اولاد کا صدمہ یا بہن کے لیے اکلوتے بھائی کی موت کا صدمہ...."

"صاف کہو تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" وہ چلائی۔ "کیا میرا صبر و حوصلہ آزما رہے ہو؟"

"نہیں۔ صبر اور حوصلہ تو تم میں ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ میں نے کل دیکھا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس وقت بھی تم اسی حوصلے سے کام لو۔ اس کمرے کے باہر کسی کو پتہ نہ چلے

کہ میں نے کیا کہا ہے۔"

"اگر عدنان کو کچھ ہوا ہے تو بتا دو۔" وہ ضبط سے کام لیتے ہوئے بولی۔ "بُری صحبت کا انجام بُرا ہی ہوتا ہے۔ پہلے بھی میں عدنان کے بارے میں ہر بُری خبر سننے کے لیے تیار رہتی تھی اور اب بھی سُن سکتی ہوں۔ کیا پولیس...؟"

"نہیں شہلا! وہ اب پولیس کی گرفت میں نہیں آسکتا۔" میں نے کہا۔ "وہ سزا و جزا اور نیکی و بدی کی اس دنیا سے بہت دور جا چکا ہے۔ اب تو تم صرف اس کی مغفرت کی دعا مانگ سکتی ہو۔" میں نے اخبار اٹھا کے اندر کے صفحات کی ایک چھوٹی سی خبر پر انگلی رکھ دی۔ شہلا نے خبر پڑھی۔ کچھ دیر پھٹی پھٹی آنکھوں سے خبر کے بے رحم الفاظ کو گھورتی رہی، پھر اس کا چہرہ لاش کی طرح سفید پڑ گیا اور اس نے دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کے رونا شروع کر دیا۔ میں نے اسے تسلی دی اور یاد دلایا کہ اپنی ماں سے اس خبر کو چھپانا اس کا فرض ہے لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ گئیں اور آواز ماسی کے کانوں تک پہنچ گئی۔ ابھی تک میں نے انگریزی میں بات کی تھی چنانچہ ماسی پریشان تھی کہ میں نے شہلا سے کیا کہہ دیا ہے کہ اس کی حالت سنبھالے نہیں سنبھلتی۔ مجبوراً مجھے اس کو بھی ساری بات سنانی پڑی۔

رفتہ رفتہ شہلا نارمل ہو گئی اور میں نے اسے سمجھا دیا کہ اس مسئلے کو کیسے حل کیا جا سکتا ہے۔ عدنان کی ماں سے حقیقت کو چھپائے رکھنے کے لیے ایک ایسی عورت کا تعاون درکار ہوگا جو وقتی طور پر ماں کا کردار نبھا سکے۔ اس کام کے لیے مناسب ترین عورت رابعہ کی خادمہ ماسی ہی ہو سکتی تھی۔ وہ صورت سے اور عادات و اطوار سے اتنی سیدھی سادی اور بے وقوف لگتی تھی کہ مجھے اس کی کامیابی مشکوک نظر آتی تھی۔ ماسی کے لیے حقیقی ماں کی طرح اکلوتے بیٹے کے اس طرح مارے جانے پر غم کا اظہار کرنا اور اپنی املیہ اداکاری سے کسی پر اصلیت ظاہر نہ ہونے دینا بہت مشکل کام تھا لیکن میں نے غور و خوض کے بعد اس کا بھی ایک آسان ساحل تلاش کر لیا۔ ماسی کو سمجھانے اور اطمینان دلانے میں مجھے خاصی دشواری کا سامنا ہوا مگر بالآخر وہ سمجھ گئی اور میں نصف شب کے بعد رخصت ہوا۔ رضوی صاحب سو چکے تھے۔ میں کوٹھی کے دروازے سے سیدھا گزر کے عقبی حصے میں چلا گیا۔ سرونٹ کوارٹر میں بھی اندھیرا تھا۔ میں نے رضوی صاحب کے ڈرائیور کانسٹبل کو ڈسٹرب کرنا مناسب نہ سمجھا جس کی نظر میں ہماری حیثیت پہلے ہی بہت پُراسرار تھی اور کسی حد تک خطرناک ہو گئی تھی۔ وہ مجبور تھا تو صرف اس لیے کہ رضوی صاحب ہمارا لحاظ کرتے تھے اور ہم پر بہت مہربان تھے ورنہ وہ کب کا ہمیں نکال باہر کر چکا ہوتا۔ تاہم اس نے اب سلام دعا تک بھی ترک کر دی تھی جس کی ہمیں بھی پروا نہیں تھی۔

اندھیرے میں جگنو سا چمکتا دکھائی دیا تو میں سمجھ گیا کہ محسن لوٹ آیا ہے اور اپنی یا میری پریشانی کے باعث جاگ رہا ہے اور انتظار کا وقت کاٹنے کے لیے بستر پر لیٹا سگریٹیں پھونک رہا ہے۔ اپنی بات کہنے سے پہلے یہ ضروری تھا کہ میں اس کی سنوں۔ حسبِ توقع وہ گھر سے ایک زبردست جنگ لڑ کے آگیا تھا اور اپنے پیچھے ایک شدید جذباتی بحران چھوڑ آیا تھا۔ والدین اس کی باغیانہ روش پر بے حد دکھی اور برافروختہ تھے لیکن کوئی انتہائی قدم اٹھاتے ہوئے اسے عاق بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ایک بیٹا ان کی ضرورت بھی تھا اور مجبوری بھی۔ لیکن اس تمام فساد کا ذمے دار میں ٹھہرا تھا جس نے پہلے بھی فوزیہ کی زندگی تباہ کی تھی اور اب بھی اس کے مقدر میں کوئی خوشی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے محسن کو بھڑکایا تھا۔ فوزیہ ایک ناسمجھ ناتجربہ کار اور جذباتی لڑکی تھی۔ محسن اسے سمجھا سکتا تھا اور اسے حقیقت کو تسلیم کرنے پر آمادہ کر سکتا تھا مگر اس نے جو کچھ کیا برعکس کیا۔ اس کی ماں کا خیال تھا کہ اب شیروانی صاحب کو میری سرپرستی سے فوراً ہاتھ کھینچ لینا چاہیے کیونکہ میں کمینہ اور احسان فراموش ثابت ہوا ہوں۔ شیروانی صاحب اس زنانہ منطق سے قائل نہیں ہوئے اور انہوں نے صاف کہہ دیا کہ وہ اس معاملے میں قطعی غیر جانبدار رہیں گے۔ جس کا جو دل چاہے کرے۔ وہ خود بھی کسی کے کہنے سے مجبور ہو کے کچھ نہیں کریں گے۔ یہ محسن کے نقطۂ نظر سے بڑی حوصلہ افزا بات تھی۔ شیروانی صاحب نے فوزیہ پر زبردستی اپنی مرضی مسلط کرنے سے انکار کر دیا تھا تو دوسری طرف مجھ سے وہ تعلق ختم کرنا بھی منظور نہیں تھا جس کی بنیاد میرے والد کی اور ان کی نصف صدی پرانی دوستی کے رشتوں پر تھی۔ مجموعی صورتِ حال سے محسن خوش اور مطمئن تھا۔ شیروانی صاحب نے پہلی بار بیوی کی بات ماننے سے انکار کر کے یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ بھی شوہر ہیں، بیوی کے غلام نہیں۔ چنانچہ اکیلی فوزیہ کی ماں اب اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ شوہر نے ان کا ساتھ دیا ہوتا تو محسن کو یقیناً شکست ہو جاتی اور فوزیہ کے مستقبل کا فیصلہ بھی ہو جاتا۔

میں نے اپنی بات کم سے کم الفاظ میں کہی کیونکہ رات بہت بیت چکی تھی اور میں اگلے دن تازہ دم اٹھنے کے لیے نیند کی کمی پوری کرنا چاہتا تھا۔ محسن نے میرے منصوبے سے

اتفاق کیا اور اپنے خدشات کا اظہار بھی کیا کہ پول کھل گئی تو ہمارے ساتھ ماسی بھی مصیبت میں گرفتار ہو جائے گی مگر مصیبت کا مفہوم بھی ہمارے لیے غیر اہم ہو گیا تھا۔ 'مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں' والا معاملہ تھا۔ صبح نو بجے پھر رابعہ نے مجھے بیدار کیا۔

"مانا کہ جناب گھوڑوں کا تمام اسٹاک بیچ کر سوتے تھے۔" وہ مسکرا کے بولی۔ "مگر اب جاگنے کا خیال نہیں ہے کیا؟"

"جاگ تو میں رہا تھا۔" میں نے ادھ کھلی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ "لیکن منتظر تھا کہ تم آ کے جگاؤ۔ اگر ہر صبح اسی طرح تمہارے آفتابِ حسن کی دید سے طلوع ہو...؟"

رابعہ کا چہرہ شفق رنگ ہو گیا اور اس نے گھبرا کے محسن کی طرف دیکھا جو سر تک چادر تانے مردے کی طرح سیدھا لیٹا ہوا تھا۔ "کیسی باتیں کرتے ہو۔ محسن سن لے گا...؟"

"فکر مت کرو۔ محسن سو رہا ہے۔" محسن نے ہلے جلے بغیر کہا اور رابعہ بے اختیار پلٹ کر بھاگی۔ محسن قہقہہ مار کے اٹھ بیٹھا۔ "یار! یہ سب لڑکیاں ایک جیسی باتیں کیوں کرتی ہیں؟ پڑھی لکھی ہوں یا جاہل... چہ خوب...! یہ باتیں سننا بھی چاہتی ہیں اور فرماتی ہیں کیسی باتیں کر رہے ہو؟"

"اگر اس رومانٹک سین کو آپ کچھ دیر اور چلنے دیتے تو کیا تھا؟" میں نے تکیہ اس کی طرف پھینکا۔ "اور جس دن تجھے عشق ہوا نا کسی سے، اس روز میں پوچھوں گا کہ یہ باتیں کیسی لگتی ہیں؟"

"سچا عشق ہمیں زکام کی طرح اکثر ہوتا رہتا ہے۔" محسن نے ارشاد کیا۔ "علاج دونوں کا نہیں۔ خدا شفا دیتا ہے ورنہ بندہ نکاح فرما لیتا ہے۔"

صبح کا آغاز اچھا ہوا تھا۔ ضامن رضوی صاحب ڈیوٹی پر جا چکے تھے چنانچہ ہم نے کوٹھی میں ناشتہ کیا اور بہت سی چیزوں کے ساتھ بیگم رضوی کی جھاڑ بھی کھائی۔ ان کو ہماری شب و روز کی مصروفیت پر سخت تشویش لاحق تھی کہ ہم کہاں رہتے ہیں، کیا کرتے ہیں اور کیوں کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ چونکہ ان کا ہمارے معاملات سے بے خبر اور بے تعلق رہنا ہی بہتر تھا اس لیے ہم باتوں کو مذاق میں ٹال گئے۔ پھر میں نے موقع پا کے مُردہ خانے فون کیا اور عدنان کے بارے میں دریافت کیا۔ مجھ سے دس منٹ بعد دوبارہ فون کرنے کو کہا گیا۔ دس منٹ بعد فون اٹھانے والے نے بہت سے سوالات کیے کہ میں کون ہوں اور عدنان سے میرا کیا رشتہ ہے۔ بات کرنے والا ڈاکٹر تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں عدنان کا فیملی ڈاکٹر ہوں اور اس کی فالج زدہ ماں کا علاج کر رہا ہوں۔ مجھے آج ہی معلوم ہوا ہے کہ عدنان کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔ اس خبر سے اس کی ماں کی حالت زیادہ خراب ہو گئی ہے۔ جسمانی طور پر وہ پہلے ہی مفلوج تھی اب اس کا ذہن بھی مفلوج ہو گیا ہے۔"

"دیکھیے جناب! یہ پولیس کیس ہے۔" مجھ سے بات کرنے والے ڈاکٹر نے کہا۔ "مجھے ہمدردی ضرور ہے لیکن میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

"میں چاہتا تھا کہ لاش کو اسپتال ہی میں غسل اور کفن وغیرہ دے دیا جائے۔" میں نے کہا۔ "اور وہیں سے تدفین کے لیے قبرستان پہنچا دیا جائے۔ اگر لاش گھر لائی گئی تو ممکن ہے اس کو دیکھتے ہی عدنان کی ماں مر جائے۔"

"آئی ایم سوری۔ آپ نے دیر سے فون کیا۔" وہ بولا۔ "عدنان کی لاش کو وارث لے جا چکے ہیں۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ لاش اس کی بہن کے حوالے کر دی گئی ہے؟" میں نے اپنی حیرت پر قابو پا کر کہا۔ "جہاں تک مجھے معلوم ہے اس کا کوئی اور قانونی وارث نہیں ہے۔"

"مجھے تو یہ معلوم ہے کہ کل ایک صاحب آئے تھے اور یہی وقت تھا، چنانچہ میری ہی ڈیوٹی تھی۔ انہوں نے بھی یہ بات کہی تھی کہ عدنان کی ماں مفلوج ہے اس لیے خود نہیں آسکتی اور بہن اس صدمے سے بے ہوش پڑی ہے، اس لیے وہ بھی نہیں آسکتی۔ پھر انہوں نے پولیس سے بات کی اور لاش لے گئے۔ غالباً وہ لڑکی کے چچا تھے۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"چچا؟" میں نے کہا۔ "کیا نام اور پتہ دیا تھا انہوں نے؟"

"نام تو تھا چوہدری دلاور۔" ڈاکٹر بولا۔ "پتہ میں آپ کو دیکھ کر بتا دیتا ہوں۔"

ایک تو وہ کچھ معقول اور شریف آدمی تھا۔ پھر یہ کہ مجھے اپنا ہم پیشہ سمجھ کے اس نے تعاون کیا ورنہ وہ یہ کہہ کر بات ختم کر سکتا تھا کہ متعلقہ تھانے سے معلوم کیجیے۔ اس نئی صورتِ حال نے مجھے پریشانی میں مبتلا کر دیا۔ چوہدری دلاور کے عزائم بالکل واضح تھے۔ وہ جانتا تھا کہ شہلا روپوش ہو گئی ہے اسے یہ شک بھی ہوگا کہ شہلا کے گھر میں بدمعاشوں کا مقابلہ کرنے والا میرے سوا کوئی نہیں ہو سکتا اور یقین ہوگا کہ بھائی کی خبر پاتے ہی شہلا سامنے آنے پر مجبور ہو گی۔ وہ اسپتال پہنچے گی تاکہ پوسٹ مارٹم کے بعد بھائی کی لاش لے جا سکے۔ چوہدری دلاور اس سے پہلے ہی لاش لے گیا اور اپنا پتہ چھوڑ گیا کہ شہلا اسپتال سے سیدھی اس کے گھر جائے اور پولیس کے ہتھے چڑھ جائے۔ شہلا کا وجود اب ان کے لیے خطرناک ہو گیا

تھا۔ اس نے ڈی سلوا کو کھلم کھلا دھمکی دی تھی اور اس خطرے کا سدِباب ضروری تھا۔ اس کے پاس دولت کی طاقت تھی اور اپنی طاقت کا گھمنڈ تھا جس سے وہ پولیس کو خرید بھی سکتے تھے۔ شہلا ایک بار ان کے چنگل میں گرفتار ہو جاتی تو اس کے لیے رہائی اور نجات کے سارے دروازے بند ہو جاتے۔ میں نے فوراً محسن سے مشورہ کیا۔

"میرا خیال ہے کہ یہ کام مجھے ہی کرنا پڑے گا۔" محسن نے کہا۔ "تیرا وہاں جانا ٹھیک نہیں۔ اگر تیرے خلاف ہی تفتیش کا چکر شروع ہو گیا تو نئی مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔"

"خطرہ مجھے صرف ایک شخص سے ہے۔" میں نے کہا۔ "جب میں ساتھ والے گھر میں فون کرنے گیا تھا تو ایک نوجوان باہر نکل رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ میں شہلا کا پڑوسی ہوں۔ وہ مجھے پہچان سکتا ہے، لیکن تجھے نہیں پہچان سکتا۔"

"اس کے علاوہ یہ بھی تو ممکن ہے کہ مار دھاڑ کرتے ہوئے نادانستگی میں تو نے کہیں اپنے فنگر پرنٹ وغیرہ چھوڑ دیے ہوں۔ ڈی سلوا نے تجھے وہاں دیکھا تھا فرض کر بعد میں اس نے پولیس کو اپنا نام بتلائے بغیر ٹیلی فون کر دیا ہو۔ اس امید میں کہ پولیس شہلا سے یا اس کی ماں سے تیری موجودگی کا اعتراف کرائے گی۔ پولیس اب بھی وہاں ہو گی مگر مجھے ان سے کوئی خطرہ نہیں۔ وہ میرے فنگر پرنٹ لے کر بھی کچھ معلوم نہیں کر سکتے۔"

"تجھے وہاں زیادہ دیر ٹھہرنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔ "تو رابعہ کی گاڑی لے جا۔ جیسی بھی ہے، چلتی تو ہے۔ ماسی کو کمبل وغیرہ لپیٹ کر پیچھے کی سیٹ پر لٹا دینا اور چوہدری دلاور کے گھر پہنچ جانا۔ میرا خیال ہے وہ شہلا کی ماں کو نہیں پہچانتا ہو گا۔ ماسی کچھ نہیں بولے گی۔ وجہ صاف ظاہر ہے، صدمے کا اثر اس کے دماغ پر ہو گیا ہے اور اس کی زبان بھی گنگ ہو گئی ہے۔ تدفین کے انتظام کی ذمہ داری تو چوہدری دلاور قبول کر ہی چکا ہے۔ شہلا کے بارے میں اس کی امیدیں خاک میں مل جائیں گی۔ میں شہلا کے پاس جا کے اسے اس نئی صورتِ حال سے خبردار کرتا ہوں۔"

میں اور محسن ایک ساتھ ہی شہلا کے پاس پہنچے جہاں سے محسن تو کچھ دیر بعد ماسی کو لے کر روانہ ہو گیا مگر میں شہلا کی ماں سے باتیں کرتا رہا۔ وہ بیٹے کے لیے بہت پریشان تھی۔ اور یہ بھی جاننا چاہتی تھی کہ آخر کب تک وہ اپنے گھر واپس جا سکے گی۔ میں نے رابعہ نے اور شہلا نے مل کر حالات کی جو وضاحت کی تھی وہ اس سے مطمئن نہیں ہو سکی تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ عدنان کو ایک بحری جہاز پر بہت اچھی ملازمت مل گئی ہے چنانچہ وہ اپنے پاسپورٹ اور دیگر دستاویزات کے حصول کی کوشش میں لگا ہوا ہے اور اسی مصروفیت کے باعث آ نہیں سکا۔ جہاز کل روانہ ہو گا مگر عدنان جانے سے پہلے ملنے کے لیے ضرور آئے گا۔ عدنان کی ماں کی صورت پر میرے جھوٹ سے اطمینان اور مسرت کے جذبات جتنے نمایاں ہوتے جا رہے تھے میرا ذہنی کرب اتنا ہی بڑھ رہا تھا۔ وہ بار بار پوچھ رہی تھی۔

"تم خود ملے تھے اس سے؟ خود اس نے تم سے کہا تھا کہ وہ ملنے کے لیے ضرور آئے گا؟ شاید خدا نے میری دعا سُن لی ہے۔ وہ بُری صحبت سے بچ گیا۔ وہ نوکری کی تلاش میں تھا۔" پھر وہ مجھ سے مزید سوالات کرنے لگی۔ "اسے یہ نوکری تو پسند ہے نا؟ دور تو جانا ہی پڑتا ہے اپنے فائدے کے لیے اور وہ کون سا ہمیشہ کے لیے دور جا رہا ہے۔ کب تک آئے گا مجھ سے ملنے کے لیے؟"

میرے پاس کسی سوال کا جواب نہیں تھا، مگر میں جواب دیتا جا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد میں چلنے لگا تو شہلا میرے ساتھ دروازے تک آئی۔

"یہ تم نے کیا نیا چکر چلا دیا ہے؟" وہ پریشانی سے بولی۔

"اس مسئلے کا یہی سب سے آسان حل تھا۔" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ "آج یا کل، جس وقت بھی ماں سوئے تو اس کے جاگنے کے بعد کہہ دینا کہ عدنان آیا تھا اور بیٹھا رہا۔ مگر اس نے آپ کو جگانا مناسب نہیں سمجھا۔"

"سکندر بھائی!" وہ میرے شانے پر سر رکھ کے رونے لگی۔ "یہ جھوٹ کب تک چلے گا؟ عدنان تو کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا۔ ماں کب تک اس کا انتظار کرے گی؟"

یکلخت میں جذباتی ہو گیا۔ "تم نے مجھے بھائی کہا ہے نا شہلا! اس لیے کہ یہ رشتہ تمہارے لیے بہت مقدس تھا، تمہیں بہت عزیز تھا اور تم اس سہارے سے محروم ہو کے خود کو تنہا محسوس کرتی ہو۔ پاگل! مجھے دیکھو۔ میں تو شروع سے تنہا ہوں۔ میرے بھی بھائی بہن تھے اور میری بھی ویسی ہی ماں تھی جیسی سب کی ماں ہوتی ہے۔ ان سب رشتوں کو تقدیر کے بے رحم ہاتھوں نے ایک جھٹکے سے توڑ ڈالا۔ میرا باپ بہت باہمت تھا جس نے اس وطن کے لیے اتنی بڑی قربانی دی مگر حوصلہ نہیں ہارا۔ اس کے گھر کو اجاڑنے والے تو غیر تھے اور دشمن تھے مگر اس کو مارنے والے اپنے کہلاتے تھے۔ اب میں اکیلا ہوں مگر تم نے بہن کا رشتہ قائم کر کے میرے اس احساس کو ختم کر دیا ہے۔ اب ہم دونوں اکیلے نہیں۔ سمجھ لو کہ میں سکندر نہیں بلکہ عدنان ہوں اور میرے ہوتے ہوئے تمہیں فکرمند ہونے کی یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"لیکن میرے بھائی! مجھے بھی تو بتاؤ کہ ہم ماں کو کیسے دلاسہ دیں گے؟"

"وہ میں نے سوچ لیا ہے۔" میں نے شہلا کے آنسوؤں کو اسی کے دوپٹے سے صاف کر دیا۔ "سمندر پار سے عدنان کے خطوط برابر آتے رہیں گے اور ان میں یہی ہو گا کہ وہ بالکل خیریت سے ہے اور خوش ہے اور تم یہ خط پڑھ کے ماں کو سناتی رہو گی۔ کبھی کبھی وہ تمہارے لیے اور ماں کے لیے تحائف بھی بھیجے گا۔"

"یہ سب کیسے ہو گا بھیا؟" وہ نظریں جھکا کے بولی۔ "اب تو میری نوکری بھی نہیں رہی ہے۔"

"میری چھوٹی سی بہن!" میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "میں سب کچھ کر لوں گا۔ بس مجھے تھوڑی سی مہلت چاہیے رفتہ رفتہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

باہر آ کے سڑک تک پیدل جاتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ سب کیسے ٹھیک ہو گا۔ شہلا اس گھر میں کیسے واپس جائے گی اور واپس نہیں جائے گی تو یہاں کب تک رہے گی؟ کیا بھائی کی حیثیت سے میں اپنی تمام ذمہ داریاں پوری کر سکوں گا؟ میں تو خود مسائل کے جال میں اتنا الجھا ہوا تھا کہ خود اپنی مدد بھی نہیں کر سکتا تھا اور میرے مسائل بہت بڑے تھے۔ انتہائی خطرناک تھے اور میرے لیے چیلنج کی حیثیت رکھتے تھے۔ شکاری میری جان کے درپے تھے اور مجھے چن چن کر ہر شکاری کو شکار کرنا تھا یا خود شکار ہو جانا تھا۔ شکاری میرے لیے جال پھیلا رہے تھے اور میں خود کو بچاتا ہوا ہر شکاری کی تاک میں تھا۔ میری ایک غلطی یا ایک غلط قدم میری شکست کا سبب بن سکتے تھے لیکن یہ شکست صرف میری نہ ہوتی کیونکہ اس جنگ میں رابعہ بھی شریک تھی، محسن بھی شامل تھا۔ شہلا اور الماس بھی فریق بن گئی تھیں اور ایک لڑکی گل رخ بھی آ گئی تھی جسے میں نے دیکھا تک نہیں تھا اور جس کے بارے میں مجھے یہ بھی خبر نہ تھی کہ وہ اپنے اسی چاہنے والے کسٹم افسر کے ساتھ شاد و آباد ہے یا اپنی غیرت کے ساتھ کسی بے نشان مدفن میں سو چکی ہے۔ مجھے سلامت شاہ کو ماچو، غلام علی اور دوسرے بہت سے لوگ یاد آئے جو میری وجہ سے مارے گئے یا میرے ہاتھوں مارے گئے۔

ایک کیمسٹ کی دکان پر میں نے ڈائریکٹری میں اسکول کا نمبر تلاش کیا۔ ہیڈ مسٹریس اب بھی وہی تھی اور اسے گل رخ یاد تھی۔ "ٹیچرز تو آتی جاتی رہتی ہیں۔" وہ بولی۔ "ملازمت چھوڑ دیا ٹرانسفر ہو جاتی ہیں اور کبھی لوٹ کر نہیں آتیں مگر گل رخ کی بات اور ہے، وہ اب بھی کینیڈا سے آتی ہے تو مجھ سے ضرور ملتی ہے۔"

"کینیڈا سے؟ کیا آج کل وہ کینیڈا میں ہے؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"ہاں، شادی کے بعد وہ کینیڈا چلی گئی تھی۔ آپ کو نہیں معلوم؟"

"جی۔۔۔ دراصل میں خود کئی سال باہر رہا۔" میں نے کہا۔ "جس لڑکے سے اس کی شادی ہونے والی تھی، وہ کسٹم میں افسر تھا اور میرا دوست تھا۔"

"نعیم۔ تم نعیم کے دوست ہو؟" ہیڈ مسٹریس بولی۔ "اچھا اچھا۔ گل رخ کی شادی اسی سے ہوئی تھی مگر شادی سے پہلے نعیم نے کسٹم کی ملازمت چھوڑ دی تھی۔ شادی کے بعد وہ لندن چلے گئے تھے اور وہاں نعیم نے کوئی اسٹور وغیرہ کھول لیا تھا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ اس نے سب بیچ دیا اور اچانک معلوم ہوا کہ وہ کینیڈا میں ہے۔ پتہ تو مجھے معلوم نہیں۔"

"کوئی بات نہیں۔" میں نے کہا۔ "میں اس کے گھر سے معلوم کر لوں گا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تمہیں کچھ معلوم نہیں۔" ہیڈ مسٹریس نے خاصی دیر بعد کہا۔ "اس کا گھر بھی اب کہاں ہے! آئی ایم سوری کہ مجھے یہ سب بتانا پڑ رہا ہے۔ گل رخ کا باپ بہت نیک اور مذہبی قسم کا خدا ترس انسان تھا۔ مولوی کہلاتا تھا۔ بیٹی کی شادی کے چند ماہ بعد بے چارے کا ذہنی توازن بگڑ گیا۔ ایک رات اس نے تیل چھڑک کر گھر میں آگ لگا لی۔ گل رخ کی ماں بھی اس حادثے میں جل کر مر گئی تھی۔ پڑوس کے ایک رہنے والے نے آگ لگنے سے پہلے گولیاں چلنے کی آوازیں سنی تھیں اور اسی نے یہ بیان پولیس کو بھی دیا تھا۔ غالباً پوسٹ مارٹم میں بھی یہ ثابت ہو گیا تھا کہ مولوی محبوب نے پہلے بیوی کو گولی ماری، پھر گھر کو آگ لگائی اور اپنے آپ کو بھی شوٹ کر لیا۔ اسی واردات کے بعد مجھے پتہ چلا تھا کہ نعیم اور گل رخ برطانیہ سے کینیڈا چلے گئے ہیں۔ میرا خیال ہے وہاں رہنے والے پاکستانی یا سفارتخانے والے ان کا پتہ چلانے میں تمہاری مدد کر سکیں گے۔"

"جی۔۔۔ وہ میں معلوم کر لوں گا۔ میں خود بھی کینیڈا سے ہی آیا تھا۔ تھینک یو۔" میں نے ریسیور رکھتے ہوئے کہا اور فون کال کے پیسے دے کر دکان سے باہر آ گیا۔ واقعات کی کڑیاں آپس میں مل گئی تھیں اور میرا ذہن اندازوں کی بنیاد

پر کچھ نتائج اخذ کرنے کے قابل ہوگیا تھا۔ کسٹم آفیسر نعیم نے دباؤ کے تحت ملازمت سے دستبردار ہونا قبول کر لیا تھا اور گل رُخ کے ساتھ لندن میں آباد ہوگیا تھا۔ شاید گل رخ کو معلوم بھی نہ ہوگا کہ جو لوگ اسے زبردستی گاڑی میں ڈال کر لے گئے تھے وہ کون تھے اور اسے کیوں لے گئے تھے صرف نعیم جانتا تھا کہ ان بدمعاشوں نے گل رُخ کی تصویریں بھی اتاری ہیں۔ ان کی دھمکی کو نظرانداز کرنا واقعی مشکل تھا۔ وہ اس کی محبت چھین بھی سکتے تھے۔ ملازمت بھی اور شاید زندگی بھی۔ چنانچہ وہ گل رخ کو ساتھ لے کر بھاگ گیا۔ تاہم اسے معلوم ہوگا کہ بلیک میل کرنے والے اپنے وعدوں پر قائم نہیں رہتے اور کبھی پیچھا نہیں چھوڑتے۔ لندن پہنچ جانے کے بعد وہ مناسب وقت کا انتظار کرتا رہا اور پھر خاموشی سے کینیڈا چلا گیا۔ ممکن ہے ڈی سلوا نے دوبارہ اس سے رابطہ قائم کیا ہو اور اس پر دباؤ ڈالا ہو کہ وہ ان کے لیے کام کرے ورنہ اس کی ازدواجی زندگی تباہ کر دی جائے گی اور اس دھمکی کے بعد نعیم نے روپوش ہو جانا بہتر سمجھا ہوگا۔ وہ لندن میں کسی کو بتا کر نہیں گیا ہوگا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ شاید اس نے مشہور کیا ہوگا کہ وہ لوٹ کر وطن جا رہے ہیں لیکن کینیڈا پہنچ گئے ہوں گے۔ اتنی بڑی دنیا میں صرف نام کی مدد سے کسی کو تلاش کرنا آسان نہیں ہے۔ ڈی سلوا کے آدمی اسے پاکستان میں ڈھونڈتے پھرتے ہوں گے یا انہوں نے برطانیہ ہی کے دوسرے شہروں میں تلاش کیا ہوگا اور انہیں مایوسی کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔

ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر میں نے خیالات کا سلسلہ پھر جوڑا۔ نعیم اور گل رُخ کے کیس میں سب سے افسوسناک پہلو گل رُخ کے والدین کی ہلاکت کا تھا۔ کیا واقعی مولوی محبوب کا ذہنی توازن بگڑ گیا تھا؟ یہ معلوم کرنا مشکل نہیں تھا کہ دیوانگی کے آثار مولوی محبوب کی شخصیت میں پہلے سے نمایاں ہو چکے تھے یا وہ اچانک بالکل پاگل ہوگیا تھا۔ اگر وہ شروع سے خبطی یا جنونی قسم کا آدمی ہوگا تو یہ بات اس سے ملنے جلنے والے ضرور جانتے ہوں گے لیکن وہ متوازن ذہن کا مالک تھا تو دیوانگی کے اس دورے کا سبب کوئی فوری صدمہ ہی ہو سکتا ہے۔ مثلاً یہ کہ ڈی سلوا یا اس کے آدمی مولوی محبوب کے پاس پہنچے ہوں اور اس سے پوچھا ہو کہ تمہاری بیٹی اور داماد برطانیہ سے غائب ہو کر کہاں گئے ہیں؟ شاید مولوی محبوب کو بھی خبر نہ ہوگی کہ وہ روپوش ہو چکے ہیں۔ اس نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا ہوگا تو پتہ پوچھنے والوں نے سنگین نتائج کی دھمکی دی ہوگی اور اس سے بھی مقصد پورا نہ ہوا تو گل رُخ کی یا نعیم کی تصویریں سامنے

رکھ دی ہوں گی۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اسے دیوانگی کا نام دے دیا گیا۔ مولوی محبوب جو اپنی پارسائی اور نیکی کے باعث مشہور تھا، بے حیائی اور بے غیرتی کے ان نمونوں کو دیکھ کر واقعی پاگل ہو سکتا تھا اور رسوائی کے تصور سے ڈر کے اپنی اور بیوی کی زندگی کا خاتمہ اسی طرح کر سکتا تھا کہ گھر کی آگ میں جل مرے لیکن یہ بات ناقابل فہم تھی کہ اس طرح گھر کو آگ لگانے سے پہلے اس نے بیوی کو گولی کیوں ماری اور آگ لگانے کے بعد اپنے آپ کو شوٹ کیوں کیا؟ کیا اسے ڈر تھا کہ آگ میں جل کے راکھ ہونے سے پہلے ہی ان کو بچا لیا جائے گا اور وہ زندہ رہنے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا؟ سوال یہ ہے کہ مولوی کہلانے والے کسی انتہائی شریف آدمی کے پاس ریوالور کہاں سے آیا؟ اس ملک میں بغیر لائسنس کا ریوالور سیٹھ یا بدمعاش قسم کے لوگ رکھ سکتے ہیں اور لائسنس کے تحت صرف ضرورت مند۔ مولوی محبوب جیسا آدمی نہ لائسنس لے سکتا تھا اور نہ بغیر لائسنس کا اسلحہ رکھ سکتا تھا۔ زیادہ امکان اسی بات کا نظر آتا تھا کہ تصویریں دیکھتے ہی مولوی محبوب کا دماغ الٹ گیا اور اس نے دھمکی دینے والوں کو جان سے مار ڈالنے کی کوشش کی اور نتیجے میں خود مارا گیا۔ اس کی بیوی بھی شوہر کے قاتلوں کی گولی کا نشانہ بنی جو اپنے جرم پر پردہ ڈالنے کے لیے گھر کو آگ لگا کے فرار ہوگئے۔ اس یقین کے ساتھ کہ آگ سے جل جانے کے بعد لاشوں پر گولی کے زخم کیسے نظر آئیں گے۔ مگر فائرنگ کی آواز ایک پڑوسی نے سُن لی۔ اس نے اپنے بیان میں بھی فائرنگ کا ذکر کیا تھا چنانچہ پولیس کے لیے پوسٹ مارٹم کرانا ضروری ہو گیا۔ شاید وہ پوسٹ مارٹم رپورٹ اب بھی کہیں پرانے ریکارڈ سے نکل آئے یا پولیس کی رپورٹ اور ہمسائے کا بیان مل جائے۔ نعیم اور گل رخ کا پتہ بعد میں معلوم کیا جا سکتا ہے۔ ہیڈ مسٹریس کو اتنا تو معلوم تھا کہ وہ کینیڈا میں ہیں اور کسی کو تو یہ بھی معلوم نہیں ہوگا۔ ہیڈ مسٹریس کی باتوں سے یہ بھی پتہ چلا تھا کہ گل رُخ، کینیڈا جانے کے بعد بھی پاکستان آئی تھی۔ اسے اپنے والدین کے المناک انجام کی خبر یقیناً ہو گی۔ خلید نعیم نے اسے یہ بھی سمجھا دیا ہوگا کہ یہ وہی دشمن ہیں جن کے خوف سے اس نے ملازمت چھوڑی تھی چلا وطن ہو کے برطانیہ گیا تھا اور وہاں سے بھاگ کر کینیڈا میں پناہ لینے پر مجبور ہوا تھا۔ وہ اسی طرح آئے ہوں گے کہ کسی کو پتہ نہ چلے اور چند روز وطن میں گزار کے لوٹ گئے ہوں گے۔ ممکن ہے یہاں نعیم کے والدین یا بہن بھائی رہتے ہوں۔ میں نے ٹیکسی سے اترتے ہوئے سوچا اور اس کے ساتھ ہی

مجھے دوسرا خیال یہ بھی آیا کہ کہیں نعیم کے دورے کا مقصد ڈی سلوا کے خلاف انتقامی کارروائی کے مواقع تلاش کرنا تو نہیں تھا؟ انتقام کی آگ میں تو وہ دونوں ایک ہی طرح جل رہے ہوں گے۔

میرونڈیرا اینڈ کمپنی کے دفتر کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہوئے میں بہت پُراعتماد تھا۔ خالی ہاتھ ہونے کے باوجود۔ کیونکہ اب میرے پاس حقائق تھے جن سے ڈی سلوا کے لیے مفر نہ تھا۔ اچانک میری نظر نے ٹیلی فون کے اس تار کو دیکھا جو زینے کی دیوار کے ساتھ ساتھ اوپر جا رہا تھا۔ اِدھر اُدھر کسی کو نہ پاکے میں نے اپنا جیبی چاقو نکالا اور تار پر رگڑ دیا۔ سخت تار کے مقابلے میں یہ چاقو بہت چھوٹا تھا مگر تھوڑی سی قوت صرف کرکے میں تار کاٹنے میں کامیاب ہو گیا۔ غور سے دیکھے بغیر لائن کے کٹے ہوئے حصے کو تلاش نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ دونوں الگ ہو جانے والے ٹکڑے اسی طرح سیدھے اور آپس میں ملے ہوئے لگتے تھے۔ میں چاقو جیب میں رکھ ہی رہا تھا کہ بائیں طرف کا دروازہ کھلا اور ایک شخص نیچے جانے کے لیے اترا۔

"سکندر صاحب!" اس نے مجھے دیکھتے ہی حیرانی سے کہا اور مجھ سے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ "آپ یہاں کیسے؟" وہ سرگوشی میں بولا۔ "آپ کی تلاش میں تو پولیس یہاں آئی تھی۔"

"یہاں! کیا میں یہاں رہتا ہوں؟ یا یہاں کام کرتا ہوں؟" میں نے پوچھا۔ ظاہر ہے اس کے پاس میرے سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔ "خیر یہ بتاؤ کہ کس سلسلے میں آئی تھی پولیس؟"

"وہ... دراصل ڈی سلوا صاحب... ان کی ایک سیکرٹری ہوتی تھیں، مس شہلا زیدی۔" وہ سر کھجا کے بولا۔ "ان کے گھر پر کچھ ہنگامہ ہوا تھا۔ وہ خود بھی غائب ہیں اور ہمیں تو ڈی سلوا صاحب نے بتایا تھا کہ..."

"اچھا اچھا۔ ڈی سلوا صاحب نے بتایا تھا۔" میں نے کہا۔ "ان سے تو میں خود پوچھ لیتا ہوں۔ تم جاؤ۔"

وہ کیبن خالی پڑا تھا جہاں میں نے اس سے پہلے شہلا کو بیٹھے دیکھا تھا۔ فرض اور محبت کے تقاضوں سے مغلوب وہ بے وقوف لڑکی ڈی سلوا کی خاطر مجھ سے دشمنی پر آمادہ تھی جبکہ بہت نقصان اٹھانے کے بعد معلوم ہوا تھا کہ دشمن تو وہ تھا جس پر اس نے متاعِ دل وجاں نثار کر دی تھی۔ ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا... میں نے ڈی سلوا کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے چچا غالب کو یاد کیا اور ڈی سلوا کو فائل پر سے نظر اٹھا کر چونکتے ہوئے دیکھا۔ اس کا ہاتھ فوراً دراز کی طرف بڑھا اور رک گیا۔ اس نے میرے تیور دیکھ لیے تھے اور اندازہ کر لیا تھا کہ میں اسے جارحانہ کارروائی کی مہلت نہیں دوں گا۔

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں مسٹر ڈی سوا۔" میں نے ہاتھ اٹھا کے صلح جُو لہجے میں کہا۔ "میں صرف باتیں کرنے آیا ہوں اور باتیں ہی کروں گا بشرطیکہ تمہیں بھی اس پر اعتراض نہ ہو۔"

"میں تم سے کسی قسم کی کوئی بات کرنا نہیں چاہتا۔" ڈی سلوا سپاٹ لہجے میں بولا۔

"ہاں۔ تم بھلا کیوں چاہو گے۔" میں نے کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "مگر میں چاہتا ہوں کہ باتیں کروں اس لیے میں باتیں ضرور کروں گا اور اگر تم جواب نہیں دو گے تو تمہاری خاموشی کو اقرار سمجھ کے بولتا رہوں گا۔ رائٹ؟ ویسے تم اچھی طرح سمجھتے ہو کہ مجھے وہ دوسرا کام بھی آتا ہے۔ لاتوں کے بھوت کو باتوں سے منوانا یا اس کے برعکس باتوں کے بھوت کو لاتوں سے قائل کرنا مگر مجھے امید ہے کہ تم مجھے دوسرا طریقہ اختیار کرنے پر مجبور نہیں کرو گے کیونکہ تم سمجھدار آدمی ہو۔ ضرورت سے بہت زیادہ سمجھدار۔" ڈی سلوا مجھے گھورتا رہا اور خاموشی سے میرے ہاتھوں کو میز کا سامان ہٹا کر ایک طرف کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے اور اس کے درمیان کوئی چیز حائل ہو۔ یہ مورچہ بندی حفاظتی نوعیت کی تھی تاکہ ضرورت پڑنے پر میں ڈی سلوا کو فوراً قابو کر سکوں۔ "آج تمہارا یہ دفتر کچھ اجڑا اجڑا سا ہے۔" میں نے کہا۔ "تمہاری وہ جانِ بہار سیکرٹری نظر نہیں آ رہی ہے جس کے عکسِ جمال سے یہ انجمن روشن تھی۔ کیا نام تھا اس کا؟ شہلا زیدی۔ میں نے تو سنا ہے... دشمنوں کے کان بہرے... کہ وہ غائب ہو گئی ہے؟ جیسے گدھے کے سر سے محاورے کے مطابق سینگ۔ سینگ کے ساتھ گدھا کتنا خوبصورت لگتا ہو گا۔ اتنا ہی جتنا پہلے یہ دفتر لگتا تھا۔ خیر یہ بتاؤ تم نے اسے رکھا کہاں ہے؟ مجھے حیرانی ہے کہ تم جیسا آدمی اتنا قدامت پرست اور تنگ نظر شوہر ثابت ہو گا کہ شادی کے بعد بیوی کو ملازمت نہیں کرنے دے گا۔ تم تو اس کی خاطر مذہب تک بدل رہے تھے؟"

ڈی سلوا کا چہرہ سرخ پڑنے لگا تھا۔ "یہ بکواس شہلا نے بہت سے لوگوں کے سامنے کی تھی۔" وہ حقارت سے بولا۔ "لیکن میں نے اس سے شادی کا کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔ مذہب بدلنے کا کیا سوال؟"

"ہاں مذہب بدلنے کا کیا سوال۔" میں نے اتفاق کیا۔ "مذہب کی بنیاد ہے انسانیت پر اور اس لیے تمہارا مذہب ہی کہاں کہ بدلو۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ پولیس مجھے تلاش کرتی ہوئی یہاں آئی تھی؟"

"تم اچھی طرح جانتے ہو کہ شہلا کے گھر میں وہ تین آدمی کس طرح مارے گئے تھے۔"

"ہاں۔" میں نے قہقہہ مارا۔ "مگر یہ پولیس والے بیوقوف یہ کچھ نہیں جانتے۔ مثلاً یہ نہیں جانتے کہ میں ایس ایس پی حسن رضوی کے گھر میں رہتا ہوں۔ وہ مجھے پوچھتے ہوئے وہاں نہیں گئے مگر یہاں آ گئے۔ ہے نا کمال کی بات؟ وہ ایک شخص تھا تمہارے جیسا افلاطون۔ اس کی سوئی گھر میں کھو گئی تھی مگر وہ باہر سڑک پر ڈھونڈ رہا تھا۔ کیونکہ گھر میں اندھیرا تھا۔ ویسے نہ میں سوئی جتنا ہوں اور نہ میرے گھر میں اندھیرا ہے کہ میں نظر نہ آؤں۔ اندھیرا ان پولیس والوں کی کھوپڑی میں ہے۔ انہوں نے تم کو تو پریشان نہیں کیا؟ اس رات تم بھی تو آئے تھے اور وہ سیکرٹری بھی تمہاری تھی؟"

"لک ہیر۔" ڈی سلوا تیز لہجے میں بولا۔ "میں یہاں فارغ نہیں بیٹھا ہوں۔ برداشت کی ایک حد ہوتی ہے۔ اگر تم یہی فضول باتیں کر کے میرا وقت ضائع کرنے آتے ہو..."

"آئی ایم ساری۔" میں نے پھر ہاتھ اٹھا کے کہا۔ "میں بالکل بھول گیا تھا کہ تمہارا وقت قیمتی ہے حالانکہ یہ میرا وقت ہے اگر تم غور کرو۔ میں مالک ہوں اور تم ملازم، چنانچہ میں حکم دے سکتا ہوں کہ مسٹر مینجر کام پر لعنت بھیجو اور میری فضول بکواس کو غور سے سنو۔ مگر تم پھر وہی اعتراض اٹھاؤ گے کہ ابھی میں مالک نہیں بنا۔ اس لیے میں اصل بات پر آتا ہوں۔ مجھے تم سے ایک شخص کا پتہ معلوم کرنا تھا۔ وہ کچھ عرصہ پہلے کسٹم آفیسر تھا اور اس کا نام تھا نعیم۔"

بڑی تیزی سے ڈی سلوا نے اپنی صورت کے بدلتے رنگ پر قابو پایا۔ "تم غلط جگہ آ گئے ہو۔"

"کیسی لطیفے کی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ میرے باپ کا دفتر ہے۔ پھر میرے لیے غلط جگہ کیسے ہو گئی؟"

"میرا مطلب تھا کہ تمہیں کسٹم آفس والوں سے رجوع کرنا چاہیے تھا۔"

میں نے زور زور سے نفی میں گردن ہلائی۔ "اوہ! نو مسٹر ڈی سلوا! کسٹم میں تو وہ بہت پہلے تھا۔ پھر اس نے نوکری چھوڑ دی تھی اور لندن چلا گیا تھا۔ اپنی بیوی گل رخ کے ساتھ۔ وہاں اس کا ایک اسٹور تھا۔"

"وہاٹ نان سینس۔" ڈی سلوا نے سنبھل جانے کے بعد پُرسکون لہجے میں کہا۔ "اگر یہ سب کچھ تمہیں معلوم ہے تو مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟ میں کسی نعیم کو نہیں جانتا۔ کسی گل رُخ کو نہیں جانتا ہوں۔"

"وہاٹ نان سینس۔" میں نے بالکل ڈی سلوا کے لہجے میں دہرایا۔ "وہ مجھے لندن میں ملا تھا تو اس نے تمہارا ذکر کیا تھا۔"

"کیا ذکر کیا تھا؟" ڈی سلوا نے ماتھے پر بل ڈال کے کہا لیکن وہ اپنے لہجے سے ظاہر ہونے والی تشویش کو نہ چھپا سکا۔

"ذکر یہی کہ تم سے اس کی دوستی تھی یا شناسائی تھی۔" میں نے گول مول جواب دیا۔ "میں نے بات کی تھی میرونڈیرا اینڈ کمپنی کی اور اس نے تمہارا نام لیا۔ وہ تو کہتا تھا کہ تم گل رخ کی فیملی کو بھی جانتے ہو۔"

ڈی سلوا کی حالت غیر ہونے لگی تھی۔ "اس نے بکواس کی تھی۔"

"اچھا؟" میں نے مصنوعی حیرانی سے کہا۔ "تم مولوی محبوب کو نہیں جانتے؟ وہ جو پاگل ہو کر گھر کو آگ لگانے کے بعد بیوی کے ساتھ جل مرا تھا؟ اور میں نے سنا ہے کہ پوسٹ مارٹم رپورٹ..."

"شٹ اپ!" ڈی سلوا نے میز پر مکا مارا اور چیخ کر کہا "شٹ اپ اینڈ گیٹ آؤٹ ورنہ میں پولیس کو بلاتا ہوں۔"

"ضرور بلاؤ۔" میں نے ٹیلی فون اس کی طرف کھسکا دیا اور اپنے ظاہری سکون اور اطمینان میں فرق نہیں آنے دیا۔ "بلکہ بہتر یہ ہو گا کہ تم دو جگہ سے پولیس کو طلب کرو۔ ایک تو انہی کو جو مجھے ڈھونڈتے ہوئے یہاں آتے تھے، دوسرے اس تھانے والوں کو بھی جن کے پاس مولوی محبوب اور اس کی بیوی کی پُراسرار موت کی رپورٹ ہے۔"

ڈی سلوا نے ریسیور اٹھایا اور کان سے لگا کر دھڑ سے دے مارا۔ "تو یہ بات ہے؟"

"آہستہ۔ مسٹر ڈی سلوا! ٹیلی فون ٹوٹ جائے گا۔" میں نے کہا۔ "یہ آفس کی ملکیت ہے تمہارے باپ کی نہیں..."

ابھی میرا جملہ پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ ڈی سلوا نے ٹیلیفون اٹھا کر مجھ پر پھینکا۔ اس کا ہاتھ ریسیور پہنچنے کے بعد ٹیلی فون سے الگ ہوا ہی نہ تھا چنانچہ میں تیار تھا۔ میں نے ہاتھ مار کے ٹیلی فون کو ایک طرف گرا دیا۔ ٹیلی فون میز کے شیشے پر گرا اور شیشے کو توڑتا ہوا فرش پر گر کر دو ٹکڑے ہو گیا۔ ڈی سلوا نے بڑی پھرتی سے اٹھ کر دراز کھینچی مگر میں نے لات مار کر اس کی کوشش ناکام بنا دی۔ ہاتھ کو جھٹکا لگنے سے دراز باہر آ گری اور ریوالور جو کاغذات میں سب سے اوپر رکھا تھا اچھل کر ڈی سلوا کے پیروں کے پاس جا پڑا۔ ڈی سلوا کرسی سے ٹکرا کر سنبھل ہی رہا تھا کہ ریوالور کو اپنی دسترس میں دیکھ کر وہ

تیزی سے جھکا۔ اس کا ہاتھ اور میرا پاؤں تقریباً ایک ساتھ ریوالور تک پہنچے۔ ڈی سلوا کا ہاتھ سیکنڈ کے دسویں حصّے کے فرق سے پہلے پہنچا تھا۔ چنانچہ میرے جوتے کے نیچے آگیا اور میں نے اس پر اپنا پورا وزن ڈال دیا۔ میرے ہاتھوں نے اس کا دوسرا بازو جکڑ لیا۔ کرسی اور میز کے درمیان اس کی گردن اس طرح آگئی کہ میں دوسرے پیر کا گھٹنا مارتا تو میز کے کنارے سے اس کی گردن ٹوٹ جاتی۔ چنانچہ میں نے اس کو جھٹکا دے کر اٹھایا اور کرسی میں فٹ کر دیا۔ ابھی تک ان آوازوں نے دفتر کے دوسرے حصّے میں کام کرنے والوں کو متوجہ نہیں کیا تھا کیونکہ ہمارے درمیان دو کمروں کی پارٹیشن اور ایک زینے کی دو دیواریں حائل تھیں۔ اس کے علاوہ نیچے بیڈن روڈ کی ٹریفک کا شور و غل تھا۔

"مسٹر ڈی سلوا! میں نے تمہیں خبردار کیا تھا،" میں نے اسے حرکت کا موقع دیے بغیر کہا۔ "اور اب پھر خبردار کرتا ہوں، میں بات کرنے آیا تھا۔ مجھے ہاتھ چلانے پر مجبور مت کرو۔ میں یہ بھی کر سکتا ہوں کہ ایک ہاتھ سے تمہارے ہوش رخصت کر دوں اور تمہارے کپڑے اتار کے تمہیں اس پنکھے سے الٹا لٹکا دوں۔ کیا تم چاہتے ہو کہ تمہارے ماتحت یہ تماشہ دیکھیں؟ تمہارے لیے یہ ثابت کرنا بہت مشکل ہوگا کہ میں یہاں آیا تھا، لیکن مجھے معلوم ہے کہ تم مجھے اس دفتر سے نکلنے کی مہلت نہیں دو گے اور شور مچاؤ گے تو سارا عملہ اکٹھا کر لو گے۔ اس لیے میں جانے سے پہلے اپنی حفاظت کا بندوبست ضرور کروں گا۔ انتخاب میں تم پر چھوڑتا ہوں۔ تم وہ طریقہ پسند کرو گے جس کا ذکر میں نے ابھی کیا تھا؟ یا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ میں تمہیں اس کرسی سے باندھ جاؤں اور تمہارا منہ بند کر جاؤں۔ تماشہ تو یہ بھی ہوگا مگر زیادہ بُرا نہیں۔ تم عقل مندی سے کام لو تو اس شخص کو خاموش بھی رکھ سکتے ہو جو تمہیں نجات دلانے آئے۔"

ظاہر ہے انتخاب اس کے ہاتھ میں نہیں تھا۔ میں نے اسے باندھنے کے لیے ٹیلی فون کا تار استعمال کیا جو میز سے دیوار کے ساتھ ساتھ سیکرٹری کے کمرے میں سے گزرتا زینے کی طرف جا رہا تھا۔ ایک جھٹکے سے تار میرے ہاتھ میں آگیا اور دوسرے جھٹکے میں دیوار کے آخری موڑ کے پاس سے ٹوٹ گیا۔ یہ تقریباً پانچ گز لمبا ٹکڑا تھا۔ میں نے ڈی سلوا کے دونوں ہاتھ کرسی کی پشت سے مضبوطی سے باندھے پھر اس کے دونوں پیروں کو ٹخنوں کے پاس سے موڑ کر کرسی کے گھومنے والے حصّے کے پیچھے کیا اور باقی تار سے باندھ دیا۔ اس دوران میں ایک لمحے کے لیے بھی ڈی سلوا کی طرف سے غافل نہیں ہوا۔ خود بھی اچھی طرح سمجھتا تھا کہ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ کر بھی سکتا ہوں۔ چنانچہ اس نے مزاحمت کو خود اپنی زیادہ بے عزتی بنانے سے گریز کیا۔ میں نے اس کا منہ بند رکھنے کے لیے اس کے منہ میں کاغذوں کی گیند سی بنا کر دبا دی۔ اس کے سوا وہاں کوئی بھی ایسی چیز دستیاب نہ تھی۔ پھر میں نے اس کے منہ پر رومال باندھا۔ اس تمام کارروائی میں میرے پانچ سات منٹ ضرور صرف ہوئے ہوں گے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس دوران میں عملے کا کوئی فرد منیجر کے کمرے میں کوئی کام لے کر نہیں آیا۔

"گڈ بائی، ڈی سلوا!" میں نے اس کی جیب سے ... نکالتے ہوئے کہا۔ "اینڈ گڈ لک۔ آج کی ملاقات کے بعد تم نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ اب میں اتنا کمزور اور بے بس نہیں ہوں جتنا لندن سے ڈی پورٹ کیے جانے کے وقت تھا۔ میری اصل کمزوری اور بے بسی کا سبب میری لاعلمی تھی۔ آئندہ ... تک مجھے اور بہت سی ایسی باتیں معلوم ہو جائیں گی جن پر اب تک پردہ پڑا ہوا تھا۔ مجھے کچھ اور ثبوت مل جائیں گے اور تم دیکھو گے کہ ہمارے لیے خطرات کا مفہوم ایک ہی ہو گیا ہے۔ پھر ایک وقت آئے گا جب تم کمبل کو چھوڑنا چاہو گے لیکن کمبل تمہیں نہیں چھوڑے گا اور تمہارا کفن بن جائے گا۔ یہ میری خوش فہمی نہیں ہے، میرا ایمان ہے کہ خدا ظالم کی رسی کو زیادہ دراز نہیں کرتا اور جیت بالآخر سچائی کی ہوتی ہے۔ قدرت کا یہ نظامِ انصاف نہ بدلا ہے اور نہ بدلے گا۔"

میں نے نیچے پڑے ہوئے ریوالور پر ڈی سلوا کا رومال ... اور اسے نالی کی طرف سے پکڑ کر اٹھا لیا۔ پوری احتیاط سے میں نے ریوالور کو رومال سمیت ایک لفافے میں منتقل کیا۔ ڈی سلوا بے بسی سے سب کچھ دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں سے خوف اور پریشانی کے جذبات عیاں تھے مگر وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میں کمرے سے نکل کر اطمینان سے چلتا ہوا نیچے اتر گیا۔ ڈی سلوا جس کرسی سے بندھا ہوا تھا وہ بہت بھاری تھی۔ وہ خود کو آزاد نہیں کرا سکتا تھا اور کرسی سمیت باہر بھی نہیں جا سکتا تھا لیکن یہ خطرہ اپنی جگہ موجود تھا کہ میرے اترتے ہی اس کا کوئی ماتحت اس کا نجات دہندہ بن کے آپہنچے۔ ڈی سلوا اسے حقیقت بتائے یا کوئی کہانی سنائے بہرصورت اس کا میرے تعاقب میں آنا یقینی تھا کیونکہ میں اس کا ریوالور لے آیا تھا جس پر اس کے فنگر پرنٹ تھے۔ اِدھر اُدھر دیکھنے پر کوئی سواری نظر نہ آئی۔ میں "کیری ہوم" ریسٹورنٹ ... سے اندر داخل ہو گیا جہاں لنچ کے وقفے کا رش تھا۔ کوئی جگہ خالی نہ تھی لیکن آخری حصّے میں ایک میز پر صرف ایک شخص بیٹھا تھا اس سے اجازت لے کر میں بھی وہیں بیٹھ گیا۔ دروازے کی طرف میری پشت تھی چنانچہ کوئی بھی اندر کے ایک نظر میں مجھ کو تلاش نہیں کر سکتا تھا۔ تقریباً پون گھنٹے بعد جب میں کھانے سے فارغ ہو چکا تھا اور ہاتھ دھونے کے لیے واش بیسن کی طرف جا رہا تھا تو میں نے ڈی سلوا کو چند فٹ کے فاصلے پر دوسری میز پر لنچ میں مصروف دیکھا اور صرف ایک بار ہماری نظریں چار ہوئیں۔ میرے ساتھ ہی وہ بھی اٹھا۔ میں نے ہاتھ دھونے کا ارادہ ترک کیا۔ بل کی ادائیگی کا مرحلہ ابھی باقی تھا اور میں انتظار نہیں کر سکتا تھا اگر میں کاؤنٹر پر بل ادا کرنے جاتا تو منیجر اس ویٹر کو بلاتا جس نے مجھے سرو کیا تھا لیکن کاؤنٹر دروازے کے پاس تھا اور ڈی سلوا مجھ سے پہلے وہاں پہنچ سکتا تھا۔ میں نے رُخ کاؤنٹر کی طرف رکھا۔ چار قدم چلنے کے بعد جب میں نے دیکھا کہ ڈی سلوا زیادہ تیز رفتاری سے کاؤنٹر کا رُخ کر رہا ہے تو میں اچانک پلٹا اور مخالف سمت میں چلنے لگا۔ اچانک میرے سامنے ویٹر آگیا۔ میں نے جیب سے پچاس کا نوٹ نکالا اور اس ٹرے پر رکھ دیا جس میں وہ کسی اور کے لیے کھانا لے کر جا رہا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ بل پچیس روپے سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔ باقی رقم میں نے ویٹر کو ٹپ کے طور پر بخش دی اور اسے ہکا بکا چھوڑ کے دروازے کی طرف گیا جو باورچی خانے میں کھلتا تھا۔ میرے آنکھ مارنے سے ویٹر سمجھ گیا تھا کہ میں نے اسے ٹپ نہیں، رشوت دی ہے۔ ابھی تک میں نے دوڑ نہیں لگائی تھی ورنہ بھگدڑ مچ جاتی لیکن اس دروازے سے گزرتے ہی جس پر لکھا تھا "اندر آنا منع ہے" میں بھاگا۔ مجھے اپنے پیچھے خاصی ہڑبونگ سنائی دی غالباً ڈی سلوا میرے پیچھے دوڑا تھا۔ میں نے دو بیروں کو ڈاج کیا، ایک کو کھانے کی ٹرے اور برتنوں سمیت چت کیا اور کچن میں نمودار ہوا جہاں پلیٹوں اور دیگچوں اور دوسرے برتنوں کی آوازوں کے علاوہ بیروں اور خانساموں کی چیخ و پکار کا ملا جلا شور تھا اور مینو کارڈ پر لکھے ہوئے سب کھانوں کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ بہت کم لوگوں نے مجھے دیکھا مگر بیشتر نے نظرانداز کر دیا۔ کچھ حیران بھی ہوئے مگر صرف ایک فرض شناس خانساماں کنگ سائز چمچہ لے کر میری طرف لپکا۔ اس کو یقین تھا کہ میں بل ادا کیے بغیر فرار ہو رہا ہوں۔ اس نے چمچے کو گرز کی طرح گھما کر مارنا چاہا مگر میں جُل دے کر دروازے سے نکل گیا۔ دروازے کو باہر سے کنڈی لگا ... میں آگیا۔ ایک رکشا والا سواری اتار کے پیسے لے رہا تھا کہ میں رکشا میں جا بیٹھا۔ حسبِ توقع اس نے بلا اجازت بیٹھنے کا بُرا منایا اور حسبِ معمول دگنے کرایے کی پیشکش پر چل پڑا۔ ابھی میٹر میں کرایہ بدلا بھی نہیں تھا کہ میں نے روک لیا۔ گن کر ایک روپیہ بیس پیسے اس کے ہاتھ پر رکھے جو واقعی اصل کرایہ سے دوگنے تھے مگر اس کی توقعات سے بہت کم تھے۔ وہ پانچ کے دس یا دس کے بیس لینے کی سوچ رہا تھا۔ اتنی ایمانداری سے اس کو دھوکا دے کر مجھے بڑی خوشی ہوئی اور میں اسے بڑبڑاتا چھوڑ کر سامنے سے گزرتی ہوئی بس میں چڑھ گیا۔ رکشا ڈرائیور کے نکتۂ نظر سے میں نے پیسے بچائے لیکن درحقیقت میں نے سفر کا زیادہ محفوظ طریقہ اختیار کیا تھا۔

اب محسن کی واپسی تک مجھے کوئی کام نہ تھا اور میرا خیال تھا کہ وہ شام سے پہلے لوٹ کر نہیں آئے گا۔ مجھے اس کی طرف سے تھوڑی سی تشویش بھی تھی کہ اسے اپنے مقصد میں کس حد تک کامیابی ہوئی مگر میں انتظار کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ رابعہ کے ساتھ میں اس کے آفس گیا جہاں اس نے دو گھنٹے صرف کیے۔ اس کے ماتحت جونیئر وکیل نوجوان تھے مگر ذہین تھے اور رابعہ کے ساتھ بہت مخلص تھے۔ انہوں نے رابعہ کی عدم موجودگی میں بھی اپنا کام بڑی لگن اور محنت سے جاری رکھا تھا اور مقدمات کی پیروی میں کوئی خلل نہیں پڑا تھا۔ ان سب کو رابعہ سے دلی ہمدردی تھی کیونکہ وہ رابعہ کی دل سے عزت کرتے تھے۔ ان کی ٹیم اسپرٹ نے مجھے بہت متاثر کیا جس کی سربراہی رابعہ کرتی تھی۔ انہوں نے رابعہ کو یقین دلایا کہ وہ آفس کی طرف سے بے فکر رہے اور اپنے حالات کو سنبھالنے پر پوری توجہ دے۔ شام کے سائے پھیلنے لگے تھے، جب میں اور رابعہ آفس سے نکلے ... شیزان میں چائے پینے بیٹھ گئے۔

"یہ تمہاری خوش قسمتی ہے۔" میں نے کہا۔ "کہ تمہارے ساتھ کام کرنے والے اتنے اچھے لوگ ہیں۔"

"ان حالات میں خوش قسمتی کا لفظ کتنا اجنبی لگتا ہے۔" وہ بولی۔ "لیکن تم ٹھیک کہتے ہو۔ اگر ایسے وقت میں جمی جمائی پریکٹس کا بیڑہ غرق ہو جاتا تو آمدنی کے ذرائع بھی نہ رہتے۔ یہ لوگ واقعی اچھے ہیں اور ان کی ہمدردی بہت بڑا سہارا ہے۔ میری غیر حاضری میں موکلوں نے بیس ہزار روپے ادا کیے تھے جو انہوں نے میرے حوالے کر دیے۔"

"اس آمدنی میں سے تم ان لوگوں کی تنخواہ بھی ادا کرو گی؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ تنخواہ کا کوئی سوال ہی نہیں۔" رابعہ بولی۔ "پہلے میں نے ان کو معاہدے کی بنیاد پر ملازم رکھا تھا، بعد میں ان کے تعاون اور نیک نیتی کو دیکھتے ہوئے پارٹنرشپ پیش کی۔ آمدنی میں سے چالیس فیصد میرا اور باقی ساٹھ فیصد میں سے تینوں کا حصہ برابر ہے۔ اس میں سب کا فائدہ ہے۔ مجھے کبھی ماہانہ بیس ہزار سے کم نہیں ملے اور ان کو بھی دس دس ہزار ضرور ملے۔ الگ پریکٹس کر کے بھی یہ اتنا کما لیتے مگر بہت عرصہ سخت محنت کرنے کے بعد۔ ٹیم ورک میں کام آسان ہو جاتا ہے اور آمدنی بھی نسبتاً تیزی سے بڑھتی ہے۔" بات کرتے کرتے اچانک اس نے اپنا ہینڈ بیگ کھولا اور براؤن پیپر کا ایک پیکٹ سا نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔ "یہ رقم تم رکھ لو۔ تمہیں ضرورت ہوگی۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ "تم سے کس نے کہہ دیا کہ مجھے پیسوں کی ضرورت ہے؟"

"سچ بتاؤں؟" وہ نظر جھکا کر بولی۔ "مجھ سے یہ بات میرے دل نے کہی ہے۔ کیا یہ غلط ہے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "دل کی بات غلط نہیں ہوتی لیکن بیس ہزار لے کر میں کیا کروں گا؟"

"جو تمہارا دل چاہے کرنا۔" وہ بولی۔ "میں تم سے حساب نہیں مانگوں گی۔"

"جانِ من!" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ "قرض تو قرض ہی ہوتا ہے۔"

"اگر تم نے قرض کا لفظ دوبارہ استعمال کیا تو میں ابھی واک آؤٹ کر جاؤں گی۔" وہ برہمی سے بولی۔

"اچھا بابا دھمکی مت دو۔" میں نے وہ پیکٹ اٹھا لیا۔ "لیکن ایک بات بتاؤں۔ ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب تم اتنی فراخدل نہیں رہو گی اور میں نے ذرا بھی فضول خرچی کی تو پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑ جاؤ گی۔"

وہ میرا مطلب فوراً سمجھ گئی کیونکہ اس کا رنگ غروب ہوتے ہوئے سورج کی کرنوں جیسا ہو گیا جن کا عکس افق کے کسی کنارے سے ایک شیشے میں جھلکنے لگا تھا۔

"تم سے ایک بات پوچھوں؟" میں نے کہا۔ "پس انداز کرنا تو ایک زنانہ صفت ہے۔ تمہاری آمدنی معقول رہی ہے یہ بتاؤ کہ اب تک تم نے کتنا بچایا ہے؟ میرا مطلب ہے کہ کیا تم اور کوئی گھر بنوا سکتی ہو؟ گو تم بھی شاہ ہو کے اس کھنڈر کو اب بھول جاؤ۔ ماضی کی یادیں اگر عذاب ہوں تو ان کو ذہن سے خارج کر دینا ہی اچھا ہے۔ وہ زمین بہت مہنگی ہے اس کو فروخت کر کے تم آدھی قیمت پر کسی ماڈرن علاقے میں اتنی ہی جگہ حاصل کر سکتی ہو۔"

"یہ سب تو ٹھیک ہے۔" وہ بولی۔ "لیکن کسی ماڈرن ... میں بھی میں اکیلی نہیں رہ سکتی۔"

"تم اپنے ساتھ ماسی کو رکھ سکتی ہو۔" میں نے کہا۔ "... جب تک میرے حالات درست نہیں ہوتے۔"

"شہلا بھی اسی طرح رہتی تھی۔" رابعہ بولی۔ "ماڈ... علاقے کے ماڈرن لوگ اسے نہیں بچا سکے۔ اس سے بہ... ہوگا کہ میں کسی پرانی آبادی میں کوئی پرانا مکان خرید لوں ... ہر طرف حقوق ہمسائیگی کو سمجھنے والے وضع دار لوگ ... اس عمارت کے ایک حصے میں خود رہوں اور باقی حصے ... پر اٹھا دوں۔ کسی بھی شریف فیملی کے ساتھ میں زیا... محفوظ رہوں گی۔ بہت ضروری ہوا تو میں ایک ڈرائیور بھی ... لوں گی جو دیں رہے اور چوکیداری بھی کرے۔ چوکیدار ... بھی لے اور رہنے کے لیے جگہ بھی۔ میں خود بھی زیادہ ... تک ضامن رضوی صاحب کی مہمان بن کے رہنا نہیں ..."

"جو کچھ تم نے سوچا ہے بہت مناسب ہے۔" میں ... چٹکی بجا کر ویٹر کو بل لانے کا اشارہ کیا۔ "مسئلہ رہ جاتا ہے ... کا، وہ بھی وہاں زیادہ عرصے نہیں رہ سکتی اور مجھے ڈر ... کبھی نہ کبھی دشمن اس کا سراغ لگا لیں گے۔"

"دشمن تو کبھی نہ کبھی سب کا سراغ لگا لیں گے ... کا، گل رخ کا، یا میرا۔" وہ مسکرا کر بولی۔ "تمہیں صرف شہلا ... فکر کیوں ہے کہ وہ کہاں رہے گی؟"

"تمہیں معلوم نہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن آج ... نے یہ ذمہ داری بھی قبول کر لی ہے اور عدنان کی جگہ لے لی ..."

"یہ تم کیا کر رہے ہو سکندر؟ اتنی ذمہ داریوں کا بوجھ ... اٹھا سکو گے؟"

"میں اکیلا کہاں ہوں۔ میرے ساتھ میری بہن ہے ... میرا دوست محسن ہے۔" میں نے کہا۔ "... اور تم ہو۔ میرا ... ہے اور میرا خدا ہے۔ آؤ اب چلیں۔"

جب ہم گلبرگ پہنچے تو اندھیرا ہونے لگا تھا۔ اند... کمروں میں روشنی تھی، جس کا مطلب یہ تھا کہ محسن آ... میں کچھ فاصلے پر رک گیا اور میں نے لفافے میں سے ریوا... نکالا جو رومال میں لپٹا ہوا تھا۔ "اسے احتیاط سے اپنے ... میں رکھ لو۔ اس کے چیمبر میں دو گولیاں کم ہیں ... اور ساخ... کے اعتبار سے یہ ویسا ہی ریوالور ہے جیسا حملہ آور لے کر ... تھے مگر اس پر ڈی سلوا کے فنگر پرنٹ ہیں۔ محسن ... گھر میں کسی جگہ پر ڈال دے گا جہاں سے اسے فوراً تلا...

نہ کیا جا سکے۔ اس رومال کے ایک کونے پر ڈی ایس کے حروف ڈی سلوا کے خلاف ایک اور شہادت فراہم کریں گے۔ رومال کو بھی گھر میں ہی ڈالا جا سکتا ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے محسن نے یہاں شہلا کو لانے کی حماقت نہیں کی ہوگی اور ماسی کو گھر چھوڑ کے شہلا کی اصل ماں کو یہاں لے آیا ہوگا۔ تم وکیل ہو اور عورت ہو اس لیے پورے اعتماد کے ساتھ اندر جا سکتی ہو۔ اگر پولیس ابھی تک موجود ہوئی تو تمہارے لیے کوئی مسئلہ نہیں، تم کہہ سکتی ہو کہ میرا شہلا کے گھر آنا جانا تھا اور ان کے خاندان پر نازل ہونے والی مصیبت کی خبر پڑھ کے تم خیریت بھی معلوم کرنے آئی ہو اور قانونی امداد کی خاطر بھی۔ پولیس والوں کو اندر بلا کر ریوالور اور رومال دونوں دکھا دینا اور انہیں جھاڑنا کہ وہ خاک تفتیش کرتے ہیں۔ یہ چیزیں انہوں نے کیوں نہیں دیکھیں؟ اور اب یہ نہیں ہونا چاہیے کہ فنگر پرنٹ ضائع ہو جائیں۔"

"میں سمجھ گئی۔" رابعہ نے کہا۔ "اب تم یہاں انتظار کرو لیکن احتیاط کے ساتھ۔ ... مشتبہ حالت میں کھڑا ہوا دیکھ کر ہمارے آنے سے پہلے ہی پکڑ کر نہ لے جائیں۔"

میں آہستہ سے ہنسا اور اسے دروازے کی طرف بڑھتا ہوا دیکھتا رہا۔ دور میں سے ایک گیٹ لائٹ جل رہی تھی۔ میں نے دور سے ایک پولیس والے کو گیٹ سے باہر آتے اور رابعہ سے باتیں کرتے دیکھا۔ پھر رابعہ اندر چلی گئی اور گیٹ بند ہو گیا۔ میں اس چھوٹی سی سڑک پر اکیلا ٹہلتا رہا اور ہر پانچ منٹ کے بعد گھڑی کے روشن ڈائل کو دیکھتا رہا۔ میں سڑک سے دور درختوں کے پیچھے تھا جہاں اندھیرا زیادہ گہرا تھا۔ سڑک پر سے گزرنے والے اکا دکا راہگیروں نے اس طرف دیکھا بھی نہیں۔ جب بھی کوئی کار نمودار ہوتی تھی، میں درخت کے تنے کی آڑ میں ہو جاتا تھا۔ ایک گاڑی اس کوٹھی میں سے بھی نکلی جہاں سے میں نے فون کیا تھا اور جب وہ میرے سامنے سے گزری تو میں نے کھڑکی میں سے ایک جھلک اس نوجوان کی دیکھی جس نے مجھے فون کرنے کی اجازت دی تھی۔ اگر وہ مجھے دیکھ لیتا تو میرے لیے مصیبت کا باعث بن جاتا۔ انتظار کا عذاب کتنا سخت ہوتا ہے، اس کا تجربہ تو مجھے کئی بار ہو چکا تھا لیکن سابقہ تجربات میں انتظار کے ساتھ اشتیاق ہوتا تھا، اضطراب ہوتا تھا یا تجسس ہوتا تھا لیکن خوف کا احساس نہیں ہوتا تھا، اندیشے نہیں ہوتے تھے اور خطرات کی یہ سنسنی خیزی نہیں ہوتی تھی۔ دروازے پر ایک موٹر سائیکل آ کے رکی اور ایک پولیس انسپکٹر اندر چلا گیا۔

میں نے طے کیا کہ انسپکٹر کے آنے کے بعد بھی رابعہ اور محسن کو ضابطے کی کارروائی کے مطابق بیان دینے اور ریوالور اور رومال اس کے حوالے کرنے میں کم سے کم پندرہ بیس منٹ ضرور لگیں گے۔ خدا کرے وہ اپنی ذہانت سے کام لیتے ہوئے انسپکٹر کو یقین دلا سکیں کہ دونوں چیزیں انہوں نے اتفاقیہ دریافت کی ہیں اور اسے یہ شک نہ ہو کہ ڈی سلوا کو ملوث کرنے کی نیت سے دونوں چیزوں کو وہاں لا کر ڈالا گیا ہے۔ ابھی پانچ منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ میں نے ایک شخص کو دروازے کے سامنے رک کر چند سیکنڈ بعد پھر روانہ ہوتے دیکھا۔ بظاہر یہ کوئی خاص بات نہ تھی۔ یہ گھر گزشتہ چند دن میں غیر معمولی ہنگامہ آرائی کے باعث سب کی توجہ کا مرکز رہا تھا۔ پاس پڑوس میں رہنے والا کوئی بھی شخص دروازے پر کھڑی ہوئی موٹر سائیکل کو دیکھ کر تجسس میں مبتلا ہو سکتا تھا۔ لیکن میں نے اس شخص کو پچاس قدم کے فاصلے سے لوٹ کر آتے دیکھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا پھر دروازے کے سامنے سے گزرا اور اس مرتبہ رکنے کے بجائے اس نے گیٹ کے اوپر سے جھانکنے کی کوشش کی۔ وہ گھر کے اندر کے حصے کا جائزہ لے رہا تھا۔ اگر وہ سپاہی موجود ہوتا جس نے رابعہ کے لیے دروازہ کھولا تھا تو اس شخص کو اتنی مہلت نہ دیتا مگر معلوم یہ ہوتا تھا کہ وہ اپنے افسرِ اعلیٰ کو تفتیش میں مدد دینے کی خاطر اندر چلا گیا تھا۔ میں غور سے اس شخص کی حرکات و سکنات کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ اچانک وہ گیٹ پر چڑھا اور اندر اتر گیا۔

بریف کیس کو وہیں چھوڑ کر میں دروازے کی طرف بڑھا۔ میرے اور گیٹ کے درمیان چالیس قدم کا فاصلہ ضرور تھا مگر میں نے یہ فاصلہ آدھے منٹ سے بھی کم وقت میں طے کیا۔ جب میں نے اوپر سے جھانکا تو وہ شخص کہیں نہ تھا۔ پھر میں نے اسے ایک درخت کی اوٹ سے نکل کر دوسرے درخت کی اوٹ میں جاتے دیکھا۔ وہ خود کو چھپاتا ہوا گھر کے قریب ہونے لگا تھا۔ پلک جھپکتے میں خود میں بھی گیٹ پر سے اندر اتر گیا۔ میں گیٹ کے اس طرف تھا جدھر لائٹ نہ ہونے کی وجہ سے اندھیرا سا تھا۔ لوہے کے گیٹ پر میرے چڑھنے اور اترنے سے ہلکی سی آواز پیدا ہوئی تھی۔ میں اندر اترتے ہی فرش پر لیٹ گیا تھا۔ اس شخص نے چونک کر گیٹ کی طرف دیکھا تو اسے کچھ دکھائی نہ دیا۔ اب اس شخص کے سامنے لان کے کنارے پر لگی ہوئی مشکل سے دو فٹ اونچی جھاڑیوں کی وہی دیوار تھی جس کے پیچھے میں پناہ گزیں تھا اور جو گیٹ

سے شروع ہو کے پورچ تک جاتی تھی۔ وہ درخت کے پیچھے سے نکلا اور ان جھاڑیوں کے دامن میں لیٹ گیا۔ اس کی نگاہ گھر کی طرف تھی چنانچہ میں آہستہ سے اٹھا اور کوئی آہٹ کیے بغیر پہلے درخت کے پیچھے پہنچ گیا۔ دوسرا درخت مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر تھا۔ پورچ کی لائٹ لان پر پڑ رہی تھی مگر وہ شخص سر سبز ہموار تراشی ہوئی جھاڑیوں کے سائے میں لیٹا ہوا اندھیرے کا ایک جزو لگتا تھا۔ اس نے ایک بار پھر گیٹ کی طرف دیکھا اور مطمئن ہو گیا کہ اسے دیکھنے والا کوئی نہیں۔

میں دوسرے درخت کی آڑ میں اس کے بہت قریب جا پہنچا۔ اب مجھے اس کی صورت تو صاف نظر نہیں آ رہی تھی مگر میں اندازہ کر سکتا تھا کہ وہ جسمانی طور پر خاصا صحت مند اور دراز قد آدمی ہے۔ اس نے گہرے رنگ کی قمیص شلوار پہن رکھی تھی۔ لباس کے رنگ کا اندازہ بھی اتنا ہی مشکل تھا جتنا اس شخص کے پاس خنجر یا ریوالور کی موجودگی کا اندازہ کرنا مگر اتنا یقینی تھا کہ وہ کمزور حریف نہیں ہے اور شاید جسمانی طور پر مجھ سے بہتر قد و قامت اور زیادہ وزن کا مالک تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ خالی ہاتھوں سے مقابلہ کرنے کا اہل ہو۔ میں نے کوئی خطرہ مول لینا مناسب نہ سمجھا۔ میں بہت آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھا اور بالکل صحیح فاصلے سے اس کے اوپر جا پڑا۔ اس کے حلق سے آواز بھی نہ نکل پائی۔ میں نے ایک ہاتھ سے اس کا منہ دبایا تھا اور وہ خود میرے وزن کے نیچے حرکت کرنے سے قاصر تھا۔ میرے دوسرے ہاتھ کے وار نے اس کو ہوش سے بیگانہ کر دیا اور وہ ڈھیلا پڑ گیا۔ میں نے اس کو وہیں سیدھا لٹا کے اس کی جیبوں کی تلاشی لی۔ اس کی شلوار کے نیفے میں سے ایک کمانی دار خنجر برآمد ہوا۔ اس کی جیب میں دو سو بیس روپے تھے اور ایک کنگھی مگر ایسی کوئی چیز نہیں تھی جس سے اس کی شناخت ہو سکتی۔

اب میں نے بھی وہیں لیٹ کر انتظار کرنا بہتر سمجھا۔ دس منٹ بعد انسپکٹر اندر سے باہر آیا۔

"معلوم نہیں آپ لوگ پولیس میں سب کو اتنا نااہل کیوں سمجھتے ہیں۔" اس نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

"اگر تم غیر معمولی طور پر ذہین ہو تو خود کو اس رائے سے مستثنیٰ سمجھو۔" رابعہ نے کہا۔ "برا ماننے کی ضرورت نہیں، کیونکہ وہ بھی تو بہت عقلمند اور تجربہ کار لوگ سمجھے جاتے ہوں گے جن کو اس واردات کی تفتیش پر مامور کیا گیا تھا... اور ان کا ریکارڈ یقیناً اچھا ہو گا مگر ثبوت تمہارے سامنے ہے کہ انہوں نے اپنی عقل اور اپنے تجربے سے کیا تیر مارا ہے؟"

انسپکٹر نے اس بات کے جواب میں کچھ نہیں کہا اور اپنے ماتحت کو چوکس رہنے کی تاکید کرتا ہوا گیٹ سے نکل گیا حسب توقع چند منٹ کے لیے کانسٹبل بھی اپنے افسر کو سیلوٹ کر کے رخصت کرنے کے لیے گیٹ سے باہر گیا۔ یہی وقت تھا جب ہم اپنے قیدی کو اندر لے جا سکتے تھے۔ رابعہ اور محسن پورچ میں کھڑے تھے۔ رابعہ کی سرخ فاکس ویگن پورچ سے ذرا آگے تھی۔ میں نے ہلکے سے سیٹی بجائی اور محسن کو ہاتھ دیکھا۔

"ادھر نورِ چشم!" میں نے اٹھ کے ہاتھ ہلایا اور اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ "جلدی!"

دو منٹ میں محسن کی مدد سے میں نے اس بھاری شخص کو اندر منتقل کر دیا۔ اس کا وزن دو سو پونڈ سے زیادہ ہی تھا۔ مجھے اس شخص کے ساتھ چھوڑ کے رابعہ اور محسن نکل گئے۔ میں نے ادھر ادھر کا جائزہ لیا۔ یہ ڈرائنگ روم جس میں ایک ہی پیڈسٹل لیمپ روشن تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ پولیس انسپکٹر نے اپنی تمام کارروائی دوسرے کمرے میں پوری کی۔ یہ دوسرا کمرہ شہلا کی ماں کا بیڈ روم نہیں ہو سکتا تھا چنانچہ شہلا کا کمرہ تھا کیونکہ گھر میں دو ہی بیڈ روم تھے۔ پہلے مجھے خیال آیا کہ اس اجنبی کو باندھنے کے لیے پرانا طریقہ اختیار کروں یعنی ایک پردہ پھاڑ لوں مگر ابھی اس کے ہوش میں آنے کا فوری خطرہ نہیں تھا چنانچہ کمرے کی آرائش کو خراب کرنا غیر ضروری تھا۔ بعد میں گھر کے اندر سے کوئی بھی رسی وغیرہ تلاش کی جا سکتی تھی۔ باہر محسن کی آواز آئی۔ وہ کانسٹبل کو ہدایات دے رہا تھا کہ ہوشیار رہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ چائے پیتے نکل جائے یا سو جائے اور کوئی اندر آ گھسے۔ جواب میں کانسٹبل نے کہا کہ اندر کیا لینے آئے گا مگر چائے اور کھانے کا مسئلہ حل ہو جائے تو وہ گیٹ پر اٹینشن کھڑا رہ سکتا ہے۔ اس کا مقصد صاف ظاہر تھا چنانچہ رابعہ نے کہا کہ کھانے کا انتظام تو مشکل ہے مگر اسے چائے کے ساتھ پیٹ بھرنے کے لیے کچھ بھیجا جا سکتا ہے۔ یہ میرے لیے بڑے اطمینان کی بات تھی، کیونکہ اب کانسٹبل کے اندر آنے کا امکان نہیں رہا تھا۔

میں نے اس شخص کو صوفے پر ڈال دیا تھا اور ذہن پر زور دے کر یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کی صورت پہلے بھی کہیں دیکھی ہے یا نہیں۔ محسن اور رابعہ ایک ساتھ اندر آئے تو میں نے مختصراً بتایا کہ میں نے اس شخص کو کیسے گرفتار کیا تھا۔

"اس کی صورت دیکھ کر تو کچھ پتہ نہیں چلتا۔" محسن نے کہا۔

"ظاہر ہے ہمیں اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنا پڑے گا۔" میں نے کہا۔

"یہ ضروری تو نہیں کہ ہوش میں آنے کے بعد یہ تمہارے ہر سوال کا جواب شرافت سے دے۔" محسن بولا۔

"شرافت سے تو شریف آدمی ہی جواب دیتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور یہ شخص مجھے کسی زاویے سے شریف نہیں لگتا۔ ہمیں اس کو بات کرنے پر مجبور کرنے کے لیے غیر شریفانہ طریقے ہی اختیار کرنے ہوں گے۔"

محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس گھر میں کچھ نہیں ہو سکتا۔ اندر ایک بیمار اور مفلوج عورت لیٹی ہوئی ہے اور باہر قانون کا محافظ کھڑا ہے۔ اگر اس نے چیخ پکار مچائی تو ہم مشکل میں پڑ جائیں گے۔"

"یہ نکتہ میرے ذہن میں بھی ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر اس کو یہاں سے لے جانا پڑا تو پھر وہی مسئلہ پیدا ہو گا۔ پہلے تو رابعہ کی کوٹھی تھی۔ اب وہ بھی نہیں ہے۔ ماسی کے گھر میں بھی کام نہیں ہو سکتا۔ وہ انتہائی گنجان آباد علاقہ ہے۔ ہمارا اپنا کمرہ بڑی مناسب جگہ تھی بشرطیکہ ساتھ والے کمرے میں کانسٹبل نہ ہوتا جس کے ساتھ ہمارے سفارتی مراسم سخت کشیدہ ہیں۔"

"میرا آفس اس وقت خالی ہو گا۔" رابعہ نے پہلی بار دخل دیا۔ "بلکہ وہ عمارت ہی تقریباً خالی ہو گی کیونکہ اس میں زیادہ تر دفاتر ہیں۔ ہوئے تو دو چوکیدار ہوں گے مگر وہ مجھے پہچانتے ہیں۔"

"یہ تجویز قابلِ عمل ہے۔" میں نے کہا۔ "اب ہم یہ سوچتے ہیں کہ اس شخص کو یہاں سے نکال کر وہاں کیسے لے جائیں۔ تم اتنی دیر میں باورچی خانہ تلاش کرو۔ دیکھو کہ ہماری اور سنتری بہادر کی خاطر مدارت کا کیا انتظام ہو سکتا ہے۔"

میری اپنی سرگزشت میں کوئی اہم بات نہیں تھی چنانچہ میں نے محسن سے پوچھا کہ اس کا مشن کیسا رہا اور ایک صوفے پر اس کے مقابل بیٹھ گیا۔

"میرا مشن بے حد کامیاب رہا۔" اس نے دوسرے صوفے پر بیٹھ کر پاؤں میز پر پھیلا دیے۔ "چوہدری دلاور نہ مجھے پہچانتا تھا اور نہ شہلا کی ماں کو۔ اسے یہ دیکھ کر سخت مایوسی ہوئی کہ شہلا ہمارے ساتھ نہیں ہے مگر چوہدری دلاور زبردست ایکٹر ہے۔ ہماری آمد سے وہ پریشان ضرور ہوا ہو گا مگر اس نے اپنی پریشانی کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔

ہم نے بھی یہ ظاہر کیا کہ ہمیں تمام حالات کا علم نہیں۔ میں اسے ایک طرف لے گیا اور اس کو بتایا کہ رشتے میں میں شہلا کا ایک کزن ہوں اور میں اس کی ماں کو چند دن کے لیے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ تین دن بعد ہم راولپنڈی سے واپس آتے اور گھر پہنچے تو گیٹ پر کھڑے ہوئے کانسٹبل نے ہمیں اندر جانے سے روک دیا اور صرف اتنا بتایا کہ کوٹھی میں قتل کی واردات ہوئی ہے۔ ہم پولیس اسٹیشن گئے اور وہاں سے ہسپتال، ہسپتال والوں نے بتایا کہ عدنان کی لاش اس کے چچا لے گئے ہیں۔ چنانچہ ہم ادھر آ گئے ہیں۔ چوہدری دلاور کو یقین تھا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ ڈی سلوا کی زبانی اس کو معلوم ہوا ہو گا کہ حملے کی رات گھر میں کون کون موجود تھا۔ ڈی سلوا نے بتایا ہو گا کہ شہلا اور اس کی ماں کے علاوہ گھر میں سکندر اور رابعہ بھی موجود تھے۔ میرا بیان غلط تھا، مگر چوہدری دلاور اسے غلط کیسے کہتا۔ وہ خود بھی تو غلط بیانی کر کے عدنان کی لاش لے گیا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ شہلا کہاں ہے اور میں نے انجان بن کر کہا کہ یہ تو مجھے آپ سے پوچھنا تھا۔ آپ بھی تو کسی رشتے سے شہلا کے چچا ہیں۔ چوہدری دلاور بہت عیار اور مکار شخص ہے۔ اس نے کہا کہ شہلا کے والد سے انتہائی قریبی دوستانہ مراسم کے باعث شہلا بچپن میں اسے چچا کہتی تھی، اسی خیال سے وہ ہسپتال پہنچا تھا کہ شہلا کی مدد کرے مگر معلوم ہوا کہ شہلا کا کوئی پتہ نہیں چنانچہ وہ لاش اپنے گھر لے آیا۔ اس نے پولیس اسٹیشن سے بھی رابطہ قائم کیا تھا اور اسے معلوم ہو گیا تھا کہ گھر پر کوئی نہیں ہے اور وہ سمجھا تھا کہ شہلا اپنی فالج زدہ ماں کو لے کر کہیں روپوش ہو گئی ہے۔ چوہدری دلاور یہ کیسے کہہ سکتا تھا کہ میں اس مفلوج عورت کو شہلا کی ماں اور خود کو اس کا کزن ثابت کروں۔ ماں کے بارے میں اسے یقین آ گیا تھا کہ حقیقی ماں ہے کیونکہ ماسی بالکل فالج زدہ عورت کی طرح پڑی رہی تھی۔ میں نے چوہدری دلاور کو سمجھایا کہ عدنان کے قتل کی خبر شہلا کی ماں کے ذہن پر بھی اثر انداز ہوئی ہے چنانچہ اب وہ زبان تک بھی نہیں ہلا سکتی۔ اس سے دلاور کو یقیناً تھوڑا سا اطمینان حاصل ہوا ہو گا کہ شہلا کی ماں اس کے دعوے کی نفی نہیں کر سکتی اور یہ نہیں کہہ سکتی کہ چوہدری دلاور کبھی بھی شہلا کے باپ کا دوست نہیں رہا تھا۔ مجبوراً اس نے یہ جھوٹ تسلیم کیا کہ شہلا کی ماں تین دن بعد راولپنڈی سے لوٹی ہے اور میرے ساتھ شہلا کی گمشدگی پر تشویش میں شریک رہا۔ وہاں پولیس والے بھی تھے لیکن وہ شہلا کی ماں سے یعنی ماسی سے

کیا پوچھتے جو بالکل بول نہیں سکتی تھی؟ اسے اندر پہنچا دیا گیا تھا جہاں وہ بڑی ہمت سے بستر پر سیدھی لیٹی رہی اور چھت کو گھورتی رہی۔ یہ واقعی قابل تعریف بات ہے کہ ان حالات میں ماسی کا نروس بریک ڈاؤن نہیں ہوا حالانکہ وہ خاصی عمر کی عورت ہے اور اتنی زیادہ چالاک بھی نہیں لگتی لیکن اس کے اعصاب واقعی مضبوط ہیں۔ پولیس والوں نے مجھ سے کچھ سوالات ضرور کیے لیکن اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کر سکے۔ میں نے اپنا نام غلط اور پتہ درست بتایا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا تھا کہ میرے والد راولپنڈی کے بہت بڑے اور مشہور ڈاکٹر ہیں۔ اس کے بعد چوہدری دلاور کو مقتول کے چچا کا رول پورا کرنا پڑا۔ اور عدنان کی تدفین کا تمام انتظام اطمینان بخش طریقہ پر ہو گیا۔ چوہدری دلاور کے گھر میں صرف دو نوکر تھے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیوی بچوں کو اس نے کہیں بھیج دیا تھا تاکہ وہ اس ڈرامے کو دیکھ کر حیران پریشان نہ ہوں۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ ڈی سلوا وہاں دکھائی نہیں دیا حالانکہ یہ اسکیم اسی نے بنائی ہو گی جو فیل ہو گئی۔ ان کا مقصد شہلا کو پکڑنا تھا۔ شہلا تو ہاتھ آئی نہیں۔ اس کے بھائی کے کفن دفن کی ذمہ داری خواہ مخواہ چوہدری دلاور کو قبول کرنی پڑی۔ اس نے ٹیلی فون پر ڈی سلوا کو گالیاں دی ہوں تو کچھ عجب نہیں۔"

"اگر اس نے بارہ بجے کے بعد فون کیا ہو گا تو لائن نہ ملنے پر اس کو مزید کوفت ہوئی ہو گی۔" میں نے کہا۔ "اور اگر ٹیلیفون آتا بھی تو میں ریسیو کرتا کیونکہ دو بجے تک میں وہاں موجود تھا لیکن میں نے اندر جانے سے پہلے لائن کاٹ دی تھی۔ پوری بات میں بعد میں بتاؤں گا، پہلے تُو بتا کہ بعد میں کیا ہوا؟"

"بعد میں کیا ہونا تھا۔" محسن بولا۔ "سب کچھ طے شدہ پروگرام کے مطابق ہوا۔ چوہدری دلاور نے پاس پڑوس کے لوگوں کو جمع کیا اور ایک گاڑی کا انتظام کیا جس میں میت کو میانی صاحب کے قبرستان لے جایا گیا۔ پیچھے صرف ایک نوکر رہ گیا تھا۔ جیسے ہی وہ نظروں سے اوجھل ہوا ماسی نے کمبل ہٹایا اور فرار ہو گئی۔ معلوم نہیں چوہدری دلاور نے اسے واپسی پر غفلت کی کیا سزا دی ہو گی۔ میں بھی قبرستان تک ساتھ تھا اور نماز جنازہ میں بھی شریک تھا مگر جب میت کو لحد میں اتارا جا رہا تھا تو مجھے بڑا اچھا موقع مل گیا۔ چند قدم کے فاصلے پر دوسری قبر کے لیے ایک اور جنازہ لایا گیا جس کے ساتھ سو ڈیڑھ سو آدمی تھے اور وہ ہمارے ساتھ مل گئے۔ میں اس بھیڑ میں گم ہو گیا اور باہر نکل آیا۔ ڈی سلوا قبرستان کے دروازے پر اپنی گاڑی میں موجود تھا۔ وہ یقیناً چوہدری دلاور کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا لیکن اس نے مجھے نہیں دیکھا۔ بعد میں دونوں کو شدت سے اپنے بیوقوفی کا احساس ہوا ہو گا۔"

اس دوران میں رابعہ چائے لے کر آگئی تھی۔ گھر پر آدھی ڈبل روٹی ملی تھی اور کچھ انڈے۔ اس نے آملیٹ بنا کر ڈبل روٹی اور چائے دروازے پر کانسٹبل کو پہنچا دی تھی، جسے یہ ڈنر دیکھ کر بہت مایوسی ہوئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ کوٹھی میں کیک یا بسکٹ، مکھن یا پھل سب کچھ ہوں گے۔ ایک کانسٹبل اگر گلبرگ کی معمولی سی کوٹھی میں موجود ہو تو رئیسانہ زندگی کا یہی تصور کر سکتا ہے۔ جتنی دیر میں چائے ختم ہوئی رابعہ نے محسن سے وہ بات پھر سنی جو میں سن چکا تھا اور محسن کو سنانی پڑی۔ اس کی روداد ختم ہونے پر میں نے اس اجنبی شخص کو باندھا، لپیٹا اور اچھی طرح پیک کر کے اسے گھسیٹتا ہوا باہر لے گیا۔ سنتری دروازے کے پاس بیٹھا آدھی ڈبل روٹی کو آملیٹ کے ساتھ نگلنے میں مصروف تھا۔ میں نے رابعہ کی گاڑی کا دروازہ کھولا اور جنگی بکس کو آگے اور پیچھے کی سیٹوں کے درمیان فرش پر ڈال دیا۔ پھر میں گیٹ کی طرف گیا۔

"کیوں بھئی! کھانا کھا لیا پیٹ بھر کے؟" میں نے بڑی خوش دلی سے پوچھا۔

"کھانا کدھر تھا صاحب جی! ناشتہ تھا۔" وہ ناراضی سے بولا۔

"چلو گزارا تو ہو گیا۔" میں نے ٹرے اٹھاتے ہوئے کہا۔ "ویسے بڑے افسوس کی بات ہے کہ پولیس والوں کو انسان نہیں سمجھا جاتا۔ ڈیوٹی پر کھڑا کر دیتے ہیں اور کھانے پینے کو نہیں پوچھتے۔" میرے شریفانہ لہجے اور ہمدردانہ رویے سے وہ متاثر ہوا اور اس کا ذہن شک کا شکار نہیں ہوا ورنہ وہ پوچھ سکتا تھا کہ جناب آپ کون ہیں اور کب تشریف لائے؟ میں گھر کے اندر سے آیا تھا تو ظاہر ہے گھر کا ہی آدمی تھا۔ بصورت دیگر الزام اسی پر آتا تھا کہ اس کی غفلت کے باعث کوئی تیسرا شخص اندر کیسے پہنچ گیا۔ اس نے فرض کر لیا ہوگا جب گاڑی اندر گئی تھی تو اس میں دو مرد تھے اور دو عورتیں تھیں۔ یا اس نے کچھ سوچنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی ہو گی۔

دس منٹ بعد ہم نے گاڑی کو بیک کیا جسے رابعہ چلا رہی تھی اور گاڑی گیٹ کی طرف بڑھی۔ سنتری اپنی جگہ کھڑا رہا اور دروازہ کھولنے کے بجائے گاڑی کی طرف آیا۔

"صاحب کا آرڈر ہے کہ کوئی بھی آئے اسے روک لو۔" وہ بولا۔

"ہاں۔ ہمارے جانے کے بعد کوئی بھی آئے تو اسے یہیں روک لو۔" رابعہ نے کہا۔ "ہم سب دروازوں کو لاک کر کے جا رہے ہیں۔ کوئی زبردستی گھسنا چاہے تو اسے گولی مار دو۔ ریوالور ہے؟"

سنتری نے اِدھر اُدھر دیکھا اور جواب دینے سے گریز کیا کیونکہ اس کے پاس ریوالور کی جگہ وہی دقیانوسی بھاری بھرکم رائفل تھی جس کے بارے میں یقین سے کہنا مشکل تھا کہ ضرورت پڑنے پر فائر کرے گی یا نہیں اور کرے گی تو گولی آگے سے نکلے گی یا پیچھے سے۔ مزید یہ کہ وہ آنے جانے کے چکر میں پڑ گیا تھا۔ آرڈر تھا آنے والوں کے لیے لیکن ہم تو جا رہے تھے چنانچہ اس نے دروازہ کھول دینا بہتر سمجھا۔ گھر والوں کو صاحب دیکھ چکا تھا اور اس نے جاتے وقت یہ نہیں کہا تھا کہ ان کو بھی گھر میں قید رکھنا۔ پھر اس کی کیا ذمے داری؟

گاڑی ابھی باہر نکلی ہی تھی کہ میں نے رابعہ کو رک جانے کے لیے کہا۔ پھر میں نیچے اتر کر درخت تک گیا اور اس کے نیچے رکھا ہوا بریف کیس اٹھا لایا۔

شہلا کی ماں بدستور سو رہی تھی۔ ضرورت کے تحت شہلا نے اسے خواب آور گولیاں دے دی تھیں ورنہ وہ اس کارروائی میں دخل اندازی کرتی۔ عدنان کے بارے میں سوالات کرتی یا وہ گفتگو سن لیتی جو رابعہ، محسن اور پولیس انسپکٹر کے درمیان ہوئی تھی۔ شاید خود انسپکٹر اسے ہوش میں دیکھتا تو اس سے کچھ پوچھتا اور ہمارا جھوٹ کھل جاتا جو ہم نے عدنان کے بارے میں بولا تھا۔ اس کی حالت ایسی نہیں تھی کہ اتنے بڑے جھوٹ کے بعد وہ اتنے بڑے سچ کا صدمہ برداشت کر سکتی۔ محسن نے انسپکٹر سے بھی وہی کہا تھا جو چوہدری دلاور نے کہا تھا۔ شہلا کی ماں سوتے میں اپنے گھر میں جا پہنچی تھی اگر اس کی نیند ٹوٹی ہو گی تو اس نے سمجھا ہو گا کہ میں خواب دیکھ رہی ہوں اور پھر سو گئی ہو گی۔ ہم نے طے کیا کہ اسے واپس شہلا کے پاس پہنچا دیا جائے اور وہاں سے ہم رابعہ کے آفس جائیں یہ بڑا لمبا راستہ تھا چنانچہ ڈرائیونگ میں نے سنبھال لی۔ رابعہ کی شکستہ حال فاکس ویگن کی کارکردگی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اس کے انجن کو پانی کی ضرورت بھی نہ پڑتی تھی اور فیول میٹر کی سوئی بتا رہی تھی کہ پٹرول ٹینک اب بھی آدھے سے زیادہ بھرا ہوا ہے۔ ہم نے شہلا سے کہا کہ لمبی بات کرنے کا وقت نہیں ہے۔ ہم واپسی میں سب کچھ بتا سکیں گے۔ فی الحال وہ مطمئن رہے کہ سب خیریت ہے اور کسی بات کی فکر نہ کرے۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم رابعہ کے آفس پہنچے۔ رابعہ اوپر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد محسن کار سے اتر کے بلڈنگ کے دروازے تک پہنچا اور اس نے چوکیدار سے رابعہ کے آفس کا پتہ پوچھا۔ چوکیدار اسے اپنے ہمراہ لے گیا۔ موقع پاتے ہی میں نے چادر میں لپٹے ہوئے اس شخص کو کندھے پر ڈالا اور خود بھی اندر داخل ہو گیا۔ حسب توقع عمارت کی زیریں منزل اس وقت ویران تھی۔ میں زینے کے نیچے کی خالی جگہ میں چھپ کر کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد چوکیدار نیچے اترا اور دروازے کی طرف چل پڑا۔ میں زینے کے نیچے سے نکلا اور کوئی آہٹ کیے بغیر اوپر چڑھ گیا۔ دو سو پونڈ کے آدمی کو اٹھا کر اتنی احتیاط کے ساتھ چلنا آسان کام نہیں تھا پھر مجھے یہ ڈر بھی تھا کہ اوپر سے کوئی نہ آ جائے۔ رابعہ کا آفس گراؤنڈ فلور کے اوپر تھا اور مجھے اس فلور پر دو جگہ روشنی نظر آئی تھی۔ سب سے اوپر والی منزل پر بھی کچھ لوگ دفتر کھولے بیٹھے تھے یا رہائش پذیر تھے۔ پانچ منٹ کے اس وقفے میں میری ملاقات کسی سے نہیں ہوئی تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور رابعہ کے آفس میں پہنچتے ہی دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ آفس کے دو حصے تھے۔ باہر کے حصے میں مؤکلوں کے لیے ویٹنگ روم بنایا گیا تھا۔ یہ حصہ کچھ چھوٹا تھا اس میں قالین پر دو صوفہ سیٹ تھے اور ایک سینٹر ٹیبل پر اخبار اور رسالے پڑے ہوئے تھے۔ اندر والے حصے کو پھر دو حصوں میں اس طرح تقسیم کیا گیا تھا کہ رابعہ کا آفس ویٹنگ روم کے برابر لکڑی اور شیشے کی پارٹیشن سے بنا ہوا کمرہ تھا۔ پارٹیشن کے دوسری جانب والا حصہ ہال ٹائپ تھا جس میں تین وکیلوں کے کیبن ایک طرف تھے اور درمیان میں کلریکل عملے کی میزیں تھیں۔ ٹائپ رائٹر، فائل کیبنٹ اور الماریاں تھیں جو چاروں طرف دیوار کے ساتھ ساتھ بنائی گئی تھیں۔ الماریوں کے شفاف کھسکنے والے شیشوں کے پیچھے قانونی ضابطوں، حوالوں اور پی، ایل، ڈی جیسی ضخیم کتابوں کی قطاریں نظر آتی تھیں۔ میں نے اپنے بوجھ کو رابعہ کے آفس میں پہنچ کر ہلکا کیا اور اسے صوفے پر ڈال کے ایک گہری سانس لی۔

"مس رابعہ قاری ایڈووکیٹ!" میں نے کہا۔ "ویسے تو آپ بھی ہر غیر قانونی کارروائی میں ہمارے ساتھ شامل رہتی ہیں لیکن ایک تو آپ جانتی ہیں کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں اپنے دفاع کے لیے کر رہے ہیں اور ضابطوں کی کارروائی سے

بچنے کے لیے کر رہے ہیں۔ ہمارا مقصد قانون شکنی نہیں ہے تاہم جو کچھ ہم نے کیا اسے غیر قانونی ہی کہا جائے گا۔"

"اس تمہید کی اس وقت کیا ضرورت پڑ گئی؟" رابعہ نے کہا۔ "صاف بات کیوں نہیں کرتے؟"

"صاف بات یہ ہے بی بی کہ ہمیں اس شخص سے کچھ پوچھنا ہے۔" میں نے کہا۔ "زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ گھی سیدھی انگلیوں سے نہیں نکلے گا اور ہمیں وہ طریقہ اختیار کرنا پڑے گا جسے تھرڈ ڈگری کہا جاتا ہے۔ تم اپنی مرضی سے موجود رہنا چاہو تو تمہاری مرضی ورنہ تمہیں وہ مناظر دیکھنے پڑیں گے جنہیں دیکھ کر عام طور پر خواتین بے ہوش ہونا پسند کرتی ہیں۔"

رابعہ کا رنگ اڑ گیا۔ "کیا یہ ضروری ہے؟ ممکن ہے یہ شخص ویسے ہی کچھ بتا دے۔"

"حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرو۔" میں نے کہا۔ "یہ شخص محض آلۂ کار ہے۔ اگر اس کے بارے میں یہ معلوم ہو جائے کہ یہ اپنے مشن میں ناکام رہا ہے اور ہمارے ہاتھوں گرفتار ہو گیا تب بھی اس کی جان بخشی مشکل ہے۔ اس کی حیثیت ہی کیا کہ یہ خود اپنی زبان سے اعترافِ جرم کرے اور ان کے بارے میں کچھ بتائے جنہوں نے اس کو بھیجا ہے۔ یہ خود بھی جانتا ہے کہ افشائے راز کی قیمت اسے اپنی جان دے کر ادا کرنی پڑے گی۔ ہم اسے پولیس کے حوالے بھی نہیں کر سکتے تھے کیونکہ اس صورت میں ہم نے شہلا اور اس کی ماں کی زندگی بچانے کے لیے جو کوشش کی تھی وہ رائیگاں جاتی اور ہمارے لیے اپنی پوزیشن کی وضاحت مشکل ہو جاتی۔ تم جانتی ہو کہ قانون کے محافظ تمہاری حفاظت کرنے میں کس طرح ناکام رہے تھے۔ ہمارے مقابل وہ لوگ ہیں جو قانون اور پولیس کو کچھ نہیں سمجھتے۔ اگر ہم نے قانون سے مدد لی تو شہلا یا اس کی ماں کی زندگی کی ضمانت کوئی نہیں دے سکے گا۔ اگر کچھ کر سکتے ہیں تو ہم خود۔ تمہاری پوزیشن بہت عجیب ہے کیونکہ تم وکیل بھی ہو اور عورت بھی۔ ایک طرف تمہارے پیشے کے تقاضے ہیں تو دوسری طرف زندگی کے رشتے ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ تمہارے ضمیر پر کوئی بوجھ ہو یا تمہاری ذہنی کشمکش تمہارے لیے عذاب بن جائے۔"

"اب تو جو ہونا تھا ہو چکا۔" رابعہ بولی۔ "اب میں تمہارے ساتھ ہوں اور میرے ذہن میں کوئی کشمکش نہیں۔ شاید اس لیے کہ مجھے تمہاری نیت پر اعتماد ہے۔ عملی زندگی میں قانون کی بے بسی کا تماشہ میں نے تم سے زیادہ دیکھا ہے اور خود بھی تماشہ بن چکی ہوں۔ تم خود بھی تسلیم کرتے ہو کہ میں ایک عورت ہوں۔ کیا مجھے ایک عام عورت کی طرح دشمنوں سے انتقام لینے کا حق بھی حاصل نہیں ہے؟ عقل دلائل سے میں جذبات پر قابو نہیں رکھ سکتی۔ اگر کبھی وہ لوگ میرے سامنے آ جائیں جنہوں نے میرا گھر تباہ کیا میں انہیں اپنے ہاتھ سے شوٹ کر دوں۔ میرے لیے نا ممکن ہوگا کہ میں انصاف حاصل کرنے کے لیے انہیں عدالت لے جاؤں اور پھر بے بسی سے دیکھتی رہوں کہ ثبوت شہادت نہ ہونے کے باعث وہ ہر سزا سے بچ گئے۔ میں تمہیں کس طرح روکوں جبکہ میں جانتی ہوں کہ تمہارے جذبات کی شدت اور حدت کہیں زیادہ ہے اور تم مجھ سے زیادہ مظلوم ہو۔"

میں نے اور محسن نے بیک وقت ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر اس شخص کی طرف جو ہوش میں آنے لگا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھوں اور پیروں کو آزاد کر دیا لیکن اس کے منہ میں ٹھونسا ہوا کپڑا انہیں نکالا۔ آہستہ آہستہ اس نے اپنی آنکھیں کھولیں اور اس کی نظروں نے ماحول کا جائزہ لیا۔ میں بالکل اس کے سر پہ سوار کھڑا تھا کہ وہ ذرا بھی جارحانہ حرکت کرے تو اس کو روک دوں لیکن وہ بہت سہما ہوا اور خوف زدہ تھا۔

"اگر تم مقابلہ کرنا چاہتے ہو تو بتاؤ۔" میں نے ہاتھ ہلا کے کہا۔ "ایک تجربہ تو تمہیں ہو چکا ہے۔"

اس شخص نے نفی میں سر ہلایا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے اپنے منہ کا کپڑا نکالنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ اس کی آنکھیں سوال کر رہی تھیں کہ ہم اس کے ساتھ اب کیا سلوک کریں گے۔

"اگر تم خاموش رہنے کا وعدہ کرو تو تمہیں اجازت دی جا سکتی ہے کہ یہ کپڑا منہ سے نکال لو۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس بات کا خیال رکھنا کہ تم نے غلط حرکت کی تو میں غلطی کروں گا۔ میرا ہاتھ کبھی غلط حرکت نہیں کرتا اور تمہارے حلق سے ذرا بھی آواز بھی نکلی تو وہ تمہاری آخری آواز ہوگی۔"

اس نے اقرار میں سر ہلایا اور آہستہ آہستہ اپنے منہ سے کپڑے کو یوں ــــ نکالنے لگا جیسے اسٹیج شو میں جادوگر نکالتے ہیں۔ پھر اس نے اطمینان سے ایک گہرا سانس لیا۔

"تم لوگ کون ہو؟" وہ بولا۔ "پولیس کے آدمی ہو؟"

میں نے اور محسن نے صرف ایک لمحے کے لیے نگاہوں ہی نظروں میں تبادلۂ خیالات کیا۔ کیا یہ مکاری ہے؟

اتنا ڈرا ہوا کیوں ہے اور کیا واقعی ہمیں نہیں پہچانتا؟ اس کو پولیس کا ڈر کیوں ہے؟

"ہم اپنے بارے میں بعد میں بتائیں گے۔" محسن نے کہا۔ "تم بتاؤ کہ اس گھر میں تمہیں کس نے بھیجا تھا؟"

"مجھے... مجھے... کسی نے... کسی نے بھی نہیں۔" اس نے بمشکل تمام تھوک نگل کر حلق تر کیا۔ "میں خود گیا تھا۔"

"کیوں؟" میں نے کہا۔ "چوری کرنے یا ڈاکا ڈالنے؟ کون ہو آخر تم؟"

"میں... میں ٹیڈی ہوں ــ یہ میرا نام نہیں ہے مگر میرا نام کوئی نہیں لیتا۔ استاد ٹیڈی کہتے ہیں سب۔" وہ بولا۔

"ہم نے بہت سے استاد دیکھے ہیں اور استادوں کے استاد دیکھے ہیں۔" میں نے کہا۔ "تم کس قسم کے استاد ہو؟"

"وہ... وہ اپنا یار تھا... جوڈی...۔" وہ بولا۔ "میں اس کی بہن سے ملنے گیا تھا۔"

"جوڈی کون؟" میں نے کہا۔ "وہاں کسی جوڈی کی بہن نہیں رہتی۔ جھوٹ بولو گے تو...۔"

"قسم مولا کی۔" وہ بے اختیار پیچھے ہٹا۔ "ہم اسے جوڈی کہتے تھے۔ ہم لوگ ایسے ہی نام دیتے ہیں سب کو۔ اس کا نام عدنان تھا۔ جب وہ آیا تھا تو خود کو مسٹر زیدی کہتا تھا۔ لوگ بہت ہنستے کہ مسٹر زیدی کیا ہوا بھلا۔ جوڈی چلے گا۔ میرا نام بھی علم دین تھا۔ پہلے ٹیڈی ہوا۔ اب استاد ٹیڈی ہوں۔ جوڈی بھی دو چار سال میں استاد جوڈی ہو جاتا۔"

ان ناموں کے ساتھ ہی میرے ذہن میں استاد پیڈرو کا خیال آیا تھا۔ یہ اس دنیا کے باسی تھے جہاں اصل نام سے زیادہ ان کی عرفیت مشہور ہو جاتی ہے اور وہ اسی پر فخر کرتے ہیں۔ میں، رابعہ اور محسن اس کی باتوں پر یقین کے لیے مجبور ہو گئے تھے۔ اس کا جذباتی لہجہ اس کی صداقت کا گواہ تھا۔ اسے اپنے یار کی موت کا صدمہ تھا۔

"تم عدنان کے دوست تھے؟" میں نے کہا۔ "اسکی بہن کے پاس تعزیت کے لیے گئے تھے؟"

"اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "جوڈی نے مجھے بتایا تھا کہ اس کی ماں اپاہج ہے اور بہن نوکری کرتی ہے۔ میں ایک دن پہلے بھی گیا تھا لیکن وہاں کوئی واردات ہوئی تھی۔ ادھر اُدھر رہنے والوں نے مجھے بتایا کہ بدمعاشوں نے حملہ کیا تھا اور اس کی بہن کو اغوا کر کے لے گئے ہیں۔ میں نے ان کی تصویریں اخبار میں دیکھی تھیں۔ قسم مولا کی۔ وہ یوں نہ مرتے تو اب تک استاد ٹیڈی کے ہاتھوں مارے جا چکے ہوتے۔

میں دوبارہ گیا تھا اور دروازے پر موٹر سائیکل کھڑی دیکھی تو اندر چلا گیا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ کیا ان کا کوئی اور ساتھی گھر میں گھسا ہے۔ روشنی دیکھ کر مجھے یہ خیال بھی آیا تھا کہ جوڈی کی بہن واپس نہ آ گئی ہو۔"

"یہ شک تمہیں کیوں ہوا تھا کہ عدنان کی بہن واپس آ گئی ہوگی۔ اغوا کرنے والے تو کسی پر رحم نہیں کھاتے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ تو ہے۔ مگر... مگر میں نے سوچا ممکن ہے وہ گھر سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئی ہو۔" وہ بولا۔ "حملہ کرنے والے تینوں ایسے لوگ نہیں تھے۔ میرا مطلب ہے اغوا قسم کی واردات میں انہوں نے کبھی حصہ نہیں لیا تھا۔ اکیلی عورتوں کو اٹھا کر لے جانے کو بدمعاشی کون کہتا ہے۔ وہ بدمعاش تو تھے مگر بے غیرت نہیں تھے اور بزدل بھی نہیں تھے۔ میں جانتا ہوں۔"

"گویا بدمعاش بھی غیرت مند ہوتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "کیا وہ کسی گروہ کے آدمی تھے؟"

"کسی خاص گروہ کے نہیں تھے۔ کبھی ایک کے ساتھ ہو جاتے تھے، کبھی دوسرے کے ساتھ۔ دو تو سگے بھائی تھے۔" وہ بولا۔

"اچھا آج کل وہ کس کے ساتھ تھے؟" میں نے پوچھا۔ محسن اور رابعہ بیٹھ چکے تھے مگر میں اب بھی کھڑا تھا۔

"آج کل؟ میں نے کچھ سنا نہیں۔" وہ سوچ کر بولا۔ "لیکن میں معلوم کر لیتا۔"

"تم نے استاد پیڈرو کا نام سنا ہوگا؟" میں نے کہا اور اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ صورتِ حال یکلخت بدل گئی تھی۔ وہ دشمن کے کیمپ کا نہیں ہمارا طرفدار ثابت ہوا تھا۔

"استاد پیڈرو کا نام تو سارا جہان جانتا ہے۔ قسم مولا علی کی، کیا بدمعاش تھا۔"

"تھا کا کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔ "کیا بدمعاشی چھوڑ دی ہے اس نے؟" محسن بولا۔

"نہیں۔ وہ مارا گیا تھا۔" ٹیڈی نے ہماری کم علمی پر افسوس سے ہمیں دیکھا۔ "پولیس سے مقابلے میں۔"

"کہاں؟" میں نے پوچھا۔ "کب کی بات ہے؟"

"سال بھر سے اوپر کی۔" وہ بولا۔ "ادھر قصور سے آگے بارڈر کراس کر رہا تھا کہ دونوں طرف سے فائرنگ ہوئی۔ معلوم نہیں کس کی گولی لگی تھی۔ اس کا ایک ساتھی پکڑا گیا تھا مگر اس نے حوالات میں خودکشی کر لی۔ دوسرا نکل گیا تھا۔"

"تم ان سب کو پہچان سکتے ہو؟" میں نے کچھ دیر بعد

کہا۔ ”میرا مطلب ہے اگر تمہیں استاد پیڈرو کی تصویر دکھائی جائے یا اس ساتھی کی جو فرار ہو گیا تھا۔ کیا نام تھے ان کے۔ حلیہ ہے کچھ ذہن میں؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”سرغنہ تو پیڈرو ہی تھا۔ باقی دو گمنام لوگ تھے۔ ابھی مشہور نہیں ہوئے تھے۔ لیکن میں استاد پیڈرو کو پہچان سکتا ہوں۔ اس کا حلیہ بھی بتا سکتا ہوں۔“ پھر اس نے یادداشت کی مدد سے جو حلیہ بتایا اسے ہم نے بہت غور سے سنا۔ یہ استاد پیڈرو کا حلیہ نہیں تھا مگر ہو سکتا تھا۔ اگر وہ استاد پیڈرو جس کے بارے میں مشہور کر دیا گیا تھا کہ وہ پولیس سے مقابلے میں مارا گیا اپنی مونچھیں صاف کر دے، بال چھوٹے کرالے اور ان کا رنگ بدل لے، کانوں میں مندریاں پہن لے تو جسامت، قدوقامت اور وزن کے مطابق وہی استاد پیڈرو بن سکتا تھا جس کا ہم سے واسطہ پڑ رہا تھا۔ ہم سب کے خیالات کی سمت ایک ہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ پولیس کے مقابلے تو فرضی بھی ہوتے ہیں۔ اگر اس صورتِ حال کو مختلف زاویے سے دیکھا جائے، مثلاً کیا یہ ممکن نہیں کہ استاد پیڈرو زیرِ زمین روپوش ہو گیا۔ پھر اس نے کسی وجہ سے سامنے آنا مناسب نہیں سمجھا لیکن در پردہ کام کرتا رہا۔ مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک بدمعاش کے بارے میں بدمعاشوں کو بھی خبر نہ ہو۔ اس کا وہ ساتھی جو بچ نکلا تھا کیا وہ چوہدری دلاور ہو سکتا ہے؟

”اچھا استاد ٹیڈی! ہم تمہیں بعد میں دو چار چہرے دکھائیں گے۔“ محسن نے کہا۔ ”ابھی تو تم یہ بتاؤ کہ عدنان کیسے مارا گیا تھا؟“

”جوا کھیل رہا تھا۔ کسی کو شک ہو گیا کہ وہ پتّے بازی کر رہا ہے۔“ ٹیڈی بولا۔

”کسی کو؟ تمہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ مارنے والا کون تھا؟“ میں نے کہا۔ ”تم خود کو استاد کہتے ہو اور عدنان کا دوست بھی؟“

”مجھے سب معلوم ہے۔“ وہ طنز کے اس دُہرے وار پر مشتعل ہو کے بولا۔ ”مگر وہ بدمعاش چھپا ہوا ہے۔ قسم مولا علی کی، وہ پولیس سے بچ سکتا ہے۔ استاد ٹیڈی کے خنجر سے نہیں بچ سکتا۔“

”گویا تمہیں قاتل کے بارے میں تو معلوم ہو چکا ہے مگر تم کسی کو بتانا نہیں چاہتے۔ پولیس کو بھی نہیں؟“ رابعہ بولی۔

”پولیس کیا کرے گی۔ اپنے یار کا بدلہ ہم خود لیں گے۔ انصاف ہم خود کریں گے جی۔“ وہ بولا۔ ”آپ دیکھ لینا۔“

”تم یہ بات ہمارے سامنے کر رہے ہو۔ اگر ہم تمہیں گرفتار کرلیں؟ فرض کرو ہم پولیس والے ہوتے؟“ میں نے کہا۔

”آپ لوگ پولیس والے نہیں ہیں۔“ وہ بولا۔ ”پولیس والے ہم سے اس طرح بات نہیں کرتے اور میں نے کیا جرم کیا ہے کہ آپ لوگ مجھے پولیس کے حوالے کریں گے۔ قسم مولا علی کی، وہ میری زبان سے اس کا نام نہیں اگلوا سکتے جس سے ہمیں یار کے خون کا بدلہ لینا ہے۔ وہ خود پتّے باز ہے سالا۔ بیچارے عدنان نے کبھی پتّے بازی نہیں کی تھی۔ یہ سب جانتے ہیں۔“

”تم عدنان کی بہن کو پہچانتے ہو؟“ میں نے کہا اور رابعہ کی طرف دیکھا۔

ٹیڈی دھوکا کھا گیا۔ ”آپ؟ آپ اس کی باجی ہیں؟“ وہ حیرت سے منہ کھول کے بولا۔ اس کے لہجے میں بڑا احترام تھا۔

رابعہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں بھئی! میں تو ایک وکیل ہوں۔“

ٹیڈی کا چہرہ بجھ گیا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ ”اس گھر میں... آپ ڈی سلوا صاحب ہیں؟“ اسے کچھ یاد آیا۔

”اچھا! تو تمہیں یہ بھی معلوم ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں ڈی سلوا نہیں ہوں۔ مگر تمہیں یہ نام کس نے بتایا ہے؟“

”خود... جوڈی نے کہا تھا... کہ اس کی بہن کی شادی ہونے والی ہے... اور یہ ڈی سلوا صاحب بہت بڑا آدمی ہے اور بہت اچھا آدمی ہے۔ اس نے کہا کہ وہ مسلمان ہو جائے گا۔ میں نے اسے کبھی دیکھا نہیں ہے۔“

”اچھا استاد ٹیڈی! اب تم نے ہمیں مطمئن کر دیا ہے۔“ میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”تمہیں بھی ہم سے کوئی خطرہ نہیں ہونا چاہیے۔ ہم تمہارے خلاف کچھ کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ ہمارا خیال ہے کہ تم ہمارے کام آ سکتے ہو۔“

”آپ لوگوں نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔“ وہ مشتبہ لہجے میں بولا۔ ”ان کے سوا۔“ اس نے رابعہ کی طرف دیکھا۔

”ہم اپنے بارے میں تفصیل سے تو پھر کبھی بتائیں گے۔“ میں نے کہا۔ ”ابھی صرف یہ سمجھ لو کہ میرا نام سکندر بخت ہے۔ یہ میرا دوست ہے۔ اس کا نام ہے محسن اور یہ رابعہ قاری وکیل ہیں بہت بڑی اور یہ انہی کا دفتر ہے۔ یہ شہلا زیدی کی سہیلی ہیں۔ میں ان کے ساتھ وہاں گیا تھا اور میں بھی سمجھا تھا کہ تم انہی بدمعاشوں کے ساتھی ہو۔ اس غلط فہمی کی وجہ سے تمہارے ساتھ تھوڑی سی زیادتی ہو گئی۔ مگر ہم اس کی تلافی کر دیتے ہیں۔ ہم تمہیں ایک اچھی خبر سنا سکتے ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ بات تمہارے سوا کسی کو معلوم نہیں ہونی چاہیے۔ تمہارے دوست کی بہن اغوا نہیں ہوئی ہے۔ اسے چھپا رکھا ہے۔ ہمیں بروقت معلوم ہو گیا تھا کہ کچھ بدمعاش اس کے گھر پر حملہ کرنے والے ہیں۔ ہم اسے اور اس کی ماں کو نکال کر لے گئے تھے۔“

”کون بدمعاش ہیں وہ؟ قسم مولا علی کی، نام بتا دیں مجھے۔ ایک ایک کو ٹھکانے نہ لگا دیا تو نام بدل دوں گا۔“ وہ ڈینگ مارتا ہوا بولا۔ درحقیقت وہ اتنا بڑا بدمعاش نہیں تھا جتنا بڑا خود کو ظاہر کرتا تھا لیکن وہ ہمارے لیے بہترین مخبر بن سکتا تھا اور ہمارا ایجنٹ بن کے دشمن کی صفوں میں شامل ہو سکتا تھا۔ اس کی ساری بدمعاشی تو میں نے ایک وار میں ختم کر دی تھی اور یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ خود کو نہتا پا کے وہ کتنا ڈر گیا تھا۔ پہلے وہ ہمیں پولیس کا آدمی سمجھ کے خوفزدہ ہو گیا تھا اور اب کہہ رہا تھا کہ پولیس کیا چیز ہے۔ اس میں اتنی جرأت بھی نہ رہی تھی کہ اپنی مرضی سے ہاتھ ہلا کے وہ رومال ہی نکال لیتا جو ہم نے اس کے منہ میں ٹھونس رکھا تھا اور اس نے دھمکی سے ڈر کے فوراً وعدہ بھی کر لیا تھا کہ وہ کوئی غلط حرکت نہیں کرے گا مگر جب اس نے محسوس کیا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں تو اب بڑھ چڑھ کے بولنے لگا تھا۔ تاہم وہ اپنے دوست کی موت کے معاملے میں سخت جذباتی ہو رہا تھا۔ قاتل بھی کوئی چھوٹا موٹا بدمعاش ہی تھا کہ روپوش ہو گیا تھا۔ شاید استاد ٹیڈی اس کو واقعی مار دیتا۔ لیکن ڈی سلوا اور چوہدری دلاور جیسے لوگوں سے مقابلہ اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس نے اعتراف کر ہی لیا تھا کہ پیڈرو بہت بڑا بدمعاش تھا۔ وہ خود لمبے چوڑے جسم سے تو واقعی بڑا بدمعاش نظر آتا تھا مگر میں نے اس کی اصلیت جان لی تھی۔ اسے بڑ مارنے کی زیادہ عادت تھی۔

”ان کا نام ہمیں بھی معلوم نہیں۔“ میں نے کافی دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ ”لیکن ہم معلوم کرنا چاہتے ہیں اور تم اس کام میں یقیناً ہماری مدد کر سکتے ہو تاکہ تمہارے یار کی بڑی بہن اور ماں کی جان کو خطرہ لاحق نہ رہے۔ جب تک یہ خطرہ موجود ہے ہم کسی کو یہ بھی نہیں بتا سکتے کہ وہ کہاں ہیں۔ لیکن ہم تمہیں لے چلیں گے۔“

”آپ کی بڑی مہربانی ہو گی جناب!“ وہ بولا۔

”استاد ٹیڈی!“ محسن نے کہا۔ ”کیا تم اپنے دوست کے جنازے میں شریک ہوئے تھے؟“

ٹیڈی نے سر ہلایا۔ ”میں نے آپ کو وہاں دیکھا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ آپ کی صورت جانی پہچانی لگتی ہے۔“

”میں نے غور نہیں کیا تھا۔“ محسن بولا۔ ”وہاں سب اجنبی لوگ تھے۔“

”میں کوٹھی کے اندر نہیں گیا تھا۔“ وہ بولا۔ ”باہر انتظار کرتا رہا تھا۔ جب میت گاڑی روانہ ہونے لگی تھی تو پیچھے سے پیچھے بیٹھ گیا تھا لیکن میں نے قبرستان میں اپنے یار کی صورت آخری بار دیکھ لی تھی۔ اس کے بعد پھر غائب ہو گیا تھا۔“

”کیوں؟ کس کا ڈر تھا تمہیں؟“ محسن نے پوچھا۔

”ڈر... ڈر تو کسی کا نہیں تھا... مگر وہاں پولیس تھی۔ وہ مجھے خواہ مخواہ پکڑ لیتے کہ مشکوک حالت میں وہاں پھر رہا تھا۔ ان کا یہی طریقہ ہے جو ہاتھ آ جائے اسے پکڑ کر لے جاؤ۔ اصل مجرم تو بھاگ گئے۔ انہوں نے دس بیس چھوٹے موٹے جواری پکڑ لیے ہوں گے اور ان سے زبردستی معلوم کریں گے کہ قاتل کون تھا۔ اب یا تو کوئی بتا دے گا ورنہ وہ دو دن انہیں حوالات میں رکھ کے چھوڑ دیں گے۔“ ٹیڈی نے کہا۔ ”معلوم تو مجھے بھی ہے مگر یہ کون بتا سکتا ہے کہ وہ کہاں چھپا ہوا ہے۔“

”تمہیں معلوم ہے وہ کوٹھی کس کی تھی جہاں سے عدنان کا جنازہ اٹھایا گیا؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں جی۔ اس کے چچا کا گھر تھا۔ چوہدری دلاور حسین کا۔“ وہ بولا۔ اس نے چوہدری دلاور کا نام بڑی عزت سے لیا تھا جس کا مطلب [illegible] انڈر گراؤنڈ ورلڈ میں یہ نام بہت بڑا سمجھا [illegible]

[illegible] ان کو جانتے تھے؟ میرا مطلب ہے پہلے کبھی یہ نام سنا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”سیٹھ دلاور کا نام تو سنا تھا، چوہدری دلاور حسین کا نہیں۔“

”اور اس سیٹھ دلاور کو تم نے کبھی دیکھا نہیں تھا؟“ میں نے کہا۔

”اسے تو کسی نے بھی نہیں دیکھا۔ سیٹھ دلاور کا صرف نام چلتا ہے۔“ وہ بولا۔

میرے شبہات کی تصدیق ہوتی جا رہی تھی۔ چوہدری دلاور جیسے لوگوں کی کبھی ایک شخصیت نہیں ہوتی۔ ہر شخصیت کا چہرہ جُدا ہوتا ہے۔ جہاں وہ رہتا تھا وہاں اس کی حیثیت ایک شریف اور معزز آدمی کی تھی۔ چوہدری دلاور حسین لیکن یہی شخص دوسرے حلقے میں سیٹھ دلاور ہو سکتا تھا۔ ہو سکتا ہے کسی زمانے میں وہ صرف دلاور ہو۔ پھر استاد دلاور بن گیا ہو اور اب برسوں بعد وہ سیٹھ دلاور تھا۔ مایا تیرے تین نام۔ اس کے سیٹھ بن جانے کے اسباب بھی مجھے معلوم تھے۔ اب وہ سامنے نہیں آتا تھا مگر بقول استاد ٹیڈی، اس کے نام کا سکہ چلتا تھا۔ میں ایسے بہت سے سیٹھوں کو جانتا تھا جن کے نام روایت بن گئے تھے اور پبلک کے سامنے وہ اتنے بڑے بدمعاش تھے کہ ان کا یارانہ اعلیٰ پولیس افسروں سے اور سرکاری حکام سے تھا اور

ان کو بدمعاشی کی مملکت میں بے تاج بادشاہ کی حیثیت حاصل تھی مگر ان کی سماجی حیثیت اتنی بلند تھی کہ کوئی ان پر انگلی نہیں اٹھا سکتا تھا۔

"میرا خیال ہے اب یہاں ٹھہرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔" میں نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ "استاد ٹیڈی نے تو خود ہی سب کچھ بتا دیا ہے اور بہت سی کام کی باتیں بتا دی ہیں جو ہمارے لیے کارآمد ثابت ہو سکتی ہیں۔"

محسن نے تائید میں سر ہلایا۔ "استاد! ہم سے رابطہ قائم کرنے کا ایک پتہ تو یہی ہے۔"

رابعہ نے ہینڈ بیگ میں سے اپنا کارڈ نکالا اور آگے بڑھا دیا۔ "اس پر آفس کا فون نمبر بھی ہے اور گھر کا بھی۔ مگر گھر کا فون کٹ گیا ہے۔ یہاں تم شام کے وقت میرے نام پیغام دے سکتے ہو۔ . . اور ان کے نام بھی۔" اس نے ہماری طرف اشارہ کیا۔

"لیکن تم سے رابطہ قائم کرنا ہو تو کیسے کیا جائے؟" میں نے سوال کیا۔

"میرا کوئی ٹھکانہ نہیں جی۔" وہ کارڈ کو جیب میں رکھ کے بولا۔ "بس میں خود ہی آجاؤں گا۔"

"تم دیکھ سکتے ہو کہ تمہاری سب چیزیں جیب میں موجود ہیں۔" میں نے کہا۔ "سوائے ایک چیز کے۔" میں نے جیب میں سے کمانی دار خنجر نکالا اور اس کی طرف بڑھا دیا۔

"اب تم جانا چاہو تو جا سکتے ہو۔ یہاں سے انارکلی زیادہ دور نہیں ہے۔"

ٹیڈی کے چلے جانے کے بعد بھی ہم کچھ دیر بیٹھے رہے اور ان خیالات کا اظہار کرتے رہے جو ہمارے ذہن میں تھے، مگر ٹیڈی کے سامنے یہ باتیں کرنا مناسب نہ تھا۔ ہم سب اس مسئلے پر ایک ہی نقطۂ نظر رکھتے تھے۔ ٹیڈی سے سب کے سامنے ملنا ہمیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا تھا۔ سب سے بہتر صورت یہی تھی کہ وہ ہمارا جاسوس بن کے کام کرے اور جو معلومات ہم خود حاصل نہ کر سکیں، وہ ٹیڈی کے ذریعے حاصل کریں۔ ممکن ہو تو اس کو ڈی سلوا یا چوہدری دلاور کے ساتھ کام کرنے پر آمادہ کریں مگر یہ کام خطرناک تھا۔ اگر ان دونوں کو شک بھی ہو جاتا کہ ٹیڈی ہم سے بھی ملتا ہے تو ٹیڈی جان سے جاتا۔ ابھی اس مہرے کو اتنا آگے بڑھانا عقلمندی نہ ہوتی۔

رات کے دس بجنے والے تھے۔ ہم نے نیچے اتر کے کسی معقول ریسٹورنٹ میں رات کا کھانا کھانے کا فیصلہ کیا۔ میں

نے لائٹس آف کیں اور محسن نے دروازے لاک کیے۔ ہم ساتھ زینے کی طرف بڑھے۔ اسی وقت نیچے سے چوکیدار کی آواز آئی۔ وہ کسی کو روک رہا تھا۔ جواب میں کسی نے اس کو گالی دی۔ چوکیدار پھر چلایا لیکن اس مرتبہ یہ چیخ ... تھی۔ یہ کسی مجروح آدمی کی چیخ تھی جس میں درد و کرب ... تھی۔ اس کے بعد جو آواز ... ئی دی اس نے ہم سب ... کر دیا۔ یہ سائلنسر لگے ہوئے ریوالور کے فائر کی آواز ...

"رابعہ! اس عمارت سے نکلنے کا کوئی دوسرا راستہ ..." میں نے رابعہ کو روک لیا۔

رابعہ نے اقرار میں سر ہلایا۔ "عمارت کے دوسری ... پر بھی ایک زینہ ہے۔ پچھلی طرف۔"

"تم محسن کے ساتھ جاؤ، جلدی کرو۔" میں نے کہا ... لوگ زینے پر بھاری قدم رکھتے اوپر آ رہے تھے۔

"اور تم . . . تم کیا کرو گے؟" رابعہ نے پریشان ہو ...

"جاؤ۔" میں نے اسے دھکیل دیا اور محسن نے ... گھسیٹ لیا۔ نیچے سے آنے والے اب بہت قریب ... چکے تھے۔

معلوم نہیں یہ کون لوگ ہیں۔ میں نے سوچا اور کیا چاہ... ہیں لیکن یہ بھی شکاری ہیں تو دھاوا بولنے سے پہلے انہوں نے فرار کے سب راستے بند کر... ہوں گے اور میرا خیال غلط نہیں تھا۔ محسن اور رابعہ برآمدے ... آخری حصے تک بھی نہیں پہنچے تھے کہ وہ دونوں طرف ... ہوئے یعنی اس زینے کی جانب سے جو ہم نے آتے وقت ... کیا تھا اور اس دوسرے عقبی زینے کی طرف سے بھی جلد... رابعہ اور محسن نکل جانا چاہتے تھے۔ وہ تعداد میں چار تھے۔ ایک جیسے قد و قامت کے اور شلوار قمیص پہنے ہوئے ... کے چہروں پر ایک جیسی داڑھیاں تھیں اور گھنی لمبی مونچھیں ... جو نقلی ہونے کے باوجود دور سے اصلی لگتی تھیں۔ ان سب ... اپنے چہروں کو غیر نمایاں اور ناقابل شناخت بنانے کے لیے بڑی ... گول ٹوپیاں بھی سر پر رکھی تھیں جن سے پیشانی کا آدھا حصہ ... گیا تھا۔ یہ ان کا بہت کامیاب حربہ تھا کہ وہ ایک جیسے حلیے ... آتے تھے اور یہ کنفیوژن چھوڑ جاتے تھے کہ ان کی تعداد کیا تھی ... وقت بھی دونوں دروازوں کے چوکیداروں نے دو ہی افراد کو ... جاتے دیکھا ہوگا اور بشرطِ زندگی وہ بعد میں کوئی بیان دیں ... تو دو کا ذکر کریں گے۔ اوپر کسی نے دیکھ لیا تو اسے چار نظر ... آئیں گے مگر حلیہ بیان کیا جائے گا تو معلوم ہوگا کہ ایک آدمی تھا۔

رابعہ اور محسن انہیں دیکھتے ہی ٹھہر گئے تھے اور غیر ارادی طور پر محسن نے رابعہ کو اپنے پیچھے کر لیا تھا لیکن مجھے انتہائی حیرت ہوئی جب آنے والوں نے ان کی طرف نگاہ اٹھا کے بھی نہیں دیکھا۔ وہ چاروں میری طرف بڑھتے آ رہے تھے۔ اوپر پہنچنے تک وہ خالی ہاتھ تھے لیکن جب میرے اور ان کے درمیان چند قدم کا فاصلہ رہ گیا تو باری باری ان سب نے قمیص کے اندر ہاتھ ڈالا اور اپنے اپنے ریوالور نکال لیے۔ میں مقابلے کے لیے پوری طرح تیار ہو چکا تھا۔ اگر وہ خالی ہاتھ کیا خنجر اور لاٹھی لے کر بھی آتے تو میں ان چاروں سے نمٹ لیتا مگر چار سمتوں سے آنے والی چار گولیوں سے مقابلہ ناممکن تھا۔ محسن اور رابعہ راستہ صاف دیکھ کر غائب ہو چکے تھے۔ شاید اس خیال سے کہ خاموش تماشائی بن کر کھڑے رہنے سے وہ میری کوئی مدد نہیں کر سکتے لیکن اس عمارت سے باہر جا کے وہ یقیناً کچھ کر سکتے تھے۔ میں دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا اور ان کے قریب آنے کا انتظار کرتا رہا۔ "کیا چاہتے ہو؟" میں نے ان سب کو براہِ راست مخاطب کیا۔

"سکندر بابو!" ان میں سے ایک نے چند قدم کے فاصلے پر رک کر کہا۔ "ہم تمہیں اپنے ساتھ لے جائیں گے۔"

"زندہ یا مردہ۔" بائیں طرف اتنے ہی فاصلے پر رک جانے والے دوسرے شخص نے کہا۔

"لیکن ہم کشت و خون نہیں چاہتے۔" تیسرے نے دائیں طرف سے کہا۔

"کیونکہ حکم بھی یہی ہے کہ تم کو زندہ لانے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔" چوتھے نے پھر بائیں طرف سے بات کی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اسٹیج کے اداکار ہیں اور ہر شخص کو معلوم ہے کہ اسے کس وقت کیا ڈائیلاگ بولنا ہے۔

"گڈ۔" میں نے اطمینان سے دونوں ہاتھ باندھ کر سینے پر رکھے اور مسکرا کے کہا۔ "میں نے تم سب کی سن لی۔ اب مجھے صرف دو سوالوں کا جواب چاہیے۔ ایک یہ کہ حکم دینے والا کون ہے؟ اور دوسرا یہ کہ تم مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہو؟"

"ہم کسی سوال کا جواب نہیں دے سکتے۔" پہلے نے کہا۔

"اس لیے کہ جواب خود ہمیں معلوم نہیں۔" دوسرے نے کہا۔

"تمہارے حق میں یہی بہتر ہے کہ فضول باتوں میں وقت ضائع کیے بغیر چل پڑو۔" تیسرا بولا اور میں نے چوتھے کی طرف دیکھا۔

"تاکہ ہم بلاوجہ مداخلت کی حماقت کرنے والے کو گولی مار دیں یہ مجبور نہ ہوں۔" چوتھے نے کہا۔

"میں بھی کسی بے گناہ کا خون ہوتے دیکھنا پسند نہیں کروں گا۔" میں نے کہا۔ "کیونکہ میں یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ تم پوری تیاری اور مصمم ارادے کے ساتھ آئے ہو۔ میں چلنے کے لیے تیار ہوں۔"

وہ مجھ سے تقریباً چھ فٹ دور ایک نیم دائرے کی شکل میں حصار قائم کیے کھڑے تھے۔ اگر اس وقت کوئی نیچے اترنے والا دور سے دیکھتا تو اسے کسی قسم کا شک نہ ہوتا اور یہی نظر آتا کہ چار افراد مجھ سے کسی کاروباری مسئلے پر بات کر رہے ہیں۔ وہ مجھے وکیل سمجھتا اور ان کو میرا موکل اور ہم پر دوسری نگاہ ڈالے بغیر گزر جاتا۔ جو ریوالور ان کے ہاتھوں میں تھے وہ پشت کی جانب سے نظر نہیں آ سکتے تھے۔ میرے ارادے کا اظہار ہوتے ہی انہوں نے مجھے راستہ دے دیا اور میرے پیچھے ہو گئے۔ زینے سے اترتے ہی میں نے چوکیدار کو تلاش کیا۔

"تم نے اس غریب چوکیدار کو مار ڈالا ہے؟" میں نے رک کر کہا۔

"نہیں۔" کسی نے مجھے دھکیل کر جواب دیا۔ "وہ صرف بیہوش پڑا ہے۔ زینے کے نیچے۔"

باہر بہت سی گاڑیوں کے درمیان ان کی کار بھی موجود

تھی۔ جب انہوں نے مجھے اس گاڑی کی طرف چلنے کا اشارہ کیا تو میں نے اس کا نمبر پڑھنے کی کوشش کی لیکن نمبر پلیٹ کی لائٹ بجھی ہوئی تھی اور گاڑی اندھیرے میں کھڑی تھی۔ اگر میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا تب بھی اس کا کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ بعد میں معلوم ہوتا کہ نمبر پلیٹ نقلی تھی یا گاڑی چوری کی تھی۔ گاڑی میں ڈرائیور کی جگہ ایک شخص اطمینان سے بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ مجھے ڈرائیور والی سیٹ پر آگے بیٹھنے کے لیے کہا گیا۔ دو افراد میرے پیچھے سیٹ پر بیٹھ گئے۔ گاڑی کے ڈرائیور نے انجن کو پہلے سے اسٹارٹ کر دیا تھا۔ دروازے بند ہوتے ہی گاڑی چل پڑی اور ہائیکورٹ کے چوک سے گھوم کر مال پر آ گئی۔ خلاف توقع مجھے یہ دیکھ کر تھوڑی سی خوشی ہوئی کہ اندر کی جانب شیشے اور دروازے کھولنے کے لیے ہینڈل موجود ہیں لیکن میں نے احمقانہ جرأت کے مظاہرے سے گریز کیا۔ یہ بات یقینی نظر آتی تھی کہ پیچھے بیٹھے ہوئے شکاری مجھے اپنے دام سے نکلتا دیکھیں گے تو بلا جھجک گولی مار دیں گے۔ اپنے اور ڈرائیور کے درمیان لگے ہوئے آئینے میں پیچھے آنے والی ٹریفک کے بجائے مجھے ان دونوں کے چہرے نظر آ رہے تھے جو بالکل ایک جیسے لگتے تھے۔ ابھی تک نہ انہوں نے ٹوپیاں اتاری تھیں اور نہ داڑھی مونچھیں۔ پھر بھی ان کی آنکھیں اور ان کے ناک کان دیکھ کر میں تصور کی مدد سے ایک ایسی خیالی تصویر بنا سکتا تھا جس میں ان کی صورت کے اصل نقوش داڑھی مونچھوں کے بغیر نظر آتے ہوں۔ گاڑی اب نئی اور پرانی انارکلی کے چوک سے گزر چکی تھی۔ میرے دائیں ہاتھ پر پنجاب یونیورسٹی کی خوبصورت عمارت تھی جس کے طرزِ تعمیر میں مشرقی روایات کا تمام حسن تھا۔ قدامت کی باوقار شان و شوکت تھی اور علم و عرفان کی ساری عظمت تھی۔ دوسری طرف عجائب خانہ جو کئی صدیوں کی تاریخ کے گم گشتہ اوراق کا خزینہ تھا اور پنجاب پبلک لائبریری تھی جس کی لاکھوں کتابیں انسان کی عقل، علم و آگہی اور تجربات کے بے کراں سمندر کی طرح موجود تھیں مگر میں ان سب کے درمیان سے گزرتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ وہ دونوں دشمن کہاں گئے جو میرے ساتھ نہیں آئے تھے۔ جواب فوراً میرے ذہن میں آ گیا وہ دوسرے دروازہ پر کھڑی ہوئی گاڑی میں بیٹھ کر پیچھے آ رہے ہوں گے۔ کیا اس کا مطلب یہ نکالا جا سکتا ہے کہ انہوں نے رابعہ اور محسن کو بھی بے بس کر کے دوسری گاڑی میں ڈال لیا ہو گا؟ میں نے سوچا اور جھک کر آئینے میں دیکھنے کی کوشش کی کہ کیا ہمارے پیچھے بھی کوئی گاڑی ہے۔ پیچھے کوئی ایک گاڑی ہوتی تو الگ بات تھی۔ ہمارے پیچھے تو گاڑیوں کی ایک قطار تھی اور رات کے

وقت صرف ان کی ہیڈ لائٹس نظر آتی تھیں۔ پیچھے بیٹھے شخص نے مجھے سیدھا بیٹھنے کا حکم دیا اور میں نے تعمیل کی۔ نے میری آنکھوں پر کوئی پٹی نہیں باندھی تھی اور مجھے بے... رکھنا بھی ضروری نہیں سمجھا تھا۔ میں بند شیشوں سے ا... کو دیکھتا جا رہا تھا جو میرے جانے پہچانے تھے۔ اپنی ... سے میں اپنے محافظوں کو یقین دلانا چاہتا تھا کہ میں ... ان سے تعاون کر رہا ہوں اور میری بے نیازی کا انداز ... کرتا تھا کہ میں خوف زدہ بھی نہیں ہوں۔ حقیقت اس ... برعکس تھی۔ میرے ذہن میں ایک اسکیم تھی جس کی کامیا... دار و مدار حالات پر تھا۔ میں ناکامی کے نتائج کا تصور ... تو خوف کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔

اب گاڑی اُن سڑکوں پر دوڑ رہی تھی جو غیر آباد ... دونوں جانب اونچے اونچے گھنے درخت تھے اور ... کے کھمبے تھے جن کے زیادہ تر بلب فیوز تھے اور جو روشن ... بھی وولٹیج کی کمی کے باعث دیے کی طرح ٹمٹما رہے ... سڑک سے دور نئی آبادی میں تعمیر ہونے والی چھوٹی بڑی ... تھیں۔ شروع کے حصے میں آبادی زیادہ تھی اور ... گھر میں روشنی نظر آ رہی تھی۔ پھر خالی پلاٹوں کی تعدا... لگی۔ جن میں کہیں مکمل اور کہیں نامکمل کوٹھیاں ایک ... سے الگ نظر آتی تھیں۔ یہ حالات خاصے امید افزا تھے ... میری اسکیم کے لیے سازگار تھے۔ ایک موڑ پر رفتار ... پلک جھپکتے میں دائیں ہاتھ سے میں نے اسٹیئرنگ کو ... اور بائیں ہاتھ سے دروازہ کھول دیا۔ ڈرائیور اگر ... نہ لگاتا تو گاڑی الٹ جاتی۔ مگر فوراً بریک لگنے ... دو فائدے ہوئے۔ پیچھے بیٹھے ہوئے دونوں افراد ایک ... آگے گرے اور میں نے کھلے دروازے سے چھلانگ لگا... مجھے زیادہ چوٹ نہیں آئی۔ نیچے گرتے ہی میں نے قلابا... اور اٹھ کر ایک درخت کے تنے کی پناہ لینے بھاگا۔ ... سن کے میں نے پیچھے دیکھا، گاڑی دوسرے کنارے کے ... درخت سے ٹکرا گئی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی میں نے ... کار کو عین اپنے پیچھے رکتے ہوئے دیکھا۔

میری اسکیم فیل ہو گئی تھی۔ کیونکہ میں اپنے پیچھے ... والی اس دوسری گاڑی کے وجود سے بے خبر تھا جو لب... لائٹس آف کیے پہلی کار کی ٹیل لائٹ کا تعاقب کر ... انہوں نے بڑی چالاکی سے مجھے دھوکا دیا تھا۔ اگر وہ ... روشن رکھتے تو کسی ویران سڑک پر پیچھے کی ونڈ اسکر... آنے والی روشنی دیکھ کر میں سمجھ جاتا کہ دوسری گا...

ساتھ ہی چل رہی ہے ان کو بھی اندیشہ ضرور تھا کہ میں راستے میں گڑبڑ کروں گا اور اس خطرے سے نمٹنے کے لیے انہوں نے جو انتظام کیا تھا قابلِ تعریف تھا۔ ابھی میں پوری طرح درخت کے پیچھے چھپا بھی نہیں تھا کہ دوسری کار میں سے پیچھے رہ جانے والے دونوں افراد ایک ساتھ نکلے اور انہوں نے درخت کے دونوں طرف پوزیشن سنبھال لی۔

"تم بھاگ کے کہیں نہیں جا سکتے۔" ان میں سے ایک نے کہا۔ "کوشش کرو گے تو مارے جاؤ گے۔"

"چلو اس دوسری گاڑی میں۔" دوسرے نے کہا جو گھوم کر میرے پیچھے آ چکا تھا۔ وہ دونوں مشتعل تھے اور ان کے ہاتھوں میں ریوالور فائر کرنے کے لیے بالکل تیار تھے۔ ان کے پاس بہانہ بھی تھا چنانچہ وہ مجھے اس ویرانے میں قتل کر کے آسانی سے فرار ہو سکتے تھے۔ میں نے آہستہ آہستہ دونوں ہاتھ اٹھائے اور دوسری گاڑی کی طرف چلنے لگا اور اس وقت میں نے دیکھا کہ پہلی گاڑی کو بھی زیادہ نقصان نہیں پہنچا تھا کیونکہ تصادم کے وقت اس کی رفتار بہت کم ہو گئی تھی۔ ڈرائیور چوٹ سے اس لیے بچ گیا تھا کہ آخری وقت میں اس نے ٹکر کو ناگزیر سمجھتے ہوئے دفاعی انداز اختیار کر لیا تھا۔ پیچھے والوں کو کچھ بھی نہیں ہوا تھا اور اب وہ بھی باہر آ چکے تھے۔ چند منٹ بعد میں بالکل اسی طرح دوسری گاڑی میں بیٹھا تھا اور کسی نامعلوم منزل کی جانب رواں تھا۔ میں نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ پہلی کار اسٹارٹ ہو گئی ہے لیکن پیچھے آنے کے بجائے واپس شہر کی طرف جا رہی ہے۔ میرے محافظ بدل گئے تھے اور اب میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔ جب وہ چاروں رابعہ کے دفتر کی عمارت کے باہر مجھ سے بات کر رہے تھے تو ہدایات کے مطابق سب نے اپنی آواز بھی بدلی ہوئی تھی۔ اب ایک ہنگامی صورتِ حال پیدا ہوئی تو ان کو یہ بات یاد نہ رہی۔ ایک آواز کو میں نے فوراً پہچان لیا تھا۔ یہ ڈی سلوا کی آواز تھی۔ جب انہوں نے مجھے کار میں بٹھانے کے لیے دروازہ کھولا تو اندر خود بخود ایک لائٹ جل گئی اور میں نے معمولی سی روشنی میں ذرا سی دیر کے لیے ان کے چہرے دیکھے۔ بظاہر ان میں کوئی فرق نہ تھا مگر میں نے پھر اپنے تصور سے مدد لی اور ایک چہرے میں سے داڑھی مونچھوں کو الگ کر کے دیکھا۔ آواز کی شناخت کے بعد اس صورت کے اصلی نقوش کو پہچاننا مشکل ثابت نہ ہوا۔ میرے دونوں محافظوں میں سے ایک یقیناً ڈی سلوا تھا۔ اس یقین کے بعد میں محتاط رہا۔ ڈی سلوا ایسا دشمن تھا جسے بے وقوف یا کمزور سمجھنے کا انجام میری موت کے سوا کچھ نہ ہوتا۔

گاڑی ایک ویران اور اندھیرے گھر کے احاطے میں داخل ہو گئی۔ ڈی سلوا اور اس کا ساتھی مجھ سے پہلے اترے اور انہوں نے مجھے بھی باہر آنے کا حکم دیا۔ ڈرائیور بدستور انجن اسٹارٹ کیے اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔

"پیچھے پلٹ کر دیکھے بغیر یہ دروازہ کھولو۔" ڈی سلوا نے کہا۔ وہ پھر آواز اور لہجہ بنا کے بول رہا تھا۔

"یہ کس کا گھر ہے مسٹر ڈی سلوا؟" میں نے کہا۔ "تمہارے کسی باپ کا؟"

"شٹ اپ۔" ڈی سلوا نے مشتعل ہوئے بغیر کہا۔ "تم سے جو کچھ کہا جائے وہی کرو۔"

"لیکن اس کی چابی؟" میں نے کہا۔ "مجھے تو یہ دروازہ مقفل لگتا ہے۔"

"دروازہ کھلا ہوا ہے۔" ڈی سلوا کے ساتھی نے مجھے پیچھے سے دھکا دیا۔ میں نے سنبھل کر دروازے کا ہینڈل گھمایا اور اندر داخل ہو گیا۔ میرے پیچھے دروازہ دھڑ سے بند ہوا اور مجھے باہر سے ڈور لاک میں چابی گھمانے کی آواز سنائی دی۔ کمرے میں تین دروازے اور بھی تھے لیکن میں کوشش کیے بغیر اندازہ کر سکتا تھا کہ وہ پہلے ہی سے مقفل ہوں گے یا باہر سے بند ہوں گے۔ میرے کانوں میں گاڑی کے دروازے بند ہونے کی اور پھر روانہ ہونے کی آواز آئی۔ کچھ دیر بعد یہ آواز بھی نہ رہی اور میرے ارد گرد ایسی خاموشی کا احساس رہ گیا جس میں انگریزی محاورے کے مطابق پِن کے گرنے کی آواز بھی سنی جا سکتی تھی۔ دشمن مجھے ایک کمرے میں قید کر کے جا چکے تھے۔

اب میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ یہ کسی نئے مکان کا خالی کمرہ تھا جس کی دیواروں پر رنگ و روغن تک ہو گیا تھا لیکن سامان نام کی کوئی چیز ابھی تک نہیں رکھی گئی تھی۔ سوائے اس ٹرانسسٹر ریڈیو کے جو کمرے کے عین درمیان میں ہونا تیک کے فرش پر رکھا ہوا تھا۔ اس کے قریب ہی ایک پین ٹارچ پڑی تھی۔ جسے بہت پہلے روشن کر کے چھوڑ دیا گیا تھا۔ چنانچہ سیل کمزور پڑ گئے تھے اور روشنی برائے نام رہ گئی تھی۔

"سکندر بخت!" ریڈیو اچانک بولا۔ "تمہیں یہاں لانے کا مقصد تم سے باتیں کرنے کے سوا کچھ نہیں۔ ہماری گزشتہ ملاقات تین ہفتے پہلے ہوئی تھی۔ تمہیں یاد ہو گا کہ ہم نے تمہیں ایک ماہ کی مہلت دی تھی۔"

میں اس آواز کو سن کر چونکا ضرور تھا لیکن حیران نہیں ہوا۔ آواز اسی شخص کی تھی جس نے پہلی بار خود کو چوہدری دلاور کہہ کر متعارف کرایا تھا لیکن اس رات میں صرف چوہدری دلاور کا سایہ دیکھ سکا تھا اور اس کے سائے سے ہی باتیں کرتا ... تھا۔

اب بھی میں اس کی آواز سن رہا تھا لیکن اسے دیکھنے سے قاصر تھا۔ وہ کہیں آس پاس ہی موجود تھا۔ شاید اسی گاڑی میں جو مجھے لے کر یہاں تک آئی تھی اور کسی پاکٹ سائز ٹرانسمیٹر کے ذریعہ بات کر رہا تھا۔ ریڈیو پہلے سے آن کر کے اور ٹرانسمیٹر کی فریکوئنسی پر ٹیون کر کے رکھ دیا گیا تھا چنانچہ ریڈیو اس کی آواز کو صاف ریسیو کر رہا تھا۔ اس کے لیے خطرے کی کوئی بات نہ تھی۔ ٹرانسمیٹر سے نشر ہونے والی آواز کی لہروں کا دائرہ پچاس گز ہوگا۔ اور اس محدود دائرے میں اس وقت کون ریڈیو لگائے بیٹھا ہوگا اگر کوئی ہوتا بھی تو وہ اپنی پسند کے مطابق کسی اسٹیشن سے خبریں سن رہا ہوتا یا فرمائشی گانے۔ یہ ناممکن تھا کہ کوئی عین اسی جگہ ریڈیو کی سوئی لے آئے اور یہ گفتگو سننے لگے۔

"کیا میری آواز تمہیں سنائی نہیں دی؟" چوہدری دلاور نے کہا۔ "تم حیران ہو رہے ہو یا کسی سوچ میں ہو؟"

"حیرانی کی میرے لیے کوئی بات نہیں۔" میں نے کہا۔ "سوچ میں یہ رہا تھا کہ بات چیت کا یہ انتظام یک طرفہ تو نہیں ہے؟ میری آواز بھی تمہارے کانوں تک پہنچ سکتی ہے یا نہیں؟"

"یہ انتظام دو طرفہ ہے۔" چوہدری دلاور نے کہا۔ "میں تمہاری آواز سن رہا ہوں اپنے ریڈیو پر۔"

"تم نے مجھے ایک مہینہ دیا تھا۔" میں نے کہا۔ "اس سے پہلے ہی دوسری ملاقات کی ضرورت کیوں پڑ گئی؟"

"اس عرصے میں بہت سی باتیں ایسی ہوئی ہیں جن سے مجھے تمہارے عزائم کا اندازہ ہوتا جا رہا ہے۔" چوہدری دلاور بولا۔ "اور میرا خیال ہے کہ تم نے اس ایک ماہ کی مہلت کو سوچ بچار میں صرف نہیں کیا۔"

"تمہارے اندازے غلط بھی تو ہو سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن اچھا ہوا کہ تم نے خود ہی مجھے بلا لیا۔ میں بھی تم سے بہت سی باتوں کی وضاحت چاہتا تھا۔ پہلی بات تو یہ کہ تم خود کو چوہدری دلاور کہتے ہو۔ ایک چوہدری دلاور کو میں بھی جانتا ہوں۔ اس کی شخصیت اس کا لب و لہجہ اور اس کے انداز و اطوار سب مختلف ہیں۔ یا تو اسے اداکاری کا کمال سمجھا جا سکتا ہے یا تمہارا جھوٹ...."

"کیوں؟ کیا دنیا میں ایک نام کے دو فرد نہیں ہو سکتے؟" وہ بولا۔ "اور یہ سوال قطعی غیر اہم ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ آئندہ ایک ہفتے میں تمہیں ایک فیصلہ کرنا ہے۔ یا تو تم حق وراثت کا کیس واپس لے کر قانونی طور پر اپنے والد کی جائداد پر ملکیت کے دعوے سے دستبردار ہو جاؤ اور اس کے بدلے ہمارا پیش کردہ معاوضہ لے کر واپس لندن چلے جاؤ۔ اگر رابعہ تمہارے ساتھ جانا چاہے تو جا سکتی ہے۔ ہمارا تم سے بعد میں کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں رہے گا اور تم بھی ایک نئی زندگی کا آغاز کرو گے جس کا تمہارے ماضی سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ دوسری پیش کش کا انحصار تمہاری ہمت اور تمہاری مرضی پر ہے۔ تم لندن میں بیٹھ کر کام کر سکتے ہو اور عیاشی سے زندگی گزار سکتے ہو۔ اس کے علاوہ کوئی تیسری صورت نہیں ہے۔"

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ میرے معاملات کی سزا دوسرے لوگوں کو کیوں دی جا رہی ہے؟" میں نے کہا۔

"جو کچھ کر رہے ہو تم خود کر رہے ہو۔" وہ بولا۔ "ہم نے تمہیں ہمیشہ پہلے خبردار کیا اور فیصلہ کرنے کی مہلت دی۔ غلط فیصلہ کرنے والے خود تم تھے۔ اگر تم ہمارے آدمی کو چھوڑ دیتے تو رابعہ کا گھر یوں تباہ نہ ہوتا۔ یہ بھی تمہاری حماقت تھی کہ تم نے اس آدمی کو رابعہ کے گھر میں رکھا اور پھر ہمیں دھوکا دینے کی کوشش کی، نقصان کس کا ہوا؟ ہمارا یا تمہارا...؟"

"یہ تو وقت بتائے گا کہ نقصان میں کون رہا۔" میں نے کہا۔

"وقت تو سب کچھ بتا چکا ہے۔" وہ ہنسا۔ "کیا تم یہ ثابت کر سکے کہ تمہارے والد کو قتل کیا گیا تھا؟ یا تمہیں معلوم ہے کہ اب ان کی ہڈیاں کہاں دفن ہیں؟ کیا تمہاری مدد کر کے غلام علی کو کوئی فائدہ ہوا؟ ایک عورت بیوہ ہو گئی اور اس کے بچے یتیم ہو گئے۔ اس سے پہلے منشی نے ہم سے نمک حرامی کی تھی اور تمہیں معلوم ہے اس کا کیا انجام ہوا؟ یہی انجام شہلا کا بھی ہوگا۔ تم سمجھتے ہو کہ ہم اسے تلاش نہیں کر سکتے؟ یہ تمہاری بھول ہے۔ کبھی نہ کبھی اس کا سراغ بھی مل جائے گا۔ آخر تمہارا رشتہ کیا ہے اس سے کہ تم اس کی خاطر اپنی زندگی کو داؤ پر لگائے ہو؟"

"چوہدری دلاور! تمہاری کسی دھمکی سے ڈر کے میں کوئی فیصلہ نہیں کروں گا۔" میں نے کہا۔ "رشتوں کی بات رہنے دو۔ رشتے تو دیواروں سے بھی استوار ہو جاتے ہیں۔ لوگ ایک درخت کو اتنی ہی محبت اور توجہ سے بڑا کرتے ہیں جیسے اپنی اولاد کو اور اپنے کتوں سے بھی پیار کرتے ہیں۔ شہلا سے بھی میرا ایک جذباتی رشتہ ہے۔"

"پہلے فوزیہ سے، پھر رابعہ سے اور اب شہلا سے... تم کس کس کے جذباتی رشتوں کی حفاظت کرو گے؟" وہ طنز سے بولا۔ "ہوگا کچھ بھی نہیں۔ بس یہ سب تمہارے جذباتی رشتوں کی بھینٹ چڑھ جائیں گی اور اس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ تمہاری ضد کی سزا محسن کو بھی مل سکتی ہے۔ اس کے گھر کے ہر فرد کو مل سکتی ہے۔ اس ایس پی کو مل سکتی ہے جسے تم ڈھال بنائے بیٹھے ہو۔"

"تمہارا خیال بالکل غلط ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر میں یہ سمجھوں گا کہ میری وجہ سے ان کو نقصان پہنچ سکتا ہے جن کا مجھ سے کوئی جذباتی تعلق ہے تو میں اپنے آپ کو تمہارے حوالے کر دوں گا۔ اگر میں نے تمہاری دونوں شرطوں کو قبول نہ کیا تو میں اس کی اطلاع دینے کے لیے ڈی سلوا کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ یہ الگ بات ہے کہ خود تختۂ دار تک پہنچنے سے پہلے میں ان سب کو چن چن کر قتل کر دوں جن کو میں اپنی تمام مشکلات اور مصائب کا ذمہ دار سمجھتا ہوں۔ الزام ایک میر شرافت علی کے قتل کا ہو یا تم جیسے دس بدمعاشوں کے قتل کا، کوئی مجھے دس بار پھانسی نہیں دے سکتا۔ تم نے مجھے بہت کچھ سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ میری یہ بات بھی سمجھ لو کہ میں نے مرنے کا فیصلہ کر لیا تو زندہ رہ کے تم بھی پچھتاؤ گے۔ میں ایک ایک کے گھر کو اور کاروبار کو اسی طرح راکھ کا ڈھیر بنا سکتا ہوں جیسے تم نے رابعہ کے گھر کو بنایا تھا۔ میرے حق وراثت کو تم مجھے مار کر بھی نہیں چھین سکتے۔ میں نے اپنی درخواست میں یہ بھی لکھا ہے کہ عدالتی فیصلے سے قبل ہی خدانخواستہ مجھے کچھ ہو جائے تو رابعہ کو میرا وارث تصور کیا جائے۔ رابعہ نے ایک وصیت نامہ کی رو سے کسی اور کو وارث بنا دیا ہے۔ یہ بڑا لمبا سلسلہ ہے۔ تم ایک کے بعد ایک کو مارتے جاؤ۔ کوئی نہ کوئی وصیت نامہ کے ذریعے وراثت کا حق حاصل کرنے کے لیے موجود رہے گا۔"

اس کی خاموشی سے اندازہ ہوتا تھا کہ میری دھمکی رائیگاں نہیں گئی۔

"ابھی ایک ہفتہ باقی ہے۔" اس نے کچھ دیر بعد کہا تو اس کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔ "عقل سے کام لو سکندر بخت اور سب کا فائدہ دیکھو۔"

"تمہارے اور میرے نقطۂ نظر میں فرق نہ ہوتا تو اختلاف کی گنجائش ہی کہاں تھی۔" میں نے کہا۔ "جسے تم فائدہ سمجھتے ہو میں بھی اسے فائدہ مان لیتا لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے۔"

"تمہاری یہ احمقانہ اصول پرستی بہت سی جانوں کا نذرانہ لے چکی ہے۔" وہ بولا۔ "اور آئندہ اس ضد پر کس کس زندگی کو قربان ہونا ہے یہ تم بھی نہیں جانتے۔ کیا حساب کے کسی قاعدے سے تم صرف ایک زندگی کی قیمت بتا سکتے ہو؟ اور اس کے بعد یہ کہہ سکتے ہو کہ تم اپنے باپ کی چھوڑی ہوئی جائداد لے کر فائدے میں رہے؟ تم اپنے آپ کو قائل کر سکو گے کہ تمہارے اصول اُن سب کی زندگی سے زیادہ اہم تھے جو ناحق مارے گئے؟"

"یہ بڑی لمبی بحث ہے چوہدری دلاور!" میں نے کہا۔ "انسانی تاریخ کے ایسے بہت سے باب ہیں جو لہو کی سرخی سے لکھے گئے اور یہ لہو ایسے ہی لوگوں کا تھا جو سمجھتے تھے کہ سچائی کا سودا نہیں ہو سکتا۔ اصول فروخت نہیں کیے جا سکتے اور ضمیر کی آواز دبائی نہیں جا سکتی۔ ایسے لوگ کبھی اکیلے نہیں رہے اور ان کا ساتھ دینے والے بھی مارے گئے لیکن خیر و شر اور نیکی بدی کی یہ جنگ ازل سے جاری ہے اور ابد تک چلتی رہے گی۔ تم جیسے لوگوں کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اس دنیا کا وجود اور انسان کی زندگی کی بقا کا مسئلہ کبھی انسان کے اختیار میں نہیں رہا۔ تم آج کے دن کی فتح اور آج کا فائدہ شمار کرتے ہو۔ میں جانتا ہوں کہ کل سُرخرو کون ہوں گے۔ اس لیے تم میرے نفع و نقصان کو اپنے پیمانے میں مت دیکھو۔ تم اپنی فکر کرو۔ میرے بارے میں یا میرا ساتھ دینے والوں کے انجام کے بارے میں مت سوچو۔"

"ٹھیک ہے۔ میں نے تمہیں آخری موقع فراہم کیا تھا۔" وہ بولا۔ "ابھی ایک ہفتہ باقی ہے۔ ان سب سے بھی مشورہ کر لو جو تمہارے قریب ہیں لیکن غیر جذباتی ہو کے سوچ سکتے ہیں۔"

"اب مجھے یہ بھی بتا دو کہ میری رہائی کی کیا صورت ہے؟" میں نے کہا۔

"تم نے خود اپنے آپ کو قید کر رکھا ہے۔" وہ بولا۔ "چابی تمہاری دسترس میں ہے اور تمہارا راستہ روکنے والا کوئی نہیں ہے۔"

کمرے کی دیواریں بالکل سپاٹ اور ویران تھیں اور ان دیواروں میں کوئی ایسی جگہ نہ تھی جہاں چابی چھپائی جا سکتی۔ میں نے پین ٹارچ کی برائے نام روشنی میں ہر گوشۂ دیوار کا جائزہ لیا اور موزائیک فلور پر بھی دیکھا لیکن چابی مجھے کہیں دکھائی نہ دی۔

"تلاش کر چکے؟" اس کا شیطانی قہقہہ سنائی دیا۔ "تم ذہین آدمی ہو۔ تمہاری نظر بھی کمزور نہیں ہے اور میں نے جھوٹ نہیں بولا ہے۔ چابی واقعی اسی کمرے میں ہے اور تم آسانی سے حاصل بھی کر سکتے ہو۔"

"اب صرف ایک جگہ رہ جاتی ہے۔" میں نے کہا۔ "چابی اس ریڈیو کے نیچے یا اس کے اندر موجود ہو سکتی ہے۔ پین ٹارچ بہت چھوٹی ہے۔ اس میں چابی آ ہی نہیں سکتی۔"

"میں ایک بار پھر تمہاری ذہانت کا اعتراف کرتا ہوں۔" اس کی آواز آئی۔ "ٹرانزسٹر کے پچھلے حصے میں سیل ڈالنے کے لیے ایک چھوٹا سا خانہ ہے جس میں چھ سیل پڑتے ہیں۔ تم یہ سیل نکال کر دیکھو گے تو تمہیں چابی مل جائے گی۔"

چابی اسی جگہ موجود تھی جہاں اس نے بتایا تھا لیکن سیل نکالنے کے لیے میں نے ٹرانزسٹر اٹھایا اور اس کے پیچھے وہ خانہ تلاش کیا جو ہموار سطح پر دکھائی بھی نہ دیتا تھا تو میں نے محسوس کیا کہ ٹرانزسٹر کچھ زیادہ بھاری ہے۔ اس سائز کے کسی بھی

ٹرانزسٹر ریڈیو کا وزن اس سے آدھا بھی نہ ہوتا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہوسکتی تھی کہ اسی ٹرانزسٹر میں کوئی چھوٹا سا ٹرانسمیٹر بھی پوشیدہ تھا جس کے ذریعے میری آواز چوہدری دلاور تک پہنچ رہی تھی مگر میں سوچ میں پڑ گیا۔ میرے دشمن بے وقوف نہیں تھے۔ اگر ان کو صرف اس ٹرانزسٹر پر بات کرنی ہوتی تو وہ اتنی مشکلوں سے مجھے یہاں تک اٹھا کے کیوں لاتے۔ اس سے کہیں آسان تو یہ ہوتا کہ وہ یہی ریڈیو، ٹرانسمیٹر کسی طرح میرے کمرے میں رکھ آتے یا اس وقت رابعہ کی گاڑی میں چھوڑ دیتے جب ہم اوپر آفس میں بیٹھے تھے۔ انہیں چار مسلح افراد کو بھیجنے کی، ایک چوکیدار کو زخمی کرنے کی اور دو گواہوں کی موجودگی میں مجھے زبردستی اغوا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس کے علاوہ کیا ایسے بے ضمیر دشمن سے اصول پرستی کی توقع کی جاسکتی ہے کہ ایک ماہ کی مہلت دے کر وہ اس وعدے پر قائم رہے گا؟ جب مجھ سے یہ وعدہ کیا گیا تھا تو بہت سی باتیں مجھے معلوم نہیں تھیں اور دشمنوں کا خیال تھا کہ اپنے مخصوص حربے آزما کر وہ مجھے ہراساں کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے۔ انہوں نے ہر طرف سے خطرے کی دیوار کھڑی کرکے مجھے محصور کرنے کی کوشش کی تھی اور ناکام رہے تھے۔ اب تو انہیں یہ بھی معلوم ہوگیا تھا کہ میرے عزائم خطرناک ہیں۔ میں نے ان کی پیش کش پر غور کرنے کے بجائے تین ہفتے ان سے محاذ آرائی میں گنوا دیے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ میں ان کی پیش کش کو قبول کرنے کا اور اپنی شکست تسلیم کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ ابھی ابھی میں نے ان پر دوبارہ یہ واضح کردیا تھا کہ مجھے اپنے نفع و نقصان کی پروا نہیں۔

میرا دماغ کسی کمپیوٹر کی طرح کام کر رہا تھا اور خود بخود نتائج اخذ کرتا جا رہا تھا۔ نہیں، میں نے اپنے آپ سے کہا۔ اس میں بھی کوئی چال ہے۔ اگر وہ مجھے اتنی آسانی سے نکل جانے کی اجازت دے رہے ہیں تو کیوں؟ اس لیے کہ میں باہر نکل کے ان کے لیے مزید مشکلات اور پریشانی کا سبب بنوں؟ میں نے ڈی سلوا کو بتا دیا تھا کہ میری معلومات کا ذخیرہ کس حد تک خطرناک ہوچکا ہے۔ میرے پاس کتنے ثبوت ہیں اور کتنے گواہ ہیں۔ اس نے یہ بات فوراً آگے پہنچائی ہوگی اور انہیں یقین آگیا ہوگا کہ میرے بارے میں ان کے سارے اندازے غلط ہوگئے ہیں۔ اب میں وہ سکندر نہیں رہا جو لندن میں ایک خوش باش اور بے فکرا طالب علم تھا۔ نوجوان اور شوقین مزاج اور ہر قسم کی ذمہ داریوں کے بوجھ سے آزاد نوجوان، جس کو وہ گھیر کر اپنی شکارگاہ میں لے آئے تھے۔ وہ اس خوش فہمی کے غرور میں مبتلا تھے کہ جسے چار سال تک گھر کے حالات سے واسطہ ہی نہ رہا ہو وہ ان کا حریف کیسے بن سکتا ہے؟ ان کی پیش کش بہت بڑی تھی اور وہ بہت طاقتور لوگ تھے چنانچہ ان کو یقینی نظر آتا تھا کہ میں اپنی جان بچانے کی کوشش کروں گا اور ان کی فراخدلانہ پیش کش کے لالچ سے قائل نہ ہوا تو انجام کے خوف سے ضرور بھاگ جاؤں گا لیکن اب صورتِ حال اس کے برعکس تھی کیا اب وہ مجھے زندہ رہنے کی مہلت دیں گے؟ اس سوال کا جواب نفی میں آتا تھا۔ جتنا میں نے سوچا اتنا ہی خطرے کا احساس بڑھتا گیا۔ وہ چھٹی حس جو خطرے سے اسی طرح خبردار کرتی ہے جیسے جہاز کا راڈار بہت آگے کے موسم کی خرابی سے آگاہ کرتا ہے، مجھے ہوشیار کرنے لگی کہ میں دشمن کی آخری بات کا یقین نہ کروں۔ انہیں معلوم تھا کہ میں نے بہت کچھ جھوٹ بھی بولا ہے مثلاً یہ کہ حقِ وراثت کے کیس میں رابعہ کے وارث ہونے کا کوئی ذکر نہیں تھا اور رابعہ نے کوئی وصیت نامہ مرتب نہیں کیا تھا، جس کی رو سے ایک کے بعد ایک وارث پیدا ہوتا جائے۔ دشمنوں کے وسائل اتنے زیادہ تھے کہ وہ وراثت کے مقدمے کی پوری فائل دیکھ چکے ہوں گے۔ "یہ شکاری ہیں۔" میری چھٹی حس پکارنے لگی۔ "ان کے جال میں مت پھنس جانا سکندر! یہ تم سے آخری بار پوچھنا چاہتے تھے کہ تم مقابلے سے دستبردار ہو کے ان کی شرائط کو قبول کر رہے ہو یا نہیں اور تم نے ابھی ابھی ان کو دو ٹوک الفاظ میں صاف جواب دے دیا ہے۔ کیا اس کے بعد بھی شک کی کوئی گنجائش رہ جاتی ہے کہ تمہیں اٹھا کے یہاں لانے کا مقصد کیا تھا!"

میں نے کور ہٹا کے پچھلے حصے کے سیل والے خانے کا معائنہ کیا۔ بظاہر اس میں کوئی ایسی بات نہیں تھی لیکن میرے ذہن میں کئی خیال آئے مثلاً کیا یہ ممکن ہے کہ سیل نکالتے ہی کوئی دھماکا ہو اور ٹرانزسٹر کے اندر پوشیدہ کوئی بم ڈی فیوز ہو کے پھٹ جائے یا میں قفل میں چابی گھماؤں تو کوئی کنکشن ٹوٹ جائے اور دروازے پر رکھا ہوا بم پھٹ جائے۔ انگریزی میں اس قسم کے نظام کو "بوبی ٹریپ" کہا جاتا ہے مگر اردو میں اس کے لیے کوئی متبادل لفظ نہیں۔ لیکن یہ نظام کہیں بھی بہت آسانی سے نصب کیا جاسکتا ہے۔ میرے شبہات کو تقویت پہنچانے والی بات یہ بھی تھی کہ دشمن مجھے تنہا چھوڑ کے فرار ہوگئے تھے اور اب چوہدری دلاور کی آواز بھی نہیں آرہی تھی۔ جس کا مطلب یہ بھی نکالا جاسکتا تھا کہ چوہدری دلاور، جو قریب ہی کسی گاڑی میں ٹرانسمیٹر لیے بیٹھا تھا اب جاچکا تھا۔ میں کچھ دیر سوچتا رہا۔ رہائی کے دوسرے امکانات کا جائزہ لیتا رہا مگر یہ امکانات صفر تھے۔ نہ کسی کو یہ معلوم تھا کہ میں کہاں ہوں جو میری مدد کے لیے آجاتا اور نہ میں زورِ بازو سے اپنا راستہ بنا سکتا تھا۔ کمرے کے تینوں دروازے اتنے مضبوط تھے کہ ان کا ٹوٹنا محال تھا اور مدد کے لیے میری فریاد و فغاں بھی کسی کے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔

اب میرے لیے زندگی کو داؤ پر لگا کے قسمت آزمانے کے سوا کوئی صورت باقی نہ رہی تھی۔ میں نے ایک ایک سیل کو پوری احتیاط کے ساتھ نکالنا شروع کیا۔ اوپر والے تین سیل جو ایک ہی قطار میں تھے باہر آگئے اور کوئی دھماکا نہیں ہوا۔ چابی اب بھی نظر نہ آئی تھی اور میرے لیے باقی تین سیل نکالنا بھی ناگزیر تھا جو نیچے والی قطار میں دوسرے رُخ لگے ہوئے تھے۔ خدا کا نام لے کر میں نے ان کو بھی الگ کردیا کہ زندگی ہوگی تو دشمن کی کوئی چال مجھے تقدیر کی عطا کی ہوئی آخری سانس لینے سے پہلے نہ مار سکے گی لیکن کاتبِ تقدیر نے اتنی ہی فرصتِ عمر بخشی ہوگی تو اپنی تمام کوشش اور احتیاط سے بھی میں اس میں ایک پل کا اضافہ نہ کرسکوں گا۔ جب خانہ خالی ہوگیا تو مجھے ایک چابی نظر آئی جو اسفنج کی پتلی سی تہہ کے اوپر رکھی تھی۔ پن ٹارچ کی روشنی برائے نام رہ گئی تھی لیکن اس کو چابی پر مرتکز کرنے سے مجھے وہ بات معلوم ہوگئی جس نے مجھے مرگِ ناگہاں سے بچا لیا۔ چابی کے دونوں کناروں کو باریک تاروں سے باندھ رکھا تھا۔ ایک تار چابی کے گول سوراخ والے حصے پر لپٹا ہوا تھا اور اس کا دوسرا سرا خانے میں دائیں جانب پن جتنے سوراخ میں غائب ہوگیا تھا۔ دوسرا تار چابی کے اس حصے پر جوڑا گیا تھا جو ڈور لاک کے اندر داخل ہوتا ہے اور اس تار کا دوسرا کنارہ خانے کے بائیں حصے میں نظر نہ آنے والے چھوٹے سے سوراخ میں جا رہا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ ٹرانزسٹر ریڈیو میں کوئی بم موجود ہے تو یہ چابی ہی اس کا فیوز ہے۔ اگر میں جلد بازی کا مظاہرہ کرتا اور ہدایات ملتے ہی احتیاط کے سارے تقاضوں کو نظر انداز کرتے ہوئے سیل نکال کر چابی کو اٹھانے کی کوشش کرتا تو جھٹکے سے وہ باریک تار ٹوٹ جاتے جو سرسری نگاہ ڈالنے پر دکھائی نہ دیتے تھے۔ پھر شاید ایک دھماکا ہوتا اور میرا وجود ہی باقی نہ رہتا۔ اس کے ساتھ ہی میرے دشمنوں کے بہت سے مسائل کا خاتمہ ہوجاتا۔

میں نے اس ربِّ کریم کا شکر ادا کیا جس نے مجھے زندہ رکھا اور زندہ رہنے کی جدوجہد کے لیے عقل سے کام لینے کی توفیق عطا کی۔ پوری احتیاط سے میں نے تمام سیل سابقہ پوزیشن کے مطابق اسی خانہ میں فٹ کردیے اور بیک کور کو برابر کردیا۔ اس کامیابی نے میرا حوصلہ دشمنوں کے عزائم سے کہیں زیادہ بلند کردیا تھا۔ میرے لیے دامِ اجل بچھانے والے شکاری تدبیر کرچکے تھے کہ میرا کام تمام کردیا جائے اور انہیں یقین بھی ہوگا کہ وہ میرا پتّا کاٹ دیں گے۔ بعد میں دوسرے مسائل پیدا ہوں گے مثلاً رابعہ اور محسن میرے قتل کو واقعات کے پرانے سلسلے کا نتیجہ قرار دیں گے اور یہ بات ثابت کرنے کی کوشش بھی کریں گے کہ میرا برطانیہ سے اخراج، وزیر خان کی پُراسرار موت۔ مجھ پر میر شرافت علی کے قتل کا الزام اور بالآخر میرا قتل ایک ہی سازش تھی اور یہ سازش کرنے والے وہ لوگ تھے جو ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس کو بلا شرکتِ غیرے اپنی ملکیت میں لینا چاہتے تھے تاکہ وہ ایک جائز کاروبار کے نام پر اپنی مجرمانہ سرگرمیاں جاری رکھ سکیں لیکن یہ سب کچھ ثابت کرنا جوئے شیر لانے سے بھی زیادہ کٹھن کام ثابت ہوتا۔ بالفرضِ محال وہ ہر جرم کا ثبوت فراہم کر دیتے اور ہر مجرم کو کیفرِ کردار تک پہنچا دیتے تب بھی یہ ان کی شکست ہی ہوتی کیونکہ اس سے نہ مجھے میری زندگی واپس مل سکتی تھی اور نہ وہ حق حاصل ہوتا تھا جس کے لیے ہماری سب جدوجہد تھی۔ اس وقت مجھے یہ خیال بھی آیا کہ جدوجہد کو جاری رہنا چاہیے خواہ میں خود رہوں یا نہ رہوں۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں نے ایک جھوٹ بولا تھا کہ میرے بعد حقِ وراثت خود بخود رابعہ کے نام منتقل ہوجائے گا اور رابعہ کی وصیت کے مطابق کسی تیسرے شخص کو اور یہ سلسلہ ختم نہیں ہوگا اب میں نے محسوس کیا کہ یہ انتظام مجھے بہت پہلے کرلینا چاہیے تھا۔ یہ ایک ایسا دفاعی نظام تھا جو دشمن کے عزائم کو خاک میں ملا سکتا تھا۔ اب تک وہ سمجھتے تھے کہ مجھے ہراساں کرکے، لالچ دے کر یا اپنے راستے سے ہٹا کر وہ اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کرسکتے ہیں لیکن ان کو یقین آجائے کہ وزیر خان مرحوم کے وارث کے بعد بھی وارث کبھی ختم نہیں ہوں گے اور ایک کے بعد ایک خود کو حقدار ثابت کرنے کے لیے آتے رہیں گے تو پورے کاروبار پر قابض ہونے کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہوگا۔ انہیں سوچنا پڑے گا کہ سکندر بخت کو قتل کرکے فائدہ کچھ نہ ہوا تو مشکلات میں اضافہ کرنے سے کیا حاصل؟ اس کے بعد رابعہ آجائے گی۔ اگر انہوں نے رابعہ کو ٹھکانے لگا دیا تو محسن میدان میں اترے گا۔ محسن کے بعد شہلا آسکتی ہے اور دشمن یہ تصور بھی نہیں کرسکتے کہ میرے وارثوں اور خونِ ناحق کے دعویداروں کا سلسلہ کہاں تک دراز ہوگا۔ جب انہیں احساس ہوگا کہ ان کے مقابل ایک سکندر بخت کے بعد ان گنت سکندر بخت ہیں تو یہی ان کی شکست ہوگی اور یہی میرے لیے تحفظ کی سب سے بڑی ضمانت ہوگی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اس قید خانے سے نکلنے میں کامیاب ہوگیا تو پہلا

کام یہی کروں گا کہ اپنا وصیت نامہ بنوا کے رجسٹر کروا لوں گا۔ محسن یا رابعہ دونوں میں سے کسی ایک کو اپنے بعد اپنا وارث بنا جاؤں گا اور ان سے بھی کہوں گا کہ وہ میری پیروی کرتے ہوئے اپنے اپنے وصیت نامے کے مطابق کسی کو وارث بنائیں۔ اوّل تو دشمن خود ہی جان جائیں گے کہ ہم نے اپنے دفاعی حصار کو ناقابلِ تسخیر بنا دیا ہے ورنہ ہم خود اس کی تشہیر کر کے یہ بات ان تک پہنچا دیں گے۔ انہیں سوچنا پڑے گا کہ سکندر بخت کو مارنا بے سود ہے۔

فوری مسئلہ یہ تھا کہ رہائی کی کیا صورت ہو۔ میں نے ٹرانزسٹر کو ایک طرف رکھ دیا لیکن آف نہیں کیا۔ اس کے ڈائل پر سوئی بھی وہیں رہی۔ اگر میں اسے چھیڑ دیتا تو دشمنوں سے دوبارہ مواصلاتی رابطہ قائم ہونے کے امکانات بالکل ختم ہو جاتے۔ ٹرانزسٹر کی صورت میں میرے پاس دشمن کا ایک ایسا خطرناک ہتھیار بھی آ گیا تھا جسے میں ضرورت پڑنے پر خود دشمن کے خلاف استعمال کر سکتا تھا۔ میں نے زور زور سے دروازہ پیٹا اور اس امید میں "کوئی ہے — کوئی ہے" چلاتا رہا کہ شاید کوئی قریب ہو تو میری آواز سن لے یا خالی کوٹھی کا چوکیدار آ گیا ہو تو متوجہ ہو جائے لیکن میری پکار صدا بہ صحرا ثابت ہوئی۔ کمرے میں ایک کیل تک نہ تھی جسے ڈور لاک میں گھما کر میں دروازہ کھولنے کی کوشش کر سکتا یا دیوار کھرچ کے پلاسٹر ہٹانے کے بعد ایک اینٹ نکال سکتا۔ یہ کام مشکل ضرور تھا مگر ناممکن نہیں تھا۔ ایک کیل سے دیوار میں شگاف کرنا حوصلے، مستقل مزاجی اور وقت کی بات تھی۔ چوبیس گھنٹے کی محنت سے یہ کام ہو سکتا تھا۔ میں نے دوسری جنگِ عظیم میں قید خانوں سے فرار ہونے والوں کی ناقابلِ یقین مگر سچی کہانیاں پڑھی تھیں جو کھانے کے ایک چمچے، ٹین کے ایک ٹکڑے جیسی چاقو، یہاں تک کہ صرف ناخنوں کی مدد سے مہینوں کی محنت کے بعد سرنگ بنا کے نکل گئے تھے۔ میں نے اطمینان سے بیٹھ کر دیوار کا سہارا لیا۔ فرش پر پاؤں پھیلائے اور سگریٹ جلا کے اپنے مسائل اور وسائل کا جائزہ لینے لگا۔ پین ٹارچ ختم ہونے کے قریب تھی اور میرے کسی کام نہیں آ سکتی تھی۔ ماچس کی چند تیلیوں سے میں دروازے میں آگ نہیں لگا سکتا تھا۔ میرے پاس ایسی کوئی چیز نہیں تھی جس سے ڈور لاک کے اسکرو کھولے جا سکیں۔ یہ امید رکھنا فضول تھا کہ محسن یا رابعہ مجھے تلاش کرتے ہوئے آ جائیں گے۔ زیادہ امید اس بات کی تھی کہ وہ خود بھی کسی نامعلوم مقام پر قید ہوں گے۔

"سکندرِ اعظم!" ٹرانزسٹر ریڈیو کے اسپیکر نے اچانک کہا۔ "کیا اب بھی زندگی کی آس لگائے بیٹھے ہو؟ جہاں تم ہو وہاں کوئی نہیں آ سکتا۔ تم جواب کیوں نہیں دیتے؟"

میں جواب دیتے دیتے رک گیا۔ مجھے خیال آیا کہ دوبارہ رابطے کی کوشش کا مقصد اس بات کی تصدیق کرنا ہو سکتا ہے کہ میں زندہ ہوں یا ان کی پُرفریب سازش کا شکار ہو چکا ہوں۔ اگر میں بول پڑتا تو انہیں فوراً معلوم ہو جاتا کہ ان کی چال ناکام ہو گئی ہے اور میں ٹرانزسٹر ریڈیو میں پوشیدہ بم کے راز سے واقف ہو چکا ہوں یا میں نے ابھی تک ٹرانزسٹر کھول کے چابی نکالی ہی نہیں ہے۔

"کیا بات ہے سکندر بخت! بات کرنا نہیں چاہتے؟"

"مُردے بات نہیں کرتے...!" دوسری آواز میں کسی نے گالی دی اور ایک قہقہہ سنائی دیا۔

"بکواس مت کرو۔ کیا معلوم وہ جان بوجھ کر خاموش بیٹھا ہو۔" یہ آواز ڈی سلوا کی تھی۔

"یہ ناممکن ہے استاد... اس نے فوراً چابی نکالی ہو گی دروازہ کھولنے کے لیے۔"

"فرض کرو اس نے...؟" ڈی سلوا بولا۔

"فرض کیا کرنا استاد! چابی نظر آنے کے بعد یہ ناممکن ہے کہ اس کا خیال کسی اور طرف گیا ہو۔" دوسرے نے اس کی بات کاٹ دی۔

"دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہوتا۔" ڈی سلوا نے کہا۔ "دھماکے کی آواز نہیں آئی۔"

"ارے استاد! تو بھی کس چکر میں پڑ گیا خواہ مخواہ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس نے چابی نہ اٹھائی ہو اور بعد میں خیال آیا ہو گا کہ چابی کے ساتھ تار بھی بندھے ہوتے ہیں تو اس خیال سے پہلے ہی تار ٹوٹ چکے ہوں گے۔ تار بہت باریک اور کمزور تھے۔ ایک معمولی سے جھٹکے میں ٹوٹ جانے والے۔ اسے مہلت ہی کہاں ملی ہو گی کہ چابی واپس رکھ دے۔"

"اتنا تو میں بھی سمجھتا ہوں لیکن میں فرض کرنے کا قائل نہیں۔ ہمیں خود جا کے دیکھنا پڑے گا۔" ڈی سلوا اپنی بات پر اڑا رہا۔

"تمہاری یہی مرضی ہے تو چلو۔"

آوازیں کم سے کم تین افراد کی تھیں۔ میری خاموشی نے ان کو اپنی کامیابی کا یقین تو دلا دیا تھا لیکن ان کا استاد کیا کام کرنے کے خلاف تھا۔ اب وہ دیکھنے آ رہے تھے کہ کیا خاموشی کا مطلب کامیابی ہے اور ان کا ٹرانسمیٹر ریسیور دھماکے کے بعد نیست و نابود ہو چکا ہے یا اس میں کوئی خرابی واقع ہو گئی ہے؟

دیکھنا اب یہ تھا کہ وہ کتنے قریب آ کر تصدیق کرتے ہیں۔ آخر ٹرانزسٹر میں کتنا بڑا بم رکھا جا سکتا ہے؟ اس کے اندر خالی جگہ زیادہ نہیں ہوتی اور اس میں اتنا آتش گیر مادہ نہیں بھرا جا سکتا جو آر سی سی پر بنے ہوئے کمرے کی دیواریں ڈھا دے لیکن ایک آدمی کو ہلاک کرنا کوئی مشکل کام نہیں خصوصاً اس شخص کو جو ٹرانزسٹر ہاتھ میں لیے کھڑا ہو۔ پھر کیا وہ اندر آ کے دیکھیں گے؟ نہیں... وہ دور سے ہی اندازہ کر لیں گے کہ دھماکا ہوا کہ نہیں۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ دھماکے سے دیواریں نہ گریں لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ دھماکا آس پاس نہ سنا جائے اور لوگوں کو متوجہ نہ کرے۔ جب وہ دیکھیں گے کہ ویران کوٹھی بدستور ویران پڑی ہے اور آس پاس لوگ جمع نہیں ہیں تو ان کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوئے اور یا تو میں عمداً خاموش رہا تھا یا میں نے مواصلاتی رابطہ منقطع کر دیا تھا۔ سیل نکال کر، سوئی آگے پیچھے کر کے یا صرف ٹرانزسٹر ریڈیو کو آف کر کے رابطہ ختم کیا جا سکتا تھا۔

یہ خیال بہت حوصلہ شکن تھا کہ دشمن دور ہی سے لوٹ جائیں گے۔ اگر وہ اندر آتے تو ان سے مقابلہ کر کے باہر نکلنے کا راستہ بنایا جا سکتا تھا۔ اس مقابلے میں میرا مارا جانا بھی ممکن تھا لیکن یہ موت زیادہ قابلِ قبول تھی۔ بصورتِ دیگر مجھے اسی اسٹور روم کی ویرانی میں بھوک اور پیاس کا طویل عذاب جھیل کر مرنا تھا۔ ایک بار پھر میرا ذہن ٹرانزسٹر کی طرف گیا۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ اس میں جو بم یا آتش گیر مادہ بھرا ہوا ہے۔ اس کی ہلاکت کا دائرہ بھی محدود ہے، اس سے وہ شخص یقیناً ہلاک ہو سکتا ہے جو اس کے بہت قریب ہو لیکن اگر وہ خود دور ہو پھر؟ اچانک میں نے آزادی کی روشنی کو یوں پھیلتے دیکھا جیسے صبحِ کاذب کے دھندلکے میں صبحِ صادق کا اجالا پھیلتا ہے۔ مایوسی کے گھپ اندھیرے میں ایک کرن روشن ہو گئی۔ ذہن کے بند دروازے کھلتے گئے اور ایک قابلِ عمل خیال نے میرے ذہن میں جگہ بنا لی۔

جو کچھ میں نے سوچا تھا وہ بھی پُرخطر تھا۔ جان جانے کے امکانات اس میں بھی تھے مگر یہ امکانات صفر سے بڑھ کر پچاس فیصد ہو گئے تھے۔ کچھ کیے بغیر مرنے سے کچھ کر کے مرنا بہتر تھا۔ پہلے میں نے اپنی قمیص اتاری لیکن کچھ سوچ کے اس کو پھاڑنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ پتلون کے نیچے میں نے انڈرویئر پہن رکھا تھا جس میں دو فٹ سے زیادہ لمبا الاسٹک تھا۔ میں نے پتلون کو بغیر انڈرویئر کے پہنا اور اس کا الاسٹک نکال لیا۔ یہ پتلا سا الاسٹک کھینچنے سے دوگنا لمبا ہو جاتا تھا۔ قمیص کو پھاڑنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں نے بڑی صفائی سے بنیان کو پھاڑا اور اس کی گولائی سے انچ چوڑی کئی پٹیاں نکالیں۔ ان سب پٹیوں کو گرہ لگا کر آپس میں جوڑنے سے ایک اتنی لمبی پٹی بن گئی جو کمرے کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک [illegible] تھی۔

اب دوسرا مرحلہ درپیش تھا جو سب سے زیادہ خطرناک تھا لیکن کامیابی کی امید نے مجھے ذہنی اور جسمانی طور پر پوری طرح چاق و چوبند اور مستعد کر دیا تھا۔ میں نے ایک بار پھر ٹرانزسٹر ریڈیو کا سیل والا خانہ کھولا اور سارے سیل نکال دیے۔ ڈور لاک کی وہ چابی میرے سامنے آ گئی جو زندگی کے راستے کھول سکتی تھی مگر مجسم موت تھی۔ بہت آہستہ آہستہ چابی کو ذرا بھی ہلائے بغیر میں نے اس کے نیچے سے اسفنج کی پتلی تہہ کو نوچ کر ہٹانا شروع کیا۔ نرم ربر کے بستر پر یہ چابی کسی لاش کی طرح لیٹی ہوئی تھی۔ ٹرانزسٹر ریڈیو بنانے والی کمپنی نے یہ نرم تہہ اس لیے بچھائی تھی کہ سیل سے پلاسٹک کی باڈی کو نقصان نہ پہنچے۔ میں ایک انگلی اور انگوٹھے کی مدد سے تھوڑا تھوڑا فوم ربر نوچتا رہا۔ تقریباً دس منٹ تک میری جان سولی پر اٹکی رہی۔ اگر غلطی سے بھی میری انگلی سے چابی کو جھٹکا لگ جاتا تو کوئی نہ کوئی تار ٹوٹ جاتا۔ بالآخر میں چابی کے درمیانی حصے کے نیچے سے فوم ربر صاف کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اب چابی کے نیچے تین سوت کا خلا پیدا ہو گیا تھا۔ میں نے انڈرویئر میں سے نکلنے والے گول الاسٹک کا ایک سرا اس خلا میں سے گزارا۔ خالی جگہ تقریباً اتنی ہی تھی جتنی الاسٹک کی گولائی۔ آہستہ آہستہ دبانے سے الاسٹک کا سرا دوسری جانب بڑھتا گیا۔ جب اس کی لمبائی چار انچ کے قریب ہو گئی تو میں نے سرے کو تھام کر باقی الاسٹک کے ساتھ وہ گرہ لگائی جو کھینچنے سے کھلنے کے بجائے اور ٹائٹ ہو جائے۔ جب کام مکمل ہو گیا تو میں نے اطمینان کا گہرا سانس لیا اور اس وقت مجھے اپنے ماتھے پر پسینے کی نمی کا احساس ہوا۔ میرا آدھے سے بھی کم رہ جانے والا بنیان قریب ہی پڑا تھا۔ اس سے میں نے ہاتھ اور منہ صاف کیے اور آخری مرحلے کے لیے تیار ہو گیا۔

میں نے ٹرانزسٹر کو ایک دروازے سے ملا کر رکھا اور الاسٹک کے لمبے حصے کے ساتھ وہ ڈوری بھی منسلک کر دی جو میں نے بنیان پھاڑ کے بنائی تھی۔ پوری احتیاط کے ساتھ میں اس ڈوری کو مخالف سمت میں آخری گوشے تک لے گیا۔ اب میرے اور اس بم کے درمیان تقریباً بارہ فٹ کا فاصلہ تھا۔ زمین پر الٹا لیٹ کر میں نے وہ پوزیشن اختیار کی جس سے میرا چہرہ، سر اور بازو محفوظ ہو گئے۔ میں اب کونے میں منہ دیے سجدے کی حالت میں پڑا تھا۔ اللہ کا نام لے کر میں نے ڈوری کو کھینچنا شروع کیا۔ ڈوری میں بہت لچک تھی۔ بنیان کے ٹکڑے بھی الاسٹک کی طرح کھنچ رہے تھے۔ میں ڈوری کو ایک ایک انچ تک کھینچتا گیا۔ ہر بار میرا دل بڑے زور سے

دھڑکتا تھا اور میں چند سیکنڈ کے بعد ڈوری کو کچھ اور کھینچ لیتا تھا جب دھماکہ ہوا تو مجھے یوں لگا جیسے میرے کانوں کے پردے پھٹ گئے ہوں۔ خالی کمرے میں اس کی گونج زیادہ سنائی دی تھی مگر اس کے ساتھ ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ سب خیریت ہے۔ نہ میں زخمی ہوا ہوں اور نہ مجھ پر کمرے کی دیواریں گری ہیں میرا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ بم زیادہ بڑا نہیں تھا مگر اتنا چھوٹا بھی نہیں تھا۔ اگر ٹرانزسٹر میرے ہاتھ میں ہوتا تو میرا حشر بھی وہی ہوتا جو اب دروازے کا ہوا تھا۔ اس کا نچلا حصہ صاف اڑ گیا تھا۔ قبضے اور سلاک کے نکل جانے سے دروازہ صرف اوپر کے ایک قبضے پر قائم رہ گیا تھا اور ٹیڑھا ہو گیا تھا۔ آتش گیر مادے سے چوکھٹ کی خشک لکڑی نے بھی آگ پکڑ لی تھی اور پٹ بھی جل رہا تھا۔ بم کے ٹکڑے قریب کی دیوار پر خراش ڈالتے ہوئے گزرے تھے لیکن آخری کونے تک پہنچتے پہنچتے ان کی قوت کچھ کم ہو گئی تھی اور جو ٹکڑے وہاں تک پہنچے تھے وہ بھی بہت اوپر کے حصے میں لگے تھے۔ ٹرانزسٹر یا اس ٹرانسمیٹر ریڈیو کا نام و نشان تک نہ رہا تھا۔ میں نے آدھی بنیان کے ٹکڑے کو بھی جلتے دیکھا اور دروازے کی طرف لپکا۔ چوکھٹ اب آگ کا ایک حلقہ تھی اور میری راہ میں دروازے کا وہ پٹ بھی ایک رکاوٹ تھا جس کی خشک لکڑی سے شعلے اٹھ رہے تھے لیکن میں نے دوڑتے ہوئے جست لگائی اور اس آگ میں سے سرکس کے بازیگر کی طرح صاف گزر گیا۔ باہر گرتے ہی میں پھر اٹھ کر بھاگا۔ دھماکے نے آس پاس کھلبلی مچا دی تھی۔ مجھے تین طرف سے لوگ دوڑتے ہوئے نظر آئے چنانچہ میں نے چوتھی طرف کا رُخ کیا۔ آگ کے پورے مکان میں پھیلنے کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ کیونکہ دروازے کے آس پاس صرف دیواریں تھیں۔ دوسرے دروازے اور کھڑکیاں شعلوں کی دسترس سے دور تھے مگر اندھیری رات میں یہ آگ بھی کسی الاؤ کی طرح سب کو متوجہ کرتی تھی۔ میں ایک درخت کے پیچھے چھپ گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں ایک مختصر سا ہجوم ہو گیا۔ ہجوم میں زیادہ تعداد نوکروں کی تھی جو آس پاس کی کوٹھیوں میں کام کرتے تھے۔ انہوں نے ذرا سی دیر میں دروازے کی آگ بجھا دی۔ نہ جانے کہاں سے ان کو پینٹ کے خالی ڈبے مل گئے تھے اور یہ ڈبے انہوں نے اندر ہی کے نلکوں سے بھر لیے تھے۔ اب وہ ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ دھماکا کیسا تھا؟ آگ کیسے لگی ہے؟ یہاں تو نہ آدمی ہے نہ آدم زاد۔

سڑک پر دو تین گاڑیاں رک گئی تھیں۔ اچانک میں نے رابعہ کی سرخ خستہ حال فوکس ویگن کو بھی سڑک پر رکتے دیکھا۔ میں درخت کی اوٹ سے نکلا اور ابھی وہ دونوں گاڑی سے نکلے ہی تھے کہ میں ان کے پاس جا پہنچا۔ وہ دونوں مجھے دیکھ کر ششدر رہ گئے۔

"تم؟" ان دونوں نے غیر ارادی طور پر ایک ساتھ کہا۔

"ہاں میں۔" میں نے اگلی سیٹ اٹھا کر پیچھے کی سیٹ پر جمپ لگاتے ہوئے کہا۔ "پہلے یہاں سے نکل چلو پھر بات کریں گے۔"

وہ فوراً اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے اور محسن نے گاڑی چلا دی۔ پیچھے کھڑی ہوئی ایک سفید کار میں سے کوئی شخص چلایا "روکو اسے۔" لیکن پھر کسی کا انتظار کیے بغیر وہ گاڑی لے کر ہمارے پیچھے دوڑا۔ اس نے مجھے کوٹھی میں سے بھاگ کر آتے دیکھا تھا۔ فوکس ویگن صرف ایک منٹ کے لیے رکی تھی اور مجھے لے کر روانہ ہو گئی تھی چنانچہ وہ شخص یہ سمجھنے میں حق بجانب تھا کہ میں ہی دھماکے اور آتش زنی کا ذمہ دار ہوں اور وہ میرے ساتھی تھے جو عین وقت پر مجھے لے کر فرار ہو رہے تھے۔

"اس کی تو ایسی کی تیسی۔" محسن نے کہا۔ "ہم سے دوڑ لگائے گا؟" اس نے گاڑی کی رفتار ایک دم بڑھا دی۔ ٹوٹی پھوٹی نظر آنے کے باوجود فوکس ویگن اپنے انجن کی کارکردگی کے اعتبار سے بہت بہتر تھی۔ رات کے وقت سڑکیں خالی ہونے کا فائدہ بھی ہوا۔ دس منٹ میں محسن نے دائیں بائیں کئی موڑ کاٹے۔ اس وقت تک ہمارے تعاقب میں آنے والا بہت پیچھے رہ گیا تھا اور شاید مایوس ہو کر 'مجرموں' کو پکڑنے کا ارادہ بھی ترک کر چکا تھا۔ محسن نے سامنے کے آئینے میں دیکھ کر اپنا اطمینان کیا اور رفتار کم کر دی۔

"سکندر تم زخمی ہو؟" رابعہ نے پیچھے مڑ کر تشویش سے کہا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔" میں نے بشاشت سے کہا۔ "تم نے مجھے دوڑتے نہیں دیکھا تھا؟"

"لیکن تمہارے ہاتھوں پر خون کے داغ ہیں۔" رابعہ نے کہا۔ "اور تمہارے کپڑوں پر بھی۔"

"وہ معمولی خراشیں ہیں، فکر کی کوئی بات نہیں۔" میں نے کہا۔ "اب یہ بتاؤ کہ اس فلمی طریقہ پر تم دونوں وہاں کیسے پہنچے؟"

"ہم تو بہت دیر سے ادھر ادھر بھٹکتے پھر رہے تھے۔" محسن بولا۔ "جب دھماکا ہوا تو ہم دوسری سڑک پر تھے۔ رابعہ نے کہا کہ محسن یہ دھماکا کیسا تھا؟ اور میں نے اندازے سے گاڑی ادھر موڑ لی۔ پھر مجھے آگ لگی ہوئی نظر آ گئی۔"

"یہ تو ٹھیک ہے مگر تم اس علاقے میں کیسے پہنچے؟"

میں نے پوچھا۔

"ہم رابعہ کے آفس سے نیچے تو اتر آئے تھے۔" محسن نے کہا۔ "مگر نیچے ایک گاڑی کھڑی تھی اور اس میں ایک شخص ریوالور لیے بیٹھا تھا۔ اس نے ہمیں روک لیا۔ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا۔ پھر اس گاڑی میں دو آدمی آ بیٹھے اور گاڑی روانہ ہو گئی۔ ہمیں دوڑ کر اپنی کار تک پہنچنے میں کچھ دیر لگی لیکن میں نے گاڑی پیچھے لگا دی تھی۔ گاڑی کا نمبر تو میں نے نوٹ نہیں کیا تھا لیکن دو نشانیاں دیکھ لی تھیں۔ ایک یہ کہ سیدھے ہاتھ کی ٹیل لائٹ ٹوٹی ہوئی ہے اور دوسری یہ کہ اس کا رنگ لال ہے۔ زمزمہ کے پاس میں نے اس گاڑی کو پہچان لیا۔ وہاں پیچھا کرنا آسان تھا کیونکہ آس پاس بہت سی گاڑیاں تھیں۔ میں نے نوٹ کیا کہ گاڑی زیادہ رفتار سے نہیں جا رہی تھی اور مسلسل ایک دوسری گاڑی کے پیچھے چل رہی تھی۔ میں نے دونوں گاڑیوں کے نمبر دیکھ لیے اور آگے جا کے تصدیق ہو گئی کہ وہ دونوں گاڑیاں ساتھ ساتھ ہیں۔ جب غیر آباد علاقہ آیا تو لال گاڑی نے اپنی ہیڈ لائٹس آف کر دیں اور ہمارے لیے بھی کم فاصلے سے پیچھے لگے رہنا مشکل ہو گیا۔ ہم تقریباً ایک فرلانگ دور رہے اور ہم نے بھی ہیڈ لائٹس بند رکھیں لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انہیں کچھ شک ہو گیا تھا۔ وہ ہمیں ڈاج دے کر نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ ہم اس علاقے میں تو پہنچ ہی گئے تھے۔ اچانک ایک گاڑی ہمارے سامنے سے نمودار ہوئی اور سیدھی گزر گئی۔ اس کی ہیڈ لائٹس ٹوٹی ہوئی تھیں۔ اندھیرے میں ٹکر ہو جاتی، چنانچہ میں نے لائٹس جلا دیں۔ آخری وقت میں مجھے اندازہ ہوا کہ یہ تو وہی گاڑی ہے جو لال گاڑی کے آگے آگے چل رہی تھی لیکن اب وہ واپس جا رہی تھی اور اس کی رفتار اتنی زیادہ تھی کہ میرے کسی فیصلے پر پہنچنے سے قبل ہی وہ غائب ہو گئی۔ اس کا کہیں ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا؟"

"ہاں اس کا ذمے دار میں ہوں۔" میں نے کہا۔ "گاڑی رکنے کی کوئی اور صورت نہیں رہی تھی۔"

"اس طرح گاڑی رکنے سے پہلے آپ نے غور فرما لیا تھا کہ آپ خود بھی ٹوٹ پھوٹ سکتے ہیں؟" رابعہ نے کہا۔

"غور فرما لیا تھا۔" میں نے کہا۔ "لیکن مرتا کیا نہ کرتا۔ میرے لیے یہ خطرہ مول لینے کے سوا چارہ ہی کیا تھا اور خطرات تو اب زندگی کا ایک ایسا جزو بن گئے ہیں کہ خوف کا کوئی مفہوم نہیں رہا۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ جس روز ہماری زندگی کے حالات معمول پر آ گئے اور کوئی خطرہ باقی نہ رہا اس روز یہ زندگی بالکل بے کیف اور سپاٹ ہو جائے گی۔ بالکل عام لوگوں کی زندگی کی طرح کہ بقول —

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے۔ عمر یونہی تمام ہوتی ہے"

"تمہارے لیے عام آدمی کی زندگی بے مصرف اور غیر دلچسپ ہے؟" رابعہ نے کہا۔ "اس لیے کہ وہ معمولات کے مطابق جیتے ہیں؟ ان کے لیے جینے میں کوئی مسرت کی بات نہیں ہے کیونکہ اس میں خطرات کی سنسنی خیزی نہیں ہے؟ کیسا عجیب فلسفۂ حیات ہے تمہارا۔ لوگ تو قدم قدم پہ خوشیوں کے خزانے تلاش کر رہے ہیں کیونکہ خوشی تو صرف ایک احساس کا نام ہے۔ تمہاری بات کا مطلب تو یہ نکلتا ہے کہ خوبیٔ تقدیر سے تم زندہ رہے تو بڑی بدبختی یہ ہوگی کہ تمہارا احساس مر جائے گا۔"

"یہ وکیلوں کی طرح الفاظ سے غلط مطلب اخذ کرنے کا کمال دکھایا ہے تم نے۔" میں نے کہا۔ "حالانکہ آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ میں آدمی ہوں مشین نہیں چنانچہ میں جذبات سے محروم نہیں، پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ سنسنی خیز مسرت کا وہ احساس مجھے نہ ہو جو ہر کامیابی عطا کرتی ہے، وہ محبت عطا کرتی ہے جس میں دردِ فرقت کے بعد شبِ وصل کی راحت کا یقین ہو۔ جو تخلیق کے غرور سے ملتی ہے۔ لفظ ساز سے، رنگ سے اور خوشبو سے۔ یہاں تک کہ ایک ایٹم بم گرا کے لاکھوں انسانوں کو مار دینے کے بعد فتح کے اعلان سے ملتی ہے۔"

"تم دونوں خبطی اور جھکی ہو۔" محسن نے جھنا کے کہا۔ "ذرا موقع ملا اور پٹری سے اتر گئے۔ ملاحظہ ہو کہ بات کیا ہو رہی ہے۔ ارے بابا یہ سوچو کہ رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت۔"

"تو نے تو مجھے حیران کر دیا یار!" میں نے ہنس کر کہا۔

"ہم لوگ غصے میں انگریزی بولتے ہیں تو فارسی بولتا ہے۔"

"ابھی یہ انگریزی فارسی سب دھری رہ جائے گی۔" محسن نے اسی لہجے میں کہا۔ "جب رضوی صاحب یہ پوچھیں گے کہ آخر سواری کہاں سے تشریف لا رہی ہے اور جناب کا یہ حلیہ کیا ہو رہا ہے؟"

"ایک صورت تو یہ ہو سکتی ہے کہ گھر پہنچتے ہی تم دونوں فرار ہو جاؤ۔" رابعہ نے کہا۔ "میں اتر کر اندر چلی جاؤں گی اور میرا بیان صاف ہوگا کہ آفس سے آ رہی ہوں۔ تم دونوں شریفانہ حلیہ بنا کے کچھ دیر بعد آ سکتے ہو۔ بہانے بنانے تو تمہیں آتے ہی ہیں۔"

"بجا ارشاد!" میں نے کہا۔ "لیکن فرض کرو رضوی صاحب

ہمیں باہر ہی مل گئے۔ انتظار اور اضطراب میں ٹہلتے ہوئے تو گاڑی سے اترتے ہی وہ ہمیں دیکھ لیں گے اور پھر وہی ہوگا یعنی مجھے کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے۔ ہمارا جھوٹ نہیں چلے گا، اس لیے میں ترکیب نمبر دو عرض کرتا ہوں۔ یعنی مس رابعہ کے پروگرام پر عملدرآمد کا موقع نہ ملا تو پھر سب سے مناسب یہی ہوگا کہ حقیقتِ حال عرض کر دی جائے۔ اس میں آخر نقصان ہی کیا ہے۔"

"میں اتفاق کرتا ہوں۔" محسن بولا۔ "لیکن حقیقتِ حال میں سے استاد ٹیڈی کو خارج کر دیا جائے۔ باقی سب وہی ہو جو ہوا اور سب نے دیکھا۔ رضوی صاحب جانتے ہیں کہ ہمارے دشمن کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں اب تک کیا کر چکے ہیں اور آئندہ کیا کر سکتے ہیں۔ وہ ہمارے سامنے سکندر کو اغوا کر کے لے گئے تھے۔ ہم نے تعاقب کیا، باقی سکندر خود بتا دے گا۔"

رضوی صاحب باہر نہیں تھے ان کے کمرے کی لائٹ جل رہی تھی جس کا مطلب تھا کہ وہ جاگ رہے ہیں۔ کوئی اور گاڑی ہوتی تو ہم خاموشی سے اتر کے ترکیب نمبر ایک پر عمل کر لیتے مگر فوکس ویگن تو دور سے اپنی آمد کا اعلان کرتی ہے۔ ابھی ہم نے گاڑی روکی بھی نہیں تھی کہ وہ باہر نکل آئے۔

"آ گئے آپ لوگ؟" انہوں نے ہمیں مجرموں کی طرح خاموش کھڑا دیکھ کر کہا۔ "وقت کیا ہو رہا ہے؟"

ہم نے باری باری ایک دوسرے کی صورت دیکھی۔ سب کی صورت پر بارہ بج رہے تھے مگر گھڑیوں میں ایک بج کر دس منٹ ہو رہے تھے۔

"ہم ایک مصیبت میں پھنس گئے تھے انکل!" رابعہ نے ہمت سے کام لے کر کہا۔

"یہ اندازہ تو سکندر کا حلیہ دیکھ کے بھی ہو جاتا ہے۔" وہ ناراضگی سے بولے۔ "مصیبت یہ ہے کہ تم لوگ مصیبت سے دامن بچا کے نکلنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔ خود مصیبت میں گرفتار ہونے چلے جاتے ہو۔ آج کیا ہو گیا تھا؟ خیر بعد میں بتانا، پہلے اندر آؤ۔ کوئی خطرے کی بات تو نہیں ہے نا؟"

"بس آج خدا نے بچا لیا ہم کو۔" رابعہ نے اندر پہنچنے کے بعد کہا۔ "کچھ لوگ سکندر کو اغوا کر کے لے گئے تھے۔"

"اچھا تم جاؤ اپنا حلیہ ٹھیک کرو۔" رضوی صاحب نے مجھ سے مخاطب ہو کے کہا۔ "کھانا وغیرہ کھایا ہے یا نہیں؟"

"ابھی تک تو دھکے ہی کھائے ہیں۔" رابعہ نے دبے دبے لہجے میں کہا۔ "اور اب آپ کی جھاڑ کھا رہے ہیں۔"

رضوی صاحب مسکرائے۔ "اچھا تم بھی جاؤ اور دیکھو! کھانے پینے کا کیا انتظام ہو سکتا ہے۔ میں محسن سے بات کرتا ہوں۔"

تقریباً پندرہ منٹ بعد میں نہا دھو کر خراشوں کو ڈیٹول سے صاف کر کے اور کپڑے بدل کے واپس پہنچا تو محسن خاموش بیٹھا تھا اور رضوی صاحب ایک ہاتھ نائٹ گاؤن کی جیب میں ڈالے اور دوسرے ہاتھ میں پائپ لیے کھڑے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ رضوی صاحب نے اپنا سارا غصہ محسن پر اتار لیا ہے۔ پانچ منٹ بعد رابعہ ٹرے اٹھائے اندر آئی اور ہم بلا تکلف کھانے میں لگ گئے۔ رضوی صاحب نے آدھی کہانی محسن کی زبانی سن لی تھی۔ اپنے قید ہونے اور قید سے نکلنے کا احوال میں نے کھانے کے دوران میں بتا دیا۔ رضوی صاحب سنتے رہے اور کمرے میں ٹہلتے رہے۔ رابعہ کچن میں چائے کے لیے پانی رکھ آئی تھی۔ کھانے کے برتن سمیٹ کر وہ چائے بنانے کے لیے چلی گئی۔

"تم دوبارہ اس مکان تک پہنچ سکتے ہو؟" رضوی صاحب نے کہا۔

"براہِ راست تو نہیں پہنچ سکتا۔" میں نے کہا۔ "اس لیے کہ رات کا وقت تھا اور وہ نئی آبادی ہے۔ سب سڑکیں ایک جیسی لگتی ہیں لیکن گھوم پھر کر دیکھا جائے تو عین ممکن ہے کہ میں کوٹھی کو دیکھ کر پہچان لوں۔ اس کے علاوہ آس پاس کے رہنے والوں سے بھی مدد مل سکتی ہے۔ دھماکا دور تک سنا گیا تھا اور بہت سے لوگوں نے دروازے کی آگ بھی دیکھی تھی۔"

رضوی صاحب نے اقرار میں سر ہلایا۔ "جہاں تک میرا خیال ہے دونوں کاریں چرائی گئی ہوں گی یا ان کی نمبر پلیٹ بوگس ہوں گی۔ مکان کے اصل مالک سے کچھ پوچھنے کا کوئی فائدہ نظر نہیں آتا لیکن جائے واردات پر... میرا مطلب ہے اس کمرے میں سے بم کے ٹکڑے مل سکتے ہیں اور ان سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ بم کس کا تھا۔ ہمارے ریکارڈ پر بہت سے ماہرین کے نام ہیں جو پس پردہ رہ کر مجرموں کی مدد کرتے ہیں مثلاً جعلی دستاویزات بنانے والے۔ خصوصاً پرانی تاریخوں کے اسٹامپ پیپر فروخت کرنے والے۔ عدالتوں کی مہریں اور دستخط بنانے کے ماہر۔ ہر قسم کی روشنائی تیار کرنے والے۔ جھوٹے گواہ اور ضامن فراہم کرنے والے... لیکن یہ کچھ دہشت گردی کا کیس ہے۔ ہمارے ملک میں تو کوئی دہشت پسند تنظیم موجود نہیں مگر دوسرے ملکوں میں ہر نظریے کے یا حکومت کے حامی اور مخالفین کی خفیہ تنظیم ہے مثلاً بلیک ستمبر یا بلیک سنڈے۔ اور ان کا دائرہ کار بہت وسیع ہے۔ ان کے پاس اتنے فنڈز ہیں کہ وہ ہر قسم کا اسلحہ اور ماہرین کی خدمات بھی حاصل کر لیتے ہیں۔ قتل و خونریزی تو ہمارے ملک میں بھی ہوتی ہے لیکن اس کے بیشتر اسباب وہی پرانے ہیں یعنی زر، زمین اور زن کے جھگڑے جن میں روایتی ہتھیار استعمال ہوتے ہیں۔ لاٹھی، خنجر یا بندوق اور ریوالور مگر ٹرانزسٹر ریڈیو کے اندر بم چھپانا تو خصوصی فنی مہارت کا کام ہے۔ ریڈیو کو دو طرفہ مواصلاتی رابطے کے قابل بنانا کوئی مشکل کام نہیں۔ کوئی بھی اچھا ریڈیو مکینک عام پرزوں کی مدد سے ریڈیو بھی اسمبل کر سکتا ہے اور ٹرانسمیٹر بھی۔ لیکن ٹرانسمیٹر رکھنا ہمارے قوانین کے مطابق بہت سنگین جرم ہے۔ یہ بڑی آسانی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ نشریات کہاں سے جاری ہیں۔ ہمارے پاس آلات ہیں جو ریڈیو کی لہروں کی اسی طرح نشاندہی کر دیتے ہیں جیسے قطب نما کی سوئی شمال کی نشاندہی کرتی ہے اس لیے یہاں کوئی شخص ٹرانسمیٹر بنانے یا رکھنے کی جرأت نہیں کرتا۔ تاہم یہ آسان کام ہے۔ اس کے اندر بم چھپانا اور فیوز لگانا دوسری قسم کی مہارت ہے۔ یہ کام کوئی سابق فوجی ماہرِ اسلحہ کر سکتا ہے لیکن میں وطن کے محافظوں سے ایسی ضمیر فروشی کی توقع نہیں رکھتا۔ زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ سرحد پار سے ہمارے دشمنوں کے ایجنٹ آ گئے ہوں لیکن ابھی تک تخریب کاری کی کوئی واردات بھی نہیں ہوئی ہے۔"

"آپ ایک حقیقت کو فراموش کر رہے ہیں انکل!" میں نے کہا۔ "ڈی سلوا کا رابطہ باہر کی دنیا سے بھی ہے اور وہ خود بھی باہر آتا جاتا رہتا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ سامان وہ باہر سے لایا ہو۔"

"ہاں یہ بھی ہو سکتا ہے۔" رضوی صاحب نے سوچتے ہوئے کہا۔ "اور اس سے یہ نتیجہ بھی نکالا جا سکتا ہے کہ ان کے پاس مزید تباہ کن اسلحہ موجود ہے۔ تمہیں یقین ہے کہ تم نے ڈی سلوا کی آواز پہچان لی تھی؟"

"مجھے کوئی شبہ نہیں۔" میں نے پورے یقین کے ساتھ کہا۔ "دوسری گاڑی میں ڈی سلوا ہی تھا۔"

رابعہ چائے لے کر اندر آ گئی اور رضوی صاحب بھی بیٹھ گئے تھے۔ تفکرات کے آثار ان کی صورت سے عیاں تھے۔ چائے پیتے ہوئے بھی وہ کچھ سوچتے رہے۔ میں نے محسوس کیا کہ محسن کی حالت غیر ہو رہی ہے۔ اسے میں نے رضوی صاحب کی ناراضگی کا نتیجہ سمجھا۔

"میرا خیال ہے کہ تم کو اس واقعے کی رپورٹ پولیس کو لکھوا دینی چاہیے۔" رضوی صاحب نے کسی فیصلے پر پہنچ کے کہا۔

"تمہیں یقین ہے تو صاف کہو کہ اغوا کرنے والا ڈی سلوا تھا۔ مکان تو ایک گھنٹے میں مل جائے گا اور وہاں گواہ بھی ہوں گے۔ اگر بم کے ٹکڑے دستیاب ہو گئے تو ہماری لیبارٹری کے ماہرین بم کی ساخت کے بارے میں قطعی رپورٹ دے سکیں گے۔ اس کے بعد تفتیش کا رخ موڑا جا سکتا ہے اور ڈی سلوا سے پوچھا جا سکتا ہے کہ بیرونِ ملک وہ کہاں کہاں جا چکا ہے اور اس کا رابطہ کن افراد سے رہا ہے۔ پیرس بہت ہی دہشت پسند سرگرمیوں کا مرکز ہے کیونکہ وہاں ہر جلاوطن کو پناہ مل جاتی ہے اور قوانین کچھ ایسے ہیں کہ جب تک فرانس کو یا عوام کی سلامتی کو خطرہ لاحق نہ ہو ہر شخص کو سب کچھ کرنے کی آزادی ہے۔ اگر تفتیش کے دوران ڈی سلوا خود ہی قبول کرے کہ وہ باہر سے اس قسم کا ممنوعہ سامان لایا تھا اور یہ سامان برآمد ہو جائے تو اسے عمر قید تک ہو سکتی ہے۔ اگر تم رپورٹ لکھوانے کے لیے تیار ہو تو اسی وقت چلے جاؤ۔ رپورٹ میں دیر سے نقصان ہو سکتا ہے۔ صبح پولیس اسے طلب کرے گی اور تمہیں اپنے ساتھ لے جائے گی تاکہ تم جائے واردات کی نشاندہی کر سکو۔"

"رپورٹ لکھوانے سے تو میں نہیں ڈرتا۔" میں نے کہا۔ "لیکن ایک تو پولیس کا طریقۂ تفتیش... اس میں بہت وقت ضائع ہوگا۔ ڈی سلوا اپنے پیسے اور اثر و رسوخ سے پورا فائدہ اٹھائے گا۔ تفتیش کرنے والے، اسلحہ کی رپورٹ دینے والے اور گواہی دینے والے سب اسی معاشرے کے فرد ہیں جس میں رشوت کا مرض کینسر کی طرح جڑ پکڑ چکا ہے۔ معلوم نہیں کتنے سچ سے مکر جائیں گے اور اگر کوئی سچ بولنے والا ہر قسم کے دباؤ کے باوجود اڑا رہا تب بھی یہ مسئلہ فوراً حل نہیں ہوگا۔ کیس عدالت میں چلتا رہے گا اور فیصلہ معلوم نہیں کیا ہوگا۔ میں نہیں چاہتا کہ میری خاطر آپ پولیس پر دباؤ ڈالیں اور خواہ مخواہ اختیارات کے ناجائز الزام سے بدنام ہوں۔ اب بھی دشمنوں کا خیال ہے کہ میں آپ کو ڈھال اور تلوار بنا کے استعمال کر رہا ہوں۔ سازشی ذہن رکھنے والے آپ کے افسرانِ بالا کی رائے کو متاثر کر سکتے ہیں کہ آپ میری پشت پناہ بنے ہوئے ہیں حالانکہ مجھ پر قتل کا الزام ہے۔"

"اس سے میرا کچھ نہیں بگڑ سکتا۔" رضوی صاحب نے برہمی سے کہا۔ "میں عدالت کے معاملات میں تو دخل نہیں دے رہا ہوں۔ مقدمے کا جو فیصلہ ہونا ہے وہ ہو جائے گا۔ فرض کرو قتل کا الزام میرے بیٹے یا بھائی پر ہوتا تو کیا میں اسے گھر سے نکال دیتا؟"

"آپ کو کوئی کیا نقصان پہنچا سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"لیکن مجھ سے آپ کا سہارا چھیننے کی خاطر یہ تو کر سکتا ہے کہ آپکو اس شہر سے ٹرانسفر کرادے اور آپ کے لیے پریشانی پیدا ہو جائے یہاں آپ بالکل ٹھیک ہیں۔ آپ کو رہنے کے لیے اچھی جگہ ملی ہوئی ہے اور آپ کے بچے ایک اچھے اسکول میں پڑھ رہے ہیں۔ فرض کیجیے آپ کو ایس پی سانگھڑ بنا کے بھیج دیا جائے، آپ کیا کریں گے؟ اکیلے جائیں گے تو ایک مستقل مسئلہ گھر سے عدم موجودگی کا اور آنے جانے کا۔ ۔ ۔ سب کو ساتھ لے جائیں تو مزید پریشانی۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے معاملات سے بالکل بے تعلق رہیں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جب تک میں اس گھر میں رہوں گا، آپ کے لیے بے تعلق رہنا بہت مشکل ہوگا۔"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟ یہاں سے جانے کا فیصلہ کر لیا ہے؟" رضوی صاحب نے کہا۔

"فیصلہ میں نے کیا ہے۔" مجھ سے پہلے رابعہ نے جواب دیا۔ "سکندر میرا مؤکل ہے اور اس سے میرا کیس خراب ہو سکتا ہے۔ اگر وکیل استغاثہ یہ نکتہ اٹھا دے کہ ملزم کو اعلیٰ پولیس آفیسروں کی حمایت حاصل ہے جو ناجائز دباؤ ڈالتے ہیں تو ضمانت تک منسوخ ہو سکتی ہے اور آپ کے لیے بھی مسئلہ کھڑا ہو سکتا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ سکندر کرائے پر مکان لے لے اور محسن کے ساتھ رہے۔"

"اس شہر میں لوگ عموماً اکیلے آدمی کو مکان نہیں دیتے۔" رضوی صاحب نے کہا۔

"مکان خریدا بھی جا سکتا ہے۔" رابعہ نے کہا۔ "زیادہ بڑا نہ سہی کوئی چھوٹا سا مکان خریدنے کے لیے زیادہ سرمائے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

"چھوٹے سے تمہاری کیا مراد ہے؟ کسی پرانی، غلیظ اور گنجان بستی میں دو کمرے؟" رضوی صاحب نے کہا۔ "بلاشبہ وہاں بھی انسان رہتے ہیں اور میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ ان میں انسانیت بھی زیادہ ہوتی ہے لیکن کیا سکندر اس ماحول کا پروردہ ہے؟ خود تم اور محسن کس ماحول کے عادی ہو؟"

"ضرورت کا تقاضہ تو یہی ہے کہ میں کسی ایسی ہی گمنام آبادی میں رہوں۔" میں نے کہا۔ "اور خود رابعہ بھی یہاں رہنا نہیں چاہتی۔ اسباب وہی ہیں جو رابعہ نے بتلائے۔"

"مجھے کچھ ایسے لگتا ہے کہ اتفاق رائے سے تم کوئی فیصلہ کر چکے ہو۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "رابعہ بھی جانا چاہتی ہے۔ تم بھی جانا چاہتے ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ بہرحال تمہارے پاس اتنا پیسہ نہیں ہے کہ مکان خریدنے کی سوچ سکو، لیکن رابعہ کے پاس یقیناً ہوگا۔ اگر تم دونوں نے شادی کر کے نیا گھر آباد کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو مجھے صاف بتا دو۔"

رابعہ نے فوراً چائے کے برتن سمیٹے اور کمرے سے نکل گئی اور میں نے دیکھا کہ رابعہ کا چہرہ سرخ پڑ گیا تھا۔ میں نے کہا۔ "یہ خیال آپ کو کیوں آیا؟"

"ایک تو وہی پرانا محاورہ ہے کہ کچھ چیزیں چھپائی نہیں جا سکتیں۔" انہوں نے میری طرف دیکھے بغیر زیر لب مسکرا کے کہا۔ "پھر کچھ اپنی عمر کا تجربہ، کچھ ملازمت کی نوعیت اور کچھ حالات ایسے ہیں کہ مجھے دو اور دو چار نظر آتے ہیں۔ ۔ ۔ اور میرا خیال ہے کہ چار ہی ہوتے ہیں۔ ایک طرف رابعہ کی ضروریات ہیں مثلاً ایک ذاتی مکان جو پہلے تھا اور اب نہیں ہے مگر وہ چاہے تو بنا سکتی ہے۔ احساسِ عدم تحفظ وغیرہ۔ ۔ ۔ دوسری طرف تمہاری ضروریات ہیں اور تمہارا مستقبل ہے۔ کمی تم کو بھی کسی چیز کی نہیں ہوگی۔ روپیہ پیسہ تعلیم سب ہے۔"

"بس بس انکل!" میں نے کہا۔ "میں آپ کی بات سمجھ گیا لیکن میں اس پر کوئی تبصرہ نہیں کروں گا۔ ابھی شادی یا خانہ آبادی کے کسی پروگرام پر کسی نے غور نہیں کیا اس لیے کہ دوسرے مسائل زیادہ اہم ہیں۔ ان سے نمٹنے کے بعد کیا ہوگا، یہ میں خود بھی نہیں جانتا۔ ہو سکتا ہے میں باعزت طور پر بری ہو جاؤں لیکن سزا کے امکانات کو مسترد بھی نہیں کیا جا سکتا۔ پہلے تو میں یہ پسند نہیں کروں گا کہ اپنے مقدمے کا فیصلہ ہونے سے پہلے کسی لڑکی کے مقدر کا فیصلہ کروں۔ خود پھانسی لٹک جاؤں یا عمر قید پا کے جیل کی دیواروں کے پیچھے بند ہو جاؤں تو اسے بیوہ کر جاؤں یا دنیا میں رسوا، لاوارث اور تنہا چھوڑ دوں۔ فیصلہ ہونے میں زیادہ وقت تو نہیں لگے گا۔ کون بدبخت ہوگی جو سب کچھ جانتے ہوئے بھی یہ ادھورا سہاگ قبول کرے گی اور مانگ کی افشاں بھرنے سے پہلے بیوگی کے خیال کو گلے لگائے گی۔ کم از کم رابعہ کو میں ایسی سزا نہیں دے سکتا۔ میں نہیں چاہتا کہ بیوی بن کر وہ میرا مقدمہ لڑے اور ہار جائے تو میری وارث بن کے کسی روز صبح دم میری لاش لینے جیل کے دروازے پر انتظار کرے۔ دو اور دو واقعی چار ہو سکتے ہیں لیکن آج نہیں۔"

"میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "تم دونوں بالغ ہو اور سمجھدار ہو، اپنے معاملات کو اپنی مرضی کے مطابق طے کرنے کے مجاز بھی ہو کیونکہ تمہیں کسی سے اجازت نہیں لینی۔ تمہارے والدین، حقیقی چچا، ماموں وغیرہ کوئی نہیں جو اپنی بزرگی کی ٹانگ اڑا سکیں۔ اگر ہیں تو ہم جیسے رشتے کے انکل۔ میں یا شیروانی صاحب۔ تو ہم کیا کر سکتے ہیں؟"

"آپ مجھے بے عزت کر رہے ہیں انکل!" میں نے آزردہ ہو کے کہا۔ "کیا میرے رویے سے آپ کو کبھی یہ احساس ہوا کہ میں سرکش اور نافرمان ہوں یا والد کے بعد اب آپ کو اپنا سرپرست نہیں سمجھتا؟ ایک آپ اور ایک انکل شیروانی میرے بزرگ، چچا یا ماموں جو کچھ ہیں آپ ہیں۔ اگر آپ مجھے حکم دیں گے کہ رابعہ سے شادی مت کرو تو۔ ۔ ۔"

"میں یہ حکم کیسے دوں؟" انہوں نے میری بات کاٹ دی۔ "غالباً وہ وقت گزر چکا ہے جب میں یہ حکم دے سکتا تھا اور تم سے تعمیل کی امید بھی رکھ سکتا تھا لیکن اب میں یہ حکم نہیں دوں گا۔ تم مجھے اختیار دے چکے ہو اس کے باوجود نہیں دوں گا۔" ان کے لہجے میں اچانک دکھ اور بے بسی کا کرب اتر آیا تھا۔ وہ اعصابی کشیدگی کا شکار ہو گئے تھے اور انہیں یہ بھی احساس نہیں تھا کہ پائپ جسے وہ مضبوطی سے پکڑے بیٹھے تھے بہت دیر پہلے بجھ چکا ہے۔ ان کا دوسرا ہاتھ سختی سے کرسی کے بازو پر جما ہوا تھا اور نظریں میری بجائے محسن کو دیکھ رہی تھیں۔ پھر میں نے محسن کو دیکھا۔ وہ پتھر کا بت بنا بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ سپاٹ اور ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا اور وہ خلا میں دیکھ رہا تھا۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ کوئی بات ایسی ضرور ہوئی تھی جو ابھی تک مجھے معلوم نہیں تھی۔ شاید اس وقت جب میں اپنا حلیہ ٹھیک کرنے گیا ہوا تھا اور رابعہ کھانا لینے باورچی خانے چلی گئی تھی۔

"انکل رضوی! آپ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں؟" میں نے کہا۔ "محسن۔ ۔ ۔ کیا بات ہے؟"

"محسن تمہاری بات کا کوئی جواب نہیں دے سکتا۔" رضوی صاحب نے پائپ کی راکھ کو ایش ٹرے میں ڈالا اور پائپ کو کھرچ کر صاف کرنے لگے۔ "تم ایک سوال کا جواب ایمانداری سے دو گے؟" انہوں نے پائپ میں تمباکو بھر کے انگوٹھے سے دبانا شروع کیا اور میز سے ماچس اٹھائی۔ "تم نے فوزیہ سے شادی نہ کرنے کے جو اسباب بتائے ہیں، کیا وہ درست ہیں؟"

"یہ اسباب تو میں نے کبھی آپ کے سامنے بیان نہیں کیے۔" میں نے کہا۔

"ہاں مگر آج میری شیروانی صاحب سے ٹیلی فون پر بات ہوئی تھی۔" انہوں نے پائپ کے تمباکو پر جلتی ہوئی دیا سلائی رکھی اور ایک کش لیا۔ "انہوں نے اس موضوع پر بات کرنے کے لیے فون نہیں کیا تھا۔ وہ ایک اطلاع دینا چاہتے تھے کیونکہ وہ پریشان تھے۔ میں نے شیروانی صاحب کو زندگی میں پریشان ہوتے پہلے بھی دیکھا تھا لیکن آج وہ ٹیلی فون پر بات کرتے رو پڑے۔ یونہی جب کوئی پچاس سال کی عمر کا آدمی جو ایک اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز ہو، رونے پر مجبور ہو جائے اور وہ آدمی دوست ہو، جیسے محسن تمہارا دوست ہے۔ بھائی سے زیادہ عزیز ہو۔ ۔ ۔ تو دل ٹوٹنے لگتا ہے۔ میں یہی خبر سنانے کے لیے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ فوزیہ نے خودکشی کی کوشش کی تھی۔ صرف کوشش۔ یہ کوشش کامیاب بھی ہو سکتی تھی مگر ناکام رہی۔ اب اس کی حالت خطرے سے باہر ہے۔ شیروانی صاحب اس کیس کو دبانے میں بھی کامیاب ہو گئے ہیں۔"

مجھے بالکل معلوم نہیں ہوا کہ محسن کب اٹھ کر چلا گیا۔ "انکل رضوی!" میں نے کہا۔ "آپ کے سوال کا جواب محسن بہتر طور پر دے سکتا تھا۔ میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ اصل مجرم تو میں ہوں اور مجھے بھی تقدیر نے مجرم بنا دیا ہے۔ زندگی حالات کے اس موڑ پر لے آئی ہے جہاں میں اپنے جرم کا اعتراف کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا اور یہ بھی جانتا ہوں کہ اس جرم کی سب سے سخت سزا صرف میرے لیے ہے۔ میرے لیے ایک نہیں، عذاب کے دو جہنم ہیں۔ میں یہ فرض کرنے پر بھی مجبور ہوں کہ مجھے ایک جنت آباد کرنی ہے۔" میں نے ان کو وہیں بیٹھے چھوڑا اور کمرے سے نکل گیا۔ میرے ذہن میں ایک آندھی چل رہی تھی اور مجھے محسن کی طرف سے تشویش لاحق ہونے لگی تھی۔ میں دوسرے کمرے میں گیا تو محسن اپنے دونوں ہاتھ تکیے پر سر کے نیچے رکھے لیٹا تھا اور چھت کو دیکھ رہا تھا۔

"میں نے فون کیا تھا۔" وہ میری طرف دیکھے بغیر بولا۔ "فوزیہ بالکل ٹھیک ہے۔"

"یہ کوئی ایسی بات نہیں محسن جس سے میں مطمئن ہو جاؤں کہ خطرہ ٹل گیا۔" میں نے بستر پر بیٹھ کے کہا۔ "اگر کوئی جینا نہ چاہے تو اسے مرنے سے کون روک سکتا ہے۔ ایک کوشش کی ناکامی سے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس کی دوسری کوشش کامیاب ہو سکتی ہے۔"

"یار! یہ لڑکیاں بہت جلد ہمت ہار دیتی ہیں۔" محسن نے کہا۔ "فوزیہ نے ناز و نعم میں پرورش پائی۔ زندگی میں اسے وہ سب کچھ ملا جو اس نے چاہا۔ اس نے حالات کی سختی کبھی نہیں جھیلی۔ ناکامی کا صدمہ نہیں اٹھایا اور محرومی کے آزار سے ہمیشہ بچی رہی لیکن ایسی لڑکیاں تو بہت ہیں۔ خوشحال گھرانوں کی ہر فکر و غم سے ناآشنا اور زندگی کو صرف خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ سمجھنے والی، کیا وہ سب اتنی ہی بزدل ہوتی ہیں اور خودکشی کو مسائل کا حل سمجھتی ہیں؟"

"میں سمجھتا ہوں محسن کہ سارا قصور میرا ہے۔ ۔ ۔"

"نہیں یار۔" محسن اٹھ بیٹھا۔ "یہی تو میں بتانا چاہتا تھا

کہ فوزیہ جیسی لڑکی نے یہ انتہائی قدم کیوں اٹھایا ہ وہ میری بہن ہے اور میں اسے اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ قصوروار میں بھی ہوں۔ وہ مجھ پر بہت بھروسہ کرتی ہے اور اسے یقین ہے کہ میں ان حالات میں اس کو سہارا دے سکتا ہوں۔ ممی اپنے آگے کسی کی نہیں چلنے دیتیں اور ڈیڈی خود کو مجبور دیکھتے ہیں تو کچھوے کی طرح اپنی ذات کے خول میں بند ہو جاتے ہیں۔ پھر ان کی بلا سے، کچھ بھی ہوتا رہے۔ آج جب میں نے ٹیلی فون کیا۔۔۔ ابھی کچھ دیر پہلے جب تو کپڑے بدلنے گیا ہوا تھا تو میری بات ممی سے ہوئی۔ حسبِ توقع انہوں نے کہا۔ فوزیہ مرتی ہے تو مر جائے۔ تمہارا اس گھر سے کوئی تعلق نہیں۔ تم ہماری فکر کیوں کرتے ہو؟ اچھا ہوا کہ فون ڈیڈی نے لے لیا۔ میں نے کہا کہ مجھے فوزیہ سے بات کرنی ہے تو انہوں نے سی۔ ایم۔ ایچ کا نمبر دیا۔ اس وقت لائن فوراً مل جاتی ہے نا۔ دو منٹ بعد میں نے ہسپتال کا نمبر ملایا اور بتایا کہ میں فوزیہ کا بھائی ہوں اور لاہور سے بول رہا ہوں تو انہوں نے چیک کیا اور فوزیہ کے کمرے کی لائن دے دی۔ وہ جاگ رہی تھی اور میرا خیال تھا کہ میری آواز سنتے ہی رونے لگے گی بلکہ مجھے تو ڈر تھا کہ اس جذباتی بحران کی کیفیت میں کہیں اس پہ ہسٹریا کا دورہ نہ پڑ جائے لیکن وہ بہت پُرسکون تھی۔ اس نے مجھے صاف بتا دیا کہ بھائی جان مجھے سکندر سے کوئی گلہ نہیں۔ اُن کی خوشی میری خوشی ہے۔ میرا ہرگز ان کو دکھ پہنچانے یا احساسِ جرم میں مبتلا رکھنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ میں ان کے بغیر زندہ رہ سکتی تھی لیکن میں چراغ دین سے شادی کر کے زندہ نہیں رہ سکتی۔ اگر میں چاہوں تب بھی یہ ناممکن ہے۔ وہ مجھے زندہ نہیں رہنے دے گا۔ معلوم نہیں اس بات کا کیا مطلب تھا جو میں فوراً نہ سمجھ سکا۔ میں نے اس سے کہا کہ فوزیہ بس اتنی سی بات تھی۔ مجھ سے یہ وعدہ کر کہ دوبارہ ایسی کوئی حماقت نہیں ہوگی اور چراغ دین کی طرف سے بے فکر ہو جا۔ اگر وہ چراغ الہ دین بھی لے آئے تو اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوگا۔ میرے جیتے جی تجھ پہ کوئی جبر نہیں کر سکتا اور اس نے مجھ سے وعدہ کر لیا کہ پھر کوئی بے وقوفی نہیں کرے گی۔ اسے مجھ پر کتنا اعتماد ہے سکندر۔۔۔!"

میں نے محسوس کیا کہ احساسِ جرم و پشیمانی، مایوسی اور بے چارگی اور رنج و الم کا ایک پہاڑ جتنا بوجھ کم ہونے لگا ہے جس کے نیچے میری روح بھی کراہنے لگی تھی۔

"اس سے زیادہ میری بات نہ ہو سکی!" محسن نے کچھ دیر بعد کہا۔ "یہ اطمینان ہی کیا کم تھا کہ اس نے خود ٹیلی فون اٹھا کے مجھ سے بات کی اور مجھ سے یہ وعدہ بھی کر لیا کہ وہ زندہ رہے گی لیکن اس وقت سے میں سوچ رہا ہوں کہ فوزیہ کی بہت سی باتیں وضاحت طلب ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ اپنے ماضی کو بھول کر بھی زندہ رہ سکتی ہے لیکن چراغ دین کے ساتھ نہیں۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ چراغ دین کے بجائے کوئی اور ہوتا تو وہ زندگی سے سمجھوتہ کر لیتی ہ یعنی وہ کسی بھی معقول آدمی سے شادی کر کے گزارا کر سکتی ہے مگر چراغ دین اسے قطعی ناقابلِ قبول ہے۔ اس حد تک کہ وہ اس کے مقابلے میں موت کو ترجیح دے گی۔ سوال یہ ہے کہ کیوں ہ اسے تو چراغ دین کے بارے میں وہ سب باتیں معلوم نہیں جو مجھے یا تجھے معلوم ہیں۔ ایک عام لڑکی کے نقطۂ نظر سے چراغ دین میں کیا خامی ہے۔ وہ بدکردار اور عیاش بھی نہیں۔ میرا مطلب ہے کہ ان خرابیوں کا شکار نہیں جو دولت سے خریدی جا سکتی ہیں۔ فوزیہ تو یہ بھی جانتی ہے کہ وہ مریم باجی سے کتنی محبت کرتا تھا اور خود مریم اپنی ازدواجی زندگی سے کتنی مطمئن اور خوش تھی پھر چراغ دین سے اتنی شدید نفرت کیوں؟"

"تیرے خیال میں فوزیہ کی چراغ دین سے اس نفرت کا سبب کیا ہو سکتا ہے؟" میں نے تمام حقائق کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ نفرت نہیں ہے سکندر! خوف ہے۔" محسن نے کہا "یہی بات تو میں تجھے سمجھانا چاہتا تھا۔ فوزیہ نے کہا تھا کہ وہ چراغ دین کے ساتھ زندہ نہیں رہ سکے گی لیکن دوسرے جملے میں یہ بات زیادہ واضح ہو گئی۔ اس نے کہا کہ چراغ دین مجھے زندہ ہی نہیں رہنے دے گا۔ اس سے نفرت کا نہیں خوف کا اظہار ہوتا ہے۔ آخر اسے یہ ڈر کیوں ہے کہ چراغ دین اسے مار ڈالے گا ہ عورت کی فطرت میں بڑی لچک ہوتی ہے۔ وہ جس مرد کے ساتھ گزارا کرنا چاہے کر سکتی ہے وہ ہر ماحول سے مطابقت کرنا جانتی ہے اور خود اپنے حالات کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے۔ بالکل پانی کی طرح کہ جس برتن میں ڈالو اسی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہ صلاحیت فوزیہ میں بھی ہے۔ اگر اس کے باوجود وہ چراغ دین کو فرشتۂ اجل کے روپ میں دیکھتی ہے اور ڈرتی ہے تو اس کی کوئی وجہ ضرور ہے۔"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔" میں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام کے کہا۔ "آخر ایسی کون سی بات ہو سکتی ہے ہ مجھے تو چراغ دین سے ایک پرانا حساب چکانا ہے۔ میری نفرت اور دشمنی کے جذبات کا ایک سبب ہے۔"

"یہی بات تو میرے لیے الجھن بنی ہوئی ہے۔" محسن نے لیٹتے ہوئے کہا۔ "میں چاہتا ہوں ایک بار پھر فوزیہ سے بات کروں اور اس سے وضاحت طلب کروں کہ یہ کیا چکر ہے؟"

میں فوزیہ سے وعدہ کر چکا ہوں جو مجھے بہر صورت پورا کرنا ہے۔ مجھے فوزیہ کی زندگی کے لیے ہزار چراغ دین بھی قتل کرنے پڑیں تو میں کروں گا۔ اس کی اور کوئی صورت نہیں ہے۔ اس نے پہلے بھی میری بات ماننے سے انکار کر دیا تھا اور اس روز بھی میں نے سوچا تھا کہ یہ جھگڑا ختم کر دوں۔ تجھے معلوم ہے کہ میں اس کو قتل کرنے گیا تھا؟"

"مجھے معلوم ہے۔" میں نے کہا۔ "تو صبح صبح غائب ہو گیا تھا اور واپسی پر تو نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔"

"ہاں۔ اس دن مجھے موقع نہیں مل سکا۔" محسن نے کہا "اور جھوٹ میں نے اس لیے بولا تھا کہ کہیں تو میرے ارادے کی راہ میں حائل نہ ہو جائے۔"

اب صبح ہونے لگی تھی۔ رات کی سیاہی میں تھوڑا سا اجالا جھلکنے لگا تھا۔ میں کھلی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا اور پھر دہلیز پر بیٹھ گیا۔ میری کمر چوکھٹ کے ایک کنارے سے لگی ہوئی تھی اور میرے پاؤں دوسرے کنارے کو چھو رہے تھے۔ سگریٹ کا آخری کش لے کر میں نے ٹکڑے کو فضا میں اچھال دیا اور یہ ٹکڑا دُم دار ستارے کی طرح اندھیرے میں ایک روشن لکیر بنا کے غائب ہو گیا۔ میری نظر صبح کے ستارے پر گئی اور مجھے فوزیہ کا خیال آیا کہ اگر وہ مر گئی ہوتی تو کیا صبح کا یہ ستارہ مجھے ایسے ہی روشن نظر آتا ہ اس کے بعد آسمان کتنا تاریک اور ویران ہوتا۔ لیکن وہ زندہ ہے۔ کیا وہ بھی جاگ رہی ہوگی ہ اور ہسپتال کے پرائیویٹ روم کی کھڑکی سے اسی طرح ستارۂ صبح کو دیکھ رہی ہوگی ہ مجھے ٹیگور کی بات یاد آئی۔ میرا محبوب بہت دور ہے۔ پھر میں چاند کو کیوں نہ دیکھوں، اسی جگہ تو میری اور اس کی نظریں ملتی ہیں۔۔۔ سونے کا اب کوئی امکان اور فائدہ نہ تھا۔ شاید محسن نے بھی یہ بات سمجھ لی تھی کیونکہ وہ بستر سے اٹھ کر چائے بنانے کے لیے کچن میں چلا گیا تھا۔ میرے ذہن میں ایک میدانِ کارزار تھا، جس میں ہر طرف سے خیالوں کے غنیم یلغار کر رہے تھے۔ میرے اپنے مسائل پیچھے ہٹ گئے تھے اور فوزیہ کی زندگی کا مسئلہ، چراغ دین کی موت کے مقابل آ گیا تھا۔ یہ انتہائی اہم اور ناگزیر ہو گیا تھا۔ وہ غلام آقا بن گیا تھا اور آقا غلام اور غلام نے اپنے پرانے آقا کو ذلت اور بے بسی کی موت عطا کی تھی۔ اسی چراغ دین نے برسوں پہلے مریم نام کی ایک لڑکی سے شادی کی تھی جو محسن کی بڑی بہن تھی اور حتیٰ کہ محسن اس شادی میں شریک نہیں ہوا تھا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ مریم کے ساتھ زبردستی ہوئی ہے۔ شاید وہ کسی اور کو چاہتی تھی لیکن بعد میں سب کچھ بھول بھال گئی تھی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آدمی کسی کو چاہے اور فراغت کی زندگی میسر ہو تو اس چاہت کو بھول جائے ہ کیا یہ ناممکن ہے کہ مریم بعد میں بھی اس سے ملتی رہی ہو جسے وہ چاہتی تھی اور اس کی حادثاتی موت حادثے کا نتیجہ نہ ہو ہ محسن نے ابھی اپنے ایک دوست کا عجیب واقعہ سنایا تھا۔ آخر کیوں ہ کیا اس کے ذہن میں بھی کہیں شک کا کوئی زہریلا سانپ سر ابھار رہا تھا کہ چراغ دین نے اپنی بیوی کو مروا دیا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ مریم کے بچے اس کے نہیں ہیں ہ فوزیہ اور مریم میں فطرت کے اعتبار سے زمین اور آسمان کا فرق تھا۔ مریم انتہائی ذہین اور چالاک لڑکی تھی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ دولت اور عزت کے درمیان بقائے باہمی کا کوئی سمجھوتہ طے پا گیا ہو ہ چراغ دین نے مریم کو اس سے ملنے کی اجازت دے دی ہو ہ میں نے محسوس کیا کہ میں اسی طرح سوچتا رہا تو پاگل ہو جاؤں گا۔ میرے خیالات کی کوئی سمت نہیں تھی۔ میرے مفروضات بے بنیاد تھے اور میری سوچ کی راہ واہموں کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہی تھی۔ حقائق کی دنیا میں ان کی کوئی قیمت نہ تھی۔ چراغ دین پر غبن کا الزام کسی عدالتِ انصاف میں ثابت نہیں ہوا تھا۔ پھر محسن کیا ثابت کرے گا؟ اسے تو قتل کرنا پڑے گا۔ اس نے نہ کیا تو یہ کام مجھے کرنا پڑے گا۔ مجھ پر ایک قتل کا الزام پہلے ہی ہے۔ دوسرے قتل کا الزام بھی کسی نہ کسی کو اٹھانا ہوگا کیونکہ قتل ثابت ہو جاتا ہے۔ جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستین کا۔ انجام وہی رسوائی، دکھ اور پشیمانی اپنے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی۔ چراغ دین مجرم تھا لیکن اس نے عقل سے کام لیا تھا چنانچہ وہ محفوظ رہا تھا۔ ہم جذبات سے کام لیں گے تو کونسی عقل مندی کریں گے۔ دشمن بہادر ہو تو بہادری سے مقابلہ کرنے میں مزہ ہے لیکن عیاری اور مکاری کے جواب میں بہادری کے جوہر دکھانا بے وقوفی ہے۔

"میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں محسن!" میں نے چائے کا کپ لیتے ہوئے کہا۔ "کہ میرا اور تیرا مسئلہ جذبات سے نہیں، عقل سے کام لے کر حل ہوگا۔ سانپ کو مر جانا چاہیے اور لاٹھی کو نہیں ٹوٹنا چاہیے۔ اس وقت تو بھی مشتعل ہے اور میں بھی انتقامی ردِعمل کا شکار ہوں۔ یہ کام بالکل اسی طرح ہونا چاہیے جیسے چراغ دین نے کیا تھا۔ وہ آج تک کسی بھی گرفت میں نہیں آیا۔ اس کا پتا ایسے صاف ہونا چاہیے کہ خود اسے بھی خبر نہ ہو اور ہم میں سے کسی پر حرف نہ آئے۔"

"تیری بات جی کو لگتی ہے لیکن سوچ بچار میں وقت

کے ہاتھ سے نکل جانے کا ڈر ہے۔"

"میرے ذہن میں ایک ترکیب آتی ہے۔" میں نے چائے کا آخری گھونٹ لے کر کہا۔ "اس پر عمل درآمد میں وقت ضائع ہونے کا کوئی سوال نہیں بشرطیکہ ایک شخص ہماری مدد کرے اور وہ شخص ہے استاد ٹیڈی۔ مجھے امید ہے وہ آج شام کو رابعہ کے آفس آئے گا یا کہیں سے ٹیلی فون کرے گا۔ اپنے مقتول دوست کے معاملے میں وہ سخت جذباتی ہو رہا ہے اور اس کی بڑی بہن سے مل کر تعزیت کرنے کے علاوہ اسے یہ یقین دلانا چاہتا ہے کہ وہ قاتل سے انتقام ضرور لے گا۔ اگر شہلا اس سے کہے تو وہ سب کچھ کرنے کو تیار ہو جائے گا۔"

"سب کچھ کیا؟" محسن نے کہا۔ "ان معاملات میں اسے کیوں لاتا ہے؟"

"مجھے ذرا سوچنے دے۔" میں نے کہا۔ "شاید شام تک میں تفصیل سے بتا سکوں۔ آج مجھے دو کام کرنے ہیں۔ ایک تو مجھے رابعہ کے ساتھ جا کے کوئی مناسب سا مکان دیکھنا ہے، وہ ایک مکان خریدنا چاہتی ہے جو اس کی اور ہماری ضروریات پوری کر سکے۔ اس کا گڑھی شاہو والا مکان تو ملبے کا ڈھیر ہے لیکن وہ زمین بہت قیمتی ہے۔ کچھ نقد سرمایہ رابعہ کے پاس بھی ہے۔ ہم کسی پراپرٹی ڈیلر سے بات کریں گے جتنی رقم نقد ہے وہ لے لے اور مکان کا قبضہ فوراً دلا دے۔ باقی رقم رابعہ کے گھر کی زمین کے فروخت ہوتے ہی ادا کر دی جائے گی۔ اس پلاٹ کو بکنے میں دیر نہیں لگے گی۔ چنانچہ مجھے پوری امید ہے کہ ہر پراپرٹی ڈیلر ——— یہ سودا بہت خوش ہو کے کرے گا۔ ڈبل کمیشن کا معاملہ ہے نا۔ پہلے مکان کی خرید پر پھر پلاٹ کی فروخت پر اور سودا بھی 'اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے' والا ہے۔ جس میں دیر کا کوئی امکان نہیں۔"

"اور دوسرا کام؟" محسن بولا۔ "اس کے لیے آج وقت ملے گا؟"

"وقت کا مسئلہ واقعی ہے۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "البتہ ہم کام تقسیم کر لیں تو مشکل حل ہو سکتی ہے مثلاً رابعہ اپنے مکان کے انتخاب کا مسئلہ مجھ پر چھوڑ دے۔ اسے میری پسند پر اور قوتِ فیصلہ پر اعتبار ہے اس لیے وہ مان جائے گی۔ وہ خود چلی جائے شہلا کی طرف۔ شہلا کی ماں کو بھی بتا دے کہ وہ اب ہمارے ساتھ رہیں گی اور ماسی کو بھی تیار کرے۔ ہو سکتا ہے کل تک ادائیگی ہو جائے اور ہم سب نئے مکان میں منتقل ہو جائیں۔ ایک نیا خاندان وجود میں آ جائے۔ ماں، بیٹے، بہن، بھائی کے سارے مقدس رشتوں کی بنیاد پڑ جائے جو خون کے رشتوں سے زیادہ استوار ثابت ہوں، زیادہ پُرخلوص ہوں اور زیادہ سچے ہوں۔ سچ پوچھو تو شہلا نے مجھے اپنا بھائی بنا لیا ہے۔"

"اب تک تو معلوم نہیں تھا، مگر اب ہو گیا ہے۔" محسن بولا اور مجھے یوں لگا جیسے وہ خواب میں ہو۔ "یار سکندر! رشتوں کی آبرو بھی کیا چیز ہے۔ کیسی جنت ہو گا وہ گھر جس میں کوئی رشتوں کا بھرم رکھنے پر مجبور نہیں ہو گا اور جذبے سچے ہوں گے۔ سو فیصد خالص اور بے غرض جہاں کوئی اپنے شجرۂ نسب کی بات نہیں کرے گا۔ الگ الگ راستوں سے ایک منزل پر جمع ہو جانے والوں کی کامیابی کتنی مکمل ہو گی۔ شاید بہت جلد آلام و مصائب کا یہ زمانہ بھی ختم ہو جائے گا اور رابعہ کا گھر تیرا گھر کہلائے گا....."

"اسٹاپ!" میں نے چٹکی بجا کے کہا۔ "خواب سے واپس حقیقت کی دنیا میں آ جا اور سن کہ دوسرا کام کیا ہے۔ تجھے الماس کے والدین کی موت اور ان کے گھر میں آتشزدگی کے بارے میں پولیس کی رپورٹ وغیرہ دیکھنی ہے اور اگر ممکن ہو تو اس کی نقل بھی حاصل کرنی ہے۔ متعلقہ تھانے کا عملہ اب تک بدل چکا ہو گا اس لیے کام دشوار نہیں۔ کسی محرر یا تھانیدار کو سو کے نوٹ دکھانا، وہ داخلِ دفتر ہو جانے والے کیس کی فائل تیرے حوالے کر دے گا۔ بعد میں کسی مرحلے پر اس کی ضرورت پڑی تو الزام کسی پر بھی نہیں آئے گا کہ فائل کس نے گم کی۔ جانے والوں نے یا آنے والوں نے۔"

"نو پرابلم۔" محسن نے کہا۔ "یہ کام ہو جائے گا۔"

"اب ایک مسئلہ ایسا ہے جو صرف رابعہ حل کر سکتی ہے۔" میں نے کہا۔ "اس کو شہلا سے ایک بات پوچھنی ہے جو میں نہیں پوچھ سکتا۔ جس رات میں اور رابعہ پہلی بار اس کے گھر پہنچے تھے تو ڈی سلوا نے وہاں آ کے شہلا سے کچھ باتیں کی تھیں ان کی خلش ابھی تک میرے دل میں باقی ہے اور حالات کے زیادہ خراب ہونے سے پہلے کوئی نہ کوئی بندوبست ایسا ہونا چاہیے کہ شہلا مزید رسوائی سے بچ جائے۔"

"میں تیری بات سمجھ گیا۔" محسن نے کہا۔ "لیکن میں رابعہ سے کیا کہوں اور کیسے کہوں؟"

"زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔ "ویسے بھی وہ وکیل ہے اور اس مسئلے کا ایک قانونی پہلو بھی ہے۔ تو اس سے کہنا کہ تلخ کلامی کے دوران میں ڈی سلوا نے شہلا پر کچھ الزامات عائد کیے تھے اور شہلا نے بھی کسی حد تک اعترافِ جرم کیا تھا۔ اس بات میں کس حد تک صداقت ہے کہ خدانخواستہ وہ ماں بنی تو ڈی سلوا کی باتوں میں آ کے گمراہ ہو جانے کی سزا ہو گی۔ رابعہ نے ساری باتیں سنی تھیں۔ وہ خود اپنے طور پر معلوم کرے گی۔ اس کے بعد سوچیں گے کہ کیا کیا جائے۔"

ساتھ والے کمرے میں سے کانسٹیبل جماہیاں لیتا برآمد ہوا اور ہماری طرف دیکھے بغیر باتھ روم میں گھس گیا۔ دس منٹ تک ایسی آوازیں آتی رہیں جیسے کوئی ڈوب رہا ہو۔ کانسٹیبل غسل کرتے ہوئے یہ آوازیں حلق، ناک اور منہ سے نکال رہا تھا۔ جب وہ اپنی وردی پہن کر چلا گیا تو ہم نے تیاری شروع کی۔ میں نے شیو اور غسل سے فارغ ہو کے ناشتہ بنانے کا عمل شروع ہی کیا تھا کہ کانسٹیبل پھر نمودار ہوا۔

"صاحب نے یہ خط دیا ہے۔" اس نے ایک لفافہ آگے بڑھایا اور واپس جانے لگا۔

"میاں تھانیدار صاحب!" میں نے کہا۔ "ذرا توقف فرمائیے، شاید کوئی جواب طلب بات ہو۔" میں نے لفافہ کھولا۔ اسی وقت محسن بھی باتھ روم سے نکل آیا۔ "کون تھانیدار؟ یہ اپنے ہمسائے تھانیدار ہو گئے ہیں؟ بھئی بہت بہت مبارک۔" محسن نے زبردستی کانسٹیبل سے گلے ملتے ہوئے کہا۔ وہ تولیہ لے جانا بھول گیا تھا، کانسٹیبل کی ساری وردی بھیگ گئی۔

"آپ بڑے غلط لوگ ہیں۔" اس نے خود کو چھڑا کے کہا۔ "ہمیشہ غلط کام کرتے ہیں۔"

میں نے لفافے میں سے برآمد ہونے والے پرچے کو دیکھا اس پر ہال روڈ کی ایک دکان کا پتہ اور ایک شخص کا نام لکھا ہوا تھا۔

"اچھا ہم ایک صحیح کام کرتے ہیں۔" محسن نے مذاق جاری رکھا۔ "ہم صاحب سے کہہ کے تمہیں واقعی تھانیدار بنوا دیتے ہیں۔ تم جانتے ہو کہ صاحب ہمارا کتنا خیال کرتے ہیں۔"

کانسٹیبل نے بے یقینی سے محسن کو دیکھا۔ "میں تھانیدار بن سکتا ہوں؟"

"کیوں نہیں۔" میں نے رقعہ جیب میں رکھ کے کہا۔ "ہماری خدمت کرو اور ہمیں خوش رکھو۔ ہم تمہاری سفارش کر دیں گے۔"

"جنابِ عالی! بندہ تو ویسے ہی آپ کا غلام ہے۔" کانسٹیبل نے عاجزی سے کہنا شروع کیا۔ "بس آپ حکم دیں۔" ترقی پا کے تھانیدار بن جانے کا خیال اس کے لیے معراج سے کم نہیں تھا۔ وہ اپنے سابقہ رویے پر شرم سے پانی پانی ہو رہا تھا اور ہمارے قدموں میں لوٹنے کے لیے تیار تھا۔

"حکم تو ابھی کوئی نہیں۔" میں نے کہا۔ "بس خدمت کے لیے تیار رہو۔ ہر خدمت کے لیے۔ اب جاؤ۔"

جب وہ چلا گیا تو ہم ہنستے رہے اور سوچتے رہے کہ اس شخص سے کیا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ میں نے محسن کو وہ نام اور پتہ بھی دکھایا جو رضوی صاحب نے لکھ بھیجا تھا۔ ہم دونوں کی رائے ایک ہی تھی۔ ہال روڈ کا یہ ریڈیو مکینک رضوی صاحب کی نظر میں تھا تو یقیناً ہمارے لیے بھی کارآمد ثابت ہو سکتا تھا۔ کچھ دیر بعد رابعہ آ گئی اور اس بات پر بہت ناراض ہوئی کہ ہم یہاں اکیلے ناشتہ کر رہے ہیں۔ ادھر گھر میں بھی سب ناشتہ کر چکے ہیں لیکن ہمارے انتظار میں وہ بھوکی بیٹھی ہے۔ ہم نے کہا کہ خفگی کی کوئی وجہ نہیں ہے کیونکہ ہم دوبارہ اس کے ساتھ بھی ناشتہ کریں گے۔ رضوی صاحب جا چکے تھے۔ ان کی بیگم نے بتایا کہ وہ رات بھر سوئے نہیں اور جانے سے پہلے انہوں نے ٹیلی فون پر اسلام آباد میں شیروانی صاحب سے بات کی تھی اور پھر سی۔ ایم۔ ایچ کے کسی کرنل سے۔ فوزیہ آج گھر واپس چلی جائے گی۔ یہ اطلاع دینے کے بعد انہوں نے ہمیں اطمینان سے ناشتہ کرنے کے لیے کہا اور خود کسی کام کا عذر پیش کر کے چلی گئیں۔ رضوی صاحب کی بیگم بالکل ویسی ہی عورت تھیں جو کسی اعلیٰ پولیس افسر کی بیوی بن کے بھی خوش رہ سکتی ہو۔ اس کی تمام توجہ اور دلچسپی اپنے گھر، شوہر اور بچّوں تک محدود تھی۔ گھر سے باہر کیا ہوتا ہے اور کیوں ہوتا ہے، یہ اس نے کبھی اپنا دردِ سر نہیں سمجھا تھا۔ یہ ناممکن تھا کہ اس کو ہمارے معاملات کی خبر ہی نہ ہو لیکن اس کے لیے ہم گھر کے فرد تھے یا مہمان تھے۔ چنانچہ وہ میزبانی کے فرائض سے سروکار رکھتی تھیں۔ اس نے کبھی تجسس ظاہر نہیں کیا تھا اور ہماری پُراسرار مصروفیات اور معاملات کے متعلق کبھی کچھ نہیں کہا تھا۔ ہم پر کبھی بزرگی یا سرپرستی کا رعب ڈال کر ہمیں شرمندہ کرنے کی اور راہِ راست پر لانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس بے نیازی میں بے رخی کا دخل بالکل نہیں تھا۔ شائستگی اور اخلاق اس کے مزاج کا حصہ تھی اور اس کا مزاج تغیر سے ناآشنا تھا۔

ہم سنجیدگی سے دوبارہ ناشتہ کرنے کے موڈ میں نہیں تھے لیکن رابعہ نے کہا۔ "تمہاری سزا یہی ہے کہ پورا ناشتہ ختم کرو خواہ بدہضمی ہو یا پیٹ پھٹے۔" بعد میں محسن نے دوسرے کمرے سے اپنے گھر فون کیا اور شیروانی صاحب سے بات کرتا رہا۔ اس

وقفے میں، میں نے رابعہ سے مکان کی خریداری کے مسئلے پر بات کی۔ اس نے کہا کہ مرضی کا کیا سوال، اسے میری پسند اور میرے فیصلے پر اعتماد ہے، بس میں جیسا چاہوں کروں۔ پھر محسن آگیا اور میں ٹیلیفون کرنے کے بہانے چلا گیا، لیکن میں نے کسی کو فون نہیں کیا۔ مجھ میں فوزیہ سے اس کی خیریت معلوم کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ اس کی ماں سے بات کرتا تو گالیاں اور کوسنے سنتا اور شیروانی صاحب سے کہتا تو کیا کہتا؟ میں دروازے سے لگ کر محسن اور رابعہ کی گفتگو سننے لگا۔

"بات یہ نہیں ہے رابعہ!" محسن کہہ رہا تھا۔ "کہ سکندر تمہیں ساتھ رکھنا نہیں چاہتا۔ اسے فوزیہ کی حماقت یا رضوی صاحب کی بات سے دکھ ضرور ہوا ہے، لیکن تمہارے لیے اس کے جذبات میں فرق نہیں پڑا ہے۔"

"ایک بات کہوں محسن، برا مت ماننا۔" رابعہ نے کہا۔ "تم جیسا بھائی اور تم جیسا دوست میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ سارے حالات سے باخبر ہونے کے باوجود تم دونوں رشتوں کو نبھا رہے ہو۔ انگریز کہتے ہیں کہ دو کشتیوں کا مسافر ڈوب جاتا ہے۔ تمہیں احساس نہیں ہوتا کہ تم انصاف نہیں جبر کر رہے ہو۔"

محسن کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر اس نے کہا۔ "نہیں رابعہ! جبر کا احساس مجھے اس لیے نہیں ہوتا کہ میں زندگی کے تقاضوں کو جذباتی مسائل نہیں بناتا۔ آدمی کی پسند اور ناپسند کا معیار عمر کے جذبات کے ساتھ ساتھ بدلتا ہے کیونکہ اس کی شخصیت بدلتی ہے۔ سکندر بخت کو جتنے قریب سے میں نے دیکھا ہے کسی اور نے نہیں دیکھا ہے۔ اس کے باپ نے بھی نہیں جس نے سکندر کو ہمیشہ دور رکھا اور یہ ہی دعویٰ میں اپنی بہن کے بارے میں کروں تو غلط نہیں ہوگا۔ ان دونوں کے بارے میں میرا یہ فیصلہ قطعی غیر جانبدارانہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ کچھ دن تو خوش رہ سکتے تھے۔ تمام عمر خوش نہیں رہ سکتے تھے کیونکہ دونوں کی فطرت کے تقاضے الگ ہیں جو بالآخر جذبات پر غالب آجاتے۔ شاید وہ ذمہ داریوں کے بوجھ کو گھسیٹتے رہتے اور خوش دکھائی بھی دیتے... شاید وہ الگ ہو جاتے اور ایک دوسرے کی زندگی میں دکھ کے کانٹے بھر جاتے۔ اب جو ہوا ٹھیک ہی ہوا۔ آج کا چھوٹا سا صدمہ ایک عمر کے روگ سے بہتر ہے۔"

دروازے کے پیچھے میں منجمد کھڑا تھا۔ محسن جھوٹ بول رہا تھا یا سچ؟ اگر وہ فریب دے رہا تھا تو کیسے؟ رابعہ کو یا اپنے آپ کو؟ ہر صورت میں محسن اپنے آپ پر جبر کر رہا تھا

اور سب کو خوش رکھنے کے لیے خود قربان ہو رہا تھا۔

"اصل بات یہ ہے کہ تمہیں ایک اور کام کرنا ہے۔ تمہیں آج شہلا کے پاس جانا ہے۔ وہاں پہلے تو تم اس کی ماں کو یہ بتاؤ گی کہ اب وہ ہمارے ساتھ رہیں گی۔ یہ معلوم نہیں کہ کہاں، لیکن آج کل میں کوئی بندوبست ہو جائے گا۔ ان کا جو سامان پرانے گھر میں ہے وہ بعد میں کسی طرح نکال لیا جائے گا۔ شہلا مان گئی تو اس کی ماں کیسے نہیں مانے گی۔ وہ اس کی حقیقی ماں تو ہے نہیں، پھر تم ماسی کو رضامند کروگی لیکن اس سے زیادہ اہم کام جو تمہیں کرنا ہے وہ... یعنی تمہیں شہلا سے اکیلے میں رازداری کے ساتھ بات کرنی ہے۔ اس کے اور ڈی سلوا کے تعلقات... کی نوعیت کے بارے میں۔"

"وہ تو تم بھی جانتے ہو۔" رابعہ نے کہا۔ "میں اس موضوع پر کیا بات کروں۔"

"نہیں، وہ باتیں میں نے نہیں سنی ہیں جو تم نے سنی تھیں۔" محسن بولا۔ "اس رات سکندر بخت تمہارے ساتھ تھا نا۔ جب دونوں شہلا کے گھر گئے تھے — پھر وہاں ڈی سلوا آگیا تھا اور کچھ گرما گرمی ہوئی تھی۔ ڈی سلوا نے اور شہلا نے ایک دوسرے کو موردِ الزام قرار دیا تھا۔ تم ... ہو کہ الزام کیا تھے اور اب تمہیں شہلا سے پوچھنا ہے کہ معاملات کس حد تک آگے بڑھ چکے تھے۔ اور وہ ... سچ تھے یا... جھوٹ ہیں؟"

"میں معلوم کر لوں گی۔" رابعہ نے کہا اور اسی وقت ... اندر آگیا۔

رابعہ کو صدر بازار میں ماسی کے گھر ڈراپ کرکے ... نے شام پانچ چھ بجے تک لوٹ آنے کا وعدہ کیا اور ... کے ساتھ روانہ ہوگیا۔ اسے پولیس اسٹیشن کے قریب ... کے میں روانہ ہونے لگا تو محسن نے ادھر ادھر دیکھ کے جیب ... ریوالور نکالا اور مجھے تھما دیا۔

"اسے اپنے ساتھ رکھو، حالات زیادہ خطرناک ہو ... جارہے ہیں۔" وہ بولا۔ "ویسے بھی میرا ناجائز اسلحہ لے ... پولیس اسٹیشن میں داخل ہونا ٹھیک نہیں۔" میں نے ریوالور کو احتیاط سے چھپایا اور ہال روڈ کی طرف چل پڑا۔ ... بیشتر دکانیں ابھی بند پڑی تھیں۔ میں نے گاڑی کو ایک جگہ روک دیا اور رضوی صاحب کا دیا ہوا پتہ تلاش ... لگا۔ وہ دکان نسبتاً بہت چھوٹی تھی اور بڑے بڑے ... بورڈ والی الیکٹرانکس کی دکانوں کے درمیان دکھائی

دیتی تھی لیکن دوسرے چکر میں میری نظر نے وہ چھوٹا سا ... سائن بورڈ دیکھ لیا جس پر لکھے ہوئے حروف صاف طور پر ... پڑھے بھی نہ جاتے تھے۔ دکان بند تھی لیکن دس منٹ بعد ... نئے ماڈل کی ایک خاصی مہنگی کار دکان سے کچھ دور رکی ... کار کو ایک عورت چلا رہی تھی۔ اس نے ہاتھ ہلا کر مرد کو ... خدا حافظ کہا اور گاڑی میں سیدھی نکل گئی۔ مرد نے سڑک ... پار کرکے دکان کا دروازہ کھولا۔ باہر لوہے کی گرل تھی جو سمٹ ... کر ایک طرف ہوگئی۔ ایک پٹ کا شیشے والا دروازہ سامنے ... آگیا جس میں عام قسم کا ڈور لاک تھا۔ پانچ منٹ بعد میں ... دکان میں جا پہنچا۔

"امین صاحب!" میں نے ہاتھ بڑھا کے کہا۔ "کیا حال ہے آپ کا؟ کاروبار کیسا چل رہا ہے؟"

امین ابھی جھاڑ پونچھ کرنے میں لگا ہوا تھا۔ فرش پر اور الماریوں میں ناکارہ، نامکمل اور خراب ٹی وی اور ریڈیو ٹرانزسٹر، ان کے فاضل پرزے اور مرمت میں کام آنے والے آلات بھرے پڑے تھے۔ اس نے مجھے غور سے دیکھا اور ہاتھ ملا کے کچھ سوچتا رہا۔

"معاف کیجیے، میں آپ کو پہچان نہیں سکا۔" وہ بالآخر حیرت زدہ لہجے میں بولا۔

"ارے بھائی امین صاحب!" میں نے ہنس کر کہا۔ "آپ بھلا ہمیں کیوں پہچاننے لگے۔ ویسے بھی آپ اس شہر میں سب کو پہچاننے کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ پہنچنے والے پہنچ ہی جاتے ہیں۔" میرے لہجے نے اس کو چوکنا کر دیا۔

"کوئی کام ہے آپ کو؟ ریڈیو، ٹی وی ٹھیک کرانا ہے؟" وہ بولا۔

"لاحول ولاقوۃ۔" میں نے کہا۔ "یہ کام تو سب کر لیتے ہیں۔ اس کے لیے ہم آپ کو تکلیف دیں گے؟"

"اور کیا کام ہے؟" وہ محتاط ہو کے بولا۔ اس کی نظریں مجھ پر جمی رہیں۔

"امین صاحب! میں دس ہزار تک دینے کے لیے تیار ہوں۔" میں نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ "تین دن میں کام ہو جانا چاہیے۔"

"میں سمجھا نہیں آپ کیا چاہتے ہیں۔" وہ سخت لہجے میں بولا۔ "دس ہزار کس کام کے؟"

"دیکھو مسٹر امین! یہ ڈرامہ نہیں چلے گا۔" میں نے کہا۔ "کام وہی ہے جو تم پہلے بھی کر چکے ہو۔"

"میں صرف ریڈیو اور ٹی وی ٹھیک کرتا ہوں۔" وہ اسی لہجے میں بولا۔

"تم کیا کرتے ہو اور کیا نہیں کرتے، یہ سب مجھے معلوم ہے۔" میں نے مسکرا کے کہا۔ "اس میں پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ مجھے تو یہ بھی معلوم ہے کہ تمہاری گاڑی کا رنگ کیا ہے اور نمبر کیا ہے۔ ڈیڑھ لاکھ کی یہ گاڑی تم نے کب خریدی اور کیسے خریدی۔ جن لوگوں نے مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے۔ انہوں نے سب بتا دیا ہے۔"

"کس نے بھیجا ہے تمہیں؟" وہ اب نروس ہو رہا تھا۔ "تمہیں غلط فہمی تو نہیں ہوئی؟"

"مجھے ڈی سلوا نے بھیجا ہے۔" میں نے اچانک سنجیدہ ہو کے کہا۔ "اب سمجھے؟ تم نے اس کے لیے ایک ٹرانزسٹر ریڈیو اور ٹرانسمیٹر کا یونٹ بنایا تھا اور اس میں ایک بم رکھا تھا۔"

"تمہارا دماغ خراب ہے۔" وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کے بولا۔

"میں فضول بکواس سننے نہیں آیا ہوں۔" میں نے جیب سے ریوالور نکال کر سامنے رکھ لیا۔ "اگر معاوضہ کم ہے تو منہ سے بکو کتنا چاہیے لیکن کام تین دن میں ہوگا ورنہ" میں نے پیشہ ور بدمعاشوں کی طرح لہجے کو خطرناک بنا کے ریوالور کا رخ اس کے سینے کی طرف کر دیا۔ "نمٹنے والے خود تم سے نمٹ لیں گے۔"

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "پرسوں شام کو آجانا۔" اس نے اداکاری چھوڑ کے یکلخت کاروباری لہجہ اختیار کر لیا۔ اس کا یہ خوف دور ہو گیا تھا کہ یہ پولیس کا پھیلایا ہوا جال نہ ہو۔ ناجائز کاروبار کرنے والوں کے لیے اپنا اطمینان ضروری ہوتا ہے اور شاید ان کی بھی کوئی چھٹی حس ہوتی ہے جو بتا دیتی ہے کہ خطرہ موجود ہے یا نہیں ہے۔

میں نے ریوالور جیب میں رکھا۔ جیب میں سے پانچ ہزار کے نوٹ یوں نکالے جیسے ان کی حیثیت ردی کاغذ سے زیادہ نہیں اور اس کے سامنے پھینک دیے۔ "یہ آدھی رقم ہے، باقی کام کرنے پر۔" میں نے کہا۔

اس نے نوٹوں پر ایک نگاہ ڈالی لیکن ان کو ہاتھ نہیں لگایا۔ "کام ہو جائے گا لیکن یہ ڈی سلوا کون ہے؟" وہ بولا۔

"ڈی سلوا تمہارا باپ ہے اور کون۔" میں نے دروازے کا رخ کرتے ہوئے غرا کے کہا۔ میرے باہر نکلنے تک وہ اسی طرح بیٹھا تھا اور بعد میں بھی مجھے دیکھنے کے لیے باہر نہیں

آیا۔ اسے یقین آچکا تھا کہ میں کسی بہت بڑے بدمعاش کا نمائندہ ہوں۔ ڈی سلوا کے نام پر اس کی حیرانی جائز تھی۔ وہ سمجھا ہوگا کہ یہ بھی کوئی بڑا بدمعاش ہی ہے کیونکہ ڈی سلوا نے بھی کسی اور کو ہی بھیجا ہوگا۔ یہ بعید از قیاس بات تھی کہ ڈی سلوا نے خود آکے اپنے آپ کو صحیح نام سے متعارف کرانے کا خطرہ مول لیا ہو۔ میں نے اندھیرے میں تیر چلایا تھا جو نشانے پر بیٹھا تھا۔ رضوی صاحب کو شہر بھر کی خبر تھی اور انہوں نے مجھے ایک نام پتہ فراہم کر دیا تھا۔ انہیں میری ذہانت پر اتنا اعتماد ضرور تھا کہ میں اس سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکوں گا۔ ڈی سلوا نے بھی این کی خدمات حاصل کی تھیں یا نہیں اور فنّی مہارت کے ایک کام کا کیا معاوضہ دیا تھا، یہ معلوم کرنا مشکل تھا۔ تاہم میرا اندازہ میرے کام آیا اور دس ہزار میں یہ سودا برا نہیں تھا۔ خود کو بہت زیادہ چالاک اور طاقت ور سمجھنے والے دشمن کی خوش فہمی دور کرنا اپنی بقا کی ضمانت حاصل کرنے کے مترادف تھا۔ اگر وہ شکاری تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ مجھے آسانی سے شکار کرلیں گے تو میں ان پر ثابت کرنا چاہتا تھا کہ شکاری میں بھی ہوں اور ان کو انہی کے ہتھیاروں سے شکار کر سکتا ہوں۔

اس کامیابی نے میرے حوصلے کو ہمالیہ پہاڑ سے بھی اونچا کر دیا تھا۔ یہ سب خدا کی مدد تھی کہ لندن سے ڈی پورٹ ہو کے وطن لوٹنے والا، لاوارث اور لاعلم سکندر آج اتنے اعتماد کے ساتھ دشمنوں کے خلاف صف آرا تھا اور اپنی طاقت کے زعم میں مبتلا دشمن جو سمجھتے تھے کہ سکندر کو چوہے دان میں پھنسنے والے چوہے کی طرح شکار کیا جا سکتا ہے، پریشانی اور خوف کا شکار ہونے لگے تھے۔ میں نے حالات کی ہر سختی جھیلی تھی اور ہر قربانی دی تھی لیکن امید کا دامن کبھی نہ چھوڑا تھا۔

دوپہر کے بعد میں نے تین مکان دیکھے۔ ان میں سے صرف ایک فوری طور پر دستیاب تھا اور کسی حد تک ہماری ضروریات کو بھی پورا کرتا تھا لیکن میں نے کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا۔ شام تک تلاش جاری رکھنے میں کوئی ہرج نہیں تھا۔ دوپہر کے کھانے کے لیے میں نعمت کدہ گیا۔ وہاں معمول کے مطابق تل دھرنے کی جگہ نہ تھی اور مجھے کچھ دیر کوئی سیٹ خالی ہونے کا انتظار کرنا پڑا۔ ایک اور شخص میرے ساتھ آکھڑا ہوا۔ چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد، سرخ و سفید چہرہ، قابلِ رشک صحت، سیاہ شیروانی اور کلف دار طرے والی پگڑی۔ ہاتھ میں عصا اور انداز میں رعونت۔ بالکل کسی ریاستی نواب یا والیٔ ریاست یا بہت بڑے جاگیردار کی جیتی جاگتی تصویر۔ میں نے صرف ایک بار اسے دیکھا اور محسوس کیا کہ اس کی نظریں میرا جا رہی ہیں۔

"معلوم ہوتا ہے سارا شہر اسی وقت ولیمہ کھا رہا ہے۔" وہ میری طرف دیکھ کے مسکرایا۔

ولیمے کے نام پر مجھے بھی ہنسی آئی کیونکہ لوگ ندیدوں کی طرح کھا رہے تھے۔ "دراصل معقول نرخ پر اچھا کھانا ہر جگہ نہیں ملتا۔" میں نے کہا۔ "باقی جگہ نام بڑے اور درشن چھوٹے والی بات ہے۔"

اسی وقت ایک میز خالی ہوئی اور میں آگے بڑھا۔ مجھے اس والیٔ ریاست کا خیال آیا اور میں نے پلٹ کر اسے ... بھی آجائیے۔ میرا خیال ہے دو شریف آدمی ایک میز پر کھانا تو کھا ہی سکتے ہیں۔" اس نے فقط سر ہلایا اور میرے مقابل بیٹھ گیا۔ ہم نے اپنی اپنی پسند کے مطابق آرڈر دیا۔ کھانا کھاتے ہوئے بھی کوئی بات نہیں کی۔ شرمندگی مجھے اس وقت ہوئی جب اس نے دونوں بل اٹھا کر ویٹر کو سرکا ... تھما دیا۔

"یہ آپ کی سراسر زیادتی ہے۔" میں نے احتجاج کیا۔

"اپنی بات یاد کرو۔" وہ دانتوں میں خلال کرتے ہوئے بولا۔ "یہ زیادتی کیسے ہوگئی۔ بھئی ہم دونوں شریف آدمی ہیں۔ دونوں نے ایک جگہ بیٹھ کے کھانا کھالیا۔ کسی کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی۔ تم نے اپنی پسند کا کھائی اور اپنے ہاتھوں سے کھائی۔"

"میرا مطلب یہ تھا کہ سارا بل آپ نے کیوں ادا ..." میں نے خفت سے کہا۔

"اور کیا آدھا بل دیتا؟ ایک طرف خود کو شریف آدمی کہتے ہو، دوسری طرف بیس بائیس روپے کی ... شمار کرتے ہو۔" وہ بولا۔ "میرا خیال ہے یہ بہت چھوٹی بات ہے۔"

میں لاجواب ہوگیا۔ ہم ایک ساتھ باہر نکلے۔ اخلاقاً میں نے کہا۔ "میں تو اب اجازت چاہوں گا کیونکہ مجھے شام تک چھپانے کا کوئی ٹھکانا ڈھونڈنا ہے۔ اگر آپ کو کہیں جانا ..."

"میری گاڑی وہ کھڑی ہے۔" اس نے چھڑی سے اشارہ کیا اور میں اس کی چمکتی دمکتی شاندار مرسڈیز کو دیکھ کر مزید شرمندہ ہوا۔ "تم کیا اپنے لیے کرائے کا مکان تلاش کر رہے ہو؟" وہ بولا۔

بات بالکل غیر ارادی طور پر میری زبان سے نکل گئی ... میں نے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔ "جی نہیں، میں کو ...

مکان خریدنا چاہتا ہوں۔"

"ہوں!" اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "کتنی مالیت کا؟ صرف اپنے لیے چاہیے یا فیملی بھی ہے؟ دراصل میں خود اپنا ایک مکان بیچنا چاہتا ہوں۔ بہت دن سے خالی پڑا ہے۔"

"مجھے مکان چاہیے جس میں کم سے کم چار بیڈ روم ہوں۔ پانچ یا چھ بھی ہوں تو مضائقہ نہیں۔" میں نے کہا۔ "علاوہ ڈرائنگ ڈائننگ وغیرہ کے۔ اگر دو منزلہ ہو تو اور بھی اچھا ہے۔ دو یا کم سے کم ایک گاڑی کھڑی کرنے کی جگہ ہو اور بہتر ہے کہ کسی نئی آبادی میں ہو۔ فاصلے کی کوئی قید نہیں۔"

"واہ میاں واہ۔" وہ شخص اپنی بڑی بڑی گھنی مونچھوں پر ہاتھ پھیر کے بولا۔ "یہ تم اپنی پسند بتا رہے ہو یا میرے مکان کا نقشہ بیان کر رہے ہو؟"

"میرے ساتھ ایک مسئلہ اور بھی ہے۔" میں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ "میرے پاس رقم کچھ کم ہے لیکن ایک پلاٹ ہے جو محلِ وقوع کے اعتبار سے کمرشل بن سکتا ہے۔ کراؤن سینما والی سڑک پر، سینما سے چند قدم دور۔ مجھے امید ہے کہ اس کی بڑی اچھی قیمت ملے گی اور وہ کھڑے کھڑے بک جائے گا۔ باقی رقم پلاٹ کی فروخت کے بعد ادا کی جا سکتی ہے۔ میں ہر قسم کی شخصی ضمانت بھی فراہم کر سکتا ہوں۔"

"پھر مسئلہ کیا ہوا؟" اس نے چھڑی کو عادت کے مطابق گھمانا شروع کیا۔ "تم میرے ساتھ چلو اور مکان دیکھ لو۔ پسند آجائے تو کل جو کچھ ہے لے آنا، مکان تمہارا، باقی پھر سہی۔ مجھے کوئی جلدی تو نہیں ہے۔"

مجھے یوں لگا جیسے قدرت میری مدد پر آمادہ ہے اور میری تلاش آج ہی ختم ہو جائے گی۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ اس شخص کے ساتھ جانے کے لیے کیا طریقہ اختیار کروں، اس کی شاندار گاڑی کے مقابلے میں چھکڑا نظر آنے والی گاڑی لے کر پیچھے چل پڑوں یا اس کے ساتھ بیٹھ جاؤں کہ اس نے مجھے بازو تھام کے کھینچ لیا۔

"اپنی گاڑی اسی جگہ رہنے دو۔" وہ بولا۔ "میرا شوفر تمہیں پھر یہاں چھوڑ جائے گا۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔" میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ "میں رکشا ٹیکسی سے آجاؤں گا۔" ابھی تک میں نے اس کے شوفر کو نہیں دیکھا تھا۔ ہم گاڑی کے قریب پہنچے تو وہ دروازہ کھولنے کے لیے اچانک نمودار ہوا اور میں اسے دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ وہ سو فیصد اپنے آقا کی تصویر تھا۔ ان کے ناک نقشے، قد و قامت، حلیے اور لباس میں سرمو فرق نہ تھا۔ عام دیکھنے والا یہی سمجھتا کہ وہ جڑواں بھائی ہیں اور ان میں اتنی محبت ہے یا ان کی پسند بھی اتنی ملتی ہے کہ دونوں ایک جیسا لباس پہنتے ہیں۔ میں اپنے بارے میں بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے ہو جاتے تو میں کسی فرق سے مالک یا شوفر کو پہچان سکتا۔ وہ میری حیرت دیکھ کر مسکرایا۔ شوفر نے پیچھے والی سیٹ کا ... زہ تھامے باادب کھڑا رہا۔

"بات دراصل یہ ہے میاں ... ا ... پیچھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی میرے ساتھ بیٹھ کر ... م ... زار لوگ ہیں۔ گاؤں کے رہنے والے مگر جدی پشتی ... زار ہیں۔ میرے آبا و اجداد کو انگریزوں نے ریاست سے محروم کر دیا تھا۔ انہوں نے ایک قانون بنایا تھا کہ کسی راجہ مہاراجہ یا نواب کا وارث نہیں ہوگا تو اس کی موت کے بعد ریاست خود بخود برطانوی سلطنت کا حصہ بن جائے گی۔ یہ قانونِ الحاق تھا۔ اس کے نفاذ سے پہلے راجے مہاراجے اور والیانِ ریاست کسی کو گود لے لیتے تھے تو بعد میں وہ تخت و تاج کا مالک ہو جاتا تھا۔ انگریز نے یہ سلسلہ بند کر دیا۔ بعد میں کچھ اس قسم کے حالات پیدا ہوئے کہ وائس رائے ہند نے ہمارے دادا کو تقریباً اتنی ہی بڑی جاگیر بخش دی جتنی بڑی ریاست تھی اور دلی دربار میں ان کی پذیرائی ہوتی۔ یہ وفاداری کا انعام تھا یا غداری کا صلہ، جو چاہو سمجھ لو، کیونکہ یہ الگ ایک کہانی ہے۔ جو جاگیر ان کو ملی وہ بدقسمتی سے پہلے کسی ہندو راجہ کی ملکیت تھی۔ وہ خود بغاوت کے دوران مارا گیا تھا۔ اس کے تین بیٹے تھے جن کو توپ دم کر دیا گیا۔ تین بیٹوں کے سات لڑکے تھے جو اس زمانے میں شیر خوار تھے چنانچہ ان کی جان بچ گئی۔ بیوہ ہو جانے والی تینوں عورتیں جان بچا کے نکل گئیں اور کسی کو معلوم نہیں کہ کہاں رہیں۔ لیکن سفر کے دوران میں رانی بھی مرگئی اور مرتے مرتے انتقام کی وصیت کر گئی۔ یہی اس کے سات پوتوں کی ماؤں نے کیا۔ ان تینوں نے مرتے وقت بیٹوں کو قسم دی کہ وہ اپنے باپ کے قاتلوں سے اور دشمنوں سے انتقام ضرور لیں۔ یہ ساتوں لڑکے جب بڑے ہوئے تو حالات بہت بدل چکے تھے۔ ان کے پاس پرانے وقتوں کی دستاویزات تھیں۔ وہ اپنا مقدمہ عدالت میں لے گئے اور میری جاگیر پر اپنا حقِ ملکیت ثابت کرنے کے لیے انہوں نے ہر بڑے وکیل کی خدمات حاصل کر لیں۔ یہ تقسیم سے پہلے کی باتیں ہیں۔ نوجوان لڑکے انگریز سے دشمنی کے جذبات

کو بھول کر صرف جاگیر کے چکر میں تھے اور ان کا دشمن میں بن گیا تھا حالانکہ جو کچھ ہوا اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ ان کے پاس بھی حقِ ملکیت کی کوئی بنیاد نہیں تھی مگر تم جانتے ہو وکیل آدمی کو کیسا چکر دیتے ہیں۔ انہوں نے بھاری فیس وصول کی اور یقین دلایا کہ ان کا حق ضرور ملے گا۔ اتنی فیس انہوں نے کیسے ادا کی اور زندگی کیسے گزاری؟ اس کے بارے میں عام قیاس یہی تھا کہ رانی اور اس کی بہو کے پاس بے حساب سونا تھا اور زر و جواہر تھے جو انہوں نے حالات کا اندازہ کرتے ہوئے پہلے ہی کہیں گاڑ دیے تھے۔ ۔ ۔ قصہ مختصر، مقدمہ خارج ہو گیا۔ انہوں نے ہائیکورٹ میں اپیل کی اور ہار گئے۔ فیڈرل کورٹ میں ان کی اپیل زیرِ سماعت تھی کہ یہ جاگیر جو مغربی پنجاب میں تھی، پاکستان میں شامل ہو گئی۔ انڈین سپریم کورٹ کے دائرہ سماعت سے باہر ہو گئی اور دوسرے ملک کے قانون کے تحفظ میں آ گئی۔ میں شرط لگا کے کہہ سکتا ہوں کہ حالات نہ بدلتے تب بھی وہ مقدمہ خارج ہو جاتا جو ایک فضول سے آئینی نکتے پر چل رہا تھا۔ لیکن ان ساتوں بھائیوں نے جو آپس میں کزن تھے، اپنی شکست کو نوشتہ تقدیر سمجھ کے قبول نہیں کیا۔ انہوں نے تلسی کے پتے پر قسم کھائی کہ جاگیر ان کے خاندان کی نہ رہی تو میرے خاندان کی بھی نہیں رہے گی۔ وہ سرحد پار کر کے پاکستان آ گئے۔ انہوں نے مسلمانوں جیسے نام رکھ لیے۔ دل سے وہ اب بھی ہندو مت کے عقائد پر قائم ہوں گے۔ میں اپنے خاندان کا ایک ہی وارث رہ گیا ہوں۔ مجھ سے بڑا بھائی آج کل آسٹریلیا میں ہے اور مجھے بالکل معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہے۔ زندہ ہے کہ مر گیا۔ سب سے چھوٹا بہت جوشیلا اور بانکا نوجوان تھا۔ اس نے فوج میں کمیشن لیا اور کشمیر میں جنگ بندی لائن پر شہید ہو گیا۔ اب میرے دو بچے ہیں جن کے بارے میں کسی کو بھی معلوم نہیں کہ وہ ایبٹ آباد میں زیرِ تعلیم ہیں۔ میرے وہ سات دشمن کئی بار مجھ پر قاتلانہ حملے کر چکے ہیں لیکن میں بھی اپنی حفاظت کے خیال سے غافل نہیں ہوں۔ میرے مزارعے مجھ سے بہت خوش اور مطمئن ہیں اور صحیح معنی میں جاں نثار ہیں۔ کوئی اجنبی وہاں آسانی سے نہیں پہنچ سکتا۔ میں خود مسلح پھرتا ہوں اور اپنے ساتھ ایک باڈی گارڈ ضرور رکھتا ہوں۔" اس نے ہاتھ سے اپنے سامنے شوفر کی جانب اشارہ کیا۔ "یہ دشمنوں کو دھوکا دینے کا پرانا طریقہ ہے۔ میں نے سنا ہے کہ ہٹلر بھی کسی ہم شکل کو ساتھ رکھتا تھا اور خدا جانے یہ سچ ہے کہ جھوٹ کہ کئی بار وہ ہٹلر کی جگہ پبلک کے سامنے بھی چلا گیا اور کوئی اسے نہ پہچان سکا۔ فیلڈ مارشل رومیل میں سے بھی کوئی ایسا ہی کرتا تھا۔" وہ ہنسا۔ "اب میں کر رہا ہوں۔ اس سے زندگی اور موت کے ففٹی ففٹی ہو جاتے ہیں۔ میرے اس ہمشکل پر ... مرتبہ قاتلانہ حملے ہوئے لیکن گاڑی بلٹ پروف ... لیے کوئی نقصان نہیں ہوا۔ تم کہو گے یہ تو بڑا کمینہ اور خود غرضی ہے کہ اپنی زندگی پر میں نے کسی اور کی ز... پر لگا رکھی ہے لیکن برادرِ عزیزم! دنیا میں بہت ... اپنی زندگی سے جوا کھیلتے ہیں۔ عجیب و غریب کا... سر انجام دیتے ہیں۔ کسی کو ماؤنٹ ایورسٹ سر کر... ہے تو کسی کو نیاگرا فال میں کودنے کا، لیکن یہ ذرا... دے دی میں نے ۔ ۔ ۔ عام آدمی جب چوری کرتا ہے ... ڈالتا ہے یا اسمگلنگ وغیرہ کرتا ہے تو کیا وہ ... بھروسہ کر کے جوا نہیں کھیلتا؟ وہ مارا بھی جا سکتا ہے ... یا تختہ قبول کرنے والے زندگی کے ہر مرحلے پر جوا ... میں نے اس شخص سے ایک معاہدہ کر رکھا ہے۔ اگر ... خاطر مارا گیا تو اس کے بیوی بچوں کی کفالت میری ... ہو گی۔ کفالت کا مطلب دال روٹی دینا نہیں ... لیے اعلیٰ ترین تعلیم کا انتظام ہو گا، خواہ وہ ولایت ... پڑھیں۔ بیٹیوں کی ویسی ہی شادی ہو گی جیسی میری ... اور مرضی کے مطابق ہو۔ رہائش کا بندوبست ... اخراجات کے لیے میں دس ہزار روپیہ ماہانہ بطور ... ہوں۔ وہ ان کو حسبِ سابق ملتا رہے گا۔ کیا اتنی ... کافی نہیں اور یہ سو فیصد اختیاری معاہدہ ہے۔ اس ... کو ذرا بھی دخل نہیں۔"

میں نے اس کی پوری کہانی بہت دلچسپی سے سنی اور اس کی منطق پر غور کرتا رہا۔ وہ یقیناً ... آدمی تھا۔ اس کی گفتگو کا انداز متاثر کرتا تھا اور ... اس نے جو حوالے دیے تھے وہ اچھے مطالعے کا ... لیکن جس بات نے مجھے ہوشیار کر دیا تھا وہ ایک ... جو اس سے نادانستگی میں سرزد ہوئی۔ نعمت کدہ ... ملاقات کے بعد کھانا کھاتے ہوئے وہ بالکل ... تھا اور بعد میں بھی جو گفتگو ہوئی اس میں کہیں ... اپنا نام نہیں لیا تھا، لیکن اس نے اپنی داستان کے ... ہی مجھے نام لے کر مخاطب کیا تھا۔ میرے حالات ... مجھ کو بہت زیادہ حساس اور شکی مزاج بنا دیا تھا۔ ... غلطی کو کیسے نہ پکڑتا؟ اور اس کے بعد یہ فرض ... مجھے پہلے سے جانتا تھا اور اس کا نعمت کدہ میں آجانا اتفاق نہیں تھا۔ پھر اس نے مجھے میری پسند اور شرائط کے مطابق ایک مکان بھی پیش کر دیا۔ اب مجھے یہ دیکھنا تھا کہ آگے کیا ہوتا ہے؟

"تم کچھ سوچ میں پڑ گئے ہو؟" وہ بولا اور میں نے دیکھا ہم گاڑی شہر کے مضافات میں ایک مکان کے سامنے کھڑی ہے۔

"دراصل میں یہ سوچ رہا تھا کہ آپ نے مجھے سب کچھ بتا دیا لیکن ابھی تک اپنا نام نہیں بتایا۔" میں نے گاڑی سے باہر آتے ہوئے کہا۔

"یہ خوب رہی۔" وہ ہنسا۔ "جو کام سب سے پہلے ہونا چاہیے تھا یعنی تعارف کا، وہ ابھی تک نہیں ہوا۔ ... بھی لوگ مجھے مختلف ناموں سے یاد کرتے ہیں مثلاً مزارعے ... وہ تسمرف مالک کہتے ہیں تو آکسفورڈ کے زمانے کے دوست ... مجھے جمی کہتے تھے لیکن ہوں میں خسرو جمشید۔" وہ پھر ہنسا۔ "یہ ... نام رکھنے میں کیا مصلحت تھی؟ یہ میں نے اپنے والد سے ... ابھی نہیں پوچھا۔ مجھ سے چھوٹا جو شہید ہو گیا وہ خسرو پرویز تھا۔ ... خیر تم آؤ مکان دیکھو۔ بھئی معاف کرنا میں نے پھر تعارف کا سلسلہ ادھورا چھوڑ دیا۔" وہ چلتے چلتے رکا۔ "مجھے تم سے ... تمہارا نام بھی تو پوچھنا چاہیے۔"

"مجھے سکندر بخت کہتے ہیں جناب!" میں نے معصومیت سے کہا۔ "میرے ساتھ ایک بہن ہے، ایک بھائی ہے، ایک مفلوج ماں ہے، ایک خادمہ ہے اور ۔ ۔"

"میں سمجھ گیا۔" وہ بے ساختہ ہنسا۔ "ان کے علاوہ ایک بیوی ہے، ایک بچہ ہے۔ سب ایک ۔ ۔"

مکان میری توقعات سے کہیں زیادہ بہتر ثابت ہوا۔ لیکن اس سے میرے شکوک پختہ ہو گئے۔ مکان نیا بنا ہوا تھا اور اس کا رنگ و روغن بتاتا تھا کہ ابھی تک اس میں کسی نے رہائش اختیار نہیں کی۔ ایک کنال رقبہ پر بنے ہوئے اس مکان میں چار کمرے نیچے تھے اور دو اوپر تھے۔ اوپر کے دونوں کمروں کے درمیان خاصا کشادہ اور جدید قسم کا باتھ روم تھا اور ایک چھوٹا سا کچن گویا اوپر کا حصہ بھی ایک مکمل رہائشی یونٹ تھا۔ پچھلے حصے میں جو گیراج تھا اس میں دو گاڑیاں ساتھ ساتھ کھڑی کی جا سکتی تھیں اور ایک سرونٹ کوارٹر تھا جسے انیکسی بھی کہا جا سکتا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق یہ مکان دوگنی قیمت کا تھا اور جمشید نے جو قیمت مانگی وہ ہماری قوتِ خرید کے برابر تھی لیکن اصل قیمت سے آدھی تھی۔

"جمشید صاحب!" میں نے کہا۔ "یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ اگر آپ کو اس مکان میں رہنا نہیں تھا تو آپ نے بنایا کیوں تھا۔ اس کے علاوہ اب جو قیمت آپ مانگ رہے ہیں وہ میرے اندازے کے مطابق بہت کم ہے۔ ابھی دو گھنٹے پہلے میں اور آپ اجنبی تھے۔ ایک دوسرے کو نام اور صورت سے بھی نہیں جانتے تھے ۔ ۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو میاں سکندر!" وہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے بولا اور میں نے محسوس کیا کہ اس کے لہجے میں اچانک بڑی تھکن اور اداسی اتر آئی ہے۔ "دنیا میں کوئی ایسا نہیں کرتا اور اگر کرے تو لوگ سمجھتے ہیں کہ پاگل ہو گیا ہے۔ بات صرف سمجھنے کی ہے جو آدمی کو اور اس کے حالات کو نہیں سمجھتے وہ کچھ بھی سمجھ سکتے ہیں۔ مکان میں نے واقعی رہنے کے لیے بنوایا تھا لیکن تقدیر کو کچھ اور منظور تھا۔ جس کی خاطر یہ سب کچھ کیا تھا اس نے ساتھ نہیں دیا۔ اب وہ ایک ایسے گھر میں رہتی ہے جو اس سرونٹ کوارٹر کے برابر بھی نہیں ہے۔ ایک تنگ و تاریک گلی میں۔" اس نے ایک سرد آہ بھری۔ "خدا اسے خوش رکھے۔ آدمی کو رہنا بھی وہیں چاہیے جہاں دل کی خوشی ملے۔ خوشی بڑا عجیب پودا ہے۔ کبھی اسے جھونپڑے کی آب و ہوا راس آتی ہے تو کبھی یہ محلوں کی دیواروں میں بھی سوکھ جاتا ہے۔"

"میں آپ کے نجی معاملات کے بارے میں کوئی سوال نہیں کروں گا۔" میں نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہا۔ "لیکن میرے دوسرے سوال کا جواب آپ نے نہیں دیا؟"

"اس کا میں کیا جواب دوں؟" وہ دونوں ہاتھ چھڑی پر رکھے بولا۔ "اس کی بھی ایک جذباتی وجہ ہے جو میں نہیں بتا سکتا، نہ تم یقین کرو گے اور نہ یہ سمجھو گے کہ میں پاگل ہوں۔ تم یہ بتاؤ کہ اس قیمت پر ایسا مکان تمہیں کہیں مل سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ نہیں مل سکتا۔ اس سودے میں تمہارا فائدہ ہے۔ پھر سوال و جواب کی کیا ضرورت ہے۔ میری چیز ہے میں ایک روپے میں بیچ دوں یا کسی کو تحفے میں دے دوں۔ اخلاقی اور قانونی طور پر یہ کوئی جرم نہیں۔"

"بات یہ ہے جناب عالی کہ نواب صاحب کا چھوٹا بھائی جو شہید ہو گیا تھا۔" شوفر نے پہلی بار ہمت کر کے لب کھولے۔ "اس کی صورت بالکل آپ جیسی تھی۔ آپ تصویر دیکھیں گے تو کہیں گے کہ میری تصویر ہے۔"

"نہیں، نہیں۔" جمشید چلایا۔ "اس کی وجہ یہ نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے بے شک تم خسرو پرویز ہو ۔ ۔ ۔ لیکن وہ تو شہید ہو چکا ہے۔ کیا یہ بات میں نہیں سمجھتا۔ بس میں یہ مکان

تمہیں اسی قیمت پر دینا چاہتا ہوں۔۔۔ تم لو گے یا نہیں؟" اس کی آواز کانپ رہی تھی، لیکن وہ مشتعل نہیں تھا، صرف جذبات کی شدت سے مغلوب تھا اور اپنی اعصابی کش مکش کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

"میں کیسے انکار کر سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "مجھے تو اس سودے میں فائدہ ہی فائدہ ہے۔ جو نقد رقم ہے، وہ کل آپ کو ادا کر دی جائے گی۔ باقی وعدے کے مطابق۔ قبضہ کل مل جائے گا؟"

"قبضہ؟" جمشید نے یہ لفظ دہرایا۔ "قبضہ لے لو، ابھی لے لو۔۔۔ یہ لو۔" اس نے چابی مجھے تھمانے کی کوشش کی۔

"جی نہیں۔" میں نے پریشان ہو کے کہا۔ "مجھے اتنی جلدی بھی نہیں ہے۔ میں آپ سے چابی کل لے لوں گا۔ یہ بتائیے کہ آپ کہاں ملیں گے؟"

"تمہاری مرضی۔" اس نے چابی واپس جیب میں رکھی۔ "اگر تم کل شام کو آؤ تو میں اسی جگہ ملوں گا۔ تم جتنی رقم لا رہے ہو اس کا بنک ڈرافٹ یا پے آرڈر بنوا لانا۔ باقی سیل ڈیڈ، دوسرے قانونی اور کاغذی مرحلے بعد میں طے ہو جائیں گے۔" وہ شوفر کی طرف پلٹا۔ "جاؤ سکندر صاحب کو چھوڑ آؤ۔ میں یہیں تمہارا انتظار کروں گا۔" اس نے مجھ سے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور میں اسے خدا حافظ کہہ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ میرا خیال تھا کہ شوفر میرے پیچھے آ رہا ہوگا۔ دروازے کے پاس پہنچ کر مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ غائب تھا مگر چند سیکنڈ بعد وہ بھی نمودار ہو گیا۔ اب میرے لیے فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ چند سیکنڈ کے اس فرق میں کیا ہوا، جب میں ان کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ کیا خسرو جمشید نے اپنا عصا شوفر کو تھما دیا اور خود شوفر بن کے میرے پیچھے چل پڑا یا اس نے واقعی شوفر کو بھیج دیا۔ اگر میں ان پر نگاہ رکھتا تو یہ دھوکا نہ ہوتا مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ عقل کی دلیل یہ تھی کہ جمشید نے شوفر کی جگہ لی ہو گی۔ آخر اسے شہر سے اتنی دور ایک بالکل خالی گھر میں ٹھہرنے کی کیا ضرورت تھی جبکہ وہ میرے ساتھ بھی آ سکتا تھا مگر اس کا ارادہ یہ ہو گا کہ میرا تعاقب کرے اور اگر میں اس کا تعاقب کروں تو دیکھ لے۔ ڈرائیور کی عقل پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ مجھے اپنی جائے رہائش سے بے خبر رکھنا چاہتا ہے اور اسی لیے سودا کرنے کے لیے اپنے آفس یا گھر کے بجائے اس نے شام کے وقت مجھے مکان پر پہنچنے کے لیے کہا تھا۔ بنک ڈرافٹ

اور پے آرڈر کی بات میرے اطمینان کے لیے تھی رقم لے جانے کی صورت میں لٹ جانے کا اندیشہ لیکن اب میرا اگلے روز شام کے وقت پہنچنا یقینی اور ان کو یہ مہلت کوئی دامِ اجل بچھانے کے لیے

شوفر خاموشی سے گاڑی چلا رہا تھا اور میں میں کھویا ہوا تھا لیکن میری نظر مسلسل راستے پر تھی یقین تھا کہ شوفر کی جگہ خود جمشید گاڑی چلا رہا ہے خالی مکان کو مقفل کر کے کسی رکشا ٹیکسی میں گھر گا۔ جمشید ابھی تک اپنے ڈرامے میں کامیاب تھا بالکل احساس نہ تھا کہ قبل از وقت میرا نام لینے کی غلطی نے اس کا راز فاش کر دیا تھا۔ میں بھی یہ سمجھنے بجانب تھا کہ جمشید نیا شکاری ہے جو نیا جال لے کر آیا ہے۔ چوہدری دلاور، ڈی سلوا، خسرو جمشید۔۔۔ کیا ان کے علاوہ بھی کوئی ہے جو ابھی تک پسِ پردہ ہوگا سوچا مگر اس سوال کا جواب صرف وقت ہی دے چال اچھی تھی اور صحیح سمت میں تھی۔ دشمن سوچ رہے تھے کہ رابعہ کب تک پرائے گھر میں رہے گی۔ اس کے پاس پیسہ ہے، وہ مکان تو خریدے گی لیکن اکیلی نہیں رہ یہ تو تقریباً طے تھا کہ میں اور محسن اس کے ساتھ ہوں گے لیکن ہمارے معاشرے میں ایک جوان اور خوبصورت شادی شدہ لڑکی دو جوان کنوارے مردوں کے ساتھ نہیں سکتی ہے جن سے کوئی رشتہ بھی نہ ہو۔ انھوں نے اندازہ ہو گا کہ وہ مجھ سے شادی کر کے رہے گی اور اندھیرے تیر چلایا تھا کہ شاید ہم اچانک غائب ہو جانے والی اور اس کی ماں کو بھی ساتھ رکھیں گے۔ وہ جانتے تھے کو کسی نے اغوا نہیں کیا ہے۔ ہم نے حالات سے نا ہوتے اسے چھپا دیا ہے۔ ایک سستا مکان ہمیشہ جُوا کھیل رہے تھے کیونکہ وہ اور کسی طرح سے شہلا کا لگانے میں بھی ناکام رہے تھے اور میری ایک بات میرے قتل کی کوشش کو بے فائدہ بنا دیا تھا۔ اب نقطۂ نظر سے یہ امکان پیدا ہو گیا تھا کہ میں اور سب وارث رابعہ، محسن اور شہلا، ایک مکان میں جائیں تو اس مکان کے نیچے بارود بچھا کے سب کا نام مٹا دیا جائے۔

گاڑی ایک بار پھر نعمت کدہ کے سامنے جا رکی نیچے اتر کے ڈرائیور کا شکریہ ادا کیا جو میرے لیے دروازہ مؤدب کھڑا تھا لیکن دروازہ بند کر کے بھی وہ والی

کی جگہ پر نہیں بیٹھا۔ وہ میری طرف دیکھے بغیر سگریٹ پینے کے بہانے ایک پان فروش کے کھوکھے کی طرف بڑھا جہاں پہلے سے پانچ چھ آدمی کھڑے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ مجھے اپنی گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہونے کا موقع دینا چاہتا ہے۔ میرے پاس فیصلے کے لیے بہت کم وقت تھا۔ میں نے آہستہ سے اگلے والا دروازہ کھولا، چابیاں سوئچ میں لٹک رہی تھیں۔ آدھے منٹ سے بھی کم وقت میں چابی کھینچ کر میں نے دروازہ پھر بند کر دیا۔ وہاں ٹریفک کا اتنا شور تھا کہ اشارے پر بند ہونے والے دروازے کی آواز ڈرائیور کے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ میں چند قدم چل کے یوں کھڑا ہو گیا جیسے سڑک پار کرنے کے لیے ٹریفک کے رکنے کا انتظار کر رہا ہوں۔ اسی وقت میں نے جمشید کو سگریٹ خرید کر واپس آتے ہوئے دیکھا اور اس کی طرف دیکھ کے مسکرایا۔ پھر میں نے آدھی سڑک پار کی اور درمیان کی فٹ پاتھ جیسی جگہ پر رک گیا۔ جو سڑک کو آنے اور جانے کے لیے دو حصوں میں جدا کرتی تھی۔ پیچھے دیکھنے پر مجھے جمشید تھوڑا سا بدحواس نظر آیا۔ وہ اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈال کے دیکھ رہا تھا اور شاید یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اترتے وقت انجن بند کرنے کے بعد اس نے چابیاں نکالی تھیں یا نہیں۔ مجھ پر شک ہو ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ میں پیچھے والی سیٹ پر بیٹھا تھا اور میرے لیے دروازہ خود اس نے کھولا تھا۔ اس کے لیے یہ فرض کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ چند سیکنڈ کے وقفے میں کوئی ہاتھ کی صفائی دکھا سکتا ہے۔ میرے سامنے وہ دوبارہ پان والے کے کھوکھے تک گیا اور جب میں نے اپنی فاکس ویگن اسٹارٹ کی تو وہ گاڑی سے کھوکھے تک کے فاصلے کو غور سے دیکھتا، بار بار بلا ارادہ جیبوں پر ہاتھ مارتا اور پان والے کی دکان پر کھڑے ہوتے لوگوں پر شک کی نظریں ڈالتا واپس آ رہا تھا۔ پان والے کی دکان پر اب دوسرے لوگ آ گئے تھے۔ اسے یہ خیال بھی آیا ہوگا کہ جو لوگ پہلے کھڑے تھے ان میں تو کوئی چابی اٹھا کے نہیں چل دیا۔ بے خیالی میں خود اس کا چابیاں نکالنا اور ذرا سی دیر کے لیے دکان پر رکھ دینا بعید از قیاس نہ تھا۔ بعد میں اس نے یہ بھی سوچا ہو گا کہ کہیں یہ میری حرکت نہ ہو مگر اس وقت تک میں بہت دور جا چکا تھا۔

یہ صورت حال دلچسپ بھی تھی توجہ طلب بھی۔ محسن اور رابعہ سے مشورہ کے بعد اس صورت حال سے فائدہ بھی اٹھایا جا سکتا تھا۔ میرے لیے آج کا دن بہت کامیاب گزرا تھا اور میں یہ جاننے کے لیے بے قرار تھا کہ محسن نے اور رابعہ نے دن بھر میں کیا کیا؟ اپنے وعدے کے مطابق میں پانچ بجے رابعہ کے پاس جا پہنچا۔ وہ اور شہلا باتوں میں مصروف تھیں اور نہ جانے کس بات پر ہنس رہی تھیں۔

"کیا بات ہے بھئی؟" میں نے گھر میں داخل ہوتے ہی کہا۔ "ہم بھی تو سنیں کہ ہنسنے کی کون سی بات ہے؟"

"آپ بھی کمال کرتے ہیں بھائی جان!" شہلا نے کہا۔ "کیا ہنسنے پر بھی پابندی ہے؟" اس کی بات پر مجھے عدنان کا خیال آیا۔ اگر وہ شہلا کا حقیقی بھائی ہوتا تو اس کی المناک موت کے بعد شہلا اس طرح کبھی نہ ہنستی لیکن وہ ایک ملازمہ کا بیٹا تھا جسے شہلا نے اپنی ضرورت کے لیے بھائی بنایا تھا۔ ضرورت ختم نہیں ہوئی تھی مگر شہلا کو بن مانگے دوسرا بھائی مل گیا تھا چنانچہ اس نے عدنان کو فراموش کر دیا۔ وہ ایک خادمہ کا بیٹا تھا اور ذاتی کردار کے اعتبار سے شہلا کا بھائی بننے کے قابل نہیں تھا لیکن اس شخص نے بھی بہن کے رشتے کا تقدس مجروح نہیں ہونے دیا تھا حالانکہ اسے نیکی بدی کی تمیز نہ رہی تھی۔ یہ خیال بڑا دل شکن تھا۔ رشتے جو ضرورت اور مصلحت کی بنیادوں پر استوار کیے جائیں، کبھی حقیقی رشتوں کا نعم البدل نہیں ہوتے۔ ایسے رشتوں کی جڑیں دلی جذبات کی گہرائی میں نہیں ہوتیں چنانچہ وہ سوت کے کچے دھاگوں کی طرح ٹوٹ جاتے ہیں۔ کیا میرے خلوص کا انجام بھی یہی ہوگا؟ شہلا اسی طرح مجھے بھی بھلا دے گی اور میرے مرتے ہی بھائی کی خالی آسامی کو پھر کوئی پُر کر دے گا۔

"تم ایک دم اتنے سنجیدہ کیوں ہو گئے ہو؟" رابعہ نے غور سے میری طرف دیکھا۔ "کیا ہوا ہے؟"

"کچھ نہیں۔ ایسے ہی تم دونوں پر رشک کر رہا تھا۔" میں نے کہا۔ "کتنے اطمینان سے گھر میں بیٹھی دانت نکال رہی ہو۔ ایک ہم ہیں کہ خوار پھر رہے ہیں۔ پتہ نہیں محسن کس حال میں ہے۔"

رابعہ مسکرائی۔ "وہ بالکل خیریت سے ہے۔ واپس آنے کے بعد گھنٹہ بھر اس معرکے کی روداد سناتا رہا جو اس نے تھانے میں سر کیا تھا۔ ابھی ابھی اپنے گھر فون کرنے گیا ہے۔ ہم اسی کی باتوں پر ہنس رہے تھے۔"

"ہنستے وقت آپ کو اس بڑھیا کا خیال نہیں آیا؟" میں نے دوسرے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ خفت سے شہلا کا رنگ زرد پڑ گیا۔

"امی سوئی ہوئی ہیں اور وہ اونچا سنتی ہیں۔" اس نے بمشکل تمام کہا۔

"اس کے علاوہ ہمارا نارمل نظر آنا بھی ضروری ہے۔"

رابعہ نے فوراً بات بنائی۔ "انہیں تو ایسے ہی یقین آئے گا کہ ان کا بیٹا باہر چلا گیا ہے۔ اگر وہ کسی کو روتا دھوتا دیکھیں گی تو۔"

"آئی ایم سوری۔" میں نے کہا۔ "میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ چلو اب تم تیار ہو جاؤ۔"

"میں بھی ساتھ چلوں گی۔" شہلا نے کہا۔ "میں ایسے یہاں نظر بند نہیں رہ سکتی۔"

"پاگل مت بنو۔" میں نے کہا۔ "تم اچھی طرح جانتی ہو کہ باہر تمہارے لیے کتنا خطرہ ہے۔"

محسن اندر آیا اور پلنگ پر بیٹھ گیا۔ "میں ابھی ابھی دیکھ کے آیا ہوں۔ ہر طرف خطرہ ہی خطرہ ہے۔ زمین پر۔ آسمان پر۔ درختوں پر اور سڑک پر جہاں بھی نظر جاتی ہے خطرے کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا۔"

"یار، یہ لڑکی ضد کر رہی ہے کہ میں بھی باہر چلوں گی۔" میں نے کہا۔ "تو سمجھا اسے۔"

"مجھے کچھ سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے۔" شہلا بولی۔ "خطرہ ہے تو ہوا کرے۔ میں اس قید سے بھی تنگ آ گئی ہوں۔"

"یہ بات تو ہے۔" محسن نے کہا۔ "اگر مجھے اس طرح قیدِ تنہائی میں رہنا پڑتا تو میں کہتا خطرے کی ایسی تیسی۔ پاگل ہو کے مرنے سے کیا فائدہ۔ موت برحق ہے اور اس کا ایک دن متعین ہے۔ پھر ڈرنا کیسا؟"

"آپ جھک مارتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "چلو بھئی شہلا تم بھی تیار ہو جاؤ۔ تمہارے حق میں بھی ایک ووٹ ہے۔"

"اس کے علاوہ مس شہلا!" محسن نے ہاتھ سینے پر رکھا اور نہایت عاشقانہ انداز میں جھکا۔ "خطرہ میری لاش پر سے گزر کے آپ تک پہنچ سکتا ہے۔ کیسا ہے یہ ڈائیلاگ؟" اس نے تعریف طلب نظروں سے ہم سب کو دیکھا۔

شہلا کو ساتھ لے جانے کے لیے ہمیں غیر معمولی حفاظتی انتظامات کرنے پڑے۔ وہ سڑک تک ماسی کے برقعے میں گئی جو بڑی مضحکہ خیز حالت میں تھا۔ پھر رابعہ بھی ایک پھٹی پرانی اور میلی چادر میں سر منہ چھپائے جاہل بوڑھی عورتوں کی طرح باہر آئی اور شہلا کے ساتھ بیٹھ گئی آخر میں، میں اور محسن نکلے اور میں نے واپس ہونے کے بجائے گاڑی کو اسی سڑک پر سیدھا جانے دیا۔ بازار ختم ہوتے ہی سڑک خالی رہ گئی۔ ہمارے پیچھے صرف ایک ٹیکسی تھی لیکن تانگہ اسٹینڈ کے پاس سے اور گلوب سینما سے کچھ پہلے ہم سیدھے ہاتھ مڑے تو یہ ٹیکسی ایئرپورٹ کی جانب چلی گئی۔ اب ہم فوری طور پر کسی خطرے سے دوچار نہیں تھے۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا ہی تھا کہ سامنے سے ڈی سلوا کی گاڑی نمودار ہوئی۔ اس کا گھر گلوب سینما کے پاس ہی تھا۔ وہ ہمیں دیکھ لیتا تو کیا سمجھتا مگر وہ آفس سے آ رہا تھا اور بہت تیزی سے... اس کی نظریں سامنے تھیں اور وہ اکیلا تھا۔ اس کی کار... سیکنڈ میں ہمارے قریب سے گزر گئی لیکن فورٹریس اسٹیڈیم... میری نگاہ بار بار آئینے میں پیچھے آنے والی گاڑیوں پر رہی۔ میں کوئی خطرہ مول لینے کے موڈ میں نہیں تھا... کی مدد ہمارے حق میں تھی اور اس مرحلے پر اپنی کار... پورا فائدہ اٹھانا ضروری تھا۔ پہلے میرا خیال تھا کہ مال... پل عبور کر کے گاڑی کو سیدھا لے جاؤں۔ یہ بعد... جا سکتا تھا کہ ہمیں رابعہ کے دفتر میں بیٹھ کر بات کرنی ہے یا کسی اور جگہ جا کے۔ مال روڈ پر بہت سے اچھے ریسٹورنٹ تھے لیکن وہ جگہ خطرناک تھی وہاں کسی سے غیر متوقع ملاقات ہونے کے امکانات زیادہ تھے۔ چنانچہ میں نے پل سے پہلے ہی گاڑی کو بائیں جانب نیچے جانے والی چھوٹی سی سڑک پر موڑ لیا۔ کینٹ اسٹیشن کے سامنے سے گزر کر میں نے دائیں... سڑک کی ریلوے کراسنگ عبور کی اور گلبرگ کے اس... جا پہنچا جہاں چار نمبر بس کا آخری اسٹاپ تھا۔ آدمی کو... دو کام کرنے ہوں یعنی ریلوے اسٹیشن بھی پہنچنا ہو اور... بھی ضائع کرنا ہو تو اطمینان سے روٹ نمبر ۴ کی ڈبل ڈیکر میں جا بیٹھے۔ بس خراماں خراماں چلتی تقریباً آدھے... سیر کرانے کے بعد بالآخر ریلوے اسٹیشن پہنچا دے گی۔ چار نمبر بس کی وجہ شہرت پاگل خانہ ہے جو اس کے راستے میں پڑتا ہے۔ کوئی بے سر و پا بات کرے تو لوگ کہتے ہیں... بس میں بٹھا دو۔ جیسے کراچی میں لوگ کہتے ہیں گر...

گاڑی کو میں نے گلبرگ کے مرکزی علاقے میں... سینما کے قریب روکا۔ یہ مارکیٹ قصبے میں چھوٹی... انتہائی ماڈرن اور فیشن ایبل شاپنگ سینٹر تھی۔... اپنے نقاب گاڑی میں چھوڑے اور ہم ایک بہت... ائیرکنڈیشنڈ ریسٹورنٹ کے فیملی روم میں جا بیٹھے۔ لارڈز یا شیزان والا رش نہیں تھا۔ ہال کی برائے نام... میں بہت کم لوگ دور دور بیٹھے تھے۔

"میں بھی یہی سوچ رہا تھا کہ مال روڈ کی طرف جانا ٹھیک نہیں۔" محسن نے بیٹھنے کے بعد کہا۔

"تو اپنے آپ کو میرے برابر عقل مند ثابت کرنا چاہتا ہے۔" میں نے اس کے ساتھ بیٹھ کے کہا۔

رابعہ اور شہلا ہمارے سامنے ساتھ ساتھ بیٹھ گئیں۔

"حالانکہ عقل مند تم دونوں میں کوئی بھی نہیں۔" رابعہ نے...

"بجا ارشاد۔" محسن نے فوراً دفاع کیا۔ "عقل مند تو صرف آپ ہیں یا آپ سے بڑھ کر یہ خاتون۔" اس نے شہلا کی طرف اشارہ کیا۔

"لڑائی کا باقاعدہ آغاز کرنے سے پہلے آپ ایک کام کریں۔" میں نے رابعہ سے کہا۔ "کاؤنٹر پر ٹیلی فون ہوگا۔ آفس فون کر دو کہ ہمارے استاد ٹیڈی آئے تو اسے یہاں بھیج دیا جائے۔ ہم تین گھنٹے تک یہیں ملیں گے۔"

"اور اگر ریسٹورنٹ والوں نے تنگ آ کے نکال دیا تو سامنے والی فٹ پاتھ پر پڑے ہوں گے۔" محسن بولا۔

"کس کی مجال ہے کہ آدھی رات کو ریسٹورنٹ کے بند ہونے سے پہلے ہمیں اٹھنے کے لیے کہے۔" میں نے کہا۔ "ہم تو عرب کے اونٹ ہیں۔ ایک بار خیمے میں جا تک بھی لیا تو عرب باہر۔ ابھی ہم چائے پئیں گے۔ اور گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے بعد ڈنر تناول فرمائیں گے۔ اس لیے تین گھنٹے تو یقیناً بیٹھیں گے۔"

رابعہ چند منٹ میں فون کر کے آ گئی۔ اس کے ساتھ ہی ویٹر بھی نمودار ہوا اور چائے کا سامان رکھ کے چلا گیا۔ "پہلے یہ دلچسپ داستان کا آغاز کرتا ہے۔" محسن نے کہا اور قمیص کے اندر سے ایک فائل برآمد کی جسے دہرا کر کے اس نے پتلون کی بیلٹ میں پھنسا رکھا تھا۔ "یہ ہے ساری روداد ایک شریف آدمی اور اس کے گھر کی تباہی کی۔ الماس کے والدین کے گھر میں آگ لگی تھی اور وہ اسی میں جل کے مر گئے تھے۔ پولیس کا ابتدائی موقف یہ تھا کہ مولوی کا دماغ چل گیا تھا لیکن بعد میں ان کو اپنا خیال بدلنا پڑا۔ اس میں ایک نہیں فردوس میں رہنے والے دو افراد کے بیانات ہیں۔ دونوں پڑوسی زندہ ہیں اور وہیں رہتے ہیں اس کے علاوہ پوسٹ مارٹم رپورٹ ہے اور وہ ڈاکٹر اب پرائیویٹ پریکٹس کرتا ہے جس نے یہ رپورٹ دی تھی۔ میں نے سب کا پتہ چلا لیا ہے اور اس میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں۔ پہلے الماس کے والدین کو قتل کیا گیا پھر قاتل گھر میں آگ لگا کے فرار ہو گئے۔ دونوں ہمسایوں نے صاف کہا ہے کہ فائرنگ کے بعد مگر آگ لگنے سے پہلے انھوں نے پٹرول کی بہت تیز بو محسوس کی تھی۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ فائل تمھیں کیسے ملی؟"

محسن نے ایک ہاتھ کی پانچ انگلیاں پھیلا کے دکھائیں۔ "وہاں ایک بہت خبیث تھانے دار بیٹھا تھا۔ تھانہ بڑے اچھے اور منافع بخش علاقے میں ہے نا۔ میں نے ایک سینچری کی بات کی تو بڑا جز بز ہوا کہ یہ تھانہ ہے یا سبزی منڈی۔ آلو ٹماٹر کا سودا کر رہے ہو؟ دو ہزار کا مال ایک سو میں لے جانا چاہتے ہو؟ لوٹ مچی ہے کیا؟ ملاحظہ ہو اس کا سوال۔ مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ لوٹ مچی ہے کیا؟ جیسے اس کے باپ کی حلال کی کمائی تھی جس کے وہ دو ہزار سے کم لیتا تو اس کی حق تلفی ہو جاتی۔ خیر میں نے بھاؤ پانچ تک بڑھا دیا مگر یا تو اس کے پاس اتنا پیسہ ہے کہ پانچ سو روپے اس کے لیے پانچ پیسے کی طرح بے وقعت ہیں یا وہ مجھے اتنا احمق اور مجبور سمجھ رہا تھا کہ میں دو ہزار چوری کر کے بھی پورے کروں گا۔ میں نے بھی منت سماجت کے بعد کہا کہ اچھا جی گھر والی کا کچھ زیور ہے، وہ بیچ کر لاتا ہوں۔ اگر میں اسے ٹرخا دیتا کہ بیٹا فائل تو میں لے لوں گا۔ تو وہ فائل غائب کر دیتا۔ میں باہر آ کے انتظار کرتا رہا کچھ دیر بعد وہ اپنی موٹر سائیکل پر کمیں دفع ہو گیا تو میں پھر اندر گیا۔ محرر مجھے دیکھ کر کھل اٹھا۔ اس نے چوری چھپے ساری گفتگو سن لی تھی اور فائل نکال کے دراز میں رکھ لی تھی۔ اس نے پانچ سو جیب میں ڈالے اور فائل میرے ہاتھ میں دے کر کہا کہ بھاگ جاؤ۔ تھانے دار صاحب کو پتہ نہ چلے۔ سب ہی حرام کی کھاتے ہیں نا، اس لیے ایک دوسرے کو بھی کاٹ دیتے ہیں۔ اب تھانے دار بیٹھا ہے دو ہزار کی آس لگائے اور ڈھونڈتا پھرے فائل۔"

"یہ ثبوت اور گواہ تو بعد میں کام آئیں گے۔" میں نے کہا۔ "جب کیس سماعت کے لیے عدالت کے سامنے آئے گا۔ اس سے پہلے میں دو کام کرنا چاہتا ہوں۔ ایک کام میں استاد ٹیڈی ہماری مدد کرے گا۔ امید ہے اس سے چراغ دین کا مسئلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا اور یہ کام اس طرح ہوگا کہ ہم دونوں بالکل محفوظ رہیں گے۔ استاد ٹیڈی کو آمادہ کرنے کے لیے ہمیں شہلا کی مدد درکار ہوگی۔"

"میری؟" شہلا نے کہا۔ "مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ چراغ دین کون ہے اور اس کا مسئلہ کیا ہے، نہ میں کسی استاد ٹیڈی کو جانتی ہوں۔"

"وہ عدنان کا جگری یار تھا۔" میں نے کہا۔ "اور سخت جذباتی قسم کا آدمی ہے۔ وہ تمھیں عدنان کی بڑی بہن سمجھتا ہے لو تم سے مل کر تمھیں یہ یقین دلانا چاہتا ہے کہ وہ عدنان کے قاتلوں سے انتقام ضرور لے گا۔ تم اس سے صرف یہ کہنا کہ بھائی عدنان کا معاملہ انصاف پر یا خدا پر چھوڑ دو۔ اگر کر سکتے ہو تو میرا ایک کام کر دو۔ کام کیا ہے، یہ سکندر بھائی بتائیں گے۔ وہ انکار نہیں کرے گا اور ہم اسے بعد میں سب کچھ سمجھا دیں گے۔"

"دوسرا پروگرام کیا ہے؟" محسن نے کہا۔

"اس کے لیے دوسرا درویش آپ بیتی کہتا ہے۔" میں نے کہا۔ "کلیجہ تھام لو پہلے سنو پھر داستان میری۔"

"خواتین کی کلیجی ہوتی ہے دوسرے درویش۔" محسن نے لقمہ دیا اور شہلا ہنسی۔ میں نے دن بھر کی سرگزشت کو امین کی

ملاقات سے شروع کیا اور خسرو جمشید کو چکما دے کر نکل آنے کی واردات پر ختم کیا۔ میں بہت آہستہ بول رہا تھا اور فصاحت کے جوہر بھی نہیں دکھا رہا تھا مگر میری بات میں چالیس منٹ گزر گئے اس دوران میں صرف ایک وقفہ آیا جب محسن نے دوسری بار گرم چائے منگوائی۔

"تمھارا دوسرا پروگرام یہ ہے کہ اپنی تم کو ریڈیو ٹرانسمیٹر میں بم فٹ کر دے تو اس سے ڈی سلوا کو اڑا دو؟" رابعہ

"میں تمھیں ایسا نہیں کرنے دوں گی سکندر!" رابعہ بولی۔

"تم ذہین ہو یہ میں مانتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "لیکن مشکل یہ ہے کہ وکیل ہونے کے باوجود عورت ہو۔ ابھی تک تم نے بحیثیت وکیلِ صفائی کی حیثیت سے دلائل دیے ہیں۔ آج اگر تم کو جج بنا دیا جائے تو میرا خیال ہے کہ تم سفاک ترین قاتلوں کو سزائے موت نہیں دے سکو گی۔"

"یہ غلط ہے۔" رابعہ نے احتجاج کیا۔ "وہ قانونی معاملہ ہے۔"

"اور وہ جو کچھ تمھارے ساتھ ہوا؟" میں نے تلخی سے کہا۔ "جب وہ تمھیں اغوا کر کے لے گئے تھے، جب انھوں نے تمھاری ماں کا جنازہ اٹھنے سے پہلے ایک دھمکی دی تھی؟ اس وقت قانون تمھارے لیے کچھ نہیں کر سکا تھا۔ انھوں نے تمھارے آبائی گھر کو بم سے اڑا دیا۔ میرے باپ کو قتل کرنے کے بعد اس کی لاش تک چرا لی۔ عدنان کو اور نہ جانے کتنے لوگوں کو مار دیا یا مروا دیا۔ قانون نے بے بسی سے تماشا دیکھنے کے علاوہ کچھ کیا؟ وہ ایسا ہی بم تھا جو میری جان لے سکتا تھا لیکن خدا کو میری زندگی منظور تھی کہ میں نے چابی سے دروازہ نہیں کھولا ورنہ آج اس وقت یہاں میرے ساتھ بیٹھ کر چائے پینے کے بجائے آپ سب لوگ میری قبر پہ فاتحہ پڑھ رہے ہوتے۔ اور آئندہ کا کیا ہے۔ کیا میں، تم، شہلا اور دوسرے لوگ محفوظ ہو گئے ہیں؟ انھوں نے تو کھلی دھمکی دی ہے کہ خمیازہ سب کو بھگتنا پڑے گا۔ محسن کے گھر والوں کو۔ شہلا کی ماں کو اور رضوی صاحب کے بیوی بچوں کو۔ تم قانون سے مدد لے کے دیکھو۔ خود رضوی صاحب ایک بار کوشش کر کے دیکھ چکے ہیں۔"

"یہ... یہ سب تو ٹھیک ہے سکندر!" رابعہ نے بڑی مشکل سے کہا۔ "لیکن کیا یہ غلط طریقہ نہیں ہے؟"

"ہے۔ میں کب کہتا ہوں کہ نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن صحیح طریقے صرف قانون کی کتابوں میں لکھے ہوتے ہیں۔ ان کو ہمارے دشمن بھی نہیں پڑھتے اور ان کی پروا بھی نہیں کرتے۔ غلط اور صحیح کے معیار کبھی نہیں بدلتے لیکن عملی زندگی کے تقاضے بھی نظر انداز نہیں کیے جا سکتے۔ جینے کا حق کسی عدالت سے نہیں ملتا اور اقوامِ متحدہ نہیں دلاتی رابعہ! یہ حق خو[د] پڑتا ہے۔ یہ دنیا طاقت ور کی ہے جس میں کمزور فریق کوئی جگہ نہیں۔ دشمن کو جب تک یہ احساس نہیں کے مقابل بھی اس کا ہم پلہ ہے وہ جارحیت سے گا۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دینا پڑتا ہے۔ ورنہ تم کہ ایک طرف تو بدمعاش ہوں جو قانون، اخلاق اور معاشرے کی ساری قیود سے آزاد ہوں۔ شہر میں لیل پھرتے ہوں جیسے جنگل میں خون آشام درندے اور ہم قانون کی دفعات دیکھتے رہیں۔ تھانوں میں رپورٹ انصاف کی دہائی دیں یا حاکم سے فریاد کریں۔ اخبار لکھیں۔ اپیل بنام آئی جی یا گورنر صاحب سے فریاد اور سے درخواست کریں۔"

"ٹھیک ہے۔ تو نے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت" محسن نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "یہ بعد میں سوچیں کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ پہلے تو یہ فیص ہے کہ ہم سب کو رہنے کی جگہ چاہیے۔"

"ہاں۔" میں نے ایک گہری سانس لی اور رابعہ دیکھا وہ نظر جھکائے دانتوں سے اپنے ناخن کاٹ رہی "صبح میں نے تین مکان دیکھے تھے۔ ان میں سے ایک لیے بہت موزوں ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ خسرو مایوسی نہ ہو۔"

"لیکن جانتے بوجھتے ہم اس مکان میں رہنے کے لیے سکتے ہیں۔" محسن نے کہا۔

"یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ نیا مہرہ ہے اسے ہمیں پیٹ دینا چاہیے۔ اس کی ایک تو میرے ذہن میں آتی ہے مگر اس پر عمل ذرا مشکل پانچ ساڑھے پانچ لاکھ کا مکان ہمیں ڈھائی تین لاکھ پیش کر رہے ہیں۔ مقصد صاف ظاہر ہے۔ وہ سمجھتے ہیں سودا فوراً کر لیں گے اور ہمیں ظاہر بھی یہی کرنا چاہیے کے باعث ہم ان کی چال میں آ گئے ہیں۔ ابھی تک یقین ہو گا کہ ڈراما کامیاب جا رہا ہے۔"

"لیکن چابیاں نکال کے تو نے ان کو شک میں ہو گا۔" محسن بولا۔

"یہ شک تو میں آسانی سے دور کر سکتا ہوں۔"

"فرض کرو میں کل شام کو شہلا کے ساتھ وہاں پہنچ جاؤں جتنی رقم ادا کرنی ہے وہ کر دوں۔ کل صبح سے شام کی سیل ڈیڈ وغیرہ تیار ہو سکتی ہے۔ شہلا کو دیکھ کر

یقین آجائے گا کہ ہم پھنس گئے اور مکان کا قبضہ ملتے ہی ہم سب خودکشی کے لیے پہنچ جائیں گے۔ وہ جلد از جلد کاغذی کارروائی مکمل کر کے مکان ہمارے نام کر دیں گے۔ دو ڈھائی لاکھ میں ان کو یہ سودا بہت سستا لگے گا کہ سارے چکر ختم۔ کوئی والی وارث نہیں۔ نہ کسی سے مقابلے کا ڈر ہے اور نہ یہ اندیشہ کہ وہ بے نقاب ہوں گے۔ میر شرافت علی مارا گیا اور صاف ظاہر ہے کہ اسے بھی ان لوگوں نے مروا کے الزام میرے سر تھوپ دیا ایک تیر سے دو شکار ہو گئے۔ وزیر خان پہلے ہی ختم ہو گیا تھا۔ حقِ ملکیت کا کوئی بھی دعوے دار باقی نہ رہے تو کاروبار کا تنہا مالک چودھری دلاور رہ جاتا ہے پھر وہ اطمینان سے اپنے ناجائز کام کو جاری رکھ سکتے ہیں۔ ان کو کروڑوں کا فائدہ ہو گا۔ اس کے لیے دو لاکھ کا گھاٹا تو کچھ بھی نہیں اس سے زیادہ کی پیش کش وہ مجھے کر چکے تھے۔ یہ مکان وہ ہمیں مفت بھی دے دیتے لیکن وہ جانتے ہیں کہ ہم کھٹک جاتے۔ اب انھوں نے کیا زبردست جواز رکھا ہے۔ جمشید ایک جذبی شخصیت ہے جسے پیسے کی پروا نہیں۔ اس کا ایک چھوٹا بھائی تھا جو شہید ہو گیا اور میں سو فیصد اس کا ہم شکل ہوں چنانچہ مجھے دیکھ کر وہ جذباتی ہو جاتا ہے۔ جذبات کا کوئی مول نہیں۔ خود اس نے کہا تھا کہ میری مرضی ہے میں یہ مکان کسی کو ایک روپے میں دے دوں۔ یہ اتنا معقول جواز ہے کہ اگر میں نے اس کی منتیں نہ پکڑی ہوتیں تو میں بھی جذباتی ہو جاتا۔ تم نو ڈیل کا ہوتا تو مجھ پر رقت طاری ہو جاتی۔ خیر اب فرض کرو ہم وہ مکان لے لیں۔ ڈھائی لاکھ میں وہ مکان مل جائے گا۔ صورت کوئی ایسی ہو کہ مکان تو ہمیں مل جائے مگر اس کے بعد ہم غائب ہو جائیں سامنے آئے بغیر ساڑھے پانچ لاکھ کے مکان کو ساڑھے چار لاکھ میں بیچ دیں تو دو لاکھ کا کھرا فائدہ ہے بس ایک ہاتھ سے خریدیے اور دوسرے ہاتھ سے بیچیے کی بات ہے اس میں کوئی دھوکا نہیں اور زبردستی نہیں۔ یہ سارا چکر دوبارہ سامنے نہ آنے کا ہے۔ ایک ہفتے بعد ڈھائی کے بجائے ہم ساڑھے چار لاکھ کے مالک ہو سکتے ہیں۔"

رابعہ مسکرائی۔ "یہ تو کوئی مشکل مسئلہ نہیں۔" وہ بولی۔ "کل شام تم ڈیڑھ لاکھ کا بینک ڈرافٹ لے جاؤ۔ میں فروخت کے معاہدے اور سیل ڈیڈ وغیرہ کا انتظام کر ہی لوں گی۔ گڑھی شاہو والا پلاٹ میرا ہے۔ اس لیے یہ معاہدہ بھی مجھے ہی کرنا پڑے گا کہ میں باقی رقم پلاٹ کے فروخت ہوتے ہی ادا کر دوں گی۔ دوسرے الفاظ میں مکان میں خریدوں گی۔ تم یہ کر سکتے ہو کہ خسرو جمشید کو میرے پاس لے آؤ۔ شہلا تمھارے ساتھ ہو گی۔ میں دن میں رضوی صاحب سے کہہ کے کوئی ایسا بندوبست کروا لوں گی کہ عمارت کے چاروں طرف سادہ کپڑوں میں پولیس موجود ہو جو بغیر شناخت کے کسی کو اندر نہ جانے دے۔ اس سے کل کسی کی مداخلت یا ہنگامہ آرائی کا خطرہ ٹل جائے گا۔ وہاں میرے پاس دستاویزات کے دو سیٹ ہوں گے۔ میں تجویز پیش کروں گی کہ خسرو جمشید صاحب! اگر آپ مناسب سمجھیں تو بات اسی وقت ختم کر دیں۔ میں ڈیڑھ لاکھ نقد دیتی ہوں اور پلاٹ آپ کے نام ٹرانسفر کر دیتی ہوں۔ اس کے ایک لاکھ آپ کو ضرور ملیں گے۔ زیادہ بھی مل سکتے ہیں اور آپ اگر چاہیں تو وہاں دوسرا مکان بنا سکتے ہیں۔ بڑی اچھی جگہ ہے۔ اگر تمھارا یہ خیال درست ہے کہ وہ ہر قیمت پہ مکان دینے کا فیصلہ کر چکے ہیں تو میری تجویز بھی ان کے لیے قابلِ قبول ہو گی۔ پلاٹ اور ڈیڑھ لاکھ نقد کے بدلے مکان میرا۔ رجسٹری وغیرہ کے سارے مرحلے میں پرسوں ہی ختم کر دوں گی۔ اگر انھوں نے میری بات نہ مانی تو میں کہوں گی کہ جمشید صاحب آپ انتظار کیجیے، میں تو مکان میں اس وقت تک نہیں آؤں گی جب تک کل رقم ادا نہ ہو جائے اور مکان واقعی میرا نہ ہو جائے۔ آگے جو خدا کو منظور۔ پلاٹ ایک ہفتے میں بکے یا ایک مہینے میں۔ جلدی ان کو ہے۔ وہ تاخیر قبول نہیں کریں گے۔ میری تجویز قبول کر لیں گے۔ پرسوں رجسٹری وغیرہ کے عدالتی معاملات ختم ہوتے ہی میں اپنی طرف سے کسی کو بھی مختارِ عام مقرر کر دوں گی۔ مختارِ عام میرے ساتھ کام کرنے والے وکیلوں میں سے بھی کوئی ہو سکتا ہے اور محسن بھی یا پھر رضوی صاحب۔ اس کے بعد ہمیں سامنے آنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ جس کے پاس بھی جنرل پاور آف اٹارنی ہو گی وہ اگلے روز ہی مکان فروخت کر سکتا ہے۔ اس میں اطلاعِ عام کی رسمی سی کارروائی میں وقت لگتا ہے اور اخبار میں اشتہار وغیرہ دینا پڑتا ہے کہ کسی کو اعتراض ہو تو اتنے دن میں حاضر ہو کے بتائے لیکن یہ اشتہار کوئی نہیں پڑھتا۔ لوگ خرچ بچانے کے لیے کم سے کم اشاعت والے اخبار میں اشتہار دے کر کاغذی کارروائی پوری کرتے ہیں۔ بلکہ یہ بھی حقیقت ہے کہ عدالت میں کچھ لوگوں نے اخبار کے نام کے ڈیکلریشن لے رکھے ہیں ان میں کوئی خبر نہیں چھپتی اور نہ کوئی ان کا نام جانتا ہے۔ کورٹ نوٹس وغیرہ کے سوا ان میں کچھ نہیں ہوتا اور یہ محض ریکارڈ کے لیے فائل میں لگا دیے جاتے ہیں۔ ہم انھی سے کام چلائیں گے۔"

"ویری گڈ بی بی!" محسن نے کہا۔ "مکان ہم نے ڈھائی لاکھ میں لے لیا اور سامنے آئے بغیر ساڑھے چار لاکھ میں بیچ بھی دیا۔ اب اس خاکسار کے چند سوالات۔ پہلا یہ کہ کل شام کو سکندر اگر شہلا کو لے کر گیا تو اس بات کی کیا ضمانت ہو گی کہ یہ دونوں زندہ سلامت لوٹ کر آئیں گے اور ساتھ خسرو جمشید کو بھی لے

آئیں گے۔ سوال نمبر دو یہ کہ ہم غائب ہو کے کہاں جائیں گے؟ مکان کے خریدنے اور بیچنے میں کچھ وقت لگے گا اور پیسہ ہمارے پاس ہو گا نہیں کہ دوسرا مکان خرید لیں۔ جہاں ہم گمنامی میں رہ سکیں۔"

"گمنامی میں تو ہم اب بھی رہتے ہیں۔" رابعہ نے کہا۔ "رہا سوال رضوی صاحب کے گھر سے منتقل ہونے کا تو میرا خیال ہے کہ ہمیں مکان خریدنے کے چکر میں نہیں پڑنا چاہیے۔ مکانوں کے مالک تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ کرایہ دار کو تلاش کرنا مشکل ہوتا ہے۔ کرایہ نامے کا ریکارڈ کہیں نہیں ہوتا اور کرایہ نامے میں نام کسی کا بھی لکھوایا جا سکتا ہے۔ اب تو ہمیں کرائے کے مکان میں ہی رہنا چاہیے لیکن دشمن بے وقوفی میں ہمیں فائدہ پہنچانا چاہتا ہے تو یہ منافع بخش سودا ضرور کرنا چاہیے تاکہ سارا نقصان پورا ہو جائے۔"

"سوال نمبر ایک کا جواب اب بھی باقی ہے۔" محسن نے کہا۔

"وہ حفاظتی انتظامات کا مسئلہ ہے۔" میں نے کہا۔ "جو ہم خود بھی کر سکتے ہیں اور رضوی صاحب بھی۔ اگر انھیں معلوم ہو کہ مکان رابعہ خرید رہی ہے تو انھیں حیرت نہیں ہو گی اور رابعہ کہے کہ مجھے ڈر ہے کہ اس کا حشر بھی پہلے والے مکان جیسا ہو گا تو وہ اس مرتبہ مکان کی حفاظت کو یقینی بنا سکتے ہیں۔ سابقہ ناکامی کی تلافی کے لیے۔"

میری نظر نے استاد ٹیڈی کو دروازے سے اندر آتے دیکھی۔ دروازے پر ہی ایک بیرے نے اس کو روکنے کی کوشش کی۔ غالباً اس کا حلیہ اس ماحول سے مطابقت نہیں رکھتا تھا اور ریسٹورنٹ والے "حقوقِ داخلہ محفوظ ہیں" کی آڑ میں بدمعاش نظر آنے والے ہر شخص کو شرفا میں شامل ہونے سے روک سکتے تھے۔ صورتِ حال کو ناخوش گوار ہونے سے بچانے کے لیے میں فوراً آگے بڑھا اور اسے اپنے ساتھ لے آیا۔ سوائے شہلا کے ہم سب اسے پہچانتے تھے۔ وہ اعلیٰ سوسائٹی کے اس اجتماع میں سب سے الگ نظر آتا تھا اور اسی احساسِ اجنبیت کے باعث کچھ نروس تھا۔ میں نے اسے شہلا کے بارے میں بتایا کہ یہ عدنان کی بڑی بہن ہیں تو اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہے۔ میں نے وقت کو غنیمت جانا اور کھانا منگوا لیا۔ میری یہ تدبیر کام کر گئی۔ کھانا ختم ہونے تک ہم لوگوں کی بے تکلف گفتگو اور ہمارے حوصلہ افزا رویے نے استاد ٹیڈی کی وہ جھجک ختم کر دی جو اس پر احساسِ جرم کی طرح سوار تھی۔ وہ زیادہ کھل کر باتیں کرنے لگا۔ اس نے عدنان کے بارے میں انھی جذبات کا اظہار کیا جو ہمارے سامنے کر چکا تھا۔ یعنی یہ کہ وہ قاتلوں کا سراغ لگائے گا اور ان کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ عدنان اس کا جگری یار تھا۔ چنانچہ وہ شہلا کو بھی بڑی بہن ہی سمجھتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

"دیکھو بھیا!" شہلا نے اچانک کہا۔ "تقدیر کے لکھے کو کوئی مٹا نہیں سکتا اور ہر شخص کو اپنے اعمال کی سزا ضرور ملتی ہے۔ یہاں بھی اور وہاں بھی۔ میں جانتی ہوں کہ عدنان کیسا آدمی تھا اور اس کا اٹھنا بیٹھنا کیسے لوگوں میں تھا۔ میں اس کے اسی انجام سے ہمیشہ ڈرتی رہی۔ مجھے اس کی موت کا دکھ تھا لیکن اس پر حیرانی نہیں ہوئی تھی۔"

میں استاد ٹیڈی کی صورت کے بدلتے ہوئے تاثرات بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔

"جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔" شہلا نے اپنی بات جاری رکھی۔ "ایک خرابی کے بعد دوسری خرابی سے کیا حاصل ہو گا۔"

"آپ کہہ رہی ہیں کہ میں ان کو بخش دوں؟" استاد نے یوں کہا جیسے مجرم اس کے قبضے میں ہوں۔ "قسم مولا کی..."

"خواہ مخواہ قسمیں مت کھاؤ۔" شہلا نے کہا۔ "تمھیں خدا کے نظامِ انصاف پر بھروسہ نہیں ہے۔ خدا کے وجود کو تو مانتے ہو۔"

"یہ کیا بات کہی جی آپ نے؟" ٹیڈی بولا۔ "میں کافر تو نہیں ہوں۔"

"تو میرے بھائی خدا پر بھروسہ رکھو۔" شہلا نے اس کی بات کاٹ دی۔ "جس کے ہاں دیر ہے مگر اندھیر نہیں ہے۔ وہ ہے اور صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ سزا اور جزا کو اس پر چھوڑ دو۔ وہی ہمارا انصاف کرے گا اور اس کی گرفت سے بچ کر کہاں جائیں گے۔ تم خدا کی خدائی میں دخل مت دو اور دیکھو کہ ظالموں کا انجام کیسا عبرت ناک ہوتا ہے۔"

"آپ کی بات تو دل کو لگتی ہے جی۔" وہ بے بسی سے بولا۔ "لیکن یہ کتنا ظلم ہے کہ ہم یاری کی بات تو کریں مگر یار کے لیے کچھ نہ کریں۔ میں کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہتا ہوں عدنان کے لیے۔"

"تم اس کی مغفرت کی دعا کرو اپنی نیکی سے اسے ثواب پہنچاؤ۔" شہلا بولی اور میں اس کی ذہانت کا قائل ہو گیا۔ وہ بہت آہستہ اور بڑی مہارت سے ٹیڈی کے ذہن کا رخ بدل رہی تھی اور اس کے خیالات پر اپنی گرفت کو مضبوط کرتی جا رہی تھی۔ رابعہ یا محسن اسے نیکی کی تلقین کرتے تو بھینس کے آگے بین بجانے والی بات ہوتی۔ ٹیڈی جیسے لوگ جو صراطِ مستقیم سے بھٹک جاتے ہیں اور شیطان کے راستے پر چلنے لگتے ہیں، وہ انسان کہاں رہتے ہیں۔ لوگ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں کہ اب خدا ہی انھیں نیکی کی توفیق دے تو دے۔ مگر کچھ لوگ کوشش جاری رکھتے ہیں۔ خواہ وہ بے سود ہو۔ ماں باپ کے بعد بڑی بہن اور کبھی کبھی بڑا بھائی بھی انھیں سمجھانے کا فرض پورا کرتے ہیں۔ شہلا نے اس وقت بڑی بہن کی ذمہ داری قبول کر لی تھی۔

ٹیڈی کو نیکی بدی اور گناہ و ثواب پر لیکچر دے کر سچ مچ بڑی بہن کا برتر مقام حاصل کر لیا تھا اور ٹیڈی مجبور ہو گیا تھا۔ وہ شہلا کو پلٹ کر جواب نہیں دے سکتا تھا۔ "جیسی کرنی ویسی بھرنی۔ یہ تو دنیا کا قاعدہ ہے..."

"لیکن باجی!" اس نے جذباتی ہو کے کہا۔ "مجھے کچھ کرنے دیں۔ قسم مولا کی۔ اگر میں آپ کے کام بھی نہ آ سکا تو لعنت میری یاری کے رشتے پر۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ کچھ لوگ آپ کو بھی پریشان کر رہے ہیں۔"

"ہاں بھئی۔" شہلا متفکر ہو کے بولی۔ "یہ معلوم نہیں کسی کو ہم سے کیا دشمنی ہے۔ میں تو ان کے ڈر سے باہر بھی نہیں نکل سکتی اور اپنے گھر میں بھی نہیں رہ سکتی۔"

"آپ اپنے گھر میں رہیں جی۔" وہ سینہ تان کے بولا۔ "ٹیڈی آپ کی حفاظت کرے گا۔ ٹیڈی کی لاش پر سے گزرے بغیر کون مائی کا لال ہے جو بری نیت سے اندر قدم بھی رکھے۔ جہاں آپ کا جی چاہے جائیں۔ ٹیڈی کے ساتھ آپ کو کوئی ڈر نہیں۔ یا مجھے بتا دیں کہ وہ کون لوگ ہیں۔ قسم مولا کی ایک ایک کو ٹھنڈا نہ کر کے دم لوں تو..." وہ پھر بڑ مارنے پر اتر آیا تھا اور اپنی بساط سے بڑھ کر بات کر رہا تھا۔

"ابھی تک صرف ایک آدمی کا پتہ چلا ہے۔" شہلا نے سوچ کر کہا۔ "کیوں سکندر بھائی؟"

"ہاں؟ ہاں۔" میں نے چونک کر کہا۔ کیونکہ اس نے مجھ سے اچانک سوال کر دیا تھا۔ "وہ تو ٹھیک ہے شہلا لیکن ہمارے یقین سے تو بات نہیں بنتی نا۔ عدالت تو ثبوت اور گواہ مانگتی ہے اور وہ معزز آدمی کہلاتا ہے۔ کون مانے گا کہ عدنان کے قتل میں درپردہ یہی شخص تھا اور وہ کسی نہ کسی بہانے عدنان کو مروانا چاہتا تھا۔ استاد ٹیڈی کو معلوم ہے کہ عدنان پر چتے بازی کا الزام جھوٹا تھا۔ بس انھوں نے بہانہ بنا لیا۔"

"آپ مجھے بتائیں جی کون ہے وہ۔" بلا ارادہ اس نے ایک غلیظ گالی دی مگر اسے احساس نہیں ہوا۔

"میرا خیال ہے رابعہ! تم شہلا کے ساتھ جاؤ۔" میں نے گھڑی دیکھ کر کہا جس میں دس بجے تھے۔ "ہم بات کر کے آتے ہیں۔ آپ لوگوں کی موجودگی میں ہم کھل کے بات نہیں کر سکتے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے کہ یہ مردانہ معاملات ہیں۔" محسن نے میری تائید کی۔ رابعہ نے اشارہ سمجھ لیا تھا۔ وہ اور شہلا ہمیں جلد پہنچنے کی تاکید کر کے چلی گئیں۔ بالکل روایتی بیویوں کے انداز میں۔

"اب بات سنو استاد ٹیڈی!" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ "ہمیں بہت اچھی طرح معلوم ہو گیا ہے کہ عدنان کو قتل کرانے کے لیے پیسہ کس شخص نے خرچ کیا تھا۔ ہماری نظر میں اصل مجرم وہی ہے اور ہم اسے سزا دینے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ تم اس کام میں ہماری مدد کرو گے؟"

"لو جی! آپ نے بھی کیا بات کی۔ قسم مولا کی جان بھی مانگو تو..."

"نہیں۔ جان کی ضرورت نہیں۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "اسے قتل کرنا ہوتا تو ہم تم سے کہہ دیتے۔"

"اور تم اپنے خنجر سے اس کو گاجر مولی کی طرح کاٹ دیتے۔" محسن نے اضافہ کیا۔

"لیکن ہم تو اسے زیادہ سخت سزا دینا چاہتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اب دیکھو کہ عدنان تو مر کے دنیا کے جھگڑوں سے ہی نکل گیا۔ سزا کسے ملی؟ پیچھے رہ جانے والوں کو۔ اس شخص کو مار دیا گیا تو سزا ملے گی بے گناہ بیوی بچوں کو۔ ہم نے کچھ اور سوچا ہے جس میں وہ خود سزا کاٹے اور اس کا سب کچھ چھن جائے۔ اس کی دولت۔ اس کا غرور۔ طاقت کا نشہ اور اثر و رسوخ۔ اسے بہت لمبی قید ہو اور جب وہ باہر نکلے تو دنیا میں اس کا کوئی نہ ہو۔ وہ فقیروں سے بھی بدتر ہو۔"

میری بات کا بہت آہستہ آہستہ اثر ہوا۔ ٹیڈی سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اس نے کہا۔ "یہ تو آپ کی بات بالکل ٹھیک ہے۔ سزا اسی کو ملنی چاہیے۔"

"مجھے معلوم تھا کہ تم بات سمجھ لو گے۔" میں نے کہا۔ "اب میرے چند سوالات کا جواب دو۔ مجھے اندازہ ہو جائے گا کہ تم کس حد تک مددگار ثابت ہو سکتے ہو۔ یہ بتاؤ کہ تمھاری جان پہچان کتنی ہے؟"

"قسم مولا کی استاد ٹیڈی ان سب کو جانتا ہے جن کو آپ نہیں جانتے۔"

"تم منشیات کا دھندا کرنے والوں سے واقف ہو؟"

"ایک تو وہ ہیں جو گلی گلی چرس بھرے سگریٹ اور راکٹ گولی۔ چرس ملا کے اسپرٹ والی شراب بیچتے ہیں۔" ٹیڈی نے زور دے کر کہا۔

"ہاں۔ ایسے لوگوں کے علاوہ تم خریداروں سے بھی واقف ہو گے؟"

"خریدار تو بہت۔ وہ خود ہی اڈوں پہ پہنچ جاتے ہیں کسی نہ کسی کی معرفت۔" ٹیڈی نے کہا۔

"ان میں پولیس کے چھوڑے ہوئے آدمی بھی ہوں گے۔" میں نے پوچھا۔

"بالکل ہیں جی مگر وہ اپنا بھتہ وصول کرنے کے سوا کچھ نہیں کرتے۔" ٹیڈی نے پھر کہا۔ "مخبری وہ اس وقت کرتے ہیں جب کوئی ان کے ساتھ بدمعاشی کرے یا ان کو حصہ کم دے

یا نزھی ہے۔"

"گویا تم منشیات فروخت کرنے والوں کو بھی پہچانتے ہو، خریداروں کو بھی اور مخبروں کو بھی۔" میں نے کہا۔ "ان میں سے کتنے تمہارے دوست ہیں؟ میرا مطلب ہے کہ جو کام آسکتے ہوں۔"

"کام کیا ہے؟" ٹیڈی نے پوچھا۔ محسن کی طرح ابھی تک وہ بھی میرے سوالوں سے پریشان تھا۔

"کام میں بعد میں بتاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "ابھی جو کچھ میں معلوم کرنا چاہتا ہوں وہ بتاؤ۔ یہ بتاؤ کہ یہ نشہ آور چیزیں آتی کہاں سے ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ جو لوگ یہ چرس بھرے سگریٹ، راکٹ، ہیروئن اور مینڈریکس کی گولیاں بیچتے پھرتے ہیں یہ لوگ مال کہاں سے لیتے ہیں؟"

"اس کے دو چار ٹھکانے ہیں۔" ٹیڈی سوچ کر بولا۔ "وہ بڑے خاص لوگ ہیں۔ خود سامنے نہیں آتے۔"

"تم ایسے کسی خاص آدمی کے ٹھکانے سے واقف ہو؟" میں نے کہا۔ "فرض کرو میں تم سے کہوں کہ مجھے وہاں لے چلو۔"

"آپ کو!" وہ ہنسا۔ "آپ مذاق کرتے ہیں جی! میں آپ کو کیسے لے جا سکتا ہوں؟"

"اچھا چلو، مجھے نہ لے جاؤ۔ یہ بتاؤ کہ تم خود ان خاص لوگوں تک جا سکتے ہو؟" میں نے کہا۔ "کوئی سودا کرنے کے لیے۔ مثلاً دس بیس ہزار کا مال اٹھانا ہو میرے لیے۔"

"یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں جی؟" ٹیڈی نے مجھے غور سے دیکھا لیکن میں بالکل سنجیدہ تھا۔ "میرا یہ دھندا نہیں اور آپ یہ مال لے کر کیا کریں گے؟"

"میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میرے ہر سوال کا ایک مقصد ہے۔ تم صرف جواب دو، مجھ سے سوال مت کرو۔ میں ابھی اسی وقت بیس ہزار روپے کی چرس یا چرس کے سگریٹ یا ہیروئن خریدنا چاہتا ہوں۔ تم دلوا سکتے ہو؟ ہاں یا نہیں؟"

ٹیڈی نے بہت دیر بعد اقرار میں سر ہلایا۔ "میں خود مال نہیں لا سکتا۔ وہ ہر ایک کو مال نہیں دیتے۔ انھی کو دیتے ہیں جن کا دھندا ہو اور جن پر اعتبار ہو۔ میرا ایک یار ہے۔ وہ لا سکتا ہے۔ مگر وہ پوچھے گا۔"

"تم کہہ سکتے ہو کہ اب تمہارا بھی یہی دھندا کرنے کا ارادہ ہے۔" میں نے کہا۔ "اور میرا خیال ہے وہ تمہارا یار ہے تو اس کو شک نہیں ہونا چاہیے کہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔"

"اس دھندے میں ادھار یا چیک نہیں چلتا۔" ٹیڈی نے کافی دیر بعد کہا۔

"میں نقد رقم دوں گا۔" میں نے کہا۔ "تم گن بھی سکتے ہو اور اپنے اس یار کو دکھا بھی سکتے ہو کہ نوٹ پرانے ہیں، سیریل میں نہیں ہیں اور ان پر کوئی نشان نہیں ہے۔"

"فرض کریں جی میں نے مال لا دیا۔" ٹیڈی بولا۔ "بتایئے کام جو اس کے بعد ہوگا؟"

"یہ ہوئی نا بات۔ میں تو سمجھا تھا کہ تم صرف باتیں کر سکتے ہو۔" میں نے اس کے جذبات کو ہوا دی۔ "اگر تم ہمیں مال لا دو۔ وقت کی کوئی بات نہیں بارہ بج جائیں یا صبح کے دو بج جائیں۔ چار بجے صبح تک بہرحال یہ ہو جانا چاہیے۔ اس مال کو ہم ایک خاص جگہ پہنچا دیں گے یعنی اس شخص کے گھر میں چھپا دیں گے جس نے عدنان کو قتل کرانے کے لیے بدمعاشوں کو پیسہ دیا تھا۔ یہ ہمارا کام ہے جس کے بارے میں تم کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم اس گھر کے نقشے سے اچھی طرح واقف ہیں۔ یہ سارا مال اگر دو تین گتے کے ڈبوں میں ہو تو بہت ہی اچھا ہو۔ ان ڈبوں میں ہم اوپر کچھ اور چیزیں مثلاً صابن یا ٹوتھ پیسٹ وغیرہ اور اس شخص کے گھر میں ایسی جگہ رکھیں گے کہ خود اسے بھی معلوم نہ ہوگا مگر پولیس جب تلاشی لے گی تو ڈبے سامنے رکھے نظر نہیں آئیں گے۔ معلوم یہی ہوگا کہ انھیں چھپا کر رکھا گیا تھا۔"

"ابھی تک آپ نے مجھے اس شخص کا نام نہیں بتایا۔" ٹیڈی نے نرم لہجے میں کہا۔

"اس کا نام ہے چراغ دین۔" میں نے کہا۔ "اب میرا دوسرا حصہ سنو۔ منشیات کا ایک چھوٹا سا پیکٹ الگ جس کی مالیت پانچ سو روپے کے لگ بھگ ہونی چاہیے۔ چونکہ بھاؤ معلوم نہیں اس لیے ہم خود پیکٹ بنانے کا کام نہیں کر سکتے ہیں۔ اس پیکٹ کو ہم چراغ دین کے پاس رکھوا دیں گے۔ کل صبح تم ایک گاہک اس کے گھر بھیجو گے۔ وہ پانچ سو دے کر یہ پیکٹ خریدے گا۔ سو سو کے ان پانچ نوٹوں پر والوں کے دستخط ہوں گے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ جس گاہک کو بھیجو گے، وہ پولیس کا مخبر ہوگا۔ چراغ دین صبح دس بجے پر ہی ملتا ہے۔ یہ گاہک ساڑھے نو بجے پہنچ جائے گا۔ ایک اصل گاہک بھی وہاں پہنچے گا۔ اس کے پاس اپنا لیکن یہ ضروری ہے کہ دونوں ساتھ پہنچیں تاکہ ایک گواہ بن سکیں۔ ٹھیک وقت پر پولیس یا اینٹی کرپشن والے والے کسی مجسٹریٹ کے ساتھ چھاپہ ماریں گے اور مال برآمد دستخط شدہ نوٹ چراغ دین کی جیب میں سے نکلیں گے ہونے کا کوئی امکان نہیں، وہ پانچ نوٹ گننے کا اور جیب لے گا۔ یہ تو ہوگا ایک سودے کا ثبوت۔"

"لیکن جناب اس میں وہ گاہک بھی تو پکڑا جائے گا جس نے سودا کیا ہوگا۔" ٹیڈی بولا۔

"بھئی وہ تو سرکاری آدمی ہوگا۔ فرضی گاہک بنا کے بھیجا جائے گا۔" میں نے کہا۔ "اسی لائن کا آدمی ہونا چاہیے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے لیکن مخبر کسی لالچ کے بغیر کام نہیں کرتے۔" ٹیڈی بولا۔ "ان کی آمدنی کا ذریعہ بند ہو جاتا ہے اور پھر وہ اعتبار کے قابل نہیں رہتے۔ بڑا دھندا کرنے والے بھی ان کے دشمن ہو جاتے ہیں اور خود پولیس والے بھی۔ اگر سارے مخبر ایمان داری سے کام کرنے لگیں تو یہ دھندا ختم نہ ہو جائے۔" وہ خاموش ہو کے کچھ سوچنے لگا۔ "البتہ ایک آدمی ہے میری نظر میں۔ ظاہر میں تو میرا دوست ہے مگر دوست وہ کسی کا بھی نہیں ہے۔ ایک بار تو اس نے مجھے مروا دیا تھا۔ مجھے یہ بھی شبہہ ہے کہ وہ اپنے یار کو قتل کرنے والوں کے بارے میں جانتا ہوگا۔ وہ ان کا چمچہ تھا۔"

"پھر تو یہ کوئی مسئلہ نہیں رہا۔" میں نے کہا۔ "ایسے شخص کو تو چھوڑنا نہیں چاہیے بس تم اسی کے کندھے پر رکھ کے بندوق چلاؤ۔ کل صبح ہم تمہیں سو سو کے پانچ نوٹ دیں گے۔ دستخط شدہ۔ تم اسے ساتھ لے کر چراغ دین کے گھر پہنچنا اور اسے کہنا کہ یہ نیا ٹھکانا ہے۔ یہاں مال سستا ملتا ہے اس لیے منافع ہونے کی زیادہ امید ہے۔ تم چونکہ اس دھندے میں نہیں ہو اس لیے وہ ضرور سوال کرے گا کہ تمہیں کس نے بتایا اور پیسے تم کیوں دے رہے ہو؟ تم کہنا کہ بتانے والوں نے بتا دیا ہے اور لوگ تو نہ جانے کب سے مال اٹھا رہے ہیں۔ اپنا بھی کچھ خیال ہے دو چار پیسے کمانے کا۔ پرانے ٹھکانے کی بات ہوتی تو وہ تم سے کہتا کہ میاں مجھے بیچ میں کیوں لاتے ہو۔ جاؤ مال اٹھاؤ اور بیچو۔ لیکن وہ مخبر ہے اور نئے ٹھکانے کا مطلب ہے آمدنی کا نیا ذریعہ۔ وہ تمہارے ساتھ ضرور جائے گا۔ نوٹ تم اس کو آخری وقت میں پکڑانا یعنی گھر کے قریب پہنچ کر بلکہ عین دروازے پر۔ دروازے پر ایک چوکیدار ہوگا۔ اس سے صرف یہ کہنا کہ صاحب کو بتا دے۔ وہ پیکٹ لینے والا آ گیا ہے۔ وہ سمجھ جائے گا اور باقی جو کچھ ہوگا سب کے سامنے ہوگا۔ وہ مخبر اور دوسرا خریدار ایک دوسرے کو یقیناً پہچان لیں گے اور بعد میں یہ بھی ثابت ہو جائے گا کہ وہ منشیات فروش ہیں۔ ایک گواہ تم بھی بن سکتے ہو۔ پھر چراغ دین اندر اور منشیات اسمگلنگ کرنے کے الزام میں ساری جائداد کی ضبطی۔ یہی ہم چاہتے ہیں اور یہی اس شخص کی سزا بھی ہونی چاہیے۔"

محسن کے اختلاف کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ استاد ٹیڈی کچھ شش و پنج کا شکار تھا لیکن وہ عدنان سے یاری کے بہت بڑے دعوے کر چکا تھا اور شہلا کو زبان دے چکا تھا۔ رات کے گیارہ بجے وہ ہمارے ساتھ اس ریسٹورنٹ سے نکلا۔ ہم نے ٹیکسی والے سے یہ معاملہ طے کیا کہ رات کو ہمیں شہر میں مختلف جگہ جانا ہے۔ اسے انتظار بھی کرنا پڑے گا۔ اس لیے وہ میٹر کی بات نہ کرے، رات بھر کی اجرت طے کر لے۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں ٹیکسی والے نے منہ پھاڑ کے رقم مانگی اور ہم نے دو سو روپے ایڈوانس ادا کر دیے۔ ٹیکسی پہلے ایک جنرل اسٹور کے قریب رکی۔ وہاں سے میں نے چائے کے اور دودھ کے ڈبے خریدے اور دکان دار نے مجھے یہ سامان تین گتے کے ڈبوں میں پیک کر کے دیا۔ ایک ڈبا ٹوتھ پیسٹ کی ٹیوبوں کا دوسرا صابن کا اور تیسرا جلے ہوئے زخموں پر لگانے والے مرہم کا۔ یہ زیادہ جگہ گھیرنے والا سامان تھا چنانچہ میرے دو سو روپے بھی خرچ نہیں ہوئے۔ آگے ایک اور دکان پر ٹیکسی رک کے میں نے ٹوتھ پیسٹ کی — بارہ ٹیوبیں خریدیں جن کا نام گتے کے ڈبے پر لکھا ہوا تھا۔ اسی طرح دو درجن صابن اور زخم پر لگانے والے مرہم کی ٹیوبیں لیں۔ اتنی رات گئے اس دکان پر ایسا سامان پہلے کس نے خریدا ہوگا۔ دکان دار کچھ حیران تو تھا مگر آخری وقت میں ہونے والی بکری سے خوش بھی تھا۔ پہلے والے تین ڈبوں کے سامان کو ہم نے ٹیکسی میں فرش پر اس طرح خالی کیا کہ ٹیکسی ڈرائیور کو پتہ بھی نہ چلا۔ وہ دو سو روپے کما کے بہت خوش تھا اور دو سو کا سامان ہم نے گاڑی میں ڈال دیا تھا۔ اس کے لیے پریشانی پیدا ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

استاد ٹیڈی ہمیں بہت سی اندھیری گلیوں میں لے گیا۔ اس کو کئی جگہ مایوس بھی لوٹنا پڑا۔ ہماری ملاقات پراسرار قسم کے لوگوں سے ہوئی اور عین اس وقت جب ہم استاد ٹیڈی کی طرف سے مایوسی کا شکار ہونے لگے تھے۔ ہماری جدوجہد بار آور ہوئی۔ ہم ٹیکسی میں آدھے گھنٹے سے اس کی واپسی کے منتظر تھے کہ وہ اچانک بہت جوش کے عالم میں نمودار ہوا اور تینوں خالی ڈبے لے گیا جس میں ہم نے پوری رقم رکھ دی تھی۔ ہم نے ڈرائیور سے کہا کہ ابھی آدھا گھنٹہ اور انتظار کرنا پڑے گا۔ اسے ہم صورت سے شریف آدمی لگتے تھے۔ وہ گاڑی کی چابیاں لے گیا اور اسی ریسٹورنٹ میں چائے پینے بیٹھ گیا جس کے سامنے ٹیکسی کھڑی تھی۔ ٹیڈی صرف دس منٹ بعد آ گیا۔ وہ مال لے آیا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور کے آنے سے پہلے ہم نے گتے کے تینوں ڈبوں کے اوپر ٹوتھ پیسٹ اور صابن وغیرہ رکھ دیے۔ پانچ سو کا پیکٹ بنا بنایا مل گیا تھا جو خوردہ فروشوں کے لیے تیار رکھا جاتا تھا۔ ہم ٹیکسی لے کر ریلوے اسٹیشن پہنچے اور استاد ٹیڈی سے وہیں انتظار کرنے کے لیے کہا۔ پھر میں اور محسن گتے کے ڈبے بغل میں دبا کر

چراغ دین کی کوٹھی کی طرف روانہ ہوئے۔

"دروازے پر محبت خاں ہوگا۔" میں نے محسن سے کہا۔

"لیکن اس وقت سو رہا ہوگا۔ اندر پہنچ کے ان چیزوں کو چھپانے کا مرحلہ زیادہ سخت ہے۔ اگر سب دروازے اور کھڑکیاں بند ہوئے تو کیا ہوگا؟"

"اندر کا نقشہ مجھے معلوم ہے۔" محسن نے کہا۔ "اور کھڑکی بھی کھولی جا سکتی ہے۔ شاید کوئی شیشہ ٹوٹا ہوا مل جائے۔ لیکن زیادہ الجھن کی بات یہ ہے کہ تو نے چھوٹے پیکٹ کے بارے میں کیا سوچا ہے۔ چراغ دین اسے کیوں رکھے گا اور صبح کسی سے پانچ سو روپے لے کر اسے کیوں دے گا؟"

"اس کا حل بھی میں نے سوچ لیا ہے محسن!" میں نے کہا۔ "خدا نے چاہا تو چراغ دین کے ساتھ کل تک میرا اور تیرا سب حساب بے باق ہو جائے گا۔ پھر میں دیکھتا ہوں شیردانی صاحب اسے بیٹی کا رشتہ کیسے دیتے ہیں۔ وہ تو بھول بھی چکا کہ اس نے وزیر خان کے اعتماد کو دھوکا دیا تھا۔ اور قانون اسکا کچھ نہیں بگاڑ سکا تھا چنانچہ وہ خود کو بالکل محفوظ سمجھے، بڑے سکون و اطمینان سے بیٹھا ہے کہ اب تو۔ آں دفتر را گاؤ خورد و گاؤ را قصاب برد۔ قصاب ہم مرد۔ حرام کی کمائی کا ایک ایک پیسہ نہ اگلوا لیا تو سکندر نام نہیں۔"

"ارے بابا! یہ سب کچھ ہو جائے گا مگر مجھے بھی تو بتا کہ ہو گا کیسے؟"

"دیکھ! ابھی تو ہم یہ مال اس کے گھر میں چھپانے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اگر کسی نے ہمیں دیکھ لیا تو سارا پروگرام چوپٹ ہو جائے گا اور یہ ثابت ہو جائے گا کہ ہم نے اس کے خلاف سازش کی تھی۔ میں کسی قسم کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتا۔ اگر محبت خان یا چراغ دین میں سے کوئی جاگ اٹھا تو اس سے پہلے کہ وہ ہنگامہ کرے یا ہمیں پہچانے، میں اس کو ناک آؤٹ کر دوں گا۔ مال کو چھپانے کا کام تیرا۔ ان دونوں پر نظر رکھنا میرا۔ اندر جانے سے پہلے مین سوئچ آف کر دیں گے۔ خدانخواستہ کوئی گڑبڑ ہو تو وہ لائٹ نہ جلا سکیں۔ ہم اندھیرے میں ان کو مٹا کے نکل جائیں گے۔ ایک آدھ گھنٹے میں ان کو ہوش آ جائے گا تو ظاہر ہے وہ پہلے گھر کا جائزہ لیں گے۔ اگر کوئی چیز غائب نہ ملی تو پولیس کو رپورٹ کرنے کا سوال ہی نہیں۔ چراغ دین اپنے چوکیدار پر تھوڑا سا بگڑے گا اور بات ختم۔"

"نوٹوں پر دستخط کون کر کے دے گا؟" محسن بولا۔ "اور دستخط کروانے کون جائے گا؟"

"دستخط کون کرے گا؟ یہ تو انسداد منشیات والے بتا سکتے ہیں۔ [illegible] جو مجھے جانا پڑے گا اور میں اپنا حلیہ تھوڑا سا بدل کے جاؤں گا۔ جب چھاپے کا پورا انتظام ہو جائے گا تو میں ان کے ساتھ چراغ دین کے گھر تک جاؤں گا۔ میرے ساتھ استاد ٹیڈی ہوگا اور چھاپہ مارنے والے تھوڑے سے وقفے کے بعد آئیں گے۔ میں نوٹ ٹیڈی کو دے کر خود نکل جاؤں گا۔ ٹیڈی بھی خود تو نہیں جائے گا، وہ اس خریدار کو آگے کرے گا۔ جب چھاپہ مارنے والے پہنچیں گے تو ہم دونوں میں سے کوئی بھی نہیں ملے گا پھر وہاں کیا ہوتا ہے ہماری جانے بلا۔ وہاں جتنے ہوں گے سب دھر لیے جائیں گے اور مال ضرور برآمد ہوگا۔"

دروازے پر رک کے میں نے اندر جھانکا۔ محبت خان برآمدے میں چارپائی پر سویا پڑا تھا۔ میں اور محسن باری باری اندر داخل ہو گئے اور گاڑی کی آڑ میں سیدھے نکل گئے۔

———— گئے۔ اندر کے سب کمروں میں اندھیرا تھا اور باہر بھی کوئی لائٹ نہیں جل رہی تھی لیکن ہر طرف سے منعکس ہو کر پہنچنے والی معمولی سی روشنی میں کوٹھی کا ہر حصہ صاف نظر آتا تھا۔ تمام کھڑکیاں اور دروازے بند تھے مگر غور سے دیکھنے پر ہمیں پیچھے کی طرف ایک کھڑکی کے پٹ کا سب سے اوپر والا شیشہ غائب نظر آیا۔ محسن کے اندازے کے مطابق یہ باورچی خانے کی کھڑکی تھی چنانچہ باورچی خانے کا دروازہ باہر سے بند نہ ہوا تو گھر میں داخل ہونا آسان ہو جائے گا۔ میں نے منڈیر پر قدم جماتے اور اوپر چڑھ کے شیشے میں ہاتھ ڈالا چٹخنی آسانی سے کھل گئی اور کھڑکی کے دونوں پٹ آواز کیے بغیر وا ہو گئے۔ ہم دونوں باری باری اندر اتر گئے۔

"اگر ہم کوئی پین ٹارچ لے آتے تو کام آسان ہو جاتا۔" محسن نے کہا۔

"تو لائٹر جلا لے اور اپنا ہاتھ سامنے رکھ۔" میں نے سرگوشی میں کہا۔ "روشنی کا دائرہ محدود ہو جائے گا۔"

باورچی خانے کا دروازہ باہر سے بند نہیں تھا۔ ہم ایک مختصر سے کوریڈور میں طلوع ہوئے۔ باورچی خانے کے بالکل سامنے اسٹور روم تھا۔ تین ڈبے چھپانے کے لیے جگہ کی کمی نہ تھی۔ چراغ دین کو ہفتوں کیا مہینوں معلوم نہ ہوتا کہ اتنے بڑے گھر کے ساز و سامان میں راتوں رات گتے کے تین ڈبوں کا اضافہ ہو گیا ہے لیکن اس مال کا ایسی جگہ سے دستیاب ہونا ضروری تھا کہ تلاش کرنے پر آسانی سے نہ ملے اور پولیس یہ یقین کرنے پر مجبور ہو کہ خود چراغ دین نے مال کو بڑی

چالاکی سے چھپایا تھا۔ اسٹور روم کا دروازہ بند کر کے محسن نے لائٹر جلایا اور ہم نے سارے فالتو سامان کا جائزہ لیا جو بے مصرف ہونے کی وجہ سے یہاں ڈال دیا گیا تھا۔ میں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ اس کاٹھ کباڑ میں کوئی ڈبا چھپانے سے مطلوبہ مقاصد حاصل نہیں ہوں گے۔ پولیس دو منٹ میں ڈبے کو تلاش کر لے گی اور چراغ دین بھی اپنے دفاع میں یہ ضرور کہہ سکے گا کہ کسی نے پھنسانے کی کوشش کی ہے۔ ڈبوں کو ایسی جگہ چھپانا ضروری تھا جہاں چراغ دین کے سوا کسی اور کی رسائی نہ ہو۔ ایسی ایک جگہ وہ بیڈ روم ہو سکتی تھی جو اب مقفل رہتا تھا۔ جب تک مریم زندہ تھی، چراغ دین بھی اسی بیڈ روم میں سوتا تھا۔ اس کی موت کے بعد چراغ دین نے مریم کے ذاتی استعمال کی چیزیں مقفل کر دی تھیں۔ ایک ٹرنک میں ریشمی لحاف گدے اور تکیے وغیرہ تھے۔ مریم کے تمام کپڑے اور جوتے وارڈروب میں بھرے ہوئے تھے اور یہ بات ہمیں پہلے سے معلوم تھی۔ اپنی کاروباری مصروفیات کے باعث چراغ دین کی زندگی اس گھر میں صرف اپنے بیڈ روم اور باتھ روم تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ صبح کا گیا شام کو لوٹتا تھا دن میں بھی اگر آتا تھا تو صرف لنچ کے لیے۔ مریم کے بیڈ روم کو کھولنے کی نہ اسے فرصت تھی اور نہ ضرورت رہی تھی۔ آپس میں مشورہ کرنے کے بعد میں اور محسن اس نتیجے پر پہنچے کہ مریم کا بیڈ روم موزوں ترین جگہ ہو سکتی ہے لیکن اس قفل کو کھولنا آسان نہیں تھا جو دروازے میں مہینوں سے پڑا ہوا تھا۔ شاید ہماری جگہ کوئی پیشہ ور نقب زن ہوتا تو اس کے لیے بھی یہ کام مشکل ہوتا۔ اس کے بعد اندر کے ٹرنک اور وارڈروب کے تالے کھولنے کا مرحلہ تھا اور بظاہر یہ کام ناممکن نظر آتا تھا۔

"یار محسن!" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "یہ سب چابیاں ایک ہی جگہ ہوں گی۔"

محسن نے اقرار میں سر ہلایا۔ "سوال یہ ہے کہ کہاں؟"

"یہ کیسے معلوم ہو سکتا ہے؟" میں نے مایوسی سے کہا۔

"ممکن ہے اس نے چابیاں کسی میز کی دراز میں ڈال دی ہوں۔ یا کہیں لٹکا دی ہوں۔ اس وقت ہم پورے گھر میں چابیاں تو تلاش نہیں کر سکتے۔"

"مجھے کچھ یاد پڑتا ہے کہ چراغ دین جو چابیوں کا گچھا اٹھائے پھرتا ہے، اس میں دس بارہ چابیاں ہیں۔"

"اس میں دکان کی چابیاں ہوں گی اور اگر گھر کی بھی ہوں گی تو اس وقت وہ گچھا اس کے کوٹ کی جیب میں، بیڈ سائڈ ٹیبل پر یا تکیے کے نیچے کہیں بھی ہو سکتا ہے۔"

"دیکھ لینے میں کیا حرج ہے۔" محسن نے کہا۔ "چراغ دین تو سویا پڑا ہے۔"

"خراٹوں کی آواز تو مجھے بھی آ رہی ہے۔" میں نے اس تجویز کے قابل عمل ہونے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "مگر یہ بہت خطرناک کام ہوگا اگر وہ جاگ اٹھا تو اسے اندھیرے میں ناک آؤٹ کر دینے کے سوا فرار کی کوئی صورت نہ ہوگی۔"

"اگر ہم اپنے چہرے چھپا لیں تو وہ ہمیں کیسے پہچان سکتا ہے۔" محسن نے کہا۔ "بالفرض محال وہ اٹھ جائے تو بیشک اس ناک آؤٹ کے پروگرام پر عمل کرنا اور اس کی آواز نہ نکلنے دینا۔ صبح ہوش آنے پر وہ گھر کا جب جائزہ لے گا تو مطمئن ہو جائے گا کہ چور آئے تھے لیکن کچھ لے کر نہیں جا سکے۔ مریم باجی کا کمرہ بدستور مقفل ہوگا اور چراغ دین کو ہر چیز اپنی جگہ پر ملے گی تو وہ خدا کا شکر بجا لائے گا۔ محبت خان کو جاگتے رہنے کے احکامات پر سختی سے عمل کرنے کی تاکید کرے گا اور بہت کیا تو کل سے بھرا ہوا ریوالور تکیے کے نیچے رکھ کر سوئے گا کہ آج تو ہوش ہی گئے تھے کل کو جان نہ چلی جائے۔"

"بشرطیکہ کل رات بھی چراغ دین کو اسی بیڈ روم میں سونا نصیب ہوا۔" میں نے کہا۔ "اور اس کا قیام سرکاری مہمان خانے میں نہ ہوا تو۔۔"

چراغ دین کے بیڈ روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے اور محسن نے تھوڑا سا جھانک کے دیکھا۔ چراغ دین نے کروٹ لی اور اٹھ بیٹھا۔ مجھے یوں لگا جیسے اندھیرے کے باوجود اس نے میرا سایہ دیکھ لیا ہو۔ میں اور محسن ایک ساتھ پیچھے ہٹے اور دیوار سے چپک کر کھڑے ہو گئے۔ چند سیکنڈ بعد بیڈ روم سے ملحق باتھ روم کا دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی۔ چراغ دین ذیابیطس کا مریض تھا چنانچہ اس کو رات کے دوران کئی بار اٹھنا پڑتا تھا۔ بجلی کی طرح ایک خیال میرے ذہن میں آیا اور میں کمرے میں داخل ہو گیا۔ کمرے میں قالین بچھا ہوا تھا اور ایک نائٹ لیمپ کی مدھم سبز روشنی تھی دروازے سے بیڈ تک چند قدم کا فاصلہ میں نے ایک سانس میں طے کیا۔ میری نظر نے بیڈ سائڈ ٹیبل پر رکھی ہوئی مختلف چیزوں کو الگ الگ دیکھا۔ اس پر صرف تین چیزیں تھیں سگریٹ کا ایک پیکٹ، ایک لائٹر اور ایک نظر کا چشمہ۔ میں نے فوراً تکیہ اٹھایا۔ اس کے نیچے پرس تھا اور چابیوں کا گچھا تھا۔ چراغ دین کے باتھ روم سے باہر آنے تک میں یہ گچھا مٹھی میں دبا کے پلنگ کے نیچے غائب ہو چکا تھا۔ چراغ دین نے باتھ روم سے باہر آ کے نائٹ لیمپ آف کیا اور سو گیا۔ بیڈ کے نیچے میں نے اس

کے دھڑام سے گرنے کی اور کچھ دیر بعد خراٹے لینے کی آواز سنی۔ دس منٹ بعد میں رینگتا ہوا بیڈ کے نیچے سے نکلا تو دروازے تک پہنچنا میرے لیے مشکل ثابت نہ ہوا کیونکہ اب کمرے کا نقشہ مکمل طور پر میرے ذہن میں تھا۔ میرے ہاتھ میں چابیاں دیکھ کر محسن نے مجھے اس طرح تھپکی دی جیسے کوئی استاد اپنے ہونہار شاگرد کو پہلے ڈاکے میں کامیابی کے بعد دیتا ہے لیکن کامیابی کے یقین کی منزل ابھی نہیں آئی تھی۔ یہ ہو سکتا تھا کہ درجن بھر چابیوں میں سے کوئی بھی چابی اس تالے کی نہ ہو جو مریم کے بیڈ روم کے دروازے میں لگا ہوا تھا۔ میں نے ساری چابیوں کو مضبوطی سے مٹھی میں دبائے رکھا اور اندازے سے قفل میں پہلی چابی لگائی۔ تالے کی ساخت کے مطابق آٹھ میں سے صرف تین چابیاں آزمائی جا سکتی تھیں۔ تیسری چابی فٹ بیٹھی اور میں نے مسرت سے محسن کی طرف دیکھا۔ تالے کو اوپر سے تھام کے میں نے آہستہ سے چابی گھمائی اور کھٹکے والے تالے کو آواز کیے بغیر کنڈی کے ہک سے نکال لیا۔ تقدیر کچھ یاور لگتی تھی کہ کنڈی سخت نہیں تھی ورنہ مہینوں بند رہنے والی کنڈی جام ہو جاتی تو ذرا سا ہلانے پر چلانے لگتی۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی میں نے دروازہ بند کر لیا۔ محسن نے تینوں ڈبے فرش پر رکھے اور جیب سے لائٹر نکال کے جلایا۔ قبر کی طرح تاریک کمرے میں ایک آسیب زدہ روشنی پھیل گئی تھی۔ میں اور محسن کچھ دیر بے حس و حرکت کھڑے رہے۔ میرے سامنے یادوں کا ایک قبرستان تھا جس میں وقت کا ہر گزرا ہوا لمحہ کسی لوحِ مزار کی طرح اداس نظر آتا تھا۔ ایسا ہی اجالا میں نے ایک گمنام قبر کے کھنڈر میں دیکھا تھا۔ جس کے ایک گوشے میں منشی مرحوم عرف نوما پنجو کا بے جان جسم فرشِ خاک پر بے گور و کفن پڑا تھا اور پکارتا تھا کہ دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو۔ اور میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہو۔ کہ وضعداری نے مجھے کارٹون بنا دیا ہے اور وفاداری نے مجرم! کمرے میں اس وقت کی بازگشت تھی جب یہ گھر مریم کے دم سے آباد تھا۔ وہ مریم جو بہت دور مری کے پہاڑوں پر مسلط سیاہ رات میں ایک قبر کے نیچے صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گئی تھی اور ہم جو اجنبی نہیں تھے اس کی خلوت گاہ میں چوروں کی طرح کھڑے تھے۔ مجھے یوں لگا جیسے ہر سمت سے مریم کی آنکھیں مجھے دیکھ رہی ہیں۔ محسن کے خیالات مجھ سے مختلف نہ تھے جب میں نے اس کی طرف دیکھا تو مجھے اس کی آنکھوں میں نمی کی چمک صاف نظر آئی لیکن اس نے درد کی لہر کو قطرۂ اشک بن کے گرنے نہ دیا۔

"ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے سکندر!" وہ بولا اور میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ٹرنک کا قفل کھولتے ہوئے ایک بار پھر مجھے اور محسن کو اپنا دل پتھر کرنا پڑا۔ ٹرنک میں سے ایک خوشبو کا جھونکا آیا جو ابھی تک زندہ تھی۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے سامان ہٹایا اور مریم کے ذاتی استعمال کی چیزوں میں دو ایسے ڈبے رکھ دیے کہ مریم زندہ ہوتی تو ڈبے کے اندر رکھی ہوئی چیزوں کو دیکھ کر ہی بے ہوش ہو جاتی۔ اس وقت میرے ذہن میں چراغ دین سے انتقام کی آرزو پر مریم کی یاد غالب تھی اور مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میں اس کی قبر پر پھولوں کے بجائے غلاظت بکھیرنے کا گناہ کر رہا ہوں۔ پھر میں نے خود کو یاد دلایا کہ میرا مقصد کیا ہے اور چراغ دین کون ہے۔ چراغ دین مارِ آستین ہے جس نے اپنے پالنے والے کو ڈسا۔ اب اس سانپ کا پھن نہ کچلا گیا تو یہ فوزیہ کو بھی ڈس لے گا اور شاید یہ اس کے نامۂ اعمال میں لکھا جانے والا ایک اور جرم ہوگا جس کی سزا سے وہ خود کو بالکل محفوظ سمجھتا ہے۔ اس خیال نے مجھے بڑی تقویت دی اور باقی کام میں نے اپنی جذباتی کمزوری پر قابو پا کے چند منٹ میں ختم کر لیے۔ میں نے ٹرنک میں پھر تالا لگایا اور اپنے رومال سے تالے کو اچھی طرح صاف کر دیا۔ کمرے کی ہر چیز پر گرد کی تہہ تھی اور اس قفل پر میرے فنگر پرنٹ نمایاں ہو سکتے تھے۔ اسے صاف کرنے کا ایک اور فائدہ بھی ہوا۔ اب معمولی سی عقل رکھنے والا کوئی پولیس افسر یہ دیکھ سکتا تھا کہ اس گرد آلودہ کمرے میں تالا بالکل صاف ہے اور آسانی سے یہ نتیجہ اخذ کر سکتا تھا کہ تالا اکثر کھولا اور بند کیا گیا ہے چنانچہ اس پر گرد نہیں ہے۔ تیسرا ڈبا وارڈروب میں کپڑوں کے پیچھے چھپا کر میں نے کمرے کو باہر سے تالا لگایا اور اپنے رومال سے دروازے کے ہینڈل تک کو صاف کر دیا۔ اب آخری مرحلہ چابیوں کو واپس تکیے کے نیچے رکھنے کا تھا۔ میں نے محسن سے کہا کہ وہ نکل جائے اور ریلوے اسٹیشن کے سامنے کھڑی ہوئی ٹیکسی میں انتظار کرے۔ استاد ٹیڈی ہماری واپسی میں تاخیر سے پریشان ہو سکتا ہے۔ مجھے امید تھی کہ چراغ دین ایک بار پھر باتھ روم جانے کے لیے ضرور اٹھے گا اور اس مہلت سے فائدہ اٹھا کے چابی پھر تکیے کے نیچے رکھ آنا مشکل نہ ہوگا۔

محسن کے جانے کے بعد میں چراغ دین کے بیڈ روم کے دروازے سے لگا کھڑا رہا اور انتظار کرتا رہا۔ مجھے یہ اندیشہ تھا کہ صبح ہونے تک وہ نہ اٹھا تو میں کیا کروں گا یا صبح کے قریب اٹھ کے پھر نہ سویا تو یہاں سے کیسے نکلوں گا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ ہر صورت میں وہ اٹھتے ہی تکیے کے نیچے چابیوں کی موجودگی کی تصدیق نہیں کرے گا بلکہ پہلے باتھ روم جائے گا۔ آدھے گھنٹے بعد ایک اور گڑبڑ ہو گئی۔ دور سے اذان کی آواز آئی اور میں نے محبت خان کو کلمہ پڑھ کے اٹھتے سنا۔ پھر یوں محسوس ہوا جیسے وہ اندر آ رہا ہے۔ میرے لیے اب چھپنے کی ایک ہی جگہ رہ گئی تھی۔ میں چراغ دین کے بیڈ کے نیچے گھس گیا۔ نیچے سے ہی میں نے محبت خان کو اندر آ کے دروازے میں رکتے دیکھا، وہ چند سیکنڈ کھڑا رہا اور پھر سیدھا نکل گیا۔ اسی وقت چراغ دین نے جماہی لی اور اٹھ کے باتھ روم میں گیا۔ میں نے چابی تکیے کے نیچے رکھی اور اس کے بیڈ روم سے نکل آیا۔ اب میں باورچی خانے کی کھڑکی کے راستے باہر نہیں جا سکتا تھا لیکن اب وہ دروازہ کھل گیا تھا جدھر سے محبت خان گھر میں آیا تھا۔ ایک منٹ بعد میں باہر آ چکا تھا۔ پھاٹک کے اوپر سے کود کر سڑک پر آتے ہی میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ میری اسکیم کا پہلا مرحلہ کامیابی سے طے ہو گیا تھا لیکن ابھی بہت سے مرحلے باقی ہیں... میں نے خود کو یاد دلایا اور ریلوے اسٹیشن کی طرف چلنے لگا۔ محسن اور استاد ٹیڈی بہت بے چینی سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ استاد ٹیڈی ٹیکسی کے بونٹ پر بیٹھا تھا اور محسن ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی محسن پیچھے والی سیٹ پر آ گیا اور استاد ٹیڈی نے ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر جگہ سنبھال لی۔

"اب کدھر جانا ہے بادشاہو؟" ٹیکسی ڈرائیور نے انجن اسٹارٹ کیا۔

"کیوں استاد؟" میں نے ٹیڈی سے مخاطب ہو کے کہا۔ "وہ چراغ دین کے دونوں بہنوئی کہاں ملیں گے؟ ہم نے کہا تھا نا کہ صبح ان کو بھیجنا ہے۔" میں نے اس کو پلٹ کر دیکھنے پر آنکھ ماری۔

"ایک تو داتا دربار کے پیچھے موہنی روڈ کی گلی میں ملے گا۔" ٹیڈی نے بات سمجھنے کے بعد سوچ کر کہا۔ "دوسرے کا پتہ کرنا پڑے گا۔"

"اچھا تو پہلے موہنی روڈ کی طرف چلو۔" میں نے کہا۔ "ایک سے تو بات ہو جائے۔"

"یار سکندرِ اعظم!" محسن نے مجھ سے انگریزی میں کہا۔ "دستخطوں کا مسئلہ کیسے حل ہوگا؟ میرا مطلب ہے ان پانچ کاغذات پر کس کے دستخط ہوں گے؟"

"یہ معاملہ ایسا ہے برادرِ عزیز!" میں نے انگریزی کے بجائے ٹوٹی پھوٹی فرنچ میں کہا۔ "کہ ہمیں اس موضوع پر بات نہیں کرنی چاہیے۔ وطنِ عزیز میں تعلیم کی صورتِ حال ایسی ہے کہ ان پڑھ نظر آنے والے گریجویٹ ثابت ہوتے ہیں۔"

"میری فرنچ میں اتنی ہی فصاحت و بلاغت ہے جتنی گوروں کی اردو میں تھی۔" محسن نے بھی فرنچ میں کہا۔

"دیکھیے نا! ہم دونوں کی زبان دانی میں انیس بیس کا فرق بھی نہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم ایک دوسرے کی گرامر اور تلفظ کی غلطیاں معاف کر سکتے ہیں کیونکہ مشکل وقت میں راز کی بات کہنے کے لیے آدھی ادھوری فرنچ سے بہتر کوئی زبان نہیں۔"

اپنے لندن کے چار سال کے قیام کی مدت میں ہم دونوں نے ایک ساتھ فرنچ پڑھی تھی۔ کچھ خود، کچھ بے قاعدہ کورس کر کے لیکن اس زبان میں گفتگو کرنے کی صلاحیت ہم نے اپنے ہم مکتب ساتھیوں اور دوست احباب کی مدد سے حاصل کی تھی۔ انگریز کے لیے لاطینی اتنی اہم تھی جتنی پہلے اردو پر عبور حاصل کرنے والوں کے لیے عربی تھی لیکن وہ دور گزر چکے تھے۔ اب انگریز کوئی دوسری زبان جانتے تھے تو فرنچ۔ بالکل اسی طرح جیسے اپنے ملک میں فارسی کی آج بھی ضرورت سمجھی جاتی ہے۔

"سو سو کے پانچ نوٹوں پر کسی مجسٹریٹ کے دستخط حاصل کرنا آسان نہیں ہوگا۔" میں نے کہا۔ "اینٹی کرپشن والوں کے پاس بھی جب تک باقاعدہ رپورٹ درج نہ کرائی جائے وہ چھاپہ نہیں مارتے اور یہ بلی کے گلے میں گھنٹی باندھنے والا کیس ہے۔ رپورٹ نہ میں لکھا سکتا ہوں، نہ تو یہ کام کر سکتا ہے، نہ اپنا استاد۔ میری سمجھ میں ایک ہی صورت آتی ہے کہ ہم کسی پولیس انسپکٹر سے رابطہ قائم کریں اور اپنا زورِ بیان صرف کر کے یقین دلائیں کہ مسمی چراغ دین کوئی شریف آدمی نہیں ہے اور اس کے گھر میں واقعی خاصی مقدار میں منشیات کا ذخیرہ ہے۔"

"ہمارے زورِ بیان سے قائل ہو کے کون مشکل میں پڑنا پسند کرے گا؟" محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "پولیس ہر شریف آدمی کے گھر پر ایسے چھاپہ مارنے لگے تو کوئی گھر محفوظ نہ رہے۔ ان کو ڈر ہوتا ہے کہ کوٹھی والا ان پر بعد میں ہتک عزت اور ہر جانے کے مقدمات دائر کر دے گا تو ان کی نوکری بھی جائے گی۔"

"یہ کام مشکل ضرور ہے محسن، لیکن ناممکن نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "نعرۂ بیان دہلا تو زرِ نقد چلے گا۔ ہم کسی پولیس انسپکٹر کی ذہانت پر بھی بھروسہ کر سکتے ہیں۔ وہ مجرموں کو پکڑنے کے معاملے میں جتنے کند ذہن نظر آتے ہیں، کسی کو مجرم بنانے میں اپنی ذہانت سے اتنا ہی کمال دکھاتے ہیں۔ آدمی کو پھانسنے کے طریقے وہ خود ایجاد کر لیتے ہیں۔"

"ایک ترکیب میرے ذہن میں آتی ہے۔" محسن نے کہا۔ "چھاپہ مارنا تو قانونی مسئلہ ہے اور اس کے لیے جو طریقۂ کار ہے اس میں ہم مداخلت نہیں کر سکتے لیکن پولیس کسی کو سرِراہ منشیات فروخت کرتے پکڑ لے تو یہ ان کے دائرہ اختیار میں ہے اور اس کے بعد خانہ تلاشی کے انتظامات وہ خود کر سکتے ہیں۔ سرِراہ کا مطلب ہے گھر سے باہر اور باہر کا مطلب یہ نہیں کہ سڑک پر یا بازار میں۔ گھر کی حدود سے نکلنے کے بعد کوئی واقعہ دروازے سے ایک فٹ دور بھی پیش آئے تو یہ گھر سے باہر کی بات ہے۔"

"چشمِ بدور!" میں نے محسن کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ "تو نے سوقت ذہانت کا بے مثل مظاہرہ کیا ہے۔ خریدار اگر چراغ دین کے گھر میں داخل نہ ہو اور گیٹ سے باہر ہی کھڑا رہے تو چراغ دین اسے وہ پیکٹ باہر آ کر دینے پر مجبور ہو گا جیسے ہی خریدار رقم ادا کرے گا انسپکٹر اسے گرفتار کر لے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس مقصد کے لیے کسی انسپکٹر کی خدمات حاصل کی جائیں۔ ہمارا تو کوئی دوست بھی نہیں۔"

"یہ کام تو متعلقہ تھانے کا کوئی انسپکٹر ہی کر سکتا ہے۔" محسن نے کہا۔

میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو واپس ہونے کے لیے کہا۔ وہ تھوڑا سا حیران ضرور ہوا لیکن پریشان نہیں ہوا۔ اسے رات بھر کا معاوضہ توقع سے زیادہ مل گیا تھا اور ہماری فرانسیسی نے اس کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ ہم غیر ملکی ہیں۔ میری ہدایات کے مطابق گاڑی تھانے کی حدود سے کچھ فاصلے پر ٹھہر گئی۔ میں نے محسن کے بجائے یہ کام خود کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں اتر کے واپس گیا اور پچاس قدم چل کے موڑ کاٹتے ہی تھانے میں داخل ہو گیا۔ تھانے کا سارا عملدرات بھر "تفتیش" میں مصروف رہنے کے بعد اب آرام میں مصروف تھا۔ حوالات کی آہنی سلاخوں کے پیچھے شب گزیدہ ملزمان ایک ہی جیسی حالت میں پڑے تھے۔ ایس ایچ او کا کمرہ خالی تھا۔ دوسرے کمرے میں دو افراد چارپائیوں پر سوئے پڑے تھے جو یقیناً عملے میں شامل تھے مگر بنیان اور دھوتی یا ایک جیسی مونچھوں سے ان کے عہدے کا اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ محرر کہنیوں پر کرسی پر رکھے مراقبے کی حالت میں تھا۔ میں نے کندھے ہلا کر اسے ہوشیار کیا۔ اور پوچھا۔ "تھانے میں کوئی انسپکٹر کیوں نہیں ہے اور ہے تو نظر کیوں نہیں آتا؟"

"کمال ہے بھئی!" محرر نے دخل در معقولات کے علاوہ میرے سوال کو گستاخی سمجھتے ہوئے کہا۔ "میں کیا بتاؤں کہ کیوں نہیں ہے۔ افسر لوگ ہیں، کسی کے باپ کے نوکر نہیں ہیں اپنی مرضی سے آتے جاتے ہیں۔"

"مرضی کے بچے!" میں نے محرر کو کرسی پر سے اٹھا کے زمین پر کھڑا کر دیا۔ "معلوم ہے میں کون ہوں؟"

محرر اس سلوک کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ بھونکا رہ گیا اور فوراً سنبھل گیا۔ اس نے یہ بات تسلیم کر لی کہ تھانے میں ایسی جرأت کا مظاہرہ کرنے والا اور اس لہجے میں گفتگو کرنے والا یا تو کوئی مجسٹریٹ ہو سکتا ہے یا کوئی نیا پولیس افسر۔

"ایس آئی شیخ... سید اکرام شیخ ڈیوٹی پر ہیں جناب عالی!" محرر نے اٹینشن ہو کے کہا۔ "ابھی سگریٹ لینے گئے ہیں۔"

"ایس آئی... ایس آئی شیخ۔" میں نے تلخی سے زیرِ لب مسکرا کے کہا۔ "تمہارا مطلب ہے کہ سگریٹ خرید کے پیتے ہیں؟"

محرر کا رنگ اڑ گیا۔ "ہم تو ماتحت ہیں سرکار! افسر کو کیا بولیں کہ حرام مت لو۔ خود کبھی کسی سے لے کر بیڑی بھی پی ہو تو آپ معلوم کر لیں۔"

جو بات مجھے معلوم کرنی تھی، معلوم ہو گئی تھی۔ میں نے سر ہلایا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ "میں ابھی کچھ دیر میں پھر چکر لگاؤں گا۔" میں نے گھڑی دیکھ کر کہا اور تھانے کی حدود سے باہر آ گیا۔ محرر میں اب اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ مجھ سے میرے بارے میں کوئی سوال کرتا۔ میں گیٹ سے کچھ فاصلے پر رک کر انتظار کرنے لگا۔ اگر شیخ صاحب سے باہر ہی ملاقات ہو جاتے تو زیادہ بہتر ہے۔ میں نے سوچا۔

ڈبل ایس آئی شیخ صاحب پندرہ منٹ بعد نمودار ہوتے۔ وہ میرے سامنے سے گزر کے تھانے میں داخل ہونے کی نیت سے بڑھا ہی تھا کہ میں نے اسے نام لے کر پکارا۔ وہ چونک کر رکا اور آہستہ آہستہ میری طرف آیا۔

"کون ہو تم؟" وہ اپنی بیٹھی ہوئی آواز میں بولا۔

"تم نے مجھے پہلے کہیں نہیں دیکھا ہے۔" میں نے کہا۔ "نہ تھانے میں، نہ عدالت میں، نہ جیل میں۔ میں تمہارے پاس ایک کام سے آیا ہوں لیکن اس میں میرا کوئی فائدہ نہیں۔ تمہیں کس حد تک فائدہ ہو سکتا ہے، اس کا انحصار تمہاری ہمت اور صلاحیت پر ہے۔"

"میں ذرا موٹی عقل کا آدمی ہوں۔" وہ بولا۔ "ایسے گھما پھرا کر بات مت کرو۔"

"تمہارے علاقے میں ایک شخص منشیات کا کاروبار کر رہا ہے۔" میں نے بے نیازی سے کہا۔ "ابھی تک اس کے بارے میں کسی کو بھی معلوم نہیں ہے۔ میں اس شخص کو پکڑوانے میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔ اگر تم اسے گرفتار کر کے مال برآمد کرنے میں کامیاب رہے تو فائدہ تمہیں ضرور ہو گا۔ یہ کارنامہ تمہارے ریکارڈ پر آ جائے گا۔"

"ہاں۔" سب انسپکٹر نے کہا۔ "لیکن تم میرا فائدہ کیوں چاہتے ہو؟ تمہاری کوئی دشمنی ہے اس شخص سے؟"

"ہاں۔ وہ ایک بار میری بیوی کو ورغلا کے لے گیا تھا اور اس نے دوسری شادی کر لی۔ اب وہ دوسری کو بھی لے جانا چاہتا ہے۔"

"تو یہ بات ہے۔" تھانیدار نے یوں سر ہلایا جیسے پورا مسئلہ سمجھ لیا ہو۔ "تمہارے پاس کیا ثبوت ہے؟"

"اگر تم اس کو گرفتار کرنا چاہو تو میں ہر ثبوت ایک شرط پر فراہم کر سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں بالکل سامنے نہیں آؤں گا۔ میں دو افراد کو اس کے پاس بھیجوں گا جو اس سے مال خریدتے ہیں۔ تم اسے عین وقت پر پکڑ سکتے ہو۔"

"لیکن اس قسم کا چھاپہ مارنے کے لیے مجسٹریٹ کا ساتھ ہونا ضروری ہے۔" سب انسپکٹر بولا۔

"تمہیں اس کے گھر پر چھاپہ نہیں مارنا ہے۔" میں نے کہا۔ "اسے سڑک پر سے گرفتار کرنا ہے۔ ٹھیک نو بجے میں ایک گاہک کو اس کے پاس بھیج سکتا ہوں جو پولیس کے لیے مخبری بھی کرتا ہے۔ اسی وقت دوسرا گاہک بھی پہنچے گا جو اکثر اس سے مال لیتا رہتا ہے۔ اگر تم مجھے سو سو کے پانچ نوٹوں پر دستخط کر کے دے دو اور نو بجے سے پہلے اپنے آدمی سادہ کپڑوں میں دروازے کے پاس کھڑے کر دو تو تم ان تینوں کو پکڑ سکتے ہو۔ وہ شخص مال دینے کے لیے باہر نکلے گا۔ جیسے ہی وہ مال دے کر نوٹ جیب میں ڈالے تم اسے گھیر لو اور اندر مت جانے دو۔ تم نے ایک مجرم کو سرِعام منشیات فروخت کرتے دیکھا۔ اس کی اطلاع تمہیں کسی نے ٹیلیفون پر دی تھی۔ دونوں خریدار تمہارے گواہ ہوں گے اور آسانی سے اعترافِ جرم کر لیں گے۔ منشیات فروخت کرنے والوں کے حلقے میں دونوں مشہور ہیں۔ اس کے بعد تم گھر پر چھاپہ مارنے اور خانہ تلاشی کے وارنٹ لینے کا انتظام خود کر سکتے ہو۔ مجھے تو اس سے ایک بدلہ لینا ہے۔ تم سوچ لو کہ یہ بہت بڑا کارنامہ ہو گا۔"

"نوٹ نکالو۔" سب انسپکٹر نے فوراً فیصلہ کر لیا کہ یہ گھاٹے کا سودا نہیں ہے۔

میں نے اس کو پانچ نوٹ پیش کیے۔ ایک لیمپ پوسٹ کے نیچے کھڑے ہو کر اس نے میری پاکٹ ڈائری پر رکھے۔ اس نے اپنے قلم سے ہر نوٹ پر دستخط کیے اور تاریخ ڈال کر میرے حوالے کر دیے۔ میں نے نوٹوں کو واپس جیب میں رکھا۔ اس سے ہاتھ ملا کر تاکید کی کہ وہ نو بجے سے پہلے پہلے اپنی نفری کے ساتھ پہنچ جائے اور پوری طرح چوکس رہے اور آخر میں اسے چراغ دین کا پتہ بتا کے روانہ ہو گیا۔ پچیس منٹ بعد میں واپس پہنچا تو صبح کا اجالا پھیلنے لگا تھا۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر میں نے محسن کو یہ خوشخبری سنائی کہ دوسرا مرحلہ بھی سر ہو گیا۔ اگر استاد ٹیڈی کسی طرح دو آدمی ٹھیک نو بجے چراغ دین کے دروازے پر پہنچا دے تو سمجھو کھیل ختم۔ آج کے دن کا سورج چراغ دین کے لیے اس دنیا میں یومِ حساب لے کر طلوع ہو گا۔ برسوں پہلے اس نمک حرام نے جس تھالی میں کھایا تھا اسی میں چھید کیا تھا۔ وہ بہت مطمئن تھا کہ اس نے بڑی صفائی سے ایک شخص کے اعتماد کو دھوکا دیا۔ بڑی ذہانت سے غبن کیا اور بچ نکلا۔ اس نظامِ انصاف میں اس کے خلاف کوئی جرم ثابت نہیں ہوا اور اب برسوں بعد اسے یہ بات یاد بھی نہ آتی ہو گی کہ دنیا میں اس نے جتنی عزت اور دولت کمائی اس کا جائز حق نہیں تھی اور انتقام مظلوم کی دوسری نسل کو لینا تھا اگر پدر نتواند پسر تمام کند۔ عیاری سے اس نے بھی کام لیا تھا اور یہی ہتھیار میں نے بھی آزمایا ہے۔ پکڑا وہ بھی نہیں گیا تھا اور میرے پکڑے جانے کا بھی کوئی امکان نہیں اور جس طرح میں جانتا تھا کہ چراغ دین مجرم ہے اسی طرح ایک دن وہ بھی جان لے گا کہ باپ کا انتقام لینے والا منیر خان کا بیٹا سکندر بخت ہی تھا۔ اس خیال سے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے قرض کا بار بہت ہلکا ہو گیا ہے۔ سوچا تو شاید میرے والد نے بھی یہی کچھ تھا کہ اس مکار، نمک حرام کو ایسی سزا دی جائے جو اس کو قانون نہ دے سکا۔ لیکن ان کو اتنی مہلت ہی نہ ملی۔

"سکندر بخت صاحب!" محسن نے کہا۔ "میں نے آپ سے ایک سوال کیا تھا۔"

"کیا؟" میں نے چونک کر کہا۔ "معاف کیجیے گا میں کہیں اور تھا۔"

"خریدار سے تو بات ابھی ہو جائے گی۔" محسن نے کہا "ہم اب بھی اپنی لنگڑی لولی فرینچ چلا رہے تھے۔" ابھی تک وہ مال چراغ دین کو نہیں ملا ہے جو خریدار لینے جائے گا۔ میری مراد اس پانچ سو کے مال والے پیکٹ سے ہے۔"

میرے جواب دینے سے پہلے ٹیکسی موہنی روڈ پر رک گئی تھی۔ تپلی سی سڑک پر دونوں طرف دکانیں کھلنے لگی تھیں۔ خصوصاً دودھ دہی کی دکانوں پر بچے جمع تھے جو ہاتھوں میں ڈول، چھوٹی چھوٹی بالٹیاں، چینی کے پیالے اور ہر قسم کے برتن لیے آخری کونڈا ختم ہونے سے پہلے دہی حاصل کرنے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ ان کے علاوہ صبح دم لسی پینے والے تھے جو الگ آوازیں لگا رہے تھے۔

"پہلوان جی، ذرا جلدی کرنا۔" مگر پہلوان جی سارے شور و غل سے بے نیاز اطمینان سے کام کر رہے تھے۔ بعض جگہ کمیٹی کے نلکوں پر جہاں لکھا تھا "یہاں نہانا سخت منع ہے" دو دو تین تین افراد بڑی فراغت سے دہی مل مل کے غسل کرنے میں مصروف تھے۔ سڑک پر سے تانگے اور ریڑھے والے مسلسل آوازیں لگاتے ان لوگوں کو متوجہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے جن کو نہ آوازوں کی پروا تھی اور نہ بظاہر اپنی جان کی۔ مجھے یہ دیکھ کر ہمیشہ حیرانی ہوتی تھی کہ ایک ہارس پاور کی گاڑی چلانے والے یہ کوچوان کتنے ماہر ہیں کہ اسٹیئرنگ اور بریک نہ ہونے کے باوجود، ہجوم میں سے راستہ نکال لیتے ہیں اور کوئی حادثہ نہیں ہوتا۔ پیرس کے ٹیکسی ڈرائیوروں کے بعد دوسروں کی جان ہتھیلی پر رکھ کر گاڑی چلانے کا فن اگر جانتے تھے تو لاہور کے کوچوان۔ یہ اس شہر کا مزاج تھا جو دنیا کے ہر بڑے شہر کی طرح سب سے جدا تھا۔

استاد ٹیڈی ہمیں چھوڑ کر ایک گلی میں چلا گیا تھا اور ہم بڑے سسپنس میں مبتلا تھے۔ ہماری ساری اسکیم کا دارومدار ٹیڈی کے کامیاب لوٹنے پر تھا۔ فرضی گاہک تو پولیس بھی بھیج دیتی ہے مگر میں چاہتا تھا کہ گاہک اصلی ہوں تاکہ بعد میں شک شبے کی گنجائش ہی نہ رہے اور چراغ دین یہ نہ کہہ سکے کہ اس کے خلاف سازش کا جال پھیلایا گیا ہے۔ وہ مال دیتے ہوئے اور قیمت وصول کرتے ہوئے پکڑا جائے گا۔ یہ ثابت ہو جائے گا کہ دونوں گاہک اس پیشہ میں پرانے ہیں اور بعد میں مزید مال چراغ دین کے گھر سے برآمد ہوگا۔ ایک ایسی جگہ سے جس کا خود چراغ دین بھی تصور نہیں کر سکتا۔ وہ بڑے اطمینان سے خانہ تلاشی کے لیے تیار ہو جائے گا اور پولیس کو چابیاں بھی دے دے گا۔

"میرا پروگرام بالکل سیدھا ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر یہاں سے دو گاہکوں کا بندوبست ہو گیا تو میں ساڑھے سات بجے چراغ دین کے پاس جاؤں گا اور یہ پیکٹ اس کے حوالے کر دوں گا۔ محبت خان کی عدم موجودگی میں، میں اسے بتا دوں گا کہ شیروانی صاحب نے بھجوایا ہے۔ اس میں کچھ پرانا زیور ہے جس کے بدلے ایک سنار نئے ڈیزائن کے مطابق کچھ بنا کر دے گا۔ کیا بنا کر دے گا، یہ مجھے نہیں معلوم لیکن جو شخص آئے گا وہ اپنا نام بتائے گا اور پانچ سو روپے بھی دے گا۔ یہ شیروانی صاحب کا کوئی حساب کتاب ہوگا جو وہ خود ہی جانتے ہیں۔۔۔"

"اور اگر اس نے پوچھا کہ یہ پیکٹ تمہارے پاس کہاں سے آیا؟" محسن نے میری بات کاٹ دی۔ "شیروانی صاحب نے محسن کو کیوں نہیں بھیجا؟"

"اس کا جواب بھی سیدھا سادا ہے۔" میں نے کہا۔ "میں کہوں گا کہ یہ سب باتیں آپ شیروانی صاحب سے پوچھیے گا۔ محسن سے تو آج کل وہ ناراض ہیں اور شاید اسی لیے انہوں نے یہ کام محسن کو نہیں سونپا۔ صبح میرے پاس ایک شخص آیا تھا اور جو کچھ اس نے پیکٹ دینے کے بعد کہا وہ میں آپ کو بتا رہا ہوں۔ آپ باقی باتیں شیروانی صاحب سے ٹیلیفون پر پوچھ لیجیے گا مجھے تو ایک مقدمے کے سلسلے میں آٹھ بجے سٹی کورٹ پہنچنا ہے۔ اب آپ غور فرمائیے محسن میاں کہ بعد میں کیا ہوگا؟ مسٹر چراغ الدین کا ذہن فوراً شادی کے انتظامات کی طرف جائے گا۔ وہ سمجھے گا کہ شیروانی صاحب زیور کے لیے کچھ بنوا رہے ہوں گے اور یہاں ان کا کوئی جاننے والا ہوگا۔ ورنہ جیولرز تو پنڈی میں بھی کم نہیں ہیں۔ وہ خوشی خوشی ڈبا رکھ لے گا۔ ہم ٹیکسی والے کی چھٹی کریں گے اور آٹھ بجے گھر۔ گویا ہم رات بھر سو کے اٹھے ہیں اور ہمارے گواہ ہوں گے ہمارے پڑوس میں رہنے والے کانسٹیبل صاحب جن کو ہماری سفارش سے تھانیدار بننا ہے۔"

"اس کا تو باپ بھی کہے گا کہ ہم رات کو اپنے کمرے میں سوتے رہے ہیں۔" محسن نے قہقہہ لگا کے کہا۔

"اب آگے سن!" میں نے ہنس کر کہا۔ "اگر ڈبل ایس آئی شیخ نے چراغ دین کو پکڑ لیا تو چشم ما روشن دل ما شاد۔ میں اس بدمعاش سے اس وقت ملاقات کروں گا جب وہ جیل پہنچ جائے گا۔ اس سے پہلے نہیں۔ اس کا جھوٹ یوں بھی ثابت ہو جائے گا کہ آج مجھے کسی مقدمے میں یہیں نہیں حاضر ہونا۔ وہ اپنے بیان میں کہے گا کہ سکندر نے یہ کہا تھا اور وہ کہا تھا۔ نہ شیروانی صاحب تصدیق کریں گے اور نہ پولیس ملنے گی۔ ہم آٹھ بجے اطمینان سے رضوی صاحب کے گھر میں ان کی فیملی کے ساتھ ناشتہ کریں گے۔ نو بجے تک گپ شپ لگائیں گے اور تھانے سے آنے والے کسی ٹیلیفون کا انتظار کریں گے۔ رضوی صاحب کی بیگم کو کوئی خواب سنائیں گے جو ہم نے گزشتہ رات دیکھا ہو اور اگر اس عرصے میں ٹیلیفون آ گیا تو خود بات بھی کر لیں گے۔"

"لیکن فرض کر، وہ ڈبل ایس آئی اپنے وعدے پر قائم نہ رہا۔" محسن بولا۔ "اگر اس نے کہہ دیا کہ اطلاع دینے والا یہی شخص تھا؟"

"وہ کہہ سکتا تھا لیکن جب اسے معلوم ہوگا کہ سکندر بخت تو ایس ایس پی ضامن رضوی کے گھر کا کوئی فرد ہے تو وہ بہتر یہی سمجھے گا کہ مجھے نہ پہچانے اور کہہ دے کہ اطلاع دینے والا کوئی اور شخص تھا۔ ویسے اس کے وعدہ خلافی کرنے سے کچھ ثابت نہیں ہوتا۔ میں بھی کہہ سکتا ہوں کہ ڈبل ایس آئی صاحب! فتور آپ کی آنکھوں میں ہے یا آپ کے دماغ میں۔ اس کا علاج ضرور کرائیے اور اگر چھاپہ ناکام رہا جس کا امکان بہت کم ہے تو پھر کچھ اور سوچیں گے کیونکہ مال تو چراغ دین کے گھر میں ایسی جگہ رکھا ہے کہ خود اس کو بھی نظر نہیں آ سکتا۔ میری بڑی خواہش تھی کہ چراغ دین کی گرفتاری کا منظر اپنی آنکھ سے دیکھتا لیکن مصلحت کا تقاضہ یہی ہے کہ ہم دور رہیں۔ کل تک اس کی رسوائی کی ساری داستان اخبار میں ہوگی۔"

استاد ٹیڈی اچانک گلی میں سے نمودار ہوا۔ اس کا دمکتا مسکراتا چہرہ دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ اسے اپنے مقصد میں ناکامی نہیں ہوئی۔ عین ممکن تھا کہ شدتِ جذبات میں وہ کوئی غلط بات کہہ دیتا جس سے ٹیکسی ڈرائیور کو شک ہو جاتا لیکن میں نے اسے اشارے سے منع کر دیا۔ ٹیڈی خاموشی سے اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور ہم نے فیصلہ کیا کہ اب ہمارا کام ختم ہو چکا ہے چنانچہ ہمیں ٹیکسی کو چھوڑ دینا چاہیے اور اپنا اپنا راستہ لینا چاہیے۔ ٹیکسی والا خود بھی یہ سمجھنے لگا تھا کہ رات بھر کا معاہدہ ختم ہو چکا ہے۔ ہم نے اسے بوہڑ والے چوک پر رخصت کیا اور وہ دائیں طرف گھوم کر غائب ہو گیا۔ پھر ریلوے اسٹیشن جا پہنچا۔ صابن اور ٹوتھ پیسٹ وغیرہ ٹیکسی میں ہی رہ گئے تھے اس لیے یہ ہو سکتا تھا کہ۔۔۔ سے کوئی سواری راستے ہی میں مل جائے اور وہ اپنی ایمانداری ثابت کرنے کے لیے ہمارے پیچھے آتے لیکن جس راستے پر وہ گیا تھا یکطرفہ تھا اور اب وہ اگلے چوک سے گھوم کر جی ٹی ایس کے اڈے کے سامنے والی سڑک پر سے گزر کر اور ریلوے اسٹیشن کے پورے راؤنڈ اباؤٹ کا چکر لگائے بغیر واپس نہیں آ سکتا تھا۔ ہم اس سامان کو لے کر کیا کرتے اور کہاں لے جاتے؟ میں نے ٹیڈی سے کہا کہ وہ شام کو ہمیں رابعہ کے آفس میں ملے اور فی الحال خود بھی روپوش رہے کیونکہ دونوں خریدار جو چراغ دین کے پاس جائیں گے پولیس کے سامنے بیان میں یہ ضرور کہیں گے کہ ان کو بھیجنے والا استاد ٹیڈی نام کا شخص تھا۔ ٹیڈی نے سڑک پار کی اور ایک ویگن میں بیٹھ گیا۔ محسن مخالف سمت میں گڑھی شاہو کی طرف جانے والی بس پر سوار ہو گیا اور میں نے واپسی اختیار کی۔ چند قدم چلنے کے بعد میں جی ٹی ایس کے اڈے کے ایک دروازے سے داخل ہوا اور مختلف شہروں کو جانے والی بسوں اور مسافروں کے ہجوم میں سے گزرتا ہوا دوسرے دروازے سے نکل گیا۔ جہاں سے چراغ دین کی کوٹھی کا فاصلہ ایک فرلانگ بھی نہیں تھا۔ جو پیکٹ میرے پاس تھا وہ عام سائز کے بیس سگریٹوں کے پیکٹ سے کچھ بڑا تھا گتے کے اس پیکٹ پر چاروں طرف سفید کاغذ اس طرح چپکایا گیا تھا کہ پیکٹ ہر طرف سے بند نظر آتا تھا۔ میں نے پیکٹ کو قمیص اور بنیان کے اندر ڈال کر پتلون کی بیلٹ سے دبا رکھا تھا۔ میں محبت خان سے ملاقات کی صورت میں بالکل خالی ہاتھ اندر جانا چاہتا تھا۔

محبت خان گیٹ پر یا گیٹ کے اندر موجود نہیں تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اس وقت وہ باورچی خانے میں خانساماں کے فرائض انجام دے رہا ہوگا اور ناشتہ بنا رہا ہوگا۔ گھنٹی بجانے کے بجائے میں سیدھا اندر چلا گیا اور دروازے پر دستک دی۔ چراغ دین نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا اور مجھے دیکھ کر حیران ہوا۔

"سکندر۔۔۔!" اس نے کسی قسم کی گرمجوشی کا مظاہرہ کیے بغیر کہا۔ "تم اس وقت یہاں کیسے؟"

"میں ایک ضروری کام سے آیا تھا۔" میں نے پیکٹ برآمد کرتے ہوئے کہا۔ "شیروانی صاحب نے اسلام آباد سے یہ سامان بھجوایا تھا آپ کے لیے۔"

"کیا ہے اس میں؟" اس نے کسی شک کے بغیر پیکٹ لے لیا۔ "کون لے کر آیا تھا؟"

"لے کر تو خود محسن آیا تھا۔" میں نے کہا۔ "اور شیروانی

صاحب نے اسے تاکید کی تھی کہ آپ کو پہنچا دے لیکن معلوم نہیں کیوں یہ کام اس نے میرے سپرد کر دیا حالانکہ میرے پاس بالکل وقت نہیں تھا، مجھے ساڑھے آٹھ بجے ایک مقدمے کے سلسلے میں ڈسٹرکٹ کورٹ پہنچنا تھا۔“ میں نے کلائی کی گھڑی پر نگاہ ڈالتے ہوئے عجلت ظاہر کی۔

چراغ دین معنی خیز طریقے سے مسکرایا۔ اس مسکراہٹ کے دو مطلب نکالے جا سکتے تھے۔ ایک یہ کہ وہ محسن کے نہ آنے کی وجہ سمجھتا ہے اور دوسرا یہ کہ میرے مقدمات کے پس منظر سے واقف ہے۔

”اس میں کچھ پرانے زیورات ہیں۔“ میں نے انجان بن کے کہا۔ ”شیروانی صاحب ان سے نئے ڈیزائن کا کچھ زیور بنوانا چاہتے ہیں۔“

”کمال ہے، اس کے لیے انہیں راولپنڈی کا کوئی جیولر پسند نہیں آیا۔“ چراغ دین ڈبے کو الٹ پلٹ کر بولا۔

”یہاں ان کا کوئی جاننے والا ہے۔“ میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”وہ آج ہی یہ پیکٹ آپ سے لے جائے گا۔“

”مگر میں اسے کس طرح پہچانوں گا؟ نام کیا ہے اس کا؟“ چراغ دین نے کہا اور میں نے محسوس کیا کہ شکوک کے بجائے اس پر خوش آئند تصورات کا غلبہ ہے۔ حسبِ توقع چراغ دین سمجھ رہا تھا کہ شیروانی صاحب شادی کے لیے زیور بنوا رہے ہیں۔

”اس کا نام بھورا ہے اور اس نام کی وجہ بھوری آنکھیں ہیں۔“ میں نے ٹیڈی کی فراہم کردہ معلومات کی بنیاد پر کہا۔ ”لیکن اصل بات یہ ہے کہ پہلے آپ کو اس سے پانچ سو روپے لینے ہیں۔ اس کے بغیر یہ پیکٹ نہیں دینا ہے۔ یہ شیروانی صاحب کا کوئی پرانا حساب کتاب ہے جس کی رو سے اس شخص کے ذمے پانچ سو روپے نکلتے ہیں۔“

”میں وصول کر لوں گا۔“ چراغ دین نے کہا۔ وہ ابھی تک مجھ سے دروازے میں کھڑا بات کر رہا تھا۔ عمداً اس نے مجھ سے نہ اندر بیٹھنے کے لیے کہا تھا اور نہ اخلاقاً ایک کپ چائے کے لیے پوچھا تھا۔ اپنی دانست میں وہ مجھے بے عزت کر رہا تھا لیکن اس بدبخت کو معلوم نہیں تھا کہ اس طرح وہ میری کتنی مدد کر رہا ہے اور خود اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی مار رہا ہے۔ اگر وہ مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھاتا اور میری خاطر تواضع کرتا تو اپنے حق میں اچھا کرتا۔ محبت خان مجھے دیکھ لیتا اور بعد میں یہ گواہی دیتا کہ سکندر صاحب صبح صبح

آتے تھے۔ اب اس بات کا کوئی گواہ نہیں رہا تھا۔ ... نے ایک بار پھر عدالت میں حاضری کا ذکر کیا۔ معذرت چاہی کہ میں بیٹھ نہیں سکتا اور ہاتھ ملا کر رخصت ہو ... پندرہ منٹ بعد ایک رکشا نے مجھے رضوی صاحب کی کوٹھی کے دروازے پر اتار دیا۔ میں تیر کی طرح سیدھا ... کوارٹر کے اس کمرے میں گیا جہاں محسن بستر پر بیٹھا ... ساتھ کے کمرے میں رہنے والا کانسٹیبل بھی وہیں موجود ...

”آپ بھی آگئے جنابِ عالی!“ وہ مجھے دیکھ کر ...

”آگئے کا کیا مطلب ہے؟“ محسن نے اسے ڈانٹا۔ ”معلوم ہوتا ہے کہ تم تھانیدار نہیں بننا چاہتے۔ کیا ... تھا تمہیں ابھی؟ ہم دونوں کل رات کو دس بجے سو گئے ... رات کو تم دو مرتبہ اٹھے۔ ایک مرتبہ پانی پینے اور ... مرتبہ حاجت کے لیے۔ دونوں مرتبہ تم نے ہمیں سوتا ہوا ... اور اٹھنے کے بعد بھی ہم گھر میں ہی تھے۔ یہی ہے ... اسے اچھی طرح یاد کر لو اگر ایک لفظ بھی بھولے ... ہم رضوی صاحب سے تمہاری کوئی سفارش نہیں کریں گے۔“

”بالکل نہیں کریں گے۔“ میں نے تائید کی اور جوتے اتارنے لگا جن پر آخری بار دو ہفتے پہلے پالش ... تھی اور اب ان پر گرد اور کیچڑ اس طرح بیٹھ گئے تھے ... جوتوں کے اصل رنگ کا پتہ نہیں چلتا تھا۔ محسن کے ... جگ مگ کرتے جوتوں کے مقابلے میں میرے جوتے کسی دیہاتی کے دس سال پرانے جوتے لگتے تھے ... گھنٹہ پہلے خود محسن کے جوتوں کی بھی یہی حالت تھی۔

”اچھا اب تم جاؤ مگر اپنا سبق یاد رکھنا“ ... کانسٹیبل کی مسکین صورت پر بے اختیار ہنسی آ رہی ...

”ورنہ ہم ایسا سبق دیں گے کہ یاد رکھو گے تمام عمر۔“

”ہم تمہاری پوسٹنگ ٹنڈو الٰہ یار کرا دیں گے۔“ ... نے کہا۔

”جہاں اللہ کے سوا تمہارا یار کوئی نہیں ہو گا۔“ ... اس کو مزید دہشت زدہ کیا۔

جب وہ چلا گیا تو ہم دل کھول کر ہنسے۔ تھانیدار بننے کے چکر میں کانسٹیبل عملی طور پر ہماری جوتیاں ... رہا تھا حالانکہ ہم تھانیدار تو کیا اس کو ہیڈ کانسٹیبل ... بنوا سکتے تھے۔ ہنستے ہنستے میں نے محسن کو چراغ دین ... والی گفتگو سنائی۔ ابھی ہم ہنس ہی رہے تھے کہ رابعہ آ ...

”تم دونوں یہاں پڑے دانت نکال رہے ہو۔“ ... نے کہا۔ ”ادھر رضوی انکل تمہارے دانت توڑنے کی

تیاری کر رہے ہیں۔“

”اچھا، ہمارا خیال تھا کہ وہ پولیس افسر ہیں، دندان ساز نہیں۔“ میں نے کہا۔

”اس کے علاوہ ہمارے دانت بالکل ٹھیک ہیں۔ اچھی بھلی چیز کو توڑنے کی کیا ضرورت ہے؟“ محسن نے کہا۔

”یہ سب کچھ ان سے ہی پوچھ لینا۔“ رابعہ نے کہا۔ ”انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ پانچ منٹ کے اندر اندر دونوں کو ناشتے کے لیے حاضر کر دو۔ چار منٹ ہو چکے ہیں۔“

ہم دونوں ایک ساتھ اٹھ کر دوڑے اور رابعہ سے پہلے رضوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ ہم دونوں نے منہ تک نہیں دھویا تھا۔ ہمارے بال بکھرے ہوئے تھے اور رات بھر جاگنے سے آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں لیکن معلوم یہی ہوتا تھا کہ ہم ابھی ابھی سو کر اٹھے ہیں اور ہماری آنکھوں میں نیند کا خمار ہے۔

”یہ کیا حرکت ہے؟“ رضوی صاحب نے کہا۔ ”ننگے پاؤں بھاگے چلے آ رہے ہو۔“

”کیا کریں انکل!“ میں نے کہا۔ ”ہمیں حکم ملا تھا کہ پانچ منٹ میں حاضر ہو جائیں۔“

”اور چار منٹ گزر چکے تھے۔“ محسن نے گردن ہلائی۔ ”ہاتھ منہ دھونے یا جوتے پہننے کے لیے وقت ہی نہیں تھا۔“

”ہم تو ابھی سو کر بھی نہیں اٹھے تھے۔“ میں نے کہا۔

”بلکہ شاید ابھی تک سو رہے ہیں۔“

”خیر کوئی بات نہیں۔“ محسن نے کہا۔ ”ہم سوتے میں ہی ناشتہ کر لیں گے۔“

ہم نے رضوی صاحب کو بولنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔ ہماری باتوں سے ان کی بیگم کو بڑی ہنسی آئی جو ابھی ناشتہ لگانے میں مصروف تھیں۔ پھر رابعہ اندر آئی اور ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

”یہ دونوں بہت بدمعاش ہیں۔“ رضوی صاحب مسکرائے۔ ”ہر وقت کوئی نہ کوئی ڈرامہ کرتے رہتے ہیں۔ اس وقت بھی یہ کوئی شرارت کر کے آتے ہیں۔“ انہوں نے رابعہ سے مخاطب ہو کے سوال کیا۔

ایک سیکنڈ کے لیے مجھے یوں لگا کہ رضوی صاحب سب کچھ جانتے ہیں۔ انہیں معلوم ہو چکا ہے کہ ہم نے چراغ دین کے ساتھ کیا ڈرامہ کیا ہے لیکن یہ خیال میرے وہم کی پیداوار تھا۔ اسی وقت کانسٹیبل اندر آیا۔ سیلوٹ کر کے اس نے رضوی صاحب کو مطلع کیا کہ گاڑی تیار ہے جنابِ عالی!

”اب آپ اس سے پوچھ لیں۔“ میں نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ ”شرارت کا کیا سوال۔ ہم کل رات دس بجے سوئے تھے اور ابھی اٹھے ہیں۔ مجال ہے جو رات کو خواب بھی دیکھا ہو۔ نیند سے فرصت ہی نہیں ملی۔“

”بالکل جنابِ عالی!“ کانسٹیبل نے کہا اور ہماری تائید میں پورا بیان فر فر پڑھ دیا۔

”اچھا اچھا۔“ رضوی صاحب نے کہا۔ ”تم جاؤ باہر ٹھہرو، میں ناشتہ کر کے آتا ہوں۔“

”انکل رضوی!“ میں نے زور سے کہا۔ ”آپ اسے تھانیدار بنا دیں نا۔“

”ہم نے تو اس سے کہیں زیادہ نالائق تھانیدار دیکھے ہیں۔“ محسن نے فوراً کہا اور کانسٹیبل نے باہر جاتے جاتے رک کر ہمیں شکر گزار نظروں سے دیکھا لیکن اس نے رضوی صاحب کا جواب نہیں سنا۔

رضوی صاحب نے ہمیں بتایا کہ وہ صبح اسلام آباد فون کر چکے ہیں۔ فوزیہ بالکل خیریت سے ہے اور گھر پہنچ چکی ہے لیکن یہ اطلاع تمہید کے لیے تھی۔ اصل بات انہوں نے اس کے بعد کی۔

”مجھے رابعہ نے بتایا ہے کہ تم نے اس کے لیے کوئی مکان پسند کیا ہے؟“ رضوی صاحب نے کہا۔ ”اور آج اس کی ادائیگی کرنی ہے۔ یہ مکان کہاں ہے؟ مجھے ذرا تفصیل سے سمجھاؤ۔“

میں نے ان کو مکان کے بارے میں مکمل معلومات فراہم کیں اور یہ بھی بتایا کہ وہاں ہمارے ساتھ کون کون رہے گا۔ میں نے شہلا کا نام بھی لیا مگر ان کو نہیں بتایا کہ وہ ڈی سلوا کی سیکرٹری رہ چکی ہے اور عدنان کی بہن ہے۔ میں نے کہا کہ وہ رابعہ کی کوئی پرانی جاننے والی ہے۔ اس کی مفلوج ماں بھی رابعہ کی ماں کو جانتی تھی اور ان کے حالات پہلے بہت اچھے تھے لیکن اب ان کے پاس سر چھپانے کا ٹھکانہ بھی نہیں ہے۔“ اخبارات میں جرائم کی اور قتل و غارت گری کی خبریں ہر روز شائع ہوتی تھیں۔ ان کو شہلا کے نام سے کچھ یاد نہیں آیا۔

”چلو، یہ انتظام کسی حد تک بہتر ہے۔“ رضوی صاحب نے کہا۔ ”ورنہ میں رابعہ کے یہاں سے جانے کو پسند نہیں کرتا۔ رابعہ کی خادمہ بھی ساتھ رہے گی اور وہ دوسری فیملی بھی ہے تو کوئی ہرج نہیں۔ تم دونوں اوپر والے بیڈ روم میں رہو گے؟“

”خیال تو یہی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ڈر صرف یہ ہے...“

”ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔“ رضوی صاحب نے میری بات کاٹ دی۔ ”رابعہ نے مجھ سے کہا ہے کہ میں چند روز

کے لیے حفاظت کے خصوصی انتظامات کردوں۔ میں اس مکان کے گرد سادہ کپڑوں میں چار مسلح آدمی کھڑے کر رہا ہوں جو ایک ہفتے تک نگرانی کریں گے۔ ان کی ڈیوٹی بدلتی رہے گی لیکن یہ انتظام غیر سرکاری قسم کا ہوگا یوں سمجھ لو کہ میں ذاتی طور پر کروں گا۔"

"اور آفس کے لیے؟" رابعہ نے دبے دبے لہجے میں کہا۔

"آفس کی بلڈنگ کے دو دروازے ہیں نا؟" رضوی صاحب نے کہا۔ "اور دونوں پر چوکیدار بھی رہتے ہیں۔ ان سے کہو کہ ریوالور کے لائسنس کے لیے درخواست دے دیں۔ میں کل تک لائسنس دلوا دوں گا۔ بلڈنگ میں رہنے والے ان کو ریوالور فراہم کرسکتے ہیں۔ دونوں دروازوں پر آج ہی نوٹس لگوا دو کہ اندر جانے والوں کو شناخت کرانی ہوگی اور غیر متعلقہ افراد اندر جائیں گے تو دروازے پر اپنا نام پتہ لکھوا کر جائیں گے۔ میں وہاں بھی گارڈ رکھ دیتا لیکن مشکل یہ ہے کہ اس عمارت میں وکیلوں کے دفتر ہیں۔ پولیس نے ان کو روکا تو گڑبڑ ہوجائے گی۔ چوکیدار جن لوگوں کو ذاتی طور پر پہچانتے ہوں ان کو جانے دیں۔ نیا آدمی ہو تو روک لیں۔ اس انتظام پہ کوئی قانونی اعتراض نہیں کرسکتا۔ اگر کرے تو رابعہ کہہ سکتی ہے کہ کچھ لوگ اسے ٹیلیفون پر دھمکیاں دے رہے تھے۔ ہر وکیل جانتا ہے کہ رابعہ کے پرانے گھر میں کیا ہوا تھا اور سب کو رابعہ سے ہمدردی بھی ہے اس لیے وہ رابعہ سے تعاون کریں گے اور اگر ان کے موکلوں کو اوپر آنے سے پہلے اپنی شناخت کرانی پڑی تو کوئی وکیل اس کو اپنے کاروبار میں رخنہ اندازی نہیں سمجھے گا یا خود ہی موکل کو مطمئن کرے گا۔ آفس کے اندر دو آدمی موجود ہوں گے جو ضرورت پڑنے پر تمہاری حفاظت کرنے کے پوری طرح اہل ہوں گے۔ یہ تمہارے آفس کے اندر کا معاملہ ہے کہ تم انھیں جہاں چاہے کھڑا رکھو یا بٹھاؤ۔ کلرکوں میں شامل کردو یا چپراسی بنالو۔ وہ پرانے تجربہ کار اور بہت اچھا ریکارڈ رکھنے والے لوگ ہیں اور اگر میں یہ کہوں کہ آدمی کو صورت سے تاڑ جاتے ہیں تو مبالغہ نہ ہوگا۔" انہوں نے کلائی کی گھڑی میں وقت دیکھا۔ "میں تو اب چلتا ہوں، پہلے ہی کچھ دیر ہوگئی ہے۔ تمہارا کیا پروگرام ہے آج؟"

"ابھی تو کچھ نہیں۔" میں نے کہا۔ "بس بینک ڈرافٹ بنوانے جانا ہوگا۔"

رضوی صاحب کے جانے کے بعد بھی ہم بیٹھے گپ لگاتے رہے اور ان کی بیگم کو گزشتہ رات کے خواب سناتے رہے جن کا مقصد صرف یہ بتانا تھا کہ ہم رات بھر کمرے میں سوتے رہے ہیں لیکن بیگم رضوی ہنستی رہیں۔ انھوں نے کہا کہ بس اب شادی کرلو۔ یوں کب تک خوابوں پر گزارا کرو گے۔ پھر ہمیں تلقین کی کہ ہم سگریٹ پینا چھوڑ دیں اور کسی کام سے باہر چلی گئیں۔ ہم اپنا حلیہ درست کرنے کو اٹھنے والے ہی تھے کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ میں نے محسن کی طرف دیکھا اور ریسیور اٹھا کے بھاری آواز میں کہا۔ "ہیلو؟"

"جناب ایس پی صاحب، رضوی صاحب سے بات کرنی تھی۔ میں انسپکٹر شیخ بول رہا ہوں۔" جواب ملا۔

"بولو بولو۔" میں نے اسی بارعب لہجے میں کہا۔ "میں رضوی بات کر رہا ہوں۔"

"جناب ایس پی صاحب!" انسپکٹر نے انتہائی مؤدب لہجے میں کہا۔ "آپ کے گھر میں کوئی سکندر بخت صاحب ہیں؟"

"ہاں میرا چھوٹا بھائی ہے۔" میں نے کہا۔ "کیا کام ہے اس سے؟"

"کام تو جناب ایسا کوئی خاص نہیں۔" انسپکٹر نے کہا۔ "دراصل ہم نے ایک مجرم پکڑا ہے جو منشیات کا دھندا کرتا تھا۔ ہمیں اطلاع ملی تھی کہ اس علاقے میں کوئی شخص یہ دھندا کر رہا ہے۔ ہم نے اطلاع دینے والے کو دستخط کیے ہوئے نوٹ دے دیے اور مجرم کو اس وقت پکڑ لیا جب وہ پانچ سو کا مال دے رہا تھا۔ اس کے ساتھ دوسرا گاہک بھی گرفتار ہوگیا ہے۔"

"کیا نام ہے مجرم کا؟" میں نے اسی لہجے میں کہا۔

"چراغ دین جناب!" انسپکٹر بولا۔ "ویسے تو اس نے دھوکا دینے کیلیے صدر میں جنرل اسٹور کھول رکھا ہے جو ہم نے ابھی دیکھا نہیں ہے۔ وہاں بھی دیکھنا ہے مگر وہ کہتا ہے کہ اس کو پھنسایا گیا ہے۔ ہم ابھی خانہ تلاشی کے وارنٹ لے کر مجسٹریٹ کے ساتھ اس کے گھر میں سے بھی مال برآمد کریں گے۔ لیکن وہ بدمعاش آپ کے چھوٹے بھائی پر الزام لگا رہا ہے کہ انہوں نے آج صبح سات بجے یہ پیکٹ اسے دیا تھا۔"

"وہ بکواس کرتا ہے۔" میں نے اسی افسرانہ لہجے میں کہا۔ "سکندر رات کو گھر پہ تھا اور صبح تو اس نے میرے ساتھ ناشتہ کیا ہے بلکہ اس وقت بھی وہ باتھ روم میں موجود ہے۔"

"وہ بالکل بکواس کرتا ہے جناب!" انسپکٹر نے فوراً کہا۔ "یہ سب پکڑے جاتے ہیں تو ایسے ہی کہتے ہیں۔ ہم تفتیش کریں گے تو سچ معلوم کرلیں گے لیکن آپ کسی وقت بھی سکندر صاحب کو تھوڑی سی دیر کے لیے بھیج دیں۔ ان کا بیان تو لینا ہی پڑے گا۔"

"ہاں ہاں، سکندر آجائے گا۔" میں نے بیزاری سے کہا۔ "لیکن تم نے گھر پہ کیوں فون کیا ہے انسپکٹر؟"

"پہلے آفس کیا تھا سر! معلوم ہوا جناب ابھی گھر پہ ہیں۔۔۔ غلطی ہوگئی۔" انسپکٹر نے کہا اور میں نے اس کی بات ختم ہونے سے پہلے ریسیور رکھ دیا۔ محسن اور رابعہ سوال بنے بیٹھے تھے۔

"ہم بڑے شکاری نہیں ہیں بھائی محسن!" میں نے اس سے ہاتھ ملا کر کہا۔ "یہ ہمارا پہلا شکار تھا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ ہم نے جو جال پھیلایا تھا وہ ٹھیک تھا۔" محسن نے قہقہہ مار کے کہا اور رابعہ نے حیرانی سے ہم دونوں کو دیکھا۔ میں نے کہا کہ اپنے غریب خانے کی طرف چلتے ہیں۔ وہاں ہم میں سے ایک شیو اور غسل کرے گا تو دوسرا تمہیں رات کی بات سنائے گا اور بات لمبی ہو گئی تو دوسرا تیاری کرے گا اور پہلا باقی بات بتا دے گا۔

محسن پہلے باتھ روم میں گھس گیا اور میں نے رابعہ کو اول تا آخر ایک پوری رات کی کارگزاری کا حال سنا دیا۔ "لوہے کو لوہا کاٹتا ہے بی بی!" میں نے اضطراب کے عالم میں ٹہلتے ہوئے کہا۔ "یہ میرے لیے بڑے اطمینانِ قلب کی بات ہے کہ میں نے ایک عیار شخص کو اس کی عیاری کی سزا عیاری سے دی۔ اس نے میرے سیدھے سادے اصول پرست، شریف اور اعتماد کرنے والے باپ کو دھوکا دیا تھا۔ امانت میں خیانت کی تھی اور غبن کرکے سمجھا تھا کہ وہ کبھی نہیں پکڑا جائے گا کیونکہ اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہوگا۔ ثبوت واقعی نہیں تھا کیونکہ جب کوئی کسی پر اعتماد کرتا ہے تو دل سے کرتا ہے لیکن عدالت دل کی گواہی نہیں مانگتی، دستاویزی شہادت مانگتی ہے۔ اس بدمعاش نے میرے باپ کو لوٹا، اس کی حلال کی کمائی پر ڈاکا ڈالا لیکن سزا سے محفوظ رہا۔ اسی غبن کے طفیل وہ عزت دار بن گیا اور بزنس مین ہوگیا۔ انتہا یہ ہے کہ اس نے میرے باپ کو گھر میں نوکر رکھا، اس کے ساتھ نوکروں جیسا سلوک کیا جو میرے باپ نے کبھی کسی کے ساتھ نہیں کیا تھا۔ وہ تو ملازموں کو اپنا دوست کہتا تھا۔ اس نمک حرام نے پرانے احسانات کا بھی خیال نہیں کیا اور میرا باپ اس کے گھر کے سرونٹ کوارٹر میں ذلیل اور رسوا ہوکر مرا۔ اس حالت میں کہ اس کے پاس علاج کرانے کے لیے بھی پیسہ نہ تھا اور وہ سرکاری ہسپتال سے خیرات میں ملنے والی دوائیں لینے پر مجبور تھا۔ بعد میں جو کچھ ہوا وہ ایک الگ کہانی ہے لیکن میرے باپ کی تباہی اور بربادی کی ابتدا اسی شخص نے کی تھی، میں نے اسی کو سب سے پہلے شکار کیا۔ میرے سینے میں نفرت اور انتقام کے جذبات کا جو آتش فشاں اُبل رہا ہے رابعہ! وہ ابھی سرد نہیں ہوا۔"

رابعہ نے میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے بٹھایا۔ "تم جذبات کی شدت سے مغلوب ہو رہے ہو۔"

"ہاں۔ اس لیے کہ اَن گنت ناکامیوں کے بعد میرے حصے میں آنے والی یہ پہلی کامیابی ہے۔" میں نے ایک گہری سانس لی۔ مجھے قطعی احساس نہیں تھا کہ بات کرتے کرتے میں چلانے لگا ہوں اور میرا چہرہ گرم ہوکے سرخ پڑ گیا ہے۔ "یہ پہلی سزا ہے جو میں نے پہلے مجرم کو دی ہے۔ اس سے پہلے سزا صرف میرے باپ نے جھیلی لیکن مجھے معلوم نہ ہو سکا۔ اس کا احساس بھی ایک سزا ہے لیکن اس کے بعد بھی میرے علاوہ کتنے لوگوں کو سزا مل چکی ہے؟ کیا جرم کیا تھا ان سب نے؟ اور کیا اختیار تھا ان لوگوں کو سزا دینے کا؟"

دس بجے کے قریب ہم ایک ساتھ نکلے۔ میں نے محسن کو رابعہ کے ساتھ کردیا کہ ایک بجے تک وہ خسرو جمشید کے نام سے ڈیڑھ لاکھ روپے کا پے آرڈر بنوالے یا بینک ڈرافٹ۔ پھر رابعہ کو لے جاکر صدر میں شہلا کے پاس چھوڑ دے۔ وہاں اگر میں پہلے سے نہ ملوں تو پولیس اسٹیشن سے میری خیریت معلوم کرے۔ رات بھر جاگنے کا اثر غسل کے بعد بھی محسوس ہو رہا تھا۔ میرا جسم کچھ ٹوٹ رہا تھا۔ سر بھاری تھا اور آنکھیں جل رہی تھیں۔ اس کے علاوہ میں چراغ دین کے بارے میں سوچ رہا تھا لیکن میری سوچ کی کوئی سمت نہیں تھی۔ میں اپنی مہم کے نتائج جاننے کے لیے سخت بے چین تھا۔ تصور میرے سامنے دو تصویریں پیش کرتا تھا۔ ایک میں چراغ دین پولیس اسٹیشن میں نظر آتا تھا، دونوں ہاتھوں میں زنجیر پہنے ہوئے اپنی ذلت اور رسوائی کے خیال سے ہراساں اور میری سازش پر برہم۔۔۔ غصے میں کھولتا ہوا مجھ سے بدلہ لینے کی

آرزو اور جھوٹ کو جھوٹ ثابت کرنے کی فکر میں مبتلا یا کچھ دے دلا کر معاملہ ختم کرنے کی کوشش میں مصروف اور اس خبر کو پھیلنے سے روکنے کی تدبیر سوچتا ہوا۔ ممکن ہے اسے یہ خیال بھی ہو کہ آج اس کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے کرنی کا پھل ہے اور اسے وہ وقت یاد آ رہا ہو۔ جب اس نے وزیر خان کے ساتھ دغا کی تھی۔ آج تقدیر نے دغا دے کر ثابت کر دیا ہے کہ خدا کی خدائی میں دیر ضرور ہو سکتی ہے مگر اندھیر نہیں ہے۔ دوسرا منظر اس سے بالکل مختلف تھا کہ اب تک چراغ دین 'باعزت' طور پر اپنے گھر واپس جا چکا ہوگا۔ پیسے میں بڑی طاقت ہے، بگڑے کام سنوارے جا سکتے ہیں۔ اس نے صورت حال کی سنگینی کا اندازہ ہوتے ہی عزت بچانے کے لیے تھوڑی سی دولت قربان کر دی ہو گی۔ انگریزی محاورے کے مطابق تھانیدار میرا حصہ لے کر خاموشی سے لوٹ گیا ہوگا اور اسی طرح دوسرے چھاپہ مار۔ رہ گئے گواہ یعنی وہ خریدار تو جان بچ جانے کو غنیمت شمار کرتے ہوئے بھاگ لیے ہوں گے۔ اس وقت چراغ دین ٹیلیفون پر شیروانی صاحب کو بتا رہا ہوگا کہ سکندر خبیث نے اس کے خلاف کیسی ناپاک سازش کی تھی جو خدا کی مہربانی سے ناکام رہی ورنہ وہ دنیا و دین میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا اور اب میں تھانے جاؤں گا تو وہ بات سچ ہو گی کہ جو دوسروں کے لیے گڑھا کھودتا ہے خود اس میں گرتا ہے اور تھانیدار کہے گا کہ آپ ہیں ایس پی رضوی صاحب کے چھوٹے بھائی ہ اور آپ نے ایک شریف اور معزز آدمی پر ایسا گھناؤنا الزام عائد کرنے کی کوشش کی تھی۔ ہم کیا اتنے بے وقوف ہیں کہ تم جیسے لونڈوں کی چالبازی کو نہ سمجھ سکیں ہ اور پھر تفتیش کا ایک نیا سلسلہ...

تھانے میں داخل ہونے تک میری ذہنی کیفیت قدیم یونان کے اس غلام سے مختلف نہ تھی جسے بھوکے شیر سے لڑنے کے لیے ارینا میں دھکیلا جا رہا ہو اور جسے یہ علم نہ ہو کہ وہ شیر کو مار کر آزاد ہو جائے گا اور عام معزز رومن شہری بن کے زندہ رہے گا یا تماشا ختم ہونے تک رزم گاہ میں صرف اس کا لہو اور کاسۂ سر رہ جائے گا اور باقی جسم بھوکے شیر کا پیٹ بھر چکا ہوگا۔ میں نے بہت خطرناک قدم اٹھایا تھا اور اپنی ناکامی کا خیال ہی میرے لیے سوہان روح تھا۔ میں رضوی صاحب سے کیا کہوں گا کہ میں نے ایسا کیوں کیا! شیروانی صاحب' ان کی بیگم اور فوزیہ کو کیا منہ دکھاؤں گا؟ وہ کہیں گے 'سکندر! ہم تمہیں اتنا گھٹیا آدمی نہیں سمجھتے تھے کہ رقابت میں تم اخلاقی پستی کی اس انتہا تک پہنچ جاؤ گے۔'

تھانے میں پہنچ کر میں نے ادھر ادھر نگاہ ڈالی۔ وہ محرر موجود نہیں تھا جو گزشتہ رات ڈیوٹی پر تھا۔ ایس ایچ او کے کمرے میں ڈبل ایس آئی شیخ کے علاوہ ایک انسپکٹر بھی موجود تھا جو شیخ سے زیادہ عمر رسیدہ، تجربہ کار اور خرانٹ نظر آتا تھا۔ اس کی نظر بچا کر شیخ نے مجھے آنکھ ماری تو اس کا مطلب سمجھ کر میں نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔

"فرمایئے؟" شیخ نے بالکل اجنبی بن کے کہا۔ "کیا کام ہے آپ کو؟"

"یار کی مصیبت اسے؟" انسپکٹر نے بڑی ناگواری سے آدم بیزار لہجے میں کہا۔ "جس کا دل چاہتا ہے بیل کی طرح منہ اٹھائے اندر آجاتا ہے... ہیں؟... اوئے یہ کوئی پرچون کی دکان ہے میاں؟ باہر کوئی نہیں بیٹھا ہے ان کو روکنے والا؟"

"انسپکٹر صاحب غور سے دیکھیے! میں بیل نہیں ہوں۔" میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے انگریزی میں کہا۔ "میرا نام سکندر ہے اور مجھے ٹیلیفون کر کے بلوایا گیا تھا ورنہ تھانے میں سیر کرنے کوئی شریف آدمی نہیں آتا۔"

انسپکٹر کا چہرہ، پوز اور رویہ سب ایک دم بدل گئے۔

"اچھا اچھا۔" اس نے خاصی کوشش کے بعد اٹھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا۔ "آپ اپنے ایس پی صاحب کے کیا ہیں...؟"

"برادر نسبتی۔" میں نے سکون سے کہا۔ اس امید پر کہ تھانیدار اتنی فارسی سمجھتا ہی نہیں ہوگا۔

"اوئے یار شیخ!" انسپکٹر نے دوبارہ کرسی میں فٹ ہو کر کہا۔ "چنگی طرح دیکھ لے..."

"دیکھنا کیا ہے جی!" شیخ بولا۔ "وہ بدمعاش بکواس کرتا ہے۔ جو بندہ مجھے اطلاع دینے آیا تھا وہ خاصی عمر کا آدمی تھا۔ کم سے کم پچاس سال کا۔ سر کے سارے بال سفید تھے، پھٹی قمیص اور چارخانے کی لنگی باندھے تھا اور صورت سے جاہل ان پڑھ لگتا تھا... اور سکندر صاحب آپ کے سامنے ہیں، فرق آپ خود دیکھ لیں۔"

"تو نے بھی کمال کیا یار شیخ!" انسپکٹر نے بڑی مایوسی سے کہا۔ "اوئے اس بندے کو جانے نہیں دینا تھا۔ وہ جو مخبر بن کر آیا تھا۔ اپنا کوئی آدمی اس کے پیچھے لگا دینا تھا۔"

"اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" شیخ نے کہا۔ "اگر اس کی اطلاع غلط ہوتی تو اور بات تھی مگر دیکھیں نا، مجرم پکڑا گیا، مال ہمارے پاس ہے اور نوٹ بھی جن پر میرے دستخط ہیں۔ اور کیا چاہیے؟"

"چاہیے کیسے نہیں۔" انسپکٹر نے غصے سے کہا۔ "سب سمجھے بغیر کام کرتے ہو۔ کسی ایرے غیرے نے کہہ دیا اور تم نے اعتبار کر کے چھاپہ مار دیا۔ اوئے شیخ پتر! یہ قانونی معاملات ہیں۔ اس میں سوچ سمجھ کے قدم اٹھانا چاہیے اور پہلے اپنے افسروں سے بات کرنی چاہیے۔ آخر اتنی جلدی کیا تھی ایف آئی آر کاٹنے کی۔ اوئے میرا انتظار تو کیا ہوتا..."

"کیا میں نے مجرم کو گرفتار کر کے کوئی غیر قانونی کام کیا ہے؟" نوجوان سب انسپکٹر شیخ نے کہا۔ "آپ آتے ہیں دس بجے۔ میں اگر نو بجے چھاپہ نہ مارتا تو یہ سب لوگ کیسے پکڑے جاتے؟ اب آپ کے پاس چالان پیش کرنے کے لیے ہر چیز ہے۔ مجرم اور گواہ۔ برآمد ہونے والا مال اور دستخط شدہ نوٹ۔ پھر میں ایف آئی آر کیسے نہ کاٹتا۔ اس میں واردات کا وقت بھی تو لکھنا تھا۔"

میں نے محسوس کیا کہ چراغ دین کی گرفتاری کے معاملے میں ان دونوں کے درمیان شدید قسم کا اختلاف رائے ہے۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے ایس آئی شیخ مل گیا جو ایماندار اور فرض شناس تھا۔ شاید اس لیے کہ ابھی وہ ایک جذباتی جوشیلا نوجوان تھا جو ترقی کرنا چاہتا تھا اگر اس کی جگہ انسپکٹر ہوتا تو صورتِ حال وہی ہوتی جس کا میں نے تصور کیا تھا یعنی چراغ دین پیسہ دے کر معاملے کو دبا دیتا اور الٹا مجھے پھنسا کے نکل جاتا۔ انسپکٹر کو افسوس تھا کہ آمدنی کا اچھا خاصا موقع ہاتھ سے نکل گیا۔ اس کا ماتحت شیخ اپنے افسر کی عادت اور فطرت سے بخوبی واقف تھا چنانچہ اس نے ایف آئی آر کاٹنے میں بالکل دیر نہیں لگائی۔ اس نے ایک اچھا کام یہ بھی کیا تھا کہ ایف آئی آر میں میرا نام کہیں نہیں لکھا تھا لیکن چراغ دین سے سودا کرنے والوں کو پکڑ کر بند کر دیا تھا اور چراغ دین کے ساتھ انہیں بھی مجرموں میں شامل کر دیا تھا۔ محبت خان اس ہنگامے میں خواہ مخواہ ملوث ہو گیا تھا۔ وہ اپنے مالک کی حمایت میں بولا تھا اور شیخ نے اسے ایک گواہ بنا کے طلب کر لیا تھا۔ محبت خان نے اپنے بیان کو حقائق تک محدود رکھا تھا یعنی یہ کہ وہ صرف چوکیدار ہے جسے زیادہ عرصہ نہیں ہوا لیکن وہ مالک کے کاروبار کی نوعیت کے بارے میں کچھ نہیں جانتا اور اسے کچھ معلوم نہیں کہ چراغ دین سے جو لوگ ملنے آتے تھے، وہ کیسے آدمی تھے۔ اس کے بیان نے میری پوزیشن بھی بہت بہتر کر دی تھی اگر وہ کہتا کہ صبح کے وقت وہ باورچی خانے میں ناشتہ بنا رہا تھا اور معلوم نہیں اس وقت سکندر صاحب آئے تھے یا نہیں تو صورت حال مختلف ہوتی مگر اس نے جلدی میں یہی کہا کہ میں نے تو صبح سکندر بخت صاحب کو آتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ وہ آتے تو صاحب ان کو گھر میں ضرور بٹھاتے اور ان کی آواز بھی آجاتی تو میں پہچان لیتا کہ اپنے سکندر صاحب آئے ہیں۔ یہ چراغ دین نے اپنی حماقت کی سزا پائی تھی۔ اس نے مجھے دروازے پر کھڑا رکھا تھا اور باہر سے ہی رخصت کر دیا تھا، اب وہ یقیناً پچھتا رہا ہوگا کہ مجھے بے عزت کر کے اسے فائدے کے بجائے الٹا یہ نقصان ہوا کہ وہ سب سے زیادہ قابل اعتماد گواہ سے محروم ہو گیا۔

میں نے چراغ دین کا پورا بیان پڑھا اور محبت خان کا بھی۔ چراغ دین نے صرف ایک عقلمندی کی تھی کہ فوزیہ کا نام نہیں لیا تھا لیکن مجھے اپنا دشمن قرار دیا تھا اور احسان فراموش کہا تھا کہ اس نے بُرے وقت میں میرے والد کو پناہ دی اور عزت و احترام کے ساتھ رکھا کیونکہ میں لندن میں تھا۔ اس نے اپنے بیان میں کہا کہ میرے والد کی موت اور بیماری طبعی حالات کا نتیجہ تھی لیکن میں نے اسے خطاوار ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی تھی اور شاید میں چراغ دین پر بھی شک کرتا تھا کہ وہ بھی قتل کرنے والوں میں شامل ہے لیکن یہ ثابت نہیں ہو سکا تھا چنانچہ میں نے انتقام لینے کی نیت سے اس کے خلاف سازش کی ہے۔ چراغ دین نے آگے چل کر یہ بھی کہا تھا کہ کئی سال پہلے اس کو غبن کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا تھا لیکن میرے والد وزیر خان مرحوم الزام کو عدالت میں ثابت کرنے سے قاصر رہے تھے چنانچہ چراغ دین باعزت طور پر بری ہو گیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ ممکن ہے وزیر خان کے بیٹے کے ذہن میں یہ پرانی بات بھی ہو کیونکہ وہ نوجوان اور جذباتی آدمی ہے۔ اس نے اپنے طور پر فرض کر لیا ہوگا کہ عدالت سے انصاف نہیں ہوا تھا چنانچہ اب وہ مجھے سزا دینا چاہتا ہو۔ حسب توقع چراغ دین نے میر شرافت علی کے قتل کا ذکر بھی کر دیا تھا۔ یہ بتایا تھا کہ میں ضمانت پر رہا کر دیا گیا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ بہت سی باتیں وہ اپنے وکیل سے مشورہ کرنے کے بعد عدالت میں بتائے گا۔

"تو جناب سکندر صاحب!" انسپکٹر نے کہا۔ "کیا خیال ہے آپ کا اس بیان کے بارے میں؟"

"اس میں کچھ باتیں سچ ہیں۔" میں نے کہا۔ "مثلاً یہ کہ چراغ دین میرے والد کی فرم کا معمولی ملازم تھا وہ غبن کر کے بھاگ گیا تھا۔ عدم ثبوت کی بنا پر اس کے خلاف کوئی جرم ثابت نہیں ہوا تھا لیکن اس وجہ سے میں چراغ دین

کا دشمن نہیں ہوسکتا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ عدالت نے حقائق کی بنیاد پر جو فیصلہ دیا تھا درست تھا چنانچہ آج کئی سال بعد اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ میں عدالت کے فیصلے کو غلط کہوں اور قانون کو اپنے ہاتھ میں لیکر چراغ دین کو خود سزا دینے کے لیے سازش کروں۔ یہ بات بھی سچ ہے کہ میرے والد نے زندگی کے آخری ایام چراغ دین کے ساتھ گزارے لیکن یہ کہنا غلط ہے کہ چراغ دین نے ان کو پناہ دی تھی اور عزت و احترام کے ساتھ رکھا تھا۔ اس نے میرے والد کو نوکر رکھا تھا۔ ان کے ساتھ نوکروں جیسا سلوک کیا تھا اور انہیں سرونٹ کوارٹر کا ایک کمرہ رہنے کے لیے دیا تھا۔ میں نے ابھی تک یہ تسلیم نہیں کیا ہے کہ میرے والد کی موت کا سبب ان کی بیماری تھی۔ مجھے یقین ہے کہ ان کو قتل کیا گیا تھا لیکن میں نے کبھی کسی کے سامنے چراغ دین پر قتل کا شبہ ظاہر نہیں کیا۔ میں چار سال تک برطانیہ میں زیر تعلیم رہا اور خصوصی حالات کے باعث اپنی تعلیم کا سلسلہ نامکمل چھوڑ کر واپس آنے پر مجبور ہوا۔ جب میں گیا تھا تو میرے والد کا شمار دولت مندوں میں ہوتا تھا۔ میں ان حالات کا پتہ چلانے کی پوری کوشش کر رہا ہوں جو میرے والد مرحوم کی تباہی کا اور موت کا سبب بنے۔ ایک دولت مند اپنے ہی سابقہ ملازم کے گھر میں ادنیٰ خادم کی حیثیت سے رہنے پر کیوں مجبور ہوا؟ یہ بھی معلوم ہو جائے گا۔ مجھے یہ بات ناقابل یقین لگتی ہے کہ وہ سرونٹ کوارٹر میں رہنے والا' ایم۔ ڈبلو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس کا پارٹنر بھی تھا جسے اعداد و شمار کے مطابق لاکھوں روپے کا منافع بھی ہوا تھا لیکن اس بات کا چراغ دین کے کیس سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ مجھ پر اسی کمپنی کے ایک پارٹنر میر شرافت علی کے قتل کا الزام ہے لیکن الزام جب تک ثابت نہ ہو' جرم نہیں کہلاتا۔ میں ارتکاب جرم کرتے ہوئے نہیں پکڑا گیا تھا لیکن چراغ دین کی گرفتاری عین اس وقت ہوئی ہے جب وہ دو افراد کو منشیات فروخت کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور ایک کو فروخت بھی کر چکا تھا۔ اس کا ثبوت سب انسپکٹر شیخ کے وہ دستخط شدہ نوٹ ہیں جو چراغ دین کی جیب میں سے نکلے تھے۔ یہ معلوم ہو جائے گا کہ جو لوگ چراغ دین سے منشیات خریدنے گئے تھے وہ اس دھندے میں ملوث ہیں یا نہیں' کیا انہوں نے بھی کہا ہے کہ میں نے انہیں چراغ دین کے پاس بھیجا تھا؟"

"وہ کسی استاد ٹیڈی کا نام لیتے ہیں۔" انسپکٹر سے پہلے سب انسپکٹر شیخ نے کہا۔ "کہ وہ صبح سویرے ان کے پاس آیا تھا اور اس نے بتایا تھا کہ مال ملنے کا ایک نیا ٹھکانا پیدا ہو گیا ہے جہاں سے مال اٹھانے میں زیادہ فائدہ ہے۔ استاد ٹیڈی کوئی چھوٹا موٹا بدمعاش ہے۔ وہ خود بھی منشیات کی فروخت کا دھندا کرنا چاہتا تھا لیکن خود کچھ ڈرتا تھا چنانچہ وہ پانچ سو روپے دے گیا تھا کہ اس کے لیے بھی تھوڑا سا مال اٹھا لیا جائے۔ انہوں نے دیکھا ہی نہیں کہ نوٹ دستخط شدہ ہیں اور مال لینے پہنچ گئے تھے۔ ابھی انہوں نے رقم ادا کر کے مال لیا ہی تھا کہ سڑک پر آس پاس ٹہلنے والے سادہ کپڑوں میں ملبوس پولیس والوں نے ان کو گھیر لیا تھا۔"

"استاد ٹیڈی سے کچھ معلوم ہوا؟" میں نے انجان بن کر کہا۔

"وہ ابھی ہاتھ ہی کہاں آیا ہے۔" انسپکٹر نے کہا۔ "اس کا پتہ ٹھکانہ کسی کو معلوم ہی نہیں۔ ہم نے حلیہ مشتہر کر دیا ہے۔"

"اصل بات تو یہ ہے کہ ہم نے ایک شخص کو سرِ راہ منشیات فروخت کرتے ہوئے پکڑا ہے۔" سب انسپکٹر شیخ نے کہا۔ "مجھے اطلاع دینے والا استاد ٹیڈی تھا یا کوئی اور یہ میں نہیں جانتا۔ اس نے خود کو پولیس کا مخبر کہا تھا اور میں نے اسے سو سو کے پانچ نوٹ، دستخط کر کے دے دیے تھے۔ نوٹ بھی میرے نہیں تھے اور مجھے یہ ڈر بھی نہیں تھا کہ اس سے کوئی ناجائز فائدہ اٹھائے گا لیکن اس شخص کا حلیہ استاد ٹیڈی کے حلیے سے بالکل نہیں ملتا۔" وہ میری طرف اشارہ کر کے بولا۔

"ہوسکتا ہے وہ چراغ دین کا کوئی دشمن ہو پیٹر!" انسپکٹر نے کہا۔ "تمہیں چاہیے تھا کہ اس کو روکتے۔"

"کیا چراغ دین بھی استاد ٹیڈی نام کے کسی شخص سے واقف ہے؟" میں نے اسی معصومیت سے سوال کیا۔ "اور وہ دونوں جو خریدار بن کر آئے تھے' وہ کیا کہتے ہیں؟ کیا ان کی استاد ٹیڈی سے کوئی دشمنی تھی؟"

"او نہیں بابا۔" انسپکٹر نے میز پر ہاتھ مارا۔ "اور یہی تو کمال کی بات ہے۔ آخر چراغ دین صرف تمہارا نام کیوں لیتا ہے۔"

"یہ بات میں بھی اس سے پوچھنا چاہوں گا۔" میں نے کہا۔ "لیکن ایک بات اور ہے جو آپ کے نقطۂ نظر سے اہم ہوسکتی ہے۔ ابھی کچھ عرصے پہلے چراغ دین کے خانساماں سلامت شاہ کو نہایت بیدردی سے قتل کر دیا گیا تھا۔ میرا خیال ہے وہ آپ ہی کے تھانے کا کیس ہوگا۔"

"ہاں۔" انسپکٹر نے بادلِ ناخواستہ تسلیم کیا۔ "اس کی لاش کے ٹکڑے ایک بکس میں بھر دیے گئے تھے اور اس

کا بہت دنوں بعد چلا تھا جب لاش کے سڑنے گلنے کی بدبو
طرف پھیلی تھی۔ تم کو کیسے معلوم ہوا؟"

"سلامت شاہ کو میں بہت اچھی طرح جانتا تھا۔" میں
نے کہا۔ "وہ انتہائی نیک آدمی تھا اور اس نے زندگی کے
خری ایام میں میرے والد کی بہت مدد کی تھی۔ یہ بات
پ محبت خان سے پوچھ سکتے ہیں کہ سلامت شاہ کا دشمن
وئی نہیں تھا۔ ایسے آدمی کا دنیا میں کون دشمن ہوگا جو
ب کا دوست ہو۔ اس کا قتل انتہائی لرزہ خیز اور افسوسناک
اقعہ تھا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے ابھی تک قاتلوں کا
وئی سراغ نہیں ملا لیکن اب یہ سوچا جا سکتا ہے کہ خود چراغ
ین نے اپنے خانساماں کو قتل کیا یا کرایا؟" میں شک کا بیج
نے میں کامیاب رہا تھا۔

"یہ نتیجہ آپ نے کیسے نکال لیا؟" انسپکٹر مجھے گھورتے
وئے بولا۔

"انسپکٹر صاحب! محبت خان کو اس لیے کچھ نہیں معلوم
، وہ چوکیدار ہے، باہر کھڑا رہتا ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن
انساماں گھر کے اندر رہتا تھا ممکن ہے اس نے کچھ سن لیا ہو
چھ دیکھ لیا ہو اور اس کا وجود چراغ دین کے لیے خطرناک
ن گیا ہو!"

"گھر کے اندر کچھ ہوگا تو ابھی ایک گھنٹے میں معلوم ہو
ائے گا۔" سب انسپکٹر شیخ نے کہا۔ "خانہ تلاشی کے
ارنٹ لے کر ہم مجسٹریٹ کے ساتھ دوپہر تک پہنچ جائیں
ے۔ ہم نے دروازے پر گارڈ بٹھا دیے ہیں۔"

"آپ تو جانتے ہی ہوں گے کہ یہ دھندا کوئی گروہ
رتا ہے۔" میں نے کہا۔ "فرض کیجیے دوسرے لوگوں کو معلوم
وا۔۔۔"

"ہم نے ابھی تک کسی کو کچھ معلوم نہیں ہونے دیا۔"
شیخ نے بڑے فخر سے کہا۔ "ان کو الگ الگ رکھا ہے اور سب
ے الگ الگ پوچھ گچھ کرنی ہے۔ اگر ان کا کوئی ملاقاتی آیا
و ہم اسے بھی دھر لیں گے۔ باقی رہا گروہ کا سوال تو کل یہ خبر
خباروں میں آجائے گی۔ ہم کوشش کریں گے کہ اس سے پہلے ہی
چراغ دین گروہ کے باقی لوگوں کے نام بتا دے۔ کل تک ہم
سے تفتیش کے لیے رکھ سکتے ہیں اور اس کے بعد بھی عدالت
ے جسمانی ریمانڈ لے سکتے ہیں۔"

شیخ کی بات سے مجھے عذاب کی وہ رات یاد آئی
ب میر شرافت علی کے قتل کی 'تفتیش' کے لیے مجھ
تھانے کے گیا تھا۔ تشدد کا ہر غیر انسانی طریقہ آزمایا گیا تھا۔ جس کے تصور سے بھی رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ یہ طریقے جن کا عام آدمی تجربے کے بغیر تصور بھی نہیں کر سکتا، پولیس کے طریقۂ تفتیش میں شامل ہیں۔ "کیا چراغ دین آج رات تفتیش کی یہ سختی اور ذلت جھیل سکے گا؟" میں نے سوچا۔ اس خیال نے ایک وحشیانہ تسکین دی کہ مجھ پر ہر ظلم روا رکھنے والوں میں سے ایک آج خود ظلم سے آشنا ہوگا۔ بلاشبہ یہ ایک رات کا عذاب' اس عذاب کے مقابلے میں کچھ نہیں تھا جو میرے والد مرحوم نے برداشت کیا تھا اور میں نے جھیلا تھا لیکن یہ احساس ہی کیا کم تھا کہ بساط الٹ گئی ہے۔ کم سے کم ایک شخص جو کل تک اپنی ذہانت اور عیاری کے مقابلے میں انصاف کی قوت کو کچھ نہیں سمجھتا تھا، جو خود کو بہت بڑا شکاری سمجھتا تھا وہ آج خود گردشِ حالات کا شکار تھا اور اس کی خوش فہمیوں کے سارے جال ٹوٹ گئے تھے۔

"غالباً میں اپنی پوزیشن کی وضاحت کر چکا ہوں۔" میں نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ "چراغ دین کا الزام بالکل بے بنیاد ہے۔ اس نے فرض کر لیا ہے کہ میں اس کا دشمن ہوں۔ چور کی داڑھی میں تنکا نہ ہو تب بھی اس کا ہاتھ تو تنکا نکالنے کے لیے اٹھتا ہے۔ محبت خان کہہ چکا ہے کہ اس نے آج صبح مجھے آتے ہوئے نہیں دیکھا۔ پھر ایس پی ضامن رضوی صاحب بتا چکے ہیں کہ کل رات سے صبح ٹیلیفون آنے تک میں گھر سے نکلا ہی نہیں۔ میں تو ابھی سو کے بھی نہیں اٹھا تھا کہ رضوی صاحب نے ناشتے پر بلا لیا۔ میں نے ان کی فیملی کے ساتھ ناشتہ کیا۔ گھر میں چند اور افراد بھی میری موجودگی کے گواہ ہیں مثلاً بیگم رضوی، ایک ایڈووکیٹ ہیں مس رابعہ قاری جو آج کل رضوی صاحب کے ساتھ ہی رہتی ہیں۔ اسلام آباد میں ایک ڈپٹی سیکرٹری ہیں مسٹر شیروانی ان کا لڑکا محسن بھی گھر میں ناشتے کے وقت موجود تھا۔ ایک ایس پی صاحب کا ڈرائیور کانسٹیبل ہے۔۔۔ اتنے گواہ ہوں تو کسی کے کہنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ پھر بھی میں چراغ دین سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس نے میرا نام کیوں لیا۔۔۔ اور اگر آپ اجازت دیں تو میں یہی بات اس سے اکیلے میں پوچھ لوں؟"

"اگر ہمارے سامنے پوچھ لیں تو کوئی ہرج ہے؟" انسپکٹر نے کچھ تذبذب کا مظاہرہ کیا۔ میرے حوالوں نے اس کو مرعوب کر لیا تھا۔

"آپ میری تلاشی لے لیں۔" میں نے دونوں ہاتھ اٹھا کے کہا۔ "میرے پاس کوئی خطرناک چیز نہیں ہے۔ جیبی چاقو

تک نہیں ہے اور نہ کوئی ٹیپ ریکارڈر قسم کی چیز ہے۔ دراصل پولیس کے سامنے ہر بات نہیں بتائی جاسکتی۔ آپ لوگ اپنے طریقوں سے پوچھ لیں تو اور بات ہے۔ رضاکارانہ طور پر اپنی خوشی سے کوئی بھی کچھ نہیں کہتا۔ میرے سامنے وہ بے خوف ہو کے بات کرسکتا ہے۔"

انسپکٹر کے قائل ہوجانے کے بعد شیخ مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔ "دیکھیے سکندر صاحب! میں نے آپ کو کتنی صفائی سے بچالیا۔" وہ بولا۔ "اگر یہ اطلاع غلط ثابت ہوتی تو اتنی ہی صفائی سے میں آپ کو گرفتار بھی کرلیتا۔"

"تمہارے ایس ایچ او صاحب کے رویّے سے ایسا لگتا ہے کہ تمہارا یہ کارنامہ انہیں پسند نہیں آیا۔" میں نے چلتے ہوئے کہا۔

"سکندر صاحب! اس محکمے میں فرض شناسی اور ایمانداری کسی کو پسند نہیں آتی۔" وہ بولا۔ "کچھ تو ہم بدنام ہیں، کچھ ہماری بدنامی کی تشہیر زیادہ ہوتی ہے اور عام لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ پولیس کے سارے محکمے میں کوئی حلال کی کھانے والا یا اصول پرست اور فرض شناس نہیں ہے۔ مثل مشہور ہے کہ ایک مچھلی سارے جل کو گندہ کرتی ہے۔ یہاں سارا جل اتنا گندہ ہے کہ کوئی مچھلی اس میں زندہ نہیں رہ سکتی۔ اگر میں نے مجرموں کو صرف گرفتار کیا ہوتا، رپورٹ نہ لکھی ہوتی اور معاملات کو ایس ایچ او صاحب کے آنے تک اٹھا رکھتا تو میرے کارنامے سے وہ بہت خوش ہوتے۔ وہ بڑی خوش اسلوبی سے معاملات کا سودا کرلیتے۔ میں نے پہلے بھی کئی بار معذرت کے ساتھ اپنا حصہ لینے سے انکار کردیا تو کسی نے تعریف نہیں کی تھی بلکہ سب پریشان ہوگئے تھے کہ تھانے میں یہ ایماندار کہاں سے آن ٹپکا۔ یہ تو نہ خود کھائے گا اور نہ ہمیں کھانے دے گا۔ اکیلا چنا بھاڑ تو نہیں پھوڑ سکتا۔ میں نے کسی کی اصلاح کا بیڑہ نہیں اٹھایا ہے کیونکہ یہ میرے فرائض میں شامل نہیں ہے اور اس سے سروکار نہیں رکھا کہ دوسرے کیا کرتے ہیں، لیکن میں نے خود اپنے ساتھ اصولوں پر کبھی سودا نہیں کیا اور اپنے آپ سے کوئی بے ایمانی نہیں کی۔ جسے رشوت نہ ملتی ہو وہ رشوت کے قانونی، مذہبی اور اخلاقی پہلو پر سب کو لیکچر دے سکتا ہے لیکن کیا آپ یقین کریں گے کہ آج صبح میں نے ایک لاکھ روپے کمانے کا نادر موقع جانتے بوجھتے گنوا دیا۔ ایس ایچ او صاحب کے فرشتوں کو بھی معلوم نہ ہوتا اور ایک لاکھ میرے اکاؤنٹ میں جمع ہوجاتے۔ اس بات کا گواہ کون ہوتا کہ میں نے ایک مجرم کو چھوڑ دیا۔ میں یہ کہہ سکتا تھا کہ مجرم ... تھی اور وہ مخبر بھی شاید نہیں تھا۔"

ہم دونوں ایک برآمدے کے درمیان ... کر رہے تھے۔ "آپ کا مطلب ہے شیخ صاحب نے آپ کو ایک لاکھ روپے کی رشوت ... تھی؟" میں نے بے یقینی سے کہا۔ "اور آپ ... انکار کردیا؟"

"ہاں۔" شیخ بولا۔ "اسی بات کا ایس ... کو ملال ہے۔ ان کی نگاہ میں مجھ سے بڑا بے وقوف ... صبح انہوں نے مجھے شرمندہ کرنے کی کوشش ... نوجوان جذباتی اور احمق ہوں۔ اصول اور فر... آدمی کا پیٹ نہیں بھرتے، سارا کھیل پیسے ... جس کے پاس دنیا میں پیسہ نہ ہو، وہ آدمی نہ... جاتا ہے... انہوں نے حساب لگا کے بھی ... ایک لاکھ میری کتنے برسوں کی تنخواہ کے برابر ... بھی کہ میں اپنی موجودہ تنخواہ میں سے بچانا شروع ... ریٹائرمنٹ کی عمر تک بھی ایک لاکھ جمع نہ ... مجھے ایک گھنٹے کے اندر اندر مل سکتے تھے۔ مسوری سر! میں تو اس عظیم شخصیت کا حقیر سا مقلد ... نے کہا تھا کہ اگر میرے ایک ہاتھ پر چاند اور دو... سورج رکھ دیا جائے، تب بھی میں سچ بولنے ... رہ سکتا۔" میں نے ایف آئی آر بھی کاٹ دی ہے ... چراغ دین کے خلاف ایک جرم کا اضافہ بھی کر... نے مجھے ایک لاکھ روپے رشوت کے طور پر دینے ... تھی۔"

میں حیرانی سے اس نوجوان پولیس افسر کو ... نے واقعی سخت ترین آزمائش میں بھی صراط مستق... چھوڑا تھا۔ اس عمر میں کسی نوجوان کو بن مانگے اللہ ... بغیر ایک لاکھ روپے مل جائیں تو وہ بہت اونچا ... ایک لاکھ سے دس لاکھ اور دس لاکھ سے ایک ... اور اپنے لیے پرمسرت اور سارے خوابوں کی تعبیر ... مگر یہ نوجوان اسی زمین پر مضبوطی سے قدم جمائے ... پر ہوس کی آندھی میں بڑے بڑے اصولوں کے ... بکھر جاتے ہیں مگر وہ رزقِ حلال پر زندہ رہنے کا ... خواہ اس کے لیے زندگی کی ہر سختی جھیلنی پڑے ... بڑھا کر اس سے مصافحہ کیا۔ "مجھے تم سے مل کر حقیقی ... ہے شیخ! اگر میرے حالات کی آزمائش درپیش ... کہہ سکتا تھا کہ ہم دوست بن سکتے ہیں۔"

شیخ ہنسا۔ "تم الٹی بات کہہ رہے ہو۔ حالات کی آزمائش میں جو دوستی پروان چڑھتی ہے وہی دوستی ہوتی ہے۔ معلوم ہے کل رات میں نے تمہیں اتنی آسانی سے دستخط کیوں کر دیے تھے؟ اس لیے کہ تمہاری صورت دیکھ کر مجھے اعتبار آگیا تھا۔ مخبری کرنے والے ایسے بات نہیں کرتے، وہ سودا کرتے ہیں۔ جتنی بڑی اسامی ہوتا ہی بڑا انعام طلب کرتے ہیں۔ تم نے تو وہ نوٹ بھی اپنی جیب سے نکالے تھے۔ اگر تمہاری جگہ کوئی پیشہ ور مخبر ہوتا اور میری جگہ ایس ایچ او صاحب ہوتے تو صورت حال بالکل مختلف ہوتی۔ لاکھ میں سے پچاس ہزار روپے ایس ایچ او صاحب لے جاتے، باقی دوسرے لوگوں میں ان کی حیثیت کے مطابق تقسیم ہوتے تو مخبر کو بھی دس ہزار ضرور مل جاتے۔"

"میں سمجھا تھا کہ ترقی پانے کے خیال سے تم فوراً راضی ہوگئے ہو گے۔" میں نے کہا۔

"ترقی؟" وہ تلخی سے ہنسا۔ "یہ ہوسکتا ہے کہ ڈی آئی جی صاحب مجھے تعریفی سند اور پانچ سو روپے کی گراں قدر رقم بطور انعام ادا کردیں اور اخبار میں ان کی تصویر بھی آتے لیکن اب میرا یہاں سے ٹرانسفر یقینی ہوگیا ہے۔ شاید مجھے پھر کبھی کسی تھانے میں پوسٹ نہ کیا جائے کہ مسٹر ایماندار! ہیڈ کوارٹر میں بیٹھ کر کلرکی کرو اور شوق سے رزقِ حلال کماتے رہو۔ خیر اب تم جاکے اس سے مل لو۔" شیخ نے کلائی کی گھڑی دیکھی۔ "خانہ تلاشی کے وارنٹ اور مجسٹریٹ صاحب آگئے تو مشکل ہوجائے گی۔" اس نے آہنی سلاخوں والے ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا جو برآمدے کے آخری حصے میں تھا اور دروازے میں کھڑے ہوئے سپاہی سے کہا کہ مجھے اندر جانے دیا جائے۔

چراغ دین گھٹنوں میں سر دیے فرش پر بیٹھا تھا۔ دروازے کا قفل کھلنے کی آواز پر اس نے سر اٹھا کے مجھے دیکھا۔ سنتری مجھے تفتیش کرنے والا سی آئی اے کا کوئی افسر سمجھ کے دروازے سے دور ہٹ گیا تھا۔

چند سیکنڈ تک میں اور چراغ دین پلک جھپکائے بغیر ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ خلافِ توقع مجھے دیکھ کر چراغ دین مشتعل نہیں ہوا تھا اور مجھ پر حملہ کرنے نہیں دوڑا تھا۔ وہ انتہائی شکست خوردہ اور مایوس نظر آتا تھا۔ بالآخر اس نے کہا۔ "تم نے یہ کیوں کیا سکندر؟ میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے دیوار کا سہارا لے کر اطمینان سے سگریٹ سلگائی۔ "میرا تم نے کچھ نہیں بگاڑا تھا۔"

"تم خود فوزیہ سے شادی کرنے سے انکار کرچکے تھے۔" وہ بولا۔

"فوزیہ کا نام یہاں مت لو۔" میں نے بڑی پھرتی سے اس کے لات رسید کی۔ وہ اس حملے کے لیے بالکل تیار نہ تھا۔ اور ضرب اتنی شدید تھی کہ وہ بیٹھا نہ رہ سکا۔ "اس معاملے کا فوزیہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" میں نے پھر سکون سے کھڑے ہو کر کہا۔

چراغ دین گرد آلود فرش پر پڑا لمبے لمبے سانس لیتا رہا۔ دہشت سے اس کی آواز بند ہوگئی تھی اور اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں مجھے یوں دیکھ رہی تھیں جیسے میں فرشتۂ اجل ہوں۔ چند سیکنڈ بعد وہ پٹے ہوئے کتے کی طرح ہاتھوں اور پیروں کے بل اٹھا اور دیوار سے کمر لگا کے بیٹھ گیا۔ "پھر... پھر تم نے مجھ سے یہ دشمنی کیوں کی؟" وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔

"کیا میرے باپ نے تم سے کوئی دشمنی کی تھی؟" میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "جو کچھ تم نے کیا اس کے بعد تو میں تمہیں قتل بھی کرسکتا تھا لیکن میں تمہیں موت سے زیادہ سخت سزا دینا چاہتا ہوں۔ خوش قسمتی ہمیشہ آدمی کا ساتھ نہیں دیتی بلکہ اکثر تو انسان اپنی بدبختی کو بھی اپنی خوش قسمتی فرض کرلیتا ہے، جیسا کہ تم نے کیا۔ جب خوش قسمتی نے میرے باپ کا ساتھ چھوڑا تو اس نے تم جیسے لوگوں پر اعتماد کیا اور اپنے نوکروں کا نوکر بننے پر مجبور ہوا۔ تمہاری بدبختی کی اس سے بڑی مثال کیا ہوگی کہ جس شخص نے تمہیں گرفتار کیا اسے تمہاری دولت بھی نہیں خرید سکی۔ خدا نے ہر فرعون کے لیے ایک موسیٰ پیدا کیا ہے۔ یہ پولیس آفیسر لاکھوں میں ایک تھا جس نے تمہارے ایک لاکھ روپے پر تھوک دیا۔ تم اسے دس لاکھ یا دس کروڑ دے کر بھی نہیں بچ سکتے تھے کیونکہ تمہارے لیے سزا کا وقت آگیا تھا۔ سزا تو تمہیں اسی وقت مل جانی چاہیے تھی جب تم نے نمک حرامی کی تھی اور میرے والد کی دولت میں غبن کیا تھا مگر اس وقت تم بچ گئے تھے۔ تم اس دولت میں دن رات اضافہ ہوتے دیکھ کر خوش ہوتے رہے۔ تمہیں خیال ہی نہیں آیا کہ اسی تناسب سے تمہاری سزا بھی بڑھ رہی ہے۔ غبن کے الزام میں شاید تمہیں سال چھ مہینے کی سزا ہوتی۔ اب تمہیں سات سال کی سزا بھی ہوسکتی ہے، عمر قید بھی اور پھانسی بھی۔"

"تم اپنے باپ کے قتل کا جرم بھی مجھ پر عائد کرو گے؟" چراغ دین طنز سے بولا۔

"نہیں۔ ان کی موت کو اب قتل ثابت کرنا مشکل ہے۔" میں نے اطمینان سے کہا۔ "لیکن سلامت شاہ کے قتل کا الزام تم پر ثابت کیا جا سکتا ہے۔ تم جانتے ہو کہ تمہارا ساتھ دینے والا اب کوئی نہیں رہا۔ شیروانی صاحب تمہارا نام بھی سننا گوارا نہیں کریں گے۔ میں اور محسن سب کچھ کر سکتے ہیں۔ ہم اپنا پیسا اور اثر و رسوخ سب کچھ استعمال کر کے تمہارے خلاف ثبوت اور شہادت بھی لا سکتے ہیں۔ دنیا میں یہ سب کچھ ہوتا ہی رہتا ہے۔ میرے باپ کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا، اس لیے کہ وہ اکیلا تھا... لیکن یہ ہو سکتا ہے چراغ دین کہ میں سلامت شاہ کے قتل کا الزام تم پر عائد کرنے کے لیے کچھ نہ کروں اور تم تختۂ دار تک پہنچنے سے بچ جاؤ۔ اس کے لیے تم دو سوالوں کے جواب دو گے۔"

"کون سے دو سوال؟" چراغ دین نے نظر اٹھا کے پُرامید لہجے میں کہا۔

"پہلا سوال یہ ہے چراغ دین کہ آخر میرے والد نے سارے شہر کو چھوڑ کر تمہارے گھر میں ملازمت کیوں کی تھی؟" میں نے کہا۔ "ایسی نوکری تو وزیر خان کو ہر گھر میں مل جاتی پھر وہ تمہارے پاس کیوں آیا جبکہ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ تم وہی ذلیل آدمی ہو جس نے سب سے پہلے اس کی پیٹھ میں خنجر گھونپا تھا۔ اس دہری ذلت کو اس نے کیوں قبول کیا تھا؟"

"مجھے نہیں معلوم... قسم خدا کی، مجھے معلوم ہوتا تو تم کو ضرور بتا دیتا۔" چراغ دین مُردہ آواز میں بولا۔ "وہ میرے پاس آیا تو تباہ ہو چکا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کا سارا کاروبار ختم ہو چکا ہے اور وہ کوڑی کوڑی کا محتاج ہے۔"

"کیا تمہیں کبھی اندازہ نہیں ہوا کہ اس نے تم سے جھوٹ بولا تھا؟" میں نے کہا۔ "کاروبار بدستور چل رہا تھا بلکہ بہت پھیل گیا تھا۔ اس کے تین پارٹنر ہو گئے تھے جن میں سے ایک میر شرافت علی تھا۔"

"وہی میر شرافت علی... جس کے قتل کا تم پر الزام ہے؟" وہ بولا۔

"ہاں وہی میر شرافت علی۔" میں نے کہا۔ "وزیر خان بھی آخری وقت تک قانونی طور پر ایک مالک تھا اور حسابات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے منافع میں سے جو حصّہ ملا تھا اس کی رقم کئی لاکھ تھی۔"

"ہو سکتا ہے تم جو کہہ رہے ہو، وہ ٹھیک ہو لیکن میں کیسے تصدیق کرتا ہوں اور مجھے کیا ضرورت تھی تصدیق کرنے کی جو اس نے جو کچھ کہا، میں نے سچ مان لیا۔ میں فرض کر سکتا تھا کہ لاکھوں کا مالک میرے پاس پناہ لے کر آئے گا؟"

"تم نے میرے پہلے سوال کا جواب نہیں دیا۔" میں نے کہا۔ "اس لیے میں دوسرا سوال کرتا ہوں۔ کیا مریم کو اس لیے مروایا تھا کہ تم اس کے بچوں کو اپنے بچے نہیں سمجھتے تھے؟"

اس سوال کا ردِعمل ایسا تھا جیسے میں نے بارود میں چنگاری پھینک دی ہو۔ "تم جھوٹ بولتے ہو... تم بکواس کرتے ہو، بھونکتے ہو کتے... ذلیل..." وہ دیوانہ وار مجھ پر حملہ آور ہوا۔ اس کے منہ سے جھاگ کے ساتھ ساتھ ایک گندی گالی نکل رہی تھی۔ میں نے اس کے منہ پر ایک مکّا رسید کیا اور وہ دور جا گرا لیکن وہ پھر پاگل کی طرح جست لگا کر آیا۔ میں نے زیادہ قوت سے دوسرا رسید کیا لیکن اس دوران میں شور سن کر سپاہی اندر آ گئے۔ چراغ دین کے دوسری بار اٹھنے سے پہلے میں باہر نکل آیا اور سنتری نے دروازے کو مقفل کر دیا۔

"یاد رکھنا چراغ دین کہ تم نے میرے دوسرے سوال کا جواب نہیں دیا ہے۔" میں نے سلاخوں کے پیچھے دیکھا اور چل پڑا۔ دوسری طرف سے مجھے ایس ایچ او اور سب انسپکٹر شیخ بھی اپنی طرف بڑھتے ہوئے نظر آئے۔ وہ سب خاصے پریشان تھے۔

چراغ دین اب دروازے کے پیچھے کھڑا ہوا مجھے دھمکیاں دے رہا تھا اور گالیاں بک رہا تھا۔ "الو کے پٹھے... کمینے... بدمعاش... میں تجھے دیکھ لوں گا۔ تیرا باپ بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکا تھا تو کیا ہے... تو سمجھتا ہے چراغ دین کو جیل ہو جائے گی۔ پاگل کے بچے... تجھے کیا معلوم چراغ دین کون ہے؟ کیا ہے؟ میرے پاس الہ دین کا وہ چراغ ہے جس کی دنیا غلام ہے... میرے پاس پیسہ ہے پیسہ..."

"تمہیں تو اس شخص کو پاگل خانے میں رکھنا چاہیے تھا۔" میں نے ایس ایچ او سے کہا۔ "جیل خانے میں نہیں۔"

"ہمیں کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے، یہ ہم جانتے ہیں۔" ایس ایچ او غرّایا۔ "اب یہاں سے دفع ہو جاؤ۔"

دروازے پر کھڑا ہوا سنتری اس صورت حال سے بدحواس ہو گیا تھا۔ اس نے مجھے تفتیش کرنے والا سمجھنے کی غلطی کی تھی اور دور کھڑا ہو گیا تھا اور اب اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ میں نے اس قیدی کے ساتھ کیا بات کی تھی جس سے وہ اتنا مشتعل ہے۔ اسے ایس ایچ او کے تیور بھی خطرناک اور بدلے ہوئے دکھائی دے رہے تھے مگر سب انسپکٹر شیخ نے صورتِ حال کو فوراً سنبھال لیا تھا۔

"چراغ دین!" شیخ نے سخت لہجے میں کہا۔ "اگر تم نے یہ ہنگامہ اور دیوانگی کا مظاہرہ جاری رکھا تو میں تم کو زنجیروں سے باندھنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔"

"تم یہاں میرے ساتھ سب کچھ کر سکتے ہو۔" چراغ دین نے چلا کے کہا۔ "لیکن عدالت میں تم میرا منہ بند نہیں کر سکتے۔ یہ مت بھولو کہ تم ایک معمولی سب انسپکٹر ہو، حاکم نہیں ہو۔ میں بڑے سے بڑا وکیل کر سکتا ہوں..."

اس سے پہلے کہ بات بڑھ جاتی، میں نے وہاں سے کھسک جانا مناسب سمجھا۔ ایس ایچ او کسی چوٹ کھائے ہوئے سانپ کی طرح تھا۔ درمیان میں اگر ایس ایس پی ضامن رضوی کا حوالہ نہ ہوتا تو مجھے وہ اسی وقت بند کر دیتا کہ میں نے حوالات میں قیدی کے ساتھ مار پیٹ کی اور تھانے میں فساد کا موجب بنا۔ شیخ تو ماتحت تھا اور اس کی حمایت سے مجھے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ تھانے سے نکل کے میں نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ ابھی ایک گھنٹہ ہی ہوا تھا۔ اگر محسن اور رابعہ کے گھر پر ملنے کا امکان ہوتا تو میں واپس چلا جاتا اور باقی دن ان کے ساتھ رہتا لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ بینک ڈرافٹ بنوانے کے لیے نکل چکے ہوں گے۔ قرب و جوار میں ایسا کوئی ریسٹورنٹ نہیں تھا جہاں میں سکون سے بیٹھ کے کچھ سوچ سکتا۔ میں ریلوے اسٹیشن کی طرف چل پڑا۔ میں سوچ رہا تھا کہ چراغ دین میرے دوسرے سوال پر کیوں بھڑک اٹھا تھا۔ کیا میں نے اس کی دکھتی رگ پر انگارہ رکھ دیا تھا؟ کیا مریم کے بارے میں قیاس آرائی میں حقیقت کو دخل تھا؟ محسن نے مجھے ایک سچا واقعہ سنایا تھا۔ اس کے باوجود میرا ذہن یہ تسلیم نہیں کرتا تھا کہ ازدواجی زندگی میں مریم جیسی عورت اور چراغ دین جیسا مرد ایک دوسرے کا بھرم رکھنے کے لیے اور باعزت طور پر کامیاب زندگی گزارنے کے لیے اتنا غیر اخلاقی سمجھوتا کرنے پر مجبور تھے۔ مجبوری تو کسی کو بھی نہیں تھی۔ چراغ دین نے اپنی مرضی سے اور بڑے جتن کر کے مریم سے شادی کی تھی اور بظاہر مریم نے مشرقی عورت کی روایت پر عمل کرتے ہوئے والدین کی خوشی پر اپنی محبت کو قربان کر دیا تھا۔ کیا یہ بھی فریبِ خیال تھا؟ مریم نے والدین کی خوشی کو بہانہ بنا کے دولت مند چراغ دین کو قبول کر لیا تھا اور اپنے مخلص پرستار کو چھوڑ دیا تھا؟ بلاشبہ مریم اپنی فطرت کے اعتبار سے بہت مختلف تھی لیکن میرے لیے یہ تصوّر کرنا محال تھا کہ اس نے جانتے بوجھتے ایک ایسے شخص کے ساتھ نباہ کیا جو ہرگز اس کا شوہر کہلانے کے قابل نہ تھا۔ وہ اتنی گری ہوئی عورت بہرحال نہیں تھی۔ اگر حصولِ دولت ہی اس کا مقصد ہوتا تو شادی کے بعد وہ کسی بھی وقت الگ ہو سکتی تھی۔ ایک لاکھ کا حق مہر تو اس کا قانونی حق تھا مگر وہ چراغ دین سے ذہنی اذیت کا ہرجانہ بھی وصول کر سکتی تھی۔ کسی عدالت میں جاتے بغیر چراغ دین اس کو سب کچھ دے دیتا۔ مریم کو عدالت میں جانے سے بھی کون روک سکتا تھا۔ میں نے چشمِ تصوّر سے مریم کے بچوں کو دیکھا جو اپنی ماں کے ساتھ ہی ابدی نیند سو چکے تھے۔

دو نمبر بس میں سوار ہونے کے بعد مجھے اچانک احساس ہوا کہ میرے دائیں اور بائیں ہاتھ پر کھڑے ہوئے مسافر ایک طرح سے مجھے نرغے میں لیے ہوئے ہیں۔ اگرچہ بس میں اتنی بھیڑ نہیں تھی کہ کھڑے ہونے والے آپس میں چپکنے پر مجبور ہوں لیکن وہ دونوں مجھ سے چپکے کھڑے تھے اور ان میں سے ایک اس پوزیشن میں تھا کہ مجھے بس سے نہ اترنے دے اور میرے خنجر گھونپ کر چلتی بس سے کود جائے۔ ڈبل ڈیکر بس کی رفتار بہت زیادہ نہیں ہوتی مگر اتنی بڑی چیز کو فوراً روکا بھی نہیں جا سکتا۔ وہ شخص ذرا بھی پھرتی دکھاتا تو کسی کے تعاقب میں آنے سے پہلے غائب ہو جاتا۔ ان دونوں کی صورتوں پر احساسِ جرم کی تحریر تھی یا میرے احساس کا کرشمہ تھا کہ میں نے ان کی نیت کو بھانپ لیا تھا۔ جسمانی طور پر وہ کسی طرح بھی مجھ سے کم نہیں تھے اور اگر ان سے براہِ راست مقابلے کی نوبت آ جاتی تو کسی کو خبر ہونے سے پہلے میرا کام تمام ہو جاتا۔ ان کے اس قدر قریب ہونے کا مطلب بھی بہت واضح تھا۔ وہ جانتے تھے آزادی سے ہاتھ پیر استعمال کرنے کا موقع ملا تو میں آسانی سے دونوں کو چت کر دوں گا۔ چنانچہ انہوں نے میرے لیے ہلنے کی جگہ بھی نہیں چھوڑی تھی۔ چند سیکنڈ میں وہ دونوں طرف سے میرے سینے میں خنجر اتار کے فرار ہو سکتے تھے۔ خنجر کو مہارت سے استعمال کرنے والوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ بعض اوقات تو خود مرنے والے کو پتہ نہیں چلتا کہ کسی نے کب اور کیسے پیٹ چاک کر دیا اور یہ خنجر کی دھار کے علاوہ ہاتھ کی صفائی کا کمال ہوتا ہے۔

خطرے کا احساس ہو جانے کے بعد دیر کرنا خودکشی کے مترادف تھا۔ شملہ پہاڑی پر بس نے موڑ کاٹا تو میں ایکدم پیچھے کی طرف ہٹا اور دو سیٹوں پر بیٹھے ہوئے مسافروں کی گود میں جا لیٹا۔ ان میں سے ایک سفید ریش بزرگوار تھے جن کے ساتھ کھڑکی والی سیٹ پر ان کی بیٹی یا بیوی بیٹھی تھی۔ ابھی ان کے منہ سے "سُور دا پُتر" ہی نکلا تھا کہ میں اٹھ کھڑا ہوا لیکن اٹھتے اٹھتے میں نے دونوں ٹانگیں مخالف سمتوں میں اس طرح پھیلائیں کہ خنجر آزمائی کے مناسب موقعے کا انتظار کرنے والوں کے قدم اکھڑ گئے۔ میرے دونوں بوٹ ان کے ٹخنوں پر بڑے زور سے لگے تھے اور اس سے دوسرے پیر کی بنیادیں بھی ہل گئی تھیں۔ وہ سیٹوں کے درمیان منہ کے بل گرے ادھر بزرگوار کی بیٹی یا بیوی نے بھی واویلا شروع کیا اور مجھے "مشٹنڈا، بے شرم" کہا۔ میں نے الزام ڈرائیور کو دیا جس نے اتنی رفتار سے موڑ کاٹا۔ کنڈیکٹر نے ڈرائیور کی حمایت کرتے ہوئے میرے الزام کی پُرزور الفاظ میں تردید کی اور یہ سب کچھ ایک منٹ سے بھی کم وقت میں ہو گیا۔ میرے دشمن میری چال کو سمجھ گئے تھے۔ ان میں سے ایک نے مجھے مشتعل کرنے کے لیے بہت گندی سی گالی دی مگر میں نے مسکرا کے کہا۔ "معاف کرنا پہلوان جی۔۔" مجھے معلوم تھا کہ ایک بار جھگڑا شروع ہو گیا تو دونوں طرف سے لوگ اٹھ کھڑے ہوں گے اور اس تنگ جگہ میں جو افراتفری پھیلے گی اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان دونوں میں سے کوئی اپنا کام کر جائے گا۔ میں پورے یقین کے ساتھ تو نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ خنجر باز ہیں۔ ان کے پاس ریوالور بھی ہو سکتا تھا۔ بس کی رفتار اتنی تیز تھی کہ کودنے کی صورت میں میری گردن یا ٹانگ ٹوٹنے کے امکانات ففٹی ففٹی تھے۔ مزید یہ کہ وہ دونوں اٹھتے ہی دروازے کے قریب راستہ روک کر کھڑے ہو گئے تھے۔ میں نے ایک قدم ان کی طرف بڑھایا اور پھر اچانک مُڑ کر زینے پر چڑھ گیا۔ اوپر کی منزل پر جگہ زیادہ تھی۔ عام طور پر کنڈیکٹر اوپر کسی کو کھڑا ہونے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ اس وقت بھی تمام سیٹیں بھری ہوئی تھیں اور میں مایوس ہو کے واپس نیچے آنے کے لیے پلٹا ہی تھا کہ بیک وقت دو مسافر اٹھے میں فوراً ان کی سیٹ پر بیٹھنے کے لیے لپکا۔ نیچے وہ دونوں اب بھی دروازے میں کھڑے تھے لیکن زینے کے اوپر لگے ہوئے گول شیشے میں مجھے بیٹھا ہوا دیکھ چکے تھے۔ اس شیشے میں کنڈیکٹر کو اوپر کی منزل کی ہر سیٹ صاف نظر آتی تھی۔ میرے ساتھ والی سیٹ خالی پڑی تھی۔ جب میں نے سر گھما کے دیکھا تو ان میں سے ایک اوپر آ چکا تھا اور میں اسے اپنے ساتھ بیٹھنے سے نہ روک سکتا تھا۔ میری سیٹ کھڑکی کے ساتھ تھی چنانچہ میں پہلے کی نسبت زیادہ ٹائٹ پوزیشن میں تھا۔

"کیا چاہیے تمہیں؟" اس شخص کی طرح میں نے اپنے ظاہری سکون اور اعتماد میں فرق نہیں آنے دیا۔

"بھاگنے کی کوشش سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔" وہ میری طرف جھک کے آہستہ سے بولا اور یوں مسکرایا جیسے اس نے مجھ سے کوئی بہت پُرلطف بات کی ہو۔ میں نے بھی مسکرا کے اسے دیکھا۔ ذرا سی دیر کے لیے اس کا ہاتھ جیب میں گیا۔ اس نے بائیں ہاتھ سے ریوالور کو تھوڑا سا نکالا اور مجھے ایک جھلک دکھا کے واپس اندر کر دیا۔ میرے سوا کسی نے بھی اس چھوٹے سے آٹومیٹک ریوالور کی نال اور سفاک چمک کو نہیں دیکھا تھا۔ سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے درختوں کی آگے بڑھ آنے والی شاخیں بس کی باڈی سے ٹکرائیں اور کچھ پتے اڑتے ہوئے اندر آ گئے۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرے گال پر چانٹا مار دیا ہے۔ امید کی کرن اچانک جاگ اٹھی۔ بائیں طرف پیتل کی وہ جیسی سلاخ نہیں تھی جو بس کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک ہر کھڑکی کو دو حصوں میں تقسیم کرتی تھی۔ اس کی موجودگی میں کوئی اپنا سر کھڑکی سے باہر نہیں نکال سکتا تھا۔ ہر کھڑکی تقریباً ڈھائی تین فٹ لمبی اور سوا فٹ کے قریب اونچی تھی۔ بیشتر شیشے جو ایک بار ٹوٹ گئے تھے دوبارہ لگے نہیں تھے۔ چنانچہ میرے بائیں ہاتھ پر شیشے اور سلاخ کی عدم موجودگی کے باعث باہر نکلنے کا راستہ پیدا ہو گیا تھا۔ چلتی ہوئی ڈبل ڈیکر بس کی دوسری منزل سے سڑک پر چھلانگ لگانا اقدامِ خودکشی کا کیس بن سکتا تھا۔ مقابلے کے بغیر جان لینا تو دشمنوں کی خواہش کی تکمیل کے مترادف تھا۔

"یہ تو ظاہر ہے کہ تم مجھے بھاگنے نہیں دو گے۔" میں نے بھی آہستہ سے کہا۔ "تمہارے پاس ریوالور ہے تو ضرور ہوگا اور تمہیں چلانا بھی آتا ہوگا۔ خیر ایک بات بتاؤ۔ اس کام کا معاوضہ کون ادا کرے گا، ڈپٹی سلوایا چوہدری؟"

میں نے اسے چونکتے ہوئے دیکھا۔ میرا مقصد بھی یہی تھا کہ تھوڑی سی دیر کے لیے اس کا ذہن اپنی ساری توجہ مجھ پر نہ رکھے کیونکہ میری نظر ان درختوں پر تھی جن کی شاخیں پھیلے ہوئے بازوؤں کی طرح میرے قریب سے گزرتی جا رہی تھیں۔ میرے قاتل ہمسفر کو جواب سوجھا بھی نہ تھا کہ میں نے سامنے سے ایک درخت کی شاخ کو قریب آتے دیکھا۔

میں نے شاخ کو گرفت میں لے لیا۔ میرے جسم کو ایک جھٹکا لگا اور میں بس سے باہر نکل کر ہوا میں معلق رہ گیا۔ اگر مجھ سے سیکنڈ کے ہزارویں حصے کی تاخیر ہو جاتی تو دست گیری کے لیے کھڑکی تک پہنچنے والی شاخ گزر جاتی اور میں سڑک پر گرتا تو اگلے روز کے اخباروں میں چراغ دین کی گرفتاری کے علاوہ میری خودکشی کی خبر بھی شائع ہو جاتی۔

بس زن سے آگے نکل گئی تھی۔ میری ٹانگوں پر کھڑکی سے ٹکرا کر چوٹ آئی تھی۔ میں جانتا تھا کہ جھٹکا بہت شدید ہوگا اور اگر میں نے شاخ پر گرفت قائم نہ رکھی تب بھی لاش کی طرح نیچے گروں گا۔ اندیشہ یہ بھی تھا کہ جھٹکے سے میرا شانہ اتر جاتے یا میں نیچے گروں تو کوئی گاڑی مجھ پر سے گزر جائے۔ اچھے سے اچھا ڈرائیور زمین پر چلنے والوں کو بچا سکتا ہے، آسمان سے ٹپکنے والوں کو کیسے بچا سکتا ہے۔ جب میں نے خود کو صحیح سالم حالت میں پکے ہوئے پھل کی طرح ڈال سے لٹکا ہوا دیکھا تو۔۔۔۔ خدا کا شکر ادا کیا جسے میری زندگی منظور تھی۔ اس کیفیت میں بھی میرے کانوں نے اس فائر کی آواز سن لی تھی جو میرے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص نے سوچے سمجھے بغیر بدحواسی کے عالم میں کر دیا تھا۔ بس میں پہلے ہی بھگدڑ مچ گئی تھی لیکن اس ہنگامے کی خبر نیچے پہنچنے میں کچھ وقت لگا اور جب ڈرائیور نے بس روکی تو میرے اور بس کے درمیان سو گز سے زیادہ کا فاصلہ حائل ہو چکا تھا۔ شاخ بہت لچکدار تھی ورنہ ٹوٹ بھی سکتی تھی۔ میرے وزن کو شاخ نے تقریباً دوہرا کر دیا تھا اور میرے پیر زمین سے پانچ چھ فٹ اوپر رہ گئے تھے۔ ہاتھ چھوڑتے ہی میں پیراشوٹ سے اترنے والے کی طرح زمین پر پہنچا۔ بس میں سے ڈرائیور اور کنڈیکٹر کی قیادت میں بہت سے جوشیلے تماشائی بھی میری طرف بھاگتے چلے آ رہے تھے اور ان میں وہ بدمعاش بھی شامل تھا جو نیچے دروازہ روکے کھڑا تھا۔ اوپر والے کے بارے میں فرض کیا جا سکتا تھا کہ باقی مسافروں نے اسے قابو کر لیا اور اب وہ پولیس اسٹیشن پہنچا دیا جائے گا۔ میں بے تحاشا بھاگا اور ایک زیرِ تعمیر عمارت میں داخل ہو کر مال روڈ پر نکلا۔ وہاں سے پھر میں نے دوڑ لگا کے ٹریفک کی پروا کیے بغیر سڑک پار کی اور باغِ جناح کے لیڈیز پارک میں گھس گیا۔ وہاں اس وقت بھی سات سال سے سترہ سال تک کی "لڑکیاں" جھولا جھول رہی تھیں۔ انہوں نے احتجاجی چیخ ماری اور میں دائیں طرف دوڑتا ہوا جم خانہ کی عمارت میں داخل ہو گیا جو سومن طرف کے لمبے لمبے [illegible] بڑے بڑے دروازوں اور مخروطی چھت والی عمارت تھی۔ عام حالت میں کوئی شخص جو ممبر نہ ہو اندر قدم بھی نہیں رکھ سکتا تھا لیکن اس وقت وہاں ملازموں کے سوا کوئی نہیں تھا جو معمول کے مطابق جھاڑ پونچھ اور آرائش کے کام میں مصروف تھے۔ میں نے پہلے اس عمارت کو اندر سے نہیں دیکھا تھا۔ اندر نہ جانے کتنے کمرے اور ہال تھے۔ مجھے تین ویٹر ٹائپ لوگوں کو ناک آؤٹ کرنا پڑا جو مختلف کمروں میں ملے کیونکہ وہ شور مچانے پر آمادہ تھے۔ میں نے ان کو صوفوں کے پیچھے قالین پر اس طرح لٹا دیا کہ کوئی اندر آ جائے تو اسے کچھ دکھائی نہ دے۔ وہ تینوں آدھے گھنٹے یا زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے بعد اپنے پیروں پر کھڑے ہو جائیں گے، یہ میں جانتا تھا۔ مجھے باہر نکلنے کے راستے یا سمت کا کوئی اندازہ نہیں رہا تھا۔ اتفاق سے چوتھے کمرے میں کوئی نہیں تھا اور یہ کمرہ کارنر کا تھا۔ میں نے دروازے اندر سے بند کیے اور کھڑکی کے پردے ہٹا کر باہر دیکھا۔ زیادہ مشتعل مزاج لوگ میرا پیچھا کرتے ہوئے مال روڈ تک تو آ گئے تھے لیکن اب حیران پریشان کھڑے ہوئے دائیں بائیں گزرتی ٹریفک کو دیکھ رہے تھے۔ ان میں وہ دوسرا بدمعاش بھی تھا جو بس کے پائدان پر میرا راستہ روکے کھڑا تھا۔ غالباً دوسرے لوگوں کی طرح اس کو بھی یقین آنے لگا تھا کہ میں کسی رکشا یا ٹیکسی میں نکل گیا ہوں۔

دس منٹ بعد سب لوگ واپس جا چکے تھے۔ یہ سوچ کر میں بہت محظوظ ہوا کہ جب بس دوبارہ روانہ ہوئی ہو گی تو مسافروں کے درمیان اس سنسنی خیز واقعہ پر کیا کیا تبصرے نہ ہوئے ہوں گے۔ جتنے منہ ہوں گے اتنی ہی باتیں۔ شاید کچھ لوگوں نے یہ بھی کہا ہو کہ میں سرکس کا بازی گر تھا یا کوئی بہت خطرناک قسم کا مجرم۔ میں یہ بھی اندازہ کر سکتا تھا کہ فائر کرنے والا اگر پکڑا نہیں گیا ہوگا تو اس ریوالور کی مدد سے لوگوں کو دہشت زدہ کر کے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا ہوگا اور عین ممکن ہے کہ وہ فائر اس نے مجھ پر نہ کیا ہو لوگوں کو خوف زدہ کرنے کے لیے کیا ہو۔ میرے حق میں بھی یہی بہتر تھا کہ وہ فرار ہو جائے ورنہ پولیس والے مار مار کے اس سے پوچھ لیں گے کہ وہ خود کون ہے اور جس پر اس نے گولی چلائی تھی وہ کون تھا۔ اگر ڈپٹی سلوایا چوہدری ملاوا نے ان کو بھیجا ہوگا تو اسے میری تصویر دکھائی ہو گی یا بتایا ہوگا کہ میں کہاں ملوں گا۔ ان کا ناکام لوٹ جانا خود ان کے حق میں بھی بہتر تھا۔ وہ ایک بار اور کوشش کرنے اور کامیاب ہونے کا دعویٰ کر کے بچ سکتے تھے لیکن ان کا پولیس کے ہاتھوں میں پڑ

جانا ڈی سلوا اور چوہدری حلاور کو بہت مہنگا پڑتا۔ یا تو وہ انہیں نقد معاوضہ ادا کر کے چھڑانے پر مجبور ہوتے یا افشائے راز کی صورت میں ان کا خاتمہ کرنے پر۔

اب مجھے اس کمرے سے کھڑکی کے راستے باہر جانا تھا۔ جانے سے پہلے میں نے ایک گوشے میں رکھا ہوا فریج کھولا کیونکہ پیاس سے میرے حلق میں کانٹے سے پڑ رہے تھے۔ پھر مجھے فریج کے اندر بہت اعلیٰ قسم کی فیرنی کے پیالے نظر آتے۔ مٹی کے چھوٹے چھوٹے پیالے جو ایک دوسرے کے اوپر اٹھا کر رکھ دیے گئے تھے۔ میں نے پیالوں کے تین جوڑے صاف کیے ان کو پھر اسی طرح رکھا اور باہر آ گیا۔ باہر زندگی معمول کے مطابق رواں دواں تھی لیکن میری نگاہ ہر اجنبی صورت کو دیکھتی جا رہی تھی۔ میں مصنوعی آبشار کے پاس سے گزرا اور اوپن ایئر ریسٹورنٹ کے پاس سے گھوم کے سیدھا چلنے لگا۔ میرے بائیں ہاتھ پر مسجد اور سبزہ زار تھے اور اس سے ذرا آگے پہاڑی کے اوپر کہیں اوپن ایئر تھیٹر تھا جو درختوں کے حصار میں نیچے سے دکھائی بھی نہ دیتا تھا یہ درخت سڑک کے دونوں کناروں پر کسی جنگل کی طرح اُگے ہوئے تھے اور بہت پُرانے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس باغ میں علم نباتات کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے وہ سب درخت لگائے گئے تھے جو یہاں کی آب و ہوا میں پرورش پا سکتے تھے۔ ہر درخت پر ایک چھوٹی سی تختی لگی ہوئی تھی جس پر اس کا نام لکھا ہوا تھا۔ یہ عام فہم زبان کے نام نہیں تھے بلکہ بوٹنی کے انتہائی مشکل لاطینی نام تھے۔ شام کو اس سڑک پر تفریح کے لیے آنے والوں کا ہجوم رہتا تھا مگر اس وقت پورے باغ پر ایسی خاموشی اور ویرانی کا تسلط تھا کہ فضا بھی سوئی سوئی سی لگتی تھی۔ چڑیا گھر کے جنگلے میں تیرتی ہوئی بطخوں پر نظر ڈالتا ہوا میں اس گمنام مزار کے پاس سے گزرا جہاں ہر جمعرات کی شام قوالی ہوتی تھی اور مجھے صرف اتنا معلوم تھا کہ اس کا اہتمام کسی خاتون کی طرف سے ہوتا ہے۔ میں اپنے خیالات میں محو تھا، اس کے باوجود میں نے اچانک اپنے پیچھے نمودار ہونے والی گاڑی کی آواز سنی۔ چڑیا گھر کے دروازے کے سامنے دو چار گاڑیاں اس وقت بھی کھڑی تھیں اور کچھ لوگ بیوی بچوں کے ساتھ ٹکٹ لے کر اندر جا رہے تھے۔ مجھے متوجہ کرنے والی انجن کی غیر معمولی آواز تھی کیونکہ مال روڈ کی طرف سے آنے یا جانے والے سڑک کے اس مختصر سے حصے میں تیز رفتاری کا مظاہرہ نہیں کرتے جہاں ہر وقت بچے موجود رہتے ہیں۔

چنانچہ میں نے سر گھما کے دیکھا کہ اتنی تیزی سے گاڑی [illegible] کر ـــــ کون روانہ ہوا ہے اور بالکل آخری وقت [illegible] مجھے کسی خونخوار جانور کی طرح چند گز کے فاصلے پر [illegible] اس کے ریڈی ایٹر کے سامنے کی جالی کسی خون آشام [illegible] کے جبڑوں کی طرح پھیلی ہوئی تھی اور بجھی ہوئی [illegible] میں اس کی سفاک آنکھوں کی چمک دکھائی دیتی [illegible] نے خود بخود ایک زبردست چھلانگ لگائی اور [illegible] گرا۔ گاڑی تقریباً میرے جسم کو چھوتی ہوئی گزری [illegible] ایک درخت سے ٹکرا گئی۔ میرے کانوں میں شیشے [illegible] کی آواز آئی اور اس کے ٹکڑے میرے آس پاس بھی [illegible] میں گرتے ہی اٹھ کھڑا ہوا بے اختیار میری نظر گاڑی [illegible] اندر گئی۔ گاڑی کے اندر وہی دونوں موجود تھے جو [illegible] میرے ساتھ تھے۔ ڈرائیونگ وہ شخص کر رہا تھا جو [illegible] تعاقب میں دوڑا تھا۔ اتنی دیر میں اس نے گاڑی کو [illegible] پیچھے کر لیا تھا۔ گاڑی درمیان میں سے دب گئی تھی [illegible] ریڈی ایٹر کے ٹوٹنے سے سارا پانی بہہ گیا تھا۔ دو [illegible] لائٹس کے چکنا چور ہو جانے کے بعد گاڑی کسی زخم [illegible] اندھے حیوان کی طرح لگتی تھی لیکن درخت سے تصا[illegible] کے بعد بھی اس کا انجن بند نہیں ہوا تھا۔ میں جانتا تھا [illegible] ریڈی ایٹر کے انجن کو ٹھنڈا رکھنے والے پانی کے خز[illegible] ہی گاڑی صرف چند منٹ چل سکے گی۔ پھر اس کا انجن [illegible] ہو کے جل جائے گا۔ میں بے تحاشا بھاگا لیکن دو[illegible] کے بجائے میں نے اس طرف جانا بہتر سمجھا جہاں آ[illegible] گپے، چاٹ اور آئس کریم بیچنے والے قطار بنائے کھڑے [illegible] ان سب نے گاڑی کو درخت سے ٹکراتے دیکھ لیا تھا [illegible] وہ سمجھتے تھے کہ یہ حادثہ ہے چنانچہ وہ مدد کے لیے [illegible] پھر انہوں نے گاڑی کو میرے پیچھے یوں آتے دیکھا جیسے [illegible] کتا کسی خرگوش کے پیچھے دوڑتا ہے۔ وہ سب بھی اپنی [illegible] جان بچا کے بھاگے۔ مجھے یہ علم تھا کہ دونوں شکاری [illegible] ہیں۔ کم از کم ایک کے پاس یقیناً ریوالور ہے۔ میں نے [illegible] گپے اور دہی بڑے کی دو ریڑھیوں کے درمیان میں [illegible] راستہ بنایا اور گزرتے گزرتے تیسری ریڑھی کو پیچھے [illegible] دیا۔ میں نے اپنے پیچھے ایک ہنگامہ سنا۔ کار کے ٹکر [illegible] ریڑھیاں الٹ گئی تھیں اور سارا مال سڑک پر یا گاڑی [illegible] گیا تھا۔ ریڑھی کے مالک چلا رہے تھے اور ان کی مدد [illegible] لوگ ہر طرف سے جمع ہونے لگے تھے۔ میں نے صرف [illegible] پلٹ کر دیکھا اور مجھے اندازہ ہو گیا کہ گاڑی جوا[illegible]

تھی۔ وہ دونوں اب لوگوں کے نرغے میں آ چکے تھے مشتعل بھی والوں نے ڈرائیور کو باہر گھسیٹ لیا تھا۔ اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص نے اچانک ریوالور نکال لیا اور ایک ہوائی فائر کیا۔ لوگ واپس بھاگے۔ چڑیا گھر کے دروازے پر عورتوں اور بچوں نے چیخنا شروع کیا اور اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر ریوالور والا میری طرف دوڑا لیکن میں اس وقت تک ایک درخت کے پیچھے پناہ لے چکا تھا۔ دوسری گولی درخت کے تنے میں پیوست ہو گئی پھر کسی نے پیچھے سے پتھر مارا جو اس کے سر پر لگا اور وہ ذرا سی دیر کے لیے چکرا گیا۔ میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہ دیا اور ایک جست میں اس کے اوپر جا پڑا۔ میرے پاؤں کی ٹھوکر اس کے گھٹنے پر پڑی، اور وہ ایک چیخ مار کے نیچے گر گیا۔ اس کے گھٹنے کے اوپر کی نرم ہڈی یقیناً ٹوٹ چکی تھی اور وہ درد سے بلبلا رہا تھا۔ لوگوں نے اس کے ساتھی کو نہیں چھوڑا تھا۔ اب کچھ لوگ میری طرف آئے۔ میں نے جوڈو یا کراٹے کا مظاہرہ کرنا مناسب نہیں سمجھا اور ایک عام آدمی کی طرح اس شخص کو مکے مار کے زمین پر گرا لیا۔ ذرا سی دیر میں وہ بھی اسیر ہو گیا۔ اسیر کرنے والے وہی تھے جن کا مالی نقصان ہوا تھا۔ گول گپے اور دہی بڑے جو اُن کو رات تک فروخت کرنے تھے ضائع ہو گئے تھے اور ان کی ریڑھیاں بھی ٹوٹ گئی تھیں اگر ان کو نقصانات کی تلافی کا خیال نہ ہوتا تو شاید وہ مشتعل ہجوم ان دونوں کو مار ڈالتا۔ جس میں متاثر ہونے والے افراد کے علاوہ دیگر ہم پیشہ اور کچھ جوشیلے تماشائی بھی شامل ہو گئے تھے۔ ایک بڈھے نے جو لنگی باندھے ہوئے تھا دھاڑیں مار مار کے رونا شروع کیا کہ اب میں نئی ریڑھی کہاں سے لاؤں گا اور کاروبار کیسے شروع کروں گا۔ کسی اور نے تسلی دی کہ "بابا! نقصان تو اس کا باپ بھی پورا کرے گا۔"

کار کو میرے پیچھے آتے اور مجھے جان بچا کر دوڑتے سب نے ہی دیکھا تھا اب وہ مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ یہ کیا چکر ہے؟ میں نے قطعی لاعلمی کا اظہار کیا۔ "مجھے نہیں معلوم کہ انہوں نے مجھے کار سے کچلنے کی کوشش کیوں کی تھی۔ میں تو ان کی صورت سے بھی آشنا نہیں ہوں۔"

"کوئی بات تو ضرور ہو گی۔" ایک نوجوان نے کہا جو زمین پر پڑے ہوئے ریوالور کی حفاظت کر رہا تھا اور پولیس کے آنے سے پہلے کسی کو ریوالور اٹھانے کی اجازت نہیں دے رہا تھا۔ وہ کچھ قانونی ذہن کا مالک تھا۔

"یہ تو انہی سے تھانے جا کر پوچھا جائے گا۔" میں نے کہا۔ اسی وقت ایک پولیس مین نمودار ہوا جسے غالباً چیئرنگ کراس سے لایا گیا تھا۔ مختلف لوگوں نے اپنی اپنی آوازوں میں چلا کے اس سنسنی خیز واقعے پر اظہار خیال کیا اور میں سوچتا رہا کہ اس مصیبت سے کیسے چھٹکارا پاؤں۔ میں اس وقت تھانے جا کر کسی نئی مشکل میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔

"یہ ضرور تمہارے کوئی دشمن ہوں گے۔" پولیس مین نے مجھے دیکھ کر کہا۔ "ایسے ہی راہ چلتے لوگوں پر تو کوئی گاڑی نہیں چڑھاتا۔"

"قسم خدا کی حوالدار صاحب! میں تو ان کا نام بھی نہیں جانتا۔" میں نے سچ بولتے ہوئے کہا۔

"تھانے جا کے سب معلوم ہو جائے گا۔" سپاہی نے دھمکی کے انداز میں سر ہلایا۔ "تمہارا اپنا نام کیا ہے؟"

"میں... میرا نام ہے جی...۔" میں نے ہونٹوں پر زبان پھیر کے سوچتے ہوئے کہا۔ "منشی قلندر بخش حیران امرتسری۔ امرتسر کا رہنے والا ہوں اور حیران تخلص کرتا ہوں۔"

کسی کے کچھ اور کہنے سے پہلے مجمع کو چیرتا ہوا ایک معزز شخص آگے آیا۔ "میری گاڑی وہاں سے کس نے ہٹائی ہے؟" وہ رعب دار لہجے میں بولا۔ پھر اس نے حیرت زدہ لوگوں کو نظر انداز کرتے ہوئے آگے پیچھے سے گاڑی کا جائزہ لیا۔ "اوہ... مائی گڈنس۔ اس کا تو بیڑہ غرق ہو گیا ہے۔ کس کی حرکت ہے یہ؟"

صورت حال لوگوں پر واضح ہو چکی تھی مگر وہ بتا رہا تھا کہ اس نے اپنی گاڑی چڑیا گھر کے دروازے پر کھڑی کی تھی اور اپنی فیملی کے ساتھ اندر چلا گیا تھا۔ باہر نکلنے پر اسے گاڑی نظر نہ آئی تو پوچھنے پر لوگوں نے مجمع کی طرف اشارہ کیا جو کار کو گھیرے کھڑا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ فرار ہونے کے لیے اس سے بہتر موقع نہ ملے گا۔ محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے تھے۔ گاڑی والا اپنی تباہی کو رو رہا تھا تو ریڑھی والا اپنی بربادی کو اور لوگ میری طرف متوجہ نہیں رہے تھے۔ میں آہستہ آہستہ پیچھے ہٹا اور اس حلقے سے نکل گیا۔ سڑک پر ایک ٹیکسی والا ایسا بھی تھا جو اس سارے تماشے سے بے نیاز اسٹیئرنگ پر سر رکھے سو رہا تھا۔ میں نے بیٹھتے ہی اس کا کندھا ہلایا اور کہا۔ "کرشن نگر۔" ڈرائیور نے ادھ کھلی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور ایک خود کار عمل کے تحت انجن اسٹارٹ کر کے روانہ ہو گیا۔ طویل فاصلے کی سواری مل جانے کے بعد اس کے اعتراض کرنے کا یا قیلولہ جاری رکھنے کا کوئی جواز نہیں رہ گیا تھا۔ مال روڈ والے گیٹ پر پہنچ کے میں نے پیچھے دیکھا۔ مجمع ابھی تک میری عدم

موجودگی سے بے خبر تھا۔ میں نے اطمینان کا گہرا سانس لیا اور ٹیکسی کی سیٹ سے پشت لگا کے اپنا سر پیچھے رکھ لیا۔ ٹیکسی مال روڈ پر سے گزر رہی تھی اور ٹیکسی والا پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔ میں نے جیب سے سگریٹ نکال کر جلائی اور اپنے منتشر خیالات کو منظم کیا۔ اس وقت اگر میں نے حاضر دماغی سے کام نہ لیا ہوتا تو وہ دونوں بد معاش میرا کام تمام کر جاتے۔ جو اب گرفتار ہو چکے تھے۔ اب وہ جانیں اور پولیس جانے سکندر بخت کچھ نہیں جانتا۔ اس نے تو آج باغِ جناح میں قدم بھی نہیں رکھا۔ ان دونوں بد معاشوں نے بھی حالات کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے مقابلہ نہیں کیا تھا اور خاموشی اختیار کر لی تھی۔ تھانے پہنچ کر وہ پولیس کی پناہ میں آجائیں گے تو پبلک کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں رہے گا۔ شاید وہ سکندر بخت کا نام بھی نہیں لیں گے۔ ان کو اس مشن پر بھیجنے والے معاملات کو خوش اسلوبی سے طے کر لیں گے۔ گاڑی والے کا نقصان پورا کر دیا جائے گا اور ضروری ہوا تو ریڑھی والوں کا بھی۔ فریقین کو عدالتی چکروں سے بچانے اور رپورٹ لکھے بغیر فیصلہ کرنے کا جو نذرانہ کوتوال صاحب لیں وہ ان کی مرضی اور خوشی کے مطابق ادا ہو جائے گا تو جھگڑا کہاں رہے گا۔ میں نے سوچے سمجھے بغیر کرشن نگر کہہ دیا تھا لیکن ٹیکسی کرشن نگر پہنچی تو میں نے سوچا کہ کیوں نہ اس وقت سے فائدہ اٹھاؤں۔ میں نے ٹیکسی سُوری بلڈنگ کے پاس رکوائی۔

انعام کیمسٹ کی دوکان تلاش کرنے میں مجھے کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ انعام تقریباً پچاس سال کا مگر صحت مند اور شکل سے چالیس سال کا نظر آنے والا اسمارٹ آدمی تھا۔ اپنا اصل نام بتاتے بتاتے میں ایک اور خیال سے رک گیا۔ فوری طور پر مجھے دوسرا کوئی نام نہ سوجھا۔

"میں منشی قلندر بخش حیراںؔ امرتسری ہوں۔" میں نے کہا۔ "آپ کے بھائی غلام علی مرحوم میرے دوست تھے۔"

میرے مضحکہ خیز نام سے جو مسکراہٹ انعام کے چہرہ پر نمودار ہوئی تھی وہ غلام علی کے ذکر پر کافور ہو گئی۔ "تشریف رکھیے حیراںؔ صاحب!" اس نے ہاتھ ملا کر مجھے کاؤنٹر کے پیچھے بلا لیا اور خود بھی میرے سامنے ایک اسٹول پر بیٹھ گیا۔

"غلام علی اور میں پی ڈبلیو ڈی میں ایک ساتھ کام کرتے تھے۔" میں نے کہا۔ "اور ایک ساتھ، ایک ہی جرم میں نکالے گئے تھے۔ یعنی ایمانداری کے جرم پر۔ آپ تو جانتے ہی ہوں گے؟"

"بھائی صاحب مرحوم نے کبھی آپ کا ذکر نہیں کیا تھا۔" وہ بولا۔

"در اصل ان کو تو ایک فرم میں بڑی اچھی نوکری مل گئی تھی۔" میں نے کہا۔ "میں نے بہت ٹھوکریں کھائیں، کچھ عرصے مشرقی پاکستان میں بھی رہا۔ مجھے کل ہی ان کی وفات کا علم ہوا۔ انہوں نے کئی بار آپ کا ذکر کیا تھا۔ بس اتفاق ہے کہ ملاقات ہوئی بھی ہے تو تعزیت کی خاطر۔"

اتنے مستند حوالوں کے بعد انعام کے لیے شک کی گنجائش نہ رہی۔ اپنے حالات تو مجھے خود غلام علی نے برسوں سے پہلے بتائے تھے۔ انعام نے مددگاروں کو نمٹایا اور ایک لڑکے کو چائے وغیرہ لینے بھیجا جو ابھی زیرِ تربیت سیلز مین تھا۔ میں نے اپنی گفتگو میں میرو وزیرا اینڈ کمپنی کا ذکر بھی کیا اور انعام نے کہا کہ وزیر خان مرحوم تو غلام علی کے لیے آدمی کے روپ میں فرشتہ ثابت ہوئے تھے۔ اپنی باتوں کے دوران وہ مجھے مسلسل حیراںؔ صاحب کہہ کے مخاطب کرتا رہا اور جتنی باتیں غلام علی نے مجھے اپنے بارے میں بتائی تھیں ان کے ذکر سے میں نے ثابت کر دیا کہ ہم واقعی ایسے دوست تھے جن سے ایک دوسرے کی زندگی کا کوئی پہلو پوشیدہ نہ تھا۔ اس کے بعد میں نے عرضِ مدعا کی۔

"میرے حاضر ہونے کا ایک اور بھی مقصد تھا انعام صاحب۔" میں نے کہا۔ "مشرقی پاکستان سے آنے کے بعد میں مکان کے سلسلے میں بہت پریشان ہوں۔ کاروبار تو اللہ کے فضل سے اچھا چل رہا ہے۔"

"آپ کا کیا کاروبار ہے؟" انعام نے میری بات کاٹ کر کہا۔

"میں کنٹریکٹر ہوں۔" میں نے کہا۔ "جنرل آرڈر سپلائر۔ سرکاری محکموں کو ہر قسم کے سامان کی فراہمی کے ٹھیکے لیتا رہتا ہوں۔ تاہم ابھی اپنا ذاتی مکان بنوانے کی استطاعت نہیں۔ پہلے ایک مکان کا آدھا حصہ کرائے پر لیا تھا۔ باقی آدھے حصے میں بڑے غلط قسم کے لوگ رہتے تھے۔ اب آپ کو کیا بتاؤں... بڑے غلط دھندے تھے اُن کے۔ دوسرا مکان لیا ہے تو مالک مکان بڑا خر دماغ ملا ہے کہ آزادی سے سانس بھی نہیں لینے دیتا۔ خود نیچے رہتا ہے تو ہم سے توقع رکھتا ہے کہ ہم چلتے وقت بھی فرش پر قدم نہ رکھیں کیونکہ اس سے دھمک پیدا ہوتی ہے۔ جس سے اس کی دوسری بیوی کو دردِ سر اور تیسری بیوی کو اختلاج ہونے لگتا ہے۔ دیوار میں کیل نہیں ٹھوکنے دیتا۔ اب کپڑے ہوا میں معلق کرنا آتا تو میں جادوگر نہ ہوتا؟"

انعام بے ساختہ ہنسا۔ "یہ تو بالکل ساس بہو کا جھگڑا ہے جو ہر جگہ اسی طرح چلتا ہے۔ اب ایک مکان تو ہے۔" وہ کچھ سوچنے لگا۔ "لیکن ذرا بڑا ہے۔ میرا مطلب ہے اس کا کرایہ آٹھ سو روپے ہے۔ شاید میرے کہنے سے سات یا ساڑھے سات ہو جائے کیونکہ مالک مکان ایک بیوہ عورت ہے۔ عورت کیا میری پھوپھی ہے۔ وہاں آپ کو اس قسم کا کوئی مسئلہ تو نہیں ہوگا۔"

"مجھے اور کچھ نہیں چاہیے انعام صاحب۔" میں نے کہا۔ "اس وقت تو میں ہزار دے کر بھی گویا قید خانے میں ہوں۔ یہ بتایئے کہ ایڈوانس کی رقم کتنی ہوگی؟"

"ایڈوانس کیا حیراںؔ صاحب۔" انعام بولا۔ "آپ تو بھائی کے دوست ہیں اور کوئی ہوتا تو میں کرایہ نامہ وغیرہ بھی بھروا تا لیکن یہ بتایئے آپ اکیلے ہیں؟"

"خدا نہ کرے دنیا میں کوئی اکیلا ہو۔" میں نے کہا۔ "ایک مفلوج خالہ ہیں اور ان کی بیٹی ہے۔ ایک چچی ہیں اور چچازاد بھائی بہن ہیں۔ یہی ہے اپنا کل خاندان۔"

"یعنی آپ کے اپنے والدین اور بھائی بہن یا بیوی بچے نہیں ہیں؟" انعام نے کہا۔

"شادی ابھی نہیں کی۔" میں نے کہا۔ "والدین اللہ کو پیارے ہو گئے، بہن بھائی تھے ہی نہیں۔ ایک چچی اور خالہ بھی بیوہ ہیں چنانچہ ہم سب مل کے رہتے ہیں اور ایک دوسرے کا سہارا بنے ہوتے ہیں۔"

انعام نے سیلز مین کو دوکان کا خیال رکھنے کی ہدایت کی اور خود میرے ساتھ چل پڑا۔ تقریباً دو فرلانگ کا فاصلہ پیدل طے کرنے کے بعد ہم ایک گلی میں مڑ گئے۔ انعام نے مجھے ایک منٹ انتظار کرنے کے لیے کہا اور خود ایک گھر میں گھس گیا۔ جب وہ باہر نکلا تو اس کے ہاتھ میں ایک چابی تھی۔ ہم نے کچھ اور فاصلہ طے کیا اور تقریباً اس جگہ جا پہنچے جہاں پہلے دو نمبر بس کا آخری اسٹاپ تھا۔ وہ مکان گلی کے آخر میں تھا۔ اس کے بعد کھیت شروع ہو جاتے تھے جن میں سبزی کی کاشت ہو رہی تھی۔ مکان میری توقع سے زیادہ بڑا نکلا۔ اس کی وسعت کو دیکھتے ہوئے آٹھ سو روپے ماہانہ بہت کم کرایہ تھا لیکن اس کی وجہ شہر سے دوری تھی۔ یہی مکان کسی فیشن ایبل یا بارونق آبادی میں ہوتا تو ڈیڑھ ہزار سے کم کرائے میں نہ ملتا لیکن ہمارے نقطۂ نظر سے یہ مکان موزوں ترین تھا۔ اس میں ہم سب کے لیے جگہ تھی۔ یہاں ہم گمنام رہ سکتے تھے اور ایک طرف کھلے کھیت جہاں صحت بخش ماحول فراہم کرتے تھے وہاں ہنگامی حالت میں فرار کے راستے بھی مہیا کرتے تھے۔ انعام کچھ تذبذب کا شکار تھا۔ ایک طرف مکان اس کی بیوہ پھوپھی کا تھا جسے وہ زیادہ سے زیادہ کرائے پر اٹھانے کا آرزومند تھا۔ دوسری طرف اس کے مرحوم بھائی کا دوست تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ شاید اتنے کرائے پر میں آبادی سے اتنا دور رہنا پسند نہ کروں لیکن میں نے فوراً اسے ایک ماہ کا کرایہ ایڈوانس ادا کر دیا تو وہ بہت خوش ہوا۔ ہم انتہائی دوستانہ اور خوشگوار ماحول میں واپس ہوئے تو مکان کی چابی میری جیب میں تھی اور میں بہت مطمئن تھا کہ ایک بہت بڑا مسئلہ اتنی آسانی سے حل ہو گیا۔

شام چار بجے میں نے کرشن نگر سے رکشا لیا جس نے مجھے پونے پانچ بجے صدر پہنچا دیا۔ رابعہ اور محسن روانگی کے لیے تیار تھے۔ میں ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ شہلا اکیلی رہ جانے کے خیال سے کچھ افسردہ تھی۔ میں نے اسے تسلی دی کہ صبر اور انتظار کی آزمائش کا زمانہ بہت جلد ختم ہو جائے گا اور یہ خوش خبری بھی سنا دی کہ ایک دو روز میں ہم سب دوسرے بہت بڑے، کشادہ اور آرام دہ مکان میں منتقل ہو جائیں گے۔ اس کے بعد کوشش کریں گے کہ گلبرگ کا سامان بھی نکال لائیں اور اسے کوئی مصروفیت بھی فراہم کر دیں۔ رابعہ کی گاڑی پیچھے والی گلی میں کھڑی تھی۔

"تمہاری یہ گاڑی بہت خطرناک ہے۔" میں نے کہا۔

"ایک تو اس کا رنگ بہت نمایاں ہے پھر اس کا حلیہ۔"

"شاید آپ کو یاد نہیں رہا کہ حلیہ بگاڑنے کا کارنامہ آپ نے ہی سرانجام دیا تھا۔" رابعہ خفگی سے بولی۔ "اب اسے خطرناک کہتے ہو۔"

میں ہنسا۔ "بُرا ماننے کی تو کوئی بات نہیں بی بی! جو خطرناک ہے وہ خطرناک ہے اور جو محض ناک ہے وہ محض ناک ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ گاڑی کا رنگ اور حلیہ بدلا جائے یا گاڑی بدلی جائے کیونکہ ہر جگہ یہ گاڑی تمہاری پہچان بن جاتی ہے۔"

"یہ کیا فضول بات پر لڑنا شروع کر دیا ہے اس وقت۔" محسن نے گاڑی چلاتے ہوئے کہا۔ "یہ بتا کہ سارا دن کہاں جھک ماری۔ میں نے تھانے فون کیا تھا تو کسی نے کہا کہ چلے گئے۔"

"تھانے میں چراغ دین سے بڑی دلچسپ ملاقات ہوئی۔" میں نے کہا اور ان کو اوّل تا آخر ہر بات بتا دی وہ دونوں خاصے متفکر اور پریشان نظر آنے لگے۔

"اس کا مطلب ہے کہ اب وہ براہِ راست حملوں پر آگئے ہیں۔"

محسن نے کہا۔" اور یہ بھی فیصلہ کر چکے ہیں کہ سکندر بخت کو ختم کر دیا جائے۔ ان کی دی ہوئی مہلت بھی ختم ہو رہی ہے۔"

"ہاں اور انہیں یقین آ چکا ہے کہ میں ان کی شرائط قبول کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔" میں نے کہا۔

"پہلی صورت میں تم کہیں بھی محفوظ نہیں ہو سکندر!" رابعہ نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔" تم شہلا کی طرح گھر میں چھپ کے نہیں بیٹھ سکتے اور سڑک پر ایک آدمی کی جان لینا ان جیسے لوگوں کے لیے کیا مشکل ہے!"

"اسی لیے میں نے کہا تھا کہ میرے تحفظ کی ضمانت صرف ایک صورت میں ہو سکتی ہے۔" میں نے کہا۔" یعنی وصیت ناموں کا ایک پورا سلسلہ مرتب کیا جائے اور اس کی اطلاع دشمنوں تک پہنچا دی جائے کہ خدا نخواستہ مجھے کچھ ہوا تو محسن میرا وارث ہوگا۔ محسن کے بعد رابعہ... رابعہ کے بعد شہلا... صرف اسی ترکیب سے دشمن پر یہ واضح کیا جا سکتا ہے کہ وزیر خان کا ایک نہیں اَن گنت وارث ہیں اور چوہدری دلاور نے پورے کاروبار پر بلا شرکت غیرے قبضہ کرنے کا جو منصوبہ بنایا ہے وہ ایک سکندر کے نہ ہونے سے کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ بلا مقصد کوئی قتل نہیں کرتا اور انہیں اپنے مقصد میں کامیابی کی امید نہیں رہے گی تو وہ مجھے راستے سے ہٹانے کا خیال بھی چھوڑ دیں گے۔ انہیں کچھ اور سوچنا پڑے گا۔ وہ نئی شرائط پیش کریں گے یا مصالحت کا کوئی اور فارمولا تلاش کریں گے... جان بچانے کی دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ میری ضمانت منسوخ ہو جائے اور میں جیل چلا جاؤں۔"

"جو لوگ ہسپتال کے اندر پہنچ سکتے ہیں اور قتل کر سکتے ہیں، وہ جیل میں بھی تمہیں مروا سکتے ہیں۔" محسن نے کہا۔

"جیل کے اندر خصوصی انتظامات کیے جا سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔" اس میں رضوی صاحب کے تعلقات کام آ سکتے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ جہاں پھانسی پانے والے مجرموں کو رکھا جاتا ہے وہاں کوئی آسانی سے نہیں پہنچ سکتا۔"

" یہ کیسی باتیں کرتے ہو تم؟" رابعہ نے دہشت زدہ ہو کے کہا۔ شاید اسے خیال آ گیا تھا کہ مجھ پر بھی قتل کا الزام ہے اور قاتلوں کی آخری منزل کال کوٹھری ہوتی ہے جو عدم آباد کی سرحد پر واقع ہوتی ہے۔ خوف سے اس کی آواز کانپ رہی تھی اور اس کا رنگ اڑ گیا تھا۔

جب میں نے تسلی دینے کے لیے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تو اس کا ہاتھ ٹھنڈا ہو رہا تھا۔

"تم سے کس نے کہا ہے کہ وصیت ناموں کا ... ناقابلِ عمل ہے۔ مجھے دو چار دن کی مہلت دو ... صاحب مل کر سب کر لیں گے۔ رجسٹریشن کے بعد ... ناموں کی ایک ایک نقل ان لوگوں کو پہنچا دیں گے ... نے کہا۔

"اچھا اچھا... میں تمہیں خوف زدہ نہیں ... تھا۔" میں نے رابعہ کے ہاتھ پر تھپکی دی۔" کال ... تو زندہ لاشیں رہتی ہیں اور ظاہر ہے ایسی ہولناک ... خوشی سے پناہ نہیں لیتا۔ وہ آخری صورت تھی ... پہلے ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں۔" میں نے محسوس کیا ... الفاظ کا خاطر خواہ اثر نہیں ہو رہا ہے چنانچہ میں نے ... بدل دیا۔" یار محسن! میں نے تجھ سے کہا تھا کہ شہلا سے ... بات معلوم کرنی ہے۔"

" وہ سب ٹھیک ہے۔" محسن نے کہا۔ ... ہوتا تھا کہ میں نے اس کا موڈ بھی خراب کر دیا ہے ... نے محض ڈی سلوا کو دھمکی دی تھی اس لیے کہ وہ کچھ ... بعد میں اس کا یہ ڈر بے بنیاد ثابت ہوا۔" اس سے ... وضاحت ممکن نہیں تھی۔

" شہلا سے ایک بات اور پوچھنی تھی۔" میں ...

"اس کا تعلق میرے شک سے ہے۔ ہسپتال میں ... گورکن کو زہر دینے والی تیسری نرس مجھے شہلا کی ...

" اب اس کا کیا ذکر۔" رابعہ نے بار ... میری طرف دیکھ کر کہا۔" ڈی سلوا نے وہ کیس ہی ...

گاڑی اس عمارت کے سامنے جا رکی جس میں رابعہ کا ... آفس تھا۔ دروازے پر پرانا چوکیدار موجود تھا لیکن ... سر پہ پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اِدھر اُدھر دیکھنے پر مجھے ... ایسے نظر آئے جن کی صورت اور نظریں دیکھ کر سمجھا جا ... تھا کہ وہ سادہ کپڑوں میں مسلح پولیس کے آدمی ہیں جو ... صاحب کی ہدایت پر وہاں پوسٹ کیے گئے ہیں۔ ... وردی والا اے ایس آئی بھی موجود تھا۔ اس نے ... کر کہا کہ ہم اپنی شناخت کروائیں لیکن چوکیدار نے ... کی اور اسے بتایا کہ یہی مس رابعہ قاری ایڈووکیٹ ہیں ... دفتر کو کسی نے بم سے اڑانے کی دھمکی دی تھی اور ... یہ حفاظتی انتظامات کیے گئے ہیں۔ اے ایس آئی نے ... سے ہمارے بارے میں پوچھا اور پھر اپنی خفت مٹانے کے ... لیے کہا۔" آپ فکر نہ کریں۔ آس پاس کوئی غلط آدمی ... بھی نہیں سکتا۔" رابعہ نے اس سے کہا کہ ابھی کچھ دیر ...

... صاحب آئیں گے۔ سیاہ شیروانی، طرّے دار ... نام کے ایک صاحب آئیں گے۔ سیاہ شیروانی، طرّے دار سفید پگڑی اور سفید شلوار۔ بھاری بھر کم چہرہ اور بڑی بڑی مونچھوں والے، ان کو اوپر آنے دیا جائے لیکن ان کی تلاشی ضرور لی جائے۔ اس طرح کہ ان کو اپنی بے عزتی کا احساس نہ ہو۔

میں نے رابعہ کو آفس میں چھوڑا پھر بنک ڈرافٹ لے کر میں اور محسن اس کوٹھی میں پہنچے جو میں نے گزشتہ روز خسرو جمشید کے ساتھ جا کر دیکھی تھی۔ مجھے اس کی شاندار مرسڈیز دور سے ہی نظر آ گئی۔ قریب پہنچ کر میں نے گاڑی روک لی تو مجھے وہ شوفر کی جگہ بیٹھا ہوا نظر آیا۔ اس کا حلیہ بالکل وہی تھا۔ قریب پہنچ کر میں گاڑی سے اترا اور اس کی طرف بڑھا۔" السلام وعلیکم۔" میں نے کھڑکی کے پاس پہنچ کر کہا۔" یہ بتلائیے کہ آپ کون ہیں؟ شوفر یا خسرو جمشید صاحب؟"

" وعلیکم السلام۔" اس نے سنجیدگی سے کہا اور کچھ دیر تک مجھے غور سے دیکھتا رہا۔" رقم لے آئے ہیں آپ؟"

میں چکر میں پڑ گیا لیکن جال فوراً میرے ذہن میں آ گئی۔" ہاں مگر تم تو شوفر ہو۔" میں نے رکھائی سے کہا اور یوں دروازے کی طرف بڑھا جیسے مجھے خسرو جمشید کے اندر ملنے کا پورا یقین ہو۔

ابھی میں چند قدم دور ہی گیا تھا کہ وہ ہنسا۔" برخوردار! ایسی نظر ہوتی تمہاری تو تم دنیا میں کہیں دھوکا نہ کھاتے۔" وہ مونچھوں کو بل دے کر بولا۔

"خسرو صاحب!" میں نے شرمندہ ہو کے اس سے ہاتھ ملایا۔" میں بنک ڈرافٹ لے آیا ہوں لیکن آپ کو میرے ساتھ چلنا ہوگا کیونکہ مکان کی اصل خریدار ایک خاتون ہیں۔ مس رابعہ قاری ایڈووکیٹ۔ آپ نے ان کا نام تو سنا ہوگا؟"

خسرو جمشید کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر اس نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا۔" نام کچھ سنا ہوا ضرور لگتا ہے۔ کیا وہ آپ کے ساتھ آئی ہیں؟"

"جی نہیں۔ وہ اپنے آفس میں آپ کی منتظر ہیں۔" میں نے کہا۔" میرے ساتھ ایک دوست آیا ہے۔ مس رابعہ کے آفس میں کاغذی اور قانونی کارروائی آسانی سے پوری ہو سکتی ہے۔ ادائیگی تو میں اس وقت بھی کر سکتا ہوں۔" میں نے اسے بنک ڈرافٹ پکڑا دیا۔ جتنی دیر میں اس نے بنک ڈرافٹ کو دیکھا میں نے اپنے چاروں طرف نگاہ ڈالی تاکہ رضوی صاحب کے حفاظتی انتظامات دیکھ سکوں لیکن مجھے آس پاس کوئی بھی نظر نہ آیا۔ ان کے آدمی اگر کہیں تھے تو چھپ کر نگرانی کر رہے تھے۔

" مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" خسرو جمشید نے بنک ڈرافٹ مجھے واپس کر دیا۔" آپ میرے ساتھ چلیں گے یا اپنی گاڑی میں؟"

"آپ کے ساتھ تو آپ کا شوفر بھی ہوگا۔" میں نے کہا۔" میں اپنی ہی گاڑی میں زیادہ محفوظ رہوں گا۔ آپ تو اپنی جان ہتھیلی پر لیے پھرتے ہیں اور دشمنی نبھاتے ہیں۔ میرا ابھی تک کوئی دشمن نہیں۔" میں نے بالکل غیر سنجیدگی کے ساتھ مذاق میں یہ بات کی تھی لیکن خسرو جمشید کا ردِ عمل بہت عجیب تھا۔ اس کے ماتھے پر ناگواری کے آثار شکن بن کے پھیل گئے تھے۔ یوں جیسے میں نے اس پر طنز کیا ہو۔

" میں اکیلا ہی چلوں گا۔" اس نے فیصلہ کرتے ہوئے انجن اسٹارٹ کیا۔" آپ آگے چلیں۔"

" اور آپ کا شوفر؟" میں نے گھر کی طرف دیکھا۔" کیا وہ یہاں اکیلا آپ کی واپسی کا انتظار کرتا رہے گا؟"

" نہیں۔ جب وہ دیکھے گا کہ میں جا چکا ہوں تو وہ بھی چلا جائے گا۔" خسرو نے کہا۔

" اگر آپ کہیں تو اندر جا کے اسے مطلع کر دوں؟" میں نے کہا۔" ایسے بیچارہ کب تک...؟"

" میں نے کہا نا مسٹر سکندر بخت کہ وہ چلا جائے گا۔" خسرو جمشید نے سخت لہجے میں کہا۔" اب آپ چلیے۔"

شک مجھے پہلے بھی تھا، اب یقین آ گیا کہ کوٹھی کے اندر شوفر موجود ہی نہیں۔ باہر سے تمام دروازے اور کھڑکیاں بند نظر آتے تھے اور خسرو جمشید کا اکیلے جانا اس کے سابقہ بیانات کی نفی کرتا تھا کہ زندگی اور موت کے امکانات کو ففٹی ففٹی کرنے کے لیے وہ اپنے ہی جیسے شوفر کو ساتھ رکھتا ہے۔ میں نے اسے بزدلی کا طعنہ نہیں دیا تھا اور یہ چیلنج نہیں دیا تھا کہ ہمت ہے تو اکیلے جا کر دکھاؤ۔ اس کے علاوہ شوفر واقعی موجود ہوتا تو خسرو جمشید اسے بے سبب چھوڑ کے کیوں جاتا۔

میں نے اپنے شبہ کا اظہار محسن پر کیا۔" یہ شخص جو ہمارے پیچھے آ رہا ہے خسرو جمشید نہیں ہے بلکہ اس کا شوفر ہے۔"

" یہ شک جناب کو کیسے ہوا؟" محسن نے گاڑی چلاتے ہوئے کہا۔

" شک کے بہت سے اسباب ہیں۔" میں نے کہا۔" ایک تو یہی کہ ہمیشہ اپنے ہمزاد قسم کے شوفر کو ساتھ رکھنے کی احتیاط اگر ضرورت یا عادت ہوتی تو اس وقت وہ اکیلا روانہ نہ ہوتا۔ دوسری بات یہ کہ مجھے شوفر کے اندازِ گفتگو میں اعتماد

کی کمی محسوس ہوتی ہے کہ کل میری بات خسرو جمشید سے ہوئی تھی چنانچہ میں یہ فرق محسوس کرسکتا ہوں۔ غالباً یہ بھی مجھے قتل کرنے کی ایک سازش تھی۔ خسرو جمشید کا خیال ہوگا کہ سارے معاملات یہیں طے پا جائیں گے۔ اس نے کہا تھا کہ کاغذی اور قانونی کارروائی بعد میں مکمل ہوتی رہے گی۔ وہ تو مجھے کل بھی قبضہ دینے پر تیار تھا۔ آج اس نے شوفر کو بھیج دیا کہ وہ مجھ سے بنک ڈرافٹ لے لے اور چابی میرے حوالے کرکے لوٹ آئے۔ بنک ڈرافٹ کو کیش کرانا اس کے پروگرام میں شامل نہ تھا۔ بعد میں کیا ہوتا ہ یا تو میں اسی وقت چابی لگا کر دروازہ کھولتا اور اندر دیکھتا یا ہم سب ساتھ جاتے بہرصورت یہ فرض کیا جاسکتا ہے کہ چابی لگاتے ہی دھماکا ہوتا اور انجام بخیر۔ شوفر جاکر خسرو جمشید کو بتا دیتا کہ مشن کامیاب رہا۔ ابھی تک کسی نے مجھے خسرو جمشید کے ساتھ نہیں دیکھا اور اس سودے کا کوئی گواہ نہیں جو ہمارے درمیان طے پایا تھا۔ کون جانے وہ خسرو جمشید تھا یا کوئی اور۔ اور اس کوٹھی کا مالک بھی تھا یا نہیں۔ یہ سب تو ملکیت کے کاغذات دیکھنے سے معلوم ہوتا۔ جائداد کی خرید و فروخت کہیں ایسے ہوتی ہے کہ میں نے نقد رقم ادا کی اور اس نے چابی مجھے دے کر کہا کہ جاؤ میاں آج سے تم مالک اس گھر کے۔ اعتماد حاصل کرنے کے لیے اس نے ایک جذباتی وجہ بتائی تھی اور کاغذی قانونی کارروائی کے لیے کہا تھا کہ بعد میں ہوتی رہے گی۔ ظاہر ہے کہ اس کارروائی کی نوبت ہی نہ آتی۔"

"اگر اس گھر کی چابی واقعی ہلاکت خیز ہے تو کیا یہ بات معلوم نہیں کی جاسکتی؟" محسن نے کہا۔

"رضوی صاحب ان ماہرین کو بھیج سکتے ہیں جو آتش گیر یا دھماکے سے پھٹنے والی چیزوں کو ناکارہ بنا دیں۔" میں نے کہا۔

"ایک اور سوال یہ ہے کہ خسرو جمشید اس مکان کا مالک نہیں اور اس کی جگہ شوفر صرف چابی دینے آیا تھا تو اب وہ کاغذات پر دستخط کیوں اور کیسے کرے گا؟" محسن نے کہا اور میں نے فوراً پلٹ کر دیکھا۔ مرسڈیز کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔ ہم اپنی باتوں میں مصروف رہے اور خسرو جمشید کا ڈرائیور موقع پاتے ہی غائب ہوگیا۔ کیونکہ کسی وکیل کے آفس میں جاکر اپنے مالک کی جگہ قانونی دستاویزات پر دستخط کرنا اس کے لیے ناممکن تھا۔

"ابھی کچھ دیر پہلے میں نے آئینے میں دیکھا تھا تو وہ گاڑی پیچھے پیچھے آرہی تھی۔" محسن نے مایوسی سے کہا اور فوکس ویگن کو سڑک کے ایک کنارے پر روک لیا۔ "ہم پانچ دس منٹ انتظار کرلیتے ہیں۔"

"اس کا کوئی فائدہ نہیں۔" میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ سب ڈرامہ تھا بلکہ فراڈ تھا۔ خسرو جمشید اور اس کا ڈرائیور، دونوں بوگس تھے اور اب دوبارہ کہیں بھی نہیں ملیں گے۔ ان کا مقصد ہمیں لالچ دے کر موت کے منہ میں لے جانے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ آج اس شوفر نے چھوڑنے سے پہلے پوچھا کہ آپ رقم لے آتے ہیں، پھر اس نے مجھے جانے سے روک دیا۔ اس کو ہدایات تھیں کہ بنک ڈرافٹ لے کر خسرو جمشید کی طرف سے چابی مجھے پیش کرے اور رخصت ہو جائے۔ جاتے جاتے کہہ دے کہ خسرو جمشید صاحب کل آپ سے ملیں گے اور یہیں ملنے آئیں گے... لیکن جب میں نے اسے بتا دیا کہ خریدار میں نہیں ہوں۔ وہ فوراً مان گیا لیکن بنک ڈرافٹ دیتے ہی میں نے نیا مسئلہ کھڑا کردیا کہ سودا طے کرنے کے لیے اور قانونی دستاویزات پر دستخط کرنے کے لیے اسی وقت ایک وکیل کے آفس میں جانا ہے۔ وہ غائب نہ ہوتا تو کیا کرتا؟ اس وقت وہ اپنے آقا کو رپورٹ دے رہا ہوگا کہ مشن کیوں ناکام رہا۔"

"یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ آقا فوراً اسکیم پر نظرثانی کرے۔"

محسن نے پانچ منٹ بعد ہی گاڑی آگے بڑھادی۔ مجھے محسن کے خیال سے اختلاف نہیں تھا تو یہ مشکل نظر آتا تھا کہ خسرو جمشید کوئی فوری قدم اٹھا کر اپنی ناکامی کے اسباب کا مداوا ہوسکے۔ میں نے اور محسن نے رضوی صاحب کے آفس کے نیچے اپنی گاڑی روکی تو رات کے آٹھ بجے تھے لیکن خلافِ معمول عمارت کے آس پاس کا وہ علاقہ جو ہمیشہ اندھیرا نظر آتا تھا، آج روشن تھا۔ گاڑیوں کی قطار کے بعد گھنے سایہ دار درختوں کی قطار تھی اور پھر مال روڈ پر ٹریفک کا رش رہتا تھا اور روشنی کا انتظام بھی بہتر اچھا تھا لیکن یہ روشنی درختوں کی وجہ سے اس حصے تک نہیں پہنچتی تھی جہاں اس عمارت کے سامنے بھی پتلی سی راہ داری تھی۔ آج اس عمارت کے اوپر دونوں طرف سرچ لائٹس نصب تھیں اور یہ حفاظتی انتظامات کی ایک کڑی تھی۔ میں نے اوپر جاکر رابعہ کو اپنی ناکامی کا احوال سنایا اور ان خدشات کا بھی ذکر کیا جو میرے ذہن میں پیدا ہوئے تھے۔ کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ میرا خیال بے بنیاد اور خبطی ہونے کی دلیل ہے۔ ایک بار پہلے بھی ایسا ہوچکا تھا جب ٹرانسمیٹر پر مجھ سے کہا گیا تھا کہ چابی میری ہے اور میں آسانی سے آزادی حاصل کرسکتا ہوں۔ اگر میں نے اس چابی سے قفل کھولنے کی کوشش کی ہوتی تو بات میرے ساتھ وہیں پر ختم ہوجاتی اور یہ دوسری چابی پیش کرنے کی نوبت ہی نہ آتی۔ ایک چابی باہر آنے کے لیے تھی تو دوسری اندر جانے کے لیے لیکن دونوں دروازے عدم کی دنیا میں کھلتے تھے۔

"چلو خدا کا شکر ہے کہ اس بار بھی وہ اپنے عزائم میں ناکام رہے۔" رابعہ نے بنک ڈرافٹ کو اپنے ہینڈ بیگ میں ڈال دیا۔ "لعنت بھیجو اس مکان پر۔"

"لیکن یہ دیکھنا تو چاہیے کہ آخر اس کوٹھی کا مالک کون ہے؟" میں نے کہا۔ "شاید اس سے خسرو جمشید بن کر آنے والے کا کچھ پتہ چل سکے اور یہ معلوم ہوسکے کہ کیا وہ بھی کوئی شکاری ہے؟"

"کوٹھی کس کی ہے یہ تو کل ہی معلوم ہوگا۔" محسن بولا۔ "لیکن سکندر کے اندیشوں کی تصدیق اسی وقت کی جاسکتی ہے۔ رضوی صاحب نے کہا تھا کہ وہ اپنے آدمی وہاں حفاظت کے لیے پوسٹ کردیں گے۔ وہ لوگ دروازے کے بجائے کسی کھڑکی یا روشن دان سے اندر چلے جائیں تو دیکھ سکتے ہیں کہ سامنے والے واحد مقفل دروازے کے پیچھے تباہ کاری کا انتظام ہے یا نہیں۔ باقی دروازے اور کھڑکیاں اندر سے چٹخنی لگا کے بند کیے گئے ہوں گے۔ وہ بم وغیرہ کو غیر مؤثر بنا دیں گے۔"

"میں انکل سے بات کرتی ہوں۔" رابعہ نے رضوی صاحب کے گھر کا نمبر ڈائل کرتے ہوئے کہا۔ میں نے باہر اس کے معاون وکیل کے کیبن میں جاکر دوسرے فون کا ریسیور اٹھالیا۔ دونوں کا ایک ہی نمبر تھا چنانچہ میں رابعہ کی اور رضوی صاحب کی گفتگو سن سکتا تھا۔

"رابعہ؟ کیا بات ہے؟ کہاں سے بات کررہی ہو؟" رضوی صاحب نے کہا۔

"اپنے آفس سے انکل!" رابعہ نے خوشدلی سے کہا۔ "اس مکان کی بات کرنی تھی۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن وہ دونوں بدمعاش کہاں ہیں؟" رضوی صاحب نے کہا۔ وہ خاصے پریشان لگتے تھے۔

"آپ کا مطلب ہے محسن اور سکندر؟ وہ دونوں اس وقت بھی میرے ساتھ آفس میں موجود ہیں۔" رابعہ ہنسی۔

"اچھا... لیکن سارا دن وہ کہاں تھے؟" رضوی صاحب نے کہا۔

"دس گیارہ بجے تک ہم گھر پر ہی تھے۔" رابعہ نے اسی سکون اور اطمینان کے ساتھ جواب دیا۔ "محسن گھر سے نکلنے کے بعد بھی میرے ساتھ رہا۔ سکندر نے کہا تھا کہ اس کو پولیس اسٹیشن جانا ہے۔ چراغ دین نام کا کوئی شخص منشیات فروخت کرتے ہوئے پکڑا گیا تھا..."

"کوئی شخص؟" رضوی صاحب نے رابعہ کی بات کاٹ دی۔ "ارے بھئی اس شخص کی شادی پہلے محسن کی بڑی بہن مریم سے ہوئی تھی اور اب اس کی چھوٹی بہن فوزیہ سے طے پائی تھی۔ تمہیں نہیں معلوم؟"

"مریم کے بارے میں تو معلوم تھا۔" رابعہ نے معصومیت سے کہا۔ "فوزیہ کی نسبت کب طے ہوئی؟"

"نسبت طے نہیں ہوئی تھی، بس شادی ہونے والی تھی۔" رضوی صاحب نے خفگی سے کہا۔ "خدا نے بچا لیا۔ وہ تو منشیات کا بہت بڑا اسمگلر ہے۔ اس کے گھر سے لاکھوں کا مال برآمد ہوا ہے۔ میں ابھی شیروانی صاحب سے بات کرتا ہوں لیکن اس بدمعاش نے سکندر کا نام کیوں لیا؟"

"میں تو خود حیران تھی۔" رابعہ نے کہا۔ "کچھ ذاتی دشمنی یا رقابت کا مسئلہ معلوم ہوتا ہے ورنہ آپ بھی جانتے ہیں کہ سکندر آج صبح تو گھر سے نکلا ہی نہیں تھا۔ میں نے اسے جگایا تھا تو وہ سوتے سوتے ہاتھ منہ دھوئے بغیر ناشتہ کرنے آگیا تھا۔"

"مجھے معلوم ہے۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "ایسی باتوں سے سکندر کو کیا نقصان ہوسکتا ہے لیکن تمہاری بات ٹھیک ہے۔ یہ وہی رقابت اور رنجش کا چکر ہے لیکن اس کے باوجود عجیب چکر ہے۔ یہ بدمعاش چراغ دین اچھی طرح جانتا تھا کہ سکندر پہلے ہی انکار کرچکا ہے..."

"لیکن انکل!" رابعہ نے ان کی بات کاٹ دی۔ "فوزیہ نے ابھی خودکشی کی جو کوشش کی تھی، اس کا سبب غالباً یہی انکار تھا۔ اس سے چراغ دین نے تذلیل محسوس کی ہوگی اور اس کے دل میں سکندر کے خلاف..."

"ہاں۔ چھوڑو اس قصے کو۔" رضوی صاحب نے عمداً اس موضوع پر مزید بات کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ "کیا تم نے اس مکان کے سلسلے میں فون کیا تھا؟ کیا سودا ہوگیا؟"

"نہیں انکل!" رابعہ نے کہا۔ "سکندر اور محسن بنک ڈرافٹ لے کر گئے تھے لیکن پارٹی نہیں آئی۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ دھوکے باز تھے۔ اس کے علاوہ ابھی کسی نامعلوم شخص کا فون آیا تھا۔ اس نے کہا کہ ایک دروازہ مقفل ہے۔ اس

کے پیچھے ایک بم رکھا ہے جو تالے میں چابی گھماتے ہی پھٹ جائے گا۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں بتایا۔ کیا آپ چیک کرا سکتے ہیں؟"

"لاحول ولاقوۃ۔ بھئی شہر میں مکانوں کی کمی ہے کیا؟" رضوی صاحب ناراض ہو کے بولے "اور جہاں میں رہتا ہوں وہاں تمہیں کیا تکلیف ہے؟ کیا ضرورت ہے خطرہ مول لینے کی؟"

"انکل! وہ مکان آدھی قیمت پر مل رہا ہے۔" رابعہ نے دبے دبے لہجے میں کہا۔ "اور میرا ارادہ وہاں رہنے کا نہیں ہے۔"

"تو پھر کیا ارادہ ہے؟ پیسہ برباد کرنے کا؟"

"میں اسے ایک ہفتے کے اندر اندر فروخت کر دوں گی۔" رابعہ نے کہا۔ "اور خود سامنے آکر سودا نہیں کروں گی، اس لیے مجھے کوئی خطرہ نہیں۔ آپ کو میرے فائدے کی خاطر بس ایک ہفتہ تک ہی حفاظت کرنی ہے۔"

"اچھا بھئی۔ میں بھیجتا ہوں کسی کو مگر تم اب گھر آجاؤ اور ان دونوں کے ساتھ۔" انہوں نے فون بند کر دیا۔ صاف ظاہر تھا کہ ان کا موڈ خراب ہے لیکن وہ رابعہ کی وجہ سے مجبور ہو گئے ہیں۔ اس گفتگو میں جو میں نے چوری چھپے سنی، میرے لیے خوشی کے دو پہلو تھے۔ ایک یہ کہ چراغ دین منشیات کا اسمگلر ثابت ہو گیا اور دوسرا یہ کہ ابھی تک کسی کو اس معاملے میں میرے ملوث ہونے کا بالکل یقین نہیں۔ لاکھوں کے مال کا حوالہ دے کر رضوی صاحب نے کچھ مبالغے سے کام لیا تھا تو اس کا سبب یہ تھا کہ ابھی تک جو اطلاعات ان کو ملی تھیں وہ سنی سنائی تھیں اور سنانے والوں نے زیب داستان کے لیے ہزاروں کی رقم کو بڑھا کے لاکھوں تک پہنچا دیا تھا۔ میں رابعہ کے آفس کی طرف جا رہا تھا کہ ویٹنگ روم کا دروازہ کھلا اور خسرو جمشید اندر آگیا۔

"بھئی معاف کرنا۔ میاں سکندر بخت!" وہ اپنی پاٹ دار آواز میں بولا۔ "میری گاڑی کا ایک ٹائر فلیٹ ہو گیا تھا لیکن تم نے تو مڑ کے دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔"

"پھر آپ یہاں کیسے آپہنچے؟" میں نے اپنی حیرت پر قابو پا کے وال کلاک کی طرف دیکھا۔ وہ چالیس منٹ بعد آیا تھا۔ ٹائر بدلنے میں دس پندرہ منٹ کی تاخیر تو ممکن تھی مگر چالیس منٹ میں یہ بھی ہو سکتا تھا کہ شوفر نے آقا کو تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کیا ہو اور آقا خود گاڑی لے کر چل پڑا ہو۔ ٹائر کے فلیٹ ہونے کی کہانی صرف درمیانی وقفے کو پورا کرنے کے لیے گھڑی گئی ہو۔

"ایک ٹیلیفون ڈائرکٹری میں نام اور پتہ دیکھنا پڑا۔" خسرو جمشید نے کہا۔ میں نے اس دلیل کو نظر انداز کیا۔ خسرو جمشید کو اپنے ساتھ لے گیا۔ محسن نے یقیناً اس کی بات سن لی تھی اور رابعہ کو ہوشیار کر دیا تھا۔ چنانچہ رابعہ نے حیران ہوئے بغیر بڑے تپاک سے خسرو جمشید کا استقبال کیا۔ "کہاں رہ گئے تھے آپ؟ ہم تو سمجھے گر... " رابعہ نے کہا۔

"بھئی ان کا... میرا مطلب ہے ان کی گاڑی کا ٹائر فلیٹ ہو گیا تھا۔" میں نے محسن کو مطلع کیا۔ تعارف کے بعد مکان کی خرید و فروخت پر... بات شروع ہوئی۔ "خریدار یہ ہیں۔ مس رابعہ ایڈووکیٹ ہائی کورٹ۔"

"آپ کا مکان سکندر بخت صاحب دیکھ چکے ہیں۔" رابعہ نے کہا۔ "اور کاروباری جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔ سچ یہ ہے کہ آپ کا مکان انہیں بہت پسند آیا ہے۔"

"لیکن خریدار آپ ہیں۔" جمشید نے کہا۔ "آپ کو پسند آنا چاہیے۔"

"مجھے ان کی پسند پر اعتماد ہے۔" رابعہ نے کہا۔ "... مختلف نہیں ہو سکتی۔"

"اچھا اچھا۔" جمشید نے معنی خیز طریقے پر مسکرا... ہلا کے کہا۔ "میں سمجھ گیا ہوں۔"

رابعہ کا رنگ ذرا سی دیر کے لیے سرخ پڑ گیا... جلدی سے ہینڈ بیگ کھولا اور بینک ڈرافٹ نکالا... "یہ ڈیڑھ لاکھ تو نقد حاضر ہیں۔" رابعہ نے کہا۔ "باقی رقم... میں سکندر صاحب آپ کو بتا چکے ہیں کہ جیسے ہی میرا... فروخت ہوا۔ آپ کو ادا کر دی جائے گی... لیکن... خیال آیا کہ ایک متبادل صورت بھی ہے۔ جو ممکن ہے... کے لیے قابلِ قبول ہو۔ فرض کیجیے میں وہ پلاٹ... نام کر دوں، آپ فروخت کریں گے تو نقصان میں... رہیں گے اور نہ آپ کو زیادہ انتظار کرنا پڑے گا... جلدی نہیں تو پچاس ہزار زیادہ بھی مل سکتے ہیں لیکن... فروخت نہ کرنا چاہیں تو وہاں رہائشی یا کاروباری... ہو سکتی ہے کیونکہ وہ جگہ ہر اعتبار سے بہت اچھی..."

"آپ کی تجویز بے حد معقول ہے۔" جمشید نے... "یہ پلاٹ کس جگہ ہے اور کتنا بڑا ہے؟"

"اس کا رقبہ دس مرلے ہے۔" رابعہ نے کہا۔ "اور اگر آپ کراؤن سینما سے تھوڑا سا آگے جائیں تو سیدھے ہاتھ پر سڑک کے کنارے ہی واقع ہے۔"

ان کی گفتگو کے درمیان میں بڑے غور سے خسرو جمشید کا جائزہ لے رہا تھا اور اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ میں نے جو مفروضہ قائم کیا تھا، وہ سو فیصد حقیقت بن کر سامنے آگیا ہے۔ پہلے مجھے واقعی شوفر ملا تھا لیکن اب اصل خسرو جمشید میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ شوفر نے غائب ہو کے بڑی عقل مندی کا ثبوت دیا تھا اور مالک فوراً روانہ ہو گیا تھا۔ درمیانی وقفے کو ٹائر فلیٹ ہو جانے کی کہانی سے بڑی ذہانت کے ساتھ پُر کیا گیا تھا مگر اصل اور نقل کا فرق مجھ سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش رائگاں گئی تھی۔ ظاہری حلیے سے دشمنوں کی نظر دھوکا کھا سکتی تھی۔ سامنے بیٹھ کر بات کرنے والا اس فریب کا شکار نہیں ہو سکتا تھا۔ حاکم اور محکوم کے انداز و اطوار کا فرق خود چغلی کھاتا تھا کہ خسرو جمشید کون ہے اور اس کا شوفر کون ہے؟

خسرو جمشید نے کسی تذبذب کے بغیر رابعہ کی تجویز سے اتفاق کیا۔ رابعہ نے کہا کہ اسے یہی امید تھی۔ چنانچہ اس نے جو دستاویزات تیار کی ہیں، وہ اسی تجویز کے مطابق ہیں۔ جمشید نے اعتماد کے اس مظاہرے پر رابعہ کا شکریہ ادا کیا اور اس کے بعد اپنے بریف کیس میں سے مکان کی ملکیت کے کاغذات نکالے، رابعہ نے اور اس کے ماتحت وکیلوں نے ان کا بغور معائنہ کیا اور انہیں ہر لحاظ سے تسلی بخش پایا۔ میں اور محسن خاموش تماشائی بنے سیل ڈیڈ اور سیل ایگریمنٹ پر دستخطوں کی کارروائی کو دیکھتے رہے۔ رات کے گیارہ بجے یہ کارروائی پوری ہو گئی تو خسرو جمشید نے مکان کی چابیاں ہمارے حوالے کیں۔ ہمیں مبارک باد دی اور ہم سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا۔ عدالتی کارروائی کے لیے اس نے صبح گیارہ بجے ڈسٹرکٹ کورٹ میں ملنے کا وعدہ کیا اور جاتے جاتے ہمیں مدعو بھی کر گیا۔

ہم کچھ دیر حیرانی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ خسرو جمشید نہ فراڈ تھا اور نہ یہ نام بوگس تھا۔ تمام دستاویزات کی رو سے خسرو جمشید بلا شرکتِ غیرے اس مکان کا مالک تھا۔ جو اس نے آدھی قیمت پر ہمیں بیچ دیا تھا۔ اس کا رہائشی پتہ ماڈل ٹاؤن کا تھا اور اس کے کارڈ پر دو ٹیلی فون نمبر بھی لکھے ہوئے تھے۔

"ہمارے تو سب اندازے غلط ہو گئے۔" محسن نے بالآخر پہلی بات کہی۔

"غلط ہوئے نہیں ... کر دیے گئے۔" میں نے کہا۔ "اور یہ کوئی نظر ثانی کیا ہوا منصوبہ ہے۔ جال اپنی جگہ موجود ہے اور شکاری بھی نہ مایوس ہیں اور نہ غافل۔ انہوں نے کچھ انتظار کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

"مجھے اب بھی دال میں کالا ہی کالا نظر آرہا ہے۔" محسن بولا۔ "اگر رات زیادہ نہ گزری ہوتی تو میں اسی وقت ماڈل ٹاؤن جا کے دیکھتا کہ یہ پتہ صحیح ہے یا غلط۔"

"پتہ تو ٹھیک ہے۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "مجھے یاد پڑتا ہے کہ قصرِ جمشید بہت عالی شان کوٹھی ہے۔ خصوصاً اس کا باغ سب کو متوجہ کرتا تھا جس میں ہر موسم میں پھول ہی پھول نظر آتے تھے۔ معلوم نہیں اب کیا حال ہے؟"

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو رابعہ نے ریسیور اٹھا لیا۔ "جی، جی ہم آرہے ہیں۔ بس ابھی چند منٹ میں اٹھنے ہی والے تھے۔ دراصل وہ پارٹی یہاں پہنچ گئی اور سودا بھی ہو گیا ...... جی ...؟" اس کی صورت پر حیرانی پھیل گئی۔ اس نے ہمیں ہاتھ سے اشارہ کیا اور ایک منٹ تک صرف سنتی رہی۔ آخر میں اس نے پھر کہا۔ "ہم زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے میں پہنچ جائیں گے۔"

"بڑی دلچسپ خبر ہے حضرات!" رابعہ نے مسکرا کر کہا۔ "رضوی صاحب نے بم ڈسپوزل والوں کو بھیجا تھا۔ وہاں ان کو پولیس نے روکا جو سادہ کپڑوں میں متعین تھے۔ جب انہوں نے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا تو پولیس والے حیران اور پریشان رہ گئے کہ اگر آپ بم ڈسپوزل والے ہیں تو وہ کون تھے جو ابھی کچھ دیر پہلے آئے تھے۔ انہیں تو اندر کچھ بھی نہیں ملا تھا۔"

"اور ظاہر ہے جب اصل لوگ گئے ہوں گے تو انہیں بھی کچھ نہیں ملا ہوگا۔" میں نے کہا۔ "اگر پولیس والے شناختی کارڈ دیکھنے پر اصرار کرتے تو پہلے پہنچنے والے پکڑے جاتے لیکن یہاں مجرموں کو پورا اعتماد ہے کہ پولیس والے ذہانت میں ان کے بالکل برابر نہیں ہیں۔"

"یہ خوب لطیفہ ہے کہ مجرم تو غیر ملکی فلموں سے اور کہانیوں سے پورا استفادہ کرتے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "لیکن وہی فلمیں دیکھ کر پولیس کی کارکردگی کا معیار بہتر نہیں ہوتا۔ جرائم میں جدید ترین وسائل بروئے کار لائے جا رہے ہیں لیکن سراغ رسانی کے لیے نہیں۔"

"میں یہ سوچ رہی ہوں کہ وہ لوگ پہلے کیسے پہنچ گئے؟" رابعہ نے کہا۔ "کس کا ٹیلی فون ٹیپ ہو رہا ہے؟ میرا یا انکل کا؟"

"رضوی صاحب کا ٹیلی فون ٹیپ ہونے کا پتہ ہم ایک بار لگا چکے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "ہو سکتا ہے اسی طرح تمہارا ٹیلی فون بھی ٹیپ ہو رہا ہو۔"

"تو نے اچھا یاد دلایا محسن!" میں نے کہا۔ "میں تو اس چیز کو...

بالکل بھول ہی گیا تھا۔ خیر اَب گھر چل کے بات کریں گے۔ زیادہ دیر ہوئی تو رضوی صاحب کی جھاڑ پڑے گی۔" مجھے ایک نیا خیال آیا تھا لیکن سوچے سمجھے بغیر اور محسن سے مشورہ کیے بغیر میں کوئی قدم اٹھانا نہیں چاہتا تھا اور یہ بات رالعہ کے سامنے بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ رالعہ اپنے خیالات میں مگن تھی۔ ورنہ وہ ضرور پوچھتی کہ میں کس چیز کا ذکر کر رہا ہوں۔

رضوی صاحب کا موڈ اچھا نہیں تھا اور اس کی متعدد وجوہات تھیں۔ ایک معاملہ چراغ دین کا تھا۔ جس کی شادی فوزیہ سے ہونے والی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ فوزیہ کی وجہ سے میں اور محسن اس شادی کے خلاف ہیں۔ خصوصاً میری مخالفت ناقابلِ فہم تھی کیونکہ میں فوزیہ سے شادی کرنے سے بھی انکار کر چکا تھا۔ دوسرا مسئلہ رالعہ کا تھا۔ رالعہ ان کو دلی ہمدردی تھی اور وہ رالعہ کو پسند بھی کرتے تھے لیکن ان کو رالعہ کا میرے ساتھ ہر وقت کا گھومنا پھرنا پسند نہیں تھا۔ وہ میرا ساتھ دینے کی پہلے ہی کافی سزا بھگت چکی تھی۔ مزید یہ کہ وہ ان کے گھر کو چھوڑ کے ہم سب کے ساتھ رہائش اختیار کرنے پر آمادہ تھی۔ جس کا مطلب تھا مزید مصیبت۔ اس کی حیثیت گھر کے ایک معزز فرد سے کم نہیں تھی اور رضوی صاحب کے ساتھ رہ کر وہ زیادہ محفوظ بھی تھی۔ خواہ اندیشہ دشمنوں کا ہو یا رسوائی کا۔ نئے مکان میں منتقل ہونے سے پہلے ہی خطرات کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور تازہ ترین واقعہ جس پر وہ جھنجلاہٹ کا شکار تھے ان کی نگراں فورس کی نااہلی تھی جس کے سبب پولیس کے بم ڈسپوزل والوں سے پہلے نامعلوم افراد اپنا کام کر گئے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ معاملات دن بدن الجھتے جا رہے ہیں۔ اس کے ذمہ دار بھی ہم تھے لیکن رضوی صاحب کو یہ معلوم نہ تھا کہ گھر سے باہر ہماری مصروفیات کیا ہیں اور ہم کیا چکر چلاتے رہتے ہیں۔

ان حالات سے وہ کب تک چشم پوشی کرتے اور برداشت سے کام لیتے۔ ہمارے گھر میں داخل ہوتے ہی انہوں نے پہلا سوال یہ کیا کہ کیا ہم لوگ کھانا کھا کے آئے ہیں؟ اور رالعہ نے کہا کہ انکل ہم تو دفتر میں خسرو جمشید کے ساتھ سر کھپا رہے تھے۔ کھانا کہاں سے کھاتے۔ وہ خاموش ہو گئے اور کھانے کی میز پر ہمارے ساتھ بیٹھے اپنا پائپ پیتے رہے اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے لیکن ان کے ماتھے کی شکنوں کو اور پریشان چہرے کو دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ اعصابی کشیدگی کو کم کرنے اور غصہ پر قابو پانے کی کوشش میں مصروف ہیں تاکہ ہم سے پُرسکون رہ کر بات کر سکیں۔ یہ اندازہ ہم سب کو ہو گیا تھا کہ وہ بعد میں کوئی بات ضرور کریں گے اور بات کا تعلق انہی مسائل سے ہو گا جو اُن کے لیے پریشانی کا سبب بنے ہوئے ہیں۔

"ابھی کچھ دیر پہلے میں نے اسلام آباد فون کیا تھا۔" انہوں نے کھانے کے بعد کہا۔ اس وقت رالعہ برتن سمیٹ کر باورچی خانے کی طرف جا چکی تھی۔ "شیروانی صاحب کو چراغ دین کے بارے میں بتانا تھا۔"

"چراغ دین کے بارے میں آپ کی اطلاع ان کے لیے یقیناً ایٹم بم کا دھماکا ثابت ہوئی ہو گی۔" محسن نے کہا۔

"ہاں ― شیروانی صاحب نے تو حد کر دی کہ میری آواز تک پہچاننے سے انکار کر دیا۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "اور معلوم ہے انہوں نے کیا کہا؟ انہوں نے کہا کہ مجھے بے وقوف بنانا چاہتے ہو۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم آواز بدل کر بول رہے ہو۔ تم اگر محسن نہیں ہو تو سکندر ہو اور تمہارا مقصد مجھے چراغ دین سے بدظن کرنا ہے۔ خیر! میں نے انھیں سمجھایا کہ بھائی عقل سے کام لو۔ میں اپنے گھر سے بات کر رہا ہوں اور وہ نہ جانے کہاں ہیں۔ تمہیں یقین نہیں آتا تو میں فون بند کر دیتا ہوں۔ تم میرے گھر کا نمبر ڈائل کر لو۔ پانچ منٹ بعد شیروانی کا فون آیا تو میں نے اسے بتایا کہ چراغ دین واقعی منشیات کا اسمگلر تھا۔ وہ منشیات کا ایک پیکٹ دے کر پانچ سو روپے لے چکا تھا کہ پولیس نے اسے دھر لیا اور اس کی جیب میں سے وہ رقم بھی برآمد کر لی جس پر ایک پولیس افسر نے دستخط کیے تھے۔ بعد میں خانہ تلاشی کے وقت مجسٹریٹ کی موجودگی میں اس کے گھر میں سے لاکھوں روپے کی ہیروئن اور چرس نکلی۔"

"لاکھوں روپے کی بات آپ نے کیسے کہہ دی؟" میں نے کہا۔ "کیا آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے؟"

"یہ کیسا احمقانہ سوال ہے؟" رضوی صاحب نے ناگواری سے کہا۔ "ارے بھئی! میں ایس ایس پی ہوں۔ مجھے رپورٹ مل جاتی ہے۔ یہ تو معاملہ ہی ایسا تھا کہ میرے پاس محکمہ انسدادِ منشیات کے ایک افسر کا فون آیا۔ اس وقت تک مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ اس نے تمہارے بارے میں پوچھا کہ سکندر نام کا کوئی شخص آپ کے ساتھ رہتا ہے؟ میں نے کہا کہ رہتا ہے۔ وہ بولا کہ آپ کو کچھ معلوم ہے کل رات سے آج صبح سات بجے تک وہ کہاں تھا۔ میں نے کہا۔ گھر پہ تھا اور کہاں تھا۔ کیونکہ سو کے اٹھا تو اس نے میرے ساتھ ہی ناشتہ کیا۔ نو بجے میں آفس کے لیے روانہ ہوا تو تب بھی وہ گھر کے دیگر افراد کے ساتھ ناشتہ کرنے میں مصروف تھا۔ لیکن یہ کیا چکر ہے ― اور تم سکندر کے بارے میں یہ تصدیق کس لیے کر رہے ہو؟ اس نے کہا کہ ابھی صرف تصدیق کرنی تھی۔ اس لیے آپ کو زحمت دی۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ معاملہ ایسا ہے کہ ہم فی الحال اس سے زیادہ کچھ نہیں بتا سکتے۔ اس کے باوجود میں پریشان رہا۔ گھر پہ فون کیا تو معلوم ہوا کہ تم جا چکے ہو۔ دوپہر کے بعد مجھے دوسرے ذرائع سے معلوم ہوا کہ وہ چراغ دین نام کے ایک شخص کو پولیس نے منشیات فروخت کرتے ہوئے پکڑا ہے۔ میں نے متعلقہ تھانے میں فون کیا۔ چھاپہ مارنے والا ایک نوجوان افسر ہے، ایس آئی شیخ۔ ایس آئی اس کے نام کا حصہ ہے اور میں نے سنا تھا کہ وہ بہت جوشیلا، ایماندار اور فرض شناس افسر ہے۔ چنانچہ اس کی دوسروں سے نہیں بنتی۔ اس نے مجھے تفصیلات فراہم کیں کہ چراغ دین کے گھر میں سے تقریباً بیس لاکھ روپے کی ہیروئن برآمد ہوئی ہے اور اس سے آدھی مالیت کی چرس۔"

رالعہ بھی واپس آ چکی تھی اور ہم سب احمقوں کی طرح منہ کھولے بیٹھے تھے۔ "آپ کا مطلب ہے تیس لاکھ کی منشیات اس نے اپنے گھر میں چھپا رکھی تھیں؟" میں نے تھوک نگل کر کہا۔ میرا یہ سوال محسن کے خیالات کی ترجمانی بھی کرتا تھا کہ ہم نے تو بیس ہزار داؤ پہ لگائے تھے۔ پولیس نے تیس لاکھ کا مال کیسے برآمد کر لیا؟

"لیکن ... لیکن یہ سب کچھ ہوا کیسے؟" رالعہ نے کہا۔

"یہ سب اس لڑکے شیخ کا کمال ہے۔" رضوی صاحب نے پائپ کو چوتھی بار سلگایا۔ "چراغ دین نے اس کو ایک لاکھ روپے کی رشوت دے کر بچنے کی کوشش کی تھی مگر اس سے وہ اور پھنس گیا۔ اینٹی کرپشن والوں نے شیخ کی رپورٹ پہ ایک مقدمہ الگ قائم کر دیا ہے۔"

"اتنا مال اس نے گھر میں کہاں چھپا رکھا تھا؟" میں نے اپنی حیرانی پر قابو پا کے کہا۔

"شیخ نے بتایا ہے کہ کچھ مال تو دیواروں میں سے نکلا۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "کپڑوں کی ایک الماری کے پیچھے خفیہ خانہ تھا جس میں سے ایک آدمی اندر داخل ہو گیا۔ دو کمروں کی درمیانی دیوار کی موٹائی کا ایسے کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اب یہ دیوار ہے ...۔" انہوں نے پائپ سے اشارہ کیا۔ "اس میں تمہیں ایک الماری نظر آ رہی ہے اور باقی دیوار صاف ہے۔ اِدھر سے دوسرے کمرے میں جاؤ گے تو یہی نقشہ ملے گا۔ تم غور نہیں کرو گے کہ دیوار کی موٹائی اتنی ہی ہے، جتنی عام طور پر رکھی جاتی ہے یا اس سے زیادہ ہے۔ چراغ دین نے درمیانی دیوار تقریباً ڈیڑھ فٹ چوڑی رکھی تھی جو بالکل اسی طرح نظر آ رہی تھی مگر وارڈ روب کے ساتھ دیوار کا خالی حصہ محض ایک پردہ تھا۔ یوں سمجھ لو کہ دونوں طرف سیمنٹ کی دو انچ موٹی دیوار کھڑی کر دی گئی تھی جو رنگ ہونے کے بعد کمرے کی باقی دیواروں جیسی نظر آتی تھی لیکن بیچ میں تقریباً سوا فٹ کا خلا رہ گیا تھا۔ وہ خانہ کپڑوں کے پیچھے نظر ہی نہیں آتا تھا۔ دیوار کے خلا میں زیادہ تر مال بھرا ہوا تھا۔ کمال کی بات یہ ہے کہ تھوڑا سا مال جو مشکل سے پچیس ہزار کا ہو گا۔ چراغ دین کی پہلی بیوی کے بیڈ روم میں سے بھی نکلا۔"

"مریم باجی کے بیڈ روم میں سے ―؟" محسن نے چونک کر کہا۔

"ہاں ― چراغ دین نے اس کے ذاتی استعمال کا سب سامان مقفل کر دیا تھا اور وہ کمرہ بھی ہمیشہ بند رہتا تھا۔ ظاہر ہے، یہ بھی دھوکا تھا تاکہ کسی کو شک نہ ہو۔ وہاں بھی وہ لاکھوں کا مال رکھتا ہو گا مگر اس وقت صرف یہی بیس پچیس ہزار کا رہ گیا تھا۔"

"یقین نہیں آتا انکل! کہ چراغ دین اتنا بڑا مجرم تھا اور مجھے معلوم نہیں تھا۔" محسن دیوار پہ نظر جما کے بولا۔

"تمہاری طرح تمہارے والدین کو بھی بڑی مشکل سے یقین آیا تھا اور وہ بھی اس لیے کہ اطلاع دینے والا میں تھا۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "ان کی بیگم نے تو رونا دھونا اور دشمنوں کو کوسنا شروع کر دیا تھا۔ جنہوں نے جھوٹا الزام لگا کے چراغ دین کو پھنسا دیا۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ تفتیش کے بعد جھوٹ سچ سامنے آ جائے گا لیکن مجھے یہ کسی کی سازش نہیں لگتی۔ اس پہ انہوں نے ایک عجیب بات کہی۔ انہوں نے کہا کہ خدا غارت کرے سکندر کو اس نے فوزیہ کو کہیں کا نہ رکھا۔ شیروانی صاحب نے ان کو اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنے دیا اور فون بند کر دیا۔"

خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا۔ جس میں ہم سب ایک دوسرے سے نظر چرانے کی اور اپنے پریشان کن خیالات سے بچنے کی بے سود کوشش کرتے رہے۔ میری اور محسن کی سوچ ایک ہی تھی۔ ہم اس غیر متوقع کامیابی کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے، بے شک ہم نے چراغ دین کو سزا دلوانے کے لیے سازش کی تھی مگر ہم سے پہلے قدرت اس کو سزا دینے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ اس کے نامۂ اعمال میں وہ سب جرائم بھی شامل تھے جو اس نے تدبیر پر تکیہ کرتے ہوئے کیے اور تقدیر کو نظر انداز کیا۔ یہ بھول گیا کہ ہر شخص کے لیے زندگی میں خوش بختی کا، خوشیوں اور کامیابیوں کا ایک کوٹہ ہے۔ جو اعمال کے تناسب سے کہیں زیادہ ہے تو کہیں کم۔ اور زیادہ خرچ کرنے سے یہ کوٹہ ختم ہو جاتا ہے تو مقدر میں صرف دُکھ، محرومی اور ناکامی رہ جاتی ہے۔ اس نے میرے والد کی دولت میں سے غبن کیا تھا اور سزا نہ پا کے یہ سمجھا تھا کہ خوش قسمتی اس کے ساتھ ہے اس کے بعد بھی وہ اسی خوش قسمتی پر بھروسہ کرتے ہوئے آگے بڑھتا گیا، ترقی کرتا رہا اور دولت مند بن گیا۔ یہاں تک

کہ وہ دن طلوع ہوا جب اس کے پاس خوش قسمتی کے خزانے میں ایک تنکا بھی نہ رہا جو اسے ڈوبتے وقت سہارا دے سکتا اور یک لخت وہ بدبختی کے دشمن اندھیرے میں تنہا محصور ہو گیا۔ وقت کی بساط پر دستِ قدرت نے ہمیں صرف ایک پیادے کی طرح آگے بڑھایا تھا اور شاطر چراغ دین کو مات ہو گئی۔ جو کچھ ہم نے کیا وہ بہانہ بن گیا ورنہ چراغ دین کے انجام کا فیصلہ تو ہو چکا تھا۔ ہماری جگہ کوئی اور بھی ایک چنگاری پھینک کر چراغ دین کی دنیا کو نیست و نابود کرسکتا تھا لیکن قدرت نے یہ موقع مجھے اور محسن کو اس لیے فراہم کیا کہ ہم ہی مردم گزیدہ تھے اور چراغ دین کے معاملے میں انصاف کے طالب تھے ـــــ

رابعہ شاید فوزیہ کے بارے میں سوچ رہی تھی اور خود بھی احساسِ جرم و پشیمانی کا شکار تھی۔ فوزیہ کی ماں نے جذباتی بحران کی کیفیت میں کہہ دیا تھا کہ میں نے فوزیہ کو کہیں کا نہیں رکھا۔ رابعہ کو یہ خیال ضرور آیا ہوگا کہ اس جرم میں وہ بھی برابر کی شریک ہے اگر اس نے مجھ سے اپنی جذباتی وابستگی کا اظہار نہ کیا ہوتا اور مجھ سے تعلقات کو کاروباری معاملات تک محدود رکھا ہوتا تو میرے اور فوزیہ کے درمیان فاصلے کی کوئی خلیج نہ ہوتی۔

"چراغ دین کی گرفتاری پر مجھے حیرانی نہیں ہوئی۔" رضوی صاحب نے بالآخر سکوت توڑا۔ "مجھے اس کے بارے میں زیادہ علم نہیں تھا ـــ لیکن جس بات نے مجھے حیران کیا، اسے اتفاق پر مبنی نہیں سمجھا جا سکتا۔ سب سے پہلے تو خود چراغ دین نے سکندر کا نام لیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ میری معلومات کی حد تک اس نے جھوٹ بولا۔ پھر یہی بات مسز شیروانی نے کہی ـــ اور چند منٹ پہلے شیروانی صاحب نے بھی اتنا ضرور کہا تھا کہ تم انھیں چراغ دین سے بدظن کرنے کے لیے جھوٹ بول رہے ہو۔"

"اس کی وجہ بالکل صاف ظاہر ہے۔" میں نے ہمت سے کام لے کر ہر شخص کے سامنے سچ کے زہر کا پیالا رکھنے کا فیصلہ کرلیا۔ "میری منگنی بچپن ہی سے طے کردی گئی تھی۔ اس کا احساس ہمیں نہ دلایا جاتا تو اچھا تھا لیکن ہمارے بزرگ مطمئن تھے کہ انھوں نے غلط فیصلہ نہیں کیا۔ انہیں ہم سے نافرمانی کی امید بھی نہیں تھی چنانچہ انھوں نے اس فیصلے کو پوشیدہ رکھنا ضروری نہیں سمجھا۔ اس کا نتیجہ ایک جذباتی تعلق کی صورت میں نکلا جو میرے اور فوزیہ کے درمیان شروع سے رہا۔ میں اس کو محبت نہیں کہوں گا، اُنس کہوں گا۔ حد سے زیادہ اُنس۔ اتنا ہی جتنا مجھے اب محسن سے ہے یا اپنے والد سے تھا۔ اس وقت تک مجھے محبت کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ میرے جذبات نے اُنس کو محبت سمجھ لیا تو اس میں کچھ قصور کم عمری کے

خیالات کا تو کچھ حالات کا بھی ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ فوزیہ مجھے پسند نہیں ہے۔ وہ ہر لحاظ سے بہت اچھی لڑکی ہے اور محبت کرنے کے قابل لیکن اس شخص کے لیے جسے فوزیہ سے محبت ہو جائے۔ یہ دقیانوسی فلسفہ آج بھی غلط نہیں ہے کہ محبت ہو جاتی ہے کی نہیں جاسکتی۔ وہ شخص بہت خوش قسمت ہوگا جسے فوزیہ جیسی بیوی ملے گی لیکن میں خود کو دلائل سے قائل نہیں کرسکتا کہ میں کسی اور کو کیوں چاہتا ہوں اور میں فوزیہ کو تمام عمر محبت کے فریب میں خوش رکھنے کی قسم بھی نہیں کھا سکتا اس لیے میں نے سب کو سچ بول کے ناراض کرلیا ہے۔ حالانکہ میں نے صرف فوزیہ سے شادی کرنے سے انکار کیا ہے۔ میں اس کی خوشیوں کا دشمن نہیں ہو گیا ہوں۔ آج بھی اگر کوئی اسے زندگی کی کسی خوشی سے محروم کرنے کی کوشش کرے تو میں اسے معاف نہیں کروں گا۔"

"فوزیہ نے چراغ دین کے ساتھ شادی سے انکار کر دیا تھا۔" رضوی صاحب نے پائپ کو خالی کرکے کہا۔ "آخر کیوں؟ اسے یہ ڈر کیوں تھا کہ چراغ دین کے ساتھ وہ خوش نہیں رہ سکے گی؟ خوف کا یہ احساس اس کے دل میں کس نے پیدا کیا؟ تم اور محسن اس معاملے میں چراغ دین کے دشمن تھے لیکن....." انھوں نے پائپ کی ڈنڈی کو میری طرف انگلی کی طرح اٹھا کے کہا۔ "تمہاری دشمنی کی جڑیں زیادہ گہری تھیں۔ اس دشمنی کا فوزیہ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔"

"کیا آپ یقین کرنا چاہتے ہیں کہ واقعی میں نے چراغ دین کے خلاف سازش کی ہے؟" میں نے کہا۔

"اے..... اگر تیس لاکھ کا معاملہ نہ ہوتا تو میں یقین کرنے پر مجبور ہو جاتا کہ تم نے انتقامی کارروائی کی ہے۔" رضوی صاحب نے دوبارہ پائپ میں تمباکو بھرنا شروع کیا۔ "کیس صرف مریم کے کمرے سے بیس پچیس ہزار کی چرس برآمد ہونے کا ہوتا تو شاید میں بھی سمجھتا کہ تم نے سازش کی ہے۔ تمہارا ذہن سازشی ہے ـــ یہ میں بُرے معنی میں نہیں کہہ رہا ہوں۔ میں تمہاری منفی ذہانت ـــ غالباً اس کو منفی بھی نہیں کہا جاسکتا۔ تم ذہین ہو لیکن تمہاری ذہانت کسی تعمیری مقصد کے لیے استعمال نہیں ہو رہی ہے۔ تم اپنا دفاع بھی کر رہے ہو اور ایک ایسی قانونی جنگ لڑ رہے ہو جس میں مدعی بھی تم ہو اور منصف بھی۔ تم وکیلِ استغاثہ کی حیثیت سے اپنے آپ کو دلائل دیتے ہو، فیصلہ سناتے ہو اور اس پر عمل درآمد بھی کرتے ہو۔ گویا تم نے پولیس سے لے کر عدالت اور جیلر

ہم سب کی ذمہ داری قبول کرلی ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"جی نہیں ـــ آپ کی رائے میرے حالات کا بڑا صحیح تجزیہ کرتی ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن یہ سب کچھ مجھے اس لیے کرنا پڑ رہا ہے کہ آپ کی پولیس مجھے تحفظ فراہم نہیں کرسکتی۔ آپ کا نظامِ انصاف کبھی مجرموں پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ کسی قاتل کو تختۂ دار تک نہیں پہنچا سکتا۔ آپ کیا چاہتے ہیں؟ میں بھی اسی طرح ذلت و رسوائی اور بے بسی کی موت مر جاؤں جو میرے والد کا مقدر ہوئی تھی؟ آپ سب حالات سے باخبر ہونے کے باوجود مجھ سے توقع رکھتے ہیں....."

"میں تم سے کوئی توقع نہیں رکھتا۔" رضوی صاحب نے میری بات کاٹ دی۔ "میں چاہتا ہوں کہ تم انتقام کے چکر میں نہ پڑو۔ معاف کردینے میں بڑائی ہے اور فلاح ہے۔"

"لیکن انکل صرف چاہنے سے تو کچھ نہیں ہوتا۔" میں نے کہا۔ "میں کسے معاف اور کیسے معاف کروں؟ کیا کسی نے مجھے یہ موقع فراہم کیا ہے؟ یہ کہا ہے کہ سکندر جو ہوا ہے اسے بھول جاؤ؟ میں خود بھی عام آدمی کی طرح سکون سے جینا اور مرنا چاہتا ہوں مگر کوئی اس کی اجازت بھی تو دے ـــ میری جدوجہد کا مقصد اور کیا ہے؟"

"مگر اس جدوجہد سے حاصل کیا ہو رہا ہے؟" رضوی صاحب نے برہمی سے کہا۔ "ہر روز ایک نئی پریشانی۔ ہر قدم پر اک نئی الجھن مثلاً یہ بتاؤ کہ جس روز رابعہ کی امی کا جنازہ اٹھنے والا تھا، تم نے اسی گھر میں ایک شخص کو یرغمالی کیوں بنا رکھا تھا؟ تم نے اسے پولیس کے حوالے کیوں نہیں کیا تھا؟ تم پھر وہی عدم اعتماد کی بات کروگے لیکن تم مجھ پر تو اعتماد کرسکتے تھے اور اگر یہ بھی ناممکن تھا تو صورتِ حالات کو دیکھتے ہوئے اس وقت خاموشی سے اسے چھوڑ سکتے تھے۔ تمہارے ہیرو بننے کی سزا کسے ملی؟ رابعہ کا گھر تباہ ہو گیا اور اب تم پھر وہی حماقت کر رہے ہو؟" وہ اچانک رابعہ سے مخاطب ہو گئے۔ "مس رابعہ فاری ایڈووکیٹ! اس وقت آپ کو ایک ایسا مکان خریدنے کا مشورہ کس عقل مند نے دیا ہے جس کے بارے میں آپ کو پہلے سے معلوم ہو چکا ہے کہ آپ کا وہاں خیریت سے رہنا ناممکن ہے۔ آپ کے وہاں جانے سے قبل ہی اس مکان میں بم رکھنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہاں آپ محفوظ تھیں، آپ کو کوئی تکلیف نہیں تھی۔ پھر اس حماقت کا مقصد تو صرف یہی ہوا نا کہ آپ سکندر کے دشمنوں کو بے وقوف بنانا چاہتی ہیں۔ آپ سامنے آئے بغیر اسے دو ڈھائی لاکھ کے منافع میں بیچنے میں

تو کامیاب ہو جائیں گی لیکن کیا اس سے آپ دشمنوں کے عزائم خاک میں ملادیں گی؟ دو ڈھائی لاکھ کا گھاٹا کھا کے وہ خاموش بیٹھ جائیں گے؟ آپ کی ذہانت اور سکندرِ اعظم کی جرأت سے شکست کھا جائیں گے؟ آپ سکندر کے ساتھ ایک ہی محاذ پر لڑ رہی ہیں۔ اس کے شانہ بشانہ قدم سے قدم ملا کے۔ فرق صرف یہی ہے کہ آپ قانونی طریقوں سے لڑ رہی ہیں اور سکندر کے طریقے غیر قانونی ہیں۔ آپ کو انجام کی فکر نہیں لیکن دوسری طرف آپ نے اور سکندر نے شادی کا فیصلہ بھی کرلیا ہے ـــ شادی کے معاملے میں آپ مجھے قدامت پرست سمجھ لیں یا جاہل لیکن میں اس چیز کو بالکل پسند نہیں کرتا، میرا مطلب ہے کہ آپ سب کی مشترکہ سرگرمیوں کو ـــ میں آپ سب پر اعتماد کرتا ہوں اور اس اعتماد کی شکست سے ڈرتا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ آپ لوگ باہر کیا گل کھلاتے پھرتے ہیں لیکن اب میں نے حالات سے باخبر رہنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ مجھے ہر روز آپ لوگوں کی نقل و حرکت کی رپورٹ ملنی چاہیے اور اس کا انتظام بھی کرلیا ہے۔" وہ ہم سب کو خاموش اور ساکت و صامت چھوڑ کے باہر نکل گئے۔

"میرا خیال ہے کہ اس وقت ہمیں سکون سے سوچنا چاہیے۔" رابعہ نے فوراً کہا۔ "صبح تک رضوی صاحب کا غصہ بھی ٹھنڈا پڑ جائے گا اور ہم بھی ٹھنڈے دماغ سے سوچ سکیں گے کہ اب کیا کرنا چاہیے۔"

رات بہت ہو چکی تھی اور ہم میں سے کوئی بھی بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ میں نے اور محسن نے گزشتہ رات بھی جاگ کے گزاری تھی۔ وہ تو پڑتے ہی سو گیا۔ کہتے ہیں کہ نیند خیالات سے فرار کا راستہ ہے۔ یہ راستہ نہ ملے تو آدمی پاگل ہو جاتا ہے۔ نیند کے خواب، خیالات کا دباؤ کم کرتے ہیں اور سیفٹی والو کا کام کرتے ہیں۔ سیفٹی والو نہ ہو تو پریشر مضبوط سے مضبوط بوائلر کی دیواروں کو پھاڑ دیتا ہے۔ میں خود بھی نیند کی پناہ چاہتا تھا لیکن مجھے رات کی تاریکی میں ایک کام کرنا تھا جو دن کے اجالے میں نہیں کیا جا سکتا تھا۔ دس منٹ تک میں نیند کی یلغار کو آنکھیں کھولے روکتا رہا۔ پھر میں خاموشی سے اٹھا اور سرونٹ کوارٹر کے عقبی حصے میں پہنچ کے ایک جگہ سے زمین کھودنے لگا۔

اپنے اندازے کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے بالکل صحیح جگہ کا انتخاب کیا تھا۔ پندرہ منٹ بعد میں نے سیلوفین میں لپٹا ہوا پیکٹ برآمد کیا اور اس میں سے وہ چھوٹا سا ریڈیو ٹرانسمیٹر نکال

لیا جو رضوی صاحب کے ٹیلی فون ٹیپ کرنے کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔ دبے پاؤں واپس آکے میں نے ہاتھ دھوئے اور ریڈیو ٹرانسمیٹر کو سرہانے کی طرف بستر کے نیچے رکھ کر سو گیا۔ تھکن سے میری حالت اتنی غیر ہو رہی تھی کہ بستر پر گرتے ہی میری آنکھیں بند ہو گئیں اور میں ایسی گہری نیند میں گم ہو گیا جسے بےہوشی کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ صبح نو بجے بھی میں اس وقت جاگا جب محسن نے میرے اوپر پانی سے بھری ہوئی بالٹی الٹ دی۔

"یہ کیا بدمعاشی ہے؟" میں نے ہڑبڑا کر اٹھتے ہوئے کہا۔

"اٹھیے حضورِ والا! سیلاب آگیا ہے۔" محسن نے کہا۔ پھر وہ اور رابعہ میری حالت دیکھ کر بے اختیار ہنسنے لگے۔

"سیلاب؟ کیسا سیلاب؟ سیلابِ بلا؟" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد؟ اگر میں ڈوب جاتا تو کیا ہوتا؟"

"ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا؟" محسن بولا اور داد طلب نظروں سے رابعہ کو دیکھنے لگا۔

"ہوتا یہ کہ — ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے۔" میں نے تولیہ اٹھا کے باتھ روم کا رخ کیا اور ان دونوں کے ہنسنے کی پروا نہیں کی۔ جب میں نہا دھو کے اور کپڑے بدل کے باہر آیا تو رابعہ میرے گیلے بستر کو کوارٹر کی دیوار پر دھوپ میں ڈال چکی تھی اور محسن ریڈیو ٹرانسمیٹر کا معائنہ کر رہا تھا۔

"چلا گیا اس میں بھی پانی؟" میں نے کہا۔ "اب اس ڈبے کو پھینک دے۔"

"ڈبا بالکل ٹھیک ہے۔" محسن نے کہا۔ "لیکن اس وقت گڑے مردے کو اکھاڑنے کا مقصد کیا ہے؟"

"مقصد بہت نیک ہے اور آج شام تک واضح ہو جائے گا۔" میں نے جواب دیا۔

"رضوی صاحب پہلے ہی بہت خفا ہیں۔" رابعہ نے کہا۔ "وہ بتا چکے ہیں کہ آئندہ ہماری نقل و حرکت کی نگرانی ہوگی۔ خدا کے لیے کوئی نیا ہنگامہ کھڑا مت کرنا۔"

"زندگی ایک مسلسل ہنگامہ ہے۔" میں نے کسی فلسفی کی طرح کہا۔ "اسی لیے چچا مرحوم نے کہا تھا ع ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق۔ جب ہم یہاں سے چلے جائیں گے تو رضوی صاحب کو احساس ہوگا کہ ہمارے دم سے یہاں کتنی رونق تھی۔ باقی رہی نگرانی کی بات تو اس سے کیا ڈرنا۔

ہم ایسے غائب ہوں گے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔"

"پھر بھی رہیں گے تو اسی شہر میں۔" رابعہ نے کہا۔

"اور یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ ہم شہلا کی طرح روپوش ہو کر گھر میں نہیں بیٹھ سکتے۔ مجھے اور تمہیں اپنے اپنے مقدمات کے سلسلے میں حاضر ہونا ہی پڑے گا۔ میں تو آفس اٹھا بھی چھوڑ سکتی ہوں مگر تمہارے لیے تاریخِ سماعت پر غیر حاضر ہونا ناممکن ہے۔ تمہاری ضمانت منسوخ ہو جائے گی۔"

"ہو سکتا ہے کل میں خود بھی اپنی حفاظت کے لیے ضمانت کی منسوخی کا طریقہ اختیار کروں۔" میں نے کہا۔ "پھر جو ہوگا لیکن آج مجھے اور تمہیں بہت سے کام نمٹانے ہیں۔ تمہیں کورٹ جا کر خسرو جمشید سے ملنا ہے اور مکان کی بکری وغیرہ کے قانونی معاملات طے کرنے ہیں۔ محسن کو یہ دیکھنا ہے کہ شہلا کے پرانے گھر میں سے سامان نکالنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔ پھر اگر ممکن ہو تو محسن آج شام تک کسی بھی وقت شہلا کی ماں کے پاس جائے اور اسے عدنان کا کوئی خط پڑھ کر سنائے تاکہ اسے کچھ قرار آ جائے۔ خط کا کیا ہے محسن چند منٹ میں لکھ لے گا۔ خط کے ساتھ بیٹے کی طرف سے ماں کو پانچ سو روپے بھی پہنچا دیے جائیں تو وہ بہت خوش ہوگی۔"

"لیکن ہم اسے کب تک ان جھوٹی خوشیوں سے بہلاتے رہیں گے؟" رابعہ نے اداسی سے کہا۔

"جب تک یہ ہمارے اختیار میں ہے۔" میں نے کہا۔ "ابھی سے سچ کا زہر دے کر مارنے سے کیا فائدہ؟ جھوٹی اگر ہیں تو ہمارے نقطۂ نظر سے۔ اس کے لیے ہر خوشی سچی ہوگی اور جب تک وہ جیے گی ان سچی خوشیوں کو جمع کرتی رہے گی لیکن میرا خیال ہے وہ زیادہ دن نہیں جیے گی۔"

"تو نے ابھی تک اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا ہے۔" محسن نے کہا۔ "تو کس محاذ پر ہوگا؟"

"میں ابھی کچھ دیر بعد شہلا کے پاس جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "اور پھر تمہیں وہیں ملوں گا۔ اگر نہ ملوں تو میرا انتظار کرنا۔ بالفرضِ محال انکل رضوی نے کسی کو ہماری نگرانی پر مامور کیا ہوگا تو وہ کس کے پیچھے جائے گا؟ ہم تینوں مختلف اوقات میں روانہ ہوں گے۔ ہماری منزلیں اور راستے جدا ہوں گے۔ میرا اندازہ ہے کہ رابعہ کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اگر تجھے کوئی اپنے تعاقب میں نظر آئے جو صورت سے پولیس کا آدمی لگتا ہو تو غچہ دے کر اپنی جان چھڑا لینا۔ میں خود بھی یہی کروں گا۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔"

ناشتہ کرتے ہوئے ہم نے اخبارات دیکھے اور ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب چراغ دین کے متعلق رضوی صاحب کی فراہم کردہ معلومات سو فیصد درست ثابت ہوئیں۔ اس کے گھر میں سے واقعی لاکھوں کا مال برآمد ہوا تھا۔ ہم اسے ایک سازش کر کے منشیات کا اسمگلر ثابت کرنا چاہتے تھے اور یہ بات ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ چراغ دین واقعی اسمگلر ہے۔ قدرت پہلے ہی اسے سزا دینے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ ہم تو محض ایک ذریعہ بن گئے تھے۔ پولیس کے ذرائع کے مطابق ملزم چراغ دین نے بہت سی باتوں کا اعتراف کر لیا تھا۔ مثلاً یہ کہ جب وہ پلاسٹک کے کھلونے بناتا تھا تو ان کھلونوں میں منشیات باہر بھیجتا تھا اور اس کا طریقہ کار بہت محفوظ تھا۔ وہ سینکڑوں میں سے ایک کھلونا اس مقصد کے لیے استعمال کرتا تھا اور چیکنگ کے دوران ایک کھلونے کے پکڑے جانے کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے لیکن اس کا ایک کاروباری شریک دشمن ہو گیا تو چراغ دین نے یہ فیکٹری بھی بند کر دی اور ایک جنرل اسٹور کھول لیا۔ خبر میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ تلاشی کے دوران چراغ دین کے گھر سے تین ٹبس ایسے ملے تھے جو دیکھنے میں صابن یا ٹوتھ پیسٹ سے بھرے ہوئے نظر آتے تھے لیکن ان میں نیچے منشیات کی خاصی بڑی مقدار موجود تھی۔ "خاصی بڑی مقدار" والی بات پولیس نے یا پھر اخبار والوں نے زیبِ داستاں کے لیے گھڑی تھی ورنہ ہم بھی جانتے تھے کہ وہ مقدار کچھ بھی نہیں۔ خصوصاً منشیات کی اسمگلنگ کرنے والوں کے نقطۂ نظر سے — اخبار میں یہ بھی تھا کہ ابھی تفتیش جاری ہے اور پولیس کچھ ناموں کو صیغۂ راز میں رکھ رہی ہے اور مزید سنسنی خیز انکشافات کی توقع ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ خبر تقریباً ہر بڑے اخبار میں صفحۂ اول پر چراغ دین کی تصویر کے ساتھ موجود تھی۔

بہت عرصے بعد یہ پہلی خبر تھی جو میرے دل کے لیے تسکین کا سامان بنی۔ کل تک جو شکاری تھا وہ آج شکار ہو چکا تھا اور اس پہلی کامیابی نے میرے عزم و حوصلے کو دو چند کر دیا تھا۔ ہم ابھی اس موضوع پر گفتگو کر رہے تھے کہ اسلام آباد سے محسن کے والد کی ٹیلی فون کال موصول ہوئی۔ اتفاق سے رابعہ نے ریسیور اٹھایا اور ہم نے اسے اشارے سے سمجھا دیا کہ شیروانی صاحب ہمارے بارے میں پوچھیں تو کہہ دے کہ ہم دونوں موجود نہیں ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ شیروانی صاحب نے کھل کے رابعہ سے بات کی۔ شیروانی صاحب بہت خوش تھے کہ چراغ دین کی گرفتاری سے اس کی شخصیت بروقت بے نقاب ہو گئی اور فوزیہ کی زندگی تباہ ہونے سے بچ گئی۔ فوزیہ نے اس خبر سے کوئی خاص تاثر قبول نہیں کیا تھا لیکن اس کی ماں کا صدمے سے برا حال تھا کہ خدانخواستہ یہ شادی ہو جاتی تو ان کی کتنی بدنامی ہوتی اور مریم کی ناگہانی موت کے بعد فوزیہ پر ان کی زبردستی کے باعث کوئی آفت پڑ جاتی تو وہ جیتے جی مر جاتیں۔ یہ بات بھی باعثِ اطمینان تھی کہ ہمارے بارے میں محسن کے والدین کے خیالات میں بڑی خوشگوار تبدیلی آئی تھی۔ انہوں نے تسلیم کر لیا تھا کہ میری اور محسن کی چراغ دین سے کوئی ذاتی عداوت نہیں تھی اور ہم فوزیہ سے اس کے رشتے کی مخالفت کر رہے تھے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ ہم کو اصل حالات کا علم تھا لیکن کسی مجبوری کی بنا پر ہم اصل حقائق بیان کرنے سے گریز کرتے تھے — مجموعی طور پر میری کوشش کا نتیجہ میری خواہشات کے مطابق رہا تھا۔ چراغ دین بالآخر قانون کی گرفت میں آ گیا تھا اور جس منزل سے وہ پہلے محفوظ رہا تھا وہ اب اس کا مقدر ہو چکی تھی۔ اس نے میرے والد کے اعتماد سے ناجائز فائدہ اٹھایا تھا اور اس کو بھی مجھ پر اعتماد کرنا بہت مہنگا پڑا تھا۔ چراغ دین نے میرے والد کو ذلت کا عذاب سہنے پر مجبور کیا تھا اور اب خود بھی عذاب میں مبتلا تھا۔ اس نے جتنا غبن کیا تھا اس میں حرام کی کمائی سے ہزار گنا اضافہ کر لیا تھا لیکن اب اس کے پاس کچھ نہیں رہا تھا اور اس طرح برسوں بعد انصاف کے تقاضے پورے ہو گئے تھے۔ چراغ دین کی دنیاوی عزت اور وقتی کامیابی سے حاصل ہونے والی دولت کا غرور خاک میں مل گئے تھے۔ فوزیہ کی زندگی بچ گئی تھی اور میرے ساتھ محسن کو بھی تمام تفکرات سے اور سب اندیشوں سے نجات مل گئی تھی جو فوزیہ کی ذات سے وابستہ تھے۔

رابعہ کے کورٹ چلے جانے کے بعد میں نے محسن کو اپنے عزائم سے آگاہ کیا۔

"تو نے ڈی سلوا کو ختم کر دینے کا فیصلہ کر لیا ہے؟" محسن بولا۔ "میں اس سے اتفاق نہیں کر سکتا۔ ہمیں جو کچھ کرنا ہے قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے اس طرح کرنا ہے کہ اس سے قانون کی راہ میں حائل دشواریاں دور ہو جائیں اور انصاف ہو سکے۔ مجرموں کو سزا مل جائے جنہوں نے اپنے چالاک ذہن کی مدد سے اپنے جرم کا کوئی سراغ نہیں چھوڑا ہے۔ ہمیں اپنا حق حاصل کرنا ہے اور انصاف حاصل کرنا ہے اور ظالموں کو بتانا ہے کہ ہم بھی لڑنے کا حوصلہ رکھتے

ہیں مگر مجرم نہیں بننا ہے۔"

"یہی میرا نظریہ بھی ہے۔" میں نے کہا۔ "میں بھی صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہم بزدل نہیں ہیں۔ ہم نے ہاتھوں میں چوڑیاں نہیں پہن رکھی ہیں اور ہم طاقت میں بھی کم نہیں۔ چراغ دین کو جیل پہنچنا تھا، ہم نے اسے جیل پہنچا دیا اور اسے جو سزا ملے گی اتنی ہی ہوگی جس کا وہ مستحق تھا۔ قتل کرنا کیا مشکل ہے، میں ان سب کو ٹھکانے لگا سکتا ہوں جن کو مجرم سمجھتا ہوں لیکن اس طرح میں خود بھی مجرم کہلاؤں گا۔ میں قانون کو اپنے ہاتھ میں نہیں لوں گا لیکن قانون کے ہاتھ اتنے مضبوط ضرور کر دوں گا کہ ہر مجرم کی گردن تک پہنچ سکیں۔ اگر میں نے شروع ہی سے کمزوری کا مظاہرہ کیا ہوتا تو دشمن اپنے ناپاک ارادوں میں کامیاب ہو جاتے اور ان کی مجرمانہ سرگرمیاں جاری رہتیں۔ اگر میں ضمیر فروش ہوتا تو اس وقت لندن میں عیش کر رہا ہوتا لیکن میں عہد کر چکا ہوں کہ ظالموں سے ظلم کے ایک ایک لمحے کا حساب لوں گا اور اپنے حق سے دست برداری کبھی قبول نہیں کروں گا خواہ اس میں میری جان ہی چلی جائے۔"

"لیکن تو نے جو انتظام کیا ہے اس میں ڈی سلوا کے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔" محسن بولا۔

"اس نے بھی میرے بچنے کی کوئی صورت نہیں چھوڑی تھی۔" میں نے کہا۔ "لیکن جس طرح میں بچ کر نکل آیا تھا اگر بچ سکا تو وہ بھی نکل آئے گا۔ مقصد تو اس کو یہ احساس دلانا ہے کہ ہم بھی اپنی طاقت اور وسائل کے اعتبار سے کم نہیں اور برابر کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اس کا یہ غرور ختم ہو جانا چاہیے کہ وہ جب چاہے ہمیں حقیر کیڑے کی طرح مار سکتا ہے اور یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اس کھیل میں زندگی اور موت کے امکانات دونوں فریقوں کے لیے برابر ہیں۔ شکاری اگر وہ ہے تو ہم بھی ہیں اور کسی طرح بھی اس سے کم نہیں ہیں۔ اب ہمیں چلنا چاہیے۔"

"میں تجھے اکیلا نہیں چھوڑوں گا۔" محسن نے کہا۔ "شہلا کے پرانے گھر سے سامان نکالنے کا مسئلہ اتنا اہم یا مشکل نہیں، ہم دونوں وہاں جا کے یہ کام کل بھی کر سکتے ہیں۔ زیادہ خطرناک کام وہ ہے جو تو اکیلے کرنا چاہتا ہے۔"

"جیسی تیری مرضی۔" میں نے کہا۔ "اصل کام تو شہلا کا ہے جو زیادہ مشکل نہیں ہے۔ اگر وہ ہماری ہدایات کے مطابق ڈی سلوا سے رابطہ قائم کرنے میں کامیاب ہو گئی تو باقی کام میں سنبھال لوں گا۔"

"تو بہت سے خطرات کو نظر انداز کر رہا ہے۔" ... نے کہا۔ "احتیاط اچھی چیز ہے۔ میں دور رہ کر نگرانی ... سکتا ہوں اور کوئی غیر متوقع بات ہو تو مدد کے لیے ... پہنچ سکتا ہوں۔"

دوپہر کے قریب ہم شہلا کے پاس پہنچے۔ محسن ... چند سطروں پر مشتمل ایک خط تحریر کر لیا تھا۔ عذرا کی ... ماں اگر اندھی نہ ہوتی تو یقیناً اس جعلسازی کو پکڑ ... تحریر اس کے بیٹے کی نہیں ہے مگر اس نے محسن کی ... پر اعتبار کیا اور اس خط کے مضمون کو کئی بار سنا۔ اس کی ... صورت پر مسرت اور اطمینان کے جذبات اور ... روشنی دیکھ کر محسن کے احساسِ جرم و پشیمانی میں اضافہ ... ہو گیا تھا۔ وہ پانچ سو روپے اس طرح لیے بیٹھی ... ولایت سے اس کے بیٹے نے ماں کے نام ... کے پانچ سال ارسال کر دیے ہوں۔ یہ احساس کی ... دولت تھی۔ تقدیر کا یہ ستم بھی عنایت سے کم ... کہ آنکھوں کی روشنی نہ رہی۔ اب وہ صرف چشمِ تصور ... سے دیکھ رہی تھی کہ بیٹا لندن میں خوشحال ہے اور ... ہے۔ آنکھیں ہوتیں تو صرف وہ قبر دیکھتیں جس میں ... کی جگہ صرف اس کی ہڈیاں رہ گئی تھیں۔

دوسرے کمرے میں میں نے شہلا سے بات کی۔ "... تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے۔" میں نے کہا۔ "میں تمہیں اپنے ساتھ آفس لے جاؤں گا۔"

وہ چونک پڑی۔ "کون سے آفس؟" اس نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

اس کا خوف دور کرنے کے لیے میں ہنس پڑا۔ "... وہی آفس جہاں تم ڈی سلوا صاحب کی وفادار ... گزار سیکرٹری تھیں۔"

شہلا کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ "اگر یہ مذاق ہے ... میں سمجھ نہیں سکی۔"

"یہ مذاق ہرگز نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "تم میرے ساتھ جاؤ گی۔ آفس کے دروازے تک میں تمہارا ... دوں گا لیکن اندر تم کو اکیلے ہی جانا ہوگا۔ نیچے ... تمہاری واپسی کا منتظر رہوں گا۔ دفتر میں تمہارے لیے خطرے ... کی کوئی بات نہیں۔ وہاں دوسرے لوگ بھی موجود ہوں ... گے۔ چنانچہ ڈی سلوا تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ... سکتا۔ وہ تمہیں زبردستی اپنے ساتھ بھی نہیں لے جا سکتا ... اس نے کوشش کی تو میں اس کا راستہ روک لوں گا۔ ... میں بھی وہاں اکیلا نہیں رہوں گا، کچھ فاصلے پر محسن بھی موجود ہوگا۔"

"لیکن... لیکن یہ سب کچھ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟" شہلا نے کہا۔ جواب بت بنی میری صورت کو دیکھ رہی تھی۔

"میں ڈی سلوا سے ملنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "مجھے اس سے کچھ باتیں کرنی ہیں لیکن وہ میرے بلانے پر نہیں آئے گا۔"

"پھر وہ میرے بلانے پر کیسے آ جائے گا؟" شہلا نے کہا۔ "وہ میری جان کا دشمن ہو رہا ہے اور اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

"اسے یہ خیال ضرور ہوگا کہ ہم نے تمہیں چھپا رکھا ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس بات کا کوئی ثبوت نہیں۔ ابھی تک کسی نے تم کو ہمارے ساتھ آتے جاتے نہیں دیکھا ہے اور کسی کو یہ بھی علم نہیں کہ تم کہاں ہو۔ تمہیں ڈی سلوا کو یقین دلانا ہوگا کہ تم محض پولیس کے ڈر سے روپوش تھیں اور اسی لیے لوٹ کر اپنے گھر نہیں گئیں کہ وہاں قتل و خون ریزی ہو چکی تھی۔ پولیس کی تفتیش کے علاوہ تم ان لوگوں سے بھی خوفزدہ تھیں جن کے ساتھی مارے گئے تھے۔ تم ڈی سلوا کو یقین دلا سکتی ہو کہ بعد میں ہمارا بھی تم سے کوئی تعلق نہیں رہا۔"

"وہ پوچھے گا نہیں کہ اب میرے پاس کیوں آئی ہو؟"

"ضرور پوچھے گا۔" میں نے کہا۔ "اور اس کا جواب بہت آسان ہے۔ تم کہہ سکتی ہو کہ مجھے پناہ کی ضرورت ہے اور ملازمت بھی چاہیے۔ کیونکہ اس طرح چھپ کر میں کب تک زندگی گزاروں گی اور بیمار ماں کے علاج کے لیے پیسے کہاں سے لاؤں گی۔ تمہاری کامیابی کا دارومدار تمہاری اداکاری پر ہے۔ ڈی سلوا کو اعتبار آ جانا چاہیے کہ تم اس کے پاس واقعی مدد حاصل کرنے کے لیے آئی ہو۔"

"وہ سوال کر سکتا ہے کہ تمہارے حمایتی کہاں گئے؟" شہلا نے پریشان ہو کے کہا۔

"ہاں ڈی سلوا یہ بات پوچھ سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اور اس کا جواب یہ ہونا چاہیے کہ وہ حمایتی کسی کی کیا مدد کریں گے جو خود چھپتے پھرتے ہوں، مقدمات میں ملوث ہوں اور زیرِ ضمانت ہوں۔ بات یہ ہے شہلا کہ ہر متوقع سوال کا جواب تمہیں طوطے کی طرح نہیں رٹایا جا سکتا۔ تم خود بھی ذہین ہو۔ تمہیں ڈی سلوا کا اعتماد حاصل کرنا ہے۔ یہ سمجھانا ہے کہ تمہارے دل میں کوئی رنجش نہیں اور تم ماضی کی ہر تلخی کو فراموش کر چکی ہو۔ تمہارا خیال ہے کہ صرف ڈی سلوا ہی تمہیں بچا سکتا ہے کیونکہ وہ طاقتور ہے، دولت مند ہے اور اثر و رسوخ کا مالک ہے۔"

ڈی سلوا کو زیرِ دام لانے کا ایک اور طریقہ بھی تھا جو کامیابی کا سو فیصد ضامن ہو سکتا تھا لیکن یہ بات ایسی تھی کہ میں اپنی زبان سے شہلا کے سامنے نہیں کر سکتا تھا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد میں نے اس مسئلے کا حل تلاش کر لیا۔ میں نے جیب سے نوٹ بک نکالی اور اس کے ایک صفحے پر لکھا۔ "ڈی سلوا کو یہ تاثر بھی دینا کہ تم اس کے بچے کی ماں بننے والی ہو لیکن تمہارا ارادہ اس کو بلیک میل کرنے کا ہرگز نہیں ہے بلکہ تم یہ چاہتی ہو کہ ڈی سلوا تمہیں اس پریشانی سے نجات دلا دے۔"

شہلا غور سے مجھے دیکھتی رہی۔ شاید تذبذب کے آثار میری صورت سے بھی عیاں تھے۔ وہ حیران تھی کہ بات کرتے کرتے میں کیا نوٹ کرنے لگا ہوں۔

"ڈی سلوا کے آفس میں داخل ہونے سے پہلے یہ بھی پڑھ لینا۔" میں نے صفحے کو نوٹ بک سے پھاڑ کر الگ کیا اور کئی بار موڑ کے تعویذ کی طرح کر دیا۔ "ابھی اس کو اپنے بیگ میں ڈال لو۔ یہ تمہارا ٹرمپ کارڈ ہے۔ اگر تم نے عقل سے کام لیا تو ڈی سلوا تم سے ملنے ضرور آئے گا۔ جہاں بھی تم کہو گی۔ اس کے پیشِ نظر ایک مقصد تو یہ ہوگا کہ کسی طرح اپنی پریشانی ختم کرے۔ ہو سکتا ہے وہ تمہیں آلۂ کار بنا کے ہمارے خلاف استعمال کرنے کی سوچے اور یہ بھی ممکن ہے کہ تم پر قطعی اعتبار نہ کرے۔ یہ سمجھے کہ تمہارا آنا ایک سازش ہے اور تم اسے بیوقوف بنا کے فائدہ اٹھانا چاہتی ہو۔ ایسی صورت میں وہ تمہیں بے وقوف بنا کے ہر طرح سے تمہاری مدد کا وعدہ کرے گا لیکن درحقیقت تمہارا جھگڑا ہمیشہ کے لیے ختم کرنا چاہے گا۔ ہر صورت میں وہ تمہارے بلانے پر ضرور آئے گا۔ تم اسے آج شام یا رات کے وقت کسی بھی ایسی جگہ ملنے کے لیے کہہ سکتی ہو جہاں اس کے لیے خطرہ کی کوئی بات نہ ہو۔ مثلاً مال روڈ پر کسی جگہ بھی۔ باغِ جناح میں یا میوزیم کے سامنے۔"

"مجھے اس کے سامنے جاتے ہوئے خوف آتا ہے سکندر بھائی!" شہلا نے کہا۔ "وہ بہت خطرناک آدمی ہے۔"

"کیا یہ بات میں نہیں جانتا؟" میں نے تھوڑی سی خفگی کا اظہار کیا۔ "اور تم کیا یہ سمجھتی ہو کہ میں جانتے بوجھتے

تمہیں خطرات میں دھکیل رہا ہوں یا تمہیں اعتماد نہیں ہے کہ ضرورت پڑنے پر میں تمہاری حفاظت کر سکوں گا؟"

"ایسی کوئی بات نہیں۔" شہلا نظر جھکا کر بولی۔ "دنیا میں میرا کون ہے۔ حقیقی رشتوں کا میرے لیے کوئی مفہوم نہیں، خطرہ میرے لیے کیا ہے... اگر یہ تنہا، بے مصرف اور دکھ بھری زندگی ختم ہوتی ہے تو ہو جائے، مجھے اس سے اتنا پیار نہیں ہے۔"

"پھر وہی بے وقوفی کی باتیں۔" میں نے اس کو بڑے بھائی کی طرح ڈانٹا۔ "حقیقی اور غیر حقیقی رشتے کیا ہوتے ہیں؟ رشتوں کا تعلق صرف جذبات سے ہے۔ تمہاری مراد خون کے رشتوں سے ہے تو دیکھو، میرا بھی کسی سے کوئی رشتہ نہیں اس کے باوجود میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ اپنے لیے، محسن کے لیے، تمہارے لیے اور رابعہ کے لیے اور دوسرے بہت سے لوگوں کے لیے۔ جن سے میری جذباتی وابستگی ہے۔ ہر رشتہ ایک زنجیر ہے جسے میں نہیں توڑ سکتا۔ پھر تم کیوں کہتی ہو کہ زندگی کا کوئی مصرف نہیں اور تمہارا کوئی نہیں ہے۔ جب میں تمہارا بھائی ہوں تو میرے تمام رشتے بھی تمہارے ہیں اور ہم سب کے لیے تمہاری زندگی بے حد اہم ہے۔ ہم تمہیں اس زندگی سے پیار کرنا بھی سکھا دیں گے۔"

شہلا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے لیکن وہ مسکرائی۔ "مجھے معاف کر دیجیے بھائی جان! میں بہت بے وقوف ہوں۔ میں نے زندگی میں دکھ ہی دکھ دیکھے ہیں۔ آہستہ آہستہ مجھے اپنے آپ پر اور دوسروں پر اعتماد کرنا آجائے گا۔"

ہم تینوں گھر سے نکلے تو دوپہر کے کھانے کا وقت ہو چکا تھا لیکن بھوک ہم میں سے کسی کو بھی نہیں تھی۔ ٹیکسی کو ہم نے مال روڈ پر چھوڑ دیا۔ محسن نے بیڈن روڈ تک ہمارا ساتھ دیا اور میں نے چند قدم پیچھے رہ کر میر وزیر اینڈ کمپنی کے دروازے تک شہلا پر نظر رکھی۔ یہ بہت غیر دانشمندانہ فعل تھا اگر ڈی سلوا یا اس کے آفس کا کوئی آدمی ہمیں آگے پیچھے دیکھ لیتا تو فوراً سمجھ جاتا کہ ہم ایک ساتھ آتے ہیں۔ شہلا نے آخری بار پلٹ کر مجھے دیکھا اور سیڑھیاں چڑھ گئی۔ میں سیدھا گزر گیا اور بیس قدم دور جا کر کھڑا ہو گیا۔ بھرا ہوا ریوالور محسن کے پاس بھی تھا اور میرے پاس بھی اور ہم نے دونوں طرف سے ناکہ بندی کر رکھی تھی لیکن اس کے باوجود میرا ذہن وسوسوں اور اندیشوں کا شکار تھا۔ کبھی مجھے خیال آتا تھا کہ ڈی سلوا اپنے آفس میں شہلا کا کام تمام نہ کر دے۔ اگر کسی نے بھی شہلا کو آفس میں جاتے ہوئے نہیں دیکھا ہوگا تو اس کے گواہ کون ہوگا؟ پھر وہ رات کو کسی وقت اکیلا آ کر لاش کو ٹھکانے لگا دے گا۔ یہ خیال بالکل بے بنیاد اگر ہم چھٹی کے وقت تک انتظار کرنے کے بعد دیکھتے ڈی سلوا اکیلا اترا ہے تو ہم اسے کہاں جانے دیتے؟ کوئی پن تو ہوتی نہیں کہ وہ دفتر میں چھپا دے یا لاش کو گم کر دے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ شہلا اپنی اداکاری سے ڈی سلوا کو قائل کرنے میں ناکام رہی تو صورت حال زیادہ سنگین ہو جائے گی۔ ڈی سلوا یقیناً شہلا کو سزا دینے کی سوچے گا اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے گا کہ کس کے ایما پر اسے چکر دینے آئی تھی۔ ممکن ہے وہ خود شہلا کا تعاقب کرے یا وعدہ کرنے کے باوجود شام کو خود ملنے کے لیے نہ آئے بلکہ اس کے آدمی شہلا کو اٹھا لے جائیں۔ یہ اندیشے بے بنیاد نہیں تھے چنانچہ یہ ضروری تھا کہ میں قبل از وقت حفاظتی اقدامات پر غور کر لوں۔ ڈی سلوا کو شہلا کے تعاقب سے روکنے کا طریقہ فوراً میری سمجھ میں آ گیا۔ اس کی گاڑی سڑک پر زینے سے تقریباً بیس گز کھڑی تھی۔ ادھر ادھر نگاہ ڈالنے پر مجھے کتابوں اور کاپیوں کی چھوٹی سی دکان نظر آئی۔ دو روپے میں مجھے ایک معمولی سی پرکار مل گئی۔ میں اطمینان سے چلتا ہوا ڈی سلوا کی گاڑی تک پہنچا۔ دیوار اور گاڑی کے درمیان مشکل سے ایک فٹ کا فاصلہ تھا اور ایک صاحب ابھی ابھی ازار بند باندھتے اور خفت سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے نکلے تھے۔ ان کی جگہ میں نے لی تو کسی نے مجھے نہیں ٹوکا۔ میں نے نیچے بیٹھ کر آگے اور پیچھے کے دونوں پہیوں کو پرکار کی نوک سے پنکچر کر دیا اور ایک منٹ بعد دور کھڑا ہو کے دو پہیوں کی ہوا نکل جانے کے بعد گاڑی کو دیوار کی طرف جھکتا ہوا دیکھتا رہا۔ ایک ٹائر فلیٹ ہو جائے تو دس منٹ میں اس کی جگہ دوسرا اسپیئر وہیل لگایا جا سکتا ہے لیکن ایک ہی وقت میں دو ٹائر بدلنا مسئلہ بن جاتا ہے اور گاڑی کو جیک پر چھوڑ کے پنکچر لگوانے کے لیے جانا پڑتا ہے۔ میں دل ہی دل میں اس منظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا جب ڈی سلوا نیچے آ کر دیکھے گا کہ ٹائر فلیٹ ہیں اور یک نہ شد، دو شد والا مسئلہ ہے۔ شہلا کو اوپر گئے ہوئے ایک گھنٹے سے زیادہ ہو گیا تھا اور میری رسٹ واچ میں تین بج کر دس منٹ ہو رہے تھے جب وہ نیچے اتری اور مال روڈ کی طرف پیدل روانہ ہو گئی۔ آگے محسن موجود تھا چنانچہ میں وہیں کھڑا رہا۔ دو منٹ بعد ڈی سلوا تیزی سے نیچے آیا اور اس نے شہلا کی طرف دیکھا جو ابھی زیادہ دور نہیں گئی تھی۔ پھر اس نے جیب سے گاڑی کی چابیاں نکالیں۔ ایک قدم آگے بڑھا اور رک گیا۔ اس کی نظر نے دونوں بیٹھے ہوئے ٹائروں کو دیکھ لیا تھا۔ اس کا چہرہ بگڑ گیا اور اس کے لبوں کی جنبش سے میں نے اندازہ کر لیا کہ حسب عادت اس نے کوئی گالی بکی ہے پھر اس نے ایک موٹر سائیکل کا ہینڈل ہلا کر دیکھا جو شاید اس کے کسی ماتحت کی تھی اور واپس اوپر گیا۔ وہ دوسری بار نیچے اترا تو اس کے ہاتھ میں موٹر سائیکل کی چابیاں تھیں لیکن موٹر سائیکل کا لاک کھولنے اور اسے کک مار کے اسٹارٹ کرنے میں مزید تین منٹ صرف ہو گئے۔ میری طرح وہ بھی دیکھ رہا تھا کہ شہلا نظروں سے اوجھل ہو چکی ہے اگر اس نے شہلا کی بات پر اعتبار نہیں کیا ہوگا تو اس کو یہ شک بھی ہوا ہوگا کہ شہلا نے ہی اوپر آنے سے پہلے ہوا نکال دی تھی۔ وہ موٹر سائیکل لے کر گیا اور پانچ منٹ بعد لوٹ آیا۔ ناکامی کی کوفت اس کی صورت سے عیاں تھی۔ وہ موٹر سائیکل کو پھر اسی جگہ چھوڑ کے آفس میں داخل ہو گیا تو میں نے وہاں رکنا فضول سمجھا۔ غصے اور پریشانی میں ڈی سلوا نے چابیاں بھی موٹر سائیکل میں لگی چھوڑ دی تھیں تھوڑی سی تفریح کی خاطر میں نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور ہوا ہو گیا۔

محسن اور شہلا شیزان میں میرے منتظر تھے۔ شہلا کے روپوش ہونے کا سب سے آسان طریقہ یہی تھا کہ وہ چند قدم کے فاصلے پر واقع شیزان میں گھس جاتے۔ اگر وہ سڑک پر رک کر رکشا یا ٹیکسی کا انتظار کرتی تو ڈی سلوا اس کے پیچھے لگ جاتا۔ اس نے مال روڈ تک آ کے دیکھا ہوگا اور شہلا دور دور تک نہ ملی ہوگی تو فرض کر لیا ہوگا کہ اتفاق سے شہلا کو فوراً کوئی سواری مل گئی اور وہ نکل گئی۔ شہلا نے مجھے بتایا کہ بظاہر مشن کامیاب رہا ہے۔ ڈی سلوا پہلے اسے دیکھ کر بھونچکا رہ گیا تھا۔ پھر بہت لال پیلا ہوا تھا مگر شہلا نے میری ہدایات پر عمل کرتے ہوئے اس کو یقین دلا دیا تھا کہ وہ مجبور ہو کے مدد مانگنے آئی ہے اور اسے پناہ کے علاوہ ملازمت کی ضرورت بھی ہے جو صرف ڈی سلوا ہی فراہم کر سکتا ہے۔ اس کے بعد ڈی سلوا کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا تھا اور اس نے شہلا کو تسلی دی تھی کہ سب ٹھیک ہو جائے گا لیکن اس میں اگر کوئی دھوکا ہوا تو شہلا کا انجام برا ہوگا۔ اس نے شہلا کو ڈرایا بھی تھا کہ پولیس اس کو ہر جگہ تلاش کرتی پھر رہی ہے۔ ایک کیس تو پرانے گھر کا ہے جہاں تین بدمعاش قتل ہوئے تھے اور پولیس یہ جاننا چاہتی ہے کہ شہلا کا ان سے کیا تعلق ہے؟ پولیس کو عدنان کے قتل کے سلسلے میں بھی اس کا بیان لینا تھا لیکن سب سے زیادہ سنگین مسئلہ اس تیسری نرس کا تھا جس کے بارے میں سکندر نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ وہ شہلا تھی اور اسی نے بوڑھے گورکن کو اسپتال میں زہر دے کر ہلاک کیا تھا۔ ڈی سلوا اس کیس کو دبا چکا تھا۔ ڈاکٹروں نے گورکن کی موت کو زندہ دفن کیے جانے کا نتیجہ قرار دیا تھا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں زہر کا ذکر تک نہ تھا لیکن شہلا کو دہشت زدہ کرنے کے لیے اس نے جان بوجھ کے یہ بات چھپا لی۔ ڈی سلوا نے شام کو اپنی مصروفیت کے باعث ملنے سے معذوری ظاہر کی تھی اور اس سے کہا تھا کہ اگلے روز صبح آفس آجائے۔ وہ پولیس کے معاملات بھی ختم کرا دے گا اور دوسرے معاملات بھی۔ دوسرے معاملات کا ذکر کرتے ہوئے شہلا کا رنگ لال ہو گیا تو میں نے اندازہ کر لیا کہ وہ میری تحریری ہدایات کا حوالہ دے رہی ہے۔ اب اگلے روز صبح نو بجے شہلا کو ڈی سلوا سے صدر کے راڈ مڈرا باوٹ پر ڈاکٹر فیاض کے کلینک کے سامنے ملنا تھا۔ شہلا نے غلطی سے اسے بتا دیا تھا کہ وہ صدر میں رہتی ہے اور ڈی سلوا نے کہا تھا کہ پھر تو کوئی مسئلہ نہیں، میں گلوب سینما سے مال روڈ کی طرف جانے کے بجائے صدر کی طرف سے آجاؤں گا اور اس کو گھر سے لے لوں گا۔ اس بہانے وہ شہلا کا گھر دیکھنا چاہتا تھا مگر شہلا نے کہا کہ وہ بہت اندر گلی میں رہتی ہے اس لیے زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ وہ سڑک کے کنارے ڈی سلوا کا انتظار کرے گی۔

گفتگو کے دوران ہم نے دو مرتبہ چائے پی اور کھانے پینے کی چیزوں کا اسٹینڈ خالی کر دیا کیونکہ ہم نے دوپہر کو کچھ نہیں کھایا تھا اور اب شام کے ساڑھے چار بج رہے تھے۔ ریسٹورنٹ کے اندر روشنی برائے نام تھی اور ابھی شام کا رش بھی شروع نہیں ہوا تھا۔ اتفاق رائے سے ہم نے شہلا کو واپس بھیجنے کا فیصلہ کیا۔

"محسن تمہیں ٹیکسی میں بٹھا دے گا۔" میں نے کہا۔ "فوری

طور پر تمہارے لیے خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔"
"آپ دونوں کا پروگرام کیا ہے؟" شہلا نے کہا۔
"میرے ساتھ کیوں نہیں چلتے؟"
"مجھے اور محسن کو کچھ شاپنگ کرنی ہے۔" میں نے کہا۔
"اور تم ہمارے ساتھ نہیں پھر سکتیں۔"
"ایسی کون سی ضروری چیز خریدنی ہے آخر؟" شہلا بولی۔ "گھر پہ رابعہ باجی انتظار کر رہی ہوں گی۔"
"دیکھو جی! ہم تمہاری رابعہ باجی کو نہیں جانتے۔" محسن نے کہا۔ "ہم اپنی مرضی کے بادشاہ ہیں۔ کیوں سکندر اعظم؟"
"سچ کہا جکن صاحب آپ نے... معاف کیجیے گا۔ شیروانی صاحب۔" میں نے تائید کی۔
"انتظار کرنا خواتین کا فرض ہے۔" محسن بولا۔ "دادی جان آج بھی انتظار کر رہی ہیں مگر دادا جان نے چالیس سال پہلے دریا میں غوطہ مارا تھا اور ابھی تک نہیں نکلے وہ بھی مرضی کے بادشاہ تھے۔"
"شادی کے بعد ہماری بیویاں ہاتھ باندھے ہمارا انتظار کیا کریں گی۔" میں نے کہا۔
"اور وہ ان جیسی ہوئیں تو ہم ہاتھ باندھے انتظار کریں گے۔ ہم حکم کے غلام بھی ہیں۔" محسن بولا۔
ہماری باتوں پر شہلا کو بے اختیار ہنسی آ گئی تھی، وہ سمجھ گئی تھی کہ ان باتوں کا کوئی مقصد نہیں اور ہم اسے ٹالنا چاہتے ہیں مگر محسن کی آخری بات پر اچانک اس کی ہنسی تھم گئی۔ اس نے بڑی عجیب نظروں سے محسن کو دیکھا جو زیرِ لب مسکرا رہا تھا مگر شہلا کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ یک لخت مجھ پر انکشاف ہوا کہ محسن نے شہلا سے وہ سب کچھ کہہ دیا ہے جو وہ کہنا چاہتا تھا اور شہلا نے اس کا مطلب سمجھ لیا تھا۔ الفاظ بڑے بازی گر ہیں کبھی ایک پورا دفترِ رموزِ کائنات کی چھوٹی سی گتھی نہیں سلجھا سکتا تو کبھی چند الفاظ ایک زندگی کا افسانہ کہہ دیتے ہیں۔ ان گنت خواہشات، لامحدود دعاؤں اور بے حساب امیدوں سے تعمیر ہونے والے مستقبل کا عنوان بن جاتے ہیں اور جذبات کے سمندر کو سمیٹ لیتے ہیں۔
جب شہلا ٹیکسی میں بیٹھ کر چلی گئی تو میں نے کہا۔
"محسن! اب اس پروگرام کا سب سے خطرناک مرحلہ درپیش ہے۔ یہاں سے چند قدم کے فاصلے پر امین کی دکان ہے جس نے مجھے آج شام کا وقت دیا تھا لیکن احتیاط کا تقاضہ ہے کہ میں وہاں نہ جاؤں۔ کیا خبر اس نے بعد میں پولیس کو اطلاع دے دی ہو اور وہ سادہ کپڑوں میں آس پاس ہی موجود ہوں۔ ایسی صورت میں وہ ہر آنے جانے والے کا چہرہ اور شکل بڑے غور سے دیکھ رہے ہوں گے اور میں اگر قرب و جوار میں نظر آیا تو پکڑا جاؤں گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ امین نے رابعہ کی سرخ فاکس ویگن دیکھ لی ہو جس میں بیٹھ کر میں یہاں پہنچا تھا اور اب وہ سرخ رنگ کی ہر گاڑی کو دور سے دیکھتے ہی مستعد ہو جاتے ہوں۔"
"امین کے مراسم بدمعاشوں سے بھی ہوں گے۔" محسن نے سر ہلا کے کہا۔ "اور ہم سارے شہر کے بدمعاشوں کو نہیں پہچانتے۔"
"ابھی مسئلہ یہ ہے کہ امین مجھے پہچانتا ہے اور اس نے کوئی انتظام کیا ہوگا تو میرے لیے۔" میں نے کہا۔ "اب یہ کام تجھے کرنا ہوگا۔ ریوالور تیرے پاس ہے۔ تو موٹر سائیکل پر سیدھا اس کے سامنے جا کے رکنا اور ادھر ادھر دیکھے بغیر اندر داخل ہو جانا۔ تجھ پر کوئی شک نہیں کر سکتا۔ مجھے امید ہے کہ اندر امین کے علاوہ کوئی نہیں ہوگا۔ اندر زیادہ جگہ نہیں ہے لیکن ایک آدھ آدمی ہو تب بھی پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ وہ تجھے دیکھ کر ہوشیار نہیں ہوں گے بلکہ یہی سمجھیں گے کہ کوئی گاہک کسی کام سے آیا ہے۔ پھر تو اچانک ریوالور نکال لینا۔ پانچ ہزار روپے ان کے سامنے پھینک دینا اور ان سے کہنا کہ یہ ہے باقی رقم۔ پانچ ہزار تمہیں پہلے مل چکے ہیں۔ وہ چیز نکالو جو ڈی سلوا نے بنوائی تھی۔ ظاہر ہے وہ کچھ بھی نہیں کر سکیں گے اور وہ چیز تیرے حوالے کر دیں گے۔ اس کے بعد بحفاظت نکلنا تیرا کام ہے۔ نکلنے سے پہلے ان کو بتا دینا کہ حلق سے آواز بھی نکلی تو اچھا نہیں ہوگا۔ باہر ہمارے آدمی موجود ہیں جن کے پاس دستی بم بھی ہیں۔ مجھے امید ہے اس دھمکی کے بعد وہ گڑبڑ نہیں کرے گا۔ تو اس چیز کو قمیص کے اندر چھپا کے باہر آنا اور موٹر سائیکل پر روانہ ہو جانا۔ اگر کوئی نگرانی کر رہا ہوگا تو تیری طرف متوجہ نہیں ہوگا۔ ان کے ہوشیار ہونے تک تیرا مشینی گھوڑا بہت دور جا چکا ہوگا۔ انگلستان میں ہم نے موٹر سائیکل چلانے کی جو مشق کی تھی وہ اب کام آنی چاہیے۔ موٹر سائیکل کا تعاقب بھی مشکل ہوتا ہے۔"
"یہ سب تو ٹھیک ہے۔" محسن نے کہا۔ "جو کچھ مجھے کرنا ہے وہ میں کر لوں گا لیکن یہ جو آپ بار بار موٹر سائیکل کا حوالہ دے رہے ہیں، یہ کہاں سے آئے گی؟"

"فکر مت کر بچہ!" میں نے محسن کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ "فقیر کے پاس سب کچھ ہے۔ آ میرے ساتھ۔"
موٹر سائیکل ان سیکڑوں اسکوٹروں اور موٹر سائیکلوں کے درمیان کھڑی تھی جو بیڈن روڈ کے شیزان والے کونے سے الفلاح بلڈنگ تک پارکنگ کے لیے مخصوص پٹی سی سڑک پر ایک قطار میں موجود تھیں اسی صف میں سائیکلیں بھی تھیں۔ چنانچہ اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ پولیس نے اسے برآمد کر لیا ہوگا۔ اس کا بدنصیب مالک پہلے تو ڈی سلوا کے سامنے رویا پیٹا ہوگا جس کی غلطی کے باعث موٹر سائیکل گئی۔ ڈی سلوا نے اسے غصے میں گالیاں دی ہوں گی کہ جاؤ پولیس میں رپورٹ لکھا دو یا ضبط سے کام لیا ہوگا تو کہا ہوگا کہ رپورٹ کر دو اگر نہ ملی تو میں دوسری لے دوں گا۔ چنانچہ ابھی تو اصل مالک تھانے تک ہی پہنچا ہوگا۔ رپورٹ لکھنے کے بعد پولیس کچھ بھی نہیں کرے گی۔ ہر روز گاڑیاں گم ہوتی ہیں۔ کچھ مل جاتی ہیں جو نہ ملیں ان کی خاطر گلی کوچوں کی خاک کوئی نہیں چھانتا اور سارے شہر کی ناکہ بندی نہیں ہوتی۔ ان کے مالک صبر کے میٹھے پھل کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔
"اس موٹر سائیکل کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ آپ اسے بحرِ ظلمات میں بھی دوڑا سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ایک ہارس پاور کی موٹر سائیکل کو آپ گھوڑا سمجھ سکتے ہیں۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ کسی نے اس کا نمبر نوٹ کر لیا تو الزام ہم پر نہیں آئے گا۔ اس کا مالک ڈی سلوا کا کوئی ماتحت ہے، اسے ہم کل فون پر بتا دیں گے کہ میاں رونا دھونا بند کرو اور فلاں جگہ سے اپنی موٹر سائیکل اٹھا لو اگر کوئی چکر پڑا تو مالک کہہ دے گا کہ موٹر سائیکل تو ڈی سلوا صاحب لے گئے تھے اور خدا معلوم واپس لائے تھے یا نہیں۔ ادھر امین بھی کہے گا کہ وہ ڈی سلوا کے آدمی تھے۔ چنانچہ ڈی سلوا پھنس جائے گا۔"
"اس سے اچھی بات کیا ہو سکتی ہے۔" محسن نے قہقہہ مارا۔ "لیکن یار سکندر! اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ امین جو چیز میرے حوالے کرے گا اس میں کوئی دھوکا نہیں ہوگا۔ ہمارے دس ہزار ضائع نہ ہو جائیں۔"
"تو اس کو سمجھا دینا کہ جن کا پیسہ ہے وہ آدمی کو ضائع کر سکتے ہیں، پیسہ نہیں۔" میں نے کہا۔ "اس کے علاوہ یہ تو جوا ہے۔ ہار گئے تو اگلی چال چلیں گے۔ اب تو جا، میں یہیں کھڑا ہوں۔"
محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "تیرے یہاں کھڑے رہنے کا فائدہ کچھ نہیں۔ معلوم نہیں مجھے کس راستے سے فرار ہونا پڑے ویسے بھی تو میری مدد کرنے کے لیے وہاں نہیں آ سکتا۔ اس لیے خدا حافظ۔ میں ایک گھنٹے کے اندر اندر گھر پہنچ جاؤں گا... شہلا کے گھر۔"
"رند اگر مے خانے نہیں پہنچے گا تو کہاں جائے گا۔" میں نے کہا اور محسن کو موٹر سائیکل پر جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔
میں گھر پہنچا تو سورج غروب ہونے والا تھا۔ رابعہ مجھ سے پہلے پہنچ چکی تھی اور شہلا سے ہماری مصروفیات کی رپورٹ بھی لے چکی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھ سے کوئی سوال کرتی میں نے اس سے پوچھ لیا کہ خسرو جمشید سے مکان کا سودا ہوا کہ نہیں؟
"سودا تو ہو گیا۔" رابعہ نے کہا۔ "لیکن خسرو جمشید خود نہیں پہنچا۔ اس کی جگہ ایک وکیل حاضر ہوا جس کے پاس مختار نامہ تھا۔ حقوق ملکیت حاصل ہو گئے ہیں لیکن ضابطے کی کارروائی کے مطابق منتقلی میں کچھ وقت لگے گا۔ اس کو بیچنے کا مرحلہ اس کے بعد آئے گا۔"
"اس کی ہمیں کوئی جلدی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن سوال یہ ہے کہ خسرو جمشید نے خود آنے سے کیوں گریز کیا؟"
"اس کے وکیل نے صرف یہ کہا کہ ناگزیر وجوہ کی بنا پر جمشید صاحب حاضر نہیں ہو سکے۔ بعد میں میری اس سے ملاقات نہیں ہو سکی ورنہ میں کچھ اور معلوم کرتی۔" رابعہ نے کہا۔
"خسرو جمشید بھی بہت بڑا ڈرامہ ہے۔" میں نے کہا۔ "اس کے بارے میں معلوم کرنا پڑے گا کہ وہ کون ہے اور اس کی کہانی میں حقیقت کو کتنا دخل ہے لیکن یہ سب کچھ بعد میں ہوتا رہے گا۔ ابھی محسن آ جائے تو اس کے بعد ہمیں پہلا کام یہ کرنا ہے کہ اپنا ٹھکانہ بدلنا ہے۔"
"اس وقت! اتنی جلدی یہ کام کیسے ہوگا؟" رابعہ نے کہا۔ "اس کی ضرورت بھی کیا ہے؟"
"یہ احتیاط کا تقاضہ ہے۔" میں نے کہا۔ "شہلا نے ڈی سلوا کے سامنے کہہ دیا تھا کہ وہ صدر میں رہتی ہے۔ اگر ڈی سلوا نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ اس کا ہم سے کوئی

تعلق ہے یا نہیں تو اسے زیادہ دشواری پیش نہیں آئے گی۔ شہلا کو یہاں آتے ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے۔ لوگ اس کے نام یا اس کی صورت سے واقف نہیں لیکن تمہاری سرخ فاکس ویگن اکثر یہاں دکھائی دیتی ہے۔ وہ انجان بن کے پوچھ سکتا ہے کہ یہاں ایک خاتون وکیل رہتی ہیں جن کی چھوٹی سی لال رنگ کی گاڑی ہے۔ میرا خیال ہے بہت سے لوگ کہیں گے کہ انہوں نے گاڑی بھی دیکھی ہے اور گاڑی چلانے والی خاتون کو بھی دیکھا ہے۔ مردوں کے مقابلے میں کار چلانے والی عورت زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے۔ شاید کوئی یہ بھی بتا دے کہ تمہارا کس گھر میں آنا جانا ہے۔ آج تو وقت نہیں رہا لیکن کل ڈی سلوا تفتیش کر سکتا ہے۔"

"لیکن میرا یہاں آنا نئی بات نہیں۔" رابعہ نے کہا۔ "ماسی ہماری پرانی خادمہ ہے اور میں گزشتہ کئی سال سے یہاں آ رہی ہوں۔"

"اس میں تو کوئی ہرج نہیں۔ ابھی ماسی یہاں رہے اور تم پہلے کی طرح اس کے پاس آتی جاتی رہو۔" میں نے کہا۔ "لیکن شہلا اور اس کی ماں کو راتوں رات یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ کل کسی کو یہاں ان کا سراغ بھی نہ ملے۔ مکان ہمارے پاس ہے اور ایسی جگہ پر ہے جہاں ڈی سلوا کے خیال کی رسائی بھی ممکن نہیں۔ تم اب گھر جاؤ تاکہ انکل رضوی کچھ مطمئن ہو جائیں۔ محسن کے آتے ہی میں شہلا اور اس کی ماں کو کرشن نگر پہنچا دوں گا۔ ہم ضرورت کا تھوڑا سا سامان لے جائیں گے۔ اس کے بعد دیکھیں گے کہ گلبرگ میں شہلا کے پرانے گھر سے سب سامان اٹھایا جا سکتا ہے یا نہیں۔ آج کی رات شہلا کو اپنی ماں کے ساتھ اس گھر میں اکیلے بسر کرنی ہوگی۔ کل ہم سب رضوی صاحب سے اجازت لے کر وہاں پہنچ جائیں گے۔"

"لیکن صبح نو بجے تو میں نے ڈی سلوا کو ٹائم دیا ہے کہ مجھے پک اپ کرے۔" شہلا نے کہا۔

"اس کا انتظام بھی ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔ "تمہیں صبح نو بجے وہاں پہنچا دیا جائے گا۔ ہم خود وہاں موجود ہوں گے۔"

"مجھے معلوم نہیں سکندر کہ تم کیا کرنا چاہتے ہو۔" رابعہ بولی۔ "اور جو کچھ تم کر رہے ہو وہ صحیح ہے یا غلط۔ تم نے اس خطرناک کھیل میں شہلا کو بھی گھسیٹ لیا ہے۔"

"شہلا کو کل صبح نو بجے صرف چند منٹ کے لیے اپنی صورت دکھانے کے سوا کچھ نہیں کرنا ہے۔" میں نے کہا۔ "ڈی سلوا

کی۔ گاڑی کے رکتے ہی شہلا کا کام ختم ہو جائے گا۔ معاملات میں اور محسن سنبھال لیں گے۔ شہلا اس کے بعد سے گھر لوٹ جائے گی۔"

"اور تم کیا کرو گے؟" رابعہ نے کہا۔ "ڈی سلوا کو لے جاؤ گے اور قتل کر دو گے؟"

"یہ تم سے کس نے کہہ دیا ہے؟" میں نے

"میرا ارادہ صرف یہ ہے کہ ڈی سلوا سے کچھ باتیں کروں۔ مجھے اس سے بہت کچھ پوچھنا ہے۔ وہ آسانی سے کچھ نہیں بتائے گا، اس لیے مجھے جبر بھی کرنا پڑے گا اور اسے یہ سمجھانا پڑے گا کہ وہ ہمیں کمزور یا بزدل نہ سمجھے۔ فنا اور بقا کے مسئلے میں تو اپنی حفاظت مقدم ہے اور اپنی جان بچانے کے لیے دشمن سے برابر کا مقابلہ کرنا کوئی جرم نہیں۔ ارادہ ڈی سلوا کو قتل کرنے کا ہرگز نہیں ہے لیکن یہ بھی ہے کہ میں اسے جینے کی رعایت دوں اور وہ مجھے قتل کر

"تم کچھ بھی کرو سکندر۔" رابعہ نے کچھ دیر بعد کہا۔ "میں یہ نہیں چاہتی کہ تم کسی نئی مصیبت میں پڑ جاؤ۔ میری تو یہی خواہش ہے کہ جیسے بھی ہو تم مصائب کی اس دلدل سے نکل جاؤ تاکہ ہم باقی زندگی عام انسانوں کی طرح چین اور سکون سے بسر کر سکیں۔"

جب وہ چلی گئی تو میں سوچتا رہا کہ میں الہ دین کے چراغ جیسی وہ طلسماتی قوت کہاں سے لاؤں جو ہر خواہش کی تکمیل کا سامان بن جاتے اور یہ زندگی اسی سانچے میں ڈھل جائے جو رابعہ کے تصور میں ہے۔ اس نے کہا تھا کہ ہم عام انسانوں کی طرح سکھ چین کی زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ اس نے میرے لیے ہی نہیں اپنے لیے بھی سکھ چین مانگا تھا لیکن سکھ کسے کہتے ہیں؟ عام آدمی کیسا ہوتا ہے... یہ کتنے معمولی اور آسان سوال تھے اور کیسی عجیب بات تھی کہ میرے لیے ان کا جواب دینا ممکن نہ تھا۔

شہلا مجھے اپنے خیالات میں محو چھوڑ کے دوسرے کمرے میں ماں کے پاس چلی گئی تھی۔ دروازے پر موٹر سائیکل رکنے کی آواز آئی تو میں چونکا پھر محسن اندر آیا۔ اس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے اور بال پریشان تھے۔

"کیا ہوا محسن؟" میں نے ایک دم اٹھ کے کہا۔ "کسی سے جھگڑا وغیرہ ہو گیا کیا؟"

"جھگڑا تو ہوا تھا لیکن پریشانی کی کوئی بات نہیں۔" وہ مسکرایا اور دیوار سے ٹیک لگا کے فرش پر بیٹھ گیا۔ "یہ کپڑے تو موٹر سائیکل سلپ ہو جانے سے پھٹے ہیں۔"

"تمہیں زیادہ چوٹ تو نہیں آئی ہے؟" میں نے پریشانی سے اس کے ہاتھوں اور پیروں کی خراشیں دیکھ کر کہا۔

"نہیں فکر کی کوئی بات نہیں۔" وہ مسکرایا۔ "میں وہ چیز لے آیا ہوں، دیکھو۔"

"اس چیز کی بات چھوڑ۔ جا پہلے نہا دھو کے زخم صاف کر اور کپڑے بدل۔" میں نے کہا۔ "اس کے بعد کوئی دوسری بات۔"

محسن نے وہ ریڈیو ٹرانزسٹر میرے سامنے رکھ دیا جو درحقیقت بم تھا اور ہنسا۔ "میرے کپڑے یہاں کہاں ہیں؟ اس حالت میں گھر گیا تو انکل رضوی کو جواب دینا مشکل ہو جائے گا۔ ابھی ایسے ہی چلنے دے، بس میں ذرا ہاتھ منہ دھو لوں۔"

جتنی دیر میں شہلا نے چائے بنائی اور محسن نے اپنا حلیہ ٹھیک کیا، میں بازار سے اسپرین لے آیا۔ محسن کی پتلون گھٹنے کے پاس سے اور قمیص، آستین پر سے پھٹ گئی تھی لیکن صاف ستھرا ہو جانے کے بعد اس کی حالت میں نمایاں تبدیلی آئی تھی۔ اس سے میری تشویش خاصی کم ہو گئی۔ چائے پیتے ہوئے اس نے مجھے بتایا کہ جب وہ دکان میں داخل ہوا تو امین اکیلا تھا اور حسب توقع وہ محسن کو دیکھ کر پریشان نہیں ہوا لیکن محسن نے اچانک ریوالور نکال لیا تو وہ بھونچکا رہ گیا۔ پانچ ہزار لے کر اس نے ریڈیو ٹرانزسٹر محسن کے حوالے کر دیا مگر اسے بتا دیا کہ اس چیز کو اپنے ساتھ لے کر وہ زندہ نہیں جا سکے گا۔ محسن سمجھ گیا کہ باہر اس کا راستہ روکنے والے موجود ہیں۔ وہ محسن کو پہچانتے نہیں تھے لیکن یہ ہو سکتا تھا کہ محسن کے باہر نکلتے ہی امین چلا کر انہیں خبردار کر دے اور وہ ان کے نرغے میں پھنس جائے۔

"میرے لیے اس خبیث کو خاموش رکھنا ضروری ہو گیا تھا۔" محسن نے چائے ختم کی اور سگریٹ جلا کے کہا۔ "میری جگہ تو ہوتا تو ایک ہاتھ مار کے اس کو لٹا دیتا مگر ہمیں یہ جوڈو کراٹے وغیرہ کے داؤ تو آتے نہیں۔ یہ بھی ناممکن تھا کہ میں اسے باندھ کر ڈال دیتا اور اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیتا۔ مجبوراً میں نے اس کے سر پر ریوالور کا بٹ مارا۔ ہاتھ کچھ ٹھیک پڑا اور وہ آواز نکالے بغیر نیچے گر گیا۔ پہلے تو میں ڈر گیا تھا کہ چوٹ خطرناک ہوئی تو وہ مر جائے گا لیکن وہ صرف چکرا گیا تھا۔ میں دکان سے نکل رہا تھا کہ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ دروازے کے باہر ایک گرل ہے۔ میں نے سوچا اسے بند کر دوں حالانکہ مقفل کیے بغیر اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ بس غلطی ہو گئی۔ گرل بند کرتے دیکھ کر ایک شخص میری

طرف لپکا جو سڑک کے دوسرے کنارے پر جیپ میں بیٹھا تھا۔ میں نے کک لگا کے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور قسمت اچھی تھی کہ ایک تو موٹر سائیکل فوراً اسٹارٹ ہو گئی دوسرے وہ شخص پہلے تو ٹریفک میں پھنس گیا تھا پھر اس نے مجھے جاتے دیکھا تو پاگلوں کی طرح ٹریفک کو نظر انداز کر کے بھاگا۔ اس کی ٹکر ایک رکشا سے ہو گئی مگر اتنی دیر میں وہ گاڑی غلط سمت سے موڑ کاٹ کے مال روڈ پر پہنچ گئی۔ میرا خیال ہے اس میں دو آدمی تھے۔ انہوں نے مجھ پر فائر بھی کیے لیکن میری رفتار زیادہ تھی اور میں دو مرتبہ بال بال بچا۔ پھر میں نے سیدھا چلنے کی بجائے موٹر سائیکل کو لہرا کے چلانا شروع کیا۔ وہاں خاصی افراتفری پھیل گئی تھی۔ کچھ لوگ تو فائرنگ پر چونکے تھے۔ کچھ یہ سوچ رہے تھے کہ میں کوئی شوقین مزاج اور احمق نوجوان ہوں جسے نہ اپنی جان کی پروا ہے اور نہ اپنی بازی گری سے ڈسٹرب ہونے والی ٹریفک کا خیال ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں یہ کرتب نہ دکھاتا تو کوئی گولی مجھے ضرور لگ جاتی کیونکہ وہ گاڑی میرے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ میں پرانی انارکلی کی طرف نکل گیا اور جو گلی سامنے آئی اس میں مڑتا گیا۔ گاڑی کے لیے تنگ گلیوں میں تیز رفتاری سے میرا پیچھا کرنا مشکل تھا۔ پندرہ منٹ بعد میں بالکل محفوظ تھا اور اردو بازار کے علاقے سے گزر رہا تھا۔ اس وقت تک مجھے خراش بھی نہیں آئی تھی۔ بس اچانک ایک بھینس سامنے آ گئی۔ بھینس گلی میں سے نکلی، اس کے پیچھے مالک دھوتی سنبھالتا شور مچاتا آیا۔ میں بھینس سے تو بچ گیا مگر بھینس والے کو بچاتے ہوئے سڑک کے کنارے بیٹھے ہوئے ایک نجومی کے بورڈ سے ٹکرا کے نجومی پر گرا۔ اسے بھی کافی چوٹیں آئیں۔ ظاہر ہے قصور یا تو بھینس کا تھا یا نجومی کا جو سڑک کے کنارے بیٹھا تھا۔ وہ بہت چیخا چلایا مگر میں نے کہا کہ سڑک تمہارے بیٹھنے کے لیے نہیں بنائی گئی ہے۔ ایسے ہی نجومی ہوتے تو آج کسی اور جگہ بیٹھ جاتے۔"

مجھے اور شہلا کو محسن کے ایڈونچر کا حال سن کر بے اختیار ہنسی آئی۔ شہلا کی آنکھوں میں تو ہنستے ہنستے آنسو آ گئے حالانکہ یہ ہنسنے کا نہیں شکر کرنے کا مقام تھا۔ ایک بھی گولی لگ جاتی تو محسن نہ جانے کہاں ہوتا۔ کسی اسپتال میں یا مردہ خانے میں۔ لیکن میری طرح محسن کا ذہن بھی حقیقت پسند تھا۔ خطرے کا وجود برحق مگر خطرہ ٹل جائے تو اسے یاد کر کے دہشت زدہ ہونے کا کیا فائدہ۔ ساری

بات رونے کی ہے۔ محسن کی طرح یہی بات مزے لے کر ہنستے ہنستے سنانے کے بجائے لرزتے اور کانپتے ہوئے بھی سنائی جا سکتی تھی مگر اس سے صرف ہمارا حوصلہ کم ہوتا مسائل کم نہ ہوتے۔ میں نے ریڈیو ٹرانسمیٹر کو آن کیا۔ بظاہر اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا لیکن اس کو ٹیسٹ کرنا مشکل تھا۔ دس ہزار لے کر امین نے ہمیں صرف ریڈیو ٹرانسمیٹر دیا تھا یا اس کے اندر ویسا ہی بم بھی فٹ کیا تھا جیسا ایک بار میرا قصہ پاک کرنے کے لیے رکھا گیا تھا۔ یہ ابھی ہم نہیں دیکھ سکتے تھے چنانچہ میں نے اسے رکھ کر محسن کو نقل مکانی کے پروگرام سے آگاہ کیا۔ شہلا کو اور ماسی کو جلد از جلد ضروری سامان باندھنے کی تاکید کر کے میں اور محسن پھر موٹر سائیکل پر روانہ ہو گئے۔ اب موٹر سائیکل میں چلا رہا تھا اور محسن اس ریڈیو ٹرانسمیٹر کو بغل میں دبائے پیچھے بیٹھا تھا۔ ایک زمانہ تھا کہ ہم اسی طرح لندن میں بے فکری سے گھومتے تھے آج مدت بعد ان گزرے ہوئے دنوں کی یاد تازہ ہو گئی۔ ہم دونوں کا موڈ بہت اچھا تھا۔ ہمیں یہ احساس فدا بھی پریشان نہیں کر رہا تھا کہ ہمارے پاس کیسی ہلاکت خیز چیز موجود ہے۔ جب تک اس کا خصوصی فیوز سلامت تھا، یہ ریڈیو ٹرانسمیٹر بالکل بے ضرر تھا۔ ہمیں یہ خیال بھی نہ تھا کہ ہمارے پاس چوری کی موٹر سائیکل بھی ہے۔ ہماری نیت چوری کی ہرگز نہیں تھی چنانچہ ہم مطمئن تھے۔ صبح مالک کو فون کریں گے تو اس ذہنی اذیت کی معافی بھی مانگ لیں گے جو ہماری وجہ سے اس کو اٹھانی پڑی۔ موٹر سائیکل کو ہم نے رضوی صاحب کے گھر سے دور ہی کھڑا کر دیا اور پیدل چلتے ہوئے اندر گئے۔ یہ دیکھ کر ہمیں مزید اطمینان حاصل ہوا کہ رضوی صاحب موجود نہیں لیکن وہ کچھ دیر بعد آ گئے۔ اتنی دیر میں ہم نہا دھو کے فارغ ہو گئے تھے اور رضوی صاحب کو ہم نے یہی تاثر دیا کہ آج ہم شریفانہ طریقے پر سرِ شام ہی لوٹ آئے ہیں۔ ان کا غصہ پہلے ہی اتر چکا تھا اور انھوں نے اخبار میں چراغ دین کی گرفتاری کی تفصیلات دیکھ کر یقین کر لیا تھا کہ ہمارا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔ ہمیں گھر میں موجود پا کے انھوں نے مزید اطمینان کا اظہار کیا اور اگر ان کو کسی دعوت میں نہ جانا ہوتا تو وہ کھانے کے بعد بھی ہم سے باتیں کرتے رہتے۔

رضوی صاحب کے دعوت میں جانے سے ہمیں ایک طرح سے نقل و حرکت کی آزادی مل گئی۔ ہم نے ان سے وعدہ کیا کہ جب بھوک لگے گی ہم بلا تکلف کھانا مانگ لیں گے مگر ان کے رخصت ہوتے ہی میں اور محسن بھی روانہ ہو گئے۔ ہماری موٹر سائیکل وہیں کھڑی تھی جہاں ہم نے اس کو چھوڑا تھا۔ پندرہ منٹ بعد ہم شہلا کے گھر پہنچے جو ماسی کے ساتھ مل کر بیشتر سامان پیک کر چکی تھی۔ ہم نے اس کی مدد کی اور آدھے گھنٹے بعد سب سامان ایک ٹرک پر لادا جا چکا تھا۔ شہلا کی ماں کو ٹرک میں آگے بٹھانے کے بجائے میں نے پیچھے کے کھلے حصے میں چارپائی ڈال کے لٹا دیا اور ماسی بھی اس کے ساتھ ہی سامان پر ٹک گئی تھی۔ ٹرک ڈرائیور سے میں نے رفتار کم رکھنے کی درخواست کی اور اسے دس روپے زیادہ دینے کا وعدہ بھی کیا لیکن وہ شریف آدمی تھا اس نے کہا کہ بیمار کو آرام سے لے جانے کے لیے وہ ایک پیسہ بھی نہیں لے گا۔ دس پندرہ منٹ کی دیر کوئی بات نہیں۔ محسن آگے ٹرک ڈرائیور کے ساتھ جا بیٹھا اور میں نے شہلا کو اپنے ساتھ موٹر سائیکل پر بٹھا کر اس قافلے کی رہنمائی کی۔ میری ہدایات کے مطابق ماسی نے آس پاس کے رہنے والوں کو بتا دیا تھا کہ وہ ماڈل ٹاؤن میں کچھ دن کے لیے اپنی بہن کے گھر جا رہی ہے جو کہ کرشن نگر سے بالکل مخالف سمت میں تھا۔ رات کے دس بجے ہم سامان کو شہلا اور اس کی ماں کے ساتھ اپنے نئے گھر میں پہنچا چکے تھے۔ ماسی بہت حیران اور پریشان تھی کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے مگر وفاداری اور دوسروں پر اعتماد اس کی فطرت میں شامل تھا۔ اس نے خود کو حالات کے اور ہمارے سپرد کر دیا تھا۔ اس یقین کے ساتھ کہ ہم اس کے حق میں جو کچھ کریں گے اچھا ہی کریں گے لیکن برا بھی ہوا تو وہ تقدیر کا لکھا سمجھ کے قبول کرے گی۔ شہلا کی ماں کا وجود اور عدم وجود برابر تھا اور وہ شہلا کا ساتھ دینے پر مجبور تھی۔ شہلا اس نئے ماحول سے خوفزدہ تھی۔ ہم نے اسے تسلی دی کہ آج ہی رات کی بات ہے۔ وہ کھڑکیاں دروازے بند رکھے اور کسی اجنبی کے اندر داخل ہونے سے پہلے فرار ہو جائے۔ فرار کے لیے پچھلا راستہ تھا جہاں اندھیرے میں پھیلے ہوئے کھیت تھے۔ چلتے چلتے میں نے شہلا کو یقین دلایا کہ یہ مکان بہت محفوظ جگہ پر ہے اور کسی دشمن کے یہاں پہنچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

کرشن نگر سے گلبرگ کا فاصلہ کافی تھا اور ہمیں شہلا کے پرانے گھر تک پہنچنے میں پون گھنٹہ لگ گیا موٹر سائیکل دور چھوڑ کے میں اور محسن باتیں کرتے اجلی بن کے گھر کے سامنے سے گزرے۔ مکان تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا اور یہاں کوئی پہرے دار نہیں تھا۔ ضابطے کی کارروائی کے مطابق تفتیش کرنے کے بعد پولیس والے بھی اس گھر کو بھول چکے تھے۔ تین مرتبہ سامنے سے گزر کر ہم نے اس بات کا اطمینان کر لیا کہ تھوڑی سی احتیاط سے کام لے کر ہمارے لیے سامان اٹھانا مشکل نہیں ہونا چاہیے۔ گھر کی چابیاں میرے پاس تھیں۔ ادھر ادھر دیکھ کر میں چار فٹ اونچی دیوار پر سے اندر کود گیا۔ محسن نے میری تقلید کی۔ چند منٹ بعد ہم گھر کے اندر تھے۔ احتیاطاً ہم نے باہر کی کوئی لائٹ نہیں جلائی اور اندر بھی کھڑکیوں کے پردے شیشوں پر پھیلا کے اس بات کا اطمینان کر لیا کہ باہر کسی کو روشنی نظر نہ آئے۔ گھر میں اتنا سامان تھا کہ ایک پورا ٹرک بھر جاتا اور ٹرک بھرتے بھرتے رات گزر جاتی جبکہ ہمیں یہ کام کم سے کم وقت میں کرنا تھا۔ باہمی مشورے سے ہم نے طے کیا کہ بھاری سامان اور غیر ضروری فرنیچر، پردے اور قالین وغیرہ چھوڑ دیے جائیں۔ لیکن شہلا کے ذاتی استعمال کی سب چیزیں، کپڑے اور سوٹ کیس اور تھوڑا بہت فرنیچر ساتھ لیا جائے۔ برتن سمیٹنا فضول تھا۔ کچھ برتن ماسی اپنے ساتھ لے گئی تھی اور باقی بازار سے بھی خریدے جا سکتے تھے۔ سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ کوئی دیکھ نہ لے۔ آس پاس کی کوٹھیاں دور تھیں اور بظاہر ویران نظر آتی تھیں لیکن یہ ہو سکتا تھا کہ کوئی روشنی دیکھے تو سمجھے کہ شہلا اور اس کی ماں واپس آ گئی ہیں۔ لوگ عام طور پر یہاں ایک دوسرے سے بے تعلق رہنا پسند کرتے تھے مگر شہلا کا گھر غیر معمولی ہنگامہ آرائی کا مرکز رہا تھا چنانچہ کوئی بھی تجسس میں مبتلا ہو سکتا تھا۔ تاہم تھوڑا بہت خطرہ مول لیے بغیر چارہ نہ تھا۔ میں نے محسن کو سامان اکٹھا کر کے دروازے کے قریب لانے کے لیے کہا اور خود ٹرک لینے چلا گیا۔

اتنی رات گئے ٹرک آسانی سے نہیں مل سکتا تھا۔ میں ایک میل تک پیدل چلتا گیا۔ جو ٹرک میرے قریب سے گزرتے تھے وہ سامان سے بھرے ہوئے ہوتے تھے۔ بالآخر مجھے سڑک کے کنارے ایک جھونپڑی جیسے ہوٹل کے قریب خالی ٹرک کھڑا نظر آیا۔ میں ڈرائیور کے چائے پی کر واپس آنے کا انتظار کرنے لگا کیونکہ میں دوسرے لوگوں کے سامنے نہیں جانا چاہتا تھا۔ ٹرک ڈرائیور میری بات پر بہت حیران ہوا۔ رات کو ٹرک ایک شہر سے دوسرے شہر کے درمیان چلتے ہیں مگر آدھی رات کو گھر کا سامان کوئی نہیں اٹھاتا۔ میری مجبوری کی بات سن کر اس نے جو معاوضہ طلب کیا وہ عام شرح سے چار گنا تھا لیکن میں نے یہ بھی قبول کر لیا اور ٹرک ڈرائیور کو مزنگ چلنے کے لیے کہا۔

ڈرائیور حد سے زیادہ باتونی اور بے پروا تھا۔ ایک میل دور نکل جانے کے بعد میں نے اس سے کہا کہ ٹرک کی چال میں فرق کیوں پڑ گیا ہے؟

"مجھے تو اپنے یلد کی چال میں کوئی فرق نہیں لگتا۔" ڈرائیور نے بے فکری سے کہا۔

"فرق تو ہے۔" میں نے اصرار کیا۔ "کہیں پچھلے پہیے کی ہوا تو کم نہیں ہو گئی ہے؟"

"اپنے ٹرک میں ہوا، پانی، تیل، پٹرول سب فل رہتا ہے بابو!" وہ فخر سے بولا۔

میں نے کھڑکی میں سے سر نکالا اور پیچھے والے پہیے کو دیکھا۔ "عجیب ڈرائیور ہو تم۔" میں نے کہا۔ "پیچھے والے پہیے میں آدھی ہوا بھی نہیں رہی ہے اور تمھیں فرق محسوس نہیں ہوتا۔ ابھی پہیہ بالکل بیٹھ جائے گا تب مانو گے۔"

ڈرائیور کو اپنی مہارت پر اتنا یقین تھا کہ اس نے گھور کر مجھے دیکھا، گیئر کو نیوٹرل کر کے دروازہ کھولا اور نیچے اتر گیا۔ پلک جھپکتے میں اس کی جگہ میں نے لی۔ ٹرک ڈرائیور گھوم کر پچھلے پہیے کی طرف گیا ہی تھا کہ میں نے اسٹیئرنگ سنبھالا اور ٹرک کو گیئر میں ڈال دیا۔ ڈرائیور چلایا مگر اس کے لیے ٹرک کا تعاقب کرنا ناممکن تھا۔ دو فرلانگ دور جا کر میں نے راستہ بدلا اور ایک گھنٹے بعد مخالف سمت سے گلبرگ جا پہنچا۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی۔ ٹرک ڈرائیور پولیس اسٹیشن گیا ہو گا تو اس نے مزنگ کی بات کی ہو گی اور پولیس گئی بھی ہو گی تو مزنگ کی طرف جو کسی طرح ہمارے راستے میں نہیں پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ ہمیں زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے کے لیے ٹرک کی ضرورت تھی۔ اس کے بعد ہم ٹرک کو کہیں بھی چھوڑ سکتے تھے۔ جب میں ٹرک کی لائٹ آف کر کے اس کو آہستہ آہستہ چلاتا ہوا اندر لے گیا تو محسن بڑی بے چینی سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا اور ہم نے ضروری سامان ٹرک پر لادنا شروع کر دیا۔ معمولی آوازیں کسی کے کانوں تک نہیں جا سکتی تھیں مگر ہم محتاط رہے۔ سامان نکالنے اور چڑھانے کی کارروائی خاموشی سے سرانجام دیتے رہے۔ ایک گھنٹہ بعد ہم نے اطمینان کا سانس لیا۔ تھکن سے ہماری حالت غیر ہو رہی تھی مگر ابھی تک کسی نے ہمیں نہیں دیکھا تھا۔ گھر کے اندر بڑی بڑی الماریاں، بیڈ، صندوق، ڈریسنگ ٹیبل اور فرج وغیرہ رہ گئے تھے۔ جن کو اٹھانا مشکل تھا۔ باقی سب کچھ ہم نے سمیٹ لیا تھا۔

ہم ٹرک لے کر روانہ ہوتے ہی تھے کہ ٹرک پر گیٹ کے سامنے ایک موٹر سائیکل آکے رُکی۔ میں نے محسن کو خبردار کیا کیونکہ موٹر سائیکل سے اترنے والا کوئی انسپکٹر تھا یا سب انسپکٹر۔ شاید وہ گشت پر تھا اور اسے معلوم ہی تھا کہ یہ گھر کس کا ہے۔ ٹرک کو روانہ ہوتے دیکھ کر اس کا شک میں مبتلا ہونا ایک قدرتی بات تھی۔ ابھی وہ گیٹ کے قریب ہی پہنچا تھا کہ میں نے رفتار ایک دم بڑھائی اور میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ میں اس کی موٹر سائیکل کو ناقابلِ استعمال بنا دوں۔ وہ خود تو عین وقت پر چھلانگ مار کے ایک طرف ہو گیا لیکن اس کی موٹر سائیکل ٹرک کی ٹکر سے دور تک گھسٹتی ہوئی گئی۔ جواب میں اس نے فائر کیا لیکن گولی ٹرک کے ٹائر پر لگنے کے بجائے اس کی سائڈ میں لگی۔ محسن نے پیچھے سے اس کے فائر کا جواب دیا اور بہت عقل مندی کا ثبوت دیا کیونکہ اس طرح انسپکٹر کو بھی ہمارے مسلح ہونے کا اندازہ ہو گیا۔ اگلا فائر کرنے سے پہلے اس نے کسی محفوظ جگہ کی پناہ لی ہوگی۔ تیسری گولی تقریباً ایک منٹ بعد ہمارے پیچھے آئی مگر ٹرک کو چھوتے بغیر گزر گئی۔ ہم فوری طور پر اس کی زد سے باہر ہو گئے تھے اور وہ موٹر سائیکل لے کر ہمارا تعاقب نہیں کر سکتا تھا۔ کرشن نگر پہنچنے سے پہلے ہم نے ایک اور حرکت کی۔ محسن نے کہیں سے ایک کوئلہ تلاش کیا اور ٹرک کی نمبر پلیٹ کو تھوڑا سا بدل دیا۔ یعنی ایک کو سات بنا دیا اور تین کو آٹھ۔ مقصد صرف یہ تھا کہ اتنی رات کو سامان اتارنے والے ٹرک کا نمبر کوئی دیکھ لے تو بعد میں چوری ہونے والے ٹرک کے نمبر سے نہ ملے۔

دو چار لوگوں نے ہمیں سامان منتقل کرتے ہوئے دیکھا۔ شاید وہ حیران بھی ہوتے ہوں گے لیکن ہم سے کسی نے کوئی سوال نہیں کیا۔ رات کے ساڑھے بارہ بجے میں نے شہلا سے اجازت لی اور کہا کہ صبح آٹھ بجے وہ میرا انتظار کرے۔ نئی جگہ پر وہ کچھ نروس تھی چنانچہ ہم نے اسے ٹرک حاصل کرنے اور پولیس سے مڈبھیڑ ہو جانے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا ورنہ وہ پریشان ہوتی۔ واپسی پر مجھے ایک اور خیال آیا۔ میں نے ٹرک کو میکلوڈ روڈ کی طرف سے لے جا کر بیڈن روڈ پر میرڈ ریڈ اینڈ کمپنی کے سامنے عین اس جگہ کھڑا کر دیا جہاں ڈی سلوا اپنی گاڑی کھڑی کرتا تھا۔ ہم نے رومال سے ہر اس جگہ کو صاف کر دیا جہاں ہمارے فنگر پرنٹ ملنے کے امکانات تھے۔ پھر ہم نے نمبر پلیٹ کو صاف کیا۔ سات کا ہندسہ دوبارہ ایک نظر آنے لگا اور آٹھ کا ہندسہ پھر تین بن گیا۔ شہر کے

اس علاقے میں رات کے ایک بجے بھی رونق تھی ورجن سے نائٹ سینماؤں کے آخری شوز ابھی ابھی ختم ہوئے تھے اور واپس گھروں کو جانے والے سگریٹ پان کی دکانوں پر موجود تھے چنانچہ ہم پر کسی کو شک نہیں ہوا۔ ویران اور غیر آباد علاقے میں چوکیدار یا پولیس والے پوچھ گچھ ضرور کرتے۔ اس وقت وہ رکشا بھی دستیاب تھے جو سواری نہ ملنے کے باعث خالی لوٹ رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے صرف پانچ روپے زیادہ لے کر ہمیں وہاں پہنچا دیا جہاں ہماری موٹر سائیکل کھڑی تھی۔ شہلا کا گھر آگے تھا اس لیے ہم محفوظ تھے۔ صبح تین بجے کے قریب ہم پھر اپنے کوارٹر میں تھے اور موٹر سائیکل حسبِ معمول سڑک سے ہٹ کے دو گھروں کی مشترک دیوار کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس طرح کہ کسی بھی کوٹھی میں رہنے والوں کی نظر پڑے تو وہ سمجھے کہ موٹر سائیکل ساتھ والے گھر کی ہے۔

ہمارا پڑوسی کانسٹیبل بھی خوابِ غفلت میں تھا۔ اسے ہمارے آنے جانے کی کوئی خبر نہ ہوئی۔ خود رضوی صاحب کے گھر کا اندھیرا اور سکوت مکینوں کے خوابیدہ ہونے کا ثبوت تھا۔ میں نے وہ ریڈیو ٹرانسمیٹر اٹھایا جسے زمین سے کھود کر نکالا تھا اور محسن نے دوسرا ریڈیو ٹرانسمیٹر اٹھا لیا جو ہمارے خیال کے مطابق بم تھا۔ اس کا پتہ تو آزمانے کے بعد ہی چل سکتا تھا کہ ہمارے ساتھ دھوکا تو نہیں ہوا۔ محسن کا خیال دونوں کو ایک ہی فریکوئنسی پر ٹیون کرنا تھا لیکن یہ کام گھر کے اندر نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک خطرہ تھا کہ ہیلو ہیلو کی آواز ہمارے کانسٹیبل کی نیند میں خلل ڈالتی ہوگی۔ دوسرے ہمیں ٹیون کرنے کے بعد کم سے کم کچھ فاصلے کے فاصلے سے بات کرنی تھی اور یہ دیکھنا تھا کہ دونوں میں آواز ایک جیسی سنائی دیتی ہے یا نہیں۔ یہ کام ہم رضوی صاحب کی کوٹھی کے اندر رہ کر مخالف سمت کے گوشوں سے کر سکتے تھے بلکہ مواصلاتی رابطے کا فاصلہ بڑھانے کے لیے باہر بھی جا سکتے تھے۔ ہم نکلنے ہی والے تھے کہ صحن کا دروازہ کھول کر رابعہ اندر آگئی۔ پرانے قبضوں کے چرچرانے سے ہم چونک پڑے اور کچھ دیر یوں کھڑے رہے جیسے چوری کرتے پکڑے گئے ہوں۔

”یہ کیا حرکت ہے؟“ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”اس وقت یہاں کیا لینے آئی ہو؟“

”کچھ نہیں، بس آپ دونوں کی خیریت نیک ہے؟“ رابعہ نے بھی آہستہ سے کہا۔ ”اس سے پہلے میں چکر لگا کے جا چکی ہوں۔ مجھے تم دونوں کی طرف سے سخت تشویش لاحق تھی۔“

”اچھا اب آپ کی تشویش رفع ہو گئی ہے؟“ میں نے کہا۔ ”آپ نے دیکھ لیا کہ ہم خیریت سے ہیں؟“

”اب آپ تشریف لے جائیے اور سو جائیے۔“ محسن نے کہا۔ ”انکل رضوی اٹھ گئے اور انہوں نے دیکھا کہ آپ غیر موجود ہیں تو سکندر کا چالان ہو جائے گا۔“

”میں جاتی ہوں۔“ رابعہ بولی۔ ”مگر یہ بتاؤ تم لوگ اب تک کہاں تھے؟“

”دیکھو بی بی! یہ باتیں صبح بھی ہو سکتی ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”تم جاؤ، سو جاؤ۔“

”جب تک تم بتاؤ گے نہیں، مجھے نیند نہیں آئے گی اور میں جاؤں گی بھی نہیں۔“ رابعہ نے کہا۔

”اُف۔ بھئی ہم گئے تھے شہلا کا سامان نئے گھر میں پہنچانے۔“ میں نے کہا۔

”یعنی اس کے پرانے گھر میں سے نکال لینے کے لیے۔“ رابعہ نے لقمہ دیا۔ ”خیر... کوئی ایسی ویسی بات تو نہیں ہوئی؟“

”ہوئی تو نہیں مگر ہو جائے گی۔ اب خدا کے لیے تم جاؤ۔“ میں نے آہستہ سے اس کا رُخ پلٹ دیا۔

”ایک آخری بات۔“ رابعہ نے پھر پلٹ کر کہا۔ ”اس وقت آپ دونوں کہاں جا رہے ہیں اور یہ بغل میں کیا ہے؟“

”بغل میں بچہ ہے جس کا ڈھنڈورا پیٹنے ہم شہر جا رہے ہیں۔“ میں نے جھنا کے کہا۔

”یعنی حد ہو گئی... آپ تو رضوی صاحب سے بڑھ کے تھانیدار ہیں خاتون۔“ محسن بولا۔ ”اب دیکھیے نا سیدھی سی بات ہے، آپ کو نیند نہیں آ رہی تھی تو آپ ادھر کے چکر لگا رہی تھیں۔ کیا کہا جائے گا اسے، ہ کوئے جاناں ہ خیر... ہمیں بھی بے خوابی کا عارضہ لاحق ہو گیا ہے چنانچہ ہم باغ میں بیٹھ کر گانے سننا چاہتے ہیں۔ آپ کو اعتراض ہے؟“

”اور چونکہ مجھے پکے گانے پسند ہیں اور محسن کو کچے گانے، اس لیے ہم ایک ساتھ دو ٹرانزسٹر لے جا رہے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”آپ کو اعتراض ہے؟“

”آپ بھی جائیں اور کوئی اچھا سا رومانٹک دوگانے والا خواب دیکھیں۔“ محسن نے کہا۔

”تم دونوں جھکی اور خبطی ہو۔“ رابعہ نے واپس جاتے جاتے پلٹ کر کہا۔ ”جب کسی بات کا صحیح جواب دینا نہیں چاہتے تو فضول بولنا شروع کر دیتے ہو۔“

اتنی دیر میں محسن نے دونوں سیٹ ٹیون کیے۔ میں نے اسے سمجھا دیا کہ صبح ہمیں کیا کرنا ہے۔ مختلف سمتوں سے ریڈیو ٹرانسمیٹرز کی کارکردگی کو آزما لینے کے بعد ہم لوٹ آئے۔ پچاس سے سو گز کے درمیان دو طرفہ گفتگو کا ہر لفظ بالکل صاف سنائی دیتا تھا۔ ہم نے کھانا نہیں کھایا تھا مگر اس وقت بھوک پر تھکن غالب تھی اور چند گھنٹے کی نیند بے حد ضروری تھی۔ میں نے سات بجے کا الارم لگایا اور کمرے کا دروازہ کھلا چھوڑ کے سو گیا تاکہ ہمارا پڑوسی کانسٹیبل اٹھے تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے کہ ہم واقعی کمرے میں سوئے پڑے ہیں۔ نیند اتنی گہری تھی کہ الارم کلاک کی آواز نے صبح سات بجے ہم دونوں میں سے کسی کو بیدار نہیں کیا لیکن ہماری سفارش پر کانسٹیبل سے تھانیدار بن جانے کی امید رکھنے والے رضوی صاحب کے ڈرائیور نے ڈیوٹی پر جانے سے پہلے ساڑھے سات بجے ہمیں جگا دیا اور مطلع کیا کہ الارم تو آدھا گھنٹہ پہلے بج کے خاموش ہو چکا ہے۔ اس طرح کانسٹیبل موصوف نے ہماری نیند میں خلل اندازی کی گستاخی کرنے پر اپنی وضاحت پیش کی اور رخصت ہو گیا۔ میں نے بڑی عجلت میں تیاری کی اور ٹھیک وقت پر ناشتہ کرنے پہنچ گیا۔ رضوی صاحب روانگی کے لیے تیار تھے۔ ان کے پوچھنے پر میں نے بتا دیا کہ محسن بھی آنے ہی والا ہے۔ وہ ہمیں خدا حافظ کہہ کے چلے گئے تو میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ انہیں ہماری شب بیداری اور رات بھر کی کارروائی کا علم نہیں۔ رضوی صاحب جیسے ذہین اور تجربہ کار پولیس آفسر کے بارے میں کسی خوش فہمی کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ ہماری طرف سے شکوک میں بھی مبتلا تھے چنانچہ یہ ناممکن نہیں تھا کہ وہ اپنے طور پر ہماری نگرانی کرتے۔ ناشتے سے فراغت کے بعد میں نکلنے ہی والا تھا کہ رابعہ آنکھیں ملتی نمودار ہوئی۔

”جناب سکندرِ اعظم!“ اس نے چند کاغذات میرے سامنے رکھ کے کہا۔ ”اس وصیت نامے پر دستخط کرتے جائیے۔“

”وصیت نامہ؟“ بیگم رضوی نے چونک کر کہا۔ ”کس کا وصیت نامہ؟ تمہارا؟“

”جی۔“ میں نے مسکین صورت بنا کے کہا۔ ”دیکھیے نا، دور اندیشی کا تقاضہ ہے کہ کل کی فکر آج کی جائے۔“

”آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں۔“ محسن نے اندر آ کے بیٹھتے ہوئے افسوس سے کہا۔ ”سامان سو برس کا ہے کل کی خبر نہیں۔“

میں نے اس بے موقع بات پر اسے گھور کر دیکھا اور جہاں جہاں رابعہ نے کہا وہاں اپنے دستخط کر دیے۔

"اس میں کیا انگریزی لکھی ہے؟" میں نے کہا۔ "ذرا پڑھ کے تو سنا دو وکیل صاحبہ!"

"ہاں۔ اس بے چارے کو تو انگریزی آتی نہیں۔ چار برس ولایت میں رہ کے بھاڑ جھونکا۔" محسن نے پوری سنجیدگی سے کہا۔

"آپ کی ہدایات کے مطابق اس میں آپ کے متعدد وارث مقرر کر دیے گئے ہیں۔" رابعہ نے کہا۔ "بالکل اسی طرح جیسے تاج و تختِ برطانیہ کے وارث ترتیب وار موجود رہتے ہیں۔ بالفرضِ محال آپ نہ رہے تو اس دنیاوی مال و متاع کا پہلا حقدار محسن ہوگا۔ دستِ اجل نے اس کو بھی نہ بخشا تو یہ بندی کام آئے گی اور اس کے بعد وراثت کی جنگ خواتین ہی لڑیں گی۔ میرے بعد شہلا اور شہلا کے بعد فوزیہ۔۔۔ علیٰ ہٰذا القیاس۔۔۔ یہاں تک کہ ساتویں نمبر پر استاد ٹیڈی کا نام آجاتا ہے جس کو ہم اپنی حد تک ایک مخلص اور قابلِ اعتماد ساتھی سمجھ سکتے ہیں۔"

"تم سب پاگل ہو گئے ہو کیا؟" بیگم رضوی نے کہا۔ "آخر اتنا لمبا چکر کس لیے؟"

"دور اندیشی بیگم رضوی!" میں نے کہا۔ "کیا بھروسہ ہے زندگانی کا۔ آدمی بلبلہ ہے پانی کا۔"

"اس پر گواہوں کے دستخط اور تصدیق وغیرہ کا کام آج ہو جائے گا۔" رابعہ نے کہا۔ "اور کل اسے رجسٹریشن کے لیے داخل کر دیا جائے گا۔ اس کی ایک مصدقہ نقل ایک بنک لاکر میں رکھوا دی جائے گی اور اسے کھولنے کا حق اصل مالک کے بعد صرف اسے حاصل ہوگا جو چابی کے ساتھ عدالت کا جاری کردہ وراثت کا سرٹیفیکیٹ لائے گا۔ ایک نقل میرے آفس میں بھی موجود رہے گی۔"

"یہ تم نے ایسا زبردست کام کیا ہے کہ مجھے اپنے گرد ایک ناقابلِ تسخیر حصار محسوس ہوتا ہے۔ تمہارے پاس اس کی کوئی فاضل نقل ہے؟"

رابعہ نے اقرار میں سر ہلایا اور چند منٹ بعد مجھے ایک مکمل نقل تھما دی جو گلابی رنگ کے پیپر پر تھی لیکن اس پر تصدیق کی مہر اور میرے دستخط نہیں تھے۔ میں نے اس کو تہہ کر کے جیب میں رکھا۔ محسن اتنی دیر میں ناشتہ ختم کر چکا تھا۔ رابعہ نے ابھی منہ بھی نہیں دھویا تھا چنانچہ ہم لوٹ آئے اور بیگم رضوی بھی یہی سمجھیں کہ ہم کوارٹر کی

طرف گئے ہیں۔ پروگرام کے مطابق محسن کمرے میں رہا اور میں پچھلی طرف سے نکل کے اس جگہ پہنچا جہاں موٹر سائیکل رات بھر لاوارث کھڑی رہی تھی۔ اس کی لا علم لوگوں کو صبح کا اجالا پھیلنے کے بعد اس وقت جب کوئی باہر آیا ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ گھنٹہ دو گھنٹہ پہلے۔۔۔ چوبیس گھنٹے بعد تو کوئی بھی پولیس کو اطلاع دے سکتا تھا کہ نہ جانے کون اس نمبر کی ایک موٹر سائیکل چھوڑ گیا ہے مگر گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں کسی کو شک کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں کرشن نگر پہنچا تو ساڑھے آٹھ بجنے والے تھے۔ شہلا کو تیار دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی۔ عام عورتوں کی طرح وہ دو منٹ کہہ کے تیار ہونے میں گھنٹا صرف کر دیتی تو سارا پروگرام چوپٹ ہو جاتا۔ سنئے کچھ اپنے خوف کے باعث وہ رات بھر سو نہیں سکی تھی۔ میں نے اسے وارننگ دی کہ پیچھے بیٹھ کر نیند پوری کرنے کی کوشش نہ کرے کیونکہ میرا ارادہ موٹر سائیکل کو جیٹ کی طرح چلانے کا ہے۔ وہ کہیں پیچھے پڑی رہ جائے گی اور مجھے معلوم بھی نہیں ہوگا۔"

پچیس منٹ کے ریکارڈ ٹائم میں میں نے شہلا کو اس جگہ پہنچا دیا جہاں اس کو ڈی سلوا سے ملنا تھا۔ میں نے موٹر سائیکل کو سڑک کے کنارے کچھ فاصلے پر کھڑا کیا۔ شہلا سے چند قدم دور راؤنڈ اباؤٹ کے پاس آگیا۔ وہاں چھپنے کی کوئی جگہ نہ تھی چنانچہ میں نے آسان راستہ اختیار کیا اور ایک اخبار خرید کے اپنے چہرے کے سامنے کر لیا۔ میں یہ بھی کر سکتا تھا کہ اخبار میں ایک چھوٹا سا سوراخ کر لوں اور اس میں سے سامنے کی پوری سڑک کو دیکھتا رہوں کیونکہ ڈی سلوا کی گاڑی کو ادھر سے ہی آنا تھا لیکن میں نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ مجھے معلوم تھا کہ ڈی سلوا کی گاڑی میرے بہت قریب آکے رکے گی اور ڈی سلوا بھی شہلا سے کوئی نہ کوئی بات ضرور کرے گا۔ چند سیکنڈ کے اس مختصر سے وقفے میں ہی مجھے اپنا کام دکھانا ہوگا۔ میں اخبار کھولے خبریں پڑھتا رہا لیکن درحقیقت میری آنکھیں الفاظ کو بھی نہیں دیکھ رہی تھیں۔ میرے کان صرف آواز پر لگے ہوئے تھے۔ نو بج کے پانچ منٹ پر ایک گاڑی نے بریک لگایا اور رک گئی۔ میں نے ڈی سلوا کی آواز سنی جس نے بڑی خوش دلی کے ساتھ شہلا کو گڈ مارننگ کہا تھا۔ گاڑی صدر کی طرف سے آئی تھی اس لیے آگے والی سیٹ کا دوسرا دروازہ مخالف

راؤنڈ اباؤٹ کی طرف تھا اور ڈی سلوا بھی اب ادھر ہی دیکھ رہا تھا۔ شہلا نے گن کر چار قدم ہی اٹھائے تھے کہ میں پیچھے سے گھوم کر دروازے تک جا پہنچا۔ اس سے پہلے کہ ڈی سلوا صورتِ حال کو سمجھتا یا سنبھلتا، میں اس کے ساتھ بیٹھ کے دروازہ بند کر چکا تھا اور ریوالور میرے ہاتھ میں آگیا تھا۔ ریوالور گاڑی کے ڈیش بورڈ سے نیچے تھا چنانچہ باہر سے کوئی بھی اسے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

"واٹ از آل دِس؟" ڈی سلوا نے کچھ دیر بعد اپنے حواس پر قابو پا کے کہا۔

"تم نے مجھے پہچانا نہیں مسٹر ڈی سلوا؟" میں نے بلاوجہ مسکرا کے کہا۔ "میں تمہارا دوست سکندر بخت ہوں اور تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"نہیں، تم کچھ اور کرنا چاہتے ہو۔" ڈی سلوا بولا۔ "ایسے کوئی بات نہیں کرتا۔ بات کرنی ہوتی تو تم مجھے ٹیلی فون کرتے یا دفتر آجاتے لیکن اس غیر شریفانہ طریقے پر میرا راستہ نہ روکتے۔"

"اگر تم اتنے سمجھدار ہو تو دیر مت کرو۔" میں نے کہا۔ "ابھی تک لوگ یہ سمجھ رہے ہیں کہ تم مجھے لفٹ دینے کے لیے رکے ہو کسی کو شک ہونے سے پہلے گاڑی آگے بڑھا دو اور واپس چلو۔ انکار کرو گے تو۔۔۔"

"تو تم مجھے گولی مار دو گے؟" وہ نفرت اور حقارت سے تلخ لہجے میں بولا۔ "ٹھیک ہے، مار دو گولی۔ میں دیکھوں گا کہ تم بچ کر کہاں جاتے ہو۔ ایک قتل کا الزام تم پر پہلے ہی ہے۔"

"میں خالی ہاتھوں سے بھی کام لینا جانتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اور مجھے ڈرائیونگ بھی آتی ہے۔" وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا اور اس کا مقصد صاف یہ معلوم ہوتا تھا کہ مجھے زیادہ سے زیادہ دیر تک وہیں الجھائے رکھے۔ ریوالور میرے دائیں ہاتھ میں تھا۔ میرا بایاں ہاتھ اتنی پھرتی سے حرکت میں آیا کہ ڈی سلوا کوشش کے باوجود نہ بچ سکا اور ضرب گردن کے سامنے والے حصے پر پڑی جس نے اسے مفلوج کر دیا۔ میں فوراً باہر آیا اور سامنے سے گھوم کر ڈی سلوا کی طرف پہنچا۔ اخبار اڑ کے دور جا چکا تھا۔ موٹر سائیکل وہیں کھڑی تھی اور شہلا میری ہدایات پر عمل کرتے ہوئے غائب ہو چکی تھی۔ میں نے دروازہ کھول کے ڈی سلوا کو آگے دھکیلا اور خود اس کی جگہ بیٹھ گیا۔ گاڑی ایسی جگہ کھڑی تھی کہ راؤنڈ اباؤٹ کا چکر کاٹ کے گزرنے والوں میں سے کوئی میری طرف متوجہ نہیں ہوا تھا۔ گاڑی کا انجن چل رہا تھا لیکن نیوٹرل تھا۔ میں نے پورے اطمینان سے اسٹیئرنگ سنبھالا اور گاڑی روانہ ہو گئی۔ ساتھ والی سیٹ پر ڈی سلوا سر پیچھے کیے نیم دراز تھا اور یوں لگتا تھا کہ وہ آنکھیں بند کیے آرام کر رہا ہو۔ نہر کے پل پر محسن سوٹ کیس لیے کھڑا تھا۔ اس نے ڈی سلوا کو پیچھے والی سیٹ پر ڈال دیا۔ پل سے ہم بائیں طرف گھوم گئے اور سیدھے چلتے گئے۔ میری آنکھوں نے وہ مقام بھی دیکھا جہاں ایک شخص سڑک کے کنارے ہمیں کچھ بتانے سے پہلے ہی مر گیا تھا۔ اس کے ہونٹوں سے نکلنے والے دو الفاظ اب بھی مجھے یاد تھے۔ ان میں سے ایک سراج تھا لیکن دوسرے کا مطلب ہنوز غیر واضح تھا کہ اس نے کیا کہا تھا، راج۔ راجہ یا راجگڑھ۔ یہ جگہ اس وقت بھی غیر آباد تھی۔ اکا دکا گاڑیوں کے علاوہ کبھی کوئی سائیکل سوار گزر جاتا تھا۔ ڈی سلوا کے کراہنے کی آواز سے میں نے اندازہ کر لیا کہ وہ ہوش میں آنے لگا ہے۔ گاڑی روک کے میں نے ڈکی کھولی مگر اس میں کوئی رسی یا تار کا ٹکڑا نہیں تھا جس سے ڈی سلوا کے ہاتھ پیر باندھے جا سکتے۔ سوچنے کے لیے وقت نہیں تھا۔ میں نے دروازے کی ربر لائننگ کو ایک جھٹکے سے کھینچ کر الگ کیا۔ اس کے دو ٹکڑے بہت کارآمد ثابت ہوئے اور میں نے ڈی سلوا کو نیچے سے اوپر تک اس طرح باندھا کہ شاید اس کے ہاتھ پیروں کی خون کی گردش بھی رک گئی ہوگی۔ اس کے منہ میں رومال ٹھونس کر ہم پھر چل پڑے۔ ربر لائننگ کے نکل جانے سے دروازے بند ہونے کے باوجود کھڑکھڑانے لگے تھے۔ ابھی ہمارے ذہن میں کوئی ایسی جگہ نہ تھی جہاں ڈی سلوا کو اسیر رکھا جا سکتا لیکن ہم جانتے تھے کہ مضافات میں ہمیں بھی کوئی نہ کوئی نامکمل خالی کوٹھی مل جائے گی۔ ماڈل ٹاؤن کے علاقے سے گزرتے ہوئے میں نے ایک بار پھر اپنا گھر دیکھا جو اب میرا نہیں تھا۔ اس کی پُرآسائش، مسرت بخش اور اپنائیت کے احساس سے معمور فضا میں میرے لیے ایک سوگوار اجنبیت تھی۔ میں ایک سرد آہ بھر کے رہ گیا۔ اگلے موڑ پر میرے پیر نے خود بخود بریک پیڈل کو دبا دیا اور گاڑی کے پہیئے جام ہو گئے۔ محسن نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

"یہ قصرِ جمشید ہے۔" میں نے کہا۔ "خسرو جمشید کا گھر۔ میں نے کہا تھا ناں کہ جب میں چھوٹا سا تھا تو اس کے پاس سے گزرتا تھا اور جو چیز مجھے سب سے زیادہ پُرکشش لگتی

تھی وہ پھولوں کے رنگ تھے۔"

"لیکن اب تو یہاں دھول اڑ رہی ہے۔" محسن نے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے یہاں کوئی رہتا بھی نہیں۔"

میں نے نیچے اتر کے دیکھا۔ زرد پتھر کے اونچے گیٹ پوسٹ پر لگی ہوئی پیتل کی لائٹس کی آب و تاب ختم ہو چکی تھی۔ سنگ مرمر کی تختی پر لکھے ہوئے قصر جمشید کے حروف بھی ماند پڑ گئے تھے اور وسیع و عریض لوہے کی موٹی موٹی سلاخوں سے بنا ہوا گیٹ بند تھا۔ اس کے دونوں پھاٹک آپس میں ملا کے لوہے کی زنجیر سے باندھ دیے گئے تھے اور زنجیر میں پرانے وقتوں کا بھاری تالا پڑا ہوا تھا۔ زنگ کا رنگ سب پر غالب تھا لیکن مجھے جس چیز نے متوجہ کیا وہ پھاٹک کے نیچے کی زمین تھی۔ اس پر دونوں جانب بارش سے بہہ کر آنے والی مٹی جمع ہو گئی تھی اور اس مٹی میں گھاس اُگ آئی تھی۔ پھاٹک کے دونوں پٹ اب زمین میں پیوست نظر آتے تھے اور صاف ظاہر تھا کہ برسوں سے کوئی بھی اس دروازے سے نہیں گزرا۔ دروازے کے ساتھ ساتھ تین فٹ اونچی دیوار کی فصیل تھی اور اس فصیل پر گیٹ کے ڈیزائن کی گرل نصب تھی۔ کسی دشواری کے بغیر میں اور محسن اندر اتر گئے اور گیٹ سے حویلی جیسے مکان تک جانے والے ویران راستے پر چلنے لگے۔ باغ کسمپرسی کے عالم میں تھا۔ لان کی جگہ خودرو گھاس لہرا رہی تھی اور پھولوں کی جگہ جھاڑیاں نظر آتی تھیں۔ دو منزلہ عمارت میں اوپر نیچے گول محرابی روشن دان والی کھڑکیاں تھیں جو سب بند تھیں اور ان کے شیشے جا بجا ٹوٹے ہوئے نظر آتے تھے۔

ہم دونوں کے ذہن میں ایک ہی سوال تھا اور اس کا جواب قصر جمشید کی خانہ ویرانی تھی۔ خسرو جمشید نے ہم سے جھوٹ بولا تھا۔ وہ یہاں رہائش پذیر ہوتا تو اس گھر کی یہ حالت نہ ہوتی۔ محض تجسس سے مجبور ہو کے ہم نے اس خانہ ویران کے گرد ایک چکر لگایا۔ اس خاموشی میں جہاں ہمارے قدموں کی چاپ کے سوا کوئی صدا نہ تھی۔ ہمارے کان کسی انسانی آواز کے منتظر نہ تھے چنانچہ کسی نے ہمارے پیچھے نمودار ہو کر بات کی تو ہم دونوں اچھل پڑے۔

"کا ہا دیکھت ہو سرکار؟" ایک بوڑھے نے اپنی پاٹ دار آواز میں کہا۔ اس کی عمر ساٹھ سال سے اوپر ضرور ہو گی لیکن وہ صحت مند آدمی تھا جس کا گٹھا ہوا سیاہ بدن دھوپ میں چمک رہا تھا اور وہ صرف دھوتی میں ملبوس تھا۔

"ہم خسرو جمشید صاحب سے ملنے آئے تھے۔" میں نے بے نیازی سے کہا۔

"نواب صاحب سے؟" بوڑھے کی...
جمی رہیں۔" ہمار سنگ مجاک کرت ہو بابو؟"

"مذاق کی اس میں کون سی بات ہے...

"کیا نواب صاحب یہاں نہیں رہتے؟"

"وہ ہت ہیں حجور!" اس نے طنزیہ... ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "مالک ہیں... تو گھر... میری اور محسن کی آنکھوں نے ایک... جہاں ایک مختصر سی شکستہ چار دیواری کے... مرمر سے ڈھکی ہوئی قبر نظر آ رہی تھی، چار... سے آٹھ فٹ اونچے ستون کھڑے تھے... ایک چھت قائم تھی۔ میرے ذہن میں خسرو... کے ہم شکل کا حلیہ تھا اور وہ سب باتیں تھیں جو... مجھ سے کی تھیں۔

"اگر یہ نواب خسرو جمشید کی قبر ہے" میں... ہوئے کہا۔ "تو اس محل کا موجودہ مالک کون... پرویز؟"

بوڑھے نے آہستہ آہستہ اقرار میں سر ہلایا...
"آپ تو نواب جمشید سے ملنے آئے تھے سرکار؟"

"وہ کچھ غلط فہمی ہو گئی۔" میں نے کہا... غلط بتا دیا۔ خیر، یہ خسرو پرویز صاحب کہاں...

"چھوٹے نواب تو دس سال سے ولایت... ہیں۔" وہ اسی مشکوک لہجے میں بولا۔

"عجیب بات ہے۔ کیا گزشتہ ہفتے... نہیں تھے یہ پاکستان میں؟"

بوڑھے نے نفی میں سر ہلایا۔ اس کا شک... میں بدلنے لگا تھا۔ "چھوٹے نواب ادھر ہوتے... معلوم نہ ہوتا؟ وہ اُدھر بیاہ کر لیے ہیں کسی میم سے... سال پہلے آئے تھے، پھر نہیں آئے۔"

"اور تم یہاں چوکیداری کر رہے ہو؟" محسن نے... مطلب ہے ہمارے ساتھ دھوکا ہوا۔ خیر تم... ضرورت نہیں۔ ہم واپس جا رہے ہیں۔ صرف... اور پوچھنی تھی کہ مرحوم نواب خسرو جمشید کا حلیہ... اس نے کم سے کم الفاظ میں خسرو جمشید کا وہ حلیہ... ہم نے دیکھا تھا۔ بوڑھا دربان حیرانی سے... ہم اس کے لیے بہت پُراسرار اجنبی بن گئے... یہ معلوم نہیں تھا کہ خسرو جمشید کو مرے ہوئے...

ہے اور ان کا بیٹا خسرو پرویز ولایت میں رہتا ہے۔ اس کے باوجود ہم نے جو حلیہ بیان کیا تھا وہ سو فیصد مرحوم نواب کی تصویر تھا۔ دربان کو حیرانی تھی کہ ہم نے ان کو کہاں دیکھ لیا ہے۔ ہماری تو اپنی عمر بھی اتنی نہیں تھی جتنا عرصہ نواب خسرو جمشید کے انتقال کو ہو چکا تھا۔ جب میں نے اس کو یہ اطمینان دلا دیا کہ ایک زمانے میں میرے والد کی کوٹھی بھی قریب ہی تھی اور میں قصر جمشید کو گلشن کی طرح آباد دیکھ چکا ہوں تو دربان نے ایک سرد آہ بھر کے تسلیم کیا کہ اس زمانے میں چھوٹے نواب یہیں رہتے تھے اور وہ اپنے والد کا نقش ثانی تھے مگر وہ کسی میم کے چکر میں ایسے اسیر ہوئے کہ آزادی کے بعد اس کے ساتھ چلے گئے کیونکہ وہ کالے لوگوں کی اس دنیا میں رہنے کو تیار نہیں تھی۔ انھوں نے ولایت جا کے ہی شادی کی اور سنا ہے اب ان کا لڑکا جوان ہے۔ وہ میم ان کو چھوڑ چکی ہے۔

"کیا مرحوم نواب کی یا ان کے بیٹے کی کسی سے جانی دشمنی بھی تھی؟" میں نے کہا۔

"دوست دشمن تو سب کے ہووت ہیں سرکار!" دربان بولا۔ "پر ہمارے بڑے نواب کا جانی دشمن؟" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "اُن کی جان کا دشمن کوئی کیسے ہو گا جو انسان کے روپ میں فرشتہ تھے۔"

اس بوڑھے سے کچھ اور کہنا سننا بے کار تھا۔ ہم نے اس سے شریفانہ انداز میں معذرت چاہی اور باہر نکل آئے۔

"کسی نے ہمارے ساتھ بہت بڑا فراڈ کیا ہے محسن!" میں نے گاڑی کے قریب رک کر کہا۔ "اس نے ہماری لاعلمی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نواب خسرو جمشید کا بہروپ اختیار کیا۔ ایک جھوٹی کہانی سنائی اور وہ جائداد ہمیں فروخت کر گیا جو خسرو جمشید کی ہرگز نہیں ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ رابعہ کا سب پیسہ ڈوب گیا؟" محسن نے کہا۔ "اور اس کا پلاٹ بھی ہاتھ سے گیا؟"

"نہیں۔ جو مکان نقلی خسرو جمشید نے اونے پونے بیچ دیا ہے وہ اس کی اپنی ملکیت ہے کیونکہ اس کے کاغذات جعلی نہیں تھے۔" میں نے کہا۔ "صرف کاغذات میں مالک کا نام اور پتہ غلط تھا۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ آج اگر میں کوئی پلاٹ خرید کے مکان تعمیر کر دوں تو میں بھی اپنا نام خسرو جمشید اور یہی پتہ لکھوا سکتا ہوں۔ لیز اور رجسٹری کرنے والوں کو شک کیوں ہونے لگا؟ انہیں کیا معلوم کہ شہر میں کتنے خسرو جمشید ہیں اور کہاں کہاں رہتے ہیں۔ بیعانہ کی رقم تو گئی مگر پلاٹ کی منتقلی روکی جا سکتی ہے۔ معاہدے پر خسرو جمشید نے خود دستخط کیے تھے چنانچہ اس کا اٹارنی اعتراض نہیں اٹھا سکتا۔ خلاف ورزی پر قانونی کارروائی کے لیے خسرو جمشید کو خود سامنے آنا پڑے گا۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ دھوکا دہی کی اس واردات کا مقصد کیا تھا؟" محسن نے کہا۔ "نقصان میں آخر کون رہا؟"

"تو صرف دو چار لاکھ کے نقصان کی بات کر رہا ہے۔" میں نے کہا۔ "انھوں نے تو جوا کھیلا تھا اگر وہ جیت جاتے تو انہیں کتنا فائدہ ہوتا۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ضرورت مند ہونے کے باوجود ہم اس گھر میں رہنے کے لیے نہیں گئے ورنہ ایک ہی جگہ اور ایک ہی وقت میں سب کا قصہ پاک ہو جاتا۔ پلاٹ کی منتقلی کو روکنے سے قانونی مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ سب سے بہتر یہی ہے کہ رابعہ اُس مکان کو فروخت کر کے دوگنی قیمت وصول کر لے۔ اپنی ناکامی کا احساس دشمنوں کو جب ہو گا جب ہماری بجائے وہاں کوئی اور رہائش اختیار کرے گا۔ اگر انھوں نے مکان کے نیچے ہر کمرے میں بارودی سرنگ بچھا رکھی ہوں گی تو ان کا سارا انتظام بے مصرف ہو گا۔ وہ کسی غیر متعلق اور بے گناہ شخص سے اپنی ناکامی کا انتقام نہیں لیں گے۔"

میں نے پھر گاڑی اسٹارٹ کی اور ہم ماڈل ٹاؤن سے باہر نکل آئے۔

"ان کی اسکیم تھی بہت شاندار۔" محسن بولا۔ "پلاٹ بھی اچھا تھا اور اس کے دو مرکزی کردار اپنا رول بہت اچھی طرح نبھا گئے لیکن وہ تھے کون؟"

"قیاس آرائی سے اس سوال کا جواب دینا۔" میں نے کہا۔ "بہت مشکل ہے جب حالات سے پردہ اٹھے گا تو یہ کردار بھی اپنے اصل چہروں کے ساتھ سامنے آ جائیں گے۔ ابھی ہم فرض کر سکتے ہیں کہ وہ بھی شکاری تھے۔"

"ڈی سلوا، چوہدری دلاور یا سیٹھ دلاور کے گروہ کا بیرون ملک تعلق تو ثابت ہے۔" محسن نے کہا۔ "انھوں نے کوشش کی تھی کہ سابق کسٹم آفیسر نعیم لندن میں ان کے لیے کام کرے مگر وہ شریف اور بزدل آدمی تھا کہ روپوش ہو گیا۔ ایک پیشکش وہ تجھ کو بھی کر چکے ہیں جسے تو نے مسترد کر دیا۔ کیا یہ بات خارج از امکان ہے کہ لندن میں رہنے والا نواب خسرو جمشید کا بیٹا ان کا آلۂ کار بننے پر رضامند ہو گیا ہو یا مجبور ہو گیا ہو... بہت سے نواب

ولایت میں جُوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں اور نوابی ٹھاٹ برقرار رکھنے کے لیے ضرورت مند رہتے ہیں۔"

"تو نے کمال ہی کر دیا۔" میں نے کہا۔ "مجھے سخت حسد محسوس ہو رہا ہے کہ یہ بات مجھے کیوں نہیں سوجھی۔ یہ واقعی ہو سکتا ہے کہ ڈرامے کا مرکزی کردار خسرو پرویز ہو اور اسی نے خسرو جمشید کے بارے میں مفصل معلومات فراہم کرنے کے علاوہ یہ رول بھی ادا کیا ہو۔ اس کے پاس یقیناً لندن کی شہریت ہو گی چنانچہ ہم پاکستانی سفارت خانے سے زیادہ معلومات حاصل نہیں کر سکتے لیکن برطانوی ہوم آفس شاید ان کا موجودہ پتہ بتا سکے ورنہ یہ تو معلوم ہو ہی سکتا ہے کہ خسرو پرویز نام کے کسی مسافر نے پی آئی اے یا بی اے او سی کے کسی طیارے سے سفر کیا ہے یا نہیں اگر انہوں نے اصل نام سے سفر کیا ہو گا تو پاسپورٹ سے دوسری تفصیلات بھی حاصل ہو جائیں گی ورنہ کچھ پتہ نہیں چلے گا۔ لندن سے کراچی تک تو ہر ایئر لائن آتی ہے۔"

آبادی اب خال خال رہ گئی تھی۔ میں اور محسن باتوں کے ساتھ یہ بھی دیکھتے جا رہے تھے کہ کون سی جگہ ہمارے مقصد کے لیے موزوں ہے۔ بہت سی کوٹھیوں میں زنگ آلود تالے پڑے ہوئے تھے مگر یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ ان کا محافظ بھی کوئی نہیں ہے۔ بہت سی کوٹھیاں زیر تعمیر تھیں اور بہت سی نامکمل بھی رہ گئی تھیں مگر ان کے آس پاس آبادی تھی۔ بالآخر مجھے ایک دو منزلہ عمارت کا ڈھانچہ نظر آیا۔ آثار بتاتے تھے کہ مدت سے اس میں ایک اینٹ کا اضافہ بھی نہیں ہوا نیچے والی منزل تقریباً مکمل تھی مگر رنگ و روغن سے عاری دروازے اور بغیر شیشوں والی کھڑکیوں کے پٹ کھلے پڑے تھے۔ میں نے اندر گھوم پھر کے اور "کوئی ہے" کی صدا لگا کے اطمینان کر لیا کہ اندر واقعی کسی فقیر کا ڈیرا بھی نہیں۔ ہم گاڑی کو اندر لے گئے اور ڈی سلوا کو گھسیٹ کر ایک کمرے میں پہنچا دیا۔ وہ اب ہوش میں آ چکا تھا۔ میں نے اسے ہاتھ کھول کے سیدھا بٹھا دیا اور اس کے منہ میں سے رومال نکال دیا۔ وہ کچھ دیر لمبے لمبے سانس لیتا رہا اور ہمیں خونخوار نظروں سے گھورتا رہا۔

"اگر تم مجھے قتل کرنے کے لیے یہاں لاتے ہو۔" اس نے عادتاً انگریزی میں کہا۔ "تو جلد از جلد اپنا کام ختم کرو۔"

میں نے اس کے ایک لات رسید کی اور وہ فرش پر گر گیا۔ "یہاں بھی حکم چلاتا ہے ہم پر حکم کے غلام۔" میں نے کہا۔ "کیا اب بھی یہ بات سمجھانی ضروری ہے کہ مالک ہوں اور تم نوکر ہو۔"

"اس کے علاوہ ہم جلدی میں کوئی کام کرنے کے قائل نہیں مسٹر ڈی سلوا!" محسن نے بالوں سے پکڑ کر بٹھا دیا۔

"ہم تمہیں ماریں گے بھی تو آہستہ آہستہ۔" اس کے دوسری لات ماری اور وہ پھر گر گیا۔ "ہمیں تم سے بہت کچھ پوچھنا ہے اور قبول کروانا ہے۔"

"حالانکہ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس طرح کیے جانے والے اعتراف جُرم کی قانونی حیثیت کیا ہو گی۔" محسن نے اسے پھر بٹھا دیا۔ "لیکن تم لاتوں کے بھوت ہو، تمہاری باتوں پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔"

"پھر بھی ہم تمہاری زبان سے ان سب باتوں کی تصدیق چاہتے ہیں جو ہمیں معلوم ہو چکی ہیں۔" میں نے پھر اسے لات مار کر گرا دیا۔ "لیکن تم سمجھتے ہو کہ ہم کو معلوم۔" میں نے لات مارتے وقت یہ خیال رکھا کہ سخت نہ پڑے ورنہ پہلی دفعہ میں اس کے جبڑے اور دانت ٹوٹ جاتے۔ دوسری بار اس کی پسلیاں ٹوٹ جاتیں اور تیسری لات سے وہ جہنم رسید بھی ہو سکتا تھا۔ اب بھی وہ نیم بے ہوش تھا اور اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ وہ کچھ دیر فرش پر پڑا ہانپتا رہا اور پھر آہستہ آہستہ ہاتھوں کے بل پر خود ہی اٹھ بیٹھا۔

"ایک بار یہی سب کچھ میرے ساتھ بھی ہوا تھا اور رابعہ کے ساتھ بھی۔" میں نے کہا۔ "تقدیر یاور تھی اور میں نے خداداد ذہانت سے بھی کام لیا، اس لیے میں زندہ رہا۔ آج میں تمہیں اپنی قسمت آزمانے کا موقع فراہم کروں گا۔ تم خود کو بہت ذہین بھی سمجھتے ہو۔ ہم دیکھیں گے کہ تم بھی زندہ بچ نکلنے میں کامیاب ہوتے ہو یا نہیں۔ حالات بالکل وہی ہیں۔ کسی کو معلوم نہیں کہ تم کہاں ہو۔ چیخنے چلانے سے تمہارا گلا بیٹھ جائے گا، تمہاری مدد کے لیے کوئی نہیں آئے گا اور ہم بہت دور ہوں گے۔ اگر تم بچ نکلے تب بھی ہم پر کوئی الزام ثابت نہیں کر سکو گے۔"

محسن اتنی دیر میں سوٹ کیس لے آیا تھا۔ میرے کندھے پر چڑھ کے اس نے بارہ فٹ اونچی چھت کے وسط میں لگے ہوئے لوہے کے ہک کو پکڑ لیا جو پنکھا لٹکانے کے لیے لگایا گیا تھا۔ ریڈیو ٹرانسمیٹر کے ساتھ میں بندھی ہوئی پتلی سی نائلون کی ڈوری کو ہک میں سے گزار کے وہ نیچے اتر آیا۔ رسی کافی لمبی تھی۔ اس کے دوسرے کنارے کو تھام کر اس نے ایک بار پھر مجھے سیڑھی کے طور پر استعمال کیا اور رسی کو روشن دان میں سے باہر پھینک دیا۔ ڈی سلوا اس تمام کارروائی کو دہشت زدہ نظروں سے دیکھتا رہا۔ محسن نے مجھے بتایا کہ اس ڈوری کے ساتھ ساتھ تانبے کا باریک سا تار بھی لپٹا ہوا ہے جو ایریل کا کام کرے گا اور آواز کی لہروں کو تقریباً سو گز نصف قطر کے دائرے میں نشر کرنے اور ریسیو کرنے کے لیے کافی ہو گا۔ ریڈیو ٹرانسمیٹر اب کمرے کے فرش پر ہک کے بالکل نیچے رکھا ہوا تھا لیکن روشن دان سے گزر کے باہر جانے والی رسی کو کھینچا جاتا تو وہ چھت سے جا لگتا لیکن ابھی محسن کو اس میں کچھ کام کرنا تھا جس میں میری موجودگی اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی تھی۔ وہ سوٹ کیس میں اپنے لیے سینڈوچ اور گرم چائے سے بھرا ہوا تھرماس بھی لے کر آیا تھا۔ چنانچہ اس نے مجھے اجازت دی کہ میں اطمینان سے اپنا کام کر آؤں۔

"ہو سکتا ہے مجھے دو تین گھنٹے لگ جائیں۔" میں نے روانگی سے پہلے کہا۔ "یا اس سے بھی زیادہ۔ میری طرف سے بے فکر رہنا لیکن اس کی طرف سے غافل مت ہونا۔" میں نے ڈی سلوا کی طرف اشارہ کیا اور اس کے ہاتھ پھر کمر کے پیچھے کر کے باندھ دیے۔

"اگر اس نے گڑبڑ کی تو میں اسے گولی مار دوں گا۔" محسن نے ریڈیو کا پچھلا حصہ کھولتے ہوئے کہا اور ڈی سلوا کی طرف نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھا۔

"مار دینا۔" میں نے بھی اسی بے نیازی سے کہا۔ "گولی کی آواز سننے والا کون ہے۔"

"لاش کہاں دفن کریں گے؟" محسن بولا۔ "کسی کھنڈر میں؟"

"ہاں۔ کہیں اور جانے کی کیا ضرورت ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "یہاں ابھی فرش بھی کچا ہے اور دوسرے کمرے میں تو روڑی بھی ایک طرف پڑی ہے قبر کھودنے میں آسانی رہے گی۔"

"مگر اس کے لیے بیلچے وغیرہ تو لانے پڑیں گے۔" محسن اپنے کام میں مصروف رہا۔ اتنے پُرسکون لہجے اور انداز بے نیازی کے ساتھ گفتگو کرنے کا مقصد ڈی سلوا کو دہشت زدہ کرنے کے سوا کچھ نہیں تھا۔

"وہ بعد کی بات ہے۔" میں نے باہر کا رُخ کرتے ہوئے کہا۔ "لاش کا کیا ہے۔ کسی گٹر یا کنویں میں بھی ڈالی جا سکتی ہے۔"

"پاگل ہوا ہے۔" محسن بولا۔ "لاش بُو دینے لگے گی تو پولیس والے گدھ کی طرح آ جائیں گے۔"

"پھر کیا ہوا۔" میں نے کہا۔ "بس کپڑے اتار لیں گے یا زیادہ سے زیادہ سر کاٹ کے کہیں اور گاڑ دیں گے۔ پولیس کا باپ بھی شناخت نہیں کر سکتا۔"

"تم دونوں... مجھے ختم کر کے... تم بچ نہیں سکو گے۔" ڈی سلوا دہشت سے چلایا۔ "تمہیں بھی پھانسی ہو گی..."

میں ہنسا اور باہر نکل گیا۔ چابیاں ابھی تک ڈی سلوا کی گاڑی میں لگی ہوئی تھیں۔ میں نے اسے بیک کیا اور اسی راستے پر چل پڑا جس راستے سے ہم یہاں پہنچے تھے میں نے ہر موڑ کی نشانی کو ذہن میں رکھا تاکہ واپسی آسان ہو اور میرے بھٹکنے کے امکانات نہ رہیں۔ گاڑی بہت شاندار تھی اور اشارے پر یوں چلتی تھی معلوم ہوتا تھا کہ اُڑ رہی ہے۔ میں نے شیشے چڑھا کر اس کا ایئر کنڈیشنر آن کر دیا۔ مجھے اب شہر کے دوسرے کنارے تک جانا تھا۔ پینتالیس منٹ کے اس راستے کو طے کرتے ہوئے میں نے کار کے ڈیش بورڈ میں لگے ہوئے ریڈیو کو آن کیا اور کہیں سے موسیقی کا کوئی پروگرام سننے کی کوشش کی مگر لاہور سے پنجابی فلموں کے بے سُرے یا اشتہاری پروگرام نشر ہو رہے تھے۔ جالندھر امرتسر سے عورتوں کے پروگرام میں بے مقصد زنانہ گفتگو چل رہی تھی اور جموں سری نگر سے دیہاتی بھائیوں کو مفید مشورے دیے جا رہے تھے۔ باقی اسٹیشن چلتی ہوئی کار کے شور میں صاف سنائی ہی نہ دیتے تھے۔ ساڑھے گیارہ بجے میں نے راوی کا پل عبور کیا اور "ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس" پہنچنے تک لاہور سے ایک غزل سننے میں کامیاب ہو گیا۔ میری توقع کے عین مطابق چوکیدار نے گاڑی کو دور سے دیکھا اور یہ غور کیے بغیر کہ اس میں کون بیٹھا ہے گیٹ پورا کھول دیا۔ گاڑی زن سے گزر گئی اور کسی کو میری ایک جھلک بھی نظر نہ آئی۔ میں نے گاڑی کو آفس کے بالکل سامنے روکا تو کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ ڈی سلوا مالک نہیں تھا مگر اس کا رُتبہ مالکوں سے کم بھی نہ تھا۔ کس کی مجال تھی کہ گاڑی کو وہاں پارک نہ ہونے دیتا۔ میں کار کے اندر بیٹھا مناسب موقعے کا

انتظار کرتا رہا۔ پھر میں نے چوہدری دلاور کے سیکرٹری کو اس کے کمرے سے نکل کر ورکشاپ کی طرف جاتے دیکھا۔ اس نے ڈی سلوا کی گاڑی کو پہچان کر ادھر اُدھر دیکھا۔ تھوڑا سا حیران ہوا مگر میرے قریب نہیں آیا۔ برآمدہ خالی پا کے میں دوسرے دروازے سے نکلا اور پلک جھپکتے میں اندر جا پہنچا۔

میرے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر دلاور کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ وہ خوف سے منجمد بیٹھا ہوا مجھے دیکھتا رہا جب اسے یقین آ گیا کہ میرا ارادہ اس کو فوراً گولی مار کے فرار ہو جانے کا نہیں ہے تو اس نے سخت جدوجہد کے بعد خود کو سنبھال لیا۔

"یہ کیا ڈراما ہے اپنے سکندر صاحب؟" وہ بیٹھی ہوئی آواز میں بولا۔ "کوئی خطا ہو گئی ہے ہم سے جنابِ عالی جو ایسے گولہ بارود لے کر حملہ کیا ہے آپ نے تو جیسے خدانخواستہ ہم آپ کے دشمن ہیں۔ جان چاہیے تو ویسے ہی حاضر ہے۔"

"تمہاری جان میرے کس کام کی؟" میں نے کہا۔ "لیکن سیٹھ دلاور! ڈراما ابھی کہاں شروع ہوا ہے۔ یہ تو پہلا سین ہے۔ اصل ڈراما دیکھنے کے لیے تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے۔" میں نے ریوالور سے اس کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔

اس کا رنگ فق ہو گیا مگر وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔

"میں سمجھا نہیں جنابِ عالی!"

"اچھا تو میں تم کو آسان زبان میں سمجھاتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "ایسے مناظر تم نے فلموں میں بھی دیکھے ہی ہوں گے۔ میں صرف دس تک گنوں گا۔ اتنی دیر میں تم کو دروازے تک پہنچنا ہے۔ قتل میرے پروگرام میں شامل نہیں ہے لیکن تم خودکشی کرنا چاہو تو تمہاری مرضی۔ کسی کو آواز دے کر دیکھو یا مقابلہ کرو۔ تمہارے قتل کا الزام ڈی سلوا پر آئے گا۔ کیسے اور کیوں؟ یہ تو جنابِ عالی! یہ بھی آپ باہر نکلتے ہی سمجھ جائیں گے۔ ایک... دو... تین... چار...." شاید میرے ارادے کی مضبوطی کا اندازہ اس نے میرے لہجے سے لگا لیا تھا کہ وہ فوراً کھڑا ہو گیا اور ابھی میں نے نو تک ہی گنا تھا کہ دروازے تک جا پہنچا۔ خود میں بھی جوا کھیل رہا تھا اور ہر لمحہ مجھے کسی کے آجانے کا خطرہ لاحق تھا۔ حل میں نے پہلے ہی سوچ رکھا تھا اگر کوئی آجاتا تو منظر بالکل بدل جاتا۔ ریوالور غائب ہو جاتا اور میرے ہاتھ میں میرے وصیت نامے کی نقل آ جاتی۔ سننے والا یہی سنتا کہ میں چوہدری دلاور کو یہ نقل دینے کی بات کر رہا ہوں اور چوہدری دلاور کے لیے ثابت کرنا ناممکن ہو جاتا کہ میں اس کو زبردستی اغوا کر کے لے جا رہا ہوں۔ میں اس کو کیوں اغوا کر... کیسے... دن دہاڑے فیکٹری میں سے فیکٹری... کو اٹھا کر لے جانا کوئی سمجھ میں آنے والی بات... منٹ کے وقفے میں کوئی بھی حائل نہیں ہوا۔ خطرہ... آخری سرحد برآمدہ تھا جہاں کوئی بھی مجھے دیکھ... گڑبڑ ہو جاتی چنانچہ میں نے صرف ایک آدمی کو... مخالف سمت میں جاتے دیکھا تو خدا کا شکر ادا کیا۔... پہلے چوہدری دلاور کو اور پھر مجھے گاڑی میں داخل... نہیں دیکھا۔

"گاڑی اسٹارٹ کرو۔" میں نے دروازہ بند کر... حکم دیا۔ "اور اطمینان سے گیٹ کی طرف چلو۔ ایک... کو ذہن میں رکھنا کہ گیٹ پہ کسی کو شک نہیں ہو... ورنہ میں خود بھی گاڑی چلانا جانتا ہوں۔ تمہیں شوٹ... بھی میں گاڑی نکال لے جاؤں گا لیکن دیکھنے والے... دیں گے کہ تمہیں ڈی سلوا لے گیا ہے۔"

"آپ بڑے بھولے ہیں اپنے سکندر صاحب!"... نے کہا۔ "کسی کے کچھ بھی کہنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ڈی... اس وقت اپنے آفس میں بیٹھا ہوگا اور اس کے گواہ... ہوں گے۔"

"عجیب بات ہے دلاور!" میں نے کہا۔ "گاڑی... ڈی سلوا آفس پہنچا ہی نہیں حالانکہ وہ گھر سے آفس جا... کے ہی لیے نکلا تھا۔ اگر وقت ہوتا تو میں آپ کو ثبوت... کرتا اور آپ ٹیلی فون کر کے تصدیق کر لیتے لیکن... گاڑی چلائیے جنابِ عالی!"

چوہدری دلاور کو یقین آ گیا کہ میں جھوٹ نہیں... رہا ہوں اور اس کے خلاف سازش کا یہ جال بہت... ہے۔ اس نے گاڑی کا رُخ دروازے کی طرف موڑا۔... بالکل تیار تھا کہ وہ ذرا بھی غلط حرکت کرے تو گر... بجائے ریوالور کا دستہ مار کے کام چلاؤں۔ چوکیدار... گیٹ کھولا اور چوہدری دلاور کو گاڑی چلاتے دیکھا... بھی کیا۔ سبز رنگ کے شیشوں میں سے اس نے... کی ہلکی سی جھلک بھی دیکھی ہوگی۔ میں دوسری طرف... اور ایک سیکنڈ کے لیے میں نے اپنا چہرہ بھی مخالف... میں کر لیا تھا۔ گاڑی پھاٹک میں سے گزر گئی تو میں... دلاور سے کہا۔ "اس وقت تم نے عقل مندی سے کام... کر اپنے بچوں کو یتیم ہونے سے بچا لیا۔"

"ہم عقل مند ہوتے ناجی سکندر صاحب!" اس نے کہا۔ "تو اس وقت تک سمجھ گئے ہوتے کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے؟"

"آہستہ آہستہ سب باتیں سمجھ میں آجائیں گی۔" میں نے کہا۔ "معاملات کو سمجھنے میں کچھ وقت تو لگتا ہی ہے۔ اب مجھے دیکھیں۔ اتنا عرصہ ہو گیا ولایت سے آئے۔ میں بھی بہت سی باتوں کو اور بہت سے انسانوں کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن کامیابی ابھی تک نہیں ہوئی۔ مثلاً میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ میر شرافت علی کو کس نے قتل کیا... وزیر خان کے قاتلوں کے بارے میں مجھے معلوم ہے کہ وہ کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟ بس میں ان کو کسی عدالت میں نہیں لے جا سکتا۔ میری سمجھ میں یہ بھی نہیں آتا کہ جس شخص نے آپ کے ایک بزنس پارٹنر کی حیثیت سے پچھلے سال گزشتہ کا منافع ساڑھے تین لاکھ روپے وصول کیا تھا وہ سرکاری اسپتال سے ملنے والی مفت دوائی کے بغیر مرا۔ وہ تمہارا پارٹنر تھا۔ اس نے تمہیں اس قابل کیوں نہیں سمجھا...؟"

"تم بھی تو اس کی ایک ہی اولاد تھے۔" دلاور نے میری بات کاٹ دی۔ "اس نے تمہیں قابلِ اعتماد کیوں نہیں سمجھا؟"

"قابلِ اعتماد؟" یہ لفظ ایک طمانچے کی طرح تھا جو میرے منہ پر پڑا۔ اس طمانچے کا کوئی جواز نہیں تھا لیکن میں اس کا جواب بھی نہیں دے سکتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہ عدم اعتماد نہیں لیکن اصلیت نہیں تھی۔ خوف تھا یا اندیشہ تھا جس نے وزیر خان کو مہر بہ لب رکھا۔ خوف کس کا تھا اور اندیشہ کس سے تھا اور اس کے لب کھولنے سے خطرہ میری زندگی کو لاحق ہوتا تھا یا اس کی اپنی زندگی کو؟ یہ اور ایسے ان گنت سوالوں کا جواب بھی معمائے زندگی تھا اور میری ساری جدوجہد اس کے لیے وقف تھی۔

"وقت نے مجھے بہت کچھ بتا دیا ہے سیٹھ دلاور!" میں نے کہا۔ "وقت تمہیں بھی بہت کچھ بتا دے گا۔ دیکھنا یہ ہے کہ وقت سے لڑنے کا حوصلہ کس میں زیادہ ہے۔ اس کھیل کے تمام ہونے سے پہلے تمہیں بھی بہت سے ایسے تجربات ہوں گے جو تمہارے گمان میں بھی نہیں ہیں۔ گاڑی کو ماڈل ٹاؤن کی طرف جانے دو۔ ان راستوں سے تم اچھی طرح واقف ہو۔"

ماڈل ٹاؤن پہنچنے کے بعد میں نے دلاور کی راہنمائی کی۔ اتنی دیر میں دلاور نے بھی صورتِ حالات کو سمجھ لیا تھا۔ اس کا خوف زدہ ہونا ایک قدرتی امر تھا لیکن وہ بہت اچھا اداکار تھا۔ اس کے نمونے میں کئی بار دیکھ چکا تھا۔ ایک رات وہ بھایا بن کر مجھ سے ہمکلام ہوا تھا۔ دوسری بار میں نے اس کی آواز فرشتۂ اجل کی طرح ایک ریڈیو ٹرانسمیٹر سے سنی تھی لیکن کسی بھی موقع پر وہ میرے سامنے نہیں آیا تھا۔ قصرِ جمشید کے سامنے پہنچ کر میں نے اسے گاڑی رکنے کے لیے کہا۔

"یہ ویران حویلی ایک ایسے شخص کی ہے جو مجھ سے اپنی موت کے چالیس سال بعد ملا۔" میں نے کہا۔ "یہی نہیں۔ اس کے ساتھ اس کا ہمزاد بھی تھا۔"

"یہ قصے کہانیاں مجھے سنانے کا کیا مقصد ہے اپنے سکندر صاحب؟" وہ بولا۔

"کچھ لوگوں کا یہ اعتقاد ہے کہ ہر شخص کا ایک ہمزاد بھی ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اور اسے قابو بھی کیا جا سکتا ہے۔ روحوں کے وجود سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ بات واقعی قابلِ غور ہے کہ چالیس سال بعد اگر نواب خسرو جمشید کی روح کو دنیاوی معاملات میں دخل دینا ہی تھا تو اس نے اپنے ہمزاد کو بلاوجہ کیوں زحمت دی۔ کیا ہمزاد کی کوئی اپنی روح بھی ہوتی ہے؟"

میں نے قہقہہ مارا۔ "تم تو مجھے ایسے دیکھ رہے ہو جیسے میں فارسی بول رہا ہوں۔ حالانکہ جو بات ہے وہ تم سمجھ گئے ہو۔" وہ اس کے لیے بالکل تیار نہ تھا چنانچہ میرے اچانک وار سے وہ خود کو بچانے کی کوشش بھی نہ کر سکا اور وہیں سیٹ پر لڑھک گیا۔ اس کی جگہ ڈرائیونگ سنبھال کے میں گاڑی کو پھر وہیں لے گیا جہاں محسن میرے انتظار میں اور اپنے کام سے تقریباً فارغ ہو چکا تھا۔ ہم دونوں نے مل کر نئے فنکار کو دوسرے کمرے میں منتقل کیا اور بے دست و پا کر کے ڈال دیا۔

محسن نے کمال مہارت کا ثبوت دیا تھا۔ اصل دوسرے ریڈیو ٹرانسمیٹر میں بھی فیوز کا نظام تقریباً ویسا ہی تھا جیسا پہلی بار مجھے ختم کرنے کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ پیچھے والے خانے میں سیل اوپر تھے اور نیچے ڈور لاک کی چابی استعمال نہیں کی گئی تھی۔ تقریباً دو انچ لمبا لوہے کا ٹکڑا تھا جس کے آخری کنارے سے دونوں طرف بال جیسے باریک تار بندھے ہوئے تھے اور یہ تار بھی باڈی کے اندر غائب ہو جاتے تھے۔ محسن نے بجلی پکڑنے کی ڈور کا ایک سرا پوری احتیاط سے مضبوطی کے ساتھ لوہے کے ٹکڑے کے ساتھ باندھ دیا تھا۔ صرف ایک جھٹکا دینے سے وہ ٹکڑا سیلوں کے ساتھ باہر آگرتا اور دونوں کناروں سے منسلک باریک

"تاروں کے ٹوٹتے ہی بم پھٹ جاتا۔ ریڈیو ٹرانسمیٹر کا پچھلا حصہ محسن نے کھلا چھوڑ دیا تھا اور دو قطاروں میں لگے ہوئے آٹھ نئے سیل صاف نظر آتے تھے۔ ڈور کا دوسرا کنارہ ایسے ہی جھول رہا تھا لیکن محسن نے پرانی وضع کی ایک گھڑی اپنے سوٹ کیس میں سے برآمد کی۔ اس نے ڈور کو ٹائم پیس کے پیچھے والے حصے میں ایک چابی سے لپیٹ کر دکھایا۔

"اس وقت ڈیڑھ بجا ہے۔" محسن نے گول ٹیبل کلاک کا رخ میری طرف کیا۔ گھڑی چل رہی تھی اور خالی کمرے میں اس کی ٹک ٹک صاف سنائی دیتی تھی ——— اس میں الارم بجنے کے لیے اس دوسری چابی کو دائیں سے بائیں گھمانا پڑتا ہے۔ یوں۔" اس نے مجھ سے زیادہ ڈی سلوا کی معلومات کے لیے عملی مظاہرہ کیا۔ "اب فرض کیجیے آپ دو بجے کا الارم سیٹ کر کے رخصت ہو جاتے ہیں اور ڈور کو اس چابی سے باندھ کر گھڑی کو اتنے فاصلے پر رکھ دیتے ہیں کہ ڈور کھنچی رہے تو ٹھیک دو بجے کیا ہوگا؟"

"الارم بجنے لگے گا اور چابی مخالف سمت میں گھومے گی یعنی بائیں سے دائیں۔" میں نے کہا۔

"رائٹ۔ اور جب چابی گھومے گی تو ڈور اس پر لپٹنے لگے گی۔ الارم کے اسپرنگ کی قوت خاصی ہوتی ہے اور ڈور کو ایک ہلکے سے جھٹکے کی ضرورت ہے۔ ایک یا زیادہ سے زیادہ دو بار چابی کے گرد لپٹنے سے ڈور کا تناؤ بڑھ جائے گا۔ ریڈیو ٹرانسمیٹر چھت کے ساتھ مضبوطی سے بندھا ہوا ہے اور ڈور اسے نہیں کھینچ سکتی۔ ڈور ٹوٹ بھی نہیں سکتی لیکن لوہے کے ٹکڑے کو کھینچ سکتی ہے سارے سیل ایک ساتھ فرش پر گریں گے اور اس کے ساتھ ہی لوہے کے ٹکڑے کا تاروں سے رشتہ ٹوٹ جائے گا۔ پھر دھماکا۔" اس نے اپنے سینے پر انگلی سے صلیب کا نشان بنایا۔ "جاتے وقت ہم اس گھڑی کو روشن دان میں رکھ جائیں گے۔"

"جانے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ مسٹر ڈی سلوا اپنا وصیت نامہ پڑھ لیں۔" میں نے کہا۔ اور جیب سے اپنے وصیت نامہ کی ایک نقل برآمد کی جو میں نے رابعہ سے حاصل کی تھی۔ یہ نقل میں نے ڈی سلوا کے سامنے رکھ دی جس کی حالت اس شخص سے مختلف نہ تھی جو دیکھ رہا ہو کہ اسے پھانسی دینے کے انتظامات مکمل کیے جا رہے ہیں۔

"یہ... یہ تو تمھارا وصیت نامہ۔" وہ مردہ آواز میں بولا۔

"کمال ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "مسٹر ڈی سلوا وصیت نامہ ہمیشہ مرنے والے چھوڑتے ہیں۔ بفضلِ خدا میں صحیح سالم اور تندرست ہوں۔ نہ میری مرنے کی عمر ہے اور نہ میرا ارادہ خودکشی کا ہے۔ خوف نے تمھاری عقل خبط کر دی ہے۔ ایک بار پھر

ڈی سلوا کی عقل واقعی خبط ہو چکی تھی

وہ دوبارہ وصیت نامے کو نہ دیکھتا۔ اس میں سات علاوہ بھی بہت سے نام تھے مگر ڈی سلوا کا نام کہیں نے وہ نقل اٹھا لی اور پھر اپنی جیب میں رکھ لی۔

"اب ہم چلتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "کسی بات کی سے یونہی آباد رہے گی دنیا۔ تم نہ ہو گے کوئی تم سا "وقت بہت کم ہے۔ خدا سے اپنے تمام گناہوں کی مانگو۔" محسن نے کہا۔ "تاکہ تم سکون سے مر سکو۔"

اس کے بعد محسن نے میرے کندھے پر چڑھ کر روشن دان میں رکھا لیکن ڈی سلوا کو بتائے بغیر الارم کا وقت بجے سے بڑھا کے رات کے آٹھ بجے کا کر دیا۔ ڈی سلوا تھا۔ وہ گالیاں بکتا ہوا اور چیختا چلاتا دونوں بندھے پیروں پر ایک ساتھ اچھلتا ہوا ہماری طرف آیا۔ محسن رہا اور جب وہ قریب پہنچا تو اپنی ٹانگ ہٹنے کے بجائے جوتے کی ایڑی ڈی سلوا کے منہ پر لگی اور وہ بلبلا کر گر گیا۔ محسن گھڑی رکھ کے نیچے کود گیا۔

"دو چار باتیں اچھی طرح سمجھ لو۔" میں نے اپنے کپڑوں سے گرد صاف کرتے ہوئے کہا۔ "ایک تو یہ کہ دور تک تمھاری پکار سننے والا کوئی نہیں ہے۔ دوسری بات یہ کہ تم خود اپنے پیر نہیں کھول سکتے۔ کھڑکیوں میں سلاخیں ہیں اور دروازہ باہر سے بند ہے۔ بالفرضِ محال تم آزاد ہو گئے تب بھی تم نہیں نکل سکتے اور تمھارا ہاتھ نہ چھت تک پہنچ سکتا ہے نہ روشن دان تک۔ اس کمرے کی سپاٹ دیواریں تمھاری کوئی مدد نہیں کریں گی۔ کمرے میں ایک تنکا تک نہیں ہے کہ تم گھڑی کو یا ریڈیو ٹرانسمیٹر کو تباہ کر سکو۔ گھڑی تمھارے ہاتھ پہ ہے۔ ہم نے الارم کا وقت آدھ گھنٹے آگے بڑھا دیا ہے۔ یہ فیصلہ تم خود کر سکتے ہو کہ تمھاری کتنی زندگی باقی ہے اور یہ وقت تمھیں کیسے گزارنا ہے۔"

اسے دہشت میں پڑا چھوڑ کے ہم باہر آ گئے۔ محسن کے سوٹ کیس میں اب صرف ایک ریڈیو ٹرانسمیٹر تھا جس میں کوئی بم نہیں تھا۔ باہر آتے ہی محسن نے اس کو آن کیا اور ڈی سلوا کے رونے کی آواز صاف سنی۔

"ہمت سے کام لو مسٹر ڈی سلوا۔" میں نے ٹرانسمیٹر کا بٹن دبا کے کہا۔ "تم تو بہت بہادر بنتے تھے۔ موت کو سامنے دیکھ کر تمھاری حالت خود تمھارے لیے باعثِ شرم ہونی چاہیے۔" مجھے یقین تھا کہ کمرے میں چھت سے لٹکے ہوئے ریڈیو نے میری آواز ڈی سلوا کے کانوں تک پہنچا دیا ہوگا۔"

بھائی کے لیے ایک آخری اطلاع۔" محسن نے کہا۔ "آج کا دن تم نے کہاں اور کیسے گزارا، اس کے معتبر گواہ موجود ہیں۔ اس لیے تمھاری موت کا الزام ہم پر نہیں آئے گا۔"

"آج تم نے ایک بہت ہی غلط کام کیا تھا۔" میں نے کہا۔ "تم اپنی گاڑی میں فیکٹری گئے اور فیکٹری کے مالک کو اٹھا لے گئے۔ بہت سے لوگ اس بات کے گواہ ہیں اور مجھے یقین ہے کل تک تمھارے خلاف رپورٹ بھی لکھوا دی جائے گی۔ افسوس ہے کہ پہلے تو تم ملو گے نہیں اور ملو گے تو اس حال میں کہ کوئی جواب نہیں دے سکو گے۔ اگر ایم ڈبلیو ڈی کمپلیکس کا مالک بھی نہ ملا تو پولیس کے لیے بڑی پیچیدگی پیدا ہو جائے گی۔ وہ ذرا آسان پسند لوگ ہوتے ہیں اور بلاوجہ معاملے کو طول نہیں دیتے ہیں۔ وہ فرض کر لیں گے کہ تم سیٹھ دلاور کو لے گئے تھے اور ذاتی عداوت کی بنا پر تم نے اسے کہیں لے جا کر قتل کر دیا۔ پولیس کے پاس ایک کیس رہ جائے گا کہ تمھیں کس نے مارا تو یہ معما بھی آسانی سے حل ہونے والا نہیں ہے۔"

"فار گاڈ سیک۔" ڈی سلوا کی لرزتی ہوئی آواز آئی۔ "مجھے مت مارو۔ میں اپنے ہر جرم کا اعتراف کرتا ہوں۔"

"تم کسی عدالت میں مجرموں کے کٹہرے میں تو نہیں کھڑے ہو ڈی سلوا!" میں نے ہنس کر کہا۔ "کیا فائدہ اس اعتراف کا جس کی قانونی اہمیت کچھ نہیں۔ اس وقت تو تم صرف خدا سے معافی مانگ سکتے ہو کیونکہ دنیا کے قانون کو تم نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے۔ اب یہ بھی دیکھ لو کہ قدرت کا نظامِ انصاف کیا ہے۔ تم مجھے حقِ وراثت سے محروم کرنا چاہتے تھے تاکہ سیٹھ دلاور پورے کاروبار کا مالک بن جائے لیکن اب صرف میں اس کاروبار کا مالک رہ گیا ہوں۔"

"خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو۔" ڈی سلوا بلبلایا۔ "میں تمھیں سب کچھ بتا دوں گا۔ میں تمھارا ساتھ دوں گا۔"

"مسٹر ڈی سلوا ساتھ دینا کیسا؟ تم ایک تنخواہ دار ملازم تھے۔" میں نے کہا۔ "تمھاری جگہ تم سے زیادہ قابل، فرض شناس اور وفادار منیجر مل جائے گا۔ بے روزگاری اتنی زیادہ ہے کہ جتنی تنخواہ تم لیتے تھے اس سے آدھی بھی نہیں دینی پڑے گی۔ اچھا اب ہم جا رہے ہیں۔ تمھارے پاس پورا آدھا گھنٹہ ہے۔ گڈ لک اینڈ گڈ بائی۔"

محسن نے کار اسٹارٹ کی تو میں نے ریڈیو ٹرانسمیٹر کا تار کھڑکی سے نکال کر بونٹ پر لگے ہوئے ایریل سے باندھ دیا کیونکہ انجن کے شور کے باعث ڈی سلوا کے چیخنے چلانے منت سماجت کرنے اور رونے کے لیے دلوانہ وار پکارنے کی آوازیں صاف سنائی نہیں دیتی تھیں۔ ہم نے بیس منٹ میں آس پاس کی کچی پکی سڑکوں پر سو گز دور جا کے بھی دیکھا۔ مواصلاتی رابطہ بالکل ٹھیک کام کر رہا تھا۔ ڈی سلوا نے یقیناً گاڑی کے روانہ ہونے کی آواز سن لی تھی اور یہ سمجھ لیا تھا کہ ہم پر کسی بات کا اثر نہیں ہوگا۔ اب وہ رو بھی نہیں رہا تھا۔ اس کے اپنے خیال کے مطابق دس منٹ میں اس کا کام تمام ہونے والا تھا۔

"یار محسن۔" میں نے تشویش سے کہا۔ "کہیں یہ ڈھائی بجے سے پہلے ہی نہ مر جائے۔"

"اگر مر جائے تو اس سے اچھی بات کیا ہو سکتی ہے۔" محسن بولا۔ "قتل کا کیس ہی نہیں بنے گا۔ یہ ریڈیو ٹرانسمیٹر پھر کبھی کام آئے گا کچھ دیر بعد لوٹ کر جائیں گے تو دیکھ لیں گے لیکن وہ جو دوسرے کمرے میں بڑا اسمگلر قید ہے....."

"وہ زیادہ سے زیادہ فرش پر لوٹ لگا سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "یا ڈی سلوا کے چیخنے چلانے کی آواز سن سکتا ہے مگر وہ اپنی مدد آپ نہیں کر سکتا تو ڈی سلوا کی کیا مدد کرے گا۔ چل کہیں کھانا کھا کے آتے ہیں۔"

"کیوں نہ ہم گھر جا کے کھانا کھائیں۔" میں نے تجویز پیش کی۔ "بیگم رضوی سیدھی سادی عورت ہیں۔ ان کو یقین دلایا جا سکتا ہے کہ ہم دو گھنٹے سے اپنے کوارٹر میں ہی تھے۔ کھانے کے بعد قیلولہ کریں گے اور انکل رضوی کے آ جانے کے بعد اطمینان سے فلم دیکھنے کے بہانے گھر سے نکلیں گے۔"

"اور یہ گاڑی۔ ابھی تو ہمیں اس کی ضرورت ہے۔" محسن بولا۔

"اس کو گھر سے دور باغِ جناح میں پارک کر دیں گے۔" میں نے کہا۔ "دس منٹ کا راستہ پیدل طے کر لیں گے۔"

بیگم رضوی ہمیں دیکھ کر خاصی حیران ہوئیں۔ انھوں نے بہت آسانی سے یقین کر لیا کہ ہم سوئے پڑے تھے اس لیے ٹھیک کھانے کے وقت نہیں پہنچ سکے۔ خانساماں کو ایمرجنسی میں طلب کر کے دو افراد کا کھانا حاضر کرنے کا حکم دیا گیا اور کھانا آنے تک ہم نے بیگم رضوی کو اپنی باتوں سے خوب ہنسایا۔ شوہر کی مستقل مصروفیت کی وجہ سے وہ زیادہ وقت گھر میں تنہا گزارتی تھیں اور انھیں کوئی بات کرنے والا بھی نہیں ملتا تھا۔ اس کے علاوہ رضوی صاحب سنجیدہ مزاج تھے۔ بیگم رضوی کو اس بات کا ملال تھا کہ ہم نے الگ مکان لے کر رہنے کا فیصلہ کیا ہے اور اگر رابعہ بھی ہمارے ساتھ چلی گئی تو انھیں گھر سونا سونا لگے گا۔ پھر انھوں نے مجھے مشورہ دیا کہ رابعہ سے شادی کر لو اور اسی گھر میں رہو۔ میں نے اٹھتے اٹھتے بڑی سنجیدگی سے کہا کہ اس وقت تو نیند آ رہی ہے اور رابعہ بھی نہیں ہے۔ "شام کو چٹ منگنی پٹ بیاہ اور فٹافٹ۔ ایک کے بعد ایک۔" میں نے چٹکی بجا کے کہا۔ "خدا نے

چاہا تو یہ گھر جہادی کیمپ بن جائے گا۔" میں نے ان کو ہنستا چھوڑا اور ہم دونوں اپنے کمرے میں آ کے پڑ گئے۔ آنکھ کھلی تو پورے پانچ بجے تھے ہم نے جلد از جلد تیار ہو کے انکل رضوی کی خدمت میں حاضری دی جو لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے شاید بیگم رضوی نے دوپہر کی باتیں بتائی تھیں کہ اچھے موڈ میں نظر آتے تھے۔ چائے پیتے ہوئے ہم نے اِدھر اُدھر کی باتیں کیں اور ان کو اپنے پروگرام سے بھی آگاہ کر دیا۔ جب ساڑھے پانچ بجے ہمیں ان سے اجازت ملی تو ہم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ ساتھ نہیں ہو لیے یا بیگم رضوی نے اچانک فلم کا پروگرام نہیں بنایا۔— باغ جناح تک پہنچتے پہنچتے ہمیں چھ بج گئے۔ ڈرائیونگ میں نے سنبھالی اور گاڑی کو ستر اسی میل کی رفتار سے دوڑایا۔ دو جگہ ہم نے جلتے بجھتے سگنل توڑے اور ٹریفک سارجنٹ کو گاڑی کا نمبر نوٹ کرنے کا موقع فراہم کیا۔ بنک اسکوائر کے سگنل پر ایک سارجنٹ نے اپنی بھاری بھرکم موٹر سائیکل پر ہمارے تعاقب کا ارادہ کیا۔ وہ ہمارے پیچھے لگ جاتا تو ہمیں گاڑی چھوڑ کے بھاگنا پڑتا مگر اس کی موٹر سائیکل اسٹارٹ نہیں ہوئی اور ہم چند منٹ میں مال روڈ کے ختم ہوتے ہی ضلع کچہری کے پاس بائیں طرف گھوم گئے۔ ساڑھے چھ بجے تھے جب میں نے گاڑی کو پھر اسی کوٹھی کے اندر کھڑا کیا جہاں ہمارے دونوں اسیر موجود تھے۔ میں آتے کے باری باری دونوں کمروں میں گیا۔ ڈی سلوا اسی طرح دست و پا بستہ دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھا تھا اور برسوں کا بیمار لگتا تھا۔ چند گھنٹوں میں اس کی عمر میں کئی سال کا اضافہ ہو گیا تھا لیکن وہ زندہ تھا اس امید پر کہ موت کا وقت ٹل گیا ہے۔ میں نے دروازہ پھر بند کیا اور چودھری دلاور کو اٹھا لایا۔ محسن کار کی ڈکی کھولے کھڑا تھا۔ میں نے چوہدری دلاور کو اسٹیرنگ وہیل، جیک اور وہیل اسپیئر کے ساتھ ہی لٹا دیا۔ دلاور کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور اس کی خاموشی بھی التجا بن گئی تھی۔ بنڈل کی طرح بھوکے پیاسے پڑے رہنے کا اثر اس کی صورت سے عیاں تھا اور شاید سر کی چوٹ کا اثر بھی کافی تھا۔

"ہم نے تمہیں بہت مہلت دی تھی سیٹھ دلاور۔" میں نے ایک پیر پچھلے بمپر کے اوپر رکھ کے کہا۔ "یہ غور کرنے کے لیے کہ طاقت کا غرور کتنا بے معنی ہوتا ہے۔ وہ جو کسی نے کہا ہے نا کہ آدمی بلبلا ہے پانی کا۔ وہ ان سب کے لیے کہا ہے جن کا ذکر 'آدمی نامہ' میں آیا ہے۔ ظالم اور مظلوم، محمود و ایاز، غریب و امیر۔ ہم اور تم سب پانی کے بلبلے ہیں۔ ابھی تمہیں اندازہ ہوا ہے نا، بہت جلد تمہیں اس کا یقین بھی آ جائے گا۔ تمہیں معلوم ہے یہ گاڑی ڈی سلوا کی ہے۔ مجھے تمہارے آفس میں آتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا تھا اور دیکھنے والوں کو یقین ہوگا کہ تم ڈی سلوا اپنے ساتھ لے گیا ہے۔ جب تمہاری لاش […] میں سے برآمد ہوگی تو قتل کا الزام کس پر آئے گا؟ میر […] کا قاتل کوئی اور تھا مگر حالات نے مجھے ملزم بنا […] حالات ہی ڈی سلوا کو تختۂ دار پر لے جائیں گے۔ یہ […] کھیل ہے چوہدری صاحب جو آپ اب تک کھیلتے […] آپ قانون سے کھیلتے رہے۔ اب تقدیر آپ کے ساتھ کھیل […] ہے۔ ڈی سلوا اور تم دونوں مل کر ہر جرم کرتے رہے […] کی گرفت سے محفوظ رہے کیونکہ تم تدبیر سے کام لیتے […] اپنے خلاف کوئی ثبوت یا شہادت نہیں چھوڑتے تھے […] وقت کبھی تم نے سوچا تھا کہ تدبیر کند بندہ، تقدیر کند خندہ؟" میں نے اس کے منہ میں سے کپڑا نکال دیا۔ "تم دوسروں کی کمزوری کا اور قانون کی بے بسی کا مذاق اڑاتے رہے اور ہنستے رہے۔ انگریز کہتے ہیں کہ ہنسنے والوں کو ہنسنے دو۔ دیکھنا […] آخری بار کون کس پر ہنستا ہے۔ اور کون کس کو روتا ہے۔"

"سکندر صاحب!" چودھری دلاور نے پڑے پڑے کہا۔ اس کی آواز کا سارا غرور اور اعتماد ختم ہو چکا تھا۔ "مجھے مار کے تمہیں کیا ملے گا؟"

"یہ تم پوچھ رہے ہو؟" میں نے ایک قہقہہ لگایا۔ "[…] وہی سب کاروبار ملے گا اپنے چوہدری صاحب! جس کے مالک آپ بننا چاہتے تھے۔"

محسن نے دوبارہ اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کے ڈکی بند کر دی اور ہم باہر نکل آئے۔ اس علاقے میں غیر آباد مکانوں کی کمی نہ تھی اور رات کے وقت تاریکی دیکھ کر یہ اندازہ کرنا اور بھی آسان ہو جاتا تھا کہ کون سا مکان لاوارث پڑا ہے۔ ساٹھ ستر گز کے فاصلے پر میں نے ایک ایسے گھر کو منتخب کیا جو خالی پلاٹوں کے درمیان اکیلا کھڑا تھا اور بالکل ویران تھا۔ انجن بند کر کے میں نے ہیڈ لائٹس آف کیں اور پیدل چل کے دروازے تک پہنچا۔ بار بار کال بیل بجانے کے باوجود دروازہ کھولنے کوئی نہیں آیا تو میں نے محسن کو اشارہ کیا اور وہ ریڈیو ٹرانسمیٹر لے کر گاڑی سے اتر آیا۔ ہم دونوں دیوار پھاند کر اندر پہنچے اور پچھلے حصے کے برآمدے میں بیٹھ گئے۔ محسن نے ایریل کے تار کو ایک درخت کی شاخ سے باندھ کے ریڈیو ٹرانسمیٹر آن کیا۔ ہمیں صرف ایک ایسی جگہ کی ضرورت تھی جو ڈی سلوا کے قید خانے سے زیادہ دور نہ ہو اور جہاں ہمیں کوئی بھی بات کرتا نہ دیکھ سکے۔

"مسلسل آن رہنے سے دوسرے ریڈیو ٹرانسمیٹر کے سیل

ختم تو نہیں ہوئے ہوں گے؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ اتنی جلدی سیل ختم نہیں ہو سکتے۔" محسن بولا۔ "کچھ کمزور پڑ سکتے ہیں۔ اس سے صرف یہ ہوگا کہ آواز ہلکی سنائی دے گی اور زیادہ دور تک نہیں جائے گی۔"

میں نے ٹرانسمیٹر والا بٹن دبایا اور چند سیکنڈ تک کوئی آواز سننے کی کوشش کرتا رہا لیکن ڈی سلوا خاموش بیٹھا تھا۔ اسیری کے پانچ گھنٹوں میں اس نے یہ حقیقت تسلیم کر لی تھی کہ ہماری مرضی کے بغیر اس کا یہاں سے زندہ نکلنا مشکل ہے۔ ڈھائی بجے اس نے سمجھ لیا ہوگا کہ بس اب چند سیکنڈ میں الارم بجنے لگے گا جو کوچ کا نقارہ ہوگا۔ معلوم نہیں اس نے سولی پر لٹکنے والے شخص کی طرح جان لیوا عذاب کے چند لمحے کس طرح کاٹے ہوں گے۔ ہر لمحہ عذاب کی ایک گھڑی بن گیا ہوگا۔ مگر اس وقت کے گزر جانے کے بعد آہستہ آہستہ خوف اور بے یقینی کے ساتھ امید بھی بیدار ہونے لگی ہوگی۔ اس نے سوچا ہوگا کہ ہم بلف کر رہے تھے۔ ہمارا ارادہ اس کو قتل کرنے کا نہیں تھا۔ ہم صرف اسے دہشت زدہ کرنا چاہتے تھے اور یہ سمجھانا چاہتے تھے کہ ان کا ہر ناجائز حربہ ہم بھی استعمال کر سکتے ہیں اور یہ مقابلہ برابر کا ہے لیکن یہ خوف ہر وقت اس پر سوار رہا ہوگا کہ نہ جانے کب الارم اچانک چلانے لگے۔ ڈھائی بجے کے بجائے ہم نے وقت کچھ اور رکھا ہو اور ہمارا مقصد اس کے لیے نزع کے کرب کو زیادہ سے زیادہ طول دینا ہو۔

"ہیلو مسٹر ڈی سلوا!" میں نے کہا۔ "کیا یہ خوشی کی بات نہیں ہے کہ تم ابھی تک زندہ ہو؟"

محسن نے اتنی دیر میں ریڈیو ریسیور سے ایک پورٹیبل ٹیپ ریکارڈر بھی جوڑ دیا تھا تاکہ ڈی سلوا کی ہر بات ریکارڈ بھی ہو جائے۔

"آخر تم لوگ کیا چاہتے ہو؟" ڈی سلوا نے سرسری آواز میں کہا۔

"اصل بات یہ ہے مسٹر ڈی سلوا کہ ہم کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "جواب دینے کے لیے تمہارے پاس صرف ایک گھنٹہ ہے اور اس مرتبہ شک کی کوئی گنجائش نہیں کیونکہ الارم کا وقت ہم نے ڈھائی بجے نہیں، آٹھ بجے کا رکھا تھا۔ انتخاب تمہارے ہاتھ میں ہے۔ ٹھیک ٹھیک جواب دو گے تو ہم ٹھیک دس منٹ پہلے تمہیں نکال لیں گے۔ ورنہ دس منٹ پہلے یہاں سے چلے جائیں گے جہاں سے ہم بات کر رہے ہیں۔ یہ جگہ زیادہ دور نہیں ہے۔ ہمارا رابطہ شارٹ رینج کے میڈیم ویو ٹرانسمیٹر کے ذریعہ قائم ہے اس لیے ہماری آواز کوئی اور نہیں سن سکتا۔"

"میں کوشش کروں گا کہ جو کچھ میں جانتا ہوں تمہیں بتا دوں۔" ڈی سلوا کی آواز آئی۔

میں نے محسن کو ٹیپ ریکارڈر آن کرنے کا اشارہ کیا اور اس کے مائیکرو فون پر رومال ڈال کے کہا۔ "کیا تمہیں معلوم ہے کہ میر شرافت علی کو کس نے قتل کیا تھا، اسے کس نے قتل کروایا تھا اور کیوں؟" اب میری آواز نشر بھی ہو رہی تھی اور ریکارڈ بھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ ڈی سلوا کے کانوں تک پہنچنے والی آواز میں کوئی فرق نہ تھا لیکن مائیکرو فون پر پڑے ہوئے رومال کے باعث ریکارڈ ہونے والی آواز بالکل بدل گئی تھی۔

"مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ قتل کرنے والا استاد پیڈرو تھا۔" ڈی سلوا نے کہا۔ "مجھے یہ نہیں معلوم کہ پیڈرو کو حکم دینے والا کون تھا۔ چوہدری دلاور اور میر شرافت علی ایک دوسرے کے ساتھی تھے اور انھوں نے آپس میں طے کر لیا تھا کہ پہلے وزیر جان کو اور پھر تمہیں ٹھکانے لگا دیا جائے۔ تاکہ ان کا کاروبار چلتا رہے۔ میر شرافت علی نے تمہارے والد کو راستے سے ہٹانے کی اسکیم بنائی تھی معلوم نہیں خود اسے راستے سے ہٹانے کی اسکیم بنانے والا کون تھا۔"

"تمہارے خیال میں چوہدری دلاور کے علاوہ بھی کوئی شخص یہ کر سکتا تھا؟"

"ہاں۔ خود تمہارے والد میر شرافت علی کی جان کے دشمن تھے۔" ڈی سلوا بولا۔ "ان کے علاوہ دلاور کے دوسرے ساتھی تھے اور کاروباری حریف تھے۔ مجھے ان کے نام نہیں معلوم کیونکہ میں تو صرف دفتر میں رہتا تھا۔"

"تم بیرونِ ملک دوروں پر بھی جاتے رہتے تھے۔"

"ہاں۔ صرف رقم وصول کرنے کے لیے۔ مجھے معلوم نہیں رقم دینے والے کون لوگ ہوتے تھے۔" وہ بولا۔

"باہر تمہارا رابطہ جن لوگوں سے رہا ان میں خسرو پرویز نام کا کوئی شخص بھی تھا جو لندن میں رہتا ہے۔"

"خسرو پرویز مجھے لندن میں ملا ضرور تھا مگر اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ کہاں رہتا ہے۔"

"کیا خسرو پرویز ان دنوں پاکستان آیا ہوا ہے؟"

"ہاں۔ اسے دلاور نے ایک خاص کام سے بلایا تھا۔"

"وہ خاص کام کیا تھا؟ ہم سب کا قتل؟"

"ہاں۔ اس کے ساتھ ایک دہشت پسند بھی آیا تھا—" […] سلوا نے پھر کہا۔ "اس نے خسرو پرویز کے کسی مکان کے نیچے بارودی سرنگیں بچھانے کا کام کیا تھا اور اس کا معاوضہ بھی لیا تھا بلعد میں یہ مکان رابعہ کو فروخت کے لیے پیش کر دیا گیا تھا۔"

"رابعہ کے پہلے مکان کو دھماکے سے تباہ کرنے والا بھی یہی شخص تھا؟ تم اس کا نام جانتے ہو؟"

"نہیں۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ رابعہ کا گھر اسی نے تباہ

کیا تھا۔"

"دونوں کو پاکستان بلوانے والا کون تھا؟ سیٹھ دلاور؟"

"میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"کسٹم کے ایک پرانے اور ایمان دار آفیسر نعیم سے لندن میں کس نے رابطہ قائم کیا تھا؟"

"خسرو پرویز نے۔" ڈی سلوا بولا۔ "لیکن وہ ہاتھ نہیں آیا۔"

"جس کے بعد اس کی بیوی کے والدین کو قتل کیا گیا۔" میں نے کہا۔ "کیونکہ وہ نعیم یا اس کی بیوی کا پتہ بتلانے سے قاصر تھے اور ان کے گھر کو آگ لگا کے قتل کے جرم پر پردہ ڈالنے کی کوشش بھی کی گئی۔ یہ کارنامہ تم نے سرانجام دیا تھا؟"

"نہیں۔ مجھے اس کا علم بعد میں ہوا۔"

"لیکن تم نے جرم کرنے والوں کا ساتھ تو دیا۔" میں نے کہا۔ "تم نے ایک نہیں دو لڑکیوں کو بلیک میل کر کے ان کی مدد کی۔ تمہارے جرائم کی فہرست بہت طویل ہے ڈی سلوا اور وقت کم ہے۔ اس لیے میں تم سے آخری تین سوال کروں گا اور اس کے بعد فیصلہ کروں گا کہ تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ پہلا سوال یہ ہے کہ میرے والد کی لاش کہاں گئی؟"

"لاش کسی جگہ دفنا دی گئی ہے لیکن مجھے وہ جگہ نہیں معلوم۔ میرا کام صرف لاش حاصل کرنا تھا اور مجھے اس کا معاوضہ پچاس ہزار روپے دیا گیا تھا۔ رقم مجھے اپنے گھر کے لیٹر بکس میں ملی تھی اور یہ کام کرانے والے نے مجھ سے ایک دن پہلے ٹیلی فون پر بات کی تھی۔"

"میرا دوسرا سوال۔ ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس کے نام پر چلنے والا ادارہ کس ناجائز اور غیر قانونی کاروبار کے لیے استعمال ہو رہا ہے اور اس میں دلاور کے علاوہ کون لوگ شامل ہیں؟" میں نے کہا۔

"اس سوال کا جواب میں نہیں دوں گا۔" ڈی سلوا نے کہا۔ "کیونکہ وہ لوگ بہت طاقت ور ہیں۔ میں آج نہ مارا گیا تو ان کے ہاتھوں کل مارا جاؤں گا۔ میں فقط ان کا آلۂ کار ہوں۔ وہ مجھے نقد معاوضہ بھی ادا کرتے ہیں اور دباؤ ڈال کے مجھے بلیک میل بھی کرتے ہیں۔ میں نے ان کے جتنے کام کیے ہیں پیسے کے لالچ میں کیے ہیں۔ کبھی دوسروں کو معاوضہ ادا کر کے کرائے ہیں تو کبھی اپنی جان بچانے کے لیے دوسروں کو بلیک میل بھی کیا ہے۔"

"میرا آخری سوال۔ میرے والد کو بلیک میل کر کے خاموش رہنے پر مجبور کرنے والا کون تھا؟" میں نے کہا۔ "اور ان کی کون سی مجبوری سے فائدہ اٹھا کے انھیں لوٹا جا رہا تھا؟"

"میر شرافت علی۔" ڈی سلوا نے کہا۔ "اس کے اسباب کا علم صرف ایک شخص کو تھا جو میر شرافت علی کا ملازم تھا اور منشی کہلاتا تھا۔ مذاق میں لوگ اسے فوما نچو کہتے تھے۔ دنیا میں اس کا

وارث کوئی نہیں ہے۔"

میں نے محسن کو ٹیپ ریکارڈر آف کرنے کا اش
تیس منٹ کی ایک سائڈ تقریباً ختم ہونے والی تھی
بجنے میں بیس منٹ رہ گئے تھے۔ میں نے ٹرانسمیٹر کو جی
ہم دونوں چیزیں اٹھا کے باہر آ گئے۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈی سلوا مجرم ہے" میں نے کہا۔ "لیکن اس کا جرم یہی ہے کہ وہ لالچی ہے جس کے باعث اس نے غلط کام کیے اور بلیک میل ہو کے دشمنوں کا آلۂ کار بنا لیکن براہِ راست اس کو ہم سے کو
نہیں تھی۔"

"اور جو کچھ اس نے بتایا ہے اس سے ہمیں کوئی
ملتی۔" محسن نے اتفاق کیا۔ "ہاں یہ ریکارڈنگ اس
آئندہ کے لیے کوئی انتظام کر سکتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ
خود کچھ نہ کہے اور اگر کوئی ایسی ویسی بات معلوم ہو
پہلے سے بتا دے ہم یہ ٹیپ بطور ضمانت اپنے پاس رکھی

جب گاڑی اس گھر کے پاس رکی جس کے ایک
ڈی سلوا زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا انتظار
کہ ہمارا فیصلہ کیا ہوگا تو پونے آٹھ بجے تھے۔ جتنی دیر
ڈی سلوا کو اندر سے اٹھا کے گاڑی میں ڈالا اتنی دیر
کو میں نے اندر پہنچا دیا۔ پھر پہلے کی طرح محسن نے میرے
پر چڑھ کے اندھیرے میں ہی روشن دان میں رکھی
کو بڑی احتیاط سے اٹھایا اور الارم کی چابی پر بندھی ڈو
الگ کر دی جب وہ نیچے اترا تو میں نے اطمینان کا سانس
کیونکہ آٹھ بجنے میں صرف پانچ منٹ باقی رہ گئے تھے
پرانی گھڑی سے پابندیٔ وقت کے اعلیٰ ترین معیار کی
رکھنا غلط تھا۔ الارم پانچ منٹ پہلے ہی بج سکتا تھا
ہو سکتا تھا کہ اندھیرے میں گھڑی محسن کے ہاتھ سے چھوٹ
اور ایک جھٹکے سے نیچے آتی یا کسی بھی وجہ سے میرا اور محسن
بگڑ جاتا۔ ٹرانسمیٹر کے اندر چھپا ہوا بم بالکل چھت کے
ہوا تھا اور یہ یقینی بات تھی کہ بم پھٹتا تو چھت
گرتی اور ہم وہیں زندہ دفن ہو جاتے۔

"میرا خیال ہے کہ ابھی آدھے ایک گھنٹے تک
جاری رکھ سکتے ہیں۔" محسن نے کہا۔ ہم نے گھر کی
سے گریز کیا اور میرے لائٹر کی روشنی میں محسن نے الارم
ساڑھے آٹھ اور پھر نو کر دیا۔

"فلموں کے شوز ساڑھے آٹھ کے بعد ہی ختم ہو
میں نے کہا۔ "ہم سوا نو بجے تک بھی گھر پہنچ جائیں
کو شک نہیں ہوگا۔ یہاں سے ہمیں ساڑھے آٹھ بجے

محسن نے ریڈیو ٹرانسمیٹر کی رسّی اور ایریل بھی روشن دان میں سے کھینچ لیے تھے اور اب اگلا مرحلہ ریڈیو ٹرانسمیٹر کو پھر نیچے آتارنے کا تھا جس کے لیے مجھے چوتھی مرتبہ محسن کو جوتوں سمیت کندھوں پہ اٹھانا پڑا۔ ریڈیو ٹرانسمیٹر کو زمین پر رکھنے کے بعد میں نے دوسرے کمروں کو دیکھا ایک کمرے کے ساتھ باتھ روم تھا جس میں ابھی دروازہ نہیں لگا تھا۔ دلاور ابھی تک یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ ہم اس کے ساتھ کیا تماشا کرنا چاہتے ہیں۔ میں اسے دوسرے کمرے میں پہنچا کے میں نے ریڈیو ٹرانسمیٹر کو باتھ روم میں رکھا اور اس کے رسّی جیسے ایریل کو روشن دان سے باہر لٹکا دیا۔ دلاور کے ہاتھ پیر اسی طرح رسّی سے بندھے ہوئے تھے جب میں نے اس کے منہ سے کپڑا نکالا تو اس نے ایک گہری سانس لی۔

"تم نے اتنی دیر سے مجھے جکڑ رکھا ہے میرے ہاتھ پاؤں ہمیشہ کے لیے مفلوج بھی ہو سکتے ہیں۔" وہ التجا کرتے ہوئے بولا۔

"پھر کیا ہوا۔ کیا تم نے دنیا میں مفلوج انسانوں کو زندگی گزارتے ہوئے نہیں دیکھا؟" میں نے بے رخی سے کہا۔

"سڑکوں اور فٹ پاتھ پر ہر جگہ مفلوج اور اپاہج پڑے بھیک مانگتے رہتے ہیں۔" محسن نے کہا۔

"لیکن میں اس زندگی پر موت کو ترجیح دوں گا۔" دلاور نے مضبوط لہجے میں کہا۔ وہ ہر لحاظ سے ڈی سلوا کے مقابلے میں زیادہ مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔

"آل رائٹ تمھاری یہ مرضی ہے تو یہی سہی۔" میں نے کہا۔ "لیکن ہم خود اپنے ہاتھوں سے تمھیں قتل نہیں کر سکتے ——— ڈی سلوا تمھارا ماتحت ہے اور تمھارا حکم بھی مانتا ہے۔ ہم اسے بھیج دیتے ہیں کہ تمھاری آخری خواہش پوری کر دے۔"

کمرے میں صرف میرے سگریٹ لائٹر کا برائے نام اجالا تھا اور اس کی روشنی بھی بے رنگ و روغن سیمنٹ کی سلیٹی رنگ کی دیواریں جذب کر رہی تھیں۔ ہم دونوں کے سائے پیچھے کی پوری دیوار پر پھیلے ہوئے تھے اور ایک گوشے میں بیٹھا ہوا دلاور خود بھی سایہ ہی لگتا تھا جب ہم دروازہ بند کر کے رخصت ہونے والے تھے تو اس نے ہمیں فحش ترین گالیاں دیں۔ دھمکی دی کہ وہ ہم سے ایسا بدلہ لے گا کہ ہم کیا ہماری آنے والی نسلیں بھی یاد رکھیں گی۔ اس وقت تک دلاور کو معلوم نہیں تھا کہ اس سے چند منٹ کے فاصلے پر ہم نے باتھ روم میں جو ریڈیو رکھا ہے وہ دراصل ٹائم بم ہے۔ باہر آ کے ہم نے گاڑی میں سے اپنا ریڈیو ٹرانسمیٹر اور ٹیپ ریکارڈر نکالا۔ دور جانے کے لیے وقت نہیں رہا تھا۔ ہم نے کوٹھی کے احاطے میں بیٹھ کر پھر اپنا مواصلاتی رابطہ بحال کیا اور محسن نے کیسٹ کو پلٹ کر لگا دیا۔

"چوہدری دلاور!" میں نے ٹرانسمیٹر کا بٹن دبا کے کہا۔ "تم چاہتے تھے نا؟ تمھاری یہ زندگی ویسے بھی اس قابل نہیں تھی کہ اس پہ فخر کر سکو۔ تمھارے نامۂ اعمال میں اب مزید گناہوں کی گنجائش نہیں رہی اور تمھارے جرائم کی فہرست کو دیکھتے ہوئے تمھیں ہزار بار سزائے موت دی جائے تو کچھ نہیں۔ تمھیں ڈرامے کرنے کا شوق تو ہے۔ ایک بار تم نے مجھ سے اور رابعہ سے ایک تہہ خانے میں اسی طرح گفتگو کی تھی۔ دوسری مرتبہ بھی تم نے یہی طریقہ زیادہ مہلک انداز میں اپنایا تھا چنانچہ آج جو کچھ میں کر رہا ہوں وہ میں نے تم سے ہی سیکھا ہے۔ اس ریڈیو ٹرانسمیٹر کا فیوز ایک الارم کلاک سے ملا ہوا ہے جو ٹھیک نو بجے تمھاری موت کا اعلان کرے گا۔ الارم کی آواز سننے کے بعد تمھیں صرف اتنی مہلت ملے گی کہ کلمہ پڑھ سکو۔ لیکن نو بجنے میں ابھی چالیس منٹ باقی ہیں۔ اگر تم میرے چند سوالات کا صحیح جواب دے دو تو ہو سکتا ہے کہ میں ٹائم بم کو فیوز سے الگ کر دوں۔ آگے تمھاری قسمت کہ کوئی تمھیں یہاں سے نکالنے کے لیے آتا ہے یا نہیں۔ ممکن ہے کوئی تمھاری پکار پہ متوجہ ہو جائے۔"

"اگر میں سوالوں کا جواب دے سکا تو دیکھوں گا کہ تم اپنے وعدے پہ قائم رہتے ہو یا نہیں۔" وہ بولا۔

"سیٹھ دلاور!" میں نے کہا اور محسن نے ٹیپ ریکارڈر چلا دیا۔ "بات بہت پرانی ہے۔ لاہور کے ایک بینک پر کچھ ڈاکوؤں نے حملہ کیا لیکن ایک فرض شناس گارڈ نے اپنی جان دے کر اس کوشش کو ناکام بنا دیا اور فرار ہونے والے ڈاکو بدحواسی میں مالِ غنیمت سڑک پر پھینک گئے۔ ایک شخص نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور افراتفری میں نوٹوں سے بھرا ہوا سوٹ کیس اٹھا کے ایک گھر میں گھس گیا جہاں اتفاق سے کوئی بھی نہیں تھا۔ سوائے ایک لڑکی کے جو اب لندن میں ہے۔ اسے خوف زدہ کر کے خاموش رہنے پر مجبور کر دیا گیا اور یوں وہ شخص جو ایک معمولی اور گمنام آدمی تھا چوہدری دلاور بن کے میرو زیرا اینڈ کمپنی میں تیسرا پارٹنر ہو گیا اور جرائم پیشہ افراد کی انڈر گراؤنڈ دنیا میں سیٹھ دلاور کے نام سے مشہور ہوا۔"

"اس بے سروپا کہانی پر کوئی یقین نہیں کر سکتا۔" دلاور بولا۔

"اور نہ آج یہ بات ثابت کی جا سکتی ہے کہ میں ہی وہ شخص تھا۔"

"تم نے پہلے سوال کا جواب گول کر دیا ہے۔" میں نے کہا۔ "اور جانتے بوجھتے حقائق کو تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے۔"

"میں نے انکار نہیں کیا ہے۔" دلاور زچ ہو کے بولا۔ "میں نے کہا ہے کہ میرے خلاف کوئی ثبوت یا شہادت نہیں۔"

جانتے بوجھتے میں نے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہی لڑکی ڈی سلوا کی سیکرٹری رہ چکی تھی اور اگر اس نے غور سے دیکھا ہوتا تو اسے پہچان بھی لیتا۔ یاسمین کے بارے میں جھوٹ بولنے کا مقصد بھی یہی تھا کہ وہ محفوظ رہے۔

"اب میرا دوسرا سوال سنو دلاور!" میں نے اس کی وضاحت نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "تمھارے آنے سے پہلے میرو زیرا اینڈ کمپنی صرف لیتھ مشین، پاور ڈرل، ہینڈ پریس اور زرعی آلات بناتی تھی جو سو فیصد جائز اور قانونی کاروبار تھا لیکن اب میرے سامنے حالات کی جو تصویر ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک جائز کاروبار کی آڑ میں کوئی غیر قانونی کاروبار چل رہا ہے۔ یہ کاروبار کیا ہے؟"

"اس سوال کا جواب دینا میرے لیے ناممکن ہے۔" دلاور نے کہا۔ "اگر تم خود معلوم کر سکتے ہو تو کر لو۔"

"میں تمھیں آخری موقع فراہم کر رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "وزیر خان کی لاش اب کہاں ہے؟"

"اس کا جواب دینا اپنے ہاتھوں سے اپنے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈالنے کے مترادف ہے۔" دلاور نے کہا۔ "طویل انتظار کے عذاب اور رسوائی کی موت کے مقابلے میں مجھے اسی وقت مرنا منظور ہے میرے یتیم بچوں کی فکر تم کیوں کرتے ہو۔ ان کے لیے میں اتنا چھوڑ جاؤں گا کہ ان کی پُرآسائش زندگی میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میری بیوی بہت حوصلہ مند عورت ہے اور ان کی پرورش بالکل صحیح خطوط پر کر رہی ہے۔ جب وہ بڑے ہوں گے تو سیٹھ دلاور نہیں بنیں گے۔"

"دنیا میں پیسہ ہی سب کچھ نہیں ہے چوہدری دلاور!" میں نے کہا۔ "ہر عورت کو ایک مرد کی محبت اور بچے کو باپ کی شفقت دنیا کے بازار میں نہیں ملتی۔ ان کا یہ احساسِ محرومی تمھاری دولت سے ختم نہیں ہو گا۔"

"یہ احساسِ محرومی تو تمھارا مقدر بھی رہا ہے۔" وہ بولا۔ "اس کے باوجود تم جی لیے ہو اور اب تمھاری جدوجہد صرف دولت کے لیے ہے مگر افسوس تو یہ ہے کہ بالآخر تمھیں کچھ بھی نہیں ملے گا۔ نہ حقِ وراثت، نہ رابعہ کی محبت اور نہ زندگی کی مہلت۔"

"ان دھمکیوں کا اب کوئی فائدہ نہیں۔" میں نے کہا۔ "مگر اب اندھیرا نہ ہوتا تو میں ایک قانونی دستاویز تمھیں دکھاتا اور تمھیں معلوم ہو جاتا کہ میری زندگی کا مقصد بالکل مختلف ہے اگر تمھارا خیال ہے کہ بعد میں تمھارے ساتھی مجھے قتل کر دیں گے تو یہ بھی سمجھ لو کہ اس قتل سے ان کے عزائم بھی پورے نہیں ہوں گے میں نے ایک وصیت نامے کی رو سے اپنے وارث کو نامزد کر دیا ہے اور ایک کے بعد دوسرے وارث کی جگہ لینے والوں کی تعداد سات ہے اور وہ سب سکندر بخت ہیں۔ ان سب کو معلوم ہے کہ میر شرافت علی نے وزیر خان کو بلیک میل کیا میر شرافت کو تم نے استاد پیڈرو سے مروا دیا اور فومانچو کہلانے والے ایک غریب منشی کی جان لی مجھے نواب خسرو جمشید کے بیٹے خسرو پرویز کی سازش کا علم بھی ہو چکا ہے جو لندن میں رہتا ہے اور ہمارے ساتھ ایک ایمان دار کسٹم آفیسر نعیم بھی ہے جسے بلیک میل کر کے نوکری سے مستعفی ہونے پر مجبور کیا گیا۔"

"تمھیں یہ سب باتیں کس نمک حرام نے بتائی ہیں؟" دلاور نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

"یہ معلوم کر کے کیا ہو گا۔" میں نے کہا۔ "یہ دیکھو کہ کتنے کم وقت میں گردشِ حالات تمھیں کہاں سے کہاں لے آئی ہے۔ تمھارا کوئی راز، راز نہیں رہا ہے اور اب مقابلہ برابر کا ہے۔ اس وقت کا تصور کرو جب تم جیسے تنکاری مجھے گھیر کے پاکستان لے آئے تھے تاکہ مجھے چوہے دان میں پھنس جانے والے چوہے کی طرح مار سکیں۔ تم نے مجھے خریدنا بھی چاہا۔ تاکہ میں کچھ جانے بغیر تم سے ڈر کر میدان چھوڑ جاؤں۔ آج تم چوہے کی طرح پکڑے گئے ہو۔ تمھارے بعد دوسروں کو بھی بہت جلد اندازہ ہو جائے گا کہ میں بھی ان سے کم تنکاری نہیں ہوں۔"

"ہم اس مسئلے پر نئے سرے سے برابری کی بنیاد پر بات کر سکتے ہیں۔" دلاور نے کہا۔

"میں اور تم کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔" میں نے کہا۔ "بالکل اسی طرح جیسے قاتل اور مقتول برابر نہیں ہو سکتے۔ قانون کی نظر میں نہ دنیا کی نظر میں۔ ویسے بھی بات کرنے کا وقت گزر چکا ہے۔ جو کچھ تمھیں کرنا تھا تم کر چکے ہو۔ اب فیصلہ میرے ہاتھ میں ہے اگر تم میرے سوالات کا جواب دے دیتے تو شاید میں آج تمھاری جان بخشی کر دیتا۔ لیکن اب میں جا رہا ہوں۔ تمھارے پاس دس منٹ ہیں۔ اس مہلت کا استعمال تم جیسے چاہو کرو۔ چیخنے چلانے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ آخری وقت میں خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگو تو اچھا ہے۔" میں نے ٹرانسمیٹر بند کر دیا۔ کیسٹ بھی ختم ہو چکا تھا۔ ہم نے بڑی عجلت میں اپنا سامان اٹھایا اور باہر نکل آئے۔ وقت بہت کم رہ گیا تھا۔ میں نے ڈی سلوا کو کار کی ڈکی سے نکالا اور محسن نے جلدی جلدی ایک کپڑے سے ڈی سلوا کی گاڑی کے ان تمام حصوں کو صاف کر دیا جہاں ہماری انگلیوں کے نشانات ملنے کے امکانات ہو سکتے تھے۔ پھر محسن نے اپنا سامان بغل میں دبایا اور روانہ ہو گیا۔ میں نے بے ہوش ڈی سلوا کو ڈکی میں سے نکال کر کندھے پر ڈالا اور محسن کے پیچھے چل پڑا۔ اس علاقے میں ٹیکسی ملنا دشوار تھا۔ کچھ دور چلنے کے بعد میں نے پیچھے سے آنے والی کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس دیکھیں

اور سڑک کے درمیان میں آ کے زور زور سے ہاتھ ہلانے لگا۔ یہ ایک چھوٹا سا ٹرک تھا۔

"کیا بات ہے؟" ٹرک ڈرائیور نے مجبوراً رک کے مشکوک لہجے میں پوچھا۔

"یہ ہمارا پڑوسی ہے۔" میں نے عاجزی سے کہا۔ "دل کا دورہ پڑ گیا ہے۔ بڑی مہربانی ہوگی اگر ہمیں آبادی تک لے چلو، جہاں ٹیکسی مل جائے۔"

ڈرائیور کی صورت کا تاثر فوراً بدل گیا اور اس نے ہمیں پیچھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے اور محسن نے ڈی سلوا کو ٹرک میں ڈالا اور اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئے۔ ٹرک اتنا پرانا تھا کہ اس کا پورا ڈھانچہ چلتے ہوئے فریاد کرتا تھا اور انجن جھٹکے لیتا تھا مگر اس وقت ٹرک کا پرانا ہونا ہمارے لیے مفید ثابت ہوا ـــــ ڈی سلوا کو اچانک ہوش آ گیا تھا۔ میں نے ایک غلطی یہ کی تھی کہ اس کے منہ سے کپڑا نکال دیا تھا۔ وہ ایک بار کراہا اور دوسری بار چلایا لیکن اس کی آواز ٹرک ڈرائیور نے نہیں سنی۔ میں نے فوراً اس کی کنپٹی پہ کان کے نیچے ہلکا سا ہاتھ مارا اور اس کی آواز بند ہو گئی۔ ٹرک ضلع کچہری کے پاس رک گیا جہاں ایک ٹیکسی کھڑی تھی۔ ہم نے ٹرک ڈرائیور کا شکریہ ادا کر کے ڈی سلوا کو اتار لیا۔ ٹیکسی والا پہلے تو گلوب سینما جانے تک تیار ہی نہ تھا مگر ہم نے کہا "بھائی خدا کا خوف کرو، ایک بیمار کو گھر پہنچانا ہے۔ تم زیادہ پیسے لے لو۔" تو ٹیکسی والا شرمندہ ہو گیا۔ اس وقت نو بج کر دس منٹ ہو چکے تھے۔ سڑک خالی ہونے کا فائدہ یہ ہوا کہ ٹیکسی ڈرائیور نے بیس منٹ بعد ہمیں گلوب سینما کے پاس ڈی سلوا کے گھر کے دروازے پر اتار دیا اور اصل کرایہ سے دس روپے زیادہ لے کر رخصت ہو گیا۔ ٹیکسی کے جاتے ہی ہم نے ڈی سلوا کو گیٹ کے اندر رکھا، دوبارہ گیٹ بند کیا اور شریر بچوں کی طرح کال بیل کا بٹن دبا کے بھاگ کھڑے ہوئے۔ ہمیں معلوم تھا کہ اب نوکر اپنے آقا کو گیٹ سے اٹھا کے بیڈ روم میں لے جائیں گے۔ گلوب سینما کے سامنے سے گزرتے ہوئے ہم ان لوگوں میں شامل ہو گئے جو فلم کا آخری شو دیکھ کر نکلے تھے۔ ایک شخص نے دو ٹکٹوں کے آدھے آدھے حصے پھینکے جو میں نے فوراً اٹھا لیے۔ گھر پہنچنے کے بعد بہت ہوشیاری سے میں نے فلم کا ذکر کیا اور دونوں کوپن بے نیازی سے نیچے پھینک دیے۔ آج کی رات ہمیں اپنے گھر میں گزارنی تھی چنانچہ میں اور محسن اپنا سامان اٹھانے کے لیے سرونٹ کوارٹر میں پہنچے وہاں ایک شخص ہمارے انتظار میں تھا۔

"تمہاری صورت مجھے کچھ دیکھی ہوئی لگتی ہے۔" میں نے اس اجنبی کو غور سے دیکھ کر کہا۔

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ یوں لگ رہا تھا کہ وہ خوف، گھبراہٹ اور پریشانی کا شکار ہے اور اسے بات کہنے کے لیے الفاظ نہیں مل رہے ہیں یا اس میں اتنی ہمت نہیں کہ صاف بات کر سکے۔ وہ چالیس پینتالیس سال کا صحت مند آدمی تھا اور حلیے سے غریب نظر آتا تھا۔ اس مختصر سے وقفے میں اپنی یادداشت کی مدد سے میں اس کی صورت سے آشنائی کے اسباب تلاش کر رہا تھا۔ میرے ساتھ محسن بھی اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔

"آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟" وہ بیٹھی ہوئی آواز میں بولا۔ پھر اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ "ایک بار آپ سے پہلے بھی ملاقات ہو چکی ہے۔ آپ نے مجھے مارا تھا۔"

"ضرور مارا ہوگا۔" مجھے تعارف کے اس انداز پر بے اختیار ہنسی آئی۔ "اب یہ بھی بتا دو کہ ہم نے تمہیں کیوں مارا تھا، کہاں مارا تھا اور کب مارا تھا؟"

"دراصل ہم اتنے لوگوں کی پٹائی کر چکے ہیں۔" محسن نے ہنستے ہنستے کہا۔ "اور اتنی بار پٹ چکے ہیں کہ کچھ یاد نہیں رہتا، چنانچہ سب سے پہلے تو تم اپنا نام بتاؤ۔"

اس مظلوم صورت شخص کی پریشانی اور بدحواسی میں اضافہ ہو گیا۔ "نام... نام تو جناب عبداللہ تھا لیکن سب عبدل کہتے ہیں۔" اس نے خفت زدہ لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "آپ نے مجھے میر شرافت علی کے گھر میں مارا تھا کیونکہ میں نے اس کی جان بچانے کے لیے کوشش کی تھی۔ میں اس کا شوفر تھا۔"

میری ساری خوش مزاجی کافور ہو گئی اور میں پلک جھپکائے بغیر اس شخص کو دیکھتا رہا جس نے شرافت علی کے دوسرے ملازم رشیدے کے ساتھ مل کر میرے خلاف گواہی دی تھی اور پولیس کے سامنے مجھے قاتل کی حیثیت سے شناخت کیا تھا۔ اس کی گواہی پر پولیس نے مجھے عین اس وقت گرفتار کر لیا تھا جب میں لاہور سے پنڈی جانے والی ریل کار میں بیٹھ چکا تھا اور ریل کار روانہ ہونے ہی والی تھی۔

"اب یہاں کیا لینے آئے ہو؟" میں نے سنجیدہ ہو کر سخت لہجے میں کہا۔ "اس روز تم شوفر کی وردی میں تھے اس لیے آج میں تمہیں فوراً نہ پہچان سکا۔ کیا کوئی کسر باقی رہ گئی تھی جو..."

"مجھ پر خفا نہ ہوں جناب!" وہ خوف زدہ ہو کے بولا۔ "میری آپ سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔"

"اس سے زیادہ دشمنی تم کیا کر سکتے تھے؟" میں نے برافروختہ ہو کے کہا۔ "تم نے مجھ پر قتل کا جھوٹا الزام عائد کر دیا۔"

"نہیں جناب! میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ قتل آپ نے کیا ہے۔ آپ میرا بیان دیکھ کر تصدیق کر سکتے ہیں۔ جو کچھ میں نے کہا تھا، وہی تھا جو میں نے دیکھا تھا۔ میں نے آپ کو شرافت علی کے ڈرائنگ روم کا سامان تباہ کرتے دیکھا تھا۔ یہ دیکھا تھا کہ آپ شرافت علی کو مار رہے ہیں اور میں شور سن کر وہاں پہنچا تھا تو آپ نے مجھے بھی لمبا لٹا دیا تھا۔ اس سے زیادہ میں نے کچھ نہیں کہا تھا اور یہ سب سچ تھا۔ میں شرافت علی کا ملازم تھا، اس کا نمک کھاتا تھا پھر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ میں اس کی مدد نہ کرتا یا جانتے بوجھتے سچ نہ بولتا۔ قسم ہے پاک پروردگار کی، میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ آپ نے قتل بھی کیا ہے یا میں نے آپ کو قتل کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ یہ بات رشیدے نے ضرور کہی تھی لیکن میں نے نہیں۔ میرے بیان کا ایک ایک لفظ پولیس کے ریکارڈ پر ہے اور آپ چاہیں تو تصدیق بھی کر سکتے ہیں۔"

وہ خاموش ہو گیا۔ میں اور محسن بھی خاموش بیٹھے اس شخص کی صورت دیکھتے رہے۔ وہ صورت سے اتنا مسکین اور لہجے سے اتنا شرمندہ نظر آتا تھا کہ اس پر غصہ اتارنا بے سود تھا۔ اس کی بات کو غلط یا جھوٹ قرار دینا بھی مشکل نظر آتا تھا لیکن سوچے سمجھے بغیر اس پر اعتبار کر لینا بھی مشکل تھا۔ اس کا آنا دشمن کی نئی چال بھی ہو سکتی تھی۔ ہمیں طائرِ بے بال و پر سمجھنے والے شکاری جان چکے تھے کہ ان کی طاقت ہمیں تسخیر نہیں کر سکتی۔ ان کی دولت ہمیں خرید نہیں سکتی اور موت کا خوف ہمارے جارحانہ عزائم کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتا۔ وہ تمام اخلاقی اور غیر اخلاقی، جائز اور ناجائز حربے آزما چکے تھے لیکن اب تک انہیں کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی اور ہمارے بارے میں ان کے ابتدائی اندازے بالکل غلط ہو چکے تھے۔ اب یہ جنگ پورے عروج پر تھی۔ نقصان ہمارا ہوا تھا تو دشمن کا اس سے زیادہ ہوا تھا۔ مشکلات اگر ہمارے لیے پیدا ہوئی تھیں تو ہماری پیدا کردہ مشکلات نے دشمنوں کو بھی پریشان کر دیا تھا اور ہمیں آسان شکار سمجھنے والے یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ ہم بھی ان کی ٹکر کے شکاری ہیں بلکہ ان سے بہتر شکاری ہیں۔ ہمارے وسائل بہت محدود تھے اور ان کے پاس سب کچھ تھا چنانچہ ہمارے ذہن میں شکوک کا جنم لینا ایک قدرتی بات تھی۔ کیا دشمن اب صلح کے بہانے یا اپنی کمزوری کا اعتراف کر کے عیاری اور مکاری سے ہماری پیٹھ میں خنجر بھونکنا چاہتا ہے؟ میں نے سوچا۔

"میاں عبدل!" بالآخر میں نے اس سکوت کو ختم کیا۔ "اگر میں تمہاری بات مان لوں تب بھی میرے سوال کا جواب باقی رہتا ہے کہ تم میرے پاس کیوں آئے ہو؟"

"وہ... بات یہ ہے جی...!" عبدل نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہنا شروع کیا۔ "کہ میری ماں نے آپ کو بلایا ہے۔"

میں نے اور محسن نے چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ محسن کے چونکنے سے مجھے یقین آیا کہ میرے کانوں نے غلط نہیں سنا۔

"تمہاری ماں نے؟" میں نے حیرانی سے کہا۔ "تمہاری ماں کا مجھ سے کیا تعلق؟ وہ مجھے جانتی ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم جناب!" عبدل نے کہا۔ "وہ مجھے کچھ نہیں بتاتی۔"

"کیا تم نے اسے کچھ بتایا تھا؟" میں نے کہا۔ "میرے بارے میں یا میر شرافت علی کے قتل کے بارے میں؟ کیا وہ اس کیس میں تمہارے اور میرے کردار کے بارے میں کچھ جانتی ہے؟"

"میں بڑی مشکل میں ہوں جناب!" عبدل بولا۔ "ادھر آپ میری بات پر یقین کرنے کے لیے تیار نہیں۔ ادھر میری ماں مجھے کچھ بتانے کو تیار نہیں۔ اس کی حالت ایسی ہے کہ میں انکار نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے مجبوراً آنا پڑا۔"

"حالت سے تمہاری کیا مراد ہے؟" میں نے نرمی سے کہا کیونکہ وہ اب رو پڑنے کے قریب تھا۔

"وہ بہت بوڑھی ہے جناب!" عبدل نے کہا۔ "اتنی بوڑھی کہ اسے اپنی عمر بھی یاد نہیں لیکن اسے اور بہت کچھ یاد ہے۔ آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے کی باتیں بھی وہ بھولی نہیں ہے۔ میرا خیال ہے وہ ستر اسی برس کی تو ضرور ہو گی۔ یوں سمجھ لیں کہ اس نے میر شرافت علی کو اپنی گود میں کھلایا تھا۔ اب اسے دکھائی نہیں دیتا۔ وہ بہت اونچا سنتی ہے اور سہارے کے بغیر بستر سے اٹھ کے ایک قدم نہیں چل سکتی ـــ میں نے اس کو میر شرافت علی کے قتل کے بارے میں کچھ نہیں بتایا ہے لیکن اس نے رشیدے سے پوچھا کہ شرافت کیوں نہیں آتا تو رشیدے نے بتا دیا۔ جب تک میر شرافت علی زندہ تھا وہ دن میں ایک بار اس کے کمرے میں خیریت معلوم کرنے ضرور جاتا تھا۔ تین دن بعد اس نے رشیدے سے پوچھا کہ شرافت کہاں ہے۔ کہیں دورے پر ولایت چلا گیا ہے کیا؟ اور رشیدے بے وقوف نے کہہ دیا کہ ماں جی وہ تو ایسے لمبے دورے پر گیا ہے کہ اب واپس نہیں آئے گا۔ بس اس کی مغفرت کی دعا کرو۔ خدا کا شکر ہے کہ رشیدے نے قتل کی بات نہیں کی اور کہہ دیا کہ

وہ بیمار ہوا تھا، اسپتال جا کے مر گیا۔ میری ماں بہت روئی پیٹی اور بعد میں مجھ پر بھی بہت خفا ہوئی کہ میں نے اسے بے خبر کیوں رکھا۔ ایک روز اچانک اس نے کہا کہ عبدل! تجھے وزیر خان کا پتہ معلوم ہے؟ میں تو اچھل پڑا۔ میں نے کہا، کون وزیر خان؟ اس نے کہا کہ وہی جو شرافت کا دوست تھا دونوں مل کر کاروبار کرتے تھے نا۔ اس وقت اگر میں اپنی ماں سے کہتا کہ وزیر خان بھی مر چکا ہے یا اسے دوسری باتیں بتا دیتا تو معلوم نہیں کیا ہوتا۔ شاید وہ اسی وقت مر جاتی۔ چنانچہ میں نے بات ٹال دی کہ مجھے نہیں معلوم لیکن وہ اس بات کو بھولی نہیں۔ جب بھی اسے یاد آتا تھا تو وہ پوچھتی تھی کہ وزیر خان کا پتہ معلوم کیا تو نے؟ اس کا ایک لڑکا بھی ہے کبیر خان جو ولایت میں پڑھتا ہے۔ اس کا اصرار بڑھتا گیا۔ اب کچھ روز سے وہ بیمار ہے۔ کھانا پینا بالکل چھوٹ گیا ہے۔ وہ خود بھی کہتی ہے اور مجھے بھی ایسا نظر آتا ہے کہ اس کی زندگی کے دن پورے ہو گئے ہیں۔ کل اس نے کہا کہ عبدل! تو مجھے... اندھی بوڑھی اور معذور عورت کو... اپنی ماں کو دھوکا دے رہا ہے؟ وزیر خان ایسا آدمی تو نہیں جس کا پتہ نہ ملے۔ میں تجھے مرتے وقت دودھ معاف نہیں کروں گی عبدل! مجھ پر وزیر خان کا ایک قرض ہے۔ تو چاہتا ہے وہ قرض میں اپنے ساتھ قبر میں لے جاؤں اور قیامت کے روز وزیر خان کو منہ نہ دکھا سکوں؟ اس کے بعد میں کیا کرتا اگر میں آپ کے پاس نہ آتا تو پاگل ہو جاتا۔ آپ میرے ساتھ چلیں اور جیسے چاہیں اسے سمجھا دیں اور اس کی سن لیں۔"

میں اور محسن ہکا بکا بیٹھے تھے۔ شبہے کی کوئی بات نہیں رہی تھی۔ ایک بوڑھی عورت جس کے پاس زندگی کی آخری چند سانسوں کے سوا کچھ نہ رہا تھا۔ جو وزیر خان کو جانتی تھی، یہ بھی جانتی تھی کہ سکندر بخت کا اصل نام کبیر خان تھا، وہ مرنے سے پہلے کون سا قرض اتارنا چاہتی تھی؟ میرے والد نے تو کبھی اس کا ذکر نہیں کیا تھا لیکن انہوں نے تو مجھے بہت سی باتوں سے بے خبر رکھا تھا۔ انہوں نے زندگی بھر مجھے انگلی پکڑ کے چلایا۔ میرے راستے کی سمت کا تعین کیا اور میری نظر صرف منزل پر رہی میرے گزشتہ کے حالات میری نگاہ سے اوجھل رہے۔ میں اس مسافر کی طرح چلتا گیا جو رات کے گھپ اندھیرے سے بے۔ نہ صرف ستارے کی تلاش میں سرگرداں ہو مگر ستارہ طلوع ہونے سے پہلے ہی غروب ہو گیا تھا اور اب میرے ہر طرف ایک بھیانک اندھیرا تھا جس میں مجھے راستہ دکھانے والا کوئی نہ تھا۔ ہر قدم پہ کوئی خوفناک حقیقت اندھے غار کی طرح منہ پھاڑے میری منتظر تھی۔ منشی مرحوم کی طرح یہ عورت بھی وہ چراغ ثابت ہو سکتی تھی جو مجھے بے رحم حقائق کے اس تاریک جنگل سے نکلنے کا کوئی راستہ دکھا سکے۔ اس سے پہلے کہ یہ چراغ بھی بجھ جائے یا بجھا دیا جائے مجھے اس بوڑھی عورت سے مل لینا چاہیے۔ منشی سے ملنے میں دیر کرنے کا انجام میرے ذہن میں تھا۔ میں فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

"چلو۔" میں نے کہا۔ "لیکن ایک بات یاد رکھنا کہ اس میں دھوکا ہوا تو نقصان میں تم رہو گے۔"

"تیرے ساتھ میں بھی چلوں گا۔" محسن بولا۔ "لیکن میں باہر رک کر تیرا انتظار کروں گا اور مجھے خطرے کا احساس ہوا تو میں انکل رضوی کو فون پر بتا دوں گا کہ تمہیں اپنے ساتھ لے جانے والا کون تھا اور کہاں لے گیا تھا۔"

"ہم انکل رضوی کو جانے سے پہلے بھی تو بتا سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "آج کل ان کو ہماری نقل و حرکت کے بارے میں تشویش لاحق رہتی ہے۔ بتا کر جانے سے ان کو بھی تسلی ہو جائے گی اور وہ ہماری حفاظت کے خیال سے بھی غافل نہیں رہیں گے۔"

ہم عبدل کو رضوی صاحب کے پاس لے گئے۔ انہوں نے پوری بات غور سے سنی اور عبدل سے خالص پولیس افسر کے لہجے میں بہت سے سوالات بھی کیے۔ عبدل ان کے سامنے بھی بھیگی بلی بنا کھڑا رہا۔

"ٹھیک ہے۔" انہوں نے مطمئن ہو کے کہا۔ "تم لوگ جاؤ۔ میں پولیس اسٹیشن فون کر دیتا ہوں۔ تمہارے پہنچنے تک میر شرافت علی کی کوٹھی کے آس پاس سادہ کپڑوں والے پولیس مین پہنچ چکے ہوں گے۔"

عبدل کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اس نے رضوی صاحب کے سوالات کا جواب کسی گھبراہٹ کے بغیر دیا تھا اور وہ حفاظتی اقدامات سے بھی پریشان نہیں تھا جس سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ اس نے کوئی غلط بات نہیں کی ہے۔ ہمارا ارادہ ٹیکسی میں جانے کا تھا لیکن رابعہ نے اصرار کیا کہ ہم اس کی فوکس ویگن لے جائیں۔ "ہر جگہ ٹیکسی کا ملنا یقینی نہیں ہوتا۔" وہ بولی۔

"تمہاری اس گاڑی میں بیٹھنے کے بعد زندگی پر یقین آدھا رہ جاتا ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ معلوم نہیں ہوتا کہ مسافر منزل پر پہنچے گا یا آخری منزل پر۔"

"یاد کرو اس گاڑی نے کہاں کہاں اور کیسے آڑے وقت میں ہمارا ساتھ دیا تھا۔" رابعہ برا مان کے بولی۔ "مگر تم مرد، فطرت کے اعتبار سے سب ایک جیسے ہوتے ہو۔ صورت پر جاتے ہو، وفاداری اور خدمت گزاری کی قدر نہیں کرتے۔"

"خواہ وہ بیوی ہو یا گاڑی۔" محسن نے خواہ مخواہ رابعہ کی تائید کی۔ "حالانکہ ظاہری حسن کو دوام نہیں اور گاڑی ہو یا بیوی دونوں کا چہرہ وقت کے ہاتھوں یا حادثات کے باعث بگڑ سکتا ہے۔"

"اب دیکھو نا محسن بھائی۔" رابعہ شکایت کرتے ہوئے بولی۔ "اس کا حلیہ بگاڑنے والے یہ خود ہیں۔ چلنے میں یہ گاڑی کسی سے کم نہیں ہے۔ تھوڑا سا ڈینٹ پینٹ ہو گا تو ٹھیک ہو جائے گی۔"

"تھوڑا سا بی بی! اس پہ گاڑی کی قیمت سے زیادہ مرمت کا خرچ ہو گا۔" میں نے کہا۔ "بس اب اسے ریٹائر کرو۔ بہت خدمت کر چکی تمہاری اور دوسری نئی گاڑی لے لو کوئی نئی اور خوبصورت سی۔"

"سنا تم نے۔" محسن شرارت سے بولا۔ "کل کو ایسی ہی بات یہ اپنی بیوی کے بارے میں بھی کہے گا۔ ابھی وقت ہے سوچنے کا۔"

رابعہ سمجھ گئی کہ محسن بالکل سنجیدہ نہیں ہے اور اس کی تائید کا مقصد شرارت کے سوا کچھ نہیں۔ وہ سخت برا مان کے اندر چلی گئی تو ہم گاڑی لے کر روانہ ہوئے۔

"یار محسن!" میں نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے کہا۔ "نیا نو دن تو پرانا سو دن — یہ گاڑی واقعی خوب ہے۔"

"صحیح فرمایا آپ نے۔" محسن نے اسی غیر سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "اس کے علاوہ ہر چیز کی ایک جذباتی قیمت ہوتی ہے جس کا مارکیٹ ویلیو سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ خیال کے طور پر سگ لیلیٰ کو ہی لیجیے اگر مجنوں اس فضول سے کتے کو بیچنے جاتا تو کوئی کوڑیوں کے مول بھی نہ لیتا مگر مجنوں کے لیے اس کی جذباتی قیمت کیا تھی۔" وہ زور سے ہنسا۔ "رابعہ نے سخت مائنڈ کیا ہو گا۔"

"میں بھی بہت سخت مائنڈ کر رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "رابعہ ٹھیک کہتی ہے۔ ہم اس کو نہیں چھوڑ سکتے اگر اس کا روز ایکسیڈنٹ ہو اور ہمیں اس پر نئی مرسڈیز کی قیمت سے زیادہ مرمت کے اخراجات برداشت کرنے پڑیں، تب بھی بری نہیں۔"

عبدل کے لیے ہماری گفتگو بالکل بے معنی تھی اور وہ اپنے خیالات میں کھویا ہوا چپ چاپ بیٹھا تھا گاڑی جانے پہچانے راستوں سے گزرتی ہوئی ایبٹ روڈ پہنچی اور میر شرافت علی کی کوٹھی "رین بسیرا" کے سامنے ٹھہر گئی۔ پوری عمارت پر اندھیرے کی حکمرانی تھی۔ گیٹ بند تھا اور اس کے اوپر لگی ہوئی لائٹس بھی بجھی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر کے لیے میرا ذہن گزرے ہوئے وقت کی یادوں میں کھو گیا۔ یہیں سے میرے تمام مصائب کا آغاز ہوا تھا اگر میں نے اس روز محسن کی بات مان لی ہوتی تو شاید میں میر شرافت علی کو قتل کرنے کے جھوٹے الزام میں ملوث نہ ہوتا۔ جذبات کی شدت سے مغلوب ہو کر میں نے احتیاط کے تقاضوں کو بھی فراموش کر دیا تھا ورنہ میں عقل سے کام لیتا تو میر شرافت علی کو کہیں زیادہ نقصان پہنچا سکتا تھا لیکن اپنے خلاف کسی کو چشم دید گواہ نہ بناتا۔ میں اور محسن اسے اٹھا کر لے جا سکتے تھے اور اس سے وہ بات بھی معلوم کر سکتے تھے جو میر شرافت علی نے آخری وقت تک نہیں بتائی تھی۔ شاید اس طرح ہم اسے قتل ہونے سے بھی بچا لیتے مگر اب اس پشیمانی سے کچھ حاصل نہیں تھا۔ میں نے اس جگہ کو بھی دیکھا جہاں سے میں ٹیلی فون کے تار کاٹ کر اندر کودا تھا اور اس جگہ کو بھی جہاں بیڈ روم خراب نظر آنے والی ٹیکسی میں سر ڈالے کھڑا تھا۔ اس نے میرے نکلتے ہی حالات سے فائدہ اٹھا کر میر شرافت علی کو قتل کر دیا تھا مگر واقعاتی شہادت نے مجھے ملزم بنا دیا تھا۔

"اس کوٹھی کے دوسرے ملازم کہاں گئے؟" میں نے عبدل سے پوچھا۔ "رشیدے کے علاوہ ایک چوکیدار بھی تھا۔"

"چوکیدار تو دوسری جگہ چلا گیا ہے۔" عبدل بولا۔ "رشیدے کا مجھے کچھ پتہ نہیں۔ یہ سرونٹ کوارٹر ... سے ہمارے پاس تھا اس لیے ہم ابھی تک یہیں ..."

اس نے بڑے گیٹ کے بیچ میں سے دوسرا چھوٹا کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ اندر جانے سے پہلے میں نے چاروں طرف نگاہ ڈالی مگر مجھے پولیس جیسا کوئی شخص نظر نہ آیا۔ شاید رضوی صاحب نے بھی عبدل کو ڈرانے کے لیے صرف دھمکی دی تھی۔ میری طرح ان کو ... بات پر یقین آ گیا تھا۔ محسن گاڑی میں ہی بیٹھا ... میں عبدل کے ساتھ کوٹھی کے عقبی حصے میں ...

دوسری بار آ کے میں نے گزرے ہوئے وقت کے ہر لمحے کو چشم تصور سے پھر زندہ دیکھا اور اس کی اذیت کو محسوس کیا۔ ویران اور تاریک کوٹھی کے اندر میر شرافت علی کا بیڈ روم تھا جہاں میں اچانک نمودار ہو گیا تھا۔ وہ منظر میرے ذہن میں نقش تھا جب میر شرافت علی نے حیرانی اور پریشانی

سے مجھے اپنے سامنے کھڑا دیکھا۔ میرے ذہن میں ایک اور تصویر اُس ڈرائنگ رُوم کی تھی جس میں لاکھوں کی مالیت کے نوادرات تھے۔ میں نے ان سب کو تباہ کر دیا تھا اور۔۔۔۔ میر شرافت علی ملبے کے ڈھیر میں میرے سامنے زاروقطار رو رہا تھا اور مجھ سے رحم کی بھیک مانگ رہا تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے یہ کل کی بات ہو۔ تمام تفصیلات میری نظر کے سامنے تھیں اور عبدل کے پیچھے چلتے ہوئے میں وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا جو میری آنکھ نہیں دیکھ سکتی تھی۔

سرونٹ کوارٹر دو کمروں پر مشتمل تھا۔ اس کی ظاہری حالت اور سازوسامان کی کیفیت ویسی ہی تھی جیسی کسی معمولی نوکر کے گھر کی ہونی چاہیے۔ ایک کمرہ تقریباً خالی تھا جبکہ دوسرے میں صرف ایک بستر بچھا ہوا تھا اور چالیس واٹ کا بلب روشن تھا۔ دوسرے کمرے میں اندھیرا تھا مگر عبدل نے لائٹ جلائی تو میلی دیواروں پر پھیل جلنے والی زرد بیمار روشنی میں مجھے ایک چارپائی پر عبدل کی ماں نظر آئی۔ اس نے ماں کی حالت بیان کرتے ہوئے مبالغے سے کام نہیں لیا تھا پلنگ پر ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ پڑا تھا جس پر خشک جھریوں بھری سیاہ کھال رہ گئی تھی۔ کمرے میں ٹین کے بنے ہوئے دو پرانے ٹرنک بھی اوپر نیچے رکھے ہوئے تھے۔ لکڑی کے ایک پرانے بے ڈھنگے اسٹول پر زیرِ استعمال دوائیں جمع تھیں۔ لائٹ جلتے ہی ہڈیوں کے ڈھانچے میں حرکت ہوئی۔

"عبدل!" بوڑھی عورت نے آہستہ سے کہا۔ "کہاں گیا تھا تُو؟ میں کب سے تیرا انتظار کر رہی ہوں۔"

"ماں!" عبدل اس پر جھک کر بولا۔ "میں وزیر خان کے لڑکے سکندر کو لایا ہوں۔"

بڑھیا نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی۔ "کون سکندر؟ وزیر خان کے بیٹے کا نام تو کبیر خان تھا، میں نے تجھے بتایا تھا۔"

میں نے عبدل کو اشارہ کیا کہ وہ ہٹ جائے اور پھر سرہانے کی طرف بیٹھ گیا۔ "ماں جی!" میں نے کہا۔ "کبیر خان میرا ہی نام تھا۔ پاکستان آنے کے بعد میں نے نام بدل لیا تھا۔"

"کیوں؟" وہ مشکوک لہجے میں بولی۔ "نام بھی کوئی پاؤں کی جوتی ہے کہ جب کوئی چاہے بدل لے؟"

"میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں تو ایک زمانے میں کبیر داس بھی رہا ہوں جب میرے گھر کے سب افراد کو ہلاک کر دیا گیا تھا اور میں ہندوستان میں اکیلا رہ گیا تھا۔"

میری بات نے اسے کچھ قائل کیا۔ "تیرا باپ وزیر خان کہاں ہے؟ وہ تیرے ساتھ کیوں نہیں آیا؟"

"اباجی بیمار تھے۔" میں نے پورے اعتماد سے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔ "ان کو میں نے علاج کے لیے ولایت بھیج دیا ہے۔"

"کبیر خان!" وہ کچھ دیر بعد بولی۔ "تو نے اچھا کیا جو آ گیا۔ اگر تو بھی نہ آتا تو میرے لیے مرنا مشکل ہو جاتا۔ خدا اُسے معاف کرے، عبدل کے باپ نے یہ ذمے داری میرے سپرد کی تھی۔ کام تو اس کا تھا مگر اس نے کہا تھا کہ عبدل کی ماں! زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ معلوم نہیں اس نے یہ بات کیوں کہی تھی۔ کیا یہ بات میں نہیں جانتی تھی؟ معلوم ہے وہ کتنا عرصہ میرے ساتھ رہا؟ ایک بار اس نے حساب لگا کے مجھے بتایا تھا، اس لیے مجھے یاد ہے۔ خیر چھوڑ اس بات کو۔ ہمارے دو بیٹے اور بیٹیاں اپنے اپنے گھروں کے ہو گئے۔ اب ان کے بچوں کے بھی بچے ہیں۔ یہ عبدل سب سے چھوٹا تھا۔ اس کے باپ نے مجھ سے کبھی کوئی بات نہیں چھپائی تھی لیکن اتنے عرصے کے بعد اس نے مجھ سے کہا کہ عبدل کی ماں! ایک بات ایسی بھی ہے جو میں نے تجھے نہیں بتائی تھی۔ اس لیے نہیں کہ مجھے اعتبار نہیں تھا بلکہ اس لیے کہ میں اس راز کو راز رکھنے کا پابند تھا۔ ہر شخص قیامت کے دن اپنی نیکی بدی کا حساب خود دے گا۔ خدا دلوں کے بھید بھی جانتا ہے اور اس سے کچھ چھپانا ناممکن ہے مگر جو کچھ دنیا میں ہو رہا ہے نا، وہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں یہ بات اب تجھے بتانے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ خدانخواستہ مجھے کچھ ہو جائے تو یہ بات وزیر خان کو یا اس کے بیٹے کو بتا دینا۔" وہ بولتے بولتے تھک کر ہانپنے لگی تھی۔ عبدل نے اسے پانی میں گلوکوز ملا کر دیا اور کوئی گولی کھانے کو دی۔ "اس نے کہا کہ اب میری زندگی کے دن ہی کتنے رہ گئے ہیں کہ میں کسی سے ڈروں۔" وہ پانچ منٹ بعد پھر بولنے لگی۔ "اب تک میں ڈرتا تھا لیکن اب اس سے زیادہ برداشت کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ وہ مجھے مارنا چاہیں تو مار دیں۔ میں نے کہا کہ وہ کون؟ وہ بولا کہ تو نہیں جانتی انہیں۔ بس تو دھیان سے میری بات سن لے تاکہ میرے بعد بھی وزیر خان یا اس کے بیٹے کو حقیقت معلوم ہو جائے۔ افسوس یہ ہے کہ ابھی تک میں خود ان سے یہ بات نہیں کہہ سکا۔ مجھے اس کا موقع ہی نہیں ملا اور جب موقع ملا تو کبیر نے میری بات نہیں سنی یا مجھ پر اعتبار نہیں کیا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ وزیر خان کہیں چلا گیا ہے اور اس کا بیٹا ولایت میں ہے۔ میں نے دو مرتبہ ولایت میں اس سے بات کرنے کی کوشش کی مگر ملاقات نہیں ہو سکی۔"

"عبدل کے باپ نے؟" میں نے چونک کر کہا۔ "اس نے مجھ سے دو بار بات کی تھی؟ ولایت میں۔۔۔؟"

"ہاں۔ اس نے مجھے یہی بتایا تھا۔" بڑھیا بولی۔ "جب وہ ولایت سے واپس آیا تو بہت مایوس تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ عبدل کی ماں! کیسا زمانہ آگیا ہے کوئی کسی پر اعتبار ہی نہیں کرتا۔ میں نے کبیر خان سے دو مرتبہ ٹیلی فون پر بات کی اور ایک بار اسے ملاقات کے لیے بلایا تاکہ اسے ساری بات بتا دوں۔۔۔ مگر وہ نہیں پہنچا۔ وزیر خان نے اسے ولایت بھیج کے بڑی غلطی کی ہے۔ معلوم نہیں وہ کن چکروں میں پڑا ہوا ہے کہ باپ کی خبر ہی نہیں لیتا۔ اللہ ایسی اولاد نہ دے تو اچھا ہے۔ وزیر خان کا بھرا گھر اجڑ گیا۔ یہ ایک لڑکا بچا تھا۔۔۔"

بڑھیا بولتی جا رہی تھی۔ میرے کان اس کی آواز سن رہے تھے اور ہر لفظ میرے سامنے واقعات کی ایک تصویر پیش کر رہا تھا۔ گزرے ہوئے وقت کی ہر بار ایک تصویر بن کے ابھرتی تھی اور مٹ جاتی تھی۔ پرانی آوازیں صدائے بازگشت کی طرح سنائی دیتی تھیں اور ختم ہو جاتی تھیں۔۔۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ فون پر مجھ سے کہا اور اس کی آواز میرے کانوں نے اسی طرح سنی جیسے لندن میں ٹیلی فون پر سنی تھی۔ ہاں، میں نے اس سے کہا تھا کہ سوری۔۔۔ مجھے اس وقت بہت بڑا معرکہ درپیش ہے اور اس نے کہا تھا۔ بیوقوف مت بنو، میں تمہیں بہت سے خطرات سے خبردار کرنا چاہتا ہوں لیکن چاہنے سے کیا ہوتا ہے اور تدبیر کے زور سے نوشتۂ تقدیر کو کون بدل سکتا ہے۔ میں اس بڑھیا کو کیا بتاتا کہ ملنا تو میں بھی چاہتا تھا مگر کمرے کا نمبر غلط ہو گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی سب کچھ غلط ہو گیا تھا۔

"معلوم نہیں وہ کیا لکھتا رہتا تھا۔" بڑھیا اب بھی بول رہی تھی۔ "ایک دن میں نے پوچھا تو اس نے کہا۔ عبدل کی ماں! معلوم نہیں کیوں مجھے ایسا لگتا ہے کہ میرا وقت پورا ہو چکا ہے۔ مجھے بہت سی ایسی باتیں معلوم ہو گئی ہیں جو معلوم نہ ہوتیں تو اچھا تھا اور انہیں بھی شک ہو گیا ہے۔ میں نے کہا کہ کس کی بات کر رہے ہو؟ تو اس نے ایک سرد آہ بھری اور بولا کہ چھوڑو۔۔۔ تمہارا کچھ نہ جاننا ہی اچھا ہے۔ اللہ مجھے معاف کرے کہ میں وزیر خان کے لیے کچھ نہ کر سکا کیونکہ میں بزدل تھا اور مرنے سے ڈرتا تھا۔ اب میں نے وہ سب کچھ لکھ دیا ہے جو مجھے معلوم تھا۔ میں کوشش کروں گا کہ کسی طرح وزیر خان یا اس کے بیٹے سے بات کروں۔ وزیر خان سے بات کرنے کا مجھے کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔ کبیر خان کو سب معلوم ہونا چاہیے۔ اور وہ کاربن رکھ کے نہ جانے کیا کچھ لکھتا رہا۔ میرا خیال ہے وہ ہی باتیں ہوں گی جو اس نے مجھے بتائی تھیں۔ کئی دن تک وہ پریشان پھرتا رہا۔ وہ بہت خوف زدہ تھا اور مجھے بھی کچھ نہ بتاتا تھا۔ پھر ایک روز وہ ایسا گیا کہ لوٹ کر نہیں آیا۔"

"منشی مرحوم آپ کے شوہر تھے؟" میں نے خاموشی کے طویل وقفے کے بعد کہا۔

"مرحوم؟" وہ چونکی۔ "وہ مر چکا ہے نا، مجھے معلوم تھا۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ وہ کہیں بھی جاتا تھا تو مجھے بتا کے جاتا تھا اور اگر بتانے کا موقع نہیں ملتا تھا تو کسی کے ہاتھ پیغام بھجوا دیتا تھا لیکن اس مرتبہ۔۔۔" وہ تھک گئی تھی۔ میری بات نے اس سے امید کی آخری کرن بھی چھین لی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ تمام عمر اس کا ساتھ نبھانے والا اب اس دنیا میں نہیں ہے مگر خود فریبی کا یہ طلسم اسے عزیز تھا جو آج ٹوٹ گیا تھا۔ زندہ رہنے کے لیے ہم سب جھوٹے سہاروں کو بھی عزیز رکھتے ہیں صرف سچ کے زہر پہ کون جی سکتا ہے۔ اب اسے احساس بھی نہیں تھا کہ وہ رو رہی ہے اور بے نور آنکھوں سے ٹپکنے والے آنسو چہرے کی جھریوں میں یوں بہے جا رہے تھے جیسے بارش کا پانی خشک ندی نالوں سے بہتا ہے۔

"جب ایک صدی کا آدھا حصہ ایک دوسرے کے ساتھ بیت جائے۔" وہ کچھ دیر بعد بولی۔ "تو میاں بیوی ایک ہو جاتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے دل کی بات کو الفاظ کی مدد کے بغیر بھی سمجھتے ہیں۔ ان کا ذہن ایک ہو جاتا ہے اور وہ خیالات کی زبان میں بھی گفتگو کر لیتے ہیں۔ جب عبدل کے باپ نے کہا کہ اس کی زندگی کے دن پورے ہو گئے ہیں تو میں نے مان لیا تھا کہ وہ سچ کہتا ہے۔ اس کو مجھ سے جھوٹ بولنے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ اور نہ جانے کیوں میرے اپنے دل میں بھی ہول اٹھ رہے تھے۔ ایک رات میں نے خواب میں دیکھا کہ میں اور عبدل کا باپ کسی پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہیں اور وہ چوٹی بادلوں میں سے یوں ابھری ہوئی ہے جیسے سمندر میں چٹانیں نکلی ہوئی نظر آتی ہیں۔ زمین بہت نیچے بادلوں میں چھپی ہوئی تھی اور وہ جگہ جہاں ہم کھڑے تھے مشکل سے چھ فٹ لمبی اور دو فٹ چوڑی تھی۔ بالکل کسی قبر کی طرح۔

اور اچانک عبدل کے باپ نے کہا کہ اب تم واپس جاؤ کیونکہ مجھے آگے جانا ہے اور میرا ہاتھ چھوڑ کے اس نے ایک قدم بڑھایا۔ میں حیرانی سے اس کو خلا میں اترتا ہوا دیکھتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ بادلوں میں گم ہو گیا۔ میں نے عبدل کے باپ سے اپنے خواب کا تذکرہ نہیں کیا تھا اور کسی خواب کی تعبیر بتلانے والے کے پاس بھی نہیں گئی تھی لیکن خواب کا مطلب سمجھ لیا تھا۔ چند دن بعد وہ چلا گیا اور پھر لوٹ کر نہیں آیا لیکن ایک رات میں نے اسے پھر خواب میں دیکھا۔ وہ کوئی عجیب سی جگہ تھی۔ صرف ایک کمرہ تھا جس کی چھت گنبد جیسی تھی اس کی خستہ حال دیواروں میں دروازے بھی نہیں تھے میں نے وہ جگہ پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ میں وہاں کیسے پہنچی۔ میں نے تو صرف یہ دیکھا کہ وہ چراغ جلائے ایک کونے میں لیٹا ہوا ہے اور کچھ پڑھ رہا ہے۔ میں نے کہا کہ کتنی دیر سے میں تمہیں تلاش کرتی پھر رہی ہوں اور تم یہاں چھپے ہوئے ہو۔ اس نے کہا کہ عبدل کی ماں! تجھ سے یہاں آنے کو کس نے کہا تھا؟ پھر اس نے وہ کاغذات دیئے کی لو پر رکھے اور ان کو جل کے راکھ ہوتے دیکھتا رہا۔ اس کے بعد وہ بولا کہ گھر جاؤ اور مجھے سونے دو کیونکہ میں بہت تھک گیا ہوں۔ اس نے چادر لی اور لمبی تان کر سو گیا۔ میں چلنے لگی تو اس نے چادر سے منہ نکال کر کہا کہ عبدل کی ماں! تمہارے پاس میری ایک امانت ہے۔ اسے سنبھال کر رکھنا اور جس کا حق ہے اسے پہنچا دینا۔ پھر وہ منہ ڈھانپ کے سو گیا اور میں ایک ویران جنگل کی رات میں بھٹکتی پھری لیکن اسی دن مجھے یقین آ گیا کہ اب وہ اس دنیا میں نہیں ہے۔"

ٹیلی پیتھی۔ روح کا وجود اور ایسی ہی مافوق الفطرت باتوں کو عقلِ سلیم تسلیم کرے یا نہ کرے، میں نے اپنے کانوں سے جو کچھ سنا تھا ناقابلِ یقین بھی تھا اور ناقابلِ تردید بھی۔ جب وہ خواب میں اپنے شوہر سے آخری ملاقات کا ذکر کر رہی تھی تو میری نظروں کے سامنے ایک فلم چل رہی تھی۔ میں نے منشی مرحوم عرف فوما پچو کو عین اسی جگہ دیکھا تھا جہاں اس کی بیوی نے دیکھا تھا۔ باغبان پورے کی طرف جانے والی اور نہر کے ساتھ ساتھ چلنے والی سڑک پر بائیں طرف وہ مقبرہ اب بھی موجود تھا جس کی شکستہ حالی درسِ عبرت تھی جس کے اوپر گنبد جیسی چھت تھی مگر اس کی چاروں دیواریں بے در تھیں اور اسی گمنام اور ویران مقبرے میں میری آنکھوں نے منشی کی لاش پڑی دیکھی تھی۔ اس ویرانے میں ایک دیا بھی روشن تھا لیکن وہ خط مجھے نہیں ملا تھا جس کو میرے ہاتھوں تک پہنچانے کی کوشش میں منشی کی جان چلی گئی تھی جو کچھ میں نے کھلی آنکھوں سے جلتے ہوئے جائے واردات پر پہنچنے کے بعد دیکھا، وہ منشی کی بیوی نے خواب میں دیکھ لیا تھا۔ اس کے خواب اور حقیقت میں سرِ مو فرق نہیں تھا اور میں اس کی توضیح کرنے سے قاصر تھا۔ سائنسی ترقی کے اس دور میں بھی جب آدمی ذرے کا دل چیر کر دیکھنے میں کامیاب ہے اور خلا کی تسخیر پر مائل ہے ان گنت باتیں ایسی ہیں جن کا احاطہ عقل نہیں کر سکتی۔ مجھے یقین آ چکا تھا کہ عبدل کی ماں نے اپنے شوہر کو اسی رات خواب میں دیکھا ہو گا جس رات وہ ہلاک ہوا۔

"آپ نے کچھ ایسی باتوں کا ذکر کیا تھا جو منشی مرحوم نے پہلے مجھے بتلانے کی کوشش کی تھی اور بعد میں آپ کو بتا دی تھیں۔" میں نے جانتے بوجھتے موضوع بدل دیا۔ "شاید یہی باتیں انہوں نے خط میں تحریر کی تھیں لیکن وہ خط مجھے نہیں مل سکا تھا۔ اس کی کوئی نقل آپ کے پاس بھی ہے؟ آپ نے ابھی گفتگو کے دوران میں کہا تھا کہ منشی مرحوم کاربن پیپر رکھ کے لکھتے تھے۔"

"مجھے نہیں معلوم کہ اس میں کیا ہے۔" وہ بولی۔ "عبدل کہاں ہے؟"

"عبدل؟" میں نے اس غیر متوقع سوال پر حیران ہو کے کہا۔ "عبدل یہاں ہی موجود ہے۔"

"عبدل تو باہر چلا جا۔" بڑھیا نے بیٹے کو حکم دیا۔

"یہ کیسی باتیں کر رہی ہو اماں؟" عبدل نے برہمی سے کہا۔ "کیا تمہیں اپنے بیٹے پر بھی اعتبار نہیں؟"

"اعتبار کی بات نہیں ہے بیٹا!" وہ عبدل کو سمجھاتے ہوئے بولی۔ "تیرے باپ نے یہی کہا تھا۔ میں اس کا حکم نہیں ٹال سکتی۔ اس نے کہا تھا کہ کبیر خان کو یہ امانت کسی کے سامنے نہیں لوٹانی ہے۔"

میں نے عبدل کی طرف دیکھا تو احساسِ ذلت سے یا غصے کی وجہ سے اس کا چہرہ بگڑ گیا تھا اور وہ مجھے اس طرح گھور رہا تھا جیسے اس کی ماں کے عدم اعتماد اور تذلیل آمیز رویئے کا ذمہ دار میں ہوں۔ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے التجا کی کہ وہ عقل سے کام لے کر صورتِ حال کو سمجھے اور تھوڑی دیر کے لیے وہاں سے چلا جائے۔ سخت اشتعال کے عالم میں اس نے دروازے کا رخ کیا تو مجھے افسوس بھی ہوا اور حیرانی بھی ہوئی۔ ابھی کچھ دیر پہلے رضوی صاحب کے گھر میں وہ عاجزی و انکساری اور مظلومیت کا پیکر بنا ہوا تھا لیکن اب وہ مجسم نفرت و حقارت کا دھواں دیتا آتش فشاں تھا۔ بات اتنی بڑی نہیں تھی جتنا بڑا انقلاب اس کی شخصیت میں رونما ہوا تھا۔ وہ دروازہ بند کر کے نکل گیا تو اس کی ماں نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے مگر میں نے اسے ایک منٹ خاموش رہنے کے لیے کہا اور دبے پاؤں دروازے کی طرف بڑھا۔ چند سیکنڈ تک میں دروازے سے کان لگائے کچھ سننے کی کوشش کرتا رہا پھر میں نے دروازہ ایک جھٹکے سے کھولا اور عبدل میرے قدموں میں آ گرا۔ میں نے اسے کالر سے پکڑ کے اٹھا لیا۔

"تمہیں شرم آنی چاہیے عبدل!" میں نے آہستہ سے کہا۔ "تم اپنی ماں کو دھوکا دے رہے ہو۔ اس سے تو بہتر تھا کہ تم صاف انکار کر دیتے۔"

"اس نے مجھے کمرے سے باہر جانے کا حکم دیا تھا۔" عبدل خود کو چھڑا کے بولا۔ "میں کمرے سے باہر کھڑا ہوں۔"

"ایسی باتوں سے تم اپنے آپ کو دھوکا دے سکتے ہو، مجھے نہیں۔" میں نے کہا۔ "اس دروازے سے اتنی دور چلے جاؤ کہ تمہارے کان کچھ نہ سن سکیں اگر تم نے چالاک بننے کی کوشش کی تو میں خود تم کو دور ڈال آؤں گا۔ پھر تم ایک گھنٹے تک ادھر کا رخ نہیں کر سکو گے، یہ دروازہ کھلا رہے گا... جاؤ۔"

عبدل نے خون آشام نظروں سے مجھے گھورا اور پلٹ کر تیز تیز قدموں سے روانہ ہو گیا۔

"کبیر خان!... عبدل!" بڑھیا چلا رہی تھی۔ "کیا بات ہے تم دونوں چلے گئے ہو کیا؟" وہ اونچا سنتی تھی اس لیے میری اور عبدل کی گفتگو اس کے کانوں تک نہیں پہنچی تھی اگر عبدل دروازے کے باہر کھڑا رہتا تو یقیناً ہماری سب باتیں سن لیتا کیونکہ مجھے ہر بات بڑھیا کے کان میں بلند آواز سے کہنی پڑتی تھی۔

"میں ذرا دروازے تک گیا تھا ماں جی!" میں نے کہا۔ "اب جو کہنا ہے کہہ دیجئے سننے والا کوئی نہیں ہے۔"

عبدل کی ماں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے گلے میں پڑی ہوئی زنجیر کو گردن سے جدا کیا۔ زنجیر کے درمیان ایک لاکٹ تھا جو دیکھنے میں تعویز نظر آتا تھا۔ اس نے تقریباً سوا انچ لمبی اور ایک انچ سے کم چوڑی ڈبیہ کو انگلیوں کی مدد سے ٹٹول کر کھولا اور میرے سامنے کر دیا۔ ڈبیہ کے ایک حصے میں منشی مرحوم کی جوانی کی تصویر تھی اور دوسرے حصے میں کوئی نقش تھا۔

"یہ تصویر پہچانی تو نے کبیر خان؟" وہ بولی۔ "میری تو آنکھیں بھی نہیں ہیں مگر میں اسے دیکھ سکتی ہوں اور یہ نقش میرے بزرگوں کی نشانی ہے۔ دیکھ اس پر کیا لکھا ہے اور اس کے نیچے کیا ہے؟"

"آپ کو تو معلوم ہو گا..." میں نے تھوڑے سے تذبذب کے بعد کاغذ کا وہ پرانا میلا سا ٹکڑا اٹھا لیا جس کا رنگ زرد پڑ چکا تھا۔ اس کے نیچے ایک چھوٹی سی چابی تھی۔ میں نے وہ چابی بھی اٹھا لی اور چار مرتبہ تہہ کیے ہوئے کاغذ کو احتیاط سے کھولا۔ کاغذ اتنا پرانا تھا کہ مجھے ہر تہہ پر سے اس کے ٹوٹنے کا اندیشہ تھا۔ کاغذ پر صرف سات سو چھیاسی کے اعداد لکھے ہوئے تھے۔

"اس پر تو صرف بسم اللہ کے اعداد لکھے ہوتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور یہ چھوٹی سی چابی ہے۔"

"ہاں۔" بڑھیا نے کہا۔ "ان مبارک اعداد سے سارے بند دروازے کھل جاتے ہیں اور ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے۔" اس نے مجھے ایک اور چابی تھمائی جو عام قسم کے قفل کی چابی تھی اور اس نے تکیے کے نیچے سے برآمد کی تھی۔ "اس کمرے میں دو ٹرنک رکھے ہیں۔ یہ نیچے والے ٹرنک کی چابی ہے۔ اس میں میری شادی کے تمام زیور اور بھاری جوڑے رکھے ہوئے ہیں۔ کئی سال سے اس کو کھولنے کی نوبت نہیں آئی تھی لیکن جانے سے پہلے عبدل کے باپ نے کپڑوں کے نیچے ایک چھوٹا سا بکس رکھوایا تھا اور مجھے بتا دیا تھا۔ اس بکس میں دو تالے ہیں۔ ایک چابی سے کھلے گا اور دوسرا نمبروں کو گھمانے سے۔ تجھے سات سو چھیاسی کے عدد ملانے ہوں گے۔ صندوق میں سے بکس نکال کر دیکھ لے، تیری امانت محفوظ ہے یا نہیں؟"

اوپر کا صندوق کافی بڑا اور بھاری تھا اسے ہٹانے کے لیے مجھے خاصی قوت صرف کرنی پڑی۔ پھر میں نے نیچے والے ٹرنک کا تالا کھولا اور کچھ دیر ڈھکنا تھامے بیٹھا رہا۔ مجھے یوں لگا جیسے یہ وہی صندوق ہے جسے میرا باپ پاکستان آتے وقت اپنے ساتھ لایا تھا اور جس میں وہ اپنی زندگی کی سب خوبصورت یادیں سمیٹ کر رکھتا تھا۔ ایسے ہی گہنے اور کپڑے میری ماں کے بھی تھے جو سلامت شاہ کے کوارٹر سے غائب ہو گئے تھے اور ان کی جگہ ٹرنک میں سلامت شاہ کی لاش کے ٹکڑے بھر دیے گئے تھے۔ بڑھیا کی آواز سن کر میں چونکا۔ وہ مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ مجھے بکس ملا ہے کہ نہیں۔ میں نے جلدی جلدی کافور سے مہکتے ہوئے پرانے ریشمی کپڑوں کے نیچے ہاتھ مارا۔ بکس درحقیقت ایک بریف کیس تھا جو بالکل نیا تھا اور

شاید منشی اپنے غیر ملکی دوروں سے واپسی پر لایا تھا۔

بریف کیس میں ایک لفافے کے سوا کچھ بھی نہیں تھا اور یہ بالکل ویسا ہی لفافہ تھا جیسا ایک بار پہلے بھی میرے ہاتھ آچکا تھا لیکن اس لفافے کے حصول کی خاطر ہم نے ناقابلِ بیان سختیاں جھیلی تھیں اور بہت نقصان اٹھایا تھا۔ یہاں تک کہ منشی کو اس کی قیمت جان دے کر ادا کرنا پڑی تھی۔ ایک فوری خیال کے تحت میری نگاہ کھلے دروازے کی طرف گئی۔ اندھیرے میں ایک سایہ سا جھلک دکھا کے اوجھل ہوگیا۔ میں نے لفافے کو بریف کیس میں سے نکال کر ٹرنک میں کپڑوں کے نیچے رکھا اور بریف کیس مقفل کر کے ایک ہاتھ میں اٹھا لیا۔ ٹرنک کو میں نے مقفل نہیں کیا تھا لیکن ایک نظر میں دیکھنے والے کو اندازہ نہیں ہوسکتا تھا کہ ٹرنک غیر مقفل ہے۔ بریف کیس کی چابی جیب میں ڈال کر میں عبدل کی ماں کے پاس گیا اور ٹرنک کے تالے کی چابی اسے واپس کردی۔

"اپنی امانت وصول کرلی؟" وہ بولی۔ "اب مجھ پر کوئی قرض تو نہیں رہا؟"

"نہیں ماں جی!" میں نے کہا۔ "میری چیز مجھے مل گئی ہے میں آپ کا شکریہ کیسے ادا کروں؟"

"شکریہ کس بات کا؟" وہ بولی۔ "یہ میرے لیے مجازی خدا کا حکم تھا اگر اس نے کہا ہوتا کہ وزیر خان کے بیٹے کو زہر دے دینا تو مرنے سے پہلے میں تجھے زہر ضرور دیتی۔"

"اگر آپ برا نہ مانیں تو میں ایک سوال کروں؟" میں نے کہا۔ "منشی مرحوم خود کو فومانچو کیوں کہتے تھے؟"

"یہ بڑی پرانی بات ہے کبیر خان!" وہ اداس ہو کے بولی۔ "اسے ڈاکٹر فومانچو کے ناول بہت پسند تھے۔ ایک زمانے میں ان کے ترجمے شائع ہوئے تھے تو ہر جگہ بڑے شوق سے پڑھے جاتے تھے۔ ڈاکٹر فومانچو۔ فومانچو کی واپسی... اور پتہ نہیں کیا کیا نام ہوتے تھے۔ عبدل کا باپ ان کے پیچھے ایسا دیوانہ تھا کہ یار دوست اس کو فومانچو کہنے لگے تھے مگر اس نے کبھی کسی کی بات کا برا نہیں مانا۔"

اس کی بات سننے کے بعد منشی کا پُراسرار رویہ میری سمجھ میں آگیا۔ اس نے خط لکھنے کے اور پہنچانے کے جتنے طریقے اختیار کیے تھے انہی ناولوں سے متاثر ہو کے کیے تھے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ڈاکٹر فومانچو کا کردار تخلیق کرنے والے انگریز مصنف کو بہت بڑا خراجِ عقیدت تھا۔ عبدل کی ماں سے اجازت لے کر میں بریف کیس اٹھائے باہر آیا اور کوٹھی سے باہر جانے والے راستے پر چلنے لگا۔ میں پوری طرح محتاط تھا مگر مجھے اپنے آس پاس کوئی بھی نظر نہ آیا۔ پھر ایک کھڑکی کے چھجے پر سے عبدل نے مجھ پر چھلانگ لگائی اور ہم دونوں ایک ساتھ نیچے گرے۔ بریف کیس میرے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا پڑا۔ میرے اٹھنے سے پہلے عبدل اس کی طرف لپکا۔ میں نے لیٹے لیٹے ایک ٹانگ بڑھائی اور عبدل پھر منہ کے بل گرا مگر اس نے بریف کیس نہیں چھوڑا اگر میں چاہتا تو ایک لمحے میں اسے مقابلے کا مزہ چکھا دیتا لیکن میں نے جانتے بوجھتے کچھ سستی اور اناڑی پن کا مظاہرہ کیا اور اسے اتنی مہلت دی کہ وہ اٹھ کر فرار ہوجائے لیکن وہ فرار نہیں ہوا۔ اس نے اچانک ریوالور نکال لیا اور گولی داغ دی۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور دیکھتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ وہ گولی چلانے سے دریغ نہیں کرے گا۔ اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت اتنی جلدی بحال نہیں ہوسکتی تھی۔ جنگ ابھی جاری تھی اور اسے دشمن پر غلبہ پانے کا موقع مل گیا تھا۔ وہ اس موقع کو کیسے ضائع کرسکتا تھا اگر میں مقابلہ جاری رکھتا تو دوسری گولی یقیناً میرا کام تمام کردیتی۔ پہلی گولی کا نشانہ تو اس لیے خطا ہوگیا تھا کہ عبدل نے بڑی عجلت میں فائر کیا تھا اور میں بھی متحرک تھا اگر میں اپنے پیروں پر کھڑا ہوجاتا تو وہ اطمینان سے نشانہ لے کر گولی چلاتا چنانچہ میں نے ایک بہت بڑا خطرہ مول لیا اور چیخ مار کر نیچے گر گیا۔

اندھیرے میں عبدل کو خون تو نظر نہیں آیا لیکن مجھے تڑپتا ہوا دیکھ کر اسے یقین آگیا کہ گولی اپنا کام کرگئی ہے۔ میرے لیے خطرہ یہ تھا کہ کہیں وہ دوسری گولی چلا کے میری موت کو یقینی بنانے کی کوشش نہ کرے لیکن وہ بریف کیس مل جانے کے بعد ایک سیکنڈ بھی ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ فائرنگ کی آواز سن کر سب سے پہلے محسن آجائے گا جو صرف میری حفاظت کے لیے دروازے پر کھڑی ہوئی گاڑی میں بیٹھا تھا۔ وہ پلٹ کر بے تحاشا بھاگا۔ میں نے فرش پر لوٹتے ہوئے دیکھا کہ اس نے بریف کیس کو ہاتھ گھما کے چھت پر پھینک دیا ہے۔ میں اس شخص کی طرح دردناک آوازیں نکالتا رہا جو نزع کے کرب میں مبتلا ہو اور عبدل کو بندر کی طرح کھڑکی کے چھجے پر اور وہاں سے چھت پر چڑھتے دیکھتا رہا۔ دوسری طرف سے میں نے محسن کو دوڑ کر آتے ہوئے دیکھا اور کپڑے جھاڑ کر کھڑا ہوگیا۔

"کیا بات ہے سکندر؟" محسن نے چلا کر کہا۔ "فائرنگ کس نے کی تھی؟"

"وہ تو بھاگ گیا۔" میں نے کہا اور ویران چھت کی طرف دیکھا۔ عبدل کا تعاقب کرنے میں کوئی عقل مندی نہیں تھی۔ وہ خالی بریف کیس کے سوا کچھ بھی نہیں لے گیا تھا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں اس صورتِ حال پر قہقہہ مار کے ہنسوں مگر میری چھٹی حس مجھے خبردار کررہی تھی کہ خطرہ اب بھی باقی ہے۔ عبدل اپنا روپ بدل کے مجھے دھوکا دینے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ وہ بدستور میرا دشمن تھا یا دشمن کا آلۂ کار تھا اور اس امکان کو مسترد نہیں کیا جاسکتا تھا کہ رشیدا ابھی اس کے ساتھ ہی گھر میں یا گھر کے آس پاس کہیں موجود ہو۔ عبدل ماں کی ضد سے مجبور ہوگیا تھا۔ اور اس کی آخری خواہش پوری کرنے کے لیے مجھے بلا لایا تھا۔ اس نے یقیناً ماں سے معلوم کرنے کی کوشش کی ہوگی کہ وہ مجھ سے یا وزیر خان سے کیوں ملنا چاہتی ہے اور مرنے سے پہلے کون سا قرض اتارنے کے لیے اتنی فکرمند ہے مگر بڑھیا جسمانی طور پر مفلوج ہونے کے باوجود پوری طرح ہوش و حواس میں تھی اور شوہر کے حکم کو خدا کا حکم سمجھتے ہوئے آخری وقت تک راز کو راز رکھنے کے ارادے پر قائم تھی۔ اپنی قوتِ ارادی کا مظاہرہ اس نے کچھ دیر پہلے بیٹے کو کمرے سے نکال کر کیا تھا۔ ماں کی بات نے عبدل کے تجسس کو پریشانی میں بدل دیا ہوگا اور اس نے یہ بات رشیدے کو یا ان لوگوں کو بتائی ہوگی جو میرے نقطۂ نظر سے وزیر خان اور پھر میر شرافت علی کے قتل کے ذمہ دار تھے اور جنہوں نے مجھے قاتل بنانے کے بعد میرے قتل کا بیڑہ بھی اٹھا رکھا تھا۔ انہوں نے ہی عبدل کو یہ اسکیم سمجھائی ہوگی کہ وہ شرافت کا لبادہ اوڑھ کے مجھے گھیر لائے اور پھر دیکھے کہ منشی کی بیوہ کیا چکر چلانا چاہتی ہے۔ منشی میرے دشمنوں کے نزدیک نمک حرام اور غدار تھا۔ چنانچہ شوہر کو مجازی خدا سمجھنے والی بیوی بھی ان کے لیے خطرہ پیدا کرسکتی تھی اور ان کے لیے یہ معلوم کرنا ضروری تھا کہ وہ کیا جانتی ہے اگر وہ اتنی ضعیف اور قریب المرگ نہ ہوتی تو شاید وہ تشدد کے مخصوص طریقے آزما کے اس سے ہر بات پوچھ لیتے مگر وہ جانتے تھے کہ بڑھیا کی صرف سانس اٹکی ہوئی ہے اور جسم و جاں کا رشتہ سُوت کے کچے دھاگے کی طرح ہے جو ایک معمولی سے جھٹکے میں ٹوٹ جائے گا۔ وہ مرگئی تو انہیں کبھی معلوم نہ ہوگا کہ وہ کون سا راز اپنے ساتھ قبر میں لے گئی۔ عبدل نے یقیناً چھپ کر ساری باتیں سن لی تھیں اور وہ مجھ سے لفافہ چھین لینے کے لیے تیار کھڑا تھا لیکن یہ اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ بہت جلد عبدل کو اپنے بے وقوف بنائے جانے کا پتہ چل جائے گا۔ رشیدے کے سامنے یا اپنے کسی آقا کے حضور اس نے بڑے فخر سے بریف کیس پیش کیا ہوگا تو اس میں سے کچھ بھی نہیں نکلا ہوگا اگر وہ کہیں قریب ہوئے تو فوراً واپس آئیں گے۔

"جب وہ بھاگ گیا ہے تو یہاں کھڑے رہ کر چھت کو گھورنے کا کیا مقصد؟" محسن نے میرا بازو ہلا کے کہا۔

میں چونک پڑا۔ "کچھ نہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ کہیں وہ واپس نہ آجائیں۔ ہمیں نکل جانا چاہیے یا انتظار کرنا چاہیے؟" پھر میں نے کم سے کم الفاظ میں اسے بتایا کہ جس لفافے کے لیے فومانچو کی جان گئی تھی اور جو ہمارے ہاتھ میں آنے کے بعد بھی ضائع ہوگیا تھا، اس کی ایک نقل عبدل کی ماں کے پاس بھی موجود ہے اور اس کے پرانے کپڑوں کے نیچے چھپی ہوئی ہے لیکن عبدل خوش فہمی میں خالی بریف کیس لے کر فرار ہوگیا ہے۔

"ایسی صورت میں جلد بازی سے نقصان ہوسکتا ہے۔" محسن نے سوچتے ہوئے کہا۔ "ہمیں ان کی واپسی کا انتظار کرنا چاہیے تاکہ یہ معلوم ہوجائے کہ عبدل کے علاوہ اس سازش میں کون کون شامل ہے۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا اور ہم دونوں شرافت علی کی کوٹھی سے باہر آئے تو ہماری صورت سے، چال سے اور انداز سے مایوسی اور شکست عیاں تھی۔ ہم گاڑی میں واپس ہوگئے۔ میں نے بیک ویو مرر میں اور محسن نے سر گھما کے کئی بار دیکھا لیکن ہمارے تعاقب میں کوئی گاڑی نہیں تھی۔ ہم الٹے سیدھے راستوں سے گزر کے لاہور ہوٹل کی طرف سے پھر میکلوڈ روڈ پر پہنچے اور گاڑی کو چوک میں "کنگ سرکل" ریسٹورنٹ کے سامنے کھڑا کردیا۔ شرافت علی کی کوٹھی تک باقی راستہ ہم نے پیدل طے کیا۔ شرافت علی کی کوٹھی اسی طرح ویران اور تاریک پڑی تھی۔ اپنے اپنے ریوالور ہاتھ میں رکھتے ہوئے میں نے اور محسن نے دو مختلف مقامات سے دیوار کو عبور کیا۔ کوٹھی کے دونوں طرف تبلی سی گلی تھی جو ساتھ والی کوٹھیوں کی دیواریں کھڑی ہونے سے خود بخود بن گئی تھی۔ بائیں ہاتھ کی گلی سیدھی سرونٹ کوارٹر تک پہنچ کے ختم ہوتی تھی۔ دائیں جانب کی گلی کے آخری حصے میں گیراج تھا جس میں اب شرافت علی کی گاڑی مقفل دروازوں کے پیچھے کھڑی رہ گئی تھی۔ میں نے بائیں طرف چلنا شروع کیا اور محسن نے دائیں جانب سے گھوم کر آنے والا راستہ اختیار کیا۔ یہ حفاظتی پیش بندی تھی۔ خدانخواستہ ہم میں سے ایک دشمن کے نرغے میں آجاتا تو دوسرا اس کی کچھ نہ کچھ مدد ضرور کرسکتا۔ رضوی صاحب نے یقیناً پولیس نہیں بھیجی تھی ورنہ وہ فائرنگ کی آواز سن کر ضرور پہنچ جاتے۔ انہوں نے صرف عبدل کو ڈرایا تھا اور ہمیں اب اپنی حفاظت خود کرنی تھی۔ آدھا فاصلہ طے کرنے کے بعد

مجھے گڑبڑ کا اندازہ ہو گیا۔ عبدل کی ماں کے کمرے میں روشنی تھی اور سرونٹ کوارٹر میں سے دو مردوں کے اونچی آواز میں بات کرنے سے پتہ چلتا تھا کہ دشمنوں کے بارے میں ہماری توقعات غلط نہیں تھیں۔ میں نے محسن کے آنے کا انتظار کیا ایک منٹ بعد وہ گیراج کی طرف سے نمودار ہوا تو میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ہم دونوں بے آواز قدموں سے اندھیرے کی پناہ میں چلتے ہوئے دروازے تک جا پہنچے اور باہر رک کے دیوار سے لگے کھڑے رہے۔

"اماں، دیکھ، اپنا نہیں تو میرا ہی خیال کر۔" عبدل کی آواز آئی۔ "تو نے سکندر بخت کو کیا دیا تھا؟"

"بدبخت، نامراد..." بڑھیا چلائی۔ "تجھے بتا دیا ہے کہ ایک بار تیرا باپ ایک امانت چھوڑ گیا تھا، وہ میں نے اس کے حوالے کر دی۔"

"یہ بکواس کرتی ہے عبدل!" دوسرے مرد کی آواز نے سخت لہجے میں کہا۔ "اس نے سیدھی طرح نہ بتایا تو..."

"نہیں شیدے!" عبدل منت سماجت کرتے ہوئے بولا۔ "میں اماں کو سمجھا لوں گا۔ دیکھو اماں! وہ یہاں سے ایک بکس لے گیا تھا لیکن اس میں کچھ بھی نہیں تھا۔ ہم نے اس کو اُدھیڑ کر رکھ دیا ہے لیکن اس میں کچھ بھی نہیں نکلا۔"

"یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں کہ اس بکس میں کیا تھا۔" بڑھیا بدستور اپنی بات پر اڑی رہی۔ "تجھے کیا بتاؤں۔"

"اچھا تیرے پاس وہ بکس کہاں سے آیا؟ میں نے تو کبھی نہیں دیکھا؟"

"تو نے تو ابھی دنیا میں بہت کچھ نہیں دیکھا بیٹا! جو یہ اندھی آنکھیں دیکھ چکی ہیں۔" بڑھیا بولی۔

"تو ہٹ جا عبدل!" شیدے نے چیخ کر کہا۔ "میں ابھی دو منٹ میں سب معلوم کر لوں گا... اس کی زبان نہ کھلی تو..."

"تو کیا ہو گا؟" عبدل نے اس کی بات کاٹ دی۔ "تو ملے گا اسے؟ اس بڑھیا کو جو بستر سے اٹھ نہیں سکتی؟ کیا ملے گا تجھے اس کو مار کے شیدے! تیرے نامۂ اعمال میں ایک اور قتل شامل ہو جائے گا۔"

"مجھے اس کی پروا نہیں۔" شیدے نے غرا کے کہا۔ "یہ ویسے بھی مرنے والی ہے۔ میں اسے اجازت نہیں دے سکتا کہ مرتے مرتے ہم سب کو مروا دے۔"

"میں بھی تجھے اجازت نہیں دے سکتا شیدے! کہ میرے سامنے تو میری ماں پر ہاتھ اٹھائے۔" عبدل نے بے خوفی سے کہا۔

"میں تجھے صرف پانچ منٹ دوں گا۔" شیدے نے خطرناک لہجہ بنا کے کہا۔ "اتنی دیر میں اس سے پوچھ لے کہ اس نے سکندر کو کیا بتایا ہے۔ اس کے بعد تو نے میرا راستہ روکا تو پھر میرا ہاتھ تجھ پر اٹھے گا۔ مجھے شک ہے کہ تو نے بھی غفلت برتی اور سکندر پر نگاہ نہیں رکھی، ورنہ وہ بریف کیس خالی نہ ہوتا۔"

"قسم خدا کی شیدے! میرے سامنے اس نے بریف کیس میں سے کوئی چیز نکال کر کہیں نہیں چھپائی تھی۔" عبدل بولا۔ "وہ نکلا ہی تھا کہ میں نے اس سے بریف کیس چھین لیا۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ بریف کیس میں تھا، سکندر اسی کمرے میں چھپا گیا ہو گا۔" شیدے نے کہا۔ "خیر وہ ہم بعد میں تلاش کریں گے۔ اپنی ماں سے پوچھ کہ اس نے اپنے..."

"شیدے!" عبدل چیخا۔ "میرے سامنے میری ماں کو گالی مت دے ورنہ میں تیرا خون پی جاؤں گا۔"

"شیدے نے قہقہہ مارا۔ "خون پی جائے گا۔" اس نے نفرت اور حقارت سے کہا۔ "خالی ہاتھوں سے؟ چمگادڑ کی اولاد!"

ابھی اس کی بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ عبدل نے اس پر حملہ کیا۔ ہم یہ جھانک کر دیکھ چکے تھے کہ شیدا صرف ریوالور کی وجہ سے ہی نہیں، جسمانی اعتبار سے بھی عبدل پر بھاری پڑتا تھا۔ اس نے گولی چلانے کے بجائے گھٹنا اٹھا کے عبدل کے پیٹ میں مارا اور اپنے ہی زور میں آنے والا عبدل ضرب کی شدت برداشت نہ کر سکا۔ اس نے ایک چیخ ماری اور پیچھے گرا تو پلنگ سے ٹکرا کر ماں کے اوپر جا پڑا۔

"عبدل!" بڑھیا نے چیخ کر کہا اور اپنے دونوں ہاتھ اس اندھیرے میں پھیلائے جو دن اور رات کے فرق کے بغیر اس کی دنیا میں چھایا رہتا تھا۔ "کیا ہوا ہے تجھے، بول؟"

میں اور محسن دروازے کی دہلیز سے سر نکالے اندر کا پورا منظر دیکھ رہے تھے اور مداخلت کے لیے مناسب وقت کے انتظار میں تھے۔ شیدا اچانک آگے بڑھا۔ اسی وقت عبدل کی نظر نے ہمیں دیکھا اور ہم جو اس کے دشمن تھے، یکلخت اس کی نظر میں مدد کے لیے پہنچنے والے فرشتۂ غیب بن گئے۔ وہ ہماری جان کا دشمن اور ہمارے خون کا پیاسا تھا مگر اس وقت وہ سب کچھ بھول چکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک خاموش التجا تھی کہ مجھے اور میری ماں کو بچا لو۔ میں بہت کمینہ ہوں مگر مجھے معاف کر دو۔ مگر تاسف اور پشیمانی کے اظہار کا وقت گزر چکا تھا اور مکافاتِ عمل کی گھڑی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ لب کھولتا یا ہم اسے بچانے کی کوشش کرتے، شیدا اس کے سر پر ریوالور کی بھرپور ضرب لگا چکا تھا۔ یہ ضرب ماں کے بوڑھے ہاتھوں پر بھی آئی تھی۔ عبدل کے حلق سے ایک بھیانک چیخ نکلی اور وہ ماں کے پھیلے ہوئے ہاتھوں میں گر گیا۔ اس سے زیادہ دل گداز چیخ عبدل کی ماں نے ماری۔

"مار ڈالا؟ میرے عبدل کو مار ڈالا؟" وہ دیوانہ وار عبدل کا سر ٹٹولتے ہوئے بولی اور اس کے بوڑھے ہاتھ خون میں بھر گئے۔

"ابھی تو نہیں مارا ہے لیکن مار ڈالوں گا۔" شیدا چیخ کر بولا اور اس نے ایک ہاتھ سے عبدل کو کھینچ کر ماں سے الگ کرنے کی کوشش کی لیکن دو سوکھے ہاتھ عبدل سے یوں چمٹ گئے تھے کہ عبدل اس کے وجود کا ہی ایک حصہ بن گیا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ جنم لینے سے پہلے تھا۔ اسی ایک لمحے میں شیدے کی پشت ہماری طرف ہوئی اور میں نے اس پر چیتے کی طرح جست لگائی جو لہو کی پیاس دبائے شکار کے زد پر آ جانے کا منتظر بیٹھا ہو۔ اس غیر متوقع حملے نے شیدے کو سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ اگر میں چاہتا تو ایک ہاتھ مار کے اس کی گردن توڑ دیتا یا اسے بے ہوش کر کے لٹا دیتا لیکن مجھ پر دحشت سوار تھی۔ میں اسے مارتا ہوا دیوار تک لے گیا۔ میرے مکے اس کے سر، پیٹ اور منہ پر اتنی قوت سے پڑے کہ وہ کئی بار گرا۔ جب وہ گرتا تھا تو میرے پاؤں خود بخود اس کو ٹھوکریں مارتے تھے۔ اس میں مدافعت کی قوت ہی نہ رہی تھی، وہ تندرست و توانا تھا مگر میرے غیظ و غضب کی طوفانی آندھی میں اس کا وجود حقیر تنکا بن گیا۔ میں نے آخری بار اسے دونوں ہاتھوں پر اٹھایا اور اتنی طاقت سے دیوار پر دے مارا کہ اس سرونٹ کوارٹر کی پرانی دیواریں بھی ہل گئی ہوں گی۔

جب مجھے ہوش آیا تو منظر بالکل بدل چکا تھا۔ چارپائی پر عبدل کی ماں بانہیں پھیلائے پڑی تھی اور اس کی کھلی آنکھیں چھت پر مرتکز ہو گئی تھیں۔ روح نے بالآخر خاک ہو جانے والے جسم سے رہائی پا لی تھی۔ بڑھیا کے لبوں پر مجھے ایک پُراطمینان کیفیت کا احساس ہوا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک مبہم سی مسکراہٹ تھی جو ان سب کا تمسخر اڑاتی ہوئی محسوس ہوتی تھی جنہوں نے اپنی تمام طاقت صرف کر دی تھی کہ پھونک سے اڑ جانے والی یہ بڑھیا اپنے خداوندِ مجازی کے حکم کی تعمیل نہ کرے مگر انہیں ناکامی ہوئی تھی۔ وہ جو اپنی دولت، اپنے اثر و رسوخ اور اپنی بدمعاشی کے غرور میں تھے اور خود کو پہاڑ سے زیادہ مضبوط اور ناقابلِ تسخیر سمجھتے تھے، اس معذور اور بے بس عورت کے عزم کو شکست نہیں دے سکے تھے۔ عبدل خون میں نہایا ہوا شیدے کا ریوالور اٹھائے کھڑا تھا۔ اس نے محسن کو دروازے کے قریب روک رکھا تھا اور میرا ہاتھ پکڑنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ اس کا سر پھٹ گیا تھا چنانچہ اس کے چہرے پر سے بہتا ہوا خون اس کے کپڑوں کو رنگین کر رہا تھا، اس کے ہاتھ پر بہہ رہا تھا اور فرش پر ٹپک رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ اس کا خون اسی طرح ضائع ہوتا رہا تو وہ زیادہ دیر نہیں جیئے گا۔

"سکندر صاحب..." عبدل نے ریوالور سے اشارہ کیا۔ "اب یہاں سے چلے جاؤ۔"

میں نے دیوار کے ساتھ پڑے ہوئے شیدے کو دیکھا۔ جو بڑی مشکل سے لمبے لمبے سانس لے رہا تھا اور اس کے حلق سے خرخر کی آواز نکل رہی تھی۔ اس کا چہرہ بھی لہولہان ہو رہا تھا۔ "عبدل! ہم تمہیں اسپتال لے چلتے ہیں۔" میں نے کہا۔

عبدل نے انکار میں سر ہلایا اور ایک ہاتھ سے دیوار تھام لی۔ دیوار پر ایک خونی پنجے کا نقش بن گیا۔ "میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ میرے مرنے سے پہلے مجھے معاف کر دو، میں نے تمہارے خلاف جھوٹی گواہی دی تھی..."

"کس کے کہنے پر؟" میں نے کہا۔ "شرافت علی کا قاتل کون تھا؟"

"ان سب باتوں کا وقت نہیں ہے..." اس نے آستین سے لبوں تک آ جانے والا خون صاف کیا۔ "میری ماں تو مر ہی چکی ہے۔ میرے باپ نے بھی تمہارے لیے جان دی تھی، اب میرا وقت ہے... میں بہت ناخلف اولاد تھا لیکن میدانِ حشر میں سرخ رو ہونے کا وقت ابھی ہے۔ تم جلد از جلد یہاں سے نکل جاؤ۔ پھر میں کوٹھی میں سے ٹیلیفون کر کے پولیس کو بلاؤں گا اور ان کے سامنے اعترافِ جرم کروں گا۔ مرتے ہوئے شخص کے اعتراف کو سچ تسلیم کیا جاتا ہے نا... میں کہہ دوں گا کہ شرافت علی کو میں نے ہی مارا ہے اور شیدے کو بھی..."

میں نے اور محسن نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"لیکن شیدا تو ابھی زندہ ہے۔" میں نے کہا۔

جواب دینے کی بجائے عبدل نے ریوالور سے شیدے کے سر کا نشانہ لیا اور گولی چلا دی۔ "شیدا زندہ تھا مگر اب نہیں ہے۔ اس بدمعاش نے میری ماں کو مارا۔ وہ مجھے بھی مارتا

چاہتا تھا... اور اس لڑائی میں ہم دونوں مارے گئے... پولیس کے سامنے میرا بیان یہی ہوگا..." اس نے قہقہہ مارا اور گرتے گرتے بچا۔ وہ پاگل ہوچکا تھا اور اس کی طاقت جواب دینے لگی تھی۔ "تم دونوں جاؤ۔" وہ ہانپتے ہوئے بولا۔ شیدا اب بالکل ساکت وصامت پڑا تھا۔

"اچھا عبدل ہم جاتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن وہ چیز جو تمہاری ماں نے مجھے دی تھی، میں یہیں چھوڑ گیا تھا۔ میں نے اوپر کے ٹرنک کی طرف اشارہ کیا۔" بریف کیس میں ایک لفافہ تھا۔ تمہاری ماں کی امانت..."

عبدل نے سر ہلایا۔" لے جاؤ۔ وہ ضرور لے جاؤ، ورنہ میرے باپ کی... میری ماں کی... اور میری قربانی رائیگاں جائے گی... تمہاری امانت کی حفاظت کے لیے ہم سب نے جان دی۔ یہ بات یاد رکھنا۔"

میں نے بے یقینی کے ساتھ اوپر والا ٹرنک ہٹایا اور نیچے والے ٹرنک کے تالے کو ایک جھٹکے سے الگ کر دیا۔ لفافہ ہاتھ میں آنے تک مجھے یقین نہیں تھا کہ عبدل جو کچھ کہہ رہا ہے، بقائمی ہوش وحواس کہہ رہا ہے اور وہ مجھ پر گولی نہیں چلائے گا۔ لفافہ نکال کے میں نے پھر اس کی طرف دیکھا اور اس نے ریوالور سے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ جو کچھ میری اور محسن کی نظروں نے دیکھا تھا، کسی بھیانک خواب کا حصہ لگتا تھا۔ ہم دونوں بوجھل قدموں سے چلنے لگے۔ سرونٹ کوارٹر سے باہر آنے کے بعد ہم نے پلٹ کر دیکھا۔ جسم کی رہی سہی قوت سے کام لے کر عبدل دیوار کا سہارا لیتا کوٹھی کی طرف آ رہا تھا۔

"ہم اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتے۔" میں نے محسن کی طرف دیکھے بغیر کہا۔" دعائے مغفرت بھی نہیں۔ اس نے اپنی زندگی کے تمام گناہوں کا کفارہ خود ہی ادا کر دیا ہے۔"

مجھ پر مسلسل یہ خوف غالب تھا کہ کہیں کسی طرف سے کوئی نادیدہ دشمن ہم پر حملہ نہ کر دے۔ معلوم نہیں منشی مرحوم نے کاغذ کے چند صفحات میں کیا لکھ دیا تھا کہ اس تحریر کو میری دسترس سے دور رکھنے کے لیے دشمن سب کچھ کر چکے تھے اور ان کی آخری ناکام کوشش کا نتیجہ تین افراد کی موت کی صورت میں نکلا تھا لیکن ہم بھی اس وقت تک اپنی کامیابی کا دعویٰ نہیں کر سکتے تھے جب تک خط کا مضمون ہمارے ذہن میں منتقل نہ ہو جاتے۔ گاڑی تک پہنچنے سے پہلے میں بہت محتاط تھا اور میری نظریں ہر اجنبی پہ تھیں کہ کہیں وہ ہمارے تعاقب میں تو نہیں ہے۔ میری شدید خواہش تھی کہ میں اس لفافے کو کھول کر دیکھوں جسے میں نے قمیص کے اندر چھپا لیا تھا مگر میں سڑک پر اس کو نکالتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ میں اور محسن دونوں اعصابی کشیدگی پر قابو پا کے نارمل نظر آنے کی بھرپور کوشش کر رہے تھے لیکن ہم دونوں کے ہاتھ جیب میں تھے۔ میں نے محسن کو یہ بات اچھی طرح سمجھا دی تھی کہ جیسے ہی وہ کوئی خطرہ محسوس کرے ریوالور نکال لے۔ ہمارے لیے تقدیر کے فراہم کردہ اس موقع کو ضائع کرنا انتہائی بدنصیبی کی بات ہوگی۔ چنانچہ ہم فیصلہ کر چکے تھے کہ اپنی جان پر کھیل کر بھی نکلنے کی کوشش کریں گے۔ ایک بار مجھے یہ خیال بھی آیا کہ ہمارے ساتھ پھر دھوکا نہ ہوا ہو اور لفافے میں سادہ یا بے معنی کاغذات کے سوا کچھ نہ نکلے۔

"محسن!" میں نے کہا۔" میرا خیال ہے کہ ہمیں اپنی گاڑی یہیں چھوڑ دینی چاہیے۔"

"ہمارے پیچھے تو کوئی بھی نہیں تھا پھر ڈرنے کی کیا بات ہے؟" محسن بولا۔

"یہ ٹھیک ہے کہ ہم نے چاروں طرف نگاہ رکھی تھی۔" میں نے کہا۔" لیکن میں سو فیصد یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا اور اس وقت شک کے ایک فیصد امکانات کو نظرانداز نہیں کر سکتا۔ ہو سکتا ہے دشمنوں نے بھی عبدل اور شیدے کی ناکامی کے امکانات کو نظرانداز نہ کیا ہو اور وہ ہماری گاڑی کے آس پاس موجود ہوں کہ ہم بخیر وعافیت یہ خطے کر نکلنے میں کامیاب ہو جائیں تو وہ پھر ہمارا راستہ روک سکیں۔"

"تیری بات دل کو لگتی ہے۔" محسن نے کہا۔" ایک تو رابعہ کی اس گاڑی کا رنگ ایسا ہے کہ ہر جگہ پہچانی جاتی ہے۔ رنگ سے زیادہ اس کا حلیہ متوجہ کرتا ہے۔ ہم کوئی ٹیکسی پکڑ لیتے ہیں۔"

میکلوڈ روڈ پر پہنچ کر ہم نے مخالف سمت میں جی پی او کی طرف چلنا شروع کیا۔ ٹیکسی والے سینما کے آخری شو کی سواریاں کو لوٹنے کے لیے بے تحاشا بھاگے چلے جا رہے تھے اور ان میں سے کوئی بھی کرشن نگر کی آخری حدود کے ویران علاقے تک جانے کے لیے آمادہ نظر نہ آتا تھا۔ دلیل ان کی وہی تھی کہ واپسی میں سواری نہیں ملتی اور اس دلیل کی تجویز کا جواب پچاس کا نوٹ تھا جس کی ایک جھلک دکھا کے ہم ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ محسن نے ٹیکسی والے سے صرف اتنا ہی کہا کہ بھائی کسی کی مجبوری سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہیے۔ واپسی میں خالی آنے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا اور اگر تمہیں ٹیکسی چلانے میں کوئی فائدہ نہیں ہو رہا ہے تو دوسرے دھندے بہت ہیں۔ یہ کوئی بُرا ماننے والی بات نہیں تھی مگر ٹیکسی ڈرائیور ضرورت سے زیادہ بدتمیز تھا۔

...نے ایک دم ٹیکسی روک دی۔ "پچاس روپے کا نوٹ دے کر سمجھتے ہو کہ مجھے خرید لیا ہے۔" ...کے بولا۔" گھنٹہ بھر سے تمہاری بکواس سن رہا ہوں۔ چلو نیچے۔"

محسن نے حیرانی سے میری طرف دیکھا۔" چلو غلطی ہو گئی ہاں جی!" میں نے محسن کا پیر دبا کے مسکینی سے کہا۔" غصہ تھوک دو اور ٹیکسی چلاؤ۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے کچھ باتیں اور کہیں کہ وہ کسی کے باپ کا نہیں ہے اور بڑے بڑے پھنے خاں اس کے سامنے کچھ نہیں ...اس کے بعد ٹیکسی لے کر روانہ ہو گیا۔ میں نے قمیص کے ...سے لفافہ نکالا۔ لفافہ کھول کر کاغذات برآمد کیے اور ...الی لفافے کو پھر بند کر کے چھپا لیا۔ کاغذات میں نے محسن ...کے سپرد کیے اور اس نے عقلمندی سے کام لیتے ہوئے اپنی ...پیٹ کے اندر پتلون کی بیلٹ کے نیچے دبا کر رکھ لیے۔

"میں تجھے راستے میں کسی جگہ اتار دوں گا۔" میں نے ...انگریزی میں کہا۔" ہم دونوں کا ایک ساتھ رہنا ٹھیک نہیں ...بالکل ممکن ہو تو جنوی کو ٹیلی فون کر دینا کہ وہ ہماری طرف سے پریشان نہ ہوں۔ ہم صبح کو حاضر ہوں گے۔ اس کے بعد تو کوئی اور ...سواری لے کر آ جانا۔ میں شہلا کے گھر میں تیرا انتظار کروں گا۔"

"اس طرح الگ الگ جانے کا فائدہ؟" محسن نے کہا۔

"فائدہ ہو یا نہ ہو، احتیاط ضروری ہے۔" میں نے کہا۔ "اسی احتیاط کی وجہ سے عبدل کو خالی بریف کیس ملا تھا۔ خدانخواستہ کوئی میرے پیچھے ہوا تو اسے پھر ناکامی ہوگی اور خالی لفافہ ملے گا۔" انگریزی بولتے بولتے میں نے فرانسیسی میں کہا۔" میں اس ٹیکسی ڈرائیور کو اس کی بدتمیزی کی تھوڑی سی سزا بھی دوں گا۔"

ڈرائیور نے سر گھما کے پیچھے دیکھا۔" انگریزی تو میں نے بھی دسویں تک پڑھی ہے مگر یہ کون سی زبان تھی؟"

"یہ فادری زبان تھی۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔" جیسے مادری زبان ہوتی ہے نا..."

"ویسے دیکھنے میں ہم پاکستانی لگتے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "لیکن ہماری ماں انگریز تھی اور باپ فرانسیسی تھا اور وہ دونوں ایسٹ انڈیا کمپنی کے مالک تھے۔ بڑا اچھا بزنس تھا، سب ڈوب گیا۔"

"اور ہم اب یہاں خوار پھر رہے ہیں شتر بے مہار کی طرح۔" میں نے کہا۔" بس گاڑی ایک منٹ کے لیے موڑ پہ روک دو۔ آدھی سواریوں کو اترنا ہے۔" ڈرائیور کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ اس نے گھور کر ہمیں دیکھا اور ٹیکسی روک دی۔ محسن کے اترتے ہی میں نے اسے آگے چلنے کے لیے کہا۔ گھر ابھی ایک فرلانگ دور تھا کہ میں نے ٹیکسی رکوائی اور نیچے اتر آیا۔" بھائی صاحب!" میں نے بڑے شریفانہ لہجے میں کہا۔ "ذرا باہر تشریف لائیے۔ آپ سے کچھ گفت وشنید کرنی ہے۔"

"اس کی کیا ضرورت ہے۔" وہ بولا۔" کرایہ نکالو۔"

میں اطمینان سے ہاتھ باندھے کھڑا رہا۔" بات یہ ہے حضور والا کہ یہ بندہ حقیر فقیر پُرتقصیر کرایہ ادا کرنے کا اس وقت تک کوئی ارادہ نہیں رکھتا جب تک آپ اپنے گستاخانہ رویے پر اظہارِ ندامت نہ فرمائیں۔ اردو سمجھ میں آ رہی ہے نا بھماشاءاللہ میٹرک تو پڑھی ہوگی۔"

"اے کی بکواس اے۔" ڈرائیور مشتعل ہو کے باہر نکلا۔ "کی ٹرٹر لائی ہوئی اے۔"

"یہ خاکسار واضح کرنا چاہتا تھا کہ آغاز میں ہم مجبور تھے، انجام آپ کی مجبوری ہے۔" میں نے شستہ اردو میں کہا۔

"مجبوری دے پُتر۔" ڈرائیور نے ہاتھ گھمایا اور میں نے اس کی کلائی پکڑ کر ایک جھٹکا دیا۔ دوسرے لمحے میں وہ سڑک پہ لیٹا ہوا تھا۔ پلک جھپکتے میں وہ پھر اٹھا اور ڈبے سے خنجر نکال کے مجھ پہ حملہ آور ہوا۔ میں چند قدم کے فاصلے پر اسی طرح

ہاتھ بلند کیے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ بالکل آخری وقت میں میرے دونوں ہاتھ حرکت میں آ گئے۔ ایک ہاتھ کی ضرب سے اس کا خنجر اڑتا ہوا دور چلا گیا۔ دوسرے ہاتھ نے اس کو پھر پہلے والے پوز میں سڑک پر لٹا دیا۔

"اب فرمائیے کہ آپ اس ناچیز کی درخواست پر غور کریں گے؟" میں پھر ہاتھ باندھ کے کھڑا ہو گیا۔ سڑک دور دور تک خالی تھی اور دو منٹ کے ایکشن کا یہ ڈرامہ کسی نے بھی نہیں دیکھا تھا۔ "بہتر ہے کہ اب معافی مانگ لیجیے کیونکہ ابھی تک تو میں نے صرف ایک ہاتھ کی صفائی دکھائی ہے۔" میں نے اچانک ریوالور نکال لیا۔ "ابھی تم نے میرا نشانہ نہیں دیکھا۔"

ڈرائیور بڑی مشکل سے کھڑا ہوا تھا۔ ریوالور دیکھتے ہی اس کی حالت غیر ہو گئی۔ "اچھا میرے باپ!" وہ دونوں ہاتھ جوڑ کے بولا۔ "میں معافی مانگتا ہوں۔ خدا کے لیے میری جان بخش دے۔ میں نے غلطی کی تھی۔"

میں نے بڑے شاہانہ وقار کے ساتھ سر ہلایا۔ ریوالور جیب میں رکھا اور پچاس کا نوٹ اس کو پکڑا دیا۔ "اب آپ تشریف لے جا سکتے ہیں۔ آئندہ کبھی ملاقات کا شوق ہو تو ایس پی ضامن رضوی کے گھر تشریف لے آئیے گا۔ میں وہیں ملوں گا۔ نام یاد رہے گا نا؟ ضامن رضوی۔"

جس بدحواسی کے عالم میں وہ ٹیکسی لے کر فرار ہوا اس پر مجھے بے اختیار ہنسی آ ئی۔ ٹیکسی کے نظر سے اوجھل ہوتے ہی میں گلی میں غائب ہو گیا۔ اندازے سے کئی گلیوں میں مڑتا ہوا میں شہلا کے گھر کی سمت چلا گیا۔ یہاں تک کہ ایک گلی کا اختتام کھیتوں پر ہوا۔ پھر میں کھیت کی منڈیر کے ساتھ ساتھ چلتا رہا اور مکانوں کو غور سے دیکھتا گیا۔ سو قدم چلنے کے بعد میری نظروں نے مکان کو شناخت کر لیا۔ کئی بار دستک دینے پر اندر کے کمرے کا دروازہ کھلا اور روشنی صحن تک پہنچی۔ دروازے کے قریب آ کے شہلا نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا "کون ہے؟"

"میں ہوں شہلا!" میں نے نرمی سے کہا۔ "تمہارا بھائی سکندر۔"

دروازہ کھل گیا اور میرے سامنے شہلا کا حیرت زدہ چہرہ آ گیا۔ نیند کا خمار ابھی اس کی آنکھوں میں باقی تھا۔ "آپ؟ اس وقت کیسے؟" وہ دروازہ بند کرتے ہوئے بولی۔ "خیریت تو ہے نا؟"

"پریشان کیوں ہوتی ہے پگلی!" میں نے ہنس کے کہا۔ "سب خیریت ہے اور وقت کی کیا بات ہے۔ بھئی ہمارا

گھر ہے۔ ہم بھری دوپہر میں آئیں یا آدھی رات۔" ظاہر تھا کہ میری بات یا میرے لہجے نے اسے مطمئن ... ہے۔ اندر جانے کے بعد جب وہ میری فرمائش پر ... لگی تو میں نے لفافہ نکال کے سامنے رکھ دیا۔

"یہ ہے وہ خونی لفافہ جس میں ایک خوفناک ... بند ہے۔" میں نے کہا۔ "بالکل اسی طرح جیسے ... ہوتا ہے۔"

"لیکن اس میں تو نہ حقیقت ہے نہ جن۔" شہلا نے لفافے میں جھانک کر کہا۔

"ابھی کچھ دیر میں محسن حسن خاں شیروانی نمودار ہو ... والے ہیں۔" میں نے کہا۔ "وہ بھی جن ہیں اور حقیقت ... پاس ہے۔" پھر میں نے اسے سنجیدگی سے عبدل کے ... لے کر مارے جانے تک کے واقعات سنا دیے۔ ... دہشت زدہ ہوئی کہ مجھے اس کی طرف سے فکر لاحق ہو ... نے اسے پانی پلایا اور ایک اسٹول پر بٹھا دیا۔ اتنی دیر ... پانی اس نے چائے بنانے کے لیے ابلنے کے لیے رکھا ... آدھا بھی نہیں رہا تھا۔ میں نے اس میں اور پانی ڈالا۔

"سکندر بھائی!" شہلا نے کانپتی ہوئی آواز میں ... "آپ کو عبدل کو ایسی حالت میں چھوڑ کر نہیں آنا چاہیے ...

"پہلی بات تو یہ ہے شہلا کہ ہم مجبور تھے۔" میں نے ... کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر سمجھاتے ہوئے کہا۔ "ہم ... ہسپتال لے جاتے مگر اس نے انکار کر دیا۔ وہ پاگل ... تھا اور اسے اپنے بچنے کی کوئی امید نظر نہیں آتی تھی ... اس کے ہاتھ میں تھا۔ اگر ہم اس کی بات نہ مانتے تو معلوم ... وہ کیا کر گزرتا۔ شاید وہ سر میں گولی مار کے مر جاتا۔ اس کے ... ہمیں بھی نظر آ رہا تھا کہ اسے ہسپتال لے جانے سے ... نہیں ہو گا۔ الٹا ہم مزید مشکلات میں مبتلا ہو جائیں گے ... یہ اخلاقی فرض پورا کرنے کی کوشش ہم نے ضرور کی تھی ... خود بھی پولیس کو طلب کرنا چاہتا تھا۔"

"آپ کے خیال میں پولیس کے آنے تک وہ ... رہے گا؟" شہلا نے کہا۔

"اسے زندہ رہنا چاہیے۔" میں نے کہا۔ "خدا کرے وہ زندہ رہے۔ یہ ہے تو انتہائی خود غرضی اور کمینگی کی بات ... لیکن حقیقت یہی ہے شہلا کہ اس کا بیان ہمیں سارے ... سے بچا سکتا ہے اور مجھ پر میر شرافت علی کے قتل کے ... الزام کو بھی ختم کر سکتا ہے۔ اگر اسے یہ موقع نہ ملا تو ہم ... زیادہ مشکلات کا شکار ہو جائیں گے کیونکہ عبدل اور ...

... شرافت کے سب سے بڑے اور چشم دید گواہ تھے۔ ان ... قتل کا الزام میرے سوا کسی پر نہیں آ سکتا۔ میرے لیے انکار ... بھی ناممکن ہو گا کیونکہ میں تو خود انکل رضوی کو بتا کے آیا ... ہوں کہ کہاں جا رہا ہوں۔ قدرتی طور پر وہ یہی نتیجہ اخذ ... کریں گے کہ میری عبدل اور رشید سے لڑائی ہوئی جس کے ... نتیجے میں وہ دونوں مارے گئے۔ اور عبدل کی ماں اس صدمے کی تاب ... نہ لا کے مر گئی۔ مجھ پر ایک کی جگہ تین افراد کے قتل کا الزام آ ... جائے گا اور میری ضمانت تو فوراً ہی منسوخ ہو جائے گی۔ اس ... لیے یہ بہت ضروری ہے کہ عبدل پولیس کے سامنے اپنا پورا ... بیان دیے بغیر نہ مرے۔"

محسن نے اس وقت دستک دی جب میں چائے تیار کر ... چکا تھا۔ وہ اندر آیا تو اس کی صورت دیکھ کر میرا دل ڈوبنے لگا ... "تو بہت پریشان نظر آ رہا ہے؟" میں نے ڈرتے ڈرتے سوال ... کیا۔ "کہیں وہ پھر...؟"

محسن نے اقرار میں سر ہلایا اور باورچی خانہ کے فرش پر ... بیٹھ کر اپنے سامنے خلا میں گھورنے لگا۔ اس کا چہرہ حزن ملال ... اور ناامیدی کی تصویر بنا ہوا تھا۔ بالآخر وہی ہوا تھا جس ... کا اندیشہ تھا۔ یعنی ہر حفاظتی تدبیر کے باوجود ہماری عقل ... دشمنوں کے حصار کو توڑنے میں ناکام رہی تھی اور ہم پھر ہار گئے ... تھے۔ شاید یہ آخری موقع تھا۔ میں نے افسوس اور بے بسی ... کے ساتھ سوچا اور اب کبھی ہمیں معلوم نہ ہو سکے گا کہ وہ داستان ... کیا تھی جس کا ہر لفظ خون سے لکھا گیا تھا مگر یہ خون ... رائیگاں گیا۔ جب تقدیر ساتھ نہ دے تو تدبیر سے کیا ہو گا؟ ... زیادہ اطمینان کی بات یہ تھی کہ محسن کو کچھ نہیں ہوا تھا اور ... افسوس کے ساتھ مجھے اگر خوشی تھی تو صرف اسی بات کی۔

"چل چھوڑ محسن! جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ اب اس پر رنجیدہ ... ہونے سے کیا حاصل۔" میں نے بہت دیر بعد حوصلہ افزا لہجے ... میں کہنا شروع کیا۔ "اس سے ہمارے عزم و استقلال میں ... فرق نہیں پڑنا چاہیے۔ بشرطِ زندگی ہم اس راز کی حقیقت ... بھی پا لیں گے کیونکہ زندگی کے بارے میں ہمارا نقطۂ نظر ہمیشہ ... مثبت رہا ہے۔ کچھ لوگ روتے ہیں کہ پیمانۂ حیات کتنا خالی ... ہے۔ ہم خدا کا شکر بجا لاتے ہیں کہ پیمانہ سلامت ہے۔"

محسن نے یک لخت قہقہہ مارا۔ "فلسفی کی اولاد۔" اس ... نے ہنستے ہنستے بے حال ہو کے کہا۔ "بند کر اپنی بکواس۔ میرے ... لیے اس سے زیادہ برداشت کرنا مشکل تھا۔"

"تو... مذاق کر رہا تھا؟" میں نے بے وقوفوں کی طرح ... شرمندہ ہو کر کہا۔ "یہ سب اداکاری تھی؟"

محسن کے ساتھ اب شہلا بھی ہنسنے لگی تھی۔ "تم تو کمال کے اداکار ہو۔ فلموں میں جاتے تو ٹاپ کے ہیرو ہوتے۔" شہلا نے اسے چائے کی پیالی تھما دی۔

"کیا عرض کروں مس شہلا!" محسن نے انکساری سے کہا۔ "بس اپنے مقابلے کی کوئی ہیروئن نظر نہیں آتی تھی۔ اگر آپ ہوتیں تو ضرور کوشش کرتا۔"

"یہ سالا تو پیدائشی ایکٹر ہے۔" میں نے چائے کی پیالی لیتے ہوئے نوٹ کیا کہ شہلا کا رنگ گلابی ہو گیا تھا۔ "بلکہ اس کی زندگی مسلسل اداکاری ہے۔ ہیرو یہ تو کیا اس کا باپ بھی نہیں بن سکتا تھا۔ کالج کے زمانے میں اور لندن میں یہ جب بھی اسٹیج پر آتا تھا اس کو مضحکہ خیز کردار ملتے تھے۔"

شہلا کے لیے یہ انکشاف تھا۔ "تم واقعی اسٹیج پر ایکٹنگ کرتے تھے؟"

"ایسی ویسی۔" محسن نے فخر سے کہا۔ "تہلکہ مچا رکھا تھا میں نے۔ قیامت برپا کر رکھی تھی۔"

"یہ بھی بتا دوں کہ تمہیں رول کیا ملتے تھے؟" میں نے جل کر کہا۔ "ایک سے ایک بیہودہ اور مضحکہ خیز۔ ایک مرتبہ یہ ہیروئن کی ماں بنا تھا، ایک مرتبہ اس نے بوڑھے گنجے یہودی کا

پارٹ کیا تھا۔ حد تو یہ ہے کہ ایک بار یہ زنخا بنا تھا اور اسٹیج پر مٹک مٹک کرناچتا رہا تھا۔ اس کو ویسے بھی بھیس بدلنے میں کمال حاصل تھا۔ مجھے یاد ہے ایک مرتبہ ہمیں وقت پر پیسے نہیں پہنچے تھے اور کرسمس کا موقع تھا تو یہ لمبی سی سفید داڑھی اور میک اپ سے سانتا کلاز بن کے ہوسٹل کے رہنے والے ہر انگریز طالب علم کے دروازے پر جا پہنچا تھا اور اس نے نہایت جذباتی انداز میں آواز بنا کے کہا تھا کہ غریب سانتا کلاز غریب بچوں کو تحفہ دینے کی خاطر آپ سے تھوڑی سی قربانی چاہتا ہے اور انگریز قوم اس معاملے میں خاصی جذباتی ہے۔ لڑکوں کو والدین نے کرسمس کے لیے زیادہ جیب خرچ بھیجا تھا اور چھٹیاں بھی ہونے ہی والی تھیں۔ یہ ان سے تین سو پونڈ ٹھگ لایا اور انہیں کبھی شک نہیں ہوا۔"

ہنستے ہنستے سہلا کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے اور جھینپنے کے باوجود خود محسن بھی ہنس رہا تھا۔ "تین سو پونڈ سے کتنا عیش کیا تھا ہم نے اور گوروں کو لوٹ کر خوشی کتنی ہوئی تھی ہمیں۔" محسن نے قمیص میں ہاتھ ڈال کے کاغذات نکالتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے اب ہمیں سنجیدہ ہو جانا چاہیے مسٹر سکندر بجنت! کیوں نہ خواتین کو باورچی خانے سے نکال دیا جائے۔ یہ رازداری کا معاملہ ہے۔"

"خواتین کو باورچی خانے سے نہیں نکالا جا سکتا۔" سہلا نے اعلان کیا۔ "اعتبار نہیں ہے تو حضرات باتھ روم استعمال کر سکتے ہیں مگر یہ خیال رہے کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔"

"بات یہ ہے نیک بی بی کہ اس خط کا مواد سنسر سے پاس شدہ نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر اس میں کہیں پشتو فلموں کی سچویشن یا پنجابی فلموں کے ڈائلاگ آ گئے تو بڑی غلط بات ہوگی مگر خیر... محسن خیال رکھے گا کہ ایسے حصوں کو حذف کر دے اور آپ کو سنانے کے بجائے مجھے پڑھوا دے۔"

محسن نے پڑھنا شروع کیا۔

"عزیزم کبیر خان!

بعد دعائے خیریت اور درازیٔ عمر کے واضح ہو کہ مجھے اب تک تم سے ملاقات نہ ہونے کا بہت رنج ہے۔ مجھے قوی امید تھی کہ لندن میں تم مجھ سے ملنے ضرور آ ؤ گے کیونکہ اس سے پہلے میں ٹیلی فون پر تمہیں بہت سی ایسی باتیں بتا چکا تھا جو تمہیں معلوم نہ تھیں اور تمہارا تشویش میں مبتلا ہو جانا ایک قدرتی امر تھا لیکن تم نہیں پہنچے اور میں بہت مایوس اور رنجیدہ واپس پاکستان لوٹا۔ مایوس اس لیے کہ میں نے

بہت بڑا خطرہ مول لے کر تم سے رابطہ قائم کیا تھا اس لیے کہ وزیر خان کے بیٹے کی حیثیت سے تم سے جو توقعات وابستہ کر لی تھیں تم ان پر پورے نہیں اترے۔ مجھے نہیں معلوم کہ تمہارے نہ آنے کا سبب کیا تھا۔ تم نے مجھے قابلِ اعتبار نہیں سمجھا تھا یا جو کچھ میں نے کہا وہ تمہارے نقطۂ نظر سے اتنا اہم نہیں تھا کہ تمہیں تشویش ہوتا یا تمہاری راہ میں کوئی مجبوری حائل ہو گئی تھی جس نے تمہارا راستہ روک لیا تھا یا مجھ سے بدظن کر دیا تھا۔

وجہ خواہ کچھ بھی ہو میں تمہیں حقائق سے باخبر رکھنے کی اپنی کوشش جاری رکھوں گا۔ حالات کو دیکھتے ہوئے یہ کوشش بھی خودکشی کے مترادف لگتی ہے لیکن میرے ضمیر پر بوجھ بڑھتا جا رہا ہے اور میں خود کو بھی صفِ مجرماں میں شامل سمجھنے لگا ہوں۔ اگر کوئی تمہاری نظروں کے سامنے خنجر نکال کے کسی کے پیٹ میں گھونپ دینے کے لیے آگے بڑھ رہا ہو تو کیا تم اپنی آنکھیں بند کر سکتے ہو؟ اور یہ کہہ کر خاموش رہ سکتے ہو کہ زید نے بکر کو مار دیا تو مجھے کیا، مجھے تو دونوں سے تعلق نہیں اور میرے لیے صرف اپنی سلامتی اہم ہے؟ میں کسی تیسرے شخص پر اعتبار نہیں کر سکتا اور یہ نامہ بر بنا کے نہیں بھیج سکتا۔ مجھے یہ بھی اندیشہ لاحق ہے کہ کچھ لوگوں کو میری ذات پر شک ہو گیا ہے اور وہ میری ہر حرکت کی نگرانی کر رہے ہیں۔ غالباً کسی ذریعے سے یہ معلوم ہو گیا ہے کہ میں نے تم سے رابطہ قائم کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان کو پوری گفتگو کی رپورٹ مل چکی ہو۔ اس صورت میں کہا جا سکتا ہے کہ تمہارے ہوٹل نہ آنے میں خدا کو کوئی بہتری منظور تھی۔

اب جو کچھ میں جانتا ہوں اسے تحریری صورت میں تمہارے ہاتھوں تک پہنچانے کی کوشش کروں گا۔ خط کے تم تک پہنچنے سے پہلے ہی غائب ہو جانے کے امکانات کو نظر انداز نہیں کروں گا۔ ایک زمانے میں مجھے جاسوسی ناول پڑھنے کا جنون تھا اور میں نے انگریزی کے وہ سب ترجمے جمع کر رکھے تھے جو تیرتھ رام فیروزپوری اور اس دور کے دوسرے لوگوں نے کیے تھے۔ ان میں مجھے "سکیس ٹن بلیک" یعنی "رابرٹ بلیک" (؟) — "سکیس رو ہمر" کے ناول بہت پسند تھے۔ خصوصاً وہ جن کا مرکزی کردار ڈاکٹر فومانچو کا تھا۔ فومانچو پر میرے اندازے کے مطابق پندرہ سولہ ناول تھے اور میں فومانچو کے کردار سے اتنا متاثر ہوا تھا کہ ہر جگہ اس کا تذکرہ کرتا تھا کہ وہ جینئس ہے لیکن اس کی منفی ذہانت بھی حیرت انگیز

ہے۔ بہت میں استعمال ہوتی تو وہ شرلاک ہومز ہوتا۔ میں نے بہت کچھ سیکھا مگر خدا کا شکر ہے کہ اسے اس طرح استعمال نہیں کیا۔ اب میں ایک چھوٹا سا تجربہ کرنے کی کوشش کروں گا۔ میں نے نظر نہ آنے والی تحریر کے بہت سے طریقے نوٹ کر رکھے ہیں ان میں سے ایک طریقہ آزما کے میں تمہارے نام ایک خط ارسال کروں گا جو کہی صفحات پر مشتمل ہوگا۔ اگر کسی کو شک ہوا تو وہ خط کو حاصل کرنے کی پوری کوشش کرے گا اور شاید کامیاب بھی ہو جائے گا۔ ایک علیحدہ خط کے ذریعے میں تمہیں بتا دوں گا کہ یہ سادہ صفحات وصول ہونے کے بعد پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں اور اگر خط کو پڑھنا مقصود ہو تو اس کے لیے خاص طریقہ ہے جس سے تحریر نمایاں ہو جائے گی۔ بنیادی بات یہ ہے کہ خط کے مضمون میں سچ صرف دس فیصد ہے۔ میں نے جانتے بوجھتے اس خط کو غلط معلومات سے پُر کرنے کا فیصلہ کیا ہے مگر اس میں ایک چوتھائی حقیقت بھی شامل کر دی ہے تاکہ وہ محض جھوٹ کا پلندہ نہ بنے۔ اگر یہ خط دشمنوں کے ہاتھ پڑ گیا تو تمہیں کوئی نقصان نہیں ہوگا مگر تمہارے دشمن دھوکا کھا جائیں گے۔ یہ ایک چوتھائی واقعات کا سچ غیر ارادی طور پر انہیں ان واقعات کی سچائی کا قائل کر لے گا اور وہ اس کو ضائع کر کے مطمئن ہو جائیں گے۔ اس کے بعد میرا اپنا انجام کیا ہوگا؟ مجھے اس کی فکر تو ہے لیکن میں اس سے خوف زدہ نہیں ہوں۔

میں تمہیں دوسرا خط بھی لکھوں گا جس میں تمام واقعات سو فیصد درست ہوں گے اور یہ خط میں ایک بینک کے لاکر میں رکھوا دوں گا لیکن میرا خیال ہے کہ لاکر بھی ان کی دسترس میں ہے کیونکہ وہ بہت طاقتور لوگ ہیں اور ان کے اثر و رسوخ کا دائرہ بہت وسیع ہے چنانچہ دوسری نقل میں اپنی بیوی کے حوالے کر کے اپنے ہی گھر میں رکھوا دوں گا۔ مجھے امید ہے کہ کسی کو مجھ سے ایسی حماقت کی توقع نہیں ہو سکتی اس لیے یہ نقل محفوظ رہنے کے امکانات زیادہ روشن ہیں اور میں اپنی بیوی سے بھی یہ توقع رکھتا ہوں کہ وہ مرتے دم تک اس امانت کی حفاظت کر سکے گی جو میں تمہارے لیے چھوڑ جاؤں گا۔

برخوردار کبیر خان! تمہارے والد اور میرے درمیان تعلق تو نصف صدی پرانا کہا جا سکتا ہے۔ ہم نے کم و بیش ایک ہی عمر میں ایک ہی مکتب سے حصول علم کا آغاز کیا تھا اور میٹرک کے امتحان تک ہم دن رات کے رفیق تھے۔ بعد

میں غم روزگار نے ہمیں کئی بار جدا کیا اور تقدیر نے کئی بار ملایا۔ دور رہ کر بھی ہمارا تعلق کسی نہ کسی صورت برقرار رہا اور ہم ایک دوسرے کے مونس و ہمدم، ہم مشرب و ہم راز رہے۔ وزیر خان مرحوم کی سب سے بڑی خوبی اس کی وضع داری تھی۔ اس کے اور میرے درمیان معاشی حالات کا فرق پڑ گیا تھا، لیکن وہ کہتا تھا کہ فومانچو! مایا تو آتی جاتی چھاؤں ہے۔ کاغذوں کے نوٹ پرانے ہوتے ہیں تو پھٹ جاتے ہیں۔ دوستی پرانی ہو کے پائیدار ہو جاتی ہے کیونکہ آدمی کاغذ کا نوٹ نہیں ہے... ہم اونچ نیچ کا خیال کیے بغیر ملتے تھے تو پرانے وقتوں کی باتیں بھی کرتے تھے اور آنے والے وقت کی بھی۔ وہ فیکٹری کا مالک تھا اور میں ایک معمولی منشی مگر وہ کہتا تھا کہ دنیا میں میرے لیے دو ہی رشتے تو رہ گئے ہیں۔ ایک خون کا رشتہ جو سکندر سے ہے اور دوسرا دوستی کا رشتہ جو تم سے ہے۔

لیکن کچھ عرصہ ہوا ہماری ملاقاتیں اچانک بند ہو گئیں۔ میں کسی کام سے پندرہ دن کے لیے ملک سے باہر رہا اور واپس آنے کے بعد بھی ایک ہفتے تک وزیر خان سے ملنے نہ جا سکا۔ تین ہفتے بعد میں شام کے وقت میں اس کی ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی پہنچا اور عادت کے مطابق سیدھا اندر چلا گیا۔ سب سے پہلے میری نگاہ ایک خادمہ پر گئی جو چائے کی ٹرے اٹھائے کچن کی طرف سے آ رہی تھی۔ میں نے چلا کے کہا "ارے میاں وزیر باتدبیر! کیا ٹھاٹ ہیں — یہ غلام اور کنیزانِ خوبرو...!" مگر میری بات ختم ہونے سے پہلے ہی خادمہ نے چیخ مار کر ٹرے گرا دی۔ ہنگامے پر میم صاحب ٹائپ دوسری عورت نے ایک دروازہ کھول کے جھانکا اور فوراً بند کر دیا۔ پھر ایک ہٹا کٹا صاحب بہادر باہر آیا اور اس نے غنڈوں کی طرح غرا کے میری گردن پکڑ لی۔ میں نے بڑی مشکل سے گلو خلاصی کرائی اور اسے یہ سمجھایا کہ میں کوٹھی کے مالک کا لنگوٹیا یار ہوں اور وزیر خان کے مہمانوں کا میرے ساتھ ایسا برتاؤ زیب نہیں دیتا۔

"مہمان؟ کون مہمان؟" وہ دھاڑ کر بولا۔ "وزیر خان جب اس گھر کا مالک تھا تب تھا۔ اب مالک میں ہوں اور تم میرے لنگوٹیے یار نہیں ہو۔ اس لیے اپنی لنگوٹی سمیت یہاں سے دفع ہو جاؤ۔"

"آپ کا مطلب ہے... یعنی کوٹھی آپ نے وزیر خان سے خرید لی ہے؟" میں نے بڑی مشکل سے کہا۔

"خریدی نہیں تو کیا اس نے مجھے تحفے میں دی ہے؟"

"اچھا آپ ناراض نہ ہوں۔" میں نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

"مجھے صرف یہ بتا دیں کہ وہ کہاں گیا ہے؟"

"وہ گیا ہے جہنم میں۔" وہ شخص چیخ کر بولا۔ "اب تم جاتے ہو یا تمہیں بھی جہنم رسید کروں؟"

ایسے بدتمیز آدمی سے بات کرنا فضول تھا۔ میں نے اندازہ یہ کیا تھا کہ وزیر خان نے گلبرگ کینٹ اور ڈیفنس ایریا علاقے میں کوٹھی خرید لی ہوگی تو یہ بات کل معلوم ہو جائے گی لیکن میری حیرانی کی کوئی انتہا نہ رہی جب اگلے روز میر شرافت علی نے بھی ان تمام معاملات سے لاعلمی کا اظہار کیا۔ اسے کچھ بھی معلوم نہ تھا۔

"کمال ہے میر صاحب!" میں نے کہا۔ "وہ آپ کے پارٹنر ہیں اور آپ کو یہ بھی معلوم نہیں کہ انہوں نے اتنا بڑا سودا کر لیا ہے۔"

"بھئی منشی جی!" میر شرافت علی نے کہا۔ "یہ سب اس کے ذاتی معاملات ہیں جن سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ وہ اپنی کوٹھی یا کار یا گھر کی کوئی بھی چیز خریدتا ہے یا بدلتا ہے تو مجھ سے مشورہ نہیں کرتا۔ بالکل اسی طرح جیسے میں اس سے نہیں پوچھتا۔"

"مگر میر صاحب! ان کا پتہ تو آپ کے پاس ہونا چاہیئے نا۔"

"ہونا تو چاہیے۔" میر شرافت علی نے اتفاق کیا۔ "لیکن اس نے بتانا مناسب نہیں سمجھا تو میں کیا کروں۔"

"اگر آپ کو ان سے رابطہ قائم کرنے کی ضرورت پیش آجائے تو؟"

"بھئی منشی یہ تو اس کو بھی سوچنا چاہیے۔" میر شرافت علی نے بے زاری سے کہا۔ "پھر یہ کہ اس کا فون ابھی کچھ دیر پہلے بھی آیا تھا لیکن اس نے کچھ نہیں بتایا۔"

میں نے میر شرافت علی کے موڈ کو دیکھتے ہوئے اس موضوع پر زیادہ گفتگو نہیں کی لیکن یہ ضرور کہا کہ اب وزیر خان کا فون آئے تو آپ مجھے بلا لیں یا اس کا پتہ لے لیں۔ دفتر میں کام کرنے والے دوسرے لوگوں کو بھی میری زبانی ہی پتہ چلا کہ وزیر خان نے اپنی رہائش تبدیل کر لی ہے۔ ان میں سے کچھ پرانے کارکن بھی تھے جن کو وزیر خان نے ہمیشہ قابلِ اعتماد دوست سمجھا تھا۔ یہ اطلاع ان کے لیے بھی حیرانی کا سبب بنی۔ اس کے بعد ایک ہفتہ تک میں مسلسل میر شرافت علی سے اور دوسرے لوگوں سے دریافت کرتا رہا لیکن وزیر خان نے ٹیلی فون پر بھی کسی سے بات نہیں کی تھی۔ ایک ہفتے بعد شرافت علی نے کہا کہ فون آیا تھا مگر میں تم کو بلانا بھول گیا۔ آٹھ دس دن اور گزرے تو شرافت علی نے کہا کہ وہ کچھ نہیں پوچھ سکا کیونکہ لائن اچانک کٹ گئی تھی۔ میری تشویش میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا اور میں یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ میر شرافت علی کو میری تشویش

سے خوشی نہیں ہوتی، پریشانی ہوتی ہے۔ یہ بھی عجیب ... ایک بزنس پارٹنر کو دوسرے بزنس پارٹنر سے بے تعلق ہو کے بھی نہیں رہنا چاہیے۔ کچھ عمر کے بعد تو انسان کو اپنے گھر کی دیواروں سے بھی ... میں نے ولایت میں ایک کتے کی گمشدگی پر سارے گھر کو سوگوار اور آنسو بہاتے ہوئے دیکھا تھا جیسے ... ایک فرد تھا۔ اتنے لمبے تعلق کے بعد میر شرافت علی کا جذباتی کاروباری رویہ میری عقل اور سمجھ بوجھ سے ...

پھر اچانک ایک دن وزیر خان آفس آ گیا ... کا وقت تھا چنانچہ اس کو صرف چوکیدار، چپراسی اور ... سیکرٹری نے آتے اور جاتے دیکھا۔ ان میں سے کسی نے ... خان سے اس کا نیا پتہ دریافت نہیں کیا۔ ڈی سلوا ... پوچھنے پر بڑی حیرانی ظاہر کی کہ مسٹر وزیر خان کا ... گیا ہے۔ وزیر خان بہت سے اہم کاغذات پر دستخط ... چلا گیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کو کہاں تلاش کروں۔ اگر وہ سرے سے غائب ہو جاتا تو ... جا کر اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرا سکتا تھا لیکن میر شرافت علی سے اس کی ٹیلی فون پر بات ہوتی تھی ... کے علاوہ آفس کے تین افراد اسے زندہ سلامت دیکھ ... تھے۔ اگلے دو ماہ میں میر شرافت علی کے کہنے کے مطابق اس نے کئی بار ٹیلی فون پر گفتگو کی اور ڈی سلوا کے بیان کے مطابق وہ لنچ کے وقفے میں دو بار آیا اور پہلے کی طرح کاغذات پر دستخط کر کے چلا گیا۔ میں ان کو جھوٹا نہیں ... تھا اور ان کو مجبور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ وزیر خان کو ... یا اس سے کسی اور وقت آنے کی اور مجھ سے ملنے کی درخواست کریں۔ ایک مہینے تک میں نے لنچ کے وقفے میں نکلنا ... دیا لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ بعد میں وزیر خان شام کو ایسے وقت میں آیا جب میں نہیں تھا تو کبھی ... کھلتے ہی آ پہنچا۔ مجھے معلوم ہوتا رہا کہ وہ زیادہ دیر ... اور ضروری کاغذات پر دستخط کر کے چلا جاتا ہے لیکن ... بارے میں کچھ نہیں بتاتا کہ وہ کہاں قیام پذیر ہے۔ اسے رہائش بدلنے کی کیا ضرورت تھی اور یکلخت اس نے ترکِ تعلق کر کے گوشۂ گمنامی میں روپوش ہو جانا کیوں ... کیا ہے؟

وزیر خان کا رویہ میرے لیے پُراسرار ہی نہیں ... بھی تھا۔ وہ کوئی خلوت پسند یا آدم بیزار شخص نہیں ... تعلقات کو زندگی کے سہارے سمجھتا تھا۔ اس نے

... کر دیا؟ آخر کیوں؟ میں نے دفتر میں کچھ لوگوں سے کہا کہ وہ ہوشیار رہیں اور اگلی مرتبہ وزیر خان آئے تو اس سے پوچھنے کی کوشش کریں۔ اگر وہ انکار کرے تو اور پتہ ... اس کا پیچھا کریں اور دیکھیں کہ وہ کہاں جاتا ہے۔ ... چند افراد میرے پروگرام پر عمل درآمد کے لیے تیار تھے لیکن انہیں اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی۔ جب وزیر خان آیا تو انہیں معلوم ہی نہ ہوا اور جب معلوم ہوا تو انہیں اندر جانے کی اجازت ہی نہیں ملی۔ چپراسی نے کہا کہ اندر میٹنگ ہو رہی ہے اور حکم ہے کہ کسی کو مداخلت نہ کرنے دی جائے۔ میٹنگ کے ختم ہونے کا بھی کسی کو پتہ نہ چلا اور وزیر خان نہ جانے کس وقت چلا گیا۔ میرے دل میں ہزار قسم کے وسوسے سر اٹھاتے تھے جن کو میں بے بنیاد قرار دے کر ذہن سے ... کر دیتا تھا کیونکہ بظاہر ایسی کوئی بات نظر نہ آتی تھی جسے پولیس کی بنیاد بنا کے میں کوئی قانونی کارروائی کر سکتا۔ وزیر خان کسی کی قید میں نہیں تھا۔ اپنی مرضی سے آتا جاتا تھا اور اس کے ... کوئی اور نہیں کرتا تھا یا اس سے جبراً نہیں کرائے جاتے تھے۔ اگر مالک اپنے کاروباری معاملات اپنے پارٹنرز کے سپرد کر دیتا ہے اور آفس نہیں آتا یا آتا ہے تو کسی سے نہیں ملتا اور کسی کو اپنا پتہ نہیں بتاتا تو اس میں کوئی بات غیر قانونی نہیں ہے۔ اگر وہ ایک کے بعد ایک کوٹھی یا گاڑی بدلتا ہے تو اس کا ... اور دوستی کے پرانے رشتے توڑ دیتا ہے تو یہ اس کا ذاتی فعل ہے لیکن اس کے باوجود میری چھٹی حس خبردار کرتی تھی کہ وزیر خان کی فطرت نہیں بدلی۔ اس کے حالات میں کوئی ناخوشگوار تبدیلی رونما ہوئی ہے جس نے اسے ساری دنیا سے الگ کر دیا ہے اور اس کو کوئی ایسی مجبوری لاحق ہے جو وہ بیان نہیں کر سکتا ہے لیکن بہت سوچنے کے باوجود میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ وزیر خان کو یہ کیا ہو گیا ہے۔ پھر ایک دن ایسا آیا کہ میں نے اسے میر شرافت علی کے ساتھ آفس سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا اور جذبات سے بے قابو ہو کر چلاتا ہوا اس کی طرف بھاگا مگر مجھے میر شرافت علی نے روک کر سخت ... "منشی! معلوم ہوتا ہے تم سٹھیا گئے ہو اور اب ... ہو جانا چاہیے۔ آخر ڈسپلن بھی کوئی چیز ہے۔ ... طرح چپراسی بھی نام لے کر چیختا چلاتا مالکوں کے پیچھے ... گا اور ایسی بے تکلفی کا مظاہرہ کرے گا تو کام کیسے چلے گا۔ یہ مت بھولو کہ تم ایک معمولی منشی ہو۔" ان الفاظ نے مجھے ... پانی پانی کر دیا تھا اور میرے قدم روک لیے تھے۔ اس کے باوجود میرا خیال تھا کہ وزیر خان مجھ سے بات

کرے گا لیکن اس نے بے رُخی سے میری طرف دیکھے بغیر کہا کہ میر صاحب ٹھیک کہتے ہیں۔ آفس میں حفظِ مراتب کا خیال رکھنا چاہیے۔ پھر وہ آگے بڑھ گیا اور شرافت علی کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر چلا گیا۔ اپنے ساتھیوں سے زیادہ میں اپنی نظر میں رسوا ہو گیا اور اس وقت تو غصے کی حالت میں میرا فیصلہ یہی تھا کہ وزیر خان کی ایسی تیسی۔ اس نے دوست سمجھنا چھوڑ دیا ہے تو مجھے اس کے لیے فکرمند ہونے کی کیا ضرورت ہے لیکن بعد میں غصہ اُتر گیا تو صرف دکھ کا احساس باقی رہ گیا اور میں نے سوچا کہ وزیر خان کا رویہ ایسا کیوں تھا؟ وہ ایسا آدمی تو نہیں تھا۔ اس عمر میں انسانی فطرت کہاں بدلتی ہے۔ مجھے کوئی ایسی وجہ بھی نظر نہیں آتی تھی کہ وزیر خان مجھ سے بدظن ہو گیا ہو۔ اسے کوئی بات بُری لگتی تو وہ مجھ سے ضرور پوچھتا اور مجھے صفائی کا موقع دیے بغیر اتنے پرانے تعلقات کو یکلخت ختم نہ کرتا۔ وہ یقیناً مجبور ہے لیکن میری عقل اس سوال کا جواب دینے سے قاصر تھی کہ یہ مجبوری کیا ہو سکتی تھی؟

اس کے بعد میں نے کئی مرتبہ سنا کہ وہ آفس آیا اور چلا گیا۔ اس نے ضروری کاغذات پر دستخط بھی کیے مگر بات کسی سے نہیں کی۔ میر شرافت علی اور ڈی سلوا مجھے بری طرح جھاڑ چکے تھے کہ اپنے کام سے کام رکھو ورنہ چھٹی کر دو۔ وزیر خان ہمیں یہ نہیں بتانا چاہتا کہ اب وہ کہاں رہتا ہے اور ہم اسے مجبور نہیں کر سکتے۔ تم چاہو تو تھانے جا کے رپورٹ لکھوا دو کہ میرا دوست وزیر خان مجھے اپنے گھر نہیں بلاتا اور مجھ سے ملنے بھی نہیں آتا۔ دیکھو پھر وہ تمہیں پاگل قرار دے کر بند کرتے ہیں یا وزیر خان کو بلاتے ہیں۔ انہوں نے سختی سے تاکید کی تھی کہ آئندہ کبھی میں ان سے یا دفتر کے کسی فرد سے اس موضوع پر کوئی بات نہ کروں ورنہ میرے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ خود بھی وزیر خان کو سب سے دور رکھنا چاہتے ہیں۔ انہیں یقیناً وزیر خان کا پتہ معلوم ہے کیونکہ بارہا وہ اس کو اپنی گاڑی میں ساتھ لے جا چکے تھے مگر وہ اس کا پتہ کسی کو بھی نہیں بتائیں گے۔ آخر وہ کیوں نہیں چاہتے کہ وزیر خان کسی سے ملے؟ میں نے سوچا اس میں ان کے لیے خطرے کی کون سی بات ہے؟ کیا وہ وزیر خان کو غلط مقاصد کے لیے استعمال کر رہے ہیں؟ اور آزاد نظر آنے کے باوجود وزیر خان عملاً ان کی قید میں ہے؟ لیکن وزیر خان کو کیا ہوا ہے؟ وہ ان کے ہاتھوں کھلونا بننے پر کیوں مجبور ہے؟ وہ انکار کیوں نہیں کر سکتا؟ احتجاج کیوں

نہیں کرتا، مدد کے لیے پولیس کے پاس کیوں نہیں جاتا اور لوگوں کو کوئی بات کیوں نہیں بتاتا ہے؟ ان تمام سوالوں کا جواب تھا کہ وزیر خان مجبور تھا۔ میرا ذہن ایک دائرے میں گھوم کر پھر وہیں پہنچ جاتا تھا جہاں وزیر خان کی مجبوری۔ کوئی ناقابلِ فہم، ناقابلِ بیان اور ناقابلِ یقین مجبوری اپنے وجود کو تسلیم کرانے پر مصر تھی مگر اس کی نوعیت کوئی نہیں جانتا تھا۔ میں راتوں کو جاگ کر سوچتا رہتا تھا اور مجھے یقین تھا کہ یہی کیفیت رہی تو میں پاگل ہو جاؤں گا لیکن اسی زمانے میں دو اہم واقعات پیش آئے۔ پہلے تو میر وزیر اینڈ کمپنی کی شاہدرہ کے صنعتی علاقے میں منتقلی تھی جہاں اس کا نام بدل کر ایم۔ ڈبلیو۔ ڈی کمپلیکس کر دیا گیا (یہ مجھے بہت بعد میں پتہ چلا کہ اس کا سبب کاروبار میں تیسرے پارٹنر دلاور کی شمولیت تھی اور یہ میر وزیر دلاور کے ناموں کا مخفف تھا۔) ایک معمولی ملازم کی حیثیت سے میں نے مالکوں کے معاملے میں غیر ضروری تشویش کا مظاہرہ کیا تھا۔ ان کی نظر میں میرا وجود بھی کانٹے کی طرح کھٹکنے لگا تھا اور اگر میں اپنا رویّہ نہ بدلتا تو وہ مجھے کب کا نکال باہر کر چکے ہوتے۔ صرف وزیر خان کے متعلق حقیقت جاننے کے لیے میں نے دل پر جبر کر کے خوشامد اور چاپلوسی سے بھی کام لیا ورنہ میں نکال دیا جاتا تو وزیر خان کے بارے میں کوئی بات کیسے معلوم کرتا؟ میں یہ دیکھ رہا تھا کہ وزیر خان کے دستخط اہم کاغذات پر باقاعدگی سے ثبت ہو رہے ہیں لیکن مدت سے اسے کسی نے آتے جاتے نہیں دیکھا۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ بیمار رہنے لگا ہے اور مسلسل تین ماہ کی غیر حاضری کے بعد وہ نظر آیا تو دیکھنے والوں کو یقین کرنا پڑا کہ وہ بیمار ہے مگر اس سے میرے یہ اندیشے مٹ گئے کہ وہ مر چکا ہے۔

دوسرا اہم واقعہ تقریباً ایک ماہ بعد پیش آیا جب میں نے وزیر خان کو راہ چلتے دیکھ لیا۔ پہلے تو مجھے شک ہوا کہ وہ وزیر خان نہیں، اس کا کوئی ہم صورت ہے مگر قریب پہنچ کے میں سناٹے میں آ گیا۔ چالیس سال سے زیادہ عرصے تک میں نے اسے بہت قریب سے دیکھا تھا اور میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتی تھیں۔ میں تو اس کی چال کو بھی دور سے پہچان سکتا تھا۔ پھر اس کے ماتھے پر دائیں جانب مندمل ہو جانے والے زخم کا نشان تھا جو ۱۹۴۷ء کی یادگار تھا۔ اس کی آنکھوں اور بالوں کا رنگ، یہاں تک کہ اس کے کپڑے بھی وہی تھے جو میرے لیے اجنبی نہیں تھے لیکن یہ کپڑے انتہائی بوسیدہ تھے اور کثرتِ استعمال سے پھٹنے والے تھے۔ وہ انتہائی کمزور اور لاغر ہو چکا تھا اور ایک لاٹھی کے سہارے آہستہ آہستہ فٹ پاتھ پر چلا جا رہا تھا۔ میں پھر شک میں مبتلا ہو گیا۔ وزیر خان ایک فیکٹری کا مالک تھا اور شاندار گاڑی میں گھومتا تھا۔ وہ ایسے حال میں کیسے ہو سکتا ہے۔ میں اسی تذبذب میں اس کے پیچھے پیچھے چلتا گیا۔ میرا مقصد صرف یہ دیکھنا تھا کہ وہ کہاں رہتا ہے۔ ایک بار اس کا ٹھکانہ معلوم ہو جانے کے بعد تفصیلی بات کی جا سکتی تھی اور پوچھا جا سکتا تھا کہ یہ سب چکر کیا ہے۔ اچانک وہ ریلوے اسپتال میں داخل ہو گیا۔ میں نے اسے پرچی لے کر مریضوں کی قطار میں شامل ہوتے دیکھا۔ ڈاکٹر کو دکھانے کے بعد جب وہ دوا لینے کے لیے ایک کھڑکی کے سامنے لگی ہوئی قطار میں شامل ہوا تو میں بھی قطار میں شامل ہو گیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا مگر میں نے اس کی پرچی دیکھ لی۔ اس پر وزیر خان لکھا جاتا تھا۔ پھر دوا دینے والے نے شیشی اور پرچی کے ... منٹ بعد کہا۔ "وزیر خان ... یہ تین گولیاں دن میں اور مکسچر صبح و شام۔ دو دن کی دوا ہے۔" اس نے ساتھ رنگین پانی جیسے مکسچر کی شیشی وزیر خان کو تھما دی۔ گولیاں وزیر خان کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر رکھ دیں۔ قطار سے الگ ہو کر کوشش کر رہا تھا کہ اس منظر پر یقین کروں جو میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں اور ان الفاظ پر یقین کروں جو میرے کانوں نے سنے۔ میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا اور مچل مچل کے فریاد کر رہا تھا کہ یہ سب جھوٹ ہے مگر عقل بضد تھی کہ سچ تو سچ ہی رہتا ہے۔

جب وزیر خان اسی طرح لاٹھی ٹیکتا اور رک رک کر دم لیتا اور کچھوے کی طرح رینگتا ہوا واپس روانہ ہوا تو میں اس کے پیچھے تھا۔ مناسب فاصلے سے میں نے اس کا تعاقب جاری رکھا۔ آدھے میل سے بھی کم فاصلہ آدھے گھنٹے سے زیادہ وقت میں طے کیا اور وہ ایک کوٹھی کے دروازے میں داخل ہو گیا جس کے باہر میر وزیر ہاؤس کی بجائے "سی سی ڈین" کی تختی لگی ہوئی تھی۔ یہ صدمہ میرے لیے پہلے سے بھی زیادہ دلخراش اور جانکاہ تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ سی سی ڈین بن جانے والا کی اصلیت کیا ہے۔ نمک حرام اور بے ضمیر جو داغ دل وزیر خان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچا کے کمپنی کے حساب میں غبن کیا تھا لیکن عدم ثبوت کی بنا پر عدالت نے شک کا فائدہ دے کر چھوڑ دیا تھا۔ وہ کمینہ اپنے آقا کی دولت سے دولت مند بنا اور یہ بات بہت سے پرانے لوگوں کو معلوم تھی۔ آستین کے گھر میں جانا میری سمجھ میں

وزیر خان کا اسی مارِ آستین کے گھر میں جانا میری سمجھ میں نہیں آیا اور میری قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ میں نے چلا کر "وزیر خان!" اور اسے چونک کر پلٹتے ہوئے بھی دیکھا۔ چند لمحوں کے لیے اس کی حالت مجھے دیکھ کر غیر ہو گئی۔ پھر اس نے خود پر قابو پا لیا اور اچانک اس کی آنکھیں میرے لیے اجنبی ہو گئیں۔ اس کی صورت میرے لیے اجنبی ہو گئی، اور وہ خود اجنبی ہو گیا۔

"کس سے ملنا ہے بھائی؟" اس نے جذبات سے عاری اجنبی لہجے میں کہا۔

"تم سے وزیر خان ... تم سے۔" میں نے چیخ کر کہا۔

"لیکن میں تو وزیر خان نہیں ہوں۔" وہ اسی کھوکھلے اجنبی لہجے میں بولا۔

"تم وزیر خان نہیں ہو؟" میں نے اسی طرح چلاتے ہوئے کہا۔ "اگر تم وزیر خان نہیں ہو تو میری آواز پر چونکے کیوں تھے اور اس پرچی پر تمہارا نام وزیر خان کیوں لکھا ہوا ہے جسے تم ابھی ریلوے کے اسپتال سے دوا لے کر آئے ہو؟ تمہیں شرم آنی چاہیے وزیر خان کہ تم مجھے جھٹلا رہے ہو۔ کیا میں اندھا ہوں یا بے وقوف ہوں جو تم مجھے بے وقوف بنانا چاہتے ہو جو پچھلے چالیس سال سے تمہیں اور تمہاری اگلی پچھلی نسلوں کو جانتا ہے۔ آخر یہ کیا چکر چلا رکھا ہے تم نے؟ چھ مہینے سے تمہارے بارے میں سوچ سوچ کے، اور لوگوں سے پوچھ پوچھ کے میں نے اپنا جینا اجیرن کر رکھا ہے اور اب تم ملے ہو تو کہتے ہو کہ میں وزیر خان نہیں ہوں۔ قسم خدا کی وزیر خان میں تمہارے ہر جاننے والے کو یہاں کھینچ لاؤں گا۔ میر شرافت علی کو، ڈی سلوا کو اور تمہارے دفتر کے پرانے لوگوں کو۔ میں اسلام آباد سے برلاس صاحب کو اور ولایت سے کبیر خان کو ...!"

خوف سے اس کا زرد رنگ لاش کی طرح سفید پڑ گیا اور اس کی ویران آنکھوں میں خوف کے گہرے سائے اتر آئے۔

"اچھا اچھا ... میں مانتا ہوں کہ میں وزیر خان ہوں۔" وہ ادھر ادھر دیکھ کے بولا۔ یوں جیسے اس کو ڈر ہو کہ کوئی یہ باتیں نہ سن لے۔ "خدا کے لیے آہستہ بولو۔ میں تمہیں سب بتا دوں گا۔" اس نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور کوٹھی کے پچھلے حصے میں بنے ہوئے سرونٹ کوارٹر کے ایک کمرے میں لے گیا۔

"تم یہاں رہتے ہو وزیر خان؟" میں نے کمرے کی بے سروسامانی اور مفلسی کی منہ بولتی تصویر دیکھ کر کہا۔ "اس سرونٹ کوارٹر کے ایک کمرے میں؟ اور اس شخص کی کوٹھی میں جو کبھی تمہارا ملازم تھا؟ وہ نمک حرام جس نے تمہارے اعتماد کا یہ صلہ دیا تھا کہ تمہارے ہی مال پر ڈاکہ ڈالا تھا۔ جس تھالی میں کھایا تھا اسی میں چھید کیا تھا؟ تم نے اپنی وہ ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی، وہ گاڑی اور تمام سازوسامان بیچ دیا۔ آخر کیوں؟ اور اس کے باوجود آج تمہارے پاس رہنے کو جگہ نہیں۔ تمہاری حالت سے ظاہر ہے کہ تمہارے پاس اچھا کھانے پہننے کو نہیں اور تم بیمار ہونے کے باوجود سرکاری اسپتال سے یہ بے کار دوائیں لا کے استعمال کرنے پر مجبور ہو۔ کیا تم میر وزیر اینڈ کمپنی کے مالک نہیں رہے ...؟" مجھے معلوم نہیں کہ میں کتنی دیر تک بولتا رہا۔ اگر میں نہ بولتا تو رنج و غم اور صدمے کا آتش فشاں اندر ہی اندر میرے وجود کو تہس نہس کر دیتا مگر یہ لاوا صبر و ضبط کے سارے بند توڑ کر بہہ نکلا۔ وزیر خان سب کچھ ایک مجرمانہ خاموشی کے ساتھ سر جھکائے سنتا رہا۔ بالآخر میں خاموش ہو گیا۔

"منشی!" وزیر خان نے بہت دیر بعد پُرسکون اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تیری ہر شکایت بجا ہے۔ ہر الزام درست ہے اور ہر سوال جائز ہے لیکن میں اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کہنا تو چاہتا ہوں مگر نہیں کہہ سکتا۔ میں صرف اپنی مجبوری کا عذر ہی پیش کر سکتا ہوں اور یہ عذر مجھے قبول کرنا ہے کیونکہ یہ بے بنیاد نہیں ہے۔ میں نے جو کچھ کیا، انتہائی مجبوری کے تحت کیا۔ میں پاگل نہیں ہوا تھا اور آج بھی خدا کے فضل سے میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پہلے سے کم نہیں۔ میری قوتِ ارادی میں فرق نہیں آیا اور میری قوتِ فیصلہ برقرار ہے لیکن میں کیا کروں میں مجبور ہوں۔"

میں پھر پھٹ پڑا۔ "تو بکواس کرتا ہے وزیر خان ...! جھوٹ بولتا ہے۔ مجبوری کی رٹ لگا کے تو مجھے ٹالنا چاہتا ہے کیونکہ تیرے پاس مجھے مطمئن کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں۔ مجبوری ہوتی ہے غریب آدمی کی، مجبوری ہوتی ہے لاوارث اور بے بس آدمی کی۔ مجبوری ہوتی ہے اس کی جس کے کندھوں پر کسی خاندان کی ذمے داریوں کا بوجھ ہو اور یہ بوجھ اٹھانے والا اس کے سوا کوئی نہ ہو۔ مجبوری ہوتی ہے اس کی جو اپنا دکھ کسی کو نہ بانٹ سکے اور دکھ کا مداوا کوئی نہ ہو۔ تجھے کس بات کی مجبوری ہے؟ تیری مجبوری کا رونا سن کے کوئی ناواقف متاثر ہو جائے تو ہو جائے، لیکن میرے سامنے مجبوری کی بات مت کر۔"

وزیر خان نے ایک سرد آہ بھر کے سر اٹھایا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ "تو بھی ٹھیک کہتا ہے منشی! کیونکہ

چالیس سال میں تُو نے کبھی مجھے مجبور نہیں دیکھا۔ تو دعویٰ کر سکتا ہے کہ وزیر خان کو جتنے قریب سے تو نے دیکھا ہے کسی نے نہیں دیکھا اور تو مجھے جھوٹا بھی کہہ سکتا ہے۔ میں تجھے جھوٹا نہیں کہوں گا کیونکہ میں تیری نیت کے خلوص پر شک کر ہی نہیں سکتا۔ اگر تیرا دل چاہتا ہے تو میری بات مان، ورنہ جو تیرا جی چاہے کہہ لے۔ میں اس کے سوا اور کچھ نہیں کہہ سکتا منشی! کہ میری مجبوریوں نے مجھے اس مقام تک پہنچا دیا لیکن میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں بتا سکتا۔"

"کیوں وزیر خان! کیوں؟" میں نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام کے کہا۔ "ایسی کون سی مجبوری ہے جس کا ذکر تو میرے سامنے بھی نہیں کر سکتا؟ کیا چالیس سال کی دوستی کے بعد بھی تیرے لیے میری ذات قابلِ اعتماد نہیں؟"

"کیسی باتیں کرتا ہے تو منشی!" وزیر خان نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ "مجھے بتا کہ کبھی میں نے تجھ سے کوئی بات چھپائی ہے؟ وہ سب باتیں جو تجھے معلوم ہیں جو میں نے اپنی بیوی کو نہیں بتائیں، سکندر کو معلوم نہیں اور دنیا میں تیرے سوا ان کا ذکر میں نے کسی سے نہیں کیا۔"

"پھر اب کیا بات ہے؟" میں نے کہا۔ "کیا میں بدل گیا ہوں؟ میرے بارے میں تیرے خیالات بدل گئے ہیں؟"

"ایسی کوئی بات نہیں منشی!" وزیر خان نے ایک انگلی سے آنکھوں میں آ جانے والے قطرۂ اشک کو جھٹک دیا۔ "میں اپنی مجبوری کا راز افشا ہونے سے ڈرتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ میری زندگی میں کسی کو کچھ معلوم ہو۔ اس زندگی کے اب دن ہی کتنے رہ گئے ہیں۔ مگر مجھے سکندر کی فکر ہے منشی! اس کی تو ابھی پوری زندگی پڑی ہے۔ خدا اسے اپنی امان میں رکھے۔ اپنا پورا گھر اس وطن کے لیے قربان کر دینے کے باوجود میں پاگل نہیں ہوا تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور اس کی رضا کے سامنے سر خم کر کے صبر اختیار کیا تھا تاکہ میں سکندر کی پرورش کر سکوں۔ میرے خاندان کے گلشن میں طوفان کی تباہ کاری سے بچ جانے والا ایک ہی نخلِ آرزو تھا جس سے میں نے مستقبل کی سب توقعات وابستہ کر لی تھیں۔ اللہ کا بڑا احسان ہے جس نے مجھے اس کے لیے ہمت، استطاعت اور زندگی کی فرصت دی۔ آج سکندر میری امیدوں کا جیتا جاگتا نقش ہے اور میرے خوابوں کی مجسم تعبیر ہے۔ اگر میں اکیلا ہوتا تو جی کر بھی کیا کرتا۔ بے مقصد جینا بھی کوئی جینا ہوتا ہے لیکن میرا مقصد سکندر تھا۔ اب وہی میری مجبوری ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ میں کامیابی کی اس منزل پر پہنچنے کے بعد سکندر کے مستقبل کی خوشی، کامیابی اور خوشحالی کا دشمن ہو جاؤں؟ ... زندگی کو تحفظ کی ضمانت فراہم کرنے کے لیے ... کر رہا ہوں منشی! جسے میں اپنی مجبوری کہتا ہوں۔"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا وزیر خان!" میں ... تو نے جو کچھ کیا سکندر کے لیے کیا، لیکن اس سے ... فائدہ ہوگا؟ تو نے تو اس سے سب کچھ چھین لیا ... کا حق تھا۔ یہ کیسی مجبوری ہے کہ تو نے اپنا سب کچھ ... اور یہاں اس حال میں پڑا ہوا ہے۔ کیا سکندر کو ... معلوم ہے؟"

وزیر خان نے نفی میں سر ہلایا۔ "اسے معلوم ہو جاتا ... منٹ بھی ولایت میں ٹھہرتا؟ وہ اپنے کیریر کو لات مار ... مگر یہاں آ کے بھی وہ میری کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا ... خطرات میں گھر جاتا۔ میں تو اس حال میں بھی ڈرتا رہتا ہوں ... کہیں اس پر ولایت میں کوئی مصیبت نازل نہ ہو ... دشمنوں کے ہاتھ بہت لمبے ہیں منشی!"

"کون دشمن؟ کیسے خطرات؟ یہ کس کی بات ... تو؟" میں نے پریشان ہو کے کہا۔ "تو نے کسی کا کیا بگاڑا ... جو کوئی تجھ سے دشمنی کرے گا یا سکندر کو نقصان پہنچا ... گا؟ خدا کے لیے صاف بات کر کہ تیری اس حالت کا ذمہ دار ... کون ہے؟ میں اپنی دوستی کی قسم کھا کے کہتا ہوں کہ ... دشمن کوئی بھی ہو، کتنا ہی طاقتور ہو اور اس کے ہاتھ ... ہی لمبے کیوں نہ ہوں، میں اس کو نیست و نابود کرنے کے لیے ... اپنی جان قربان کر دوں گا تو یہ تجھ پر کوئی احسان نہیں ..."

"تو سمجھتا نہیں منشی!" وزیر خان نے کہا۔ "یہ ... بھی کر سکتا تھا، لیکن دشمن کوئی ایک نہیں ہے۔ وہ ... اور ہر طرف شکاری کی طرح گھات میں ہیں۔ میں ان ... سے مقابلے کا تصور بھی نہیں کر سکتا، کیونکہ اس ... کے لیے خطرات بڑھ جاتے ہیں۔ کوئی باپ اپنے بیٹے ... زندگی سنوارنے کے بعد اس کی راہ میں انگارے نہیں ... سکتا۔ تو آج کی ملاقات کو بھول جا۔ یہ سمجھ لے کہ وزیر خان ... چالیس سال تک تیرا دوست رہا تھا، مر چکا ہے ... تو نے جسے دیکھا تھا وہ اس کا کوئی ہم شکل تھا۔ اگر ... سے اس بات کا تذکرہ کیا تو یہ دوستی نہیں دشمنی ہوگی ... ساتھ بھی، سکندر سے بھی اور اپنے آپ سے بھی۔ یہاں ... چلا جا اور دوبارہ کبھی مجھ سے ملنے مت آنا۔ نہ دن ... آ جانے میں اور نہ رات کے اندھیرے میں۔"

"نہیں وزیر خان! انجام کچھ بھی ہو لیکن

میں کوئی وعدہ نہیں کروں گا البتہ یہ وعدہ کر سکتا ہوں کہ ... میرے سوا کسی کو معلوم نہیں ہوگی۔ پینے والا میری یا ... بیوی بچوں کی جان تو لے سکتا ہے مگر یہ ناممکن ہے ... میری زبان سے کچھ اگلوا سکے۔" میں نے کہا۔

وزیر خان مجبور ہو گیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ میر وزیر اینڈ ... اس کی کوئی حیثیت نہیں رہی۔ بے شک کارخانہ ... کا نام اب بھی مالکوں میں ہی شامل ہے مگر کاروبار، انتظامی امور اور عملی طور پر تمام معاملات ... نقصان ... اس کا کوئی تعلق نہیں رہا۔ سارے فیصلے پہلے میر شرافت علی ... تھا، اب ایک نیا پارٹنر چوہدری دلاور بھی پیدا ہو گیا ہے ... یہ ہے کہ وہ شخص جسے میں نے اپنے دستخط سے بطور منیجر ... رکھا تھا یعنی ڈی سلوا بھی مالک بن بیٹھا ہے۔ وہ جہاں کہتے ... دستخط کر دیتا ہوں۔ اس سال تمام اخراجات وضع کرنے ... بعد میرے حصے کا منافع ساڑھے تین لاکھ بنا تھا۔ انہوں ... دستخط کروا کر منافع وصول پایا، اور میں نے دستخط ... لیکن مجھے اس میں سے ایک پیسہ بھی نہیں ملا۔

میں بھونچکا رہ گیا۔" اور یہ ساڑھے تین لاکھ کہاں گئے؟ ... نے وصول کیے؟"

"اسی شخص نے جو میری موجودہ حالت کا ذمے دار ہے۔" ... وزیر خان نے کہا۔ "اس نے یقیناً دوسروں کو بھی حصہ دیا ہوگا لیکن ... ان کی ذات سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں۔ میری تباہی ... کا ذمے دار وہی شخص ہے جسے میں نے سب سے پہلے اپنے ... کاروبار میں شریک کیا تھا۔ میں انکار کر ہی نہیں سکتا تھا۔ ... وہ شخص پاکستان آیا تھا اور مجھ سے ملا تھا تو مجھے ... اندازہ ہو گیا تھا کہ مجھ پر کوئی مصیبت نازل ہونے والی ہے۔ ... اس شخص کی فطرت سے واقف ہوں لیکن سمجھتا تھا کہ میں ... ہندوستان میں چھوڑ آیا ہوں اور یہاں اس کے شر سے بالکل ... محفوظ ہوں لیکن بہت جلد میری غلط فہمی رفع ہو گئی۔ اس ... شخص نے مجھ سے سب کچھ چھین لیا۔ میرا بنا بنایا گھر، جما جمایا کاروبار ... عزت اور آبرو۔ اگر اس کے بس میں ہوتا تو وہ میرے جسم ... کے خون کا آخری قطرہ بھی نچوڑ لیتا لیکن وہ دنیا کی نظر میں مجرم ... نہیں بننا چاہتا تھا۔ اس لیے مجھے زندہ رکھا لیکن کیا یہ زندگی ... ہے؟" وزیر خان اب زار و قطار رو رہا تھا۔ "میرے آفس ... کے میرے پرانے دوست اور خیر خواہ کچھ نہیں جانتے۔ ... سمجھتے ہیں میں بدل گیا ہوں۔ مغرور ہو گیا ہوں یا خبطی ہو ... گیا ہوں۔ میں نے ماڈل ٹاؤن چھوڑ کے گلبرگ میں کوٹھی بنا لی ... ہے لیکن کسی کو اپنا پتہ نہیں بتاتا کیونکہ میں اپنے برابر کے لوگوں

کے علاوہ کسی سے ملنا پسند نہیں کرتا۔ وہ مجھے آتا جاتا دیکھتے ہیں اور حیران ہوتے ہیں کہ اب میں ان سے بات تک کرنے کا روادار نہیں ہوں۔ معلوم نہیں پیٹھ پیچھے لوگ کیسی کیسی باتیں بناتے ہوں گے، لیکن میری کیسی بے بسی ہے کہ میں کسی کو کچھ بھی نہیں بتا سکتا۔ اپنی صفائی تک پیش نہیں کر سکتا۔"

میں بہت دیر تک دم بخود بیٹھا رہا۔ یہاں تک کہ مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ "وزیر خان! کیا تجھ میں شرافت علی کو قتل کر دینے کی ہمت نہیں تھی؟" میں نے برافروختہ ہو کے کہا۔ "اور اگر نہیں تھی تو تو نے مجھ سے کیوں نہیں کہا۔ کیا ملا تجھے اپنا سب کچھ گنوا کے؟ سکندر کا سب کچھ محفوظ ہو گیا؟ تیرے مصائب کا خاتمہ ہو گیا؟ یہ سلسلہ تو جاری رہے گا۔ وہ اسی طرح تیرا خون چوستا رہے گا اور تو یہاں بیٹھ کر رونے کے سوا کچھ نہیں کرے گا۔ دنیا میں ایسا کون سا مسئلہ ہے جو حل نہیں ہو سکتا؟ تیرا جوان بیٹا ہے۔ اس کے بازوؤں میں دم ہے اور اس کو تیری قربانیوں کا بھی احساس ہے جو تو نے اس کے بہترین مستقبل کے لیے دیں۔ وہ تجھے کبھی معاف نہیں کرے گا۔ سکندر تو ولایت میں بیٹھا ہے مگر یہاں میں ہوں . . ."

"تو کچھ نہیں کرے گا منشی!" وزیر خان نے میری بات کاٹ دی۔ "تو وعدہ کر چکا ہے کہ اس گفتگو کا کسی کو پتہ نہیں چلے گا۔ میں نے اسی لیے تجھے یہ بات بتا دی ہے۔ اگر تیری زبان سے ایک لفظ بھی نکلا تو اچھا نہیں ہوگا۔ اس کی سزا صرف مجھے ملتی تو کوئی بات نہیں مگر سزا تجھ کو بھی ملے گی اور سب سے زیادہ نقصان سکندر کو ہوگا۔ میری تمام عمر کی محنت اور قربانی رائیگاں جائے گی۔ شرافت علی کو قتل کرنے سے خطرات کم نہیں ہوں گے بڑھ جائیں گے۔"

"اُف!" میں نے دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔ "میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا وزیر خان! میں پاگل ہو جاؤں گا اور پاگل پن میں کچھ بھی کر گزروں مجھے الزام مت دینا۔ خدا کے لیے مجھے یہ سمجھا دے کہ خطرہ کیا ہے اور کہاں ہے؟ تجھے میر شرافت علی نے پیسے پیسے کا محتاج کر دیا ہے۔ تیرا سب کچھ چھین لیا ہے۔ اب اس سے کیا ڈرنا؟ اس سے زیادہ وہ کیا کر سکتا ہے؟ ذرا اپنی ذلت کو دیکھ۔ تو اپنے معمولی نوکر کا نوکر ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں تو گلبرگ کی کسی عالی شان کوٹھی میں رہتا ہے اور تو اس سرونٹ کوارٹر میں مر رہا ہے۔ تو ایک فیکٹری کا مالک ہے اور تیرا بیٹا ولایت میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ اسے بالکل معلوم نہیں ہے کہ میر شرافت علی نے تجھ پر کتنا ظلم ڈھایا ہے۔ کیوں ڈرتا ہے تو میر شرافت علی سے؟ تو اس کے خلاف کسی سے مدد کیوں نہیں

مانگ سکتا۔ احتجاج اور فریاد کیوں نہیں کر سکتا؟ تو نے اپنا سب کچھ اسے دیا تو کیوں؟ تیری کس کمزوری سے فائدہ اٹھایا اس نے؟" میں غم و غصہ میں کانپ رہا تھا۔ چلا رہا تھا اور خستہ حال میز پر مکے مار رہا تھا۔ "ٹھیک ہے میں نے وعدہ کیا تھا اور میں وعدے پر قائم بھی رہوں گا، لیکن خدا کے لیے مجھے بتا تو سہی کہ میر شرافت علی کس طرح تجھے بلیک میل کر رہا ہے؟ اسے ایسی کون سی بات معلوم ہے تیرے بارے میں؟"

جو کچھ اس کے بعد وزیر خان نے بتایا وہ بہت پرانی باتیں ہیں لیکن مجھے معلوم تھیں، چنانچہ مجھے افسوس ہوا کہ میں یہ بات کیوں بھولا رہا۔ اگر مجھے تقسیم ہند سے پہلے کا یہ واقعہ یاد آجاتا تو شاید اس کلید سے میرے ذہن کے بند دروازے کھل جاتے اور جو واقعات میرے فہم و قیاس میں نہ آتے تھے، آپس کی کڑیاں مل جانے کے بعد خود بخود سمجھ میں آجاتے۔ میں یہ سرگزشت وزیر خان کے الفاظ میں بیان کر دیتا ہوں۔

وزیر خان نے کہا۔ "تجھے یاد ہو گا منشی! کہ تقسیم سے پندرہ سولہ سال پہلے ہندوستان میں سول نافرمانی کی تحریک عروج پر تھی اور یہ آگ پورے ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھی۔ لوگ ہر انگریزی چیز کو چھوڑ رہے تھے، خطابات واپس کر رہے تھے اور انگریزی لباس کو نذرِ آتش کر رہے تھے۔ نفرت کی یہ لہر کبھی کبھی پُرتشدد بھی ہو جاتی تھی۔ چنانچہ مشتعل ہجوم میں گھر جانے والے یا جوشیلے یا سر پھرے نوجوانوں کے ہتھے چڑھ جانے والے انگریز اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے تھے۔ ردِ عمل کے طور پر حاکموں کا عتاب نازل ہوتا تھا تو بے گناہ اور گنہگار سب پکڑے جاتے تھے۔ جیل خانے بھر گئے تھے اور کالے پانی جانے والوں کو بڑی دھوم دھام سے رخصت کیا جاتا تھا۔ میں بڑے اچھے عہدے پر فائز تھا لیکن عوامی جذبات کی رو میں بہہ کر میں نے استعفٰے دے دیا۔ میں مسلم لیگ کا بڑا جوشیلا اور سرگرم کارکن تھا۔ شاید تجھے یاد ہو میرے گھر پہ بم اسی لیے پھینکا گیا تھا کہ میں نے مسلم لیگ کا سبز پرچم اتارنے سے انکار کر دیا تھا حالانکہ مخلص ساتھیوں نے بھی مجھے مصلحت کے تقاضے سمجھانے کی کوشش کی تھی اور بعد میں بلوائیوں نے میرے بھرے گھر کے ایک ایک فرد سے یوں انتقام لیا تھا کہ میں اور سکندر اتفاق سے بچ گئے تھے۔ خیر اب اس بات کا کیا ذکر کرنا کہ یہ میری عاقبت نااندیشی تھی یا وہ میرا عزم تھا جس کی خاطر میں نے ہر قربانی دی۔ لیکن مسلم لیگ سے میری وابستگی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ میں جلسوں کے انتظام میں پیش پیش رہتا تھا۔ استقبالیہ کمیٹی میں اور انتظام کرنے والوں میں آگے آگے رہتا تھا۔ جو کچھ بس انداز کرتا تھا وہ مسلم لیگ کو چندے میں دے دیتا تھا۔ پہلے اپنے حلقے کا سیکرٹری تھا۔ پھر صدر منتخب ہو کر صوبائی مجلسِ عاملہ میں آگیا۔ میری سیاسی سرگرمیوں پر حکومت کی بھی نظر تھی۔ سول نافرمانی کے دور میں اگر میں استعفٰے نہ دیتا تو ان رپورٹوں کی بنیاد پر برطرف کر دیا جاتا جو میرے بارے میں بالا کو ارسال کی گئی تھیں۔ یہی شہرت میرے کام آئی اور ریاست سلطان آباد کے ولی عہد کا سیکرٹری رکھ لیا گیا۔ میری تنخواہ چار گنا تھی۔ مجھے شاہانہ مراعات حاصل تھیں۔ ریاست کا تحفظ حاصل تھا۔ بہت سے والیانِ ریاست مسلم لیگ کے سرپرست تھے اور نواب اسد جنگ بھی ان میں شامل تھے۔ مسلم لیگ کے ایک جلسے میں میرا جوش و خروش اور خیالات سے متاثر ہو کے انہوں نے مجھے شاباش دی تھی اور کہا تھا کہ کبھی ضرورت پڑے تو میں بلا تکلف ان کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں۔ مستعفی ہونے کے بعد فکرِ معاش کا مسئلہ پیدا ہوا تو میں نواب صاحب کے پاس پہنچا اور انہوں نے مجھے رکھ لیا۔ نواب صاحب یہ بھی جانتے تھے کہ میں صرف جذباتی اور جوشیلا آدمی ہی نہیں ہوں، ذہانت اور قابلیت بھی رکھتا ہوں ورنہ برطانوی حکومت مجھے اچھا عہدہ نہ دیتی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد سے انگریز حریت پسند مسلمانوں کو ہمیشہ سر پر لٹکنے والی خطرے کی تلوار سمجھتے تھے اور ہندوؤں کے مقابلے میں ان کی وفاداری ہمیشہ مشکوک سمجھی گئی۔ میرا استعفٰے دینا جد و جہدِ آزادی کی خاطر بہت بڑی قربانی سمجھا گیا اور نواب صاحب نے میری قدر کرتے ہوئے مجھے شہزادہ خورشید عالم کا سیکرٹری اور اتالیق مقرر فرمایا۔

نواب صاحب اور ان کے فرزند پرنس خورشید عالم کی عادت اور فطرت کے اعتبار سے زمین و آسمان کا فرق تھا۔ نواب صاحب شفیق اور بردبار، فراخدل اور شریف النفس، مضبوط کردار کے آدمی تھے۔ ان کی خط و کتابت سرکردہ رہنماؤں سے بھی تھی لیکن عجیب بات یہ تھی کہ ان کا سیکرٹری ہندو تھا جس پر وہ بے حد اعتماد کرتے تھے۔ نجانے کیوں وہ شخص شروع سے اچھا نہیں لگا۔ اس کا نام گیان چند تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ میرا سلطان آباد آنا بھی اس کو ناگوار گزرا اور میری ذات پر نواب صاحب کی عنایات نے بھی اس کو ناخوش کیا تھا۔ میں نے اس کو ایک پیشہ ور حاسد سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا۔ ہماری ذمے داریاں الگ تھیں اور ان کی نوعیت میں فرق تھا اور ایک طرح سے ہمارے راستے الگ ہی تھے چنانچہ ہمارے راستوں کا ایک دوسرے سے

متصل تھا اور ہمارے درمیان براہِ راست تعلق نہ ہونے کے باعث کسی مسئلے پر اختلافِ رائے کا بھی سوال نہ تھا مگر اس کے وجود سے میرے اور گیان چند کے درمیان پہلے ہی دن سے خاموش اور سرد جنگ چھڑ گئی تھی۔ اسے جنگ کہنا مشکل ہے یوں سمجھ لو کہ ہم ایک دوسرے کے دشمن بھی نہیں تھے اور دوست بھی نہیں تھے چنانچہ دونوں ایک دوسرے کے وجود کو برداشت کرتے تھے۔ اس کشیدگی کو کسی نے کبھی محسوس نہیں کیا۔ اس کی بنیاد مذہبی عقائد کے اختلاف پر بھی نہیں تھی اور میں سمجھتا تھا کہ کسی ہندو کا مسلم لیگ کے منشور اور اس کے نظریات سے اتفاق کرنا مشکل ضرور ہے مگر ناممکن نہیں کیونکہ بہت سے مسلمان بھی کٹر کانگریسی تھے۔

نواب صاحب کے برعکس شہزادہ خورشید عالم کی طبیعت بالکل مختلف تھی۔ حلقۂ احباب میں وہ پرنس خرم کہلاتا تھا اور اس حلقہ میں ایسے حضرات و خواتین کی اکثریت تھی جو طبقۂ امرا سے تعلق رکھتے تھے مگر میرے نقطۂ نظر سے ان کی عادت کے طور طریقے معیوب اور غیر شریفانہ تھے۔ ان کا زیادہ تر وقت عیش و عشرت کی ہنگامہ آرائی میں صرف ہوتا تھا۔ اس کی ایک وجہ مصروفیت کا نہ ہونا بھی تھا۔ نوابوں، راجوں اور جاگیرداروں کی اولاد فکرِ معاش سے اور ہر قسم کی ذمے داریوں سے آزاد تھی۔ ان کے پاس خرچ کرنے کو بے حساب پیسہ تھا اور بہت فرصت تھی چنانچہ وہ ایک دوسرے کو پارٹیاں دیتے تھے کبھی سالگرہ کے بہانے کبھی تہوار کی خوشی میں۔ سالِ نو کے آغاز پر یہاں تک کہ کرسمس پر جس میں انگریز صاحب بھی بلائے جاتے تھے اور یہ صاحب لوگ عموماً ریذیڈنٹ بہادر کے دوست اور حاشیہ بردار ہوا کرتے تھے۔ انگریزوں نے اپنی حکمتِ عملی سے ہر ریاست میں اپنا ایک مشیر مقرر کر رکھا تھا جو ریذیڈنٹ کہلاتا تھا۔ والیانِ ریاست اس کے مشورے اور اس کی تائید کے بغیر کوئی اہم فیصلہ کرنے کے مجاز نہ تھے اور وہ ایک طرح سے ریاست کے حاکموں کا حاکم ہوتا تھا۔ یہ صورتِ حال کسی کے لیے بھی قابلِ قبول نہ تھی۔ جہاں حاکم یا ریذیڈنٹ میں سے کوئی ایک یہ سمجھتا تھا کہ ایک نیام میں دو تلواریں کیسے رہ سکتی ہیں وہاں سارے کام رک جاتے تھے۔ والیٔ ریاست اور ریذیڈنٹ کا جھگڑا وائسرائے کی کونسل میں پہنچتا تھا۔ حکومت ریذیڈنٹ کو اختیارات ضرور دیتی تھی لیکن مصالحت کی کوئی صورت نہیں رہتی تو ریذیڈنٹ ہی بدلا جاتا تھا۔ سمجھدار ریذیڈنٹ جانتے تھے کہ والیانِ ریاست کی پوزیشن اب بھی مستحکم ہے اور حکومت انہیں سرکاری ملازم کی طرح نہ تبدیل کر سکتی ہے اور نہ برطرف کر سکتی ہے۔ چنانچہ وہ 'جیو اور جینے دو' کی پالیسی اپنا لیتے تھے۔ اختیارات کو سوچ سمجھ کر استعمال کرتے تھے کہ خرابی پیدا نہ ہو اور عموماً والیانِ ریاست کی برتری کو تسلیم کرتے ہوئے ان کے دوست بنے رہتے تھے۔

سلطان آباد میں میرے وارد ہونے سے پہلے ایک معقولیت پسند انگریز بارہ سال تک ریذیڈنٹ رہا اور نواب صاحب اس کے اخلاق و کردار کی اکثر تعریف کرتے تھے۔ وہ ریٹائر ہو کے انگلستان چلا گیا تو حکومت نے ایک سر پھرے متعصب اور تنگ نظر نوجوان کو ریذیڈنٹ بنا دیا جو نواب صاحب کے مقابلے میں واقعی لونڈا تھا مگر حاکمیت کے نشے میں چور تھا کیونکہ اس کی شاہی خاندان سے بہت دور کی قرابت داری تھی۔ وہ عام ہندوستانی کو ڈیم فول کالا آدمی سمجھتا تھا اور کہتا تھا۔ نواب صاحب نے اپنی فطری بردباری اور عالی ظرفی کے باعث بہت عرصہ برداشت کیا اور بالآخر مجبور ہو کے وائسرائے سے کہا کہ یا تو اس ریذیڈنٹ کو والیانِ ریاست کے ساتھ رہنے کے آداب سکھا دیے جائیں ورنہ ہم اسے چماروں سے جوتے لگوا کر ریاست کی حدود سے باہر پھنکوا دیں گے۔ وائسرائے کے لیے یہ کوئی نیا مسئلہ نہیں تھا اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ سابقہ ریذیڈنٹ نے بارہ سال تک اپنے فرائض بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیے تھے اور اگر وہ ریٹائر نہ ہوتا تو سلطان آباد میں اختلاف کی نوبت ہی نہ آتی۔ وائسرائے نے اوپر ہی اوپر ریذیڈنٹ کو سمجھا دیا کہ شاہی خاندان سے تعلق کو بھول جاؤ کیونکہ جن سے تمہارا تعلق ہے ان کا شجرۂ نسب بھی شاہوں کے خاندان سے ملتا ہے۔ ریذیڈنٹ وقتی طور پر خون کے گھونٹ پی کر خاموش ہو گیا مگر اس نے ذلت کا انتقام لینے کے لیے سیاسی چال چلی۔ 'تقسیم کرو اور حکومت کرو' انگریز کی ہندوستان میں کامیابی کا فارمولا تھا۔ ریذیڈنٹ نے ولی عہد سے دوستی گانٹھی۔ وہ دونوں ہم عمر تھے۔ دعوتوں کے ذریعے میل ملاقات بڑھی۔ وہ دونوں سیر و تفریح اور شکار کے لیے ایک ساتھ جانے لگے اور عیش و نشاط کی ایسی محفلیں سجانے لگے جہاں رازداری کا خصوصی انتظام ہوتا تھا اور کسی غیر کو کانوں کان خبر نہ ہوتی تھی۔ ریذیڈنٹ کے بنگلے پر لکھنؤ اور بمبئی سے ناچنے گانے والیاں بلائی جاتی تھیں۔ رقص و سرود کی محفلوں میں شراب و شباب ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ ریذیڈنٹ کی سرکاری رہائش گاہ کو ریذیڈنسی کہا جاتا تھا۔ یہ طوائفیں خاموشی سے وہیں بلوائی جاتی تھیں اور وہیں سے رخصت ہو جاتی تھیں۔

میری جان بڑے عذاب میں پھنس گئی تھی۔ کہنے کو میں پرنس کا اتالیق بھی تھا مگر اصل صورتِ حال یہ تھی کہ اُلٹا پرنس مجھے زندہ رہنے کے طور طریقے سکھانے کی کوشش کرتا تھا۔ اس کا نظریۂ حیات صرف یہ تھا کہ 'بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست'۔ وہ کہتا تھا کہ میاں وزیر خان! یہ جوانی میں تم نے کیا روگ پالے ہیں۔ یہ آزادی اور مسلم لیگ، سیاسی نظریات۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آزادی نہیں ملنی چاہیے یا مسلم لیگ کا کوئی مقصد نہیں۔ آزادی بالکل ملنی چاہیے اور مسلمانوں کو مسلم لیگ کا ساتھ دینا چاہیے مگر تمہاری کوئی سیاست کی عمر ہے۔ ارے بھائی چالیس سال کے ہو جاؤ تو یہ دھندے بھی کر لینا۔ جوانی کے دھندے کچھ اور ہوتے ہیں... ظاہر ہے میں اتفاق نہیں کر سکتا تھا۔ صرف ایک بار میں نے کہا تھا کہ شہزادہ صاحب! آپ کو امورِ سلطنت اور سیاست سے اتنا بے تعلق نہیں رہنا چاہیے۔ کیونکہ نواب صاحب قبلہ کے بعد ان کی ذمہ داری آپ کو سنبھالنی ہے۔ تو وہ ہنستے ہنستے بولا تھا کہ یار! تم تو بس نام کے وزیر ہو، عقل کے پیدل ہو۔ ذرا سوچو تم کب کی بات کر رہے ہو۔ نواب صاحب ماشاءاللہ جوانوں سے زیادہ صحت مند اور آبا و اجداد کی طرح لمبی عمر پائیں گے تو ابھی اتنا ہی اور جئیں گے۔ معلوم نہیں اس وقت تک ریاست رہتی ہے یا نہیں اور ہم خود رہتے ہیں یا نہیں۔ ہمیں حکومت کرنے کا بالکل شوق نہیں ورنہ باپ کو قتل کر کے تخت پر بیٹھ جانا تو روایت رہی ہے۔ خدا والدِ ماجد کا سایہ تا ابد سلامت رکھے تاکہ اپنی زندگی بھی اسی بے فکری سے عیش کرتے گزر جائے۔

پرنس کی عیاشی اور عیش پرستی کی رپورٹ نواب صاحب کو دینا مجھے بے مقصد لگتا تھا۔ میں سوچتا تھا کہ باپ کو اکلوتے بیٹے کے بارے میں یقیناً پہلے سے سب کچھ معلوم ہوگا اگر وہ چشم پوشی کرتے ہیں تو مجھے کیا ضرورت ہے کہ دونوں طرف سے بدگمانی مول لوں۔ نواب صاحب تو شاید ناگواری سے سب کچھ سُن کے بھی خاموش رہیں مگر پرنس فوراً مجھے برخاست کر دے گا۔ نواب صاحب مجھے اس پر زبردستی مسلط نہیں رکھیں گے بلکہ عین ممکن ہے کہ پرنس اسے انا کا مسئلہ بنا لے تو مجھے اصطبل میں گھوڑے مالش کرنے پر لگا دیا جائے یا ریاست سے نکال باہر کیا جائے ــــ انگریزی نوکری میں چھوڑ چکا تھا اور اب ایک طرح سے حکومت کے مخالفین میں شامل تھا۔ ریاست میں رہ کر مجھے تحفظ بھی حاصل تھا اور ہر آسائش بھی میسّر تھی لیکن اس سے زیادہ اہم بات میرے لیے نواب صاحب کی مسلم لیگ کی حمایت تھی۔ یہاں میں دل کھول کر اور بے خوف و خطر مسلم لیگ کی سرگرمیوں میں حصہ لے سکتا تھا چنانچہ پرنس کے ذاتی معاملات سے خود کو الگ رکھا مگر نتیجہ یہ نکلا کہ پرنس نے مجھے دوست و ہمراز بنا لیا۔ اس کی رہائش محل کے آخری حصے میں تھی، اسی حصے میں میرا قیام بھی تھا۔ محل کی ساخت کچھ ایسی تھی کہ یہ حصہ باقی محل سے تقریباً الگ تھا۔ آدھی رات کو عقبی دروازے سے چادروں میں لپٹی عورتیں اندر آتی تھیں اور صبح کا اجالا پھیلنے سے پہلے اکرام لے کر رخصت ہو جاتی تھیں۔ ان میں ہندو مسلم کی تخصیص نہیں تھی۔ بس وہ دولت کے بدلے آبرو کا سودا کرنے والی لڑکیاں ہوتی تھیں۔ یہ بے راہ روی دیکھنے والا تماشائی میں ہی نہیں تھا، محل کے اسی حصے میں پرنس کی بیوی بھی تھی۔ اللہ میاں کی گائے جسے ایک رسم پوری کر کے محل میں لا کر کھونٹے سے باندھ دیا گیا تھا۔ ایک عورت کی حیثیت سے اس کے دل پر جو گزرتی ہوگی اس کا اندازہ میں کر سکتا تھا لیکن میری طرح وہ بھی مجبور تھی۔ اسے نوابوں اور نواب زادوں کی جوانی کے بارے میں پہلے ہی سمجھا دیا گیا تھا جو کسی کے بس میں نہیں ہوتی۔ ایک مرتبہ پرنس کو دیکھ کر میں نے دبے دبے لہجے میں کہا تھا کہ بیوی کے ہوتے ہوئے یہ سب کس حد تک جائز ہے تو پرنس نے ہنس کر کہا تھا۔ ”اے وزیرِ باتدبیر! کیا تو نے عقل مندوں کا قول نہیں سنا، گھر کی مرغی، دال برابر۔“

اس کے بعد یہ ہونے لگا کہ ہفتہ دس دن میں پرنس اپنی جگہ چھوڑ کے نکل گیا اور رات بھر ریذیڈنسی میں گزار کر صبح کا اجالا پھیلنے سے پہلے لوٹ آیا۔ جہاں بقول اس کے ”ایک سے ایک ولایتی مال ملتا تھا۔“ میں بڑی کوشش کرتا تھا کہ یہ خطرناک ذمہ داری قبول نہ کروں لیکن پرنس کے سامنے میری ایک نہ چلتی تھی۔ ایک طرف مجھے اس کا دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں اچانک کسی رات نواب صاحب ادھر نہ آ نکلیں یا پرنس کو طلب نہ کر لیں تو دوسری طرف یہ پریشانی لاحق رہتی تھی کہ پرنس کی بیوی کو یہ بات معلوم ہوگئی تو وہ میرے خلاف طوفان کھڑا کر دے گی اور شاید مجھے بھی چین سے نہیں بیٹھنے دے گی کیونکہ وہ خود بھی ایک رئیس کی بیٹی تھی اور اس کے بھائی بڑے طرم خان۔ میاں بیوی کے تعلقات روایت کے مطابق کشیدگی کی انتہا کو پہنچ گئے تھے جہاں ازدواجی رشتے کی حقیقت بے معنی ہو کر رہ گئی تھی، صرف خاندانی وقار، معاشرتی مجبوری اور مذہب یا قانون کے تقاضے علیحدگی کی راہ میں حائل

...منت سے ان کے بیڈروم الگ اور اتنے فاصلے پر تھے ...ایک کمرے کی آواز بھی دوسرے کمرے تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ اس کے باوجود بیوی کو شوہر کے کمرے میں آنے سے ...روک سکتا تھا اگر کسی رات وہ دیکھ لیتی کہ میں اس کے شوہر کی جگہ سو رہا ہوں اور شوہر غائب ہے تو یہ بھی ہو سکتا تھا ...مشتعل ہو کے وہ مجھے قتل کر دے یا کرا دے۔ اس محل کی چار دیواری کے اندر اس پر کوئی الزام نہیں آسکتا تھا لیکن مجھ پر یہ الزام آتا تھا کہ اتالیق ہونے کے باوجود میں نے پرنس کو رنگ رلیاں منانے کی اجازت دی۔ اس کے اخلاق و کردار کو سنوارنے کے بجائے بُرائی کے راستوں پر چلنے میں اس کی مدد کی۔ اس طرح نواب صاحب کے اعتماد کو بھی مجروح کیا۔ میرا ضمیر بھی مجھے پریشان کرتا تھا اور میں یہ سوچنے لگا تھا کہ کسی بھی بہانے سلطان آباد سے نکل جاؤں۔ مجھے اس عیش و آسائش کی زندگی سے دست بردار ہونا پڑے گا اور کوئی چھوٹی موٹی نوکری کرنی پڑے گی۔ جھوٹ بول کر نواب صاحب کو مطمئن کرنا ہوگا کہ میں ان کی عنایات کو ٹھکرانے پر کیوں مجبور ہوں اور مسلم لیگ سے جذباتی وابستگی کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑے گا مگر میں اس ذہنی عذاب سے تو بچ جاؤں۔ اس سے پہلے کہ میں اپنے فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کوئی قدم اٹھاتا میں اس دلدل میں اور گہرا اتر گیا۔ ایک روز وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔

میرے احتجاج کے باوجود پرنس ریذیڈنسی جا چکا تھا جہاں ایک آفتِ جاں، غارت گرِ ہوش، کافر ادا، نوخیز و دلربا حسینۂ افرنگ تازہ تازہ ولایت سے وارد ہوئی ہے۔ اس نوخیز بُتِ طناز کے عشقِ خانہ خراب نے قیامت سے پہلے قیامت ڈھا دی ہے۔ پرنس نے یہ بھی فرمایا تھا ...یہ بلبلِ نوبہار کسی اور کے باغ کی زینت ہے لیکن دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔ میں نے پرنس کو ایک شادی شدہ ...سے تعلقات سے آگاہ کر دیا تھا کیونکہ وہ رعایا میں سے کسی کی بیوی نہیں تھی حاکموں کے طبقے میں شامل تھی۔ عشق میں احتیاط بے سود ہے کیونکہ اس کی خوشبو تو مشک کی طرح پھیلتی ہے اور اپنے وجود کی خود خبر دیتی ہے۔ اس پر پرنس نے ایک سرد آہ بھر کے سینے پر ہاتھ رکھا تھا اور نوٹنکی کے مکالموں کی طرح کہا تھا۔ ”حضرتِ ناصح! یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجیے۔ ایک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے۔“

میں سر پکڑے بستر پر بیٹھا اس نئی اُفتاد کے بارے میں سوچ رہا تھا اور ابھی روشنی گل بھی نہ کی تھی کہ دروازہ کھلا اور ایک عورت اندر آگئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسے دیکھتے ہی میں نے سمجھ لیا تھا کہ وہ کون ہو سکتی ہے۔ وہ نوجوان اور صحت مند عورت تھی جس کے حسن و شباب کی دلکشی اور رعنائی کا ذکر کرنے لگوں تو الفاظ کم پڑیں گے۔ اس کے انداز و اطوار میں ایسی شاہانہ تمکنت تھی کہ میں دم بخود اور سحر زدہ بیٹھا رہ گیا۔ محل میں محرم اور نامحرم سے پردے کا اہتمام بہت سخت تھا چنانچہ میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا مگر میں سمجھ گیا کہ وہ پرنس کی بیوی کے سوا کوئی نہیں ہو سکتی۔

”بندی تسلیم بجا لاتی ہے وزیر صاحب!“ اس نے طنز کا نشتر چلاتے ہوئے کہا اور معنی خیز طریقے پر ہنسی۔ ”کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ بہت صدمہ ہوا ہے مجھے یہاں دیکھ کر؟“

”بیگم صاحبہ...!“ میں نے گھبرا کر اٹھتے ہوئے کہا۔ ”آپ اس وقت یہاں؟ آپ کو تو اپنی خواب گاہ میں ہونا چاہیے تھا۔“

”بجا ارشاد!“ وہ اسی طنزیہ لہجے میں بولی۔ ”میں اپنی خواب گاہ ہی میں ہوں۔ آپ کو یہاں نہیں ہونا چاہیے۔ شوہر کی خواب گاہ میں صرف شوہر کو یا اس کی بیوی کو ہونا چاہیے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہاں آپ کیا کر رہے ہیں اور شہزادہ صاحب کہاں ہیں؟“

میں سخت نروس ہو رہا تھا۔ شرمندگی سے میرا سارا وجود پانی بن گیا تھا۔ پرنس کی بیوی کی زبان سے نکلنے والے ہر لفظ کی کاٹ تلوار کی دھار سے زیادہ تیز تھی۔ میں بیک وقت اس کے حُسن و شباب کی کشش سے مغلوب اور مسحور کھڑا تھا اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکا تھا۔

”تشریف رکھیے وزیر صاحب! پسینہ پونچھیے اپنی جبیں سے۔“ وہ بڑی نخوت کے ساتھ مسہری کے ایک کنارے پر اطمینان سے بیٹھ گئی۔ ”میں آپ کو شرمندہ کرنے نہیں آئی ہوں کہ جو کچھ آپ نے کیا وہ ایک اتالیق کا منصب نہیں تھا۔ مجھے اپنے شوہر کی ہر رات کا افسانۂ رنگیں معلوم ہے کہ یہاں کون آتا ہے یا وہ خود کہاں جاتا ہے۔ وہ بیوی ہی کیا جسے شوہر کے پل پل کی خبر نہ ہو خواہ شوہر پل بھر کے لیے بھی اس کی خبر لینے نہ آتا ہو اور جو اس کی رگ رگ سے واقف نہ ہو۔ جو کہنے کو رگِ جاں سے بھی قریب تر ہو مگر اتنی دور ہو جتنا آکاش سے پاتال... لیکن میری بدقسمتی کو میری خوش قسمتی مان لیا گیا ہے۔ ایک مزدور کی بیوی اپنے شوہر کا گریبان پکڑ کے پوچھ سکتی ہے کہ بول اتنی دیر سے گھر کیوں آیا لیکن ایک نواب کی بہو اور علی عہد بہادر کی منکوحہ جو محل

میں رہتی ہے، خادموں اور کنیزوں پر حکم چلاتی ہے" دنیاوی مال و متاع کے خزانوں کی چابیاں رکھتی ہے اور بہت اونچی ناک رکھنے والے خاندان کی عزت کہلاتی ہے' وہ اپنے شوہر سے کوئی سوال نہیں کرسکتی کہ میرے سرتاج! عروسی کے پہلے چند ماہ کے بعد مجھے میرا حق کیوں نہیں ملا ؟"

اب میں اپنی گھبراہٹ پر کسی حد تک قابو پا چکا تھا لیکن میرے لب بند تھے اور میری عقل دنگ تھی۔ مجھے پرنس کی بدنصیبی کا خیال نہیں تھا جو گھر کے کوہ نور کو ٹھکرا کے کوچہ و بازار میں ٹھیکریاں چنتا پھر رہا تھا۔ میں دستِ قدرت کے تراشے ہوئے حسنِ بے مثال کے اس پیکر کو دیکھ رہا تھا جس کے لبوں سے نکلنے والا ہر لفظ ٹکسال میں ڈھل کر نکلنے والے چمکتے دمکتے سکّے کی طرح تھا۔ اس کا اندازِ گفتگو، لہجے کی دلآویزی اور آواز کی نغمگی مجھ پر جادو کر رہی تھی۔ مجھے دیوانہ کر رہی تھی۔

"۔۔۔ میں تو آپ سے ایک صاف سیدھی بات کا جواب مانگنے آئی ہوں۔" اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔ "میں آپ کو منصف بناتی ہوں کہ مذہب اور قانون کی رُو سے کسی کو اس کے جرم کی سزا دینا جائز ہے یا نہیں ؟ کیا خون کا بدلہ خون نہیں ہونا چاہیے ؟"

میں نے آہستہ سے سر ہلایا۔ "یہ تو دنیا میں ہوتا ہی ہے اور ہونا بھی چاہیے۔"

"بجا ارشاد۔" وہ مسکرائی۔ "آپ نے انصاف کیا اور اسی فیصلے کی روشنی میں فریادی کے دوسرے سوال کا جواب بھی دیا جائے کہ کیا بے وفائی کے بدلے بے وفائی غلط ہوگی ؟ بولیے، جواب دیجیے۔"

"دیکھیے! میں کوئی مفتی، قاضی یا جج تو نہیں ہوں۔" میں نے بڑی مشکل سے کہا۔

"ہاں، لیکن آپ نے ایک عام آدمی کی طرح اپنی عقل سے کام لے کر فیصلہ کر دیا ہے۔" وہ پھر مسکرائی۔ "میں کب کہتی ہوں کہ یہ عدالتی فیصلہ ہے یا کوئی فتویٰ ہے۔ اب تم اس فیصلے سے انحراف ہی نہیں کر سکتے۔ تم اس پوزیشن میں ہی نہیں ہو کہ انحراف کرسکو۔" وہ آپ سے اچانک تم پر آگئی تھی اور اس کے لہجے میں بے تکلف شوخی کا انداز نمایاں ہونے لگا تھا۔ "تم اپنے ہونہار شاگرد کو بے وفائی کرنے سے نہیں روک سکے تو کیا مجھے روک سکتے ہو ؟ ہمت ہے تو انکار کر کے دیکھو۔ میری آواز کے بلند ہوتے ہی کتنے جاں نثار دوڑے چلے آئیں گے اور اسی دیر میں نواب صاحب کو بھی خبر ہو جائے گی۔"

اس نے مجھے بلیک میل کیا کیونکہ وہ بلیک میل کرنے کی پوزیشن میں تھی لیکن سب سے بڑی بات یہ تھی کہ میں بلیک میل ہونا چاہتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میں نے اس کو امرت کا پیالہ سمجھ کے اٹھا لیا۔ میں جانتا تھا کہ یہ آگ ہے مگر میں نے انگاروں سے دامن بھر لیا۔ پرنس کو پھر کبھی نہیں ٹوکا اور اس کا رازدار بنا رہا۔ وہ عشق میں مبتلا تھا، وہ دن بدن شدت اختیار کر رہا تھا۔ وہ اکثر راتوں کو گھر سے غائب رہنے لگا لیکن میں نے اس کی عدم موجودگی کے ہر لمحے کو غنیمت شمار کیا اور وصلِ نایاب کی خوشی سمیٹ لی۔ اس کے جاتے ہی پرنس کی اس کی خواب گاہ میں خوشبو، رنگ اور لطافت بن کے اتر آتی تھی اور صبح سے پہلے میں اٹھ کے اس کے لیے دروازے کھول دیتا تھا۔ وہ آتے ہی مجھ سے پوچھا کرتا تھا کہ سب خیریت ہے نا میاں وزیر باتدبیر ؟ اور میں دل ہی دل میں مسکرا کے کہتا تھا کہ شہزادہِ عالی جاہ! آپ کو تو تقدیر یاد رہے۔ پرنس کے معاملات آگے بڑھے تو وہ کبھی محل میں آنے لگی۔ اس کا شوہر کبھی کبھی دو چار دن کے لیے دلّی چلا جاتا تھا اور وہ ہر رات نوکروں کے سو جانے کے بعد پرنس کی خوابگاہ تک ایک فرلانگ کا فاصلہ پیدل طے کر لیتی تھی۔ کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا۔ اس نے کبھی نہیں سوچا کہ اس راہ میں کتنی بدنامی ہے اور کتنے خطرات ہیں اور کسی نے اس کو دیکھ لیا تو کیا ہوگا۔ پرنس اس کو چشم براہ ملتا تھا اور صبح سے پہلے پھر خواب گاہ کے دروازے کھلتے تھے تو حویلی کے راز کسی پر افشا نہیں کرتے تھے۔ پرنس کو مجھ پر پورا اعتماد تھا اور اس کے گمان میں بھی نہ تھا کہ جو اپنا رازداں تھا وہ اپنا رقیب بن گیا ہے۔ جب وہ فرنگن پرنس کی خواب گاہ میں رہتی تھی تو میرے لیے یہ فراغت بڑھ جاتی تھی۔ مجھے پرنس کے اچانک لوٹ آنے کا خوف نہیں رہتا تھا اور میں زیادہ سکون کے ساتھ اپنی خواب گاہ میں رہتا تھا اور میرے لیے خواب گاہ کے دروازے بھی کھل جاتے تھے جس کی دہلیز کو پرنس کے قدموں نے کئی ماہ سے عبور نہیں کیا تھا۔

یہ انکشاف مجھ پر بہت بعد میں ہوا کہ پرنس جس شادی شدہ فرنگن کے عشق میں دیوانہ ہو رہا ہے وہ ریذیڈنٹ کی بیوی ہے۔ یہ بات معلوم ہوئی تو میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ میں جانتا تھا کہ ریذیڈنٹ کتنا کینہ پرور شخص ہے۔ ایک بار پہلے اس کی انا کو ٹھیس

تھی تو اس نے انتقام لینے کے لیے بیٹے کے ہاتھوں باپ کو قتل کرانے کی سازش کی تھی۔ اس نے پرنس سے راہ و رسم اسی لیے بڑھائی تھی کہ اسے نواب صاحب کے خلاف اکسائے۔ جھوٹی اور بے بنیاد باتیں سنا کے بدظن کرنے کی کوشش کرے۔ اپنے بے ضمیر حاشیہ برداروں کی مدد سے افواہوں کا زہر پھیلائے اور پرنس کو حاکم بننے کے جنون میں مبتلا کر دے لیکن اس کی سازش ناکام رہی۔ اپنے والد کے بارے میں پرنس کے خیالات کو بدلنا ناممکن تھا۔ ریذیڈنٹ اسے الٹی پٹی پڑھاتا تھا اور وہ ہنس کے مجھے بتاتا تھا کہ سالا حرم خنزیر کھانے والا سمجھتا ہے کہ میں کاٹھ کا اُلّو ہوں۔ ہمیں ہمارے والد سے بھڑانے کی باتیں کرتا ہے۔ ان انگریزوں نے ایسی ہی شیطانی سازشوں سے پورے ہندوستان پر قبضہ کر لیا۔ سلطان آباد میں یہ چکر نہیں چلے گا۔ ہم تخت و تاج کو لات مار سکتے ہیں تو دوسری لات برطانیہ کے شاہی خاندان سے رشتہ ملانے والے کو بھی مار سکتے ہیں۔۔۔ اور یوں آپ اپنے دام میں صیاد آگیا۔ ریذیڈنٹ نے پرنس کو چکر میں ڈالنا چاہا اور خود چکر میں پڑ گیا۔ میں حیران تھا کہ وہ کیسا شوہر ہے جس کو ابھی تک بیوی کے رویّے کی تبدیلی سے صورتِ حالات کا کوئی اندازہ نہیں ہوا۔ آزادانہ میل جول ان کی سوسائٹی میں بُرا نہیں سمجھا جاتا لیکن پرنس جیسے شخص کا اپنی بیوی سے یہ میل جول اسے حد سے زیادہ نہیں لگتا ؟ کیا وہ اتنا بے وقوف ہے کہ جائز اور ناجائز تعلق کے فرق کو محسوس نہیں کر سکتا ؟ ریذیڈنسی کے نمک خوار کچھ نہیں دیکھتے اور اسے کچھ نہیں بتاتے ؟ اس کے حلقہِ احباب میں سے کسی نے بھی اس کی توجہ پرنس کے اور اس کی بیوی کے بڑھتے ہوئے تعلق کی طرف نہیں دلائی ؟ کیا اس نے کبھی آئینے میں خود کو دیکھ کر موازنہ نہیں کیا کہ پرنس اس کے مقابلے میں کتنا وجیہہ و شکیل اور پرکشش مرد ہے ؟ اور اس کو بیوی کے رویّے کا فرق بھی محسوس نہیں ہوتا ؟

میں کچھ دنوں سے یہ محسوس کر رہا تھا کہ ایک نامعلوم خطرے کا سایہ افق کے آخری کنارے سے اٹھنے والے ساون کے بادل کی طرح پھیلتا جا رہا ہے۔ یہ خطرہ ہر طرف تھا اور ہر لحظہ قریب آ رہا تھا اور اس کا حصار تنگ سے تنگ تر ہونے لگا تھا۔ کئی بار میں نے اس کو اپنے مجرم ذہن کا احساس سمجھ کے جھٹک دینے کی کوشش کی مگر کوئی غیبی قوت یا میری چھٹی حس مجھے مسلسل خبردار کرتی رہی۔ اچانک ایک دن مجھے نواب صاحب نے تخلیے میں طلب فرمایا۔ اِدھر اُدھر کی بہت سی باتوں کے بعد انہوں نے کہا۔ "میاں وزیر خان! ہمیں تمہاری ذہانت اور صلاحیت پر، تمہارے خلوص اور تمہاری وفاداری پر بہت اعتماد ہے۔"

"حضور کی ذرہ نوازی ہے۔" میں نے اندر ہی اندر شرم سے پانی پانی ہو کے کہا۔

"تمہارے خیالات اور نظریات بھی ہمیں پسند ہیں۔" انہوں نے ہاتھ پیچھے باندھ کر ٹہلتے ہوئے بات جاری رکھی۔ "ہم بہت دنوں سے سوچ رہے تھے کہ ایک خاص کام تمہارے سپرد کریں۔ ہمیں یقین ہے کہ اس معاملے میں تم رازداری کو شرطِ اوّل تصور کرو گے کیونکہ یہ ہماری عزت کا بھی سوال ہے۔ ہمیں امید ہے کہ تم یہ کام خوش اسلوبی سے کر لو گے۔ اگر تم چاہو تو گیان چند بھی تمہاری مدد کر سکتا ہے کیونکہ وہ قابلِ اعتماد ہے۔"

"آپ حکم کیجیے۔" میں نے کہا۔ "میں آپ کی توقعات پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔"

"معاملہ ہے ریذیڈنٹ کا۔" نواب صاحب نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "ہم نے گیان چند سے بھی ذکر کیا تھا۔ لیکن دوبارہ غور کرنے پر تم ہمیں اس کام کے لیے زیادہ موزوں شخص نظر آئے۔ آج رات۔۔۔"

نواب صاحب کی بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ گیان چند اندر آگیا اور اس نے اطلاع دی کہ ریذیڈنٹ صاحب بغرضِ ملاقات تشریف لائے ہیں۔ نواب صاحب نے مجھ سے کہا کہ پھر بات کریں گے اور خود مہمان کی پذیرائی کے لیے باہر چلے گئے۔ میں تمام دن سوچتا رہا کہ نواب صاحب کے کام کی نوعیت کیا ہوسکتی ہے اور وہ کون سا معاملہ ہوسکتا ہے جس کا تعلق ریذیڈنٹ سے ہو۔ نواب صاحب کا مزاج برہم ہوتا تو میں سمجھ لیتا کہ بالآخر ان کے کانوں تک بات پہنچ چکی ہے۔ لیکن وہ بالکل پُرسکون تھے۔ میں اس روز اپنے کمرے سے بھی نہیں نکلا کہ کہیں نواب صاحب دوبارہ بات کرنے کے لیے طلب نہ فرمائیں۔ رات کے کھانے کے بعد میں پرنس سے یہی بات کر رہا تھا کہ گیان چند آیا اور اس نے کہا کہ ریذیڈنٹ صاحب نے گاڑی بھیجی ہے اور تمہیں بلایا ہے۔

"تمہیں بلایا ہے یا وزیر خان کو ؟" پرنس نے حیرانی سے کہا۔ "کون لینے آیا ہے ؟"

"میر شرافت علی۔ اُن کا شوفر۔" گیان چند نے کہا۔

"مگر ریذیڈنٹ صاحب کو وزیر خان سے کیا کام ہوسکتا ہے ؟" پرنس نے کچھ پریشان ہو کے کہا۔

"یہ تو میں نہیں جانتا حضور! لیکن نواب صاحب کا کوئی کام ہوسکتا ہے۔" گیان چند نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"کیوں وزیرخان؟" اس نے میری طرف دیکھا اور میں نے تائید میں سر ہلا دیا۔

"اچھا اچھا۔ ہم ابھی یہی بات کر رہے تھے۔" پرنس نے مسکرا کے کہا۔ "ٹھیک ہے وزیرخان! نہ آپا حضور کا کام ٹالا جا سکتا ہے اور نہ ریذیڈنٹ بہادر کا حکم۔ تم جاؤ مگر واپسی میں مجھے ضرور بتانا کہ کیا گپ شپ رہی۔"

میں باہر آیا تو ریذیڈنسی کی سیاہ گاڑی کھڑی ہوئی تھی اور میر شرافت علی ڈرائیور کی جگہ بیٹھا تھا۔ گیان چند نے پیچھے کا دروازہ کھولا اور خود بھی میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس وقت تک میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ گاڑی کی ڈکی میں ہمارے ساتھ ایک لاش بھی سفر کر رہی ہے!

جب گاڑی روانہ ہوئی تو میں نے گیان چند سے پوچھا کہ ریذیڈنٹ صاحب کو مجھ سے کیا کام پڑ گیا ہے۔ میں پرنس کا سیکرٹری ہوں اور میرا ریاست کے انتظامی معاملات سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں ہے! اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور یوں باہر دیکھتا رہا، جیسے میری بات اس نے سنی بھی نہیں ہے۔ دوسری بار میں نے شانہ ہلا کے اسے متوجہ کیا اور اپنا سوال دہرایا تو اس نے بڑی رکھائی سے میرا ہاتھ جھٹک دیا اور کہا کہ مجھے کچھ نہیں معلوم۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے اور جانتے بوجھتے مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش میں مصروف ہے۔ کشیدگی کے اسباب ہمارے درمیان پہلے سے موجود تھے چنانچہ میں نے اسے نظرانداز کرتے ہوئے میر شرافت علی کو مخاطب کیا۔ "شرافت علی! کیا تمہیں بھی کچھ معلوم نہیں؟"

"بھائی وزیرخان!" شرافت علی نے نگاہ سامنے رکھی۔ "ایک شوفر کو کیا معلوم ہو سکتا ہے۔"

"شوفر کو راستے تو معلوم ہوتے ہیں۔" میں نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا۔ "اور جس راستے پر تم جا رہے ہو وہ ریذیڈنسی کا راستہ نہیں ہے۔ آخر تم مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہو؟"

"گھبراتے کیوں ہو؟" گیان چند طنز سے بولا۔ "ہم تمہیں قتل کرنے نہیں جا رہے ہیں۔"

"یہ کیا فضول بکواس ہے۔" میں نے مشتعل ہو کے کہا۔ "کیا مجھ سے جھوٹ بولا گیا تھا کہ مجھے ریذیڈنٹ نے طلب کیا ہے؟"

اس وقت تک گاڑی کی رفتار میں غیر معمولی اضافہ ہو چکا تھا اور ہم آبادی کی حدود سے نکل چکے تھے۔ آگے گھنا جنگل تھا اور پھر ایک برساتی ندی تھی جس پر دو پُل تھے۔ ایک لکڑی کا پرانا پل جسے صرف پیدل چلنے والے استعمال کرتے تھے اور دوسرا نیا بنا ہوا سیمنٹ کا پل جو گاڑیوں کی آمد و رفت کے لیے مخصوص تھا۔ ندی کے پار پھر جنگل شروع ہو جاتا تھا اور پانچ چھ میل تک سڑک اسی جنگل میں سے سیدھی گزرتی تھی۔ مگر دائیں بائیں درخت اور جھاڑیاں صاف کر کے ایسے کچے راستے بنا دیے گئے تھے جن پر سے جیپ گزر سکتی تھی اور یہ پُرپیچ راستے جنگل کے سرے تک پھیلے ہوئے تھے۔ جنگل دراصل ریاست کی شکارگاہ تھا اور یہ راستے شکاری رئیسوں اور صاحب بہادروں کے لیے بطور خاص بنوائے گئے تھے۔ عام آدمی کا ان خطرناک راستوں پر گزر نہیں ہوتا تھا۔

گاڑی جب پُل کو عبور کر گئی تو میں نے چلا کر کہا۔ "کیا ریذیڈنٹ صاحب اس جنگل میں ملیں گے؟ میں تو کوئی شکاری نہیں ہوں۔ ان کے ہم مرتبہ شکاری تو پرنس خورشید ہو سکتے ہیں، ان کا سیکرٹری نہیں ہو سکتا۔ اگر تم لوگ کسی غلط ارادے سے مجھ کو اپنے ساتھ لاتے ہو تو یہ بات ذہن میں رکھو کہ ہر بات پرنس کے سامنے ہوئی تھی اور انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ مجھے کون لوگ لے گئے ہیں۔"

"اگر ریذیڈنٹ صاحب نے اپنی زبان سے کہہ دیا کہ گاڑی میں تم کو صرف ریذیڈنسی لے جایا گیا تھا؟" گیان چند نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ "اور یہ بھی کہ وہ تمہارے ساتھ شطرنج کھیلتے رہے تھے تو تم کیا کرو گے؟ کوئی ماننے گا تمہاری بات کہ ہم تمہیں جنگل میں لے گئے تھے؟"

"مجھے معلوم ہے کہ تمہاری طرح ریذیڈنٹ بھی عیار آدمی ہے۔" میں نے حقارت سے کہا۔ "لیکن مجھ میں اس کو منہ پر جھوٹا کہنے کی ہمت ہے۔ وہ کیا کرے گا؟ کیا مجھے توپ دم کر دے گا؟ پرنس کو معلوم ہے کہ میں کیسا آدمی ہوں۔ اعتبار وہ مجھ پر ہی کریں گے۔"

گاڑی اچانک سیدھے ہاتھ کے ایک کچے راستے پر مڑ گئی رات کے اندھیرے میں دونوں طرف کے گھنے درخت اور جھاڑیاں ایک سیاہ دیوار کی طرح نظر آتے تھے لیکن درمیان کا راستہ ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی سے منور تھا۔ میں نے چیخ کر شرافت علی کو گاڑی روکنے کے لیے کہا لیکن اس نے رفتار میں اضافہ کر دیا۔ جھاڑیاں اور درختوں کی شاخیں جو راستے پر آگے تک نکل آئی تھیں، گاڑی کی بیرونی سطح سے رگڑ کھا رہی تھیں کیونکہ یہ گاڑی جیپ کے مقابلے میں زیادہ چوڑی تھی۔ میں نے جان کی پروا نہ کرتے ہوئے باہر کودنے کا فیصلہ کیا اور دروازہ کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ تب مجھ پر انکشاف ہوا کہ دقتی ضرورت کی خاطر اندر سے دروازہ کھولنے والا ہینڈل نکال لیا گیا ہے۔ میرے غصے کی انتہا نہ رہی۔ ایک گالی دے کر میں نے پیچھے سے شرافت علی کی گردن میں ہاتھ ڈال دیا۔ گاڑی تھوڑا سا لہرائی اور شرافت علی کے بریک لگانے کے باوجود ایک جھاڑی میں گھس کے رک گئی۔

"یہ کیا دیوانگی ہے بھائی وزیرخان؟" شرافت علی نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"دیوانگی کے بچے! میں تجھے اس وقت تک نہیں چھوڑوں گا جب تک تو مجھے یہاں لانے کا مقصد نہیں بتائے گا۔" میں نے اس کی گردن پر اپنی گرفت سخت کر دی۔ "میں تجھے جان سے مار ڈالوں گا۔ آخر تم لوگوں نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے؟"

"میں تمہیں سمجھا دیتا ہوں کہ ہم یہاں کیوں آئے ہیں۔" گیان چند نے کہا۔ "شرافت علی کو چھوڑ دو اور باہر آ جاؤ۔"

میں نے دیکھا کہ وہ ریوالور لیے باہر کھڑا تھا اور اس نے باہر سے میری طرف والا دروازہ بھی کھول دیا تھا چنانچہ اب میں براہ راست اس کے ریوالور کی زد میں تھا۔ میں نے شرافت علی کو چھوڑ دیا اور نیچے اتر آیا۔ گیان چند اس خیال سے چند قدم پیچھے ہٹ گیا کہ کہیں میں اس پر جست نہ لگا دوں۔

"ابھی تم نے کہا تھا کہ تم مجھے یہاں قتل کرنے کے لیے نہیں لائے ہو۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "مجھے معلوم ہے گیان چند کہ میرا وجود تمہاری آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے لیکن مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنے کم ظرف اور کمینے دشمن ہو۔"

"تم اب بھی غلط سمجھ رہے ہو۔" گیان چند بولا۔ "میں بیوقوف نہیں ہوں کہ تمہیں قتل کر کے پھانسی چڑھ جاؤں۔ ہم یہاں ایک مشن پر آئے ہیں۔ میں اکیلا شرافت علی کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا اس لیے میں نے تمہیں بھی ساتھ لے لیا۔ میرے اور شرافت علی کے مقابلے میں تم زیادہ صحت مند ہو اور یہ کام جسمانی مشقت کا ہے۔ ہمیں یہاں ایک لاش کو دفن کرنا ہے۔"

میں ہکا بکا کھڑا ہوا ان دونوں کی صورت دیکھ رہا تھا۔ "لاش کو؟ کس کی لاش کو؟"

"لاش تو لاش ہی ہوتی ہے۔ اس سے تمہیں کیا فرق پڑتا ہے کہ کس کی لاش ہے۔" شرافت علی نے کہا۔ "ہمارا کام تو اس کو دفن کرنا ہے۔"

"فرق کیسے نہیں پڑتا؟" میں نے برہمی سے کہا۔ "لاش میرے باپ کی ہو۔ میرے بھائی، دوست یا نواب صاحب کی ہو تو میں تم کو زندہ دفن کر دوں گا۔ اور میری جگہ تم ہوتے شرافت علی تو تم بھی یہی کہتے اور یہی کرتے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں میاں وزیرخان!" شرافت علی نے ہنس کر کہا۔ "تم بلاوجہ اتنے سیریس ہو رہے ہو۔ بات یہ ہے کہ اپنے ریذیڈنٹ صاحب سے کچھ نشے میں ایک قتل ہو گیا ہے، ہم میں سے کسی کا بھی مقتول کے ساتھ دور کا بھی رشتہ نہیں۔ چنانچہ ہمیں تو صرف ان کی عزت بچانے کی فکر کرنی چاہیے جن کا ہم نمک کھاتے ہیں۔ اس معاملے میں ہر شخص پر تو اعتماد نہیں کیا جا سکتا تھا چنانچہ ریذیڈنٹ صاحب نے یہ کام میرے سپرد کر دیا اور میرے لیے گیان چند کے بعد تم ہی بھروسے کے آدمی ہو کیونکہ تم پرنس کے سیکرٹری ہو اور جانتے ہو کہ ریذیڈنٹ صاحب سے ان کی کتنی پکی دوستی ہے۔ یہ زیادہ سے زیادہ تین گھنٹے کا کام ہے۔ ہم تینوں مل کر ایک قبر کھودیں گے جس کے لیے ہم سامان اپنے ساتھ لے کر آئے ہیں۔ یہ سب کام ایک آدمی رات بھر میں نہیں کر سکتا کیونکہ ہم میں سے کوئی بھی پیشہ ور گورکن نہیں ہے۔" اس نے پھر قہقہہ لگایا۔

مجھے اس ماحول میں یہ ہنسی بڑی بھیانک اور دہشت زدہ کرنے والی محسوس ہوئی۔ لیکن شرافت علی پر کوئی اثر نہ تھا۔ "پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ لاش کس کی ہے؟" میں نے بہت دیر بعد کہا۔ "عورت کی ہے یا مرد کی؟ غصہ اور نشہ کرنا تو تمہارے صاحب کی فطرت میں شامل ہے۔ اس بدبخت کا نام کیا تھا؟"

"یہ سب باتیں جان کے کیا کرو گے بھائی وزیرخان؟" شرافت علی نے دوستانہ لہجے میں کہا۔

"یہ جانے بغیر میں تمہارے ساتھ کسی قسم کا تعاون نہیں کروں گا۔" میں نے اپنی ضد پر اڑتے ہوئے کہا۔

"ایسی کوئی غیر معمولی بات تو نہیں ہے۔" شرافت علی نے کچھ سوچ کے کہا۔ "دنیا میں ایسا ہر روز ہوتا ہے اور ہر جگہ ہوتا ہے۔ ہمارے صاحب بہادر کچھ شوقین مزاج واقع ہوئے ہیں۔ شوقینی ایسے ہی صاحبوں اور رئیسوں کی شان ہے۔ میرے جیسے دال کھانے والے شوقین بننے کی کوشش کریں تو رسوا ہوتے ہیں۔ ایک بدبخت عورت نے صاحب کی مہربانیوں سے پورا فائدہ اٹھایا اور بعد میں ان کی عزت سے کھیلنا چاہا۔ صاحب کے لیے اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ اس کا قصہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیں۔ نہ رہے گا بانس، نہ بجے گی بانسری۔ حاکم لوگ ہیں جن کی عزت رعایا کے مقابلے میں کہیں زیادہ اہم ہوتی ہے۔ انہوں نے اس داغِ رسوائی کو پھیلنے سے پہلے ہی مٹا دیا اور باقی کام ہم جیسے قابلِ اعتماد نمک خواروں کے سپرد کر دیا۔"

ریذیڈنٹ نے کسی عورت کو قتل کر دیا تھا۔ قانون کی نظر میں یہ جرم تھا اور قانونی کتابوں میں یہ بھی لکھا ہوا تھا کہ معاملاتِ انصاف میں حاکم و محکوم اور گورے یا کالے کے درمیان کوئی تفریق نہیں مگر یہ کتابی باتیں عملی زندگی کا حصہ نہیں تھیں، خصوصاً اس ریاست کی حدود میں جہاں حاکم اور

محکوم کے درمیان زمین اور آسمان کی دوری تھی۔ حاکموں کا فرمایا ہوا مستند تھا اور قانون کا درجہ رکھتا تھا۔ محکوم کے لیے کوئی قانون نہیں تھا اور اس کی کوئی آواز نہیں تھی۔ میں جانتا تھا کہ رنگینیٔ طبع اور کاروبارِ شوق میں پرنس اور ریذیڈنٹ ایک دوسرے کے رفیق و راز داں ہیں۔ چنانچہ میرے لیے انکار کی کوئی گنجائش نہیں۔ پرنس کو یہ بات یقیناً ناگوار گزرے گی کہ میں نے اس کے ہم مشرب و ہم پیالہ ریذیڈنٹ کی خواہش کا احترام کیوں نہیں کیا۔ اور جس عورت نے ریذیڈنٹ کی عزت سے کھیلنے کی کوشش کی تھی، اس کے قتل پر خاموشی سے پردہ ڈالنے والوں کے ساتھ تعاون کیوں نہیں کیا۔ اس راز سے آشنائی کے بعد خود میری ذات کا تحفظ بھی اخفائے راز سے وابستہ تھا۔ بصورتِ دیگر افشائے راز کے امکانات کو ختم کرنے کے لیے میرا خاتمہ ناگزیر ہو جاتا۔

ہم تینوں نے اپنے کپڑے اتارے اور صرف انڈر ویئر پہنے قبر کھودنے میں مصروف ہو گئے۔ رات اندھیری تھی اور آسمان پر گہرے سیاہ بادل برسنے کو تیار کھڑے تھے۔ شرافت علی نے کام کا آغاز کیا لیکن دس منٹ بعد ہی اس کی ہمت جواب دے گئی۔ اس کا بدن پسینے میں تر ہو گیا اور سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگی۔ اس کے الگ ہوتے ہی گیان چند نے بیلچہ سنبھالا اور پندرہ منٹ کام کر کے الگ ہو گیا۔ قبر ابھی آدھا فٹ گہری بھی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے سر جھکا کے زمین کھودنی شروع ہی کی تھی کہ ایک کوندا سا لپکا اور میں نے سر اٹھا کے دیکھا تو شرافت علی اور گیان چند ساتھ ساتھ بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے۔ شرافت علی نے کہا کہ بجلی چمک رہی ہے جلدی کرو۔ نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگا کہ وہ بجلی کی چمک نہیں تھی۔ اس کے بعد گرج کی آواز بھی سنائی نہیں دی۔ میں پھر اپنے کام میں لگ گیا اور آدھے گھنٹے تک ادھر ادھر دیکھے بغیر مٹی کھودتا رہا۔ اس دوران میں بجلی دو مرتبہ چمکی اور ہر بار مجھے پہلے کی طرح یوں لگا جیسے خیرہ کن روشنی آسمان سے نہیں اتری ہے لیکن کچھ دیر بعد وقفے وقفے سے بجلی نے بادلوں میں رونمائی شروع کی اور گرج کی آواز بھی میرے کانوں تک پہنچی تو میرے ابتدائی شکوک خود بخود مٹ گئے۔ دو گھنٹے کی مسلسل اور مشترکہ کوشش کے بعد ہم چھ فٹ لمبی اور تین فٹ گہری قبر کھود کے فارغ ہوئے تو شرافت علی نے ڈکی کھولی اور مجھ سے لاش اٹھانے کو کہا۔ گیان چند ابھی ابھی کھدائی سے فارغ ہو کے بیٹھا تھا اور آرام کر رہا تھا۔ شرافت علی دُبلا پتلا کمزور آدمی تھا چنانچہ میں نے عورت کی لاش کو ڈکی میں سے کھینچ کر نکالا۔

اور دونوں ہاتھوں میں اس طرح اٹھا لیا کہ میرا ایک ہاتھ عورت کی کمر پر شانوں سے ذرا نیچے رہا تو دوسرا گھٹنوں کے خم کے نیچے۔ عورت کی ڈھلکی ہوئی گردن پیچھے جھولتی رہی اور اس کے بال تیز ہوا میں اڑتے رہے۔ نہ جانے کیوں مجھے اس کے مُردہ جسم سے اٹھنے والی خوشبو جانی پہچانی لگی۔ میں اس بدبخت اور بدکردار عورت کا چہرہ دیکھنے سے عمداً گریز کر رہا تھا کہ پھر اس کی صورت کا تصور مجھے بعد میں پریشان نہ کرے۔ اندھیرا اتنا گہرا تھا کہ ویسے بھی چہرے کے نقوش دکھائی نہ دیتے تھے۔ میں لاش کو قبر میں سیدھا لٹا رہا تھا کہ بجلی بالکل میرے سر پر چمکی۔ میں فوراً سیدھا کھڑا ہو گیا اور میں نے قبر کے باہر مٹی کے ڈھیر پر شرافت علی کو بیٹھے دیکھا۔ اسی وقت فلیش کی خیرہ کن روشنی میرے منہ پر پڑی اور میں ساری بات سمجھ گیا۔ میرے شکوک بے بنیاد نہیں تھے۔ پہلے بھی تین بار کیمرے کی فلیش لائٹ ہی تھی جس کی چکاچوند کو شرافت علی نے آسمانی بجلی کی چمک قرار دیا تھا حالانکہ بادلوں میں چمک اور گرج کا سلسلہ بہت دیر بعد شروع ہوا تھا۔

میں نے شرافت علی کو ایک غلیظ گالی دی اور قبر سے باہر نکلنا چاہا۔ میں اتنا مشتعل تھا کہ شرافت علی میرے ہاتھ آ جاتا تو میں اس کو بھی کیمرے سمیت وہیں گاڑ دیتا۔ شرافت علی نے پیچھے ہٹتے ہٹتے ایک اور تصویر اتار لی اور میں ابھی باہر آیا بھی نہ تھا کہ گیان چند نے میرے سر پر ربر کی بنی ہوئی سخت گیند جیسی کوئی چیز گھما کے ماری۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ میرا بھیجا تک ہل گیا اور میں ایک سیکنڈ میں بے ہوش ہو کر واپس قبر کے اندر لاش کے اوپر جا پڑا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں اس جنگل کے بجائے ریذیڈنسی کی وسیع عمارت کے ایک کمرے میں صاف ستھرے بستر پر اپنے صاف ستھرے کپڑے پہنے لیٹا ہوا تھا۔ میرے ہاتھوں، پیروں پر یا منہ پر یا سر میں مٹی کا ایک ذرّہ تک نہ تھا۔ یہاں تک کہ میرے جوتے بھی پالش سے چمک رہے تھے۔ میرے سر پر چوٹ کا کوئی نشان نہیں تھا لیکن سر کے اندر درد کا ایک سمندر موجزن تھا۔ مجھ پر نقاہت طاری تھی اور آنکھیں کھول کر دیکھنے سے مجھے اپنے اطراف کمرے کی دیواریں گردش کرتی محسوس ہوتی تھیں۔ پھر بھی میں نے دیکھ لیا کہ شرافت علی میرے قریب گرم دودھ کا گلاس لیے کھڑا ہے اور گیان چند بند دروازے کے قریب ریوالور لیے بیٹھا ہے۔ تھوڑا سا دودھ حلق سے اتارنے کے بعد مجھے اپنی حالت میں افاقہ محسوس ہوا۔ ہوش و حواس کے ساتھ میری جسمانی توانائی بحال ہونے لگی اور میں اس قابل ہو

گیا کہ بیٹھ کر بات کر سکوں۔ "شرافت علی!" میں نے اپنا سر تھام کے کہا۔ "تم نے مجھے کیوں دھوکا دیا تھا؟"

"اس کے بغیر تم وہ سب کچھ کرنے پر تیار نہ ہوتے۔" شرافت علی نے خباثت سے ہنس کر کہا۔ وہ اب مجھ سے کچھ فاصلے پر کرسی پر جا بیٹھا تھا۔ "اور ہمیں یہ کام تم سے ہی لینا تھا۔"

"آخر وہ عورت کون تھی جس کو دفن کرنے کے لیے صرف میری خدمات حاصل کرنا ضروری ہو گیا تھا؟" میں نے پوچھا۔ "یہی کام سو پچاس روپے میں کوئی مزدور بھی کر سکتا تھا۔"

"اس کی وجہ تمہیں بہت جلد معلوم ہو جائے گی وزیر خان!" گیان چند نے دور سے کہا۔

"وہ تصویریں تم نے مجھے بلیک میل کرنے کے لیے اتاری ہیں؟" میں نے کہا۔ "لیکن یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ میں پرنس کا سیکرٹری یا اتالیق ہی نہیں، قابلِ اعتماد دوست بھی ہوں۔ تم میرے خلاف جو ثبوت چاہو لے آؤ۔ پرنس صرف میری بات پر اعتبار کرے گا۔"

"قبل از وقت دعویٰ کرنا بے وقوفی کی دلیل ہے وزیر خان!" شرافت علی نے کہا۔ "تمہارے حق میں یہی بہتر ہے کہ ابھی کسی کے سامنے کوئی بات نہ کرو۔ تم کچھ بھی ثابت نہیں کر سکو گے۔"

"مجھے کسی ثبوت یا گواہ کی ضرورت نہیں۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "میرا گواہ پرنس ہے۔"

"پرنس؟" شرافت علی نے قہقہہ مارا۔ "پرنس اور ریذیڈنٹ تو آج ہی صبح اکٹھے آگرے گئے ہیں اور شاید دو دن بعد واپس آئیں گے۔ بے شک پرنس کو معلوم ہے کہ تم کو ریذیڈنٹ نے بلوایا تھا اور شرافت علی کو گاڑی دے کر بھیجا تھا۔ یہ بات تو ریذیڈنٹ صاحب نے بھی اب تک پرنس کے سامنے تسلیم کر لی ہو گی کہ تم گزشتہ شب دس منٹ کے لیے آئے تھے۔ انہوں نے بتایا ہو گا کہ تمہیں ایک خط ذاتی طور پر پرنس کو پہنچانے کے لیے طلب کیا گیا تھا مگر بعد میں ریذیڈنٹ صاحب نے اپنا ارادہ بدل دیا اور اس کے بعد خود پرنس سے بات کر لی۔ ان دونوں کا آگرہ میں کوئی خاص پروگرام تھا۔ تم جانتے ہو کہ ان دونوں کے خاص پروگرام کیا ہوتے ہیں۔" شرافت علی مجھے آنکھ مار کے بے شرمی سے ہنسا۔ "نواب صاحب کو تو بیٹے کی مصروفیات کی کوئی خبر نہیں اور انہیں بے خبر رکھنے کے ذمے دار تم بھی ہو۔ اس لیے نواب صاحب کے سامنے تم لب نہیں کھول سکتے۔ گزشتہ رات کے واقعات کا ذکر کرو گے تو اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارو گے۔ سوائے شرمندگی کے حاصل کچھ نہ ہو گا۔ گیان چند صبح ہونے سے پہلے ہی واپس پہنچ گیا تھا۔ نواب صاحب نے اس کو معمول کے مطابق محل میں

موجود پایا تھا لیکن تم غائب تھے۔ عین ممکن ہے پرنس کو واپس آنے کے بعد یہ بات یاد آ جائے اور وہ تم سے پوچھے کہ رات بھر بارش میں تم کہاں رہے تھے؟ ریذیڈنٹ صاحب نے تو دس منٹ بعد ہی تمہیں واپس بھجوا دیا تھا اور میں بتاؤں گا کہ تمہیں محل کے دروازے پر چھوڑ گیا تھا تو تمہارے لیے اپنی صفائی میں کچھ کہنا زیادہ مشکل ہو جائے گا۔"

"تم بکواس کرتے ہو۔۔۔ بھونکتے ہو کتے۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "میں تمہاری اس ناپاک سازش کو کبھی کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔ پرنس کی واپسی سے پہلے ہی میں نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر سارے واقعات من و عن بیان کر دوں گا اور ان کو سیدھا اس مقام تک لے جاؤں گا جہاں وہ قبر ہے۔ قتل کیا ہے تو ریذیڈنٹ نے، پرنس نے یا میں نے نہیں اور نواب صاحب اس لونڈے سے پہلے بھی نمٹ چکے ہیں اور اب بھی اس کی ایسی تیسی کر سکتے ہیں۔"

وہ دونوں ایک ساتھ ہنسے جیسے یہ سب مجذوب کی بڑ ہے اور ان باتوں کا کوئی مطلب نہیں۔

"وزیر خان صاحب! آپ پر کوئی پابندی نہیں۔۔۔" گیان چند نے طنز سے کہا۔ "اس وقت سہ پہر کے تین بجے ہیں۔ نواب صاحب قیلولہ فرما رہے ہیں۔ ان کی خدمت میں حاضر ہو کے کچھ عرض کرنے سے پہلے وہ جگہ دیکھ آؤ جہاں بقول تمہارے گزشتہ روز ایک عورت کو دفن کیا گیا تھا۔ اوّل تو تم شکارگاہ کے بھول بھلیوں جیسے کچے راستوں پر گھنٹوں بھٹکتے پھرو گے اور بالفرضِ محال اس راستے پر جا نکلے تب بھی اس جگہ کی نشاندہی کرنی ناممکن ہو گی۔ آدھی رات کے بعد سے صبح تک ہونے والی موسلادھار بارش نے سارے نشانات مٹا دیے ہیں اور زمین برابر کر دی ہے جیسے میلوں تک پھیلی ہوئی زمین۔ تمہیں نواب صاحب کو اپنے ہمراہ لے جا کر بڑی خفت کا سامنا ہو گا۔ ہم خود بھی نہا دھو کر کپڑے بدل چکے ہیں۔ گاڑی ریذیڈنٹ صاحب لے گئے ہیں اور انہیں گاڑی بالکل دھلی دھلائی اور صاف ملی تھی۔ اتنا تو پرنس کو بھی یاد رہے گا کہ صبح گاڑی کے پہیوں پر کیچڑ کا داغ تک نہ تھا اگر غلاظت اور گھاس پھونس ہوتی تو وہ فوراً نوٹ کر لیتے اور ریذیڈنٹ صاحب بھی شرافت علی پر ناراض ضرور ہوتے۔ یہاں ریذیڈنسی میں ایسا کوئی نہیں جو کہہ سکے کہ گاڑی رات بھر باہر رہی ہے! اب تم اپنی حالت پر غور کرو۔ تمہیں کہیں مٹی نظر آتی ہے؟ تمہارے ناخن تک صاف ہیں اور جوتوں کی پالش تک خراب نہیں ہوئی۔ تین فٹ گہری قبر کھودنے والے کی حالت ایسی ہوتی

ہے ؟ نواب صاحب تم پر کیسے یقین کر لیں گے وزیر خان کہ تم جھوٹ نہیں بول رہے ہو۔"

میں بیٹے ہوئے مہرے کی طرح بیٹھا ہوا تھا میری سمجھ میں یہ بات اچھی طرح آگئی تھی کہ شرافت علی اور گیان چند نے اپنے جرم کا کوئی ثبوت نہیں چھوڑا ہے۔ مجھے یقین آنے لگا تھا کہ اس نامعلوم عورت کے اصل قاتل وہی دونوں ہیں۔ ریذیڈنٹ کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہوگا اور تصویریں اتارنے کا مقصد اس کے سوا کچھ اور نہیں کہ ملزم مجھے بنا دیا جائے۔ شرافت علی کبھی میرا دوست نہ تھا اور گیان چند سے میری پرانی دشمنی تھی۔ اب اس نے مجھے بلیک میل کرنے کا ایک وسیلہ پیدا کر لیا تھا اور یہ اندازہ کرنا مشکل نہ تھا کہ وہ اپنے کون سے شیطانی عزائم کی تکمیل چاہتا ہے۔ اس کا مقصد مجھے ریاست سے فرار ہونے پر مجبور کرنا تھا۔

"اب میں تو چلتا ہوں۔" گیان چند نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "نواب صاحب جاگنے والے ہوں گے۔" اس نے ریوالور جیب میں ڈال لیا۔ جسمانی طور پر وہ دونوں مجھ سے کمزور تھے اور انہیں ڈر تھا کہ ہوش میں آنے کے بعد میں مشتعل ہو کے ان پر حملہ نہ کر دوں لیکن اب میری حالت کو دیکھتے ہوئے یہ خوف باقی نہیں رہا تھا۔ میں اس قابل بھی نہ تھا کہ اپنے پیروں پر کھڑا رہ سکوں۔ کمرے کے ایک گوشے میں تقریباً ڈیڑھ فٹ لمبا بہت موٹے ربر کا ہوز پائپ پڑا تھا جس کے ایک کنارے میں لکڑی کا گول سلنڈر جیسا ٹکڑا فٹ کر دیا گیا تھا۔ لکڑی کے ٹکڑے اور ہوز پائپ کا قطر برابر تھا لیکن ربر میں تھوڑی سی لچک کے باعث پھیلنے کی گنجائش تھی اور لکڑی کا وہ ٹکڑا ربر کے پائپ میں زبردستی ٹھونسا گیا تھا چنانچہ اس کا کنارہ تقریباً تین انچ تک باقی پائپ کے مقابلے میں پھولا ہوا نظر آتا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ جسے میں نے ربر کی سخت گیند سمجھا تھا وہ اسی پائپ کا پھولا ہوا حصہ تھا اور پائپ گھما کر میرے سر میں مارنے سے بیرونی چوٹ نہیں آئی تھی مگر اندر سے میرے دماغ کی مشینری کا ہر پرزہ ہل گیا تھا۔

گیان چند کے جانے کے بعد شرافت علی نے اپنی حفاظت کے لیے ہوز پائپ اٹھا لیا اور ایک دو بار ہوا میں گھما کر مجھ پر واضح کیا کہ وقت ضرورت یہ ہتھیار دوبارہ استعمال کیا جا سکتا ہے۔

"شرافت علی!" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ "گیان چند سے میں نے کبھی بھلائی کی توقع نہیں رکھی۔ وہ ہندو ہے اور میں مسلمان ہوں لیکن ہمارے درمیان اختلاف کی وجہ یہ نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ انتہائی چالاک کمینہ اور سازشی ذہن کا مالک ہے جو کسی طرح نواب صاحب کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ نواب صاحب خود شریف، اصول پرست اور فراخدل ہیں۔ اس لیے وہ دوسروں کو بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں مگر میں گیان چند کے ظاہر و باطن کا فرق دیکھ رہا ہوں۔ وہ مجھ سے ڈرتا ہے اور میرا پتا کاٹ دینا چاہتا ہے لیکن تم سے میرا کوئی اختلاف نہیں اور اس رات سے پہلے ہمارا تعلق برائے نام تھا۔ آخر تم نے گیان چند کے ساتھ مل کر میرے خلاف سازش کیوں کی؟"

شرافت علی کچھ دیر ہوز پائپ لیے مجھ سے دور دور کمرے میں ٹہلتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔ "نوکری کیسی بھی ہو مجبوری ہوتی ہے وزیر خان! اور یہاں تو غلامی ہے۔ اب یہی دیکھ لو کہ ایک مسلمان ہونے کے باوجود میں نے ہندو کا ساتھ دیا اور تم سے دشمنی کی حالانکہ تم نے میرا کچھ نہیں بگاڑا تھا لیکن میں کیا کروں میں ریذیڈنٹ صاحب کا حکم کیسے ٹالتا۔ ریاست میں دو ہی افراد کا حکم چلتا ہے۔ ایک نواب صاحب کا اور دوسرا ریذیڈنٹ کا۔ حقیقت یہ ہے کہ گیان چند خود میرے پاس نواب صاحب کا پیغام لے کر آیا تھا۔ اس عورت کو نواب صاحب کی خواہش اور ان کے حکم کے مطابق قتل کیا گیا تھا۔"

"اس کا... اس کا مطلب یہ ہے...؟" میں نے بڑی مشکل سے کہا۔ "کہ وہ کہانی جھوٹی تھی جو تم نے مجھے سنائی تھی؟"

"ہاں۔ گیان چند کے سامنے میں سچ نہیں بول سکتا تھا۔" شرافت علی نے کہا۔ "ویسے تو خود ریذیڈنٹ صاحب بھی اس عورت کی وجہ سے پریشان تھے لیکن وہ اسے قتل شاید نہیں کر سکتے تھے۔"

"میرا ذہن یہ بات تسلیم نہیں کرتا۔" میں نے کہا۔ "نواب صاحب کا اس عورت سے کیا تعلق ہے؟ اور اگر وہ ریذیڈنٹ کے لیے مسئلہ بنی ہوئی تھی تو نواب صاحب نے اس کو کیوں قتل کرایا؟"

"میرا خیال تھا وزیر خان کہ تم سمجھ جاؤ گے کیونکہ تم ذہین آدمی ہو۔" شرافت علی نے مایوسی اور افسردگی سے سر ہلایا۔ "تم خود بھی بالواسطہ طور پر ملوث تھے۔"

"میں؟" میں نے بے اختیار چلا کے کہا۔ "کیا تمہارا دماغ خراب ہے۔ اب تم مجھے بھی اس معاملے میں گھسیٹ رہے ہو جس کی میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں۔"

"جھوٹ مت بولو وزیر خان!" شرافت علی نے بھی اونچی آواز میں کہا۔ "کیا تمہیں معلوم نہیں تھا کہ نواب صاحب کے لڑکے شہزادہ خورشید عالم کے اور ریذیڈنٹ کی بیوی کے درمیان ناجائز تعلقات ہیں؟ کیا تم اس راز سے واقف نہیں تھے کہ پرنس رات کو محل سے غائب ہو کے کہاں جاتا ہے؟ تمہیں تو یہ بھی علم ہوگا کہ ریذیڈنٹ کی بیوی نے کتنی راتیں پرنس کی خواب گاہ میں گزاری ہیں۔ جب ریذیڈنٹ سرکاری کام سے دہلی گیا ہوا تھا۔ تم پرنس کے اتالیق تھے۔ اس کے اخلاق و کردار کے ذمہ دار تھے۔ پھر تم نے یہ بات کیوں چھپائی۔ نواب صاحب کو کیوں نہیں بتایا کہ ان کا فرزند آگ سے کھیل رہا ہے؟ عشق تو آدمی کو اندھا کر ہی دیتا ہے۔ وہ دونوں سمجھتے تھے کہ کسی کو کچھ معلوم نہیں اور انہیں کوئی نہیں دیکھ رہا لیکن تمہاری عقل پر کیسا پردہ پڑ گیا تھا لالچ کا کیونکہ پرنس تمہیں انعام و کرام سے نوازتا تھا؟"

خوف اور حیرت سے میری زبان گنگ ہو گئی تھی۔ میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت باقی نہ رہی تھی اور میں بے حس و حرکت بیٹھا رہ گیا تھا چنانچہ میں تردید بھی نہ کر سکا کہ پرنس نے مجھے رازداری کا کوئی معاوضہ نہیں دیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہے، وہ غلط ہو رہا ہے اور ایک نہ ایک دن اس عشق کے چرچے نواب صاحب کے کانوں تک پہنچیں گے تو مجرم میں بھی گردانا جاؤں گا۔ زبانِ خلق پر آ جانے والی بات کیسے چھپی رہ سکتی ہے اور عشق کی آگ بھڑکتی ہے تو جلنے والوں کے سوا دھواں سب کو نظر آتا ہے۔ میں شرافت علی کو کیسے سمجھاتا کہ پہلی غلطی مجھ سے مجبوری میں سرزد ہوئی تھی اور مجھے اندازہ نہ تھا کہ آگے مجبوریوں کی ایک دلدل ہے جس سے نکلنا میرے اختیار کی بات نہ رہے گی۔ میں نجات پانے کی جتنی کوشش کروں گا اتنا ہی اس میں اترتا چلا جاؤں گا۔

"شرافت علی! کیا یہ بات نواب صاحب کو معلوم ہے... کہ میں بھی...؟" میں نے بے ربط الفاظ میں اپنے دل کی بات زبان سے کہنے کی کوشش کی۔

"پرنس کے بارے میں نواب صاحب کو یقیناً بہت پہلے معلوم ہو چکا تھا۔" شرافت علی نے کہا۔ "لیکن وہ ریذیڈنٹ سے کچھ نہیں کہہ سکتے تھے۔ کسی اور کی بہو بیٹی ہوتی تو نواب صاحب اس کے وارثوں کو اٹھوا لیتے اور خاموشی سے سمجھا دیتے کہ میاں! اپنے گھر کی عزت سنبھالو اور اپنی اوقات مت بھولو۔ موری کی اینٹ چوبارے چڑھنے کی گستاخی کر رہی ہے۔ پھر کبھی ہم نے کچھ سنا تو زندہ دفن کرا دیں گے۔ لیکن اس لہجے میں برابر کے حاکم سے بات نہیں کی جا سکتی تھی۔ خود نواب صاحب کو لاکھ منہ نہ لگائیں، اس کی بیوی کے متعلق کچھ کہتے ہوئے ڈرتے تھے کہ ریذیڈنٹ اسے الزام اور اپنی عزت پر حملہ سمجھے گا تو نواب صاحب کو بھی بے عزت کر دے گا۔ وہ سمجھدار ہیں۔ ان کو معلوم تھا کہ منع کرنے سے یا سمجھانے سے پرنس پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ اگر وہ عقل سے کام لے سکتا تو یہ حماقت ہی کیوں کرتا۔ میرا خیال ہے کہ سب سے پہلے ان کو یہ خبر دینے والا گیان چند ہی ہوگا۔ اسے تم سے پرخاش تھی چنانچہ اس نے ایک تیر سے دو شکار کیے ہیں تو حیرت کی کوئی بات نہیں۔ ظاہر ہے نواب صاحب اتنی آسانی سے گیان چند کی بات پر اعتبار نہ کرتے۔ گیان چند نے ناقابلِ تردید ثبوت اور شہادت مل جانے کے بعد ہی نواب صاحب کو بتایا ہوگا کہ پرنس کیسے خطرناک کھیل میں مصروف ہے اور جسے آپ نے اتالیق مقرر کیا تھا وہ پرنس کا معاون و مددگار بن گیا ہے۔ ریذیڈنٹ کے ذہن میں ایسا کوئی خیال نہ تھا لیکن نواب صاحب کو خیال ضرور آیا ہوگا کہ ریذیڈنٹ جیسا کینہ پرور آدمی رقابت کے جذبات سے مغلوب ہو کر ان کے اکلوتے بیٹے کو مروا دے گا۔ عین ممکن ہے گیان چند نے نواب صاحب کو اپنی آنکھوں سے سب کچھ دکھا دیا ہو جس کے بعد شبے کی کوئی گنجائش نہ رہی ہو۔ نواب صاحب کے لیے یہ بھی ناممکن تھا کہ پرنس کو قید کر دیں اور اس عورت سے نہ ملنے دیں اور یہ بھی ناممکن تھا کہ ریذیڈنٹ کو

اپنی بیوی سمیت ریاست سے نکلوا دیں۔ چنانچہ انھوں نے وہ راستہ اختیار کیا جو سب سے کم خطرناک تھا۔"

شرافت علی کی زبان سے نکلنے والا ہر لفظ میرے کانوں نے سزائے موت کے فیصلے کی طرح سنا جس کے خلاف اپیل کی گنجائش نہ ہو۔ گیان چند محل کے اندر ہی رہتا تھا اس نے اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا ہوگا یا کسی سے کچھ سنا ہوگا تو اس نے خود جاسوسی کی ہوگی تاکہ میرے خلاف ہر الزام کو ثابت بھی کر سکے۔ ایک بار شک ہو جانے کے بعد اس کے لیے چوری چھپے میری اور پرنس کی نقل و حرکت کی نگرانی کرنا مشکل نہ تھا۔ ہم مطمئن تھے کہ دیکھنے والا کوئی نہیں لیکن گیان چند کسی تاریک گوشے، کسی بند دریچے یا کسی جھاڑی کی اوٹ سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس نے چشم دید گواہ بھی پیدا کر لیے ہوں گے یا خود نواب صاحب کو دکھا دیا ہوگا کہ پس پردہ کیا ہو رہا ہے۔ یہ بات پھر بھی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ نواب صاحب نے مجھے طلب فرما کے پرستش کیوں نہیں کی۔ اگر ان کو تمام حالات کا علم ہو چکا تھا تو انھوں نے مجھے قصوروار کیوں نہیں سمجھا؟ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ ولی عہد بہادر کی رنگین مزاجی کے بارے میں پہلے سے جانتے تھے۔ کون باپ ہے جو بیٹے کی فطرت سے نا آشنا ہے۔ پرنس کے سابقہ کارنامے بھی ان سے پوشیدہ نہ رہے ہوں گے مگر وہ چشم پوشی پر مجبور تھے۔ ایک اس لیے کہ پرنس ان کا ایک ہی بیٹا تھا۔ دوسرے یہ کہ وہ شہزادہ تھا۔ مجھے بھی انھوں نے مجبور سمجھ کر معاف کر دیا ہوگا۔ کہنے کو میں سیکرٹری بھی تھا اور اتالیق بھی لیکن در حقیقت میں پرنس کا ملازم تھا اور اس کے حکم یا اس کی مرضی کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ مجھ سے پہلے کسی نے پرنس کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کی ہوگی تو براہِ راست پرنس نے اسے برطرف کر دیا ہوگا چنانچہ نواب صاحب نے مجھے موردِ الزام اور شریکِ جرم ہونے کی سزا نہیں دی اور خود ہی معاملات کو درست کر دیا۔

"شرافت علی! تم نے بتایا نہیں کہ نواب صاحب کا اختیار کردہ سب سے کم خطرناک طریقہ کیا تھا؟" میں نے خاموشی کے طویل وقفے کے بعد کہا۔

"یار وذیر خان! کیا ہو گیا ہے تمہاری عقل کو؟" شرافت علی نے مجھے یوں دیکھا جیسے میں اس کی نگاہ میں دنیا کا سب سے بڑا احمق ہوں۔ "بھئی انھوں نے وہی کیا جو حالات کا تقاضا تھا۔ انھوں نے گیان چند سے کہا کہ نہ ہوگا بانس نہ بجے گی بانسری۔ جیسے بھی ہو اس معاملے کو ختم کر دو اور گیان چند نے معاملہ ختم

کر دیا۔ وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا۔"

"کیا بک رہے ہو؟" میں نے دہشت زدہ ہو کے کہا "کیا گیان چند نے ریذیڈنٹ کی بیوی کو قتل کر دیا ہے؟"

"تمہارے خیال میں وہ عورت کون تھی جسے ہم نے گزشتہ رات دفن کیا تھا؟" شرافت علی نے ہنس کر کہا اور اپنی جیب سے ایک لفافہ نکال کے میری طرف پھینکا۔ "یہ تصویریں ابھی دو گھنٹے پہلے دُھل کر تیار ہوئی ہیں۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔"

کانپتے ہاتھوں سے میں نے تصویریں نکالیں۔ پہلی تصویر پر نگاہ پڑتے ہی میرے ذہن میں ایک خوفناک دھماکا ہوا جس نے میرے ہوش و حواس مختل کر دیے۔ میں اپنے دونوں ہاتھوں میں ریذیڈنٹ کی بیوی کی لاش اٹھائے کھڑا تھا، اور پس منظر میں وہ قبر تھی جو ایک ویران جنگل کے کسی گمنام مقام پر کھودی گئی تھی۔ پھر دوسری تصویر میرے سامنے آگئی میں تین فٹ گہری قبر میں لاش کے اوپر جھکا ہوا تھا۔ ایک اور بم کا دھماکا ہوا جس کے بعد میں ہوش سے بے گانہ ہو گیا۔ تصویریں میرے ہاتھ سے گر گئیں اور میں نے عالمِ دیوانگی میں شرافت علی پر جست لگائی لیکن وہ تیار تھا اور اسی وقت کے انتظار میں ہونز پاتپ لیے بیٹھا تھا۔ اس نے بڑی پھرتی سے ہاتھ گھمایا اور مجھے یوں لگا جیسے من بھر کا پتھر شہاب ثاقب کی طرح میرے سینے پر آ گرا ہو۔ پل بھر کے لیے میں بے دم ہو گیا مگر جنون کی کیفیت میری طاقت بن گئی اور میں پھر شرافت علی کی طرف لپکا جو اتنی دیر میں چند قدم دور جا کھڑا ہوا تھا اور بڑی خباثت سے ہنس رہا تھا۔ دوسری مرتبہ وہ ہونز پاتپ میری دائیں ٹانگ پر گھٹنے سے ذرا اوپر لگا۔ میری دائیں ٹانگ بیکار ہو گئی اور میں نیچے گر رہا تھا کہ شرافت علی نے میری دوسری ٹانگ پر وار کیا۔ وہ مجھے جان سے نہیں مارنا چاہتا تھا ورنہ میرے سر کا نشانہ لیتا یا میری گردن توڑ دیتا لیکن اس نے مجھے اٹھنے کے قابل نہیں چھوڑا۔ جب میں گر گیا تو اس نے میرے شانوں پر ضرب لگائی اور میرے ہاتھ بھی ناکارہ ہو گئے۔

"سنو وذیر خان! ریذیڈنٹ کی بیوی کو تم نے قتل کیا ہے صرف تم نے۔" وہ میرے مفلوج جسم پر جھک کے بولا "بیشک نواب صاحب نے یہ کام گیان چند کے سپرد کیا تھا مگر قاتل تم ہو اور اس کا ثبوت یہ تصویریں ہیں۔ اس میں نہ گیان چند ہے اور نہ میں ہوں۔ گیان چند نے نواب صاحب کو جو رپورٹ دی ہے اس میں بھی تمہاری فرض شناسی اور جاں نثاری کو سراہا گیا ہے کہ گیان چند نے اس مصیبت سے نجات پانے کے لیے تم سے مشورہ کیا اور تم نے اکیلے ہی سب کچھ کر لیا کیونکہ اتالیق کی حیثیت سے تم پرنس کی بہتری چاہتے تھے لیکن کچھ کرتے ہوئے ڈرتے تھے۔ نواب صاحب کا اشارہ پا کے تمہارا خوف دور ہو گیا اور اب نواب صاحب کو تم سے کوئی گلا نہیں۔ وہ خوش ہیں کہ تم نے اتنا بڑا مسئلہ ختم کر دیا... مگر وذیر خان! یہ سوچو کہ پرنس نے یہ تصویریں دیکھ لیں تو تمہارا انجام کیا ہوگا۔ یہ بھی سمجھ لو کہ ریذیڈنٹ کی نگاہ میں ابھی تک اس کی بیوی نے جرم بے وفائی نہیں کیا تھا۔ وہ بے وقوف اور عقل کا اندھا اپنی بیوی کو روزِ اوّل کی طرح وفادار سمجھتا تھا۔ یہی تصویریں اس نے دیکھ لیں تو کیا وہ اپنی باوفا اور شوہر سے محبت کرنے والی بیوی کے قاتل کو معاف کر دے گا؟ تم بیک وقت پرنس اور ریذیڈنٹ کے قہر و غضب کا نشانہ بنو گے تو تمہیں کون پناہ دے گا؟ نواب صاحب؟ شاید وہ اس حد تک تمہاری مدد کر دیں کہ تمہیں بحفاظت ریاست کی حدود سے باہر پہنچا دیں کیونکہ یہاں وہ چوبیس گھنٹے تمہارے باڈی گارڈ کے فرائض انجام نہیں دے سکتے لیکن ایک بات اور بھی ہے جس کا علم ابھی تک صرف گیان چند کو ہے یا مجھے ہے اور وہ ہے تمہارے اور پرنس کی بیوی کے مراسم کی بات... تم نے نواب صاحب کے خاندان کی عزت پر ہاتھ ڈالا ہے۔ اگر یہ بات نواب صاحب کے علم میں لائی گئی تو تمہارا ٹھکانہ کہاں ہوگا وذیر خان؟"

میری نظروں کے سامنے بار بار اندھیرا پھیل جاتا تھا اور مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میرا وجود اس تاریکی میں ڈوبتا جا رہا ہے۔ قصوروار میں نہیں تھا، پرنس تھا جس نے مشرقی ماحول کی پروردہ، عالی نسب اور حسن و جمال میں بے مثال بیوی کو چھوڑ کے ایک فرنگن کے عشق کا طوق گلے میں ڈال لیا حالانکہ وہ فرنگن اپنی دلکشی اور معیارِ حسن کے اعتبار سے پرنس کی بیوی کا پاسنگ بھی نہ تھی۔ اس نے یہ بھی نہیں سوچا کہ دیارِ غیر سے آنے والی یہ عورت اس کی کیسے ہو سکتی ہے جبکہ وہ اپنے شوہر کی نہ ہوئی۔ اور یہ نہیں سوچا کہ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے اور جس دن بیوی کی بے وفائی اور دوستی کا دم بھرنے والے پرنس کی دغا بازی کا علم ریذیڈنٹ کو ہوگا، اس دن عزتوں کے کتنے جنازے اٹھیں گے کیونکہ ریذیڈنٹ بہرحال ایک مرد تھا جو کتنا ہی بے غیرت کیوں نہ ہو، بیوی کے معاملے میں مکمل حاکمیت اور احساسِ ملکیت اس کی فطرت کا جزو ہیں اور اس میں رخنہ اندازی سے اس کی انا کو ٹھیس پہنچے تو جوشِ انتقام میں مہذب ترین معاشرے کا فرد بھی حیوان بن جاتا ہے... اور اس نے یہ سوچا کہ وہ بیوی بھی عورت ہوتی ہے جسے شرافت اور نجابت اور ظاہری حسن کے معیار سے پرکھنے کے بعد سنگین دیواروں کے حصار میں قید کر دیا جائے جہاں اس کے جذبات اور امنگوں کی فریاد سننے والا کوئی نہ ہو اور اس سے یہ توقع رکھی جائے کہ وہ اپنی خواہشات کو ان دیواروں کی آبرو پر قربان کر دے گی۔ قصوروار اس عورت کی انا تھی جسے ایک کمتر عورت نے شکست دی تھی اور اس سے وہ مرد چھین لیا تھا جس کو اس نے سب کے سامنے اپنے سر کا تاج، اپنا سہاگ اور اپنا مجازی خدا تسلیم کیا تھا۔ اس کا انتقامی ردِ عمل فطری تھا۔ اس کے شوہر نے دوسری عورت کی خاطر اسے چھوڑ دیا تھا۔ اس نے دوسرے مرد کی خاطر شوہر کو چھوڑ دیا۔ اگر وہ بزدل اور کم ہمت عورت ہوتی تو شاہی محل کی خواب گاہ کی تنہائی میں دیواروں سے سر پھوڑ کے مر جاتی... لیکن اس بے وفائی کا بدلہ بے وفائی سے لیا، اور انجام کی پروا نہیں کی۔ اپنی خواب گاہ کی قیدِ تنہائی سے فرار ہوتے ہوئے اس کو خیال تو آیا ہوگا کہ پکڑے جانے کی صورت میں خاندان کے ناموس کو خاک میں ملانے کی سزا بھی موت ہوگی مگر وہ پہلے ہی زندہ درگور تھی۔ خودکشی کر کے یا گھٹ گھٹ کر جان دینے سے اس نے یہ بہتر سمجھا ہوگا کہ اس خاندان سے وہ سب خوشیاں چھین لے جو اس کا حق ہونے کے باوجود اسے نہیں ملی تھیں اور مرنے سے پہلے اونچی حویلیوں میں رہنے والے کھوکھلی عزت کے پاسبانوں کے منہ پر وہ سیاہی مل جائے جسے وہ دنیا سے چھپا لیں تب بھی آئینے میں ان کو اپنا چہرہ سیاہ دکھائی دے۔ قصوروار وہ ریذیڈنٹ بھی تھا جس کی آنکھیں کچھ دیکھنے سے قاصر تھیں یا جو اتنا بے غیرت تھا کہ اپنی بیوی کو بھی طوائف سمجھتا تھا جسے حصولِ مقصد کی خاطر استعمال کیا جا سکے۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ قصوروار صرف دوسرے تھے۔ قصوروار میں بھی تھا۔ مجھے روزِ اوّل ہی سے نواب صاحب کو بتا دینا چاہیے تھا کہ میں شہزادے کا اتالیق تو کیا سیکرٹری بھی

نہیں بن سکتا لیکن مجھے اچھی تنخواہ اور پُرآسائش زندگی کی ہوس نے روک لیا۔ میں نتائج کی پروا کیے بغیر نواب صاحب کو بتا سکتا تھا کہ پرنس کی مصروفیات کیا رنگ لا سکتی ہیں مگر خوف نے میری زبان پکڑ لی۔ میں موقع ملتے ہی باعزت طور پر ریاست سے جا سکتا تھا مگر مجھے پرنس کی بیوی نے اسیر کر لیا اور اب عملی صورتِ حال یہ تھی کہ ہر قصور کی سزا صرف میرا مقدر ہو چکی تھی سوائے میرے کوئی بھی قصوروار نہ رہا تھا اور میں ہر طرف سے محصور ہو گیا تھا۔ واپس آنے کے بعد ریذیڈنٹ اپنی بیوی کی "پُراسرار گمشدگی" پر ہنگامہ برپا کرے گا تو رپورٹ وائسرائے تک جائے گی۔ ایسی صورت میں صرف ایک تصویر مجھے تختۂ دار تک پہنچانے کے لیے کافی ہو گی۔ بشرطیکہ اس مقدمۂ قتل کی سماعت مکمل ہونے تک پرنس نے بھی مجھے زندہ چھوڑا۔ شدّتِ جذبات میں اپنی محبوبۂ دلنواز کے قاتل کو معاف کرنا اس کے بس میں نہ ہو گا۔ نواب صاحب بھی مجھے بچانا ضروری نہیں سمجھیں گے اور یہی کہیں گے کہ وزیر خان! تم نے ہمیں شروع میں ہی خبردار کر دیا ہوتا تو ہم اس فتنے کا سدِباب کر لیتے اور نوبت یہاں تک نہ پہنچتی۔

مجھے معلوم نہیں کہ شرافت علی کب گیا۔ کتنی دیر تک بولتا رہا اور میں کب سے زمین پر پڑا ہوں۔ جب مجھے ہوش آیا اور میں اس قابل ہوا کہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو کے چل سکوں تو میں آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھا جسے شرافت علی کھلا چھوڑ گیا تھا۔ درمیان میں پہنچ کر میرے قدم رک گئے۔ فرش پر وہ چاروں تصویریں بکھری پڑی تھیں جو میرے جرم کا منہ بولتا ثبوت فراہم کرتی تھیں۔ ان تصویروں کو دیکھ کر میری ذہنی کیفیت میں ایک غیر متوقع تبدیلی آئی۔ یکلخت اپنی مجبوری اور بے بسی کا احساس انتقام کی آرزو میں ڈھلنے لگا۔ گیان چند اور شرافت علی نے مل کر میرے خلاف ایک ایسی سازش کی تھی جو مجھے قتل کرا دینے کی کوشش کے مترادف تھی لیکن میں ان کی سازش کو کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔ وہ اتنی آسانی سے مجھے شکار نہیں کر سکیں گے۔ اگر وہ مجھے بلیک میل کرنے کی سوچ رہے ہیں تو میں ان کے مطالبات کے سامنے سر جھکانے کے بجائے ان کو مار کے مرجانے کو ترجیح دوں گا۔ اس سے پہلے کہ مجھے میرے ناکردہ گناہوں کی سزا ملے میں ان دونوں کو اپنا جرم میرے سر تھوپنے کی سزا ضرور دوں گا اس کے بعد کچھ بھی ہو۔ ان کے پاس نیگیٹو ہے اور وہ جتنے پرنٹ چاہیں بنوا سکتے ہیں۔ بعد میں کوئی کاپی پرنس یا ریذیڈنٹ کو ملتی ہے تو مل جائے۔ تختۂ دار پر مجھے یہ اطمینان تو حاصل ہو گا کہ مجھ سے پہلے میرے قاتل مارے گئے۔ میں نے تصویریں کو جیب میں ڈالا اور باہر نکل کے دیکھا تو خود کو عقبی حصے میں پایا۔ ایک صحیح فیصلے پر پہنچ جانے کے بعد میں کچھ پُرسکون ہو گیا تھا۔ میں نے ریذیڈنسی کے دوسرے ملازموں سے پوچھا کہ شرافت علی کہاں ہے تو انہوں نے مجھے بتایا کہ ابھی کچھ دیر پہلے وہ دہلی چلا گیا ہے اور وہاں سے آگرہ جائے گا تاکہ واپسی پر گاڑی ڈرائیو کر کے لا سکے۔ ریذیڈنٹ صاحب یہی حکم دے گئے تھے۔ دوسرے ملازم مجھے پہچانتے تھے چنانچہ میری خواہش پر انہوں نے مجھے چائے اور کھانے پینے کی چیزیں لا کر دیں۔ آدھے گھنٹے تک میں ریذیڈنسی کے لان پر اکیلا بیٹھا رہا۔ میں بہت کچھ سوچنا چاہتا تھا اور بہت سے فیصلے کرنا چاہتا تھا لیکن میرا ذہن اس طوفانی سمندر کی طرح تھا جس میں جگہ جگہ گرداب ہوں، پتھر کی چٹانیں ہوں اور مخالف ہوا ہو جن سے لہروں کا زور ٹوٹ جاتے۔ جب میں وہاں سے روانہ ہوا تو میری حالت بہت بہتر تھی۔ گزشتہ شب سے اب تک کے واقعات کسی دہشت زدہ کر دینے والے خواب کی طرح لگتے تھے مگر وہ چار تصویریں جو میری جیب میں تھیں، مجھے مسلسل یقین دلا رہی تھیں کہ حقیقت سے کہیں مفر نہیں۔ محل میں پہنچنے کے بعد دریافت کرنے پر مجھے معلوم ہوا کہ گیان چند بھی نواب صاحب سے تین دن کی چھٹی لے کر چلا گیا ہے۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ وہ دونوں خوفزدہ ہو کے فرار ہو گئے ہیں۔ ان کو یقین ہو گا کہ ہوش و حواس بحال ہونے کے بعد میرا پہلا ردِعمل انتقامی ہو گا۔ خیر، میں نے اپنے آپ سے کہا۔ "بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی؟ میرا فیصلہ قطعی اور اٹل ہے۔" اتفاق سے میرا سامنا نواب صاحب سے بھی ہو گیا اور انہوں نے اخلاقاً پوچھا کہ خیریت تو ہے۔ کئی دن سے نظر نہیں آئے اور کچھ بیمار بیمار سے لگتے ہو؟ میں نے طبیعت کی معمولی سی خرابی کا بہانہ کیا اور کہا کہ میں تو اپنے کمرے میں سویا ہوا تھا۔ انہوں نے فرمایا کہ پرنس کے ساتھ آگرہ ہو آتے تو طبیعت بہل جاتی اور میں شکریہ ادا کر کے اپنے کمرے میں گھس گیا۔ میرا جسم رات بھر جاگنے، محنت مشقت کرنے اور اس کے بعد شرافت علی کے تشدد کا نشانہ بننے سے پھوڑے کی طرح درد کر رہا تھا اور مجھے آرام کی سخت ضرورت تھی لیکن اک ذہنی کیفیت میں نیند کا آنا محال بلکہ ناممکن نظر آتا تھا۔ چنانچہ موقع پا کے میں پرنس کی بیوی کے کمرے میں گھس گیا وہ کمرے میں موجود نہیں تھی۔ تھوڑا سا تلاش کرنے پر مجھے سنگھار میز کی ایک دراز میں سے سکون بخش گولیاں مل گئیں۔ خوراک کی مقدار کا اندازہ کیے بغیر میں نے آدھی شیشی پھانک لی اور اپنے کمرے میں پہنچ کر پانی کے ساتھ نگل گیا۔ عین وقت پر مجھے ان تصویروں کا خیال آیا جو میری جیب میں تھیں اور میں نے انہیں تکیے کے نیچے رکھ دیا۔ بیس منٹ تک میں بستر پر لیٹا چھت کو گھورتا رہا۔ سفید بے داغ چھت سینما کا اسکرین بن گئی اور اس پر گزشتہ شب کے واقعات کی فلم چلنے لگی۔ پھر دوا کا اثر شروع ہوا اور میرا تصور بھٹکنے لگا۔ باری باری میں نے وہ سب مناظر دیکھے جو خوف بن کر لاشعور کی گہرائی میں نقش ہو گئے تھے۔ میں نے اپنے آپ کو پھانسی کے تختے پر دستِ جلاد کی ایک جنبش کا منتظر دیکھا جس کے بعد میرے جسم کو موت کے اندھے کنویں میں غائب ہو جانا تھا۔ پھر میں نے پرنس کو دیکھا جس کی آنکھوں سے مجنوں کی طرح وحشت ٹپک رہی تھی اور وہ چلّا رہا تھا: "مارِ آستین! تو نے میری محبت کو ڈس لیا۔" اور اس کے ہاتھ میں چمڑے کا ہنٹر تھا جو وہ میری لاش پر برسا رہا تھا۔ میں نے ریذیڈنٹ کو دیکھا جو ریوالور سے میرے سر کا نشانہ لیے کھڑا تھا اور کہہ رہا تھا: "یو ڈرٹی بلیک مین! وہ کوئی معمولی عورت نہیں تھی جس کو تم مرڈر کیا۔ وہ ہمارا وائف تھا اور ہم رائل فیملی کا ممبر ہے۔" آخری منظر میں جو بہت دھندلا رہ گیا تھا، میں نے نواب صاحب کو ہاتھ باندھے اداس اور متفکر مگر پورے جاہ و جلال اور وقار کے ساتھ دو لاشوں کے پاس ٹہلتے دیکھا۔ ان میں سے ایک لاش میری تھی اور دوسری پرنس کی بیوی اور نواب صاحب کی بہو کی۔ وہ کہہ رہے تھے: "افسوس کہ ہمارے لیے اس کے سوا چارہ نہ تھا۔ اب ان روسیاہ بدبختوں کی لاش کے ٹکڑے شکارگاہ میں بکھیر دو تاکہ کل تک ہماری خاندانی عزت سے کھیلنے والوں کی ناپاک ہڈیاں بھی کتے اور بھیڑیے کھا جائیں۔" جیسے جیسے سکون بخش گولیوں کا اثر بڑھتا گیا، تصورات کی پرچھائیاں زیادہ بے ربط ہونے لگیں اور نیند غالب آنے لگی جو درحقیقت ہوش سے بیگانگی تھی۔ تاہم ذہنی انتشار کی شدّت اتنی زیادہ تھی کہ سکون دینے والی دواؤں کا اثر بھی عارضی ثابت ہوا اور رات کے کسی پہر میں بھیانک خوابوں کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا۔ اتنی زیادہ مقدار کے باوجود لاشعور پر دواؤں کی گرفت کمزور پڑ گئی تھی۔ پھر نیم بیداری کے عالم میں مجھے ایسا محسوس ہوا کہ پرنس کی بیوی مجھے جھنجھوڑ کر جگانے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس نے آہستہ آہستہ میرے گالوں پر طمانچے مارے۔ یہاں تک کہ میں آنکھیں کھولنے پر مجبور ہو گیا اور اس کا دھندلایا ہوا چہرہ مجھے صاف نظر آنے لگا۔

"وزیر خان! دیکھو میری طرف۔" اس نے مجھے پانی کے چھینٹے مارنے شروع کیے۔ "دیکھو میں کون ہوں۔ پہچانتے ہو نا مجھے؟"

میں نے سر کو آہستہ سے اقرار میں ہلایا: "تم... پرنس امینہ ہو۔" میں نے آنکھیں بند کر کے بڑبڑانا شروع کیا: "اور میں وزیر خان... مجھے سب یاد ہے... ہم اس دنیا میں ملے تھے جہاں تمہارا عیاش اور بے وفا شوہر تھا... اور وہ بدمعاش... گیان چند تھا... اور اس کا ساتھی شرافت علی تھا... ان دونوں نے... ہم دونوں کی جان لی تھی۔ وہ قاتل ہیں... مگر وہ زندہ ہیں اور ہم مر چکے ہیں..."

"یہ کیسی باتیں کر رہے ہو وزیر خان!" وہ میرے شانے کو ہلا کے بولی: "دیکھو، یہ وہی دنیا ہے اور ہم دونوں زندہ ہیں۔"

میں نے آنکھیں کھول کر اسے غور سے دیکھا۔ "ہم دونوں زندہ ہیں؟ کیوں زندہ ہیں؟"

"اچھا دیکھو اب سونا نہیں ہے۔ میں تمہارے لیے گرم چائے لاتی ہوں۔" وہ بولی: "میں تمہیں سہارا دیتی ہوں۔ اٹھ کر بیٹھو، شاباش۔"

اس نے تھرماس میں سے بغیر دودھ اور چینی کی چائے کے دو مگ زبردستی میرے حلق سے اتار دیے تو میں پوری طرح ہوش میں آ گیا۔

"یہ کیا حماقت کی تھی تم نے؟" وہ مجھے تکیوں کے سہارے بٹھا کے بولی: "اگر وہ گولیاں زیادہ طاقت کی ہوتیں؟"

"تم کو کیسے معلوم ہوا کہ میں نے تمہاری گولیاں کھا لی ہیں؟" میں نے کہا۔ میرا سر اب بھی بھاری تھا لیکن تلخ چائے نے تریاق کا کام کیا تھا۔

"تم جلدی میں دراز کھلا چھوڑ آئے تھے۔" وہ بولی۔ "اور شیشی بھی اوپر رکھی تھی چنانچہ میں نے فوراً دیکھ لی ورنہ مجھے رات کے وقت معلوم ہوتا۔"

"اور اس وقت تک میں واقعی عالمِ ارواح میں ہوتا۔" میں نے ہاتھ بڑھا کے سگریٹ کا پیکٹ اٹھایا۔

"اس کا کوئی امکان نہیں تھا۔" وہ بولی: "تم پوری شیشی کھا لیتے تو زیادہ سے زیادہ بے ہوش ہو جاتے لیکن مجھے یہ بتاؤ کہ کل رات تم کہاں تھے اور واپس آ کے خودکشی کی یہ کوشش کرنے کا مقصد کیا تھا؟" اب تک اس کا رویّہ ہمدردانہ اور حوصلہ افزا تھا مگر یکلخت وہ برہم ہو گئی۔

میں بہت دیر تک شش و پنج میں رہا۔ میرے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ تمام واقعات بتا دینے سے مصلحت کے تقاضے تو نظرانداز نہیں ہوں گے۔ بیشک

ابھی تک اس نے بڑی سمجھداری کا ثبوت دیا تھا اور اکیلے ہی میری حالت سنبھالنے میں کامیاب رہی تھی لیکن یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ حقائق سے آگاہی کے بعد اس کا ردِ عمل کیا ہوگا؟

"کیا بات ہے وزیر خان؟" وہ مجروح لہجے میں بولی۔ "کیا کوئی ایسی بات ہے جو تم مجھے بتانا نہیں چاہتے؟ کسی کا ڈر ہے تمہیں؟ یا مجھ پر اعتماد نہیں ہے تمہیں؟ تمہاری صورت سے لگتا ہے کہ تم برسوں کے بیمار ہو۔ تمہاری آنکھوں میں دہشت زدہ کر دینے والی ویرانی نظر آتی ہے تو تمہارے ماتھے پہ احساسِ جرم و ندامت کی تحریر۔ ایسا کیوں ہے وزیر خان؟ کیا یہ میری نظر کا دھوکا ہے؟ بولو۔ کچھ تو کہو۔" وہ اچانک پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔ "کیا دنیا میں کوئی میرا نہیں ہوگا۔ شوہر نے مجھے چھوڑ دیا تھا۔ جان ہتھیلی پر رکھ کے میں نے تمہیں اپنایا تھا اور تم بھی مجھے اس بے دردِل دنیا کے حوالے کر کے جانا چاہتے ہو؟ یہ جانتے ہوئے بھی کہ تمہارے بعد خود اپنی نظر میں گر کے جینا میرے لیے ناممکن ہوگا۔"

میں اسے روتا ہوا دیکھتا رہا۔ ہر قطرۂ اشک تیزاب کی طرح تھا جو میرے سینے پر فکر و غم کی بھاری چٹان کو کاٹ رہا تھا اور میرا بوجھ کم کر رہا تھا۔ ایک شاہی خاندان کی پروردہ، ایک والیِ ریاست کے اکلوتے بیٹے کی بیوی۔ دولت اور اختیارات کی مالک پرنس امینہ صرف ایک عورت رہ گئی تھی۔ ایک ایسی عورت جس کا دامن خوشیوں سے خالی تھا اور وہ جھولی پھیلائے مجھ سے پیار مانگ رہی تھی۔ اعتماد کی بھیک چاہتی تھی اور تحفظ کی طلب گار تھی۔ اس کے بدلے وہ مجھے بھی پیار، اعتماد اور تحفظ دے سکتی تھی چنانچہ میں نے اس کو سب کچھ بتلا دیا۔ پرنس کی عیاشی کی روداد سے لے کر اپنی ذات پر آنے والے ہر الزام تک اس سے کوئی بات نہیں چھپائی۔ میں نے اعتراف کیا کہ میں نے اپنی عاقبت نااندیشی کی وجہ سے پرنس کی زندگی سنوارنے کی بجائے اور بگاڑ دی اور اس طرح نواب صاحب کے اعتماد کو بھی دھوکا دیا اور پھر پرنس کے اعتماد کو بھی... اور انجامِ کار نوبت یہاں تک آ گئی کہ اب مجھے جینے کا کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔ گیان چند اور شرافت علی جیسے شیطان مجھے ہر طرح سے بلیک میل کر سکتے ہیں اور ان کی بات نہ ماننے سے میری ہی نہیں امینہ کی عزت اور زندگی کو بھی خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔

اُس نے میری بات بڑی توجہ سے سنی لیکن پریشان بالکل نہیں ہوئی۔ "جہاں تک میرے سرتاج ولی عہد بہادر کا تعلق ہے۔" اس نے میری بات ختم ہونے کے بعد کہا۔ "اُن کے اخلاق و کردار کو تم نے نہیں بگاڑا۔ تم سے پہلے بھی کئی اتالیق اس جرم میں بڑی ذلت کے ساتھ رخصت کیے جا چکے ہیں کیونکہ انہوں نے سچ مچ اتالیق بن کے شہزادے کی اصلاح کو اپنا فرض سمجھنے کی غلطی کی تھی۔ یہاں شرافت کے معیار مختلف ہیں۔ جسے تم عیش پرستی کہتے ہو وہ نوابی شان ہے۔ جو کچھ کل رات ہوا اس میں تمہاری نیت کو یا ارادے کو کوئی دخل نہ تھا۔ اب رہا سوال اس اونچے خاندان کی جھوٹی آبرو کے بھرم کا تو تم سے پہلے میں نے اس کو خاک میں ملایا تھا۔ پہل تم نے نہیں کی تھی۔ اپنی زندگی کو خود میں نے داؤ پر لگایا تھا۔ تم نے میرے لیے کوئی خطرہ پیدا نہیں کیا۔ میں تو تمہیں پہلے بھی بتا چکی ہوں کہ میں مرنے سے نہیں ڈرتی لیکن جینا ضرور چاہتی ہوں۔ کیا تم مجھ سے بھی کم حوصلہ ہو؟ کیا تم شرافت علی اور گیان چند جیسے لوگوں کو شکست نہیں دے سکتے؟"

میں حیرانی سے اس کی صورت کو دیکھتا رہا۔ "تمہارے خیال میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

"میرا خیال ہے وزیر خان!" وہ تذبذب اور فیصلہ کُن لہجے میں بولی۔ "کہ ہمیں یہاں سے بھاگ جانا چاہیے۔"

"ہمیں؟ کہاں؟ میرا مطلب ہے کیا تم بھی؟"

"ہاں۔" وہ میری بے ربط بات کے جواب میں سکون سے بولی۔ "مجھے بھی تمہارے ساتھ ہی جانا ہوگا کیونکہ تم میرے بغیر کہیں بھی نہیں جا سکتے۔ اگر تم مجھے اکیلا چھوڑ کے جاؤ گے تو خود ہی واپس آنے پر مجبور ہو جاؤ گے مگر اس وقت بہت دیر ہو چکی ہوگی اور تمہیں مجھ سے ملنے کے لیے میری قبر پر آنا پڑے گا۔ میری مرگِ ناگہاں کی کہانی سب کی زبان پر ایک ہی ہوگی کہ کس طرح ایک رات اچانک میں علیل ہوئی اور اس سے پہلے کہ طبیب یا ڈاکٹر پہنچتے میں خالقِ حقیقی سے جا ملی۔ کسی زبان سے تم رسوائی کی کوئی بات نہ سنو گے۔"

"لیکن... امینہ... اس طرح بھاگ کے ہم کہاں جا سکتے ہیں؟" میں نے فکر مند ہو کے پوچھا۔ امینہ کی بات نے مجھے سخت تشویش میں مبتلا کر دیا تھا لیکن اس تشویش میں ایک سنسنی خیز مسرت کا احساس بھی شامل تھا۔ امینہ نے ایک ایسی بات کہہ دی تھی جو میں نے تصور میں بھی نہ سوچی تھی مگر اب مجھے یوں لگتا تھا کہ یہ میرے دل کی آواز تھی اور چاہتا میں بھی یہی تھا مگر اس کا اعتراف یا اظہار کرنے کی ہمت مجھ میں نہ تھی۔

"کیا اتنی بڑی دنیا میں ہم کہیں نہیں جا سکتے؟" وہ بولی۔ "اور عشق کیا ہے تو انجام کی فکر کیسی؟ یہاں سے نہ جا کے ہم دشمنوں کو موقع فراہم کریں گے کہ وہ جس طرح چاہیں ہمیں ذلیل و خوار کریں اور سر پر لٹکتی ہوئی خوف کی تلوار کے سائے میں مر مر کے جئیں۔ ہم نکل گئے تو اپنی بے بسی پر ماتم کے سوا وہ کیا کریں گے؟ شکست انہیں ہوگی، ہمیں نہیں۔ اور اس کے بعد اپنی شکست کو فتح میں بدلنے کے لیے وہ ہماری تلاش میں خوار ہوں گے مگر سوچو وزیر خان کہ وہ ہمیں ڈھونڈنے نکلیں گے بھی تو کدھر جائیں گے؟ مشرق کی طرف یا مغرب کی طرف۔ شمال میں یا جنوب میں۔ بالفرضِ محال وہ ہمیں پکڑ کر لانے میں کامیاب ہو گئے تب بھی کیا ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ وہ ہمیں قتل کرا دیں گے نا۔ یہ اطمینان پھر بھی ہمارا ہوگا کہ ہم نے جرمِ الفت کی سزا قبول کی مگر بلیک میل ہونا منظور نہیں کیا۔"

شہزادہ خورشید عالم کی بیوی پرنسس امینہ مجبور اور مظلوم ضرور تھی لیکن وہ انتہائی ذہین اور باہمت عورت بھی تھی۔ اس کی باتوں نے مجھے قائل بھی کیا اور شرمندہ بھی۔ اور اسی شرمندگی نے میرے اندر سوئے ہوئے مرد کو جگا دیا۔ اسی روز میں نے اپنا مختصر سا سامان سمیٹا۔ امینہ نے صرف وہ زیورات لیے جو اس کو باپ کے گھر سے جہیز میں ملے تھے اور ہم اسی رات وہی کپڑے پہن کر محل سے نکل کھڑے ہوئے جو ہمارے تن پر تھے۔ یہ کپڑے بھی معمولی اور میلے تھے اور ہمارا سرمایہ ایک پوٹلی میں بندھا ہوا تھا۔ اس پوٹلی کو میں نے کندھے پر رکھی ہوئی لاٹھی سے باندھ کر لٹکا لیا تھا اگر کوئی ہمیں دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ ہم دیہاتی یا معمولی حیثیت کے غریب لوگ ہیں اور اس پوٹلی میں بھی مکئی کی روٹی اور ساگ کے سوا کیا ہوگا۔ اس کے باوجود ہم نے چھپ کے سفر کیا اور سلطان آباد کی شاہراہ سے خاصے فاصلے پر گھنے جنگل تک چلتے رہے۔ رات بھر کا یہ سفر انتہائی مشکل خطرناک اور ہمارے حوصلے کی آزمائش تھا۔ ہم راستے سے بھٹک جاتے تھے۔ ہمارا دامن کانٹوں میں الجھ جاتا تھا جس سے ہمارے کپڑے بھی پھٹ گئے تھے۔ ہمارے ہاتھوں پر اور چہرے پر خراشیں پڑ جاتی تھیں۔ ناہموار اور پُر خار اندھیرے راستوں پر ہم نے کئی بار ٹھوکر کھائی مگر ایک دوسرے کا ہاتھ نہیں چھوڑا۔ اپنی تکلیف کو خاموشی سے برداشت کیا اور ایک دوسرے کا حوصلہ بڑھاتے رہے۔ ہمیں معلوم تھا کہ سلطان آباد کا یہ گھنا جنگل ایک شکارگاہ ہے جس میں تیتر، بٹیر یا خرگوش، ہرن جیسے بے ضرر جانوروں کے علاوہ بھوکے بھیڑیے بھی گھومتے ہیں۔ بھوک میں تو گیدڑ بھی بھیڑیے کی طرح خطرناک ہو جاتا ہے۔ میں نے یہ بھی سنا تھا کہ اس جنگل میں سانپوں کی بہتات ہے مگر اس وقت ہمیں کسی کا خوف نہیں تھا اور ہم منزل کی لگن میں بڑھتے جا رہے تھے۔ ظلم و ستم، جبر و استیصال، عیش پرستی اور بے راہ روی اور مکر و فریب کی سازش کے جال سے نکل کر دنیا کے کسی گمنام گوشے میں ایک چھوٹا سا گھر بنانے کے لیے چلتے جا رہے تھے اور ایک بھیانک ماضی کی یادوں سے نجات کی خاطر خوبصورت مستقبل کے خوابوں کی طرف بڑھتے جا رہے تھے۔ مجھے معلوم نہیں کہ اُس رات ہم نے کتنی مسافت طے کی مگر صبح کا اجالا افق پر نمودار ہوا تو ہم اس جہنم سے فرار کی کوشش میں بڑی حد تک کامیاب ہو چکے تھے سورج نکلنے کے بعد میں نے دیکھا تو مجھے امینہ کے نازک ہاتھوں اور اس کے چہرے کی مخمل جیسی جلد پر اَن گنت سرخ لکیریں نظر آئیں جو کانٹوں کی زبان میں لکھی ہوئی اقرارِ محبت کی انمول تحریر تھی۔ اس نے بڑی استقامت کے ساتھ یہ سفر طے کیا تھا اور اتنی بڑی سختی صرف اس لیے جھیلی تھی کہ وہ خوشی مل جاتی جو اسے محل میں رہ کر نہیں ملی تھی۔ اسے مجھ پر اعتماد تھا کہ میں اسے ہر خوشی دے سکتا ہوں جو خریدی نہیں جا سکتی اور اپنے آپ پر اعتماد تھا کہ وہ میرے ساتھ خوش رہ سکتی ہے۔

سلطان آباد کی آخری حدود کے قریب ایک چھوٹا سا پہاڑی سلسلہ تھا مگر اس سے پہلے ایک ندی تھی جس کو صرف پل پر سے عبور کیا جا سکتا تھا اور یہ بہت خطرناک کام تھا۔ اگر نواب صاحب کو معلوم ہوا ہوگا کہ میں ان کی خاندانی عزت کا جنازہ نکال کے محل سے نکل گیا ہوں تو ان کے کارندے ہر طرف دوڑ پڑے ہوں گے اور ریاست سے باہر جانے والے تمام راستے بند کر دیے جائیں گے۔ شرافت علی اور گیان چند کو معلوم ہوگا کہ میں نے ان کے شیطانی عزائم کو خاک میں ملا دیا ہے تو وہ انتقامی کارروائی کرتے ہوئے نواب صاحب کو جھوٹ سچ سب بتا دیں گے۔ اس کے بعد اگر فوری طور پر نواب صاحب نے خودکشی نہ کی تو گیان چند معاملہ فہم ہونے کا ثبوت دے گا اور نواب صاحب کو سمجھا دیگا کہ وہ فکر نہ کریں۔ محل کی بات محل کی دیواروں سے باہر نہیں جائے گی۔ ان کی بہو پر کوئی حرف نہیں آئے گا اور اصل ملزم کو یعنی مجھے ٹھکانے لگا دیا جائے گا۔ نواب صاحب کی بہو کے بارے میں کون جان سکتا ہے کہ وہ محل میں موجود نہیں۔ پردہ دار عورت کا پردہ سلامت رہے گا۔ میرے بارے میں مشہور کر دیا جائے گا کہ

میں بہت سا مال وزر سمیٹ کر فرار ہو گیا ہوں اور میرے جیسے نمک حرام، احسان فراموش اور بے ضمیر آدمی کو قتل کر دینا کوئی جرم نہیں چنانچہ مجھے زندہ یا مردہ حالت میں نواب صاحب کے سامنے پیش کرے گا۔ اسے انعام واکرام سے نوازا جائے گا۔ رہا بیگم کا مسئلہ تو مہینے بھر بعد ان کی علالت کا اور اچانک موت کا ڈرامہ بھی کیا جا سکتا ہے اور باعزت طور پر سب کے سامنے ایک لاش دفن بھی کی جا سکتی ہے لیکن حکم نواب صاحب کا یہی ہو گا کہ وہ دونوں جہاں بھی نظر آئیں ان کو وہیں مار کے گاڑ دیا جائے۔ نواب صاحب کو پہلے ہی گیان چند پر بہت اعتماد ہے اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا تو اس کی قدر و منزلت پہلے سے بہت زیادہ ہو جائے گی۔ اگر ابھی کچھ نہ ہوا تو پرنس اور ریذیڈنٹ کی واپسی پر ضرور ہو گا۔

میں نے امینہ کے ساتھ دریا کو کس طرح تیر کر پار کیا یہ ایسی کہانی ہے جو الفاظ میں بیان نہیں کی جا سکتی۔ آج مجھے یہ کارنامہ ناممکن نظر آتا ہے مگر اس وقت جذبۂ عشق نے مجھے ناممکن کو ممکن بنا دینے کا حوصلہ عطا کر دیا تھا۔ رات بھر کے سفر کی تھکن سے چور اور خستہ جان ہونے کے باوجود میں نے امینہ کے ساتھ دریا پار کر لیا اور ہم ایک چھوٹے سے پہاڑی غار میں پناہ گزیں ہو گئے جہاں سے پل کا منظر دکھائی دیتا تھا۔ امینہ عورت تھی اور شہزادی تھی جس نے قالین اور سرسبز گھاس کے سوا کبھی سخت زمین پر پیدل سفر نہیں کیا تھا چنانچہ اس کی حالت زیادہ خراب تھی۔ اسے آرام سے لٹا کر اور تسلی دے کر میں نے پہاڑ کی سرحد کو عبور کیا۔ دوسری طرف ایک چھوٹا سا قصبہ تھا جہاں مجھے کھانے پینے کی چیزیں مل گئیں اور ایک ایسا شخص بھی مل گیا جس نے پچاس روپے لے کر مجھے اپنا ایک پرانا جوڑا بخش دیا اور امینہ کے لیے چوری چھپے بیوی کے کپڑوں میں سے بھی ایک جوڑا نکال لایا۔ ان کپڑوں کی حالت دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ شاید وہ بھنگی نظر آنے والا دیہاتی اور اس کی بیوی خود بھی یہ کپڑے استعمال نہیں کرتے ہوں گے مگر اس نے میری مدد کر کے ثواب بھی کما لیا اور پیسہ بھی۔ میں یہ چیزیں لے کر واپس غار میں پہنچا تو امینہ بے ہوش پڑی تھی۔ اِدھر اُدھر سے کچھ لکڑیاں جمع کر کے میں نے آگ جلائی اور دودھ گرم کیا۔ امینہ کے زخم صاف کیے اور مجبوراً خود ہی اس کے کپڑے بھی بدلے۔ پھر میں نے گرم دودھ بھی پیا اور زبردستی اس کے حلق سے بھی اتارا۔ ایک گھنٹے بعد وہ ہوش میں آئی، اُس وقت تک میں بھی لباس تبدیل کر چکا تھا۔ ہم دونوں نے جو کچھ کھایا جا سکا کھایا اور بے سُدھ ہو کے پڑ گئے۔ پہلے میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ شام ہو چکی ہے۔ میری حالت بہت بہتر تھی۔ تھکن اور کمزوری کے اثرات زائل ہو چکے تھے اور میں اس قابل تھا کہ رات کو پھر سفر جاری رکھ سکوں۔ امینہ بدستور فرشِ خاک پر گہری نیند میں تھی۔ اس کے اور اپنے کپڑوں کو اور فقیرانہ حلیے کو دیکھ کر بے اختیار ہنسی آئی۔ پھر ایک دکھ کا احساس غالب آ گیا۔ یہ محلوں کی رہنے والی عورت تھی جو سرسراتے ریشم کے گل رنگ ملبوس پہنتی تھی۔ خوشبو اور لطافت کا پیکر تھی۔ شاہانہ خواب گاہ میں بالوں سے زیادہ ملائم گدّوں کی آغوش میں سوتی تھی مگر وہ اس وقت اتنے سکون سے کھردری ناہموار اور پتھریلی زمین پر سو رہی تھی کہ حیرت ہوتی تھی۔ یہ بالکل الف لیلیٰ کی کہانیوں کی طرح لگتا تھا کہ گڈریا بادشاہ کی بیٹی پر فریفتہ ہو گیا اور شہزادی کو ایک جن کی قید سے نکال لایا اور پھر شہزادی نے گڈریے سے شادی کر لی۔ ایسی محبت میرے لیے بالکل نیا تجربہ تھی۔ میں نے محسوس کیا اس محبت پر غرور کی خوشی کے سوا میرے دل میں کوئی جذبہ نہیں ہے۔ نہ خوف کا، نہ پشیمانی کا، نہ بارِ گناہ کا۔ میں غار کے دہانے پر آ کھڑا ہوا اور دریا کے پار سلطان آباد کی طرف دیکھنے لگا۔ سورج میرے پیچھے پہاڑ کی بلندی میں غروب ہو چکا تھا لیکن سامنے اب بھی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ اچانک میں نے سڑک پر ریاستی نشان والی گاڑی دیکھی۔ گاڑی پل پر پہنچ کے رک گئی اور اس میں سے چار آدمی اترے۔ ان میں سے دو مسلح محافظ تھے جن کی رائفلیں کندھے پر لٹکی ہوئی تھیں۔ ان کے ساتھ شرافت علی اور گیان چند تھے جن کو میں نے صاف شناخت کر لیا۔ انہوں نے پُل کے دونوں کناروں پر کھڑے ہوئے محافظوں سے بات کی جن کو ابھی تک میں نہ دیکھ سکا تھا۔ شرافت علی نے پُل کے دونوں جانب ہاتھ سے اشارہ کیا اور شاید یہ پوچھا کہ کسی نے دریا کو پار تو نہیں کیا کیونکہ جواب میں سنتری نے گردن ہلا کر کسی بات کی تردید کی تھی۔ شرافت علی اس کے باوجود بہتے دریا کے پانی اور دریا کے پاٹ کو دیکھتا رہا۔ ایک بار اس کی نگاہ پہاڑی سلسلے پر بھی گئی اور ایک لمحے کے لیے میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔ بے شک میں گہرے سائے میں اور چٹان کے پیچھے تھا مگر اسی وقت امینہ اٹھ کے باہر آ جاتی یا شرافت علی دوسرے کنارے سے غار تک پہنچنے کا فیصلہ کر لیتا تو ہم پکڑے جاتے۔ میرا خیال ہے کہ دریا کی تیز رفتاری اور چوڑائی کو دیکھنے کے بعد وہ خود بھی قائل ہو گیا کہ ہم پل پر سے نہیں گزرے تو یہ بھی ناممکن ہے کہ اس مقام سے دریا کو عبور کر گئے ہوں۔ اس نے سوچا ہو گا کہ ہم ابھی تک جنگل ہی میں بھٹک رہے ہیں اور اگر ہم نے تیر کر دریا کو پار کیا ہو گا تو پل کے اتنے قریب سے نہیں کیا ہو گا۔ چنانچہ وہ جدھر سے آیا تھا، ادھر ہی چلا گیا۔ میں نے دریا پار کرنے کی جس دیوانہ وار ہمت کا مظاہرہ کیا تھا اسی نے ہمیں بچایا اور مجھے محبت کی اس طاقت پر اعتبار آیا جس کی مدد سے فرہاد نے پہاڑ کاٹ کر قصرِ شیریں تک دودھ کی نہر نکال دی تھی۔

سورج غروب ہونے کے بعد جب رات نے اپنا دامن پھیلایا تو میں نے اور امینہ نے "ڈنر" کیا۔ جو کھانے پینے کی بچی ہوئی چیزوں پر مشتمل تھا اور ایک دوسرے کو دیکھ کر بہت ہنسے۔ ہمیں شرافت علی اور گیان چند کے ناکام لوٹ جانے کی بات پر بھی ہنسی آئی۔ اصل بات یہ تھی کہ ہم بہت خوش تھے اور اس وقت کوئی ہمیں گرفتار کرنے بھی آ جاتا یا ہمارے سامنے شیر آ کھڑا ہوتا تب بھی ہم اسی طرح ہنستے رہتے اور ہنستے ہنستے ہی مر بھی جاتے۔ اس رات ہمارا سفر زیادہ دشوار نہیں رہا۔ ہم اس بستی سے نہیں گزرے جہاں سے میں نے کھانے پینے کی چیزیں لی تھیں اور کپڑے خریدے تھے۔ کپڑے دینے والا ایسا ہی آدمی تھا کہ مزید پچاس روپے ملتے تو وہ میرا مکمل حلیہ بیان کر دیتا اور یہ بھی بتا دیتا کہ میں پہاڑوں کی طرف چلا گیا ہوں۔ آدھی رات کے بعد ہم دوسری بستی میں پہنچے اور ایک جھوٹی کہانی سنائی کہ ہم میاں بیوی اپنی بیل گاڑی میں آ رہے تھے کہ راستے میں بدمعاشوں نے ہماری بیل گاڑی چھین کر ہمیں پیدل کر دیا۔ جس دروازے پر ہم نے دستک دی تھی وہ ایک مسلمان جولاہے کا گھر تھا۔ اس نے ہمیں اپنے چھوٹے سے گھر میں پناہ دی اور سونے کی جگہ فراہم کی۔ اگلے روز ہم اس گاؤں سے روانہ ہو گئے۔ اس وقت تک سلطان آباد کے بارے میں بہت سی سنسنی خیز خبریں اور افواہیں پھیل چکی تھیں۔ کچھ لوگ بتاتے تھے کہ نواب صاحب نے خودکشی کر لی، کچھ کہتے تھے کہ نواب صاحب نے انگریز حاکم کی بیوی کو اغوا کر لیا تھا اور انگریز نے دونوں کو گولی مار دی۔ مشہور یہ بھی تھا کہ بیٹے نے ریاست پر حکومت کی خاطر باپ کو قتل کر دیا اور موت کو خودکشی قرار دے دیا۔ جتنے منہ تھے، اتنی باتیں تھیں۔ حقیقت بہرحال یہ تھی کہ نواب صاحب اپنی آن پر قربان ہو گئے تھے۔ یا انہوں نے بدبخت بیٹے کے گناہوں کا کفارہ اپنی جان دے کر ادا کر دیا تھا۔ بعد میں پرنس اور ریذیڈنٹ کے درمیان ایک زبردست جنگ چھڑ گئی، جس کی بنیاد ذاتی رقابت اور دشمنی کے جذبات پر مبنی تھی، جس کے نتیجہ میں ریذیڈنٹ کو تبدیل کر دیا گیا تھا۔ چونکہ وہ حاکموں کے طبقے کا آدمی تھا اور واقعی اس کا تعلق شاہی خاندان سے تھا۔ اس لیے وہ مسلسل ترقی کرتا رہا اور کسی صوبہ کا لیفٹیننٹ گورنر بھی بن گیا مگر یہ بہت بعد کی بات ہے۔ اس جھگڑے میں شرافت علی اور گیان چند کو بھی جان بچا کے فرار ہونا پڑا۔ شرافت علی میرٹھ پہنچا اور گیان چند لاہور۔ میں امینہ کے ساتھ دس سال تک مختلف مقامات پر پھرتا رہا۔ تین سال ہم نے جنوبی ہندوستان میں گزارے اور مدراس کے قریب رہے۔ وہاں سے آسام گئے اور دو سال بعد پنجاب کے شہر امرتسر آ گئے۔ میرا اپنا گھر میرٹھ میں ہی تھا جہاں میرے والدین میری طرف سے سخت پریشان تھے کہ آخر میں نے ایسا کیا جرم کیا ہے کہ چھُپ چھپا کر بھی میرٹھ نہیں پہنچ سکتا لیکن جب تک شرافت علی میرٹھ میں تھا، میرے وہاں جانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے اپنے گھر والوں کو نہ کبھی اپنا پتہ دیا تھا اور نہ امینہ کے بارے میں کچھ بتایا تھا۔ ڈرنے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ خط غلط ہاتھوں میں پڑ جاتا تو میرے خلاف میرے ہی ہاتھ کی لکھی ہوئی اعترافِ جرم کی تحریر بن جاتا یا خود میرے گھر والوں کی زبان سے نادانستگی میں کوئی بات نکل جاتی تو میرا راز افشا ہو جاتا لیکن خوف کی دوسری وجہ زیادہ اہم ہے۔ دس سال میں ہمارے پانچ بچے ہو چکے تھے لیکن ہمارا نکاح نہیں ہوا تھا۔ مذہب اور قانون کی رو سے امینہ ایک شوہر کی موجودگی میں دوسرا شوہر نہیں کر سکتی تھی۔ بے شک ہم مجرم تھے اور گنہگار تھے لیکن ہم مجبور تھے اور دنیا کے بعد آخرت میں اپنے لیے ہر سزا قبول کر چکے تھے۔ میرے ساتھ محل کی زندگی کو لات مار کے خانہ بدوشی اختیار کرتے وقت امینہ ایک بچے کی ماں بننے والی تھی۔ ظاہر ہے یہ بچہ میرا نہیں، شہزادہ خورشید عالم کا تھا جو ایک ریاست کا حاکم تھا اور بہت طاقت ور شخص تھا۔ اس بچے کا نام میں نے کبیر خان اور اس کی ماں نے سکندر بخت رکھا تھا۔

حفظِ ماتقدم کے طور پر امینہ نے اپنا نام بدل کے سلطانہ رکھ لیا تھا اور میں نے سلطان۔ مقصد صرف یہ تھا کہ خدانخواستہ کبھی پرنس سے نواب خورشید عالم بن جانے والے امینہ کے شوہر کو ہماری خبر مل جائے تو وہ حقوقِ زوجیت یا کبیر پہ حقوقِ ولدیت کا دعویٰ نہ کر سکے۔ تقسیم کے بعد ریاستیں ختم ہو گئیں اور سابق حکمرانوں کا گزارا سرکاری وظائف پر ہو رہا تھا لیکن اس سے پہلے بھی برطانوی حکومت کا قانون غالب تھا اور ریاست کی حدود سے باہر نواب خورشید عالم ہمیں کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا تھا۔ اس کے باوجود ہم ڈرتے رہے اور کہیں بھی جم کر نہیں رہ سکے۔ ہر جگہ ہمیں یہ خطرہ لاحق رہتا تھا کہ نواب کے کسی حواری نے یا ریاست کے کسی باشندے نے ہمیں دیکھ لیا تو خبر آگے پہنچ جائے گی چنانچہ ہم اپنے ٹھکانے بدلتے رہتے تھے اور حسبِ ضرورت نام بھی۔

میں ثواب وعذاب کے فلسفے کو سمجھنے کا دعویٰ نہیں رکھتا۔ یہ نہیں کہتا کہ ہم گنہگار نہ تھے اور یہ نہیں سمجھتا کہ ہمارا جرم قابلِ معافی ہے لیکن میں نے سزا و جزا کا فیصلہ داورِ محشر پر چھوڑ دیا تھا جو نیتوں کا حال جانتا ہے اور ظاہری اعمال کو نہیں دیکھتا۔ عفو و درگزر ... ہے اور بہت مہربان اور بڑا رحم کرنے والا ہے۔ ہم نے ہمیشہ بڑے عجز کے ساتھ اس کے سامنے سر جھکایا اور اپنی غلطی پر صدقِ دل سے معافی مانگی۔ دنیا میں انسانوں پر بہت کچھ حرام کیا گیا ہے لیکن مخصوص حالات میں جہاں زندگی اور موت کا سوال ہو اور جان بچنے کی کوئی صورت نہ ہو، وہاں حرام کو بھی حلال کر دیا گیا ہے چنانچہ دنیا جو چاہے کہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے جان بچائی تھی اور ایک مطمئن اور پُرسکون زندگی گزاری تھی۔ آخرت میں ہمارے لیے کوئی سزا تھی تو ہم اس کے لیے راضی برضا تھے... اُس مجرم کی طرح جس نے ایک جائز مقصد کی خاطر ہنسی خوشی سزائے دار و رسن قبول کی ہو۔ لوگ کہتے ہیں کہ سلطانہ کی اور ہمارے تمام بچوں کی موت ہمارے گناہوں کی سزا تھی اور سکندر اس لیے بچ گیا کہ وہ اپنے باپ کی جائز اولاد تھا۔ منطقی اعتبار سے لوگوں کی بات غلط نہیں معلوم ہوتی مگر میرا دل یہ بات نہیں مانتا۔ قدرت کے نظامِ انصاف کو سمجھنے کا دعویٰ فانی انسان کیسے کر سکتا ہے۔ اس دورِ جنوں خیز میں تو لاکھوں مارے گئے تھے۔ ان میں معصوم شیرخوار بچے بھی تھے جو گناہ کے مفہوم سے بھی نا آشنا تھے اور جن کی پاک دامنی کی قسم فرشتے بھی کھا سکتے تھے۔

قصہ مختصر... کئی سال تک در بدر پھرنے کے بعد ایک وقت ایسا آیا جب ہم نے محسوس کیا کہ وہ پُرخطر اور پُرآشوب زمانہ ختم ہو چکا ہے جو ہم نے جلاوطنی میں گزار دیا۔ شاید نواب خورشید عالم کو یاد بھی نہ ہوگا کہ پرنسس امینہ کو باعزت طور پر "دفن" کرتے وقت انہوں نے اپنے حلقۂ احباب اور اپنی رعایا کو اس کی المناک موت کی کیا کہانی سنائی ہوگی اور ان کا حرم حسبِ سابق اسی طرح آباد رہا ہوگا اور انتقام کے جذبات شراب و شباب کی مستی میں دم توڑ چکے ہوں گے۔ انگریز ریذیڈنٹ شاید وطن واپس لوٹ گیا ہوگا یا ہندوستان میں ہوا تو نہ جانے کہاں اور کس عہدے پر ہوگا۔ یہ ناممکن ہے کہ ابھی تک وہ اپنی بیوی کے مبینہ قاتل کی تلاش میں روزِ اوّل کی طرح سرگرداں ہو۔ وقت بہت بڑا چارہ گر ہے اور گہرے سے گہرے زخم کو اپنی مسیحائی سے مندمل کر دیتا ہے۔ جذبات کی شدت کم ہوتے ہوتے ختم ہو جاتی ہے اور بڑے سے بڑا سانحہ ایک بھولی بسری یاد بن کے ماضی کے صحرا کی گرد میں دفن ہو جاتا ہے۔

گیان چند کا تو مجھے علم ہی نہ تھا لیکن شرافت علی کے بارے میں مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ میرٹھ میں ہے اور وہاں کوئی بزنس کر رہا ہے۔ میرا یہ بھی خیال تھا کہ شرافت علی بھی پرانی باتیں بھلا چکا ہوگا۔ شاید وہ اپنے کیے پر شرمسار بھی ہو اور اب مجھے کوئی بھی نقصان پہنچانا اس کے لیے ممکن ہی نہ ہو۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ میری عدم موجودگی میں میرے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ آخری وقت تک وہ اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے مجھے یاد کرتے رہے اور ایک ایک سے التجا کرتے رہے کہ کسی طرح میرے وزیر خان کو بلا لاؤ۔ اس سے کہو کہ آخری بار مجھے اپنی صورت تو دکھا جائے لیکن کوئی بھی ان کے لیے کچھ نہ کر سکا۔ کسی کو معلوم ہی نہ تھا کہ میں کہاں ہوں۔ مجھے قانون کی گرفت میں آنے کا ڈر نہیں تھا۔ بھیس بدل کے یا رات کے اندھیرے میں چوری چھپے میرٹھ ہو آنا کوئی مشکل کام نہ تھا مگر میں اپنے گھر والوں کو اپنا چہرہ دکھاتے ہوئے ڈرتا تھا۔ یہ بتاتے ہوئے ڈرتا تھا کہ میں ایک غیر مرد کی شادی شدہ بیوی کو اس کے گھر سے نکال لایا ہوں اور میں نے اس سے نکاح بھی نہیں کیا ہے لیکن میں پانچ بچوں کا باپ ہوں۔ میں اپنے باپ کو اور اس کی فطرت کو سمجھتا تھا اور اپنی ماں کو بھی جانتا تھا۔ وہ حالات کا عذر کبھی قبول نہ کرتے اور مجھے کبھی معاف نہ کرتے۔ میری وجہ سے وہ ... اپنی نظر میں گر جاتے اور یہ صدمہ ان کے لیے ناقابلِ برداشت ہوتا۔ میں اپنے بہنوں اور بھائیوں کو کیسے منہ دکھاتا؟ اور خدانخواستہ شرافت علی پرانی تصویریں لے کر پرانے واقعات سنانے آ جاتا تو میرے گھر کی عزت خاک میں مل جاتی۔

والد کے انتقال نے مجھے اپنا بن باس ختم کر کے گھر لوٹنے پر مجبور کر دیا۔ مرنے سے پہلے وہ میری سب بہنوں کی رخصتی کر چکے تھے اور میرا واحد بھائی جو فوج میں تھا، برما کے محاذ سے لوٹ کر نہیں آیا تھا۔ گھر میں صرف میری ماں رہ گئی تھی۔ اگرچہ میرے تمام خطوط یکطرفہ ہوتے تھے لیکن سال چھ مہینے میں مجھ کو کسی نہ کسی ذریعے سے گھر کے حالات کا پتہ چلتا رہتا تھا۔ جب میں گھر پہنچا تو میری ماں روتے روتے بے ہوش ہو گئی۔ اس نے مجھے اپنے بوڑھے ہاتھوں سے بہت مارا اور بہت کوسا کہ نامراد، بے غیرت... اب بھی آنے کی کیا ضرورت تھی اور کچھ دن کے بعد میری قبر پر آ جاتا۔ میں نے اس کے پاؤں پکڑ لیے اور رو دھو کے اپنی مجبوریوں کی ایک جھوٹی کہانی سنائی۔ وہ ماں تھی، مجھے معاف کر کے گلے سے کیوں نہ لگاتی جو قدرت نے اچانک اسے ایک جوان بیٹا لوٹا دیا تھا۔ اس کے ...

... سلیقہ مند اور خدمت گزار بہو اور اس کے بچوں کے وجود ... مالا مال کر دیا تھا۔ وہ اکیلی نہیں رہی تھی۔ بہت جلد وہ ... کچھ بھول گئی۔ سلطانہ نے یعنی امینہ نے گھر کو سنبھال لیا ... نے باپ کے کاروبار کو۔ سلطانہ کے بارے میں اپنی ... میں نے کوئی بات سچ نہیں بتائی اور صرف یہ کہا کہ اپنی ... ذات کے پٹھانوں کی لڑکی ہے اور ماں باپ بہت عزت دار ... تھے لیکن ان کا انتقال ہو جانے کے بعد اب دنیا میں ... کا کوئی نہیں ہے۔ ایسی باتوں کا مقصد ایک طرف تو ... ماں کو مطمئن کرنا تھا اور دوسری طرف بہو کی حیثیت سے ... میں سلطانہ کی قدر و منزلت میں اضافہ کرنا تھا۔ میری ... بہن انڈین آرمی کے کسی میجر سے بیاہی گئی تھی جو آخری ... اطلاعات کے مطابق ڈیرہ دون کی ملٹری اکیڈمی میں انسٹرکٹر ... اور دوسری بہن شادی کر کے سنگاپور چلی گئی تھی۔ ایسے میں ... سلطانہ کا اور میرا گھر پہنچنا بہت مبارک ثابت ہوا اور اس ... ویران گھر کی رونق اور خوشی لوٹ آئی۔ لیکن یہ خوشی بہت ... عارضی ثابت ہوئی۔ دو مہینے بعد جب میں کاروبار بھی سنبھال ... چکا تھا، میری ماں کا انتقال ہو گیا۔ تعزیت کے لیے آنے ... والوں میں میر شرافت علی بھی تھا۔ اس نے مجھے دیکھ کر کسی ... حیرانی کا اظہار نہیں کیا۔ یوں جیسے وہ پہلے سے میری موجودگی ... سے باخبر تھا۔ اس نے بڑی شرافت سے بات کی اور دوسرے ... لوگوں کی طرح دم دلاسہ دینے کا اخلاقی فرض پورا کر کے چلا ... گیا۔ میں نے اس کو سوئم اور چہلم پر بھی دیکھا۔ بعد میں اس ... آتے جاتے بڑھتے میل ملاقات بڑھائی اور ایک پرانے تعلق ... دوستی کی بنیاد بنا لیا۔ جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ شرافت علی ... کے ذہن میں سلطان آباد میں پیش آنے والے واقعات ... کی اہمیت نہیں رہی تو خود میں نے ایک دن اس ... سے پوچھا کہ میرے اور پرنس امینہ کے فرار ہو جانے کے بعد ... دوسرے لوگوں کا ردِعمل کیا تھا؟

"سب سے زیادہ صدمہ نواب صاحب کو ہوا تھا۔" ... انہیں تم سے یا اپنی عالی نسب بہو سے یہ امید نہ ... تھی ... ان کے ناموس کا خون کر دو گے۔ ان میں دنیا کے ... سامنے رسوا ہونے کی ہمت نہ تھی چنانچہ انہوں نے خودکشی ... کر لی تھی۔"

"یہ تو مجھے بھی معلوم ہو گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "پرنس کا ... کیا تھا؟"

"... وہی جو کسی بھی غیرت مند شوہر کا ہونا چاہیے تھا۔" ... "اس نے قسم کھائی تھی کہ تم جہاں بھی ملو گے اور جب بھی ملو گے، وہ تمہیں زیادہ بے آبرو کر کے اور زیادہ عذاب دے کر قتل کر دے گا۔"

"تمہارے خیال میں وہ ابھی تک اپنے اس عہد پر قائم ہوگا؟" میں نے کہا۔

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" شرافت علی بولا۔ "پرنس عیاش اور شوقین مزاج آدمی تھا۔ اس نے بعد میں کوئی شادی نہیں کی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کی راتیں بدستور آباد رہیں۔ درحقیقت پرنس میں بہت سی خوبیاں باپ کی طرح تھیں مثلاً یہ کہ وہ ذہین تھا۔ ریاست کے معاملات کو سابقہ روایت کے مطابق چلانے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ وہ مزاج کا ضدی اور اپنی انا کے معاملے میں انتہائی خود پرست تھا۔"

"کیا دوسری شادی نہ کرنا بھی اس کی قسم میں شامل تھا؟" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

"میں نے یہی سنا ہے۔" شرافت علی بولا۔ "کہ جب تک پرنس اپنی قسم پوری نہیں کرے گا، شادی بھی نہیں کرے گا۔ اب وہ ذمے دار اور سنجیدہ مزاج آدمی ہے۔ کوئی بے فکرا نوجوان نہیں ہے۔ نواب کا حرم کتنا ہی آباد کیوں نہ ہو، اس میں بیوی کی جگہ تو خالی رہتی ہے اور اس کا احساس بھی برقرار رہتا ہے۔"

"اپنی بیوی کی بے وفائی کے داغ کو اس نے دنیا سے کس طرح چھپایا تھا؟ اتنا اندازہ تو مجھے تھا کہ وہ اس خبر کو محل کی دیواروں سے باہر نہیں نکلنے دے گا۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔ نواب صاحب کی خودکشی کو ایک حادثہ قرار دیا گیا تھا۔" شرافت علی نے کہا۔ "اور کہا یہ گیا کہ وہ اپنی شکاری بندوق کا معائنہ کر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ میگزین خالی ہے لیکن اس میں ایک گولی تھی ـــــ جو ٹریگر دباتے ہی چل گئی۔ اس کے گواہ محل کے ہی دو خادم بنے۔ ان میں سے ایک گیان چند تھا۔ جب پہلے گواہ کی لاش ایک رات تالاب میں تیرتی ہوئی پائی گئی تو گیان چند کو اپنی فکر لاحق ہوئی اور وہ صبح ہونے سے پہلے ہی فرار ہو گیا۔ پھر وہ ملازم پُراسرار طور پر غائب ہو گئے جو امینہ کی خدمت پر مامور تھے اور جن سے افشائے راز کا ڈر تھا۔ بے شک وہ پرانے خدمت گار تھے اور محلوں کے راز کو راز رکھنا جانتے تھے مگر پرنس نے کوئی خطرہ مول لینا مناسب نہیں سمجھا۔ اگر وہ غلطی سے بھی کہہ دیتے کہ بیگم صاحبہ تو خواب گاہ یا محل میں موجود ہی نہیں ہیں تو ڈرامہ آگے کیسے چلتا؟ بعد میں دوسرے ملازموں کو سختی سے تاکید کر دی گئی کہ وہ اس

حصّے میں قدم بھی نہ رکھیں جہاں پرنسس امینہ اور شہزادہ خورشید عالم کا قیام تھا کیونکہ نواب بیگم کی علالت کے باعث ڈاکٹروں نے سب ملنے جلنے والوں پر پابندی عائد کر دی ہے یہاں تک کہ خود نواب خورشید عالم بھی ان کے کمرے میں نہیں جا سکتے۔ محل میں بہت سے اجنبی چہرے نظر آتے جن کے بارے میں کہا گیا کہ دہلی اور کلکتہ سے آئے ہوئے بڑے بڑے ماہر ڈاکٹر ہیں۔ تاہم صرف ایک ہفتہ بعد نواب بیگم کا انتقال ہو گیا اور ان کو خاموشی سے محل کے احاطے ہی میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔"

"اور وہ لاش کس کی تھی جو دفنائی گئی تھی؟" میں نے کہا۔

"صورت تو کسی نے بھی نہیں دیکھی ہو گی۔" شرافت علی بولا۔" وہ پردہ دار بیوی تھی۔ مرنے کے بعد بھی شوہر کے سوا کوئی نامحرم اس کا چہرہ کیسے دیکھ سکتا تھا۔ کفن میں کسی عورت کی لاش تھی یا مرد کی۔ وہ لاش کہاں سے حاصل کی گئی تھی؟ یہ سب باتیں غیر اہم تھیں۔"

"کیوں؟ امینہ کے والدین اور اس کے بھائی بھی تو تھے۔" میں نے کہا۔

شرافت علی ہنسا۔" ان کی مرضی شامل نہ ہوتی تو یہ ممکن ہو سکتا تھا؟ وہ بھی نواب کے خاندان کی طرح اونچی ناک والے تھے۔ انہوں نے نواب سے کہا ہو گا کہ ہمارے گھر سے جانے کے بعد وہ تمہارے گھر کی عزت تھی۔ باپ کے گھر سے بیٹی کی ڈولی اٹھتی ہے اور شوہر کے گھر سے صرف جنازہ اٹھتا ہے۔ اب تم جیسے چاہو اپنی عزت کا جنازہ اٹھاؤ، ہم دخل نہیں دیں گے۔ ان کی بیٹی کے فرار ہونے کی بات لوگوں کی زبان پر آ جاتی تو وہ بھی کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتے۔ چنانچہ انہوں نے داماد کا ساتھ دیا۔"

میں کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ یہی بات مجھ سے امینہ نے بھی کہی تھی کہ تم واپس آ گئے بھی تو تمہیں صرف میری قبر ملے گی۔ قبر اب بھی موجود تھی مگر چند لوگوں کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس میں پرنسس امینہ کی ہڈیاں نہیں ہیں۔ امینہ اب سلطانہ تھی اور میرے ساتھ تھی اور میں خود بھی زندہ تھا۔ اگر اس رات میں اور امینہ محل سے نہ نکلتے تو آج میرا بے نشان مدفن بھی امینہ کے مزار سے بہت دور ہوتا۔

"اور وہ جو ریذیڈنٹ تھا... جان سائمن؟" میں نے کہا۔ "کیا گیان چند نے اور تم نے اسے بتا دیا تھا... تمہارے پاس تو ناقابلِ تردید ثبوت تھے۔"

"سیدھی بات تو یہ ہے بھائی وزیرخان!" شرافت علی مجھ سے نظر ملائے بغیر بولا۔" کہ یہ ساری اسکیم گیان چند نے بنائی تھی۔ تم مانو یا نہ مانو اور میں اس کا ساتھ دینے پر مجبور ہو گیا تھا۔ تمہارے چلے جانے کا گیان چند کو بہت سخت ملال تھا لیکن بعد میں اس کو بھی جان کے لالے پڑ گئے تو وہ [illegible] سے اور بڑی عجلت میں جان بچا کر بھاگا تھا لیکن جانے سے پہلے اس نے وہ تصویریں جان سائمن کو ارسال کر دیں۔ [illegible] دن کی بجائے ہفتے بھر بعد سائمن جب پرنس کے ہمراہ آگرہ سے لوٹا تو اس نے اپنی ڈاک دیکھی۔ ڈاک میں وہ تصویریں بھی شامل تھیں۔ غصّہ میں پاگل ہو کے وہ رائفل سمیت پرنس کے پاس پہنچا مگر محل میں ایک کہرام مچا ہوا تھا۔ نواب صاحب نے واپس آتے ہی بیٹے کو بتا دیا تھا کہ وہ جس عورت کی عزت کا رکھوالا تھا وہ اس پر تھوک کے ایک ادنیٰ ملازم کے ساتھ جا چکی ہے۔ وہ دوسروں کی عزت سے کھیلنے میں مصروف تھا اور مکافاتِ عمل سے غافل ہو گیا تھا۔ یہ بھول گیا تھا کہ اس کی اپنی عزت بھی تماشا بن سکتی ہے لیکن وہ خود تماشا بنیں گے اور نہ تماشائی۔ اس کے بعد انہوں نے بیٹے کو [illegible] کی وصیت کی ہو گی اور سمجھایا ہو گا کہ اس مسئلے کو باعزت طور پر کیسے حل کرنا ہے چنانچہ ریذیڈنٹ پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ "اتفاقیہ" گولی چل جانے سے نواب صاحب کی وفات ہو گئی ہے۔ سائمن غصّہ میں پاگل ہو رہا تھا۔ وہ پرنس کو [illegible] ایک طرف لے گیا اور تصویریں اس کے سامنے رکھ دیں۔ اس وقت تک گیان چند بھی وہیں موجود تھا اور یہ باتیں مجھے اسی [illegible] معلوم ہوئی ہیں۔ پرنس نے تصویروں کو بڑے سکون سے دیکھا اور کہا سوری ریذیڈنٹ صاحب میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا کیونکہ یہ شخص وزیرخان جو آپ کی بیوی کا قاتل ہے محل سے فرار ہو گیا ہے اور وہ نمک حرام جاتے وقت کروڑوں کے ہیرے جواہرات اور میری بیوی کے زیورات بھی لے [illegible] ہے۔ ریذیڈنٹ نے کہا کہ تم جھوٹ بکتے ہو کیونکہ تم [illegible] بچانا چاہتے ہو۔ وہ تمہارا خاص آدمی تھا تم اس پر بہت اعتماد کرتے تھے اور اسے انتہائی ایماندار کہتے تھے۔ [illegible] نے کہا کہ میرے اندازے غلط تھے اور مجھے اس آدمی [illegible] میں دھوکا ہوا۔ وزیرخان بہت بدمعاش اور مجرمانہ ذہن کا مالک تھا۔ کہتے ہیں کہ عالمِ دیوانگی میں ریذیڈنٹ نے پرنس کی بات نہیں مانی اور اس پر رائفل تان لی [illegible] وزیرخان کہاں ہے؟ پرنس نے آسانی سے اس کو قابو کر لیا [illegible] کی رائفل سے نشانہ لے کر کہا کہ مسٹر سائمن، اگر میں چاہتا تو تم کو اسی وقت گولی مار کے تمہاری لاش برطانوی حکومت کو ارسال کر سکتا ہوں کہ تمہارا یہ ریذیڈنٹ مجھے قتل کرنے کی نیت سے محل میں داخل ہوا تھا۔ تم جانتے ہو کہ یہاں اسلحہ لے کر کوئی نہیں آ سکتا۔ محل کے بہت سے ملازموں نے تمہیں رائفل سمیت اندر آتے دیکھا ہے اگر نہ دیکھا ہوتا تب بھی کوئی فرق نہ پڑتا... کیونکہ وہ میرے ملازم ہیں اور میرے خلاف گواہی دینے کی ہمت نہیں کر سکتے۔ ان کی زبان وہی کہے گی جو میں کہوں گا۔ اس سے بھی زیادہ آسان کام میرے لیے تم کو نواب صاحب کا قاتل ثابت کر دینا ہو گا۔ تم عین اسی وقت یہاں پہنچے ہو جب نواب صاحب اتفاقیہ گولی چل جانے سے وفات پا چکے ہیں۔ میں پولیس کے آنے تک تمہارے ہاتھ پیر باندھ کر تمہیں قید رکھ سکتا ہوں۔ پولیس کے سامنے میں بیان دوں گا کہ نواب صاحب کو تم نے ہلاک کیا ہے اور یہاں محل کے سارے ملازم یک زبان ہو کر کہیں گے کہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے تمہیں نواب صاحب پر گولی چلاتے ہوئے دیکھا ہے۔ تمہارے اور نواب صاحب کے اختلافات پرانے ہیں جن کا علم وائسرائے کو بھی ہے واقعاتی شہادت اور چشم دید گواہوں کی موجودگی میں تمہارا قانون، تمہارا عہدہ اور شاہی خاندان سے تمہارا تعلق سب مل کر بھی تم کو بچا نہیں سکیں گے لیکن میں تم کو بخش رہا ہوں۔ اس لیے کہ تمہیں میری اور مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ تم وزیرخان کے خلاف الگ رپورٹ درج کراؤ گے کہ اس نے تمہاری بیوی کو قتل کر دیا ہے اور تمہاری حکومت ایک ریذیڈنٹ کی بیوی کے قاتل کو گرفتار کرنے کے لیے اپنے تمام وسائل بروئے کار لانے پر مجبور ہو جائے گی۔ دوسری رپورٹ میں لکھواؤں گا کہ میرا سیکرٹری وزیرخان دس لاکھ مالیت کے ہیرے جواہرات چوری کر کے فرار ہو گیا ہے۔ اس کی گرفتاری کے لیے میں اپنے طور پر ایک لاکھ روپے کا انعام رکھوں گا، جو پولیس دے گی۔"

"اور کیا انہوں نے واقعی ایسا کیا تھا؟" میں نے ڈوبتے دل کے ساتھ کہا۔

"تمہیں نہیں معلوم؟" شرافت علی نے حیرانی سے مجھے دیکھا۔ "[illegible] تمام اخبارات میں شائع ہوئی تھی۔ تمہاری تصویر کے [illegible] بعد میں پولیس کی جانب سے پبلک کے لیے ایک [illegible] دیا گیا تھا کہ تمہیں گرفتار کر کے پیش کرنے والے کو [illegible] سراغ دینے والے کو ایک لاکھ روپے کا انعام ملے گا۔ [illegible] بھی تمہاری تصویر تھی۔ تمام صوبوں کی پولیس کو بھی اس تصویر کی نقل فراہم کی گئی تھی۔ کمال کی بات ہے کہ تم نے نہیں دیکھی۔"

"یہ کمال کی نہیں تقدیر کے یاور ہونے کی بات ہے۔" میں نے کہا۔" میں ایسے گمنام مقامات پر رہا جہاں عام طور پر اخبارات ہی نہیں پہنچتے تھے۔ خواص کا ایک طبقہ اخبارات پڑھتا تھا مگر ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں تھی اور ان کا مجھ سے دور کا بھی تعلق نہ تھا۔"

"پھر بھی پولیس تو تمہیں شناخت کر سکتی تھی؟"

"پولیس کی مت پوچھو۔" میں نے ہنس کر کہا۔" تھانے میں ایسے کیس روز آتے ہیں اور مفرور مجرموں کی تصویریں ان کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ سیکڑوں تصویریں پرانے ریکارڈ میں پڑی ہوں گی۔ ان سب کی صورت اور ان کے حلیے کسی کو کیا یاد رہ سکتے ہیں؟"

"تم ایک بہت اہم بات کو نظرانداز کر رہے ہو وزیرخان!" وہ بولا۔" تم ایک لاکھ کی رقم کو نظرانداز کر رہے ہو۔ عام طور پر انعام کی رقم پانچ سو یا ہزار سے زیادہ نہیں ہوتی۔ کسی حوالدار یا سپاہی کی نظر سے دیکھو۔ اپنے پورے ملازمت کے دور میں وہ جتنی تنخواہ یا رشوت لے سکتا ہے، یہ رقم اس سے کہیں زیادہ تھی اور یک مشت مل رہی تھی اور جائز طور پر۔ تھوڑا تھوڑا بچا کے تو کوئی تھانیدار بھی ایک لاکھ جمع نہیں کر سکتا۔ اتنے بڑے انعام کی امید میں نیچے سے اوپر تک سب اتنے مستعد ہو گئے ہوں گے کہ انہیں ہر شخص وزیرخان ہی نظر آتا ہو گا اور یہ بھی کیا معلوم کتنے محض تمہاری صورت سے مشابہت رکھنے کے جرم میں خواہ مخواہ پکڑ لیے گئے ہوں گے۔"

"ایسی صورت میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ مارنے والے ہاتھ سے بچانے والا ہاتھ زبردست ہے۔" میں نے کہا۔" میں سارے ہندوستان میں گھومتا پھرا اور نام بدلنے کے سوا کوئی احتیاط بھی نہیں کی۔ علم ہوتا تو میں چہرہ بھی بدل لیتا مگر میں سمجھ رہا تھا کہ معاملات دب گئے۔"

"معاملات کیسے دب سکتے ہیں وزیرخان!" شرافت علی نے کہا۔" وہ دونوں مقدمات درج کرانے والے میرے تمہارے جیسے معمولی لوگ تو نہیں تھے۔ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد پولیس نے مایوس ہو کے تلاش ترک کر دی ہو گی۔ ان کے پاس نئے کیس آ گئے ہوں گے اور پرانے خود بخود سرد خانے میں چلے گئے ہوں گے لیکن تم جانتے ہو کہ قتل کا کیس کبھی ختم نہیں ہوتا اور چور جب بھی پکڑا جائے چور ہی کہلاتا ہے۔ پہلے تم پر ایک ریذیڈنٹ کی بیوی کے قتل کا الزام تھا مگر جان سائمن اب ایک صوبے

کا لیفٹیننٹ گورنر ہے اور نواب خورشید عالم کیسے بھول سکتے ہیں کہ تم نے ان کے خاندان کی عزت لوٹی اور ان کے والد کی موت کا سبب بنے۔ اگر آج بھی کوئی تمہارے بارے میں پولیس کو مخبری کر دے۔۔۔۔"

"کیا تم مجھے پھر دھمکی دے رہے ہو شرافت علی؟" میں نے کہا۔

"کیسی باتیں کرتے ہو وزیر خان!" شرافت علی بولا۔ "اگر مجھے یہی کرنا ہوتا تو میں اب تک انتظار کیوں کرتا۔ مجھے تو بہت پہلے معلوم ہو گیا تھا کہ تم میرٹھ میں ہو لیکن دوسروں سے محتاط رہو۔ تمہارے رشتہ دار، محلے دار اور جان پہچان والوں کو کئی برس پرانی بات یاد ہو گی۔ ان میں سے بیشتر تمہارے خیر خواہ ہیں اس لیے تم ابھی تک محفوظ ہو مگر ایسا کوئی نہیں ہوتا جس کا دشمن کوئی نہ ہو۔"

شرافت علی کے انکشافات نے میرا خون خشک کر دیا تھا اچانک مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ خطرہ ہر طرف سے رات کے اندھیرے کی طرح میری طرف بڑھ رہا ہے اور اس اندھیرے کی آڑ میں قانون کے ہاتھ چپکے چپکے مجھے گرفت میں لینے کے لیے آگے آ رہے ہیں۔ فضا میں انگشت نمائی کرنے والے بدخواہوں کی سرگوشی سنائی دیتی تھی۔ ہتھکڑی کی زنجیر کھنکتی تھی اور تقدیر کی بے رحم ہنسی گونجتی تھی۔ اس رات میں نے امینہ کو بتایا کہ شرافت علی سے مجھے کیا معلوم ہوا ہے تو وہ بھی خوفزدہ ہو گئی۔ یوں لگتا تھا کہ ہندوستان کی زمین پر اب ہمارے لیے کوئی جائے پناہ نہیں رہی ہے۔ بعد کے واقعات تم جانتے ہو منشی! میں بیوی بچوں کے ساتھ میرٹھ سے نکل گیا تھا کیونکہ میرٹھ میں میرے جاننے والے بہت تھے اور دہلی چلا گیا تھا جہاں مجھے کسی شناسا کے ملنے کا ڈر نہیں تھا۔ تمہیں یہ بھی معلوم ہے منشی کہ میرا پورا خاندان فسادات کی نذر ہو گیا تھا۔"

میں وزیر خان کے بچپن کا دوست تھا اور ان واقعات کے سوا جن کا تعلق ریاست سلطان آباد سے تھا اور جو مجھے وزیر خان کی زبانی پہلی بار معلوم ہوئے تھے میں اس کی زندگی کے حالات سے پوری طرح باخبر تھا۔ جس زمانے میں وزیر خان سلطان آباد سے نکل کر ہندوستان کے طول و عرض میں چھپتا پھر رہا تھا میں میرٹھ سے ساٹھ میل دور ایک گاؤں کے چھوٹے سے پرائمری اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھا اور انتہائی سکون اور قناعت کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ اس زمانے میں ریڈیو بھی عام نہ تھے اور اس گاؤں تک اخبارات تو کیا تار بھی مشکل سے پہنچتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے وزیر خان کے بارے میں شائع ہونے والی خبریں نہیں پڑھیں، اشتہارات نہیں دیکھے اور تصویر نہیں دیکھی ورنہ میں اسے میرٹھ پہنچتے ہی خبردار کر دیتا اور اسے فوراً نکل جانے کا مشورہ دیتا۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ وزیر خان کے والدین بھی ان حقائق سے بے خبر رہے میرا خیال ہے کہ ان کو عمداً بے خبر رکھا گیا۔ ورنہ بڑھاپے میں یہ صدمہ ان کی جان لے لیتا۔ وہ خود اخبار نہیں پڑھتے تھے اور جنہوں نے اخبار میں کچھ دیکھا تھا وہ نیک دل لوگ تھے۔ انہوں نے جانتے بوجھتے ان کی حالت پر ترس کھاتے ہوئے انہیں کچھ نہیں بتایا۔ وزیر خان کا ایک بہنوئی انڈین آرمی میں میجر تھا اور اس سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ فرض شناسی کے چکر میں بیوی کے جذبات کی پروا نہ کرے اور اس کے بھائی کو پکڑوا دے۔ شاید بہت سے لوگوں کو اس خیال نے بھی کچھ نہ کرنے دیا کہ اوائے فرض سے زیادہ ان کی حرکت کو ایک لاکھ کے لالچ سے تعبیر کیا جائے گا۔ جو لوگ انگریز کے دشمن تھے انہوں نے سمجھا ہو گا کہ وزیر خان نے ایک انگریز کی بیوی کو قتل کیا تو کوئی جرم نہیں کیا بلکہ نیک کام کیا اور یہ قتل بھی اس نے بے سبب تو نہیں کیا ہو گا ممکن ہے اس نے اپنی تذلیل کا انتقام لیا ہو۔ جو لوگ وزیر خان کے کردار سے واقف تھے وہ سمجھتے ہوں گے کہ چوری کا الزام کسی سازش کا نتیجہ ہے۔ وزیر خان ایسا آدمی نہیں کہ جس تھالی میں کھائے اسی میں چھید کرے پھر یہ سب واقعات ایک ہی ریاست میں پیش آتے تھے اور وزیر خان پر الزامات عائد کرنے والے دونوں حاکم تھے۔ وزیر خان ایک معمولی ملازم تھا جسے حاکم لوگ کسی بھی ذاتی رنجش کے باعث اپنے انتقام کا نشانہ بنا سکتے تھے۔ غرض یہ سب باتیں تھیں جس کی وجہ سے وزیر خان میرٹھ میں بھی محفوظ رہا اور کسی نے اس کی موجودگی کا راز افشا نہیں کیا۔

لیکن یہ سب تقسیم سے پہلے کی باتیں تھیں جسے اٹھارہ سال ہو چکے تھے۔ وقت بدل گیا تھا، جغرافیائی سرحدیں بدل گئی تھیں۔ ہندوستان میں سلطان آباد کی ریاست اور ریاست کا تاج بھارت میں ضم ہو گئی تھی۔ انگریز اپنا بوریا بستر گول کر کے والیس چلے گئے تھے۔ وزیر خان نے دوسرے ملک میں ایک نئی زندگی کا آغاز اپنے حوصلے کی بنیاد پر کیا تھا۔ اس نے کاروبار شروع کیا تھا تو اس کا سرمایہ فقط اس کا عزم تھا اور اس کی مستقل مزاجی تھی۔ نیک نیتی تھی اور ایمانداری بھی چنانچہ خدا نے کاروبار کو برکت دی۔

۱۹۵۶ء میں شرافت علی کاروبار میں پارٹنر بنا تو شرافت علی پہلے سے وزیر خان کے ساتھ تھا اور وزیر خان مجھ پر بہت اعتبار کرتا تھا۔ چنانچہ میرا ذہن یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ آج شرافت علی کس طرح وزیر خان کو بلیک میل کر سکتا ہے۔ اس کے خلاف الزامات کی کوئی اہمیت نہیں رہی تھی۔ وہ شخص جس نے اپنی بیوی کا مقدمہ کیا تھا، برطانیہ میں تھا اور بظاہر اس کو بھول چکا تھا۔ اس نے دوسری شادی کر لی تھی اور ریٹائرڈ لائف گزار رہا تھا۔ تم بھی اسے جانتے ہو کبیر خان! کیونکہ تم اس کی لڑکی مارگریٹ کے دوست تھے اور یہ لڑکی اس کی دوسری بیوی کے بطن سے ہے۔ وہ بڈھا اب رچرڈ سائمن ہے مگر اسے یہ علم نہیں ہے کہ تم کس وزیر خان کے بیٹے ہو۔۔۔ تم کو حیرانی ہوئی ہو گی کہ میں یہ سب کچھ کیسے جانتا ہوں، برخوردار! میری عمر جاسوسی ناول پڑھتے گزری ہے۔ اسی وجہ کے باعث لوگ مجھے منشی کی بجائے فوما نچو کہنے لگے تھے۔ میں کام کے سلسلے میں لندن آتا جاتا رہتا تھا اور تمہارے والد کی خواہش کے مطابق جاسوسی کر کے معلوم کرتا تھا کہ تم لندن میں کیا کر رہے ہو اور کیوں کر رہے ہو۔ واپسی پر میں وزیر خان کو مکمل رپورٹ دیتا تھا کہ سب خیریت ہے۔ صرف ایک بات میں نے اسے نہیں بتائی تھی کہ تم جان سائمن کے ساتھ گھومتے پھرتے ہو ورنہ وہ تشویش میں مبتلا ہو جاتا۔

وزیر خان کی ساری روداد سن کے میں نے کہا۔ "وزیر خان! لیکن میرے سوال کا جواب اب بھی نہیں ملا ہے۔ شرافت علی اب تمہیں کیسے بلیک میل کر رہا ہے؟ شرافت علی کو تم سے دشمنی ہوتی تو وہ تقسیم سے پہلے ہی اس زمانے میں تم کو پکڑوا دیتا جب تم میرٹھ میں تھے اور ایک لاکھ کا انعام حاصل کر لیتا۔"

"اس میں ہمت نہیں تھی منشی!" وزیر خان نے کہا۔ "میں مسلم لیگ کا بڑا پرانا کارکن ہوں اور میرے دوست بھی بہت تھے جو مجھ پر جان نثار کر سکتے تھے۔ وہ شرافت علی کو زندہ نہ چھوڑتے۔"

"پھر کیا بات ہے؟" میں نے کہا۔ "تمہارے باقی دشمن تو مر کھپ گئے یا اِدھر اُدھر ہو گئے۔ مثلاً وہ ریذیڈنٹ جان سائمن۔ وہ تمہارا کیا بگاڑ سکتا ہے؟ نواب خورشید عالم کی ریاست ختم ہوئی اور وہ بھی ہندوستان میں رہ گئے۔ اب زندہ ہوں گے تو وظیفہ خوار ہوں گے۔ رہ گیا گیان چند تو میرا خیال ہے فسادات میں مارا گیا ہو گا۔ اس کا گھر اور کاروبار عالمی گیٹ کے اندر تھا جہاں سب سے زیادہ سکھ اور ہندو مارے گئے تھے۔ اگر وہ جان بچا کے فرار ہوا ہو گا تو بھارت میں شرنارتھی ہو گا۔ بھارت کی پولیس کے قوانین پاکستان میں نہیں اور ایک لاکھ کے انعام والا اشتہار یہاں کچھ نہیں کر سکتا پھر تمہیں کس کا ڈر ہے؟ کیوں بلیک میل ہونے پر مجبور ہے تو؟"

"دیکھ منشی! میں نے تجھے ہر بات بتا دی ہے۔" وزیر خان نے کہا۔ "یہ بھی مان لیا ہے کہ شرافت علی مجھے بلیک میل کر رہا ہے۔ میں اتنا بتا سکتا ہوں کہ اسباب وہی پرانے ہیں جن کا میں نے ذکر کیا۔ اب میں اپنے انجام سے نہیں ڈرتا۔ میری زندگی کے تھوڑے سے دن رہ گئے ہیں لیکن سکندر کی پوری زندگی باقی ہے۔ اسے محفوظ رکھنے کے لیے میں نے سینے پر صبر کی سل رکھ لی ہے۔ اس کو اپنی نگاہوں سے بھی دور رکھا۔ میں نے یہ قربانی اس کے مستقبل کے لیے دی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ آخری وقت میں یہ جنگ ہار جاؤں۔ جو کچھ میرے پاس تھا وہ میں نے بھوکے بھیڑیوں کے سامنے ڈال دیا ہے۔ سوائے اس چیز کے جس پر میرے بعد سکندر کا حق تھا۔ یہ کاروبار میرا ہے۔ میری زندگی میں کوئی مجھے اس کی ملکیت سے محروم نہیں کر سکتا۔ وہ چاہتے ہیں کہ میں اس سے بھی دستبردار ہو جاؤں لیکن میں سکندر کو اس کے حق سے کیسے محروم کر دوں۔ وہ میری جان تو لے سکتے ہیں مگر حقِ ملکیت سے دستبرداری کے کاغذات پر دستخط نہیں لے سکتے۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا وزیر خان کہ کسی وکیل کی معرفت تو اپنا مقدمہ عدالت میں کیوں نہیں لے جا سکتا؟" میں نے کہا۔ "یا پولیس کو رپورٹ کیوں نہیں کر سکتا؟"

"اس کا کوئی فائدہ نہیں منشی! یہ سب بالکل بے کار ہے۔" وہ بولا۔ "میں کچھ بھی ثابت نہیں کر سکتا اور ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

"اور اگر بعد میں انہوں نے یہی کھیل سکندر کے ساتھ جاری رکھا؟"

"سکندر جوان آدمی ہے۔" وزیر خان نے کہا۔ "باہمت ہے اور ذہین ہے لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس کے ماضی کے دامن پر کوئی داغ نہیں ہے کوئی اسے بلیک میل نہیں کر سکتا وہ اپنا دفاع خود کر لے گا۔ اللہ اس کا حامی و ناصر ہو گا۔"

تو برخوردار کبیر خان! اس سے زیادہ میں تمہیں کچھ نہیں بتا سکتا کیونکہ اس سے زیادہ مجھے وزیر خان نے کچھ نہیں بتایا۔ یہ بات میرے لیے آج بھی معمہ ہے کہ ستائیس سال قبل سلطان آباد کی ریاست میں پیش آنے والے واقعات کا ان واقعات سے کیا تعلق ہے جو وزیر خان کے ساتھ پیش آئے۔ کم سے کم میری عقل تو کوئی تعلق دریافت کرنے سے قاصر ہے میں رازداری کا پابند تھا چنانچہ میں نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔ میں دوبارہ وزیر خان سے ملنے بھی نہیں گیا۔ میری اور اس کی آخری ملاقات اس کے مرنے کے بعد ہوئی تھی جب وہ جراغدین

کی کوٹھی کے برآمدے میں کفن پہنے ابدی نیند سو رہا تھا۔ لوگ سمجھ رہے تھے کہ یہ کوٹھی اسی کی ہے اور میں کسی کو یہ بھی نہیں بتا سکتا تھا کہ وہ تو اپنے نوکر کے نوکروں کے ساتھ سرونٹ کوارٹر کے ایک کمرے میں رہتا تھا لیکن میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا اور جب میں نے اپنے ہاتھوں سے اس کو لحد میں اتارا تو میں نے کہا کہ بھائی وزیر خان تم نے رفاقت کا عہد توڑ دیا۔ اب میں کسی عہد کا پابند نہیں رہا۔ جو کچھ تھا تمہارے دم کے ساتھ تھا۔ اب تم نہیں تو دوستی نہیں۔ اور جب دوستی نہیں تو کیسا وعدہ اور کہاں کے عہد و پیمان۔ میں نے اسی لمحے فیصلہ کر لیا تھا کہ جو بات میں تم کو خود نہ بتا سکا وہ تحریر کی صورت میں چھوڑ جاؤں گا خواہ اس میں میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ آگے کے معاملات میں تم پر چھوڑتا ہوں۔ تم کو معلوم کرنا ہوگا کہ میر شرافت علی نے تمہارے باپ کی کون سی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر اسے مار ڈالا؟ معلوم نہیں کیوں مجھے یہ شبہ ہوتا ہے کہ وزیر خان کی موت کے اسباب طبعی نہیں تھے۔ اسے ختم کیا گیا تھا۔ اس احساس کو تم میری چھٹی حس کا کرشمہ بھی کہہ سکتے ہو اور میری چھٹی حس یہ بھی کہتی ہے کہ میرا انجام وزیر خان کے انجام سے مختلف نہ ہوگا۔ اس کے دشمن پوری کوشش کریں گے کہ تم کو میں کچھ نہ بتا سکوں لیکن میں بھی فوما نچو ہوں۔ میں ان کو ایسا چکر دوں گا کہ ایک نہ ایک دن یہ تحریر تمہارے ہاتھوں تک پہنچ جائے گی۔ ہو سکتا ہے کہ جب تم اسے پڑھو تو میرا وجود رزقِ خاک بن چکا ہو۔ اگر ایسا ہو تو میری مغفرت کی دعا کرنا۔ میری روح کی نجات کے لیے اتنا بھی بہت ہوگا کہ میری محنت رائیگاں نہیں گئی۔ یہ جان تو آنی جانی ہے اس جان کی تو کوئی بات نہیں... فقط:

تمہارا چچا۔ دعاگو اور خیر خواہ

فوما نچو

خط ختم ہو گیا۔ ماضی کی ایک داستان ختم ہو گئی۔ وہ رات پہلے ختم ہو گئی تھی جس نے قیدِ زمان و مکاں کو ختم کر دیا تھا۔ میں، شہلا اور محسن محض ایک وجود رہ گئے تھے صرف ایک احساس جو حال اور ماضی کے درمیان سرگرداں تھا۔ یہ کوئی سائنس فکشن نہیں تھا۔ ہمارے پاس کوئی ٹائم مشین نہیں تھی۔ ان سب کے لیے اس حقیقت سے انکار ناممکن تھا کہ اس رات کے دوران میں ہم نے بہت پیچھے جا کر ستائیس برسوں کا سفر طے کیا۔ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور محسوس کیا۔ چار گھنٹوں کے مختصر وقفوں میں ستائیس سال کا وقت کیسے سمٹ گیا؟ مگر اس طویل سفر کے بعد میں جس دنیا میں اترا وہ دنیا میری نہیں تھی۔ میں بھی وہ نہیں تھا جو ماضی کے سفر میں محسن کے ساتھ روانہ ہوا تھا۔ اس خلا نورد کی طرح جو ایک سیارے سے پرواز کر کے دوسرے سیارے پر جا اترے، ایک اجنبی دنیا میں اکیلا تھا۔ ایسا خواب میں بھی ہوتا ہے، آنکھ کھل جاتی ہے مگر ذہن بدستور خواب کے آسیب میں رہتا ہے۔

"سکندر! میری طرف دیکھو، میں محسن ہوں۔" محسن نے میرا شانہ پکڑ کر ہلایا۔

"گستاخ!" میں نے گرج کر کہا اور اپنا ہاتھ گھمایا۔ "تو ہوگا محسن لیکن ہم سکندر نہیں ہیں۔ ہم... ہم سکندر نہیں ہیں... ہم پرنس کبیر خان ہیں... ولی عہد ریاست سلطان پور ہیں۔ ہماری ماں پرنسس امینہ تھی اور ہمارے والد نواب خورشید عالم...!" میں نے سینے پر ہاتھ مار کے کہا۔

"بھائی جان... یہ کیا ہو گیا ہے آپ کو... خدا کے لیے ہوش میں آئیے۔" شہلا نے روتے ہوئے کہا۔

"بدتمیز کنیز!" میں نے اس کے ایک چانٹا رسید کیا۔ "جانتی نہیں کہ ہم اکلوتے تھے؟ تو ہمیں بھائی کہتی ہے بدتمیز۔ ہم تیری کھال میں بھس بھروا دیں گے... ہم اس ریاست کے مالک ہیں اور یہاں کوئی ہمارے حکم سے سرتابی کی ہمت نہیں کر سکتا۔ صرف ہم عالی نسب خاندان کے فرزند ہیں۔ کس کی مجال ہے کہ ہمیں ایک معمولی آدمی کی اولاد کہہ سکے۔ ہم نواب خورشید عالم کی جائز اولاد ہیں، باقی سب... وہ سب جو وزیر خان کی اولاد تھے...!" میرا خیال ہے کہ میں چلا رہا تھا، نشے میں [illegible] شرابی کی طرح بکار رہا تھا۔ زور زور سے سینے پر ہاتھ مار رہا تھا۔ ہنس رہا تھا اور رو رہا تھا کہ اچانک مجھ پر آسمان آ گرا۔ ٹکڑے ٹکڑے ہوتے آفاق پہ خورشید و قمر۔ دنیا پر اندھیرا چھا گیا اور میرا وجود اس خلا میں گرتا چلا گیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں کسی کمرے میں بستر پر [illegible] تھا۔ میرے ہاتھ پیر بالکل سن ہو چکے تھے اور میں اپنی مرضی سے ایک انگلی تک نہیں ہلا سکتا تھا۔ آنکھیں کھولیں تو مجھے مانوس چہروں کی پرچھائیاں تیرتی ہوئی نظر آئیں۔ میں نے باری باری ہر چہرے کو دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ [illegible] سوال خود بخود میرے ذہن میں آیا۔

آخر یہ کون لوگ ہیں جو صورت سے مہربان اور ہمدرد نظر آتے ہیں۔ یہ عورت جو میرے سیدھے ہاتھ کی طرف [illegible] آنسو بہا رہی ہے، کس کے لیے رو رہی ہے؟ میرے بائیں

ساتھ بھی تو ایک اور لڑکی کھڑی ہے۔ وہ کیوں رو رہی ہے؟ میں نے آنکھیں کھول کر پھر دوسری طرف دیکھا جہاں دو مرد کھڑے تھے۔ ایک عمر رسیدہ اور ایک میرا ہم عمر۔ میں نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے گہری نیند آ رہی ہے لیکن میں سونا نہیں چاہتا تھا۔ میں سوچنا چاہتا تھا مگر میرے دماغ میں خلا تھا۔ جسم کے ساتھ میرا ذہن بھی مفلوج ہو چکا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اٹھ کر بیٹھ جاؤں مگر یہ میرے اختیار کی بات نہ رہی تھی۔ اس کے بعد بہت سے وقفے آئے جب میں نیم بیداری اور نیم ہوش کے عالم میں بہت کچھ دیکھتا رہا۔ ان میں سے کچھ مناظر حقیقی تھے اور کچھ میرے تصور کی پیداوار تھے۔ میرے کانوں نے بہت سی آوازیں سنیں جو ایک گم گشتہ وقت کی صدائے بازگشت تھی۔ میں نے مارگریٹ کے باپ سر جان سائمن کو دیکھا جو حوالات میں میرے سامنے کھڑا تھا اور کہہ رہا تھا۔ "میری بیوی ایک نیٹو پرنس کو چاہنے لگی تھی۔ میں نے اس کو باعزت طور پر دفن کرا دیا تھا...!" میں نے اپنے والد کو دیکھا۔ انہوں نے روتے روتے مجھ سے کہا۔ "تم میرے بیٹے ہو سکندر کیونکہ تم کو جنم دینے والی عورت میری بیوی تھی اور تمہیں میں نے پالا تھا۔" پھر ایک اجنبی نمودار ہوا جو حلیہ میں خسرو جمشید کی طرح تھا اور اس نے تنفر اور حقارت سے کہا۔ "یہ نمک حرام جھوٹ بکتا ہے۔ امینہ میری بیوی تھی اور تم میرے بیٹے ہو۔" پھر یکے بعد دیگرے گھپ اندھیرے سے نکل کے بہت سے چہرے روشنی میں آ گئے۔ ان کے بدن زخموں سے فگار تھے اور انہوں نے یک زبان ہو کے کہا۔ "ہماری خون آلودہ لاشوں کو دیکھو۔ کیا تم ہمیں پہچانتے نہیں ہو؟ ہم تمہارے بھائی بہن ہیں۔" اندھیرے ہال میں سینما کے پردے پر نظر آنے والے سلائڈز کی طرح بہت سے چہرے روشن ہوئے اور بجھ گئے۔ ان میں پنڈت دیا ناتھ کا متفکر چہرہ تھا۔ ان کے بیٹے موہن اور بیٹی موہنی کا چہرہ تھا۔ ایک عورت بڑے شاہانہ وقار کے ساتھ اپنے محل کی خواب گاہ میں دکھائی دی۔ پھر میں نے اسی عورت کو ایک چھوٹے سے گھر میں پھٹے پرانے کپڑے پہنے جھاڑو دیتے ہوئے دیکھا۔ "پرنسس امینہ!" اس نے تمکنت سے میری طرف دیکھا۔ "میں تو تمہاری ماں ہوں سکندر!" اس کے علاوہ بھی میں نے بہت کچھ دیکھا جو منشی کے خط میں بیان کردہ واقعات کی تصویر تھا۔ بالآخر میرے ذہن سے ایک شدید جذباتی صدمے کے اثرات زائل ہونے لگے اور میں اپنے غم گساروں کی مشفقانہ کوششوں اور ان کی دعاؤں کے اعجازِ مسیحائی کے سبب دیوانگی سے فرزانگی کی طرف بڑھتا گیا۔ میں نے رابعہ اور شہلا کا چہرہ پہچان لیا۔ محسن کو اور انکل رضوی کو پہچان لیا اور ان کی باتیں سمجھنے لگا۔ میری جسمانی معذوری اور ذہنی تھکن کا سبب وہ سکون بخش اور خواب آور دوائیں تھیں جو مجھے وافر مقدار میں دی گئی تھیں۔ میں اسی کرشن نگر والے گھر میں تھا اور رفتہ رفتہ حقیقت کو خواب سے الگ کر کے دیکھنے لگا تھا۔

بالآخر ایک وقت ایسا آیا جب میں نے ہوش سے بیگانہ رکھنے والی دوائیں کھانے سے انکار کر دیا اور سیاہ کافی طلب کی۔ میں نے اپنی بات کا انتہائی مسرت خیز ردِ عمل دیکھا۔ ان سب کے چہرے امید کی روشنی سے دمک اٹھے جو میری شفایابی کے لیے خلوصِ نیت کے ساتھ کوشاں تھے۔ چند منٹ بعد رابعہ بغیر دودھ اور چینی کی گرم کافی کا بہت بڑا مگ بھر لائی۔ محسن نے مجھے سہارا دیا اور شہلا نے تھوڑی تھوڑی کر کے سب کافی میرے حلق میں اتار دی۔ پھر آہستہ آہستہ دھند چھٹنے لگی اور میرا ذہن صاف ہوتا گیا۔ میری جسمانی توانائی بحال ہونے لگی اور آدھے گھنٹے بعد میں پوری طرح ہوش میں آ گیا۔ میں نے باری باری سب کی طرف دیکھا اور شرمندہ ہو کے کہا۔ "میں بہت شرمندہ ہوں آپ سب سے۔"

"ابھی اپنے ذہن پر بار مت ڈالو۔" انکل رضوی نے شفقت سے مسکرا کے میری پیٹھ تھپکی۔ "شرمندہ ہونے کے لیے ساری عمر پڑی ہے۔"

"میں اب بالکل ٹھیک ہوں انکل رضوی!" میں نے کہا۔ "ذہنی صدمہ اتنا شدید تھا کہ میں برداشت نہ کر سکا۔"

"زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ اس صدمہ کے اثرات عارضی ثابت ہوئے۔" محسن نے میرا ہاتھ تھام کر کہا۔ "اور تم بہت جلد سنبھل گئے۔"

"کیا اس بات کا امکان بھی تھا کہ میرا دماغی توازن ہمیشہ کے لیے بگڑ جاتا؟"

"ہمیشہ کے لیے تو نہیں۔" محسن بولا۔ "لیکن یہ ہو سکتا تھا کہ اس میں کچھ زیادہ وقت لگ جاتا۔"

"میری نیند یا بے ہوشی کا یہ وقفہ کتنا طویل تھا؟" میں نے پوچھا۔ "مجھے وقت کا کوئی اندازہ نہیں ہے۔"

"آپ صرف چوبیس گھنٹے دراز رہے۔" محسن نے کہا۔ "اس وقت صبح کے نو بجے ہیں اور..."

"میرا خیال ہے کہ اس وقت تمہیں زیادہ بات نہیں کرنی چاہیے۔" رضوی صاحب نے کلائی کی گھڑی دیکھ کر کہا۔ "فکر کی تو کوئی بات نہیں رہی مگر سکندر کو ابھی آرام کی ضرورت ہے۔ میں اب ڈیوٹی پر جا رہا ہوں، شام کو آؤں گا۔ اس وقت

تک تم لوگ سکندر کے آرام کا خیال رکھو گے اور اس کو سوپ اور گلوکوز دیتے رہو۔"

انکل رضوی کے جانے کے بعد رابعہ، محسن اور شہلا نے مل کر ان کی ہدایات پر عمل کرنے کی پوری کوشش کی اور زبردستی مجھے کمرے میں اکیلا چھوڑنے اور میرے پیٹ کو حلق تک طاقت دینے والی چیزوں سے بھر دینے کی متفقہ جدوجہد کی مگر میں نے اپنے آگے ان کی ایک نہ چلنے دی۔

"آخر یہ کیا تماشا ہے؟" میں نے رابعہ کے ہاتھ سے گرم دودھ کا پیالہ لے کر کھڑکی سے باہر پھینکتے ہوئے کہا۔ "تم لوگ چاہتے ہو کہ میرا پیٹ پھٹ جائے۔ میرا پیٹ ہے کہ ڈرم؟ صبح سے کوئی ایک گیلن جوس چڑھا جا چکا ہے، کوئی ایک گیلن چائے اور گلوکوز اور اب آپ دوسری بار ایک گیلن دودھ انڈیلنے آگئی ہیں۔ میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔"

"خاک ٹھیک ہو۔" رابعہ نے جل بھن کر کہا۔ "یہ دماغ کی خرابی نہیں ہے تو کیا ہے کہ پیالہ باہر پھینک دیا۔"

"اب اگر کوئی، کسی قسم کا مائع میرے حلق میں ڈالنے کے لیے لایا تو میں اس کو بھی باہر پھینک دوں گا۔" میں نے کہا۔

اسی وقت شہلا اور محسن کمرے میں داخل ہوئے۔ شہلا کے ہاتھ میں سوپ کا پیالہ تھا اور محسن کے ہاتھ میں ایک پلیٹ تھی جس میں دو اُبلے ہوئے انڈے رکھے تھے۔

"یہ سب کیا ہے؟" میں نے سہم کر کہا۔ "کیا یہ بھی۔۔۔"

"جی ہاں، یہ بھی۔" محسن نے جارحانہ انداز میں آستین چڑھائی۔ "ہم سب مل کر زبردستی یہ تمہارے حلق سے اتاریں گے، اس کے بعد تمہیں اختیار ہے کہ ہمیں باری باری اٹھا کر باہر پھینک دو۔"

"دیکھیے شیروانی صاحب!" میں نے لجاجت سے کہا۔ "شرفا کا یہ شیوہ نہیں۔ میں ایک شرط پر آپ کی بات مان لیتا ہوں کہ بعد میں آپ یہاں بیٹھ کر مجھ سے بات کریں گے۔ مجھے آپ سے بہت کچھ پوچھنا ہے۔"

"مجھے منظور ہے۔" محسن بولا اور میں نے بھوک نہ ہونے کے باوجود کھانا پینا شروع کیا۔ رابعہ اور شہلا مسکراتی رہیں۔

"اس وقت تو آپ دونوں کی بتیسی باہر آ رہی ہے۔" میں نے کہا۔ "پہلے کیوں آنسو بہائے جا رہے تھے؟"

"وہ خوشی کے آنسو تھے۔" رابعہ نے بڑی ڈھٹائی سے جھوٹ بولتے ہوئے اعلان کیا۔

"اچھا یار محسن!" میں نے خالی گلاس شہلا کو واپس پکڑا کے کہا۔ "وہ خط کہاں ہے؟"

"خط انکل رضوی کے پاس ہے۔" محسن نے کہا۔ "ویسے بھی اس وقت خط کے موضوع پر کوئی بات نہیں ہو سکتی۔"

"دیکھ محسن! میرا ذہنی ردِ عمل غیر ارادی تھا۔" میں نے کہا۔ "ذرا سی دیر کے لیے میرا دماغ خراب ہو گیا تھا لیکن اب ہوش میں آنے کے بعد میں نارمل ہوں اور وہی پہلے والا سکندر بخت ہوں۔ بے شک اس خط نے بہت سے تلخ حقائق کا انکشاف کیا ہے جن کو تسلیم کیے بنا چارہ نہیں لیکن ان سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں کسی نواب خورشید عالم کو نہیں جانتا اور حقیقت کچھ بھی ہو، اپنے والدین کے لیے میرے خیالات اور جذبات وہی ہیں جو یہ خط ملنے سے پہلے تھے۔ میں وزیر خان کا بیٹا ہوں اور اپنے اس عہد پر قائم ہوں کہ مجھے اس کے قتل کا انتقام لینا ہے۔ اُن سب سے جو اُس کی موت کے ذمے دار تھے۔ میر شرافت علی تو مر چکا ہے لیکن آج میرے دشمنوں کی فہرست میں ایک نام کا اضافہ ہو گیا ہے یعنی گیان چند۔ شرافت علی اور گیان چند بھی بہت مکار اور عیار شکاری تھے جو میرے باپ کو گھیر کر شکار گاہ تک لے گئے اور وہ ان کی سازش کا شکار ہو گیا۔ اس کی عمر شکاری کتوں کے تعاقب سے بچنے کے لیے بھاگتے ہوئے گزری۔ وہ اپنا سب کچھ لٹا کے نقل وطن کر گیا مگر یہ شکاری کتے یہاں بھی آ پہنچے اور انہوں نے بالآخر اسے شکار کر لیا۔ اب بازی پلٹ گئی ہے اور شکاری میں ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ مجھ پر شرافت علی کے قتل کا الزام آیا لیکن میں اسے قتل نہ کر سکا۔ ایک جذباتی کمزوری کے لمحے میں شرافت علی کو میرے ہاتھوں وہ سزا نہ ملی جس کا وہ مستحق تھا۔"

"اگر منشی یہ خط نہ لکھتا تو اچھا ہوتا۔" محسن باہر دیکھتے ہوئے بولا۔ "کیا فائدہ ہوا، ہمیں اس سے؟ یہ تو ہم اب بھی نہیں جانتے کہ مرحوم چچا وزیر خان کی مجبوریاں کیا تھیں؟ کیا وہ ڈرتے تھے کہ تجھے حالات کا علم ہو گیا تو تیری نظر میں جذباتی رشتوں کی اہمیت ختم ہو جائے گی؟ تجھے معلوم ہو جائے گا کہ تیرا اُن سے خون کا رشتہ نہیں ہے، تو تُو وزیر خان کو چھوڑ کر نواب خورشید عالم کے پاس چلا جائے گا؟"

"میں اپنے والد کی فطرت کو سمجھتا تھا محسن!" میں نے کہا۔ "انہیں مجھ پر پورا اعتماد ہو گا کہ میں انہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ رشتے جذبات کے ہوتے ہیں۔ خون کا رشتوں سے کیا تعلق؟ خون کے صرف گروپ ہوتے ہیں۔ یہ دیکھنا ہے تو کسی بھی ہسپتال میں چلا جا۔ گورے کا خون کالے کو دیا جاتا ہے بعض وقت ضرورت پڑتی ہے تو بلڈ بینک سے مل جاتا ہے یا فٹ پاتھ پر بیٹھے ہوئے خون فروشوں سے۔ کوئی نہیں جانتا کہ کس کا خون کس کے جسم میں

پہنچا۔ پھر یہ خون کا رشتہ کیا ہوا۔ جس شخص کی جان بچ جاتی ہے وہ تو اسے پہچانتا بھی نہیں جس نے اپنا خون اس کو دیا تھا۔ مجھے اس سے بھی کوئی غرض نہیں کہ میری ماں پرنسس امینہ تھی یا سلطانہ نام کی ایک عام عورت تھی۔ ماں تو صرف ماں ہی ہوتی ہے۔ میرے وہ بہن بھائی جنہوں نے اس وطن کے لیے جان قربان کی، ایک ہی ماں سے پیدا ہوئے تھے اور ان کی یاد آج بھی میرے لیے ایک مقدس امانت ہے۔ یہ جذبات کے بندھن ہیں۔ حالات کی گردش انہیں توڑ نہیں سکتی۔"

"مجھے تجھ پر فخر ہے سکندر بخت!" محسن نے کہا۔ "اگر تیرے خیالات بدل جاتے تو مجھے دکھ ہوتا۔"

"اگر آج میرے ماضی کے کسی راز پر پڑا ہوا پردہ اٹھ جائے،" میں نے کہا۔ "اور تم میرے لیے غیر ہو جاؤ۔ تم سب جن کو میں اپنا خاندان سمجھتا ہوں تو دکھ مجھے بھی ہو گا۔ اگر آج رابعہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ تو میرا دوست ہے یا شہلا نے مجھے بھائی کہا ہے تو اس لیے کہ آج میں جیسا بھی ہوں اس رشتے سے تمہارا ہوں۔ جس کا میرے ماضی سے تو کوئی تعلق نہیں۔ اگر میں نے کبھی کسی سازش کا شکار ہو کے نادانستگی میں کوئی قتل کیا ہوتا تو کیا تم مجھ سے رشتے توڑ لیتے؟"

"میرا خیال ہے سکندر اب ان باتوں سے کچھ حاصل نہیں۔" محسن نے کہا۔ "اپنی نگاہ مستقبل پر رکھ۔ پیچھے مڑ کے دیکھے گا تو تیرے لیے آگے قدم بڑھانا مشکل ہوتا جائے گا۔"

"مجھے اپنے ماضی پر نہ کوئی ندامت ہے اور نہ افسوس۔" میں نے برہمی سے کہا۔ "اور میں اپنے آپ سے نہیں ڈرتا۔ جب بھی مجھے موقع ملا، میں سلطان آباد ضرور جاؤں گا۔ میں گیان چند کا سراغ بھی لگاؤں گا۔ بے شک وہ بہت بڑا ملک ہے اور پچاس ساٹھ کروڑ کی آبادی میں ایک آدمی کو تلاش کرنا بھوسے کے ڈھیر میں سوئی تلاش کرنے سے زیادہ مشکل کام ہے لیکن ہو سکتا ہے سلطان آباد سے گیان چند کا کوئی اتا پتہ مل جائے۔ سرحد کے پار بھی اچھے لوگ بستے ہیں اور انہی میں سے ایک پنڈت دیانا تھ تھے جو شاید اب دنیا میں نہ ہوں۔ مگر ان کا ایک بیٹا تھا موہن اور اس کی بہن تھی موہنی۔ ان سے بھی میرا بہت گہرا جذباتی رشتہ ہے۔ وہ میری ہر ممکن مدد کریں گے لیکن فی الحال مجھے یہاں کے مسائل سے نمٹنا ہے اور میں ابھی تک اتنا آزاد بھی نہیں ہوں کہ اپنی مرضی سے جہاں چاہوں چلا جاؤں۔ یہ بتا کہ تو نے میرے سر پر کیا مارا تھا جس سے میں بے ہوش ہوا؟"

"ڈنڈا۔" محسن ہنسا۔ "اس کے سوا تجھے قابو کرنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ تو پاگل ہو رہا تھا۔"

اچانک مجھے کچھ اور یاد آیا اور میں اٹھ بیٹھا۔ "محسن! میں تو یہ بات بالکل ہی بھول گیا تھا۔ پرسوں ہم نے دلاور کے لیے جال پھیلایا تھا۔۔۔ اور ڈی سلوا۔۔۔"

"مانا کہ تو بہت بڑا شکاری ہے۔" محسن نے لیٹتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ بہت لمبی بات ہے۔"

"اچھا صرف اتنا بتا دے کہ دلاور مارا گیا یا نہیں؟" میں نے کہا۔ "اور ڈی سلوا پکڑا گیا یا نہیں؟"

"اس سوال کا جواب ہاں یا نہ میں دینا مشکل ہے۔" محسن پھر بیٹھ گیا۔ "بہت سی باتیں ہیں جو اخبار والوں کو معلوم نہیں ہو سکیں۔ مثلاً یہ کہ جب ہم ڈی سلوا کو اس کے گھر کے دروازے پر ڈال کر بھاگ آئے تھے تو بعد میں کیا ہوا تھا۔۔۔ کال بیل کی آواز پر ایک نوکر دروازے تک آیا تھا اور اپنے آقا کو اٹھا کر لے گیا تھا۔ ڈی سلوا بے ہوش تھا اور نوکر کیسے اندازہ کر سکتا تھا کہ صاحب کو کیا ہوا ہے۔ سابقہ تجربے کی بنا پر اتنا اندازہ تو اس کو ہو گیا تھا کہ صاحب نشے میں دھت نہیں ہے۔ گھبراہٹ میں اس نے ڈاکٹر کو طلب کر لیا تھا جس نے غور سے معائنہ کرنے کے بعد یہ رائے ظاہر کی تھی کہ ڈی سلوا کسی حادثے کا شکار نہیں ہوا بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسے مارا پیٹا گیا ہے۔ اس کے جسم پر چوٹوں کے نشانات بھی تھے اور رسی سے باندھے جانے کے بھی۔ ڈاکٹر کے خیال میں یہ ممکن تھا کہ کسی نے اسے لوٹنے کے لیے یا کسی بُری نیت سے اغوا کیا ہو۔ چنانچہ یہ پولیس کیس ہے اور اس کی رپورٹ فوراً کر دینی چاہیے۔ بات اگر گھر تک محدود رہتی تو ڈی سلوا کے ہوش میں آنے تک نوکر کچھ بھی نہ کرتا اور اس نے کچھ کیا بھی نہیں تھا لیکن اس ڈاکٹر نے پہنچتے ہی تھانے فون کر دیا۔۔۔

وہ کچھ اصول پرست اور قانون کی سختی سے پابندی کرنے والا ڈاکٹر تھا۔ نتیجہ یہ کہ اُدھر ڈی سلوا ہوش میں آیا، اُدھر قانون کے رکھوالے آ گئے۔ اب ڈی سلوا ان کو بتاتا بھی تو کیسے بتاتا؟ اسے خود بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کی گاڑی کہاں کھڑی ہے اور چوہدری دلاور کہاں ہے۔ ہم نے اپنا پورا پلان اس کو بتا دیا تھا کہ ہم اس کی گاڑی میں دلاور کو اغوا کر کے لے آئے ہیں اور اسے قتل کر دینا چاہتے ہیں لیکن ہماری پوزیشن محفوظ ہے چنانچہ دلاور کے قتل کا الزام اگر آیا بھی تو صرف اس کی ذات پر آئے گا۔ اب تک وہ ہمیں اچھی طرح سمجھ چکا ہے۔ اس نے یہ فرض نہیں کیا ہو گا کہ ہم محض بکواس فرما رہے تھے۔ اس نے تسلیم کر لیا ہو گا کہ ہمیشہ کی طرح ہم نے

جو کچھ کہا اس پر عمل بھی کیا ہوگا لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ ہم نے دلاور کو کہاں لے جاکے مارا اور کیسے مارا۔ وہ دس فیصد امکانات کو مسترد بھی نہیں کرسکتا تھا کہ ہم نے ڈرامہ کیا ہو اور ہمارا مقصد دلاور سے کچھ معلومات حاصل کرنا اور اسے دہشت زدہ کرنا ہی ہو۔ ان سب باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوتے اس نے پولیس کو ٹال دیا کہ ایسی کوئی بات نہیں جس کی رپورٹ درج کرائی جائے۔ میرا اپنا قیاس ہے کہ ڈی سلوا نے پولیس کو نامعلوم افراد سے لڑائی جھگڑے کی کہانی سنادی ہوگی کہ وہ ڈی سلوا کو لوٹنا چاہتے تھے۔ قاضی کے گھر کے تو چوہے بھی سیانے ہوتے ہیں۔ اس کے نوکروں نے ہی معاملہ سنبھال لیا ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ انہوں نے کہہ دیا ہوگا کہ صاحب کبھی زیادہ پی لیتا ہے تو آؤٹ ہوجاتا ہے اور ایسی حالت میں کیا بتا سکتا ہے کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ رپورٹ ایک ڈاکٹر کی تھی اس لیے پولیس کو جانا پڑا لیکن جانا انہیں مہنگا نہیں پڑا۔ وہ معاملے کو بھول جانے کا نذرانہ لے کر واپس چلے گئے تھے۔ غریب آدمی ہوتا تو تھانے لے جاتے اور کچھ 'تفتیش' بھی کرتے۔"

"ڈی سلوا نے ہمارا نام نہیں لیا تھا؟" میں نے پوچھا۔ "یہ نہیں کہا کہ ہم اس کو اغوا کرکے لے گئے تھے۔ اپنی گاڑی کے چوری ہوجانے کی رپورٹ تک نہیں لکھوائی تھی؟"

"اس وقت تو نہیں لکھوائی تھی۔" محسن نے کہا۔ "ایک تو اس کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ سوچ سمجھ کے کوئی فیصلہ کرسکتا۔ اس کو سوچنے سمجھنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ پھر یہ کہ وہ انتظار کرنا چاہتا تھا اور یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ آگے کیا ہوتا ہے، اس کی گاڑی کہاں ملتی ہے، دلاور کی لاش ملتی ہے یا وہ بھی اسی کی طرح اپنے گھر پہنچتا ہے۔ ڈی سلوا نے دیکھ لیا تھا کہ قتل کی دھمکی دینے اور مار کے گاڑ دینے کا مصمم ارادہ ظاہر کرنے کے باوجود ہم نے اس سے کچھ معلومات حاصل کیں، اسے دہشت زدہ کیا لیکن آخر میں اس کو قتل کرنے کے بجائے گھر چھوڑ گئے۔ اسے خیال ضرور آیا ہوگا کہ شاید دلاور کے ساتھ بھی ہم نے اس سے زیادہ کچھ نہ کیا ہو اور صبح ہونے تک دلاور سے رابطہ قائم ہوجائے تو آئندہ کی فکر کی جائے اور ہمارے خلاف کوئی مشترکہ لائحہ عمل تیار کیا جائے۔ وہ ڈرتا بھی ہوگا کہ جو کچھ ہم اس سے پوچھ چکے ہیں وہ کسی بھی لمحے اس کی پوزیشن خراب کرسکتا ہے۔ اطمینان کا ایک پہلو صرف یہ تھا کہ ہم نے دلاور کو قتل نہیں کیا ہوگا تو اس سے بھی بہت کچھ معلوم کرلیا ہوگا۔ بعد میں وہ ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ کے اپنی اپنی دکھ بھری کہانی سنا سکتے تھے اور اعتراف کرسکتے تھے کہ ہمارے جبر و تشدد اور ہماری بدمعاشی سے مجبور ہوکے انہوں نے ہمارے سامنے کتنا سچ بولا اور کتنا جھوٹ۔ اور جو ہونا تھا سو ہوگیا لیکن اب سوچنا چاہیے کہ آئندہ کیا ہوگا اور ہمارا اگلا قدم کیا ہوگا۔"

"اور اگر بعد کے نتائج ڈی سلوا کے اندازوں کی نفی کردیتے" میں نے کہا۔

"بعد میں یہی ہوا تھا۔" محسن بولا۔ "یعنی ڈی سلوا نے عقل مند بننے کی کوشش میں زبردست بیوقوفی کا ثبوت دیا۔ ہوا یہ کہ ٹھیک آٹھ بجے ریڈیو ٹرانسمیٹر میں رکھا ہوا بم پھٹ گیا اور اس زیرِ تعمیر عمارت کے باتھ روم کی چھت دھماکے سے گر گئی جس کے ساتھ والے کمرے میں دلاور قید تھا۔ کمرے کی ایک دیوار اور چھت کا تھوڑا سا حصہ بھی منہدم ہوئے لیکن دلاور ذرا دور تھا اس لیے معمولی زخمی ہوا۔ کمرے کی باقی دیواریں بھی تڑخ گئی تھیں۔ میں نے خود بعد میں وہاں جاکے دیکھا تھا۔ اس وقت آپ یہاں محوِ استراحت تھے اور کچھ دیوانگی سے شوق فرما رہے تھے۔ خیر حسبِ توقع دھماکا ہوتے ہی اِدھر اُدھر کے لوگ جمع ہوگئے۔ انہوں نے دلاور کو آزاد کیا اور اتنی دیر میں پولیس بھی وہاں پہنچ گئی۔ جائے واردات پر چشم دید گواہوں نے تو یہی بتایا جو دیکھا تھا لیکن دلاور نے تمہارے خلاف اغوا کا اور ہم دونوں کے خلاف قتل کی سازش کا الزام عائد کردیا۔ اب کنفیوشن سے بڑی عجیب و غریب اور مزاحیہ صورتِ حال پیدا ہوگئی ہے۔ دلاور کی بیوی نے کہیں اپنے شوہر کو فون کیا تھا تو اسے بتایا گیا تھا کہ دلاور صاحب کو ڈی سلوا صاحب اپنی گاڑی میں کہیں لے گئے ہیں۔ اسے حقیقت کا علم کہاں تھا۔ یہی بات اس نے پولیس کو بتادی۔ پولیس نے ایم ڈبلیو ڈی کمپلیکس کے چوکیدار سے بیان لیا تو اس نے حلف اٹھا کے کہا کہ دلاور صاحب خود گاڑی چلا رہے تھے اور گاڑی ڈی سلوا صاحب کی تھی۔ گیٹ سے گزرتے ہوئے چوہدری صاحب نے اس کے سلام کا جواب بھی دیا تھا اور اُن کے ساتھ والی سیٹ پر ڈی سلوا صاحب موجود تھے۔ چوکیدار بے چارہ کیسے کہتا کہ اس نے ڈی سلوا صاحب کو دیکھے بغیر گاڑی کو اندر جانے دیا تھا اور واپسی میں چوہدری صاحب کے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص پر غور ہی نہیں کیا تھا۔ دلاور کی بیوی اور چوکیدار کا بیان دلاور کے بیان کی صاف نفی کرتے تھے۔ کیونکہ کسی نے کارخانے کے اندر آتے جاتے اور دلاور کو گن پوائنٹ پر اغوا کرکے لے جاتے نہیں دیکھا تھا۔ دلاور کا خود گاڑی

[...]کرے جانا اور بالکل نارمل طریقے پر چوکیدار کے سلام کا [...]اب دینا مزید ثبوت فراہم کرتا تھا کہ وہ جہاں بھی گیا تھا، [...]مرضی سے گیا تھا۔ چوکیدار کیسے کہہ دیتا کہ دلاور کا نارمل نظر [...]اور ڈرائیونگ کرنا بھی ایک امرِ مجبوری تھا، چنانچہ اس [...]تیرا نام ہی نہیں لیا اور وہ ابھی تک اپنے بیان پر قائم [...]ہے۔ بے چارے دلاور کو خود اس کی بیوی اور اس کے ایک [...]ملازم نے جھوٹا کردیا۔ دوسری طرف ڈی سلوا پھنس گیا۔ [...]ب سے پہلے تو وہ آفس نہ جانے کی وجہ نہیں بتاسکا۔ چونکہ [...]یس نے الگ الگ بیانات لیے تھے اور ڈی سلوا نے نوکروں [...]صحیح بریفنگ نہیں کی تھی اس لیے نوکروں نے اپنے بیان [...]لکھ دیا کہ صاحب معمول کے مطابق دفتر گئے تھے۔ اب بیچارہ [...]ڈی سلوا کیا بتائے کہ سارا دن اس نے کہاں گزارا اور کیسے گزارا۔ [...]اگر وہ رات کو ہی پولیس کے سامنے حقیقت بیان کردیتا تو اس [...]کی پوزیشن خراب نہ ہوتی مگر اس نے جلد بازی سے گریز کیا اور [...]معاملے کو چوہدری دلاور سے ملاقات تک التوا میں رکھنے کی [...]حماقت کی۔ اب وہ کیسے ثابت کرتا کہ شہلا اس سے ملی تھی اور [...]بہرکندر اسے گاڑی سمیت ہائی جیک کرکے لے گیا تھا۔ وہ [...]کرسکتا تھا کہ گھر سے دفتر جاتے ہوئے اس کو ایک پرانا دوست [...]مل گیا تھا یا اس کی طبیعت خراب ہوگئی تھی مگر گاڑی اس کے [...]لیے مسئلہ بن گئی۔ وہ کوئی وضاحت پیش نہیں کرسکا کہ اس کی [...]گاڑی ایک نیم آباد علاقے میں کھڑی ہوئی کیوں پائی گئی؟ [...]اور اس نامکمل کوٹھی کے سامنے والی سڑک پر کیسے پہنچی جس میں [...]بم کا دھماکا ہوا تھا اور دلاور قید تھا۔ اگر کوئی اس کی گاڑی [...]لے گیا تھا یا گاڑی چوری ہوگئی تھی تو ڈی سلوا نے رپورٹ [...]کیوں نہیں لکھوائی؟ دلچسپ بات یہ ہے کہ دونوں کیس الگ [...]الگ تھانوں کے ہیں بلکہ اس میں تو تین تھانے ملوث ہوگئے۔ [...]یہ چوہدری دلاور کے اغوا کا کیس شاہدرہ کے ایک تھانے [...]ہے۔ جہاں دھماکا ہوا تھا وہ ماڈل ٹاؤن تھانے کا علاقہ ہے [...]اور تیسرا تھانہ وہ ہے جس کی حدود میں ڈی سلوا کی گلوب سینما [...]والی کوٹھی آتی ہے۔ پولیس والے رات کو ڈاکٹر کی رپورٹ پر [...]گئے تھے تو بڑے خوش لوٹے تھے کہ زیرچی نہ پرچا۔ ہاتھ میں [...]لے جانے کا خرچا۔ لیکن اب انہوں نے بھی ڈی سلوا اور اس [...]کے ایک نوکر کو غلط بیانی کا ملزم بنادیا کیونکہ وہ ڈاکٹر اپنی [...]بات پر اڑا ہوا ہے کہ میں نے تو رات ہی کو ٹیلی فون کردیا تھا۔ [...]اب تھانے والوں نے کچھ نہیں کیا اور ڈی سلوا نے منہ بند کرکے [...]انہیں واپس بھیج دیا تو یہ دونوں کی مجرمانہ غلطی ہے۔"

"آخر پولیس کسی نتیجے پر تو پہنچی ہوگی؟" میں نے کہا۔

"پولیس خود تو کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکتی تھی اور نہ پہنچنا چاہتی تھی۔" محسن نے کہا۔ "ان کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ جہاں تک ہوسکے معاملہ ان کے ہاتھ میں رہے۔ مقدمہ درج کرنے کی نوبت نہ آئے۔ وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو ملوث کرکے اپنی 'تفتیش' کے عمل کو جاری رکھ سکیں اور پھر فریقین سے معاملات کو دبانے کا جتنا معاوضہ وصول کرسکیں کریں۔ انہیں اس سے کیا غرض کہ غلطی کس کی تھی، ظلم کس نے کیا تھا، کس پر کیا تھا اور قانون کے تقاضے کیا ہیں؟ تفتیش، سماعت اور سزا کے نام سے سب کو ہراساں رکھنے میں ہی ان کی خوشحالی کا راز مضمر ہے۔ اگر انکل رضوی نے مداخلت نہ کی ہوتی تو تیرے خلاف بھی بہت سی دفعات کے تحت تفتیش شروع ہوجاتی لیکن ان کو یقین تھا کہ دلاور بکواس کرتا ہے۔ ان کو اچھی طرح معلوم ہے کہ سارا دن ہم کہاں رہے اور کیا کرتے رہے۔ خود بیگم رضوی کی گواہی ہمارے حق میں ہے اور ہمیں بے گناہ ثابت کرتی ہے۔ انہوں نے اپنے شوہر کو بتادیا تھا کہ ہم ناشتے کے بعد کوارٹر میں چلے گئے تھے اور دوپہر کے کھانے کے وقت بھی گھر میں موجود تھے۔ اصل میں وہ ہم دونوں سے بہت خوش ہیں بلکہ ہم تینوں سے۔"

"کیونکہ ہم اپنی باتوں سے ان کا دل بہلاتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور ان کو ہنساتے ہیں۔"

"بالفاظِ دیگر ایک سیدھی سادی عورت کو بڑی نیک نیتی سے بے وقوف بناتے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "اللہ معاف کرے، خیر کہنے کا مقصد یہ تھا کہ بیگم رضوی ہماری خاطر جھوٹ بھی بول سکتی ہیں۔ وہ رضوی صاحب کی طرح سخت اصول پرست اور محبت پر فرض کو مقدم رکھنے والی چیز نہیں ہیں۔ انکل رضوی کا تو اصول یہ ہے کہ ادائے فرض میں وہ تعلقات کو حائل نہیں ہونے دیتے۔ میرے ڈیڈی ممی یا تیرے مرحوم والد نے بھی کبھی ان سے کوئی ناجائز کام کرنے کو نہیں کہا لیکن ہمارے کیس میں انہیں صاف گڑبڑ نظر آتی ہے۔ معاملات اگر لندن تک محدود رہتے تو وہ ہمارے سوا کسی کو قصوروار نہ سمجھتے مگر یہاں انہوں نے اپنی آنکھوں سے بہت کچھ دیکھا ہے۔ چچا وزیر خان مرحوم کے حالات اور ان کی موت کے غیر معمولی اسباب، سلامت شاہ کا قتل، رابعہ کے گھر کی تباہی اور اب یہ خط جس کی خاطر منشی مرحوم کے پورے خاندان نے اپنی جان قربان کردی۔ ان سب باتوں نے شبہے کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی ہے کہ ڈی سلوا اور دلاور ہی ہمارے اصل دشمن ہیں جن کا ساتھ دینے والے استاد پیڈرو سے لے کر نواب خسرو جمشید تک بہت سے لوگ تھے۔ ان کی مجبوریاں دو ہیں۔ ایک تو میر شرافت علی کے قتل کا الزام جس میں حالات اور واقعات

کی شہادت تجھے مجرم ثابت کرتی ہے۔ دوسری مجبوری ہماری فطرت ہے۔ انہیں ہم سے گلہ ہے کہ ہم ان پر یا پولیس پر بھروسہ نہیں کرتے اور جائز و ناجائز طریقے پر معاملات کو اپنے ہاتھ میں لے کر مزید خرابی کے اسباب پیدا کرتے ہیں لیکن اس دن کے بارے میں ان کو پورا یقین ہے کہ ہم نے کچھ نہیں کیا۔ اس سے پہلے کی رات کے واقعات کا ان کو کوئی علم نہیں۔ صبح انہوں نے ہمیں سو کر اٹھ کے ناشتے کے لیے آتے دیکھا تھا۔ جب وہ آفس گئے تھے تو ہم گھر پر تھے جب رابعہ کورٹ گئی تھی تب بھی ہم ناشتے کی میز پر ہی بیٹھے تھے۔ دوپہر کے کھانے کے وقت تک ہماری موجودگی کی گواہ بیگم رضوی ہو گئیں۔ شام کے وقت پھر انکل رضوی نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ ہم سو کر اٹھے ہیں اور کوارٹر سے برآمد ہوتے ہیں۔ چھ بجے تک ہم نے ان کے ساتھ چائے پی تھی اور گپ لگائی تھی اور پھر پیدل روانہ ہوتے تھے کہ فلم دیکھنے جا رہے ہیں۔ ہم ٹھیک وقت پر واپس پہنچے تو ہمارے پاس دو ٹکٹوں کے پھاڑے ہوئے کوپن بھی تھے۔ رضوی صاحب بہت ذہین افسر ہیں صرف کوپن دیکھ کر وہ کبھی تسلیم نہ کرتے کہ ہم واقعی فلم دیکھ رہے تھے لیکن شام چھ بجے تک ہماری گھر میں موجودگی شبہے سے بالاتر تھی۔ پھر وہ کیسے مان لیتے کہ چوہدری دلاور اور ڈی سلوا سچ بول رہے ہیں۔ پولیس والے جب ہمارا بیان لینے پہنچے تو صرف میں موجود تھا اور میں نے بڑی معصومیت سے بتا دیا تھا کہ ہم تو گھر سے نکلے ہی نہیں تھے۔ یہ ساری کہانی جھوٹی ہے جو ڈی سلوا اور چوہدری دلاور نے آپس میں سازش کر کے ہمارے خلاف گھڑی ہے۔ اپنے یقین کی بنیاد پر انکل رضوی نے میری تائید کی۔ تفتیش کے لیے آنے والا ایک انسپکٹر تھا وہ بے چارہ کسی ایس ایس پی کے سامنے کیا بولتا۔ ایس ایس پی بھی وہ جس کے بارے میں مشہور ہے کہ باپ کو نہ بخشے۔ رضوی صاحب نے چوہدری دلاور اور ڈی سلوا پر سخت ناراضگی ظاہر کی۔ انسپکٹر سے کہا کہ ان دونوں بدمعاشوں سے ذرا سختی کے ساتھ پوچھو کہ اتنا بڑا جھوٹ بولنے کے لیے انہوں نے یہ ڈرامہ کیوں کیا؟ کیا وہ دونوں سب کو احمق اور گدھا سمجھتے ہیں؟"

...... محسن نے قہقہہ مارا۔ "اور میری توقعات کے عین مطابق انکل رضوی نے انسپکٹر سے بڑا اچھا سوال کیا۔ انہوں نے کہا۔ 'انسپکٹر! ذرا عقل سے کام لو۔ کیا یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ایک شخص گاڑی چرائے، اپنے دو جانی دشمنوں کو اغوا کرے۔ مارے، پیٹے اور پھر ان میں سے ایک کو بہ حفاظت گھر پہنچا دے۔ دوسرے کو قتل کرنے کی ایسی احمقانہ کوشش کرے۔ بم باتھ روم میں تھا اور دلاور کمرے میں۔ کیا بم کو اور دلاور کو باتھ روم میں ایک ہی جگہ نہیں رکھا جا سکتا تھا... پرخچے اڑ جاتے۔ اس کے ساتھ ڈی سلوا کو بھی بند کر دیا... دونوں کا قصہ ہی پاک ہو جاتا۔ بالفرض محال محسن اور سکندر نے... حرکت کی ہوتی تو کیا ان پر کوئی الزام آ سکتا تھا؟ میری اور... واقف کی اور مس رابعہ قاری ایڈووکیٹ کی گواہی تو ہے... یہ دونوں سارا دن گھر میں ہی رہے، جو ایک حقیقت ہے... اور ایسے گواہوں کی گواہی کو کوئی عدالت مسترد نہیں کر سکتی... کم سے کم میرے بارے میں تو دنیا جانتی ہے کہ میں جھوٹ نہیں بولتا۔'"

"حالانکہ وہ اس وقت بھی جھوٹ بول رہے تھے۔" ... نے شرمندگی سے کہا۔

"ہاں۔ اور اس یقین کامل کے ساتھ کہ یہی سچ ہے۔" محسن نے اعتراف کیا۔ "انہوں نے انسپکٹر کے سامنے یہ خیال ظاہر کیا کہ ڈی سلوا کو چوہدری دلاور نے گھر کے دروازے پر اس حالت میں چھوڑا کہ خود بخود شبہ پیدا ہو۔ پھر وہ ڈی سلوا کی گاڑی چلا کے اس ویران کوٹھی تک لے گیا جہاں اس نے پوری احتیاط سے بم کو باتھ روم میں رکھا اور خود دوسرے کمرے کے آخری گوشے میں کھڑا رہا۔ اسے معلوم ہو گا کہ ... کی طاقت کتنی ہے اور آر سی سی کی چھت کتنی مضبوط ... ہے۔ شاید اس کے کسی آدمی نے اسے باندھ بھی دیا ہو... کی آواز پر لوگوں کا آ جانا یقینی تھا۔ انسپکٹر تو تیرا بیان لینے کی رسمی کارروائی بھی پورا کرنا چاہتا تھا لیکن انکل رضوی نے کہا کہ سکندر کو ملیریا ہے اور بہت تیز بخار ہے۔ جو پوچھنا ہے دو دن بعد پوچھ لینا۔ ظاہر ہے انسپکٹر اختلاف نہیں کر سکتا..."

"انکل رضوی نے یہ جھوٹ کیوں بولا؟" میں نے ... میں کہا۔

"یہ جھوٹ نہیں تھا۔" محسن نے برا مان کے کہا۔ "وہ... خط پڑھ چکے تھے اور تیری حالت بھی دیکھ چکے تھے۔"

تین افراد بیک وقت کمرے میں داخل ہوئے... آگے ڈاکٹر تھا جسے میں نے عالم ہوش میں پہلی بار دیکھا تھا... اس کا چہرہ مجھے جانا پہچانا لگا۔ ویسے بھی میڈیکل بیگ... دل کی دھڑکن شمار کرنے والا گلے کا ہار اس کے ڈاکٹر ہونے... کا اشتہار تھا۔ اس کے پیچھے رابعہ اور شہلا تھیں اور ایسا دکھائی... ہوتا تھا کہ ان دونوں نے زبردستی ڈاکٹر کو آگے دھکیلا ہے... اور اب ریوالور لیے اس کے پیچھے چل رہی ہیں۔

"ملاحظہ فرمائیے ڈاکٹر صاحب!" رابعہ نے باقاعدہ ... شکایت کرتے ہوئے کہا۔ "یہ ہے آپ کا ... دوسرا باغی تیمار دار۔ دونوں آپ کی ہدایات کی صریح خلاف ورزی کر رہے ہیں۔"

ڈاکٹر نے ہم دونوں کو ملامت آمیز نظروں سے دیکھا اور نہایت خطرناک عزائم کے ساتھ میرے قریب بیٹھ کر اپنا بیگ کھولنے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ اب وہ کوئی انجکشن بھونک کر پھر اتنا غفیل کرنا چاہتا ہے۔

"قبلہ ڈاکٹر صاحب!" میں کہنا شروع کیا۔ "آپ یقین کیجیے میں بالکل صحت مند ہوں اور مجھے علاج یا تیمار داری کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔"

ڈاکٹر یوں سلو موشن میں سرنج بھرتا رہا جیسے میں کسی اور سے مخاطب ہوں۔ اور شہلا مسکراتی رہی۔ "البتہ یہ خواتین" میں نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "ان کو کچھ... ذہنی امراض لاحق ہیں۔ پاگل تو خیر نہیں ہیں مگر..."

سلو موشن میں حرکت کرنے والے ڈاکٹر نے اچانک بجلی کی طرح لپک کر میرا بازو تھام کر انجکشن لگانے کی ناکام کوشش کی۔ بڑے وقت پر میں نے پلٹا کھایا اور بیڈ کے دوسرے کنارے سے نیچے گرا۔

ڈاکٹر نے ایک سرد آہ بھری۔ تکیے میں گھپ جانے والے انجکشن کی سوئی نکالی اور اپنا سامان سمیٹنے لگا۔ جو ایک طرح سے مشن کی ناکامی کا اعلان تھا۔ "میں کچھ نہیں کر سکتا رابعہ بی بی!"

"کیا آپ کے پاس وہ گن نہیں ہے؟" رابعہ نے مایوسی سے کہا۔ "جس سے بے ہوش کرنے والے فائر کیے جاتے ہیں۔ میں نے ایک فلم میں دیکھا تھا کہ افریقہ میں گینڈے کس طرح پکڑے جاتے ہیں۔"

"یہ تقریباً ویسی ہی کوشش تھی۔" میں نے اٹھ کر فاتحانہ مسرت سے کہا۔ "لیکن جسے اللہ رکھے، اسے کون چکھے۔"

"اس کو میں بے ہوش کر سکتا ہوں۔" محسن نے دعویٰ کیا۔ "لیکن میرا خیال ہے، اس کی ضرورت نہیں رہی۔"

ڈاکٹر بہت کم گو تھا یا شاید اس معقولے پر عمل پیرا تھا کہ جواب جاہلاں باشد خاموشی۔ وہ روانہ ہونے ہی والا تھا کہ خواتین کو آداب میزبانی کا خیال آیا اور وہ چائے لانے کے لیے چلی گئیں۔ میں نے سنجیدگی سے معذرت کی اور ڈاکٹر کو یقین دلایا کہ میں اب واقعی ٹھیک ہوں اور مجھے بہت سے کام کرنے ہیں جو بے ہوش پڑے رہنے سے زیادہ ضروری ہیں۔"

"کیا ضروری ہے اور کیا ضروری نہیں۔" ڈاکٹر نے کسی فلسفی کی طرح کہا۔ "اس کا فیصلہ وقت کرے گا۔"

اسی وقت شہلا چائے کی ٹرے اٹھائے اندر آئی تو میں حیران ہوا۔ یقیناً چائے پہلے سے تیار تھی ورنہ ایک منٹ میں کیسے آ جاتی۔ ڈاکٹر ایسا مظلوم صورت تھا کہ بے اختیار اسے چھیڑنے کو دل چاہتا تھا۔ جب وہ چائے پی رہا تھا تو میں نے بڑے فخر سے اس کو بتایا کہ وقت کی کمی کی وجہ سے میں جوڈو اور کراٹے میں بلیک بیلٹ لیتے لیتے رہ گیا چنانچہ پہلے حملے کی ناکامی کے بعد وہ دوسری کوشش کرتا تو میری جگہ خود لیٹا ہوتا۔ انجکشن لگنے سے پہلے ہی میں اسے ناک آؤٹ کر دیتا۔ ڈاکٹر خاموش رہا اور رابعہ مجھے بدتمیزی کے اس مظاہرے پر گھورتی رہی۔

"اچھا مسٹر بلیک بیلٹ!" ڈاکٹر نے چلتے چلتے کہا۔ "وقت ملے تو میری بات پر بھی غور کرنا۔"

کمرے میں اپنے مختصر سے قیام کے دوران اس نے دو ہی جملے بولے اور قابل اعتبار صرف دوسرا ہی جملہ تھا۔ ڈاکٹر کے جانے کے بعد رابعہ نے اور شہلا نے ہنسنا شروع کیا اور ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا تو میں نے اور محسن نے بے وقوفوں کی طرح ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"یہ کیا چکر ہے مسٹر شیروانی؟" میں نے بیڈ پر لیٹ کر کہا۔

"چکر تو ابھی آپ کو آئیں گے۔" شہلا نے کہا۔ "یہ کمرہ آپ کی نظروں کے سامنے گھومنے لگے گا اور دنیا اندھیر ہو جائے گی۔"

"دراصل مجھے پہلے ہی اس بات کا اندیشہ تھا سکندر اعظم!" رابعہ بولی۔ "کہ تم مزاحمت کرو گے حالانکہ ابھی تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ میں نے باہر ہی ڈاکٹر سے بات کر لی تھی اور اس نے دوسرا طریقہ بھی بتا دیا تھا۔ چائے آپ کو کیسی لگی؟"

"یہ چائے تھی یا کافی؟" میں نے ڈاکٹر کی اور رابعہ کی بات پر ایک ساتھ غور کیا اور فوراً اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ جو دوا مجھے انجکشن کے ذریعے نہیں دی جا سکی، وہ مجھے چائے میں دے دی گئی ہے۔ اس کے اثرات ظاہر ہونے لگے تھے۔

"فراڈ۔" میں نے چلا کے کہا۔ "ایک مجبور اور لاچار جاں بلب مریض کے ساتھ فراڈ۔ پولیس..."

خواب آور دوا کا اثر زائل ہوا تو میری آنکھ اس وقت کھلی جب رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ کمرے میں ایک لائٹ دیوار کی اور ایک ٹیبل لیمپ میرے سرہانے روشن تھی۔ کچھ دیر تو کمرے کی ہر چیز آؤٹ آف فوکس رہی لیکن دس منٹ بعد دھند چھٹ گئی اور میں نے ہر صورت کو اپنے مقابل صاف دیکھا۔ میرے بائیں ہاتھ پر یعنی دروازے کی طرف تین کرسیاں پڑی تھیں۔ دو پر محسن اور رابعہ آمنے سامنے چپ بیٹھے تھے۔ تیسری خالی کرسی رضوی صاحب کی تھی جو ہاتھ باندھے کمرے میں ٹہل رہے تھے اور خاصے متفکر نظر

آتے تھے۔

"گڈ مارننگ انکل رضوی!" میں نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "آج مجھ پر بہت ظلم ہوا۔ ۔ ۔"

"مجھے معلوم ہے۔" انہوں نے درشتگی سے میری بات کاٹ دی اور ایک ہاتھ سے دوسری طرف اشارہ کیا۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ دائیں طرف بھی دو کرسیاں تھیں۔ ان میں سے ایک پر جو پولیس انسپکٹر بیٹھا تھا اسے میں اچھی طرح جانتا تھا۔

"ڈبل ایس آئی شیخ!" میں نے حیرت اور مسرت سے کہا اور مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ "آپ یہاں کیسے آئے؟" اس وقت تک میرا خیال یہی تھا کہ چراغ دین جیسے منشیات کے اسمگلر کی گرفتاری میں مدد کرنے پر وہ میرا شکریہ ادا کرنے آیا ہوگا یا محض میری خیریت معلوم کرنے کے لیے۔

"میرا ٹرانسفر کر دیا گیا ہے مسٹر سکندر!" ایس آئی سید اکرام شیخ نے مجھ سے ہاتھ ملا کے کہا۔ جو میرے لیے غیر متوقع بات نہیں تھی۔

"تم دونوں پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے ہو؟" رضوی صاحب نے حیرانی سے کہا اور کرسی پر بیٹھ گئے۔ "خیر یہ بڑی اچھی بات ہے۔ سکندر!" وہ مجھ سے مخاطب ہو کے بولے۔ "سب انسپکٹر شیخ ایک بہت اصول پرست اور ایماندار انسپکٹر ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے انکل!" میں نے کہا۔ "اور اسی لیے اتنا بڑا کارنامہ انجام دینے پر ان کی ترقی نہیں ہوئی بلکہ تبدیلی ہو گئی ہے۔"

"آپ نے پہلی ملاقات میں کہا تھا کہ ہم سازگار حالات میں ملے ہوتے تو اچھے دوست بن سکتے تھے۔" انسپکٹر شیخ نے کہا۔ "افسوس یہ ہے کہ ہماری دوسری ملاقات بھی ایسے ہی حالات میں ہو رہی ہے۔"

"دراصل مسٹر شیخ ایک کیس کے سلسلے میں تم سے کچھ پوچھنے کے لیے آئے ہیں۔" رابعہ نے بر وقت مداخلت کر کے مجھے خبردار کر دیا کہ میں سوچے سمجھے بغیر منہ سے کوئی بات نہ نکالوں۔

"ان کو کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں ہوں؟" میں نے رابعہ کی طرف دیکھا۔

"انہوں نے مجھے فون کیا تھا۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "پولیس کے ریکارڈ پر تمہارا پتہ وہی ہے جو میرا ہے۔ میں ان کو یہاں لے آیا ہوں اور مجھے یہاں رابعہ لائی تھی۔"

"ویسے آپ کو اپنا پتہ بدلنے سے پہلے عدالت کو مطلع کر دینا چاہیے تھا۔" انسپکٹر شیخ نے کہا۔

"جس روز میں گھر بدلوں گا یہی کروں گا۔" میں نے کہا۔ "یہ تو میری بہن کا گھر ہے۔"

"میری حاصل کردہ معلومات کے مطابق آپ کی کوئی بہن نہیں ہے۔" انسپکٹر شیخ نے ایک خاصی ضخیم فائل دکھا کے کہا۔ "آپ وزیر خان مرحوم کے ایک ہی وارث ہیں۔"

بے اختیار میں نے رابعہ، محسن اور رضوی صاحب کی طرف دیکھا۔ یہ پوچھنے کے لیے کہ کیا ایک ہی سوال کا جواب انکار بھی ہو سکتا ہے اور اقرار بھی؟ آخر میں کس کا وارث ہوں؟ ریاست سلطان آباد کے سابق حکمران نواب خورشید کا؟ یا اس وزیر خان کا جس نے پاکستان کی خاطر اپنے پورے خاندان کی زندگی کا نذرانہ دے کر صرف مجھے بچا لیا تھا؟ اور جو لکھ پتی ہونے کے باوجود بے بسی کی موت مرا؟ ایسے سوالات میرے ذہن میں پہلے کبھی پیدا نہیں ہوئے تھے۔ رابعہ اور محسن کے علاوہ رضوی صاحب نے میرے خیالات کو میری صورت پر پڑھ لیا تھا اور مجھ سے نظر ملاتے ہوئے کترا رہے تھے۔

"مسٹر سکندر! میرا چراغ دین کے کیس سے کوئی تعلق نہیں رہا۔" شیخ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "لیکن اس کیس کی تفتیش اپنے جانشین کے سپرد کرنے سے پہلے مجھے آپ کے بارے میں اور آپ کے والد کے متعلق بہت سی باتیں معلوم ہو گئی تھیں مگر میں ان کا ذکر نہیں کروں گا۔ اب جو کیس مجھے دیا گیا ہے اس کا تعلق تین افراد سے ہے۔ دو کے بارے میں میڈیکل رپورٹ اور ابتدائی شہادت سے ثابت ہوتا ہے کہ دونوں نے ایک دوسرے کو قتل کر دیا تھا۔ ایک کا نام عبدل تھا اور دوسرے کو شیدا کہا جاتا تھا اور یہ دونوں میر شرافت علی کے ملازم تھے۔ ۔ ۔"

"اور میر شرافت علی کا قاتل میں ہوں؟" میں نے اس کی بات کاٹ کر تلخی سے کہا۔ "رائٹ؟"

"یہ فیصلہ تو صرف عدالت ہی کر سکتی ہے۔" انسپکٹر شیخ نے کہا۔ "میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ تم پر اس قتل کا الزام ہے۔"

شہلا کے اندر آ جانے کے باعث وہ خاموش ہو گیا۔ شہلا نے مجھے دوا دی اور چائے کی ٹرے درمیان میں رکھ کے خاموشی سے باہر چلی گئی۔ "میں اس لڑکی کو بہن کہتا ہوں اور سمجھتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اس کا نام شہلا ہے۔"

"وہیں ہلاک ہونے والی بوڑھی عورت عبدل کی ماں تھی۔" انسپکٹر شیخ نے میری بات کو اہمیت دیے بغیر نگاہ فائل پر رکھی۔ "پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق اس کی موت حرکت قلب بند ہو جانے کے سبب ہوئی تھی۔"

"پولیس کو اس واردات کی اطلاع کس نے دی تھی؟" میں نے رابعہ کے ہاتھ سے چائے کا کپ لے کر آگے بڑھایا۔

"مجھے بتایا گیا تھا۔" شیخ نے چائے کا کپ لیتے ہوئے رضوی صاحب کی طرف دیکھا۔ "کہ آپ بیمار ہیں، کچھ ملیریا وغیرہ تھا آپ کو۔ چنانچہ میں شام کو ایس پی صاحب کے گھر پہنچا۔ ایس پی صاحب کے پاس جانے کا ایک مقصد یہ تھا کہ آپ کی خیریت معلوم کروں اور دوسرا مقصد آپ سے ان دونوں کے بارے میں پوچھنا تھا۔ یعنی عبدل اور رشید سے کے بارے میں کیونکہ وہ۔ ۔ ۔ شرافت علی کے قتل کے چشم دید گواہ تھے اور استغاثہ کا سارا کیس ان کی گواہی پر منحصر تھا۔ ۔ ۔"

"کتنی عجیب بات ہے انسپکٹر شیخ!" میں نے کہا۔ "صفائی کا صرف ایک ہی گواہ تھا، سلامت شاہ۔"

"پلیز۔ آپ مجھے بات ختم کرنے دیں۔" انسپکٹر شیخ نے کپ رکھتے ہوئے کہا۔ "ایس پی صاحب نے بتایا کہ آپ بیمار ہیں اور آپ کو ابھی تک دُہرے قتل کی اس واردات کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔ اخبار آپ نے دیکھا نہیں اور باقی لوگوں نے بیماری کی وجہ سے آپ کو یہ بات نہیں بتائی۔" وہ ذرا دیر کے لیے رُکا، سگریٹ جلا کے اس نے ایک کش لیا اور دوبارہ بات شروع کی۔ "یہ دو دن پہلے کی بات ہے یعنی منگل کی رات کو تقریباً ایک بجے۔ یا آپ کہہ سکتے ہیں کہ بدھ کی صبح ایک بجے کسی شخص نے پولیس اسٹیشن فون کیا۔ اتفاق سے رات کی ڈیوٹی پر میں تھا۔ ریسیور میں نے ہی اٹھایا تو فون کرنے والے نے کہا کہ وہ کسی ذمے دار افسر سے بات کرنا چاہتا ہے۔ میں نے کہا کہ میں سب انسپکٹر شیخ بول رہا ہوں اور تم مجھ پر اعتماد کر سکتے ہو۔ اس نے کہا، جناب انسپکٹر صاحب! سوالات بعد میں کیجیے گا، پہلے میرا بیان لکھ لیجیے یا ٹیپ کر لیجیے کیونکہ میں شدید زخمی ہوں اور مجھے اپنی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ ہو سکتا ہے آپ کے پہنچنے سے پہلے ہی مر جاؤں اور میں بیان دیے بغیر مرنا نہیں چاہتا۔ اب یہ اتفاق ہے کہ اس وقت تھانے میں ایک ٹیپ ریکارڈر موجود تھا۔ چند روز قبل ایک چور پکڑا گیا تھا اور اس کے قبضے سے چوری کا مال برآمد ہوا تھا اس میں یہ ٹیپ ریکارڈر بھی شامل تھا جو بالکل نیا تھا۔ فون کرنے والے کی آواز بتاتی تھی کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا ہے۔ میں نے ٹیپ ریکارڈر پلگ کر کے آن کیا اور اسے ٹیلی فون سے منسلک کر دیا۔ وہ گرینڈگ جرمنی کا خاصا مہنگا ٹیپ ریکارڈر تھا۔ ماڈل ٹی کے ۲۴۷۔ جو میرے گھر میں بھی ہے۔ اس میں ٹیلی فون کے پیغامات ریکارڈ کرنے کا خصوصی نظام ہے۔ آپ اسے ٹیلیفون سے منسلک کر دیں تو یہ آپ کی عدم موجودگی میں آنے والی ہر کال ریکارڈ کر سکتا ہے اور آپ جب بھی واپس آئیں ٹیپ ری وائنڈ کر کے سارے پیغامات سن سکتے ہیں۔ کیونکہ میں اس کے طریقہ استعمال سے واقف تھا اس لیے مجھے ٹیلی فون اور ٹیپ ریکارڈر کا کنکشن ملانے میں ایک منٹ بھی نہیں لگا۔ عبدل کا وہ بیان جو اس نے مرنے سے پہلے دیا لفظ بہ لفظ اس کی اپنی آواز میں ریکارڈ ہو گیا۔ جب میں پولیس پارٹی کے ساتھ عبدل کے پتے پر یعنی۔ ۔ ۔ میر شرافت علی کی پرانی کوٹھی "رین بسیرا" پر پہنچا تو عبدل ایک بیڈ روم میں ٹیلی فون کے قریب مرا پڑا تھا۔ بعد میں ٹیپ کی مدد سے ہم نے اس بیان کو کاغذ پر اتار لیا۔ اگر تھوڑی سی مہلت ملتی تو میں تحریری بیان پر عبدل کے دستخط بھی حاصل کر لیتا۔"

"لیکن اب تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" میں نے کہا۔ "آپ کے پاس ٹیپ جو ہے اور جہاں تک میری قانونی معلومات کا تعلق ہے، میرا خیال ہے کہ وہ بیان سچ سمجھا جاتا ہے جو کوئی شخص مرنے سے پہلے دیتا ہے۔"

میری بات کا انسپکٹر شیخ نے فوراً جواب نہیں دیا۔ اس نے سگریٹ کو فرش پر ٹھال کے جوتے سے مسل دیا کیونکہ آس پاس کوئی ایش ٹرے نہیں تھا۔ "آپ کی بات غلط نہیں ہے۔" اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ "افسوس یہ ہے کہ وہ ٹیپ غائب ہو گیا تھا۔"

"غائب ہو گیا تھا؟" میں نے اس بات کا مطلب ذہن نشین کرنے کے بعد کہا لیکن یہ کوئی سوال نہیں تھا۔ "شیخ صاحب! ٹیپ چوری ہو سکتا ہے، تباہ ہو سکتا ہے یا گم ہو سکتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ریکارڈنگ کو عمداً صاف کر دیا جائے مگر ایک اچھوتا پانی کے بلبلے کی طرح غائب نہیں ہو سکتا۔"

"آپ کا طنز کرنا بجا ہے۔" شیخ بولا۔ "مجھے یہ کہنا چاہیے تھا کہ ٹیپ غائب کر دیا گیا ہے یا چوری کر لیا گیا ہے۔ ٹیلی فون پر عبدل کا بیان پورا ہوتے ہی میں نے محرر کو سمجھایا کہ ٹیپ کے الفاظ کو کاغذ پر کیسے اتارنا ہے اور خود دو سپاہیوں کے ساتھ جائے واردات پر پہنچ گیا۔ یہاں تھانوں میں آمد و رفت کی کوئی سہولت تو ہوتی نہیں چنانچہ مجھے سڑک تک آ کے کچھ دیر انتظار کرنا پڑا اور جب ہم ٹیکسی میں میر شرافت علی کی کوٹھی پہنچے تو آدھا گھنٹہ گزر چکا تھا۔ میں نے محرر کو ہدایت کی تھی کہ بیان کی نقل بن جائے تو فوراً کسی کے ہاتھ روانہ کر دے۔ مقصد یہی تھا کہ عبدل زندہ مل جائے تو بیان پر اس کے دستخط لے لوں یا اس کا انگوٹھا لگوا لوں لیکن عبدل تو میرے پہنچنے سے پہلے ہی مر چکا تھا۔ بیان کی نقل ایک گھنٹے بعد موصول ہوئی۔ اس کے بعد میں ضابطے کی کارروائی میں الجھ گیا۔ شیدے کی لاش مجھے کمرے میں سے ملی اور عبدل کی ماں کی لاش بھی۔ میں نے آلۂ قتل وغیرہ اپنے قبضے میں کیے، فنگر پرنٹ لیے، آس پاس رہنے والوں کو بلوایا اور بالآخر تقریباً صبح کے دس بجے لاشوں کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوانے کے بعد

واپس پولیس اسٹیشن پہنچا۔ اگر یہ وارت نہ ہوتی تو میری ڈیوٹی آٹھ بجے ختم ہو جاتی۔ میری عدم موجودگی میں ڈیوٹی پر حشمت خان آ گیا تھا۔"

"حشمت خان؟" میں نے چونک کر کہا۔ "پھر تو یہ ہونا ہی تھا۔"

"نہیں، ٹیپ حشمت خان نے غائب نہیں کیا۔" شیخ نے کہا۔ "اس کی قسموں پر تو میں نے بھی اعتبار نہیں کیا تھا۔ اس نے میرے پوچھنے پر کسی ٹیپ کی موجودگی سے قطعی لاعلمی ظاہر کی اور کہا کہ وہ آٹھ کے بجائے ساڑھے نو بجے یعنی صرف آدھے گھنٹے پہلے آیا تھا اور اس آدھے گھنٹے میں روزنامچہ دیکھنے یا چائے پینے کے سوا اس نے کوئی کام نہیں کیا۔ وہ تو اپنی سیٹ پر سے اٹھا بھی نہیں۔ ٹیپ ریکارڈر وہیں موجود تھا جہاں میں نے اس کو پلگ میں لگایا تھا لیکن اس میں کوئی اسپول نہیں تھا۔ میرے ہنگامہ کرنے پر وہ محرر جاگ اٹھا جو رات کی ڈیوٹی پر تھا اور پیچھے والے کمرے میں سو رہا تھا۔ اس نے بروقت مداخلت کی ورنہ میری حشمت خان سے بھی جنگ چھڑ جاتی اور میں رپورٹ حکام بالا تک ضرور پہنچاتا۔ محرر نے رازداری کے وعدے پر ڈرتے ڈرتے مجھے بتایا کہ جب وہ ٹیپ کو کاپی کر رہا تھا تو ایس ایچ او صاحب نے راؤنڈ لگایا تھا اور پوچھا تھا کہ یہ کیا تماشا ہے...؟"

"ایس ایچ او کے فرائض اب بھی وہی انجام دے رہا ہے؟" میر محمد؟" میں نے پوچھا۔

"پولیس تھانے کے بارے میں تمہاری معلومات خاصی اپ ٹو ڈیٹ ہیں۔" انسپکٹر شیخ نے کہا۔ "محرر نے بتایا کہ ٹیپ ایس ایچ او صاحب ہی نے نکال لیا تھا اور ظاہر ہے ایک محرر اسے روک نہیں سکتا تھا۔ اس نے مجھے خبردار کیا کہ میر محمد انتہائی کمینہ اور کینہ پرور آدمی ہے اگر اسے معلوم ہو گیا کہ محرر نے ٹیپ کی چوری کا الزام اس پر عائد کر دیا ہے تو میرے ساتھ وہ محرر کی جان کا دشمن بھی ہو جائے گا۔ میں نے اسے اطمینان دلایا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہوگی اور وہ مطمئن رہے۔ ابھی مجھے اس تھانے میں پہنچے ہوئے جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوتے تھے اور تقریباً ہر شخص سے اختلاف اور تلخ کلامی کی نوبت آ چکی تھی۔ جب میں ڈیوٹی پر ہوتا تھا تو سارے عملے کے لیے مسئلہ بن جاتا تھا خصوصاً نائٹ ڈیوٹی کے دوران۔ ایک تو انہیں ہر شخص کی رپورٹ لکھنی پڑتی تھی اور قطعی غیر جانبداری کے ساتھ۔ نذر نذرانے کی مدد سے حقائق کو مسخ کرنے یا ظالم کو مظلوم بنا دینے کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی تھی۔ لوگ رات کے وقت اپنے عزیزوں کو گھر سے کھانا پہنچاتے اور تشدد سے بچانے کے لیے بھاری معاوضے ادا کرتے ہیں۔ میری موجودگی میں یہ سب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ پہلی بار میر محمد سے میری اسی بات پر بحث ہوئی۔ اس نے مجھ سے بڑے غلط لہجے میں کہا کہ مسٹر شیخ! آپ نے ہے کہ تم نے رات کو تفتیش میں رکاوٹ ڈالی، تھانے کے عملے کو معمول کے مطابق کام نہیں کرنے دیا اور لوگوں کو بھی پریشان کیا۔ میں نے کہا کہ مسٹر قائم مقام ایس ایچ او صاحب! پہلی بار میں آپ کو معاف کر رہا ہوں۔ آئندہ یاد رکھیے گا کہ میرا نام اکرام شیخ ہے۔ باقی الزامات میرے لیے نئے نہیں ہیں۔ اگر کسی کو مجھ سے شکایت ہے تو تحریری طور پر آپ کو دے سکتا ہے، اوپر بھیج سکتا ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ میں اپنی موجودگی میں کسی کو بھی کوئی غلط کام نہیں کرنے دوں گا۔ میں نے پولیس کی نوکری ایک مشن سمجھ کے کی ہے اور یہ مشن ہے قانون کی مدد سے معاشرے کی اصلاح کا۔ ورنہ میرا باپ بزنس مین ہے اور مجھے پیٹ پالنے کے لیے اس تنخواہ کی بھی ضرورت نہیں۔ میر محمد بہت ہنسا اور کہنے لگا کہ شہزادے! کبھی ایک چنا بھاڑ پھوڑنے میں کامیاب ہوا ہے؟ نوکری کی ضرورت نہیں ہے تو گھر جاؤ اور عیش کرو تاکہ دوسرے بھی عیش کریں۔ میں نے کہا کہ نوکری تو حکومت کی ہے، تمہارے یا کسی اور کے کہنے سے میں گھر جا کے نہیں بیٹھ سکتا اور آئندہ ایسی بات مجھ سے کہنا بھی نہیں۔ خیر اس کے بعد میری اور میر محمد کی کوئی بات نہیں ہوئی۔ محرر سے حقیقت معلوم ہو جانے کے بعد میں بڑی الجھن میں پڑ گیا۔ یا تو خود محرر گواہی دیتا کہ اس نے میر محمد کو ٹیپ لے جاتے دیکھا ہے لیکن یہ ناممکن تھا۔ اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں تھی کہ میں میر محمد پر الزام عائد کر سکتا۔ میں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد ایک چال چلی۔ میں حشمت خان کو چارج دے کر نکلا اور پیچھے سے گھوم کر پھر اسی کمرے میں آ گیا۔ میں نے محرر سے کہا کہ وہ باہر برآمدے میں جا کے سو جائے۔ میں خود اس کی جگہ لیٹا رہا کہ کوئی اور آئے تو مجھے سوتا دیکھ کر لوٹ جائے۔ مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ بیس منٹ بعد میر محمد آ گیا۔ حشمت خان نے فوراً اسے مطلع کیا کہ میں ٹیپ کے نہ ملنے پر سخت برہم تھا۔ حسب توقع میر محمد نے مجھے ایک سے ایک گندی گالی دی اور اس عزم کا اظہار کیا کہ اس نے میری ایسی تیسی کر کے مجھے پولیس سے نہ نکلوایا تو اپنا نام بدل دے گا اور مجھے افسوس ہوا کہ میرے پاس ان کی گفتگو کو ریکارڈ کرنے کا کوئی بندوبست نہیں تھا اور میں عقبی دروازے سے لگا کھڑا تھا۔ اگر میرے پاس کوئی چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر بھی ہوتا تو صورت حال مختلف ہو جاتی۔ میرے ساتھ اس کی ہاں میں ہاں ملانے والا احمق خود حشمت خان ... جانا۔ اس موضوع پر ان کی گفتگو ختم ہوئی تو میں ایک دم سامنے آ گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ذرا سی دیر کے لیے ان دونوں کی حالت غیر ہو گئی تھی مگر وہ پرانے پاپی ہیں۔ انہوں نے فوراً اپنے آپ کو سنبھال لیا اور میں نے کہا کہ میر صاحب! جو کچھ آپ نے فرمایا ہے وہ سب میں نے سنا۔ جتنی گالیاں آپ نے مجھے دیں ان سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا اور آپ دونوں مل کر میرا جو بگاڑنا چاہیں بگاڑ لیں مگر وہ ٹیپ مجھے اسی وقت مل جانا چاہیے۔ ان دونوں کی اداکاری واقعی کمال کی تھی۔ میر نے بڑی حیرانی سے حشمت خان کی طرف دیکھا اور کہا کہ یہ شیخ صاحب کیا فرما رہے ہیں؟ ہم نے انہیں گالیاں اور دھمکیاں دی ہیں؟ اور حشمت خان نے بھی اتنی ہی حیرانی سے نفی میں سر ہلایا اور کہا کہ ہم نے تو شیخ صاحب کی بات ہی نہیں کی۔ میں نے کہا کہ اچھا یہ سب چھوڑو اور وہ ٹیپ نکالو۔ میر نے قطعی لاعلمی ظاہر کی اور کہا کہ ٹیپ ریکارڈر میں کوئی ٹیپ تھا ہی نہیں۔ میری دھمکی پر اس نے وہ مشیر نامہ میرے سامنے رکھ دیا جس میں برآمد ہونے والے تمام سامان کی تفصیل لکھی ہوئی تھی جس میں ٹیپ ریکارڈر اور اس کا ماڈل نمبر وغیرہ سب درج تھے لیکن یہ واقعی نہیں تھا کہ ٹیپ ریکارڈر کے اندر کوئی اسپول بھی تھا۔ ظاہر ہے اس پر کسی نے غور ہی نہیں کیا تھا۔ یا غور کیا تھا تو قابل ذکر نہیں سمجھا تھا۔ اب یہی نادانستگی میں ہونے والی غلطی یا فروگزاشت ایک انتہائی سنگین مسئلہ بن گئی تھی۔ جس کی عدم موجودگی میں محرر کے ہاتھ کا لکھا ہوا بیان بے معنی تھا۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ محرر کے ہاتھ کی تحریر میں وہ بیان میرے پاس پہنچ گیا۔ اگر خود میں نے اسے کاپی کیا ہوتا تو میرے پاس کوئی گواہ بھی نہ ہوتا۔ محرر کی پوزیشن بڑی خراب ہے۔ وہ بیوی بچوں والا آدمی ہے اور میر محمد سے ڈرتا ہے کہ دشمن ہو گیا تو کسی الزام میں پھنسا کے نوکری سے بھی نکلوا دے گا اور جیل بھی بھجوا دے گا کیونکہ حشمت خان اینڈ کمپنی بھی میر محمد کے ساتھ ہے۔ میں نے محرر سے بات کی تھی کہ دیکھو یہ ایک شخص کی زندگی اور موت کا سوال ہے۔ اگر یہ ثابت نہ ہو سکا کہ عبدل اور رشید نے ایک دوسرے کو قتل کیا تھا تو الزام خود بخود اس شخص پر آ جائے گا جو پہلے ہی ایک قتل کے مقدمے میں ملوث ہے لیکن ضمانت پر رہا کر دیا گیا ہے۔ اس کی ضمانت فوراً منسوخ کر دی جائے گی کہ اس نے اپنی آزادی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دونوں چشم دید گواہوں کو ٹھکانے لگا دیا اور اس کے بعد یہ تین افراد کے قتل عمد کا کیس بنے گا جس میں سزائے موت یقینی ہو گی۔ تحریر تمہارے ہاتھ کی ہے اس لیے مجھے صرف تمہاری گواہی چاہیے کہ عبدل نے مرنے سے پہلے فون کیا تھا اور تم نے وہی لکھا تھا جو اس نے ٹیلی فون پر کہا تھا۔ محرر نے پھر اپنے بیوی بچوں کی بات کی۔ میں نے کہا کہ رزق دینے والا تو خدا ہے۔ تمہیں اس پر اور اپنے آپ پر بالکل اعتماد نہیں، نعوذ باللہ میر محمد کاتب تقدیر تو نہیں ہے... لیکن میرے دلائل سے فائدہ کچھ نہیں ہوا۔ محرر نے صاف بتا دیا کہ وہ میرے حق میں گواہی نہیں دے گا۔ اسے عاقبت میں اپنی سزا قبول ہے لیکن وہ دنیا میں بیوی بچوں کو فاقہ کشی، مفلسی اور پریشانی کی سزا نہیں دے سکتا۔ وہ اکیلا ہوتا تو پھانسی بھی چڑھ جاتا مگر اس پر اپنے خاندان کے علاوہ بوڑھے اور بیمار والدین کی ذمہ داری بھی ہے۔ میں اس کے ساتھ کوئی زبردستی نہیں کر سکتا اور مجھے اندازہ ہو چکا ہے کہ میں نے عبدل کے اس بیان کا حوالہ دیا جو اس نے اپنے ہاتھ سے لکھا تھا تو وہ کہے گا کہ شیخ صاحب نے سر پر کھڑے ہو کے مجھ سے یہ تحریر لکھوائی تھی۔ وہ افسر ہیں اور میں انکار نہیں کر سکتا تھا اس لیے وہ جو کچھ کہتے گئے، میں لکھتا گیا۔"

کمرے میں موجود ہر شخص خاموش تھا۔ رابعہ سر جھکائے اپنے دوپٹے کو ایک انگلی پر لپیٹ رہی تھی اور کھول رہی تھی۔ یہ اضطراری حرکت اس کے جذباتی خلفشار کی آئینہ دار تھی۔ محسن میری بجائے رابعہ کو زیادہ غور سے دیکھ رہا تھا اور رضوی صاحب نے پھر ٹہلنا شروع کر دیا تھا۔

"کیا تمہاری اپنی گواہی بالکل معتبر نہیں سمجھی جائے گی؟" میں نے کھوکھلی آواز میں کہا۔ اس آواز میں ویرانی کی آسیب زدہ بازگشت تھی چنانچہ مجھے خود بھی اپنی آواز سے خوف آیا۔

"سکندر! اس وقت میں پولیس افسر نہیں ہوں۔" شیخ نے میرا ہاتھ تھام کے کہا۔ "مجھے تم سے اور تمہارے حالات سے پوری ہمدردی ہے لیکن قانون کے تقاضے نظر انداز نہیں کیے جا سکتے۔ بے شک میں تفتیش کے لیے ایس پی صاحب کے گھر گیا تھا لیکن مجھے معلوم ہوا کہ تم بیمار ہو تو میں بیان لینے کے لیے یہاں آ گیا اور میں نے تم کو وہ ساری باتیں تفصیل سے بتا دیں جو ابھی تک میرے سوا کوئی نہیں جانتا اور اس کی ایک وجہ ہے۔ میں ایس ایس پی صاحب کے عہدے سے مرعوب نہیں مگر ان کے کردار سے متاثر ہوں اور یہی بات میرے لیے قابل عزت ہے۔ یہاں آنے کے بعد مس رابعہ قاری نے بھی مجھ پر واضح کر دیا تھا کہ وہ تمہاری وکالت کر رہی ہیں اور کمرے میں موجود رہیں گی۔ کوئی اور وکیل ہوتا تو شاید میں یہ درخواست مسترد کر دیتا۔ میں نے تو محسن کو بھی کمرے سے نہیں نکالا۔ بہت سی باتیں میں نے معلوم کر لی تھیں مگر جو کچھ میں نے دیکھا وہ بالکل مختلف تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ آپ سب لوگ خون کا رشتہ نہ ہونے کے باوجود ایک خاندان کی طرح ہیں جس کی بنیاد اپنائیت کے احساس، خلوص اور اعتماد پر ہے مثلاً وہ لڑکی جو ابھی چائے لے کر

آئی تھی، تم اسے بہن کہتے ہو اور سمجھتے ہو۔ میں جب کام سے کہیں جاتا ہوں تو چائے کا ایک کپ بھی نہیں پیتا لیکن یہاں میں نے انکار نہیں کیا۔ دراصل اس گھر کی فضا میں مجھے اعتماد نظر آتا ہے۔ اعتماد نہ ہوتا تو ایس پی صاحب مجھے یہاں لے کر ہی نہ آتے۔ میری اپنی زندگی کے تجربات بالکل مختلف ہیں اور خاصے ناخوشگوار۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت میں تم سے دوست بن کے بات کر رہا ہوں۔ بے شک میری گواہی تمہارے حق میں ہوگی اور سچ بات کہنے سے مجھے کوئی نہیں روک سکے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ تمہیں اس سے کوئی فائدہ ہونے کی اُمید نہیں رکھنی چاہیے۔ جس تھانے سے مجھے ٹرانسفر کیا گیا ہے وہاں بھی تمہارے نام کے ساتھ میرا نام لیا گیا تھا اور یہ کہا گیا تھا کہ میں نے اپنے اختیارات سے تجاوز کر کے تمہیں ملزم چراغ دین سے لاک اپ میں ملاقات کی اجازت دی تھی۔ میرے کارنامے کو تمہاری مخبری سے منسوب کیا گیا تھا۔ اب میں عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہو کے کہوں گا کہ عبدل اور رشیدے کو سکندر بخت نے قتل نہیں کیا تھا۔ عبدل نے رشیدے کو اس لیے مار دیا تھا کہ اس نے سرونٹ کوارٹر میں ایک بوڑھی عورت کو اکیلا پا کے ڈاکا ڈالنے کی کوشش کی اور اس کا زیور وغیرہ اتارنے کے لیے زبردستی کر رہا تھا کہ عبدل آ گیا۔ اس نے مشتعل ہو کے رشیدے پر گولی چلا دی اور رشیدے نے مرتے مرتے عبدل کو گولی مار دی۔ یہ سب ایک تحریری بیان کی صورت میں پہلے سے موجود ہے لیکن یہ ثابت کیسے ہوگا کہ یہی وہ بیان ہے جو عبدل نے ٹیلی فون پر دیا تھا اور میں نے ٹیپ کیا تھا۔ اس ٹیپ کا تو وجود ہی ثابت نہیں ہوتا۔ اگر عبدل نے کسی دوسرے گھر سے فون کیا ہوتا تو ممکن ہے کوئی گواہ مل جاتا جو اس بیان کی تائید کرتا۔ اب تو یہ فرض کر لیا جائے گا اور کہا بھی جائے گا کہ میں تمہارے احسان کا بدلہ چکا رہا ہوں۔ تمہاری مخبری سے میں نے منشیات کے اسمگلروں کے ایک گروہ کی بیخ کنی کی تھی اور اب تمہارے لیے صفائی کا گواہ بن گیا ہوں۔ پھر میری پوزیشن پر غور کرو کہ میں ہی ڈیوٹی پر تھا، میں نے ہی جائے واردات پر پہنچ کے ابتدائی تفتیش کی۔ ثبوت، شہادت، گواہوں کے بیانات وغیرہ حاصل کیے۔ یہ کیس پہلے سے میرے پاس تھا۔ اب میں ہی صفائی کا گواہ بن کے پیش ہوا تو اس کے دو نتیجے نکالے جائیں گے۔ ایک یہ کہ مجھے بہت بھاری رشوت دی گئی ہے۔ دوسرا یہ کہ مجھ پر رضوی صاحب کا دباؤ ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے پہلے کہا، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں سچ نہیں بولوں گا۔ ثبوت کے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں کسی کی زبان سے یا نوکری کے خیال سے نہیں ڈرتا کیونکہ میرا اپنا ضمیر بالکل مطمئن ہے۔

کل وکیلِ سرکار کی طرف سے درخواست لگائی جائے گی کہ تمہاری ضمانت منسوخ کر دی جائے جو منظور ہو جائے گی اور کل ہی تمہارے وارنٹ جاری ہو جائیں گے۔ میر محمد کہتا ہے کہ اس مرتبہ تمہیں جوڈیشل ریمانڈ پر جیل نہیں بھیجا جائے گا بلکہ پولیس تمہارا جسمانی ریمانڈ حاصل کرے گی۔ تمہارے دونوں وکیل بہت بڑے وکیل ہیں اور تمہارے ساتھ بہت مخلص ہیں لیکن مجھے ڈر ہے کہ ان کی قابلیت اور ان کا خلوص تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکے گا۔ ہو سکتا ہے کل مجھے ہی تمہارے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈالنی پڑے اور اپنے ساتھ لے جانا پڑے۔ اس سے دل شکستہ مت ہونا۔ ان سب لوگوں کی طرح میں بھی تمہارے ساتھ ہوں کیونکہ مجھے بھی تمہاری بے گناہی کا پورا یقین ہے۔"

"تھینک یو۔ تھینک یو ویری مچ شیخ!" میں نے فرطِ جذبات سے گلوگیر آواز میں کہا۔ "وہ شخص خود کو اکیلا اور بے سہارا کیسے سمجھ سکتا ہے جس کے ساتھ خدا کے علاوہ اتنے نیک دل اور مخلص دوست بھی ہوں۔"

قانونی کارروائی پوری کرنے کے لیے انسپکٹر شیخ نے میرا بیان لکھا۔ میں نے اپنے بیان میں وہی کہا جو مجھے کہنا چاہیے تھا یعنی یہ کہ جس رات رشیدے اور عبدل کا قتل ہوا، میں عبدل کے کہنے پر اس کے ساتھ ضرور گیا تھا۔ وہ خود مجھے بلانے کے لیے رضوی صاحب کے گھر آیا تھا اور یہ کہا تھا کہ اس کی بوڑھی اور بیمار ماں مجھ سے ملنا چاہتی ہے اور جاتے وقت یہ بات میں نے رضوی صاحب کو بھی بتا دی تھی۔

"مسٹر سکندر! اپنے بیان کو آپ ان واقعات تک محدود رکھیں جو میر شرافت علی کی کوٹھی میں پیش آئے۔" انسپکٹر شیخ نے مداخلت کی۔

"دراصل یہ سب باتیں تو میں اپنے بیان میں بھی بتا چکا ہوں۔" رضوی صاحب نے کہا۔

"سب سے پہلے یہ بتائیے کہ عبدل نے آپ سے جھوٹ بولا تھا تو آپ نے اس پر یقین کیسے کر لیا؟" شیخ نے کہا۔ "کیا آپ کو معلوم نہیں تھا کہ وہ آپ کا دوست یا ہمدرد نہیں ہے دشمن ہے؟"

"اس نے مجھ سے جھوٹ نہیں بولا تھا۔" میں نے کہا۔ "عبدل کی ماں نے مجھے واقعی بلایا تھا۔"

"کیا اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ عبدل کی ماں تمام حالات سے بے خبر تھی۔۔۔؟" شیخ بولا۔ "یعنی اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کا بیٹا تمہارے خلاف قتل کے کیس میں ایک چشم دید گواہ ہے؟"

ایک ایسی عورت کو دنیا میں پیش آنے والے واقعات کی خبر کیسے ہو سکتی ہے انسپکٹر! جس کو عمر نے اور بیماری نے بستر سے اٹھنے کے قابل بھی نہ چھوڑا ہو اور جو کچھ دیکھ بھی نہ سکتی ہو۔" میں نے کہا۔ "وہ اپنی تاریک دنیا میں بھی اتنی ہی اکیلی رہتی تھی جتنی اب قبر کے اندھیرے میں ہوگی۔ اس کی یادوں کے رشتے ماضی سے ملتے تھے اور صرف اس کے تصور میں استوار تھے۔ شاید اسے اتنا ہی معلوم تھا کہ پہلے وہ ہندوستان میں تھی اور اب پاکستان میں ہے لیکن اسے یہ کون بتاتا کہ زمین کے ساتھ ہی انسان بدل گئے ہیں۔ انسانوں کے چہرے ہی نہیں اُن کے دل بدل گئے ہیں اور محبتوں کے رشتے عداوتوں میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ اسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ میرے والد وزیر خان کا انتقال ہو چکا ہے اور وہ یہی سمجھتی تھی کہ میر شرافت علی اور وزیر خان کی دوستی آج بھی قائم ہے۔"

"پھر ایسی کیا بات تھی کہ اس نے اچانک تمہیں طلب کر لیا اور تم سوچے سمجھے بغیر چلے گئے؟"

"یہ غلط ہے کہ میں سوچے سمجھے بغیر چلا گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "میں نے محسن کو بھی اپنے ساتھ رکھا تھا اور ہم دونوں نے سازش کے امکانات کو نظر انداز نہیں کیا تھا۔ محسن کا باہر رک کر حالات پر نظر رکھنا اور میری واپسی تک انتظار کرنا بھی یہ ظاہر کرتا ہے کہ ہم اپنی حفاظت کے خیال سے غافل نہیں تھے۔ اس کے علاوہ رضوی صاحب نے ہمیں یقین دلایا تھا کہ وہ ہمارے لیے مناسب حفاظتی انتظامات کر دیں گے۔"

"یہ دلیل بالکل بے وزن ہے۔" شیخ نے کہا۔ "اور اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میں عرض کروں کہ آپ میں سے کسی نے بھی عقلمندی کا ثبوت نہیں دیا۔ میں تمام واقعات کو دُہرانا نہیں چاہتا لیکن اب تک جو کچھ ہو چکا ہے اس کے بعد آپ کو سمجھ لینا چاہیے کہ اپنے معاملات سے خود نمٹنے میں خطرہ ہی خطرہ ہے۔ اگر وہاں چار آدمی پہلے سے موجود ہوتے اور وہ آپ کے ٹکڑے کر دیتے تو باہر انتظار کرنے والا محسن ان کا کیا بگاڑ لیتا اور ایس پی صاحب نے کوٹھی کے باہر ٹینک بھی کھڑے کر دیے ہوتے تو کیا تمہاری جان بچ جاتی؟ حفاظتی انتظامات اور اپنی احتیاط پسندی کی بات مت کرو۔ بس یہ کہو کہ زندگی باقی تھی اور خدا نے تمہیں محفوظ رکھا۔ تمہاری جگہ وہ دونوں مارے گئے جو تمہاری جان کے دشمن تھے اور تم سلامتی کے ساتھ لوٹ آئے۔ فرض کرو تم جانے سے پہلے پولیس کو اطلاع کر دیتے اور مسلح پولیس کے ساتھ جاتے۔ ظاہر ہے اس کے بعد وہ سب کچھ نہ ہوتا جو ہوا۔ پولیس کی موجودگی میں عبدل اور رشیدا ایک دوسرے کو قتل نہ کرتے لیکن سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا کہ خود پولیس تمہاری بے گناہی کی گواہ ہو جاتی۔"

ہم میں سے کوئی بھی شیخ کی دلیل کو مسترد نہیں کر سکتا تھا۔ یہاں تک کہ خود رضوی صاحب بھی خاموش تھے۔ "میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس وقت مجھے عبدل کی بات اور اس کے لہجے نے قائل کر لیا تھا کہ مجبور وہ خود ہے اور اگر اس کی ماں بضد نہ ہوتی تو وہ خود بھی میرے سامنے آنے کی ہمت نہ کرتا۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ اسے دیکھتے ہی میں مشتعل ہو جاتا اور نہ جانے کیا کر بیٹھتا۔"

"خیر، یہ بتاؤ کہ عبدل کی ماں کو تم کیسے جانتے ہو؟"

"میں اسے بالکل نہیں جانتا تھا۔" میں نے کہا۔ "مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کس کا بیٹا ہے اور اس کے والدین زندہ ہیں یا نہیں لیکن وہ سب کچھ جانتی تھی۔ اس کا شوہر میرے والد کا پرانا دوست تھا چنانچہ اسے وہ باتیں بھی معلوم تھیں جو مجھے معلوم نہیں تھیں۔"

"اور اس نے تمہیں یہی باتیں بتانے کے لیے بلایا تھا؟" شیخ نے کہا۔

میں نے باری باری رابعہ، محسن اور رضوی صاحب کی طرف دیکھا۔ میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ سب انسپکٹر شیخ کو اس خط کے بارے میں کچھ بتایا گیا ہے یا نہیں جس کی وجہ سے تین افراد بھی جائے واردات پر مر گئے تھے اور اس سے پہلے بھی بہت سے افراد اپنی جان دے چکے تھے۔ محسن اور رابعہ بالکل سامنے تھے اور ان پر شیخ کی نظر بھی تھی چنانچہ وہ مجھے کوئی اشارہ بھی نہیں کر سکتے تھے لیکن رضوی صاحب ٹہلتے ہوئے ایسی جگہ پہنچ گئے تھے کہ شیخ کی پیٹھ ان کی طرف تھی مگر وہ مجھے دیکھ سکتے تھے۔ انھوں نے اپنا سگار جلاتے ہوئے ایک انگلی سے مجھے واضح اشارہ کیا جس کا مطلب میں نے یہ نکالا کہ میں خط کی بات نہ کروں۔

"وہ مجھ سے میرے والد کے بارے میں پوچھنا چاہتی تھی۔" میں نے کہا۔ "کیونکہ بہت عرصے سے ان کی کوئی خیر خیریت نہیں ملی تھی اور اسے کوئی کچھ نہیں بتاتا تھا۔"

"غلط بیانی سے آپ کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔" شیخ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس نے تمہیں کوئی خط دیا تھا۔"

میرا اندازہ غلط ہو گیا تھا۔ غالباً شیخ مجھ سے پہلے دوسروں کے بیانات قلمبند کر چکا تھا۔

"انسپکٹر!" رضوی صاحب نے بروقت مداخلت کی۔ "میرا ایک بیان سب کے بیانات کو غلط کر دیتا۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ وہ بوگس اور جعلی خط تھا جس کی کوئی اہمیت نہیں

یہ خط کسی نے وزیر خان کے نام سے بھیجا تھا اور اس میں نشی مرحوم سے دو ہزار روپے بطور قرض مانگے گئے تھے حالانکہ اس خط کی تاریخ سے اندازہ ہوتا ہے خط وزیر خان کی موت کے ایک مہینے بعد لکھا گیا تھا۔ میں وزیر خان کی تحریر بھی پہچانتا ہوں اور اُن کے دستخط بھی۔"

شیخ نے اس مداخلت کو پسند نہیں کیا۔ یہ بات ایک بچہ بھی سمجھ سکتا تھا کہ رضوی صاحب نے مجھے جواب دینے کا موقع نہیں دیا اور بالواسطہ طور پر مجھے سمجھا دیا کہ خط کے متعلق شیخ کو کیا بتایا گیا ہے۔ اگر اُن کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شیخ یقیناً اسے بے عزت کر دیتا کہ سوال اس سے نہیں کیا تھا تو جواب اس نے کیوں دیا۔ شاید وہ اس حقیقت کو بھی فرض کے تقاضوں پر قربان کر دیتا کہ وہ خود ایک معمولی اے ایس آئی ہے جس کے مقابل ایس ایس پی ہے مگر دو باتوں کا لحاظ کر کے خاموش ہو گیا۔ ایک رضوی صاحب کی عمر کا اور ان کی نیک نامی کا، دوسرا اس بات کا کہ وہ تھانے میں نہیں ہمارے گھر میں بیٹھا تھا اور ہم نے میزبانی کے آداب کا خیال رکھا تھا تو یہ خود بخود اس کا اخلاقی فرض ہو جاتا تھا کہ وہ مہمانی کے آداب فراموش نہ کرے۔

"میں نے تم سے کہا تھا محسن کہ وہ خط انہیں دکھا دو۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "بلکہ انہیں دے دو۔ یہ اپنے ریکارڈ میں شامل کر لیں۔"

"جی۔۔۔" محسن نے بڑی سعادت مندی سے کہا۔ "دراصل وہ خط میں کہیں رکھ کر بھول گیا تھا۔" پھر اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک خط نکالا۔ میں نے جان بوجھ کے کسی طرف نہیں دیکھا۔ میں جانتا تھا کہ جو خط شیخ کے حوالے کیا گیا ہے، وہ جعلسازی کا نمونہ ہے۔

"اس خط کے ساتھ کوئی لفافہ بھی ہوگا؟" شیخ نے خط کے مضمون پر نگاہ ڈالنے کے بعد زیرِ لب مسکرا کے کہا۔

"لوگ عموماً خط سنبھال کے رکھتے ہیں اور لفافے پھاڑ کر پھینک دیتے ہیں۔" محسن نے کہا۔

"محض اسی خط سے تو کچھ ثابت نہیں ہوتا کہ خط لکھنے والا کون ہے اور اس نے یہ خط کہاں سے ڈالا ہے؟" شیخ بولا۔

"خط ایک لیٹر ہیڈ پر لکھا گیا ہے اور اس پر لندن کا پتہ چھپا ہوا ہے۔" محسن نے کہا۔ "اگرچہ اس سے بھی ثابت نہیں ہوتا کہ خط واقعی کسی نے لندن سے لکھا تھا کیونکہ پیڈ تو یہاں بھی چھپ جاتے ہیں مگر تفتیش کرنا پولیس کا کام ہے۔ ہو سکتا ہے اس پتے سے کوئی کارآمد بات معلوم ہو جائے۔"

میں نے بڑی مشکل سے اپنی مسکراہٹ کو ضبط کیا۔ ایک زمانہ تھا کہ میں نے اور محسن نے خود کو برطانیہ میں کالوں کے حقوق کے تحفظ کا ٹھیکیدار بنا رکھا تھا۔ خصوصاً اپنے ہم وطن پاکستانی طلبہ کے حقوق کا۔ ہم نے تین چار کلب اور انجمن قسم کے ادارے بنا رکھے تھے جن کے نام بہت متاثر کرتے تھے۔ درحقیقت ان کا وجود کہیں نہ تھا مگر جب بھی ہمارے نقطۂ نظر سے کسی پاکستانی کے ساتھ یا ہمارے ساتھ کوئی زیادتی ہوتی تھی تو ہم مختلف اخبارات کو مراسلے، اجتماعی قرار دادیں اور پریس نوٹ وغیرہ بھیج دیتے تھے جو کسی نہ کسی اخبار یا ہفت روزے میں شائع ہو جاتے تھے کہ پاکستانی طلبہ کی فلاں انجمن کے ایک زبردست جلسے میں اس بات کی مذمت کی گئی وغیرہ وغیرہ۔ یہ ان ہی میں سے ایک لیٹر ہیڈ تھا۔ اگر پاکستان کی پولیس دریافت کرتی تو خود لندن کی پولیس اس پتے پر پہنچنے میں ناکام رہتی اور اس تگ و دو سے کچھ بھی حاصل نہ ہوتا۔

"دراصل عبدل کی ماں کا خیال تھا کہ میرے والد باہر ہیں۔" میں نے کہا۔ "بیٹے نے اس کو یہی بتا رکھا تھا۔ وہ مجھ سے معلوم کرنا چاہتی تھی کہ وزیر خان کو لندن میں دو ہزار روپے کی کیا ضرورت پڑ گئی ہے کیونکہ یہ بہت چھوٹی سی رقم تھی اور عبدل کی ماں یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ باہر پیسے بھجوانے ہوں تو کیا کرنا چاہیے۔"

"میرے لیے اس بیان کی صداقت کو تسلیم کیے بنا چارہ نہیں۔" شیخ نے خط کو فائل میں رکھتے ہوئے کہا۔ "اب ایک انتہائی اہم سوال یہ ہے کہ آپ لوگ وہاں کتنی دیر ٹھہرے تھے؟"

"مشکل سے بیس منٹ۔" محسن نے فوراً کہا۔ "یہ بات آپ کو شہلا بھی بتا چکی ہے کہ ہم ساڑھے دس بجے گھر آ گئے تھے۔"

شیخ نے ناگواری سے محسن کی طرف دیکھا۔ "مجھے مسٹر سکندر کا بیان آپ لوگوں کی موجودگی میں نہیں لینا چاہیے تھا۔ اب تو آپ سب کا بیان ایک ہو گیا۔ سوال میں نے آپ سے تو نہیں کیا تھا مسٹر محسن!"

"آئی ایم سوری۔" محسن نے بڑی معصومیت کے ساتھ کہا۔ "آپ نے پوچھا تھا، آپ لوگ۔ میں سمجھا سوال ہم دونوں سے کیا گیا ہے۔"

"اس کے باوجود مجموعی صورتِ حال نہیں بدلتی۔" شیخ نے کہا۔ "آپ کے لیے ثابت کرنا مشکل ہوگا کہ آپ واقعی ساڑھے دس بجے لوٹ آئے تھے۔ اس کے گواہ صرف گھر والے ہی ہیں یا باہر کا کوئی آدمی ہے جو کہہ سکے کہ اس نے آپ کو واردات سے پہلے کہیں دیکھا تھا؟"

"میں اس سوال کو تفتیش کا ایک لازمی جزو سمجھتا تھا چنانچہ اس کے لیے تیار تھا۔ "یار محسن!" میں نے اچانک کہا۔ "تو نے استاد ٹیڈی کا ذکر نہیں کیا، وہ کس وقت ملا تھا؟"

"وہ؟ میرا خیال ہے کہ دس بجے کے بعد ہی ملا تھا ہمیں۔" محسن نے سوچتے ہوئے کہا۔ "میں اس کا ذکر کرنے ہی والا تھا۔ وہ یقیناً شیخ صاحب کو بتا سکتا ہے کہ ہم کس وقت ملے تھے۔"

"جب ہم واپس آ رہے تھے انسپکٹر صاحب!" میں نے کہا۔ "تو ہمیں استاد ٹیڈی مل گیا تھا۔ وہ اکیلا تانگے میں جا رہا تھا کہ اس کی نظر ہم پر پڑ گئی اور اس نے ہمیں بھی ساتھ بٹھا لیا۔ ہم نے اس کے ساتھ چائے بھی پی تھی۔"

شیخ حیرانی سے مجھے اور محسن کو دیکھتا رہا۔ "یہ استاد ٹیڈی کیا چیز ہے اور آپ جیسے شریفوں کا ایسے استادوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا۔۔۔ چہ معنی دارد۔ نام سے تو مجھے وہ کسی اسکول کا استاد نہیں لگتا۔"

"کیا کریں شیخ صاحب!" میں نے افسوس سے کہا۔ "اپنا بچپن کا دوست تھا۔ بس غلط راستے پر پڑ گیا۔ کوئی بدمعاش نہیں ہے لیکن ذرا تیتے باز ہے اور کبھی کبھی ہاتھ کی صفائی دکھا دیتا ہے چنانچہ لونڈے اسے استاد ٹیڈی کہنے لگے ہیں۔"

"اور تمہارا یہ استاد کہاں ملے گا؟" شیخ نے بے بسی سے کہا۔ "اب یہ ضروری ہو گیا ہے کہ میں اس کا بیان علیحدگی میں لوں کیونکہ اس کی گواہی بہت اہم ہے۔"

"آج تو اس کا ملنا مشکل ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ راولپنڈی گیا ہوا ہے۔ بری امام شاہ کے مزار پر منت ماننے کی بات کر رہا تھا۔ کل پرسوں تک آ جائے گا۔ مجھ سے اس نے یہی کہا تھا۔"

"تم اس کا پتہ تو بتا سکتے ہو؟" شیخ بولا۔ "لاہور میں وہ کہاں رہتا ہے؟"

"یہ بھی ہمیں معلوم نہیں۔" میں نے کہا۔ "ایک تو اس کے ٹھکانے بدلتے رہتے ہیں۔ پھر یہ کہ ہم بھی بس رسم و راہ نبھاتے ہیں۔ ایسے ہی سرِ راہ ملاقات ہو جاتی ہے تو ہو جاتی ہے۔ اس کے گھر جانے کا اتفاق نہیں ہوتا۔"

"ویری گڈ مسٹر سکندر!" شیخ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اتفاق میں بڑی برکت ہے۔ اس کا عملی مظاہرہ میں نے آج یہاں دیکھا۔ جھوٹ سچ کا پتہ چلانا عدالت کا کام ہے لیکن اتنا میں کہہ سکتا ہوں کہ آپ سب لوگوں کے بیانات میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ یہ بڑا اچھا ٹیم ورک تھا۔"

"اے ایس آئی شیخ!" رابعہ نے پہلی بار لب کھولے۔ "بیان کے دوران میں نے کہیں دخل نہیں دیا اور میرے مؤکل نے آپ کے کسی سوال کا جواب دینے سے انکار نہیں کیا لیکن اب میں بولتی ہوں کیونکہ آپ بیان لینے کے بعد بیان پر تبصرہ بھی فرما رہے ہیں جو آپ کی ذمے داری نہیں۔ اس کے علاوہ آپ نام لیے بغیر سب کی دیانت داری پر شبہے کا اظہار کر رہے ہیں جس کا آپ کو کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ اس سے آپ کی اپنی غیر جانب داری مشکوک ہو جاتی ہے۔ آپ کو کچھ اور پوچھنا ہے؟"

"نہیں میڈم!" شیخ نے فائل سنبھال کے طنز سے کہا۔ "اگر میرے الفاظ سے غلط مفہوم نکلتا ہے تو میں معذرت چاہتا ہوں۔ میں اپنے الفاظ واپس بھی لے سکتا ہوں۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"سِٹ ڈاؤن۔" رضوی صاحب نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "فرض شناسی بڑی اچھی چیز ہے اور میں اس کی قدر کرتا ہوں لیکن مجھے افسوس ہے کہ تمہارے رویّے میں اعتماد کی لچک نہیں ہے۔ مجھے یہ بتاؤ کہ جس وقت تم میرے گھر آئے تھے اور تم نے مجھ سے سکندر کے بارے میں دریافت کیا تھا تو میں تم کو یہاں لے آیا تھا۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ میرا اردلی تم کو باہر سے ہی رخصت کر دیتا؟ میں کہہ دیتا کہ مجھے معلوم نہیں اور بات کرنی ہے تو کل دفتر میں آ جانا۔۔۔؟"

شیخ پھر بیٹھ گیا۔ "میں آپ کے رویّے سے متاثر ہوا ہوں رضوی صاحب لیکن آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ فرض کے تقاضے بہرحال نظر انداز نہیں کیے جا سکتے۔"

"یہ غلطی تو تم سے پہلے ہی سرزد ہو چکی ہے۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "کیا فرض کا تقاضا یہ نہیں تھا کہ تم عبدل کا فون ملنے کے بعد ٹیپ کی حفاظت کا معقول انتظام پہلے کرتے؟ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ تم ٹیپ کو مقفل کر جاتے یا اپنے ساتھ لے جاتے۔"

"لیکن سر! میں نے کوشش کی تھی کہ تحریری بیان پر دستخط بھی حاصل کر لوں۔"

"اور حاصل کیا ہوا؟" رضوی صاحب نے کہا۔ "نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم۔ اب نہ تمہارے پاس وہ ٹیپ ہے اور نہ کوئی دستخط شدہ بیان ورنہ تمہارے پاس کم سے کم ایک چیز تو ہوتی جسے عدالت میں پیش کیا جا سکتا۔ اس پر ایک شخص کی زندگی اور موت کا انحصار تھا اور اس کے نہ ہونے سے کیا نقصانات ہوں گے، یہ اندازہ تم خود بھی کر سکتے ہو۔"

"لیکن سر! میں نے وہ ٹیپ ایک ذمے دار شخص کے سپرد کیا تھا۔" شیخ کی پوزیشن خراب ہونے لگی تھی۔

"اور اس ایڈیٹ ذمے دار شخص نے کیا کیا؟" رضوی صاحب اب واقعی غصے میں تھے۔ "تم نے کیا کیا؟ اس محرر کی بیلٹ بھیجو میرے پاس اور اس سے کہو کہ اپنے آپ کو معطل سمجھے۔ اسے بتا دو کہ اب وہ ایک ہی صورت میں بچ سکتا ہے۔ اگر وہ سچ بولے

اور جو کچھ ہوا ہے عدالت میں بیان کردے۔ اس کی حفاظت کی ذمے داری میں لیتا ہوں۔ میں دیکھوں گا کہ نوکری اس کی جاتی ہے یا میر محمد کی۔ لیکن اس نے جانتے بوجھتے حقیقت کا اعتراف کرنے سے گریز کیا اور سکندر کی ضمانت منسوخ ہوئی تو اس کا حشر بہت بُرا ہوگا۔"

"یس سر!" شیخ نے کھڑے ہوکر سلوٹ کیا۔ "جیسا آپ چاہتے ہیں ویسا ہی ہوگا۔ اب مجھے اجازت دیجیے۔"

رضوی صاحب کا غصہ اس کے چلے جانے کے بعد بھی کم نہیں ہوا۔ "بہت فرض شناسی کی بات کرتا ہے۔ بے وقوف یہ نہیں دیکھتا کہ کوتاہی کتنی بڑی ہوئی ہے۔ جب ایک شخص ٹیلیفون پر خود بتا رہا ہے کہ میں مرنے والا ہوں تو اس کا بیان ضرور لکھو، مگر یہ بھی تو سوچو کہ دوسرے نتائج کیا نکل سکتے ہیں۔ آدمی کو ہر طرف دیکھنا چاہیے اور تمام امکانات کو مدنظر رکھنا چاہیے مگر تم نوجوان لوگ عقل کی بجائے جوش و جذبات سے کام لیتے ہو۔" وہ اچانک میری طرف مڑے۔ "یہ میر محمد وہی ہے نا جس نے تم پر تشدد کیا تھا؟ اس نے ٹیپ غائب کیا ہوگا تو میں اس کو بخشوں گا نہیں۔"

"جی۔" میں نے کہا۔ "بہت کینہ پرور اور کمینہ آدمی ہے اور میرے معاملے میں اس پر کسی کا دباؤ بھی ہے۔ کوئی اے ایس پی ہے۔"

"میں سمجھ لوں گا اس سے۔" رضوی صاحب نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اب اسے فیصلہ کرنا پڑے گا کہ وہ نوکری کرنا چاہتا ہے یا وہ ٹیپ واپس کرنا چاہتا ہے۔"

"ہو سکتا ہے اس نے ٹیپ تباہ کردیا ہو یا صاف کر دیا ہو۔" رابعہ نے کہا۔

"ایسی صورت میں وہ انتخاب کے حق سے بھی محروم ہو جائے گا۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "اس کے خلاف شیخ بھی گواہی دے گا اور وہ محرر بھی۔ ان کے انکار کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ خیر چھوڑو اس بات کو۔ خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مجھے ایک کپ چائے پلاؤ، پھر میں چلتا ہوں۔"

رابعہ ان کے لیے چائے لینے چلی گئی تو میں نے کہا۔ "انکل رضوی! میں نے اس دور دراز علاقے میں یہ ایک گمنام سا مکان شہلا کی حفاظت کے لیے لیا تھا مگر اب یہ بھی محفوظ نہیں رہا۔ یہ پتہ پولیس کے ریکارڈ پر آ جائے گا تو سب کو معلوم ہو جائے گا۔"

"تم لوگوں نے بھی مجھے کم پریشان نہیں کیا ہے۔" رضوی صاحب نے خفگی سے کہا۔ "کچھ تو تقدیر نے تمہارے خلاف چکر چلا رکھے ہیں اور کچھ تمہارے دشمنوں نے۔ لیکن خود تم بھی اپنی عقل مندی سے اپنی مشکلات میں اضافہ کرتے ہو۔ آخر کیا ضرورت تھی اس نقل مکانی کی۔ کیا میرے پاس جگہ کم تھی یا تمہیں یہ احساس تھا کہ تم مجھ پر بار ہو یا وہاں محفوظ نہیں ہو۔"

"ایسی تو کوئی بات نہیں تھی انکل۔" محسن نے وضاحت کی کوشش کی۔ "مگر..."

"اگر مگر کچھ نہیں۔" انہوں نے محسن کی بات کاٹ دی۔ "اپنا سامان آج ہی یہاں سے اٹھاؤ اور واپس چلو۔ وہ پورا سرونٹ کوارٹر شہلا اور اس کی ماں کے لیے کافی ہوگا۔ کانسٹیبل اپنا بندوبست کہیں اور کرے گا۔ رابعہ حسب سابق رہے گی اور تم دونوں کو ایک کمرہ مل جائے گا، جہاں تم میری نگرانی میں رہو گے۔ تم دونوں نے اپنے آپ کو بہت آزاد اور خود مختار سمجھ لیا ہے اس لیے کہ ایک کا باپ مر گیا ہے اور دوسرے کا بہت دور اسلام آباد میں بیٹھا ہے۔" ان کا موڈ بہت خراب تھا۔ ایک طرف دوستی کے رشتے سے یہ اخلاقی ذمہ داری عائد ہوتی تھی کہ وہ جس حد تک بھی ہمارا خیال رکھ سکتے ہوں رکھیں۔ دوسری طرف قانون کے مقابلے میں وہ اپنی مجبوریاں بھی سمجھتے تھے اور اس خیال سے بہت پریشان تھے کہ خدانخواستہ مجھ پر استغاثہ کے دونوں گواہوں کے قتل کا الزام آ گیا تو کیا ہوگا۔

وہ چائے پی کر رخصت ہو گئے تو میں نے اور محسن نے اطمینان کا سانس لیا۔ ان کے حکم سے سرتابی ممکن نہ تھی اور ویسے بھی یہ گھر اب محفوظ نہیں رہا تھا۔ رابعہ اور محسن نے بھی اتفاق کیا کہ ان حالات میں ہمارے لیے اور کوئی جائے پناہ نہیں ہے اور فی الحال ہمیں رضوی صاحب کی میزبانی کو مجبوری یا ضرورت سمجھتے ہوئے قبول کرنا پڑے گا۔ شہلا کی اپنی کوئی رائے نہیں تھی۔ مردہ بدست زندہ۔ اسے ہمارا ہر فیصلہ قبول تھا۔ اسی روز شام تک منتقلی کا سارا کام مکمل ہو گیا، جس میں عملی طور پر میں نے کوئی حصہ نہیں لیا۔ محسن، رابعہ اور شہلا نے وہ سامان پھر باندھا جو ابھی پوری طرح کھلا بھی نہ تھا۔ پھر محسن ایک ٹرک اور چند مزدور لے کر آیا جنہوں نے ذرا سی دیر میں سب سامان لاد دیا اور سورج غروب ہونے سے پہلے رضوی صاحب کی کوٹھی میں اتار دیا۔ ہمارا ہمسایہ کانسٹیبل رات کو ڈیوٹی سے فارغ ہو کے واپس لوٹا تو یہ دیکھ کر سخت مایوس ہوا کہ عرب کے اونٹ کی طرح ہم نے اسے باہر نکال پھینکا ہے۔ اس نے تو ہمارے جوتے تک پالش کیے تھے کیونکہ ہم نے اسے تھانے دار بنوا دینے کا وعدہ کیا تھا۔ ہم نے اسے یقین دلایا کہ ہمارے عزائم غاصبانہ اور بدنیتی پر مبنی نہیں ہیں بلکہ یہ سب رضوی صاحب کے حکم سے ہوا ہے لیکن وہ اس سے مطمئن نہیں ہوا اور فریاد لے کر رضوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا مگر رضوی صاحب نے اسے کہا کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ اس کی رہائش کے لیے ساتھ والی کوٹھی کے سرونٹ کوارٹر میں ایک کمرے کا انتظام ہو گیا ہے۔ مطمئن وہ پھر بھی نہیں ہوا مگر تعمیل کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ خون کے گھونٹ پی کر اور ہم سے سخت بدظن ہو کے رخصت ہوا۔ اس وقت تک شہلا نے اپنے نئے گھر میں سامان کو ٹھکانے سے رکھنے کا انتظام مکمل کر لیا تھا۔ جو کمرہ ہمیں دیا گیا تھا وہ گھر کے آخری حصے میں تھا اور بچوں کا بیڈ روم تھا۔ نتیجے میں بچوں کو اس کمرے میں منتقل کیا جو پہلے مہمانوں کا کمرہ کہلاتا تھا۔

محسن نے میری توجہ اس امر کی طرف مبذول کرائی کہ اس سارے انتظام کا مقصد یہ ہے کہ ہماری نقل و حرکت پر نظر رکھی جائے ورنہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ بچوں کو ان کے کمرے میں رہنے دیا جاتا اور ہمیں مہمانوں والا کمرہ دے دیا جاتا۔ اب ہم شریفانہ راستہ اختیار کر کے باہر جاتے تو یہ ناممکن تھا کہ رضوی صاحب یا ان کی بیگم کو معلوم نہ ہو۔ دوسرا طریقہ کھڑکی کو دروازے کے طور پر استعمال کرنے کا تھا۔ اس میں بھی یہ خطرہ بہرحال تھا کہ ہماری عدم موجودگی کا راز کسی بھی وقت افشا ہو جائے۔ محسن نے اس خیال کا اظہار بھی کیا کہ رضوی صاحب ظالم سماج بن کے مجھے اور رابعہ کو زیادہ سے زیادہ فاصلے پر رکھنا چاہتے ہیں اور میں نے اس کو زبردست فلمی جواب دیا۔

رات کے کھانے پر رضوی صاحب سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے بڑی مسرت کا اظہار کیا اور ہماری سعادت مندی کی تعریف کی۔ ان سے زیادہ خوشی بیگم رضوی کو تھی کہ وہ اکیلی نہیں رہیں اور رابعہ کے علاوہ اب شہلا بھی ان کی رفیق تنہائی ہو گئی ہے۔ شہلا خود خاموش تھی کیونکہ وہ اس ماحول میں اجنبی تھی۔ شاید اسے یہ احساس بھی تھا کہ جو اختیار اسے پہلے اپنی زندگی پر تھا وہ اب نہیں رہا۔ اپنے گلبرگ والے گھر سے نکلنا اسے راس نہیں آیا تھا اور اس کا کوئی ٹھکانہ مستقل نہ رہا تھا۔ شہلا کی ماں اس سے زیادہ پریشان تھی جس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کے اکلوتے بیٹے عدنان کے جاتے ہی حالات میں یہ کیسا انقلاب آ گیا ہے اور اسے ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ اور دوسری جگہ سے تیسری جگہ کیوں لے جایا جا رہا ہے۔ وہ شہلا کی حقیقی ماں بھی نہیں تھی کہ اس پر حکم چلا سکتی یا اس سے وضاحت طلب کر سکتی۔ اس کا مفلوج وجود عملی زندگی کی جدوجہد میں آگے بڑھنے والوں کے لیے ایسا بارِ گراں تھا جسے اتار کر پھینکا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ وہ اپنی مجبوریوں کو بھی سمجھتی تھی اور دوسروں کی مجبوری کو بھی چنانچہ وہ بے بس تھی۔

رات کو فرصت ملتے ہی میں اور محسن اپنے کمرے میں سونے کے لیے پہنچے تو ہم میں سے کسی کو بھی نیند نہیں آ رہی تھی۔ ہم نے رابعہ سے چائے کی فرمائش کی اور اپنے اپنے بستر پر لیٹ کر سگریٹ کے دھوئیں کو چھت کی طرف اٹھ کر فضا میں تحلیل ہوتا دیکھتے رہے۔

"آج کتنے دن ہو گئے، میرا اپنے گھر سے کوئی رابطہ نہیں۔" محسن نے اچانک کہا۔ "معلوم نہیں فوزیہ کیسی ہے۔ سب سے زیادہ وہی مجھے یاد کرتی ہوگی۔"

"دیکھ محسن! اب بھی وقت ہے۔" میں نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "تو اپنے گھر لوٹ جا۔ والدین کے حقوق مجھ سے زیادہ ہیں۔"

"میں ان کے حقوق تسلیم کرتا ہوں۔" محسن نے کہا۔ "اور وقت آئے گا تو میں اپنے فرائض میں کوتاہی نہیں کروں گا لیکن اس وقت میں کسی کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ نہ تجھے، نہ رابعہ کو اور نہ شہلا کو۔ ہم سب ایک دوسرے کے ذمے دار ہیں اور جب رابعہ یا شہلا عورت ہونے کے باوجود پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہیں تو میں کیسے بھاگ جاؤں؟"

"تیرے پاس وہ کیسٹ تو محفوظ ہے نا جس میں ہم نے ڈی سلوا اور چودھری دلاور کی گفتگو ریکارڈ کی تھی؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ وہی تو ہمارے پاس ایک موثر ہتھیار ہے۔" محسن نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "کم سے کم ڈی سلوا کے خلاف۔"

"ابھی تک ان میں سے کسی کو معلوم نہیں کہ ہم نے ساری گفتگو ریکارڈ کر لی تھی۔" میں نے کہا۔

"ہاں، لیکن وہ بے وقوف نہیں ہیں۔" محسن نے اپنے بریف کیس میں سے کیسٹ نکالا۔ "انہوں نے اندازہ ضرور کر لیا ہوگا کہ جب ہم دو طرفہ مواصلاتی رابطہ قائم کر سکتے ہیں تو ان کی آواز بھی ریکارڈ کر سکتے ہیں کہ سند رہے اور وقتِ ضرورت کام آئے۔"

"جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے چودھری دلاور نے ایسی کوئی بات نہیں کہی تھی جو بعد میں اس کے خلاف استعمال کی جا سکتی۔ لیکن ڈی سلوا نے پوری طرح اعترافِ جرم کر لیا تھا۔"

"اب یہ ضروری ہے کہ اسے اپنی ہی آواز سنوائی جائے اور پھر اس کا ردِ عمل دیکھا جائے۔" محسن بولا۔

"ردِ عمل کیا ہوگا۔" میں نے کہا۔ "وہ بزدل آدمی ہے یا تو دلاور کا ساتھ چھوڑنے پر مجبور ہوگا... یا فرار پر۔"

"لیکن دلاور کا ساتھ چھوڑ کے وہ کہاں جائے گا؟" محسن بولا۔ "میں یہ فرض نہیں کر سکتا کہ وہ ہمارے ساتھ مل کر ہمارے دشمنوں کے خلاف صف آرا ہو جائے گا۔ اس کے لیے بچنے کی ایک ہی صورت ہے کہ وہ غائب ہو جائے۔ وہ دلاور سے دشمنی مول نہیں لے سکتا اور ہم اس پر اعتماد نہیں کر سکتے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ہم اسے یہ کیسٹ سنوائیں اور دھمکی دیں کہ اس کی ایک نقل دلاور کو ارسال کر دی جائے گی۔ اس کے بعد وہ کیا

کرے گا؟ میرا خیال ہے وہ دلاور کی خدمت میں حاضر ہو کر روتے پیٹے گا کہ کس طرح ہم نے جبر اور تشدد سے اسے بولنے پر مجبور کر دیا تھا۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" میں نے کہا۔ "دلاور کبھی اسے مجبوری کے عذر سے معاف نہیں کرے گا۔ اس کا اعتراف جرمِ غداری کے مترادف سمجھا جائے گا جس کی سزا مجرموں کے ضابطۂ اخلاق کے مطابق صرف موت ہے۔ یہ بات خود ڈی سلوا بھی اچھی طرح جانتا ہوگا اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ دلاور تھوڑی سی عقل مندی سے کام لے تو ڈی سلوا کا پتہ صاف کر سکتا ہے۔ حالات اور واقعات کی شہادت سے ثابت ہوتا ہے کہ ڈی سلوا ہی دلاور کو اپنی گاڑی میں لے گیا تھا اور اسے قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ اگر دلاور بھی یہی کہہ دے تو ڈی سلوا کیسے بچے گا؟"

"تیرا اندازہ بالکل ٹھیک ہے۔" محسن نے پھر کہا۔ "دلاور جانتا ہے کہ وہ تجھے ملزم ثابت نہیں کر سکتا۔ اس سے کہیں زیادہ آسان یہ ہے کہ ملزم ڈی سلوا کو بنا دیا جائے مگر اس سے دلاور کو کیا فائدہ ہوگا؟ زیادہ سے زیادہ ڈی سلوا کو دو چار سال قید کی سزا ہو جائے گی مگر اس سے یہ خطرہ نہیں ہے کہ ڈی سلوا دشمن ہو جائے تو ساری پول کھول دے اور دلاور کا بیڑا غرق بھی کر دے ۔۔۔ اسے اور بھی بہت سی ایسی باتیں معلوم ہیں جو کسی کو بھی معلوم نہیں ہیں۔ وہ اب تک ہر کاروبار میں اور ہر جرم میں برابر کے شریک رہے ہیں۔ ان دونوں کے لیے ہر حال میں ایک دوسرے کا ساتھ دینے کے سوا چارہ نہیں۔ وہ ایک دوسرے کے دشمن بھی نہیں ہو سکتے۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمارا یہ کیسٹ ہمارے کسی کام نہیں آ سکتا؟" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

"نہیں، کام کیوں نہیں آ سکتا؟" محسن نے کہا۔ "ہو سکتا ہے وہ خود اسی کیسٹ کی وجہ سے مصالحت یا کوئی سودا کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ وہ پہلے جیسی صورتِ حال نہیں ہے۔"

"وہ اپنی بدمعاشی کے بل پر ہم سے یہ کیسٹ حاصل کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "یا ڈی سلوا ڈبل گیم کھیل سکتا ہے۔"

"ایک کیسٹ تو ایک نیگیٹو کی طرح ہوتا ہے۔" محسن نے کہا۔ "اس سے کئی نقلیں بنائی جا سکتی ہیں اور ہم دلاور اینڈ کمپنی کو بتایا جا سکتا ہے کہ یہ کوشش بے سود ہے کیونکہ ہمارے پاس اس کی دس کاپیاں موجود ہیں جن سے ہم مزید ایک سو یا ایک ہزار کاپیاں بنا سکتے ہیں۔"

"اور ہمیں بنا لینی چاہئیں۔" میں نے کہا۔ "ابھی تو ہمارے پاس صرف اصل ہے۔"

"اس میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جو ہمیں خارج کرنی ہیں۔" محسن نے کہا۔ "جن کا نہ ہونا ہی بہتر ہے مگر ضروری ہے کہ اسے ہم ایک بار سن کر دیکھیں اسی وقت۔"

"اس وقت تو مشکل ہے۔ ابھی رابعہ چائے لے کر آئے گی تو اس سے کہیں گے کہ ٹیپ ریکارڈر ڈھونڈ لائے۔" میں نے کہا۔ "خود ہم نے کوشش کی تو انکل رضوی فوراً شک میں مبتلا ہو جائیں گے اور یہ کیسٹ ان کے ہاتھ لگ گیا تو بحقِ سرکار ضبط ہو جائے گا اس لیے بہتر ہے کہ تو اسے واپس رکھ دے۔"

اسی وقت رابعہ چائے لے کر اندر آئی۔ "تم نے تو مجھے بھی مشکل میں ڈال دیا تھا۔" وہ ٹرے میز پر رکھ کے بولی۔ "انکل پوچھ رہے تھے کہ اس وقت چائے پینے کی کیا تک ہے؟ تم لوگوں کو سو جانا چاہیے۔ میں نے سر درد کا بہانہ کیا۔"

"کس کے سر درد کا؟" محسن نے کہا۔ "اپنے یا سکندر بخت کے؟ اور سر درد کے اسباب کیا بتائے؟"

رابعہ نے آنکھیں نکال کے اس کی طرف دیکھا۔ "یہ کیا ہے؟" اس نے کیسٹ کی طرف اشارہ کیا جو ابھی تک محسن کے ہاتھ میں تھا۔

"یہ ہے یہ ایک کیسٹ ہے۔" محسن نے اسے مطلع کیا۔ "اور اس پر لکھا ہے پیار بھرے دوگانے۔ اگر آپ دونوں سننا یا گانا چاہیں تو ٹیپ ریکارڈر لے آئیں۔ میں یہاں سے دفع ہو جاتا ہوں۔"

"آپ ادھر سرونٹ کوارٹر کی طرف تشریف لے جائیے۔" رابعہ نے جواب دیا۔ "وہاں ایک خاتون ہیں مس شہلا۔ ان کے پاس ٹیپ ریکارڈر ہے۔ آپ دونوں شوق فرمائیے۔" وہ بیٹھ کر چائے بنانے لگی۔

"آئیڈیا، مسٹر محسن شیروانی!" میں نے کہا۔ "یہ خیال تو ہمیں آیا ہی نہیں تھا کہ ٹیپ ریکارڈر شہلا کے پاس بھی ہے۔"

"غالباً وہ سو چکی ہے۔" محسن نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ "تھک گئی ہوگی سارا دن کی مصروفیت میں۔"

"مجھے تو ڈر ہے کہیں وہ نروس بریک ڈاؤن کا شکار نہ ہو جائے۔" رابعہ نے کہا۔ "اس کے اعصاب اتنے مضبوط نہیں ہیں۔ پہلے عدنان کی موت کا صدمہ تھا۔ پھر اسے یہ جھوٹ نبھانا پڑا کہ عدنان زندہ ہے۔ ڈی سلوا کی وجہ سے اس کے گھر میں کشت و خون ہوا اور اب وہ کسی مفرور مجرم کی طرح روپوش رہنے پر مجبور ہے۔ جذباتی دباؤ کی ایک وجہ عدنان کی ماں ہے جو نہ زندوں میں ہے اور نہ مُردوں میں۔ مصروفیت میں اعصابی دباؤ کم ہو جاتا ہے لیکن وہ گھر میں قید رہتی ہے۔ تم اتنے بے حس ہو کہ تمہیں اس کی پروا ہی نہیں۔" وہ محسن کو مخاطب ہو کے بولی۔ "ورنہ تم اس کا سہارا بن سکتے ہو۔"

"نہیں بی بی! میں سب کچھ کر سکتا ہوں لیکن ذمے داری قبول نہیں کر سکتا۔ اس کی وجہ سکندر جانتا ہے۔ میں اپنے والدین کا بھی ایک ہی بیٹا ہوں۔ اگر میرا ایک بھائی اور ہوتا تو بڑا اچھا تھا۔ میں بیک وقت ماں بہن اور باپ کی امیدوں کا مرکز نہ ہوتا اور وقتی طور پر ان کو ناراض کرنا بھی منظور کر لیتا۔ میرے والد بہت معقولیت پسند ہیں لیکن فوزیہ ایک بے وقوف، انتہائی کم ہمت اور کمزور لڑکی ہے۔ اس میں کسی جذباتی بحران کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں تھی چنانچہ ایک مرتبہ وہ اپنی زندگی کا خاتمہ کرنے کی بزدلانہ کوشش کر چکی ہے۔ حالانکہ اسے معلوم تھا کہ اس کی ماں اب صرف تین مہینے کی مہمان ہے۔ تین ماہ قبل جب ڈاکٹروں نے متفقہ طور پر ٹرمینل کینسر کی تشخیص کی تھی اور حتمی فیصلہ دیا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ چھ مہینے زندہ رہیں گی تو ہم سب نے عہد کیا تھا کہ ان کی زندگی کے بقیہ ایام میں ان کو زیادہ سے زیادہ خوش رکھنے کی کوشش کریں گے مگر وہ اس عہد کو بھول گئی۔ وہ مر جاتی تو ممی کی زندگی اور مختصر ہو جاتی اور ڈیڈی اکیلے رہ جاتے۔ یہ بات شاید ممی کو بھی معلوم ہو گئی ہے کہ ڈیڈی بہت جلد اکیلے رہ جائیں گے۔ میرا خیال ہے، ہر مریض کو اس کی چھٹی حس سب کچھ بتا دیتی ہے۔ شاید تیمارداروں کے محتاط رویّے میں یا ان کے ظاہری اطمینان میں کوئی بات ایسی ہوتی ہے جو اُن کے جھوٹ کی پول کھول دیتی ہے یا نادانستگی میں سچ سامنے آ جاتا ہے۔ اب وہ کوشش کر رہی ہیں کہ ایک مہینے کے اندر اندر بہو لے آئیں۔ زندگی مہلت دیتی تو وہ اتنی جلدی نہ کرتیں مگر وہ چاہتی ہیں کہ بعد میں کوئی ڈیڈی کا خیال رکھنے والا ہونا چاہیے۔ فوزیہ کو بالآخر اپنے گھر جانا ہے اور مجھے اطلاع تو نہیں ملی مگر میرا اندازہ ہے کہ اب وہ پھر پروفیسر ایاز ہی کا سہارا لیں گی۔ معلوم نہیں یہ چراغ دین بیچ میں کیوں آ گیا تھا۔ اس نے ممی کو گمراہ کیا۔ اپنی طرف سے انہوں نے بیٹی کے لیے وہ سب خوشی خرید لی تھی جو چراغ دین کی دولت دے سکتی تھی۔ پروفیسر ایاز کی شرافت، علمیت یا محبت نہیں دے سکتی تھی۔ ان کا نقطۂ نظر غلط تھا مگر اچھا ہوا خود حالات نے یہ بات انہیں سمجھا دی۔ ایاز نے یقیناً اپنی تذلیل محسوس کی ہوگی مگر وہ کم ظرف آدمی نہیں ہے۔ وہ انتقام فوزیہ سے نہیں لے گا۔ وہ فوزیہ کو خوش رکھ سکے گا۔"

"اور تم ۔۔ تمہارے بارے میں کیا فیصلہ کیا گیا ہے؟" رابعہ نے کہا۔ اس پر یہ انکشاف پہلی بار ہوا تھا چنانچہ وہ تصویرِ حیرت بنی ہوئی تھی۔ "ممی نے تمہارے لیے کس کو شریکِ حیات منتخب کیا ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔" محسن نے کہا۔ "پہلے کسی ڈپٹی سیکرٹری کی لڑکی تھی۔ چراغ دین اسکینڈل میں وہ بات ختم ہو گئی۔ خود لڑکی والوں نے انکار کر دیا اور مجھ پر بڑا احسان کیا۔ ممی کو دوسرا سبق ملا ہوگا کہ بڑے گھر والوں کے اخلاقی معیار کتنے پست ہو سکتے ہیں۔ ممکن ہے اب وہ اپنی پسند کا معیار بدل دیں۔ کوئی سگھڑ، سلیقہ مند، خدمت گزار ٹائپ بہو لائیں۔"

"شہلا اس معیار پر پوری اترتی ہے۔" رابعہ نے کہا۔

"اسے کوئی ناپسند نہیں کر سکتا۔"

"ہاں۔ مگر ممی فیملی بیک گراؤنڈ بھی دیکھیں گی۔ شہلا کے ماں باپ کون ہیں، یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں۔" محسن نے کہا۔

"یہ معلوم کیا جا سکتا ہے۔" رابعہ نے سوچتے ہوئے کہا۔ "میرے اور تمہارے نقطۂ نظر سے اس کا باپ بھنگی بھی ہو تو کوئی فرق نہیں پڑتا بلکہ زیادہ قابلِ احترام ہو جاتا ہے جس نے بیٹی کی تعلیم و تربیت میں کوئی کمی نہیں چھوڑی مگر تمہاری ممی کو مطمئن کرنے کے لیے اس کے شجرۂ نسب میں نظریۂ ضرورت کے تحت ترمیم کی جا سکتی ہے مثلاً وہ میری سگی بہن ہو سکتی ہے۔ میں انکل رضوی سے نہ سہی بیگم رضوی سے بات کر سکتی ہوں اور وہ انکل کو سمجھا سکتی ہیں۔ پھر انکل تمہارے ڈیڈی سے بات کر سکتے ہیں۔"

"لیکن تمہیں اتنا لمبا چکر چلانے کی اتنی اشد ضرورت کیوں محسوس ہو رہی ہے بی بی؟" محسن نے کہا۔

"اس لیے کہ میں کھلی آنکھوں سے بہت کچھ دیکھ رہی ہوں۔" رابعہ نے کہا۔ "حقیقی زندگی کا ڈرامہ۔"

"بالکل اسی طرح جیسے ہم نے فلم ہیر رانجھا اور سسی پنوں دیکھی تھیں۔" میں نے کہا۔ "علاوہ ولایت کی بالغ کرنے والی فلموں کے۔"

"اور اب اپنے کانوں سے سب کچھ سن لینے کے بعد میں نہیں چاہتی کہ مزید خرابی کے اسباب پیدا ہوں۔" رابعہ نے مجھے گھور کر کہا۔ "ابھی وقت ہے اور بہت کچھ کیا جا سکتا ہے۔"

"ایک شعر عرض کیا ہے ؎

رندِ خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو!
تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو۔"

"تھینک یو۔ مجھے صرف آپ کے این او سی کی ضرورت

تھی۔" رابعہ نے جلتے جلتے کہا۔
"یہ این اوسی یکطرفہ ہے۔" میں نے کہا۔ "میں نے اب تک کوئی شادی ایسی نہیں دیکھی جس میں قاضی کے علاوہ صرف دولہا ہو اور کسی کو ایک ہاتھ سے تالی بجاتے نہیں سنا۔"
"میں صرف دائیں ہاتھ سے آپ کے ایک جھانپڑ رسید کروں تو آواز بالکل تالی کی طرح آئے گی، شرطیہ۔" محسن نے کہا۔ "اگر مس رابعہ قاری ایڈووکیٹ اجازت دیں۔"
"میری طرف سے اجازت ہے۔" رابعہ نے باہر سے کہا اور غائب ہوگئی۔
"کس بات کی اجازت ہے؟" محسن نے چلا کے کہا۔ "میں تو پوچھ رہا تھا کہ اجازت ہو تو نکاح شروع کروں؟"
بات مذاق میں ختم ہوگئی تھی لیکن وہ خلش ٹوٹ کر رہ جانے والی نوکِ خار کی طرح اپنے وجود کا مسلسل احساس دلا رہی تھی جس سے کوئی محفوظ نہ تھا۔ رابعہ جانتی تھی کہ فوزیہ کے جذباتی بحران کی ذمّے دار وہ خود بھی ہے۔ یہی احساسِ جرم مجھے بھی تھا اور محسن بھی سمجھتا ہوگا کہ رابعہ کی یہ کوشش ماضی کے عطا کردہ زخموں پر مستقبل کی امیدوں کا پھاہا رکھنے کے مترادف ہے۔ سب سے بڑا دل محسن کا تھا جس نے ہمیں معاف کر دیا تھا اور دوستی کے رشتے کا آئینہ سلامت تھا۔ اس میں بال تک نہ آیا تھا۔ اس کے سامنے میں خود کو بہت چھوٹا محسوس کرتا تھا اور یہ خیال بھی مجھے اکثر آتا تھا کہ محسن کی جگہ میں ہوتا تو کیا کرتا؟ اس سوال کا جواب بھی اتنا ہی مشکل تھا۔ معلوم نہیں جو کچھ ہوا۔ ایسا تو کسی نے نہ سوچا تھا، نہ چاہا تھا۔
"محسن!" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ "تم سب لوگوں نے، میرا مطلب ہے رابعہ نے، انکل رضوی نے اور تو نے، وہ خط پڑھنے کے بعد کچھ سوچ کر ہی فیصلہ کیا ہوگا کہ اسے مخفی رکھا جائے۔"
"ہاں۔" محسن نے کہا۔ "کسی کو اس کے بارے میں بتانے سے کیا فائدہ ہو سکتا تھا۔ یہ پیچیدگی ضرور پیدا ہو سکتی تھی کہ تو وزیر خان کا وارث نہیں ہے اور اس کا اثر تیرے وراثت کے سرٹیفکیٹ کے مقدمے پر بھی پڑتا۔ بے شک تو خود کو وزیر خان کا بیٹا ہی سمجھتا ہے مگر یہ تیرے جذبات کا مسئلہ ہے جو قانونی مسئلے سے بالکل الگ ہے۔"
"غور طلب بات یہ ہے محسن کہ میرے والد نے اپنے دوست کو ایسی بہت سی باتیں بتا دیں... جو... اگر وہ چاہتے تو نہ بتاتے۔ مثلاً وہ کہہ سکتے تھے کہ ہم نے محل چھوڑنے کے بعد نکاح کر لیا تھا۔ اس بات کا گواہ کون تھا۔ اور شکی کبھی

ثبوت نہ مانگتا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وزیر خان کو اپنے دوست پر کتنا اعتماد تھا۔ اس نے اپنی کوتاہیاں اور خامیاں چھپانے کی ضرورت محسوس نہیں کی مگر پھر بھی اس نے وہ بات نہیں بتائی جو سب سے اہم تھی یعنی شرافت علی نے ان کو اس حد تک کیسے بلیک میل کر لیا۔" میں نے کہا۔
"اس کے بہت سے اسباب ہو سکتے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "اور ہم نے سب پر بحث کی تھی۔ ایک وجہ وہ تصاویر ہو سکتی تھیں جن کے نیگیٹو گیان چند کے پاس تھے۔ ممکن ہے وہ جاتے جاتے یہ نیگیٹو اپنے دوسرے رفیقِ کار کو بخش گیا ہو یا بیچ گیا ہو مگر ان سے شرافت علی پاکستان میں کیا فائدہ اٹھا سکتا تھا؟"
"بہت سے ممالک کے درمیان ایک سمجھوتا ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ "جو مجرموں کے تبادلے کا سمجھوتا کہلاتا ہے کہ ایک ملک کا کوئی مجرم سرحد پار کر جائے تو دوسرے ملک کی پولیس اسے گرفتار کرنے کے لیے اپنا مجرم فرض کرے اور وہ پکڑا جائے تو متعلقہ ملک کو واپس کر دے۔ وزیر خان کے خلاف دو مقدمات قائم تھے۔ ایک قتل کا، ایک ڈکیتی کا۔"
"ہاں۔ اور میر شرافت علی اس کو گرفتار کرا دیتا تو اسے ایک لاکھ کا وہ انعام بھی مل جاتا جو سابق برطانوی حکومت کے دور میں اس کی گرفتاری کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔" محسن نے کہا۔
"مگر اس نے ایک لاکھ سے زیادہ کا فائدہ اٹھایا۔ ساڑھے تین لاکھ تو وزیر خان سے اس نے سالِ رواں کا منافع لے لیا۔ اس کے علاوہ بھی کیا کچھ نہیں لیا۔ نہیں سکندر! یہ بات کچھ اور تھی۔ اس سے بھی زیادہ سنگین خطرہ تھا جسے وزیر خان چپ چاپ ٹالتے رہے۔ شرافت علی کو اپنا منہ بند رکھنے کی قیمت ادا کرتے رہے اور خاموش رہے۔"
"تیرا مطلب ہے وہ میرے اور وزیر خان کے درمیان موجود رشتے کو توڑ دینے کی دھمکی دیتا ہوگا؟" میں نے کہا۔ "میرے والد سے کہتا ہوگا کہ میں سکندر کو بتا دوں گا کہ تم کون ہو اور جو شخص میری پیدائش کا ذمہ دار ہے وہ کون تھا؟"
"ہم سب اس بات پر متفق ہیں کہ اس دھمکی کا وزیر خان مرحوم پر بھی کوئی اثر نہیں ہو سکتا تھا۔" محسن نے کہا۔ "یہ ٹھیک ہے کہ تمہیں وقتی طور پر صدمہ ضرور ہوا تھا مگر بہت جلد تم سنبھل گئے تھے۔ وزیر خان مرحوم کے لیے اب تمہارے جذبات کے آئینے میں بال تک نہیں۔ تمہاری فطرت کو میں سمجھتا ہوں تو کیا وہ شخص نہیں سمجھتا ہوگا جس نے تمہیں پیدائش سے تمہیں پال پوس کے بڑا کیا۔ تمہارے لیے بیک وقت باپ

اور ماں بن کے جیا اور تمہارے لیے مر گیا۔ اسے تم پر اعتماد ہوگا کہ کوئی لاکھ گمان کرے اور وزیر خان کے خلاف کچھ بھی کہے، تمہارے جذبات کا رُخ نہیں پلٹ سکتا۔ میر شرافت علی یا گیان چند کے لیے ان تصویروں کی مدد سے ان کو قاتل ثابت کرنا بہت آسان تھا۔ وہ کہہ سکتے تھے کہ تصدیق کرنا چاہو تو کرو کہ تمہارا باپ تمہاری ماں کو بھگا کر لایا تھا اور انہوں نے شادی نہیں کی تھی۔ شادی والی بات کو ثابت کرنا آسان نہیں تھا۔ پرانے وقتوں میں نکاح تو دو گواہوں کی موجودگی میں ہو جاتے تھے۔ لکھت پڑھت ہوتی ہی نہیں تھی مگر وہ الزام بہرحال لگا سکتے تھے اور یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ سابق ہندوستان اور موجودہ بھارت کی پولیس سے پوچھ کر دیکھو۔ ان کے پاس دس لاکھ کے ہیرے جواہرات لے کر بھاگ جانے والے وزیر خان کے خلاف ایک ایف آئی آر بھی نکل آئے گی جو پرنس خورشید عالم عرف خرّم نے لکھوائی تھی لیکن وہ جانتے تھے کہ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ تم کہہ دو گے کہ یہ سب مجھے کیوں بتا رہے ہو۔ میرے لیے وزیر خان ہی باپ ہے اور اس حیثیت میں اس کی عزت کبھی کم نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ انہوں نے یہ نہیں کیا۔ انہوں نے وزیر خان کو بھی دھمکی نہیں دی اور تم سے بھی رابطہ قائم نہیں کیا، ممکن ہے وہ وزیر خان سے بات کر کے منہ کی کھا چکے ہوں۔ اس نے کہہ دیا ہو۔ جاؤ، تمہارا جو دل چاہے کرو، جیسے جو چاہو بتاؤ۔ سکندر میرا بیٹا ہے اور میرا بیٹا ہی رہے گا۔ اس کے بعد..."
"مجھے ایک بات بتا محسن!" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "تو جمع کا صیغہ کیوں استعمال کر رہا ہے۔ بات شرافت علی کی تھی مگر تو گیان چند کو بھی بیچ میں لا رہا ہے۔"
"گیان چند کے بارے میں آخری اطلاع یہی تھی کہ وہ جان بچا کے بھاگ گیا تھا۔" محسن نے کچھ دیر بعد کہا۔ "لیکن بھاگ کر وہ کہاں گیا تھا، یہ کسی کو معلوم نہیں۔ انکل رضوی کا خیال ہے کہ وہ پنجاب کے علاقے کا رہنے والا تھا۔ ہو سکتا ہے تقسیم کے بعد وہ ہجرت کر کے نہ گیا ہو۔ میں ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جنہوں نے اپنی جائداد کو اپنے مذہب سے زیادہ اہم سمجھا اور ملک بدلنے سے زیادہ آسان یہ سمجھا کہ وہ مذہب بدل لیں اور پھر وہیں رہیں جہاں رہتے تھے۔ ویسے بھی بہت سے ہندو پاکستان میں اسی طرح آباد ہیں جس طرح بھارت میں مسلمان۔ اور ان میں دولت مند بھی ہیں۔ مثلاً پنڈی میں ایک مشہور فوٹو گرافر ہندو ہے۔ ایک دندان ساز ہے جس کی دکان صدر میں ہے اور وہ کوئی معمولی ڈینٹسٹ نہیں۔ وہ عام شہریوں کی طرح معزز زندگی گزار رہے ہیں ... مرے میں بھی ان کی حیثیت کا معیار ان کی دولت ہے جنون

کا وہ دور گزر چکا ہے جب مذہب کے نام پر شیطانوں نے خون کی ہولی کھیلی تھی اور اب اس وقت کو یاد کر کے بھی انسانوں کے سر ندامت سے جھک جاتے ہیں۔ اندرونِ سندھ بہت سے دولت مند ساہوکار اور زمیندار، ڈاکٹر، ایڈووکیٹ اور پروفیسر ہندو ہیں۔ کیا گیان چند اُن میں شامل نہیں ہو سکتا؟ انکل رضوی سے مجھے بھی اتفاق ہے۔ شرافت علی چوہدری دلاور، ڈی سلوا اور خسرو جمشید کے علاوہ اسی گروہ میں گیان چند بھی ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اب اس کا نام ہی بدل گیا ہو۔ چہرہ تو وقت کے ساتھ کچھ بدل ہی جاتا ہے..."
"اس خط میں لکھا تھا کہ گیان چند نے وہ تصاویر سرجان سائمن کو ارسال کر دی تھیں جن میں وزیر خان کو ریذیڈنٹ کی بیوی کو قتل کرنے کے بعد دفن کرتے دکھایا گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "جان سائمن کے پاس وہ تصویریں تو اب بھی ہوں گی۔"
"ضرور ہوں گی اور لندن میں ہمارے ساتھ پیش آنے والے واقعات کا سبب وہ تصاویر ہو سکتی ہیں۔" محسن نے کہا۔ "یعنی جب تک سرجان سائمن کو یہ علم نہ تھا کہ تم کس کے بیٹے ہو، اس نے مارگریٹ کی تم سے محبت کو طوعاً و کرہاً برداشت کیا۔ دیسی لوگوں سے اس کی حد درجہ نفرت کے اسباب بھی اس پس منظر میں صاف نظر آتے ہیں۔ فرض کرو کسی مرحلے پر تمہارے والد کے انکار کے بعد جان سائمن کو یہ بات بتا دی گئی کہ وزیر خان تمہارا باپ تھا۔ برطانیہ میں بیٹھ کے وہ وزیر خان کا کیا بگاڑ سکتا تھا۔ اس نے تمہیں قتل کرانے کی کوشش کی۔ محض اس لیے کہ وزیر خان کو بڑھاپے میں اتنا ہی شدید جذباتی صدمہ پہنچے جتنا اسے جوانی میں اٹھانا پڑا تھا مگر یہ بھی مفروضہ ہے۔ وزیر خان مرحوم نے سب کچھ تو انہیں دے دیا تھا۔"
"لیکن وہ کاروبار سے دستبردار ہونے پر آخری وقت تک رضامند نہیں ہوئے تھے۔" میں نے کہا۔
"ہاں۔ شاید اسی بات پر انہیں دھمکی دی گئی ہو کہ سکندر کے بارے میں سرجان سائمن کو بتا دیا جائے گا۔" محسن نے کہا۔ "اور انہوں نے کہہ دیا ہو کہ اب جو چاہو کرو۔ میرے پاس تمہیں دینے کے لیے اور کچھ نہیں لیکن خود شرافت علی اینڈ کمپنی کے لیے بھی اس میں سو فیصد تحفظ کی ضمانت نہیں تھی۔ بالفرضِ محال وزیر خان کو برسوں پرانے الزام میں گرفتار کر لیا جاتا تو کیا شرافت علی محفوظ رہتا اور وہ گیان چند جو تھا، یا ہے... محفوظ رہتا؟ وزیر خان کے بیان کے بعد وہ بھی ملوث ہو جاتے۔"
"میرا خیال ہے کہ یہ ریاست سلطان آباد کہیں نہ کہیں ضرور ہوگی۔" میں نے کہا۔ "اس کی خود مختاری بھارت میں ضم ہو جانے

سے ضرور ختم ہوئی ہوگی مگر وہ جگہ، سلطان آباد، وہاں کے لوگ جو سابق حکمرانوں کے دور میں زندہ تھے جو نواب کو، ریذیڈنٹ کو، پرنس کو، ان سے منسوب داستانوں کو اور سلطان آباد کی تاریخ کو یقیناً جانتے ہوں گے۔ کسی کتاب میں اس تاریخ کا ذکر ملے نہ ملے، ایک کے بعد دوسری نسل کو منتقل ہونے والی روایات زندہ رہتی ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے میں جلیانوالہ باغ کے خونیں واقعے کا تصور کرسکتا ہوں حالانکہ ۱۹۱۹ء میں میرا وجود تک نہ تھا اور میں کبھی جالندھر نہیں گیا مگر میں نے پڑھنے کے علاوہ بہت سے لوگوں سے بہت کچھ سنا ہے۔ سلطان آباد کی موجودہ نسل کو بھی پرانے واقعات کا ضرور علم ہوگا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اصل حقائق میں بہت کچھ زیبِ داستان کے لیے بھی شامل ہوگیا ہوگا مگر حقائق کا حوالہ پھر بھی ملے گا۔"

"رابعہ کا خیال تھا کہ خسرو جمشید ہی دراصل پرنس خورشید عالم ہے، جو بعد نواب خورشید عالم ہوگیا تھا۔" محسن نے کہا۔ "اس کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہیں۔ انکل رضوی نے غیر سرکاری طور پر ٹیلی فون کے ذریعے ہندوستان کے سفارت خانے سے درخواست کی تھی کہ سلطان آباد کے آخری نواب خورشید عالم کے بارے میں معلومات فراہم کی جائیں۔ ان کے کسی صحافی دوست نے یہ کام کیا تھا۔ جواب یہ ملا کہ نواب نے پانچ سال سرکاری وظیفہ لیا۔ پھر اپنی تمام جائداد منقولہ و غیر منقولہ کو فروخت کیا اور غالباً لندن چلا گیا۔ شادی تو اس نے نہیں کی تھی چنانچہ سلطان آباد میں حکمران خاندان کا کوئی فرد نہیں۔ خسرو جمشید بھی لندن ہی سے آیا تھا لیکن میں نے کہا کہ یہ اس کے باپ کا نام تھا، خسرو جمشید مرچکا ہے اور اس کی قبر یہیں موجود ہے۔ وہ خسرو پرویز تھا جو تمہیں ملا تھا اور جس کے ساتھ ایک ہمشکل شوفر رہتا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ خسرو پرویز لندن میں مرگیا ہو اور سابق نواب خورشید عالم نے دلاور اینڈ کمپنی میں شامل ہونے کے لیے یہ نام اختیار کرلیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لاہور آنے کے باوجود اپنی کوٹھی میں نہیں گیا۔ اس کا مالی زندہ ہے۔ وہ فوراً پہچان جاتا کہ خسرو پرویز کے بہروپ میں کوئی اور ہے۔ تمہیں یاد ہے کہ وہ چوکیدار مالی قسم کا بوڑھا ہمارے منہ سے خسرو جمشید کا اور پھر خسرو پرویز کا ذکر سن کے کتنا حیران ہوا تھا۔"

"نواب خورشید عالم نے اپنا نام کیوں بدلا ہے اور بدلنا ہی تھا تو یہ نام کیوں اختیار کیا؟" میں نے کہا۔

"جب تک خسرو پرویز سے دوبارہ ملاقات نہ ہو یہ عقدہ وا نہیں ہوسکتا۔" محسن نے کہا۔

"اگر زندگی نے مہلت دی تو میں کبھی نہ کبھی سلطان آباد ضرور جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس سے پہلے یہاں بہت سے کام نمٹانے ہیں۔ بہت سے لوگوں سے نمٹنا ہے۔" یکلخت مجھے محسوس ہوا کہ کھڑکی کے پاس سے ایک سایہ سا گزرا ہے۔

"یہ... یہ کون تھا؟" محسن نے چونک کر کہا۔ "کیا کوئی کھڑکی کے پاس کھڑا ہماری باتیں سن رہا تھا؟"

"دیکھا تو کچھ میں نے بھی تھا۔" میں نے کہا۔ "لیکن میں سمجھا میری نظر کا دھوکا ہے۔"

محسن نے کھڑکی کھول کے باہر جھانکا۔ "یہاں تو کوئی بھی نہیں۔" اس نے احتیاط سے دائیں بائیں نگاہ ڈال کے کہا اور پھر باہر اتر گیا۔ آدھی سے زیادہ رات گزر چکی تھی رضوی صاحب کی کوٹھی میں گیٹ لائٹ یا ہمارے کمرے کی لائٹ کے سوا کہیں روشنی نہ تھی۔ "ہوشیار...!" باہر سے چوکیدار صدا لگاتا گزرا۔ میں نے اٹھ کر باہر دیکھا تو مجھے اندھیرے میں گم ہوتے ہوئے محسن کی ایک جھلک نظر آئی۔ وہ کوٹھی کے گرد گھوم کر دوسری دیوار کے گوشے سے سرونٹ کوارٹر پر نگاہ ڈالنا چاہتا تھا جہاں اب شہلا مقیم تھی۔ میں چند قدم اس کے پیچھے گیا اور رک گیا۔ صرف اس خیال سے کہ خطرے کی کوئی بات ہی نہیں اور محسن بھی کوارٹر تک جاکے لوٹ آئے گا۔ میری نظروں کے سامنے اس نے سرونٹ کوارٹر کی بیرونی دیوار تک پہنچ کے دروازے کو آہستہ سے دھکیلا اور اندر داخل ہوگیا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ شہلا احتیاط پسند لڑکی تھی اور اپنی زندگی کے جس دور سے گزر رہی تھی اس میں احتیاط پسندی ایک ضرورت تھی۔ یہ بات مجھے قدرے غیر معمولی لگی کہ اس اجنبی گھر میں پہلی رات ہی اس نے سونے سے پہلے کھڑکیاں اور دروازے کھلے چھوڑ دیے۔ محسن کے اور میرے درمیان شاید پچاس گز کا فاصلہ بھی نہیں ہوگا۔ اگر اس نے دستک دی ہوتی تو اس خاموشی میں میرے کان ضرور سن لیتے۔ میں یہ بھی فرض نہیں کرسکتا تھا کہ محسن نے شہلا کو ملاقات کا وقت دے رکھا تھا اور وہ نصف شب کے بعد دروازہ کھولے چشم براہ تھی۔ ایسی بات ہوتی تو محسن مجھے ضرور بتا دیتا۔ انہیں ایک دوسرے سے ملنا ہوتا تو اس کے لیے اتنی رازداری کے اہتمام کی قطعی ضرورت نہ تھی۔ ان کی راہ میں حائل ہونے والا کوئی نہیں تھا۔

پھر یہ "شجرِ ممنوعہ" قسم کی محبت اور چوری چھپے ملاقات معنی دار؟

ابھی تک گھر میں مکمل اندھیرا تھا۔ اگر شہلا جاگ رہی ہوتی تو محسن کے آنے پر لائٹ ضرور جلا دیتی۔ میری نظریں اس منظر کا تصور کرنے سے قاصر تھیں، وہ دونوں اندھیرے کی پناہ میں سایوں کی طرح کھڑے فلمی محبت کے جذباتی مکالمے بول رہے ہوں گے۔ آہستہ آہستہ میں آگے بڑھا اور سرونٹ کوارٹر کے کھلے دروازے تک جا پہنچا۔ "محسن!" میں نے مکمل خاموشی میں چند سیکنڈ انتظار کرنے کے بعد کہا۔ محسن نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دوسری بار میں نے اسے زیادہ اونچی آواز میں پکارا کہ اگر وہ اندر کے کسی کمرے میں ہوتا تب بھی میری آواز سن لیتا۔ پھر میں نے شہلا کو آواز دی مگر سکوتِ شب میں کمی نہ آئی اور یہ احساس بوجھل ہونے لگا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ میں نے دروازے کے اندر قدم رکھا۔ سامنے کے دونوں کمروں کے دروازے کھلے نظر آرہے تھے۔ اب شک کی گنجائش ختم ہونے لگی تھی۔ یہ تو ہوسکتا تھا کہ شہلا باہر والا دروازہ بند کرنا بھول گئی ہو مگر کمروں کے دروازے کھلے چھوڑ کر سونا شہلا کے لیے مشکل تھا۔ وہ حالات سے بے حد خوف زدہ تھی اور یہ نئی جگہ تھی، اسے معلوم تھا کہ وہ باقی گھر سے الگ ہے اور اس کے ساتھ صرف ایک بوڑھی عورت ہے جو کچھ نہیں کرسکتی۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ دروازے کھلے چھوڑ کر بے فکری سے سو جائے۔

میں چند قدم آگے بڑھا۔ میری نگاہ کمروں کے کھلے دروازوں سے گزر کر اندھیرے میں کسی غیر معمولی حرکت یا اجنبی اور نا آشنا سائے کی جستجو میں تھی لیکن اندھیرا دیوار سے زیادہ ٹھوس تھا اور جامد تھا۔ خطرے کی بو دیتا ہوا، کسی نامعلوم خوف سے دبکا ہوا، سہما ہوا۔ میں نے اگلا قدم اٹھایا ہی تھا کہ مجھے ٹھوکر لگی اور میں منہ کے بل گرتے گرتے بچا۔ میں نے نیچے دیکھا اور لہو میری رگوں میں منجمد ہونے لگا۔ فرش پر محسن چت لیٹا تھا۔ "محسن!" میں نے چلا کر کہا اور گھٹنوں کے بل اس کے پاس بیٹھ کر اس کے چہرے کو ٹٹولا۔ یہ حرکت قطعی غیر ارادی تھی لیکن میں دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کے سر کے کسی زخم سے لہو تو نہیں بہہ رہا ہے۔ پھر میں نے اس کا ہاتھ تھام کر نبض دیکھی۔ نبض کی رفتار مجھے نارمل لگی۔ ایک جست لگا کے میں نے باتھ روم کی لائٹ جلا دی جو قریب ترین تھی۔ دروازے سے روشنی کا ایک مستطیل ٹکڑا صحن میں پھیل گیا اور میں نے محسن کو کسی لاش کی طرح بے حس و حرکت پڑا دیکھا۔ ایک مگ میں پانی لے کر آدھے منٹ بعد پھر محسن کے قریب جا بیٹھا۔ میں نے اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور اس کے گالوں پر تھپکی دی۔ وہ آہستہ سے کراہا اور میں نے پانی کا مگ اس کے لبوں سے لگا دیا۔ ایک گھونٹ میں سے آدھا حلق سے اترا۔ باقی ہونٹوں کے کناروں سے بہہ گیا لیکن میری کوشش بارآور ثابت ہوئی۔ دو منٹ بعد وہ ہوش میں آگیا۔ اس نے سر کو جھٹکا اور اٹھ بیٹھا۔ کچھ دیر مجھے یوں دیکھتا رہا جیسے پہچاننے کی کوشش کررہا ہو۔ پھر اس نے سر دبا کے اندر دیکھا۔ "شہلا... وہ... سکندر... کیا وہ لے گئے اسے؟" اس نے سوالیہ لہجے میں کہا۔

"کون؟" میں نے کہا۔ "کون لے گیا شہلا کو؟" میں نے کہا۔

"وہی... جنہوں نے میرے سر پر کوئی چیز ماری تھی۔" محسن نے کہا۔ "جیسے ہی میں اندر داخل ہوا... میں نے اسے دیکھا نہیں..."

اب تک میں نے یہ سوچا بھی نہیں تھا۔ میری ساری توجہ محسن پر رہی تھی۔ اس کی بات پر میں نے پلٹ کر دیکھا اور کمرے تک پہنچنے والے مدھم سے اجالے میں مجھے یوں لگا جیسے کوئی کرسی پر بیٹھا ہے۔ میں نے پوری طرح چوکس رہتے ہوئے آگے بڑھ کر کمرے کی بجلی جلائی۔ کمرے کا پورا منظر یکلخت میرے سامنے آگیا اور میرے ذہن کو ایک شدید جھٹکا لگا۔ شہلا کرسی پر بندھی بیٹھی تھی اور بے ہوش تھی۔ اس کا سر ایک طرف ڈھلکا ہوا تھا۔ پیروں کو رسی کے اگلے دو پایوں سے باندھا گیا تھا اور ہاتھوں کو ساتھ ملا کر ایک ہی رسی نیچے سے اوپر کرسی کی پشت تک لپیٹ دی گئی تھی۔ اس طرح کہ ہوش میں آنے کے بعد بھی وہ حرکت نہ کرسکے۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنی چیخ کو ضبط کیا۔ یہ رضوی صاحب کے گھر میں ان کی پہلی رات تھی اور میں نہیں چاہتا تھا کہ شور اور ہنگامے سے رضوی صاحب کی فیملی جاگ اٹھے تو انہیں احساس ہو کہ ہماری میزبانی قبول کرکے انہوں نے کوئی غلطی کی ہے۔ جانتے بوجھتے ہمارے خطرات کو اپنا دردِ سر بنا لیا ہے اور اپنی پُرتحفظ زندگی کا سکون قربان کردیا ہے۔

سب سے پہلے میں نے شہلا کی ظاہری حالت دیکھی وہ صرف بے ہوش تھی۔ اس کے جسم پر مزاحمت، مقابلے یا تشدد کے آثار ناپید تھے۔ جب میں نے اس کے جسم کے گرد لپٹی ہوئی رسی کھولنی شروع کی تو مجھے احساس ہوا کہ باندھنے والوں نے اسے باندھ کے محض مذاق کیا ہے۔ ان کا مقصد ہرگز یہ معلوم نہ ہوتا تھا کہ شہلا کو بے بس کردیا جائے۔ رسیاں اتنی ڈھیلی تھیں کہ اگر شہلا ہوش میں آجاتی تو معمولی سی جدوجہد کرکے خود کو آزاد کرسکتی تھی۔ پیروں کی گانٹھیں ایک اشارے میں کھل گئیں۔ شہلا کے ٹخنوں پر ہلکا سا نشان ضرور پڑ گیا تھا مگر خراش نہیں آئی تھی۔ اس رعایت اور رحمدلی کے مظاہرے کی غرض و غایت میری سمجھ میں نہ آئی۔ پھر میں نے ایک اور بات پر غور کیا۔ اسے بے بس کرنے والوں نے یہ بندوبست بھی نہیں کیا تھا کہ شہلا ہوش میں آنے کے بعد چلانے نہ لگے۔ نہ اس کے منہ میں کوئی کپڑا ٹھونسا گیا تھا اور نہ ہونٹوں پر ٹیپ چپکایا گیا

تھا۔ باندھنے کا مقصد یہ لگتا تھا کہ وہ بے ہوشی کے عالم میں کرسی سے نہ گر پڑے اور جیسے ہی ہوش میں آتے مدد کے لیے پکارنے لگے۔

"یہ کیا چکر ہے محسن؟" میں نے محسن کو اندر آتے دیکھ کر کہا۔ "تو نے دیکھا تھا کسی کو؟"

"نہیں۔ میں تو دروازہ کھلا دیکھ کر حیران ہوا تھا۔" وہ بولا۔ "اور وہ شاید دروازے سے لگا کھڑا تھا کہ جیسے ہی میں اندر داخل ہوا اس نے کوئی سخت سی چیز میرے سر پر دے ماری۔"

میں نے شہلا کو کرسی سے اٹھا کے بستر پر لٹا دیا۔ "کوئی سلاخ یا ڈنڈا؟"

"نہیں۔ انہوں نے وہی ہتھیار استعمال کیا۔" محسن بولا۔ "ربر کے ہوز پائپ کے ایک سرے پر لکڑی کا کوئی ٹکڑا پھنسا دیا یا کرکٹ کی گیند فٹ کر دی۔ مجھے تو یوں لگا تھا جیسے سر میں توپ کا گولہ آ لگا ہے مگر چوٹ کی کوئی علامت نہیں۔ بیہوش ہونے سے پہلے مجھے آواز نکالنے کی کیا پورا سانس لینے کی مہلت بھی نہیں ملی تھی۔ میں فوراً آؤٹ ہو گیا تھا۔ شہلا کو کیا ہوا ہے؟"

"ممکن ہے شہلا پر بھی وہی ہتھیار آزمایا گیا ہو۔" میں نے کہا۔ "اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شہلا محض دہشت سے بیہوش ہو گئی ہو۔ کلوروفارم وغیرہ کی بُو تو ہے نہیں اور مجھے تشدد کے آثار بھی نہیں ملتے۔ وہ خود ہی ہوش میں آ کے کچھ بتا سکے گی۔"

"وہ سایہ سا جو ہماری کھڑکی کے سامنے سے گزرا تھا۔" محسن نے سوچتے ہوئے کہا۔ "انہی لوگوں میں سے ایک ہوگا جو یہاں آئے تھے اور انہی میں سے ایک کسی وجہ سے پیچھے رہ گیا تھا۔"

"ایک وجہ میری سمجھ میں آنے لگی ہے۔ وہ ہمیں متوجہ کرنا چاہتے تھے۔ اگر کسی وجہ سے ہم اس سائے کو کھڑکی کے سامنے سے گزرتا نہ دیکھ پاتے تو کچھ دیر بعد شہلا کی چیخ و پکار ہمیں متوجہ کر لیتی، لیکن میں یہ سوچ رہا ہوں کہ ہمیں یوں متوجہ کرنے کا مقصد کیا ہو سکتا ہے؟" میں نے کہا۔ "اور وہ آخری آدمی جو تیرے آنے کے بعد گیا، پہلے کیوں نہیں چلا گیا تھا؟ اصل وجہ میری سمجھ میں آ رہی ہے۔ وہ صرف مجھے متوجہ کرنا چاہتے تھے لیکن ان کو یہ خیال بھی تھا کہ کہیں ان کی ساری پلاننگ فیل نہ ہو جائے۔ کھڑکی کے سامنے سے گزرنے والے پر صرف تیری نظر پڑے تو میری بجائے صرف تو آئے اور صورتِ حال کو مخدوش پا کے مجھے روک دے۔ اتفاق سے یہاں پہلے تو آیا اور وہ تجھے ناک آؤٹ کر کے نکل گئے۔ اس یقین کے ساتھ کہ اب کچھ دیر بعد میں بھی ضرور پہنچوں گا۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ مجھ سے کیا چاہتے تھے؟"

"شہلا ہوش میں آ جاتے تو شاید کچھ بتا سکے۔" محسن نے گھڑی دیکھی جس میں رات کا ایک بجا تھا۔

اچانک مجھے ایک اور خیال آیا۔ "محسن! دوسرے کمرے میں... وہ شہلا کی ماں کا بیڈ تھا۔ تو یہاں ٹھہر، میں دیکھتا ہوں۔"

دوسرا کمرہ بالکل خالی تھا۔ دو دیواروں کے سنگم پر لگا ہوا صاف ستھرا بستر دیکھ کے یہ اندازہ ضرور ہو جاتا تھا کہ کچھ دیر پہلے وہ بوڑھی مفلوج عورت اس پر موجود تھی جسے شہلا اپنی ماں سمجھتی تھی۔ اب اس کی جگہ شکن آلودہ سفید چادر پر ایک لفافہ رکھا ہوا تھا۔ میں نے اس لفافے کو یوں اٹھایا جیسے اس میں موت کی اطلاع کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ مجھے بتایا جائے گا کہ مسٹر سکندر بخت! جنگ ابھی جاری ہے۔ اس سے پہلے ایک محاذ پر تم اپنی حکمتِ عملی سے فائدہ اٹھانے میں کامیاب ہو گئے تھے جیسے کوئی چالاک جنرل دشمن کی فوجوں کو آپس میں ہی لڑا دے۔ لیکن اب جنگ ایک نئے فیصلہ کن موڑ پر آ گئی ہے۔ صبح تمہیں اس عورت کی لاش مل جائے گی جس سے تمہارا براہِ راست کوئی جذباتی تعلق نہیں۔ اب تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ ہم کتنے بڑے شکاری تھے۔ تم مقابلہ جاری رکھنا چاہتے ہو تو اپنے مہرے شمار کر لو۔ ہو سکتا ہے اس کے بعد شہلا کی باری آ جائے۔ پھر فوزیہ کی، رابعہ کی، محسن کی اور بالآخر سب کچھ کھو کر تمہیں حقِ وراثت مل جائے۔

میں نے لاحول پڑھ کے ذہن سے پریشان کرنے والے خیالات کو جھٹک دیا۔ کیا یہ میری ذہنی شکست خوردگی کے آثار ہیں۔ ڈرتا ہوں آدمی سے کہ مردم گزیدہ ہوں۔ اور اب تو اپنے خیالوں سے ڈرنے لگا ہوں۔ مجھے پہلے اس لفافے کو کھول کر تو دیکھنا چاہیے۔ لفافہ بند نہیں تھا۔ میں نے اس کے اندر سے وہ کاغذ نکالا جو کسی کتاب یا رسالے میں سے پھاڑا گیا تھا بلکہ نوچ لیا گیا تھا۔ مطبوعہ عبارت کو کہیں کہیں سے انڈر لائن کر دیا گیا تھا۔ یہ جرم و سزا کی کوئی کہانی تھی اور خط کشیدہ جملوں کو ملا کر پڑھنے سے پیغام بالکل واضح ہو جاتا تھا۔

خط کشیدہ الفاظ اور جملوں سے یہ عبارت بنتی تھی:

"ہم کسی کو قتل کرنا نہیں چاہتے۔ تمہاری بیوی کو ہم ایک خاص مقصد کی خاطر لے جا رہے ہیں۔ اگر تمہیں اس کی زندگی عزیز ہے تو ہماری بات مان لو۔ پولیس کو اطلاع دی تو ہم تمہاری بیوی کی لاش پولیس ہیڈ کوارٹر کے دروازے پر ڈال جائیں گے۔ باہر نکل کے دائیں طرف چلنا شروع کر دو۔ تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر تمہیں سلیٹی رنگ کی ایک کار کھڑی ہوئی نظر آئے گی۔ کار میں کوئی بھی نہیں ہوگا۔ مزید ہدایات تمہیں کار کے ڈیش بورڈ پر رکھے ہوئے لفافے میں ملیں گی۔ ہم ایک گھنٹے تک تمہارا انتظار کریں گے۔ اس کے بعد تمہاری بیوی..."

آخری جملہ اس لیے نامکمل رہ گیا تھا کہ وہ اس صفحے کی عبارت کا آخری جملہ تھا۔ باقی جملہ اس سے اگلے صفحے پر مکمل ہوا ہوگا، لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کیونکہ مطلب بہرحال واضح ہو جاتا تھا۔ ایک بچہ بھی تھوڑی سی عقل سے کام لے کر خالی جگہ کو پُر کیجیے، کا یہ سوال حل کر سکتا تھا۔ "اس کے بعد تمہاری بیوی کو قتل کر دیا جائے گا۔" وہ میری بیوی کو اغوا کر کے نہیں لے گئے تھے مگر "تمہاری بیوی" کی جگہ "شہلا کی ماں" کے الفاظ رکھنے سے عبارت بالکل حسبِ حال ہو جاتی تھی۔ یوں گویا کسی اغوا کنندہ نے پیغام اپنے ہاتھ سے لکھا ہو۔

"یہ کیا لیے کھڑا ہے تو؟" محسن نے میرے پیچھے آ کے کہا اور میں نے وہ صفحہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے بھی مطلب سمجھنے میں دیر نہیں لگائی۔

"یہ بہت چالاک لوگ ہیں۔" وہ صفحے کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے بولا۔ "انہوں نے اپنا ہینڈ رائٹنگ تو کیا ٹائپ کے حرف کا پیغام بھی نہیں چھوڑا۔"

"حالانکہ ہماری پولیس۔ چشم بد دور۔ ٹائپ رائٹر کے الفاظ کی ساخت اور صورت سے تا قیامت معلوم نہیں کر سکتی کہ یہ کس ٹائپ رائٹر کی تحریر ہے۔"

"اسکاٹ لینڈ یارڈ والے تو نے بھی دیکھے ہیں۔" میں نے کہا۔ "وہ تو اس صفحے کو بھی رکھ لیتے۔ پھر معلوم کر لیتے۔ یا کم از کم معلوم کرنے کی کوشش ضرور کرتے... کہ یہ کس کتاب یا رسالے کا صفحہ چھیانوے ستانوے ہے۔ اصل کتاب انہیں نہ ملتی تب بھی وہ دوسرے نسخے سے کہانی ضرور ڈھونڈ لیتے اور پھر پوری کہانی پڑھ کے اس کے پلاٹ پر بھی غور کرتے کہ کیا اس سے کوئی سراغ ملتا ہے لیکن یہاں تو یہ منوانا بھی مشکل کام ہے کہ یہ صفحہ واقعی بڑی بی کو اغوا کرنے والوں نے ہمارے لیے چھوڑا ہے اور یہ لکیریں بے مقصد نہیں ہیں اور کسی بچے نے نہیں لگائی ہیں۔ حرام خور قسم کے لوگوں کے لیے یہی بہانہ بہت ہے کہ اس میں تو لکھا ہے، 'ہم تمہاری بیوی کو ایک خاص مقصد کے لیے لے جا رہے ہیں۔' آپ دونوں میں سے تو کوئی شادی شدہ ہی نہیں چنانچہ یہ سب بے معنی بکواس ہے۔ یہ سمجھانا مشکل بارت میں 'شہلا کی ماں' کے الفاظ وہ کہاں سے ڈالتے؟"

"سوال یہ ہے کہ اب کیا کرنا ہے؟" محسن نے کہا۔

"کرنا وہی ہے جو ہمیں کہا گیا ہے۔" میں نے کہا۔ "میں جا رہا ہوں۔ شہلا کی ماں کو واپس تو لانا ہی ہے۔"

"ایسے ہی؟ خالی ہاتھ؟" محسن نے کہا۔ "تو خود کیسے واپس آئے گا؟"

"میں ابھی سے کیسے بتا سکتا ہوں؟" میں نے کہا۔ "مسلح ہو کر جانے سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ میں پستول لے کر جاؤں گا تو وہ توپ لیے منتظر ملیں گے اور ایک کا مقابلہ کرنے کے لیے وہ دو ضرور ہوں گے۔"

"ہمیں رضوی صاحب کو بتا دینا چاہیے۔" محسن نے کہا۔ "انسپکٹر شیخ کو بھی یہ شکایت تھی کہ ہم قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر نقصان اٹھاتے ہیں۔"

"میں یہ خطرہ مول لینے کے حق میں نہیں۔" میں نے کہا۔ "وہ لوگ یقیناً مجھ سے کوئی بات کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے قتل کرنا نہیں چاہتے اور یہ بات بھی نئی نہیں ہوگی۔ وہ پرانی بات منوانے کے لیے دباؤ بڑھانا چاہتے ہیں۔ مجھے مار دینے سے ان کا مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ یہ ان کو پہلے بھی معلوم تھا اور ہم نے بھی اچھی طرح سمجھا دیا ہے۔ میری فکر مت کر۔ میں دیکھتا ہوں کہ وہ مجھے کیا دھمکی دیتے ہیں۔ میں کوشش کروں گا کہ بڑی بی کو ساتھ لے کر جلد از جلد لوٹ آؤں۔ اگر صرف میرے وعدے سے کام چل سکتا تو میں سمجھتا کہ یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ میں جھوٹا وعدہ کر کے نکل آؤں گا لیکن معاملات اس حد تک آگے بڑھ چکے ہیں کہ کوئی کسی پر اعتبار نہیں کر سکتا۔ انہوں نے کچھ اور سوچا ہوگا جس کا اندازہ میں نہیں کر سکتا۔ یہ تو ان سے مل کر ہی معلوم ہوگا کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ اگر مذاکرات کامیاب رہے تو میں صبح ہونے سے پہلے لوٹ آؤں گا لیکن میں نہ آؤں تو جیسا تو مناسب سمجھے کرنا۔ اگر شہلا خود رضوی صاحب کو بتا دے کہ رات کو کیا ہوا تھا تو یہ زیادہ اچھا ہوگا۔ پھر تو کہہ دینا کہ میں سو کر اٹھا تو مجھے سکندر کے پلنگ پر یہ صفحہ پڑا ہوا ملا اور کہہ دینا میرا خیال ہے وہ شہلا کی ماں کی جان بچانے کے لیے نکل گیا۔"

"وہ پوچھیں گے کہ اس نے تمہیں بھی نہیں بتایا؟" محسن نے سوچ کر کہا۔

"اس کا جواب آسان ہے۔" میں نے کہا۔ "تو کہہ سکتا ہے کہ شاید سکندر نے عمداً ایسا نہیں کیا۔ اس خیال سے کہ میں اسے اکیلا جانے نہیں دوں گا۔ بات یہ ہے محسن کہ اس معاملے میں میری چھٹی حس میری رہنمائی کر رہی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ

تاخیر ہوئی یا ہدایات پر عمل نہ کیا گیا تو اس بڑھیا کی جان ضرور جائے گی جس کا ہمارے مسائل سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ جسے کچھ معلوم ہی نہیں۔ ہم بھی اتنے ہی بے حس اور بے ضمیر ہوتے تو خود کو قائل کرنے کے لیے ہمارے پاس دلائل کی کمی نہیں۔ اس بڑھیا سے شہلا کا قریبی تعلق تو ہے لیکن کوئی گہرا جذباتی رشتہ نہیں ہے۔ تجھے یاد ہوگا کہ عدنان کی موت کا اسے دکھ ضرور ہوا تھا مگر ایسا شدید صدمہ نہیں جیسا اسے سگے بھائی کی موت پر ہوتا۔ بڑھیا کی موت پر وہ پاگل نہیں ہو جائے گی۔ ہم اس دھمکی کو اس طرح بھی نظر انداز کر سکتے ہیں کہ وہ آدھی ادھوری بے مصرف اور بے سہارا زندگی نہ رہی تو اچھا ہی ہوگا جو دوسروں کے اعصاب پر پیرِ تسمہ پا کی طرح سوار ہے جس کے لیے اپنا وجود ایک مسلسل ذہنی و جسمانی اذیت کے سوا کچھ نہیں اور اس طرح مرجانے سے ماں پر جوان بیٹے کی موت کا راز افشا نہیں ہوگا اور ہم اس کی نظر میں ذلیل نہیں ہوں گے کہ ہم نے جھوٹ بول کر اسے دھوکے میں رکھا۔ اس کو لندن سے موصول ہونے والے بے وجود خطوط سناتے رہے جبکہ اس کے بیٹے کا وجود محض ہڈیوں نے ایک مدفون پنجر کے سوا کچھ نہ تھا اور کیا معلوم جس روز بھی حقیقت کا انکشاف ہوتا وہ اسی روز صدمے سے مرجاتی مگر یہ سب دلائل غیر انسانی ہیں۔ اگر وہ مفلوج ہونے کے علاوہ پاگل ہوتی یا اس کی زندگی کی چند سانسیں باقی ہوتیں تب بھی میں اس کی اور اپنی زندگی کو ایک ہی سطح پر اہمیت دیتا۔ تو شہلا کا خیال رکھنا۔ ہو سکتا ہے وہ کوئی زیادہ کار آمد بات بتا سکے اور اسے تسلی بھی دینا کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اگر صبح تک معاملات طے ہو گئے تو رضوی صاحب کو کچھ معلوم ہی نہیں ہوگا۔"

محسن کو خاموش اور اپنے خیالات سے نبرد آزما چھوڑ کے میں باہر نکل گیا۔ صاف ظاہر تھا کہ میرے دلائل نے اسے قائل تو کر لیا ہے لیکن جذبات کی دیوار کو عبور کرنا اس کے لیے مشکل ثابت ہو رہا ہے۔ وہ مجھے ہنسی خوشی کیسے اجازت دیتا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ میں جن لوگوں سے ملنے جا رہا ہوں، وہ کس قماش کے لوگ ہیں۔ ان سے کچھ بعید نہیں۔ ویسے بھی دنیا میں یہ کہاں ہوا ہے کہ جنگ اصولوں پر لڑی گئی ہو۔ وہ وقت اور اس وقت کا تصور بھی اب مضحکہ خیز لگتا تھا جب سورج غروب ہوتے ہی لشکر ہتھیار رکھ کے خیموں میں لوٹ آتے تھے اور اگلی صبح طبلِ جنگ بجنے تک لڑائی پھر شروع نہیں ہوتی تھی۔ پھر یہ لڑائیاں بھی کھلے میدانوں میں ہوتی تھیں مثلاً پانی پت کا میدان۔ جنگ نہ ہوئی کرکٹ ہو گئی کہ لارڈز یا ٹرینٹ برج کے گراؤنڈ میں ہو سکتی ہے جہاں مقابلہ دو ٹیموں میں نہیں دو ملکوں میں ہوتا ہے۔ اصول و قواعد اور ضوابط کے مطابق روشنی کم ہوئی اور اپیل پر کھیل ختم۔ اب صبح لڑیں گے کشتوں کے پشتے لگا کر رکھ دیں گے۔ گویا چوکے چھکے مار مار کے چھکے چھڑا دیں گے۔ بغیر لڑے شکست گویا انگ کی فتح۔

اپنے خیالات کی رو میں بہتا میں ابھی گیٹ سے نکل کے پچاس قدم ہی گیا تھا کہ پیچھے سے ایک کار کی ہیڈ لائٹس نمودار ہوئیں۔ میں نے صرف ایک بار پلٹ کر دیکھا اور پھر سامنے دور تک سڑک کو روشن کر دینے والی ہیڈ لائٹس کے اجالے میں کسی سلیٹی رنگ کی کار کی جستجو کرنے لگا مگر سڑک کے آخری کنارے تک مجھے صرف ایک گاڑی دکھائی دی جس کا رنگ سفید تھا۔ ممکن ہے اس صفحے کی عبارت میں سفید کی جگہ سلیٹی ہی چھپا ہوا ہو۔ جیسے "شہلا کی ماں" کی جگہ تمہاری بیوی تھا۔ مطلب تو یہ تھا کہ ایک کار ملے گی اور کار تقریباً اسی جگہ موجود تھی جہاں اسے ہونا چاہیے تھا لیکن ابھی میں چند قدم ہی آگے گیا تھا کہ پیچھے سے آنے والی کار اس طرح میرے پاس آکے رُکی کہ مجھے زبردست رگڑ لگی اور میں ایک جھٹکے سے گھوم گیا۔ میری کہنی بھی کار کے دروازے کے ہینڈل سے ٹکرائی۔ میرے سنبھلنے سے پہلے دروازے کھلے اور ایک ساتھ دو افراد نے مجھے تقریباً اٹھا کے پیچھے والی سیٹ پر اچھال دیا جس پر پہلے سے ایک شخص ریوالور لیے بیٹھا تھا۔ مجھے اچھالنے والے دونوں افراد میں سے ایک تو خود ڈرائیور تھا اور دوسرا عین اس کے بالکل پیچھے بیٹھا ہوا گوریلا جو میرے اندر گرتے ہی پھر اپنی جگہ پر آ بیٹھا۔ ایک منٹ سے کم وقت میں دروازے پھر بند ہوئے اور کار چل پڑی۔ میں اب پچھلی سیٹ پر دو گوریلوں کے درمیان پھنسا ہوا تھا جو قد و قامت سے دیوزاد لگتے تھے تو صورت سے حبشی مگر میں نے دیکھ لیا کہ انہوں نے چہروں پر کالک یا سیاہی وغیرہ مل رکھی ہے۔ گردن کے نیچے اور کان کے پیچھے ان کا اصل گندمی رنگ زیادہ سفید نظر آتا تھا۔ آگے والی سیٹ پر ڈرائیور کے علاوہ بھی ایک شخص تھا جس نے پلٹ کر ایک بار بھی نہیں دیکھا اور زبان سے ایک لفظ نہیں بولا۔ وہ کچھ پستہ قد تھا۔ بھاری بدن کا اور اطوار و انداز سے مغرور نظر آنے والا۔ اس نے مفصل ہدایات پہلے ہی دے دی تھیں چنانچہ کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی تھی اور میں خاموشی سے برضا و رغبت اغوا ہو گیا تھا۔ گاڑی کے شیشوں پر اندر سیاہ پینٹ کر دیا گیا تھا۔

"اس گاڑی کا رنگ سلیٹی تو نہیں، نیلا ہے۔" میں نے [...]ر بعد کہا جب گاڑی دائیں طرف گھومی۔ "اور یہ بے [...]ی گاڑی ہے۔ اڈیل ریکارڈ، لیفٹ ہینڈ ڈرائیو، ۷ ۔ ۶ کے [...]ا ماڈل ہے۔ بہت اچھی گاڑی ہے۔"

[...]سی نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ ڈرائیور کے [...]وہ میرے دائیں بائیں کا مک مل کے بیٹھنے والے تینوں افراد [...]ایک جیسے سیاہ لباس بھی پہن رکھے تھے اور وہ قد و قامت [...]ھی ایک دوسرے سے کم نہ تھے لیکن ایک بات میں [...]وراً نوٹ کر لی۔ ڈرائیور کے کالے کانوں میں سنہری مندریاں [...]ب رہی تھیں۔

"اس کے ونڈ اسکرین پر یہ لکیر سی کیسی ہے؟" میں نے کہا۔

[...]باً شیشے میں بال پڑ گیا ہے۔ مار دیا ہوگا کسی نے دو لائنس [...]تھر اور ڈز پڑ گئی دو ہزار کی۔ میرا خیال ہے، میں دوبارہ اس [...]کو دیکھوں گا تو پہچان لوں گا۔"

"پھر کسی جنم میں، اس جگہ سے گزرو گے تو سب یہ کچھ [...]یان لوگے۔ بشرطیکہ دوسرا جنم ملا اور تم اس میں آدمی ہی [...]ے کتے نہ ہوئے۔" ڈرائیور نے غرا کر کہا۔

میں ہنسا۔ "میرا اس زندگی پر اعتقاد ہے یا عاقبت کی [...]ندگی پر۔ خدا کا شکر ہے اس نے مجھے انسان بنایا ہے ورنہ [...]ز دنیا میں بھی کتے کی طرح رہے۔ آقا کے اشارے پر چلنے [...]ے۔ ایک ہڈی کے پیچھے لپکنے والے۔ نہ گھر کے نہ گھاٹ [...]ہ جس کی دم کو کسی نے بارہ سال بعد نلکی سے نکال کے دیکھا [...]تو ٹیڑھا ہی پایا۔ معلوم نہیں تیرہ سال بعد کیا ہوتا ویسے [...]بھونکتے ہی ہو یا کاٹتے بھی ہو۔ . . اور وہ کتے ہو جو کتے [...]ری ہوتا ہے . . ."

میرے دائیں ہاتھ پر بیٹھے ہوئے شخص نے اپنی کہنی سے [...]ری پسلی پر زبردست وار کیا۔ درد کی شدت سے میری [...]نکھوں میں آنسو آ گئے مگر میں نے نوٹ کر لیا کہ گاڑی جو [...]نی کی رفتار سے جا رہی تھی آہستہ ہوئی اور بائیں جانب مڑ [...]نا۔ رفتار پھر زیادہ ہو گئی۔

"معاف کرنا . . . تم نے میرے سچ کا بُرا مانا۔ سچ عموماً [...]وا لگتا ہے۔" میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ اپنی باتوں [...]سے میں دو مقاصد حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ایک تو میں ان کو بتانا [...]ہتا تھا کہ میں بالکل خوفزدہ نہیں ہوں۔ دوسرے میں ان [...]شتعل کرنا چاہتا تھا کہ وہ راستے میں کچھ نہ کرنے اور کچھ [...]نے کی ہدایات کو بھول کر ذرا بھی غافل ہوں تو میں موقعے [...]ے فائدہ اٹھاؤں۔ لیکن آگے بیٹھے ہوئے دوسرے شخص [...]کہا جس کے بعد وہ سب پھر محتاط ہو گئے۔

"تم تینوں ایک ساتھ پیدا ہوئے تھے کیا؟" میں نے کہا۔ "رنگ روپ، ناک نقش سب ایک ہے۔ یا کسی تھیٹر میں جوکر کا رول کرتے ہو تینوں؟ اس وقت تو خیر مشکل ہے لیکن کبھی نہ کبھی میں تم تینوں کو ایک ساتھ دنگل لڑنے کی دعوت ضرور دوں گا۔ تم بھی کیا یاد کرو گے۔ اپنے اپنے اسٹریچر ساتھ لانا اور ماؤں سے دودھ بھی بخشوا لینا۔"

اس بار بائیں طرف بیٹھے ہوئے شخص نے میرے سر پہ ریوالور کا بٹ مارا۔ مجھے صرف ذرا سی دیر کے لیے چکر آیا تھا مگر میں اپنے محسن کے کندھے پہ سر رکھ کے انٹا غفیل ہو گیا۔ کار رک گئی کیونکہ میں نے ایک زبردست کراہ بھی بلند کی تھی۔

"اُلو کے پٹھے۔" آگے بیٹھے ہوئے شخص نے کہا۔ "میں نے کیا سمجھایا تھا تجھے؟"

"ارے استاد، سالا بولتا جا رہا تھا اور اپنی ماں کا نام کیسے لیا اس نے؟" مجھے ناک آؤٹ کرنے والے نے کہا۔ "میں کب تک یہ بک بک برداشت کرتا۔ ہم کو اس نے کتا کہا اور یہ سمجھا کہ ہم چوہے ہیں۔"

"اگر اسے راستے میں ہی ہوش نہ آیا تو منزل پر پہنچنے کے بعد تمہاری قوتِ برداشت کا امتحان میں خود لوں گا۔" وہ بولا۔

"ارے استاد، معاف کر دو، بے وقوف ہے۔" ڈرائیور نے لجاجت سے کہا۔ "پہلی بار ایسے مشن میں شامل ہوا ہے۔"

"تم نے مجھے یقین دلایا تھا کہ سب پرانے آدمی ہیں اور قابلِ اعتماد ہیں۔"

"ویسے تو بڑے بڑے کام کر چکا ہے مگر اس کام کی نوعیت ذرا اور ہے نا۔" مندری والے نے کہا۔

"تم اس کو نہیں جانتے۔ یہ ہر ایک کی آواز پہچان لے گا۔" استاد کا غصہ کچھ کم ہوا۔ "میں نے اسی لیے سمجھا دیا تھا کہ کوئی بھی بالکل نہ بولے۔ تمہارا کام صرف اس کو اٹھانا تھا مگر تم نے مجھے بھی بولنے پر مجبور کر دیا۔"

"ہم میں سے کوئی بھی اصل آواز میں بات نہیں کر رہا ہے استاد!" اس شخص نے کہا جو اب تک خاموش تھا اور جس نے میری پسلیوں میں خاموشی سے کہنی ماری تھی۔

"ہر شخص کو اپنی طرح عقل سے پیدل مت سمجھو۔" استاد نے برہمی سے کہا۔ "تاڑنے والے سات پردوں میں تاڑ لیتے ہیں اور یہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔ عقل کے اعتبار سے تم جیسے دس کو یہ کوڑیوں کے مول بیچ آتے۔ چلو اب گاڑی چلاؤ۔" دشمن کے منہ سے اپنی تعریف سن کے مجھے تھوڑی سی خوشی

ہوئی مگر اس وقت احساسِ مسرت پر دوسرے خیالات غالب تھے۔ میں واقعی کوشش کر رہا تھا کہ اصل آواز کو پہچان سکوں۔ مندری والے کے بارے میں مجھے کوئی شک نہیں تھا۔ حیرت مجھے اس کی عقل پر تھی۔ میں نے اسے بہت عرصے بعد دیکھا تھا مگر مندریوں کے باعث اسے فوراً شناخت کر لیا تھا۔ آخر وہ ان مندریوں کو اتار کیوں نہیں دیتا جو ہر جگہ اس کے ٹریڈ مارک کی طرح نظر آجاتی ہیں۔ اس نے روپوش رہنا قبول کیا اور اتنے عرصے بعد سامنے آیا بھی تو اپنی ظاہری صورت کو بدل کے لیکن مندریاں اس نے پھر بھی نہیں اتاریں۔ اس حماقت کے دو ہی اسباب ہو سکتے تھے۔ ایک یہ کہ وہ مندریاں اسے بہت عزیز تھیں اور کوئی جذباتی وجہ ایسی تھی کہ ان سے جدا ہونا اس کے لیے ممکن نہ تھا۔ دوسرا یہ کہ کان کاٹے بغیر مندریاں اتاری ہی نہیں جا سکتی تھیں مگر پہلی وجہ زیادہ قابلِ قبول تھی۔ شاید مندریاں اس کی ماں نے کوئی منت مان کے پہنائی ہوں اور مرتے وقت اسے بتا دیا ہو کہ انہیں کبھی نہ اتارے ورنہ فلاں درویش بابا کے علمِ غیب کے مطابق وہ کسی سخت مشکل میں گرفتار ہو جائے گا یا اس کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔ استاد کی آواز پر مجھے دلاور کی آواز کا شبہ ہوتا تھا۔ وہ بڑا اچھا اداکار اور صداکار تھا۔ اس نے اپنے کمالِ فن کے کئی نمونے پیش کیے تھے۔ مجھ سے پہلی ملاقات میں اس کا لب و لہجہ بالکل مختلف تھا یا یہ بن کر مجھ سے بات کرتے وقت اس کا اندازِ گفتگو کچھ اور تھا۔ ایک تہہ خانے میں مائکروفون کے ذریعے بات کرتے ہوئے اور ہسپتال میں ڈاکٹروں کے سامنے گورکن کی ہلاکت کے معاملے پر اپنی بے گناہی ثابت کرتے ہوئے۔ ہر جگہ وہ ایک مختلف آدمی تھا۔ بے شک اس کی اصل آواز بھی میں نے سنی تھی لیکن اس وقت میں سو فیصد یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ دلاور ہی ہے۔ صرف اس کے قد و قامت سے یہ اندازہ ممکن تھا ورنہ ابھی تک اس نے مجھے اپنا چہرہ ہی نہیں دکھایا تھا۔ میں بے ہوش بنا ایک آنکھ کی درز کو تھوڑا سا کھولے پڑا تھا اور اگر وہ ایک بار بھی پلٹ کر دیکھتا تو اندھیرے کے باوجود میں اسے پہچان لیتا مگر اس نے پیچھے والوں کو بھی پیچھے دیکھے بغیر جھاڑ پلائی تھی۔ ایک وجہ آگے کی دونوں سیٹوں پر لگے ہوئے ہیڈ ریسٹ تھے جن کی وجہ سے سیٹوں کی بیک دونوں آگے بیٹھنے والوں کے سر سے بھی اونچی ہو گئی تھی۔

دوسرے موڑ کے بعد میں سمجھ گیا تھا کہ گاڑی اب ایبرمال پر چھاؤنی کی طرف جا رہی ہے اور میرا خیال تھا کہ اس سمت میں ہماری منزل ڈی سلوا کا گھر ہی ہوگا لیکن گاڑی نے ایک موڑ اور کاٹا۔ اگرچہ میں باہر کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن میں نے اندازے کو بنیاد بنا کے فرض کیا کہ اب ہم صدر بازار جانے والی سڑک پر سے گزر رہے ہیں۔ دس منٹ بعد کار بائیں جانب مڑنے لگی تو میں نے تصور میں وہ سڑک دیکھی جو دھر میورہ کے سامنے سے گزر کے گڑھی شاہو کی طرف جاتی ہے یعنی علامہ اقبال روڈ جو پہلے میو روڈ کہلاتی تھی۔ کار کو مسلسل دو جھٹکے لگے تو مجھے اپنے اندازے کے درست ہونے کا یقین آیا۔ کار کے پہیوں نے صدر کی ریلوے کراسنگ پار کی تھی اور جھٹکے دونوں لائنوں پر گاڑی کے اچھلنے سے آئے تھے۔ ریلوے لائن کے آس پاس کی ٹوٹی پھوٹی سڑک میں لائنوں کے ساتھ ساتھ نالیاں سی بنی ہوئی تھیں اور ریلوے لائن سڑک کی سطح کے برابر نہیں رہی تھی۔

ہم ایک بہت لمبا چکر کاٹ کے تقریباً اسی جگہ پہنچ رہے تھے جہاں سے روانہ ہوئے تھے۔ مزید پانچ منٹ کے بعد میں نے نہر کے پل کے نیچے پانی کی روانی کا شور سنا تو مجھے کوئی شبہ نہیں رہا۔ اگر وہ چاہتے تو روانہ ہوتے ہی دائیں طرف مڑنے کی بجائے بائیں طرف مڑ جاتے اور جہاں وہ آدھے گھنٹے میں پہنچے تھے وہاں تین منٹ میں پہنچ جاتے لیکن وہ ڈرتے تھے کہ اس طرح میں سمت اور فاصلے کا اندازہ کر لوں گا۔ اتنے لمبے راستے سے گھوم کر آنے اور اتنے موڑ کاٹنے کا مقصد مجھے کنفیوز کرنے کے سوا کچھ نہ تھا لیکن انہیں ابھی تک اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ نہر کا پل عبور کرتے ہی کار سیدھے ہاتھ پر گھوم گئی اور نہر کے ساتھ ساتھ خالی سڑک پر دوڑتی رہی۔ اب اگرچہ نہر کے پانی کے خاموشی سے بہنے کی کوئی آواز نہیں آرہی تھی لیکن میں نہر کے پانی کی، کنارے کی مٹی کی، سبزے کی اور نم آلودہ ہوا کی خوشبو سونگھ رہا تھا جو کار کے اگلے شیشوں کے کھل جانے سے اندر تک پہنچ رہی تھی۔ مجھے بے ہوش دیکھ کر انہوں نے آگے والی کھڑکیوں کے شیشے اتار دیے تھے تاکہ گھٹن کچھ کم ہو۔ ایک پل اور آیا اور اس کے بعد گاڑی نے دائیں طرف کا رخ کر لیا جو میرے خیال کے مطابق باغبانپورے والی سڑک تھی اور ہم اب شالیمار باغ کی طرف جا رہے تھے۔

بالآخر کار رک گئی اور میرے دونوں جانب متعین محافظوں نے مجھے باہر نکال کے اندر پہنچانے کا کام شروع کیا۔ چونکہ ان کے یقین کے مطابق میں ابھی تک ہوش میں نہیں آیا تھا، اس لیے میرے سر پر ریوالور کا دستہ مارنے کی غلطی کرنے والا یقیناً متفکر ہوگا کہ نہ جانے اب اسے قوتِ برداشت کا کیا امتحان دینا پڑے گا۔ اگر شہلا کی ماں کا خیال نہ ہوتا تو میں اس موقعے پر فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ مندری والے ڈرائیور نے اترتے ہی ریوالور نکال لیا تھا تاکہ میری منتقلی کے آپریشن میں کوئی گڑبڑ نہ ہو۔ اس کے ساتھ بیٹھا ہوا سب کا استاد اترتے ہی اندر چلا گیا تھا چنانچہ میں چاہتا تو اس شخص کا ٹینٹوا دبا دیتا جو مجھے لاش کی طرح اٹھا کے لے جا رہا تھا۔ دوسرے کے ایک لات رسید کرتا تو اس کی گردن ٹوٹ جاتی۔ وہ میری لات کی رسائی میں بھی تھا اور اس سے پہلے کہ مندری والا سنبھلتا، میں سواری کے لیے استعمال ہونے والے حیوانِ ناطق کو اس کے اوپر پھینک دیتا۔ گولی لگتی بھی تو اسی کے جسم پر میں سوار تھا۔ شاید ریوالور بھی میرے ہاتھ لگ جاتا مگر اس کے بعد کیا ہوتا۔ یہ میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ اندر سے گولیوں کی آواز سن کے کتنے شکاری نکل آتے، کیسے شکار کرتے اور کیسے معاف کرتے اور شہلا کی ماں سمیت بھاگ جاتے یا اس کی لاش چھوڑ جاتے کہ مجھے بہادر بننے کی بے وقوفی کرنے پر عبرت آمیز سبق دیا جائے۔

عمارت کو میں نے پہچان لیا تھا۔ یہ وہی کوٹھی تھی جو نواب نما کے ڈبل رول کرنے والے خسرو جمشید نے میری معرفت رابعہ کو فروخت کی تھی۔ مجبوراً... ورنہ اس کے نیچے گولہ بارود تو انہوں نے بطورِ خاص اسی لیے بچھایا تھا کہ مجھے اور لواحقین کو ایک ہی دفعہ میں ایک ساتھ راہیِ ملکِ عدم کر دیا جائے۔ اب وصیت ناموں کے ایک سلسلے نے میری وفات سے حاصل ہونے والے فائدے کو عملاً صفر کر دیا تھا چنانچہ وہ مجھے زندہ رکھنے پر مجبور تھے اور زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتے تھے کہ مجھ پر دباؤ ڈال کے مجھے اپنے مطالبات کے سامنے سپر ڈالنے پر مجبور کریں۔ کسی محاذ پر جنگ طول پکڑ جائے اور طاقت سے فیصلہ نہ ہوتا ہو تو حکمتِ عملی بدل کے مختلف حربے آزمانے کے سوا چارہ نہیں رہتا۔ شہلا کی ماں کا اغوا اس جنگ میں ایک نئے موڑ کے مترادف تھا۔ مجھے دشمن کے کیمپ میں جا کر یہ فیصلہ کرنا تھا کہ اب مجھے جنگ بندی قبول ہے یا نہیں۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ مجھے کس قسم کے نتائج کی دھمکیاں دے سکتے ہیں لیکن میرے ذہن میں کوئی الجھن نہیں تھی۔

مجھے ایک خالی کمرے کے فرش پر لٹا دیا گیا۔ فرش و ہائٹ سیمنٹ میں سرخ و سیاہ پتھروں کے موزیک کا نمونہ تھا مگر اس پر اتنی گرد تھی کہ اصل ڈیزائن کے نقوش نظر ہی نہ آتے تھے۔ چاروں دیواروں پر ڈبل وال لائٹس جل رہی تھیں۔ مخصوص ڈیزائن کے سفید دودھیا بلب دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے شمع دانوں میں بڑی بڑی موم بتیاں روشن ہوں۔ اسی قسم کا ایک فانوس عین وسط میں روشن تھا جس میں ایسی ہی سولہ لائٹس تھیں چنانچہ کمرہ ہر طرف سے روشن تھا لیکن سایہ کہیں نہ تھا۔ لائٹس کے علاوہ کمرے میں کوئی چیز نہیں تھی۔ اس کی سپاٹ دیواروں میں سے دو کا رنگ نیلا تھا اور دو کا نارنجی مائل زرد۔ میں نے فرش پر استراحت فرمانے سے پہلے ہی دیکھ لیا تھا کہ کمرے میں میرا انٹرویو یا میری جان لینے والے کتنے افراد موجود ہیں۔ جو شخص کار میں استاد بنا ہوا تھا وہ دراصل دلاور ہی تھا۔ ڈی سلوا اس کے ساتھ کھڑا تھا۔ پھر وہ ڈبل رول کرنے والے دونوں بدمعاش تھے یعنی نواب خسرو جمشید اور اس کا شوفر۔ اس وقت بھی وہ ایک جیسے لباس اور حلیے میں تھے چنانچہ میں پورے یقین کے ساتھ محمود و ایاز میں تفریق نہیں کر سکتا تھا۔ پانچویں شخص کو میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ تیس بتیس سال کا جوان آدمی تھا جس کی ہلکی ہلکی مونچھیں تھیں۔ وہ قمیص پتلون پہنے ہوئے تھا اور صورت سے مہذب، تعلیم یافتہ اور معزز نظر آتا تھا۔ ان سب کے سامنے تین آدمی منہ پر سیاہی ملے بالکل بھوت نظر آتے تھے۔

"کیا ہوا ہے اسے؟" پانچویں شخص نے مجھ پر نگاہ ڈال کے کہا۔ ساتھ والے کمرے میں سے خرخروں کی آواز آئی۔

"اس پاگل کے بچے نے یہ ثابت کیا تھا کہ یہ چوہا نہیں ہے۔" دلاور نے حقارت سے اس سورما پر نظر ڈالی جو اب دوسری جانب دو سیاہ افراد کی صف میں سرنگوں کھڑا تھا۔ "حالانکہ ایک بار نہیں دس بار سمجھا دیا تھا اسے کہ ہوش میں رہنا۔"

"مجھ سے غلطی ہو گئی سراج صاحب!" پاگل کے بچے نے گھگھیا کر کہا۔ "اس بار معافی دے دیں۔"

"یہ بھی دیکھو کہ بے ہوشی اصلی ہے یا نقلی۔" سراج نے معافی کے خواستگار کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ بظاہر اسے معاف کر دیا گیا تھا مگر اس کی بات نے یکلخت میرے ذہن میں ایک بند دریچے کو کھول دیا تھا۔ ایک معما حل کر دیا تھا اور ایک پرانی یاد سے وابستہ نام کو حقیقی وجود عطا کر دیا تھا۔ وہ پورا منظر میرے تصور میں زندہ ہو گیا جب رابعہ کی ماں کی تدفین کے بعد ہم واپس لوٹ کر آئے تھے تو ایک جنگی قیدی جسے ہم بڑی مشکل سے نکال کر لانے میں کامیاب ہوئے تھے (اور اس کامیابی کی بہت بڑی قیمت ادا کی تھی) قریب المرگ تھا۔ ہم اسے ایک نہر کے کنارے مرتا دیکھتے رہے تھے اور جب میں ہاتھوں کے پیالے میں نہر کا پانی بھر کے لایا تو وہ مر چکا تھا لیکن مرنے سے پہلے اس نے تین بے ربط الفاظ کہے تھے۔ ایک لفظ کا مطلب راج محل ہو سکتا تھا۔ دوسرا لفظ کرامت تھا

جس کے معنی ابھی تک واضح نہ تھے مگر تیسرا لفظ سراج تھا۔ اب شبے کی کوئی گنجائش نہ رہی تھی کہ اس نے سراب بھی نہیں کہا تھا اور سروج بھی نہیں۔ اس نے ہمیں سراج نام کے اس شخص کے بارے میں کچھ بتانے کی کوشش کی تھی مگر فرشتۂ اجل نے اس کی روح پہلے قبض کر لی۔

میری ناک میں زبردست خارش ہوئی۔ یوں جیسے چیونٹیوں کی فوج میری ناک کو اپنا بل سمجھ کے اندر گھس آئی ہو۔ پھر مجھے ایک زبردست چھینک آئی اور مجھے اٹھ کر بیٹھنا پڑا۔ سراج اپنی چالاکی سے یہ معلوم کرنے میں کامیاب رہا تھا کہ میری بیہوشی محض اداکاری ہے۔ کسی نے میری ناک کو بطور ایش ٹرے استعمال کیا تھا اور جلتی سگریٹ سے گرم راکھ جھاڑ کے پھونک مار دی تھی۔

"السلام علیکم حضرات!" میں نے آلتی پالتی مار کے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "آپ سب کو ایک جگہ دیکھ کر... خوشی تو نہیں ہوئی۔ یہ ثابت ہو گیا کہ اکیلا صرف میں ہوں۔ بے شک میرا خدا میرے ساتھ ہے مگر آپ لوگوں کے ساتھ ساری خدائی ہے۔"

"وندر فل۔" سراج نام کا شخص بولا جو اب پیچھے ہاتھ باندھے اور پیروں کو تھوڑا سا پھیلائے کھڑا تھا۔ "میں نے سنا تھا کہ تم اور تمہارا وہ ساتھی، دونوں جوکر ہو۔ تمہیں معلوم ہے ہم نے تمہیں کیوں بلایا ہے؟"

"نہیں۔ اور میں معلوم کرنا بھی نہیں چاہتا لیکن تم لوگ بتائے بغیر جانے نہیں دو گے۔" میں نے کہا۔ "اسے راؤنڈ ٹیبل کانفرنس تو نہیں کہا جا سکتا کیونکہ ٹیبل سرے سے نہیں۔ آپ لوگ تشریف رکھیں، ایسے کب تک کھڑے رہیں گے؟"

"تم اس بڑھیا کو زندہ واپس لے جانا چاہو گے یا اس کی لاش؟" سراج نے متانت سے کہا۔ اس کے رکھ رکھاؤ اور اس کے سامنے دوسروں کی خاموشی کو دیکھتے ہوئے اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ اس شکاری ٹولے کی کمان وہی کرتا ہے۔ اب تک وہ پس منظر میں تھا مگر اب دوسروں کی مسلسل ناکامیوں کے بعد اس نے خود سامنے آ کر مجھ سے بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

"میرے چاہنے سے کیا ہوتا ہے سراج صاحب!" میں نے کہا۔ "چاہتا تو میں یہ ہوں کہ شہلا کی ماں کو زندہ لے جاؤں اور آپ سب کی لاشیں۔ مگر کیا آپ اس کی اجازت دیں گے؟"

ساتھ کے کمرے سے پھر کسی کے کراہنے جیسی آواز سنائی دی۔

"تمہاری حسِ مزاح بہت سخت جان ہے۔" وہ بولا۔ "میرا خیال ہے پہلے تم کو سنجیدگی سے گفتگو کے لیے آمادہ کیا جائے۔ مذاق بہت ہو چکا اور مذاق مذاق میں بہت وقت بھی ضائع ہوا اور بہت سے آدمی بھی ضائع ہوئے۔ کیا خیال ہے، تمہیں کچھ مہمانوں سے ملوایا جائے جو تم سے ملاقات کے لیے بڑی دور سے آئے ہیں۔"

میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا مگر اس کا اشارہ پاتے ہی وہ دونوں کالے بھوت مجھ سے چمٹ گئے تھے جو کار میں مجھے دونوں طرف سے دبوچے بیٹھے تھے۔ انہوں نے مجھے ایک جھٹکے سے کھڑا کر دیا۔ اس وقت نہ جانے کیوں مجھے شرارت سوجھی حالانکہ یہ مقابلے کی کوئی جگہ نہیں تھی اور مقابلے کا فائدہ بھی کوئی نہیں تھا لیکن یہ احساس غالب تھا کہ وہ مجھے نقصان بھی نہیں پہنچا سکتے۔ میں نے بڑی پھرتی سے کراٹے کی ٹانگ لگا کے ایک کو الٹ دیا اور ابھی وہ فرش پر گرا ہی تھا کہ میں نے دوسرے کو گردن میں پیچھے سے ہاتھ ڈال کر آگے دے مارا۔ ایک ساتھ بہت سے ریوالور نکل آئے اور خسرو جمشید یا اس کے شوفر نے نشانہ لے کر گولی بھی چلائی جو میرے کان کو چھوتی ہوئی گزر کے دیوار میں پیوست ہو گئی۔

میں نے دونوں ہاتھ پہلے ہی اوپر اٹھا دیے تھے۔ "سوری۔" میں نے کہا۔ "میں تھوڑی سی پریکٹس کر رہا تھا اور کچھ ان دونوں کالے دیو کے بچوں کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ اتنی بڑی باڈی سے کچھ نہیں ہوتا۔ چلو بھئی، کدھر چلنا ہے؟" میں نے ان دونوں سے سرپرستانہ انداز میں کہا جو اب کمر سہلاتے اٹھ رہے تھے اور سخت خفت زدہ اور مشتعل تھے کہ پابندیاں نہ ہوتیں تو وہ متحد ہو کے مجھ پر بھرپور حملہ کرتے۔ "خبردار اب ہاتھ مت لگانا۔" میں نے ان کو وارننگ دی۔ "ورنہ ہاتھ پیر تڑوا بیٹھو گے۔"

وہ دونوں مجھے خون آشام نظروں سے گھورتے ہوئے میرے ساتھ ہو لیے اور دائیں بائیں چلنے لگے لیکن ان میں سے کسی نے مجھ سے چھ انچ کے فاصلے پر آنے کی کوشش نہیں کی۔ چوہدری دلاور زیرِلب مسکرا رہا تھا اور اپنی ایک مونچھ کو عادت کے مطابق مروڑنے میں مصروف تھا۔ ڈی سلوا مجھ سے نظر نہیں ملا رہا تھا اور یوں کھڑا تھا جیسے اس تمام قضیے سے اس کا کوئی تعلق ہی نہیں۔ خسرو جمشید اور اس کے نقشِ ثانی کے چہرے بھی سپاٹ تھے۔ صرف سراج کے ماتھے پر نمودار ہونے والی ایک شکن یہ ظاہر کرتی تھی کہ اس نے میرے ایک ایکٹ کے مزاحیہ ڈرامے کو پسند نہیں کیا لیکن مصلحت کا تقاضا سمجھتے ہوئے مجھے شوٹ بھی نہیں کیا۔ وہ اس قسم کا آدمی تھا جو بات کرتے کرتے ریوالور نکال کے کسی کو بھی گولی مار سکتا تھا اور پھر ریوالور رکھ کے اطمینان سے بات وہیں سے شروع کر سکتا تھا جہاں سے سلسلہ ٹوٹا تھا۔ یوں جیسے درمیان میں کچھ ہوا ہی نہیں۔ ایسا

...ں انگریزی محاورے کے مطابق "انتہائی ٹھنڈے دل ...لا قاتل بیٹھے"، کہنا غلط نہ ہوتا۔ اس میں وہ سب صفات بدرجۂ تمام ...ود تھیں جو اسے خونی شکاریوں کے اس غول میں دوسروں ...ے ممتاز کرتی تھیں اور سرغنہ کے منصب کا اہل ثابت کرتی تھیں۔

دوسرے کمرے میں قدم رکھتے ہی مجھے یوں محسوس ہوا ...یسے چھت میرے سر پر آ گری ہے یا زمین میرے قدموں ...ے نیچے سے غائب ہو گئی ہے اور میں اندھے خلا میں گرتا جا ...رہا ہوں۔ میرے سامنے دو کرسیوں پر فوزیہ اور انکل شیروانی ...بندھے بیٹھے تھے۔ ان کی آواز کو خاموش رکھنے کے لیے لبوں پر ...ٹیپ چپکا دیا گیا تھا۔ جو آوازیں مجھے کبوتر کی غٹرغوں سے مشابہ لگی ...تھیں وہ صرف ناک سے نکلنے والی آوازیں تھیں جن سے شیروانی ...صاحب مجھے متوجہ کرنا چاہتے تھے۔ مجھے معلوم نہیں کہ اس ...وقت اچانک آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑنے اور نتائج کی ...پروا کیے بغیر ان شیطانوں کی رزم گاہ میں کود پڑنے کی بجائے میں ...نے کیسے خود پر قابو پا لیا۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور سر کو جھٹکا ...خود کو یاد دلایا کہ اب صورتِ حال بالکل مختلف ہو گئی ہے جس میں ...میرا غیر سنجیدہ رویہ دوسروں کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتا تھا۔ ...میں نے آگے بڑھ کر میں نے باری باری ان دونوں کے منہ پر سے ...ٹیپ ہٹایا اور وہ رسیاں کھولیں جن سے وہ بندھے ہوئے تھے۔

"یہ شیطان آپ کو بھی اٹھا لائے انکل!" میں نے سخت اذیت اور شرمندگی کے ساتھ کہا۔

شیروانی صاحب نے نفی میں سر ہلایا۔ "ہمیں کوئی اٹھا کے نہیں لایا سکندر!" انہوں نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"پھر... پھر آپ لوگ یہاں کیسے پہنچے؟" میں نے فوزیہ کے ...زرد رنگ کی طرف دیکھا۔ وہ میری طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ ...لیکن اس کی صورت پر احساسِ ذلت، نفرت، برہمی و شرمندگی اور ...اس کے ساتھ میرے لیے ملامت کے جذبات عیاں تھے۔

"شامتِ اعمال ہمیں یہاں لے آئی بیٹے!" شیروانی صاحب نے تلخی سے کہا۔ "ہم اس چکر سے کب تک بچے رہ سکتے تھے۔ میں نے تمہارا ضامن بننے کی غلطی بھی کی تھی۔"

"میں... میں آپ سے کیا کہوں انکل!" میں نے بمشکل ...عالم کہا۔ "یہ کہوں کہ میں بے قصور ہوں؟ میرا یہی قصور کیا کم ہے ...کہ میں اس وزیر خان کا بیٹا ہوں جو آپ کا دوست تھا۔ سزا ...صرف انہی کو برداشت کرنی پڑ رہی ہے جو کسی بھی طرح مجھ سے ...کوئی جذباتی تعلق رکھتے ہیں۔ یہ جو کچھ میرے ساتھ اب ہو ...رہا ہے اس کا علم اگر مجھے پہلے سے ہو جاتا تو میں ابا سے کہتا کہ ...میرا کمرے لیے سب کو چھوڑ دیجیے یا سارے رشتے توڑ دیجیے، مجھے عاق کر کے مجھ سے بھی بے تعلق ہو جائیے۔"

"بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔" شیروانی صاحب نے ہاتھ اٹھا کے رنجیدہ لہجے میں کہا۔ "ہمیں تمہاری طرف سے ایک تار ملا تھا کہ محسن سخت بیمار ہے اور یہ بات ایسی تھی کہ میں... ہم نے محسن کی ماں کو نہیں بتائی۔ میں تو اکیلا ہی آ رہا تھا۔ بھائی کی وجہ سے فوزیہ بھی ساتھ آ گئی۔"

فوزیہ کی صورت کا تاثر میری بات کے بعد کچھ مختلف ہو گیا تھا۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے کلائیوں پر رسی سے پڑ جانے والے نشانات کو مٹانے میں مصروف تھی جو ایک اضطراری اور غیر ارادی حرکت تھی۔ تاہم وہ میری طرف دیکھنا ہی نہیں چاہتی تھی۔

"اسٹیشن پر ہمیں پولیس کی وردی میں ملبوس ایک شخص ملا۔" شیروانی صاحب نے قدرے توقف کر کے کہا۔ "اس نے کہا کہ رضوی صاحب نے ہمیں لے جانے کے لیے گاڑی بھیجی ہے۔ ہمیں شک کیسے ہو سکتا تھا۔"

"اب آئندہ کے لیے میں کیا کہوں۔ یہ کہ آپ تصدیق کیے بغیر یوں نہ آیا کریں۔" میں نے کہا۔ "ظاہر ہے آپ خود محتاط رہیں گے۔ ابھی تو آپ کو یہ بتانا ہے کہ محسن بالکل خیریت سے رضوی صاحب کے گھر پر ہے اور اب ان لوگوں سے پوچھنا ہے کہ ان کے عزائم کیا ہیں؟"

"دیکھو سکندر! میں لمبی بات نہیں کرنا چاہتا۔" شیروانی صاحب نے کہا۔ "حالات کو ہم سب سمجھتے ہیں اور کوئی بھی کسی کے لیے کچھ نہیں کر سکتا مگر ہو سکے تو معاملات کو سمیٹنے کی کوشش کرو، ورنہ خدا پر ہمیں بھی بھروسہ ہے۔ جو ہمارا نوشتۂ تقدیر ہے سامنے آ جائے گا۔ اس سے مفر نہیں، نہ ہمیں نہ تمہیں اور نہ ان کو جو نمرود کی طرح خدا بنے قسمتوں کے فیصلے کرنے لگے ہیں۔" ان کو تسلی دے کر میں پلٹ کر اسی کمرے میں آیا جہاں وہ سب جمع تھے۔

"یس مسٹر سکندر! ملاقات ہوئی اپنے انکل سے جو تمہارے ضامن بھی تھے؟" خسرو جمشید نمبر ون نے کہا۔

"اور سسر بھی ہو سکتے تھے اللہ کی مہربانی سے۔" چوہدری دلاور نے کہا۔ "اگر تم ذرا وہ نہ ہوتے۔ کیا نام اپنے... کوتاہ اندیش۔"

"اپنی بکواس بند کرو اور مجھے بتاؤ ان لوگوں کو یہاں لانے کا کیا مقصد ہے؟" میں نے دھاڑ کر کہا اور اس کمرے کی طرف اشارہ کیا جہاں فوزیہ اور شیروانی صاحب بدستور کرسی پر بیٹھے تھے۔ "کیا چاہتے ہو تم لوگ؟"

"جو ہم چاہتے ہیں۔" سراج نام کے شخص نے سگریٹ کا ایک کش لے کر سوچتے ہوئے کہا۔ "وہ تم جانتے ہو۔"

"میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ غیر متعلقہ لوگوں کو، مفلوج اور بیمار عورتوں کو، بوڑھوں کو اور کمزور لڑکیوں کو اس طرح اٹھا لانے میں کون سی بہادری ہے؟" میں نے چیخ کر کہا۔ "کیا تم میں مردانہ وار مقابلے کا حوصلہ نہیں رہا؟"

"ہم نے کب کہا تھا کہ تم مقابلہ کرو۔" سراج بولا۔ "تمہیں سوچنے سمجھنے اور فیصلہ کرنے کے لیے ایک مہینے کی مہلت بھی دی تھی۔ تم نے اس سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔"

"سراج!" میں نے کہا۔ "تم اس جنگ کو پھیلا رہے ہو۔"

"جنگ کو ختم کرنا تمہارے اختیار میں ہے۔ ہم نے ایک پیشکش کی تھی۔" سراج بولا۔ "تمہارے سامنے بہت سے راستے رکھے تھے مگر تم نے ان میں سے کسی کا انتخاب نہیں کیا۔"

"وقت اب بھی نہیں گزرا ہے لیٹنے سکندر صاحب!" چوہدری دلاور نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ "غور فرماؤ۔"

"ہاں برخوردار! تمہیں غور کرنے کے لیے مزید مہلت دی جا سکتی ہے۔" خسرو جمشید ہمبرسن نے کہا۔

"اور اگر تم سمجھتے ہو کہ ہماری پیشکش میں کوئی کمی تھی۔" سراج نے اپنے معاونین کی تائید میں سر ہلایا۔ "تو تم بتاؤ، کیا چاہتے ہو؟ آدمی کے رویّے میں لچک ہونی چاہیے۔ ہم مل بیٹھ کر معاملات کو خوش اسلوبی سے طے کر سکتے ہیں۔"

"خوش اسلوبی سے؟ اب؟" میں نے نفرت کے سارے زہر کو اُگل کے کہا۔ "جب تم میرے باپ کو بے کسی کی موت مار چکے؟ منشی کو اور سلامت شاہ کو اپنی درندگی کا نشانہ بنا چکے؟ غلام علی کو قتل کر چکے اور لندن کی ایک طوا لف سے لے کر یہاں کرائے پر ملنے والے کتنے ہی بد معاشوں کا خون بہا چکے؟ آج تم رویّے میں لچک کی بات کرتے ہو؟ رابعہ کے گھر کو بم سے اڑا کے، شہلا کے گھر کو آگ لگا کے، نعیم اور گل رُخ کی زندگی تباہ کر کے؟" میں نے آگے بڑھ کر سراج کے منہ پر تھوک دیا۔ "میں تم پر لعنت بھیجتا ہوں، کتو...!"

سراج کا تھپڑ میرے منہ پر پوری قوت سے پڑا۔ "میں تمہاری بات سن رہا ہوں، یہی کافی ہے۔" اس نے اطمینان سے رومال نکال کے اپنا منہ صاف کیا۔ "ورنہ کیا یہاں صرف لاشیں چھوڑ کر جانا میرے لیے ناممکن ہے؟"

"پہلے بہت کچھ ممکن تھا سراج! تم نے شرافت علی کے قتل کا الزام میرے سر منڈھ دیا۔" میں نے تلخی سے مسکرا کے کہا۔ "اور جتنی آسانی سے تم نے وزیر خان کو شکار کیا تھا اتنی ہی آسانی سے مجھے شکار کرنا چاہا تھا لیکن وقت نے تمہیں اچھا سبق دیا ہے کہ شکاری تم ہی نہیں، وہ بھی ہیں جو تہی دست نظر آتے ہیں۔ تم اپنی ساری فرعونیت اور طاقت کے باوجود منشی کے مشن کو ناکام نہیں بنا سکے۔ جان لینا آسان ہے، دینا بہت مشکل ہے مگر اس بوڑھے اور کمزور شخص کو دیکھو جس نے اپنے آپ کو داؤ پر لگایا پھر اپنی بیوی کو۔ سوچو ذرا سراج کہ وہ اندھی بوڑھی عورت تمہارے مقابلے میں کیا تھی مگر منشی نے اس کی زندگی کو بھی داؤ پر لگا دیا اور انہوں نے تمہیں شکست دی۔ موت تو ایک دن سب کو آنی ہے مگر یہ دیکھو کہ کیا تم اس پیغام کو میرے ہاتھوں تک پہنچنے سے روک سکے۔ تم نے سلامت شاہ کے ٹکڑے کر دیے مگر کیا اس سے حقائق پر کوئی پردہ پڑا؟ تم نے ایک گورکن کو زندہ در گور کر دیا لیکن کیا یہ بات ثابت نہیں ہو گئی کہ وزیر خان کی لاش غائب کر دی گئی ہے۔" میں نے ایک نظر ڈپٹی سلوا کی طرف دیکھا جس کا رنگ اڑ گیا تھا۔ "اب سارا زمانہ جانتا ہے کہ وزیر خان کو قتل کیا گیا تھا۔ یہ بھی بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ اسے بے رحمی سے کیسے بلیک میل کیا گیا اور کیوں؟ آج میں اکیلا ہی نہیں جس کو تمہارے مذموم عزائم کا علم ہے۔ تم نے سب بجھ کر کے دیکھ لیا۔ کیا اب بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آیا کہ مارنے والے سے بچانے والا ہاتھ زبردست ہے؟"

"وہ اپنے سکندر صاحب! یہ لیکچر ویکچر چھوڑو۔" چوہدری دلاور نے کہا۔ "یہ کتابی باتیں کتابوں ہی میں اچھی لگتی ہیں۔ کبھی ایسا ہی ہوتا تو... خیر... بات مطلب کی کرو اب کہ معاملہ کیسے ختم ہو سکتا ہے؟"

"یہ تو تمہیں طے کرنا ہے۔ میں نے تو تم سے اپنے حق کے سوا کچھ نہیں مانگا اور میرے حق میں انصاف کا حق بھی شامل ہے۔" میں نے کہا۔

"انصاف کا معیار، اس کے تقاضے، سب حالات کے مطابق بدلتے رہتے ہیں۔" سراج نے سگریٹ کی راکھ جھاڑ کے کہا۔

"ہاں۔ حالات کے پیشِ نظر میں یہ چاہتا ہوں کہ اس بلیک میلر کو قانون کے سپرد کروں جس نے میرے باپ کو کچھ بھی ہونے کے باوجود فقیروں کی طرح کر دیا۔" میں نے کہا۔ "میں اس کے قاتل کو تختۂ دار پر دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"بے شک وزیر خان کے معاملے میں کچھ زیادتی ہوئی۔ افسوسناک حد تک زیادتی ہوئی۔" سراج نے ایک ایک لفظ آہستہ آہستہ ادا کیا۔ بات کرتے وقت وہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا نظر آتا تھا اور اس کی آنکھیں خلا میں دیکھتی تھیں۔ "مگر اس کا ذمے دار میر شرافت علی تھا۔ اسے تم نے مار دیا۔ اگر مصالحت کی بات ہو تو یہ الزام بھی تم پر نہ رہے گا۔"

"مصالحت کا کوئی سوال نہیں۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "نہ میرا کوئی مطالبہ ہے اور نہ میں تمہاری کسی فراخدلانہ پیشکش پر غور کرنے کے لیے مہلت چاہتا ہوں۔ جو قانونی طور پر میرا ہے وہ مجھے ضرور ملے گا۔ انصاف ضرور ہوگا خواہ عدالت کے باہر ہو۔ ظلم کرنے والے کو سزا ضرور ملے گی خواہ قانون نہ دے سکے۔ میرا ایمان دو باتوں پر متزلزل نہیں ہو سکتا۔ ایک یہ کہ موت وقت سے پہلے نہیں آ سکتی اور نوشتۂ تقدیر کو آدمی نہیں بدل سکتا۔"

"تمہیں معلوم ہے اس ضد کا نقصان کسے ہوگا؟" سراج نے کہا۔

"ہاں۔ تم نے ایک بوڑھی عورت کو اٹھا کے ثابت کر دیا ہے کہ میری ضد پر کون کون قربان ہوگا۔" میں نے کہا۔ "اور یہ بھی سمجھا دیا ہے کہ تمہارے ہاتھ کتنے لمبے ہیں۔ تم اسلام آباد سے بھی لوگوں کو اٹھوا سکتے ہو۔"

"اور اس کے باوجود تم سمجھوتے پر راضی نہیں۔" سراج نے کہا۔ "تمہیں یہ منظور ہے کہ شہلا جسے اپنی جان سمجھتی ہے اس کی مسخ شدہ لاش دیکھے؟ اتنا عزیز ہے یہ کاروبار تمہیں؟ اس کی خاطر تم دوسروں کی زندگی کو جہنم بنا سکتے ہو۔ تمہیں معلوم ہے فوزیہ کی ماں کی عمر تمام ہو رہی ہے۔ کیا تمہاری ضد کی وجہ سے اسے بیوگی بھی ملے گی؟"

"تم اس سے زیادہ بھی بہت کچھ کر سکتے ہو۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "تم فوزیہ کو تشدد کا نشانہ بنا سکتے ہو۔ اس کی آبرو سے کھیل سکتے ہو۔ اس کی ماں تو مرنے ہی والی ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ باپ بھی صدمے سے مر جائے گا۔"

سراج نے افسوس سے سر ہلایا۔ "تم حد درجہ احمق اور خود سر ہو۔ ان سب لوگوں کی زندگی کی قیمت تمہارے نزدیک اس چھوٹے سے کارخانے سے زیادہ نہیں۔"

"بات کارخانے کی نہیں۔ اگر میرا باپ بیس فیکٹریاں بھی چھوڑ گیا ہوتا تو مجھے فرق نہ پڑتا۔" میں نے کہا۔ "آج بھی میں اس جائداد سے دستبرداری قبول کر سکتا ہوں لیکن اس سے پہلے مجرم میرے حوالے کیا جائے جو عدالت کے روبرو اعتراف کرے کہ اس نے کس طرح میرے باپ کو لوٹا، قتل کیا اور اس کی لاش کو بے حرمت کیا۔ جو اس کے بعد ہونے والے ہر قتل کا الزام قبول کرے اور سب قاتلوں کی نشاندہی کرے۔ تم نے سمجھنے میں غلطی کی۔ میں ایم ڈبلیو ڈی کمپلیکس کی ملکیت یا اپنے باپ کے حصّے کی دولت نہیں مانگتا، میں انصاف مانگتا ہوں۔ یہ انصاف میرا حق ہے۔ مجھے میرا حق مل جائے تو میں دنیا کی ساری دولت ٹھکرا سکتا ہوں لیکن اس حق سے دستبرداری کسی قیمت پر قبول نہیں کر سکتا۔ یہ کاروبار نہیں، اصولوں کا معاملہ ہے جس پر سودا نہیں ہوتا۔ اصولوں کی خاطر مجھ سے پہلے بھی بہت سے لوگوں نے سختیاں جھیلی ہیں اور قربانیاں دی ہیں اور آئندہ بھی دیتے رہیں گے۔ ایسا نہ ہو تو یہ انسانی معاشرہ درندوں کا جنگل بن جائے۔"

"ویری گڈ۔ تم خاصے اچھے ڈائلاگ بول لیتے ہو مگر اس وقت تم اسٹیج پر نہیں ہو۔" سراج نے کہا۔ "میں جلدی میں کوئی کام نہیں کرتا۔ فوزیہ کو اور شیروانی صاحب کو صبح باعزت طور پر واپس پہنچا دیا جائے گا۔ بخیر و عافیت اور زندہ سلامت پھر کبھی ضرورت محسوس ہوگی تو بُلا لیں گے۔ ابھی تو صبح تمہارے ساتھ صرف شہلا کی ماں کی لاش واپس کی جائے گی۔ اس کے بعد تمہاری قوتِ مزاحمت کا اندازہ کیا جائے گا۔ تم اَڑے رہے تو ہم تمہیں کوئی چھوٹا سا تحفہ بھیجیں گے۔ مثلاً تمہاری منگیتر اور شریکِ حیات بننے والی فوزیہ کی ایک چھوٹی انگلی۔ اگر تم مان گئے تو زیادہ گھاٹے میں نہیں رہو گے۔ نو انگلیوں کے ساتھ بھی فوزیہ جیسی بیوی بری نہیں۔ اس سے اگلے مرحلے میں تمہیں اس کا ایک ہاتھ ارسال کیا جا سکتا ہے۔ ایک ہاتھ کے بغیر وہ زندہ تو رہ سکے گی اور تمہاری محبت میں بھی شاید فرق نہ پڑے لیکن دونوں ہاتھوں سے محرومی کے بعد...!"

"کتے!" میں نے سراج پر حملہ کرنے کی کوشش کی مگر وہ دونوں کالے بھوت مجھ سے چمٹ گئے۔ "اس کے بعد؟ پھر تو فوزیہ کے باقی ٹکڑے ارسال کرے گا مجھے؟ اور تیرا کیا خیال ہے میں صرف آنسو بہاتا رہوں گا۔ میں تم سب کو چن چن کے قتل کر دوں گا۔ چوہدری دلاور! بدمعاش! تیری بھی تو ایک فیملی ہے۔ تم سب کی بھی کوئی نہ کوئی فوزیہ ضرور ہوگی۔ تمہارے بھی رشتے ہوں گے۔ ماں کے اور بہن کے اور بیٹی کے، جن کی تقدیس میں انسانیت کی عظمت ہے لیکن تم نے مجھے انسان سے شیطان بنا دیا تو کیا میں ان رشتوں کا احترام کروں گا؟ ان سب کو معاف کر دوں گا؟ میں تمہارے بوڑھے اور بیمار والدین کو، تمہاری بہنوں کو اور ان کے بچوں کو، تمہارے بچوں کو، بھائیوں کو اور سب کو اسی طرح اٹھاؤں گا۔ تم کس کس کے ساتھ رہو گے اور کہاں کہاں ان کی حفاظت کرو گے؟ ان کا حشر بھی مختلف نہیں ہوگا۔ یا تو تم مجھے قتل کر دو ورنہ میں قسم کھاتا ہوں کہ جو کچھ میرے ساتھ ہوگا اس سے بدتر تمہارے ساتھ ہوگا۔" چلّاتے چلّاتے میرا گلا بیٹھ گیا۔ وہ اسی طرح پُرسکون اور بہرے بنے کھڑے رہے جیسے میری آواز ان کے کانوں تک پہنچ ہی نہیں رہی ہے۔

"تم مجھے میر شرافت علی کا قاتل سمجھتے ہو۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ قاتل تم میں سے ایک ہے۔" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔

"اب تم میرے والد کے ساتھ ہونے والے ظلم کا ذمّے دار بھی اسے قرار دیتے ہو۔ صرف اس لیے کہ وہ تمہارے الزام کی تردید کے لیے نہیں آ سکتا۔ پھر مجھ سے کیوں توقع رکھتے ہو کہ میں اس کو سچ تسلیم کروں۔ میرا خیال ہے شرافت علی کا جرم بھی وہی ہوگا جو میرے والد کا تھا۔ اس نے تمہارے مذموم کاروبار میں رخنہ اندازی کی ہوگی چنانچہ تم نے ایک تیر سے دو شکار کیے۔ تم نے اسے مار دیا اور مجھے اس کا قاتل بنا دیا تاکہ تم مجھے انتخاب کا حق دے سکو میں اپنی زندگی یا حقِ وراثت میں سے ایک چیز سے محرومی قبول کرلوں۔ تم نے صفائی کے واحد گواہ کو بھی زندہ نہیں رہنے دیا مگر تم نے بچانے والے ہاتھ کا کرشمہ دیکھا؟ تمہارے دونوں چشم دید گواہ بھی نہیں رہے۔ انہوں نے ایک دوسرے کو ختم کر دیا۔"

"ان کے قتل کا الزام بھی تم پر ہی ہے مسٹر سکندر!" سراج نے کہا۔ "اور حالات و واقعات کی شہادت پھر تمہارے خلاف ہے۔ تمہیں پھانسی ہو جائے گی۔"

"ہونے دو۔ اس سے تمہیں وہ کاروبار نہیں ملے گا۔ تمہارے مقاصد پورے نہیں ہوں گے اور وہ سب جو صفِ مجرماں میں شامل ہیں اپنی سزا سے نہیں بچ سکیں گے۔" میں نے کہا۔ "میں عاقبت کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ انہیں یہیں اسی دنیا کے نظامِ انصاف کے مطابق سزا ملے گی۔ ایک سزا تو وہ اس وقت بھی کاٹ رہے ہیں۔ وہ خود اپنی نظر میں مجرم ہیں اور اس احساس سے نجات ان کے اختیار میں نہیں۔ تم جو چاہو کرو۔"

"دیکھو سکندر!" سراج نے نسبتاً دوستانہ لہجے میں کہا۔ "میں بہادر اور ذہین دشمن کو بزدل اور بے وقوف دوست سے بہتر سمجھتا ہوں۔ میں اصول پرستی وغیرہ کو غلط نہیں کہتا مگر یہ دنیا کتابی نظریات پر نہیں چل رہی ہے۔ سب ایمانداری سے رزقِ حلال نہیں کما رہے ہیں، سچ نہیں بول رہے ہیں اور اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے مذہب، اخلاق یا قانون کے اصولوں کے مطابق زندگی بسر نہیں کر رہے ہیں۔ آنکھیں کھول کر دنیا کو دیکھو کہ اقدار کی وقعت زیادہ ہے یا دولت کے انبار کی؟ فائدے میں کون ہے اور نقصان میں کون؟ مثالی انسان صرف مثالی معاشرے میں اور مثالی دنیا میں زندہ رہ سکتا ہے جس کا تصور کتابوں میں تو ہے مگر عملاً یہ دنیا اس سے بہت دور ہے اور دور ہوتی جا رہی ہے۔ یہ وقت کا دھارا ہے۔ یہ مت سوچو کہ اسے کس سمت میں بہنا چاہیے۔ یہ دیکھو کہ کس سمت میں بہہ رہا ہے اور اس حقیقت کو قبول کر لو۔ اس کا رخ بدلنے کی کوشش دیوانگی کہلاتی ہے۔ تم پر واضح کر دیا گیا تھا کہ 'میرفنیر اینڈ کمپنی' کی گڈ ول سے ہم دیگر فوائد بھی حاصل کر رہے ہیں اور اسی لیے تمہارے سامنے دو متبادل راستے رکھے گئے تھے۔ یکمشت رقم سے مکمل علیحدگی یا ہم سب کے برابر کمیشن کی بنیاد پر لندن میں ہماری نمائندگی۔ مگر تم حقِ ملکیت پر مصر رہے۔ تمہارے کہنے سے ہم اپنا کاروبار ختم کر کے صرف 'ایم ڈبلیو ڈی کمپلکس' کی مصنوعات فروخت کرنے پر قناعت نہیں کر سکتے۔" اس نے ایک منظر دوسروں کی طرف دیکھا جو اس طرح کھڑے تھے جیسے وہ جنرل ہیں اور ان کا سپریم کمانڈر، دشمن فوج کے کمانڈر سے فیصلہ کن مذاکرات کر رہا ہے۔ "مزید نقصانات سے بچنے کے لیے" سراج نے پھر کہنا شروع کیا۔ "اور مفادِ باہمی کی خاطر... ہم نے یہ طے کیا ہے کہ تمہاری بات مان لی جائے یعنی تمہیں ایک مالک تسلیم کر لیا جائے۔ اس کے علاوہ جو سالانہ منافع اب تک تمہارا حق بنتا ہے وہ بھی تمہیں ادا کر دیا جائے۔ علاوہ دیگر چھوٹے موٹے نقصانات کے۔ مثلاً تمہارے والد مرحوم کی جائداد، کوٹھی کار وغیرہ، اس کے عوض بھی تلافی کے طور پر مناسب معاوضہ ادا کر دیا جائے۔"

"تھینک یو ویری مچ۔ آپ لوگ واقعی بہت فراخدل ہیں۔" میں نے طنز آمیز تلخی سے کہا۔ "لیکن میں یہ رشوت اور خیرات آپ کو بخشتا ہوں۔ آپ سب نے مل کر جتنا مالِ حرام کھایا، جتنی بے ایمانی کی، ناجائز ذرائع سے جتنی دولت کمائی، وہ سب جو میرے والد کو ملنا تھا اور نہیں ملا۔ وہ سب جو اُن کے پاس تھا اور نہیں رہا، میں یہ سب کچھ چھوڑتا ہوں۔ باقی رہے آپ لوگوں کے جرائم اور نامۂ اعمال کے گناہ، ان سب کا حساب میں یومِ حساب پر چھوڑتا ہوں۔ میں اس بات سے بھی اتفاق کرتا ہوں کہ آدمی کو حقیقت پسند ہونا چاہیے۔ میں اکیلا اس ساری دنیا کی خرابیوں کو ٹھیک نہیں کر سکتا اور محض میرے چاہنے سے دنیا ایک تصوراتی جنت نہیں بن سکتی۔ جرائم کا وجود ہر دور میں رہا ہے مگر یہ زمانہ تیز رفتاری کا ہے چنانچہ جرائم کی رفتار میں بھی اسی تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے تو حیرت کی کوئی بات نہیں۔ مافیا جیسی اسمگلروں کی بین الاقوامی تنظیم امریکی صدر کو قتل کرا سکتی ہے تو میں کیا ہوں۔ میں تو اپنے پڑوسی کے اعمال کو کیا خود اپنے اعمال کو درست رکھنے پر قادر نہیں۔ چنانچہ میں ایم ڈبلیو ڈی کمپلکس اور اس کی آڑ میں ہونے والا ناجائز اور جائز ہر قسم کا کاروبار کلی طور پر تمہارے حوالے کرتا ہوں۔"

انہوں نے پُر امید نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا مگر میں نے ایک ڈرامائی وقفہ دیا تھا۔

"لیکن..." میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ "آپ لوگوں کی ہر بات ماننے اور ہر مطالبہ منظور کر لینے کے بعد مجھے بھی یہ حق پہنچتا ہے حضرات کہ آپ لوگوں سے کچھ مانگ سکوں۔ آپ

سب با اختیار، با اثر اور بادشاہ لوگ ہیں۔" میں خاموش ہو گیا۔

"یس۔" سراج نے میری خاموشی سے اعصابی کشیدگی میں مبتلا ہو کے کہا۔ "کیا مطالبات ہیں تمہارے؟"

"میرا ایک مطالبہ تو یہ ہے کہ فوزیہ اور شیروانی صاحب کو اسی وقت رضوی صاحب کے گھر پہنچا دیا جائے۔" میں نے کہا۔

سراج نے ایک سیاہ فام کی طرف دیکھا اور اسے سر کی جنبش سے اشارہ کیا۔ کچھ دیر بعد ایک کار ان دونوں کو لے کر روانہ ہو گئی۔

"میرے باقی مطالبات بہت سیدھے سادے ہیں،" میں نے کہا۔ "اور اب جمع کا صیغہ استعمال کرنا بھی غلط ہے میرا تو صرف ایک مطالبہ ہے۔ مجھے اپنا باپ وزیر خان چاہیے۔ زندہ، سلامت، صحت مند اور خوشحال۔ بالکل اسی حالت میں جیسے میں نے اس کو لندن جاتے وقت دیکھا تھا، دیٹس آل۔"

اس اینٹی کلائمکس سے ان سب کے چہرے اتر گئے۔ سراج نے آدھی سے زیادہ سگریٹ کو زمین پر ڈال کے جوتے کی ایڑی سے رگڑ دیا۔ اس کا چہرہ غصّے سے سرخ ہونے لگا تھا۔ "میرا خیال تھا تم کوئی معقولیت کی بات کرو گے..."

"یہ اپنے سکندر صاحب بڑے مسخرے ہیں جی۔" چوہدری دلاور نے مسخر آمیز طنز سے کہا۔

"بلڈی ڈسٹی جوکر۔" سراج نے دانت پیس کر کہا۔ "تم ایسے نہیں مانو گے۔"

"ہاں۔ جب تک میرا یہ ایک مطالبہ پورا نہیں ہوگا میں کسی کی کوئی بات نہیں مانوں گا۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "تم نے مجھے بتا دیا ہے کہ اب تم کیا کرو گے۔ میرا پروگرام بھی سن لو۔ ابھی تک میں اکیلا تھا۔ میرا ایک دوست ضرور تھا محسن مگر وہ اس جنگ میں ایک فریق نہیں تھا۔ تمہارے عزائم کی نوعیت واضح ہو جانے کے بعد میں نے بھی طے کر لیا ہے کہ اب ہم شریف آدمی نہیں رہیں گے۔ شرافت کی سند کو ہم پھاڑ کر نہیں پھینکیں گے۔ فی الحال طاقِ نسیاں پر رکھ دیں گے اور پھر تمہاری طرح بدمعاشی کے دعوے کے ساتھ ایک گروہ بنائیں گے۔ سب کھیل پیسے کا ہے یا ہمت کا ہے اور ہمارے پاس گزارے کے لیے دونوں چیزیں ہیں۔ ہم کرائے کے بدمعاش بھرتی کریں گے یا ان کی خدمات حاصل کریں گے۔ اب تک ہم نے تم سے بہت کچھ سیکھ لیا ہے، وہ سب ہمارے کام آئے گا۔ پھر ہم بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دے سکیں گے۔ سارا مسئلہ تو ہماری شرافت بنی ہوئی تھی۔ ایک بار ہم نے اس کو طلاق دے دی تو ہمارے لیے کوئی کام مشکل نہیں رہے گا۔ ہم بھی جس کو اٹھانا چاہیں گے، اٹھوا لیں گے۔ تم سب بھی تو بن ماں باپ کے پیدا نہیں ہوئے ہو۔ تمہارے بھی خاندان ہیں اور دوست احباب ہیں اور ان سب کے بیوی بچے ہیں۔ میرا دنیا میں کون ہے؟ رابعہ کا کون ہے؟ محسن کی بھی ایک ہی بہن ہے۔ ماں کو شمار ہی مت کرو۔ باپ کی زندگی بھی اچھی گزر گئی اور اس نے بیٹی کو مار کے خودکشی کر لی تو محسن بھی اکیلا رہ جائے گا۔ اب تم بھی اپنے اردگرد نظر ڈال لو، نفع نقصان کا حساب لگا لو۔ شرافت، مروت، انسانیت کو بالائے طاق رکھنے کے بعد ہمیں بے ضمیر شیطان بننے پر مجبور کیا گیا تو..." وہ سب بڑے انہماک سے چہروں پر مسخر اڑانے والی مسکراہٹ سجائے، اپنی طاقت کے غرور میں بدمست، ایک بے رحم اندازِ بے نیازی کے ساتھ میرے بلند بانگ دعوؤں کو سن رہے تھے جو اُن کے نزدیک فضول بکواس سے زیادہ نہ تھی۔ میری حکمتِ عملی حالات کے مطابق کارگر ہو رہی تھی۔ عین اس وقت جب وہ میرا ادھورا جملہ مکمل ہونے کے انتظار میں تھے، میں نے ایک جست لگائی اور سراج کو یوں دبوچ لیا کہ ان میں سے کوئی حرکت بھی نہ کر سکا۔ ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت میں سراج اس طرح میرے سامنے آ گیا کہ میرے بائیں ہاتھ نے اس کی گردن کو بازو کے شکنجے میں جکڑ لیا تھا۔ میرا ہاتھ سامنے سے گھوم کر سراج کے دائیں شانے کو گرفت میں لے چکا تھا اور اپنے سیدھے ہاتھ سے میں نے سراج کے سیدھے ہاتھ کو اس طرح موڑ لیا تھا کہ اگر وہ ذرا بھی حرکت کرتا یا خود کو چھڑانے کی جدوجہد کرتا تو اس کی گردن یا کلائی ضرور ٹوٹ جاتی۔ میں اب دیوار سے لگا ہوا تھا اور سراج میرے سامنے ڈھال بن گیا تھا۔ میری گرفت اتنی سخت تھی کہ سراج کا سانس رکنے لگا تھا۔ وہ تھوڑا سا تڑپا اور اس کی کلائی کی ہڈی کے ٹوٹنے کی آواز آئی۔ کمرے میں موجود دیگر افراد اپنے اپنے ریوالور ہاتھ میں لیے بے حس و حرکت کھڑے رہے۔ سراج بلبلایا۔

"تم میں سے جو سراج کو گولی مارنا چاہے، مار سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر کسی کو انتقام لینے کا موقع آج تک نہیں ملا تھا تو فائدہ اٹھا لے۔ ابھی سراج زندہ ہے۔ صرف ایک ہاتھ سے معذور ہوا ہے جس سے یہ گولی چلاتا تھا۔ ٹھیک ایک منٹ بعد میں کہنی کے پاس سے بھی ہاتھ توڑ دوں گا۔" پھر میں نے سراج کی ایک ٹانگ کو اپنی ایک ٹانگ میں پھنسا لیا۔ "ابھی کچھ دیر پہلے مسٹر سراج نے ایک پروگرام کا خاکہ پیش کیا تھا کہ وہ کس طرح فوزیہ کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ارسال کر سکتے ہیں۔ میں آج کا کام کل پر نہیں چھوڑتا۔" میں نے سراج کے بازو کو بل دیا۔ کہنی کے پاس سے اس کا جوڑ چٹخ گیا۔

اور اس نے ایک کراہ بلند کی۔
"یہ... اپنے سکندر صاحب! تم نے اسی وقت مرنے کا فیصلہ کرلیا ہے شاید۔" چوہدری دلاور نے کہا۔
"مجھے کب مرنا ہے، اس کا فیصلہ تو وہ کرچکا ہے جس نے مجھے زندگی دی تھی۔" میں نے کہا۔ "ہوسکتا ہے کہ سراج کا آخری وقت آگیا ہو۔ اور تقدیر کی ستم ظریفی دیکھو، اس کو مارنے والا ابھی تم میں سے کوئی ایک ہوگا جو اس کے اطاعت گزار، پارٹنرز، ہمراز یا چمچے تھے۔ گولی اگر سراج کے جسم سے گزر کر میرا کام بھی تمام کرگئی تو مجھے افسوس نہیں ہوگا کیونکہ مجھے ملنے والے دشمن ہی ہوں گے۔ سراج نے کبھی سوچا تک نہ ہوگا کہ تم میں سے کوئی اس کا قاتل بنے گا ورنہ وہ بہت پہلے مقتول ہوجاتا۔"
"تمہیں معلوم ہے سراج صاحب کون ہیں؟" خسرو جمشید نمبر دو نے کہا۔
"ہاں۔ اچھے بھلے صحیح سالم آدمی تھے ابھی چند منٹ پہلے اور خاصے اونچے اڑ رہے تھے۔" میں نے کہا۔ "اب ایک ہاتھ سے معذور اور زندگی سے مایوس، بے بس آدمی ہیں۔" میں نے سراج کا ٹوٹتا ہوا بازو چھوڑ دیا اور اس کی پتلون کی جیب میں سے ریوالور نکال لیا۔ "میں چاہوں تو ان کے شیطانی دماغ کا سارا مواد ایک سوراخ سے خارج بھی کرسکتا ہوں مگر میں انہی کی زبان میں تمہیں سمجھاؤں گا کہ ایک ہاتھ سے معذور ہوجانے کے باوجود ابھی نقصان زیادہ نہیں ہوا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ نو انگلیاں ہونے کے باوجود فوزیہ بری بیوی نہیں... تو سراج بھی ہاتھ ٹوٹنے کے باوجود برا سرغنہ نہیں۔ دو چار ماہ میں ٹوٹی ہوئی ہڈیاں جڑ سکتی ہیں۔ ہاتھ پھر ٹھیک ہوسکتا ہے۔ میں تمہیں مزید دو منٹ دوں گا۔ اس کے بعد سراج کا دوسرا بازو بھی پہلے بازو کی طرح ہوجائے گا۔ یہ خالی ہاتھوں سے بہت کچھ کرنے کا فن ہے۔ میں نے کوئی بلیک بیلٹ وغیرہ تو نہیں لی مگر کوشش کرتا تو لے سکتا تھا۔ چنانچہ میں نہایت فنکارانہ طریقے پر اس کی ٹانگ کو بل دوں گا۔ اس کے بعد یہ صرف ایک ٹانگ پر کھڑا رہ سکے گا۔ تاہم جیسا کہ سراج نے کہا تھا کہ ایک ہاتھ نہ ہونے سے بھی فوزیہ کے ساتھ میری زندگی گزر سکتی ہے۔ ایسے ہی میں کہتا ہوں کہ ٹوٹے ہوئے ہاتھوں اور پیروں کی مرمت کے بعد سراج زندہ رہ سکتا ہے اور سال چھ ماہ میں ویسا ہی ہوسکتا ہے جیسا کچھ دیر پہلے تھا۔"
"سکندر اعظم کی اولاد!" خسرو جمشید نمبر دو نے کہا۔ "سراج ایک اعلیٰ پولیس افسر ہے۔"
"اوہ۔" میں نے سخت تعجب کا اظہار کیا پھر یکلخت میرے ذہن کے نہاں خانوں میں یاد کی ایک کرن روشن ہوئی۔ اپنی گرفتاری کی پہلی رات میر محمد نے کسی اے ایس پی کا حوالہ دیا تھا۔ میں نے مندری والے کو تھانے میں آتے جاتے دیکھا تھا لیکن میر محمد نے صاف انکار کردیا تھا۔ ایک بار اس نے کہا تھا "کیا تو ڈی ایس پی صاحب کو کہہ دے گا کہ یہ اصل قاتل ہے۔" مگر بعد میں اس نے مجھے صاف بتادیا تھا کہ اے ایس پی کا کیا حکم ہے۔ ملزم جب تک قتل کا اعتراف نہ کرے اور تحریری بیان نہ دے، پوچھ گچھ جاری رکھی جائے۔ پہلی بار شاید اس نے روانی میں صحیح عہدہ بتادیا تھا۔ بعد میں اس کو غلطی کا احساس ہوا تو اس نے اے ایس پی کہا۔
"سراج صاحب ڈی ایس پی ہیں نا؟" میں نے کہا "تمہارا کیا خیال ہے، مجھے معلوم نہیں تھا۔"
"ان کو کچھ ہوا... تو پولیس کا سارا محکمہ حرکت میں آجائے گا۔" خسرو جمشید نمبر ون نے کہا۔ "اور وہ سب ہوگا جو اب تک نہیں ہوا تھا۔"
"ہاں۔ مثلاً ایک جگہ خالی ہوجائے گی۔" میں نے کہا "اور کسی تھانیدار کو سفارش کی بنیاد پر ڈی ایس پی کے عہدے پر ترقی مل جائے گی یا کوئی اے ایس پی سنیارٹی پر ڈی ایس پی ہوجائے گا۔"
مندری والے کے ساتھ اب ایک کالا بھوت کھڑا رہ گیا تھا۔ دوسرا جو فوزیہ اور شیروانی صاحب کو لے کر گیا تھا، ایک گھنٹے سے پہلے لوٹ کر نہیں آسکتا تھا۔ ان کی طرف سے میں بہت مطمئن تھا۔ وہ سراج کی اجازت یا حکم پر بھیجے گئے تھے اور انہیں لے جانے والے کی مجال نہ تھی کہ اپنے طور پر کوئی شرارت کرے۔ میرا خیال تھا کہ ڈرائیور انہیں کوٹھی سے کچھ فاصلے پر اتار کے لوٹ آئے گا۔ کوٹھی میں پہنچتے ہی وہ دونوں رضوی صاحب اور محسن کو ساری بات بتادیں گے سوائے ایک بات کے۔ وہ اس جگہ کے متعلق کچھ نہ بتاسکیں گے جہاں دشمنوں نے مجھے گھیر رکھا تھا۔ البتہ یہ امید کی جاسکتی تھی کہ خالی گھر اور کرول کے نقشے سے وہ صحیح نتیجہ اخذ کریں اور دس فیصد امکانات کی روشنی میں پولیس فورس لے کر یہاں آجائیں مگر اس سب کارروائی میں دو گھنٹے صرف ہونے لازمی تھے۔ میں نے اچانک سراج کا دوسرا ہاتھ موڑا اور کہنی کے پاس سے توڑ دیا۔
سراج کے سرغنہ ہونے کے اسباب بھی واضح ہوچکے تھے۔ وہ پولیس میں ڈی ایس پی تھا اور اپنے اختیارات اور وسائل سے سب کو بچاتا تھا اور ہر قسم کی مدد فراہم کرتا تھا۔ شاید اسی کی معرفت بدمعاشوں کی خدمات حاصل ہوتی تھیں۔ پولیس

ہر جگہ علاقے کے اور شہر کے سب بدمعاشوں کے پتے ٹھکانے اور کاروبار جانتی ہے اور اخبارات اور رائے عامہ کے مطابق ان کی سرپرستی کے فرائض بھی پورے کرتی ہے۔ اگر کوئی اور ہوتا تو دلاور یقیناً اسے اور مجھے گولی مار دیتا اور خود گروہ کی کمان سنبھال لیتا مگر ڈی ایس پی سراج کو قتل کرنا آسان نہیں تھا اور اس کا نعم البدل ملنا بھی مشکل تھا۔ سب ڈی ایس پی بدمعاشوں کے گروہوں کے سرغنہ نہیں ہوتے۔ بقول شاعر بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا۔ چنانچہ وہ سب بے بس اور متذبذب کھڑے تھے۔
"اب صرف ایک منٹ باقی ہے۔" میں نے کہا۔ "اس کے بعد ڈی ایس پی صاحب کی ٹانگ بھی گئی۔ ہاتھ تو عموماً ٹھیک ہوجاتے ہیں لیکن ٹوٹی ہوئی ٹانگ میں سوت بھر فرق بھی رہ جائے تو اچھا بھلا پولیس افسر لگڑ بگڑ کی طرح چلتا ہے۔ تم سب لوگ اپنے اپنے ریوالور اس گوشے میں پھینک سکتے ہو، جہاں میں کھڑا ہوں۔"
انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر چوہدری دلاور نے سیکنڈ ان کمانڈ کی حیثیت سے ہتھیار ڈال دینے کی رسمی کارروائی کا آغاز کیا۔ یکے بعد دیگرے چھ ریوالور چپس کے فرش پر بڑی آواز کے ساتھ گرے اور پھسلتے ہوئے دیوار تک آئے۔ میں نے ایک سیکنڈ کے لیے بھی اپنی نظر ان سب پر سے نہیں ہٹائی۔ وہ بہت ہشیار لوگ تھے اور ان کے پاس دوسرے ریوالور کی موجودگی عین ممکن تھی۔ اگر میرے ساتھ کوئی اور ہوتا تو میں تلاشی کا فرض اسے سونپتا اور خود سراج کو یرغمال بنائے ریوالور لیے کھڑا رہتا مگر اس وقت میرے ذہن میں صرف ایک ہی ترکیب آئی تھی۔ اگر میں ان سے کہتا کہ دوسرے کمرے میں چلے جائیں اور پھر باہر سے کنڈی لگا دیتا تو ان کے فرار ہونے کی کوشش کرتا تو یہ ہوسکتا تھا کہ وہ دوسرے کمرے کے دوسرے دروازے سے نکل آتے یا کھڑکی میں سے مجھے نشانہ بنالیتے۔ باتھ روم محفوظ جگہ ہوسکتی تھی مگر مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس نوتعمیر کوٹھی میں باتھ روم کہاں ہیں۔ ان کے روشن دان چھوٹے ہیں یا اتنے بڑے کہ آدمی گزر جائے۔ اور دروازے باہر سے بند ہوسکتے ہیں یا نہیں۔ چنانچہ میں نے پیچھے ہٹتے ہوئے سب ریوالور کونے میں ڈھیر کرلئے۔ اس وقت تک سراج کی حالت غیر ہوچکی تھی۔ وہ درد سے تڑپ رہا تھا مگر میرے بازو کے شکنجے میں کسا ہوا سانس لینے کی کوشش میں بری طرح ہانپ رہا تھا تاہم آدمی سخت جان تھا کہ ابھی تک بے ہوش بھی نہیں ہوا تھا اور ہڈیاں ٹوٹ جانے کے باوجود بے بس بھی نہیں رہا تھا۔ اس نے مجھ سے رحم کی بھیک بھی نہیں مانگی تھی۔ میری منت سماجت بھی نہیں کی تھی اور مشتعل ہوکے اپنے معاونوں کو گالیاں بھی نہیں دی تھیں کہ وہ بزدلوں کی طرح خاموش تماشائی بنے ہوئے ہیں اور کٹھ پتلیوں کی طرح میرے اشاروں پر چل رہے ہیں۔ وہ اپنی اور ان کی مجبوریوں کو سمجھتا تھا۔
"اب کیا چاہتے ہو تم، اپنے سکندر صاحب!" چوہدری دلاور نے پرسکون رہنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "ہم باہر چلے جائیں، دفع ہوجائیں یہاں سے، تم ڈی ایس پی صاحب کی جان تو چھوڑ دو۔"
"دفع ہوجائیں اور ہر طرف سے عمارت کو گھیر لیں؟" میں نے قہقہہ لگایا۔ "چوہدری! جب تک یہ شکار میرے قبضے میں ہے، تم مجھے شکار نہیں کرسکتے۔ میں جانتا ہوں تم بہت بڑے شکاری ہو لیکن یہی بات اب تک تم کو میرے متعلق معلوم ہوچکی ہوگی۔ اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم میں سے کسی کے پاس اندر کی کسی جیب میں کوئی دوسرا ریوالور نہیں ہے؟"
"آخر یہ ضمانت کیسے فراہم کی جائے؟" خسرو جمشید نمبر ایک نے کہا۔
"ہم اپنی اپنی تلاشی دینے کے لیے تیار ہیں۔" اس کے ہمزاد نے کہا۔
"لیکن میں تو تلاشی لے نہیں سکتا۔" میں نے کہا۔
"تو ہم تمہارے سامنے ایک دوسرے کی تلاشی لیتے ہیں۔" خسرو جمشید نمبر دو نے تجویز پیش کی۔
"اس جامہ تلاشی پر اعتماد کرکے میں اپنے بے وقوف ہونے کا ثبوت دینا نہیں چاہتا۔" میں نے کہا۔ "اس لیے اب میں حکم دیتا ہوں کہ آپ لوگ اسلحے کی طرح اپنے اپنے کپڑے اتار کے ادھر ہی پھینک دیں۔ ذرا احتیاط سے۔"
"تمہارا... تمہارا مطلب ہے ہم سب کپڑے... اتار دیں؟" چوہدری دلاور نے بے یقینی سے کہا۔
"ہاں۔ یہاں ایک حمام میں سب ننگے ہیں۔ یہ محاورہ اگر عملاً درست ہوجائے تو کیا ہرج ہے۔" میں نے کہا۔
"یہ... یہ ناممکن ہے... اپنے سکندر صاحب! تم حد سے بڑھتے جارہے ہو۔" چوہدری دلاور کا رنگ سرخ پڑگیا۔
"کیا ممکن ہے اور کیا ممکن نہیں ہے، اس کا فیصلہ تو وقت کرے گا۔ اپنے چوہدری صاحب!" میں نے کہا۔ "میں دو منٹ کی مہلت دوں گا، اس کے بعد تمہارے ہیڈ کی ٹانگ گھٹنے کے پاس سے دو نیم ہوجائے گی۔"
یہ ان کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ پانسہ اتنی جلدی پلٹ جائے گا اور انکی اتنی بڑی فتح اتنی تذلیل آمیز شکست

میں تبدیل ہو جائے گی۔ بے عزتی، ندامت، اشتعال اور بے بسی کے ملے جلے جذبات نے ان سب کو ایک دوسرے کی نظر میں اور خود اپنی نظر میں رسوا کر دیا تھا۔ سوائے ڈی سلوا کے وہ سب ایک جیسے جذباتی ردِ عمل کا شکار تھے۔ صرف ڈی سلوا تھا جو خاموش رہا تھا اور جس نے خلافِ معمول اپنا جارحانہ انداز برقرار نہیں رکھا تھا۔ اس کی وجہ صرف میں جانتا تھا۔ وہ خود کو پٹے ہوئے مہرے کی طرح محسوس کر رہا تھا اور اگرچہ وہ صورت سے اس خوف کا اظہار نہیں ہونے دے رہا تھا لیکن یہ ناممکن تھا کہ وہ خوف زدہ نہ ہو۔ اس نے میرے سامنے بہت کچھ قبول دیا تھا۔ چنانچہ ہر لحظہ اسے یہ ڈر تھا کہ کہیں میں اس کے الفاظ دہرا کر اسے رسوا نہ کروں۔ اگر اس کے ساتھیوں کو اس کی غداری کا علم ہو جاتا تو وہ اس کو یقیناً مار ڈالتے۔ ڈی سلوا نے پہلے میرے رویّے کا مشاہدہ کیا تھا اور پھر شاید یہ سمجھ لیا تھا کہ میں اس کا راز ابھی افشا نہیں کروں گا بلکہ بعد میں اسے بلیک میل کرنے کے لیے استعمال کروں گا۔

ہتھیار ڈالنے میں چوہدری دلاور نے پہل کی تھی، کپڑے اتارنے میں ڈی سلوا نے۔

"ڈیم اٹ مین" اس نے غصے میں پتلون کے اندر سے قمیص نکالی اور اتار کے گولہ سا بنا کر میری طرف پھینک دی۔ اس کے بعد دوسروں کے لیے بھی تقلید کے سوا چارہ نہ رہا۔ سب سے زیادہ مضحکہ خیز وہ دونوں نظر آ رہے تھے جنہوں نے اپنے چہروں پر سیاہی ملی تھی۔ ان کے جسم کا رنگ ہاتھوں سے بھی زیادہ صاف تھا، چنانچہ کالے سر اور منہ کے ساتھ جسم کا صاف رنگ دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے سنگِ مرمر کے مجسمے کا سر کالی مٹی سے بنا دیا ہو۔ میرا شبہ غلط نہیں تھا۔ جب چوہدری دلاور اور خسرو جمشید مرزا نے اپنے کپڑے پھینکے تو فرش پر دھات کی کسی چیز کے ٹکرانے سے آواز پیدا ہوئی جو سگریٹ لائٹر جیسی چھوٹی چیز کی آواز نہیں ہو سکتی تھی۔

"کار کی چابیاں کس کے پاس ہیں؟" میں نے کہا۔

"باہر اب صرف ایک کار ہو گی۔ اس میں چابیاں لگی ہوئی ہیں۔" چوہدری دلاور نے چلا کے کہا۔ "جاؤ، دفع ہو جاؤ کتے کے بچے....." اس کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔ اس نے مجھے اپنی بے بسی کا بدلہ لینے کے لیے ایک سے ایک گندی گالی دی۔ میں نے پہلی مرتبہ اس کے غصے کے آتش فشاں کو پھٹتے دیکھا تھا۔ میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا۔ ریوالور اب صرف میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے سراج کو ان کی طرف دھکیلنے سے پہلے اس کے کپڑوں کو ٹٹول کر دیکھا۔ اس کے پاس دوسرا ریوالور نہیں تھا۔

"اب تم لوگ اتنے بے بس ہو کہ میں تمہیں ریوڑ کی طرح ہانک کر پولیس اسٹیشن بھی لے جا سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اگر چاہوں تو پولیس کو بھی یہاں بلا سکتا ہوں لیکن میں جانتا ہوں ڈی ایس پی صاحب کی موجودگی میں پولیس کیا کارروائی کرے گی اور کس کے خلاف کرے گی۔ یہ اتفاق نہیں کہ گھر کی مالک رابعہ ہے۔ تم لوگوں نے بہت صحیح جگہ کا انتخاب کیا تھا۔ اگر کوئی بات غلط ہو جاتی اور کشت و خون ہوتا تو اس کی وضاحت رابعہ قاری ایڈووکیٹ کو کرنی پڑتی۔ مجھے اپنے خلاف ڈی ایس پی صاحب کی ہڈیاں توڑنے کا کیس بنوانے کا بھی کوئی شوق نہیں۔ اس لیے میں آپ سب کو اپنے اپنے حال پر چھوڑ کر اکیلا ہی جاؤں گا۔ جانے سے پہلے ایک آخری بات۔ میں یہاں آپ لوگوں سے ملاقات کرنے یا آپ لوگوں کا یہ باڈی بلڈنگ شو منعقد کرانے کے شوق میں نہیں آیا تھا۔ بہت سی باتوں میں اصل بات تو رہ گئی۔ وہ بوڑھی اور مفلوج عورت کہاں ہے جسے اٹھا لانے کا مردانہ کارنامہ سرانجام دے کر آپ نے سمجھا تھا کہ بازی جیت لی۔ دل تو چاہتا ہے کہ کاش میرے پاس اس وقت ایک کیمرہ ہوتا اور میں یہ گروپ فوٹو اتار لیتا کہ سند رہے اور بوقتِ ضرورت کام آوے۔ میں لوگوں کو، بشمول آپ کے اہلِ خانہ کے، یہ تصویر دکھا کے کہہ سکتا کہ دیکھو، یہ ہیں وہ شریف مرد..... یا میرے پاس ایک آئینہ ہوتا جس میں تم سب اپنے آپ کو دیکھ سکتے۔" میں نے ایک قہقہہ مارا۔ "بالکل کسی سرکس کا ٹروپ ہے۔ دو جوکر اور پانچ بازیگر مع ایک عدد شکستہ ٹرینر، لباسِ قدرت میں۔"

"اس بڑھیا کو بھی واپس کر دیا گیا ہے بدمعاش!" چوہدری دلاور نے کہا۔ "تمہاری اس ماں کے ساتھ۔"

میں نے ایک فائر کیا اور چوہدری دلاور یوں فرش پر گرا جیسے اسے سچ مچ گولی لگ گئی ہے۔ فوزیہ کے بارے میں اس کے الفاظ نے مجھے مشتعل تو کیا تھا مگر مجھ میں اتنی عقل سلامت تھی کہ اس کامیابی کو ایک قتل کر کے ناکامی میں نہ بدلوں۔

"اب زبان سنبھال کے بات کرنا۔" میں نے دھاڑ کر کہا۔

"زندگی تھی، اس لیے پہلی بار میرا نشانہ خطا ہو گیا۔"

"وہ اسی کار میں تھی جو رضوی صاحب کے گھر گئی ہے۔" ڈی سلوا نے کہا۔

"آل رائٹ۔ باقی سب لوگ چلیں دوسرے کمرے میں۔" میں نے کہا۔ "مسٹر ڈی سلوا! تم اپنے کپڑے پہن لو۔ گاڑی تم چلاؤ گے۔ میں پیچھے بیٹھوں گا۔ تمہیں رضوی صاحب کے گھر کا راستہ تو معلوم ہو گا۔ راستے میں کسی جگہ سے میں فون کر دوں گا۔ اگر تصدیق ہو گئی کہ شہلا کی ماں بخیر و عافیت واپس پہنچ گئی ہے تو تم بھی بخیر و عافیت گھر لوٹ جاؤ گے لیکن یہ جھوٹ ہوا تو تمہاری لاش بھی کسی کو نہ ملے گی۔ کم آن۔ سنا نہیں باقی لوگوں نے۔"

وہ سب نہایت مضحکہ خیز طریقے پر آگے پیچھے چلتے، ایک دوسرے سے نظر چراتے، شرم سے اور شرمندگی سے اور غصے سے بے حال مگر بے بس" اس کمرے میں جانے لگے جس میں کچھ دیر پہلے میں نے انکل شیروانی سے اور فوزیہ سے ملاقات کی تھی۔ ایک پاؤں کی ٹھوکر سے میں نے ڈی سلوا کے کپڑے اس کی طرف پھینکے اور اسے نظر میں رکھتے ہوئے کمرے کے دروازے میں جا کھڑا ہوا۔ چوہدری دلاور اور خسرو جمشید دیوار کی طرف منہ کر کے کرسیوں پر بیٹھ گئے تھے۔ باقی لوگ سراج کو سنبھال رہے تھے۔ غالباً وہ دیکھ چکے تھے کہ کمرے کے دوسرے دو دروازوں میں سے ایک اٹیچ باتھ کا تھا اور دوسرا باہر سے بند تھا۔ میں نے وہ دروازہ بھی بند کر دیا جس سے وہ گروہ کمرے میں گئے تھے۔ میرے کنڈی لگاتے ہی اندر سے چوہدری دلاور نے مجھے ایک درجن سے زائد غلیظ گالیاں دیں۔

"مسٹر ڈی سلوا!" میں نے کہا۔ "جب تم کپڑے پہن چکو تو منہ دیوار کی طرف رکھتے ہوئے ایک قمیص میں یہ سب اسلحہ باندھ لینا کہ کسی کے کام نہ آ سکا۔ شاید میرے کام آئے اور یاد رکھنا کہ تم نے گردن موڑ کر دیکھنے کی خفیف سی کوشش بھی کی تو میں تمہاری کھوپڑی میں سوراخ کر دوں گا۔"

ڈی سلوا نے کوئی جواب نہیں دیا اور میرے احکامات کی تعمیل کرتے ہوئے آٹھ ریوالور ایک پوٹلی میں باندھ لیے۔

"اب چلو آگے۔ گاڑی اسٹارٹ کرو۔" میں نے کہا۔ "یہ پوٹلی پچھلی والی سیٹ پر رکھ دینا اور خیال رکھنا کہ آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں۔ غلط فہمی بھی تمہاری جان لے سکتی ہے۔"

"میں تمہارے خلاف نہیں ہوں۔" ڈی سلوا نے باہر آ کے آہستہ سے فرنچ میں کہا۔

"تمہیں فرنچ آتی ہے؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"میں گوا کا رہنے والا ہوں اور یورپ میں کئی سال گزار چکا ہوں۔" وہ بولا۔ "جو بات میں کہنا چاہتا تھا وہ کچھ اور تھی۔ وہ بڑھیا اس کار میں نہیں تھی جو تمہارے انکل کو لے گئی ہے۔"

"پھر؟" میں چلتے چلتے رک گیا۔ "کیا وہ یہیں ہے؟"

ڈی سلوا نے اس کمرے کی طرف دیکھا جہاں باقی شکاری بند تھے۔ وہ سب کھڑکی سے منہ لگاتے باہر جھانک رہے تھے۔ کوئی بات کیے بغیر وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور کار اسٹارٹ کی۔ اسی وقت مجھے ایک خیال آیا۔ اگر وہ بڑھیا گھر میں ہوتی تو ڈی سلوا ضرور اشارہ کر دیتا۔ جواب میں ہاں یا نہ ہی کہہ دیتا۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے کسی دوسری جگہ پر رکھا گیا ہے۔ مثلاً اس کار کی ڈکی میں جو اب مجھے لے کر روانہ ہونے والی تھی؟

"اچھا!" میں نے کہا۔ "اگر وہ یہاں نہیں ہے تو کہاں ہے؟"

"میں نے یہ تو نہیں کہا کہ وہ یہاں نہیں ہے ——"

ڈی سلوا نے کہا۔ "لیکن پلیز مسٹر سکندر! اپنے رویّے سے دوستانہ طرزِ عمل کا اظہار مت کیجیے۔" صاف ظاہر تھا کہ وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا مگر میرا رویّہ بدلتے دیکھ کر نہ کہہ سکا۔

"آل رائٹ۔ یو سن آف اے ڈرٹی....." میں نے اس کا مطلب سمجھتے ہوئے چلا کر انگریزی میں کہا۔

ڈی سلوا نے کسی وجہ کے بغیر نفی میں سر ہلایا۔ "میں ابھی تم کو بتا دیتا ہوں کہ وہ کہاں ہے لیکن اِدھر اُدھر دیکھنے کی بجائے تم میرے ایک مکا مارنا جس سے ظاہر ہو کہ میں بدستور عدم تعاون کا مظاہرہ کر رہا ہوں اور جو لوگ کھڑکی میں سے دیکھ رہے ہیں ان کو یہ شک نہ ہو کہ..... کہ میں در پردہ....."

"بکواس کرنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے چیخ کر کہا اور نہایت جارحانہ عزائم کے ساتھ آگے بڑھا۔

"وہ ڈکی میں بند ہے۔" ڈی سلوا نے آہستہ سے کہا اور میں نے طے شدہ پروگرام کے مطابق اس کے ایک مکا رسید کیا۔ اگر اس نے مجھے پہلے سے تیار نہ کیا ہوتا تو میں یقیناً ڈکی کھول کر دیکھتا اور اس کے ساتھیوں کو اندازہ ہو جاتا کہ ڈی سلوا نے غداری کی ہے۔ ڈی سلوا لڑکھڑایا اور ایک قدم پیچھے ہٹ کر سنبھل گیا۔ اندر سے آنے والی آوازوں سے معلوم ہوتا تھا کہ اسیرانِ قفس رہائی کے لیے کوشاں ہیں اور دیواروں سے سر ٹکرانے کی بجائے دروازہ توڑنے کی فکر میں ہیں۔

"کیا وہ زندہ ہے؟" میں نے ریوالور کا رُخ اس کی جانب کیا۔

"اسے قتل کرنا پروگرام میں شامل نہیں تھا۔" ڈی سلوا نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔ "وہ خود ہی مر گئی ہو تو میں نہیں کہہ سکتا۔"

اس کا خیال میرے لیے سخت باعثِ تشویش ہو گیا۔ شہلا کی ماں اتنی دیر تک ڈکی میں بند رہ کے مری نہیں ہو گی تو مرنے والی ہو گی۔ اس کی جانِ ناتواں کے لیے اس فولادی پنجرے میں محبوس اور بے دست و پا رہ کے سانس کی نازک ڈوری کو ٹوٹنے نہ دینا بظاہر محال معلوم ہوتا تھا لیکن یہ دیکھنے کے لیے میرا اس گھر سے کچھ دور پہنچ جانا ضروری تھا، جہاں محاورے کی عملی صورت کے مطابق ایک حمام میں سب ننگے تھے۔ دروازے کا ٹوٹ جانا

یقینی تھا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ رہائی پاتے ہی وہ خاموشی سے راہِ فرار اختیار کریں گے۔ میری طرح وہ بھی چاہیں گے کہ بعد میں یہاں ان کی موجودگی کا کوئی سراغ نہ ملے اور میں ان کو یہ موقع فراہم کرنا چاہتا تھا ورنہ میرے لیے یہ بھی ممکن تھا کہ جاتے جاتے میں ان سب کو شوٹ کر دوں یا پولیس کو طلب کروں لیکن دونوں صورتوں میں میرے لیے اور رابعہ کے لیے ایسی قانونی مشکلات پیدا ہو جاتیں کہ میرا یہ انتہائی قدم خودکشی کے مترادف ہوتا۔ مسئلہ اگر صرف ان کو قتل کرنے کا ہوتا تو میں بہت پہلے ان سب کو مار دیتا لیکن مجھے پہلے ان سے یہ پوچھنا تھا کہ انہوں نے میرے باپ کو کیوں مارا اور کیسے مارا؟ بالکل اسی طرح جیسے مجھے مار دینے سے ان کے مقاصد کی تکمیل نہیں ہوتی تھی، اسی طرح میں بھی ان کو زندہ چھوڑ دینے پر مجبور تھا۔ ہم وہ شکاری تھے جو ایک دوسرے کے لیے جال پھیلا رہے تھے مگر ہمارا مقصد ایک دوسرے کی جان لینا نہیں تھا۔

پھر چلتے چلتے مجھے شرارت سوجھی۔ "مسٹر ڈی سلوا!" میں نے کہا۔ "اباؤٹ ٹرن۔ بالکل گھوم جاؤ۔"

"کیا تم مجھے بھی ان کے ساتھ بند کرو گے؟" اس نے پلٹ کر کہا۔

"نہیں، مجھے ایک ڈرائیور کی ضرورت تو ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن میں اپنی حفاظت کی خاطر ایک تماشا کرنا چاہتا ہوں۔ تم واپس اندر چلو اور ان سب شرفا کے کپڑے اٹھا لاؤ۔"

میری نگرانی میں ڈی سلوا نے کمرے میں رکھے ہوئے سب کپڑوں کی گٹھڑی سی بنا لی۔ دروازہ اب بری طرح ہل رہا تھا اور گرنے ہی والا تھا۔ کپڑوں کے بنڈل کو بھی میں نے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر رکھا اور ڈی سلوا کو حکم دیا کہ وہ کار نکال لے جائے۔ ڈی سلوا نے تعمیل کی اسی وقت ایک دھماکے سے دروازہ ٹوٹ کر گرا اور میں نے پلٹ کر دیکھا، کسی نے ایک پتھر پھینکا جو کار کے پچھلے حصے پر آ کے لگا۔ ان کی بے بسی کا تصور کر کے مجھے بے اختیار ہنسی آئی۔ تاریکیٔ شب کی پناہ میں ہونے کے باوجود اُن سب کے لیے ہمارے پیچھے دوڑنا یا لوگوں کو مدد کے لیے پکارنا بعید از قیاس تھا۔ ان کے لیے تو صبح ہونے سے پہلے پہلے اس گھر سے نکل کر اپنے اپنے گھر پہنچنا بھی مسئلہ ہو گا۔ خود کو بہت بڑا شکاری سمجھنے والے پریشان تھے اور برہم تھے کہ شکار تو ہاتھ سے گیا، جاتے جاتے ان کو ایک دوسرے کی نظر میں شرمندہ و رسوا بھی کر گیا۔ شکار کرنے کو آئے شکار ہو کے چلے۔ اب وہ کیا کریں گے؟ شاید کسی رُوسیاہ غلام کو روانہ کریں گے کہ کسی بھی گھر میں جا کر کوئی چادر، کوئی تولیہ یا پردہ ہی مار لائے اور پھر اس لباسِ فاخرہ کو زیبِ تن کر کے کہیں جائے اور کسی بہانے ان سب کے لیے ایسے کپڑے لے آئے جو فٹ آئیں یا نہ آئیں، اس قابل ضرور ہوں کہ دیکھنے والوں کو وہ کپڑے نظر آئیں ــــ بقول شاعر؎ تن کی عریانی سے بہتر نہیں دنیا میں لباس مگر اس کا کیا علاج کہ دنیا کی نظر شاعرانہ نہیں۔ جب تک ان کی ستر پوشی کا سامان فراہم نہیں ہو جائے گا وہ اس گھر سے تو نکل جائیں گے مگر کسی گمنام گوشے کے اندھیرے میں چھپ کر انتظار کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکیں گے۔ گاڑی اب اس گھر سے کافی دور آ چکی تھی اور نہر کے ساتھ ساتھ چلنے والی سڑک پر رواں تھی۔

"مسٹر ڈی سلوا!" میں نے اچانک کہا۔ "یہ گاڑی کس کی ہے؟"

"کسی کی بھی نہیں۔" ڈی سلوا نے اطمینان سے کہا۔ "میرا مطلب ہے ان سب میں سے کسی کی نہیں۔"

"آل رائٹ۔ گاڑی کو یہیں روک دو۔" میں نے کہا۔ "میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ اس بوڑھی عورت کا کیا حال ہے اور یہ خیال رکھنا کہ میرا اعتماد حاصل کر کے تم مجھے دھوکا نہیں دے سکتے۔ اگر تم نے مقابلے کی کوشش کی تو میں تمہیں کتے کی موت مار دوں گا اور کار لے کر بھاگ جاؤں گا۔ تمہارے ساتھی بھی یہ وضاحت کرنے سے گریز کریں گے کہ تمہاری لاش یہاں کیوں پڑی تھی اور۔۔"

"یقین کرو مسٹر سکندر! میں ابھی مرنا بالکل نہیں چاہتا۔" ڈی سلوا نے کہا۔

اس کی یقین دہانی کے باوجود میں نے ایک قمیص میں لپٹے ہوئے آٹھ ریوالوروں کا بے ہنگم بنڈل اٹھا لیا۔ "اگر تم نے گاڑی لے کر بھاگنے کی کوشش کی تب بھی مجھے اس کے دونوں ٹائر برسٹ کرنے کے لیے گولی چلانی پڑے گی۔"

"اور اگر تم محض دھمکیاں دینے میں وقت ضائع کرتے رہے تو وہ بڑھیا مر جائے گی۔" ڈی سلوا نے کہا۔ "میری اس سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ڈکی کھولنے کے لیے تمہیں چابیوں کی ضرورت پڑے گی۔ پھر میں کار لے کر کیسے فرار ہو سکتا ہوں؟" اس نے اگنیشن سوئچ آف کیا اور چابیاں میری طرف اچھال دیں۔ میں نے چابیاں اٹھا کے اور پیچھے جا کے ڈکی کھولی۔ ابھی میں اس پر جھکا ہی تھا کہ گاڑی ایک دم اسٹارٹ ہو گئی۔ اس سے پہلے کہ میں سنبھلتا، گاڑی ایک زبردست جست لگا کے آگے بڑھی۔ ڈی سلوا نے کلچ ایک دم چھوڑ کے ایکسیلیٹر کو پورا دبا دیا تھا اور بظاہر اس کا مقصد یہی معلوم ہوتا تھا کہ میں جھٹکے سے گروں تو سڑک پر پڑا رہ جاؤں لیکن میں اندر لڑھکنے میں کامیاب ہو گیا۔ ڈکی کا اوپر اٹھا ہوا ڈھکنا جھٹکے سے نیچے آیا۔ اگر میری ٹانگیں باہر لٹکی ہوئی نہ ہوتیں تو ڈکی خود بخود بند اور مقفل ہو جاتی اور میرے لیے اندر سے اس کو کھولنا ناممکن ہوتا۔ مزید یہ کہ اسپیئر وہیل اور جیک وغیرہ کے ساتھ جس مختصر سی جگہ میں شہلا کی ماں قید تھی اسی میں خود میں بھی پیک ہو جاتا اور ڈی سلوا دونوں قیدیوں کے ساتھ۔۔!

غنیمت اسلحہ اور ان کے کپڑے پیش کر کے اپنے آقاؤں کے سامنے سُرخرو ہوتا۔ اپنی ذہانت، جرأت اور وفا شناسی کا لوہا منوا لیتا اور اس عظیم الشان فتح کا سہرا بلاشبہ اسی کے سر بندھتا۔ مگر تقدیر نے ٹانگ اڑا دی اور میری ٹانگیں درمیان میں آ گئیں۔ چنانچہ ڈکی کا ڈھکنا میرے پیروں پر گرا جس سے ایک لمحے کے لیے تو مجھے یہ بھی شک گزرا کہ شاید گھٹنوں سے نیچے میری ٹانگیں کٹ کر سڑک پر ہی گر چکی ہیں۔ پھر درد کی شدت نے مجھے تڑپا دیا اور میں سمجھا کہ پنڈلی سے اوپر میری ٹانگوں کی ہڈیاں ٹوٹ گئی ہیں لیکن چند منٹ بعد میں ٹانگیں ہلا کے ڈھکن کو اوپر اٹھانے میں کامیاب ہوا تو مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ بفضلِ خدا میں صحیح سالم ہوں اور منہ ڈکی میں دیے ٹانگیں آسمان کی طرف اٹھائے نہایت مضحکہ خیز انداز میں سفر کر رہا ہوں۔ کار اس وقت تک واپس ہو کے نہر کے ساتھ والی سڑک پر دوڑ رہی تھی اور شالیمار باغ کی طرف رواں تھی۔

گاڑی کی رفتار ستر اسی میل سے کم نہیں تھی۔ غیر ارادی طور پر میں نے چیخ کر ڈی سلوا کو ایک غلیظ گالی دی۔ پھر مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ میری آواز اس کے کانوں تک پہنچ ہی نہیں سکتی تھی اور پہنچ بھی جاتی تو وہ کب فرمانبرداری کا ثبوت دیتے ہوئے گاڑی روک دیتا۔ چنانچہ سب سے پہلے میں نے ریوالور نکال کر ڈی سلوا کو شوٹ کرنے کے بارے میں سوچا لیکن ڈکی میں سے گولی چلا کے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے کسی بھی شخص کا نشانہ لینا عملاً ناممکن تھا۔ دوسری صورت یہ تھی کہ میں گولی سے پٹرول ٹینک میں سوراخ کر دوں لیکن اس طرح پٹرول کو آگ لگتی تو ٹینک دھماکے سے پھٹ جاتا اور ہم خود جو ایک طرح ٹینک کے اوپر براجمان تھے اس کے ساتھ ہی اڑ جاتے۔ میرے پاس آٹھ ریوالور تھے اور سب بھرے ہوئے تھے لیکن میں ڈکی سے سر نکال کے ایک ٹائر بھی برسٹ نہیں کر سکتا تھا۔ اس رفتار پر ٹائر برسٹ ہوتے ہی گاڑی الٹ جاتی۔ وقت بہت کم تھا اور فاصلہ ہر لمحہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ ڈی سلوا مجھے واپس وہیں لیے جا رہا تھا جہاں میرے دشمن کسی زخم خوردہ درندے کی طرح میرے خون کے پیاسے اور میری بوٹیاں نوچ نوچ کھانے کے لیے تیار تھے۔

پوری کوشش سے میں نے خود کو اٹھایا اور پیچھے کھسک کر اپنے پیروں کو گاڑی کے پیچھے والے بمپر پر جما دیا۔ اب میں انگریزی حرف ایل کی شکل میں آدھا کار کے اندر تھا آدھا باہر۔ میری پوری کوشش تھی کہ میرے جسم کا بوجھ اندر کی طرف رہے تاکہ میں الٹ کر سڑک پر نہ جا گروں۔ اپنا ایک ہاتھ میں نے اٹھا رکھا تھا۔ ہر جھٹکے سے نیچے آنے والا ڈکی کا فولادی اور بھاری بھرکم ڈھکنا میرے ہاتھ سے ٹکراتا تھا اور رک جاتا تھا۔ ہاتھ کی یہ روک نہ ہوتی تو ڈھکنا عین میری کمر پر گرتا اور ریڑھ کی ہڈی کا ایک آدھ مہرہ ضرور توڑ دیتا۔ دوسرے ہاتھ سے میں نے ڈکی کو اندر سے تھام رکھا تھا جب مجھے یقین ہو گیا کہ اب میرے دونوں پنجے بمپر اور کار کی باڈی کے درمیان پھنس گئے ہیں اور چند سیکنڈ کے لیے ہی سہی مگر میں ہاتھوں کی گرفت کے بغیر بھی اپنا توازن کسی سرکس کے بازیگر کی طرح قائم رکھ سکتا ہوں تو میں نے اوپر اٹھے ہوئے ہاتھ کو تھوڑا سا نیچے کیا۔ ڈکی کا ڈھکنا نیچے آیا تو میں نے جھپٹ کر اپنی انگلیاں نمبر پلیٹ پر جما دیں۔ ٹین کی نمبر پلیٹ تھوڑی سی خم ہوئی اور میری انگلیاں اس کے پیچھے پھنس گئیں۔ میں نے دوسرا ہاتھ بھی چھوڑ دیا جس سے میں نے ڈکی کے اندر کا کنارہ پکڑ رکھا تھا۔

ڈکی کا ڈھکنا ایک دھماکے سے بند ہوا اور میرا جسم رفتار کے سبب کچھ یوں پیچھے گیا کہ میرے بمپر میں پھنسے ہوئے پیروں اور نمبر پلیٹ کو تھامنے والے ہاتھوں کے درمیان میرا جسم سات کے عدد کی طرح ہو گیا۔ یہ اطمینان بہت حوصلہ افزا تھا کہ میں جھٹکے سے سڑک پر نہیں گرا ورنہ میری موت انتہائی پُرعذاب ہوتی۔ میرے پیر بمپر میں پھنسے رہتے اور میرا سر سڑک کی سنگین سطح پر ساٹھ ستر میل کی رفتار سے رگڑ کھاتے ہوئے چند سیکنڈ میں پاش پاش ہو جاتا اور میرا جسم ان غلاموں کے جسم کی طرح اُدھڑ جاتا جن کو معتوب ہونے پر رتھ کے پیچھے باندھ کر رتھ دوڑانے کا فرمان جاری ہوتا تھا۔

اس جان لیوا مرحلے سے گزر جانے کے بعد میں نے نمبر پلیٹ چھوڑ کر ہاتھ آگے پھیلائے اور ڈکی پر سر کے بل جا گرا۔ آہستہ آہستہ میں نے اپنا توازن برقرار رکھتے ہوئے دونوں پیروں کو بمپر سے نکالا۔ ڈی سلوا نے پلٹ کر دیکھا اور صورتِ حال کا فوراً اندازہ کر لیا۔ مجھے ڈکی پر سے گرانے کے لیے اس نے کار کی رفتار بڑھا دی اور انتہائی خطرناک طریقے پر لہرا کے چلانے لگا۔ کار ایک سیکنڈ میں سڑک کے ایک کنارے پر ہوتی تھی اور دوسرے سیکنڈ میں دوسرے کنارے پر۔ ڈکی پر پینٹ کی ہوئی سطح اتنی چکنی تھی کہ میں وائپر کی طرح پھسلتا ہوا کبھی ایک کنارے پر جا پہنچتا تھا تو کبھی دوسرے کنارے پر اور مجھے خود کو نیچے گرنے سے بچانے کے لیے جسم کی تمام قوت کو مخالف سمت میں صرف کرنا پڑتا تھا لیکن اب میں ونڈ اسکرین کے پیچھے تھا اور مجھے صرف ایک سیکنڈ کی مہلت درکار تھی کہ میں ریوالور کا بٹ مار کر شیشے کو چور چور کر دوں۔ اس کے پاس جا سٹرکی تھی چنانچہ ڈی سلوا مجھے دھکا دینے اور گاڑی لے کر فرار ہونے

میں کامیاب تو ہوگیا تھا مگر اب اسے اپنی کامیابی خاک میں ملتی نظر آرہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ یہ ناکامی اسے کتنی مہنگی پڑے گی اور اسے اپنا انجام صاف نظر آنے لگا تھا۔ وہ شکست سے بچنے کے لیے دیوانہ وار کوشش کر رہا تھا اور اسے اپنی جان کی پروا بھی نہ تھی۔

موقع ملتے ہی میں نے دائیں ہاتھ سے ریوالور کا بھرپور وار کیا اور پیچھے والا شیشہ ریزہ ریزہ ہوگیا۔ ڈی سلوا نے دہشت زدہ ہو کے پیچھے دیکھا۔ شاید اسے یقین آچکا تھا کہ اب کسی بھی لمحے ریوالور کی گولی اس کے سر کو پاش پاش کردے گی۔ اس ایک لمحے میں جب خوف نے اس کی عقل کو مفلوج کردیا تھا اور اسے موت کے سوا کچھ نظر نہیں آرہا تھا وہ بھول گیا کہ اس کے ہاتھ ستر میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑنے والی کار کے اسٹیرنگ وھیل کو سنبھالے ہوتے ہیں اور یہ خطرناک کام مکمل یکسوئی اور توجہ کا طالب ہے۔ وہ اسٹیرنگ کو دائیں بائیں گھما رہا تھا۔ مجھے اندر داخل ہوتے دیکھ کر اس کی نگاہ سامنے نہ رہی لیکن ہاتھ کسی ارادے کے بغیر حرکت میں رہے۔ کار پھر قوس کی شکل میں لہرائی لیکن سڑک کے دوسرے کنارے تک پہنچنے کے بعد مخالف سمت میں گھومنے کی گنجائش نہ رہی اور ڈی سلوا نے یہ سب کچھ اس وقت دیکھا جب کچھ کرنا اس کے بس کی بات نہ رہی تھی۔ سیکنڈ کے سوویں یا ہزارویں حصے میں میری نگاہ نے بھی دیکھ لیا کہ ایک تناور درخت کار کی رفتار سے بے نیاز اپنی جڑوں سے زمین کو تھامے بڑی مستقل مزاجی کے ساتھ کھڑا ہے۔ اگر ڈی سلوا کی نظر سڑک پر ہوتی اور اس کی عقل نے ساتھ دیا ہوتا تو وہ اپنی مہارت اور کوشش سے تصادم نہ ہونے دیتا۔ میری نظر نے بھی درخت کا صرف سایہ سا دیکھا پھر ایک زبردست دھماکا ہوا اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ساری کائنات الٹ گئی ہو۔ آوازوں کا ایک مکروہ شور اٹھا جس میں موت کی ہذیانی ہنسی کا وجود سب سے الگ تھا۔ پھر ایک دم سناٹا پھیل گیا۔ مہیب، پُرآسیب اور بیکراں۔

آنکھیں کھولتے ہی میں نے عالمِ بالا کا تصوّر کیا لیکن مجھے اپنے اردگرد ایک فولادی شکستہ پنجرہ سا دکھائی دیا۔ میں کار کی اگلی اور پچھلی سیٹوں کے درمیان پھنسا ہوا تھا۔ تھوڑی ہی جدوجہد کے بعد میں سر اٹھا کے اپنے جسم کے دیگر اعضا کا جائزہ لینے کے قابل ہوگیا۔ مارنے والا ہاتھ ڈی سلوا کا تھا۔ بچانے والا ہاتھ ڈی سلوا کے خدا اور میرے خدا کا تھا۔ میں جھٹکے سے اندر گیا تو کار کی اگلی سیٹوں نے ”شاک ابزاربر“ کا کام کیا۔ آگے پیچھے ہو جانے والی سیٹوں کی پشت سے ٹکرا کے میں وہیں رک گیا اور پیچھے آیا تو ایک لمبی سیٹ پر گرا جس کے کُشن بہت نرم تھے چنانچہ میں لڑھک کر درمیان ہی میں رہ گیا۔ مجھے چوٹیں تو آئی تھیں لیکن میرے تمام اعضا سلامت تھے اور معمولی خراشوں کے سوا میرے جسم کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔

مجھے یقین تھا کہ دھماکے نے اِدھر اُدھر کے بہت سے رہنے والوں کو اور گشت کرنے والے چوکیداروں کو ضرور متوجہ کیا ہوگا۔ ڈی سلوا مرچکا تھا، اس میں شک کی کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔ کار کا اگلا حصہ چور چور ہو کے پچک گیا تھا اور ڈی سلوا کی خون آلود مسخ شدہ اور بھیانک لاش نہایت مضحکہ خیز طریقے پر اس کا ڈھانچے میں پھنسی رہ گئی تھی۔ اسٹیرنگ وھیل ٹیڑھا ہو کے چھتری کی طرح اس کے اوپر آیا ہوا تھا اور اس کا سر گردن کے ٹوٹ جانے سے دائیں طرف کی کھڑکی سے باہر لٹک گیا تھا تو ایک ٹانگ مخالف سمت کی کھڑکی سے باہر نکل گئی تھی۔ اس کا سر بھی کھڑکی سے ٹکرا کے ہی ٹوٹا ہوگا۔ اب اس کا وہ مغز جو ہر طرح کے شیطانی خیالات کی آماجگاہ رہا تھا، جس سے تمام مجرم منصوبے جنم لیتے تھے اور جس میں اس کے ننگِ انسانیت ماضی کا ہر نقش موجود تھا اس کے ناپاک خون کے ساتھ فرشِ خاک پر ٹپک رہا تھا۔ اس کی موت ایک درسِ عبرت تھی مگر ان کے لیے جو بصارت کے ساتھ بصیرت بھی رکھتے ہوں ورنہ یہ عبرت ناک تماشا تو روز ہر جگہ ہوتا ہے اور مرنے والے اس سے بھی کہیں زیادہ عذاب کے ساتھ مرتے ہیں۔

میں نے خود کو گھسیٹ کر پیچھے کے شکستہ شیشے سے باہر نکالا۔ حادثے نے میرے اعصاب کو بُری طرح متاثر کیا تھا اور بچ جانے کے باوجود میرا وجود دہشت سے سُن ہو رہا تھا۔ مجھ میں اتنی ہمت بھی نہ تھی کہ ڈی سلوا کی لاش پر دوسری نظر ڈال سکوں لیکن اس سے بھی زیادہ روح فرسا خیال شہلا کی ماں کا تھا۔ پہلی چابیاں نہ جانے کہاں گری تھیں مگر دوسری ہنوز اگنیشن سوئچ میں جھول رہی تھیں۔ میں نے بڑی مشکل سے چابیاں نکالیں لیکن ایسا کرتے ہوئے میرا ہاتھ ڈی سلوا کے خون سے مس ہوا اور مجھے گرم انسانی خون کی مہک محسوس ہوئی۔ جو میرے جسم کے خون سے مختلف نہ تھا۔ فرق ہوتا ہے تو انسانوں میں، لہو تو کسی کا بھی گنہگار نہیں ہوتا۔ مجھے ایک چکر سا آیا اور میرا جی مالش کرنے لگا۔ وہیں سڑک پر گر کے میں نے قے کی اور الٹا پڑا لمبی لمبی سانسیں لیتا رہا۔ ابھی تک اس ویرانے میں کوئی نہیں پہنچا تھا لیکن کوئی راہ گیر، گشتی پولیس یا پہریداروں میں سے کسی کا آجانا عین ممکن تھا۔ متلی ہو جانے کے بعد میری طبیعت کچھ بحال ہو گئی تھی لیکن کمزوری باقی تھی۔ جسم کی تمام قوت کو مجتمع کر کے میں

سیدھا کھڑا ہوا اور ڈگمگاتے قدموں سے ڈکی کھولنے بڑھا۔ چابی لگانے سے پہلے میرا ہاتھ بُری طرح کانپ رہا تھا۔ پھر کوشش کے باوجود میں چابی نہ گھما سکا۔ ایک نامعلوم طاقت نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”مت کھولو اس لاوارث عورت کے مدفن کو، مت دیکھو کہ اس کے مفلوج جسم کا اس زنداں میں کیا انجام ہوا۔ تم جانتے ہو کہ تصادم ہوتے ہی اس کا استخوانی ڈھانچہ فولادی دیواروں سے ٹکرا کے ٹوٹ پھوٹ گیا ہوگا۔ جسم سے روح کا رشتہ تو پہلے ہی زندگی کے نام پر ایک تہمت تھا۔ اب دیکھنے کو کیا ہے۔ یہ جنگ ٹھہری ہے کوئی کھیل نہیں ہے اے دل۔ درد اور جنگ میں کچھ میل نہیں ہے اے دل۔ پھر مٹی سینچو اشکوں سے۔ پھر اپنے لہو کی کھاد بھرو اور اگلی رت کی فکر کرو۔ جب پھر اک بار اُجڑنا ہے جب تک تو یہی کچھ کرنا ہے۔“

میں نے چابیاں واپس اگنیشن سوئچ میں لگا دیں اور پیچھے سے وہ پوٹلی اٹھالی جس میں اب بھی سات ریوالور بندھے ہوئے تھے۔ آٹھویں ریوالور کو بھی اسی میں ٹھونس کر میں وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اندھیرے میں کئی جگہ میں ٹھوکر کھا کے گرتے گرتے بچا۔ جسم میں طاقت نہیں تھی اور ضمیر میرے راستے میں کانٹے بچھا رہا تھا لیکن عقل مجھے گھسیٹ رہی تھی۔ خود غرضی اور کمینگی پر مبنی اپنی ذات کے تحفظ کی آرزو مجھے اس جگہ سے دور دھکیل رہی تھی جہاں ایک بوڑھی عورت کا ٹوٹا پھوٹا بے جان جسم بہت سے سوالوں کے جواب مانگتا تھا کہ میں نے ماتا کی دھرتی سے صرف اسی کو پروان نہیں چڑھایا تھا جس نے میری کوکھ سے جنم لیا تھا، شہلا کو بھی وہ سب دیا تھا جو اس کی ماں دیتی۔ پھر میرے ساتھ یہ سب کیوں ہوا؟ عالمِ ارواح میں اس نے اپنے بیٹے سے کہا ہوگا۔ ”عدنان! کیا یہ وہی ولایت ہے جہاں سے تو نے مجھے چٹھی لکھی تھی اور پیسے بھیجے تھے؟ لوگوں نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا تھا؟ اگر اس وقت جب تو ایک جواری کے ہاتھوں قتل ہوا تھا مجھے سچ بتا دیا جاتا تو میں یقیناً مرجاتی مگر کیا وہ موت زیادہ باعزت اور قابلِ احترام نہ ہوتی۔ اس موت سے بہتر نہ ہوتی؟ پھر اب میرا جنازہ کون اٹھائے گا؟ مجھے مٹی کون دے گا؟ میری قبر پر پھول چڑھانے کون آئے گا؟“ میں اپنے خیالات کے پاگل کرنے والے ہجوم سے بچنا چاہتا تھا۔ بے شک میرا ایک قوی دشمن خود اپنی ہی وجہ سے مارا گیا تھا اور جسے وہ مارنا چاہتا تھا یعنی میں۔ وہ صرف اس لیے زندہ رہا تھا کہ ابھی اس کی زندگی کے دن پورے نہیں ہوئے تھے مگر صرف میری وجہ سے شہلا کی ماں بھی مرگئی تھی۔ میری خاطر جان دینے والوں میں ایک اور بے گناہ نام کا اضافہ ہوگیا تھا اور ان سب کی جان کا قرض بڑھتا جا رہا تھا۔ اس قرض کو چکانے کے لیے مجھے نہ جانے کتنی فرصتِ زندگی درکار تھی۔

کسی آہوئے صیاد دیدہ کی طرح میں سایوں کی پناہ لیے بھاگتا رہا۔ میں جلد از جلد رضوی صاحب کی کوٹھی پہنچ کے دیکھنا چاہتا تھا کہ فوزیہ اور انکل شیروانی کو بحفاظت پہنچا دیا گیا ہے یا وہ بھی محض میرا اعتماد حاصل کرنے کے لیے ایک دامِ فریب تھا۔ کہیں مجھے مطمئن کرنے کے لیے ان کو وہاں سے رخصت کردیا گیا ہو اور کسی دوسرے زنداں میں قید کردیا گیا ہو۔ صبح ہونے میں اب زیادہ دیر نہیں تھی اگر فوزیہ اپنے والد کے ہمراہ رضوی صاحب کے پاس پہنچی ہوگی تو اب تک ایس پی رضوی اپنی عقل اور ذہانت سے کام لے کر بہت کچھ پوچھ چکے ہوں گے اور سمجھ چکے ہوں گے۔ اپنی آتشِ قہر و غضب کو انہوں نے بھڑکنے سے پہلے ہی فرو کردیا ہوگا اور اب وہ اپنے تمام قانونی اختیارات سے کام لے کر مجھے بچانے کے ساتھ ساتھ مجرموں کو گرفت میں لینے کی فکر بھی کر رہے ہوں گے۔ اس طرح کہ سانپ بھی مرجاتے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ بے شک یہ انتہائی اشتعال انگیز کارروائی تھی مگر رضوی صاحب کا سب سے نمایاں وصف (جو شاید ان کی ہر کامیابی کا ضامن تھا) ہنگامی حالات میں عقل پر جذبات کو حاوی نہ ہونے دینے کی قابلِ رشک صلاحیت تھی۔ میں چاہتا تھا کہ ان کے کوئی عملی قدم اٹھانے سے پہلے خود بھی گھر پہنچ جاؤں۔ کچھ باتیں محسن پہلے ہی بتا چکا ہوگا یا اس نے اپنے والدین کے ساتھ پیش آنے والے واقعات سُن کر بتا دی ہوں گی چنانچہ رابعہ اور شہلا سے بھی کچھ پوشیدہ نہ رہا ہوگا۔ انکل شیروانی نے بھی ان واقعات کا تذکرہ کردیا ہوگا جو اُن کے ساتھ پیش آئے۔ اب مجھے یہ بتانا تھا کہ بعد میں کیا ہوا۔ میں اس اُدھیڑبُن میں تھا کہ کتنے فیصد حقائق کو حذف کروں۔ مثلاً میں رضوی صاحب کو اپنے ایڈونچر کے متعلق صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ میں لڑ بھڑ کے نکل آیا۔ یہ نہیں بتانا چاہتا تھا کہ میں نے کس طرح ڈی سلوا کا مقابلہ کیا۔ ڈی سلوا کے حادثے میں مرنے اور شہلا کی ماں کے بارے میں کچھ بتانے کا نتیجہ یہ نکلتا کہ میں ایک اور ضابطے کی کارروائی میں ملوث ہوجاتا۔ صورتِ حالات ایسی تھی کہ میرے لیے بہت سی الجھنوں کا اضافہ ہوجاتا۔ ابھی تازہ ترین الزام یہ تھا کہ میں نے چوہدری دلاور کو اغوا کیا اور ڈی سلوا کی کارچرائی۔ پھر ڈی سلوا کو لے گیا اور دلاور کو ختم کر کے الزام ڈی سلوا پر عائد کرنے کا پلان بنایا۔ اس کے فوراً بعد اگر میں یہ کہتا کہ میں نے تو صرف یہ کوشش کی تھی کہ ڈی سلوا مجھے اور شہلا کی ماں واپس نہ لے جاسکے۔ حادثہ خود ڈی سلوا کی بدحواسی کا شاخسانہ تھا

تو یہ بات سخت مشکوک سمجھی جاتی۔ دوست اور دشمن، اپنے اور پرائے سب یہ سوچنے میں حق بجانب ہوتے کہ فوزیہ کے اغوا کی واردات نے مجھے پاگل کر دیا ہوگا۔ میں شہلا کی ماں کو بچانا چاہتا تھا لیکن میں نے دیکھا کہ مجرم اس لڑکی کو اٹھا لائے ہیں جس سے میری پرانی جذباتی وابستگی تھی اور اس کے باپ کو پکڑ لائے ہیں تو غصے میں اپنی جان پر کھیل کر میں وہاں سے نکل آیا اور ڈی سلوا کو قتل کر کے یا بیہوش کر کے اس کی گاڑی کو درخت سے ٹکرا دیا کہ یہ حادثہ نظر آئے۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ گاڑی اسٹارٹ کر کے اور گیئر میں ڈال کے دروازے میں سے چھلانگ لگا دی جائے اور چھلانگ لگانے سے پہلے ایکسیلریٹر کو دبانے کے لیے پتھر بھی رکھ دیا جائے تو گاڑی کسی بے ہوش آدمی کو لے کر دوڑتی ہوئی تیز ہوتی جائے گی اور کہیں نہ کہیں کسی کھمبے، درخت یا دیوار سے ٹکرا جائے گی۔ بیہوش آدمی کی موت اس تصادم کے بعد حادثے کا نتیجہ ہی سمجھی جائے گی۔

میرے خاموش رہنے سے پولیس کے لیے بھی کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ فرض کر لیتے کہ ڈی سلوا جب شہلا کی ماں کو اغوا کر کے لے جا رہا تھا تو بریک فیل ہو جانے کے باعث یا کسی اور وجہ سے کار بے قابو ہو گئی اور درخت سے ٹکرا گئی۔ ٹوٹی پھوٹی کار کے ڈھانچے کو دیکھ کر تو اسکاٹ لینڈ یارڈ کے ماہرین بھی نہیں بتا سکتے کہ بریک لائن کہاں سے ٹوٹی تھی۔ چشم بد دور، ہماری بے حد ذہین اور مستعد پولیس ایسے کیس فوراً فائل کر دیتی ہے جس میں "متوفی" کچھ نہ بتا سکے، چشم دید گواہ کوئی نہ ہو اور مشکوک ملزم بھی کوئی نہ ہو جس سے تفتیش کی جا سکے۔ چنانچہ جو حقائق انہوں نے رپورٹ میں لکھ دیئے وہی فائنل۔ کیس داخل دفتر۔ بصورتِ دیگر اُن کو مجھ سے بہت کچھ پوچھنا پڑتا۔ چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کو بھی بلانا پڑتا، بیانات لینے پڑتے۔ میرے بتائے ہوئے راستوں پر خوار ہونا پڑتا، حلیے مشتہر کرنے پڑتے اور انکل شیر دل، فوزیہ اور رضوی صاحب کے علاوہ شہلا سے محسن سے اور نجانے کتنے لوگوں سے معلوم کرنا پڑتا کہ یہ سب کیسے ہوا اور کیوں ہوا ؟ ضابطے کی کارروائی ٹالی نہیں جا سکتی تھی۔ پولیس والے پھنس جاتے۔ ایک طرف وہ بڑے بدمعاش تھے جو انہیں اسی بات کا وظیفہ دیتے ہیں کہ ان کے معاملات دبائے جائیں یا ان کے حریفوں کو دبایا جائے۔ دوسری طرف ایک ایس ایس پی اور ایک ڈپٹی سیکرٹری۔ گویا آگے کنواں پیچھے خندق۔ میں جلد از جلد گھر پہنچ کے کسی چکر کو شروع ہونے سے پہلے ہی ختم کرنے کا آرزومند تھا۔ میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ گھر پہنچوں تو ایک اسلحہ خانہ میرے پاس ہو اور ان میں وہ ریوالور بھی ہوں جن کے نمبر سے لائسنس

کا اور مالک کا نام و نشان معلوم کیا جا سکے۔ دوسری طرف میں اسلحہ نہر میں بھی غرق کرنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ ریوالور بہت بڑی طاقت بننے کا ذریعہ تھے۔ پاکستان میں ایک ریوالور حاصل کرنا بھی جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا۔ اگر درے سے دیسی ساخت کا ریوالور اسمگل کر کے لایا جائے تو اس میں بھی پکڑے جانے یا نکل آنے کے امکانات ففٹی ففٹی رہتے ہیں۔ بلاشبہ دیسی ریوالور ناسہون فن کے تجربہ کا شاہکار ہوتے ہیں اور انگلش ریوالور سے کسی طرح کوالٹی میں کم نہیں ہوتے مگر انہیں لاہور تک پہنچانا بھی اتنا ہی دشوار اور پُرخطر ہوتا ہے جتنا تیرنا سیکھے بغیر دریا پار کرنے کی کوشش کرنا۔ اس کے علاوہ میں نے یہ بھی سنا تھا کہ اب وقت کے تقاضوں نے اس کاروبار میں بھی ایمانداری کو غیر ضروری بنا دیا ہے۔ جو لوگ درے کا ریوالور فراہم کرتے ہیں وہی پولیس کو مخبری بھی کر دیتے ہیں۔ پھر دُہرا فائدہ ہوتا ہے۔ ریوالور اسمگل کرنے کی کوشش کرنے والا پکڑا جاتا ہے تو حسب توفیق سو پیاز اور سو جوتے کھا کے یا سو سو کے نوٹ اور ریوالور دے کر جان چھڑاتا ہے۔ ریوالور واپس اسی کے پاس پہنچ جاتا ہے جس نے فراہم کیا تھا اور پولیس آدھی قیمت مال پہنچانے کے بدلے وصول کرتی ہے۔ وہی ریوالور پھر فروخت ہوتا ہے اور یہ سلسلہ یونہی چلتا رہتا ہے۔

ان سب باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے یہ ریوالور اپنے پاس رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ کسی جگہ ضرورت پڑنے پر ہم اپنی جان بچانے کے لیے کسی کو مار کے نکل آنے پر مجبور ہو جاتے تو آلۂ قتل وہیں چھوڑ آتے۔ تفتیش ہوتی تو پولیس اس کے مالک کا سراغ لگاتی، ہمارا نہیں۔ ہمارے حریف وہ بدنام مجرم تھے جو عیاری، مکاری، جھوٹ اور فریب۔ دغابازی اور بدمعاشی کے تمام حربے بے دریغ استعمال کرتے تھے۔ اپنی طاقت میں خود کو فرعون کی طرح (نعوذ باللہ) خدا سے کم نہیں جانتے تھے اور اپنی دولت کی بالادستی کے غرور میں ساری خدائی کو قابلِ خرید سمجھتے تھے۔ ہم اب تک ان پر اچھی طرح واضح کر چکے تھے کہ لوہے کو لوہا ہی کاٹتا ہے اور اگر وہ سیر ہیں تو ہم بھی سوا سیر ہیں۔ اگر ہم نے ان کا غرور نہیں توڑا تھا تو اتنا ضرور کیا تھا کہ انہیں اپنے برابر کا شکاری ہونے کا یقین ضرور دلا دیا تھا۔ پہلے وہ خود کو ببر شیر سمجھتے تھے تو ہمیں چوہے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ یہ ضروری تھا کہ ان پر نفسیاتی دباؤ برقرار رکھا جائے اور یہ احساس بھی ختم نہ ہو کہ ہم ان سے ذرا بھی خوفزدہ نہیں اور اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی صلاحیت میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ ہم ریوالور سے کسی کی جان لیں۔ سب سے پہلے تو یہ ہمارے اپنے دفاع کا مؤثر ذریعہ تھے۔ پھر یہ کہ حالات سے

فائدہ اٹھانے میں مددگار ثابت ہو سکتے تھے۔ جیسے دشمن نے محض حالات کی شہادت سے مجھے قاتل بنا دیا تھا، ایسے ہی موقع ملنے پر میں بھی یہ کر سکتا تھا کہ دلاور یا ——— سراج کے اپنے ریوالور کو کسی جگہ بطورِ ثبوت چھوڑ دوں اور پھر ایسے حالات پیدا کر دوں کہ قانون صرف انہیں گرفت میں لے۔ سرِدست مسئلہ یہ تھا کہ میں یہ اسلحے کا ذخیرہ کہاں چھپاؤں جہاں سے وقتِ ضرورت اس کا حصول بھی آسان ہو۔

رضوی صاحب کے گھر کے پاس پہنچ کے یہ مسئلہ حل ہو گیا۔ مجھے اس جگہ کا خیال آیا جہاں میں نے ایک ریڈیو ٹرانسمیٹر دفن کیا تھا۔ یہ جگہ اس کوارٹر کے عقب میں تھی جہاں پہلے ہمارے ساتھ کے دوسرے کمرے میں ایک کانسٹیبل مقیم تھا۔ ہم نے اسے تھانیدار بنوانے کے چکر میں ڈال کے اپنے جوتے تک صاف کرائے تھے اور بالآخر گھر سے بیدخل کرا دیا تھا۔ اس کی جگہ شہلا کی ماں نے لی تھی مگر اس کا قیام کتنا مختصر تھا۔ ایک بار پھر چشمِ تصور سے میں نے وہ کار کا ڈھانچہ دیکھا جس میں دو انسانی ڈھانچے آخرِ شب اس انتظار میں تھے کہ صبح ہو تو اجالا دنیا کو ان کے انجام کی خبر دے۔ ابھی نہ سہی چند گھنٹوں میں شہلا کو بھی معلوم ہو جائے گا کہ وہ جنم دینے والی ماں کے بعد ممتا دینے والی ماں سے بھی محروم ہو چکی ہے۔ عدنان، اوباش قسم کا آدمی تھا جس سے شہلا کی جذباتی وابستگی سطحی رہی مگر جس عورت نے اسے پرورش کیا تھا، اسے زندہ رکھنے کے لیے بھرپور جدوجہد کی تھی، عزم و حوصلہ دیا تھا اور زمانے کی کڑی دھوپ سے بچائے رکھنے کے لیے محبت اور شفقت کا ٹھنڈا سایہ دیا تھا، اس کی یہ المناک موت ایک ایسا جذباتی سانحہ ہوگی جس کی شدت اسے لہو رلائے گی اور جس کی کسک برسوں باقی رہے گی۔ بے شک وقت ہی سب سے بڑا چارہ گر ہے جو درد کے ہر زخم کا درماں بن جاتا ہے مگر وقت تو گزرتے گزرتے ہی گزرتا ہے۔ یہ آدمی کے اختیار میں نہیں کہ وہ احساس کو وقت کی رفتار سے آگے لے جائے اور سالوں کے زخم لمحوں میں مندمل ہو جائیں۔

رضوی صاحب کے گھر کا ہر کمرہ روشن تھا جس سے صاف ظاہر تھا کہ درونِ خانہ ہنگامہ برپا ہے اور اس ناگہانی افتاد سے پیدا ہونے والی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے عملی اقدامات زیرِ غور ہیں۔ اس ہنگامی اجلاس میں شہلا بھی یقیناً شریک ہو گی۔ میں نے ساتھ والی کوٹھی میں داخل ہو کے سوچا اور سایۂ دیوار میں چوروں کی طرح چلنے لگا۔ مکین ہنوز لذتِ خوابِ سحر میں کھوئے ہوئے تھے۔ مجھے ان کی خوش بختی پر رشک آیا جن کے دن غمِ جہاں کے لیے اور کاروبارِ حیات کی جدوجہد کے لیے وقف تھے مگر راتیں صرف غمِ جاں کے لیے تھیں۔ نیند اُن کی ہے، خواب ان کے ہیں، راتیں ان کی ہیں جن کے خیالات پر خوف کی یلغار نہیں، جن کی ہر رات ایک فصیل ہے جو انہیں تفکرات سے تحفظ فراہم کرتی ہے، دن بھر کی تھکن کے بعد آسودگی کے لیے فرصت فراہم کرتی ہے کہ وہ صبح اٹھیں تو زندگی کے ایک نئے پُرامید اور پُرمسرت دن کے آغاز کے لیے ان کے پاس توانائی اور ذہنی یکسوئی کا نیا ذخیرہ ہو۔

دیوار کے آخری گوشے تک پہنچ کے میں رضوی صاحب کے گھر میں سرونٹ کوارٹر کے پیچھے کود گیا۔ کوارٹر کے پیچھے اندھیرا تھا مگر دو کمروں کی بند کھڑکیوں کے شیشوں سے اندر کی روشنی باہر بھی پہنچ رہی تھی۔ اس اُجالے میں میرے لیے وہ جگہ تلاش کرنا آسان ہو گیا جہاں میں ریوالور دفن کرنا چاہتا تھا۔ وہ زمین ابھی زیادہ سخت نہیں ہوئی تھی مگر صرف ہاتھوں کی مدد سے ایک فٹ گہرا گڑھا بنانا بہرحال آسان نہیں تھا۔ کچھ سوچ کر میں نے کھڑکی کے ایک شیشے میں سے اندر جھانکا۔ میں براہِ راست روشنی کی زد میں نہیں تھا چنانچہ میرا سایہ شیشے پر نہیں آ سکتا تھا۔ یہ شہلا کے کمرے کی کھڑکی تھی۔ اس کا پلنگ خالی تھا اور اوپر سو واٹ کا بلب روشن تھا۔ نہ جانے کیوں میں نے دوسرے کمرے کے اندر بھی دیکھا۔ چند سیکنڈ تک میں اس پلنگ کو گھورتا رہا جو اب کسی خالی قبر کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ اوپر جلنے والا چالیس واٹ کا بلب اپنی زرد اُداس روشنی سے کمرے کی ویرانی کے تاثر کو گہرا کر رہا تھا اور اس کے ماحول کو پُرآسیب بنا رہا تھا۔

میں گھوم کر سامنے والے حصے کی طرف گیا اور کھلے دروازے سے گھر میں داخل ہو گیا۔ یہ وہی گھر تھا جہاں میں رہتا تھا مگر اس وقت مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کسی مقبرے میں قدم رکھ رہا ہوں یا اس کمرے میں تنہا کھڑا ہوں جہاں سے ابھی ابھی کوئی میّت اٹھائی گئی ہے۔ اس گھر کی دیواریں تک میرے لیے اجنبی ہو گئی تھیں اور مجھے یوں گھور رہی تھیں جیسے زبانِ خاموشی سے پوچھ رہی ہوں کہ آ گئے سورما! بڑے دعوے اور طمطراق سے گئے تھے۔ پھر اب تمہارے ہاتھ خالی اور تمہارا چہرہ احساسِ شکست کی تصویر اور تمہارا دل ویران کیوں ہے ؟

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر باورچی خانے میں سے ایک چھری لے کر نکل آیا۔ زمین کے سینے میں یہ خنجر پوری قوت سے اتار کے میں نے ایک بہت بڑا گھاؤ پیدا کر دیا لیکن یہ گھاؤ بھی مجھ پر خندہ زن رہا۔ یہ دشمن کا سینہ نہیں، مٹی ہے جو زندگی کو نمو بھی دیتی ہے اور اپنے جیسا بھی کر دیتی ہے۔ وہ گڑھا اور اس کے قریب لگے ہوئے مٹی کے ڈھیر کو دیکھ کر مجھے اپنے باپ کی خالی قبر یاد آ گئی۔ زمین بیک وقت کتنی مہربان اور کتنی بے رحم ہے۔ آدمی کو جینے

کے لیے کیا کچھ نہیں دیتی ـــــ رواں بہتے دریاؤں اور گنگناتے چشموں کا ٹھنڈا میٹھا پانی، سونا چاندی، تیل جو مشینوں کو متحرک رکھتا ہے اور پھر سب کچھ لے لیتی ہے۔ آدمی کا گوشت پوست اور ہڈیاں سب نگل جاتی ہے۔ کتنے وزیر خان ہیں جن کے بے نشان مدفنوں کی خبر نہیں دیتی اور ان کے بے گناہ لہو کا سراغ نہیں دیتی۔ زلزلوں سے اور سیلابوں سے بستیاں فنا کر دیتی ہے۔ تہذیبوں کو مٹا دیتی ہے۔ بیکراں سمندروں اور صحراؤں میں ایٹمی دھماکوں کے لیے گنجائش نکالتی ہے مگر روئے زمین پر پھولوں کے رنگ اور خوشبو کا جادو بھی جگاتی ہے۔

ریوالورں کو بحفاظت قابلِ استعمال رکھنے کے لیے مجھے پولی تھین یا سیلوفین جیسی چیز کی تلاش میں پھر اندر جانا پڑا۔ کوڑے کے ڈھیر میں سے جو شہلا نے جھاڑ دے کر ایک گوشے میں کر دیا تھا، مجھے ڈبل روٹی کے خالی بیگ ملے۔ میں نے ان کو جھاڑا اور ایک ایک تھیلی میں دو دو ریوالور اچھی طرح لپیٹ کر گڑھے میں اوپر تلے رکھ دیے۔ زمین برابر کرنے میں مجھے پانچ منٹ بھی نہیں لگے۔ مٹی کو پیروں سے دبا کر میں نے اس کے اوپر خشک پتے اور گھاس پھونس بکھیرا اور اس جگہ کو بالکل ایسا ہی کر دیا جیسا آس پاس کا علاقہ تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ قانونی کارروائی ہونے تو رضوی صاحب سرونٹ کوارٹر کے پیچھے بھی تفتیش کے لیے ضرور آئیں گے۔ وہ میرے نقشِ قدم بھی دیکھیں گے اور وہ جگہ بھی جہاں سے میں کودا تھا۔ غنیمت یہ تھا کہ میں نے باٹا کے آٹھ نمبر لیدر سول جوتے پہن رکھے تھے جو نیچے سے بالکل چکنے تھے۔ اگر سول پر کوئی پرنٹ ہوتا تو میں پکڑا جاتا اور رضوی صاحب مجھ سے پوچھ گچھ ضرور کرتے لیکن اب جو نشانات بنے تھے ان سے کچھ معلوم نہیں ہو سکتا تھا۔ شہر میں ہزاروں افراد اسی سائز کے ایسے ہی جوتے پہنے پھر رہے تھے۔ اس کے علاوہ مجھے انکل شیروانی اور فوزیہ کے بیانات کا تحفظ بھی حاصل تھا جس کے مطابق میں ہنوز دشمن کی قید میں تھا۔ رضوی صاحب کا ذہن میری طرف جا ہی نہیں سکتا تھا۔

حفظِ ماتقدم کے طور پر میں نے براہِ راست اندر جانے سے گریز کیا اور لوٹ کر اس راستے پر بھی نہیں گیا جس سے اندر آیا تھا۔ میں نے مخالف سمت کا رخ کیا اور دوسری طرف والی کوٹھی کو جدا کرنے والی دیوار عبور کر گیا۔ اب اگر نقوشِ قدم دیکھے جاتے تب بھی یہی نتیجہ اخذ کیا جاتا کہ ملزم ایک طرف سے آئے اور دوسری طرف سے نکل گئے۔ دوسری طرف قدِ آدم گھنی جھاڑیوں کی باڑھ تھی جو مین گیٹ تک چلی گئی تھی لیکن خشک ہو رہی تھی۔ اس میں سے گزرتے ہوئے میرے ہاتھوں پر اور چہرے پر خراشیں آئیں اور میرے کپڑے پھٹے لیکن میں نے پروا نہیں کی۔ یہ ظاہری حالت میرے بیان کی صداقت کا منہ بولتا ثبوت ہوگی۔ وہ قمیص جس میں ریوالور بندھے ہوتے تھے اب بھی میرے پاس تھی۔ اسے میں نے سڑک پر آتے ہی پھینک دیا۔ مجھے یقین تھا کہ کچھ دیر میں دن نکلنے سے پہلے ہی سڑک پر لوگوں کی آمدورفت شروع ہو گی تو پہلا ضرورت مند اس بیش قیمت قمیص کو فوراً اٹھا لے گا اور سب کی نظریں بچا کر بغل میں دبا کے فوراً رفوچکر ہو جائے گا۔

میں نے بڑی ڈرامائی "انٹری" دی۔ میں آہستہ سے دروازہ دھکیل کر بھی اندر جا سکتا تھا مگر میں نے باہر ہی سے چلانا شروع کیا۔ "انکل شیروانی! انکل رضوی! محسن۔۔۔" اور پھر اس سے پہلے کہ وہ سب باہر لپکتے، میں دھڑام سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ میرا تصادم رابعہ سے ہوا جو شاید سب سے پہلے بھاگی تھی۔ وہ نیچے گری اور رضوی صاحب نے اسے سنبھال لیا۔ میں بہت زور زور سے سانس لے رہا تھا جیسے سارا فاصلہ میں نے دوڑ کر طے کیا ہو۔

"آپ۔۔۔ آپ۔۔۔ اور فوزیہ۔۔۔" میں نے ہانپتے ہوئے کہا اور دیوار تھام لی۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ کمرے میں سب لوگ موجود ہیں۔ رابعہ اور فوزیہ کی آنکھوں میں آنسو ہیں اور ان کے چہرے غم و اندوہ اور خوف سے نڈھال ہیں۔ انکل شیروانی کی حالت بھی ایسی تھی جیسے ان پر دل کا دورہ پڑا ہے۔ صرف محسن اور انکل رضوی پُرسکون تھے مگر تفکرات کے آثار ان کی صورت پر بھی عیاں تھے۔

"خدا کا شکر ہے تم آگئے۔" انکل شیروانی نے ہاتھ اٹھا کے کہا۔ "ہمیں تو وہ بدمعاش خود ہی چھوڑ گئے تھے۔"

"تم ٹھیک تو ہونا سکندر!" فوزیہ اور رابعہ نے ایک ساتھ کہا۔ دونوں کے الفاظ ایک تھے۔ الفاظ کے جذبے ایک سے تھے، لہجہ ایک تھا اور لہجے میں تشویش کے ساتھ اطمینان کا احساس ایک تھا۔ ان دونوں کو بیک وقت اپنے اپنے دل کی بے تابی کا اور اپنے جذبات پر اپنے اختیار کے نہ ہونے کا احساس ہوا مگر اس میں رقابت کی خلش نہیں، صرف خلوص اور اپنائیت کا انداز تھا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔" میں نے ان دونوں کو خفت سے بچانے کے لیے ان کی طرف دیکھے بغیر کہا اور کرسی پر گر گیا۔ "شہلا کہاں ہے؟"

"وہ دوسرے کمرے میں سو رہی ہے۔" انکل رضوی نے متانت سے کہا۔ "تمہاری آنٹی نے اس کے ہوش میں آنے سے پہلے ہی ڈاکٹر کو طلب کر لیا تھا اور اب وہ سو رہی ہے۔" انہوں نے رابعہ اور فوزیہ کو اشارہ کیا۔ "تم لوگ جاؤ، کچھ چائے وغیرہ بنا لاؤ۔"

"میری امی کا کیا بنا سکندر بھائی؟" شہلا نے اچانک دروازے میں نمودار ہو کے کہا۔ "آپ ان کو لینے گئے تھے۔"

ایک لمحے کے لیے سب کو سانپ سونگھ گیا۔ غالباً میری آواز نے شہلا کے لاشعور کو بھی جھنجوڑ دیا تھا اور اسے کوئی خواب آور دوا دی گئی تھی تو اس کا اثر زائل ہو گیا تھا مگر وہ اب بھی دروازے میں یوں کھڑی تھی کہ لگتا تھا سو رہی ہے۔ اس کی آنکھیں اپنے سامنے دیوار پر مرتکز تھیں جہاں کھڑکی کے شیشوں سے صبح کی سفیدی جھلکنے لگی تھی۔

"وہ بالکل ٹھیک ہیں۔" میں نے مسکرا کے کہا۔ "خدا کا شکر ہے میں وقت پر پہنچ گیا۔"

"آپ انہیں لے کر کیوں نہیں آئے؟" شہلا نے پلک جھپکائے بغیر سپاٹ لہجے میں کہا۔

"ان کی حالت ایسی نہیں تھی کہ میں ان کو یہاں لاتا۔" میں نے اسی بے ساختگی سے کہا۔ "میں انہیں ہسپتال لے گیا تھا جہاں ڈاکٹروں نے انہیں داخل کر لیا ہے۔ ایک دو دن میں گھر لوٹ آئیں گی۔ شام کو۔۔۔"

"آپ جھوٹ بول رہے ہیں سکندر بھائی!" شہلا نے میری بات کاٹ کر کہا۔

"یہ شک تمہیں کیسے ہوا بے وقوف؟" میں نے اس کے وار سے سنبھل کے کہا۔

"اس لیے کہ آپ نے عدنان کے بارے میں اسی اعتماد کے ساتھ ان سے جھوٹ بولا تھا۔" شہلا نے کہا۔

"وہ۔۔۔ ان کی بات اور تھی۔" میں نے اس کی منطق سے بوکھلا کے کہا۔ "تم تو ماشاءاللہ سمجھدار ہو۔"

"اسی لیے تو پوچھ رہی ہوں کہ مجھ سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"رابعہ!" رضوی صاحب نے سخت لہجے میں کہا۔ "یہ فضول بحث کا وقت نہیں ہے۔ اسے اندر لے جاؤ اور دوا دے دو۔"

"کون سی دوا؟" شہلا نے رابعہ سے بازو چھڑا لیا۔ "جھوٹ کو سچ بنانے کی دوا؟ حقائق سے بے خبر رکھنے کے لیے آنکھیں بند کر دینے والی گولی؟ نہیں انکل! میں بھی آپ سب میں شامل ہوں۔ مجھے بھی یہ حق حاصل ہے کہ جو آپ سب جانتے ہیں وہ مجھے بھی معلوم ہو۔ مجھے سُلا سُلا کر آپ کب تک حقیقت کو چھپائیں گے؟"

"دیکھو شہلا! تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" محسن اور رابعہ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔" وہ ان کے بیچ میں سے نکل کے وسط میں آگئی۔ "آپ سب لوگ خوفزدہ نہ ہوں، میں وعدہ کرتی ہوں کہ بڑی سے بڑی خبر سن کے بھی چیخ نہیں ماروں گی، بیہوش ہو کے نہیں گروں گی، پاگل ہو کے کپڑے نہیں پھاڑوں گی اور بڑی سے بڑی خبر کیا ہو سکتی ہے؟ یہی نا کہ جو انہیں اٹھا کے لے گئے تھے ان بے ضمیروں نے انہیں مار دیا۔ وہ پہلے بھی زندہ ہی کہاں تھیں کہ کوئی ان کو مار کے جری کہلائے یا مجھے صدمہ ہو کہ وہ کیوں مر گئیں۔ انہیں تو بہت پہلے مر جانا چاہیے تھا۔"

"آل رائٹ۔ آل رائٹ۔" انکل رضوی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے شفقت سے تھپکی دی۔ "بیٹھ جاؤ۔ ابھی خود ہمیں بھی کچھ معلوم نہیں۔ سکندر نے ابھی تک کچھ نہیں بتایا۔" انہوں نے شہلا کو ایک کرسی پر شیروانی صاحب کے ساتھ بٹھا دیا۔

"سکندر بھائی! کہہ دیجیے کہ آپ نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا اور وہ مر چکی ہیں۔" شہلا نے اسی سکون سے کہا۔

اس کی طرف دیکھے بغیر میں نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا اور پھر۔۔۔ ذرا سی دیر کے لیے اس کمرے میں موجود تمام افراد صرف پتھر کے بت بنے رہ گئے جن کی ساکت نظریں مجھ پر مرتکز تھیں۔

"میں نے کہا تھا کہ چائے لاؤ۔" رضوی صاحب نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "شہلا کو اور سکندر کو بلیک کافی دو، اسٹرانگ۔ تم اندر جا کے ہاتھ منہ دھو لو۔" وہ مجھ سے مخاطب ہو کے بولے۔ "اور کپڑے بدل کے آؤ۔ پانچ دس منٹ کی تاخیر سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ یہ ضروری ہے کہ ہم سب بات کرنے اور سمجھنے کے قابل ہوں۔"

ٹھیک دس منٹ بعد میں بدلے ہوئے حلیے میں واپس پہنچا تو کمرے میں انکل شیروانی اور رضوی کے علاوہ شہلا بھی بالکل اپنی اپنی جگہ اسی طرح خاموش بیٹھے تھے۔ شہلا کا چہرہ بدستور سپاٹ تھا۔ شیروانی صاحب اضطراب میں پہلو بدل رہے تھے اور صرف رضوی صاحب تھے جو پُرسکون نظر آتے تھے۔ وہ سگریٹ کے کش لے کر کچھ سوچنے میں محو تھے۔

"شیروانی صاحب سے مجھے کوئی خاص بات معلوم نہیں ہو سکی۔" رضوی صاحب نے اچانک سگریٹ کو کھڑکی سے باہر اُچھال کے کہا۔ "انہوں نے کسی کی صورت نہیں دیکھی، سوائے اس کے جو پولیس کی وردی میں میرا ڈرائیور بن کے پہنچا تھا۔"

"میں نے تو اس کی صورت پر بھی غور نہیں کیا۔" شیروانی صاحب نے خفت سے کہا۔ "وردی میں سب ایک جیسے لگتے ہیں۔ بس اتنا یاد ہے کہ وہ دُبلا پتلا اور درمیانے قد کا آدمی تھا۔"

"آپ نے ان میں سے کسی کو نہیں دیکھا؟" میں نے تعجب سے کہا۔ "ملاوہ۔۔۔ ڈی سلوا اور دوسرے لوگوں کو؟"

شیروانی صاحب نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ۔۔۔ وہ خبیث

ڈرائیور۔۔۔ وہ مجھے سیدھا اس کمرے میں لے گیا تھا۔ وہاں دو آدمی اور بھی تھے مگر انھوں نے منہ پر نقاب ڈال رکھے تھے۔ ڈرائیور نے ریوالور نکال لیا، ایک نے فوزیہ کو باندھ دیا، دوسرے نے مجھے۔"

"واپسی میں تو آپ نے غور کیا ہوگا۔۔" میں نے کہا۔

"کیا تم نے دیکھا نہیں تھا؟ انھوں نے ہماری آنکھوں پر ٹیپ چپکا دیے تھے۔" شیروانی صاحب نے کہا۔

"اوہ۔ دراصل۔۔۔ آپ لوگ جب میرے سامنے سے گزرے تو۔۔۔ تو میں نے صرف پشت دیکھی تھی۔" میں نے کہا۔

"ایک نے کہا تھا کہ خاموشی سے نکل چلو۔ حلق سے آواز بھی نکالی تو۔۔۔ وہ مارا جائے گا۔" شیروانی صاحب نے کہا۔ "اس نے گالی دے کر تمہارا نام لیا تھا۔ دوسرے نے کہا خطرہ مول مت لو۔ ان کو ٹھنڈا کر کے لے چلو۔ غالباً اس کی مراد بیہوش کرنے سے تھی لیکن میں نے کہا کہ میں وعدہ کرتا ہوں، خاموش رہوں گا اور فوزیہ بھی خاموش رہے گی لیکن تم بھی خدا کو حاضر ناظر جان کے وعدہ کرو کہ بعد میں سکندر کو کچھ نہیں ہوگا۔"

"آپ بہت سادہ لوح ہیں انکل!" میں نے کہا۔ "وہ آپ کی بات پر ضرور ہنسے ہوں گے۔"

"ہاں۔ خبیث ہنسنے لگے مگر اتنا ضرور ہوا کہ وہ ہمیں ایسے ہی نکال لائے، بغیر ناک آؤٹ کیے۔" شیروانی صاحب نے کہا۔

"آپ نے ان سے پوچھا نہیں کہ اب کہاں لے جا رہے ہو؟ اور یہ اچانک ارادہ کیسے بدل گیا؟" میں نے کہا۔

"پوچھا تھا۔ ایک بدمعاش کہنے لگا، ٹرٹر مت کرو۔" شیروانی صاحب نے کہا۔ "ہم کو باس کا حکم ہے کہ تمہیں ایس ایس پی کے گھر چھوڑ آئیں۔ ہمارا ارادہ بدل گیا تو اوپر پہنچا دیں گے۔ اللہ میاں کے گھر۔"

"انکل۔ آپ تو پہلے بھی لاہور آ چکے تھے۔" میں نے کہا۔ "جب ڈرائیور نے راستہ بدلا تو آپ نے نوٹ نہیں کیا؟"

"بھئی۔۔۔ پہلے تو وہ سیدھے راستے پر چلتا گیا۔ ریلوے اسٹیشن سے گڑھی شاہو کی طرف۔" شیروانی صاحب نے کہا۔ "پھر میں اور فوزیہ باتیں کرنے لگے۔ محسن کی طرف سے ہمیں تشویش تو تھی اور ہماری سے زیادہ مجھے اس بات کی فکر تھی کہ کہیں وہ کسی مشکل میں گرفتار نہ ہو۔ یہاں تمہارے حالات ہی ایسے ہیں۔ بس اسی میں چند منٹ گزر گئے۔ پھر جب میں نے دیکھا تو کار ایک خاصی ویران سڑک پر سے گزر رہی تھی۔ شالیمار باغ والی سڑک تھی غالباً۔ میں نے ڈرائیور سے کہا کہ یہ کدھر جا رہے ہو تو اس نے ریوالور نکال لیا اور بولا، ٹرٹر مت کرو۔ گاڑی کے شیشے اندر سے نہیں کھولے جا سکتے تھے۔ یہ احساس ہمیں بہت بعد میں ہوا۔ ہم تو سمجھے تھے کہ ایئرکنڈیشنڈ گاڑی ہے اس لیے شیشے بند ہیں۔ ویسے بھی کار کی رفتار اتنی زیادہ تھی کہ ہم چھلانگ مارتے تو یہ خودکشی کے مترادف ہوتا۔"

"وہ۔ انکل اور فوزیہ کو اسی کوٹھی میں لے گئے تھے جو نواب خسرو جمشید نے رابعہ کو فروخت کی تھی۔" میں نے رضوی صاحب کو مطلع کیا۔ "اور وہاں ان کی پوری کمپنی موجود تھی۔" رابعہ اور فوزیہ چائے لے کر اندر آئیں اور خاموشی سے بیٹھ گئیں۔

"پوری کمپنی سے کچھ پتا نہیں چلتا۔ تم سب کو پہچانتے ہو؟" رضوی صاحب نے کہا۔

"جی۔ ایک تو وہی تھا ان کا سرغنہ۔" میں نے کہا۔ "بلکہ حقیقت یہ ہے کہ سرغنہ وہ بھی نہیں اور اس کا انکشاف بھی آج ہی ہوا ہے۔ اب تک میں سمجھتا تھا کہ سارے گروہ کی کمان چوہدری فلاور کے ہاتھ میں ہے۔ پھر مُندری والا تھا جس نے میرے یقین کے مطابق میر شرافت علی کو قتل کیا تھا، وہ شخص تھا جو خود کو نواب خسرو جمشید کہتا ہے اور اس کا نقشِ ثانی شوفر۔ یہ پتا چلانا بہت مشکل ہے کہ ان میں فرق کہاں ہے ـــــ وہاں ڈی سلوا تھا جو بالکل خاموش تھا۔ دو افراد اور بھی تھے جن کو میں نے پہلے نہیں دیکھا۔ مُندری والے اور ان دونوں افراد نے منہ پر سیاہی مل رکھی تھی اور ایک جیسے کپڑے پہن رکھے تھے۔ میر شرافت علی کا قاتل تو مُندریوں کی وجہ سے پہچانا گیا۔ باقی دو میں سے ایک شاید وہ ڈرائیور ہوگا جو انکل شیروانی کو اسٹیشن سے لے کر آیا تھا۔ ان تینوں کی حیثیت حکم کے غلام کی سی تھی۔"

"گویا سات آدمی تھے۔" رضوی صاحب نے غور کر کے کہا۔ "اور سرغنہ تمہارے خیال میں کون تھا؟"

"سرغنہ۔۔" میں نے قدرے تامل کے ساتھ کہا۔ "آپ کو سُن کر حیرانی بھی ہوگی اور افسوس بھی ہوگا۔ سرغنہ کوئی بدمعاش نہیں، ایک پولیس افسر ہے۔"

رابعہ نے سب کو چائے کی پیالی تھمائی۔

"ڈی ایس پی؟" رضوی صاحب نے چونک کر مجھے دیکھا۔ "کیا نام ہے اس کا اور تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ پولیس افسر ہے؟"

فوزیہ نے مجھے ایک مگ میں بلیک کافی بنا کے دی اور دوسرا مگ شملا کو پلانے لگی۔

"اس کا نام سراج ہے۔" میں نے کہا۔ "سراج دین یا سراج الدولہ یہ میں نہیں جانتا۔ وہاں جو لوگ موجود تھے وہ اسے سراج ہی کہہ رہے تھے اور اس کے سامنے بہت باادب، باملاحظہ ہوشیار نظر آتے تھے۔ تمام باتیں خود سراج نے کی تھیں اور وہی سب کو حکم دے رہا تھا۔ اس کے اطوار میں بھی ایک شاہانہ وقار، دبدبہ اور تمکنت کا انداز تھا، جو ممکن ہے اداکاری ہو مگر انہوں نے مجھ پر واضح کر دیا تھا کہ وہ پولیس افسر ہے۔"

"سراج؟" رضوی صاحب نے سوچتے ہوئے کہا۔ "کیا وہ وردی میں تھا؟"

"نہیں، لیکن میرا خیال یہ ہے کہ سراج واقعی پولیس افسر ہوگا۔" میں نے کہا۔ "مجھے ایک بات یاد ہے۔ جس رات مجھے چند گھنٹے حوالات میں گزارنے پڑے تھے تو مُندری والا وہاں آیا تھا اور ایس ایچ او میر محمد سے مل کر نکل گیا تھا لیکن میں نے اسے دیکھ کر پہچان لیا تھا کیونکہ لندن سے واپسی پر وہی مجھے ٹیکسی میں چراغ دین کی کوٹھی تک لایا تھا۔ وہی قتل کی شب میر شرافت علی کی کوٹھی کے باہر مجھے دوبارہ ملا تھا مگر یہ بعد کی بات ہے۔ جب میں قتل کے الزام میں حوالات میں بند تھا تو مجھے اس کی ایک جھلک دکھائی دی تھی اور میں نے بہت چیخ و پکار مچائی تھی کہ اسے پکڑو لیکن میر محمد نے پہلے تو صاف انکار کر دیا کہ اس سے کوئی مُندری والا مل کر گیا ہے۔ معلوم نہیں وہ کیا پیغام لایا تھا اور کیا دیکھنے آیا تھا۔ میرے اصرار پر میر محمد نے مجھ پر تشدد کیا اور صاف کہا کہ اعترافِ جرم تو مجھے کرنا ہی پڑے گا کیونکہ ڈی ایس پی صاحب یہ چاہتے ہیں۔ پہلے اس نے اے ایس پی کہا تھا اور ہو سکتا ہے عمداً ڈی ایس پی کو اے ایس پی کہا ہو یا اس وقت سراج اے ایس پی ہی ہو۔ اس کی ترقی بعد میں ہوئی ہو۔"

"یہ میں معلوم کر لوں گا۔" رضوی صاحب نے سر ہلا کے کہا اور خالی کپ میز پر رکھ دیا۔

"مقصد مجھے صرف یہ بتانا تھا کہ اس معاملے میں ایک اعلیٰ پولیس افسر کے احکامات کیا ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور میرے لیے تباہی کی کوئی صورت نہیں۔ بعد میں ایک اور واقعہ پیش آیا تھا آپ کو یاد ہوگا کہ جس دن رابعہ کی والدہ کا انتقال ہوا تھا اس رات ہمارے قبضے میں دشمن کا ایک آدمی تھا اور ہمارا خیال تھا کہ اس سے بہت کچھ معلوم کیا جا سکتا ہے۔"

"مجھے یاد ہے، تم نے اور محسن نے جو کارنامہ انجام دیا تھا۔" رضوی صاحب نے طنز آمیز تلخی سے کہا۔ "اسی حماقت کے باعث رابعہ کا گھر بھی تباہ ہوا تھا اور جنازے میں شریک ہونے والے چند افراد کی گاڑیاں بھی تباہ ہوئی تھیں۔ اخبارات نے ایک اسکینڈل کھڑا کر دیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ میرا نام نہیں آیا ورنہ ملوث تو تم نے مجھے بھی کر لیا تھا، بلاوجہ۔ میں نے بڑی مشکل سے نوکری بچائی تھی اپنی۔ کیا ملا تھا تمہیں اس سے؟" وہ غصے میں آنے لگے تھے۔

"میں اپنی حماقت کا اعتراف کرتا ہوں انکل!" میں نے نظر جھکا کر کہا۔ "اور ان تمام نقصانات کی ذمے داری بھی قبول کرتا ہوں جو میرے اور محسن کے غلط اقدام کا نتیجہ تھے لیکن ہمیں اس شخص سے ایک کام کی بات معلوم ہو گئی تھی۔"

"وہ تو۔۔۔ شاید کچھ بتائے بغیر ہی مر گیا تھا۔"

"نہیں انکل! ہم نے کچھ غلط بیانی بھی کی تھی آپ سے۔" میں نے خفت سے کہا۔ "مرنے سے پہلے اس نے ایک نام لیا تھا، سراج۔ اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں کہہ سکا تھا۔ میری سمجھ میں یہی آیا تھا مگر مجھے شبہ تھا کہ اس نے راج کہا ہے یا سروج کہا ہے۔ سروج تو ہو نہیں سکتا تھا اور خراج بھی مشکل تھا۔ راج گڑھ یہاں کے ایک علاقے کا نام ہے۔ ہم نے اس سے پوچھا تھا کہ اسے مارنے والا کون ہے؟"

"اس نے ایک لفظ اور بھی بولا تھا، کرامت۔" محسن نے مجھے یاد دلانے کے لیے لب کھولے۔

"ہاں۔ اور بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ راج گڑھ میں ایک کرامت اسٹریٹ ہے۔" میں نے کہا۔ "جو مسلم پارک سے شروع ہوتی ہے۔ وہاں سے دوسری گلی سیدھی چوبرجی پر جا نکلتی ہے۔"

"تو گویا تمہارے خیال میں یہ ڈی ایس پی سراج وہیں رہتا ہے؟" رضوی صاحب نے کہا۔ "راج گڑھ کی کرامت اسٹریٹ میں؟ اس سے کچھ مدد مل سکتی ہے؟"

"جی۔ لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ مرنے والا کیا بتانا چاہتا تھا۔" میں نے کہا۔ "یہ کہ ڈی ایس پی سراج وہاں رہتا ہے یا وہاں ان کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ اس گلی میں تو پچاس سے زائد مکان ہوں گے اور وہاں عام قسم کے شریف لوگ رہتے ہیں۔ پرانی آبادی ہے۔ بیشتر غریب اور نچلے طبقے پر مشتمل۔ ان جیسے بدمعاشوں کو جن کے پاس لاکھوں ہوں اور ناجائز ذرائع سے آمدنی کے دس ذرائع ہوں، وہاں رہنے کی کیا ضرورت ہے۔ ماڈل ٹاؤن، گلبرگ اور سمن آباد میں ان کے ہیڈ کوارٹرز ہو سکتے ہیں۔"

رضوی صاحب نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ لوگ گمنام علاقوں کو بھی اس لیے منتخب کر لیتے ہیں کہ سیدھے سادے لوگ کچھ نہیں سمجھتے اور وہاں ان کی موجودگی کی طرف کسی کا خیال بھی نہیں جاتا۔ خیر یہ مسئلہ اتنا اہم نہیں۔ کرامت اسٹریٹ کے دونوں کناروں پر سادہ کپڑوں میں پولیس کو پوسٹ کیا جا سکتا ہے اور ـــــــ سراج کا سراغ بھی لگایا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ یہ اس کا اصل نام ہو۔ تم اس کو دوبارہ دیکھو تو پہچان لوگے؟"

"بالکل پہچان لوں گا۔" میں نے یقین کامل کے ساتھ کہا۔ "وہ تقریباً چھ فٹ قد کا آدمی ہے۔ وزن شاید ڈیڑھ سو پونڈ کے لگ بھگ ہوگا چنانچہ جسم متناسب اور مضبوط لگتا ہے۔ پیچھے کی طرف بال بناتا ہے۔ بالوں کا رنگ بالکل سیاہ نہیں ہے بلکہ شنی

میں ہلکا سا بھورا رنگ جھلکتا ہے۔ آنکھیں بھی ہلکی سی سبز جھلک دیتی ہیں اور آپ اسے شاعری نہ سمجھیں تو کہوں کہ بالکل کسی گہری جھیل کی طرح ساکت نظر آتی ہیں۔ ہر وقت سوچ میں ڈوبی ہوئی۔ رک رک کر ایک ایک لفظ صاف ادا کرتا ہے۔ لہجہ مدھم رکھتا ہے اور عادتاً سر کے بالوں کو ہاتھ پھیر کر جمانے کی غیرارادی حرکت میں مصروف رہتا ہے۔ چہرہ کچھ لمبوترا اور ناک قدرے ستواں۔۔۔۔"

"اتنا کافی ہے۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "بعد میں نوٹ کرا دینا۔ پہلے یہ بتاؤ کہ یہاں سے جانے کے بعد کیا ہوا؟"

"وہی جو اُن کے پیغام میں تھا۔" میں نے کہا۔ "آپ نے دیکھ لیا ہو گا کہ انہوں نے کسی کہانی کا ایک صفحہ پیغام کا مفہوم واضح کرنے کے لیے کس طرح استعمال کیا تھا لیکن ہم سو فیصد ان کے پلان کے مطابق نہیں تھا۔ مجھے باہر کوئی سلیٹی رنگ کی کار نہیں ملی۔ میں ابھی مشکل سے پچاس قدم گیا تھا کہ پیچھے سے آنے والی ایک سفید کار نے میرے قریب آ کے بریک لگائے اور اس کی رگڑ سے میں گر گیا۔ وہ مجھے کار میں ڈال کے لے گئے اور راستے میں ریوالور کا بٹ مار کے بیہوش کر دیا۔ کار کے اندر شیشوں پر بھی سیاہ پینٹ تھا یا سیاہ کاغذ چپکا دیا گیا تھا مگر میں نے اس کوٹھی کو اندر سے دیکھا تو پہچان لیا۔"

"اور وہاں ان سے کیا بات ہوئی؟" رضوی صاحب نے کہا۔ "تمہیں لے جانے کا مقصد کچھ تو ہو گا؟"

"انہوں نے پرانے مطالبے دُہرائے۔ یعنی میں کاروبار سے اور حقِ وراثت سے دستبردار ہو جاؤں۔" میں نے کہا۔ "اپنی سابقہ پیش کش کا اعادہ کیا لیکن تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ۔ اب وہ مجھے ایک مالک کی حیثیت دینے پر تیار ہیں۔ میرے نقصانات کی تلافی پر بھی آمادہ ہیں۔ ظاہر ہے یہ سب اس شرط پر کہ میں صرف منافعے سے سروکار رکھوں۔ کاروبار کی نوعیت سے نہیں دخل در معقولات نہ کروں اور ایک طرح سے 'سلیپنگ پارٹنر' رہوں۔ میں نے کہہ دیا کہ مجھے اپنا سب کچھ دینا منظور ہے۔ بدلے میں مجھے صرف میرا باپ دلایا جائے۔ اس کے بعد مذاکرات کی گنجائش ہی نہ رہی۔" میں خاموش ہو گیا۔

"اور انہوں نے پہلے شیروانی صاحب اور فوزیہ کو چھوڑ دیا پھر تمہیں گھر لوٹ جانے کی اجازت دے دی؟" رضوی صاحب نے کہا۔

"نہیں۔ ایسے تو نہیں۔" میں نے کہا۔ "میں موقعے کی تاک میں تھا اور قدرت کو مجھے بچانا منظور تھا۔ اچانک سراج میرے قابو میں آ گیا۔ وہ گولی مارتے تو اس کو لگتی۔ اس کے باوجود وہ اپنی شکست تسلیم کرنے پر تیار نہ تھے۔ مجبوراً مجھے ان پر انہی کے حربے آزمانے پڑے۔"

"کیا؟ تم نے سراج کو۔۔۔ مار دیا؟" شیروانی صاحب نے پریشان ہو کے کہا۔

"نہیں انکل! میں نے ان کو نوٹس دیا کہ آپ کو بخیر و عافیت گھر پہنچا دیا جائے۔" میں نے کہا۔ "سراج کی ایک کلائی پہلے ہی ٹوٹ گئی تھی، مزاحمت کرتے ہوئے۔ میں نے ان کو تھوڑی سی مہلت دی اور وہ انکل کو چھوڑنے پر مجبور ہو گئے، دوسری کلائی ٹوٹنے کے بعد۔ اس کے بعد خود میرے نکلنے کا مسئلہ تھا۔ میں نے سراج کو ڈھال بنائے رکھا۔ اس کے ہاتھ تو بیکار ہو ہی چکے تھے۔ میں اس کی آڑ میں دروازے کی طرف بڑھا تو ان کا حوصلہ جواب دینے لگا۔ وہ مجھ پر حملہ کرنا چاہتے تھے مگر میں نے کہا کہ ہاتھوں کی ہڈیاں تو جُڑ جائیں گی لیکن کوئی آگے بڑھا تو سراج صاحب کی دونوں ٹانگیں اور ضروری ہوا تو گردن بھی توڑ دوں گا——— وہ بے بس ہو گئے اور میں سراج کو سامنے رکھ کے الٹا چلتا ہوا باہر نکل آیا۔ پچاس قدم بعد میں نے اسے دھکا دیا اور بھاگ لیا۔"

"شہلا کی ماں کے بارے میں؟" رضوی صاحب نے کچھ دیر بعد کہا اور شہلا کی طرف دیکھا۔ "تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"ان کی گفتگو سے۔" میں نے اپنے جھوٹ کو پوری طرح نبھاتے ہوئے کہا۔

"ہو سکتا ہے وہ محض تمہیں خوفزدہ کر رہے ہوں۔" رضوی صاحب نے کہا۔

"ہاں ہو سکتا ہے، لیکن مجھے امید کم ہے۔" میں نے متذبذب لہجے میں کہا۔

"تم نے اپنی آنکھوں سے کچھ دیکھا تھا، میرا مطلب ہے شہلا کی ماں کو؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "دیکھا تو نہیں۔۔۔ میں دیکھ بھی کیسے سکتا تھا؟"

یہ بات سچ تھی مگر سچ کے دو مفہوم ہو گئے تھے۔ ایک وہ جو میرے ذہن میں تھا، دوسرا وہ جو دوسروں نے سمجھا۔ "پھر تو امید کی جا سکتی ہے کہ شاید وہ ایک بوڑھی اور لاچار عورت کو بخش دیں۔" رضوی صاحب نے جملے کے آخری الفاظ بدل دیے۔ "قتل نہ کریں" کی بجائے انہوں نے "بخش دیں" کہہ دیا۔

"نہیں انکل!" میں نے مناسب سمجھا کہ شہلا کو جھوٹی امید دلانے کے کرب میں نہ رکھوں۔ "وہ جھوٹ نہیں بول رہے تھے۔ ہمارا اس کہا تھا کہ ابھی تمہیں براہِ راست نقصان نہیں ہوا ہے۔ عورت سے کوئی جذباتی رشتہ نہیں تھا جسے ہم نے راوی کی لہروں کے سپرد کر دیا۔ ہم اس کے بوجھ کو کہاں اٹھائے پھرتے لیکن آئندہ ہم اسے اٹھائیں گے جو تمہیں زیادہ عزیز ہو گا۔ پھر اس کو جو عزیز تر ہو گا اور اس کے بعد عزیز ترین کو۔ کس کی قیمت تمہارے نزدیک کتنی ہے یہ ہم جانتے ہیں اور تم بھی جانتے ہو۔ دیکھتے ہیں تم میں دوسروں کی زندگی قربان کرنے کا حوصلہ کتنا ہے۔ نفع نقصان کا حساب تم خود لگا لینا۔ میں نے انہیں صاف بتا دیا انکل کہ میری اپنی جان کا کوئی مسئلہ نہیں۔ مجھے مار کے بھی تمہیں کچھ نہیں ملے گا لیکن کسی اور کی جان کی قیمت تم کو بھی برابر ادا کرنی پڑے گی اگر میں اکیلا نہیں ہوں تو تم بھی اکیلے نہیں ہو اور رشتے اگر میرے لیے اہم ہیں تو تمہارے لیے بھی ہوں گے۔ تم ان کی تقدیس کو مجروح کرو گے تو یہ مت سمجھنا کہ میں بدلہ نہیں لوں گا اور معاملہ یومِ حساب کے آنے تک ٹل جائے گا۔ یہ حساب یہیں بے باق ہو گا، مساوی طور پر۔" میرا خیال ہے مشتعل ہونے کی وجہ سے میری آواز کچھ بلند ہو گئی تھی۔

"اچھا اچھا۔ اب یہ بات چھوڑو، میرا خیال ہے تمہیں آج آرام کی ضرورت ہے۔" رضوی صاحب نے کہا۔

"لیکن مجھے آج عدالت میں حاضر ہونا ہے۔" میں نے کہا۔ "رشیدے اور عبدل کے قتل کے بعد وکیلِ سرکار میری ضمانت کی منسوخی کی درخواست کرے گا۔"

"آئی سی۔" رضوی صاحب نے متفکر ہو کے کہا اور رابعہ کی طرف دیکھا۔ "کیا ضمانت منسوخ ہو جائے گی؟"

"مجھے امکانات تو نظر نہیں آتے۔" رابعہ نے کہا۔ "میں نے منظر صاحب سے بھی بات کی تھی۔ سب انسپکٹر شیخ کا بیان اور محرّر کی تحریر میں اس بیان کی نقل کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اگر محرّر بھی انسپکٹر شیخ کے بیان کی تائید کر دے تو نہ صرف یہ کہ ضمانت کی منسوخی کا جواز نہیں رہتا بلکہ بعد میں استغاثہ کے گواہوں کی عدم موجودگی میں میر شرافت علی کے قتل کا کیس بھی کمزور پڑ جاتا ہے۔"

"محرّر ضرور تائیدی بیان دے گا۔" رضوی صاحب نے بلا کے یقین سے کہا۔ "اسے میر محمد کا ڈر ہے نا؟ میں اسے اپنے پاس بلوا لیتا ہوں۔ فی الحال عارضی طور پر۔ بعد میں اسے ہیڈ کوارٹر ہی میں رکھ لوں گا یا جہاں وہ خود کو محفوظ سمجھے گا بھجوا دوں گا یا پھر میر محمد کو کسی دور افتادہ قصبے میں پوسٹ کرا دوں گا۔"

"لیکن انکل! خطرہ تو پھر بھی رہے گا۔" میں نے کہا۔ "میر محمد کی پشت پر وہ سراج ہے۔"

"وہ کچھ نہیں کر سکتا۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "میر محمد کو اس کی پشت پناہی مہنگی پڑے گی۔ یہ میں میر محمد کو سمجھا دوں گا۔ ابھی تو میں آفس جا رہا ہوں، وہاں سے فون کر کے پوچھ لوں گا کہ عدالت میں پیشی کا وقت کیا ہے۔ ظاہر ہے اس وقت وہاں میر بھی ہو گا اور وہ محرّر بھی۔ تم نگاہ رکھنا کہ کہیں آس پاس سادے کپڑوں میں دوسرے لوگ بھی ہیں یا نہیں اور اگر ——— سراج نظر آ جائے تو مجھے اشارہ کر دینا۔ ایک ٹیم کو میں وہاں بھیج رہا ہوں جہاں گزشتہ شب تمہیں لے جایا گیا تھا ویسے تو وہ رابعہ کا اپنا مکان ہے مگر میں معاملے کو الجھانا نہیں چاہتا۔ میں یہ رپورٹ دوں گا کہ کچھ دشمن مجرم میری ایک عزیز خاتون کو اغوا کر کے یہاں لائے تھے اور انہوں نے فون کر کے مجھے بتا بھی دیا تھا کہ ایک لاکھ لے کر وہ اسے رہا کر دیں گے ورنہ اسے قتل کر دیں گے۔ میرے پاس ایک لاکھ نہیں تھے چنانچہ میں بات کرنے گیا تھا مگر مجھے وہاں کوئی بھی نہیں ملا۔ شیروانی صاحب کا اور فوزیہ کا نام اس کیس میں بالکل نہیں آنا چاہیے اور میرا خیال ہے آپ دونوں کچھ دیر بعد واپس پنڈی چلے جائیں۔ میرا ڈرائیور میری کار میں آپ کو لے جائے گا۔ آپ محسن کی والدہ کو تسلی دیجیے گا کہ سب ٹھیک ہے۔ یہ نہ ہو وہ بھی یہاں آ جائیں اور ہاں محسن! تم نے شیخ کے سامنے کسی استاد ٹیڈی کا ذکر کیا تھا؟"

"میں اسے لے کر عدالت پہنچ جاؤں گا۔" محسن نے کہا۔ "وہ صفائی کا سب سے اہم گواہ بنے گا۔ بس وہ مل جائے۔"

"یہ صورتِ حال اب میرے لیے بھی باعثِ تشویش ہو گئی ہے۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "اور خطرناک بھی۔ مجرموں کا حوصلہ بڑھتا جا رہا ہے۔ ابھی تک میں نے پوری کوشش کی ہے کہ غیر جانبدار رہوں اور انصاف کے عمل میں دخل اندازی نہ کروں لیکن مجرم اسی سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ وہ ہر غیر قانونی کام کرنے کے باوجود قانون کی گرفت میں نہیں آتے اور ہر جگہ اپنی بے گناہی ثابت کر دیتے ہیں۔ میں اس لاقانونیت کو کب تک خاموش تماشائی کی حیثیت سے دیکھتا رہوں گا۔ اگر آج انہوں نے تمہیں اور فوزیہ کو اٹھوا لیا ہے ——— تو کل کو وہ میرے گھر سے کسی کو بھی اٹھا کے لے جا سکتے ہیں۔ میرے بیوی بچوں کو۔ شہلا یا رابعہ کو۔ اور پھر گواہ لا سکتے ہیں کہ وہ تو سیکڑوں میل دور کراچی میں یا پشاور میں کسی کی شادی یا موت میں گئے ہوئے تھے۔ اس جھوٹ کو جھوٹ ثابت کرنا ناممکن ہو گا لیکن میں یہ نوبت نہیں آنے دوں گا۔ یہ لوگ مجھے مجبور کر رہے ہیں کہ میں اپنے قانونی اختیارات سے تجاوز کر کے ان کے دماغ درست کرنے کا انتظام کروں ——— بس میری اصول پرست فطرت آڑے آتی ہے۔ خیر آئندہ کی فکر ابھی سے کیا کرنی۔" وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے شیروانی صاحب سے ہاتھ ملایا۔ "گھبرانا نہیں۔" انہوں نے شیروانی صاحب کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ "خدا نے

چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا لیکن احتیاط لازم ہے۔ اگر ہو سکے تو اپنی رہائش بدل دو۔ کچھ عرصے کے لیے چھٹی لے کر یہاں آ جاؤ۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے تم نے سروس میں بہت کم چھٹی کی ہے۔ بہت چھٹی جمع ہو گی تمہارے حساب میں؟"

"چھٹی تو ہے۔" شیروانی صاحب نے کہا "لیکن رضوی! جو تم کہہ رہے ہو وہ ناقابلِ عمل ہے۔ گھر بدلنے سے حالات تو نہیں بدلیں گے۔ پتا چلانے والے ہر جگہ پہنچ سکتے ہیں۔ پھر چھٹی لے کر میں یہاں کیسے آ جاؤں؟ دو مہینے میں مجھے بہت کچھ کرنا ہے۔"

رضوی صاحب کا ہاتھ ان کے کندھے پر ہی رک گیا۔

میں نے محسن کی طرف دیکھا اور پھر ہم دونوں کھڑکی سے باہر دیکھنے لگے جہاں ایک نئے دن کی دھوپ پھیل چکی تھی۔ محسن کی ماں کو ڈاکٹروں نے جینے کی جتنی مہلت دی تھی اس میں ایک اور دن کم ہو گیا تھا۔ خاموشی کا وقفہ اتنا بوجھل ہو گیا کہ میرا سانس رکنے لگا۔ میرے لیے فوزیہ سے نظریں ملانا ناممکن ہو گیا۔ قصوروار اگر میرے حالات تھے تو میں بھی تھا۔ وقت نے مجھے ایک ایسے دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا جہاں مجھے اپنی قوتِ فیصلہ کو بروئے کار لاتے ہوئے رابعہ اور فوزیہ میں سے ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ فوزیہ سے میری دلی وابستگی ماضی کے حالات کا تقاضا تھی جب تک میں رابعہ سے نہیں ملا تھا اس کے لیے میرے جذبات بھی وہی تھے جو فوزیہ کے دل میں میرے لیے تھے لیکن رابعہ بہت مظلوم تھی۔ تنہا تھی اور میرے لیے تباہ ہو گئی تھی پھر عقل کے تقاضے دلی جذبات پر غالب آ گئے تھے اور میں نے فوزیہ کے خیال کو دل سے نکال دیا تھا۔ یا کم از کم اس کی ناکام کوشش ضرور کی تھی۔ فوزیہ اب تک دل کے نہاں خانے میں ماضی کی ہر یاد کے ساتھ جلوہ فگن تھی مگر مستقبل کے خوابوں میں اس کی جگہ رابعہ نے لے لی تھی۔ اس مسئلے پر میں نے بہت سوچا تھا لیکن یہ مسئلہ ایسا تھا کہ اس کے حق میں اور اس کے خلاف دلائل کبھی ختم نہیں ہو سکتے تھے اور یہ حقیقت اپنا وجود خود تسلیم کرا لیتی تھی کہ رابعہ کا پلہ بھاری ہے۔ اپنے تجزیے کے مطابق فوزیہ کی اور میری محبت خلوصِ نیت پر مبنی ہونے کے باوجود ماحول کی پروردہ تھی۔ ہم بچپن سے قریب تھے اور عام خیال یہی تھا کہ باقاعدہ منسوب نہ ہونے پر بھی ہم بالآخر ایک دوسرے کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو جائیں گے۔ رابعہ کا عشق عملی اور عقلی بنیادوں پر استوار تھا۔ بے شک اس کی جذباتی جڑیں بھی بچپن کے وقت کی گہرائی تک اتری ہوئی تھیں۔ جب ہم ایک ہی کلاس میں پڑھتے تھے لیکن دوبارہ رابعہ سے ملاقات کے وقت اس دور کی کوئی یاد میرے دامن میں نہ تھی۔ پھر دیکھتے دیکھتے حالات نے میرے خیالات کو بدل دیا اور رابعہ میرے لیے ناگزیر ہوتی گئی۔ مجھ پر اس کا قرض بڑھتا گیا اور میں ہر طرف سے محصور ہو گیا۔ ایک خیال ہمدردی و غم گساری کا تھا کیونکہ رابعہ ایک بار شادی کے بعد رخصتی سے پہلے ہی بیوہ ہو گئی تھی اور المیہ یہ تھا کہ اس کا نام نہاد شوہر بھی زندہ تھا پھر رابعہ نے میری بھرپور مدد کی اور میرے جذبات میں احسان مندی کا خیال بھی شامل ہو گیا۔ رابعہ کی ماں کی موت اور اس کے گھر کی تباہی کے بعد احساسِ جرم نے مجھے رابعہ کا سہارا بننے پر مجبور کر دیا اور جب میں نے دیکھا کہ میری وجہ سے ہونے والے نقصانات کے باوجود رابعہ کے جذبات، اس کے خلوص اور اس کے عزمِ رفاقت میں کوئی فرق نہیں آیا ہے تو بلاشبہ میں اس کی محبت کی عظمت کا قائل ہو گیا۔ اس کے مقابلے میں فوزیہ ایک عام لڑکی رہ گئی۔ ظاہری حسن کی کشش میں رابعہ بھی کم نہ تھی مگر فوزیہ وہ سب کچھ نہیں کر سکتی تھی جو رابعہ نے میرے لیے کیا۔ آہستہ آہستہ میرا یہ یقین پختہ اور ناقابلِ شکست ہو گیا کہ زندگی کے پُرخطر، حوصلہ آزما اور دشوار سفر میں صرف رابعہ ہی میرا ساتھ دینے کی اہل ہے۔ فوزیہ کو صدمہ یقیناً ہو گا اور اس نے جذباتی بحران کے ایک لمحے میں اپنی جان سے کھیلنے کی کوشش بھی کی تھی مگر وہ بحران گزر چکا تھا اور اب میں دیکھ رہا تھا کہ فوزیہ کا ردِعمل منفی ہونے لگا ہے۔ وہ مجھے ایک کمینہ، خود غرض، مغرب کی تعلیم سے بگڑا ہوا، دولت کے حصول کی خاطر رابعہ سے رشتہ جوڑ لینے والا طوطا چشم قسم کا جھوٹا عاشق سمجھنے لگی تھی جو میرے لیے دکھ کی نہیں بڑے اطمینان کی بات تھی۔ اب وہ ماں کی آخری خواہش کو پورا کرنے کے لیے پروفیسر ایاز کو قبول کرے گی تو اسے مجھ سے بے وفائی کا خیال ضمیر کی خلش بن کے پریشان نہیں کرے گا اور وہ ایاز کے ساتھ خوش بھی رہ سکے گی جو بہرحال ایک شریف آدمی تھا۔

ٹیڑھا مسئلہ محسن کا تھا۔ اگر اپنی زندگی کے باقی ماندہ دو ماہ کے عرصے میں ماں نے یہ چاہا کہ بیٹی کو رخصت کرنے سے پہلے بہو کو گھر میں لے آئے تو کیا محسن اس کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے میرا ساتھ چھوڑ کے چلا جائے گا؟ معلوم نہیں میں کب تک اپنے خیالات میں ڈوبا رہتا مگر محسن نے شانہ پکڑ کے مجھے ہلایا۔ "سات بجے ہیں گیانی مہاراج!" وہ بولا۔ "نو بجے آپ کو عدالت پہنچنا ہے۔"

"ہاں۔" میں نے چونک کر ادھر اُدھر دیکھا۔ کمرے میں ہم دونوں کے سوا کوئی نہیں رہا تھا۔ "باقی لوگ کہاں گئے؟"

"انکل رضوی گئے اپنے آفس۔ شہلا کو فوزیہ اپنے ساتھ لے جا رہی ہے۔"

"کہاں؟ اسلام آباد؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"ہاں۔ اور ڈیڈی نے کہا ہے کہ اس سے بہتر کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔ فی الحال شہلا کو اس ماحول سے نکل جانا چاہیے۔ وہ اکیلی بھی نہیں رہ سکتی اور رضوی صاحب کے لیے ہم تین ہی بہت ہیں۔" محسن ہنسا۔ "وہ لوگ ناشتہ کر رہے ہیں۔"

"محسن! ابھی سب کے سامنے جو کچھ میں نے کہا سب جھوٹ تھا۔" میں نے کہا۔ "تفصیل میں تجھے بعد میں بتاؤں گا۔ ابھی یہ سن لے کہ ڈی سلوا مارا جا چکا ہے۔"

"کیسے؟" محسن نے کچھ دیر بعد کہا جب اسے یقین ہو گیا کہ میں سیریس ہوں۔ "تو نے..."

"نہیں، کار کے حادثے میں۔" میں نے کہا۔ "وہ مجھے لے کر واپس جا رہا تھا کہ میں نے اسے قابو کرنے کی کوشش کی اور کار بے قابو ہو کے درخت سے ٹکرا گئی۔ رفتار بہت زیادہ تھی، وہ وہیں مر گیا۔ اسی کار کی ڈکی میں شہلا کی ماں تھی جب سے دشمن اس کو اغوا کر کے لے گئے تھے، وہ اسی میں بند تھی مگر مجھے معلوم نہیں تھا۔ اوّل تو وہ پہلے ہی مر چکی ہو گی اور اگر زندہ ہوئی تو حادثے کے بعد اس کے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"کیا تو نے ڈکی کھول کے نہیں دیکھا تھا؟" محسن نے کہا۔

"نہیں۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی... اور... مجھ میں ہمت بھی نہیں تھی۔" میں نے اعتراف کیا۔

"تجھے معلوم کیسے ہوا کہ شہلا کی ماں ڈکی میں بند ہے؟" محسن بولا۔

"مجھے ڈی سلوا نے بتایا تھا لیکن اس وقت موقع نہیں تھا۔ موقع ملنے سے پہلے ہی حادثہ پیش آ گیا۔" میں نے کہا۔

"اور یہ حادثہ کہاں ہوا؟" محسن نے کہا۔

"نہر والی سڑک پر۔ تقریباً موڑ کے پاس۔" میں نے کہا۔ "اسی شکستہ مرقد کے سامنے جہاں سے نوما پخو کی لاش ملی تھی۔"

"یہ بات تو چھپی نہیں رہ سکتی۔" محسن نے سوچ کر کہا۔ "ابھی کچھ دیر بعد انکل رضوی کو بھی خبر مل ہی جائے گی۔ پولیس تو اب تک پہنچ چکی ہو گی۔ انکل رضوی رپورٹ کریں گے کہ ان کی ایک خاتون عزیز کو گزشتہ شب اغوا کر لیا گیا تھا تو نام حلیہ اور عمر وغیرہ بھی لکھوائیں گے اور معاملہ چونکہ ایس ایس پی کا ہے اس لیے اطلاع دی جائے گی کہ مطلوبہ حلیے کی خاتون فلاں جگہ کار کی ڈکی میں سے ملی ہیں۔ پھر ڈی سلوا کی شناخت بھی ہو ہی جائے گی۔"

"اس سے میرا بیان غلط نہیں ہو گا۔" میں نے کہا۔ "بس یہ ثابت ہو گا کہ اغوا کرنے والا ڈی سلوا تھا۔ حادثہ کیسے پیش آیا، پولیس اپنی تفتیش سے جو نتیجہ چاہے اخذ کرے۔ میں بتا ہی چکا ہوں کہ میں کس طرح نکلنے میں کامیاب ہوا تھا۔ اس میں کوئی بات غلط نہیں لیکن اس کے باوجود میں نے ڈی سلوا کو گن پوائنٹ پر گاڑی لے کر چلنے کو کہا تھا۔ اس نے شہلا کی ماں کے بارے میں بتا کے مجھے اعتماد میں لینے کی کوشش کی۔ میں اس کی چال میں آ گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ اب ہم سے خوفزدہ ہے لیکن میں ڈکی کھولنے اترا تو اس نے گاڑی چلا دی اور واپس جانے لگا۔ میں بونٹ پر چڑھ گیا اور ونڈ اسکرین توڑ کے اندر گھسنے میں کامیاب ہو گیا۔ اسی میں حادثہ ہو گیا۔ میں خواہ مخواہ کے قانونی چکروں سے بھی بچنا چاہتا تھا۔ اب ڈی سلوا کی موت کے کیس میں میرا نام ہی نہیں آئے گا۔ شہلا کو میں نے اتنا تو بتا دیا ہے کہ اس کی ماں مر چکی ہے۔ وہ اس خبر کے صدمے کو برداشت کر لینے کے بعد لاش دیکھ کر بھی پاگل نہیں ہو گی اور ظاہر ہے پوسٹ مارٹم کے بعد لاش یہیں آئے گی۔"

"پھر تو یہ اور بھی اچھا ہے کہ شہلا اسی وقت ڈیڈی اور فوزیہ کے ساتھ نکل جائے۔" محسن بولا۔ "ہم بعد میں اسے اطلاع دے دیں گے کہ لاش مل گئی تھی اور ہم نے تدفین کر دی ہے۔ وہ اپنی آنکھوں سے کچھ نہیں دیکھے گی۔"

"محسن!" میں نے کہا۔ "فوزیہ کے بارے میں تیری ممی نے کیا طے کیا ہے؟"

"اس کی شادی آئندہ ماہ پروفیسر ایاز سے ہو رہی ہے۔" محسن نے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ "وہ اچھا آدمی ہے، فوزیہ خوش رہے گی۔"

"تجھے کوئی دکھ نہیں۔ کوئی گلہ نہیں مجھ سے۔ کہ میں نے..." میں نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن الفاظ میرے حلق میں پھنس گئے۔

"نہیں سکندر! یہ حالات کا قصور ہے تیرا نہیں۔" محسن نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ "فرض کرو تمہاری زندگی بعد میں ویسی نہ گزرتی جیسی کہ تم نے سوچا تھا۔ یوں نہ تھا میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے۔ والی بات ہوتی تو کیا فائدہ ہوتا۔ کون جانے انجام کتنی تلخی پر ہوتا اور اس سے ہماری دوستی بھی متاثر ہوتی۔ اچھا ہوا ابھی بات صاف ہو گئی۔ خدا جو کرتا ہے بہتر ہی کرتا ہے۔ تیری جگہ چراغ دین لیتا تو بڑی خرابی ہوتی۔ مجھے اس ذلیل کو قتل کرنا

پڑتا اور فوزیہ کی زندگی بھی تباہ ہو جاتی "۔

"انکل شیروانی نے ابھی دو ماہ کی بات کی تھی "۔ میں نے بڑی مشکل سے الفاظ کو مربوط کیا۔" فرض کرو اسی عرصے میں تیری ممی نے تجھے بھی بلا لیا اور پہلے بہو لانے کا سوچا "۔

"تو میں مخالفت نہیں کروں گا "۔ محسن نے کہا۔" رشتہ تو تقریباً طے ہی ہے۔ نکاح کی رسمی کارروائی باقی ہے۔ اس کے لیے میں نے ممی سے بات کر لی تھی کہ اچھا ہو یا برا، میں آپ کے انتخاب کو قبول کرتا ہوں لیکن نکاح بالکل سادگی سے ہوگا۔ رسمیں وغیرہ بالکل نہیں ہوں گی۔ دھوم دھام قطعی نہیں۔ میں صرف دو دن کے لیے جاؤں گا۔ ایک دن نکاح کا، دوسرا ولیمے کا۔ تیسرے دن لوٹ آؤں گا "۔

" اور تیری ممی۔۔۔ وہ اجازت دیں گی کہ تو نئی نویلی دلھن کو چھوڑ کر بھاگ جائے "۔

" وہ چکر میں نے الگ چلا دیا ہے۔ ڈیڈی سے کہہ دیا ہے کہ وہ بھی اس بات کو سمجھ لیں۔ میں دوست کا ساتھ بھی نہیں چھوڑ سکتا اور اس ماں کو بھی ناخوش نہیں کر سکتا جس کی زندگی چراغِ سحری ہے "۔ محسن بولا۔" چنانچہ میں جھوٹ بولوں گا کہ میں نے لاہور میں کام شروع کیا ہے اور اس مرحلے پر دو دن بھی میرے مستقبل کو تباہ کر سکتے ہیں۔ مجھے کنسٹرکشن کا ایک کنٹریکٹ ملا ہے جسے فوراً سائن کرنا ضروری ہے البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ میں ساتھ ساتھ کسی مناسب جگہ پر مکان بھی تلاش کرتا رہوں اور بعد میں بیوی کو بلواؤں۔ اس عرصے میں بیوی جہاں چاہے رہے۔ اس کے دو گھر ہیں۔ اپنے ماں باپ کا اور میرے ماں باپ کا "۔

" فوزیہ کی رخصتی کے لیے تجھے پھر جانا پڑے گا "۔ میں نے کہا۔

" اس کے لیے ڈیڈی کچھ ایسا انتظام کر رہے ہیں کہ دونوں کام ایک ساتھ ہو جائیں۔ ایک برات آئے، ایک جائے "۔ محسن بولا۔ " تیرے ڈیڈی ابھی تک مجھ سے بدظن نہیں ہوئے۔ میں نے پہلے تو فوزیہ کو قبول نہیں کیا۔۔۔۔"

" اگر تیرے انکار سے ممی ناخوش ہوتیں تو ڈیڈی بھی تجھے معاف نہ کرتے "۔ وہ بولا۔" لیکن ممی اس شادی کے شروع سے خلاف تھیں۔ تیرے انکار کے بعد ڈیڈی کو موقع مل گیا کہ انہیں اپنی خوشی کہنے دیں "۔

" انہوں نے یہ بھی نہیں کہا کہ سکندر کے ساتھ رہ کر مصیبت میں گرفتار ہونے اور زندگی کا خطرہ مول لینے کی کیا ضرورت ہے "۔

" نہیں۔ یہ بات وہ کبھی نہیں کہہ سکتے "۔ محسن نے پورے یقین کے ساتھ کہا۔" وہ خود بہت وضعدار اور اصول پرست آدمی ہیں۔ انہوں نے چچا نذیر خان مرحوم سے جس طرح دوستی نبھائی وہ اس کی مثال ہے۔ وہ مجھے دوستی نبھانے سے کیسے روک سکتے ہیں؟ بلکہ میرا تو خیال ہے کہ اگر ان حالات میں میں تیرا ساتھ نہ دیتا تو ان کو افسوس ہوتا۔ اب تو وہ مطمئن ہوں گے کہ بیٹا ان سے کم نہیں رہا "۔

" تم لوگ ناشتہ بھی کرو گے یا ایک دوسرے کا سر کھاتے رہو گے "۔ رابعہ نے اندر آ کے ہمیں ڈانٹا۔

" آپ کے سرِ عزیز کی قسم! آپ نے ٹوکا نہ ہوتا تو سر کیا، ہم ایک دوسرے کو سالم نگل جاتے "۔ محسن نے کہا۔

" لیکن محسن خان شیروانی! ہم آدم خور تو نہیں ہیں "۔ میں نے کہا۔" حوا خور ہیں "۔

" قبلہ آپ لام کو حذف کر گئے۔ غالباً آپ حلوا خور کہنا چاہتے تھے۔ عزیزہ! کیا ناشتے میں حلوا پوری ملے گا "۔ محسن نے مفروضہ داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔

" میں تو جا رہی ہوں کورٹ "۔ رابعہ نے زچ ہو کے کہا " میں گیارہ بجے کا ٹائم لگواؤں گی۔ نہیں پہنچو گے تو ڈنر جیل میں کرو گے "۔

" اور لنچ "۔ میں نے پوچھا۔" حوالات میں آج کل مینو کیا ہوتا ہے، چائنیز یا انگلش "۔ مگر میری بات پوری ہونے تک وہ دروازے تک پہنچ چکی تھی۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ قہقہہ مارا اور حیران ہوئے کہ ان حالات میں بھی ہم ہنسنا نہیں بھولے۔ اور خطرات حادثات اور سختی حالات کے باوجود ہنس کے فکر و غم کی گرد کو جھاڑ سکتے ہیں۔

" اب برادر۔۔۔ "۔ میں نسبتی کہتے کہتے رک گیا۔" تو جا استاد ٹیڈی کو پکڑ "۔

" کہاں سے پکڑوں؟ وہ تو شیخ کو ٹالا تھا "۔ محسن نے کہا۔

" مجھے کیا معلوم وہ کہاں ہوگا "۔

" اس کے ٹھکانے دیکھ اور اگر وہ مل جائے تو اس کو ساری صورتِ حال سمجھا کے لے آ "۔ میں نے کہا۔

" وہ۔۔۔ دے گا وہی بیان، جو میں نے اس سے منسوب کر دیا تھا "۔ محسن نے مشتبہ لہجے میں سوال کیا۔

" ٹیڈی دل کا شیر ہے اور بہت اچھا قابلِ اعتماد اور مخلص دوست بن سکتا ہے "۔ میں نے کہا۔" المیہ وہی ہے کہ زمانے نے اس سے دشمنی کی اور وہ راستے سے بھٹک گیا۔ وحشی جانور کو بھی پیار سے اپنی مرضی کا تابع بنایا جا سکتا ہے۔ ٹیڈی بھی پیار سے محرومی کا شکار ہے۔ اسے کسی نے اپنایا نہیں ہے۔ ہم نے اسے عزت دی اور اس کی نیکی کو پہچانا۔ وہ شہلا کو بہن سمجھتا ہے اور ہمیں دوست۔ حالانکہ ہمارے معاشرے کے معیار پر اس میں اور ہم میں بہت فرق ہے۔ کم ظرف لوگوں کے لیے وہ اچھوت رہا ہے۔ معزز، تعلیم یافتہ اور شریف لوگوں میں جگہ مل جاتے تو وہ بھی سدھر سکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس جنگ میں وہ ہمارا اتنا ہی اچھا مددگار ثابت ہو سکتا ہے جتنا فوما بخو تھا، یار اوبے "۔

ہم دوسرے کمرے میں ناشتے کے لیے گئے تو اسلام آباد جانے والے تیار تھے۔ فوزیہ نے شہلا کے چند جوڑے اپنے سوٹ کیس میں رکھ لیے تھے۔ ان دونوں کی جسمانی ساخت ایک جیسی تھی چنانچہ شہلا اسلام آباد میں فوزیہ کے جوتے، کپڑے بھی استعمال کر سکتی تھی۔ باقی تمام چیزوں کے لیے اس نے شہلا سے کہہ دیا تھا کہ گھر میں سب کچھ ہے اور نہیں ہوگا تو آ جائے گا۔ شہلا اس عمل انتقال سے زیادہ مطمئن نظر نہیں آتی تھی مگر دونوں بزرگوں یعنی رضوی اور شیروانی صاحبان کے سامنے وہ کچھ نہ بول سکی۔ پھر رابعہ نے اور بیگم رضوی نے بھی اسے سمجھا دیا کہ پنڈی میں محسن کا گھر بھی غیر کا گھر نہیں ہے۔ شاید وہ خود بھی وقتی طور پر اس ماحول سے چھٹکارا چاہتی تھی کیونکہ اسے معلوم تھا آئندہ چند دن میں کیا ہوگا۔ اس نے ایک ماہ کے لیے جانا قبول کیا تھا۔ فوزیہ نے تو اسے نہیں بتایا تھا لیکن رابعہ نے بتا دیا تھا کہ ایک ماہ کے اندر اندر فوزیہ کی رخصتی ہے اور اس کی ماں بیمار ہے چنانچہ وہ شادی کے کام میں مدد کر سکتی ہے۔ بے چاری لڑکی کے ساتھ دہرا المیہ تھا۔ ایک تو فوزیہ کی شادی کی بات ایسے وقت میں کی گئی جب خود اس کی اپنی ماں کی موت کو ایک دن بھی نہیں ہوا تھا۔ وہ لاکھ حقیقی ماں نہ سہی شہلا کا غم تو کم نہ تھا۔ پھر اسے یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ فوزیہ کے ساتھ ہی محسن کی شادی بھی طے ہو چکی ہے۔ وہ محسن کو چاہنے لگی تھی اور یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ کم سے کم میں اور رابعہ اس کے جذبات کو بہت پہلے سمجھ چکے تھے اور میرا اندازہ یہ بھی تھا کہ محسن مجبور نہ ہوتا تو شادی کے لیے کبھی تیار نہ ہوتا۔ ناشتے کے دوران میں نے اس تمام صورتِ حال پر غور کیا اور مجھے یہ بات مناسب لگی کہ ایک ماہ بعد وہ لوٹ آتے، اس وقت تک یہاں تجہیز و تکفین کے اور قانونی کارروائی کے سارے مرحلے پورے ہو چکے ہوں گے۔ پولیس خواہ مخواہ شہلا کا بیان نہیں لے گی اور ڈی سلوا سے اس کے تعلقات کو زیرِ بحث نہیں لائے گی۔ رضوی صاحب کہہ دیں گے کہ وہ تو پنڈی میں ہے۔ شہلا نے بھی میرے بیان پر یقین کر لیا تھا کہ اس کی ماں کو مجرموں نے راوی میں پھینک دیا ہے۔ اس کے نقطہ نظر سے اب تجہیز و تکفین کے امکانات ہی نہ رہے تھے۔ ہم میں سے کوئی بھی یہ پسند نہ کرتا کہ وہ ماں کی مسخ شدہ لاش دیکھے۔ شہلا بہت رونے دھونے کے ساتھ جانے پر تیار ہو گئی تھی۔

لیکن اس کا ایک ماہ بعد لوٹ آنا بھی اتنا ہی ضروری تھا جتنا اس وقت یہاں سے چلے جانا۔ ایک ماہ بعد اگر پروگرام کے مطابق محسن کی شادی ہو گئی تو یہ شہلا کے لیے ایک اور جذباتی سانحہ ہوگا۔ پھر فوزیہ رخصت ہو چکی ہو گی چنانچہ اسے تسلی دینے والا بھی کوئی نہ ہوگا۔ فوزیہ کی ماں کے لیے وہ زندگی کا آخری مہینہ ہوگا اور ان کی حالت اس وقت تک یقیناً خاصی خراب ہو جائے گی۔ محسن کی بیوی اگر تیسرے دن والدین کے گھر جا بھی تو تیمارداری کے لیے صرف شہلا رہ جائے گی۔ محسن نے تو مجھے صاف بتا دیا تھا کہ وہ شادی کے لیے گیا بھی تو دو دن کے لیے جائے گا اور لوٹ آئے گا۔ پھر شہلا کے لیے وہاں بھی ایک المناک موت کا نظارہ کرنے اور اپنا دکھ دنیا سے چھپائے رکھنے کا دہرا عذاب ہوگا چنانچہ بہتر یہی ہوگا کہ وہ اس وقت سے پہلے ہی واپس آ جائے اور یہاں ہم سب مل کر اس کو پھر زندگی کی جدوجہد میں نئی دلچسپی کے ساتھ شریک ہونے پر مجبور کر دیں۔

عین اس وقت جب باقی لوگ گاڑی میں بیٹھ چکے تھے، میں نے شہلا کو ایک منٹ کے لیے ایک طرف بلایا۔" تمہیں معلوم ہے شہلا کہ محسن کی ماں بیمار ہے "۔ میں نے کہا۔

" جی بھائی جان! رابعہ باجی نے مجھے بتایا تھا کہ فوزیہ کی شادی بھی آئندہ ماہ تک متوقع ہے "۔ وہ بولی۔

" اور یہ شادی ہنگامی حالات میں اسی لیے کی جا رہی ہے "۔ میں نے کہا۔" کیونکہ مسز شیروانی کی زندگی غیر متوقع ہے "۔

وہ میری بات پر کچھ حیران ہوئی۔" کیا بیماری لاحق ہے انہیں سکندر بھائی "۔

" انہیں سرطان ہے "۔ میں نے کہا۔" یہ بات ڈاکٹروں نے بہت پہلے بتا دی تھی کہ انہیں زیادہ سے زیادہ چھ ماہ جینا ہے۔ اب انکل شیروانی نے کہا ہے کہ ان کی زندگی کے دو ماہ بھی نہیں رہے، کوئی معجزہ ہی انہیں بچا سکتا ہے "۔

" کیا یہ بات فوزیہ کو۔۔۔ اور محسن کو معلوم ہے "۔ وہ سہم کر بولی۔

" ہاں۔ یہ بات سب کو معلوم ہے۔ سوائے خود محسن کی ماں کے "۔ میں نے کہا۔" لیکن میرا خیال ہے انہیں بھی معلوم ہو چکا ہے۔ حقیقت کبھی چھپی نہیں رہتی۔ سب ایک دوسرے کے جھوٹ کا بھرم رکھ رہے ہیں اور یہ بھرم تم کو بھی رکھنا ہے "۔ میں نے الفاظ کی تلاش کے لیے سخت جدوجہد کی لیکن اچانک میرے ذہن میں خلا رہ گیا۔

" چلو بھئی۔ یہ کیا کانفرنس شروع کر دی ہے "۔ باہر سے شیروانی صاحب کی آواز آئی۔

"ایک منٹ انکل!" میں نے چلاّ کر کہا۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ وقت کم ہے، تلخ حقیقت کو خوبصورت الفاظ کا جامہ پہنانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔" بات یہ ہے شہلا کہ محسن فوزیہ اور ان کے والد مل کر کوشش کر رہے ہیں کہ۔۔ کہ ایک شخص زندگی کے آخری ایام میں جو مانگے اسے دے دیا جائے۔ اس کی خوشی کو مقدم رکھا جائے اور اسے دنیا سے یوں رخصت کیا جائے کہ اسے اپنوں سے کوئی گلہ نہ ہو۔ ان سب نے اپنے مقصد کے حصول کے لیے ہر قربانی دینے کا عزم کر رکھا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ وہ محسن کی شادی بھی اپنی زندگی میں ہی کرنا چاہتی ہیں۔ اس میں محسن کی پسند کا کوئی سوال نہیں۔ وہ مجبور ہے۔"

اس انکشافِ حقیقت کے ایک لمحے میں شہلا کے جذبات کا جو عکس اس کی صورت پر نمودار ہوا اُسے الفاظ میں بیان کرنا میرے لیے ناممکن ہے۔ اس نے ایک بار نظر جھکائی اور پھر سر اٹھا کر مجھے دیکھا تو مجھے وہ بالکل اجنبی لگی۔

"یہ آپ مجھے کیوں بتا رہے ہیں۔۔۔ میرا مطلب ہے کیا آپ کو شک ہے کہ میں اس آزمائش میں پوری نہیں اتروں گی؟" وہ بولی۔

"نہیں،" میں نے کہا۔"میں صرف یہ چاہتا تھا کہ۔۔۔ کہ جہاں تم جا رہی ہو۔ وہاں کے بارے میں حالات کا کوئی پہلو تم سے پوشیدہ نہ رہے۔ ویسے مجھے تم پر پورا اعتماد ہے۔"

"اس اعتماد کا بہت بہت شکریہ بھائی جان!" شہلا نے طنز آمیز تلخی سے کہا۔" شاید میں اس کی مستحق نہیں تھی مگر پھر بھی، میں کوشش کروں گی کہ کسی کو مجھ سے شکایت نہ ہو۔ خدا حافظ!"

اس کی بات کا ہر لفظ میرے دل میں تیر کی طرح پیوست ہو گیا۔ وہ پلٹی اور تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی باہر نکل گئی۔ محسن پہلے ہی استاد ٹیڈی کا کھوج لگانے جا چکا تھا۔ میں وہیں کھڑا سوچتا رہا کہ کیا وہ اس وقت موجود ہوتا تو شہلا کو جانے دیتا؟ غالباً کسی نے اس سے پوچھا ہی نہیں تھا اور انکل رضوی اور انکل شیروانی نے یہ فیصلہ خود ہی کر لیا تھا۔ انھیں اندازہ کہاں تھا کہ شہلا اور محسن کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے جذبات کی نوعیت کیا ہے۔ رابعہ کو موقع نہیں ملا تھا اور شاید اس کا خیال یہ بھی ہو کہ جب باقی لوگ جانتے ہیں تو محسن بھی جانتا ہی ہو گا لیکن میں سمجھ رہا تھا کہ ہم سب نے نادانستگی میں شہلا پر ایک اور ظلم کیا ہے۔ اگر وہ یہیں رہتی اور محسن کی شادی کی تاریخ بھی طے ہو جاتی تو محسن اپنے طور پر اسے اپنی مجبوری سے آگاہ کر دیتا اور اس سے معافی مانگ لیتا لیکن محسن کو خبر بھی نہیں ہو سکی تھی۔ اب فوزیہ کو رخصت کرتے وقت ایک امتحان میرے لیے درپیش ہو گا جو دوسرے امتحان سے شہلا اس وقت گزرے گی جب محسن کی بارات سجے گی۔ میں اس جذباتی بحران کا سامنا کر لوں گا کیونکہ فوزیہ اس وقت تک میرے خیال کو بھی دل سے نکال دے گی اور غیر شعوری طور پر مجھ سے نفرت کا شکار ہو گی لیکن محسن دیکھے گا کہ ماں کی خوشی کے لیے اس نے اپنے جذبات کے ساتھ شہلا کے ارمانوں کو بھی پامال کر دیا ہے اور شہلا اسی گھر کی چھت کے نیچے موجود ہے جہاں اس کے لیے شبِ عروسی کی مسرّت کا اہتمام ہو رہا ہے اور سینے پر صبر کی سِل رکھے انگاروں کے بستر پر تنہا لیٹی ہے۔

باہر سے کار کے اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ پھر یہ آواز دور ہونے لگی اور چند سیکنڈ میں فضا کے سکوت کا ایک حصّہ بن کے کھو گئی۔ انکل شیروانی نے مجھے بدتمیز سمجھا ہو گا کہ خدا حافظ کہنے کے لیے دروازے سے باہر بھی نہیں آیا۔ فوزیہ نے مجھے مجرم سمجھا ہو گا جس میں اتنی ہمّت ہی نہ تھی کہ اپنا چہرہ دکھا سکے۔ شہلا نے مجھے وہ بھائی سمجھا ہو گا جس نے سہارا دے کر اسے بے سہارا کر دیا۔ بیگم رضوی نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا تو میں چونکا۔

"یہ کیا رونی شکل بنائے کھڑے ہو؟" انھوں نے کہا۔ "کوئی تم سے ملنے آیا بیٹھا ہے۔"

"مجھ سے! اس وقت کون ملنے آگیا؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔

"وہ جسے تم ڈبل ایس آئی شیخ کہتے ہو،" بیگم رضوی نے کہا۔" ضابطے کی کارروائی پوری کرنے کے لیے وہ تمھیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔"

میں نے سر ہلایا اور آہستہ آہستہ ڈرائنگ روم کی طرف بڑھا۔ خلافِ معمول شیخ کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔

"ملزم حاضر ہے شیخ صاحب!" میں نے خوش دلی سے کہا۔ "جس طرح چاہیں۔۔۔"

"آئی ایم سوری سکندر!" اس نے مصافحہ کرنے کے بعد پھر بیٹھتے ہوئے کہا۔" غالباً آج سماعت نہ ہو سکے گی۔ شیدے اور عبدل کے کیس کا چالان ہی پولیس نے مکمل نہیں کیا ہے۔ پھر بھی حاضری تو ضروری ہے۔"

"اور جب تک چالان پیش نہیں کیا جائے گا اس وقت تک کیا ہو گا؟" میں نے کہا۔" میری ضمانت برقرار رہے گی یا منسوخ سمجھی جائے گی؟"

"بغیر سماعت کے ضمانت کیسے منسوخ کی جا سکتی ہے۔" وہ بولا۔" پہلے چالان پیش ہو گا۔ اس میں کہا جائے گا کہ قتل کے سلسلے میں تم پر شک ہے چنانچہ تفتیش کے لیے تمھاری ضمانت پر رہائی کے احکامات واپس لیے جائیں اور تمھیں پولیس کے حوالے کیا جائے۔ شیدے اور عبدل کے قتل کا مقدمہ دوسری عدالت میں سماعت کے لیے جائے گا۔ تمھاری ضمانت منظور کرنے والی عدالت دوسری ہے وہاں چالان کی نقل ہی نہیں پہنچے گی تو سماعت کیسے ہو گی۔"

"پھر پریشانی کیا ہے؟" میں نے کہا۔" کیا ملزم کو حاضر کرنے کے لیے ہتھکڑی لگانے کا مسئلہ ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔" جب تم ضمانت پر ہو تو حاضر ہونا تمھاری اپنی ذمّے داری ہے۔ میرا کام عدالت کے سمن تم تک پہنچانا تھا۔" اس نے فائل میں سے ایک کاغذ نکالا۔" یہ اپنے پاس رکھ لو اور اس پر یہاں دستخط کر دو۔ تاریخ آج کی مت ڈالنا۔ اس دن کی ڈالنا جب میں تم سے ملنے کے لیے کرشن نگر آیا تھا۔"

"وہ کیوں؟" میں نے دستخط کرتے ہوئے کہا۔

"اس لیے کہ یہ سمن مجھے اسی روز دینے تھے۔" شیخ نے مطمئن ہو کے فائل پر نگاہ ڈالی۔" لیکن میں باتوں میں بھول گیا۔ خیر اب چلو۔" اس نے گھڑی پر نگاہ ڈال کے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"میرے پاس تو اس وقت کوئی سواری نہیں۔" میں نے کہا۔" کار ابھی ابھی پنڈی گئی ہے۔ سرکاری جیپ میں رضوی صاحب آفس گئے ہیں اور اپنی فاکس ویگن میں رابعہ کورٹ جا چکی ہے۔ سڑک پر جہاں تک ٹیکسی ملے، پیدل ہی جانا ہو گا۔"

نہر کی طرف آنے کے بجائے ہم دونو مخالف سمت میں چلنے لگے۔ اگلے چوک پر رکشا یا ٹیکسی عموماً مل جاتے تھے۔

"سکندر!" شیخ نے اچانک کہا۔" فرض کی ادائیگی خود ایک امتحان ہوتی ہے اور خدا کا شکر ہے کہ اب تک میں نے جانتے بوجھتے کبھی کوتاہی نہیں کی لیکن فرض شناسی کا یہ امتحان اب ایک سزا بننے لگا ہے۔"

"جو کچھ کہنا ہے، صاف الفاظ میں کھل کر کہو۔ کسی نے دھمکی دی ہے تمھیں؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ مختلف اوقات میں اور مختلف طریقوں سے مجھے سمجھانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔" وہ بولا۔" سب سے پہلے تو اسی دن جب میں کرشن نگر میں تمھاری بہن شہلا کے مکان سے نکلا تو کچھ لوگ میرے انتظار میں تھے۔ باہر نکلتے ہی مجھے ٹیکسی نظر آگئی اور اس سے پہلے کہ وہ بات کرتے، میں روانہ ہو گیا۔ انھوں نے ایک جیپ میں تعاقب کیا لیکن میری خوش قسمتی یا ان کی بدقسمتی ایک ٹائر فلیٹ ہو گیا۔ مجھے تو معلوم ہی نہیں ہوا تھا کہ میرے پیچھے بھی کوئی ہے اگر یہ معمولی سا حادثہ نہ پیش آتا تو وہ لوگ وہیں معاملہ طے کر لیتے۔"

"کس بات کا معاملہ؟" میں نے کہا۔

"وہ ٹیپ تو میرے پاس نہیں ہے جس پر میں نے عبدل کے مرنے سے پہلے اس کا ٹیلی فون پر موصول ہونے والا پیغام ریکارڈ کیا تھا مگر محرّر نے اپنے ہاتھ سے جو نقل بنائی تھی، وہ میرے پاس تھی اگر وہ نقل بھی نہ ہو تو خود محرّر بھی صاف انکار کر سکتا ہے کہ کیسا ٹیپ اور کیسا تحریری بیان؟ میں نے تو اپنے ہاتھ سے کچھ بھی نہیں لکھا۔ غالباً ان لوگوں نے میر محمد کی اطلاع پر محرّر سے رابطہ قائم کیا تھا۔ محرّر بے چارے نے کہا ہو گا کہ میں اب کیا کروں، تحریر میرے ہاتھ کی ہے لیکن دوسروں کے ہاتھ پڑ چکی ہے۔ اب زیادہ سے زیادہ میں یہی کر سکتا ہوں کہ شیخ صاحب پر زبردستی وہ بیان لکھوانے کا غلط الزام عائد کر دوں مگر یہ بہت کمزور مؤقف ہو گا۔ سکندر کے وکیل بہت بڑے ہیں اور اس کے ساتھ ایک ایس ایس پی بھی ہے جو میری ایسی تیسی کر سکتا ہے اگر وہ تحریر محرّر کے پاس ہوتی یا تھانے میں ہوتی تو مجرم یقیناً ہر قیمت پر اسے حاصل کر لیتے۔"

"کیا اب وہ منہ مانگی قیمت دینے کی پوزیشن میں نہیں رہے؟" میں نے کہا۔

"نہیں، وہ تحریر کسی کی دسترس میں نہیں رہی۔" شیخ مسکرایا۔ "پہلی ناکامی کے بعد کسی نے میرے گھر فون کیا تھا اور مجھ سے صاف بات کی تھی۔ انھوں نے کہا تھا کہ میں کوئی بیان ہی نہ دوں اور اگر دوں تو اس میں عبدل کے ٹیلی فون کا کوئی ذکر نہ کروں۔ میں نے پوچھا کہ جناب کون ہیں، یہ مطالبہ کیوں فرما رہے ہیں اور اس کیس میں اتنی دلچسپی لینے کی وجہ کیا ہے؟ مجھے جواب ملا کہ شیخ صاحب! آپ واقعی جولاہے ہیں۔ بھائی آدمی کو آم کھانے چاہییں یا پیڑ شمار کرنے میں وقت ضائع کرنا چاہیے۔ عقل سے کام لو۔ ہماری بات ماننے میں فائدہ ہے تو فائدہ اٹھاؤ۔ ہم بھی کے ٹو سر کرنے کا مطالبہ تو نہیں کر رہے ہیں۔ خاموش رہنا بھی کوئی مشکل کام ہے اور اگر محض خاموش رہنے کے ایک لاکھ مل جائیں تو کیا حرج جائز ہے؟ میں نے کہا۔ لاکھ کے بعد ہوتا ہے کروڑ۔ اس کے بعد ارب اور کھرب، مگر ان سے پہلے ہوتا ہے اصول۔ اس کے معنی جانتے ہو؟ میرا دستور ہے کہ میرے اصول قابلِ فروخت و خرید نہیں چنانچہ اعداد و شمار کے چکر میں مت پڑو۔ اپنی دولت بچاؤ اور جیسا کہ تم نے ابھی کہا تھا۔ مجھ جولاہے کی بات ماننے میں فائدہ ہے تو فائدہ ضرور اٹھاؤ۔ پھر میں نے فون بند کر دیا لیکن اس شخص نے پھر فون کیا اور رقم بڑھا کے پانچ لاکھ تک کر دی۔ اس وقت

مجھ سے ایک غلطی ہوگئی۔ میں نے کہہ دیا کہ اب میں ٹیلی فون ایکس چینج سے شکایت کر رہا ہوں اور تم نے فون کیا تو مجھے معلوم ہوجائے گا کہ تم کہاں سے بات کر رہی ہو اور ہو سکتا ہے وہاں آبزرویشن پر سب ریکارڈ ہوجائے۔ تیسری بار کسی عورت نے میرے والد سے بات کی اور ان سے کہا کہ آپ کا عاقبت نا اندیش بیٹا پانچ لاکھ کی رقم کو نہیں، ہمیں لات مار رہا ہے اور اچھا نہیں کر رہا ہے۔ آپ کے نزدیک اس کی زندگی کی قیمت کیا ہوگی؟ میرے والد پریشان تو ہوئے مگر انھوں نے کہا۔ ''بی بی! یہ کیا معموں میں بات کر رہی ہو، میں کچھ نہیں سمجھا۔ کیا تمھارا کوئی بیٹا ہے؟ ہے تو مجھے بھی بتا دو کہ اس کی زندگی کی مالیت تم نے سکۂ رائج الوقت میں کتنی رکھی ہے؟ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ زندگی کا کوئی مول ہی نہیں اور یہ خدا کی امانت ہے۔'' اس عورت نے کہا کہ تفصیلات اپنے بیٹے سے معلوم کر لیجیے اور فون بند کر دیا۔ غالباً وہ خوفزدہ ہوگئی کہ کہیں سچ مچ میں نے ٹیلی فون کو آبزرویشن پر نہ رکھوا دیا ہو۔ میرے والد نے مجھے بلایا اور ساری بات بتائی۔ میں نے کہا کہ آپ کا جواب بہت مناسب تھا۔ وہ مجھ سے میرے ایمان کا سودا کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بتایئے کتنے میں بیچوں؟ میرے والد نے کہا کہ یہ بات ہے تو جان کی فکر مت کرو، اس کا لینے والا بھی اُس کے سوا کوئی نہیں جو زندگی دیتا ہے اور اسے وقتِ مقررہ تک اس کی حفاظت بھی خود ہی کرتا ہے۔ لیکن...''

''لیکن یہ شیخ تم نے تو واقعی ثابت کر دیا کہ تم پولیس انسپکٹر نہیں، بہ ... ہے ہو۔'' میں نے کہا۔ ''اس دھمکی کے باوجود فائل کو یوں ... لیے پھر رہے ہو بقولِ چچا غالب ؎

کو ... جو چھپے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے''

... ہنسا۔ ''میں اتنا احمق نہیں ہوں جتنا نظر آتا ہوں ... پوچھے گا تو میں چھپاؤں گا کچھ نہیں۔ فائل ان کے حوالے کردوں گا۔''

''یہ مزید عقلمندی کی دلیل ہوگی۔'' میں نے کہا۔ ''پہلے پانچ لاکھ چھوڑ دیے پھر فائل تحفے میں دے دی۔''

''یہ تحفہ پا کے وہ خوش نہیں ہوں گے۔'' شیخ نے ہنس کر کہا اور فائل کھول کر مجھے دکھائی۔

میں بھونچکا رہ گیا۔ فائل میں وہ سمن ضرور موجود تھا جس پر میں نے ابھی کچھ دیر پہلے دستخط کیے تھے لیکن باقی فائل کی ضخامت بے مصرف صفحات پر مبنی تھی۔ درمیان میں ردی اخبار تہہ کر کے لگا دیے گئے تھے۔

''اصل فائل کہاں گئی؟'' میں نے بے وقوفوں کی طرح کہا۔

''اب بتاؤ، جولاہے عقلمند ہوتے ہیں یا پٹھان؟'' شیخ نے ایک ٹیکسی کو روکتے ہوئے کہا۔

''میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''تم یہ نقلی فائل لیے پھر رہے ہو۔ خطرہ تو پھر بھی ہے۔ جو اسی نقلی فائل کو اصلی سمجھ کے حاصل کرنے کی کوشش کریں گے وہ تمھیں کوئی رعایت نہیں دیں گے اور جب انھیں اپنے بے وقوف بننے کا اور اپنی ناکامی کا احساس ہوگا تو وہ مزید مشتعل ہوں گے۔'' میں بھی ٹیکسی کی پیچھے والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

''رات کو میں نے اس صورتِ حال پر ہر پہلو سے غور کر لیا تھا۔'' شیخ نے کہا۔ ''مجھے تو رات کو بھی اندیشہ تھا کہ کہیں اس فائل کے لیے صبح ہونے سے پہلے ہی خریدار نہ آجائیں چنانچہ پہلا کام تو میں نے یہ کیا کہ فائل اپنے ساتھ والے گھر میں رکھوا دی۔ ایک لفافے میں بند کر کے اور لفافے کو بریف کیس میں مقفل کر کے۔ پھر راتوں رات میں نے یہ فائل تیار کی۔ اس کے علاوہ میں نے تھانے سے دو مسلح سپاہی بلوائے جو آگے پیچھے پہرہ دیتے رہے۔ خود میں بھی چوکس رہا اور میرا ریوالور تکیے کے نیچے موجود رہا۔ ممکن ہے کہ کوئی آیا ہو اور یہ حفاظتی انتظامات دیکھ کر لوٹ گیا ہو۔''

''اگر تم سادہ کپڑوں میں لوگوں کو چھپا دیتے تو شاید کوئی تمھارے ہاتھ لگ جاتا۔'' میں نے کہا۔

''یہ خیال تو مجھے بھی آیا تھا۔'' شیخ نے کہا۔ ''لیکن میں نے دوسرے امکانات پر غور کیا۔ مثلاً یہ کہ وہ بھی مسلح ہو کے آتے اور خود کو محصور دیکھتے تو ایک خونریز جنگ کے بعد یا تو مر جاتے یا کسی کو مار دیتے۔ میں خون خرابا نہیں چاہتا تھا اور یہ بھی واضح کر دینا چاہتا تھا کہ ایک پولیس افسر اپنی حفاظت کر سکتا ہے۔ وہ کھلی جنگ نہیں لڑ سکتے۔ صبح میں نے والد سے کہا کہ جب میں نکل جاؤں تو آدھے گھنٹے بعد آپ پڑوس کے گھر جائیں۔ وہاں سے بریف کیس لیں اور ان سے کہیں کہ اپنی گاڑی میں آپ کو کورٹ پہنچا دیں۔ ان سے ہمارے پرانے مراسم ہیں اور ایک زمانے میں یہ پڑوسی میرے والد کا شاگرد تھا۔ وہ انکار کر ہی نہیں سکتا۔ کورٹ جانے کے بعد وہ بریف کیس رابعہ قاری ایڈووکیٹ کے حوالے کردیں اور لوٹ آئیں۔ بار روم سے مس رابعہ قاری کا پتا چل جائے گا۔ وہ نہ ملیں تو عبدالودود منظر نام کے ایڈووکیٹ سے مل لیں اور انھیں ساری بات بتا دیں۔ پھر میں پہنچ جاؤں گا اور اگر نہ بھی پہنچا تو فائل بہرحال عدالت کی تحویل میں پہنچ جائے گی۔ ایک مرتبہ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج اس محرر کے لکھے ہوئے بیان کو پڑھ لے اور میرا بیان سن لے۔ میں گزشتہ شب ٹیلی فون پر ہونے والی گفتگو کا ذکر بھی کردوں گا اور میرے والد بھی بیان حلفی داخل کریں

...ئے۔ اس کے بعد کوئی خطرہ نہیں۔''

''لیکن شیخ۔ وہ محرر...''

ابھی میرا جملہ مکمل بھی نہیں ہوا تھا کہ ایک زبردست دھماکا ہوا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے سخت کوشش کر کے ٹیکسی کو بے قابو ہونے اور الٹنے سے بچا لیا مگر اسے ایک دیوار کے ساتھ ٹکرانے سے نہیں بچا سکا۔ میں اور شیخ تصادم کے بعد ایک دوسرے پر ... مگر فوراً سنبھل گئے۔ میرے کانوں میں ہیڈ لائٹس اور ...سامنے کے ونڈ اسکرین کا شیشہ ٹوٹ کر بکھرنے کی آواز آئی اور ...شے کے ذرے اڑ کر اندر آئے۔ مجھے ذرا سی دیر کے لیے ٹیکسی ڈرائیور کا لہولہان چہرہ دکھائی دیا پھر میں نے وہ جیپ دیکھی ...س نے سائڈ روڈ سے آ کے ٹیکسی کو ٹکر ماری تھی۔ یہ پرانی جیپ ...ایسے ہی کم مضبوط نہ تھی لیکن اس کے سامنے بمپر کے اوپر لوہے کی سلاخوں سے بنی ہوئی جالی لگا دی گئی تھی۔ بظاہر اس کا مقصد ...رف ہیڈ لائٹس یا جیپ کے سامنے والے حصے کی حفاظت کے ...ظاہی انتظام کے سوا کچھ نہ تھا مگر میں نے دیکھا کہ لوہے کی ...سلاخیں سامنے کی طرف موڑ دی گئی ہیں اور ان کا اگلا حصہ نوکیلا ...ہے۔ جیپ کی چوڑائی کے رخ پر ایک ایک فٹ لمبے بھالے سے ...ا لگے ہوئے تھے کہ جیپ دیوار سے ٹکراتی تو دیوار میں پیوست ہو جاتے۔ انھوں نے ڈرائیور کی سائڈ سے ٹکر ماری تھی — شاید اُن کا نشانہ پیچھے والا دروازہ ہوگا لیکن ذرا سے فرق کے باعث سلاخیں ڈرائیور کی سائڈ والے حصے میں، انجن کے ...بونٹ میں اور ایک ٹائر میں گھس گئیں۔ ٹائر برسٹ ہوتے ہی ٹیکسی سامنے سے تھوڑا سا جھک گئی اور ڈرائیور کی سائڈ کا دروازہ ...در گھس گیا تھا۔ اس میں سلاخوں سے سوراخ بھی ہوئے تھے ...ین ڈرائیور بال بال بچ گیا تھا۔ خود میں نے جب اسی طرف سے دروازہ کھول کے باہر نکلنے کی کوشش کی تو مجھے معلوم ہوا کہ پیچھے ...والا دروازہ بھی ایک سلاخ نے سیل کر دیا ہے۔ میں اور شیخ تقریباً ...یک ساتھ دوسری طرف سے باہر نکلے۔ میرا خیال تھا کہ شیخ نے ...ریوالور فوراً نکال لیا ہوگا مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ جیپ میں ...سے اترنے والے دو افراد نے ہمارا راستہ اس طرح روک لیا کہ ہم ...خود بھی دیوار سے لگ گئے۔ وہ دونوں قد و قامت میں ہم سے ...ڑ ... تھے مگر اصل خطرے کی بات یہ تھی کہ ایک چند قدم پیچھے ...تھا اور اس نے ایک ہاتھ میں ریوالور پکڑ رکھا تھا جس کا رخ ...اری طرف تھا۔ دونوں نے منہ پر ڈھاٹے باندھے ہوئے تھے۔

''انسپکٹر صاحب! یہ فائل ...'' آگے رہنے والے نے ہاتھ ...ڑھایا مگر وہ اب بھی ہم سے کافی دور تھا۔

''لیکن ... ...بن تم نے پانچ لاکھ... کل میری بات ہوئی تھی۔'' شیخ نے ہکلا کر کہا۔

اس شخص نے قہقہہ مارا اور پھر شیخ کو ایک گالی دی۔ ''وہ کل کی بات تھی۔ کل کے ساتھ گئی۔''

''یہ... یہ تو بڑی زیادتی ہے۔'' شیخ نے مظلوم بن کے فریاد کی۔ یہ سب اداکاری تھی۔ ''چلو ایک لاکھ ہی دے دو۔''

''بکواس نہیں چاہیے۔ فائل پھینک ادھر۔'' اس نے مزید غلاظت کا اضافہ کیا۔

شیخ نے فائل اس کی طرف پھینک دی جسے اس نے بڑی پھرتی سے اٹھا لیا۔ اس کا دوسرا ساتھی ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہیں ہوا۔ میں ذرا بھی مستعدی دکھاتا تو وہ یقیناً گولی چلا دیتا۔ اس کی نیت کا اندازہ اس کی آنکھوں سے ہو رہا تھا۔ شاید اسے اچھی طرح بریف کر دیا گیا تھا کہ انسپکٹر کے پاس تو خیر ریوالور ہوگا ہی مگر اس کے ساتھ جو شخص خالی ہاتھ ہوگا، وہ زیادہ خطرناک ہے۔ اسے موقع دیا تو وہ پلک جھپکتے میں گردن توڑ دے گا۔ میں نے اور شیخ نے بے بسی سے ایک دوسرے کو دیکھا اور اپنے حریفوں کو کامیابی پر مسرور ہونے کا موقع دیا۔

اچانک ایک کار نمودار ہوئی۔ جہاں ہم مجبوراً کھڑے تھے وہاں سے صبح صبح گزرنے والا کوئی نہ تھا۔ چنانچہ اس کار کو دیکھ کر مجھے تھوڑی سی خوشی ہوئی مگر یہ خوشی پل بھر کی بھی نہ تھی۔ کار پر کوئی نمبر نہیں تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ نمبر نوٹ کر کے ایک گواہ تو پیدا کر لوں گا جو بعد میں چشم دید واقعات بیان کر سکے گا۔ کار سیدھی ہمارے سامنے آ رکی۔ فائل والا ایک ایک قدم پیچھے ہٹا اور کار کے ڈرائیور نے اس کے لیے پیچھے کا دروازہ کھول دیا۔ اس نے کار میں بیٹھتے ہی ریوالور کھڑکی سے باہر نکالا اور اپنے دوسرے ساتھی کو واپسی کا حکم دیا۔ دوسرا شخص دوسری طرف سے کار میں جا بیٹھا۔ کار ایک جھٹکے سے روانہ ہوئی اور حیرت انگیز رفتار سے سیدھی اس سڑک پر دوڑنے لگی جس پر ہم پیدل چل کے آئے تھے۔ اس کے بعد شیخ نے بڑی تیزی سے ریوالور نکالا اور کار کے ٹائروں کا نشانہ لے کر فائر کیا مگر اس کی گولی کے نکلنے سے چند سیکنڈ قبل فرار ہونے والے مجرموں نے کھڑکی میں سے کوئی چیز باہر پھینکی جو چوراہے پر گر کے دھماکے سے پھٹی اور دھوئیں کا ایک گہرا سیاہ بادل اٹھا جس نے کار کو ہماری نظروں سے چھپا لیا۔ اس کثیف دھوئیں کے پار دیکھنا اتنا ہی مشکل تھا جتنا کسی ایک فٹ موٹی دیوار کے پار دیکھنا۔ شیخ کا نشانہ خطا ہوگیا۔ وہ بے اختیار پیچھے دوڑا مگر میں نے اسے روک لیا۔

''پاگل ہوئے ہو۔ وہ بہت دور جا چکے ہیں۔'' میں نے

کہا۔"ہم ان کا پیچھا نہیں کر سکتے جتنی دیر میں ہمیں کوئی سواری ملے گی۔ وہ میلوں دُور جا چکے ہوں گے۔ اب خیریت اسی میں ہے کہ یہاں سے نکل چلو۔ لوگ جمع ہو رہے ہیں۔"

"مگر مجھے اس حملے کی رپورٹ دینی ہے۔" شیخ نے برہمی سے کہا۔"انھوں نے جان بوجھ کے ٹکر ماری تھی۔"

"مجھے بھی معلوم ہے لیکن اس کا ثبوت؟" میں نے کہا۔ کیوں خود کو بلاوجہ اس حادثے میں ملوّث کرتے ہو۔ عقل سے کام لے کر جان تو بچالی تھی اور فائل بھی۔ اب مصیبت میں کیوں . . ."

"تمھارا مطلب ہے میں اس ٹیکسی ڈرائیور کو یہیں چھوڑ کے چلا جاؤں؟ اسی حالت میں؟"

"ڈرائیور کو صرف خراشیں آئی ہیں اور وہ بھی منہ پر شیشہ لگنے سے۔" میں نے کہا۔" وہ کچھ دیر بعد ہوش میں آ جائے گا۔"

"اور ہوش میں آتے ہی وہ بیان دے گا کہ مجھے ایک سب انسپکٹر نے روکا تھا۔" شیخ بولا اور ریوالور جیب میں رکھ لیا۔

"کس سب انسپکٹر نے؟ وہ تمھارا نام تو نہیں جانتا۔" میں نے کہا۔" وردی میں سب ایک جیسے لگتے ہیں۔ ہم اپنے اپنے گھروں سے بہت دور ہیں۔ وہ میرا حلیہ بھی لکھوائے گا۔ تو کیا پتا چلے گا۔" میں نے اسے اپنے ساتھ گھسیٹ لیا۔

"مگر اس کی ٹیکسی کا بہت نقصان ہوا ہے۔" شیخ نے کہا۔ "اس کا ذمے دار میں ہوں۔"

"زیادہ سے زیادہ پانچ ہزار میں ٹیکسی ڈینٹ پینٹ ہو جائے گی۔" میں نے کہا۔" یہ رقم ہم اسے بعد میں بھجوا دیں گے۔ جیپ جس نے ٹکر ماری تھی، یہیں پھنسی ہوئی ہے اور اس پر نمبر پلیٹ بھی ہے۔ اس علاقے کے تھانے کو تفتیش کرنے دو۔ یا تو وہ جیپ والے کا سراغ لگالیں گے۔ ورنہ کیس فائل کر دیں گے۔ ہوسکتا ہے جیپ چوری کی ہو یا کسی کی بھی نہ ہو۔ فرضی نام پتے پر رجسٹرڈ ہو۔ ابھی یہاں کوئی چشم دید گواہ نہیں۔ لوگ چوک میں جمع ہو رہے ہیں مگر وہ اِدھر بھی آ جائیں گے پھر ہم پھنس جائیں گے اور وقت پر عدالت میں حاضر نہیں ہوسکیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ میری ضمانت خود بخود منسوخ ہو جائے گی۔ عدالت میں پہنچ کے تم اپنا مفصل بیان لکھوا سکتے ہو لیکن دیکھو، حادثے کا ذکر کر کے مشکل میں پڑنے سے کچھ حاصل نہیں۔ اطمینان سے عدالت میں وہ فائل پیش کر دو اور یہ ظاہر کرو جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ پھر دیکھنا اس ناکامی سے مجرم کتنا پیچ و تاب کھاتے ہیں لیکن پھر وہ کچھ نہیں کر سکیں گے۔ تیر ان کے ہاتھ سے نکل چکا ہوگا۔"

شیخ آہستہ آہستہ میری باتوں سے قائل ہونے لگا تھا۔ ہم اب جائے حادثہ سے اگلا موڑ کاٹ کر مال پر آ گئے تھے۔ وہاں ہمیں ایک رکشا ملا اور ہم اس مار دھاڑ سے بھرپور وقفے کے بعد پھر ضلع کچہری کی جانب روانہ ہوئے۔

یہ عجیب ہنگامہ خیز دن تھا۔ ایک رات کے ختم ہونے سے پہلے دو افراد اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ ان میں ایک بوڑھی اور مفلوج عورت تھی جو کسی جرم کے مفہوم سے بھی آشنا نہ تھی۔ شاید وہ سمجھتی ہوگی کہ جھوٹ بولنا جرم ہے، امانت میں خیانت جرم ہے، کسی کا دل دُکھانا جرم ہے۔ یہ باتیں پرانے لوگ کہتے تھے اور پرانی کتابوں میں لکھی ہوئی تھیں اور آج بھی غلط نہ تھیں مگر منشیات اور اسلحے کی اسمگلنگ، بردہ فروشی اور بطور پیشہ قتل کرنے یا کرانے اور اس نوعیت کے سنگین جرائم کے مقابلے میں یہ باتیں کس قدر عجیب معلوم ہوتی ہیں۔ شہلا کی ماں کو سمجھایا جاتا تب بھی وہ نہ سمجھتی کہ ڈی سلوا اور چوہدری دلاور کیا کرتے ہیں اور کیوں کرتے ہیں اور اس نے مرنے سے پہلے بہت سوچا ہوگا کہ مجھے کس جرم کی سزا مل رہی ہے اور یہ سزا دینے والے کون ہیں مگر کوئی جواب اس کی عقل میں آنے سے پہلے موت کا بلاوا آ گیا ہوگا۔ خود ڈی سلوا نے اس کے برعکس یہ سوچا بھی نہ ہوگا کہ اگلا لمحہ اس کے اختیار سے باہر موت کی سرحد کو عبور کرنے کے بعد آئے گا۔ وہ اپنی قوت اور ذہنی و جسمانی صلاحیت پر نازاں کامل اعتماد کے ساتھ زندگی کی شاہراہ پر کامیابی کی طرف ایک اور قدم اٹھا چکا تھا اور اب اس وقت جبکہ میں شیخ اور ہم جیسے دنیا کے تمام انسان بدستور کاروبارِ حیات میں معروف تھے (کیونکہ وہ زندہ تھے) اور یہ دنیا اسی طرح وقت کے پیمانے کے مطابق سورج کے گرد گھوم رہی تھی، ڈی سلوا کا بے حس وجود ڈی کمپوز ہونے لگا تھا۔ زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب۔ موت کیا ہے اِنھی اجزا کا پریشاں ہونا۔ معلوم نہیں کہاں لکھا تھا کہ آدمی کے جسم میں ننانوے فی صد پانی ہے جو بخارات بن کے فضا میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ باقی جسم کے کیمیائی اجزا کیلشیم، فاسفورس، فولاد وغیرہ کی قیمت ساڑھے چھ ڈالر بنتی ہے تو ڈی سلوا بھی ساڑھے چھ ڈالر کے نوٹ کی طرح پھٹا پڑا ہوگا اور قانون کے نگہبان صرف یہ جاننے کی فکر میں ہوں گے کہ یہ نوٹ آخر پھٹا کیسے؟

"کیا سوچ رہے ہو؟" شیخ نے میرا شانہ ہلا کے کہا۔" میں نے کچھ پوچھا تھا۔"

میں بُری طرح چونکا۔" اوہ۔ معاف کرنا۔ میرا ذہن سمہ... میں نہ آنے والے واقعات میں الجھا ہوا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ ...اگر اس وقت تمھارے پاس اصل فائل ہوتی تو تم کیا کرتے؟"

"ظاہر ہے، میں اس کی حفاظت کرتا۔ جب تک ممکن ہوتا۔" شیخ بولا۔

"یہ تمھاری دانشمندی یا دُور اندیشی کے علاوہ تائیدِ ایزدی بھی ہے۔" میں نے کہا۔"اگر وہ اسی وقت فائل کھول کے دیکھ ...لیتے تب بھی شاید صورتِ حال مختلف نہ ہوتی مگر اب تو معاملہ ...الٹا ہوگیا ہے۔ مارے وہی جائیں گے جو ہمیں مارنے آئے تھے، ...وہ بڑے فخر سے اپنے کامیاب مشن کی رپورٹ دیں گے اور سند کے ...طور پر فائل پیش کریں گے۔ اس کا جو انعام انھیں ملے گا، وہ ...ظاہر ہے۔"

"یہ ہوسکتا ہے کہ وہ دوبارہ کوشش کریں، عدالت پہنچ جائیں۔" شیخ نے کہا۔

"نہیں۔ وہاں وہ بے بسی سے تماشا دیکھ سکتے ہیں، کچھ ...نہیں سکتے۔" میں نے کہا۔" یہ تو ناممکن ہے کہ اس کاغذ کے ...پرزے کے لیے وہ تمھیں، خدانخواستہ تمھارے والد کو، رابعہ اور ...لشکر میں سے کسی کو شوٹ کر دیں۔ البتہ مجھے اب اس محرّر کی طرف ...تشویش لاحق ہوگئی ہے۔"

"تشویش کیسی، عدالت میں اسے کچھ تو کہنا ہی پڑے گا۔ جھوٹ یا سچ۔" شیخ نے کہا۔

"ہاں۔ بشرطیکہ وہ عدالت پہنچا۔" میں نے کہا۔" ویسے تو ...رضوی صاحب نے بھی کہا تھا کہ محرّر بیان ضرور دے گا اور اسے ...نے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میر محمد اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ ...اسے اپنے پاس بلوالیں گے یا میر کا خانہ خراب کر دیں گے ...یہ زبانی دعوے ہیں جو غلط بھی ہوسکتے ہیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے ...محرّر غائب ہو جائے۔"

"غائب ہو کے وہ کہاں جائے گا۔" شیخ نے کہا۔" اور کتنے ...غائب رہے گا۔"

"یار شیخ پھر وہی کم عقلی کی باتیں۔" میں نے کہا۔" ارے ...اس دنیا میں سب تو ایس آئی شیخ نہیں ہیں اور ان کے ...جیسے کہاں ہوتے ہیں جو زندگی کو انمول بھی بتائیں ...بھی تسلیم کریں کہ ایمان کے لیے جان دینا کوئی گھاٹے ...سودا نہیں۔ محرّر گھاٹے کا سودا کیوں کرے گا۔ اس سے یہ توقع ...عبث ہے کہ وہ پانچ لاکھ ٹھکرا دے گا اور اپنی زبان بند ...رکھے گا۔ وہ پانچ لاکھ لے کر بیوی بچوں سمیت پاکستان سے غائب ہو جائے گا اور اس کی مدد کرنے والے بھی بہت ...اسے کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ سمجھانے والوں نے اسے یہ بھی سمجھا دیا ہوگا کہ وہ مدد کے علاوہ بھی بہت کچھ کر سکتے ہیں اور پانچ لاکھ دے سکتے ہیں تو جان بھی لے سکتے ہیں، ملک سے باہر پہنچا سکتے ہیں جہاں کوئی اس سے سوال کرنے والا نہ ہو لیکن وہ نہ مانے تو اسے عدم آباد بھی پہنچا نا مشکل نہیں۔ محرّر غریب اور کم ہمت آدمی ہے پہلے ہی کہہ چکا تھا کہ اسے میر محمد سے ڈر لگتا ہے۔ ڈی سلوا اور چوہدری دلاور جیسے لوگوں کا مقابلہ کرنے کی وہ سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"اگر اس نے میرے بیان کی تائید نہ کی تو میری گواہی قابل اعتبار نہیں رہے گی۔" شیخ نے مایوسی سے کہا۔" الزام مجھ پر ہی آئے گا کہ میں نے تمھاری ناجائز مدد کی اور ایک ماتحت سے زبردستی وہ تحریر لکھوائی مگر تم نے کسی اور کا ذکر بھی تو کیا تھا؟"

"استاد ٹیڈی کا۔" میں نے کہا۔" محسن اسے تلاش کرنے نکلا ہے۔ مل گیا تو سیدھا عدالت میں حاضر کر دے گا۔"

"مجھے اب بھی یہ خیال پریشان کر رہا ہے کہ مجھے اس ٹیکسی ڈرائیور کو اس حال میں چھوڑ کے نہیں آنا چاہیے تھا۔" وہ بولا۔

"خدا کا شکر ادا کرو شیخ کہ کوئی جانی نقصان نہیں ہوا اور مالی نقصان بھی برائے نام ہوا۔" میں نے کہا۔" تم قتل نہیں ہوتے اور ایک فائل کو بچانے کے لیے میرے یا تمھارے ہاتھوں کوئی مارا نہیں گیا۔ حملہ آوروں کو بھی صرف فائل کے حصول کا حکم تھا اور خونریزی سے اجتناب کی تاکید تھی۔ جہاں اس وقت وہ ٹیکسی کھڑی ہے وہاں لاشیں پڑی ہوتیں۔ تم مارنے والوں میں ہوتے تو تمھارا شمار قاتلوں میں ہوتا اور تم معطل ہو جاتے۔ جو تمھارے بدخواہوں کی خواہش کے عین مطابق ہوتا۔ یہ بھی خدا کی مرضی تھی۔ کہ حادثے میں ہمیں گزند نہ پہنچے ورنہ لوہے کی وہ سلاخیں میرے، تمھارے یا اس ٹیکسی ڈرائیور کے جسم کے پار بھی ہوسکتی تھیں۔"

"تمھیں یقین ہے کہ وہ صرف بے ہوش تھا؟ فرض کرو اس کے سر کی چوٹ مہلک ثابت ہوئی؟"

"چوٹ اس کے سر میں نہیں آئی تھی اور نہ کوئی گہرا زخم آیا تھا۔" میں نے کہا۔" وہ صدمے کے عارضی اثرات سے بے ہوش تھا اور اب تک یقیناً ہوش میں آگیا ہوگا۔ لوگ جائے حادثہ پر پہنچ چکے ہوں گے۔ اسے اسپتال پہنچا دیا جائے گا۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ مجرموں نے فرار ہوتے وقت دستی بم نہیں پھینکا۔ صرف دھواں پھیلانے والا گولا چھوڑ دیا اور اس 'اسموک اسکرین' کی پناہ میں فرار ہوگئے۔ اسی اسموک اسکرین یا دھوئیں کی دیوار نے ہمیں بھی نکل آنے کا موقع فراہم کیا اور کسی نے ہمیں دیکھا نہیں۔"

"لوگوں کی بے حسی پر مجھے حیرانی ہوتی ہے۔" شیخ بولا۔" حادثے کے بعد اور اس وقت جب ملزم ہمیں ہینڈز اَپ کرائے کھڑے تھے،

اس جگہ سے تین افراد گزرے تھے۔ تم نے نہیں دیکھا مگر میں نے دیکھا تھا۔ ایک موٹر سائیکل والا' ایک سائیکل سوار اور ایک پیدل۔ مگر وہ سب ایسے نظر چُرا کے بھاگے جیسے خود مجرم ہوں"۔

"ہر شریف آدمی گواہی کے چکّر میں پڑنے سے گریز کرتا ہے شیخ"۔ میں نے کہا۔" بھلا جو شخص گھر سے نوکری پر جانے یا دکان کھولنے یا محنت مزدوری کرنے نکلا ہو، وہ خواہ مخواہ اس قسم کے معاملات میں پڑ کے مشکل میں گرفتار کیوں ہو۔ بعد میں کیس تو نہ جانے کب تک چلے گا۔ اسے تفتیش میں خوار ہونے کے بعد ہر تاریخِ سماعت پر حاضری کے لیے دفتر سے چھٹی کرنی پڑے گی۔ دکان بند رکھنی ہوگی یا ایک دن کی روزی قربان کرنی پڑے گی۔ چشم دید گواہ تو مصیبت میں پڑ جاتے ہیں"۔

رکشا ضلع کچہری کے احاطے میں رکا تو میں نے کرایہ ادا کیا۔ رکشا والے نے خاصی حیرانی سے اور کچھ پریشانی کے بعد کرایہ قبول کیا۔ اس کے لیے بھی یہ ایک نیا تجربہ ہوگا کہ کوئی پولیس افسر وردی میں ہونے کے باوجود مفت میں رکشا کی سواری نہ کرے۔

"اب آخری بار سمجھ لو شیخ!" میں نے کہا۔" ہمارے ساتھ کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔ تمھاری صورت پر بارہ بج رہے ہیں۔ پولیس افسر بن جاؤ جو قتل کے ایک ملزم کو لے کر عدالت پہنچا ہے۔ ہمارے چلنے سے کچھ پتا نہیں چلتا پھر ہمیں کسی کو کچھ بتانے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ بھی نہیں کہ ہم گھر سے رکشا میں بیٹھے اور یہاں آگئے۔ کوئی بھلا ہم سے کیوں پوچھے گا کہ آپ لوگ کس طرح پہنچے؟"

"اتنا بڑا جھوٹ میں نے زندگی میں پہلے کبھی نہیں بولا تھا سکندر!" وہ میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

"زندگی میں ابھی تم نے بہت کچھ نہیں کیا ہے۔" میں نے کہا۔" میری طرح تجربات کی بھٹی سے نکلو گے تو زمانے کے گرم و سرد کو سمجھ لو گے اور تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ جھوٹ اور سچ محض حالات کے پیمانے ہیں اور یہ دوسروں کا نقطۂ نظر ہے جو سچ اور جھوٹ کے درمیان فرق پیدا کرتا ہے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ تم جانتے ہو کہ عبدل نے تمھیں فون کیا تھا اور یہ بتا دیا تھا کہ سچ کیا ہے۔ مگر اتنا بڑا سچ دوسروں کے نقطۂ نظر سے جھوٹ ثابت ہو رہا ہے۔ سچ یہ بھی ہے کہ میر شرافت علی کو میں نے قتل نہیں کیا تھا مگر اسے جھوٹ ثابت کرنے والے زیادہ مستند ہیں۔ سچ تو یہ بھی ہے کہ میرے باپ کو بلیک میل کرنے والوں نے غربت اور بے بسی کی بدترین موت عطا کی مگر سچ یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس نے سالِ رواں میں ساڑھے تین لاکھ کا منافع وصول کیا تھا اور اپنے دستخطوں سے۔ مگر اب اس کی لاش بھی نہیں جو اس جھوٹ کی تردید کر سکے۔ ہم اس ٹیکسی والے کی مدد سامنے آئے بغیر بھی کر سکتے ہیں۔ سامنے آنے اور سچ بولنے سے اس کو تو کوئی فائدہ نہیں ہوگا تمھارا انجام وہی ہوگا جو فرض شناسی اور ایمانداری کے چکر میں پہلے بھی اچھا نہیں ہوا۔"

شیخ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی حالت سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ میرے دلائل سے اس کے ضمیر میں چبھا ہوا کانٹا نہیں نکلا اور اس وقت تک وہ اندرونی خلش سے جرم و پشیمانی کے احساس میں مبتلا رہے گا جب تک اسے معلوم نہیں ہو جائے گا کہ ٹیکسی والا خیریت سے ہے۔ بار روم میں پہنچ کے ہم نے مس رابعہ قاری سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ وکیلوں کو بلوانے کی خدمت پہ مامور آدم بیزار شخص نے انٹرکام قسم کے ایک آلے میں پکارا" مس رابعہ قاری۔۔ مس رابعہ قاری!" اور پھر ہم سے کہا کہ ہم انتظار کریں' وہ آرہی ہیں۔ بار روم میں عام آدمی کا داخلہ ممنوع تھا چنانچہ اس کے سامنے موکلوں کا اور ملاقاتیوں کا ایک اجتماع تھا۔ وہ ایک وکیل کو پکار کے فارغ ہوتا تھا تو دوسرے لوگ اس کے پیچھے پڑ جاتے تھے کہ فلاں وکیل صاحب کے بارے میں معلوم کرو' عدالت میں ہیں یا بار روم میں بیٹھے ہیں۔ اس کی آدم بیزاری درست تھی۔ کم سے کم دس افراد اس کے سامنے کھڑے مختلف ناموں کی گردان کر رہے تھے۔

پانچ منٹ بعد رابعہ نمودار ہوئی۔" بہت دیر کر دی آپ لوگوں نے آنے میں"۔ وہ بولی" عدالت میں بڑی مشکل سے گیارہ بجے کا وقت لگوایا ہے"۔

"مگر ابھی تو دس بھی نہیں بجے"۔ میں نے گھڑی دیکھ کر کہا۔

"تمھیں یہاں نو بجے موجود ہونا چاہیے تھا"۔ وہ برہمی سے بولی" اگر دلاور اینڈ کمپنی کی کوشش سے پہلا نام تمھارا ہی پکارا جاتا اور کاز لسٹ میں سرفہرست ہوتا تو تم کیا کر لیتے۔ تمھاری ضمانت منسوخ ہو جاتی"۔

"آئی ایم سوری"۔ میں نے کہا" یہ بتاؤ تمھیں کسی نے کوئی بریف کیس پہنچایا ہے"۔

"ہاں۔ ایک بزرگوار تشریف لائے تھے"۔ رابعہ نے کہا" میں نے تو دیکھا بھی نہیں۔ یہاں ریسپشن میں بریف کیس رے گئے تھے اور کہہ گئے تھے کہ میرا بیٹا آ کے لے لے گا۔ کیا ہے اس میں؟ اور وہ کون صاحب تھے؟"

"وہ انسپکٹر شیخ کے والد تھے"۔ میں نے کہا" تم نے بریف کیس کھول کے دیکھا ہوتا تو تمھیں معلوم ہو جاتا کہ اس میں کیس فائل ہے جس میں محرّر کے ہاتھ کا لکھا ہوا عبدل کا بیان بھی لگا ہوا ہے"۔

"میں کیوں کھول کر دیکھتی"۔ رابعہ نے کہا" جب کہ مجھے یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ... کہ لینے کوئی اور آئے گا۔ آخر کیس فائل کہ... طرح پہنچانے کی ضرورت کیا تھی؟"

"اگر شیخ صاحب نے عقلمندی سے کام نہ لیا ہوتا تو وہ تحریر ... وقت تک دشمنوں کے ہاتھ میں پہنچ چکی ہوتی"۔ میں نے کہا۔ ... ہوں نے اس کا سودا کرنے کی کوشش بھی کی تھی اور انسپکٹر صاحب ... خطرناک نتائج کی دھمکی بھی دی تھی"۔

"اچھا تم اسی عدالت میں پہنچو اور باہر ٹھہرو"۔ رابعہ نے کہا۔ ... ظر صاحب بھی وہیں ملیں گے۔ میں آتی ہوں۔ وہ بریف کیس ... بار روم ہی میں پڑا ہے۔ میں دو بریف کیس تو اٹھا نہیں سکتی۔ ... یں فائل کو اپنے بریف کیس میں رکھ لوں گی"۔

"رابعہ وہ فائل عدالت کی تحویل میں دینی ہے۔ پوری فائل ... ہی' وہ بیان جو محرّر نے لکھا تھا اس کی اصل عدالت کے ریکارڈ ... رہے گی تو محفوظ ہوگی"۔

"وہ محرّر بھی آیا ہے کہ نہیں؟" رابعہ نے کہا" اس کی تائید ... کے بغیر وہ تحریر... اتنی اہم نہیں رہتی"۔

"کیوں اہم نہیں رہتی؟" میں نے کہا" اگر وہ آیا تو اس ... آپ بھی تسلیم کرے گا کہ اس نے یہ بیان خود ٹیپ سے کاغذ پر ... تارا تھا اور ٹیپ بعد میں غائب ہو گیا تھا۔ نہ آیا تو ہم اس کے ... سے یا تھانے سے اس کی تحریر کے نمونے حاصل کر لیں گے ... س سے ثابت ہو جائے گا کہ لکھنے والا وہی تھا اور میرا خیال ہے' ... ہمیں یہ دوسرا طریقہ ہی اختیار کرنا پڑے گا۔ محرّر کے آنے کا بظاہر ... کوئی امکان نظر نہیں آتا"۔

"اور تمھارا وہ استاد ٹیڈی۔ وہ تو آئے گا؟" رابعہ نے کہا۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں"۔ میں نے کہا" محسن اسے تلاش کرنے ... سے پہلے نکل گیا تھا"۔

"مس رابعہ!" شیخ نے کہا" آج محض پیشی ہے۔ ضمانت کی ... منسوخی کی درخواست پر سماعت نہیں ہو سکے گی۔ اس لیے ٹیڈی ... آج نہ آیا تو اگلی پیشی پر آ جائے گا۔ اس کے لیے کافی وقت ملے ... دراصل شیدے اور عبدل کے قتل کا چالان ہی ابھی تک پیش ... نہیں کیا گیا ہے"۔

جب وہ رابعہ سے بات کر رہا تھا تو میری نگاہیں چاروں ... طرف کسی آشنا چہرے کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے سرگرداں تھیں ... مگر اس ہجوم میں مجھے جانے پہچانے دشمنوں کی صورت کہیں دکھائی ... نہ دی۔ ہر طرف وہ لوگ تھے جو کسی عزیز کی تاریخِ سماعت پر ... اس کے ساتھ آئے تھے۔ گواہ تھے، ملزم تھے' کچھ صرف ہتھکڑیاں ... لگائے ہوئے' کچھ پاؤں میں بیڑیوں کے ساتھ' ان کو گھیرے رکھنے والے ... پولیس کے سپاہی تھے جو زنجیر کا دوسرا سرا اپنی وردی کی بیلٹ سے ... باندھے ... اور ملزم کو چائے اور ناشتے یا سگرٹ وغیرہ پینے کی رعایت دینے کا نذرانہ ان کے عزیزوں دوستوں سے وصول کر رہے تھے۔ وکیل اور ان کے منشی اور ایجنٹ تھے اور اس گہماگہمی کو دیکھ کر اندازہ یہ ہوتا تھا کہ قاتلوں کے محافظ کتنی مستعدی سے انصاف فراہم کرنے کے عمل میں کوشاں ہیں جبکہ درحقیقت کچھ بھی نہیں ہو رہا تھا۔ وکیلوں کی معرفت ریڈر لمبی پیشی دینے یا نہ دینے کا فیصلہ اس معاوضے کی بنیاد پر کر رہے تھے جو ان کو سب کی نظر بچا کے مگر سب کے سامنے دیا جا رہا تھا۔ گواہوں کو سبق پڑھایا جا رہا تھا کہ ان کو کیا کہنا ہے اور کیا نہیں کہنا ہے یا اظہارِ حقائق سے باز رہنے کی تلقین کی جا رہی ہے۔ فیس کا آدھا حصہ پیشگی وصول کر لینے والے اپنے موکلوں کو یقین دلانے میں مصروف تھے کہ چٹکی بجانے میں فیصلہ ان کے حق میں ہو جائے گا۔ دور دراز مقامات مضافات اور دیہات سے آئے ہوئے پورے پورے خاندان کسی ایک اسیر کی خاطر خوار و زبوں تھے، برآمدوں میں اور خشک بے وجود گھاس کے تختوں پر ڈیرے ڈالے بیٹھے تھے اور ملزم سے زیادہ مظلوم لگتے تھے۔ ہے کہاں روزِ مکافات اے خدائے دار و گیر!

جس عدالت میں مجھے پیش ہونا تھا وہاں کا نقشہ بھی مختلف نہ تھا اور فلموں میں دکھائے جانے والے مناظر سے قطعی مختلف تھا۔ میلی' بوسیدہ دیواروں اور اونچی چھتوں والے کمرے نیم تاریک تھے جن میں پرانی خستہ حال بنچوں اور کرسیوں پر لوگ زندگی سے بیزار بیٹھے تھے۔ انگریزوں کے وقت کا لٹکایا ہوا پنکھا جیسے تھک چکا تھا کہ اب بادلِ ناخواستہ گھومنے پر مجبور تھا۔ کمرے کی الماریاں اور اس میں ٹھونسی ہوئی فائلوں کو دیکھ کر کسی سرکاری دفتر کا گماں ہوتا تھا۔ ریڈر کے گرد موکلوں اور وکیلوں کا اژدہام تھا اور ایک سیدھی سادی میز جس پر لوہے کے اسٹینڈ والا چھوٹا سا جھنڈا موجود تھا تقریباً خالی پڑی تھی۔ اس کے پیچھے والی کرسی بھی خالی تھی جس سے اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ کرسی پہ رونق افروز ہونے والا منصف ابھی اپنے چیمبر میں ہے۔ عدالت اور چیمبر کے درمیانی دروازے پر ایک اتنا ہی میلا اور پرانا کپڑا بطور پردے کے استعمال ہو رہا تھا جتنا میز پر پھیلا ہوا میز پوش۔

میرا خیال تھا کہ وہاں میر محمد پہلے سے موجود ہوگا مگر اس کی جگہ میری ملاقات حشمت خان اور حوالدار بجلی سے ہوئی۔ حوالدار کے اضطراب و اشتیاق سے ظاہر ہوتا تھا کہ بقولِ شاعر۔

تو ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز

اسے ایک اشارہ چاہیے پھر وہ مثلِ برقِ تپاں مجھ پر گرتا اور ملزم زیرِ دفعہ ضابطۂ فوجداری ۳۰۲ ہونے کے باوجود اکڑ فوں دکھانے کا مزہ چکھا دیتا۔ میں نہ صرف یہ کہ گستاخانہ طور پر مسکرا رہا تھا بلکہ میں نے اس کے اعلیٰ افسر کو نظر انداز

کرکے گزر جانے کی جسارت بھی کی تھی۔ حشمت خان نے خود مجھے روک لیا "آگئے ہو شہزادے! واہ بھئی واہ! اپنے شیخ صاحب بھی ساتھ ہیں" اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے کیا مگر میں نے اطمینان کے ساتھ جیب سے سگریٹ نکالی اور لائٹر سے جلائی۔ حشمت خان نے خفیف ہو کے ہاتھ کھینچ لیا اور حوالدار کی نظر میں قہر کی بجلی سی لہرائی۔ وہ اپنی خودی کو بلند رکھنے کی جدوجہد میں افسران بالا کو بھی نہیں بھولا تھا۔

"خیر سے اپنے سکندر صاحب کچھ ناراض معلوم ہوتے ہیں۔" وہ حوالدار سے مخاطب ہو کے بولا۔

"ایک بار آجائیں ہماری مہمانی کے لیے۔ ہم ساری ناراضگی دور کر دیں گے انشاءاللہ۔" حوالدار نے خون کے گھونٹ پی کر کہا۔ پھر دلی تسکین کے لیے اس نے غیر معمولی پھرتی سے ایک قیدی کے منہ پر چھانپڑ مارا "سگریٹ پیتا ہے عدالت میں' کھوتے دا...." ملزم مذکور بھونچکا رہ گیا۔ کیونکہ اس نے یہ رعایت ایسے ہی حاصل نہیں کی تھی۔

"تم کہاں شترِ بے مہار کی طرح پھر رہے ہو؟" میں نے سگریٹ کا ایک کش لے کر کہا "تمہارا وہ ایس ایچ او میر محمد کیوں نہیں آیا؟ الو کے پٹھے!" میں نے غور سے سگریٹ کو دیکھا۔

"کیا؟" حوالدار یوں اچھلا جیسے اس کو چار سو چالیس وولٹ کا کرنٹ لگ گیا ہو "گالی... گالی دیتا ہے! ملزم!"

"ہاں" میں نے اطمینان سے کہا "میں سگریٹ بنانے والوں کو کہہ رہا تھا۔ معلوم ہوتا ہے بھوسہ بھر دیا ہے۔"

"وہ جی..." حشمت خان مجھے ٹکٹکی باندھے بڑی عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا "بڑے افسوس کی بات ہے.." اس نے کہنا شروع کیا۔

"ہاں۔ بھوسہ اس لیے تو نہیں ہوتا کہ سگریٹ میں بھرا جائے' آخر کچھ تو فرق ہونا چاہیے سگریٹ میں اور پولیس والوں کی کھوپڑی میں" میں نے اس کی بات کاٹ کے کہا۔ شیخ بے نیازی سے دوسری طرف دیکھتا رہا۔

حوالدار بجلی پھر تڑپا "پچھلی بار تو کچھ نہیں ہوا تھا۔ اس بار بتائیں گے کہ بھوسہ کیسے بھرا جاتا ہے کھال میں۔"

"ابھی ایس ایس پی صاحب آنے والے ہیں۔" میں نے بے نیازی سے کہا "انھیں بھی سمجھا دینا۔"

حوالدار بجلی کے غبارے میں سے ساری ہوا نکل گئی۔ حشمت خان نے اسے ملامت اور غصے سے دیکھا "اوئے کھوتے! الو یں اپنی ٹانگ مت اڑایا کر بیچ میں۔" حشمت خان نے حوالدار بجلی کی خودی کو انتہائی بلندی سے انتہائی پستی میں پہنچا کے کہا "میں بات کر رہا تھا میر کی۔ بات یہ ہے اپنے سکندر صاحب کہ آنا تو میر محمد ہی کو تھا۔ پکا ایس ایچ او تو خیر ابھی وہ نہیں بنا۔ بس اس وقت کام کر رہا ہے مگر مجھے اس کا پیغام ملا۔ ایک سگریٹ تو نکالیں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "اپنے پیسے سے کھانا پینا سیکھو حشمت خان! سگریٹ خرید کر پیو۔ تم میرے دوست تو نہیں ہو۔"

حشمت خان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ بادلِ ناخواستہ اس نے جیب سے ایک اٹھنی نکالی اور حوالدار بجلی کو دی "جا اوئے! کیفسٹن کا ایک سگریٹ پکڑ لا۔" حوالدار بجلی نے افسوس ناک نظروں سے اٹھنی کو دیکھا جو اس کے نقطۂ نظر سے بزدلی کا پیڈ اتھی۔

"کیا پیغام ملا تھا میر محمد کا؟" میرے بجائے شیخ نے سوال کیا۔

انسپکٹر حشمت خان نے جیب سے ایک کاغذ نکالا "اس نے تو اچھا تھا رخصت کی درخواست بھیج دیتا لیکن اس میں لکھا ہے کہ میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ تم صبح شرافت علی کے قتل کے کیس سے نمٹ لینا۔"

"حشمت خان!" انسپکٹر شیخ نے کاغذ کے اس پرزے پر غور کر کے کہا جو کسی کاپی سے پھاڑا گیا تھا "یہ میر محمد کا ہینڈ رائٹنگ تو نہیں ہے۔ وہ خاصا بدخط ہے۔ مجھے یہ دستخط بھی اس کے نہیں لگتے۔"

"او جی یہ تو ہم نے پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔ آپ ہمیں کیا بتا رہے ہو؟" حشمت خان نے ناگواری سے کہا۔

"پھر... یہ بات سمجھ لینے کے بعد تم نے کچھ کیا؟" شیخ نے پوچھا۔

"آپ تو ہم سے ایسے پوچھ رہے ہو جی... جیسے کہ آپ ہی ہمارے افسر ہو۔ او جی ہم نے کیا کوئی توپ چلانی تھی؟" وہ خفگی سے بولا "میں نے اس کا انتظار کیا۔ پھر اس کے گھر جا کے دیکھا۔ وہیں تو رہتا ہے وہ۔ تھانے کے پیچھے لیکن اس کی گھر والی نے کہا۔ خیر اب عورت ذات کو کیا کہیں۔ اس نے تو بہت کچھ کہا تھا۔ مطلب اس کا یہ تھا کہ میر محمد اس وقت ڈیوٹی پر ہوتا ہے۔ گھر میں نہیں بیٹھا رہتا۔ مغز ماری کے لیے وقت نہیں تھا بعد میں دیکھیں گے کیا چکر ہے اگر سرکاری کام ہوتا تو وہ ہمیں بتا کے جاتا۔ پرائیویٹ کام ہوتا تو گھر والی کو معلوم ہوتا۔"

اسی وقت کسی نے میرے کندھے پر زور سے ہاتھ مارا۔

"ارے بھائی سکندرِ اعظم۔ واہ واہ۔ کمال کر دیا۔"

"منظر!" میں نے پلٹ کر اس سے مصافحہ کیا "کیا حال ہے میاں! کچھ اور بھول گیا ہے تو۔ کیا کھاتا ہے؟"

"کھاتے ہیں اپنا اور دوسروں کا سر۔ بس غم نہیں کھاتے۔" وہ قہقہہ مار کے ہنسا "تو بھی بڑا آدم خور شیر دا پتر ہے۔ دو بندے اور کھا گیا؟ کھا جا سب سالوں کو۔ نہ رہے گا بانس اور نہ یہ تیرے پیچھے لے کر پھریں گے۔ وہ کیا کہتے ہیں۔ الٹے بانس کہاں؟ بریلی کو..." اس نے کہا اور پھر زور سے ہنسا۔ حوالدار نے آنے میں "کیفسٹن" کے بیس سگرٹوں کا پیکٹ لے آیا تھا خود تو بلحاظ ضمانت بہت کمتر محسوس کیا۔ میں نے جیب سے سگریٹ نکال کے اسے اور شیخ کو پیش کی۔ حشمت خان نے مناسب یہی سمجھا کہ مزید توہین برداشت کرنے کے بجائے وہ کھسک لے۔

"یار۔ وہ تیرا جو کیس تھا حق وراثت والا۔" منظر نے سگریٹ جلا کے کہا "وہ ذرا وقت لے گا۔ کورٹ خالی ہے اور جب تک کسی کی پوسٹنگ نہیں ہوتی..."

"اس کیس کی بات چھوڑ۔ تجھے رابعہ نے کچھ بتایا ہے اس کیس کے بارے میں؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ وہ ٹھیک ہو جائے گا۔" منظر نے کہا "رابعہ خود ہی ٹھیک کر لے گی۔ ضمانت منسوخ نہیں ہوگی۔ وہ کیا کہتے ہیں۔ جیسی روح ویسے فرشتے۔ تو تیرے لیے بھی رابعہ سے بہتر وکیل کون ہو سکتا ہے۔" وہ معنی خیز طریقے پر مجھے آنکھ مار کے مسکرایا "ویسے میں عدالت میں موجود رہوں گا۔"

"منظر! اگر وہ محرر حاضر نہ ہوا جس کی امید بہت کم ہے۔"

"ارے بھائی گولی مار محرر کو بھی۔" وہ ہنسا "جب کہہ دیا کہ سب ٹھیک ہو جائے گا تو رونا کیسا۔ ہم پر اعتماد نہیں ہے کیا؟ لوگ تو تیری جگہ پھانسی چڑھ جائیں۔ سولی پر تو چڑھے ہوتے ہی ہیں جب سے شادی کی ہے۔ اور غضب خدا کا۔ وہ بھی تھوروار کہتی ہے مجھے۔ اچھا یار! میری پیشی ہے ایک کیس میں۔ ابھی آتا ہوں آدھے گھنٹے میں۔"

"خوب آدمی ہے تمہارا یہ وکیل بھی۔" شیخ نے مسکرا کے کہا۔

"وکیل تو بعد میں بنا ہے' پہلے تو اپنا یار تھا۔ بچپن میں رابعہ اور ہم اس کے ساتھ ہی پڑھتے تھے۔" میں نے کہا "ساڑھے دس بج گئے ہیں شیخ!" میں نے گھڑی دیکھ کر کہا "وہ محرر نہیں پہنچا نا۔"

"غنیمت ہے کہ آج سماعت کا امکان نہیں۔ بعد میں اسے تلاش کریں گے۔" شیخ نے کہا "میں نے تم سے کہا تھا کہ ادھر اُدھر نگاہ رکھنا۔"

"میں ہر طرف دیکھ رہا ہوں۔" میں نے کہا "ابھی تک کوئی سامنے نہیں آیا ہے۔ وہ لوگ دور دور سے دیکھ رہے ہوں تو الگ بات ہے۔ قریب آتے ہوئے ڈرتے ہوں۔"

"تمہارا دوست محسن بھی نہیں آیا۔" شیخ نے کہا "معلوم ہوتا ہے تمہارا استاد ٹیڈی..."

"استاد ٹیڈی حاضر ہے جنابِ عالی!" ٹیڈی نے اچانک ہجوم میں سے نمودار ہو کے کہا "قسم مولا علی کی۔ یاروں کو ٹیڈی کی ضرورت پڑے اور ٹیڈی نہ آئے' یہ کبھی ہو سکتا ہے۔"

"تو تم استاد ٹیڈی ہو۔" انسپکٹر شیخ نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے اس سے مصافحہ کیا "استاد کس نے بنا دیا ہے تمھیں۔ کیا کہیں پڑھاتے ہو؟ کسی اسکول وغیرہ میں؟" اس نے جانتے بوجھتے انجان بن کے سوال کیا۔

"استاد زمانے نے بنا دیا ہے تھانیدار صاحب!" وہ ہاتھ جوڑ کے بولا "دنیا جسے چاہے کچھ بھی بنا دے۔ جسے چاہے بادشاہ کر دے اور جسے چاہے فقیر۔ قسم مولا علی کی۔ خود پڑھے ہوتے تو یہی پڑھانے کا کام کرتے۔ استاد کا درجہ تو باپ کے برابر ہوتا ہے۔ ہم تو اس نام کو بھی بدنام کرتے ہیں۔"

"محسن کہاں ہے ٹیڈی؟" میں نے اِدھر اُدھر نگاہ ڈال کے کہا

"وہ رک گیا تھا ٹیکسی کے پیسے دینے کے لیے۔ آتا ہوگا۔ آپ بالکل فکر نہ کریں سکندر صاحب!" اس نے مضبوط پُراعتماد لہجے میں کہا اور شیخ کی نظر بچا کے مجھے آنکھ ماری "ہم وہی کہیں گے جو سچ ہے۔ بھلے کوئی ہماری گردن اتارے۔"

"اور سچ کیا ہے؟ کیا اس رات سکندر صاحب اور محسن صاحب تمہارے ساتھ تھے جس رات شیدے اور عبدل کے قتل کی دُہری واردات ہوئی؟" شیخ نے کہا۔

"ہاں جی' اس میں کوئی شک ہے۔ سارا زمانہ جانتا ہے یہ بات تو۔" وہ بولا "ہم ادھر رتن سنیما کے پاس تیل مالش کرا رہے تھے کہ پہلوان تانگے والا آگیا۔ بولا گھر چس رہے ہو۔ میں

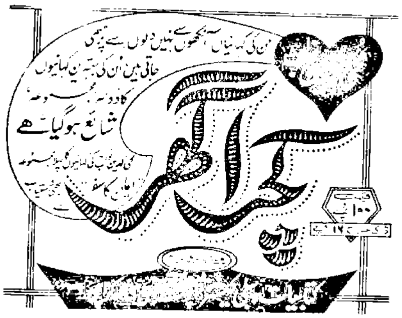

گھوڑی کھول رہا ہوں۔ میں نے کہا۔ آج ابھی سے سواری نہیں مل رہی ہے کیا؟ یہ اپنا یار پہلوان بھی اُلو ہے۔ رات کو جاگتا ہے، اسٹیشن سے سواریاں اٹھاتا ہے۔ اس کے بعد صبح ہونے سے پہلے اکھاڑے پہنچ جاتا ہے۔ دن میں سوتا ہے اور شام کو پھر اکھاڑے میں۔ ایسے پٹھے ہیں اس کے۔ قسم مولا علی کی۔ ایک سے ایک بانکا کڑیل جوان ہے۔ پر پہلوان تانگے والا سب کا باپ ہے۔۔"

"تم پٹری سے اُتر رہے ہو۔" شیخ نے اسے ٹوکا۔ "یہ بتاؤ کہ سکندر صاحب کس وقت ملے تھے تمھیں؟"

"وہی تو بتا رہا ہوں تھانیدار صاحب!" ٹیڈی نے عاجزی سے کہا۔ "پہلوان کہنے لگا کہ یار ماں بیمار ہے، جلدی گھر پہنچنا ہے، اس کو دوائی دینی ہے۔ ورنہ سواریاں تو رب کی مہربانی سے اتنی کہ رات ٹُھک جاتی ہے ڈھوتے ڈھوتے۔ خیر جی ہم نے کہا۔ چلو چلتے ہیں۔ اس وقت بجے ہوں گے یہی کوئی دس۔ اتفاق سے میں نے سکندر صاحب کو اور محسن صاحب کو دیکھ لیا اور ان کو بھی اُدھر ہی جانا تھا۔ ہم پہلے تو سب بیٹھ گئے تانگے میں۔ پھر راستے میں ہم نے کہا سکندر صاحب! آؤ آپ کو چائے پلائیں۔ بڑے دن بعد ملے ہو ——— اپنے اڈے پر ایسی ملائی والی چائے ملتی ہے تھانیدار صاحب کہ آپ کو کہیں پورے لاہور میں نہیں ملے گی۔ ہم وہاں بارہ بجے تک بیٹھے رہے۔ اس ہوٹل کا مالک ہے شیرو۔ اس نے بھی دیکھا تھا اور بھی بہت سے لوگ تھے۔ سب آسکتے ہیں گواہی دینے۔"

میں سمجھ گیا کہ محسن نے اسے تمام صورتِ حال سمجھا دی ہے اور باقی سب کچھ استاد ٹیڈی کے حسنِ انتظام کی دلیل ہے اگر اس نے کسی پہلوان تانگے والے اور کسی ہوٹل کے مالک شیرو کا حوالہ دیا ہے تو اسے یقین ہوگا کہ ضرورت پڑنے پر یہ دونوں گواہ اس کے بیان کی صداقت ثابت کرنے کے لیے ضرور آجائیں گے۔ بے شک یہ گواہی جھوٹی ہوگی مگر جس نظام ——— کی بنیاد ہی شہادت پر ہو اور جس میں سچ کو جھوٹ ثابت کرنے والے پیشہ ور گواہ عدالتوں کے احاطوں کا طواف کرتے ہوں، پیشہ ور ضامن بے وجود یا جعلی کاغذات سے صاحب جائیداد بن کے حاضر ہوتے ہوں، دنیا و عقبیٰ کے خوف کا خیال دل میں لائے بغیر حلف اٹھاتے ہوں۔ وہاں اور کیا ہو سکتا ہے۔ غلط کام میں بھی کر رہا تھا اور دل کو یہ تسلی بھی دے سکتا تھا کہ میں تو صرف ایک سچ کو سچ ثابت کرنے کے لیے جھوٹے گواہ لانے پر مجبور ہوں مگر یہ جواز صرف بقا کی جدوجہد کے معیار پر درست تسلیم کیا جا سکتا تھا جس کا اخلاق کے معیار سے رشتہ نہ ہو۔ ورنہ کسی معاشرے، مذہب یا قانون کا کوئی اصول میرے فعل کو قبولیت کی سند نہیں دے سکتا تھا۔ یہی میرا

اور میرے دور کا المیہ تھا کہ اصولی اور عملی زندگی کے راستے جدا اور متضاد سمتوں میں تقسیم ہو گئے تھے اور سقراط کی طرح زہر کا پیالہ اٹھانے والا عقل و ہوش سے بیگانہ قرار دیا جاتا تھا پھر میں یہ پیالہ کیسے اٹھاتا جو اس وقت کا تقاضا تھا۔

سالبعہ گیارہ بجنے میں پانچ منٹ پر نمودار ہوئی۔ ٹھیک گیارہ بجے میرا نام پکارا گیا اور اندر جاتے ہوئے میں نے رضوی صاحب کو گاڑی سے اترتے اور منظر کو ہانپتے ہوئے، ہجوم میں سے راستہ بناتے دیکھا۔ عدالتی کارروائی میں زیادہ وقت صرف نہیں ہوا۔ وکیلِ استغاثہ کی طرف سے میری ضمانت منسوخ کرنے کی رسمی استدعا کی گئی۔ پبلک پراسیکیوٹر نوجوان لڑکا سا تھا جو بار بار رابعہ کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ میں نے اندازہ کیا کہ رابعہ یقیناً پہلے ہی اس سے بات کر چکی ہے پھر سب انسپکٹر شیخ نے اپنا بیان قلم بند کرایا۔ اس نے بہت اختصار سے کام لیا اور اپنے بیان کو بنیادی حقائق تک محدود رکھا جس میں عبدل کے ٹیلی فون، محرّر کے لکھے ہوئے بیان، ٹیپ کے غائب ہونے اور ٹیلی فون پر ملنے والی دھمکی سب کا ذکر آگیا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ یہ حقائق عدالت کے ریکارڈ پر رکھنا چاہتا ہے اور اس کیس سے دستبردار ہو رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی رابعہ نے استدعا کی کہ محرّر کے لکھے ہوئے عبدل کے اس بیان کو بھی عدالت اپنے ریکارڈ پر رکھے جو اس نے مرتے وقت دیا تھا کیونکہ نامعلوم افراد کی طرف سے دھمکیاں موصول ہونے کے بعد یہ اندیشہ ہے کہ ٹیپ کی طرح یہ تحریر بھی غائب ہو جائے گی پھر اس نے وکیلِ استغاثہ کی درخواست مسترد کرنے کے لیے اپنے دلائل پیش کیے اور صفائی کے ایک گواہ استاد ٹیڈی کا بیان ہوا۔ حسبِ توقع فیصلہ یہی ہوا کہ موجودہ حالات میں ضمانت کی منسوخی کا کوئی جواز نہیں۔ عبدل اور شیدے کے قتل کی تفتیش ہنوز نامکمل ہے اور ظاہری شہادت سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ واردات سے سکندر بخت کا کوئی تعلق ہے۔ عدالت نے صفائی کے دوسرے گواہ یعنی محرّر کی غیر حاضری کو نوٹ کیا اور میر محمد کے خلاف تفتیش کے لیے بھی احکامات جاری کیے جو سب انسپکٹر شیخ کے بیان کے مطابق ٹیپ غائب کرنے کا ذمے دار تھا اور یہ بھی حکم دیا کہ اگلی پیشی پر وہ خود حاضر ہو کے ان الزامات کا جواب دے۔ تاہم کیس کی تفتیش سے سب انسپکٹر شیخ کی دستبرداری کے عذر کو عدالت نے ناکافی وجوہات کی بنا پر قبول نہیں کیا اور اسے پولیس کے اعلیٰ حکام کا مسئلہ قرار دیا۔ سب انسپکٹر شیخ چاہے تو اپنی درخواست افسرانِ بالا کو بھیج سکتا ہے۔ محرّر کے لکھے ہوئے بیان کو عدالت نے اپنی تحویل میں لے لیا اور اس کی ایک مصدقہ نقل پولیس کو فراہم کرنے کی تاکید کی۔

اس تمام کارروائی کے دوران میں اپنے آگے پیچھے دیکھتا رہا۔ منظر میرے سامنے پہلی قطار میں موجود تھا اور رابعہ نے کئی بار اس سے مشورہ بھی کیا۔ پیچھے کی بنچوں پر غیر متعلقہ افراد بھی موجود تھے لیکن ان میں سے کسی کا چہرہ جانا پہچانا نہیں تھا۔ محسن دوسری قطار میں استاد ٹیڈی کے ساتھ بیٹھا تھا۔ بعد میں سب انسپکٹر شیخ بھی ان کے ساتھ جا بیٹھا اور میں نے محسن کو اس سے ہاتھ ملاتے دیکھا جو ایک طرح سے اس کی حق گوئی و بے باکی اور آئینِ جواں مردی کو خراجِ تحسین تھا۔ رضوی صاحب کی عدم موجودگی کو میں نے خصوصاً نوٹ کیا۔ شاید وہ عمداً باہر رہے تھے۔ ایس ایس پی کی حیثیت سے وہ غیر معروف شخصیت نہیں تھے چنانچہ ان کا سماعت کے دوران حاضر رہنا سب کی نظر میں آتا۔ آئندہ تاریخِ سماعت ایک ماہ بعد مقرر ہوئی اور ہم باہر نکلے تو ایک بج رہا تھا۔ عدالت کی کارروائی میں بھی وقفہ آگیا تھا۔ سب سے پہلے جج کے اٹھتے ہی منظر نے میرے کندھے پر ہاتھ مارا۔

"بس، جا اور قتلِ کر۔ قتلِ عام کر سالے۔ بس فکر مت کر۔" وہ ہنسا۔ "ابے جب رابعہ جیسی وکیل ہوگی تو کوئی تیرا کیا بگاڑے گا۔ تو خود ہی بگڑ جائے تو اور بات ہے۔" وہ بے حد بااُصول شخص تھا۔ مجھ سے بات کرتے کرتے وہ شیخ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "بھئی کیا نام ہے تمھارا۔ سب انسپکٹر شیخ۔ تم نے تو ثابت کر دیا کہ آج کل بھی سچ بولنا ممکن ہے۔ بہت ہمت کی بات ہے بھائی۔"

"میرا خیال ہے ضمانت منسوخ نہ ہونے کا سب سے بڑا سبب شیخ کا بیان ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ میری خوش قسمتی ہے یا تائیدِ ایزدی کہ کیس شیخ کے پاس تھا۔ ورنہ ان کی خاموشی مجھے مزید دو افراد کے قتل کے الزام میں ملوث کر سکتی تھی۔ ان کی جرأتِ اظہار، اصول پرستی اور ایمان داری نے مجھے تختۂ دار تک پہنچنے سے بچا لیا ہے۔ میری زندگی ان کا قرض ہو گئی ہے۔"

"کیسی باتیں کرتے ہیں آپ لوگ۔" سب انسپکٹر شیخ نے کہا۔ "میں نے صرف اپنا فرض ادا کیا ہے۔"

"یہی تو کمال ہے آپ کا۔ ورنہ فرض کا احساس کہاں ہے کسے ہے؟" رابعہ نے کہا۔ "آپ پہلے ہی فرض شناسی کا نقصان اٹھا چکے ہیں اور مجھے تو ڈر ہے، آج آپ نے اپنی مشکلات میں اضافہ کیا ہے۔ اپنی نوکری ہی نہیں، زندگی کو بھی داؤ پر لگا دیا ہے اور جب یہ بات مدِنظر رکھی جائے کہ آپ نے ایسے تو واقعی یقین نہیں آتا۔"

"مس رابعہ! اصول پرستی میں کبھی کسی نے دنیا میں مادی فوائد حاصل نہیں کیے۔ اگر میں پانچ لاکھ لے کر خاموش ہو جاتا یا دھمکی سے ڈر جاتا تو اپنا ایمان ہی نہیں، ایک بے گناہ شخص کی زندگی بھی بیچتا۔ جو میرے نقطۂ نظر سے قتل ہوتا۔ میں فرشتہ نہیں ہوں۔ آپ سب بھی جانتے بوجھتے کسی کو قتل نہیں کر سکتے۔"

"قسم مولا علی کی تھانیدار بادشاہ!" استاد ٹیڈی نے آگے بڑھ کر شیخ کے ہاتھ تھام لیے "تم جاہے نہ مانو، ہم تو سمجھتے ہیں کہ جو تم نے کیا، وہ کسی ہم جیسے گناہ گار انسان کے لیے ناممکن تھا۔ تم واقعی فرشتہ ہو۔ کبھی ضرورت پڑے تو کہنا کہ جان چاہیے۔ قسم مولا علی کی ٹیڈی سر کے بل آئے گا۔"

"اچھا اچھا۔ اب چلیں آپ سب لوگ۔ بہت ہو چکی قصیدہ خوانی۔" شیخ نے کہا۔ "میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اب یہ کیس کسی اور کے سپرد کر دوں۔"

"عجلت میں یہ فیصلہ مت کرو شیخ!" میں نے کہا۔ "یہ نہ ہو کہ کیس تمھارے ہاتھ سے نکلے تو حشمت خان جیسے شخص کے سپرد ہو جائے اور تم آخر ڈرتے کیوں ہو۔ سچ بولنے والے تو رشتوں کے ٹوٹ جانے کی پروا نہیں کرتے اور تم جیسا شخص تو دوست رہ کے بھی جانبدار نہیں ہو سکتا۔ اگر حقائق مجھے مجرم ثابت کریں گے تو تم کسی کا لحاظ نہیں کرو گے مگر اس میں میرے لیے یہ اطمینان تو ہوگا کہ میرے ساتھ انصاف ہوا۔ میر محمد اور حشمت خان تو ایسے لوگ ہیں کہ جس کی گردن میں فٹ آجائے اسی کے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈالتے پھرتے ہیں۔ مجھے ان کے حوالے کیوں کرتے ہو؟" مجھے قطعی احساس نہیں تھا کہ حشمت خان اور حوالدار بجلی کان لگائے ہماری گفتگو کا ایک ایک لفظ سن رہے ہیں۔ ان کی حیثیت پٹے ہوئے مہرے سے بدتر تھی۔ خصوصاً حوالدار بجلی کا تو سارا کرنٹ ختم ہو گیا تھا۔

رضوی صاحب عدالت کے باہر مجھے اس وقت ملے جب شیخ، استاد ٹیڈی اور دوسرے سب لوگ جا چکے تھے۔ میرے ساتھ صرف رابعہ اور محسن رہ گئے تھے۔

"تم لوگ میرے ساتھ چلو۔" انھوں نے کہا اور میں نے اندازہ کیا کہ ان کا موڈ کچھ آف ہے۔

"لیکن انکل۔ میری گاڑی [illegible]"

"وہ میرا شوفر لے آئے گا۔" انھوں نے [illegible] "بیٹھو [illegible] تم بھی محسن۔ مجھے کچھ کہنا ہے تم سب [illegible]"

ان کی جیپ ڈسٹرکٹ کورٹ کے احاطے سے نکلی اور مال روڈ پر دوڑنے لگی۔

"آپ کچھ کہنا چاہتے تھے۔" رابعہ نے ہمت کر کے کہا۔

"ہاں- میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم لوگ مجھ سے جھوٹ کیوں بولتے ہو؟ مجھے بے وقوف کیوں بناتے ہو؟ کیا تمھیں اعتماد نہیں ہے مجھ پر؟" وہ یکلخت پھٹ پڑے "کیا سمجھتے ہو تم مجھے؟"

محسن اور میں نے ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"یہ ٹھیک ہے کہ ہم نے آپ سے بہت جھوٹ بولے ہیں۔ لیکن یہ غلط ہے کہ ہمیں آپ پر اعتماد نہیں۔" رالعبہ نے کہا۔

"یہ بھی جھوٹ ہے۔ تم کو معلوم تھا کہ شہلا کی ماں مر چکی ہے۔ تم جانتے تھے کہ ڈی سلوا مر چکا ہے۔"

"آپ سے کس نے کہا ہے کہ ہمیں یہ بات معلوم تھی؟" میں نے ہمت سے کام لے کر کہا۔ "اگر محسن یا رالعبہ کو یہ بات معلوم تھی تو انھوں نے مجھے نہیں بتائی۔ میں قسم کھا سکتا ہوں۔"

"مجھے کیسے معلوم ہو سکتا تھا؟" محسن نے احتجاج کیا۔ "میں صبح سے ٹیڈی کو ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔"

"پھر تو یں ہی رہ گئی۔ میں نے ہی کسی عدالت میں یا بار روم میں سنی ہو گی یہ بات۔" رالعبہ نے تلخی سے کہا۔

"دیکھو- یہ سب کچھ تم لوگوں نے طے شدہ پروگرام کے مطابق کیا ہے؟" رضوی صاحب نے غصے کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔ "تم لوگوں نے جانتے بوجھتے شہلا کو اسلام آباد بھجوا دیا۔ تاکہ وہ اپنی ماں کی مسخ شدہ لاش نہ دیکھے اور ہر قسم کی تحقیق و تفتیش سے بچ جائے۔"

"شہلا- وہ ڈیڈی کے ساتھ چلی گئی ہے؟" محسن نے بےیقینی سے کہا۔

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ "اور اسے انکل شیروانی نے اور فوزیہ نے مجبور کیا تھا، میں نے نہیں۔ یقین نہیں تو گھر جا کے فون پر ان سے بات کر لینا۔ وہ بھی اب گھر پہنچنے ہی والے ہوں گے لیکن پہلے مجھے یہ بتائیے انکل کہ آپ نے یہ کیسے فرض کر لیا کہ ہمیں وہ سب کچھ معلوم تھا جو آپ کو معلوم ہو گیا ہے۔"

"میرے پاس کوئی ثبوت نہیں مگر میں جانتا ہوں، کل رات تم نے مجھے اپنے فرار کی جو کہانی سنائی تھی، وہ سو فی صد سچ نہیں تھی۔"

"تو آپ بتا دیجیے کہ پورا سچ کیا تھا؟" میں نے کہا۔ "اور میرے سچ میں جھوٹ کی آمیزش کا تناسب آپ نے کیا نکالا ہے اور کیسے نکالا ہے؟"

"دیکھو برخوردار! تمھارے معاملے میں میرے دو کردار ہیں، میری شخصیت کے دو حصے ہو گئے ہیں اور ان کو مربوط رکھنا میرے لیے دن بدن مشکل ہوتا جا رہا ہے۔" رضوی صاحب نے تلخ لہجے میں کہا۔ "ایک طرف میں ایس ایس پی ہوں۔ دوسری طرف تم مجھے انکل کہتے ہو۔ میں نے کبھی اپنے فرائض سے پہلو تہی نہیں کی مگر میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ظلم تمھارے ساتھ ہوا ہے۔ تاہم میں تمھاری طرح یہ نہیں کر سکتا کہ ظلم کرنے والوں سے خود نمٹنے لگوں۔ نظامِ انصاف میں لاکھ خرابیاں سہی پھر بھی اس سے بہتر نظام اور کیا ہو گا؟ عملی صورت کو مت دیکھو جسے ہم نے مسخ کر رکھا ہے۔ اصولی طور پر یہ ایک صدی سے زیادہ کے عرصے میں مکمل ہوا ہے اور تکمیل کا یہ عمل ابھی جاری ہے مگر اس نظام نے زندگی کے ہر شعبے کا احاطہ کر رکھا ہے۔ ہم اس کو بہتر بنانے کے لیے یہی کر سکتے ہیں کہ اپنی زندگی میں خود اس کو عملی طور پر قبول کریں اور اس کے پابند ہوں۔ اس وقت بھی جب ہمیں کوئی پولیس مین نہ دیکھ رہا ہو۔ اگر اس میں خرابیاں پیدا کرنے والے ہم خود ہیں تو اس نظام کو موردِ الزام نہ ٹھہرائیں اور پھر من مانی نہ کریں۔ اگر ہر شخص قانون کو بےبس اور بےاثر سمجھ کے خود اپنا نظامِ انصاف وضع کرنے لگے، خود مدعی ہو اور خود ہی منصف بھی تو یہ قانون جنگل کا قانون ہو گا۔ معاشرے میں، کسی بھی دنیا کے مہذب معاشرے میں اجتماعی قدروں کو فروغ ہوتا ہے۔ یہ نہ ہو تو پھر جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔"

"ہمارے اردگرد یہی ہو رہا ہے انکل۔ اور اس کے ذمے دار ہم نہیں آپ ہیں۔ میرا مطلب ہے وہ جو ہمارے پیشرو تھے۔ جنھوں نے ہمارے لیے یہ ماحول پیدا کیا جس میں ہم نے پرورش پائی۔" میں نے کہا۔ "ہم نے تو ابھی عملی زندگی میں قدم بھی نہیں رکھا۔ ان سب خرابیوں کے ذمے دار ہم کیسے ہو گئے؟ ہر دور میں نئی نسل کو موردِ الزام قرار دیا جاتا ہے کہ وہ اخلاقی قدروں کو پامال کر رہی ہے۔ معاشرتی خرابیوں کا سارا بوجھ ان پر ڈال دیا جاتا ہے جو نوجوان کہلاتے ہیں۔ کیا وہ لوگ بالکل بےقصور ہوتے ہیں جو ان نوجوانوں کی پرورش کرتے ہیں؟ ان کے اخلاق و کردار کے نگراں کہلاتے ہیں اور جن کے نقشِ قدم پر نوجوان چلتے ہیں؟ نہ جانے کب سے لوگ کہتے آ رہے ہیں کہ جی کیا زمانہ آ گیا ہے۔ ہمارے زمانے میں تو ایسا نہیں ہوتا تھا۔ ویسا نہیں ہوتا تھا اور ہم تو گویا فرشتے تھے۔ قربِ قیامت کی نشانیاں کس دور میں نظر نہیں آئیں۔ ان کو جو بزرگ ہو چلے تھے۔ کوئی ان سے سوال نہیں کرتا کہ جناب کیا ان نوجوانوں کے سنِ بلوغت کو پہنچتے ہی راتوں رات دنیا اخلاقی طور پر دیوالیہ ہو گئی۔ پہلے ہر شخص نیک تھا۔ پرہیزگار اور پابندِ صوم و صلوٰۃ۔ مہذب، باحیا اور قانون کا احترام کرنے والا تھا۔ پھر اس کم

...جیسی کیوں نہ بنی؟ مثلاً میں اور محسن تو پہلے اسکول ...ہم میں ...پھر لندن چلے گئے۔ یہاں جو کچھ ہوا، اس میں نوجوان نسل کا ...حصہ کتنا تھا؟ میر شرافت علی، چوہدری دلاور، چراغ دین، پیڈرو ...سب آپ کے اور انکل شیروانی کے دور کے لوگ ہیں۔ یہاں ...معاشرے کی باگ دوڑ انھی کے ہاتھ میں تھی۔ ہمیں تو واپسی پر ...دنیا ویسی ہی ملی جیسی نظر آتی ہے۔ وہ نہیں جو ہونی چاہیے تھی۔"

"ٹھیک ہے۔ میں اتفاق کرتا ہوں مگر تمھارا کام بھی یہ تو ...نہیں کہ ان خرابیوں میں اضافہ کرو۔ ظلم ہوتا دیکھو تو ظالم بن جاؤ۔ ...کو چوری کرتے، ڈاکا ڈالتے دیکھو تو ڈاکو بن جاؤ۔" رضوی صاحب ...نرم پڑتے ہوئے کہا۔ رالعبہ نے بےحد عجیب نظروں سے ...دیکھا۔ ان نظروں میں فخر و مسرت کے جذبات بھی تھے ...ستائش کے بھی۔ "تم کو ان خرابیوں کے خلاف جہاد کرنا ...ہے۔ نہ کہ ان خرابیوں کا شکار ہو جانا چاہیے۔ آخر یہ کام کون ...کرے گا؟ خیر- میں جانتا ہوں یہ فلسفیانہ بحث کبھی ختم ہونے ...والی نہیں ہے۔ یہ بتاؤ کیا تمھیں واقعی ڈی سلوا کی موت کا علم ...نہیں تھا؟"

...ذرا سی دیر کے لیے میں مخمصے میں پڑ گیا لیکن میری قوتِ ...فیصلہ نے بروقت مجھے خبردار کر دیا۔ اب سچ بولنے سے کچھ حاصل ...نہ ہو گا سوائے خرابی کے اور جھوٹ جس سے کسی کو نقصان نہ ...ہو، جو مجبوری میں بولا جائے اور سچ کے مقابلے میں کم ...نقصان رساں ہو۔ بہرحال بہتر ہے۔

"مجھے اب تک یقین نہیں کہ میرا ایک اتنا بڑا دشمن نہیں ...رہا" میں نے کہا۔ "آپ کو کس نے بتایا؟"

"میں نے ایک رپورٹ درج کرائی تھی۔ جیسا کہ میں نے ...بتایا تھا" رضوی صاحب نے کہا۔ "دس بجے کے قریب مجھے ...اطلاع موصول ہوا کہ حادثے میں تباہ ہو جانے والی ایک گاڑی ...میں سے ایک بوڑھی عورت کی لاش ملی ہے۔ مجھے شناخت ...کے لیے بلایا گیا تھا۔ میں جائے واردات پر پہنچا یعنی باغبانپورے ...والی سڑک کے آخری موڑ پر۔ وہ سڑک جو نہر کے ساتھ ...شالیمار کی طرف سے جاتی ہے اور وہاں پہنچ کے میں ...نے شہلا کی ماں کو تو پہچان ہی لیا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ اسی ...حادثے میں ڈی سلوا بھی ہلاک ہو گیا ہے۔"

"گویا ڈی سلوا ہی شہلا کی ماں کو اغوا کر کے لے گیا تھا ...حادثے کا شکار ہو گیا۔"

"نہیں- یہی بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔" رضوی صاحب ...نے کہا۔ "ایک تو حادثے کی کوئی وجہ نہیں۔ ڈی سلوا نشے میں ...نہیں تھا اور گاڑی درخت سے ٹکرائی ہے، کسی گاڑی سے نہیں۔ پھر گاڑی کی حالت دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ حادثے کے وقت اس کی رفتار کم سے کم پچاس میل فی گھنٹہ ضرور تھی۔"

"ہو سکتا ہے اس نے سامنے سے آنے والی کسی گاڑی سے تصادم کو بچانے کی کوشش کی ہو۔" میں نے کہا۔ "اور گاڑی بےقابو ہو گئی ہو۔"

"یہ- صرف فرض کیا جا سکتا ہے۔" رضوی صاحب نے عدمِ اتفاق کی کوئی صورت نہ پا کے کہا۔ "یہ بھی فرض کیا جا سکتا ہے کہ اس کے بریک فیل ہو گئے تھے مگر حقائق کچھ اور ہیں۔ تم نے اسے کس وقت دیکھا تھا؟"

"تقریباً رات کے ایک بجے۔" میں نے کہا۔ "ممکن ہے ڈیڑھ کا وقت ہو۔"

"تم صبح کے ساڑھے پانچ بجے واپس پہنچے تھے اور بظاہر تم نے یہ فاصلہ دوڑتے ہوئے طے کیا تھا۔ تمھاری حالت سے یہی ظاہر ہوتا تھا اور یہ بھی مجھے معلوم ہے کہ تمھارے پاس کوئی سواری نہیں تھی۔ یہ فاصلہ تم نے کتنی دیر میں طے کیا تھا؟" رضوی صاحب نے کہا۔

"میرا خیال ہے ایک گھنٹہ تو لگا ہو گا مجھے۔" میں نے کہا۔ محسن نے میرا ہاتھ دبا کے مجھے محتاط ہونے کی تاکید کی۔

"شیروانی صاحب اور ان کی بیٹی تین بجے صبح پہنچے تھے۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "اور وہ گاڑی میں لائے گئے تھے جس نے انھیں عین میری کوٹھی کے دروازے پر اتارا تھا۔ گاڑی پر کوئی نمبر پلیٹ تھی تو وہ دیکھ نہیں سکے۔ لائٹ آف تھی اور وہ گھبرائے ہوئے بھی تھے مگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ آدھے گھنٹے سے کم میں۔ تقریباً بیس منٹ میں پہنچے ہوں گے۔ گویا پونے تین بجے کے قریب وہاں سے روانہ ہوئے ہوں گے۔ اس حساب میں کوئی غلطی ہے تو بتاؤ کہ جو فاصلہ ایک شخص پیدل چل کے ایک گھنٹے میں طے کرے۔ وہ کار میں زیادہ سے زیادہ ایک چوتھائی وقت میں طے ہو جائے گا۔ تم نے کسی سے لفٹ نہیں لی تھی۔ کوئی رکشا یا ٹیکسی تمھیں نہیں ملی تھی اور ظاہر ہے اتنی رات گئے تم نے پانچ میل کی دوڑ نہیں لگائی تھی۔ اتنے طویل راستے پر گشتی پولیس یا چوکیدار تمھیں بھاگتا دیکھتے تو ضرور تمھارے پیچھے لگ جاتے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ تمھیں ایک گھنٹے سے زیادہ وقت لگا ہو گا۔ اوسطاً آدمی تین میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتا ہے۔ تیز چلے تب بھی چار میل سے زیادہ کی رفتار نہیں ہو سکتی اور یہ رفتار بھی ایک دو میل تک برقرار رہ سکتی ہے۔ بعد میں گھٹ جاتی ہے۔ خیر یہ بتاؤ کہ جب تم نے سراج کو فدلو کر کے فوزیہ اور شیروانی کو بھیجا تو کیا

ڈی سلوا وہاں موجود تھا؟"

"جی - اس وقت وہ وہیں تھا۔" میں نے غور کر کے کہا۔

"اور تمھارے پہنچنے کے کتنی دیر بعد ان کو رہائی ملی تھی؟"

"ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد۔" میں نے کہا۔ "آپ کیا نتیجہ اخذ کرنا چاہتے ہیں اس سے؟"

"اور تم ان کے روانہ ہونے کے بعد کتنی دیر وہاں رہے تھے؟" رضوی صاحب نے میرے سوال کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔

"میں... میں تقریباً ان کے ساتھ ہی - چند منٹ کے فرق سے۔" میں نے کہا لیکن مجھے اپنی غلطی کا احساس ہونے لگا تھا۔

"میرا بھی یہی خیال تھا۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "جب تم نے ایک بار سراج کو قابو کر لیا تھا۔ تو ظاہر ہے اسے ایک گھنٹے تک پکڑے نہیں کھڑے رہے ہو گے۔ تم نے پہلے شیروانی اور فوزیہ کو چھڑایا اور اس کے بعد ڈی ایس پی سراج کو ڈھال بنائے باہر آ گئے۔ رائٹ - فرض کرو دس منٹ بعد۔ گویا تم تین بجے وہاں سے روانہ ہوئے اور تمھارے کہنے کے مطابق ایک گھنٹے میں گھر پہنچ گئے لیکن اس طرح تمھیں چار بجے پہنچ جانا چاہیے تھا۔ ڈیڑھ گھنٹا تم کہاں رہے؟"

رضوی صاحب نے مجھے ٹریپ کر لیا تھا۔ وقت کے الٹ پھیر میں ڈیڑھ گھنٹے کا فرق نکل آیا تھا۔ "میں نے اندازوں کی بنیاد پر بات کی ہے۔ آپ صحیح وقت کو مدِنظر رکھ کے حساب لگا رہے ہیں۔" میں نے کہا مگر صاف ظاہر تھا کہ میرا لہجہ اعتماد سے خالی ہے۔

"اچھا یہ بھی مانا۔ یہ بتاؤ جب تم روانہ ہوئے تب بھی ڈی سلوا وہیں موجود تھا؟ ظاہر ہے، ہو گا۔ پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صبح کے تقریباً پانچ چھ بجے، وہ شہلا کی ماں کو ادھر سے لے کر مخالف سمت میں کہاں جا رہا تھا۔" رضوی صاحب نے کہا۔

"کیا موت کے وقت کا تعین ہو گیا ہے؟" میں نے کہا۔

"ابتدائی اندازے کے مطابق اسے مرے ہوئے زیادہ وقت نہیں ہوا تھا۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "صبح چھ بجے ایک شخص نے کہیں سے فون کر کے حادثے کی اطلاع دی۔ اس نے اپنا نام نہیں بتایا تھا۔ پولیس ساڑھے چھ بجے پہنچی اور ایک انسپکٹر نے مجھے بتایا ہے کہ خون کا رنگ اور مہک باقی تھے۔ خون کچھ جم گیا تھا لیکن کچھ اس وقت بھی رس رہا تھا۔ چنانچہ اس نے یہ خیال ظاہر کیا کہ حادثے کے کچھ دیر بعد ہی کسی نے گاڑی دیکھ لی۔ سڑک کے دوسری طرف بنگلے ہیں۔ وہیں سے کسی نے فون کر دیا۔ گویا وقت وہی پانچ اور چھ بجے کے درمیان کا تھا۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ سے حتمی طور پر یہ بات معلوم ہو جائے گی مگر جو بات میں نہیں سمجھ سکا، وہ کچھ اور ہے۔ میرے ایما پر ایک پولیس پارٹی وہاں گئی تھی جہاں تمھیں لے جایا گیا تھا۔ انھوں نے بڑا تفصیلی معائنہ کیا لیکن کسی قطعی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔ انھیں غیر آباد کمروں میں اور آس پاس کوئی سراغ نہیں ملا جس سے ثابت ہوتا کہ رات کو وہاں کچھ لوگ موجود تھے بیرون کے نشانات کیا، گاڑیوں کے ٹائروں کے نشانات تک نہیں تھے۔ کھڑکیاں، دروازے سب بند تھے۔ سوائے ایک کھڑکی کے۔"

"ظاہر ہے، وہ اسی میں سے نکل گئے اور جاتے جاتے اپنی موجودگی کی تمام علامات مٹا گئے۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔ لیکن ڈی سلوا کی گاڑی کو یہ حادثہ وہاں سے آتے ہوئے پیش نہیں آیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ وہاں جا رہا تھا۔ وہ گلوب سنیما کے پاس رہتا ہے۔ اگر اسے یہ خیال تھا کہ شہلا کی ماں کو اپنے گھر لے جائے تب بھی یہ سمت بالکل الٹی ہے۔ کار کا رخ دوسری جانب ہونا چاہیے تھا۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "اگر اسے شہلا کی ماں کو کہیں اور لے جانا تھا تب بھی یہ غلط ہے۔ ایسی صورت میں حادثہ داروغہ والا کی جانب کہیں ہوتا یا مخالف سمت میں باغبانپورے کی طرف۔"

"اب آپ کا کیا خیال ہے؟ یہ بھی صاف بتا دیجیے۔ منطقی اعتبار سے آپ نے مجھے قائل کر لیا۔"

"میرا خیال یہ ہے میاں سکندرِ اعظم کہ تم نے ڈی سلوا کو مجبور کیا کہ وہ تمھیں ڈراپ کرے۔" رضوی صاحب نے ایک بار پلٹ کے مجھے دیکھا اور پھر گاڑی موڑ لی۔ "اس وقت تمھارے ذہن میں یہ خیال نہیں تھا کہ پانچ میل کی دوڑ لگائی جائے۔ جب باہر ایک گاڑی موجود ہو تو کوئی یہ خطرہ کیسے مول لے سکتا ہے۔ ایک صورت یہ تھی کہ تم گاڑی کے ٹائر فلیٹ کر دو۔ مگر اس کے لیے تمھیں گولی چلانی پڑتی۔ دوسری بہتر صورت یہ تھی کہ تم اسی گاڑی کو استعمال کرو۔ اتنی رات گئے تم رکشا یا ٹیکسی ملنے کی امید نہیں کر سکتے تھے۔ گھر سے پانچ میل دور تھے اور تمھیں جلد از جلد گھر پہنچنے کی فکر تھی۔ سراج جو تمھارے خیال کے مطابق گروہ کا سرغنہ ہے تمھاری گرفت میں تھا۔ تم اس کے دونوں ہاتھ توڑ چکے تھے۔ کیا اس کے بعد تم نے سراج کا ریوالور نہیں نکال لیا ہو گا؟ یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب میں فرض کر لوں کہ سراج غیر مسلح تھا مگر کسی خطرناک گروہ کا سرغنہ اپنے پاس ریوالور نہ رکھے، ورنہ وہ بھی ایک پولیس افسر جسے سرکاری طور پر ریوالور ملتا ہے اور ناجائز اسلحہ برآمد کرنے کے مواقع ملتے ہیں تو اس میں سے خورد برد کے مواقع بھی ملتے ہیں۔ تم نے ریوالور کی مدد سے ڈی سلوا کو گاڑی چلانے پر مجبور کیا اور وہ تمھیں چھوڑ کے واپس جا رہا تھا۔ جب یہ حادثہ پیش آیا۔ تمھیں یہ معلوم نہیں تھا کہ ڈکی میں شہلا کی ماں ہے۔ جیسے ہی وہ تمھیں نہر کے پل کے آس پاس کہیں چھوڑ کے واپس ہوا، تم گاڑی سے چمٹ گئے۔ تمھارے پاس سراج کا ریوالور تھا۔ اس سے تم نے پیچھے کا ونڈ اسکرین توڑا۔ میرا خیال ہے جب ڈی سلوا نے گاڑی کو بیک کیا ہو گا تو اچانک چھلانگ مار کے تم بونٹ پر چڑھ گئے ہو گے۔ پہلے تم نے کوشش کی ہو گی کہ وہ ریوالور سے ڈر کے رک جائے مگر وہ بدحواس اور خوفزدہ ہو کے بھاگا اور اس کوشش میں گاڑی بے قابو ہو گئی۔ یہ فاصلہ چند منٹ کا ہے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ڈی سلوا مخالف سمت میں کیوں جا رہا تھا۔ شہلا کی ماں کیسے ماری گئی اور تم کو گھر پہنچتے پہنچتے ساڑھے پانچ کیسے بج گئے۔ اب یہ بتاؤ کہ سراج کا ریوالور کہاں ہے؟"

"وہ... وہ میں نے نہر میں پھینک دیا تھا۔" میں نے اس وقت کہا جب گاڑی گھر کے دروازے سے اندر داخل ہو رہی تھی۔ رضوی صاحب نے اپنی ذہانت سے تقریباً صحیح صورتحال کا اندازہ کر لیا تھا اور میرے لیے اعترافِ جرم کے سوا چارہ نہیں تھا۔ میرے ساتھ محسن اور رابعہ بھی شرمسار بیٹھے تھے۔ رابعہ کچھ خفا تھی کیونکہ ابھی تک ہم نے اسے بھی شریکِ راز نہیں کیا تھا۔

"دیکھو پھر جھوٹ مت بولنا۔" رضوی صاحب نے سخت لہجے میں کہا۔ "اس ریوالور کی مدد سے بہت کچھ معلوم ہو سکتا ہے، ممکن ہے۔ وہ سرکاری ریوالور ہو۔ اس کے سیریل نمبر سے معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ کس کو دیا گیا تھا۔"

"کیا اس کا نام سراج نہیں ہے؟" میں نے نیچے اترتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ میں نے معلوم کر لیا ہے۔ یہاں سراج نام کا کوئی اے ایس پی، ڈی ایس پی یا ایس پی نہیں ہے۔ کسی تھانے کا ایس ایچ او تک سراج نہیں ہے۔ پرسنل برانچ نے مجھے بتایا ہے کہ ایک سب انسپکٹر مزنگ تھانے میں ہے اور دوسرا مصری شاہ کے علاقے میں، جن کے نام میں سراج آتا ہے۔ ان میں سے ایک بھی ہسپتال میں لائلپور گیا ہوا ہے اور دوسرا ریٹائر ہونے والا ہے۔ یعنی بڑی عمر کا آدمی ہے۔ اس جگہ کی نشاندہی کر سکتے ہو جہاں تم نے ریوالور پھینکا تھا؟"

میں نے فقط اقرار میں سر ہلایا پھر بیگم رضوی نمودار ہوئیں اور ہم خاموشی سے اندر چلے گئے۔

"کیا بات ہے۔ صورتیں کیوں اتری ہوئی ہیں؟" انھوں نے کہا۔ "ضمانت منسوخ ہو گئی کیا؟"

"ضمانت منسوخ ہو جاتی تو یہ حضرت یہاں نظر آتے؟" رضوی صاحب نے طنز سے کہا۔ محسن بہت حد تک حقائق سے باخبر تھا مگر مجھے موقع ہی نہیں ملا تھا کہ رابعہ کو کچھ بتا سکوں۔ موقع اس وقت بھی نہیں تھا۔ کھانا تقریباً تیار تھا۔ ابھی ہم کھانا کھا ہی رہے تھے کہ میو اسپتال سے ٹیلی فون موصول ہوا۔ پوسٹ مارٹم کے بعد شہلا کی ماں کی لاش لے کر ایک ایمبولینس روانہ ہو چکی تھی۔

شام تک اس غریب لاوارث عورت کی تدفین بڑی سادگی اور خاموشی سے ہو گئی۔ جنازے میں مشکل سے بیس افراد شریک ہوئے جو میانی صاحب کے قبرستان سے ایک گھنٹے میں لوٹ آئے۔ میں نے اور محسن نے لوٹتے ہوئے رابعہ کی ماں کی قبر پر فاتحہ پڑھی۔ پہلے رابعہ کی ماں، پھر شہلا کی ماں اور اب ہو گی محسن کی ماں کی باری۔ فرشتۂ اجل نے صرف میرے باپ کا انتخاب کیا تھا۔ باقی سب کی ماؤں کا۔ یہ فضول و بے سروپا خیال میرے ذہنی انتشار کا آئینہ دار تھا۔ شام کا اندھیرا ایک سوگوار رات کے اندھیرے میں ڈھل گیا۔ پورے گھر پر ایک ماتمی سکوت کا غلبہ تھا۔ کسی نے رات کے کھانے پر ہمیں نہیں بلایا۔ شاید کسی نے کھانا کھایا ہی نہیں۔ رضوی صاحب اپنے کمرے سے نہیں نکلے اور رابعہ اپنے کمرے میں بند رہی۔ میں اور محسن سگریٹیں پھونکتے رہے اور دبے دبے لہجے میں باتیں کرتے رہے۔ میں نے اسے تفصیل سے بتایا کہ گزشتہ شب میری اپنے دشمنوں سے کیا باتیں ہوئی تھیں اور ڈی سلوا کی موت تک پیش آنے والے تمام واقعات کا مفصل ذکر کیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ استاد ٹیڈی کو تلاش کرنے اور اسے صورتِ حال سے آگاہ کر کے بیان کے لیے تیار کرنے میں کتنی محنت ہوئی۔ "لیکن یہ محنت اکارت نہیں گئی۔" محسن نے کہا۔ "اس نے تو کمال کر دیا۔"

"شید سے اور عبدل کے قتل کا الزام تو اب ہم پر آتا نہیں۔" میں نے کہا۔ "شکاری کوئی اور چال سوچیں۔"

"میرا خیال ہے سرِدست تو ان کی پیشکش قبول کر لے۔" محسن نے اچانک کہا۔

"کیا؟ یعنی ان کے ناجائز کاروبار میں ان کے ساتھ شریک ہو جاؤں؟" میں نے بھڑک کر کہا۔

"نہیں۔ سیاست سے کام لے سکندر! وہ تجھے پارٹنر کی حیثیت دینے پر تیار ہو گئے ہیں۔ پہلے اپنی پوزیشن کو مستحکم کر لے۔ اس کے بعد دیکھ وہ کیا کرتے ہیں۔" محسن نے کہا

"انھوں نے میرے سامنے کچھ شرائط رکھی ہیں۔" میں نے کہا۔ "جو میں قبول نہیں کر سکتا۔ مثلاً ان کا مدعا ہے، وزیر خان

والے معاملے کو دبانا۔ وہ میرے نقصانات کی تلافی کے لیے تیار ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ میں اس کی موت کو بھول جاؤں۔ یہ بات بھول جاؤں کہ انھیں کس طرح محصور کر کے بے بس کر کے اور مفلس کر کے مارا گیا۔ میں سلامت شاہ، فوما نچو، غلام علی اور دیگر سب بے گناہوں کے خون کی قیمت وصول کر لوں اور خاموش ہو جاؤں۔"

"میں یہ نہیں کہتا کہ تو ان کی شرائط پر صلح کر لے۔" محسن نے کہا۔ "اگر وہ تیرے حقِ وراثت کو تسلیم کر لیتے ہیں تو یہ ایک محاذ پر تیری فتح ہے۔ جنگی حکمتِ عملی یہ ہونی چاہیے کہ پہلے مورچے کو مضبوط کر لیا جائے اور پھر پیش قدمی کی جائے۔ تو یہ طے ہے کہ سودا کسی قیمت پر نہیں ہو سکتا۔ آج اگر وہ سب کچھ تیرے حوالے کر دیں، تب بھی نہیں۔ کوئی مجرم کسی عدالت میں ایک معمولی سے جرم کی قیمت ادا کر کے نہیں بچ سکتا۔ ان کے جرائم تو بہت سنگین ہیں۔ ان کو معاف کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ فوزیہ کو اٹھا لائے، میرے باپ کو اٹھا لائے۔ انھوں نے شہلا کی ماں کو مار دیا۔ جنگ کا دائرہ تو اب بہت پھیل گیا ہے۔"

"بالکل یہی میں نے ان سے کہا تھا۔" میں نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"مگر یار سکندر! یہ تو نے شہلا کو وہاں جانے سے روکا کیوں نہیں؟" وہ بولا۔ "وہ تیرے کہنے سے رک جاتی۔"

"میں کیسے روکتا۔ سب لوگ ایک طرف تھے۔ بیگم رضوی، انکل، رابعہ اور فوزیہ۔" میں نے کہا۔ "لیکن... میں نے اسے وہ سب بتا دیا تھا جو اسے نہیں معلوم تھا۔"

"ممی کی بیماری کے متعلق؟" وہ بولا۔ "یا فوزیہ کی شادی کے بارے میں؟"

"یہ تو اسے بتا دیا گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "مگر... یہ نہیں کہ فوزیہ کے علاوہ تیری بھی شادی ہو سکتی ہے۔ میرا ابھی خیال یہی ہے کہ اسے وہاں موجود نہیں ہونا چاہیے۔ تیری شادی کے موقعے پر اور اس کے بعد۔ لیکن اب اس کی ایک ہی صورت ہے کہ پہلے فوزیہ کی شادی ہو۔ اس کے بعد شہلا لوٹ آئے اور..."

محسن نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر ہم اپنے اپنے خیالات میں محو خاموش لیٹے چھت کو گھورتے رہے پھر باہر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے غور سے سنا۔ آہٹ باہر کی طرف ہوئی تھی۔ "محسن!" میں نے سرگوشی میں کہا مگر وہ سو چکا تھا۔ میں دم سادھے پڑا رہا۔ کمرے کی کھڑکی میں ایک سایہ سا نمودار ہوا۔

میں نے کھڑکی کھول کے جھانکا۔ باہر کوئی نہ تھا۔ گیٹ پر صرف ایک مسلح سپاہی بے حد مستعد کھڑا تھا اور حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس کے ہاتھ میں پولیس کی روایتی، گوروں کے عہدِ رفتہ کی نشانی، دھائیں سے ایک فائر کرنے والی تھری ناٹ تھری کی وہ رائفل نہیں تھی جس سے دوسری گولی چلانی مقصود ہو تو اس کے میگزین سے برآمد کرنی پڑتی ہے اور اس کے لیے ایک لیور کو خاصی زور آزمائی سے آگے پیچھے کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اس رائفل کے بغیر میرے ذہن میں مسلح پولیس کی تصویر مکمل نہیں ہوتی تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے سہرے کے بغیر دولھا کا تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔

بلکہ یہ سپاہی جدید طرز کی چھوٹی سی آٹومیٹک مشین گن لیے کھڑا تھا جو اسٹین گن سے مشابہ تھی اور ممکن ہے اسٹین گن ہی ہو۔ میں نے جدید آلاتِ ضرب کو مار دھاڑ سے بھرپور انگریزی فلموں میں استعمال ہوتے دیکھا تھا یا سنا تھا کہ وطنِ عزیز میں بھی ڈکیتی کی وارداتوں کے لیے ان کا استعمال کامیابی سے ہونے لگا ہے مگر ذاتی طور پر ان کی اقسام کے فرق کو اتنی دور سے محسوس کرنا میرے لیے مشکل تھا۔

گیٹ کے اوپر مجھے دو سرچ لائٹس بھی نظر آئیں۔ یہ دونوں کا رُخ مخالف سمت میں تھا اور ایک سے بیرونی دیوار کا وہ حصّہ روشن تھا جو سڑک کے ساتھ ساتھ تھا تو دوسری سے دائیں طرف سرونٹ کوارٹر تک کوٹھی کا تمام علاقہ روشن تھا۔ سرونٹ کوارٹر مقفّل اور تاریک تھا مگر اس کے باہر سایہ بھی حرکت کرتا تو مستعد محافظ کی نظر اسے دیکھ لیتی۔ اسی طرح سڑک کی طرف سے کوئی احاطے کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتا تھا۔ یہ تازہ ترین حفاظتی انتظامات جو رضوی صاحب نے صرف ہماری وجہ سے کیے تھے ان کی دور اندیشی، فہم و فراست اور حسنِ تدبیر کا عملی ثبوت تھے۔

میں نے اپنے آپ کو خاصا محفوظ محسوس کیا۔ دشمنوں سے کچھ بعید نہ تھا کہ ڈی سلوا کی موت کے بعد وہ راست اقدام کا منصوبہ بناتے تو مجھے، محسن یا رابعہ کو اغوا کر لے جاتے یا اس گھر کا بھی وہی حشر کرتے جو رابعہ کے گھر کا ہوا تھا۔ بے شک دن میں ہم ہر جگہ ان کے انتقام کا نشانہ بن سکتے تھے مگر اب ہم نے بھی غیر مسلح پھرنا چھوڑ دیا تھا۔ ہمارے قتل سے ان کو کوئی فائدہ ہوتا تو وہ بہت پہلے ہمیں ٹھکانے لگا چکے ہوتے۔ کسی نامعلوم سمت سے آنے والی گولی کے صحیح نشانے پر لگنے والی گولی ان کے مسائل کا حل ہوتی تو وہ خود سارا جھگڑا ختم کر دیتے یا کسی پیشہ ور قاتل کی خدمات

حاصل کر لیتے۔

لیکن ان کے عزائم کو خاک میں ملانے کے لیے ہم نے جارحیت کا جواب جارحیت سے دیا تھا اور اپنے دفاع کو بھی اتنا مضبوط بنا لیا تھا کہ وہ آسانی سے کامیاب ہونے کے جتنے خواب دیکھ رہے تھے ان کی تعبیر الٹی ہوتی جا رہی تھی۔ ہم سے اپنی تمام شرائط منوانے کی صرف ایک مؤثر صورت یہ تھی کہ وہ ہم میں سے کسی ایک کو یرغمالی بنا لیں اور اس کی جان کے بدلے ہم سے سودا کریں۔ ہمارے رفاعی حصار میں صرف ایک کمزور پہلو تھا۔ ہماری ایک دوسرے سے جذباتی وابستگی۔

وہ جانتے تھے کہ مجھے شہلا، رابعہ یا محسن کو ایک دوسرے سے کتنی محبت ہے۔ انکل رضوی اور ان کی فیملی کے ہر ممبر یا شیروانی صاحب کے خاندان سے بھی ہمارے رشتوں کی بنیادیں کتنی مستحکم ہیں۔ بے غرضی اور خلوص پر مبنی ان رشتوں کو صرف اسی طرح شکست ہو سکتی ہے کہ ہمارے سامنے ہم میں سے کسی کے لیے بھی آزمائش کی کوئی صورت پیدا کر دی جائے۔ وہ اگر رضوی صاحب کے گھر کے ایک بچّے کو بھی اٹھا لے جاتے تو میں بخوشی اپنی ہار قبول کر لیتا اور غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیتا، جو بات وہ نہیں جانتے تھے، یہ تھی کہ ایسا وقت آیا تو اعترافِ شکست میرے لیے زیادہ مشکل ہو جائے گا۔ رضوی صاحب جیسے کٹّر اصول پرست شخص کے لیے یہ صرف ایک بچّے کے اغوا کا کیس تھا۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا کہ وہ بچّہ ان کا ہے یا کسی اور کا۔ وہ مجھے کبھی اجازت نہ دیں گے کہ مجرموں کے ایسے مطالبے کے سامنے سر جھکا دوں خواہ اس کا انجام کچھ بھی ہو۔ انھیں اپنے لختِ جگر کی لاش ملے یا نہ ملے، وہ کامل یکسوئی کے ساتھ مجرموں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کی قانونی کارروائی کو جاری رکھیں گے۔ یہی صورتِ حال دوسروں کے ساتھ ہو گی۔ رابعہ، محسن اور شہلا میں سے ہر ایک مجھے اپنی محبت یا اپنی جان کی قسم دے کر منع کر دے گا کہ دشمنوں کی بات نہ مانوں ورنہ وہ مجھے کبھی معاف نہ کریں گے۔

دن دہاڑے ہم میں سے کوئی بھی آسانی سے اغوا نہ ہو سکتا تھا۔ نہ میں اور محسن، نہ رابعہ یا رضوی صاحب۔ برابر کا مقابلہ کرتے اور مرتے یا مار دیتے۔ میری موت انھیں منظور نہ تھی، ایک افسر کو قتل کرنے کی ان میں ہمت نہ ہو کا سارا محکمہ اپنے تمام وسائل کے ساتھ

ان کی بیخ کنی پر تل جاتا اور یہ دشمنی انھیں بہت مہنگی پڑتی۔ یہی صورت رابعہ کی تھی۔ اس کے اغوا یا قتل ہوتے ہی ساری وکیل برادری اٹھ کھڑی ہوتی اور ڈسٹرکٹ سے لے کر ہائی کورٹ تک ہر بار ایسوسی ایشن اور سب قومی اخبارات پولیس کے پیچھے پڑ جاتے تو مجرموں کے لیے جائے پناہ نہ رہتی۔ پولیس کی نظر کس مجرم پر نہیں ہوتی۔ ولی را ولی می شناسد۔ وہ جانتے ہیں کہ علاقے میں کتنے گرہ کٹ اور جیب تراش ہیں، کتنے چور اور کتنے ڈاکو ہیں، سٹّے کے اڈے کہاں ہیں اور منشیات کے کہاں۔ لیکن وہ کچھ دو اور کچھ لو۔ جیو اور جینے دو کے فلسفے پر عمل پیرا رہتے ہوئے "عفو و درگزر" سے کام لیتے ہیں۔ جب یہ نوبت آ جائے کہ انھیں اپنی جان کے یا نوکری کے لالے پڑ جائیں تو وہ جائز طریقے اختیار کریں یا ناجائز مگر مجرم تک رسائی ضرور حاصل کر لیتے ہیں۔ اس کامیابی میں عموماً سب سے بڑا ہاتھ ان مخبروں کا ہوتا ہے جو بظاہر مجرموں کے آلۂ کار ہوتے ہیں اور خود بھی شریفانہ طریقے سے روزی نہیں کماتے۔ سابقہ سزا یافتہ مجرم، بھتہ وصول کر کے آگے پہنچانے والے، ہتھارے وار اور بعض اوقات بالکل بے ضرر کاروبار میں مصروف عام آدمی۔ ان سب کا جال شہر کے گلی کوچوں میں پھیلا رہتا ہے اور بوقتِ ضرورت خفیہ طور پر معلومات کی فراہمی کا سب سے مؤثر ذریعہ ثابت ہوتا ہے۔

صرف محسن ایسا شخص تھا جسے دشمن اغوا کرنے میں کامیاب ہو جاتے تو ناکامی کی صورت میں قتل بھی کر دیتے اور یہ ایک عام آدمی کا قتل کہلاتا جو زیادہ اہم نہیں سمجھا جاتا اور زیادہ مسائل پیدا نہ کرتا۔ مگر اس سے زیادہ آسان شہلا یا فوزیہ کو اٹھانا تھا اور فوزیہ کے ساتھ شیروانی صاحب کو اسلام آباد سے لاہور پہنچا کے انھوں نے ثابت کر دیا تھا کہ ان کے ہاتھ کتنے لمبے تھے۔ آدھی سے زیادہ رات گزر چکی تھی لیکن نیند کا کہیں پتا نہ تھا۔ میں کھلی کھڑکی میں کھڑا سگریٹ پیتا رہا اور ایک غیر یقینی مستقبل کے خدشات، امکانات اور تصوّرات میں گم رہا۔ شیروانی صاحب، پرانی وضع کے شریف اور عمر رسیدہ افسر۔ وہ اپنی حفاظت نہیں کر سکتے تو کسی اور کو کیسے بچائیں گے۔ پہلے ایک فوزیہ ہی تھی، اب شہلا بھی ہے۔ یک نہ شد دو شد۔ لیکن سب سے زیادہ تکلیف دہ خیال یہ تھا کہ ان بے ضمیر انسانوں نے انتقام کی آرزو میں اندھا ہو کے اور ذلّت کی انتہائی پستی میں گرتے ہوئے اس عورت کو حصولِ مقصد کا ذریعہ بنا لیا

میں نے محسن کی طرف دیکھا۔ وہ گہری نیند میں تھا۔ مجھے اس پر رشک آیا۔ شاید اس کے ذہن میں کوئی کشمکش نہیں، کوئی خلفشار نہیں۔ وہ فیصلہ کر چکا ہے کہ اسے کیا کرنا ہے اور اس فیصلے سے پوری طرح مطمئن بھی ہے۔

رابعہ اب دائیں جانب کے مختصر سے باغیچے میں لان پر جا کھڑی ہوئی تھی۔ نیم شب کی چاندنی میں وہ بالکل کسی مرمریں مجسمے کی طرح نظر آتی تھی جس کے پیکر کے خدوخال کو اس مہارت سے تراشنے میں فنکار کے ہاتھوں کو خود قدرت نے اپنے کمالِ حسن آفرینی کا ذریعہ بنایا ہو۔ میں دبے پاؤں اس کے پیچھے پہنچا اور حلق سے مینڈک کی طرح آواز نکالی۔

وہ اچھل کر دور جا کھڑی ہوئی۔ پھر اس نے مجھے دیکھا۔ میں جھک کر تسلیم بجا لایا اور پھر وہی آواز نکالی۔

"آدھی رات کو مینڈک کی طرح ٹرانے سے کیا ہوتا ہے؟" وہ ہنس کر بولی۔

"مینڈک ہو تو گلا صاف ہو جاتا ہے۔" میں نے کھنکار کر کہا۔ "اگر مینڈکی ہو تو زکام ہو جاتا ہے۔"

اسی وقت رابعہ کو چھینک آئی۔ دروازے پر مستعد کھڑے ہوئے سنتری نے چونک کر ہمیں دیکھا۔ اس نے یقیناً یہ سمجھا ہو گا کہ اس کوٹھی میں رہنے والے بھی رات کو شراب پی کر آؤٹ ہو جاتے ہیں اور کوٹھی والوں کے متعلق اس کے عقائد کو تقویت حاصل ہوئی ہو گی کہ سب بلا تخصیص اخلاقی طور پر دیوالیہ ہوتے ہیں۔ ہم دونوں بے ساختہ ہنسے۔

"میں نے نوٹ کیا ہے کہ تم ایک گھنٹہ چوالیس منٹ بیالیس سیکنڈ تک ساٹے کو دیکھتی رہیں۔ پانچ منٹ چھ سیکنڈ تک چاندنی پر غور فرماتی رہیں۔ اور اب تین منٹ چار سیکنڈ سے میرے فرمودات عالیہ سے مستفید ہو رہی ہو۔ آخر کیوں؟ میرا مطلب ہے، نیند کیوں رات بھر نہیں آتی؟ مجھے اور تمھیں۔" میں نے کرسی پر بیٹھ کر کہا۔ "کیا یہ الزام غلط ہے؟"

"نہیں۔" رابعہ دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔ "مگر تم مدعی ہو یا مدعا علیہ؟ جواب تو تمھیں بھی دینا ہے۔"

"کرۂ ارض پر رات بھر جاگنے والوں کی تین اقسام مشہور ہیں۔" میں نے کہا۔ "اخبار چھاپنے والے، عاشقانِ مہجور اور الو۔"

رابعہ پھر ہنسی۔ "تم نے جس زبان میں فریاد کی تھی، وہ کچھ اور تھی۔"

"اس کے بارے میں ایک شعر عرض کرتا ہوں ؎

جب مینڈک ٹراتے ہیں اُلو جاگتا رہتا ہے
کتے بھونکتے رہتے ہیں، قافلہ بھاگتا رہتا ہے"

"قافلہ چلتا رہتا ہے؟ کم سے کم محاورے کو تو بخش دو۔" رابعہ نے کہا۔

"نہیں۔ جب کتے بھونکیں گے تو قافلے والے خود سرپٹ دوڑیں گے۔ محاورہ درست کرلیں۔ یہ ذاتی تجربے کی بات ہے۔"

رابعہ کو پھر ہنسی آئی اور مجھے بہت اچھا لگا۔ خدشات اور تفکرات کے بیاباں سے نکل کر میں یکلخت اپنے خوابوں کے دل نشیں جزیرے میں جا اُترا تھا جہاں رنگ اور خوشبو کی فراوانی تھی! حسن و رعنائی کے آبشار تھے اور گنگناتے چشموں کے گیت تھے۔

"اچھی خاصی باتیں کرتے کرتے سکتہ کیوں طاری ہو گیا؟" رابعہ نے میری آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرا کے کہا۔

میں چونکا۔ "باتیں! ہاں، میں باتیں ہی تو کرنا چاہتا تھا کیوں کہ میں سوچتے سوچتے تھک گیا تھا۔"

"صرف سوچنے سے کچھ نہیں ہوتا سکندر!" وہ بولی۔

"صرف سوچتے رہنے سے آدمی پاگل تو ہو جاتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اور شاید تم نظر نہ آتیں تو میں بھی ہو جاتا۔ تم نے دیکھا کہ آثار پیدا ہو چلے تھے۔ میں نے جو بے سروپا باتیں کی ہیں، وہ اور کیا تھا؟ میرے دماغ کے بوائلر میں اندیشوں کی اسٹیم کا پریشر بڑھ گیا تھا۔ پریشر والو کھلنے سے کیسا شور پیدا ہوتا ہے مگر اس سے بوائلر نہیں پھٹتا۔ کچھ دیر پہلے میں بالکل اکیلا تھا اور بہت ڈرا ہوا تھا۔ تم نے مجھے بچا لیا۔ اب مجھ سے باتیں کرو۔ وہ باتیں جن کا تعلق سکندر بخت کے مقدمات سے، اس کے مسائل اور اس کی مشکلات سے نہ ہو۔ تھانے، کچہری اور قانون کی دفعات سے نہ ہو۔ لاقانونیت سے نہ ہو۔ مستقبل کے کسی خوف، کسی تاریک پہلو اور کسی پریشانی سے نہ ہو۔ اپنی بات کرو۔ میری بات کرو۔ ان خوابوں کی بات کرو جو میرے بھی ہیں اور تمھارے بھی۔ اس محبت کی بات کرو جس نے مجھے تسخیر کر لیا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے رات کے اندھیرے کو صبح کا اجالا تسخیر کرتا ہے۔ ہر صبح پہلے کاذب لگتی ہے۔ دھوکا۔ فریبِ نگاہ۔ مگر وہی صبح صادق کا اجالا بن جاتی ہے تو سحر کے یقین کو کون جھٹلا سکتا ہے۔" بولتے بولتے میں نے رابعہ کی طرف دیکھا اور خاموش ہو گیا۔ وہ بت بنی بیٹھی تھی اور چاندنی کے مدھم اجالے میں بھی اس کے عارض پر رنگ گلاب کی سرخی جھلکنے لگی تھی۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور سر کو کرسی کی پشت سے لگا دیا۔ سکون اور طمانیت کا ایک اجنبی اور مسرت

جس کی زندگی چراغِ سحری ہے تو کیا ہو گا؟ بہت جلد محسن کی ماں کو دنیا سے رختِ سفر باندھنا تھا اور اس کے پاس فرصتِ عمر بہت کم تھی۔ شاید وہ خود بھی جانتی تھی کہ زندگی کے باقی ماندہ گنے چنے دنوں میں اس کو کیا کچھ کرنا ہے ؎

عمرِ دراز مانگ کے لائے تھے چار دن۔ کرنا تو بہت کچھ تھا مگر اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ کہ دو ان حسرتوں سے کہیں اور جا بسیں۔ ان گنت خواہشوں اور بے حساب تمناؤں کے لیے کوئی گنجائش نہیں، اس نے تھوڑی سی خوشیوں کا انتخاب کر لیا ہے۔ جیسے پیاسے نے سمندر سے شبنم کے چند قطرے مانگ لیے ہوں اور ہم سب نے تہیہ کر رکھا تھا کہ ان خوشیوں کی تکمیل کا سامان ضرور کریں گے۔ اسے دُنیا سے بے مراد، دل شکستہ اور اس احساس کے ساتھ رخصت نہیں کریں گے کہ اس نے جن پودوں کو جنم دیا اور اپنے لہو سے پروان چڑھایا، ان کا ثمر نا امیدی ہے، احساسِ محرومی ہے اور تنہائی ہے۔ اَزلی و اَبدی۔ ان میں پھول نہیں کھلے، کانٹے نکلے اور ملکِ عدم میں اس کے ساتھ کسی کا پیار تک نہیں۔

اور ہمیں مجبوریوں کے جال میں پھنسا لینے والے فنکاری سوال کریں گے کہ میاں سکندرِ اعظم! کیا اب بھی تم کو اپنی فتوحات عزیز تر ہیں؟ فوزیہ اور اس کے باپ کی ملتجی سوالیہ نگاہیں مجھ سے ان خوشیوں کی بھیک مانگنے پر مجبور ہوں گی جو وہ اپنی ماں اور اپنی شریکِ زندگی کے دامن میں ڈالنے کا عہد کر چکے تھے اور اس عہد کو ایک مقدس فرض کی طرح پورا کرنا چاہتے تھے مگر سب سے کڑی آزمائش محسن کے لیے ہو گی۔ وہ میرا ساتھ دے گا تو اس جنت سے محروم رہ جائے گا جو ماں کے قدموں کے نیچے ملتی ہے پھر اس کے لیے یہ زندگی جہنم کے عذاب سے کم نہ ہو گی جس میں ہر سانس، ضمیر پر ایک تازیانہ ہو گی کہ بدبخت تو نے اپنی ہی ماں کی آخری چند سانسوں کو سکھ اور طمانیت کی جگہ دکھ اور آزار دیے اور اس سے چند دن اور جینے کا حق بھی چھین لیا۔ اگر اس نے ماں کی خاطر میری رفاقت کو قربان کیا، تب بھی یہ زندگی اس کے لیے ایک مستقل سزا ہو گی اور صرف وزیر خان ہی نہیں سلامت شاہ، فوما بخو اور نہ جانے کتنے بے گناہوں کے لہو کا خیال اُسے ستاتا رہے گا جو یومِ حشر اس سے انصاف کا طلبگار ہو گا۔ یہ احساس ہی اسے پاگل کر دے گا کہ اس نے اپنے مظلوم دوست کو آزمائش کی گھڑی میں تنہا چھوڑ دیا اور وہ منزلِ دار و رسن تک گیا تو ایک صدمہ اسے جرمِ بے گناہی کی سزا پانے کا تھا تو دوسرا دوستی کے نام کو رسوا کرنے والے محسن کی بے وفائی کا۔

خود میں اس پوزیشن میں ہوتا تو کیا کرتا؟ اس ماں کا ساتھ دیتا جسے بہرحال مرجانا ہے اور خواہ دنیا کی ساری خوشیاں بھی اس کے سامنے ڈھیر کر دی جائیں، اس کی زندگی کا طلبگار لمحہ جان کا نذرانہ لیے بغیر ٹلنے والا نہیں ہے۔ سب سے بڑا دکھ تو یہی ہے کہ آدمی خود کو اس لمحے کے مقابل بے بس پا کر زندہ انسانوں کی خوبصورت دنیا سے تہی دست جانے پر مجبور ہو اور پھر یہ بھی جانتا ہو کہ اپنے پرائے، جان سے پیارے اور جان کے دشمن، سب بہت جلد اسے بھول کر کاروبارِ حیات کی مصروفیت میں کھو جائیں گے۔ سوئم، چہلم، ایک آدھ برسی۔ پھر یاد کا کوئی بے کسک لمحہ۔ اس کے بعد کچھ بھی نہیں۔ اطمینان کی بات صرف یہ ہوتی ہے کہ جسم کے ساتھ ہی احساس بھی مرجاتا ہے اور جسم بھی مٹی ہو جاتا ہے ورنہ قبر میں لیٹے ہوئے آدمی کو یہ دکھ کتنا تڑپائے کہ اسے اتنی جلد فراموش کر دینے والی یہ کمینی دنیا، زندگی کے حسن سے بدستور آراستہ ہے اور خوشی کے خزانے سے اپنا حصہ وصول کرنے کی خود غرضانہ جدوجہد جاری ہے۔

کیا یہ سوال حساب کے قاعدے سے حل کیا جا سکتا ہے؟ ایک عورت (فرض کرو ماں) جس کو صرف چند دن جینا ہو، بیٹے کی طرف سے مایوسی کا دکھ اٹھا کے مرجائے تو بہتر ہے؟ یا ایک دوست جس کو ابھی نہیں مرنا ہے اسی عورت کی وقتی خوشی کی خاطر جینے کے حق سے محروم ہو جائے؟ کس کو دکھ دینا چاہیے؟ فائدہ کس کے دکھ میں ہے اور نقصان کس کے دکھ کا زیادہ ہے؟ نہیں۔ یہ نفع نقصان کا سوال ہی نہیں۔

معلوم نہیں میں کب تک چوکھٹ میں پیر سمیٹ کر توازن برقرار رکھے بیٹھا رہتا اور ایسے ہی خیالات کی بھول بھلیوں میں بھٹکتا رہتا لیکن میری نظر نے سایۂ دیوار سے ایک اور سایہ جدا ہوتے دیکھا۔ یہ رابعہ تھی جو نجانے کب سے رات کے اس خاموش پہر میں دیوار سے ٹیک لگائے تنہا کھڑی تھی۔ میری طرف اس کی پشت نہ ہوتی تو وہ ضرور دیکھ لیتی کہ میں بھی اس کی طرح خیالات کے گرداب میں اکیلا ڈوب رہا ہوں، ڈوب کر ابھرنے کی کوشش میں امید کے ایک تنکے کا سہارا چاہتا ہوں اور روشنی کی ایک کرن کا متلاشی ہوں۔

بخش احساس میرے وجود میں نشہ بن کے اترنے لگا۔ میں نے آرزو کی کہ کاش وقت کی گردش یہیں رک جائے۔ اس رات کا کا دوسرا کنارہ نہ ہو۔

"سکندر!" رابعہ کی آواز بیکراں وقت کے کسی ساحل سے آئی۔ "میں تمہارے اس سوال کا جواب دوں گی جو تم نے سب سے پہلے کیا تھا۔ کہ نیند کیوں رات بھر نہیں آتی؟ تم نے تو وجہ بتا دی۔ وجہ میرے لیے بھی وہی تھی۔ میں بھی مستقبل کے اندیشوں میں گرفتار تھی۔ تنہا تھی اور ڈری ہوئی تھی لیکن میں عورت بھی ہوں، صرف وکیل ہی نہیں۔ میں بھی سوچ رہی تھی اور تم نہ آتے تو شاید سوچتے سوچتے میں بھی پاگل ہو جاتی مگر میں صرف اپنے اور تمہارے بارے میں سوچ رہی تھی، کسی مقدمے اور کسی قانونی حوالے کے بارے میں نہیں۔ وہ دن کی دنیا ہے جس میں ہم سب ایک ساتھ ایک ہی کشتی میں سوار ہیں۔ تم اور میں۔ محسن اور شہلا۔ انکل رضوی اور شیرانی اور فوزیہ اور اس کی ماں۔ ہم سب ایک ساتھ پار اُتر جائیں گے۔ سلامتی کے کسی ساحل پر۔ یا اس منجدھار میں ڈوب جائیں گے۔ مگر میں یہ نہیں چاہتی۔ مجھے جینے کے لیے صرف ایک زندگی ملی ہے۔ اگر میں صرف اپنے لیے جینا چاہوں تو کیا یہ جرم ہے؟ خود غرضی ہے؟ اور خود غرضی ہے تو کیا بقا کی جدوجہد میں اپنے سوا سب کو نظر انداز کر دینا عین قانونِ فطرت ہے؟ ایک حیوانی جبلّت ہے؟ میں اپنی ایک زندگی کو ایک دنیا کی بقا کے مسائل پر قربان کیوں کروں؟ کیا دیا ہے آخر اب تک اس دنیا نے مجھے کہ میں اس کی خاطر کچھ کروں اور آئندہ کیا دے گی؟ دُکھ، بدنامی اور مصائب کے سوا۔ میں اپنی دنیا کو لے کر الگ کیوں نہ ہو جاؤں؟ خوشی پر میرا حق بھی تو ہے۔"

"تم کیا کہنا چاہتی ہو؟" میں نے آنکھیں کھول کر اور سیدھا بیٹھ کے کہا۔

"تم جانتے ہو کہ میں کیا چاہتی ہوں۔" وہ بولی۔ "کیونکہ وہی تم بھی چاہتے ہو۔ اپنے آپ سے تو جھوٹ مت بولو سکندر!"

"حقیقت کو تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے رابعہ!" میں نے کہا۔ "صرف آرزو کرنے سے ہی بات نہیں بنتی۔"

"ہونہہ!" وہ سر جھٹک کر بولی۔ اس کے بال چہرے پر آ گئے۔ اس نے نزاکت سے انہیں پھر شانوں پر پھیلا دیا۔ "آرزو کیا ہے؟ فقط اپنے ارادوں کی کمزوری۔ ورنہ جہاں چاہ ہے وہاں راہ ہے۔"

"راہ تو ہے لیکن منزل کہاں ہے؟ ابھی تو نشانِ منزل کا بھی پتا نہیں ہے؟"

"مجھے ٹالنے کی کوشش مت کرو۔ میری اور تمہاری منزل ایک ہے تو ڈر کیسا؟" وہ بولی۔ "میرا ہاتھ تھام لو۔ میں تمہیں سیدھا راستہ دکھاتی ہوں۔ ورنہ جن راستوں سے ہم منزل تک پہنچنے کو سرگرداں ہیں، وہ اتنے پُرپیچ ہیں کہ ہم تمام عمر بھٹکتے رہیں گے اور منزل ہمیشہ سراب کی طرح دور ہوتی جائے گی۔ ان سب جھگڑوں، بکھیڑوں کو یہیں چھوڑ دو۔ سارے رشتوں کو اور سب بندھنوں کو توڑ دو۔ چلو اپنی دنیا میں چلیں۔"

"تم زنانہ ناولوں کے ڈائیلاگ بول رہی ہو؟ اس دنیا سے الگ کون سی دنیا ہے؟ سوائے عالمِ ارواح کے۔"

"نہیں۔ میرے سامنے ایک عملی صورت ہے۔" وہ بُرا مانے بغیر بولی۔ "ذرا تصور کرو، دنیا کا دوسرا کنارہ کہاں ہے۔ دنیا کی تین ارب آبادی کہاں کہاں پھیلی ہوئی ہے۔ قطبِ شمالی سے قطبِ جنوبی تک۔ ہانگ کانگ سے لاس اینجلز تک۔ پانچ برِاعظم ہیں۔ سوا سو ملک ہیں۔ سیکڑوں شہر، لاکھوں قصبے۔ اتنی وسیع زمین پر انسانوں کے اس سمندر میں ایک مرد اور ایک عورت کے لیے پناہ کی کوئی جگہ نہیں ہے؟ کسی دور افتادہ، خیال اور امکان کی دسترس سے دور ایک چھوٹا سا گھر بھی نہیں جو کسی گمنام اور نادیدہ و ناشنیدہ گاؤں میں ہو؟"

میں بھونچکا رہ گیا۔ "تم کہہ رہی ہو کہ ہم دونوں بھاگ جائیں!"

"بے شک اخباروں اور کتابوں کی دنیا میں اور ہمارے گھروں میں یہ لفظ مختلف معانی رکھتے ہیں۔ لیکن کیا اس کے باوجود لوگ پناہ کے لیے بھاگتے نہیں رہتے۔ ہمّت ہوتی ہے تو کبھی بچّے، کبھی ماں اور کبھی باپ اس گھر سے بھاگ جاتے ہیں جہاں خوشی نہ ہو۔ بزدل ہوں تو ذمّے داریوں سے بچ کر بھاگ جاتے ہیں۔ ہم سب دن سے بھاگ کر رات کی آغوش میں اور حقائق سے بھاگ کر خوابوں کی دنیا میں پناہ لیتے ہیں۔ یہ سب جو مار دھاڑ، عشق و محبت اور ہنسی و مذاق سے بھرپور فلمیں دیکھتے ہیں وہ بھی تو تین گھنٹے کے لیے عملی زندگی سے بھاگ جاتے ہیں اور اسکرین کی دنیا میں انھیں خوشی مل جاتی ہے۔ جنھیں کہیں خوشی نہ ملے، وہ نشہ یا خودکشی نہ کر سکیں تو عقل و ہوش کی دنیا سے بھاگ جاتے ہیں۔ پاگل خانے کی دنیا میں بھی انہیں خوشی مل جاتی ہے۔"

"تمہارا... مطلب ہے میں اور تم اس ملک سے نکل جائیں؟" میں نے احمقوں کی طرح کہا۔

"ہاں۔ ذرا سوچو کتنے مجرم ہیں جو اس طرح اپنے اپنے ملک سے نکل گئے اور انھوں نے اپنے وسائل سے دوسرے ملکوں کی شہریت حاصل کر لی۔" رابعہ نے کہا۔

"تم ٹھیک کہتی ہو رابعہ!" میں نے کہا۔ "تم قانون کو سمجھتی ہو۔ اتنا تجربہ مجھے بھی ہے کہ غلط نام سے پاسپورٹ کیسے اور کہاں سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ بھیس بدل کے یا فرضی نام اختیار کر کے مشرق مغرب یا شمال جنوب کی طرف نکل جانے کے کتنے راستے ہیں۔ خشکی کے راستے۔ سمندری راستے اور ہوائی سفر کے راستے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جتنا پیسہ اب تمہارے پاس ہے اسے زرِمبادلہ کی صورت میں باہر منتقل کرنا ہو تو کیسے کیا جا سکتا ہے۔ یہ رقم یقیناً اتنی ہے کہ اس سے ہم۔ بقول تمہارے ہانگ کانگ سے لاس اینجلز تک۔ کہیں بھی سکونت اختیار کر سکتے ہیں اور خود کفالت کے لیے آمدنی کے مزید ذرائع بھی پیدا کر سکتے ہیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ ہمارے ارادوں میں کھوٹ نہیں۔ ہم کسی گناہ کے مرتکب نہیں ہوں گے اور جان بچانا کوئی جرم نہیں۔ ہم باقاعدہ شادی کر کے عام لوگوں کی طرح رہ سکتے ہیں۔ خواہ ہمارے نام کچھ بھی ہوں۔ جیسے فلمی دنیا میں ممتاز بیگم کی جگہ مدھوبالا اور یوسف خان کی جگہ دلیپ کمار نے لی۔ ویسے ہی ہم مسٹر اینڈ مسز ایکس وائی زیڈ ہو جائیں تو کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ ہم جانتے ہیں ہم کون ہیں اور کیا کر رہے ہیں، کس کے لیے کر رہے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ... قانون کی دسترس سے دور ہو جانے کے بعد ہم سب آفات، تمام مصائب اور سارے مسائل و تفکّرات سے محفوظ ہو جائیں گے اور میرے مقدمات کی فائلیں بالآخر داخلِ دفتر ہو جائیں گی۔ ان کو دیمک چاٹ جائے گی خواہ ریکارڈ پر مفرور مجرم کا لیبل لگا رہے۔"

دم لینے کے لیے اور اینٹی کلائمکس کی تیاری کے لیے میں نے وقفہ دیا اور جیب سے سگریٹ نکال کے سلگائی۔ رابعہ جانتی تھی کہ میری بات ابھی پوری نہیں ہوئی اور اس میں فیصلہ کن موڑ باقی ہے۔

"ان تمام حقائق کو سمجھتے ہوئے بھی۔" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ "میں تم سے اتفاق نہیں کر سکتا۔ اس لیے نہیں کہ میں ڈرتا ہوں۔ نہیں۔ بقول فلمی شاعر۔ پیار کیا تو ڈرنا کیا؟ میں ہیرو بننے کے خبط میں بھی مبتلا نہیں اور یہ نہیں کہہ سکتا کہ فکر مت کرو۔ میں ایک ایک کو ٹھکانے لگا دوں گا اور دشمنوں کی ایسی تیسی۔ ہم یہیں رہ کے شادی کریں گے اور جیسا کہ عموماً فلموں میں ہوتا ہے۔ ولن کا خانہ خراب ہوگا اور آخری منظر میں ہیرو، ہیروئن کی خانہ آبادی ہوگی۔ اصل بات یہ ہے رابعہ کہ مجھ پر اپنی جان کا نہیں دوسروں کی جان کا قرض ہے۔ سب سے پہلے وزیر خان کا دردناک انجام مجھ سے تقاضا کرتا ہے کہ میں اس کی روح کے لیے سکون کا سامان فراہم کروں۔ جذباتی رشتے رابابِ تھا۔ اس نے جس نیک نیتی اور فراخدلی سے میری پرورش پر اپنی زندگی قربان کی اس کا صلہ میں اس طرح نہیں دے سکتا کہ صرف اپنی خوشی کو مقدّم سمجھتے ہوئے بھاگ جاؤں۔ ہم کسی دور افتادہ اور گمنام قصبے کے چھوٹے سے گھر میں ——— قانون اور اپنے دشمنوں کے عتاب سے تو محفوظ رہ سکتے ہیں لیکن خوش نہیں رہ سکتے رابعہ! ضمیر کی ایک خلش ہم دونوں کے لیے ساری عمر کا آزار بن جائے گی کہ ہم نے ان سب کے لیے کچھ نہیں کیا جنھوں نے ہماری خاطر جان تک دے دی۔ مظلوم تم بھی ہو۔ شہلا بھی ہے۔ یاسمین نام کی ایک لڑکی بھی ہے۔ پھر گل رُخ ہے اور ایک ایماندار کسٹم آفیسر نعیم ہے جو روپوش رہنے پر مجبور ہے۔ میں بزدلی اور کم ہمّتی کا طعنہ برداشت کر لوں گا۔ اپنی خود غرضی کو جواز فراہم کر دوں گا۔ لیکن کیا میں اس بات پر خود کو معاف کر سکوں گا کہ میرے میدان چھوڑ کر بھاگ جانے سے جیت ان کی ہوئی جو ظالم تھے۔ اپنی طاقت کے زعم میں۔ نعوذ باللہ۔ خود کو خدا سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ ہر سکندر بخت اگر مفرور مجرم ہو جائے تو دنیا میں صرف وہی پیشہ ور بے ضمیر مجرم رہ جائیں گے جو ڈی سلوا ہوں گے اور چوہدری دلاور ہوں گے۔ وزیر خان اور سلامت شاہ اور فوما نجو اسی طرح بے بسی کی موت مرتے رہیں گے۔ نہیں رابعہ! اس احساس کے ساتھ زندہ رہنے میں میرے لیے خوشی کا تصور بھی ناممکن ہے۔"

خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا۔ دور کہیں سے مؤذن کی صدا بلند ہوئی۔ گواہی دیتا ہوں میں کہ سوائے اللہ کے کوئی معبود نہیں۔ کوئی حاکم نہیں۔ وہ سب سے بڑا ہے۔ ہر ڈی سلوا، ہر چوہدری دلاور، ہر خسروِ جمشید، ہر ظالم اور فرعون، ہر شیطان اور ہر شکاری سے بہت بڑا ہے، بہت زیادہ طاقتور ہے۔ وہ بچانے والا ہے اور اس کا ہاتھ مارنے والے کے ہاتھ سے زبردست ہے۔ اس کی عدالت کا قانون اندھا نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ دنیا نیکی کے مفہوم اور سچ کے وجود کو کہاں سمجھتی اور خود آدمی نے اپنی ہی دنیا کو کب کا تباہ کر دیا ہوتا۔

مجھے رابعہ کے اٹھ کر جانے کا علم نہیں ہوا۔ چشمِ تصوّر میں وہ پیکرِ حسن و خوبی میرے مقابل تھا اور میں آنکھیں بند کیے اس چھوٹے سے گھر میں گھوم رہا تھا جو سیکڑوں سے ہزاروں میل دور دامنِ کوہ کے ایک چھوٹے سے پُرفضا قصبے کے آخری کنارے پر تھا۔ سُرخ اینٹوں کے اس مکان کی کھڑکیاں اور دروازے سفید تھے اور اس کی مخروطی چھت پر ایک چمنی کے ساتھ ٹی وی کا انٹینا لگا ہوا تھا۔ اندر آتشدان میں شعلے بھڑک رہے تھے جن کا عکس فائر اسکرین کو روشن

کر رہا تھا۔ بند کھڑکیوں کے شفاف شیشوں سے برفباری کا پورا منظر دکھائی دیتا تھا۔ چھت پر ڈھیر ہو جانے والی برف پھسل پھسل کر نیچے گرنے لگی تھی۔ ٹی وی پر کوئی تصویر بھی نظر آرہی تھی لیکن ہم خود تصویر بنے ایک دوسرے کی آنکھوں میں اپنی محبت کے عکس کو روشن دیکھ کر خوش تھے۔ میں اُس سے نظر نہ ملا سکا اور آنکھیں بند کر لیں۔

جب میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو وہ جا چکی تھی۔ اس کی کرسی خالی پڑی تھی۔ وہ خود شاید اندر اپنے کمرے میں بستر پر پڑی اپنے خوابِ آرزو کی شکست پر آنسو بہا رہی تھی۔ آخر کیا ہو جاتا ہے اچھی بھلی بالغ اور سمجھدار عورتوں کو۔ محبت کرتی ہیں تو سب ایک جیسی ہو جاتی ہیں۔ وہی رومان پرور خیالات کی غیر عملی دنیا میں رہنے والی نادان لڑکی جو صرف جذبات کی زبان سمجھتی ہے اور عقل سے سب رشتے توڑ دیتی ہے۔ میرا گھر میری جنت۔ شوہر میرے سر کا تاج اور میرے بچے، میرے گلشن کے پھول۔ کیا گاؤں کی اُلھڑ دوشیزہ۔ کیا اسکول گرل اور کیا وکیل۔ ان سب کی تمنائیں خوشیاں اور خواب اتنے عام اور مشترک کیوں ہوتے ہیں۔ فلم میں ہیروئن بھی مطالبہ کرتی ہے کہ چل چلیے دنیا دے اس نکڑے جتھے بندہ نہ بندے دی ذات ہووے۔ اور رابعہ بھی یہی چاہتی تھی کہ ہم رہیں ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو۔ بات تو ایک ہی ہے۔ کوئی سمجھائے کہ بابا۔ اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔ تو ٹپ ٹپ آنسو، شکوے۔ ہسٹریا۔

میں اٹھا اور تھکے تھکے قدموں سے اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ رابعہ کی بات نے میرے خیالات کے دھارے کا رخ بدل دیا تھا۔ میں اب اپنی زندگی کو لاحق خطرات اور اپنے مقدمات کے بارے میں نہیں، رابعہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ نہ جانے کیسے تفکرات کا بارِ گراں غائب ہو گیا تھا۔ اس کی جگہ صرف ایک خیال رہ گیا تھا۔ وہ مجھے اتنا چاہتی ہے؟ دیوانگی کی حد تک؟ میری خاطر سب کچھ چھوڑ سکتی ہے؟ اپنا نام۔ اپنا معزز پیشہ۔ اپنا گھر اور وطن۔ اتنا بھروسہ ہے اسے مجھ پر؟ اور اس خیال میں میرے لیے وہ سکون بخش راحت اور مسرت تھی کہ جب میں کھڑکی کے راستے پھر کمرے میں وارد ہوا تو مسکرا رہا تھا۔

محسن آلتی پالتی مارے مہاتما بدھ کی طرح بستر پہ بیٹھا تھا اور اسی طرح بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔

"السلام علیکم!" میں نے خفت کو چھپانے کے لیے خوشدلی سے کہا۔ "کیا وقت ہوا ہے؟"

"یہ وقت ہے شگفتن گلہائے ناز کا۔" اس نے میری طرف دیکھے بغیر روبوٹ کی طرح کہا۔ "مگر ایش ٹرے میں ایک ٹوٹا تک نہ چھوڑنا بڑی کمینگی ہے۔ ایک سگریٹ ملے تو مزید گستاخی کروں آپ کی شان میں۔"

"ضرور، ضرور۔" میں نے سگریٹ کا پیکٹ اس کی گود میں ڈال کے کہا۔

اس نے سگریٹ جلا کے ایک کش لیا اور ڈانٹ کر بولا۔ "یہ کیا ہو رہا تھا؟ باغ میں۔"

"باغ میں؟ کون سے باغ میں؟" میں نے معصومیت سے کہا۔ "کیا ہو رہا تھا؟ کچھ بھی نہیں ہو رہا تھا۔ کسی بھی باغ میں۔"

"میری پرنانی ایسے ہی بال بکھرائے راتوں کو باغ میں گھومتی تھیں۔" محسن نے کہا۔ "ان پر ایک جن فریفتہ ہو گیا تھا۔ خاصا وی آئی پی قسم کا۔"

"یہ تمھاری پرنانی نہیں تھیں۔" میں نے کہا۔ "رابعہ تھی۔"

"کہہ رہی ہو گی میرے ساتھ نکل چلو۔" محسن بولا۔

میں اچھل پڑا۔ "تو... تو سن رہا تھا!"

"نہیں۔" محسن ہنستے ہنستے دُہرا ہو گیا۔ "مگر یہ مخلوق ایک ہی زبان بولتی ہے۔ ہم نے یہ بال ایسے ہی راتیں کالی کر کے سیاہ کیے ہیں نورِ چشم۔ دھوپ میں سفید نہیں کیے۔ اس لیے سب جانتے ہیں۔"

محسن نے مذاق کیا تھا اور اندھیرے میں تیر چلایا تھا مگر غلط نہیں کہا تھا۔ "کمال ہے یار!" میں نے کہا۔ "رابعہ اتنی عقل و ذہانت، اعلیٰ تعلیم اور تجربے کے باوجود بہت کمزور عورت ہے۔" پھر میں نے اسے بتایا کہ رابعہ کیا چاہتی تھی۔

"یار تم دونوں ہنولولو چلے جاؤ۔ وہاں میری ایک پین فرینڈ ہے۔" محسن نے کہا۔ "میں رابعہ سے اتفاق کرتا ہوں۔"

"پہلے تو شملا کے ساتھ ٹمبکٹو چلا جا۔ وہاں میری ایک پین فرینڈ رہتی ہے۔" میں نے جل بھن کر کہا۔

"خیال تو اچھا ہے۔" محسن نے کہا۔ "بس ایسا کرتے ہیں کہ ان دونوں کو یہیں ڈراپ کرتے ہیں۔ خواہ مخواہ فالتو پرسنل بیگیج پہ خرچ کریں۔ تو خالی ہاتھ ٹمبکٹو چلا جا۔ میں جاتا ہوں ہنولولو۔ اپنی اپنی پین فرینڈز سے...."

"پین فرینڈ؟ ...؟" رضوی صاحب نے اچانک اندر آکے کہا۔ "ارے بھئی ابھی تک یہ بچوں والی بازی...!" وہ حسبِ عادت صبحدم لان پر ٹہلنے کے لیے نکلے تھے مگر ہمارے کمرے میں روشنی دیکھ کر ادھر آگئے۔ محسن نے بڑی عجلت میں پیکٹ چھپایا اور جلتی ہوئی سگریٹ کو پلنگ کے نیچے پھینک دیا۔ اسے اتنا وقت ہی نہیں ملا تھا کہ سگریٹ کو ایش ٹرے میں بجھا سکتا۔

"السلام علیکم انکل!" ہم دونوں نے ایک ساتھ اٹھتے ہوئے بوکھلا کے کہا۔

رضوی صاحب مسکرائے۔ "یہ آج تم دونوں کی سحر خیزی۔ خدا خیر کرے۔ کوئی نیا گل کھلانے کا خیال ہے؟"

"نہیں انکل!" میں نے بڑی سعادت مندی سے کہا۔ "یہ تو ایک اچھی عادت ہے۔ انگریز کہتے ہیں نا...!"

"بالکل بالکل۔" رضوی صاحب نے بیڈ کے نیچے سے دھوئیں کی بل کھاتی لکیر کو دیکھ کر کہا۔ "مگر یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے۔ انگریز یہ بھی کہتے ہیں نا کہ جہاں دھواں ہو گا وہاں آگ ضرور ہو گی۔" انھوں نے نیچے جھک کر سگریٹ اٹھائی اور محسن کو پیش کی۔ "شوق فرمائیے۔"

محسن نے جھینپ کر سگریٹ لی اور ایش ٹرے میں بجھا دی۔ "وہ... میں... میرا خیال ہے۔ میں غسل کر لوں۔" وہ جلدی سے اٹھا۔ باتھ روم تک پہنچتے پہنچتے ایک اسٹول سے ٹھوکر کھا کے منہ کے بل گرتے گرتے بچا۔ پھر دروازہ کھولے بغیر باتھ روم میں داخل ہونے کی کوشش میں دروازے سے ٹکرایا اور سر سہلاتا، دانت نکالتا روپوش ہو گیا۔

"گدھا۔" رضوی صاحب نے شفقت سے مسکرا کے کہا اور نائٹ گاؤن کی جیب میں ہاتھ ڈالے خالی بیڈ کے کنارے پر ٹک گئے۔

"جی۔" میں نے کہا۔ سوائے اس کے میں کہہ بھی کیا سکتا تھا۔

"جی کیا؟ تم خود کیا ہو؟" انھوں نے فرمایا۔ "الو۔ آخر تم لوگوں کو نیند کیوں نہیں آتی۔ ارے بھئی جوانی میں تو آدمی گھوڑے گدھے سب بیچ کر سوتا ہے۔ ہم بھی سوتے تھے۔ کیا باتیں کرنے کے لیے دن کم ہے کہ رات کو بھی قربان کیا جائے۔ وکیل اور موکل کس مسئلے پر قانونی موشگافی میں مصروف تھے؟"

اب میرے بوکھلانے کی باری تھی۔ "وہ... بس یہی..... دراصل مسائل اتنے ہیں۔ پریشانیوں کے باعث۔"

"خدا نے رات آرام کے لیے بنائی ہے۔ پریشان ہونے کے لیے نہیں اور کیا محض پریشان ہونے سے مسائل حل ہو جاتے ہیں۔" انھوں نے مجھے ڈانٹنا شروع کیا۔ "خرابی یہی ہے۔ آرام نہ کرنے سے جسم پر، اعصاب پر اور ذہن پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ رات کو سکون سے سونے کے بعد جو شخص تازہ دم ہو کے اٹھتا ہے وہ اپنے مسائل کو بہتر طور پر حل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ خیر، میں کوئی لیکچر دینے نہیں آیا تھا۔ تم عاقل و بالغ ہو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خود مختار ہو۔"

"آپ شرمندہ کر رہے ہیں انکل!" میں نے سر کھجا کے کہا۔

"ہاں۔ مگر کسی توقع پر نہیں۔" انھوں نے کہا۔ "اچھا ہوا تمھارا مشیرِ اعلیٰ چلا گیا۔ ورنہ مجھے تم کو خاص طور پر اپنے ساتھ لے جانا پڑتا۔ مجھے تم سے ہی بات کرنی تھی۔ اٹھو چلو میرے ساتھ۔"

میں نے بلا چون و چرا تعمیل کی اور ان کے ساتھ لان پر آگیا۔

"رات کو شیروانی کا فون آیا تھا۔" انھوں نے ٹہلتے ٹہلتے کہا۔

"خیریت تو ہے نا وہاں انکل؟" میں نے ان کے لہجے کی تشویش کو محسوس کر لیا۔

"نہیں۔ بظاہر خیریت نہیں ہے۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "شیروانی نے تو مجھے تسلی دینے کے لیے الفاظ کا سہارا لینے کی کوشش کی تھی۔ مگر وہ پریشان تھا۔ مسز شیروانی کی طبیعت اچانک بگڑ گئی ہے۔ وہ سی ایم ایچ میں داخل ہیں۔ ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ یہ کولیپس۔ اردو میں اس کا متبادل کیا ہے؟ خیر۔ تو یہ نتیجہ ہے غیر معمولی اعصابی کشیدگی اور ذہنی دباؤ کا۔ اور پریشانیوں کا۔ جبکہ انھیں تاکید تھی کہ وہ خوش رہیں۔ یہ ڈاکٹر لوگ آخر دنیا کو اپنی نظر سے کیوں دیکھتے ہیں کہ ایسا ہونا چاہیے۔ جسے روٹی میسر نہیں اسے کہتے ہیں کچھ نہیں۔ انیمیا ہے۔ خوب پھل انڈے، گوشت کھاؤ۔ وہی کہ روٹی نہیں ملتی تو کیک کھاؤ اور وہ جو پانچ سو کمانے کے لیے صبح سے شام تک لوہا پتھر کوٹتا ہے اور ٹی بی میں مبتلا ہو جاتا ہے اسے کہتے ہیں آرام کرو اور تفکرات سے دور رہو۔ وہ غریب آرام کرے گا تو کنبہ فاقے کرے گا۔ اس کو تو مرنا ہی ہے۔ یہ راج روگ ہیں۔ گنگو تیلی کیا کرے۔"

وہ خفگی میں اصل بات تو بھول گئے تھے لیکن میں نے ان کو ٹوکا نہیں۔ انھوں نے ایک گہری سانس لی۔ "میرا خیال ہے کہ میرا بلڈ پریشر کچھ ہائی ہونے لگا ہے۔ اس عمر میں چیک کراتے رہنا چاہیے۔ میں بات کر رہا تھا مسز شیروانی کی۔"

"کیا خدانخواستہ... معاملہ سیریس ہے؟" میں نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔

"نہیں۔ اب تو ہوش میں ہیں۔ مگر ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ انھوں نے... انھوں نے کیا۔ یہ تو قدرت کا بہت پہلے سے تحریر کردہ فیصلہ ہے جسے ڈاکٹر صحیح نہ پڑھ سکے۔ بہرحال، جتنی مہلت ان کے اندازے کے مطابق باقی تھی۔ وہ اب آدھی بھی نہیں رہی اور کوشش تو سب نے کی تھی لیکن یہ بات مسز شیروانی سے چھُپی نہیں رہ سکی۔ ہوتی ہے کوئی غیبی قوت۔ یا چھٹی حس۔ جو پُرخطر حالات میں قبل از وقت

خبردار کر دیتی ہے۔ انھوں نے سب کو بتا دیا ہے کہ ان کا آخری وقت آ گیا ہے اور ڈاکٹروں کی رائے یا دوسروں کے دلائل سے سچ کو جھوٹ ثابت کرنے کی کوشش بے سود ہو گی۔ چنانچہ انھوں نے کل دوائیں وغیرہ سب پھینک دیں اور واپس گھر جانے پر اصرار کیا۔ اس سے مزید تشویشناک صورت حال پیدا ہو گئی ہے۔ علاج جاری رہتا تو کچھ وقت اور گزر جاتا۔ مگر دوا نہ کھانے سے...“ انھوں نے مایوسی سے سر ہلایا ”آج شیروانی اسے گھر لے جائے گا۔ میں نے بھی کہا۔ اب کیا فائدہ زبردستی کرنے کا۔“ وہ خاموش ہو گئے۔ کچھ دیر ہم مختصر سے لان پر ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ میں جانتا تھا وہ کچھ اور کہنے کی سوچ رہے ہیں اور شاید مناسب الفاظ کی جستجو میں ہیں۔ تذبذب ان کی صورت سے عیاں تھا۔

”پھر تو محسن کو فوراً گھر چلا جانا چاہیے۔“ میں نے اس خاموشی سے گھبرا کے کہا۔

”ہاں، اسے تو جانا ہی ہے۔“ وہ بے خیالی میں سر ہلا کے بولے ”بس وہ ابھی ناشتا وغیرہ کر لے اور روانہ ہو جائے۔ ڈر مجھے یہ ہے کہ وہ انکار نہ کر دے۔“

”وہ اتنا بے حس اور سنگدل یا نافرمان تو نہیں ہے انکل!“ میں نے کہا ”مجھے معلوم ہے وہ اپنی ماں کے لیے دل میں کیا جذبات رکھتا ہے اور اس کی خاطر ہر قربانی دے سکتا ہے۔“

”ہاں۔ سوائے شاید ایک تمھاری دوستی کے۔“ انھوں نے اتفاق کیا ”لیکن یہ قربانی کسی نے بھی نہیں مانگی ہے۔ ہوتا یہ ہے سکندر! کہ بعض اوقات آزمائش کے مرحلے توقعات سے زیادہ سخت ثابت ہوتے ہیں۔ وہ شخص جس کا دل موم کا بنا ہوا ہو، کسی کو مرتے ہوئے بھی نہیں دیکھ سکتا۔ مرنے والی اگر اپنی ماں ہو اور اس کی موت دوسروں کے لیے بھی اتنی پُرعذاب ہو، تو وہ ڈر جاتا ہے۔ نزع کے قرب سے تدفین تک کے مراحل۔ سب انتہائی صبر آزما ہوتے ہیں۔ یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد یادوں کو ذہن سے خارج کر دینا آسان نہیں ہوتا۔ زیادہ آسان یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک سطر کا ٹیلی گرام پڑھ لے کہ ماں مر گئی یا ٹیلیفون پر اطلاع ملنے کے بعد بھی اس وقت پہنچے جب دیکھنے یا کرنے کو کچھ نہ رہے۔ وہ باپ کو تسلی دے۔ ماں کی قبر پر فاتحہ پڑھے اور لوٹ آئے۔“

”محسن ایسا کبھی نہیں کرے گا۔“ میں نے کہا ”اس کی ایک بہن بھی ہے۔ جو اس سے چھوٹی ہے۔“

”اسی کا تو مسئلہ ہے۔“ رضوی صاحب نے کہا ”دو دن کے اندر اندر وہ اس کا نکاح اور رخصتی سب کر دینا چاہتی ہیں۔ آج یا کل میں... کوئی پروفیسر ہے...“

”ایاز۔“ میں نے کھوکھلے لہجے میں کہا ”یہ بات تو پہلے سے طے تھی۔“

”تم... تمھیں کوئی صدمہ نہیں ہوا؟“ انھوں نے مجھے غور سے دیکھ کر کہا ”کیوں؟“

”ایاز بہت اچھا آدمی ہے۔“ میں نے نظر چرا کے کہا۔ ”فوزیہ اس کے ساتھ بہت خوش اور مطمئن رہے گی۔“

”اور تم..... میرا خیال تھا کہ تم بھی اسے چاہتے تھے۔ اس سے منسوب تھے۔ باقاعدہ نہ سہی۔“

”وقت کے ساتھ آدمی کے خیالات۔ اس کی پسند ناپسند بہت کچھ بدل جاتا ہے انکل! ہم سب ایک مسلسل تغیر کے عمل سے گزرتے رہتے ہیں۔ بقولِ شاعر۔ ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں۔“ میں نے کسی یقین کے بغیر اپنا دفاع کیا۔

”جذبات کی اس تبدیلی کا ذمے دار کون ہے؟ تم یا فوزیہ؟“

”میں انکل!“ میں نے ہمت سے کام لے کر کہا ”خود میں نے اسے ٹرن ڈاؤن کیا۔ کسی مجبوری کے بغیر۔ ولایت میں رہ کے میرے جذبات وہ نہیں رہے تھے۔ یہ بات میں نے محسن سے بھی کہہ دی تھی اور فوزیہ سے بھی۔ میں جھوٹ کیسے بولتا ان سے۔“

رضوی صاحب نے اطمینان کا گہرا سانس لیا ”سنا تو میں نے بھی تھا۔ اچھا کیا جو تم نے تصدیق کر دی۔ میرے ذہن پر کوئی بوجھ نہیں رہا۔“ انھوں نے گھڑی دیکھی ”ناشتا کرنا چاہیے۔“

”ایک بات اور بتا دوں انکل!“ میں نے کہا ”محسن کی ماں نے اس کی نسبت بھی کسی جمیل صاحب کی لڑکی سے طے کر دی تھی جسے محسن نے دیکھا تک نہیں۔ اس کا نام تک نہیں جانتا وہ۔ مگر وہ ماں کی خوشی کے لیے اس رشتے کو قبول کر چکا تھا حالانکہ وہ شہلا کو پسند کرتا ہے اور محسن ایسا آدمی ہے کہ جبر کے تحت ہونے والی شادی پر بھی تمام عمر خوش رہنے کی اداکاری کر لیتا مگر کسی پر اپنا دکھ ظاہر نہ ہونے دیتا۔“

”خدا جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔“ انھوں نے میرے ساتھ اندر کا رُخ کرتے ہوئے کہا ”وہ بہت غلط لوگ ثابت ہوئے، بات کر کے مکر گئے۔ کسی لڑکے کا پیغام آیا تھا جو امریکہ میں ہے، انھوں نے راتوں رات نکاح پڑھوا کے لڑکی کو اس کے ساتھ بھیج دیا۔“

میں بھونچکا رہ گیا ”اس کا علم آپ کو کیسے ہوا.... میرا مطلب ہے محسن...؟“

”مجھے شیروانی نے رات کو بتایا۔ لیکن اس نے یہ بات اپنی بیوی کو نہیں بتائی ہے۔ اس سے کہا ہے کہ لڑکی یرقان میں

مبتلا ہے اور اسپتال میں داخل ہے۔ ورنہ وہ تو مصر تھی کہ دونوں کام ایک ساتھ ہو جائیں۔ اسے حقیقت معلوم ہو جاتی تو نہ جانے کیا ہوتا۔ اب لڑکی کو ایک ہفتہ تک اسپتال میں رکھا جا سکتا ہے۔“ رضوی صاحب نے کہا۔

”ایک ہفتہ؟ کیا اس کا مطلب ہے کہ محسن کی ماں... اس سے زیادہ...؟“

”ہاں برخوردار! اس کا بالکل یہی مطلب ہے۔“ رضوی صاحب نے کہا ”جاؤ ذرا اطمینان سے محسن کو سب سمجھا دو اور پھر جلدی سے ناشتے کے لیے آ جاؤ۔ غسل تو تم بھی کر دگے۔“

محسن اور بیگم رضوی صوفے پر بیٹھے بڑی متانت سے گفتگو میں مصروف تھے جو بہت غیر معمولی بات تھی۔ بیگم رضوی کے سامنے ہم دونوں سنجیدگی سے بات کر ہی نہیں سکتے تھے اور ان کو میری، محسن یا رابعہ کی باتوں پر یا لڑائیوں پر ہنسی آتی تھی تو ہمیں بڑی اپنائیت محسوس ہوتی تھی اس بے تکلفی کا مظاہرہ رضوی صاحب کی موجودگی میں ناممکن تھا۔ جن کو غصہ کبھی نہیں آتا تھا مگر ان کا رعب اور دبدبہ پورے گھر پر قائم تھا۔ رابعہ ان کے سامنے اتنی ہی متانت کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اس نے مجھ سے نگاہیں نہیں ملائیں مگر مجھے اس کے دھلے دھلائے شگفتہ چہرے پر برگشتگی یا شرمندگی کے آثار بالکل محسوس نہیں ہوئے۔

”محسن!“ میں نے موقع پا کے کہا ”وہ ذرا ایک منٹ۔“

”اس کی کوئی ضرورت نہیں۔“ محسن نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا ”آنٹی نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔“

بے اختیار میں نے اطمینان کی ایک گہری سانس لی۔ یوں جیسے میرے سر پر رکھا ہوا پہاڑ کے برابر بوجھ بخارات بن کے فضا میں تحلیل ہو گیا ہو ”تھینک یو آنٹی! آپ نے میری مدد کر کے میری مشکل آسان کر دی۔“ میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”اب کیا پروگرام ہے؟“

”محسن ابھی پنڈی جا رہا ہے۔“ بیگم رضوی نے مجھے مطلع کیا ”ریل کار تو نکل گئی ہے۔ ویگن ہر وقت مل سکتی ہے۔“

نہانے کے بعد میں ناشتے کی میز پر پہنچا تو ماحول مجموعی طور پر سوگوار تھا جو ایک قدرتی بات تھی ”آپ محسن کے ساتھ چلی جائیں۔“ رضوی صاحب نے کہا ”اور گاڑی لے جائیں۔“

”بچوں کا کیا ہو گا؟“ بیگم رضوی نے بالکل گھریلو بیویوں کی طرح کہا ”انھیں بھی لے جانا ہے؟“

نہیں۔ میرے خیال میں ان کا وہاں جانا مناسب نہیں۔ میں کچھ کر لوں گا۔ ساتھ والوں کے گھر میں انھیں کوئی پرابلم نہیں ہو گی۔“ رضوی صاحب نے کہا ”ہم لوگ شام یا رات تک آئیں گے۔“

آخر آپ سب لوگ ہمارے ساتھ کیوں نہیں جا سکتے؟“ بیگم رضوی نے کہا۔

”میرا تو کوئی مسئلہ نہیں۔“ رضوی صاحب نے کہا ”فون کر سکتا ہوں اور بتا سکتا ہوں کہ دو چار دن کے لیے اسلام آباد جا رہا ہوں۔ سب جانتے ہیں میں بلاوجہ چھٹی نہیں کرتا۔ کوئی مجھ سے سبب بھی نہیں پوچھے گا۔“

”میرے کیس میں میرے ساتھی پیش ہو سکتے ہیں یا تاریخ لے سکتے ہیں۔“ رابعہ نے کہا۔ اس کا لہجہ بالکل نارمل تھا

”مشکل ہے سکندر کے لیے۔“ رضوی صاحب نے کہا۔

”یہ عدالت کی اجازت کے بغیر شہر سے نہیں جا سکتا۔ تمھاری اگلی پیشی کب ہے؟“ انھوں نے مجھ سے مخاطب ہو کے کہا۔

”ابھی کافی دن ہیں۔“ میں نے کہا ”اجازت ملنے میں کتنا وقت لگ جاتا ہے؟“

”اجازت عدالت کی صوابدید پر ہے۔“ رابعہ نے کہا۔ ”آج ہی مل سکتی ہے۔ انکار بھی ہو سکتا ہے اور اس کے امکانات زیادہ ہیں۔“

”کیوں؟ جب میرے ضامن موجود ہیں...؟“ میں نے کہا۔

”عدالت کے اختیارات کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے خلاف اپیل کی جا سکتی ہے۔“ رابعہ نے کہا ”وہ جج اس معاملے میں بہت سخت ہے جس کے پاس تمھارا کیس ہے۔ وہ تم سے دس سوالات کرے گا اور فیصلہ یہ دے گا کہ اجازت دینے کا کوئی جواز نہیں کیونکہ ملزم کا اس خاندان سے براہِ راست کوئی رشتہ نہیں۔ اپنے ماں باپ اور بھائی بہن ہوں تو انکار کا جواز نہیں رہتا۔ دراصل زیرِ ضمانت ملزم جو اس نوعیت کے مقدمات میں ماخوذ ہوں، گھومنے پھرنے کے لیے ایسے ہی بہانے کرتے ہیں۔ فلاں دوست یا کسی کزن کی فیملی میں کچھ ہو رہا ہے۔ جھوٹ سچ کا پتا چلانا مشکل ہوتا ہے۔“

”تم چھوڑو اس سارے چکر کو۔“ بیگم رضوی نے کہا۔ ”ابھی نہ پیشی ہے نہ کوئی سمن آنے کو ہے۔“

”یہ... خلافِ قانون ہے بیگم!“ رضوی صاحب نے دبے دبے لہجے میں کہا۔

”ہاں ہاں۔ ہے۔ مگر تم سڑک پر سے گزرتے ہو تو کتنی جگہ تمھاری نظر خلافِ قانون کام ہوتا دیکھتی ہے مگر تم نظرانداز کر کے گزر جاتے ہو۔ گاڑیاں غلط جگہ کھڑی ہوتی ہیں۔ خود

تمھیں لوگ غلط سائڈ سے اوورٹیک کر جاتے ہیں۔ فٹ پاتھ پر حجام سے لے کر فال نکالنے والے طوطے تک سب بزنس کرتے ہیں۔ پابندی کے باوجود لوگ کارپوریشن کے نلکوں پر نہاتے ہیں۔ نہر کے پل پر بچے تک سڑک سے کودتے ہیں اور اس ریلوے پھاٹک کو بند ہونے کے باوجود سائیکل اٹھا کے کراس کرتے ہیں۔ اور شب برات پر کیا تمھارے بچے آتش بازی نہیں کرتے؟ پھر اس بات کو کیوں نظر انداز نہیں کر سکتے تم جو بالکل جائز ہے۔" بیگم رضوی کو میں نے کبھی اتنی دیر تک مسلسل بولتے نہیں دیکھا تھا اور نہ اس طرح رضوی صاحب کے سامنے اختلاف رائے کرتے سنا تھا۔

"دیکھا بی بی رابعہ!" خلاف توقع رضوی صاحب نے مسکرا کے کہا۔ "تم ہی وکیل نہیں ہو اس گھر میں۔"

"ویسے کسی کو معلوم تو نہیں ہو سکتا انکل!" رابعہ نے کہا۔ "لوگ تو تین تین مہینے تک سمن وصول نہیں کرتے۔ گھر میں موجود ہونے کے باوجود۔ ایسا کوئی انتظام کر لیں کہ کوئی آئے تو کہہ دیا جائے محسن صاحب ڈاکٹر کے پاس گئے ہوئے ہیں۔ صرف ایک ہفتے کی بات ہی تو ہے۔" یکلخت اسے احساس ہوا کہ یہ آخری جملہ جو غیر ارادی طور پر اس کے منہ سے نکل گیا تھا کتنا غلط تھا۔

"اگر یہ انتہائی ضروری ہے کہ اس وقت ہم سب وہاں موجود ہوں۔" بیگم رضوی نے فوراً خلا کو پُر کر دیا۔ "تمام عمر پچھتانے سے بھی بعد میں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اس بچی کی رخصتی میں ہم شریک نہ ہوئے تو کون ہوگا۔"

محسن اچانک اٹھا اور باہر نکل گیا۔ اس کی حالت کسی سے پوشیدہ نہ تھی۔ وہ برداشت کر رہا تھا مگر اس کا دل رو رہا تھا۔ میں اس کے پیچھے لپکا۔ پھر میں نے رابعہ کو اپنے پیچھے آتے دیکھا۔

"ٹھیک ہے۔" رضوی صاحب نے بھی ناشتا ادھورا چھوڑ کے کہا۔ "ہم سب جائیں گے۔ ابھی ایک گھنٹے کے اندر اندر۔"

محسن اپنے کمرے میں کھڑا تھا۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ پلٹا اور مجھے اس کی آنکھوں میں آنسو نظر آئے۔ یہ زندگی میں دوسرا موقع تھا جب میں نے اس کی آنکھ میں آنسو دیکھ کر خود کو بے بس محسوس کیا۔ محسن باہمت اور اپنے دکھ کو ہنس کر جھیلنے والا آدمی تھا جس کی نگاہ ہمیشہ زندگی کے روشن پہلو پر رہتی تھی۔ پہلا جذباتی صدمہ مریم کی موت تھی۔ اس حادثے کے بعد وہ سارا دن روتا رہا تھا اور پھر مہینے رہا تھا۔ کھویا کھویا سا اور گرد و پیش سے بے خبر۔ اس کی نظریں اِدھر اُدھر کچھ تلاش کرتی رہتی تھیں اور وہ یکلخت ذہنی طور پر غیر حاضر ہو جاتا تھا۔ کبھی بات کرتے کرتے چپ ہو جاتا تھا۔ محفل یاراں میں تنہا رہ جاتا تھا۔ فلم یا تھیٹر کے دوران میں احساس ہوتا تھا کہ اس کی توجہ سامنے کے منظر سے ہٹ گئی ہے اور وہ کچھ اور سوچ رہا ہے۔ میں نے جب بھی اسے ٹوکا اس نے اعتراف کیا کہ یار نہ جانے کیا بات ہے۔ باجی کی موت کو میں حقیقت سمجھ کے تسلیم کر چکا ہوں۔ اب ایسا لگتا ہے کہ میرا کچھ کھو گیا ہے۔ کوئی ایسی چیز جو مجھے بہت عزیز تھی۔ میں سوچتا ہوں وہ کیا چیز تھی؟ جیب ٹٹولتا ہوں، کیا کوئی نوٹ گم ہو گیا ہے؟ پرس گر گیا ہے؟ سڑک پر چلتے چلتے خیال آتا ہے کہ کچھ تھا جو اب نہیں ہے۔ کیا تھا؟ درخت، کھمبے، عمارات، دکانیں، کوئی سائن بورڈ۔ ہزار بار کے دیکھے بھالے منظر میں سے کیا غائب ہو گیا ہے؟ میں غور کرتا ہوں اور سب کچھ وہی ہوتا ہے۔ تیرے ساتھ یا دوستوں سے باتیں کرتے کرتے یکلخت اپنے بچپن کی کوئی بات یاد آجاتی ہے مثلاً یہ کہ بعض اوقات کسی قصور کے بغیر پٹائی ہو جاتی تھی تو وہی مجھے تسلی دیتی تھی اور پیار کرتی تھی کہ بھئی نو مرتبہ تو قصور ہوتا ہے نا تمھارا؟ دسویں بار بے قصور پٹ گئے تو کیا ہوا۔ دس فیصد ظلم تو کچھ نہیں۔ جب تم دنیا میں قدم رکھو گے تو دیکھو گے کہ دنیا میں کتنا ظلم ہو رہا ہے۔ بے گناہ مارے جا رہے ہیں۔ تمھیں پچاس فیصد انصاف بھی مل جائے گا تو سمجھنا بہت خوش قسمت ہو۔ دس فیصد مقدمات میں تو ہر جگہ غلط فیصلہ ہو سکتا ہے۔ یا بلاوجہ خیال آجاتا ہے کہ وہ بیسن کا حلوا کتنا اچھا بناتی تھی۔" یہ محسن کے لاشعور کا تصور تھا جو پرانی یادوں کے البم سے بھولی بسری تصویریں نکال کے موقع بے موقع اس کے سامنے پیش کر دیتا تھا۔ میں نے اس کی بہت دلجوئی کی۔ وہ بالکل اس بچے کی طرح ہو گیا تھا جس کے ہاتھ میں گیس کے غبارے کی ڈور رہ گئی ہو۔ رنگین اڑتا ہوا غبارہ دھماکا ہوتے ہی غائب ہو چکا ہو۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات
تیسرے حصے میں ملاحظہ فرمائیے

شکاری

معاشرے کے ان ناسوروں کی روداد جو گوشت پوست کے انسانی ھیولوں میں اتر رہے تھے۔ ایک کفن بردوش نوجوان کی کہانی جس کے روز و شب موت کی بستی میں گزرتے ہیں

اب وہ پھر میرے کندھے پر سر رکھ کے رو رہا تھا مگر اس صدمے کی کیفیت مختلف تھی۔ یہ احساس زیادہ باعثِ آزار تھا کہ وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ دوا اور دعا سب بے کار ہیں۔ میں نے اسے رونے دیا۔ تاکہ اس کے دل کا غبار نکل جائے اور وہ گھر پہنچے تو سب کے سامنے نہ روئے۔ وہاں اس کی ذمے داریاں سب سے زیادہ تھیں۔ ایک جوان بیٹے کو اور بہن کے بڑے بھائی کو دوسروں کے آنسو پونچھنے تھے اور انھیں حوصلہ دینا تھا کہ وہ خاندان کی عمارت کے اس ستون کو گرنے سے تو نہیں بچا سکتے مگر تین ستونوں پر اس کو قائم رکھنے کی جدّ و جہد انھیں ضرور کرنی چاہیے۔

رابعہ میرے پیچھے کھڑی تھی اور بار بار ایک ہی جملہ دہرا رہی تھی ”محسن بھائی! ہمت سے کام لیجیے۔ ایسے رونے سے تو کچھ نہیں ہو گا“ اور خود بھی روتی جا رہی تھی لیکن اسے احساس نہ تھا۔ کچھ دیر بعد محسن پُرسکون ہو گیا تو میرے کہنے پر وہ سامان پیک کرنے چلی گئی۔

”محسن!“ میں نے کہا ”اب اس کے واپس آنے تک تجھے رونا نہیں ہے“

محسن نے اقرار میں سر ہلایا ”یار یہ سب۔ مجھے معلوم تھا، یہ تو ہونا ہی ہے۔ مگر اس کے باوجود۔ تو جانتا ہے نا، جسے سزائے موت ہو جائے وہ آخری اپیل کے مسترد ہونے تک پُرامید رہتا ہے۔ اس وقت تک کسی معجزے کا انتظار کرتا ہے جب تک اسے تختۂ دار پر لے جانے والے نہ آ جائیں“

”تجھے اچھی طرح معلوم ہے وہاں کیا ہو گا۔ کوئی بات غیر متوقع نہیں ہے“ میں نے کہا ”لیکن تیرے مقابلے میں فوزیہ بہت کمزور ہے کیونکہ وہ عورت ہے اور شیروانی صاحب عمر کے اس حصے میں ہیں جہاں رفیقِ سفر کے بغیر سفر ہی بے مقصد لگتا ہے اور پھر سب کے ساتھ تجھے وہ صدمہ بھی اٹھانا ہے جس میں تیری مدد کوئی بھی نہیں کر سکتا ہے۔ میں بھی صرف الفاظ کا سہارا دے سکتا ہوں۔ اس سے کچھ نہیں ہو گا۔ ہمدردی کے رسمی الفاظ کی کمی کسی کے پاس نہیں ہو گی مگر اس درد کا درماں صرف وقت کے پاس ہے اور یہ سفاک مسیحا میرے قبضے میں نہیں“

”ہاں۔ ہم سب زندہ رہیں گے“ محسن نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”ایک بات اور ہے محسن!“ میں نے کچھ دیر بعد کہا ”وقت بہت کم ہے اس لیے میں صرف تجھے سمجھا سکتا ہوں۔ میں تم سب کے ساتھ نہیں جا سکتا۔ میں آ جاؤں گا۔ تین چار دن بعد“

”فوزیہ کی رخصتی کے بعد؟“ محسن نے اسی لہجے میں کہا۔

"فوزیہ سے ڈرتا ہے تو؟"

"ہاں" میں نے بمشکل تمام کہا۔ "صاف بات یہ ہے کہ مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ اس کا سامنا کرسکوں اور وہ بھی ایسے وقت میں۔ یہاں سب مصر ہوں گے کہ ساتھ چلو۔"

"تو کیا بہانہ کرے گا؟" محسن نے کہا۔ "رضوی صاحب اور رابعہ نہیں مانیں گے۔"

"بہانہ پہلے سے موجود ہے۔ میں اجازت لے کر آؤں گا۔" میں نے کہا۔ "اجازت مجھے منظر صاحب بھی دلوا سکتے ہیں۔"

"جیسی تیری مرضی۔" محسن نے کہا۔ "مگر تو یہاں اکیلا ہوگا..."

"میری فکر نہ کر۔ مجھے کچھ نہیں ہوگا۔" میں نے کہا۔

دوسروں پر اپنے ارادے کا اعلان میں نے اس وقت کیا جب ساری تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ سامان گاڑی میں رکھا جا چکا تھا اور خواتین گاڑی میں بیٹھ چکی تھیں۔ ان کے ساتھ پچھلی سیٹ پر محسن تھا۔ رضوی صاحب میری بات پر حیران ہوئے۔

"لو بیگم! اس کو کہتے ہیں مدعی چست، گواہ سست۔" انھوں نے کہا۔ "صاحبزادے فرما رہے ہیں بعد میں آؤں گا۔ تمھاری وکالت نے مجھے تو مجبور کر دیا تھا۔"

"یہ تمھیں اچانک کیا ہو گیا ہے سکندر!" بیگم رضوی نے برہمی سے کہا۔ "کیا ارادہ ہے تمھارا؟"

"میرا کوئی غلط ارادہ نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "دراصل میں نہیں چاہتا کہ خلافِ قانون کام کر دوں اور کل کو خدانخواستہ میری وجہ سے رضوی صاحب پر حرف آئے۔ انھوں نے بہ امرِ مجبوری آپ کی بات مان لی تھی۔ میں کل پرسوں تک اجازت لے کر پہنچ جاؤں گا۔"

"مگر رابعہ تو ہمارے ساتھ جا رہی ہے۔"

"میرے دو وکیل ہیں اور دوسرا بچپن کا دوست ہے۔ عبدالودود منظر۔ یہ کام وہ کرے گا۔" میں نے کہا۔

رابعہ میری صورت سے میرے دلی جذبات کا اندازہ کرنے کی بے سود کوشش کر رہی تھی اور کچھ متفکر تھی۔ محسن کی طرح اسے بھی میرے اکیلے رہ جانے کا خیال آیا ہوگا اور شاید یہ بھی کہ شترِ بے مہار نہ ہو جاؤں۔ اکیلا ہی تیسری جنگِ عظیم نہ چھیڑ دوں یا دشمنوں کے نرغے میں نہ آ جاؤں جو ڈی سلوا کی موت کے بعد بہت زیادہ مشتعل ہوں گے۔ ایسے ہی جیسے بہت بڑے اور بہت طاقتور غنیم کی فوج کا کوئی جنرل کمزور نہتے اور محصور حریف کے ہاتھوں ہلاک ہو جائے۔ مجھے آسان شکار سمجھنے والا ایک زورآور، عیار اور سفاک شکاری خود اپنی موت مارا گیا تھا۔ اپنی موت کا ذمے دار وہ خود تھا۔ اگر وہ مجھے شرافت سے گھر چھوڑ دیتا تو میں بھی اسے لوٹ جانے دیتا۔ دغا دینے کی کوشش خود اس نے کی تھی اور میں نے صرف اپنے دفاع کی جنگ لڑی تھی۔ وہ میرے ہاتھوں نہیں گاڑی کے بے قابو ہو کر حادثے کا شکار ہو جانے کے باعث ہلاک ہوا تھا مگر شکارگاہ کے دوسرے شکاری یہ بات نہیں جانتے تھے۔ انھیں یقین ہوگا کہ یہ حادثہ نہیں، قتل تھا جو میں نے کیا۔

"ہمارے جانے کے بعد اپنی حفاظت کے خیال سے غافل نہ ہو جانا۔" رابعہ نے کہا۔ بالکل میکے جانے والی بیویوں کی طرح۔

"بالفاظ دیگر۔ دو دن شرافت سے رہنا۔" رضوی صاحب نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ "رستم خانی کے زعم میں ہر جگہ للکارتے مت پھرنا کہ آ بیل مجھے مار۔"

جب گاڑی چلی گئی تو مجھے ایک ایسے سناٹے کا احساس ہوا جو میرے چار سو، زمین سے آسمان تک محیط تھا۔ شہر جیسے شہرِ خموشاں بن گیا تھا جس میں خود اپنی آواز بھی سنائی نہ دیتی تھی۔ گھر کے دیوار و در خاموش تھے، اداس تھے اور میری طرح تنہائی کے احساس کا شکار تھے۔ میں خالی گھر کے خالی کمروں میں پھرتا رہا۔ ابھی صبح ہوئی تھی۔ دوپہر بہت دور تھی۔ اس کے بعد شام کی منزل تھی اور رات نہ جانے کتنی صدیوں کی مسافت پر تھی۔ صبح کرنا شام کا لانا مرحلہ ہوگا۔ میں کچھ دیر اپنے کمرے میں لیٹا چھت کو گھورتا رہا مگر چھت پر یادوں کی پرچھائیوں کی فلم چل رہی تھی اور سکوت میں آوازوں کی بازگشت تھی۔ رابعہ کی صورت کا خیال تھا اور اس کی باتیں تھیں —

شبِ گزشتہ کا ہر نقش ہنوز تازہ تھا۔ چاندنی میں وہ کیسے دنیس کا مجسمہ بنی کھڑی تھی۔ بے داغ سفید لباس میں اس کے ملکوتی حسن پر چاندنی کے کھلنے کا منظر کتنا سحرآفریں تھا۔ اس کی زلفِ مشکبار کے ہالے میں اس کا چہرہ کتنا روشن تھا۔ رہیے اب ایسی جگہ چل کے جہاں کوئی نہ ہو۔ کاش! کاش خواہشوں کے مقابل آدمی اتنا بے اختیار نہ ہوتا۔ اس کا نقش مٹتا تھا تو فوزیہ اپنی تمام حشر سامانی کے ساتھ آ جاتی تھی۔ وقت کے پرانے پیوند لے کر۔ کیا یہ تم نے نہیں کہا تھا؟ یہ وعدہ تم نے نہیں کیا تھا؟ میری آنکھوں کو یہ خواب تم نے نہیں دیا تھا؟ کیا ملا تمھیں آخر فریبِ آرزو کا درد دے کر؟ اب تم شکستہ شیشۂ دل کی

صدا بھی نہیں سنتے۔ پھر وہ عام لڑکیوں کی طرح رونا شروع کر دیتی تھی۔ قصور میرا تھا کہ میں نے تمھیں غلط نہیں سمجھا۔ تم وہ نہ تھے جو نظر آتے تھے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم ولایت جا کے میرے سکندر نہ رہو گے۔ میری محبت کتنی بے ثبات تھی۔ کتنی آسانی سے دوسری عورت نے اس پر قبضہ کر لیا۔ اگر تم ولایت سے کوئی میم لے آتے تو میں صبر کر لیتی کہ تمھارے قدم بھی آزادی ملتے ہی بھٹک گئے۔ یہ ڈر تو مجھے تھا۔ مگر میں نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ تم واپس آ کے...

میں گھبرا کے اٹھ بیٹھا۔ ابھی تک نو ہی بجے ہیں۔ آخر میں کہاں جاؤں؟ دیواروں سے باتیں کروں یا اپنے آپ سے۔ بچے اسکول گئے ہوئے تھے اور ان کو واپس آنے کے بعد بھی ساتھ والے گھر جانا تھا جہاں ان سب کا سامان پہنچا دیا گیا تھا۔ وہاں ان کے ہم عمر دوست اور کلاس فیلو بھی تھے چنانچہ وہ بہت خوش تھے کہ ایک ہفتے تک دن رات ان کا ساتھ رہے گا۔ دروازے پر ڈیوٹی بدل جانے کے بعد دوسرا اسنتری آ گیا تھا۔

سنیما ابھی بند تھے اور اس وقت سونا بھی بہت مشکل تھا۔ وقت سے نمٹنے کا ایک طریقہ یہی تھا کہ میں باہر نکل جاؤں۔ سڑکوں اور بازاروں میں بے مقصد پھروں۔ جہاں کسی دشمن سے مڈبھیڑ کا امکان نہ ہو۔ دوپہر کے کھانے کا وقت ہونے تک شالیمار چلا جاؤں۔ باغِ جناح میں جا بیٹھوں۔ میوزیم۔ انارکلی۔ جہانگیر کا مقبرہ۔ مگر اکیلا آدمی ایسی جگہ کتنا بھٹکا ہوا لگتا ہے۔ اس بچے کی طرح جو گھر سے تو اسکول گیا ہو مگر اسکول سے بھاگ آیا ہو۔ دنیا کی رونق کسی ساتھی کے بغیر کچھ نہیں۔

میں لباس بدل کے موزے چڑھانے کے بعد جوتوں کے بند باندھ رہا تھا کہ اندر رضوی صاحب کے کمرے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں ایک جوتا پہنے ایک ہاتھ میں اٹھائے لنگڑاتا ہوا گیا اور ریسیور اٹھا لیا۔

"ہیلو!" میں نے آواز کو تھوڑا سا بدلنے کے لیے ماؤتھ پیس پر رومال ڈال لیا۔ "ایس ایس پی رضوی صاحب کی ریذیڈنس۔"

"رضوی صاحب کو بلاؤ۔" کسی نے بھاری آواز میں مجھے حکم دیا۔

"وہ تو نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔ "عموماً اس وقت گھر پر نہیں ہوتے۔ آپ کو آفس فون کرنا چاہیے تھا۔"

"بدتمیز! تم کون ہو مجھے سمجھانے والے۔ کیا وہ چلے گئے ہیں؟" بات کرنے والا گرم ہو کے انگریزی میں بولا۔

"ہاں۔ مگر تم مجھے بتاؤ کہ تم کون ہو۔" میں نے بھی انگریزی میں جواب دیا۔ "نہ اس گھر میں بدتمیز لوگ رہتے ہیں اور نہ کسی بدتمیز سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہاں فون کرنے والے تم پہلے بدتمیز آدمی ہو۔ افسوس یہ ہے کہ میں تمھیں فون پر تمیز نہیں سکھا سکتا تھا۔"

مگر اس نے ریسیور رکھ دیا۔ آخر یہ کون الو کا پٹھا تھا۔ اپنے تحکمانہ لہجے سے تو وہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ بہ لحاظ عہدہ وہ رضوی صاحب سے برتر ہے یا ان کے برابر ضرور ہے مگر ان کے عہدے کے لوگ اس طرح بات نہیں کرتے۔ ہیڈکوارٹر کے علاوہ کوئی ان سے سینئر کہاں ہو سکتا ہے اور ہیڈکوارٹر میں افسران کو معلوم ہوگا کہ ضامن رضوی صاحب رخصت پر ہیں اور چند دن نہیں آئیں گے۔ مزید یہ کہ دس بجے گھر پر رضوی صاحب کو وہی فون کر سکتا ہے جسے معلوم ہو کہ وہ دفتر میں نہیں ہیں۔ اس کا یہ پوچھنا کہ کیا وہ چلے گئے ہیں؟ کیا وہ جانتا تھا کہ انھیں جانا تھا۔ شاید رضوی صاحب نے بتا دیا ہوگا کہ ان کے آفس نہ آنے کی وجہ کیا ہے لیکن بات تو انھوں نے اپنے کسی افسرِ اعلیٰ سے ہی کی ہوگی۔ جو انھیں چھٹی دینے کا مجاز ہوگا۔ رضوی صاحب جیسے شریف آدمی کے گھر فون کرنے والا اگر خود وہی افسرِ اعلیٰ ہوتا تو ایسے لہجے میں بات نہ کرتا۔ ماتحت ہوتا تو اس کا لہجہ زیادہ مؤدبانہ ہوتا مگر اتنی جلدی ہر ماتحت کو کیسے معلوم ہو سکتا ہے کہ رضوی صاحب رخصت پر ہیں اور انھیں اسلام آباد جانا تھا۔ وہ کیوں پوچھے گا کہ رضوی صاحب چلے گئے ہیں یا نہیں۔ خیر۔ وہ جو بھی تھا بھاڑ میں جائے۔

میں اسی طرح ایک جوتے کو انگلی کے ہک پر لٹکائے کھڑا تھا اور واپس ہونے ہی والا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی پھر بجنے لگی۔ میں کچھ دیر متذبذب کھڑا رہا۔ پھر یہ سوچ کر ریسیور اٹھا لیا کہ فون مسز رضوی کا یا ان کے کسی جاننے والے کا بھی تو

ہو سکتا ہے۔

"ہیلو۔" میں نے پہاڑ کھانے والے لہجے میں کہا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی مجھے آواز سے بھی شناخت کرے۔

"ارے بھئی کون بول رہا ہے؟" کسی نے بڑے شائستہ شگفتہ لہجے میں کہا۔ آواز پھر مردانہ تھی اور نہ جانے کیا بات تھی کہ میرے کان کھڑے ہو گئے۔ پیغام میرے ذہن کی... لیبارٹری میں پہنچ چکا تھا جہاں آواز کا تجزیہ ہو رہا تھا۔ چند سیکنڈ میں رپورٹ موصول ہو گئی۔ آواز وہی ہے۔ لہجہ بدلا ہوا ہے۔

"میں... میں جی حکم کا غلام۔ میرا مطلب ہے حکم دین۔" میں نے جاہلوں کی طرح کہا۔

"اچھا بھئی حکم دین! ایس پی صاحب ایک سیف کی چابیاں دے کر نہیں گئے۔ اس میں بہت اہم کاغذات ہیں جن کی ضرورت پڑ سکتی ہے بعد میں۔" فون کرنے والے نے کہا۔ "ان سے کہو رؤف بول رہا ہے۔ میں ان کا پی اے ہوں۔"

میں چکر میں پڑ گیا۔ کیا میرے دماغ کے کمپیوٹر کی رپورٹ غلط تھی۔

"وہ... وہ تو چلے گئے جی۔ پنڈی۔" میں نے کہا۔

"اکیلے؟" وہ بولا۔

میرا ماتھا پھر ٹھنکا۔ "اکیلے کیوں جی! سب گئے ہیں۔" میں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔ کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ضرور تھی۔ رضوی صاحب کے پی اے کو یہ تجسس کیوں کہ وہ اکیلے گئے ہیں یا سب کے ساتھ۔ اور کیا رضوی صاحب اتنے غیر ذمے دار ہیں کہ ایک ایسے سیف کی چابیاں ساتھ لے گئے جس میں اہم دستاویزات تھیں۔

جوتے کو نیچے رکھ کر میں نے ڈائریکٹری اٹھائی اور ہیڈ کوارٹر کے نمبر دیکھنے لگا۔ رضوی صاحب کا نمبر اسی لائن میں ذرا نیچے تھا۔ گھر کے فون نمبر کے علاوہ اس میں آفس کے دو نمبر دیے ہوئے تھے۔ ایک ڈائریکٹ لائن تھی۔ دوسری ایکسچینج کی ایکس ٹینشن۔ میں نے ڈائریکٹ نمبر ملایا۔

"رؤف۔" کسی نے تیسری گھنٹی پر ریسیور اٹھا کے کہا۔ گو نام درست تھا مگر میں فوراً سمجھ گیا کہ پہلا رؤف نقلی تھا۔

"رؤف صاحب!" میں نے کہا۔ "میں رضوی صاحب کے گھر سے سکندر بول رہا تھا۔ کیا آپ نے ابھی فون کیا تھا؟"

"میں نے!" وہ حیران ہو کے بولا۔ "میں فون کیوں کروں گا۔ مجھے معلوم ہے وہ چھٹی لے کر اسلام آباد گئے ہیں۔"

"ابھی کسی نے آپ کا نام لے کر کہا تھا کہ رضوی صاحب دفتر کی چابیاں اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔" میں نے اسے گواہ بنانے کی خاطر یہ اطلاع دینا مناسب سمجھا۔ "کسی الماری کی چابیاں۔"

"چابیاں سب میرے پاس رہتی ہیں۔" رؤف نے کہا۔ "کسی نے شرارت کی ہو گی۔"

"ہاں۔ مگر رؤف صاحب! یہ شرارت بھی وہی کر سکتا تھا جسے علم ہو کہ رضوی صاحب رخصت پر ہیں۔" میں نے کہا۔ "پریشانی کی تو کوئی بات نہیں۔ آپ کو میں صرف اس لیے بتا رہا ہوں کہ خدانخواستہ ایسی ویسی کوئی بات ہو تو..."

"ایسی ویسی کیا بات ہو سکتی ہے سکندر صاحب؟" وہ میری بات کاٹ کے بولا۔

"کچھ نہیں۔ بس سمجھ لیجیے احتیاطاً آپ کے نوٹس میں یہ بات ہونی چاہیے۔ کوئی گواہ تو ہو گا۔"

"میں سمجھا نہیں سکندر صاحب!" وہ بولا۔ "گواہی سے آپ کی کیا مراد ہے۔ کہاں دینی ہو گی مجھے گواہی اور کیوں؟ دیکھیے تا میں تو آپ کو نہیں جانتا۔ یہ بھی نہیں جانتا کہ آپ واقعی سے رضوی صاحب کے گھر سے بول رہے ہیں یا کسی پبلک کال آفس سے..."

"میں ریسیور رکھ دیتا ہوں۔ آپ ان کے گھر کا نمبر ملا کے دیکھ لیں۔"

"چلیے میں مانتا ہوں۔ مگر دیکھیے نا۔ فون میری موجودگی میں تو نہیں آیا۔ آپ کہہ رہے ہیں وہ جھوٹ بھی ہو سکتا ہے اور سچ بھی۔ میں زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتا ہوں کہ سکندر نام کے کسی شخص نے... دس بج کے چالیس منٹ پر مجھے فون کر کے کیا بتایا تھا۔"

وہ سخت جھکی اور قانونی آدمی تھا۔ اور کیوں نہ ہوتا۔ رضوی صاحب جیسے افسر کا پی اے تھا۔

"رؤف صاحب! میرے ہاتھ میں ایک جوتا ہے۔" میں نے کہا۔

"جوتا ہے؟" وہ چراغ پا ہو کے بولا۔ "کیا مطلب ہے اس واہیات بات کا؟"

"میں نے صرف یہ کہا ہے کہ میرے ہاتھ میں ایک جوتا ہے۔" میں نے کہا۔ "دوسرا میرے پیر میں ہے۔ جو میں نے ساڑھے دس بجے پہنا تھا۔ ٹھیک پونے گیارہ بجے میں دوسرا جوتا بھی پہن لوں گا۔ آپ کو اس لیے اطلاع..."

اس نے فون بند کر دیا تو میں ہنسا اور جوتے کو پھر انگلی پر اٹھا لیا۔ اس وقت مجھ پر یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ پالش تو میں نے دونوں جوتوں پر کر لی تھی لیکن برش اور کپڑا صرف ایک ہی پر مارا تھا اور اسے پہن لیا تھا۔ دوسرے کی باری آنے سے قبل ہی فون آ گیا تھا۔ میں اسے شکار کی ہوئی مچھلی کی طرح لٹکائے اسی طرح لنگڑاتا ہوا اپنے بیڈ روم کی طرف واپس ہوا۔

جوتے کو کچھ دیر رگڑنے کے بعد میں نے اسے مقابل رکھ کے یہ دیکھنے کی عبث کوشش کی کہ اس میں آئینے جیسی چمک پیدا ہوئی ہے یا نہیں۔ مگر وہ بدبخت جوتا جسے محض چمکایا جائے اور مہینوں پالش نصیب نہ ہو میری توقعات پر کیسے پورا اتر سکتا تھا۔ اس کا روکھا پھیکا بے رونق چہرہ کسی بیوہ کے چہرے کی طرح تھا جس پر میک اپ بھی ضائع ہو جائے۔

ابھی جوتا میرے ہاتھ میں ہی تھا کہ مجھے باہر ایک آہٹ سی سنائی دی۔ میں جوتا ہاتھ میں لیے باہر نکلا۔ کوریڈور خالی پڑا تھا لیکن میرا شک برقرار تھا۔ میں نے قدموں کی واضح آہٹ سنی تھی۔

میں ایک پاؤں میں جوتا پہنے دوسرے کمرے میں گیا۔ میری ایک ٹانگ تقریباً دو انچ لمبی ہو گئی تھی چنانچہ میری چال مضحکہ خیز ہو گئی تھی لیکن میری حالت پر ہنسنے یا رونے والا کون تھا۔ یکے بعد دیگرے میں نے سب کمرے دیکھے۔ کہیں کوئی بات بھی خلاف معمول نہیں تھی لیکن مجھے یقین تھا کہ میں نے ایک نہیں کم سے کم دو افراد کے قدموں کی دبی دبی چاپ سنی تھی۔ دو کمروں کے ساتھ اٹیچ باتھ روم تھے۔ میں نے ان میں بھی جھانکا۔ پھر اسٹور اور کچن کو ملاحظہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ تنہائی میرے اعصاب پر اثرانداز ہونے لگی ہے اور یہ حد سے بڑھی ہوئی حساسیت ہے جس کی وجہ سے ابھی تو میرے کان بجنے لگے ہیں پھر میری آنکھیں بھی بے وجود چیزوں کو دیکھنے لگیں گی۔ کسی بھی گوشت پوست کے بنے ہوئے انسان کے اعصاب لوہے کے بنے ہوئے نہیں ہوتے اور دماغ بھی بالآخر قوت برداشت کی مسلسل آزمائش سے تھک جاتا ہے۔

اسی وقت میری نگاہ باہر گئی۔ سنتری جسے بہت سخت احکامات تھے کہ دروازے سے نہ ہلے اور کوئی زبردستی اندر داخل ہونے کی کوشش کرے یا دروازے کے علاوہ کسی دوسرے راستے سے اندر آنا چاہے تو بلا تامل گولی مار دے، غائب تھا۔

"سنتری!" میں نے کھڑکی سے سر نکال کے آواز دی۔ "گارڈ!"

اگر وہ دروازے کے آس پاس ہوتا تو جواب ضرور دیتا یا فوراً سامنے آ جاتا۔ میرے شکوک میں اضافہ ہو گیا۔ گارڈ کی اتنی ہمت نہیں تھی کہ رضوی صاحب کے جاتے ہی خود بھی چھٹی کر لے۔ سگریٹ پینے نکل جائے یا لمبی تان کے سو جائے۔ جاتے جاتے بھی رضوی صاحب نے اس کو لیکچر دیا تھا اور ایک معمولی کانسٹیبل کی کیا مجال کہ فرائض میں کوتاہی کا مرتکب ہو۔ رضوی صاحب کی سخت گیری مشہور تھی۔

میں پلٹا ہی تھا کہ ایک شخص اندر آ گیا۔ کوئی سوال کیے بغیر میں نے وہ جوتا ہاتھ گھما کر اس کی طرف پھینکا جو میرے ہاتھ میں ہی تھا۔ وہ راکٹ کی طرح گیا اور اس کی ناک پر لگا۔ وہ اتنے فوری ردِ عمل اور اس نوعیت کے ہتھیار کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ بری طرح بلبلایا اور میں نے اس کی ناک سے خون کا فوارہ اُبلتے دیکھا۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھ کے ایک طرف ہوا ہی تھا کہ اس کے پیچھے آنے والے تین افراد نے کمان سنبھال لی۔ اعلانِ جنگ سے پہلے ہی جنگ شروع ہو گئی تھی۔ بظاہر وہ بھی میری طرح خالی ہاتھ تھے لیکن یہ ناممکن تھا کہ وہ مسلح ہو کے نہ آئے ہوں۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ ان چاروں نے بالکل ایک جیسے کپڑے پہن رکھے تھے اور کسی میک اپ آرٹسٹ نے ان کی صورتوں کو بھی مشابہ کر دیا تھا۔ سب نے گول قراقلی ٹوپیاں، گہرے دار ملیشیا کی شلواریں اور قمیص پہننے کے علاوہ ایک ہی رنگ، سائز اور تراش کی داڑھی مونچھیں بھی لگا لی تھیں۔ فرق صرف قد و قامت میں رہ گیا تھا۔ دو تو ہم وزن تھے اور قد میں بھی برابر تھے۔ تیسرا نسبتاً دبلا اور چھوٹا تھا۔ جو تھا جسے جوتا لگا تھا سب سے دراز قد تھا۔

صاف ظاہر تھا کہ ان کے ارادے نیک نہیں مگر مجھے پرسکون رہنا تھا تاکہ میں اپنی عقل اور اپنے ہاتھوں سے زیادہ کام لے سکوں۔ "بس چار ہی ہو؟ خیر۔" میں نے ان کے پیچھے دیکھ کر کہا۔ "کیوں پٹنے آئے ہو؟ اور باری باری پٹو گے یا ایک ساتھ؟"

"ہم ایک ٹیپ لینے آئے ہیں۔" ان میں سے ایک نے کہا۔ "شرافت سے لا دو گے تو ہم جیسے آئے ہیں ویسے ہی چلے جائیں گے۔"

"واپس کیسے چلے جاؤ گے؟" میں نے کہا۔ "خاطر تواضع کے بغیر۔"

جس شخص کی ناک جوتے کی راہ میں حائل ہو گئی تھی وہ غسل خانے سے برآمد ہوا۔ "دیکھتے کیا ہو۔" وہ عجیب مضحکہ خیز آواز میں فریاد کرتے ہوئے چلایا۔ "ہڈیاں توڑ دو اس کی۔ دو دانت توڑ دیے ہیں اس نے میرے۔" اس نے ہاتھ ہٹا کے اپنی صداقت کا ثبوت پیش کیا۔ اوپر کے لب کے نیچے دانتوں کی قطار میں واقعی خلا پیدا ہو گیا تھا۔

"باس نے کیا کہا تھا۔ مار پیٹ نہیں کرنی ہے۔" چھوٹے نے کہا۔ "یہ تمہارے باپ کا نہیں ایک پولیس افسر کا گھر ہے۔"

"باس گیا تیل لینے۔" وہ تلخی سے بولا۔ "میں اپنی منگیتر کو کیا منہ دکھاؤں گا۔"

"یہ تمہاری تبلیغی نہیں منگنی ٹوٹی ہے۔ ریچھ کے بچے۔" میں نے کہا۔

"فضول بکواس مت کرو۔ وہ ٹیپ کہاں ہے؟" دراز قد نے کہا۔ اس کے پاس ایک بیگ تھا جو اس نے اندر آتے ہی نیچے رکھ دیا تھا۔

"ٹیپ؟" میں نے سر کھجا کے سوچتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے الماری میں ہوگا۔" کمرے میں ایک ہی الماری تھی۔

"چھوٹے! الماری دیکھ۔" دراز قد نے کہا اور ریوالور نکال لیا۔

"الماری میں تالا ہے۔" چھوٹے نے اسٹیل کی الماری کا ہینڈل گھمانے کی ناکام جدوجہد کی۔

"چابیاں منگوا لیتے ہیں رضوی صاحب کو فون کر کے۔" میں نے کہا۔ "مگر اس کی لائن تو کاٹ دی ہوگی تم نے۔"

"چھوٹے! عقل نہیں مگر ریوالور تو ہے تیرے پاس۔" دراز قد نے کہا۔

"ریوالور تو ہے۔" چھوٹے نے اڑتیس بور کا ریوالور نکال کے کہا۔ "مگر اس سے تالا کیسے کھلے گا۔" وہ واقعی احمق تھا۔

"تالا اُڑا دے گولی مار کے ورنہ میں تجھے گولی مار دوں گا۔" دراز قد کا حوصلہ جواب دے گیا۔

ایک دھماکا ہوا۔ گولی نے فولادی دروازے کے پرخچے اڑا دیے اور شاید اس میں سے صاف گزر کر دیوار سے ٹکرائی کیونکہ بند الماری میں بھی گونج پیدا ہوئی تھی۔ چھوٹے نے الماری میں سے ہر چیز نکال کے باہر پھینکنا شروع کی۔ الماری خالی ہوگئی تو اس نے خفیہ دراز کو کھینچا۔ سارے کاغذات فرش پر بکھر گئے۔

"اس میں کوئی ٹیپ نہیں ہے۔" چھوٹے نے اعلان کیا اور بیگ میں سے کوئی چیز نکالی۔

"تم سب اندھے ہو کیا؟" انہیں نے کہا۔ "یہ سامنے کیا پڑا ہے؟ اپنا اپنا قد دیکھ لو۔" میں نے انچی ٹیپ کی طرف اشارہ کیا۔

"ہمیں بتا دیا گیا تھا کہ تم جوکر ہو۔" دراز قد نے دانت پیس کر کہا۔ "یہ تمہارے لیے آخری موقع ہے۔ یہ بات سمجھ لو کہ ہمارے پاس وقت کی کمی نہیں۔ ایک ہفتے تک تم ہمارا مقابلہ نہیں کر سکتے اور یہاں تمہاری مدد کے لیے کوئی نہیں آ سکتا۔"

"غلط فہمی خود تم نے پیدا کی۔" میں نے کہا۔ "پہلے ہی بتا دیتے کہ اسکاچ ٹیپ چاہیے۔"

"اسکاچ ٹیپ کی اولاد۔" دراز قد نے چیخ کر کہا۔ "ہمیں وہ ٹیپ چاہیے...!"

"میں سمجھ گیا!" میں نے سر ہلا کے کہا۔ "تمھیں پلاسٹک ٹیپ چاہیے۔ انسولیشن کے لیے۔ الیکٹریشن ہو تم لوگ؟"

دراز قد نے جست لگائی۔ میں یہی چاہتا تھا کہ کسی طرح اس کی قوتِ برداشت جواب دے جائے اور وہ اتنا مشتعل ہو جائے کہ حملہ کر دے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں نے اس کی صلاحیت کو کم سمجھا تھا۔ وہ اناڑی نہیں تھا۔ اس نے مجھے دونوں پیر اٹھا کے فلائنگ کک مارنی چاہی تھی۔ اگر یہ پیر میرے سینے پر لگتے تو میں الٹ کر گرتا لیکن جوڈو کی مشق میرے کام آئی۔ میری تربیت بلیک بیلٹ کی حد تک تقریباً مکمل ہو چکی تھی جب میں کوئی سند لیے بغیر برطانیہ سے ڈی پورٹ کیا گیا تھا۔ نہ انجینئرنگ کی سند نہ جوڈو کی۔ مگر اس کاغذی سند کے بغیر بھی میرا علم اور تجربہ میرے ساتھ تھا۔ میں نے فوراً بیٹھ کر اپنے ہاتھوں کو بڑی پھرتی سے اوپر اٹھایا اور حملہ آور کو اپنی ہی قوت میں سر کے اوپر سے گزار دیا۔ وہ تیرتا ہوا گیا اور کھڑکی کے شیشے توڑتا ہوا باہر جا گرا۔ میری توجہ باقی دو کی طرف ہوگئی کہ وہ کیا کرتے ہیں۔ بروقت میں نے دیکھ لیا کہ ایک جوتا مار کے میں نے جس شخص کا ازدواجی مستقبل تباہ کر دیا تھا وہ فائر کرنے کے لیے ریوالور اٹھا رہا تھا۔ میں نے غوطہ مارا اور گولی اس شخص کے سر پر لگی جو باہر گرنے کے بعد پھر اٹھ کے اندر آنے کی کوشش میں کھڑکی کو عبور کر چکا تھا۔ اس کا چہرہ ٹوٹے ہوئے شیشے لگنے سے پہلے ہی لہولہان ہو رہا تھا۔ گولی لگتے ہی اس نے ایک دلخراش چیخ ماری اور کھڑکی سے اندر لڑھک گیا۔ اس کا خون ایک دھارے کی شکل میں دیوار پر پڑا۔ اگر میں خود کو نہ بچاتا تو خون کے چھینٹے مجھ پر بھی گرتے۔ میں ابھی اٹھا بھی نہ تھا کہ چھوٹے نے بڑی مہارت سے کوئی چیز میری طرف پھینکی۔ یہ نائلون کا جال تھا۔ جو پیراشوٹ کی طرح کھل کے میرے اوپر گرا۔ میں نے اس سے بچنے کی بے سود کوشش کی۔ جال میرے گرد لپٹتا گیا۔ چھوٹے نے ایک ڈوری کھینچی اور مجھے بے بس کر دیا۔

شکاری مجھے اس جال میں اسیر کر کے بے خوف ہو گئے تھے۔ میرے لیے اس جال کو توڑنا ناممکن تھا۔ اس کی ہر ڈوری پتلی ہونے کے باوجود اتنی مضبوط تھی کہ میں آزاد ہوتا تب بھی اپنے زورِ بازو سے اس کے دو ٹکڑے نہیں کر سکتا تھا۔ اب تو یہ پوزیشن تھی کہ میں ہاتھ سے زور لگاتا تھا تو جال کھنچ جاتا تھا لیکن میری کمر دُہری ہونے لگتی تھی۔ پیروں سے زور لگاتا تھا تب بھی یہی ہوتا تھا۔ جال ہر سمت میں گنجائش کے مطابق پھیل جاتا تھا لیکن دوسری طرف سے میرے جسم میں گڑنے لگتا تھا۔ یہ اینٹ پتھر کی دیواروں سے زیادہ مضبوط حصار تھا جسے سر ٹکرا کے بھی نہیں توڑا جا سکتا تھا۔ مزید یہ کہ میں اس محدود سے رقبے میں پابندِ سلاسل نہ ہونے کے باوجود حرکت تو کر سکتا تھا مگر نہ بیٹھ سکتا تھا نہ کھڑا ہو سکتا تھا۔ میرا چیخنا چلّانا یا کسی کو مدد کے لیے پکارنا سب بے کار تھا۔ میری آواز دوسری کسی کوٹھی کے اندر نہیں پہنچ سکتی تھی۔ ویسے بھی اس وقت کوٹھیوں میں

بچے تک نہ تھے۔ نوکر یا گھر میں رہ جانے والی خواتین باورچی خانے یا گھر کے کسی کمرے میں امورِ خانہ داری کو نمٹانے میں مصروف ہوں گے وہ کسی آواز پر متوجہ بھی ہوتے تو کام چھوڑ کر نہ آتے۔ سڑک پر سے بہت کم لوگ پیدل گزرتے تھے۔ زیادہ تعداد ان گاڑیوں کی ہوتی تھی جو گڑھی شاہو اور اسٹیشن کا لمبا راستہ چھوڑ کے اور رش سے بچنے کے لیے اس طرف سے مال روڈ تک پہنچنا پسند کرتے تھے یا ادھر سے واپس آتے تھے۔ ان میں رکشا اور ٹیکسی بھی شامل تھے۔ ایسے گزرنے والے اِدھر اُدھر کی آواز پر غور ہی نہیں کرتے تھے۔

میں یہ بات بھی سمجھ چکا تھا کہ اندر آنے سے پہلے انھوں نے سنتری کو بھی قابو کر لیا ہوگا اور اگر قتل کر کے نہیں ڈالا ہوگا تو اُسے بھی میری طرح گٹھڑی بنا کے کسی جگہ رکھ دیا ہوگا۔ یہ کام مشکل ضرور تھا ناممکن نہیں تھا۔ سڑک پر کھڑا ہوا مسلح سنتری بہت خطرناک تھا۔ ایک تو یہ کہ ذرا سا شبہ ہوتے ہی وہ ایک راؤنڈ میں ان سب کو لٹا دیتا۔ مزید یہ کہ وہ آنے جانے والوں کی نظر میں تھا اور اسے لڑ بھڑ کے بے بس کرنے میں یہ اندیشہ یقینی تھا کہ کوئی دیکھ لے گا تو رک جائے گا۔ چنانچہ انھوں نے ساری کارروائی مناسب وقفے میں بڑی پھرتی سے کی ہوگی۔ سنتری کے سر پر ڈنڈا مار کے اسے لٹا دیا ہوگا یا اچانک پیچھے سے دبوچ کر اس کی ناک پر کلوروفارم میں بھیگا ہوا رومال رکھ دیا ہوگا اور پھر اسے فوراً دروازے سے ہٹا کے اندر لے آئے ہوں گے۔

"چھوٹے!" دراز قد نے کہا۔ "یہ سب چیزیں جو تو نے الماری میں سے ایسے نکال پھینکی ہیں، واپس اسی طرح رکھ۔ جو چیز جہاں تھی وہیں۔ اور رومال سے فنگر پرنٹ وغیرہ مٹا۔"

چھوٹے نے پریشانی سے فرش پر بکھرے ہوئے متفرق نوعیت کے سامان کو دیکھا۔ "مجھے تو یاد نہیں، کون سی چیز کہاں تھی۔"

"تو پھر ایسے پھینکی کیوں تھیں؟" دراز قد غرایا۔ "کیا کہا تھا باس نے۔ کوئی چیز اِدھر سے اُدھر نہ ہو۔ بالکل پتا نہ چلے کہ گھر میں داخل ہو کے کسی نے خانہ تلاشی لی ہے۔" اس نے دوسرے کی طرف دیکھا۔ "تو الماری کے تالے کی طرف دیکھ لے اور بازار جا کے بالکل ایسا ہی تالا لے آ۔ بلکہ اسے کھول کے لے جا اپنے ساتھ۔"

جسے مخاطب کیا گیا تھا وہ بیگ اٹھا کے الماری کی طرف بڑھا۔ وہ بڑے منظم طریقے پر تمام سامانِ ضرورت سے لیس ہو کر آئے تھے۔ ان کو مفصّل ہدایات دے دی گئی تھیں کہ انھیں کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے چنانچہ مجھے حیرانی ہوئی کہ وہ تالے کھولنے کے لیے چابیاں اور کسی ماہرِ فن کو نہیں لائے جو گولی سے اڑائے بغیر تالے کھول دیتا۔ شاید یہ انتظام عجلت میں کیا گیا تھا اور اس کی وجہ بھی صاف ظاہر تھی۔ رضوی صاحب نے اسلام آباد جانے کا فیصلہ بھی گزشتہ شب کی ٹیلی فون کال موصول ہونے کے بعد کیا تھا۔ سب کے جانے کی بات تو ابھی چند گھنٹے پہلے ہوئی تھی۔

اور یہ سب ہمارے دشمنوں کو فوراً معلوم ہو گیا تھا۔ اس انکشاف نے مجھے سن کر دیا۔ ایک بار پہلے بھی ہم ٹیلی فون سے منسلک ٹرانسمیٹر دریافت کر چکے تھے۔ مگر اس کے بعد دشمنوں نے موقع ملتے ہی متبادل بندوبست کر لیا تھا۔ انھوں نے گھر کے اندر کسی جگہ کوئی مائیکروفون نصب کر دیا تھا۔ چھت اور دیواروں کے سیکڑوں گوشے تھے اور سامان سے بھری ہوئی کوٹھی میں ایک ننھے سے مائیکروفون کو چھپانا کوئی مشکل کام نہ تھا مگر اس کو تلاش کرنا یقیناً بہت مشکل کام تھا۔ امریکہ اور یورپ میں یہ ننھے منے خفیہ مائیکروفون "بگ" کہلاتے ہیں اور وہاں اتنا بڑا ٹرانسمیٹر حکومت کی اجازت سے کوئی بھی لگا سکتا ہے جس کی نشریات عام سنی جا سکیں مگر جاسوسی اور سراغ رسانی کرنے والے اداروں یا پولیس کے سوا خفیہ مائیکروفون رکھنا وہاں بھی جرم ہے۔ تاہم یہ ممنوعہ چیز بھی وہاں اتنی ہی آسانی سے مل جاتی ہے جتنی آسانی سے ممنوعہ ادویات یا منشیات۔ شوکیس میں رکھ کے اسے نہیں بیچا جا سکتا مگر دنیا کے ہر ملک میں انڈر گراؤنڈ مارکیٹ ہوتی ہے جہاں سب کچھ دستیاب ہوتا ہے۔ لانے والے وہاں سے یہ چیزیں... پاکستان بھی لے آتے ہیں جو عموماً جرائم پیشہ افراد ہی کے لیے زیادہ کارآمد ثابت ہوتی ہیں۔ لوگوں کی پرائیویٹ زندگی کے یا کاروباری معاملات کے راز جاننے کا سب سے مؤثر ذریعہ "بگ" ہے۔

رضوی صاحب کے گھر میں ایک یا ایک سے زیادہ "بگ" موجود تھے۔ جو اس گھر کی چار دیواری میں ہونے والی سب گفتگو دوسروں تک پہنچا دیتے تھے۔ بگ ویسے تو کھٹمل کو کہتے ہیں مگر یہ نظر نہ آنے والے کھٹمل سے بہت زیادہ خطرناک تھے۔ ان کے ذریعے باہر پہنچنے والی ہر بات ایک محدود دائرے میں سنی جا سکتی تھی یا اور آگے نشر کی جا سکتی تھی۔ اس کا دوسرا مطلب یہ تھا کہ آس پاس ہی کہیں دشمنوں نے اپنا ریسیونگ اسٹیشن بھی قائم کر رکھا تھا۔ سو دو سو گز کے اندر اندر وہ کسی کوٹھی میں مقیم ہیں جو انھوں نے خریدی ہے یا کرائے پر حاصل کی ہے۔ اس امکان کو بھی مسترد نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ کسی ہمسائے سے مل گئے ہوں۔ اسے نقد رقم کا لالچ دیا ہو یا اس سے جھوٹ بولا ہو کہ وہ انٹیلی جنس کے آدمی ہیں اور ایک دشمن ملک کے جاسوسوں نے قریب ہی اپنا خفیہ ٹھکانا بنا رکھا ہے چنانچہ ان کی نقل و حرکت

کی نگرانی اور ان کے ارسال کردہ پیغامات کی "اسٹر سیپشن" کے لیے جگہ مطلوب ہے۔ محبِ وطن شہری ویسے ہی تعاون کرتے ہوئے ایک کمرہ دینے میں عار نہیں محسوس کرے گا۔ اگر کوئی نہ مانے تو اسے دھمکی دی جا سکتی ہے کہ حکومت قانونی طور پر زبردستی بھی یہ گھر لے سکتی ہے۔ جو غلط نہیں۔ اور اسے افشائے راز یا اس مسئلے پر اظہارِ رائے کے سنگین نتائج اور سخت سزا سے خوفزدہ کر کے خاموش رہنے پر مجبور بھی کیا جا سکتا ہے۔ جس ٹیم میں چوہدری دلاور جیسے ایکٹر ڈائریکٹر ہوں وہ ہر ڈراما کر سکتی ہے۔ رضوی صاحب کے سرونٹ کوارٹر کی طرح انھیں کوئی سے غیر آباد سرونٹ کوارٹر یا گیراج بھی مل سکتا ہے جہاں وہ خاموشی سے کسی نمک حرام لالچی نوکر کی مدد سے ڈیرہ جمائے بیٹھے ہوں اور صاحبِ خانہ کو علم ہی نہ ہو۔

یہ صورتِ حال بالکل نئی تھی اور بہت خطرناک۔ میرے لیے پہلا مسئلہ رہائی پانے کا تھا۔ اطمینان کی بات یہ تھی کہ کسی کا پروگرام مجھے قتل یا اغوا کرنے کا نہیں تھا۔ اس سلسلے میں انھیں واضح ہدایات تھیں۔ وہ ایک پولیس افسر کے گھر میں واردات کرنے کے نتائج کی سنگینی سے پوری طرح واقف تھے۔ وہ اپنی تشریف آوری کا کوئی ثبوت تک چھوڑ کے جانا نہیں چاہتے تھے۔

ان میں سے ایک اسٹیل کی الماری کے نقصان رسیدہ تالے کو کھول کے نکالنے کی جدوجہد میں مصروف تھا۔ باقی سب بڑے اطمینان سے تلاشی لینے میں مصروف تھے اور بہت احتیاط کے ساتھ۔ انھیں جلدی نہیں تھی اور کسی کا ڈر نہیں تھا۔ چھوٹا بھی کسی نہ کسی طرح تمام سامان واپس الماری میں اس طرح رکھ چکا تھا کہ بے ترتیب نظر نہ آئے۔ جوتے کا نشانہ بننے والا بار بار غسل خانے میں جاتا تھا اور کلّیاں کر کے لوٹتا تھا اور ہر بار مجھے نئی گالیاں دیتا تھا۔

"تمھاری بتیسی اب تیس رہ گئی ہے۔" میں نے فرش پر پڑے پڑے کہا۔ "اگر تم منہ بند رکھو تو کچھ پتا نہیں چلتا۔ اس لیے اب تمھارے لیے بہتر یہی ہے کہ جتنی گالیاں دینی ہیں دل ہی دل میں دو۔"

"کتے! وہ میرا جوتا اٹھا کے میری طرف لپکا۔ "تیرا منہ بھی اسی طرح بند کرتا ہوں میں۔"

میں نے اپنا سر گھما کے منہ فرش کی طرف نہ کر لیا ہوتا تو وہ اپنے عزائم میں یقیناً کامیاب ہو جاتا۔ اب ایک دلچسپ کھیل شروع ہوا۔ وہ جوتا لے کر دائیں طرف آتا تھا تو میں اپنا منہ دوسری طرف کر لیتا تھا۔ وہ دوسری طرف آتا تھا تو میں منہ پھیر لیتا تھا۔ اس نے میرا سر تھام کے اور گردن گھما کے منہ کو اوپر لانے کی کوشش بھی کی مگر ناکام رہا۔ مجھے اس پر حملہ کرنے کے دو مواقع ملے۔ ایک بار میں نے جال کے اندر سے ہی ہاتھ لمبا کر کے اس کے سر پر مکا مارا مگر چوٹ سخت نہیں پڑی۔ دوسری بار میں نے اپنا سر اس کی پسلیوں میں مارا اور وہ نیچے لڑھک گیا۔ تیسری بار وہ لڑکھڑا کے پیچھے گرا تو میں اس کے اوپر آ گیا۔ جال میں پھنسا ہوا ہونے کے باوجود اب میں اپنے ہاتھوں سے یا جسم کے زور سے اس کی گردن بھی توڑ سکتا تھا لیکن گردن میری دسترس سے دور تھی۔ میں اس کے پیٹ پر تھا چنانچہ میں نے ہاتھوں کو پسلیوں پر رکھ کے دبایا تو وہ تڑپا، اس کی دو پسلیوں کی ہڈی بڑی آواز کے ساتھ ٹوٹی۔ اس نے ذبح ہونے والے بکرے کی طرح آواز نکالی۔

اس کے ساتھی پہلے اس پر ہنس رہے تھے۔ بعد میں دراز قد نے اسے گالی دے کر کہا تھا کہ چھوڑ اسے اور اپنا کام کر۔ اب وہ کام چھوڑ کر لپکے۔

"تو بھی کیا یاد کرے گا۔" میں نے اسے گالی دے کر کہا۔ "اچھا بھلا ثابت اور مکمل آیا تھا۔ دو دانت، منگنی اور دو پسلیاں...!" میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے میرے سر پر کوئی چیز پڑی۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ میری آنکھوں نے دن میں تارے دیکھ لیے۔ پھر تارے غائب ہو گئے اور دن کی جگہ رات رہ گئی۔

جب مجھے ہوش آیا تو وہ جا چکے تھے۔ مجھے دست و پا بستہ چھوڑ کے۔ چھوٹا کسی مچھیرے کی اولاد لگتا تھا۔ جس نے اتنی مہارت سے جال پھینکا تھا کہ مجھے بچنے کی مہلت ہی نہیں ملی تھی اور ڈوری کھینچتے ہی جال میرے گرد یوں لپٹ گیا تھا کہ میں کچھ نہ کر سکا تھا۔ وہ بھی یہی چاہتے تھے کہ میں کچھ نہ کر سکوں۔ نہ گولی چلانی پڑے اور نہ خنجر۔ مجھے خراش تک نہ آئے اور میں ان کے کام میں مداخلت نہ کر سکوں۔ یہ کام آسانی سے ہونے والا نہیں تھا۔ وہ جانتے تھے کہ میں مزاحمت کروں گا اور اگرچہ وہ چار ہیں مگر پھر بھی نقصانات کا تناسب برابر رہے گا۔ وہ ایک کو پکڑیں گے تو دو کے جزوی یا کلی نقصان کے بعد۔ اور وہ اپنے ساتھ اسٹریچر، ایمبولینس وغیرہ نہیں لائے تھے۔ اس کے باوجود میں نے ایک کا حلیہ اور مستقبل خراب کر ہی دیا تھا۔ وہ اسے اٹھا کر لے گئے ہوں گے اور اب یہ اوپر والوں کی اور اوپر والے کی مرضی کہ اس بدبخت کا شکستہ اعضا کی مرمت کے بعد زندگی سے اور منگیتر سے پرانا رشتہ استوار رہے یا اس کی دنیا میں ضرورت اور قدر و قیمت ختم ہو گئی ہو تو اسے دریا برد کر دیا جائے۔ کرائے پر ایسی مہمات سر کرنے والوں کو زندگی اور موت کا جوا تو کھیلنا ہی پڑتا ہے اور جیسا کہ انگریزی میں کہتے ہیں کہ یہ لوگ "قابلِ خرچ"

ہوتے ہیں۔ یعنی اٹھ گئے تو اٹھ گئے۔ ہزاروں اٹھ جاتے ہیں۔ کاغذ کے روپے بھی ایسے روپے سے ملنے والے بھی۔ ان کی جگہ ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔ اتنا تردد کون کرتا ہے کہ ٹوٹ پھوٹ جانے والوں کے علاج معالجے پر مزید خرچ کرے۔ گاڑی ہو تو ڈینٹنگ پینٹنگ پر اخراجات سے فائدہ بھی ہے۔ ناکارہ انسان کو صفر کر دینا چاہیے۔ ان کا معاوضہ بچتا ہے۔ دوا دارو کا خرچ بچتا ہے اور یہ خطرہ نہیں رہتا کہ وہ کچھ بک نہ دیں۔

مجھ سمیت کمرے کی ہر چیز اپنی جگہ پر تھی۔ دنگل ہوتا تو یہ کمرہ پانی پت کے میدان کا نقشہ پیش کرتا لیکن اب تو صرف یہ ثابت ہوتا تھا کہ میں نے بہ رضا و رغبت خود کو اس جال میں داخل فرمایا اور شوقیہ ڈوری کھینچ کر استراحت کا یہ نیا طریقہ اختیار کیا۔ انھیں گئے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ میں تقریباً سوا گھنٹے بیہوش رہا تھا۔ کیا اس وقفے میں ان کی کوشش بارآور ہوئی تھی؟

ٹیپ سے ان کی مراد یقیناً وہ کیسٹ تھا جو ہم نے خاصی زبردستی کے بعد ریکارڈ کیا تھا اور جس میں ڈی سلوا آنجہانی کا اعترافِ جرم بھی تھا۔ اور چوہدری دلاور کی آواز بھی تھی۔ ڈی سلوا کے مرنے کے بعد اس کیسٹ سے خطرہ صرف دلاور کے لیے باقی رہ گیا تھا۔ وہ جاننا چاہتا ہو گا کہ آخر اس میں کتنا مواد ہے جسے قانونی طور پر ہم اس کے خلاف استعمال کر سکتے ہیں اور یہ تسلیم کرتے ہوئے بھی کہ ایک کیسٹ سے ہم جیسے چالاک لوگ کئی کاپیاں بنوا سکتے ہیں اس کے لیے ایک نقل حاصل کرنا ضروری تھا تاکہ وہ بچاؤ کی فکر کر سکے اور جوابی اقدامات سوچ سکے۔

کیسٹ محسن کے بریف کیس میں تھا جو وہ کمرے میں ہی چھوڑ گیا تھا چنانچہ شبہے کی کوئی گنجائش نہ تھی کہ ان کا مشن کامیاب رہا۔ الٹا انھیں افسوس ہوا ہو گا کہ مجھ سے پوچھنے کے بجائے وہ اپنی کارروائی کا آغاز جال پھینکنے سے ہی کرتے تو اپنی ہڈیاں اور دانت تڑوائے بغیر کامراں لوٹ جاتے۔ کیسٹ تو سامنے ہی رکھا تھا۔

اب جھوٹی دھمکی تو دلاور کو بعد میں دی جائے گی کہ کیسٹ کی اور بھی نقول ہیں۔ اس سے پہلے تو اس جال کے جنجال سے رہائی کی کوئی صورت ہونی چاہیے۔ آخر میں کب تک یوں مالِ غنیمت کی طرح گٹھری بنا پڑا رہوں گا۔ سر کا درد سب سے زیادہ شدید تھا مگر جسم کے دیگر اعضا بھی ایک ہی پوز میں پڑے رہنے سے اکڑ گئے تھے۔ میں نے متعدد امکانات پر غور کیا۔ ان واقعات کو یاد کیا جہاں لوگ اس سے زیادہ مشکل حالات میں قید سے نکل گئے۔ میں نے دانتوں سے جال کاٹنے کا سوچا اور کچھ دیر ایک حلقۂ دام پر دانت بھی رگڑے لیکن کچھ دیر بعد میرے دانت درد کرنے لگے۔ رسّی پر اثر کیا ہوتا غالباً دانت ہی کچھ گھس گئے۔ پھر میں نے جال کو کسی نوکیلی چیز پر رگڑ کے کاٹنے کے لیے ادھر ادھر دیکھا۔ قریب ترین دروازے یا کھڑکی کا کنارہ بھی میری پہنچ سے باہر تھا۔ میز اور بیڈ بھی دور رہتے۔ قریب صرف ایک کرسی تھی اور اس کے پائے لکڑی کے تھے۔ مگر دھار خاصی امید افزا نظر آتی تھی۔ میں نے جال کو اس پر رگڑنا شروع کیا۔ کرسی الٹ گئی اور مجھ سے دور ہو گئی۔

مسلسل ناکامیوں کے بعد مجھے دوسری نوعیت کے واقعات کا خیال آنے لگا۔ ان کا جو کسی غیر آباد مکان میں ایسے ہی قید پڑے رہے تھے۔ اس امید میں کہ کوئی تو ادھر ضرور آئے گا۔ مگر ان کی نجات کے لیے صرف فرشتۂ اجل آیا تھا۔ اس وقت جب بھوک پیاس سے پہلے ہی وہ ہوش کھو چکے تھے۔ کیا میں ایک ہفتے تک کچھ کھائے پیے بغیر اسی طرح لیٹا رہ سکتا ہوں؟ ہر آدمی کی قوتِ برداشت جدا ہوتی ہے لیکن عموماً میرے جیسا صحت مند آدمی کتنے دن بھوکا رہ سکتا ہے۔ اور مرتا ہے تو بھوک سے یا پیاس سے؟ مجھے تو دو دن بھی بھوکے پیاسے رہنے کا تجربہ نہ تھا۔ آدمی کو یہ مشق بھی ہونی چاہیے۔ اسلام آباد میں میرے نہ پہنچنے سے کیا ہو گا؟ تین چار دن بعد ہی تشویش کا آغاز ہو گا۔ شاید رضوی صاحب یا رابعہ میں سے کوئی فون کرے۔ فون کی گھنٹی بجتی رہے گی۔ نہیں نہ مجھے اچانک خیال آیا۔ اگر انھوں نے اندر آنے سے پہلے فون کے تار کاٹ دیے ہوں گے تو گھنٹی بھی کہاں بجے گی۔ پھر رضوی صاحب کیا کریں گے؟ ایکسچینج سے معلوم کریں گے کہ لائن ڈیڈ کیوں ہے؟ شاید ٹیلی فون والے ایک پولیس افسر کے فون کی خرابی کو اہمیت دیتے ہوئے فوراً دوڑیں۔ مگر وہ باہر سے ہی لائن جوڑ کے چلے جائیں گے۔ شاید وہ اپنے آفس میں پی اے کو فون کریں۔ یا کسی پولیس اسٹیشن کو۔ کہ جا کر دیکھو معاملہ کیا ہے۔ ممکن ہے رابعہ اپنے آفس کے ساتھیوں سے کہے کہ میری خیریت دریافت کریں۔ بے شک میں بچہ نہیں ہوں مگر میری خیریت کو ہمیشہ سخت خطرہ لاحق رہتا ہے۔ پانچویں دن کسی کے آنے یا نہ آنے کے امکانات ففٹی ففٹی ہیں۔ پانچ دن کیا کم ہوتے ہیں۔ ابھی تو پانچ گھنٹے بھی نہیں گزرے اور چل چلاؤ لگتا ہے۔

نہ جانے کیا چیز تھی جو مسلسل میری پسلیوں میں چبھ رہی تھی۔ میں نے پہلو بدل کے اس کو ہٹانے کی کوشش کی اور میرے ہاتھ میں لائٹر آ گیا۔ صدمے سے میرا برا حال ہو گیا۔ وہ لائٹر ایک میڈل تھا کہ کرۂ ارض پر میرا شمار ان میں کیا جا سکتا ہے جو احمق درجۂ اوّل ہوں۔ عقل ہونے کے باوجود بروقت اس کا استعمال نہ کر سکتے ہوں اور خود کو عاقل خان سمجھتے ہوں۔ لائٹر شاید اس دنگل کے دوران میں جیب سے باہر گر گیا تھا جس میں میرے

حریف کی دو لبلیاں ٹوٹی تھیں۔

میں نے لائٹر کو روشن کیا اور چند سیکنڈ اس کے ننھے سے شعلے کو گھورنے میں ضائع کیے۔ پھر میں نے شعلے کو جال کے پھندے سے چھوا۔ نائلون پگھل کے جل گیا۔ ایک حلقہ پھیل کر دو حلقوں کے برابر ہوگیا۔ پھر دو کی وسعت چار کے برابر ہوئی۔ چند منٹ کے بعد جال فرش پر پڑا تھا اور میں کبڑا ہوا کھڑا تھا۔

آہستہ آہستہ میری کمر سیدھی ہونے لگی۔ میں نے کرسی کو سیدھا کیا اور اس پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد جب میرے ہاتھوں پیروں میں دورانِ خون بحال ہوگیا اور میری جسمانی صلاحیت کا گراف کچھ اوپر اٹھا تو میں ہمت کرکے کرسی پر سے اٹھا اور شرابی کی طرح ڈولتا کچن کی طرف گیا۔ وہاں میں نے چائے اور کافی میں سے کافی کا انتخاب کیا۔ کافی کے لیے مجھے صرف الیکٹرک کیٹل کا پلگ لگا کے پانی ابالنا پڑا۔ اس میں کریم کے ساتھ میں نے چینی کے بجائے گلوکوز استعمال کیا اور وہیں دیوار کے سہارے بیٹھ کر پورا مگ ختم کیا۔ تھوڑی سی ورزش کے بعد میں بالکل ویسا ہی ہوگیا جیسا جال میں پھنسنے سے قبل تھا۔

اندر جا کے میں نے سب سے پہلے تو محسن کا بریف کیس دیکھا۔ حسبِ توقع کیسٹ اس میں نہیں تھا۔ اس میں کوئی ایسی بات تو نہ تھی جس سے ہم دلاور کو سر کے بل آ کے اعترافِ شکست پر مجبور کر سکتے مگر کیسٹ ایک ٹرمپ کارڈ تھا جس سے ہم دلاور کو خوف میں ضرور مبتلا رکھ سکتے تھے۔ اب تک وہ کیسٹ سن چکا ہوگا اور شاید اس پر طبلہ خان ہارمونیم والے اور سارنگی خاں تانپورے والے قوال اور ہمنوا کی آوازیں کوئی قوالی بھی ریکارڈ کر چکا ہوگا۔

اچانک مجھے ایک اور خیال آیا۔ میں رضوی صاحب کے مطالعے کے کمرے میں گیا اور سب سے نیچے والی دراز کھینچ کر دیکھی۔ اس میں سے وہ فائل بھی غائب تھی جو ہمیں مرحوم غلام علی نے لا کر دی تھی۔ اس نے یہ ہرگز نہیں سمجھا تھا کہ وہ اپنے محسن اور مربی وزیر خان کے احسانات کا بدلہ چکا رہا ہے اور یہ فائل ان احسانات کی قیمت ہے۔ مگر اس فائل کے ساتھ ہی اسے جان بھی دینی پڑی تھی۔ چنانچہ وہ قرض تو ادا ہوگیا تھا جو وزیر خان پر واجب الادا تھا اور اب الٹا میں اس کا مقروض تھا۔

اس فائل کے جانے کا مجھے سخت صدمہ ہوا۔ مجھے یوں لگا جیسے غلام علی کی قربانی رائیگاں گئی۔ اس نے جس نیک مقصد کی خاطر جان تک قربان کر دی تھی وہ خاک میں مل گیا۔ صرف اس لیے کہ ہم نے اصل کی ایک ہی فوٹو اسٹیٹ کاپی بنوائی تھی جو میں نے ایک ڈرامائی تاثر کی خاطر ڈی سلوا کو ارسال کر دی تھی۔ ایک بار اس سے چھین لی تھی اور پھر اس کی سیکرٹری کے سامنے پھینک دی تھی کہ یہ اپنے باس کو دے دو۔ ہم اصل کے دس سو یا ہزار جتنی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں چاہیں بنوا سکتے ہیں۔ اس وقت ڈی سلوا کی سیکرٹری شہلا تھی۔ ہم نے اصل کو محفوظ سمجھتے ہوئے اس کی مزید کاپیاں بنوانے کی ضرورت کو اہم نہیں سمجھا تھا اور اس تساہل کا نتیجہ یہ تھا کہ اب ہمارے پاس کچھ نہیں رہا تھا لیکن دلاور کو معلوم ہوگیا تھا کہ سابقہ واقعات کے بارے میں ہماری معلومات کس حد تک اَپ ٹو ڈیٹ ہیں۔

فوری طور پر اس سے یاسمین کو اور اس کی ازدواجی زندگی کے مستقبل کو خطرہ لاحق ہوسکتا تھا۔ مگر کیا دلاور کو معلوم ہوگا کہ وہ لڑکی اب کہاں ہے جس نے اسے ایک ناکام بنک ڈکیتی کا مالِ غنیمت سمیٹ کر فرار ہوتے دیکھا تھا اور جو اسے اب بھی شناخت کر سکتی ہے کیونکہ وہ اسی کے گھر میں چھپا رہا تھا، خطرہ ٹلنے تک۔ اب وہ پھر خود کو خطرے میں محسوس کرے گا۔ اگر اسے علم ہوا کہ وہ لڑکی نسبت روڈ پر رہتی ہے تو وہ ہمیشہ کے لیے اس خطرے کو ختم کر دے گا جو یاسمین کے وجود سے وابستہ ہے مگر یہ کام تو وہ پہلے بھی کر سکتا تھا اور یقیناً کر چکا ہوتا۔ نہیں۔ اسے نہیں معلوم کہ یاسمین کہاں ہے تاہم میرے لیے ضروری ہوگیا تھا کہ میں یاسمین کو خبردار کر دوں۔

لیکن اس سے بھی پہلے میرے لیے ضروری تھا کہ میں غیر قانونی طور پر رضوی صاحب کے گھر میں داخل ہونے، خانہ تلاشی لینے والے اور مار پیٹ کرنے والے مجرموں کے خلاف قانونی کارروائی کروں اور یہ معلوم کروں کہ دروازے پر پہرہ دینے والے گارڈ کا کیا حشر ہوا؟ اس کی ایک سیدھی صورت یہ تھی کہ میں رابعہ کی گاڑی لے کر جاؤں اور پولیس اسٹیشن پر واردات کی رپورٹ لکھوا دوں۔ ان کے رپورٹ لکھنے میں لیت و لعل کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

لیکن اس میں اندیشہ یہ تھا کہ خبر فوراً حکام بالا تک پہنچ جائے گی۔ قواعد کے تحت رخصت پر جانے سے پہلے وہ پتا ضرور چھوڑ کر گئے ہوں گے۔ جہاں ان سے ہنگامی ضرورت میں رابطہ قائم کیا جا سکے۔ ان کے کسی ساتھی یا پی اے سے کچھ بعید نہیں کہ وہ ریسیور اٹھائے اور شیروانی صاحب کے گھر کا نمبر گھما کے ساری کہانی سنا دے۔ خصوصاً وہ پی اے جسے میں نے کچھ ہی دیر قبل فون کیا تھا۔ وہ تو یہ بھی بتا دے گا کہ آپ کے گھر سے یا کہیں سے سکندر نام کے کسی شخص نے فون پر ایسی باتیں کی تھیں جن کا کوئی سر پیر نہیں تھا۔ رضوی صاحب کے لیے نئی پریشانی پیدا ہو جائے گی کہ منع کرنے کے باوجود میں نے کوئی نیا گل کھلایا ہے۔

وہ جس مقصد کی خاطر سارے کام چھوڑ کر گئے ہیں وہ فوت نہیں ہوگا تب بھی اس خبر سے ان کا پروگرام ضرور متاثر ہوگا۔ وہ یہاں آ کے صورتِ حال کا جائزہ لینے پر اور "سب ٹھیک ہے" کی اطلاع پا کے فوراً واپس جائیں گے تو ان کو سخت کوفت ہوگی اور ان کی برہمی کا نشانہ صرف میری ذات ہوگی۔

میں نے محسوس کیا کہ میری قوتِ فیصلہ میرا ساتھ نہیں دے رہی ہے۔ میں عبدالودود منظر سے مشورہ کر لیتا مگر وہ نہ جانے کس کورٹ میں تھا چنانچہ اس سے رابطہ محال تھا۔ پھر مجھے اکرام شیخ کا خیال آیا۔ کیوں نہ میں اسے بلالوں اور اسے تمام واقعات بتا دوں۔ پھر جیسا مشورہ وہ دے وہی کروں۔

ایک مرتبہ پھر میں نے ڈائریکٹری دیکھی اور تھانوں کی طویل فہرست میں سے اس کا نمبر تلاش کیا۔ ڈائریکٹری میں ابھی تک سابق ایس ایچ او کا نام درج تھا۔ جس کے بارے میں حشمت خان نے ارشاد کیا تھا کہ اسے ایک "معمولی" سی بات پر لائن حاضر کر دیا گیا تھا۔ معمولی بات یہ تھی کہ اس نے تفتیش کے دوران میں ایک آدمی پر اتنا تشدد کیا تھا کہ وہ مر گیا تھا۔ مگر پولیس کے نقطۂ نظر سے یہ واقعی معمولی بات تھی اور اس کی یہ سزا بہت بڑی تھی کہ اسے لائن حاضر کر دیا گیا۔ اور بس۔ تشدد سے موت واقع ہونے کے واقعات تو عام تھے لیکن ملک کی تاریخ میں ایسا واقعہ ایک بھی نہیں تھا جب کسی تھانیدار پر قتلِ عمد کا کیس بھی بنا ہو۔

ریسیور حشمت خان نے اٹھایا۔ "او ئے لگا اس... کے چھتر۔" اس نے درمیان میں ایک گالی دے کر کہا مگر یہ بات اس نے مجھ سے نہیں، حاضرین و ناظرین سے کہی تھی اور ان کے بارے میں کہی تھی جو زیرِ تفتیش تھے۔ "ہاں جی۔" اس نے یوں کہا جیسے میں نے دخل در معقولات کر کے اس کھیل کا مزہ کرکرا کر دیا ہے جس میں وہ پوری دلچسپی کے ساتھ مصروف تھا۔

"مجھے سید اکرام شیخ صاحب سے بات کرنی تھی۔" میں نے اپنا نام بتلانے سے گریز کرتے ہوئے کہا۔

"تو کر لینا شام کو۔ جب وہ ڈیوٹی پر آئیں۔ او ئے تیرا تے پیو وی منے گا۔" اس نے ریسیور رکھ دیا۔ یہ آخری جملہ پھر میرے لیے نہیں تھا بلکہ کسی ایسے شخص کے لیے تھا جو اعترافِ جرم پر آمادہ نہ تھا۔

میں نے پھر نمبر ملایا۔ "حشمت خان!" میں نے آواز بدل کے سخت اور افسرانہ لہجے میں کہا۔ پس منظر میں مجھے "چھتر بازی" اور فریاد و فغاں کا ملا جلا شور صاف سنائی دے رہا تھا۔

"یس... یس سر!" حشمت خان نے محتاط ہو کے کہا اور شاید اشارہ کیا کہ "انٹرول"، شور یکلخت تھم گیا۔

"بھئی میں رؤف ہوں۔ ہیڈ کوارٹر سے۔" میں نے حتی الامکان اس کی نقل اتاری۔ "ایس ایس پی کا پی اے۔ کون کون حاضر ہے بھئی؟"

"سب ہیں جناب! حکم فرمائیں میرے لیے۔ ہم بھی خادم ہیں۔"

"میر محمد کو بلاؤ۔" میں نے کہا۔ مجھے معلوم تھا وہ اکثر موجود نہیں ہوتا۔ "اور وہ نہیں تو اس کے لڑکے شیخ کو۔"

"میر صاحب تو... جائے واردات پر گئے ہیں۔ نقصِ امن کی رپورٹ ملی تھی۔ اکرام شیخ کی ڈیوٹی نہیں ہے۔ کوئی ضروری بات ہے تو اس کے گھر فون کر لیں۔" حشمت خان نے شرافت سے کہا۔

"اس کے گھر میں فون ہے؟" میں نے کسی قدر حیرانی سے کہا۔ "اے ایس آئی کے گھر میں؟"

"اجی رؤف صاحب! سب پیسے کے کھیل ہیں۔" حشمت خان نے گول مول بات کی اور یہ نہیں کہا کہ وہ کھاتے پیتے گھر کا لڑکا ہے۔ "جمعہ جمعہ ابھی آٹھ دن بھی نہیں ہوئے نوکری کو۔ آپ نمبر لکھ لیں۔"

"بھئی حشمت خان!" میں نے نمبر نوٹ کر کے کہا۔ "تمہارے خلاف بڑی لمبی رپورٹ آئی ہے۔ اوپر والے بہت خفا تھے کہ یہ کیا چکر ہے۔ پہلے والی رپورٹیں کہاں ہیں؟"

"پہلے والی؟" حشمت خان کی مری مری آواز آئی۔ "کس... نے کی تھی۔" وہ گالی دیتے دیتے رک گیا۔

"یہ تو اب تفتیش ہوگی تو معلوم ہوگا۔ تم ذرا محتاط رہو۔" میں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔ اتنی بات حشمت خان کی نیندیں اڑانے کے لیے کافی تھی۔ اب وہ تفتیش وغیرہ چھوڑ کے اپنے خلاف ہونے والی تفتیش کے چکر میں پڑ جائے گا۔ اگر اس نے رؤف سے پھر بات کی تو رؤف اس سے زیادہ پریشان ہوگا کہ یہ آج کون میرے نام کے اور میرے پیچھے پڑ گیا ہے۔ اس کنفیوژن کا تصور کر کے میں بے اختیار ہنسا جو بعد میں پیدا ہوگا۔ حشمت خان پر حقیقت واضح ہوگی تو وہ پٹاخے کی طرح اچھلے گا۔

میں نے اکرام شیخ کے گھر فون کیا جو کسی خاتون نے اٹھایا۔ دو منٹ بعد اکرام شیخ کی آواز سنائی دی۔

"یار شیخ!" میں نے کہا۔ "میں بدبخت سکندر بخت بول رہا ہوں۔ تم کیا کر رہے ہو؟"

"میں؟ دوپہر کے کھانے کا انتظار۔" وہ بولا۔ "خیریت ہے؟"

"خیریت! میں تو اس لفظ کے مفہوم سے بھی ناآشنا ہوتا جا رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "تم ایسا کرو۔ یہاں آ جاؤ۔ خاص رضوی صاحب کے گھر۔ مجھے تم سے ایک انتہائی اہم بات کرنی ہے جو میں کسی اور سے نہیں کر سکتا۔ کھانا ہم دونوں باہر کھائیں گے۔"

"کیوں؟ گھر میں دال پکی ہے کیا؟" وہ بولا۔

"گھر میں میرے سوا کوئی نہیں۔ سب اسلام آباد گئے ہوئے ہیں۔" میں نے کہا۔ "میں آ جاتا لیکن مسئلہ دہی ہے یعنی یہاں عجیب اور ہنگامی صورت حال پیدا ہوئی ہے۔ تم سے مشورہ کیے بغیر میں کوئی قدم اٹھانا نہیں چاہتا۔"

"اچھا۔" وہ کچھ توقف کے بعد بولا۔ "میں بیس منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔ زندہ تو ملو گے نا؟"

"آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں۔" میں نے ڈرامائی لہجے میں کہا۔ "سامان سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں۔" اور فون رکھ دیا۔

اس میں بیس منٹ تک میں کمرے میں ٹہلتا رہا اور ہر ایک منٹ لا کر دی تھی ازے کی طرف دیکھتا رہا۔ آخر سنتری کہاں گیا؟ یہ سوال اور مرتی وزیٹ دیکھ کر میرے ذہن میں آیا۔ گزشتہ شب کی بات فائل ان امیں نے اسے بے حد مستعد کھڑا دیکھا تھا اور صبح اسے جان لمحہ بھر کے لیے گیٹ میں رکی تھی تو اس نے رضوی صاحب وزیر زبردست سلیوٹ جھاڑا تھا۔ دوسرا سگریٹ ختم ہونے والا تھا کہ اکرام شیخ اسکوٹر پر اندر داخل ہوا۔

میں باہر نکلا تو وہ اسکوٹر بند کر کے اسٹینڈ پر کھڑا کر رہا تھا۔

"کدھر ہے ہنگامی صورت حال؟" اس نے کہا۔

"ہر طرف۔ اندر۔ باہر۔" میں نے کہا۔ "ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق۔ پیدائش پر ہنگامہ۔ موت پر ہنگامہ۔"

اندر لے جا کر میں نے اسے ساری بات تفصیل سے سنائی لیکن کیسٹ کا ذکر عمداً نہیں کیا۔ ورنہ مجھے یہ بھی بتانا پڑتا کہ میں نے ڈی سلوا اور دلاور کی گفتگو کس طرح ریکارڈ کی تھی۔ میں نے صرف اس فائل کا ذکر کیا جو غلام علی نے فراہم کی تھی اور اس جرم کی پاداش میں مارا گیا تھا۔

"فائل تو بعد میں مل جائے گی۔ پہلا مسئلہ گارڈ کا ہے۔" وہ متفکر ہو کے بولا۔ "وہ کہاں گیا؟"

"مجھے تو شک ہے کہ وہ مارا گیا۔ ان لوگوں نے پہلے بھی پہرے داروں کو ٹھکانے لگایا ہے۔" میں نے کہا۔

اکرام شیخ نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ پولیس کا آدمی تھا۔ انتہائی تجربہ کار اور اس کے پاس مشین گن تھی۔"

ہم دونوں نے گیٹ کا معائنہ کیا۔ وہاں جدوجہد، مزاحمت یا کشمکش کے آثار مفقود تھے۔ پھر میرے ساتھ شیخ نے ایک ایک کمرے میں، باتھ روم میں یہاں تک کہ ہر بیڈ کے نیچے اور پردوں، الماریوں کے پیچھے دیکھا۔ میں نے اسے وہ میز دکھائی جس کے نیچے والی دراز میں سے فائل چوری ہوئی تھی۔ باقی کاغذات کو چھیڑا تک نہیں گیا تھا۔ گھر کے اندر دیکھ لینے کے بعد ہم نے عقبی حصے کا رخ کیا۔ باغ اور گیراج دیکھے۔ آخری حصہ وہ کوارٹر تھا جس میں پہلے صرف ایک کانسٹیبل رہتا تھا۔ پھر ہم رہے تھے اور آخر میں شہلا نے اپنی ماں کے ساتھ کچھ دن گزارے تھے۔ اب یہ کوارٹر ویران پڑا تھا۔ میں نے اس کے دروازے کو دھکیلا اور ہم تقریباً ایک ساتھ اندر داخل ہو کے ایک ساتھ رک گئے۔ صحن کی دیوار کے ساتھ کوئی شخص بندھا پڑا تھا۔ اسے بڑی مضبوطی سے باندھ کے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا گیا تھا۔ بظاہر وہ شخص مردہ نظر آتا تھا لیکن وہ صرف بے ہوش تھا۔

چہرہ دیکھتے ہی میں نے اسے شناخت کر لیا۔ یہ وہی پولیس گارڈ تھا۔ میں نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کے اسے غور سے دیکھا۔ "شیخ! یہ تو پولیس گارڈ ہے۔" میں نے کہا۔ "جسے دروازے پر تعینات کیا گیا تھا اور ابھی صبح تک ڈیوٹی پر تھا۔"

شیخ بھی گھٹنوں کے بل میرے قریب ٹک گیا۔ اس نے گارڈ کا ہاتھ تھام کے اس کی نبض دیکھی۔ "غنیمت ہے کہ اسے قتل نہیں کیا گیا۔ نبض کچھ سست ہے۔" شیخ نے کہا اور گارڈ کے منہ سے کپڑا نکال دیا۔

"جسم بھی کچھ ٹھنڈا ہے لیکن اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ نہ جانے کب سے اسی طرح کھلے آسمان کے نیچے زمین پر پڑا ہے۔ یہ خود ہی بتا سکتا ہے کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔" شیخ نے کہا۔ "پہلے تو اسے اٹھا کے اندر لے چلتے ہیں۔"

"پہلے اس کی یہ رسیاں کاٹ دیں۔" میں نے باورچی خانے کی طرف لپکتے ہوئے کہا۔ جہاں میرے خیال کے مطابق ایک چھری ہونی چاہیے تھی۔ چھری مجھے تھوڑی سی تلاش کے بعد مل گئی۔ ایک منٹ بعد میں وہ رسیاں کاٹ چکا تھا جو گارڈ کے جسم پر اتنی سختی سے باندھی گئی تھیں کہ گوشت میں گڑ گئیں تھیں اور سیاہی مائل نیلی لکیریں گارڈ کے سارے جسم پر پھیلی ہوئی تھیں۔ ان لکیروں کے علاوہ اس کے جسم پر تشدد کے نشان نہیں تھے۔

میں اور شیخ اسے اٹھا کے سرونٹ کوارٹرز سے بیڈ روم تک لائے اور ایک بستر پر لٹا دیا۔

"میں ڈاکٹر کو بلاتا ہوں۔" میں نے فون کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

جتنی دیر میں شیخ نے اس کے جسم پر کمبل ڈالا میں نے ڈاکٹر کو فون کیا اور اسے بتایا کہ میں رضوی صاحب کے گھر سے بول رہا ہوں اور وہ فوراً پہنچ جائیں۔ ڈاکٹر ان کی فیملی کے ہر فرد کو جانتا تھا چنانچہ اس نے مجھ سے معلوم کرنا چاہا کہ کون بیمار ہے اور بیماری کیا ہے۔ مجبوراً مجھے ٹیلی فون پر ہی بتانا پڑا کہ بات کیا ہے۔

"تم نے پولیس کو رپورٹ کی؟" ڈاکٹر نے کہا۔

"میرا ایک دوست ہے۔ پولیس انسپکٹر۔" میں نے کہا۔ "وہ اس وقت یہاں موجود ہے۔"

"تمھیں اس گارڈ کو اسپتال لے جانا چاہیے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "پولیس سرجن سے بات کرو اور ایمبولینس منگوالو۔"

"اس کی کنڈیشنڈ سیریس نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "کسی اور کا گھر ہوتا تو میں بھی وہی کرتا جو آپ سمجھا رہے ہیں اور رضوی صاحب ہوتے تو معاملات کو خود سنبھال لیتے۔ جیسا مناسب سمجھتے کرتے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ شاید وہ بھی تشہیر پسند نہ کرتے۔ تفتیش تو ہوگی ہی بعد میں۔ پہلے تو آپ اتنا دیکھ لیں کہ اسپتال لے جائے بغیر کام چل سکتا ہے یا نہیں۔"

"اچھا۔" ڈاکٹر نے بادلِ ناخواستہ مجھ سے اتفاق کیا۔ "میں آدھے گھنٹے میں آتا ہوں۔"

اس کے آنے تک مجھے اور شیخ کو کچھ نہیں کرنا تھا۔ میں نے اسے چائے کی پیش کش کی۔

"چائے۔" وہ سر پہ ہاتھ مار کے بولا۔ "لنچ کے وقت چائے۔ گھر میں مچھلی تلی جا رہی تھی۔ تم نے کہا لنچ باہر کریں گے اور اب چائے۔ نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے۔"

"لنچ بھی ہوگا۔ ذرا دیر ہوگی۔ ایسا اندھیر نہیں ہوگا کہ تمھیں محض ایک پیالی چائے پر ٹرخا دیا جائے۔" میں نے کہا۔ "لاؤ لاؤ۔ کچھ بھی لاؤ۔" شیخ نے کہا۔ "بھوک کو قتل تو کرنا ہی ہے۔"

"شاید سنتری صاحب کو بھی چائے دینے سے ہوش آ جائے۔" میں نے مزید دلائل دیے۔ "ڈاکٹر صاحب کی خاطر بھی ہو جائے گی۔"

ڈاکٹر کے پہنچنے سے قبل ہی میں نے اور شیخ نے خاصی کوشش سے ایک ایک چمچہ کر کے آدھا کپ گرم چائے گارڈ کے حلق سے اتار دی اور اس کے مفید نتائج بھی برآمد ہوئے۔ وہ پوری طرح ہوش میں تو نہیں آیا مگر اس کے جسم کا درجۂ حرارت نارمل ہو گیا اور نبض کی رفتار بھی بہتر ہو گئی۔ وہ ایک بار آہستہ سے کراہا بھی جو ہوش آ جانے کی پہلی امید افزا علامت تھی۔ ہم نے چائے کے ساتھ صبح کی بچی ہوئی ڈبل روٹی کا ایک ایک سلائس کھایا جو بھوکے اور خالی پیٹ کے لیے عبوری امداد کے مترادف تھا۔

"میں نے اپنا استعفیٰ اوپر ارسال کر دیا ہے۔" شیخ نے کہا۔

"معاف کیجیے گا شیخ صاحب! یہ کوئی عقلمندی نہیں کی آپ نے۔" میں نے کہا۔ "اتنی جلدی میدان چھوڑ کے بھاگ گئے۔"

"سکندرِ اعظم! مانا کہ تم بڑے مردِ میداں ہو۔" وہ بولا۔ "مگر کیا ملا تمھیں مقابلہ کر کے؟ اس کے علاوہ تم میں اور مجھ میں ایک بنیادی فرق ہے۔ تمھارا جتنا نقصان ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ تم انتقام کے جذبات سے مغلوب تھے اور تنہا تھے۔ میرے ساتھ جوان بہن ہے۔ ماں ہے۔ سوتیلی ہے تو کیا۔ اور میرا باپ ہے۔ میں ان سب کو اپنی جرأتِ مردانہ کی اَنا پر قربان نہیں کر سکتا۔ کیا قصور ہے آخر ان کا۔ انھوں نے مجھے پڑھا لکھا کے جوان کیا اور اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل بنایا۔ مجھے محبت دی اور... میری خواہش کا احترام کرتے ہوئے بڑی نیک نیتی سے ایک غلطی بھی کی۔ یعنی مجھے اجازت دی کہ میں پولیس کی نوکری کر لوں وہ چاہتے تو مجھ سے کہتے کہ قانون پڑھو اور اپنی پریکٹس جماؤ۔ جیسا کہ میرے خاندان میں بہت سے لوگ کر رہے ہیں۔ مالی طور پر پریکٹس چلنے تک وہ میری کفالت بھی کر سکتے تھے اور مدد بھی۔ لیکن میں نے کہا کہ میں ملک اور قوم کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ طنز سے ہنسا۔ "بالکل اسی طرح جیسے ڈاکٹر کہتے ہیں ۔۔۔ لوگ بہت مظلوم ہیں کیونکہ انھیں انصاف نہیں ملتا اور انھیں پولیس سے بہت شکایات ہیں کہ وہ ظالم کے طرف دار ہیں اور خود بھی ظالم ہیں۔ میں اس تاثر کو ختم کروں گا۔ بے شک اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا مگر کسی نہ کسی کو صحیح سمت میں قدم اٹھانا ہی ہوگا۔ یہ نظام ان خرابیوں کے ساتھ ہمیشہ نہیں چل سکتا۔ میں تمام نقصانات اور خطرات سے نبرد آزما ہونے کے لیے بھی تیار تھا۔

کیوں کہ دریا میں رہ کے مگرمچھوں سے بیر رکھنے کے نتائج کبھی خوشگوار نہیں ہوتے۔ اور تم اسے فلمی ڈائیلاگ نہ سمجھو تو کہوں کہ میں فرض کی ادائیگی کے لیے جان دینے سے بھی نہیں ڈرتا تھا۔ جب فرض ہی چوروں، ڈاکوؤں اور قاتلوں سے مقابلے کا ہو تو جان کی سلامتی کا یقین کیسے ہوتا ہے۔ یہ 'وائٹ کالر جاب' نہیں ہے۔ میز پر بیٹھ کے کلرکی کرنے یا افسر بن کے کمرے میں بیٹھنے والے کو بھلا کیا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ پولیس والے اگر رشوت لیتے ہیں، بھتے وصول کرتے ہیں یا جرائم کی سرپرستی کرتے ہیں تو مارے بھی جاتے ہیں۔ کبھی اسمگلروں کے ہاتھوں۔ کبھی قانون شکن عناصر کی فائرنگ سے اور کبھی مشتعل ہجوم کے حملے سے لیکن ملازمت کے اس مختصر سے دور نے میری خوش فہمی دور کر دی ہے۔ میری جنگ قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں سے نہیں ہوئی۔ میں ایک بدعنوان سازشی نظام کی چیرہ دستی کا شکار ہو گیا جنھوں نے مجھے صرف اس لیے مجرم قرار دیا کہ میں کتابی اور اصولی باتیں کرتا تھا اور ان پر عمل بھی کرنا چاہتا تھا۔ جب معاشرہ ہی دکرپٹ، ہو تو وہ افراد جو اسی معاشرے کا حصہ ہوں، کیسے ٹھیک ہو سکتے ہیں۔ انھیں آپ کہیں بھی بٹھا دیں۔ لہریں گننے والی بات سنی ہے نا تم نے؟ کسی بادشاہ نے ایک راشی اور بدعنوان شخص کو شکایات موصول ہونے کے بعد کبھی ایک محکمے میں کبھی دوسرے میں لگایا مگر وہ ہر جگہ لوگوں کو پریشان کر کے ناجائز آمدنی کے ذرائع پیدا کر لیتا تھا۔ تنگ آ کے بادشاہِ وقت نے اس کو دریا کے کنارے بٹھا دیا کہ یہاں بیٹھو اور لہریں گنو۔ صبح سے شام تک اور کوئی کام نہیں اور تمھیں بس اسی کام کی تنخواہ ملے گی۔ چند دن میں اس نے وہاں بھی آمدنی کی ایک صورت نکال لی۔ اس نے ماہی گیروں کو اور دریا سے کشتی پر سامان لے جانے والوں کو روک دیا اور کہا کہ تم سرکاری کام میں مداخلت کرتے ہو؟ مجھے یہاں لہریں گننے پر لگایا گیا ہے۔ تمھاری کشتیوں کے آنے جانے سے لہروں کا سارا حساب غلط ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے اس کے بعد اجازت لیے بغیر کوئی نہیں گزر سکتا تھا اور اجازت بلا معاوضہ نہیں ملتی تھی۔"

میں اس کی سنجیدہ گفتگو کے باوجود ہنسنے لگا۔ "یہ تو ٹھیک ہے۔ یہاں نیک نام صرف وہی ہیں جن کو موقع نہیں ملتا، ورنہ آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔ اس حمام میں ننگا وہ ہے جس نے کپڑے پہن رکھے ہوں۔ جو مچھلی گندی نہیں ہے وہ جل میں رہنے کے قابل نہیں۔"

"اور الزام کوئی کسے دے؟" شیخ نے کہا۔ "آپ ایک ادارے کی بدعنوانی کی روک تھام کے لیے اس کے اوپر دوسرا ادارہ بنا دیں۔ وہ بھی ہوں گے تو ہم میں سے ہی نا۔ خیر یہ سب مجھے پہلے سے معلوم تھا کہ مجھے کیا مشکلات درپیش ہوں گی۔ مگر میں یہ نہیں سمجھتا تھا کہ میری اصول پرستی اور فرض شناسی کی سزا میرے علاوہ میرے گھر والوں کو بھی مل سکتی ہے۔ ان کی زندگی بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے اور انھیں بھی خطرناک نتائج کی دھمکی دی جا سکتی ہے۔ تمھارے بارے میں مفصل معلومات حاصل ہو جانے کے بعد مجھے انجام صاف نظر آنے لگا۔ میرے لیے شبہے کی کوئی گنجائش نہ رہی کہ میرے جرائم کی سزا سے دوسرے بھی نہیں بچ سکیں گے۔ میرا خیال ہے وہ مجرم بہتر ہیں جو کسی پولیس افسر کو گولی مار دیتے ہیں لیکن اس کے بعد کچھ نہیں کرتے۔ اس کی فیملی کو ختم نہیں کرتے۔ بیوی، بچوں۔ ماں باپ یا بھائی بہن پر ظلم نہیں کرتے۔ جن مجرموں سے میرا واسطہ پڑ رہا ہے وہ اتنے بے ضمیر ہیں کہ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ پھر مجھے کیا ضرورت ہے دوسروں کی زندگی سے دشمنی کرنے کی۔ کل کو خدانخواستہ میری بہن غائب ہو جائے۔ وہ ہر روز پیدل کالج جاتی ہے۔ میرے باپ کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ جائے جس سے میری سوتیلی ماں بیوہ ہو جائے۔ وہ میری ماں کی سب سے چھوٹی بہن بھی ہے اور اس رشتے سے میری خالہ ہے۔ وہ روایتی قسم کی سوتیلی ماں نہیں ہے۔ میں اور میری بہن اس پر بہت اعتماد کرتے ہیں۔ وہ ہمیں اپنا سب کچھ سمجھتی ہے۔ مجھے کیا حق حاصل ہے کہ اپنی ضد پہ پورے ہنستے بستے گھر کو اجاڑ دوں۔ اپنی وجہ سے نہیں، میں ان سب کی وجہ سے شکست تسلیم کر لینا بہتر سمجھتا ہوں جن سے میرا خونی اور جذباتی رشتہ ہے۔ فکرِ معاش مجھے کبھی نہیں ہوئی۔ میں بزنس بھی کر سکتا ہوں۔"

"اور اس نظام کا کیا ہو گا جس کی اصلاح کا عزم لے کر تم پولیس میں بھرتی ہوئے تھے۔"

"اس کو خدا ہی ٹھیک کرے تو کرے۔ میں اپنی ہار مانتا ہوں بھائی۔" شیخ نے ہاتھ جوڑ کے کہا۔

"گویا یہاں کوئی بھی پہل نہیں کرے گا۔ کوئی سقراط نہیں آئے گا جو زہر کا یہ پیالہ اٹھائے؟" میں نے کہا۔ "مجھے ایک بات بتاؤ۔ آخر رضوی صاحب نے اسی دلدل میں رہ کے خود کو کیسے غلاظت سے پاک رکھا۔ ان کے دامن پر داغ بھی نہیں آیا اور انھوں نے ترقی بھی کی۔ عزت بھی پائی اور نیک نامی بھی کمائی۔ آج بھی میری وجہ سے انھوں نے اپنی فیملی کے تحفظ کو غیر یقینی بنا رکھا ہے۔ وہ مجھے، محسن اور رابعہ کو گھر میں رکھے ہوئے ہیں اور ان کے پائے استقامت میں کبھی لغزش نہیں آئی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ رابعہ کا گھر کس طرح تباہ ہوا تھا اور میرا ساتھ دینے والوں کا کیا حشر ہوا۔ تم اگر پولیس میں رہتے تو ہمارا اقفقہ کالم بن سکتے تھے۔"

"مجھے معلوم نہیں رضوی صاحب نے ناممکن کو کیسے ممکن کر دکھایا۔ شاید وہ اس دور میں بھرتی ہوئے تھے جب آزمائش اتنی سخت نہیں ہوتی تھی۔ اصول پرستی اور فرض شناسی سے کم لوگ خوش ہوتے ہوں گے مگر اوپر کچھ لوگ ضرور ہوں گے جو ان کی حفاظت کرتے رہے۔ اوپر والا مضبوط کردار کا مالک ہو اور غلطی پر سختی سے بازپرس کر سکتا ہو اور سخت سزا دے سکتا ہو تو نیچے والوں کی ہمت نہیں پڑتی کہ کوئی غلط کام کریں۔ وہ اب اس پوزیشن میں ہیں کہ کوئی انھیں نقصان نہیں پہنچا سکتا۔"

"کچھ لوگوں کے نقطۂ نظر سے وہ نقصان میں ہیں۔" وہ اسی شہر کے کسی علاقے کے ایس پی ہوتے تو کتنے تھانوں کے مالک ہوتے؟ ایک معمولی تھانے کا چارج لینے والے کتنی سخت کوشش کرتے ہیں۔ سفارش لاتے ہیں اور بعض جگہ تو اس کی قیمت مقرر ہے۔ فلاں تھانے میں پوسٹنگ۔ اتنا معاوضہ۔ رضوی صاحب کسی قصبے کے ایس پی ہوتے تو اپنے علاقے کے بے تاج بادشاہ ہوتے اور اپنی رعایا سے جو خراج وصول کرنا چاہتے، کر لیتے اور ہیڈ کوارٹر میں پوسٹنگ تو گویا سزا ہوتی ہے ان کے نزدیک۔ رضوی صاحب تمھارے بارے میں سب جانتے ہیں اور ان کی رائے بہت اچھی ہے۔ میرا خیال ہے وہ تمھیں بھی اپنے سایۂ عاطفت میں، یعنی ہیڈ کوارٹر میں بلانے کی سوچ رہے ہیں۔ لعنت بھیجو تھانے پر۔ تم حشمت خان اور میر محمد جیسے لوگوں کو ٹھیک نہیں کر سکتے جو کتے کی دُم ہیں۔ بلکہ کاٹنے والے کتے ہیں۔ رضوی صاحب کے ساتھ رہو۔"

شیخ خاموش بیٹھا کچھ سوچتا رہا اور سگریٹ پیتا رہا۔ بظاہر وہ مجھ سے متفق نظر آتا تھا۔

"لیکن اب تو میں استعفیٰ بھیج چکا۔" اس نے کہا۔

"استعفیٰ واپس بھی لیا جا سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اور نامنظور بھی کیا جا سکتا ہے۔"

اسی وقت کوئی گاڑی باہر آ کے رکی اور ڈاکٹر نے ہارن بجا کے اپنی آمد کی اطلاع دی۔ میں اسے لینے باہر گیا تو وہ کار سے اتر رہا تھا۔ اس نے اپنا بیگ مجھے یوں تھمایا جیسے گھر کے کسی خادم کو تھماتا۔

"تم ہو سکندرِ اعظم؟" اس نے کہا۔ "کیا لگتے ہو رضوی صاحب کے؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے کہا۔ "سکندرِ اعظم بھی ان کا کچھ نہیں لگتا تھا جو تئیس سو سال پہلے فوت ہوا تھا۔ میں سکندر بخت ہوں۔"

ڈاکٹر نے میرے مذاق پر برا سا منہ بنایا اور سیدھا چلتا گیا۔ میں دروازہ کھول کے بیڈ روم میں داخل ہوا تو وہ خاصا

آ گے نکل چکا تھا اور میرے آواز دینے پر واپس آیا تو مزید جزبز ہوا۔ اس نے گارڈ کا معائنہ یوں کیا جیسے پوسٹ مارٹم شروع کرنے والا ہو۔

"کچھ نہیں" اس نے چند منٹ میں فیصلہ کر دیا" شاک اور سر کی چوٹ۔ میں انجکشن دیتا ہوں۔ اگر ہوش نہ آئے ایک گھنٹے کے اندر اندر۔ یا ہوش آنے کے بعد متلی اور قے وغیرہ ہو تو میو اسپتال لے جانا۔ ورنہ علاج کی ضرورت نہیں۔ آرام اور خوراک" اس نے ایک انجکشن بھرا اور گارڈ کی کلائی سے ذرا اوپر ابھری ہوئی رگ میں لگا دیا۔

"مسٹر پولیس انسپکٹر!" اس نے روانگی سے قبل کہا" میں نہیں چاہتا کہ اس کیس میں کہیں میرا نام آئے۔"

"میرا خیال ہے اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی" شیخ نے کہا۔

"تھینک یو۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ مریض خود ہی ہوش میں آ گیا تھا۔ اور خدانخواستہ کنڈیشن سیریس ہو جائے۔ جس کا مجھے کوئی امکان نظر نہیں آتا تو آپ یہ نہیں کہیں گے کہ کسی پرائیویٹ ڈاکٹر نے انجکشن وغیرہ دیا تھا"

"آئی ایم سوری۔ اس صورت میں جھوٹ بولنا مشکل ہو گا میرے لیے" شیخ نے کہا۔

ڈاکٹر نے نظر جما کے شیخ کو دیکھا" میرے لیے مشکل نہیں ہو گا انسپکٹر! میں صاف انکار کر دوں گا۔ اور ثابت بھی کر دوں گا کہ میں سچا ہوں" وہ بیگ اٹھا کے احتجاجی انداز میں واک آؤٹ کر گیا۔

"اس شخص کی رضوی صاحب سے کیسے نبھ رہی ہے؟" شیخ نے حیرانی سے کہا۔

"شاید اس لیے کہ ڈاکٹر اچھا ہے" میں نے کہا۔

ڈاکٹر کے جانے کے آدھے گھنٹے بعد سنتری کو ہوش آ گیا۔ وہ ایک دم اٹھ بیٹھا اور احمقوں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ گیٹ پر ڈیوٹی دیتے دیتے وہ بیڈ روم میں کیسے آ لیٹا۔ ہم نے اسے تسلی دی کہ فکر کی کوئی بات نہیں اور زبردستی لٹا دیا" وہ... جناب... بات تو سن لیں" اس نے حیرانی سے اپنے کپڑوں کو دیکھا۔

"تمھاری بات بھی سنیں گے۔ لیکن ابھی نہیں" شیخ نے کہا۔ "جب تمھاری طبیعت بالکل ٹھیک ہو جائے گی"

"قسم خدا کی جناب! میرا کوئی... قصور نہیں" سنتری نے اس کے باوجود اپنا دفاع جاری رکھا۔

"ہاں ہاں۔ ہم جانتے ہیں" میں نے کہا" ابھی تم آرام کرو۔ یہ انسپکٹر صاحب اسی لیے آئے ہیں کہ تمھارا بیان لیں"

ہم نے اسے ایک گلاس گرم دودھ کا گلوکوز ملا کے دیا اور پھر طے کیا کہ ہم ایک گھنٹے کے لیے اسے چھوڑ کے لنچ کے لیے جا سکتے ہیں۔ یہ بات ہم نے اسے نہیں بتائی ورنہ وہ اتنا خوفزدہ تھا کہ شاید اٹھ کے بھاگ جاتا۔ ہم نے کہا کہ دو گھنٹے بعد ہم پھر آئیں گے۔ ہم دوسرے کمرے میں آرام کرتے ہیں۔ ممکن ہو تو وہ بھی سو جائے۔

شیخ نے باہر آ کے اسکوٹر اسٹارٹ نہیں کیا۔ وہ سڑک تک اسکوٹر کو ایسے ہی چلا کے لایا اور گیٹ سے کچھ فاصلے پر روک کے اسٹارٹنگ کک لگائی۔ اس وقت تین بجنے والے تھے اور جتنی دیر میں ہم بیڈن روڈ سے کھانا کھا کے لوٹے شام ہونے لگی تھی۔

"کیس کی رپورٹ تو لکھوانی پڑے گی" شیخ نے کہا۔ "پہلے ذرا اس کی سن لیں۔ رضوی صاحب کو اطلاع دینی چاہیے یا نہیں۔ یہ فیصلہ بعد میں کریں گے"

سنتری پوری طرح ہوش میں آ چکا تھا اور آنکھیں کھولے ہکا بکا لیٹا چھت کو گھور رہا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ اٹھ کے بیٹھ گیا۔ "آپ تو خیر سکندر صاحب ہیں" وہ بولا" لیکن یہ انسپکٹر صاحب کون ہیں۔ کس نے بلایا ہے انھیں؟"

"میں نے بلایا ہے" میں اس کے لہجے پر حیران ہو کے بولا" یہ سب انسپکٹر اکرام شیخ ہیں"

"سوالات مجھے کرنے ہیں" شیخ نے کہا" نام کیا ہے تمھارا؟"

"دین محمد۔ مگر میں کانسٹیبل نہیں ہوں" اس نے احتجاجی لہجے میں کہا۔

"پھر کیا ہو؟ نائک؟" شیخ نے فل اسکیپ کاغذ پر قلم سے کچھ لکھتے ہوئے کہا۔

"میں بھی سب انسپکٹر ہوں" وہ بولا" میں اپنی اسناد کا اور میڈلوں کا کیا ذکر کروں۔ یوں سمجھ لیں کہ دہشت گردی کا کیس ہو تو عموماً مجھے خصوصی تفتیش کی ٹیم میں ضرور شامل کیا جاتا ہے"

انسپکٹر شیخ نے اور میں نے حیرانی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا" گویا تمھیں خاص طور پر رضوی صاحب کے گھر کی حفاظت کے لیے منتخب کیا گیا تھا؟" شیخ نے کاغذ پر اس کا نام اور عہدہ لکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ اور مجھے بہت افسوس ہے کہ میں ناکام رہا۔ ایس پی صاحب کے گھر میں تو خیریت ہے نا؟" وہ خفت سے بولا۔

"ہاں۔ وہ اپنی فیملی کے ساتھ اسلام آباد گئے ہیں" میں نے کہا" جاتے وقت انھوں نے تم سے بات بھی کی تھی"

"مجھ سے؟" وہ حیران ہو کے بولا" میں نے تو انھیں جاتے ہوئے بھی نہیں دیکھا۔ کب گئے تھے وہ؟"

"آج صبح ساڑھے نو بجے" میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ "وہ خود گاڑی چلا رہے تھے اور اس وقت تم اپنی مشین گن لیے گیٹ پر کھڑے تھے۔ میرے سامنے انھوں نے گیٹ پر کار روکی تھی"

دین محمد نے نفی میں سر ہلایا" وہ کوئی اور ہو گا سکندر صاحب!"

"کل۔ یعنی گزشتہ رات تقریباً ایک بجے سے ساڑھے چار بجے تک بھی میں نے تم کو ہی گیٹ پر اٹن شن دیکھا تھا" میں نے اس کی بات ختم ہونے سے پہلے کہا" اسی لیے میں نے تمھیں شناخت کر لیا۔ میرے علاوہ رابعہ بی بی نے دیکھا تھا تمھیں۔ کیا تم نے نہیں دیکھا تھا ہمیں۔ ہم باغ میں بیٹھے باتیں کرتے رہے تھے۔ چاندنی کا اجالا بہت کافی تھا۔ اور تم تو گیٹ لائٹ.."

"آپ اپنی کہتے جا رہے ہیں" دین محمد نے ناگواری سے کہا" میری بھی تو سن لیں۔ گزشتہ رات بھی میں ڈیوٹی پر نہیں تھا۔ آپ نے کسی اور کو دیکھا ہو گا۔ اتنی دور سے وردی میں سب ایک جیسے لگتے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ میرے ہی قد و قامت کا کوئی آدمی ہو۔ یا اس کی صورت مجھ سے ملتی ہو۔ صورت تو میک اپ سے بنائی بھی جا سکتی ہے۔ میں تو پرسوں شام کو اندھیرا ہونے کے بعد ڈیوٹی پر پہنچا تھا۔ دن میں دوسرا شخص آ گیا۔ رات کو دس بجے پھر میں نے چارج لیا تھا۔ اس وقت تک صاحب بھی گھر نہیں لوٹے تھے۔ اس گیٹ پوسٹ کے پیچھے یا ساتھ والی کوٹھی کی دیوار کے ادھر کوئی چھپا کھڑا تھا جس نے اچانک مجھے قابو کر لیا۔ میری نظر سڑک پر بھی تھی اور... ہر طرف تھی۔ لیکن پڑوسیوں کی طرف سے میں مطمئن تھا۔ سب مجھے معلوم ہے وہاں کون رہتا ہے۔ وہ بہت چالاک لوگ تھے۔ واقعی پیشہ ور لوگ۔ انھوں نے مجھے پیچھے سے دبوچا اور میری ناک پر رومال رکھ دیا۔ کلوروفارم میں بھیگا ہوا۔ وہ دو تھے اور جس نے مجھے قابو کیا وہ خاصا طاقتور تھا۔ اس نے رومال رکھتے ہی مجھے پیچھے جھاڑیوں میں گھسیٹ لیا تھا۔ پھر دوسرے نے میرے سر پر کوئی چیز دے ماری تھی۔ کوئی خاصی سخت چیز۔ میرا خیال ہے رومال یا کسی کپڑے سے ہاکی یا کرکٹ کی گیند لپیٹ کر وار کیا گیا تھا۔ میں بے ہوش ہو گیا۔ کلوروفارم سے نہیں۔ اس ضرب سے۔ میں نے سانس روک لیا تھا اور تین منٹ تک روک سکتا تھا۔ مجھے اگر مہلت ملتی تو میں ان دونوں سے نمٹ لیتا۔ شاید انھوں نے اندازہ کر لیا تھا۔ اور اسی لیے انھوں نے سر پر وار کیا۔ میں نے ان کی صورتیں تو نہیں دیکھیں مگر آوازیں سنی تھیں۔ ایک نے دوسرے سے چلّا کے کہا تھا" دیکھتا کیا ہے۔ مار" اس کے بعد کیا ہوا مجھے معلوم نہیں۔ میرا خیال ہے انہی میں سے کسی نے میری وردی پہن لی ہو گی اور پہرے دار بن کے کھڑا ہو گیا ہو گا۔ آپ نے بھی اسے ہی دیکھا اور ایس پی صاحب نے بھی۔ میں حیران ہوں کہ آپ کی نظر تو دھوکا کھا سکتی ہے۔ ایس پی صاحب کو دھوکا کیسے ہو گیا!"

"میرا خیال ہے انھوں نے اس شخص کو نہیں دیکھا ہو گا جو دن کی ڈیوٹی پر مامور تھا۔ اگر انھیں تمھاری جگہ کوئی اور نظر آیا ہو گا تو وہ سمجھے ہوں گے کہ دن میں یہی شخص ڈیوٹی پر ہوتا ہے" شیخ نے کہا" وہ کس وقت آتا ہے؟"

"دس بجے" دین محمد نے کہا" بارہ بارہ گھنٹے سے ڈیوٹی بدلتی ہے"

"پھر سوال یہ ہے دین محمد کہ آج صبح دس بجے وہ کیوں نہیں آیا؟" شیخ نے کہا" رضوی صاحب آدھے گھنٹے پہلے چلے گئے تھے اس لیے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ انھوں نے نقلی محافظ کو اصلی سمجھا۔ گزشتہ روز بھی وہ دس بجے آیا ہو گا۔ اور دس بجے رضوی صاحب آفس میں ہوتے ہیں۔ ڈیوٹی باہر ہی باہر بدل جاتی تھی۔ اس لیے بیگم صاحبہ نے بھی نہیں دیکھا۔ کیا نام ہے اس کا؟"

"خواجہ اکبر۔ وہ بھی سب انسپکٹر ہے سی آئی اے کا" دین محمد نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کل رات دس بجے سے تم وہاں بیہوش اور بندھے پڑے تھے"

"کہاں بندھا پڑا تھا۔ نشانات تو مجھے بھی نظر آ رہے ہیں۔ اپنے جسم پر" وہ بولا۔

"پیچھے ایک سرونٹ کوارٹر ہے۔ اس کے صحن میں" میں نے کہا" آج دو بجے تک سولہ گھنٹے ہو گئے۔ اور کلوروفارم سے کوئی بھی سولہ گھنٹے بیہوش نہیں رہ سکتا۔ انھوں نے تمھیں خواب آور دوا بھی دی ہو گی"

"اس کا اثر بھی آٹھ گھنٹے بعد ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن تمھاری بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ تمھیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ تم کہاں پڑے ہو" شیخ نے میری بات پر تعریفی انداز میں سر ہلایا" تم نے آنکھیں کھول کر دیکھا تک نہیں۔ چنانچہ یا تو ہم فرض کر سکتے ہیں کہ سولہ گھنٹے کی بیہوشی سر کی چوٹ کا نتیجہ تھی۔ جو بہت طویل وقفہ ہے اور چوٹ اتنی سیریس ہوتی تو ڈاکٹر کو اندازہ ہو جاتا۔ اس کا کوئی نشان نہ ہوتا تب بھی ڈاکٹر اسے معمولی قرار نہ دیتا۔ دوسری صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اپنا کام ختم ہونے تک تمھیں ہوش میں نہیں آنے دیا گیا۔ وقفے وقفے سے تمھیں انجکشن وغیرہ دیے گئے"

دین محمد نے ڈھیلے ڈھالے نائٹ سوٹ کی آستین کو شانے تک اٹھا کے دیکھا۔ شانے سے ذرا نیچے تین ننھے ننھے نشان نظر آ رہے تھے۔ اس نے بازو کو دوسرے ہاتھ سے تھوڑا سا دبا کے اقرار میں سر ہلایا۔

"ممکن ہے اسی شخص نے یہ کام بھی کیا ہو جو بیداری کے بہانے گھر کی نگرانی پر مامور تھا۔ مارفیا۔ پیتھاڈین یا ڈائزی پام کا ہیوی ڈوز دینا کوئی مشکل کام نہیں۔ یہ چیزیں عام دستیاب ہیں۔" شیخ نے کہا۔ "مجھے افسوس ہے کہ تمھارا قابلِ فخر ریکارڈ خراب ہوگیا دین محمد! تم پر چارج تو بنے گا۔ ایک غفلت برتنے کا۔ دوسرا وہ اسلحہ گم کرنے کا جو تمھیں خصوصی اجازت کے تحت دیا گیا ہوگا۔ تم معطل بھی ہو جاؤ گے لیکن میرا خیال ہے بحال بھی ہو جاؤ گے۔"

"کیسی عجیب اور خطرناک بات ہے شیخ کہ رضوی صاحب تک مطمئن تھے۔" میں نے کہا۔ "اور وہ بدمعاش پاسبان نہیں، دشمنِ جان تھا۔ آج مجھے خیال آیا تھا کہ سنتری اس طرح ڈیوٹی چھوڑ کے جانے کی حماقت اور جرأت نہیں کر سکتا۔ اس کے علاوہ گھر کی بات دشمنوں تک اتنی جلدی کیسے پہنچ گئی۔ کل رات ہی محسن کے والد کا فون آیا تھا اور انھوں نے صبح ہم سے بات کی۔ اس سے پہلے اسلام آباد جانے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ اور اس پروگرام کی فوراً دشمنوں کو خبر مل گئی۔ میں سوچ رہا تھا کیسے؟ کیا انھوں نے گھر کے اندر کوئی خفیہ مائیکروفون چھپا رکھا ہے اور کہیں آس پاس ہی بیٹھے سب گفتگو سن رہے ہیں۔ اب بات سمجھ میں آتی ہے۔ یا تو وہ بدمعاش جو گیٹ پر محافظ بنا کھڑا تھا کسی کھڑکی دروازے سے کان لگائے ساری باتیں سن سکتا تھا مگر اس میں پکڑے جانے کا بہت خطرہ تھا۔ رضوی صاحب یا گھر کا کوئی فرد اچانک باہر آجاتا تو اسے دیکھ لیتا۔ چنانچہ اصل بات یہ ہے کہ کوئی چھوٹا سا ٹرانسمیٹر مائیکروفون گھر کے اندر تھا اور ریسیور اس کی جیب میں۔ ظاہر ہے اس کی رینج بہت کم ہوتی ہے۔ انھیں آس پاس کوئی جگہ نہ ملی..."

"نہیں سکندر! بات جگہ کی نہیں۔" شیخ نے سوچتے ہوئے کہا۔ "وہ کچھ اور بتانا چاہتے تھے۔ یہ کہ تم لاکھ ایس پی کی کوٹھی میں قلعہ بند ہو کے بیٹھ جاؤ اور دروازوں پر محافظ بٹھا دو۔ ہماری پہنچ سے باہر نہیں۔ ہم جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ غور کرو کہ ان کے ہاتھ میں مشین گن تھی۔ وہ کیا نہیں کر سکتے تھے۔ وہ گھر کو اڑا دیتے یا سب کو لے جاتے۔ مگر وہ صرف ایک فائل لے گئے اور کچھ کہے بغیر بہت کچھ کہہ گئے۔ کہ ہم بلاوجہ کشت و خون نہیں کرتے اور تمھیں ایک موقع فراہم کرتے ہیں کہ ہماری طاقت کا اندازہ کرتے ہوئے مقابلے کا خیال چھوڑ دو۔"

شیخ کے مشورے پر میں نے رضوی صاحب کو اطلاع دیے بغیر رپورٹ درج کرانے کا فیصلہ کیا۔ کچھ دیر بعد اس کی ڈیوٹی شروع ہونے والی تھی۔ وہ رخصت ہو گیا تو میں نے طے کیا کہ رپورٹ بھی آٹھ بجے کے بعد لکھواؤں جب حشمت خان کی جگہ خود اکرام شیخ آجائے۔ اس کے جانے کے بعد میں دین محمد سے باتیں کرتا رہا۔ وہ پرانا سپاہی تھا۔ وہ مجھے اپنی بہادری کے پرانے کارنامے سناتا رہا جن پر اسے تعریفی اسناد ملی تھیں اور میڈل ملے تھے۔

ساری بات یہ ہے کہ موت نہ وقتِ مقررہ سے پہلے آتی ہے نہ اس کے بعد۔ جب یہ وقت آتا ہے تو وہ عورت جو مفلوج ہو اور گھر کے اندر بستر پر لیٹی ہو اور بالکل نہ جانتی ہو کہ دنیا میں کوئی اس کا دشمن بھی ہے جو تصور بھی نہ کر سکتی ہو کہ اس کی موت طبعی نہیں ہوگی اور قتل کو ایسا فعل سمجھتی ہو جو انسان نہیں کر سکتے۔ خود قتل ہو جاتی ہے۔ ورنہ دین محمد جیسے لوگ خطرناک ترین مجرموں کو کیفرِ کردار تک پہنچاتے ہیں۔ آتشیں اسلحے کی جنگ میں سینہ سپر ہو جاتے ہیں اور جان ہتھیلی پر لیے پھرتے ہیں۔ میڈل اور اسناد پانے کے لیے زندہ رہتے ہیں اور انھیں خراش تک نہیں آتی۔

رات کو میں اسے رابعہ کی گاڑی میں بٹھا کے اپنے ساتھ پولیس اسٹیشن لے گیا۔ حشمت خان چارج دے چکا تھا اور محض اپنا فلسفۂ حیات اور ملازمت کے زریں اصول سمجھا کے شیخ کا وقت ضائع کرنے میں مصروف تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ چونکا۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ چونکنے کا اصل سبب میرے ساتھ دین محمد کا آنا تھا۔ دین محمد پولیس سے سی آئی اے میں گیا تھا اور پرانا افسر تھا چنانچہ حشمت خان بھی اس کو پہچانتا تھا۔ پہلا نظریہ اس نے یہی قائم کیا ہوگا کہ میرے جیسے خطرناک مجرم کا کیس اب سی آئی اے نے لے لیا ہے مگر رپورٹ کی بات سن کے اسے مایوسی ہوئی۔ دین محمد اب میری قمیص اور پتلون پہنے ہوئے تھا۔

"آپ میری مانیں تو گھوڑے شاہ کے مزار پر کوئی منت مانیں۔" اس نے درمیان میں موقع پا کے کہا۔ "آپ کے سارے گھر پر کسی کا منحوس سایہ ہے۔" اس نے بڑے معنی خیز طریقے سے میری طرف دیکھا۔

"سارے گھر کا کیا مطلب ہے؟" دین محمد نے ناگواری سے کہا۔ "میرے ساتھ اس سے بھی زیادہ ہو چکی ہے۔"

"وہ تو ہے جی۔ مگر ذرا غور کریں نا۔ ایک ہی وقت میں آپ اور آپ کے بھائی دونوں..." اس نے عمداً جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔

"پوری بات کیوں نہیں کرتے؟" دین محمد نے کہا۔ "کیا ہوا ہے میر محمد کو؟"

چونکنے کی باری اب میری تھی۔ "میر محمد بھائی ہے تمھارا؟ سگا؟"

"اور کیا سوتیلا۔ آپ بھی کمال بات کرتے ہیں سکندر صاحب! اب دیکھیں نا۔ کل سے اس کا بھی پتا نہیں۔" حشمت خان بولا۔

"کیا پتا نہیں؟" دین محمد نے برہمی سے کہا۔ "اس کا گھر تو یہیں ہے۔"

"میں بتاتا ہوں آپ کو۔" حشمت خان نے کہانی کو کا... ساتھ عدالت جانا تھا لیکن ان کا ایک پیغام ملا مجھے کہ وہ نہیں جا سکتے اور یہ کام میں کروں۔ کورٹ تو میں چلا گیا۔ لیکن میں نے اپنے شک کا بہرحال اظہار کر دیا تھا کیونکہ تحریر میر محمد کی نہیں تھی۔ اس کی بیوی بھی بہت پریشان ہے۔ ایسے بتائے بغیر وہ پہلے کبھی کہیں نہیں گیا۔"

دین محمد اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں بھابی سے پوچھتا ہوں۔"

میں اور شیخ اس کے پیچھے گئے لیکن حشمت خان وہیں بیٹھا رہا۔ میر محمد کا گھر تھانے سے ملحق احاطے میں تھا جہاں عملے کی رہائش کے لیے فلیٹ بنے ہوئے تھے۔ دو بلاک ماتحت عملے کے لیے تھے اور یہ چھوٹے کوارٹر تھے۔ میر محمد تین کمروں والے فلیٹ میں تھا اور اس کا فلیٹ تیسری منزل پر تھا۔ دین محمد نے دستک دی اور دروازہ کھلتے ہی اندر داخل ہو گیا۔ پھر ہم نے اس کے چلّانے کی آواز سنی اور اجازت لیے بغیر اندر گھس گئے۔

اندر دین محمد دیوانہ وار ایک سے دوسرے کمرے میں جا رہا تھا۔ دونوں کمروں کی حالت ناقابلِ بیان حد تک ابتر تھی۔ گھر کا سارا سامان کباڑی کی دوکان کی طرح بکھرا پڑا تھا۔ سارے صندوقوں کو الٹ کر خالی کر دیا گیا تھا۔ اب خالی صندوق الگ پڑے تھے اور ان کا سامان فرش پر پھیلا ہوا تھا۔ یہی کیفیت الماریوں کی تھی۔ ان میں سے ہر چیز نکال کے باہر ڈال دی گئی تھی۔ تلاشی لینے والوں کے لیے ممکن ہوتا تو وہ دیواروں کو بھی ادھیڑ دیتے کیونکہ انھوں نے کوئی چیز سلامت نہیں چھوڑی تھی۔ انھوں نے تکیے، لحاف بستر سب پھاڑ دیے تھے۔ ایک صوفہ سیٹ کا کور خنجر جیسی کسی چیز سے یوں پھاڑا گیا تھا کہ صرف اندر کے اسپرنگ رہ گئے تھے انھوں نے درمیان میں بھری ہوئی جوٹ تک نکال پھینکی تھی۔

"میر محمد کی بیوی کہاں ہے؟" شیخ نے ہر طرف جھانک کر تباہی و بربادی کا مکمل جائزہ لینے کے بعد کہا۔

"مجھے... مجھے کیا معلوم۔ میں ابھی تمھارے سامنے ہی تو آیا ہوں۔" دین محمد نے کہا۔ "دیکھا نہیں تھا کیا؟"

"تمھاری دستک پر دروازہ کس نے کھولا تھا؟" شیخ نے میری طرف دیکھا۔

"کسی نے بھی نہیں۔ جب میں نے دستک دی تھی تو دروازہ تھوڑا سا پیچھے ہو گیا تھا۔" دین محمد نے کہا۔ "دروازہ پہلے سے کھلا ہوا تھا۔ میں اندر چلا گیا۔"

"شاید سامنے کے فلیٹ والے پڑوسی کو کچھ معلوم ہو۔" شیخ نے کہا۔ باہر جھانکنے پر مجھے سامنے کا دروازہ مقفل نظر آیا۔ نیچے رہنے والوں کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ ہر منزل پر دو فلیٹ تھے جن کے دروازے زینے میں آمنے سامنے کھلتے تھے چنانچہ میر محمد کی بیوی کا میل ملاپ زیادہ تر تیسری منزل کے دوسرے مکینوں کے ساتھ تھا مگر اس میں رہنے والا اے ایس آئی تبدیل ہو کے ملتان چلا گیا تھا اور اب سے وہ فلیٹ خالی پڑا تھا۔ تیسری منزل پر میر محمد اکیلا تھا۔ دین محمد اور اکرام شیخ نے مجھے فلیٹ ہی میں چھوڑا اور اوپر چلے گئے۔ اوپر کسی دوسرے تھانے کے دو انسپکٹر رہتے تھے۔ وہ اپنے اپنے گھر میں ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ چنانچہ ان کے کانوں نے بھی کوئی غیر معمولی آواز نہیں سنی تھی۔ کسی کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ میر محمد غائب ہے۔

دس منٹ بعد وہ دونوں لوٹ آئے۔ "ابھی کل میری اس سے بات ہوئی تھی۔" دین محمد نے کہا۔

"کل بات ہوئی تھی تمھاری؟" شیخ نے چونک کر کہا۔ "کس وقت؟"

"صبح دس سوا دس بجے۔ صحیح وقت تو میں نے نوٹ نہیں کیا تھا۔ میں ڈیوٹی کے بعد تھانے گیا تھا۔" دین محمد بولا۔

"اور تمھارا بھائی وہاں موجود تھا؟" شیخ نے کہا۔ "کیا بات ہوئی تھی اس سے؟"

"اس نے فون کیا تھا۔" دین محمد نے کہا۔

"کہاں سے؟ اس کے گھر میں تو فون ہے نہیں اور تھانے میں وہ آیا نہیں تھا۔" شیخ نے کہا۔

"یہ میں نے اس سے نہیں پوچھا تھا کہ وہ کہاں سے بول رہا ہے۔ میرا خیال تھا کہ تھانے سے ہی بات کر رہا ہوگا۔" دین محمد بولا۔

"اور تم نے اپنے تھانے پہنچ کر فون ریسیو کیا تھا؟" شیخ نے کہا۔

"ہاں۔ مجھے ڈیوٹی کے بعد گھر جانے سے پہلے ایس پی صاحب کو رپورٹ دینی پڑتی ہے۔ ابھی میں نے رپورٹ نہیں دی تھی۔ صاحب کے پاس کچھ لوگ بیٹھے تھے۔ اتنی دیر میں ایک انسپکٹر نے آواز دے کر مجھے بلایا اور کہا میر محمد کا فون ہے۔"

"گویا میر محمد کو معلوم تھا کہ تم اس وقت ڈیوٹی ختم کر کے تھانے پہنچ گئے ہو گے۔" شیخ نے کہا۔

"یہ نتیجہ آپ نکال رہے ہیں۔" دین محمد نے کہا۔ "میر محمد کو میں نے اپنی ڈیوٹی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ ہمیں جب بھی بات کرنی ہوتی تھی ہم اپنے اپنے تھانے سے فون کر لیتے تھے۔ اس میں کوئی غیر معمولی یا نئی بات نہیں تھی۔"

"اچھا کل کوئی خاص بات کہی تھی اس نے؟" شیخ نے کہا۔

"دیکھیں جی۔ ویسے تو وہ بھائی تھا میرا۔ مجھ سے چھوٹا تھا۔" دین محمد نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "لیکن اس کی اور میری طبیعت میں بہت فرق تھا۔ اسے پیسے کی ہوس تھی۔ پیسے کی خاطر وہ بہت سے غلط کام بھی کرتا تھا۔ غلط کام تو سب ہی کرتے ہیں مگر اپنا دامن

بچا کے۔ زمانہ بڑا خراب آگیا ہے۔ ایک سبزی فروش کے وارث بھی ہائی کورٹ جا پہنچتے ہیں، وکیل کر لیتے ہیں اور پولیس کو عدالت میں گھسیٹ لیتے ہیں۔ پیسہ آگیا ہے سب کے ہاتھ میں اور وکیل صاحب کو صرف پیسہ چاہیے۔ ایک بار اس نے کسی ٹرک ڈرائیور کے ہاتھ مار دیا تھا۔ جی ٹی روڈ پر ساری ٹریفک رک گئی۔ ٹرک والوں کے ساتھ بس والے شامل ہو گئے اور انھوں نے سڑک بند کر دی۔ ایس ڈی ایم اور کمشنر صاحب کو معاملہ رفع دفع کرانا پڑا۔ میں اس کو بہت سمجھاتا رہا کہ دیکھ حد سے نہ بڑھ۔ تیرا ریکارڈ اچھا نہیں ہے۔ آئے دن شکایات موصول ہوتی ہیں۔ مگر اسے پروا نہیں تھی۔ اس نے اتنا پیسہ جمع کر لیا تھا کہ وہ کسی کی پروا نہیں کرتا تھا۔ بیوی کے نام سے گلبرگ کی ایک دو منزلہ کوٹھی دو سال پہلے خریدی تھی۔ ایک کنال کی کوٹھی ہے۔ اس کے دونوں حصے کرائے پر اٹھا رکھے تھے۔ دوسری ابھی بیٹے کے نام سے لی تھی۔ خاصی زرعی زمین بھی تھی — ساہیوال کی طرف۔ کنوں، مالٹے کے ایک باغ سے ہی پچاس ہزار سالانہ ملتے تھے۔ لیکن اس میں قناعت نہیں تھی۔ بیوی بھی روتی تھی اور مجھ سے کہتی تھی بھائیا جی! آپ ہی سمجھائیں انھیں۔ میری تو ایک نہیں سنتے۔ اتنا لالچ ٹھیک نہیں۔ کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو نوکری بھی جائے گی اور عزت بھی۔ کیا فائدہ ان کوٹھیوں کا اور اس پیسے کا جن کا مالک جیل میں پڑا ہو۔ ہمیں اتنا بہت ہے۔ وہ الٹا بیوی پر گرم ہوتا تھا کہ کیسی عورت ہے۔ جو کچھ میں کرتا ہوں اس کے بھلے کے لیے، بچوں کے بھلے کے لیے کرتا ہوں۔ جس روز ایسی ویسی بات کا خطرہ ہوگا میں استعفیٰ منہ پر مار دوں گا۔ کیا میں اس معمولی سی پینشن کی رقم کے لیے نوکری کر رہا ہوں جس سے میرا مہینے کا سگریٹ خرچ بھی پورا نہیں ہوتا۔ میں جب چاہوں اپنا بزنس شروع کر سکتا ہوں اور جتنی تنخواہ اب سرکار کے خزانے سے لے رہا ہوں اس سے زیادہ تنخواہ پر سیلز مین ملازم رکھ سکتا ہوں۔"

"یہ تو میں سمجھ گیا۔" شیخ نے بڑی احتیاط سے اس کو ٹوکا۔ "کل کیا بات ہوئی تھی؟"

"کل۔۔۔" دین محمد نے کہا۔ وہ کچھ تذبذب کا شکار تھا۔ "ایک بات ایسی تھی۔ قابلِ ذکر۔۔۔ اس نے کہا تھا، بھائیا جی! بس اب نوکری سے چھٹی اپنی۔ میں نے کہا۔ کیا مطلب؟ استعفیٰ دے دیا ہے کیا؟ اس نے کہا، بس دے دوں گا آج کل میں۔ بہت کر لی سب کی غلامی۔ میں پہلے تو یہی سمجھا کہ جس بات سے میں ڈرتا تھا وہی نہ ہوئی ہو۔ میں نے کہا۔ کوئی ایسی ویسی بات ہے تو مجھے بتاؤ۔ وہ ہنسنے لگا۔ بولا، بھائیا جی! آپ تو ہمیشہ ڈرتے ہی رہے۔ بات کیا ہونی ہے۔ بس جی بھر گیا ہے اپنا۔ میں نے کہا۔ پھر بھی کوئی بات تو ایسی ہوگی کہ آج تم نے اچانک فیصلہ کر لیا۔ وہ بولا، ہاں۔ ایک بڑا سودا کیا ہے۔ لاکھوں کا۔ بڑی پارٹی ہے۔ پانچ لاکھ دیتے تھے، میں نے دس پر مجبور کر دیا۔ میرے بہت پوچھنے پر بھی اس نے سودے کی نوعیت نہیں بتائی اور پارٹی کا نام نہیں لیا۔ ایک بات میں اس سے کہنا چاہتا تھا مگر نہیں کہہ سکا کہ دس لاکھ دینے والے معمولی لوگ نہیں ہوتے۔ ان سے بہت محتاط رہنا چاہیے۔ وہ نو لاکھ بچانے کا بندوبست بھی کر سکتے ہیں۔ ایک لاکھ دے کر کسی کو تمھارا پتہ صاف کرنے کے لیے بھیج سکتے ہیں۔ اس شہر میں ایسے بہت ہیں جو ایک لاکھ کی خاطر اپنے بھائی کے قتل سے گریز نہ کریں۔" وہ ذرا سی دیر کے لیے رُکا۔ "مجھے ایسا لگتا ہے کہ میرے اندیشے غلط نہیں تھے۔"

"یہ معاملہ تفتیش طلب ہے۔" شیخ نے کہا۔ "لیکن پہلے یہ معلوم کرو اس کے بیوی بچے کہاں ہیں۔ میرا مطلب ہے کہیں وہ تمھارے گھر تو نہیں گئے ہوئے ہیں۔"

دین محمد نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس کی بیوی کی میری بیوی سے کبھی نہیں بنی۔ حالانکہ دونوں سگی بہنیں ہیں۔"

"اس اختلاف کی وجہ؟" شیخ نے کہا۔

"عورت ذات کی فطرت۔" دین محمد نے تلخی سے کہا۔ "سگی بہنیں دو گھروں میں جا کے ایک دوسرے کی بھاوج بن جاتی ہیں تو بچپن کے رشتے کو فراموش کر دیتی ہیں۔ یہ دیکھنے لگتی ہیں کہ دوسری بہن کے گھر میں کیا ہے اور میرے گھر میں کیا نہیں ہے۔ حسد کی کوئی انتہا نہیں۔ سارا قصور میری بیوی کا ہے۔ ہر وقت روتی رہتی تھی کہ اپنے بھائیے کے گھر کو دیکھو اور اپنے گھر کو دیکھو۔ میری تو قسمت پھوٹ گئی آپ سے شادی کر کے۔ وہ چھوٹی بہن ہے اور اس کے گھر میں ہر چیز ہے۔ یہاں دھول اڑ رہی ہے۔ وہ عیش کر رہی ہے اور میں اپنے نصیب کو رو رہی ہوں۔ حالانکہ میر محمد کی بیوی اپنے شوہر کی کمائی سے خوش نہیں تھی۔ وہ میرے سامنے روتی تھی کہ مجھے یہ منحوس کمائی اور ایسی بھلائی نہیں چاہیے۔ معاملہ بالکل الٹا تھا۔ جسے سب میسر تھا وہ کہتی تھی مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ معلوم نہیں وہ میری بیوی ہوتی تو کیا کہتی۔ شاید وہی جو اب میری بیوی کہتی ہے۔ عورت کو نہ غربت راس آتی ہے، نہ دولت۔ بس اسی بات پر ان کی ایسی اَن بن تھی کہ ایک دوسرے سے بات تک کرنے کی روادار نہ تھیں۔"

"ممکن ہے وہ میکے گئی ہو۔" شیخ نے کہا۔

دین محمد نے پھر نفی میں سر ہلایا۔ "دونوں کا میکہ ایک تھا۔ اب نہیں ہے۔ ماں باپ مر گئے۔ بھائیوں نے مکان بیچ کر پیسہ بانٹ لیا۔ ایک دبئی چلا گیا۔ دوسرا کراچی گیا تھا۔ معلوم نہیں اب کہاں ہے۔"

"تمھیں ان کے ملنے جلنے والوں کے متعلق کچھ معلوم ہے؟" شیخ نے کہا۔

"شیخ صاحب! اس وقت رات کے دس بج رہے ہیں۔" دین محمد نے اپنی کلائی کی طرف دیکھا لیکن اُسے بیہوش کرنے والے اُس کی گھڑی بھی اتار کر لے گئے تھے۔ "جس عورت کا شوہر دو دن سے غائب ہو، وہ کہاں جائے گی اپنے دونوں بچوں کے ساتھ۔"

"شاید وہ یہی معلوم کرنے نکلی ہو۔ اسے معلوم ہوگا کہ میر محمد کہاں جاتا ہے۔ کس کس سے ملتا ہے۔" شیخ نے کہا۔

"یہ معلوم کرنے کے لیے اسے خود دھکے کھانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ تھانے میں کہلوا سکتی تھی کہ فلاں فلاں جگہ پر جا کے دیکھو۔" دین محمد نے کہا۔ "وہ خود گھر پر انتظار کرتی۔"

"اگر وہ کچھ دیر میں آجاتی ہے تو ٹھیک ہے۔" شیخ نے کہا۔ "ورنہ۔۔۔ ہمیں یہ فرض کرنا پڑے گا کہ میر محمد کی بیوی بھی غائب ہے اور وہ خیریت سے نہیں ہے۔ نو لاکھ بچانے والوں نے گھاٹے کا سودا نہیں کیا ہے۔ شاید انتخاب انھوں نے میر محمد پر چھوڑ دیا ہوگا کہ بیوی بچوں کی زندگی اور دس لاکھ میں سے جو قبول ہے رکھ لو۔"

دین محمد نے افسردگی سے سر ہلایا۔ "سوچ تو میں بھی یہی رہا تھا مگر مجھ میں ہمت نہیں تھی یہ بات کہنے کی۔"

"حقائق کا سامنا کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہنا چاہیے دین محمد!" شیخ نے کہا۔ "خدا کرے کہ ایسا نہ ہو۔ تمھیں بالکل اندازہ نہیں کہ یہ سب کسی نے کیوں کیا ہوگا؟ کس چیز کی تلاش تھی انھیں؟"

میں بہت دیر سے خاموش تھا اور یہ سوچ رہا تھا کہ میر محمد کس پارٹی کو پانچ لاکھ کے بجائے دس لاکھ دینے پر مجبور کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا؟ وہ کیا چیز تھی جس کے بدلے کوئی اتنی بڑی رقم دینے کے لیے تیار تھا۔ میری سمجھ میں ایک ہی جواب آتا تھا۔ میر محمد نے چوہدری دلاور اینڈ کمپنی سے ٹیپ ریکارڈر کے ایک اسپول کا سودا کرنے کی کوشش کی ہوگی جو اس نے ٹیپ ریکارڈر میں سے نکال لیا تھا اور غائب کر دیا تھا۔ اس پر عبدل کا وہ اعترافِ جرم اس کی اپنی آواز میں ریکارڈ ہوا تھا جو اس نے مرنے سے قبل کیا تھا۔ شیخ نے فون کو ٹیپ ریکارڈر سے جوڑ کر عبدل کی آواز کو محفوظ کر لیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ جب عبدل کا فون آیا تھا تو تھانے میں ایک ٹیپ ریکارڈر موجود تھا۔ گرانڈگ کا ماڈل TK-۴۷ جو ٹیلی فون کے پیغامات خود بخود ریکارڈ کر سکتا ہے۔ لیکن جب وہ عبدل کے قتل کی ابتدائی تفتیش کر کے لوٹا تھا تو یہ ٹیپ موجود نہیں تھا جس کے پیغام کو ایک محرر نے کاغذ پر نقل کیا تھا۔ اب وہ محرر بھی نہیں تھا۔ لیکن محرر نے بتایا تھا کہ ٹیپ کو میر محمد نے حشمت خان کی موجودگی میں نکالا تھا۔ محرر اور ٹیپ کی عدم موجودگی میں عبدل اور رشیدے کے قتل کا الزام مجھ پر آتا تھا۔ میر محمد پہلے سے چوہدری دلاور اینڈ کمپنی سے ملا ہوا تھا۔ اس نے مجھے گرفتار کرنے کے بعد کہا تھا کہ صاحب چاہتے ہیں تم میر شرافت علی کے قتل کا اعتراف کر لو۔ میں نے اصل قاتل یعنی مندری والے استاد پیڈرو کو تھانے میں اس کے پاس آتے دیکھا تھا مگر وہ صاف مکر گیا تھا۔ اب تو یہ بھی ثابت ہو گیا تھا کہ وہ جعلی اے ایس پی سراج تھا جو کوئی جعل ساز تھا۔

ان سب باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں تصور کر سکتا تھا کہ میر محمد نے اس ٹیپ اسپول کا سودا کرنے کی کوشش کی ہوگی۔ اس نے چوہدری دلاور یا ان کے کسی ساتھی سے کہا ہوگا کہ میرے پاس وہ چیز ہے جو تمھارے دشمن کو سیدھا تختۂ دار تک پہنچا سکتی ہے اور تمھارے سارے مسائل حل کر سکتی ہے۔ بولو کتنے میں سودا کرتے ہو۔ اور جب انھوں نے پانچ لاکھ سے زیادہ دینے سے انکار کیا ہوگا تو میر نے کہا ہوگا کہ اچھا میں یہ ٹیپ شیخ کے حوالے کر دیتا ہوں یا سکندر کو دے دیتا ہوں۔ اس کے بعد وہ دس لاکھ دینے پر بھی رضامند ہو گئے ہوں گے۔

اور اس کے بعد وہی ہوا ہوگا جو دلاور جیسے لوگ یہ قیاس آسکتے ہیں اور کر سکتے ہیں۔ انھوں نے طے کر لیا ہوگا سب حفاظتی وہ اسپول ٹیپ ان کے حوالے کرے گا اُدھر دوسری طرف، ہوگا کہ میں بیوی بچوں کو اٹھوا لیا جائے گا اور میر محمد کے سامنے دونوں چیزیں رکھ دی جائیں گی کہ یہ رہے دس لاکھ نقد اور یہ ہے تمھاری فیملی۔ ایک چیز لے جاؤ۔ دس لاکھ کی رقم کم تو نہیں ہوتی۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ سودا اگر طے ہو گیا تھا تو خانہ تلاشی کی نوبت کیوں آئی۔

اس سوال کے کئی جواب ممکن تھے۔ مثلاً میر محمد نے وعدہ کیا کہ وہ اسپول ٹیپ لے کر وقتِ مقررہ پر فلاں جگہ پہنچ جائے گا۔ میر محمد بھی کم ہوشیار نہیں تھا۔ اس نے احتیاط کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے کسی ویران جگہ پر ٹیپ اس کے حوالے نہیں کیا ہوگا۔ شاید اس نے کسی ریسٹورنٹ کا انتخاب کیا ہوگا اور وہ مسلح ہو کے بھی گیا ہوگا۔ اس نے قبل از وقت پہنچ کے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ اس کو رقم دینے اور ٹیپ لینے کون آتا ہے۔ وہ پولیس کی وردی میں گیا ہوگا اور اس نے ٹیپ کہیں رکھوا دیا ہوگا۔ مثلاً ریسٹورنٹ کے منیجر کے پاس یا اپنے کسی آدمی کے پاس جو قریب ہی مسلح بیٹھا ہوگا کہ سودا کرنے والوں کی نیت میں فتور کا احساس ہو یا وہ میر محمد کو ٹیپ سمیت لے جانے کے موڈ میں آئیں تو وہ بات کیے بغیر نکل جائے یا وہ لوگ ٹیپ چھین کر رقم ادا کیے بغیر جانا چاہیں تو نہ جا سکیں۔ میر محمد کا ساتھی ان کا راستہ روک لے۔ پھر وردی میں ملبوس ایک پولیس انسپکٹر ان سب کو ہینڈز اپ کرا کے لے آئے اور تھانے میں بند کر دے۔ شاید ایسی ہی کوئی وجہ تھی جس کے باعث سودا نہ ہو سکا مگر وہ لوگ میر محمد کو ٹیپ سمیت لے جانے

اُن کامیاب ہو گئے، میر محمد کی احتیاطی پیش بندی ناکام رہی، ایسی صورت میں میر محمد کے بجائے اس کی لاش ملنے کے امکانات بہت زیادہ تھے۔

یہ بھی ہوسکتا تھا کہ سودا کرنے والوں نے رقم ادا کر دی ہو مگر میر محمد کے دل میں بے ایمانی آگئی ہو اور اس نے جو ٹیپ دس لاکھ کے لیے کر دیا ہو، وہ اصل نہ ہو یا اس نے آدھی رقم پیشگی مانگی ہو اور اسے باقی آدھی نہ ملی ہو تو اس نے ٹیپ دینے سے انکار کر دیا ہو۔ تلاشی لینے پر اس کے پاس سے کچھ برآمد نہ ہوا ہو تو پانچ لاکھ ادا کر دینے والوں نے اسے اپنے پاس رکھا ہو اور اپنے آدمی اس کے گھر سے اسپول ٹیپ لانے کے لیے بھیجے ہوں۔ ٹیپ تو انھیں نہیں ملا مگر وہ جاتے جاتے اس کے بیوی بچوں کو لے گئے تاکہ ان کو تشدد کا نشانہ بنا کے میر سے ٹیپ حاصل کر سکیں۔ یا پھر سودا تو اسی طرح ہوا ہو جیسے ہونا چاہیے تھا مگر اس لاکھ ادا کرنے والوں نے اس بات کی ضمانت طلب کی ہو کہ دوسرا ٹیپ نہیں ریکارڈ کیا گیا ہے۔ میر محمد جیسے نے نقد رقم لینے سے گریز کیا ہوگا۔ اس نے محفوظ راستہ اختیار کیا ہوگا۔ مثلاً اس نے مختلف ناموں سے بیرر چیک لیے ہوں گے۔ بیوی کے نام سے پے آرڈر۔ یا اس نے کہا ہوگا کہ فلاں کوٹھی خرید کے کاغذات میری بیوی کے نام کرا دو۔ خود براہِ راست کچھ نہ لینے کے بہت سے طریقے ہیں۔ دس لاکھ دینے والوں کے لیے یہ رقم واپس لینا آسان نہیں تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ میر محمد کو قتل کر سکتے تھے اور اس کا خیال ہوگا کہ ٹیپ حاصل کر لینے کے بعد وہ اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ شاید اس نے دھمکی دے دی کہ مجھے یا میری فیملی کو نقصان پہنچانے کا خیال دل میں مت لانا۔ میرے پاس اس کی ایک نقل محفوظ ہے جو میری سب سے بڑی ضمانت ہے۔

چنانچہ دلاور اینڈ کمپنی نے میر محمد کو روک لیا کہ تمھاری ضمانت کی ایسی تیسی۔ ہم دیکھتے ہیں وہ دوسرا ٹیپ کہاں ہے۔ گھر ہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں وہ اصل ٹیپ کی نقل تلاش کر سکتے تھے اور میرے ارد گرد پھیلی ہوئی تباہی اس کا ثبوت تھی کہ وہ کسی اور مقصد سے نہیں آئے تھے۔ جواب طلب سوال صرف یہ تھا کہ کیا وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہے اور انھوں نے ٹیپ حاصل کر کے میر محمد کا منہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا؟ اگر وہ کامیاب نہیں ہوئے تھے تو یہ اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ اس وقت وہ میر محمد سے پوچھ رہے ہوں گے کہ دوسرا ٹیپ کہاں ہے؟ اور اس سے صحیح جواب حاصل کرنے کے لیے اس کے بیوی بچوں پر تشدد کا مؤثر حربہ استعمال کر رہے ہوں گے یا کر چکے ہوں گے۔

دس لاکھ اتنی آسانی سے بہرحال حاصل نہیں ہوتے اور اس دھندے میں اپنے ساتھ دوسروں کی زندگی کو داؤ پر لگا کے جُوا کھیلنا ہی پڑتا ہے۔ جُوئے میں جیت کا تناسب زیادہ رہتا ہے یا ہار کا۔ یہی آدمی کی بدبختی یا خوش قسمتی کہلاتی ہے۔ بقول دین محمد کے۔ نو لاکھ بچانے کے لیے ایک لاکھ میں کرائے کے قاتل حاصل کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔

اب اس سوال کا جواب وقت ہی دے سکتا ہے کہ میر محمد کا اور اس کے بیوی بچوں کا انجام کیا ہوا؟ چاہ کن را چاہ در پیش۔ میر محمد نے میرے لیے گڑھا کھودا تھا۔ کیا اس گڑھے میں وہ خود دفن ہوگا؟ اپنے بیوی، بچوں اور اپنے اس مستقبل سمیت جسے وہ ناجائز ذرائع سے حاصل ہونے والی دولت کے غرور میں اپنی قوتِ خرید میں سمجھتا تھا۔ اس کی گلبرگ کی دو منزلہ کوٹھی۔ وہ کوٹھی جو اس نے حال ہی میں خریدی تھی۔ اس کی زرعی زمین۔ لاکھوں کا بنک بیلنس۔ کسی بھی وقت استعفیٰ دے کر بزنس کرنے کا پروگرام۔ ان سب کا کیا ہوگا۔ (سکندر جب گیا دنیا سے دونوں ہاتھ خالی تھے۔) میر محمد کے گناہوں کی سزا اس کے خاندان کو بھی ملے گی؟ اس کے بنک بیلنس میں دس لاکھ کا اضافہ ہو جائے گا اور وہ بیوی بچوں کے ساتھ بخیر و عافیت لوٹ آئے گا یا...؟"

ایک کانسٹیبل کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ "آپ کا فون ہے صاحب!" اس نے اکرام شیخ کو مخاطب کر کے کہا۔ "کوئی صرف آپ سے بات کرنا چاہتا ہے۔ کہتا ہے یہ انتہائی اہم خبر ہے۔ کسی اخبار کا نمائندہ ہے۔"

"تم نے بتایا نہیں کہ میں اس وقت کسی اخباری نمائندے کے ساتھ سر نہیں کھپا سکتا۔" شیخ نے خفگی سے کہا۔ "خیر۔ دیکھو اس فلیٹ کو تالا لگاؤ۔ کسی چیز کو چھونا نہیں ہے اور یہاں سے ہلنا بھی نہیں ہے۔"

"یس سر!" کانسٹیبل نے مردہ آواز میں کہا۔ وہ پیغام دینے آیا تھا اور بیگار میں پکڑا گیا تھا۔

"میر صاحب کی فیملی کے علاوہ کوئی اندر نہیں جائے گا۔" شیخ نے کہا۔ "اور اگر وہ آجائیں تو ان سے بھی کہنا ہے کہ پہلے مجھ سے ملیں۔ کوئی اور آئے تو روک لو اور مجھے اطلاع کرو۔ زبردستی کرے تو گولی مار دو۔"

"گولی؟" کانسٹیبل نے بمشکل تمام کہا۔ "خالی ہاتھ سے...!"

شیخ نے اپنا خالی ریوالور اسے دے دیا۔ "یہ لو۔ مگر اس کا استعمال صرف ایک صورت میں کرنا ہے۔ جب کوئی تم پر حملہ کرے اور تم مقابلہ نہ کر سکو۔"

پریشان حال کانسٹیبل کو وہیں چھوڑ کے ہم واپس تھانے کی عمارت میں پہنچے۔ حشمت خان کی کرسی خالی دیکھ کر ایک خیال بجلی کی طرح میرے ذہن میں آیا۔ حشمت خان بھی تو جانتا ہے کہ میر نے اسپول نکالا تھا۔ شیخ نے چھپ کر ان کی باتیں سنی تھیں جن سے ثابت ہوتا تھا کہ وہ میر محمد کے ساتھ برابر کا شریکِ جرم ہے اور اس کا دستِ راست ہے۔ اسے یقیناً علم ہوگا کہ میر محمد کس سے سودا کر رہا ہے۔ اس سودے میں حشمت خان کا حصّہ بھی تو ہوگا لیکن وہ جا چکا تھا۔

اخباری نمائندہ بہت مستقل مزاج تھا کہ دس منٹ تک دوسری طرف ہولڈ کیے کھڑا رہا۔

"ہیلو! میں شیخ اکرام بول رہا ہوں۔ ایس آئی اکرام شیخ۔" شیخ نے ریسیور اٹھاتے ہی کہا۔ "ہاں ہاں بھائی میں ہی ڈیوٹی پر ہوں۔ ٹھیک ہے آپ کسی ذمے دار افسر سے بات کرنا چاہتے تھے۔ کہو کیا کہنا ہے۔ لاحول ولا قوۃ۔ ارے بھائی ایس ایچ او کوئی نہیں ہے یہاں۔ اس وقت سب کچھ میں ہی ہوں یہاں۔ مست قلندر؟ اچھا آپ کالم لکھتے ہیں اس نام سے؟ کون سے اخبار میں؟ جی نہیں۔ بدقسمتی ہے میری کہ اب تک آپ کا یہ کالم تو کیا اخبار تک میری نظروں سے نہیں گزرا۔ فرمائیے کیسے یاد کیا اس وقت۔ اطلاع دینی تھی تو دیجیے۔" شیخ کچھ دیر سنتا رہا اور دیکھتے دیکھتے اس کی صورت کا تاثر بدل گیا۔ اس کے ماتھے کی ہر شکن گہری ہو گئی اور تشویش کے آثار زیادہ نمایاں ہو گئے۔

"جی ہاں بہت غور سے سن رہا ہوں۔ آپ بولتے جائیے۔" اس نے درمیان میں صرف ایک بار کہا۔ مست قلندر صاحب، بہت مفصل گفتگو کے عادی معلوم ہوتے تھے اور کئی سہ کالمی خبروں کا پورا متن سنانے پر آمادہ تھے۔ شیخ نے صبر و تحمل کے ساتھ غیر ضروری بکواس بھی سنی اور پھر کہا۔ "قلندر صاحب! معاف کیجیے گا مست قلندر صاحب! آپ وہیں موجود رہیے۔ میں خود حاضر ہوتا ہوں۔ جی یہی دس پندرہ منٹ میں۔" اور ریسیور رکھ دیا۔

"دین محمد!" شیخ نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ "ایک واردات ہو گئی ہے۔ تم یہاں اپنی رپورٹ لکھواؤ۔ وہ سب کچھ جو تمھارے ساتھ ہوا۔ جو تم نے دیکھا۔ یا ایسا کرو۔ دونوں کیس الگ کر لو۔ پہلے صاحب کے گھر کی رپورٹ دو۔ پھر دوسری رپورٹ بھائی کی حیثیت سے لکھواؤ۔ میر محمد اور اس کی فیملی اور گھر کے متعلق۔ محرّر کہاں ہے؟"

"محرّر تو آج بھی نہیں آیا سر!" ایک نائک نے کہا۔

"کیا مصیبت ہے۔ تھانہ ہے کہ چنڈو خانہ۔ ایس ایچ او غائب۔ محرّر غائب۔ آج سارا دن رپورٹیں کس نے لکھیں؟"

"کسی نے بھی نہیں سر!" نائک نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "حشمت خان صاحب نے کہا جو رپورٹ لکھوانے آئے اسے بھگا دو۔ دو افراد چوری کی رپورٹ درج کرانے آئے تھے۔ ان میں سے ایک ضدی تھا۔ حشمت خان نے کہا محرّر ہے نہیں تو رپورٹ تمھارا باپ درج کرے گا۔ کل آنا۔ یہ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ بھی کسی اخبار کے رپورٹر کا بھائی تھا۔ جاتے جاتے دھمکی دے گیا کہ کل کا اخبار دیکھ لینا۔"

"اچھا بابا۔ وہ حشمت خان کا دردِ سر ہے۔ تم بیٹھ جاؤ محرّر کی جگہ۔" شیخ نے کہا۔ "اور دیکھو۔ میر محمد کے گھر کے دروازے پر ایک کانسٹیبل کھڑا ہے۔ اسے کوئی رائفل پہنچا دو اور اس سے میرا ریوالور لے آؤ۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "سکندر صاحب! بہتر ہوگا آج کی رات آپ کسی ہوٹل میں گزار لیں۔ فوری طور پر میں وہاں کسی گارڈ کو پوسٹ کرنے کا انتظام نہیں کر سکتا۔ کل صبح معلوم کروں گا اس دوسرے گارڈ خواجہ اکبر کا کیا ہوا۔ وہ ڈیوٹی پر کیوں نہیں پہنچا۔"

باہر آکے میں کچھ دیر سوچتا رہا کہ موجودہ حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے۔ شیخ کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے کسی ہوٹل میں قیام کرنا چاہیے یا گھر ہی میں رہنا چاہیے۔ گھر کے اندر بھی مناسب حفاظتی انتظامات کے ساتھ ایک رات تو گزار ہی سکتا ہوں۔ فائدہ یہ ہوگا کہ میں اسلام آباد فون کر کے سب کی خیریت دریافت کر سکوں گا۔

"یار سکندر!" شیخ نے اچانک میرے پاس آکے کہا۔ اس کا سانس کچھ پھولا ہوا تھا۔ "میرا اسکوٹر اسٹارٹ نہیں ہو رہا ہے۔ میں نے پلگ بھی صاف کر کے دیکھ لیا۔ معلوم نہیں کیا بات ہے۔ تم کو کوئی ضروری کام نہ ہو تو میرے ساتھ چلو۔"

"مجھے فرصت ہی فرصت ہے۔" میں نے کہا۔ "بیٹھو۔" میں نے گاڑی کا دوسرا دروازہ کھول دیا۔

"اسے چلتا دیکھ کر مجھے بہت حیرانی ہوتی ہے۔" اس نے بیٹھنے کے بعد کہا۔ "اور اب مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ راستے میں ہی اس کی باڈی تو الگ ہو کے بکھر جائے گی، تم اسٹیئرنگ تھامے اور میں اس سیٹ پر چار پہیوں کے دوڑتے ہوئے چیسس پر دھرے رہ جائیں گے۔"

"اس شاندار گاڑی کی اس حالت کا ذمّے دار میں ہوں۔" میں نے اسے بڑے فخر سے مطلع کیا۔

"دیکھنے میں یہ اب بھی فاکس ویگن کی طرح لگتی ہے۔" شیخ نے کہا۔ "بس معلوم ہوتا ہے بحرِ ظلمات میں دوڑتی رہی ہے۔"

"یہ اب بھی فاکس ویگن کی طرح دوڑتی ہے اور بحرِ ظلمات کیا ہے۔ ماؤنٹ ایورسٹ یا بحر الکاہل دونوں پر سے گزر سکتی ہے۔" جب گاڑی نے زبردست گرج کے ساتھ دوڑنا شروع کیا تو شیخ نے اپنے الفاظ واپس لے لیے۔ گاڑی کی دل آزاری کے خیال سے۔

"فون کس مست قلندر کا تھا؟" میں نے کہا۔ "واردات

کیا ہوئی ہے؟"

"میں دین محمد کے سامنے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔" شیخ نے کہا۔ "وہ کسی روزنامہ میں کالم لکھتا ہے۔ کالم کا عنوان ہے 'دمادم' چنانچہ اسے مست قلندر بہت موزوں ہے۔ آج شام ایک بچہ وہاں پہنچا۔ تقریباً سات سال کا۔ اس کے ساتھ دوسرا بچہ تھا جو دو سال چھوٹا تھا۔ انھوں نے اندر آکے ایڈیٹر کو پوچھا۔ دونوں بہت ڈرے ہوئے تھے اس وقت تک اخبار کا عملہ نہیں آیا تھا۔ مست قلندر صاحب اپنا کالم لکھتے لکھتے پان لینے باہر نکلے تھے کہ وہ بچے مل گئے۔ انھیں بچوں کا آنا کچھ عجیب سا لگا۔ پہلا خیال انھیں یہ آیا کہ بچے گھر سے بھاگے ہیں یا اغوا کرنے والے لوگوں سے بچ کے۔ انھیں تخریب کاروں کا خیال بھی آیا لیکن بچوں کی ظاہری حالت ویسی نہیں تھی جیسی تخریب کار کیمپ سے بھاگنے والوں کی ہوتی ہے سانھوں نے کہہ دیا کہ کیا بات ہے بیٹا! میں ایڈیٹر ہوں۔ بڑے بچے نے کہا۔ ہمیں امی نے کہا تھا کہ سیدھے اخبار کے دفتر جانا اور ایڈیٹر کے سوا کسی سے بات نہ کرنا۔ قلندر صاحب مزید حیران ہوئے۔ انھوں نے پوچھا کہ تمھاری امی کون ہیں اور انھوں نے کیوں بھیجا ہے تمھیں یہاں۔ وہ بچوں کو اپنے کمرے میں لے گئے اور انھیں خاصی تسلی دی کہ ڈرنے کی بالکل کوئی بات نہیں۔ یہاں کوئی نہیں آسکتا۔ تم پوری بات بتاؤ۔ اس پر بڑے بچے نے کہا کہ ان کے والد پولیس میں ہیں اور ان کا نام میر محمد ہے۔"

میں ایسے چونکا کہ گاڑی دائیں سے بائیں لہرائی۔ "میر محمد کے بچے؟ اخبار کے دفتر میں؟"

"ہاں۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے والد کا کل سے کوئی پتا نہیں۔" شیخ نے اپنی بات جاری رکھی۔ "ہماری امی بہت پریشان تھیں۔ آج شام کو کسی نے ہمارے دروازے پر دستک دی۔ ہماری امی نے دروازہ کھولا تو انھیں دو اجنبی نظر آئے۔ انھوں نے اندر آتے ہی ہماری امی کو دھکا دیا اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ پھر انھوں نے گھر کی ہر چیز توڑ پھوڑ ڈالی اور ہماری امی کو مارا۔ وہ بیہوش ہو کے گر گئیں اور وہ اپنا کام کرتے رہے لیکن درمیان میں امی کو ہوش آگیا۔ انھوں نے بڑے لڑکے کو اشارے سے بلایا اور سرگوشی میں کہا کہ نیچے بھاگو۔ سب سے نیچے والے فلیٹ میں۔ ان سے کہنا کہ ابا جان نے جو چیز دکھولائی تھی، وہ دے دیں۔ وہ موقع ملنے کے انتظار میں رہے۔ ماں نے انھیں یہ بھی سمجھا دیا کہ وہ چیز لے کر اوپر نہ آئیں۔ سیدھے اخبار کے دفتر جائیں۔ گھر کی تلاشی لینے والے یہ سمجھتے رہے کہ عورت بیہوش پڑی ہے اور دونوں بچے اس سے لگے سہمے بیٹھے ہیں۔ پانچ اور سات سال کے بچوں کو انھوں نے قطعی بے ضرر سمجھتے ہوئے اہمیت نہیں دی۔ جب وہ اندر کے تیسرے کمرے کی خانہ تلاشی لے رہے تھے تو ماں ہمت کر کے اٹھی۔ خاموشی سے دبے پاؤں دروازے تک گئی اور اس نے دونوں بچوں کو باہر نکال دیا۔ پھر وہ واپس آکے اپنی جگہ لیٹ گئی۔ یہاں سے دائیں طرف..."

"اور وہ بچے، وہ چیز لے کر مست قلندر کے پاس پہنچ گئے؟" میں نے کہا اور گاڑی موڑ دی۔

"ہاں۔ انھیں معلوم نہیں تھا کہ دفتر کہاں ہے اور کتنی دور ہے۔" شیخ نے کہا۔ "تھانے سے کچھ دور آکے انھوں نے ایک شخص سے پوچھا۔ وہ شخص گاڑی سے اتر کے سگریٹ لینے کے بعد پھر گاڑی میں بیٹھنے ہی والا تھا۔ بچوں نے اس سے پوچھا کہ اخبار 'ہم نوا' کا دفتر کہاں ہے؟ وہ شخص بھی حیران ہوا اور اس نے بھی پوچھا کہ تمھیں وہاں کیا کام ہے؟ بڑے بچے نے صاف کہہ دیا کہ ہماری امی نے کہا ہے کہ ایڈیٹر کے پاس چلے جاؤ۔ غالباً بچوں نے اسے بھی ساری بات بتادی۔ وہ بچوں کو دفتر کے دروازے پر چھوڑ کے نکل گیا۔ وہ کسی چکر میں پڑنا نہیں چاہتا تھا... بائیں طرف؟"

"اور وہ چیز کیا تھی جو بچے لے کر گئے تھے؟" میں نے کہا۔

"وہ ایک پیکٹ تھا۔ مست قلندر صاحب نے اس کو کھولا تو اس میں سے ایک اسپول ٹائپ ٹیپ نکلا۔" شیخ نے کہا۔

میں بھونچکا رہ گیا۔ "وہ اسپول! وہ میر محمد نے...!"

"ہاں۔ اس نے بیوی کو دیا تھا اور شاید یہی ہدایات بھی دی تھیں جو اس نے بچوں کو دیں۔ بچوں نے کمال ہمت کا ثبوت دیا... مست قلندر صاحب نے ٹیپ کو سننے کے لیے کہیں سے ٹیپ ریکارڈر منگوایا۔" شیخ نے کہا۔ "اس وقت تک اخبار کا عملہ بھی آچکا تھا مگر مست قلندر صاحب نے ایڈیٹر کے سوا کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ انھوں نے ٹیپ سنا۔ وہ پوری بات تو نہیں سمجھے لیکن ایڈیٹر نے مختلف تھانوں میں فون کیا۔ یہاں... بس یہاں روک لو۔"

میں نے کار روکی اور شیخ کے ساتھ اتر گیا۔ "جگہ تو یہی بتائی تھی۔" وہ زیر لب بولا۔ پھر وہ نیچے اتر گیا۔ میں اس کے ساتھ رہا۔ اچانک شیخ کی ٹارچ کی روشنی ایک گڑھے میں گئی۔

گڑھا

زمین کھودنے سے بنا تھا اور زمین کی مٹی کسی نے اپنے گھر کی بنیادیں اونچی رکھنے میں استعمال کر لی تھی۔ گڑھا بالکل گول نہیں تھا۔ بیضوی تھا لیکن کنارے گولائی میں تھے اور اس کی زیادہ سے زیادہ چوڑائی چھ سات فٹ اور لمبائی دس بارہ فٹ کے درمیان تھی۔ کناروں کے مقابلے میں درمیان کا حصہ زیادہ گہرا تھا لیکن یہ گہرائی کہیں بھی یکساں نہیں تھی۔ اردگرد جھاڑیاں تھیں جو بے مصرف زمین پر کسی کی محنت کے بغیر محض سورج سے روشنی، ابر باراں سے نمی اور مٹی

سے نمو پاکے اُگی تھیں۔ بالکل ان بچوں کی طرح جن کو کسی عورت کی ممتا اور کسی مرد سے باپ کی شفقت، کسی کی محبت اور توجہ نہیں ملتی لیکن ان کا وجود گلیوں کی خاک چھان کے اور روٹی کے ٹکڑے چن کر، غربت اور محرومی کے سائے میں کسی مقصد حیات کے بغیر پلتا اور بڑھتا ہے۔ حالانکہ دنیا کو ان کی اور انھیں دنیا کی پروا نہیں ہوتی۔

"یہاں کیا ہے؟" میں نے شیخ کے متفکر چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ ٹارچ کی روشنی کے دائرے کو اس گڑھے میں ہر طرف لے جاکر دیکھ چکا تھا اور بظاہر اس کی تلاش لاحاصل رہی تھی۔

"جگہ تو یہی ہے یار!" اس نے میرے سوال کا جواب یوں دیا جیسے وہ مجھ سے زیادہ خود سے مخاطب ہے۔

"کیا تھا یہاں؟" میں نے کہا۔

"پام کا ایک درخت۔" وہ بولا۔ "وہ درخت بھی ہے اور قریب میں اور کوئی ایسی گہری جگہ بھی نہیں ہے۔" اس نے ٹارچ کی روشنی سے اردگرد کے ماحول کا جائزہ لیا۔ "یہ مذاق بھی نہیں ہو سکتا۔ اطلاع دینے والا جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔"

"تم اپنے آپ سے ہمکلام ہو اور ناچیز کی عقل دنگ ہے۔" میں نے کہا۔

"عقل تو میری بھی دنگ ہے۔" شیخ نے کہا۔ "تمھارے آنے سے پہلے کسی نے فون کیا تھا۔ اس نے اپنا نام پتا کچھ نہیں بتایا تھا۔ صرف یہ کہا تھا کہ وہ موٹر سائیکل پر اس راستے سے گزر رہا تھا کہ ایک گاڑی مخالف سمت سے آکے یہاں رکی۔ اس میں سے دو آدمی ایک بوری اٹھائے اترے اور بوری کو گھسیٹتے ہوئے سڑک سے نیچے اتر گئے۔ موٹر سائیکل والے نے ہیڈ لائٹ کی روشنی میں یہ منظر صاف دیکھا تھا لیکن روشنی سڑک پر تھی اس لیے وہ ان لوگوں کے چہرے نہیں دیکھ سکا تھا۔ اسے دال میں کچھ کالا نظر آیا۔ وہ عین اسی جگہ تو نہیں رکا مگر گزرتے گزرتے اس نے دیکھ لیا کہ کار سے اترنے والوں نے بوری کو گڑھے میں ڈال دیا ہے۔ موٹر سائیکل والا تقریباً پچاس گز دور جاکے کھڑا ہو گیا۔ انجن بند کر کے اور لائٹس آف کر کے اس نے اپنی موٹر سائیکل کا اسپارک پلگ کو نکالا اور اسے صاف کرنے کے بہانے پیچھے دیکھنے لگا۔ وہ دونوں جو بوری پھینکنے گئے تھے، کار کے پچھلے دروازے کو کھول کر بیٹھ گئے جس سے اس نے اندازہ کیا کہ کم سے کم ایک شخص آگے ڈرائیور کی سیٹ پر اسٹیئرنگ سنبھالے بھی بیٹھا تھا۔"

"یہ بات اس نے کار کے قریب سے گزرتے وقت نوٹ نہیں کی تھی؟" میں نے کہا۔

"میں نے اس سے بالکل یہی سوال کیا تھا۔" شیخ نے کہا۔ "اور اس نے بہت معقول جواب دیا۔ اس نے کہا کہ وہ بائیں جانب متوجہ تھا۔ کار دائیں جانب تھی۔ سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی کار قابل غور نہیں ہوتی۔ مگر رات کے اندھیرے میں دو افراد بوری میں کچھ بھر کے پھینکنے جا رہے ہوں تو یہ غیر معمولی بات لگتی ہے۔ بوری کا وزن کافی تھا کیونکہ اسے گھسیٹنے میں انھیں خاصا زور صرف کرنا پڑ رہا تھا۔ اس ویران اور غیر آباد علاقے میں کوئی کیا پھینکنے آئے گا، اسی خیال نے موٹر سائیکل والے کو شبہے میں مبتلا کر دیا۔ اس نے اعتراف کیا کہ بہت زیادہ جاسوسی ناول پڑھنے اور جرائم پر مبنی فلمیں دیکھنے کی وجہ سے اس کا ذہن فوراً اس امکان کی طرف گیا تھا کہ بوری میں لاش ہو سکتی ہے جسے قاتل جائے واردات سے بہت دور پھینکنے لائے ہوں گے۔ وہ خود بھی اس جگہ سے بہت دور رہتے ہوں گے اور ان کا بزنس یا ان کا ہیڈ کوارٹر بھی اتنی دور ہو گا کہ اس لاش کو دریافت کے بعد بھی کوئی ان سے منسوب نہ کر سکے۔ اس نے بتایا کہ گاڑی کی لائٹس آف تھیں مگر انجن آن تھا۔ تاہم پچاس گز کے فاصلے سے وہ کار کا رنگ نہیں دیکھ سکا جو سیاہ، گہرا نیلا یا گہرا سرخ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ نمبر نوٹ کرنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ لائٹ آن ہوتی تب بھی پچاس گز کے فاصلے سے نہ وہ حروف پڑھ سکتا تھا اور نہ اعداد۔ وہ کار کی ظاہری صورت سے یہ بھی نہیں بتا سکتا کہ وہ کوئی جاپانی گاڑی ٹویوٹا، مزدا یا ڈاٹسن تھی یا فورڈ یا اوپل چنانچہ یہ کیسے بتائے کہ ماڈل کس سال کا تھا۔ جب گاڑی چلی گئی تو وہ موٹر سائیکل وہیں چھوڑ کے پیدل واپس گیا تاکہ وہ گاڑی آگے جاکے لوٹ آئے تو وہ فوراً کسی جھاڑی کے پیچھے چھپ سکے۔ وہ بہت ڈرا ہوا تھا۔ گڑھے کے قریب جاکے اس نے اپنا سگریٹ لائٹر جلایا اور اس کی برائے نام روشنی میں بوری کو دیکھ لیا۔ اس نے پورے یقین کے ساتھ بتایا کہ بوری پر خون کے داغ تھے۔ اوپر سے یہ داغ صاف نظر نہیں آتے تھے۔ چنانچہ ادھر اُدھر دیکھ کے اور 'جل تو جلال تو' کا ورد کرتا ہوا وہ نیچے اتر گیا۔ بوری کو چھو کر دیکھنے سے ہی وہ سمجھ گیا کہ اس کے شکوک غلط نہیں تھے۔ اس میں واقعی کوئی آدمی تھا۔ زندہ یا مردہ۔ اس نے پہلے بھاگنے کی سوچی پھر اسے خیال آیا کہ کہیں وہ شخص زندہ ہی نہ ہو جو بوری میں بند ہے۔ خوف پر انسانی ہمدردی کا جذبہ غالب آگیا اور اس نے نتائج کی پروا کیے بغیر بوری کا منہ کھولا اور خاصی محنت سے اس شخص کا چہرہ دیکھنے میں کامیاب ہو گیا۔ شناخت کرنا تو اس کے لیے ناممکن تھا مگر اس نے کھلی آنکھیں اور مسخ شدہ صورت دیکھتے ہی سمجھ لیا کہ وہ مر چکا ہے۔ وہ بے تحاشا بھاگا اور اپنی موٹر سائیکل لے کر ہوا ہو گیا۔ فون اس نے جی پی او سے کیا تھا۔"

"جی پی او سے تمھیں کیوں؟" میں نے کہا "کیا وہ تمھیں جانتا تھا؟"

"کمال ہے۔ تم تو مجھ سے وہی سوالات کر رہے ہو جو میں نے اس سے کیے تھے۔" شیخ نے کہا "اس نے کہا کہ مجھے نہیں معلوم' اس علاقے کا تھانہ کون سا ہے جہاں وہ لاش پڑی ہے۔ تھانے والوں کی حدود عجیب ہوتی ہیں اور اس علاقے میں رہنے والوں کو کیا بعض اوقات خود تھانے والے نہیں جانتے کہ ان کی تھانیداری کی سرحد کہاں سے کہاں تک ہے۔ اس نے تو ٹیلی فون ڈائرکٹری دیکھی۔ ایک نمبر ملایا۔ وہ ملا نہیں دوسرا ملایا تو کسی نے ریسیور ہی نہیں اٹھایا۔ تیسری جگہ میں نے اٹھا لیا۔ وہ خود تھانے میں قدم رکھنے سے بہتر سمجھتا تھا کہ آدم خور شیر کے پنجرے میں داخل ہو جائے جہاں موت سے فوراً اور باعزت طور پر تشدد کا عذاب جھیلے بغیر ملاقات ہو سکتی ہے۔ کیسا افسوسناک تاثر قائم ہو گیا ہے پبلک کے ذہن میں اور کسی کو پروا بھی نہیں۔ خیر' اتفاق یہ کہ وہ جگہ ہمارے تھانے کی حدود میں تھی۔ میں نے حشمت خان سے کہا کہ وہ موٹر سائیکل پر گزرتے گزرتے دیکھ لے اور یہ کسی کی شرارت نہ ہو تو اپنے گھر جا کے فون کر دے مگر اسے کیا کہا جائے؟ بے حسی یا حرام خوری؟ اس نے کہا کہ شیخ صاحب! اتنی تنخواہ میں تو بس اتنی ہی نوکری ہو سکتی ہے۔ اپنی ڈیوٹی کا وقت ختم ہو چکا ہے۔"

"حرام خور" میں نے کہا "تنخواہ اور ڈیوٹی کے ٹائم کی بات کرتا ہے' اس آمدنی کی بات نہیں کرتا جو اسی ڈیوٹی کے ٹائم میں رشوت سے ہوتی ہے۔ کچھ ملنے کی امید ہوتی نا تو سر کے بل جاتا۔ خواہ مخواہ بیٹھا رہا تھانے میں۔"

"یہ تو آف دی ریکارڈ بیچ ہے۔" شیخ نے کہا "اس کے انکار کے بعد میں کیا کرتا۔ ادھر میر محمد نہیں ہے۔ سابق ایس ایچ او صاحب معطل بیٹھے ہیں۔ افسر دو ہی رہ گئے ہیں۔ میں اور حشمت خان۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ خود جاؤں یا کسی کانسٹیبل کو بھیجوں' تھانے میں ایک ڈیوٹی آفیسر بھی تو ہونا چاہیے۔ اتنے میں تم آ گئے پھر وہ میر محمد کا معاملہ اٹھ کھڑا ہوا۔ تم تو گواہ ہو۔ ابھی اس سے فراغت بھی نہیں ہوئی تھی کہ مست قلندر صاحب کا فون آ گیا۔ اب یہاں دیکھ لو کچھ بھی نہیں ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ اخبار کے آفس جاتے ہوئے ایک نظر ڈال لوں۔"

"چلو اب یہاں کچھ نہیں تو وقت ضائع کرنے سے کیا حاصل۔" میں نے کہا۔

"نہیں سکندر! میرے دل یا میری چھٹی حس کا تقاضا ہے کہ میں نیچے اتر کے دیکھوں۔ اس آدمی کا لہجہ اس کے سچ کا گواہ تھا۔ جو شرارت میں فون کرتے ہیں' اتنی سنجیدگی سے بات نہیں کرتے' اتنی تفصیلات نہیں بتاتے اور اتنا منطقی تجزیہ نہیں کرتے۔"

"چلو تو نیچے بھی دیکھ لیتے ہیں۔" میں نے کہا "سچ کے آثار ہوں گے تو نظر بھی آ جائیں گے۔"

میں اور اکرام شیخ ایک ہی ٹارچ کی محدود روشنی کے دائرے میں ساتھ ساتھ اس بیضوی گڑھے کے کنارے سے اترنے لگے۔ نشیب کی جانب ناہموار زمین کی مٹی میں کنکر بھی تھے۔ چنانچہ ایک بار میں پھسلتے پھسلتے بچا۔ پانچ منٹ میں ہم سات آٹھ فٹ نیچے پہنچ گئے۔ اب ہمیں سڑک پر سے کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ٹارچ کی روشنی میں زمین کا رنگ صاف نظر آ رہا تھا۔ ہم نے گہرائی کے محیط میں کنارے کے ساتھ چلنا شروع کیا۔

پھر شیخ اور میں ایک ساتھ رک گئے۔ مٹی کے خاکی رنگ میں سُرخی کا ایک دھبہ الگ نظر آ رہا تھا۔ اس دھبے سے اوپر کی طرف دیکھنے پر ہمیں وہ نشانات بھی نظر آئے جو کسی بوری کو گھسیٹنے سے ہی بن سکتے تھے۔

"رپورٹ بالکل درست تھی۔" شیخ نے کہا "مگر وہ بوری اور لاش کہاں گئی؟"

"کہیں وہ لوگ بعد میں اسے اٹھا کے تو نہیں لے گئے۔" میں نے کہا "انھیں خیال آیا ہو کہ... کہ وہ لاش کو دفنا دیتے تو بہتر تھا۔ کہیں کسی کو سراغ ہی نہ ملے تو اچھا ہے۔"

"ہو سکتا ہے کہ انھوں نے موٹر سائیکل والے کو رک کر جائزہ لیتے دیکھ لیا ہو جس کا موٹر سائیکل والے کو اندازہ نہ ہو سکا ہو۔" شیخ نے کہا "وہ اسے دیکھتے رہے اور جب وہ چلا گیا۔ تو وہ لوٹ کر آئے اور لاش لے گئے۔" میں نے شیخ سے اتفاق کیا۔ اس ناکامی پر وہ خاصا مایوس نظر آتا تھا۔ ہم دونوں نے اس لکیر کے ساتھ ساتھ اوپر چڑھنا شروع کیا جو بوری کے گھسیٹے جانے کا ثبوت فراہم کرتی تھی۔

شیخ اپنی ٹارچ سے اردگرد کی بنجر زمین اور خود رو نباتات پر بھی روشنی ڈالتا جا رہا تھا۔ پام کا واحد درخت اب ہمارے دائیں ہاتھ پر رہ گیا تھا۔ اچانک شیخ رک گیا۔

"یہ کیا ہے سکندر؟" اس نے روشنی کو ایک جگہ مرتکز کر دیا تھا۔ دس قدم دور سے بھی وہ جگہ تازہ کھدی ہوئی نظر آتی تھی جواب دینے کے بجائے میں شیخ کے ساتھ ہو لیا۔

"غالباً تمھارا خیال درست تھا۔" میں نے کہا "انھوں نے موٹر سائیکل والے کی حرکات و سکنات پر نظر رکھی تھی۔ وہ لوٹ کر آئے ہوں گے مگر موٹر سائیکل والا انھیں نہیں دیکھ سکا گڑھے کے اندر اتر جانے کے بعد سڑک تو نظر نہیں آتی۔ وہ ہیڈ لائٹس بجھا کے آئے ہوں گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انھوں نے موٹر سائیکل والے کو اس وقت دیکھا ہو جب وہ گڑھے سے نکل کر بھاگا تھا۔ اب یا تو وہ موٹر سائیکل کا پیچھا کرتے جو ذرا مشکل کام ہے۔ موٹر سائیکل گلی کوچوں میں بھی غائب ہو جاتی ہے پھر یہ کہ گھی سیدھی انگلیوں سے نکلتا ہو تو انگلیاں ٹیڑھی کیوں کی جائیں۔ ایک اور قتل کرنے سے زیادہ آسان یہ تھا کہ لاش کو اس جگہ سے ہٹا دیا جائے۔"

"یہ تو صاف ظاہر ہے کہ یہاں زمین کھود کے برابر کی گئی ہے۔" شیخ نے کہا "لیکن اب میرے لیے خالی ہاتھوں زمین کھودنا تو ممکن نہیں۔ ویسے بھی عجلت غیر ضروری ہے۔ اس جگہ کا علم کسے ہے؟ میں بعد میں دوسرے لوگوں کو بھیج سکتا ہوں کہ لاش ہے تو نکال لیں۔ ہم مست قلندر صاحب کی طرف چلتے ہیں۔"

مست قلندر صاحب دیکھنے کی چیز تھے۔ اتنا مزہ شاید ان کے کالم میں نہیں نظر آتا ہو گا جتنا ان کی شخصیت میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ انھوں نے سائز سے بہت بڑی شیروانی اور سائز سے بہت چھوٹی شلوار پہن رکھی تھی جسے شرعی کہا جا سکتا تھا۔ شلوار کا رنگ نیلا تھا اور شیروانی کبھی کریم کلر کی ہو گی۔ مسلسل استعمال اور سالانہ ڈرائی کلیننگ کے باعث اس کا رنگ کچھ سرمئی سا ہو گیا تھا۔ یہ طے کرنا مشکل تھا کہ شیروانی کے نیچے قمیص ہے یا نہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے سر پر پیالے کی طرح رکھی ہوئی ٹوپی کے نیچے بالوں کی موجودگی کا پتا چلانا مشکل تھا۔ حالانکہ کپڑے کی ٹوپی اس ہیر ٹانک میں تر تھی جو انھوں نے وافر مقدار میں چپڑا تھا۔ ان کی منحنی آواز ان کی جانِ ناتواں سے بہت میچ کرتی تھی۔

"ارے میاں انعام شیخ صاحب! کمال کر دیا یعنی کہ..." انھوں نے کسی تعارف کے بغیر ہمیں پہچان لیا۔

"اکرام شیخ۔" شیخ نے ریکارڈ کی درستی کے لیے کہا۔

"اماں کیا۔ لاحول ولا قوۃ۔ چھوڑو انعام و اکرام' بس شیخ۔" انھوں نے ایک چُرمُر میلے رومال میں اپنی ناک کی برآمدات کو بڑی پھرتی سے منتقل کیا "ہم تو بس سوکھ گئے انتظار میں۔ طولِ شب فراق کیا چیز ہے۔ اب تو کالم چلا گیا۔ مگر کل... کل کا موضوع ہے پولیس کی تاخیر پسندی اور... خیر شیخ جی! بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے۔"

"ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا۔" میں نے عرض کی۔

"واہ سبحان اللہ۔ گویا آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا۔ کون تھا وہ؟" انھوں نے پھڑک کر کہا "یا تھی؟"

"وہ میں بعد میں عرض کروں گا۔ پہلے عرضِ مدعا۔ وہ بچے اور ٹیپ کہاں ہیں؟" شیخ نے کہا۔

"ٹیپ کے بچے... میرا مطلب ہے ٹیپ اور بچے دونوں بلکہ تینوں خیر سے ہیں۔ الحمدللہ۔" مست قلندر صاحب نے فرمایا۔ "مگر میاں شیخ جی! یہ اسٹوری کیا ہے؟" انھوں نے رازدارانہ طور پر آگے جھک کر سرگوشی میں کہا۔

"اسٹوری آپ کی۔" شیخ نے مسکرا کے کہا "پہلے یہ بتائیے ٹیپ اور بچے کہاں محفوظ ہیں؟ میرا مطلب ہے کہ ممکن ہے آپ کے نقطۂ نظر سے وہ محفوظ ہوں لیکن درحقیقت ایسا نہ ہو۔"

"شیخ صاحب سے رسم و راہ نہ کی۔ شکر ہے زندگی تباہ نہ کی۔" انھوں نے کہا "ورنہ میاں ہم بھی ہو جاتے گاؤدی۔ گویا افلاطون ایک آپ ہی ہیں۔ ہمارا نقطۂ نظر تو یعنی کہ ایسا ہی ہے جیسا ہمارا کالم۔ اور کالم آپ نے کبھی پڑھا نہیں ہمارا۔ حضرتِ شیخ! بچے ہیں اس عاجز کے یتیم خانے میں۔" وہ ہنسے "کیا سمجھے؟ میاں ہم یتیم تو ہمارا گھر بھلا کیا ہوا۔ اور وہاں تو ایک اژدھام ہے۔ چھ انچ سے چھ فٹ تک کے بچے حاضر اسٹاک سے دستیاب ہیں۔ وہ بھی انھی میں گھل مل گئے ہوں گے۔ کوئی کیسے ڈھونڈے گا انھیں؟ چراغِ رخِ زیبا لے کر؟ اب رہا ٹیپ۔ تو وہ یہاں ہے۔" انھوں نے عقیدت سے سر جھکا کے ٹوپی اتاری اور اس کی تیل سے چمکتی سطح کے بے بال ہونے کا راز افشا کر دیا "مگر یہی نہیں حضرت! اصل ٹیپ تو گیا لائبریری میں۔ گویا پرانی خبروں کی قبروں میں۔ نقل حاضر ہے۔" انھوں نے کھٹ سے الماری کھولی اور ٹیپ ہمارے سامنے رکھ دیا۔

"آپ نے تو کمال کر دیا!" شیخ نے کچھ دیر بعد تعریفی لہجے میں کہا "میں معافی چاہتا ہوں اعتماد نہ کرنے پر۔ یہ نقل میں اپنے ساتھ لے جاتا ہوں۔ باقی معاملات کو جوں کا توں رکھیے فی الحال۔ ابھی یہ عقدہ پوری طرح وا نہیں ہوا ہے۔ اس لیے میں اسٹوری آپ کو اس وقت د[illegible] کا جب واقعات کی سب کڑیاں آپس میں مل جائیں گی۔ اجازت ہو تو چند سوالات کر لوں؟"

"اجازت؟ میاں تھانیدار بادشاہ! کیوں شرمندہ کرتے ہو اپنے نام کو۔ تم اور اجازت؟ انکار کر کے ہمیں تھانے نہیں جانا ہے۔" مست قلندر صاحب نے ٹوپی کو پھر سر پر چپکا کے کہا۔

"آپ نے ان بچوں سے پوچھا کہ انھیں ماں نے خاص طور سے آپ کے اخبار کے دفتر کے لیے ہی تاکید کیوں کی تھی؟" شیخ نے ان کے طنز کو پی کر کہا "کون تھا جس پر ان کی ماں کو اتنا اعتماد تھا۔ میرا مطلب ہے مقصد صرف کسی اخبار کے دفتر بھیجنا ہوتا تو..."

"ہاں ہاں کہیے کہیے کہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے۔" قلندر صاحب نے چمک کر کہا "کون پوچھتا ہے اس اخبار کو جو صدائے وقت ہے۔ امروز ہے اور مشرق ہے اور بڑے بڑے کثیر الاشاعت متعدد

اخبارات میں۔ تو تصور اس کی بھی وجہ تھی۔ اس رسالے کے مدیر اس وقت بھی مجنوں تھے جبکہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر۔ دونوں کا المیہ ایک ہی ہے۔ خیالِ فرقتِ لیلیٰ نے ایک کو صحرا میں پہنچا دیا، دوسرے کو صدائے وقت میں جسے کوئی نہیں سُنتا۔ دروغ بر گردنِ راوی۔ بچوں کی ماں سے وہی منسوب تھے۔ عقد ہو گیا تھانیدار سے۔ اب یہ تو ظالم سماج کی وہ خباثت ہے جس پر اتنے ناول لکھے گئے اور اتنی فلمیں بنیں مگر کتے کی دُم کبھی سیدھی ہوئی ہے؟ ہمارے مدیر صاحب تب سے بیٹھے ہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے۔ حالانکہ یہ قصہ ہے تب کا جب آتش جوان تھا۔ تھانیدار کی رقابت مہنگی پڑی۔ ہر روز ایک نئی دفعہ ضابطۂ فوجداری کی نکال لیتا تھا اور ان کو بند کر دیتا تھا۔ آخری بار جب نکلے تو لیلیٰ تھانیدارنی ہو چکی تھی، خیر سے۔"

"میں سمجھ گیا۔" شیخ میری طرف دیکھ کے بے ساختہ ہنسا۔ "پھر بچوں کو وہ کیوں نہیں لے گئے؟"

"ارے میاں! جس نے شادی ہی نہیں کی، بچے کیسے پالتا۔" مست قلندر صاحب نے کہا۔ "اور لیلیٰ کے بچے پالتا تو لیلیٰ کو کیسے تلاش کرتا۔ وہ بھی تو کرنا ہے۔ ہم نے کہا میاں جہاں سیر وہاں سوا سیر۔ یہ بارِ امانت بھی اٹھا لیتے ہیں۔ اپنے ریوڑ میں شامل کر لیا۔ گویا سمندر میں لوٹا بھر پانی۔"

ٹیپ لے کر اور پھر ملنے کا وعدہ کر کے ہم ہنستے ہوئے رخصت ہوئے۔

"آدمی ہے کہ اچھا خاصا فکاہیہ کالم۔" میں نے کہا۔

"لگتا بھی کارٹون ہے لیکن عقل سے پیدل نہیں ہے۔ بہت سے تھانیداروں سے زیادہ معاملہ فہم اور دُور اندیش ہے۔ تم بُرا مت ماننا، میں حشمت خان جیسے سیانوں سے موازنہ کر رہا تھا۔" میں نے کہا۔

"اس نے واقعی بہت تسلی بخش انتظام کیا ہے۔ بہت سوچ سمجھ کر۔ حالانکہ پوری بات اسے معلوم نہیں تھی۔"

"میرے سر سے تو ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا۔" میں نے کہا۔ "یوں لگتا ہے کہ قدرت نے بازی میرے حق میں پلٹ دی ہے۔ ایک طرف شیدے اور رعبدل کے قتل کا الزام نہیں رہا۔ دوسری طرف استغاثہ کے دونوں چشم دید گواہ نہیں رہے۔"

"اس وقت میرے سامنے زیادہ اہم اور فوری توجہ طلب سوال دو ہیں۔" شیخ نے کہا۔ "ایک یہ کہ میر محمد کہاں گیا یہ ثابت ہو جانے کے بعد کہ گھر میں گھس کر تلاشی لینے اور مار پیٹ کرنے والے اسی ٹیپ کی جستجو میں تھے۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ میر محمد کی بیوی کہاں گئی۔ عورت ذات اس حد تک ناقص العقل ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ یوں کرو کہ میر کی بیوی نے بچوں کو باہر نکال دیا۔ ارے بھئی دروازہ کھولا تھا تو خود بھی نکل جاتی اور دروازے کو باہر سے بند کر دیتی۔ واپس جا کے وہیں لیٹنے کی کیا تک تھی؟"

"میری سمجھ میں ایک وجہ آتی ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ بچوں کو فرار ہونے کا موقع دینا چاہتی تھی۔ فلیٹ کا دوسرا دروازہ بھی تھا لیکن اس کی باہر والی کنڈی غائب تھی۔ حملہ آوروں نے پانچ اور سات سال کے دونوں بچوں سے تعرض نہیں کیا تھا اور ایک طرح سے ان کی موجودگی کو نظر انداز کر دیا تھا۔ انھیں غیر موجود پا کے بھی وہ پریشان نہیں ہوئے ہوں گے لیکن وہ خود نکل جاتی اور ایک منٹ بعد انھیں معلوم ہو جاتا تو وہ نیچے دوڑتے اور شاید وہ اس قابل نہیں تھی کہ ایک منٹ میں دوڑ کر ان کی دسترس سے دور ہو جائے۔ اس نے خود کو ڈھال بنا کے بچوں کو پناہ فراہم کی۔ ممکن ہے بعد میں انھوں نے پوچھا بھی ہو کہ بچے کہاں گئے اور اس نے کوئی بہانہ کر کے انھیں چند منٹ تک روکے رکھا ہو۔ مثلاً یہ کہہ دیا ہو کہ وہ باتھ روم میں ہیں۔ ادھر بچوں کی مدد تقدیر نے کی۔ وہ ٹیپ لے کر نکلے تو ایک کار والے نے انھیں بٹھا لیا اور اخبار کے دفتر تک چھوڑ گیا۔"

"آدمی میر محمد بھی چالاک تھا لیکن اس کی بیوی بھی بہت سمجھدار ثابت ہوئی۔ شاید اسی لیے میر نے اس پر بھروسہ کرتے ہوئے بتا دیا ہوگا کہ نیچے والوں کے پاس ٹیپ کی ایک نقل موجود ہے۔ جب تک کوئی تم سے زبردستی کر کے نہ پوچھے اس کے بارے میں کسی سے بات تک نہ کرنا۔ وہ میری زندگی کی ضمانت ہے۔ اس کی بیوی نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ ٹیپ کی تلاش میں آنے والے جب اپنے مقصد میں ناکام ہوں گے تو کیا کریں گے۔ وہ تشدد پر اتر آئیں گے اور ہو سکتا ہے وہ ان کے ظلم کی تاب نہ لاتے ہوئے سچ بولنے پر مجبور ہو جائے۔ میر محمد جیسے پولیس افسر کی بیوی جانتی ہوگی کہ تشدد کے حربے کیا ہوتے ہیں اور کتنے کارگر ثابت ہوتے ہیں۔ وہ بتا دیتی کہ ٹیپ نیچے والوں کے پاس ہے تو امانت رکھنے والوں کی شامت آ جاتی اور وہ ٹیپ ہاتھ سے [illegible] اس کے شوہر کی زندگی کی ضمانت تھا۔ بعد میں اس نے خود بتا دیا کہ ٹیپ تو بچے لے گئے پولیس اسٹیشن۔ یا محض یہ کہہ دیا کہ ٹیپ نیچے والوں کے پاس ہے اگر وہ نیچے والوں کے پاس گئے ہوں گے تو انھیں معلوم ہوا ہوگا کہ پانچ سات سال کے وہ بچے جن کو وہ بے ضرر سمجھے تھے، ٹیپ لے کر غائب ہو گئے ہیں۔ وہ اِدھر اُدھر دوڑے ہوں گے کہ اتنے چھوٹے بچے زیادہ دور نہیں جا سکتے لیکن بچے کار میں نکل گئے تھے۔ اب یا تو میر کی بیوی بھی اس مہلت سے فائدہ اٹھا کے نکل گئی مگر وہ نکلتی تو اس کے لیے پناہ کی قریب ترین اور سب سے محفوظ جگہ پولیس اسٹیشن تھا۔ وہ وہاں نہیں پہنچی تو اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ اپنی ناکامی اور ایک عورت کی چالاکی پر سخت مشتعل ہوتے

اور شدتِ اشتعال میں یا تو انھوں نے میر کی بیوی کو وہیں مار دیا اور لاش لے گئے یا اسے اپنے باس کے سامنے پیش کر دیا کہ یہ ہے ہمارے خالی ہاتھ لوٹنے کی اصل وجہ۔ چنانچہ لاش کو دریا بُرد یا کہیں دفن نہیں کیا گیا تو اس وقت وہ میر محمد کے سامنے جسمانی تشدد کے وہ سب انسانیت سوز مظالم جھیل رہی ہوگی جو میر محمد کے معمولات میں شامل تھے۔ اس معاملے میں یعنی ایذا رسانی کے طریقے ایجاد کرنے میں وہ شیطانی جینئس تھا لیکن اپنا کیا اپنے ہی سامنے آتا ہے تم خود تصور کر سکتے ہو کہ میر محمد کی بے بسی کا عذاب کتنا شدید ہوگا۔"

"کیا یہ امکان نہیں ہے کہ وہ حقیقت کے اظہار پر مجبور ہو جائے؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ لیکن جس بد معاشی کا مظاہرہ انھوں نے ایک گھر میں کیا، وہ کسی اخبار کے دفتر میں یا پولیس اسٹیشن پر ناممکن ہے۔" شیخ نے کہا۔ "نقار خانے میں طوطی کی آواز چاہے کوئی نہ سُنے، مست قلندر کے اخبار کی بہرحال سُنی جاتی ہے اور اس عورت سے تو مجھے امید ہے کہ اس نے کسی بڑے اخبار کا نام ہی لیا ہوگا۔ اب وہ ایڈیٹر کو فون کر کے دھمکی دینا تو در کنار اس سے ٹیپ کے متعلق پُوچھ بھی نہیں سکتے۔ تم نے ایک کالم لکھنے والے کی عقلمندی دیکھی ہے تو ایڈیٹر کے متعلق خود ہی سوچ لو۔ کسی نے اس سے پوچھنے کی حماقت کی ہوگی نا تو اس نے وہ چکر چلایا ہوگا کہ بد معاشوں کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے ہوں گے۔ مثلاً اس نے کہا ہوگا کہ بچوں کی فکر چھوڑو، اپنی فکر کرو۔ ٹیپ کی نقل تو گئی اوپر ڈی آئی جی تک۔ تمھارا نام نہیں تو کیا، حلیہ وغیرہ سب آ رہا ہے صبح کے اخبار میں۔ اب خیریت مطلوب ہے تو میر محمد اور اس کی بیوی کو اخبار کی آخری کاپی پریس جانے سے پہلے چھوڑ دو۔ ورنہ وہ چشم دید گواہ بہت کچھ کر سکتے ہیں، جتنی تصویریں پولیس کے ریکارڈ پر ہیں وہ ان کو دکھائی جائیں گی اور مجرم پہچان لیے جائیں گے۔"

میں نے اس کے باوجود مایوسی کا اظہار کیا۔ "میر محمد یا اس کی بیوی کا زندہ ملنا مجھے محال نظر آتا ہے اگر اغوا کرنے والوں کو امید ہوتی کہ ان کی فراہم کردہ معلومات کے بغیر ٹیپ حاصل کرنا ناممکن ہے تو وہ ان کو زندہ رکھتے لیکن جھنجلاہٹ اور بے بسی میں وہ یہی کر سکتے ہیں کہ بچوں کو یتیم کر دیں۔ ان کے ماں باپ دونوں کو مار ڈالیں۔ وہ کسی ایڈیٹر کی دھمکی سے ڈرنے والے نہیں ہیں۔ پکڑے جانے کا خوف کچھ نہیں۔ سب سے زیادہ ملال انھیں ٹیپ کے ہاتھ سے نکل جانے کا ہوگا۔"

"مجھے ایک اور بات یاد آئی۔ حشمت خان اس ٹیپ کو غائب کرنے کی سازش میں شریک تھا۔" میں نے کہا۔ "یا اس جرم کا گواہ ضرور تھا۔ کیا اس نے میر محمد سے کوئی قیمت وصول نہیں کی ہوگی؟"

"ممکن ہے کی ہو اور میر محمد نے کہا ہو کہ ذرا صبر کرو، میں بہت بڑا سودا کر رہا ہوں۔ اس میں سے تمھیں حصہ ضرور ملے گا مگر مجھ سے کچھ توقع مت رکھنا جیسے تم نے انکار کیا تھا ویسے ہی میں بھی انکار کر سکتا ہوں۔"

"کیا حشمت خان نے نہیں پوچھا ہوگا کہ سودا کس سے ہو رہا ہے اور کتنی رقم کا؟"

"پوچھا ہوگا تو وہ ہمیں کیوں بتائے گا۔ اسے تو اب اپنی فکر پڑ جائے گی اور اس کے لیے سلامتی اسی میں ہے کہ وہ اپنے سابقہ موقف پر ڈٹا رہے۔" شیخ نے کہا۔

"تم نے اس محرر کے نہ آنے کو اہمیت نہیں دی۔ کیا اس کے ساتھ بھی وہ نہیں ہو سکتا جو میر محمد کے ساتھ ہوا۔ اسے اپنے ہاتھ کی تحریر شناخت کرنے پر مجبور کیا جا سکتا تھا۔ دشمن جانتے ہیں کہ رضوی صاحب ہمارے حامی ہیں۔ وہ محرر سے ڈرا دھمکا کے یہ بیان بھی دلوا سکتے تھے کہ بیان اس نے ٹیپ سے نقل کیا تھا اور ٹیپ میر محمد نے نکال لیا تھا۔"

"یہ بات میرے ذہن میں بھی ہے۔ میں صبح اس کے بارے میں بھی معلوم کروں گا۔ میری تگ و دو اسی کیس تک محدود رہے گی جس کا تعلق تم سے بھی اتنا ہی ہے جتنا میر محمد سے۔ لیکن میر محمد کا کیس میں نہیں لوں گا۔ اس کا بھائی جو چاہے کرے۔ کیس حشمت خان کو دے یا سی آئی اے کو ٹرانسفر کرا لے۔" شیخ نے کہا۔ "یا خصوصی ٹیم بنا دی جائے۔ میرے پاس وقت نہیں ہے۔ ایک پوسٹ پہلے سے خالی تھی۔ دوسری ایس ایچ او کی معطلی سے خالی ہوئی۔ تیسری میر محمد کی گمشدگی سے اور توقع ہے کہ چوتھی میرے استعفیٰ سے ہوگی۔ اس طرح تھانہ نہیں چل سکتا۔"

گاڑی پھر پولیس اسٹیشن میں داخل ہوئی۔ "استعفیٰ ان حالات میں ویسے بھی منظور نہیں ہوگا اور رضوی صاحب سے کہوں گا کہ منظور نہ ہونے پائے۔ بعد میں چاہو تو ہیڈ کوارٹر چلے جانا۔"

تھانے میں دین محمد بے چینی سے ہماری واپسی کے انتظار میں تھا۔ اکرام شیخ نے اسے مختصراً بتایا کہ اس کے بھائی اور بیوی کے ساتھ کیا ہوا یا ہو سکتا ہے۔

"یہ ٹیپ ساری خرابی کی وجہ ہے۔" شیخ نے کہا۔ "میر محمد نے اس کو غائب نہ کیا ہوتا تو کچھ نہ ہوتا۔ یا وہ اتنا بڑا سودا کرنے کا خطرہ مول نہ لیتا۔ بے شک وہ بہت ہوشیار تھا اور کبھی پکڑا نہیں گیا تھا لیکن اونٹ کبھی تو پہاڑ کے نیچے سے گزرتا ہی ہے۔ تب ہی اسے معلوم ہوتا ہے۔"

"یہ مجھے معلوم ہے جو ہونا تھا ہو چکا لیکن اب تم کیا کر رہے ہو؟" دین محمد نے برہمی سے کہا۔

"میں ہی میں تفتیش کر رہا ہوں۔" شیخ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "بہت کچھ معلوم ہو چکا ہے مجھے۔"

"تم نے یہ سب کچھ مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا تھا؟" دین محمد نے چراغ پا ہو کے کہا۔

"میں اب بھی تمھیں کچھ بتانے کا پابند نہیں ہوں۔" شیخ نے اسی لہجے میں کہا۔ "نہ میں تمھارا ماتحت ہوں۔"

"لیکن تم میر محمد کے ماتحت ہو۔" دین محمد چیخ کے بولا۔

"آہستہ بات کرو۔" شیخ نے میز پر ہاتھ مارا۔ "اگر میں اس کا ماتحت ہوں تو مجھ سے صرف وہ پرسش کا اختیار رکھتا ہے، تم نہیں۔ دوسری زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس لہجے میں تمھارا بھائی بھی مجھ سے کچھ نہیں پوچھ سکتا۔ میں اپنا استعفیٰ اوپر بھیج چکا ہوں۔ یہ تفتیش سے انکار بھی کر دوں تو کوئی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ آئی جی بھی نہیں۔"

دین محمد کا غصہ سمندر کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

"مجھے ایک ہی کام نہیں ہے دین محمد! مجھے تمھارے بھائی اور بھاوج کے علاوہ اپنے محرّر اور تمھارے دوسرے ساتھی خواجہ اکبر کی گمشدگی کا بھی پتا چلانا ہے۔" شیخ نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہا۔ "مجھے تم سے ہمدردی ضرور ہے اور اسی لیے میں تمھیں ایک مشورہ دیتا ہوں۔ صبح ایس پی صاحب سے ملو۔ ان سے کہو میر محمد کا کیس سی آئی اے کو دے دیا جائے۔ یا اس کی تفتیش کے لیے خصوصی ٹیم تشکیل دی جائے کیونکہ معاملہ بہرحال ایک ایس ایچ او کی گمشدگی یا اغوا کا ہے۔ شاید میں اکیلا زیادہ دوڑ دھوپ نہ کر سکوں۔ حشمت خان پر بھروسہ ہے تو الگ بات ہے۔ ورنہ میرا مشورہ مانو۔ تم اپنا اثر و رسوخ استعمال کر سکتے ہو۔ سی آئی اے میں تمھارے ہی ساتھی ہوں گے اور ہمدردی تو سب کو ہی ہو گی۔ ابھی تو بجے ہیں رات کے گیارہ، مجھے ایک اور کیس کے لیے جانا ہے اور ابھی تک میں نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا ہے۔ تم صبح ہونے تک صبر کرو۔"

"اس کے بچے تو میرے پاس ہونے چاہئیں۔" دین محمد بولا۔

"میری مانو تو انھیں وہیں رہنے دو۔ وہاں وہ زیادہ محفوظ ہیں اور اپنی حفاظت کی سوچو کیونکہ تم میر محمد کے بھائی ہو۔" شیخ نے کہا۔ "مجرموں کا اگلا نشانہ تمھارا گھر بھی ہو سکتا ہے۔"

اس نے آہستہ سے سر ہلایا اور جانے کے لیے اٹھا۔ "تو پھر میں چلتا ہوں۔"

"تم نے اس حملے کی رپورٹ لکھوا دی ہے جو تم پر ہوا تھا؟" اکرام شیخ نے کہا۔

دین محمد نے اقرار میں سر ہلایا۔ نانک نے تصدیق کی کہ دونوں کیس الگ الگ درج کر لیے گئے ہیں۔

"دیکھو دین محمد! ان حالات میں تم کو گھر جانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "میں تمھیں گرفتار کرنے پر مجبور ہوں۔ تم نے وہ مشین گن کھو دی ہے جو تمھیں حکومت کی طرف سے ڈیوٹی کے لیے دی گئی تھی۔"

دین محمد رک گیا۔ آہستہ آہستہ اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہوا۔ "مگر کیا وہ میرا قصور تھا؟"

"یہ میں نہیں جانتا۔ یہ تمھارا بیان ہے اور میں فیصلے کا مجاز نہیں۔" شیخ نے کہا۔ "صبح تمھیں متعلقہ حکام کے حوالے کر دیا جائے گا! وہ تمھیں معطل رکھیں یا تمھارے بیان سُن کر تمھیں بحال کر دیں، یہ ان کا کام ہے۔"

"خبیث! تم نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا!" دین محمد برافروختہ ہو کے بولا۔

"جو کچھ میں نے یا سکندر صاحب نے دیکھا تھا، وہ ہم بتا دیں گے۔" شیخ نے کہا۔ "تم ہمارا نام بطور گواہ کے دے سکتے ہو۔ ہم نے تم کو سرونٹ کوارٹر میں بیہوش اور بندھا ہوا پایا تھا لیکن اس سے قبل کیا ہوا تھا۔ یہ صرف تم جانتے ہو۔ ہم اس کے چشم دید گواہ نہیں ہیں۔ گالی دینے پر میں تم کو معاف کرتا ہوں کیونکہ وہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔" اس نے کانسٹیبل کو اشارہ کیا۔ "دین محمد صاحب کو لاک اپ میں لے جاؤ۔ لاٹ صاحب کا فون آئے تب بھی میری اجازت کے بغیر ان کو چھوڑنا نہیں ہے۔"

"میں تم سے سمجھ لوں گا شیخ!" دین محمد نے سخت احساسِ تذلیل کے ساتھ زہریلے لہجے میں کہا۔

"میں اس دھمکی کو بھی نظر انداز کرتا ہوں کیونکہ مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ لیکن میں کسی طرح بھی قانون کے تقاضوں کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔" شیخ نے کہا۔

دین محمد آہستہ آہستہ لاک اپ کی طرف بڑھا اور اس کے کھلے دروازے سے زیرِ تفتیش مجرموں کے درمیان جا کھڑا ہوا۔ میں اس کی ذہنی کیفیت کا بخوبی اندازہ کر سکتا تھا۔ اس کے پاس جرأت و ہمت اور فرض شناسی کے مظاہرے پر ملنے والی اسناد تھیں اور میڈل تھے۔ اس کا شمار اچھے پولیس افسروں میں ہوتا تھا اور اپنے فرض میں کوتاہی کا مرتکب وہ اب بھی نہیں ہوا تھا لیکن اس وقت وہ عام مجرموں کے ساتھ ایک تھانے کے لاک اپ میں بند تھا۔

"کانسٹیبل!" شیخ نے کہا۔ "لاک اپ کی چابی مجھے دے دو اور تم دو سپاہیوں کے ساتھ چلو۔ اپنے ساتھ زمین کھودنے کا سامان بھی لے لو۔ ہمیں ایک لاش برآمد کرنی ہے۔"

کانسٹیبل کی حالت غیر ہو گئی۔ "اس وقت... میرا مطلب ہے سر کہ سواری کا کیا ہو گا؟"

"یہ سکندر صاحب ہماری مدد کر رہے ہیں۔ ان کے پاس گاڑی ہے۔" شیخ نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔

تین افراد کو ہم نے وہاں پہنچایا۔ جہاں زمین تازہ کھدی ہوئی لگتی تھی۔ میری حالت بھوک سے غیر ہو رہی تھی۔ چنانچہ راہ میں کسی سینما کے آخری شو سے لوٹنے والی ریڑھی کو دیکھ کر میں نے گاڑی روکی اور اس سے بند کباب کا تمام بچا ہوا اسٹاک خرید لیا۔ اس کے پاس دس بند اور بیس کباب باقی رہ گئے تھے جو شاید وہ اگلے دن کے مال میں شامل کرتا۔ پورے پیسے ملنے پر اس کا چہرہ دمک اٹھا ورنہ وہ سمجھ رہا تھا کہ بچا ہوا مال حرام ہی گیا۔ گاڑی میں میرے سوا چاروں افراد پولیس کی وردی میں تھے اور ان میں ایک انسپکٹر بھی تھا۔ بادل ناخواستہ ہمارے ساتھ بیگار پر جانے والے تینوں کانسٹبل یقیناً ڈنر تناول فرما چکے تھے مگر انھوں نے ہماری دعوت کو مسترد نہیں کیا اور ہمارے ساتھ برابر کے شریک رہے۔ یہ روکھی سوکھی حلق سے اتارنے کے بعد ہم نے کولڈ ڈرنک پیے اور تھانے سے روانہ ہونے کے نصف گھنٹے بعد وہاں پہنچے جہاں ہمارے اندازے کے مطابق ایک لاش دفن تھی۔

ایک کانسٹبل نے جو زیادہ بے باک تھا۔ یہ خیال ظاہر کیا کہ یہی کارروائی صبح ہونے کے بعد کی جاتی تو کیا تھا اور اس بات پر شیخ سے جھاڑ کھائی۔ ہم انھیں کھدائی میں مصروف چھوڑ کے چند قدم دور جا کھڑے ہوئے اور سگریٹ پینے لگے۔ ہم سڑک سے تقریباً پچاس گز دور نشیبی علاقے میں تھے۔ اب چاند بھی نکل آیا تھا لیکن گورکنی پر مامور کانسٹبل ایک پیٹرومیکس لیمپ بھی لائے تھے اور اسے روشن کرنے میں بھی کامیاب ہو چکے تھے۔ آدھے گھنٹے میں سڑک پر سے دو گاڑیاں گزریں اور دو موٹر سائیکلیں۔ ان سب نے رک کر اندھیرے اور ویرانی میں ہونے والی کارروائی کو بغور دیکھا اور اس امر کا یقین کر لینے کے بعد کہ یہ جن بھوت نہیں، پولیس والے ہیں، رفوچکر ہو گئے۔ ان کے لیے دونوں برابر تھے کہ چمٹ جائیں تو جان نہ چھوڑیں۔ خدا دونوں سے امان میں رکھے۔

تقریباً پون گھنٹے تک آپس میں باتیں کرنے یا ہمیں گالیاں دینے کے بعد بالآخر ایک کانسٹبل نے چلا کر ہمیں پکارا اور ہم بڑی توقعات کے ساتھ لپکے۔ وہ تین فٹ قطر کے محدود علاقے میں دو فٹ کی گہرائی تک کھدائی کر چکے تھے اور ایک بوری کی دریافت پر مطمئن تھے کہ ان کی محنت رائیگاں نہیں گئی۔

بوری کا منہ اوپر کی طرف نہیں تھا لیکن بوری خالی بھی نہیں تھی۔ ارد گرد کی ساری جگہ کھودے بغیر یہ بھی نہیں دیکھا جا سکتا تھا کہ نیچے سے بوری کا منہ بند ہو گا یا نہیں۔ ٹیلی فون کرنے والے نے تو واضح اعتراف کیا تھا کہ اس نے بوری کو کھول کر دیکھا تھا اور پھر خوف زدہ ہو کے بھاگ لیا تھا۔ ایسی صورت میں بوری کو اوپر کے دونوں کناروں سے کونے تھام کر کھینچا جاتا تو انجام یہی ہوتا کہ لاش گڑھے میں رہ جاتی اور خالی بوری کھینچنے والے پیچھے جا گرتے۔

اکرام نے ٹارچ کی لائٹ ڈال کے دیکھا۔ بوری کے اوپر مٹی میں خون کا رنگ شامل تھا۔ قانون کے رکھوالے عام طور پر اس قسم کی محنت کے عادی نہ تھے جس سے جیب میں کچھ نہ جائے اور تھکن کے سوا کچھ حاصل نہ ہو۔ معاشیات [illegible] میں یہ غیر بارآور محنت کہلاتی ہے۔ وہ بوری کے ارد گرد تین فٹ [illegible] زمین سے مٹی نکالنے پر آمادہ نہ لگتے تھے۔ شیخ نے اپنے خد[illegible] کا اظہار کیا تو انھوں نے متبادل تجویز پیش کی۔ وہ بوری کے کناروں کو اس طرح کھینچ کر نکالیں گے کہ اندر سے لاش کے جسم کا کوئی حصہ بھی گرفت میں آ جائے۔ شیخ نے بادل ناخواستہ ان سے اتفاق کیا۔ وہ جانتا تھا کہ زبردستی اب نہیں چلے گی۔ تینوں ماتحت لمبے لیٹ جائیں گے ایک کہے گا میری کمر میں جھٹکا آ گیا ہے۔ دوسرا چکر آنے کے بعد بیہوش بھی ہو سکتا تھا۔ تیسرا صاف کہتا کہ اب میں اکیلا کیا کروں گا۔

ان تینوں نے مل کر زور لگایا اور معلوم نہیں کس نے لاش کی ٹانگ کھینچی اور کس نے ہاتھ پکڑ کے گھسیٹا لیکن بالآخر وہ مٹی میں دبی ہوئی بوری کو نکالنے میں کامیاب ہو گئے۔ بوری کا منہ دوسری طرف سے پھر باندھ دیا گیا تھا جس سے یہ نظریہ درست ثابت ہوتا تھا کہ اصل قاتل کسی خوف یا مصلحت کی بنا پر دوبارہ آئے تھے۔

"کھولو اسے۔" شیخ نے کچھ دیر ٹارچ لائٹ کو بوری پر جمانے کے بعد کہا۔ یہ اندازہ تو بوری کی بے ڈھب حالت سے بھی ہو جاتا تھا کہ اس میں لاش ہی ہے، ریت یا بھوسہ نہیں بھرا ہوا ہے۔

اس پر لپٹی ہوئی رسّی کسی دشواری کے بغیر کھل گئی لیکن جو چیز اس میں سے برآمد ہوئی اس نے ہمیں بھی دہشت زدہ کر دیا۔ دو کانسٹبل اللہ توبہ کرتے بھاگے اور چند قدم کے فاصلے پر جا کھڑے ہوئے۔ بوری کا کفن اتارنے والا بھی خود بخود پیچھے ہٹ کر ہمارے قریب آ گیا۔

اب ہمارے درمیان ایک بے گور و کفن ہی نہیں، بے لباس لاش پڑی تھی۔ خاک و خون میں لتھڑی ہوئی اور محاورے کے مطابق منہ کے بل لیکن عملی طور پر منہ کے بغیر۔ گردن سے اوپر لاش کا سر غائب تھا۔ سر کو تن سے جدا کرنے کا کام کسی نے بڑی مہارت اور صفائی کے ساتھ کیا تھا۔ [illegible] قصابوں کا بڑا چھرا استعمال کیا ہو گا یا "ٹوکا"۔

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔" میں [illegible] خاموشی کے اس وقفے کو ختم کیا۔

"ہاں۔ سچ پوچھو تو مجھے بھی مایوسی ہوئی ہے۔ یہ جسم [illegible]

"تمھیں امید تھی کہ اس میں سے میر محمد یا اس کی بیوی کی لاش نکلے گی؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ لیکن میں قبل از وقت یہ بات نہیں کہنا چاہتا تھا۔" شیخ نے کہا۔ "قتل تو ہوتے ہی رہتے ہیں اور کبھی کبھار پرانی مدفون لاشیں بھی نکل آتی ہیں لیکن جس طرح مجھے اطلاع دی گئی تھی پھر جیسے میر محمد کے گھر کی تباہی دیکھی اور اس کے فوراً بعد مست قلندر صاحب نے میر محمد کے بچوں کی بات کی۔ اس سے میرے ذہن نے واقعات کو منسلک کر لیا اور میرا یہ شک بھی یقین میں بدلنے لگا کہ ایسے پھینکی جانے والی لاش دونوں بدقسمت میاں بیوی میں سے کسی ایک کی ہو گی۔ یہ نہ ہوتا تو میں اتنی رات تک اپنے ساتھ دوسروں کو بھی خوار نہ کرتا۔ لاش صبح نکال لی جاتی اور اسپتال بھیج دی جاتی۔"

"سچ پوچھو تو میرا بھی یہی خیال تھا۔" میں نے کہا۔ "میں اس لیے خاموش رہا کہ جو ہو گا سامنے آ جائے گا۔ تم بڑی دلچسپی کے ساتھ اس کام میں لگے ہوئے تھے۔"

"اب یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ جسمانی ساخت کے اعتبار سے یہ لاش میر محمد کی بھی ہو سکتی ہے مگر تصدیق صرف فنگر پرنٹ سے ہی ممکن ہے۔" شیخ نے کہا۔

"فنگر پرنٹ کہاں سے ملیں گے سر!" ایک کانسٹبل نے اطلاعاً کہا۔ "جب فنگرز ہی نہیں ہوں گی۔"

"کیا مطلب ہے؟" اکرام شیخ نے چونک کر کانسٹبل کی طرف دیکھا۔

"مطلب یہ کہ لاش کے سر کی طرح اس کے ہاتھ بھی غائب ہیں کلائی کے پاس سے۔" کانسٹبل نے کہا۔

"یہ بہت غیر معمولی بات ہے۔ سر بریدہ لاش تو بعض اوقات مل جاتی ہے لیکن وہ کسی عام آدمی کی لاش ہوتی ہے جس کی فنگر پرنٹس کا ریکارڈ کہیں بھی نہیں ہوتا۔" شیخ نے کہا۔ "بس کوئی قاتل جنونی کیفیت میں یہ حرکت کر بیٹھتا ہے یا پھر وہ اتنا سیانا ہوتا ہے کہ شناخت کو دشوار بنا دیتا ہے۔ لیکن ہاتھ کاٹنے کا تو اور کوئی سبب ہی نہیں۔ قاتل یہ جانتے ہوں گے کہ مقتول کی شناخت فنگر پرنٹ سے بھی ہو جائے گی۔ فنگر پرنٹ یا تو ہسٹری شیٹر مجرموں کے مل جاتے ہیں یا پھر ملازمت پیشہ افراد کے۔ ان کی سروس بک کے آغاز میں۔ اب میں پھر شک میں پڑ گیا ہوں۔"

"یعنی یہ کہ لاش میر محمد کی ہو سکتی ہے؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ لیکن فوری طور پر میں کچھ ثابت نہیں کر سکتا۔ عملی زندگی میں شناخت کی دوسری علامات وہ نشان ہوتے ہیں جو کسی زخم، حادثے کے باعث یا چوٹ لگنے سے پڑ جاتے ہیں۔ عموماً یہ نشانات بھی جسم کے کھلے حصوں پر ملتے ہیں۔ منہ پر یا ہاتھوں پر۔ اور نمایاں شناختی علامات کبھی صورت دیکھ کر لکھ دی جاتی ہیں۔" شیخ نے کہا۔ "جسم کے باقی حصوں پر کوئی تل، برتھ مارک یا جلد کا داغ ہو تو... تو اس کی ماں کے بعد صرف اس کی بیوی بتا سکتی ہے۔ فی الحال وہ دونوں بھی موجود نہیں۔ ایک مر چکی ہے، ایک غائب ہے۔ اس لیے ہم چلتے ہیں۔ ایمبولینس بھیج دیتے ہیں جو لاش کو اسپتال لے جائے گی۔"

میں اور اکرام شیخ تھکے ہارے سڑک کی طرف روانہ ہوئے مجھے بھی اپنی توقعات کے غلط ثابت ہو جانے کا ملال تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں اس شخص کو مردہ دیکھنا چاہتا تھا جو شکاریوں کا آلۂ کار تھا اور جس نے قتل جیسے سنگین ترین جرم کا اعتراف کرانے کے لیے ایک رات مجھ پر تشدد کے وہ حیاسوز اور ننگِ انسانیت حربے آزمائے تھے جن کے تصور سے آج بھی مجھے جھرجھری آ جاتی تھی۔ میں صرف ایک بے نام تجسس کا شکار تھا اور میرے خیال کے راستے بھی ایک ہی سمت میں اشارہ کرتے تھے اور میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ میری سوچ کی سمت غلط ہے یا نہیں۔ اس شخص نے ایک تیر سے دو شکار کرنے چاہے تھے۔ اس نے ٹیپ غائب کر کے مجھے تختۂ دار تک پہنچانے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی تھی اور اس کے ساتھ ہی اپنے کارنامے پر منہ مانگا انعام حاصل کرنا چاہا تھا مگر تیرِ قضا نے اسے پہلے شکار کر لیا۔ نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم۔ ٹیپ پھر شیخ کی تحویل میں تھا اور میر محمد لالچ میں ایک بہت بڑا سودا کرتے کرتے اپنا سب کچھ گنوا بیٹھا تھا۔

اگر وہ مجھے دوبارہ زندہ مل جائے تو میں اس سے ضرور پوچھوں کہ کیا قدرت کے فیصلوں کو بدلنا اس کے اختیار میں تھا؟ کیا یہ درست نہیں ہے کہ ظلم کی کھیتی کبھی پھلتی نہیں؟

"کیا سوچ رہے ہو؟" شیخ نے کہا۔ "واپس نہیں چلنا کیا؟"

میں نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور شیخ میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ "اب کیا پروگرام ہے؟" میں نے کہا۔

"مجھے تھانے میں ڈراپ کر دو۔ اس کے بعد تم جاؤ۔ رات کے دو بجنے والے ہیں اور میری ڈیوٹی تو صبح تک ہے۔" شیخ نے کہا۔ "تم جا کے آرام کرو۔"

"مجھے بھی اسلام آباد فون کرنا ہے۔ اس وقت لائن فوراً مل جائے گی۔" میں نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

"فون تو مجھے بھی کرنا ہے۔" شیخ بولا۔ "وہ حضرت بھی فارغ ہونے ہی والے ہوں گے۔ مجنوں پر..."

مجھے جواب دینے کا موقع نہ ملا۔ کسی نے پیچھے سے میرے کندھے پر تھپکی دی۔ "گاڑی یہاں سے سیدھی لے چلو۔" تھپکی دینے والے نے بھاری بھرکم لہجے میں مجھے حکم دیا۔

ایک لمحے کے لیے میں اور اکرام شیخ اپنی اپنی جگہ ساکت بیٹھے رہ گئے۔ ہم دونوں کے ذہن نے فوراً اس حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا کہ حکم دینے والا حکم پر عمل کرانے کی پوزیشن میں بھی ہے اور کسی فوری ردِعمل کے تحت ہم نے جرأت کا مظاہرہ کیا ہوتا تو یقیناً نقصان میں رہتے۔ آہستہ آہستہ ہم دونوں نے سر کو تھوڑا سا پیچھے گھمایا اور بیک وقت اس ریوالور کو دیکھا جس کی زد میں ہم دونوں تھے۔ اسے گولی چلانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ سر کے پچھلے حصے پر بٹ مار کے بھی ہمیں ناک آؤٹ کر سکتا تھا۔ اس کا پہلا نشانہ شیخ ہی ہوتا کیونکہ میرے ہاتھ میں اسٹیئرنگ تھا۔

میں نے گاڑی کو سڑک پر چھوڑتے وقت لاک کر دیا تھا مگر کاروں کے ڈور لاک کسی بھی ملتی جلتی چابی سے کھل جاتے ہیں۔ وہ اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے پیچھے آ بیٹھا تھا اور ہم نے اس کی طرف دیکھا تک نہیں تھا۔ ہم اپنے اپنے خیالات میں محو تھے اور آگے کی سیٹوں پر بیٹھنے کے بعد پلٹ کر دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔ وہ بیٹھا ہوا ہوتا تو شاید میں اس کی پرچھائیں بیک ویو مرر میں دیکھ لیتا مگر وہ لیٹا ہوا تھا اور یہ بھی ممکن تھا کہ سیاہ ریگزین کی سیٹوں پر کیمو فلاج کرنے کے لیے اس نے کالے کپڑے بھی پہن لیے ہوں یا اوپر کالی چادر اوڑھ رکھی ہو۔

"کیا چاہیے تمھیں؟" شیخ نے ہمت سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"تم جو بھی ہو مسٹر ایکس وائی زیڈ۔"

"مجھے وہ چیز چاہیے جو میر محمد ہمیں نہ دے سکا۔" وہ بولا۔

میں نے اس کی آواز پر غور کیا جو سنی ہوئی لگتی تھی۔

"تمھیں کیوں یقین ہے کہ وہ چیز تم کو ہم سے مل سکتی ہے؟" شیخ نے کہا۔

"میر محمد نے بتا دیا تھا کہ وہ چیز تمھارے پاس ہے۔" وہ بولا۔ "اور وہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔"

"تم اس کے لیے ماضی کا صیغہ کیوں استعمال کر رہے ہو۔ کیا تم اسے مار چکے ہو مسٹر ایکس؟"

"مجبوری تھی۔ وہ لالچ میں حد سے بڑھ گیا تھا۔ آدمی جس شاخ پر بیٹھا ہو اسے ہی کاٹے گا تو کیا ہو گا؟"

"تم نے اس کی بات پر یقین کر کے عقلمند ہونے کا ثبوت نہیں دیا۔" شیخ نے کہا۔ "کیا تمھیں معلوم نہیں کہ وہ ٹیپ جو تم مانگ رہے ہو میر محمد لے گیا تھا۔ اس کا گواہ حشمت خان بھی ہے اور اسی بات پر میر کے اور میرے درمیان شدید اختلافات تھے۔ میں نے عدالت کے رُوبرو اپنے بیان میں بھی یہی کہا تھا۔"

"اس وقت تک یہ بات سچ تھی۔" وہ پیچھے سے بولا۔ "گویا بعد میں اس کے ضمیر نے ملامت کی تو اس نے ٹیپ مجھے دے دیا؟" شیخ نے طنز سے کہا۔ "یا وہ تم سے منہ مانگا معاوضہ وصول کرنے میں ناکام رہا تو دشمنی پر اتر آیا؟"

"اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ ہم سے دشمنی کر سکتا اور ہم اسے منہ مانگا انعام دینے کا وعدہ بھی کر چکے تھے۔"

"صرف وعدہ؟ یا تم نے اسے کچھ دیا بھی تھا؟" شیخ نے کہا۔

"اس نے دس لاکھ مانگے تھے اور پانچ لاکھ اسے دے دیے گئے تھے۔" وہ بولا۔ "لیکن کل تم دونوں سکندر اور محسن آدھی رات کے وقت اس کے گھر میں جا گھسے۔ تم نے اس کے بچوں کو ریوالور کی زد پر رکھ کے اس سے ٹیپ طلب کیا اور دھمکی دی کہ ٹیپ نہ دیا گیا تو تم اس کے دونوں بچوں کو لے جاؤ گے۔ کوئی بھی تمھارا کچھ نہ بگاڑ سکے گا کیونکہ ایک بڑا پولیس افسر اور ایڈووکیٹ رالعبہ جیسے لوگ گواہی دیں گے کہ اغوا کی واردات کے وقت تم ان کے سامنے گھر میں بیٹھے لوڈو کھیل رہے تھے۔"

"مسٹر ایکس... یہ سب کچھ تم سے میر محمد نے کہا تھا؟" شیخ نے کہا۔

"ہاں۔ وہ خود کبھی تمھاری دھمکی میں نہ آتا۔ اس نے اپنی بے وقوف اور بزدل بیوی کو سمجھایا بھی کہ نہ ہم گولی چلا سکتے ہیں، اس کی آواز پر اوپر نیچے رہنے والے آ جائیں گے اور شاید تھانے والے بھی اور نہ یہ ممکن ہے کہ ہم دو بچوں کو اٹھا کے نیچے تک جائیں اور پھر بھاگ کر تھانے کی حدود سے بھی نکل جائیں لیکن وہ عورت تھی، اپنے بچوں کو دہشت زدہ نہ دیکھ سکی اور خود ان سے زیادہ دہشت زدہ ہو گئی۔ اس نے میر محمد کے منع کرنے کے باوجود ٹیپ تمھیں لا دیا۔ میر محمد نے صرف ایک بے وقوفی کی تھی۔ اس نے ٹیپ کو گھر میں رکھا تھا اور وہ بھی اپنے بیڈ کے نیچے اور اس کی وجہ صاف ظاہر ہے۔ وہ منہ مانگا انعام وصول کیے بغیر ٹیپ ہمارے حوالے کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ورنہ وہ ٹیپ کو اگلے ہی دن پہنچا دیتا۔"

"ویری گڈ۔ کہانی اچھی سنائی تھی میر محمد نے۔ اس کے بعد کیا ہوا۔" میں نے پہلی بار گفتگو میں دخل دیا۔ "کیا ہم نے اسے چھوڑ دیا اور اطمینان سے نیچے اتر گئے۔ یا جاتے جاتے ہم میاں بیوی کو ناک آؤٹ کر گئے کہ وہ شور نہ مچا سکیں اور کھڑکی سے کسی کو آواز نہ دے سکیں؟"

"نہیں، تم ایک بچے کو بطورِ ضمانت اپنے ساتھ لے گئے تھے۔" وہ بولا۔ "کہ اسے تھانے کے گیٹ پر ڈراپ کر دیا جائے گا۔ بچہ دس منٹ بعد واپس آیا اور اس نے دونوں دروازوں کی کُنڈی باہر سے کھولی۔"

میں اور شیخ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔ "کیا بچے نے یہ بھی کہا تھا کہ گاڑی لال رنگ کی تھی یا وہ فاکس ویگن کو پہچانتا ہے۔ ایک ہوشیار پولیس افسر کا بیٹا ہے نا۔ اس نے تو نمبر بھی نوٹ کر لیا ہو گا۔"

"گاڑی یہاں روک دو۔" وہ بولا۔ میں نے تعمیل کی اور گاڑی کو اس ویران سڑک پر کھڑا کر دیا جہاں سے اس وقت کسی کے گزرنے کا امکان نہ تھا۔ "ہمیں یہیں انتظار کرنا ہے کچھ دیر۔"

"تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟" میں نے کہا۔

"بچے نے کچھ نہیں بتایا تھا۔ میر محمد تمھیں اچھی طرح جانتا تھا۔ اس نے کھڑکی میں سے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ تمھاری گاڑی تھانے کے گیٹ سے نکل رہی ہے۔ وہ گاڑی کو بھی پہچان گیا۔" اجنبی نے کہا۔

"مسٹر ایکس! پھر تم یہ ٹیپ لینے کے لیے میرے گھر کیوں نہیں آئے۔ حالانکہ میں اکیلا تھا اور تمھارا ہی ایک آدمی رضوی صاحب کی کوٹھی کے گیٹ پر سنتری بنا کھڑا تھا۔" میں نے کہا۔

"تم اچھی طرح جانتے ہو سکندر! کہ ہم نے ایک نہیں، چار آدمی بھیجے تھے اور انھیں اچھی طرح سمجھا بھی دیا تھا کہ انھیں ایک ٹیپ لانا ہے۔ ہم انھیں یہ نہیں بتا سکتے تھے کہ وہ ٹیپ کیسا ہے یا اس میں کون سی خطرناک بات ہے۔ اتنا ان کو یقیناً معلوم تھا کہ وہ ٹیپ ہمارے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے اور اس کا حاصل کرنا ہمارے لیے بے حد ضروری ہے۔ ان کو دس دس ہزار روپے دینے کا وعدہ کیا گیا تھا اور یہ سمجھا دیا گیا تھا کہ وہ اپنا کام اطمینان سے کریں وہاں کوئی نہیں آئے گا لیکن تم سے ہوشیار رہیں۔ لیکن وہ ناتجربہ کار لوگ تھے اور اس بات سے بہت زیادہ پریشان تھے کہ انھیں ایک بہت بڑے پولیس افسر کے گھر میں گھس کر سارا کام کرنا ہے جس نے سخت حفاظتی انتظامات بھی کر رکھے ہیں۔ سنتری کو ہم نے خود ہی ہٹا دیا تھا مگر اندر کی ہمیں بھی خبر نہ تھی کہ وہاں کوئی خفیہ الارم نہ ہو یا کوئی کیمرہ وغیرہ پوشیدہ نہ ہو۔ یہ بات ہم نے ان پر بھی واضح کر دی تھی کہ چند روپوں کے ایک کیسٹ کو لانے کے لیے ہم چار افراد کو دس دس ہزار بے وجہ نہیں دے رہے ہیں۔ یہ کام آسان بہرحال نہیں ہے۔ انھیں گھر کی تلاشی لینی ہو گی اور پوری احتیاط کے ساتھ۔ وہ کیسٹ کہیں نہ کہیں ضرور مل جائے گا۔ زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ کیسٹ ہمارے ہی کمرے میں ہو گا۔ ورنہ رالعبہ کے کمرے میں۔ رضوی صاحب کا کمرہ اور گھر کے دوسرے حصے بعد میں دیکھے جائیں لیکن خانہ تلاشی کا ثبوت کہیں نہ چھوڑا جائے۔ انھیں اچھی طرح سمجھا دیا گیا تھا کہ مار پیٹ اور توڑ پھوڑ سے گریز کریں اور ریوالور دکھا کے تمھیں بے بس کر دیں۔ مگر وہ جو بڑا بدمعاش بنتا تھا اور ان کا سرغنہ بن کے گیا تھا انھیں کنٹرول نہ کر سکا۔ ایک تو تمھاری اشتعال انگیزی کے باعث بے قابو ہو گیا اور دوسرے نے تمھیں ڈنڈا مار کے بے ہوش کر دیا۔"

"اگر میں نے وہ دوسرا جوتا بھی پہن لیا ہوتا تو کچھ نہ ہوتا۔" میں نے کہا۔ "اگر کا لفظ تاریخ میں بھی بڑی گڑبڑ کا باعث رہا ہے اگر نورجہاں نے وہ دوسرا کبوتر بھی نہ چھوڑا ہوتا جو جہانگیر نے اسے تھمایا تھا۔ اگر ایک سقّے نے اپنی مشک سے شہنشاہِ ہند کی جان نہ بچائی ہوتی۔ وہ جوتا بھی میرے ہاتھ میں نہ ہوتا تو میں اس کو فوراً نہ کھینچ مارتا اس کے سامنے کے دو دانت نہ ٹوٹتے۔ وہ مذاق نہ بنتا۔ اسے رشتہ ٹوٹنے کا غم نہ ہوتا اور وہ مشتعل ہو کے حملہ کرنے کی حماقت نہ کرتا تو اس کی پسلیاں ٹوٹنے کی نوبت نہ آتی۔ غالباً اس کے بعد وہ بدحواس ہو گئے۔"

"ہاں۔ مجھیرا تو فوراً دوڑ کر باہر آ گیا کہ میرا کام ختم ہو گیا۔" وہ بولا۔ "باقی لوگوں نے بڑی عجلت میں تلاشی لی۔ ان میں سے ایک احمق نے اپنے باس کے حکم پر الماری کے تالے کو فائر کر کے کھول لیا تھا۔ جو انھیں بعد میں بازار سے لا کے لگانا پڑا تھا۔"

"مسٹر ایکس! کیا اس ٹیم میں شامل کرنے کے لیے کوئی ایسا آدمی نہیں ملا تھا جو تالے کھولنے کا ماہر ہوتا ہے؟" میں نے کہا۔

"وہ پانچواں آدمی پہنچا ہی نہیں جس کا وہ بیگ تھا۔ اسے پولیس بہت سے لوگوں کے ساتھ چوری کے ایک کیس میں تفتیش کے لیے اٹھا کر لے گئی تھی۔" وہ بولا۔ "باقی لوگوں نے واپس آ کے ناکامی کی رپورٹ دینا کسرِ شان سمجھا۔ انھیں یہ ڈر بھی تھا کہ ان کے دس دس ہزار مارے جائیں گے۔ وہ ایک کے بعد دوسری غلطی کرتے چلے گئے۔ انھوں نے ایک بریف کیس میں سے ایک ٹیپ بھی نکال لیا۔ وہ اسے ہی اصل سمجھے۔"

"کیوں؟ کیا انھوں نے اسے سُن کر دیکھا تھا مسٹر ایکس؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ انھوں نے گھر کے ہی ایک کیسٹ پلیئر پر اسے سنا تھا۔" وہ بولا۔

"اس کا مطلب ہے وہ آوازیں پہچان گئے تھے۔ وہ ان لوگوں کو پہلے سے جانتے تھے جن کی آوازیں اس ٹیپ میں تھیں۔ وہ ناتجربہ کار تو تھے مگر نئے لوگ نہیں تھے۔" میں نے کہا۔ "وہ چوہدری دلاور کی اور ڈی سلوا کی باتیں سن کے اس نتیجے پر پہنچے ہوں گے کہ یہی وہ خطرناک ٹیپ ہے۔ پھر یہ کہ وہ ایک فائل بھی لے گئے۔"

"فائل؟ کون سی فائل۔ وہ کوئی فائل وغیرہ لینے نہیں گئے تھے۔" وہ بولا۔ اس کے یقین نے مجھے چکرا دیا۔ وہ فائل پھر کہاں گئی؟

"تم انھیں بتا دیتے کہ ٹیپ بھی دو قسم کے ہوتے ہیں۔" شیخ نے کہا۔ "ایک یہ نئے کیسٹ ٹائپ اور دوسرے پرانے اسپول۔"

"یہ غلط فہمی تو اس اُلّو کے پٹھے میر محمد نے پیدا کی تھی جو آخر

تک صرف ٹیپ ٹیپ کہتا رہا۔"
"اسے اب گالی کیوں دیتے ہو جو مر چکا۔ اس نے تو تمھیں نجانے کتنی غلط باتوں سے بے وقوف بنایا۔" میں نے کہا۔ "تم کو ٹیپ چاہیے تو یہ لو۔" میں نے گاڑی کا خانہ کھولا اور اسپول کو گتے کے ڈبے سمیت پیچھے بڑھا دیا۔ "لیکن کچھ باتیں میری بھی سن لو۔ معلوم نہیں ہم یہاں کس کا انتظار کر رہے ہیں اور کیوں۔ اور یہ انتظار کب تک جاری رہے گا۔ میری باتیں تمھاری سمجھ میں آجائیں تو انھیں بھی سمجھا دینا جو سمجھتے ہیں کہ میری جان اس ٹیپ میں ہے۔ یہ پرانے الف لیلوی قصوں جیسی بات ہے کہ سمندر بیچ ایک جزیرہ ہے، جزیرے میں سات کوس پر ایک باغ ہے۔ باغ میں سونے کا ایک پنجرہ ہے اور اس پنجرے میں جو طوطا ہے اس میں کالے دیو کی جان ہے۔ بنیادی بات تو یہ ہے کہ زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہیں لیکن اس ٹیپ کو حاصل کرنے کی جدوجہد بھی فضول تھی۔ ایک جھوٹ تو میر محمد نے تم سے یہ بولا کہ ٹیپ ہم لے گئے تھے۔ ثبوت اگر دیکھنا ہو تو میر محمد کا فلیٹ جا کے دیکھنا۔ اس کے دو دروازے زینے میں کھلتے ہیں مگر دونوں باہر سے بند نہیں ہو سکتے۔ ایک کی کنڈی ہی نہیں ہے باہر۔ اگر میر محمد کو ناک آؤٹ کیے بغیر فرار ہوتے تو صرف ایک دروازہ بند کر سکتے تھے۔ وہ دوسرے دروازے سے ہمارے پیچھے دوڑ کر آ سکتا تھا۔"

وہ خاموش رہا اور میں نے اندازہ لگایا کہ میری بات کا تھوڑا بہت اثر ضرور ہوا ہے۔

"دوسری بات زیادہ اہم ہے۔" میں نے کہا۔ "اس نے یہ ٹیپ اپنے خلاف ہونے والی محکمہ جاتی کارروائی سے بچنے کے لیے خود اکرام شیخ کو دیا تھا۔ اس بیان کے بعد جو اکرام شیخ نے عدالت میں دیا تھا۔ اس کے خلاف تفتیش ناگزیر تھی۔ خاص طور پر محرر کے اس بیان کی وجہ سے جو اس نے ٹیپ سے نقل کیا تھا۔ بے شک اب وہ محرر بھی غائب ہے اور بیان پر عبدل کے دستخط بھی نہیں ہیں، لیکن اس بات کو جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ وہ تحریر محرر کی ہی ہے۔ اس کی تحریر کا نمونہ تو تھانے کے روزنامچے میں بھی ہے۔ یہ بیان عدالت کے ریکارڈ پر ہے۔ عدالت قدرتی طور پر یہ سوال کرے گی کہ محرر کو بلاوجہ کسی مقتول سے ایک اعترافِ جرم منسوب کر کے لکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ شیخ کو بلاوجہ میر محمد پر ٹیپ کی چوری کا الزام عائد کرنے میں کیا فائدہ تھا؟"

"تم غلط کہتے ہو۔" وہ بولا۔ "میر محمد کو ٹیپ کے پانچ لاکھ مل چکے تھے۔ پانچ لاکھ اور ملنے تھے۔ اسے اندازہ تھا کہ بدعہدی اور غداری کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔"

"خمیازہ!" میں نے طنز سے ہنس کر کہا۔ "وہ بہت چالاک تھا مسٹر ایکس! اس نے اکرام شیخ سے کہا تھا کہ وہ نادم ہے اور اس سے ایک درخواست کی تھی۔ شیخ کہہ دے کہ کوئی شخص یہ ٹیپ تھانے میں چھوڑ گیا تھا۔ اگلی پیشی پر شیخ یہ بتا دے کہ گمشدہ ٹیپ مل گیا ہے۔ اس سے پہلے وہ اصل ٹیپ تمھارے حوالے کر کے تم سے باقی پانچ لاکھ وصول کر لیتا اور بعد میں معصوم بن جاتا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ شیخ پہلے ہی ایک نقل بنا چکا ہے۔ اس کے گھر میں بھی ویسا ہی ٹیپ ریکارڈر ہے۔ یقین نہیں تو اس کے گھر جا کے دیکھ لو۔ ویسے بھی وہ نوکری پر لات مار کے ملک سے فرار ہونے کی سوچ رہا تھا۔"

"بکواس بند کرو۔ اب تم مجھے یہ بتا رہے ہو کہ ٹیپ دو ہیں؟"

"افسوس کہ تم نے میر محمد کو مارنے میں بہت جلدی کی۔" میں نے کہا۔ "وہ زندہ ہوتا تو تم اس سے پوچھ سکتے تھے کہ اصل ٹیپ کس کمپنی کا بنایا ہوا تھا اور وہ تمھیں بتاتا کہ جو ٹیپ اس نے نکالا تھا 'بی اے ایس ایف' کا تھا۔ وہ ٹیپ ریکارڈر بھی جرمنی کا بنا ہوا تھا۔ اسپول ٹیپ بھی جرمن تھا۔ اب اس ٹیپ پر غور کرو مسٹر ایکس! یہ جاپانی ہے۔ اکائی آف جاپان۔ فرق صاف ظاہر ہے لیکن تمھارے پاس تصدیق کا کوئی ذریعہ نہیں۔"

"اور وہ اصل۔ کیا نام لیا تھا تم نے۔ ایم بی بی ایس۔۔۔"

میری بات نے اسے چکرا دیا تھا۔

"بی اے ایس ایف۔" میں نے اس کی جہالت کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ "اگر میر کی بیوی کے پاس لے جاؤ گے۔ تو وہ دونوں کے ڈبے دیکھ کر فرق بتا دے گی۔"

"اس کو تو ہم نے میر محمد کے سامنے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا۔ ساری خرابی کی ذمے دار وہ تھی۔ اس نے ہماری آنکھوں میں دھول جھونکی تھی۔" وہ مشتعل ہو کے بولا۔

"اور میر محمد، وہ کچھ نہیں بولا تھا اس ظلم کے باوجود؟"

"ہم نے اسے ایک ہی دفعہ میں نہیں مار دیا تھا۔" وہ بولا۔ "ہم نے اسے تھوڑا تھوڑا کر کے ختم کیا تھا۔ میر محمد کے سامنے اس کے ساتھ ایسا سلوک کیا تھا کہ میر پاگل ہو گیا تھا۔ وہ چیخ چیخ کر اپنی بیوی کو گالیاں دیتا رہا اور اسے کہتا رہا کہ ٹیپ کے متعلق بتا دے مگر اس نے شوہر کی بھی نہیں مانی اور بڑے عذاب کے ساتھ مرنا منظور کر لیا۔ کسی کو بھی امید نہیں تھی کہ ایک عورت ایسی قوت کا مظاہرہ کر سکتی ہے۔"

عورت؟ میں نے سوچا۔ وہ عورت نہیں ماں تھی۔ اس کے لیے یہ کیسے ممکن تھا کہ اپنی جان بچا لیتی اور اپنی ممتا کا خون کر دیتی۔ اپنے بچوں کو ان خونی درندوں کے حوالے کر دیتی۔ ممتا کے مقدس رشتے کی آبرو گنوا دیتی۔

"جلد بازی کا نتیجہ ہمیشہ برا ہوتا ہے۔" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔

"اب تمھیں کون بتائے گا کہ اصل ٹیپ کہاں ہے؟ تم تو میر محمد کو بھی قتل کر چکے ہو مسٹر ایکس!"

"اس نے دیوانگی میں ہم پر حملہ کیا تھا۔" وہ بولا۔

"اور تم میں سے کسی نے اسے گولی مار دی؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ ہم نے اسے ذبح کر دیا۔" وہ غصیلے لہجے میں بولا۔ پھر اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

"گویا وہ لاش میر محمد کی ہے جس کا نہ سر ہے، نہ ہاتھ ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور جو ابھی قبر سے نکلی ہے۔"

"وہ قبر نہیں تھی، چوہے دان تھا جس میں تم دونوں پھنس گئے ہو۔" وہ بولا۔

"مجھے فون کرنے والے تم ہی تھے نا؟" شیخ نے اچانک کہا۔ "آواز بدلی ہوئی تھی لیکن تمھارا لہجہ وہی ہے۔"

وہ ہنسا۔ "کیسی تھی وہ کہانی جو میں نے سنائی تھی۔ جب میں اور میرے ساتھی بوری پھینکنے گئے تھے تو وہاں سے کوئی اُلّو کا پٹھا موٹر سائیکل والا نہیں گزرا تھا۔ ہمیں معلوم تھا تم تجسس اور فرض شناسی کے چکر میں وہاں ضرور آؤ گے۔"

"تم اس ڈرامے کے ہدایتکار نہیں ہو۔" میں نے کہا۔ "ایک معمولی اداکار ہو۔ خود کو یہ کریڈٹ مت دو کہ۔۔۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ میں نہ آتا۔" شیخ نے کہا۔ "ایک حماقت تم نے بھی کی تھی یعنی پہلے لاش کو گڑھے میں پھینک دیا تھا اور پھر اس کو کچھ دور لے جا کر دفن کیا تھا۔"

"یہ صرف اس لیے تھا کہ تم نہ آؤ تو کم سے کم میر محمد کی گمشدگی کا راز فاش نہ ہو۔" وہ بولا۔ "بعد میں کسی نے کہا تھا کہ ایک پولیس افسر کی لاش سے بہت ہلچل پیدا ہو گی۔ اسے ناقابلِ شناخت بنا دو۔ تم نہ آئے تو کوئی بات نہیں اور آ گئے تو کھود کر کیا نکالو گے۔ محض ایک جسم۔ نامکمل اور بے جان، جو اپنے بارے میں کچھ نہیں بتا سکے گا۔ تمھاری ذہانت سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بات یقینی تھی کہ تم نشانات سے اصل مدفن تک پہنچ جاؤ گے۔"

"ہم یہاں کب تک مذاکرات کرتے رہیں گے۔" میں نے کہا۔ "جبکہ مشترکہ اعلامیہ جاری ہونے کے امکانات بھی ہیں اور ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ ہم سب کا انجام کیا ہو گا۔"

"تمھیں میرے انجام کی فکر کیوں ہے؟" وہ چڑ کر بولا۔

"اس لیے کہ تم بھی محض ایک مہرے ہو، پیدل، گھوڑے یا فیل بھی نہیں۔ تمھارا پٹنا بھی یقینی ہے۔"

"تم بولے بغیر نہیں رہ سکتے۔" وہ بولا۔ "یا تم مجھے بھی مشتعل کرنے کا حربہ آزما کے شکار کرنا چاہتے ہو؟"

"میر، ایک سگریٹ تو پی سکتا ہوں؟" میں نے کہا۔ "تمھاری اجازت ہے؟"

"اس بہانے اپنی پھرتی اور چالاکی مت دکھانا۔ مجھے حکم ہے کہ تم سے کوئی سروکار نہ رکھوں بلکہ پوری کوشش کروں کہ تمھیں کوئی نقصان نہ پہنچے۔" وہ بولا۔ "وہ لوگ صرف شیخ صاحب کو لینے آئیں گے۔"

"بیٹھے بیٹھے تو میرا سارا جسم اکڑ گیا ہے۔" میں نے ہاتھ اٹھا کے انگڑائی لی اور ہاتھ نیچے لاتے ہوئے تھوڑا سا بیک ویو مرر کو چھو دیا۔ بیک ویو مرر گھوم کر پیچھے والی سیٹ کا منظر پیش کرنے لگا۔ پھر میں نے سگریٹ جلائی۔

میرا دل اچھل کر میرے سینے سے ٹکرایا اور میرا سانس رک گیا۔ پیچھے کی سیٹ پر سے میر محمد مجھے گھور رہا تھا۔ اس کی کھلی آنکھیں مجھ پر مرتکز تھیں۔ لائٹر کی مدھم روشنی میں بھی اس کی صورت کے نقوش بالکل واضح تھے۔ اس صورت کو شناخت کرنے میں میری نظر دھوکا نہیں کھا سکتی تھی۔ یہ وہی میر محمد تھا جس نے بہت کوشش کی تھی کہ پھانسی کا پھندا میرے گلے میں فٹ ہو جائے۔

فرق صرف اتنا تھا کہ میری نظر کے سامنے صرف میر محمد کا چہرہ تھا۔ باقی دھڑ نہیں تھا۔ باقی دھڑ بہت پیچھے اس وقت بھی فرشِ خاک پر داستانِ عبرت بنا پڑا تھا۔ یہ صرف سر تھا۔ گردن سے اوپر کا وہ حصہ جو لاش کے تن سے جدا کر دیا گیا تھا۔

آہستہ آہستہ میں نے اپنے رکے ہوئے سانس کو خارج کیا اور پھونک مار کے لائٹر کو آف کر دیا حالانکہ میرا اس پر سے انگوٹھا ہٹا لینا ہی اس کے شعلے کو دبا دینے کے لیے کافی تھا۔ میں نے سگریٹ کا ایک کش لیا اور دھواں خارج کرتے ہوئے ایک بار پھر بیک ویو مرر میں دیکھا۔

شیخ نے یقیناً میری حالت میں رونما ہونے والے تغیر کو نوٹ کر لیا تھا۔

"تم نے مجھے سگریٹ نہیں دی۔" وہ بولا۔ "سگریٹ پینے کے ادب آداب سب بھول گئے؟"

"سوری" میں نے چونک کر کہا "پہلے ان سے تو اجازت لے لو۔ ہمارے جیلر صاحب سے۔"

"مسٹر ایکس! کیا میں بھی سکندر سے ایک سگریٹ لے سکتا ہوں" شیخ نے کہا۔

"لے لو۔ اور ہو سکے تو ایک مجھے بھی دے دو۔" اس نے بڑی شانِ استغنا سے کہا۔

میں نے پیکٹ میں سے ایک سگریٹ نکال کے شیخ کی طرف بڑھائی اور اپنے لائٹر سے جلائی۔ امید کی ایک کرن پل بھر کے لیے روشن ہوئی۔ میں نے سگریٹ اور لائٹر دونوں ۔۔۔ مڑ کر دیکھے بغیر پیچھے بڑھائے۔

حسبِ توقع اس نے ایک ہاتھ سے ریوالور تھامے رکھا اور سگریٹ کا پیکٹ لینے کے لیے دوسرا ہاتھ آگے بڑھایا "معلوم نہیں یار شیخ! اسلام آباد کی صورتِ حال کیا ہے" میں نے ایک بے مقصد بات کی اور بظاہر غیر ارادی طور پر میرا وہ ہاتھ پیچھے ہو گیا جو سگریٹ اور لائٹر اپنے شانے کے پیچھے پکڑانے کے لیے آگے بڑھا ہوا تھا۔ یہ ایک بے ضرر سی بات تھی جس کا ہماری موجودہ صورتِ حال سے ذرا بھی تعلق نہیں تھا۔ مسٹر ایکس نے ہاتھ اور آگے بڑھا کے دونوں چیزیں لے لیں۔

مشکل یہ تھی کہ وہ عین اکرام شیخ کے پیچھے تھا چنانچہ مجھے بیک ویو مرر میں نظر نہیں آتا تھا۔ بالکل دوسرے کنارے پر یعنی میرے پیچھے میر محمد کا سر سیٹ پر یوں رکھا ہوا تھا کہ میں نگاہ اٹھا کے دیکھتا تھا تو اس کی آنکھیں مجھے گھورنے لگتی تھی۔ بیک ویو مرر کا زاویہ جس میں پہلے پیچھے کی سڑک اور ٹریفک نظر آتی تھی، میرا ہاتھ لگنے سے ایسے زاویے پر آ گیا تھا جسے درست کرنا اب مشکل تھا۔ چاہتا میں یہی تھا کہ اس آئینے میں اپنے دشمن کا چہرہ دیکھوں مگر میرا ہاتھ ایسے لگا کہ آئینہ دوسری سمت میں گھوم گیا۔

اس نے دائیں ہاتھ میں ریوالور پر گرفت مضبوط رکھی۔ پیکٹ کو گود میں رکھ کے اس نے بائیں ہاتھ کی مدد سے ایک سگریٹ نکال کے لبوں میں دبائی اور پھر بائیں ہاتھ سے ہی لائٹر کو دبا کے روشن کیا۔

"یہ لوگ تمھیں کہاں لے جائیں گے شیخ؟" میں نے تشویش آمیز لہجے میں کہا۔ "ٹیپ تو مل گیا ہے ان کو۔" بظاہر میں پیچھے کی طرف بالکل متوجہ نہ تھا لیکن درحقیقت میری تمام توجہ پیچھے تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر مجھے واپس دینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا چکا ہے۔ میں نے بات شیخ سے جاری رکھی اور ہاتھ کو تھوڑا سا پیچھے کیا۔ اس نے اپنا ہاتھ تھوڑا سا اور آگے بڑھایا تاکہ دونوں چیزیں میرے ہاتھ تک پہنچ جائیں۔ اچانک میں نے دیکھا کہ اس کا ہاتھ تقریباً میرے کندھے کے پاس ہے۔

وہ لمحہ بہت مختصر تھا جب میں ہاتھ پکڑ کے ایک جھٹکے میں اسے آگے لا سکتا تھا اور اسی وقت ہاتھوں کی قوت پر خود کو اٹھا کر پیروں کو سمیٹتے ہوئے اس خالی جگہ سے گزر سکتا تھا جو سیٹ اور فاکس ویگن کی چھت کے درمیان تھی۔ وہ جھٹکے سے آگے آتا اور اس کا منہ اپنے مقابل سیٹ کی پشت سے ٹکراتا اور وہ اتنا جھک جاتا کہ میں اس کے اوپر جا گرتا۔

لیکن یہ بات یقینی تھی کہ اس کے ریوالور سے ایک گولی ضرور نکلے گی۔ جب اس کا توازن بگڑے گا تو ریوالور کا رخ بھی بدلے گا مگر کس حد تک؟ حملہ ہوتے ہی اس کا ذہنی ردِعمل کسی خود کار مشین کی طرح ہوگا۔ اپنے ہاتھ کو میرے ہاتھ کی گرفت میں محسوس کرتے ہی وہ فائر کرے گا اور اس لمحے کے ایک مختصر ترین حصے میں جب میں اچانک اس پر حملہ کروں گا، وہ آگے آ رہا ہوگا اور میں اس کو زیر کرنے کے لیے پیچھے کی طرف چھلانگ لگا دوں گا مگر ابھی اتنا ہی وقت گزرا ہوگا کہ میں اوپر اٹھ جاؤں۔ وہ فائر کر چکا ہوگا۔ اس وقت ریوالور سے نکلنے والی گولی کہاں جائے گی؟

میرا اندازہ یہ تھا کہ ریوالور کا رخ اس وقت اکرام شیخ کے سر کی طرف ہے۔ دشمن کے ذہن میں یہ خیال بھی نہیں کہ میں جو بڑے پُرسکون طریقے پر حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے تسلیم کر چکا ہوں کہ دشمن زبردست ہے اور مقابلہ بے سود ہے، یکلخت اپنی بے ضرر گفتگو کو منقطع کر کے اور جملہ ادھورا چھوڑ کے اس پر حملہ کرنے والا ہوں۔

میں یہ بھی جانتا تھا کہ جب فائر ہوگا تو ریوالور کا رخ اوپر کے بجائے کچھ نیچے ہو جائے گا لیکن ریوالور اکرام شیخ کے بالکل پیچھے، بہت قریب تھا۔ تھوڑا نیچا ہونے کے باوجود ریوالور کی گولی اس کو کہیں بھی لگ سکتی تھی۔ گردن میں، اس سے نیچے ریڑھ کی ہڈی میں، شانے سے کچھ نیچے بائیں طرف سے دل میں۔ ہر صورت میں یہ گولی مہلک ثابت ہوتی۔ میری بہادری کا انعام یہ احساس ہوتا کہ میں نے اکرام شیخ کو مروا دیا۔ براہِ راست نہ سہی بالواسطہ طور پر میں اس کے قتل کا ذمّے دار ہوا۔

ہاں اگر ریوالور اتنا جھک جائے کہ گولی سیٹ کے نیچے فرش پر لگے یا دس فیصد امکانات کی صورت میں ہاتھ کے اوپر اٹھنے سے چھت پھاڑ کے نکل جائے تو میں اس دشمن کو مغلوب کر سکتا ہوں جسے اپنی طاقت پر نہیں، اس چھوٹے سے آتشیں اور ہلاکت خیز کھلونے پر بھروسہ تھا جو اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس سے زیادہ اعتماد مجھے اپنے خالی ہاتھوں کی قوت پر ہے لیکن میں مجبور ہوں۔ اس لیے کہ خطرہ میری جان کو نہیں، میرے دوست اکرام شیخ کی زندگی کو تھا۔

چنانچہ یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ وقت کم ہے اور مجھے کوئی

موقع نہیں ملے گا، میں نے اس فیصلہ کن لمحے کو مایوس لوٹا دیا اور سگریٹ لائٹر لے کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔ میں نے بزدلی اور کم ہمتی کے احساس سے مفاہمت کر لی لیکن ایک اچھے دوست اور اچھے آدمی کے بے گناہ خون کے چھینٹوں سے اپنا دامن بچا لیا۔

"تم ٹاپ مین تو نہیں ہو۔" میں نے کہا۔ "لیکن استاد پیڈرو کی طرح اوپر والوں کے معتمدِ خاص ضرور ہو۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ مجھے چھوڑنے اور شیخ کو ساتھ لے جانے میں کیا مصلحت ہے؟"

"میں جواب دینے کا پابند تو نہیں۔" مجھ سے معتمدِ خاص کا خطاب پا کے اس کی خودی کچھ بلند ہو گئی تھی۔ "لیکن بتا دینے میں کوئی ہرج بھی نہیں سمجھتا۔ سب انسپکٹر شیخ کو ہم بطور ضمانت لے جائیں گے۔ صرف تصدیق کے لیے کہ تم نے ہمیں خالی ٹیپ تو نہیں تھما دیا ہے۔ یہاں تو کوئی صورت نہیں اس کو سننے کی۔ اس کے لیے وہ بھاری بھرکم ٹیپ ریکارڈر چاہیے۔ اگر ٹیپ ٹھیک ہوا تو شیخ صاحب کو چھوڑ دیا جائے گا لیکن یہ پہلے کی بات تھی جب ہمارا خیال تھا کہ ٹیپ ایک ہی ہے۔ تم نے دوسرے ٹیپ کی موجودگی کا ذکر کر کے حالات کو غیر یقینی بنا دیا ہے۔ ہو سکتا ہے اب مسٹر شیخ کو اس وقت تک رکھا جائے جب تک دوسرا ٹیپ بھی نہ مل جائے جو اصل ہے۔"

"مگر وہ دوسرا ٹیپ ہمارے پاس تو نہیں ہے جو اصل ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ تم کہہ رہے ہو۔ کیا یہ جھوٹ نہیں ہو سکتا؟" وہ بولا۔

"ہو سکتا ہے۔" میں نے اعتراف کیا۔ "اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اصل ٹیپ سے صرف ایک ہی کاپی نہ بنائی گئی ہو۔ دو یا دس کاپیاں بنالی گئی ہوں۔ اب تک ایک کاپی ہمارے پاس تھی۔ تمھیں کیا معلوم ہم نے اس کاپی سے کتنی کاپیاں اور بنالی ہیں۔ جس ثبوت کو تم مٹانا چاہتے تھے۔ وہ صرف ایک کاپی لے جانے سے تو ختم نہیں ہوگا۔"

"اب کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے۔" وہ لاجواب ہو کے بولا۔ "اس کا فیصلہ وہی کریں گے جو ٹاپ مین ہیں۔"

پھر ایک ایسی بات ہوئی جو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔

فاکس ویگن دو دروازوں والی کار ہے اور یہ دونوں دروازے آگے ہوتے ہیں۔ ان کو کھولنے والے ہینڈل بھی آگے ہی ہوتے ہیں مگر اکرام شیخ اگر نکلنا چاہتا تو اسے بائیں ہاتھ سے لیور ٹائپ ہینڈل کو اوپر کرنا پڑتا اور پھر اس کے دروازے کو شانے سے یا ہاتھ سے دھکا دینا پڑتا۔ اس کے بعد بھی باہر نکلنا اقدامِ خودکشی کے مترادف ہوتا۔ وہ سیٹ پر سے لڑھک جاتا تب بھی کھلے دروازے کے فٹ بورڈ کے قریب زمین پر گرتا اور اتنی دیر میں دشمن اس کو یقیناً شوٹ کر دیتا۔

یہ گولی اکرام شیخ کے کہیں بھی لگ سکتی تھی۔ باہر نکلنے سے پہلے یا زمین پر گرنے کے بعد۔ دشمن جو پوری طرح تیار بیٹھا تھا اطمینان سے اس کا نشانہ لے سکتا تھا۔ چنانچہ میرا خیال تھا کہ اکرام شیخ ایسی کوئی حرکت نہیں کرے گا مگر جس طرح میرا ذہن مسلسل مصروفِ عمل تھا، شیخ بھی خالی نہیں بیٹھا تھا۔ اس نے میری صورت کے تاثرات سے، میرے لہجے کی مایوسی سے یا اپنی چھٹی حس سے، جس کو ہم ٹیلی پیتھی بھی کہہ سکتے ہیں کیونکہ ہم ایک جیسی صورتِ حال سے دوچار تھے اور ہمارے ذہن اس لیے ہم آہنگ تھے کہ ہم ایک ہی مسئلے پر ساری توانائی صرف کر رہے تھے۔ یہ اندازہ کر لیا کہ میں نے کچھ سوچا تھا اور ناقابلِ عمل سمجھ کے اس پر عمل نہیں کیا۔

پھر اس نے طے کیا کہ اب میری باری ہے۔ سکندر کم ہمت نہیں ہے اور اس نے خطرہ مول نہیں لیا۔ تو شاید میری وجہ سے کیونکہ ریوالور کی زد پر میں ہوں۔" اس نتیجے پر پہنچنے کے بعد شیخ نے عملی قدم اٹھایا۔

میں نے تو صرف ہلکا سا کھٹکا سنا تھا۔ سیکنڈ کے ہزارویں یا اس سے بھی کم حصّے میں مَیں نے سمجھ لیا کہ شیخ اپنی جان پر کھیلنے کا فیصلہ کر چکا ہے اور دروازہ کھول کے باہر گرنے والا ہے۔ یہ کھٹکا اس سوئچ کے کھٹکے کی طرح تھا جس سے کوئی برقی میکانکی نظام فعال ہو جائے۔ کوئی مشینی کارخانہ چل پڑے یا دو تاروں کے ملنے سے ڈائنامائٹ کا دھماکا ہو جائے۔ بیک وقت میں نے نتائج کی پروا کیے بغیر پیچھے چھلانگ لگائی۔ شیخ کو باہر گرتے دیکھا اور فائر کی آواز سنی۔

ریوالور کا رخ باہر کی طرف تھا اور دشمن کی تمام توجہ اس شخص کی طرف تھی جسے وہ گرفتار کر کے ساتھ لے جانے پر مامور تھا۔ چنانچہ میرے لیے کوئی خطرہ نہ تھا۔ دوسرے لمحے مَیں اس کے اوپر تھا اور وہ میرے نیچے۔

میں نے اس کا سر ایک وحشیانہ قوت کے ساتھ آگے اور پیچھے والی سیٹ کے درمیان گھسیٹر دیا۔ وہ دُہرا ہو گیا۔ کیونکہ اس کے پیر پہلے ہی فرش پر تھے۔ میں مشتعل نہیں تھا۔ اس لیے میں نے پوری احتیاط کے ساتھ اور متوازن قوت کے ساتھ اس کے کان کے پیچھے وار کیا۔ اس کا تمام شور و غوغا تھم گیا اور وہ ڈھیلا پڑ گیا۔ میں نے اس کے سر کے بالوں کو پکڑ کے ایک جھٹکے سے اٹھایا اور اسے کھینچ کر سیٹ پر ڈال دیا پھر میں نے اگلی سیٹ کو دھکیلا اور جگہ پیدا ہوتے ہی باہر نکل گیا۔

"شیخ!" میں نے زور سے پکارا اور اِدھر اُدھر دیکھا۔

وہ گاڑی کے پیچھے سے نکلا۔ اسے زندہ سلامت پا کے مجھے خوشی ہوئی۔

"تم نے بڑی حماقت کی تھی۔ مرجاتے تو یہ بہادری نہیں، خودکشی کہلاتی۔" میں نے کہا۔

"ارے یار! مرنا تو ایک ہی بار ہے نا۔" وہ بولا۔

"اور ٹیپو سلطان کا قول ہے کہ گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر شیخ جی! وہ انگریزوں کے خلاف جہاد کر رہا تھا۔ اس کی لڑائی بدمعاشوں سے نہیں تھی اور وہ میسور کا حکمراں تھا۔ پولیس کا سب انسپکٹر نہیں تھا۔ یہ بتا کہیں چوٹ تو نہیں آئی ہے؟"

"چوٹ تو نہیں آئی۔" وہ بولا۔ "ایک زخم آیا ہے گولی سے۔"

پھر وہ ایک قدم آگے بڑھا تو میں نے اسے لنگڑاتے دیکھا۔ گولی اس کی بائیں ٹانگ میں لگی تھی۔

"کہاں لگی ہے گولی؟" میں نے اسے سہارا دے کر کہا۔ "تو چل سکتا ہے نا یا میں اٹھالوں؟"

"میں چل سکتا ہوں۔" وہ بولا۔ "گولی پنڈلی میں لگی ہے، بس ہڈی نہیں ٹوٹی۔"

"اس کار کو یہیں چھوڑ کے ذرا دور سے دیکھتے ہیں کہ ادھر کون آتا ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن ایک منٹ ٹھہر جا۔ پہلے میں ذرا اپنی حفاظت کا انتظام بھی کرلوں۔ تیرے پاس تو ایک ریوالور ہے نا؟ اس سے مجھے کور کر۔"

میں اسے چھوڑ کے واپس فاکس ویگن میں گھسا اور اس شخص کو دیکھا جو پچھلی سیٹ پر ترچھا پڑا تھا۔ اس طرح کہ اس کے اور میر محمد کے سر کے درمیان کوئی فاصلہ نہ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک سیاہ نقاب سی تھی جو اتار کر دیکھنے پر عام کپڑے کا سیاہ تھیلا ثابت ہوا۔ اس میں سامنے سے دیکھنے کے لیے دو سوراخ بنا دیے گئے تھے۔

میں نے اگلی سیٹ پر دیکھا مگر شیخ کی ٹارچ سیٹ پر نہیں تھی۔ فاکس ویگن کے ڈیش بورڈ پر کچھ رکھنے کی جگہ نہیں ہوتی۔ ٹارچ اس نے اپنی گود میں ہی رکھی ہوگی اور جب اس نے باہر چھلانگ لگائی تھی تو شاید نیچے جا گری ہوگی۔ میں نے آگے آ کے دیکھا۔ ٹارچ دونوں اگلی سیٹوں کے درمیان پڑی تھی۔

ٹارچ کی روشنی میں اس کا چہرہ سیدھا کرکے دیکھتے ہی میں بھونچکا رہ گیا۔ یہ پیڈرو تھا۔ اس کے کانوں میں مندریاں بدستور موجود تھیں اور ویسے بھی اس سے میرا اتنا سابقہ پڑ چکا تھا کہ اب اسے میں دور سے بھی شناخت کرسکتا تھا۔

اس نے کالے رنگ کی ٹائٹ فٹ پینٹ اور اوپر اسی رنگ کی جسم سے چپکی ہوئی جرسی، پہن رکھی تھی۔ چنانچہ وہ غور سے دیکھے بغیر اندھیرے میں کیسے نظر آتا۔ حیرت کا ایک لمحہ گزر گیا تو اس کی جگہ مسرت نے لے لی۔

"بلّے بلّے شیخ!" میں نے بے اختیار ایک نعرہ بلند کیا۔ "اوئے دیکھ ہم نے تو ایک شکاری کو گرفتار کرلیا ہے۔"

"کون شکاری؟" شیخ نے قریب آ کے کہا۔

"واہ بیٹا!" میں نے شیخ کی بات کا جواب دینے کے بجائے بیہوش استاد پیڈرو کو مخاطب کیا۔ "کہاں جا کے قابو آیا ہے۔ اب تو تیرا باپ بھی بتائے گا کہ شرافت علی کو میں نے قتل کیا تھا یا تو نے؟"

شیخ نے مجھے پیچھے کھینچ لیا۔ "پاگل ہوگیا ہے کیا؟" اس کی آواز میں وحشت تھی اور اس وحشت کی وجہ بھی ظاہر تھی۔ اس نے میر محمد کا کٹا ہوا سر دیکھ لیا تھا۔ "کس سے باتیں کر رہا ہے؟"

"سوری یار!" میں نے کہا۔ "یہ استاد پیڈرو ہے جو میرے بہت سے مصائب کے علاوہ میر شرافت علی کا اصل قاتل ہے۔ میر محمد کا سر میں نے پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔ بیک ویو مرر میں۔ لیکن میں خاموش رہا۔"

"اس سر کو یہاں رکھنے کا مقصد؟" شیخ نے سوچ کر کہا۔

"غالباً دشمن یہ چاہتے تھے کہ وہ تجھے ٹیپ سمیت لے جائیں۔" میں نے کہا۔ "اور مجھے جانے دیں۔ ظاہر ہے اس کے بعد میں پیچھے نہ دیکھتا اور تیرے اغوا کی رپورٹ لے کر سیدھا تھانے جاتا تو یہ سر میرے ساتھ تھانے پہنچتا۔ میری اور اس کی دشمنی پہلے سے چل رہی ہے اور میں نے برملا اس کا اظہار بھی کیا ہے۔ تھانے میں پہنچنے کے بعد یہ دریافت ہوتا کہ میں ایس ایچ او صاحب کا سر پُرغرور بھی اتنی دیدہ دلیری کے ساتھ لیے پھر رہا ہوں تو مجھ سے پوچھا جاتا کہ سکندرِ اعظم! باقی ایس ایچ او صاحب کہاں ہیں اور میں انھیں سچ بولتے ہوئے بتا دیتا کہ اس سر کا حصہ فلاں جگہ برآمد ہونے والے جسم سے جوڑ کر دیکھو تو وہ کہتے کہ آنکھوں میں دھول جھونکتے ہو۔ وہ بے سر کی لاش تو مسٹر ایکس یا ایرا غیرا خان ولد غیرا خان کی ہے۔ میر محمد کی لاش کہاں ہے؟"

"ایسے مفروضات نہیں چلتے۔ پوسٹ مارٹم سے معلوم ہو جاتا کہ سر اسی لاش کا ہے۔" شیخ نے کہا۔

"یار تم غیر عملی باتیں کرتے ہو۔" میں نے جھلا کر کہا۔ "جب قبر سے لاش غائب ہوسکتی ہے۔ اسپتال میں ڈاکٹروں، نرسوں، پولیس اور مجسٹریٹ کی موجودگی میں ایک زندہ درگور کیے جانے والے گورکن کو زہر دیا جاسکتا ہے تو کیا اسپتال میں پڑی ہوئی درجنوں لاشوں میں سے ایک غائب نہیں کی جاسکتی یا اس کی جگہ دوسری لاش نہیں رکھی جاسکتی۔ تم نے مردہ خانے تو دیکھے ہوں گے اور وہاں کی حالت زار اور بدانتظامی بھی دیکھی ہوگی۔ جمعدار ٹائپ کا شخص ہی ... کے اس ٹرانزٹ کیمپ کا سب کچھ ہوتا ہے۔ آل اِن آل۔ دھن اور دھونس کے سامنے سرِتسلیم خم کرتے ہوئے یہ دھاندلی اس کے لیے ناگزیر ہوجاتی ہے۔ ہر جگہ دھن کا راج ہے۔ دھن مہاراج ہے اور مُردہ تو مُردہ ہے۔ اِدھر سے اُدھر رکھنے یا اس کا "ٹیپ" بدلنے سے جیب میں سو سو کے دس بیس نوٹ آجائیں تو کسی کا نقصان نہیں۔ الف کے وارثوں نے جیم کے مردے کو دفنا دیا اور جیم کے وارثوں نے الف کے مردے کو تو کون سا غضب ہوگیا۔ دفن تو دونوں ہوگئے اور قیامت آئے گی تو اٹھیں گے بھی ساتھ ساتھ۔ تم غور کرو تو اس سر اور اس جسم کے اسپتال پہنچنے اور پوسٹ مارٹم رپورٹ ملنے تک ہزار مرحلے ہیں اور گھپلا کہیں بھی کیا جاسکتا ہے جس سے حسبِ منشا رپورٹ حاصل ہوجائے۔ میں کیا بتاتا کہ سر سے نیچے کا میر محمد کیا ہوا؟ پھر ایک اور بھی غور طلب بات ہے۔ لاش کے بارے میں ابتدائی رپورٹ غلط تھی۔ جھوٹ بول کر ہمیں ایک جگہ بلایا گیا تھا اور شک ہونے کے باوجود ہم نے قبل از وقت کسی سے بات نہیں کی تھی۔ ایک دوسرے سے بھی نہیں لیکن پتا چلانے ہم دونوں ہی آئے تھے۔ کیا یہ نہ کہا جاتا کہ ہم دونوں پہلے میر محمد کو گاڑ گئے پھر لاش برآمد کرنے کے لیے پولیس کی نفری کے ساتھ پہنچے، بالکل انجان بن کے۔ میں یہ کیسے ثابت کرتا کہ اکرام شیخ کو واقعی گن پوائنٹ پر اغوا کیا گیا ہے۔ جب تو رہا ہو کے واپس پہنچتا تو یہی ثابت ہوتا کہ اغوا بھی ڈراما تھا۔ اکرام شیخ اپنی مرضی سے غائب ہوا اور پھر مناسب وقت پر لوٹ آیا۔ یعنی اس وقت جب میں رپورٹ لکھوا چکا تھا۔ میر محمد کے سر کو ہم نے کہیں اور پھینکنے یا گاڑنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن بدحواسی یا شامتِ اعمال کے باعث بھول گئے۔"

"یہ تو بڑی خطرناک سازش تھی جس سے ہم بال بال بچ گئے۔" شیخ نے قائل ہو کے کہا۔

"بس تیری ٹانگ میں گولی کا ایک زخم آیا۔ مجھ پر ایک اور قتل کا الزام نہیں آیا۔" میں نے کہا۔ "اور ہمارے ہاتھ وہ شخص لگ گیا جس کی مجھے سب سے زیادہ ضرورت تھی۔"

"پھر اب کیا سوچا ہے؟" شیخ نے کہا۔ "میری ٹانگ میں تکلیف ہو رہی ہے۔ رومال تو باندھ لیا تھا میں نے پیچھے جا کر۔"

"یہاں سے کچھ دور مورچہ قائم کرتے ہیں۔" میں نے اسے سہارا دیتے ہوئے کہا۔ "اور دیکھتے ہیں کون آتا ہے۔"

میں اسے کچھ دور لے گیا اور ہم ایک جھاڑی کے پیچھے اس طرح لیٹ گئے کہ ہماری گاڑی صاف نظر آتی رہے۔ ایک دروازہ مقفل تھا اور اگر ہوش میں آنے کے بعد جس کا کوئی امکان نہ تھا، پیڈرو دوسرے دروازے سے باہر نکلنے کی کوشش کرتا تو اسی کے ریوالور کی ایک گولی اس کا راستہ روکنے کے لیے کافی ہوتی۔

"ہمیں یہاں ایک گھنٹے سے زیادہ ہوگیا ہے۔" شیخ نے کہا۔ "آخر وہ لوگ آئے کیوں نہیں؟"

"یہی میں بھی سوچ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "بے شک ہماری واپسی کا کوئی وقت متعین نہیں تھا لیکن پیڈرو کے ساتھی کچھ دور رہ کر انتظار کرسکتے تھے۔ مثلاً اسی جگہ اور اگر ان کا خیال واقعی عین اس وقت پہنچنے کا تھا جب پیڈرو ہمیں لے کر یہاں پہنچ جائے تب بھی ایک گھنٹے کا فرق، چہ معنی دارد کیا وہ پانچ دس منٹ پہلے یا پانچ دس منٹ بعد نہیں آسکتے تھے؟"

"ورنہ اس ایک گھنٹے میں چکر لگا کے تو دیکھ سکتے تھے کہ پیڈرو اپنے اسیروں کو لے آیا ہے یا نہیں۔ ہمیں کیا معلوم وہ کس قسم کی گاڑی میں آئیں گے۔ وہ احتیاط کی خاطر یہ کرسکتے تھے کہ ایک مرتبہ سیدھے گزر جاتے اور مطمئن ہوجانے کے بعد لوٹ آتے۔" شیخ نے کہا۔

"ادھر تو کوئی گاڑی ہی نہیں آئی۔"

"کچھ دیر میں صبح ہوجائے گی۔" میں نے کہا۔ "زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے میں۔"

"کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ ان کی گاڑی کو حادثہ پیش آگیا ہو۔" شیخ بولا۔ "یا ان کی گاڑی خراب ہوگئی ہو؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں اب کچھ اور سوچ رہا ہوں شیخ!" میں نے کہا۔ "جب کوئی چوکی محصور ہو جائے اور اس کے دفاع کی کوئی صورت نہ رہے تو اسے دشمنوں کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ گھوڑا بیمار یا لنگڑا ہو جائے تو اسے گولی مار دیتے ہیں اور جس گھر کی مخدوش حالت سے دوسروں کو خطرہ لاحق ہو اُسے گرا دیا جاتا ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔" اکرام شیخ نے کراہ کے کہا۔ "آپ سیدھی صاف بات کریں تو میری ناقص عقل میں آئے۔"

"شیخ جی!" میں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ "شروع سے اب تک استاد پیڈرو نمایاں رہا ہے۔ ہر جگہ اس کا نام آیا ہے اور وہ کئی بار نظر آچکا ہے۔ میرے اور محسن کے علاوہ بھی اسے بہت سے لوگ پہچانتے ہیں۔ اس کی پوزیشن ایک ایسی قابلِ اعتماد لانچ کی سی ہے جو کارکردگی کے اعتبار سے بہترین ہو، سیکڑوں بار سمندر میں سفر کر چکی ہو اور مالکوں کو لاکھوں کروڑوں کا فائدہ پہنچا چکی ہو، ابھی مزید کئی سال چل سکتی ہو اور مالکوں کو اتنا ہی فائدہ اور پہنچا سکتی ہو مگر پولیس کی نظر میں آگئی ہو۔ کیا یہ لانچ اپنی جان کے صدقے میں پولیس کے سُپرد کر دینا عقلمندی نہیں۔ اسے آخری سفر پر یوں روانہ کیا جائے کہ معلوم ہو یہ بھی ایک کاروباری پھیرا ہے اور پولیس کو موقع دیا جائے کہ وہ تعاقب کر کے اسے پکڑ لے۔"

"تمھارا مطلب ہے اب وہ خود پیڈرو کو پولیس کے حوالے کر دینا چاہتے ہیں؟" شیخ نے کہا۔

"غالباً۔ لیکن بیچارے استاد پیڈرو کو یہ بات نہیں معلوم۔ وہ اسی یقین کے ساتھ آیا تھا کہ یہ بھی حسبِ سابق ایک ایسی اہم خدمت تھی جس کے لائق کوئی اور نہ تھا۔ ذرا سوچو کہ دن کا اجالا پھیل جانے کے بعد وہ ہمیں کیسے قابو میں رکھتا۔ اسے حکم تھا کہ مجھے گزند نہ پہنچے۔ تمھیں بحفاظت لایا جائے اور وہ بھی بطورِ ضمانت صرف تصدیق کے لیے۔ دن چڑھنے سے پہلے وہ کیسے بھاگتا۔ کیا ہم اسے بھاگنے دیتے؟ ایک صورت یہی رہ جاتی تھی کہ وہ ہم دونوں کو مار کے نکل جائے۔ ورنہ روشنی ہوتے ہی لوگوں کی آمد و رفت شروع ہو جاتی۔ سامنے والی کوٹھیوں میں سے کوئی پوچھنے آجاتا کہ میاں یہاں کیوں گاڑی روکے بیٹھے ہو یا کوئی راہ گیر ایس ایچ او کا سر دیکھ لیتا تو اس کا سر نہ پھر جاتا۔ ابھی تک پیڈرو کو شک نہیں ہوا تھا کہ اسے پھنسا دیا گیا ہے۔ اگر وہ اپنے ساتھیوں کے نہ آنے سے پریشان تھا تو اس کا اظہار نہیں کر رہا تھا۔ اگر اسی طرح بیٹھے بیٹھے آدھا گھنٹہ بھی اور گزر جاتا تو وہ کچھ نہ کچھ ضرور کرتا۔"

"پھر یہاں انتظار کرنے سے کیا حاصل؟" شیخ نے کہا۔ "تھانے چلتے ہیں؟"

"کیا تیری ٹانگ میں بہت زیادہ تکلیف ہو رہی ہے؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ گولی سے تو صرف خراش آئی ہے۔ کچھ گہری ہے مگر اب تو خون بھی رِسنا بند ہو گیا ہے۔"

"تو پھر کچھ دیر انتظار کر لینے میں کوئی ہرج نہیں۔" میں نے کہا۔ "شاید تیری ہی بات ٹھیک ہو۔ کسی حادثے یا گاڑی میں خرابی کے باعث وہ ابھی تک نہ پہنچ سکے ہوں۔"

"تیری بات میں بہت سے نکات کی وضاحت نہیں ہوتی۔" شیخ نے کہا۔ "کیا ان کے پاس پیڈرو سے نجات پانے کے اور طریقے نہیں تھے؟ وہ چاہتے تو کسی دشواری کے بغیر قتل کرا دیتے۔"

"یعنی سامنے کھڑا کر کے گولی مار دیتے؟" میں نے کہا۔ "یا کسی کو اس کے قتل پر مامور کر دیتے۔ بے شک یہ ہو سکتا تھا لیکن اس طرح ان کے دیگر ساتھی احساسِ عدم تحفظ میں مبتلا ہو جاتے۔ ان کے پاس دو طرح کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جن کی خدمات کسی وقتی ضرورت کے لیے اور معاوضے پر حاصل کر لی جاتی ہیں۔ عموماً پیڈرو جیسے لوگ ہی مطلب کے آدمی ڈھونڈ کر لاتے ہیں۔ کام ہو جائے تو انھیں معاوضہ دے دیا جاتا ہے اور تعلق ختم۔ کام کے دوران میں وہ مارے جائیں تو ان کا مقدر۔ پکڑے جائیں تو خطرے کی بات نہیں۔ وہ کچھ بتا ہی نہیں سکتے سوائے اس کے کہ ان کو اتنے معاوضے پر یہ کام کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔ کس نے کہا تھا؟ ایک آدمی تھا اس حلیے کا۔ حلیہ ہمیشہ غلط ہوتا ہے۔ چنانچہ خود ان کے سوا کوئی سزا نہیں پاتا۔ دوسری قسم پیڈرو جیسے لوگوں کی ہے۔ لیڈرانِ درجہ دوم خصوصی معتمد۔ یہ مستقل ساتھی ہوتے ہیں جو طویل رفاقت اور آزمائش کے بعد اس مرتبے تک پہنچتے ہیں اور اگر تقدیر یاوری کرے۔ یعنی جرائم کی مملکت کے بے تاج بادشاہ سلامت نہ رہیں۔ حادثے میں جہنم رسید ہو جائیں یا شامتِ اعمال کے باعث پولیس سے مقابلے میں کام آجائیں تو قیادت انھی کے پاس آجاتی ہے لیکن ایسے وفاداروں کو قتل کیا جائے اور یہ خبر پھیل جائے تو دوسرے سمجھتے ہیں کہ کسی دن انھیں بھی وفاداری اور جاں نثاری کا صلہ یہی ملے گا۔ ان میں خوف اور بددلی پھیل جاتی ہے تو گروہ میں ڈسپلن نہیں رہتا۔ بغاوت کا اندیشہ رہتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خصوصی معتمد کسی حریف گروہ میں شامل ہو جائیں تو ان کے اپنے گروہ کا وجود ہی خطرے میں پڑ جائے۔ یہ طریقہ باعزت اور بے ضرر ہے۔ پیڈرو کو سب کے سامنے ایک مشن پر روانہ کیا گیا تھا۔ افسوس کہ وہ پولیس کے ہتھے چڑھ گیا اور لوٹ کر نہیں آیا۔ ممکن ہے کہ اس وقت بھی کچھ لوگ مخالف سمت میں یا یہاں سے بہت دور کسی سڑک پر منتظر ہوں کہ استاد پیڈرو فتح کے جھنڈے لہراتا سرخ فاکس ویگن میں دو قیدیوں کے ساتھ نمودار ہوگا۔ یہ جگہ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگی۔ وہ کب تک انتظار کریں گے؟ شاید اب تک وہ واپس جا کے پیڈرو کے نہ آنے کی رپورٹ بھی دے چکے ہوں گے۔"

شیخ نے اقرار میں سر ہلایا۔ "تمھاری باتوں سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ چار سال تک تم انگلستان میں انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کرنے نہیں گئے تھے، اسکاٹ لینڈ یارڈ میں زیرِ تربیت تھے۔ کتنا اچھا ہو اگر تم جیسے لوگ پولیس میں ہوں۔"

میں بے اختیار ہنسا۔ "تیری یہ خواہش ایسی ہی ہے جیسے کوئی چاہے کہ سورج رات کو نکلا کرے اور چاند دن میں۔ فرق تو کوئی نہیں پڑے گا۔ خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد۔ جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے۔ تو شیخ صاحب! پولیس کے بجائے میں صفِ مجرماں میں شامل ہوں۔ اور ہوتے ہیں اہلِ ہوس مدعی بھی منصف بھی۔ یہ ہو سکتا ہے لیکن ہوگا نہیں کہ میرے جیسے لوگ پولیس میں ہوں۔ جہاں سے تم جیسے بھی خارج کیے جا رہے ہیں۔"

"کیا پیڈرو کو خودکشی کے اس مشن پر ارسال کرنے والوں کو یہ اندیشہ نہیں کہ پیڈرو سب کچھ جانتا ہے اور پولیس اقبالِ جرم کرانا جانتی ہے۔ ان کے سارے راز افشا ہو جائیں گے۔"

"نہیں۔ جب یہ لوگ پولیس کے ہاتھ لگتے ہیں تو یہ بات اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ انھوں نے اعترافِ جرم کیا تو قانون سزائے موت دے گا اور اگر کوئی انکشاف کیا تو سزائے موت دوسری طرف سے ملے گی لیکن وہ پامردی سے ڈٹے رہے اور کسی کے بارے میں کچھ نہ بتایا تو انھیں قانونی و غیر قانونی طور پر تحفظ فراہم کیا جائے گا۔ وکیل اور مقدمے کے اخراجات، زرِ ضمانت، سب کا بندوبست ہو جائے گا اور خدانخواستہ سزا ہو گئی تب بھی جیل کے اندر انھیں ہر سہولت حاصل رہے گی۔ وہ رہائی پا کے نکلیں گے تو اپنی جاں نثاری کے باعث پہلے سے زیادہ اہم ہو جائیں گے۔"

"میرا خیال ہے اب چلنا چاہیے۔" شیخ نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ "اب کوئی نہیں آئے گا۔ تیرا خیال درست ثابت ہو رہا ہے۔"

میں نے کلائی کی گھڑی میں وقت دیکھا۔ ساڑھے تین بج چکے تھے۔ ایک گھنٹے میں صبح کے آثار نمودار ہونے لگیں گے۔ میں نے اقرار میں سر ہلایا اور کھڑا ہو گیا۔

"میں تیرے ساتھ تھانے تک نہیں جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "تیرا بیان یہی ہوگا کہ میں تجھے جائے واردات تک پہنچانے کے بعد گھر چلا گیا تھا۔ تیرا اور میرا ایک ساتھ تھانے پہنچنا شکوک پیدا کرے گا۔ میں تجھے اور تیرے قیدی کو کسی ایسی جگہ پہنچا دوں گا جہاں سے تجھے ٹیکسی مل جائے۔ ٹیپ بھی میں لے جاؤں گا۔"

"اور اس کا کیا ہوگا؟" اکرام شیخ نے ہاتھ سے میر محمد کے سر کی طرف اشارہ کیا۔

"اسے بھی میں ہی لے جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "سب سے اچھا تو یہ ہوتا کہ ہم اس کو جائے واردات کے آس پاس ہی ڈال سکتے لیکن ابھی وہاں تیری فوج کھڑی ہے اور شاید آج کا سارا دن کوئی وہاں رہے۔"

"میں ان کو ہٹا لوں گا۔" شیخ نے کہا۔ "لاش کے اسپتال پہنچنے کے بعد۔"

"پھر بھی دن میں ایسی کوئی کارروائی خطرے سے خالی نہیں۔" میں نے کہا۔ "رات تک میں کچھ کر لوں گا۔ تجھے دو کام کرنے ہیں۔ ایک تو میر محمد کی بے سر لاش کی حفاظت کے لیے خصوصی انتظامات۔ کہ غائب یا تبدیل نہ ہونے پائے۔ اس سے زیادہ خطرناک کام استاد پیڈرو کو بچانا ہے۔ اگر یہ ہوش میں ہوا تو اس کو حوالات میں بھی قتل کرا دیا جائے گا خواہ اس کے لیے قاتلوں کو دستی بم ہی کیوں نہ پھینکنا پڑے۔ یہ ہوش میں نہ آیا تو اسے پولیس کی تحویل میں اسپتال لے جانا پڑے گا اور اسپتال میں قاتلوں کا کام زیادہ آسان ہو جائے گا۔ اچھا اب تو آگے پیچھے نظر رکھ۔ میں میر محمد کے سر کو سیٹ پر سے اٹھا کے آگے ڈِگی میں رکھتا ہوں۔"

"ایسے ہی۔۔۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "تیری سیٹ پر تو خون کے داغ ہوں گے ہی۔ آگے بھی پڑ جائیں گے۔"

"میرے پاس ایک پرانا تولیہ ہے۔" میں نے کہا۔ "جسے میں گاڑی یا ونڈ اسکرین پر سے گرد جھاڑنے کے لیے استعمال کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے سر کو اسی میں لپیٹ لوں۔"

تولیہ سیٹ کے نیچے تھا۔ میں نے اسے پچھلی سیٹ پر پھیلایا اور میر محمد کے سر کو بالوں سے پکڑ کے اوپر اٹھایا۔ ذرا سی دیر کے لیے میرا ہاتھ کانپا۔ پھر میں نے سر کو تولیے پر رکھ دیا اور تولیے کے چاروں کونے الٹ کر اس کی گٹھری سی بنا لی۔ اکرام شیخ نے اندر سے تار کھینچا اور میں نے ڈِگی کو اٹھا کے سر کو اسپیئر وھیل کے بیچ کی خالی جگہ میں رکھ دیا۔ اسپیئر وھیل کو بالکل سامنے کے کھانچے میں کھڑا ہونا چاہیے تھا لیکن جب سے ایکسیڈنٹ میں اگلا حصہ پچکا تھا، ٹائر اس جگہ میں فٹ نہیں ہوتا تھا اور فٹ ہوتا تھا تو بونٹ بند نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ اسے ڈِگی میں جیک وغیرہ کے ساتھ ہی رکھ دیا گیا تھا۔ درمیان میں سر کے لڑھکتے پھرنے کا امکان نہیں تھا۔

بونٹ بند کر کے میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اکرام شیخ نے دروازہ بند کیا اور میں نے گاڑی اسٹارٹ کرنے سے پہلے ایک کام یہ کیا کہ جو کالا نقاب پیڈرو کے منہ پر تھا، وہ پیچھے کی نمبر پلیٹ پر چڑھا دیا۔ احتیاط بہر حال ضروری تھی۔

"کیا تو نے کوئی بہت زوردار ہاتھ مار دیا تھا؟" شیخ نے

کہا: "یہ ہوش میں کیوں نہیں آرہا ہے؟"

"ہاتھ تو میں نے بہت ناپ تول کے مارا تھا۔" میں نے کہا: "اب ہر شخص کی قوتِ برداشت الگ ہوتی ہے۔ ویسے تشویش کی بات نہیں۔ صبح ہونے سے پہلے اسے یقیناً ہوش آجائے گا۔ اسے باندھ کے رکھنا اور ہوسکے تو چھپا کے بھی۔"

"وہ میں کرلوں گا۔" شیخ نے کہا: "اس سے اگلے چوک پر ٹھہر جانا۔ وہاں سے اسٹیشن جانے والے رکشا اور ٹیکسی گزرتے رہتے ہیں۔ اب تو صبح ہونے والی ہے۔"

"ٹیکسی والے کو شک نہیں ہوگا؟" میں نے کہا اور گاڑی روک لی۔ اسی وقت ایک ٹیکسی نمودار ہوئی۔ شیخ فوراً اتر کے اس کے سامنے آگیا۔ ورنہ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ صبح دم بیگار میں پکڑے جانے کے خوف سے بھاگ جاتا۔

"دیکھو بھائی!" شیخ نے شرافت سے کہا: "ذرا تھانے تک چلنا ہے۔ ایک آدمی سڑک پر بیہوش پڑا تھا۔ یہ کار والے شریف آدمی تھے۔ یہاں تک تو لے آئے ہیں مگر یہ خود جلدی میں ہیں، ان کو مخالف سمت میں جانا ہے۔"

ٹیکسی ڈرائیور ایک بار رکنے کے بعد انکار کی پوزیشن میں کہاں تھا مگر اکرام شیخ کے شریفانہ اور قطعی "غیر تھانیدارانہ" لہجے نے اسے شک میں ڈال دیا کہ کہیں پولیس کی وردی میں ڈاکو نہ ہوں۔ وہ تذبذب کے عالم میں بیٹھا رہا۔

"ایسے بے وقوفوں کی طرح منہ کیا دیکھ رہے ہو؟" اکرام شیخ نے ایک دم لہجہ بدل لیا: "کوئی فارسی تو نہیں بول رہا ہوں میں۔" اس نے گرج کر کہا: "نیچے اترو اور اس آدمی کو اٹھاؤ۔"

"جی... جی صاحب..." ٹیکسی والے کے سارے شکوک دور ہوگئے۔ اس نے پیڈرو کو ٹیکسی کے اندر لٹانے میں میری مدد کی اور کچھ حیران بھی ہوا۔ ایک شخص پولیس کی وردی میں، دوسرا شریفانہ لباس میں، تیسرا چوروں جیسے کالے کپڑے پہنے۔ لیکن وہ بولا نہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ تھانے جا کے جب شیخ اسے کرایہ ادا کرے گا تو وہ مزید حیران ہوگا کہ جسے وہ برا شگون سمجھا تھا، وہ مبارک ترین فال ثابت ہوا۔ ایک "اصلی تے وڈا" تھانیدار اسے پکڑ کر تھانے لے گیا اور "یونہی" ایسی ہوئی جو اس کی توقعات کے عین برعکس تھی۔ اس تھانیدار نے غلط میٹر کے مطابق پیسے دیے۔ ایسا پہلے کبھی ہوا ہے؟

ٹیکسی کے نظر سے اوجھل ہو جانے کے بعد میں نے گاڑی اسٹارٹ کر کے بیک کی اور گھر کی طرف چل پڑا۔ میں نے کراؤن سینما سے آگے "گڑھی شاہو" کا موڑ کاٹ کے دائیں طرف ایک فرلانگ کا فاصلہ بھی طے نہیں کیا تھا کہ انجن نے پہلا جھٹکا لیا۔ چند قدم بعد دوسرا اور آخری ہچکی لے کر بند ہوگیا۔

میں نے فیول میٹر کی طرف نگاہ ڈالی۔ اس کی سوئی نہ جانے کب سے بتا رہی تھی کہ ٹینک خالی ہوچکا ہے مگر میں ذہنی طور پر دوسرے مسائل میں ایسا الجھا ہوا تھا کہ میں نے اس طرف توجہ ہی نہیں دی تھی۔ پیٹرول پمپ مجھے سامنے مشکل سے سو گز کے فاصلے پر نظر آرہا تھا لیکن میرے پاس کوئی خالی ڈبا نہیں تھا اور ہوتا بھی تو پیٹرول پمپ سے ڈبے میں پیٹرول نہ ملتا۔ اس قانون کی مضحکہ خیزی نے مجھے ہمیشہ حیران کیا تھا۔ ویسے ایک بوند پیٹرول نہیں ملے گا، آپ خود چاہیں تو ٹینک فل کرائیں۔ پھر ربڑ کے پائپ سے سب نکال کے ڈبے بھرلیں اور اگلے پیٹرول پمپ سے پھر ٹینک بھروالیں۔ جب تک خود آپ کا دل نہ بھرے آپ ہر پیٹرول پمپ پر جا کے اپنا یہ شغل جاری رکھیں۔ قانون اپنی جگہ ہے چنانچہ پمپ والے پیٹرول دیں تو ان کی سزا یہ کہ لائسنس منسوخ، قید یا جرمانہ یا دونوں۔ اور جو اس طرح پیٹرول لینے آتا ہے وہ فیملی کے ساتھ ہو یا خود کو ہر حوالے سے شریف آدمی ثابت کرے تب بھی مجرم ہے جو آتش زنی کی واردات پر کمربستہ ہے۔

سڑک خالی پڑی تھی۔ فاکس ویگن کو اکیلے دھکا لگا کے لے جانا بہت مشکل کام تھا۔ دس گز بعد میرا سانس پھول گیا۔ دو ریڑھے والے مدد کرنے کے بجائے آپس میں ریس لگاتے گزر گئے ایک "جوگنگ" کرنے والے نوجوان نے اس خستہ حال فاکس ویگن کو دھکا لگانے کو کسرِ شان سمجھا۔ دھکا لگانا ہو تو آدمی کم سے کم مرسیڈیز کو تو دھکا لگائے۔

پھر ایک فقیر گلے میں کشکول ڈالے نمودار ہوا۔ وہ بھی روز کی طرح فکرِ معاش میں نکلا تھا اور ڈیوٹی پر جا رہا تھا: "دھکا دینے کو کہتا ہے بچہ!" وہ بیٹھی ہوئی آواز میں بولا: "تم جیسوں نے ہمیں دھکے دیے ہیں ہمیشہ۔"

"وہ وقت اور مقدر کی بات ہے بابا! جس کے مقدر میں دھکے کھانا لکھا ہے وہ دھکے ہی کھائے گا۔" میں نے اس کے فلسفیانہ نکتے کا جواب فلسفے سے دیا: "میں ایک روپیہ دوں گا۔"

"ایک روپیہ!" وہ کھی کھی کر کے ہنسا: "ایک روپے میں تو فقیر صرف دعا دیتا ہے، دھکا نہیں دیتا۔ پانچ دے گا؟"

مجھے پہلے سے اندازہ تھا کہ وہ موقعے سے فائدہ ضرور اٹھائے گا۔ اگر وہ ایک روپے میں مان جاتا تو میں حیران ہوتا اور پیٹرول پمپ پہنچنے کے بعد اسے پانچ ہی دیتا۔ گاڑی نے آگے کھسکنا شروع کیا۔ "یا علی مدد!" فقیر نے نعرہ لگایا۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ پیٹرول پمپ پر بہت روشنی ہوگی۔ پیٹرول ڈلوانے کے لیے مجھے آگے سے ڈِگی کھولنی پڑے گی جس میں پیٹرول ٹینک کا منہ ہے اگر تولیے میں لپٹا ہوا سر کوئی کونہ ہٹ جانے سے نمایاں ہوگیا۔ یا کہیں خون کا داغ نظر آگیا تو کیا ہوگا؟ پیٹرول بھرنے والا تو فوراً تولیہ اٹھا کے دیکھ لے گا، چیخ مارے گا اور بیہوش ہوجائے گا۔ ورنہ پولیس پولیس چلانے لگے گا۔ اس کے لیے مجھے بہت محتاط رہنا ہوگا۔ میں نے طے کیا۔ ڈِگی کا ڈھکن اٹھتے ہی میں باہر جا کے کھڑا ہو جاؤں گا اور خود پیٹرول ٹینک کی کیپ کھولوں گا۔ پائپ سے پیٹرول ڈالنے والے کو پیسے لینے والے کو اپنی طرف متوجہ رکھوں گا اور تولیے کو ہرگز ہاتھ نہیں لگانے دوں گا۔

فقیر اور میں فاکس ویگن کو دھکا دیتے پیٹرول پمپ پہنچے تو اس منظر سے وہاں موجود عملہ محظوظ ہوا۔ فقیر نے پانچ کا نوٹ کھیسے میں ڈالا اور کوئی دعا نہیں دی۔ پانچ روپے اس نے محنت سے کمائے تھے، خیرات نہیں لیے تھے اور شاید وہ پشیمان بھی تھا کہ خواہ مخواہ زورِ بازو سے کمائی کے چکر میں انرجی ضائع کی۔ اسے محنت کی عادت نہیں تھی۔ چنانچہ اس کا سانس مجھ سے بھی زیادہ پھولا ہوا تھا۔ خود اندر سے تار کھینچ کر ڈِگی کھولنے کے بجائے میں نے اس لڑکے سے جو پمپ کی نال کو مشین گن کی طرح تھامے کھڑا تھا، یہ کہا کہ وہ تار کھینچے اور اس کے لیے ایک فضول سا بہانہ کیا۔

"معاف کرنا یار! مجھ میں مزید زور لگانے کا دم نہیں ہے۔" میں نے ضرورت سے زیادہ ہانپتے ہوئے کہا۔ وہ اس بات پر حیران تو ہوا مگر اس نے ہوز پائپ کو واپس لٹکایا اور میری مدد کی۔ میں نے ڈِگی کو اٹھایا اور بیہوش ہوتے ہوتے بچا۔ سر کے اوپر سے تولیے کے چاروں کونے پھسل چکے تھے اور اب ٹائر کے بیچ میں وہ سر ایک بچھے ہوئے تولیے پر یوں رکھا ہوا تھا، جیسے نمائش کے لیے رکھا گیا ہو۔

میں نے خدا کا ہزار شکر ادا کیا کہ دوسرا شخص یعنی کیشیئر جس نے گلے میں چمڑے کا تھیلا لٹکا رکھا تھا، ابھی دور تھا۔ پیٹرول بھرنے والے لڑکے نے بھی سامنے سے ہو کر جانے کے بجائے پیچھے کی طرف سے پمپ تک کا فاصلہ طے کیا اور مجھے اتنا وقت مل گیا کہ میں تولیے کو پھر اس کھوپڑی پر ڈھک سکوں۔ چار گیلن پورے ہوتے ہی میں نے خود پیٹرول ٹینک کی کیپ بند کی اور لڑکے نے ربر پائپ کو واپس پمپ کی سائڈ میں لٹکا دیا۔

اور اس وقت اپنی طرف سے ہر احتیاط برتنے کے باوجود مجھ سے ایک غلطی ہوئی۔ نوٹ میرے ہاتھ میں تھا اور میری توجہ کیشیئر کی طرف نہیں رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں ڈِگی بند کرتا، وہ میرے پیچھے سے نکل کر سامنے آگیا: "ٹائر کو یہاں نہیں رکھنا چاہیے صاحب!" اس نے میرے منع کرنے سے پہلے ٹائر اٹھانے کے لیے کھینچا۔

"کیا کر رہے ہو تم؟" میں چلایا: "رہنے دو اسے یہیں۔"

"اس کے نیچے تار ہوتے ہیں صاحب! شارٹ ہوسکتے..."

جملہ نامکمل رہ گیا کیونکہ ٹائر کے کھینچنے سے درمیان میں رکھے ہوئے سر کے اوپر پڑا ہوا تولیہ ہٹ گیا اور میر محمد کا کٹا ہوا سر کیشیئر کو گھورنے لگا۔ وہ ذرا سی دیر کے لیے دہشت سے منجمد ہوگیا۔ پہلے اس نے یقیناً سمجھا ہوگا کہ یہ فریبِ نظر ہے یا میرا دماغ چل گیا ہے۔ کسی شریف آدمی کی ڈِگی میں لاش کا سر کسی کے قیاس میں آنے والی بات بھی نہیں۔

یکلخت مجھے خطرے کا احساس ہوا۔ میں نے نوٹ اس کی طرف پھینکا مگر اس وقت تک وہ ایک فلک شگاف چیخ مار چکا تھا: "خون... قاتل... اوئے پکڑو..." اس نے پوری قوت سے چلانا شروع کیا۔ میں نے ایک کمرے کے شیشے والے آفس میں سے دو افراد کو دوڑ کر آتے دیکھا۔ کیشیئر کے جنون کی حالت دیکھ کر وہ سمجھے ہوں گے کہ میں کوئی ڈاکو ہوں جو گن پوائنٹ پر اس کے کیش کا تھیلا چھین کر بھاگنا چاہتا ہوں۔

میں نے کیشیئر کے ایک مکا رسید کیا کیونکہ وہ مجھے پکڑ چکا تھا اور مجھے کار میں نہیں بیٹھنے دے رہا تھا۔ وہ پیچھے گرا تو وہ نوعمر لڑکا سامنے آگیا جس نے پیٹرول ڈالا تھا۔ میں نے ایک لات اس کے رسید کی اور وہ بلبلا کے بیٹھ گیا۔ کیشیئر کو پکے فرش پر گرنے سے چکر آگئے تھے۔ چنانچہ وہ اٹھ کر تو بیٹھ گیا تھا مگر پھر مقابلے کے لیے کھڑا نہیں ہوا تھا۔ وہ ہذیانی کیفیت میں چلا رہا تھا: "قاتل، خون۔ اوئے میری توبہ مولا۔ ڈگی میں سر بندے کا..." میں نے دروازہ کھولا ہی تھا کہ آفس میں سے نمودار ہونے والے آپہنچے۔

صورتِ حال یکلخت سنگین ہوگئی تھی۔ کوئی گاڑی کسی بھی وقت پیٹرول لینے آجاتی تو میرے لیے فرار بھی مشکل ہوجاتا۔ اندر سے آنے والے ہٹے کٹے نوجوان تھے اور غالباً گارڈ کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ میں نے سمجھ لیا کہ ان دونوں سے مقابلہ آسان نہیں ہوگا۔ میں نے فوراً پوزیشن لے لی۔ اب میرے لیے جوڈو میں اپنی مہارت کا استعمال کیے بغیر نکلنا مشکل تھا۔

وہ دونوں ایک ساتھ مجھ پر حملہ آور ہوئے اور میں نے غوطہ مار کے دونوں کو بازوؤں پر لے لیا۔ پھر میں نے بیک سمرسالٹ یعنی الٹی قلابازی کھائی اور وہ میرے ساتھ ہی فرش پر یوں گرے۔ جیسے کوئی دھوبی پٹخا مارنے سے کمر کے بل گرتا ہے۔ وہ ایسی پیشہ ورانہ مہارت کے مظاہرے کے لیے بالکل تیار نہ تھے، وہ چیت ہی پڑے تھے کہ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ کروٹ لے کر اٹھنے لگے تو میں نے بوٹ سے ان کی ٹھوڑی کے نیچے کک رسید کی۔ وہ دونوں الٹ کر گرے اور میں کھلے دروازے کی طرف بڑھا۔

گاڑی کا انجن بند تھا اور اگلے حصّے کے ٹینک سے پیچھے انجن کے کاربوریٹر تک پیٹرول اس وقت تک نہیں پہنچ سکتا تھا جب تک میں ایکسلریٹر کو خوب پمپ نہ کروں۔ اس کے بعد بھی اگر انجن اسٹارٹ نہ ہوتا تو کوئی عجیب بات نہ ہوتی۔ بعض اوقات خشک کاربوریٹر میں تھوڑا سا پٹرول انجن کا بونٹ اٹھا کے اور ایئر کلینر ہٹا کے بھی ڈالنا پڑتا ہے۔ اس میں بھی مقدار کا بہت خیال رکھنا پڑتا ہے۔ پیٹرول کم ہو تو آخری قطرہ تک استعمال کر لینے والے انجن کا بھلا نہیں ہوتا اور زیادہ ہو کے کاربوریٹر میں جمع ہو جائے تو گاڑی "اوور" ہو جاتی ہے پھر اسے دھکا دے کر ہی اسٹارٹ کرنا بہتر ہوتا ہے۔ ورنہ سیلف مارنے سے کاربوریٹر میں کچھ اور پیٹرول آجاتا ہے اور بار بار سیلف مارنے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بیٹری بیٹھ جاتی ہے اور گاڑی کھڑی رہتی ہے۔

اندر بیٹھتے ہی میں نے زور زور سے ایکسلریٹر پر پیر ملے اور کھڑکی سے باہر دیکھا تو ناک آؤٹ ہونے والے کھڑے ہو چکے تھے، کیشیئر ان پر واضح کر چکا تھا کہ اس نے کیا دیکھا تھا۔ عام حالات میں شاید وہ کیشیئر کی بات پر یقین نہ کرتے اور اسے نظر یا دماغ کا فتور قرار دیتے لیکن اس معرکہ آرائی کے بعد یقین نہ کرنے کا سوال ہی نہ تھا۔ وہ اب چلّا چلّا کے رائے عامّہ کو متوجہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے مگر رائے عامّہ ابھی سوئی پڑی تھی۔ ایک شخص نے دوسری منزل کے مکان کی کھڑکی سے سر نکال کے کہا "اوئے! کی رولا اے بھئی؟"

میں نے انجن کو اسٹارٹ کرنے کے لیے چابی گھمائی۔ انجن غرایا اور خاموش ہو گیا۔ میں نے پھر پمپنگ کی۔ اسی وقت ایک رکشا اندر کی طرف مڑا۔ پیٹرول پمپ والے اس کی طرف دوڑے۔ میں نے دوبارہ چابی گھمائی اور انجن یکلخت اسٹارٹ ہو گیا۔ اس مختصر مدت میں رکشا والے کو بھی صورتِ حال کی سنگینی کا خلاصہ چار افراد نے بیک وقت اپنی بے ربط گفتگو میں سنا دیا تھا "آدمی کا سر!" رکشا والا چلّایا۔

میں نے کھڑکی سے ہاتھ نکال کے دو ہوائی فائر کیے اور کار لے کر بھاگا۔ فاکس ویگن کی رفتار کا مقابلہ رکشا کیا کرتا۔ میرا مقصد تو اسے خوفزدہ کر کے تعاقب سے روکنا تھا۔ اندھیرا اب بھی تھا مگر میں نے نہ ہیڈ لائٹس جلائیں، نہ عقبی لائٹس جلائیں۔ اس وقت مجھے خیال ہی نہیں آیا کہ میری ایک چھوٹی سی احتیاط نے مجھے بڑی مشکل میں پڑنے سے بچا لیا ہے۔ اگر پیچھے والی نمبر پلیٹ پر کالا کپڑا نہ چڑھا ہوتا تو پیٹرول پمپ کی مرکزی لائٹ میں وہ کار کا نمبر صاف نوٹ کر لیتے۔

لائٹس میں نے ایک فرلانگ دور آنے کے بعد جلائیں جب مجھے یقین آ گیا کہ میرے تعاقب میں کوئی نہیں ہے۔

صحیح سمت سے گریز کی خاطر میں نے گاڑی کو دائیں ہاتھ موڑنے کے بجائے بائیں طرف موڑ لیا۔ پھر مجھے پولیس کی نفری کا خیال آیا جو شاید ابھی تک ایمبولینس کے انتظار میں اپنے افسرِ اعلیٰ کی بے سر لاش پر پہرہ دے رہی ہو۔ وہ گاڑی کو پہچان جائیں گے۔ عام فاکس ویگن کا رنگ سرخ ہوتا تو وہ سمجھتے کہ یہ ویسی ہی دوسری گاڑی ہے لیکن سامنے سے میں نے اس کا حلیہ یوں بگاڑا تھا کہ اب اسے ایک بار دیکھنے والا دوبارہ دیکھتے ہی شناخت کر سکتا تھا۔ پھر یہ کیا عجیب صورتِ حال ہوتی کہ ایس ایچ او کا دھڑ تو اسی جگہ پڑا نظر آیا اور سر کو میں اتنے قریب سے لے کر گزر جاتا۔ اگر ایمانداری بقولِ شاعر "حق گوئی و بیباکی آئینِ جواں مرداں" سے کام لیتے ہوئے رک کر یہ سر پیش کرتا کہ ایس ایچ او صاحب کو مکمل کر لیا جائے تو کوئی جرم نہ کرنے کے باوجود مجرم بن جاتا اور یہ راست گوئی خود اپنے لیے رسن و دار کا سامان فراہم کرنے کے مترادف ہوتی۔

میں نے کار کو بیک کیا اور پل پر سے سیدھا گزر گیا۔ صبح کے آثار اب آسمان کی سیاہی میں ہلکی سی سفیدی بن کے جھلکنے لگے تھے۔ اخبار فروش اور دودھ والے سائیکلوں پر نکل کھڑے ہوئے تھے "اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو" پھر انھیں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی دو۔ کارپوریشن کا پانی اور بھینس کا دودھ ایک ہی قیمت میں ایک ساتھ۔ اور انھیں اخبار دو کہ انھیں جرائم کی تازہ ترین صورتِ حال سے لے کر آٹے دال کا بھاؤ سب معلوم ہو جائے اور رات خوابوں کی دنیا میں بسر کرنے والے عملی زندگی کے تلخ اور سنگین حقائق کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔

کار کی طرح میرے خیالات کی سمت بھی کوئی نہ تھی۔ کار کو میں نے غیر ارادی طور پر دائیں طرف موڑ لیا اور انفنٹری روڈ سے گزرا۔ میاں میر صاحب کا قبرستان سیدھے ہاتھ پر رہ گیا اور ایک ورکشاپ کی چار دیواری شروع ہو گئی پھر فورٹریس اسٹیڈیم آ گیا جہاں ہر سال میلۂ اسپاں و مویشیاں کا ہنگامہ بپا ہوتا تھا اس وقت وہاں حدِ نظر تک ویرانی تھی۔ میں نے بیک ویو مرر میں دیکھا تو مجھے اپنے پیچھے بھی سڑک دور دور تک خالی نظر آئی آگے مال روڈ تھا اور نمبر پلیٹ پر سیاہ کپڑا چڑھا کے وہاں سے گزرنا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ مال پر ٹریفک ہوگا اور پیچھے سے آنے والی کوئی بھی گاڑی پولیس یا ملٹری کی ہوگی تو فوراً روک لے گی۔

میں نے گاڑی کو ایک طرف روکا اور اتر کے پیچھے گیا۔ ہیڈ رو کا سیاہ نقاب میں نے زبردستی نمبر پلیٹ کے ... نیچے

دبا دیا تھا کیونکہ کنارے نٹ بولٹ سے کسے ہوئے تھے۔ تاہم اس سے تین چوتھائی نمبر چھپ گیا تھا۔ ایک طرف صرف ایل پڑھا جاتا تھا تو دوسرے کنارے پر صرف چھ کا ہندسہ نظر آ رہا تھا۔ میں نے اسے ایک جھٹکے سے اتارا اور وہیں پھینک دیا۔

مال روڈ پر پہنچ کے میں نے اطمینان سے گاڑی چلاتے ہوئے اپنے خطرات اور خدشات کا جائزہ لیا۔ بے شک ہوائی فائرنگ سے خوفزدہ ہو جانے والوں نے میرا تعاقب نہیں کیا تھا۔ کیونکہ ان میں سے کسی کو بھی ایک نئے دن کا آغاز اپنی وفات سے کرنا منظور نہ تھا لیکن سوال یہ تھا کہ کیا انھوں نے بعد میں اس ناقابلِ حد تک خوفناک، دہشتناک، افسوسناک اور سنسنی خیز واقعے کی رپورٹ پولیس کو دی ہوگی۔ نہیں۔ میں نے اپنے آپ سے کہا۔ رپورٹ میں وہ کیا لکھوائیں گے؟ سب سے ضروری کام تو یہ تھا کہ وہ کار کا نمبر نوٹ کرتے۔ ٹالنے کی ماہر پولیس انھیں اس نااہلی پر دھر لے گی اور مناسب نذرانہ لے کر چھوڑے گی کہ خبردار! آئندہ بلاوجہ پولیس کو تنگ کرنے مت آنا۔ نہ یہ معلوم کہ نمبر کیا تھا، ملزم کا نام کیا تھا۔ ولدیت پتا کچھ معلوم نہیں۔ چلے آئے رپورٹ لکھوانے۔ لال رنگ کی فاکس ویگن تھی۔ آدمی تھا تقریباً چھ فٹ کا، رنگ سانولا، بال کالے، سفید قمیص، سیاہی مائل پتلون۔ ایسے تو سب ہی ہوتے ہیں اور لال رنگ کی کیا ایک ہی گاڑی ہے شہر میں؟

لیکن سب سے زیادہ اہم بات یہ تھی کہ وہ سب بھی عام لوگ تھے۔ عام آدمی کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ تھانے کچہری کے چکر میں نہیں پڑتا۔ قانون کی مدد کرنا اپنا فرض نہیں سمجھتا یہ سمجھتا ہے کہ قانون اس کے گلے پڑ جائے گا۔ اس کا وقت، ذہنی سکون، پیسہ، کاروبار، سب متاثر ہوں گے اور یہ کون کہہ سکتا ہے کہ تفتیش کتنے مہینے یا کتنے سال چلے گی۔ پھر مقدمے کے سلسلے میں کتنے مہینے یا کتنے سال وہ بطورِ گواہ حاضر ہوتے رہیں گے اور انجام کی کسے خبر۔ جس کی گردن میں پھندا فٹ ہو وہی لٹک جائے چنانچہ پٹرول پمپ پر رہ جانے والوں نے بعد میں، پہلے تو اپنے اپنے نقصانات کا جائزہ لیا ہوگا۔ سب کو معمولی چوٹیں آئی تھیں، سب کی ہڈی پسلی بتیسی سلامت تھی۔ پیسے میں زیادہ ہی دے آیا تھا۔ یعنی پچاس کا پورا نوٹ پھینک دیا تھا۔ اتفاقِ رائے سے انھوں نے طے کیا ہوگا کہ اس معاملے میں لب کشائی کی ضرورت نہیں۔ انھیں جان کا صدقہ دینا چاہیے کہ ایک خطرناک قاتل کی کوئی گولی ان میں سے کسی کے نہیں لگی۔ اس لاقانونیت کا تدارک کون کر سکتا ہے۔ زمانہ ہی ایسا ہے۔ کس دیدہ دلیری کے ساتھ قاتل اپنے مقتول کے سر کو یوں لیے پھرتے ہیں جیسے بھُس بھروا کے ڈرائنگ روم میں سجانے کا ارادہ ہے۔ اسی طرح جیسے شکاری ہرن، بارہ سنگھے یا شیر کے سر کو شیلڈ بنا کے لگاتے ہیں۔

جب میں گھر پہنچا تو سورج نکل آیا تھا۔ دروازے کے باہر ایک شخص ملٹری ماڈل کی پرانی موٹر سائیکل پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ میں نے اسے ہارن دیا۔ "گاڑی کے بریک ٹھیک نہیں ہیں" میں نے نیچے اتر کے گیٹ کھولتے ہوئے کہا "غنیمت ہے کہ تمھارے اسپِ تازی پر سے نہیں گزری"

"کس پر سے؟" وہ موٹر سائیکل کو ہٹا کے کھڑا کرنے کے بعد بولا "کیا کہا ہے تم نے مجھے؟"

"کچھ نہیں" میں نے کہا اور گاڑی کو اندر لے گیا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے آیا۔ اس کی بغل میں ایک فائل تھی۔

"تم ۔۔ تم اندر بھی آ گئے؟" میں نے کہا "بلا اجازت؟"

"یہ ۔ ۔ ۔ یہ ۔ ۔ ۔ ضامن رضوی صاحب کی کوٹھی ہے؟" اس نے کچھ مؤدب ہو کے کہا۔

"تمھیں کیا نظر آتی ہے؟ کوٹھی یا جھگّی؟ اور اس سوال کا مقصد؟" میں نے کہا۔

"میں تفتیش کے لیے آیا ہوں" وہ فائل نکالتے ہوئے بولا۔ "بیان لینا ہے"

"معاف کرو بابا! میں اس وقت کچھ نہیں دے سکتا۔ پھر کبھی آنا" میں نے یوں کہا جیسے وہ فقیر ہے اور بھیک مانگ رہا ہے۔

"میں بیان لیے بغیر نہیں جا سکتا" اس نے اپنی خودی کو سہارا دے کر بلند کیا "میں سی آئی اے میں ہوں"

"پی آئی اے میں ہو تو جاؤ جہاز اڑاؤ" میں نے کہا۔ "ہوا بازی کی جگہ بیان بازی کا اختیار کس نے دیا ہے تمھیں؟"

اس نے جزبز ہو کے اپنا کارڈ نکالا "میں نے سی آئی اے کہا تھا۔ ہمارے دو انسپکٹر یہاں ڈیوٹی پر مامور تھے۔ دین محمد اور خواجہ اکبر"

"ان میں سے پچاس فیصد کو میں دریافت کر چکا ہوں۔ بالکل اسی طرح جیسے کولمبس نے امریکہ دریافت کیا تھا" میں نے کہا "تم کو دین محمد سے ملنا ہو تو تھانے چلے جاؤ۔ وہ حوالات میں بند ہے"

"آپ سیریس ہو کے بات نہیں کر سکتے؟" اس کی قوتِ برداشت جواب دینے لگی تھی۔

"کیا مطلب؟" میں نے کہا "میں سیریس نہیں ہوں، مذاق کر رہا ہوں؟ جوکر ہوں؟ اچھا اندر آؤ"

وہ میرے ساتھ ڈرائنگ روم میں آ گیا "یہ فون رکھا ہے، نمبر ملانا آتا ہے نا؟ تو یہ نمبر ملاؤ۔ ایک انسپکٹر اکرام شیخ جواب دے گا۔ اس سے کہنا کہ دین محمد سے بات کرا دے۔ میں اتنی دیر میں

نہاکے آتا ہوں "

جب میں نہا کے آیا تو تفتیش کے لیے آنے والا یوں بیٹھا تھا جیسے زیرِ تفتیش ہو۔

" بات یہ ہے سکندر صاحب !" اس نے معذرت آمیز لہجے میں کہنا شروع کیا " خواجہ اکبر پہلے ہی مل چکا تھا۔ دین محمد کا پتا نہیں چل رہا تھا۔"

" خواجہ اکبر کی سرگزشت سناؤ " میں نے کہا" وہ کہاں تھا اور کیوں تھا ؟"

" اس کے ساتھ بڑی عجیب بات ہوئی " وہ بولا " وہ صبح گھر سے نکلا تھا ڈیوٹی پر پہنچنے کے لیے۔ وہ بس سے آرہا تھا۔ راستے میں اسے ایک مسافر نے سگریٹ پیش کی۔"

" سگریٹ ؟" میں نے کہا " بس میں تو سگریٹ پینا جرم ہے مگر تم لوگوں کو مفت ملے تو زہر بھی پی لو۔ خیر "

" اس نے سگریٹ ختم کی تو اسے چکر سے آنے لگے۔ ذرا سی دیر میں وہ بے ہوش ہوگیا " وہ میری مداخلت کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا " لوگوں نے اسے سگریٹ پیش کرنے والے سے باتیں کرتے دیکھا تھا چنانچہ وہ انھیں ساتھی سمجھے اور سگریٹ پلانے والے نے کہا کہ اس کا دوست دل کا مریض ہے۔ بس فوراً روک دی گئی اور وہ خواجہ اکبر کو لے کر اُتر گیا اور ٹیکسی میں ڈال کے لے گیا " وہ خاموش ہوگیا اور کچھ سوچنے لگا۔

" اس کے بعد کیا ہوا ؟ کوئی دردناک واقعہ پیش آیا یا شرمناک ؟" میں نے اس کے تذبذب کو دیکھ کر کہا۔

" میں وہی بتا دیتا ہوں جو خواجہ اکبر نے کہا تھا۔ اسے ہوش آیا تو وہ کسی کوٹھی میں لیٹا تھا۔ کوٹھی بہت شاندار تھی۔ خواجہ اکبر بیڈروم میں تھا اور جس بیڈ پر جوتوں سمیت لیٹا تھا۔ وہ بھی بہت بیش قیمت تھا۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا کہ یہ حقیقت ہے یا خواب۔ آہستہ آہستہ اسے گزرے ہوئے واقعات یاد آنے لگے۔ وہ سمجھ گیا کہ ساری خرابی اس سگریٹ کی تھی جو اسے ایک اجنبی نے پیش کی تھی۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ وہ شریف آدمی نظر آتا تھا اور کچھ شریف آدمی بااخلاق بھی ہوتے ہیں جو کسی ہمسفر کو ایک سگریٹ پیش کر دینے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے۔ خواجہ اکبر کا سر بہت بھاری ہو رہا تھا اور وہ لیٹا ہوا سوچ رہا تھا کہ کہیں اس نے غلط تو نہیں سمجھا۔ ممکن ہے اس کی طبیعت بگڑ گئی ہو۔ وہ ہائی بلڈ پریشر کا مریض بھی ہے۔ اس نے سوچا کہ کہیں مجھے دل کا دورہ تو نہیں پڑا تھا اور یہ اسی شریف آدمی کا گھر تو نہیں ہے۔ ورنہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ سگریٹ پلا کے بیہوش کرنے والا اسے ایک سجی سجائی کوٹھی میں اتنے آرام سے لاکر لٹادے۔ ایک اجنبی دوسرے بیہوش اجنبی کو اٹھا کے تیسرے اجنبی کی خوابگاہ میں کیسے پہنچا سکتا ہے۔ وہ سوچ رہا اور کسی نتیجے پر پہنچنے کے علاوہ اٹھنے کی اور کسی کو پکارنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ ایک عورت اندر آگئی۔ خواجہ اکبر کو دیکھتے ہی اس نے ایک چیخ ماری اور پٹ سے گر کر بے ہوش ہوگئی۔ خواجہ اکبر کو وضاحت کا موقع ہی نہیں ملا۔ وہ بھونچکا بیٹھا تھا کہ دو ہٹے کٹے نوکر اور دو مشٹنڈے نوجوان اندر آگئے جو اس عورت کے بیٹے تھے۔ انھوں نے خواجہ اکبر کو پکڑ لیا۔ نوکروں نے صرف خواجہ اکبر کو پکڑے رکھا۔ نوجوانوں نے . . ."

" نوجوانوں نے 'تفتیش' شروع کی " میں نے قہقہہ مار کے کہا۔ " تمھارے اپنے طریقوں کے مطابق "

" وہ دونوں کالج کے باکسر تھے۔ انھوں نے خواجہ اکبر کی ایک نہیں مانی اور یہی پوچھتے رہے کہ وہ اندر کیسے آیا اور اس نے ان کی ممی کو کیوں مارا ؟" وہ بولا " خواجہ اکبر کی جیب میں کچھ نہیں تھا نہ پرس، نہ شناختی کارڈ۔ انھوں نے اسے اپنے باتھ روم میں بند کر دیا اور تھانے میں رپورٹ لکھوادی کہ کوئی بدمعاش چوری کی نیّت سے ان کے گھر میں آگھسا تھا۔ خواجہ اکبر پرانا آدمی ہے مگر جو اے ایس آئی آیا، وہ نیا تھا۔ اس نے دفعہ چار سو ایک دن ضابطۂ فوجداری کے تحت ایف آئی آر کاٹ دی۔ یعنی مجرمانہ عزائم لے کر ناجائز طور پر کسی کے گھر میں داخل ہونا۔ جو ناقابلِ ضمانت جرم ہو جاتا ہے۔ ضمانت صرف عدالت منظور کر سکتی ہے۔ اصل بات تو اس کے حوالات میں بند ہو جانے کے بعد معلوم ہوئی۔ مگر ایف آئی آر تو کٹ چکی تھی۔ اب وہ معطل ہے اور حوالات میں بیٹھا ہے۔ باعزت طور پر بری ہونے میں کچھ وقت تو لگے گا "

میری ہنسی اس کو مشتعل بھی کر رہی تھی اور شرمندہ بھی لیکن وہ ضبط پر مجبور تھا کیونکہ یہ کسی غریب لاوارث کا نہیں، ایک پولیس افسر کا گھر تھا۔ دشمنوں کی پلاننگ بہت اچھی تھی۔ انھیں وقتی طور پر دونوں محافظوں کو ہٹانا مقصود تھا۔ ایک پر انھیں تھوڑی سی زبردستی کرنی پڑی۔ دوسرے کو انھوں نے بڑی آسانی سے روک لیا۔ دونوں کی فرض شناسی نے انھیں حوالات پہنچا دیا۔ زمانہ بڑا قدر ناشناس ہے۔

" واہ بھئی واہ " میں نے ہنسی روک کر کہا " ساتھ ہو تو ایسا۔ پہلے دونوں سی آئی اے میں تھے۔ اب دونوں حوالات میں ہیں "

اچانک باہر سے ایک کتّے نے بھونکنا شروع کیا۔ میں نے دو منٹ تک برداشت سے کام لیا۔ اس امید میں کہ شاید وہ خود ہی چلا جائے گا لیکن دو منٹ بعد وہ ایک سے دو ہو گئے۔

" کیا رضوی صاحب نے کتّے بھی پال رکھے ہیں ؟"

" کتّے ؟" میں نے کچھ سوچ کر معنی خیز لہجے میں کہا " ہاں۔ بہت " لیکن وہ کچھ نہیں سمجھا اور میں اس کے ساتھ باہر آیا۔ میری ساری شوخی یکلخت کافور ہوگئی۔ دونوں کتّے کار کی ڈکّی پر حملہ کرنے کے موڈ میں تھے اور اس کی طرف تھوتھنی اٹھا کے مسلسل بھونک رہے تھے۔ انھیں ڈکّی میں سے خارج ہونے والے خون اور گوشت کی اس بُو نے متوجہ کر لیا تھا جو انسانی ناک محسوس نہیں کر سکتی تھی۔

" کیا ہے اس کار میں ؟" تفتیش کے لیے آنے والے نے کہا۔

" بہت کچھ ہے " میں نے بدستور غیر سنجیدہ رہنے کی کوشش کی " انجن ہے، باڈی ہے، چار پہیے ہیں "

" ڈکّی میں کیا ہے ؟" وہ میری بات کاٹ کے بولا۔

" پیٹرول ٹینک، اسپیئر وھیل، جیک " میں نے کہا " بجلی کے تار اور بہت کچھ "

" کتّے ایسی چیزوں پر نہیں بھونکتے "

" ان کتّوں کو کسی چیز سے الرجی معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً پیٹرول کی بُو سے۔ یا سرخ رنگ سے " میں نے کہا " اور ان کا ایک علاج تو یہ ہے کہ انھیں نفسیاتی کلینک بھیج دیا جائے لیکن دوسرا علاج فوری، سہل اور مؤثر ہے " میں نے ایک پتھر اٹھایا اور تاک کر ایک کتّے کے رسید کیا۔ مجھے اس وقت تک علم نہ تھا کہ میرا نشانہ کتنا صحیح ہے۔ پتھر ایک کتّے کے سر پر لگا۔ وہ چلّاتا ہوا بھاگا۔ اس کے پارٹنر نے دوسرے پتھر کا انتظار نہیں کیا اور وہ دونوں بیک وقت فرار ہو گئے " کتّے کہیں کے " میں نے ہاتھ جھاڑے اور اس اجنبی کی طرف دیکھ کر کہا " آؤ اب چائے پی کر جانا "

اس نے برا سا منہ بنایا کیونکہ جملے کا ابتدائی آدھا حصّہ اس سے نہیں کہا گیا تھا مگر اس پر بھی منطبق ہوتا تھا۔ وہ میرے اس رویّے کے بعد میری مہمان نوازی کو قبول کرنے کے موڈ میں نہ تھا لیکن میں نے اسے بے تکلفی سے ہاتھ پکڑ کے کھینچ لیا۔ میں نے اس کے سامنے اخبار رکھا اور ناشتا بنانے چلا گیا۔ ناشتا بناتے بناتے مجھے ایک اور خیال آیا۔

واپسی پر میں چائے کے علاوہ ٹرے میں اتنا سامان بھر لایا کہ وہ آدھے گھنٹے تک کھانے میں مصروف رہے۔ فریج میں سالم ڈبل روٹی تھی۔ میں نے چار انڈے اُبال لیے تھے، چار کا آملیٹ بنا لیا تھا۔ مکھن اور جام اس کے علاوہ تھے اور غالباً وہ ناشتا کر کے نہیں آیا تھا۔ وہ سب ذلت بھول کے پورے انہماک کے ساتھ کھانے میں مصروف ہوگیا۔ دو منٹ بعد میں نے کہا۔ " معاف کرنا یار ! میں آتا ہوں باتھ روم ہو کے۔ تم جاری رکھو۔ تکلف کی بالکل ضرورت نہیں " میں نے دوستانہ لہجے میں کہا۔

اور اس نے فقط سر ہلایا۔

باہر آ کے میں نے ڈکّی کو کسی آواز کے بغیر کھولا اور میر محمد کے سر کو تولیے سمیت اٹھا لیا۔ وہ ہیبت ناک موٹر سائیکل گیٹ کے اندر کھڑی تھی۔ اس کے کیریر سے دونوں طرف موٹے اور میلے کینوس کے بیگ لٹک رہے تھے اور انھیں بیلٹ جیسے تسموں کو بکل سے گزار کے بند کیا گیا تھا۔ ایک میں کچھ کاغذات تھے۔ دوسرے میں سے مختلف اشیا برآمد ہوئیں۔ بسکٹ کا ایک ڈبا۔ بچّوں کے ملک پاؤڈر کا ایک ڈبا۔ ڈرائی فروٹ کے دو لفافے۔ ایک میں آدھا سیر کے قریب کاٹھے بادام تھے۔ دوسرے میں اخروٹ کی گری۔ یہ سب مالِ غنیمت تھا۔ وہ نذرانہ جو صاحبِ اختیار لوگ راہ چلتے بھی وصول کر لیتے ہیں۔ سوائے شاید بے بی ملک پاؤڈر کے جو میں نے واپس رکھ دیا۔ باقی اسباب کی جگہ میں نے میر محمد سابق سب انسپکٹر اینڈ آنریری ایس ایچ او کے سر کو منتقل کیا۔ اس طرح کہ میں نے اپنے ہاتھ سے سر کو چھُوا تک نہیں۔ تولیے کا ایک کونا پکڑ کے کھینچ لیا۔ دوبارہ بکل سے بیگ کو بند کرنے اور سامان کو اندر لے جانے میں میرے دو منٹ بھی صرف نہیں ہوئے۔ پانچ منٹ بعد میں پھر ناشتے کی میز پر تھا۔ جہاں اب میرے کھانے کے لیے بہت کم بچا تھا مگر میں نے اسی

پر اکتفا کی جو میرے مقدر میں تھا۔ ناشتے کے بعد میں نے اسے سگریٹ پیش کی اور اس سے معذرت کی کہ میں اپنی عادت سے مجبور ہوں اور بعض اوقات مذاق میں حد سے بڑھ جاتا ہوں۔ میرا مقصد اس کی بے عزتی ہرگز نہیں تھا۔

جب وہ رخصت ہوا تو بہت خوش تھا اور اس نے رازدارانہ طور پر مجھے یہ بھی بتایا کہ خواجہ اکبر کو زیرِ دفعہ چار سو اکیاون ضابطۂ فوجداری سزا ہو جائے تو اس کی ترقی یقینی ہے اور سزا اس لیے یقینی ہے کہ مدعی بہت اونچے لوگ ہیں۔ کیا رضوی صاحب بھی سزا دلوانے کے لیے کچھ نہیں کر سکتے؟ کیوں نہیں کر سکتے؟ میں نے اسے یقین دلایا۔ میں بات کروں گا انکل سے اور انکل بات کریں گے مجسٹریٹ سے اور سمجھ لو کہ خواجہ اکبر گیا اندر۔ خوشی میں اس نے موٹر سائیکل سے متعلق کسی بیگ کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ دو تار آپس میں ملائے اور کک مارنے کے عمل میں مصروف ہو گیا۔ اس کا سانس اکھڑنے ہی والا تھا جب موٹر سائیکل کا انجن اسٹارٹ ہونے پر مجبور ہو گیا۔ ہانپتے ہوئے اس نے آخری بار مجھ سے مصافحہ کیا اور دندناتا ہوا باہر نکل گیا۔

اس کے جاتے ہی میں نے پہلا کام یہ کیا کہ اکرام شیخ سے بات کی اور اسے پیٹرول پمپ کی پہلی جنگ کے اسباب، واقعات اور نتائج سے مطلع کیا۔ "ذرا معلوم کرنا اپنے طور پر کہ متعلقہ تھانے میں کسی نے رپورٹ لکھوانے کی حماقت تو نہیں کی ہے؟" میں نے کہا۔

"وہ تو میں کر لوں گا۔" شیخ نے کہا۔ "تم خدا کے لیے اس کار کو لے کر مت نکلنا۔"

"اسے میں ابھی ڈینٹ پینٹ کے لیے دینے کا ارادہ رکھتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "نیا رنگ ہونے کے بعد نئی لگے گی۔"

"اس پر... میرا مطلب ہے سیٹ پر۔ ویسے تو تم عقل مند ہو۔"

"درست چہ شک۔ وہ میں دھو دھلا کے صاف کر دوں گا۔" میں نے کہا۔ پھر لائن کٹ گئی۔ شاید کوئی آ گیا تھا۔ میں نے ریسیور رکھا ہی تھا کہ گھنٹی پھر بجنے لگی۔ اسلام آباد سے ضامن رضوی صاحب بات کر رہے تھے۔

"گڈ مارننگ انکل!" میں نے خوشدلی سے کہا۔ "خیریت تو ہے وہاں؟"

"ابھی تک تو خیریت ہے۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "تم رات کو کہاں تھے۔ دو مرتبہ فون کیا تھا میں نے؟"

"اچھا؟" میں نے بے حد حیرت کا اظہار کیا۔ "میں تو کہیں گیا ہی نہیں۔ ذرا جلدی سو گیا تھا؟"

"جھوٹ مت بولو۔ میں نے ایک آدمی کو بھیجا تھا چیک کرنے کے لیے۔ نو بجے کے قریب۔"

"وہ... اس وقت تو میں کھانے کے لیے نکلا تھا۔ دس بجے تک لوٹ آیا تھا۔" میں نے سنبھل کر کہا۔

"اچھا اچھا۔ وہ تم نے اجازت کے لیے درخواست دی۔ کب آ رہے ہو یہاں؟" انھوں نے مطمئن ہو کے کہا۔

"بس انشاء اللہ آج نہیں تو کل۔" میں نے کہا۔ "مسز شیرواں کی طبیعت کیسی ہے؟"

"ان کی حالت اچانک سنبھل گئی ہے لیکن ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ حالت اسی طرح اچانک بگڑ بھی سکتی ہے۔ دوا یا علاج نہیں، یہ ان کی اپنی قوتِ ارادی ہے جو انھیں زندہ رکھے ہوئے ہے۔ یا یوں سمجھ لو کہ قدرت کا مقرر کیا ہوا وقت ابھی نہیں آیا۔ ابھی تو وہ پوری طرح ہوش میں ہیں اور لیٹے لیٹے سب انتظامات اپنی نگرانی میں کرا رہی ہیں۔" انھوں نے کہا۔

"کیسے انتظامات؟" میں نے بے خیالی میں کہا۔

"فوزیہ کی رخصتی کے۔ آج سہ پہر کے بعد نکاح ہے۔" رضوی صاحب نے کہا۔

اچانک میرے اردگرد ایک مہیب سناٹا مسلط ہو گیا۔ پھر جیسے شہرِ خموشاں کی زمین شق ہو گئی اور گزرے ہوئے وقت کی یادوں کے قبرستان سے ان گنت ڈھانچے نکل آئے۔ وہ اپنے استخوانی ہاتھ اٹھا اٹھا کے میری طرف اشارہ کر رہے تھے۔ سنا تم نے۔ فوزیہ اپنے گھر جا رہی ہے۔ دلھن بن کے رخصت ہو رہی ہے۔ تمھاری محبت کو تمھارے وعدوں کو اور تمھارے خوابوں کو اس نے نفرت کا زہر دے کر قتل کر دیا ہے۔ پیار کا امرت دینے کے بعد یہ زہر بھی تم نے ہی فوزیہ کو دیا تھا۔ تم ان سب امیدوں کے قاتل ہو جو آسیب بن کے مرتے دم تک اس کا پیچھا کریں گی۔ کوئی اپنے ماضی سے بھاگ کر کہاں جا سکتا ہے۔ یادوں کے گلاب اگر خار دار کیکٹس بن جائیں تو اس آزار سے نجات کوئی مستقبل نہیں دے سکتا۔ خواہ اس میں ہر خوشی ہو، ہر آسائش ہو اور ہر آرزو کی تکمیل کا سامان ہو۔

مجھے بالکل اندازہ نہیں کہ رضوی صاحب نے کب بات ختم کی اور کیا کہا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں ریسیور ہاتھ میں لیے کھڑا تھا اور بالکل اکیلا تھا۔ مجھ میں اتنی ہمت بھی نہ تھی کہ آخری بار فوزیہ سے معافی مانگ سکتا۔

باہر آ کے میں نے کار کی پچھلی سیٹ نکالی اور اسے اٹھا کے دھونے کے لیے اندر لے گیا۔ صابن سے اچھی طرح رگڑ کر دھونے اور خشک کرنے کے بعد میں نے اسے پھر فٹ کر دیا۔ میں جانتا تھا کہ لہو کے داغ دھونے سے کبھی نہیں جاتے اور اگر سائنٹیفک ٹیسٹ لیے جائیں تو ہزار بار دھونے کے بعد بھی ان کا سراغ ملتا ہے مگر مجھے ایسے کسی ٹیسٹ کا اندیشہ نہ تھا۔ ڈکی میں ایسا کوئی داغ نہ تھا کیونکہ کٹے ہوئے سر سے رسنے والا خون جم کر بالکل خشک ہو چکا تھا اور میں نے اسے ڈکی میں رکھا تھا تو تولیے میں لپیٹ کر۔ اس کے باوجود مجھے یہ خیال ضرور تھا کہ کہیں وہ موٹر سائیکل والا پھر نہ آ دھمکے۔

یہ عین ممکن تھا کہ وہ سارا دن مصروف رہے اور شام کو گھر پہنچنے سے پہلے بیگ نہ کھولے اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اسے ابھی معلوم ہو جائے۔ وہ کہیں موٹر سائیکل کھڑی کرے تو کوئی کتا اس کے بیگ کو دیکھ کر بھونکنے لگے۔ یہاں تو میں نے اسے ٹال دیا تھا لیکن اپنی موٹر سائیکل کی تلاشی وہ فوراً لے گا۔ اس کا ذہن فاکس ویگن کی طرف بھی جا سکتا ہے اور اگر اس نے میر محمد کا سر برآمد کر لیا تو وہ یہی نتیجہ اخذ کرے گا کہ کتے بلاوجہ نہیں بھونک رہے تھے۔ اس میں شبے کی بات ہی نہ ہو گی کہ وہ سر میں نے اس کے تھیلے میں ڈالا لیکن اس کے پاس ثبوت کوئی نہ ہو گا۔

اگر یہ ایک بڑے پولیس افسر کا گھر نہ ہوتا اور یہ گاڑی رابعہ قاری ایڈووکیٹ کی نہ ہوتی تو وہ مجھے سی آئی اے کے تھانے میں الٹا لٹکا کے ثبوت بھی حاصل کر لیتا اور مجھ سے اعترافِ جرم بھی کرا لیتا۔ مگر وہ میرا رویہ دیکھ چکا تھا۔ میں اس کے قابو میں آنے والا شخص نہیں تھا۔ میں نے اپنی بلا اس کے سر منڈھ دی تھی۔ وہ عقلمندی سے کام لے گا تو ہنگامہ کیے بغیر اس سر کو کسی اور کے حوالے کر دے گا یا کہیں پھینک دے گا۔ دوسرے کاغذات کے علاوہ میں ٹیپ کو بھی گھر میں رکھ چکا تھا۔ تاہم میرے لیے یہ ضروری تھا کہ میں فوراً گھر سے نکل جاؤں۔ اگر وہ لوٹ کر آئے بھی تو میرا اس سے سامنا نہ ہو۔ حفظِ ماتقدم کے طور پر یہ بندوبست بھی ضروری تھا کہ وہ مجھے پھنسانا چاہے تو میں اس کو پہچاننے سے بھی انکار کر دوں۔ یہ ثابت کر دوں کہ میں گھر سے باہر تھا۔ چنانچہ اس سے ملاقات کا کیا سوال۔ اس کام میں دو افراد میری مدد کر سکتے تھے۔ ایک استاد ٹیڈی، دوسرا عبدالودود منظر۔ استاد ٹیڈی کا پتا ٹھکانا مجھے معلوم ہی نہیں تھا۔ میں نے منظر سے مل کر اپنے دفاعی انتظامات مستحکم کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے ناشتے کے آثار مٹائے، سارے دروازے مقفل کیے پھر میں فاکس ویگن لے کر نکلا۔ کونے والے گھر کے سامنے ایک اور فاکس ویگن کھڑی تھی جسے میں عموماً وہاں کھڑا دیکھتا تھا۔ اس کے چلنے کی نوبت بہت کم آتی تھی۔ اس پر گرد، خشک پتے اور پرندوں کی غلاظت دو دو ہفتے تک کوئی صاف نہیں کرتا تھا۔ آج بھی اس کی حالت مالکوں کی عدم توجہی کا نقشہ پیش کر رہی تھی۔ شاید اسے چلانے والا یہاں تھا ہی نہیں یا گھر والوں کے پاس کوئی دوسری بڑی گاڑی آ گئی تھی۔ چنانچہ پرانی گاڑی کسمپرسی کا شکار تھی۔

میں نے اپنی گاڑی کو اس کے پاس لے جا کر روکا۔ چند منٹ ادھر ادھر دیکھا پھر میں نے اپنی چابی سے دوسری فاکس ویگن کا دروازہ کھولا۔ اس کی گرد آلودہ سیٹ کو اٹھا کر اپنی گاڑی تک لا کے میں نے اپنی گاڑی کی سیٹ ہٹائی، اس کی جگہ دوسری سیٹ فٹ کی اور اپنی سیٹ دوسری فاکس ویگن میں لگا کے دروازہ پھر مقفل کر دیا۔ چند گزرنے والوں نے مجھے ایک نظر دیکھا اور کسی قسم کا شک کیے بغیر گزر گئے۔ دونوں گاڑیوں کی سیٹ اوریجنل تھی یعنی کالے رنگ کی دانے دار ریگزین سے بنی ہوئی۔ دوسری فاکس ویگن کے مالک کو تبدیلی کا احساس نہیں ہو سکتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ وہ حیران ہو گا کہ پیچھے والی سیٹ اتنی صاف کیسے ہو گئی۔ اسی حیرت کا اظہار اس ڈینٹر پینٹر نے بھی کیا جسے میں نے فاکس ویگن سفید رنگ کرنے کے لیے دی۔ پچھلی سیٹ کی گرد دیکھ کر اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ میں نے کافی دن بعد گاڑی کو چلایا ہے۔ میں نے اس سے اتفاق کیا۔ "ایسی بگڑی ہوئی شکل والی فاکس ویگن کو لے کر شہر میں پھرنا کوئی آسان کام ہے۔ لوگ کم اور دوست زیادہ ہنستے ہیں۔" میں نے کہا۔

"اب آپ فکر نہ کریں۔ ایک دم لشکارا مارتی ہوئی نکلے گی۔ نئی بھی کیا مقابلہ کرے گی اس کا۔" وہ بولا۔

"اور یہ کام کتنے دن میں مکمل ہو جائے گا؟" میں نے کہا۔

"دس دن تو لگیں گے صاحب!" وہ بولا۔ "یہ رنگ اسکریپ کرنا پڑے گا۔ پھر نیا استر۔ اس سے پہلے چار پانچ دن ڈینٹر لے گا۔ ڈیکو پینٹ ہو گا، اصلی جناب، بہت رب کرنا پڑتا ہے اسے۔"

"ٹھیک ہے۔ مگر گاڑی لینے میں نہیں آؤں گا۔ وہ بیگم صاحبہ آئیں گی جن کی گاڑی ہے۔ بہت بڑی وکیل ہیں مس رابعہ قاری۔" میں نے اسے بتایا۔ تاکہ پولیس تفتیش کرتی ہوئی آئے اور لال گاڑی دیکھ کر سوال کرے تو وہ کہہ دے۔ کہ گاڑی ایک خاتون وکیل کی ہے۔ میں نے اسے پانچ سو روپے بطورِ ایڈوانس دیے اور پیدل روانہ ہو گیا۔

شہر اجڑا اجڑا سا تھا۔ فضا بے رنگ تھی اور ہوا خاموش، اوپر آسمان کی ویرانی میں بہت بلندی پر اڑنے والے پرندے ایک میکانکی انداز میں محوِ پرواز تھے۔ نیچے زمین پر محنت سے نکالے ہوئے انسان زندگی کا بوجھ ڈھو رہے تھے۔ بقا کی جدوجہد میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی خاطر ایک دوسرے کا گلا تک کاٹنے کے لیے تیار تھے۔ حصولِ دولت کی اس سعیٔ رائیگاں کو ہی کامیابی

سمجھ رہے تھے جس کی ابتدا عدم وجود پر تھی اور انتہا بھی عدم وجود پر۔ ایک صفر کے اضافے سے ایک کا ہندسہ کیا بنتا ہے۔ دس، سو، ہزار، لاکھ، کروڑ، پہلے صفر سے آخری صفر تک کے سفر میں آدمی کو کیا ملتا ہے۔ ثواب و عذاب، نیکی بدی، دُکھ سُکھ، ان سب کی قیمت کیا ہوتی ہے؟

میں بے حد قنوطی ہو رہا تھا اور اس کے اسباب واضح تھے۔ میرے پاس کوئی بھی نہیں تھا جس کے کندھے پر سر رکھ کے میں رو سکتا۔ نہ محسن، نہ رالعہ اور نہ شہلا۔ خون کے سب رشتے سرحد کے اِدھر یا اُدھر انسانوں کی درندگی کی بھینٹ چڑھ گئے تھے۔ چنانچہ میں نے نئے رشتے استوار کر لیے تھے اور انھی کو بیساکھی بنا کے زندگی کا سفر طے کر رہا تھا۔ اب میں کہاں جاؤں؟ کدھر جاؤں؟

پونے دو سو میل دور اسلام آباد میں فوزیہ دُلھن بن رہی تھی۔ کیا بیٹیاں ایسے رخصت ہوتی ہیں ماں باپ کے گھر سے۔ نہ جشنِ طرب، نہ ہنگامہ مسرت، نہ ڈھولک کی تھاپ اور رچولیوں کی جھنکار پر گائے جانے والے وداعی کے گیت، نہ سکھیوں، سہیلیوں کی شوخی سے کھنکتے قہقہے۔ فرشتۂ اجل دروازے پر دستک دیے جا رہا ہے۔ جلدی کرو جلدی۔ کیونکہ وقت کم ہے۔ دیر کیسی ہے مولانا صاحب! بسم اللہ کیجیے، مسٹر شیروانی دِس اِز نو ٹائم۔ ہاں مگر میں کیا کروں۔ مسماۃ فوزیہ ناہید بنت احمد رضا خاں شیروانی۔ تم کو مسمی ایاز احمد ولد غیاث احمد سے اپنا عقد بعوض حقِ مہر شرعی قبول ہے۔ ویری سوری شیروانی صاحب! ہم نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ خاتمہ اچانک ہو سکتا ہے۔ جاؤ بی بی! اپنے گھر سدھارو۔ سدا سُکھی رہو۔ دُودھوں نہاؤ، پُوتوں پھلو۔ سب کے چہرے سوگوار ہیں۔ بجھے بجھے ہیں۔ کسی کی آنکھ میں آنسو نہیں۔ سب آنسوؤں کو پی رہے ہیں۔ زبردستی مسکرا رہے ہیں۔ وہ خوشی کہاں ہے جو رخصتی کے وقت اشکوں سے بھی یوں چھلکتی ہے جیسے دامنِ سحاب سے شفق کی سرخی۔ شبِ تار میں ستاروں کی ضیا۔ آمدِ فصلِ گل کی نامہ بر ہوا سے خوشبو۔

سکندر بخت، بدبخت، تیرے مقدر کی خوشی کیا ہوئی۔ کاتبِ تقدیر تجھ پر اتنا نامہرباں کیوں ہوا کہ مسرتوں کے لازوال، لامحدود خزانے تیرے اپنے نہ رہے۔ تو صحرا کے اس پیاسے مسافر کی طرح حیران و سرگرداں ہے جس کی چھاگل کا آخری قطرۂ آب بھی ریت نے پی لیا ہو۔ یہاں جو کچھ ہے اپنے اپنے وقت کا پیمانہ ہے۔ ہاتف نے صدا دی۔ آدمی خود اپنے گرد زنداں کی دیواریں اٹھاتا ہے، اپنے جہنم کی آگ خود روشن کرتا ہے۔ اپنی جنت کی خود تعمیر کرتا ہے۔ اپنی خوشیوں کو خود قتل کرتا ہے اور اپنے دکھوں کو خود سینچتا ہے۔ وقت گزر جائے گا تو احساس مر جائے گا، سو جائے گا۔ فوزیہ اپنے گھر میں اپنے شوہر اور بچوں کے درمیان ہنستے ہنستے ایک پل کے لیے خاموش ہو جائے گی اور دوسرے پل میں تمھاری یاد کو بھی اس طرح دھکے مار کے دل سے نکال دے گی جیسے کوئی گھر میں گھس آنے والے فقیر کو نکالتا ہے اور خود تم ــ تم کیا کرو گے؟ رسن و دار کی منزل سے گزر کے کوئے یار تک پہنچے تو وقت کے سبز زخم کا نشاں بھی کھرچ دو گے۔ محبت! مائی فٹ۔ آئی واز این ایڈیٹ اینڈ سو واز شی۔ معلوم ہے جس روز اس کی شادی ہوئی میں کیا محسوس کر رہا تھا؟ آئی واز میڈ۔ ہا ہا... جوانی میں تو ایک عشق اِز اے مسٹ۔ مزید قہقہے۔ شادی کی ساتویں یا سترھویں سالگرہ میں شریک ہونے والے معزز مہمان بھنے ہوئے مرغ، لیمب روسٹ، فروٹ کسٹرڈ کھا رہے ہیں۔ یہ سب فوزیہ، رالعہ ہوتی ہیں۔ صرف بیویاں۔

ایک ہاتھ میری کمر پر پڑا ”یُو بلڈی مَرڈرر“ پھر بڑی گھن گرج کے ساتھ ایک قہقہہ۔

میں نے عبدالودود منظر کی طرف دیکھا جو بار رُوم کے باہر کھڑا تھا۔ میں بار رُوم کیسے پہنچا آخر؟ پیدل۔

”ابے ایسے کیا اُلوؤں کی طرح دیدے گھما رہا ہے۔“ اس نے میرے شانے کو ہلایا۔

”میں... میں تجھے ہی دیکھ رہا تھا۔“ میں نے خود کو سنبھال کے بمشکل تمام کہا۔ ابھی تک مجھے یقین نہیں آیا تھا کہ بالکل غیر شعوری طور پر میں پیدل چلتا ہوا ڈسٹرکٹ کورٹ تک آ پہنچا ہوں۔

”تو بھائی کب تک دیکھے گا؟ نظر نہیں آ رہا ہوں میں کیا؟“ وہ پھر گلا پھاڑ کے ہنسا۔ ”کوئی خوردبین سے دیکھنے کی چیز ہوں میں؟ ابے گدھے ایک جھانپڑ اور دوں گا۔ یہ کیا رونی شکل بنا رکھی ہے پھر کسی کو قتل کر آیا ہے تو بتا۔ ابے ہم ہیں تو پھانسی کا کیا ڈر۔ خود پہنچائیں گے تجھے۔“

”یار وہ... فوزیہ کی ماں ڈیتھ بیڈ پر ہے۔“ میں نے کہا۔ ”سب چلے گئے ہیں۔ میں اس لیے نہیں جا سکا کہ اجازت کی ضرورت تھی۔“ عمداً میں نے یہ نہیں کہا کہ آج فوزیہ کی شادی بھی ہے۔

”تجھے جانا ہے؟“ وہ بولا۔ ”تو جا۔ یہاں کیوں آ گیا۔ بلاوا بالغ کا اڈا ہے یہ؟“

”یار! بات کچھ اور ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اکیلے میں کرنی ہے۔ پانچ منٹ میری بات سن لے۔“

اس نے سر ہلایا اور مجھے کنٹین میں لے گیا۔ میں نے میر محمد کی لاش ملنے سے لے کر اس کے سر کی بلا کو ٹلانے تک کی رُوداد لِمن وعن سنا دی۔ وہ ہکا بکا بیٹھا رہا۔

”اب تو میری طرف سے اجازت کی درخواست لگا۔“ میں نے کہا۔ ”خدانخواستہ کوئی چکر چلے تو میں یہ کہہ سکوں کہ میں منظر کے ساتھ تھا۔ رضوی صاحب کا فون آیا تھا ساڑھے آٹھ بجے۔ پونے نو بجے میں نے تجھے فون کیا اور تو مجھے تو اپنے ساتھ ہی لے گیا۔“

”ابے تیرے چکر مجھے لگوا دیں گے پھانسی۔“ وہ سر پر ہاتھ مار کے بولا۔ ”جان ویسے ہی سولی پر اٹکی ہوئی ہے۔ گھر پہ جورو نے دسواں سپوت تحفتہً دیا ہے۔ خیر یہ بتا وہ تفتیش کرنے والا کس وقت آیا تھا؟“

”وہ تو سات بجے ہی وہاں موجود تھا۔“ میں نے کہا۔

”تو پونے نو بجے سے پہلے کا کیا بنے گا؟“ وہ سوچتے ہوئے بولا۔ ”کیسے ثابت ہو گا کہ تو سو رہا تھا اور تجھ سے ملنے کوئی آیا ہی نہیں تھا۔“

”میرا خیال ہے استاد ٹیڈی گواہ بن جائے گا۔ میں کہوں گا کہ میں اکیلا تھا اُسے بلا لیا۔“

”ابے چھوڑ۔ میں کہہ دوں گا۔ تو نے جھوٹ بولا تھا۔ تو رات کو میرے گھر میں سویا تھا۔ ڈر کے مارے ہمت نہیں پڑ رہی تھی گھر جانے کی۔“ منظر نے کہا۔ ”بس اسی وقت گیا تھا۔ صبح آٹھ بجے کے قریب ناشتا کر کے۔ میرے گھر سے وہاں تک آدھا گھنٹا تو لگتا ہی ہے اور رضوی صاحب میری مانیں گے، تیری نہیں۔ کیا سمجھا؟“ اس نے پھر میرے شانے پر ہاتھ مارا اور زور سے ہنسا۔

”تھینک یو منظر!“ میں نے کہا۔ ”میں بہت پریشان تھا۔ تجھے بھی جھوٹ بولنا پڑ رہا ہے میری وجہ سے۔“

”جھوٹ۔“ وہ پھر ہنسا۔ ”یار! جھوٹ تو ہم یہاں اتنا بولتے ہیں کہ کبھی سچ منہ سے نکل جائے تو حیرانی ہوتی ہے۔ خیال آتا ہے کہ دماغ غیر حاضر تھا۔ وہ کیا کہتے ہیں۔ درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا۔ اب تو احساس بھی نہیں ہوتا کہ جھوٹ بولا ہے اور جب پیسے کی خاطر بولتے ہیں تو کیا یار کی خاطر نہیں بول سکتے؟“

”پھر تو بیوی سے بھی جھوٹ ہی بولتا ہو گا۔“ میں نے کہا۔

وہ یوں ہنسا کہ کنٹین میں بہت سے لوگ متوجہ ہوئے۔ ”ابے شادی کرے گا تو معلوم ہو گا کہ جھوٹ بولے بنا زندگی کی گاڑی چل ہی نہیں سکتی۔ کیا کہتے ہیں وہ۔ کہ میاں بیوی زندگی کی گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ تو بھیا جھوٹ اس کی گریس ہے۔ گریس نہ ہو تو فرکشن پیدا ہوتی ہے۔ ازدواجی زندگی کا بوجھ ڈھونا مشکل ہو جاتا ہے۔ پہیے چُوں چُوں کرنے لگتے ہیں۔ دیکھ لے بیوی مجھ سے کتنی خوش ہے۔ سچ بولتا تو کب کی میکے جا بیٹھی ہوتی۔ طلاق لے چکی ہوتی۔ کامیاب شوہر وہ ہے جو کامیابی سے جھوٹ بول سکے۔ آیا کچھ عقل میں؟ چل اٹھ۔“

میں نے بڑی صفائی سے کندھے کو ایک اور وار سے بچایا اور ہم دونوں کنٹین سے نکل آئے۔ میں اس سے رخصت ہوا تو دوپہر ہونے والی تھی۔ میرے سر سے ایک پریشانی کا بوجھ اتر گیا تھا۔ رضوی صاحب نے جاتے جاتے بھی مجھے تاکید کی تھی کہ میں شرافت سے رہوں اور کوئی نیا گُل نہ کھلاؤں۔ لیکن اب اس کا کیا علاج کہ میں تو کمبل کو چھوڑتا ہوں لیکن کمبل مجھے نہیں چھوڑتا۔ میں نے تو اکرام شیخ کی مدد کی تھی۔ یہ شرافت اور اخلاق، دوستی یا قانون سب کا تقاضا تھا۔ اگر اس کا اسکوٹر خراب نہ ہوتا تو مجھے اس کے ساتھ نہ جانا پڑتا اور وہ سب کچھ نہ ہوتا جو بعد میں ہوا۔

لیکن یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ میر محمد کی لاش کا سر میری گاڑی میں صرف اس لیے رکھا گیا تھا کہ میں لاش برآمد کرانے کے لیے اکرام شیخ کو اپنی گاڑی میں لے گیا تھا۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ وہ ٹیکسی میں چلا جاتا۔ پھر کیا دشمن اس سر کو ٹیکسی میں رکھتے؟ نہیں۔ وہ پہلے ہی طے کر چکے تھے کہ میر محمد کا سر میری گاڑی میں رکھا جائے گا۔ اگر میں اکرام شیخ کے ساتھ نہ جاتا اور گھر آ کے سو جاتا تو صبح یہ سر مجھے اسی طرح فاکس ویگن کی پچھلی سیٹ پر موجود ملتا۔ شاید میں پیچھے نگاہ ڈالے بغیر گاڑی لے کر روانہ ہو جاتا اور دن کے اجالے میں کہیں گاڑی پارک کر کے جاتا تو واپسی پر گاڑی کے گرد مجمع ہوتا یا پھر میرے سو کر اٹھنے سے پہلے ہی پولیس آ دھمکتی اور مجھے آنکھیں کھلنے سے پہلے گرفتار کر کے لے جاتی۔

یس ـ پولیس تو واقعی صبح ہی آ پہنچی تھی۔ سات بجے سے پہلے کسی کا تفتیش کے لیے آنا۔ چہ معنی دارد۔ یہ انتظام تو پہلے ہی کر لیا گیا تھا۔ جب اسے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر کوئی سر نظر نہ آیا تو اسے مایوسی ہوئی اور اس نے خواجہ اکبر کی بازیابی اور دین محمد کی گمشدگی کا ذکر چھیڑ دیا۔ اسے اپنے آنے کی کوئی وجہ تو بتانی ہی تھی۔ لاش کا سر مل جاتا تو وہ کہتا کہ ہمیں مخبروں کے ذریعے یہ اطلاع ملی تھی۔ اور اطلاع غلط بھی نہیں تھی اسے پہلے سے معلوم ہو گا کہ خواجہ اکبر کے ساتھ کیا ہوا۔ جب میں اسے ڈرائنگ روم میں چھوڑ کر غسل کرنے گیا تھا تو اس نے کہیں فون نہیں کیا ہو گا اور دین محمد کے بارے میں اکرام شیخ سے بات نہیں کی ہو گی۔ اس نے باہر آ کے فاکس ویگن میں جھانکا ہو گا لیکن گاڑی کے دونوں دروازے مقفل تھے اور شیشوں سے ناک لگا کر اندر دیکھنے سے اس کو خالی سیٹ تو نظر آ گئی ہو گی مگر سیاہ سیٹ پر خون کے معمولی سے سرخ داغ دکھائی نہیں دیے ہوں گے۔ وہ سمجھا ہو گا کہ کسی وجہ سے وہ لوگ اپنی اسکیم پر عمل درآمد میں کامیاب نہیں ہوئے جنھوں نے اسے نہار منہ رضوی صاحب کے گھر پہنچنے کی تاکید کی تھی اور اس بات کا معاوضہ ادا کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب میں غسل کے بعد لوٹ

کر آیا تھا تو اس کی صورت پر بارہ بجے ہوئے تھے۔

اس نتیجے پر پہنچنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ بظاہر میں نے اپنی حفاظت کا پورا بندوبست کر لیا ہے اور اپنے گلے پڑنے والی بلا سے نجات حاصل کر لی ہے مگر خطرہ اب بھی باقی ہے۔ وہ شخص اپنی ناکامی کی رپورٹ دے گا اور بتائے گا کہ سکندر بخت نے مجھے مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ معلوم نہیں کیسے اور کب اس نے میر محمد کا سر میری موٹر سائیکل کے بیگ میں ٹھونس دیا۔ اس کی خدمات حاصل کرنے والے کہیں گے، پاگل کے بچے! سر تو ہم نے رات کو ہی گاڑی میں رکھ دیا تھا۔ اس گاڑی کو فوراً قبضے میں لے لو۔ اس کی پچھلی سیٹ پر خون کے داغ ضرور ہوں گے۔

اور اس وقت پریشانی کے باوجود مجھے تھوڑی سی خوشی بھی ہوئی کہ میں نے سیٹ بدل کے دشمنوں کے عزائم کو ناکام بنا دیا ہے۔ اب شوق سے لے جائیں گاڑی کو اپنی لیبارٹری میں اور ہر طرح سے ٹیسٹ کریں۔ اکرام شیخ کی ڈیوٹی کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ میں نے اسے گھر پر فون کیا اور اس نے مجھے بتایا کہ متعلقہ تھانے میں کسی پیٹرول پمپ پر کام کرنے والوں نے کوئی رپورٹ درج نہیں کرائی ہے۔ اس نے مجھے دعوت دی کہ میں دوپہر کا کھانا اس کے ساتھ کھاؤں لیکن میں نے کہا کہ میں ذرا مصروف ہوں اور بے کار بھی ہوں۔

"یہ تو بڑی خراب بات ہے" وہ بولا "انگریزی میں کہتے ہیں نا کہ بیکار آدمی کا ذہن شیطان کی ورکشاپ ہوتا ہے۔ مجھے بھی معلوم تو ہو آپ کی مصروفیات کیا ہیں آخر؟ آپ کا مصروف رہنا ہی آپ کے حق اچھا ہے"

میں ہنسا "نہیں۔ میں کوشش کروں گا کہ مصروفیت سے کوئی خرابی پیدا نہ ہو"

"یہ تمہارے اختیار کی بات نہیں ہے سکندر اعظم!" وہ بولا۔

"اچھا بھائی میں گھر جاتا ہوں اور سو جاتا ہوں۔ خواب تک نہیں دیکھوں گا" میں نے کہا۔

"یہاں آنے میں کیا اعتراض ہے تمہیں؟ کھانا کہیں تو کھاؤ گے یا بھوکے ہی سو جاؤ گے" شیخ نے کہا "چلو اس بہانے میرے گھر والوں سے مل لو اور میرا گھر بھی دیکھ لو"

میں مجبور ہو گیا۔ رکشا لے کر میں آدھے گھنٹے بعد گلبرگ پہنچا۔ گھر کا نمبر مجھے معلوم تھا لیکن گھر تلاش کرنے میں میرا مزید آدھا گھنٹہ صرف ہو گیا۔ میں نے ان لوگوں کو کوسا جو شہر بساتے ہیں تو اپنی اپنی عقل کے مطابق گھروں پر نمبر لگانے کا طریقہ خود وضع کرتے ہیں۔ ہر کہ آمد عمارت نو ساخت۔ جو آیا اس نے سابقہ سسٹم کو خوبیاں خامیاں دیکھے بغیر آؤٹ آف ڈیٹ قرار دے کر متروک کر دیا اور اپنی افلاطونیت کا مظاہرہ کیا۔ نتیجہ یہ کہ ہر علاقے میں نمبروں کا نظام ایک معما بن گیا۔ نہ سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔ میں نے پہلے سنا تھا اور پھر دیکھا تھا کہ یورپ اور امریکہ کے بڑے بڑے شہروں میں کسی ایک علاقے کا سسٹم جدا نہیں ہے۔ پورے شہر کی نمبرنگ کا ایک سائنٹیفک فارمولا ہے جو اتنا آسان ہے کہ آپ ٹیکسی والے کو نمبر بتا دیں اور وہ آپ کو گھر کے دروازے پر اتار دے گا۔

جب بالآخر ایک گھنٹے بعد میں نے کال بیل بجائی تو شیخ نے دروازہ کھولا "خدا کا شکر ہے کہ آپ بخیر و عافیت پہنچے۔ میں تو متفکر ہو چلا تھا"

"فکر کی کون سی بات تھی" میں نے کہا "ذرا گھر تلاش کرنے میں دیر لگی"

"ارے بھائی! آپ کے لیے ہی تو کہا تھا کسی نے کہ کہ زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے" وہ بولا "خیر۔ اب اندر آؤ"

اکرام شیخ کے والد ساٹھ سال سے زیادہ عمر کے مگر صحت مند آدمی تھے۔ شیخ نے میرا تعارف کرایا تو وہ ہاتھ ملانے کے بعد بہت دیر تک میرا ہاتھ بڑی شفقت اور محبت سے تھامے کھڑے رہے۔ "تو تم ہو سکندر بخت" انھوں نے کہا "مجھے اکرام نے تمہارے متعلق سب کچھ بتا دیا ہے۔ تم بہت باہمت اور باکردار آدمی ہو۔ خدا نے چاہا تو کوئی تمہارا بال بیکا نہیں کر سکے گا۔ آزمائش کا وقت تو سب پر آتا ہے۔ حوصلہ مت ہارنا"

"میں آپ کی حوصلہ افزائی اور آپ کی دعاؤں کا طالب ہوں" میں نے کہا۔ پھر وہ ظہر کی نماز کے لیے مسجد چلے گئے اور شیخ مجھے اندر لے گیا۔ ڈرائنگ روم میں ایک لڑکی صوفے پر بیٹھی کتاب پڑھتے پڑھتے سو گئی تھی۔ کتاب نیچے گر گئی تھی لیکن اسے خبر نہ تھی۔ وہ سترہ اٹھارہ سال کی ایسی لڑکی تھی جس کا حسن نقش چغتائی تھا اور ایک نظر میں دیکھنے والوں کی نگاہوں کو خیرہ کر دیتا تھا۔ اس کی آنکھیں پلکوں کی چلمن کے سائے میں بھی غیر معمولی طور پر لمبی لگتی تھیں اور اس کے گول چہرے پر بہت بڑی نظر آتی تھیں۔ اس کے بھورے سیاہ بالوں پر روشنی پڑنے سے چہرے کے گرد ایک سنہرا اجالا سا دکھائی دیتا تھا اور وہ سچ مچ کسی مصور کے تصور کی خیالی صورت کا حسین ترین مگر جیتا جاگتا عکس تھی۔ اپنی معصومیت کے تاثر سے یہ حسن ملکوتی لگتا تھا۔

شیخ نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور صوفے کے پیچھے جا کے قالین کے دھاگے سے بتی سی بنائی۔ پھر اس نے ہاتھ بڑھا کے یہ بتی اس کی ناک میں گھمائی اور صوفے کے پیچھے غائب ہو گیا۔

وہ ہڑبڑا کے اور ایک چھینک مار کے اٹھی۔ اپنے مقابل مجھے پا کے اس نے فوراً دوپٹہ سنبھالا اور کچھ حیران ہوئی "آپ کون ہیں جی؟" وہ بگڑ کے بولی "اور یہ کیا بدتمیزی ہے؟"

"آپ کی کتاب!" میں نے نیچے سے کتاب اٹھا کے گرد جھاڑی اور اسے پیش کی "میں سکندر اعظم ہوں"

"کیا؟" وہ کتاب چھین کر بولی "میں بتاتی ہوں تمہیں" اس نے کتاب پھینک کر آستین چڑھائی اور جوڈو کی بالکل صحیح پوزیشن لے کر کھڑی ہو گئی۔ وہ یقیناً اس فن کی تربیت حاصل کر رہی تھی اور میں دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کی قدرتی صلاحیت اور تربیت کا معیار کیا ہے لیکن شیخ سے ہنسی ضبط نہ ہو سکی۔ وہ قہقہہ مار کے صوفے کے پیچھے سے برآمد ہوا۔

"دیکھا تم نے؟ کیسے کیسے نمونے ہیں یہاں! یہ میری چھوٹی بہن ہے نازلی جسے ہم نازو کہتے ہیں، سوائے میرے۔ میں اسے نازی کہتا ہوں۔ کیونکہ یہ ہٹلر سے کم خطرناک نہیں" شیخ نے ہنستے ہوئے کہا۔

نازلی کا رنگ خفت سے لال ہو گیا "تو یہ تمہاری حرکت تھی شیخ آف چلی" وہ چلائی۔ اس نے صوفے کا کشن اٹھا کے شیخ کی طرف پھینکا۔ شیخ نے غوطہ مارا اور صاف بچ گیا۔

"ارے ارے" وہ بولا "مہمانوں کے سامنے بھی خانہ جنگی۔ کیا کہیں گے میرے دوست کہ گھر ہے یا پانی پت کا میدان"

"اور ابھی میں مار دیتی ان کے ایک ہاتھ۔ پھر۔۔؟" وہ میری طرف متوجہ ہوئے بغیر بولی۔

"تو تم پر چودہ طبق روشن ہو جاتے نادان لڑکی! یہ جوڈو میں بلیک بیلٹ ہیں" شیخ نے کہا "میرے دوست سکندر بخت"

نازلی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ میں اس کے حسن فتنہ محشر سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا "آپ واقعی بلیک بیلٹ ہیں۔ مجھ سے اکرام نے آپ کا ذکر کیا تھا۔ جوڈو کہاں سے سیکھا ہے آپ نے؟"

"اکرام ایسے ہی کہتا رہتا ہے" میں نے مسکرا کے کہا "مجھے جوڈو وغیرہ نہیں آتا"

"یہ جھوٹ ہے۔ بلیک بیلٹ تو اس وقت بھی باندھ رکھی ہے اس نے نازی!" اکرام شیخ نے کہا "تو کسی غلط فہمی میں نہ رہنا۔ ایک ہاتھ مار دیا نا تیرے۔ تو یہاں سے ڈولی میں نہیں اسٹریچر پر جائے گی۔ سسرال نہیں اسپتال"

"بھیا میں مار دوں گی" نازلی چلائی اور میں بہن بھائی کی اس دلچسپ لڑائی میں اپنے سارے فکر و غم بھول گیا۔

تیس بتیس سال کی ایک عورت اندر آئی "کیا شور ہے یہ۔ پھر لڑ رہے ہو بچوں کی طرح؟" اس نے مجھے دیکھا اور ٹھٹک کر رک گئی۔

"یہ میرے دوست ہیں سکندر بخت عرف سکندر اعظم ثانی" اکرام شیخ نے میرا تعارف کرایا "ان کی فتوحات اور معرکہ آرائی کا ذکر تو آپ سنتی ہی رہتی ہیں"

میں سمجھ گیا کہ شیخ نے تعارف کو ادھورا کیوں چھوڑ دیا۔ وہ اس کے باپ کی دوسری بیوی تھی جسے وہ ماں نہیں کہتا تھا۔ یہ بات وہ پہلے میرے سامنے تسلیم کر چکا تھا لیکن اس وقت وہ ایک اجنبی کے سامنے اپنی سوتیلی ماں کو اپنی ماں بھی نہیں کہنا چاہتا تھا اور یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ "یہ ہیں میری آنٹی"

"آپ نے بہت دیر کی سکندر صاحب! ہم سب نے آپ کے انتظار میں کھانا بھی نہیں کھایا!" وہ بے حد اخلاق اور شائستگی سے بولی "اب آپ کو کچھ دیر انتظار کرنا پڑے گا۔ وہ نماز پڑھ کے آجائیں۔ آپ بیٹھیں، میں کھانا لگاتی ہوں" وہ لوٹ گئی اور میں ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

"آپ کہیں جوڈو سیکھ رہی ہیں؟" میں نے نازلی سے مخاطب ہو کے کہا۔

"جی۔ چھ مہینے ہو گئے ہیں" نازلی نے بڑے فخر سے کہا۔

"یہ بڑی اچھی بات ہے" میں نے کہا "ہمارے ملک کی لڑکیوں نے خود کو چھوئی موئی بنا رکھا تھا۔ حالانکہ زمانہ ایسا ہے کہ سب کو اپنا دفاع اور اپنی حفاظت کرنے کا ہنر آنا چاہیے۔ افراد کی طاقت ہی قوم کی طاقت ہے"

نازلی نے بھائی کی طرف دیکھا "یہ ہمارے بھیا کبھی آپ سے اتفاق نہیں کریں گے۔ یہ تو کہتے ہیں بس ایک ریوالور کافی ہوتا ہے۔ ہاتھ پیر چلانے کا فن سیکھنے سے کچھ نہیں ہوتا"

"یہ تو ہے" اکرام شیخ نے کہا "ہاتھ میں ریوالور ہو تو بلیک بیلٹ کا باپ قریب نہیں پھٹک سکتا"

"ہر شخص ہر وقت اور ہر جگہ تو ریوالور لے کر نہیں پھر سکتا" میں نے کہا "خصوصاً لڑکیاں"

"یہی میں کہتی ہوں ان سے" نازلی کا چہرہ مسرت سے دمکنے لگا "سچ بتائیں آپ بلیک بیلٹ ہیں؟"

اس نے اتنی معصومیت سے سوال کیا تھا کہ میں جھوٹ نہ بول سکا "بھئی بیلٹ وغیرہ تو لی نہیں۔ مگر لندن میں ایک اسکول تھا، جوڈو اور کراٹے کا۔ وہاں میں نے مسلسل تربیت حاصل کی تھی اور تربیت دینے والے جاپان کے سند یافتہ بلیک بیلٹ تھے۔ ان کی رائے تھی کہ مجھ میں ایک خداداد صلاحیت ہے اور بلیک بیلٹ مل جاتی مجھے، اگر لندن سے کک آؤٹ نہ کیا جاتا"

نازلی نے حیرت اور مسرت سے ایک "ہائے اللہ" قسم کی خالص زنانہ آواز نکالی۔ "پھر تو آپ مجھے بھی کوچ کر سکتے ہیں۔"

"سوری۔" میں نے کہا۔ "ان۔نوں مجھے ایک۔ بلکہ کئی اہم آپریشن درپیش ہیں۔" شیخ نے سر ہلا کے میری تائید کی۔

"آپریشن؟" وہ ہکا بکا رہ گئی۔ "تو آپ ڈاکٹر بھی ہیں۔ سرجن۔"

وہ آپریشن کا مطلب سرجیکل آپریشن سمجھی تھی تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں تھی۔ عام گفتگو میں یہ لفظ انھی معنوں میں استعمال ہوتا ہے لیکن اس کے سوال سے مجھے اندازہ ہوا کہ اکرام شیخ نے اسے میرے مقدمات اور قانونی مسائل کے بارے میں کچھ نہیں بتایا ہے۔

"سرجن۔" میں نے کہا۔ "بس یہی سمجھ لو۔ کچھ لوگ ہیں جن کے دماغ درست کرنے ہیں۔ کام بہت مشکل ہے۔"

"دماغ کا آپریشن بہت خطرناک ہوتا ہے۔" اس نے مجھ سے اتفاق کیا۔ وہ مجھ سے سخت متاثر اور مرعوب ہو چکی تھی۔

"تم بھی بیک وقت جوڈو اور شاعری سے شوق کرتی ہو؟" میں نے اس کی پھینکی ہوئی کتاب اٹھالی۔

"بھی کا مطلب یہ کہ سکندرِ اعظم بھی گھوڑے گدھے کو ایک لاٹھی سے ہانکتے ہیں۔" اکرام شیخ نے کہا۔

"کون سے اسکول میں پڑھتی ہو تم؟" میں نے کتاب کے صفحے پلٹتے ہوئے بے خیالی میں کہا۔

"اسکول میں؟" اس کا موڈ ایک دم آف ہو گیا۔ "کیا میں آپ کو ننھی سی بچی نظر آتی ہوں۔ بس تھرڈ ائیر میں ہوں جناب!"

اکرام شیخ کی ہنسی نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ "بات تھرڈ ائیر کی نہیں۔ عقل کے اعتبار سے تم اسکول کی بچی کے برابر بھی نہیں ہو۔ یہ اور بات ہے کہ اٹھارہ سال کی بالغ لڑکی ہو۔ مگر بالغ اور عاقل میں بڑا فرق ہے۔"

وہ احتجاجاً واک آؤٹ کر گئی۔ دوبارہ اس سے کھانے کی میز پر ملاقات ہوئی لیکن اس کا منہ پھولا رہا اور شیخ کی چھیڑ چھاڑ کے باوجود وہ خاموش رہی۔ مجھے وہ گھر اور وہ سب لوگ بہت اچھے لگے جہاں رہنے والے تمام تفکرات سے آزاد تھے اور اعتماد کے باہمی رشتے میں اس طرح منسلک تھے کہ سب مل کر اس گھر کی تکمیل کرتے تھے۔ جیسے الگ الگ کڑیوں کے ملنے سے ایک زنجیر بنتی ہے۔

کھانے کے بعد میں نے اجازت چاہی تو شیخ نے کہا کہ وہ مجھے اپنے اسکوٹر پہ چھوڑ دے گا جس کا اصل مقصد بار۔ حا کے تبادلۂ خیالات کرنا تھا۔ ہم نسبت روڈ تک باتیں کرتے گئے۔ وہاں پہنچ کے مجھے معلوم ہوا کہ یا' مین اس مکان کو چھوڑ کے جا چکی ہے۔ اس کے بزرگ مالک مکان نے اتنا تو بتا دیا کہ وہ ملک سے باہر ہے مگر یہ نہیں بتایا کہ وہ کس ملک میں ہے۔ میرے اطمینان کے لیے یہی بات کافی تھی کہ فی الحال وہ کسی کی دسترس میں نہیں اور اپنے شوہر کے ساتھ خوش ہے۔ چوہدری دلاور نے وہ کیسٹ سن لیا ہوگا۔ تب بھی وہ یاسمین کو نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔

شام ہونے والی تھی جب اکرام شیخ نے مجھے رضوی صاحب کے گھر کے اندر سا تارا۔ میں کھلا گیٹ دیکھ کر سوچ ہی رہا تھا کہ یہ بے احتیاطی میں نے جاتے وقت کی تھی یا بعد میں کوئی آیا تھا کہ مجھے حشمت خان نظر آیا۔ اس کے ساتھ دو سپاہی اور بھی تھے۔ وہ مجھے میر محمد کے قتل کے الزام میں گرفتار کرنے آئے تھے۔

شیخ کو میرے ساتھ دیکھ کے حشمت خان کو کچھ مایوسی ہوئی۔ اس کے ساتھ آنے والے دونوں ماتحت بڑے اطمینان سے لان پر آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے اور وہ خود بحیثیت افسر کے ایک کرسی پر متمکن تھا۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" میں نے ماتھے پر بل ڈال کے کہا۔ "کس کی اجازت سے اندر آئے ہو؟"

"پولیس کو تفتیش کے لیے بھی کسی سے اجازت لینی پڑتی ہے اپنے سکندر صاحب؟" وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

"میں نے تفتیش کے بارے میں نہیں، تمہارے بلا اجازت اندر آنے کے متعلق پوچھا تھا۔" میں نے اسی لہجے میں کہا۔ "تفتیش اپنے تھانے میں جیسے چاہے کرو۔ یہ ایک بڑے پولیس آفیسر کا گھر ہے۔"

"تو ہم کون سے گھر کے اندر گھس گئے ہیں جو آپ گرم ہو رہے ہو۔" حشمت خان نے ماتحتوں کی موجودگی میں اپنی سبکی محسوس کی۔ خود یا تحت اس کی عزتِ نفس کا دفاع کرنے سے قاصر تھے۔

"تمہیں باہر انتظار کرنا چاہیے تھا حشمت خان!" ایس آئی شیخ نے متانت سے کہا۔ "تمہیں معلوم ہے گھر پر کوئی نہیں؟"

"لیکن گیٹ کھلا پڑا تھا۔" حشمت خان نے احتجاج کیا۔ "ہم نے یہاں سے کیا اٹھا لیا ہے؟"

"اگر اندر والے دروازے کھلے پڑے ہوتے تو تم کیا کرتے؟" میں نے برہمی سے کہا۔ "رضوی صاحب کے بیڈ روم میں استراحت فرماتے؟ مجھے اجازت دو گے تم کہ تمہارے گھر کا دروازہ کھلا دیکھوں تو اندر جا بیٹھوں؟ تم صریحاً مداخلتِ بیجا کے مرتکب ہوئے ہو حشمت خان! اور رضوی صاحب موجود ہوتے تو اس وضاحت کے باوجود تم معطل کر دیے جاتے۔ یہ کرسی تمہارے تھانے کی نہیں، رضوی صاحب کی ذاتی ملکیت ہے اس لیے فوراً اٹھ جاؤ۔" میں نے اسے نہایت تحقیر آمیز انداز میں ایک انگلی سے اشارہ کیا۔ مہمان کی تو بات ہی الگ ہے۔ اگر اس کی جگہ کوئی اجنبی یا شریف آدمی ہوتا تو میں اتنی معمولی سی بات پر یہ مسئلہ کھڑا نہ کرتا مگر حشمت خان جیسے لوگ میرے نقطۂ نظر سے ہر تذلیل کے مستحق تھے جو کسی شریف آدمی کو ذلیل کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ ایسے ہی لوگ پولیس کے ماتھے پر بدنما داغ ہیں۔ اگر ایس آئی شیخ جیسا۔ کوئی ایماندار و ذمے دار افسر ہوتا تو میں اسے معاف کر دیتا اور میرا رویہ اس کے ساتھ ایسا نہ ہوتا۔

"تم کو معلوم ہے۔" احساسِ ذلت سے حشمت خان کا چہرہ سرخ پڑ گیا تھا۔ "میرے آنے کا مقصد..."

"تمہارے آنے کا مقصد اگر مجھے یہیں پھانسی دینا بھی ہے تو میں بعد میں معلوم کر لوں گا۔" میں نے چٹکی بجا کر اس کی بات درمیان سے اچکتے ہوئے کہا۔ "گیٹ اپ اینڈ گیٹ آؤٹ۔ دروازے سے باہر جاؤ۔ کال بیل بجاؤ اور میرے آنے کا انتظار کرو۔ اگر دو منٹ میں تم باہر نظر نہ آئے تو میں تمہارے خلاف مجرمانہ مداخلت کا کیس درج کرانے پر مجبور ہو جاؤں گا۔ سب انسپکٹر شیخ تمہارے جرم کے گواہ ہیں۔"

حشمت خان آہستہ آہستہ اٹھا اور اس نے گھٹنے پر رکھی ہوئی ٹوپی سر پر جمائی۔ "باہر نکلو۔" اس نے ایک خوفناک گالی دی اور غرا کے دونوں ماتحت سپاہیوں کو مخاطب کیا۔ "اتنا سن کے بھی بیٹھے ہوئے ہو بے غیرتو!"

دونوں سپاہی بڑی پھرتی سے اٹھے اور پلٹ کر دیکھے بغیر گیٹ سے نکل گئے۔ پھر حشمت خان نے اپنی خودی کو بلند رکھنے کی بے سود کوشش کرتے ہوئے ایک قدم بڑھایا۔ میں نے زیرِ لب مسکرا کے شیخ کی طرف دیکھا اور اسے آہستہ سے آنکھ ماری۔ وہ تمام معاملے سے قطعی لاتعلق اسکوٹر اسٹارٹ کرنے کے لیے تیار کھڑا تھا۔

"یہ تم نے اچھا نہیں کیا سکندر!" حشمت خان رک کر بولا۔ "تم پچھتاؤ گے۔"

"آؤٹ۔" میں نے ہاتھ اٹھا کے گیٹ کی طرف اشارہ کیا۔ "میں نے آج تک کچھ بھی اچھا نہیں کیا لیکن پچھتانا مجھے نہیں آتا۔ اچھا تم نے بھی میرے ساتھ نہیں کیا مگر وہ سب جو تم نے اب تک اپنے حق میں کیا، زیادہ برا تھا۔ اس کا اندازہ تمہیں میر محمد کے انجام سے ہو جانا چاہیے۔"

حشمت خان تڑپ کے پلٹا اور شاید جواب میں گالی دینے کی خواہش پر قابو پا کے باہر نکل گیا۔ میں نے گیٹ بند کر دیا۔

"یہ کس چکر میں آیا ہے؟" شیخ نے موقع پاتے ہی کہا۔ "تم کیا چاہتے ہو؟ میں ٹھہروں کہ جاؤں؟"

"میرا خیال ہے تم کچھ دیر رک جاؤ۔" میں نے کہا۔ "پہلے میں اس کی بات سن لوں۔ تمہاری موجودگی میں وہ ذرا محتاط رہے گا۔"

حشمت خان نے باہر سے کال بیل بجائی، اس کی آواز گھر کے اندر سے آئی۔ میں نے شیخ کو اشارہ کیا اور ہم دونوں مقفل دروازے کو کھول کر اندر چلے گئے۔ دوبارہ گھنٹی بجی تو میں شیخ کے ساتھ باہر آیا۔ میرے ہاتھ میں ایک قفل تھا جو میں نے گیٹ کو بند کرنے کے بعد اندر کی طرف لگا دیا۔ "ہاں بھئی حشمت خان! اب بولو کیا بات ہے؟" میں نے چابی جیب میں ڈال کے کہا۔

"دراصل رضوی صاحب کہہ گئے تھے کہ میری عدم موجودگی میں گھر کا پوری طرح خیال رکھنا۔"

"میں انسپکٹر میر محمد کے قتل کی تفتیش کر رہا ہوں۔" وہ بولا۔

"گویا مشتبہ افراد میں میرا نام شامل کر لیا ہے تم نے؟" میں نے کہا۔ "تم جیسے فرض شناس افسروں نے محکمے کا نام واقعی بہت روشن کیا ہے۔ میر شرافت علی کے قتل سے لے کر اب تک کتنے افراد کے قتل میں ملوث کر چکے ہو تم مجھے؟ ناکامی کی پروا مت کرو اور آئندہ بھی کوشش جاری رکھو۔ لاہور میں کیا سندھ و آم میں بھی کوئی واردات ہو جائے تو میرا نام لکھوا دو۔"

"بات کو خواہ مخواہ مت بڑھاؤ اپنے سکندر صاحب!" حشمت خان بولا۔ "ہمیں باقاعدہ رپورٹ ملی ہے اور میں صرف پوچھ گچھ کے لیے آیا ہوں۔ تم سے زبانی باتیں کروں گا اور چلا جاؤں گا۔ میں نے تمہارا نام ایف۔آئی۔آر میں نہیں لکھا ہے لیکن تم نے یہی رویہ رکھا تو میں تمہاری گرفتاری کے وارنٹ بھی لے آؤں گا۔"

مجھے اس کیس میں ملوث کرنے کے بعد میرے خلاف کچھ ثابت نہیں ہوتا۔ لیکن میری پریشانیوں میں تھوڑا سا اضافہ ضرور ہو جاتا۔ میر محمد کا تعلق براہِ راست ان سب مقدمات سے تھا جو میرے خلاف زیرِ سماعت تھے۔ میری طرف سے اس پر متعدد ایسے الزامات بھی عائد کیے جا چکے تھے جن سے میری اور اس کی عداوت کے اسباب عدالت کے ریکارڈ پر آ گئے تھے۔ مثلاً میں نے پہلی رات تھانے میں تشدد کی کارروائی کا ذمے دار اسے ٹھہرایا تھا اور یہ کہا تھا کہ اس نے جانتے بوجھتے وہ ٹیپ غائب کر دیا جسے سن کر محرر نے عبدل کا آخری بیان تحریر کیا تھا۔ ٹیپ کی موجودگی سے ثابت ہوتا تھا کہ میر شرافت علی کے قتل کے کیس کے دونوں چشم دید گواہ یعنی عبدل اور رشید سے کو قتل کرنے والا میں نہیں تھا۔ اب اگر میر محمد کے کیس میں بھی میرا نام آ جاتا تو مجھے ایک اور ضمانت حاصل کرنا پڑتی۔ قتل کی کسی ایف آئی آر میں نام آ جائے تو مقدمے کا فیصلہ ہونے تک خارج ہونا مشکل ہی نہیں عملاً ناممکن

ہوتا ہے۔

"آل رائٹ۔" میں نے کہا۔ "تم چلو، میں شیخ کے ساتھ پولیس اسٹیشن آتا ہوں، جو پوچھنا ہے، وہیں پوچھ لینا۔ میں اپنے وکلاء کو بھی مطلع کر دوں اور ان سے مشورہ بھی لے لوں۔"

"صرف پوچھنے کی بات ہوتی تو ہم اتنی نفری لے کر آپ کے درِ دولت پر کیوں حاضر ہوتے۔" وہ طنزیہ اور تمسخر آمیز لہجے میں بولا۔ "ہمیں اندر کچھ دیکھنا ہے۔ میں وارنٹ لے کر تو نہیں آیا، مگر۔۔۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ میرا گھر ہوتا تو میں ضرور اجازت دیتا مگر صاحبِ خانہ کی عدم موجودگی میں یہ ناممکن ہے۔"

"اور یہ جو تمہارا یار شیخ اندر بیٹھا ہے۔ وہ بھی تو تھانیدار ہے سکندر صاحب!" حشمت خان نے احساسِ ذلت کے ساتھ کہا۔

"وہ کسی قسم کی تفتیش کے سلسلے میں نہیں آیا ہے حشمت خان!" میں نے کہا۔ "اس کے علاوہ شیخ آدمی ہے تھانیدار نہیں۔ جب رضوی صاحب آ جائیں تو خانہ تلاشی کے وارنٹ سمیت حاضر ہو جانا۔ ابھی تو وہ اسلام آباد میں ہیں۔"

"میں نے خانہ تلاشی کی تو بات نہیں کی۔" حشمت خان بولا۔ "مجھے صرف وہ گاڑی دیکھنا تھی جو تمہاری۔۔۔ وکیل مس رابعہ قاری کی ہے۔"

"وہ گاڑی دیکھ کے کیا کرو گے؟" میں نے حیرانی کا اظہار کیا۔ "کئی بار تو دیکھ چکے ہو۔ اس کے علاوہ، دیکھنے کا ہی شوق ہے تو اس جیسی کوئی بھی فاکس ویگن دیکھ لو۔ لاہور میں سیکڑوں پھر رہی ہیں۔ خریدنے کا خیال ہے کیا؟ تمہارا یہ دھواں دھار خچر۔۔۔" میں نے اس کی موٹر سائیکل کی طرف اشارہ کیا۔

"سکندر صاحب! بہت ہو چکی۔" حشمت خان کا حوصلہ جواب دے گیا۔ "ہمیں اطلاع ملی ہے کہ آج صبح سورج نکلنے سے بہت پہلے تم وہ گاڑی لے کر پھر رہے تھے اور اس گاڑی میں کوئی قتل ہوا تھا۔ تم نے ایک پیٹرول پمپ پر مار پیٹ کی تھی اور فرار ہو گئے تھے کیونکہ پیٹرول پمپ کے ملازم نے گاڑی میں لاش کا سر دیکھ لیا تھا۔ انہوں نے نمبر بھی نوٹ کر لیا تھا اور یہ نمبر مس رابعہ کی گاڑی کا ہے۔"

پیٹرول پمپ کے واقعات غلط نہیں تھے مگر نمبر دیکھنے والی بات جھوٹ تھی۔ جب میں فرار ہوا تھا تو پیچھے والی نمبر پلیٹ پر سیاہ کپڑا چڑھا ہوا تھا۔ یہ نمبر پولیس والے پہلے سے جانتے تھے۔ اگر پیٹرول پمپ والوں نے کسی لمبے چکر سے بچنے کے لیے پولیس اسٹیشن فون کیا ہو گا کہ اس حلیے اور رنگ کی ایک گاڑی جسے اس قسم کا ایک جوان چلا رہا تھا، پیٹرول لینے رکی تھی اور اس میں کسی لاش کا سر رکھا تھا تو میر محمد کے سر کو ایک خاص مقصد کے تحت اس کی پچھلی سیٹ پر رکھنے والوں نے فوراً پیٹرول پمپ والوں کو سمجھا دیا ہو گا کہ انہیں کیا بیان دینا ہے۔ گاڑی کا نمبر بتانے کے علاوہ ان کو یہ بھی کہنا ہو گا کہ سر پچھلی سیٹ پر رکھا تھا اور گاڑی کو شناخت کرنے والے یہ گواہ ایسے تھے کہ ان کی جانب کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ان کے بیان میں اگر حقیقت کا عنصر پچھتر فیصد ہوتا تو باقی پچیس فیصد پولیس کے دباؤ سے شامل ہو جاتا کہ مجموعی طور پر اس سچ پر جھوٹ کا شائبہ تک نہ ہو۔

"اگر میں قفل نہ کھولوں حشمت خان!" میں نے سوچ کر کہا۔ "تو تم زبردستی اندر آنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ رضوی صاحب کی واپسی تک تمہیں یہاں گارڈ بٹھانی پڑے گی کہ کہیں ملزم فرار نہ ہو جائے، چونکہ مجھے فرار ہونا ہے، اس کے لیے مجھے عدالت سے اجازت مل چکی ہے اس لیے میں تم کو برضا و رغبت اندر تشریف لانے کی دعوت دیتا ہوں۔" میں نے قفل کھولتے ہوئے کہا۔ "تم اگر چاہو تو میرے ساتھ گھر کے ہر کمرے میں، ہر میز کی دراز کھول کے بھی دیکھ سکتے ہو کہ گاڑی کہیں بھی چھپائی نہیں گئی ہے۔"

حشمت خان نے باضابطہ طور پر اندر قدم رنجہ فرمایا۔ "یہاں نہیں ہے تو وہ گاڑی کہاں ہے سکندر صاحب؟"

"یہاں سے کوئی پونے دو سو میل دور۔" میں نے دانت نکال کے کہا۔ "اب تم پوچھو گے کیوں؟ تو تھانیدار صاحب! ملک کا کوئی قانون ایسا نہیں ہے جو مالک کو اپنی گاڑی لے کر پاکستان کی جغرافیائی حدود میں کسی بھی سمت میں جانے سے روک سکے۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو سکندر صاحب!" حشمت خان نے بے یقینی سے کہا۔ "لیکن اس طرح تم بچ نہیں سکتے۔"

"یہ دعویٰ اب تک اتنے لوگ کر چکے ہیں کہ اب مجھے ہنسی تک نہیں آتی۔" میں نے کہا۔ "میں قانون سے تعاون کو فرض سمجھنے والا شہری ہوں اور اگرچہ تم میری نظر میں لاقانونیت کے علمبردار ہو مگر میں تمہیں اجازت دیتا ہوں کہ اپنا اطمینان کر لو۔"

شیخ ڈرائنگ روم میں صوفے پر نیم دراز تھا اور تازہ اخبار ملاحظہ کر رہا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ سیدھا بیٹھ گیا۔

"یہ بڑے افسوس کی بات ہے شیخ صاحب!" حشمت خان نے اس کے مقابل بیٹھتے ہوئے کہا۔ "آپ کی موجودگی میں ہماری اتنی بے عزتی خراب ہو جاتی ہے۔ آخر آپ بھی پولیس افسر ہیں، پھر آپ ایک ملزم کے ساتھ پھرتے ہیں۔"

"میں استعفیٰ دے چکا ہوں حشمت خان!" شیخ نے بے نیازی سے کہا۔ "تمہیں میرے ذاتی قول و فعل کی فکر نہیں کرنا چاہیے۔"

"یہی تو بڑی مشکل ہے۔" حشمت خان نے افسوس سے سر ہلایا۔ "ملزموں کو پولیس افسروں کی پشت پناہی مل جاتی ہے۔ ہم کیا کریں؟"

"تم اپنا کام کرو حشمت خان!" میں نے کہا۔ "تمہارے سامنے ٹیلی فون رکھا ہے۔ میں تم کو اسلام آباد میں ایک ڈپٹی سیکرٹری کی کوٹھی کا نمبر دیتا ہوں۔ خود بات کر لو جس سے چاہو۔ رضوی صاحب بھی وہیں ہیں۔ رابعہ بھی اور دونوں گھروں کے افراد بھی۔ سب لوگ اپنی اپنی گاڑی میں ایک ساتھ ہی گئے تھے۔"

حشمت خان کا ہاتھ بڑھا اور رک گیا۔ میرے اعتماد نے اس کے ارادے کو متزلزل کر دیا تھا، ویسے بھی کسی ڈپٹی سیکرٹری، کسی بیرسٹر خاتون یا ایک ایس ایس پی سے بات کرنا اس کے لیے آسان نہ تھا۔

"تمہارا۔۔۔ مطلب ہے۔۔۔ وہ سب جھوٹ ہے۔ پیٹرول پمپ کے وہ معمولی ملازم دشمن تو نہیں ہیں تمہارے۔"

"تم جسے چاہو میرے خلاف صفِ دشمناں میں کھڑا کر دو حشمت خان!" میں نے تلخی سے کہا۔ "مشکل یہ ہے کہ تم جھوٹ بھی وہ بولتے ہو جس کے پیر نہیں ہوتے۔ جھوٹ بولنے کے لیے بھی تمہارے پاس عقل کہاں؟"

"سکندر صاحب!" حشمت خان نے کہا۔ "ہم ان پڑھ لوگ ضرور ہیں، تم جیسے سیانے لوگ ہمیں بے وقوف بنانے کی کوشش کرتے وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ صرف علم سے تجربے کو شکست نہیں دی جا سکتی۔ آج ہی صبح ایک انسپکٹر تفتیش کے لیے آیا تھا تو اس نے وہی گاڑی یہاں دیکھی تھی۔ کیا یہ غلط ہے کہ تم اسی وقت کہیں سے آئے تھے اور تمہاری گاڑی کو دیکھ کر کتے بھونکنے لگے تھے؟ کتے بلاوجہ ہر گاڑی پر تو نہیں بھونکتے؟"

"یہ تو ہے۔" میں نے تسلیم کیا۔ "مثلاً تمہاری اس موٹر سائیکل جیسی چیز پر ضرور بھونکتے ہوں گے مگر جہاں تک کسی انسپکٹر صاحب بہادر کا سوال ہے تو عرض یہ ہے کہ گزشتہ چوبیس گھنٹوں میں مجھے صرف دو انسپکٹر ملے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ انسپکٹر کا بیان غلط نہیں تھا۔" حشمت خان بولا۔

"کس کا بیان؟" میں نے حیرانی سے کہا۔ "ایک انسپکٹر تو یہ شیخ ہے، دوسرے تم ہو۔ تم دونوں نے کوئی بیان دیا ہے؟"

"میں اس کی بات کر رہا ہوں جو آج صبح تم سے ملا تھا۔" حشمت خان کا موڈ خراب ہو گیا۔

"آج صبح کوئی الّو کا پٹھا مجھ سے ملنے یہاں نہیں آیا۔" میں نے بھی سخت لہجے میں کہا۔ "اور آیا ہو گا تو جھک مار کے لوٹ گیا ہو گا۔ یہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ گزشتہ رات بھی میں ایک دوست کے گھر تھا۔ وہ میرا دوست بھی ہے اور میرا وکیل بھی۔ تم چاہو تو تصدیق کر سکتے ہو کہ میں رات کو عبدالودود منظر ایڈووکیٹ کے گھر سویا تھا یا نہیں۔ وہ خود تو اس وقت ہو گا نہیں لیکن یہ بات تو اس کی بیوی بھی بتا دے گی کہ صبح میں کس وقت گھر سے نکلا تھا۔ اس کے بعد میں شیخ کے گھر چلا گیا تھا۔ شیخ تمہارے سامنے بیٹھا ہے لیکن تم اس کے گھر فون کر لو۔ وہاں اس کے والد اور گھر کے دیگر افراد ہیں۔ وہ تمہارے ہر سوال کا جواب دے سکتے ہیں۔ تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کل شام سے اب تک میں کہاں تھا۔ یہ بھی پوچھ لینا کہ میں گاڑی لے کر گیا تھا یا پیدل۔ اس کے بعد پیٹرول پمپ والوں کو تھانے بلا کے سچ پوچھنا۔ شاید اس وقت وہ نشے میں نہ ہوں۔"

حشمت خان کی مایوسی اور بے بسی قابلِ دید تھی۔ میرے اعتماد کے علاوہ میرے حوالوں نے اس کی تمام امیدوں کو خاک میں ملا دیا تھا۔ وہ سارا منصوبہ جو مجھے میر محمد کے سرِ بریدہ کے ساتھ گرفتار کرنے کا تھا، فلاپ ہو رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ میں اس جال سے صاف بچ گیا تھا اور اس نے اپنے سازشی منصوبے کی بنیاد جھوٹ پر رکھی تھی تو میں نے زیادہ بڑے جھوٹ سے اس کو ناکام بنا دیا تھا۔ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ میرے گواہ زیادہ معتبر اور ناقابلِ تردید تھے۔ ان کی گواہی کو مسترد کرنا ناممکن تھا۔ حشمت خان دوسروں کا مہرہ تھا۔ وہ بہت بڑے شاطر تھے لیکن حشمت خان بہت چھوٹا پولیس افسر تھا۔ اگر اس میں ہمت ہوتی تو وہ اسلام آباد فون ضرور کر لیتا اور پھر میرے جھوٹ کا پردہ چاک ہو جاتا لیکن میرا اعتماد میرے کام آیا اور اسے تسلیم کرنا پڑا کہ جھوٹ ہونے کے باوجود سچ وہی ہے جو میں کہہ رہا ہوں اور وہ گاڑی واقعی رابعہ اپنے ساتھ اسلام آباد لے جا چکی ہے۔ اسے یقین ہو گا کہ رابعہ صبح انسپکٹر سے میری ملاقات کے بعد گاڑی لے کر نکلی ہو گی تو چار پانچ گھنٹے میں اسلام آباد جا پہنچی ہو گی لیکن اس سے پوچھا گیا تو وہ بھی یہی کہے گی کہ وہ اپنی گاڑی میں گزشتہ روز اسلام آباد پہنچی تھی۔ اسی طرح شیخ یا عبدالودود منظر کے گھر فون کرنا اسے بے سود نظر آتا تھا۔ وہاں کون تھا جس سے حشمت خان کو مختلف بیان کی توقع ہوتی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ ہم سب نے مل کے طے کر لیا ہے کہ ہمیں کیا کہنا ہے چنانچہ ہمارے بیانات میں سرِ مو فرق نہ ہو گا۔ درحقیقت ایسی کوئی بات نہیں تھی لیکن حشمت خان کے مایوس ذہن کا ردِعمل حالات

کی حوصلہ شکن تصویر پیش کر رہا تھا چنانچہ اس نے کہیں بھی فون نہیں کیا۔ اس طرح یہ خطرہ ٹل گیا کہ وہ لاہور میں ہی رابعہ کی گاڑی کو تلاش کرتا ہوا اس گیراج تک جا پہنچے گا جہاں میں نے گاڑی کو ڈینٹ پینٹ ہونے کے لیے دیا تھا۔ بے شک میں اس کی سیٹ بدل چکا تھا لیکن آگے ڈِکّی میں خون کے ذرّات کی موجودگی بہت کچھ ثابت کر سکتی تھی۔ ہفتہ بھر کے بعد تو نئی چمکتی دمکتی گاڑی کو میں خود بھی اسی پیٹرول پمپ پر لے جاتا تو کسی کو شک بھی نہ ہوتا۔ نئے رنگ و روغن کے بعد کسی لہو کا سراغ ملنا بھی ناممکن تھا۔

"میر محمد کے کیس کی کیا پوزیشن ہے حشمت خان؟" شیخ نے اخبار رکھ کے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"لاش تو جناب کو مل ہی گئی تھی۔" وہ طنز آمیز تعظیم سے بولا۔ "مسر کوئی تھانے میں ڈال گیا۔"

"کوئی کا کیا مطلب؟" شیخ نے کہا۔ "اور کہاں ڈال گیا؟ ایس۔ ایچ۔ او صاحب کے کمرے میں؟"

"ملندر صاحب کی صحبت میں آپ بھی مسخرے ہوتے جا رہے ہیں۔" حشمت خان کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ "ہم نے دیکھا ہی ہوتا کسی کو تو اسے جانے دیتے؟ سر، عمارت کے پچھلے حصے میں پڑا ہوا ملا تھا۔ کھلے گٹر میں۔"

"پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا!" میں نے دل ہی دل میں کہا۔ اس انسپکٹر کے لیے اپنی جان چھڑانے کا اور کوئی آسان طریقہ نہیں ہو سکتا تھا۔ جیسے ہی اس پر انکشاف ہوا ہوگا کہ اپنے بیگ میں مالِ غنیمت کے ساتھ وہ ایک پولیس والے کی سری بھی لیے پھر رہا ہے، وہ ساری بات سمجھ گیا ہوگا۔ ممکن ہے وہ لوٹ کر بھی آیا ہو مگر اس وقت تک میں گاڑی سمیت غائب ہو چکا تھا۔ کسی جھمیلے میں پڑنے کے بجائے اس نے سوچ سمجھ کر سر کو سپردِ گٹر کیا اور اس طرح نہ صرف یہ کہ اپنا مسئلہ حل کیا بلکہ پولیس کی مشکل بھی آسان کر دی۔ اب ان کے پاس سالم میر محمد جملہ اعضا کے ساتھ موجود تھا۔ جسے مقتول ثابت کیا جا سکتا تھا اور اسے نہ میرا نام لینے کی ضرورت تھی نہ کسی اور کی۔ شیخ مجھ سے مصافحہ کر کے رخصت ہو گیا۔

"میرا مشورہ تو ان حالات میں یہ ہے حشمت خان! کہ ہم لوگ سب کچھ بھول جائیں۔" میں نے کہا۔ "مثلاً وہ پیٹرول پمپ والے بھول جائیں کہ نشے کی کیفیت میں انہوں نے کیا دیکھا تھا۔ تم ان کی رپورٹ کو بھول جاؤ۔ میں بھول جاتا ہوں کہ تم یہاں آئے تھے اور تمہارے اور ہمارے درمیان غلط فہمی کی بنیاد پر کوئی بات ہوئی تھی۔ پُرسکون زندگی گزارنے کا ایک نسخہ یہ بھی ہے کہ آدمی بے بنیاد خیالات کے انتشار سے بچے اور جو بات ثابت نہ ہوتی ہو، وہ بے بنیاد خیال سے زیادہ فضول ہوتی ہے۔ تم جو قانون کی نمائندگی کا دعویٰ کرتے ہو وہ اسی سچائی کو تسلیم کرتا ہے جو ثابت بھی کی جا سکے۔"

معلوم نہیں حشمت خان کس موڈ میں تھا کہ جواب دینے کے بجائے وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ "اپنی کون سی خاندانی دشمنی چل رہی ہے سکندر صاحب! ہم تو گیہوں کے ساتھ پس جانے والے گھن ہیں۔"

"اور تم محض لالچ کے باعث چکی کے دو پاٹوں کے بیچ آ گئے ہو۔" میں نے کہا۔ "چلتی چکی دیکھ کے دیا کبیرا روئے۔ دو پاٹن کے بیچ میں ثابت بچا نہ کوئے۔ ذرا احساب کرو کہ اس چلتی ہوئی چکی میں کتنے پس گئے۔ کیا میر محمد کے سر کو گٹر میں سے نکالتے وقت تمہیں بالکل خیال نہیں آیا تھا حشمت خان کہ یہ سر تمہارا بھی ہو سکتا ہے۔"

"میں..... میں..... میں ایسا کیوں سوچوں؟" حشمت خان کا رنگ اڑ گیا۔ "ویسے تو اس نوکری میں بدنامی اور خطرات کے سوا رکھا ہی کیا ہے۔ سر کو ہتھیلی پر رکھ کے پھرنا ہی پڑتا ہے۔"

"بیٹھ جاؤ حشمت خان!" میں نے کہا۔ "تم تفتیش کر چکے اب تم میرے مہمان ہو۔ ہماری گفتگو آف دی ریکارڈ ہوگی۔ تم نے تسلیم کیا ہے کہ ذاتی طور پر تمہیں مجھ سے کوئی عداوت نہیں تھی پھر یہ کیا تھا حشمت خان! جس نے تمہیں مجبور کر دیا کہ تم نے ایک ٹیپ کو غائب کرنے میں میر محمد کا ساتھ دیا۔ تم اچھی طرح جانتے تھے کہ میری بے گناہی کا وہی ایک ثبوت ہے اور اگر وہ ثبوت نہ رہا تو شاید استغاثہ کے سب سے اہم گواہوں کو قتل کرنے کا الزام براہِ راست مجھ پر آ جائے گا۔ کرنے والے تو بہت دنوں سے کوشش کر رہے ہیں کہ مجھے دھکیل کر تختۂ دار تک لے جائیں۔ اس کوشش میں ان کا اپنا کیا انجام ہوا، یہ تم اب بھی نہیں سمجھے؟ تم ہتھیلی پر سر رکھ کے نہیں، ہتھیلی پھیلائے پھر رہے ہو اور تمہاری ہتھیلی میں سوراخ ہے۔ اس کو شاید دولت نہیں بھر سکتی۔ ایک دن قبر کی مٹی ضرور بھر دے گی۔"

"ایسی آف دی ریکارڈ باتوں کے لیے میرے پاس وقت نہیں ہے۔" وہ نروس ہو کے بولا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے کہ اب تمہارے پاس وقت کم ہے۔" میں نے کہا۔ "تم نے دیکھا کہ ڈی سلوا نہیں رہا۔ اسے کتنا غرور تھا اپنی طاقت کا اور میر محمد نہیں رہا۔ اس نے بھی ساری خدائی کو اپنی قوّتِ تسخیر میں سمجھا تھا۔ ان سے پہلے بہت سے نمرود اور فرعون گزرے جو اتنی سی بات نہ سمجھ پائے کہ ملانے والے سے بچانے والا ہاتھ زبردست ہے۔ تم نے میری زندگی کی قیمت کیا وصول کی تھی؟ بلکہ اس سوال کو یوں سمجھو کہ لگانے والوں نے میری زندگی کی جتنی قیمت لگائی تھی، اس میں سے تمہارا حصہ کیا تھا؟"

"یہ کیا فضول بکواس ہے۔" حشمت خان اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا نروس بریک ڈاؤن ہونے لگا تھا۔

"میں تم پر ایک الزام لگا رہا ہوں اور اس کے باوجود مجھے تمہاری برہمی کا یہ انداز بھی کھوکھلا لگتا ہے۔ تم خوفزدہ ہو حشمت خان!" میں نے کہا۔ "تم کیا سمجھتے ہو؟ مجھے کچھ معلوم نہیں؟ یہ ٹھیک ہے کہ مجھے صحیح رقم کا اندازہ نہیں مگر میں جانتا ہوں کہ میر محمد نے وہ ٹیپ میری جان کے دشمنوں کو فروخت کرنا چاہا تھا۔ اور وہ کسی حد تک اپنے مقصد میں کامیاب بھی رہا تھا کہ اسے خاصی رقم پیشگی مل گئی تھی مگر یہ ناممکن تھا کہ وہ اکیلا ساری رقم ہضم کر جاتا۔ اس کے شریکِ راز اور برابر کے شریکِ جرم تم بھی تھے۔ اس نے تمہارا حصہ ضرور ادا کیا ہوگا۔ خود تم حصہ لیے بغیر ٹلنے والے کہاں تھے مگر انعام کے بعد انجام کے لیے بھی تیار رہو۔ اپنی بیوی کو بھی وہ سب تفصیل سے بتا دینا جو میر محمد کی بیوی کے ساتھ ہوا۔ وہ بھی ذہنی طور پر تیار رہے اور اتنی ہی ہمت اور جرأت کا مظاہرہ کرے جتنا میر محمد کی بیوی نے مرتے دم تک کیا۔"

"تمہارا..... تمہارا دماغ خراب ہے۔ یہ سب تم کیسے جانتے ہو؟" حشمت خان ہکلایا۔

"بہت سی باتیں تمہیں آج معلوم نہیں لیکن کیا تمہاری لاعلمی سے کوئی فرق پڑتا ہے؟" میں نے کہا۔ "جو ہونا ہے وہ ضرور ہوگا۔ میں تو اچھا کر رہا ہوں کہ تم کو قبل از وقت خبردار کر رہا ہوں۔ میر محمد کی بیوی بہت سمجھدار تھی، اس نے بڑی ہوشیاری سے اپنے بچوں کی جان تو بچا لی۔ اگر تمہاری بیوی کچھ نہیں کر سکتی تو تم کوئی انتظام کر لو۔"

حشمت خان نے ٹوپی اٹھائی اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ وہ دہشت زدہ ہو گیا تھا۔

"اور کل صبح کے اخبارات ضرور دیکھ لینا!" میں نے چلا کر کہا۔ "کسی میں تم کو میر محمد کے دونوں بچوں کی تصویروں کے علاوہ اور بہت سی دلچسپ خبریں ملیں گی۔" میں نے ایک قہقہہ مارا اور اس کے پیچھے پیچھے باہر تک آیا۔ حشمت خان کے دونوں ماتحت پہلے ہی جا چکے تھے۔ اب وہ اپنی موٹر سائیکل اسٹارٹ کر رہا تھا۔

"اب تو بہت پیسہ ہوگا تمہارے پاس۔ نئی کار نہ سہی موٹر سائیکل تو نئی لے لو حشمت خان!" میں نے گیٹ بند کرتے ہوئے کہا۔ "دینے والے تو اتنے سود خور ہیں کہ ایک ہاتھ سے پیسہ دیتے ہیں تو دوسرے سے جان لے لیتے ہیں۔ میر محمد کا مزار تک نہیں بنائیں گے اس پیسے سے جو بیچارے نے جان کی بازی لگا کر کمایا تھا۔"

حشمت خان نے اِدھر اُدھر دیکھ کے مجھے ایک فحش گالی دی اور ہانپتے ہوئے کِک مارتا رہا۔

میں ہنسا۔ "تم جتنی گالیاں چاہے دو، میں مشتعل ہو کے ایک باوردی پولیس افسر پر حملہ نہیں کروں گا۔ افسوس حشمت خان! کہ دنیا میں تمہارا کوئی دوست نہیں ہے جو دوستی میں تمہاری خاطر جان دے سکے۔ پیسہ جسے تُو نے دوست رکھا، ہمیشہ جان لیتا ہے اور کسی سے وفا نہیں کرتا۔" اسی وقت موٹر سائیکل ایک پٹاخہ چھوٹنے کے بعد اسٹارٹ ہو گئی۔ "اچھا بھئی! خدا کرے صبح تک تمہارے بیوی بچے، بیوہ اور یتیم نہ ہوں۔ میری فکر نہ کرنا۔ میں رضوی صاحب سے کچھ نہیں کہوں گا۔" حشمت خان کا حوصلہ اتنا پست ہو گیا تھا کہ وہ بڑی عجلت میں فرار ہو گیا۔ خطرے کا احساس اسے یقیناً ہو گیا تھا۔ جو اسکیم میر محمد کے قتل میں مجھے ملوّث کرنے کے لیے اسے سمجھائی گئی تھی، وہ ناکام ہو گئی تھی اور اسے ڈر تھا کہ موردِ الزام اس کی ذات ٹھہرے گی۔ میر محمد کے انجام کے بعد میری باتوں نے اس کے ہوش گم کر دیے تھے۔ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ میدان چھوڑ کر بھاگ جائے۔ تاہم ڈی سلوا کے مارے جانے کے بعد میری اپنی ذات کے لیے خطرات بڑھ گئے تھے۔ ڈی سلوا اس گروہ کا ایک شکاری تھا جو وزیر خان کے بعد

مجھے شکار کرنے کے لیے متحد ہوئے تھے۔ استاد پیڈرو اور میر محمد جیسے لوگ تو ان کا آلۂ کار تھے۔ جو کار آمد رہیں تو قیمت رکھتے ہیں اور بے مصرف ہو جائیں تو ختم کر دیے جاتے ہیں۔ ان کی جگہ کبھی خالی نہیں رہتی۔ دنیا کے ہر بازار میں قاتل بھی مل جاتے ہیں جو صرف معاوضے کی بات کرتے ہیں۔ یہ نہیں پوچھتے کہ کس کی جان لینی ہے اور کیوں لینی ہے اور یہ نہیں سوچتے کہ یہ بازی جان کی بازی ہے اور بازی میں جیت کے ساتھ ہار بھی ہو سکتی ہے۔ ڈی سلوا کی موت پر ایک فوری انتقامی ردِ عمل یہ بھی ہو سکتا تھا کہ شکاری مزید صبر و ضبط سے کام نہ لے سکیں۔ اب تک وہ مجھے زندہ گرفتار کرنے کے لیے حصار کو تنگ کرتے جا رہے تھے اور انہیں امید تھی کہ بالآخر وہ مجھے زیرِ دام لانے میں کامیاب ہو جائیں گے اس کے لیے وہ بہت بڑی قیمت ادا کر چکے تھے لیکن کامیابی کی منزل ان سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ تازہ ترین شکست استاد پیڈرو کی گرفتاری تھی جسے وہ ختم کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے اسے بچا کے ہم نے ان کے لیے بہت سے تشویش کے اسباب پیدا کر دیے تھے۔ استاد پیڈرو بہت کچھ جانتا تھا اور اب دشمن نے ہمیں کمزور سمجھنا چھوڑ دیا تھا۔ انہیں ڈر ہو گا کہ ہم اپنے مخصوص طریقے آزما کے استاد پیڈرو کی قوتِ مزاحمت کو شکست دے سکتے ہیں اور اسے بولنے پر مجبور کر سکتے ہیں۔ مجھے یہ بات تقریباً یقینی لگتی تھی کہ افشائے راز سے قبل ہی وہ استاد پیڈرو کی زبان ہمیشہ کے لیے بند کرنے کا انتظام کر دیں گے۔ خواہ اس کے لیے پیڈرو کو حوالات میں ہی قتل کرانا پڑے یا اسے بزورِ بازو نکال کے لے جانا پڑے۔ مجھے شیخ پر اعتماد تھا کہ وہ پیڈرو کی حفاظت کے انتظامات میں کوتاہی کا مرتکب نہیں ہو سکتا چنانچہ میں نے بعد میں اس سے پوچھا ہی نہ تھا کہ قیدی کس حال میں ہے۔ رضوی صاحب نے اپنے گھر میں میری حفاظت کے لیے جو انتظامات کیے تھے وہ درہم برہم ہو گئے تھے اور اب ان کی واپسی تک یہاں میرا صرف اللہ نگہبان تھا تاہم احتیاط کرنا مجھ پر لازم تھا اور مجھے آج کی رات اکیلے سونے میں خطرہ محسوس ہوتا تھا۔ میں سارا دن گھر سے غیر حاضر رہا تھا اور اس وقفے میں کسی کا اندر چھپ کے بیٹھ جانا مشکل نہ تھا۔ جو رات کو اندر سے دروازہ کھول دے تو مجھے سوتے میں اٹھا لیا جائے۔ استاد پیڈرو کے حصول کا ایک آسان طریقہ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ میری رہائی کو اس کی رہائی سے مشروط کر دیا جائے۔ اِس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے۔ تم پیڈرو کو چھوڑ دو، ہم سکندر کو واپس کر دیتے ہیں۔ چوہدری دلاور ایسے سودے کرنے میں کسی سے کم نہ تھا۔

نہ جانے کیوں یہ خیال میرے ذہن میں راسخ ہوتا گیا کہ آج رات ایسا ہی ہو گا اور مجھے اغوا کر لیا جائے گا پہلے میں نے بھرا ہوا ساتھ رکھ کے گھر کا ہر کمرہ اور ہر کمرے کا ہر گوشہ دیکھا۔ اندر کوئی نہیں تھا لیکن میری تسلی نہ ہوئی۔ اس قسم کی خانہ تلاشی بے سود تھ کسی بھی شخص کے لیے یہ بہت آسان تھا کہ میں ایک کمرے جاؤں تو وہ دوسرے میں کھسک جائے اور میں دوسرے میں پہنچ تو وہ پھر پہلے میں آ جائے۔ میں نے عقل کے دلائل سے خود کو قائ کرنا چاہا کہ یہ خیال میرے لاشعور میں پنہاں خوف کی پیداوار جو اس لیے غالب آ رہا ہے کہ اچانک مجھے اپنے اکیلے رہ جانے کا ہو گیا ہے محسن، رابعہ، شہلا اور انکل رضوی سمیت اس گھر کے مکین میرے لیے ایک نفسیاتی سہارا تھے جن کی موجودگی میں تنہا کے خوف سے کبھی واسطہ نہ پڑتا تھا۔

میں نے سب کھڑکیاں اندر سے بند کر کے دروازے مقفل کیے اور گھر سے باہر آ گیا۔ رات اپنا دامن پھیلا چکی تھی اور سے ویرانیٔ شہرِ نگاراں کا تاثر کچھ اور گہرا ہو گیا تھا۔ میں کچھ دیر میں کھڑا رہا۔ اس جگہ جہاں ایک رات میں اور رابعہ ایک دو کے قریب بیٹھے باتیں کرتے رہے تھے۔ یہ قربتیں اور فاصلے، سب احساس کے کرشمے تھے۔ اس رات وہ میرے کتنی قریب تھی ظاہر کی آنکھ سے دیکھنے والے کو کیسے نظر آتا۔ اب وہ مجھ سے دور تھ تو اس کا تصور ایک حقیقت بن کے رگِ جاں سے قریب تر آ گیا اور میں اسے بالکل ویسے ہی دیکھ رہا تھا جیسے اسلام آباد میں محس اسے دیکھ رہا تھا یا شہلا اور دوسرے لوگ دیکھ رہے تھے۔ عجیب بات یہ تھی کہ اس وقت مجھے سب کے چہرے دکھائی دیے۔ افسر اور ملول۔ وہ ایک دوسرے کے دکھ میں شریک تھے۔ ان کے ایک دوسرے کے غم میں رفاقت کا جذبہ تو تھا۔ وہ ایک ساتھ رو سکتے تھے اور ایک دوسرے کے آنسو پونچھ سکتے تھے۔ صرف میں ا تھا۔ شام کے ساتھ ہی قنوطیت اسی طرح میرے رگ و پے م اترنے لگتی تھی جب بھی میں اکیلا رہ جاتا تھا۔ عجیب بات یہ تھ میں نے فوزیہ کو یاد کیا تو مجھے یوں لگا جیسے وہ مجھ سے بہت دو ہے۔ جہاں میرے خیال کی رسائی بھی نہیں۔ وہ میرے خیالات کی دنیا سے بھی اتنی دور چلی گئی ہے کہ اس کا تصور تک دھندلا گیا ہے۔ اس خواب کے نقش کی طرح جسے رواں دواں زندگی کے ہنگا میں یاد رکھنا بھی محال ہو۔

شاید جینے والوں کو ایسے ہی سہاروں کی ضرورت پڑتی وہ مرنے والوں کے ساتھ مر نہیں جاتے، راستوں پر ساتھ چھوڑ جا والوں کی جگہ نئے ہمسفر بنا لیتے ہیں۔ یہ کیا ہے؟ خود غرضی؟ دنیا کی چارہ گری یا حقیقت پسندی کی انتہا؟ وہ انتہا جہاں جذبا کی وابستگی بھی عقل کے پیمانے پر حماقت نظر آتی ہے۔ وقت جو گزر گیا

بے وجود ہوا۔ وقت جو آنے والا ہے، وجود کا محتاج ہے۔ جو کچھ ہے، یہی اک پل ہے، لمحۂ گزراں۔ آج رابعہ کے بغیر میں ادھورا ہوں جیسے دن کے ساتھ رات کے بغیر وقت کا کوئی تصور نہیں۔ کل اگر رابعہ کا ساتھ بھی نہ رہا تو کیا سفر ایسے ہی جاری رہے گا؟ میری ذات کی تکمیل کوئی اور کردے گا؟ "نہیں"۔ میں نے گھبرا کے سوچا۔ رابعہ کہاں جاسکتی ہے جاس کے بغیر میں کہاں رہ سکتا ہوں جاس نے اپنا سب کچھ دے دیا ہے اور مجھ سے سب کچھ لے لیا ہے اور پھر زندگی کو اس سانچے میں ڈھال دیا ہے جو اس کے لیے اور میرے لیے ایک ہی ہے۔ فوزیہ ایک خواب تھی۔ رابعہ وہ حقیقت جس سے مفر نہیں۔

میں نے کلائی کی گھڑی میں وقت دیکھا اور سوچا کہ اگر میں اسی وقت روانہ ہوجاؤں تو رات کو کسی وقت پنڈی پہنچ سکتا ہوں۔ یہاں تو میں نے بلاوجہ وقت ضائع کیا۔ مجھے عدالت سے اجازت ملتے ہی روانہ ہوجانا چاہیے تھا۔ یہ رات بھی کسی دوست کے گھر میں یا ہوٹل میں گزارنے سے کیا حاصل؟ فوزیہ کی شادی میں شرکت نہ کرنے کا ایک جذباتی عذر بھی تھا اور ایک قانونی عذر بھی لیکن محسن کی ماں کی زندگی کے آخری لمحات میں سب کے ساتھ مجھے بھی موجود ہونا چاہیے۔ بے شک محسن کو مجھ سے کوئی شکایت نہ ہوگی مگر خدانخواستہ میں نے اجازت ہونے کے باوجود مسز شیروانی کی آخری رسوم میں شرکت نہ کی تو یہ بہت معیوب بات ہوگی۔

آدھی رات کے بعد اسلام آباد پہنچنے میں میرے لیے بھی پریشانی تھی اور میزبانوں کے لیے بھی۔ صبح پہنچنا بہتر تھا یا صبح روانہ ہونا؟ میں نے اندر جا کے اپنا بریف کیس خالی کیا اور اس میں کپڑوں کے دو جوڑے ڈال لیے۔ میری جیب میں دو ڈھائی سو روپے تھے جو عام حالات میں میری ضرورت کے لیے کم نہ تھے لیکن اسلام آباد میں جہاں میرا کوئی بنک اکاؤنٹ نہیں تھا اور میرے قیام کی مدّت غیر یقینی تھی، مجھے پیسے کی ضرورت پڑ جاتی تو رابعہ یا محسن سے مانگنے پڑتے۔ بے شک وہ بھی اپنا ہی گھر تھا اور انکل رضوی یا انکل شیروانی میری ہر ضرورت پوری کرسکتے تھے مگر میں نے بہتر یہ سمجھا کہ خالی ہاتھ نہ جاؤں۔ اس وقت بنک بند تھے لیکن یہ ہوسکتا تھا کہ میں کسی کو ایک ہزار کا چیک دے دوں جو وہ صبح کیش کرالے اور مجھے اس وقت اپنے پاس سے ایک ہزار دے دے۔ شاید شیخ اس کا انتظام کردے۔ اس کے سوا لاہور میں اپنا کوئی جاننے والا تھا تو استاد ٹیڈی مگر اس کا سراغ لگانا آسان کام نہ تھا۔ شیخ دن بھر میرے ساتھ رہا تھا چنانچہ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ رات کو ڈیوٹی پر ہوگا اور کچھ دیر قبل آنے والا حشمت خان اسے چارج دے کر جاچکا ہوگا۔

میرا اندازہ درست تھا جب میں پولیس اسٹیشن پہنچا شیخ کو ڈیوٹی پر آئے آدھا گھنٹہ بھی نہیں ہوا تھا۔

"یہ کوئی پرابلم نہیں۔" اس نے مجھ سے چیک لے کر کہا۔ "جیب میں تو تھوڑی سی رقم ہے مگر میں گھر سے منگوا لیتا ہوں۔" اس نے اپنے گھر فون کیا۔ "نازو بی بی!" کچھ دیر بعد وہ "ہاں، ہم تو بالکل خیریت سے ہیں لیکن تمہارے یہ گرو مہاراج مکرّم، سکندرِ اعظم بلیک بیلٹ مصیبت زدہ بیٹھے ہیں۔ ان کی حالت قابلِ رحم ہے۔ بڑی دکھ بھری کہانی ہے ان کی۔ مختصراً یہ کہ ہزار کا چیک لیے پھر رہے ہیں اور نقد مانگتے ہیں۔ دیکھو بی بی! ہم پولیس والے کسی پر اعتبار نہیں کرتے، یہ چیک ضرور بوگس ہوگا... تمہاری مرضی... تم کرلو بات۔" اس نے ریسیور مجھے تھما دیا۔

"یہ کیا مصیبت ہے یار؟" میں نے بادلِ ناخواستہ ریسیور... حوالات کی طرف سے کسی کا نعرہ سنائی دیا۔ "حق اللہ!"

"استاد جی!" نازلی کی شوخ آواز آئی۔ "ہزار روپے مل سکتے ہیں اسی وقت لیکن چند شرائط ہیں۔"

"وہ بھی فرما دیجیے۔" میں نے کہا۔ "لیکن ذرا آہستہ بات... یا پھر ٹیلی فون رکھ کے بات کیجیے۔ آواز آجائے گی۔"

وہ ہنسی۔ "ایک شرط تو یہ ہے کہ معاملہ ادھار کا ہے... بھر کا سود لگے گا۔ دوسری یہ کہ آپ نے مجھے اسکول کی بچی سمجھا... اس کا جرمانہ دینا پڑے گا اور جرمانہ یہ ہے کہ آپ کو مجھے ساتھ... میں قبول کرنا ہوگا۔"

"پہلی شرط منظور ہے۔" میں نے کہا۔ "باقی نامنظور... تو سود بھی حرام ہے لیکن گناہ تمہارے سر۔"

"چلیے سود اور جرمانہ ایک کرلیتے ہیں۔" وہ بولی۔ "آپ... آئیے اور... چشمِ ما روشن دلِ ماشاد۔ باقی رہا شاگردی میں قبول... کرنے کا معاملہ تو جناب میرا بھتیجا تھانیدار ہے۔ اسے سب... کرانا آتا ہے۔" اس نے ہنس کے ریسیور رکھ دیا۔

"یہ تیری بہن بھی کیا چیز ہے یار!" میں نے کان میں... گھما کے کہا۔ "کان کھا گئی میرے۔ ذرا مجھے اسکوٹر کی چابی دینا۔"

"کیوں؟" شیخ نے مسکرا کے چابی میری طرف کھسکا... دیا۔ "کوئی جرمانہ تم پر بھی۔ بس ایسے ہی مجھ سے بھی جرمانے وصول... رہتی ہے اور رقم اینٹھتی رہتی ہے۔ اس کے پاس ہمیشہ نقد... موجود رہتی ہے۔ ادھار دیتی ہے تو اس کی شرح سود فی گھنٹہ... ہے۔ دس فیصد گھنٹہ تک۔ ایک بار رات کو سو روپے لے... صبح دو سو دینے پڑے۔"

"مجھے حکم ہے کہ آ کے لے جائیے۔" میں نے کہا۔ "میں... آتا ہوں۔"

"جانا تو ویسے بھی پڑتا تمہیں۔" شیخ نے کہا۔ "گھر پر کوئی نوکر تو ہے نہیں اور یہاں سے میرا جانا مشکل تھا۔"

✽

نازلی کو دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ آج ہی دن میں اسے دیکھ کر میں نے یہ سمجھا تھا کہ وہ اسکول کی بچّی ہے تو کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ وہ اپنی عمر سے بہت کم اور صورت سے بہت زیادہ معصوم لگتی تھی لیکن اس وقت وہ بالکل بدلی ہوئی تھی۔ اس نے بڑے اہتمام سے ساڑھی باندھی تھی جس کی کوئی وجہ میری سمجھ میں نہ آسکی۔ بال شانوں پر پریشان تھے اور اس نے ہلکا سا میک اپ بھی کیا تھا۔

"تم جا رہی ہو کہیں؟" میں نے اس کے حیا آلودہ رخساروں پر شبنمی مسکراہٹ کا اجالا دیکھ کر کہا۔

"میں..... جی نہیں..... میرا مطلب ہے جی ہاں۔" اس نے کچھ سوچ کے اپنے جواب کو بدل دیا۔ "یہ لیجیے۔" اس نے بند مٹھی میرے سامنے کھول دی۔ گلابی ہاتھ پر سو سو کے دس نوٹوں کا رول سا بنا ہوا رکھا تھا اور اس کے ہاتھ کی نمی سے بھیگا بھیگا لگتا تھا۔ میں نے نوٹ جیب میں رکھے اور چیک آگے بڑھا دیا۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے چیک کو غور سے پڑھا اور پھر اطمینان سے اس کے دو ٹکڑے کردیے۔

"یہ کیا حرکت ہے؟" میں نے کہا۔ نہ جانے کیوں مجھے ایک عجیب سی بے کلی محسوس ہونے لگی تھی۔

"کچھ نہیں۔ ہمیں اعتبار ہے آپ پر۔ واپس آ کے لوٹا دیجیے گا۔" وہ اٹھلا کے بولی۔ "میں چائے لے کر آتی ہوں۔"

"چائے۔" میں نے کہا۔ "میرا تو بالکل موڈ نہیں ہے اس وقت چائے پینے کا۔ بس میں چلتا ہوں اب۔"

"میں کہوں ابو سے؟" وہ مجھے دھمکی دیتے ہوئے بولی۔ "وہ تھانیدار کے باپ ہیں۔ کھانے پر روک لیں گے۔"

میں مجبور ہو کے بیٹھ گیا۔ کسی کمرے سے ٹی۔ وی چلنے کی آواز آرہی تھی۔ شاید بڑے شیخ صاحب خبریں سن رہے تھے۔

نازلی کا رویّہ اچانک میرے لیے پُراسرار اور کسی حد تک پریشان کن ہوگیا تھا۔ وہ نابالغ بچّی واقعی نہیں تھی چنانچہ اس کی ہر بات کا اور اس کے عشوہ و غمزہ و ادا کا مطلب سمجھنا میرے لیے مشکل نہ تھا۔ وہ نادان لڑکی مجھ میں دلچسپی لے رہی تھی جو ہر طرح سے بہت خطرناک بات تھی۔ میرے لیے ناممکن تھا کہ اس کی دلچسپی کا جواب دلچسپی سے دوں۔ اس کی دل شکنی بھی بہت مشکل اور صبر آزما کام تھا اور انکار یا اقرار، نتائج بہرصورت میری

اور شیخ کی بے غرض دوستی پر اثر انداز ہوسکتے تھے۔ میں نے تہیہ کیا کہ آئندہ کبھی ادھر نہیں آؤں گا اور آیا بھی تو رابعہ کو ساتھ لے کر آؤں گا۔ ذرا بھی عقل ہوگی تو نازلی خود سمجھ لے گی کہ میرے اور رابعہ کے درمیان جذبات کا رشتہ کتنا مضبوط ہے ہیں خود کسی نہ کسی طرح یہ بات نازلی کے کان میں ڈال دوں گا کہ میرا اور رابعہ کا ارادہ تمام عمر کی رفاقت کا ہے اور حالات کے سازگار ہوتے ہی ہم ایک ہوجائیں گے۔ میں نے جلدی جلدی چائے ختم کی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"آپ تو ایسے بھاگ رہے ہیں۔" نازلی نے اپنا کپ رکھ کے کہا۔ "جیسے گاڑی نکلی جارہی ہو!"

"بجا ارشاد۔ گاڑی واقعی نکل جائے گی۔" میں نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ "مجھے اسی وقت پنڈی جانا ہے۔"

"سکندر جی! اس وقت کوئی ٹرین پنڈی نہیں جاتی۔" اس نے گھڑی دیکھ کے اعلان کیا۔ "اب آپ پہلے مجھے راستے میں میری ایک سہیلی کے گھر ڈراپ کریں گے۔ پلیز! اک ذرا آپ کو زحمت ہوگی۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ اگر میں نہیں آتا تو تم کیسے جاتیں؟" میں نے بھنا کے کہا۔ میں اسے دوسرا مصرعہ پڑھنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ شاید وہ پڑھتی بھی نہیں مگر کسی طرح مفہوم کا اظہار کردیتی۔ میں نے خود کو احمق اور ناسمجھ ظاہر کرنا بہتر جانا جو اشارہ پا کے بھی بات نہ سمجھے۔

"پھر میں ٹیکسی پر چلی جاتی۔ اب پیسے کیوں نہ بچاؤں۔" وہ بولی۔ "اور آپ کیوں اکڑ رہے ہیں جناب! میرے بھیّا کا اسکوٹر ہے۔ تھوڑی سی ڈرائیونگ ہی کرنا پڑے گی نا۔ ہم اس کا معاوضہ ادا کردیں گے۔" وہ کھلکھلا کے ہنس پڑی اور میرے لیے انکار کی گنجائش نہ رہی۔ مجھے یقین تھا کہ اس نے یہ تمام تیاری میرے استقبال کے لیے کی تھی مگر میرے پوچھنے پر فوراً ایک جواز تلاش کرلیا اور میرے ساتھ جانے کا ایک بہانہ بھی۔ وہ کسی بھی سہیلی کے گھر کوئی پروگرام بنائے بغیر صرف ملاقات کے لیے جاسکتی تھی۔ اگرچہ میں اسکوٹر چلاتے وقت بہت محتاط تھا اور سڑک بھی ہموار تھی۔ پھر بھی میں سخت مشکل میں تھا۔

بالآخر اس نے ایک کوٹھی کے گیٹ پر مجھ سے رکنے کو کہا۔ "اب آپ مانگیں گے اُجرت؟"

"جی نہیں۔" میں نے جل کر کہا۔ "صرف اجازت مانگوں گا۔ ورنہ ہو واپس لے جانے کی بیگار میں پکڑا جاؤں۔" میں نے اس کے اترتے ہی اسکوٹر اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ وہ ہنسی اور ہاتھ لہرا کے اندر غائب ہوگئی۔ میں نے اطمینان کا گہرا سانس لیا کہ خیریت رہی اور کوئی ناخوشگوار صورتِ حال پیدا ہونے کی نوبت نہیں

آئی۔ نہ میرے لیے اور نہ نازلی کے لیے۔ بیس منٹ بعد میں نے اسکوٹر کو پھر تھانے میں روکا تو رات کے ساڑھے نو بجنے والے تھے۔ تھانے میں ایک وکیل نہ بیٹھا ہوتا تو شاید شیخ مجھ سے پوچھتا کہ اتنی دیر کیوں لگی مگر وہ دونوں بحث میں مصروف تھے۔ میں نے خاموشی سے چابی شیخ کی طرف کھسکائی اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ نہ جانے کیوں وکیل نے مجھے بڑے غور سے دیکھا۔

"میں نے کہا نا وکیل صاحب کہ ملزم خیریت سے ہے۔" شیخ نے چابی جیب میں ڈال کے کہا۔

"ملزم! پھر وہی ملزم۔" وکیل نے کہا۔ "میں یہی تو پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس پر الزام کیا ہے؟"

"حقیقت تو یہ ہے وکیل صاحب کہ وہ ایک بہت پرانے مقدمۂ قتل کے سلسلے میں مطلوب تھا۔" شیخ نے کہا۔

"کیا اس کا نام ایف۔ آئی۔ آر میں ہے؟" وکیل نے اس کی بات کاٹ دی۔

"نہیں۔ مگر اس کو مشتبہ افراد میں سرِفہرست سمجھا جا سکتا ہے۔" شیخ نے کہا۔ "اب یہ نہ پوچھیے گا کہ کیوں؟ یہ شبہے کی بات ہے اور ہم تفتیش کے نتائج سے مطمئن ہیں۔ کسی کو قبل از وقت کچھ بتانے سے نقصان ہو سکتا ہے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ وہ بےقصور ہو گا تو اسے چھوڑ دیا جائے گا۔"

"کب؟ اور کس حالت میں؟" وکیل نے تلخ لہجے میں کہا۔ "ساری رات اس پر تشدد کر کے؟ جب وہ اٹھ کر کھڑا نہیں ہو سکے گا اور مرنے کے قریب ہو جائے گا تو تم اسے سڑک پر ڈال دو گے۔"

"تم کسی ثبوت کے بغیر مجھ پر ایک سنگین الزام عائد کر رہے ہو۔" شیخ نے چیں بہ جبیں ہو کے کہا۔

"تو کر دو مجھے بھی بند۔ تم بادشاہ ہو تھانیدار صاحب!" وکیل نے تڑخ کے کہا۔ "میری زندگی اسی پیشے میں گزری ہے مجھے مت بتاؤ کہ تم لوگ کیا کرتے ہو اور کیا نہیں کرتے۔"

"میں نے زندگی میں کوئی غیر قانونی کام نہیں کیا وکیل صاحب!"

"مجھے ابھی تک کوئی تھانیدار ایسا نہیں ملا جو یہ دعویٰ نہ کرتا ہو۔" وکیل نے نفرت اور حقارت سے کہا۔ "جو ثابت نہ کرتا ہو کہ وہ صرف اپنی تنخواہ میں گزارا کرتا ہے اور رشوت لیتے ہیں تو دوسرے، وہ خود تو فرشتہ ہے۔"

"میں تم پر کچھ ثابت نہیں کرنا چاہتا۔" شیخ نے برہمی سے کہا۔ "نہ میرا کوئی دعویٰ ہے۔"

"دعویٰ تم کس منہ سے کرو گے۔" وکیل نے میز پر مکا مارا۔ "کسی قانونی اختیار کے بغیر تم ایک شریف آدمی کے گھر میں گھس گئے۔ دن دھاڑے اسے گھر کے اندر سے اٹھا لائے۔ اس کے گھر کا سامان توڑ پھوڑ دیا۔ کیا ہے تمہارے نزدیک قانونی تحفظ کا؟ تمہارے سورماؤں نے ایک عورت کو مارا، بچوں کو نہیں بخشا۔"

"کون الو کا پٹھا کہتا ہے یہ؟" شیخ نے چیخ کر زیادہ زور سے میز پر مکا مارا۔ "نام بتاؤ مجھے اس کا؟"

"تم مجھ سے اس کا نام پوچھتے ہو؟" وکیل نے متاثر ہوئے بغیر کہا۔ "گالی تم نے اپنے آپ کو دی ہے تھانیدار!"

"میں...... میں نے یہ سب کچھ کیا تھا؟" شیخ اٹھ کھڑا ہوا۔

"اور کس نے کیا تھا! کیسے گرفتار کیا تھا تم نے اسے؟ کہاں سے پکڑا تھا؟" وکیل نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔

"ایک منٹ!" میں نے مداخلت کو ناگزیر سمجھتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے کوئی غلط فہمی......"

"شٹ اپ، غلط فہمی کے معنی معلوم ہیں تمہیں؟" وہ چراغ پا ہو کے بولا۔ "کون ہو تم؟ مخبر؟ پولیس کے چمچے؟"

پلک جھپکتے ہی صورتِ حال بدل گئی۔ شیخ اپنی برہمی ... کے بیچ میں حائل ہو گیا۔ اس نے فوراً اندازہ کر لیا تھا کہ اشتعال انگیزی کی فضا کس حد تک خطرناک ہو گئی ہے اور اس میں شک نہیں کہ شیخ نہ روکتا تو میں اس تذلیل کے بعد وکیل کو کرسی سمیت تھانے سے باہر پھینک دیتا اور اس کی ہڈی پسلی ایک کر دیتا۔

"وکیل صاحب! یہ میرے دوست ہیں۔ انگلینڈ سے ... کی اعلیٰ تعلیم لے کر لوٹے ہیں اور خود بھی ایک صنعتکار ہیں۔" شیخ نے تھوڑے سے مبالغے کو ضروری سمجھتے ہوئے کہا۔ "ان کا پولیس سے کوئی تعلق نہیں۔ آپ بھی پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ تھانے میں ... مت بنائیے۔ اطمینان سے بیٹھ کے بات کیجیے۔ یہ بتائیے کہ میرے متعلق جو کچھ آپ نے کہا وہ آپ سے کس نے کہا تھا؟"

"خود اس شخص کی بیوی نے، اس کے بچوں نے، محلے والوں نے۔" وکیل نے کہا۔

"یقین کیجیے یہ سب جھوٹ ہے۔" شیخ نے کہا۔ "میری ... ابھی ابھی شروع ہوئی ہے۔"

"لیکن اسے آپ نے کل رات گھر سے اٹھایا تھا۔" وکیل ...

"اور جن لوگوں نے مجھے دیکھا تھا، وہ مجھے پہچان لیں ...؟" شیخ نے کہا۔ "غالباً پہچان لیں گے۔ انہیں میری تصویر دکھا دی گئی ہو گی۔ استعفیٰ تو میں دے چکا ہوں۔ یہ مجھے معطل یا برطرف کرانے کی کوشش ہے۔"

"میں یہ سب نہیں جانتا۔" وکیل نے کہا۔ "جھوٹ ہے ... فیصلہ عدالت کرے گی۔ اس شخص کے دوستوں نے اور لواحقین نے مجھے وکیل کیا ہے اور میں ان کے بیانات کی ... ہوں۔ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"لیکن وہ شخص کسی سے ملنا نہیں چاہتا۔" شیخ نے کہا۔ "آج دن میں بھی کچھ ملاقاتی آئے تھے....."

"اور انہیں بھی لوٹا دیا گیا تھا۔" وکیل نے کہا۔ "لیکن میں غیر اہم نہیں، اس کا وکیل ہوں۔ مجھے وکالت نامے پر اس کے دستخط لینے ہیں۔"

"لیکن اس نے آپ سے ملنے سے بھی انکار کر دیا ہے۔ میں نے اسے سمجھایا تھا۔" شیخ نے کہا۔

"تم جھوٹ بولتے ہو۔" وکیل نے کہا۔ "اصل بات یہ ہے کہ وہ جسمانی طور پر اس قابل نہیں کہ تم اسے میرے سامنے لا سکو۔ تمہارے تشدد کے باعث اس کی حالت غیر ہے یا وہ مر چکا ہے۔"

"یہ اقدام ہم نے اس کی حفاظت کے پیشِ نظر بھی کیا تھا کہ کسی کو اس سے نہ ملنے دیں۔" شیخ نے کہا۔ "لیکن اب تمہیں جھوٹا ثابت کرنے کے لیے مجھے اس کو زبردستی بلوانا پڑے گا۔" اس نے میز پر رکھی ہوئی گھنٹی پر ہاتھ مارا۔

ایک سنتری نے کمرے میں آ کے سیلوٹ جھاڑا اور اٹن شن کھڑا ہو گیا۔

"دیکھو ایک حوالاتی ہے، آخری کمرے میں۔" ایس۔ آئی شیخ نے کہا۔ "اس کو یہاں بلا لاؤ۔ کہنا میں بلا رہا ہوں۔"

آخری کمرے کے نام پر مجھے ایک جھرجھری سی آئی۔ یہ وہ کمرۂ تفتیش تھا جہاں پہلی رات میں نے بھی تفتیش کے نام پر ہونے والے انسانیت سوز ظلم کی اذیت برداشت کی تھی۔ چند لمحے مکمل خاموشی میں گزر گئے۔ وکیل کے جارحانہ رویّے کے باعث کشیدگی کی ایک ایسی فضا قائم ہو گئی تھی جس میں کسی کے لیے کسی سے نظر ملانا دشوار تھا۔ وکیل اپنی جیبوں میں کچھ تلاش کرتا رہا۔ شیخ نے میز کی نیچے والی دراز میں کچھ تلاش کیا اور میں نے جیب سے سگریٹ لائٹر نکالا۔ اخلاقاً مجھے دوسروں کو بھی سگریٹ پیش کرنے کی عادت تھی مگر شیخ سگریٹ نوشی ترک کر چکا تھا اور بڑی سختی سے اپنے عہد پر قائم تھا۔ وکیل کے ساتھ اس کی بدتمیزی کے بعد بااخلاق برتنے کی گنجائش نہ رہی تھی۔ میں نے اپنے لیے ایک سگریٹ نکالی اور پیکٹ کو خالی پا کے میز کے نیچے رکھی ہوئی ٹوکری میں ڈال دیا۔ جب میں نے سر اٹھایا تو ایک کانسٹیبل استاد پیڈرو کو اپنے ساتھ لے کر اندر آ چکا تھا۔ پیڈرو کی نظر مجھ سے ملی تو وہ چونکا مگر پھر انجان بن کے دست بستہ کھڑا ہو گیا۔ مجھے اس کی مسکین صورت اور اس کے رویّے کی انکساری پر حیرت ہوئی کہ وہ بدمعاش جو استادی کے مرتبے پر فائز ہو جائیں، تھانوں میں ایسی سعادت مندی کا مظاہرہ نہیں کرتے ... ان کی اکڑ فوں میں کمی نہیں آتی۔ لیکن اس کے انداز و اطوار میں بدمعاشی کی جھلک تک نہ تھی۔ کسی حوالاتی نے نعرہ لگایا۔ "حق اللہ"۔

"بیٹھ جاؤ بھئی۔" شیخ نے کہا۔ "کیا نام ہے تمہارا؟"

"زرداد جناب!" اس نے سوچے بغیر کہا۔ "ہمارا قصور تو بتا دیں تھانیدار صاحب! کل سے بند کر رکھا ہے ہمیں۔"

"تم استاد پیڈرو کے نام سے زیادہ مشہور ہو؟" شیخ نے کہا۔ "کرتے کیا ہو؟"

"ریڑھی لگاتا ہوں ریجنٹ سینما پر جناب! سردی میں مونگ پھلی، گرمی میں قلفی۔ استاد پیڈرو تو مجھے کوئی نہیں کہتا۔ میں نے تو آپ سے کہا تھا کہ مجھے کسی اور کے دھوکے میں پکڑ لیا گیا ہے۔" وہ ہاتھ جوڑ کے بولا اور ہتھکڑی کھنکی۔ میں نے اس سے کچھ کہنے کی خواہش پر بڑی مشکل سے قابو پایا۔

کچھ دیر میں اور شیخ اسے گھورتے رہے۔ وہ بُری اداکاری نہیں کر رہا تھا۔ "تم میر شرافت علی کے نام سے واقف ہو؟"

"جی ہاں۔ میرا ماموں بھی ہے اور سسر بھی۔" وہ بولا۔ "میرے ساتھ مل کر ریڑھی لگاتا ہے۔"

"اب ان کو یہ بھی بتا دو زرداد کہ تمہیں کیسے گرفتار کیا گیا تھا اور کہاں سے۔" وکیل نے کہا۔

استاد پیڈرو کی باتوں نے مجھے اور شیخ کو چکرا دیا تھا۔ وہ بہت بڑا بدمعاش تھا اور اس میں ہمارے لیے شک کی ایک فیصد گنجائش بھی نہ تھی مگر اس وقت وہ ایک مظلوم اور غریب آدمی بنا ہوا تھا جو محنت مزدوری کر کے اپنے اور بیوی بچوں کے لیے حلال کی روزی کمانے کے سوا کچھ نہیں کرتا تھا۔ یہ عین ممکن تھا کہ استاد پیڈرو دُہری زندگی بسر کرتا ہو۔ اپنے محلے میں وہ واقعی زرداد ہو اور اس بات کے گواہ بھی ہوں کہ وہ شرافت کی زندگی گزارتا ہے مگر باہر اُس دنیا میں جہاں چوہدری دلاور اور ڈی سلوا جیسے لوگ اس کے باس تھے، وہ استاد پیڈرو ہو۔ بہت سے بدمعاش اپنے بیوی بچوں کی نگاہ میں ویسے ہی شوہر اور باپ رہنا پسند کرتے ہیں جیسے عام لوگ۔ اپنی مجرمانہ زندگی کا سایہ تک اپنے گھر پر نہیں پڑنے دیتے۔ وہ اس دنیا کے نشیب و فراز دیکھ لیتے ہیں تو یہ سمجھتے ہیں کہ تقدیر نے انہیں جس غلط راہ پر ڈال دیا تھا اس پر ان کی اولاد کبھی دولت کو نصب العین بنا کے نہ چلے۔ وہ شریف کہلائیں اور ان کی زندگی دنیا میں قانون کی سزا کے خوف سے بھی آزاد ہو اور عاقبت کی سزا کے ڈر سے بھی۔ شاید پیڈرو بھی ایسا ہی آدمی تھا۔ اس نے بچوں کو ناجائز ذرائع سے حاصل ہونے والی دولت کا سکھ آرام اور زندگی کے تمام لوازمات ضرور فراہم کیے ہوں گے مگر اس کے ساتھ ہی ان کی نظر میں اپنی

عزت اور وقار بحال رکھنے کے لیے جھوٹ کا سہارا بھی لیا ہوگا اور انہیں یقین ہوگا کہ ان کے باپ کا کوئی کاروبار ہے۔ اتنا ہی جائزہ جتنے سب کے ہوتے ہیں۔

وکیل کے سوال پر اس نے اجازت طلب نظروں سے شیخ کی طرف دیکھا۔ ڈرتے ڈرتے۔

"ان کی فکر مت کرو۔" وکیل نے کہا۔ "میری موجودگی میں یہ تم کو سچ بولنے سے نہیں روک سکتے۔ میں تمہارا وکیل ہوں۔ تمہاری بیوی نے مجھے بھیجا ہے۔ میری فیس بھی ادا کر دی ہے اس نے۔ کیا تم نے ملاقات سے انکار کر دیا تھا؟"

"یہ جھوٹ ہے۔" استاد پیڈرو کے رویئے میں نمایاں تبدیلی آئی۔ اس کا خوف دور ہوگیا۔ اس نے بڑی تفصیل سے بتایا کہ کس طرح آدھی رات کے بعد پولیس والے دیوار پھاند کے اس کے گھر میں داخل ہوئے۔ اس کی بیوی نے شور مچایا تو ایک سپاہی نے اسے مارا اور باورچی خانے میں بند کر دیا۔ اس شور سے بچے جاگ اٹھے تھے اور سہم کر چلّانے لگے تھے۔ ایک اور پولیس مین نے ان کو بھی گھسیٹ کر ماں کے ساتھ بند کر دیا۔ وہ لوگ سارے گھر میں کچھ تلاش کرتے پھرے اور پھر اسے مارتے دھکیلتے باہر لے آئے اور ایک جیپ میں ڈال کے تھانے پہنچا دیا۔

شیخ کے لیے اور میرے لیے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ ہم اپنے ملزم کی گرفتاری کے اصل واقعات اور اسباب بیان نہیں کر سکتے تھے۔ جن حالات میں وہ ہمارے ہاتھ آیا تھا ان پر ہم نے مختلف انداز میں سوچا تھا۔ میر محمد اپنی ہوس کا شکار ہوا۔ اس نے تمام عمر ناجائز ذرائع سے پیسہ کمایا تھا اور اپنی تھانیداری کے بل پر اس کا شکار وہ ہوئے جو کمزور تھے۔ اپنی شہ زوری کے اسی زعم میں اس نے بڑی اسامی دیکھ کر بڑا ہاتھ مارنا چاہا لیکن جن پر اس نے ہاتھ ڈالا تھا وہ بہت بڑے شکاری تھے۔ شاید وہ میر محمد کو منہ مانگا انعام بھی دے دیتے لیکن میر محمد نے ضرورت سے زیا ہوشیار بننے کی کوشش کی اور وہ ٹیپ گنوا دیا جس کا ضائع ہونا مجھے دُہرے قتل کے الزام میں ملوث رکھنے کے لیے ضروری تھا۔ اس کی وجہ سے چوہدری دلاور کی وہ کوشش ناکامی کے انجام سے دوچار ہوئی جو مجھے راستے سے ہٹانے کے لیے کی گئی تھی۔ اگر میں اپنی بے گناہی ثابت کرنے میں ناکام رہتا تو استغاثہ کے لیے مجھے میر شرافت علی کا قاتل ثابت کرنا کوئی مسئلہ نہ ہوتا۔ میر شرافت علی کے گھر میں گھس کے مجھے مار پیٹ اور توڑ پھوڑ میں مصروف دیکھنے والے بھی دو افراد تھے جو اس وقت میر شرافت علی کے گھر میں موجود تھے اور جنہوں نے چشم دید گواہ کی حیثیت سے مجھے شناخت بھی کر لیا تھا۔ ان کے سفاکانہ قتل کا ذمے دار میرے سوا کون ٹھہرتا

عبدل اور رشید معمولی گھریلو ملازم تھے اور ان کی کسی سے کو نہ تھی سوائے میرے۔ میں ان کے خلاف انتقامی ردِعمل کا اور جانتا تھا کہ جب عدالتی کارروائی کا آغاز ہوگا تو یہی دو گوا منزلِ دار و رسن تک پہنچائیں گے چنانچہ میں نے اس وقت آنے سے پہلے ہی ان کا پتہ بھی صاف کر دیا جس طرح حالا گواہی نے مجھے میر شرافت علی کا قاتل بنا دیا تھا اسی طرح کی گواہی سے یہ الزام بھی مجھ پر آجاتا کہ پہلے قتل کی سزا سے کے لیے میں نے دو قتل اور کر دیے۔ جب سوال اپنی زندگی کسی اور کی زندگی کی پروا کون کرتا ہے اور پھانسی تو ایک ہوتی ہے خواہ ایک قتل کا جرم ثابت ہو خواہ تین کے قتل کا ایک بات یقینی تھی۔ اگر میر شرافت علی کے کیس میں میرے موت سے بچنے کے امکانات ففٹی ففٹی تھے اور عمر قید ہو جانے کے فائدے میں بری ہو جانے کے امکانات بھی ففٹی ففٹی استغاثہ کے سب سے اہم گواہوں کو قتل کرنے کے بعد میر سزائے موت سے بچنا ناممکن تھا۔ پہلے قتل کو حادثے کا نتیجہ ق دیا جا سکتا تھا۔ رابعہ اور عبدالودود منظر کی کوشش سے یہ بھی ہو سکتا تھا کہ میں نے عمداً اسے قتل نہیں کیا تھا بلکہ اپنا د کیا تھا مگر عبدل اور رشیدے کا معاملہ قطعی مختلف ہوتا۔ یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوتی کہ میں نے ان کو سوچے سمجھے منصو کے تحت ایک خاص مقصد کی خاطر قتل کیا۔ موت حادثاتی اشتعال انگیزی کا نتیجہ ہو یا اپنے دفاع کا حق استعمال کرتے واقع ہو جائے قانون کی نظر میں اتنا سنگین جرم نہیں ر قتلِ عمد۔ بلکہ بعض اوقات یہ تسلیم کر لیا جاتا ہے کہ انسان بے بس ہے اور جذبات اس کی عقل پر حاوی آجائیں تو وحشت و دیوانگی میں جان دے بھی سکتا ہے اور لے بھی ہے مگر دیوانے کو اس کے قول و فعل کا ذمے دار ٹھہرا کر سزا کا نہیں سمجھا جاتا۔ چنانچہ یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا تھا کہ بھر کے قابل ترین وکیل مل کے، مجھے میر شرافت علی کے قتل الزام سے تو بری کرا سکتے تھے مگر عبدل اور رشیدے کے قا بچانے میں ناکام رہتے۔ میرا دشمن، میرا ماضی تھا۔ لندن کے دوران میں مجھ پر ایک طوائف کے قتل کا الزام آیا تھا ثابت نہیں ہوا تھا۔ انگریز دشمنی کے باعث مجھ پر ہوسٹل رکھنے اور دو افراد کی موت کا سبب بننے کا الزام آیا تھا بچ گیا تھا لیکن بالآخر انہی مشکوک حالات کے باعث سے پھر کالج اور پھر برطانیہ سے اخراج عمل میں آیا تھا۔ جن میں میرے والد وزیر خان کا انتقال ہوا تھا وہ خود دلیل کرتے تھے کہ میں نے بلیک میلنگ اور قت

میر شرافت علی کا خون کیا یا اسے اتنا مارا کہ وہ مر گیا (استغاثہ کا کیس مختلف تھا کہ میں نے اسے خنجر کے وار سے ہلاک کیا) لیکن عبدل اور رشیدے کے کیس میں میرا ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ ارتکاب جرم ثابت ہوتا تھا مگر عبدل نے مرتے مرتے اپنے بارِ گناہ کو یوں اتارا کہ مجھے بے گناہ قرار دے گیا اور قانون کی نظر میں وہ بیان اس لیے سچ تھا کہ ایک شخص نے اس وقت دیا جب اسے اپنی زندگی کے ختم ہونے کا اعتبار بقائمی ہوش و حواس آگیا تھا۔

میر محمد کے لالچ سے زیادہ اس کی غیر دانشمندانہ دانشمندی کے باعث عبدل کا وہ آخری بیان ریکارڈ پر آگیا جس کے بارے میں شکاری مطمئن تھے کہ اب اس کا وجود ثابت نہیں ہوتا۔ اس بیان کو ایک محرر نے لکھا تھا مگر اس پر عبدل کے دستخط نہیں تھے۔ صرف تحریر محرر کے ہاتھ کی تھی جسے عدالت کے ریکارڈ پر رکھنے سے کوئی خاص فائدہ حاصل نہیں ہوتا تھا کیونکہ میر محمد کے دباؤ میں یا چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کی طرف سے دھمکی یا فراخدلانہ پیش کش کے بعد وہ کہہ سکتا تھا کہ ٹیپ کا کوئی وجود نہیں اور اس نے اپنے ہاتھ سے وہی لکھ دیا تھا جو ایس۔ آئی شیخ صاحب نے لوا تھا مگر اب ٹیپ نہ ہمارے پاس تھا اور نہ ہمارے دشمنوں کے پاس بلکہ ایک طرح سے پبلک پراپرٹی ہوگیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ مرنے سے پہلے میر محمد کی بیوی نے تشدد کرنے والوں کو دھمکی ضرور دی ہوگی کہ اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا اور وہ ٹیپ اخبار والوں کو پہنچ چکا ہے۔ شاید اس باہمت اور چالاک عورت نے یہ بھی کہا ہو کہ اب بیان ہی اخبار میں نہیں آئے گا، بچوں کی تصویر اور ان کا بیان کردہ مجرموں کا حلیہ بھی شائع ہو جائیں گے اور کچھ بعید نہیں کہ اس نے جان بچانے کی خاطر ہر قابلِ یقین اور ناقابلِ یقین جھوٹ کا سہارا لیا ہو۔ یہ بھی کہہ دیا ہو کہ بچے مجرموں کی تصویر بھی لے کر گئے تھے۔ ایک رشوت خور پولیس والے کے بچوں کے پاس عام قسم کا پاکٹ سائز یا بے بی کیمرہ ہونا بعید از قیاس بات نہیں لیکن اس کے بیان نے شکاریوں کو احساس دلا دیا کہ وہ جال کاٹ دیا گیا ہے جو انہوں نے مجھے شکار کرنے کے لیے پھیلایا تھا اور اسے کاٹنے میں میر محمد کا ہاتھ بھی ہے اور اس کی بیوی کا بھی۔ میر محمد نے ان کو بلیک میل کرنے کا جرم کیا تھا جو ان کے نقطۂ نظر سے اتنا سنگین جرم نہیں تھا۔ پیسہ ان کے لیے غیر اہم تھا۔ زیادہ سنگین جرم یہ تھا کہ میر محمد نے اس ٹیپ کی نقل بنا کے کہیں اور رکھوائی اور اس کی بیوی نے ناکامی کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکتے ہوئے وہ ٹیپ اخبار والوں کو پہنچا دیا۔ ان دونوں کے لیے کم از کم سزا موت کی ہی ہو سکتی تھی جو انہیں بڑے عذاب کے ساتھ دی گئی اور دوسروں کے

یسے درسِ عبرت بنا کے دی گئی مگر اس کے باوجود تلافی نہ ہوئی تو انھوں نے نئی چال چلی اور میر محمد کی لاش سے وہ کام لیا جو میر محمد سے نہ لے سکے تھے۔ عبدل اور شیدے کے قتل کا الزام نہ سہی، میر محمد کے قتل کا سہی۔ اسباب تو دونوں کے ایک ہی بنتے تھے اور سزا بھی ایک تھی لیکن اس چال کی ناکامی غیر متوقع تھی۔ نہ صرف یہ کہ میں اپنی چالاکی اور تقدیر کی یاوری کے باعث صاف بچ گیا تھا بلکہ اُلٹا ہم ایک شکاری کو شکار کر لائے تھے۔

میں اور شیخ دونوں ہی قانونی معاملات کی اُلجھن کو جانتے تھے چنانچہ شیخ نے حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے قانونی کارروائی نہیں کی تھی اور اگر کی تھی تو صرف اس حد تک کہ اس شکاری کو حراست میں لے لیا تھا۔ اس وقت ہم دونوں کے ذہن میں وہ سب غیر قانونی حربے تھے جو دشمن ہمارے خلاف استعمال کر رہا تھا یا کر سکتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے ایک قانون شکن دشمن کو ذہن میں رکھا اور یہ سوچا کہ اب وہ اپنے ساتھی کی رہائی کے لیے یا اس کی زبان کھُلنے سے پہلے ہمیشہ کے لیے بند کرنے کی خاطر کیا قدم اٹھائیں گے۔ ہم نے تمام امکانات پر غور کر لیا تھا۔ سوائے قانونی امکانات کے۔ یہ خیال مجھے بھی نہیں آیا تھا کہ استاد پیڈرو کی رہائی کے لیے ایک وکیل آ دھمکے گا جو قانون کے حوالے سے الزامات کی نوعیت اور شیخ کے اختیارات کو چیلنج کر دے گا۔ ابھی تو شیخ نے تفتیش کا آغاز بھی نہیں کیا تھا اور پیڈرو سے کچھ بھی نہیں پوچھا تھا۔

اب اچانک صورتِ حال مزید پیچیدہ ہو گئی تھی۔ جسے ہم بہت بڑے مجرموں کا سب سے اہم آدمی سمجھ کے اٹھا لائے تھے، وہ خود کو ایک غریب مونگ پھلی بیچنے والا ثابت کر رہا تھا اور اُلٹا الزام عائد کر رہا تھا کہ اسے کسی جرم کے بغیر گھر کے اندر گھُس کر اٹھایا گیا ہے۔

"آپ کی زبان کو تالا کیوں لگ گیا تھانیدار صاحب؟" وکیل نے طنز سے کہا۔ "کس سوچ میں پڑ گئے آپ؟"

"میں یہ سوچ رہا تھا وکیل صاحب کہ سچ صرف ایک ہو سکتا ہے۔" شیخ نے کہا۔ "یہ ناممکن ہے کہ جھوٹ بیک وقت جھوٹ بھی ہو اور سچ بھی۔ کیا آپ اتفاق کرتے ہیں میری بات سے؟"

"یہ ایک منطقی اور فلسفیانہ نکتہ ہے جس سے ہر معقول آدمی اتفاق کرے گا۔"

"پھر آپ مجھے بتائیے کہ یہ شخص اتنے بڑے جھوٹ کو سچ کیسے ثابت کرے گا؟" شیخ نے کہا۔

"یہ کام میرا ہے۔ ثبوت میں عدالت کے سامنے پیش کروں گا۔" وکیل نے کہا۔ "اب آپ مجھے یہ بتائیں کہ معاملے کو ختم کریں گے ابھی اور اسی وقت...."

"ختم کرنے سے آپ کی کیا مراد ہے؟" شیخ نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"اس شخص پر کوئی الزام نہیں۔ آپ اسے میرے ساتھ... پولیس زیادتی بھی کرتی ہے، خصوصاً ایسے غریبوں کے ساتھ مگر چھوٹی چھوٹی باتوں پر مقدمے بازی میں وقت ضائع ہوتا ہے..." نے مصالحت کے موڈ میں کہا۔

"یہ غریب شخص کہاں رہتا ہے؟" شیخ نے کہا۔ "بقول آپ... جہاں سے میں نے اس کو بزورِ بازو اٹھایا؟"

"مزنگ میں، جہاں مچھلی بیچنے والوں کی دکانیں ہیں، ... کے پیچھے ایک گلی میں۔" وکیل نے کہا۔

"اور آپ کو یقین ہے کہ وہاں چشم دید گواہ موجود ہیں جو ... بھی پہچان لیں گے؟ اس کے بیوی، بچّے، محلّے دار۔"

"یس۔ اور ان سب کی گواہی سے آپ خود مجرم بن ... گے۔" وکیل نے کہا۔

"آل رائٹ وکیل صاحب!" شیخ نے فیصلہ کُن لہجے میں ... "مقابلہ اگر جھوٹے گواہوں کو عدالت میں پیش کرنے کا ہے تو ... یہ چیلنج قبول کرتا ہوں۔ آپ کے علم میں یقیناً ہوگا کہ پولیس ... وسائل اور اختیارات کا ناجائز استعمال مشکل نہیں۔ گو میں نے ... کبھی نہیں کیا مگر آپ نہیں مانیں گے اس لیے یہ دعویٰ کرنے کے بجائے میں وہی کروں گا جو آپ چاہتے ہیں یعنی انگریزی کا... کے مطابق میں آپ کے سکّوں سے آپ کو ادائیگی کروں گا۔ ... وقت بہت قیمتی ہے لیکن آپ کچھ دیر یہیں انتظار فرمائیے۔" وہ ... ہوئے دروازے کی طرف بڑھا۔

وکیل کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور اس کے اعتماد ... رخصت ہو گیا۔ "میں سمجھا نہیں یہ بات؟"

"آپ ابھی سمجھ جائیں گے۔ صرف دس منٹ میں۔" ... دوسرے کمرے میں غائب ہو گیا۔ میں اسی اندازِ بے نیازی ... ساتھ بیٹھا رہا۔ استاد پیڈرو کے لبوں پر ایک تحقیر آمیز مسکرا... تھی۔ وکیل بظاہر بے تعلق بیٹھا تھا مگر ایک بار مجھے بے عز... کے خاموش کر دینے کے بعد وہ بھی خود کو فاتح تصور کرنے لگا ... تاہم اس کی صورت پر اب الجھن کے آثار پیدا ہو گئے تھے ... اسے یقین تھا کہ وہ شیخ کو دبانے میں کامیاب ہو گیا ہے لیکن ... رویّے کی تبدیلی اور اس کی آخری بات کے واضح نہ ہونے ... کا یقین برقرار نہ رہا تھا۔ خود میں اندازہ کرنے سے قاصر تھا کہ ... کرنا چاہتا ہے۔ دس منٹ کے بجائے پندرہ منٹ گزر گئے ... شیخ لوٹ کر نہ آیا۔ اس دوران میں وکیل نے کم از کم پندرہ ...

گھڑی دیکھی اور اپنی متانت قائم رکھتے ہوئے غریب مونگ پھلی والے کو تسلی بھی دی کہ وہ فکر نہ کرے، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اس کی گفتگو کے انداز میں اجنبیت بھی تھی جیسے کہ وہ پہلی بار اپنے مؤکل سے ملا ہو اور اپنائیت بھی تھی کیونکہ اب بہرحال ان کے درمیان ایک رشتہ قائم ہو چکا تھا۔ اگرچہ وہ نوعیت کے اعتبار سے کاروباری تھا۔ حقیقت کیا ہے؟ یہ ہم سب جانتے تھے۔ میں جانتا تھا کہ میری نظر اور عقل نے دھوکا نہیں کھایا۔ استاد پیڈرو جانتا تھا کہ وکیل کو بھیجنے والے کون ہیں، وکیل جانتا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ کامیابی کی صورت میں اس کا معاوضہ کتنا ہوگا۔ وہ یقیناً مجھے بھی جانتا ہوگا۔ استاد پیڈرو جیسے خطرناک مجرم کو سب کی آنکھوں میں دُھول جھونک کے غریب مونگ پھلی والا ثابت کرنے کے انتظامات کر لیے گئے تھے اور بڑی ٹھوس بنیادوں پر۔ کون کہتا ہے، اس بیسویں صدی میں کہ جھوٹ کی کھیتی سدا پھلتی نہیں۔ اور ناؤ کاغذ کی سدا چلتی نہیں — یہ بھی کاغذ ہی کی ناؤ تھی جسے ایسے ہی وکیل اور ایسے ہی مجرموں کے مفاد واشتراکِ باہمی کی قوت چلا رہی تھی اور وہ انصاف جس کا بول بالا ہوتا ہے اس ناؤ کے سامنے ڈوب رہا تھا۔

"سوری وکیل صاحب!" شیخ نے اچانک اندر آ کے کہا۔ "آپ کو کچھ انتظار کی زحمت اٹھانا پڑی۔" وہ اپنے ساتھ روزنامچہ لے کر آیا تھا۔ اسی وقت ایک سپاہی چائے لے کر اندر آیا۔ "آپ کو کم از کم یہ شکایت تو نہ ہو کہ تھانے میں کوئی اخلاق سے بات نہیں کرتا اور حسنِ سلوک سے پیش نہیں آتا۔"

وکیل نے بادلِ ناخواستہ چائے کا کپ لے لیا۔ "آپ تشریف کہاں لے گئے تھے؟"

"میں دراصل روزنامچہ لینے گیا تھا۔" شیخ نے شگفتہ لہجے میں کہا۔ "محرر غائب ہے چنانچہ آجکل سب کام ایسے ہی چل رہا ہے۔ بعض اوقات تو رپورٹ بھی خود لکھنی پڑتی ہے، اپنے ہاتھ سے۔" اس نے چائے کا ایک گھونٹ لیا اور میری طرف دیکھا۔ چائے کا ایک کپ میرے سامنے بھی رکھ دیا گیا تھا۔ صرف استاد پیڈرو کو نظرانداز کیا گیا تھا۔

"چائے نہیں تو ایک سگریٹ ہی مل جائے تھانیدار صاحب۔" استاد پیڈرو نے مسکینی سے کہا۔

"اچھا۔" شیخ نے کہا اور ایک سپاہی کو طلب کیا کہ ملزم کی ہتھکڑی کو ایک ہاتھ تک محدود کر دیا جائے۔

استاد پیڈرو نے میز پر رکھے ہوئے سگریٹ کے پیکٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر وکیل زیادہ مستعد ثابت ہوا۔ اس نے پیکٹ میں سے ایک سگریٹ آگے بڑھائی اور میز پر سے ماچس اٹھا کے سلگانے میں اپنے مؤکل کی مدد کی جس کے لیے یہ سب کام ایک ہاتھ سے ممکن تو تھے لیکن آسان نہ تھے۔

"وکیل صاحب!" ایس۔ آئی شیخ نے روزنامچے پر نظر رکھتے ہوئے کہا۔ "ہمارے ریکارڈ میں ملزم کا نام استاد پیڈرو ہے۔ کوئی زرداغلطی سے پکڑا گیا ہوگا تو چھوڑ بھی دیا گیا ہوگا۔ روزنامچے کے اندراجات کے مطابق تو ملزم کو آج سہ پہر گرفتار کیا گیا...."

"یہ جھوٹ ہے۔" وکیل یکلخت پھٹ پڑا۔ "کون اُلّو کا پٹھا کہتا ہے۔"

"پلیز، شٹ اپ۔" شیخ نے میز پر دھڑ سے ہاتھ مارا۔ "اگر آپ نے مجھے پھر گالی دی تو نتائج کے خود ذمّے دار ہوں گے۔ آپ وکیل ہیں، اچھی طرح جانتے ہوں گے کہ تھانے میں کیا، سڑک پر بھی آپ کسی کو گالی دے کر اشتعال انگیزی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ میں آپ کو وہ بتا رہا ہوں جو روزنامچے میں لکھا ہوا ہے۔ اپنے دلائل عدالت میں دیجیے گا۔ کل صبح ہم ملزم کو مجسٹریٹ کے سامنے پیش کریں گے اور چودہ دن کے لیے اس کا جسمانی ریمانڈ حاصل کر لیں گے۔ جب تک تفتیش مکمل نہ ہو، چالان پیش کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں۔" اس نے پھر روزنامچے کو دیکھا۔ "اس میں لکھا ہے کہ ملزم مشتبہ حالت میں تھانے کے قریب گھومتا ہوا پایا گیا۔ ایک سنتری کے روکنے پر اس نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن اسے پکڑ لیا گیا۔ اس کے قبضے سے چرس بھرے سگریٹوں کا ایک پیکٹ اور ایک بغیر لائسنس کا ریوالور دستیاب ہوا۔"

"یہ اندراج تم نے ابھی اندر جا کے کیا ہے۔" وکیل مشتعل ہو کے بولا۔ "چرس بھرے سگریٹ اور ایسے ریوالور تو تم لوگ اپنے پاس رکھتے ہو کہ......"

"میں نے کہا ہے کہ اسے عدالت مت سمجھیے۔" شیخ نے اس کی بات کاٹ دی۔ "آپ اور آپ کا مؤکل دونوں پرلے درجے کے جھوٹے آدمی ہیں اور اس کا ثبوت یہ اندراج ہے جو چھ گھنٹے پہلے کا ہے۔ اس پر چار بج کر دس منٹ کا وقت لکھا ہوا ہے۔ میری ڈیوٹی آٹھ بجے شروع ہوئی ہے۔ اس وقت حشمت خان ڈیوٹی پر تھا مگر اندراج اس کے ہاتھ کا نہیں۔ آپ دیکھ سکتے ہیں، یہ میرے ہاتھ کی تحریر بھی نہیں، اس لیے یہ مت کہیے کہ میں ابھی اندر اسی کام سے گیا تھا۔"

وکیل نے روزنامچہ لے لیا۔ "میں جانتا ہوں تھانیدار صاحب تم نے ابھی ابھی اپنے کسی ماتحت سے یہ سب کچھ لکھوایا ہے۔ اس سے پہلے چوری کی رپورٹ چار بجے لکھی گئی تھی۔ تم نے اگلا اندراج دس منٹ کا وقفہ دے کر دکھا دیا ہے۔"

"اب تم اپنے وہ سب گواہ عدالت میں لے کر آنا جنھوں

نے دیکھا تھا کہ میں نے پولیس کی نفری کے ساتھ اس غریب مونگ پھلی بیچنے والے کو اس کے گھر میں گھس کے گرفتار کیا' اس کے بیوی بچوں کو مارا اور توڑ پھوڑ کی۔ میں تو خیر استعفا دے ہی چکا ہوں۔ تم حشمت خان کو طلب کر کے جرح کرنا کیونکہ یہ اندراج اس کی ڈیوٹی کے ٹائم میں ہوا ہے۔ اس کی جواب دہی میرا کام نہیں۔ ہاں' تمہارے الزام کے جواب میں اپنا دفاع میں خود کروں گا یا میرا کوئی وکیل ہوگا۔" اس نے روزنامچہ بند کر کے گھنٹی بجائی۔" ملزم کو ہتھکڑی لگاؤ اور لے جاؤ۔" اس نے ایک سپاہی کے اندر آتے ہی کہا۔

وکیل کے ماتھے پر ہر شکن گہری ہوگئی۔" اس کا مطلب ہے... خیر۔" اس نے بات ادھوری چھوڑی اور سگریٹ کا پیکٹ اٹھا کے استاد پیڈرو کو دوسری سگریٹ دی۔" میں سمجھ لوں گا تم سے شیخ جی!" وہ پیڈرو کی سگریٹ جلانے کے بعد پیکٹ اور ماچس جیب میں رکھتے ہوئے بولا۔

" شٹ اپ! اینڈ گیٹ آؤٹ۔" شیخ نے کہا۔" اس سے پہلے کہ میری قوتِ برداشت جواب دے جائے۔"

وکیل نے اپنا بریف کیس اٹھایا اور احتجاجاً واک آؤٹ کر گیا۔ سپاہی نے استاد پیڈرو کے دونوں ہاتھوں کو پھر ہتھکڑی میں جکڑ دیا اور اسے اپنے ہمراہ لے گیا۔ دست بستہ ہونے کے باوجود پیڈرو نے سگریٹ تو نہیں چھوڑی۔ اس کے لبوں پر وہی زیرِ لب فاتحانہ مسکراہٹ تھی جو صاف ہمارا مذاق اڑاتی محسوس ہوتی تھی مگر زبان سے اس نے کچھ نہیں کہا۔

" لاحول ولاقوۃ۔" شیخ نے وکیل کے جاتے ہی گہری سانس لے کر کہا۔" یہ تو میرے گلے پڑ گیا تھا۔"

" مگر تم نے اچھا سلوک کیا اس کے ساتھ۔" میں نے کہا۔

" یار اب کیا کریں' مجبور ہو جاتے ہیں پولیس کے ہتھکنڈے استعمال کرنے پر۔ شرافت اور اصول پرستی سے کام لیتا تو جاتے جاتے بھی یہ الزام سر آجاتا۔" وہ افسوس سے سر ہلا کے بولا۔" اور میاں سکندرِ اعظم! مجھے قطعی شبہ نہ تھا کہ مجرم نکل جاتا' مجھے مجرم بنا کے۔"

" اندراج کس نے کیا؟" میں نے کہا۔" حشمت خان اس کے پیچھے پڑ جائے گا۔"

" اسی سپاہی نے جو پیڈرو کو لے گیا ہے۔" شیخ نے کہا۔" اس کی اور حشمت خان کی پرانی دشمنی چل رہی ہے' پہلے سے لگتی ہے۔ شاید کسی بے ایمانی کے سودے میں بے ایمانی پر۔"

" یہ چکر تمہاری سمجھ میں آیا؟" میں نے کہا۔" استاد پیڈرو کا ڈبل رول۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ یہ پیڈرو سے ملتی جلتی شکل کا کوئی آدمی ہو؟ فلمی فارمولے کے مطابق جڑواں بھائی ہو۔ یا میک اپ سے..."

اس سے پہلے کہ میری بات پوری ہوتی' حوالات کی طرف سے ہنگامے کی آواز آئی۔ بیک وقت تین چار افراد ایک دوسرے سے چلا چلا کر کچھ کہہ رہے تھے۔ پھر کسی نے کہا۔" اوئے کھوتے! بلا انچارج صاحب کو..."

" او پانی پلا اس کو کھوتے دے پُتّر! انچارج صاب! انچارج صاب!" دوسرے نے پکارنا شروع کیا اور بیک وقت میں اور شیخ اندر کی طرف لپکے۔ استاد پیڈرو حوالات کے فرش پر لیٹا ہوا تھا اور ایک سپاہی زبردستی اس کے حلق سے پانی اتارنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ حوالات کے دوسرے مکین ذرا فاصلے سے بیک وقت خوف' نفرت اور دلچسپی کے ساتھ یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

" کیا ہوا ہے اسے؟" شیخ نے پیڈرو کے پاس بیٹھ کے اس کا ہاتھ تھام لیا اور نبض پر انگلی رکھ دی۔

" پتا نہیں سر! ابھی سگریٹ پی رہا تھا۔ پھر کھانسنے لگا۔ جیسے دمے کا دورہ پڑتا ہے۔ پھر لیٹ گیا۔" پانی پلانے والے سپاہی نے اپنی کوشش ترک کر دی تھی کیونکہ پیڈرو مر چکا تھا۔ اس کی آنکھوں کی پُتلیاں ٹھہر گئی تھیں۔

" فون کرو۔ ڈاکٹر کو بلاؤ فوراً۔" شیخ نے چلا کر کہا۔" ایمبولینس منگواؤ۔ غالباً دل کا دورہ ہے۔"

" اس کا اب کوئی فائدہ نہیں شیخ!" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔" مُردے زندہ نہیں ہو سکتے۔"

شیخ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے دونوں سپاہیوں کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کے اس نے کہا۔

" تم بتاؤ! تم اس کو لے کر آئے تھے۔ کسی نے کچھ دیا تھا اسے؟" اس نے حوالات میں بند دوسرے لوگوں کے حوالے سے کہا۔

" نہیں سر!" سپاہی نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔" ابھی تو میں اس کو چھوڑ کر حوالات سے نکلا بھی نہیں تھا۔ بس اُدھر لے جا کے بٹھایا تھا۔ کھانا اس نے کیا تھا؟ ان میں سے تو کوئی قریب نہیں آیا ملزم کے سر..." اس نے حوالات کی جانب ہاتھ سے اشارہ کیا۔" بس وہی سگریٹ کے سوٹے لگا رہا تھا۔"

" سگریٹ؟ کہاں ہے وہ سگریٹ؟" شیخ نے چلا کر اس کی بات کاٹ دی۔" یہاں لاؤ تلاش کر کے۔"

پانچ منٹ کے اندر اندر وہ سگریٹ کا نصف سے زیادہ بھیگا ہوا ٹکڑا شیخ کے سامنے رکھ دیا گیا۔

" اس ٹکڑے کو کسی کاغذ پر اٹھا لو۔" اس

" سکندر! تم نے دیکھا تھا نا؟ اس وکیل نے یہ سگریٹ دی تھی اسے؟"

" ہاں' لیکن میری گواہی سے کچھ ثابت نہیں ہوتا۔" میں نے تردد سے کہا۔" اس کے علاوہ کیا وکیل نے اپنا نام بتایا تھا؟"

" ہاں۔ اس نے کہا تھا' میں خادم حسین آفندی بار ایٹ لاء ہوں۔" شیخ نے مایوسی سے کہا۔" اگر یہ اس کا نام نہ ہوا تو؟"

" مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔" ممکن ہے سگریٹ میں کچھ نہ ہو۔ اس کا ہارٹ فیل ہو گیا ہو۔"

شیخ نے افسردگی سے نفی میں سر ہلایا۔" وہ جعل ساز ہاتھ دکھا گیا سکندر! مجھے اس کو یہ رعایت نہیں دینا چاہیے تھی کہ حوالاتی کو سگریٹ پیش کرے۔ وہ پیکٹ بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ جاؤ لاش کو حوالات سے ہٹا دو۔" اس نے دونوں سپاہیوں سے کہا۔

" میں اور تم جو سگریٹ پیتے ہیں..." میں نے کہا۔" وہ کیپسٹن ہیں۔ مگر وکیل نے اسے "کے ٹو" دی تھی۔"

" یہ بھی کیپسٹن ہے سکندر بخت!" شیخ نے کہا۔" جو کے ٹو کی ڈبیا میں اسی لیے رکھا گیا تھا۔ اس وقت کے لیے جب ملزم کو چھڑا کے ساتھ لے جانے کی کوئی صورت نہ رہے۔ آؤ ذرا لاش کو دیکھیں۔"

لاش اب ایک کمرے میں چارپائی پر رکھ دی گئی تھی۔

" جب اس نے سگریٹ ماچس جیب میں رکھے تھے تو میں حیران ہوا تھا۔ تم جانتے ہو کہ عموماً وکیل اتنے کم قیمت سگریٹ نہیں پیتے اور خود اس نے تو سگریٹ پی ہی نہیں۔" میں نے اس کے ساتھ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

" وہ ڈبیا اس نے میز پر کب رکھی تھی؟" شیخ نے چارپائی پر پڑے ہوئے پیڈرو کو دیکھا۔

" میں نے اسے کچھ رکھتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ ڈبیا... پہلے سے میز پر رکھی تھی۔ میں سمجھا ہو گی کسی کی۔" میں نے کہا۔" کسی سپاہی کی۔"

" اب کچھ نہیں ہو سکتا دوست! مرنے والا مر گیا بلکہ مار دیا گیا۔" شیخ نے اٹھتے ہوئے کہا۔" اب تو صرف پوسٹ مارٹم ہوگا۔ اس کی رپورٹ میں کچھ بھی لکھا جائے' یہ کہ سگریٹ میں سائنائڈ تھا یا ملزم کا ہارٹ فیل ہو گیا تھا۔ کل کے اخبارات کی سرخی یہی ہوگی کہ زیرِ تفتیش ملزم کی حوالات میں پُراسرار ہلاکت۔"

" شیخ! یہ کیا ہو رہا ہے؟" میں نے اس کی توجہ مرنے والے کے چہرے کی طرف مبذول کرائی۔

جب پیڈرو بیہوش ہوا تھا تو اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے والوں نے اس کے منہ پر پانی ڈالا تھا۔ جو پانی اسے پلانے کی کوشش کی گئی تھی۔ وہ بھی منہ پر بہہ گیا تھا اور جہاں پر پانی جذب ہوا تھا وہاں سے اس کی کھال اترنے لگی تھی۔ لیکن کھال تو اتنی جلدی تیزاب سے بھی نہیں اترتی۔ شیخ نے اسے انگلی سے چھو کر دیکھا۔

" یہ... یہ تو کچھ پلستر جیسی چیز ہے۔" اس نے فوراً انگلی ہٹالی۔ میں نے نیچے بیٹھ کر غور سے دیکھا تو مجھے بالوں کے بھی مصنوعی ہونے کا شبہ ہوا۔" یہ کوئی اور ہے سکندر!" شیخ دروازہ بند کر کے بولا۔

" مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔ لیکن تم کچھ مت کرو۔ ایمبولینس کو آنے دو۔" میں نے کہا اور اسے ساتھ لے کر باہر نکل آیا۔ شیخ نے دو سپاہیوں کو لاش کے پاس کھڑا کر دیا تھا۔ ایک درویش صفت قیدی نے نعرہ لگایا۔" حق اللہ۔"

" یہ تو بہت برا ہوا سکندر!" شیخ نے اپنے آفس میں پہنچ کے کرسی پر گرتے ہوئے کہا۔" مجھے معلوم تھا کہ ایک نہ ایک دن یہ نوکری مجھے لے بیٹھے گی۔ اسی لیے میں اپنی جان چھڑا رہا تھا مگر اب تو جو مقدر میں لکھا ہے' ضرور ہوگا۔"

" گھبرانے کی کیا بات ہے یار!" میں نے کہا۔" یہ سب

میری وجہ سے ہوا ہے مگر رابعہ کو دیکھو اور شہلا کو دیکھو۔ انھوں نے میرا ساتھ دینے کی کتنی سخت سزا پائی ہے۔ تُو نے خود تو اسے قتل نہیں کیا۔ زیادہ سے زیادہ تجھ پر الزام آئے گا فرائض کی بجا آوری میں غفلت برتنے کا۔ تُو نے ملزم کو وکیل سے ملوایا اور اسے سگریٹ پلانے کی اجازت دی اور... ظاہر ہے وہ جعلی وکیل تھا۔ تُو نے تصدیق نہیں کی۔ مگر اس جرم کی سزا زیادہ نہیں ہو سکتی۔ وہی معطلی یا لائن حاضری۔ انکل رضوی اور کچھ نہیں ہونے دیں گے۔"

"بات صرف اتنی ہی نہیں ہوگی سکندر!" شیخ نے کہا۔ "میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔ اگر یہ پیڈرو نہیں تھا تو پھر یہ زرداد ہی ہوگا۔ جو گرمی میں قلفی اور سردی میں مونگ پھلی بیچتا تھا۔ اس کی خدمات مستعار لی گئی ہوں گی۔ بھاری معاوضہ ادا کر کے اور تحفظ کی پوری یقین دہانی کے ساتھ۔ غریب اور سادہ لوح آدمی تھا۔ لالچ میں مارا گیا۔ اب میں فرض کر سکتا ہوں کہ یہ ڈراما کیا تھا۔ اس مونگ پھلی والے سے بات کرنے اور اسے نقد معاوضہ ادا کرنے کے بعد رات کو کچھ لوگ پولیس کی وردی میں اس کے گھر پہنچے۔ انھوں نے وہی کیا جو زرداد نے بتایا تھا اور ظاہر ہے کہ سب نے دیکھا تھا۔ ان میں کوئی تھانیدار بھی ہوگا۔ میرے جیسے قدوقامت کا اور میری عمر کا۔ وردی پہن کے یوں بھی سب ایک جیسے لگتے ہیں۔ رات کے وقت دیکھی ہوئی صورت کس کے ذہن میں رہے گی۔ لیکن دیکھنے والوں کے سامنے میرا نام لیا گیا ہوگا۔ اس جعلی سب انسپکٹر کو اکرام شیخ کہہ کے بلایا گیا ہوگا۔ یا شاید اس کے بیوی بچوں کو پہلے سے کوئی جھوٹی کہانی سنا دی گئی ہوگی کہ اکرام شیخ نام کا ایک سب انسپکٹر اس کے غریب شوہر کا دشمن ہو رہا ہے۔ وجہ کچھ بھی ہو سکتی ہے۔ بھتہ زیادہ مانگتا تھا ریڑھی لگانے کا۔ اور ڈر ہے کہ وہ دشمنی میں زرداد کو بند کر دے گا، کوئی بھی جھوٹا الزام لگا کے۔ مرنے والا تو بتا نہیں سکتا کہ اس نے میک اپ کیوں کیا تھا۔ اس کے بیوی بچے کیا بتائیں گے۔ شاید یہی کہ مجھ سے بچنے کے لیے اس نے یہ سوانگ بھرا ہوگا مگر وہ مجھے یقیناً پہچان لیں گے اور میرا نام بھی بتا دیں گے۔ میں نے جھوٹا الزام اس پر واقعی عائد کر دیا ہے۔ کون مانے گا کہ وہ غریب آدمی چرس کے سگریٹ اور بغیر لائسنس کا ریوالور لے کر مشتبہ حالت میں تھانے کے پاس گھوم رہا تھا۔"

"میرا موجود ہونا بھی اچھا ہی رہا۔ کم سے کم ایک گواہ تو تھا جس نے سب کچھ دیکھا۔" میں نے کہا۔ "مثلاً اس وکیل کو۔"

"مجھے خوش فہمی میں کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔" شیخ نے روزنامچے کو گھورتے ہوئے کہا۔ "بہرحال۔ تم اپنا بیان لکھ کے دے دو۔ وجہ کیا بتاؤ گے کہ یہاں کیا کر رہے تھے؟"

"میں حشمت خان سے ملنے آیا تھا۔" میں نے کہا۔ "مجھے تو علم نہیں تھا کہ ڈیوٹی پر کون ملے گا اور مجھے یہ دیکھنا تھا کہ کیا واقعی انسپکٹر میر محمد کے قتل کے سلسلے میں کسی قسم کی رپورٹ میں میرا نام بھی آیا ہے۔ آیا ہے تو کیوں اور کس نے لیا ہے، آخر حشمت خان تفتیش کے لیے میرے پاس کیسے پہنچا؟ اتنا جواز کافی ہے۔"

"عملے کی کمی بھی ایک مسئلہ بن گئی ہے۔ اگر میر محمد ہوتا تو اس وقت میں یہاں موجود نہ ہوتا۔" شیخ بولا۔ "اب ایک تو ایس ایچ او کوئی نہیں، دوسرے محرر غائب۔ کسی کو لاش کے ساتھ بھی اسپتال بھیجنا ہے۔ یہاں حشمت خان کو شوق ہے دن بھر میں زیادہ سے زیادہ بندے ڈک دینے کا۔ لڑائی جھگڑا ہو تو دونوں پارٹیاں اندر۔ چوری ڈکیتی کا کیس ہو تو جسے چاہو مشتبہ قرار دے کر بلوالو، آوارہ گردی میں دھر لو۔ رپورٹ کسی کی نہیں لکھتا۔ بس سودا کھرا کیا اور مال جیب میں تو ملزم باہر۔ ورنہ حوالات میں۔ اب یہ دیکھو! اس وقت بھی دس آدمی بند ہیں۔ ان میں سے صرف دو کے خلاف پرچہ کاٹا گیا ہے۔ باقی آٹھ سے کچھ نہیں ملا تو میرے لیے چھوڑ گیا۔ روز رات کو آ کے ایک ایک سے سر کھپاتا ہوں اور جو واقعی بلاوجہ بند ہوتے ہیں، انھیں چھوڑتا ہوں۔ آج تو ان بے چاروں کی بھی نہیں سنی۔"

باہر سے ایمبولینس کا سائرن سنائی دیا تو شیخ باہر نکلا۔ اس نے لاش اٹھوا کے میو اسپتال ارسال کی۔ ایک کانسٹبل کو ہدایات دے کے ساتھ کیا اور تقریباً آدھے گھنٹے بعد لوٹا تو میں اپنا تفصیلی بیان لکھ چکا تھا جو میں نے دستخط کرنے سے پہلے اسے پڑھ کے سنایا اور پھر دستخط کر کے اس کے حوالے کر دیا۔ رات کے گیارہ بجے وہ چوری کی ایک رپورٹ روزنامچے میں لکھ کے فارغ ہوا تو وہ سپاہی اندر آ گیا جو پیڈرو یعنی زرداد کی لاش کے ساتھ گیا تھا۔

"ہمارا کیا بنے گا سر؟" اس نے فریاد کے انداز میں کہا۔ "حشمت خان کو کیا جواب دوں گا میں؟"

"جو مقدر میں ہے اسے کوئی نہیں ٹال سکتا جوان!" شیخ نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ "خود مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ بے چارہ ایک سازش کا شکار ہوا ہے۔ جہاں تک حشمت خان کا سوال ہے تو اس سے ڈرنے کی تمھیں کیا ضرورت ہے۔ وہ سارا دن بوگس کارروائی کے سوا کرتا کیا ہے۔ تم اگر اڑ جاؤ کہ تم نے اسی کے کہنے پر اندراج کیا تھا تو وہ مصالحت ہی بہتر سمجھے گا

کہ اس کیس میں وہ بالکل ملوث نہ ہو چنانچہ وہ ہرگز پسند نہیں کرے گا کہ تم اس کے خلاف کوئی بیان دو۔ وہ تمھاری تائید کرے گا تو تمھارا یا اس کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ جہاں تک محکمے کی کارروائی کا تعلق ہے تم دونوں محفوظ ہو۔ خود کو بچانے کے لیے حشمت خان چرس اور ریوالور وغیرہ کا انتظام بھی کر ہی لے گا۔ اس کے پاس سب کچھ ہوتا ہے۔ نہ ہو تو وہ حاصل کر لیتا ہے۔ سارا الزام مجھ پر آئے گا۔ اس لیے حشمت خان اپنی پوزیشن محفوظ رکھے گا اور تمھیں خود بخود تحفظ حاصل ہو جائے گا۔ اس نے ایک مشتبہ شخص کو پکڑا تھا اور بس۔ جو کچھ برآمد ہوا وہ محفوظ ہے۔ قیدی مر گیا تو اس کا کیا تعلق حشمت خان سے۔ وہ ڈیوٹی پر تھا ہی نہیں۔ وہ میرا بھی دشمن ہے اور تمھارا بھی لیکن اس وقت صورتِ حالات ایسی ہو گئی ہے کہ وہ ایک دشمن کا ساتھ دے کر دوسرے کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ چنانچہ تم مطمئن رہو، وہ تمھارا ساتھ دے گا۔ جھوٹ یا سچ سے مرنے والے کو فائدہ پہنچ سکتا ہے اور نہ نقصان ہو سکتا ہے۔ اس کی قضا آئی تھی کہ وہ یہاں پہنچا۔ قضا خود آدمی کو اس جگہ پہنچا دیتی ہے جہاں فرشتۂ اجل اس کا منتظر ہو۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے اس کے خلاف بلاوجہ ایک اندراج کیا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں اسے چھوڑ دیتا تو وہ بچ جاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے اس کی جان بچانے کی خاطر ہی اسے حوالات میں رکھنے کا فیصلہ کیا تھا اور اس دھوکے باز وکیل نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں کوئی جواز پیدا کروں۔ وہ وکیل تھا ہی نہیں، قاتل تھا۔"

"جی؟" سپاہی کی صورت پر بارہ بج گئے۔ اپنے افسر کی بات اس کی ناقص عقل میں نہیں آئی تھی۔

"تم کو یہ سب سمجھنے کی ضرورت نہیں۔" شیخ نے کہا۔ "یہ لمبا چکر ہے۔ بس اتنا سمجھ لو کہ وہ شخص حوالات میں نہ مرتا تو باہر لے جا کر مار دیا جاتا۔ جب اس کی صورت نہ رہی تو اسے یہیں ختم کر دیا گیا۔ حوالات میں کتنے لوگ بلاوجہ بند ہیں۔ روزنامچہ دیکھو اور جن کے خلاف کوئی الزام نہیں انھیں یہاں لے آؤ۔"

دس منٹ بعد آٹھ افراد دست بستہ قائم مقام ایس ایچ او صاحب کے کمرے میں حاضر کیے گئے اور سر جھکا کے کھڑے ہو گئے۔ میں نے ان سب کو غور سے دیکھا۔ ان میں ایک تو حلیے سے ہی فقیر لگتا تھا۔ داڑھی اور سر کے جھاڑ جھنکاڑ بالوں اور سرخ انگارہ آنکھوں سے، تار تار لباس سے اور گلے میں پڑی ہوئی منکوں کی مالا سے۔ چھ اوباش اور لوفر قسم کے نوجوان... تھے۔ لنڈے کی رنگین شرٹیں پہن کے اور لمبے بال رکھ کے ہپی بن جانے والے، جو پڑھتے تھے نہ کوئی کام کرتے تھے مگر جوانی کے زعم میں اینڈتے پھرتے تھے کہ ہم چو من دیگرے نیست۔ ان کی صورتوں پر مفلسی کی تحریر بتاتی تھی کہ وہ احساسِ محرومی کا شکار ہونے اور غریب گھر میں پیدا ہونے کو اپنا جرم سمجھنے لگے۔ وہ چاہتے تو محنت کر کے اپنی تقدیر بدل سکتے تھے مگر انھوں نے منفی اور انتقامی ردِعمل اختیار کیا۔ اور غلط راہ پر چل پڑے۔ بدا اچھا، بدنام بُرا اور لاوارث اس سے بھی بُرا۔ اب کہیں کچھ ہو، انھیں پکڑ کر جوتا کاری کے لیے بلا لیا جاتا تھا۔ آٹھواں نسبتاً عمر رسیدہ تھا اور اپنی صورت سے شریف اور مظلوم آدمی لگتا تھا۔ غالباً ان سب کو یہ سمجھا کر لایا گیا تھا کہ ایس ایچ او صاحب بہادر کے سامنے ان کو شور و غل نہیں کرنا ہے، رونا دھونا نہیں ہے اور اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے بک بک نہیں کرنی ہے چنانچہ وہ سب حکمِ حاکم کے انتظار میں تھے۔

درویش نے نعرہ مارا "حق اللہ!" اور شیخ کے اشارے پر اسے سوال و جواب کیے بغیر سب سے پہلے رہائی مل گئی۔

"تم کیا کرتے ہو میاں؟" شیخ نے پولیس والوں کے لہجے میں عمر رسیدہ شخص سے پوچھا۔

"بروکر ہوں مائی باپ!" وہ ہاتھ جوڑ کے بولا۔ "لوگوں کے مکان کرائے پر اٹھواتا ہوں۔ کوئی غلط کام نہیں کرتا۔ اپنی محنت کا معاوضہ، کمیشن لیتا ہوں۔ تھانیدار حشمت خان کو ایک کرائے دار لا کر دیا تھا۔ حشمت خان نے اپنی تھانیداری سے اس کا جینا عذاب کر دیا۔ ورنہ وہ شریف آدمی تھا۔ تنگ آ گیا تو اس نے اپنے سالے سے کہا۔ وہ سی آئی اے کا کوئی ڈی ایس پی ہے۔ اس نے حشمت خان کو اُدھر جانے سے بھی روک دیا۔ حشمت خان سال میں دو بار کرایہ بڑھوا چکا تھا۔ پھر اس نے مکان خالی کرانے کا نوٹس دے دیا۔ کرائے دار نے عدالت میں کیس کر دیا اور حشمت خان نے مجھے پکڑ لیا۔ مجھ سے کہتا ہے اسے نکالو، نہیں تو دو سو روپے ماہانہ دو۔ کرایہ بڑھ گیا ہے اور تمھارا آدمی پرانا کرایہ دیتا ہے۔ مائی باپ! معاملہ عدالت کا ہے۔ ہم کیا کریں اور کرائے دار کو میں نے زبردستی تو نہیں رکھوایا تھا۔ بعد میں میری کیا ذمّے داری؟"

"اچھا اچھا۔" شیخ نے کہا۔ "تم جاؤ۔ آئندہ کسی تھانیدار کو کرائے دار مت لا کر دینا۔"

"یہ بھی مشکل ہے مائی باپ! جب دھندا یہی ہے تو تھانیدار کو کیسے انکار کر سکتے ہیں۔ آپ کی مہربانی۔" وہ سلام کر کے رخصت ہو گیا۔ پھر شیخ نے نوجوانوں کی طرف دیکھا۔

"ان دو کو تو میں پہچانتا ہوں۔" شیخ نے کہا۔ "مہینے میں

ایک بار ہمارے مہمان ضرور ہوتے ہیں۔" اس نے قطار کے اوّل و آخر میں کھڑے ہوئے دو جوانوں سے کہا۔" مجھے معلوم ہے پر کیا کرتے ہیں۔ تم سب بھی انھی کے چیلے ہو؟"

سب سر جھکائے کھڑے رہے اور شیخ کا لیکچر سنتے رہے۔

"تم لوگ لاتوں کے بھوت ہو گئے ہو۔" شیخ نے کہا۔" باتیں بیکار ہیں۔ اس لیے میں پھر تم کو چھوڑ رہا ہوں مگر یہ آخری موقع ہے ہو سکتا ہے میرے بعد آنے والا تھانیدار تمھارا دماغ درست کر دے۔"

چونکہ ان کی صحبت خراب تھی اور وہ چوروں، بدمعاشوں، جیب کتروں اور دس نمبریوں کے مُرید تھے۔ اس لیے بعض اوقات جوتا کاری کے مفید نتائج نکلتے تھے اور ان کے ذریعے کسی نہ کسی واردات کا سراغ بھی مل جاتا تھا۔ ورنہ وہ رات حوالات میں گزارتے تھے اور صبح کوئی غریب باپ یا بھائی کہیں سے سو پچاس کا بندوبست کرلاتا تھا اور انھیں جوتے مارتا ہوا لے جاتا تھا۔ مگر وہ جس راستے پر گامزن تھے اس کی منزلِ حوالات کے بعد جیل یا تختۂ دار بھی ہو سکتی تھی۔ واپسی نصیب کی نہیں، ان کے اپنے اختیار کی بات تھی۔ کسی سزا کے خوف سے یا کسی کی نصیحت سے وہ راہِ راست پر نہیں آسکتے تھے۔ یہ صرف قوّتِ ارادی کو بروئے کار لانے کا مسئلہ تھا۔ لیکن غلط ماحول میں وہ دن بدن خراب ہو رہے تھے۔ بیشتر صورتوں میں وہ چھوٹے موٹے گروہ بنا لیتے تھے اور ایک دوسرے کے خلاف پولیس کے مخبر بن کے بھی کام کرتے تھے۔ کچھ ان سے بڑے بدمعاش اور کچھ پولیس والے دونوں مل کے انھیں صراطِ مستقیم سے دور لے جا رہے تھے۔ کیونکہ دونوں کے مفادات انھی سے وابستہ تھے اور یہ کم عمر نوجوان نہیں جانتے تھے کہ وہ کیا کر رہے ہیں، کس کے لیے کر رہے ہیں اور کیوں کر رہے ہیں؟ یہ شاید قومی ہی نہیں بین الاقوامی مسئلہ تھا۔ سنِ بلوغت تک پہنچنے والوں کو منشیات کا عادی بنانا، جرائم کی ترغیب دینا، دولت کی خاطر قانون اور معاشرے کے خلاف بغاوت پر اکسانا اور بدمعاشی کا مطلب بہادری سمجھانا آسان ہے کیونکہ بالغ اور بالغ نظر ہونے کی عمر میں بڑا فرق ہے۔ جو نوجوان بالغ ہوتے ہی اعلانِ خود مختاری کر دیتے ہیں۔ انھیں زمانے کی ٹھوکریں کھانے کے بعد پتا چلتا ہے کہ قصوروار کون تھا۔ ان کا مقدر؟ زمانہ یا وہ خود؟

"ابھی جو کچھ ہوا، تم سب نے دیکھا تھا؟" شیخ نے کہا اور میں چونکا۔ ان سب نے اقرار میں سر ہلایا۔" اچھا یہ بتاؤ کہ کیا اس میں میرا قصور تھا؟" شیخ نے کہا۔" میرا مطلب ہے کیا میں نے اس پر تشدّد کیا تھا؟ تم میں سے کسی کے ساتھ کبھی کوئی زیادتی کی ہے میں نے؟ کبھی کسی بے قصور کو پکڑا ہے؟"

"نہیں جنابِ عالی! آپ ہی تو ایک ہمیں بچا لیتے تھے" ان میں سے ایک نے کہا۔" رات کو کسی اور کی ڈیوٹی ہوتی تو ہماری شامت آجاتی تھی۔ اپنے پیروں پر چل کے گھر جانا مشکل ہوتا تھا۔"

"آئندہ میں تمھارے لیے کچھ نہیں کر سکوں گا۔" شیخ نے کہا۔" ایک بات تو یہ کہ میں نے استعفا دے دیا ہے لیکن اس کے قبول ہونے سے پہلے ہی میں معطل ہو جاؤں گا اور ممکن ہے مجھ پر یہ الزام عائد کرنے کی کوشش بھی کی جائے کہ میں نے مرنے والے پر اتنا تشدد کیا کہ وہ مر گیا۔ تھانوں میں یہ ہوتا رہتا ہے اور سنسنی خیز خبریں چھاپنے والے اخبارات اس کی پبلسٹی کرتے ہیں۔ یہ بتاؤ کہ ضرورت پڑنے پر میری طرف سے صفائی کے گواہ کے طور پر پیش ہو سکو گے؟ کبھی مجھے بچانے کے لیے عدالت میں آ کے سچ بول سکو گے؟ وہی بتا سکو گے جو تم نے دیکھا تھا؟"

قطار کے اوّل و آخر میں کھڑے ہوئے دونوں تجربہ کار نوجوانوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ مشورہ کیا۔ پھر دوسروں کو متذبذب دیکھ کر وہ آگے بڑھے۔

"ہم آئیں گے جنابِ عالی!" ایک نے سینے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ "کوئی مائی کا لال ہمیں سچ بولنے سے نہیں روک سکتا۔" باقی چار نے بھی ان کی دیکھا دیکھی کہا کہ وہ گواہی دینے حاضر ہو جائیں گے لیکن صاف ظاہر تھا کہ وہ مجبوراً اور صرف اپنی جان چھڑانے کے لیے ایسا کہہ رہے ہیں۔

"سالے سقراط کی اولاد۔" شیخ نے ان سب کے رخصت ہوتے ہی کہا۔" تم دیکھنا یہی دونوں صاف مُکر جائیں گے اور ضرورت پڑنے پر ان کا پتا بھی نہیں چلے گا کہ ہیں کہاں۔ باقی چار میں سے دو شاید آجائیں۔"

رات کے بارہ بجنے والے تھے۔ میں نے شیخ سے اجازت لی۔" مجھے اسلام آباد جانا ہے۔"

"واپسی کب ہوگی؟" شیخ نے پوچھا۔" ممکن ہے یہاں مجھے تمھاری ضرورت پڑ جائے۔"

"میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔" میں نے کہا۔ مسز شیروانی کی کنڈیشن بہت سیریس تھی اور ڈاکٹر نا اُمید ہو چکے تھے۔ خدا کرے ان کی حالت سنبھل جائے اور میں دو تین دن میں ہی واپس آجاؤں۔ بصورتِ دیگر شاید ٹھہرنا پڑ جائے۔"

"میں بھی اسپتال چلتا ہوں۔ دیکھوں گا کہ میک اپ کے بغیر وہ کیا تھا۔" شیخ نے کہا۔" پھر موقع ملا تو اس کے گھر جاؤں گا، صرف تصدیق کے لیے کہ وہ وہیں رہتا تھا۔ گھر سے اٹھایا گیا تھا۔"

"اور اگر یہ سچ ہوا۔" میں نے کہا۔" تو یہ خبر بھی تم ہی سناؤ گے کہ زرداد کی گھر والی بیوہ ہو گئی ہے اور اس کے بچے یتیم ہو گئے ہیں۔ اتنی ہمت ہے تم میں؟"

"بے شک یہ کام بہت مشکل ہے۔" شیخ نے کہا۔" لیکن یہ بہت ضروری ہے کہ میں اپنی بے گناہی کسی عدالت میں ثابت کرنے سے پہلے اس عورت اور اس کے بچوں کے سامنے ثابت کر دوں۔ انھیں یہ بتا دوں کہ وہ کس چکر میں مارا گیا اور اس کے قاتل کیا چاہتے تھے؟ یہ وضاحت کر دوں کہ خود میں بھی سازش کا شکار ہوا ہوں اور قصوروار نہ ہونے کے باوجود مجھے مجرم بنا دیا گیا ہے۔ مجھے محکمہ جاتی کارروائی اور قانونی مسائل کی فکر نہیں۔ اگر وہ عورت میری بات سمجھ لے، مجھے معاف کر دے اور میری بے گناہی تسلیم کر لے تو میرے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں رہے گا۔ یہ بہت اطمینان کی بات ہوگی میرے لیے۔"

"اچھا۔" میں نے کچھ سوچ کے کہا۔" پھر میں بھی چلتا ہوں تمھارے ساتھ۔ صبح چلا جاؤں گا اسلام آباد۔ میرا خیال ہے کہ اس تمام معاملے کو میں بہتر طور پر سمجھا سکتا ہوں۔ مگر میں تھانے سے باہر ملوں گا۔"

ماتحت عملے کا انچارج ایک نائک کو مقرر کر کے اور دیگر لوگوں کو ضروری ہدایات دے کر وہ گشت پر روانہ ہو گیا۔ میں اس کے ساتھ نہیں تھا، تھانے سے کچھ فاصلے پر اپنا بریف کیس اٹھائے کھڑا تھا۔ سڑک سنسان تھی۔ چنانچہ اس نے تھانے سے نکلتے ہی مجھے دیکھ لیا اور اسکوٹر میرے قریب لا کر روکا۔ سینما کے آخری شو ختم ہوئے تھے۔ چنانچہ ایبٹ روڈ سے آگے سڑکیں کچھ دیر کے لیے آباد ہو گئی تھیں۔ نسبت روڈ پر بھی ایک دو حلوائی دکانیں کھولے بیٹھے تھے۔ دکانوں کے سامنے لکڑی کی بینچوں پر لوگ بڑے بڑے پیالوں میں گرما گرم ملائی والا دودھ پی رہے تھے یا پیڑے والی گاڑھی اور ٹھنڈی لسّی۔ اس کے آگے میو اسپتال کے دروازے پر بھی رونق تھی۔ مجھے وہ رات یاد آئی جب رابعہ کی ماں نے ایمرجنسی وارڈ میں زندگی کی آخری چند سانسوں کے ختم ہونے سے پہلے بیٹی کو دیکھنا چاہا تھا اور میں نے ایک اجنبی لڑکی کو جھوٹ بولنے پر مجبور کر کے اس کے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔ اس گناہِ بے لذّت کی کسک پھر تازہ ہو گئی۔ نہ جانے اب وہ لڑکی کہاں ہو گی جس کا نام تک مجھے معلوم نہیں۔ اسے بھی تمام عمر ملال رہے گا کہ اس نے ایک مرتی ہوئی عورت کو دھوکا دینا کیوں منظور کر لیا تھا جس کے حواس تک جواب دے چکے تھے جو نہ دیکھ سکتی تھی، نہ سن سکتی تھی اور نہ محسوس کر سکتی تھی۔

شیخ نے اسکوٹر مُردہ خانے کے قریب روکا تو میں چونکا۔ "کون سی دنیا میں تھے جناب!" شیخ نے کہا۔" پریشان میں بھی ہوں لیکن تم سے کم۔"

"کیوں، کیا ہوا؟" میں نے خفت سے کہا اور اِدھر اُدھر دیکھا۔

"ہونا کیا تھا، اکیلا اپنے آپ سے باتیں کرتا آیا ہوں۔ تم نے کچھ سنا؟" شیخ نے اسکوٹر کو لاک کیا۔

"سچ تو یہ ہے کہ میں نے نہیں سنا۔" میں نے اعتراف کیا۔ لیکن اس کی وجہ پریشانی نہیں، میں اپنے خیالات میں گم تھا۔"

"کس کے خیالات میں؟" شیخ نے صرف میرا مورال اَپ رکھنے کے لیے مذاق کیا۔" نام لوں اس کا؟"

"کمال ہے کہ تم نے صحیح اندازہ کیا۔" میں نے کہا۔" نسبت اسی کے نام سے ہے۔ میں رابعہ کی ماں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔"

لاش کو مُردہ خانے میں ڈال دیا گیا تھا۔ پوسٹ مارٹم کوئی ایمرجنسی نہیں ہوتی۔ ہمیں بتایا گیا کہ یہ تو صبح ہی طے ہو گا کہ پوسٹ مارٹم کس وقت کیا جائے گا اور کون ڈاکٹر کرے گا۔ چونکہ شیخ اپنی وردی میں تھا، اس لیے مردہ خانے کے قائم مقام نگراں نے (جو بلحاظ عہدہ بھنگی تھا) ہمیں اندر جانے سے نہیں روکا مگر وہ ہمارے ساتھ رہا۔ اچانک مجھے ایک خیال آیا۔ میں نے بڑے دوستانہ لہجے میں اس سے نام پوچھا، یہ پوچھا کہ اسے کتنی تنخواہ ملتی ہے اور کیا اس مشکل کام کا کوئی خصوصی معاوضہ ملتا ہے؟ ظاہر ہے خصوصی معاوضہ کچھ نہ تھا۔ میں نے افسوس کا اظہار کیا اور پوچھا کہ بچے کتنے ہیں؟ چار بچے، ایک بیوی، ماں باپ، ایک بہن۔ نو افراد کا اس آمدنی میں کیسے گزارا ہوتا ہے؟ میں نے جیب سے سو کا ایک نوٹ نکال کے اسے دیا۔ بظاہر یہ ہمدردی کا انداز صرف مدد کرنے کے لیے تھا مگر وہ جانتا تھا کہ دولت مند بھی بلاوجہ ضرورت مندوں میں سو سو کے نوٹ نہیں بانٹتے پھرتے۔ اس تمام عرصے میں شیخ لاش کا بغور معائنہ کرتا رہا تھا۔

"تمھیں یقین ہے کہ یہی وہ لاش ہے جو تھانے سے لائی گئی تھی؟" میں نے کہا۔

جمعدار نے اقرار میں سر ہلایا۔" آپ کے کوئی عزیز یا جاننے والے تھے کیا؟" سو کا نوٹ جیب میں رکھ لینے کے بعد وہ میری جوابی مدد کے لیے ذہنی طور پر تیار تھا۔ وہاں آنے والے اس کو خصوصی خدمات کا خصوصی نذرانہ دیتے تھے اور وہ سب کے نذرانے ان کے کام کی نوعیت کے اعتبار سے قبول کرتا تھا۔

"یہ ایک بہروپیا تھا۔" میں نے کہا۔ "بے چارہ ضرورت سے مجبور ہو کے چوری کر بیٹھا۔ ہم اسے بچانے کے لیے کچھ کرنا چاہتے ہیں۔"

"بات کچھ پتے نہیں پڑی جی۔ پولیس ایک چور کی مدد کیوں کرنا چاہتی ہے؟" وہ بے رُخی سے بولا۔ شیخ اب معائنے سے فارغ ہو چکا تھا اور ہماری گفتگو سے اندازہ کرنا چاہتا تھا کہ میرے ذہن میں کیا ہے؟

"بات بہت آسان ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ بے چارہ بھیس بدل کے ایک جگہ چوری کرنے پہنچا اور پکڑا گیا۔ گھر والے جاگ اٹھے تھے۔ یہ بھاگا اور کوئی راستہ نہ پا کے چھت پر سے گلی میں کود گیا۔ گھر والوں کی چیخ پکار پر گشتی پولیس آگئی اور گلی میں بھی لوگ نکل آئے مگر یہ غریب بھاگنے کے قابل ہی نہ رہا تھا۔ کسی اندرونی چوٹ سے جہاں گرا تھا، وہیں بیہوش پڑا ہوا تھا۔ پولیس اس کو تھانے لائی تو یہ مر چکا تھا۔ اب ہمیں معلوم ہوا ہے کہ اس نے فاقوں سے مجبور ہو کے پہلی بار یہ حرکت کی تھی۔ سرکس میں سوانگ بھرنے والوں کی اب آمدنی کہاں رہی ہے۔ لوگ فلم دیکھتے ہیں یا ٹی وی۔ اکیلا آدمی تو فاقے بھی برداشت کر لیتا ہے لیکن جس کے بیوی بچے ہوں؟" میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ "انھی کی خاطر تو آدمی سب کچھ کر گزرتا ہے۔"

"یہ تو ہے جی۔" جمعدار مذکور نے اتفاق میں سر ہلایا۔

"جن لوگوں نے اسے گرفتار کیا تھا، وہ اس کو پہچانتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن گرفتاری کے وقت یہ میک اَپ میں تھا۔ اب یہ بے چارہ خود تو مر گیا، تفتیش سے کیا فائدہ۔ اس کے گھر والے ہی پریشان ہوں گے نا۔ لیکن اس کا میک اَپ اتار دیا جائے تو اس کو وہ لوگ بھی نہیں پہچان سکیں گے جنھوں نے اس کو دیکھ لیا تھا۔ میرا مطلب ہے اس گھر کے لوگ جہاں یہ چوری کرنے گیا تھا اور گشتی پولیس۔ پھر اس لاش کو گھر والے لے جائیں گے اور یہ کسی چور کی لاش نہیں، اس غریب آدمی کی لاش ہوگی جو غالباً کسی حادثے کا شکار ہوا تھا۔"

"لیکن جو لوگ لاش لائے تھے۔۔۔" وہ متفکر ہو کے بولا۔

"وہ اسے تلاش کریں گے۔"

"انھیں یہ لاش چاہیے۔ جیسی یہ اب ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر میک اَپ اتار دیا جائے تو وہ اس کو کیسے شناخت کر سکتے ہیں۔ صبح سے پہلے کوئی کارروائی نہیں ہوگی اور تمھاری ڈیوٹی صبح ختم ہو جائے گی۔ بعد میں کیا ہوتا ہے، یہ تمھاری ذمّے داری نہیں۔"

"صرف۔۔۔ سو روپے کی خاطر اتنا بڑا خطرہ۔۔۔" اس نے متذبذب لہجے میں کہا اور لاش کو غور سے دیکھنے لگا۔

میں نے شیخ کو آنکھ ماری اور جیب سے مزید چار نوٹ نکالے۔ "لو بھئی اب تو کوئی عذر نہیں ہونا چاہیے۔ پولیس نے ابھی تک کوئی رپورٹ درج نہیں کی ہے۔"

جمعدار نے پانچ سو کی رقم پر غور کیا، مردہ خانے کے نظام اور طریقِ کار پر غور کیا۔ ان خطرات پر غور کیا جو اس کی ذات کو لاحق ہو سکتے تھے۔ ان امکانات پر غور کیا جو تحفظ کی ضمانت فراہم کرتے تھے اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچا کہ آدمی کو آدمی کی مدد کرنا چاہیے۔ مرنے والے کی نیکی بدی اس کے ساتھ گئی۔ دس منٹ میں اس نے میک اَپ دھو ڈالا اور وِگ اتار کے ہمیں تھما دی۔ میں اور شیخ دم بخود دیکھتے رہے۔ ذرا سی دیر میں جہاں استاد پیڈرو کی لاش پڑی تھی، وہاں اسی قد و قامت کے دوسرے آدمی کی لاش رہ گئی جس کی شکل ذرا بھی پیڈرو سے نہیں ملتی تھی۔ اس کا رنگ پیڈرو کے مقابلے میں بہت صاف تھا۔ مونچھیں ہٹ جانے کے بعد اس کے کلوں کی ہڈیاں اور نمایاں ہو گئیں۔ پیڈرو کے جیسے بالوں کی جگہ استرے سے گھٹا ہوا صاف سر رہ گیا۔ معلوم نہیں صرف وِگ لگانے کے لیے اس نے سر صاف کرا لیا تھا یا وہ اسی ہیڈ اسٹائل کو پسند کرتا تھا۔ لباس کا مسئلہ اب بھی باقی تھا۔ دو نوٹوں نے یہ مسئلہ بھی حل کر دیا۔ جمعدار نے زرداد کے کپڑے اتارے اور اس کی لاش کو اسپتال کی ہی ایک چادر میں لپیٹ دیا۔ وہ مردہ خانے میں کام کرتے کرتے اتنا نڈر اور بے حس ہو چکا تھا کہ نہ اسے مُردوں سے خوف محسوس ہوتا تھا اور نہ ان کے ساتھ کسی زیادتی پر افسوس۔ میں نے سنا تھا کہ مردہ خانوں میں لائی جانے والی لاشوں کے ہاتھوں سے گھڑیاں اور انگوٹھیاں تک اتار لی جاتی ہیں۔

"بس جی ہمارا خیال رکھنا۔" وہ شیخ سے مخاطب ہو کے بولا۔ "ہم غریب آدمی ہیں تھانیدار صاحب!"

"فکر مت کرو۔" میں نے اس کے کندھے پر تھپکی دی۔ "تم نے کوئی غلط کام نہیں کیا۔ بہت سے لوگوں کو پریشانی سے بچایا ہے۔"

"۔۔۔ مثلاً ہم کو۔" شیخ نے باہر آ کے کہا۔ "تمھاری اسکیم کچھ کچھ میری سمجھ میں آگئی تھی۔"

"شیخ صاحب!" میں نے کہا۔ "میں جو اَب تک بچا ہوا ہوں تو اس لیے نہیں کہ مجھے دنیا کے نظامِ قانون کا تحفظ ملتا رہا۔ قانون کی نظر میں تو میں مجرم ہوں لیکن بہت سے جرائم مجھ پر اس لیے ثابت نہیں ہوئے کہ میں نے بے بنیاد ثبوت مٹا دیے اور اپنے خلاف جھوٹ کی شہادت کو ختم کر دیا۔ تم کہہ سکتے ہو مجھے تائیدِ ایزدی اس لیے حاصل ہے کہ میں خود

پر ہوں یا سمجھ لو کہ میں نے ذہانت سے کام لیا۔ جو کچھ میں نے اپنے دفاع کے لیے کیا، اسے جرم نہیں سمجھا سکتا۔ میں نے اینٹ کا جواب پتھر سے دیا اور جنھوں نے میرے لیے گڑھا کھودا، میں نے ان کو گڑھے میں پہلے دھکیل دیا۔ فنا اور بقا کی جنگ میں یہی ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہے گا۔ دنیا اسی پر عمل پیرا ہے کہ محبت اور جنگ میں سب جائز ہے اور ہم بہرحال اسی دنیا میں رہتے ہیں۔ اب تم بات کو اچھی طرح سمجھ لو۔ حوالات میں کوئی زرداد وغیرہ نہیں تھا۔ کسی روزنامچے میں اس کا ذکر نہیں۔ تم سے ملنے کے لیے کوئی خادم حسین آفندی بارایٹ لا نہیں آیا تھا، نہ استاد پیڈرو اس کے سامنے لایا گیا تھا۔ نہ تم نے اس کو سگریٹ پیش کرنے کی اجازت دی تھی۔ چونکہ اس نام کا کوئی وکیل ہے ہی نہیں۔"

"تم اتنے یقین کے ساتھ کیسے کہہ سکتے ہو؟" شیخ نے کہا۔

"میری چھٹی حس کبھی غلط نہیں کہتی۔" میں نے کہا۔ "چاہو تو صبح بار کونسل سے تصدیق کر لینا۔ بیشتر قیدی رہا ہو کے گئے اور جو دور رہ گئے ہیں انھیں وہی معلوم ہے جو ان کے سامنے ہوا۔ یعنی استاد پیڈرو حوالات میں بیٹھے بیٹھے مر گیا۔ کسی نے اس پر تشدد نہیں کیا اور کوئی زہر آلود چیز نہیں دی۔ غالباً اس کا ہارٹ فیل ہوا۔ یہی سب نے سنا بھی تھا۔ پھر تم نے لاش اسپتال بھیج دی ایک کانسٹبل کے ہمراہ۔ تمھاری ذمّے داری ختم۔ اس دکیل میں ہمت ہے تو دوبارہ آ کے دکھائے۔"

"نہ جانے کیوں میں احساسِ جرم کا شکار ہوں۔" شیخ نے کہا۔ "جو کچھ میں نے کیا فیئر پلے نہیں تھا۔"

"یار شیخ! جذبات سے نہیں، عقل سے سوچو۔ کہاں کا فیئر پلے، کیسا فیئر پلے؟" میں نے کہا۔ "فیئر پلے کے چکر میں تم نے اپنی نوکری کو اپنے لیے سزا بنا لیا اور کیا ملا اس سے؟ کیا حشمت خان اور میر محمد جیسے لوگوں نے تمھاری تقلید شروع کر دی؟ یا تمھیں جھک مار کے اس دلدل سے نکلنا پڑا۔ احساسِ جرم پھر کیسا؟ کیا اس شخص نے جو کچھ کیا تھا، وہ جائز تھا؟ جن لوگوں کے لیے وہ ایک غلط کام کرنے پر تیار ہوا، وہ اچھے لوگ تھے؟ تمھیں یا مجھے تو وہ جانتا تک نہ تھا مگر پیسہ لے کر اس نے مجھے پھنسانے کی کوشش کی اور تمھیں باعزت طور پر مستعفی ہونے سے قبل ہی بدنام کر کے معطل کرانے کی سازش میں آلۂ کار بنا۔ پھر یہ بتاؤ کہ کیا اسے تم نے مارا؟ اس کا قاتل تو وہ دھوکے باز بدمعاش تھا جو وکیل بن کے پہنچا تھا۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ ابھی تک تم نے اس واردات کے متعلق روزنامچے میں کوئی اندراج نہیں کیا ہے۔ ورنہ تم کیا کرتے جب معلوم ہوتا کہ خادم حسین آفندی بارایٹ لا کا وجود ہی نہیں؟ قاتل کو کیسے گرفتار کرتے؟ جو آیا تو صرف ایک کام سے تھا کہ کچھ لے دے کر معاملہ ختم کرا دے اور زرداد مطمئن تھا کہ حسبِ وعدہ اسے بحفاظت نکال کر لے جانے والے ایفائے عہد کرنے آگئے ہیں۔ اگر زرداد اس کے ساتھ چلا جاتا تو کیا ہوتا؟ شاید لواحقین کو اس کی لاش بھی نہ ملتی۔ مگر تم نے دشمنوں کے عزائم کو ناکام بنانا چاہا تو وہ جاتے جاتے ایک تیر سے دو شکار کر گیا۔ اس نے زرداد کو بھی ٹھکانے لگایا اور تمھیں بھی سزا دلوانے کا انتظام کر دیا۔ اس کے باوجود تم بات کرتے ہو فیئر پلے کی؟ زندگی کے بارے میں میرا ایک نظریہ ہے جو نہ اخلاقیات کے خلاف ہے نہ ہمارے مذہبی عقائد کے۔ جان لینے کی کوشش کرنے والے کے ساتھ رعایت کیسی؟ ہمارا مذہب یہ نہیں سکھاتا کہ کوئی تمھارے گال پر ایک تھپڑ مارے تو تم دوسرا گال آگے کر دو۔ نہیں۔ ہم آنکھ کے بدلے آنکھ اور جان کے بدلے جان لینے کے مجاز ہیں۔ فرق صرف طریقۂ کار کا ہے۔ تو یہ طریقۂ کار بھی انگریز کے بنائے ہوئے قانون کی وجہ سے مشکلات پیدا کرتا ہے۔ یہ پورا معاشرہ جھوٹ کے پاؤں پر چل رہا ہے۔ تم سچ کا سہارا لے کر دو قدم نہیں چل سکتے۔"

"پھر بھی مجھے خیال آتا ہے کہ مجھے سب سچ لکھ دینا چاہیے تھا اور پھر نتائج کا معاملہ خدا پر چھوڑ دینا چاہیے تھا۔"

"خدا نے یہ تو نہیں کہا ہے کہ جب ضرورت پڑے تو کچھ مت سوچو۔ عقل کو بالائے طاق رکھ دو اور آنکھیں بند کر کے بیٹھ جاؤ۔" میں نے بھنّا کے کہا۔ "کہ جو خدا کو منظور ہوگا، وہی ہوگا۔ حالات تمھارے سامنے ہیں اور تم سب کچھ جانتے ہو۔ تمھیں اچھی طرح معلوم ہے کہ خود تم نے کوئی غلط کام نہیں کیا، کسی کے خلاف زیادتی نہیں کی، قانون کا احترام کرتے رہے اور فرض کو مقدّم جانا۔ کبھی رشوت نہیں لی اور اپنے اختیارات سے تجاوز نہیں کیا۔ آج جو کچھ ہوا، وہ میرے اور تمھارے خلاف ایک مذموم سازش تھی۔ ہم نے عقل سے کام لیا اور بچ گئے۔ خدا جانتا ہے کہ ہم نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ ایک بوجھ تمھارے ضمیر پر یہ ہے کہ مرنے والے کی بیوی کی نظر میں اس کے شوہر کو لے جانے والا ایس آئی اکرام شیخ تھا اور جب اسے علم ہوگا کہ وہ مر گیا ہے تو شاید وہ اکرام شیخ کو ہی قاتل سمجھتی رہے گی۔ اس کے لیے تم اپنی پوزیشن کلیئر کرنا چاہتے ہو۔ میں سمجھتا ہوں یہ تم اچھا کر رہے ہو اور اسی لیے میں تمھارا ساتھ دے رہا ہوں۔"

"اچھا یار!" شیخ نے ایک گہری سانس لی۔ "تم کہتے ہو تو

ٹھیک ہے۔" اس نے کِک مار کے اسکوٹر کو اسٹارٹ کیا۔

"لیکن اب یہ نوکری اپنے بس کی نہیں۔ میں نے اس پر لعنت بھیج دی ہے اور بس اب خیریت کے ساتھ استعفا منظور ہو جائے۔"

"پھر وہی حماقت کی بات۔" میں نے پیچھے بیٹھ کے کہا۔ "تم استعفا واپس لوگے اور نہیں لوگے تو شرط لگا لو کہ منظور نہیں ہوگا۔ تھانہ اگر گندی جگہ ہے تو اسے چھوڑ دو۔ ہیڈ کوارٹر میں رہو۔ وہاں صاف ستھرا کام ہے۔"

"بس، میں یہ نوکری کرنا ہی نہیں چاہتا۔" شیخ نے بگڑ کے کہا۔ "میں محتاج نہیں ہوں، میرے پاس سب کچھ ہے۔"

"یہ سب کچھ تو اس وقت بھی تھا جب تم نے پولیس کا محکمہ جوائن کیا تھا۔" میں نے کہا۔ "کیا وہ جذبہ اتنا کمزور تھا، قانون کے ذریعے خدمتِ خلق کرنے کا؟ وہ محض جذباتی فیصلہ تھا جس نے تمھیں بزنس کرنے، مقابلے کا امتحان دینے یا گھر بیٹھ کر کھانے کے بجائے پولیس کی ملازمت اختیار کرنے پر مجبور کیا تھا؟"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن میں نے یہاں آ کے دیکھ لیا، کسی کو میرے جذبے کی ضرورت نہیں۔"

"غلط۔ بے شک تمھیں ماحول غلط ملا مگر یہ مت کہو کہ تمھارے جذبے کی قدر کرنے والا کوئی نہیں۔" میں نے کہا۔ "ایک تو میں ہوں اور میں اکیلا ہی نہیں، وہ سب ہیں جو میرے ساتھ ہیں اور تمھیں جانتے ہیں۔ تمھارے گھر والے بھی ان میں شامل ہیں۔ انکل رضوی جیسے بھی پولیس میں ہیں۔ ان کی جگہ کون لے گا اگر تم جیسے ہمت ہار کے نکل جائیں گے؟ تمھارا تجربہ ابھی بہت کم ہے۔ آہستہ آہستہ تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ اپنے مشن میں تم اکیلے نہیں، تمھارے محکمے میں بھی تمھارے ساتھ بہت ہیں۔ کیا کہا ہے وہ شاعر نے کہ؏ تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب۔ یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لیے۔ تو مسٹر عقاب! ایک دن تمھیں آئی جی وغیرہ بننا ہے اور اس پورے محکمے سے ہر حشمت خان کو خارج کرنا ہے۔ خود خارج ہو گئے تو یہاں راج کریں گے حشمت خان۔ نقصان ہوگا ملک و قوم کا اور پبلک کا کہ ''گل گئے، گلشن گئے، کدّو کریلے رہ گئے۔''"

شیخ ہنس پڑا۔ "کہاں انجینئرنگ کے پیشے میں گھس گیا تو۔ وکیل ہوتا تو سب کا باجا بجا دیتا۔ تیری دلیل کے آگے کسی کی منطق نہ چلتی۔"

"اور سزا، نہ مدعی کو ملتی، نہ ملزم کو ملتی۔ وکیل صاحب دونوں طرف سے پٹتے۔" میں نے کہا۔

"اس وقت رات کے تین بجے ہیں۔" شیخ نے کہا۔ "مزنگ جا کے کسی کا دروازہ بجانا اور اس آدمی، زرداد کا گھر تلاش کرنا بہت غلط بات ہوگی۔ کسی کو سوتے سے اٹھا کے بُری خبر سنائی جائے تو شاک بہت زیادہ ہوتا ہے۔"

"یہی میں بھی سوچ رہا تھا کہ وہاں صبح ہونے سے پہلے نہیں جانا چاہیے۔" میں نے کہا۔ "ایسا کرتے ہیں کہ تُو جا اپنے تھانے۔ گشت کے لیے نکلا تھا نا، اس لیے رات بھر غائب رہنا اچھا نہیں۔ وہاں تو معمول کے مطابق ڈیوٹی پوری کر۔ کسی قسم کی پریشانی کے بغیر۔ حوالات میں ایک قیدی مر گیا تھا، لاش تُو نے اسپتال کی ایمبولینس میں بھیج دی جو روزنامچے کے اندراجات کے مطابق استاد پیڈرو کی لاش تھی اور اسے شناخت کرنے والے بہت ہیں۔ بظاہر اسے دل کا دورہ پڑا تھا لیکن پوسٹ مارٹم ہوگا تو حقیقت سامنے آ جائے گی۔ اب استاد پیڈرو کی لاش ہی نہ ملی تو پوسٹ مارٹم رپورٹ کیسی؟ اور لاش کہاں گئی؟ یہ تیری ذمے داری نہیں۔ اس سپاہی سے بھی کچھ کہنے کی ضرورت نہیں جو ایمبولینس میں لاش کے ساتھ گیا تھا۔ وہ حلفیہ بیان دے گا کہ لاش اس نے اسپتال والوں کے حوالے کی تھی اور اس کا جو حلیہ بیان کرے گا، وہ بھی اس کے یقین کے مطابق غلط نہیں ہوگا۔ میں جاتا ہوں اپنے گھر۔ صبح جب تو ڈیوٹی ختم کر کے گھر پہنچے گا تو میں بھی آ جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے، ناشتا ہمارے ساتھ کرنا۔" شیخ نے کہا۔ "اس کے بعد ہم زرداد کے گھر چلیں گے۔"

"میرا ارادہ تھا کہ آٹھ بجے اسلام آباد چلا جاؤں۔" میں نے کہا۔ "دو ڈھائی سو روپے کم نہیں تھے مگر میں ایک ہزار احتیاطاً ساتھ لے جانے کے چکّر میں پڑ گیا اور اب مجھے کل دوپہر سے پہلے روانگی مشکل نظر آتی ہے۔ میں تیرے پاس نہ آتا تو اس وقت پنڈی میں ہوتا۔ اچھی سزا ملی ہے احتیاط پسندی کی۔"

"قدرت کا کوئی کام مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔" شیخ نے کہا۔ "یہ احتیاط پسندی میرے تو کام آئی۔ میں اکیلا ہوتا تو نہ جانے کیا ہوتا۔ میرا دماغ کام ہی نہیں کر رہا تھا۔ تو نے میرا اعتماد بحال رکھا۔" اسکوٹر کا رُخ اب میرے گھر کی طرف تھا۔

"محسن کے ساتھ میری ذہنی کیفیت بھی یہی ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔ "ایک اکیلا اور دو گیارہ۔ اور مجھے تو لگتا ہے کہ اب ہم ایک سو گیارہ ہو گئے ہیں۔ یہ سب خدا کی مہربانی ہے کہ جتنے دشمنوں کے حوصلے بلند ہوتے جا رہے ہیں اور ان کے عزائم پہلے سے زیادہ خطرناک ہونے لگے ہیں، اتنے ہی میرے دوست اور مددگار بڑھتے جا رہے ہیں۔ جب میں لندن سے آیا تھا تو میرے ساتھ صرف محسن تھا۔ یہاں پہنچا تو بالکل اکیلا تھا۔ ایک باپ تھا، وہ بھی نہیں ملا۔ مگر اس دن کے بعد سے آج تک کیا ہوا؟ شکاری جال پر جال پھیلاتے گئے اور میں بچ کر نکلتا گیا۔ یہاں تک کہ مجھ میں اتنا حوصلہ اور اعتماد آ گیا کہ میں خود شکاری بن گیا اور میں گزرے ہوئے وقت کو دیکھتا ہوں تو مجھے اپنی کامیابیوں پر فخر کیا، مغرور محسوس ہوتا ہے۔ لیکن میں غرور سے توبہ کرتا ہوں۔ یہ سب تائیدِ ایزدی ہے کہ آج دشمن مجھ سے اتنے ہی خوفزدہ ہیں جتنا کل میں ان سے تھا۔ آج بھی میرے ساتھ صرف محسن ہی نہیں، رابعہ ہے اور شہلا ہے اور منظر ہے۔ تُو ہے اور تیرے گھر والے ہیں۔ استاد ٹیڈی ہے۔ یہ سب لوگ اجنبی تھے۔ جب میں نے پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھا تھا تو ان میں سے کسی کو نہ جانتا تھا۔ رابعہ اور منظر بچپن کے ساتھی ضرور ہیں لیکن ہمیں ایک دوسرے کے بارے میں یہ بھی علم نہ تھا کہ کون زندہ ہے اور کون مر گیا ہے۔ میں انکل رضوی اور شیروانی صاحب سے ضرور واقف تھا مگر اس کے بعد مجھے کتنے سہارے ملے؟ کتنے قابلِ اعتماد اور کتنے حوصلہ دینے والے اور بے غرض، کتنے مخلص دوست ملے؟ کتنے سچ بولنے والے ملے اور کتنے بدخواہ کیفرِ کردار کو پہنچے؟ کتنے دشمن کم ہوئے؟ کم سے کم تین افراد کا نام میں پورے وثوق کے ساتھ لے سکتا ہوں کہ میرا وجود ان کی نظر میں کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا اور وہ اس کانٹے کو نکال پھینکنا چاہتے تھے مگر کسی کے چاہنے سے کچھ ہوتا تو سب کے دشمن مر گئے ہوتے اور دنیا روزِ اوّل کی طرح غیر آباد ہوتی۔ یا اس میں صرف جانور ہوتے کیونکہ آدمی کا دشمن تو صرف آدمی ہی رہا ہے۔ چراغ دین — ڈی سلوا اور میر محمد نے کیا چاہا تھا اور خود ان کے ساتھ کیا ہوا ہے؟"

اسکوٹر نہر کے پُل سے مُڑا تو میں نے موقع پاتے ہی زرداد کے کپڑے اور اس کی وگ کا بنڈل پانی میں پھینک دیا پھر رات کے تین بجنے کی اطلاع کسی گھر کے وال کلاک نے بہت دور سے دی۔ اور شیخ نے اسکوٹر روک کر مجھے گھر کے دروازے پر اُتارا۔ میں اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک کہ اس کی سرخ ٹیل لائٹ نظر آتی رہی۔ پھر میں نے گیٹ کو اندر ہاتھ ڈال کے کھولنا چاہا مگر اس کے پٹ خود بخود پیچھے ہو گئے۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ میں گیٹ کو اندر سے مقفل کر کے اوپر سے باہر کود گیا تھا لیکن اب وہ تالا ہی غائب تھا۔ بے اختیار میں پیچھے ہٹا اور دیوار کے سائے میں چلتا ہوا گیٹ سے دور ہوتا گیا۔ میں نے احتیاطاً وہ بھرا ہوا ریوالور بھی نکال لیا تھا جو میں نے جاتے ہوئے اپنے ساتھ رکھ لیا تھا۔

آخری کونے پر جہاں ساتھ والی کوٹھی کا گیٹ تھا، میں نے دیوار کے اوپر سے جھانک کر دیکھا۔ بظاہر اندر کسی قسم کی گڑبڑ نظر نہیں آتی تھی۔ سب کھڑکیاں اور دروازے بند تھے اور کمروں میں مکمل اندھیرا غالب تھا۔

"سکندر صاب!" کسی نے دبی دبی سرگوشی میں مجھے پکارا اور میں نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کے دیکھنے کی کوشش کی۔ پھر وہ درختوں کے پیچھے سے نکلا اور دیوار کے ساتھ ساتھ لگی ہوئی سرسبز باڑھ کے پیچھے رہ کر سرکتا ہوا آگے بڑھا۔ دیوار اور باڑھ کے درمیان جگہ نہ ہونے کے برابر تھی چنانچہ اس کی پشت یقیناً دیوار سے چھل گئی ہوگی اور سامنے سے کٹی ہوئی شاخوں کے نوکیلے کناروں سے اس کے جسم پر خراشیں آئی ہوں گی۔ اس کی حرکت سے خاصی سرسراہٹ بھی پیدا ہو رہی تھی۔ چنانچہ وہ بہت آہستہ آہستہ میری طرف بڑھ رہا تھا۔ میں دیوار پر سے اندر اتر گیا کیونکہ میں نے استاد ٹیڈی کو پہچان لیا تھا۔ میں دو دیواروں کے سنگم پر کونے میں دبکا کھڑا رہا اور استاد ٹیڈی کے پُراسرار رویّے کے اسباب پر غور کرتا رہا۔ اس نے ضرور کوئی ایسی بات نوٹ کی تھی کہ وہ چھپا کھڑا تھا اور نگرانی کے علاوہ اس کا مقصد مجھے کسی خطرے سے بروقت خبردار کرنا تھا۔

"کیا بات ہے استاد؟" میں نے ٹیڈی کے قریب آتے ہی آہستہ سے پوچھا۔

"آپ نے اچھا کیا، سیدھے اندر نہیں گئے۔" وہ منہ پر انگلی رکھ کے بولا۔ "میں نے اسی لیے تالا کھول لیا تھا۔"

"تالا تم نے کھولا تھا؟" میں نے تعجب سے کہا۔ "کیسے؟"

"قسم مولا کی سکندر صاب! ایسے ہی تو ہم استاد نہیں ہو گئے۔" وہ بولا۔ "بس آپ کی دعا سے جب تک ضرورت نہ پڑے ہاتھ کی صفائی نہیں دکھاتے۔ یہ تو سیدھا سادا تالا تھا علی گڑھ والا۔ کبھی کوئی تجوری کھولنی ہو تو بتانا۔"

"تم نے بڑی عقلمندی کا ثبوت دیا اس وقت۔" میں نے کہا۔ "میں واقعی تالے کو غائب پا کے کھٹک گیا تھا۔"

"میں دروازے کے پاس انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ وہ مجھے صاف دیکھ لیتے۔" ٹیڈی نے کہا۔ اس کی نظر بے اختیار گھر کی طرف گئی۔

"وہ کون؟" میں نے کہا۔ "اندر کوئی ہے کیا؟"

ٹیڈی نے اقرار میں سر ہلایا۔ "میرا خیال ہے کم سے کم تین آدمی ہیں۔" ٹیڈی بولا۔ "ایک ایک کر کے آئے تھے۔ میں نے دیکھ لیا ہے کہ پیچھے ایک کھڑکی کا شیشہ غائب ہے۔ اندھیرے میں پتا نہیں چلتا۔ اندر سے پردے بھی برابر ہیں لیکن وہی

ایک کھڑکی کھلی ہوئی ہے۔ تینوں اسی راستے سے اندر گئے ہوں گے۔"

"تم نے کسی کو پہچانا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں جی، وہ بہت دور تھے۔" ٹیڈی نے کہا۔ "اس اندھیرے میں تو آپ نے آواز سن کے ہی مجھے پہچانا ہو گا۔"

"مجھے ڈر تھا اسی بات کا۔" میں نے کہا۔ "اور میں گھر سے تو نکل گیا تھا کہ آج رات یہاں نہیں رہوں گا، اسلام آباد چلا جاؤں گا لیکن واپس آنا پڑ گیا۔ اب کیا ہم صبح تک اسی جگہ چھپے کھڑے رہیں گے؟"

"اگر کچھ کرنا ہے اپنے سکندر صاحب! تو بس یہی وقت ہے۔" ٹیڈی مونچھوں پر تاؤ دے کر بولا۔ "اندھیرے میں ہم بھی اندر جا سکتے ہیں اور ان کو دلوچ سکتے ہیں۔ ورنہ ان کا کیا ہے، وہ صبح ہونے کے بعد بھی اندر بیٹھے رہیں۔"

"ہاں۔ اندر ان کے لیے خطرے کی کوئی بات نہیں۔" میں نے تسلیم کیا۔ "وہ اچھی طرح جانتے ہوں گے کہ سوائے میرے فی الحال کسی کے گھر آنے کا کوئی امکان نہیں اور میں کب تک نہیں آؤں گا؟ وہ انتظار کر سکتے ہیں۔ اندر ان کی ضرورت کا ہر سامان ہے۔ کھانے پینے کا اور آرام کرنے کا۔ جلدی کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"لیکن ہم تو صبح کی روشنی پھیلتے ہی صاف نظر آجائیں گے۔" ٹیڈی نے مضطرب لہجے میں کہا۔ "کیوں آئے ہیں یہ لوگ جی؟"

"استاد بھولے!" میں نے کہا۔ "چور ہوتے تو مایوس ہو کر لوٹ چکے ہوتے۔ اب تک جو بیٹھے ہیں، صرف سکندر بخت کے منتظر ہیں۔"

"پھر بتائیں آپ! اندر جا کے بھرتہ بنا دوں ان کا؟ قسم مولا کی... گاجر مولی ہیں سُسرے۔" اس نے ڈب سے خنجر نکال لیا۔

"بس بس، اتنا غصہ ٹھیک نہیں۔ چالاک دشمن کا مقابلہ طاقت سے نہیں کیا جا سکتا۔ ہماری صحبت میں رہ کے ابھی تک تم نے اتنا بھی نہیں سمجھا۔" میں نے کہا۔ "یہ خنجر رکھ لو۔ جہاں تک میرا خیال ہے یہ لوگ تمھیں نہیں پہچانتے ہوں گے۔ لیکن میرا خیال غلط بھی ہو سکتا ہے استاد!"

"آپ بولیں جی، کرنا کیا ہے؟" ٹیڈی کے جذبۂ شجاعت میں خنجر رکھ لینے کے باوجود کمی نہیں آئی تھی۔

"تم یہ کرو کہ اطمینان سے ہوشیار! خبردار! کی صدا لگاتے اندر جاؤ۔" میں نے کہا۔ "یوں جیسے تم اس علاقے کے چوکیدار ہو۔ اندر وہ یقیناً پریشان اور حیران ہوں گے کہ چوکیدار اندر کیوں آیا۔ لیکن سمجھیں گے یہی کہ ایس پی کا گھر ہے، وہ جاتے وقت چوکیدار کو بطورِ خاص گھر کا خیال رکھنے کا کہہ گئے ہوں گے۔ چوکیدار اب دوسرے گھروں کا خیال رکھے نہ رکھے، اس گھر کی طرف سے غافل نہیں ہو گا۔ تم سامنے سے شروع کرو۔ ہر دروازے کو ٹھوک بجا کے اور ہلا جلا کے دیکھو۔ جیسے جیسے تم اس کھڑکی کی طرف بڑھو گے ان کی تشویش میں اضافہ ہو گا۔ وہ اندر سے کنڈی لگائیں گے اور انتظار کریں گے کہ تم چیکنگ سے مطمئن ہو کے دفع ہو جاؤ اور تم بالکل یہی کرنا یعنی اگلی کھڑکی یا دروازہ دیکھ کے اسی طرح صدا دیتے نکل جانا۔ اس وقت تک میں کھڑکی کے عین نیچے پہنچ جاؤں گا۔ مجھے امید ہے کہ تمھارے جاتے ہی کوئی کھڑکی پھر کھولے گا اور اپنے اطمینان کے لیے سر نکال کر دیکھے گا۔ اس کے بعد میں سنبھال لوں گا۔"

"میں بھی چکر لگا کے پھر پیچھے پہنچ جاؤں گا۔" ٹیڈی نے میری اسکیم سے اتفاق کیا۔ "قسم مولا کی دونوں مل کر ان کا بھرتہ بنا دیں گے۔ ان کی تو..." اس نے کہا اور دیوار پر سے باہر کود گیا۔

صورتِ حال کی سنگینی کے باوجود مجھے ہنسی آئی۔ استاد ٹیڈی کے لیے شاید یہ عملی آزمائش کا پہلا موقع ہو گا۔ اب تک تو اس نے مولا کی قسمیں کھانے اور ساری دنیا کا بھرتہ بنا دینے کے زبانی عزائم کا اظہار کرنے کے سوا کچھ نہیں کیا تھا۔

چند منٹ بعد میں نے استاد ٹیڈی کی دبنگ آواز سنی جو اونچا بولنے کی وجہ سے پتلی اور کسی حد تک مضحکہ خیز ہو گئی تھی۔ وہ بڑے سُر میں صدا لگا رہا تھا اور یوں لگتا تھا کہ 'جاگتے رہو، ہوشیار رہو اور خبردار رہو' کے بول گا رہا ہے۔ اصل چوکیدار کی آواز میں جو کرختگی اور کراراپن ہوتا ہے اور جو ہر رات صدا لگانے کی مشق سے آتا ہے، وہ ٹیڈی کی آواز میں مفقود تھا لیکن اس فرق کو صرف میں ہی محسوس کر رہا تھا۔ دوبارہ وہ اپنی سُریلی آواز میں چلا کے کھنکارا اور کوٹھی کے اندر داخل ہوا۔ اس نے پورے اطمینان کے ساتھ سامنے کے دروازے ہلا کے بلکہ جھنجوڑ کر دیکھے۔ جب وہ پیچھے کی طرف بڑھا تو میں جھاڑیوں سے تیر کی طرح نکلا۔ مجھے یقین تھا کہ اب جو لوگ اندر ہوں گے، غیر شعوری طور پر اسی کھڑکی کی طرف لپکے ہوں گے جس میں سے وہ اندر گئے تھے چنانچہ وہ مجھے نہیں دیکھ سکیں گے۔ ٹیڈی دائیں طرف سے گھوم کر گیا تھا، میں بائیں طرف سے گیا۔ موڑ کاٹتے ہی میں اتنا نیچے جھک گیا کہ مجھے چاروں ہاتھوں پیروں پر آہٹ کیے بغیر کسی جانور کی طرح دوڑنا پڑا۔ میں نے ٹیڈی کو سامنے سے آتے دیکھا اور اس سے چند سیکنڈ قبل ٹوٹے ہوئے شیشے والی کھڑکی کے نیچے پہنچ گیا۔ میرے کانوں نے واضح طور پر اندر سے چٹخنی

کے چڑھائے جانے کی ہلکی سی آواز سنی۔ میں دیوار سے چپکا ہوا، سانس روکے، چوکھٹ کے عین نیچے اس چیتے کی طرح بیٹھا رہا جو شکار پر جست لگانے کے لیے تیار ہو۔ ٹیڈی نے اس کھڑکی کو بھی تھوڑا سا ہلایا اور اگلی کھڑکی پر چلا گیا۔ اس کے بعد ایک دروازہ تھا۔ پھر آخری کھڑکی اور تقریباً موڑ کے پاس اسٹور کا دروازہ۔ ٹیڈی نے صدا لگائی اور گھوم گیا۔ اب میں بالکل تیار تھا کیونکہ ٹیڈی دوسری طرف کے کھڑکی دروازے چیک کر رہا تھا، جدھر سے میں آیا تھا اور اب کسی بھی لمحے کوئی کھڑکی کھول کے جھانک سکتا تھا۔

اچانک میرے کانوں نے چٹخنی کھولے جانے کی ہلکی سی آواز سنی۔ میں چوکنا ہو گیا تھا۔ سر اٹھا کے دیکھنے پر مجھے ایک سایہ سا دکھائی دیا جو کھڑکی کے چوکھٹے سے باہر نکلا ہوا تھا۔ "چلا گیا۔" کسی نے سرگوشی میں کہا۔

میں بجلی کی طرح اٹھا اور میرے ہاتھوں نے حلقہ بنا کے باہر جھانکنے والے کی گردن کو شکنجے کی طرح کس لیا۔ پھر میں نے آگے کی طرف جھٹکا دیا اور وہ کھڑکی سے سیدھا باہر آیا۔ یہ حملہ اتنا غیر متوقع تھا کہ وہ اپنے دفاع میں کچھ نہ کر سکا۔ اس کے حلق سے 'اوق' کی آواز نکلی۔ میں نے دھوبی پٹخے کے انداز میں اس کو کندھے پر سے گزار کے زمین پر دے مارا لیکن وہ بلا کا پھرتیلا آدمی تھا کہ گرتے ہی اس نے قلابازی کھائی اور پلک جھپکتے میں اٹھ کر میرے مقابل آگیا۔ مجھے معلوم تھا، وہ اکیلا نہیں ہے۔ اس نے چوکیدار کے چلے جانے کے بعد کسی سے بات کی تھی اور خود ٹیڈی کا اندازہ بھی یہی تھا کہ اندر دو یا تین آدمی موجود ہیں۔ چنانچہ میں دوسروں کی طرف سے بھی غافل نہ تھا۔ میں نے تھوڑا سا پیچھے ہٹ کر اپنے حریف کو سامنے آنے کی دعوت دی۔ میرا مقصد تو کھڑکی سے دور ہونا تھا تاکہ پیچھے سے کوئی مجھے دلوچ نہ لے۔ اس نے اپنے بھاری بھرکم وجود پر انحصار کرتے ہوئے خود کو مجھ پر پھینک دیا اور سخت اناڑی پن کا ثبوت دیا۔ میں اچھل کر ایک طرف ہو گیا اور وہ اپنے ہی زور میں منہ کے بل گرا۔ اگر وہ مجھ سے ٹکرا جاتا تو یقیناً دیوار سے تصادم میں میرا جسم پتے کی طرح چپٹا ہو جاتا۔ خود اسے امید ہو گی کہ میں جوابی حملے کے لیے تیار نہ ملوں گا۔ کیونکہ وہ کسی دبا کے چھوڑ دیے جانے والے اسپرنگ کی طرح میری طرف آیا تھا۔ دوسری بار منہ کے بل گرنے سے اس کی ہڈی پسلی ایک ہو جانا چاہیے تھی مگر وہ اتنی ہی مستعدی سے پھر اٹھ کھڑا ہوا اور اٹھتے اٹھتے اس نے میرے گھٹنے پر ہاتھ مارا۔

ایک لمحے کے لیے تو مجھے یوں لگا جیسے گھٹنے کے اوپر کی گول اور نرم ہڈی ہی ٹوٹ گئی ہے۔ درد کی لہر سے میری آنکھوں کے سامنے اندھیرے میں جگنو سے جھلملانے لگے اور میرے وجود کی عمارت کو سہارا دینے والا ایک ستون ہلنے لگا۔ میں نے دوسری لات گھما کے اس کے پیٹ پر ماری۔ وہ ضرب کی شدت سے بے اختیار دُہرا ہوا اور میں نے اسی پیر کو اٹھا کے گھٹنا مارا جو اس کی ٹھوڑی کے نیچے لگا۔ وہ پیچھے الٹ گیا۔ اسی وقت میں نے ٹیڈی کو دوڑ کر آتے دیکھا۔ وہ یوں چھرا لہراتا ہوا آ رہا تھا جیسے اس کے ہاتھ میں شمشیرِ بے نیام ہے اور وہ کسی لشکر کی کمان کر رہا ہے جو غنیم کو تہِ تیغ کرنے کے لیے جوش سے نعرے لگاتا، گھوڑے دوڑاتا میدانِ کارزار کی جانب بڑھ رہا ہو۔

"قسم مولا کی۔ آج کوئی سالا بچ کر نہیں جا سکتا۔" اس نے قریب آ کے ببانگِ دُہل کہا لیکن دشمن کے اس مورچے یا کمین گاہ کو بھول گیا جس کے سامنے ابھی تک میری صرف ایک حریف سے دست بدست جنگ چل رہی تھی۔ کھڑکی میں سے ہاتھ نکال کے کسی نے اس کے سر پر ٹن سے کوئی چیز ماری۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ پیتل کی ایک منقش تھالی تھی جو دیوار پر ڈیکوریشن پیس کے طور پر استعمال ہو رہی تھی۔ استاد ٹیڈی کے حلق سے عجیب سی آواز نکلی اور تھالی کی میوزیکل گونج کے ساتھ ہی وہ بھد سے نیچے گرا اور بالکل ساکت ہو گیا۔ مجھے بے ساختہ میاں خوجی اور ان کی وہ شہرہ آفاق قرولی یاد آئی جو وقتِ ضرورت اسی طرح ان کے بلند بانگ دعوؤں کو باطل کر دیتی تھی۔ استاد ٹیڈی کا خنجر بھی کام نہ آیا تھا اور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کے دور جا پڑا تھا۔ میں فوراً اس کی طرف جھپٹا۔

اسی وقت کھڑکی سے آنے والی سرچ لائٹ جیسی تیز اندھا کر دینے والی روشنی میرے منہ پر پڑی۔

"بس۔" کسی نے بھاری بیٹھی ہوئی آواز میں کہا۔ "میرے ہاتھ میں ریوالور ہے۔ ہاتھ اوپر اٹھا کے کھڑے ہو جاؤ۔ بالکل سیدھے۔"

میں نے تعمیل کی اور خنجر کا خیال چھوڑ کے اپنی جگہ پر ساکت ہو گیا۔ وہ شخص جو میرے مقابلے پر اترا تھا۔ بلکہ جسے خود میں نے مقابلے پر گھسیٹ لیا تھا۔ اب احمقوں کی طرح آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا اور اپنا سر سہلا رہا تھا۔ ٹارچ کی روشنی اس کے چہرے پر پڑی تو میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ وہ میرے لیے اجنبی تھا اور کسی سانڈ کی طرح مضبوط جسم کا مالک تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اتنے مقابلے کے بعد چت ہو جاتا لیکن وہ سخت جان بھی تھا اور کچھ لڑنے بھڑنے کا ماہر بھی۔

کھڑکی میں سے دوسرا شخص آہستہ آہستہ باہر آیا۔ اس نے ٹارچ ایک ہاتھ کی گرفت میں رکھی اور ریوالور کو دائیں ہاتھ میں پکڑے ہوئے ایک ٹانگ نیچے لٹکائی "کون ہو تم ٹارزن کی اولاد؟" وہ بولا۔

پھر ایک غیر متوقع اور کسی حد تک مضحکہ خیز بات ہوئی۔ استاد ٹیڈی تڑپ کر اٹھا اور اس نے اندر سے اترنے والے کو ٹانگ پکڑ کے پوری قوت سے گھسیٹ لیا۔ وہ بڑے عجیب طریقے سے باہر گرا۔ خود بخود اس کے ہاتھ سے ٹارچ چھوٹ گئی اور چند فٹ دور جا گری۔ اس کی روشنی دیوار پر ایک دائرے کی شکل میں پڑنے لگی۔

"قسم مولا کی۔۔۔ میں نے کہا تھا نا کہ کوئی۔۔۔" استاد ٹیڈی کی آواز آئی۔

ابھی مجھے استاد ٹیڈی کی حاضر دماغی، پھرتی اور اداکاری پر حیران ہونے کا موقع بھی نہیں ملا تھا کہ حریفِ اوّل نے ایک دم پیچھے سے آ کے اس کے سر پر وہی ٹارچ دے ماری جو اس کے قریب گری تھی۔ استاد ٹیڈی نے جملہ نامکمل چھوڑ کے حلق سے پھر وہی "اوق" کی آواز نکالی اور اس بار سچ مچ انٹا غفیل ہو گیا۔ حریفِ ثانی جس کو اس نے کھڑکی سے برآمد کیا تھا، مجھ پر حملہ آور ہوا۔ میں اس سے نمٹنے کے لیے تیار تھا۔۔۔ اس نے ریوالور کا دستہ میرے سر پر مارنا چاہا تو میں نے اس کے ہاتھ کو کلائی پر جھٹکا دیا۔ ریوالور تو اس کے ہاتھ سے نکل گیا مگر اس نے بڑی پھرتی سے میرے کان کے قریب بائیں ہتھیلی سے وار کیا۔ جس طرح اسے امید نہ تھی کہ میں جوڈو کراٹے کے فن سے واقف ہوں، اسی طرح میں بھی سمجھ رہا تھا کہ وہ لڑائی مار کٹائی کے مروجہ دیسی طریقوں سے کام لے گا لیکن وہ بھی اس معاملے میں مجھ سے کم نہ تھا۔ اچانک وہ پورا منظر میری نظروں کے سامنے گردش کرنے لگا، دھندلا ہوا اور پھر غائب ہو گیا۔ میرا خیال ہے نیچے گرنے سے پہلے ہی میں ہوش و حواس سے بیگانہ ہو چکا تھا۔

ہوش آنے کے بعد میں نے گرد و پیش پر نگاہ ڈالی تو ماحول کچھ جانا پہچانا محسوس ہوا۔ رفتہ رفتہ دھند چھٹنے لگی اور میں نے انکل رضوی کے بیڈ روم کو پہچان لیا۔ میں اپنے ہی گھر میں رضوی صاحب کے بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔ گردن گھما کے دیکھنے پر مجھے اپنے ساتھ ہی استاد ٹیڈی لیٹا ہوا نظر آیا۔ میرے ہاتھ پیر آزاد تھے۔ یہ جان کے مجھے حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ پھر میں نے ان دونوں کو دیکھا جو ہاتھ میں ریوالور لیے اطمینان سے کرسی پر بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے۔

"تم۔۔۔ تم لوگ کیا چاہتے ہو؟" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"کون ہو تم لوگ؟"

"یہی سوال ہمیں تم سے کرنا ہے۔" حریفِ اوّل نے کسی قسم کی پریشانی کے بغیر کہا۔ "اور جواب تم پہلے دو گے۔"

"میں سکندر بخت ہوں!" میں نے حیرانی سے کہا۔ "اسی گھر میں رہتا ہوں! کیا تمھیں معلوم نہیں؟"

"نہیں، ہمیں معلوم نہیں تھا۔" وہ بولا۔ "اور یہ کارٹون؟" اس نے استاد ٹیڈی کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ میرا دوست ہے۔ مجھ سے ملنے آیا تھا۔" میں نے احتجاجی لہجے میں کہا۔

"تو یہ چوکیدار بننے کی ایکٹنگ کیوں کر رہا تھا؟" وہ بولا۔ "کیا تمھارے دوست اسی طرح آتے ہیں ملاقات کرنے اور ایسے ہی جوکر ہیں سب؟" اس کے انداز میں بڑا اہانت آمیز تمسخر تھا۔

"یہ سب پوچھنے والے تم کون ہوتے ہو؟" میں نے متانت سے کہا۔ "اور تم یہاں کیا کر رہے تھے؟ کیا تمھیں معلوم ہے کہ یہ گھر کس کا ہے؟" ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، مسکرائے اور ریوالور جیب میں رکھ لیے۔

"ہاں، اور ہمیں بھی انھوں نے ہی بھیجا تھا۔" دوسرے نے پہلی بار لب کھولے۔ "ضامن رضوی صاحب نے۔"

میں نے احمقوں کی طرح ان دونوں کو دیکھا۔ "رضوی صاحب نے؟ وہ کیوں؟"

اس نے جیب سے اپنا شناختی کارڈ نکالا اور میری طرف پھینک دیا۔ میں نے تصویر کو اس کی صورت سے ملایا اور کارڈ پر غور کرنے کے بعد انکشاف ہوا کہ وہ خفیہ پولیس کا ایک انسپکٹر ہے۔

"اگر میں مان لوں کہ شناختی کارڈ جعلی نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔ "تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انکل رضوی نے تم کو یہاں چوروں کی طرح چھپ کر بیٹھنے کے لیے کیوں بھیجا تھا اور کیا انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ سکندر بخت کی مرمت کرنی ہے؟"

"وہ آپ نے خود ہمیں دعوت دی تھی۔" وہ بولا۔ "اور ہم آپ کو پہچانتے نہیں تھے۔ رضوی صاحب آج دن بھر آپ کو فون کرتے رہے مگر آپ نہیں ملے۔ رات گیارہ بجے انھوں نے ہم سے رابطہ قائم کیا۔ وہ آپ کی طرف سے متفکر تھے۔ انھوں نے کہا کہ خاموشی سے جاؤ اور دیکھو، سکندر بخت گھر میں ہے یا نہیں۔ یہاں آنے کے بعد ہم نے آپ کو سارے گھر میں تلاش کر کے دیکھ لیا اور رضوی صاحب کو فون پر بتا دیا کہ گھر پر تو سب خیریت ہے۔ دراصل انھوں نے کہا تھا کہ گھر میں کوئی غیر معمولی بات محسوس ہو تو۔۔۔"

"ان کا مطلب ہو گا کہ میری لاش پڑی ملے یا توڑ پھوڑ، مار پیٹ یا خون خرابے کے آثار ملیں۔" میں نے کہا۔

"جی۔ ان کا مطلب ہم نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔" وہ بولا۔ "ہم جانے ہی والے تھے کہ ہمیں ایک شخص باہر بڑے مشکوک انداز میں داخل ہو کے چھپتا نظر آیا۔ پھر ہمیں رکنا پڑا۔ ہم نے سوچا ممکن ہے اس کے دوسرے ساتھی بھی آئیں۔ اس کی نقل و حرکت پر تو ہمیں نگاہ رکھنی ہی تھی۔ ہم اندر کمرے میں اندھیرا کیے بیٹھے تھے اور شیشے میں سے جھانک رہے تھے۔ باہر نسبتاً زیادہ روشنی تھی۔ وہ شخص جھاڑیوں کے پیچھے چھپا رہا۔ پھر اس کا ایک ساتھی دروازے تک آ کے لوٹ گیا۔ دوبارہ ہم نے اسے دیوار کے کونے سے اندر کودتے دیکھا۔ وہ شخص جھاڑیوں کے پیچھے سرکتا ہوا اس کے پاس گیا اور کچھ دیر وہ دونوں نجانے کیا باتیں کرتے رہے۔ پھر وہ باہر نکل گیا۔"

"وہ شخص۔" میں نے اسی متانت سے استاد ٹیڈی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "یہ ہے۔ اور دیوار پر سے کودنے والا میں خود تھا۔"

استاد ٹیڈی کی مونچھیں تھرتھرانے لگی تھیں اور حلق سے کچھ کراہنے کی آواز بھی بلند ہو رہی تھی۔

"یہ سب غلط فہمی کے باعث ہوا۔" میں نے کہا۔ "ہمیں معلوم ہو گیا تھا کہ اندر کوئی ہے۔ ہم باہر چھپ کر انتظار کرتے رہے۔ پھر میں نے ہی استاد ٹیڈی۔۔۔ میرا مطلب ہے اپنے اس دوست کو چوکیدار بنا کے بھیجا تھا۔"

"رضوی صاحب نے کہا تھا کہ آپ ڈرامے کرتے رہتے ہیں۔" دوسرا بولا۔ "مگر یہ تو کوئی ڈراما نہیں تھا کہ آپ نے اٹھا کے مجھے باہر پھینک دیا۔ خواہ مخواہ، میں یا آپ لنگڑے لولے ہو جاتے پھر؟ یا ایس آئی صاحب گولی مار دیتے۔"

ایس آئی نے اپنے ماتحت کو گھورا۔ "میرا خیال تھا کہ تم مقابلہ کر سکتے تھے۔ اتنی جان صرف حرام کھانے کے لیے بنائی ہے؟"

"اچھا اب آپ لوگ بیٹھیں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "خوشی کی بات یہ ہے کہ کسی کا نقصان نہیں ہوا۔ میں چائے بنا کے لاتا ہوں۔ میرا یار ہوش میں آنے لگا ہے۔ اسے بھی سمجھا دینا کہ سب خیریت ہے۔" لیکن وہ دونوں میرے ساتھ ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔

"آپ چائے پئیں، ہم چلتے ہیں۔" پہلے نے جماہی لے کر کہا۔ "خواہ مخواہ رات بھر کی بیگار میں پکڑے گئے تھے۔ اب گھر چل کے سوتے ہیں۔ آپ رضوی صاحب سے بات کر لیں۔"

"لیکن۔۔۔ یہ سب نہ کہیں۔۔۔ تو بڑی مہربانی۔" حوالدار نے سر پر ہاتھ پھیر کے کہا۔ "جو بھی ہوا غلط فہمی کے باعث ہوا۔"

میں ہنسا۔ "فکر مت کرو۔ ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں ہوتی رہتی ہیں۔ ان سے تو ہم بڑی بڑی باتیں نہیں کہتے۔"

جب میں چائے بنا کے لوٹا تو استاد ٹیڈی کے ہوش و حواس میں سے ہوش بحال ہو چکے تھے۔ میں نے اسے چائے پلانے کے بعد ساری رام کہانی سنائی تو مجھے بے اختیار ہنسی آئی۔ خصوصاً اس منظر کا ذکر کرتے وقت جب ٹیڈی سر پر تھالی بجتے ہی بیک گراؤنڈ میوزک کے ساتھ لیٹ گیا تھا۔ "اداکاری خوب کی تھی تم نے استاد!" میں نے کہا۔

"ایسا غچّہ دیا تھا گدھوں کو۔" وہ خفت سے بولا۔ "اچھا ہوا دشمن نہیں تھے ورنہ کشتوں کے پشتے لگ جاتے۔"

میں اس کی حوصلہ شکنی نہیں چاہتا تھا لیکن چائے پیتے پیتے مجھے وہ منظر یاد آیا جب وہ خنجر کو تیغِ آبدار کی طرح لہراتا آ رہا تھا۔ تو مجھے پھر ہنسی آئی۔ "غلط فہمی نے بھی کیا تماشا دکھا دیا۔" میں نے اسے مزید خفت سے بچانے کے لیے کہا۔ میں نے اسے اس رات کے دوران میں پیش آنے والے واقعات کے متعلق کچھ بھی نہیں بتایا تھا اور ابھی تک اسی تذبذب کا شکار تھا کہ جو بات ابھی تک میرے اور شیخ کے سوا کسی کو معلوم نہیں، کیا وہ ٹیڈی کو بتانے سے مجھے کوئی فائدہ ہو سکتا ہے۔ مجھے اسلام آباد جا کے یہ سب کچھ رالعہ کو اور محسن کو تو بتانا ہی تھا۔ استاد ٹیڈی کام کا آدمی تھا۔ اس نے ایک ہنگامی صورت حال میں میری مدد کی تھی اور ایسے گواہ فراہم کر دیے تھے جو ثابت کر سکتے تھے کہ عبدل اور شیدے کے قتل کی واردات کے وقت میں ان کے ساتھ تھا۔ یہ ضرورت مجھے پھر پیش آ سکتی تھی۔ گزشتہ رات کا بندوبست تو عبدالودود منظر نے کر دیا تھا۔ اس کا یہی احسان بہت تھا۔ آج کی رات میں کہاں رہا اور کیا کرتا رہا؟ اس کے گواہ بھی ہونے چاہئیں۔ ظاہر ہے سچ بولنے کی گنجائش نہ میرے لیے رہی تھی، نہ شیخ کے لیے۔ جھوٹ کا مقابلہ جھوٹ سے ہی کیا جا سکتا تھا۔ کون جانے کل میرے لیے یہ ثبوت فراہم کرنا مسئلہ بن جائے کہ میں رات بھر کہاں تھا اور کس وقت کیا کر رہا تھا۔ خود انکل رضوی مجھ سے پوچھ سکتے تھے کہ برخوردار! گھر سے کہاں غائب تھے؟

"کیا سوچ رہے ہو استاد سکندرِ اعظم؟" ٹیڈی نے کہا۔

"میں؟۔۔۔ ہاں۔۔۔ میں سوچ رہا تھا کہ انکل نے بار بار مجھے فون کیوں کیا تھا۔" میں نے اصل بات چھپاتے ہوئے کہا۔ "مجھے اسلام آباد فون کر کے معلوم کر لینا چاہیے۔ خدا کرے، وہاں خیریت ہو۔"

"میرا بھی سلام دینا شہلا باجی کو۔" وہ بولا۔ "اور محسن بھائی کو۔"

میں ٹیلی فون کرنے کی غرض سے ہی دوسرے کمرے میں گیا تھا لیکن ریسیور اٹھانے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ لائن تو ڈیڈ ہے۔ میں نے پورے محکمے پر لعنت بھیجی اور ٹیلی فون کے پروگرام کو صبح پر ملتوی کر کے لوٹ آیا۔ یہ ناممکن تھا کہ اس وقت جب میٹھی نیند سونے والے کسی خواب کے کلائمکس کا فلمی انجام دیکھ رہے ہوں گے۔ میں انھیں جگا کے کہوں کہ جناب مجھے ٹیلی فون کی خرابی کی شکایت درج کرانے کے لیے آپ کے گھر سے فون کرنا ہے۔ وہ زبان سے تو کچھ نہ کہتے لیکن دل ہی دل میں گالیاں دیتے کہ میاں پانچ دس منٹ بعد آجاتے تو کیا تھا۔

میں منہ لٹکائے واپس آیا تو ٹیڈی نے پوچھا "خیریت تو ہے اپنے سکندر صاب؟"

"ہاں۔ بس فون مرا پڑا ہے۔" میں نے کہا "اب صبح ہونے والی ہے، بلکہ ہوگئی ہے۔ میں تم سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ یہ جو کچھ ابھی ہوا، اس کی تو کوئی اہمیت نہیں۔ اس سے پہلے بہت کچھ ہو چکا تھا، بڑی گڑبڑ والی بات ہے۔"

"پھر... کوئی... کسی قاتل کو مقتول بنا دیا ہے کیا؟" ٹیڈی نے سوچتے ہوئے کہا "یار! تم نے بھی خواہ مخواہ اپنی جان کو روگ لگا رکھے ہیں۔ میری مانو تو اپنی اس وکیل صاحبہ کو لو اور لوٹ جاؤ ولایت۔"

"یہ آرزو ہی بڑی چیز ہے مگر ہمدم۔" میں نے آہ بھر کے کسی فلسفی کی طرح کہا "خواہشات کوئی تانگوں میں جتے ہوئے گھوڑے نہیں کہ لگام ہاتھ میں ہو تو اپنی مرضی سے جس تعبیر کی راہ پر چاہو موڑ لو اور ہم کو ولایت یہیں مل جائے تو اچھا ہے۔ وہاں سے تو ہم آئے نہیں، لائے گئے تھے۔ میں جو بات کہنا چاہتا ہوں اسے دھیان سے سنو! ہو سکتا ہے مجھے پھر تمھاری مدد کی ضرورت پڑ جائے۔"

جتنی دیر تک میں نے اسے تھانے میں پیش آنے والے واقعات کے انجام سے آگاہ کیا، وہ یوں ہکا بکا بیٹھا رہا جیسے کسی زمانے میں داستانِ امیر حمزہ یا طلسمِ ہوشربا جیسی کہانیاں قسط وار سننے والے عمرو عیار کے کارناموں پر دم بخود بیٹھے رہتے ہوں گے۔ حقیقت سے ٹیڈی کو روشناس کرا دینے کا فیصلہ کر لینے کے بعد میں نے اس سے کچھ نہیں چھپایا۔

"قسم مولا کی۔" وہ میری بات ختم ہونے کے بعد بولا "ایسے خوفناک سنسنی خیز واقعات تو اپن نے کسی انگریزی فلم میں بھی نہیں دیکھے۔ کون تھا وہ جو پیڈرو کے میک اپ میں تھا؟"

"جیسا کہ اس نے خود بتایا، زرداد۔" میں نے کہا "لیکن اب اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس کا نام کیا تھا اور وہ کیا کرتا تھا۔ مونگ پھلی بیچتا تھا یا قلفی۔ وہ تو اب ایک لاوارث لاش ہے جس پر صرف ایک حوالہ نمبر پڑا ہوا ہے۔ تم اگر کر سکتے ہو تو ایک کام کرو۔ بلکہ دو کام کرو۔"

"آپ دس کام کہیں اپنے سکندر صاب! قسم مولا کی، آپ نے ٹیڈی کو یار کہہ دیا تو اب ہم یاری کا حق ادا کر کے نہ دکھائیں تو لعنت ہم پر۔" وہ سینے پر ہاتھ رکھ کے بولا۔

"پہلا کام تو یہ ہے کہ تم استاد پیڈرو کا پتا لگاؤ۔ وہ کہاں ملتا ہے اور واردات کی شب کہاں تھا؟ یقینی بات یہ ہے کہ جب کسی اور کو پیڈرو بنا کے بھیجا گیا تھا تو یہ انتظام بھی کیا ہوگا کہ اصل پیڈرو رات بھر کسی اور جگہ موجود رہے جہاں درجن بھر افراد اس کی ہمہ وقت موجودگی کے گواہ ہوں۔ دوسرا کام تم پہلے بھی کر چکے ہو۔ دو چار ایسے قابلِ اعتماد گواہ پیدا کر لو جو کہہ سکیں کہ رات بھر میں ان کے ساتھ تھا۔"

"لو جی۔ کیا موقعے کی بات کی ہے آپ نے!" وہ ہاتھ ملا کے بولا "آج اپنے یار رحیمو پہلوان تانگے والے کے گھر میں کچھ رونق میلہ تھا، اس کی بیٹی کی شادی ہے کل۔ اس نے کچھ فنکشن وغیرہ کا انتظام کیا تھا اور سب یار دوستوں کو بلایا تھا بس تم بھی وہیں تھے۔ رات بھر کا پروگرام تھا۔ صبح تک تم شریک رہے۔ خود رحیمو بتا دے گا۔"

"واہ استاد! تم واقعی یاروں کے یار ہو اور استادوں کے استاد۔" میں نے کہا۔

ٹیڈی کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔ وہ ایک چھوٹا سا بدمعاش تھا لیکن اس کا دل بہت بڑا تھا۔ وہ ہر وقت، ہر شخص کی مدد کے لیے تیار رہتا تھا اور ہر کسی کے دکھ میں شریک ہو جانا اس کا شعار تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کا حلقۂ احباب وسیع تھا اور وہ سب جن کے لیے اس نے کبھی کچھ کیا تھا، ضرورت پڑنے پر ٹیڈی کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہو جاتے تھے۔ اس کو احساس تھا تو یہ کہ معاشرے میں اس کی عزت نہیں اور شرفا اس سے یوں پرہیز کرتے ہیں جیسے کسی کوڑھی سے لیکن ہم نے اسے وہ مقام دیا جس کا وہ آرزومند تھا۔ اب وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ، دولت مند اور معزز افراد کا دوست ہی نہیں، جذبات کے رشتوں سے ہمارے مختصر سے خاندان کا ایک فرد بن چکا تھا اور بڑے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ وہ سکندر بخت کا دوست ہے جو ایک فیکٹری کا مالک ہے اور چار سال ولایت میں رہ چکا ہے اور محسن کا دوست ہے جو اسلام آباد کے ایک ڈپٹی سیکرٹری کا لڑکا ہے۔ رابعہ قاضی جیسی ایڈووکیٹ کے گھر میں اس کا آنا جانا اسی طرح ہے جیسے

بھائیوں کا بہنوں کے گھروں میں اور وہ ضامن رضوی صاحب کی کوٹھی میں بھی جاتا رہتا ہے۔ یہ سب ایسی باتیں تھیں کہ ٹیڈی کے حلقۂ احباب میں بیشتر لوگ اسے زبردست گپ قرار دیتے ہوں گے تو یقین کرنے پر سخت مرعوب ہوتے ہوں گے۔ کیونکہ خود ان کے خاندان اور حلقۂ شناسائی میں بھی انھی کے ہم رتبہ لوگ تھے۔ وہ سب پستی کے مکین کہلاتے تھے اور جن کا ذکر ٹیڈی کرتا ہوگا، وہ اونچے لوگ تھے جن کا دماغ بہرحال عرشِ معلّے پر رہتا ہے۔ اعلیٰ سوسائٹی کا کمپلیکس ٹیڈی کے مستقبل کی راہیں بدل سکتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ اپنی موجودہ صحبت سے دور ہوتا جائے اور جتنا ہم سے قریب ہو، اس کی زندگی کے نظریات میں رونما ہونے والے انقلاب کی بنیادیں استوار ہوتی جائیں ۔ ہر کہ در کانِ نمک رفت نمک شد۔ یہ بات اگر پہلے درست تھی تو اب یہ ہو سکتا تھا کہ ۔ جمالِ ہم نشیں در من اثر کرد، والی بات صحیح ہو جائے۔

میں نے سات بجے کے قریب غسل کیا اور جب ٹیڈی ایک کوٹھی کے خوبصورت باتھ روم میں نہانے کا لطف اٹھاتے ہوئے زور زور سے گا رہا تھا "میں تو چھوٹی موٹی رے" تو میں ناشتا بنا رہا تھا اور استاد ٹیڈی کی شجاعت کے کارنامے یاد کر کے مسکرا رہا تھا۔ آٹھ بجے کے قریب میں نے دروازوں کو مقفّل کیا اور ہم دونوں ایک ساتھ نکل کے مخالف سمتوں میں روانہ ہو گئے۔ میں نے گزشتہ دن ہی عہد کیا تھا کہ پھر کبھی آیا تو رابعہ کے ساتھ آؤں گا لیکن ابھی چوبیس گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے کہ میں پھر شیخ کے گھر میں تھا۔ مجھے امید تھی کہ شیخ آچکا ہوگا لیکن اسے کچھ دیر ہوگئی تھی۔ میرا استقبال اسی آفت کی پرکالہ نازلی نے کیا۔

"ارے آپ؟" وہ مجھے دیکھ کر دنگ رہ گئی "آپ تو اسلام آباد گئے تھے؟ پھر یہ کیا؟ آپ کی تصویر مجھے ٹی وی پر نظر آرہی ہے یا تصوّر میں۔ یا آپ کی روح کو میری آنکھیں مجسّم دیکھ رہی ہیں سکندر جی!"

"ارے بابا! نہ سلام نہ دعا۔" میں نے زچ ہو کے کہا۔ "اب آپ مجھے اندر جانے دیں۔"

"اوہ۔ سوری۔ السلام علیکم!" وہ پیچھے ہٹ کے بولی۔ "صبح صبح کوّا بول رہا تھا منڈیر پر۔ میں نے بہت غور کیا کہ کون آنے والا ہے؟ ہے نا کمال کہ آپ آگئے۔ ویسے آپ کو ہزار روپے کی ضرورت تھی تو اتنا لمبا جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی؟ جھوٹ بولنا بری بات ہے۔ اب مجھے ہی لیجیے، میں کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔"

"مگر بولتی بہت ہو۔ محاورے کے مطابق آپ کو کوّے نوش فرمانے سے تو رغبت نہیں ہے؟" میں نے کہا "اور آج ناشتے میں آپ نے اس بدبخت کوّے کو تو نہیں کھا لیا جس نے آپ کے گھر کی منڈیر پر آکے بولنے کی حماقت کی تھی؟"

وہ ہنسی "وہ دراصل کوّا نہیں تھا، اُلّو تھا۔ آگیا صبح صبح۔ اب آنے والے کو کوئی کیسے روکے؟"

"خدا کے واسطے اندر جا کے شیخ سے کہو کہ شامت کا مارا سکندر آیا ہے۔" میں نے کہا۔

"شیخ صاحب کے تشریف لاتے ہی یہ بات میں ان سے کہہ دوں گی۔" وہ بولی "فی الحال آپ تشریف رکھیں۔"

"اچھا اپنے ڈیڈی سے یا امّی سے کہہ دو۔" میں نے کہا۔

"ان سے تو ابھی ملاقات ہو جائے گی سکندر جی!" وہ چٹکی بجا کے بولی "میں ناشتا لگانے ہی والی تھی میز پر۔"

"میں ناشتا کر کے آیا ہوں۔" میں نے ہاتھ جوڑ کے کہا۔ "مجھے معاف کر دو۔ میرا پیٹ بھرا ہوا ہے۔"

"معاف کرنا کیسا جی۔ میں جا کے بتا دیتی ہوں امّی کو کہ سکندر صاحب آئے ہیں، بغیر ناشتا کیے۔" وہ ہنسی "صبح صبح کوئی بھوکا آجائے دروازے پر تو اسے پیٹ بھر کھلانے کا بڑا ثواب ہے۔ ظاہر ہے، تم اتنے بدخواہ بھی نہیں ہو ہمارے کہ ہمیں ثواب سے محروم رکھو اور اتنے بداخلاق بھی نہیں کہ امّی ڈیڈی کے ڈانٹنے پر بھی کچھ نہ کھاؤ۔ زیادہ سے زیادہ بدہضمی ہی ہوگی نا۔ باہر جا کے چورن کھا لینا۔" وہ باہر جاتے جاتے پھر ہنسی۔ یا میرے خدا! اس کی شادی کسی بہرے سے ہو جائے تو اچھا ہے۔ ورنہ وہ پاگل ہو جائے گا۔

ناشتے کی میز پر اس کا جبر جاری رہا۔ اس نے دو بار بے خبری میں حملہ کیا اور میری پلیٹ کو ایک بار دلیے سے اور دوسری بار حلوے سے بھر دیا۔ پھر اس نے یہی زبردستی چائے کے معاملے میں کی۔ چنانچہ میں ناشتے کے بعد اٹھا تو میرے لیے سانس لینا مشکل ہو رہا تھا۔ مجھے بدہضمی کیا، ہیضہ ہو جانے کا یقین آنے لگا تھا۔ نازلی کے والدین کو پتا نہیں تھا کہ صرف آدھے گھنٹے کے وقفے سے میں نے یہ دوسرا اور ڈبل ناشتا کیا تھا۔ وہ بڑے شفقت آمیز اصرار کے ساتھ مجھے اور کھانے پر مجبور کرتے رہے اور نازلی کی شرارت کو آدابِ میزبانی سمجھ کے نظر انداز کرتے رہے۔ صرف نازلی تھی جو مجھ پر یہ ظلم کر کے بہت خوش تھی۔

شیخ ساڑھے آٹھ بجے آیا اور اس نے اخلاقاً معذرت کی۔ "ہم پولیس والوں کی تو نوکری ہی ایسی ہے یار! نہ آنے کا وقت، نہ جانے کا۔"

"کوئی بات نہیں بھائی جان! انھوں نے ناشتا کر لیا ہے۔ گھر سے ایسے ہی آ گئے تھے۔" نازلی نے کہا۔

"گڈ۔" شیخ نے چٹکی بجا کے کہا۔ "بس اب مجھے آدھا گھنٹا اور دے دو۔ میں آیا نہا کے اور ناشتا کر کے۔"

نازلی کی ماں اندر جا چکی تھی اور اس کے ابا اخبار لے کر باہر جا بیٹھے تھے چنانچہ آدھے گھنٹے کے لیے میں پھر نازلی کے ساتھ تنہا رہ گیا۔ "مس نازلی!" میں نے متانت سے کہا۔ "کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ بھی تشریف لے جائیں اور اندر جا کے کوئی نیک کام کریں۔ مثلاً کتابوں میں دل لگائیں۔"

"استاد جی!" وہ آہِ سرد بھر کے بولی۔ "اس وقت میرا پڑھنے کا بالکل موڈ نہیں ہے۔ آپ ایسا کریں کہ میرا ٹیسٹ لے لیں۔"

"ٹیسٹ لے لوں؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔ "کس چیز کا؟"

"یہی کہ مجھے جوڈو اور کراٹے کتنا آتا ہے۔ آجائیے سامنے۔"

وہ اٹھی اور دوپٹے کو سر پر سے اتار کے کمر کے گرد لپیٹ لیا اور آستین کو اوپر چڑھا کے اس نے مجھے چیلنج کیا لیکن میں چیلنج قبول کرنے کے بجائے یہ سوچ رہا تھا کہ بے تکلفی اور معصومیت کے اس مظاہرے کو ظاہر کی آنکھ سے دیکھنے والا کیا صرف نوجوانی کا الّھڑ پن سمجھے گا؟ پہلے تو میں نے سوچا کہ اس لڑکی کو آزمانے کے بہانے ایسا سبق دوں کہ وہ ساری شوخی بھول جائے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ وہ ایک کم عمر اور کم عقل لڑکی ہی تو ہے، میرا اس کا کیا مقابلہ؟ چنانچہ میں اسی اطمینان کے ساتھ بیٹھا رہا۔ تیار ہونے کے بجائے میں صوفے پر نیم دراز ہو گیا۔

"تم واقعی اسکول کی بچّی ہو۔" میں نے سگریٹ جلا کے ایک کش لیتے ہوئے کہا۔ "غلطی سے کالج میں پہنچ گئی ہو۔"

"کیا مطلب؟" وہ ماتھے پر بل ڈال کے بولی۔ "عقل نہیں ہے مجھ میں یا... چھوٹی ہوں میں؟"

"ماشاء اللہ، بہت جلد سمجھ لیا بات کو۔" میں نے کہا۔ "یہ بھی سچ ہے کہ تمھارا عقل نام کی کسی چیز سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اس کے علاوہ چھوٹا بڑا ہوتا ہے آدمی ذہنی طور پر۔ اب تم دیکھنے میں تو واقعی بڑی لگتی ہو۔ مگر ہو نہیں۔"

میرا حربہ کارگر رہا۔ نازلی کا موڈ آف ہو گیا اور منہ سُوج گیا۔ اس نے دوپٹے کو کمر سے کھول کر شانے پر ڈالا اور آستین نیچی کر کے سخت برہمی کے عالم میں دروازے کی طرف بڑھی۔ عین دروازے میں اس کا تصادم شیخ سے ہوا۔

"الٰہی خیر! یہ لومڑی دُم دبا کے کہاں فرار ہو رہی ہے۔" شیخ نے کہا اور پھر غور سے اس کی رونی صورت کو دیکھا۔ "... ہے تجھے؟ بھڑ نے کاٹا ہے کیا؟ منہ کیوں کُپّا ہو رہا ہے؟"

"کچھ نہیں یار!" میں نے کہا۔ "مجھ سے فرما رہی تھیں جوڈو کراٹے سکھا دیں۔" میں نے کہا۔ "عقل کے ناخن لو بی بی۔ شریف لڑکیاں ہانڈی چولھا کرتی ہیں، جھاڑو برتن کرتی ہیں۔ مار دھاڑ نہیں کرتی پھرتیں اور ابھی تو گڑیاں کھیلنے کی عمر ہے تمھاری۔ بس اسی کا غصہ ہے کہ میں نے سچ کیوں بولا۔"

نازلی میری بات سن کے ذرا سی دیر کے لیے رکی تھی مگر بات سننے کے بعد اس کا پارہ اور چڑھ گیا اور وہ پیر پٹختی ہوئی نکل گئی۔

شیخ نے ایک زبردست قہقہہ مارا اور میں نے عمداً اس کا ساتھ دیا۔ تاکہ آواز نازلی تک پہنچ جائے اور وہ سمجھ لے کہ ہم اس پر ہنس رہے ہیں۔ ممکن ہے وہ جذباتی لڑکی اپنے کمرے میں بیڈ پر گر کے اب رو رہی تھی — میں نے سوچا۔ ایک جذباتی حماقت کی انتہا کا شکار ہونے والی لڑکی تو خودکشی تک کر سکتی ہے۔ اگر اس نے بھی اسی قسم کا کوئی قدم اٹھا لیا تو احساسِ جرم کا داغ میرے ضمیر پر رہ جائے گا۔ میں کسی کو بتا بھی نہ سکوں گا کہ ایسا کیوں ہوا؟

"بیٹھے ہیں پھر تصوّرِ جاناں کیے ہوئے۔" شیخ نے اندر آ کے کہا۔ "مگر جناب ابھی فرصت کے وہ رات دن کہاں؟ ... کہ اب وہ لذّتِ خوابِ سحر گئی۔"

میں چونک کر ہنسا۔ "پولیس اور غالب۔ کیا ستم ہے! کیا زمانہ آ گیا ہے۔"

باہر نکل کے میں نے اسے گزشتہ رات پیش آنے والے واقعات سنائے جو کسی لطیفے سے کم نہ تھے۔ وہ بڑی دلچسپی سے سنتا رہا۔ ایک اسکوٹر کی آواز پھر ٹریفک کا شور۔ مجھے اس کے کان میں چلّا کے بات کرنا پڑ رہی تھی لیکن میری نظر اِدھر اُدھر بھی تھی کہ خدانخواستہ کوئی ہمارے تعاقب میں تو نہیں ہے۔

"یہ خوب ہوا۔" شیخ نے کہا۔ "مارا بھی اور مار بھی کھائی۔ وجہ کوئی نہیں۔ کھایا پیا کچھ نہیں، گلاس توڑا دو روپے۔"

"اب یہ تو مشکل تھا کہ ہم آمنے سامنے ہو کے تعظیم بجا لاتے اور اپنا اپنا تعارف کراتے کہ فدوی کو سکندر بخت کہتے ہیں اور وہ کورنش بجا لاتے کہ ناچیز کارکنانِ خفیہ پولیس ہیں، آداب اور شب بخیر! مقصود صرف حضور کی خیریت دریافت کرنا تھا۔"

"لیکن یار! رضوی صاحب نے بار بار فون کیا تھا تو ان سے بھی پوچھ لینا تھا کہ بات کیا ہے۔ خدانخواستہ..."

"میں نے پہلا کام یہی کیا تھا مگر اپنے گھر کا ٹیلی فون فوت ہو چکا تھا۔" میں نے کہا۔ "اب ذرا اپنے کام سے فارغ ہو لیں تو کسی جگہ سے بات کریں گے۔ مجھے سخت مایوسی ہوئی یار! آخر رابعہ نے مجھے فون کیوں نہیں کیا۔ ایک بار تو کرتی۔"

"حالانکہ جناب نے اس کی یاد میں ہجر و فراق کے یہ دن تڑپ تڑپ کر گزارنے کے سوا کچھ نہیں کیا۔" شیخ ہنسا۔ "صبح کرنا شام کا لانا تھا جوئے شیر کا۔ رات اختر شماری کرتے گزرتی تھی اور دن اسے ٹیلی فون کرتے۔"

"میں اسے کس طرح فون کر سکتا تھا یار! وہاں اتنے لوگ ہیں اور پھر وہاں کے حالات۔" میں نے خفت سے کہا۔

"تو اس کے لیے یہ پرابلم نہیں تھی کیا؟" شیخ نے کہا۔ "سب کچھ نظرانداز کر کے تمھیں حالِ دلِ زار بتاتی رہتی۔"

"اسے تو معلوم تھا نا یار کہ یہاں میں اکیلا ہوں۔" میں نے کہا۔ "فرض کرو وہاں انکل رضوی یا شیروانی صاحب میں سے کوئی ریسیور اٹھا لیتا تو میں بیمار پُرسی کے بجائے کہتا کہ ذرا میری منسوبہ کو بلائیے۔"

"یار! وہ بڑی پریکٹیکل لڑکی ہے۔" شیخ نے کہا۔ "اس کے علاوہ وہ سمجھ رہی ہوگی کہ تم پہنچنے والے ہو۔ آج نہ سہی کل عدالتی اجازت ملتے ہی آ جاؤ گے۔ عدالت کی اجازت ملے چوبیس گھنٹے ہونے کو ہیں اور جناب کہاں جا رہے ہیں، مزنگ۔"

"میں تو مارا گیا شیخ صاحب! دونوں طرف سے۔" میں نے کہا۔ "اُدھر محسن کو گلہ ہوگا تو دوسری طرف رابعہ کو بھی کہ میں اپنے ایڈونچرز سے باز نہیں آیا۔ حالانکہ خدا گواہ ہے، میں جانے کی نیّت کر کے ہی تیرے پاس آیا تھا اور نازلی سے ایک ہزار نقد بھی اسی مقصد کے لیے مانگے تھے۔ مگر آگے جو کچھ ہوا اس میں میرا کیا قصور۔" مجھے یہ خیال بھی آیا کہ اگر وہ لڑکی مجھے زبردستی چائے پینے اور پھر خواہ مخواہ ایک سہیلی کے گھر چھوڑ کر آنے پر مجبور نہ کرتی تو میں بہت پہلے تھانے پہنچ جاتا۔ اس وکیل کے آنے سے پہلے میں بادامی باغ کے اڈے پہنچ جاتا اور اس سارے جھمیلے سے بچ جاتا۔ لیکن بات وہی ہے کہ نصیب کا لکھا آگے آتا ہے اور خدا کا کوئی کام مصلحت سے خالی نہیں۔ میری موجودگی کے باعث ہی شیخ بچ گیا تھا۔

"تو نے اس کانسٹبل کو بریف کر دیا ہے نا کہ اسے حشمت خان سے کیا کہنا ہے؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ وہ بہت نروس تھا لیکن میں نے کہا کہ جوان جب اوکھلی میں دیا سر، تو موصلی کا کیا ڈر۔" شیخ نے کہا۔ "اب ڈٹے رہو اپنے بیان پر۔ حشمت خان کو شاید یاد ہی نہ آئے کہ اس نے کب کس کو ڈک دینے کے احکامات صادر فرمائے تھے اور اس کا کیا جرم تھا۔ ہر روز..."

"یہ ذرا مختلف بات ہے شیخ!" میں نے کہا۔ "اگر وہ کانسٹبل کسی ایرے غیرے نتھو خیرے کا نام لیتا تو حشمت خان شاید مخمصے میں پڑ جاتا لیکن استاد پیڈرو کا نام ایسا نہیں کہ وہ اچھل نہ پڑے۔ وہ استاد پیڈرو کی صورت ہی نہیں پہچانتا، اس کے معاونین میں سے ایک ہے۔ دوسرا امیر محمد تھا جو اب نہیں ہے۔ تیسرا کوئی نقلی ڈی ایس پی سراج ہے۔"

"خیر اب وہ کانسٹبل تو اپنے بیان سے ایک انچ نہیں ہٹے گا۔ ویسے بھی وہ گل محمد ہے۔ زمیں جنبد، نہ جنبد گل محمد۔" شیخ نے کہا۔ "اسے اپنی جان بھی تو بچانی ہے۔ وہ اڑ جائے گا کہ اس نے حشمت خان کے کہنے پر روزنامچے میں اندراج کیا تھا۔ بعد میں وہ کیسے مرا؟ اس کے گواہ بہت ہیں۔ وہ ثابت کر دے گا کہ لاش کو اس نے خود اسپتال پہنچایا تھا اور اس کے گواہ ہوں گے ایمبولینس لے کر آنے والے۔ بعد میں لاش کہاں گئی؟ اس کی فکر حشمت خان کو بھی نہیں ہوگی۔ وہ سمجھے گا کہ لاش کو وہی لوگ لے گئے جو کبھی سامنے آ کے کام نہیں کرتے اور جو کچھ کرتے ہیں اس کا سراغ نہیں چھوڑتے۔ اس کے علاوہ یہ بھی تو ہو سکتا ہے شیخ جی کہ حشمت خان کو اصلیت کا علم ہو۔ وہ جانتا ہو کہ پکڑا جانے والا استاد پیڈرو کے روپ میں کوئی اور ہے۔ اگر یہ بات ہوگی تو وہ سمجھے گا کہ بلا ٹلی اور تمھارے گلے پڑ گئی۔ اب تم وضاحت کرتے پھرو کہ زرداد کون تھا؟ کیسے پکڑا گیا تھا اور کیسے مر گیا؟ وہ تو خوش ہوگا کہ کرنے والوں نے خود ایسا انتظام کر دیا کہ ایک تیر سے دو شکار ہو گئے۔ زرداد کو تو مرنا ہی تھا۔ اس نے ایس آئی شیخ کو بھی مروا دیا۔ میرا ساتھ دینے کی وجہ سے تم بھی اس کے دشمنوں میں شامل ہو گئے ہو۔"

"ارے یار! کرے کوئی ہم سے دشمنی۔ ایک جان ہی تو ہے جس کے جانے کا ڈر رہتا ہے۔ اس کے بعد کیا لے گا؟ یہ زندگی اور موت کا معاملہ خدا نے دنیا بناتے وقت کسی حشمت خان کے اختیار میں نہیں رکھا تھا۔" شیخ بولا۔

اچانک مجھے ایک اور خیال آیا۔ "یار شیخ! تو نے اخبار دیکھا؟"

"اخبار تو دیکھا مگر وہ نہیں۔" شیخ نے کہا۔ "وہ تو اس اخبار کی ایسی خبر ہوگی جو دھماکا کرے گی اور سب کو ہلا دے گی۔ ایکسکلیوسو اسٹوری۔ ابھی دیکھ لیتے ہیں۔" اس نے اسکوٹر

کو ایک بکسٹال کے سامنے ذرا سی دیر کے لیے روکا اور میں نے بطورِ خاص 'صدائے وقت' طلب کیا اور اخبار فروش نے حسبِ توقع 'نوائے وقت' نکالا۔ میں نے دوبارہ زیادہ واضح الفاظ میں 'صدائے وقت' کہا۔ تو وہ خاصا حیران ہوا۔

" بابو جی! ایک بات پوچھوں؟ آج صبح سے آپ تیسرے آدمی ہیں جس نے یہ اخبار مانگا ہے!" وہ بولا" بکتا نہیں اس لیے ہم تو رکھتے نہیں۔ مگر آگے آپ کو مل جائے گا۔ مزنگ چوک پر۔"

ہم آگے روانہ ہو گئے۔ مزنگ چوک کی ایک دکان سے بالآخر" صدائے وقت" دستیاب ہوا۔ میں نے بڑے اشتیاق سے پہلا صفحہ کھولا۔ اس پر ملکی د غیر ملکی اور اندرونِ اضلاع کی سب اہم خبریں تھیں مگر وہ خبر نہیں تھی جس کی ہمیں تلاش تھی۔ میں نے وہ صفحہ دیکھا جس پر شہر کی خبریں تھیں۔ ہر اخبار کا ایک صفحہ مقامی نوعیت کی خبروں اور اعلانات وغیرہ پر مشتمل ہوتا ہے، اس پر بھی ایسی کوئی سنسنی خیز ہیڈ لائن نہیں تھی۔ جس میں کسی ایس۔ ایچ۔ او میر محمد کے گھر میں ہونے والی واردات کا ذکر ملتا۔ بقول شیخ کے اس میں کوئی "ایکس کلیوسو" اسٹوری نہیں تھی جس کے ساتھ ان بچوں کی تصویر بھی ہوتی جنھوں نے اخبار کو یہ خبر فراہم کی۔

" یہ کیا چکر ہے شیخ ؟" میں نے اخبار الٹ پلٹ کر اس کے حوالے کیا۔

" میں خود سمجھنے سے قاصر ہوں" شیخ نے کہا" یہ خبر تو تہلکہ مچا دیتی۔ پولیس کی ایسی تیسی ہو جاتی۔"

" اس کی وجہ صرف ایک ہو سکتی ہے دوست" میں نے چٹکی بجا کے کہا" کہیں سے فون کریں گے تو معلوم ہو جائے گا۔"

" فون کسے کرو گے ؟ مست قلندر صاحب کو ؟" شیخ نے کہا۔ " یا مدیر مجنوں کو ؟ اس وقت دونوں نہیں ملیں گے۔"

" یار اخبار کا مدیر تھا۔ اس کے گھر پر فون ہونا چاہیے۔" میں نے کہا۔

" کس اخبار کا ؟ جسے کوئی پڑھتا ہی نہ تھا" شیخ نے تلخی سے کہا" خیر کوشش کرنے میں کوئی ہرج نہیں۔"

ایک جنرل اسٹور والا پہلے تو سوچ میں پڑ گیا تھا لیکن اس کے کوئی بہانہ کرنے سے قبل ہی شیخ نے اپنا کارڈ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا" ایک سرکاری کام سے اخبار کے دفتر فون کرنا ہے" شیخ نے کہا" لیکن ہم مفت نہیں کریں گے۔ کال کے چارجز دیں گے۔"

" کیسی بات کرتے ہیں آپ سر! قانون کی مدد... مہذب شہری کا فرض ہے" اس نے رٹا رٹایا جملہ دُہرا... نے ڈائریکٹری دیکھی اور" صدائے وقت" کا نمبر تلاش کیا... خوش قسمتی کہ وہاں آپریٹر تو نہیں تھا لیکن ایک چوکیدار نے... اٹھا لیا اور یہ حوصلہ شکن اطلاع دی کہ مست قلندر صاحب... میں تو فون ہے ہی نہیں۔ ایڈیٹر صاحب کے گھر کا... اسے نمبر یاد نہیں۔ آپریٹر بتائے گا اور وہ دس گیارہ بجے... گا۔ ریسیور رکھنے کے بعد میں کچھ دیر سوچتا رہا، پھر مجھے... عقل پر افسوس ہوا۔ اخبار کے آخری صفحے پر سب سے... پرنٹ لائن میں ایڈیٹر کا اصل نام موجود تھا۔ ذرا سی دیر... یہ نام ڈائریکٹری میں مل گیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے... نوٹ کر لیا۔ دس منٹ تک ہم مسلسل وہ نمبر ملاتے رہے... بجتی رہی لیکن ریسیور کسی نے نہیں اٹھایا۔

" یہ رات کو جاگنے والی مخلوق ہے شیخ جی" میں... سوچتے ہوئے کہا" گھوڑے گدھے سب بیچ کر سو رہے ہوں..."

" کہیں کوئی ایسی ویسی بات نہ ہو" شیخ نے سوچتے ہوئے... کہا میرے ذہن کو ایک جھٹکا لگا۔ مجنوں صاحب کے ساتھ... کچھ ہو سکتا تھا کیونکہ بچے انھی کے پاس تھے اور وہ ٹیپ... اس امکان کو مسترد نہیں کیا جا سکتا تھا کہ میر محمد کی بیوی تشدد... تاب نہ لا کے سچ بولنے پر مجبور ہو گئی ہو۔ مست قلندر صاحب... تو بچوں کو ایسے ہی مل گئے تھے لیکن انھوں نے بڑی عقلمندی... ثبوت دیا تھا کہ بچوں کو ٹیپ سمیت آگے ارسال کرنے سے... ٹیپ کی ایک نقل بنوا کے اپنے ریکارڈ روم میں رکھوا دی... اینڈ کمپنی کو بھی معلوم ہوا ہو گا تو صرف یہی کہ بچے ٹیپ لے... ایڈیٹر صاحب" صدائے وقت" کے پاس جا پہنچے۔ وہ دوڑے ہوں... گے کہ راز کے طشت از بام ہونے سے قبل ہی کوئی بندوبست... لیں۔ خبر کی اشاعت کے بعد انھیں نہ مجنوں صاحب کو مار... کوئی فائدہ ہوتا، نہ ان کی لیلیٰ کی نشانیوں کو ظلم و ستم کا نشانہ... کے۔ جو خبر چھپ جاتی وہ زمانے کو معلوم ہو جاتی۔ اخبار معمو... ہو تو کیا، ایڈیٹر تو ایڈیٹر ہی ہوتا ہے۔ ایک معمولی رپورٹر کے ساتھ... کوئی زیادتی ہو تو سارا قومی پریس آسمان پر اٹھا لیتا ہے... ناممکن تھا کہ وہ اخبار کے دفتر پر حملہ کریں اور ایڈیٹر کو اٹھا... اتنا تو وہ بھی سمجھتے ہوں گے کہ اخبار کا ایڈیٹر احمق نہیں ہو... اس نے سب سے پہلے اپنی اور بچوں کی حفاظت کے لیے کو... بندوبست کیا ہو گا اور اس ٹیپ کی نہ جانے کتنی نقلیں بنوا... تقسیم کر دی ہوں گی۔ میں اور شیخ یہ بات جانتے تھے کہ میر...

مست قلندر صاحب کا نام نہیں جانتی تھی اور نہ اسے

کی بیوی

علم تھا کہ بچے اس کے پاس جا پہنچے ہوں گے۔ وہ کسی کو ایک

ایسی بات کیسے بتا سکتی ہے جس سے وہ خود بے خبر ہے۔ چنانچہ

مست قلندر صاحب کی ذات محفوظ تھی اور اس طرح وہ ٹیپ

بھی محفوظ تھا جو انھوں نے پرانے ریکارڈ میں دفن کر دیا تھا۔

لیکن ایڈیٹر کی ذات اپنے گھر میں بہر حال محفوظ نہ تھی۔

مست قلندر صاحب نے بتا دیا تھا کہ میاں مجنوں ابھی تک

لنڈورے ہیں۔ ان کو بچوں اور ٹیپ سمیت اغوا کیا جا سکتا ہے۔

" یار شیخ !" میں نے کہا" مجھے مجنوں صاحب کی طرف

سے فکر لاحق ہو گئی ہے۔ پہلے ان کو نہ دیکھ لیں"

" رہتے تو وہ بھی اِدھر ہی ہیں" شیخ نے پھر اسکوٹر اسٹارٹ

کیا" دیر تو ہو ہی گئی ہے"

" ابھی دیر نہیں ہوئی" میں نے کہا" اسپتال میں نئی

لاشوں کے پوسٹ مارٹم کی کارروائی معمول کے مطابق ہو گی۔ کتنی

لاشیں ہیں اور کتنے ڈاکٹر فارغ ہیں۔ پھر یہ کہ کون سا کیس فوری

توجہ کا طالب ہے اور کس لاش کے پوسٹ مارٹم کو آخر تک

التوا میں رکھا جا سکتا ہے۔ جلدی یا تو پولیس کرتی ہے یا لواحقین

کرتے ہیں۔ زرداد کے لیے کون دباؤ ڈال رہا ہے"

شیخ نے تائید میں سر ہلایا اور ہم ایڈیٹر صدائے وقت کی اقامت گاہ تلاش کرنے کے لیے روانہ ہو گئے۔

پتا زیادہ مشکل نہیں تھا لیکن ایڈیٹر کوئی ایسی شخصیت نہیں ہوتا جو ہر روز چمکتی دمکتی مرسیڈیز میں گزرتا ہو تو زمانہ دیکھتا اور سلام کرتا ہو۔ وہ دانشور قسم کا، اپنے خیالوں میں اور اپنے حال میں مست رہنے والا، اپنے حلیے کی پروا نہ کرنے والا اور غریب نظر آنے والا شخص ایسا نہ تھا کہ اسے سب پہچانتے چنانچہ ہم آدھے گھنٹے بعد وہاں پہنچے جہاں ہم دس منٹ میں پہنچ سکتے تھے۔

دروازہ باہر سے مقفل تھا۔ ہمیں بند دروازے کے سامنے احمقوں کی طرح کھڑا دیکھ کر ایک پڑوسی نے اوپر والی منزل کی کھڑکی سے سر نکالا" کس سے ملنا ہے جی ؟ ایڈیٹر صاحب سے ؟" وہ غیر سنجیدہ لہجے میں بولا۔

" ہاں" میں نے کہا" صدائے وقت کے مدیرِ اعلیٰ سے جناب!"

" اوبس جی۔ زبان کو اتنی تکلیف کیوں دیتے ہیں۔ وہ چلے گئے" اس نے دھوتی کو بڑی مہارت سے کھول کر باندھا۔

" کہاں چلے گئے ؟" میں نے اور شیخ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

" من موجی آدمی تھے۔ دنیا کا موج میلہ دیکھنے نکل گئے"

وہ مسکرایا" اور دنیا بہت بڑی ہے۔ میرے کرائے دار تھے"

" تمھیں تو کچھ ضرور بتا کے جانا چاہیے تھا۔ بعد میں کوئی ملاقاتی آئے یا ڈاک آئے تو . . ."

" او جی یہ سب ہم نے بھی کہا تھا" وہ آگے لٹک کر بولا۔ " مگر وہ تو بس ہوا کے گھوڑے پر سوار تھے۔ آدھا سامان بھی چھوڑ گئے۔ نوٹس نہیں دیا تھا، اس لیے کرایہ دے گئے اور چلے گئے۔ کہنے لگے کہ جو بھی پوچھنے آئے اسے بتا دینا کہ گئے اور کچھ نہیں بتا کے گئے۔ ملکِ عدم گئے کہ جہنم میں گئے۔ یہ انھی کے الفاظ ہیں"

" ان کے ساتھ دو بچے بھی تھے ؟" میں نے کہا۔

وہ چونکا" ہاں . . . لیکن آپ کو کیسے معلوم ہوا ؟" وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا" وہ بھلے مانس تھے اس لیے میں نے رکھا ہوا تھا۔ ورنہ چھڑے چھانٹ کو کون رکھتا ہے۔ کل نہ جانے کہاں سے دو بچے آ گئے تھے۔ میں نے پوچھا تو کہنے لگے انسان کے بچے ہیں اور کس کے بچے ہیں۔ موڈی بندہ تھا جی، ایک دم موڈی۔ آپ دفتر سے معلوم کریں"

دفتر جانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں اندازہ کر سکتا تھا کہ مجنوں صاحب نے صورتِ حال کی نزاکت کو سمجھتے ہی کیا فیصلہ کیا ہو گا۔ ایک طرف ملازمت تھی اور ان کا کیریئر تھا تو دوسری طرف وہ امانت تھی جس کی حفاظت ان کو جان دے کر بھی کرنی تھی کیونکہ یہ امانت اس عورت نے ان کے سپرد کی تھی جس کی محبت ان کی زندگی کا سب سے عزیز سرمایہ تھی۔ برسوں حفاظت کرنے کے بعد وہ اس سرمائے کو ضائع کیسے کر دیتے۔

انھوں نے اخبار کے دفتر اپنا استعفیٰ ارسال کیا ہو گا اور خود اپنا بارِ امانت اٹھا کے نکل گئے ہوں گے۔ ملکِ خدا تنگ نیست۔ پائے گدا لنگ نیست۔ اور وہ جو کہا ہے نا شاعر نے کہ کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا۔ تو غلط نہیں کہا۔

مزنگ کی گلیوں میں زرداد کا گھر تلاش کرنا کہیں زیادہ مشکل مرحلہ ثابت ہوا۔ ہم نے مختلف دکانداروں سے پوچھا۔ ریڑھی والوں سے پوچھا۔ بالآخر ایک پان والے نے کاغذ پر نقشہ بنا کے ہمیں منزلِ مراد کا پتا سمجھایا۔ دس منٹ بعد ہم نے ٹاٹ کے پردے والے ایک دروازے پر دستک دی۔ تقریباً تیس سال کی ایک عورت نے دروازے کی اوٹ سے ہمیں دیکھا۔ میں نے اس کی ایک جھلک صاف دیکھ لی تھی۔ وہ اگر غریب اور پھٹے حال میں نہ ہوتی تو یقیناً قبول صورت کہلاتی مگر زندگی کے دکھوں نے اس کو قبل از وقت ضعیفی کی سند عطا کر دی تھی۔

چند لمحے اس کی سوالیہ نگاہیں مجھ پر اور شیخ پر مرتکز رہیں، وہ یادداشت کے دریچوں سے ہماری اجنبی صورتوں میں شناسائی کے آثار تلاش کر رہی تھی اور میرے لیے بڑے اطمینان کی بات تھی کہ اس نے شیخ کو دیکھتے ہی ہنگامہ برپا نہیں کیا۔ اگر شیخ نے واقعی اس کے شوہر کو گھر سے اٹھایا ہوتا تو اب تک وہ شیخ کا گریبان تھام چکی ہوتی چلا چلا کے اس سے سوال کرتی کہ میرا شوہر زرداد کہاں ہے اور تم دوبارہ اس گھر کے دروازے تک آ پہنچے ہو تو اب کیا لے جاؤ گے؟ مجھے یا اس آبرو کو جو ہر شریف عورت کے لیے متاعِ عاقبت ہوتی ہے اور بدکار کے لیے متاعِ حیات۔ لیکن اس کی آنکھوں سے حیرت ایک سوال بن کے جھانکنے لگی تھی۔

"کس سے ملنا ہے آپ کو بھائی صاحب؟" اس نے بیک وقت ہم دونوں کو مخاطب کیا۔

"یہاں زرداد نام کا ایک شخص رہتا ہے؟" میں نے کہنا شروع کیا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ اس کے بعد کیا کہوں!

"کیا کام ہے تمہیں اس سے؟" عورت کی صورت اور لہجہ دونوں بدل گئے۔ "کون ہو تم لوگ؟"

"ہم اس کے دوست ہیں بہن!" شیخ نے کہا۔ "ہمیں اُس کے بارے میں ایک تشویش ناک اطلاع ملی تھی کہ اُسے پولیس اٹھا کر لے گئی ہے! کسی قصور کے بغیر۔"

"اور بہن ہم آپ کی مدد کے خیال سے آئے تھے۔" میں نے کہا۔ "کیا آپ ہم پر اعتماد کرتے ہوئے اجازت دیں گی کہ ہم اندر بیٹھ کے چند باتیں کر لیں، یا اس دروازے سے اندر آ کے؟ گلی میں کھڑے رہ کر کچھ معیوب لگتا ہے۔"

وہ کچھ متذبذب کھڑی ہماری شریفانہ صورتوں پر اور ہمارے شائستہ لہجے پر غور کرتی رہی اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچی کہ ہم دھوکے باز ہوئے تب بھی بہن کہنے کے بعد اس کی عزت پر تو ہاتھ نہیں ڈالیں گے۔ باقی اس گھر میں کیا ہے جس کے لٹ جانے کا ڈر ہو۔ یا پھر اسے واقعی ہم پر اعتبار آ گیا کہ اس نے آہستہ سے سر ہلایا اور دروازہ کھلا چھوڑ کے پیچھے ہٹ گئی۔ تین چار مرلے پر بنے ہوئے اس گھر میں دو کمرے تھے۔ دونوں کمروں کے سامنے برآمدہ پھیلا ہوا تھا۔ پھر وہ صحن تھا جس میں ہم دونوں کھڑے تھے۔ دائیں ہاتھ پر غسلخانہ اور بائیں جانب زینہ تھا جو اوپر کھلی چھت کی طرف جا رہا تھا۔ چھت پر بیت الخلاء کے علاوہ اسٹور یا دوچھتی قسم کی کوئی چیز بھی بنی ہوئی تھی۔ ہم دونوں صحن میں ہی ایک چارپائی پر بیٹھ گئے۔

"پولیس نے آپ کے شوہر کو کس جرم میں گرفتار کیا تھا بہن؟" شیخ نے کہا۔

"وہ کسی کو بتاتے کب ہیں؟" وہ تلخی سے بولی۔ "اور گرفتاری اس کے لیے کون سی انوکھی بات تھی۔ دو چار دن رہے گا حوالات میں، جوتے کھائے گا اور پھر آ جائے گا بے غیرتوں کی طرح دانت نکالتا ہوا۔"

"وہ اکثر گرفتار ہوتا رہتا ہے؟" میں نے حیرانی سے کہا۔ "پہلے تو ایسا نہیں تھا وہ؟"

"پہلے کب؟ جب اس نے مجھے اس گھر میں زندہ درگور کیا تھا؟" وہ دیوار کا سہارا لے کر خلا میں گھورتے ہوئے بولی۔ "میں نہیں جانتی کہ اس وقت وہ کیا تھا۔ اب تو وہ غلطی سے بھی کوئی نیک کام نہیں…"

"مگر میں نے سنا تھا کہ وہ سردیوں میں مونگ پھلی اور گرمیوں میں … بیچتا ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ تو کوئی ایسی بات نہیں۔"

"خود اس نے کہی ہوں گی یہ سب باتیں آپ سے؟" وہ بولی۔ "… تو میرا باپ لگاتا ہے۔ اُس نے بہت چاہا کہ وہیں کسی دوسرے … زرداد کو بھی جگہ مل جائے مگر محنت کرکے کمانا بہت سخت کام ہے۔ … بجے سے رات کے ساڑھے گیارہ بارہ بجے تک ایک ہی جگہ پر بیٹھے رہنا جیسے نکھٹو کے بس کی بات نہیں تھی۔ اب میرا باپ ہے، آدھی رات کو گھر لوٹتا ہے تو روٹی کھاتا ہے۔ صبح سو کے اٹھتا ہے تو پھر دوپہر تک … تیار کرتا ہے۔ وہ تو اُلٹا اپنے مفت خورے یاروں کے ساتھ جا پہنچتا تھا اور وہ مزے سے قلفی کھاتے تھے یا مونگ پھلیاں جیب میں بھر کے … پڑتے تھے۔"

"اور تمہارا باپ کچھ نہیں کہتا تھا اُسے؟" میں نے کہا۔ "گھر کا خرچ آخر کیسے چلتا تھا؟"

"پیٹ تو کتا بھی بھر ہی لیتا ہے۔" وہ بولی۔ "اُس نے تو کبھی غور نہیں کیا کہ میری ضروریات کیسے پوری ہوتی ہیں۔ بازار سے ایک گز کپڑا نہیں خریدا تو میرے تن پر کپڑے کہاں سے آ گئے؟ وہ اُسے معلوم ہے کہ باپ مجبور ہے، کما کے کہاں لے جائے گا۔ ایک میں ہی تو رہ گئی ہوں اس کی وارث، مجھے بھوکا ننگا تو دیکھ نہیں سکتا۔ شادی کے بعد رخصت ہو کے میں اس کے گھر نہیں گئی تھی، وہ اس گھر میں رہنے لگا تھا۔ اس نے تو مجھے بہت سبز باغ دکھائے کہ گھر بیچ کر پیسا اسے دے دوں تو وہ دن رات ایک کرکے لاکھ کے دس لاکھ بنا لے گا۔ دکان سے فیکٹری کھڑی کرے گا اور گلبرگ میں کوٹھی خریدے گا لیکن یہی تو میرے پاس سر چھپانے کا آسرا ہے۔ میں مر جاؤں گی لیکن اسے فروخت نہیں ہونے دوں گی۔"

"زرداد کچھ تو کرتا ہی ہوگا۔ میرا مطلب ہے آخر پولیس اُسے ہر آئے دن کیوں پکڑ لیتی ہے؟" شیخ نے کچھ دیر بعد کہا۔

"پہلے سینما پر ٹکٹوں کی بلیک کرتا تھا۔ دو چار مرتبہ پکڑا گیا مگر میرا باپ چھڑا لایا۔" وہ گہری سانس لے کر بولی۔ "پھر فلمی تصویریں بھی بیچنے لگا۔ فلموں کے ٹوٹے جو دکھائے نہیں جاتے تھے۔ کسی فوٹو گرافر سے یارانہ تھا۔ اُس کے ساتھ مل کر یہ تصویروں کا دھندا کرتا تھا۔" اُس کا چہرہ ذرا سی دیر کے لیے سرخ ہو گیا۔ "جوئے اور سٹے کا دھندا کرنے لگا تو پولیس والوں سے معاملہ ہو گیا۔ علاقے میں کوئی بھی ایسی واردات ہو جائے جس میں تفتیش کیے بنا چارہ نہ ہو تو وہ سب نامی گرامی لوگوں کو بلا کے تھانے میں رونق میلہ لگائے رکھتے تھے۔ کسی نے قبول دیا تو ٹھیک ہے ورنہ سب کی گرد جھاڑ کے واپس کر دیتے تھے۔ آج کل پولیس کے لیے بھتہ وصول کر رہا تھا اور مخبری بھی کرتا تھا۔"

میرے دل پر سے احساسِ ملامت کا بار اُتر گیا۔ شاید شیخ نے بھی میری طرح خود کو بری الذمہ محسوس کیا ہوگا کہ اس کی کوتاہی سے کوئی شریف محنت کرکے روزی کمانے والا غریب آدمی نہیں مارا گیا۔ جس راہ پر زرداد چل رہا تھا اس کی منزل یہی ذلت کی موت ہو سکتی تھی۔ اس خود ساختہ وکیل نے زرداد کو قتل کرنے سے پہلے جو کچھ کہا تھا، سب جھوٹ تھا۔

"آپ اُن پولیس والوں کو پہچانتی ہیں بہن؟" شیخ نے کہا۔ "اور آپ کب تک کھڑی رہیں گی۔ بیٹھ جائیں۔" وہ اندر سے ایک پیڑھی اُٹھا کے لے آئی اور دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ "مجھے یقین نہیں آتا کہ آپ دونوں زرداد کے دوست ہیں۔ آپ لوگ تو شریف آدمی ہیں۔"

"ہم جب بہت چھوٹے تھے تو دوست تھے۔" میں نے کہا۔ "ابھی برسوں ملاقات نہیں ہوتی تھی۔ جب وہ ملتا تھا تو اپنے متعلق کچھ بھی نہیں بتاتا تھا۔ بس یہی کہتا تھا کہ محنت مزدوری سے گزارا ہو رہا ہے۔ عزت سے دو وقت کی روٹی مل رہی ہے۔"

"عزت سے!" وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ "سوچا تو میں نے بھی یہی تھا کہ زرداد غریب اور لاوارث ہے تو کیا، بس عزت سے محنت مزدوری کرکے روکھی سوکھی کھلائے گا تو میں خدا کا شکر ادا کروں گی۔ سونے چاندی اور محلوں کے خواب میں نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔"

"میں نے یہ پوچھا تھا بہن کہ اسے لے جانے والے کون تھے؟" شیخ نے نرمی سے اپنا سوال دہرایا۔

"وہی جو آتے رہتے تھے۔ کبھی بھتے کی رقم وصول کرنے تو کبھی ساتھ لے جانے کے لیے۔" وہ بولی۔

"آپ پہچانتی ہیں اُن سب کو؟" شیخ نے کہا۔ "اگر وہ سادہ کپڑوں میں ہوں تو انھیں عدالت میں شناخت کر سکتی ہیں؟ میری مراد اُن سے ہے جو اب زرداد کو لے گئے ہیں؟"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی! کس عدالت میں لے جانا ہے مجھے؟" وہ کچھ پریشان نظر آنے لگی۔

"بات یہ ہے بہن!" شیخ نے ایک طویل سانس لے کر کہنا شروع کیا۔ "میں خود بھی ایک پولیس افسر ہوں۔ آپ میرا شناختی کارڈ دیکھ کر اطمینان کر لیں۔" اس نے جیب سے شناختی کارڈ نکال کر آگے بڑھایا۔ معلوم نہیں وہ عورت کچھ پڑھ سکتی تھی یا نہیں مگر اُس نے کارڈ پر لگی ہوئی تصویر ضرور دیکھی اور مطمئن ہو کے کارڈ واپس کر دیا۔

"میرا آج تک زرداد سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں رہا۔ میرا نام سید اکرام شیخ ہے۔ میں نے کسی مجبوری یا لالچ کی وجہ سے یہ نوکری نہیں کی تھی۔ خدا کے فضل سے ہمارے گھر میں سب کچھ تھا۔ میں خود بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوں اور میرے والد نے شروع سے مجھے جو تربیت دی تھی وہ پولیس کی نوکری کے لیے نہیں تھی۔ انہوں نے مجھے اصول پرست، ایماندار اور فرض شناس بنا دیا تھا۔ یہ احساس مجھے بعد میں ہوا کہ یہ خوبیاں نہیں، میری خامیاں ہیں۔ شاید میں کسی بھی محکمے کی ملازمت کرتا تو دوسروں کے لیے اور اپنے لیے مشکلات پیدا کرتا۔ پولیس میں بھی دوست میں نے ایک بنایا تو دشمن دس پیدا کر لیے۔ ان دشمنوں نے میرے خلاف ہر سازش کی اور مجھے بدنام کرکے نکلوانے کی خاطر مجھ پر جھوٹے الزامات عائد کیے۔ اب تو خیر میں استعفا ہی دے چکا ہوں لیکن میرے دشمنوں نے آخری کوشش یہ کی تھی کہ مجھ پر زرداد کو گھر کے اندر گھس کر گرفتار کرنے کا الزام لگا دیا تھا۔ زرداد اُن کا آلۂ کار بنا اور جیسا بیان پولیس نے دلوانا چاہا اُس نے وہی دے دیا۔ بیان میں یہ بھی ہے کہ میں نے کسی قانونی اختیار کے بغیر گھر میں داخل ہو کے زرداد کو پکڑنے کے علاوہ خدانخواستہ تمہیں بھی مارا اور تمہارے بچوں کو بھی۔ میں قرآن پر ہاتھ رکھ کے کہہ سکتا ہوں بہن کہ میں نے تو تھانے میں کسی مجرم تک پر ہاتھ نہیں اُٹھایا، میں تم جیسی مظلوم اور بے گناہ عورت پر ہاتھ کیسے اٹھا سکتا ہوں۔ میری نظر میں یہ ناقابلِ معافی گناہ ہے اور جرم ہے۔ اگر میں ایسا کروں گا تو خود اپنی نظر میں گر جاؤں گا۔ میرے والد کو شدید ذہنی صدمہ ہوگا اور میری بہن جو کالج میں پڑھتی ہے اور مجھے فرشتہ سیرت سمجھتی ہے اُسے بہت دکھ ہوگا۔"

خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا جس میں ہم سب ایک دوسرے سے نگاہیں چُراتے رہے۔

"مجھ سے تم کیا چاہتے ہو بھائی؟" زرداد کی بیوی نے بالآخر سر اُٹھا کے کہا۔

"کچھ نہیں۔ صرف اتنا کہ کبھی ضرورت پڑے تو کہہ دینا کہ جو الزام مجھ پر لگایا گیا ہے، غلط ہے۔" شیخ نے کہا۔ "جانتی ہو کہ میں زرداد کو لے گیا تھا، نہ میں نے تمہارے ساتھ کوئی زیادتی کی تھی۔ میں نے تو آج پہلی بار اس گھر میں قدم رکھا ہے۔"

"یہ تو سچ ہے۔" زرداد کی بیوی نے کہا۔ "اور سچ بولنے میں کیا ہے۔"

"بعض اوقات حالات آدمی کو اتنا بے بس کر دیتے ہیں بہن کہ وہ سچ نہیں بول سکتا۔" شیخ نے کہا۔ "فرض کرو زرداد ہی کا معاملہ ہو۔ پولیس تمہیں مجبور کرے کہ اپنے شوہر کے بیان کی تائید کرو۔ ورنہ......"

"ورنہ کیا؟ وہ اُس پر تشدد کریں گے؟ تشدد جھیلنے کا تو زرداد عادی ہے۔" وہ تلخی سے بولی۔ "اسے جھوٹے کیس میں پھنسا کے جیل بھجوا دیں گے؟ جیل تو اسے کئی بار ہو جاتی مگر نہیں ہوئی۔ اس نے ہر جرم کیا اور پولیس کی پشت پناہی کے باعث بچ گیا۔ میں سمجھ لوں گی کہ اُسے پرانے گناہوں پر اب سزا ملی ہے۔"

اس عورت کی ثابت قدمی نے اور مظلومیت نے مجھے حیران کر دیا۔ میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ اس کا ذہن نفرت کے ردِعمل کا شکار تو نہیں ہے، وہ شعوری طور پر اپنے شوہر سے اس کے مظالم کا انتقام تو نہیں لینا چاہتی؟

"آزمائش کا وقت آتا ہے تو زبانی دعوے ریت کی دیوار ثابت

ہوتے ہیں۔" شیخ نے کہا۔ "یہ بھی ہو سکتا ہے بہن کہ خود تمہاری ذات براہِ راست کسی وحشیانہ بربریت کا نشانہ بن جائے۔ تم عورت ہو اس لیے میں تم سے یہ توقع نہیں رکھتا کہ تم ہر ظلم برداشت کرلو گی۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ خدانخواستہ اب کوئی غیر قانونی طور پر اس گھر میں قدم رکھے تو مجھے بتانا۔ میں تم کو اپنے گھر اور آفس کا پتا دے کر جاؤں گا۔ فون میرے گھر پر بھی ہے اور دفتر میں بھی۔ تم کسی طرح مجھے اطلاع کرا دینا اور ان کو بتا دینا کہ سید اکرام شیخ میرا بھائی ہے۔ پھر میں سب سے نمٹ لوں گا۔"

"میرے چچا ایس، ایس، پی ہیں۔" میں نے کہا۔ "پولیس کے بہت بڑے افسر۔ وہ سب کو تمہارے سامنے کھڑا کر دیں گے۔ تم بتانا کہ وہ کون تھے جو اکثر زرداد کے پاس آتے تھے اور جو اسے لے گئے تھے۔ اس کے بعد تم بالکل محفوظ رہو گی۔"

"مجھے اپنی فکر نہیں بھائی!" وہ سر جھکا کے بولی۔ "بس زرداد کی جان ان لوگوں سے چھوٹ جائے جنہوں نے اسے اپنے شیطانی جال میں پھنسا رکھا ہے اور وہ راہِ راست پر آجائے۔"

میں نے اور شیخ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ وہ راہِ راست پر کیا آئے گا جو کبھی لوٹ کر نہ آنے والے راستوں پر جا چکا ہو۔ زرداد کی بیوی سے یہ تو ثابت ہو گیا تھا کہ اس خود ساختہ وکیل نے اپنے جھوٹ سے ہمیں خوفزدہ کر کے یہ چاہا تھا کہ کسی طرح ہم مصالحت پر مجبور ہو جائیں اور ان کے لیے استاد پیڈرو کا رول کرنے والے کو چھوڑ دیں۔ زرداد، پولیس کا خاص آدمی تھا چنانچہ حشمت خان یا میر محمد کے قاتلوں نے اس کو معقول معاوضے کے وعدے پر ایک خاص مقصد کے لیے استعمال کیا تھا۔ اگر وہ جعلی وکیل اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا تو زرداد کا کچھ نہ بگڑتا۔ اسے معاوضہ ادا کر دیا جاتا اور وہ حسبِ سابق پولیس کے لیے کام کرتا رہتا مگر اس وکیل کا واسطہ شیخ جیسے خر دماغ افسر سے پڑ گیا۔ مجبوراً اسے زرداد کا قصہ ہی پاک کرنا پڑا۔ زرداد جیسے پولیس کو ہر وقت دستیاب رہتے ہیں اور کہیں کام بگڑ جائیں تو خس کم جہاں پاک والی بات ہوتی ہے۔ بظاہر زرداد کی بیوی بھی اس کے ساتھ انتہائی مجبوری میں زندگی گزار رہی تھی اور اس نے خود کو "زندہ درگور" بھی کہا تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں نکالا جا سکتا تھا کہ وہ زرداد سے چھٹکارا چاہتی تھی اور اس کی موت کو بھی ذریعہ نجات سمجھ کے قبول کر سکتی تھی۔ اس کے لیے وہ جیسا بھی تھا شوہر تھا۔ سرتاج، مجازی خدا، سہاگ کا سیندور اور مانگ کی افشاں۔ اس مرد کے رشتے کے ان گنت نام تھے۔ اس کے بغیر وہ بیوی نہیں، بیوہ ہو جاتی تھی اور بیوگی کا تمغہ کوئی سہاگن نہیں مانگتی۔ خواہ وہ کسی چور، ڈاکو، شرابی جواری یا قاتل کی بیوی ہی کیوں نہ ہو۔ یہی وجہ تھی کہ اب تک وہ بات کہنے کی جرأت ہم دونوں میں سے کسی نے نہیں کی تھی جو سب سے اہم اٹل اور بے رحم حقیقت تھی۔

"اگر تم اس کے ساتھ نباہ کرنا اتنا ہی مشکل سمجھتی ہو تو اس سے علیحدگی اختیار کر لو۔" شیخ نے کہا۔

اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ "اگر یہ میرے اختیار میں ہوتا، تو میں ضرور کر لیتی۔" اس نے رک رک کے کہا۔ "لیکن میرا باپ کہتا ہے میں عورت کی ڈولی جائے وہاں سے اس کا جنازہ ہی نکلنا چاہیے۔ نہیں آتا کہ میں تو اب بھی چلتی پھرتی لاش ہی ہوں۔ اسے زندگی کوئی؟ میرا جنازہ تو کب کا اٹھ چکا۔ میرے ارمانوں کا، میری امیدوں کا۔ اس محبت کا جو میں اپنے شوہر کو دے سکتی تھی اور طلب کر سکتی تھی۔ سب کا جنازہ اٹھ چکا۔ وہ خود زرداد جیسا نہیں اپنی زندگی تو گزار لی۔ اس کی بیوی نے یعنی میری ماں نے کبھی نہیں مر جائے یا اس کو مارنے والا مر جائے۔"

"اور تم چاہتی ہو، تمہیں آتا ہے یہ خیال کہ وہ مر جائے؟" کو نارمل رکھنے کی سخت جدوجہد کی۔

"جب زندگی کا عذاب اتنا سخت ہو گا تو آدمی کیا چاہے گا؟" لہجے میں بولی۔ "طلاق تو وہ مجھے دیتا نہیں۔ کہتا ہے ٹکڑے کر کے لیکن یہ طعنہ برداشت نہیں کروں گا کہ جورو نے چھوڑ دیا۔ موت کے سوا کوئی راستہ ہے؟"

"اچھا بہن!" شیخ نے ہمت کر کے کہا۔ "شاید خدا کو یہی منظور .... کہ تمہیں نجات بھی ملے تو دکھ اٹھا کے۔"

"ہم یہاں آئے تھے۔" میں نے کہنا شروع کیا۔ "تو ہمارے ایک مقصد اور بھی تھا۔ وہ جیسا بھی تھا، تمہارا شوہر تھا اور تمہارے باپ تھا....."

"اور جو کچھ اس کے ساتھ ہوا، وہ یقیناً بہت برا ہوا...." شیخ بات آگے بڑھائی۔ "انہیں اس کی سزا ضرور ملے گی..... میرا مطلب اس ظلم کے ذمہ دار ثابت ہوں گے.... قانون سب کے لیے ایک ہے۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" وہ چلائی۔ "جو کچھ کہنا ہے صاف کیا وہ مر گیا ہے؟"

"ہاں بہن! ہم تمہیں یہ بری خبر سناتے ہوئے ڈرتے تھے۔" میں کہا۔ "اب تم حوصلے سے اور صبر سے کام لو....."

"اور ہمیں بتاؤ کہ اس کو اپنے ساتھ لے جانے والے کون تھے؟" نے کہا۔

زرداد کی بیوی نے سینے پر ایک دو ہتڑ مارا۔ "مار دیا اسے؟ میرے زرداد کو۔" اس نے چیخ کر کہا۔ "بے رحمو.... قتل کر دیا تم مجھے بھی مار دو اب تو!" اس نے چلا چلا کر بین کرنا شروع کر دیا۔ عورت تھی جو ابھی ایک لمحہ پہلے طلاق یا موت، ہر صورت میں زرداد سے قبول کرنے پر آمادہ تھی۔

"..... ارے لوگو! .... ارے خدا غارت کرے انہیں نے مجھے بیوہ کر دیا..... خدا ان سب کے گھر برباد کرے جنہوں نے بچوں کے سر سے باپ کا سایہ چھینا۔" وہ سر پر ہاتھ مار مار کے چیخنے ذرا سی دیر میں ارد گرد کے بہت سے گھروں کی عورتیں اندر آ گئیں۔

دروازے پر اکٹھا ہونے لگے۔ میں اور شیخ اس صورتِ حال کے لیے قطعی تیار نہ تھے مگر اب شیخ کو سامنے آنا پڑا۔ میرے ساتھ باہر آ کے اس نے لوگوں پر ایک نظر ڈالی۔

"میں سب انسپکٹر شیخ ہوں۔" اُس نے اپنا کارڈ دکھا کے کہا۔ "میں زرداد کے فوت ہونے کی اطلاع لے کر آیا تھا۔ میرا تعلق اس علاقے کے تھانے سے نہیں ہے۔ میں نے سُنا ہے کہ اسے پولیس والے لے گئے تھے۔ آپ میں سے کوئی عینی گواہ ہے؟"

شیخ کی بات کا جواب وہ خاموشی تھی جو دیکھنے اور سُننے والوں کے دلی جذبات اور احساسات کی عکاسی کرتی تھی۔ شیخ بھی پولیس مین تھا اور وہ بھی پولیس والے تھے جو زرداد کو قتل کرنے کے لیے گھر سے اٹھا کر لے گئے تھے چنانچہ شیخ کے اعتراف کا ردِعمل غیر متوقع نہیں تھا ہر جگہ لوگ اسی طرح پولیس کو عوام دشمن، بے رحم، بے ضمیر اور بدعنوان و بدکردار افراد کا ایسا ٹولہ سمجھتے ہیں جو قانون کی مدد سے تحفظ فراہم کرنے کی ذمے داری پوری نہیں کرتا۔ قانون کی آڑ میں من مانی کارروائی کرتا ہے اور ان کے ظلم کا نشانہ وہی بنتے ہیں جن کا خدا کے سوا کوئی نہ ہو۔

"کیا بات ہے؟" شیخ نے سخت لہجے میں کہا۔ "آپ سب کی زبانوں کو تالے کیوں لگ گئے؟ مجھے بتایا گیا تھا کہ اس واقعے کے چشم دید گواہ محلے والے ہیں۔ کسی نے تو دیکھا ہوگا کہ زرداد کو لے جانے والے کون تھے؟"

"ایسے بھولے مت بنو تھانیدار بادشاہ!" ایک پہلوان قسم کے شخص نے آگے بڑھ کر کہا۔ "تم سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہو، سب جانتے ہوئے بھی ہم سے ہی پوچھ رہے ہو۔"

"تاکہ ہم میں سے جو بولے اسے گواہی میں پکڑ کے لے جاؤ۔" لمبے لمبے بالوں والے ایک نوجوان نے چلّا کر کہا۔ "اور تھانے لے جا کر اس کا بھی وہی حشر کرو جو زرداد کا کیا۔ تاکہ تمہاری مرضی کے مطابق بیان دے۔"

"یا سادہ کاغذ پر دستخط کر دے۔" ایک مولوی ٹائپ شخص نے غصے سے کہا۔ "جس پر تم جو چاہو لکھ لو۔"

"ارے یہ سب ایک جیسے ہی ہیں۔ جرم خود کیا ہے، پھنسانا ہمیں چاہتے ہیں۔" کسی نے پیچھے سے چیخ کر کہا۔ مجمع اب پہلے سے کہیں زیادہ ہو گیا تھا اور ایک بات سے اُن کی زبانیں کھل گئی تھیں۔ اپنی افرادی طاقت کا احساس ان کے مشتعل جذبات کو ہوا دے رہا تھا۔

"آپ لوگ غلط سمجھ رہے ہیں۔" شیخ نے ہاتھ اٹھا کے کہا۔ "زرداد تو مر گیا۔ اب اس کیس میں ان لوگوں کی گرفتاری ضروری ہے جو زرداد کو کسی جرم اور کسی وارنٹ کے بغیر لے گئے تھے۔ آخر اُن کی شناخت کیسے ہوگی؟"

"ارے تھانیدار بادشاہ! زیادہ اُلّو مت بناؤ ہمیں۔" پہلوان نے ایک قدم آگے بڑھ کے کہا۔ "تم کو سب معلوم ہوگا کہ کس نے زرداد کے ساتھ کیا ظلم کیا اور اس کے قاتل کون ہیں۔ ہم بڑے خراب آدمی ہیں۔ غصہ آجائے تو یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ ہمارا باپ کون تھا؟"

"مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں کہ تم کیسے آدمی ہو۔" شیخ نے متانت سے کہا۔ "اصل مسئلہ کچھ اور ہے۔ اگر تم میں سے کسی نے نہ کیا کہ اس نے مجرموں کو دیکھا تھا تو مجھے مجبوراً زرداد کی بیوہ کو لے جانا پڑے گا۔ وہ پہچانتی ہے سب کو۔"

"تم اس کی بیوہ کو تھانے لے جاؤ گے؟" نوجوان چیخ کر بولا۔ "عورت کو؟"

"اور عورت بھی وہ جو عدت کا زمانہ پورا کیے بغیر گھر سے باہر نکل سکتی۔" مولوی نے کہا اور گویا اجتماعی فیصلہ سُنا دیا۔

"ارے قسم ہے اپنے پیدا کرنے والے کی تھانیدار بادشاہ!" پہلوان نے مونچھوں پر تاؤ دے کر کہا۔ "ہمارے ہوتے ہوئے تم نے عورت ذات کی طرف نظر اٹھا کے بھی دیکھا تو ہم اپنی اور تمہاری جان ایک کر دیں گے۔"

"تم لے جا کر تو دیکھو اس بیوہ عورت کو ...." پیچھے سے کسی نے بات مکمل کرنے کے بعد ایک زبردست گالی دی۔ اس کے ساتھ ہی دیگر افراد نے پولیس کی ہجو شروع کر دی۔ "ہوگا سالا تھانیدار کی اولاد۔ ہم پر رعب جماتا ہے۔ اکڑ کرتا ہے ..... ہم سے سالا۔" پہلوان سب سے آگے تھا۔ "پکڑو۔ مارو سالوں کو۔ یہیں گاڑ دو۔" لوگ چلّانے لگے۔ شیخ کی آواز ان کے شور میں دب گئی۔ پھر پہلوان نے شیخ کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔ شیخ نے اس کا ہاتھ جھٹک کے اسے پیچھے دھکیل دیا مگر اتنی دیر میں لوگ آگے بڑھ آئے تھے۔ فرداً فرداً وہ سب کمزور حریف تھے مگر ایک مشتعل ہجوم بڑی تباہ کن قوت بن جاتا ہے۔ کئی ہاتھ اوپر اٹھے۔ میں اور شیخ ذرا سے پیچھے ہٹ گئے۔ پیچھے صحن کا کھلا میدان تھا۔ آٹھ دس افراد ایک ساتھ ہم پر حملہ آور ہوئے۔ اس سے پہلے کہ شیخ اپنا ریوالور نکالتا میں نے اپنے بچاؤ کے لیے پوزیشن سنبھال لی تھی۔ میری لات مگدر کی طرح پہلوان کے پیٹ پر لگی اور وہ بلبلا کے لیٹ گیا اور ہائے ہائے کرنے لگا لیکن اس سے مشتعل افراد میں اضافہ ہو گیا۔ میں نے دوسرے شخص کو دائیں ہاتھ کے وار سے چت کیا۔ ایک کو ہاتھ تھام کے جھٹکا دیا اور اپنے پیچھے اچھال دیا۔ میرا گھٹنا ایک اور شخص کی ٹانگوں میں لگا۔ میرے ہاتھ پیر بجلی کی طرح چل رہے تھے لیکن میں مشتعل نہیں تھا اور مجھے ہر لحظہ یہ خیال تھا کہ کسی کو کاری ضرب نہ آئے۔ ایک منٹ میں وہ سب ڈھیر ہو گئے جو سورما بن کے آئے تھے۔ آخری آدمی کو میں نے درمیان سے پکڑ کے اٹھا لیا، گھمایا اور باقی مجمع کی طرف اچھال دیا۔ بچا اس ہو جانے والے اور ... رہ کر بہادری کا مظاہرہ کرنے والے پلٹ کر بھاگے۔ اسی وقت شیخ نے ریوالور نکال لیا۔ "ٹھہر جاؤ!" اس نے گرج کر کہا۔ "ورنہ میں گولی مار دوں گا!" اس نے ایک ہوائی فائر کیا۔

فرار ہونے والے اپنی اپنی جگہ منجمد ہو گئے۔ میں نے ایک جست لگائی اور ان کے درمیان سے گزر کے گلی میں آگیا۔

"سب اندر۔" میں نے انہیں ریوڑ کی طرح ہانکتے ہوئے کہا۔

صرف لمبے بالوں والے نوجوان نے مجھے غچہ دے کر نکلنے کی کوشش کی مگر میں نے ٹانگ آگے بڑھائی اور وہ گلی میں منہ کے بل گرا۔ میں نے اُسے گدی سے پکڑ کے اٹھایا اور اندر کی جانب دھکیل دیا۔ سب لوگوں کے صحن میں جمع ہوتے ہی میں نے دروازے کی کنڈی لگا دی۔ وہ سب ایک گوشے میں غنیم کے شکست خوردہ اور اسیر ہو جانے والے دستے کی طرح کھڑے تھے۔ سب کو نہ سہی ان میں سے چند ایک کی صورت دیکھ کر واقعی ہنسی آتی تھی شاید وہ سمجھ رہے تھے کہ اب ہم انہیں دیوار سے لگا کے شوٹ کر دیں گے، مُرغا بنا دیں گے ورنہ تھانے تو لے ہی جائیں گے۔ میرے اور شیخ کے کپڑے بھی اس ہاتھا پائی میں پھٹ گئے تھے اور ہم غالب حریف ہونے کے باوجود قابلِ رحم لگتے تھے۔

"تم سب کا جرم بہت سنگین ہے۔" شیخ نے ریوالور کا رخ ان سب کی طرف کر کے کہا۔ "تم نے ان پولیس افسروں پر ہاتھ اٹھایا جو ڈیوٹی پر تھے اور فرائض کی انجام دہی میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی۔ گواہی دینے سے انکار کیا اور... حقائق کو جانتے بوجھتے چھپانا چاہا۔ ان سب جرائم پر متعدد قانونی دفعات لاگو ہوتی ہیں اور تم سب کی سزا تین سال سے سات سال تک کی قیدِ بامشقت ہو سکتی ہے۔" اس نے اپنی بات کا تاثر دیکھنے کے لیے ایک ڈرامائی وقفہ دیا۔

یکلخت کسی نے دھاڑیں مار مار کے رونا شروع کر دیا۔ "آپ کو اللہ رسول کا واسطہ تھانیدار صاحب! غلطی ہو گئی مجھ سے۔"

دو چار افراد میں اب بھی جرأتِ رندانہ باقی تھی اور ان کی آنکھیں چیلنج دیتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں کہ ہمت ہے تو اپنی تھانیداری اور اپنا ریوالور چھوڑ کے سامنے آؤ لیکن بیشتر افراد کی حالت غیر تھی۔ انہیں اپنے جذبات کی رَو میں بہہ جانے کا افسوس تھا۔ یہ زندگی کا ایک اور عملی سبق تھا کہ پرائے پھڈے میں پڑ کے آدمی کس طرح خوار ہوتا ہے۔

لیکن شیخ نے ریوالور جیب میں رکھ کر خیر سگالی کے جذبات کا اظہار کرنے میں پہل کی۔ "میں آپ سب کو کچھ نہیں کہوں گا۔ معاف کرنے کا لفظ مجھے زیب نہیں دیتا۔ آپ سب میری ہی طرح جذبات سے مغلوب ہو جانے والے انسان ہیں۔ آپ لوگوں کو پولیس کے مظالم کی شکایت ہے اور اپنے ایک محلے دار کی موت کا افسوس ہے جو شریف آدمی تو نہیں تھا لیکن سزائے موت کا مستحق بہرحال نہ تھا۔ میں کسی کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کروں گا لیکن آپ سب کو سچ بولنا ہوگا۔ اپنا نام پتا بتاتے جائیں تاکہ مجھے اندازہ ہو کہ یہاں پڑوس میں کون رہتا ہے یا پھر جنہوں نے سب کچھ دیکھا تھا، وہ رضاکارانہ طور پر آگے آجائیں اور میرے ساتھ اس علاقے کے پولیس اسٹیشن تک چلیں۔ آپ لوگ نہیں جانتے تو میں بھی زرداد کی بیوی کو تھانے جا کر گناہگار ہونا نہیں چاہتا۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ آپ لوگوں پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔ بس اُن لوگوں کی نشاندہی کر دیں جو تھانے سے آئے تھے اور زرداد کو اٹھا کر لے گئے تھے۔ میں آپ لوگوں کے ساتھ ہوں۔ میرا مقصد بھی صرف یہی ہے کہ مجرموں کو سزا ملے۔ یہ کوئی نیکی یا بہادری نہیں ہے جس کا مظاہرہ ابھی ہوا تھا۔ کرنا ہے تو عملی طور پر کچھ کیجیے۔ گواہی دیجیے بے خوف ہو کے۔"

میں دیکھ رہا تھا کہ لوگوں کی صورتوں کے تاثرات تیزی سے بدل رہے ہیں۔ شیخ کی بات کا ردِعمل انتہائی خوشگوار ہو رہا تھا۔ انھوں نے کسی تھانیدار کے لبوں سے اس لہجے میں ایسی باتیں کبھی نہیں سُنی تھیں چنانچہ وہ حیران تھے، پشیمان تھے اور نفرت کی جگہ ان کی صورتوں پر دوستانہ جذبات کا عکس یوں پھیلنے لگا تھا جیسے تاریکی کے بعد صبحِ صادق کی روشنی پھیلتی ہے۔

مولوی ٹائپ شخص نے سب سے پہلے خود کو پیش کیا۔ وہ زرداد کا ایک ہمسایہ تھا پھر پہلوان نے سر ہلایا جو اب تک کمر پر ہاتھ رکھے مجھے خونخوار نظروں سے گھور رہا تھا۔ کل کے لونڈے نے جو اس سے عمر، وزن اور جسامت میں نصف بھی نہیں تھا اس کی برسوں میں قائم ہونے والی ..... ساکھ پل بھر میں خاک میں ملا دی تھی۔ وہ زرداد کا دوسرا ہمسایہ تھا۔

"دو گواہ کافی ہیں۔" شیخ نے کہا۔ "باقی لوگ جا سکتے ہیں۔ بہتر ہوگا کہ کچھ لوگ ہسپتال جا کے زرداد کی میت لائیں اور تجہیز و تکفین کا بندوبست کریں۔"

اسی وقت مجھے پہلی بار زرداد کی بیوی کا خیال آیا۔ فساد کے اندیشے کے علاوہ فائر کی آواز سے دہشت زدہ ہو کے وہ کمرے میں گھس گئی تھی۔ میں نے بڑی مشکل سے دروازہ کھلوایا۔ اُس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو خشک ہو چکے تھے۔

"آپ ہمت سے کام لیں بہن!" میں نے کہا۔ "محلے والے آپ کے ساتھ ہیں اور ہم تھانے جا رہے ہیں تاکہ وہ مجرموں کی نشاندہی کر سکیں۔ آپ کے بچے کہاں ہیں؟"

"دونوں بچے، نانا اور نانی کے ساتھ رہتے ہیں۔" وہ بولی۔ "میں خود تو بھوک بھی برداشت کر لیتی تھی، محلے والے دے جاتے تھے تو صبر شکر کے ساتھ یہ خیرات بھی قبول کر لیتی تھی اور وہ نشے میں مجھے گالیاں بھی بکتا تھا، میری ہڈیاں توڑتا تھا تو یہ ظلم بھی سہتی تھی لیکن میں نہیں چاہتی تھی کہ بچوں کی نظر میں یہ گھر یتیم خانہ ہو۔ جہاں اُن کو خیرات سے پیٹ بھرنا پڑتا ہو۔ مجھے ان کے سامنے ذلیل ہونا قبول نہیں تھا۔ وہاں وہ سکھ سے رہتے ہیں۔ وہ گھر ایسا تو ہے کہ انھیں محبت اور شفقت بھی مل رہی ہے اور ان کی پرورش بھی عزت کے ساتھ ہو رہی ہے۔ یہاں رہتے تو وہ گھر سے متنفر ہو جاتے۔ ماں باپ سے نفرت کرتے اور گھر کی قید سے نکل جاتے تو غلط صحبت میں پڑ کے وہی بنتے جو اُن کا باپ تھا۔"

"ہاں۔" میں نے سوچا۔ "ایسا ہی ہوتا آیا ہے اور ایسا ہی ہوتا رہے گا۔ ہم جو بچوں کی فلاح و بہبود کے شاندار منصوبے بناتے ہیں، کام کے لیے رفاہی ادارے قائم کرتے ہیں، سیمینار منعقد کراتے ہیں جن میں پُرمغز مقالے

پڑھے جاتے ہیں۔ بچوں کا عالمی دن مناتے ہیں۔ وہ معاشرہ جو آج کے بچوں کو آنے والے کل کا معمار کہتا ہے، یونیسیف اور بچوں کی نفسیات کے ماہرین، ہم سب مل کے بھی کچھ نہیں کر سکتے۔

پولیس اسٹیشن زیادہ دور نہیں تھا لیکن میں اور شیخ اسکوٹر پر تھے چنانچہ دونوں چشم دید گواہوں کو رکشا لینا پڑا جب تو تھانے پولیس اسٹیشن میں خاصا دلچسپ تماشا ہوا۔ پہلی نظر میں تھانے کے عملے نے ہمیں مجرم اور رکشا سے اترنے والے آنے والوں کو مدعی سمجھا۔ پھر انھیں یہ نقص امن کا کیس لگا جس میں فریقین الگ الگ آئے تھے اور ظاہری حالت سے ایک جیسے مضروب و مظلوم لگتے تھے۔ شیخ کے اعلان نے اُن کو دم بخود کر دیا۔ انھوں نے پھٹے کپڑوں میں پٹ کر آنے والے کسی پولیس افسر کو اتنے سکون سے ایسے شریفانہ لہجے میں بات کرتے نہیں دیکھا تھا۔ ایس ایچ او صاحب بہادر تو گشت پر تشریف لے گئے تھے لیکن ایک سب انسپکٹر ڈیوٹی پر تھا۔ اس نے شیخ کو اور مجھے بڑی عزت سے کمرے میں بٹھایا اور بادل نخواستہ محترم گواہوں کے لیے بھی کرسیاں طلب کیں۔ پوری بات سننے کے بعد اس نے قطعی لاعلمی ظاہر کی۔

"میری ڈیوٹی کے دوران میں تو یہ واردات ہوئی نہیں شیخ صاحب!" وہ تمسخر آمیز لہجے میں زیرلب مسکرایا۔ "آپ کہتے ہیں تو روزنامچہ دیکھ لیتے ہیں۔"

"روزنامچے میں اس قسم کا کوئی اندراج نہیں ہوگا۔" شیخ نے کہا۔ "اس لیے خواہ مخواہ تکلیف مت کرو۔"

"اچھا جی پھر آپ ہی فرما دیں کہ میں کیا کروں؟" انسپکٹر نے کہا۔ "تھانے میں تو ڈیوٹی بدلتی رہتی ہے۔ میں ساری نفری کو اس وقت شناختی پریڈ کے لیے لائن حاضر نہیں کر سکتا۔"

"مجھ سے ایسے بات مت کرو جیسے میں نے کبھی تھانہ نہیں دیکھا۔" شیخ نے تند لہجے میں کہا۔ "تمھاری طرح میں بھی ایک پولیس اسٹیشن میں ہوں اور جب ڈیوٹی ہوتی ہے تو وہی کرتا ہوں جو تم کر رہے ہو۔ اس وقت جو لوگ حاضر ہیں انھیں بلاؤ۔"

"تم مجھے ایسے حکم دے رہے ہو جیسے تم ہی میرے افسر اعلیٰ ہو۔ یا ایس۔ ایس۔ پی ہو۔" انسپکٹر بولا۔ "اگر میں انکار کر دوں تو تم کیا کرو گے شیخ صاحب!"

"اس کے بعد کچھ مجھے بھی کرنا پڑے گا۔" میں نے شیخ کے جواب دینے سے پہلے کہا۔ "ایس۔ ایس۔ پی ضامن رضوی صاحب ہی یہاں آئیں گے اور یہ شناختی پریڈ اُن کی موجودگی میں ہو گی جس میں تھانے کی ساری نفری اٹینشن کھڑی ہو گی۔ جو ڈیوٹی پر ہوں گے وہ بھی اور جو نہیں ہوں گے وہ بھی حاضر ہوں گے۔ میں انھی کے گھر میں رہتا ہوں اور اُن کا چھوٹا بھائی ہوں۔ تم ابھی تو ہمیں ٹال سکتے ہو کیونکہ رضوی صاحب اسلام آباد گئے ہوئے ہیں لیکن دو چار دن میں حقائق بدلیں گے اور نہ گواہ۔ گواہوں کو بدلنے کی کوشش بھی مت کرنا۔ تم جانتے ہی ہو گے کہ رضوی صاحب کس قسم کے افسر ہیں۔"

انسپکٹر کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ "تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟"

"نہیں۔" میں نے کہا۔ "لاؤ یہ فون مجھے دو۔ مجھے ویسے بھی ان سے بات کرنی تھی۔ یہیں سے کر لیتا ہوں اور یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ مسئلہ کیا ہے۔ وہ ان سے بات کریں گے۔ فون تو میں باہر سے بھی کر سکتا ہوں یا شیخ کے ساتھ جا... لیکن اس کے بعد تمھاری پوزیشن زیادہ خراب ہو جائے گی انسپکٹر! جب رضوی... براہ راست تمھیں فون کریں گے یا ایس ایچ او سے وضاحت طلب کریں گے۔ اچھی طرح سمجھ لو کہ ہم اس کیس میں اصل مجرموں کی معطلی یا گرفتاری تک کوئی... نہیں کریں گے۔"

انسپکٹر کچھ دیر سوچتا رہا۔ اس کے اپنے علاقے کے دو افراد کے سامنے کی خاصی سبکی ہوئی تھی لیکن ہمارے جارحانہ تیور بتاتے تھے کہ ہم ٹلنے والے نہیں ہیں... عدم تعاون کا نتیجہ مزید خرابی کا باعث ہوگا۔ اس نے میز پر رکھی ہوئی زنگ خوردہ گھنٹی پر زور سے ہاتھ مارا جس سے محض ایک بار ٹن کی آواز پیدا ہوئی اور ایک کانسٹیبل نے چق سے جھانکا۔

"تھانے کے اندر کون کون ہے اس وقت؟" انسپکٹر نے کہا۔ "ایک ایک کے سب کو بلاؤ۔"

شیخ نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس میں بہت وقت لگے گا۔ تم وہ رجسٹر منگواؤ جس میں سب کی تصویریں اور نام پتے ہوں گے۔"

لوہے کو لوہا کاٹ رہا تھا۔ ایک انسپکٹر تھا تو دوسرا بھی سب انسپکٹر...

...پھول زیادہ تھا تو دوسرا عقل و ذہانت میں اس سے ایک ہم آتے تھے لیکن اس وقت ہمیں سخت مایوسی ہوئی جب گواہوں نے کسی کو شناخت نہیں کیا۔ میرے نزدیک اس کے دو اسباب ہو سکتے تھے۔ ایک یہ کہ وہاں گواہ جانتے بوجھتے انجان بن رہے تھے۔ انھیں بعد میں بھی اسی علاقے میں رہنا تھا اور زرداد کے انجام کے بعد یہاں رہ کے مگرمچھ سے بیر رکھنے کے فیصلے کی ہیبت ان پر عیاں ہو چکی تھی۔ دوسری یہ کہ فی الحقیقت اغوا کنندگان کا تعلق اس تھانے سے تھا ہی نہیں۔ دوسری وجہ مجھے زیادہ قرین قیاس لگی۔ یہ ہو سکتا تھا کہ حشمت خان جیسے کمینے نے بقلم خود مارا ہو یا پولیس کی وردی میں پولیس والے نہ ہوں۔

گواہوں کو ضرورت کے وقت حاضر ہونے کی ہدایت دے کر رخصت کرنے کے بعد ہم نے رسماً یا اخلاقاً انسپکٹر سے معذرت کی اور انسپکٹر مذکور نے ہمیں بڑی فراخ دلی سے معاف بھی کر دیا۔

"یہ تو بڑا عجیب معاملہ ہو گیا۔" میں نے تھانے سے نکل کے اسکوٹر کی پچھلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "ہم نے جھک ماری۔ زرداد کے اغوا کا ڈراما کرنے والے ہاتھ تو آئے نہیں۔"

"پھر بھی ایک بوجھ تو سر سے اترا۔" شیخ نے اسکوٹر چلاتے ہوئے کہا۔ "کہ مجھ پر کوئی الزام نہیں۔ اب رہ گیا زرداد کی پراسرار موت کا معاملہ۔ تو ہمارا اس سے کیا تعلق۔ وہاں استاد پیدو نام کا ایک شخص بند تھا جس کی لاش ہم نے موت کے بعد پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دی تھی۔ اس لاش کا کیا ہوا؟ یہ اسپتال والے ہی بتا سکتے ہیں اور میرا خیال ہے کہ جب اس کے متعلق کوئی پوچھے گا نہیں تو انھیں وضاحت کی ضرورت بھی پیش نہیں آئے گی۔ زرداد کا معاملہ دوسرے تھانے کا ہے جہاں سے ہم آئے ہیں۔ وہ انھیں رپورٹ کرے کہ کس طرح گھر سے اٹھایا گیا تھا۔ اٹھانے والے کون تھے اور اس کی لاش اسپتال کیسے پہنچی۔ اس کی تفتیش بھی انھی کا کام ہے لیکن وہ انھیں خود ہی ایسے چکر میں نہیں پڑیں گے چنانچہ زرداد کی تدفین اس طرح ہو جائے گی جیسے وہ اپنے گھر میں طبعی موت مرا۔ نہ اسپتال والوں کے لیے پریشانی۔ نہ پولیس کے لیے۔ زرداد جیسے لوگوں کی موت بھی ویسی ہی ہوتی ہے جیسی ان کی زندگی۔"

"یہ بھی غنیمت ہے کہ زرداد کی بیوی کے پاس اپنا مکان ہے۔" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ "اور ابھی باپ بھی ہے جس کی آمدنی سے گھر کا خرچ چل جاتا ہے۔ خدا کرے جب تک اس کے اپنے بچے کمانے کے قابل نہ ہو جائیں یہ سہارا باقی رہے۔"

"میں تو عورت کی فطرت پر انگشت بدنداں ہوں جناب!" شیخ نے افسوس سے سر ہلایا۔ "ذرا دیر پہلے وہی عورت کہہ رہی تھی کہ خدا اسے موت دے دے یا مجھے۔ اور موت کی خبر ملی تو سب بھول گئی۔"

"آدمی زبان سے جو کچھ کہتا ہے یا کسی مخصوص ذہنی کیفیت میں کہہ جاتا ہے اس کا دلی جذبات سے لازمی تعلق نہیں ہوتا۔" میں نے کسی فلسفی کی طرح کہا۔ "اب یہ سب کہنے والی کی تلخ یادوں کے باعث وہ مرنے والے کو جلد بھول جائے گی۔ میں اسلام آباد ہو آؤں۔ پھر استاد ڈیڈی کی مدد سے معلوم کرنے کی کوشش کروں گا کہ زرداد کو فرضی اغوا کرنے والے کون تھے۔"

"چھوڑو اس چکر کو میاں!" شیخ نے کہا۔ "معلوم کچھ بھی نہیں ہوگا۔ اپنے وقت اور اپنی توانائی کو اپنے مسائل کے لیے بچا کے رکھو۔ دکھ مجھے بھی ہے اور میرا بھی دل چاہتا ہے کہ وہ خبیث میرے ہاتھ لگ جائیں تو ان کی کھال میں بھس بھر دوں مگر اکیلا چنا بھاڑ کو نہیں پھوڑ سکتا۔ یہ ظلم اور ناانصافی ہر طرف ہے اور ہر جگہ ہے۔ زرداد کے انصاف کو خدا پر چھوڑ۔ ایسے زرداد تو لاتعداد ہیں جن کے لیے کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ بتا تجھے کہاں چھوڑ دوں؟"

"مجھے میرے گھر کے دروازے پر گرا دے، میرا مطلب ہے ڈراپ کر دے۔" میں نے کہا۔ "ایک بار پھر لباسِ فاخرہ زیب تن فرما کر قصد اسلام آباد کا کرتا ہوں۔"

"اس سے زیادہ کٹھن مرحلہ مجھے درپیش ہے۔" شیخ نے کہا۔ "مجھے نا ندہ اس لباسِ فاخرہ میں دیکھ کے بہت محظوظ ہوگی تو ابا میاں سخت پریشان ہوں گے اور انھیں مطمئن کرنے کے لیے مجھے کوئی کہانی گھڑنی پڑے گی۔ پھر ڈیوٹی پر پہنچنا ہے حشمت خان کو چارج دینے کے لیے۔"

جب وہ رخصت ہوا تو شیخ نے نیک نیتی سے ہاتھ ملا کے کہا۔ "انشاءاللہ بہت جلد پھر ملاقات ہوگی۔"

"خدا کرے اسلام آباد میں سب خیریت ہو اور میں جلد لوٹ آؤں۔" میں نے کہا اور گیٹ سے اندر داخل ہو گیا۔ غسل سے فارغ ہو کے میں نے لباس بدلا تو دوپہر کا ایک بجنے والا تھا۔ میں نے بہتر سمجھا کہ پہلے اسلام آباد فون کر لوں اور پھر روانہ ہو جاؤں۔ کھانا باہر کہیں بھی کھا کے میں دو بجے والی بس یا ویگن پکڑ سکتا تھا جو مجھے سات بجے پنڈی پہنچا دے۔ میں نے خیرو والی صاحب کے گھر کا نمبر ملایا۔ خلاف توقع لائن دس منٹ میں مل گئی۔ ریسیور شہلا نے اٹھایا۔ "ہیلو!" اس نے کہا۔

"ہیلو کیا جی۔" میں نے کہا۔ "السلام علیکم۔ یہ بتائیں آپ کون ہیں؟ ہم اسی حساب سے بات کریں۔"

"سکندر بھائی! میں شہلا ہوں۔" شہلا ہنسی۔ "آپ کی آواز تو پہچان لی میں نے۔ خیریت سے ہیں نا آپ؟"

"آداب بجا لاتا ہوں آپا!" میں نے کہا۔ "یہ بتاؤ تمھارا اور دیگر اہلِ خانہ کا کیا حال ہے۔ چچی کی طبیعت کیسی ہے؟"

"چچی کی طبیعت بہتر ہے۔" وہ بولی۔ "فوزیہ کی رخصتی ہو چکی۔ آپ اس کے بعد بھی نہیں آئے۔ دونوں انکل بہت خفا ہیں۔"

"بس آج میں آ رہا ہوں شام تک۔" میں نے کہا۔ "قصد کر کے کئی بار گھر سے نکلا۔ ہر بار کالی بلی نے راستہ کاٹ دیا۔ یا کوئی ایسی ہی بات ہو گئی کہ لوٹ کے بدھو گھر کو آئے۔ تم ذرا پولیس والے انکل کو بلاؤ۔ پہلے انھیں گولی دے دوں۔"

"بلاتی ہوں۔ آپ ہولڈ کریں۔" وہ بولی۔ "یہ بھی کہہ دوں گی کہ سکندر بھائی آپ کو گولی دینا چاہتے ہیں۔"

تقریباً ایک منٹ بعد رضوی صاحب کی آواز آئی۔ "سکندر! فرصت مل گئی تمھیں؟"

"مجھے معلوم ہے انکل کہ آپ بہت خفا ہیں۔" میں نے کہنا شروع کیا۔ "لیکن یقین کیجیے......"

"کس بات پر یقین کروں ؟" رضوی صاحب نے برہمی سے کہا۔ "شہلا نے بتادیا ہے کہ تم گولی دینا چاہتے ہو۔"

اُف ، میں نے سر پکڑ لیا۔ سچ سچ بتادیا جائے۔ اُلو کی پٹھی۔ واپسی پر سمجھوں گا تجھ سے بھی۔

"قسم خدا کی انکل ! حالات ہی ایسے ہو گئے تھے شہلا نے شرارت کی ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میں نہ آتا اور وہ بھی ایسے موقع پر۔"

"آنے کی بات چھوڑو۔ تم تھے کہاں ؟" انکل نے کہا "ہم نے دن میں دو دو بار فون کیا۔ رات میں تین بار۔"

"اکیلے گھر میں وحشت ہوتی تھی انکل !" میں نے کہا۔ "عبدالودود منظر کے گھر چلا گیا تھا۔ عدالت میں درخواست دی تھی سپرارت کو اس نے روک لیا۔ اجازت اگلے دن ملی میں نے سوچا تھا کہ رات کو روانہ ہو کے صبح اسلام آباد پہنچ جاؤں گا لیکن گھر گیا تو بڑی گڑبڑ ہو گئی۔"

"تمہارے ساتھ گڑبڑ کے سوا ہوتا کیا ہے ؟" رضوی صاحب نے کہا۔

"یقین کیجیے انکل ! کہ اس میں میرا ذرا بھی قصور نہیں تھا۔ آپ بلاوجہ ناراض ہو رہے ہیں۔" میں نے مسکینی سے کہا۔

"یہ بھی آپ نے سچ فرمایا قصوروار ہمیشہ دوسرے ہوتے ہیں۔"

"دیکھیے انکل ! گھر میں چور گھس گئے تھے۔ میں کیا کرتا ؟" میں نے کہا۔ "وہ تو اتفاق ہے کہ میں نے عین وقت پر انھیں اندر جاتا دیکھ لیا، اور وہ کچھ لے جا نہیں سکے۔ بس جان سلامت لے گئے، یہی غنیمت ہے۔ انشاء اللہ جب تک زندہ رہیں گے، یاد رکھیں گے۔"

"تم نے مار پیٹ کی اُن سے ؟" رضوی صاحب نے سخت تشویش میں مبتلا ہو کے کہا۔

"اور کیا میں مار کھاتا اُن چوروں سے انکل ؟" میں نے معصومیت سے کہا۔ "چار سال جوڈو کراٹے سیکھا کس لیے تھا آخر۔ بہت عرصے بعد صحیح موقع ملا تھا۔ ایک کی تو آدھی پسلیاں ضرور ٹوٹ گئی ہوں گی۔ دوسرے کی آدھی بتیسی خلاص ہو گئی۔ ایک شاید تمام عمر ایسے چلے گا جیسے ایک پاؤں فٹ پاتھ پر ہو تو دوسرا سڑک پر۔ دوسرا دنیا کو ہمیشہ ایک آنکھ سے دیکھے گا۔ خاصی ڈینٹنگ کرانی پڑے گی دونوں کو پھر بھی اوریجنل شیپ میں آنا مشکل ہے۔"

"لاحول ولاقوۃ۔ ارے بھئی اُن دونوں کو میں نے بھیجا تھا تمھاری خیریت معلوم کرنے کے لیے۔" رضوی صاحب نے کہا۔

"اوہ ..... آئی ایم سوری انکل ... ! دیکھیے نا .... آپ نے بھی تو نہیں بتایا اور وہ بھی بس پٹتے رہے اور پھر بھاگ گئے۔" میں نے کہا۔ "اب آپ واپس آئیں گے تو میں اُن سے معذرت کرلوں گا اسپتال جا کے۔ میں رات تک پہنچ رہا ہوں۔"

"بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے۔" رضوی صاحب نے طنز سے کہا۔ "خیر اب بھی آجاؤ گے تو مسز شیرانی کی عیادت کا اخلاقی فرض تو پورا کرلو گے ورنہ بڑی معیوب بات ہوتی۔ محسن سے یہ دوستی اور اس پہ بے تعلقی کا یہ انداز۔"

"محسن میری مجبوریوں کو سمجھتا ہے انکل ! اور مجھے بھی سمجھنا ... نے کہا۔ "ذرا اسے بلادیں آپ۔"

محسن سے میری گفتگو سرسری اور مختصر ہوئی۔ اصل مقصد رابعہ کو بلوانے کا تھا۔ دو تین منٹ میں رابعہ آگئی۔ "جی ؟" وہ بولی "... ہیں جناب آج کل ؟"

"عرض کیا ہے ۔ ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی کچھ ... نہیں آتی۔" میں نے بزبانِ غالب ارشاد کیا۔

"دن رات غائب رہتے ہو۔" وہ بولی "میں نے دن ... رات کو کیا جناب کا پتا نہیں۔ کیا کر رہے تھے ؟"

"دن میں مثنوی زہرِ عشق پڑھتا رہا۔" میں نے کہا۔ "رات کو ... چلا گیا۔ شرفاء کا قاعدہ پہلے یہی تھا۔"

"میں شرفاء کی نہیں تمھاری بات کر رہی تھی۔" وہ بولی۔ "اندازہ ... تھا مجھے کہ تمھاری مصروفیات میں قرار کو دخل نہیں۔ مجھے حشمت خان صاحب ... تھا۔ پوچھ رہا تھا کہ آپ اسلام آباد کیسے گئی ہیں ؟ میں نے کہا گاڑی ... بولا کون سی گاڑی سے ؟ میں نے کہا۔ ان فضول سوالات کا مطلب ... صرف اتنا بتا دیجیے کہ اپنی گاڑی میں گئی ہیں یا ریلوے کی گاڑی میں ... غلط کیا اُس نے ورنہ تمھارا بھانڈا پھوٹ جاتا۔ اگر اسے معلوم کرنا ہوتا ... کس وقت لاہور سے روانہ ہوئی تھی تو وہ وقت پوچھتا یا ٹرین کا نام ... یہ معلوم کرتا کہیں ریل کار سے گئی ہوں یا "فلائنگ ہارس" والوں کی ویگن ... اسے یہ تو علم تھا کہ رضوی صاحب اسلام آباد میں ہیں عقل میں تو یہی بات ... میں اُن کے ساتھ انھی کی گاڑی میں گئی ہوں گی۔ اس کے باوجود اپنی گاڑی ... کر کے اُس نے مجھے تذبذب میں مبتلا کر دیا۔ میں نے کہا تھا کہ کیا خیال ہے ... میں اپنی گاڑی میں گئی ہوں تو کیا میں نے کوئی جرم کیا ہے ؟ کہنے لگا کہ ... ایسی جرح سے کیا فائدہ۔ اگر واقعی آپ اپنی فوکس ویگن میں تشریف لے گئی ہیں ... دیکھیے۔ آپ کا احسان ہو گا۔ واقعی کا لفظ استعمال کر کے اُس نے مجھے ہوشیار ... ایسی بات نہیں تھی جس کے لیے اسلام آباد فون کرنا ضروری ہوتا۔ وہ انکل ... دیکھ سکتا تھا یا تم سے پوچھ سکتا تھا کہ گاڑی ہے یا نہیں۔ میں سمجھ گئی کہ ... ہی گیا ہو گا اور گاڑی کے متعلق تم نے ہی کہا ہو گا کہ رابعہ لے گئی ہے ... کر دیا تھا کیا ؟"

"یہ میں بعد میں بتاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "پہلے یہ بتاؤ کہ تم نے ... کیا جواب دیا تھا ؟"

"میں نے کہہ دیا تھا کہ سکندر صاحب کا بیان بالکل ٹھیک ہے۔ اپنی گاڑی ساتھ لائی ہوں۔" وہ بولی۔

میں نے قہقہہ مارا۔ "بھلا میرے حوالے سے اقرار کرنے کی کیا ... تھا ؟ اُسے سخت صدمہ ہوا ہو گا۔"

"ہاں۔ کہنے لگا ٹھیک ہے وکیل صاحبہ ! آپ بھی سچی اور سکندر ... بھی سچے۔ ہم ہی بن جاتے ہیں جھوٹے۔" رابعہ ہنسی۔

"کہانی کی کہانی طویل ہے۔ بقلم خود حاضر ہو کے سناؤں گا۔" میں نے ... اب اجازت ہو تو کچھ فلمی قسم کے رومانٹک ڈائیلاگ بول لوں۔ میں نے ایک فلم میں ٹیلی فون پہ باقاعدہ دو دو گانا سنا ہے۔ بتانا صرف یہ تھا کہ کل رات کی اختر شماری کا ذکر کیا ہے۔ میں نے کتنی سرد آہیں بھری ہیں اور ان کا کم سے کم درجہ حرارت ... تھا اور کتنے لیٹر خونِ جگر جلا کے میں نے آنکھوں سے کتنے آنسو بہائے ہیں۔"

"جب انکل کے ٹیلی فون کا بل آئے گا تو سب معلوم ہو جائے گا۔" وہ ہنسی "... کہ یہ ٹرنک کال انھیں کتنی مہنگی پڑی۔ تم کو جو کچھ کہنا ہے فون بند کر کے کہہ دینا میں سن لوں گی۔ اب ایک خوشخبری جسے میں شام کو تمہارے آنے تک ملتوی نہیں کر سکتی۔ محسن کی امی نے شہلا کو پسند کر لیا ہے۔ بات پکی سمجھو۔"

"ہمیں کیا جی دوسروں کی کچی پکی سے۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا "... اپنی دال تو گلتی نظر نہیں آتی۔"

"یہ منہ اور مسور کی دال۔" وہ ہنسی اور فون بند ہو گیا۔ اس کے بعد میں نے چشمِ تصور سے وہ سب کچھ دیکھا جو بارہا خوابوں میں بھی دیکھ چکا تھا۔

... سات کے بجائے میں ساڑھے سات بجے راولپنڈی پہنچا۔ اسلام آباد پہنچتے پہنچتے مجھے نو بج گئے۔ سب سے پہلے مسز شیرانی کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُن کی حالت دیکھ کر مجھے ناقابلِ بیان صدمہ پہنچا۔ وہ بستر پہ لیٹی ہوئی بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ لگتی تھیں حالانکہ جب میں نے ان کو گزشتہ بار دیکھا تھا تو بیماری کے باوجود وہ جسمانی طور پر تو کچھ صحت مند نظر آتی تھیں۔ ان کا رنگ روپ میں نے جوانی میں بھی دیکھا تھا۔ اب فوزیہ ان کا نقشِ ثانی بن گئی تھی اور ماں جو نقشِ اول تھی یوں مٹ رہی تھی جیسے مغلوں کے عہد کی حسین و پُرشکوہ عمارات کے وہ کھنڈر جن کو محکمہ آثارِ قدیمہ نے بھی فراموش کر دیا ہو۔ میں نے اُن کا ہاتھ جو ہڈیوں پر منڈھی ہوئی کھال اور رگوں کے اُبھرے ہوئے جال کے سوا کچھ نہ تھا اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"میں تو سمجھی تھی، تم خفا ہو مجھ سے۔" انھوں نے اُداسی سے مسکرا کے کہا۔

"یہ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں مجھے مزید شرمندہ کرنے کے لیے۔" میں نے کہا۔ "کیا مجھ میں اور محسن میں کوئی فرق ہے۔ میں نے تو آپ کو ہمیشہ ماں کے روپ میں دیکھا ہے۔ دُکھ تو مجھے ہے کہ میں ، ... میں نے آپ کو بہت دکھ پہنچائے اور آپ کی کوئی بھی خدمت نہ کرسکا۔ معافی مجھے مانگنی ہے آپ سے۔"

"مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں بیٹا !" انھوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھا۔ "خدا تمھیں اور رابعہ کو خوش رکھے۔"

"مجھے آپ کی دُعاؤں کی ہمیشہ ضرورت رہے گی چچی !" میں نے کہا۔

"میرا خیال ہے پہلے تم نہا دھو کے کھانا کھالو۔" شیروانی صاحب نے صورتحال کو سنبھالنے کے لیے کہا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ گفتگو میں یہی جذباتی عنصر غالب رہا تو سب رونے لگیں گے۔ رابعہ تو خاموشی سے سسک رہی تھی لیکن شہلا سب سے پیچھے افسردہ کھڑی تھی اور اسے بالکل احساس نہ تھا کہ اس کا ایک ہاتھ محسن کے کندھے پہ ہے۔ خود محسن سخت ملول اور دل گرفتہ تھا اور دیوار سے ٹیک لگائے خلا میں گھور رہا تھا۔ انکل رضوی اور انکل شیروانی ان کے سامنے تھے چنانچہ ان دونوں کا یہ پوز نہیں دیکھ رہے تھے۔ مجھے یوں لگا جیسے شہلا نے ایک ہی ہاتھ سے محسن کا سہارا بھی لیا ہے اور اسے سہارا فراہم بھی کر دیا ہے۔ بالکل غیر شعوری طور پر لوراالفاظ کی زبان میں کچھ کہے بغیر اس نے محسن سے رفاقت کا دائمی عہد کر لیا ہے اور یہ عہد نامہ دنیاداری کی ظاہری رسموں سے کہیں زیادہ پُرتقدس ہے اور صرف ان جذبوں کا امین ہے جو انتہائی معصوم سچے اور پاکیزہ ہوتے ہیں چنانچہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ نسبت طے ہو جانے کے بعد انھیں ایک دوسرے کے سامنے نہیں آنا چاہیے اور شہلا کو اتنے لوگوں کی موجودگی میں اپنے منگیتر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے بے شرمی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔ یہ منظر اتنا دلکش اور نظر نواز تھا کہ میں کوئی عظیم مصور ہوتا تو اس خوبصورت لمحے کے طلسم کو رنگوں میں اُتار لیتا اور حسن و عشق کی یہ تصویر بھی مونا لیزا کی مسکراہٹ کی طرح لافانی ہو جاتی۔ دیکھنے والے اس کے سامنے مسحور کھڑے رہتے اور ان کے دل محبت کے جذبات کی عظمت، پاکیزگی اور ہمہ گیری کے احساس سے معمور ہو جاتے۔ جب میں اٹھا تو منظر بدل گیا لیکن اس تصویر کا نقش میرے تصور میں باقی رہا اور لازوال ہو گیا۔

کھانا کھانے کے بعد میں نے رضوی صاحب کے سامنے اعتراف کیا کہ میں نے جو واقعات اُن کو سنائے تھے ان میں زیبِ داستاں کے لیے کچھ بڑھا بھی دیا تھا غلط فہمی کے باعث معمولی سی ہاتھا پائی ضرور ہوئی تھی لیکن ٹوٹ پھوٹ بالکل نہیں ہوئی اور ان کے آدمی بفضلِ خدا اتنے ہی صحیح سلامت ہیں جتنا میں۔

جب انکل حضرات ہم لوگوں کی نامعقولیت پر تبصرے کے بعد تشریف لے گئے تو میں نے محسن اور رابعہ کو ان کی عدم موجودگی میں پیش آنے والے واقعات تفصیل سے سنائے۔ شہلا جانتے بوجھتے محفل سے غیر حاضر رہی۔ اس کا خیال ہو گا کہ اکٹھے ہو جانے کے بعد ہم سب اس کو چھیڑیں گے۔ محسن ڈھیٹ آدمی، اس پہ کیا اثر ہو گا۔ البتہ وہ ہمارے ساتھ شامل ہو کے شہلا کو پریشان کرنے پر اُتر آئے تو اس سے بعید نہیں۔ شہلا سیدھی سادی لڑکی تھی۔ نہ بہت زیادہ ذہین اور حاضر جواب اور نہ اتنی تیز طرار کہ اپنی زبان سے برابر کا مقابلہ کرسکے۔ محسن نے بالآخر اعتراف کیا کہ جو کچھ ہوا اس کی مرضی سے تو نہیں ہوا لیکن اس کی خواہشات کے عین مطابق ہوا۔

"شہلا نے اپنی خدمت گزاری اور سعادت مندی اور شرافت سے پاپا اور امی کے دل جیت لیے ہیں۔" اس نے خاصے جذباتی لہجے میں کہا۔ "فوزیہ نے تو بہت پہلے ہی شہلا کو پسند کر لیا تھا۔ رخصت ہونے سے پہلے اس نے ماں سے بات کرلی تھی کہ امی ! اب کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ خدا نے گھر بیٹھے وہ بہو بھیج دی ہے آپ کے لیے کہ اس جیسی دوسری چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گی۔"

"رات کو ٹارچ لے کر ڈھونڈنے سے۔" میں نے کہا۔ "دن میں عینک لگا کے تلاش کرنے سے تیسری نہیں ملے گی۔"

رابعہ نے اس بے محل دخل اندازی پر مجھے گھور کے دیکھا۔ "محاورے میں یہ غیر ضروری ترمیم خلافِ ضابطہ قرار دی جاتی ہے۔"

"لیکن دوسری تو خود شہلا تھی۔" میں نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ "جو ہم نے اسی طرح دریافت کی تھی۔ کیوں محسن ؟"

رابعہ کا چہرہ ذرا سی دیر کے لیے لال پڑ گیا۔ وہ سمجھ گئی کہ میں نے پہلے نمبر پہ اسے رکھا ہے کیونکہ وہ مجھے پہلے ملی تھی۔

"یہ تو ہے۔" محسن مسکرایا۔ "خیر۔ فوزیہ کی بات خود امی کے دل کی بات تھی

لیکن انھوں نے کہا کہ وہ شہلا کی مرضی جاننا چاہتی ہیں۔ اگر اس کے والدین ہوتے تو ان کی مرضی معلوم کی جاتی اور وہ زبردستی بھی کرتے تو یہ ان کا حق تھا لیکن وہ بن ماں باپ کی بچی یہاں ایک طرح سے ہماری پناہ میں ہے۔ فوزیہ نے اپنی طرف سے تو واضح کر دیا تھا کہ شہلا انکار نہیں کرے گی مگر بعد میں امّی نے شہلا سے خود بات کی۔ شہلا نے سر جھکا کے کہہ دیا کہ امّی، میرا اپنا تو اس دنیا میں کوئی رہا نہیں جو کچھ بھی ہیں آپ ہیں، انکل رضوی ہیں، رابعہ باجی ہیں اور سکندر بھائی ہیں۔ یہی میرا خاندان ہے اور میرے بارے میں کوئی فیصلہ کریں گے تو یہی لوگ کریں گے! امّی نے پاپا سے کہا اور بزرگوں کا ایک خصوصی اجلاس طلب کیا گیا۔ گویا شادی کمیشن کا اجلاس۔"

"حسن کی رکنیت کا اعزاز مجھے بھی بخشا گیا۔" رابعہ نے کہا۔ "یہ تو طے ہے میاں محسن خان شیروانی بلاحیثیت سرپرست کے اگر میں رشتہ قبول نہ کرتی تو انجام اسی کا وہی ہوتا جو قیس و فرہاد کا ہوا۔ لیکن میں نے کہا کہ لڑکا ہے تو کچھ سرپھرا مگر آجائے گا راہِ راست پر، چنانچہ بات پکّی ہو گئی۔ اب وہاں ایک بڑا لطیفہ پیش آیا۔ انکل شیروانی نے اخلاقاً کچھ دبے دبے لہجے میں کہا کہ بھئی سکندر آ جاتا تو اچھا تھا اس کی رائے بھی معلوم کر لیتے۔ انکل رضوی نے مجھے ڈانٹا کہ اس نامعقول کی کیا مجال کہ جو ہمارے فیصلے سے اختلاف کرے لیکن محسن سے بہرحال پوچھ لینا چاہیے۔ اس پر انکل شیروانی نے بھی مجھے ڈانٹ کر کہا اس نامعقول کی کیا مجال جو ہمارے فیصلے سے اختلاف کرے۔ نزلہ برعضوِ ضعیف۔ میں ہی سب سے جونیئر رکن تھی، جسے بلاوجہ ڈانٹا جا سکتا تھا۔" وہ ہم سب کے ساتھ ہنسی۔ "اصل بات معلوم ہے کیا تھی؟" اُس نے ہماری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ "دونوں انکل اچھی طرح جانتے تھے کہ محسن اور شہلا کیا چاہتے ہیں اور یہ وہی بات ہے کہ میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی۔"

"اور اب ایک اور اجلاس ہو گا شادی کمیشن کا۔" محسن نے کہا۔ "جس میں دوسرا ایسا ہی کیس پیش ہو گا لیکن اس کا سب سے جونیئر رکن ہو گا یہ خاکسار۔۔۔۔"

"فی الحال کوئی اجلاس وغیرہ نہیں ہو رہا ہے مسٹر خاکسار! بلکہ یہ اجلاس بھی برخواست۔" رابعہ نے اٹھتے ہوئے کہا اور باہر نکل گئی۔

"عقلمندوں نے کہا ہے کہ عورت کی نا کو اس کی ہاں سمجھنا چاہیے۔" محسن نے فلسفیانہ لہجے میں کہا۔

"بالکل ٹھیک کہا ہے عقلمندوں نے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "لیکن افسوس کہ شہلا نے ہاں کہہ دیا۔ مجبور تھی بے چاری۔"

"جب تیرا وقت آئے گا کبیر داس۔۔۔" محسن نے تکیے سے مجھ پر حملہ کیا۔ "تو دیکھیں گے کہ دلھن ہاں کہتی ہے یا نا۔"

"خان صاحب!" میں نے اپنے تکیے سے جوابی کارروائی کی۔ "اُس نے انکار کیا تو میں دلھن کو قاضی سمیت یوں اٹھا کے لے جاؤں گا جیسے پرتھوی راج نے سوئمبر سے سنجوگتا کو اٹھا لیا تھا۔"

❁

شہلا کو وہیں چھوڑ کے ہم سب اگلے دن ناشتے کے بعد واپس ہوئے۔ مسز شیروانی کی طبیعت کچھ افسردہ ضرور تھی لیکن یہ وقتی کیفیت تھی۔ یہ خیال اُن کے ذہن میں کبھی آیا ہو گا کہ شاید ان سب لوگوں سے دوبارہ ملاقات ... بالکل فطری تھا۔ اس خیال کا اظہار ہم میں سے کبھی کسی نے نہیں کیا ... طور پر ہم بھی اسی خوف کا شکار رہتے تھے کہ یہ مسز شیروانی کو زندہ دیکھنے کا ... ثابت نہ ہو۔ ڈاکٹر ان کی طرف سے مایوس ہو چکے تھے جس کا واضح ... نکالا جا سکتا تھا کہ ان کی زندگی کے گنے چنے دن باقی رہ گئے ہیں مگر ... تھے۔ رضوی صاحب ڈیوٹی سے غیر حاضر نہیں رہ سکتے تھے اور رابعہ ... مقدمات کی پیروی، غیر معینہ مدت کے لیے ماتحتوں پر نہیں چھوڑ سکتی ... زیرِ ضمانت تھا اور مجھے عدالت سے صرف تین دن کے لیے لاہور جانے کی ... ملی تھی۔ محسن کے نہ رکنے کے متعدد اسباب تھے۔ پہلی وجہ اس کی ماں ... نے کہا تھا۔ "یار میں اپنی ماں کو لمحہ لمحہ اپنے سامنے مرتا دیکھنے کا عذاب ... نہیں کر سکتا۔ ایک بار خبر سُن کے صبر کر لوں گا۔ کیونکہ یہ خبر غیر متوقع نہیں ... سب سے بڑی وجہ بھی یہی تھی۔ دوسری وجہ شہلا تھی جس کی موجودگی میں ... گھر میں رہنا اخلاقی، جذباتی اور معاشرتی مسائل پیدا کر دیتا اور تیسری ... جسے ان حالات میں وہ اکیلا چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔

میر محمد کے قتل اور اس الزام میں مجھے ملوث کرنے کی سازش ... نے محسن کے علاوہ رابعہ کو بھی متفکر اور خوفزدہ کر دیا تھا۔ اُن کی ... تھی لیکن خوف کا اظہار انھوں نے کبھی نہیں کیا تھا۔ زرداد الاعوان ... اور افسوسناک تھا۔ حیرانی کی بات یہ تھی کہ جسے ہم نے اتنی جدوجہد کے بعد ... مجھ کے گرفتار کیا تھا وہ کوئی اور تھا اور افسوسناک اس کی موت تھی شیخ کی ... تائید سے ہماری قوت میں اضافہ ہوا تھا اور سب کی متفقہ رائے یہی تھی ... کو اپنا اثر و رسوخ استعمال کرنے پر آمادہ کیا جائے تاکہ وہ شیخ کا استعفیٰ ... دیں اور اسے تھانے سے ہٹا کے اپنے ساتھ ہیڈ آفس میں رکھیں۔ رابعہ ... وضاحت کے باوجود مطمئن نہیں ہوئی تھی کہ ہم نے زرداد کی موت کے کیس ... اپنی جان چھڑائی وہی اخلاقی اور قانونی طور پر جائز اور دانشمندانہ طریقہ ... کا خیال تھا کہ شیخ کو تمام واقعات کی من و عن رپورٹ لکھنی چاہیے تھی۔

"اگر وہ رپورٹ میں ایک جعلساز کے وکیل بن کر آنے کا اور زہریلی ... ایک زیرِ تفتیش ملزم کو قتل کر جانے کا ذکر کر دیتا تو شیخ پر کیا الزام آتا؟ ... زیادہ محتاط رہنے کا۔" اس نے کہا۔ "مگر اس انکشاف کے بعد ... والا استاد بیدار نہیں، زرداد تھا جس نے میک اپ سے اس کا حلیہ ... تھا شیخ کی پوزیشن اور صاف ہو جاتی۔ وہ لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے ... وقت بھی یہ بات واضح کر سکتا تھا۔"

"تم ایک بات بھول رہی ہو۔" میں نے کہا۔ "اس وقت ... خیال تھا کہ مقتول زرداد کو غیر قانونی طور پر گھر سے اٹھانے کا، اس ... بچوں کو مار نے پیٹنے کا اور تھانے میں بند کرنے کا الزام بھی شیخ پر ہی ... یہ سفید جھوٹ تھا جو اس خود ساختہ وکیل نے زرداد کو نکال کر لے جانے ... بولا تھا۔ شیخ پریشان ہو گیا تھا کیونکہ اسے معلوم نہیں تھا کہ یہ جھوٹ ... ہوتا تو وہ کتنے سنگین الزامات میں ملوث ہو جاتا۔ ... اس وقت ...

زرداد کی لاش سے اپنی لاتعلقی کا بندوبست کر چکے تھے اور ظاہر ہے اس کے بعد سچ بولنے کی گنجائش نہیں رہی تھی۔" میری بات نے رابعہ کو خاموش کر دیا تھا لیکن قائل نہیں کیا تھا۔

معاملات پیچیدہ صورت اختیار کرتے جا رہے تھے اور راس کا خیال تھا کہ اس قسم کے غلط چکر جتنے زیادہ ہوں گے اتنے ہی خطرات زیادہ ہوں گے، اور یہ امکانات بڑھتے جائیں گے کہ نادانستگی میں ہم سے کوئی حماقت سرزد ہو جائے۔ جنگ میں خود کو دشمن سے زیادہ چالاک اور طاقتور سمجھنے والا مارا بھی جاتا ہے، خواہ یہ خوش فہمی حقیقت پر مبنی ہی کیوں نہ ہو۔ میں نے اس کی رائے سے اتفاق کیا تھا کہ اب شرافت علی کے قتل کے مقدمے کی سماعت فوراً شروع ہو جانی چاہیے۔ اصل قاتل کا سراغ ملے نہ ملے استغاثہ کے دونوں بنیادی گواہ شیدا اور عبدل مارے جا چکے تھے اور ان میں سے ایک یعنی عبدل نے مرتے وقت جو بیان دیا تھا، اس میں مجھے قتل کے الزام سے بری الذمہ قرار دیا گیا تھا۔ اس بیان کا ایک ٹیپ مست قلندر صاحب نے روزنامہ 'صدائے وقت' کے ریکارڈ میں رکھوا دیا تھا لو دوسرا اخبار کے مدیرِ اعلیٰ اپنے ساتھ لے کر غائب ہو گئے تھے مگر مجھے یقین تھا کہ ضرورت پڑنے پر فاضل مدیر باتدبیر کسی جن کی طرح اچانک نمودار ہو جائے گا اور عدالت کے سامنے اصل ٹیپ پیش کر کے سب کو حیران کر دے گا۔ عدالت کی فائل میں محرر کے ہاتھ کا لکھا ہوا بیان موجود ہے۔ جب ٹیپ ہو گا اور اکرم شیخ کی گواہی ہو گی تو کیس میں میرے خلاف کیا ہو گا؟

سفر کے آغاز میں موسم بہت خوشگوار تھا لیکن ہم سب خاموش تھے اور اپنے اپنے خیالات میں کھوئے ہوئے تھے۔ باہر اونچے نیچے پہاڑی سلسلے تھے اور زرد مٹی کے ٹیلے تھے جن پر کیکر اور چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ زمین کا کٹاؤ کہیں کہیں گہری کھائی کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ سطحِ مرتفع پوٹھوہار کا یہ نسبتاً بنجر علاقہ گوجر خان سے آگے جہلم تک پھیلا ہوا تھا۔ دو جگہ کار پہاڑی سرنگوں کے اوپر سے گزری اور ہم نے سیکڑوں فٹ نیچے ٹرین کو سرنگ میں سے نکل کے سڑک کے ساتھ ساتھ چلتے دیکھا۔ پھر کسی موڑ پر سڑک کا راستہ جدا ہو گیا اور کار پہاڑی راستوں پر چکر کاٹتی، برساتی نالوں کے پل عبور کرتی دوبارہ ٹرین سے آگے نکل گئی۔ جہلم کے بعد میدانی علاقے کی ہریالی، گھنے سرسبز درختوں کی شادابی اور لہلہاتے کھیتوں کی مہک نے ہمارا استقبال کیا۔ تقریباً نصف راستہ طے کرنے کے بعد رضوی صاحب نے گاڑی روکی اور ہم نے ایک روڈ سائیڈ ریسٹورنٹ میں چائے پی۔ لاہور اب اسی میل دور تھا۔

دوبارہ سفر شروع ہوا تو رضوی صاحب پیچھے چلے گئے اور ڈرائیونگ میرے سپرد کر دی۔ تقریباً دس منٹ تک وہ پائپ کے کش لیتے رہے اور باہر دیکھتے رہے۔ پھر انھوں نے اچانک کہا۔ "مجھے معلوم ہوا تھا کہ میر محمد کو قتل کر دیا گیا ہے اور اس کی لاش کا نصف حصہ یعنی دھڑ اکرام شیخ نے دریافت کیا تھا۔ سرکوئی تھانے میں پھینک گیا تھا۔ تم کو شیخ نے کچھ بتایا تو ہو گا کہ قتل کے محرکات کیا ہو سکتے ہیں؟"

"اس میں شبے کی کوئی گنجائش نہیں۔" میں نے کہا۔ "اُس نے عبدل کے بیان کا ٹیپ غائب کیا تھا۔ بعد میں اس نے ٹیپ کے بدلے بہت بڑی رقم مانگی۔ اور اس نے بڑی غلطی یہ کی کہ ٹیپ کی نقل بنالی۔" میں نے اُن کو مختصراً وہ تمام واقعات سُنائے جو ان کی غیر حاضری میں پیش آئے تھے یعنی کس طرح میں نے دین محمد کے ساتھ جا کے اس کے بھائی کے گھر کا نقشہ دیکھا تھا اور پھر کیسے مجھے مست قلندر صاحب کی زبانی دیگر تفصیلات کا علم ہوا تھا۔ لیکن اب میر محمد کے بچے، اصل ٹیپ اور روزنامہ 'صدائے وقت' کے مدیر کہاں ہیں؟ یہ کسی کو معلوم نہیں۔" وہ بڑے دھیان سے سُنتے رہے اور پائپ کے کش لیتے رہے۔

"گویا اس قتل کا براہِ راست تمہارے ساتھ پیش آنے والے واقعات سے کوئی تعلق ضرور ہے؟" انھوں نے کہا۔ "کون ہو سکتے ہیں وہ لوگ جن پر قتل کا شبہ کیا جا سکتا ہے؟"

"آپ اُن لوگوں کو اچھی طرح جانتے ہیں انکل!" میں نے کہا۔ "یہ لوگ مجھے میر شرافت کا قاتل ثابت کرنا چاہتے تھے۔ میر محمد کی بے وقوفی نے ان کے عزائم کو ناکامی کے اندیشے میں بدل دیا۔"

"اور ان لوگوں نے صرف میر محمد اور اس کی بیوی کے قتل کو کافی سمجھا؟" رضوی صاحب نے کہا۔ "تمہیں اس الزام میں ملوث کرنے کی بالکل کوشش نہیں کی۔ حالانکہ وہ بہت چالاک قسم کے لوگ ہیں۔ اتنا تو کر ہی سکتے تھے کہ میر محمد کو مار کے اس کی لاش تمہارے کمرے میں یعنی میرے گھر میں ڈال جاتے یا تمہاری کچھ چیزیں وہاں ڈال دیتے جہاں لاش ملی تھی۔"

رضوی صاحب کا ذہن ایک تجربہ کار پولیس افسر کی طرح صحیح خطوط پر سوچ رہا تھا، لیکن میں اُن سے کیا کہتا کہ دشمنوں نے تو بڑی زبردست چال چلی تھی میرے ساتھ اور مجھے میر محمد کے کٹے ہوئے سر سمیت گرفتار کرانے کا پورا بندوبست بھی کر لیا تھا، مگر خدا کو بچانا منظور تھا اُن کی چال ناکام ہو گئی۔

"دیکھو نا! میر محمد تمہارا دشمن تھا۔" انھوں نے مجھے خاموش دیکھ کے کہا۔ "یہ بات عدالت کے ریکارڈ پر بھی ہے۔ اگرچہ دشمنی کے اسباب معلوم نہیں لیکن تم نے اور شیخ نے اُس پر ٹیپ غائب کرنے کا الزام لگایا تھا۔ اُس نے تم پر تشدد بھی کیا تھا اور تم سے اعترافِ جرم بھی حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ اگر وہ تم کو اس جرم میں ملوث کرنا چاہتے تو کر سکتے تھے۔"

"انھوں نے کوشش تو کی تھی انکل!" میں نے کہا۔ "حشمت خان ایک دن صبح صبح آ پہنچا تھا، یہ پوچھنے کہ گزشتہ شب میں کہاں تھا۔"

"اور یہ اتفاق ہے کہ اس رات تم عبدالودود منظر ایڈووکیٹ کے گھر سوئے تھے۔" رضوی صاحب نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "بلکہ یہ کہا جائے کہ ایڈووکیٹ صاحب اس بات کے گواہ ہیں تو زیادہ صحیح ہو گا۔ اُن کا بیان نہ ہوتا تو پولیس تمہیں یقیناً گرفتار کر کے لے جاتی اور قتل کی ایف آئی آر میں تمہارا نام ضرور آتا۔"

"کیا آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ میں نے میر محمد کو قتل کیا، لیکن عبدالودود منظر نے جھوٹا بیان دے کر مجھے بچا لیا؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔" انھوں نے کچھ سوچ کے کہا۔ "قتل تو تم نہیں کر سکتے لیکن

تمہارے دوست بھی تم سے کم نہیں۔ تمہیں ہر الزام سے بچا لیتے ہیں۔"

"اگر مجھے جھوٹے الزام سے بچانے کی خاطر وہ جھوٹ بولتے بھی ہیں تو کیا غلط کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "جس دنیا میں آپ رہتے ہیں انکل! اس میں کتنے ہیں جو سچ بول کے جی رہے ہیں۔ آپ کا تجربہ میری عمر سے زیادہ ہے۔"

"میں ساری دنیا کی بات نہیں کر رہا تھا۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "تم مجھ سے جھوٹ کیوں بولتے ہو؟ کیا تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں ہے؟ یا تمہیں اندیشہ ہے کہ میں جھوٹ اور سچ کے فرق کو سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہوں اور حقائق کا تجزیہ نہیں کر سکتا۔ سوچے سمجھے بغیر میں تم کو ان لوگوں کے حوالے کر دوں گا جو تمہاری جان کے دشمن ہیں اور ہر قیمت پر تمہیں ختم کر دینا چاہتے ہیں تاکہ ان کے مذموم عزائم کی تکمیل ہو سکے۔"

"میں سمجھتا ہوں، اب تک مجھے سب سے زیادہ تحفظ خدا کے بعد آپ نے ہی فراہم کیا ہے۔ صرف مجھے ہی نہیں، رابعہ کو بھی اور شہلا کو بھی آپ نے صرف میری وجہ سے اپنے گھر میں جگہ دی۔ اپنے خاندان کا ایک فرد بنا کے رکھا۔" میں نے کہا۔

"اور اس کے باوجود تم مجھے ہی وہ بات نہیں بتاتے ہو جو شاید رابعہ کو اور محسن کو بتا چکے ہو؟"

میں مجبور ہو گیا۔ میں نے ان کو میر محمد کی لاش کے ملنے سے اس کار ملنے تک کی تمام روداد سنا دی۔ یہ بھی بتا دیا کہ میں نے کس طرح اپنی جان چھڑانے کے لیے وہ سر تفتیش کے لیے آنے والے انسپکٹر کے بیگ میں ڈال دیا تھا اور اس نے سر کو گٹر میں ڈال کے اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کیا۔ گاڑی کو میں نے ڈینٹ پینٹ کے لیے دے دیا تھا چنانچہ حشمت خان کچھ نہیں کر سکا تھا۔ اپنے بیان میں سے استاد پیڈرو کی گرفتاری کا اور اس کے زندہ ثابت ہونے کا ذکر میں نے پھر بھی گول کر دیا۔ میں نے یہ ظاہر کیا کہ میر محمد کا سر میں نے گھر پہنچنے کے بعد پچھلی سیٹ پر پڑا دیکھا تھا اور فوراً سمجھ گیا تھا کہ اس حرکت کا مقصد کیا ہے اور اس کا انجام کیا ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد میں نے وہی کیا جو میری عقل میں آیا۔

رضوی صاحب نے کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا لیکن ان کا موڈ بتا رہا تھا کہ وہ ذہنی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ ان کی زندگی میں آزمائش کا ایسا دور کبھی نہیں آیا تھا۔ اگر وہ فرض کو مقدم رکھتے تو اسی وقت مجھے پولیس کے حوالے کر دیتے لیکن وہ جانتے تھے کہ یہ مجھ پر دہرا ظلم ہوگا۔ ایک طرف وہ لوگ تھے جو ہر طرح سے مجھے اپنی سازش کے جال میں گرفتار کرنے پر تلے بیٹھے تھے اور اپنی طاقت اور اپنی دولت سے جھوٹی گواہیاں خرید رہے تھے، جھوٹے حالات پیدا کر رہے تھے اور جھوٹی شہادتیں جمع کر رہے تھے تاکہ مجھے تختۂ دار تک پہنچا سکیں۔ یہی نہیں، وہ براہِ راست بھی میری زندگی پر قاتلانہ داؤ آزما چکے تھے۔ اگر رضوی صاحب یہ سب کچھ جاننے کے باوجود صرف قانون کو دیکھتے تو انہی کی مدد کرتے جو صفِ دشمناں میں شامل تھے اور خود کو اتنا بڑا شکاری سمجھتے تھے کہ نظامِ انصاف تک کو شکار کرنے کا دعویٰ رکھتے تھے۔ انہوں نے بچپن سے مجھے دیکھا تھا۔ وہ میری فطرت کو اچھی طرح سمجھتے تھے اور اب میرے باپ کی جگہ تھے۔ انہیں وزیر خان کے حالات کا بھی علم تھا۔ اب یہ ناممکن تھا کہ اب وہ مجھے بھی ان سفاک درندوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں جو وزیر خان کے قاتل تھے۔ اگر میں ان کی نظر میں مجرم ہوتا تو شاید وہ کسی جذباتی رشتے کا لحاظ نہ کرتے لیکن ان کو یقین تھا کہ غلط طریقے سے ہی سہی میں جو کچھ کر رہا ہوں اپنے دفاع میں کر رہا ہوں۔

رضوی صاحب کی بیگم اگر ایک پولیس افسر کی رفاقت کی عادی نہ ہوتیں تو ہماری باتوں سے یقیناً دہشت زدہ ہو جاتیں لیکن ان کے تو بچے بھی ایسی گفتگو کے عادی تھے۔ رابعہ کچھ پریشان سی تھی کہ کہیں میرے منہ سے روانی میں کوئی غلط بات نہ نکل جائے اور میں اس ذہنی انتشار سے دوچار تھا کہ کہیں میری مسلسل غیر ذمے دارانہ حرکتوں کے باعث رضوی صاحب کی عقل کا فیصلہ میری توقعات کے برعکس نہ ہو جائے کیونکہ حقیقت کو ان کے نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا تو جو کچھ میں اور محسن کرتے تھے وہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کے مترادف تھا۔ ہم گجرانوالہ کو پیچھے چھوڑ آئے تھے اور وہ سنگِ میل ابھی ابھی گزرا تھا جس پر لکھا ہوا تھا۔ لاہور پینتیس میل دور رہ گئے۔ میں نے ایک ٹرک کو اوورٹیک کرنے کی کوشش کی جو تقریباً سڑک کے وسط میں تھا اور اس پر عمارتی سریا لدا ہوا تھا۔ ہارن دے کر میں نے رفتار بڑھائی اور سیدھے ہاتھ سے نکلنے کی کوشش کی لیکن اسی وقت سامنے سے دوسرا ٹرک نمودار ہوا، جو انتہائی تیز رفتاری سے ہماری طرف آ رہا تھا۔ حالانکہ اوورٹیک کرنے سے پہلے میں نے یہ اطمینان کر لیا تھا کہ سڑک خالی ہے اور اتنی گنجائش ضرور ہے کہ میں آگے نکل کر اپنی سائیڈ پر ہو جاؤں۔ اس غیر متوقع صورتحال نے بھی مجھے نروس نہیں کیا کیونکہ سڑکوں پر ڈرائیونگ کرتے ہوئے ذہن کو ہر انہونی بات کے لیے تیار رکھنا پڑتا ہے۔ پریشانی میں اس وقت ہوا جب میں نے بریک لگانے کی کوشش کی اور بریک نہیں لگے۔ بریک پیڈل گاڑی کے فرش سے جا لگا لیکن اس کی رفتار میں کوئی کمی نہیں آئی۔ بریک فیل نہ ہوتے تو میں بڑی آسانی سے رفتار کو کنٹرول کر کے پھر سریے سے لدے ہوئے ٹرک کے پیچھے ہو جاتا لیکن اب اس کی گنجائش نہیں رہی تھی۔

اس خطرناک صورتِ حال میں بھی میرے اوسان خطا نہیں ہوئے۔ میں نے چلا کر کہا۔ "انکل! بریک فیل ہو گئے ہیں۔" اور اس وارننگ کے ساتھ ہی میں نے انجن کو ٹاپ گیئر میں سے دوسرے گیئر میں ڈالا۔ گاڑی نے ایک زبردست جھٹکا لیا اور اس کا انجن احتجاج کرتے ہوئے گرجا۔ رفتار میں فوراً کمی آئی اور سریے والا ٹرک تھوڑا سا آگے ہو گیا اس کے باوجود میرے لیے ٹرک کی لائن میں آنا مشکل تھا۔ لمبے لمبے سریے انتہائی خطرناک طریقے پر ٹرک کی باڈی سے بہت پیچھے تک جھول رہے تھے اور میں گاڑی کو بائیں طرف تھوڑا سا بھی موڑتا تو یہ سریے ونڈ اسکرین کو توڑتے، گاڑی کی باڈی میں سوراخ کرتے اور گاڑی کے اندر بیٹھے ہوئے لوگوں کو بھی زخمی کر دیتے۔ دوسری طرف سامنے سے آنے والا ٹرک بہت نزدیک آ گیا تھا لیکن ابھی تک اس کا ڈرائیور یہ اندازہ نہیں کر سکا تھا کہ ہماری گاڑی کے بریک فیل ہو گئے ہیں۔ اس نے تو مجھے کوئی سرپھرا اور جوشیلا نوجوان سمجھا ہوگا جو اسی طرح

کی جان کی پروا کیے بغیر یوں گاڑی چلاتے ہیں جیسے وہ زمین پر نہیں ہوا میں اڑ رہے ہیں یا اس نے مجھے نشے میں دھت تصور کیا ہوگا ورنہ کار لے کر ٹرک کے سامنے آنا خودکشی کی کوشش کے سوا کچھ نہیں۔ اس نے ہارن دیا اور کھڑکی سے سر نکال کے کلینر نے بھی چلا کے مجھے راستہ دینے کو کہا۔ بالکل آخری وقت میں میں نے اسٹیئرنگ کو پورا دائیں جانب کاٹ دیا اور گاڑی تقریباً نوے درجے کے زاویے پر گھوم گئی۔ کچی سڑک پر اور پھر نیچے نشیبی علاقے میں اتر گئی۔ میری ساری توجہ اور جدوجہد گاڑی کا توازن برقرار رکھنے پر صرف ہو رہی تھی۔ اس کے باوجود میں نے ایک ہلکی سی رگڑ کی آواز سنی جو گاڑی کے پچھلے حصے سے آئی تھی۔ بعد میں نیچے اتر کے دیکھنے پر مجھے اندازہ ہوا کہ موت ہمارے کتنے قریب سے گاڑی کو چھوتی ہوئی گزر گئی تھی۔ گاڑی کا پیچھے والا بمپر اور مڈگارڈ کا کونا تیز رفتار ٹرک سے مس ہو کر پچک گئے تھے۔ فوری طور پر میں نے گاڑی کا انجن بند کیا اور بالکل آخری لمحے میں گاڑی کو ایک گڑھے میں گر کر الٹنے سے بچانے کی دیوانہ وار کوشش میں پھر دائیں طرف اسٹیئرنگ کو پورا گھما دیا۔ گاڑی کے پہیے کھڈ کے کناروں کو چھوتے ہوئے گزر گئے لیکن گاڑی ٹیلی فون کے ایک کھمبے سے ٹکرا گئی۔ اس وقت تک گاڑی کی رفتار اتنی کم ہو گئی تھی کہ تصادم کی قوت نے صرف گاڑی کے سامنے والے حصے کو تباہ کیا۔ بمپر اور بونٹ بالکل درمیان میں سے اندر گھس گئے لیکن ونڈ اسکرین اور ہیڈ لائٹس کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ دوسرے لوگوں کو خبردار کرنے کے بعد جو وقت میں نے اپنی اور اپنے ساتھ دوسروں کی زندگی بچانے میں صرف کیا تھا وہ مشکل سے آدھا منٹ ہوگا۔ اس آدھے منٹ میں کس نے مجھ سے کیا کہا اور میں نے کیا جواب دیا، کس کس نے دہشت زدہ ہو کے چیخ ماری اور کون کس پر گرا، یہ سب نہ میں نے دیکھا نہ سنا۔ آدھے منٹ کی اس جدوجہد کی کامیابی کے بعد گاڑی آخری جھٹکا لے کر رکی اور اس کا انجن بند ہو گیا تو میں نے نڈھال ہو کے اپنا سر اسٹیئرنگ پر رکھ دیا۔ ذہنی اور جسمانی طور میں اتنا تھک گیا تھا جیسے میں نے مسلسل چوبیس گھنٹے گاڑی چلائی ہو۔

کچھ دیر بعد مجھے ہوش آیا تو میں نے انکل رضوی کی آواز سنی۔ وہ میرے شانے پر تھپکی دے رہے تھے۔ "بیٹے سکندر! ہوش میں آؤ۔ شاباش! تم نے ہم سب کو بچا لیا ہے سکندر! تم نے تو کمال کر دیا ہے بیٹے!"

میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو مجھے بہت سے چہرے دکھائی دیے۔ ان میں رابعہ کا چہرہ تھا جو خوف سے سفید پڑ گیا تھا لیکن وہ مسکرا رہی تھی میرا حوصلہ بڑھانے کے لیے اور یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ اسے مجھ پر کتنا فخر ہے۔ میں نے محسن کو دیکھا جس کی مسکراہٹ میں اعتماد کا غرور تھا۔ بچوں کو خطرے کی سنگینی کا کوئی اندازہ نہیں ہوا تھا اور وہ صرف جھٹکے لگنے سے خوف زدہ ہوئے تھے۔ سب سے زیادہ خوف زدہ بیگم رضوی تھیں جو اب اپنے بچوں کو دونوں

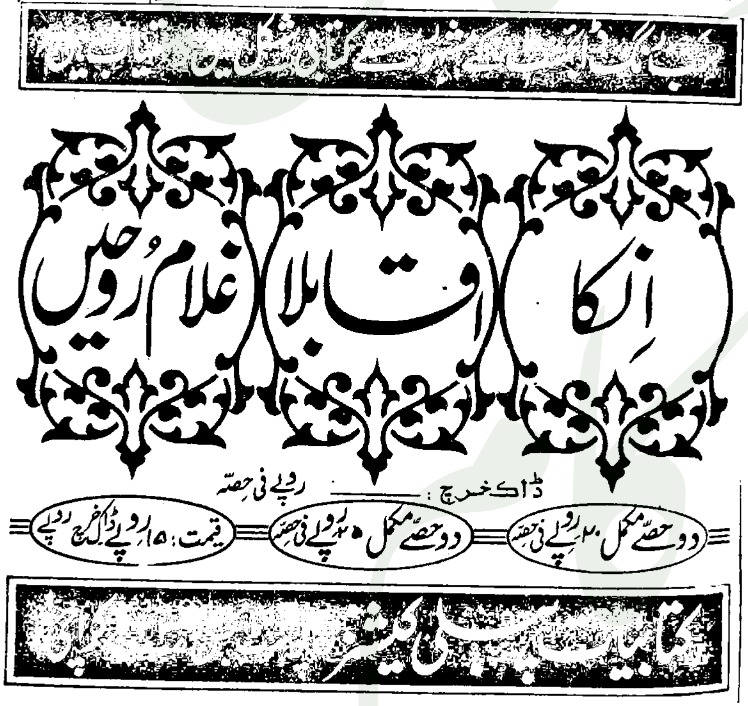

ہاتھوں سے اپنے قریب کیے کھڑی تھیں۔ سڑک پر کچھ گاڑیاں رک گئی تھیں اور بہت سے لوگ مدد کے لیے دوڑتے ہوئے آ رہے تھے۔ وہ ٹرک جس نے کار کے پچھلے حصے کو چھوا تھا بغیر رکے سیدھا نکل گیا تھا۔

"کسی کے زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟" میں نے محسن سے کہا اور دروازہ کھول کے باہر نکلا۔

"خدا کا شکر ہے کہ سب خیریت سے ہیں۔" محسن [illegible] تیرا کمال ہے سکندر! ورنہ مجھے تو تصادم سے بچنے [illegible]

بعد میں سب نے فرداً فرداً میری حاضر [illegible] قوت فیصلہ اور قوت ارادی کا اعتراف کیا اور خود میں نے گاڑی کے [illegible] پچھلے حصے کو دیکھا تو مجھے یقین آیا کہ مجھ سے ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے [illegible] دیر بھی ہو جاتی تو ٹرک اپنی پوری قوت کے ساتھ گاڑی کے دونوں [illegible] سے ٹکراتا اور اسے یوں گھسیٹتا ہوا لے جاتا جیسے کوئی خون آشام [illegible] پر جست لگا کر اسے اپنے خونی پنجوں میں دبوچ کر لے جاتا ہے [illegible] تصادم کے بعد ہم میں سے کسی کا زندہ بچ جانا معجزہ ہی ہو سکتا تھا۔ اگر گاڑی الٹ جاتی یا کھڈ میں گر جاتی تب بھی ہمارے شدید زخمی ہونے کے امکانات تھے لیکن کھمبے سے ٹکرا کے صرف یہ نقصان ہوا تھا کہ [illegible] کی جالی ٹوٹ گئی تھی۔ انجن کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا مگر اب [illegible] کے سڑک تک لانا بھی ناممکن تھا۔ پانی نہ ہونے کی وجہ سے انجن گرم [illegible] سے بن جاتا۔

مدد کے لیے آنے والوں نے یہ کیا کہ گاڑی میں سے سارا سامان نکالا اور ایک شخص میرے اور محسن کے سوا سب لوگوں کو اپنی گاڑی میں لاہور لے جانے پر تیار ہو گیا۔ جاتے جاتے بھی رضوی صاحب نے مجھے شاباش دی اور کہا کہ میں نقصان کی بالکل فکر نہ کروں۔ خدا کو سب کی زندگی منظور تھی ورنہ وہ خود گاڑی چلا رہے ہوتے تو اس حادثے سے نہیں بچ سکتے تھے۔ انہوں نے مجھے دو ہزار روپے بھی دیے کہ میں اور محسن کسی طرح بھی گاڑی کو واپس گجرانوالہ لے جائیں یا لاہور لے آئیں۔ ہم نے انھیں تسلی دے کر رخصت کیا اور کہا کہ وہ ہماری طرف سے مطمئن رہیں۔ جیسے بھی ہوگا، ہم شام سے پہلے گاڑی سمیت گھر پہنچ جائیں گے۔

گاڑی کو نشیب سے سڑک تک پہنچانا بہت کٹھن مرحلہ تھا لیکن مدد کرنے والوں کی کمی نہ تھی۔ پندرہ بیس افراد نے جن میں زیادہ تر ڈرائیور اور کلینر قسم کے لوگ تھے ایک ساتھ مل کر زور لگایا اور گاڑی کا رخ پلٹ کے سڑک تک لانے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ فاصلہ شاید سو گز بھی نہیں ہوگا لیکن سڑک تک آتے آتے ہر شخص بری طرح ہانپنے لگا تھا۔ سب کے کپڑے پسینے میں تر تھے اور ہاتھ پیر گندے ہو گئے تھے۔ میں نے اور محسن نے مدد کرنے والوں کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اب ہم باقی کام خود کر لیں گے۔ جو لوگ گاڑیاں روک کر آئے تھے وہ رخصت ہو گئے۔ صرف ایک پولیس کی گاڑی رہ گئی جسے کوئی کانسٹیبل چلا رہا تھا۔ ہمارے اشارے پر تو شاید نہ رکتا مگر وہ اپنے تجسس کی وجہ سے رکا تھا کہ رضوی صاحب نے اسے پکڑ لیا اور حکم دیا کہ وہ ہماری مدد کیے بغیر نہ جائے۔ کانسٹیبل میں اتنی جرأت کہاں تھی کہ کسی اعلیٰ افسر کے حکم سے سرتابی کرتا۔ اس نے کسی ٹرک کو روک کے ایک بہت مضبوط رسی حاصل کی اور پھر خود ہی ہماری گاڑی کو اپنی گاڑی کے پیچھے باندھا۔ محسن نے ڈرائیور کی جگہ سنبھالی اور میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا تو کانسٹیبل نے بڑی احتیاط کے ساتھ اپنی گاڑی کا اسٹارٹ کی۔ ہماری گاڑی جھٹکے کھا کے آگے بڑھی اور دونوں گاڑیاں تقریباً چھ سات گز آگے پیچھے کچھوے کی طرح رینگنے لگیں۔ صرف ایک بار کانسٹیبل نے رفتار میں تھوڑا سا اضافہ کیا تھا تو محسن نے ہارن دے کر اسے خبردار کیا کہ رفتار کم رکھے ورنہ اس نے بریک لگائی تو ہم اس کے سوا کچھ نہ کر سکیں گے کہ پیچھے سے اس کی گاڑی کو ٹکر مار دیں۔

میرے اعصاب پر ابھی تک حادثے کے اثرات باقی تھے اور اس منظر کا تصور بھی روح فرسا ثابت ہو رہا تھا جب زندگی اور موت کے درمیان وقت کے ایک بے وجود لمحے کی ناپائیدار دیوار حائل رہ گئی تھی۔ موت کو میں نے اتنے قریب سے کبھی نہیں دیکھا تھا اور محسن کی طرح اب مجھے بھی یقین نہیں آتا تھا کہ صرف میری کوشش سے ایک نہیں کئی خاندان تباہ ہونے سے بچ گئے تھے۔ ایک خاندان تو رضوی صاحب کا تھا۔ دوسرا محسن کا خاندان تھا۔ اس کی بہن کی رخصتی ہو چکی تھی اور ماں بہت جلد ہمیشہ کے لیے دنیا سے رخصت ہونے والی تھی۔ محسن نہ رہتا تو بوڑھے والد بھی اس صدمے سے مر جاتے۔ پھر اسی خاندان کے بطن سے جنم لینے والا دوسرا خاندان وہ تھا جس کی بنیاد شہلا اور محسن تھے۔ یہ خاندان وجود میں آنے سے قبل ہی مٹ جاتا۔ چوتھا خاندان وہ تھا جو میرا اور رابعہ کا خاندان کہلاتا۔ ابھی تو ہم نے صرف خیالوں میں اس کا نقش مکمل کیا تھا۔ صرف اپنے تصور میں اس کا خاکہ بنایا تھا اور صرف خوابوں میں اس کو آباد کیا تھا۔ کتنا بے حس اور سفاک ہوتا ہے وہ لمحہ جو برسوں روشن رہنے والے امیدوں کے چراغ ایک پل میں بجھا دیتا ہے۔ ایک پل میں اس نخل آرزو کو ویران کر دیتا ہے جس کی آبیاری خون جگر سے کرتے عمر بیت جاتی ہے اور ایک پل میں محبت کے ہر تاج محل کو سنسان کھنڈر کر کے گزر جاتا ہے۔

محسن نے میری طرف سگریٹ بڑھائی تو مجھے احساس ہوا کہ میرے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ "یہ کیا ہو گیا ہے تجھے؟" محسن نے کہا۔ "بس اتنا ہی حوصلہ تھا سکندر اعظم!" میں نے پیکٹ لے کر دو سگریٹیں جلائیں اور ایک محسن کو دے دی۔

"بات حوصلے کی نہیں ہے محسن!" میں نے کہا۔ "نتائج کا تصور لرزہ خیز ہے۔ کیا ہوتا اگر گاڑی ٹکرا جاتی۔ ہم نے اپنی جدوجہد کا آغاز کب کیا تھا اور کہاں سے کیا تھا پھر کتنے مصائب برداشت کیے۔ کیسی کیسی آزمائش سے گزرے اور کتنے بڑے دشمنوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ ان کی ہر چال کو ناکام بنایا اور کبھی ہراساں نہیں ہوئے۔ کہاں جاتا کامیابی کا سارا غرور اور اپنے اعتماد سے بالآخر دشمن کو شکست دینے کا عزم۔ تقدیر کی ایک غلط چال سے دشمن جیت جاتے اور ہم نے جتنی جدوجہد کی تھی رائیگاں جاتی۔"

"یہ جدوجہد بہت عظیم تھی جو تو نے ابھی سات افراد کی زندگی بچانے کے لیے کی۔" محسن نے کہا۔ "اور میں سمجھتا ہوں تائید ایزدی حاصل نہ ہوتی تو ہمیں بہت پہلے ہی شکست ہو جاتی۔ خدا نے تجھے حوصلہ عطا کیا، [illegible] اور تیری مدد کی تو آج بھی تیری کوشش نے موت کو شکست دے دی۔"

"میری کوشش سے کیا ہو سکتا تھا محسن! اگر نوشتہ تقدیر کے مطابق فرشتۂ اجل اسی جگہ اسی وقت ہم سب کی روح قبض کرنے کا منتظر ہوتا۔" میں نے کہا۔ "ہم کب سے موت کے خلاف نبرد آزما ہیں اور ڈاکٹر جتنی کوشش کر سکتے تھے کر چکے۔ ان کے پاس جتنا علم تھا تجربہ تھا اور صلاحیت تھی اور میڈیکل سائنس کی جتنی ریسرچ کا سرمایہ تھا سب تمام ہوا اور انہوں نے اپنی بے بسی کا اعتراف کر لیا کہ وہ اس ناگزیر لمحے کو نہیں ٹال سکتے۔"

"یہ بڑی عجیب بات ہے۔" محسن بولا۔ "ڈاکٹروں نے پہلے ان کی زندگی کی میعاد چھ ماہ رکھی تھی۔ پھر اسے چار مہینے کر دیا اور اب انھیں اسپتال سے لانے سے پہلے تو ڈاکٹروں نے صاف بتا دیا تھا کہ شاید یہ آخری مہینہ بھی پورا نہیں گزرے گا لیکن تین ہفتے گزر چکے ہیں۔ مایوسی میں آدمی کیا کچھ نہیں کرتا۔ مشورے دینے والے سب ہی ہمدرد لوگ تھے۔ کسی نے کہا فلاں درگاہ کی مٹی میں شفا ہے، ڈیڈی نے وہ بھی پانی میں گھول کر پلا دی۔ کسی نے اپنے پیر صاحب سے تعویذ لا کے دیا۔ ڈیڈی نے اسے بھی عین ہدایات کے مطابق عمل کر کے سرہانے رکھ دیا۔ ایک نفسیاتی سہارے کی ضرورت ڈیڈی کو بھی تھی اور یہی سہارا دے کر وہ امی کی توانائی کو بحال رکھنا چاہتے تھے ورنہ میرا خیال ہے کہ زندگی میں خدا کے سوا انہوں نے کسی سے مدد نہیں مانگی اور کوشش کو صرف ایک وسیلہ ضرور سمجھا ہوگا مگر کامیابی کو رضائے الٰہی سے منسوب کیا۔ ہر شخص کی زندگی کے تجربات الگ ہوتے ہیں اور انہی کے نتائج پر وہ اپنے یقین کی بنیادیں استوار کرتا ہے۔ معمولات متعین کرتا ہے اور جینے کا ایک ڈھنگ اپناتا ہے۔ ڈیڈی پر کبھی سخت وقت آیا تو وہ رات بھر سربسجود رہے اور خدا کے حضور دست بدعا رہے مگر میں نے انہیں کبھی پیروں فقیروں کے آستانوں پر حاضری دیتے نہیں دیکھا۔ بیماری میں انہوں نے ہمیشہ سرکاری ڈاکٹروں سے رجوع کیا یا اسپتال گئے۔ دنیا میں ایک سے ایک بڑا حکیم موجود ہے جن کے ہاتھ میں خدا نے شفا دی ہے اور بڑے ماہر ہومیوپیتھ بیٹھے ہیں جنہوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں اور علم سے صحیح تشخیص کی اور ان کے علاج سے وہ مریض صحت یاب ہوئے جن کو ایلوپیتھک ڈاکٹر ناقابل علاج قرار دے چکے تھے۔ امی کے کیس میں بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ ڈیڈی کے کسی دوست نے گوالمنڈی کے ایک ہومیوپیتھک ڈاکٹر کا ذکر کیا اور ان کے اعجاز مسیحائی کے بہت سے واقعات سنا کے ڈیڈی کو قائل کر لیا کہ کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔ عام ڈاکٹر تو جواب دے چکے ہیں۔ وہ خود ڈاکٹر کو گھر پر لائے اور انہوں نے تو بڑے یقین اور اعتماد کے ساتھ کہا کہ مایوسی کفر ہے کیونکہ شفا خدا دیتا ہے اور انسان کی عقل سے یا دوا کی تاثیر سے اس وقت تک کچھ نہیں ہوتا جب تک اس کا حکم نہ ہو۔ عجیب درویش صفت اور بے غرض آدمی تھا۔ اس نے نہ جانے کیا دوا دی۔ میں کچھ کہہ نہیں سکتا کہ آگے کیا ہوگا۔ اس ہومیوپیتھ نے کوئی دعویٰ بھی نہیں کیا ہے مگر امی کی حالت میں نمایاں تبدیلی آئی ہے۔ ان کی حالت پہلے کے مقابلے میں بہت بہتر ہے اور بتدریج بہتر ہو رہی ہے۔ بے شک یہ معجزوں کا زمانہ نہیں ہے لیکن کیا ہر جگہ، ہر دور میں ایسے واقعات رونما نہیں ہوئے جن کو صرف معجزہ سمجھا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر، حکیم، وید اور ہومیوپیتھ۔ جڑی بوٹیوں سے علاج کرنے والے سنیاسی اور صرف دعا دینے والے درویش، ان سب سے ایسے واقعات منسوب ہیں جب مریض کی زندگی کی امید کسی کو نہیں تھی لیکن وہ کسی کے دست شفا کے باعث موت کی سرحد تک جا کے لوٹ آئے اور پھر طبعی عمر کو پہنچ کے مرے۔"

"یہ بات صرف ہمارے ہندوستان پاکستان کی حد تک ہی درست نہیں۔" میں نے کہا۔ "جب ہم برطانیہ میں تھے تو کیسے عجیب و غریب کیس اخبارات میں نظر آتے تھے۔ فلاں ماہر روحانیات، ہپناٹزم سے علاج کرنے والے۔ پراسرار علوم کے ذریعے ہر جسمانی عذاب سے نجات دلانے والے، ان کے معتقد بھی ہوتے تھے اور ایسے لوگ خود پبلک کے سامنے آتے تھے جو انہی لوگوں کے ہاتھوں کسی علت ناقابل علاج مرض سے شفایاب ہوئے۔ خود میڈیکل ایکسپرٹ یہ وضاحت کرنے سے قاصر رہتے تھے کہ ایسا کیوں ہوا؟"

"پھر پچھلے دنوں ایک بڑی عجیب بات اور بھی ہوئی۔" محسن بولا۔ "امی نے خواب میں ایک آواز سنی۔ وہ کسی پہاڑ کی چوٹی پر کھڑی تھیں۔ یہ خواب انہوں نے مجھ سے بھی بیان کیا تھا۔ نہ جانے کہاں سے آواز آ رہی تھی جس کی بازگشت ہر سمت سے آ رہی تھی۔ جا تجھے تیری بیٹی کے لیے زندگی دی بیٹی

دی اور اس کی زندگی بھی دی۔ الفاظ بالکل یہی تھے۔ کیا مطلب ہے ان کا؟"

"ہمارے کسی خواب کی تعبیر بتانے والے سے پوچھو گے تو وہ تمہاری توقعات کے عین مطابق یہ بتائے گا کہ یہ نئی زندگی کی بشارت ہے۔" میں نے کہا۔ "یا اسی قسم کی امید افزا باتیں کرے گا۔ نفسیات تو کہتی ہے خواب انسان کی ناآسودہ خواہشات کی تکمیل کا سامان فراہم کرتے ہیں اور انہی کا عکس ہوتے ہیں۔ چنانچہ تمہاری امی کے لاشعور میں زندہ رہنے کی جو خواہش موجود ہے، وہی خواب بن گئی۔ اب کون سچ کہتا ہے اور کون غلط، اس کا فیصلہ میں کیسے کر سکتا ہوں۔"

"فیصلہ میں بھی نہیں کر سکتا کہ خواب جھوٹے سچے ہوتے ہیں یا نہیں۔" محسن نے کہا۔ "لیکن امی پر اس خواب کا بڑا خوشگوار نفسیاتی اثر پڑا ہے۔ پہلے وہ خاصی ناامیدی کی باتیں کرتی تھیں۔ اب کہتی ہیں میں زندہ رہوں گی۔ خدا نے مجھے نئی زندگی بخش دی ہے۔ تم سب دیکھو لو گے، میری بیٹی نے مجھے نئی زندگی دی ہے۔"

"یعنی مریم باجی نے؟" میں نے کہا۔ "خواب میں انہوں نے خود کو پہاڑ پر دیکھا تھا اور مریم باجی کا انتقال جس حادثے میں ہوا تھا وہ مری میں پیش آیا تھا۔ یہ سانحہ بھی اُن کے لاشعور میں......"

"نہیں۔ اُن کی مراد شہلا سے ہے۔" محسن بولا۔ "پہلے میں بھی یہی سمجھا تھا لیکن انہوں نے میری توجہ الفاظ کی طرف دلائی۔ نئی بیٹی کے لیے زندگی دی۔ بیٹی بھی دی اور زندگی بھی دی۔"

میں دم بخود رہ گیا۔ "یہ تو کمال ہو گیا۔ شہلا نے اس حد تک متاثر کر لیا ہے انہیں۔ ان حالات میں اگر شہلا ہی وہ نفسیاتی قوت بن جائے جو انہیں موت کے منہ سے کھینچ لائے تو کچھ عجب نہیں۔"

"معلوم نہیں کیا بات ہے سکندر! میں ان کی حالت میں موجودہ افاقے کو کسی طریقہ علاج کی کامیابی سے منسوب نہیں کر سکتا۔" محسن نے کہا۔ "یہ ممکن ہے کہ ہومیو پیتھی کا علاج انہیں موافق آ گیا ہو۔ مگر تیری طرح میں بھی اسے اعتقاد کا کرشمہ سمجھنے پر مجبور ہوں میرے اور ڈیڈی کے لیے اُن کے یقین سے روگردانی ناممکن تھی۔ ہم نے ان کے یقین کو تقویت پہنچانے کی پوری کوشش کی یقین کی قوت سے ہی معجزے ظہور میں آتے ہیں اور اسی لیے میں تیرے ساتھ چلا آیا میں نے کہا امی! اب تو آپ ٹھیک ہو رہی ہیں میں یہاں رہ کے کیا کروں گا۔ آپ کی خدمت کے لیے خدا نے آپ کو نئی بیٹی بھی دے دی ہے۔ وہاں سکندر کے ساتھ کوئی نہیں یہ در اصل ان کے اعتقاد پر اپنے اعتماد کا اظہار تھا جو اس مرحلے پر بہت کچھ کر سکتا ہے۔ اگر یہ سب میری خواہشات کا فریب ہوا اور ڈاکٹروں کا فیصلہ ہی صحیح ثابت ہوا تو میری بدنصیبی۔ میں ان کے پاس رہ کے بھی کیا کر لیتا۔ جب ضرورت پڑے گی پھر چلا جاؤں گا اور ان کی آخری رسوم میں شرکت کر کے لوٹ آؤں گا۔ ورنہ میری بات کا ردِ عمل بہت مثبت ہو گا اور اثر تو اسی وقت ہو گیا تھا جب انہوں نے کہا تھا تُو جا میں اب ٹھیک ہوں۔ میری فکر مت کر۔ سکندر کا خیال رکھ۔"

جی ٹی روڈ پر ٹریفک بہت زیادہ تھی چنانچہ ہم بالکل بائیں کنارے پر رہنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پیچھے سے آنے والے تو قریب آ کے ہماری سست رفتاری کا سبب جان لیتے تھے اور اوورٹیک کرنے سے پہلے احتیاط سے کام لیتے تھے لاہور کی طرف سے آنے والی بسوں اور ویگنوں سے تھا جو اس سیدھی سڑک پر ایک دوسرے کے ساتھ ریس لگاتے تھے اور بعض اوقات آگے نکلنے کی کوشش میں سڑک کے دوسرے کنارے تک پہنچ جاتے تھے تو سامنے سے آنے والوں کے لیے نہیں رہتا تھا چنانچہ حادثات بھی ہو جاتے تھے۔

کالا شاہ کاکو سے آگے یہ خطرہ اور بڑھ گیا تو میں نے اور محسن نے فیصلہ کیا کہ شاہدرہ پہنچتے ہی گاڑی کو سب سے پہلے نظر آنے والے گیراج پر کھڑا کر دیں گے۔ پانچ میل کے بعد میں نے سڑک سے ہٹ کر ایک جگہ سائلینسر لٹکے ہوئے دیکھے وہیں درخت کے نیچے ایک شخص ریڈی ایٹر کی جالی میں ٹانکے لگا رہا تھا اور بقلم خود لکھے ہوئے "داتا نگری موٹر ورکشاپ" کے سامنے بہت سی گاڑیاں کھڑی تھیں دو ٹرک، ایک بس اور ایک ویگن کے علاوہ دو کاریں بھی زیرِ علاج تھیں۔

میں نے ہارن دے کر کانسٹیبل کو متوجہ کیا اور اس نے ہاتھ کے اشارے سے مطلب سمجھ کے اپنی گاڑی آہستہ آہستہ روک لی۔ ہم نے اُس کا شکریہ ادا کر کے رخصت کیا اور گیراج کے مالک کو تلاش کیا۔ ایک لڑکے نے بتایا کہ استاد کہاں ہیں۔

پروپرائٹر گیراج ہذا درخت کے نیچے چارپائی پر نیم دراز تھے اور دو زیرِ تربیت شاگردوں کو ان کی عمر اور سینیارٹی کے مطابق پُرشفقت گالیوں سے نواز رہے تھے "بھیو باؤ جی!" انہوں نے ہمیں کسی بس سے نکلی ہوئی سیٹ کی طرف متوجہ کیا جو صوفے کا کام دیتی تھی۔ پھر انہوں نے دہاڑ کر کہا۔ "اوئے کبوترا! دیکھ باؤ جی دی گڈی لے کر آ فٹا فٹ۔ تو بھی جا ساتھ اس کے پہلوان۔"

جسے کبوتر قرار دیا گیا تھا وہ چودہ پندرہ برس کا شوقین مزاج لڑکا تھا جس نے لمبے لمبے بال رکھے ہوئے تھے اور آنکھوں میں چمچے کے حساب سے کاجل ڈالا تھا۔ شاید یہ لقب اسے کبوتر بازی کے شوق کے طفیل ملا ہو گا۔ پہلوان کا معاملہ "برعکس نہند نام زنگی کافور" والا تھا۔ وہ سترہ اٹھارہ برس کا بانس کی طرح دبلا اور لمبا نوجوان تھا جس کی ساری پسلیاں بنیان کے سوراخوں سے گنی جا سکتی تھیں۔

"کیا ہوا ہے گڈی کو جنابِ عالی!" پروپرائٹر نے حقے کا کش لے کر سوال کیا۔ ہم نے اپنی دکھ بھری کہانی رقت انگیز پیرایے میں اور رحم سے کم الفاظ میں بیان کی۔ مقصد صرف یہ تھا کہ وہ حادثے کے متاثرین کو ترجیح دے اور فوری امداد فراہم کرے۔

"چلو جی رب دا شکر کریں۔ سب توں آپا دا فضل اے۔ گڈی ٹھیک ہو جاتی ہے۔" اس نے متاثر ہو کے کہا۔ "لیکن فیر دی تین چار گھنٹے لگ جائیں گے آپ کے۔ جالی کھول کے دیکھنی پڑے گی کہ نئی ڈالنی ہے یا مرمت سے کام چل جائے گا۔ ماسٹر سلنڈر کی واشریں اور ساری بریک لائن چیک کرنے کے بعد بریک سیٹ کرنے پڑیں گے چاروں دہیلوں کے۔ ایک ڈبہ بریک آئل چاہیے۔"

"آپ یہ بتا دیں کہ کُل خرچ کتنا ہو گا؟" میں نے کہا۔ "ہم آپ کو کتنے پیسے دے جائیں اور کس وقت آئیں؟"

"دیکھو جی! اگر تو جالی نئی پڑی تو خرچہ ہو گا زیادہ۔ ورنہ آپ سو دے جائیں۔" استاد نے کہا۔

"آپ ریڈی ایٹر نیا ڈال دیں۔ مجھے امید نہیں کہ مرمت کے بعد وہ ٹھیک ہو سکے۔" میں نے کہا۔ "گاڑی گرم ہونے لگی تو مصیبت بنی رہے گی۔"

"چنگا جی جیسے آپ کی مرضی۔" استاد نے کہا۔ "پھر آپ پانچ سو دے جائیں اور ابھی کیا ٹائم ہوا ہے...... تین۔ آپ آجائیں مغرب کے وقت۔ یہ ڈینٹ شینٹ کا کیا ہو گا؟" اُس نے گاڑی پر نگاہ ڈال کے افسوس سے سر ہلایا۔

"وہ ہم بعد میں کرائیں گے۔" میں نے کہا۔ "پہلے گاڑی چلنے کے قابل تو ہو جائے۔" اور سو سو کے پانچ نوٹ استاد جی کی نذر کیے۔ استاد جی نے دیکھا کہ جتنے نوٹ ان کی جیب میں گئے ہیں اُن سے کہیں زیادہ تو میری جیب میں موجود ہیں۔ ایک بار پھر انہوں نے ڈینٹنگ کا سارا کام بھی ختم کرا لینے کے فوائد پر روشنی ڈالنی چاہی اور یہ بھی کہا کہ ہمیں خصوصی رعایت دی جائے گی لیکن ہم چاہتے تھے کہ رنگ و روغن خود رضوی صاحب اپنی پسند سے کرائیں، جب چاہیں کرائیں اور جس سے چاہیں کرائیں۔ یہ دو چار گھنٹے کا نہیں، ہفتے دس دن کا کام تھا۔

تین بجے ہم نے شاہدرہ کے "ہائی کلاس ہوٹل" میں لنچ تناول فرمایا۔ کھانے کا وقت گزر چکا تھا چنانچہ تنور کی روٹیاں ٹھنڈی تھیں اور انہیں دانتوں سے پیس کر حلق میں اتارنا خاصا مشقت طلب کام تھا۔ بچا کھچا "قورمہ" چند ہڈیوں پر مشتمل تھا جن پر گوشت کے ذرات محسن نے دریافت کیے۔ دیگر اجزا میں سب سے اہم عنصر سرخ مرچوں کا تھا جو وافر مقدار میں ڈالی گئی تھیں اتنی کہ پہلا لقمہ کھانے کے بعد اشک آنکھوں سے بہنے لگے اور دھواں سیکے کانوں سے خارج ہونے لگا۔ پھر میں اتنا محتاط ہو گیا کہ روٹی کو سالن سے رسماً چھوتا رہا اور اوپر سے پانی ڈالتا رہا۔

"شاید اسی کا نام قورمہ ہے بھائی محسن!" میں نے گلوگیر لہجے میں آنکھیں پونچھ کر کہا۔ "اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی۔"

"یہ آگ وہ نہیں جسے پانی بجھا سکے۔" محسن نے ارشاد کیا اور باقی جگ خالی کر دیا۔ "اب اگر مجھے اجازت ہو تو میں جاؤں۔ کئی دن سے سونا نصیب نہیں ہوا۔ پہلے رخصتی کا ہنگامہ تھا اور کام کرنے والا میں اکیلا۔ پھر تیمارداری اور دونوں کا جذباتی دباؤ۔"

"مجھے افسوس ہے یار کہ میں پہلے نہیں آ سکا۔" میں نے شرمندگی سے کہا۔ "میں آنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ مجھ میں ہمت نہیں تھی۔"

"مجھے معلوم ہے۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ "اب تو لے آنا گاڑی۔ تین گھنٹے گزارنے کے لیے جہانگیر کے مقبرے چلا جا یا وہ جو سامنے دوسرا مقبرہ سا نظر آ رہا ہے نا...... وہ ہے تھیٹر۔ اس میں فلم "ٹیکے والی" دیکھ اور عش عش کر۔ کیا غضب ڈھایا ہے مسرت نذیر نے بھی تانگہ چلا کے۔ گھوڑے کی خوش قسمتی پر رشک آتا ہے" اور ان مفید مشوروں کے بعد وہ ایک رکشا روک کے روانہ ہو گیا۔

میرا ارادہ فلم ٹیکے والی دیکھ کے مسرت نذیر پر فریفتہ ہونے کا ہرگز نہیں تھا چنانچہ میں نے بڑی نیک نیتی سے مقبرہ جہانگیر کا رُخ کیا تھا۔ ارے کرنا خدا کا ایسا ہوا کہ بقول شاعر ؎ جو راہ ادھر کو جاتی ہے مقتل سے گزر کے جاتی ہے۔ میں "ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس" کے سامنے سے گزرا تو میری نیت بدل گئی اور میں نے سوچا کہ اتنے عرصے بعد چوہدری دلاور سے ملاقات کر لینے میں کوئی حرج نہیں۔ مقصد تو صرف وقت گزارنا ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ مجھے دیکھ کر دلاور کے دل پر کیا گزرتی ہے۔ میں اطمینان سے اس کیبن تک گیا جو "ریسپشن" سے زیادہ چیک پوسٹ تھا۔ حسبِ توقع اندر وہی نوجوان شاید اسی مصنف کے تازہ ترین جاسوسی ناول میں غرق تھا۔ اگر وہ غور کرتا تو مجھے پہچان جاتا لیکن اس کے تصور میں منظر وہی رہا جہاں میں نے دخل اندازی کی تھی۔

"کیا کام ہے؟" اس نے کتاب رکھ کے کہا۔ "نام بتاؤ اپنا۔"

"نام ہے سائیں علی مراد بھائی دروازے والا۔" میں نے کہا۔ "وڈے چوہدری صاحب نے بلایا تھا۔"

اس نے ایک پرچی پر "علی مراد" اور وقت ملاقات کے بعد چوہدری دلاور لکھا اور مجھے پکڑا دی۔ "واپسی میں دستخط کرا کے لانا۔" اس نے دوبارہ ناول اٹھا کے اسی صفحے سے مطالعہ شروع کیا۔ میں نے پرچی گیٹ پر موجود چوکیدار کو دکھائی۔ وہ میری صورت سے آشنائی اور نام سے ناآشنائی کے باعث تھوڑے سے تذبذب کا شکار ہوا۔ پھر اس نے سطے کیا کہ پرچی ہو تو اسے کیا ضرورت ہے پریشان ہونے کی۔ اسی نے مجھے اندر کر دیا۔ گیٹ پھر بند ہو گیا۔

میں نے پرچی کو گولی بنا کے اچھال دیا اور چوہدری دلاور کے کمرے کی طرف بڑھا۔ ابھی ایک مرحلہ اور بھی تھا۔ پہلے دروازے سے کمرے میں قدم رکھتے ہی دلاور کے پی اے سے مڈبھیڑ ہوئی۔ اس نے مجھے پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں کی ـــــ میرا آنا مصیبت کے آنے سے کم نہیں تھا اور شاید دلاور نے اسے اچھی طرح سمجھا چکا تھا کہ میں کتنی خطرناک چیز ہوں اور کتنی گڑبڑ پھیلانے کا سبب بن چکا ہوں۔ چنانچہ وہ میری طرف لپکا۔ "سکندر صاحب! کیا بات ہے؟"

"کہاں کیا بات ہے؟" میں نے کہا۔ "اور اگر کوئی بات ہے تو کیا یہ ضروری ہے کہ تمہیں بتائی جائے۔"

"چوہدری صاحب کا حکم ہے...... میرا مطلب ہے وہ خفا ہوں گے مجھ پر۔" وہ نروس ہو گیا۔ "میری نوکری کا تو خیال کیجیے۔"

"تمہاری نوکری برقرار رہے گی۔" میں نے کہا۔ "بلکہ ہم ترقی بھی دیں گے لیکن تم راہ میں حائل ہوئے تو ہم ایک جھانپڑ دیں گے اور تمہیں مالکوں سے یوں بات کرنے کا مزہ اس وقت آئے گا جب تم نقلی بتیسی لگا کے سوجی تناول فرماؤ گے۔"

مجھے اس کی مجبوری اور بے بسی پر ترس آیا۔ وہ ہاتھیوں کی جنگ میں پس جانے والے حشرات الارض سے زیادہ مظلوم تھا اور کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا، سوائے اپنے۔ وہ مجھے نہ روکتا تو اچھی

نوکری سے ہاتھ دھوتا اور روکتا تو اپنے دانتوں سے۔ میں اسے ہکابکا اور پریشان حال چھوڑ کے دلاور کے کمرے میں داخل ہوگیا۔ چوہدری دلاور گھومنے والی کرسی کی پشت کا سہارا لیے پیر اپنی میز پہ پھیلائے فارغ بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ ذرا بھی نہیں چونکا اور اسی پوز میں بالکل بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ اس کی اداکارانہ صلاحیت کا میں پہلے سے معترف تھا لیکن یہ اداکاری کا کمال نہیں تھا۔ اس نے یقیناً میری آواز سن لی تھی اور یہ طے کرچکا تھا کہ میری آمد پر حیرت، خوف یا پریشانی کا اظہار اس کو زیب نہیں دیتا۔

"کون ہے، اپنے سکندر صاحب۔" میرے "السلام علیکم" کے جواب میں اس نے بڑے سکون کے ساتھ مسکرا کے کہا اور پاؤں میز پر سے ہٹا کے آہستہ آہستہ اٹھا۔ "لو بھئی کمال ہوگیا۔ بڑی عمر ہے آپ کی۔ ابھی آپ کے متعلق ہی سوچ رہا تھا میں۔" مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا کے بولا۔

"انگریز کہتے ہیں کہ ادھر شیطان کو یاد کرو، ادھر وہ حاضر۔" میں نے بے تکلفی سے کہا۔

"یہی تو فرق ہے جی ان میں اور ہم میں۔" وہ بیٹھتے ہوئے بولا۔ "تشریف رکھیں۔ ہم سادہ دل لوگوں کے دل میں کبھی برائی کا خیال نہیں آتا۔ ہم کہتے ہیں عمر لمبی ہو۔ وہ کہتے ہیں شیطان آگیا۔ اسی سادگی سے فائدہ اٹھا کے تو وہ ہم پہ اتنا عرصہ حکومت کر گئے۔ آپ نے تو بہت کچھ سیکھا ہوگا ان سے۔"

"انسان نے تو شیطان سے بھی سبق سیکھا تھا۔" میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اور انگریز تو دفع ہوئے مگر حکومت اب آپ جیسے سادہ دل لوگوں کی ہے۔ ہمیں بھی جو کچھ سیکھنا ہے آپ ہی سے سیکھنا ہے۔ اور کچھ سکھانا ہے تو وہ بھی آپ ہی کو۔"

چوہدری دلاور کا چہرہ میری ذو معنی بات کے باوجود سپاٹ رہا۔ "بڑے عرصے بعد ملاقات ہوئی آپ سے۔" وہ بولا۔

"آپ تو جانتے ہیں میں کتنا مصروف تھا اپنے چوہدری صاحب!" میں نے اطمینان سے سگریٹ سلگائی۔ "تعزیت تک کے لیے حاضر نہ ہو سکا۔" میں نے لائٹر کو جیب میں رکھنے سے پہلے پھونک مار کے اس کے شعلے کو بجھایا۔

"کیسی تعزیت؟" دلاور نے کہا۔ ذرا سی دیر کے لیے اس کی صورت پر حیرانی کے آثار نمودار ہوئے۔ میرا آخری جملہ اتنا غیر متوقع تھا کہ وہ اپنے فطری ردِعمل کو نہ چھپا سکا۔ پھر اسے یاد آگیا کہ میں کس کا حوالہ دے رہا ہوں۔ "اچھا... وہ....."

"جی۔ میں نے سنا تھا آپ کے گھر کی کسی خاتون کا انتقال ہو گیا تھا۔" میں نے سگریٹ کا کش لے کر کہا۔ "مجھے معلوم نہیں تھا کہ شہلا کی والدہ سے آپ کی قرابت داری تھی۔ وہ لڑکی تھی نا شہلا۔ اپنے ڈی سلوا صاحب کی سیکرٹری۔"

"مجھے معلوم ہوا ہے۔" دلاور نے مکھی مارنے والی جالی کو ... سے میز پہ مارا اور مقتول مکھی کی لاش نیچے پھینک دی۔

"پھر بڑا افسوس ہوا ڈی سلوا صاحب کا۔" میں نے ... جاری رکھی۔ "سنا ہے بڑا خوفناک۔ بلکہ عبرتناک حادثہ تھا ... بھی سنا ہے کہ....."

"جو بھی آپ نے سنا ہے ٹھیک ہی سنا ہوگا۔ اپنے سکندر ..." وہ میری بات کاٹ کے بولا۔ "اور ابھی بہت کچھ سنیں گے ہم ... آپ بھی۔ یہ بتائیں کیا پئیں گے؟ دیسی کہ ولائتی؟ میرا مطلب ہے ... کہ ٹھنڈا۔"

"چائے۔" میں نے کہا۔ "اس میں زہر ہوتا ہے تھوڑا ... کیفین۔ وہی دے دیں اپنے ہاتھ سے۔"

دلاور ہنسا۔ "آپ مذاق خوب کرتے ہیں۔" وہ بولا۔ "بھلا ... پر زہر کیا اثر کرے گا؟ اور ہم کوئی دشمن ہیں آپ کے جو خدانخواستہ ... زہر دیں گے آپ کو اور وہ بھی اپنے ہاتھوں سے؟" اس نے ... کا بٹن دبا کے پی اے سے چائے کے لیے کہا۔

"ڈی سلوا کی جگہ کسی نئے منیجر کا تقرر کیا ہے آپ نے ..." میں نے کہا۔ "یا ایسے ہی کام چل رہا ہے؟"

"کام ایسے ہی کیسے چل سکتا ہے۔ نیا بندہ رکھا ہے میں نے ... ایک۔" وہ بولا۔ "لیکن ابھی عارضی ہے۔ اب یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے ... اپنے سکندر صاحب کہ میں ہی فیصلے کرتا رہوں، آپ سے مشورہ کیے بغیر۔ مالک تو آپ بھی ہیں برابر کے۔ قانون یہ بات کل تسلیم کرے ... ہم آج کرتے ہیں۔"

دلاور کا رویہ اور خیالات کی یہ تبدیلی کسی نئی حکمتِ عملی ... تپا دیتی تھی۔ میں یہ فرض نہیں کر سکتا تھا کہ دلاور جیسے شخص کے ... کی سوچ کا یہ مثبت پہلو اس کی شخصیت میں رونما ہونے والے ... کا نتیجہ ہے۔ وہ مصالحت پر آمادہ ہے یا اس نے حقیقت کو تسلیم ... ہے۔ شکاری نئی چال چل رہے تھے یا نیا جال بچھا رہے تھے ... عقل تقاضہ کرتی تھی کہ میں محتاط ہو جاؤں۔ پی اے نے ڈرتے ڈرتے ... چائے لا کر رکھی اور دلاور سے نظر ملائے بغیر لوٹ گیا۔

"کیا پرانے لوگوں میں سے کوئی اس قابل نہیں تھا کہ اسے ... بنایا جائے۔ ان کو کام کا تجربہ تھا۔" میں نے کہا۔

"ایک ہی آدمی تھا کام کا جناب!" وہ افسوس سے سر ہلا کر ... بولا۔ "مارا گیا بیچارا حادثے میں۔ کیا نام تھا اس کا.... ہاں غلام ... اکاؤنٹنٹ تھا اور آپ کے والد مرحوم کا خاص آدمی تھا۔"

"اور یہ نیا منیجر؟ یہ کس کے والد کا خاص آدمی ہے؟" ... نے کہا۔ "تجربہ اور تعلیم کیا ہے اس کی؟"

دلاور کی قابلِ رشک خوبی یہ تھی کہ اسے اپنے اعصاب پر مکمل کنٹرول حاصل تھا۔ وہ گالی کھا کے بھی مسکرا سکتا تھا اور مسکراتے ہوئے گالی دے سکتا تھا۔ اس کے دلی جذبات کا عکس اس کی صورت پر حسبِ منشا نمودار ہوتا تھا۔ اور اندر ہی اندر آتشِ غضب سے کھولنے کے باوجود وہ اظہارِ مسرت پر قادر تھا اور نفرت کے زہر کو دبا کے محبت کرنا جانتا تھا۔

"ڈی سلوا قابل آدمی تھا۔" اس نے اعتراف کیا۔ "احمد نواز گردیزی.... میری مراد اس نئے منیجر سے ہے اس کے برابر تو نہیں ہے لیکن ہو جائے گا۔" اس نے ایک کپ چائے بنا کر میرے سامنے رکھی۔

"آپ کے زیرِ سایہ تربیت پا کے تو وہ ڈی سلوا ہی بنے گا۔" میں نے کہا۔ "لیکن سوال یہ ہے چوہدری صاحب! کہ آپ کی جوہر شناس نظروں نے اس ہیرے کو کہاں سے اٹھا لیا۔ راہ چلتے کسی آدمی کا تقرر تو نہیں کیا ہوگا آپ نے؟ احمد نواز... اور کیا؟.... گردیزی۔ تو یہ گردیزی صاحب کون ہیں، پہلے کیا کرتے تھے اور کہاں تھے؟"

"میں اتنے بہت سارے سوالات کا جواب کیا دوں سکندر صاحب!" دلاور نے کہا اور انٹرکام کا بٹن دبایا۔ "ذرا احمد نواز سے کہو کہ سب کام چھوڑ کے آجائے اور یہ لڑکا جو ریسپشن پر بیٹھا ہے اسے کہو کہ اپنا رجسٹر لے کر آئے۔"

"یس سر!" پی اے نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"ابھی حاضر ہو جاتا ہے گردیزی۔" دلاور نے کہا۔ "آپ چائے پئیں۔ جو پوچھنا ہے اس سے آپ خود ہی دریافت فرمالیں۔"

"گویا آپ کو کچھ معلوم نہیں۔" میں نے کہا۔ "یا آپ کا خیال ہے کہ میں یقین نہیں کروں گا؟ خیر۔ آنے دیں اسے۔"

"بات دراصل یہ ہے جنابِ عالی!" دلاور نے کسی طنز کے بغیر کہا۔ "کہ یہ جو میرا پی اے ہے نا، اسی نے کوئی فون وغیرہ کیا تھا۔ دفتر روزگار والوں کو اور ان کو سمجھا دیا تھا کہ ہمیں کیسا بندہ چاہیے۔ پہلے ہمارے پاس کون تھا اور ہم کرتے کیا ہیں۔ انہوں نے غلط آدمی تو نہیں بھیجا ہوگا۔ ایک سے ایک قابل بندہ ڈگریاں لے کر جوتیاں چٹخاتا پھر رہا ہے۔ اس منڈی میں دیسی ولایتی سب مال مل جاتا ہے۔"

ریسپشن کے ڈبے میں بیٹھ کے جاسوسی ناولوں کا کورس کرنے والا نوجوان رجسٹر لے کر نمودار ہوا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی پیشانی پر ناگواری اور حیرت کے آثار شکن بن کے نمودار ہوئے۔ دوسرے لمحے مجھے پہچانتے ہی اس پر چودہ طبق روشن ہوگئے اور اس پر یہ افسوسناک انکشاف ہوا کہ عملی زندگی میں اس کی جاسوسی دھری رہ گئی اور اتنا پڑھ کے بھی اس نے جھک ماری کہ غلط آدمی کو شناخت نا بھی نہ سیکھا۔ اس نے مجھے گھورتے ہوئے رجسٹر دلاور کے سامنے رکھ دیا۔

دلاور نے دور ہی سے اس پر ایک سرسری نگاہ ڈالی۔ "یہ سائیں علی مراد کون آیا ہے مجھ سے ملنے۔ بلاؤ اسے۔"

"وہ..... یہ..... انہوں نے یہی کہا تھا۔" نوجوان نے میری طرف اشارہ کیا۔ اسے شاید میرا نام یاد نہیں آیا۔

دلاور نے اسے غور سے دیکھا۔ "او میاں! یہ بتا کہ نشہ کون سا کرتا ہے تُو؟ مالکوں کو نہیں پہچانتا ہے آج، کل باپ کو بھی نہیں پہچانے گا۔ کوئی اور ہوگا وہ۔ جا اسے دیکھ اور لے کے آ میرے پاس۔ کوئی ملنگ فقیر اندر فیکٹری میں گھس گیا اور تو کیا کرتا رہا؟ جاسوسی ناول پڑھتا رہ گیا؟" اس نے رجسٹر بند کر کے واپس کھسکایا۔ "اس چوکیدار کے ساتھ مل کے سائیں علی مراد کو لے آ فٹافٹ ورنہ پتر تم دونوں کی خیر نہیں۔ دیکھیں نا اپنے سکندر صاحب! نہ جانے کون (.....) سائیں بن کے اندر آگیا اور یہ (.....) دیکھتے رہے۔ وہ پاگل کا بچہ نقصان پہنچا دے مشینری کو؟ آگ لگا دے فیکٹری میں۔" اس نے تینوں افراد کے لیے ایک ہی اسم صفت استعمال کیا اور اسے بڑی مہارت سے جملے کے درمیان یوں فٹ کیا کہ میں دنگ رہ گیا۔ اتنی بڑی گالی اس نوجوان مرد نے محض اس لیے چپ چاپ کھالی کہ اسے اور اس کی آمدنی پر انحصار کرنے والوں کو روٹی بھی کھانی تھی، تن بھی ڈھانپنا تھا اور زندہ رہنے کے اس سہارے

کو قائم رکھنا تھا۔ اس نے بڑی عجیب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ان نظروں میں فریاد بھی تھی، احتجاج بھی تھا، ملامت بھی تھی اور اپنی بے بسی کا اقرار بھی تھا کہ ملاحظہ فرمائیے سکندر صاحب! کسی کی جان گئی اور آپ کی ہنسی ٹھہری۔ ہم غریبوں سے آپ کا یہ کیسا جان لیوا مذاق تھا کہ ہم بے آبرو بھی ہوئے اور بے روزگار بھی اور آپ اب بھی اقرار نہیں کر رہے ہیں کہ سائیں علی مراد بن کے آپ ہی آئے تھے۔

"چوہدری صاحب! قسم خدا کی، میں نے کوئی غلطی کی ہے تو مجھے معاف کر دیں۔" وہ اچانک دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ "یہ سکندر صاحب ہیں نا یہ۔ اب مجھے ان کا نام یاد آگیا ہے۔ انہوں نے اپنا نام سائیں علی مراد بھاٹی گیٹ والا ہی بتایا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ آپ نے بلایا ہے۔ میں ان کو پہچان نہیں سکا تھا۔ میری ماں کی آنکھوں کا آپریشن ہونا ہے۔ اس کے لیے میں تین ہزار روپے جمع کر رہا ہوں۔ آپ نوکری سے نکال دیں گے تو......"

"تو کیا ہوگا؟" میں نے گرج کر کہا۔ "اور جتنے لوگ دنیا میں زندگی گزار رہے ہیں سب یہیں پر ملازم ہیں؟ جسے یہاں سے نکال دیا گیا، کیا وہ فاقے کرتا سڑک پر ایڑیاں رگڑتا مر گیا؟ شرم آنی چاہیے تمہیں جوان آدمی ہو۔ ہاتھ پیر سلامت ہیں۔ مسلمان ہو۔ اس کے باوجود اپنے رزق کو اپنے ہی جیسے انسان کے ہاتھ میں سمجھتے ہو؟ یہاں سے نکال دیے گئے تو اور کچھ نہیں کر سکو گے؟ ماں کی آنکھوں کی روشنی عزیز ہے تو اس کے لیے ریڑھی نہیں لگا سکتے؟ گنڈیریاں نہیں بیچ سکتے؟ پلاسٹک پر قلعی نہیں بن سکتے؟ محنت کرنی پڑتی ہے نا اور جاسوسی ناول پڑھنے کے لیے فراغت نہیں ملتی اس لیے تن آسانی کے عادی ہو گئے ہو۔ ہاتھ پیر چلائے بغیر ملتی ہے اس لیے گالیاں بھی قبول ہیں...."

نوجوان کی سٹی گم ہو گئی۔ وہ احمقوں کی طرح مجھے دیکھنے لگا اور رونا بھول گیا۔

"جاؤ۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "آج معاف کیا تم کو بھی اور چوکیدار کو بھی لیکن یہ چوہدری صاحب کی مہربانی سمجھو کیونکہ برابر کے مالک کی حیثیت سے انہوں نے مجھے بھی فیصلے کرنے کا اختیار دیا ہے۔ میں دوبارہ بھی تمہارا تقرر کر سکتا ہوں مگر ابھی تو کسی نے برطرف بھی نہیں کیا ہے تم کو۔ ذاتی طور پر میں اتنے کم ہمت اور بے غیرت لوگوں کو پسند نہیں کرتا۔ جاؤ۔"

جب وہ چلا گیا تو میں نے دلاور کو دیکھا۔ وہ یقیناً اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہا ہوگا مگر ظاہری طور پر بالکل پُرسکون بیٹھا تھا اور مسکرا رہا تھا۔

"بس ایسے ہی دل لگی کی سوجھ گئی مجھے اپنے چوہدری صاحب!" میں نے بھی اس کی طرف مسکرا کے دیکھا۔ میں نے کہا "ذرا آپ کو حیران کر دیں۔ بے چلیے خواہ مخواہ پریشان ہوئے میرے مذاق سے۔ آپ کو اطلاع ملتی تو آپ بھی حیران ہوتے کہ یہ کون سائیں آگیا۔"

"کمال کرتے ہیں جی آپ۔" وہ بولا۔ "آپ جس نام سے آئیں اور کسی بھی حلیے میں آئیں کیا ہم آپ کو نہیں پہچانیں گے؟ کیا آپ نے وضاحت بھی کر دی۔ آئندہ مالکوں میں اور مالکوں کے لیے آنے والوں میں فرق کا خیال تو رکھیں گے۔ آنکھیں تو کھلی چاہییں نا جی۔ یہی بات بری لگی تھی مجھے کہ شاید یہ سوتے رہے، نہ جانے کون اندر گھس گیا۔ سو دوست ہوتے ہیں بندے کے تو اسی لیے ان کو کھڑا کیا ہے وہاں۔ اب آپ نے معاف کر دیا ہے تو ہم کیا کہیں۔ ویسے بھی میں ذرا دم خم دیکھ رہا تھا۔ سمجھ تو گیا تھا کہ سائیں جی آپ ہی ہیں۔"

"مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے چوہدری صاحب کہ آپ آدمی کو پہچان جاتی ہے۔" میں نے کہا۔ "اور حالات کو بہت جلد ... ہے۔ کاروبار میں آپ جیسے پارٹنر کا ہونا میری خوش قسمتی ہے ... ذرا ٹیڑھا آدمی تھا۔ خواہ مخواہ قانونی الجھنوں میں پڑتا تھا اور ... کام کرتا تھا۔ اب یہ کتنی معقول بات ہے جو آپ نے ابھی کی تھی ... تو مجھے کل مالک تسلیم کرے گا، آپ آج کر رہے ہیں۔ بے شک ... کے مالک ہیں لیکن تجربہ آپ کا زیادہ ہے۔ جو کام آپ سے کیے ... کر سکتے ہیں وہ میں نہیں کر سکتا۔ اس لیے آئندہ بھی آپ کی حیثیت ... بڑے بھائی جیسی ہوگی۔ آپ کی رہنمائی کے بغیر شاید میں اس کار... کو چلا ہی نہیں سکتا تھا جو آپ چلا رہے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ... کے متعلق کچھ معلوم ہی نہیں۔"

چوہدری دلاور نے محسوس کر لیا ہوگا کہ میری ہر بات کا ... مطلب ہے چنانچہ جس کاروبار کا میں حوالہ دے رہا ہوں وہ علیم ... انجینئرنگ کمپلیکس کی آڑ میں چلنے والا کاروبار ہے۔ وہ کاروبار ... کی بنیاد وزیر خان مرحوم نے رکھی تھی۔ دلاور نے میری مالکانہ حیثیت تسلیم کر کے کوئی چال چلی تھی۔ تو اس کو بڑے بھائی کی جگہ قرار دے ... میں نے بھی ظاہر کر دیا تھا کہ میٹھی چھری سے حلال کرنا مجھے بھی ... ہے اور حقیقت اب بھی وہی ہے کہ ہم پارٹنر نہیں ایک دوسرے کے حریف ہیں۔ دشمن ہیں اور وہی شکاری ہیں جو اس زندگی کی بازی میں اپنی چال سے ایک دوسرے کی شکست کے سوا کچھ نہیں چاہتے۔ ... اس کاروبار میں مجھے برابر کا شریک کر رہا ہے تو صرف زبان سے ... کی کسی مجبوری کے باعث اور میں اسے قابل اعتماد سمجھ رہا ہوں تو صرف ... اس لیے کہ مجھے سچائی کا پتا چلانا ہے۔ اس ایک سچائی کے پردے ... بہت سے پیچ ہیں۔

"غلط فہمی سے بہت سے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔" دلاور نے ... ایک ایک لفظ کو سوچ کر ادا کیا۔ "لیکن ہر غلط فہمی کبھی نہ کبھی دور ... ہے اپنے سکندر صاحب! ساری بات وقت کی ہے۔ شاید وہ کچھ ...

کتا لیکن انٹرکام پر اس کے پی اے نے مداخلت کی اور یہ اطلاع دی کہ گردیزی صاحب آگئے ہیں۔ دلاور نے مسکرا کے میری طرف دیکھا۔ "کیا خیال ہے؟ بلا لیں اس کو بھی؟"

"اس میں پوچھنے کی کون سی بات ہے؟" میں نے کہا۔ "آپ نے اسے ہیڈ آفس سے یہاں تک دوڑایا ہے تو کیا صرف باہر بٹھانے کے لیے؟"

ایک منٹ بعد احمد نواز گردیزی نے اندر قدم رکھا تو مجھے اندازہ ہوا کہ چوہدری دلاور کا یہ ڈراما بھی کتنا کامیاب رہا ہے۔ اس سے قبل کئی بار صورت حال کو انتہائی پُراسرار اور ڈرامائی انداز میں پیش کر کے وہ اپنی صلاحیت تسلیم کرا چکا تھا اور اس فن میں طاق تھا۔ وہ ذہن کو شاک دینے کے لیے ایسے ہی تیار کرتا تھا جیسے قصائی ذبح کرنے سے پہلے بکرے کو چھری نہیں دکھاتا بلکہ پانی پلا کے تازہ دم کرتا ہے۔ احمد نواز گردیزی پر نگاہ پڑتے ہی میں حیرت اور صدمے سے مفلوج ہو گیا اور اس طرح بیٹھا رہا جس طرح میرے آنے پر دلاور بیٹھا رہا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس نے اداکاری کی تھی اور میرا ردِعمل بالکل فطری تھا۔ کیونکہ نئے مینجر گردیزی کے روپ میں میرے سامنے استاد پیڈرو مسکرا رہا تھا۔ بے شک اس کا ظاہری حلیہ بدلا ہوا تھا۔ وہ بہترین سوٹ میں تھا اور اس کے ہاتھ میں خاصا قیمتی بریف کیس تھا۔ اس کے گھنگھریالے بال بڑے سلیقے سے جمے ہوئے تھے اور کانوں میں پیتل کی وہ مندریاں بھی نہیں تھیں جو ہر جگہ اس کی شناخت کی سب سے بڑی اور نمایاں نشانی بن جاتی تھیں لیکن دونوں کانوں میں وہ سوراخ صاف نظر آ رہے تھے جو برسوں مندریاں پہننے سے ہو گئے تھے۔ اس کا باقی ناک نقشہ اور رنگ روپ وہی تھا۔ اس نے ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی کہ اپنی نئی شخصیت کے ساتھ اپنا چہرہ بھی بدلے۔ چنانچہ میری نظریں استاد پیڈرو کا روپ دیکھ رہی تھیں۔ سب سے پہلے وہ مجھے ایک ٹیکسی ڈرائیور بن کے ملا تھا۔ اور برطانیہ سے پاکستان پہنچنے کے بعد ایک ہی دن میں اس سے میری دوبارہ ملاقات کسی اتفاق کا نتیجہ نہیں تھی۔ دوسری بار وہ تعاقب کرتا ہوا میرے ساتھ ساتھ میر شرافت علی کی کوٹھی تک گیا تھا اور اسے قتل کر کے الزام میرے سر تھوپنے میں کامیاب رہا تھا۔ اس کے بعد وہ جب بھی ملا استاد پیڈرو بن کے ہی ملا لیکن اس کی شخصیت کا دوسرا عارضی بہروپ میں نے زرداد کے روپ میں دیکھا تھا۔ جواب منوں مٹی تلے دنیا کی نظر سے اوجھل ہو چکا تھا۔ احمد نواز گردیزی اس کا تیسرا روپ تھا۔ شاید دلاور نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ استاد پیڈرو کا اصل روپ اب خطرناک ہو گیا ہے اور اس کا ختم ہو جانا ہی بہتر ہے۔ پیڈرو نے حقِ نمک ادا کر دیا تھا اور اپنے آقاؤں کی خوشنودی کے لیے اپنی جان کی بازی لگانے سے بھی کبھی دریغ نہیں کیا تھا چنانچہ وہ اس انعام کا مستحق تھا کہ اس کا درجہ بڑھا دیا جائے۔ ڈی سلوا کے خلا کو اس سے بہتر طور پر کون پُر کر سکتا تھا۔ اس کی سب سے بڑی صلاحیت یہی تھی کہ وہ جان نثار تھا، رازدار تھا اور وفادار تھا اور دلاور کے لیے ڈی سلوا کے بعد دستِ راست بننے کا اہل تھا۔

"خیریت تو ہے اپنے سکندر صاحب؟" چوہدری دلاور نے خوشدلی سے کہا۔ "آپ کی طبیعت کچھ خراب لگتی ہے مجھے۔"

"نہیں ... وہ دراصل میں کچھ اور سوچنے لگا تھا۔" میں نے چونک کر کہا اور مسکرایا۔

"آپ تو بالکل ہی جام ہو گئے تھے۔" چوہدری دلاور نے کہا۔ "بھئی یہ ہمارے نئے جنرل مینجر ہیں جن کا میں نے آپ سے ذکر کیا تھا۔"

احمد نواز گردیزی نے شاید پہلے بھی مجھ سے ہاتھ ملانے کی کوشش کی تھی اور ناکام رہا تھا۔ وہ اب دوسری کرسی پر ضرورت سے زیادہ سنجیدہ بیٹھا تھا۔ دلاور نے میرا نام بتانے کے بعد یہ بھی کہا کہ گردیزی صاحب! میں نے آپ سے ذکر کیا تھا کہ اس کاروبار کے دوسرے مالک سکندر بخت صاحب بھی ہیں اور آج یہ اتفاق سے آ گئے تو مناسب سمجھا کہ آپ کا تعارف کرا دوں۔"

گردیزی نے ایک بار پھر رسمی آداب و اخلاق کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی اور اپنا ہاتھ تھوڑا سا آگے بڑھایا لیکن میں اس کے لیے پہلے سے تیار تھا۔ میں نے جیب سے سگریٹ نکالتے ہوئے لائٹر کو بڑی صفائی سے چھوڑ دیا اور پھر اسے اٹھانے کے لیے جھکا۔ گردیزی کو دوبارہ شرمندگی اٹھانی پڑی کیونکہ میں نے اس کی طرف دیکھا ہی نہیں تھا۔

"گردیزی صاحب!" میں نے سگریٹ جلاتے ہوئے کہا۔ "آپ کی صورت کچھ جانی پہچانی لگتی ہے۔ کیا ہماری ملاقات پہلے کبھی ہوئی ہے؟"

"مجھے تو یاد نہیں پڑتا۔" گردیزی نے کہا اور میں نے اس کی آواز بھی پہچان لی۔

"لیکن مجھے کچھ یاد آ رہا ہے۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا اور اپنی بات کا ردِعمل دیکھنے کے لیے تھوڑا سا وقفہ دیا۔ گردیزی بن جانے کے باوجود پیڈرو وہی شخص تھا جو ایک معمولی بدمعاش تھا اور جرائم کی دنیا میں اپنی کامیابی کے جھنڈے گاڑنے کے بعد استاد کے منصب پر فائز ہو گیا تھا لیکن وہ دلاور کی طرح منجھا ہوا اداکار نہیں تھا۔ اس کا رنگ فق ہو گیا اور اس نے دلاور کی طرف امداد طلب نظروں سے دیکھا۔ میری نظر دونوں پر تھی اس لیے میں نے دلاور کی وہ نگاہ بھی دیکھ لی جس میں پیڈرو کے لیے واضح پیغام تھا کہ ہمت سے کام لو ورنہ یہ ہو سکتا ہے کہ تمہیں جنرل مینجر کے عہدے سے ہٹا کر پھر استاد پیڈرو بنا دیا جائے۔

"آپ کو یاد ہے تو بتا دیجیے کہ ہم کب اور کہاں ملے تھے؟" گردیزی نے خود کو سنبھال کے کہا۔

"میں نے یہ نہیں کہا مسٹر گردیزی!" میں نے معنی خیز مسکراہٹ

کے ساتھ جواب دیا۔" مجھے کچھ یاد آ رہا تھا، دراصل اس شہر میں بالکل آپ جیسی شکل و صورت کا ایک بدمعاش تھا۔"

"بعض اوقات شریفوں کی اور بدمعاشوں کی صورتوں کو پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے۔" دلاور نے کہا۔

"یہی میں بھی عرض کر رہا تھا۔" میں نے کہا۔ "وہ بدمعاش استاد پیڈرو کہلاتا تھا۔ پہلے تو ایسے ہی غنڈہ گردی کرتا تھا اور صرف پیڈرو تھا۔ بعد میں اپنا گروہ بنا کے استاد ہو گیا پھر کسی اسمگلر کا ساتھی رہا اور بالآخر پولیس سے مقابلے میں مارا گیا۔ یہ کافی پرانی بات ہے جو آج مسٹر گردیزی کو دیکھ کر یاد آ گئی۔ میرا مطلب ہے ان کی صورت دیکھ کر۔" براہ راست کوئی الزام لگائے بغیر میں نے واضح کر دیا تھا کہ میں گردیزی کی اصلیت کو اتنی ہی اچھی طرح سمجھ گیا ہوں جتنی اچھی طرح پیڈرو کی اصلیت کو جانتا تھا اور میری معلومات کس حد تک درست ہیں۔

دلاور مطمئن بیٹھا رہا۔ وہ یہی چاہتا تھا کہ یہ تماشا پہلی بار خود اپنی آنکھوں سے دیکھے اور اس کے بعد اگلا قدم اٹھائے۔ اگر میں اچانک میرو زیر اینڈ کمپنی کے آفس جا پہنچتا اور ڈی سلوا کی جگہ پیڈرو کو دیکھتا تو دلاور کو ہم دونوں کے ردِ عمل کا پتا نہ چلتا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ میں وہاں سے گردیزی کو جوتے مار کے نکال دیتا اور یہ بھی ممکن تھا کہ پیڈرو کو گردیزی کا کردار نبھانے میں ناکامی ہوتی تو وہ مشتعل ہو کے اپنی فطرت اور مزاج کے مطابق مجھ پر خنجر یا ریوالور نکال لیتا۔ یہاں اس قسم کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ دونوں کردار اس کے سامنے تھے اور اس کے کنٹرول میں تھے۔ میری پوزیشن کو اس نے پیڈرو سے بہتر رکھا تھا کیونکہ اسے مجھ پر زیادہ اعتماد تھا کہ میں جذبات سے بے قابو ہو کے کوئی ہنگامہ کرنے سے گریز کروں۔ بالفرضِ محال میں یہ حماقت کرتا تو وہ گردیزی کو رخصت کر دیتا اور کسی دشواری کے بغیر میرے جذبات کو اپنی باتوں سے ٹھنڈا کر دیتا۔ غلطی اگر پیڈرو کرتا تو دلاور اسے کوئی رعایت نہ دیتا۔ وہ مجھ سے کہتا کہ سکندر صاحب اگر یہ شخص آپ کے خیال میں جنرل منیجر بننے کے قابل نہیں تو اس کی چھٹی کر دیتے ہیں اور بعد میں پیڈرو پر واضح کر دیتا کہ وہ خود کو جنرل منیجر احمد نواز گردیزی کی اہلیت کے معیار کا مستحق ثابت نہیں کر سکا چنانچہ اسے اپنی سابقہ پوزیشن پر واپس لوٹ کے استاد پیڈرو ہی رہنا ہو گا۔ میرے اچانک آ جانے سے اس کو موقع مل گیا کہ وہ پیڈرو کو آزما سکے اور دیکھ سکے کہ وہ گردیزی کے کردار میں کہاں تک کامیاب رہتا ہے۔ یہ بات تو یقیناً پیڈرو بھی سمجھتا ہو گا کہ ایک نہ ایک دن اس کا اور میرا سامنا ہو گا لیکن وہ اس غیر متوقع آزمائش کے لیے تیار نہ تھا۔

"مجھے چوہدری صاحب نے بتایا ہے کہ جو کام آپ کے سپرد کیا گیا ہے اس میں تو آپ کو خاصا تجربہ ہے اور آپ اس کام کی نوعیت کو بہت اچھی طرح سمجھتے ہیں جو چوہدری صاحب کر رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اس لیے میں آپ سے کوئی سوال نہیں کروں گا کہ آپ کی کوالیفیکیشن کیا ہے، آپ پہلے کہاں تھے اور اس فیلڈ میں آپ کے تجربے ... ہو گا؟ ظاہر ہے چوہدری صاحب نے آپ کا تقرر کیا ہے تو ... کیا ہے۔ مجھے اس سے اتفاق ہے۔"

"لو بھئی اپنے گردیزی صاحب!" دلاور نے مسکرا کے کہا ... صاحب نے آپ کی نوکری پکی کر دی۔"

"اگر میں ان کو مطمئن کر سکا تو مجھے بڑی خوشی ہو گی۔" گردیزی نے اچانک انگریزی میں کہا۔ اس کے لہجے کی روانی نے مجھے حیران ... یقیناً تعلیم یافتہ تھا اور یہ میرے لیے بہت افسوسناک انکشاف ... نہیں وہ کیا حالات تھے جنہوں نے اعلیٰ تعلیم کے باوجود ایک ... کو غلط راستوں پر ڈال دیا جہاں اس نے اپنی ہمت اور ذہانت ... استعمال کیا۔ دنیا ایسے افراد سے بھری پڑی ہے جو حالات کو ... اپنی منفی سوچ کے انداز کا جواز فراہم کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ... دنیا سے اپنی محرومیوں کا انتقام لے رہے ہیں یا نفرت کے ... کا شکار ہیں جو انہیں ساری دنیا نے دی۔ سب کی دلیل یہی ہوتی ... مجرم بنانے والی یہ دنیا ہے ورنہ ماں کے پیٹ سے تو کوئی بھی ... نہیں ہوتا۔ کوئی بھی یہ تسلیم نہیں کرتا کہ سارا قصور انسان کی فطرت ... اس کی سرشت میں شامل بدی کے عنصر کا ہے۔ برائی بہت جلد اور ... آسانی سے مغلوب کر لیتی ہے تو یہ انسان کے اپنے کردار میں خود ... اور قوتِ ارادی کے فقدان کے سبب ہوتا ہے۔ پیڈرو کے ... کوئی ایسی ہی کہانی ہو گی جو اب نئی نہیں رہی۔

"مسٹر گردیزی! آفس کا کام تو آپ نے یقیناً اچھی طرح ... لیا ہو گا؟" میں نے کہا اور بات انگریزی میں کی۔

"میرے تقرر کو ابھی صرف تین دن ہوئے ہیں مسٹر سکندر ... گردیزی نے اسی روانی سے انگریزی کا جواب انگریزی میں دیا ... پھر بھی میں نے دفتر کے نظام کو کافی حد تک سمجھ لیا ہے۔ لوگوں ... چکا ہوں اور کمپنی کے حالات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں ... ہے کہ پہلے حالات کیا تھے اور اب کیا ہیں؟"

"گویا آپ ابھی فائلوں کی کاغذی دنیا میں گھوم رہے ہیں ... نے کہا۔ "فیکٹری دیکھی آپ نے؟ یہاں کیا بنتا ہے، کیسے بنتا ... جاتا ہے اور کیسا جاتا ہے؟ پروڈکشن کی سائیڈ کو بھی سمجھنا ضروری ..."

"یس سر!" گردیزی نے پورے اعتماد کے ساتھ کہا۔ "یہ ... دیکھ چکا ہوں۔"

اسی غلط جواب نے صورتحال کو یک لخت بدل دیا۔ میں ... کھڑا ہوا۔ "ویری گڈ مسٹر گردیزی!" میں نے کہا۔ "میں نے ابھی تک ... کبھی نہیں دیکھا۔ دراصل برطانیہ سے آنے کے بعد میں بہت سے ... مسائل میں الجھ گیا تھا۔ ممکن ہے چوہدری صاحب نے ان کا ذکر ... نہیں کیا تو تفصیل سے بعد میں سمجھا دوں گا۔ لیکن ان ہی مسائل ...

سے مجھے فیکٹری کو دیکھنے کی فرصت نہیں ملی۔ اس وقت آپ بھی موجود ہیں تو چلیے میرے ساتھ۔"

"لیکن اب تو کوئی وقت نہیں رہا اپنے سکندر صاحب!" دلاور نے گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا اور اپنے ظاہری اطمینان میں کوئی فرق نہیں آنے دیا۔

"چھٹی کا وقت ہو گیا ہے۔" گردیزی نے اس کی تائید کی۔ "اس معاملے کو کل پر اٹھا رکھیے سر!"

"آج کا کام کبھی کل پر نہیں چھوڑنا چاہیے۔" میں نے متانت سے کہا۔ "کل کا کوئی اعتبار نہیں اور ویسے بھی کاروباری دنیا میں یہی اصول کامیابی کی ضمانت ہے ورنہ دوسرے آگے نکل جاتے ہیں۔ میرا خیال ہے ہمیں ایک گھنٹے سے زیادہ تو نہیں لگے گا؟ ابھی پانچ بجے ہیں بلکہ پانچ منٹ باقی ہیں پانچ بجنے میں، آپ مزدوروں کو جانے دیں۔ ہر سیکشن کے فورمین کو ایک گھنٹے کے لیے روک لیں اور انہیں کل ایک دن کے اوور ٹائم کی ادائیگی کر دیں۔ کل کتنے سیکشن ہیں جن کا تعلق ہماری پروڈکشن لائن سے ہے؟"

"سیکشن تو سات ہیں۔" دلاور نے بے خیالی میں کہا۔ وہ گردیزی کو غلط جواب دینے کی پریشانی سے بچا رہا تھا لیکن اس کا ذہن کہیں اور تھا۔ میری بات نے اس کے لیے کوئی الجھن کھڑی کر دی تھی۔ پریشانی کے آثار گردیزی کے چہرے سے بھی عیاں تھے اور وہ دلاور کی طرف سوالیہ مگر پُرامید نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"سوچنے کی اور دیر کرنے کی کیا ضرورت ہے مسٹر گردیزی؟" میں نے کہا۔ "کیا آپ نے میرے احکامات نہیں سنے؟ دو منٹ میں چھٹی ہو جائے گی تو سب لوگ نکل جائیں گے۔ جائیے اور چوکیدار کو بتا دیجیے۔"

میرے سخت لہجے نے گردیزی کو کمرے سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ دلاور ابھی تک گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا اور بظاہر اس مشکل سے نکلنے کی کوئی صورت اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

"آپ ساتھ چلیں گے چوہدری صاحب؟" میں نے بریف کیس اٹھاتے ہوئے کہا۔ "یا گھر جائیں گے؟"

"میرا خیال ہے میں کہیں بھی نہیں جاؤں گا۔" دلاور نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کی بخیریت واپسی تک آفس میں انتظار کروں گا اپنے سکندر صاحب!" وہ یقیناً کسی نتیجے پر پہنچ گیا تھا اور اب میں اس کے لہجے میں محسوس ہونے والی دھمکی کو اپنا وہم سمجھ کے نظر انداز نہیں کر سکتا تھا اور میری چھٹی حس مجھے کسی خطرے کے وجود سے خبردار کرنے لگی تھی۔ جب اس نے کہا تھا کہ میں آپ کی واپسی تک انتظار کروں گا تو بخیریت واپسی کا حوالہ بہت سوچ سمجھ کے اور مجھے یہ سمجھانے کے لیے دیا تھا کہ ہو سکتا ہے میری واپسی نہ ہو یا ہو تو خیریت کے ساتھ نہ ہو۔ لیکن اب قدم آگے بڑھانے کے بعد پیچھے نہیں ہٹایا جا سکتا تھا۔ یہ بات تو میرے ذہن میں بہت پہلے سے تھی کہ ایک نہ ایک دن مجھے فیکٹری کو اندر سے دیکھنا ہے کیونکہ گھپلا اگر کہیں ہو سکتا تھا تو صرف فیکٹری میں۔ آفس میں اس کی گنجائش نہیں تھی لیکن میرا اس وقت کا فیصلہ فوری تھا اور میں نے بہت عجلت سے کام لیتے ہوئے کر لیا تھا۔ اس فیصلے کی محرک یہ خواہش بھی تھی کہ میں احمد نواز گردیزی کی شخصیت میں چھپے ہوئے پیڈرو کو بے نقاب کر دوں۔ اس کی دیدہ دلیری میرے لیے ایک کھلا چیلنج بن گئی تھی اور دلاور مجھے یہ چیلنج دینے کے بعد مجھ پر خندہ زن تھا کہ سکندر اعظم! تم بھی تو بہت بڑا شکاری ہونے کا دعویٰ رکھتے ہو اور تمہیں اپنی عقل و ذہانت پر بھی بہت ناز ہے تو اب دیکھنا یہ ہے کہ اس فراڈ کو فراڈ ثابت کرنے کے لیے تم کیا کر سکتے ہو۔ میں نے استاد پیڈرو کو احمد نواز گردیزی بنا دیا ہے۔ تم میں ہمت ہے تو اسے پھر استاد پیڈرو بنا کے دکھاؤ اور میں نے غیر شعوری طور پر اس چیلنج کو قبول کر لیا تھا کہ یہ سازش کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔ جب پیڈرو نے گردیزی بن کے مجھ سے انگریزی میں بات کی تھی تو ذہنی طور پر مجھے تسلیم کرنا پڑا تھا کہ یہ ایک کامیاب چال تھی اور ایک طرح سے انہیں مجھ پر نفسیاتی برتری حاصل ہو گئی تھی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ بدمعاش کہلانے والا پیڈرو میری ہی فیکٹری میں جنرل منیجر بن کے بیٹھ جائے گا اور اپنی تعلیم، انتظامی صلاحیت اور تجربے کی بنا پر وہ خود کو اس منصب کا اہل ثابت کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس بات نے مجھے مشتعل کر دیا تھا کیونکہ یہ کھلی دھاندلی تھی۔

سوا پانچ بجے تک فیکٹری کے کارکن اور مزدور گیٹ سے جا چکے تھے۔ چوکیدار نے بڑے گیٹ میں فٹ ہونے والا چھوٹا دروازہ کھولا تھا جس میں سے ایک وقت میں ایک ہی آدمی کے گزرنے کی گنجائش تھی۔ دروازے کے باہر چوکیدار ان کے کپڑوں کو ٹٹول کر جامہ تلاشی کی رسمی کارروائی پوری کرتا تھا۔ ان کے بیگ اور ٹفن کیریئر کھول کے دیکھتا تھا۔ وہ سب اسی طریقۂ کار کے عادی معلوم ہوتے تھے۔ چنانچہ جو سلوک میرے نقطہ نظر سے ذلت آمیز تھا وہ ان کے لیے معمول کی بات تھی۔ ہر فیکٹری یا کارخانے میں چوری سے ہونے والے نقصانات کو روکنے کا یہی دستور تھا ورنہ نیچے سے اوپر تک جس کو موقع ملتا تھا وہ کوئی نہ کوئی چیز چھپا کے نکال لینے کی کوشش کرتا تھا خواہ وہ ایک پینسل ہو، کسی مشین کا کوئی پرزہ کوئی اوزار یا مشین پر بنی ہوئی کوئی ایسی چیز جسے بازار میں فروخت کرنے سے چار پیسے ہاتھ میں آ جائیں۔ مزدوروں کی قطار میری اور گردیزی کی موجودگی کے خیال سے محتاط تھی یا مرعوب تھی چنانچہ وہ ہر روز کی طرح چھٹی کی خوشی میں ہنستے کھیلتے اور باتیں کرتے ہوئے نہیں جا رہے تھے بلکہ کچھ سہمے سہمے دکھائی دیتے تھے۔ اپنے بارے میں تو میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ مجھے جانتے تھے یا نہیں لیکن گردیزی کا نام عہدہ اور چہرہ ان کے لیے اجنبی نہیں تھا کیونکہ بیشتر لوگ

مینجر صاحب کہہ کے سلام کرتے تھے۔ کیا ان لوگوں نے پیڈرو کو کبھی نہیں دیکھا تھا، میں نے سوچا پھر یہ لوگ اس کی ظاہری حالت کے انقلاب پر حیران کیوں نہیں ہیں۔ کیا انہوں نے ذہنی طور پر یہ تسلیم کر لیا ہے کہ جو شخص پہلے چوہدری صاحب کا خاص آدمی تھا اس نے اب ڈی سلوا صاحب کی جگہ لے لی ہے تو اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں۔

گیٹ بند ہو گیا اور میں نے دیکھا کہ اندر میرے اور گردیزی کے علاوہ صرف چھ آدمی رہ گئے ہیں۔ یہ چھ آدمی ایک جیسے دراز قد اور صحت مند تھے۔ مجھے وہ حلیے سے ذرا بھی فورمین قسم کے لوگ نہیں لگے۔ نہ ان کے ہاتھ مشینوں پر کام کرنے سے گندے ہوئے تھے اور نہ ان کے لباس پر داغ آیا تھا۔ ان میں سے چار نے ڈینم کی پرانی پتلونیں اور چُست قسم کے آدھے بازوؤں والی جرسیاں پہن رکھی تھیں تاکہ وہ اپنے بازوؤں کی قوت کی پوری نمائش کر سکیں۔ باقی دو کا لباس بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ جو چیز مشترک تھی وہ ان کے جارحانہ تیور اور خطرناک انداز تھے۔ وہ سب کسی رجمنٹ کی طرح ایک قطار میں ہاتھ سینوں پر باندھے پیر پھیلائے کھڑے تھے اور مجھے گھور رہے تھے۔ یہ خود کو بدمعاش ظاہر کرنے کا گھٹیا فلمی انداز تھا۔ اگر وہ فورمین ہوتے تو صرف ایک گھنٹہ رو کے جانے پر مالکوں کی موجودگی میں یہ اشتعال انگیز رویّہ اختیار نہ کرتے اور اس بات پر تو یقیناً شکر گزار ہوتے کہ انہیں مفت کی بےگار میں نہیں پکڑا گیا بلکہ ایک گھنٹے کا اوور ٹائم ایک پورے دن کے معاوضے کے برابر دیا جا رہا ہے لیکن وہ پیڈرو جیسے لوگ تھے۔ پیڈرو اگر جنرل مینجر کا عہدہ سنبھال سکتا تھا تو وہ بھی ایک سیکشن کو یقیناً کنٹرول کر سکتے تھے۔ وہ مشینوں پر محنت کر کے صلاحیت کی بنا پر فورمین نہیں بنے تھے بلکہ مزدوروں پر مسلط کر دیے گئے تھے۔ ان کے انتخاب میں بھی اس بات کو پیشِ نظر رکھا گیا ہو گا کہ غنڈوں سے زیادہ وہ گڑبڑ کرنے والوں کو کنٹرول کرنے کے قابل ہیں یا نہیں۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ میرا فیصلہ غلط تھا۔ یہی کام میں اس طرح بھی کر سکتا تھا کہ میرے لیے اپنی حفاظت کا کوئی مسئلہ نہ ہو۔ میں محسن کے ساتھ کسی بھی دن ایسے وقت میں آ سکتا تھا جب کام جاری ہو یا رضوی صاحب کی مدد سے باڈی گارڈ ساتھ لے کر آ سکتا تھا لیکن اس وقت میں اکیلا تھا خالی ہاتھ تھا اور محصور تھا۔

باہر ابھی شام کے سائے پھیلنے شروع ہوئے تھے مگر اندر اندھیرا دن کے اُجالے پر غالب آنے لگا تھا۔ فیکٹری کے گیٹ سے سڑک اتنی دور تھی اور سڑک پر ٹریفک کا شور اتنا زیادہ تھا کہ یہاں کوئی مجھ پر گولی بھی چلاتا تو فائر کی آواز پر کوئی متوجہ نہ ہوتا۔ مزید یہ کہ وہ سب لوگ جو میری مدد کر سکتے تھے اس بات سے بےخبر تھے کہ گاڑی مرمت کراتے کراتے شامتِ اعمال کے باعث میں کہاں آ کے مشکل میں گرفتار ہو گیا ہوں۔ محسن نے تو مجھے سیدھا سا بےضرر نسخہ یہ بتایا تھا کہ وقت گزارنے کے لیے میں فلم دیکھوں یا جہانگیر کے مقبرے پر چلا جاؤں۔ اگر اسے شک بھی ہو جاتا کہ میں اس کے جاتے ہی چوہدری دلاور کے ہاں پہنچ جاؤں گا تو شاید وہ مجھے چھوڑ کر ہی نہ جاتا۔ اب میں واپس نہ پہنچا تو وہ لوگ موٹر ورکشاپ جائیں گے۔ میں وہاں نہیں ملوں گا تو انتظار کریں گے اور اگر تلاش بھی کریں گے تو ان مقامات پر جہاں میری موجودگی کا کوئی سراغ مل سکے۔ فیکٹری کی طرف کوئی نہیں آئے گا جس کے گیٹ بند ہوں گے اور بام و در تاریک۔ چوکیدار کے سوا انہیں کون ملے گا اور چوکیدار کیا بتائے گا کہ اندر کیا ہوا۔ شاید وہ کچھ بتائے گا ہی نہیں۔

لیکن اب اپنے خوف کو ظاہر کرنا دشمن کا حوصلہ بڑھانے کے مترادف تھا چنانچہ میں نے اپنے انداز کے اعتماد میں کمی نہیں آنے دی۔

”مسٹر گردیزی! میں نے سخت لہجے میں کہا۔“ مجھے بتایا گیا تھا کہ سیکشن سات ہیں اور یہ بات مسٹر دلاور نے آپ کی موجودگی میں کہی تھی۔ پھر یہاں چھ شکلیں کیوں دکھائی دے رہی ہیں؟“

”ساتواں آدمی اگر نہیں رکا تو میں کیا کر سکتا ہوں؟“ گردیزی نے کہا۔

”اس سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تمہارا کنٹرول موثر نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لوگ تمہارے حکم کی پروا نہیں کرتے اور یہ بات مجھے بالکل پسند نہیں آئی۔ مسٹر گردیزی! تم پوری فیکٹری کو اور آفس کو کیسے کنٹرول کرو گے۔ اس ساتویں آدمی کو ڈسمس کرو اور کل ٹھیک بارہ بجے اپنے آفس بلا کے اس کا حساب کر دو۔ اگر اسے کچھ کہنا ہو گا تو مجھ سے کہہ دے گا۔“ پھر میں نے اپنا بریف کیس اس کی طرف بڑھایا۔ ”یہ چوکیدار کے پاس رکھوا دو بلکہ اسے یہاں بلا لو۔ میں خود بات کروں گا۔“

گردیزی نے بُرا سا منہ بنایا لیکن چوکیدار کو بلانے چلا گیا۔ چوکیدار کو شاید معلوم ہو چکا تھا کہ آج میں نہ بچا تو وہ نوکری سے برطرف کر دیا جائے گا۔ اس نے اندر آ کے مجھے سلام کیا اور با ادب کھڑا ہو گیا۔ ”کیا حکم ہے صاحب؟“

”دیکھو چوکیدار!“ میں نے کہا۔ ”ابھی میرے ایک دوست آنے والے ہیں۔ یہ نہ ہو کہ دروازہ بند دیکھ کر وہ لوٹ جائیں ——— یہ بریف کیس ان کو دینا ہے اور یاد رکھنا کہ ان کا نام محسن ہو گا۔“ میں نے بریف کیس اسے تھما دیا۔

”میں یاد رکھوں گا جناب!“ چوکیدار نے مجھ سے بریف کیس لے لیا اور چلا گیا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ میں انہیں یہ تاثر دینے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ میرے یہاں آنے کی خبر محسن کو بھی ہے اور وہ یہاں ضرور آئے گا۔ میں اب خالی ہاتھ بھی تھا اور پوری طرح تیار بھی تھا کہ ضرورت پڑی تو خالی ہاتھ لڑنے کی جتنی تربیت میں نے حاصل کی تھی وہ اپنی جان بچانے کے لیے صرف کر دوں گا۔ عملی زندگی میں اس کے بھرپور مظاہرے کی نوبت کبھی نہیں آئی تھی لیکن آج صورتِ حال

مختلف تھی کیونکہ میرے مقابل سات آدمی تھے جو کسی طرح بھی مجھ سے کم نہ تھے۔ کم سے کم ان کی ظاہری صحت مجھ سے بہتر تھی۔ اندیشہ کی بات تھی تو صرف یہ کہ وہ مسلح نہ ہوں ورنہ جس کے ہاتھ میں ریوالور ہو وہی غالب رہتا ہے اور اس کے سامنے جوڈو کراٹے میں بلیک بیلٹ لینے والے حریف ہوں تب بھی اس کے قریب آنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔

”مسٹر گردیزی! میں کسی جلوس کی قیادت نہیں کرنا چاہتا۔“ میں نے کہا۔ ”پہلے صرف ایک سیکشن کا فورمین آئے گا جب وہ فارغ ہو گا تو دوسرے کو بھیج دے گا۔ کیا تم نے ان سب کو بتا دیا ہے کہ میں کون ہوں؟“

”میرا خیال ہے کہ یہ لوگ آپ کو پہلے سے جانتے ہیں۔“ گردیزی نے کہا۔ ”ورنہ اب جان لیں گے۔“

”پہلی بات تو یہ کہ میں نے تمہارا خیال نہیں پوچھا تھا۔“ میں نے غرا کے کہا۔ ”ایک سوال پوچھا تھا جس کا جواب ہیں یا نو تھا۔ دوسری بات یہ کہ میں ڈسپلن کو بہت اہمیت دیتا ہوں۔ باہر تم مجھ سے برابر کے دوستوں کی طرح مل سکتے ہو لیکن یہاں میں باس ہوں اس لیے بات کرتے وقت یا جواب دیتے ہوئے سَر کہنا مت بھولو۔ یہ بات تم سب لوگ بھی نوٹ کر لو۔“ میں نے ان چھ افراد سے مخاطب ہو کے کہا جو میری اکڑفوں سے بہت لطف اندوز ہو رہے تھے اور ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھنے کے علاوہ زیرِ لب مسکرا رہے تھے۔ میرے اشارے پر پہلا آدمی آگے آیا۔ اس کے چیونگ گم چبانے کا انداز خالص ویسٹرن ولن کا تھا۔

”تمہارا کون سا سیکشن ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”اس سیکشن میں کب سے ہو اور نام کیا ہے تمہارا؟“

”میرا نام غفور ہے..... سر!“ اس نے نیم سنجیدہ لہجے میں کہا اور آخری لفظ یوں ادا کیا جیسے وہ مجھے باس سمجھ کے میری عزت کرنے کے بجائے میرا مذاق اڑا رہا ہے۔ ”میں فونڈری میں ہوں۔ چھ مہینے سے۔“

”اور چھ مہینے پہلے کہاں تھے؟“ میں نے کہا۔ ”کسی اور سیکشن میں؟“

”یہ آپ چوہدری صاحب سے پوچھ سکتے ہیں۔“ وہ بولا۔ ”وہ بتائیں گے آپ کو۔“

”شٹ اپ۔ جو بات تم سے پوچھی گئی ہے اس کا جواب تم دو گے۔“ میں نے گرج کر کہا۔ ”کوئی چوہدری نہیں دے گا۔ سمجھے!“

”دیکھو سکندر صاحب! ہم سے چوہدری صاحب نے کبھی اس لہجے میں بات نہیں کی۔“ وہ ایک قدم آگے بڑھا۔ ”اور ہم بہت ٹیڑھا آدمی ہے۔ اپن سے سیدھا بولو۔ ہاں۔“

”چوہدری صاحب اگر تمہاری بدتمیزی برداشت کرتے رہے ہیں یا انہوں نے تم کو ڈھیل دے رکھی تھی تو سمجھ لو کہ میں بالکل مختلف قسم کا آدمی ہوں۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔ ”برطرف تو تمہیں بعد میں کروں گا لیکن کسی نے گستاخانہ لہجے میں بات کی تو اس بدتمیزی کی سزا پہلے خود دوں گا۔ بڑے بدمعاش کارخانوں میں فورمین نہیں ہوتے لیکن کسی کو خوش فہمی ہو تو میں دور کر سکتا ہوں۔ اب بتاؤ کہ چھ مہینے پہلے تم کیا کرتے تھے؟ یہ جگالی مت کرو میرے سامنے۔“

”چھ مہینے پہلے میں روڈ انسپکٹر تھا۔ گھاس کھودتا تھا۔“ اس نے زمین پر تھوک کر کہا اور اس کے ساتھی بہت محظوظ ہوئے۔ ان میں سے دو نے ہنسنے کی کوشش بھی کی لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ دیکھ سکتے میں نے بڑی پھرتی سے اپنے سامنے کھڑے ہوئے شخص کے پیٹ میں گھٹنا مارا۔ وہ بلبلا کے دُہرا ہوا تو میرے دونوں ہاتھ حرکت میں آ گئے۔ میں نے ایک ہتھیلی سے اس کے بازو پر ضرب لگائی۔ ہڈی ٹوٹنے کی آواز اس کی چیخ سے پہلے آئی۔ دوسرا ہاتھ اتنی دیر میں کان کے قریب پڑ چکا تھا۔ مشکل سے پانچ سیکنڈ میں وہ زمین پر گر کے بےحس و حرکت ہو گیا۔ گردیزی سمیت باقی چھ افراد اس غیر متوقع صورتِ حال کے لیے بالکل تیار نہیں تھے۔ ذرا سی دیر کے لیے سناٹا چھا گیا اور سب کی نظریں زمین پر پڑے ہوئے شخص پر مرتکز ہو گئیں لیکن وہ خوفزدہ نہیں ہوئے۔ ان کا غصّہ بھڑک اٹھا۔

”یہ تم نے کیا کیا؟“ گردیزی برہم ہو کے بولا۔ ”یہ تو پولیس کیس بنے گا تم پر۔“

میں نے گردیزی کے کوٹ کا کالر تھام لیا۔ ”یہ آخری موقع ہے مسٹر گردیزی! دوبارہ اس لہجے میں بات کی تو اس کے ساتھ تمہیں بھی پارسل کرنا پڑے گا۔ زبان اور دماغ کو قابو میں رکھو۔ تم کی جگہ آپ

کہو اور سر ضرور کہو۔ پولیس نے آج تک کسی صنعتکار کو اس جرم میں گرفتار نہیں کیا کہ اس نے ایک خطرناک ارادہ رکھنے والے مزدور کو سزا دی۔ پولیس میری مٹھی میں ہے۔ سمجھے؟" میں نے اسے چھوڑتے ہوئے کہا۔ "تم کو معلوم نہیں تو جا کے اپنے چوہدری سے پوچھو کہ میری کیا حیثیت ہے اور کتنی پہنچ ہے۔"

پیڈرو کا چہرہ احساسِ ذلت سے سرخ پڑ گیا۔ "کیا یہ یہیں پڑا رہے گا.... سر؟" وہ بولا۔

"تم ایک آدمی کو ساتھ لو۔ دوسرے سیکشن کے فورمین کو۔" میں نے کہا۔ "باقی چار میں سے ایک چوہدری صاحب کے پاس جائے اور فون کر کے ایمبولینس منگوا لے۔ ویسے آدھے گھنٹے بعد یہ ہوش میں آ جائے گا... تو خود بھی اپنے پیروں سے چل کے جا سکے گا۔ ہڈی صرف ایک بازو کی ٹوٹی ہے۔ دوسرا میں نے رحم کھا کے چھوڑ دیا۔"

دوسرا فورمین زیادہ محتاط انداز میں آگے آیا۔ "چلو سر جی! ہمارا پیکنگ کا کام ہے۔"

گردیزی میرے دائیں ہاتھ پر رہا اور فورمین تھوڑے سے فاصلے سے بائیں جانب لیکن میں نے عمداً ان کو ایک قدم آگے رکھا تاکہ وہ میری نظر میں رہیں اور مجھ پہ بے خبری میں حملہ نہ کر سکیں۔ جس بیرک نما ہال میں ہم داخل ہوئے وہ سب سے پہلا تھا اور اس لحاظ سے ٹھیک تھا کہ یہاں فیکٹری کا مال آخری مرحلے میں مکمل ہونے کے بعد پہنچتا تھا اور پیک ہونے کے بعد سیدھا گیٹ سے نکل جاتا تھا۔ میں نے فورمین کو موقع دیا کہ وہ ساری لائٹس جلائے کیونکہ اندر اندھیرا تھا۔ بیرک کے سب سے اوپر والے حصے میں روشندانوں کی قطار تھی جو اس وقت روشنی کی مدھم سی جھلک دے رہی تھی۔ اندر مجھے مختلف سائز کے کریٹ نظر آئے۔ کچھ اتنے چھوٹے جتنے پھلوں کے کریٹ ہوتے ہیں تو کچھ اتنے بڑے کہ معلوم ہوتا تھا ان میں ٹریکٹر کا ٹائر ہو گا۔ ہم ٹائر نہیں بناتے تھے چنانچہ میں نے فورمین سے پوچھا کہ اس میں کیا ہے اور اس نے خاصے مؤدب لہجے میں بتایا کہ اس میں فصل کاٹنے والے آلات ہیں جو ٹریکٹر کے ساتھ جوڑے جاتے ہیں۔ حالات اب بہت حد تک قابو میں آ گئے تھے اور میں نے اپنے مالک ہونے کے علاوہ اپنے "طاقتور بدمعاش" ہونے کا جو مظاہرہ کیا تھا وہ کامیاب رہا تھا۔ بیرک سے گزرتے ہوئے ہم نے لکڑی کے تختوں کے ڈھیر دیکھے جن سے کریٹ بنائے جا رہے تھے۔ کچھ لمبوترے، کچھ چوڑے، کچھ اونچائی کے رخ چپٹے اور کچھ ہر طرف سے برابر نظر آنے والے کریٹ مکمل پڑے تھے۔ دوسری طرف وہ سامان رکھا تھا جو شاید اگلے دن پیک ہونا تھا۔ یہ سب زرعی آلات تھے۔ وہیٹ تھریشر، چاول چھڑنے، فصل کاٹنے اور بھسنے والے آلات کے پرزے یا مکمل آلات ان سب پر "ایم۔ڈبلیو ڈی" کی مہر تھی۔

میرا دورہ کامیاب رہا تھا اور فورمین نے تمام سوالات کے جواب شرافت سے دیے تھے چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ اس کارروائی کو ختم کر دوں۔ اتنی تفصیل سے پوری فیکٹری کو دیکھنے کے لیے کم از کم آدھے دن کی مہلت درکار تھی۔ پون گھنٹے میں صرف ایک سیکشن ختم ہوا تھا۔ اگر میں چاہتا تو انہیں روک کے رکھتا اور رات تک معائنہ جاری رکھتا لیکن یہ خطرہ مول لینے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ رات زیادہ ہو جاتی تو میرا نکلنا دشوار ہو جاتا۔ مجھے مغرب کے بعد گاڑی بھی لینی تھی اور مستری نے کام کے لیے جو تین گھنٹے کی مہلت مانگی تھی وہ ختم ہو رہی تھی۔

"ٹھیک ہے مسٹر گردیزی!" میں نے کلائی کی گھڑی دیکھ کر کہا۔ "باقی میں پھر کبھی دیکھوں گا۔ میں نے ان لوگوں کو ایک گھنٹے کے لیے روکا تھا۔ انہیں اب جانے دو۔" لیکن اسی وقت میں نے نوٹ کیا کہ فورمین جو مجھ سے آگے آگے اپنے سیکشن کے کام کی وضاحت کرتا چل رہا تھا دروازے میں رک گیا ہے۔ اس نے دونوں پیر پورے پھیلا لیے تھے کہ عین وسط میں کھڑا رہ کے وہ راستے کو بلاک کر رہا تھا۔ دروازہ اس سے زیادہ چوڑا تھا لیکن وہ دونوں طرف ہاتھ پھیلا کے اور دائیں بائیں جھک کے کسی کو بھی پکڑ سکتا تھا۔ پھر میں نے گردیزی کو دیکھا۔ وہ میرے پیچھے کھڑا مسکرا رہا تھا اور اس نے ٹائی کے ساتھ اپنا کوٹ بھی اتار کے نیچے پھینک دیا تھا۔

"تو یہ بات ہے؟" میں نے ایک قدم پیچھے ہو کے کہا۔ "تمہارا خیال ہے کہ میں اب نکل نہیں سکتا؟"

"ضرور نکلے گا تم سکندر صاحب!" فورمین بولا۔ "لیکن ایسے نہیں، تمہارا جنازہ نکلے گا۔"

گردیزی یعنی پیڈرو نے مجھے آگے دھکا دیا۔ میں سیدھا ہو گیا۔ یوں جیسے دھکے سے میرے پیر اکھڑ گئے ہیں لیکن رکنے کے بجائے میں نے دروازے میں کھڑے ہوئے فورمین سے ٹکرا کے باہر نکلنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ فورمین میری نیت کو بھانپ گیا اور اس نے بڑی پھرتی سے لات گھمائی جو میرے منہ پر پڑتی تو میرے جبڑے ٹوٹ جاتے یا میری گردن ٹیڑھی ہو جاتی مگر میں نے جپ لگا کے اسی ٹانگ کو پکڑ لیا اور ایک جھٹکا دے کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ فورمین ایک ٹانگ پہ آ گیا اور اس کے ہاتھوں نے دروازے کو گرفت میں لے کر توازن برقرار رکھنے کی کوشش کی مگر اسے ناکامی ہوئی اور وہ تھوڑا سا گھسٹنے کے بعد کمر کے بل گرا۔ پیچھے سے گردیزی مجھ پر حملہ آور ہو چکا تھا۔ میں نے فورمین کو اس کی ٹانگ سے پکڑ کے زمین سے تھوڑا سا اوپر اٹھایا اور خود گھوم گیا۔ فورمین بھی یوں گھوم گیا جیسے مرکز کے ساتھ گھڑی کی سوئی گھومتی ہے یا پنکھے کا حصہ گھومتا ہے تو پنکھے کے ونگ گھومتے ہیں۔ اس کا سر گردیزی کی ٹانگ سے ٹکرایا۔ گردیزی لڑکھڑا کے گرا اور

میں نے فورمین کو چھوڑ دیا۔ وہ گرتے ہوئے گردیزی کے ساتھ مقدام ... پیچھے لے گیا۔ ان کو اٹھنے کا موقع دیے بغیر میں ... ہوئے ... بھی کچھ آگے بڑھ کے گردیزی کے بوٹ کو ٹھوکر ماری اور وہ الٹ کر دیوار سے جا لگا۔ فورمین رکوع کی حالت میں تھا کہ میں نے اس کو کمر سے پکڑ کے اٹھا لیا اور سر سے اوپر لے جا کر یوں پھینکا کہ وہ ایک کریٹ سے ٹکرایا۔ کریٹ خالی تھا اور چوڑائی کی نسبت اس کی بلندی دگنی تھی۔ پھر کریٹ پیچھے گرا اور گردیزی کے سر پر لگا۔ اس نے کراہ کر سر پر ہاتھ رکھا اور عالمِ دیوانگی میں کریٹ اٹھا کے میری طرف پھینکا۔ میں نے غوطہ مار کے خود کو بچایا لیکن اس کا ایک کونا میرے شانے سے چھوتا ہوا گزرا تو میری قمیص پھٹ گئی۔ کریٹ فرش پر بڑی آواز کے ساتھ گرا۔ اسی کے ساتھ دونوں طرف کے دروازوں سے دو دو افراد اندر داخل ہوئے۔ میں نے انہیں تختوں کے ڈھیر سے لکڑی کے موٹے اور لمبے تختے اٹھاتے دیکھا۔ اپنے قریب ہی مجھے ٹوٹنے والے کریٹ کے تختے نظر آئے۔ میں نے ایک تختہ اٹھایا جس کی چوڑائی چار پانچ کے قریب تھی اور جیسے ہی گردیزی میری طرف آیا میں نے تختہ گھما کے اس کے سر پر مارا لیکن وہ بچ گیا اور چوٹ اس کے شانے پر آئی۔ اس کی اور فورمین کی حالت کسی حد تک غیر تھی مگر چار تازہ دم افراد کی کمک نے ان کے حوصلے بڑھا دیے تھے۔ میں ہر سمت سے محصور ہونے لگا تھا۔ اطمینان کی بات یہ تھی کہ کسی کے ہاتھ میں ریوالور نہیں تھا لیکن ان سب نے اپنی اپنی پسند کے مطابق لمبے لمبے تختے اٹھا لیے جو میرے ہاتھ کے تختے کی لمبائی سے دگنے لمبے تھے۔ اب وہ آہستہ آہستہ حلقہ بنائے میری طرف بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ گالیاں بکتے، زمین پر سانڈ کی طرح پیر مارتے، پھنکارتے نفرت اور حقارت سے تھوکتے۔ میرے مالک ہونے کے غرور کو خاک میں ملانے کی دھمکیاں دیتے۔

میں نے اب دفاعی انداز اختیار کر لیا تھا اور اپنی نشست دیوار سے لگا لی تھی تاکہ وہ سب میرے سامنے رہیں۔ بالکل سامنے آ کے ان میں سے ایک اچھلا اور جلد بازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے تختہ اٹھا کے میرے سر پر مارنا چاہا۔ میں نے سر کو بچانے یا جوابی وار کرنے کے بجائے اس تختے کا وار ہتھیلی پر روکا اور گرفت مضبوط کر کے جھٹکا دیا تو وہ اپنے ہی زور میں آگے جھکا اور میں نے دوسرے ہاتھ سے تختہ اس کے سر پر مارا۔ وہ چلایا اور وہیں گر گیا مگر اس کے بعد وہ سب ایک ساتھ مجھ پر حملہ آور ہوئے۔ دو کے وار کو میں نے تختے پر روکا اور ایک کو لات مار کے دور پھینکا مگر ایک کا وار میرے شانے پر لگا۔ مجھے یہ مقابلہ بے سود نظر آ رہا تھا کیونکہ اپنی دو آنکھوں سے میں ان سب پر نظر رکھ سکتا تھا اور بیک وقت چھ افراد کے وار سے نہیں بچ سکتا تھا پھر بھی یہ ناممکن تھا کہ میں مقابلہ کیے بغیر شکست قبول

کر لوں۔ خود گرنے سے پہلے میں دو حملہ آوروں کو لٹا چکا تھا۔ یہ دیوانہ وار جدوجہد بالآخر ختم ہو گئی۔ مجھے لٹانے والا وار ٹھیک میرے سر کے پچھلے حصے پر لگا۔ یکلخت ساری روشنیاں بجھ گئیں اور مجھے اندھیرے میں جگنو سے اڑتے دکھائی دیے۔ آخری احساس یہ تھا کہ ان میں سے کسی نے گالی دے کر میرے کِک رسید کی ہے۔ آخری آواز دلاور کی تھی لیکن الفاظ کا مفہوم سمجھنے سے پہلے میرے ہوش و حواس ساتھ چھوڑ گئے۔

جب مجھے ہوش آیا تو میری ناک میں لکڑی کے رندہ کیے ہوئے تختوں کی مخصوص بو آئی۔ یہ بو بہت واضح تھی۔ پھر مجھے حرکت کا احساس ہوا۔ زمین میرے نیچے مسلسل اوپر نیچے ہو رہی تھی اور رگڑ کا شور اس حرکت کے ساتھ تھا۔ میرے ہاتھ کمر کے پیچھے بندھے ہوئے تھے اور دونوں پیر ایک ساتھ باندھنے کے لیے بھی وہی رسّی استعمال کی گئی تھی۔ اس کے باوجود میں کھڑا نہیں ہو سکتا تھا اور کچھ دیر تو میں سمجھ ہی نہ سکا کہ آخر میرا سر نیچے کیوں ہے اور پیر اوپر کیوں اٹھے ہوئے ہیں۔ پھر جیسے جیسے ہوش و حواس بحال ہوتے گئے میں اس صورتِ حال کا بہتر طور پر جائزہ لینے کے قابل ہو گیا۔ میں لکڑی کے کسی کریٹ میں تھا اور کریٹ کو ایک طرف سے اوپر اٹھا کے زمین پر گھسیٹا جا رہا تھا۔ اگر باہر اجالا ہوتا تو مجھے تختوں کی جھری سے ضرور دکھائی دیتا لیکن اندر اور باہر ایک جیسی سیاہی ظاہر کرتی تھی کہ وقت رات کا ہے۔ میں اس تابوت نما بکس میں ادھر سے ادھر ہو رہا تھا اور میرا سر بار بار نیچے کے حصے پر لگ رہا تھا۔ کریٹ میرے سائز کے مطابق نہیں بنایا گیا تھا بلکہ ان ہی میں سے منتخب کیا گیا تھا جو میں نے ورکشاپ میں تیار دیکھے تھے۔ اس کی لمبائی چوڑائی اور اونچائی میں اتنی گنجائش تھی کہ میں ہر طرف ایک منٹ تک حرکت کر سکتا تھا۔ چونکہ کریٹ مشینری کے لیے بنائے گئے تھے اس لیے تختے موٹے استعمال ہوئے تھے۔ تختوں کے درمیان کہیں سوت آدھے سوت کی جھری رہ گئی تھی تو اسے نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ کوئی چیز اس میں سے نکل کے یا بہہ کے باہر آنے والی ہوتی تو شاید اسے ایئر ٹائٹ بھی کیا جاتا مگر اس میں سے تو ایک نٹ بولٹ بھی گرنے کا امکان نہیں تھا۔ تاہم یہی جھریاں میری زندگی کی ضامن تھیں کیونکہ ان میں سے تازہ ہوا کی فراہمی جاری تھی۔

"کریٹ کے اوپر کچھ نہیں لکھا، پاگل کے بچو!" میں نے دلاور کی آواز سنی۔ "راستے میں تمہارا کوئی باپ مل گیا تو کیا بتاؤ گے کہ کس کا مال ہے اور کہاں جا رہا ہے؟"

"کمپنی کا ٹرک ہے چوہدری صاحب!" پیڈرو یعنی گردیزی کی آواز آئی۔

"تو مجھ سے زیادہ عقلمند ہے؟" چوہدری دلاور نے برہمی سے کہا۔ "خطرہ مول لینے کی کیا ضرورت ہے۔ اس پر پشاور کے کسی دیہات

یا قصبے کا نام لکھ دو۔ کسی زمیں دار کے نام سے مشینری کے کاغذات بنا کے ساتھ رکھو۔"

کریٹ اب ساکت تھا چنانچہ میں سیدھا لیٹا ہوا خود کو خاصا پُرسکون محسوس کر رہا تھا۔ ورنہ زمین سے رگڑ کھانے کا شور میری کھوپڑی میں بادلوں کی گرج بن کے گونجتا تھا اور میرا مغز اُلٹ پلٹ ہونے لگتا تھا۔ میرے منہ پر انہوں نے ٹیپ لگا دیا تھا چنانچہ میں کسی کو مدد کے لیے نہیں پکار سکتا تھا۔ اگر میں کوشش کرتا تو میرے حلق سے کبوتر کی طرح غٹرغوں کے سوا کچھ نہ نکلتا۔ میں کریٹ کی سائڈ پر لاتیں مار سکتا تھا اور ہاتھوں سے بھی پیچھے کی طرف زور لگا سکتا تھا لیکن ابھی اس کارروائی کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ اس کے لیے مناسب ترین موقع کا انتظار کرنا بہتر تھا۔ حالانکہ یہ امید بھی خود فریبی کے سوا کچھ نہ تھی کہ میں ٹانگوں کا زور لگا کے آدھا اِنچ سے زائد موٹے تختوں کو توڑ دوں گا یا ان کی کیلیں نکال دوں گا۔ دیواروں پر دھم دھم لاتیں مار کے کسی کو متوجہ کر سکوں گا یا ایس او ایس کا سگنل دے سکوں گا۔

ان ہی بدمعاشوں میں سے کسی نے کریٹ پر کالے رنگ اور برش سے کچھ لکھنا شروع کیا۔ ایک جھری میں سے بلب کی روشنی سنہرے تار کی طرح جھلملانے لگی لیکن میں بے حس وحرکت پڑا رہا۔ ابھی ان کو یہی تاثر دینا بہتر تھا کہ مجھے ہوش ہی نہیں۔ شاید اسی طرح میں ان کی گفتگو کا کوئی لفظ سُن کے اندازہ کر سکوں کہ وہ مجھے پیک کر کے کہاں لے جانا چاہتے ہیں۔ مقصد اگر مجھے مارنے کا ہوتا تو اس کے لیے یہ تکلف غیر ضروری تھا اور تدفین کی خاطر تابوت بھی غیر ضروری تھا۔ صاف ظاہر یہی ہوتا تھا کہ وہ کسی قسم کا خطرہ مول لیے بغیر مجھے کہیں شفٹ کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے ہی ہاتھ پیر باندھ کے گٹھری کی طرح ٹرک میں لے جانا مشکل کام نہیں تھا لیکن وہ محتاط تھے اور مجھے کوئی موقع فراہم نہیں کرنا چاہتے کہ میں رسّیاں کھول کے چلتے ٹرک سے کود جاؤں یا ہوش میں آ کے بندھا ہوا بھی پر کٹے کبوتر کی طرح قلابازیاں کھانے لگوں۔ کریٹ کے اندر رہ کے میں نہ کسی کو نظر آ سکتا تھا اور نہ آزاد ہو جانے کی صورت میں (جس کا امکان ایک فیصد بھی نہیں تھا) کوئی خطرناک کارروائی کر سکتا تھا۔

"گاڑی میں دوسرا مال بھی جائے گا؟" گردیزی نے سوال کیا۔ معلوم نہیں دوسرے مال سے اس کی مراد کیا تھی؟

"نہیں۔ فی الحال اسی کو ٹھکانے پہنچا دو۔" چوہدری دلاور نے کہا۔ "اور دیکھو راستے میں کوئی روکے تو اسے دور لے جا کر سودا کر لینا۔ قریب کوئی آنے ہی نہ پائے۔ کوئی پیچھے لگ جائے تو بھاگنے کی کوشش مت کرنا۔ ٹرک لے کر کھلی سڑک پر کوئی نہیں بھاگ سکتا اور تیز رفتاری میں حادثہ ہو جاتا ہے۔ میں ہر غلطی معاف کر دوں گا لیکن حادثے میں کوئی نقصان ہوا تو زندہ گاڑ دوں گا۔" اس کی آواز اور اس کا لہجہ دونوں بدلے ہوئے تھے۔

"چوہدری صاحب! دونوں پرانے ڈرائیور ہیں اور انہیں اچھی طرح سمجھا دیا ہے۔" گردیزی بولا۔

"صبح تک سب کو واپس آنا ہے۔ سب ڈیوٹی پر معمول کے مطابق۔" دلاور نے کہا۔

ان کی گفتگو سے میں نے یہ نتائج اخذ کیے کہ ٹھکانے کا مطلب ٹھکانے لگانا نہیں تھا۔ مجھے وہ کسی محفوظ مقام پر لے جا رہے تھے جو ان کا اڈہ تھا یا کوئی ایسی جگہ تھی جہاں کسی کی... مزید یہ کہ وہ جگہ سو سوا سو میل کے اندر تھی۔ ایک ٹرک اتنی ہی دور جا کے واپس آ سکتا تھا۔ صبح تک انہیں دس گھنٹے... پانچ گھنٹے کا ایک طرفہ سفر زیادہ سے زیادہ دو سو میل ہو سکتا... ٹرک کی اوسط رفتار چالیس میل فی گھنٹہ سے کم نہ ہو۔ ہائی وے... رفتار رات کے وقت کافی ہے۔ پھر یہ کہ شہروں سے گزرتے... رفتار کو پندرہ بیس میل رکھنا پڑتا ہے۔ چنانچہ پانچ گھنٹے... تیس میل فی گھنٹہ سے زیادہ نہیں طے کیے جا سکتے۔ راہ میں گو... وزیر آباد، گجرات اور لالہ موسیٰ کے شہر تو یقیناً تھے لیکن... پھر جہلم کا شہر بھی آ سکتے تھے۔ تقریباً ڈیڑھ سو میل کے... تھا۔ ایک سو ساٹھ میل۔ اور میرے حساب کے مطابق وہ... آگے جانے کا ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ شاید جہلم اور راولپنڈی... ہی پہاڑوں اور کھائیوں میں کہیں وہ جگہ تھی جہاں مجھے قید رکھنا... تھا۔ قید میں رکھنے کا مقصد کیا ہوگا، یہ میں نے ابھی نہیں سوچا تھا... دشمنوں کو صرف مہمان نوازی کا ثبوت دینے کے لیے قید نہیں رکھا... سے کچھ اعتراف کرانے، کچھ پوچھنے یا کسی نام پر مجبور کرنے کا... ہے اور دیگر علوم وفنون کی طرح ایذا رسانی اور تشدد کے طریقے... بنیادوں پر اتنے موثر ہو گئے ہیں کہ ان کا تصور کرنے سے بھی... ہوتی ہے۔

دس منٹ بعد جو دس گھنٹوں کے برابر طویل تھے، میں... ٹرک کی آواز سنی۔ میرے کان سڑکوں پر ڈرائیونگ کرتے رہنے... کی گاڑی کی آواز سے آشنا تھے اور یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں... لوگ اس فرق کو محسوس کر سکتے ہیں۔ میرے خیال کے مطابق... کا چھوٹا ٹرک تھا۔ آوازیں جو کچھ دیر کے لیے معدوم ہو گئی... وہ لوگ راستے میں دکھانے کے لیے کاغذات بنانے آفس... گئے تھے) دوبارہ سنائی دیں اور چار ہاتھوں نے مجھے آگے پیچھے سے اٹھا کے ٹرک پر رکھا اور دھکا لگا کے آگے کر دیا۔ ٹرک کا پچھلا دروازہ بند ہوا جو دراصل دو فٹ اونچی روک تھا اور ٹرک کے... کی تین دیواروں کے برابر تھا۔

پھر نہ جانے کیا ہوا کہ بھگدڑ مچ گئی۔ دلاور نے سب کو... اچانک غائب ہو جانے کا حکم دیا۔ "وہ تو سچ مچ آگیا ہے۔" اس نے جملے کے آخر میں ایک گالی کا اضافہ کیا۔ "سب اندر جاؤ اور اتنی ہی لائٹس جلنے دو جتنی روز ہوتی ہے۔"

"کیا یہ خطرہ ہے چوہدری صاحب کہ وہ اندر آجائے گا؟" گردیزی نے گھبرا کے کہا۔

"اندر کیوں آئے گا؟ اس کے باپ کا گھر ہے یا بیوی کا میکہ ہے؟" دلاور نے کہا۔ "بریف کیس لے گا اور چلا جائے گا۔"

"اس نے چوکیدار سے کچھ پوچھا تو....." گردیزی نے کہا۔ "وہ کچھ بک نہ دے۔" لیکن اس کی بات سننے سے پہلے ہی میرا دل میرے سینے میں اتنی ہی زور سے دھڑکا تھا جتنی قوت سے میں لکڑی کے اس تابوت میں تڑپا تھا۔ میرے کانوں نے غلط نہیں سنا تھا۔ محسن سچ مچ آپہنچا تھا جس کی مجھے کوئی امید نہیں تھی۔ میں نے ان کو بلف کیا تھا اور مقصد صرف ان کو یہ احساس دلانا تھا کہ میرے یہاں آنے کی خبر دوسروں کو بھی ہے۔

"یہ منحوس لاتیں مار کے ڈھول بجا رہا ہے۔" گردیزی نے کہا۔ "ہوش میں آگیا ہے....."

"اس کا ڈھول بعد میں بجائیں گے۔" دلاور نے کہا۔ "جا کے سنو وہ اس کا یار کیا جھک جھک کر رہا ہے۔"

"آپ نے تو سمجھا ہی دیا تھا چوکیدار کو۔ وہ کہہ دے گا کہ سکندر صاحب آئے تھے اور یہ دے کر چلے گئے۔"

"یہی تو غلطی ہو گئی ہے ہم سے۔" دلاور نے کہا۔ "اب اتنا تو ثابت ہو ہی جائے گا کہ وہ یہاں تک پہنچا تھا۔ اس کا باپ ایس ایس پی ہے وہ آجائے گا جرح کرنے کہ سکندر دروازے تک ہی آیا تھا یا اندر بھی گیا تھا۔"

میرا دل چاہا کہ میں قہقہہ مار کے ہنسوں۔ یہ بات اب یقینی تھی کہ محسن، رابعہ اور رضوی صاحب کی ساری تفتیش کا مرکز چوکیدار ہوگا۔ یہ سوال قدرتی طور پر ان کے ذہن میں پیدا ہوگا کہ سکندر کو یہاں بریف کیس رکھوانے کی کیا ضرورت تھی جبکہ اسے گاڑی لے کر گھر پہنچنا تھا۔ مجھے وقت کا اندازہ نہیں تھا لیکن محسن کا آنا یہ ظاہر کرتا تھا کہ مغرب کے بعد بھی دو تین گھنٹے گزر چکے ہیں۔ انہوں نے رات ہونے تک میرا انتظار کیا ہوگا اور پھر محسن نے طے کیا ہوگا کہ وہ خود جا کے معلوم کرے۔ مجھے صرف تین گھنٹے ہی تو گزارنے تھے۔ پانچ گھنٹے بعد بھی میرے نہ پہنچنے سے تشویش پیدا ہونا یقینی تھا۔ چھ گھنٹے بعد بھی اگر محسن صوابی انگری موٹر ورکشاپ پہنچا ہوگا تو پروپرائٹر استاد نے بتایا ہوگا کہ جناب عالی! گاڑی تو ایک گھنٹہ بعد تیار کھڑی ہے پر وہ صاحب لینے ہی نہیں آئے۔" اور اس کے بعد محسن گاڑی لے کر چلا ہوگا تو اس کے ذہن میں دو ہی مقامات ہوں گے۔ مقبرہ جہانگیر اور فلم دیکھنے والی... لیکن رات کو مقبرہ بند رہتا ہے اور فلم کا آخری شو جاری ہوگا یا شروع ہونے والا ہوگا چنانچہ دونوں جگہ میری موجودگی خارج از امکان تھی۔ پھر وہی ہوا ہوگا جو میرے ساتھ ہوا یعنی اس کی نظر نے "ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس" کا بورڈ دیکھ لیا ہوگا۔ وہ میری فطرت سے بخوبی واقف تھا اور خود اس کی سوچ کا انداز طویل رفاقت کے بعد میرے ذہن سے ہم آہنگ ہو چکا تھا اور ہمارے خیالات کی یہ مطابقت بعض اوقات ٹیلی پیتھی کی طرح ہو جاتی تھی۔ اس نے سوچا ہوگا کہ اگر سکندرِ اعظم کی جولانیٔ طبع اور مہم جُو فطرت نے مجبور کیا ہوگا تو کچھ بعید نہیں کہ وہ مسترت نذیر کو یکہ چلاتا دیکھنے کے بجائے چوہدری دلاور سے "آ بیل مجھے مار" کہنے چل پڑے ہوں گے اور اب وہ دروازے تک آپہنچا تھا۔ میری ایک فضول سی حرکت بہت بامعنی ہو گئی تھی اور دشمنوں کی ذرا سی غلطی بہت بڑی مصیبت کا پیش خیمہ ثابت ہونے والی تھی۔ اگر وہ بریف کیس غائب کر دیتے اور چوکیدار کو سمجھا دیتے کہ کسی سے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں تو کچھ نہ ہوتا لیکن خود ان کو ایک فیصد شبہہ نہ تھا کہ محسن واقعی آجائے گا۔ انہیں یہ سب میری اداکاری کا جزو محسوس ہوا ہوگا۔

"تم گدھے ہو بہت گھٹیا قسم کے۔" دلاور نے آہستہ سے کہا۔ "تم نے اسی وقت مجھے بتا دیا ہوتا تو میں بریف کیس منگوا لیتا لیکن تم نے اپنی عقل کے گھوڑے دوڑائے۔"

"میری جگہ آپ ہوتے چوہدری صاحب! تو اس مکار کی باتیں سن کے یہی سمجھتے کہ سب بکواس ہے۔" گردیزی بولا۔

"اچھا اب تم لوگ جاؤ۔" دلاور نے کہا۔ "چوکیدار سے میں نمٹ لوں گا۔ مجھے معلوم ہے وہ صبح پھر آئیں گے۔ ہو سکتا ہے رات کو ہی آجائیں۔ اس سے پہلے مجھے چوکیدار بدلنا ہے۔ چوکیدار کو بھی ڈال دو گاڑی میں۔"

میرا دل ڈوبنے لگا۔ یہ لوگ اب چوکیدار کو ختم کرنے پر آمادہ تھے۔ جب وہ چوکیدار ہی نہیں ہوگا تو کوئی اس کی زبان سے کیا اگلوائے گا اور نیا آدمی ہوگا تو لاکھ پوچھنے پر بھی وہ بات کیسے بتائے گا جس کا علم اس کے فرشتوں کو بھی نہیں۔ رضوی صاحب کی ساری فورس اندر آ کے کونا کونا چھان مارے۔ نہ انہیں سکندر ملے گا نہ وہ چوکیدار۔ چوہدری دلاور یا گردیزی بن جانے والے پیڈرو کی پوزیشن بالکل محفوظ ہوگی۔ وہ صاف انکار کر دیں گے کہ سکندر بخت کو انہوں نے دیکھا تک نہیں۔ وہ معمول کے مطابق چھٹی کر کے گھر چلے گئے تھے۔ ان کے وہ پیچھے نوکر بھی یہی بیان دیں گے تو ثابت کیا ہوگا۔ اس کے باوجود مجھے خوشی تھی کہ کچھ تو ہوا۔ میرا سراغ اس فیکٹری کے گیٹ تک تو ملا۔ آگے رضوی صاحب کی ذہانت، ان کے وسائل اور ان کی خصوصی ٹیم مل کے کیا کرتے ہیں، یہ میرا مقدر۔

"چوہدری صاحب! میری غلطی جناب۔" چوکیدار کے چلانے کی

آواز آئی۔ پھر کسی نے اس کے سر پر کوئی چیز ماری کہ اس نے حلق سے ذبح کیے ہوئے بکرے جیسی آواز نکالی اور خاموش ہوگیا۔ میرے قریب ہی دھاکا ہوا جس سے میں نے اندازہ کیا کہ چوکیدار کو باندھ کے اوپر سے اچھال دیا گیا ہے۔ خدا کرے کہ وہ زندہ ہو۔ میں نے دل ہی دل میں دعا کی۔ یہ ہو سکتا ہے کہ راستے میں اسے ہوش آجائے۔ میرے اور اس کے درمیان ایک تختے کی دیوار ہے۔ وہ میری بات سن سکے گا لیکن یہ آواز آگے بیٹھ کے ٹرک چلانے والوں تک نہیں پہنچے گی۔ میری پہلی کوشش کی ناکامی نے مجھے تھوڑا سا دل شکستہ کر دیا تھا لیکن مایوس نہیں کیا تھا۔ محسن گیٹ سے باہر تھا چنانچہ وہ آواز اس کے کانوں تک کیسے پہنچ سکتی تھی جو میری لاتوں کے کریٹ پر لگنے سے پیدا ہوئی تھی۔ اگر یہ دھم دھم وہ سن بھی لیتا تو اس سے یہ نتیجہ کیسے اخذ کرتا کہ یہ شہزادہ سکندر بخت کا ایس او ایس ہے جو اس وقت لکڑی کے ایک ڈبے میں پیک کیے جا چکے ہیں اور اندر ہی اندر مرغ بسمل کی طرح تڑپ رہے ہیں لیکن اندر رہ کے بھی میں باہر پڑے ہوئے چوکیدار سے مشورہ کر سکتا تھا اور حالات کے مطابق اس کو مشورہ دے سکتا تھا یا اس کی رہنمائی کر سکتا تھا۔ ایک اکیلا اور دو گیارہ۔ زندہ رہنے کی جدوجہد میں یہ اشتراکِ باہمی کارآمد ثابت ہوگا یا نہیں، یہ کہنا قبل از وقت تھا۔

آگے کا دروازہ بند ہوا اور ٹرک جھٹکا لے کر آگے بڑھا۔ فیکٹری کے گیٹ سے سڑک تک آنے میں دو منٹ بھی نہیں لگے ہوں گے۔ اس وقت میری ذہنی کیفیت بہت عجیب تھی۔ میں نے اس تمام ٹریفک کا تصور کیا جو ہمارے آگے پیچھے رواں تھی۔ بسیں اور ٹرک، ویگن اور کاریں۔ ان کا شور مجھ تک پہنچ رہا تھا لیکن مجھے ذرا بھی امید نہیں تھی کہ میں نے کریٹ کے اندر لاتیں مار کے ڈھول بجایا تو یہ آواز کسی کے کانوں تک پہنچے گی۔ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ اگر ٹرک کا کسی سے ایکسیڈنٹ ہو جائے۔ وجہ کچھ بھی ہو مثلاً اس کے بھی بریک فیل ہو جائیں۔ یا سامنے سے کوئی غلط اوورٹیک کرتے ہوئے اس سے ٹکرا جائے تو اس بات کا خاصا امکان ہے کہ جھٹکے سے کریٹ نیچے جا گرے یا ٹوٹ جائے۔ لیکن ایسی صورت میں ففٹی ففٹی چانس میری گردن ٹوٹنے کے یا میرا سر پھٹنے کے بھی تھے۔ معمولی زخمی ہونا تو یقینی تھا۔ یہ کس قدر ناقابلِ یقین بات ہوگی۔ میں نے سوچا۔ اگر دیکھنے والوں کو بتایا جائے کہ یہ جو ٹرک ابھی ابھی "ایم۔ ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس" سے نکلا ہے اور جس پر صرف ایک کریٹ رکھا ہے اس میں خود فیکٹری کے مالک تشریف فرما ہیں۔ بے شک عام حالات میں فیکٹریوں کے مالک اس طرح سفر نہیں کرتے مگر یہ مخصوص حالات ہیں جن کا تعلق شامتِ اعمال سے ہے۔

سڑک پر پہنچنے کے بعد ٹرک کی رفتار بڑھ گئی تھی۔ لاؤڈ اسپیکر فٹ کرنے والوں کی طرح میں نے صندوق کو اندر سے "ہیلو ٹیسٹنگ ٹیسٹنگ" کے انداز میں بجایا۔ مقصد یہ معلوم کرنا تھا کہ یہ صدا کس حد تک ... ہے۔ اس مشینی سفینے کے قاتل ناخداؤں تک یا میرے ... دھرے بحرِ مصائب میں غرق ہونے والے پاسبان تک ... کے شور کے سوا کچھ نہ آیا جواب کچھ کم ہوگیا تھا۔

ہم شاہدرے سے دور آچکے تھے میں نے ... لیٹے سوچنا شروع کیا کہ چار پانچ گھنٹے میں کیا کچھ کیا جا ... سے کچھ حاصل ہو یا نہ ہو۔ سب سے اچھا تو یہ ہوتا کہ کوئی ... میرے منہ پر سے ٹیپ اتار دیتا۔ پھر میں لاؤڈ اسپیکر کی ... نہ کسی کو ضرور متوجہ کر لیتا مگر دستِ غیب کے کریٹ میں ... الف لیلوی تھا۔ بالکل ایسا ہی جیسے کسی پری یا جن ... کا خیال جو ہاتھ کی ایک جنبش سے کریٹ کی دیواریں غائب کر ...

میری ناک میں عجیب سی ناگوار بدبو پہنچی تو میں نے ... ہم کالا شاہ کاکو سے گزر رہے ہیں جہاں کیڑے مکوڑے ... بنانے والا بہت بڑا کارخانہ ہے اور اس کا کیمیائی دھواں ... کو معطر رکھتا ہے۔ یہ تو وہی جگہ ہے گزرے تھے ہم جہاں ... آیا" اس وقت جب موت یقینی نظر آتی تھی خدا نے مجھ ...

تھی کہ میں نے گاڑی کو ایک خوفناک تصادم سے بال بال ... اس کے بعد جب وفات پانے کے امکانات تقریباً معدوم ... مجھے بہکا کے کہاں لے گیا۔ اب میں اسی راستے پر واپس ... میری منزل سلامتی کی منزل نہ تھی۔ اگلے اور پچھلے حصے ... تھا چنانچہ ڈرائیورانِ گرامی یہ تو دیکھ سکتے تھے کہ اسیرانِ ... جگہ موجود ہیں لیکن کسی قسم کی آواز نہیں سن سکتے تھے۔ اگر ... ہوتا تو یقیناً بے ہوش پڑے ہوئے چوکیدار کو لپکاتا اور کسی ... والے کی طرح اس وقت تک یہ عمل جاری رکھتا جب تک ... اس کے کانوں کے راستے اس کے لاشعور میں نہ اتر جاتی اور ... کو بیدار نہ کر دیتی لیکن میں قوتِ گویائی سے ہی محروم تھا۔

میں اپنے بے سروپا خیالات میں غرق تھا کہ میں نے ... کراہنے کی آواز سنی۔ میرا دل تیزی سے دھڑکا۔ اگر چوکیدار ... آجائے تو یقیناً چیخ و پکار مچا سکتا ہے۔ میں نے سوچا۔ ... سے گزرتے ہوئے۔ اسی وقت میں نے ایک بھاری بھرکم ... آواز سنی۔ پھر موٹر سائیکل نے ٹرک کو اوورٹیک کیا ... خالص پولیس والے دبنگ لہجے میں کہا "گاڑی روک ادھر ... حکم عدولی کی گنجائش ہی نہ تھی۔ ٹرک کی رفتار کم ہو ... ایک سائڈ پر رک گیا۔

"کیا لے جا رہے ہو بے؟" ٹرک کو روکنے والے نے کہا۔ ... آواز بہت قریب محسوس ہوئی۔

موہوم سی امید میں میرا دل زور سے دھڑکا۔

ایک میں نے دونوں لاتوں کو سمیٹ کر پھیلایا اور جسم کی ساری توانائی صرف کر کے اس صندوق کی دیوار پہ مارا جو میرا تابوت بنا ہوا تھا۔ اندر ایک گونج سی پیدا ہوئی اور یہ آواز یقیناً اس کو بھی متوجہ کر لیتی جس نے ٹرک روکا تھا مگر میری بدقسمتی کہ عین اسی وقت کوئی ٹرک کا دروازہ زور سے بند کر کے نیچے اترا۔

"حکم کریں عالی جاہ!" میں نے ایک آواز سنی۔ یہ انہی میں سے ایک تھا جو میر وزیر اینڈ کمپنی میں فورمین کہلاتے تھے۔

"کیا لے جا رہے ہو ٹرک میں؟" عالی جاہ نے خوشامدانہ لہجے سے متاثر ہوئے بغیر غرّا کے کہا۔

"وہی جو روز لے جاتے ہیں سرکار! کمپنی کا مال ہے تھانیدار جی!"

"کون سی کمپنی کا؟ کیا مال ہے، اس صندوق میں۔؟" تھانیدار بولا۔

"کمپنی کا نام تو ٹرک پر لکھا ہوا ہے سرکار! اپنے چوہدری دلاور صاحب کی فیکٹری ہے۔"

میں نے پھر صندوق کی دیوار پر لات ماری۔ "یہ کیسی آواز ہے؟" تھانیدار نے کہا۔

"وہ پیچھے والا پٹ ذرا ڈھیلا ہے عالی جاہ! آپ ذرا ادھر آئیں۔ سڑک سے ہٹ کر بات کریں۔"

"اوئے.... ہاتھ چھوڑ۔ بات کر اسی جگہ۔" تھانیدار گرم ہوگیا۔ "بکس میں کیا ہے؟"

"بکس میں پرزے ہیں جی! ٹریکٹر کے ساتھ جوڑنے والے۔" آواز اب قدرے دور سے آئی مگر میں نے باکس کے اندر لاتیں مارنے کی جدوجہد جاری رکھی۔ "اپنے چوہدری صاحب کی فیکٹری میں یہی بنتے ہیں۔"

باہر سے ٹرک اور بسیں گزرتے جا رہے تھے چنانچہ جتنی آواز میرے کان اس ڈبے میں سن رہے تھے، اتنی باہر تھانیدار تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ اس کے باوجود تھانیدار کے ذہن میں پیدا ہونے والا شک برقرار رہا۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ مجھے اغوا کرنے والے کا لہجہ اعتماد سے خالی تھا اور شاید وہ گھبرا گیا تھا کہ خوف اس کی آواز سے جھلکتا تھا۔

"اُلّو بناتا ہے مجھے۔" تھانیدار نے اسے ایک اور گالی دے کر کہا۔ "تھانے لے کر چل ٹرک کو۔"

"تھانے کی بات کیوں کرتے ہیں جنابِ عالی!" ڈرائیور نے لجاجت سے کہا۔ "بات تو یہاں بھی ہو سکتی ہے۔"

"تو بات کر! انسانوں کی طرح۔ یہ کیا ڈھک ڈھک ہو رہی ہے بکس میں؟" تھانیدار نے کہا اور اپنی کوشش کی کامیابی نے میرا حوصلہ بڑھا دیا۔ میں نے صندوق کے اندر مرغِ بسمل کی طرح تڑپنا شروع کیا اور میری لاتیں لکڑی کی بنی ہوئی تین دیواروں پر پڑتی رہیں۔

"ٹریکٹر کے پرزے اندر ہی اندر چلنے لگے ہیں؟ تیرے چوہدری صاحب کی...!" تھانیدار نے برہمی سے دلاور کو بھی گالی سے نوازا۔ "میں کھال کھینچ کے سڑک پر ڈال دوں گا۔"

"عالی جاہ! اس بار معاف کر دیں۔" ڈرائیور بولا۔ "میں نے جھوٹ بولا تھا۔ بکس میں ہرن ہے۔ چوہدری صاحب نے چھانگا مانگا سے پکڑا تھا۔ بڑا سخت جرم ہے جی! لیکن ہم تو بے قصور ہیں۔ بڑے آدمیوں کے شوق ہیں۔ ہمیں حکم ملا تھا کہ اسے ایک دوست کے گھر پہنچانا ہے۔ وہ صوبہ سرحد کے بہت بڑے زمیندار ہیں سرکار۔ کھلا نہیں لے جا سکتے تھے اس لیے ایک بکس میں ڈال کے لے جا رہے ہیں۔" اس کی آواز رفتہ رفتہ قریب آرہی تھی جس سے میں نے اندازہ کیا کہ تھانیدار ایک ایک قدم پیچھے کی طرف بڑھتا آرہا ہے۔

ڈرائیور نے بڑی چالاکی سے میری امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ لیکن ایک امید ابھی زندہ تھی۔ اگر پولیس والے نے پیچھے آکے جھانکا تو اسے بیہوش پڑا ہوا چوکیدار ضرور نظر آجائے گا۔ اس کے بعد وہ ڈرائیور کو ہرگز نہیں بخشے گا۔

"وہ دیکھیں عالی جاہ... چوہدری صاحب نے کہا تھا کہ کوئی پوچھے تو اسے یہی بتایا جائے۔ اور یہ نذرانہ ہے چوہدری صاحب کی طرف سے۔" ڈرائیور نے تھانیدار کو روکنے کی کوشش میں کوئی کمی نہیں آنے دی۔ "پورے دو ہزار ہیں۔ آپ فرما دیں کم ہے تو...."

"یہ ہرن کا بچہ اچھل کود رہا ہے؟" تھانیدار کی آواز بہت قریب سے آئی۔ "چلّا کیوں نہیں رہا ہے؟"

"چلائے گا کیسے سرکار! منہ باندھ دیا ہے اس کا۔" ڈرائیور بولا۔ "اب جانے دیں اس معاملے کو۔ خواہ مخواہ بات بڑھے گی۔ آپ اسے ضبط کر لیں گے۔ پھر مجھے پکڑ کے ڈک لیں گے مگر چوہدری صاحب بڑے رسوخ والے آدمی ہیں۔ ان کو جیل تو ہو ہی نہیں سکتی۔ جرمانہ ہی ہوگا عدالت سے۔ جرمانہ آپ لے لیں۔ اپنا وقت کیوں ضائع کرتے ہیں عالی جاہ! میری بھی ضمانت ہو جائے گی۔ ہم تو حکم کے غلام ہیں۔ ہمارا کوئی جرم نہیں۔ چلیں آپ دو کے چار کر لیں۔ ویسے اپنے چوہدری صاحب نے مجھے پانچ تک اختیار دیا ہے لیکن ہرن تو ضرور جائے گا جی۔ ہو سکتا ہے چوہدری صاحب ایسے ہی آکر لے جائیں۔ پھر آپ کو افسوس ہوگا اپنے نقصان کا۔ ایسے ہی ضد میں پانچ ہزار بھی جائیں گے، ہرن کا کیا ہے۔"

"اوئے ہرن کے بچے!" تھانیدار نے یکلخت مشتعل ہوتے کہا۔ پھر پٹاخے کی طرح آواز آئی جس سے میں نے اندازہ کیا کہ تھپڑ

خاصا بھرپور تھا اور ڈرائیور کے منہ پر پڑا ہے۔" یہ ہرن ہے کہ بندہ؟ بول تیری ایسی تیسی۔"

"بتاتا ہوں، بتاتا ہوں عالی جاہ!" ڈرائیور کی گھٹی گھٹی آواز آئی۔ یوں لگتا تھا کہ تھانیدار نے گالی دیتے ہی اس کی گردن بھی دبوچ لی ہے۔ خدا نے میری سن لی تھی۔ پولیس انسپکٹر نے بیہوش پڑے ہوئے چوکیدار کو دیکھ لیا تھا۔ ہرن والا جھوٹ شاید پانچ ہزار میں چل جاتا۔ لیکن اب معاملہ لمبا ہوگیا تھا۔ ڈرائیور بولنے کی کوشش میں حلق سے خرخر کی آوازیں نکال رہا تھا۔ "میرا گلا تو چھوڑیں۔" وہ ہانپتے ہوئے کھانسنے لگا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ گالیاں دینے والے تھانیدار کی آواز ایک دم بند ہوگئی۔ آخری آواز جو میرے کانوں نے سنی کراہنے کی تھی۔ شاید اس سے پہلے کوئی چیز گری تھی یا ٹکرائی تھی۔

"بازای نیئس سی آوندا شودا پتر" ایک اور کرخت، بیٹھی ہوئی آواز آئی۔ "ہُن لے پنج ہزار۔"

"بڑے وقت پر کام کر دیا تو نے۔" پہلا شخص بولا۔ "میں تو گھبرا گیا تھا۔"

"چل اب نکل۔ گڈی سٹارٹ کر۔" دوسرے نے کہا۔ "ٹریفک بہت ہے۔"

"اور اس کا کیا بنے گا۔ یہیں سڑک پر ہی پڑا رہے گا۔"

"یار تو جلدی کر۔ میں اس کو ڈالتا ہوں کنارے پر۔" دوسرا بھنا کے بولا۔ "اوئے ٹھیر ذرا۔ اِدھر بیٹھ جا۔ بیٹھ میرے ساتھ۔ کوئی گڈی ہے پیچھے۔ لائٹ اس پر نہ آئے ورنہ پھنس جائیں گے۔ اس کو بالکل کور کر لے۔ بس نیچے دیکھ۔ معلوم ہو کہ ہم ٹرک میں کوئی خرابی دیکھ رہے ہیں۔ ایسے گھبرا مت جایا کر......"

"اس کی موٹر سائیکل بھی تو کھڑی ہے۔"

"وہ آگے ہے اور بالکل ٹرک کی سائڈ میں ہے۔ پیچھے سے نظر نہیں آتی۔" دوسرا بولا۔

"مگر یار اس نے نمبر تو نوٹ کر ہی لیا ہوگا۔" ڈرائیور نے کہا۔

"اوئے دماغ کو ٹھکانے رکھ۔ نمبر کون سا اصلی ہے۔ دوسرے نے جھلا کر کہا۔ "چل اب اٹھ۔ فٹافٹ نکل جاتے ہیں۔"

ٹرک ایک بار پھر روانہ ہوگیا اور اس اندھیرے میں جو رات کا ایک حصہ تھا اور میرے ساتھ لکڑی کے اس باکس میں محصور تھا مایوسی کا گہرا اندھیرا بھی شامل ہوگیا۔ اتنا اندازہ تو مجھے تھا کہ ٹرک میں آگے کم سے کم دو افراد ہوں گے۔ اب میں تصور کر سکتا تھا کہ شامتِ اعمال کے باعث راستہ روکنے والے انسپکٹر کے ساتھ کیا ہوا۔ جب وہ ایک سے بات کر رہا تھا تو دوسرا ٹرک میں بیٹھا رہا اور موقع ملتے ہی دوسری جانب اتر گیا جہاں اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ انسپکٹر یا تو بہت ایماندار اور فرض شناس تھا یا بہت لالچی کہ پانچ ہزار کی رقم بھی

دَئی کرنے کی فکر میں تھا۔ ڈرائیور کا دوسرا ساتھی ٹرک کی اوٹ چھپا کھڑا رہا۔ انسپکٹر پانچ ہزار لے کر چلا جاتا تو وہ بھی خاموشی سے لوٹ کر اپنی جگہ آ بیٹھتا۔ مگر اس نے معاملات کو قابو سے باہر دیکھا تو بے خبری میں اچانک پیچھے سے آ کے انسپکٹر کے سر پر کسی شے یا سریے سے وار کیا اور بات ختم کر دی۔ اب معلوم نہیں وہ زندہ تھا یا صرف بیہوش لیکن اس کا جسم سڑک سے ہٹ کر نشیب یا کسی جھاڑی کے پیچھے پڑا تھا جہاں اسے سڑک پر سے گزرنے والے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اس کی موٹر سائیکل کو یقیناً ہر گاڑی کے ڈرائیور نے دیکھا ہوگا اور پہچان لیا ہوگا مگر جانتے بوجھتے اس چکر میں پڑتا ہے کہ پولیس کی خیریت معلوم کرنے رُکے اور اپنی خیریت سے سب یہی فرض کرتے رہیں گے کہ سارجنٹ آگے پیچھے کہیں مصروف ہوگا۔ صبح کی روشنی پھیلنے تک اس کو کوئی اٹھانے والا نہ ہوگا کہ خدا کے۔ اگر وہ خود بھی ہوش میں آ کے اٹھ کھڑا ہوا تب بھی چوہدری صاحب کا کیا بگاڑ لے گا۔ وہ رپورٹ کرے گا کہ "میر وزیر آباد کے فلاں ٹرک نے جس کا نمبر یہ تھا اور جسے اس حلیے کا ڈرائیور چلا رہا تھا اس پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ اور چوہدری دلاور کہے گا۔ "کیسی باتیں کرتے ہیں اپنے تھانیدار صاحب! اِنہ اس نمبر کا ٹرک ہماری فیکٹری میں ہے اور نہ اس حلیے کا کوئی ڈرائیور۔ ہیں جی! یہ جو بندہ ہے جسے آپ نے شناخت کیا ہے تو یہ ڈرائیور نہیں، فورمین ہے جناب عالی! اور ہرن کیسا؟ آپ مذاق کر رہے ہیں ہم سے اپنے تھانیدار صاحب! اچھا ننگا مانگا میں ہرن کہاں۔ اور ہوں بھی تو ہم کو مرنے جینے کی فرصت نہیں۔ ہم کیوں پکڑیں گے ہرن۔ کیا ہمیں معلوم نہیں کہ یہ جرم ہے۔ صوبہ سرحد میں دوست؟ واہ جی واہ! ہم نے تو ابھی تک پنجاب سے آگے کچھ دیکھا ہی نہیں۔ یہ صوبہ سرحد ہے کدھر جناب انسپکٹر صاحب بہادر؟" اور بیچارا انسپکٹر یہی بہتر سمجھے گا کہ چوہدری صاحب ازراہِ عنایت خیر جو کچھ بھی دیں، وہی لے کر شکریہ ادا کرے اور رخصت ہو جائے ورنہ لینے کے دینے بھی پڑ سکتے ہیں۔

وقت کے ساتھ فاصلے کا احساس بھی باقی نہ رہا۔ رفتہ رفتہ مسلسل جھٹکوں سے میری اپنی حالت غیر ہونے لگی۔ اگر مجھے کنکریٹ مکسر میں ڈال کے گھمایا جاتا تب بھی میری حالت یہی ہوتی۔ میرے جسم کا جوڑ جوڑ ہل گیا تھا اور اسی طرح درد کر رہا تھا جیسے دلِ حوالات میں پہلی رات سرکار کی میزبانی کے بعد درد میرے رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا۔ اس قید سے نجات کی بظاہر کوئی صورت نظر نہ آتی تھی اور منزل تک پہنچنے سے پہلے اغوا کنندگان کے عزائم کا اندازہ بھی محال تھا۔ تاہم وقتی مایوسی اور ناامیدی کا وقفہ گزر گیا تو میں نے سوچنا شروع کیا کہ اب تائیدِ غیبی کی کیا صورت ہو سکتی ہے — سوائے سوچنے کے میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ ایک امید کی کرن تو

چوہدری کا وجود تھا۔ خدا کرے اسے ہوش آ جائے اور وہ اس قابل ہو جائے کہ راہگیرِ عامہ کو متوجہ کر سکے یعنی کسی شہر یا قصبے سے گزرتے ہوئے چیخ و پکار مچا سکے۔ ہاتھوں اور پیروں کے کھل جانے کی امید رکھنا ایسا ہی تھا جیسے میرے گرد مضبوطی سے جمے ہوئے تختوں کی دیوار کے شق ہونے کی توقع رکھنا۔ البتہ یہ ہو سکتا تھا کہ کسی طرح وہ ٹیپ ڈھیلا ہو جائے جس نے میری قوتِ گویائی سلب کر رکھی تھی۔ میں نے ہونٹوں کو جبڑوں کو اور دانتوں کو حرکت دے کر اس ٹیپ سے نجات حاصل کرنے کی واجبی سی کوشش کی جس کے بعد مجھے اندازہ ہو گیا کہ این خیال است و محال است و جنوں۔ ٹیپ تو میرے لبوں کے گرد گوشت کے ہر ریشے سے یوں چپکا ہوا تھا کہ اس قسم کی سعی لاحاصل اپنی ہی نظر میں حماقت لگتی تھی۔

پیچھے سے کسی گاڑی نے میوزیکل ہارن دینا شروع کیا۔ پیں پاں پیں پیں پاں۔ پیں پاں پیں پیں پاں۔ یہ غالباً لاہور سے راولپنڈی جانے والی کوئی ویگن تھی جو ذرا سی دیر میں آگے نکل گئی۔ ڈرائیور محض تفریحِ طبع اور اپنی انفرادیت کے مظاہرے کی خاطر ہارن بجا رہا تھا ورنہ اس وقت سڑکوں پر ٹریفک بہت کم تھی۔ شہر کے رش میں راستہ مانگنے کے لیے یہ سرگم شاید کسی کے کانوں پر جوں کی طرح رینگتی مگر باہر صرف وہی گاڑیاں تھیں جو ایک شہر سے دوسرے شہر آ جا رہی تھیں۔ ہارن کی سریلی آواز دور ہوتی گئی پھر دوسرے ٹریفک کے شور میں گم ہوگئی۔ میں اس ہارن کے سُر بھول چکا تھا کہ اچانک میرے کانوں نے وہی آواز پھر سنی۔ ٹرک کی رفتار میں اضافہ نہیں ہوا تھا چنانچہ اس کا مطلب یہی نکالا جا سکتا تھا کہ ویگن رُک گئی تھی یا اس کی رفتار اتنی کم ہوگئی تھی کہ ٹرک نے پھر اسے جا لیا۔ دوسری صورت قدرے غیر عملی لگتی تھی کیونکہ ویگن والے تیز رفتاری کے باعث خاصے نیک نام ہیں چنانچہ یہ بات زیادہ قرینِ قیاس لگتی تھی کہ ویگن رکی ہے۔ پیں پاں پیں پیں پاں۔ میوزیکل ہارن کی آواز پھر سنائی دی اور اسی وقت ہم نے انہیں کراس کیا۔ ذرا سی دیر کے لیے ویگن کے کنڈیکٹر کی صدا آئی۔ "بھائی چکوال موڑ۔" ہارن پھر بولا۔ سوہاوہ کے قریب بائیں جانب ایک سڑک چکوال جاتی ہے اور ایک سنگِ میل سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام آباد کتنی دور ہے۔ مخالف سمت میں لاہور کتنی دور اور بائیں ہاتھ پر چکوال کا فاصلہ کتنا ہے۔ ایسا ہی دوسرا موڑ بہت آگے راولپنڈی کے قریب آتا ہے لیکن میرے اندازے کے مطابق ابھی ہم نے اتنا فاصلہ طے نہیں کیا تھا۔

ٹرک بائیں طرف گھوم گیا۔ ویگن کا میوزیکل ہارن دور سے سنائی دیا۔ پھر قریب آنے لگا۔ اب شبہے کی گنجائش نہ رہی تھی۔ ٹرک چکوال والی سڑک پر جا رہا تھا۔ ذرا سی دیر میں ویگن پھر آگے نکل گئی۔ ٹرک نے ایک اور موڑ کاٹا اور راستہ مزید ناہموار ہوگیا۔ یہ جہلم کے

گرد و نواح کا وہی ناہموار، ٹیلوں اور کھائیوں والا علاقہ تھا جہاں سے میں صبح کار میں گزرا تھا۔ کار تو اب محسن لے جا چکا ہوگا اور میرے غائب ہو جانے سے سب تشویش اور پریشانی میں مبتلا ہوں گے۔ یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آئی ہوگی کہ میرا بریف کیس "ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس" کے چوکیدار کے پاس کیسے پہنچا اور میں فیکٹری میں نہیں گیا — تو کہاں گیا۔ رضوی صاحب سخت برہم ہوں گے۔ "یہ سکندر باز نہیں آتا کوئی نیا گل کھلانے سے۔ اسے تو ہر وقت نظر کے سامنے رکھنا چاہیے۔ بس غلطی ہوگئی کہ گاڑی کو مرمت کرا کے لانے کی ذمہ داری سونپ دی۔" اور رابعہ سخت فکرمند ہوگی۔ عین ممکن ہے کسی کمرے میں بیٹھی رو رہی ہو۔ میں نے چشمِ تصور سے رابعہ کو اپنے لیے روتے دیکھا اور اس منظر نے مجھے خاصا سامانِ تسکینِ قلب فراہم کیا۔ محسن کیا کرے گا۔ اب تو رضوی صاحب ہی ہیں کہ اپنی پولیس فورس کے ساتھ فیکٹری پر چڑھائی کر دیں اور چوکیدار سے چوہدری دلاور تک سب کو چھان پھٹک کے میرا سراغ لگانے کی کوشش کریں۔ نئے چوکیدار کو کچھ معلوم نہیں ہوگا تو بتائے گا کیا خاک۔ چوہدری دلاور کچھ بتانے والا آدمی ہی نہیں ہے۔ وہ تو ایسا ایکٹر ہے کہ ایف بی آئی اور اسکاٹ لینڈ یارڈ والوں کے سامنے قتل کر دے اور پھر انہیں اپنی بے گناہی کا یقین دلا دے۔

ٹرک ایک ہچکولے کے بعد رک گیا۔ آگے والے دونوں دروازوں کے کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی۔ میں منتظر رہا کہ سفر ختم ہونے کے بعد آزمائش کا اگلا مرحلہ کیا ہوگا۔ ہمیشہ کی طرح مجھے یہ خیال بھی آیا کہ شاید اب وہ میرا قصہ پاک کر کے مجھے اس مقام پر دفن کر جائیں گے جہاں تک کسی کے خیال کی رسائی بھی نہیں ہوگی ا[illegible] نے یہ بھی سوچا کہ میرے قتل سے دشمنوں کو کچھ حاصل ہوتا تو د[illegible] مجھے آج سے بہت پہلے ٹھکانے لگا چکے ہوتے۔ وہ اس کی جرأت نہیں کر سکتے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اکیلا ہونے کے باوجود میں اکیلا نہیں۔ ایس ایس پی ضامن رضوی۔ رابعہ قاری ایڈووکیٹ۔ محسن۔ اے ایس آئی شیخ اور استاد ٹیڈی کے علاوہ میرے اتنے مخلص دوست اور طرفدار ہیں کہ انہیں ہر قطرۂ خوں کا حساب دینا پڑے گا اور یہ سب لوگ مل کر انھیں تختۂ دار تک پہنچائے بغیر دم نہیں لیں گے جن کے دامن پر میرے لہو کا ایک بھی داغ نظر آیا۔ مجھے اتنی دور لانے کا مقصد کچھ اور بھی ہو سکتا تھا جو مجھ پر واضح نہیں تھا۔ تشدد کے ذریعے کوئی تحریر حاصل کرنے یا کسی بات کا اعتراف کرنے کا مسئلہ ہوتا تو لاہور میں بھی حل ہو جاتا۔

لیکن ان کے رکنے کا مقصد کچھ اور تھا۔ ان کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ تھک گئے تھے۔ ان میں سے ایک کو رفعِ حاجت کی ضرورت محسوس ہوئی تھی اور دوسرا سر درد کی شکایت کر رہا تھا۔ اب وہ دونوں تھرماس میں سے چائے پی رہے تھے یا کچھ کھا رہے تھے اور نہ جانے کیوں خاموش تھے۔ پھر وہ ٹرک کے عقبی حصے کے

قریب بیٹھ کے سگریٹیں پینے لگے۔ اسی وقت چوکیدار بڑبڑایا۔

"چوہدری... چوہد... ری... صاب..... ماف.... ماف کر دیں مجھے.... آپ کو.... پاک پنج تن کا... واسطہ... مجھے.... مت ماریں.... میرے.... بیوی بچے....."

وہ ہوش میں آنے لگا تھا۔ شعور اور لاشعور کے درمیان اس کا احساس جاگ رہا تھا اور اسے یاد دلا رہا تھا کہ چوہدری صاحب اس کے قتل کا حکم صادر فرما چکے ہیں۔ کیسی عجیب بات ہے کہ وہ شخص جو اپنا گھر بنا لیتا ہے، کسی بھی عورت سے وابستہ ہو جاتا ہے اور باپ بن جاتا ہے اسے اپنی ذات کے مفادات کا تحفظ عزیز نہیں رہتا۔ وہ خود کو اور اپنی زندگی سے محبت کو بھول جاتا ہے اور اس کی تمام توجہ، محبت و شفقت، جذبات اور خیالات کی دنیا وہی گھر بن جاتا ہے۔ وہ خود کو اور اپنی زندگی کو اسی گھر میں بانٹ دیتا ہے اور اپنے لیے کچھ بھی نہیں رکھتا، کچھ بھی نہیں مانگتا۔ مرنے سے نہیں ڈرتا لیکن اس خیال سے ڈرتا ہے کہ وہ مر گیا تو اس کے گھر کا کیا بنے گا اور اس کے بیوی بچوں کو وہ سب کون دے گا جو اس کے دم سے انہیں میسر تھا اور اس میں بھی حسرت کا پہلو یہ تھا کہ کبھی کوئی یہ نہیں سوچتا تھا کہ انہیں روٹی کپڑا کون فراہم کرے گا اور ان کے مادی وسائل کے اسباب کیا ہوں گے۔ خدا کے رازق ہونے پر سب کا اعتقاد کامل رہتا تھا اور سب یہ سمجھتے تھے کہ پلنے کو دنیا میں کتے کے بچے بھی پل جاتے ہیں جن کا کوئی خاندان نہیں ہوتا۔ جذباتی رشتے نہیں ہوتے اور والدین جیسا پرورش کرنے والا نہیں ہوتا۔ اصل کمی محبت کی رہ جاتی ہے اور تربیت کی رہ جاتی ہے اور یہ کمی صرف باپ پوری کر سکتا ہے۔ میرا اپنا کوئی گھر نہیں تھا۔ بیوی اور بچے نہیں تھے لیکن میں نے دنیا میں ہر جگہ خاندان اور گھر سے آدمی کے تعلق کو اسی انداز میں دیکھا تھا اور محسوس کیا تھا۔

"گامے! ہمیں کام ختم کر کے واپس بھی جانا ہے۔" میں نے ڈرائیور کی آواز کو بہت قریب سے سُنا۔

"دیکھ طافے! اس چوکیدار کو چھوڑ دے۔" دوسرے شخص نے متذبذب لہجے میں کہا جسے گامے کے نام سے مخاطب کیا گیا تھا۔

"کیا؟ دماغ چل گیا ہے تیرا۔" طافے نے کہا۔ "اس وقت سڑک پر کوئی نہیں۔ اسے یہیں ڈال کے گاڑی اوپر سے گزار دیتے ہیں۔ اسے لمبائی کے رخ لٹا دے۔ پچھلے والے ڈبل پہیے اوپر سے ایک بار گزر گئے تو قیمہ ہو جائے گا۔ صورت پھر کون پہچانے گا؟"

"طافے! میری بات مان لے۔ یہ بہت غریب اور.... بے قصور آدمی ہے۔ بیوی بچے ہیں اس کے۔"

"طافے نے اسے گالی دی۔" وہ تو تیرے بھی ہیں۔ چوہدری صاحب تجھے زندہ چھوڑیں گے؟

"انہیں معلوم ہی نہیں ہو گا۔ میں اس کو سمجھا دوں گا کہ یہ..." گامے نے لجاجت سے کہا۔

"تو سفارش کیوں کر رہا ہے اس کی؟" طافے نے بگڑ کر... "تیرا ماما لگتا ہے یہ؟"

"ہاں۔ یہ ٹھیک ہے طافے! یہ میرا ماما ہے۔" گامے... "سگا تو نہیں لیکن اس نے میری ماں کو ہمیشہ بہن کہا تھا اور... اسے گاؤں سے بُلا کے نوکری دلائی تھی۔"

"نہیں گامے!" طافے نے کچھ دیر بعد کہا۔ "میں یہ خطرہ نہیں لے سکتا۔ مجھے اپنی زندگی پیاری ہے۔ میں وہی کروں گا جو مجھے چوہدری صاحب نے کہا تھا۔"

"طافے! کل یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چوہدری صاحب... کا انعام تجھے الٹا دیں۔" گامے نے کہا۔ "مجھے معلوم ہے کہ چوہدری... کے کتنے تابعدار اسی لیے مارے گئے کہ انہوں نے حکم کی تعمیل... وہ کسی پر بھروسہ نہیں کرتا اور اپنے کسی رازدار کو زندہ ہی نہیں رہنے... بعد میں اس کے لیے خطرہ بنے۔"

"کل کی کل دیکھی جائے گی۔" طافے نے کہا لیکن اب اس... لہجے میں خوف شامل ہو گیا تھا اور اس کا اعتماد کھوکھلا لگتا تھا۔ "اس... علاوہ جھوٹ تو ہمیں ہی بولنا پڑے گا واپس جا کے۔ یہ اعتراف... پڑے گا کہ ہم نے اسے مار دیا۔ بات تو ایک ہی ہے۔ پھر یہ... جرم کرنے کا فائدہ؟ ہو سکتا ہے چوہدری کو ان پر بھروسہ نہ ہو... بات تو کرتا ہے۔ ہمیں ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن کبھی یہ راز... ہو گیا کہ ہم نے جھوٹ بولا تھا اور چوکیدار کو زندہ چھوڑ دیا تھا تو... معاف نہیں کرے گا۔"

"اسے نہیں معلوم ہو گا طافے!" گامے نے کہا۔ "یہ تلہ گنگ... آگے ایک گمنام سے گاؤں میں رہتا ہے۔ ضلع کیمبل پور میں۔ ا... چوہدری کا یا اس کے کارندے کا گزر ہونے کا کوئی سوال نہیں۔ میں اسے سب بتا دوں گا... کہ روپوش ہو جائے۔"

"بے وقوفی کی بات نہ کر۔" طافے نے مشتعل ہو کے کہا۔ "... تو پرسوں چوہدری ہر اخبار دیکھے گا اور اس کو کسی بھی اخبار میں یہ... ملے گی کہ چکوال جانے والی سڑک پر کوئی نامعلوم شخص کسی بس یا ٹرک... نیچے کچلا گیا تو کیا وہ ہم سے نہیں پوچھے گا؟ کیا جواب دے گا تو..."

"ہم.... ہم یہ بھی تو کہہ سکتے ہیں کہ سڑک پر خطرہ تھا۔ گا... آ جا رہی تھیں۔" گامے نے کہا۔ "چنانچہ ہم نے اسے ایک غیر آباد..."

"کیسے گاڑ دیا۔ خالی ہاتھوں سے قبر کھود کے؟" طافے نے... سے کہا۔ "اتنا بے وقوف سمجھتا ہے تو دلاور کو؟ وہ مجھے گردن... کے لے آئے گا کہ بتا اپنے ماما کو کہاں گاڑا تھا۔ پھر وہ تیری قبر بنا دے..."

"کچھ بھی ہو طافے!" گامے نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "میں نے..."

ہوتے وقت ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ قتل نہیں ہونے دوں گا۔"

"تیرے فیصلے کی ایسی تیسی۔ میں خود کر لوں گا سب کچھ اور دیکھتا ہوں تو مجھے کیسے روک سکتا ہے۔" طافے نے کہا۔ میں دم بخود لیٹا یہ سب سن رہا تھا اور دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ ان کا اختلافِ رائے تصادم کا باعث بن جائے۔ ان میں سے ایک مارا جائے گا مگر دوسرا بھی شدید زخمی ہو سکتا ہے۔ اس حد تک کہ وہ ٹرک چلانے کے قابل نہ رہے اور اب جھگڑا واقعی بڑھ گیا تھا۔ غالباً طافے نے آگے بڑھنے کی کوشش کی اور گامے نے اس کا راستہ روکا۔ میں گھپ اندھیرے میں آوازیں سُن کے صرف تصور سے کام لے سکتا تھا۔

طافے نے چلّا کے ایک گالی بکی "چھوڑ دے مجھے۔"

"میرا خیال تھا تو ایسے ہی سمجھ جائے گا۔" گامے نے ہانپتے ہوئے کہا "جا کے اپنے ماما کو قتل کر۔" اُس نے گالی دے کر کہا۔

"میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" طافے نے بھی ہانپتے ہوئے دوسری گالی دی۔ "تو ہے کیا۔" آوازوں کے اتار چڑھاؤ سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ گتھم گتھا ہو رہے ہیں پھر ان میں سے کوئی سڑک کی دیوار سے ٹکرا کے کراہا۔ یہ آواز گامے کی تھی۔ پھر کچھ دیر کی خاموشی کا ایک وقفہ آیا۔ شاید گامے کی قوتِ مزاحمت وقتی طور پہ جواب دے گئی تھی۔

"اوئے گامیا!" طافے اچانک چلّایا۔ "وہ تو ہے ہی نہیں۔ بھاگ گیا وہ تیری ماں کا خصم۔"

"بھاگ گیا۔" گامے نے کمزور آواز میں کہا۔ "اب کیا کرے گا تیرا چوہدری۔"

"ابھی تو یہاں تھا وہ۔" طافے نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اتنی جلدی کہاں جا سکتا ہے وہ۔ میں اسے پکڑ لوں گا۔ اس کی حالت ایسی نہیں کہ وہ دور گیا ہو۔" پھر ایک جسم کے زمین پر گرنے کی آواز آئی۔ "چھوڑ میری ٹانگ کتے۔" طافے نے چیخ کر کہا جو شاید گامے کی وجہ سے منہ کے بل گرا تھا۔ گامے نے اس کے بھاگنے سے پہلے ہی اپنی ٹانگ اڑا دی تھی یا پھر ہاتھ بڑھا کے اس طرح طافے کی ٹانگ پکڑ لی تھی کہ وہ چت ہو گیا تھا۔ کچھ دیر تک میں صرف گالیوں دھمکیوں اور خالی ہاتھ مار پیٹ کرنے کی آوازیں سنتا رہا۔ پھر ان آوازوں میں تھکن کے اور شکست کے آثار نمودار ہونے لگے۔ غالباً دونوں حریف ہم پلّہ تھے اور کسی کو موقع نہیں ملا تھا کہ خنجر پستول استعمال کر سکے چنانچہ دونوں ادھ موئے ہو رہے تھے۔ یہ صورتِ حالات میرے حق میں خوش آئند تھی اور قدرتی طور پر میری جذباتی ہمدردی گامے کے ساتھ تھی۔ وقت کا احساس بے معنی ہو چکا تھا۔ اب صرف انجام کا انتظار تھا لیکن آوازیں دور ہوتی جا رہی تھیں یا مدھم پڑ رہی تھیں۔ وہ دونوں اس طرح کراہ رہے تھے جیسے نزع کے کرب میں مبتلا ہوں۔

میری امیدیں نئے سرے سے بیدار ہو گئی تھیں۔ میں یہ فرض ...ں حق بجانب تھا کہ بچ جانے والا بھی اس ٹرک کو اتنے ... ساتھ، ایسے اندھیرے میں اور ایسے راستوں پر نہیں چلا سکے گا ... کوشش کی تب بھی ٹرک الٹ جائے گا۔ کسی کھڈ میں گر جائے ... سے ٹکرا جائے گا۔ ایسی صورت میں باکس کے گر کر کھل جانے ... خاصے روشن تھے۔ لیکن زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ ہم ... بھی نہ اٹھ سکے اور چند گھنٹے بعد دن کا اجالا نمودار ہوتے ... پر ٹریفک بحال ہو تو گزرنے والے مدد کے لیے آ جائیں ... کو بلالیں۔ یا اس سے پہلے ہی گامے کا ماما کسی کو بُلا لائے۔ مجھے ... یقینی نظر آنے لگی تھی لیکن نجات کے بعد بہت سے مسائل ... بھی یقینی تھا۔ مجھے اس ڈربے سے نکالنے والے پہلا سوال ... گے کہ میں کون ہوں؟ طافے نے تو مجھے ہرن قرار دیا تھا اور ... میں انسان ہونے کے باوجود آہوئے صیاد دیدہ تھا لیکن میری ... ٹرک میں منتقلی اور قریب ہی دو افراد کے مردہ یا نیم مردہ پائے ... کے اسباب خاصے وضاحت طلب ہوں گے۔ خیر ... میرا کوئی نقصان نہیں تھا۔ صفائی کے کٹھن مرحلے مس رابعہ ... اور مس شہلا پر مشتمل ٹربیونل کے سامنے درپیش ہوں گے جس ... چیئرمین ہوں گے انکل ایس ایس پی۔

اچانک میں نے صندوق کی ایک دیوار پر ٹھک ٹھک ... خاموشی اتنی گہری تھی اور میں اپنے خیالات میں ایسا کھویا ہوا تھا کہ ... پر بھی میں اچھل پڑا۔ میرے چونکنے کی اصل وجہ یہ تھی کہ اس دستک ... کا انداز مختلف تھا۔ اس میں سوال تھا کہ بتاؤ کیا تم خیریت سے ... تم جو بھی ہو میری مدد کے مستحق ہو۔ نہ تم محمود ہو نہ میں ایاز ہوں جسے ... ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا۔ اگر تم اسی فیکٹری کے مالک ہو جس کا ... ادنیٰ سا ملازم ہوں تو کیا اس مقام پر اور اس لمحے ہم ایک ہی ... ایک ہی جنگ میں برابر کے شریک ہیں۔ جو صرف یہ چاہتے ہیں ... خود بھی زندہ رہیں اور دوسروں کو بھی زندہ رہنے دیں۔ میں نے ... جواب میں اندر سے لاتیں چلائیں۔

"دیکھ میاں! گھبرانا نہیں۔ رب نے چاہا تو سب خیر ... ٹھیک ہو جائے گا۔" چوکیدار کی نحیف سی آواز آئی۔ اگر میں جواب ... دے سکتا تو ضرور کہتا کہ یہ فیصلہ تو میرے تمہارے رب نے ... پہلے ہی کر لیا تھا کہ ابھی ہمیں جینا ہے۔

"جواب دے میاں! کچھ منہ سے بول۔" چوکیدار ... تختے سے منہ لگا کر سرگوشی کی۔ صحرا میں گم گشتہ مسافر کو تلاش کر ... والا ہیلی کاپٹر مسلسل پیغام نشر کر رہا تھا۔ "ہیلو! ہیلو! ہم تمہیں ... نہیں سکتے۔ ہماری آوازیں سُن رہے ہو تو جواب دو۔" مگر ... جاں مسافر کے ساتھ ہی اس کا ریڈیو ٹرانسمیٹر بھی بے کار پڑا تھا ...

... سمندر کی بیکراں وسعت میں ایک تنکے کا سہارا لے کر جینے کی امید ... کرنے والے کو جان بچانے والی کشتی تلاش کرتی پھر رہی تھی۔ کاش اس کے لیے ممکن ہوتا کہ وہ چلّا کے انہیں متوجہ کر سکے جو اتنے قریب آ گئے تھے۔ سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے۔

"او بھائی! کوئی اندر ہے؟ کوئی بندہ ہے۔ جیوندا ہے؟" چوکیدار بولا۔ میں نے سر کو دیوارِ زنداں سے ٹکرا کے اثبات میں جواب دیا۔ ہاں میں اندر ہوں۔ میں انسان ہوں اور ابھی زندہ ہوں۔

"اچھا اچھا۔ فکر نہ کر۔" چوکیدار نے کہا اور میں نے اطمینان کا سانس لیا اور خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ وقت کا ایک ایک لمحہ اب اپنے وجود کی خبر دے رہا تھا۔ چوکیدار اب ٹرک سے اترا ہے۔ اب اس نے آگے والا دروازہ کھولا ہے۔ اب شاید وہ اندر لگی ہوئی چابیاں نکال لایا ہے۔ اب اس کے ہاتھ ٹول بکس میں صحیح چابی لگا رہے ہیں۔ ٹول بکس کھل گیا ہے۔ اس میں جیک ہو گا ہینڈل ہو گا۔ وھیل اسپینر اور اسکرو ڈرائیور بھی ہوں گے۔ چوکیدار کے ہاتھ اوزاروں کو ٹٹول رہے تھے۔ اوزاروں کی آواز کتنی خوشگوار ہے۔ بالکل رابعہ کی ہنسی۔ رومت رابعہ! تیرے میرے بیچ صرف یہی رات حائل ہے۔ رونے سے کچھ نہیں ہو گا۔ سورج تو صرف زمین کے گرد گھومتا ہے۔ چوکیدار نے کوئی بڑا اسکرو ڈرائیور کونے کی درز میں پھنسا کے زور لگایا اور درز پھیلی تو لوہے کی ہر کیل لولی جس نے تختوں کو ایک دوسرے سے پیوست کر رکھا تھا۔ چوکیدار نے اسکرو ڈرائیور کو نیچے لا کے پھر زور لگایا اور ایک تختہ بڑی آواز کے ساتھ ٹرک میں گرا۔ چوکیدار اب ہانپ رہا تھا لیکن اس کی آنکھوں نے چھ انچ چوڑے شگاف میں سے مجھے دست و پابستہ دیکھ لیا تھا۔ کونے کا تختہ ہی زیادہ کیلوں سے جڑا ہوا تھا۔ باقی تختوں میں صرف اوپر نیچے کیلیں ٹھونکیں گئی تھیں۔ اس نے اوپر سے دوسرے تختے کو الگ کیا اور پھر ہاتھوں سے کھینچ کر نچلے حصے سے جدا کر دیا۔ خلا اب ایک فٹ کا ہو گیا تھا۔ لیکن خستہ جان چوکیدار کی جسمانی قوت اس کا ساتھ چھوڑ رہی تھی۔ میں کینچوے کی طرح نیچے کھسکا۔ جسم کو سمیٹ کر فرش کے ساتھ پوری قوت سے پھیلایا اور میرے پاؤں ایک فٹ کے شگاف سے باہر نکل گئے۔

چوکیدار کے ہاتھ میرے پاؤں سے مس ہوئے۔ اس نے رسّی کی مضبوطی اور ہر گرہ کی سختی کا اندازہ کیا اور نہ جانے کیا سوچ کے نیچے اتر گیا۔ ناطاقتی کے سبب وہ ٹرک سے اترنے کے بجائے گرا تھا کھڑا ہو گیا۔ میں نے لیٹے لیٹے ایک فٹ کے اس روشندان میں سے اس کا تاریک سایہ دیکھا جس کے پس منظر میں تاروں بھرا آسمان تھا اور پھر کچھ نیچے سرکا۔ چند منٹ بعد چوکیدار پھر نمودار ہوا۔ سخت کوشش سے اس نے اپنے بوجھ کو اوپر گھسیٹا اور گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ اس نے تیلی جلائی تو مجھے تھکن کی جگہ اس کے چہرے پر نور دکھائی دیا۔ جیسے وہ انسان نہیں فرشتہ ہے جو خدا کے حکم سے صرف میری زندگی بچانے کے لیے اترا ہو۔ اس نے کانپتے ہاتھوں کی پناہ میں دیا سلائی کے ننھے سے شعلے کو روشن رکھا اور آہستہ آہستہ رسّی کے نیچے لے آیا۔ ایک تیلی بجھ گئی تو اس نے دوسری جلائی اور رسّی کا ایک بل ایک ہی جگہ سے جلنے لگا۔ میں نے پیروں کو پھیلا کے زور لگایا اور ایک بند ٹوٹ گیا۔ باقی بل ڈھیلے پڑ گئے۔ چوکیدار نے ان کو میری پنڈلیوں سے جدا کیا۔ مُردہ ہو جانے والی رگوں میں خون پھیلا تو درد کی ٹیس اٹھی۔ چوکیدار اس تمام کارروائی کے دوران مجھے مسلسل تسلی دیتا رہا تھا اور میرا حوصلہ بڑھاتا رہا تھا۔ اپنے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اور دیہاتی لہجے میں۔ لیکن میں الفاظ کے مفہوم پر غور ہی کہاں کر رہا تھا۔ میں تو دل ہی دل میں اس ہستیٔ مطلق کے انتظام اور اس کی قدرتِ کاملہ کے سامنے آدمی کی بے بسی پر غور کر رہا تھا۔ اس نے ایک لفظ "کُن" کہا اور وہ ہو گیا۔ فتح مندی کا غرور رکھنے والے مٹ گئے اور شکست خوردہ فاتح کہلائے جو خاک نشیں تھے مسند نشین ہوئے۔ جو تاجدار تھے فقیر ہوئے۔ ایک بے بس، وفادار، بیہوش و ناتواں چوکیدار کو قتل کرنے والے اس انجام سے دوچار ہوئے جو ان کے تصور میں بھی نہ تھا۔

میں نے جسم کی توانائی کو مجتمع کر کے خود کو کچھ اور نیچے کھینچا یہاں تک کہ میرا دھڑ اس ایک فٹ چوڑے شگاف تک پہنچ گیا۔ اگر میرے ہاتھ بندھے ہوئے نہ ہوتے تو میں پہلو کے بل سمٹ کے نکلنے کی کوشش ضرور کر سکتا لیکن ہاتھ کمر کی طرف تھے۔ چوکیدار نے تیلی جلا کے دیکھا اور سمجھ گیا کہ میرے رُک جانے کی وجہ کیا ہے۔ اس نے وہی اسکرو ڈرائیور اٹھایا اور اوپر سے تیسرے تختے کی درز میں پھنسا کے زور لگایا۔ ہر کیل کسی چٹان میں پیوست پودے کی جڑ کی طرح نکل آئی اور تختہ نیچے کی طرف جھکا تو چوکیدار نے اسے کھینچ لیا۔ نیچے کی کیلیں تختے کے وزن ہی سے مڑ کے الگ ہو گئیں۔ میں اٹھ بیٹھا اور کھڑے ہونے کی کوشش میں دھڑام سے گرا۔ میرے پیر ابھی جسم کا وزن اٹھا کے توازن برقرار رکھنے کے قابل نہیں ہوئے تھے۔ چوکیدار نے میرے منہ پر سے ٹیپ اتار دیا۔

"نا۔ نا۔ ہولے ہولے پُتّر۔" چوکیدار نے مجھے سہارا دیا اور مجھے اپنے آپ سے شرم آئی۔ مجھ سے زیادہ تو خود چوکیدار کو سہارے کی ضرورت تھی۔ جسمانی طور پر وہ مجھ سے کم اور عمر میں بہت زیادہ تھا۔ میرے تو صرف ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے لیکن وہ سر کی چوٹ کے اثر سے گھنٹوں بیہوش پڑا رہا تھا اور پھر بھی یہ اسی کی ہمت تھی کہ اپنے ساتھ اس نے مجھے بھی بچا لیا ورنہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ اتر کے بھاگ جاتا۔ اب اس نے آہستہ آہستہ میرے ہاتھ سے لپٹی ہوئی رسّی کھولی جو ہتھکڑی سے زیادہ مضبوط تھی۔ میں نے دونوں ہاتھوں کو سیدھا کیا تو میرے شانوں کا ہر جوڑ اور بازوؤں کا ہر

پٹھا درد بن گیا۔ مجسم درد جو کلائیوں سے آگے انگلیوں میں اور انگلیوں کی پوروں تک پھیلتا چلا گیا۔ میں لکڑی کے اسی صندوق کا سہارا لے کر بیٹھ گیا اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ میری جسمانی توانائی بڑی سرعت سے بحال ہونے لگی تھی۔ دورانِ خون کے معمول پر آجانے کے بعد ہاتھوں اور پیروں کا درد ناقابلِ برداشت نہیں رہا تھا۔ چوکیدار میرے سامنے بیٹھا مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔ ان پڑھ۔ کم حیثیت اور کمزور شخص نے ابھی تک مجھے پہچانا نہیں تھا۔

"بابا!" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ "آج تم نے میری زندگی بچالی۔"

"ناپُتّر! ایہہ کفر دا کلمہ ہے۔" وہ انگلی اوپر اٹھا کے بولا۔ "اس دا حکم نہ ہووے تو بندہ کیا کرسکتا ہے۔"

"میں تمہاری ہمت کی داد دیتا ہوں۔ اس حالت میں بھی تم نے حوصلہ نہیں ہارا اور میرا ساتھ نہیں چھوڑا۔" میں نے ہاتھوں پیروں کو متحرک رکھتے ہوئے کہا۔ "تمہارا یہ احسان بھی مجھ پر ایک قرض رہے گا۔ جب چاہو وصول کرلینا۔ تمہیں معلوم ہے میں کون ہوں؟"

کی جاناں میں کون بُلیا۔ میں کون ہوں لے ہم لغنو۔ اگر میری اصل دیکھی جائے تو میں ایک پرنس ہوں۔ میری رگوں میں ایک نواب خاندان کا خون دوڑ رہا ہے اور میں ایک شہزادہ ہوں کیونکہ پدرم سلطان بود۔ باپ بن کے پرورش کرنے والا شخص وزیر خان تھا۔ بے شک زندگی خدا کی دی ہوئی تھی مگر اس کی حفاظت دوسروں نے کی۔ اور وہ سب بھی اپنا اپنا قرض مجھ پر چھوڑ گئے۔ یوم حشر میں کس کس کا قرض چکاؤں گا۔ سلامت شاہ کا؟ اس نابینا بوڑھی عورت کا جس نے میری امانت میرے حوالے کرنے سے پہلے فرشتۂ اجل کا مقابلہ کیا؟ فقیرانہ بھیس بنا کے تماشائے اہلِ کرم دیکھنے والے فو مانچو کا؟ اس بوڑھے گورکن کا جو زندہ درگور ہوا؟ بار بڑھتا جارہا ہے۔ ابھی ابھی میں نے مقروض ہونے کی ایک اور دستاویز اس چوکیدار کے حوالے کردی ہے۔ رابعہ اور اس کی ماں۔ محسن اور اس کی ماں۔ یہ سب مجھ پر احسانات کرتے جارہے ہیں یا کرکے گزرتے جارہے ہیں۔ مجھے بھی اتنی توفیق دے خداوندا کہ میں سر اٹھا کے چل سکوں۔

"دیکھو بابا!" میں نے جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ سگریٹ لائٹر اور پیکٹ میری جیب میں موجود تھے۔ "میں بھی اس فیکٹری کا ایک مالک ہوں جس میں تم چوکیدار ہو۔ چوہدری دلاور کی طرح۔ میں وزیر خان کا بیٹا ہوں۔"

"آپ... آپ وزیر خان مرحوم کے..." شدّتِ جذبات سے اس کی آواز بند ہوگئی۔

"ہاں۔ میرا نام سکندر بخت ہے۔" میں نے سگریٹ جلا کے ایک طویل کش لیا۔ "چوہدری دلاور مجھے اپنے راستے سے ہٹا[کر] فیکٹری کا مالک بننا چاہتا ہے۔ آج اس نے مجھے دھوکے [سے] ... تھا اور شاید یہ لوگ مجھے ٹھکانے لگانے کے لیے لے جارہے تھے!... نے تفصیلات اور الجھنوں کا حوالہ دیے بغیر اسے سیدھے ساد[ے] ... میں وہ بات بتائی جو اس کا ذہن آسانی سے قبول کرلے۔ "میر[ا خیال ہے] وہ تمہیں بھی قتل کردیتے کیونکہ تم نے مجھے فیکٹری میں آتے دیکھا [تھا] مگر ابھی تم کہاں غائب ہوگئے تھے اچانک؟"

"وہ... میں... معلوم نہیں جی کیسے میں نیچے اترا اور ٹرک [کے] نیچے گھس گیا۔ انہوں نے مجھے کیوں مارا تھا جی؟"

"چوہدری دلاور اور اس کے چمچوں کو ڈر تھا کہ تم پولیس کو [بتا] دو گے۔" میں نے کہا۔ "جب میں غائب ہوجاؤں گا تو پولیس تفتیش [کے] لیے فیکٹری بھی جائے گی۔ میں نے ایک بریف کیس تمہارے حوالے [کیا] تھا۔ کچھ یاد ہے؟"

"ہاں۔" اس نے سر پر ہاتھ رکھ کے ذہن پر زور دیا۔ "اور اسے کوئی لینے آیا تھا۔ کیا نام تھا اس کا... احسان؟"

"نہیں۔ وہ محسن خان تھا۔" میں نے کہا۔ "میں نے ہی تمہیں [بتایا] تھا کہ وہ آئے گا۔ لیکن چوہدری دلاور ڈرتا تھا کہ تم یہ سب کچھ پو[لیس] کو بتا دو گے۔ اس نے مجھے صندوق میں ڈالا اور تمہیں مار کے [ٹرک] میں ڈال دیا۔ طافے اور گامے نام کے دو شخص ہمیں یہاں تک [لائے] تھے۔ یہ چکوال جانے والی سڑک ہے۔ جہلم سے آگے سوہاوہ موڑ [سے] ..."

"گاما کون جناب؟" چوکیدار نے مضطرب ہو کے میری [بات] کاٹ دی۔ "غلام محمد؟"

"ہاں۔ وہ جو تمہاری منہ بولی بہن کا لڑکا تھا۔" میں نے [کہا]۔ چوکیدار اب حفظِ مراتب کے خیال سے محتاط اور مؤدب ہوگیا تھا۔

"وہ ایسا نہیں کرسکتا۔ گاما مجھے قتل نہیں کرسکتا جناب" وہ بڑے دکھ اور یقین کے ساتھ بولا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" میں نے کہا۔ "اسی نے طافے سے کہا کہ تمہیں چھوڑ دے۔ اس بات پر ان میں جھگڑا ہوا۔"

"آپ کو کیسے معلوم ہوا جناب! آپ تو کچھ نہیں دیکھ سکتے!" اس کا لہجہ بے یقینی کا آئینہ دار تھا۔

"ہاں۔ لیکن میں سب سن رہا تھا۔ اور اندازہ کررہا تھا۔" [میں] نے کہا۔ "انہوں نے ایک دوسرے کو بہت مارا۔ اور میرا خیال [ہے] وہ کہیں قریب ہی بے ہوش پڑے ہوں گے۔ ہم ابھی دیکھ لیتے [ہیں]۔ اب میں بھی چل پھر سکتا ہوں۔"

وہ مجھ سے پہلے نیچے اتر گیا۔ "گامے!" اس نے ایک [ہاتھ] منہ پر رکھ کے آواز دی اور پھر دوسری طرف منہ کرکے پکار[ا]۔ "پُتّر غلام محمد!" لیکن ان دونوں کو پہلے ...

پر لہولہان اور بے سدھ پڑے تھے۔ ان کے ہاتھ اب یوں پھیلے ہوئے تھے جیسے وہ ایک دوسرے کا گلا گھونٹ دینا چاہتے ہوں۔ میں نے لائٹر کے ننھے سے شعلے کی روشنی میں ان کی کھلی آنکھوں کو دیکھا اور ان کے زخموں کا معائنہ کیا۔ بظاہر ان کی موت زیادہ خون بہہ جانے سے واقع ہوئی تھی لیکن یہ بھی ہوسکتا تھا کہ پہلے ایک نے دوسرے کو مار دیا ہو اور پھر کسی اندرونی چوٹ کے باعث خود بھی مرگیا ہو۔ لائٹر کی روشنی دیکھ کے چوکیدار میری طرف آیا۔

"گامیا...!" نصف شب کے سکوت میں اس کی چیخ نے جنگل کی ویران فضا کو جھنجوڑ دیا۔ "او تے ظالما۔ مینوں مار دیناسی۔ اوئے اپنے مامے نوں قتل کر دیناسی۔ تیری ماں نوں کی دساں گا میں کہ تیرا پُتّر میرے لئی مرگیا۔" وہ دھاڑیں مار مار کے رو رہا تھا اور اس بھانجے کے لیے بین کر رہا تھا جس کو ایک نہ ایک دن اسی انجام سے دوچار ہونا تھا۔ عیدل کی طرح اس نے بھی انسانیت کے رشتوں کا تقدس تمام عمر پامال کیا تھا مگر مرتے مرتے ایک لمحے کی جذباتی طاقت نے اسے جان دینے پر مجبور کردیا تھا۔ اور وہ بھی ایک ایسے شخص کے لیے جس کے خون کا اس کے خون سے براہِ راست کوئی رشتہ نہ تھا۔ میں نے چوکیدار کو ہاتھ پکڑ کے اٹھایا۔

"گامے کے لیے اب تم کچھ نہیں کرسکتے۔" میں نے کہا۔ "سوائے مغفرت کی دعا کے۔ مگر جو کچھ وہ تمہارے لیے کرنا چاہتا تھا وہ مت بھولو۔ وہ تمہیں بچانا چاہتا تھا۔ مرتے دم تک اس نے یہی خواہش کی تھی۔"

میں اسے کھینچ کر ٹرک تک لے آیا۔ آگے ڈیش بورڈ کے نیچے پینے کے پانی سے بھرا ہوا پلاسٹک کا جیری کین رکھا ہوا تھا۔ میں نے چند گھونٹ اس کو پلائے اور پھر بوتل اپنے منہ سے لگالی۔ آدھی کے قریب بوتل خالی کرکے مجھے احساس ہوا کہ میں کتنا پیاسا تھا لیکن ایک بڑی مصیبت میں گرفتار ہو کے چھوٹی چھوٹی مشکلات کی طرف کس کا دھیان جاتا ہے۔

"اس ٹرک کو ایک خاص وقت پر کسی جگہ پہنچنا تھا۔" میں نے کہا۔ "اور صبح ہوتے ہی لاہور لوٹ جانا تھا۔ جب دیر ہوگی تو یقیناً شکاری اسے ڈھونڈتے ہوئے آئیں گے۔ میرا مطلب ہے چوہدری دلاور کے آدمی۔ اور ہم یہیں بیٹھے ملے تو وہ اپنا کام کرجائیں گے۔ گامے کی یہ آرزو مرکے بھی پوری نہیں ہوگی کہ تم زندہ رہو۔ اس لیے اب جتنی جلدی ممکن ہو یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ تم میرے ساتھ بیٹھو۔ ٹرک میں چلاؤں گا۔ چلو۔" میں نے اس کا بازو تھام کے کہا۔

"لیکن گاما؟ کیا وہ یہیں پڑا رہے گا؟" اس نے اپنا بازو چھڑالیا۔ "وہ میری خاطر مرگیا اور...؟"

"گامے کو پولیس پہنچا دے گی۔" میں نے کہا۔ "کل پرسوں تک اس کی لاش گاؤں پہنچ جائے گی۔ ہم اسے اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتے۔ راستے میں کسی نے دیکھ لیا تو بہت سی قانونی مشکلات پیدا ہوجائیں گی۔ تمہارے لیے بھی اور میرے لیے بھی۔"

"میں اسے چھوڑ کے نہیں جاؤں گا مالک!" وہ تلخ لہجے میں بولا۔ "آپ جائیں۔"

مجبوراً میں نے گامے کی لاش کو اٹھا کے ٹرک کے پچھلے حصے میں اسی صندوق کے اندر رکھا جس میں کچھ دیر پہلے میں قید تھا۔ لاش کو چھپانے کے لیے مجھے باکس کا رخ بدلنا پڑا تاکہ کھلا حصہ دوسری طرف ہوجائے۔ خطرہ اس کے باوجود تھا کہ راہ میں کوئی چیک نہ کرلے لیکن فوری طور پر اس سے زیادہ پریشان کن مسائل دو تھے۔ ایک یہ کہ کہیں واپسی کے سفر میں خالی سڑک پر شکاری نہ مل جائیں: وہ ٹرک کو فوراً شناخت کرلیں گے اور ان کا مقابلہ آسان نہ ہوگا۔ کیونکہ وہ مسلح ہوں گے۔ دوسرا مسئلہ چوکیدار اور گامے کا تھا۔ چوکیدار کو میں بآسانی بس یا ویگن میں بٹھا کے روانہ کرسکتا تھا اور سمجھا سکتا تھا کہ جب تک خطرہ ٹل نہ جائے وہ روپوش رہے لیکن لاش کو تلہ گنگ کے پہاڑی علاقے میں کسی دور افتادہ گاؤں تک پہنچانا بہت بڑا مسئلہ تھا۔ گاما طبعی موت مرا ہوتا تو میں اس کے تابوت کو پورے ٹرک کا کرایہ ادا کرکے بھیج سکتا تھا۔ وہ رقم بھی میری جیب میں محفوظ تھی جو رضوی صاحب نے گاڑی کی مرمت کے اخراجات کے لیے دی تھی لیکن گاما ایک خون آلود لاش تھا جسے کسی ایمبولینس یا ٹرک کے ذریعے اس وقت تک ارسال نہیں کیا جاسکتا تھا جب تک کہ پولیس کی ابتدائی تفتیش کے مرحلے طے نہ ہوجائیں اور پوسٹ مارٹم نہ ہوجائے۔ اس چکر میں چوکیدار کے لیے بہت خواری تھی اور روپوشی ناممکن تھی چنانچہ دوسری صورت یہی رہ جاتی تھی کہ میں خود لاش کو اس کے گاؤں تک پہنچاؤں اور کسی قسم کی قانونی کارروائی کے بغیر تدفین کرادوں۔ چوہدری دلاور کو معلوم ہی نہ ہوگا کہ طافے کیسے مارا گیا اور گاما کدھر گیا۔ لیکن یہ بڑا لمبا اور خطرناک کام تھا۔ ٹرک پر "ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس" لکھا ہوا تھا۔ یہ ٹرک جہاں سے بھی گزرتا پہچانا جاتا۔ خصوصاً چھوٹے قصبوں اور دیہات میں۔ اور اگر ایک طرف کا سفر چھ سات گھنٹے کا ہو تب بھی تدفین کے بعد لاہور پہنچنے کے لیے مجھے دو دن درکار تھے۔ ایک عام ڈرائیور کے مقابلے میں میری پوزیشن قدرے بہتر تھی۔ میں کسی بھی پولیس افسر سے زیادہ اعتماد کے ساتھ بات کرسکتا تھا۔ ان میں اتنا دم خم نہیں ہوتا کہ کسی فیکٹری کے مالک سے اکڑفوں کرسکیں جو فر فر انگریزی بولتا ہو۔ میرا دوسرا سہارا ساڑھے تین ہزار کی وہ رقم تھی جو میری جیب میں محفوظ رہ گئی تھی۔ شاید اس لیے کہ میرے دشمنوں کو میرے پیسے کی ضرورت

ہی نہیں تھی۔

میں نے لاش کے بارے میں ساری صورتِ حال چوکیدار کو سمجھا دی۔" اب اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ میں خود تمہیں گاؤں چھوڑ آؤں۔ گاؤں میں کوئی تھانیدار رہے ہے؟"

"نہیں سرکار تھانہ تلہ گنگ کا ہی لگتا ہے۔" وہ بولا۔ "وہ گشت پہ آتے رہتے ہیں۔"

"حرام کھانے اور ہراساں کرنے کے لیے؟" میں نے کہا۔ "خیر۔ تم کو بیان دینا ہے کہ گاما کوٹھے سے گر گیا تھا۔ مار پیٹ، چوہدری دلاور یا طافے کا ذکر نہیں کرنا ہے۔ سمجھے؟ ورنہ پھنس جاؤ گے لمبے چکر میں۔ گامے کی ماں کو سمجھانا تمہارا کام ہے۔ گاؤں والوں کو صرف یہ معلوم ہو گا کہ گاما رات کو چھٹی لے کر گھر آیا تھا اور ذرا سی دیر بعد یہ حادثہ پیش آ گیا۔ پھر فوراً تدفین کرا دینا۔ لاش کو صاف ستھرا کر کے۔"

"جو آپ کا حکم سرکار۔" اور میں نے ٹرک کو اسٹارٹ کیا۔ اپنے اندازے پر بھروسہ کرتے ہوئے میں بہت جلد اس سڑک پر آ گیا جو سوہاوہ کے قریب جی ٹی روڈ سے جا ملتی تھی۔

"مقصد صرف یہ ہے کہ بات جتنی جلدی ختم ہو جائے اچھا ہے۔" میں نے کہا۔ "ورنہ چوہدری دلاور تک پہنچ جائے گی۔"

وہ سادہ لوح اور سیدھا سادا آدمی تھا جس کا ذہن شکوک، وسوسوں اور اندیشوں کے جنگل سے دور رہتا تھا۔ ورنہ وہ پوچھ سکتا تھا کہ آخر چوہدری دلاور سے یہ بات کیسے چھپی رہ سکتی ہے۔ کیا گاؤں کے لوگ اس ٹرک کو اور اس ڈرائیور کو نہیں پہچان لیں گے جو خود کو فیکٹری کا مالک کہتا تھا۔ کیا فیکٹریوں کے مالک خود اپنے ملازموں کی میت ان کے آبائی گھروں تک پہنچاتے ہیں۔ میں خود نہیں چاہتا تھا کہ اس ٹرک میں میں خود اپنا اشتہار دیتا ہوا اتنی دور تک جاؤں لیکن اس مسئلے کو کسی اور طریقے سے حل کرنے کی ابھی تک میرے ذہن میں کوئی صورت نہیں آئی تھی۔ چنانچہ میں نے اس پر سوچ بچار ملتوی کر دی۔

"تم وزیر خان کو جانتے تھے چوکیدار؟" میں نے اچانک کہا۔

"آتے جاتے دیکھا تھا جناب۔" چوکیدار بولا۔ "سلام کا جواب بڑی خوش اخلاقی سے دیتے تھے۔ گھر بار کا حال بھی پوچھ لیتے تھے۔"

"وہ باقاعدگی سے فیکٹری میں آتے تھے؟ ہر روز؟" میں نے کہا۔

"پہلے تو ہر روز ہی آتے تھے۔ پھر کبھی کبھار آنے لگے میں نے سنا تھا وہ بیمار ہیں۔ آخری بار آئے تھے تو وہ بہت کمزور تھے۔" وہ بولا۔ "میر صاحب کے ساتھ آتے تھے۔"

"اور میر صاحب کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟" میں نے کہا۔ غالباً اسے علم نہیں تھا کہ مجھ پر میر صاحب کے قتل کا الزام ہے۔

"وہ بھی اچھے آدمی تھے۔ خدا انہیں جنت نصیب کرے۔" چوکیدار بولا۔ "مجھے انہوں نے ہی ملازم رکھا تھا۔"

"کب؟" میں نے کہا۔ "تم سے پہلے تو صرف گاما یہاں کام کرتا تھا۔"

"ہاں جی۔ اسی نے مجھے چھٹی ڈالی تھی۔" وہ بولا۔ "پہلے میں میر صاحب کا چپراسی تھا۔ پھر یہاں چوکیدار مر گیا۔ میرا مطلب ہے فیکٹری میں۔ کسی نے اسے رات کے وقت مار دیا۔"

"مار دیا؟" میں نے چونک کر کہا۔ "کیسے؟ اور کتنی پرانی بات ہے یہ؟"

"سال ہو گیا جناب! یا ہونے والا ہے جناب۔" وہ کچھ سوچ کر بولا۔ "اس کی لاش فیکٹری گیٹ سے سو گز دور جی ٹی روڈ پر ملی تھی۔ کوئی اسے کچل کے فرار ہو گیا تھا۔ معلوم نہیں وہ روڈ پر کیا لینے گیا تھا۔"

میں اسے کیا بتاتا کہ روڈ تک وہ خود نہیں گیا تھا، لے جایا گیا تھا۔ بالکل ایسے ہی جیسے آج وہ خود چکوال روڈ تک لایا گیا تھا۔ صبح اس کی بھی کچلی ہوئی مسخ شدہ لاش ملتی اگر گاما دخل در معقولات نہ کرتا۔ ایک حادثہ جی ٹی روڈ پر پیش آ چکا تھا چنانچہ انہی حالات میں ویسا ہی دوسرا حادثہ شکوک کو جنم دیتا۔ یہ اہتمام اسی لیے تھا کہ اس بار کوئی چوکیدار کی لاش کو شناخت تک نہ کر سکے اور یہ ذکر تک نہ ہو کہ "ایم ڈبلیو ڈی بلڈنگ کمپلیکس" کا دوسرا چوکیدار بالکل اسی طرح مارا گیا جیسے پہلا مارا گیا تھا۔ آنے کو تو تیسرا بھی آ جاتا جو دونوں اموات کو اتفاق پر محمول کرتا تاوقتیکہ تیسرا خود شکار نہ ہوتا لیکن پولیس اتفاقات کو اتنی آسانی سے تسلیم نہیں کرتی۔ ہر چوکیدار محرمِ رازِ درونِ میخانہ ہو جاتا ہے۔ یہ دیکھتا رہتا ہے کہ کون آ رہا ہے اور کیا جا رہا ہے اور تجسس کی حد تک تو ٹھیک ہے لیکن وہ فرض شناسی کو ضروری سمجھتے ہوئے روک ٹوک کرنے لگے یا سچ مچ کا چوکیدار بن کے کوئی ناجائز چیز ناجائز طریقے پر نہ نکلنے دے تو حادثے کا شکار ہو جاتا ہے اور شکاری ہمیشہ وہی رہتے ہیں جو کبھی سامنے نہیں آتے۔

"چوکیدار!" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ سوہاوہ موڑ اب زیادہ دور نہیں رہا تھا۔ مجھے جی ٹی روڈ پر ٹریفک لائٹس نظر آنے لگی تھیں۔ "تم کو سال بھر میں معلوم تو ہو گیا ہو گا کہ فیکٹری میں زرعی مشینری اور آلات بنتے ہیں۔ کیا اس عرصے میں تم نے کوئی غیر معمولی بات دیکھی؟ مثلاً یہ کہ اندر کوئی غلط کام ہو رہا ہے۔ یا فیکٹری میں غلط قسم کے لوگ آنے لگے ہیں؟"

"نہیں مالک! ہمارا کام دروازے کے باہر تھا۔ اندر کی ہمیں کوئی خبر نہیں۔" وہ بولا۔ "بابو جسے چٹ بنا دیتا تھا اسے اندر جانے کی اجازت تھی۔ اندر سے کوئی گاڑی نکلتی تھی تو پاس کے بغیر [illegible]

[illegible] تھی اور پاس پر خود چوہدری صاحب دستخط کرتے تھے۔"

"جس بابو کا تم ذکر رہے ہو۔" میں نے کہا۔ "وہ جو باہر کیبن میں بیٹھا ہر وقت جاسوسی ناول پڑھتا رہتا ہے، اسے ملازم ہوئے کتنا عرصہ ہوا؟" میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ شاید وہ کلرک اس چوکیدار کے مقابلے میں زیادہ معلومات رکھتا ہو۔

"وہ بھی نیا آدمی ہے جناب!" چوکیدار بولا۔ "پہلے میں آیا تھا، دو چار دن بعد وہ آ گیا۔"

"اور اس سے پہلے وہاں کون تھا؟" میں نے دلچسپی سے پوچھا۔ "کیا وہ بھی حادثے میں مر گیا تھا۔ یا قتل ہو گیا تھا؟"

چوکیدار نے حیرانی سے میری طرف دیکھا۔ "ایسی تو کوئی بات نہیں جی! یہ کام پہلے طافے کرتا تھا جو اب الطاف فورمین کہلاتا ہے۔"

جی ٹی روڈ سے فرلانگ بھر پہلے میں نے ٹرک کو روک لیا۔ باہر نکل کے میں نے ٹرک پر لکھی ہوئی عبارت پہ غور کیا۔ ٹرک کا رنگ دونوں طرف سے نیلا تھا، اور اس پر فیکٹری کا نام سفید رنگ سے بعد میں لکھا گیا تھا۔ بہت غور سے دیکھنے پر یا ہاتھ پھیرنے سے سفید حروف ابھرے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ میں نے سب سے بڑا پیچ کس اٹھایا اور بڑی احتیاط کے ساتھ پہلے لفظ کو کھرچنے لگا۔ پرانے سفید رنگ کی پپڑیاں سی اکھڑتی گئیں اور ٹرک پر "وزیر اینڈ کمپنی" باقی رہ گیا۔ لیکن یہ نام بھی "میر وزیر اینڈ کمپنی" سے خاصا مشابہ تھا۔ میں کچھ دیر سوچتا رہا کہ اس میں مزید کیا ردّوبدل کر دوں۔ پھر مجھے ایک طریقہ سوجھ گیا۔ میں نے وزیر کے انگریزی میں لکھے ہوئے لفظ کا پہلا حرف W جزوی طور پر یوں مٹا دیا کہ بائیں طرف سے W کی صرف ایک لکیر نہ رہی۔ ڈبلیو اپنی شکل بدل کے این ہو گیا اور جو پہلے وزیر اینڈ کمپنی تھا وہ نذیر اینڈ کمپنی ہو گیا۔ سفید حروف کے نیچے سے ٹرک کا اصل نیلا رنگ نکل آیا تھا چنانچہ ایک نظر میں دیکھنے والے کو یہ تبدیلی محسوس ہی نہیں ہوتی تھی۔

دوسرا مسئلہ نمبر کا تھا اور فوری طور پر حل نہیں ہو سکتا تھا۔ نمبر سیاہ پلیٹ پر سفید رنگ سے لکھے ہوئے تھے۔ اس کو میں نے سردست التوا میں رکھنا بہتر سمجھا۔ آگے گوجر خان سے بھی مجھے کالا یا سفید رنگ ملنے کی امید تھی۔ لیکن میں نمبروں کو پینٹ سے بدلنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے عام کالی روشنائی ہی کافی تھی اور تھوڑا سا سفید کاغذ اور گوند۔ ایک کے ہندسے پر سفید کاغذ کی پٹی چپکا کے میں اسے سات بنا سکتا تھا اس طرح کہ جب تک کوئی قریب آ کے نہ دیکھے سفید پینٹ اور سفید کاغذ میں فرق محسوس نہ کر سکے۔ کالی روشنائی میں سفید پینٹ پر پھیر دیتا تو ایل کا ایک بازو انگریزی حرف آئی رہ جاتا۔ آٹھ کے اوپر والے حصے میں دائیں جانب تھوڑی سی سیاہی ملنے سے چھ کا ہندسہ بن سکتا تھا اور اس کے بعد نمبر پلیٹ بالکل مختلف ہو جاتی واپس آتے ہوئے نمبر پلیٹ کو دھو دینا کافی تھا۔ کاغذ اور روشنائی بہہ کر صاف ہو جاتے اور اصل نمبر پھر نمودار ہو جاتے۔

ابھی صبح ہونے میں کچھ دیر تھی۔ باکس اور اس میں رکھی ہوئی لاش کا مسئلہ میں نے یوں حل کیا کہ لاش کو باہر رکھ کر چوکیدار کی مدد سے خالی بکس اور اکھڑے ہوئے تختے سب نیچے لڑھکا دیے۔ پتھریلی زمین کے نشیب و فراز میں لڑھکنے والا صندوق سو فٹ کی گہری کھائی تک پہنچتے پہنچتے پاش پاش ہو چکا تھا۔ لاش اب کھلے ٹرک میں رکھی تھی۔ ٹرک کی تینوں دیواریں تقریباً دو دو فٹ بلند تھیں۔ چنانچہ بالکل آخری حصے میں رکھی ہوئی لاش کو کوئی اس وقت تک نہیں دیکھ سکتا تھا جب تک کہ قریب آ کے اندر نہ جھانکے۔ یہ صورتِ حال اطمینان بخش تو نہیں تھی لیکن میں نے اس کا بھی کوئی بہتر طریقہ اختیار کرنے کا........ مسئلہ حالات پر چھوڑ دیا اور ٹرک لے کر روانہ ہو گیا۔ سوہاوہ کے قصبے کا بازار صبح کے دھندلکے میں ویران پڑا تھا۔ آبادی سے نکلتے ہی کھیت آ گئے۔ پھر ایک جگہ میں نے سڑک کے بہت قریب ایک کچا گھر دیکھا۔ باہر کھلی ہوا میں دو چارپائیاں پڑی تھیں۔ دونوں پر بستر بھی تھے اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ابھی کوئی اٹھ کے کسی کنوئیں یا نہر پہ نہانے گیا ہو گا یا کسی مسجد میں نماز پڑھنے۔ میں نے ٹرک روکا اور بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک بستر سمیٹ کر بغل میں دبایا اور دوسرے میں بان کی چارپائی اٹھا کے دوڑا۔ جب میں چارپائی کو ٹرک میں ڈال چکا تھا تو اندر سے نکلنے والے ایک بچے نے چلانا شروع کیا۔ میں نے بستر بھی ٹرک میں پھینکا اور ڈرائیور کی جگہ بیٹھ کر ٹرک اسٹارٹ کر دیا۔

ایک میل آگے جا کے میں نے چوکیدار کو مدد کے لیے طلب کیا۔ ہم نے چارپائی پر بستر بچھا کے لاش کو اس کے اوپر لٹا دیا اور چادر اس طرح پھیلا دی کہ صرف چہرہ نظر آئے۔

"اب راستے میں اگر کوئی پوچھے تو کہنا میرا لڑکا ہے۔ علاج کے لیے پنڈی لے جا رہا ہوں۔" میں نے چوکیدار کو سمجھایا۔

"لیکن جناب! زندہ مردہ کا فرق تو نظر آ جاتا ہے۔" چوکیدار نے کہا جو میری اس کارروائی سے پریشان بھی تھا اور خوفزدہ بھی۔

"فرق تمہیں نظر آ رہا ہے کیونکہ تم حقیقت جانتے ہو۔" میں نے کہا۔ "ورنہ بیہوش یا بے جان آدمی ایک جیسے لگتے ہیں، جب تک کوئی نظر جما کے نہ دیکھے کہ سانس بھی چل رہی ہے یا نہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ کسی نے پوچھا تو تمہارے جواب سے یقیناً مطمئن ہو جائے گا۔ شک کی بات ہی نہیں ہو گی تو کوئی اتنے غور سے نہیں دیکھے گا۔"

مردہ بدست زندہ۔ خود چوکیدار بھی میرے رحم و کرم پر تھا اور مطمئن اس لیے تھا کہ میں یہ سب کچھ اس کی بھلائی کے لیے کر رہا تھا۔

"اب تک تو میں تمہیں چوکیدار کہتا آیا ہوں۔" میں نے کہا۔ "نام کیا ہے تمہارا؟"

”فلک شیر جناب!“ وہ بولا ”ویسے سب لوگ شیرو کہتے تھے۔“

”اچھا تو فلک شیر!“ میں نے کہا ”کچھ باتیں ایسی ہیں جو تمہیں ابھی سے سمجھ لینی چاہئیں۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ چوہدری دلاور نے تمہیں قتل کرا کے دفن کرانے کا پورا بندوبست کر لیا تھا اور۔ شاید میرا بھی۔ جب انہیں معلوم ہو گا کہ تم بچ کر نکل گئے ہو یا انہیں شبہ ہو گا کہ طافے کی موت اس مشن سے پہلے واقع ہو گئی تھی تو وہ پریشان بھی ہوں گے اور برہم بھی۔ وہ کوشش کریں گے کہ تمہارا اور گامے کا پتا چلائیں اور پھر تم کو قتل کرا دیں۔ یہ بتاؤ تم لاہور میں کہاں رہتے تھے؟“

”میں گامے کے ساتھ تھا جناب!“ چوکیدار بولا ”محلہ بی بی پاکدامن میں ایک کمرہ تھا۔“

”آفس میں تمہارا یا گامے کا پتا لکھا ہوا تھا؟ گاؤں یا گھر کا؟“ میں نے کہا۔

”ہو گا جی!“ چوکیدار نے کہا ”مجھے معلوم نہیں۔“

”گاؤں سے تمہارے خطوط تو آتے ہوں گے؟“ میں نے متفکر ہو کے کہا۔

”گامے کی ماں منشی سے چٹھیاں لکھواتی رہتی تھی۔ میری بیوی خود لکھتی تھی۔ وہ چار جماعت پڑھی ہوئی ہے۔“

”اور یہ سب خط تم پھاڑ دیتے تھے یا محفوظ رکھتے تھے؟“ میں نے کہا۔

”کاکے کی ماں کے سارے خط میں نے بکسے میں ڈال چھوڑے تھے جناب! گاما بھی ماں کے خطوں کو سنبھال کے رکھتا تھا۔“

میں نے افسوس سے سر ہلایا ”پھر تو وہ بہت جلد تمہارے گاؤں پہنچ جائیں گے۔ یہ بتاؤ تم گاؤں چھوڑ کے جا سکتے ہو۔ گامے کی ماں کو رہنے دو۔ اسے وہ کچھ نہیں کہیں گے۔ اس کے آگے پیچھے کوئی ہے؟“

”گامے کے دو چھوٹے بھائی ہیں۔ دونوں کی عمریں کم ہیں۔ دونوں ابھی بچے ہیں۔ سب ایک ہی جگہ رہتے ہیں۔“ وہ بولا۔

”بس تو تم اپنی فیملی کو لے کر نکل جاؤ۔ کوئی ایسی جگہ ہے جہاں تم کچھ عرصہ چھپ کے رہ سکو اور کسی کو معلوم نہ ہو۔“ میں نے کہا۔

”کراچی میں بھائی ہے میرا۔“ وہ بولا ”کسی افسر کے پاس ڈرائیور ہے۔“

”بس اسی کے پاس چلے جاؤ۔ وہاں پہنچ کے مجھے ایک خط ڈال دینا۔“ میں نے کہا۔

”لیکن۔۔۔ جناب! کراچی پہنچنے کے لیے گاڑی کا کرایہ۔ اور وہاں پہنچ کے بھائی پر بوجھ بننا۔“

”تم اس کی بالکل بھی فکر مت کرو۔“ میں نے ٹرک چلاتے چلاتے جیب میں ہاتھ ڈالا اور سارے نوٹ اسے تھما دیے۔

”یہ ساڑھے تین ہزار کے قریب ہیں۔ دو ہزار تم رکھ لو۔ کراچی پہنچنے کے لیے کافی ہوں گے۔ باقی مجھے دے دو۔ مجھے بھی واپس پہنچنا ہے۔ چلو ڈھائی ہزار رکھ لو۔ ہزار مجھے بہت ہوں گے۔ جب تک تم کراچی میں رہو گے تمہیں ہر ماہ ایک ہزار روپے ملتے رہیں گے۔ وہاں روزگار بھی آسانی سے مل جاتا ہے۔ تمہارا بھائی مدد کرے گا تو یہ مسئلہ حل ہو جائے گا اور تم اس پر بوجھ نہیں بنو گے۔ جیسے ہی حالات میرے قابو میں آئے میں تم کو بلا لوں گا۔ اس وقت تو میں کوئی انعام دینے کا وعدہ بھی نہیں کر سکتا لیکن جب میں اس قابل ہو جاؤں گا تو تمہیں انعام ضرور ملے گا۔“

”کس بات کا انعام سرکار؟“ چوکیدار ہکا بکا بیٹھا تھا۔

”تم نے آج میری زندگی بچا کے مجھ پر جو احسان کیا ہے اس کا بدلہ تو میں چکا نہیں سکتا۔“ میں نے کہا ”تمہاری ہمت اور محنت کا انعام ضرور دوں گا لیکن اس دن جب حالات سازگار ہوں گے تمہاری توقعات سے بڑھ کر۔“

”آپ... آپ کی اپنی زندگی بھی خطرے میں ہے سرکار!“ فلک شیر نے کہا ”آپ کہاں جائیں گے؟“

”میں کہیں نہیں جاؤں گا۔“ میں نے کہا ”تمہارے بدنصیب بھانجے کی آخری رسوم میں شرکت کے بعد واپس لاہور جاؤں گا۔ لیکن پھر بھی مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہو گی۔ تم گاؤں میں میرا نام نذیر صاحب بتاؤ گے کیونکہ ٹرک پر ”نذیر اینڈ کمپنی“ رہ گیا ہے۔ تاکہ جب کوئی ہیرو وزیر اینڈ کمپنی یا سکندر بخت کو تلاش کرتا ہوا پہنچے تو کسی سے کچھ نہ معلوم ہو کہ میں اسی ٹرک میں تمہارے ساتھ گاؤں گیا تھا۔ تم کو گاؤں میں دو چار دن سے زیادہ نہیں رہنا ہے۔ بہتر ہو گا کہ تم گامے کا سوئم ہوتے ہی روپوش ہو جاؤ۔ اپنی بیوی کو بھی یہ بتانا کہ ہم لاہور جا رہے ہیں اور اب وہیں رہیں گے جہاں میں کام کرتا ہوں مگر اسے تاکید کر دینا کہ کسی سے کچھ نہ کہے۔ عورتیں بات کو چھپا نہیں سکتیں۔ اگر وہ کسی کو بتانے کی غلطی کرے گی تو بھی لاہور ہی بتائے گی۔ پھر تم کراچی کا ٹکٹ لے کر گاڑی میں بیٹھ جانا۔ جب کراچی پہنچ جاؤ تو اپنے بھائی سے کسی بات کا ذکر مت کرنا۔ بس یہی کہہ دینا کہ تلاشِ روزگار میں آیا ہوں۔“

”اور اگر اس نے پوچھا کہ ہزار روپیہ مہینہ کون بھیج رہا ہے پھر؟“

”اسے بتا دینا کہ ایک دوست ہے۔ ملازمت اور الگ گھر ملنے تک مدد کرے گا۔ جب تم الگ رہنے لگو گے تو بھائی کو کیا معلوم ہو گا۔“ میں نے کہا۔

میں نے دیکھا کہ وہ تذبذب کا شکار ہے۔ اسے بہت سے جھوٹ بولنے کے لیے اور نقلِ مکانی یا جلا وطنی قبول کرنے پر آمادہ کیا جا رہا تھا۔ وہ گاؤں کا باسی تھا جس کے رشتے زمین سے اتنے ہی گہرے

ہوتے ہیں جتنے پرانے ہوں۔ برگد کے درخت کی طرح۔ سنگ و خشت کی دیواروں کی طرح نہیں جن کی بنیادیں ایک دو فٹ مٹی کے بعد نہیں ملیں چنانچہ شہروں میں رہنے والے گھروں سے ناطے نہیں جوڑتے خواہ گھر ان کا اپنا ہو یا پرایا اور خوب سے خوب تر کی جانب لپکتے رہتے ہیں اور بھٹکتے رہتے ہیں مگر گاؤں میں جس زمین پر دادا پردادا ہل چلاتے آئے اسی پر تیسری چوتھی نسل نے بالکل اسی طرح ہل چلایا۔ وہی کچے گھر وندے وہی خاندانی محبتوں اور عداوتوں کے سلسلے۔ نہ جانے لاہور وہ کیسے آ گیا تھا۔ پھر لاہور میں جو کچھ اس کے ساتھ ہوا تھا اس کے بعد ایک اور زیادہ بڑے، زیادہ مشینی اور زیادہ بے حس شہر جا کے کیا ہو گا جہاں انسانوں کا جنگل آباد ہو اور آدمی بھی درخت ہوں جو پھلتے پھولتے ہیں مگر دوسروں سے اپنا فاصلہ برقرار رکھتے ہیں اور جذبات سے نا آشنا ہوتے ہیں۔ میں نے اسے سمجھایا کہ خطرے کی وجہ سے تو خود خدا کے پیارے نبیؐ نے ہجرت کی تھی اور جب سوال اپنوں کی زندگی کا ہو تو تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔ ورنہ بعد میں کفِ افسوس ملنے سے کچھ نہیں حاصل ہوتا۔ چوہدری دلاور بہت خطرناک آدمی ہے اور اس کے ہاتھ اتنے لمبے ہیں کہ بہت جلد پھر اس کی گردن تک پہنچ جائیں گے اور عین ممکن ہے اس مرتبہ وہ اکیلا نہ مارا جائے۔ انتقام کے عتاب کی زد میں اس کا پورا خاندان آ جائے۔ بالآخر وہ قائل ہو گیا۔

جب ہم گوجر خان سے گزرے تو صبح کے سات بجے تھے۔ بچے اور بچیاں بستے لیے اسکول جا رہے تھے اور بازار آباد ہونے لگے تھے۔ کالی روشنائی اور گوند آسانی سے ہر جگہ مل جانے والی چیزیں تھیں اور مجھے صرف ایک روپے میں پہلی ہی دکان سے مل گئیں۔ اتفاق سے میری نظر برتنوں کی دکان میں رکھے ہوئے تھرمس پر پڑ گئی۔ میں نے وہ بھی خرید لیا اور ایک دکان نما ریسٹورنٹ سے کھولتی ہوئی چائے بھروالی۔ بسکٹوں کا ایک پیکٹ اور اسپرین لے کر میں واپس آیا تو چوکیدار بھی بنا ایک اے ایس آئی کے سامنے کھڑا تھا۔ ”سچ سچ بتاؤ یہ کیا چکر ہے؟“ اے ایس آئی نے کہا۔

”ہیلو!“ میں نے سامان آگے رکھ کے بے تکلفی سے اسے مخاطب کیا اور انگریزی پر آ گیا ”جھوٹ سچ مجھ سے پوچھو۔ میرے ملازم کو بلاوجہ ہراساں مت کرو۔“ مجھ سے ذرا سی چوک یہ ہو گئی تھی کہ میں نے ٹرک کو سڑک کے کنارے واقع تھانے کے سامنے کھڑا کر دیا تھا۔

اے ایس آئی نے مجھے گھور کر دیکھا ”تم کون ہو مالک صاحب؟“

”میرا نام مالک نہیں نذیر بیگ ہے۔ میں اس فیکٹری کا مالک ہوں جس کا نام ٹرک پر لکھا ہوا ہے۔“ میں نے کہا ”اب بولو؟“

”یہ بڑھا پہلے تو کہہ رہا تھا کہ اپنے بیٹے کو علاج کے لیے پنڈی لے جا رہا ہے۔“ اے ایس آئی بولا ”پھر میں نے پوچھا کہ بیماری کیا ہے تو کہنے لگا کوٹھے سے گر گیا ہے۔“ اور مجھے بسکٹ کا پیکٹ کھولتے دیکھتا رہا۔

”اس میں جھوٹ کیا ہے؟“ میں نے کہا ”اس کے سر میں کوئی اندرونی چوٹ معلوم ہوتی ہے۔“

”اس کے چہرے پر خون نظر آ رہا ہے۔“ اے ایس آئی نے کہا۔

”تم کوٹھے سے گر کے دیکھو، خون نکلتا ہے یا صرف ہڈیاں ٹوٹتی ہیں۔“ میں نے اسے مشتعل کرنے کے لیے کہا۔

”مجھے شک ہے کہ اصل معاملہ کچھ اور ہے۔“ وہ گرم ہو کے بولا ”یہ دیکھنا پڑے گا کہ زخمی اس کا بیٹا ہے یا نہیں۔ اس نے خودکشی کی کوشش تو نہیں کی تھی اور یہ مار پیٹ میں تو زخمی نہیں ہوا۔“ وہ زبردستی کیس بنانے پر آمادہ تھا اور میں اس کا مطلب بھی سمجھتا تھا۔ ”یہ ٹرک تمہارے تھانے کے علاقے میں کھڑا ہے اس لیے؟“ میں نے کہا ”ہم تو چکوال کی طرف سے آ رہے ہیں۔“ میں نے تھرماس میں سے چائے کا ایک مگ بھرا۔

”میں یہ سب نہیں جانتا۔“ وہ بولا ”تفتیش ہو گی تو سب معلوم ہو جائے گا۔“ ٹھیٹھ پولیس کا لہجہ اور زبان۔

”اور تفتیش ہی تفتیش میں یہ مر گیا تو ذمے دار کون ہو گا؟“ میں نے ہاتھ سے گامے کی لاش کی طرف اشارہ کیا۔

”تم نے حادثے کی رپورٹ درج نہیں کرائی ہے۔“ وہ بولا ”اور میں اپنی آنکھوں کے سامنے سب کچھ دیکھ لینے کے بعد تم کو قانونی کارروائی کے بغیر کیسے جانے دوں۔“

میں نے چائے کا ایک مگ چوکیدار کو دیا ”تم اندر جا کے بیٹھو۔“ میں نے کہا ”یہ بسکٹ بھی لیتے جاؤ۔“ پھر میں نے دوسرا مگ اپنے لیے بھرا اور ایک بسکٹ کھانے لگا ”پھر ایسا کرتے ہیں...“ میں نے کھاتے کھاتے بدتمیزی سے کہا۔ میرے اندازِ بے نیازی کے بعد وہ اس بداخلاقی پر مزید برہم تھا کہ ہم نے اسے چائے کے لیے پوچھا تک نہیں ”ایسا کرتے ہیں کہ اندر چلتے ہیں۔“ میں نے تھانے کی طرف اشارہ کیا اور تیسرا بسکٹ نگلا ”معاف کرنا ناشتے کا وقت تھا۔ تم تو ڈٹ کے آئے ہو گے۔ ہم ذرا تازہ دم ہو لیں پھر لاہور فون کر لیتے ہیں۔ فون تو ہو گا نا تھانے میں؟“

”فون کسے کرنا ہے؟“ اے ایس آئی مزید گرم ہوا ”مجھ سے سیدھی طرح بات کرو۔“

میں نے چائے کا خالی مگ تھرماس پر رکھا۔ رومال سے منہ صاف کیا اور جیب سے سگریٹ نکال کے لائٹر سے جلائی ”لاہور فون کر لو۔“ میں نے ایک طویل کش لے کر بے نیازی سے کہا اور اسے ضامن رضوی صاحب کے گھر کا نمبر بتایا ”یہ نمبر ہے لاہور کے ایس ایس پی کی کوٹھی کا۔ ابھی وہ آفس نہیں گئے ہوں گے۔“ میں نے

گھڑی پر نظر ڈالی "غالباً ناشتا کر رہے ہوں گے۔ فون ان کے گھر میں سے کوئی اٹھائے گا۔ محسن یا رابعہ قاری ایڈووکیٹ۔ یا خود ان کی بیگم۔ ان سے سب معلوم ہو جائے گا۔"

"کون ایس ایس پی؟" اے ایس آئی نے کہا۔ "ضامن رضوی صاحب؟"

"ویری گڈ۔ تم تو جانتے ہو۔" میں نے کہا۔ "لاہور میں رہے ہو کیا؟"

"تمہارا ان سے کیا تعلق ہے؟" وہ بولا لیکن اب اس کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔

"وہ انکل ہیں میرے۔" میں نے کہا۔ "انہی کے گھر میں رہتا ہوں۔ چلو۔" میں نے تھانے کی طرف قدم بڑھائے۔

"آپ پہلے ہی بتا دیتے نا جی۔" اے ایس آئی نے ناگواری سے کہا۔ "جائیں آپ۔"

"بھئی مجھے بات کرنی ہے اپنے گھر۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "انہیں اطلاع دینی ہے کہ ابھی تک سب خیریت ہے۔ اور آگے تو شاید پنڈی ہی میں کوئی موقع ملے۔ لیکن اس وقت تک وہ ڈیوٹی پر جا چکے ہوں گے۔ دفتر کا نمبر ذرا مشکل سے ملتا ہے۔ یا تم سمجھتے ہو کہ تھانے کا فون ایک ایس ایس پی سے گفتگو کے لیے استعمال نہیں ہو سکتا؟"

"میں نے کب کہا ہے جی! آپ تو ایسے ہی بات بڑھا رہے ہیں۔ دس بار فون کریں۔" وہ میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اس کی ساری اکڑ فوں ختم ہو گئی تھی۔ اس کی صبح کا آغاز بہت غلط طریقے پر ہوا تھا۔ قانونی تفتیش اور کارروائی کا تو کوئی سوال ہی نہیں رہا تھا۔ الٹی اسے یہ فکر لاحق ہو گئی تھی کہ میں اس کی شکایت نہ کر دوں۔ ایک تو میں دولت مند اور فیکٹری کا مالک۔ پھر ایس ایس پی کا بھانجا۔ لیکن میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔ سب سے پہلے تو مجھے اپنی خیریت کی اطلاع دینی چاہیے۔ میں تار بھی دے سکتا تھا مگر فون پر براہِ راست بات ہو سکتی تھی اور اس کے لیے تھانے کا فون سب سے بہتر ذریعہ تھا۔ بڑا اچھا ہو اگر فون محسن یا رابعہ میں سے کوئی اٹھا لے، میں نے سوچا۔

اندر وہی نحوست زدہ۔ پُر آسیب اور نیم روشن سہمی سہمی فضا تھی جو ہر تھانے کا طرۂ امتیاز ہے۔ میں نے کرسی پر بیٹھ کے فون کو اپنی طرف گھسیٹا اور سگریٹ لبوں میں دبا کے نمبر ملانے لگا۔ میں اوور ایکٹنگ کر رہا تھا چنانچہ غریب اے ایس آئی احساسِ کمتری میں مبتلا ہو رہا تھا۔ ایسے ہی مواقع پر اس کی بادشاہت کا غرور خاک میں مل جاتا تھا۔ گھنٹی تین بار بجی۔ پھر محسن نے ریسیور اٹھا کے کہا۔ "ہیلو!"

"ارے بھائی شیروانی صاحب! آداب عرض ہے قبلہ۔" میں نے اپنی قدرتی آواز میں کہا۔

"سکندر! اُلو کے پٹھے۔ خبیث۔" محسن نے میری آواز پہچانتے ہی بے اختیار دل کا غبار نکالنا شروع کیا۔ "کہاں کہاں ہے اب؟ مر گیا ہے کہ زندہ ہے؟"

"یار میں یہاں گوجر خان کے تھانے سے بول رہا ہو[ں]..." [میں] نے مسکرا کے کہا۔

"پہنچ گیا پھر تھانے۔ قسم خدا کی جو اب ہم میں سے کوئی [...] گیا۔" محسن نے برہمی سے کہا۔ "حد ہوتی ہے کسی بات کی۔"

"میں بالکل خیریت سے ہوں محسن۔" میں نے کہا۔ "اور [...] کو یہی اطلاع دینی تھی۔ مس رابعہ قاری ایڈووکیٹ کا کیا حال ہے؟"

"انتقال ہو گیا ان کا۔" محسن نے بھنا کے کہا۔ "آپ کے [...] رد رو کے جان دے دی۔"

"اور انکل رضوی؟" میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے ابھی [...] نہیں گئے ہوں گے۔ ناشتا کر رہے ہوں گے۔"

"وہ بندوق لے کر آ رہے ہیں، ابھی فون پر گولی مار د[یں گے]..." محسن بہت ناراض تھا۔

"آپ بات کرنا چاہیں ایس ایس پی صاحب سے [تو]..." میں نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کے نزدیک ہی موجود اے ایس آئی [سے] کہا۔ "ناشتے کی میز پر ہیں۔ اخبار بھی اسی وقت پڑھتے ہیں اگر کوئی ڈسٹرب کرے تو...؟"

"نہیں... اس کی... ان کو تکلیف مت دیں۔ سلام دی[جیے]..." اس نے سینے پر انگلی سے اپنے نام کے بیج کی طرف اشارہ کیا۔

"اچھا بھائی محسن! میں کل یا زیادہ سے زیادہ پرسوں [تک] پہنچ جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "انکل کو بتا دینا۔ ابھی تو میں جا ر[ہا ہوں] بس دو چار منٹ میں۔"

"کہاں؟" محسن چلّایا۔ "اب کدھر کا ارادہ ہے؟ بھائی [خدا کے] واسطے گھر آ جا۔ لے بات کر انکل اور رابعہ سے۔"

"اچھا خان صاحب! خدا حافظ۔" میں نے فوراً ریسیو[ر رکھ] دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھ سے ایک غلطی ہو گئی تھی۔ میں نے [...] کو بتا دیا تھا کہ میں تھانہ گوجر خان سے بول رہا ہوں۔ رضوی [صاحب] ابھی ذرا سی دیر میں اس کا نمبر معلوم کر لیں گے اور پھر [...] کہہ دیں گے کہ اس شخص کو بند کر دو حوالات میں۔ اور جب [تک میں] خود لینے نہ آ جاؤں اسے مت چھوڑنا۔ یا حکم صادر کر دیں گے [کہ] اسے پولیس کے پہرے اور نگرانی میں لاہور روانہ کر دو۔ [...] منٹ میں میرا فرار ہو جانا ضروری تھا۔ اے ایس آئی بادل [ناخواستہ] مجھے رخصت کرنے تھانے کے گیٹ تک آیا۔

"دیکھیں۔ وہ جو کچھ بات ہوئی۔ غلط فہمی کے باعث [...]" نے بمشکل تمام کہا۔

"اوہ نو۔ فارگیٹ اِٹ۔" میں نے کہا۔ "میں پولیس وا[لوں] [...] کے بزنس کو بہت اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ اس لیے مائنڈ [...]یں کرتا۔ یوں بھی۔ جب آپ جانتے ہوں کہ بچھو ڈنک مارتا ہے [تو] اس کی فطرت کو بدلنے کی کوشش کرنا یا اس کے کاٹنے پر بچھو کو [...] بھلا کہنا دونوں ایک جیسی فضول باتیں ہیں۔ او کے۔ خدا حافظ۔"

[...]ں نے اس کے منہ پر جوتا رسید کر کے بڑے تپاک سے مصافحہ کیا اور ٹرک کی جانب چل پڑا۔ اے ایس آئی کی دلی کیفیت کا مجھے بخوبی اندازہ تھا۔ اس ذلت کا بدلہ آج وہ ان سے لے گا جو شامتِ اعمال کے باعث کوتوالی لائے جائیں گے۔ خوشی مجھے اس بات کی تھی کہ وہ زندہ اور مُردہ میں فرق نوٹ نہیں کر سکا اور شاید ٹرک کا نمبر بھی۔

فلک شیر گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا تھا۔ میں نے شاپنگ، بریک فاسٹ اور ٹرنک کال میں تقریباً ایک گھنٹہ گزار دیا تھا۔ دھوپ بڑھ گئی تھی چنانچہ وہ لاش کی طرف سے متفکر تھا جو کھلی جگہ پر رکھی تھی۔ ابھی ٹرک سائے میں تھا لیکن آگے کا سفر کم سے کم چھ گھنٹے کا تھا اور دوپہر کے دو بجے تک دھوپ میں رہنا تھا۔ میں نے اسے تسلی دی کہ راولپنڈی سے ہم کوئی ترپال وغیرہ لے کر اوپر پھیلا دیں گے اور لاش خراب نہیں ہو گی۔ گاؤں پہنچنے کے بعد بھی تدفین کے لیے دو چار گھنٹے مل جائیں گے۔ موسم اتنا گرم نہیں تھا کہ بارہ گھنٹے میں خرابی کے آثار پیدا ہو جائیں۔

راولپنڈی کا فاصلہ میں نے ڈیڑھ گھنٹے میں طے کیا اور راستے میں صرف ایک جگہ پٹرول ٹینک فل کرانے کے لیے رُکا۔ اگر میں سوان ندی اور ٹوپی پارک کی طرف سے پنڈی میں داخل ہو کے مال روڈ پر ہو جاتا تو شہری ٹریفک سے بچ کے بالکل سیدھا گزر جاتا اور کوہ نور ٹیکسٹائل مل کے بعد صرف ترنول چیک پوسٹ ہی تھی جہاں کوئی ٹرک میں جھانک کر دیکھتا لیکن اس میں خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔ ہم کہہ سکتے تھے کہ زخمی مریض کو لیڈی ریڈنگ ہاسپٹل پشاور لے جا رہے ہیں کیونکہ وہاں اس کا چچا نیورو سرجن ہے۔ عام حالات میں پنڈی کے ہولی فیملی یا سی ایم ایچ جیسے اسپتالوں کو چھوڑ کے پشاور جانے کی بات کوئی نہیں کرتا لیکن کسی کا قریبی عزیز مثلاً خود ڈاکٹر ہو تو یہ بات فطری نظر آتی ہے۔ غیروں کے بجائے اپنے زیادہ توجہ دے سکتے ہیں اور نہ دیں تب بھی ان پر اعتماد تو زیادہ ہی رہتا ہے۔

ترپال خریدنے کے لیے مجھے ہاتھی چوک ضرور جانا پڑتا۔ اس بات کا خطرہ تھا کہ ٹرک میں لگے ہوئے بستر پر ایک مجروح شخص کو لیٹا دیکھ کر تجسس کے مارے لوگ جمع ہو جائیں اور کسی کی نظر قیامت کی ہو تو وہ تاڑ جائے۔ احتیاطاً میں نے کینٹ ہاسپٹل کی طرف سے گزرنے والی سڑک پکڑی جس پر ابھی زیادہ رش نہیں تھا۔ ترپال کیلے سے پہلے مجھے ریگزین والی ایک دکان نظر آ گئی اور میں نے وہیں سے ٹرک کو موڑ لیا۔ فرش پر بچھانے والے پلاسٹک کی شیٹ کے رنگ برنگے تھان کپڑوں کی طرح لپٹے ہوئے رکھے تھے۔ میں نے سادہ سے براؤن رنگ کی شیٹ خریدی اور ٹرک کی تینوں دیواروں پر پھیلا کے لاش پر ایک عارضی سائبان قائم کر دیا۔ شیٹ کے کناروں کو میں نے ٹرک کی سائڈ میں بنے ہوئے لوہے کی ہر ہُک میں پرو دیا تاکہ ٹرک چلنے سے شیٹ کو ہوا نہ اڑائے۔ اس کے باوجود جب میں پھر فیروز سنز کی طرف سے مال روڈ پر پہنچا اور دائیں طرف گھوم کے پشاور جانے والی سڑک پر ٹرک نے اسپیڈ پکڑی تو پلاسٹک شیٹ ہوا بھرنے سے پیراشوٹ کی طرح پھول گئی اور بالآخر پھٹ گئی۔ اس کا ایک کونا پھڑپھڑانے لگا۔ پھر دوسری ہُک کا سوراخ ایک چاک بن گیا اور ابھی ہم ریڈیو پاکستان کے سامنے سے گزرے ہی تھے کہ شیٹ اُڑ گئی۔

"اب کچھ نہیں ہو سکتا۔" میں نے فلک شیر سے کہا۔ "ٹرک پر چھت تو نہیں ہے لیکن دھوپ کا اثر ہوا سے زائل ہوتا رہے گا۔"

فلک شیر کچھ نہیں بولا مگر اس کی صورت بتاتی تھی کہ اس صورتِ حال پر وہ آزردہ ہے۔

"اب چار پانچ گھنٹے کا سفر ہے۔" میں نے کہا۔ "تم کہو تو میں لاش کو پلنگ کے نیچے رکھ دوں۔ یہی ایک صورت ہو سکتی ہے اسے سائے میں رکھنے کی۔"

فلک شیر نے اقرار میں سر ہلایا اور میں نے ٹرک کو ایک طرف کھڑا کیا۔ نیچے اترا اور پیچھے جا کے اکیلے ہی لاش کو چارپائی سے اتار کے ٹرک کے فرش پر رکھا اور چادر اس پر ڈال دی۔ لیکن بستر چارپائی پر ہی رہنے دیا۔ اب مردہ گامے کو بیہوش قرار دینے اور علاج کی غرض سے پشاور لے جانے والی کہانی نہیں چل سکتی تھی۔ بیمار اور مجروح شخص کو آرام سے بستر پر لٹا کے لے جایا جاتا ہے نہ کہ سخت فرش پر جہاں جھٹکے لگنے سے صحت مند آدمی کی حالت بھی خراب ہو جائے۔ میں نے فلک شیر کو سمجھایا کہ اب ہم سے راہ میں کوئی سوال کرے گا تو ہمارا جواب مختلف ہو گا۔ ہم بتائیں گے کہ مریض کو علاج کے لیے پنڈی لے گئے تھے اور اس کا آپریشن ہونا تھا مگر اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ چنانچہ اب تجہیز و تکفین کے لیے واپس لے جا رہے ہیں اور اسے چارپائی کے نیچے رکھنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ دھوپ سے محفوظ رکھا جائے۔ گامے کے سر اور چہرے کے زخموں سے رسنے والا لہو جم کے سیاہ اور سخت ہو چکا تھا چنانچہ اس چادر پر کوئی داغ نمودار نہیں ہوا تھا جو میں نے لاش پر ڈالی تھی اور میرا خیال تھا کہ ہم نے اعتماد سے بات کی تو کوئی شک نہیں کرے گا۔

لیکن ترنول چیک پوسٹ پر تین افراد اچانک ٹرک کے سامنے آ گئے اور سڑک روکنے والے لمبے بانس سے ڈنڈے کے پیچھے صف بستہ ہو گئے۔ ان کے تیور بدلے ہوئے تھے۔ عموماً وہ ہر گاڑی پر سرسری نگاہ ڈال کے چنگی محصول لیتے تھے اور گاڑی کو گزر جانے دیتے تھے مگر

وہ ہر گاڑی کی تلاشی تفصیل سے لیتے تو دونوں جانب گاڑیوں کی قطاریں لگ جاتیں اور ٹریفک جام ہو جاتا۔ اس وقت وہ مکمل ناکہ بندی کی پوزیشن میں تھے اور یہ ناممکن تھا کہ میں بیریئر کو توڑتا ہوا فرار ہو جاؤں۔ صاف ظاہر تھا کہ رضوی صاحب کے حکم کی تعمیل کر رہے تھے۔ گوجرخان کے تھانے میں اے ایس آئی نے انہیں ٹرک کا نمبر اور میرا حلیہ سب بتا دیا ہوگا۔ اگلا بندوبست انہوں نے یہی کیا ہوگا کہ مجھے راولپنڈی میں داخل ہوتے وقت یا شہر سے نکلتے وقت روکنے کی ہدایات جاری کر دی ہوں گی۔ انہیں راولپنڈی کے ایس ایس پی یا اسی عہدے کے کسی افسر کا تعاون حاصل ہوگا یا انہوں نے شیروانی صاحب کو بتا دیا ہوگا جو خود بھی اسلام آباد میں خاصے بااثر افسر تھے۔ جیسے ہی میں نے ٹرک کو روکا ایک انسپکٹر قسم کا شخص میری طرف آیا۔ باقی دو پچھلے حصے کی طرف بڑھے۔

"کیا بات ہے؟" میں نے پُرسکون رہتے ہوئے اطمینان سے کہا لیکن فلک شیر کا چہرہ فق ہو گیا۔

"کچھ نہیں۔ آپ نیچے تشریف لے آئیں۔" انسپکٹر نے طنز آمیز شائستگی سے کہا۔ "آپ کا نام سکندر بخت ہے نا؟"

"ہاں۔ لیکن اس طرح میرا راستہ روکنے کا مقصد؟" میں نے چیں بجبیں ہو کے کہا۔ "مجھے پشاور جانا ہے۔"

"ہم صرف احکامات کی تعمیل کر رہے ہیں۔" وہ بولا۔ "کہ آپ کو یہیں روک لیا جائے۔"

"کس لیے۔ اور کس نے دیا ہے یہ حکم؟" میں نے بحث کر کے اسے قائل کرنے کی بے سود کوشش کی۔

"ہمارے اعلیٰ افسران کا۔ اگر ہم نے کوتاہی کی تو معطل ہو جائیں گے۔ اس لیے آپ ضد نہ کریں۔" وہ بولا۔

"پیچھے مینجی کے نیچے لاش ہے سر جی!" ایک ماتحت نے سامنے آکے رپورٹ پیش کی اور اس سنسنی خیز دریافت پر اپنے افسر کی طرف داد طلب نظروں سے دیکھا۔ افسر نے چونک کر مجھے غور سے دیکھا۔ اب تک وہ سمجھ رہا ہوگا کہ میں کوئی خطرناک قسم کا پُراسرار مجرم ہوں مثلاً غیر ملکی جاسوس۔ چنانچہ افسرانِ بالا نے صرف مجھے روکنے کا حکم دیا ہے۔ گرفتار کرنے کا نہیں اور شاید وہ خود آکے مجھے تفتیش کے لیے اپنے ہمراہ لے جانا چاہتے ہوں گے مگر اب اچانک میری حیثیت ایک عام مجرم کی سی ہو گئی جو قتل کر کے لاش سمیت فرار ہو رہا تھا۔ میں نے نیچے اُتر کے دروازے کو دھڑ سے مارا۔ فلک شیر پہلے ہی اتر گیا تھا۔ ایک شخص فوراً میری جگہ چڑھ گیا اور اس نے ٹرک کو بیچ میں سے ہٹا کے سڑک سے دور ایک کنارے پر کھڑا کر دیا۔ وقتی طور پہ رُک جانے والی ٹریفک پھر چل پڑی۔ انسپکٹر مجھے ایک مختصر سے کمرے میں لے گیا جہاں صرف ایک میز تھی اور ایک کرسی۔ میں فوراً اس کرسی پر بیٹھ گیا۔ عام حالات میں یہ بڑی گستاخی ہوتی مگر اس وقت انسپکٹر خون کے گھونٹ پی کر خاموش ہو گیا۔ اس نے اپنے لیے دوسری کرسی منگوائی لیکن فلک شیر کو کھڑا رکھا۔

"یہ لاش میری فیکٹری کے ایک فورمین غلام محمد کی ہے۔" میں نے اطمینان سے کہا اور جیب سے سگریٹ نکال کے جلائی۔ "میں ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس کا مالک ہوں۔ ہم اسے تدفین کے لیے لے جا رہے ہیں۔"

"اچھا جی!" انسپکٹر نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "پھر میں کیا کروں" اس نے ٹرک پر نگاہ ڈالی جس پر نذیر اینڈ کمپنی کا نام لکھا ہوا تھا۔ اس کا لہجہ اور سوال دونوں مشتعل کرنے والے تھے لیکن میں نے ضبط سے کام لیا۔ "تم یہ کرو کہ اس افسر سے میری بات کراؤ جس کے حکم پر مجھے یہاں روکا گیا ہے۔ اور ہاں۔ یہاں چائے تو ملتی ہے۔ ہمارے لیے چائے کا انتظام کرو۔ پیسے میں دوں گا۔" میں نے جیب سے ایک نوٹ نکال کر میز پہ رکھے ہوئے فون کے قریب ڈال دیا۔ انسپکٹر مجبوراً اُٹھا۔ میرے تحکمانہ انداز نے اسے قائل کر لیا تھا کہ "معاملہ گڑبڑ ہے" اور میں معمولی آدمی نہیں ہوں۔ اس کے اٹھتے ہی میں نے فلک شیر کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ انسپکٹر نے غصّے سے پلٹ کر دیکھا اور پھر کسی سے کہا کہ ہاف سیٹ چائے اور ایک کرسی لائے۔ میں نے ٹیلیفون کا ریسیور اٹھا کے ضامن رضوی صاحب کے آفس کا نمبر ملانا شروع ہی کیا تھا کہ اس نے لائن کاٹ دی۔

"میں ایس ایس پی ضامن رضوی صاحب کو فون کر رہا تھا" میں نے ناگواری سے کہا۔

"یہاں کوئی ضامن رضوی نہیں ہے۔" انسپکٹر یوں مسکرایا جیسے اس نے میرا جھوٹ پکڑ لیا ہے۔

"میں لاہور کا نمبر ملا رہا تھا۔" میں نے کہا۔ "وہاں ضامن رضوی ہی ایس ایس پی ہیں۔ جن کے حکم پہ مجھے روکا گیا ہے۔"

"ہم کسی ضامن رضوی کو نہیں جانتے۔" وہ بولا۔ "یہ اسلام آباد کے ایک ایس پی کا حکم تھا۔ وہ آنے ہی والے ہیں۔"

کرسی پہلے آئی چائے اس کے بعد۔ دودھ پتی اور چینی کے اس مکسچر کو اجزائے ترکیبی کی بنا پر چائے ہی کہا جا سکتا تھا ورنہ اس میں چائے والی کوئی بات نہ تھی۔ سوائے درجۂ حرارت کے جو بہت زیادہ تھا۔ تھکن دور کرنے میں یہ گرم مشروب بے حد مفید ثابت ہوا۔ "شرع کے مطابق میّت کو دفن کرنے میں عجلت پسندیدہ فعل ہے۔" میں نے کہا۔

اس سے پہلے کہ انسپکٹر میری دینی معلومات پر تبصرہ کرتا ایک جیپ باہر آکر رُکی اور اس میں سے انکل شیروانی ایک ڈی ایس پی کے ساتھ برآمد ہوئے۔ انسپکٹر اُچھل کے کھڑا ہوا اور ایڑیاں کھٹ سے بجا کے سلیوٹ جھاڑا۔ انکل شیروانی نے پہلے مجھے گلے لگایا اور پھر جھاڑ پلائی شروع کی۔ "یعنی حد ہوتی ہے نامعقولیت کی۔ کسی کا خیال نہیں کہ سب کتنے پریشان ہیں۔ جب جی چاہا ایسے غائب ہو گئے جیسے..... جیسے....."

"جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔" میں نے سر جھکا کے کہا۔ "میں واقعی گدھا ہوں لیکن آپ میری بات تو سُن لیں۔"

"خاک سُن لوں تمہاری بات۔" انکل شیروانی نے کہا۔ "وہاں سب کا جینا حرام کر رکھا ہے تم نے۔ رضوی کے فون پر فون آ رہے ہیں کہ اسے کوئی سوال کیے بغیر ہتھکڑی لگا کے واپس بھیج دو۔ رابعہ اور محسن الگ پریشان ہیں۔ یہاں میری اور شہلا کی نیند حرام۔ آخر تم کہاں غائب ہو گئے تھے اور یہاں کیا کر رہے ہو؟"

میں نے دیکھا کہ ڈی ایس پی زیرِ لب مسکرا رہا ہے۔ میں انکل شیروانی کو ایک طرف لے گیا۔

"مسئلہ کوئی ایسا سنگین نہیں انکل!" میں نے کہا۔ "یہ فورمین میری جان بچاتے ہوئے مارا گیا۔ مجھے اتنا تو کرنا چاہیے کہ اس کی آخری رسوم میں شریک ہوں۔" میری آواز اتنی کم تھی کہ دوسرے لوگ صاف نہیں سُن سکتے تھے۔

"وہ تو ٹھیک ہے۔" انکل شیروانی بولے۔ "لیکن یہ نوبت آئی کیسے؟ یعنی تم اچھے بھلے سمجھدار آدمی، اپنی عقل اور حاضر دماغی سے تم نے سب کی جان بچائی اور پھر سب کی جان کے دشمن ہو گئے۔ کس حکیم نے لکھا تھا نسخے میں کہ اکیلے وہاں جاؤ۔ بلاوجہ۔"

"میں اپنی غلطی تسلیم کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس وقت میری پوزیشن کا خیال کیجیے۔ فورمین کی لاش کے ساتھ اس کا ماما ہے جو فیکٹری کا چوکیدار تھا اس کی جان بھی خدا نے بچا لی۔ ورنہ یہ بھی میرے ساتھ ہی مارا جاتا۔ بس میں انہیں گاؤں تک چھوڑ آؤں۔ میرا وعدہ کہ کل دوپہر تک آپ کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ آپ ذرا انکل رضوی کو سمجھا دیں۔ وہ آپ کی بات مان لیں گے۔"

"اچھا بھئی۔ لیکن دیکھو۔ میں کوئی انتظام کر دیتا ہوں کہ تمہارے ساتھ کچھ لوگ چلے جائیں۔" انکل شیروانی نے مجبور ہو کے کہا۔ "صرف تمہاری حفاظت کے لیے۔ تمہارے لیے کار آ جائے گی۔"

میں یقیناً انکار کر دیتا لیکن اسی وقت پل بھر کے لیے میری نگاہ باہر گئی اور میں نے ایک نیلے رنگ کی کار کو گزرتے دیکھا۔ پھر شعوری طور پر مجھے ڈی سلوا یاد آیا جس کے پاس ایسی ہی ٹویوٹا کراؤن تھی۔ پھر میں نے ونڈ اسکرین کے پیچھے سابق استاد پیڈرو اور موجودہ احمد نواز گردیزی کو دیکھا۔ وہ بڑی تیزی سے واپس جا رہا تھا اور اس کی نظر سڑک کے کنارے سے دور کھڑے ہوئے ٹرک پر گئی ہی نہیں ورنہ وہ "نذیر اینڈ کمپنی" لکھا ہوا دیکھنے کے باوجود اپنی فیکٹری کے ٹرک کو پہچان جاتا۔ یہ بھی بہت اچھا ہوا کہ ہم کمرے کے اندر تھے ورنہ سخت گڑبڑ ہو جاتی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کہاں سے واپس آیا ہے۔ مجھے اور چوکیدار کو لے جانے والا ٹرک مقررہ وقت پر ان کے ٹھکانے پر نہیں پہنچا ہوگا تو وہ تشویش میں مبتلا ہوئے ہوں گے اور تلاش کرنے پر انہیں طافے کی لاش کے علاوہ لکڑی کا وہ شکستہ تابوت بھی نظر آ گیا ہوگا جس میں مجھے پیک کیا گیا تھا۔ شاید انہیں پہلے سے معلوم ہوگا کہ فیکٹری کا چوکیدار گامے کا رشتہ دار ہے اور وہ اسی نتیجے پر پہنچے ہوں گے کہ چوکیدار نے "غدّاری" کی یعنی مجھ سے وفاداری اور اپنے بھانجے سمیت فرار ہو گیا۔ گردیزی کے پاس خاصی طاقتور کار تھی اور اسے پہلے سے معلوم ہوگا کہ گامے کا اور چوکیدار کا تعلق کس گاؤں سے ہے۔ وہ بلاتاخیر روانہ ہو گیا۔ غالباً اس وقت جب ہم گوجرخان تھانے میں رُکے ہوئے تھے وہ ہمیں کراس کر گیا۔ گامے اور چوکیدار کے گھر پہنچا اور یہ معلوم کر کے فوراً واپس آ گیا کہ وہ دونوں گاؤں نہیں پہنچے۔ اب وہ چوہدری دلاور کو رپورٹ دے گا کہ دونوں نمک حرام موت کی وجہ سے گھر کی طرف نہیں گئے اور رُوپوش ہیں۔ دلاور احمق نہیں ہے۔ وہ پیڈرو سے کہے گا۔ "گردیزی! تم گدھے کی اولاد ہو اور گدھے ہی رہو گے۔ تمہارے پاس کار تھی۔ تم گولی کی طرح گئے اور تصدیق کر کے لوٹ آئے۔ ان کے پاس کیا ہوائی جہاز تھا کہ تم سے پہلے پہنچ جاتے۔ وہ چھپتے چھپاتے بس میں سفر کر کے جائیں گے تو کل پرسوں تک پہنچیں گے۔" اور اس کے بعد پیڈرو کو اسی مشن پر واپس بھیج دیا جائے گا۔ اور دوسرے پھیرے میں پیڈرو کو چوکیدار مل جاتے گا تو اس کے ساتھ اس کے بیوی بچے بھی اٹھا لیے جائیں گے اور انجام پہلے سے بھی بُرا ہوگا۔

"ٹھیک ہے انکل!" میں نے کہا۔ "مگر آپ کے آدمی سادہ کپڑوں میں ہوں تو اچھا ہے۔ دیہاتی بن کے پیچھے میّت کے ساتھ بیٹھ جائیں۔ تدفین میں شریک رہیں اور ہمارے ساتھ ہی واپس آ جائیں لیکن میں اسی ٹرک کو لے جاؤں گا، کار رہنے دیں۔"

باوردی حضرات کو بے وردی کرنے اور حفاظتی انتظامات کی نوعیت سمجھانے میں ایک گھنٹہ گزر گیا۔ لیکن ہم دوبارہ روانہ ہوئے تو حالات بہت بہتر تھے۔ پیچھے میّت کو دوبارہ چارپائی پر رکھ دیا گیا تھا اور پولیس نے اپنے وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے برف کی دو سلوں کا بھی انتظام کر لیا تھا جو چارپائی کے نیچے رکھ دی گئی تھیں۔ ٹرک دیکھنے میں پرانا لگتا تھا کیونکہ لوڈنگ میں استعمال ہوتا تھا لیکن اس کا انجن جاندار تھا۔ میں نے کیمبل پور تک اسے ساٹھ میل کی رفتار سے دوڑایا۔ پھر میں نے فلک شیر کی ہدایات پر عمل کیا کیونکہ آگے کا راستہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ کیمبل پور سے گزرتے ہوئے ہرو ندی کا تنگ سا پُل آ گیا۔ ندی خود کسی برساتی نالے کی طرح تھی اور اس کے پانی کی گہرائی

برانے نام تھی۔ پانی کے شفاف دھارے کئی حصّوں میں بٹ گئے تھے اور خشک جزیرے جیسے کئی ٹکڑے الگ الگ نظر آتے تھے۔ ندی کی پوری تہ پر گول چکنے پتھروں کا فرش بچھا ہوا تھا اور اس پر جو پُل قائم تھا وہ خاصا بلند تھا۔ شاید بارش کے موسم میں ندی کی سطح اتنی ہی بلند ہو جاتی ہوگی اور اس کا پاٹ بھی پُل کی لمبائی کے برابر ہو جاتا ہوگا۔ ابھی تو مجھے خاصے نشیب میں فٹ پاتھ یا کسی چھوٹی سی سڑک کے برابر ہموار سطح نظر آ رہی تھی جس پر دونوں جانب کوئی حفاظتی جنگلا نہیں تھا اور اس پر سے ایک وقت میں ایک ہی گاڑی گزر سکتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اگر میں ٹرک کے چاروں پہیّوں کو سیدھا اور پُل کے کناروں پر رکھنے میں کامیاب ہو گیا تب بھی اس کی باڈی پُل کے دونوں طرف نکلی رہے گی۔ تلہ گنگ جانے والی بس کے مسافروں کا اس پُل پر سے گزرتے ہوئے کیا حال ہوتا ہوگا جب وہ دیکھتے ہوں گے کہ بس پُل صراط پر سے گزر رہی ہے اور پہیّے تو شاید پُل پر ہی ہیں مگر وہ خود ندی کے اوپر معلق ہیں۔ نشیب کے فوراً بعد فراز تھا اور سڑک تیس درجے کے زاویے پر ایک دم اٹھتی تھی۔ کہیں کہیں یہ زاویہ پینتالیس درجے تک ہو جاتا تھا۔ چنانچہ پُل کراس کرتے ہی مجھے ٹرک کو سیکنڈ گیئر میں رکھنا پڑا اور اس کا انجن زور لگا تا شور مچاتا اوپر چڑھنے لگا۔ چڑھائی کے علاوہ پہاڑی موڑ تھے جو اتنے خطرناک تھے کہ دوسری طرف سے آنے والی ٹریفک بالکل نظر نہیں آتی تھی چنانچہ ایک بس جو کیمبلپور جا رہی تھی، اترائی کی وجہ سے لڑھکتی ہوئی زدم سے گزر گئی تو مجھے حیرت ہوئی کہ دونوں گاڑیوں نے ایک دوسرے سے مصافحہ کیوں نہیں کیا۔ لیکن بس ڈرائیور تجربہ کار اور ان راستوں پر غیر متوقع ملاقاتوں کا عادی تھا کہ ایک ملی میٹر کے فاصلے سے گاڑی نکال لے گیا۔ آگے کا راستہ اور بھی خطرناک ثابت ہوا اور مسافت کم ہونے کے باوجود مجھے بے حد محتاط رہنا پڑا اور رفتار کو قابو میں رکھنا پڑا۔

دو بجے بالآخر ہم اپنی منزل پر پہنچے۔ اس کے بعد ایک ماتمی کہرام مچا جس کی ذہنی اذیت سے بچنے کے لیے میں گاؤں کے بازار چلا گیا جہاں گنتی کی چند دکانوں میں سے ایک چائے خانہ بھی تھا اور پروپرائٹر چائے خانہ ہٰذا نے میرے جیسے وی آئی پی کے قدم رنجہ فرمانے پر خصوصی چائے کا انتظام کیا اور گلاس بھر کے اوپر چھٹانک بھر ملائی کی تہ کے ساتھ چائے پیش کی۔ اس کی عقل سمجھنے سے قاصر تھی کہ میں آخر ہوں کیا ———— کیونکہ تین بے وردی ملازم سائے کی طرح میرے ساتھ لگے ہوئے تھے۔ مسلح بھی نظر آتے تھے اور مجھ سے آپ جناب کے بغیر بات نہیں کرتے تھے۔ ان تینوں کو بھی تقریباً ویسی ہی اسپیشل چائے پیش کی گئی لیکن وہ عمداً مجھ سے دور بیٹھے۔ میں بسکٹوں کے باقی ماندہ حصّے کو بطور لنچ چرتا رہا۔ دریں حالات یہ شہری نعمت بھی بہت غنیمت ثابت ہوئی۔

شام کو قبرستان سے لوٹنے کے بعد میں نے فلک شیر سے کہا "اگر تمہیں جانا پڑے تو تیاری کے لیے اور سامان وغیرہ باندھنے کے لیے کتنا وقت درکار ہوگا؟"

"تیاری کیسی مالک؟" وہ بولا۔ "اور غریب کا سامان ہی کتنا، بوریا بستر، چند کپڑے اور برتن۔"

"اس کا مطلب ہے تم اگر چاہو تو آج میرے ساتھ واپس جا سکتے ہو، بیوی بچّوں سمیت۔" میں نے کہا۔

"آج؟" وہ چلتے چلتے رُک گیا۔ "سوئم سے بھی پہلے؟"

"میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اور میری کوئی ذاتی غرض وابستہ نہ ہوتی تو میں تمہارے ساتھ یہاں تک آتا ہی نہیں۔ تم کو وہیں ترنول چوکی سے پولیس کی ایمبولینس میں یا اسی ٹرک میں بھجوا دیتا اور خود واپس چلا جاتا۔ لیکن میرے یہاں آنے کا ایک مقصد ہے اور وہ مقصد ہے تمہیں اور تمہارے بیوی بچّوں کو دلاور کے ظلم و ستم سے بچانا۔ تمہیں معلوم ہے اس کا ایک آدمی گامے کو پوچھتا ہوا گاؤں آ کے جا چکا ہے۔"

"آپ نے بھی سُن لی ہے یہ بات جناب؟" وہ پھر میرے ساتھ چلنے لگا۔

"ہاں۔ آج یہاں اسے کوئی نہیں ملا۔ لیکن وہ معاف کرنے والا اور بھول جانے والا آدمی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "اس کے علاوہ تمہارا وجود اس کے لیے خطرے کی علامت ہے۔ وہ پھر کسی کو بھیجے گا۔ کل یا زیادہ سے زیادہ پرسوں۔ گامے نے تمہیں بچایا اور یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ تمہیں اس سے کتنی محبت تھی۔ کوئی ان کی خاطر تو جان نہیں دیتا جن سے نفرت کرتا ہو۔ لیکن کیا اپنے بیوی بچّوں سے تمہیں محبت نہیں ہے۔ تم یہ منظور کر سکتے ہو کہ تمہارے حصّے کی سزا انہیں بھی ملے اور دلاور کے آدمی انہیں بھیڑ بکریوں کی طرح کاٹ کے ڈال دیں۔ میرا مقصد صرف یہ تھا کہ اپنی بساط کے مطابق تمہیں اس ظلم سے محفوظ رکھنے کی کوشش کروں۔ تاکہ تم زندہ رہو اور مجھے موقع ملے کہ میں تمہارے احسان کے بدلے تمہارے لیے کچھ کر سکوں۔"

"پھر بھی، آج اچانک چلا جاؤں۔" وہ بڑبڑایا۔ "گامے کی ماں سے کیا کہوں؟"

"کچھ نہیں۔ کسی سے کچھ نہیں کہنا۔" میں نے کہا۔ "رات کو سامان سمیٹو اور میرے ساتھ ٹرک میں نکل چلو۔ صبح ہونے سے پہلے پہلے غائب ہو جاؤ۔ میں پنڈی سے تم کو کراچی کی ٹرین میں بٹھا دوں گا۔"

گاؤں میں رات مغرب کے فوراً بعد آ گئی۔ تعزیت کے لیے آنے والے عشاء کی نماز سے پہلے ہی اٹھ گئے۔ عشاء کے بعد چوپال میں کوئی بھی نہ رہا۔ کچّے گھروں میں جلنے والے تیل کے چراغ بجھ گئے اور ابھی نو ہی بجے تھے کہ چوکیدار نے "ہوشیار خبردار" کی صدا لگا۔

پوری کی۔ پھر ہر سمت خاموشی پھیل گئی۔ اتنی گہری اور بوجھل کہ میں نے بھی محسوس نہ کی تھی۔ آوارہ کتے تک سو گئے تھے کہ کسی کے بھونکنے کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ جنگلوں اور کھیتوں میں گیدڑ تک نہیں چلاّ رہے تھے۔ میں نے فلک شیر سے کہا کہ یہی مناسب وقت ہے۔ اس وقت میرا خیال تھا کہ فلک شیر کی بیوی اتنی کم مہلت میں اور "آدھی رات" کو چوروں کی طرح ہزار کوس کے سفر پر نکلنے کے لیے آمادہ نہ ہوگی۔ مرد حقائق کو نسبتاً کم وقت میں قبول کر لیتے ہیں۔ اور حالات کو سمجھتے ہوئے مفاہمت کا راستہ اختیار کرنے میں دیر نہیں لگاتے۔ عورت کی ذات جذبات کا پیکر۔ جہاں رہے جس کے ساتھ رہے، وفا کے رشتوں کو اتنا استوار کر لیتی ہے کہ آسانی سے توڑ بھی نہیں سکتی۔ لیکن فلک شیر کی بیوی مختلف عورت ثابت ہوئی۔ فلک شیر کے کہنے پر میں نے خود اس سے بات کی تو اس نے میری بات بڑے سکون سے سُنی اور فلک شیر کو دیکھتی رہی۔ نہ جانے کیوں فلک شیر نے اس سے نگاہ نہیں ملائی۔

"میں ضرور جاؤں گی ویر۔" اس نے بالآخر کہا۔ "اگر میں یہاں رہوں گی تو وہ ڈائن ہم سب کو کھا جائے گی۔"

"خوامخواہ بات کو مت بڑھا نیک بخت۔" فلک شیر نے آہستہ سے کہا اور باہر نکل گیا۔

"میں نے اپنی زندگی جل جل کے گزار دی۔ کیا نہیں کیا میں نے اس گھر کے لیے۔ مگر مجھے خوشی کبھی نہیں ملی۔ اس نے مجھے خوش رہنے ہی نہیں دیا۔" وہ نفرت کے زہر سے بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ "میرا بس چلتا تو میں اس کا گلا گھونٹ دیتی۔ اتنی دور چلی جاتی کہ اس کا منحوس خیال تک میرا سُکھ نہ چھینے۔"

"تم کس کی بات کر رہی ہو بہن؟" میں نے نرمی سے تسلی دینے والے انداز میں کہا۔

"اسی شہدے گامے کی ماں کو رو رہی ہوں ویر۔" وہ بولی۔ "جو میری بچپن کی منگنی توڑ کے اس سے بیاہ رچانا چاہتی تھی۔ مجھے معلوم ہے اس نے مولوی سے کتنے تعویذ لیے میرے خلاف، کتنے عمل کرائے۔"

"ایسی باتوں سے کچھ نہیں ہوتا بہن! ہوتا وہی ہے جو خدا کو منظور ہوتا ہے۔" میں نے محبّت کی کہانی کے اس پرانے المیّے کو سمجھتے ہوئے کہا جو ہر آدمی کا المیہ ہے۔ جسے وہ چاہتا ہے اسے کوئی اور چاہنے لگتا ہے۔ محبّت کرنے والے دو۔ حاصلِ محبّت ایک خواہ وہ مرد ہو یا عورت اور انجام یہی خانہ خرابی۔ خوشی کے پیچھے بھاگتے بھاگتے معلوم ہوتا ہے کہ خوشی تو ایک سراب تھی۔

"اپنا کیا اپنے آگے آتا ہے ویر جی۔" وہ بولی۔ "گھر والا چھوڑ گیا۔ کب تک لوگوں کی سُنتا اور بے غیرت بن کے جیتا۔ حیا ان دونوں کو کبھی نہ آئی۔"

"لیکن گامے کے دو بھائی ہیں!" میں نے حیرانی سے کہا۔ "فلک شیر نے بتایا ہے مجھے۔"

"ہاں۔ اس نے دوسرا خصم جو کر لیا تھا۔" وہ بولی۔ "دونوں اسی کی اولاد ہیں۔ ایک دس سال کا، دوسرا بارہ سال کا۔"

"اور یہ گاما۔ غلام محمد۔ یہ پہلے شوہر سے تھا؟" میں نے زنانہ تجسّس کا مظاہرہ کیا۔

وہ ہنسی۔ طنز آمیز۔ تلخ۔ تمسخر اُڑانے والی بے بس ہنسی جو اپنی مجبوری کا نوحہ تھی۔ "ہاں، کہا تو یہی جاتا ہے۔"

"میرا خیال ہے تم بلا وجہ حسد اور شک میں مبتلا ہو بہن۔" میں نے بے یقینی کے باوجود کہا۔ "وہ فلک شیر کی منہ بولی بہن ہے۔"

"پہلے سب یہی سمجھتے تھے۔ اب سب سمجھتے ہیں۔ اور پھر شوہر کو بیوی سے زیادہ کون جانتا ہے۔" وہ بولی۔

"چلو پھر تو تمہارا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔" میں نے بات کو مختصر کیا۔ "فرض کرو فلک شیر جھوٹ بولتا تم سے۔ کراچی میں تو کوئی بات نہیں ہوگی۔ تم تیار رہو نا؟"

"میرا یہاں کون ہے۔ ہوتا تو میں اتنے دکھ سہتی۔" وہ بولی۔ "ان بچوں کو کسی کے سُپرد کر تی اور نیلا تھوتھا کھا لیتی۔ میرا فلک شیر مجھے مل جائے تو میں کہیں بھی جانے کے لیے تیار ہوں۔"

رات کے گیارہ بجے اس خاندان کا مختصر سا سامان پیک ہو چکا تھا۔ فلک شیر کے دونوں بچے حیران تھے کہ آتنی رات کو تمام سامان لے کر جانے کا مقصد کیا ہو سکتا ہے۔ فلک شیر چُپ تھا اور اس چُپ کے ہزار مفہوم تھے۔ یا نکالے جا سکتے تھے۔ یہ اس گھر سے یا اس زمین سے رشتہ ٹوٹنے کا دکھ بھی ہو سکتا تھا جس کے ہر ذرّے سے اس کی عمرِ رفتہ کا دامن بندھا ہوا تھا۔ اگر فلک شیر کی بیوی نے غلط نہیں کہا تھا تو یہ ایک نقشِ ماضی کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دینے کا افسوس بھی ہو سکتا تھا۔ خواب تھا جو ہم نے دیکھا جو سنا افسانہ تھا۔ یہ گامے کی موت کا غم بھی ہو سکتا تھا جسے اس نے اپنا بھانجا کہا تھا مگر جو اس کی بیوی کے خیال میں فلک شیر کا بیٹا تھا۔ اپنے عقیدے کے مطابق وہ اس کی مغفرت کے لیے بھی کچھ نہ کر سکا تھا۔ زندگی کی کہانیاں کہاں کہاں بکھری ہوئی ہیں اور ہر داستانِ حیات کا عنوان جدا ہے۔ اسی نفرت اور محبت اور رقابت کی بنیاد پر کھڑی ہوئی مثلث کے لاتعداد زاویے تھے۔

رات ایک بجے میں نے انہیں پنڈی کے اسٹیشن پر اتارا اور ان کے لیے بڑے جتن کر کے پشاور سے آنے والی خیبر میل میں جگہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ رات ڈھائی بجے خیبر میل کے روانہ ہو جانے کے بعد میں نے خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ میرے

سر پر تفکرات اور اندیشوں کا ایک کوہِ گراں تھا جو اپنے مقصد میں کامیابی کے بعد باقی نہ رہا۔

میری حفاظت پر مامور تینوں افراد کی حالت غیر تھی۔ مجھے روک کردہ بیگار میں پکڑے گئے تھے۔ حکم حاکم مرگِ مفاجات۔ انہیں کچھ بھی نہیں کرنا تھا اور یہی ان کے لیے بہت بڑی سزا تھی۔ یہ بھی کوئی ڈیوٹی ہوئی کہ بس ایک آدمی کے ساتھ رہو۔ وہ جہنم میں بھی جائے تو ساتھ جاؤ۔ سڑک پر کھڑے رہنا بھی ان کے نقطۂ نظر سے لاکھ درجہ بہتر تھا کہ وہ خود بھی مصروف رہتے اور دوسروں کو بھی مصروف رکھتے۔ آدمی بھی انہیں میرے جیسا ملا تھا جس سے تعلقات کی ابتدا ہی کشیدگی سے ہوئی تھی اور جو پوزیشن رکھتا تھا جیسے ڈی آئی جی ہو چنانچہ وہ آپس میں بھی بے تکلف ہو کے گفتگو نہیں کر سکتے تھے۔ مجھ سے بے تکلف ہونے کا کیا سوال۔ لیکن میں سمجھتا تھا کہ ان کو دخل در معقولات سے باز رکھنے کے لیے یہ رویہ ضروری ہے۔ اب مجھے ان پر ترس آیا۔ میں نے اخلاقاً ان سے کھانے پینے تک کو نہیں پوچھا تھا۔

"آپ لوگوں کا بہت بہت شکریہ۔" میں نے کہا "میری وجہ سے آپ سب کو بہت زحمت اٹھانا پڑی۔ اب آپ لوگ جائیں۔" میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کے نوٹ نکالے اور ان سب کو سو سو کے نوٹ پکڑا دیے۔ "افسوس یہ ہے کہ اس وقت میرے پاس یہی ہیں ورنہ میں آپ لوگوں کو اس مستعدی اور فرض شناسی کا زیادہ انعام دیتا۔"

انہوں نے رسماً انکار کیا اور پھر مجھ سے مصافحہ کر کے رفوچکر ہو گئے۔ بعد میں انہوں نے مجھے بہت گالیاں دی ہوں گی کہ سالا فیکٹری کا مالک۔ سو روپے دے کر اسے انعام کہتا ہے۔ دس گھنٹے کی بیگار اور سو روپے۔ لاحول ولاقوۃ۔ ایک بندے کو دھر لو آوارہ گردی میں تو اس کی جیب سے نکل آتے ہیں۔ چار بندے ڈک دو تو والی وارث ہزار روپے نذرانہ دے جاتے ہیں۔ اس کے باوجود انہوں نے انکار نہیں کیا تھا۔ بھاگتے چور کی لنگوٹی ہی سہی۔

صبح دم ساڑھے تین بجے جب مرغوں کے الارم کلاک بجنے لگے تھے میں نے ٹرک سمیت انکل شیروانی کی کوٹھی میں داخل ہو کے مسلسل ہارن بجانا شروع کیا اور انجن کو ریس دیتا رہا۔ پھر خود باہر نکلا اور چلانے لگا "ارے بھئی کوئی ہے؟ ہم ڈاکو ہیں۔ لوٹنے آئے ہیں۔ کسی کو کچھ خوف ہونا چاہیے۔"

انکل شیروانی سخت بدحواسی میں نائٹ گاؤن پہنتے اور پاجامے کے ازار بند کا ایک کنارا ٹخنوں تک لہراتے نکلے۔ "یعنی کہ یہ کیا ہنگامۂ محشر ہے۔ میاں تم آئے ہو کہ قیامت آئی ہے؟" انہوں نے ڈانٹتے ہوئے فرمایا۔ "چلو اندر چلو۔"

پھر شہلا نکلی اور گلے لگ کے رونے لگی۔ میں نے اس کے سر پر دستِ شفقت پھیرا۔ "ڈاکوؤں کے نام سے ڈر گئی ہے۔" میں نے دانت نکال کے خفت سے کہا اور پھر شہلا کو تسلی دینے لگا۔ "ارے بھئی ہم مذاق کر رہے تھے۔ ہم شریف آدمی ہیں اور پھر یہ کسٹم آفیسر یا پولیس آفیسر کا گھر تو ہے نہیں جسے کوئی لوٹنے آئے۔" شیروانی صاحب کے پیچھے چلنے لگے۔

"یہ آپ کیا کرتے ہیں بھائی جان!" وہ شکایتی لہجے میں بولی۔ "سب کو پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہاں تو آپ کی خیریت کی اطلاع ملنے سے پہلے سب کا سکھ چین حرام ہو گیا تھا۔"

"وہاں کہاں؟ آپ کے سسرال میں۔ نہیں میکے میں؟" میں نے کہا۔ "لاحول ولاقوۃ۔ سب گڑبڑ ہو گیا ہے۔ جو میکہ تھا اصولاً وہ سسرال کا ہو گیا ہے اور سسرال کو بنا دیا ہے تم نے میکہ۔ رخصتی کس کی ہوئی، کدھر کدھر سے ہوگی؟"

حسبِ توقع شہلا بھاگ گئی۔ میں چچی کے کمرے میں داخل ہوا، کورنش بجا لایا۔ انہوں نے بہت حیرت کا اظہار کیا "ارے لڑکے! کل ہی تو گیا تھا۔ آج اتنے سویرے واپس! بات کیا ہے؟" انہیں یقیناً میری پُراسرار گمشدگی اور بازیابی کے متعلق کچھ نہیں بتایا گیا تھا۔

"وہ چچی۔ میں ذرا نکلا تھا کھانے کے بعد چہل قدمی کے لیے۔" میں نے کہا "سوچا آپ کی خیریت بھی پوچھ لوں۔"

"سن رہی ہو باتیں۔ لاہور سے اسلام آباد آ گئے چہل قدمی کرتے ہوئے۔" شیروانی صاحب مسکرائے۔ "چلو تم نہا دھو کے انسان بنو۔ میں شہلا سے کہتا ہوں کچھ چائے کافی وغیرہ کا انتظام کرے یا ناشتا ہوگا؟ میں تو دفتر جانے سے پہلے سات بجے کرتا ہوں۔"

"ابھی تو کافی ہی کافی ہے۔" میں نے کہا۔ "ناشتا کریں گے ذرا اطمینان سے۔ آپ کے ساتھ ہی۔"

کافی میں نے شہلا کے کمرے میں پی۔ "تم نے اپنے میاں کے بارے میں نہیں پوچھا۔ افسوس!"

"دیکھیں بھائی جان! ایسی باتیں مت کریں۔ ورنہ میں ناراض ہو جاؤں گی۔" شہلا نے منہ پھلا کے کہا۔

"ایکٹنگ کا یہ انداز اب مقبول نہیں رہا۔" میں نے کہا۔ "ارے بھئی ڈرکیسا۔ صاف پوچھو محسن کا کیا حال ہے۔ دل کی بات لبوں تک نہ آنے دینا کون سی عقلمندی ہے اور خیریت معلوم کرنے میں اخلاقاً یا شرعاً کون سی معیوب بات ہے؟"

"آپ اپنی بات کریں۔" وہ بولی۔ "اس بار کہاں کہاں تیر چلا آئے۔ کیا معرکہ سر کیا ہے؟ دنیا میں ایسی کھلبلی مچی ہوئی تھی جیسے سکندرِ اعظم نے ڈھائی ہزار سال بعد پھر حملہ کر دیا ہے۔ سکندر بخت کے نام سے" میرے ساتھ وہ بھی ہنسی۔ میں نے اسے مختصراً بتایا کہ شیر کی کچھار میں

داخل ہونے کی حماقت فرما کے مجھ پر کیا بیتی تھی اور اس حرکت کے زائد و نقصانات پر روشنی ڈالی۔ پند و نصائح کا انبار لے کر میں شیروانی صاحب کے ساتھ ہی نکلا اور انہیں خدا حافظ کہہ کے لاہور کی طرف روانہ ہو گیا۔ دوپہر ایک بجے میں شاہدرہ پہنچا۔ پروگرام کے مطابق میں نے ٹرک کو ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس کی طرف موڑا اور راستے کے بیچ عین دروازے کے سامنے روک دیا۔ یہ دوپہر کے کھانے کا وقفہ تھا چنانچہ جاسوسی ناول پڑھنے والا نوجوان غیر حاضر تھا۔ نئے چوکیدار نے ہلڑ مچا دیا۔ "او خانہ خراب... یہ کیا ہے۔ کدھر کھڑا کیا ہے اس کو۔ ہٹاؤ اسے اور سائڈ میں کھڑا کرو۔"

"محترم خانِ اعظم!" میں نے چابیاں بڑھا کے کہا۔ "اندر اولادِ سگ برادرِ خر چوہدری دلاور صاحب اپنے مرقد میں تشریف فرما ہوں گے۔ یہ چابیاں ان کی خدمت میں پیش کر دو۔ انہیں بتا دینا کہ عالمِ ارواح سے فوزین غلام محمد اور الطاف نے ارسال کی ہیں۔"

میری فارسی کو چوکیدار کچھ سمجھا اور کچھ نہیں سمجھا لیکن میں چابیاں دیتے ہی واپس چل پڑا تھا اس لیے وہ حیرت سے سر ہلاتا اندر چلا گیا۔ اس کے چوہدری دلاور کے ہمراہ واپس آنے تک میں دوڑ کر سڑک تک جا پہنچا تھا اور ایک رکشا میں بیٹھ گیا تھا۔ "الٹے بانس بریلی کو۔" میں نے رکشا والے سے کہا۔ وہ ہکا بکا رہ گیا۔ "معاف کرنا۔ بانسوں والی سڑک۔" میں نے کہا اور رکشا چل پڑا۔ "اصل معرکہ تو اب درپیش ہوگا، جناب شہزادہ سکندر بخت صاحب۔" میں نے اپنے آپ سے کہا۔ "جب محسن زبان درازی کے ساتھ دست درازی پر اتر آئے گا اور مس رابعہ قاری روٹھنے کا زنانہ طریق جنگ اختیار کریں گی۔ آخر میں رضوی صاحب کا آتش فشاں لیکچر۔ خیر۔ جب اوکھلی میں دیا سر تو موصلی کا کیا ڈر۔ بس ایک کان سے سنو اور دوسرے کان سے اُڑا دو۔ رہ گئی روٹھی ہوئی محبوبہ تو اس کو منانے کے ایک ہزار ایک کارگر نسخے تمہیں آتے ہیں۔ ایڈووکیٹ ہے تو کیا۔ ہر عورت جو محبت کرتی ہے مجبور ہوتی ہے اور اسی مجبوری کو سرمایۂ افتخار سمجھتی ہے۔ صرف رو سکتی ہے رُلا نہیں سکتی اور یہ روٹھنا منانا تو پیار کا وہ سیمنٹ ہے جس سے عشق کی بنیادیں استوار ہوتی جاتی ہیں۔"

محسن خان نے سب سے پہلے میرا دیدار کیا اور استقبال کے لیے آگے بڑھے۔ "آئیے آئیے مہاراج۔ پدھاریے۔" اس نے سلیپر اتارتے ہوئے کہا۔ میں اندر کی طرف دوڑا لیکن دروازے پر پکڑا گیا۔ محسن آگ بگولا ہو رہا تھا۔ جو گالیاں وہ ٹیلی فون پر نہیں دے سکا تھا، وہ اس نے اب دیں۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"نصیب دشمناں، یہ کیا ہو گیا ہے آپ کو شیروانی صاحب!" میں نے کہا۔ "اچھا بھلا چھوڑ کے گیا تھا آپ کو میں! کب سے ہے یہ جنونی کیفیت؟ اور یہ کفش برداری آپ جیسے شرفا کو زیب نہیں دیتی۔"

بیگم رضوی ہنگامہ سن کے باہر آئیں اور انہوں نے ہم دونوں کو ڈانٹا۔ "کیا بیہودگی ہے یہ۔ اندر تو چلو۔"

"نہیں آنٹی! یہ جائے کسی اور سفر پہ۔ سندباد جہازی کا بچہ۔" محسن نے کہا لیکن بیگم رضوی مجھے اپنے ساتھ لے گئیں۔ فوری طور پر میں نے باتھ روم کا رُخ کیا اور نہانے دھونے کے بعد کپڑے بدل کے نکلا تو میز پر کھانا لگا ہوا تھا۔

"واضح ہو کہ گزشتہ چوبیس گھنٹے میں باقاعدہ طعام قسم کی کوئی چیز مجھے نصیب نہیں ہوئی۔" میں نے کہا۔

"افسوس یہ ہے کہ راہِ حق میں آپ کو شہادت نصیب نہیں ہوئی۔" محسن نے میز پر طبلہ بجاتے ہوئے کہا۔

"باقی لوگ کہاں ہیں؟" میں نے کہا۔ "مثلاً ایس ایس پی صاحب اور خاتون ایڈووکیٹ۔"

"اوّل الذکر آپ کی خبر لینے دفتر سے روانہ ہو چکے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "یاررروم میں بھوک ہڑتال ہے۔"

"اچھا!" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "میں بار روم تک ہو کے آتا ہوں۔ بھوکوں کو کھانا کھلانا کارِ ثواب ہے۔" اور محسن کے ہنسنے اور بیگم رضوی صاحب کے مسکرانے کی پروا کیے بغیر میں باہر نکل گیا۔ رابعہ کا کمرہ بند تھا۔ میں نے ایک بار دستک دی اور کوئی جواب نہ پا کے اندر داخل ہو گیا۔ وہ بیڈ پر پیر لٹکائے سیدھی بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سرخ ڈورے بتا دیتے تھے کہ وہ سوئی نہیں اور روتی رہی ہے۔

"آہم۔" میں نے کھنکار کے گلا صاف کیا۔ "بقولِ شاعر

بھنویں تنی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں"

وہ اٹھ کے دروازے کی طرف بڑھی۔ میں نے اس کا راستہ روک لیا۔ "بہت ناراض ہو؟"

"مجھے کیا ضرورت ہے ناراض ہونے کی؟" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "اور تم کون ہوتے ہو یہ سوال پوچھنے والے؟"

میں قہقہہ مار کے ہنسا۔ "ایسی ہی صورتِ حال میں کسی نے فرمایا تھا کہ

ان کو آتا ہے پیار پر غصہ۔ ہم کو غصے پہ پیار آتا ہے"

"یہ تھرڈ کلاس شعر اور آؤٹ آف ڈیٹ طریقے ہیں۔" وہ رکھائی سے بولی۔ "زندگی فلم لیلیٰ مجنوں نہیں ہے۔"

"اچھا تو سیدھی طرح بتاؤ کہ منہ کیوں سُوجا ہوا ہے اور کھانے کی میز پر موجود نہ ہونے کی وجہ کیا ہے؟" میں نے کہا۔ "جو کچھ میں نے کیا اس کی وضاحت تو ہوتی رہے گی۔ جواب کے لیے میں پانچ سیکنڈ دیتا ہوں۔ اس کے بعد میں تمہیں اٹھا کے لے جاؤں گا۔ کسی کی پروا کیے بغیر اور کرسی پر لے جا کر رکھ دوں گا۔ ہو گئے پانچ سیکنڈ۔" میں ایک دم اس کی طرف بڑھا۔

"ارے رے .... کیا کرتے ہو" اس کی پریشانی قابلِ دید تھی۔ "ٹھہرو ٹھہرو۔ میں چلتی ہوں۔ چلتی ہوں بابا"

چند منٹ بعد میں رابعہ کے ساتھ مسکراتا ہوا کھانے کے کمرے میں پہنچا لیکن انکل رضوی پر نگاہ پڑتے ہی میری مسکراہٹ منجمد ہو گئی اور میں ساری شوخی بھول گیا۔ "دیکھیے انکل! مجھے معلوم ہے کہ آپ بہت خفا ہیں۔ لیکن پہلے آپ مجھے کھانا کھانے دیں۔ پھر اپنے کمرے میں لے جا کر میری گوشمالی کریں یا بے عزتی خراب فرمائیں۔ مجھے منظور ہے۔ لیکن میں بھوک سے ویسے ہی فوت ہونے والا ہوں۔ اس پر آپ نے مجمعِ عام میں پاپوشِ مبارک سے سرفراز فرمایا تو...."

انکل رضوی مسکرائے۔ "بہت ڈھیٹ اور نامعقول ہو۔ چلو بیٹھو اور کھانا کھاؤ۔" میرا خیال ہے میرے آنے سے پہلے ہی بیگم رضوی نے انہیں کسی شفیق ماں کی طرح سمجھا دیا تھا کہ خیر سے گھر لوٹ کے آنے والے بدھو پر ایک دم جوتا لے کر مت پل پڑنا۔ پہلے اس کی سُن لینا۔ ورنہ میرے مسخرے پن پر وہ اور بھڑک اٹھتے۔

"کچھ نہیں انکل"، محسن نے مایوسی سے کہا۔ "یہی وقت تھا اس کا دماغ درست کرنے کا۔ آپ کو پولیس کے بجائے محکمۂ انسدادِ بے رحمیِ حیوانات میں ہونا چاہیے تھا۔"

کھانے کے بعد بند کمرے میں ایک اجلاس ہوا۔ انکل رضوی، رابعہ اور محسن کی طرف سے مجھ پر ایک ہی الزام تھا کہ سیدھی طرح گاڑی لے کر گھر آنے کے بجائے مجھے خالی ہاتھ ممنوعہ علاقے میں نہیں جانا چاہیے تھا۔ میں نے اپنی غلطی تسلیم کی اور اس کے بعد پیش آنے والے تمام واقعات بلاکم و کاست سُنا دیے۔ میرا بیان کوئی ایک گھنٹہ جاری رہا۔ محسن صوفے پر نیم دراز رہا اور انکل رضوی ہاتھ پیچھے باندھے کمرے میں ٹہلتے رہے۔

"میں تو گھر آتے ہی سو گیا تھا اور شام کو اٹھا" محسن نے کہا۔ "جب رات ہوئی تو مجھے فکر لاحق ہوئی۔ پہلے تو میں یہی سمجھا کہ مکینک نے کام وقت پر پورا نہیں کیا ہو گا لیکن دیر کی ایک حد ہوتی ہے۔ میں رکشا لے کر گیراج گیا تو گاڑی تیار تھی۔ مالک نے کہا کہ کام تو مغرب کے وقت ہی ختم ہو گیا تھا لیکن کوئی لینے ہی نہیں آیا۔ میری جیب میں اتنی رقم بھی نہیں تھی کہ مرمت کے اخراجات ادا کر کے گاڑی لے آتا۔ میں نے کہا اچھا، میں دیکھ کے آتا ہوں۔ مقبرۂ جہانگیر جانے کا کوئی وقت نہیں تھا۔ میں نے سینما کا رُخ کیا جہاں مسرت نذیر کی تہلکہ خیز فلم یکے والی چل رہی ہے۔ آپ نے دیکھی ہے انکل؟"

"کیا؟" رضوی صاحب نے چونک کر کہا۔ "لاحول ولا قوۃ...."

میں نے بڑی مشکل سے ہنسی ضبط کی۔

"خیر۔ اب کرنا خدا کا یہ ہوا کہ راہ میں میری نظر "ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس" کے بورڈ پر چلی گئی۔ اسے آپ چھٹی حس کہیں یا ٹیلی پیتھی یا کچھ اور۔ مگر میں رک گیا اور مجھے خیال آیا کہ کیا میں یہاں سے گزرتا اور سکندر ریخت ہوتا تو میرے قدم آگے بڑھتے؟ جواب نفی میں آیا کیونکہ میں اس کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ میں نے سوچا پوچھ لینے میں کیا ہرج ہے۔ جب چوکیدار نے مجھے صرف بریف کیس دیا تو میں چکرا گیا۔ صرف بریف کیس؟ وہ آدمی کہاں جس کا بریف کیس تھا؟ چوکیدار نے جانتے بوجھتے یا بے خبری کے باعث کہا کہ اندر کوئی نہیں۔ فیکٹری بند ہو چکی ہے۔ اس نے کہا کہ اندر جانے کا کوئی سوال نہیں۔ میری تمام ہرج بے کار تھی۔ اس کے پاس ہر سوال کا ایک ہی جواب تھا۔ مجھے نہیں معلوم۔ وہاں کھڑے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں بریف کیس لے کر مین روڈ پر آ گیا اور ایک گھنٹے تک کھڑا رہا۔ ٹرک میرے سامنے نکلا تو میں نے فوراً رکشا ٹیکسی تلاش کیے۔ اگر اس وقت میری جیب میں اتنی رقم ہوتی کہ میں کار چھڑا سکتا تو تعاقب کرنا کوئی مسئلہ نہ ہوتا۔ رکشا مجھے ملا وہ دس منٹ بعد ملا اور جب چلا تو مجھے اندازہ ہوا کہ اس کی رفتار سائیکل کے برابر بھی نہیں۔ پانچ چھ میل کے بعد اس کے پلگ میں کچرا آ گیا اور اس نے سیٹ اٹھا کے پلگ نکالا۔ میں نے اس پر لعنت بھیجی اور دوسرے رکشے کا انتظار کرنے لگا۔ پھر بند جانے والی ایک ویگن آ گئی اور میں اسی میں بیٹھ گیا۔ افسوس مجھے یہ تھا کہ میں نے ٹرک کا نمبر نہیں دیکھا۔ ایک تو موڑ پر اندھیرا تھا۔ نمبر پلیٹ کو روشن رکھنے والی لائٹ بجھی ہوئی تھی۔ اس کے باوجود مجھے امید تھی کہ راستے میں کہیں نہ کہیں میں ٹرک کو دیکھوں گا تو پہچان لوں گا۔ ویگن کی رفتار ٹرک سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن پہلے تو ویگن ایک جگہ ڈیزل بھروانے کے لیے رک گئی۔ قسمت کی خرابی دیکھو کہ ویگن کے پیٹرول پمپ پر پہنچنے تک بجلی بند تھی۔ اِدھر ویگن کی باری آئی اُدھر بجلی غائب۔ خیر انہوں نے ہاتھ سے ہینڈل گھما کے ڈیزل بھر دیا۔ ایک ایک منٹ کا انتظار میرے لیے دوبھر تھا اور میں یہ حساب لگا رہا تھا کہ ٹرک اتنی دیر میں کہاں پہنچ چکا ہو گا۔ خدا خدا کر کے ویگن پھر چلی اور ابھی بیس پچیس میل دور ہی گئی ہو گی کہ اس کا ایک ٹائر فلیٹ ہو گیا۔ اس وقت گوجرانوالہ شہر کی روشنیاں سامنے نظر آ رہی تھیں۔ عام حالات میں پہیہ بدلنا دس پندرہ منٹ کا کام ہوتا ہے لیکن ان کے پاس جیک نہیں تھا۔ میں ذرا گرم ہوا کہ گاڑی ایسے ہی لیے پھرتے ہو تو کہنے لگے کہ جیک چوری ہو گیا تھا ابھی کسی سے لے لیتے ہیں۔ پھر وہ سڑک پر کھڑے ہو کر آنے والی ویگن کو ہاتھ دیتے رہے۔ آدھے گھنٹے بعد ایک ویگن کے ڈرائیور نے اس کی مدد کی لیکن اس وقت تک میں بالکل مایوس ہو چکا تھا اور مجھے یہ خیال بھی تھا کہ سکندر تو گیا ہی تھا، میں بھی واپس نہ پہنچا تو انکل رضوی کہیں گے کہ لو۔ یک نہ شد دو شد۔ میں واپس لوٹ آیا اور میں نے انکل کو ساری بات بتا دی۔"

خاموش ہوا۔

"میں نے اسی وقت چوہدری دلاور کے گھر فون کیا تھا" انکل رضوی نے کہا۔ "لیکن حسبِ توقع اس نے یہی کہا کہ سکندر صاحب سے ملے تو زمانہ ہو گیا۔ میں نے کہا پھر تمہارے چوکیدار کے پاس سکندر کا بریف کیس کیسے پہنچا؟ کہنے لگا جنابِ عالی یہ آپ اسی سے جا کے پوچھیں۔ میری دھمکی کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ کہنے لگا اپنے ایس پی صاحب! ہم قصوروار ہوں تو بے شک پھانسی لگوا دیجیے۔ آپ حاکم ہیں۔ مگر ایسے تو نہ کریں۔ سکندر کہیں چلا گیا ہے تو کیا شہر میں کسی کو بھی پکڑ کے اس سے زبردستی اعترافِ جرم کرا لیں گے کہ وہی سکندر کا قاتل ہے۔ پھر میں کیا کہتا اس سے۔ میں اور محسن فیکٹری پہنچے لیکن وہاں وہ چوکیدار ہی نہیں تھا جس نے محسن کو تمہارا بریف کیس دیا تھا۔ اسے میں نے شاہدرہ پولیس اسٹیشن بھجوا دیا تھا جس کا مجھے افسوس ہے۔ اس نے کہا کہ وہ تو ابھی ابھی ڈیوٹی پر آیا ہے۔ اس سے پہلے چوکیدار کون تھا یہ اسے بالکل معلوم نہیں۔ صبح میں نے سرچ وارنٹ حاصل کیے اور فیکٹری کے اندر کونا کونا چھان مارا لیکن تم وہاں ہوتے تو ملتے۔"

"تلاشی کے دوران میں آپ کو وہاں کوئی ایسی چیز نہیں ملی جس کا تعلق کاروبار سے نہ ہو" میں نے کہا۔ "کوئی غلط قسم کی یا مشتبہ بات نوٹ نہیں کی آپ نے؟"

رضوی صاحب نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہاں وہی ہو رہا تھا جو ہونا چاہیے۔"

"دلاور دور اندیش آدمی ہے" میں نے کہا۔ "اسے یقین ہو گا کہ صبح چھاپا ضرور پڑے گا۔ اس نے راتوں رات سب صاف کر دیا۔"

"کیا صاف کر دیا؟" انکل رضوی نے بے خیالی میں کہا۔

"دیکھیے نا انکل! وہاں کوئی نہ کوئی غیر قانونی کاروبار ضرور ہوتا ہے" میں نے کہا۔ "ورنہ وہ مجھے کاروبار سے الگ رکھنے کے لیے اتنے جتن نہ کرتے۔ اگر میں پارٹنر بن جاتا تو وہ فقیر نہیں ہو جاتے۔ دلاور کا منافع آدھا رہ جاتا نا، یہ آدھا بھی کم تو نہیں ہوتا۔ پھر یہ سب کچھ کیوں کیا اس نے؟ لندن میں نمائندہ بن کے لاکھوں روپے کمانے کی پیشکش، یکمشت رقم کی ادائیگی کی پیشکش تاکہ میں اس کاروبار سے دستبردار ہو جاؤں اور مجھے کسی نہ کسی طرح تختۂ دار تک پہنچانے کی سازش۔ وہ تو ہم نے انتظام ایسا کر لیا ہے کہ میرے قتل سے بھی ان کو فائدہ نہیں ہوتا۔ ایک کے بعد دوسرا وارث آ جائے گا۔ دلاور بزنس سے زیادہ منافع دینے کو تیار ہے۔ سلیپنگ پارٹنر بنانے کو تیار ہے مگر عملی طور پر کاروبار میں دخل اندازی کا حق دینے کے لیے تیار نہیں۔ وہ چاہتا ہے میں کاروبار سے دُور رہوں۔ آخر کیوں؟ ظاہر ہے اس کو خطرہ ہے کہ قریب رہ کر میں اصل کاروبار کی نوعیت جان لوں گا۔ اور وہ میرے سامنے اعتراف بھی کر چکا ہے کہ یہ جائز کاروبار دوسرے ناجائز کاروبار کا پردہ ہے۔ یہ دوسرا کاروبار کیا ہے؟"

"مجھے اس سلسلے میں کوئی خصوصی تفتیشی ٹیم تشکیل دینی پڑے گی" ضامن رضوی صاحب نے کہا۔ "ان کی سرگرمیاں حد سے بڑھتی جا رہی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے قانون کوئی چیز ہی نہیں۔ جسے چاہا اٹھا لیا، جسے چاہا مروا دیا اور ان کا حوصلہ اس لیے بڑھتا جا رہا ہے کہ وہ ابھی تک گرفت میں نہیں آئے مگر ان کے ننانوے دن پورے ہو چکے ہیں۔ ایک دن اور سہی۔ اس سے اگلا دن کو زوال کا ہو گا۔"

میں نے اور محسن نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ رضوی صاحب مستقل مزاج اور دُھن کے پکے تو مشہور ہی تھے۔ اس وقت وہ برہم بھی تھے اور یہ برہمی اپنی بے بسی پر تھی۔ "آپ کی یہ خصوصی ٹیم کیا کرے گی انکل؟" میں نے ایک فضول سا سوال کیا۔

"ابھی سے کیا بتا دوں تمھیں کہ کیا کرے گی؟" انکل رضوی نے چڑ کے کہا۔ "ہر ٹیم اپنے طریقۂ تفتیش کو حالات کے مطابق طے کرتی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ عام کارکن کی حیثیت سے فیکٹری میں بھرتی ہو جائیں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "ہر سیکشن کے فورمین کو میں دیکھ چکا ہوں۔ وہ دلاور کے اپنے آدمی ہیں۔ ڈی سلوا کی جگہ وہ بیڈ ز کو احمد نواز گردیزی بنا کے لایا ہے۔ کچھ تجربہ اسے ہے۔ باقی راہنمائی دلاور کرے گا اور اسے چلائے گا۔ میرا خیال ہے کہ یہ فورمین اپنے اپنے سیکشن کے آدمی خود دیکھتے ہوں گے۔ اگر والد مرحوم زندہ ہوتے یا میر شرافت علی ہی ہوتا تو معلوم ہو جاتا کہ پرانے وفادار کارکن کتنے ہیں اور نئے آدمی کتنے۔ میں تو کسی کو بھی نہیں پہچانتا، نہ وہ مجھے جانتے ہیں۔ دلاور اینڈ کمپنی نے ایک ایک کر کے سب پرانے آدمی نکال باہر کیے ہوں گے اور جیسے جیسے بھروسے کے آدمی ملتے گئے ہوں گے، انھیں رکھتے گئے ہوں گے۔ بے شک ہر راہ چلتے کو ایک مخصوص مہارت کا مشینی کام نہیں سونپا جا سکتا لیکن ان مشینوں کو چلانے کے لیے کوئی ڈگری یا کورس نہیں کرنا پڑتا۔ جسے بھی خراد کا کام آتا ہو وہ ان مشینوں پر کام کر سکتا ہے اور خراد کی مشین کا استعمال تین مہینے میں آ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ تربیت یافتہ افراد بھی لالچ میں ضمیر فروش بن سکتے ہیں۔"

"ابھی تو میرا خیال ہے کہ تمھارے ساتھ ایک بار دلاور سے ملاقات کروں" رضوی صاحب نے کہا۔

"دوسرا کام آپ یہ کریں کہ سوہادہ سے آگے چکوال روڈ پر بائیں جانب کے علاقے پر نظر رکھیں۔ اُدھر کوئی ایسی جگہ ضرور ہے، جہاں ان لوگوں کے ناجائز کاروبار کا اڈا ہے۔"

"وہ سارا علاقہ سیکڑوں مربع میل میں پھیلا ہوا ہے۔"

رضوی صاحب نے کہا۔ "اس میں نہ جانے کتنے گاؤں ہوں گے۔ پہاڑیوں اور کھائیوں کا کوئی شمار نہیں۔"

"میں دائرہ کار کو کسی حد تک کم کر سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "یہ تو ظاہر ہے کہ طافے اور گامے کو ابھی کچھ اور آگے جانا تھا۔ جہاں وہ رُکے تھے وہاں تک میں پہنچ جاؤں گا۔ تلاش کا سلسلہ اس سے آگے شروع کیا جائے۔ میرا ایک خیال یہ بھی ہے کہ اُن کی منزل زیادہ دُور نہیں رہی تھی۔ جی ٹی روڈ پر اُن کو موقع نہیں ملا کہ گامے کو کچل سکیں۔ اسے زندہ سلامت منزل تک پہنچانا احکامات کی خلاف ورزی کے مترادف ہوتا۔ شاید ان سے پہلے دلاور خود پہنچ چکا ہوتا یا اس کے معاونین منتظر ہوتے۔ مثلاً وہ نقلی ڈی۔ ایس پی سراج۔ وہ نقلی نواب خسرو جمشید۔ یا پیڈرو۔ اس مقام سے آگے جہاں طافے اور گامے نے ایک دوسرے کو مار ڈالا اور جکوال سے پہلے ہی کہیں کوئی خفیہ جگہ ہوگی۔"

"ایسے لوگ خطرے کا احساس ہوتے ہی ٹھکانہ بدل لیتے ہیں۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "وہیں فتح جنگ کے پاس انتہائی خطرناک قسم کا دشوار گزار جنگل بھی ہے۔ خیر یہ بعد کی باتیں ہیں۔ ناشتا کر کے تم میرے ساتھ چلو۔ تم دونوں!"

نو بجنے میں پندرہ منٹ پر ہم رضوی صاحب کی جیپ میں "ایم ڈبلیو ڈی کمپلیکس" پہنچے۔ وہ ایس ایس پی کی وردی میں تھے۔ چنانچہ دربان کی جرأت نہ ہوئی کہ اُن کا راستہ رُوک کے تشریف لانے کا مقصد پوچھے۔ جاسوسی ناول پڑھنے والا نوجوان کھڑا ہوا اور دم بخود کھڑا رہا۔ جیپ اندر داخل ہوئی اور بائیں طرف گھوم کے دلاور کے آفس کے سامنے رک گئی۔ دلاور کے پی اے نے بڑی پھرتی دکھائی اور فوراً انٹر کام اٹھا کے دلاور سے کچھ کہا۔ اس نے یقیناً ایس ایس پی کے دوبارہ اور میرے ہمراہ آنے کی اطلاع دے دی تھی لیکن دلاور نے حسب سابق بڑے سکون اور اعتماد کا مظاہرہ کیا۔ جب ہم نے دروازہ کھولا تو وہ غور سے کسی فائل کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے سر اٹھا کر ہمیں دیکھا اور مسکرا کر آہستہ آہستہ اٹھا۔

"واہ بھئی واہ! صبح صبح بڑی بڑی ہستیاں آ رہی ہیں آج تو۔ بڑا مبارک دن ہے۔" اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

اس کا رویّہ اور لہجہ دونوں ایسے تھے کہ نہ اُن سے کسی قسم کی مسرت کا احساس ہوتا تھا نہ حیرت کا۔ وہ ہمیں دیکھ کے نہ پریشان ہوا تھا نہ برہم۔ یہی ایس ایس پی ایک دن پہلے سرچ وارنٹس کے ساتھ اپنی پولیس فورس لے کر اس کی فیکٹری پر چڑھائی کر چکا تھا۔ گزشتہ رات اس کا ایک مشن ناکامی کا شکار ہو چکا تھا اور اس کے دو کارندے اس ناکامی کی نذر ہو گئے تھے مگر اس کی صورت سے نہ تو افسوس کا اظہار ہوتا تھا نہ پشیمانی کا، نہ جھنجلاہٹ کا اور انتقامی جذبات کا۔ میں اور وہ تو ایک دوسرے کے باقاعدہ... تھے۔ محسن میرا دست راست تھا اور ضامن رضوی صاحب اس کے خلاف ہی تھے۔ اس کے باوجود وہ اتنے تپاک سے ملا جیسے ہم روز کے آنے والے ہیں اور آج بھی ہمارا آنا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ رضوی صاحب کی وجہ سے ہم نے بھی اپنی متانت برقرار رکھی اور خاموشی سے مصافحہ کر کے بیٹھ گئے۔

"کیا حکم ہے غلام واسطے؟" اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر انکسار کے ساتھ کہا۔ "لیکن پہلے بتائیں کہ ٹھنڈا چلے گا یا گرم" اور جواب کا انتظار کیے بغیر انٹر کام اٹھا لیا۔

"کچھ نہیں۔" رضوی صاحب نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ "ابھی ناشتا کر کے گھر سے نکلے ہیں۔"

"پھر کیا ہوا جی۔ وہ تو بڑی دیر ہو گئی۔" وہ مسکرایا۔ "ایک پیالی کی جگہ تو ہر وقت رہتی ہے۔"

"مسٹر دلاور! یہ بات کل بھی ہوئی تھی کہ ڈیوٹی پر میں خاطر تواضع قبول نہیں کرتا۔" رضوی صاحب کا لہجہ اور سخت ہو گیا۔

"اچھا جناب عالی!" وہ ہتھیار ڈالنے کے انداز میں بولا۔ "سکندر صاحب تو ڈیوٹی پر نہیں ہیں اور ان کے یہ دوست تو بار آئے ہیں!"

"دوسری بار۔" محسن نے یاد دلایا۔ "میں کل شام بھی تشریف لایا تھا لیکن باہر سے ہی لوٹ گیا تھا۔"

"باہر سے کیوں جی؟" دلاور نے افسوس اور حیرت کا اظہار کیا۔ "اندر آنے میں کیا تھا! کوئی ناراضگی تھی ہم سے؟"

"مجھے اندر آنے ہی نہیں دیا گیا تھا۔" محسن بولا۔ "چوکیدار نے مجھے ایک بریف کیس تھما کے واپس کر دیا تھا۔"

"کون سا بریف کیس؟ اور کون بدتمیز چوکیدار تھا وہ؟" ... سے بولا۔ "میں ابھی معلوم کرتا ہوں۔"

"تمہیں سب معلوم ہے۔" رضوی صاحب نے میز پر ہاتھ ... "لیکن تم اداکاری اچھی کر لیتے ہو۔ کل رات تمہاری فیکٹری میں ... کے ساتھ کیا ہوا تھا وہ چھ فورمین کہاں ہیں جنہوں نے اسے بے ہوش ... اور ایک صندوق میں بند کر دیا تھا؟"

دلاور تصویر حیرت بن گیا۔ "رات کو؟ کس وقت؟ اپنے ... صاحب! فیکٹری تو پانچ بجے بند ہو گئی تھی۔"

"بکواس مت کرو۔" رضوی صاحب نے گرج کر ...

"اُن سب کو حاضر کرو۔ سب کو شناخت کے لیے لائن ... کرو۔"

"جو حکم عالی جاہ! لیکن بات آہستہ ..."

اس نے مرعوب ہوئے بغیر پھر انٹر کام اٹھا لیا۔ "او میاں! یہ جتنے بھی فورمین ہیں نا، سب کو میرے پاس بھیج دے۔ فوراً۔"

"تمہارا ایک فورمین غلام محمد بھی ہے۔" میں نے کہا۔ "گامے کے نام سے مشہور ہے۔"

"ہوگا۔ دراصل مجھے فیکٹری کے سب ورکرز کے نام ایسے یاد نہیں رہتے۔ صورت سے سب کو پہچانتا ہوں۔" وہ بولا۔

"اچھا تو الطاف عرف طافے نام کے ایک شخص کو بھی بلوا لو۔" میں نے کہا۔

"ابھی لو جی۔ او دیکھ میاں! کوئی الطاف ہے یہاں، طافا۔ ہاں اسے بھی حاضر کر۔" وہ انٹر کام میں بولا۔

چند منٹ بعد پہلا شخص اندر آیا۔ اس کی صورت میرے لیے اجنبی تھی۔ اس کے بعد پانچ افراد اور آ گئے اور ایک لائن میں کھڑے ہو گئے۔ ان سب کی صورتوں پر ایک جیسا سوالیہ نشان تھا اور ایس ایس پی کو دیکھ کر وہ مزید نروس ہو گئے تھے۔

"کل مجھے بتایا گیا تھا کہ فورمین سات ہیں۔" میں نے کہا۔

"ساتواں آدمی حکم عدولی کرتے ہوئے چلا گیا تھا۔"

"بولو بھئی! کل اپنے سکندر صاحب سے کیا بات ہوئی تھی؟" دلاور نے ان چھ افراد سے مخاطب ہو کر کہا جن میں ایک کی صورت بھی میں نے پہلے نہیں دیکھی تھی۔ مجھے ٹھوک پیٹ کے پیک کرنے کے لیے جو چھ افراد لائے گئے تھے وہ اور تھے۔ میں خود کسی کو کہاں پہچانتا تھا کہ اعتراض کرتا۔ چنانچہ چھ آدمی فورمین بنا کے میرے سامنے پیش کر دیے گئے تھے۔ ایک بات غور طلب تھی۔ وہ سب کام کی نوعیت کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات ضرور رکھتے تھے اور اس سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا کہ وہ مختلف ورکشاپس کے ملازم تھے یا انہیں باہر سے لایا گیا تھا۔ تب بھی وہ تربیت یافتہ فورس تھی جس کا اصل کام فیکٹری سے باہر تھا مگر وہ اندر کے معاملات میں بھی کورے نہیں تھے۔

"یہ سب لوگ مختلف ہیں۔" میں نے کہا۔ "اگر یہ فورمین ہیں تو وہ کون تھے جن کو فورمین بنا کے لائن اپ کیا گیا تھا۔ ساتواں آدمی کہاں ہے؟"

دلاور نے سر کھجایا۔ "آپ کی بات کچھ اپنے پلے نہیں پڑ رہی ہے۔ فورمین تو یہی ہیں اپنے سکندر صاحب! کُل چھ۔"

"ان میں غلام محمد عرف گاما بھی ہے؟" میں نے کہا۔

"ضرور ہوگا جی۔"

ایک لاغر اور بانس جیسا شخص آگے بڑھا۔ "غلام محمد میرا نام ہے۔" اس نے کہا۔ جسم کے مقابلے میں اس کی آواز حیرت انگیز طور پر بھاری تھی۔

رضوی صاحب بڑے غور سے اُنہیں دیکھ رہے تھے اور اُن کے ماتھے کی ہر شکن ظاہر کرتی تھی کہ وہ سب کچھ سمجھ رہے ہیں۔ ایک ایک کر کے ہر فورمین نے اپنا تعارف کرایا۔ شناختی کارڈ دکھایا۔ یہ بتایا کہ وہ کب سے ملازم ہے اور کیا کرتا ہے۔ وہ سب سچ بول رہے تھے۔ چنانچہ شبہے کی اب کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ گزشتہ شام چھ افراد کی خصوصی ٹیم برآمد کی گئی تھی اور وہ سب دلاور اینڈ کمپنی کے غیر قانونی کاروبار کو چلانے والے لوگ تھے جن کا فیکٹری سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ چوکیدار پرانا آدمی تھا لیکن وہ باہر کھڑا تھا۔ اگر میں اس سے پوچھتا تو وہ یقیناً بتا دیتا کہ ان میں سے فورمین کوئی نہیں لیکن مجھے شک ہی نہیں ہوا تھا کہ دلاور اتنے کم وقت میں بھی اتنی کامیابی سے اس قسم کا چکر چلا سکتا ہے۔ شاید چوکیدار کا قصہ پاک کرنے کا ایک سبب یہ بھی ہو کہ بوقت ضرورت وہ گواہ نہ ہو سکے۔ انکل رضوی کے سوالات کے جواب میں ان لوگوں نے بتایا کہ وہ پندرہ سے بیس سال کا تجربہ رکھتے ہیں اور انھیں خود مرحوم وزیر خان نے ملازم رکھا تھا۔ وزیر خان کے متعلق اُن کی معلومات وہی تھیں جو عام طور سے مشہور تھیں کہ وہ بیمار رہنے لگے تھے اور بہت کم آتے تھے۔ آخری دنوں میں انھوں نے عملاً کنارہ کشی اختیار کر لی تھی اور سارے معاملات میر خیرات علی پر چھوڑ دیے تھے۔ چودھری دلاور صاحب میر صاحب کے ساتھ مل کر کاروبار کو چلاتے رہے۔ وزیر خان کے انتقال تک۔

میں نے حوصلہ نہیں ہارا۔ "طافے یعنی الطاف کو نہیں بلوایا گیا۔"

"ابھی بلا لیتے ہیں جی۔ کسی کام میں لگا ہوا ہوگا۔" دلاور نے انٹر کام اٹھایا۔ "او یار اس طافے کے بچے کو گردن سے پکڑ لا۔"

طافے کی صورت میرے لیے اجنبی نہیں تھی۔ میں نے اسے پہلے بھی کہیں دیکھا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ الیکٹریشن ہے اور فیکٹری میں بجلی کی ہر خرابی دور کرنا اسی کا کام ہے۔ مجھے ذہن پر زور دینے کے باوجود یاد نہیں آ رہا تھا کہ اس شخص سے پہلے کب اور کہاں ملاقات ہوئی ہے۔ لیکن اس نے اپنے الیکٹریشن ہونے کا ذکر کیا تو یکلخت وہ پورا منظر میری نظروں میں گھوم گیا۔ جب مجھے کسی فلم میکر کی خالی کوٹھی میں لے جایا گیا تھا جہاں میرے سامنے خیرہ کن سرچ لائٹس لگا دی گئی تھیں تاکہ میں عملاً اندھا ہو جاؤں۔ پھر دلاور نے ایک روشن پردے کے پیچھے سے سایہ بن کر گفتگو کی تھی۔ وہاں سرچ لائٹس لانے والا۔ صحیح زاویے پر نصب کرنے والا اور جلانے، بجھانے والا یہی شخص تھا۔ مجھے اس کے لبوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ کا شبہ بھی ہوا۔

"میں داد دیتا ہوں تمہاری چالاکی اور عیاری کی۔" میں نے سب لوگوں کے چلے جانے کے بعد کہا۔ "تم نے بڑی صفائی سے میری آنکھوں میں دھول جھونکی۔"

"یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں اپنے سکندر صاحب!" وہ بُرا مانے بغیر بولا۔ "ہم اور آپ ہی تو پارٹنر ہیں بزنس میں۔"

"چھوڑو یہ باتیں۔" رضوی صاحب نے اچانک کہا۔ "وہ چوکیدار کہاں ہے جس نے محسن کو بریف کیس دیا تھا۔"

"چوکیدار تین ہیں اپنے ایس پی صاحب۔" دلاور نے کرسی کی پُشت کا سہارا لے کر بالوں میں ہاتھ پھیرا۔ "اور اُن کی ڈیوٹی بدلتی رہتی ہے۔ اَب دیکھیں نا، کوئی بھی رات بارہ بجے سے صبح آٹھ بجے تک ہر روز ڈیوٹی دینا نہیں چاہتا۔ رات بھر گھر سے باہر رہنا پڑتا ہے نا جی۔ اس لیے ہم نے ایک انتظام کر رکھا ہے۔ باری باری شفٹ بدلتی رہتی ہے۔"

"کل پانچ بجے کون ڈیوٹی پر تھا؟" میرے ضبط کا پیمانہ چھلکنے والا تھا اور اگر انکل رضوی نہ ہوتے تو شاید میں دلاور کی گردن پر نوکِ خنجر رکھ کر سچ اُگلوا لیتا۔ دلاور حیرت انگیز طور پر سرد مزاج تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ اسی طرح وہ اپنے حریف کو اعصابی شکست دے سکتا ہے۔ نہ وہ خود مشتعل ہوتا تھا اور نہ ایسا موقع آنے دیتا تھا کہ کوئی اور مشتعل ہو۔

"یہ ڈیوٹی کا چارٹ دیکھنا پڑے گا۔" وہ بولا۔ "ایک تو گیا ہو گا چار بجے چھٹی کر کے۔ جو کل چار بجے سے بارہ بجے رات تک ڈیوٹی پر تھا۔ وہ آج رات بارہ بجے سے کل صبح کے آٹھ بجے تک ملے گا۔"

"تمہارے پاس اسٹاف کے پتے تو ہوں گے۔ جہاں ہنگامی ضرورت میں تم ان سے رابطہ قائم کر سکو۔"

"ہاں۔ ایک رجسٹر تو ہے۔" وہ بے نیازی سے بولا۔ "لیکن ہوتا یہ ہے اپنے سکندر صاحب کہ جب کوئی گھر بدلتا ہے تو ہمیں نہیں بتاتا۔ حالانکہ اس کا فرض ہے کہ نئے پتے سے مطلع کرے۔ بہت کم لوگوں کے پتے اَپ ٹو ڈیٹ ہوں گے۔ پھر بھی دیکھ لیتے ہیں۔"

اس نے پھر اپنے پی اے سے بات کی اور اُسے مطلوبہ رجسٹر لانے کے لیے کہا۔ اس میں چوکیدار فلک شیر کا وہی پتا درج تھا جو اس نے مجھے بتایا تھا۔ محلّہ بی بی پاک دامن میں ایک کمرے کا مکان۔ اچانک مجھے ایک اور بات یاد آئی۔ فلک شیر نے کہا تھا کہ وہ اپنے بھانجے غلام محمد کے ساتھ رہتا ہے جو فیکٹری میں فورمین ہے۔ لیکن فورمین غلام محمد بالکل مختلف آدمی تھا۔ چوکیدار مجھ سے جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔ نیّت اور اعمال کی خبر صرف خدا کو ہے۔ اس نے گامے کو اپنی منہ بولی بہن کا بیٹا کہا تھا، جب کہ اس کی بیوی کے بیان

کے مطابق وہ فلک شیر کا بیٹا تھا۔ اس جھوٹ یا مصلحت ...
قطع نظر چوکیدار کو یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ گاما فیکٹری میں فورمین ہے۔ شاید وہ گاما اکثر فیکٹری میں آتا جاتا ... وہ چوہدری دلاور کا کارندہ تھا اور اس نے خود ہی فلک شیر ... جھوٹ بولا تھا کہ وہ فورمین ہے۔ اب وہ مر چکا تھا اور فلک ... بیوی بچوں کے ساتھ خیبر میل میں کراچی کی جانب رواں تھا ... محلّہ بی بی پاکدامن جانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہاں مکان ... اور ہمارے کسی سوال کا جواب دینے والا کوئی نہ ہو گا۔ رات ... بجے آ کے ہم مزید بے وقوف بنتے۔

خود رضوی صاحب کنفیوژن میں مبتلا تھے۔ گزشتہ روز ... اور آج کی جرح رائیگاں گئی تھی۔ "اچھا مسٹر دلاور!" انہوں نے ... بعد کہا۔ "تمہارے ریکارڈ پر ہر قسم کی گاڑیوں کی فہرست تو ہو ..."

"بالکل ہے جناب عالی! اس میں سب کچھ ہے۔ کون سی ... کب خریدی گئی تھی۔ کتنے میل چل چکی ہے۔ کتنی بار سروس ہو چکی ..." وہ بولا۔ "ہر گاڑی کی لاگ بک الگ ہے۔ اس میں تو یہ بھی روز ... جاتا ہے کہ گاڑی کہاں گئی تھی۔ کتنے میل چلی۔ اس سے پیٹرول ... کے خرچ کا صحیح اندازہ رہتا ہے ورنہ یہ ڈرائیور تو لوٹ کر کھا ... کوئی سوال کیے بغیر کہ یہ تفتیش کس سلسلے میں کی جا رہی ہے اس ... کہ ہر گاڑی کی لاگ بک لائی جائے۔

ٹرک کا نمبر مجھے یاد تھا چنانچہ ایک لاگ بک میں نے ...
"یہ گاڑی کل کہاں تھی؟"

"آپ بھی خوب مذاق کرتے ہیں اپنے سکندر صاحب!" ...
"دراصل سارا قصور عمر کا ہے۔" وہ رضوی صاحب سے مخاطب ... بولا۔ "طبیعت میں تھوڑی سی شوخی ہے۔ اس گاڑی کو خود سکندر ... کل کہیں لے گئے تھے۔ اب ہم سے پوچھ رہے ہیں اور اب ... صاحب! ہم خود تو کبھی آپ سے شکایت نہ کرتے۔ لیکن بتانا ... پڑے گا۔ مجھے تو چوکیدار سے معلوم ہوا۔ یہ آج صبح گاڑی کو ... کے سامنے چھوڑ گئے اور چابیاں بھجوا کے چلے گئے۔ میں نے ... جا کے دیکھا تو بات کچھ سمجھ نہیں آئی۔ انہوں نے "میر وزیر اینڈ ..." کو "نذیر اینڈ کمپنی" بنا دیا تھا۔ پینٹ کھرچ کے۔ تھوڑی سی کاری ... انہوں نے نمبر پلیٹ میں بھی دکھائی تھی۔ معلوم نہیں نمبر بدلنے کا ... کیا تھا۔ اب الٹا مجھ سے پوچھ رہے ہیں۔ یہ تو آپ بتائیں اپنے ... صاحب کہ گاڑی کو آپ کل کہاں لے گئے تھے؟"

"کیا میرے پاس گاڑی کی چابیاں تھیں۔ اصل چابیاں ..." ... نے برہمی سے کہا۔

"اصل نقل کا تو ہمیں پتا نہیں جی۔ لیکن آپ تو جانتے ... بھی گاڑی کو اسٹارٹ کرنا ناممکن نہیں ہوتا۔" وہ بولا۔ "ایک ...

... جب چوکیدار نے مجھے وہ چابیاں لا کے دیں اور حلیہ بتلایا ... سمجھ گیا کہ اپنے سکندر صاحب ہی ہوں گے۔"

میں نے غصّے کو ضبط کیا۔ مجرم دلاور تھا یا طافی اور گامے کی ... لیکن کتنی آسانی سے الزام میری ذات پر آ رہا تھا۔ صرف اس ... جذباتی ہو کے میں نے ایک غلطی کی تھی اور نئے چوکیدار کو ... اپنے خلاف ایک گواہ بنا لیا تھا۔

"میرے آنے کا مقصد بھی یہی تھا چوہدری صاحب!" رضوی صاحب نے لہجہ بدل کے اٹھتے ہوئے کہا۔ "یہ ذرا غیر ذمے دار قسم کے لڑکے ہیں۔ شرارتیں کرتے رہتے ہیں لیکن کسی کو نقصان نہیں پہنچاتے۔ کچھ باتیں وضاحت طلب رہ گئی تھیں جن کی آج وضاحت ہو گئی۔"

"آپ ہزار بار تشریف لائیں جی۔" دلاور نے مصافحہ کرنے کے بعد اٹھ کے اپنا ہاتھ سینے پر رکھا۔ "ہم کوئی بُرا تھوڑی مانتے ہیں۔ وہ فارسی میں کچھ کہتے ہیں کہ جس کا حساب ٹھیک ہو وہ محاسبے سے نہیں ڈرتا۔ کوئی گستاخی ہوئی ہو تو معافی۔ خدمت کا موقع تو دیا ہی نہیں آپ نے۔" وہ دروازے تک ہمارے ساتھ آیا۔ "بے شک آپ رشوت نہیں لیتے۔ سارا زمانہ جانتا ہے۔ مگر چائے کی ایک پیالی تو رشوت میں شمار نہیں ہوتی۔ مہمان کے لیے اتنا تو سب ہی کرتے ہیں۔ خیر آپ کی مرضی۔"

اس نے محض اپنے اعتماد اور پُرسکون لہجے سے بات بگڑنے نہیں دی تھی اور یہ ایسی صلاحیت تھی جس کا اعتراف مجھے بھی کرنا پڑا۔ اتنی قوتِ برداشت کا مظاہرہ میرے لیے ناممکن تھا۔ دلاور کی جگہ میں ہوتا تو کسی ایس پی کو کمرے میں قدم نہ رکھنے دیتا۔

واپسی پر ضامن رضوی صاحب ذہنی طور پر غیر حاضر تھے اور میرا خیال ہے کسی گہری سوچ میں مستغرق تھے۔ میری ذہنی کیفیت بالکل مختلف تھی۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ دلاور کے پاس آ کے میں نے خود کو صرف بے وقوف ثابت کیا ہے۔ اور دلاور نے ایک بار پھر واضح کر دیا ہے کہ اس کا حصار کتنا مضبوط ہے۔

"میں نے یہ نوٹ کیا ہے کہ تم جذباتی ہو کے جارحانہ انداز اختیار کر لیتے ہو۔" رضوی صاحب نے اچانک کہا۔ "تمہارے مقابلے میں دلاور دفاعی کھیل کھیلتا ہے۔ پہلی غلطی تم نے یہ کی تھی کہ خالی ہاتھ اور اکیلے فیکٹری میں جا گھسے تھے۔ اس کی قطعی ضرورت نہیں تھی۔ پھر اندر پہنچ کر تم نے اپنے مالکانہ اختیارات کو بروئے کار لانے کی کوشش کی۔ حالانکہ یہ اختیارات قانونی طور پر تمہیں حاصل نہیں ہوتے اور اس کے لیے بہت غلط وقت کا انتخاب کیا۔ تم کسی وقت جاتے تو کچھ نہ ہوتا۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا انکل!" میں نے محسن کی طرف دیکھ کے کہا۔

وقت کوئی غلط کام ہو رہا تھا۔ ثبوت تو کوئی نہیں لیکن فرض کر لو کہ منشیات کی ایک کھیپ برآمد کے لیے تیار تھی ایسے وقت میں تمہیں اجازت نہیں دی جا سکتی تھی کہ تم چھاننے کے بہانے تلاشی لو۔ اور حقیقت جان جاؤ چنانچہ تمہیں وہ ٹیم ملی جو دوسرا دھندا کرتی تھی۔ انہوں نے تمہیں راستے سے ہٹا دیا اور اپنا کام کر لیا۔ نتیجہ کیا نکلا؟ یہ کہ خانہ تلاشی میں کچھ بھی نہیں ہوا۔ چھاپے بہت سوچ سمجھ کے مارے جاتے ہیں۔ طویل عرصے تک نگرانی کے بعد۔ مخبروں سے تمام معلومات حاصل کر لینے کے بعد اور فرار کے تمام راستے بند کر دینے کے بعد۔ تمہارا اچانک جانا چھاپے سے کم نہیں تھا۔ اگر تم آج جاتے تو دلاور خود تمہیں ہر ورکشاپ میں لے جاتا اور تمہیں اجازت دیتا کہ جس طرح چاہو اپنا اطمینان کر لو۔ جو چاہو دیکھ لو۔ وہ ایک چال آگے کی سوچتا ہے۔ اس کو معلوم تھا کہ تمہاری تلاش کا آغاز یہیں سے ہو گا۔ وہ اگر چاہتا تو یہ بریف کیس چوکیدار کو ملتا اور نہ تمہارا پیغام۔ لیکن اس نے ہمارے لیے جال پھیلایا تھا۔ ہم آئے اور جھک مار کے چلے گئے۔ دلاور کا کیا نقصان ہوا؟ اس کی پوزیشن تو اور کلیئر ہو گئی کہ ایس پی صاحب نے دشمنوں کی رپورٹ پر چھاپا مارا لیکن ملا کچھ نہیں۔ آئندہ چھاپا مارنے کی اجازت لینا اتنا آسان نہیں ہو گا۔ دوسری حماقت تم نے آج صبح کی۔ اگر تم اس ٹرک کو سڑک کے کنارے کسی جگہ بھی چھوڑ دیتے تو کیا حرج تھا۔ ٹرک بالآخر فیکٹری پہنچ جاتا۔ لیکن تم نے دلاور پر یہ جتلانے کی کوشش کی کہ تم کتنے بہادر اور عقلمند ہو۔ عقلمندی کے اس زعم میں تم بھول گئے کہ یہ نیا چوکیدار تمہارے خلاف ایک چشم دید گواہ ہو گیا ہے۔ دلاور جیسے دشمن کا مقابلہ ٹھنڈے دماغ سے اور عقل سے نہیں کرو گے تو منہ کی کھاؤ گے۔ مجھے تو اب کوئی امید نظر نہیں آتی کہ ہمیں کسی خفیہ ٹھکانے کا سراغ تک ملے۔"

"کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے خصوصی ٹیم تشکیل دینے کا پروگرام ختم کر دیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ اب مجھے سوچنا پڑے گا۔" انکل نے کہا۔ "دلاور سے میں پہلی بار ملا ہوں اور مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ وہ تم دونوں کے مقابلے میں بہت بھاری پڑتا ہے۔ تم اس کے سامنے طفلِ مکتب ہو۔"

"کیا آپ کے خیال میں یہ لوگ منشیات اسمگل کر رہے ہیں؟" محسن خفگی سے بولا۔

"نہیں۔ ابھی تک تو ایسی کوئی شہادت نہیں ملی۔" انکل رضوی نے کہا۔ "یہ کوئی اور چکر ہے۔ اچھا اب تم لوگوں کا پروگرام کیا ہے؟ مجھے تو پہلے ہی دفتر سے دیر ہو گئی ہے۔"

"آپ ہمیں کہیں بھی اتار دیں۔" میں نے کہا۔ "ہم گھر چلے جائیں گے۔ مجھے تو سونا ہے۔"

انکل رضوی نے جیپ روک لی۔ "میرا مشورہ مانو تو سوچ

سمجھے بغیر کوئی قدم مت اٹھاؤ۔ موقع ملے تو مشورہ کر لو۔ مجھ سے یا رابعہ سے۔ ورنہ کسی دن ایسے پھنسو گے کہ ہم بھی تمہارے لیے کچھ نہ کر سکیں گے۔" صاف ظاہر تھا کہ ان کا موڈ آف تھا۔

"آیا کچھ عقل شریف میں؟" محسن نے جیپ کے جاتے ہی طنز سے کہا۔

"ہر کام عقل پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔" میں نے کہا۔ "کچھ جذباتی فیصلے ناگزیر ہو جاتے ہیں۔ جب عقل ساتھ نہیں دیتی یا اتنی مہلت ہی نہیں ملتی کہ مشورے سے لائحہ عمل تیار کیا جائے۔ مثلاً اب میں سوچ رہا ہوں کہ "میر وزیر اینڈ کمپنی" کے آفس کا ایک چکر لگا کے سابق استاد پیڈرو کو بحیثیت احمد نواز گردیزی جنرل منیجر کام کرتے دیکھوں کیا خیال ہے آپ کا؟"

"اگر آپ نے آج اسے نہ دیکھا تو کیا آپ کا ہاضمہ خراب ہو جائے گا؟" محسن نے جھنا کر کہا۔ "گھر چل سیدھی طرح۔"

"شیروانی!" میں نے کہا۔ "دلاور نے تیری ہمت شکستہ کر کے بزدل بنا دیا ہے۔ اس وقت چوہدری دلاور بہت خوش ہو گا کہ اس نے ایس ایس پی صاحب کو دوسری شکستِ فاش دی۔ حالانکہ میرا خیال ہے اب اس کی خیر نہیں۔ رضوی صاحب نے اس کو مع ثبوت گھیرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔"

"گویا رضوی صاحب بھی شکاری ہو گئے ہیں؟" محسن نے کہا۔ "ہماری طرح۔"

"یہی سمجھ لے۔ دلاور نے فون پر پیڈرو یعنی احمد نواز گردیزی کو ہنس ہنس کے ہمارے آنے اور جانے کا احوال سنایا ہوگا اور گردیزی کو اس وقت بالکل توقع نہیں ہو گی کہ ہم اہلِ ایمان ہیں۔ ادھر ڈوبے اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے۔ وہ احمق ہے۔ نروس ہو جائے گا۔ اسی آفس میں ڈی سلوا کی اور میری چپقلش بلکہ جنگ ہو چکی ہے۔ ڈی سلوا دباؤ میں آ گیا تھا۔ اپنے استاد پیڈرو کی شان دیکھتے ہیں۔ کوا ہنس کی چال کیسے چل رہا ہے؟"

"ایڈونچر کوئی نہیں ہو گا۔" محسن نے کہا۔ "میں بالکل موڈ میں نہیں ہوں۔" ہم ایک رکشا میں بیٹھ کر گئے۔

"جہاں تک موڈ کا تعلق ہے خان صاحب!" میں نے کہا۔ "تو دل اس وقت میرا بھی چاہتا ہے۔ کیا چاہتا ہے؟ یہ آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ مگر رابعہ کورٹ میں ہو گی اور ضابطہ فوجداری و دیوانی کے چکر میں سب بھول گئی ہو گی۔ ضابطۂ عشق کی دفعہ ایک سو نو۔"

"ایک سو نو آوارہ گردی ہوتی ہے۔" محسن نے مجھے مطلع کیا۔

"یہ ظالم سماج عشق کو آج بھی آوارہ گردی ہی سمجھتا ہے حالانکہ آوارہ گردی عشق کے نصاب میں شامل ہے۔" میں نے کہا۔ "مثلاً خانۂ مجنوں صحرا گردِ بے دروازہ تھا۔ وہ جنگلوں میں بھٹکتے پھرتے تھے۔ چنانچہ میرے تصوّر میں اور کچھ زنانہ رومانی ناولوں کا سا منظر ہے کہ چودھویں

کی رات۔ لبِ جوئبار اور دامنِ کوہسار۔ سرو سمن اور مرغزار۔ سہانی وہ جانِ بہار۔ لیکن حاضر اسٹاک میں کیا دستیاب ہے؟ دوپہر کا تارکول کی پکی سڑک۔ جوتیاں چٹخاتا ہیرو زیرِ ضمانت زیرِ دفعہ اور ہیروئن ندارد۔ چنانچہ اب تصوّر سے ہی گزارا کیا ہے جیسے اسلام آباد میں آپ کی ممکنہ زوجہ کر رہی ہیں۔"

"یار تو نے کچھ پوچھا تھا اس سے؟" محسن نے نہایت بے دانت نکال کے پوچھا۔ "یاد کرتی تھی مجھے؟"

میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ "میں اس دلشکن، دل آزار اور دل موضوع سے گریز چاہتا تھا۔" میں نے کہا۔ "اس بدبخت کے ساتھ کچھ بزرگوں نے کیا یعنی زبردستی سے کام لے کر اس کا مستقبل تباہ کر دیا۔ بس کچھ وہ مجبور تھی اس لیے استحصال کا شکار رہی۔ مگر اب ایک انتقامی ردِ عمل کا شکار ہے اور دروغ برگردنِ راوی۔ سنوا ہر جوانِ رعنا و خوبرو کے ساتھ فرار پر کمربستہ ہے۔ میں نے اپنی گنہگار آنکھوں سے اس کے کمرے میں وحید مراد اور ندیم کی تصا دیکھی ہیں۔ علاوہ انکل رضوی اینڈ شیروانی کی تصاویر کے۔ یہ انکل

"اگر تو نے کچھ اس بندے کی تو میں رکشا سے کود جاؤں گا یا تجھے چھینک دوں گا۔" محسن نے جھلا کے کہا۔

"رکشا ڈرائیور کو پھینک دینے میں زیادہ فائدہ ہے۔" میں نے کہا لیکن اسی وقت رکشا رک گیا۔

میں اور محسن سیڑھیاں چڑھ کے اوپر پہنچے۔ خلافِ توقع کسی نے ہمارا راستہ نہیں روکا۔ چوکیدار اوپر کھڑا تھا جہاں بائیں کا دروازہ اسٹاف روم میں کھلتا تھا اور بائیں طرف جنرل منیجر کا کمرہ

"کس سے ملنا ہے آپ کو صاحب؟" نئے چوکیدار نے دو وہ پرانے چوکیدار سے زیادہ مہذب تھا۔

"ملنا تو سب سے ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن تم اجازت دو گے۔ حاکم ہو۔"

"ہماری کیا مجال صاحب!" وہ سمجھا ہم اس کا مذاق اُڑا رہے ہیں۔ "میرا مطلب ہے آپ کو کس سے کام ہے تو ادھر جائیں۔"

"ہمیں ڈی سلوا صاحب سے ملنا ہے۔" میں نے سرسری بے نیازی سے کہا۔

"وہ۔۔ وہ تو۔۔ ان کا انتقال ہو چکا ہے صاحب!" اس نے ہماری کم علمی پر کہا۔

"اچھا!" میں نے کہا۔ "ہم استاد پیڈرو سے ملیں گے۔"

"کون استاد پیڈرو جناب؟" اس نے حیران ہو کے کہا۔

ہم اس کو جواب دیے بغیر جنرل منیجر کے کمرے میں داخل نقشہ میرا دیکھا بھالا تھا۔ پہلے وہی مختصر کمرہ آیا جس میں شہلا یہ جگہ نہ جانے کیوں ابھی تک خالی تھی۔ میں۔ ۔ رومانی درو کو دھکیلا اور اندر داخل ہوا۔ میرے قدم!

جو شخص جنرل منیجر کی جگہ بیٹھا تھا وہ استاد پیڈرو نہیں تھا۔ وہ تیس پینتیس سال کا اسمارٹ سا آدمی تھا۔ کھلتے ہوئے رنگ اور اکہرے جسم والا جس کے صاف شیو کیے ہوئے چہرے پر ہلکی ہلکی اور نفاست سے تراشی ہوئی مونچھیں تھیں۔ اس کے گھنے سیاہ بال درمیان سے دو حصے کر کے بنائے گئے تھے اور اس نے آنکھوں پر قیمتی سنہرے فریم والی عینک لگا رکھی تھی۔ وہ سوٹ میں آفس آیا تھا لیکن کوٹ اس نے ہینگر سے لٹکا دیا تھا اور اب بے داغ سفید قمیص، سلیٹی رنگ کی پتلون اور آڑی سیاہ و سفید پٹیوں والی ٹائی میں ملبوس تھا۔ چہرے کے نقوش کی ملائمت سے وہ تعلیم یافتہ اور مہذب لگتا تھا۔

"یس پلیز؟" وہ ہمیں دیکھتے ہی اٹھا۔ "تشریف لائیے۔" اس نے مجھے اور محسن کو مقابل کی نشست پر بیٹھنے کی دعوت دی۔

"وہ۔۔۔ دراصل ہمیں مسٹر احمد نواز گردیزی سے ملنا تھا۔" میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا اور گفتگو انگریزی میں کی۔

"احمد نواز گردیزی میں ہوں۔" اس نے بڑی شائستگی سے انگریزی میں جواب دیا۔ "فرمائیے؟"

اگر وہ کہتا کہ میں الٰہ دین کے چراغ کا جن ہوں تب بھی میں اور محسن اتنا نہ چونکتے۔ ہم نے پہلے ایک دوسرے کی طرف اور پھر غور سے اس دوسرے احمد نواز گردیزی کی طرف دیکھا جسے ہمارے رویّے نے تھوڑا سا حیران کر دیا تھا۔

"آپ کو یقین ہے۔۔۔ کہ آپ ہی احمد نواز گردیزی ہیں؟" محسن نے نہایت احمقانہ سوال کیا۔ "نئے جنرل منیجر؟"

وہ مسکرایا۔ "مجھے تو یقین ہے لیکن آپ لوگوں کو یقین نہیں آیا ہے، کیوں؟"

"کیونکہ ایک احمد نواز گردیزی سے ہم پہلے بھی مل چکے ہیں۔" محسن نے کہا اور خود کو مزید خفت سے بچایا۔

"اسی جگہ؟ میرا مطلب ہے کسی نے عمداً آپ کو دھوکا دیا تھا؟" وہ بولا۔

"جی۔ لیکن اسے ہم سے یہاں نہیں ملوایا گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "ہماری ملاقات باہر ہوئی تھی اور اس کے بارے میں یہی بتایا گیا تھا کہ وہ سابق جنرل منیجر مسٹر ڈی سلوا کی جگہ آیا ہے۔"

وہ کرسی کی پشت کا سہارا لے کر مجھے غور سے دیکھنے لگا۔ "ملوانے والا کون تھا؟ اور کیا مقصد تھا اس کا؟"

"ایک تو یہ بات بہت لمبی ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "اس کے علاوہ۔۔ میں یہ سمجھتا ہوں یہ ہمارے باہمی مفاد میں بھی نہیں کہ ملوانے والے کا نام اور مقصد ظاہر کیا جائے۔ ایک نہ ایک دن آپ کو معلوم ہو ہی جائے گا۔"

"آل رائٹ۔" وہ کسی تردد کے بغیر بولا۔ "یہ تو بتائیں گے آپ کہ وہ شخص خود کون تھا؟"

"استاد پیڈرو نام کے کسی شخص کو جانتے ہیں آپ؟" میں نے کہا۔

"استاد پیڈرو؟" اس نے حیرت سے دہرایا۔ "یہ بڑا عجیب سا نام ہے۔ میں نے پہلے کبھی نہیں سنا۔"

"شیخ مختار اور بیگم پارہ کی ایک فلم تھی۔" محسن نے کہا۔ "اس کا یہی نام تھا۔ پاکستان میں بھی ریلیز ہوئی تھی۔ نام ضرور سنا ہو گا آپ نے۔"

"آپ لوگ خود کون ہیں؟" وہ مشکوک لہجے میں بولا۔ "ابھی تک آپ نے اپنا تعارف نہیں کرایا ہے اور اپنے آنے کا کوئی مقصد بھی بیان نہیں کیا ہے۔"

"میرا نام سکندر ہے۔ سکندرِ اعظم نہیں، سکندر بخت۔" میں نے کہا۔ "ان دنوں بخت خراب ہیں لیکن سکندر ابھی تک ٹھیک ہے۔ میرے ساتھ میرا دوست ہے مسٹر شیروانی عرف محسن حسن خاں۔ ہمارے آنے کا مقصد صرف آپ سے ملاقات کرنا تھا۔"

"لیکن! میں تو آپ حضرات کو جانتا تک نہیں۔" حیرت زدہ گردیزی نے کہا۔ "ویسے فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔"

"آپ ہمارے لیے چائے یا کافی منگوا سکتے ہیں۔" میں نے جیب سے سگریٹ نکالی اور ایک اسے پیش کی۔ "جو بھی مل جائے۔"

"تھینکس۔" اس نے سگریٹ کی پیشکش کو مسترد کرتے ہوئے رکھائی سے جواب دیا۔ "میرا خیال ہے آپ غلط جگہ آ گئے ہیں۔ ریسٹورنٹ نیچے ہے۔ یہ آفس ہے میر وزیر اینڈ کمپنی کا۔"

"مجھے معلوم ہے۔" میں نے اطمینان سے سگریٹ جلا کے لائٹر اور پیکٹ محسن کو پکڑا دیے۔ "اس کے بانی اور ایک سابق مالک وزیر خان میرے والد تھے۔ ان کی وفات کے وقت میں انگلینڈ میں انجینئرنگ کی تعلیم مکمل کر رہا تھا۔ اب میں ان کا واحد وارث ہوں۔ میں نے حقِ وراثت کے لیے کیس فائل کر رکھا ہے چنانچہ آپ مجھے نصف فرم کا مالک سمجھ سکتے ہیں۔ میر شرافت علی کے بعد میں اور دلاور ہی رہ گئے ہیں۔"

اب اس کے حیران ہونے کی باری تھی۔ "آئی سی!" اس نے ابتدائی صدمے سے سنبھلنے کے بعد خوشگوار لہجے میں کہا اور دوبارہ مجھ سے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ "آپ نے بہت دیر میں بتایا۔ بہرحال۔ آپ سے مل کے خوشی ہوئی۔"

"میرے بچپن کے دوست اور کلاس فیلو مسٹر محسن کے والد وزارتِ خارجہ میں ڈپٹی سیکریٹری ہیں۔" میں نے ہاتھ ملا کے کہا۔

اس نے فوراً محسن سے بھی مصافحہ کیا اور تقریباً وہی الفاظ کہے جو مجھ سے کہے تھے۔ پھر اس نے کافی کا آرڈر دیا۔

"مسٹر ڈی سلوا کے پاس ایک سکریٹری تھی" میں نے کہا۔ "آپ نے ابھی تک کسی کا تقرر نہیں کیا؟"

"پرابلم یہ ہے مسٹر سکندر" وہ سوچتے ہوئے بولا۔ "کہ تقرر کریں گے مسٹر چوہدری۔ انہوں نے وعدہ کیا تھا۔"

"میرا خیال ہے کہ یہ کام آپ خود بھی کر سکتے ہیں" میں نے کہا۔ "اور بہتر ہوگا کہ آپ کریں۔ میں دلاور سے بات کرلوں گا۔"

"ٹھیک یو مسٹر سکندر!" وہ شکر گزار لہجے میں بولا۔ "میں یہی چاہتا تھا۔ یو سی۔ کام میرا ہے۔ مجھے کیسے کرنا ہے اور کیسے لینا ہے۔ یہ میری پرابلم ہے۔ اب مسٹر چوہدری مالک ہیں اور مجھے اس میں بھی شبہ نہیں کہ مجھ سے زیادہ تجربہ کار ہیں لیکن یہ ضروری تو نہیں کہ میری اور ان کی پسند ناپسند میں مطابقت ہو۔ جسے وہ سکریٹری منتخب کر کے بھیجتے، اگر وہ میرے مزاج اور طریقہ کار کو نہ سمجھ پاتی تو اس سے کارکردگی یقیناً متاثر ہوتی۔"

"اس لیے میں نے آپ کو اختیار دیا ہے کہ اپنی سیکریٹری کا انتخاب خود کریں" میں نے کہا۔ "اخبار میں اشتہار دے دیں جو انٹرویو کے لیے آئیں ان میں سے دیکھ لیں۔ اور تنخواہ بھی خود ہی صلاحیت اور تجربے کی بنا پر طے کرلیں۔"

گردیزی کا چہرہ مسرت سے چمکنے لگا۔ ایک چپراسی کافی کی ٹرے اندر رکھ گیا تھا۔ وہ ہمارے لیے کافی بنانے لگا۔ مجھے یہ شخص پسند آیا تھا۔ اگرچہ مجھے اس کے بارے میں مفصل معلومات حاصل نہیں تھیں لیکن مجھے کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ جنرل منیجر کے عہدے کے لیے ہر لحاظ سے موزوں ہے۔ ڈراما میرے ساتھ چوہدری دلاور نے کیا تھا۔ اس نے چھ عدد بدمعاش جو اس کے ناجائز کاروبار کو چلاتے تھے "میر دزیر اینڈ کمپنی" کا فورمین بنا کے پیش کر دیے تھے اور پھر مجھے ان کے حوالے کر دیا تھا کہ مجھے صراطِ مستقیم دکھائیں۔ صبح مجھے رضوی صاحب کی موجودگی میں سخت خفت اٹھانی پڑی تھی جب اصل فورمین شناخت کے لیے صف بستہ کیے گئے تھے۔ دوسرا چکر دلاور نے مجھے جنرل منیجر کے لیے دیا تھا۔ اس نے اصل کاروبار کے لیے صحیح آدمی کا تقرر کیا تھا مگر میرے سامنے استاد پیڈرو کو احمد نواز گردیزی بنا کے کھڑا کر دیا تھا۔ صرف میرا ردِعمل دیکھنے کے لیے اور لطف لینے کے لیے۔ مجھ پر واضح کرنے کے لیے کہ وہ مجھے احمق سمجھتا ہے اور بے وقوف بنا سکتا ہے۔ بعد میں کسی مناسب موقع پر وہ ہنگامہ برپا کرتا کہ یہ فراڈ ہے اور ساری دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے مترادف ہے تو وہ بڑے اطمینان سے اصل احمد نواز گردیزی کو سامنے لے آتا اور کہتا۔ "آپ بھی کمال کی باتیں کرتے ہیں اپنے سکندر صاحب! مذاق کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ پوچھ لیں ان سے۔ یہ ہیں جنرل منیجر ہیں۔ کیا ان کا نام کبھی استاد پیڈرو تھا یا ہے؟"

اور میں مزید بے وقوف بنتا۔

"آپ نے اپنے متعلق نہیں بتایا؟" میں نے کافی لے کر کہا۔ "پہلے آپ کہاں تھے؟"

"میں بٹالہ انجینئرنگ میں تھا" گردیزی نے کہا۔ "میں نے لائلپور کی زرعی یونیورسٹی سے گریجویشن کی تھی۔ بیکو میں سیل منیجر تھا۔ مسٹر چوہدری نے بہت اچھی آفر دی تو میں ادھر آ گیا۔"

"آپ کو یقیناً کام سمجھنے اور چلانے میں کسی قسم کی دشواری پیش نہیں آئے گی" میں نے کہا۔ "لیکن کچھ مسائل ایسے ہوں گے جن سے خود کو الگ تھلگ رکھ کے آپ کامیاب رہیں گے۔"

"مثلاً؟" وہ سوچتے ہوئے بولا۔ "وہ کیا مسائل ہوں گے مسٹر سکندر؟"

"میں آپ کو تاریکی میں رکھنا نہیں چاہتا" میں نے کہا۔ "میرے اور دلاور کے درمیان کچھ ذاتی اختلافات ہیں۔ قانونی طور پر ہم دونوں برابر کے مالک ضرور ہیں۔ بظاہر تپاک سے ملتے ہیں اور کسی پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیتے۔ لیکن یہ ایسی باتیں ہیں جو سب جانتے ہیں اور آپ کو بھی معلوم ہونی چاہئیں۔ ایک تو یہ کہ مجھ پر میر شرافت علی کے قتل کا الزام ہے۔ الزام بے بنیاد ہے اور اس کا مقصد مجھے کاروبار سے الگ کرنا ہے۔ میری بے گناہی یا سزا کا فیصلہ تو عدالت ہی کرے گی۔ دلاور پورے کاروبار کا مالک بننا چاہتا تھا مگر ابھی تک اسے اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی۔ چنانچہ تفصیلات میں جائے بغیر میں کہوں کہ وہ میرا دشمن ہے تو یہ غلط نہیں ہوگا۔"

احمد نواز گردیزی کے لیے یہ انکشافات ناقابلِ یقین تھے چنانچہ وہ بھونچکا بیٹھا تھا۔ "شاید اسی لیے آپ نے مجھے اختیار دیا ہے کہ میں سیکرٹری کا تقرر خود کرلوں" وہ پریشان ہو کے بولا۔ "مسٹر چوہدری ان احکامات کو منسوخ کر دیں گے۔"

"اوہ نو" میں نے کہا اور ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا لیا۔ "میں نے بتایا نا کہ ہمارے ظاہری تعلقات اچھے ہیں۔" میں نے چوہدری دلاور کا نمبر ڈائل کرنا شروع کیا۔ "اس فون کی ایکسٹینشن سیکرٹری کے کمرے میں ہے۔ آپ ہماری گفتگو سن لیں۔"

گردیزی اٹھ کے دوسرے کمرے میں گیا۔ "چوہدری صاحب!" میں نے کہا۔ "السلام علیکم۔ سکندر بول رہا ہوں۔"

"وعلیکم السلام اپنے سکندر صاحب۔" چوہدری نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔ "خیر ہے نا جی؟"

"ہاں۔ میں یہاں آفس میں گردیزی صاحب کے پاس بیٹھا تھا" میں نے کہا۔ "ان کے پاس کوئی سیکرٹری نہیں ابھی تک۔ میں نے کہہ دیا ہے کہ اخبار میں اشتہار دے کر رکھ لیں اور تنخواہ بھی خود طے کرلیں۔ جو بھی مناسب ہو۔"

"یہ اچھا کیا جی آپ نے" چوہدری دلاور نے بالکل نارمل رہتے ہوئے کہا۔ "میرا دردِ سر نہیں رہا۔ ویسے ہی وقت نہیں ملتا۔ کچھ یاد بھی نہیں رہتا۔"

"بس یہی بتانا تھا آپ کو۔ خدا حافظ" میں نے ریسیور رکھ دیا۔ بتانا تو مجھے یہ تھا کہ میں اصل گردیزی سے مل چکا ہوں اور کسی بات پہ بالکل پریشان نہیں ہوں۔ گردیزی جب واپس آیا تو زیادہ مطمئن تھا۔

"یہ میں بھی نہیں چاہوں گا" گردیزی اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "اور آپ کی بھی بڑی عنایت ہوگی کہ اپنے ذاتی اور قانونی مسائل سے مجھے بالکل الگ رکھیں۔ میں آپ دونوں کو ایک جیسا مالک تسلیم کرتا ہوں۔ کسی نے مجھے پارٹی بنایا تو میرے لیے کام کرنا مشکل ہو جائے گا۔ وہ ڈراما پڑھا ہے آپ نے 'اے سرونٹ آف ٹو ماسٹرز'؟ کمال احمد رضوی نے یہاں آرٹس کونسل میں 'صاحب بی بی اور غلام' کے نام سے اسٹیج کیا تھا۔ تو وہ پوزیشن نہ ہو میری" وہ مسکرایا۔

"نہیں" میں نے مسکرا کے کہا۔ "آپ تو ماسٹر آف ٹو سرونٹس ہوں گے۔"

"آف دی ریکارڈ مسٹر" وہ بولا۔ "آپ مجھے قاتل ٹائپ نہیں لگتے۔ ذرا اپنا ہاتھ دکھائیے۔"

"آپ پامسٹری کے حساب سے فیصلہ کریں گے؟" میں نے کہا۔ "عدالتی نظام میں اس کی اہمیت نہیں ہے۔"

"نہ ہو۔ لیکن میرا اپنے علم پر سے یقین ختم نہیں ہو سکتا میں کوئی پروفیشنل نہیں ہوں" وہ بولا۔ "یہ میرا شوق ہے۔ میں نے بہت سی ایسی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے جو ان خود ساختہ اور اشتہار وں سے بڑے بن جانے والے پامسٹوں نے دیکھی تک نہیں ہوں گی۔ دوسری زبانوں میں ایسی کتب کا بیش بہا ذخیرہ ہے۔" اس نے میرے ہاتھ کو دیکھنا جاری رکھا۔ "میرا ایک دوست روسی نژاد تھا اس کا باپ انقلابِ روس کے بعد ملک سے فرار ہوا تھا اور افغانستان کے راستے ہندوستان آ گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ زارِ روس کا شاہی منجم تھا۔ بہت ٹھاٹھ سے رہتا تھا اور اس کے گھر کے برتن بھی سونے چاندی کے تھے لیکن اس کو بھاگنا پڑا تو نقد و زر اور ہیرے جواہرات چھوڑ کے اس نے اپنے ساتھ وہی نایاب اور نادر کتابیں رکھیں جن کو وہ اپنی متاعِ حیات سمجھتا تھا۔ مرتے وقت وہ اپنا علم اور کتب خانہ بیٹے کو دے گیا۔ ظاہر ہے اب دنیا میں نہ زار ہیں، نہ شہنشاہ۔ پامسٹ فٹ پاتھ پر بیٹھتے ہیں۔ میرے اس دوست کی پرورش پاکستان میں ہوئی تھی۔ میرا مطلب ہے اس علاقے میں جو اب پاکستان میں شامل ہے۔ اس نے بیشتر کتابوں کا مجھ سے انگلش ترجمہ کرایا تھا کیونکہ یہ خبط مجھے بھی تھا۔ ان کتابوں کے ٹائپ کیے ہوئے مسودے میرے پاس پڑے ہیں۔ کوئی ناشر انہیں چھاپنے کے لیے تیار نہیں۔ خدا نے جب بھی توفیق دی میں انہیں اپنے خرچ پر چھپواؤں گا۔"

"تم اکیلے؟" میں نے کہا۔ "تمہارا وہ دوست اس منصوبے کے اخراجات میں حصہ نہیں دے گا؟ نام تو اسی کا ہوگا۔"

"نام!" وہ تلخی سے مسکرایا اور میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ "وہ کئی سال پہلے ایک حادثے میں مر چکا ہے۔ مجھے معلوم ہونے تک اس کی تدفین ایک لاوارث کی حیثیت سے ہو چکی تھی۔"

"آئی ایم سوری" میں نے اخلاقاً کہا۔ "کس نتیجے پر پہنچے آپ؟ اعتقاد نہیں ہے میرا۔ لیکن تجسس سمجھ لیں اسے۔"

"میرا پختہ یقین ہے کہ آپ پر قتل کا الزام بے بنیاد ہے۔" وہ بولا۔ "آپ قتل کر ہی نہیں سکتے۔"

"غیر ارادی یا اپنے دفاع میں بھی نہیں؟" میں نے دلچسپی سے کہا۔ "فرض کیجیے کوئی میری جان لینے کی کوشش میں مارا جاتا ہے۔"

"وہ قتل نہیں ہے مسٹر سکندر بخت جو کسی ارادے یا نیّت کے بغیر سرزد ہو جائے" گردیزی نے کہا۔ "میں قانون کی بات نہیں کرتا۔ ایک چھوٹی سی مثال دیتا ہوں۔ اگر روزے کی نیّت کے بعد آپ بھول چوک میں کچھ کھا لیں تو روزہ نہیں ٹوٹتا۔ بات ارادۂ قتل کی ہے جس میں فطری رجحانات کو دخل ہوتا ہے۔ گویا قتلِ عمد وہ آپ نہیں کر سکتے۔"

"ابھی میں اس فیصلے پر کوئی تبصرہ نہیں کروں گا" میں نے کہا۔ "حالات خود اس کی گواہی دیں گے۔ آہستہ آہستہ بہت سی باتیں آپ کو معلوم ہو جائیں گی۔ کچھ جھوٹ اور کچھ سچ۔ آپ اپنی عقل کے مطابق تجزیہ ضرور کریں۔ لیکن میں ایک بات کی قدر کروں گا۔ اگر آپ خود کو تمام معاملات سے الگ رکھیں اور صرف اس کام سے کام رکھیں جس کے لیے آپ کی خدمات مستعار لی گئی ہیں، تو بالآخر اس غیر جانبداری سے آپ کو فائدہ ہوگا۔ ابھی میں اس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ کوئی وعدہ کر سکوں لیکن آپ کی اس غیر جانبدارانہ فرض شناسی کی کوشش میں مشکلات کا سامنا ہوا تو میری ہمدردی آپ کے ساتھ ہوگی۔ صرف جذباتی نہیں، عملی۔ اب میں چلتا ہوں۔ کوئی پرابلم ہو تو مجھے ایس ایس پی رضوی صاحب کے گھر فون کر لیجیے۔ میں نہ ملوں تو مسٹر محسن یا رابعہ قاری ایڈووکیٹ کو پیغام دے دیجیے۔"

وہ ہمیں رخصت کرنے کے لیے اٹھا تھا اور اس کی صورت پر بڑی دوستانہ، شائستہ اور زندہ مسکراہٹ تھی اور اس کا ہاتھ الوداعی مصافحے کے لیے آگے بڑھا ہوا تھا۔ یکلخت وہ مسکراہٹ بجھ گئی۔ اس چراغ کی طرح جس نے محفل کو روشن رکھا ہو۔ مرگئی، اس نوزائیدہ بچے کی طرح جس نے ابھی مسکرانا سیکھا ہو۔ اس کی نظر میں ایک ویرانی اتر گئی۔ اداس اور تنہا لمحوں کی طرح نوحہ خواں۔ اس کا وجود سیلِ وقت

میں اس پتھر کی طرح پڑا رہ گیا جسے دریا نے رُخ بدل کے پیاسا چھوڑ دیا ہو اور اس کا ذہن حال کی فصیل عبور کر کے ماضی کے ویرانوں میں بھٹکنے لگا جہاں ہر یاد کے مدفن پر ایک کتبہ تھا لیکن اس کی تحریر مٹ گئی تھی۔ بالکل غیر ارادی طور پر اس کا آگے بڑھا ہوا ہاتھ بے جان ہو کے گر گیا اور وہ لڑکھڑا کے بیٹھ گیا۔ اس کی حالت میں یہ تغیر اتنا نمایاں تھا کہ میں نے تشویش سے محسن کی طرف دیکھا۔ وہ خود اس انقلاب پر حیران تھا۔

"کیا بات ہے مسٹر گردیزی؟" میں نے کہا۔ "آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں۔ ہاں۔" وہ کھوکھلے لہجے میں بولا۔ "وہ بس۔ ایسے ہی کبھی کبھی مجھے کچھ ہو جاتا ہے۔"

"آپ کچھ چھپا رہے ہیں مجھ سے۔" میں نے پھر بیٹھ کے کہا اور کہنیاں میز پر ٹکا کے آگے جھکا۔ "کیا آپ رابعہ کو جانتے ہیں؟" میں نے نوٹ کر لیا تھا کہ یہ تبدیلی جس نے اس دلکش شخصیت کا سارا طلسم باطل کر دیا تھا کس کے نام پر آئی تھی۔

"میں؟" وہ زبردستی مسکرایا۔ "کیوں۔ جانتا تو آدمی بہت سے لوگوں کو ہے۔ اب وہ اتنی مشہور وکیل ہیں۔"

بات کچھ اور تھی جو وہ بتانا نہیں چاہتا تھا۔ اگر وہ ولادو کی طرح اچھا اداکار ہوتا تو اپنے دلی جذبات کا اظہار اپنی صورت سے نہ ہونے دیتا اور مجھے کچھ معلوم نہ ہوتا لیکن اس کا چہرہ اس کے دل کا آئینہ تھا جس میں ہر جذبے کا عکس اپنے اصل روپ میں اتر آتا تھا۔ اس نے مجھے کچھ بھی نہیں بتایا تھا اور بہت کچھ بتا دیا تھا جو میں جاننا چاہتا تھا اور یہ بھی چاہتا تھا کہ مجھے نہ معلوم ہو تو اچھا ہے۔ محسن نے میری ذہنی کیفیت کو بھانپ لیا تھا اور مجھے اپنے ساتھ لے کر نیچے اتر آیا۔

"اس گردیزی کو کیا ہو گیا تھا رابعہ کا نام سن کے؟" میں نے سڑک پر آتے ہی کہا۔

"اسے تو ہو گیا تھا مالیخولیا۔" محسن نے کہا۔ "تجھے کیا ہو گیا تھا؟"

"رابعہ نے تو مجھ سے کبھی کچھ نہیں چھپایا تھا۔" میں نے کہا۔ "چنانچہ یہ خیال آنا لازمی تھا کہ گردیزی کا رابعہ سے کیا تعلق تھا۔ ظاہر ہے اس کی نوعیت جذباتی تھی۔"

"کیا تھا اور کیا نہیں تھا۔ یہ سب جان کے کیا کرے گا تو؟" محسن نے کہا۔ "اپنے مستقبل کی بنیاد اس حسد پر رکھے گا جس کا اب کوئی جواز نہیں۔ فرض کر رابعہ کبھی اس کو چاہتی تھی۔ یہی پھانس چبھ گئی ہے نا تیرے دل میں؟ اب تو اس پھانس کو وہم کی طرح پالے گا۔ اس کی خلش سے آزار میں مبتلا رہے گا۔ تیرا دماغ خراب ہے۔ اپنے پاؤں پر کلہاڑی مت مار۔ آج وہ تجھے چاہتی ہے۔ صرف تیرے لیے زندہ ہے۔ کیا اس میں کوئی شبہ ہے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا۔ میں کیا کروں۔"

"یہ سب بکواس ہے۔" محسن نے کہا۔ "آدمی جسے چاہتا ہے دل سے نہیں دماغ سے چاہتا ہے۔ اسے سمجھتا ہے۔ پرکھتا ہے اپنی خواہشات کے پیمانے سے۔ زندگی کے تقاضوں کے حوالے سے۔ مستقبل کی توقعات کے ترازو میں تول کر۔ اور رابعہ کو تو نے اسی طرح دیکھ کر طے کیا ہے کہ زندگی کے سفر میں اس سے بہتر رفیق شاید پھر نہ ملے۔ یہ عقل کا فیصلہ تھا اس لیے میں نے بھی قبول کیا۔"

میں مجرم بنا خاموشی سے اس کے ساتھ چلتا رہا۔ مجھے معلوم تھا اب وہ کیا کہے گا۔

"فوزیہ میری بہن تھی ——————— مگر وہ جذباتی عمر تھی۔" محسن نے بات جاری رکھی۔ "میں حقیقت پسند نہ ہوتا تو تجھے قتل کر دیتا کہ تو نے اس کی زندگی میں کانٹے بوئے۔ ورنہ تیرا ساتھ تو چھوڑ ہی دیتا اور کوئی برا نہ کہتا۔ سب میرے ہمنوا ہوتے کہ تو نے دوست بن کے دغا کی اور رشتوں کی آبرو گنوا دی۔ لیکن میں جانتا ہوں فوزیہ کی وابستگی بھی بس ایسی ہی تھی جیسی کہ اس عمر میں ہو جاتی ہے لیکن اب وہ تجھے بھول چکی ہے اور مجھے معلوم ہے کہ اپنے گھر میں وہ بہت خوش رہے گی۔ تجھے یاد بھی کرے گی تو زندگی کے ایک تلخ تجربے کی طرح جسے فراموش کر دینا ہی بہتر ہوتا ہے۔ رابعہ کی بات مختلف ہے۔ تم دونوں اب سنجیدہ مزاج اور پریکٹیکل ہو۔ تم دونوں اب ایک دوسرے پر شک کرنے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اس حسد وغیرہ کی اب تمہاری زندگی میں کوئی گنجائش نہیں۔ اگر زندگی کے کسی دور میں رابعہ نے گردیزی کو پسند بھی کیا ہوگا تو اسے بالکل ایسے ہی بھول بھی جائے گی جیسے فوزیہ تجھے بھول جائے گی۔ اس کے علاوہ۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ گردیزی کے جذبات یکطرفہ ہوں۔ صرف وہ رابعہ کو چاہتا ہو۔ رابعہ کو علم ہی نہ ہو یا پروا ہی نہ ہو۔"

"شاید تو ٹھیک ہی کہتا ہے۔" میں نے کہا۔ "میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔"

"اور برادر۔ رابعہ کی فراخدلی بھی تو دیکھ۔" محسن نے کہا۔ "وہ تیرے اور فوزیہ کے جذباتی تعلقات کے بارے میں جانتی ہے مگر اس کے باوجود کیا وہ رشک یا حسد میں مبتلا ہوئی؟ اپنے رویے یا اشارے کنائے سے اس نے کبھی حوالہ دیا کہ اسے تیری ذات پر اعتماد نہیں۔ شاید اس نے کبھی سوچا تک نہیں کہ جیسے تو فوزیہ کے لیے بدل گیا ایسے ہی پھر کسی کے لیے بدل جائے گا۔ اس کا یقین کامل ہے۔ اتنا کہ مجھے تعجب بھی ہوتا ہے اور تجھ پر رشک بھی آتا ہے۔"

"یقین تو میرا بھی کامل ہے۔" میں نے خفت سے کہا۔ "بس یہی سوچ رہا تھا کہ یہ بات کیا ہوئی۔ تو نے اچھا کیا کہ میرے دماغ کو بھٹکنے سے پہلے ہی پھر راہِ راست پر ڈال دیا۔"

"اس کے باوجود تو رابعہ سے پوچھے گا کہ احمد نواز گردیزی کون ہے۔" محسن نے کہا۔

"ہاں۔" میں نے تسلیم کیا۔ "لیکن اس طرح نہیں جیسے پہلے پوچھتا۔ ممکن ہے وہ خود ہی بتا دے۔"

"وہ بتا دے گی۔" محسن نے کہا۔ "وہ اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتی کہ تجھ سے کچھ چھپائے۔"

"مجھے اب خیال آ رہا ہے کہ احمد نواز گردیزی وہی نہ ہو۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

"وہی کون؟" محسن نے چلتے چلتے حیرانی سے کہا۔ ہم دونوں پیدل ہی گھر کے قریب پہنچ چکے تھے۔

"اس کا پہلا شوہر۔" میں نے کہا۔ "مجھے اس کا نام یاد نہیں۔ معلوم نہیں رابعہ نے بتایا تھا یا نہیں۔"

"رابعہ کی شادی پہلے بھی ہو چکی ہے؟" محسن نے دم بخود ہو کے کہا۔

"ہاں۔ صرف شادی۔" محسن نے کہا۔ "اور یہ شادی قانونی طور پر کافی عرصہ برقرار رہی۔ لیکن رخصتی کی نوبت نہیں آئی۔"

"کیوں؟" محسن نے کہا۔ "کسی کے ساتھ زبردستی ہوئی تھی؟"

"کسی کے ساتھ نہیں۔" میں نے کہا۔ "اور اپنی اپنی جگہ دونوں اچھے تھے۔ خراب کسی کو نہیں کہا جا سکتا لیکن یہ انکشاف بعد میں ہوا کہ شوہر کو انکار کر دینا چاہیے تھا مگر بدنامی خود رابعہ کے حصے میں آئی۔ دنیا نے تو ظاہر کو ہی دیکھا کہ پہلے اس کی رخصتی التوا میں پڑی رہی۔ بظاہر کسی وجہ کے بغیر۔ پھر طلاق ہو گئی۔ کوئی خرابی تو ہو گی نا کہ بیاہنے والے بیاہ کر پچھتائے اور لے کر نہیں گئے اور شریف لوگ تھے اس لیے خاموش رہے۔ خرابی کی تشہیر نہیں کی اور طلاق دے کر الگ ہو گئے۔ شاید میں نے تجھے بھی بتایا تھا یہ سب کچھ۔ جس دن مجھے رابعہ سے معلوم ہوا تھا۔"

"ممکن ہے بتایا ہو۔" محسن نے کہا۔ "مجھے یاد نہیں پڑتا۔ یہی کہا جا سکتا ہے کہ میں ذہنی طور پر غیر حاضر تھا اور کچھ سوچ رہا تھا ورنہ ایسی بات تو نہیں کہ میں سنتا اور بھول جاتا۔ بڑی مظلوم لڑکی ہے رابعہ بھی۔ اگر بات یہی ہے تو میں اس کی وسعتِ قلب اور نیک نیتی کا پہلے سے زیادہ معترف ہو گیا ہوں۔"

"اس نے زندگی سے بہت سمجھوتے کیے ہیں۔" میں نے کہا۔ "حالانکہ حسرتوں، محرومیوں اور ناکامیوں کے سوا زندگی نے اسے کیا دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں یہی بہت بڑا کمال ہے کہ اس نے اپنی شخصیت کے حصار میں دراڑ تک نہیں پڑنے دی اور کسی منفی ردِ عمل کا شکار نہیں ہوئی۔"

"اگر احمد نواز گردیزی وہی شخص ہوا تو کیا ہوگا؟" محسن نے کہا۔

"کیا ہوگا۔" میں نے کہا۔ "کچھ نہیں ہوگا۔ وہ رابعہ کا احسان مند تھا اور اس نے بعد میں بھی اپنا رویّہ دوستانہ رکھا۔ ایک بار میرے لیے رابعہ کو اس کے پاس جانا پڑا تھا تو اس نے رابعہ کی مدد کی تھی۔"

"کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ اپنی ناکامی کے باوجود بعد میں تجھ سے وہ ذہنی رقابت محسوس کرنے لگا ہو۔" محسن بولا۔ "رابعہ نے تو خود کو بچا لیا مگر ممکن ہے اس کی اپنی شخصیت منفی ردِ عمل سے مسخ ہو گئی ہو۔"

"میری رقابت سے اسے کیا فائدہ اور مجھے کیا نقصان ہو سکتا ہے؟" میں نے کہا۔

"یہ جذبات کا مسئلہ ہے۔" محسن نے کہا۔ "ایک معصوم بچہ بھی معذوری کے باعث کسی کھلونے سے نہ کھیل سکتا ہو تو اسے توڑ دیتا ہے اور اس طرح دوسروں کو بھی اس مسرت سے محروم کر دیتا ہے جس سے وہ خود محروم ہے۔"

"نہ جانے کیوں میرا ذہن اس دلیل کو قبول نہیں کرتا۔" میں نے کہا۔ "اس نے رابعہ کو نقصان نہیں پہنچایا تو میرے خلاف کیا

کرے گا؟ اور کیوں کرے گا؟ جو بات میری سمجھ میں نہیں آتی، وہ کچھ اور ہے۔ رابعہ نے تو مجھ سے کہا تھا کہ وہ سی ایس پی افسر ہو گیا تھا اور خاصے بڑے عہدے پر فائز تھا۔ احمد نواز گردیزی کہتا ہے کہ وہ بیکو میں تھا۔"

"فرض کرو یہ بات غلط ثابت ہوتی؟" محسن نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "اس سے میری وہ بات زیادہ قابلِ غور ہو جائے گی کہ محض رابعہ کی وجہ سے وہ تیرے خلاف حسد میں مبتلا ہو جائے۔ رابعہ ایسی لڑکی ہے کہ جو اسے قریب سے دیکھتا ہے، اس کے ظاہر اور باطن کے حسن کا اسیر ہو جاتا ہے۔ اگر یہ شادی چل سکتی تو گردیزی خود کو انتہائی خوش قسمت سمجھتا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اب کیا وہ اس شخص کے لیے مخالفانہ جذبات کا شکار نہیں ہو گا جو اتنا خوش قسمت ہے کہ رابعہ اسے مل گئی ہے۔ حالات نے جو انعام اسے دیا تھا وہ تقدیر نے کسی اور کو بخش دیا ہے۔"

"نظریاتی طور پر میں تیری بات کو تسلیم کرتا ہوں۔ لیکن عملاً ایسا نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"مجھے شبہ ہے کہ عملی صورتِ حال کچھ اور ہے۔" محسن نے کہا۔ "ممکن ہے احمد نواز گردیزی نے سرکاری ملازمت چھوڑ دی ہو۔ اسے بٹالہ انجینئرنگ میں بہتر مواقع ملے ہوں۔ سرکاری نوکری ذہنی و جسمانی طور پر انسان کی طاقتِ پرواز کو محدود کر دیتی ہے اور اس کی صلاحیت کے لیے کوئی چیلنج نہیں بنتی۔ سال کے سال ایک انکریمنٹ ملتی ہے اور ترقی بھی قواعد و ضوابط کے مطابق ہوتا اس وقت تک نہیں ملتی جب تک کہ افسرانِ بالا کی خوشنودی اور سرپرستی حاصل نہ رہے۔ گردیزی جیسے مردِ زندگی کے ایک محاذ پر شکست کی تلافی یوں کرتے ہیں کہ باقی زندگی میں ہر جگہ فتح حاصل کرتے رہیں۔ ان کے نامۂ اعمال میں ناکامی کا لفظ صرف ایک بار آئے تو کامیابی کے ذکر سے ان کی داستانِ حیات دوسروں کے لیے قابلِ رشک بن جائے۔ یوں سمجھ لے کہ جسمانی توانائی کی سمت بدل جاتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ گردیزی کو یہاں لایا گیا ہے۔"

میں چونکا۔ محسن کا سارا فلسفہ اچانک میری سمجھ میں آنے لگا تھا۔ "تیرا مطلب ہے وہ بھی شکاری ہے؟"

"ہے نہیں تو ہو جائے گا۔ اس میں صلاحیت ہے اور وہ تمام صفات ہیں جن سے دوسرے شکاری فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "اسے تھوڑی سی تربیت اور رہنمائی کی ضرورت ہے۔ اس کی سوچ کا انداز پہلے سے تیرے خلاف ہے۔ اب تک اس میں تخریبی عنصر شامل نہیں تھا لیکن ایک چیز کی کمی دوسری چیز سے پوری کی جا سکتی ہے۔ دولت کی طاقت سے اس کے جذبات کا رُخ اسی طرح موڑا جا سکتا ہے جیسے دریا پر بند باندھ کے اس کا رخ موڑ دیا جاتا ہے اور اس کے پانی سے... جاتی ہے۔ تو خود سوچ کہ جہاں ڈی سلوا جیسا شخص... چل سکتا ہے؟ اگر چلے گا تو صرف دو ہی صورتوں میں۔ کاروبار بدل جائے اور دلاور سابقہ دھندے چھوڑ کر... جائز کام کرنے لگے۔ وہی پر اتنا کام جس کی بنیاد وزیر... نے رکھی تھی۔ یہ ناممکن ہے۔ دوسری صورت پھر یہی رو... ہے کہ گردیزی دوسرا ڈی سلوا بن جائے یا بنا دیا جائے۔ بہت زیادہ قرینِ قیاس ہے۔"

"یار محسن حسن خاں شیروانی۔" میں نے کہا۔ "معاف کیجیے میں ایک بار پھر اعتراف کرتا ہوں کہ آپ دنیا کے سب... احمق آدمی نہیں ہیں۔ جیسا کہ میرا عقیدہ تھا۔ یہ بات میری... میں نہیں آسکتی تھی۔"

"عقل ہوتی آپ کے سرِ عزیز میں تو رونا کس بات کا... عزیزم!" محسن نے شفقت سے فرمایا۔ "یقیناً آپ نے... کو پسند کیا ہو گا۔ کوئی بھی شخص جو اس کے پس منظر سے آگاہ نہ ہو... راست اس کا حریف نہ بنے یقیناً اس سے متاثر ہو گا۔ مگر... وہی مورچہ فتح کیا ہے جس پر اسے ہزیمت اٹھانی پڑی تھی۔... سینے پر سجا ہوا رابعہ کی محبت کا میڈل اس کے منہ پر طمانچہ... دلاور اینڈ کمپنی نے یہ مہرہ بہت سوچ سمجھ کے انتخاب کیا... انہیں اس کی بہت بھاری قیمت ادا کرنی پڑی ہو گی لیکن... ان کے لیے کوئی مسئلہ نہیں۔"

"اگر تصدیق کرنے پر معلوم ہو گیا کہ احمد نواز گردیزی... انجینئرنگ میں نہیں تھا تو واقعی شبہے کی گنجائش نہیں رہے... گردیزی نو آموز شکاری ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن بعد میں... سے زیادہ خطرناک ثابت ہو گا کیونکہ اس کا بہت بڑا اثاثہ... اور صلاحیت ہے، علاوہ اس کی فطرت کے۔" میں نے سوچا... کسی رکاوٹ کے بغیر بہتا ہے تو اس کے کنارے آباد رہتے... ان سے کھیتوں کی زرخیزی قائم رہتی ہے اور زمین کی شادابی... بڑھتی ہے لیکن گردیزی وہ دریا ہے جس کی راہ میں ایک... نے رکاوٹ ڈالی ہے بے شک ایٹم سے حاصل ہونے والی... قوت کو تعمیری مقاصد کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس... روشن ہوتے ہیں۔ مشینوں کے پُرزے متحرک رہتے ہیں جو... کے لیے تن ڈھانپنے کو کپڑا بنتی ہیں اور زندگی کو پُر آسائش بنانے... ہزار اسباب فراہم کرتی ہیں مگر یہی توانائی غلط مقاصد رکھنے والوں... اسیر ہو جائے تو ہیروشیما اور ناگاساکی کھنڈر بن جاتے ہیں... کو پُرامن جنت بنانے والوں کے عزائم جوہری اسلحہ خانوں... سے بہت نیچے نظر آتے ہیں۔

گھر میں ہم ٹھیک کھانے کے وقت پہنچے۔ بیگم رضوی، اُن کے دونوں بچے اور رابعہ سب میز پر جمع تھے۔

"انکل سکندر!" رضوی صاحب کے چھوٹے بچے نے کہا۔ "امی نے کہا تھا اب آپ کی خیر نہیں۔"

"کیونکہ ڈیڈی مولا بخش کو لینے گئے ہیں۔" دوسرے نے مسرت سے کہا۔ ان کی ماں نے گھور کر انہیں دیکھا۔

"انکل! یہ مولا بخش کون ہے؟" چھوٹے نے ماں کی تنبیہ کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"مولا بخش؟" میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "ہمارا ایک بچپن کا دوست ہے۔ ہماری طرح سیدھا سادہ۔"

"سیدھے تو خیر ہم اب بھی ہیں۔ بالکل جلیبی کی طرح۔" محسن نے کہا۔ "بس کبھی کبھی مولا بخش کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔"

"کل آنٹی رابعہ بھی کہہ رہی تھیں کہ آپ کو بھڑ کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کا شوق ہے۔" پہلے نے مجھے مطلع کیا۔ "یہ آپ کی ہابی ہے انکل؟" وہ یقیناً سوچ رہا تھا کہ میں بہت دلیر آدمی ہوں۔ "شہد تو بازار میں بھی مل جاتا ہے۔"

"بھابی؟" محسن نے دخل در معقولات کیا۔ "ہماری بھابی؟ آپ جانتے ہیں ہماری بھابی کے متعلق۔ شہد کیا چیز ہے...؟"

"ارے بھئی کھانا کھاؤ۔" بیگم رضوی نے ہمیں ٹوکا۔ "یہ کیا بچوں کے سامنے ہابی اور بھابی کو ملا رہے ہو۔"

"وہ دراصل آنٹی! بچوں کی تعلیم و تربیت بھی تو ضروری ہے۔" محسن بولا۔ "لغویات کے جدید نظریات کے مطابق پہلے ہوتی ہے صرف ہابی۔ وہی آگے چل کر بھابی بن جاتی ہے.... اور جب بھابی وجود میں آتی ہے تو بن جاتی ہے ایک لابی۔ حزبِ اقتدار کی۔ جو پیدا کرتی ہے خرابی...." اس سے پہلے کہ محسن اسی قافیے میں اپنی آزاد نظم کو آگے بڑھاتا، رضوی صاحب نازل ہوئے۔

"آپ کچھ فرما رہے تھے۔" رابعہ نے کہا۔ "اپنے خیالات سے انکل کو بھی مستفیض فرمائیے۔"

"میں؟" محسن نے بے حد حیرانی سے کہا۔ "میں تو ایک لفظ نہیں بولا۔ بالکل خاموش بیٹھا تھا۔ آپ کے کان بجنے لگے ہیں خاتون۔" بیگم رضوی کی ہنسی نے یہ راز افشا کر دیا کہ ہم کچھ ہانک رہے تھے لیکن انہیں دیکھ کر خاموش ہو گئے ہیں۔

"آج اس لڑکے اکرام شیخ کو بلوایا تھا میں نے۔" انکل نے ہم سے پہلے کھانے کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ان کے پاس بیٹھنے کے لیے بہت کم وقت ہوتا تھا۔ وہ مشکل سے آدھا گھنٹہ گھر رہ... اس کا انحصار بھی فرصت ملنے پر تھا۔

"آپ اس کے استعفے کو نامنظور کر دیں انکل!" میں نے کہا۔ "اور اسے اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیں۔ میرا مطلب ہے پولیس ہیڈ آفس میں ہی بلا لیں۔"

"ارے بھئی اس میں کسی کے ساتھ کوئی زبردستی کیسے کر سکتا ہے۔" انہوں نے کہا۔ "اب وہ نوکری نہیں کرنا چاہتا تو میں کیا کروں۔ میں نے اسے انٹرویو کے لیے وقت دیا اور پوچھا کہ بات کیا ہے۔ خیریات تو مجھے معلوم تھی۔ میں اس کی زبان سے سننا چاہتا تھا لیکن اس نے کچھ بتایا نہیں۔ یہی کہتا رہا کہ سر میرے نجی حالات کا یہی تقاضا ہے۔ فی الحال میں نے فیصلہ ملتوی کر دیا ہے کہ اسٹاف کی پوزیشن بہتر ہونے پر غور کیا جائے گا۔ وہ کچھ ضرورت سے زیادہ برہم ہے۔ کہنے لگا آپ کی مرضی سر۔ میں تو نوکری چھوڑ چکا اور کمرے سے واک آؤٹ کر گیا۔ کوئی اور ہوتا میری جگہ تو اِن ڈسپلن سمجھتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ جوانی کی شوریدہ سری ہے۔ تم سمجھاؤ اسے۔"

"اب میں سمجھا لوں گا اسے انکل!" میں نے پورے یقین سے کہا۔ "اس کا تو باپ بھی نوکری کرے گا۔"

"وہ تو نوکری کر کے ریٹائر ہو چکا۔ دوبارہ نہیں کر سکتا۔" انکل رضوی نے ہنس کے کہا۔

"ڈیڈی! وہ مولا بخش کہاں ہے؟" ان کے چھوٹے بچے نے موقع پاتے ہی کہا۔

"ارے بیٹا۔ جانے دے۔" میں نے کہا۔ "ہم پہلے ہی مارے ہوئے ہیں زمانے کے، شامتِ اعمال کے، تقدیر کے اور نہ جانے کس کس کی نظر کے۔" میں نے نظر بچا کے رابعہ کی طرف دیکھا اور ذرا اٹھ کھڑا ہوا۔ رابعہ کا رنگ ذرا سی دیر کے لیے متغیر ہوا۔

"کل فون آیا تھا اس کی بہن کا۔" بیگم رضوی نے اچانک کہا۔ "کیا نام ہے اس کا۔ نازو۔ کہہ رہی تھی تم کو اس کا کوئی ادھار چکانا تھا۔ میں نے بہت پوچھا کہ کیا ادھار ہے لیکن وہ ہنسنے لگی۔ میں نے بتایا کہ وہ تو لاپتا ہے تو پریشان ہو گئی۔ باتیں کرتے کرتے رونے لگی۔ کہنے لگی داتا صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کے منت مانگوں گی۔ عجیب باؤلی لڑکی ہے۔"

میں نے رابعہ کی طرف دیکھا اور میرا دل بیٹھ گیا۔ اس نے صرف ایک نظر میری طرف دیکھا اور میں سمجھ گیا کہ جو پھانس میرے دل میں احمد نواز گردیزی کے رویتے سے بلاوجہ چبھ گئی تھی وہی اب رابعہ کے دل میں خلش بن گئی ہے۔

"میں نے پنڈی جانے سے پہلے شیخ کو ایک ہزار روپے کا چیک دے کر کیش دینے کے لیے کہا تھا۔" میں نے سب کے سامنے وضاحت کرنا بہتر سمجھا۔ "اس کے پاس نقد نہیں تھے۔

مجھے اس کے گھر جانا پڑا۔ نازو اس کی چھوٹی بہن ہے۔ بالکل یہودی۔ اپنے بھائی کو بھی ایک دن کے لیے سو روپے دیتی ہے تو دوسرے دن ایک سو دس روپے وصول کرتی ہے۔ سو روپے روز کے حساب سے تیرہ سو روپے دینے پڑیں گے اسے۔ بچپن بہت ہے اس کی عادت میں۔"

"کیا کرنا تھا تمہیں ایک ہزار کا؟" رابعہ کے دل کی بات بیگم رضوی نے کہی۔ "تم پنڈی جا رہے تھے کہ حج کرنے؟"

"بس ایسے ہی... میں نے احتیاطاً یہ مناسب سمجھا... کہ کچھ پیسے جیب میں ہوں۔" میں نے محسوس کیا کہ اس وضاحت نے کسی کو بھی مطمئن نہیں کیا ہے۔ "اچانک کوئی ضرورت پڑ جائے تو۔"

"اچانک کوئی اشد ضرورت پڑ جاتی تو ہم سب تھے وہاں۔" رضوی صاحب نے اٹھتے ہوئے نیپکن سے ہاتھ صاف کیا اور خدا حافظ کہہ کر نکل گئے۔ جب میں اپنے کمرے میں پہنچا تو ان کی جیپ کے باہر نکلنے کی آواز آئی۔ چند منٹ بعد محسن اندر آیا تو میں بستر پر نیم دراز سگریٹ کا دھواں پھیلا رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کیا رابعہ جیسی عورت بھی بے بنیاد شک اور حسد میں مبتلا ہو سکتی ہے۔ یہی سوال میں نے محسن سے کیا۔

"عورت تو عورت ہی ہوتی ہے۔" محسن نے فلسفیانہ انداز میں انکشاف کیا۔ "اور ہمارے سابق حکماء فرماتے تھے کہ دھواں وہیں سے اٹھتا ہے جہاں آگ ہو۔ تو یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے؟"

"آگ تو ہے مگر دونوں طرف برابر نہیں لگی ہوئی ہے اور میں نے لگائی بھی نہیں ہے۔" میں نے کہا اور اسے نازو کے بارے میں سب کچھ بتا دیا جو اب تک محسن کو معلوم نہیں تھا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کروں کیا۔"

"نکاح۔" مسٹر محسن نے آنکھیں بند کر کے غور فرمانے کے بعد کہا۔ "ویسے تو آپ چار کر سکتے ہیں مگر میں صرف رابعہ کی بات کر رہا ہوں۔ میں نے اس کی بدگمانی یا غلط فہمی وغیرہ نوٹ کی تھی۔ اب تک اگر وہ دل شکستہ ہو کے خودکشی کر چکی ہو تو کچھ عجب نہیں۔"

"تو نے دیکھا ہوگا فلموں میں کیا ہوتا ہے۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "جہاں اس قسم کی سچویشن آتی ہے ہیرو کھٹ سے آ ٹپکتا ہے۔ اور پھر جناب یا تو ہاتھ مار کے زہر کی شیشی گرا دیتا ہے یا چٹان سے دریا میں کودنے والی ہیروئن کو ہوا میں اچک لیتا ہے۔ چنانچہ میں جاتا ہوں عین وقت پر نمودار ہونے کے لیے۔" میں پھرتی سے اٹھا اور کھڑکی سے باہر کود گیا۔

رابعہ اپنے کمرے میں سیدھی لیٹی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔

نوعہ تھا۔

"یہ کیا حرکت ہے؟" وہ مجھے کھڑکی کے راستے قدم رکھتے دیکھ کر اٹھ بیٹھی۔ "دروازہ بھی تو کھلا تھا۔"

"کوئی دا تیری محفل میں کوئی دھم سے نہ ہو گا۔" میں نے ... میں جا کے شعر پڑھا۔ "وہ کام کیا ہم نے جو رستم سے نہ ہوگا۔"

"چشم بد دور۔ ذوق اچھا ہے آپ کا۔" وہ بولی۔ "آپ کی پسند کے معیار بدلتے رہتے ہیں۔"

"ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں۔" میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "میں سمجھ رہا ہوں بی بی کہ تم کس حوالے سے بات کر رہی ہو لیکن میں تم سے نکاح کرنے آیا ہوں۔ محسن کے حکم پر۔"

"تمہارے دماغ پہ اثر ہے۔ کوئی چوٹ وغیرہ لگ گئی تھی کیا؟" رابعہ مسکرائی۔

"چوٹ لگی ہے دل پر۔" میں نے سینے پہ ہاتھ رکھا۔ "یہ ہے ڈائیلاگ؟ جہاں تک نکاح والی بات ہے تو میں بے حد سیریس ہوں۔ اس کے دو اسباب ہیں۔ بلکہ تین۔ ایک تو میں محسن کے حکم سے سرتابی نہیں کر سکتا۔ دوسرے یہ کہ نکاح سنت ہے اور تیسرا یہ کہ تم کو بطور منکوحہ اپنے ساتھ لے جا کر اس لڑکی نازو پر واضح کر سکتا ہوں کہ میں شادی شدہ آدمی ہوں چنانچہ مجھ پر ڈورے نہ ڈالے اور ڈالنے ہی ہیں تو پہلے تم سے ڈوئیل لڑے۔"

"وہ تو میں ہار جاؤں گی۔" رابعہ ہنسی۔ "میں نے سنا ہے جوڈو جانتی ہے اور تمہاری شاگردی پر مصر ہے۔"

"اچھا۔ اور اس کے باوجود تم روٹھی ہوئی تھیں۔ تک نہیں ہو... سے؟ بڑے افسوس کی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "میں تو تمہیں منانے آیا تھا لیکن محسن حسن خاں شیروانی پہلے ہی فرما چکے تھے کہ تمہیں مجھ پر کامل یقین ہے۔"

"کامل یقین کیا ہوتا ہے۔" وہ بولی۔ "اور کوئی کسی کے بارے میں یہ بات یقین کامل کے ساتھ کیسے کہہ سکتا ہے؟"

"یہ تو ہے۔" میں نے سر کھجا کے کہا۔ "اچھا یہ بتاؤ کہ جب میں تمہارے بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال کے، گرفتار بلا ہو چکا تھا تمہارے دل کی کیا حالت تھی؟ میرا مطلب ہے خدانخواستہ میں واپس نہ آتا؟"

"تم مجھ سے کہلوانا چاہتے ہو کہ تم مر جاتے تو میں بھی زندہ نہ رہتی؟" وہ چڑ کے بولی۔ "یہ خیال مجھے آیا ہی نہیں تھا۔"

"تو بس یہی ہے وہ۔ کامل یقین۔" میں نے کہا۔ "اور مثال دوں؟ جب میں اپنے تابوت شریف میں دست و پا بستہ اور بے زبان محو استراحت تھا... تو مجھے خیال آیا تھا۔ اس وقت بالکل خوفزدہ نہیں تھا۔ اور جب تمہارا تصور کیا تو تم کو بالکل ایسے دیکھا جیسے اب دیکھ رہا ہوں۔ اور کیا محسوس کیا۔ میں اسے بیان

کر سکتا۔ تمہارے وجود سے ایک ذہنی کیفیت وابستہ ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ہر میگنٹ کا ایک حلقۂ اثر ہوتا ہے۔ برقی مقناطیسی میدان کہتے ہیں اسے۔ تو بس اسی طرح میں نے تم کو محسوس کیا تھا۔"

"اب تمہیں سچ بتاؤں میں؟" رابعہ یکلخت بے حد سنجیدہ ہو گئی۔ "اس رات میری آنکھ کھلی تو میں رو رہی تھی۔ حالانکہ میں نے کوئی ڈراؤنا خواب نہیں دیکھا تھا۔ سوتے وقت میرے ذہن میں کوئی ایسا ویسا خیال نہیں تھا۔ تمہارا ٹیلی فون تو بہت بعد میں آیا۔ لیکن مجھے ایسا لگا جیسے تم نے کچھ کہا۔ اور میں اندھیرے میں بیٹھی غور کرتی رہی۔ تمہارے الفاظ مجھے یاد تھے۔ میں بالکل خیریت سے ہوں اور تم لوگوں کو بس یہی اطلاع دینا مقصود تھی۔ اور تم نے میری خیریت پوچھی تھی۔ لیکن اس سے بھی زیادہ ناقابلِ یقین بات یہ تھی کہ تم نے کہا تھا کہ میں گوجر خان سے بول رہا ہوں۔ سوچو ذرا مجھے گوجر خان کا خیال کیسے آ گیا؟ ان گنت شہر قصبے ہیں جن کے نام میرے ذہن میں موجود ہیں۔ پھر یہی نام کہاں سے سُن لیا تھا میں نے۔ میں نے کسی کو بھی یہ بات نہیں بتائی تھی ورنہ سب میرا مذاق اڑاتے۔ مجھ پر ہنستے کہ تم دلی ہو گئی ہو بی بی۔ اور محسن۔ وہ تو نہ جانے کیا کچھ کہتا۔ مگر اس نے مجھے تمہارے فون کے متعلق بتایا تو میں . . ." وہ اچانک خاموش ہو گئی۔ "ایسا مت کیا کرو سکندر!"

"اب نہیں کروں گا۔" میں نے بے خیالی میں کہا جب رابعہ بات کر رہی تھی تو میں اس وقت کے بارے میں سوچ رہا تھا جب مجھے رابعہ کے خیال نے سامانِ تسکینِ قلب فراہم کیا تھا کیونکہ چشمِ تصور سے میں نے اسے اپنے لیے روتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس وقت وہ ٹرک کہاں تھا؟ سوہاوہ سے چکوال کی طرف مڑ چکا تھا۔ گویا رات کے بارہ ایک بجے کا وقت تھا۔

"جب رات کو تمہاری آنکھ کھلی تھی تو تم نے وقت دیکھا تھا؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ بارہ بج کے چالیس منٹ ہوتے تھے۔" وہ بولی۔ "میں بارہ بجے کے قریب سوگئی تھی۔ کیوں؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ بھی ایسی ہی بات ہے کوئی سنے گا تو ہنسے گا، مثلاً محسن۔ ٹھیک اسی وقت میں نے تم کو دیکھا تھا روتے ہوئے۔ حالانکہ میں تمہارا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھنا چاہتا تھا۔"

رابعہ کے عارض پر محبت کے گلاب کھلے اور اس کی آنکھوں سے اترنے والے شبنم کے دو موتی وہیں ڈھلک کر جھلملانے لگے۔ پھر وہ ہنس پڑی۔ پھر میں ہنس پڑا "کیسی باتیں کر رہے ہیں ہم لوگ۔" رابعہ نے کہا۔

"سچی باتیں۔" میں نے کہا۔ اسی وقت آدم و حوا کی جنت میں شیطان بن کے محسن خاں وارد ہوئے۔

"اس سے زیادہ رومانس میں برداشت نہیں کر سکتا" اس نے فلم ڈائریکٹر کی طرح کہا۔ "آپ لوگ دوگانا کرنے والے تھے۔ میں کوئی ریکارڈ لگا دیتا ہوں۔ آپ لب ہلائیں پر۔ بس یہ کونسا گانا چلے گا۔ میں ترا چاند تو مری چاندنی۔"

"ہم شہزادہ سکندر بخت۔ اگر اپنی ریاست میں ہوتے" میں نے خالی ہوا میں مکا گھمایا۔ "تو تخلیے میں اس مداخلت پر آپ کی کھال میں بھُس بھروا دیتے جو آپ کے سرِ عزیز میں بھرا ہوا ہے۔ چھُپ چھُپ کے باتیں سنتا ہے ولد شیروانی عرف اچکن۔"

محسن نے غوطہ مار کے خود کو بچایا۔ "دیکھیے دیکھیے خاں صاحب میں تو ٹیلی پیتھی پر اپنی ریسرچ مکمل کر رہا تھا...... آپ بلا وجہ ناراض ہو رہے ہیں۔ آپ دونوں کی گفتگو سے میرا تھیسس پورا ہو گیا۔"

"اچھا اچھا" میں نے کہا۔ "پھر کوئی بات نہیں۔ تشریف رکھیے اور بذریعہ ٹیلی پیتھی شہلا سے کہیے . . . کہیے کہ . . . پہلوئے حور میں لنگور خدا کی قدرت۔ اور دیکھیے جواب کیا آتا ہے۔"

"گویا جو کچھ دیکھ رہا ہوں وہ بیان کر دوں۔" محسن بیٹھتے ہوئے بولا۔ "کہنے میں یہ آیا تھا کہ انکل جاتے جاتے کچھ فرما گئے ہیں۔ پولیس چالان پیش کر چکی ہے اور کل سماعت باقاعدہ شروع ہو گی۔ اس لیے آج باہر جانا بند۔"

"رابعہ نے مجھے بتا دیا تھا۔" میں نے بڑے اعتماد سے جھوٹ بولا۔ پھر بات سنجیدگی سے ہونے لگی۔ اور رابعہ نے بتایا کہ عدالتی طریقِ کار کے مطابق کل کوئی خاص بات نہیں ہو گی۔ بس چالان کی ایک نقل فراہم کر دی جائے گی اور رابعہ آئی آر پیش ہو گی۔

"حقِ وراثت والے کیس میں کہاں تک پیش رفت ہوئی ہے؟" میں نے کہا۔

"منظر صاحب ملے تھے۔ ایسے ہی بار روم میں سامنا ہو گیا تھا۔" وہ بولی۔ "کہہ رہے تھے کسی نے اعتراض داخل کیا ہے۔ وہ خود ہی جواب دیں گے آئندہ تاریخِ سماعت پر۔"

"تم نے پوچھا نہیں، کسے اعتراض ہے اور کیا اعتراض ہے؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ وہ جلدی میں تھے۔" رابعہ بولی۔ "ظاہر ہے اعتراض کرنے والے وہی تمہارے مہربان ہوں گے یا محض ٹانگ اڑانے، فیصلے میں تاخیر کرانے والے ہوتے ہیں۔ حسد کے مارے ہوئے لوگ۔ ملتا ملاتا کچھ نہیں انہیں اور اعتراض بھی بے بنیاد ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہوتا بھی کچھ نہیں۔ حق تو حقدار کو مل ہی جاتا ہے۔ دو چار مہینے کی دیر معمولی بات ہے۔ یہ بتاؤ تم نے گاڑی تو دے دی تھی رنگ روغن کے لیے۔ واپس کب ملے گی؟ اور رنگ کا کیا کہا تھا؟"

"میں نے سفید رنگ کرنے کے لیے کہہ دیا تھا۔" میں نے کہا۔ "میرا محبوب سے عام رنگ ہے۔ گاڑی تو ملے گی ہفتہ بھر بعد۔"

"مجھے اس کا سرخ رنگ ہی اچھا لگتا تھا۔" رابعہ نے کہا۔

"سب لڑکیوں کو سُرخ رنگ اچھا لگتا ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن یہ رنگ حنا اور سہاگ کے جوڑے کا رنگ ہی نہیں لہو کا رنگ بھی ہے۔ خون کسی کا نہیں ہونا چاہیے۔ نہ دل کا نہ ارمانوں کا اور نہ اپنا۔ اس لیے سفید رنگ جو امن کی علامت ہے..."

"تم پھر نان سیریس ہو گئے ہو۔" وہ اٹھ کے باہر نکل گئی۔ "اب جو کچھ کہنا ہے ایک دوسرے سے کہو۔"

صبح میں اور محسن بھی رابعہ کے ساتھ ہی کورٹ گئے اور رضوی صاحب کی گاڑی میں ٹھیک نو بجے کورٹ پہنچے تو ہجوم میں نظر آنے والا سب سے پہلا چہرہ حشمت خان اور حوالدار بجلی کا تھا۔ حشمت خان کے تیور پہلے جتنے جارحانہ نہیں رہے تھے اور وہ کچھ ناامید سا نظر آتا تھا لیکن حوالدار بجلی کا کرنٹ کم نہیں ہوا تھا۔

"سکندر بخت ولد وزیر خان۔ زیرِ ضمانت۔ ملزم زیرِ دفعہ تین صفر دو ض۔ ف حاضر ہے جنابِ عالی۔" اس نے مجھے دیکھتے ہی اپنے افسرِ اعلیٰ کو رپورٹ دی۔ اور مجھے یوں دیکھا جیسے جلاد تختۂ دار پر کھڑے ہوئے شخص کو دیکھتا ہے۔

"او ئے دیکھ لیا ہے میں نے تجھ سے پہلے۔" افسرِ اعلیٰ نے اس فرض شناسی کے مظاہرے کا جواب نہایت حوصلہ شکن لہجے میں دیا۔

"کوئی رسّی وسّی لے آئے ہوتا حوالدار صاحب جی" محسن نے کہا۔ "پھانسی تو ہونی ہی ہونی ہے۔" اس نے بے تکلفی سے حوالدار بجلی کے کندھے پر ہاتھ مارا جو صرف وردی ہی وردی تھا۔ حوالدار نے محسن کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"یار تم کو بیوی ایسے ہی ٹانگ دیتی ہو گی ہینگر میں؟" محسن اسے چھیڑنے پر مصر تھا۔ "وردی سمیت۔ اگلے دن اتارا اور روانہ کر دیا۔ کچھ جان شان بناؤ اپنے حشمت خان کی طرح۔ کیا عالی شان توند ہے۔ کوئی دیکھے تو سمجھے تربوز چھپا کے جا رہا ہے۔"

"آپ جی... بس آپ خیال کریں۔ اپنا اور ہمارا بھی... منہ مت کھلوائیں۔" غصے سے حوالدار بجلی کا برا حال ہو گیا۔

پھر استاد ٹیڈی نمودار ہوا۔ "قسم مولا کی۔" اس نے مونچھوں پر تاؤ دے کر کہا۔ "یہ حوالدار کسی دن اندر ہی اندر غائب ہو جائے گا۔ وردی جھاڑیں گے تو خالی۔" یہ جلتی پر تیل چھڑکنے کے مترادف تھا۔ حوالدار فوراً وہاں سے رخصت ہو گیا۔ اس کی قوتِ برداشت جواب دے رہی تھی اور اس نے فیصلہ کیا تھا کہ کمینوں کے منہ نہیں لگنا چاہیے۔ روزِ اوّل کی طرح اس نے تڑپ کر محسن کے ہاتھ نہیں مارا۔ اتنے عرصے میں جو کچھ وہ ہمارے متعلق سنتا رہا تھا اس سے حوالدار کو اتنا اندازہ تو بخوبی ہو گیا تھا کہ ہم سے عام مجرموں کی طرح پیش آنا اور اپنے فرائض کی بجا آوری میں اختیارات سے تجاوز کرنا خود اس کی ذات کے مفاد میں نہیں۔

سماعت کا آغاز معمول کے مطابق ویسے ہی ماحول میں ہوا جو میں نے اپنے ملک کی عدالتوں میں بارہا دیکھا تھا۔ یہ ماحول برطانوی عدالتوں اور پاکستانی فلموں میں پیش کیے جانے والے ماحول سے یکسر مختلف تھا۔ ایک فرق یہ بھی تھا کہ اس بار نہ میں گواہ تھا نہ تماشائی۔ بلکہ ملزموں کے کٹہرے میں تھا۔ جہاں سے میں پوری عدالت کے منظر کو دیکھ سکتا تھا۔ وکیلِ استغاثہ اور پبلک پراسیکیوٹر کے ساتھ ہی دو میزیں اور کرسیاں رابعہ قاری اور عبدالودود منظر کے لیے تھیں جہاں سے منظر دو بار یہ بتانے آ چکا تھا کہ فکر کی کوئی بات نہیں اور جہاں میں ہوں وہاں کوئی مجرم ہو تو شرم کی بات ہے ورنہ یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا۔ مجھ سے پہلے بھی کئی بے گناہ محض جرمِ بے گناہی میں اسی منزلِ دار و رسن سے سرفراز گزر چکے ہیں اور بعد میں بھی گزرتے رہیں گے۔ کیونکہ حق و باطل کی یہ جنگ ازلی و ابدی ہے۔ سماعت کی کارروائی دیکھنے کے لیے آنے والوں میں بہت سے چہرے اجنبی بھی تھے۔ اس کیس نے اخبارات میں بڑی شہرت پائی تھی۔ کیونکہ اس میں نچلے طبقے کے یا پیشہ ور قلم کے کردار نہیں تھے۔ یہ ایک صنعت کار کے بیٹے کے ہاتھوں اپنے بزنس پارٹنر کے

قتل کا کیس تھا۔ مبیّنہ قاتل برطانیہ سے آیا تھا اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے علاوہ مقامی ایس ایس پی کا عزیز مشہور تھا۔ رضوی صاحب اسی لیے عدالت سے غیر حاضر تھے۔ اب تک زبانِ خلق پر میرا اور رابعہ کا نام بھی آگیا تھا اور ان ناموں سے وابستہ افسانے بھی مخصوص حلقوں میں گردش کر رہے تھے۔ پبلک کے لیے دلچسپی کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ میں صرف بے گناہ ہونے کا دعوےٰ نہیں رکھتا تھا، یہ الزام بھی عائد کر چکا تھا کہ خود مقتول شرافت علی نے میرے والد کو بلیک میل کیا تھا اور بالواسطہ طور پر ان کے قتل کا ذمّہ دار تھا۔ بعد کے واقعات بھی وقتاً فوقتاً اخبارات کی زینت بنتے تھے چنانچہ میں نے اندازہ کیا کہ حاضرین میں مقامی اخباروں کے سب ہی نمائندے ہوں گے جنہوں نے اوّل سے آخر تک تمام واقعات کو اور خبروں کو منسلک کر لیا تھا چنانچہ ان کے نقطۂ نظر سے یہ انتہائی سنسنی خیز مقدمہ تھا۔

حاضرین کی پہلی صف میں کچھ دوست بھی تھے۔ محسن کے ساتھ استاد ٹیڈی بیٹھا مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا۔ بالکل آخری وقت میں مسز رضوی اندر آئیں اور ان کے ساتھ بیٹھ گئیں۔ وہ رضوی صاحب کی پبلک لائف سے دور رہتی تھیں چنانچہ کسی نے ان کو ایس ایس پی کی بیگم کی حیثیت سے شناخت نہیں کیا۔ میں نے احمد نواز گردیزی کو بھی دیکھا جس نے بڑے حوصلہ افزا انداز میں مسکرا کے مجھے دیکھا اور دو انگلیوں سے "وی فار وکٹری" کا مشہور نشان بنایا۔ میری نگاہیں دوستوں اور ناآشنا چہروں کے درمیان شکاری تلاش کر رہی تھیں جن کے پھیلائے ہوئے دام نے مجھے بڑی کامیابی سے اسیر کر لیا تھا۔ اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے کے برعکس اُترنے نہ پائے تھے زمیں پہ کہ گرفتار ہم ہوئے۔ پنہاں تھا دام سخت قریب آشیانے کے۔ لیکن مجھے کوئی شکاری صورت نظر نہ آئی۔ اگر ان کا کوئی "رپورٹر" سب کے درمیان سب سے الگ تھا تو میری نگاہ اسے شناخت نہ کر پائی۔ مختصر سا کمرہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔

اچانک دوسری صف میں سے ایک شخص اٹھا۔ وہ تقریباً چالیس سال کا دبلا پتلا اور اوسط قد و قامت کا آدمی تھا جس کی شخصیت کا سب سے نمایاں حصّہ اس کے لمبے لمبے بال تھے۔ بے ترتیب اور اس کے شانوں سے ذرا اوپر تک آنے والے سیاہ بالوں میں سفیدی کا عنصر قبل از وقت غالب محسوس ہوتا تھا۔ اس کی شیو بھی بڑھی ہوئی تھی اور لباس کے معاملے میں بھی وہ خاصی بے توجّہی کا شکار تھا۔ جو کرتا پاجامہ وہ پہن کے سویا تھا، اسی میں عدالت آگیا تھا۔ اس کی آنکھیں اس وقت بھی محوِ خواب لگتی تھیں۔

"جناب والا!" اس نے پلاسٹک کے سیاہ فریم اور موٹے شیشوں والی عینک کو ناک کے بانسے پہ جما کے کہا۔ "میں معزز عدالت سے پیشگی معذرت خواہ ہوں۔ مجھے کچھ عرض کرنا تھا۔"

جج نے چشمہ ہٹا کے اسے غور سے دیکھا۔ "آپ کا اس کیس سے کوئی تعلق ہے؟"

"جی۔ بہت اہم تعلق ہے۔" وہ بولا۔ "میں صفائی کا گواہ ہوں۔"

"تو آپ انتظار کیجیے۔ جب گواہی کا مرحلہ آئے گا تو آپ کو طلب کر لیا جائے گا۔" جج نے کہا۔

"میرا نام صفائی کے گواہوں میں نہیں ہے جناب والا۔" وہ بولا۔

"تو شامل کر لیا جائے گا۔" جج نے پھر چشمہ لگا لیا۔ "بیٹھ جائیں آپ۔"

"میں اس عدالت کے احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ عرض کرنے پر مجبور ہوں کہ میرا بیان پہلے ہو جانا چاہیے۔" اس نے کہا۔

"سماعت ایک طریقۂ کار کے مطابق ہوتی ہے مسٹر!" جج نے سختی سے کہا۔

"مجھے اس کا علم ہے یور آنر۔ لیکن مخصوص حالات کے پیشِ نظر میں گزارش کروں گا کہ اس طریقۂ کار سے تھوڑا سا انحراف کرتے ہوئے میرا بیان ریکارڈ کر لیا جائے۔" اس شخص نے گھورنے والی نظروں کی پروا کیے بغیر کہا۔ اس کا لہجہ پُرسکون، پُراعتماد اور پُریقین تھا۔ میں اور محسن، رابعہ اور منظر سب کی نگاہیں اس پہ مرتکز ہو گئی تھیں جو ہمارا نامعلوم طرفدار تھا۔

"کیوں؟" جج نے پھر چشمہ اتار کے رکھ دیا۔ "کیا ہیں وہ مخصوص حالات؟ مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ صرف تمہارے بیان کے لیے عدالتی طریقۂ کار بدل دیا جائے۔"

"یور آنر۔ میں روزنامہ صدائے وقت کا مدیرِ اعلیٰ ہوں جمیل احمد شہریار۔" اس نے اپنی پاٹ دار آواز میں کہا۔ "جو بیان میں دینا چاہتا ہوں وہ میرے نقطۂ نظر سے اس پورے مقدمے کا سب سے اہم بیان ہوگا اور میں عرض کروں کہ اس کا تعلق زندگی اور موت سے ہے تو اس میں قطعی مبالغہ نہیں۔ مزید یہ کہ میرے بیان اور میری پیش کردہ دستاویزی شہادت سے میر شرافت علی کے قتل کے مقدمے کا رُخ ہی نہیں بدلے گا اس سے قتل کے دوسرے کیس کے حالات بھی منظرِ عام پر آئیں گے۔"

"یہ ٹھیک ہے۔" جج نے جھنجلا کے کہا۔ "سوال صرف یہ ہے کہ تم اسی وقت مداخلت پہ کیوں مصر ہو؟"

"یہ مداخلت نہیں ہے جناب والا! ضرورت ہے۔" جمیل احمد نے کہا۔ "اس لیے کہ مجھے اپنی زندگی کے آنے والے لمحے کا بھی یقین نہیں۔ یہ بات میں عام عقیدے یا محاورے کے مطابق نہیں کہہ رہا ہوں۔ اگر یہ معزز عدالت مجھے ضمانت فراہم کر سکے کہ اس کمرے سے باہر نکلنے کے بعد مجھے قتل کر کے میری آواز ہمیشہ کے لیے خاموش نہیں کر دی جائے گی اور مجھے یقین دلا دیا جائے کہ مناسب وقت آنے پر جب میری گواہی مطلوب ہوگی تو یہ عدالت مجھے زندہ سلامت پیش کر سکے گی تو میں بیٹھ جاتا ہوں۔"

جب تک عدالت میں اس کی آواز آتی رہی مکمل سکوت رہا جس میں قدیم چھت کے پنکھے کی سرسراہٹ بھی صاف سنائی دیتی تھی۔ اس کے خاموش ہوتے ہی آوازوں کا بھنور سا اٹھا۔ جج نے روایت کے مطابق لکڑی کا ہتھوڑا میز پہ مار کے "آرڈر۔ آرڈر" کہا۔ "مسٹر جمیل احمد! آپ کو کیوں یقین ہے کہ بیان دینے سے پہلے ہی آپ کو قتل کر دیا جائے گا؟" جج نے سوال کیا۔

"اس لیے یور آنر کہ مجھے اس انجام سے خبردار کر دیا گیا ہے۔" جمیل احمد نے کہا۔ "اور میں جانتا ہوں کہ وہ لوگ صرف دھمکی نہیں دیتے، اس پر عمل کر کے بھی دکھاتے ہیں۔"

"کون لوگ؟" جج نے کہا جو اب اخبار کے اس ایڈیٹر کی بات سننے پر مجبور ہو گیا تھا۔ "آپ نے پولیس کو رپورٹ کی تھی؟"

"میں ان کو نام سے نہیں جانتا جناب والا۔ کسی کو صورت سے بھی نہیں پہچانتا۔" جمیل نے کہا۔ "وہ میرے ذاتی دشمن بھی نہیں ہیں لیکن وہ یہ نہیں چاہتے کہ میں اپنی شہادت اس عدالت کے روبرو پیش کروں۔ ان کے خلاف میں رپورٹ کیسے لکھوا سکتا ہوں جناب والا جن کے متعلق میری معلومات صفر ہیں۔ مجھے ان کا نام پتا صورت کچھ معلوم نہیں۔ کیا پولیس رپورٹ درج کر لیتی؟ اور بالفرضِ محال مجھے ایک اخبار کا ایڈیٹر ہونے کی وجہ سے رپورٹ لکھوانے میں کامیابی ہو جاتی تو کیا یہ ممکن تھا کہ میں اس وقت حاضر ہو سکتا؟ محض ایک رپورٹ نے کبھی کسی کی جان بچائی ہے جناب والا؟"

"آل رائٹ۔" جج نے کہا۔ "اس کا مطلب ہے وہ لوگ آپ کو جانتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ آپ کے پاس کوئی ایسی شہادت ہے جس سے۔ بقول آپ کے۔ مقدمے کا رُخ پلٹ جائے گا۔ تو انہوں نے اب تک آپ کو مہلت کیوں دی؟"

"اس لیے جناب والا کہ میں روپوش تھا۔" جمیل احمد نے کہا۔ "میں نے ان کے عزائم کا اندازہ حالات سے کر لیا تھا اس لیے میں غائب ہو گیا۔ انہیں میرا پتا معلوم ہو جاتا تو وہ مجھے اس عدالت تک ہرگز نہ پہنچنے دیتے۔ میں جانتا تھا کہ میرے لیے اس ملک سے بھاگ جانا آسان ہے اور جس دن میں اپنی گواہی کے لیے عدالت جاؤں گا تو شاید زندہ لوٹ کر نہیں آؤں گا۔ مگر اس میں میرے لیے اطمینان کا ایک پہلو تھا۔ فرار ہو جانے کی صورت میں یہ بوجھ تمام عمر میرے ضمیر پر رہتا کہ میں نے اپنی جان بچانے کے لیے حقائق سے پہلوتہی کی اور وہ بنیادی شہادت فراہم نہیں کی جس سے ایک شخص کی زندگی بچ سکتی تھی۔ میری مراد مبیّنہ ملزم سکندر بخت سے ہے جسے میں نے آج پہلی بار دیکھا ہے۔ یہ میرے یقین کے مطابق قتل ہوتا۔ موت کا ایک دن معیّن ہے۔ بے شک کسی کے چاہنے سے کوئی نہ مر سکتا ہے نہ بچ سکتا ہے لیکن ضمیر پر کوئی بوجھ لے کر جینے سے مر جانا بہتر ہے۔ میرے بیان کے بعد اگر وہ لوگ مجھے قتل بھی کر دیں گے تو مجھے اپنے مرنے کا کوئی افسوس نہیں ہوگا۔"

"مسٹر جمیل! مختصر بات کیجیے۔" جج نے کہا۔ "کیونکہ عدالت کا وقت قیمتی ہے۔"

"وقت کبھی انسانی زندگی سے زیادہ قیمتی نہیں ہوتا جناب والا!" وہ بولا۔ "کیا یہ عدالت، وقت کو انصاف کے تقاضوں سے زیادہ اہمیت دے گی؟ طریقِ کار کو ملحوظ رکھنے کے لیے ایک بے گناہ کو سزائے موت دینا پسند کرے گی؟ ہرگز نہیں۔"

"سوال صرف یہ ہے کہ آپ کو گواہی سے روکنے والے کون ہیں۔ نہ آپ انہیں جانتے ہیں نہ وہ آپ کے بارے میں جانتے تھے کہ آپ کہاں روپوش ہیں۔ اس کے باوجود انہوں نے آپ کو قتل کی دھمکی دی تو کیسے؟" جج نے کہا۔ "انہیں کیسے علم ہوا کہ آپ کے پاس کوئی بے حد اہم دستاویزی شہادت ہے۔ اور اگر مقدمے کا رُخ پلٹ جاتا تو ان کا کیا نقصان تھا؟"

"میں معذرت خواہ ہوں یور آنر کہ تمام سوالات کے جواب نہیں دے سکتا۔" اس نے جیب میں سے اخبار کا ایک صفحہ نکالا جسے اس نے تہ کر کے چھپا رکھا تھا۔ "باقی تمام سوالات کا جواب شاید آپ کو سماعت کے دوران میں مل جائے گا۔ میں صرف ایک سوال کا جواب پیش کرتا ہوں تاکہ عدالت کو قائل کر سکوں۔ یہ ایک اشتہار ہے جو ہر سنڈے ایڈیشن میں شائع ہوتا رہا۔ کسی نے اس کی عبارت یا مفہوم پر غور نہیں کیا۔ ملاحظہ فرمائیے تازہ ترین اشتہار۔ بنام جمیل احمد صدیقی ولد کفیل احمد صدیقی۔ المعروف بہ پیارے میاں۔ ہمارے علم میں یہ بات لائی گئی ہے کہ تم اہم دستاویزات لے کر روپوش ہو گئے ہو جن میں ایک ٹیپ بھی شامل ہے۔ تمہیں خبردار کیا جاتا ہے کہ کوئی غلط قدم اٹھانے کے نتائج انتہائی سنگین ہوں گے جس کے ذمّے دار تم خود ہو گے۔"

کچھ دیر عدالت میں مچھلی بازار کا سماں رہا۔ کسی نے جج کے ہتھوڑے اور "آرڈر۔ آرڈر" پکارنے کی پروا نہیں کی۔ اخبار کا وہ صفحہ رابعہ سے عبدالودود منتظر کے ہاتھوں میں اور پھر جج تک

پہنچا۔ جمیل احمد اب بیٹھ گیا تھا اور اسے قطعی پروا نہیں تھی کہ اس مجمع عام میں جو اس کے چاروں طرف موجود ہے کوئی بھی شخص اسے اس وقت بھی قتل کر سکتا تھا مگر عدالت کے کمرے میں قتل کے امکانات عملاً معدوم ہوتے ہیں اور اس چار دیواری میں تحفظ کا احساس غالب رہتا ہے۔ مجھے اس شخص کی جرأت و ہمت نے، بے باکی اور بے خوفی نے اور ضمیر کی آواز سنوانے کے اٹل فیصلے پر قائم رہنے کی مستقل مزاجی نے حیران کر دیا تھا۔ یہ تو وہ خود ہی بتا چکا تھا کہ اپنے مرنے جینے کی فکر اسے اپنے فرض سے سبکدوشی سے قبل تک تھی اس کے بعد نہیں ہوگی اور جس طرح اس نے عدالتی کارروائی روک کر اپنے بیان اور دلائل دیے تھے اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ سب سے پہلے اپنی کہنے آیا ہے تو اپنی کہہ کر ہی جائے گا۔ عدالت کے لیے وہ صفائی کا ایک اہم گواہ تھا لیکن میرے لیے وہ فرشتۂ غیب جس کی آمد کا مجھے انتظار تھا اور میرا نادیدہ محسن تھا جس نے میری زندگی بچانے کو اپنا مشن بنا لیا تھا اور یہ مشن طلبگارِ جاں تھا تو اسے پروا نہ تھی۔ جس درجے سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے۔ یہ جان تو آنی جانی ہے اس جاں کی تو کوئی بات نہیں۔

عدالت کا اجلاس آدھے گھنٹے کے لیے ملتوی ہو گیا تھا۔

جج نے رابعہ اور منظر کے ساتھ ہی استغاثہ کے وکیلوں کو بھی چیمبر میں مشورے کے لیے طلب کیا تھا اور محسن نے جمیل صدیقی کو آ گے، اپنے اور استاد ٹیڈی کے درمیان بُلا لیا تھا۔ محسن کے ساتھ مجھے اکرام شیخ نظر آیا جو شاید جمیل صدیقی کی بحث کے دوران ہی پہنچا تھا پھر میں نے نازلی کو دیکھا اور نہ جانے کیوں مجھے دکھ ہوا کہ یہ نادان لڑکی گرد و پیش سے بے نیاز آنکھیں بند کیے جذباتی وابستگی کے اس راستے پر آگے بڑھتی جا رہی ہے جس پر میں اس کا ساتھ نہیں دے سکوں گا۔ اس فریبِ آرزو کا انجام دل شکستگی تھا۔ خواہشوں کے سراب کی جستجو میں سرگرداں اس لڑکی کے لیے منزل فقط بے مراد واپسی کا تنہا اور پُرآزار سفر تھی لیکن یہ بات وہ نہیں سمجھتی تھی اور سمجھنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ کاش مجھ میں اتنی ہمت ہوتی کہ میں اس کو یہیں روک کر کہہ سکتا کہ لوٹ جائے۔ مگر کیا میرے کہنے سے وہ اپنی امیدوں کی شکست قبول کر لیتی اور تہی دامن و تہی دست لوٹ جاتی؟ اپنے خوابوں سے دستبردار ہو جاتی اور اپنے ارمانوں کو اس نوزائیدہ بچے کی طرح دفن کر دیتی جس کا وجود سندِ رسوائی ہو۔ دل کو بہلا کے تھپک کے سلا دیتی کہ نہیں کوئی نہیں۔ راہ رو ہوگا کہیں اور چلا جائے گا۔

میں اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ یہ احساس مجھے جج کے دوبارہ آنے پر ہوا لیکن نازو میری نظر کے اشارے کا غلط مطلب نکال چکی تھی۔ اب میں اسے کیا بتاتا اور کیسے بتاتا کہ میں تو اسے دیکھ ہی نہیں رہا تھا اور تصور صرف آنکھوں کا سہارا جواز کی جانب دیکھتی رہیں جب کہ میرے خیالات متضاد سمت محو پرواز تھے۔ رابعہ نے مجھے دیکھ کے سر ہلایا اور منظر نے مسکرا کے باقاعدہ آنکھ ماری۔

"مسٹر جمیل احمد صدیقی!" جج نے کہا اور صدیقی صاحب کھڑے ہو گئے۔ "اگرچہ آپ شواہد و دلائل سے عدالت کے سامنے مخصوص حالات کا جواز پیش کرنے میں ناکام رہے اور یہ ثابت نہیں کر سکے کہ محض اپنے بیان کی پاداش میں آپ کو نامعلوم افراد کے ہاتھوں مارے جانے کا خطرہ ہے لیکن وکیلانِ صفائی نے نسبتاً تفصیل سے وضاحت کی چنانچہ یہ عدالت آپ کو اپنا بیان ریکارڈ کرانے کی خصوصی اجازت دیتی ہے۔"

"جنابِ والا!" وکیلِ استغاثہ نے اعتراض اٹھاتے ہوئے کہا۔ "اگر عدالتی طریقۂ کار سے انحراف کا کوئی جواز نہیں ہے جیسا کہ آپ نے خود فرمایا۔ تو اس مرحلے پر یہ شہادت الفعان کے تقاضوں کے خلاف اور ملزم کو خصوصی رعایت دینے کے مترادف ہے۔"

"گواہ ایک معتبر اور معزز شخص ہے۔" جج نے کہا۔ "اس نے یہ درخواست بقائمی ہوش و حواس کی ہے۔ چنانچہ عدالت یہ سمجھنے پر مجبور ہے کہ اس کے خدشات بے بنیاد نہیں۔ اگر مناسب تحفظ فراہم نہ ہونے کے باعث ایک ایسی شہادت پیش ہونے سے رہ گئی جس پر ایک انسان کی زندگی یا موت کے فیصلے کا انحصار ہے تو یہ نقصان ناقابلِ تلافی ہوگا۔ صدیقی صاحب! آپ گواہوں کے کٹہرے میں آ سکتے ہیں۔"

جمیل احمد صدیقی نے مروّجہ حلف اٹھایا اور بیان شروع کیا۔ "حضورِ والا! جو کچھ میں عرض کروں گا اس کا پہلے ہی کچھ حصہ تحریری صورت میں اس عدالت کے ریکارڈ پر ہے۔ میری مراد اے ایس آئی اکرام شیخ کے ایک بیان سے ہے جس کے ساتھ متعلقہ تھانے کے محرر کے ہاتھ سے لکھا ہوا ایک اقبالی اعترافِ جرم شامل ہے۔ یہ استغاثہ کے ایک چشم دید گواہ عبدل کا وہ بیان ہے جو اس نے مرنے سے پہلے ٹیلی فون کر کے لکھوایا تھا کیونکہ مرحوم عبدل کے پاس خود تھانے حاضر ہو کے بیان دینے کے لیے وقت نہیں تھا اور اس کی جسمانی قوت جواب دے رہی تھی۔ وہ شیدے نام کے ایک شخص کو قتل کر چکا تھا جو استغاثہ کا دوسرا عینی گواہ تھا لیکن اس جھگڑے میں وہ خود بھی مہلک طور پر شدید زخمی ہوا تھا۔"

"مجھے اس پر اعتراض ہے جنابِ والا!" وکیلِ استغاثہ نے کھڑے ہو کر کہا۔ "معزز گواہ کو ان واقعات کا علم کیسے ہوا؟"

جمیل صدیقی مسکرایا۔ "اوّل تو یہ سماعت پہلے بھی کھلی عدالت میں ہوئی ہے چنانچہ کوئی بات پوشیدہ نہیں۔ اس کے علاوہ میں ایک اخبار کا مدیر ہوں جس کو گرد و پیش کے واقعات کی خبر عام آدمی سے زیادہ ہوتی ہے۔ تیسری بات یہ کہ اے ایس آئی اکرام شیخ خود عدالت میں موجود ہیں۔ اگر میں غلط بیانی کروں تو انہیں تصدیق کے لیے طلب کیا جا سکتا ہے۔"

"میں آپ کا اعتراض مسترد کرنے پر مجبور ہوں۔" جج نے کہا۔ "بیان جاری رکھیے صدیقی صاحب!"

"شکریہ جنابِ والا!" جمیل نے کہا۔ "اے ایس آئی اکرام شیخ نے کہا تھا کہ ٹیلی فون پر موصول ہونے والے عبدل کے بیان کو صرف محرر نے ہی نہیں لکھا تھا خود انہوں نے تھانے میں موجود ایک ٹیپ ریکارڈر پر محفوظ کر لیا تھا۔ ٹیپ ریکارڈر مالِ مسروقہ تھا۔ بعد میں ٹیپ ریکارڈر میں لگا ہوا اسپول پُراسرار طور پر غائب ہو گیا۔ اور ایک مقتول انسپکٹر میر محمد نے مشیر نامے کی رُو سے ثابت کیا کہ اس ٹیپ ریکارڈر میں کوئی اسپول نہیں تھا۔ شاید عدالت کے علم میں یہ بات نہ ہو کہ کچھ عرصے بعد وہ محرر بھی کہیں چلا گیا جس نے اپنے ہاتھ سے عبدل کا بیان ٹیپ سے کاغذ پر اتارا تھا۔ محرر کی گمشدگی کے متعلق پندرہ دن بعد تھانے میں ایک رپورٹ لکھوائی گئی جو محرر کی بیوی نے درج کرائی تھی۔ اس تاخیر کے علاوہ یہ بات بھی قابلِ غور ہے جنابِ والا کہ متعلقہ تھانے والوں نے محرر کی بیوی کی رپورٹ درج کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا اور کہا تھا کہ وہ اسے چھوڑ کر بھاگ گیا ہے تو ہم کیا کریں۔ اس عورت نے میرے اخبار کے ایک رپورٹر کی مدد سے ڈی آئی جی صاحب کو درخواست دی اور انہی کے حکم پر رپورٹ لکھی گئی مگر محرر کا ابھی تک کوئی پتا نہیں۔ ان حالات میں یہ فرض کر سکتا ہوں کہ اس کی تحریر کی صداقت کو چیلنج کیا جائے گا۔ نہ وہ خود موجود ہے کہ اے ایس آئی اکرام شیخ کے بیان کی تائید کر سکے اور مقتول ایس ایچ او ٹیپ کی عدم موجودگی کا دستاویزی ثبوت پہلے ہی پیش کر چکا ہے۔ میری معلومات کے مطابق اس ٹیپ ریکارڈر میں ٹیپ موجود تھا لیکن مشیر نامہ تیار کرتے وقت صرف اہم تفصیلات کو مدِنظر رکھا گیا۔ مثلاً مالِ مسروقہ کے کوائف میں صرف ٹیپ ریکارڈر لکھا گیا اور میکر یعنی بنانے والی کمپنی کا نام۔ میرے خیال میں 'گرنڈگ' کے اس ٹیپ ریکارڈر کا ماڈل نمبر بھی لکھا جانا چاہیے تھا ورنہ گرنڈگ کمپنی کے بہت سے نئے پرانے ماڈل مستعمل ہیں۔ البتہ TK-47 ایسا ماڈل ہے جو ٹیلی فون سے منسلک ہو جائے تو موصول ہونے والے پیغامات ریکارڈ کر سکتا ہے۔ ایسی ہی ایک ضروری تفصیل یہ تھی کہ ٹیپ ریکارڈر میں لگے ہوئے اسپول کا ذکر کیا جاتا۔ بلکہ اس کا سائز بھی درج کیا جاتا۔ یہ عمداً کیا گیا یا محض بے پروائی کے باعث۔ میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ لیکن مقتول ایس ایچ او نے عدالت کے روبرو جانتے بوجھتے جھوٹ بولا۔ حقائق کو چھپایا اور بنیادی شہادت کو ختم کرنے کی کوشش کے جرم کا ارتکاب کیا۔"

"اعتراض یور آنر!" وکیلِ استغاثہ نے کہا۔ "ایک مقتول ایس ایچ او پر اس نوعیت کے سنگین الزامات عائد کرنا اخلاقاً اور قانوناً غلط ہے کیونکہ وہ ان کی تردید کے لیے پیش نہیں ہو سکتا۔"

"اس کی ضرورت نہیں یور آنر!" جمیل احمد صدیقی نے کہا۔ پھر اس نے قمیص کے اندر ہاتھ ڈال کے گتے کا ایک ڈبا برآمد کیا جو سات آٹھ انچ مربع اور موٹائی میں نصف انچ کے قریب تھا۔ "یہ بی اے ایس ایف کا وہ اسپول ہے جنابِ والا جو ٹیپ ریکارڈر میں فٹ تھا۔ یہ چھ انچ سائز کا اسپول ہے۔ گتے کا ڈبا اس کے ساتھ نہیں تھا۔ یہ میں نے ٹیپ کی حفاظت کی خاطر خود فراہم کیا تھا۔ اس پر عبدل کا پورا بیان اس کی اپنی آواز میں موجود ہے جو اس نے مرنے سے پہلے دیا تھا چنانچہ قانوناً اس کی صداقت مسلّم ہے۔"

عدالت میں پھر ایک شور برپا ہوا۔ جج کے ریڈر نے ڈبا لے کر بڑی احتیاط سے جج کے سامنے رکھ دیا۔ میرے جسم کا رُواں رُواں مسرت سے سرشار ہو گیا اور میرا سر اس شخص کے لیے تعظیم سے جھک گیا جس نے عملاً ثابت کر دیا تھا کہ حق گوئی و بے باکی آئینِ جواں مرداں۔ جس نے بتا دیا تھا کہ دنیا اب بھی ان لوگوں سے خالی نہیں جو دوسروں کے لیے جیتے ہیں اور دوسروں کے لیے مر بھی جاتے ہیں۔ جج نے کئی بار میز پر ہتھوڑا بجایا۔ اس سنسنی خیز اور ڈرامائی انکشاف نے عدالت میں دھماکا کر دیا تھا اور واقعی مقدمے کا رُخ بدل دیا تھا۔

"مسٹر جمیل احمد صدیقی!" جج نے خاموشی ہو جانے کے بعد کہا۔ "قانون کی مدد کے لیے آپ نے جس مستقل مزاجی اور دُور اندیشی کا ثبوت دیا عدالت اس کی قدر کرتی ہے۔"

"ابھی اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملا ہے جنابِ عالی کہ یہی وہ ٹیپ ہے۔" وکیلِ استغاثہ نے احتجاج کیا۔

"مجھے اس اعتراض کے اٹھائے جانے کی توقع تھی یور آنر۔" جمیل احمد صدیقی نے کہا۔ "چنانچہ میں نے اپنے فراہم کردہ ثبوت کو حتمی اور ناقابلِ تردید بنانے کا بھی پورا بندوبست کر لیا تھا۔ اے ایس آئی اکرام شیخ میری اور اس معزز عدالت کی مدد کے لیے ویسا ہی ایک ٹیپ ریکارڈر لے کر آئے ہیں۔ میں استدعا کروں گا

کہ مقتول عبدل کا یہ آخری بیان مدعی اور مدعا علیہان کے سامنے سنوا دیا جائے۔ اور اسپول کو عدالت کی تحویل میں اور اس کے ریکارڈ پر لے لیا جائے۔"

"مجھے یہ ٹیپ ریکارڈر پیش کرنے کی اجازت ہے یور آنر؟" اے ایس آئی اکرام شیخ نے کھڑے ہو کر کہا۔

"بیان زیادہ طویل نہیں ہے۔" جمیل صدیقی نے کہا۔ "اور اس کی اہمیت واضح ہو جانے کے بعد یہ عدالت پندرہ بیس منٹ کے وقفے کو وقت کا زیاں قرار نہیں دے گی۔"

جتنی دیر میں اکرام شیخ نے ٹیپ ریکارڈر کو جج کے سامنے میز پر رکھا اور اس کا پلگ لگایا، عدالت میں ایک ہلچل مچی رہی۔ ہر شخص آگے آ کے ٹیپ کا ہر لفظ سننے کے لیے بے تاب تھا، خصوصاً اخباری نمائندے۔ وہ اب پینسل اور پیڈ لیے اس بیان کا ایک ایک لفظ سننے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ پلگ میز کے قریب نہیں تھا مگر یہ بات یقیناً اکرام شیخ کے ذہن میں تھی چنانچہ وہ خاصی لمبی 'لیڈ' لے کر آیا تھا جس سے ٹیپ ریکارڈر کو تقریباً چھ گز دور پلگ میں لگا دیا گیا۔ جج نے اس دوران میں کئی بار میز کو ہتھوڑے سے بجایا! اور 'آرڈر آرڈر' پکارا لیکن خاموشی اسی وقت ہوئی جب اکرام شیخ نے ٹیپ ریکارڈر میں ٹیپ فٹ کیا اور ٹیپ ریکارڈ کی ایک سرخ آنکھ جیسی روشنی "ہوشیار خبردار" پکارنے لگی۔ میں نے اشارے سے رابعہ کو اپنی طرف بلایا۔

"محسن سے کہو ذرا انکل رضوی کو فون کرے۔" میں نے سرگوشی میں کہا۔ "ٹیپ ہم سن رہے ہیں۔ وہ انکل کو بتا دے کہ یہاں کیا صورتِ حال درپیش ہے۔ وہ جمیل احمد صدیقی کو بحفاظت عدالت سے باہر لے جانے اور گھر تک پہنچانے کا ایسا انتظام کر سکتے ہیں کہ کسی کو پتا نہ چلے۔ پندرہ بیس منٹ ٹیپ چلے گا، ممکن ہے جمیل احمد صدیقی کا بیان بعد میں بھی چلے۔"

"یور آنر!" اکرام شیخ نے ٹیپ کو ایک جگہ روک کر جج کو مخاطب کیا۔ "عبدل کا ٹیلی فون موصول ہونے کے بعد میں ابتدائی گفتگو کا کچھ حصہ ریکارڈ نہیں کر سکا تھا کیونکہ میں اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ ہونے کے بعد میں نے فوراً اس ٹیپ ریکارڈر سے فائدہ اٹھایا جو برآمد شدہ... مالِ مسروقہ میں شامل تھا اور عبدل سے درخواست کی کہ وہ ساری بات پھر کہے چنانچہ اس نے دوبارہ بات شروع کی۔"

میں نے رابعہ کو محسن کے پاس جا کے آہستہ سے کچھ کہتے اور محسن کو دبے پاؤں باہر جاتے دیکھا۔ اسی وقت ٹیپ ریکارڈر سے ایک آواز ابھری جو بے وجود ہو چکی تھی مگر برقی مقناطیسی ارتعاشات کی صورت میں زندہ تھی۔

"جنابِ تھانیدار صاحب! میں عبدل ہوں۔ پورا نام عبداللہ۔ باپ کا نام منشی بندے علی... شرافت علی مرحوم کا پرانا ملازم ہوں... مجھ سے پہلے میرا باپ منشی اسی خاندان کا نمک خوار تھا... اور دوست احباب کے حلقے میں نوما پچو بھی کہلاتا تھا۔ شرافت علی کو قتل کر دیا گیا تھا اور اس کا الزام وزیر خان کے بیٹے سکندر بخت پر ہے۔ اس کے خلاف میں نے بھی گواہی دی تھی اور شیدے نے بھی۔ شیدا دراصل... رشید ہے۔ اسے ملازم ہوئے دو سال بھی نہیں ہوئے تھے اور وہ شرافت علی کا ڈرائیور تھا۔ میں نے تو صرف یہ کہا تھا کہ... سکندر بخت نے... سامنے شرافت علی کو مارا... اور اس کے کمرے میں بھی سامان توڑ پھوڑ کر تباہ کیا کیونکہ... وہ بہت غصے میں تھا اور شرافت علی پر چلا رہا تھا کہ اسی نے وزیر خان کو... بلیک میل کیا... اور قتل کرا دیا... میں نے شرافت علی کو سکندر کے سامنے... گھٹنوں کے بل بیٹھ کے رحم کی بھیک مانگتے بھی دیکھا تھا... لیکن خدا گواہ ہے... میں نے سکندر کو قتل کرتے نہیں دیکھا تھا... یہ بات صرف شیدے نے اپنے بیان میں کہی تھی... آج ہی اپنی ماں کے مجبور کرنے پر میں سکندر بخت کو بلانے گیا تھا... معلوم نہیں کیوں میری ماں اس سے ملنا چاہتی تھی... میں یہ جانتا ہوں کہ وزیر خان کی اور میرے باپ منشی کی دوستی تھی... پاکستان بننے سے پہلے سے... سکندر میرے ساتھ اکیلا نہیں آیا... اس نے اپنے دوست کو بھی ساتھ لیا... اور آنے سے پہلے ایس پی رضوی صاحب کو بھی بتا دیا۔ انہوں نے بھی مجھ سے کچھ سوالات کیے تھے... اور سکندر سے یہ بھی کہا تھا کہ جاؤ... تمہاری حفاظت کا انتظام میں کر دوں گا۔ میری ماں نے سکندر کے آنے کے بعد مجھ سے کہا کہ میں باہر چلا جاؤں... وہ سکندر سے کوئی راز کی بات کہنا چاہتی تھی۔ لیکن مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس نے چپکے سے سکندر کو کچھ دے دیا۔ کیونکہ سکندر جب آیا تھا تو خالی ہاتھ تھا۔ لیکن وہ جانے لگا تو اس کے پاس ایک بریف کیس تھا... یہ بات میں نے شیدے کو بتائی... ہم... نے، ہم دونوں نے مل کر سکندر کو روکنے کی اور اس سے بریف کیس

چھیننے کی کوشش کی... مگر وہ نکل گیا... کیونکہ اس کا دوسرا ساتھی فائر کی آواز پہ آ گیا تھا... شیدا مجھے گالیاں دینے لگا... کہ تیری بے وقوفی کی وجہ سے یہ سب کچھ ہوا۔ تجھے کیا ضرورت تھی وہاں سے نکلنے کی... اور نکلا ہی تھا تو چھپ کر دیکھتا... اس نے میری ایک نہیں سنی... کہ میں نے پوری کوشش کی تھی... پھر وہ میری ماں سے پوچھنے گیا... کہ اس نے سکندر بخت کو کیا دیا ہے... میری ماں اندھی تھی، تھانیدار صاحب۔ اور بہت بوڑھی تھی... مگر اس نے شیدے کو کچھ بتانے سے انکار کر دیا... شیدا گرم ہو گیا اور اس نے میری ماں کو گالی دی... میں نے اسے منع کیا تو وہ اور بڑھ گیا۔ وہ میری ماں کو میرے سامنے مارنا چاہتا تھا... اور زبردستی اس سے... معلوم کرنا چاہتا تھا کہ... سکندر کیا... کیا لے گیا ہے... یہ... یہ میں کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ میں بہت برا ہوں... بڑا گنہگار ہوں... میری ساری عمر برے کاموں میں گزری ہے... لیکن اچھا ہو یا برا... ماں تو ہر بیٹے کے لیے ایک ہی جیسی ہوتی ہے نا تھانیدار صاحب... میں نے شیدے کا مقابلہ کیا... لیکن اس سے پہلے وہ مجھے گولی مار چکا تھا... مجھے معلوم ہے اب میں بھی مر جاؤں گا... میری ماں اس لڑائی سے پہلے ہی مر گئی تھی... اور میرا باپ بہت پہلے قتل کر دیا گیا تھا۔ اب میں اپنے ماں باپ کو اور شرمندہ نہیں کروں گا... میں بہت ناخلف تھا... ان کو بہت دکھ دیے میں نے... لیکن مرنے سے پہلے وہی کروں گا... جو وہ کرنا چاہتے تھے... میں سکندر پر کسی اور قتل کا الزام نہیں آنے دوں گا... اتنی رات گئے مجھے کوئی سواری نہیں ملے گی... ملی تو وہ مجھے لہولہان دیکھ کر بھاگ جائے گا... میں تھانے نہیں آ سکتا۔ میر شرافت علی کی کوٹھی کے اندر فون سے...."

ٹیپ یکلخت خاموش ہو گیا۔ مکمل سکوت میں صرف اس کے اسپیکر کی ہلکی سی سرسراہٹ باقی رہ گئی تھی۔ عبدل کے ساتھ ہی عبدل کا بیان ختم ہو گیا تھا۔ لیکن ایک سچائی ناقابلِ شکست بنیادوں پر استوار ہو چکی تھی۔ اکرام شیخ نے ہاتھ بڑھا کے ٹیپ کو آف کر دیا۔ ری وائنڈ کیا اور نکال کے جج کے سامنے رکھ دیا۔ مہر بلب اور ساکت وصامت بیٹھے لوگوں کی صورت قابلِ دید تھی۔ وہ خوف، حیرت، تجسس و تحیر اور واقعات کے اس نئے موڑ کی سنسنی خیزی سے سانس روکے بیٹھے تھے۔ ٹیپ ختم ہوا تو آہستہ آہستہ انہیں کمرۂ عدالت میں اپنی موجودگی کا احساس ہوا۔ سرگوشی میں کی جانے والی باتوں کا شور رفتہ رفتہ بلند ہونے لگا۔ رابعہ اور عبدالودود منظر نے مسرت سے میری طرف دیکھا اور منظر نے عادتاً مجھے آنکھ ماری۔ اکرام شیخ اب تار نکال کے لپیٹ رہا تھا۔ اس کی بہن کا چہرہ یوں کھل اٹھا تھا جیسے مقدمے کی سماعت ختم ہو چکی ہے اور عدالت نے مجھے باعزت طور پر بری کر دیا ہے۔

"مسٹر صدیقی! آپ کو کچھ اور کہنا ہے؟" جج نے ایک بار پھر شور ہنگامے پر قابو پا کے کہا۔

"یس سر!" جمیل احمد نے کرسی سے اٹھ کے کہا جو اسے وہیں فراہم کر دی گئی تھی۔ "ابھی تو میں نے ان معاملات سے متعلق کچھ کہا ہی نہیں جن کا تعلق مجھ سے ہے۔ میں سکندر بخت کو نہیں جانتا۔ کسی عبدل سے واقف نہیں اور میں نے نہ میر شرافت علی کا نام سنا تھا اور نہ اسے دیکھا تھا۔ قتل ہر روز ہوتے ہیں اور ان کے اسباب زر، زمین اور زن سے بڑھ کر کہیں زیادہ ہو گئے ہیں۔ میں ان کی خبریں چھاپتا تھا اور بھول جاتا تھا۔ اس کیس میں بھی میری کوئی ذاتی دلچسپی نہیں تھی اور سکندر بخت قاتل ہے یا نہیں، اس کا فیصلہ عدالت ہی کرے گی۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ بہت سے مجرم کسی نہ کسی طرح قانون کی گرفت میں آنے سے رہ جاتے ہیں لیکن میرا یہ عقیدہ ہے کہ وہ سزا سے نہیں بچتے۔ اس دنیا کی ہر عدالتِ عظمیٰ سے بڑی عدالت اوپر ہے جس کے سامنے 'حقائق' واقعات اور شہادت' کسی کو مسخ نہیں کیا جا سکتا۔ اور جو اس دنیا کی عدالت سے سزا نہ پا کے سمجھتے ہیں کہ وہ بچ گئے وہ گھاٹے میں رہتے ہیں۔ کیونکہ اس عدالت کی دی ہوئی سزا کہیں زیادہ سخت ہوتی ہے اور اس کے خلاف اپیل کوئی نہیں۔" اس نے اوپر انگلی اٹھا کے کہا۔ "کوئی تعلق نہ ہونے کے باوجود آج میں اس کیس میں بطورِ گواہ پیش ہونے پر مجبور ہوں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میرا یہ فعل خود میری زندگی کے لیے پُرخطر ہے۔ یہ ٹیپ میرے پاس دو بچے لے کر آئے تھے۔ بلکہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ وہ دونوں بچے مجھے تلاش کرتے ہوئے میرے اخبار کے دفتر پہنچے تھے۔ میں آفس میں موجود نہیں تھا چنانچہ ان کی ملاقات ایک مزاحیہ کالم نگار سے ہوئی جس کا نام مست قلندر تو نہیں تھا مگر وہ اسی قلمی نام سے فکاہیہ کالم لکھتا تھا۔ آپ نے پرسوں کے اخبارات میں ملاحظہ کیا ہو گا کہ کس طرح دن دہاڑے کچھ لوگوں نے 'صدائے وقت' کے دفتر پر حملہ کیا۔ بظاہر وہ طلبہ کا ایک گروہ

تھے جو کسی خبر کے خلاف احتجاج کرنے آتے تھے لیکن حقیقت یہ ہے جناب والا کہ انہوں نے مست قلندر سے یہی ٹیپ مانگا تھا۔ وہ دُبلا پتلا کمزور سا آدمی جب کسی موضوع پر قلم اٹھاتا تھا تو ایوانِ اقتدار میں بیٹھنے والوں کے قول و فعل کی پوسٹ مارٹم رپورٹ لکھ مارتا تھا اور اس کے قلم کی کاٹ سے افسر شاہی کے بڑے بڑے مُہرے پٹ جاتے تھے لیکن ان غنڈوں پر ہاتھ اٹھانا اس کے بس کی بات نہیں تھی جو لاقانونیت کو اپنا قانون سمجھتے تھے۔ انہوں نے مست قلندر سے پوچھا کہ ٹیپ کہاں ہے اور وہ دونوں بچّے کہاں ہیں لیکن اس نے جبر کی طاقت کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا، تم مجھے صرف قتل کر سکتے ہو۔ قتل تو لوگ ہر روز ہوتے ہیں۔ یہی اس نے مجھ سے کہا تھا جنابِ والا۔ اور اس نے یہ بھی کہا تھا کہ سب لوگ ایک ہی طرح نہیں مرتے۔ کوئی بھی نہیں جان سکتا کہ وہ کب، کہاں اور کس طرح دنیا سے جائے گا۔ اب اگر نوشتۂ تقدیر یہی ہے تو اس سے لڑنا میرے اختیار کی بات نہیں۔ ہاں، مجھے اپنے قول و فعل پر پورا اختیار ہے اور اس کا حق تم مجھ سے اس وقت تک نہیں چھین سکتے جب تک اجل کا نامہ بر آ کے نہ کہے کہ مست قلندر تیری زندگی کا یہ فکاہیہ کالم پورا ہوا۔ میں تم کو نہیں بتاؤں گا کہ اس ٹیپ کی اصل کہاں ہے اور نقل کہاں ہے۔ مرتے دم تک وہ اپنی بات پر قائم رہا اور وہ لوگ بہت مایوس ہوئے جو قتل کو دھمکی سمجھتے تھے۔ اس نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ زیادہ سے زیادہ تم لوگ مجھے قتل کر سکتے ہو۔ خبر آپ نے پڑھ ہی لی ہو گی۔ آپ تعزیتی بیانات۔ احتجاجی بیانات۔ مذمت کی قرار دادیں۔ مجرموں کو قرار واقعی سزا دینے کے مطالبے سب پڑھ چکے ہوں گے۔ یہ رسمِ دنیا ہے جسے نبھانے والوں نے پسِ مرگ خوب نبھایا۔ عمر بھر سنگ زنی کرتے رہے اہلِ وطن۔ یہ الگ بات ہے دفنائیں گے اعزاز کے ساتھ۔ میں معذرت چاہتا ہوں۔ جذباتی ہو کے عدالتی بیان میں شاعری کرنے لگا۔ کہنا مجھے یہ تھا جنابِ والا کہ جو خبر کہیں شائع نہیں ہوئی اور کسی نے نہیں پڑھی، وہ کچھ اور تھی۔ مست قلندر مر گیا۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔ اسے مارنے والے ٹیپ کی نقل تلاش کر کے لے جانے میں بھی کامیاب ہو گئے مگر وہ اصل کو اس عدالت تک پہنچانے کے مشن کو ناکام بنانے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ مست قلندر کو امید نہیں تھی کہ اس بیسویں صدی کے مہذب معاشرے میں بھی قانون کو اتنا بے بس سمجھنے والے ہیں جو ایک ٹیپ کی خاطر ایک زندگی لے سکتے ہیں ورنہ وہ دو نقلیں بنوا لیتا اور دونوں ان کے حوالے کر دیتا۔ ممکن ہے وہ لوگ اسے بخش جاتے لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا۔ اسے ایسے ہی مرنا تھا، سو وہ مر گیا۔ اسے مارنے والوں کو پھر بھی شکست ہوئی اور میں نے وہ ٹیپ عدالت کے سپرد کر دیا ہے لیکن ان حالات میں کیا میرے خدشات کو بے سبب اور بے بنیاد کہا جا سکتا ہے؟ کیا اس صورت میں سچ کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کے بعد میں نے خود اپنے لیے سزائے موت قبول نہیں کر لی ہے۔ میں اس نبی کی خاکِ پا بھی نہیں جس نے راہِ حق میں ہر صعوبت کو سجدۂ شکر کے ساتھ قبول کیا۔ میں تو سقراط ہونے کا دعویٰ بھی کر دوں تو خدا مجھے اس عذرِ بے پر رسوا کرے۔ یہ سچ میرے پاس ایک امانت تھا اور کیوں تھا، اس کہانی کا زیرِ سماعت مقدمے سے کوئی تعلق نہیں چنانچہ میں اس کو حذف کرتا ہوں۔ میں سرخ رُو ہوں کہ اس بارِ امانت سے سبکدوش ہوا۔"

"مسٹر صدیقی!" جج نے نرمی سے کہا۔ "یہ ٹیپ آپ کے پاس کیسے پہنچا اور وہ بچّے کون تھے جن کا آپ نے ذکر کیا ہے؟"

"جنابِ والا! مست قلندر مرحوم نے بڑی عجلت میں ٹیپ کی ایک نقل بنا کے اولڈ ریکارڈ میں رکھوا دی تھی۔" جمیل صدیقی نے کہا۔ "اور ان بچّوں کو اصل سمیت میرے حوالے کر دیا تھا۔ وہ بچّے مقتول ایس ایچ او میر محمد کے تھے۔ آپ کے علم میں یقیناً ہو گا کہ اسے قتل کرنے والے ابھی تک گرفتار نہیں ہوئے ہیں۔ انہی لوگوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ میر محمد کی بیوی کو اغوا کر کے لے گئے ہیں۔"

"سوال یہ ہے صدیقی صاحب کہ وہ بچّے آپ کے پاس ہی کیوں پہنچے؟" جج نے کہا۔ "وہ پولیس اسٹیشن کی حدود میں رہتے تھے اور ان کے لیے وہیں پناہ لینا زیادہ آسان تھا۔"

"یہ ان کی ماں نے انہیں سمجھا دیا تھا کہ وہ تھانے نہ جائیں۔" جمیل صدیقی نے کہا۔ "شاید اس لیے کہ تھانے کو وہ ان کی دسترس سے دور نہیں سمجھتی تھی جو اس کے گھر میں داخل ہو کے مار پیٹ اور توڑ پھوڑ کے جرم کے مرتکب ہوتے تھے۔ وہ بچّے بہت چھوٹے ہیں جنابِ والا، چنانچہ ان باتوں کو نہیں سمجھتے کہ لوگ قتل کیوں کرتے ہیں اور جب باپ گھر میں نہ ہو تو ماں کے ساتھ ایسا ظالمانہ سلوک کیوں کرتے ہیں۔ انہوں نے مست قلندر مرحوم کو بھی بتایا تھا اور مجھے بھی کہ ان کے ابّو کہیں گئے ہوئے تھے اور گھر میں صرف ان کی ماں تھی۔ ایک دُبلی پتلی کمزور عورت۔"

"کیا آپ نے اسے دیکھا تھا؟" جج نے کہا۔ "آپ کی کوئی عزیزہ تھی وہ؟"

"عزیزہ؟" جمیل صدیقی نے یہ لفظ یوں دُہرایا جیسے اس کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ "جی ہاں۔ وہ عزیزہ تھی... بے حد

عزیزہ تھی مجھے اور میں نے اسے دیکھا تھا۔ یہ قصّہ ہے جب کا آتش جواں تھا۔ آئی ایم سوری۔ مجھے بات مختصر کرنی چاہیے اور ٹو دی پوائنٹ۔ ان بچّوں نے مجھے بتایا کہ وہ اسکول سے واپس آ کے کھانا کھا رہے تھے جب دروازے پر دستک ہوئی اور ان کی امّی یہ سمجھی کہ شاید میر محمد لوٹ آیا ہے۔ میں میر محمد کے کردار پر کوئی تبصرہ نہیں کروں گا۔ اس کے فرائض کی نوعیت البتہ ایسی تھی کہ وہ بعض اوقات دن رات گھر سے باہر رہتا تھا۔ اگر مسلسل غیر حاضر رہتا ہو تو یہ بھی ممکن ہے۔ دروازہ کھلتے ہی دو افراد اندر آ گئے جن کے متعلق بچّوں نے بتایا کہ وہ بہت طاقتور تھے اور ان کی ماں کے مقابلے میں بہت بڑے تھے۔ بچّوں کے اپنے الفاظ میں، 'وہ پہلوانوں جیسے تھے اور امّی ان کے سامنے بہت چھوٹی لگتی تھیں'۔ اسی لیے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ اب بھی دُبلی پتلی اور نازک اندام تھی۔ بڑا بچّہ نسبتاً سمجھدار ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ اندر آتے ہی ان لوگوں نے بڑے بڑے چاقو نکال لیے تھے اور کہا تھا کہ چیخنے چلّانے یا حلق سے آواز نکالنے کی کوشش کی تو سب کو ذبح کر دیا جائے گا۔ بچّے ڈر گئے کیونکہ ان کی ماں بھی ڈر گئی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے بچّوں کی ماں سے ٹیپ کے متعلق پوچھا۔ اور اس کے بعد اس پر تشدّد کے وہ سب انسانیت سوز حربے آزمائے جن کا ذکر بھی میرے لیے باعثِ آزار ہے۔ یہ عدالت خود اندازہ کر سکتی ہے کہ کسی گھر میں ایک تنہا عورت کے ساتھ دو وحشی اور درندہ صفت افراد کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ تاہم بچّے اسی دھمکی سے خوفزدہ تھے جو آنے والوں نے گھر میں قدم رکھتے ہی دی تھی۔ انہوں نے اس ڈر سے کوئی آواز نہیں نکالی کہ وہ لوگ انہیں اور ان کی ماں کو ذبح کر دیں گے اور کونے میں دبکے پڑے رہے۔ آپ ان بچّوں کی ذہنی کیفیت کا اندازہ نہیں کر سکتے حضورِ والا۔ ان کے معصوم ذہن کو خوف نے کس حد تک مسخ کر دیا ہے۔ وہ رات کو روتے ہیں، نیند میں چلنے لگتے ہیں۔ اور ایسی باتیں کرنے لگتے ہیں جو اُن کی عمر کے دوسرے بچّے نہیں کرتے۔ وقت بڑا مسیحا ہے۔ میں انہیں جھوٹ کی گولیاں دے دے کر وقت گزار رہا ہوں اور کوشش کر رہا ہوں کہ وہ نارمل رہیں لیکن اس کے باوجود وہ بڑے ہو کر انسان نہ رہیں، آدمیت کا احترام نہ کریں اور عورت کے مرتبے اور مقام کی عزّت نہ کریں تو یہ ان کا قصور نہیں ہو گا۔ بقول شاعر۔ دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں۔ جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں۔ ہم سب یہی کرتے ہیں۔ پیار پاتے ہیں تو پیار لُٹاتے ہیں۔ نفرت پاتے ہیں تو نفرت لوٹاتے ہیں۔"

"آپ بیان کو واقعات تک محدود رکھنے کی کوشش کیجیے صدیقی صاحب کیونکہ وقت کم رہ گیا ہے۔" جج نے گھڑی دیکھ کے کہا۔

"وقت واقعی کم رہ گیا ہے۔" اس نے یوں کہا جیسے وہ اپنی بات کر رہا ہو۔ "بچّوں نے بتایا کہ انہوں نے ماں کو بہت مارا لیکن ماں نے ٹیپ کا پتا نہیں بتایا۔ ٹیپ سب سے نیچے فلیٹ میں رہنے والوں کے پاس رکھا ہوا تھا۔ یہ بچّوں کو بھی نہیں معلوم تھا کہ کیوں؟ مگر جب ان کی ماں نے موقع پاتے ہی انہیں گھر سے نکال دیا اور کہا کہ وہ نیچے والے گھر سے ٹیپ لے کر بھاگ جائیں تو وہ ٹیپ لے آئے۔ ماں نے ان سے کہا تھا کہ خبردار تھانے مت جانا۔ ایک نام یاد رکھنا۔ صدائے وقت۔ یہ اخبار ہے۔ اس کے دفتر پہنچ جانا۔ کسی بھی رکشا یا ٹیکسی میں بیٹھ کے۔ وہاں جمیل صاحب ہوں گے جو اخبار کے ایڈیٹر ہیں۔ انہیں سب بتا دینا۔ ٹیپ ان کے حوالے کر دینا اور پھر جیسا وہ کہیں کرنا۔ وہ بھول گئی تھی کہ میں دن میں گھر پر ہوتا ہوں۔ اخبار رات کو چھپتا ہے چنانچہ میں شام کے بعد آفس پہنچتا ہوں۔ بڑا بچّہ میرا نام بھول گیا لیکن اسے ایڈیٹر کا لفظ یاد رہا۔ تقدیر ان کی یاور تھی کہ رکشا ٹیکسی تلاش کرنے سے پہلے ان کو ایک پرائیویٹ کار کا ڈرائیور مل گیا جس نے انہیں 'صدائے وقت' کے آفس پہنچا دیا۔ اس کے بعد کے واقعات آپ جانتے ہیں۔"

"کیا یہ ممکن ہے کہ آپ ان بچّوں کو کسی مرحلے پر عدالت میں پیش کر سکیں؟"

"میں قانون کا پابند اور عدالت کا احترام کرنے والا آدمی ہوں جنابِ والا۔" جمیل صدیقی نے کہا۔ "لیکن میں استدعا کروں گا کہ ان بچّوں کی زندگی کی خاطر مجھے اس حکم کی تعمیل کا پابند نہ کیا جائے۔ بچّے بالکل محفوظ ہیں اور میں ان کو محفوظ ہی رکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے عدالت کے احکامات کی تعمیل نہ کرنے کے جرم کی سزا قبول ہو گی..."

"یہ کوئی حکم نہیں ہے صدیقی صاحب!" جج نے کہا۔ "کیا آپ یہ بتائیں گے کہ اس ٹیپ کو اتنی تاخیر سے عدالت تک پہنچانے کے اسباب کیا تھے؟ یہ بھی تو ممکن تھا کہ آپ ٹیپ کسی قابلِ اعتماد شخص کے ہاتھوں بھجوا دیتے اور خود سامنے آنے کا خطرہ مول نہ لیتے۔ ٹیپ کو آپ ڈاک سے بھی بھیج سکتے تھے۔ میرے گھر بھی پہنچا سکتے تھے۔ پتا معلوم کرنا آپ کے لیے مشکل نہیں تھا۔ اخبار کے ایڈیٹر کی حیثیت سے آپ کے وسائل کم نہیں۔"

"بجا ارشاد یور آنر۔" جمیل صدیقی نے کہا۔ "لیکن ٹیپ ملنے کے بعد میں نے بہت سے کام کیے۔ میں نے بچّوں کو محفوظ مقام پر منتقل کیا۔ ٹیپ کی مزید دو نقول بنوائیں۔ اس

کے ساتھ ہی میں میر محمد کی بیوی کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف رہا۔ مجھے اپنے مقصد میں ناکامی ہوئی اور اب میں بھی ان سب کے خیال سے اتفاق کرتا ہوں جو سمجھتے ہیں کہ میر محمد کے ساتھ ہی اس کی بیوی کو بھی اغوا کے بعد قتل کر دیا گیا ہوگا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میر محمد کی لاش کے ٹکڑے مل گئے ہیں۔ ان بچوں کی ماں کو کسی مدفنِ بے نشاں کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ میں نے ٹیپ سننے کے بعد گزشتہ اخبارات میں شائع ہونے والی میر شرافت علی کے قتل کی سب خبروں کو یکجا کیا۔ پھر سکندر رجنٹ یعنی مبینہ قاتل کے بارے میں مفصل معلومات حاصل کیں۔ اس کے لیے مجھے برطانیہ میں اپنے چند ہم پیشہ افراد سے بھی رابطہ قائم کرنا پڑا۔ انہوں نے مجھے وہاں کے اخبارات کے تراشے ارسال کیے۔ میں نے واقعات کی کڑیوں کو جوڑا تو مجھے اور بھی بہت سی خبریں ملیں جن کا تعلق اسی ایک کیس سے تھا۔ یہ سب خبریں مختلف اوقات میں الگ الگ شائع ہوئی تھیں۔ اور ان سب پر غور کرنے کے بعد میں نے متعدد نتائج اخذ کیے۔ چونکہ مقدمۂ زیرِ سماعت پر اپنی رائے دینا قانوناً جرم ہے اور یہ عدالت سماعت کے دوران میں واقعات، حالات اور شہادتوں سے از خود نتائج اخذ کرنے کی اہل ہے اس لیے میں یہ فائل عدالت کو پیش کر سکتا ہوں۔ صرف عدالت کی مدد کے لیے۔" اس نے پیچھے کی طرف دیکھا اور لوگوں میں سے ایک شخص اچانک اٹھا جیسے وہ اسی وقت اور اشارے کا منتظر تھا۔ وہ صفوں کے بیچ سے گزر کے آیا اور اس نے ایک پتلی سی فائل جج کی میز پر رکھ دی۔ اسی وقت میں نے دائیں اور بائیں دروازوں سے سادہ کپڑے والوں کو اندر آتے دیکھا۔ محسن ان کے پیچھے تھا۔ وہ لوگ دروازوں کے قریب ہی دیوار سے یوں ٹیک لگا کے کھڑے ہو گئے جیسے بیٹھنے کی جگہ نہ ہونے کی وجہ سے مجبوراً کھڑے ہیں لیکن میں نے ان کو صورت شکل سے ہی نہیں، طور طریقے سے، مستعدی کے انداز سے اور تیوروں سے پہچان لیا۔ ضامن رضوی صاحب نے محسن کے ایس۔ او۔ ایس پر فوری کارروائی کی تھی۔ جمیل صدیقی کو بحفاظت اپنے نرغے میں لے کر نکال لے جانے والے آ پہنچے تھے اور اب جمیل صدیقی سے زیادہ مجھے اس بات کی فکر تھی کہ کہیں وہ اپنے مقصد میں ناکام نہ رہیں۔

"مجھے اور کچھ نہیں عرض کرنا ہے جنابِ والا۔" صدیقی نے کہا۔

"مسٹر صدیقی!" جج نے کہا۔ "آج کی کارروائی کا تمام وقت آپ کے بیان میں صرف ہوا اور عدالت نے آپ کے مخصوص حالات کے پیشِ نظر مروجہ طریقۂ کار سے انحراف کی رعایت بھی دی۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ مقدمے میں قانون کے تقاضے نظر انداز نہیں کیے جا سکتے۔ اس بیان کے بعد استغاثہ کو جرح کا حق ملنا چاہیے۔ آپ کا بیان فی الحال ریکارڈ پر رہنا چاہیے لیکن گواہوں پر جرح کا مرحلہ آئے گا تو آپ کے نام سمن جاری کر دیے جائیں گے۔ معرفت روزنامہ صدائے وقت۔"

"بشرطِ زندگی میں عدالت کے احکامات کی ضرور تعمیل کروں گا جنابِ والا۔" جمیل صدیقی نے کہا۔ "اور حاضر ہو جاؤں گا۔"

"آپ اب بھی محسوس کرتے ہیں کہ آپ کی زندگی کو خطرہ لاحق ہے تو عدالت آپ کو پولیس کی معیت میں بھیج سکتی ہے لیکن آپ کو تحفظ کے لیے خود پولیس سے رجوع کرنا ہوگا۔" جج نے کہا۔ "وہ بھی آپ سے یہ سوال کریں گے کہ آپ کو کس سے خطرہ لاحق ہے۔"

"میں عدالت کا شکر گزار ہوں۔" جمیل صدیقی نے کہا۔ "لیکن میں ان انتظامات کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ اگر ایک مسلح پہریدار سائے کی طرح ہمرکاب رہے تب بھی اس گولی کو نہیں روکا جا سکتا جو کسی بھی نامعلوم سمت سے آ کے سارے انتظامات کو غیر موثر کر سکتی ہے۔ اگر ایک پوری رجمنٹ بھی میری حفاظت پر مامور ہو تو کیا یہ ممکن نہیں کہ اسی رجمنٹ کا ایک سپاہی دشمنوں کے عزائم کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کی قیمت وصول کر لے۔" اس نے تعظیم کے لیے سر جھکایا اور باہر نکل آیا۔

بڑی تیزی سے میں نے نصف درجن کے قریب افراد کو جمیل صدیقی کے گرد حصار سا قائم کرتے دیکھا۔ جج اپنے چیمبر میں جا چکا تھا اور باقی لوگ بھی منتشر ہو رہے تھے۔ بظاہر کوئی بھی صورت سے قاتل نہیں لگتا تھا۔ لیکن جمیل احمد صدیقی کسی فوبیا کا شکار نہیں تھا۔ اس کا خوف بے سبب نہیں تھا۔ مست قلندر پر قاتلانہ حملے کی اطلاع نے مجھے سخت صدمہ پہنچایا تھا۔ رابعہ اور محسن بھی اس خبر پر چونکے تھے۔ ظاہر ہے یہ افسوسناک واقعہ اس وقت پیش آیا تھا جب ہم اسلام آباد گئے ہوئے تھے اور وہاں ہم نے لاہور کے اخبار نہیں دیکھے تھے۔ مقامی اخبارات میں یہ خبر ہو گی تو اندر کے کسی صفحے پر اور اتنی غیر نمایاں کہ ہم میں سے کسی نے نوٹ نہیں کی۔ محسن اور رابعہ کو ان دنوں میں یوں بھی تفصیل سے اخبار دیکھنے کی فرصت نہیں تھی۔ اور میں اپنے چکروں میں تھا۔ اس کے علاوہ زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ خبر میں مست قلندر کا نام نمایاں نہیں ہوگا۔ جمیل صدیقی کے بیان کو ذہن میں رکھتے ہوئے جو ہیڈ لائن بنتی تھی وہ یہی ہو سکتی تھی کہ اخبار کے دفتر پر مشتعل طلبا کا حملہ۔ ایک کارکن زخموں کی تاب نہ لا کر جاں بحق۔ اس سے ہمارے ذہن میں مست قلندر کا خیال کیسے آ سکتا تھا۔

لیکن اس مست قلندر کی مرگِ ناگہاں کے بعد جمیل صدیقی کی زندگی واقعی خطرے میں نظر آتی تھی۔

"بھئی یہ کیا ہے! کون ہیں آپ لوگ؟" جمیل صدیقی نے یکلخت اپنے گرد کچھ اجنبی چہرے دیکھ کر کہا۔

"فکر کی بات نہیں جمیل صاحب۔" میں نے کہا۔ "یہ سب دوست ہیں۔ دشمن نہیں۔"

"اچھے دوست ہیں! میں تو کسی کو پہچانتا تک نہیں سکندر صاحب!" وہ بولا۔

"یہ آپ کے محافظ ہیں۔" میں نے وضاحت کی۔ "مجھے امید ہے یہ کسی کو آپ کے قریب نہیں آنے دیں گے۔"

"میں نے کسی قسم کے حفاظتی انتظامات کی درخواست کسی سے نہیں کی تھی۔" وہ ناگواری سے بولا۔

"یہ جرأت میں نے کی صدیقی صاحب کہ آپ کی اجازت کے بغیر خاموشی سے یہ بندوبست کر لیا۔" میں نے کہا۔ "جیسے میری طرف سے صفائی کے گواہ کی حیثیت سے پیش ہونے کا خطرہ آپ نے اپنی مرضی سے مول لیا تھا۔ آگے بڑھتے رہیے۔"

"لیکن یہ لوگ مجھے کہاں لے جائیں گے۔" جمیل صدیقی نے بے بسی سے کہا۔

"جہاں آپ کہیں گے۔" محسن بولا۔ "یہ لوگ اپنے کام کے ماہر ہیں۔ ان کے درمیان چلتے جائیے۔ باہر ایک بلٹ پروف کار کھڑی ہے۔ اگر کوئی اس کار کا پیچھا کرے گا تو پکڑا جائے گا۔ کیونکہ اس کے پیچھے بھی ایک کار ہو گی۔ اس کار کا تعاقب بہت مشکل ہے۔ یہ چکمہ دے کر آپ کو صاف نکال لے جائیں گے اور جب ان کو یقین ہو گا کہ اب آپ کے پیچھے کوئی نہیں تو یہ آپ کو گھر پہنچا دیں گے۔ اور کسی کو معلوم نہیں ہو گا کہ وہ گھر کہاں ہے۔ آپ ان پر اعتماد کر سکتے ہیں۔ تاوقتیکہ آپ پر کوئی دستی بم نہ پھینکے۔ یہ آپ پر ہونے والے فائر کو بھی آپ کے جسم تک نہیں پہنچنے دیں گے۔"

"میں یقیناً بہت متاثر ہوا ہوں سکندر صاحب!" جمیل صدیقی نے کہا۔ "لیکن میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ نے یہ سب کیوں کیا؟"

"یہ تو ایسا سوال ہے کہ مجھے جواب دیتے ہوئے بھی ندامت کا احساس ہوتا ہے۔ میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔ سب کچھ آپ نے کیا۔ اس ٹیپ کو عدالت میں سنوانے تک اتنے مرحلے تھے اور میرا تو آپ سے کوئی رشتہ تک نہ تھا۔ سوائے انسانیت کے رشتے کے۔ جو کچھ آپ نے میرے لیے کیا اس کے مقابلے میں یہ فضول سی کوشش کیا ہے۔ مجھے اتنا حق تو دیجیے کہ آپ نے میری زندگی بچانے کے مقصد کو جہاد سمجھا تو میں بھی آپ کی زندگی کی قدر کر سکوں۔"

"جو کچھ میں نے کیا وہ میرا فرض تھا۔ اور فرض سے میں نے کبھی پہلو تہی نہیں کی۔" وہ بولا۔

"بات تو احساس کی ہے صدیقی صاحب کہ آپ نفسا نفسی کی اس دنیا میں فرض کسے سمجھتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "صرف اپنے لیے جینے اور مرنے کو، اپنے مفادات کے تحفظ کو اور اپنے مسائل کو؟ اپنے رشتوں کو اور اپنی محدود دنیا میں اپنی خوشی کی خاطر جدوجہد کرنے کو؟"

"اپنے مفادات کو دیکھتا اور صرف اپنے لیے جیتا برخوردار تو میں اس غیر معروف، ہمیشہ زیرِ عتاب رہنے والے اور مالی مشکلات کے شکار 'صدائے وقت' کا مدیر نہ ہوتا۔" اس نے تلخی سے کہا۔ "میں بڑے اور نامور، زیادہ فروخت ہونے والے اور سرکاری اشتہارات کے بل پر چلنے والے اخباروں کے مالکوں اور مدیروں کو جانتا ہوں۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ ان کی صلاحیت کیا ہے۔ وہ کتنی ڈھٹائی سے جھوٹ بول لیتے ہیں۔ خوشامد کر لیتے ہیں۔ ناجائز کو جائز اور دن کو رات کہہ سکتے ہیں اور اصول یا سچائی ان کے نزدیک محض تجارتی پیمانے ہیں چنانچہ وہ خوش حال ہیں۔ مست قلندر میرا دستِ راست تھا اور میرے لیے حوصلہ افزا بات یہی تھی کہ دنیا میں میرے جیسے سرپھرے اور بھی ہیں۔ میری پوری ٹیم میری جانشین ہو سکتی ہے۔"

"آپ جیسے لوگ روشنی کا مینار ہیں۔" میں نے کہا۔ "اب کوئی ان سے رہنمائی حاصل کرے یا نہ کرے۔ آپ نے ان دونوں بچوں کی ذمہ داری قبول کی جن سے آپ کا ایک جذباتی تعلق تھا، بہت پرانا۔"

"یہ بات تم کیسے جانتے ہو؟" وہ چونکا اور چلتے چلتے رک گیا۔

"جیسے آپ میرے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "آپ نے کسی غرض کے بغیر میرے کیس میں دلچسپی لی۔ خبریں جمع کیں۔ ٹیپ کی حفاظت کی اور اسے عدالت کے سامنے پیش کرنے کے لیے جان ہتھیلی پر رکھ کر چلے آئے۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ آپ ان دونوں بچوں کے ساتھ روپوش ہو جاتے۔ اس کی پروا کیے بغیر کہ سکندر کے ساتھ کیا ہوا اور کیوں ہوا۔ اور بعد میں کیا ہو گا۔ آپ پر کوئی اخلاقی ذمے داری تک عائد نہیں ہوتی تھی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں آپ مجبور ہو گئے تھے کسی منطقی استدلال کے بعد آپ قائل ہو گئے تھے کہ آپ نے میری مدد نہ کی تو تمام عمر اپنے آپ سے شرمندہ رہیں گے۔"

یہ مختصر سا جلوس سیاہ رنگ کی بلٹ پروف کار تک پہنچ گیا تھا۔ معلوم نہیں رضوی صاحب نے اتنے کم وقت میں

اتنا قابلِ اعتماد انتظام کیسے کر دیا تھا۔ سکیورٹی کے پانچ افراد ہمارے دائیں بائیں اور آگے پیچھے بظاہر ہم سے لاتعلق چل رہے تھے لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ ان کی نگاہ ہر طرف ہے اور سب پہ ہے۔ اگر وہ کسی کو ذرا بھی مشتبہ حرکت کرتے دیکھتے تو فوراً وہ ریوالور نکال لیتے جو اُن کی قمیص کے نیچے شلوار کے گھیر میں نظر نہیں آتے تھے۔ میں نے اس قسم کے لوگوں کی پھرتی کا عملی مظاہرہ بھی دیکھا تھا۔ نظریاتی اختلاف میں جنون کی حد تک پہنچ جانے والے ایک شخص نے میرے سامنے ایک غیر ملکی مہمان کو گولی کا نشانہ بنانے کے لیے ریوالور نکالا ہی تھا کہ سیکیورٹی والوں نے مہمان کو گرا دیا اور خود اس کے اوپر نیچے دائیں بائیں لیٹ گئے۔ اس حالت میں مشین گن یا دستی بم سے بھی نقصان پہنچتا تو صرف انہی کی ذات کو۔ پھر پلک جھپکنے میں انہوں نے نوجوان کو نشانہ بنا لیا تھا لیکن اسے مارا نہیں تھا۔ اس کا نشانہ خطا کر دیا تھا اور اسے زندہ گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے تاکہ اس سے مزید پوچھ گچھ کی جا سکے اور یہ پتا چلایا جا سکے کہ جو کچھ اس نے کیا، وہ اس کا ذاتی فعل تھا یا کسی منظم سازش کا نتیجہ۔ کیا ہمارے یہ محافظ بھی ایسی ہی کارکردگی کا مظاہرہ کریں گے؟ میں نے سوچا۔ جمیل صدیقی کے دائیں ہاتھ پر میں تھا۔ بائیں ہاتھ پہ محسن اور پیچھے استاد ٹیڈی۔

"صدیقی صاحب!" میں نے کہا۔ "ان حالات میں آپ کا رُوپوش اور گمنام رہنا ہی بہتر ہے۔ اور آپ کو یقیناً ہم سب کا پورا تعاون حاصل رہے گا۔ لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ بعد میں کسی وقت میں آپ سے مل سکوں۔ آپ مجھے ایس پی ضامن رضوی کے گھر فون کر سکتے ہیں اور یہ پیغام دے سکتے ہیں کہ میں کہاں اور کس وقت حاضر ہو جاؤں؟"

ایک محافظ نے دروازہ کھولا۔ جمیل صدیقی کو شاید زندگی میں پہلی بار یہ "وی آئی پی ٹریٹ منٹ" ملا تھا ورنہ وہ مردِ آزاد و بے باک تو نہ جینے سے ڈرتا تھا نہ مرنے سے چنانچہ اپنی ذات اور خدا پر اعتماد کے ساتھ گھومتا پھرتا تھا۔ وہی کرتا تھا جس پر اس کو ضمیر سے تائید ملے اور وہی لکھتا تھا جو اس کے نقطۂ نظر سے سچ ہو اور یہی وجوہات تھیں کہ "صدائے وقت" ایک غیر معروف، گمنام اخبار رہا اور تجارتی کامیابی کی اس منزل تک نہ پہنچ سکا جہاں دولت، عزت اور شہرت ملتی نہیں، عطا کر دی جاتی ہے۔ خلعتِ فاخرہ کی طرح۔

"میں بتا دوں گا۔" جمیل صدیقی نے کہا۔ "لیکن اس کی وجہ؟"

"میں صرف دیکھنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "کہ مجھے موضوع بنا کے آپ نے جو ریسرچ کی تھی اس کے نتائج کس حد تک درست ہیں۔ میری حقیقت کو مجھ سے بہتر کوئی نہیں جانتا۔ مجھے یقین ہے کہ جس رائے کے اظہار سے آپ نے عدالت میں اجتناب کیا وہ صائب ہو گی اور جو نتائج آپ نے اخذ کیے وہ میرے یقین کے مطابق ہوں گے۔"

جمیل صدیقی مسکرایا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ جو شخص دروازہ تھامے کھڑا تھا اس کے ساتھ والی سیٹ پہ ڈرائیور کی جگہ جا بیٹھا۔ باقی تین افراد پہلے ہی پچھلی نشست پر پوزیشن سنبھال کے دروازے بند کر چکے تھے۔ گاڑی روانہ ہوئی تو ہم وہیں کھڑے رہے۔ ہمیں بالکل احساس نہیں تھا کہ اور بھی بہت سے لوگ تماشائی ہیں۔ ان کے اخباری نمائندے بھی تو تھے جنہوں نے جمیل صدیقی کی متعدد تصاویر اتاری تھیں۔ ہماری ساری توجہ دوسری طرف تھی لیکن فوری طور پر کوئی گاڑی تعاقب میں روانہ نہیں ہوئی تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

"قسم مولا کی۔" استاد ٹیڈی نے کہا۔ "یہ ہوئی نا بہادری۔ آج سمجھ میں آئی بات۔"

"آج تک تم کیا سمجھتے تھے؟" میں نے کہا۔ "یہی کہ خنجر، پستول سے کسی نہتے شخص کو دہشت زدہ کر دینا یا اسٹین گن سے کسی بینک کے لاکھوں لوٹ کر فرار ہو جانا ہی بہادری ہے۔"

"اب چلو۔ بیگم رضوی گاڑی میں ہماری منتظر ہیں۔" محسن نے کہا۔ "میرا خیال ہے رابعہ بھی پہنچ گئی ہو گی۔"

"پھر مجھے اجازت دیں۔" استاد ٹیڈی نے کہا۔ "شہلا باجی کو میرا اسلام دیں۔ آج کی بات سن کے وہ بھی خوش ہوں گی۔"

"ہاں۔ شہلا کو ہم فون پہ اطلاع دیں گے۔" میں نے کہا۔ "لیکن استاد! تم کو ایک کام کرنا ہے۔ اس کے لیے وقت کی کوئی میعاد نہیں۔ ذرا یہ معلوم کرو کہ استاد پیڈرو کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔ خصوصاً گزشتہ ایک ہفتے میں وہ کیا کر رہا تھا۔ معلوم کر سکتے ہو؟"

"کوشش ضرور کروں گا جی۔ معلوم کیسے نہیں ہو گا؟" وہ جاتے جاتے بولا۔ میں اور محسن پلٹ کر مخالف سمت میں چلنے لگے۔ اچانک بھگدڑ سی مچ گئی۔ ایک شخص بے تحاشا بھاگا۔ میں نے اسے فوراً پہچان لیا۔ اسی شخص نے عدالت میں اخباروں کے تراشوں پر مشتمل فائل پیش کی تھی۔ اس کے کپڑے کچھ پھٹے ہوئے تھے اور یوں لگتا تھا جیسے وہ بڑے مقابلے کے بعد دشمنوں کی گرفت سے نکلنے میں کامیاب ہوا ہے۔ دشمن اس کے پیچھے تھے۔ میں نے بیک وقت دو افراد کو اس کے پیچھے لپکتے دیکھا۔

"پکڑو۔ پکڑو" وہ دونوں چلا رہے تھے۔ "جیب کاٹ کے بھاگا ہے۔"

یہ سب جھوٹ تھا اور اس شخص کو پکڑنے کا بہانہ تھا یہ بات سمجھنے میں مجھے دیر نہیں لگی۔ خود محسن اندازہ کر چکا تھا کہ بات کیا ہے۔ میں نے سامنے سے ایک کا راستہ یوں روکا کہ تصادم اتفاقیہ نظر آئے۔ دوسرے کی ٹکر محسن سے ہوئی۔ دوسرے لمحے ہم چاروں بھد سے منہ کے بل گرے۔ معذرت کرنے کی بجائے میں نے اٹھ کے اس شخص کی گردن دبوچ لی جو مجھ سے ٹکرایا تھا۔

"اندھا ہے کیا؟" میں نے چیخ کر کہا۔ "سانڈ کی طرح لوگوں کے ٹکر مارتا پھرتا ہے؟"

"ارے... رے بھائی! میں تو اس کے پیچھے تھا۔" اس نے بمشکل تمام کہا اور ہاتھ سے اشارہ کیا۔ اس کی بدقسمتی کہ اشارے کا رخ ایک لڑکی کی طرف ہوا جو اس ہنگامے پہ رُک گئی اور کچھ سہمی ہوئی لگتی تھی۔

"اچھا۔ چوری اور سینہ زوری۔" میں نے اس کے ایک جانپڑ رسید کیا۔ "شہدے لفنگے لڑکیوں کا پیچھا کرتا ہے۔"

"اجی وہ میرا بٹوا نکال کر لے گیا۔" وہ چیخ کر بولا۔ "میں ایک جیب کترے کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔"

"جیب کترا؟" میں نے حیرانی اور خفت سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ "پہلے بکنا تھا نا۔ ہم خود اسے پکڑ لیتے۔"

محسن حسن خاں نے بھی کچھ ایسا ہی ڈراما کیا تھا اور ان سے بھی فریقِ ثانی کے مذاکرات خاصے غیر دوستانہ فضا میں ہو رہے تھے۔ لیکن ان میں ہاتھا پائی کی نوبت نہیں آئی تھی۔

"تم نے جانتے بوُجھتے میرے ٹکر ماری ہے۔" محسن کہہ رہا تھا۔

"تم بکواس کرتے ہو۔ وہ شخص میری جیب کاٹ کر بھاگا تھا۔ میں اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔" دوسرا چیخ کر بولا۔

"ایک آدمی بیک وقت دو کی جیب کاٹ کر کیسے بھاگ گیا؟" میں نے چلّا کے کہا۔ ہمارا ایک مقصد ان دونوں کی پیش قدمی روکنا تھا۔ اس ہنگامے پہ ہمارے گرد مجمع لگ گیا تھا اور وہ شخص صاف بچ کے نکل گیا تھا جو حقائق پر مبنی فائل پیش کرنے کا مجرم تھا۔ معلوم نہیں وہ کون تھا جس نے جمیل صدیقی کا ساتھ دیا تھا۔ لیکن صدیقی صاحب جاتے وقت اسے غیر محفوظ چھوڑ گئے تھے۔ شاید ان کو یاد نہیں رہا تھا ورنہ وہ کسی مددگار و معاون کو بھولنے والے آدمی نہیں تھے۔ عدالت کے احاطے میں پولیس کی کمی نہیں ہوتی۔ مجمع دیکھتے ہی حوالدار سے کمتر عہدے کے چند افراد نمودار ہوئے۔ پھر حوالدار بجلی نمودار ہوا اور جھگڑے میں ملوث ہمیں دیکھ کر اس کے لبوں پہ ایک معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی جو زبانِ حال سے اعلان کرتی تھی کہ ہم جیسے "شر پسندوں" سے نمٹنے کے لیے اس کے قانونی اختیارات کافی ہیں اور وہ اس سنہرے موقعے سے پورا فائدہ اٹھائے گا۔ لیکن اس کی بدقسمتی کہ ابھی اس نے امن و امان کی صورتِ حال سنبھالنے کے لیے ابتدائی تفتیش کا آغاز بھی نہیں کیا تھا کہ اے ایس آئی اکرام شیخ نمودار ہو گیا۔ حوالدار بجلی کی امیدوں کے غنچے بن کھلے مرجھا گئے۔

"کیا ہو رہا ہے یہاں؟" شیخ نے قطعی انجان بن کے کہا۔ "یہ کوئی مجمع لگانے کی جگہ ہے؟"

"اس نے مجھ پر جیب کترا ہونے کا الزام لگایا ہے۔" محسن نے اپنے فریق کے خلاف اشتعال انگیزی کا مظاہرہ کیا۔

"جھوٹ۔ جیب کترا وہ تھا جو بھاگ گیا۔" دوسرا فریاد کناں لہجے میں بولا۔ "تم نے مجھے اس کے پیچھے جانے سے روکا۔"

"گویا میں بھی اس کا ساتھی اور شریک کار تھا۔" محسن نے اس بار اپنے حریف کا گریبان تھام لیا۔

"چھوڑو۔ چھوڑو۔ میں تم دونوں کو بند کر دوں گا۔" شیخ نے گرج کر کہا کیونکہ اس نے مجھے آنکھ مارتے دیکھ لیا تھا۔

"اس نے جانتے بوجھتے مجھے ٹکر ماری۔" میں نے اپنا کیس پیش کیا۔ "اس کا ساتھی میرا پرس لے کر بھاگ گیا۔"

"یہاں سے کوئی نہیں بھاگا۔" محسن نے چلّا کر کہا۔ "کس نے دیکھا ہے کسی کو فرار ہوتے؟"

یہ سوال بڑا برمحل تھا۔ جنہوں نے ایک شخص کو بھاگتے دیکھا تھا وہ یا تو جا چکے تھے یا اب بھی موجود تھے تو انہوں نے لب کشائی سے گریز کیا۔ بلاوجہ کے جھگڑے میں کون اپنا کام چھوڑ کے تھانے جائے۔ باقی جمع ہونے والے بعد میں پہنچے تھے اور انہوں نے واقعی کسی کو بھی جائے واردات سے فرار ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ کچھ لوگ خاصے محظوظ ہو رہے تھے کیونکہ یہ طے کرنا مشکل ہو گیا تھا کہ جیب کس کی کٹی، کس نے کاٹی؟ کون فرار ہوا اور کس نے کس کا راستہ روکا؟

"حوالدار۔" شیخ نے حوالدار بجلی کو مخاطب کیا۔ "ان سب کو تھانے لے چلو۔ دیکھو کوئی ٹیکسی ہے۔"

"لیکن سر۔ آپ مجھ سے تو پوچھیں۔ میں جائے واردات پر موجود تھا۔ یہ دونوں..." اس نے ہماری طرف اشارہ کیا۔

"یہاں کچہری مت لگاؤ۔" شیخ نے پھر گرج کر کہا۔ "جو میں نے کہا ہے وہ کرو۔ جاؤ۔"

"یہ حوالدار بجتا ہے سر جی۔" کسی نے پیچھے سے کہا۔ "یہ تو آپ کے بھی بعد میں آیا تھا۔" میں نے استاد ٹیڈی کی آواز پہچان لی اور اس کی حمایت پہ بڑی مشکل سے ہنسی ضبط کی لیکن حوالدار بجلی اچھلا۔

ٹیڈی بھی شاید مجمع دیکھ کر لوٹ آیا تھا۔

"کون ...کون کمینہ کہتا ہے ـــــ" اس نے چیخ کر کہا۔ "سامنے آئے میرے۔"

"حوالدار" شیخ نے غرا کے کہا "تم ڈسپلن کی خلاف ورزی کر رہے ہو۔ میرے حکم کو نظر انداز کر رہے ہو۔"

حوالدار بجلی کو خون کے گھونٹ پی کے رہ جانا پڑا۔ میں نے موقع پا کے استاد ٹیڈی سے کہا "رابعہ اور بیگم رضوی کو جانے کے لیے کہہ دو۔ ہم ذرا دیر سے گھر آئیں گے۔ شیخ کے ساتھ جا رہے ہیں۔ بس اس سے زیادہ کچھ مت کہنا۔"

ٹیڈی جو سرکتا ہوا آگے آ گیا تھا میری بات سنتے ہی سر ہلا کے غائب ہو گیا۔ غیظ و غضب سے کھولتے ہوئے حوالدار بجلی نے ٹیکسی پکڑنے میں بڑی پھرتی دکھائی۔ بیگار میں ہاتھ آنے والی ٹیکسی کا ڈرائیور انکار کرتا تو یقیناً اس کے ہاتھوں قتل ہو جاتا۔ شیخ نے یہی مناسب سمجھا کہ جلد از جلد اس علاقے سے نکل جائے ورنہ یہاں اس سے بڑے افسر کا یا کسی مجسٹریٹ وغیرہ کا نمودار ہو جانا بھی عین ممکن تھا۔ متحارب گروپ کے ارکان چار تھے لیکن شیخ پانچویں سواری بن کے فٹ ہو گیا۔ ڈرائیور کیسے کہتا کہ یہ خلافِ قانون ہے۔ تھانیدار کی وردی میں شیخ آگے براجمان تھا۔ پیچھے ہم چار افراد تھے لیکن ہم نے بھی بڑی چالاکی سے یہ کیا تھا کہ ایک پچھلے دروازے سے محسن پہلے اندر گھس کے بیٹھ گیا تھا۔ دوسری طرف سے میں نے ان دونوں کو پہلے بیٹھنے پر مجبور کیا تاکہ خود دوسرے دروازے کی طرف پہریداری کے فرائض انجام دے سکوں۔ نشست کے اس انتظام پر بھی ایک مختصر سا تلخ و ترش اختلافی مکالمہ ہوا لیکن وہ محض چھیڑ خانی تھا۔ شیخ نے ان کو ایک ڈانٹ لگائی تو وہ مجبور ہو گئے۔ ٹیکسی میں بیٹھنے سے پہلے وہ خاصے بے ضرر اور مظلوم نظر آنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن گرفتاری کے غیر متوقع انجام نے انہیں متفکر کر دیا تھا اور ان کے چہروں پر وہ خباثت لوٹ آئی تھی جو ان کی اصل فطرت کی عکاس تھی۔ مجھے شبہ تھا کہ وہ مسلح ہوں گے لیکن ضلع کچہری میں اسلحے کی نمائش مشکل تھی۔ اس کے بعد ہماری مداخلت نے انہیں بے بس کر دیا۔ خصوصاً میں بہت محتاط رہا کہ کسی کا ہاتھ جیب یا نیفے کی طرف بڑھے تو اسے روک دوں خواہ اس کے لیے مجھے ہاتھ کو وار کر کے سن کرنا پڑے یا کلائی توڑنی پڑے۔ آخری خرابی حوالدار بجلی اور انسپکٹر شیخ کا نمودار ہونا تھا اور یہ سب اتنی جلدی میں ہو گیا تھا کہ وہ کچھ بھی نہیں کر سکے تھے۔ عدالت میں یقیناً وہ بھی ہوں گے جنہوں نے طے کیا ہو گا کہ کسی نے ٹیپ کی کاپی پیش کی تو اسے باہر نکلتے ہی ٹھکانے لگا دیں گے لیکن ان

کو اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی تو انہوں نے اپنے دو چمچوں کو حکم دیا کہ سکندر کے دوسرے حمایتی کو پکڑ لاؤ مگر ارادے بساآرزو کہ خاک شدہ۔ وہ خود پکڑے گئے۔ حوالدار بجلی کو ذلت کا آخری صدمہ یہ اٹھانا پڑا کہ شیخ نے اسے زبردستی ٹیکسی میں ٹھنسنے ہونے سے روک دیا اور بس میں آنے کو کہا۔

"پانچ تو پہلے ہی پھنس گئے ہیں۔ پھر تم کو بیچ میں آ کے چوراہا ہونے کی کیا ضرورت ہے۔" شیخ نے کہا۔

"ویسے تو سر جی پانچ بھی نہیں بیٹھ سکتے ٹیکسی میں۔" حوالدار نے جل بھن کے مگر آہستہ سے کہا۔

"یہ تو ہے۔" شیخ نے یوں کہا جیسے ابھی تک اسے احساس نہیں تھا کہ پانچویں سواری قانون کی خلاف ورزی کر رہی ہے۔

"اچھا تم ان میں سے ایک کے ساتھ رکشا میں آ جاؤ۔" وہ بولا اور اس نے مجھے اترنے کا اشارہ کیا۔ میں نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔ شیخ نے ریوالور نکال لیا "اگر راستے میں کسی نے دروازے کی طرف ہاتھ بھی بڑھایا تو میں گولی مار دوں گا۔" اور بیک ویو مرر کو اس دروازے پر ایڈجسٹ کر لیا جس سے میں اترا تھا "تم ذرا پیچھے دیکھ کے گاڑی چلاؤ۔ اور پیچھے اپنی آنکھوں سے دیکھو۔" اس نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔

حوالدار بجلی اور میں ان مسافروں کی طرح کھڑے رہ گئے جن کو ایک دوسرے کی شکایت پر بے ٹکٹ ہونے کے جرم میں کسی ویران پلیٹ فارم پر اتار دیا گیا ہو اور ٹرین جا چکی ہو۔

"حوالدار صاب!" میں نے کہا "رکشا روکو۔ ایس پی صاب حکم دے گئے ہیں۔"

"وہ اے ایس آئی تھا۔" حوالدار نے میری جہالت پر ملامت آمیز لہجے میں کہا "رکشا کا کرایہ اس کا باپ دے گا۔ حکم دے گئے ہیں!"

"میرا خیال ہے تم سوال کر دگے تو بڑے شیخ صاحب انکار نہیں کریں گے؟" میں نے جیب سے سگریٹ نکال کے جلائی "ان کا اصول ہے کہ کسی فقیر کو خالی ہاتھ مت لوٹاؤ۔ بڑے سخی اور نیک دل آدمی ہیں۔"

"تمہاری جیب میں بھی تو پیسے ہوں گے۔" حوالدار نے اس بے عزتی کو بھی دل پر جبر کر کے برداشت کیا "ایک سگریٹ تو دے دو۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "یہ رشوت ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ میرا اصول یہ ہے کہ نہ کسی سے مانگ کے پیتا ہوں نہ پلاتا ہوں۔"

"رکشا کا کرایہ تو دے سکتے ہو۔ تم خود بیٹھو گے اس میں۔"

حوالدار بجلی نے خونخوار لہجے میں کہا۔

"دے تو سکتا ہوں۔ مگر دوں گا نہیں۔" میں نے سگریٹ کا ایک کش لے کر کہا "اس کے بھی دو اسباب ہیں۔ ایک یہ کہ سوال میری عزت کا ہے۔ تم ساتھ بیٹھو گے تو لوگ سمجھیں گے کہ مجھے گرفتار کر لیا گیا ہے۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ میرا ارادہ پیدل جانے کا ہے۔ پیدل چلنے سے صحت ٹھیک رہتی ہے اور مجھے تمہاری صحت تو ویسے ہی قابلِ افسوس لگتی ہے۔ موسم بھی کیا سہانا ہے۔ پیدل چلو گے تو بھوک کھل جائے گی۔"

سہ پہر کا سورج اپنی تمازت برسا رہا تھا جس سے سڑک کا تارکول تک پگھلنے لگا تھا اور خود میرا بھوک سے حال پتلا تھا لیکن میں نے پیدل چلنا شروع کیا۔ سخت طیش کے عالم میں حوالدار بجلی نے ایک رکشا والے کو روکا اور تھانے چلنے کو کہا۔ رکشا والے نے میٹر پر بندھے ہوئے کپڑے کی طرف اشارہ کیا "میری شفٹ ختم ہو رہی ہے حوالدار صاحب!"

حوالدار بجلی نے اپنی مخصوص مہارت کا استعمال کیا اور بجلی کی طرح رکشا والے کی گدی پر ایک ہاتھ رسید کیا "شفٹ کی اولاد۔ سرکاری ڈیوٹی سے انکار کرتا ہے۔"

رکشا والا ضرب کی شدت سے زیادہ اس قدر منحنی قسم کے حوالدار کی پھرتی پر بھونچکا رہ گیا۔ انکار وہ کیا کرتا۔

"تمہارا میٹر ٹھیک ہے نا۔" میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا "حوالدار صاحب کرایہ ہمیشہ پورا دیتے ہیں۔"

"کرایہ کیا سرکار۔ دوسری شفٹ والے کو رکشا وقت پر نہ ملا تو کل مالک مجھے رکشا دے گا ہی نہیں۔" رکشا والے نے فریاد کی۔

میں نے حوالدار بجلی کو بے تکلفی سے ہاتھ تھام کے گھسیٹ لیا "اچھا تو پھر تم جاؤ۔ ہم دوسرا رکشا لے کر چلے جاتے ہیں۔"

"آپ جیسے لوگ ..." حوالدار بجلی نے بمشکل تمام خود کو غلط جملہ بولنے سے روکا "ہماری بھی بے عزتی خراب کراتے ہیں۔"

رکشا کا ڈرائیور رفو چکر ہو گیا تھا اور میں دوسرے رکشا کے لیے پھر حوالدار پر تکیہ کیے کھڑا تھا۔

"بے عزتی خراب اسی وقت ہوتی ہے۔" میں نے سگریٹ کا کش لے کر اطمینان سے کہا "جب آدمی کی عزت ہو۔ اچھا ہوا تم نے زبردستی نہیں کی ورنہ دنیا و آخرت میں رسوا ہوتے۔ ایک بے گناہ کو مارنے کا جرم تو کر ہی چکے تھے۔ وہ تھانے جا کے بول پڑتا تو تمہیں بھی سچ بتانا پڑتا۔ خواہ مخواہ کیس بن جاتا تم پر مارپیٹ کا۔ اور کل اسے رکشا نہ ملتا تو گناہ بھی تمہارے نامۂ اعمال میں لکھا جاتا کہ تم نے اسے رزق سے محروم رکھنے کی کوشش کی۔ خدانخواستہ اس کے گھر میں فاقہ ہوتا۔"

"بہت پڑھنے سے بندے کا دماغ چل جاتا ہے۔ تمہاری طرح۔" اس نے دوسرا رکشا روکتے ہوئے میری بات کاٹ دی۔

*

شیخ نے دونوں ملزموں کو حوالات میں "ڈک" دیا تھا۔ ان کے قبضے سے ناجائز اسلحہ برآمد ہوا تھا۔ چنانچہ وہ سب معاملہ غتر بود ہو گیا تھا جو ہمارے ٹانگ اڑانے کا نتیجہ تھا۔ اور ان کی ایک نہیں سنی گئی تھی۔ میں نے رابعہ کو فون کیا اور بتایا کہ ہم ساتھ کیوں نہیں آ سکے "ذرا ان دونوں کی سن لیں۔ پھر آتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"تمہاری نازو کا فون آ چکا ہے دوبار۔" رابعہ نے شوخی اور شرارت سے کہا لیکن مجھے یہ بات بُری لگی۔

"تم کبھی کبھی بالکل عام اور جاہل عورتوں کی طرح باتیں کرنے لگتی ہو۔ یہ تمہاری کہنے کا کیا مقصد ہے؟" میں نے بھنا کے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔ محسن نے اور شیخ نے بڑی دلچسپی سے میری صورت دیکھی۔

"کیا بات ہے؟" شیخ نے کہا "دونوں طرف ہے بھوک برابر لگی ہوئی؟"

"ہاں۔ ہاں یار۔ حکم تھا کہ کھانا گھر آ کے کھاؤ۔" میں نے بات بنائی "یہاں کہیں سے کچھ منگوا لے یار۔ حوالدار کو پیسے دیدے۔"

حوالدار نے اس بات کا برا نہیں مانا۔ شیخ نے اسے پچاس کا نوٹ دیا تھا اور اسے امید تھی کہ وہ ایک پیسہ خرچ کیے بغیر چاروں افراد کے لیے طعام کا مناسب بندوبست کرے گا۔

"منگل ہے سر جی۔ صرف چکن ملے گا۔ یا چکن بریانی۔"

"چکن ملے یا چکن۔" شیخ نے کہا "واپس آ کے مجھے بتانا کہاں سے لائے ہو۔ کھانا خراب ہو تو میں اسے بھی ڈک دوں۔"

حوالدار کا چہرہ اتر گیا۔ یہ پیسے دے کر کھانا منگوانے والا صاحب کسی کو نہیں ڈک سکتا تھا۔ اس کی بات کا مقصد صرف یہ واضح کرنا تھا کہ خبردار مالِ مفت مت لانا ورنہ میں معلوم کر لوں گا۔ وہ سخت دل شکستہ روانہ ہوا۔ شیخ نے ہم دونوں کو اشارہ کیا اور ایک سپاہی کو حکم دیا کہ نئے مہمانوں کو خاطر تواضع کے لیے لایا جائے۔ شیخ کے ہمراہ میں نے پھر اس کمرے میں قدم رکھا جہاں ایک رات نے مجھے سمجھا دیا تھا کہ دیسی اور ولایتی تفتیش کے طریقوں میں کیا فرق ہے اور میں نے اتنی زیادہ رسوائی، تشدد کی سختی اور ناقابلِ بیان مظالم کی ذلت جھیلی تھی کہ اندر داخل ہوتے ہی اس رات کا تصور میرے لیے حقیقی عذاب بن گیا۔ اس اذیت خانے میں ہر چیز ویسی ہی تھی۔ اس کی پُر آسیب، دہشت زدہ کر دینے والی فضا۔ وہی دیواریں جن کے ہر داغ پر کسی کے

لمو کا گمان ہوتا تھا۔ وہی غلیظ بدبودار فرش اور وہی سامانِ عقوبت۔ مجھے اس ماحول سے وحشت ہونے لگی۔

میری حالت کے تغیر کو محسن نے محسوس کیا اور سمجھ لیا۔ "یار شیخ کسی دوسرے کمرے میں بات نہیں ہوسکتی؟" میں نے کہا۔

"ہوسکتی ہے۔ لیکن میں اس جگہ کے نفسیاتی دباؤ کو استعمال کرنا چاہتا ہوں۔" وہ بولا۔ "میں خود مختار ہوتا تو اس کمرے کو مسمار کرا دیتا لیکن یہاں جو کچھ ہے اور جیسا ہے 'وہی رہے گا۔ ایک رات کے تجربے کو اپنا کمپلکس مت بننے دے۔ زندگی میں اس سے زیادہ کٹھن مرحلے آتے ہیں۔ حادثے کا شکار ہونے والوں کی حالت کیا ہوتی ہے۔ وہ ٹوٹے پھوٹے شکستہ اور خون آلودہ، مردہ اور نیم جاں جسم اور بکھر جانے والے انسانی اعضا سمیٹتے ہیں اور بعض اوقات خود تمام عمر معذوری کی زندگی گزارتے ہیں لیکن کیا اس بھیانک تجربے کے بعد وہ بسوں اور ٹرینوں سے ڈرنے لگتے ہیں، ان میں سفر کرنا چھوڑ دیتے ہیں؟ یہاں ایسے بھی ہیں جو روز یہی دیکھتے ہیں۔"

میں شرمندہ ہو کے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ ایک سپاہی ان دونوں کو دھکے دیتا ہوا اندر لایا۔

"ہاں بھئی۔" شیخ نے ٹھیٹھ تھانیداروں والے لہجے میں کہا۔ "کیا ارادے ہیں پھر اب؟ کچھ خاطر مدارت کریں تمہاری؟"

"ان میں سے ایک نے واویلا شروع کیا۔" لیکن ہمارا جرم تھانیدار جی! یہ کہاں کا انصاف ہے۔"

"اوئے انصاف دے پُتر۔" شیخ نے اس کے ایک جانپر رسید کیا۔ "ناجائز اسلحہ لے کر پھرتا ہے ڈبے میں۔ یہ شریف آدمی مداخلت نہ کرتے تو تم نے اس بندے کو وہیں کاٹ دینا تھا۔ اب جرم پوچھتا ہے۔"

ناجائز اسلحے کی تفصیل اب مجھ پر اور محسن پر واضح ہوئی۔ ان کے پاس سے صرف خنجر برآمد ہوئے تھے۔ میں نے خنجر دیکھے نہیں تھے لیکن یہ جانتا تھا کہ پولیس معمولی چاقو کو بھی اسلحہ ایکٹ کے تحت خنجر قرار دینے کے اختیارات رکھتی تھی جو ہر گھر کے باورچی خانے سے برآمد ہوسکتا ہے اور سڑک پر تلاشی لی جائے تو شرفا کی جیب میں مل سکتا ہے۔

"تو بتا لاتوں کے بھوت؟" شیخ نے دوسرے کے لات رسید کی۔ "کس نے بھیجا تھا تمہیں؟ بول نہیں تو تیری چمڑی اتارتا ہوں۔"

دوسرا ڈیل ڈول میں بڑا ہونے کے باوجود بہت کم ہمت تھا۔ وہ سجدے میں گرا اور بھوں بھوں کر کے رونے لگا۔

"مجھے نہیں معلوم سرکار۔" وہ بولا۔ "ہم جیب کترے ضرور ہیں۔" اس نے ہاتھ جوڑ کے گڑگڑانا شروع کیا۔

"جیب کترے؟" میں نے اور محسن نے ایک ساتھ کہا اور اپنی اپنی جیب دیکھی۔ ہم دونوں کے پرس غائب تھے، بلکہ وقت ان دونوں نے اپنی جیب سے پرس نکالے اور سامنے رکھ دیے۔ میں نے اور محسن نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ہمارے لیے ہنسی ضبط کرنا مشکل ہوگیا۔ وہ جیب کترے کے پیچھے دوڑنے کا دعوےٰ کر رہے تھے۔ پھر انہوں نے ہمیں جیب تراش قرار دیا تھا اور تھے خود اس فن کے پرستار۔ مگر حال کی سنگینی کے پیشِ نظر ہم نے سنجیدگی سے اپنے پرس اٹھا لیے۔

"دیکھ لیجیے جناب۔ ایک پیسہ کم ہو تو ہم کو سو جوتے لگا سو پیاز منظور۔" پہلا بولا۔

"تم نے میرا سوال سنا نہیں تھا شاید۔" شیخ نے کہا۔ "کان خراب معلوم ہوتے ہیں تمہارے۔ ابھی گرم تیل ڈالتے ہیں، صاف سننے لگو گے۔ اوئے حوالدار! ذرا لانا گرم مسالہ۔"

ان دونوں کی حالت غیر ہوگئی۔ انہوں نے اس پیشے میں دوسروں کی زبانی اس تشدد کا آنکھوں دیکھا حال ضرور سنا ہوگا، کبھی پکڑے جانے کی صورت میں اس کا عملی تجربہ بھی کیا ہوگا کہ تھانے میں گرم مسالہ کس طرح لگایا جاتا ہے۔ انہوں نے رونا پیٹنا شروع کیا۔ پھر موٹے نے کہا۔ "میں بتاتا ہوں سرکار۔ آپ تھانہ مزنگ کے ملک صاحب سے ہمارے بارے میں پوچھ لیں۔ ہم صرف جیب کاٹتے ہیں۔ ضلع کچہری میں رش ہوتا ہے اور پیسہ دونوں کی جیب میں ملتا ہے۔"

"دونوں کون؟" محسن نے حیرانی سے کہا۔ بات میری ناقص عقل میں بھی نہیں آئی تھی۔

"وہی جی۔ رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے۔" موٹے نے ہماری معلومات میں اضافہ کیا اور ہم نے یوں سر ہلایا جیسے یہ بات تو ہمیں پہلے سے معلوم تھی۔ "اپنا علاقہ اب ملک صاحب کی سفارش سے یہی ہوگیا ہے۔ پہلے انارکلی میں، نیلے گنبد سے رنگیل چوک تک تھا۔ ہماری جگہ دو بھائی تھے۔"

"انہیں کیوں تبدیل کر دیا گیا اس علاقے سے؟" شیخ نے کہا۔ "ڈنڈی مارتے تھے؟"

"ہاں سرکار۔ نیت بے ایمان ہوگئی تھی ان کی۔ حصہ پورا نہیں پہنچاتے تھے۔" چھوٹے نے اعتراف کیا۔ میں اور محسن دم بخود بیٹھے رہے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ ایک علاقے کے تھانے سے دوسرے علاقے کے تھانے میں پوسٹنگ کی بات ہو رہی ہے لیکن شیخ نے ہمیں بعد میں سمجھایا کہ تھانوں کی طرح جیب تراشوں کے دائرۂ اختیار کی بھی حدود متعین ہیں۔ ایک علاقے کا جیب تراش دوسرے علاقے میں واردات نہیں کر سکتا۔ اپنے ضابطۂ اخلاق کی خلاف ورزی سمجھی جاتی ہے جس پر علاقے میں ان کے علاقے کا گروہ کا سردار دوسرے علاقے کے سرغنہ سے شکایت کرتا ہے اور عموماً معاملہ افہام و تفہیم سے طے پا جاتا ہے یعنی وہ مال متعلقہ علاقے والوں کے حوالے کر دیا جاتا ہے جو علاقہ غیر سے لایا گیا ہو۔

"ملک صاحب بڑے سخت آدمی ہیں۔ آپ تو جانتے ہی ہوں گے۔" موٹے نے کہا اور شیخ نے سر ہلایا حالانکہ مجھے یقین ہے کہ اسے خاک علم نہیں ہوگا۔ "اب سرکار مندی کا زمانہ ہو یا دھندے کا زور ہو، ان کا حصہ ان تک ضرور پہنچ جاتا ہے۔ وہ بھی خوش، ہم بھی خوش۔ آج بھی ہم روز کی طرح شکار کی تلاش میں پھر رہے تھے۔ وہاں روز نئے چہرے ہوتے ہیں ناجی! اس لیے کوئی کسی کو پہچانتا نہیں اور رش بھی اتنا ہوتا ہے کہ بندے کو بندے کی خبر نہیں ہوتی۔ دھکم پیل بہت زیادہ ہوتی ہے اور لوگ بولائے ہوئے پھرتے ہیں۔ گواچی گاں کی طرح۔ کوئی وکیل کو ڈھونڈ رہا ہے تو کوئی پیش کار کو۔ سب کے اپنے اپنے کیس اڑے ہوئے ہوتے ہیں اور سب اتنے پریشان ہوتے ہیں کہ دس بندے بھی ٹکرا جائیں تو وہ پلٹ کر نہیں دیکھتے۔ بس اسی لیے وہاں دھندا خوب چلتا ہے۔" اس کی باتیں اتنی عجیب تھیں کہ میں نے اور محسن نے اُن کا باقاعدہ انٹرویو شروع کیا۔

"پھر بھی جیب کی طرف سے تو سب ہوشیار رہتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "تھانہ کچہری ہو یا بازار۔"

"او جی بھولے بادشاہو۔ آپ نہیں سمجھتے ان باتوں کو۔" چھوٹے نے کہا۔ "کیسے پاکٹ سے تو لوگ بسوں میں بھی ہوشیار رہتے ہیں مگر ہم پھر بھی اپنا کام دکھا جاتے ہیں۔ دراصل ہماری کامیابی کا ایک راز ہے۔ جیب پر ہاتھ مارنے سے پہلے بندے کو 'پُٹ دو'۔ پُٹ دو سمجھتے ہیں آپ؟ اس کے قدم اکھاڑ دو۔ جو لوگ گھر سے مال لے کر چلتے ہیں ناجی! وہ تو خود اس کی خبر دیتے ہیں۔ ان کا ہاتھ خود اسی جیب کی طرف جاتا ہے جس میں مال ہو۔ ہم یہی تاڑتے رہتے ہیں۔ پھر جیسے ہی موقع ملتا ہے 'مال غائب۔ اب موقع کبھی تو خود مل جاتا ہے۔ بس کو اچانک جھٹکا لگا یا ڈرائیور نے ماردی بریک تو جتنے کھڑے ہوتے ہیں سب خود کو گرنے سے بچاتے تھا۔ گریں نہ تب بھی آپس میں ٹکرا تے ہیں یا کسی پر چڑھ جاتے ہیں۔ بیٹھے ہوئے بھی اچھلتے تو ہیں۔ بس یہی ہوتا ہے موقع۔ اس وقت ایک سیکنڈ کے لیے آدمی کی توجہ مال سے ہٹ جاتی ہے۔ وہ خود کو سنبھالتا ہے یا معذرت کرتا ہے۔ ورنہ ڈرائیور کو اور پولیس کو گالی دیتا ہے۔ اسی ایک سیکنڈ میں ہم ہاتھ کی صفائی دکھاتے ہیں تو اسے معلوم بھی نہیں ہوتا۔ کچہری میں موقع خود پیدا ہو جاتا ہے۔ جس سے چاہو اوپر نیچے آتے جاتے ٹکرا جاؤ۔ کوئی برا نہیں مانتا اور اسے معلوم بھی نہیں ہوتا کہ وہ کب لٹ گیا۔ کس نے ٹکر ماری تھی جیب صاف کرنے کی نیت سے۔ ٹکر تو بھیڑ بھاڑ میں ہوتی رہتی ہے۔ کئی جگہ خود کو سنبھالنا پڑتا ہے، کبھی گرنے سے کبھی کسی اور سے ٹکرانے سے۔ سب 'سوری' کہہ کے گزر جاتے ہیں۔"

'پُٹ' دینے یا کسی کے قدم اکھاڑ کے لوٹ لینے کے اس بے حد باریک نفسیاتی مسئلے کی افادیت نے مجھے حیران کر دیا۔ کسی جیب کترے کی زبانی اس کے فن سے اسرار و رموز سے آشنائی کا یہ پہلا موقع تھا۔

"تو تم وہاں شکار کی تلاش میں گھوم رہے تھے۔ پھر کیا ہوا؟" شیخ نے متانت سے کہا۔

"لنچ تناول فرمایئے سر جی!" حوالدار بجلی نے کمرے میں قدم رنجہ فرما کے اعلان کیا۔ "صرف چکن بریانی ہے...."

"اچھا تم تناول فرماؤ۔" شیخ نے کہا۔ "ہم آتے ہیں۔ ہاں بھئی؟" وہ پھر ملزمانِ زیرِ تفتیش سے مخاطب ہوگیا۔

"ہمیں ایک آدمی نے بلایا اور کہا کہ ایک چھوٹا سا کام ہے۔ دونوں کو ہزار ہزار دوں گا۔" موٹے نے کہا۔ "اسی نے ہمیں طریقہ بھی سمجھایا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ بس اس آدمی

کو پکڑ کے لے آؤ۔ میں اپنی گاڑی کے پاس کھڑا ہوں۔ تھانے لے جانے کے لیے اس کو اندر ڈال دو اور خود بھی بیٹھ جاؤ۔ جہاں کہو گے اتار دوں گا۔ باقی کام میرا۔ ہم نے آپس میں مشورہ کیا۔ دو ہزار کم نہیں تھے اور کام زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ کا تھا۔ ہم نے کہا رقم ایڈوانس دے دیں۔ انہوں نے دیدی۔“

”بے وقوف۔ اگر بعد میں وہ اس شخص کو قتل کر کے سڑک پر پھینک دیتے تو تم کیا کرتے؟“ شیخ نے کہا۔ ”کتنے لوگ گواہی دیتے کہ انہیں پکڑ کر لانے والے تم تھے۔ وہ سارے اسٹامپ وینڈر اور منشی اور ٹائپ کرنے والے۔ کیا بتاتے تم ان کے بارے میں؟ قتل کا کیس ایسا تو نہیں ہوتا کہ تمہارے ملک صاحب کی ’سفارش‘ سے ختم ہو جاتا؟“

ان دونوں کا رنگ اُڑ گیا۔ دو ہزار پیشگی مل جانے کے بعد وہ نتائج کی سنگینی کے بارے میں سوچنا تک بھول گئے تھے۔ اسی سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ محض جیب کترے ہیں۔ کوئی خطرناک مجرم نہیں۔

”اس شخص کی گاڑی دیکھی تھی تم نے؟“ شیخ نے کہا۔ ”اس کا رنگ۔ ماڈل۔ نمبر؟“۔

ان دونوں نے سر جھکا کے اپنی کوتاہ اندیشی اور بیوقوفی کا اعتراف کیا۔

”اچھا پھر دیکھو گے اس شخص کو تو پہچان لو گے؟“ شیخ نے کہا۔ ”خدا کا شکر کرو کہ آج قتل کے الزام میں پکڑے جانے سے بچ گئے۔ اگر وہ شخص تمہارے ہاتھ آجاتا تو اب تک اس کی لاش مردہ خانے پہنچ چکی ہوتی۔ صورت یاد ہے نا اس کی؟“

ان دونوں نے اقرار میں سر ہلایا۔ ”پھر دیکھیں گے تو ضرور پہچان لیں گے عالی جاہ! آپ چاہیں تو وہ دو ہزار بھی رکھ لیں۔“

”بکو مت!“ شیخ نے گرج کے کہا۔ ”افسوس یہ ہے کہ تم واردات کا ارتکاب کرتے پکڑے نہیں گئے۔ نام بتاؤ اپنے؟ اچھا رہنے دو۔ میں ملک صاحب سے پوچھ لوں گا سب کچھ۔ انہیں تو پتا بھی معلوم ہوگا۔“

”نام تو میرا بھولا ہے جی۔“ چھوٹے نے کہا۔ ”اور یہ چھوٹو ہے۔ ملک صاحب پتا نہیں بتائیں گے۔“

”اچھا۔“ شیخ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”پھر ابھی تم یہیں رہو۔ جب تک تمہارا صحیح ٹھکانہ معلوم نہ ہو جائے۔ حوالدار۔ لے جاؤ انہیں۔“ اس نے بلند آواز میں کہا اور ہمارے ساتھ باہر آگیا۔ حوالدار کی جگہ وہی کانسٹیبل پھر نمودار ہوا اور انہیں ہنکا کے لے گیا۔

حوالدار آفس میں ماحضر تناول فرمانے کی کارروائی میں بڑے انہماک سے مصروف تھا۔ ہمیں دیکھ کے اس نے ایک زوردار ڈکار لی اور پانی کا گلاس اٹھا لیا۔ ہم سب نے بچے ہوئے ”چکن بریانی“ سے لنچ شروع کیا۔

”کیا انکشافات ہوتے ہیں اس ناچیز پہ کہ عقل دنگ رہ جائے“ میں نے کہا۔ ”یعنی دھندا جیب کاٹنے کا اور ذکر بد نیتی کے انجام کا اور ایمانداری پر قائم رہنے کا۔“

”میرے علم میں تو اتنا اضافہ ہوا ہے کہ سوچتا ہوں یہی پیشہ اختیار کر لوں۔“ محسن نے کہا۔ ”بندوں کو ٹیٹ دینے کا۔“

”اس پیشے کے اور دلچسپ اور مضحکہ خیز پہلو ہیں۔“ شیخ نے کہا۔ ”مثلاً یہی علاقوں کی تقسیم کا مسئلہ۔ اس میں بعض اوقات ایسی صورتِ حال پیدا ہو جاتی ہے کہ ایک جیب کترے نے کسی موٹی اسامی کو تاڑا اور اس کے پیچھے لگ گیا۔ اب فرض کرو اسے بدقسمتی سے موقع ہی نہیں ملا اور علاقہ دوسرا شروع ہو گیا کسی دوسرے جیب تراش کا۔ تو وہ آگے نہیں جائے گا۔ اسامی کا سودا کرے گا۔ اپنے کسی ہم پیشہ کو بتا دے گا کہ اسامی موٹی ہے اتنا مال ملنے کی امید ہے۔ اتنے میں سودا منظور ہے تو مال نکال میں بتا دیتا ہوں۔ اب بالکل یہ لاٹری والا کھیل ہے۔ معمولی سے معاوضے پر موٹی مرغی دوسرے کے سپرد کر دی جاتی ہے۔ بقول شاعر، سپردم بہ تو مایۂ خویش را۔ کہ مال تو میرا تھا مگر قسمت نے ساتھ نہیں دیا۔ اب آگے دوسرا اپنی قسمت آزماتا ہے۔ خدانخواستہ وہ بھی ناکام رہے اور تیسرے علاقے کی حدود میں داخل ہو جائے تو وہ رقم اسے واپس مل جاتی ہے جو اس نے داؤ پر لگائی تھی۔ بعض اوقات ایک ہی اسامی چار چار پانچ ہاتھوں میں جاتی ہے اور اسے خبر نہیں ہوتی کہ کرنے والے کس مزے سے اس کی خرید و فروخت کر رہے ہیں۔“

مجھے اور محسن کو بے اختیار ہنسی آئی۔ ”یار شیخ! تو کسی جیب کتروں کے گروہ میں تو نہیں رہا؟“ میں نے کہا۔

”گروہ میں تو نہیں رہا لیکن اتفاق ہے کہ میں نے ان کا مشاہدہ بہت قریب سے کیا ہے۔“ شیخ ہنسا۔ ”ایک زمانہ تھا کہ ہم ... میں رہتے تھے۔ وہیں ایک جیب کتروں کا اڈا تھا جہاں ان کا سرغنہ رہتا تھا۔ محلے میں اس کی بڑی عزت تھی اور وہ شاہ صاحب کہلاتا تھا لیکن عموماً لوگ یہ بات جانتے تھے کہ وہ کیا ہے۔ بس کچھ محلے داری کی وجہ سے۔ کچھ دشمنی کے ڈر سے۔ ... شہادت نہ ہونے کے باعث اور پولیس کے چکر سے دور رہنے کے لیے کوئی اس کی رپورٹ نہیں کرتا تھا۔ ایک بار میں گلبرگ سے چار نمبر بس میں بیٹھا اور اسٹیشن پہنچا۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹے ... میں۔ تمہیں معلوم ہے وہ بس آدھا لاہور گھوم کے ... ہے۔ اسٹیشن تک پرس میرے پاس تھا کیونکہ میں نے اترنے کے بعد آلو بخارے خریدے تھے۔ جب میں دوبارہ رام گلی کی بس میں چڑھا اور کنڈکٹر نے ٹکٹ کے پیسے مانگے تو پرس غائب۔ میں سخت پریشان اور شرمندہ ہوا۔ کچھ لوگ ٹکٹ نہ لینے کے لیے جیب کٹ جانے کا بہانہ استعمال کرتے ہی رہتے ہیں۔ میں نے کنڈکٹر کو ایک سیر آلو بخارے پیش کیے کہ قبول فرمایئے اور رام گلی کا ایک ٹکٹ عنایت کر دیجیے۔ معلوم ہے اس کے بعد کیا ہوا؟ کنڈکٹر نے دانت نکالتے ہوئے لفافہ لے لیا اور یہ ظاہر کیا جیسے میرا جاننے والا ہے۔ ’اس تکلف کی کیا ضرورت ہے جناب!‘ وہ بولا اور ٹکٹ دیے بغیر آگے نکل گیا۔“

ہنستے ہنستے میرا اور محسن کا بُرا حال ہو گیا۔ ”فائدے میں رہا تُو۔ ورنہ وہ اتار دیتا بے عزت کر کے تو مارچ کرنا پڑتا۔“

”ابھی اور سنو۔“ وہ بولا۔ ”شام کو میں شاہ جی کے ڈیرے پہنچا۔ میں نے کہا شاہ صاحب بڑے افسوس کی بات ہے اب محلے داری کا اتنا بھی لحاظ نہیں رہا۔ آپ ہی کے علاقے میں کسی نے ہم پر ہاتھ صاف کر دیا؟ شاہ جی نے مجھے تسلی دی اور تفصیلات پوچھیں۔ مثلاً یہ کہ کیا آپ کو یقین ہے جیب اسٹیشن آنے سے پہلے نہیں کاٹی گئی۔ میں نے آلو بخارے والا واقعہ عرض کیا جو اس بات کا ٹھوس ثبوت تھا کہ پرس اس وقت نہیں نکلا تھا۔ وہ قائل ہو گئے۔ ’اسٹیشن سے پرے ہمارا علاقہ نہیں ہے ناجی۔‘ انہوں نے کہا۔ ’لیکن اب آپ فکر نہ کریں۔ رات کو عشاء کے بعد آجائیں۔ پرس مل جائے گا۔‘ مجھے ذرا بھی یقین نہیں تھا مگر رات کو پھر میں گیا تو انہوں نے درجن بھر پرس میرے سامنے رکھے اور کہا کہ اپنی چیز اٹھا لیں اور رقم گن کے تسلی کر لیں۔ میں نے بندے کو سمجھا دیا ہے۔ دیکھیں ناجی کسی کے ماتھے پہ تو نہیں لکھا ہوتا ہے کہ وہ کہاں رہتا ہے۔ پرس میں ایک روپیہ تک کم نہیں تھا۔“

کھانے کے بعد شیخ نے مزنگ تھانے کا نمبر ملایا۔ ”جی ... السلام علیکم۔ آئی ایم شیخ بول رہا ہوں۔ ہاں۔ وہ اپنے ملک صاحب ... ڈیوٹی پر ہیں؟ اچھا اچھا۔ ملک صاحب ہی بول رہے ہیں۔ السلام علیکم۔ ہاں خیریت ہی تھی۔ وہ آج ضلع کچہری کے احاطے سے دو بندے پکڑے گئے تھے۔ ایک خود کو بھولا بھالا۔ معاف کیجیے گا بھولا کہتا ہے۔ دوسرا چھوٹو۔ کہتے ہیں ملک صاحب مزنگ تھانے والے جانتے ہیں ہمیں۔ میں نے کہا اچھا انہی سے معلوم کر لوں گا۔ کیا پتا ہے ان کا؟ پھر بھی کوئی ٹھکانہ ہو گا ان کا جہاں سے ضرورت پڑنے پر انہیں بلایا جا سکے۔ نہیں ابھی تو میں ان کو چھوڑ رہا ہوں اپنی ذمہ داری پہ۔ لیکن بعد میں ان کو بلانا پڑا تو... جی۔ آپ سے کہہ دوں۔ بہت بہتر۔ السلام علیکم۔“

اس نے ریسیور رکھ دیا۔ ”دونوں ملک صاحب کے آدمی ہیں۔ جیب تراشی کے علاوہ مخبری بھی کرتے ہیں۔ ان کو روکے رکھنے سے کیا حاصل۔ وہ تو نکل گئے جنہوں نے دو ہزار میں انہیں اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کی تھی۔ اب وہ جیسے چاہیں اپنے دو ہزار واپس وصول کریں۔ نقد یا ناکامی کی سزا دے کر۔ حوالدار!“

حوالدار بجلی زیادہ کھا لینے کے بعد کسی کمرے میں قیلولہ فرما رہے تھے۔ وہ جماہیاں لیتا افیم کھانے والوں کی طرح سلو موشن میں چلتا ہوا نمودار ہوا۔ ”حکم عالی جاہ!“

”ان دونوں کی چھٹی کر دو۔“ اے ایس آئی شیخ نے کہا۔ ”اور تم کو بھی سونا ہی ہے تو گھر جاؤ۔ چار بجنے والے ہیں۔ حشمت خان کو چارج دے کر میں بھی چلا جاؤں گا۔“ حوالدار نے سر کھجایا اور ملزمان کو تفتیش یا جرمانے کے بغیر رہا کر دینے کی مصلحت پر غور کرتا ہوا رخصت ہو گیا۔ کام کی کوئی بات ہمیں بھی معلوم نہیں ہوئی تھی چنانچہ ہم نے اجازت چاہی۔ چلتے چلتے مجھے نازلی کا قرض یاد آیا۔

”یار شیخ! وہ ہزار جو میں نے نازو سے لیے تھے ابھی تک ادا نہیں ہوئے ہیں۔“ میں نے کہا۔

شیخ ہنسا۔ ”کوئی بات نہیں۔ سو روپیہ روز کے حساب سے سود ادا کر دینا۔ اس کا تو یہی حساب ہے۔“

”اچھا۔“ میں نے کہا۔ ”آج رات ہم آئیں گے اس مصیبت سے نجات پانے کے لیے۔“ شیخ نے مصیبت سود کے بارِ گراں کو ہی سمجھا ہو گا لیکن میرے نقطۂ نظر سے خود نازو ایک مصیبت بننے لگی تھی۔

”دنیا کیسے کیسے لوگوں سے بھری پڑی ہے۔“ محسن نے باہر آ کے کہا۔ ”مثلاً یہ بھولا اور چھوٹو۔ اور ان کے برعکس مست قلندر مرحوم اور جمیل صدیقی۔ جو آج تو مرحوم نہیں ہو سکے مگر۔“

”مگر دگر کچھ نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”وہ اپنا کام کر کے نکل گیا۔ اب وہ کسی کے ہاتھ نہیں آئے گا۔ گواہی دے گیا لیکن جرح کے لیے حاضر نہیں ہو گا۔ زمانہ ہم کو ڈھونڈے گا نہ جانے ہم کہاں ہوں گے۔“

”میرا خیال ہے اس کیس میں اب جان نہیں رہی۔“ محسن نے کہا۔ ”یہ دشمنوں کی سب سے بڑی شکست ہے۔ باقی رہ جاتا ہے مار پیٹ اور توڑ پھوڑ کا مقدمہ تو وہ کوئی سنگین معاملہ نہیں۔ اس کے ذمے دار کسی حد تک ہمارے اشتعال انگیز حالات تھے۔“

"بظاہر تو مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن عقلمندوں نے کہا ہے کہ دشمن کو کبھی کمزور نہیں سمجھنا چاہیے۔ دشمن اگر دلاور جیسے ہوں تو خود کو کسی خطرے سے محفوظ سمجھنا بے وقوفی ہے۔ انہوں نے میر شرافت علی کے قتل کا الزام مجھ پر عائد کرنے کی کوشش کی اور ناکام رہے تو کیا، اس سے پہلے ہی وہ مجھے میر محمد کے قتل میں ملوث کرنے کا انتظام کر چکے تھے۔ مجھ پر عبدل اور رشیدے کے قتل کا الزام تو یقیناً آ جاتا لیکن مارنے والے ہاتھ سے بچانے والا ہاتھ زبردست ہے۔ عبدل نے مرتے مرتے مجھے بچا لیا۔ میری کوشش کا کیا دخل تھا اس میں کہ وہ ٹیپ آج بحفاظت عدالت تک پہنچ گیا۔ کرنے والوں نے تو اس شہادت کو ضائع کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا لیا تھا۔ اس کی خاطر میر محمد، اس کی بیوی اور مست قلندر تین افراد تو اپنی جان سے گئے۔ زیادہ سے زیادہ میں میر محمد کے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ اس انجام کا مستحق تھا لیکن اس کی بیوی اور اس کے بچے، مست قلندر کا خاندان؟ انہیں کس بات کی سزا ملی؟"

"اس عشق کی حقیقت کو بھی کسی نے نہ سمجھا۔" محسن بولا۔ "مضحکہ خیز نظر آنے کے باوجود جمیل صدیقی کتنا عظیم ہے۔ کوئی تصور کر سکتا ہے اس کے عشق کا۔ یہ کیا تھا؟ صرف ایک عورت کے حصول کی خواہش اور اس میں ناکامی کا ردِ عمل۔ وہ جذبہ تو اسی شدت کے ساتھ زندہ رہا۔ وہ عورت کسی اور کی ہو گئی اور شاید بھول بھی گئی کہ جمیل نام کے کسی شخص نے اسے چاہا تھا لیکن کمال دیکھو کہ جب وقت آیا تو اسے ساری دنیا میں جمیل سے زیادہ اعتماد کے قابل کوئی نظر نہ آیا اور اس نے کتنی عقیدت سے یہ بارِ امانت اٹھا لیا۔ کوئی رقابت نہیں، کوئی حسد نہیں، کوئی شکایت نہیں۔ یہ خیال نہیں کہ بچے کس کے ہیں۔ تمام عمر ایک نام سے نسبت رہی دل کو۔"

"کتنی حسرت سے کہا تھا اس نے کہ ہاں وہ عزیز تھی مجھے۔ بے حد عزیز تھی۔" میں نے کہا۔ "سب نے یہی سمجھا کہ وہ اپنے اور اس عورت کے رشتے کو تسلیم کر رہا ہے۔ وہ رشتہ کیا تھا؟ یہ صرف ہم جانتے ہیں۔ جب اس نے آتش کے جواں ہونے کا ذکر کیا تھا تو کچھ دیر کے لیے اس کا ذہن بھٹک گیا تھا۔ لیکن اس نے خود کو سنبھال لیا۔ اس نے فرض کر لیا ہے کہ اغوا کرنے والوں نے اس عورت کو قتل کر کے کہیں گاڑ دیا لیکن یہ بات اس نے کتنے غیر جذباتی انداز میں کہی۔ وجہ وہی کہ اس عورت سے وقتی رشتہ نہ پہلے تھا۔ نہ اب ہے۔ وہ اس کے خیال سے اور اس کے تصور سے پرستش کے جذبات وابستہ کیے زندہ ہے

چنانچہ اس کے ذہن میں وہی پرانی دبلی پتلی نازک اندام لڑکی ہے۔ تلخی اس کے لہجے میں اس وقت آئی تھی جب وہ ایک عورت پر ہونے والے مظالم اور بچوں کے ذہن پر ان کے اثرات کا ذکر کر رہا تھا مگر یہ تلخی بھی غیر ذاتی تھی۔ میرا مطلب ہے اگر وہ کسی اجنبی عورت اور اس کے بچوں کا ذکر کرتا تب بھی اس کا لہجہ ایسا ہی تلخ ہو جاتا۔ ایک طرف یہ دیوانگی۔ دوسری طرف زندگی کا یہ شعور کہ اس نے ٹیپ سُن کر تمام معلومات حاصل کیں اور انہیں عدالت تک پہنچا دیا۔ کیا آدمی تھا۔"

ہمارے گھر پہنچنے تک شام ہو گئی تھی۔ رضوی صاحب لان پر بیٹھے تھے لیکن اکیلے نہیں تھے۔ وہ دین محمد سے کسی بات پر بحث کر رہے تھے جو میر محمد کا بھائی تھا۔ ہم قریب جا کے بیٹھے تو ہم نے دیکھا کہ رضوی صاحب کا موڈ خراب تھا۔

"مجھے افسوس ہے سر۔ تھانے والوں نے میر محمد کے قتل اور اس کی بیوی کے اغوا کے کیس میں دلچسپی نہیں لی۔ ابھی تک کسی کو اس شک میں تفتیش کے لیے گرفتار تک نہیں کیا گیا۔" وہ بولا۔

"تمہیں اگر کسی پر شک ہے تو بتاؤ۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "اور تم کیا چاہتے ہو؟ کیس سی آئی اے یا کرائمز برانچ والوں کے سپرد کر دیا جائے؟ اس کے لیے تمہیں ڈی آئی جی کرائمز کے پاس جانا چاہیے۔"

"وہ کہتے ہیں پولیس خود ہمیں کوئی کیس ٹرانسفر کر سکتی ہے۔" دین محمد نے تلخی سے کہا۔ "حالانکہ کچھ واقعات بالکل واضح ہیں اور ایک ہی سلسلے کی کڑی ہیں مثلاً آپ کے اسلام آباد جانے سے پہلے مجھے بیہوش کر کے اور باندھ کے پیچھے آپ کے سرونٹ کوارٹر میں ڈال دیا گیا۔ اُدھر میرا بھائی غائب ہو گیا اور تھانے کی حدود میں سے اس کی بیوی کو اٹھا لیا گیا۔"

"تمہارے پاس اگر کوئی ثبوت ہے کہ تمہیں ناک آؤٹ کرنے والے اور تمہارے بھائی کے گھر میں واردات کرنے والے وہی لوگ تھے تو بتاتے کیوں نہیں؟" رضوی صاحب نے کہا۔ "میرا خیال ہے کسی کو تمہارے خاندان سے دشمنی تھی۔"

"بس اسی خاندانی تنازعہ اور انتقام کی لائن پر تفتیش جاری ہے جو سراسر غلط ہے۔ ہمارا کوئی دشمن نہیں تھا۔ ہمارا کوئی خاندانی تنازعہ نہیں تھا۔ نہ زمین جائداد کا۔ نہ رشتے ناتے کا۔" دین محمد نے کہا۔ "اصل بات یہ ہے سر کہ دونوں جگہ وارداتوں کے پس منظر میں اتفاق کی کوئی وجہ نہیں۔ مجھے یہاں کس کے لیے حفاظت پر مامور کیا گیا تھا؟ اور میر محمد کس کے خلاف قتل کے الزام کی تفتیش کر رہا تھا؟"

میرے کان کھڑے ہوئے۔ وہ نام لیے بغیر میرا اشارہ دے رہا تھا۔ لیکن میں عمداً خاموش رہا۔

"تم سکندر بخت کو تفتیش میں شامل کرنا چاہتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "البتہ یہ بات منطقی طور پر عجیب سی لگے گی کہ میں سکندر بخت کی زندگی کو محفوظ نہیں سمجھتا تھا۔ اس کی وجوہات تھیں۔ پہلے کے واقعات۔ اور وہ یہاں اکیلا رہ گیا تھا اس لیے میں نے عارضی طور پر تمہیں تعینات کر دیا۔ اب تم کہو گے کہ اسی نے تمہیں مار باندھ کے ڈال دیا حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اگر وہ تمہیں نجات نہ دلاتا تو ہماری واپسی تک تم وہیں پڑے رہتے اور خدا معلوم اس وقت تک کیا ہو جاتا۔ تم کسی کو مدد کے لیے بھی متوجہ نہ کر سکتے۔ پھر مجھے اس کا سبب بتاؤ۔ یعنی فرض کرو سکندر نے ایسا کیا تو کیوں کیا؟"

"یہ تو تفتیش کرنے والے معلوم کر سکتے ہیں سر۔" دین محمد بولا۔ "لیکن آپ مزید اتفاقات پر غور کریں۔ میر محمد کے گھر میں پیش آنے والے واقعات اور اس کے بیوی بچوں کے اغوا کا پتا کس نے چلایا؟ اے ایس آئی شیخ نے۔"

"یہ غلط ہے۔" رضوی صاحب کے نفی میں سر ہلانے سے قبل ہی میں نے کہا۔ "پہلے تم گئے تھے۔ تم نے دروازہ کھلا پایا تھا اور سب سے پہلے تم نے خود ہی اندر کی تباہی کا نظارہ دیکھا تھا۔ میں اور شیخ بعد میں پہنچے۔"

"لیکن اس وقت میں ساتھ نہیں تھا جب تم نے اور شیخ نے میر محمد کی آدھی لاش دریافت کی تھی۔" وہ تیز لہجے میں بولا۔

"اس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟" رضوی صاحب نے کہا۔ "جو کہنا ہے صاف کہو۔"

"صاف کیا کہوں سر! سب کچھ تو آپ کے سامنے ہے۔" وہ بولا۔ "اسی شخص کی وجہ سے سب کچھ ہوا۔ اسی کی حفاظت کرتے ہوئے مجھ پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ اسی کے کیس کی تفتیش کرتے ہوئے میرا بھائی مارا گیا۔ یہ اس وقت بھی موجود تھا جب میر محمد کے گھر تباہی کا پتا چلا اور اس وقت بھی جب اس کی ادھوری لاش نکالی گئی۔ یہ اور اس کا دوست اے ایس آئی شیخ۔ پھر اس کے سر کے بارے میں بھی رپورٹ ملی کہ ایک گاڑی میں تھا۔ وہ گاڑی یہی چلا رہا تھا۔ پٹرول پمپ والوں نے اس کا نمبر تک دیکھ لیا تھا لیکن وہ گاڑی مس رابعہ قاری کی ثابت ہوئی جو اسی کی وکیل ہیں۔ انہوں نے کہہ دیا کہ وہ گاڑی لے کے اسلام آباد گئی ہیں۔ اس سے کسی نے سوال تک نہیں کیا۔"

"دیکھو دین محمد! یہ سب کچھ لکھ کے تم ڈی آئی جی صاحب کو درخواست دے دو۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "میں سمجھ رہا ہوں کہ تمہارے ذہن میں شبہات کی نوعیت کیا ہے۔ تمہارے خیال میں سکندر بخت نے پہلے تمہیں ناک آؤٹ کیا۔ پھر دین محمد کو قتل کر کے کہیں گاڑا لیکن اس کا سر اپنے ساتھ لے آیا۔ پھر سکندر بخت نے دین محمد کی بیوی اور بچوں کو اغوا کیا اور مار اپیٹا۔ اور رابعہ نے اس کی مدد کی۔ اے ایس آئی شیخ نے اس کی مدد کی۔ پولیس اس لیے تفتیش سے گریز کر رہی ہے کہ سکندر سے میرا کوئی تعلق ہے۔" وہ اب غصے میں تھے۔ "تم کو جذبات نے پاگل کر دیا ہے دین محمد! اس لیے میں تم کو قصوروار نہیں سمجھتا۔ تمہاری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفلوج ہو چکی ہے۔ تم آزاد ہو۔ ایک ایک درخواست سب کے خلاف دے دو اور دیکھو نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ تمہیں دماغ کے معائنے کے لیے بھیج دیا جائے گا۔"

"آپ چاہیں گے تو ایسا ہی ہو گا سر۔" دین محمد اٹھتے ہوئے بولا۔ "لیکن مجھے نوکری کی پروا نہیں۔"

"شٹ اَپ۔ بیٹھو اِدھر اور میری پوری بات سنو۔" رضوی صاحب نے گرج کے کہا۔ "یہ دنیا جانتی ہے کہ میر محمد کس قماش کا آدمی تھا اور اے ایس آئی شیخ کیسا آدمی ہے۔ اس میں میری گواہی شامل نہیں ہو گی۔ مجھ سے سُنو کہ میر محمد کیوں مارا گیا۔ اگر تم آج عدالت میں ہوتے تو ایک ایسے شخص کی زبان سے ساری کہانی سن لیتے جس کا نام بھی شاید تم نے نہیں سُنا ہو گا۔ میر محمد نے اپنی تباہی کا سامان خود کیا تھا۔ اس نے ایک ٹیپ غائب کر دیا تھا تاکہ دو افراد کے قتل کا جرم ثابت ہو جائے۔ لیکن خود اس کی بیوی نے اس کوشش کو ناکام بنا دیا۔ میر محمد کا جھوٹ ثابت ہو چکا ہے۔ اس نے کس کے کہنے پر ایسا کیا تھا۔ اور کیا تھا تو ٹیپ اپنے پاس کیوں رکھا۔ یہی وہ جرم تھا جس کی وجہ سے وہ مارا گیا۔ اس کی بیوی کو شوہر کے جرم کی سزا ملی۔ انجام ایک ہوا لیکن اسباب مختلف تھے۔ میر محمد اپنے لالچ کے باعث قتل ہوا۔ اور اس کی بیوی نے جو کچھ کیا وہ اس کے نامۂ اعمال میں ایک نیکی بن کے لکھا گیا۔ ان دونوں کے بچے محفوظ ہیں۔ کل کا اخبار پڑھ کے دیکھنا۔"

دین محمد کا جوش و خروش کچھ کم ہو گیا۔ "میرا مطلب یہ نہیں تھا سر!"

"مجھے مطلب مت سمجھاؤ۔ میں نے تم سے زیادہ نوکری کی ہے اور اس سے زیادہ پیچیدہ نوعیت کے مقدمات دیکھے ہیں۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "تم کو شکایت ہے کہ رابعہ قاری ایڈووکیٹ نے جھوٹ بولا۔ تمہارے لیے سب دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ تھانے جاؤ۔ براہِ راست ایس ڈی ایم کو

شکایت لکھوا دو یا ڈی آئی جی کو۔ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ اے ایس آئی اکرام شیخ نے تو استعفیٰ دے دیا ہے مگر ابھی تک منظور نہیں ہوا ہے۔ اس کے خلاف دوسری درخواست لگا دو کہ جب تم نے اپنے بھائی کے گھر کی حالت دیکھی تو وہ کیوں موجود تھا؟ ایک گمنام اطلاع پر اس نے نصف شب کو کارروائی کیوں کی اور تمہارے بھائی کی لاش برآمد کیوں کی۔ گمنام شکایات پر کوئی قدم نہیں اٹھایا جاتا۔ اچھا تھا اگر وہ لات پر لات رکھے تھانے میں بیٹھا رہتا۔ اب رہ گیا سکندر۔ اس کے خلاف الگ تحقیقات شروع کراؤ کہ اس نے تمہیں کیوں آزاد کیا۔ یہ ثابت کرنا چاہو تو کر دینا کہ اسی نے تمہیں باندھا تھا۔ یہ نکتہ بھی اٹھانا کہ اے ایس آئی اکرام شیخ کے ساتھ یہ کیوں موجود تھا؟ یہ سب اپنی اپنی جوابدہی کر لیں گے۔ میرے خلاف بھی ایک درخواست دے دو کہ میں مجرموں کی پشت پناہی کر رہا ہوں‘ مجھے پروا نہ ہوگی۔ میرا ماضی بے داغ ہے اور ضمیر مطمئن ہے۔ اگر الزام تمہارے بیٹے پر ہوتا تو کیا تم اسے نکال سکتے تھے گھر سے؟ پھر یہ توقع مجھ سے کیوں رکھتے ہو کہ میں سکندر کو اس گھر میں رہنے بھی نہ دوں حالانکہ وہ میرے بچپن کے دوست کا بیٹا ہے اور اس کی حیثیت پہلے بھی اس گھر میں ایک فرد کی تھی جب اس پر قتل کا کوئی الزام نہیں تھا۔ اور دین محمد! اسے جب پھانسی ہو گئی نا تو اس کی لاش لینے والا وارث میرے سوا کوئی نہیں ہوگا۔ سمجھے۔“

دین محمد کا چہرہ فق ہو گیا۔ رضوی صاحب خوش گفتار اور... خوش اخلاق آدمی تھے اور اپنے کسی ماتحت پر یوں برہم نہیں ہوتے تھے۔ شاید اسی رویے نے دین محمد کو اس جسارت پر اکسایا تھا کہ ان کے سامنے آ کے اول فول بکنا شروع کر دے۔ اب رضوی صاحب نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیا تھا۔ جو بات اس کی ناقص عقل میں اس لیے نہیں آ رہی تھی کہ اس کی راہ میں جذبات حائل تھے‘ وہ اس کی سمجھ میں آ گئی تھی اور اس پر چودہ پندرہ طبق روشن ہو گئے تھے۔

خادم جو چائے اندر سے لا کے درمیان میں رکھ گیا تھا وہ پڑے پڑے ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ انکل رضوی نے محسن سے کہا کہ وہ دوسری چائے منگوائے۔ محسن کے اندر جاتے ہی دین محمد نے اجازت چاہی۔

”بیٹھو ابھی، چائے پی کر جانا۔“ رضوی صاحب نے حکم دیا۔ وہ اب سگار کا کونا کاٹ رہے تھے اور نسبتاً پُرسکون تھے۔ ”تم پولیس میں ہو دین محمد۔“ انہوں نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”یہ بتاؤ کہ کیا اس شہر میں ہونے والے اغوا، قتل اور دیگر تمام جرائم کا سراغ لگانے کا ذمے دار میں ہوں؟ ابھی تم سے پہلے اس محرر کی بیوی آئی تھی۔ اس نے رو رو کے میرے پاؤں پکڑنے کی کوشش کی جیسے میرے سوا اس کے گمشدہ شوہر کو کوئی نہیں لا سکتا۔ ڈی آئی جی کو وہ پہلے ہی درخواست دے چکی ہے اور اس پر احکامات بھی صادر ہو چکے ہیں۔ میرے پاس کیا الہ دین کے چراغ کا جن ہے جسے میں حکم دوں اور وہ پلک جھپکنے میں مسئلہ حل کر دے۔ یہ سب تھانے۔ سی آئی اے۔ ایف آئی اے۔ ایس پی‘ ڈی ایس پی اور صوبوں کے ڈی آئی جی اور آئی جی آخر کس لیے بیٹھے ہیں۔ کیا تم اسی طرح ڈی آئی جی کے گھر جا سکتے تھے اور ان سے اتنی ہی دیر تک اس لہجے میں بات کر سکتے تھے؟ لیکن میں سمجھتا ہوں‘ تم ہمدردی کے مستحق ہو۔ سکندر بخت کا سارا کیس معلوم ہے تم کو؟ تمہیں معلوم ہے رابعہ کے ساتھ کیا کچھ ہوا؟ کیا ان کے لیے میں نے کوئی خصوصی کوشش کی؟ پولیس کے سارے محکمے کو لائن اپ کر دیا؟ کوئی خصوصی ٹیم تشکیل دی ان کے معاملات کی تفتیش کے لیے؟ کیا تم سے پہلے ان کا حق نہیں تھا۔ مجھے اپنے اختیارات سے تجاوز کرنا ہوتا اور اپنی افسری سے ناجائز مدد کرنی ہوتی تو ان کی نہ کرتا۔ جا کے ریکارڈ چیک کر لینا۔ مجھے اس نظامِ انصاف پر اعتماد ہے۔ ایک عدالت کے اوپر دوسری ہے‘ پھر ہائی کورٹ ہے۔ سپریم کورٹ ہے۔ وہاں جو لوگ بیٹھے ہیں اپنی عقل ذہانت اور تجربے سے اس مقام تک پہنچے ہیں اور خدا نے انہیں جھوٹ سچ میں تمیز کرنے کی بے پناہ صلاحیت سے نوازا ہے۔ کسی سے غلط فیصلہ ہوتا ہے تو اس لیے کہ اس کے سامنے حقائق کو مسخ کر کے پیش کیا جاتا ہے۔ گواہ جھوٹ بولتے ہیں۔ لیکن کسی نہ کسی مرحلے پر اس کی تلافی ہو جاتی ہے اور فیصلہ ہمیشہ صحیح ہوتا ہے اور عین انصاف کے تقاضوں کے مطابق ہوتا ہے۔ میں ایک انتظامی افسر ہوں۔ آئندہ میرے پاس آنے کے بجائے انصاف کرنے والوں سے رجوع کرنا۔ شکایت کسی کے خلاف بھی ہو میرے پاس مت آنا۔“

چائے پیتے ہوئے میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ہم نے میر محمد کے بارے میں انکل کو پہلے ہی سب کچھ بتا دیا تھا ورنہ اس انکشاف کے بعد کہ اس کا سر فاکس ویگن سے دستیاب ہوا تھا‘ وہ ہمیں کبھی نہ بخشتے۔ میں اور محسن نہایت سعادت مندی سے خاموش بیٹھے رہے۔ ہمارا کیس رضوی صاحب خود لڑ رہے تھے چنانچہ ہمارا دین محمد سے لڑنا حالات کو ہمارے خلاف کر دیتا۔ تھوڑی بہت جھاڑ پڑنے کی امید اب بھی تھی کیونکہ ان کا موڈ بے حد خراب تھا۔ دین محمد سے انہوں نے جو کچھ کہا تھا وہ مدلل اور ناقابلِ تردید تھا چنانچہ وہ اپنا سا منہ لے کر چلا گیا تو ہماری شامت آئی۔

”دیکھا تم دونوں نے۔ زندگی میں کبھی کسی ماتحت کی ہمت نہیں ہوئی تھی کہ میرے سامنے تو کیا میرے گھر آ کے اس قسم کی باتیں کر سکے۔“ انہوں نے خفگی سے کہا۔ ”اور تم لوگ ہو کہ ’ہم چو من دیگرے نیست‘۔ ابھی تک نہیں سمجھے ہو کہ دنیا کس ڈھب پہ جا رہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے دونوں مل کے اس پورے نظام کی اصلاح کیے بغیر دم نہیں لو گے۔“ وہ اور جانے کیا کچھ بولتے لیکن اندر سے رابعہ نے نمودار ہو کے انہیں طلب کیا۔

”آنٹی کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ آپ دیکھ لیں ڈاکٹر کو بلانا ہے کہ اسپتال لے جائیں۔“ رابعہ نے کہا۔

رضوی صاحب سب کچھ بھول گئے۔ اپنا غصہ، چائے کی آدھی پیالی اور بجھا ہوا سگار چھوڑ کے وہ اندر لپکے۔

”کیا ہوا ہے بیگم رضوی کو؟“ میں نے حیران اور پریشان ہو کے کہا۔

”تمہارا سر۔“ رابعہ نے برتن اٹھاتے اٹھاتے کہا۔ ”وہ سب سن رہی تھیں۔ پھر یہ اچکن خاں آ گئے چائے کے بہانے اور ہاتھ پیر جوڑنے لگے کہ آنٹی ہم تو مارے گئے۔ بس کسی طرح انکل کو اندر بلا لیں۔“

”بڑے شرم کی بات ہے خاں صاحب۔“ میں نے شرمندہ ہو کے محسن کو ڈانٹا۔ ”کیا تھا اگر ہم جھاڑ کی ایک ڈوز پی جاتے۔“

”ان کی طبیعت واقعی خراب تھی۔“ محسن ڈھٹائی سے بولا۔ ”میں نے کہا آپ لیٹ جائیں اور انکل کو بلا لیں ہماری جاں بخشی بھی ہو جائے گی۔ رحمدل خاتون نے اس گناہگار کی درخواست کو شرفِ قبولیت بخشا۔“

”لیکن اب اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ یہاں بے فکر بیٹھے دانت نکالتے رہو۔“ رابعہ نے کہا۔ ”اٹھو۔ اندر جا کے دیکھو۔“

میں اور محسن فوراً اٹھے اور اندر دوڑے۔ ضرورت سے زیادہ فرمانبرداری اور مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہم نے ڈاکٹر کو بلانے پر اصرار کیا لیکن بیگم رضوی نے سب کچھ سمجھتے ہوئے بات ٹال دی۔ ”رابعہ نے ایسے ہی پریشان کیا سب کو۔ بس ذرا سر میں درد تھا اس لیے اسپرین کھا کے لیٹ گئی تھی۔ اب ٹھیک ہے۔“

رضوی صاحب وہیں ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور سگار سلگانے لگے۔ ”اچھا ہو گیا آج۔“ انہوں نے عدالتی کارروائی کا حوالہ دیا۔

”آپ نے کمال کر دیا انکل۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے امید نہیں تھی کہ جمیل صدیقی زندہ سلامت واپس جا سکے۔“

”جمیل صدیقی؟ وہ کون ہے؟“ انہوں نے بے خیالی میں کہا۔ ”اچھا وہی۔ مدیرِ صد لائے وقت۔ وہ بس اتنی جلدی میں کرنا پڑا سب انتظام کہ میں خود مطمئن نہیں تھا۔ بات سمجھنے میں بھی ذرا دیر لگی۔ مگر خیر۔ تم لوگ جاؤ۔ نہانا دھونا ہوگا۔“

میں نے اور محسن نے اتنی آسانی سے گلو خلاصی پر خدا کا شکر ادا کیا اور باہر آ گئے۔ محسن کو واقعی غسل کرنا تھا اور پھر اس کا ارادہ اسلام آباد ٹیلی فون کرنے کا تھا۔ میں نے ہاتھ منہ دھو کے رابعہ کے کمرے کا رُخ کیا۔

دروازہ اندر سے بند تھا۔ ”کون ہے؟“ اس نے میری مخصوص دستک پہچان لینے کے باوجود کہا۔

”شرفا۔“ میں نے کہا۔ ”سوری۔ یہ تو جمع کا صیغہ ہے۔ واحد متکلم حقیر فقیر پُرتقصیر۔ طالبِ خیراتِ حُسن۔“

”معاف کرو فقیر صاحب۔“ اس نے دروازہ کھول کے جھانکا۔ ”ہٹے کٹے ہو۔ بھیک مانگتے شرم نہیں آتی۔“

میں زبردستی اندر داخل ہو گیا۔ ”پہلے آتی تھی اب نہیں آتی۔“ میں نے کہا۔ وہ آئینے کے سامنے بال سنوار رہی تھی۔ اس کے گہرے سیاہ بالوں کو یوں کھلا ہوا میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ اس نظارۂ حسن نے مجھے پل بھر کے لیے مبہوت کر دیا۔

رابعہ نے آئینے میں مجھے دیکھا اور اس کا رنگ گلابی ہو گیا لیکن اس نے پلٹے بغیر کہا۔ ”کیا سوچ رہے ہو؟“

"جو کچھ سوچ رہا تھا وہ تو نہیں بتاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "تم کہیں جانے کے لیے تیار ہو رہی ہو؟"

"مجھے کہاں جانا ہے؟ وہ بولی۔"

"جانا ہے۔" میں نے کہا۔ "میرے ساتھ۔ اور میں تم کو لے کر ہی جاؤں گا۔"

اس نے گھوم کر مجھے دیکھا۔ "نصیب دشمناں، دماغ پر کچھ اثر معلوم ہوتا ہے۔" وہ بولی اور مسکرائی۔

"مسئلہ بہت سنگین ہے رابعہ۔" میں نے گھٹنے سمیٹ کر صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اور نہیں ہوا تو ہو جائے گا۔ لیکن یہ مسئلہ فی الحال قانونی نہیں ہے۔ اخلاقی اور معاشرتی ہے۔ اس کو حل کرنے میں تمہاری مدد، بلکہ رضا درکار ہے۔"

"میں نے تمہارے سارے مسائل حل کرنے کا ٹھیکہ نہیں لے رکھا ہے۔ جب دیکھو مسئلہ۔ کبھی کوئی اور بات بھی کر لیا کرو۔"

"قسم خدا کی اگر میں نے وہ باتیں شروع کر دیں نا تو تم ایک منٹ نہیں ٹھہرو گی یہاں۔" میں نے جھنا کر کہا۔ "دیواروں سے سر پھوڑتا رہ جاؤں گا میں۔ تم کو واقعی میرے ساتھ چلنا ہے۔ مجھے، تم کو اور محسن کو۔"

"لیکن کہاں؟" وہ مجھے سنجیدہ دیکھ کے بولی۔ "انکل ناراض ہوں گے۔ گاڑی بھی نہیں ہے۔"

"انکل بالکل ناراض نہیں ہوں گے اور ہم انہیں کی گاڑی میں جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "اکرام شیخ کے گھر۔"

"اس کے گھر میں کوئی تقریب ہے؟" وہ بولی۔ "تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے۔"

"نہیں۔ اس نے مدعو کیا ہے۔" میں نے کہا۔ "خود میں نے کہا تھا کہ ہم آئیں گے۔ مقصد صرف ملاقات نہیں ہے۔ میں تم کو نازلی سے ملوانا چاہتا ہوں۔ شیخ کی بہن سے۔"

رابعہ ہنسی۔ "بھئی ملنا ہے تو تم جا کے ملو اس سے۔ مجھے ساتھ کیوں گھسیٹتے ہو۔ کباب میں ہڈی۔"

"میں ابھی یہ سارا میک اپ خراب کر دوں گا۔ منہ پر یہ بھبھوت مل دوں گا۔" میں نے ایش ٹرے کو الٹ کر ہتھیلی پر خالی کی۔ "اور بال بنا دوں گا بیا کا گھونسلا۔" میں جارحانہ طریقے پر آگے بڑھا۔ "بات سنو گی سنجیدگی سے یا نہیں؟"

"ارے رے ۔۔۔ پاگل ہوئے ہو۔" وہ گھوم کر بیڈ کے کنارے پر جا کھڑی ہوئی۔ "اچھا کہو کیا بات ہے۔"

میں پھر صوفے پر بیٹھ گیا۔ "شیخ کی یہ بہن نازلی عرف نازو میرے لیے وبال جان بن رہی ہے۔ بہت کم سن ہے نادان ہے اور ۔۔۔ اور اسے کچھ بھی معلوم نہیں میرے بارے میں۔"

"کیا معلوم نہیں؟ تمہارا پچ چیٹا تو اخباروں میں آتا رہتا ہے۔ اور وہ ہے اے ایس آئی شیخ کی بہن۔"

"پھر وہی۔" میں نے اسے دھمکی کے انداز میں کہا۔ "اسے نہیں معلوم کہ میں اب محبت نہیں کر سکتا۔ کسی اور سے محبت نہیں کر سکتا۔"

"آئی سی۔" رابعہ سنجیدہ ہو کے بولی۔ "اور وہ تمہیں مجبور کر رہی ہے کسی سے محبت کرنے پر؟ کون ہے وہ؟"

"وہ مجھ پر ہزار جان سے فریفتہ ہو گئی ہے، تمہارے ..." میں نے چلا کے کہا۔ "اسے نہیں معلوم کہ میں تم پر مرتا ہوں۔"

رابعہ کا رنگ فق ہو گیا۔ "خدا کے لیے آہستہ بولو۔ یہ کیا بچپن ہے۔"

"کسے نہیں معلوم کہ کون کس پر مرتا ہے۔" محسن خاں نے بلا اجازت اندر قدم رنجہ فرما کے کہا۔

"یار محسن! وہ جو شیخ ہے نا۔ اس کی بہن نازو نے مجھے سخت پریشان کر رکھا ہے۔" میں نے کہا۔ "ابھی مجھے اس کا قرض چکانے جانا ہے۔ میں نے شیخ سے کہہ دیا تھا کہ ہم آئیں گے۔ اب وہاں ایک ڈراما کرنا ہے۔ تو کسی طرح نازو کے سامنے انکشاف کرے گا کہ ... کہ رابعہ میری منگیتر ہے ... اور کہ بہت جلد ہماری شادی ہونے والی ہے۔ کوئی نہ کوئی تجھے ایسا مل جائے گا جب نازو ہو گی یا اس کے والدین ہوں گے۔ شیخ بھی ہو تو کوئی ہرج نہیں۔"

رابعہ کا چہرہ حیا سے گلنار ہو گیا۔ "سکندر! ایسا مت کرو۔ انکل کو معلوم ہو جائے گا۔"

"ہو جانے دو۔ وہ بعد کی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "اصل بات یہ ہے کہ میرے لیے اس لڑکی سے جان چھڑانے کی اور کوئی صورت نہیں رہی۔ اسے ایک ہی مرتبہ یہ کڑوی گولی نگلنے پر مجبور کر دیا جائے۔ امید ہے اس کو بھی شفا ہو گی۔ بات کو بڑھنے سے پہلے ہی ختم کر دینا بہتر ہے۔ ورنہ یہ دیکھو شیخ اپنا دوست ہے۔ اس لڑکی نے یہ جذباتی پیش قدمی جاری رکھی تو اسے ضرور معلوم ہو جائے گا اور اس کے ... ٹھیس پہنچے گی۔"

"ٹھیس تو اس کے دل کو بھی پہنچے گی۔" محسن نے ... کہا۔ "اور میں نے سنا ہے ٹھکرائی ہوئی عورت زخم خوردہ ناگن سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔"

"آپ نے اب تک جو کچھ سنا ہے وہ مجھے مت سنائیے۔" میں نے کہا۔ "رابعہ! ذرا تم جا کے انکل سے گاڑی کی بات کرو۔"

*

نو بجے کے قریب ہم شیخ کے گھر پہنچے تو دعوت کے اہتمام کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ میں نے تو سرسری طور پر کہا تھا کہ ہم آئیں گے لیکن وہاں سب یوں چشم براہ تھے جیسے ہمیں خصوصی طور پر مدعو کیا گیا ہے۔ رابعہ نے دلچسپی سے نازلی کو دیکھا جو سادگی کے باوجود بڑے اہتمام سے تیار ہوئی تھی۔ رابعہ کی صورت پر مجھے کسی جذباتی تاثر کا احساس نہیں ہوا تھا لیکن نازو کا شگفتہ، مسکراتا چہرہ ذرا سی دیر کے لیے بجھ گیا۔ "آپ سے پہلے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔"

"یہ رابعہ قاری ہیں۔ مشہور ایڈووکیٹ۔" محسن نے کہا۔ "ہمارے ساتھ ہی رہتی ہیں۔"

"ہمارے ساتھ کا کیا مطلب؟" نازو مسکرائی۔ "آپ کے ساتھ۔ یا آپ کے ساتھ؟" اس نے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھا۔

"محسن نے مسکرا کے کہا۔ "جیسے میرے ساتھ رہتا ہے وہ تو اسلام آباد میں بیٹھی ہے۔" اس نے بڑی خوبی سے اور بڑے واضح الفاظ میں سب کچھ کہہ دیا تھا۔ اکرام شیخ کے والدین معذرت کر کے جا چکے تھے کہ آپ لوگ گپ شپ کریں۔ نوجوانوں کی محفل میں ہم بوڑھوں کا کیا کام۔ اور شیخ کسی کو فون کر رہا تھا چنانچہ محسن نے موقع سے فائدہ اٹھا لیا۔

کھانے کے دوران میں اور واپسی تک نازلی بجھی بجھی سی رہی۔ اس کی ساری شگفتگی اور شوخی کافور ہو چکی تھی۔ شیخ نے اسے محسوس کیا اور نازو کو چھیڑا مگر اس کے منہ کو چپ لگ گئی۔ انکل رضوی کا بہانہ کر کے ہم جلد ہی لوٹ آئے۔ روانہ ہوتے ہی مجھے یوں لگا جیسے کوئی اور کار بھی ہمارے تعاقب میں روانہ ہوئی ہے۔ تصدیق کے لیے میں نے اپنی گاڑی کو غلط سمتوں میں، ویران سڑکوں پر موڑا اور رفتار کم زیادہ کر کے دوڑایا لیکن وہ دوسری گاڑی بدستور پیچھے رہی۔

شک محسن کو بھی ہو گیا تھا اور اس نے پچھلی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے کئی بار پلٹ کے دیکھا مگر رابعہ کے خیال سے خاموش رہا جو نہ جانے کس خیال میں گم تھی۔ شاید اسے نازلی کے دل پر بیتنے والے صدمے کا خیال تھا اور وہ سوچ رہی تھی کہ آج وہ خود نازلی کی جگہ ہوتی تو اس کی ذہنی کیفیت کیا ہوتی۔ مجھ پر اس کا اعتماد برقرار تھا مگر ایک نادان لڑکی کو شکست دے کر اس جیت کی متاع غرور پر فخر کرنا اس کے لیے مشکل تھا۔ وہ اتنی کم ظرف نہیں تھی ۔۔۔ تعاقب کرنے والی گاڑی سو گز کا فاصلہ برقرار رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ شبہے کی اب کوئی بات نہیں رہی تھی اور میرے سامنے دو ہی راستے تھے۔ ایکسلریٹر دبا کے شہر کی خالی سڑکوں پر ریس کا فلمی سین پیش کر دوں اور اسے جل دے کر نکل جاؤں۔ اس میں کامیابی، ناکامی یا کسی حادثے کے امکانات مساوی تھے۔ دوسری صورت یہ تھی کہ میں رک کر پیچھے آنے والوں کو سامنے آنے کا موقع دوں اور اگر ان کے عزائم غلط ہوں تو محسن کے ساتھ ان سے دو دو ہاتھ کر لوں۔ لیکن اس میں بھی خطرہ یہ تھا کہ ہمارے مقابل چار چار ہاتھ ہوتے یا آٹھ آٹھ تو مقابلہ برابر کا نہیں رہے گا اور پھر رابعہ کا کیا ہو گا؟

"سکندر!" میرے خیالات کا تسلسل محسن نے توڑ دیا۔ "یہ کون ہیں جو ہمیں گھر تک چھوڑنے پر کمربستہ ہیں۔ رضوی صاحب کے بندے یا ہمارے پرانے دوستوں کے نامہ بر؟"

رابعہ نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ اسی وقت پیچھے والی کار ایک دم آگے آئی اور میں نے اندازہ کیا کہ اس طاقتور مرسیڈیز کو تیز رفتاری میں شکست دینا عملاً محال ہے۔ "یہ تو اب ان سے پوچھنا ہی پڑے گا۔" میں نے ہیڈ لائٹس آف کرتے ہوئے کہا۔ "رابعہ! کوئی ایسی ویسی بات ہو تو تم مت رکنا۔" میں نے چلا کر کہا اور رفتار کم کر کے اچانک بریک لگائے۔ "گاڑی لے کر نکل جانا۔" میری آواز تصادم کے ہلکے سے دھماکے میں دب گئی۔ مرسیڈیز نے جان بوجھ کے پیچھے سے ٹکر ماری تھی اور مقصد صرف یہی ہو سکتا تھا کہ اب ہم دونوں نیچے اتر کے اپنی اپنی گاڑی کو دیکھیں۔ نقصان

کا جائزہ لیں اور ایک دوسرے کو موردِ الزام قرار دیں۔ سڑک پر یہ تماشا ہوتا ہی رہتا ہے اور غلطی کسی کی ہو، دونوں تُک تُک جھک جھک کرکے اپنی اپنی راہ لیتے ہیں۔ قانون کی مدد سے تلافی کی کوئی نہیں سوچتا لیکن یہاں ٹکر مارنے والے کچھ اور چاہتے تھے۔ اگر مقصد ہمیں ہلاک کرنا ہوتا تو وہ پیچھے سے فائرنگ کرتے یا دستی بم پھینک کر فرار ہو جاتے لیکن شکاری اب دفاعی کھیل پر اُتر آئے تھے کیونکہ وہ یقین کر چکے تھے کہ ہم میں سے کسی کی موت سے ان کا کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا ورنہ یہ کام تو بہت آسان تھا اور بہت پہلے بھی کیا جا سکتا تھا۔ ان کے عزائم کی تکمیل ہمارے زندہ گرفتار ہونے سے ممکن تھی۔

ٹکر کے وقت گاڑی سڑک کے انتہائی بائیں جانب تھی۔ چنانچہ میرا دائیں طرف سڑک پر اترنا ہی ممکن تھا۔ محسن نے زیادہ عقلمندی کا ثبوت نہیں دیا اور وہ بھی اُدھر کا دروازہ کھول کر ہی نکلا جدھر سے میں نکلا تھا۔ اگر وہ دوسری طرف اترتا تو زیادہ محفوظ رہتا اور چھُپ کے زیادہ مؤثر کارروائی کر سکتا تھا۔ میں نے انجن بند نہیں کیا تھا۔ اترتے اترتے میں نے رابعہ کو سیٹ پر گھسیٹ لیا اور چلا کر اپنی بات دُہرائی۔

"جاؤ۔ نکل جاؤ!" ہمارے پیچھے آنے والی مرسیڈیز کے ڈرائیور نے بھی انجن بند نہیں کیا تھا۔ تصادم سے ہماری گاڑی کچھ آگے ہو گئی تھی۔ مرسیڈیز غرا کے پیچھے ہوئی۔ ابھی ہمارے قدم زمین پر پڑے ہی تھے کہ وہ راستہ کاٹ کے اس طرح آگے آئی جیسے ڈرائیور کا ارادہ ہمیں کچل دینے کا ہو۔ میں نے اور محسن نے ایک ساتھ جست لگائی لیکن مرسیڈیز کا اگلا دروازہ ہماری گاڑی کے کھلے دروازوں سے ٹکرایا۔ دونوں دروازے ٹوٹ کے سڑک پر گرے اور ایک خوفناک آواز کے ساتھ سڑک کی سخت کھردری سطح پر دور تک گھسٹتے ہوئے گئے۔ میں اور محسن اپنی اپنی جان بچانے میں کامیاب رہے تھے لیکن رابعہ کی خوفزدہ نظروں نے اندھیرے میں کچھ نہیں دیکھا تھا۔ اس نے فرض کر لیا کہ ہم بھی گاڑی کے نیچے کچلے گئے "سکندر!" اس نے دہشت زدہ ہو کے چیخ ماری۔

"رابعہ! گاڑی نکال کے لے جاؤ۔" میں نے اسے چلا کے زندہ سلامت ہونے کا ثبوت فراہم کیا ورنہ شاید وہ نتائج کی پروا کیے بغیر سڑک پر آجاتی۔ میرے اندیشے یہ تھے کہ حملہ آور کسی کو قتل کرنا نہیں چاہتے، مجھ پر دباؤ ڈال کے اپنے مطالبات کے سامنے سر جھکانے کے لیے مجبور کرنے کا سب سے مؤثر ذریعہ اب یہی رہ گیا تھا کہ وہ کسی اور کی جان یا آبرو کے بدلے میں مجھ سے سب کچھ لے لیں۔ وہ جانتے تھے کہ رابعہ اور محسن کے لیے میں سب کچھ دے سکتا ہوں۔ دنیاوی مال و متاع بھی اور اپنی جان بھی۔ لیکن انہیں تو صرف ایک تحریر مطلوب تھی کہ میں سکندر بخت ولد وزیر خان برضا و رغبت "میر وزیر اینڈ کمپنی" کی ملکیت کے دعوے سے دستبرداری قبول کرتا ہوں۔ اعترافِ شکست کی اس دستاویز پر دستخط کے بعد مجھے کچھ نہیں کرنا تھا، یہ کرنے کو کچھ باقی بھی نہیں رہتا لیکن میرے لیے مرنے والوں کا خون رائیگاں جاتا تھا۔ ابھی تک میں نے کئی بار سوچا تھا مگر کبھی فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ وقت آیا اور مجھے ایک طرف رابعہ، محسن یا ان کی طرح کسی اور کی زندگی اور مقابل میں سب بے گناہ مرنے والوں کی آرزوئے انتقام میں سے کسی کا انتخاب کرنا پڑا تو میں کسے چھوڑوں گا۔ اس وقت میرے ساتھ رابعہ بھی تھی اور محسن بھی تھا لیکن شکاری بھی انتخاب کرتے تو رابعہ کو ہی لے جاتے۔ وہ قانون کی عدالت میں ہمارا دفاع کر تی تھی لیکن لاقانونیت کی قوت کے مقابل وہ ہمارے دفاعی حصار کا سب سے کمزور حصہ تھی۔ کیونکہ وہ بہرحال ایک عورت تھی، کمزور، لیکن میری ساری طاقت تھی۔

گاڑی جو سائڈ سے آگے نکلی تھی تھوڑا سا گھوم کر ہماری کار کے سامنے رُک گئی تھی۔ یوں کہ اس کی طوالت نے سڑک کا چوڑائی میں گزرنے کا راستہ بند کر دیا تھا۔ میرے اندیشے سچ ثابت ہو رہے تھے۔ وہ رابعہ کو لے جانے آئے تھے اور اسے فرار ہونے کا موقع نہیں دینا چاہتے تھے۔ اس سے پہلے کہ کار میں سے کوئی اترتا اور رابعہ کو گھسیٹ کر لے جاتا میں نے ایک جست لگائی اور دروازے پر جا پڑا۔ ڈرائیور نے دروازہ کھول کے ایک پاؤں زمین پر رکھا ہی تھا کہ میں نے دروازہ اپنے جسم کی قوت سے بند کر دیا۔ وہ بیچ میں دب کے کراہا۔

"محسن!" میں نے چیخ کر کہا۔ "یہ گاڑی جانے نہ پائے۔" محسن میرے ساتھ ہی آگے آیا تھا اور اس نے بھی حملہ آوروں کے دوسرے ساتھی کو دوسری طرف سے اترتے دیکھ لیا تھا مگر وہ دونوں گاڑیوں اور سڑک کے ساتھ بنی ہوئی دیوار کے درمیان تین طرف سے محصور تھا۔ اس نے اپنی گاڑی کی ڈگی پر چڑھ کے مجھ پر کودنے کی کوشش کی لیکن محسن نے اسے دھکا دیا تو پلٹ کر گرا اور دیوار سے ٹکرایا۔

"رابعہ! گاڑی پیچھے کرو اور ریورس میں لے جاؤ۔" میں نے محسن کی آواز سُنی۔ میری ساری قوت اس شخص کو اندر رکھنے میں صرف ہو رہی تھی جو آدھے کھلے دروازے سے باہر آنے کی بھرپور جدوجہد کر رہا تھا۔ ہماری گاڑی ایک دم پیچھے ہوئی تو میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ رابعہ ان کے ہاتھ نہیں آئی۔ اب وہ ہمارے لیے امداد بھی حاصل کر سکتی تھی اور رضوی صاحب کو بھی بتا سکتی تھی کہ ہم کہاں ہیں۔ میرا خیال تھا کہ وہ کسی کوٹھی میں گھس جائے گی اور وہاں کے رہنے والوں کو بلائے گی اور وہیں سے انکل رضوی کو بھی فون کر دے گی۔ لیکن گاڑی کو ریورس میں دُور تک لے جانے کے بجائے وہ صرف دس گز پیچھے لے گئی اور پھر آگے لے کر آئی۔ اس وقت تک دوسرا شخص اُٹھ کھڑا ہوا تھا، جسے محسن نے پیچھے گرا دیا تھا۔ وہ حملے کی نیت سے آگے بڑھا ہی تھا کہ اس نے کار کو تیزی سے آتے دیکھا۔ اس نے اپنی جان بچانے کے لیے پھر پیچھے جست لگائی اور سید ھا دیوار پر لگا۔ رابعہ نے خاصی رفتار سے گاڑی آگے لا کے ٹکر ماری۔ غالباً اس نے وہ بات سُن لی تھی جو میں نے محسن سے کہی تھی۔ ایک اور دھماکا ہوا اور میں جھٹکے سے دور جا گرا۔ مجھے شیشہ ٹوٹنے کی آواز سنائی دی۔ پھر شیشے کے کنکر جیسے ٹکڑے اوپر گرے۔ ہیڈلائٹس کا اجالا غائب ہو گیا اور میں سمجھ گیا کہ ٹکر سے ہماری گاڑی کا کیا حال ہوا ہو گا۔ اس کی ہیڈلائٹس کا ہی نہیں، ونڈ اسکرین کا بھی چورا ہو گیا ہو تو عجب نہیں، لیکن مرسیڈیز کا بھی تھوڑا بہت نقصان ضرور ہوا ہو گا۔ جب میں اٹھا تو میں نے دیکھا کہ دھکا لگنے سے مرسیڈیز آگے بڑھ کر دیوار میں گھس گئی تھی۔ دیوار منہدم ہونے سے مرسیڈیز کے شیشے بھی چکنا چور ہو گئے تھے اور ملبہ اس کے اوپر گرا تھا۔ بونٹ پر اور ونڈ اسکرین کے کھلے شگاف سے سیٹوں پر اور اگلے پہیّوں کے آس پاس۔ چنانچہ گاڑی اب پھنس گئی تھی اور اس کے نکل جانے کا کوئی امکان نہیں رہا تھا۔ جو کام محسن نہیں کر سکتا تھا وہ رابعہ نے ہمت اور حاضر دماغی سے کر دیا تھا۔

میں نے دوسرے حملہ آور کو رابعہ کی طرف لپکتے دیکھا۔ ہماری گاڑی کے دونوں دروازے کسمپرسی کے عالم میں ٹوٹے پھوٹے سڑک پر پڑے تھے۔ چنانچہ اس کے لیے گاڑی میں داخل ہونا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ شاید وہ رابعہ سمیت ہماری گاڑی لے جانا چاہتا تھا۔ رابعہ نے اسے روکنے کے لیے لات ماری جو اس کے پیٹ پر لگی۔ پھر محسن نے اس کو پیچھے سے کھینچ لیا۔ "رابعہ!" محسن چلایا۔ "بے وقوفی مت کرو۔ گاڑی لے کر بھاگ جاؤ۔"

میں نے اٹھنے کی کوشش کی مگر نہ اٹھ سکا ـــــ میرے جسم کا دایاں حصہ سُن ہو کے ناکارہ ہو چکا تھا۔ جب رابعہ نے ٹکر ماری تھی تو میں مرسیڈیز کے دروازے پر جسم کا سارا بوجھ ڈالے جھکا کھڑا تھا۔ ٹکر سے دروازہ کھُلا اور اس کی زبردست قوت نے مجھے کسی جناتی ہاتھ کی طرح دور پھینک دیا تو سڑک پر گرنے اور پتھروں پر رگڑنے سے مجھے کہنی کے پاس اور گھٹنے پر شدید چوٹ آئی تھی۔ انتہائی بے بسی سے میں نے محسن کو اپنے حریف کے ہاتھوں ناک آؤٹ ہوتے دیکھا۔ وہ سڑک پر گر کے پھر اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ گاڑیوں کے ٹکرانے کی اور ٹوٹنے کی، شیشہ بکھرنے کی اور دیوار کے منہدم ہونے کی آوازوں کے شور نے رات کے سکوت کو درہم برہم کر دیا تھا۔ اس گھر کے مکین جاگ اُٹھے تھے جس کی دیوار جنگ میں کام آئی تھی۔ گیٹ لائٹس روشن ہو گئی تھیں اور اندر سے کچھ لوگ چلاتے، دوڑتے آرہے تھے۔ پھر مجھے اور بھی لوگ نظر آئے جو چوکیدار تھے یا آس پاس کے رہنے والے۔ ان سب کا خیال یہی ہو گا کہ دونوں گاڑیوں کا خوفناک ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ خالی سڑک پر دو گاڑیوں کے یوں ٹکرانے کا مطلب یہی نکالا جا سکتا تھا کہ اوورٹیک کرتے ہوئے کسی وجہ سے ایک گاڑی بے قابو ہو گئی۔ وجہ اگلے وہیل کا نکل جانا یا ٹائر برسٹ ہو جانا بھی ہو سکتی تھی۔ اور ڈرائیور کی مدہوشی بھی۔ لیکن اب فکر کی کوئی بات نہیں رہی تھی۔ ہم پر غالب آجانے والے حملہ آوروں کی گرفتاری یقینی تھی۔

پھر اس شخص کو اچانک میں نے اپنے سر پر دیکھا جو مرسیڈیز کا ڈرائیور تھا۔ اس نے ریوالور نکال لیا تھا۔ "خبردار!" وہ چلایا۔ "کوئی آگے نہ آئے۔" اس نے قریب آنے والوں کی طرف دو ہوائی فائر کیے۔ چار پانچ جیالے ایک دم رُک گئے اور پلٹ کر بھاگے۔ جیسے وہ حادثہ سمجھ کے مدد کے لیے آئے تھے وہ حادثہ نہیں تھا۔ بھاگنے والوں میں سے ایک خوف اور گھبراہٹ میں منہ کے بل گرا اور ساکت ہو گیا۔ اسے گولی ہرگز نہیں لگی تھی۔ وہ کمزور دل تھا یا دل کا مریض تھا۔ دوسرے لمحے ہوائی فائر کرنے والے نے ریوالور کا بٹ میرے سر پہ دے مارا۔ سارا منظر ایک لمحے کے لیے میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ سیکنڈ کے ایک حصّے کے لیے مجھے پھر ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ وہ دونوں محسن کو گھسیٹ رہے تھے اور رابعہ اپنی بے مصرف زنانہ قوت کے ساتھ محسن سے لپٹی ہوئی تھی اور مدد کے لیے چیخ رہی تھی۔ اس کے بعد آخری آواز فائر کی تھی یا گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی۔ گھُپ اندھیرے میں بصارت کے ساتھ میری سماعت بھی ختم ہو گئی اور میرا وجود بے حسی کے اندھے کنویں میں ڈوب گیا۔

مجھے ہوش آیا تو حالات بدلے ہوئے تھے۔ قدرتی طور پر سب سے پہلے مجھے یہ خیال آیا کہ میں کہاں ہوں اور کس حال میں ہوں۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت رفتہ رفتہ بحال ہوئی۔ پھر منظر جو میرے پیشِ نگاہ تھا لیکن فوکس آؤٹ تھا، واضح ہونے لگا۔ میں ایک عام سے کمرے میں تھا اور انہی کپڑوں میں بیڈ پر لیٹا ہوا تھا جو گزشتہ شب زور آزمائی کے وقت میرے جسم پر تھے۔ رات

بیت چکی تھی کیونکہ دو جانب وسیع و عریض کھڑکیاں تھیں جن پر سے پردے ہٹا دیے گئے تھے اور باہر کے روزِ روشن کا اجالا اندر بھی پھیل رہا تھا۔ کمرہ خاصے تکلف سے آراستہ تھا۔ چاروں دیواروں پر ایک آبنوسی ہاتھ نے دُودھیا شیشے والی لائٹ تھام رکھی تھی۔ چھت کا پنکھا خاموشی سے گھوم رہا تھا اور بالکل وسط میں تھا۔ نیچے منقش قالین پر ایک صوفہ سیٹ اور درمیان میں سینٹر ٹیبل سیٹ رکھا تھا۔ گلاس ٹاپ اور سنہری المونیم کی پٹی کے حاشیے والا۔ ایک کونے میں پیڈسٹل لیمپ استادہ تھا اور دیوار پر لینڈ اسکیپ کا ایک منظر تھا جس میں سورج کو طلوع یا غروب ہوتے دکھایا گیا تھا۔ سینری کوئی چار فٹ لمبی اور دو فٹ چوڑی تھی لیکن فریم سے کم قیمت تھی۔

سب سے آخر میں سر گھما کے میں نے استاد پیڈرو کو دیکھا۔ وہ بیڈ کی دوسری جانب کرسی پر اطمینان سے بیٹھا مسکرا رہا تھا اور مجھے گرد و پیش کا جائزہ لیتے دیکھ رہا تھا۔ اس کی شخصیت میں ایک نمایاں تبدیلی کو میں نے فوراً نوٹ کر لیا۔ اس کے دونوں کانوں سے سونے کی مُندریاں غائب ہو گئی تھیں جو اب تک اس کی شناخت بن چکی تھیں۔ اس نے اپنا ہیئر اسٹائل بھی بدل لیا تھا۔ بھورے گھنگھریالے اور سخت بالوں کی جگہ اس کے سر پر سیدھے سیاہ اور چمکیلے بال تھے جن کو اس نے درمیان سے دو حصے کر کے سنوار رکھا تھا۔ ایک جیسی شلوار قمیص کے بجائے وہ باریک سُرخ دھاریوں والی سفید قمیص اور براؤن پتلون میں ملبوس تھا۔ لیکن اس ظاہری انقلاب سے اس کی صورت کی خباثت میں کمی نہیں آئی تھی اور اس کی آنکھوں سے جھانکنے والی درندوں جیسی سفاکی و بے رحمی ختم نہیں ہوئی تھی۔

"ایسے کیا دیکھتے ہو سکندرِ اعظم؟" وہ بولا۔ "کیا پہچانا نہیں؟"

"میں ولی ہونے کا دعوٰے تو نہیں رکھتا۔" میں نے کہا۔ "لیکن پھر بھی شیطان کو ہر رُوپ میں پہچان سکتا ہوں!"

"اس نئی شخصیت کے لیے مجھے تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔" وہ مسکرایا۔ "تمہاری کوشش سے استاد پیڈرو کی لاش میو ہسپتال کے مُردہ خانے پہنچی اور وہاں سے غائب ہو گئی۔ تمہارا دوست ایس آئی شیخ اور تھانے کا عملہ گواہ ہے کہ اس کی موت حوالات میں واقع ہوئی تھی اور ضابطے کی کارروائی کے مطابق اس کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دی گئی تھی۔ اب تو حشمت خان بھی یہی کہتا ہے اور وہ کانسٹیبل بھی جو لاش کے ساتھ گیا تھا۔ یہ بڑا اچھا ہوا کہ استاد پیڈرو مر گیا۔ وہ اتنا بدنام ہو گیا تھا اور اتنے لوگوں کی نظر میں آ گیا تھا کہ اس کا مر جانا ضروری تھا۔" پھر اسے کچھ اور یاد آیا۔ "اب کیا خیال ہے تمہارا؟ میں کون ہوں؟ احمد نواز گردیزی!" وہ قہقہہ مار کے ہنسا۔

"مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ اب تم دنیا کے لیے کیا ہو!" میں نے کہا۔ "مجھے صرف یہ بتا دو کہ تم نے محسن اور رابعہ کے ساتھ کیا کیا۔ کیا وہ بھی میرے ساتھ ہی پکڑے گئے تھے؟"

"محسن تو نہیں پکڑا گیا۔" وہ افسوس سے سر ہلا کے بولا۔ "بہت مزاحمت کی اس نے حالانکہ وہ بھی ہمارے ساتھ آ جاتا تو اسے کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ دیکھو تم کتنے آرام سے ہو؟"

"وہ دونوں کہاں ہیں؟" میں نے چیخ کر کہا اور اٹھنے کی کوشش کی لیکن خود ہی بستر پر گر گیا۔ ایک پٹی میری کُہنی کے گرد لپٹی ہوئی تھی جس کی وجہ سے میں اپنا بازو سیدھا رکھنے پر مجبور تھا۔ دوسری پٹی گھٹنے کے اوپر سے نیچے تک پلستر کی شکل میں موجود تھی چنانچہ میں دائیں ٹانگ ہلانے سے قاصر تھا۔

"تمہیں شاید علم نہیں۔" استاد پیڈرو نے جیب سے سگریٹ نکال کے اطمینان سے جلائی۔ "تمہارے گھٹنے سے ذرا نیچے ٹانگ کی ہڈی میں بال آ گیا ہے۔ اگر تم نے مزید ہنگامہ آرائی کی تو یہ بال بڑھ کے وبال بن جائے گا۔ ابھی تو ڈاکٹر کا خیال ہے کہ پندرہ بیس دن میں تم لنگڑا کے چل سکو گے اور مہینے دو مہینے میں بالکل سیدھے۔ لیکن ہڈی ٹوٹ گئی تو...؟"

"مجھے اپنی میڈیکل رپورٹ نہیں چاہیے۔" میں نے چیخ پکار کو بے سود سمجھتے ہوئے کہا۔ "میرے سوال کا جواب دو!"

"محسن کے بارے میں مجھے افسوس ہے۔" وہ کش لے کر دھواں چھت کی طرف چھوڑتے ہوئے بولا۔ "لیکن تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم نے اسے قتل کیا۔ اسے مار پیٹ میں سر کی چوٹ آئی تھی۔ وہ تین دن اسپتال میں بے ہوش پڑا رہا۔"

"جھوٹ... بکواس کرتے ہو تم!" میں نے کانپتے ہوئے کہا۔ "محسن نہیں مر سکتا...!"

"ہم سب مر سکتے ہیں سکندرِ اعظم۔" وہ تلخی سے بولا۔ "وہ سکندرِ اعظم بھی مر گیا جس نے دنیا کو فتح کرنا چاہا تھا۔ ایک مچھّر کے ڈنک نے اس کا خاتمہ کر دیا تھا۔ کیا اور لوگوں کو مرتے نہیں دیکھا تم نے؟ پھر محسن کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ مر نہیں سکتا بڑی عجیب سی بات ہے۔"

"تم مجھے دہشت زدہ کرنا چاہتے ہو۔ غلط بیانی سے کام لے رہے ہو۔" میں نے یقین کی گرتی ہوئی دیوار کو استوار رکھنے کی جدوجہد جاری رکھی۔ "ایسی ہی بات تم رابعہ کے بارے میں کہو گے!"

"نہیں۔" پیڈرو نے نفی میں سر ہلایا۔ "رابعہ کے بارے میں کوئی بیان نہیں دوں گا میں۔ اس لیے کہ مجھے خود بھی پتا نہیں وہ کہاں ہے۔ ممکن ہے کسی اور کو معلوم ہو۔"

"کیا وہ رضوی صاحب کے گھر میں نہیں ہے؟" میں نے ڈوبتے دل کے ساتھ سوال کیا۔

"نہیں۔ وہاں تو یقیناً نہیں ہے۔" پیڈرو بولا۔ "اس لیے کہ میں نے اخبارات میں خود مشہور خاتون ایڈووکیٹ اور ان کے دوست کی پُراسرار گمشدگی کی چٹپٹی خبر پڑھی تھی۔ اخبار والے ایسی خبروں سے بہت فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ایک اخبار نے تو پورے کیس پر فیچر دے دیا تھا کہ یہ ایڈووکیٹ اور سکندر بخت پرانے دوست ہیں لیکن سکندر بخت پر قتل کا الزام ہے چنانچہ ان کی پیروی خاتون ایڈووکیٹ کر رہی تھیں۔ دونوں ایس پی ضامن رضوی کے گھر میں مقیم تھے۔ چنانچہ گمشدگی کو فرار بھی سمجھا جا سکتا ہے۔"

میں اس سے زیادہ نہ سُن سکا۔ لیکن میں بے بس تھا۔ نہ میں اس کا گلا گھونٹ کے اس کی زبان بند کر سکتا تھا اور نہ میرے قریب کوئی ایسی چیز تھی جو میں اس پر کھینچ مارتا۔ میں نے اس پر تکیہ پھینکا اور اسے ایک گالی دی ——— تکیہ دُور جا گرا اور پیڈرو اسی اطمینان کے ساتھ بیٹھا مسکراتا رہا۔ بالآخر میں بے دم ہو گیا۔

"افسوس مجھے اس بات کا ہے کہ تمہارے اور رابعہ کے اسکینڈل میں ضامن رضوی صاحب جیسے بااصول اور ایماندار افسر کو بھی استعفیٰ دینا پڑا۔" پیڈرو نے کچھ دیر بعد کہا۔ "وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل ہی نہیں رہے تھے۔ آدمی عزت دار اور باعزت تھے ورنہ دنیا کو بھونکنے دیتے۔ ان پر ایک مجرم کی اعانت اور سرپرستی کا الزام آ گیا تو کیا۔ یہ الزام تو پولیس پر بہت پرانا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ وہ مجرموں کی پشت پناہی کرتے ہیں۔ ایک اور اخبار والا آزادی دور کی کوڑی لایا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ خاتون ایڈووکیٹ کے بارے میں سمجھا جاتا ہے کہ انہوں نے شادی نہیں کی تھی جو سراسر غلط ہے۔ ان کی پہلی شادی ایک سی ایس پی افسر سے ہوئی تھی جس نے نامعلوم وجوہ کی بنا پر ان کو رخصتی سے قبل طلاق دے دی۔ بنظر ملزم میں خاتون ایڈووکیٹ کی دلچسپی کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ ایک سابق صنعت کار کا ولایت پلٹ بیٹا ہے جس کے حقِ وراثت کا مقدمہ زیرِ سماعت ہے اور فیصلہ ملزم کے حق میں ہو جانے کی صورت میں ایڈووکیٹ کو اس سے بہتر دوسرا رشتہ نہیں مل سکتا تھا جو اپنی آزاد خیالی کے باعث خاصی مشہور ہیں۔ رقابت اور دشمنی میں خاتون ایڈووکیٹ کا گھر تباہ ہو گیا تھا۔ اب ملزم سکندر بخت کی وجہ سے ان کی پریکٹس بھی تقریباً ختم ہو چکی تھی۔"

"میں ان سب کی ایسی تیسی کر دوں گا۔" میں نے عالمِ اشتعال میں مکا دانت بھینچ کر اور بند مٹھی بیڈ سائڈ پر مار کے کہا۔ "سب پر ہتکِ عزت کا مقدمہ دائر کر دوں گا۔ ان سب کو بہت مہنگا پڑے گا..."

"کیا؟" پیڈرو ہنسا۔ "سچ بولنا مہنگا پڑے گا؟ اس میں کوئی بات غلط ثابت کر سکو گے تم؟ بشرطِ زندگی۔ ابھی تو تم اپنے لیے بھی کچھ نہیں کر سکتے۔"

یکلخت مجھے مایوسی کی ایک قیامت خیز لہر نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ پیڈرو کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس داستان کا ہر لفظ گزرے ہوئے وقت کی تفسیر تھا۔ رابعہ کے اور میرے بارے میں ہر بات سچ تھی۔ فرق صرف سچ کے مفہوم کا تھا۔ سنسنی خیز صحافت کی زبان میں یہ "مشتبہ مراسم" تھے اور "پُراسرار گمشدگی" تھی یا فرار تھا جب کہ میرے نزدیک یہ محبت تھی۔ وہ محبت جس کا تعلق صرف خوبصورت جذبوں سے تھا اور خوبصورت مستقبل کے خوابوں سے تھا اور یہ جذبے اور یہ خواب ہر آلودگی سے پاک تھے۔ ان میں صرف وفا کے سدا بہار پھولوں کی مہک تھی اور زندگی کی آبرومند روایات کو تابندہ رکھنے کے لیے سارے رنگ تھے۔ ان کی محبت اتنی معصوم تھی جتنا برگِ گل پر اترنے والے قطرۂ شبنم کی مسکان۔ مجھے وہ وقت یاد آیا جب رابعہ نے کہا تھا کہ چلو سکندر ہم ان سارے جھمیلوں کی دنیا سے نکل جاتے ہیں لیکن میں نے کہا تھا کہ رابعہ! ہم کو اپنا گھر اس دنیا میں آباد کرنا ہے۔ اس طرح کہ وہ گھر ایک ایسی جنتِ ارضی ہو جسے دیکھ کر محبت کرنے والے رشک کریں۔ اور دنیا والے عقیدت سے سر جھکا دیں۔ پُراسرار گمشدگی اور فرار کا کیا سوال۔ یہ کیچڑ تو ہمارے منہ پر صرف اس لیے ملا گیا تھا کہ ہماری محبت کو ہوس کا شیطانی جذبہ بنا دیا جائے اور بدنامی کی یہ داستان پھیلا کر ہمیں مستقبل پر اعتماد کے رشتوں سے محروم کر دیا جائے۔ نیا جال لائے پرانے شکاری۔ انہوں نے مجھے کہیں اور پہنچا دیا۔ رابعہ کو کہیں اور.... ہماری نجی زندگی کے معاملات کو اسکینڈل بنا کے پیش کر دیا کیونکہ اس کے منفی اثرات بہت دور رس تھے! اس کی لپیٹ میں ضامن رضوی صاحب کی نوکری آ گئی جو نوکری سے زیادہ ان کے لیے آبرو کا سودا تھی۔ یہ خبر شہلا تک پہنچے گی۔ بالآخر وہ بھی یقین کرنے پر مجبور ہو گی کہ زبانِ خلق غلط نہیں کہہ سکتی۔ پھر نوزیہ تک پہنچے گی جس کی نظر میں میرا جرمِ بے وفائی پہلے ہی ناقابلِ معافی تھا۔ وہ بھی یقین کر لے گی کہ سکندر محض ہوس پرست تھا۔ اس کی ہوس نے انگلستان میں گل کھلائے۔ یہاں آ کے دولت کی ہوس نے اسے قاتل بنا دیا۔ انکل شیر دانی کیا سمجھیں گے۔ اور اگر رابعہ کو بھی معلوم ہوا تو اس کے دل پر کیا بیتے گی؟ پھر مجھے وہ متعدد مواقع یاد آئے جب زندگی کی آزمائش کے لمحات بہت سخت تھے اور رابعہ نے کہا تھا ہمت نہ ہارنا سکندر۔ یہ جان تو آنی جانی ہے اس جان کی کوئی بات نہیں۔ محسن مر گیا۔ پھر کیا ہوا؟ کیا آدمی ایک ٹانگ اور ایک ہاتھ کے بغیر زندہ نہیں رہتے؟۔ انکل رضوی ایس پی نہیں رہے تو کیا ہوا؟ خدا کے اس سہارے پر تمہارا

اعتماد کیوں متزلزل ہو رہا ہے جس نے تمہیں اب تک حوصلہ دیا۔ سہارا دیا اور قوت دی کیونکہ تم حق پر تھے۔ آہستہ آہستہ میرے خیالات کی بازگشت رابعہ کی آواز بن گئی۔ بازی ابھی تمام نہیں ہوئی سکندر۔ کیا یہ ناممکن ہے کہ تمہارا حوصلہ ختم کرنا، تم سے امید کا سہارا چھین لینا اور تمہیں اعتماد سے محروم کر دینا بھی دشمن شکاری کی ایک چال ہو۔ اور میں نے آنکھیں کھول کر پیڈرو کو دیکھا۔

"کیا ثبوت ہے تمہارے پاس اس بات کا؟" میں نے کہا۔ "کہ محسن مر گیا۔ رابعہ لاپتا ہو گئی اور رضوی صاحب مستعفی ہو گئے ہیں؟ تم مجھے وہ اخبارات لا کے دکھا سکتے ہو جن میں یہ سب بکواس شائع ہوئی ہے؟"

"کیوں نہیں،" پیڈرو بولا۔ "اخبارات گزشتہ ہفتے کے ہیں، گزشتہ صدی کے تو نہیں۔ فوراً تو پیش نہیں کر سکتا لیکن لا دوں گا۔ کہیں نہ کہیں سے مل جائیں گے۔"

"یہ.... یہ گزشتہ ہفتے کی بات ہے؟" میں نے بے یقینی سے کہا۔ "ایک ہفتہ بے ہوش رہا میں؟"

"مجبوراً رکھا ہم نے۔" وہ بولا۔ پھر اس نے پلٹ کر دیکھا اور میری نظر نے اس کی نظر کا تعاقب کیا۔ دیوار پر لگی ہوئی گھڑی وقت کے ساتھ ہی تاریخ بتا رہی تھی۔ جو واقعات مجھے یاد تھے ایک ہفتہ پرانے ہو چکے تھے۔

"کیا مجبوری لاحق تھی تمہیں؟" میں نے طنز آمیز تلخ لہجے میں کہا۔

"ایک مجبوری تو تم خود تھے۔ درد کی شدت سے چلاتے تھے تو ہمارا سونا بھی حرام کرتے تھے۔" وہ بولا۔ "پھر حکم یہی تھا کہ جب تک معاملات درست نہ ہو جائیں تمہیں انڈر عقیل رکھا جائے۔ اب یہ مت پوچھنا مجھ سے کہ کون سے معاملات؟"

میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہونے لگا۔ کیا معاملات درست ہونے کا مطلب یہ تھا کہ رابعہ کو کسی ایسی جگہ پہنچا دیا جائے جہاں وہ سب کی دسترس سے اور میرے وہم و گمان کی رسائی سے بھی دور ہو۔ اور اس کے بعد مجھ سے میرا حال پوچھا جائے کہ سکندر اعظم صاحب! کیسے سودا کرتے ہیں؟ ہماری ایک مٹھی میں رابعہ کی جان و آبرو ہے، دوسری مٹھی میں ہمارا کاروبار۔ تمہیں کیا چاہیے۔ ہماری شرائط پر رابعہ کی واپسی یا وہ سب جو ابھی تک نہیں ہوا لیکن ہو سکتا ہے۔ اس وقت پیڈرو نے تمہیں صرف ٹریلر دکھایا ہے۔ اصل فلم اس سے کہیں زیادہ صبر آزما، لرزہ خیز اور عذاب ناک ہے۔ اور اگر وہ سب کچھ ہو چکا تھا جو پیڈرو نے مجھے بتایا تھا تو اور کیا ہوگا۔ انہی رشتوں کی تقدیس تو میرے پاؤں کی زنجیر تھی۔ اکیلے آدمی کا جینا کیا اور مرنا کیا۔ ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام۔ ایک مرگِ ناگہانی اور ہے۔ تو موت سے کون کافر ڈرتا ہے جو ایک ہی بار آتی ہے۔ آدمی دوسروں کے لیے جینا چاہتا ہے۔ کبھی اپنے بیوی بچوں کے لیے۔ کبھی والدین کی زندگی کے لیے۔ ان کے لیے جو اس کی ذات کو پیار دیتے اور پھر اس کے پیار سے سہارا پاتے ہیں۔ دوستوں کے لیے اور محبت سے اپنا سمجھنے والوں کے لیے۔ دشمنوں کے لیے کون جیتا ہے۔ وہ مارتا ہے یا مر جاتا ہے اور کسی کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کسی کی زندگی میں خلا نہیں آتا اور کوئی آنکھ اشکبار نہیں ہوتی۔

میں قنوطی ہو رہا تھا اور میرے خیالات بھٹکنے لگے تھے۔ میرا ذہن اس حقیقت سے گریزاں تھا کہ میں جینے کے سارے سہاروں سے محروم ہو چکا ہوں۔ ماں کی ممتا اور بہن بھائیوں سے خون کا رشتہ ہوش سنبھالنے سے قبل ہی ٹوٹ گیا تھا لیکن وقت اپنی یاد کا ناسور چھوڑ گیا تھا۔ وزیر خان کی موت کا زخم ہنوز تازہ تھا۔ اور اس کی پُرالم زندگی کا انجام مجھے خون رلاتا تھا۔ میں ایک مشن لے کر آگے بڑھ رہا تھا اور یہ مشن تھا انہیں سزا دینے کا اور دنیا کے سامنے بے نقاب کرنے کا جو وزیر خان کے ہی نہیں اور بھی بہت سے بے گناہوں کے قاتل تھے۔ ان میں سلامت شاہ تھا، منشی بندے علی عرف فومانچو تھا۔ اس کی نابینا اور لبِ گور بیوی تھی۔ رابعہ کی ماں تھی اور ایک بوڑھا گورکن تھا جسے اسپتال میں ڈاکٹروں اور نرسوں کی موجودگی میں قتل کر دیا گیا تھا۔ مرنے والوں میں شملا کی ماں تھی۔ غلام علی اکاؤنٹنٹ تھا جس نے تمام عمر ایماندار رہنے کے جرم کی سزا پائی تھی اور نیکی کا ایک قرض اتارتے ہوئے مارا گیا تھا۔ مرنے والے ڈی سلوا سے لے کر زرداد جیسے غریب آدمی تک ان گنت لوگ تھے جن کی حقیقت بساطِ حیات پر پیادے، فیل یا وزیر کی تھی۔ ان کی جگہ نئے مہرے آ گئے تھے۔ اور بازی تمام ہونے تک نہ جانے کتنے ہوں گے جو میر محمد اور اس کی بیوی کی طرح مٹ جائیں گے۔ کبھی ادھر سے مارے جائیں گے تو کبھی ادھر سے کیونکہ دونوں طرف کے شکاری اپنی اپنی کامیابی کے لیے ہر قیمت ادا کرنے کو تیار تھے۔

لیکن اب محسن بھی مر چکا تھا اور رابعہ میرے کیے کی سزا پا رہی تھی۔ جو اس نے پہلے کئی بار پائی تھی لیکن میری خاطر اس نے ہر جبر جھیلا تھا اور ہر انسانیت سوز ظلم برداشت کیا تھا۔ اب انکل رضوی کی ساری زندگی کی اصول پرستی، فرض شناسی اور ایمانداری کی وجہ سے خاک میں مل گئی تھی۔ یہی ان کی متاعِ عزیز تھی جو مجھ سے تعلق رکھنے کی پاداش میں بدنامی کی سند بن گئی۔ ہے کہاں مکافاتِ عمل اے خدائے دادگیر۔ یہی سب تو میرا سہارا تھے۔ اگر میں اکیلا رہ گیا ہوں تو جیت کے میں کیا کروں گا۔ میری جیت پر خوش ہونے والا کون ہوگا؟ کامیابی مجھے کیا دے گی اور ناکامی

میرا کیا لے گی۔ بہتر ہے میں اس کھیل کو ختم کر دوں، اپنی شکست مان لوں۔ سارے معاملات یوم حشر پر اٹھا رکھوں جب انصاف بہر حال ہوگا۔ وہاں میزانِ عدل کسی انسان کے ہاتھ میں نہیں ہوگی۔

مجھے معلوم نہیں تھا کہ میری آنکھیں اشک فشاں ہیں۔ لاشعور کا خوف اب شعور پر غالب آ رہا تھا اور میری آنکھیں محسن کو دیکھ رہی تھیں۔ یادوں کا سلسلہ بڑا دراز تھا لیکن اب عمرِ گزشتہ انہی یادوں کا ایک قبرستان تھی جس میں ہر تاریخ ایک کتبہ بن گئی تھی۔ گزری ہیں کتنی صلیبیں مرے دریچے میں۔ محسن اور میں کہاں کہاں یہ نقش چھوڑ آتے ہیں۔ اس راستے پر جو گھر سے اسکول تک پھیلا ہوا تھا اور جس پر ہم بستے گلوں میں لٹکائے برسوں آتے جاتے رہے۔ اس وقت کی راہ گزر پر جو سات سمندر پار ولایت کے عہدِ طالبعلمی تک پھیلی ہوئی ہے۔ شب و روز کے واقعات۔ ہر واردات قلب و نظر۔ زندگی کی فتوحات کے کامراں لمحے۔ ناکامیوں کی دل شکستگی کے صدمے۔ وہ سب کچھ رزقِ خاک ہوا؟ محسن بھی مٹی کا ایک ڈھیر رہ گیا ہے جس پر پھول خشک ہو چکے ہیں اور اس کا جیتا جاگتا، ہنگامہ خیز، ناقابلِ شکست نظر آنے والا وجود ڈھانچہ بن رہا ہے؟ مٹی میں مل رہا ہے اور حشرات الارض کا رزق ہو گیا ہے۔ صرف میں زندہ ہوں۔ اپنی آرزوئے انتقام پر سب کو قربان کر دینے والا خود غرض انسان۔

"تم رو رہے ہو؟" پیڈرو کی ہنسی نے مجھے پھر متوجہ کیا۔ اس کے انداز میں تمسخر کے ساتھ حقارت تھی۔

"تم مجھ پر ہنس سکتے ہو۔" میں نے کہا۔ "لیکن انگریز ایک بات کہتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ آخری بار کون کس پر ہنستا ہے اور کون کس کو روتا ہے۔ یہ دوسری بات میری ہے۔ میں تم سے کسی قسم کی رعایت کا طلب گار نہیں۔"

"تم کو اس سے زیادہ رعایت دی بھی نہیں جا سکتی تھی۔" پیڈرو بولا۔

"تم مجھے اتنا تو بتا سکتے ہو کہ میں کہاں ہوں؟" میں نے کہا۔

"تم اسی زمین پر ہو۔ انسانوں کی دنیا میں۔" وہ بولا۔ "کیا اتنا کافی نہیں ہے کہ تم عالمِ ارواح میں نہیں پہنچے۔ یہ اچھا خاصا آرام دہ مکان ہے۔ تمہاری ضرورت کا خیال رکھا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر تمہیں صبح شام دیکھنے آتا ہے۔ سگریٹ، چائے یا کافی کی خواہش ہے تو بتا دو۔ میں منگوا دیتا ہوں۔"

"یہ مکان کس کا ہے اور مجھے کب تک یہاں رہنا ہوگا؟" میں نے مایوسی سے کہا۔

"اس کا انحصار حالات پر ہے۔" پیڈرو نے کہا۔ "ابھی تو تم خود بھی اس قابل نہیں ہو کہ کہیں جا سکو چنانچہ صرف میں تمہاری نگرانی کر رہا ہوں۔ یہ جان کے کیا کرو گے کہ مکان لاہور میں ہے یا شیخوپورے میں۔ اور کس گلی محلے میں ہے یا کس کی ملکیت ہے۔ فرض کر لو یہ مکان میرے باپ کا ہے اور ایسی جگہ ہے جہاں تمہارے کسی حمایتی کے پہنچنے کی کوئی صورت نہیں۔ زیادہ ... یہ ہے کہ یہاں تم بالکل بے بس ہو۔ کھلی کھڑکی سے بھی تمہارے چلانے کی آواز کسی کے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی۔ خواہ تم سارا دن گلا پھاڑتے رہو۔ میرے علاوہ یہاں ایک ملازم ہے جو گونگا ہے۔ پیدائشی طور پر نہیں۔ پہلے وہ ٹھیک تھا مگر اس سے ایک غلطی ہوئی۔ اس نے ایک راز کی بات سن لی اور غلط موقع پر زبان سے بک دی۔ آدمی وفادار تھا چنانچہ باس نے نرمی سے کام لیتے ہوئے اسے معاف کر دیا۔ بس وہ چیز نہیں چھوڑی جس کا اس نے غلط استعمال کیا تھا۔ بچہ بھی چاقو اٹھا لے تو اسی لیے چھین لیتے ہیں کہ وہ اس کا استعمال نہیں جانتا۔ اور اس کے غلط استعمال سے دوسروں کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ جو ڈاکٹر تمہارا علاج کر رہا ہے ہمارا اپنا آدمی ہے۔ پچاس ہزار روپے ماہانہ کا ملازم ہے اور احکامات کی تعمیل کرتا ہے۔ جو دوا یا انجکشن دینا ہو دے دیتا ہے جس سے منع کیا جائے وہ نہیں دیتا۔ فائدے یا نقصان کی فکر نہیں کرتا۔"

ڈاکٹر اسی وقت کمرے میں داخل ہوا۔ نہ جانے اس نے اپنی گاڑی کہاں کھڑی کی تھی؟ باہر مکمل سکوت تھا۔ وہ گاڑی ... لاتا تو میں آواز صاف سنتا۔ ایسے ڈاکٹر جو صرف ایک مجرموں کے گروہ سے ہر ماہ پچاس ہزار روپے وصول کر لیتے ہوں، دیگر ناجائز ذرائع اختیار کر کے بھی پچاس ہزار تو یقیناً کما لیتے ہوں گے۔ ایک لاکھ ماہانہ کی آمدنی والا ڈاکٹر جوتیاں نہیں چٹخاتا پھرتا۔ اس کے پاس ایک، دو یا تین شاندار گاڑیاں بھی ہو سکتی ہیں۔ غالباً وہ گاڑی کو دور چھوڑ کے آیا تھا تا کہ کوئی اسے یہاں آتا نہ دیکھے۔ اس سے یہ بات ضرور ثابت ہوتی تھی کہ سڑک اس کمرے سے بہت دور نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ چالیس سال سے زائد عمر کا منحنی آدمی تھا جس کی صورت کو اس کے اعمال نے مسخ کر دیا تھا۔ پیسے کی خاطر نہ جانے اس نے کتنے انسانوں کے جسم میں زہر اتارا تھا اور کتنے جسموں سے روح کھینچ لی تھی۔ وہ اس مقدس پیشے کے نام پر کلنک کا بدنما ٹیکا تھا۔ اگر اس کے مذموم کاروبار کی خبر پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن کو ہو جاتی تو اس کا پریکٹس کا لائسنس منسوخ ہو جاتا اور شاید اس کی ڈگری بھی۔ اسے عام مجرموں کی طرح عدالت میں پیش کیا جاتا اور عام قاتلوں کی طرح پھانسی پر لٹکایا جاتا۔

"کب تک چلنے پھرنے کے قابل ہو جاؤں گا میں؟" ... نے اس کے معائنے کے بعد کہا۔

"جب ہم چاہیں گے۔" وہ بولا۔ "ابھی تو دائیں ٹانگ ٹھیک نہیں۔ اس کے بعد بائیں ٹانگ خراب ہو سکتی ہے۔"

"بائیں ٹانگ کو تو کچھ بھی نہیں ہوا ہے! اس کی بات کیوں کرتے ہو؟" میں نے برہمی سے کہا۔

"کچھ ہوا تو نہیں مگر ہو سکتا ہے۔ ایک تم نے خود توڑی تھی۔ کیا دوسری ہم نہیں توڑ سکتے؟ ایسے!" اس نے اپنا ہاتھ میری بائیں ٹانگ پر ہتھوڑے کے انداز میں مارا۔

"تم واقعی ڈاکٹر نہیں جلاد ہو۔" میں نے کہا۔ "اگر تم نے میری ٹانگ توڑی تو میں تمہارا سر توڑ دوں گا۔"

"اچھا؟" وہ میرے مذاق سے محظوظ ہو کے ہنسا۔ "تم سے پہلے میرا واسطہ بڑے بڑے ٹارزن اور رستم قسم کے بدمعاشوں سے پڑ چکا ہے جو تم سے زیادہ ہٹے کٹے تھے اور میرا سر مر کر سکتے تھے۔ لیکن صرف ایک گولی کھا کے مر گئے، ایک چھوٹے سے انجکشن نے ان کو چت کر دیا۔ ہمیشہ کے لیے۔"

"اور ایسے کتنے ٹارزن اور رستم چت کر چکے ہو تم پہلوان؟" میں نے طنز سے کہا۔

"اس کا حساب نہیں رکھا میں نے۔" وہ جھک کر بیگ اٹھاتے ہوئے بولا۔ "ورنہ ضرور بتاتا۔"

ذرا سی دیر کے لیے اس کا شیطانی سر میرے بہت قریب آ گیا۔ اتنا قریب کہ میں چاہتا تو اس کی گردن دبوچ لیتا۔ اور اس کا گلا گھونٹ دیتا۔ ابھی ابھی اس نے میرے روبرو اعتراف کیا تھا کہ وہ بے حساب قتل کر چکا ہے اور یہ اعتراف اس نے بالکل بے خوفی سے اور کسی دباؤ کے بغیر کیا تھا کیونکہ وہ کسی عدالت میں نہیں تھا۔ کسی ایسے شخص کے سامنے بیان نہیں دے رہا تھا جو بعد میں اس کے خلاف گواہی دے سکے اور یہ سمجھتا تھا کہ وہ بالکل محفوظ ہے۔ لیکن وہ قاتل تھا اور اتنے قتل کرنے کے بعد اسے سزائے موت سے کم کوئی سزا نہیں ہو سکتی تھی۔ چشم زدن میں میرا ہاتھ گھوما اور اس کی گردن پر پڑا۔ ہڈی چٹخنے کی آواز آئی اور ڈاکٹر اجمل بے جان ہو کے زمین پر گر گیا۔

چند سیکنڈ تک پیڈرو بے یقینی کے عالم میں منجمد بیٹھا رہا۔ خوف اور حیرت نے اسے مفلوج کر دیا تھا اور اس کی آنکھیں بے حس و حرکت جسم پر ٹھہر گئی تھیں۔ پھر وہ ایسے اچھلا جیسے کرسی میں گیارہ ہزار وولٹ کا کرنٹ آ گیا ہو۔

"خبیث!" وہ چیخ کر بولا۔ "یہ تم نے کیا کر دیا۔۔۔۔"

"وہی جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔" میں نے سکون سے کہا۔ "میں نے ایک قاتل کو سزائے موت دے کر انصاف کے تقاضے پورے کر دیے۔ یہ سزا تو اسے بہت پہلے ہو جانی چاہیے تھی!"

پیڈرو نے زمین پر پڑے ہوئے ڈاکٹر کی لاش کو بازوؤں میں اٹھایا تو اس کی کھوپڑی گردن سے معلق ہو کے جھولنے لگی۔ جب پیڈرو نے اسے صوفے پر ڈالا تب بھی اس کا سر مضحکہ خیز طور پر جھول رہا تھا۔

"بہت جلد تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ انصاف تمہیں کتنا مہنگا پڑا ہے۔" پیڈرو ہانپتے ہوئے غرایا۔ اس کا چہرہ غصے سے لال بھبوکا ہو رہا تھا اور آنکھیں انگارے بن گئی تھیں۔ اگر اسے واضح احکامات نہ ہوتے کہ مجھے گزند نہ پہنچے تو وہ یقیناً مجھے قتل کر دیتا۔

"میرا ضمیر مطمئن ہے کہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر میں نے کوئی غلطی نہیں کی۔" میں نے کہا۔ "ویسے تو ڈاکٹر کہلانے والے اس پیشہ ور قاتل کو دنیا کی کسی عدالت میں مجرم کی حیثیت سے پیش کرنا ناممکن تھا۔ عدالت ثبوت اور شہادت مانگتی ہے۔"

"اور تم نے کسی ثبوت اور شہادت کے بغیر اسے قتل کر دیا۔ منعف کی اولاد۔" پیڈرو چلایا۔

"مجھے ثبوت و شہادت کی ضرورت نہیں تھی۔" میں نے کہا۔ "تم اس کے متعلق پہلے ہی سب کچھ بتا چکے تھے۔ خود اس نے تسلیم کر لیا تھا کہ جتنے قتل وہ کر چکا ہے اس کا حساب بھی یاد نہیں۔"

"ایسے تو کوئی جج اپنے باپ کے قاتل کو بھی نہیں مار سکتا۔ خواہ اس نے قتل ہوتے دیکھا ہو۔"

"جج اپنے عہدے اور حفظِ مراتب، شرائطِ ملازمت اور قانونی پابندیوں کے باعث مجبور ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ "میں مجبور نہیں تھا۔ اگر میں اس شخص کو زندہ چھوڑ دیتا تو یہ جرم ہوتا۔ یہ نہ جانے اور کس کس کی جان لیتا۔"

پیڈرو نے مجھے ایک گندی گالی دی۔ ڈاکٹر کی موت نے اسے مشتعل ضرور کیا تھا لیکن اتنا پاگل نہیں کیا تھا کہ اب وہ میرے قریب آنے کا خطرہ مول لیتا۔ اس نے کرسی اٹھا کے میری ٹانگ پر ماری۔ میں اچھلا اور درد کی ٹیسوں سے تڑپ گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ٹانگ کی وہ ہڈی جس میں بال تھا، ٹوٹ کے الگ ہو گئی ہے لیکن کرسی کی ٹانگ گھٹنے کے اوپر لگی تھی۔ "اب کرو انصاف۔" اس نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان مجھے پھر گالی دی اور کرسی کو سر سے اوپر اٹھا کے پھر وہیں مارا۔ ضبط کرنے کے باوجود میری چیخ نکل گئی اور میری آنکھوں میں درد کی شدت سے آنسو آ گئے۔ میرا سارا جسم کانپنے لگا۔ "میرے ساتھ انصاف کرو!" پیڈرو چیخا اور اس نے تیسری بار کرسی اٹھائی۔ اگر اس کی وحشت بڑھ جاتی تو وہ براہِ راست میری ٹانگ کے مضروب حصے پر وار کر دیتا یا شاید کرسی میرے سر پر دے مارتا۔ نیم بیہوشی کی کیفیت میں بھی میرے

ذہن نے سوچنا بند نہیں کیا تھا۔ میں نے اس کو جو نہی بار کرسی اٹھاتے دیکھا اور اس وقت اچانک مجھ میں اتنی طاقت آگئی کہ میں اُلٹے ہاتھ کے بل پر اوپر اٹھا اور میں نے کرسی کو بائیں ٹانگ ماری۔ یہ ضرب کی شدت تھی یا تصادم کی قوت کہ کرسی ٹوٹ گئی اور پیڈرو جو اس جوابی کارروائی کے لیے تیار نہ تھا جھٹکے سے پیچھے جا گرا۔ وہ کچھ دیر اسی جگہ پڑا ہانپتا رہا جہاں پہلے ڈاکٹر پڑا تھا۔ اس کی دیوانگی کا دورہ ختم ہو گیا تھا۔ "تم سے میں بعد میں سمجھوں گا۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا اور ایک دروازے سے ساتھ والے کمرے میں چلا گیا جہاں ٹیلی فون تھا۔ میں اسے کسی سے باتیں کرتے سنتا رہا۔ وہ اس حادثے کی رپورٹ اپنے الفاظ میں دے رہا تھا۔ کچھ دیر بعد جب اس نے گفتگو کا سلسلہ منقطع کیا تو مجھے ریسیور کو کریڈل پر رکھنے کی آواز سنائی نہیں دی اور تب مجھے خیال آیا کہ میں نے نمبر ڈائل کرنے کی آواز بھی کہاں سنی تھی۔ وہ یقیناً ریڈیو ٹرانسیٹر پر بات کر رہا تھا۔ کس سے اور کہاں؟ اس کا اندازہ مجھے نہ ہو سکا۔

وہ دوبارہ کمرے میں داخل ہوا تو اس کے ساتھ ایک اور شخص بھی تھا جو بظاہر انسان ہی تھا کیونکہ اس کے دو ہاتھ پیر تھے۔ ناک کان اور آنکھیں بالکل انسانی تھیں۔ لیکن دیگر بہت سی صفات میں وہ آدمی نہیں تھا۔ مثلاً قد و قامت، جسامت اور وزن میں وہ گوریلا تھا۔ آدمی اگر حیوانِ ناطق ہے تو وہ صرف حیوان تھا۔ کیونکہ پیڈرو کے بیان کے مطابق وہ زبان جس کا اس نے غلط استعمال کیا تھا کاٹ دی گئی تھی۔ اب وہ بولنے کی کوشش میں حلق سے بے معنی اور عجیب و غریب آوازیں نکالتا تھا۔ اور اپنا مفہوم اشاروں کی مدد سے واضح کرتا تھا۔ معلوم نہیں اس کے کانوں میں کیا سرجری کی گئی ہوگی کہ وہ سماعت سے بھی محروم ہو گیا۔ ان جیسے سفاک لوگوں سے کچھ بعید نہیں کہ اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا ہو۔ وہ ساڑھے چھ فٹ سے زیادہ قد کا آدمی تھا اور اس کی گردن کسی سانڈ سے زیادہ مضبوط تھی۔ اس کے ہاتھوں کی گولائی شانوں سے نیچے اتنی زیادہ تھی کہ ان کا موازنہ میں اپنی ٹانگوں سے کر سکتا تھا لیکن وہ صرف گوشت کا انبار نہیں تھا۔ اس کے بازوؤں کی مچھلیاں اور جسم کے پٹھے چڑھے ہوتے تھے۔ اور اس کے ورزشی بدن کی غیر معمولی قوت کے مظہر تھے۔ مجھے اسے دیکھ کر الف لیلوی کہانیوں کے جن اور دیو یاد آئے اور وہ فلمیں یاد آئیں جن میں ہرکولیس، ٹارزن اور سیمسن کے کردار تھے۔ جب پیڈرو نے اسے مخاطب کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ اس کا نام سیمسن ہی ہے۔ پیڈرو نے اسے اشاروں کی زبان میں سمجھایا کہ میں نے کیسے ہاتھ مار کے ڈاکٹر کی گردن توڑ دی ہے اور وہ میری طرف بڑھا۔ میری روح فنا ہونے لگی۔ وہ دیوزاد مجھے کسی کھلونے کی طرح اٹھا کے اُچھال سکتا تھا اور دیوار پر مار مار کے میرے جسم کے چیتھڑے بکھیر سکتا تھا۔ دفاع کی واحد صورت یہی رہ گئی تھی کہ معذوری کے باوجود میں جوڈو کراٹے کے فن کی ساری مہارت کو بروئے کار لاؤں اور جیسے بھی ہو اس گوریلے کے بازو توڑ دوں یا اس گونگے بہرے جانور کو اندھا بھی کر دوں۔ پیڈرو چند سیکنڈ میرے ردِ عمل سے محظوظ ہوتا رہا۔ پھر اس نے اپنے حکم کے غلام کو روک دیا۔ "سیمسن!" اس نے ہاتھ کے اشارے سے صوفے کی طرف اشارہ کیا جس پر ڈاکٹر کی لاش کامل بے حسی کے ساتھ پڑی تھی۔ "وہ بعد میں۔ پہلے یہ۔" اس نے ہاتھوں کی مدد سے واضح کیا کہ اس دیوزاد کو کیا کرنا ہے۔ اس نے سیمسن کو سمجھا دیا تھا کہ ڈاکٹر کو باہر لے جا کر گاڑ دے۔

"اچھا کیا جو تم نے اس گوریلے کو روک دیا۔" میں نے پُرسکون رہتے ہوئے کہا۔ "ورنہ خود تمہیں ایک کے بجائے دو لاشیں دفن کرنا پڑتیں۔ ڈاکٹر کو تو اٹھایا جا سکتا تھا۔ اس حیوان کو کیسے لے جاتے تم؟ کرین کی مدد سے؟ اس کی قبر کے لیے گڑھا بھی موت کے کنوئیں جتنا چاہیے۔"

سیمسن اپنے آقا کا اشارہ پا کے لوٹ گیا تھا لیکن میری بات سے پیڈرو کو پھر طیش آ گیا۔

"سیمسن!" اس نے چیخ کر کہا حالانکہ اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ سیمسن اس کی آواز کے بجائے کندھے کی تھپکی محسوس کر کے پلٹا اور پیڈرو کو دیکھنے لگا۔ نہ جانے پیڈرو نے اسے کیا اشارہ کیا کہ وہ حیوانی آوازیں نکالتا اپنے بازو پھیلا کے میری طرف لپکا۔ مجھے سنبھلنے کے لیے بہت کم وقت ملا۔ پھر بھی میں نے صحیح "کراتیکا" کی طرح اپنے حواس کو قابو میں رکھا۔ محض ڈیل ڈول اور جسمانی طاقت میرے لیے کچھ نہیں تھی۔ میری کمزوری صرف یہ تھی کہ میں ایک ہاتھ اور ایک پیر کی مدد سے محروم تھا اور میری حرکت پذیری کی صلاحیت مایوس کن تھی۔ اگر میں صحیح پوزیشن لے سکتا اور آزادانہ نقل و حرکت کر سکتا تو مجھے اس پہاڑ کو زمیں بوس کرنے میں سات سیکنڈ سے زیادہ نہ لگتے اور وہ ایک بار میرے سر پر سے گزر کر فرش پر کمر کے بل گرتا تو پھر نہ اٹھتا۔ اس کی کمر اور فرش دونوں ٹوٹ جاتے۔ لیکن اب بھی تقدیر یاور رہی اور سیمسن نے سوچے سمجھے بغیر اپنے پورے وجود سمیت مجھ پر گرنے کی حماقت کی۔ میں نے اسے بڑی پھرتی سے ہاتھوں پر لیا اور یوں گزر جانے دیا کہ وہ مقابل کی دیوار تک اپنے ہی زور میں گیا اور اس سے یوں ٹکرایا کہ مجھے دیوار کے گرنے کا خطرہ لاحق ہو گیا۔ میرا بایاں ہاتھ زیادہ کام آیا تھا لیکن زور دائیں ہاتھ پر بھی پڑا تھا اور جھٹکا میرے دائیں پیر پر بھی آیا تھا۔ اگر وہ پھر حملہ کرتا تو شاید میں نہ روک پاتا لیکن پیڈرو نے اسے گر کر اٹھتے ہی رُک جانے کا اشارہ کیا۔ شاید پیڈرو نے محسوس کر لیا تھا کہ اس جنگ میں یہ ٹینک بھی کام آ گیا تو وہ خسارہ جاتے گا۔ سیمسن رُک گیا۔

"بس؟" میں نے تمسخر آمیز انداز میں چیلنج کیا لیکن میں جانتا تھا کہ اب پیڈرو مشتعل نہیں ہوگا۔ "ختم ہو گیا اس گینڈے کی طاقت آزمائی کا غرور؟ اس حال میں بھی میرے لیے تمہارا سیمسن حقیر چوہے سے زیادہ نہیں۔"

پیڈرو نے اس اشتعال انگیزی کو نظر انداز کر دیا اور سیمسن کو آگے آنے کا اشارہ کیا۔ جسم کی مناسبت سے سیمسن کا سر بہت چھوٹا تھا۔ بالکل شاہ دولہ کے چوہوں کی طرح۔

سیمسن بالکل شاہ دولہ کا چوہا تھا۔ اس کا ذہن عام آدمی جیسا ہوتا تو آج اس کی یہ حالت کیوں ہوتی۔ نہ جانے وہ کب سے ان مجرموں کے ساتھ تھا۔ نادانستگی میں سرزد ہو جانے والی ایک غلطی پر اس کی زبان کاٹ دی گئی تھی اور کان بہرے کر دیے گئے تھے اور یہ ایسی سزا تھی جس کا بیسویں صدی کے مہذب معاشرے میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ سیمسن اس کے باوجود وہیں تھا، فرار نہیں ہوا تھا۔ اور ذہنی طور پر بدستور ان کا غلام تھا۔ ان کے اشاروں پر چلتا تھا۔ کیونکہ اس کا اپنا کوئی ارادہ، کوئی مرضی، کوئی رائے نہیں تھی۔ قوتِ فیصلہ نہیں تھی اور اچھے بُرے میں تفریق کا شعور نہیں تھا۔ وہ آدمی سے زیادہ روبوٹ تھا۔ مشینی آدمی۔ ایک اشارہ اسے متحرک و فعال کر دیتا تھا، دوسرا اشارہ اسے سوئچ کی طرح آف کرنے کے لیے کافی تھا۔ اس کے ذاتی جذبات بالکل نہیں تھے کہ وہ حیران ہوتا، خوش ہوتا، مشتعل ہوتا۔ سوال کرتا کہ اسے یہ کام کرنے کے لیے کیوں کہا جا رہا ہے اور وہ کام کرنے سے کیوں روکا گیا ہے۔ اس کا کام عمل کرنا تھا، سوچنا نہیں۔ وہ سوچ سکتا تو ضرور سوچتا کہ اس میں اور پیڈرو میں کیا فرق ہے؟ نہ وہ ڈاکٹر کی لاش دیکھ کے خوفزدہ ہوا تھا اور نہ میرے ہاتھوں پہلے حملے کی ناکامی سے مشتعل۔ اس نے پہلے بھی پیڈرو کا حکم بلا چون و چرا مانا تھا اور بعد میں بھی۔

جتنی دیر میں پیڈرو نے ڈاکٹر کی جیب سے ہر کاغذ کا پرزہ نکالا، اس کی گھڑی اور ہیرے ...... والی سونے کی انگوٹھی اتاری اتنی دیر میں سیمسن کئی بار اندر گیا اور باہر آیا۔ پیڈرو جو کچھ کر رہا تھا، شناخت کی ہر علامت مٹانے کے لیے کر رہا تھا۔ وہ شخص جو کچھ دیر پہلے پیڈرو کے گروہ کے لیے اتنا کارآمد تھا کہ وہ اسے پچاس ہزار روپے ہر ماہ ادا کرنا کوئی گھاٹے کا سودا نہیں سمجھتے تھے، یک لخت بے مصرف ہو گیا تھا۔ صرف ایک لاش رہ گیا تھا جس سے نجات حاصل کرنا ضروری تھا۔ فوری مسئلہ میرا نہیں، اس لاش کو تمام احتیاطی تدابیر کے ساتھ ٹھکانے لگانے کا تھا اور اس کے انتظامات مرحلہ وار ہو رہے تھے۔ نہ جانے کہاں سے سیمسن پلاسٹک کی ایک تھیلی لایا اور پیڈرو نے سر ہلا کے اطمینان سے سر ہلایا۔ ڈاکٹر کے جسم پر سے اب کپڑے تک اتار لیے گئے تھے۔ پیڈرو نے جیب سے ایک تیز دھار خنجر نکالا۔ بٹن دباتے ہی اس کا پھل باہر آ گیا۔ "اس سے میں تمہاری کھال اتار دوں گا۔" وہ خنجر کو میری طرف لہرا کے بولا۔ لیکن یہ محض ایک جملۂ معترضہ تھا۔ خنجر سے اس نے ڈاکٹر کے دونوں ہاتھوں کی دس انگلیوں کو اس طرح کچوکے لگا کے زخمی کیا جیسے قصائی گوشت کا قیمہ کرتے ہیں۔ یہ فنگر پرنٹ مٹانے کا آپریشن تھا۔

پھر پیڈرو نے خنجر کو واپس جیب میں رکھا اور سیمسن کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ سیمسن نے ڈاکٹر کو ٹوٹی ہوئی گردن سے چوہے کی طرح پکڑ کے اٹھایا اور پلاسٹک کی تھیلی میں ڈال دیا۔ ڈاکٹر کو مرے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی چنانچہ اس کی لاش اکڑی نہیں تھی۔ وہ تھیلی میں یوں سما گیا کہ انگریزی حرف یُو بن گیا۔ اس کی ٹانگیں سر کی طرف تھیں اور سر دونوں پیروں میں پھنس گیا تھا۔ پلاسٹک کی موٹی تھیلی چھ فٹ لمبی تھی چنانچہ آدھی تھیلی میں ڈاکٹر کا جسم دوبار لپیٹ دیا گیا۔ میں حیران تھا کہ اس قسم کی تھیلی عام استعمال میں تو آتی نہیں ... ماضر اسٹاک میں سے کیسے لے آیا پھر جواب میری سمجھ میں آ گیا۔ یہ پلاسٹک کے کفن غالباً لاشوں کے لیے ہی تھے۔ ان میں بند کر کے لاش کو دفن کرنے اور غرق کرنے کے بعد یہ خطرہ بالکل نہیں رہتا تھا کہ تعفن کسی کو متوجہ کر سکتا ہے۔ لیکن میری آنکھوں نے ابھی بہت کچھ دیکھنا تھا۔

پیڈرو کے حکم پر سیمسن نے ڈاکٹر کی پلاسٹک کے کفن میں لپٹی ہوئی لاش کو ایک بوری میں ڈال دیا اور بوری کا منہ اس جگہ سے باندھ دیا جہاں تک اس کا وجود سمایا۔ اوپر کا خالی حصہ سیمسن کے ہاتھوں میں رہ گیا۔ اچانک اس نے بوری کو اٹھا کے گھمایا اور یوں زمین پر دے مارا جیسے دھوبی کپڑے دھوتے ہیں۔ پیڈرو نے پھر اشارہ کیا اور سیمسن نے وہی عمل دُہرایا۔ بے رحمی کا یہ مظاہرہ دیکھنا میری برداشت سے باہر ہو گیا۔

"پیڈرو... کچھ تو خدا کا خوف کرو!" میں چلایا۔ "وہ مر گیا۔ اب اسے کیوں مارتے ہو؟"

"مجھے خدا ترسی کا سبق دے رہے ہو؟" پیڈرو نے طنز سے کہا۔ "اسے مارنے والے خود تم ہو۔"

"میں نے اسے صرف وہ سزا دی تھی جس کا وہ مستحق تھا۔ جو اسے دنیا کا ہر نظامِ انصاف دیتا مگر سزائے موت دینے والے بھی کم سے کم عذاب دے کر مارتے ہیں۔ پھانسی کی جگہ

الیکٹرک چیئر اور گیس چیمبر...."

"بند کرو اپنا یہ فضول لیکچر۔" پیڈرو بیزار ہو کے بولا۔ اس کے اشارے پر سیمسن نے بوری کو گھما گھما کے پٹخنا شروع کیا۔ میں نے اس اذیت ناک منظر سے بچنے کے لیے آنکھیں بند کر کے منہ پھیر لیا مگر دھم دھم کی صدا میرے دماغ پر ہتھوڑے کی طرح پڑتی رہی۔ سیمسن کے طاقتور بازو مشینی انداز میں چل رہے تھے۔ ڈاکٹر کی ہڈیاں تو پہلی دفعہ ہی ٹوٹ گئی ہوں گی۔ اب اس کی لاش کا چُورا ہو رہا تھا اور سالم آدمی کو قیمے جیسے گوشت کے ڈھیر میں تبدیل کیا جا رہا تھا۔ اس ظالمانہ کارروائی کا مقصد میری سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ خوشی جو ڈاکٹر کے شیطانی وجود سے دنیا کو پاک کر کے ملی تھی ایک پُرعذاب احساسِ ندامت میں ڈھل گئی تھی۔ ڈاکٹر کے ساتھ یہ سب کچھ اس لیے ہو رہا تھا کہ میں نے اس پر پہلا ہاتھ اٹھایا تھا اور اب مجھے اس کی سزا مل رہی تھی جسے میں نے انصاف کا تقاضا سمجھا تھا۔ جو حشر مرنے کے بعد ڈاکٹر کا ہوا تھا دنیا میں کسی کا نہیں ہوا ہوگا۔ پرانے وقتوں میں مطلق العنان حکمران باغیوں کو باندھ کر ہاتھی کے پیروں میں ڈلنے کی سزا دیتے تھے۔ انسان اب بھی ٹرینوں سے کٹ جاتے تھے۔ دیوہیکل بسوں کے نیچے پس جاتے تھے اور بڑی بڑی مشینوں کی لپیٹ میں آ کے ختم ہو جاتے تھے۔ لیکن یہ حادثات کہلاتے تھے۔ ایسے متعدد افسوسناک واقعات میں نے سُنے تھے یا پڑھے تھے۔ لیکن سُننے اور دیکھنے ہونے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ اب میری طبیعت متعفن ہو رہی تھی۔ میرے پیٹ میں مروڑ سا اٹھ رہا تھا اور میرا دل قے کرنے کو چاہتا تھا۔ لیکن مجھے مسلسل ابکائیاں آ رہی تھیں مجھے یہ احساس بالکل نہ تھا کہ میرا جسم ٹھنڈے پسینے میں ڈوبا ہوا ہے۔

باہر ایک گاڑی آ کے رُکی۔ میں نے دو افراد کے باتیں کرنے کی آواز سُنی۔ پھر کار کے چاروں دروازے بند ہوئے اور میں سوچتا رہا کہ یہ آواز کس کی ہے؟ حالانکہ میرا سابقہ اس آواز سے اتنی بار پڑ چکا تھا کہ اب مجھے ایک جملہ سُن کے اسے شناخت کر لینا چاہیے تھا۔ لیکن میرا ذہن اس وقت بالکل ماؤف ہو چکا تھا۔

"اچھا! تو اپنے سکندر صاحب یہاں بھی ہاتھ کی صفائی دکھا گئے۔" اسی آواز نے کہا۔ اور میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو مجھے اپنے قریب چوہدری دلاور نظر آیا۔ اس کے دونوں ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے تھے اور وہ ٹانگوں کو تھوڑا سا پھیلا کے متانت کی تصویر بنا کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ میں نواب خسرو جمشید تھا۔

"کیا بتاؤں چوہدری صاحب!" پیڈرو نے سہمے ہوئے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔ "اس کتے نے ایک دم ہاتھ ملا دیا۔ ڈاکٹر کی اتنی جان کہاں تھی۔"

"جان تو ہمارے سکندر صاحب کی ہے۔ بڑے سخت جان ہیں یہ؟" دلاور نے تلخی سے کہا۔ "لیکن یہاں کی حالت کیوں غیر ہو رہی ہے! ٹوٹی ٹوٹا تانگ ہے، ہوائیاں چہرے پر اڑ رہی ہیں!"

"بالکل عالمِ نزع کی سی کیفیت ہے۔" خسرو جمشید سے کہا جو مجھے بہت عرصے بعد پھر نظر آیا تھا۔

"اوہو ہو... ان کے تو پسینے چھوٹ گئے ہیں۔" دلاور نے ہمیشہ کی طرح اپنی اداکاری جاری رکھی۔ "ارے بھئی جوان آدمی ہو بہادر رہو، تمہیں تو ابھی بہت کچھ دیکھنا ہے۔ ابھی سے ہمت ہار گئے؟"

میں اسے کیا جواب دے سکتا تھا۔ اگر وہ میرے قریب ہوتا تو میں اس کے منہ پر ضرور تھوک دیتا۔

"ڈاکٹر اچھا آدمی تھا۔" خسرو جمشید نے افسوس سے سر ہلایا۔ "وفادار تھا۔"

"ہاں۔ لالچی تو تھا مگر وفادار تھا۔ اب کسی اور کی وفاداری خریدنی ہوگی۔" دلاور نے کہا۔ "ہے کوئی بندہ ایسا نظر میں جو اعتبار کے قابل ہو؟ مگر خیر، یہ سب بعد میں ہوگا۔ پہلے ہم ڈاکٹر کی آخری رسوم تو ادا کر لیں۔ پیڈرو! پیکنگ بہت اچھی ہونی چاہیے۔ تحفۂ خاص ہے۔"

پیڈرو نے ٹین کا وہ خاص ڈبا بجایا جو گھروں میں ایک من آٹا رکھنے کے کام آتا ہے۔ "یہ کیسا رہے گا؟"

"چلے گا۔" چوہدری دلاور نے کچھ دیر بعد سر ہلایا۔ میں نے ہمت کر کے سر گھمایا۔ ڈاکٹر کی لاش ایک گٹھڑی کی شکل میں فرش پر رکھی تھی۔ بوری اسی طرح بند تھی لیکن اس میں سے خون کا ایک قطرہ تک باہر نہیں ٹپکا تھا۔ ٹاٹ کی موٹی بوری کے اندر پلاسٹک کی ڈبل تہ لگانے کے نتائج خاطر خواہ برآمد ہوئے تھے۔ پیڈرو نے بوری کو اٹھایا اور ڈبے میں ڈال دیا۔ مرحوم کے پاس بہت کچھ تھا۔ کوٹھیاں اور کاریں۔ سامانِ عیش و عشرت، دولت کی قوت، غرور، چوہدری دلاور جیسے مجرموں کی پشت پناہی کا اعتماد۔ اس انجام کو پہنچنے سے کچھ دیر پہلے ہی اس نے کتنے اعتماد سے دھمکی دی تھی کہ وہ ایک ننھی سی گولی یا انجکشن سے مجھے چت کر سکتا ہے کیونکہ وہ پہلے مجھ سے زیادہ طاقتور اور تارزن ٹائپ لوگوں کو مار چکا ہے جو اس کی ہڈیوں کا سُرمہ بنا سکتے تھے۔ تقدیر کا یہ بھی عجب مذاق تھا جو ڈاکٹر نے کہا تھا وہ چند منٹ بعد ہو گیا۔

"اس کو کیسے بھیجنا ہے چوہدری صاحب؟" پیڈرو نے ڈبے کے کنستر کو بند کرتے ہوئے کہا۔ "دستی یا...؟"

"دستی کا کیا سوال؟" چوہدری دلاور نے یوں کہا جیسے پیڈرو اس کی غلطی پر تنبیہہ کر رہا ہو۔ "لاہور تک ٹرین میں بُک کرلو، آگے غلام ہو جائے گا۔"

پیڈرو کا رنگ ذرا سی دیر کے لیے بدلا تھا جس سے میں نے اندازہ کیا تھا کہ غلطی سے وہ سچ بول گیا تھا۔ جہاں یہ خونی پارسل رکھا تھا وہ جگہ لاہور سے زیادہ دور نہیں تھی۔ شاید لاہور ہی میں تھی اور یہ ممکن تھا کہ ڈبا کوئی خود پہنچا دے۔ چوہدری دلاور نے ٹرین سے بکنگ کا ذکر کر کے معاملے کو سنبھالنا چاہا تھا لیکن میں سمجھ گیا۔

"اور دیکھو، وہ سامان کہاں ہے جو گفٹ کے ساتھ جائے گا؟" دلاور بولا۔

پیڈرو دوسرے کمرے میں گیا اور دونوں ہاتھوں میں کچھ چیزیں لیے لوٹا۔ ان میں میری کلائی گھڑی تھی۔ میرا پرس تھا، اور قلم تھا۔ پرس میں نقد رقم بھی تھی جسے دلاور نے سرسری انداز میں دیکھا اور واپس رکھ دیا۔ پھر اس نے انٹرنیشنل ڈرائیونگ لائسنس نکالا جو میں نے لندن سے حاصل کیا تھا۔ اسے کھول کر میری تصویر دیکھنے کے بعد دلاور مسکرایا۔

"تصویر زیادہ پرانی تو نہیں لگتی اپنے سکندر صاحب۔ وارث پہچان لیں گے آپ کو۔"

"کون وارث؟" میں نے کسی انجانے خوف سے لرز کے کہا۔ "کیا مطلب ہے اس بات کا؟"

دلاور اور خسرو جمشید اس صوفے پر بیٹھ گئے جس پر کچھ دیر پہلے ڈاکٹر کی لاش پڑی تھی۔ "آدمی تو تم ضرورت سے زیادہ سیانے ہو۔ وارث کا مطلب نہیں سمجھے؟" دلاور نے اطمینان سے پیر پھیلا کے کہا اور "تمہاری ذاتی اشیاء پیڈرو کو تھما دیں۔" "وارث صرف ماں باپ یا بھائی بہن ہی تو نہیں ہوتے۔ یار بیلی ہیں، چاچے مامے ہیں، چاہنے والے ہیں، مثلاً وہ وکیل صاحب ہیں۔ نہیں نہیں، فکر مت کرو۔ ان کو نہیں ملے گا یہ تحفہ۔ محسن زندہ ہوتا تو...."

"محسن زندہ ہے۔" میں دیوانہ وار چلایا۔ "تم سب بکتے ہو، جھوٹ بکتے ہو۔"

"اچھا بھئی سب زندہ ہیں۔" دلاور معنی خیز انداز میں ہنسا۔ "بات زندے مُردے شمار کرنے کی نہیں ہو رہی تھی، مسئلہ یہ ہے کہ تمہارا یہ تحفہ بھیجنا ہے۔" اس نے آٹے کے بند ٹین کی طرف اشارہ کیا۔ "تمہارے ایس پی صاحب تو اب رہے نہیں ورنہ وہ فنافٹ تحقیقات شروع کر دیتے۔ پھر انہیں تکلیف دینے کا کیا فائدہ؟ تمہارا ذاتی سامان بھی تحفے کے ساتھ ہی جائے گا۔ بس اتنا بتا دو کہ کس کو بھیجا جائے؟ ایک وہ تمہاری بہن ہے شہلا۔ دوسری وہ جسے تم نے چھوڑ دیا۔ فوزیہ! تیسرا محسن کا باپ ہے.... کون زیادہ خوش ہوگا یہ تحفہ وصول کر کے؟"

"خدا کے لیے دلاور۔" میں نے بے بسی سے کہا۔ "اپنے اور میرے معاملات میں ان لوگوں کو مت لاؤ۔ پہلے ہی کیا کم سزا مل چکی ہے انہیں۔ قصوروار اگر ہوں، تو میں۔ مجھے جو سزا چاہو دو۔"

دلاور ہنسا۔ "اپنے اور میرے معاملات کے بیچ خدا کو مت لاؤ۔ خدا نے یہ دنیا بنانے کے بعد آدمی کو عقل و شعور اسی لیے دیا تھا کہ وہ اس کے انتظامی مسائل خود سنبھالے۔ قصوروار تو ایک ہی آدمی ہوتا ہے۔ وہ کسی خاندان کا سربراہ ہو۔ ادارے کا یا ملک کا۔ اگر وہ غلط فیصلہ کرتا ہے تو نقصان سب کو ہوتا ہے۔ بیوی بچوں کو۔ اس ادارے سے وابستہ افراد کو یا اس ملک میں رہنے والوں کو۔ جواری، شرابی اور بدکردار افراد کے گھر میں کیا ہوتا ہے؟ کیا ان کے بیٹے وطن کا نام روشن کرتے ہیں؟ بیٹیوں کو عزت دار رشتے مل جاتے ہیں؟"

"پیڈرو کے بارے میں مجھے معلوم نہیں لیکن تمہارا تو گھر بھی ہے اور بیوی بچے بھی ہیں۔" میں نے کہا۔

"میں عزت دار آدمی ہوں اپنے سکندر صاحب!" دلاور طنز سے مسکرایا۔ "ایک تمہارے نہ ماننے سے کچھ نہیں ہوتا۔ میرے تعلقات کسی طرح بھی تمہارے انکل ایس ایس پی صاحب سے کم نہیں۔ میرے مقابلے میں تم کیا ہو؟ اپنی نظر میں بڑے ہیرو۔ اصولوں کی جنگ میں جان کی بازی لگا دینے والے۔ حق پرست اور باضمیر۔ لیکن دنیا تم کو پھر بھی فرشتہ نہیں مانتی! قاتل سمجھتی ہے۔ تمہارے خلاف دستاویزات پر مشتمل ایک پوری فائل انگلستان میں محفوظ ہے۔ یہاں تمہارا نام اتنی بار اخبارات کی زینت بن چکا ہے، اتنے تھانوں میں اور مقدمات میں درج ہے کہ سب کو اکٹھا کیا جائے تو یہاں بھی دوسری فائل بن سکتی ہے۔ زیادہ بڑھی، مار پیٹ، توڑ پھوڑ، آتش زنی، اغوا، قتل، کیا کچھ منسوب نہیں ہے تم سے۔ تم لاکھ کہو کہ یہ سب غلط ہے، تمہاری مانے گا کون؟ اس کے برعکس میرے خلاف کیا ہے؟ وہ ایک بار تم نے مجھے ملوث کرنے کے لیے میرا نام لیا مگر اس سے کیا فرق پڑا؟ میرا نام آیا کہیں؟ میری عزت کم ہوئی یا کسی نے انگشت نمائی بھی کی مجھ پہ؟"

"دلاور!" میں نے کہا۔ "چور کے اسی طرح سو دن ہو گئے ہیں اور کوتوال کا ایک دن۔"

"سب پرانے محاورے، پرانی باتیں ہیں۔ اب کوتوال بھی تو چوروں کا ہے۔" دلاور بولا۔ "اور سو دن تو بہت ہیں۔ ابھی تم کو ہماری دنیا میں آئے ہوئے جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے۔ غلطی ہم سے ہوئی کہ تمہاری جوانی پر ترس کھایا اور تمہیں زندہ سلامت آنے دیا۔ ہمارا خیال تھا کہ تم جس کاروباری ماحول اور مادہ پرست معاشرے

میں برسوں رہ کے لوٹے ہو اس کے بعد تم اپنے دماغ سے سوچتے ہوگے، دل سے نہیں۔ تم دو اور دو پانچ بھی مان لوگے۔ ہم نے تو دو جمع دو، دس تک کیے تھے اور ہماری آفر انتہائی فراخدلانہ تھی۔ تم عیش سے عمر بسر کر سکتے تھے اور اس سارے عذاب سے بچ سکتے تھے جس میں تم خود بھی مبتلا ہوئے اور ہمیں بھی مبتلا کیا۔ تمہارا باپ اتنا ضدی نہیں تھا۔ اس نے ہماری ہر بات خوشی سے مان لی تھی۔ ہمارا خیال تھا کہ تم بھی اسی کی طرح ہوگے۔ ورنہ کیا ضرورت تھی ہمیں تم کو رعایت دینے کی۔ تمہاری ضد سے ہمارا کتنا نقصان ہوا، مالی بھی اور جانی بھی۔ دو چار مرتبہ تم حسنِ اتفاق یا تقدیر کی یاوری سے بچ گئے تو تمہارا حوصلہ بڑھ گیا۔" وہ اپنے لب و لہجے اور اندازِ گفتگو سے قطعی بدلا ہوا دلاور تھا۔

اتنی سنجیدگی کے ساتھ اور ایسے رواں لہجے میں اس نے پہلے کبھی بات نہیں کی تھی۔ اس کی اداکارانہ صلاحیت کا میں شروع سے معترف تھا۔ یہ انکشاف بھی میرے لیے باعثِ حیرت ثابت ہوا کہ اس کا ہر جملے میں "اپنے سکندر صاحب" کہنا۔ ادھورے جملے بولنا۔ اردو میں پنجابی کے الفاظ شامل کرنا اور ان پڑھوں کی طرح گفتگو کرنا بھی اداکاری تھی۔ اصل چوہدری دلاور کی زبان بالکل مختلف تھی۔ وہ انتہائی عیار اور معاملہ فہم، متین اور سرد مزاج، جہاندیدہ اور تعلیم یافتہ شخص تھا۔ دو ٹوک اور ٹو دی پوائنٹ بات کرنے والا۔ پُراعتماد اور اپنی حاکمیت میں خود مختار۔

"اس وقت تم سب کچھ کہہ سکتے ہو دلاور۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ میرے لیے قابلِ قبول ہو۔ اور آج اگر سچ ہے تو کل بھی سچ ہوگا۔" میں نے کہا۔ "میں نے صرف اپنا حق مانگا تھا اور انصاف مانگا تھا۔"

دلاور ہنسا۔ "پہلے تم غلط وقت پر پیدا ہوگئے۔ پھر غلط جگہ آ گئے۔ اپنی کتابوں کی دنیا میں ہی رہتے تو اچھا تھا۔ پڑھ لکھ کے کیا فائدہ ہوا تمہیں؟ آنکھیں تو تمہاری بند ہی رہیں ورنہ تم دنیا کو دیکھتے، اپنی آنکھ سے بھی اور دوسروں کی آنکھ سے بھی۔ تمہیں معلوم ہو جاتا کہ اس پورے کرۂ ارض پر حق و انصاف کے الفاظ صرف تقریروں میں استعمال ہوتے ہیں جن کے مسودے بڑی محنت سے تیار کیے جاتے ہیں۔ اقوامِ متحدہ کی قراردادوں میں نظر آتے ہیں اور کبھی کبھی فلموں یا قصے کہانیوں میں بھی جو دل بہلانے کے ذریعے ہیں۔ ورنہ میرا خیال ہے کہ ان الفاظ کو اب دنیا کی ہر زبان کی ڈکشنری سے بھی خارج کر دینا چاہیے۔ حق کسے مل رہا ہے اور انصاف کہاں ہو رہا ہے؟ اسرائیل سے کشمیر تک؟ گوروں اور کالوں کی معاشی جنگ میں؟ پسماندہ کہلانے والے اور ترقی یافتہ ممالک میں؟ امیر اور غریب میں؟ اپنی معاشرتی قدروں کو دیکھو جن کے دُہرے معیار ہیں۔ اخلاقی حالت پر نظر ڈالو۔"

"یہ فلسفہ مت پڑھاؤ مجھے دلاور! کیونکہ میرا ذہن اسے قبول نہیں کرتا۔ جو فرق میری فطرت میں ہے، وہ رہے گا۔ ازل سے آج تک انسان کی سرشت میں نیکی یا بدی کا عنصر اسی لیے غالب رہا کہ سب انسان ایک جیسے نہیں تھے۔ کچھ زہر کا پیالہ دیتے تھے تو کچھ اسے بخوشی لبوں سے لگا لیتے تھے۔ شیطان آدمی کا [illegible] ہے مگر پھر بھی پہچانا جاتا ہے۔ خواہ کسی بھی بہروپ میں آئے۔ ڈاکٹر بن کر۔ دلاور بن کر یا میر محمد بن کر۔ اور انکل رضوی صاحب یا انسپکٹر شیخ، رابعہ جیسی عورت اور مجھ جیسے کم عقل اور کوتاہ بیں اسے دیکھ لیتے ہیں۔"

"یہ بکواس بند کرو اور بتاؤ کہ ہم یہ باکس کس کے نام ارسال کریں؟" دلاور نے برہمی سے کہا۔

"میرا خیال ہے اسے تم خود اپنے بیوی بچوں کے لیے لے جاؤ۔ بیوی تمہاری شرافت کی اور بچے تمہاری نرم دلی کے قائل ہو جائیں گے دلاور۔" میں نے کہا۔ "تمہاری عزت پہلے سے زیادہ کرنے لگیں گے۔ پوری داستانِ شجاعت سُنا دینا انہیں۔"

"تم مجھے مشتعل کرنا چاہتے ہو نا؟" چوہدری دلاور مسکرایا۔ "تاکہ میں تمہارے منہ پر تھپڑ رسید کرنے کی غلطی کر دوں اور تم کو دوسرا وار میری گردن پر کرنے کا موقع مل جائے۔ افسوس یہ ہے کہ تم نے ابھی تک مجھے نہیں سمجھا حالانکہ تم ذہین بھی ہو۔ حماقت کی حد تک جرأت مند ہونے کے علاوہ۔ اپنا کام کرو پیڈرو! تم کیوں رُک گئے تھے؟"

پیڈرو نے خفیف ہو کے سر ہلایا اور ٹین کے اس ڈبے کو بند کر کے چاروں طرف سے گوند سے موٹا سفید کاغذ چپکانے لگا۔ مقفل کرنے سے پہلے اس نے باکس کو کھولا اور بوری میں میرے ذاتی استعمال کی وہ سب چیزیں ڈال دیں جو میری شناخت کا ذریعہ ثابت ہو سکتی تھیں۔ یہ دلاور کے شیطان کے زیادہ قریبی ذہن کا کمال تھا کہ اس نے مجھے نفسیاتی طور پر دہشت زدہ کرنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا۔ ڈاکٹر تو مر ہی چکا تھا اور دلاور کے لیے اس میں ذاتی صدمے کی کوئی بات نہیں تھی۔ جب ناجائز مقاصد کے لیے زرِ کثیر صرف کر کے کسی کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں تو ایک غیر تحریری معاہدے کے تحت یہ بھی واضح کر دیا جاتا ہے کہ اتنا زیادہ معاوضہ درحقیقت اُن خطرات کا ہے جو ہر کام [illegible] بدنامی تو کچھ نہیں۔ زندگی اور موت کے مابین پُل صراط کا سفر طے کرنا ہوگا اور ہر گام پر ایک مرحلۂ طلبگارِ جاں در پیش ہوگا۔ [illegible] کتنا عرصہ وہ اندیشۂ سود و زیاں سے بے نیاز پچاس ہزار [illegible] وصول کرتا رہا۔ اب موت اچانک آگئی تو اصل مع سود [illegible] ہو گیا۔ یہی کام اتنے ہی معاوضے پر کوئی اور کرے گا اور پھر کوئی اور۔

اس معاملے میں سب سے اہم کاروبار ہے۔ افراد یا پیسہ نہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر جو برضا و رغبت پچاس ہزار روپے سکۂ رائج الوقت پر جلاد مقرر ہوا تھا، اپنی غلطی سے مرا یا کسی اور کی غلطی سے۔ دلاور اینڈ کمپنی کی بیلنس شیٹ میں گھٹ گیا۔ اس کی آخری رسوم مذہبی عقائد کے مطابق ہونے سے اور اس کی مغفرت کے لیے دُعا مانگنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کیونکہ اس کے نامۂ اعمال پر جہنمی ہونے کی مُہر بہت پہلے لگ چکی تھی۔ بے جان جسم سے دلاور نے تھوڑا سا فائدہ اور اٹھا لیا۔ لاش کو اُس نے گاڑنے اور جلانے یا دبانے کے بجائے میرے لیے سامانِ عقوبت بنا دیا۔ اب یہ لاش جسے بھی ملے گی، انکل رضوی اور شیروانی۔ فوزیہ اور شہلا، انسپکٹر شیخ یا استاد ڈیڈی۔ سب جان لیں گے کہ یہ تحفہ کس نے بھیجا ہے اور نشانیاں دیکھ کر مان لیں گے کہ گوشت پوست کا یہ ڈھیر کس کا ہے۔ نہیں مانیں گے تب بھی یہ اُن کا دردِ سر ہوگا کہ لاش کو دفن کریں یا پوسٹ مارٹم کے لیے رکھوا دیں۔ شناخت تو ناممکن ہو گی کہ مرنے والا کون تھا۔

میری روح اس منظر کے تصور سے کانپتی تھی جب پلاسٹک کے کفن میں سے نکلنے والے متعفن گوشت اور ہڈیوں کے چورے کو بوری سے برآمد ہونے والی اشیاء کی مدد سے سکندر بخت سمجھا جائے گا۔ ابھی تو سب ہی میری گمشدگی سے پریشان تھے۔ ایسے میں میرے پرس قلم اور گھڑی کے ساتھ موصول ہونے والے باکس کو کھولنے والے کے لیے ذہنی صدمہ کتنا شدید ہوگا۔ شیخ اور انکل رضوی تو پولیس کی نوکری کے باعث ایسے نظارے کے بعد بھی اعصاب پر قابو رکھ سکتے ہیں اور عقل سے کام لے کر طے کر سکتے ہیں کہ یہ اسباب تو سکندر بخت کا ہے لیکن کیا اس سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ وہ پُرزہ پُرزہ جسم بھی سکندر کا ہے؟ انکل شیروانی سول سرونٹ۔ شریکِ حیات کے جُدا ہونے کا منظر دیکھنے والے۔ یہ منظر دیکھ سکیں گے؟ ان کو ہارٹ اٹیک ہو سکتا ہے اور اُن کا ذہن بھی متاثر ہو سکتا ہے۔ فوزیہ پر ہسٹریا کا دورہ پڑ سکتا ہے اور اس کا ذہن بھی متاثر ہو سکتا ہے۔ شہلا کا کچھ پتا نہیں۔ اس نے اتنے غم جھیلے ہیں اور اتنے دُکھ اٹھائے ہیں کہ شاید اس کی تاب ہی نہ لا سکے۔ پاگل ہو جائے یا خودکشی کر لے۔ صرف رابعہ کے بارے میں یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ وہ اس کو بھی دامِ فریب سمجھے۔ اس کا دل نہ مانے کہ یہ سکندر ہے اور دماغ تسلیم نہ کرے کہ سکندر کا یہ انجام ہو سکتا ہے۔ مگر ہے تو وہ بھی عورت۔ باشعور اور پیشے کے اعتبار سے وکیل مگر ہر طرح سے صرف محبت کرنے والی عورت۔ باہر سے منطق، دلائل اور عقل۔ اندر سے صرف جذبات کی نرمی، عشق کی حلاوت، خوابوں کی آسودگی۔

"دلاور!" میں نے کہا۔ "تم میرے ساتھ جو سلوک چاہو کرو۔ مجھے اتنا تو بتا دو کہ رابعہ کہاں ہے؟"

"رابعہ کہاں ہے؟" چوہدری دلاور نے زیرِ لب دُہرایا جیسے یہ سیدھی سادی بات اس کی سمجھ میں ہی نہیں آئی۔ "یہ بھی معلوم ہو جائے گا۔ ایسی جلدی کیا ہے۔ آدمی کے لیے یہ دنیا ہے یا وہ دنیا۔ کہیں نہ کہیں وہ بھی ہوگی۔"

پیڈرو اتنی دیر میں فارغ ہو گیا تھا اور اب کہیں سے لال رنگ کا موٹا مارکر لا کے باکس پر کچھ لکھ رہا تھا لیکن جس سائڈ پر وہ لکھ رہا تھا وہ میرے سامنے نہیں تھی۔

"اب اسے بھجوا دو وہیں جہاں میں نے کہا تھا۔" دلاور نے کہا۔ اسی وقت سیمسن سے ایک غلطی ہو گئی۔ بالکل غیر ارادی طور پر اس نے ہاتھ کو ہتھوڑا سا ہلایا۔ زمین کھودنے کے انداز میں۔ کیونکہ پیڈرو اسے پہلے ہی سمجھا چکا تھا کہ اس باکس کو دفن کرنا ہے۔

میرے جسم کا رُواں رُواں ناقابلِ بیان اطمینان کی لذّت سے سرشار ہو گیا تھا۔ دلاور نے نہیں دیکھا تھا کہ ایک گینڈے جتنا جسم اور چیونٹی جتنی عقل رکھنے والے غلام نے اس کے سارے ڈرامے کا پلاٹ کلائمکس سے پہلے ہی مجھے بتا دیا ہے۔ اس کی یہ حرکت ایسی ہی تھی جیسے مداری کی ڈگڈگی سے زیادہ اس کے الفاظ پر بندر خود بخود کھڑا ہو جائے۔ کھڑا ہو تو بیٹھ جائے یا قلابازی کھا کے کوئی کرتب دکھا دے۔ سیمسن بھی ایک بہت بڑا بندر تھا جس کی ڈگڈگی دلاور کے ہاتھ میں تھی۔ محض عقلِ سلیم سے محرومی کے باعث وہ قدرت کی عطا کردہ سماعت اور نطق کی انسانی صفات سے محروم ہوا تھا۔ شاید اس نے کوئی ایسی بات بلا ارادہ سُن لی تھی اور انجام کا تصور کیے بغیر کہہ دی تھی جس سے دلاور اینڈ کمپنی کو نقصان ہوا۔ معمولی نقصان ہوتا تو اسے جسمانی مار کی سزا دی جاتی۔ کوڑے مار مار کے اس کی کھال ادھیڑ دی جاتی یا اس کے جسم کو گرم سلاخوں سے داغا جاتا مگر نقصان زیادہ ہوا تھا چنانچہ سزا بھی اسی مناسبت سے ملی تھی۔ اس وقت سیمسن سے پھر بیوقوفی سرزد ہو گئی تھی مگر اس کا ذمے دار پیڈرو بھی تھا جس نے میرے سامنے سیمسن کو اشاروں میں سمجھایا تھا کہ ڈاکٹر کا کیا کرنا ہے۔ اس کے ہاتھ ہلتے ہی میں سمجھ گیا کہ یہ خونیں تحفہ کسی کو بھی نہیں جائے گا۔ اگر اس وقت میں اپنی خوشی کا اظہار کر دیتا یا بتا دیتا کہ پیڈرو اور سیمسن کی مشترکہ حماقت کے باعث حقیقت مجھ پر عیاں ہو گئی ہے تو ان دونوں کو ہی سزا نہ ملتی، سزا مجھے بھی ملتی ـــــ دلاور کو اس خیال سے تسکین تھی کہ وہ مجھے دہشت زدہ کرنے میں کامیاب رہا اور اب یہ احساس میرے لیے سوہانِ روح رہے گا کہ میرے یوں مرنے کی خبر پا کر لواحقین پر کیا بیتے گی۔

"ٹھہرو!" سیمسن نے وہ ڈبا اٹھایا تو میں چلایا۔ "دلاور!"

رحم کرو مجھ پر۔ یہ تو بتا دو کہ میری لاش کسے بھیج رہے ہو؟"

"میں نے تو تم کو انتخاب کا حق دیا تھا۔" دلاور نے ہاتھ اٹھا کے سیمن کو روکا۔ "جلو اب بتاؤ۔"

"معلوم نہیں تم کیا مقصد حاصل کرنا چاہتے ہو۔ اگر فوزیہ مر گئی یا شہلا پاگل ہو گئی تو تمہیں کیا ملے گا؟ کوئی عورت یہ بھیانک منظر کیسے دیکھ سکتی ہے؟" میں نے منت کرنے کے انداز میں کہا۔

"تم پھر فضول باتوں میں اُلجھ گئے۔" دلاور بولا۔ "جلدی سے نام بتا دو۔ ورنہ...."

"بتاتا ہوں۔ بتاتا ہوں۔" میں نے کانپتے ہوئے کہا۔ "فوزیہ، رابعہ اور شہلا کو چھوڑ دو۔ وہ کمزور، جذباتی عورتیں ہیں۔ فوزیہ کی شادی ہو چکی ہے اور وہ مجھے اچھا آدمی نہیں سمجھتی لیکن اس کی ازدواجی زندگی ہنسی خوشی گزر رہی ہے۔ مظلوم رابعہ بھی ہے مگر شہلا سب سے بزدل ہے اور سب سے زیادہ دُکھ اٹھا چکی ہے۔ وہ پاگل ہو کے اپنی جان دے دے گی۔ تم اسے بخش دو۔ انکل رضوی اور انسپکٹر شیخ ...."

"بس بس۔ وقت نہیں ہے میرے پاس اتنا۔" دلاور بولا۔ "پیڈرو۔ یہ تحفہ شہلا کو پہنچا دو۔"

سیمن اور پیڈرو کے ساتھ جمشید بھی نکل گیا۔ مجھے امید تھی کہ دلاور کا مقصد مجھے زیادہ سے زیادہ اذیت دینا ہے چنانچہ وہ میری بات کیوں ماننے لگا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ بالفرضِ محال یہ تحفہ بھیجنا ہی ہوتا تو اس سے کس کو زیادہ سے زیادہ صدمہ ہوتا۔ میں نے واضح کر دیا تھا کہ شہلا سب سے زیادہ اثر لے گی۔ اس نے حسب توقع شہلا ہی کو باکس بھجوانے کی ہدایت کر دی اور یہ اس کی ایذا پسند فطرت کے عین مطابق تھا۔ وہ مجھے بے وقوف بنا رہا تھا اور میں اسے یہ تاثر دینے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ میں بے وقوف بن گیا۔ میں نے اس پر اعتبار کر لیا اور اب شدید اندرونی کرب میں مبتلا ہوں جب کہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ میں جانتا تھا کہ رات کو کسی ویرانے میں ڈاکٹر کی لاش گاڑ دی جائے گی۔ دلاور کوئی کام بلاوجہ نہیں کرتا تھا۔ میری لاش میرے وارثوں کو بھجوانے سے اسے کیا فائدہ ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ وہ میری موت کا یقین کر لیتے۔ اس کے لیے وہ سب ضروری تو نہیں تھا جو میرے سامنے ہوا۔ وہ تو صرف مجھے سزا دے رہا تھا ورنہ میرے مرنے کا یقین دلانے کے اور بھی آسان طریقے تھے۔

"دلاور۔" میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ "اس درندگی کے مظاہرے سے تم کو حاصل کچھ نہیں ہو گا۔ میرے سارے وارث تو نہیں مر جائیں گے۔ تم نے مجھے اور رابعہ کو قتل کر دیا اور شہلا نے خودکشی کر لی تب بھی تین آدمی اور بچیں گے کیونکہ محسن کو تم پہلے ہی مار چکے ہو۔ وہ تین ہماری جگہ مزید چار افراد کو نامزد کر دیں گے اور کاروبار اس زندگی میں کبھی صرف تمہاری ملکیت نہیں بنے گا۔ وارثوں کی اس قطار میں انکل رضوی اور انسپکٹر شیخ بھی ہیں۔ جس دن وہ تمہارے پارٹنر ہو گئے ...."

"اپنے سکندر صاحب، آپ بولتے بہت ہو۔" دلاور نے میری بات کاٹ دی اور پھر صوفے پر بیٹھ گیا۔ "کس نے کہا ہے آپ سے کہ ہم رابعہ یا خدانخواستہ آپ کو قتل کرنا چاہتے ہیں۔ محسن تو اپنی بہادری کی وجہ سے مارا گیا ہے۔"

"تو پھر کیا مقصد ہے مجھے یوں اغوا کر لانے کا؟" میں نے کہا۔

"کچھ نہیں۔ بس دل چاہتا تھا کہ آپ کچھ دن ہمارے مہمان رہیں۔ رابعہ بی بی تو اپنے گھر میں ہیں۔" وہ مسکرایا۔

"کیا ثبوت ہے اس بات کا؟" میں نے دھڑکتے دل پر قابو پا کے کہا۔

"ثبوت تو میں ابھی فراہم کر دیتا۔ ٹیلی فون پہ بات کروا دیتا تمہاری۔" وہ بولا۔ "لیکن اس میں تھوڑا سا خطرہ ہے۔ تمہارے انکل کی لائن پر یقیناً آبزرویشن ہو گی۔ تمہاری گفتگو ٹیپ ہونے میں تو ہمارا کچھ نہیں جاتا لیکن یہ نمبر معلوم ہو جائے گا جہاں سے کال کی گئی۔ تم کوئی اور نمبر بتا دو۔"

"نمبر تو رابعہ کے آفس کا بھی ہے۔" میں نے کہا۔ "شیخ کے گھر کا ہے۔"

"ہوں۔" وہ سوچ کے بولا۔ "اچھا میں بندوبست کرتا ہوں کہ تم بات کر لو۔ پہلے میں تصدیق کر لوں کہ جو نمبر تم دو گے وہ بھی آبزرویشن پہ تو نہیں ہیں۔ اگر نہ ہوئے تو میں رابعہ کے لیے پیغام دے دوں گا کہ کل کسی وقت وہاں آ جائے اور تم سے بات کر لے۔ شرط یہی ہے کہ لائن آبزرویشن پہ نہ ہو۔ اگر کل تک یہ انتظام کر لیا گیا تو مجھے پتا چل جائے گا اور پھر بات نہیں ہو سکے گی۔ نمبر بتاؤ۔"

میں نے اسے نمبر دیے اور وہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں گیا۔ پہلے کی طرح پھر نمبر ڈائل کرنے کی آواز نہیں آئی۔ "ہیلو۔ دیکھو پتا کرو کہ ضامن رضوی سابق ایس ایس پی کی لائن ٹیپ ہو رہی ہے یا نہیں۔ یہی بات دو اور نمبروں کے لیے معلوم کرنی ہے۔ نمبر لکھو۔ ہاں ... اور دیکھو مجھے ابھی بتاؤ آدھے گھنٹے میں۔"

میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ ایک طرف دلاور ایک نامعلوم لاش بھجوا کے میری موت کا یقین دلانا چاہتا تھا۔ دوسری طرف فون پہ براہ راست رابعہ سے بات کرا کے میرے زندہ

ہونے کا ثبوت فراہم کرنا چاہتا تھا۔ پہلی بات تو ڈراما تھی جس کا دلاور ماہر تھا مگر یہ دوسری بات، یہ بھی ڈراما ہو گی؟

"مجھے کب تک یہاں رہنا ہو گا؟ ٹانگ ٹھیک ہونے تک؟" میں نے واپسی پر اس سے پوچھا۔

"اب اتنی بھی کیا جلدی ہے اپنے سکندر صاحب۔ آپ اپنے گھر میں آرام سے رہو۔ کھانے کی کوئی تکلیف ہو تو بتاؤ۔ ڈاکٹر کل دوسرا آ جائے گا۔ چاہو تو اسے بھی مار دینا۔ وہ تحفہ فوزیہ کو پہنچ جائے گا۔ زمانہ بڑا عجیب ہے۔ عجیب کیا ہے، پیسے کا ہے۔ تم جتنے چاہو بندے مارو۔ بازار میں جو چیز آج کل بہت لوگ بیچ رہے ہیں وہ ضمیر ہی ہے۔ اس کے پیسے اچھے مل جاتے ہیں نا۔ وطن دشمن اور غدار۔ پیشہ ور مجرم۔ ہر غیر قانونی اور ناجائز کام کرنے والے کم نہیں۔ علاج تمہیں کرانا ہے، مجھے نہیں۔ ایسے بندے مارتے جاؤ گے تو اپنا ہی دُہرا نقصان کرو گے۔ ہم لاش آگے بھیجتے رہیں گے اور تم یہاں پڑے رہو گے، اسی طرح۔"

"پھر بھی مجھے کب تک قید رکھو گے؟" میں نے کہا۔

"یہی کوئی سات سال تک۔" دلاور بے نیازی سے بولا۔ "زیادہ دن لگے تو آٹھ نو سال۔"

میرا دل ڈوبنے لگا۔ "آٹھ نو سال۔ تمام عمر کیوں نہیں اور اس سے کیا حاصل؟" میں نے کہا۔ "تم مجھے مار کیوں نہیں دیتے۔ سات آٹھ یا نو سال تک تم مجھے کیوں زندہ رکھو گے؟"

"ہر بات میں کوئی مصلحت ہوتی ہے اپنے سکندر صاحب۔" وہ بولا۔ "اب فرض کرو ہم تمہیں مار دیں تو ہمیں کیا فائدہ ہو گا؟ تم نے تو پکا بندوبست کر رکھا ہے۔ لائن لگا رکھی ہے کہ الف مر جائے تو ب اور ب مر جائے تو جیم تمہاری جگہ وارث ہو گا اور میر وزیر اینڈ کمپنی کا وارث بن جائے گا۔ خود وہ لوگ ایسے ہیں کہ پکا کام کرتے ہیں۔ تم سے کم نہیں۔ ظاہر ہے ان سب کو نہیں مارا جا سکتا۔ تم پہلے ہو، دوسرا محسن تھا۔ اوُپر بھی اندھے نہیں بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ پوچھیں گے ضرور کہ چوہدری صاحب یہ قصہ کیا ہے۔ جو بھی میر وزیر اینڈ کمپنی میں آپ کا پارٹنر بنتا ہے، قتل ہو جاتا ہے! اب آپ کو یہ جان کر خوشی ہو گی کہ حقِ وراثت کا سرٹیفکیٹ آپ کے نام سے جاری ہو گیا ہے۔ عدالت نے احکامات تو صادر کر دیے ہیں لیکن آپ خود کیسے جاؤ گے عدالت میں یہ سرٹیفکیٹ لینے کے لیے۔ عدالت انتظار کرے گی۔ دوسری عدالت جس میں قتل کا مقدمہ زیرِ سماعت ہے، انتظار نہیں کرے گی اور آپ کی غیر حاضری پر ضمانت منسوخ کر دے گی۔ آپ کے وارث کچھ نہیں کر سکتے۔ وہ بھی انتظار کریں گے۔ تلاش کریں گے۔ ساری دنیا کی خاک چھان ماریں گے۔ اگر لاش مل جائے اور شناخت ہو جائے تو قصہ ختم ہو جاتا ہے۔ حقِ وراثت دوسرے شخص کو منتقل ہو جاتا ہے لیکن پہلا آدمی ملے ہی نہیں تو اسے کیسے مردہ ثابت کیا جا سکتا ہے؟ اس کے لیے سات سال انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اس کے بعد ہی عدالت کو درخواست دی جا سکتی ہے کہ اب فلاں گم شدہ شخص کی بازیابی کا کوئی امکان نہیں چنانچہ اسے مُردہ قرار دے دیا جائے اور فلاں کو اس کا وارث تسلیم کر لیا جائے۔ جس بیوی کا شوہر گم ہو جائے وہ سات سال تک دوسری شادی نہیں کر سکتی۔ جنگ کے بعد اکثر ایسا ہوتا ہے کہ سپاہی لاپتا ہو جاتے ہیں اور کسی ذریعے سے ان کی موت کی تصدیق نہیں ہوتی اور یہ بھی پتا نہیں چلتا کہ وہ دشمن کے قیدی بن گئے۔ قید میں مر گئے یا قید سے فرار ہو گئے۔ چنانچہ ان کی بیویوں کو سات سال تک شوہر کی واپسی کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ تمہاری واپسی کا انتظار بھی سات سال تو ہو گا اور اس عرصے میں چار چھ ماہ تک میں بھی سخت تشویش میں مبتلا رہوں گا کہ میرا اتنا لائق فائق قانونی پارٹنر کدھر گیا۔ پھر کوئی اور تمہاری جگہ لینے آئے گا اور عدالتی کارروائی ہو گی۔ اسی لیے میں نے کہا کہ کم سے کم سات سال۔ آٹھ یا نو اس لیے کہے کہ عدالت کو سال دو سال لگ سکتے ہیں۔ معلوم نہیں رابعہ اتنا عرصہ تمہارا انتظار کرے گی یا نہیں۔ مگر ہمارے لیے آٹھ نو سال کی مہلت بہت ہے۔ ظاہر ہے عملی طور پر میں ہی سارے کاروبار کو چلاؤں گا۔ کاروبار میں نفع بھی ہوتا ہے نقصان بھی۔ آگے کچھ یوں ہو گا کہ کاروبار سال بھر بعد گھاٹے میں جانے لگے گا۔ کبھی آگ لگ جائے گی، کبھی ہڑتالی توڑ پھوڑ کر دیں گے۔ ڈاکا پڑ جائے گا۔ کوئی عمارت بیٹھ جائے گی۔ ان آفات کا انجام یہ ہو گا کہ کمپنی دیوالیہ ہو جائے گی۔ چار پانچ سال میں اس کا ملبہ اور جگہ رہ جائیں گے۔ وقت آنے پر اس کا قبضہ تمہارے وارثوں کو دے دیا جائے گا۔ شاید میں اس وقت نہ ملوں۔ پہلے ہی کاروبار سے دستبرداری کا اعلان کر کے نکل جاؤں گا۔ میرے ساتھیوں میں سے کوئی بھی نہیں ملے گا کیونکہ ہم کاروبار کو منتقل کر چکے ہوں گے۔ کسی اور شہر یا کسی اور ملک میں۔ ہاں، پولیس تمہیں منتظر ملے گی، میر شرافت علی کے قتل کے کیس میں گرفتار کرنے کے لیے۔"

میں خاموش لیٹا سنتا رہا۔ چوہدری دلاور کا یہ منصوبہ بھی بہت مکمل تھا۔

"اور تمہیں یقین ہے کہ تم آٹھ نو سال تک خود بھی زندہ رہو گے؟" میں نے کہا۔ "میں بھی زندہ رہوں گا اور اسی طرح تمہاری قید میں جیسے اس وقت ہوں؟"

"معاف کرنا، میں بشرطِ زندگی کہنا بھول گیا تھا۔" دلاور نے طنز سے کہا۔ "کل کیا ہو گا اس کا دعویٰ سو فیصد یقین کے ساتھ کس نے کیا ہے؟ وہ کیا کہتے ہیں۔ سامان سو برس کا، پل کی خبر

نہیں۔ تو یہ بھی میرا ارادہ ہے یا منصوبہ ہے اور منصوبے تو حکومت بھی بناتی ہے۔ ایک پنج سالہ منصوبہ، پھر دوسرا، پھر تیسرا۔ کہ ہم یہ کریں گے اور وہ کریں گے اور ہر سال بجٹ بھی پیش کیا جاتا ہے کہ آئندہ ایک سال میں کیا ہوگا۔ آدمی گھر بنانے کی فکر میں رہتا ہے۔ اس کے لیے دن رات محنت کرتا ہے اور پس انداز کرتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کی بنیاد رکھنے سے پہلے کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ موت پر ہر لحظہ یقین رکھنے کے باوجود اور ہر سانس کو آخری سانس شمار کرنے کے باوجود ہر شخص زندگی کے کاروبار میں مگن ہے اور اس کی نظر آنے والے وقت پر ہے۔"

"تمہارا دعویٰ ہے کہ تم سوچے سمجھے بغیر کوئی کام نہیں کرتے اور بے مقصد نہیں کرتے۔" میں نے کہا۔ "پھر یہ کیا ہے۔ ایک طرف تم میری لاش ارسال کر رہے ہو کہ لواحقین کو میری موت کا یقین آجائے۔ دوسری طرف رابعہ سے بات کرا رہے ہو؟"

اس سے پہلے کہ وہ میری بات کا جواب دیتا، دوسرے کمرے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ دلاور اٹھ کے دوسرے کمرے میں گیا۔ "ہاں!" میں نے اس کی آواز سنی۔ "تم نے اچھی طرح معلوم کر لیا ہے نا؟ کیسے؟ کون ہے ڈیوٹی پر ٹیلیفون ایکسچینج میں؟ اچھا.... اچھا ٹھیک ہے۔" بات ختم ہو گئی اور وہ ٹیلی فون اٹھائے نمودار ہوا۔ یہ عام ٹیلی فون نہیں تھا۔ اس میں چوڑائی کے رُخ ایک حصے میں صفر سے نو تک ہندسوں والے نمبر تھے جن کو ڈائل گھمانے کے بجائے صرف انگلیوں سے دبانا کافی تھا مگر چند بٹن اس کے علاوہ تھے۔ دوسرے حصے میں لکیریں سی یہ ظاہر کرتی تھیں کہ پیچھے اسپیکر ہوگا۔ ٹیلی فون کے ساتھ ساتھ یہ تین لائنوں کا انٹرکام بھی تھا جسے ایک گھر یا آفس میں تین ٹیلی فون لگا کے آپس میں گفتگو کے لیے یا کال کو ایک فون سے دوسرے فون پر منتقل کرنے کے لیے استعمال کیا جا سکتا تھا۔ یہ کوئی انوکھی ایجاد نہیں تھی۔ بازار میں اس قسم کے سیٹ عام ملتے تھے۔

"لو بھئی۔ سابق ایس ایس پی صاحب نے اپنے گھر اور رابعہ کے آفس کی لائن پر تو آبزرویشن لگا رکھی ہے۔ تمہارے شیخ صاحب کا فون البتہ محفوظ ہے۔" دلاور نے کہا۔ "اب میں نمبر ملاتا ہوں۔ تمام گفتگو میں یہیں بیٹھ کے سنوں گا۔ تم کیسے پیغام دو گے؟"

"اگر شیخ ڈیوٹی پر ہوا تو اس کے والد ہوں گے یا نازو ہو گی، اس کی بہن۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ پیغام میں تم صرف اتنا کہو گے کہ رابعہ کو فون کر کے بلا لیا جائے۔ اسے بتا دیا جائے کہ سکندر بات کرے گا لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں اور یہ بات بھی صرف رابعہ کو بتائی جائے گی۔ وہ کسی کو بتائے بغیر آئے گی۔ اگر کسی اور کو معلوم ہوا تو بات نہیں ہو سکے گی۔"

میں نے سر ہلایا۔ "تم نمبر ملاؤ اور پیغام بھی خود ہی دے دو۔"

دلاور نے نفی میں سر ہلایا۔ "ہو سکتا ہے ایک اجنبی کی آواز پہ اعتبار کوئی نہ کرے۔" وہ نمبر ملاتے ہوئے بولا۔ لیکن فون کو اس نے اس انداز سے گود میں رکھا کہ میں نمبروں پہ اس کی ایک انگلی کو حرکت کرتے نہ دیکھ سکوں۔ ڈائل ہوتا تو اس کے گھومنے کی آواز سے مجھے ایک بات ضرور معلوم ہو جاتی کہ نمبر لوکل ہے یا اس نے ٹرنک نمبر ڈائل کیا ہے۔ پانچ بار نمبر ملانے کا مطلب ہوتا کہ بات لاہور ہی میں ہو رہی ہے۔ سات بار ڈائل گھومتا تو اس بات کا ثبوت ہوتا کہ ڈائریکٹ ڈائلنگ سے لاہور یا کراچی ملایا گیا ہے اور میں پنڈی میں ہوں۔ یا پھر کراچی میں۔

"ہیلو! کون بول رہا ہے؟" دلاور نے کہا اور میرا دل بے اختیار دھڑکا۔ اس خیال سے کہ میں دشمن کی قید سے اپنے گھر اپنی خیریت کی اطلاع دوں گا۔ جنگی اسیر اپنے زنداں سے ریڈیو کے ذریعے اپنے گھر والوں کو پیغام ارسال کرتے تھے اور وہ سب جن کے باپ بیٹے یا بھائی محاذ سے لوٹ کر نہیں آئے تھے اور لاپتا ہو گئے تھے دوسری جنگِ عظیم کے زمانے میں ریڈیو کے گرد جمگھٹا لگائے سانس روکے گوش بر آواز رہتے تھے۔ ان کے چہروں کی کیفیت کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا: تو بیک وقت امید اور ناامیدی، خوف اور غم و اندوہ میں مبتلا، اپنی دعاؤں کی قبولیت پر اعتماد کے باوجود عدم اعتماد کا شکار، آس کا دامن تھامے بیٹھے رہتے تھے اور جب اچانک، بالکل لاٹری میں نکل آنے والے انعام کی طرح کوئی نام آجاتا تھا۔ "میں سپاہی فلاں ولد فلاں۔ فلاں علاقے کا رہنے والا اپنے گھر والوں کو سلام کہتا ہوں۔ میں دشمن کی قید میں ہوں۔ بالکل فکر نہ کریں۔" اور اس وقت اچانک کوئی فرطِ مسرت سے چلانے لگتا تھا۔ رونے لگتا تھا، بکنے لگتا تھا اور ہنسنے لگتا تھا۔ سُنا کا کے دی ماں! وہ زندہ ہے۔ تیرا شکر ہے مولا۔ اور دوسرے جن کے حصے میں ابھی خوشی کا نامہ بر یہ لمحہ نہیں آیا تھا، بڑے رشک سے، اپنے دُکھ کے باوجود انہیں مبارکباد دیتے تھے۔ زندہ ہے تو کسی دن لوٹ بھی آئے گا۔ دشمن کی قید میں ہے تو کیا۔ کسی نامعلوم محاذ پر بے گور و کفن تو نہیں پڑا ہے۔ اس پر سے کوئی ٹینک تو نہیں گزرا۔ اور جب وہ اتنے مرحلے سے گزر گیا تو قیدِ زنداں کی مشکلات سے بھی گزر جائے گا۔ یہ تصویر کا بہت پرانا نقش تھا جو ہنوز میرے ذہن میں محفوظ تھا۔ ان جذبات کی تمام شدت کے ساتھ جو میں نے انتظار کرنے والوں کی صورت پر دیکھے تھے۔ پل بھر میں وہی تصویر بدلے ہوئے وقت اور کردار کے ساتھ زندہ ہو گئی۔

"ہیلو۔ کون ہیں جی آپ؟ کس سے کام ہے آپ کو؟" چھوٹے

اسپیکر سے نازو کی آواز آئی۔

"نازو بی بی! سکندر صاحب بات کریں گے آپ سے۔" دلاور نے سکون سے کہا اور ریسیور مجھے تھما دیا۔

"نازو!" میں نے بمشکل تمام کہا۔ "میں سکندر بخت بول رہا ہوں۔"

"سکندر؟" نازو کی ہسٹریائی چیخ سنائی دی۔ "کہاں ہو تم۔ اللہ۔ کتنے پریشان ہیں سب۔"

"سنو نازو! چیخ پکار مت مچاؤ۔" میں نے کہا۔

"شور کیسے نہ مچاؤں۔ یہاں سب کی حالت خراب ہے۔" نازو اب رونے لگی تھی۔ "یہ کیا کرتے ہو تم؟"

"نازو! میری بات سُن لو پہلے۔ میں مجبور ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں اس وقت کہاں ہوں۔ مجھے اتنی اجازت ملی ہے کہ رابعہ سے بات کر لوں لیکن رابعہ کے گھر اور دفتر دونوں جگہ فون کرنا مشکل تھا۔" میں نے کہا۔ "انکل نے لائن پر آبزرویشن رکھوا دی ہے۔ اس لیے تم کو.... تمہارے گھر فون کرنا پڑا۔ اب تم ایسا کرو کہ اسی وقت رابعہ کے پاس جاؤ۔ رکشا ٹیکسی کر کے یا کسی بھی طرح اور یہ رونا دھونا بھی بند کرو۔"

"میں بھائی جان کے ساتھ چلی جاؤں گی۔ وہ ڈیوٹی پہ نہیں ہیں۔" وہ بدستور سسکیاں لیتی رہی۔

"ٹھیک ہے۔ فون مت کرنا اُسے۔ سُنا تم نے۔ اور شیخ سے...."

"میں بُلا لیتی ہوں اُن کو بھی...."

"نہیں نہیں... ایسا غضب مت کرنا۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "کسی کو کچھ نہیں بتانا ہے۔ صرف رابعہ سے کہنی ہے یہ بات کہ میں بات کرنا چاہتا ہوں، تمہارے گھر میں۔ اسے ساتھ لے آنا لیکن نہ شیخ کو معلوم ہو کہ تم نے رابعہ سے کیا کہا ہے اور نہ کسی اور کو۔ رابعہ سے کہنا چُپ چاپ تمہارے ساتھ آجائے۔ کسی کو کچھ بتائے بغیر ورنہ میرے ساتھ بات کرنے کی اجازت نہیں ملے گی...."

"کیوں؟ تم کسی کی قید میں ہو کیا؟" نازو نے روتے ہوئے کہا۔

"بس کچھ ایسی ہی بات ہے۔ اگر تمہارے بھیا یا انکل کو معلوم ہُوا تو وہ پولیس والوں کی طرح اس نمبر سے بھی کال ٹریس کرنے کے چکر میں پڑ جائیں گے اور یہ لوگ... جنہوں نے مجھے بات کرنے کی اجازت دی ہے... ان کے تعلقات اور وسائل بہت وسیع ہیں۔ ان کو معلوم ہو جائے گا۔ اس لیے یہ بات میرے اور تمہارے درمیان رہنی چاہیے۔ میری قسم کھا کے کہو کہ ایسا ہی ہوگا۔"

"اپنی قسم دیتے ہو مجھے؟" وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ "کیوں؟ بولو سکندر؟"

"بس نازو... میں پھر فون کروں گا... ایک گھنٹے بعد۔" میں نے کہا۔

"سکندر!" وہ چلائی۔ "ابھی بند مت کرنا۔ خدا کے لیے.... ایک بات مجھے بھی کہنے دو... جو میں ابھی تک نہیں کہہ سکی تھی.... ایسا نہ ہو... خدا نہ کرے... کہ میں... پھر کوئی اجازت نہ دے... یا مہلت نہ ملے۔ مجھے یا تمہیں۔"

میں جانتا تھا کہ وہ کیا کہے گی لیکن میں مجبور تھا اور کوشش کے باوجود ریسیور نہ رکھ سکا۔ "جلدی بولو نازو۔"

"بات... بات بہت چھوٹی سی ہے... اور بہت بڑی ہے... میں تم سے محبت کرتی ہوں سکندر... اس کے باوجود کہ تم رابعہ کو چاہتے ہو اور کبھی میرے نہیں ہو سکتے... یہ میرے اختیار کی بات نہیں رہی کہ تمہیں نہ چاہوں...۔"

میں نے ریسیور رکھ دیا اور اپنی آنکھیں بند کر لیں لیکن نازو میرے تصور میں اسی طرح ریسیور تھامے کھڑی رہی۔ اس کی آواز اب بھی مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ سکندر... سکندر۔ تم سُن رہے ہو نا... ہیلو... ہیلو...!

"زندگی میں اتنے چاہنے والے مجھے نہیں ملے۔" دلاور مسکرایا۔ "میں کیا کہوں تمہیں، خوش نصیب یا بدنصیب؟"

"خود تم نے کسے چاہا دلاور؟" میں نے کہا۔ "کس کی آرزو کی؟ صرف مال و زر کی۔ تمہارے دل میں چاہت کی گنجائش ہی کہاں تھی؟ تمہارا دل تو سونے کا ایک ڈلا تھا۔ صرف دماغ تھا تمہارے پاس۔ اس سے تم نے جو چاہا پا لیا۔ اب شکوہ کیسا۔ کچھ لوگوں کے نقطۂ نظر سے تم انتہائی خوش نصیب ہو۔"

"تم پر اس لیے افسوس ہوتا ہے کہ اپنی خوش نصیبی کو تم نے اپنی اَنا پر قربان کر دیا۔" وہ بولا۔ "یہ اَنا کا مسئلہ آخر کیا تھا۔ احمقانہ جذباتیت۔ جوانی کی شوریدہ سری۔ عاقبت نااندیشی۔ کتنا اچھا ہوتا اگر تم دس بیس لاکھ روپے لے کر واپس چلے جاتے۔ فوزیہ، رابعہ اور نازو جیسی لڑکیاں ہی کیا ساری دنیا کی رنگینی ہی اس عمر میں تمہارے لیے تھی۔ عقل کی آنکھ سے دیکھتے تو دنیا تمہیں بیس لاکھ کی روشنی میں بڑی خوبصورت نظر آتی۔ لیکن تم اُلٹے چکر میں پڑ گئے۔ گڑے مُردے اکھاڑنے کے، انتقام کے اور محاورے کے مطابق، دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنے کے چکر میں۔ اب تک کیا ملا ہے تمہیں اور میرا کیا گیا ہے۔ کبھی نفع نقصان کی بیلنس شیٹ دیکھو۔ گھاٹے میں کون جا رہا ہے؟ تکلیف کون اُٹھا رہا ہے؟"

"مشکل یہ ہے کہ تم آج کی بات کر رہے ہو اور میں کل کو دیکھتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"کون سے کل کو؟ وہ جو گزر گیا، یا وہ جو آئے گا ہی نہیں؟" دلاور نے پُرتمسخر لہجے میں کہا۔

"دونوں کو۔ جو کل ہوا اُسے بُھلانا میرے بس کی بات نہیں اور آنے والے دن پر میرا اعتقاد کبھی متزلزل نہیں ہو سکتا خواہ

حالات اس سے بھی زیادہ سخت ہو جائیں۔" میں نے کہا۔

"تم نے مجھ سے ایک سوال کیا تھا۔" دلاور نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "ٹیلی فون آنے سے پہلے۔ کہ تمہاری وفات کا ثبوت فراہم کرنے کے بعد تمہاری گفتگو کرانے میں کون سی عقلمندی ہے؟ تو اپنے سکندر صاحب۔ وہ تحفہ پہنچے گا دو چار دن بعد۔ بات کر گئے تم ابھی۔ نکالنے والے تو یہی نتیجہ نکالیں گے تاکہ تم بعد میں مارے گئے کسی غلطی کے باعث۔ بعض اوقات بہادری بھی تو غلطی ہی جاتی ہے اور اس میں کسی کو شک نہیں کہ تمہیں بہادر بننے کا بہت شوق ہے۔ پھر کچھ دن یہی سسپنس چلے گا کہ تم زندہ ہو یا نہیں اور ہو تو کہاں ہو؟ اخبارات سے ہمیں معلوم ہوتا رہے گا کہ تمہارے انکل کیا توپ چلا رہے ہیں اور تمہارے چاہنے والے کہاں کہاں کی خاک چھان رہے ہیں؟"

"گویا تمہیں یقین نہیں کہ اس لاش کا تحفہ وصول کرنے کے باوجود بھی ان کو میری موت کا اعتبار آئے گا؟"

دلاور ہنسا۔ "ارے وہ ایس ایس پی بہت ہوشیار ہے اور اس کے ساتھ ہے ایک تو تمہاری سب کچھ۔ وکیل، محبوبہ، منگیتر۔ وہ بھی کم چالاک نہیں۔ تیسرے شیخ جی ہیں۔ وہ چھان بین کر کے پتا چلا لیں گے کہ لاش کسی اور کی ہے۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ کچھ عرصے بعد ہم پھر کہیں سے تمہاری آواز سنوا دیں گے انہیں۔"

"کتنے عرصے بعد؟" میں نے محسوس کیا کہ میرے لہجے میں مایوسی کا عنصر غالب آنے لگا ہے۔

"بھئی ابھی تو بات کی ہے تم نے۔" دلاور بولا۔ "اب چار چھ مہینے کی مکمل خاموشی ضروری ہے۔ جب دیکھیں گے کہ وہ کچھ مایوس ہونے لگے ہیں تو انہیں اُمید کا دوسرا انجکشن دے دیں گے۔"

"لیکن تم نے تو ابھی طلب کیا ہے رابعہ کو۔ ایک گھنٹے میں۔"

دلاور قہقہہ مار کے ہنسا۔ "بھولے بادشاہو۔ رابعہ آتی ہے تو آنے دو۔ وہ بیٹھی رہے گی۔ انتظار کرتی رہے گی، شام تک یا رات تک۔ اصل مقصد تو حاصل ہو گیا۔ نازو نے تمہاری آواز پہچان لی۔ تم سے بات کر لی۔ اسے معلوم ہو گیا کہ تم قیدی ہو اور مجبور ہو۔ اتنا کافی ہے۔ اب وہ رو رو کے اور قسمیں کھا کھا کے لوگوں کو یقین دلاتی رہے گی کہ غلط فہمی کا کوئی سوال نہیں۔ آواز سکندر کی تھی لیکن اور کسی سوال کا جواب نہ دے سکے گی۔ کرنے والے تو اس سے ہزاروں سوال کریں گے۔ تحریری بیان لیں گے۔ ایک ایک لفظ جو تم نے کہا یا اس نے کہا لکھ کر دینے کو کہیں گے۔ سوائے اس آخری بات کے وہ سب لکھ دے گی اور بتا دے گی مگر اس کے بعد فل اسٹاپ۔

اچھا اب میں چلتا ہوں۔"

صرف ٹیلی فون تھا جو میں اس پر پھینک کر مار سکتا تھا۔ وہ اُٹھ کر دو ہی قدم گیا تھا کہ میں نے گالیاں دیتے ہوئے ٹیلیفون اس کے سر کا نشانہ لے کر پھینکا۔ مگر ٹیلی فون کے ساتھ تار تھا، چنانچہ دلاور بال بال بچ گیا۔ ٹیلی فون اس کے جسم سے چند انچ دور رہ گیا اور تار کی لمبائی ختم ہو جانے کے بعد جھٹکے سے نیچے گر کر ٹوٹ گیا۔

"ویسے کوئی نہ کوئی تمہاری خبر گیری کے لیے یہاں ہر وقت موجود رہے گا۔" دلاور نے ٹیلی فون کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "اور تمہاری ہر ضرورت پوری ہوتی رہے گی۔ پھر بھی کسی چیز کی کمی ہو یا مجھ سے کوئی بات کرنی ہو تو بتا دینا۔ جیسے ہی مجھے فرصت ملی میں آ جاؤں گا۔" اس نے دروازہ بند کیا اور باہر نکل گیا۔

کمرے کے اندر اپنی اسیری اور تنہائی کا احساس پوری شدت کے ساتھ مجھ پر مسلط ہونے لگا۔ میرے پیروں میں کوئی زنجیر نہیں تھی اور میرے ہاتھ بھی آزاد تھے لیکن میں اٹھ کر کھڑکی تک بھی نہیں جا سکتا تھا۔ جسمانی طور پر نقل و حرکت کے قابل ہونے تک اس قید سے نجات کی کوشش کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ زنداں کی دیواروں سے نکلنے اور فرار ہونے کے لیے جسمانی قوت بغیر صحت کے نہیں حاصل ہو سکتی تھی چنانچہ ابھی تو میرے لیے سوائے لیٹے رہنے کے کوئی کام نہ تھا۔ کسی سے بات کیے بغیر اور بالکل بے کار لیٹ کر چوبیس گھنٹے کا پورا دن کیسے کٹے گا۔ صبح کرنا شام کا اور پھر شام کرنا صبح کا دونوں ہی جوئے شیر لانے سے زیادہ مشکل کام ہوں گے۔ اس پر وہ ذہنی عذاب جو تصور دے گا جو ہر تصویر پیش کرے گا۔ ان سب کی صورت پر رنج و الم کی ہر کیفیت کا عکس دکھائے گا جو دن رات کے ہر لمحے میں پریشان ہوں گے۔ یقین اور بے یقینی کے درمیان معلق رہیں گے اور ایک موہوم اُمید پر جئیں گے۔ اچھا ہوتا اگر ایک ہی بار وہ مان لیتے کہ سکندر دنیا سے خالی ہاتھ گیا لیکن وہ میری آواز سن چکے ہیں۔ انہیں میری زندگی کا یقین آ چکا ہوگا۔ رابعہ نے پہلے ہی بتا دیا ہوگا کہ مجھے کن حالات میں اور کس طرح اغوا کیا گیا تھا۔ اب نازو بتا دے گی کہ میں نے اسے کیوں فون کیا تھا؟ مجھے اکیلا پا کے بھیانک خیالوں کے عفریت ہر سمت سے نمودار ہونے لگے۔ ان کے ہاتھوں میں نوکیلے خنجر اور بھالے تھے جن سے وہ دل کو چھیدتے تھے۔ ان کی زبان خار دار تھی جو روح کو زخم دیتی تھی اور ان کی آنکھیں زہر کے پیالے جو نزع کے کرب میں مبتلا تھے۔ کیا محسن سچ مچ مر گیا؟ بالآخر؟ کب سے وہ اس جنگ میں میرے ساتھ تھا۔ ہر فتح اور ہر شکست میں شریک تھا۔ میرے لیے اتنا ہی ناگزیر ہو چکا تھا جتنا روح کے لیے ایک جسم کا وجود۔ اب یہ ذہن

کرنا کہ اس کو کفن میں لپیٹ کر کندھوں پر اٹھا لیا گیا اور قبر میں رکھ کے اس پر مٹی ڈھیر کر دی گئی۔ نہیں۔ یہ ناممکن ہے۔ ہا ہا ہا۔ دلاور کی ہنسی ایک بازگشت بن کے گونجی۔ ہم سب مر سکتے ہیں سکندرِ اعظم۔ کیا اور لوگوں کو مرتے نہیں دیکھا تم نے؟ محسن کیا لافانی تھا؟ تھا تو انسان ہی نا۔ انسان فانی ہے۔

یہ سب جھوٹ بھی ہو سکتا تھا کیونکہ چوہدری دلاور بہت بڑا ڈرامے باز تھا۔ ایکٹر، ڈائریکٹر اور سنسنی خیز پلاٹ بنانے والا۔ ابھی ابھی دو بار اس نے اپنے جھوٹ کے سچ ہونے کا یقین دلا دیا تھا۔ اس نے مجھے واقعی دہشت زدہ کر دیا تھا کہ ڈاکٹر کی لاش کو میری لاش بنا کے شہلا کے نام ارسال کر دیا گیا ہے اور یہ سب کچھ ایک انتہائی اذیت دہ اور ہولناک تجربہ تھا۔ پھر اس نے شک کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی تھی کہ کچھ دیر میں میری بات رابعہ سے ہو گی اور پھر چٹکی بجا کے خوابِ آرزو کو ختم کر دیا۔ عین اس وقت جب تصور رابعہ کو روبرو دیکھ رہا تھا اور اس سے ہمکلام تھا۔ اس نے بہت چالاکی سے اپنا مقصد پورا کر لیا تھا لیکن اس کی باتوں میں آ کے میں نے ایک موقع گنوا دیا تھا۔ میں نے نازو سے وہ سب نہیں کہا تھا جو میں رابعہ سے کہنا چاہتا تھا۔ مجھے خود معلوم نہیں تھا کہ میں اس سے کیا کہوں گا اور کیا کہہ سکوں گا لیکن میں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ واضح الفاظ میں نہ سہی، اشاروں میں کچھ نہ کچھ بتانے کی کوشش ضرور کروں گا۔ نازو کی نسبت رابعہ زیادہ ذہین اور سمجھدار تھی۔ وہ سمجھ لیتی لیکن اب وہ شیخ کے گھر میں ٹیلی فون کے پاس گم صم بیٹھی ہو گی۔ ایک ایک لمحے کا انتظار ایک صدی کا انتظار ہو گا۔ لیکن ٹیلی فون چپ رہے گا۔ اس کی گھنٹی اگر بجے گی تو محض دھوکا دینے کے لیے۔ جھوٹی اُمیدوں کا مذاق اُڑانے کے لیے۔

یقین اور بے یقینی کے درمیان لٹکتے رہنا جانکنی کی تکلیف سے کم نہ تھا۔ کاش کوئی مجھے صرف اتنا بتا سکتا کہ محسن زندہ ہے اور رضوی صاحب کو میری وجہ سے مستعفی نہیں ہونا پڑا۔ دلاور کے جھوٹ کا پردہ محسن کی ایک غیر شعوری حرکت نے چاک کر دیا تھا۔ پیڈرو کے ایک جھوٹ کو دلاور نبھانے میں ناکام رہا تھا۔ پیڈرو نے مجھ سے رابعہ کے بارے میں یہ کہا تھا کہ وہ رضوی صاحب کے گھر میں تو یقیناً نہیں ہے مگر دلاور نے کسی تذبذب کے بغیر بتا دیا تھا کہ وہ اپنے گھر میں ہے۔ چنانچہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ سب جھوٹ ہو جو میرے سامنے سچ بنا کے پیش کیا گیا تھا۔ وہ صرف مجھے اغوا کرا لائے ہوں۔ اغوا کی اس واردات کے محرکات کیا تھے، یہ دلاور مجھے اچھی طرح سمجھا گیا تھا۔ کسی اور سے ان کو غرض نہ تھی چنانچہ ان کو گزند پہنچانا غیر ضروری تھا۔

زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ اس رات حملے کے بعد وہ مجھے بیہوشی کے عالم میں اٹھا لائے۔ محسن اور رابعہ کسی وجہ سے ان کا تعاقب نہیں کر سکے۔ حملہ آوروں کی گاڑی تو پھنس گئی تھی۔ ممکن ہے وہ مجھے اسی گاڑی میں ڈال کے فرار ہوئے ہوں جس میں رابعہ تھی۔ میری نگاہ پھر دیوار پر گئی۔ وقت اور تاریخ نظر کا دھوکا نہیں تھے لیکن یہ عقل کو فریب دینے کا ایک طریقہ ہو سکتا تھا۔ گھڑی کی سوئیوں کو اگر گھما کر چوبیس گھنٹے آگے کر دیا جائے تو تاریخ خود بخود ایک دن آگے بڑھ جاتی ہے۔ ایسے سات دن آگے بھی کیا جا سکتا ہے۔ مجھے باور کرانے کے لیے کہ گزشتہ شب کا واقعہ درحقیقت ایک ہفتہ پہلے پیش آیا تھا۔

پیڈرو نے یہ بھی کہا تھا کہ تمام واقعات اخباروں میں آ چکے ہیں۔ اگر یہ جھوٹ تھا تو انتہائی احمقانہ جھوٹ تھا جو پیڈرو تو بول سکتا تھا لیکن دلاور کبھی نہ بولتا۔ میں ثبوت کے لیے اخبار مانگ سکتا تھا۔ ایک بار تو اس نے بڑی خوبصورتی سے مجھے ٹال دیا تھا لیکن ایسے وہ کب تک ٹالے گا؟ اور ٹالے گا تو اس کے جھوٹ کی قلعی کھل جائے گی۔ پھر میں نے اس امکان پر غور کیا کہ کیا وہ تاریخ بدل کے یا مٹا کے مجھے کوئی اخبار دکھا سکتا ہے اور میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ اخبار کے ہر صفحے پر ہی نہیں ہر خبر کے ساتھ تاریخ ہوتی ہے جو زیادہ سے زیادہ دو دن پہلے کی ہو سکتی ہے۔ وہ خبر کون چھاپتا ہے جو تین دن پرانی ہو۔ بیشتر خبروں پر گزشتہ دن کی تاریخ ہو گی۔ چوہدری دلاور کے وسائل بہت زیادہ تھے۔ وہ ایک اخبار چھاپ کے مجھے پیش کر سکتا تھا جس میں مجھے ہر خبر مل جائے اور تاریخ بھی لیکن یہ کسی کرائے کے قاتل کی خدمات حاصل کرنے کے مقابلے میں انتہائی دشوار کام تھا۔ اخبار کا ایک صفحہ ترتیب دینا بھی عقل اور ذہانت کا، تجربے اور مہارت کا اور خالص تکنیکی نوعیت کا کام ہے۔ اہمیت کے اعتبار سے ہر صفحے پر خبر کا انتخاب۔ سرخی کی تشکیل۔ متن کا مضمون۔ کتابت اور طباعت، سب زرعی آلات بنانے سے مختلف کام تھے۔ ہر اخبار میں سیکڑوں خبریں ہوتی ہیں۔ پہلے صفحے پر بین الاقوامی۔ اندر ایک صفحہ شہر کی مقامی خبروں کا۔ پھر ڈسٹرکٹ کی خبریں جو ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے نمائندے ایک سے ایک غیر معروف مقام سے ارسال کرتے ہیں۔ پریس ریلیز اور بیانات۔ فیچر اور تصاویر۔ نہیں یہ کام چوہدری دلاور اپنا تمام پیسہ اور اثر و رسوخ استعمال کر کے بھی نہیں کر سکتا۔

سیدھا طریقہ یہ تھا کہ میں پیڈرو سے گزشتہ ایک ہفتے کے اخبارات طلب کروں اور اس مطالبے کو اس کی جان کے لیے عذاب بنا دوں یہاں تک کہ وہ ٹالتے ٹالتے تنگ آ جائے اور صاف انکار کر دے۔ اس کا انکار دراصل اقرار ہو گا کہ اس نے صرف جھوٹ

بولا تھا لیکن پیڈرو ہے کہاں؟ میں نے کان لگا کے آواز سننے کی کوشش کی مگر اس گھر میں تو جیسے کوئی تھا ہی نہیں۔ ہر سمت ایک گہرا سکوت تھا۔ بوجھل اور بے کراں۔ باہر سے بھی کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ نہ کسی گاڑی کے گزرنے کی، نہ کسی کے باتیں کرنے کی۔ میں گوش برآواز رہا تھا۔ کہیں کوئی بچہ رونے، کوئی قہقہہ مار کے ہنسے، کسی کے ہاتھ سے کوئی برتن گرے، کوئی دروازہ کھلے یا بند ہو۔ زندگی اپنے وجود کا کوئی تو ثبوت دے لیکن آس پاس صرف سناٹا تھا جس میں کسی پرندے کی صدا تک نہ تھی۔ یہ کیسا ویرانہ ہے۔ میں نے سوچا۔ ورنہ چڑیاں کہاں نہیں بولتیں۔ کوے کہاں نہیں ہوتے۔ آبادیوں کے باہر تو طوطے اور مینا۔ کوئل اور شیاما کی آواز بھی سنائی دے جاتی ہے۔

میں نے اپنی موجودہ حالت پر غور کیا۔ پیڈرو نے میری مجروح ٹانگ کو کرسی مار مار کے بالکل ناکارہ بنا دیا تھا اور اب یہ ٹانگ بری طرح درد کر رہی تھی۔ تکلیف دائیں ہاتھ میں بھی تھی چنانچہ عملاً میرے جسم کا دایاں نصف حصہ کارآمد نہیں رہا تھا لیکن اس وقت میں ایک ٹانگ اور ایک ہاتھ کو کام میں لا سکتا تھا۔ میری نگاہ فرش پر گئی۔ ڈاکٹر کا بیگ وہیں دھرا ہوا تھا جہاں سے اس کو اٹھاتے اٹھاتے وہ خود جہاں سے اٹھ گیا تھا۔ ڈاکٹر کو اس مرگِ ناگہاں پر حیران ہونے کا وقت تک نہ ملا۔ جب وہ پچاس ہزار روپے ماہانہ کا حقِ نمک ادا کرنے یہاں آیا تھا تو اس نے اپنی شاندار گاڑی کسی پوشیدہ مقام پر روکی ہو گی اور تھوڑا سا فاصلہ پیدل طے کرتے وقت بھی اس کے ذہن میں جلد از جلد واپسی کا خیال ہو گا۔ آج شام سے رات تک کی مصروفیات کا خیال ہو گا لیکن یہ خیال ہرگز نہیں ہو گا کہ اگلے آدھے گھنٹے میں اس کی لاش کا چورا کر کے اسے ڈبے میں پیک کر دیا جائے گا اور وہ لوحِ جہاں سے حرف مکرر کی طرح مٹ جائے گا، غائب ہو جائے گا۔ کیا کوئی اس کی واپسی کا انتظار نہیں کرے گا؟ میں نے سوچا اور جب وہ لوٹ کر نہیں جائے گا تو کوئی پریشان نہیں ہو گا؟ کوئی اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج نہیں کرائے گا؟ امید کی ایک کرن روشن ہوئی اور بجھ گئی۔ رپورٹ لکھوانے سے کیا ہو گا؟ کسے معلوم ہو گا کہ کلینک سے وہ کہاں گیا؟ اس نے کسی کو نہیں بتایا ہو گا کہ وہ مجرموں کے ایک گروہ میں شامل ہے اور مسیحا بن کے قاتل ہو گیا ہے۔ نشترِ جراحی چھوڑ کے اس نے تیشۂ جلاد اٹھا لیا ہے۔ اس نے اپنے مذموم کاروبار کا سراغ کہیں نہیں چھوڑا ہو گا۔ پھر کوئی اس کا سراغ یہاں تک کیسے لگائے گا؟

میں نے بائیں جانب جھک کر جسم کو تھوڑا سا گھسیٹا اور آگے جھکا۔ بیگ میری دسترس میں تھا۔ میں نے اسے جھکا کے اندر جھانکا۔ اس میں وہ سب کچھ تھا جو ایک عام ڈاکٹر کے میڈیکل بیگ میں ہوتا ہے لیکن اس کے علاوہ بھی کچھ تھا۔ کوئی جانی پہچانا زہر۔ سفوف، گولی یا انجکشن کی صورت میں۔ چند مہلک زہر میں نے بھی دیکھے تھے۔ مثلاً سنکھیا اور نیلا تھوتھا۔ کچھ کا میں نے ذکر سنا تھا یا پڑھا تھا لیکن میں ان کو شناخت نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ بعض مخصوص حالات میں جو دوا کسی کو شفا دیتی ہے وہی ایک صحت مند آدمی کو دی جائے تو وہ مر جاتا ہے۔ کچھ دواؤں کی مقررہ مقدار فائدہ مند ہوتی ہے، زیادہ مقدار ہلاکت کا سبب بن جاتی ہے لیکن میں کوئی ڈاکٹر نہیں تھا کہ مجھے یہ سب معلوم ہوتا اس کے علاوہ میرے پاس اتنا وقت بھی نہیں تھا کہ میں بیگ سے ہر شیشی، ہر پیکٹ اور انجکشن کو نکال کے اس کا معائنہ کرتا۔ پیڈرو کسی وقت بھی آ سکتا تھا۔ پورے بیگ کو چھپانا عملاً ناممکن تھا لیکن اس کا سامان نکالا جا سکتا تھا۔ سب سامان نکال لینا شکوک پیدا کرتا۔ میں نے جلدی جلدی بیگ میں ہاتھ مارا۔ ایک پیکٹ میں پانچ سی سی کا انجکشن بھرا ہوا تھا۔ مجھے تھوڑی سی حیرت ہوئی۔ ڈاکٹر صرف ضرورت کے وقت سرنج بھرتے ہیں اور وہ بھی سٹیرلائز کرنے کے بعد۔ میں نے اس پیکٹ کو فوراً تکیے کے نیچے چھپا دیا۔

ایک نظر دروازے پر اور کان آہٹ پر رکھتے ہوئے میں نے بڑی عجلت میں شیشیوں کو دیکھا۔ بیشتر پر کمپنی کا لیبل تھا اور دوا کا نام صاف لکھا ہوا تھا۔ صرف تین شیشیاں ایسی تھیں جن پر سے لیبل اتار دیا گیا تھا۔ شیشیوں کا رنگ گہرا ہرا تھا۔ ایک میں گولیاں تھیں اور دو میں پاؤڈر تھا لیکن کسی کے رنگ کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ میں نے یہی تینوں شیشیاں تکیے کے نیچے رکھیں اور بیگ کو واپس وہیں رکھ دیا جہاں سے اٹھایا تھا۔ اپنی بے بسی کا احساس کچھ کم ہوا۔ خنجر، پستول نہ سہی میرے پاس کچھ تو آیا جس کو میں اپنا اسلحہ سمجھوں۔ شاید تقدیر ساتھ دے تو میں اسی سے شکاری کو شکار کر سکوں۔

پھر میری نظر نے ٹوٹی ہوئی کرسی کو دیکھا جو خاصے فاصلے پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کا ایک پایہ ٹوٹ کر الگ ہو گیا تھا منصوبہ ایک دم میرے ذہن میں آ گیا۔ بات صرف جسمانی ہمت کی تھی۔ اگر میں کسی طرح اٹھ کے دروازے تک جا سکوں تو یہ ہو سکتا ہے کہ دیوار سے لگ کے کھڑا ہو جاؤں اور اس مضبوط ڈنڈے کو ہاتھ میں تھامے تیار کھڑا رہوں۔ دروازہ کھلتے ہی جو بھی اندر آئے اس کے سر پر پوری قوت سے وار کروں اور اسے ناک آؤٹ کر دوں لیکن اندر تین آدمی آ سکتے تھے جو شاید اس وقت ڈاکٹر کی تدفین میں شریک تھے۔ پیڈرو، نواب خسرو جمشید کہلانے والا بہروپیہ اور سیمسن۔ آگے یقیناً پیڈرو ہو گا یا خسرو جمشید۔ ایک ناک آؤٹ ہو

جائے گا لیکن دوسرا مجھے ناک آؤٹ کر دے گا۔ بالفرضِ محال میں نے اسے بھی کھینچ لیا تو سیمسن رہ جائے گا۔ اُس نے مجھے پکڑ لیا تو میری ہڈیاں چُرمُر کر دے گا لیکن اس کے ڈیل ڈول سے نمٹا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ اُسے قریب آنے کا موقع ہی نہ دیا جائے۔

ابھی میں نے سخت جدوجہد کے بعد نیچے قدم رکھا ہی تھا کہ نہ جانے کہاں ایک گھنٹی بجنے لگی لیکن کال بیل نہیں تھی۔ میں نے ایک پیر پر توازن قائم رکھتے ہوئے بیڈ کے کنارے کو تھاما اور جھک کر آگے بڑھا۔ اُسی وقت دروازہ کھلا اور سفید وردی میں ایک نرس اندر آ گئی۔

"یس سر؟" اُس نے سپاٹ لہجے میں سوال کیا۔

"تم کہاں سے آ گئیں؟" میں نے خفت سے سر کھجایا۔ "کیا میں نے تمہیں طلب کیا تھا؟"

"اس گھنٹی کا مطلب ہے کہ آپ کو میری مدد کی ضرورت ہے۔" وہ اتنے ہی جذبات سے عاری لہجے میں بولی۔

نرس اٹھائیس برس کی ہو سکتی تھی اور اڑتیس کی بھی۔ عورت کی عمر میں لباس کی تبدیلی سے کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ یہ میرا ذاتی مشاہدہ تھا کہ اچھی خاصی جوان لڑکیاں اسکول یونیفارم میں بچی نظر آتی ہیں۔ انہی کو اسکول کے فنکشن میں دیکھ کر تعجب ہوتا ہے جب وہ اپنے بہترین لباس میں سج دھج کے آتی ہیں۔ ساڑی میں عمر زیادہ لگتی ہے تو شلوار قمیص میں کم ہو جاتی ہے اور پیشہ ورانہ قسم کے یونیفارم میں گڑبڑ ہو جاتی ہے۔

"جہاں تک میری یادداشت کا تعلق ہے۔" میں نے کوئی جواب نہ پا کے کہا۔ "میں نے کوئی گھنٹی نہیں بجائی۔"

اُس نے کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں کیا اور مجھے پلک جھپکائے بغیر دیکھتی رہی۔ گھنٹی ابھی تک بند نہیں ہوئی تھی۔

"آل رائٹ۔" میں نے بستر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "میں نے باتھ روم جانا ہے۔" گھنٹی اچانک بند ہو گئی۔

"آپ بیساکھی لے کر جا سکتے ہیں۔ میں دیکھ رہی ہوں۔" وہ بولی۔

"عجیب بات ہے! ابھی تم نے کہا تھا مدد کرنے آئی ہو۔ اب مشورہ دے رہی ہو کہ بیساکھی لے کر چلے جاؤ۔ میں اپنی مدد آپ کروں؟ دیکھنے کی مجھ میں کون سی بات ہے؟" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ گھنٹی پھر بجنے لگی اور اچانک یہ انتظام میری سمجھ میں آ گیا۔ "ویری گڈ۔ سارا آٹومیٹک نظام ہے۔" میں پھر بیٹھا، اٹھا اور گھنٹی بند ہو کے دوبارہ بجنے لگی۔ اس کا سلسلہ میرے بیڈ سے ملا ہوا تھا۔ بیڈ پر میرا دباؤ رہتا تھا تو کسی تار سے منسلک کوئی سوئچ بھی آف رہتا تھا ــــــ دباؤ کم ہوتے ہی سوئچ آن ہو جاتا تھا۔ بالفاظ دیگر گھنٹی ایک الارم تھی کہ قیدی نے بستر سے نیچے قدم رکھا ہے۔ نرس خوبصورت نہیں تھی تو بدصورت بھی نہیں تھی۔

"اگر بیساکھی لے کر میں باتھ روم کی طرف نہ جاؤں، بلکہ دروازے سے باہر نکلنے کی کوشش کروں تو کیا تم میرا راستہ روک سکو گی؟" میں نے کہا۔

"یس سر۔ میرے پاس دو قسم کے پستول ہیں!" وہ بولی۔ "ایک سے میں آپ کی ٹانگ پر گولی مار دوں گی۔"

"میرا بھی یہی خیال تھا۔" میں نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔ "یہ دوسری قسم کا پستول کیا ہے؟ پستول تو صرف گولی چلانے کے لیے ہوتے ہیں۔ بے شک بچے پچکاری والے پستول بھی استعمال کرتے ہیں لیکن تم بچی تو نہیں ہو۔"

"ضرورت کے وقت آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ دوسرا پستول کس کام آتا ہے۔" وہ بولی۔ "اب آپ باتھ روم ہو آئیں۔ آپ کے ڈنر کا اور دوا کا وقت ہو رہا ہے۔ مجھے آپ کو انجکشن بھی دینا ہے۔"

"اب کس کی ہمت ہے کہ میرے قریب آ کے مجھے انجکشن لگا سکے۔" میں نے لیٹتے ہوئے کہا۔ "ڈاکٹر نے یہ غلطی کی تھی اور اسے زندگی سے ہاتھ دھونے پڑے۔"

نرس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور باہر نکل گئی۔ جب وہ دوبارہ کھانے کی ٹرے لیے نمودار ہوئی تو میں سیدھا لیٹا چھت کو گھور رہا تھا اور اس حوصلہ شکن صورتِ حال پر غور کر رہا تھا۔

"لے جاؤ یہ کھانا۔ مجھے بھوک نہیں ہے۔" میں نے دہاڑ کر کہا۔ نرس نے ٹرے کو دروازے کے قریب رکھ دیا۔

"پھر آپ کو سو جانا چاہیے سر، آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔" نرس نے مخصوص پیشہ ورانہ لہجے میں کہا۔

"میں سونا بھی نہیں چاہتا ابھی۔" میں نے بیزاری سے منہ پھیر لیا۔ "جب نیند آئے گی سو جاؤں گا۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور میں نے فرض کیا کہ اب وہ کھانے کی ٹرے اٹھائے گی اور چلی جائے گی۔ میں نے اس سے کوئی بھی غلط بات نہیں کی تھی۔ حقیقت یہی تھی کہ اس ذہنی پریشان حالی میں میری نیند، بھوک کا کوئی سوال نہ تھا۔ اچانک میری پشت پر شانے کے قریب ٹیس اٹھی اور مجھے یوں لگا جیسے کوئی نوکدار شے میرے جسم میں پیوست ہو گئی ہے۔ میرا خیال غلط نہیں تھا۔ میں نے کراہ کے ہاتھ سے دیکھا تو شانے میں تقریباً چھ انچ لمبا ایک ننھا سا تیر گڑا ہوا تھا اور وہ نرس ہاتھ میں پستول جیسی کوئی چیز لیے کھڑی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس پستول کی نالی زیادہ لمبی تھی۔

"یہ کیا حرکت ہے؟" میں نے مشتعل لہجے میں کہا اور تیر کو کھینچ کر

نکالا جو ربر کا بنا ہوا تھا۔
"پریشانی کی کوئی بات نہیں سر" وہ پستول کو اپنی یونیفارم میں ڈال کے جھکی "آپ کو انجکشن لگا دیا گیا ہے۔ چند منٹ بعد آپ سکون سے سو جائیں گے۔"

اس سے پہلے کہ میں اس خبیث نرس سے کچھ کہتا وہ ٹرے اُٹھا کے اور دروازہ بند کر کے نکل گئی۔ اس نے کہا تھا کہ ضرورت پڑنے پر آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ دوسری قسم کا ریوالور کیا ہے اور اب اس کا استعمال خود پر میں نے اپنی آنکھوں سے ہوتے دیکھ لیا تھا۔ اس سے پہلے میں نے افریقی جنگلوں میں بنائی جانے والی فلموں میں شکاریوں کو ایسے کارتوس استعمال کرتے دیکھا تھا۔ جو وحشی درندوں کو بیہوش کر کے زندہ پکڑنے کے کام آتے تھے۔ شکاری چھپ کر نشانہ لیتے تھے اور ببر شیر، چیتے یہاں تک کہ وہ پیکر ہاتھی بھی کارتوس کے جسم میں پیوست ہوتے ہی تھوڑی دُور بھاگتے تھے اور چت ہو جاتے تھے۔

میرے شکاری بھی جانتے تھے کہ میرے قریب جا کے مجھے انجکشن لگانا آسان نہیں۔ ڈاکٹر کی موت کے بعد وہ اور خوفزدہ ہو گئے تھے۔ ان کے لیے میں بھی کسی وحشی درندے سے کم خطرناک نہیں تھا جسے وہ زیرِ دام لانے میں تو کامیاب ہو گئے تھے مگر اب اسے اسیر رکھنا بھی ایک چیلنج تھا۔ یا تو وہ مجھے زنجیروں سے باندھ کر رکھتے۔ اپنی موجودہ حالت میں انہوں نے یہ ضروری نہیں سمجھا تھا مگر تقریباً بے دست و پا ہونے کے باوجود میں نے ان کا ایک آدمی مار ڈالا تھا اور ان کے سیمسن کے حملے کا منہ توڑ جواب دیا تھا۔ اب کوئی میرے قریب آنے کا رسک کیسے لیتا۔ اگر وہ میری گرفت میں آ جاتا تو بچ کے نہ نکلتا۔ چنانچہ انہوں نے جو طریقہ اختیار کیا ٹھیک تھا۔

مجھے معلوم تھا اب اس "پستولی" انجکشن کے زیرِ اثر میں بہت جلد ہوش و حواس سے بیگانہ ہو جاؤں گا۔ شاید پھر ہوش آنے پر یہی ہوگا کہ میں خود کو دست و پا بستہ پاؤں گا۔ آہستہ آہستہ کمرہ میری نظر کے سامنے ہلنے لگا۔ پھر گھومنے لگا اور دھندلا پڑ گیا۔ نرس نے جاتے جاتے بلب جلا دیا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ جل بجھ سا رہا ہے۔ پھر سب کچھ غائب ہو گیا۔

▲

جب پھر میری آنکھ کھلی تو کمرے میں سورج کی روشنی تھی۔ میری نگاہ بے اختیار اس دیوار پر گئی جہاں گھڑی تھی لیکن گھڑی ہٹا لی گئی تھی۔ اب میں یہ اندازہ کرنے سے قاصر تھا کہ بیہوشی کی اس نیند کا وقفہ کتنا طویل تھا اور میں اگلی صبح جاگا ہوں یا پھر مجھے کئی دن عالمِ ہوش سے بیگانہ رکھا گیا ہے۔ دیو زاد سیمسن میرے سامنے دوسری طرف زمین پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا اور مجھے پلک جھپکائے بغیر دیکھ رہا تھا۔ میں نے اپنے کیمیائی اسلحے کی جستجو میں تکیے کے نیچے ہاتھ ڈالا۔

اس حیوان نما انسان کی جگہ پیڈرو ہوتا تو میری حرکت پر فوراً شک و شبہ میں مبتلا ہو جاتا اور خود یہ جاننے کی کوشش کرتا کہ میں تکیے کے نیچے سے کیا نکال رہا ہوں لیکن سیمسن کا آئی کیو یا ذہانت کا معیار بہت پست تھا۔ وہ جنگالی کے انداز میں جبڑوں کو ہلانے میں مصروف رہا اور نہ جانے کیا چباتا رہا۔ میرا کیمیائی اسلحے کا ذخیرہ ابھی موجود تھا۔ ابھی تک میں نے یہ طے نہیں کیا تھا کہ دشمنوں کے خلاف یہ اسلحہ موثر طور پر کیسے استعمال کیا جا سکتا ہے اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کے استعمال کا مناسب موقع کب ملے گا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ میری چوری پکڑی جائے اور میں خوش فہمی کے اس سہارے سے بھی محروم ہو جاؤں کہ اس زہر سے تمام دشمنوں کو ٹھکانے لگا کر میں فرار ہونے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ اس کے علاوہ ابھی میں یقینِ کامل کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ جو گولیاں اور سفوف میرے قبضے میں ہیں یا جو دوا انجکشن کی سرنج میں بھری ہوئی ہے وہ زہرِ قاتل ہی ہیں۔ گولیاں اور پاؤڈر کچھ بھی ہو سکتے ہیں۔ بے ضرر قسم کی اسپرین یا کوئی اینٹی بائیوٹک۔ صرف انجکشن کے بارے میں میں زیادہ پُر امید تھا۔ عام طور پر ڈاکٹر دوا کو وقتِ ضرورت سے پہلے سرنج میں نہیں بھرتے کیونکہ وہ خود نہیں جانتے کہ اگلا مریض کس قسم کا ہوگا اور اسے کون سا انجکشن دینا ہوگا لیکن یہ سرنج پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق تیار تھی کہ ضرورت پڑنے پر فوراً استعمال کی جا سکے۔ جب حالات ہنگامی ہوں اور اتنا وقت بھی نہ ہو کہ وائل کو ننھی سی آری سے کاٹا جائے اور شیشے کو توڑ کر دوائی سوئی کے ذریعے سرنج میں بھری جائے۔

دشمن چالاک تھے۔ جسمانی طور پر مجھ سے قوی اور صحت مند تھے چنانچہ انہیں زہر دینا ہرگز آسان نہ تھا۔ نہ وہ میرے ہاتھ سے لے کر چائے پیتے تھے نہ پانی۔ بلکہ میں وہی کھاتا پیتا تھا جو وہ لا کر دیتے تھے اور وہ میرے قریب تک نہیں آتے تھے۔ پھر بھی ناامیدی کے صحرا میں خیال کا یہ سراب غنیمت تھا کہ شاید کوئی فلمی اتفاق ایسا ہو کہ میں زہر چائے کی پیالی میں ڈال سکوں اور ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر پیالیاں بدل سکوں۔ عقل کہتی تھی کہ ایں خیال است و محال است و جنوں۔

بیڈ کے پاس رکھا ہوا ڈاکٹر کا بیگ ہٹا لیا گیا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ کسی کو بیگ میں سے کسی چیز کے نکالے جانے کی خبر نہیں ہوئی۔

کام آئے یا نہ آئے لیکن مجھے اپنے کیمیائی اسلحہ خانے کو کسی محفوظ مقام پر منتقل کرنا تھا۔ تکیے کے نیچے اس کی موجودگی کا راز کسی بھی وقت افشا ہو سکتا تھا۔ مثلاً بیڈ شیٹ بدلتے وقت سیمسن کی طرف کروٹ بدل کے میں نے بڑی احتیاط سے انجکشن والے پیکٹ کو قمیص اور پتلون کے نیچے اپنے پیٹ سے لگا کے دبا لیا۔ تین شیشیوں کو چھپانا البتہ مسئلہ تھا۔ کمبل کے نیچے ہی میں نے انہیں اپنی پتلون کی دو جیبوں میں منتقل کرنا چاہا لیکن تنگ فٹ پتلون کی جیب میں اتنی گنجائش نہ تھی۔ میرے اٹھتے ہی جیب میں شیشی کی موجودگی خود اپنا راز فاش کر دیتی۔

میں نے بہتر یہی سمجھا کہ تینوں شیشیاں تکیے کے نیچے چھوڑ دوں اور اس طرح دشمن کو موقع دوں کہ وہ میرے پوشیدہ وسائل کا سراغ لگا کے مطمئن ہو جائے۔ یہ سمجھے کہ اس نے اپنی ہوشیاری سے میری چالاکی کا پتہ کاٹ دیا ہے اور اس کامیابی کے بعد مزید جستجو کی ضرورت ہی محسوس نہ کرے۔ گولیاں زیادہ بڑی نہیں تھیں اور شیشی تقریباً بھری ہوئی تھی۔ اس میں سے کچھ گولیاں نکالی جا سکتی تھیں اور جیب میں بھی چھپائی جا سکتی تھیں۔

ابھی میں اُٹھ کے بیٹھا ہی تھا کہ سیمسن کھڑا ہو گیا۔ اس کے تیور یکلخت جارحانہ اور خطرناک ہو گئے۔ وہ مجھے اس خون آشام درندے کی طرح نظر آیا جو اپنے شکار پر جست لگانے ہی والا ہو۔ اس کی آنکھوں کی حیوانی چمک میں وہی سفاکی تھی جس میں لہو کی پیاس جھلکتی تھی۔ میں دوستانہ انداز میں اس کو دیکھ کے مسکرایا اور ہاتھ کے اشارے سے واضح کیا کہ مجھے صرف باتھ روم تک جانا ہے۔

میری ٹانگ میں درد بہت کم تھا اور دائیں ہاتھ کی تکلیف میں بھی افاقہ محسوس ہو رہا تھا۔ معلوم نہیں یہ بے حس کرنے والی دواؤں کا اثر تھا یا سچ مچ مجھے علاج سے فائدہ ہو رہا تھا۔ تاہم مصلحت کا تقاضا تھا کہ میں افاقے کا پتا نہ چلنے دوں۔ ہائے ہائے کرتے ہوئے میں نے بستر سے نیچے قدم رکھا اور بیساکھی اٹھائی۔ اندر سے گھنٹی بجنے کی آواز کے ساتھ ہی وہ نرس اندر آ گئی جس کے بارے میں اب مجھے کوئی خوش فہمی نہیں تھی۔ وہ بلا تذبذب میری دوسری ٹانگ پر گولی چلا سکتی تھی اور سرِدست مجھے مکمل معذوری قبول نہ تھی۔

"یس سر؟" اس نے سوالیہ لہجے میں کہا اور ریوالور نکال لیا۔ یہ اصلی ریوالور تھا۔ ۳۸۔ کا تقریباً نیا کولٹ آٹومیٹک۔ اس کی نیلگوں چمک والی نال کا رُخ میری طرف تھا اور نشانہ میری ٹانگ تھی

"کچھ نہیں" میں نے بے ضرر مسکراہٹ کے ساتھ کہا "ذرا باتھ روم تک جانا تھا مجھے"۔ اور بیساکھی کا سہارا لے کر آگے بڑھا۔ میری صورت سے سخت تکلیف کے آثار عیاں تھے۔ جبکہ تکلیف معمولی تھی۔

نرس نے سر ہلا کے مجھے اجازت دی "میں اتنی دیر میں آپ کا بیڈ ٹھیک کر دیتی ہوں" جس اطمینان کے ساتھ اس نے میری بات مانی تھی اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ میرا باتھ روم جانا خطرے کی کوئی بات نہیں اور اس کا اطمینان غلط نہیں تھا۔ باتھ روم سے فرار کے راستے معدوم تھے۔ اس میں صرف ایک واش بیسن اور ایک

ڈبلیوسی تھا۔ باقی دیواریں بالکل سپاٹ اور بے رنگ و روغن تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کمرے کے ساتھ باتھ روم کا اضافہ حال ہی میں کیا گیا ہے۔ تقریباً آٹھ فٹ کی بلندی پر دو طرف روشندان تھے لیکن میں واش بیسن پر چڑھ کے وہاں نہیں پہنچ سکتا تھا کیونکہ واش بیسن تیسری طرف تھا۔ بالفرضِ محال میں روشندان تک رسائی حاصل کر لیتا تب بھی مجھے کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ اس میں لوہے کی مضبوط گرل نصب تھی جسے ویلڈنگ ٹارچ سے ہی کاٹا جا سکتا تھا۔

میں بائیں ہاتھ سے منہ دھونے کی کوشش کر رہا تھا کہ باہر سے پیڈرو کے اونچا بولنے اور جواب میں نرس کے کچھ کہنے کا شور سنائی دیا۔ میں نے ڈور لاک کے سوراخ سے آنکھ لگائی تو مجھے پیڈرو کی پشت نظر آئی۔ نرس اس کے سامنے تھی چنانچہ میں اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔

"کہاں سے آئیں یہ سب چیزیں اس کے پاس؟" پیڈرو ہاتھ بڑھا کے بولا "کیا ہے یہ سب؟"

"مجھے... مجھے نہیں معلوم۔" نرس نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

پیڈرو کا ہاتھ بڑی تیزی سے حرکت میں آیا اور اس کے بائیں رخسار پر آواز کے ساتھ پڑا۔ "تجھے نہیں معلوم اور کسے معلوم ہوگا؟ دروازے پر تو بیٹھی تھی۔ سو گئی تھی کیا؟"

"قسم خدا کی سر۔ وہ جب بھی بستر سے اترا میں نے اندر آنے میں ایک سیکنڈ کی دیر نہیں کی۔"

"پھر یقیناً کوئی اندر آ کے اُسے یہ دے گیا ہوگا۔" پیڈرو نے غزا کے ہاتھ سامنے کیا جس پر یہ تینوں شیشیاں رکھی تھیں۔

"دروازہ میں باہر سے مقفل رکھتی تھی سر۔" نرس نے کہا۔ آنسو اس کے گالوں پر بہتے رہے۔

"پھر تو یہی راستہ رہ جاتا ہے۔" پیڈرو نے سر اٹھا کے کھڑکی کو دیکھا۔ نرس کے آنسوؤں نے یا لہجے نے پیڈرو کو اس کی سچائی کا قائل کر دیا تھا۔ اس کے اپنے لہجے کی درشتی ختم ہو گئی تھی اور اس نے سوال نہیں کیا تھا۔ ایک خیال ظاہر کیا تھا۔

"سیمسن!" اس نے کچھ دیر بعد کہا اور آگے بڑھ کے اشاروں کی زبان میں اس پر واضح کیا کہ ان تینوں شیشیوں میں کیا ہے جو میرے تکیے کے نیچے سے ملی تھیں۔ "یہ زہر ہے، بہت خطرناک قسم کا۔" پیڈرو نے زبان سے بھی بات کرنا جاری رکھا کیونکہ وہ خود گونگا نہیں تھا۔ بیشتر لوگ گونگے بہروں سے اشاروں میں بات کرتے ہوئے بھی خاموش نہیں رہ سکتے۔ پیڈرو میری نظروں کے سامنے نہیں تھا چنانچہ میں اس کا ردِعمل نہ دیکھ سکا۔

"کہاں سے آیا یہ زہر! اُلو کے پٹھے؟" پیڈرو نے چلا کر کہا۔ "بات سمجھتا ہی نہیں۔"

"اس کھڑکی کے راستے سے آیا تھا کوئی؟" پیڈرو نے مشتعل ہو کے ہاتھ چلائے۔ یوں جیسے کوئی رسّی کو تھام کے اوپر چڑھتا ہے۔ خاموشی کا ایک وقفہ آیا۔ غالباً سیمسن نے یقینِ محکم کے ساتھ نفی میں سر ہلایا یا اس امکان کو مسترد کر دیا ہوگا۔

"جھوٹ۔" پیڈرو نے دہاڑ کر کہا "تم دونوں میں سے ایک جھوٹ بک رہا ہے۔ کسی نہ کسی نے غفلت برتی ہے۔ میں کہتا ہوں غلطی کی ہے تو مان لو ورنہ میں منوا لوں گا۔ ہزار طریقے ہیں میرے پاس سچ اگلوانے کے۔"

"سر۔ یہ ضروری تو نہیں کہ اس میں زہر ہی ہو۔" نرس نے خوفزدہ ہو کے کہا۔

"اور کیا فرض کر لوں میں؟" پیڈرو نے چیخ کر کہا "دوا تو خود دیتی ہے۔ یہ کون سی دوا ہے؟"

دریں حالات میرے لیے انجکشن کو اپنے پاس رکھنا خطرناک تھا۔ میں نے باتھ روم میں اِدھر اُدھر دیکھا لیکن مجھے روشندان کے سوا کوئی جگہ نظر نہ آئی جہاں اس پیکٹ کو چھپایا جا سکتا تھا۔ روشندان تک میرا ہاتھ نہیں پہنچتا تھا مگر یہ ہو سکتا تھا کہ پیکٹ کو آہستہ سے اوپر اچھال دوں اور پیکٹ اس چھ انچ چوڑی جگہ میں لینڈ کر جائے جو دیوار کی موٹائی کے برابر تھی اور جسے روشندان کی گہرائی بھی سمجھا جا سکتا تھا۔ تاہم یہ کوئی محفوظ جگہ نہیں تھی۔ اگر پیڈرو باتھ روم کی تلاشی لیتا تو قدرتی طور پر سب سے پہلے روشندان کے طاق پر ہاتھ ڈالتا۔ وقت کم تھا۔ میں نے باتھ روم میں دس منٹ گزار لیے تھے۔ پانچ منٹ بعد کسی کو بھی غیر ضروری تاخیر کا احساس ہو سکتا تھا۔ اگر کوئی تالے کے سوراخ سے دیکھنے لگتا تو میرے لیے اپنی کارروائی کو جاری رکھنا مشکل ہو جاتا۔ وہ عین وقت پر مجھے جرم کا ارتکاب کرتے ہوئے پکڑ لیتے۔

روشندان کے علاوہ مجھے ایک ہی جگہ نسبتاً محفوظ نظر آئی۔ ڈبلیوسی کے اوپر لگا ہوا فلش ٹینک۔ میں نے اس ٹونٹی کو بند کیا جس سے ٹینک میں پانی جاتا تھا اور فلش چلا دیا۔ ٹینک خالی ہو گیا لیکن دوبارہ نہیں بھرا۔ پھر میں نے پیکٹ کو بڑی احتیاط سے نکالا اور فلش ٹینک کا ڈھکنا ہٹا کے ایک کونے میں رکھ دیا۔ ٹینک کی سطح نم تھی مگر اس نمی سے گتے کی ڈبیا کے گل جانے کا کوئی احتمال نہ تھا۔ کوئی آواز کیے بغیر میں نے ڈھکنا واپس فٹ کیا اور اگرچہ مجھے سو فیصد اطمینان حاصل نہ تھا کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب رہا لیکن نصف اطمینان کا یہ احساس بھی بہت غنیمت تھا۔ ابھی میں دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ کسی نے دھڑ سے دروازے پر لات ماری۔

"کیا ہو رہا ہے اندر؟" پیڈرو نے مجھے گالی دے کر کہا۔ "یہ باتھ روم ہے یا آرام کرنے کی جگہ؟"

قدرتی طور پر اس خیال نے مجھے مایوس کر دیا کہ شاید میرا مشن ناکام ہو گیا ہے۔ لات مارنے سے پہلے پیڈرو نے جھانکا ہوگا تو سب دیکھ لیا ہوگا۔ میں نے کُنڈی کھولی اور باہر آ گیا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے قمیص کے دامن سے منہ صاف کر کے کہا۔ "اتنی جلدی کس بات کی ہے؟ تمہیں فکر تھی کہ میں لات مار کے دیوار سے راستہ نہ بنا لوں۔ میری لات تو ویسے ہی ٹوٹی ہوئی ہے اور میں سیمسن بھی نہیں ہوں۔"

"تمہیں فضول بھونکنے کی بہت عادت ہے۔" پیڈرو نے کہا جو میری بیساکھی اور میرے ہاتھ کی پہنچ سے خاصے فاصلے پر کھڑا ہوا تھا۔ "یہ کیا ہے؟"

"یہ؟" میں نے اس کی ہتھیلی کو غور سے دیکھا۔ "مجھے تو تین شیشیاں نظر آ رہی ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ ان میں زہر ہے۔ تمہارے پاس کیسے آئیں یہ شیشیاں؟" پیڈرو بولا۔

"میرے پاس!" میں نے حیرانی سے کہا اور بیڈ کی طرف بڑھا۔ "شیشیاں تمہارے پاس ہیں پیڈرو۔"

"لیکن مجھے تمہارے تکیے کے نیچے سے ملی ہیں۔" وہ چیخ کر بولا۔

"میں نے کبھی تکیے کے نیچے جھانک کر نہیں دیکھا۔" میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "ورنہ اب تک یہ زہر تم سب کو دے چکا ہوتا۔ اب تم خود کھا لو تو مجھے بڑی خوشی ہوگی۔ کون سا زہر ہے؟"

مجھے جواب دینے کے بجائے پیڈرو غصے میں پھنکارتا ہوا پلٹا اور دروازہ کھول کے باہر نکل گیا۔ میں نے باہر سے دروازے کے قفل میں چابی گھمانے کی آواز سُنی۔ "اب ہم تینوں قیدی ہیں۔ ایک ہی کشتی کے ڈوبنے والے مسافر۔" میں نے نرس اور سیمسن کی طرف دیکھ کے کہا۔ سیمسن نے بات سُنی نہ سمجھی چنانچہ وہ بے حس و حرکت کھڑا رہا۔

"تم خود تو مرو گے ہی۔ ہم سب کو بھی ساتھ مرواؤ گے۔" نرس نے مجھے شعلہ بار نظروں سے گھورا۔

"سب مرنے والوں کی یہی کوشش ہوتی ہے۔" میں نے کسی فلسفی کی طرح فرمایا۔ "کہ ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے۔"

"اور اس سے پہلے میں تمہیں گولی مار دوں تو؟" نرس کو میرے الفاظ نے مزید مشتعل کیا۔

"تم کیا چیز ہو؟ مجھے پیڈرو تک گولی نہیں مار سکتا۔" میں نے جلتی پر کچھ اور تیل چھڑکا۔ "کیا پدی اور کیا پدی کا شوربہ! ہاتھ میں ریوالور آ جانے کا مطلب یہ نہیں کہ تم اسے چلانے کا اختیار بھی رکھتی ہو۔ تم نے صرف نرس کا یہ لباس پہن لیا ہے ورنہ تم پیسے کے عوض بک جانے والی ایک بدکردار اور بے ضمیر عورت ہو۔ تم بے گناہوں کے خون پر پلنے والی جونک ہو۔"

"بکواس مت کرو۔" نرس نے چیخ کر کہا اور پلک جھپکنے میں ریوالور نکال لیا۔ اس کا اشتعال قوتِ برداشت سے بڑھ گیا تھا۔ اس کا اندازہ مجھے اُس کے ہسٹریائی لہجے سے ہوا اور ایک فطری ردِعمل کے طور پر میں پلٹ کر بیڈ کے دوسرے کنارے سے نیچے گر گیا۔ گولی جو میرے سینے یا پیٹ اور کمر میں کسی جگہ پیوست ہو سکتی تھی، خالی بستر پر لگی اور سفید چادر پر ایک سوراخ چھوڑ کے فرش سے ٹکرائی۔ سوراخ کے جلے ہوئے کنارے سے دھواں اُٹھا اور کمرے میں بارود کی بو پھیل گئی۔ کمرہ بند ہونے کے باوجود دھماکا پیڈرو نے بھی سنا جو شاید واپس آ رہا تھا۔ اس نے باہر سے قفل کھولا اور بگولے کی طرح اندر آیا۔ ریوالور اس کے ہاتھ میں تھا۔

"کیا ہو رہا ہے یہاں؟" وہ نرس کی طرف دیکھ کر چلّایا جو اب مجرم بنی کھڑی تھی۔ مغلوب کر کے عقل و ہوش سے بیگانہ کر دینے والا قاتل لمحہ گزر گیا تھا۔ اس کے بعد ندامت اور خوف کا لمحہ تھا جو پوچھتا تھا کہ تم نے ایسا کیوں کیا اور کیا تم کو عقل نہیں تھی کہ ہر ضابطے، حکم یا قانون کو توڑنے کی سزا ہے۔ شاید ہر قتل کے بعد یہ لمحہ ضرور آتا ہے۔ عمل کے بعد ردِعمل اور مکافاتِ عمل۔

"کہاں ہے وہ؟" پیڈرو نے میرے نام کی جگہ ایک غلیظ گالی استعمال کی۔ "سیمسن!"

صورتِ حالات کو محفوظ پا کے میں فرش سے اٹھا۔ "خدا کا شکر ہے کہ میں ابھی تک اسی قیدِ حیات میں اور تمہاری جیل میں ہوں ورنہ اس عورت نے تو مجھے دونوں سے آزاد کرنے کی پوری کوشش کی تھی۔ حکم عدولی کی سزا کیا ہے تمہارے ضابطۂ فوجداری میں؟" میں نے چادر کے زخم کو ہاتھ سے جھاڑا۔ "یہ نقصان الگ ہوا۔"

"گولی کیوں چلائی تھی؟" پیڈرو نے پھر نرس پر گرجنا شروع کیا۔ "دماغ چل گیا تھا...؟"

"اس نے... اس نے مجھے گالیاں دی تھیں۔" نرس نے اس انتہائی اقدام کا ایک فضول سا جواز پیش کیا۔ خوف اور ہسٹریا کی کیفیت میں اس کا ذہن کوئی بہتر وجہ سوچنے سے قاصر تھا۔ وہ بہت ڈری ہوئی تھی۔

پیڈرو نے اسے نصف درجن ایسی گالیاں دیں کہ مجھے شرم آئی۔ "اور جواب میں گالیاں دینے کے بجائے تو نے گولی چلا دی؟ اس لیے کہ تو بہت عزت دار اور غیرت مند ہے؟" اس نے مزید مغلظات اگلنے کے بعد اچانک اپنا ہاتھ سامنے کیا۔ تب پہلی بار میں نے اس

بات پر غور کیا کہ اب تک وہ دونوں ہاتھ پیچھے باندھے، دونوں پاؤں کچھ پھیلا کے مضبوطی سے زمین پر قدم جمائے اور بالکل ویلن کا پوز بنائے کیوں کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چمڑے کا ہنٹر تھا جس کا ایک سرا نسبتاً موٹا اور خنجر کے دستے کی طرح تھا۔ سانپ کی طرح لہرانے والا چابک جیسا حصہ چمڑے کی پتلی پتلی لیکن مضبوط ڈوریوں سے ایسے بنایا گیا تھا جیسے عورتیں چوٹی گوندھتی ہیں۔ اس نے جبر و استبداد، حاکمیت اور قوت کے پیکر کا روپ دھار کے ہنٹر کو ایک بار ہوا میں شائیں سے لہرایا اور اس ڈرامائی تاثر سے خوف کی فضا کو گمبھیر کر دیا۔ نرس کا رنگ لاش کی طرح سفید پڑ گیا اور وہ کانپنے لگی۔ اس نے ٹوٹے پھوٹے بے ربط الفاظ میں ایک بار پھر پیڈرو کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ اس سے ادائے فرض میں کوتاہی بالکل نہیں ہوئی۔ وہ کرسچن تھی چنانچہ اس نے انگلی کے اشارے سے سینے پر صلیب بنانے کی غیر ارادی حرکت کی اور حضرت یسوع مسیح کی قسم کھا کے وعدہ کیا کہ آئندہ وہ اپنے جذبات پر قابو رکھے گی اور گولی چلانے سے گریز کرے گی مگر ہونٹوں پہ ایک انتقامی اور شیطانی قسم کی سفاک مسکراہٹ سجائے پیڈرو قدم قدم اس کی طرف بڑھتا گیا۔ وہ پیچھے ہٹتی گئی اور میں سانس روکے دیکھتا رہا کہ کیا واقعی اس جرم کی پاداش میں جوانمرد پیڈرو ایک عورت کی کھال اُدھیڑ دے گا۔

نرس دیوار سے جا لگی۔ دیوار نہ ہوتی تب بھی اس کے لیے فرار ناممکن تھا۔ اچانک پیڈرو نے سیمن کو اشارہ کیا جو نرس کے بہت قریب تھا اور اس نے نرس کو یوں پکڑ لیا جیسے شکاری باز اپنے پنجوں میں چڑیا کو جکڑ لے۔ پیڈرو کا ہاتھ گھوما اور نرس نے ایک دلخراش چیخ ماری۔ ضرب کی اذیت میں نے محسوس کی۔ مجھے یوں لگا جیسے چمڑے کے ہنٹر کی آتشیں زبان میرے جسم پر سلگتی ہوئی لکیر بن کے دہکنے لگی ہے۔

"ٹھہرو سورما!" میں نے پیڈرو کو مخاطب کرتے ہوئے ہاتھ اٹھایا۔ "اس عورت کا کوئی قصور نہیں۔"

"تم کو دخل دینے کی ضرورت نہیں۔" پیڈرو مڑ گھما کے بولا لیکن اس کا ہاتھ رُک گیا تھا۔

"وہ زہر میں نے ڈاکٹر کے بیگ سے چوری کیا تھا۔" میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ "اپنی غلطی کی سزا اس عورت کو کیوں دیتے ہو۔ کیا تمہیں خوش فہمی ہے کہ تم سزا سے بالاتر ہو۔ سزا تو ایک دن تمہارے آقا اور اَن داتا چوہدری دلاور کو بھی ملے گی مگر وہ دن ابھی نہیں آیا۔ دلاور شاید آج آئے۔ اگر وہ آیا تو میں اس کو بتا دوں گا کہ تم اس اعتماد کے مستحق نہیں ہو جو تمہیں حاصل ہے کیونکہ تم احمق ہو۔ احمق وہ ڈاکٹر بھی تھا جس نے میرے قریب آنے کی غلطی کی تھی مگر کیا یہ تمہارا کام نہیں تھا کہ ڈاکٹر کی حفاظت کرتے۔ تم جانتے تھے کہ ڈاکٹر اپنا دفاع نہیں کر سکتا اور تمہاری کوتاہی کا انجام یہ ہوا کہ ڈاکٹر اپنی جان سے گیا۔ دلاور نے ابھی تک یہ نہیں سوچا ہے کہ تمہارا سیکیورٹی کا انتظام ناقص تھا۔ تم ریوالور اٹھائے کھڑے رہتے تو میں ڈاکٹر پر ہاتھ کیسے اٹھاتا۔ دوسری غلطی تم نے بعد میں کی جب تم ڈاکٹر کی لاش کو کتے کی لاش سے زیادہ بے حرمت کرانے میں مصروف تھے اور اپنے نامۂ اعمال میں وہ گناہ بھی لکھوا رہے تھے جو شاید ابلیس کے لیے بھی باعثِ شرم ہوتا۔ تو ڈاکٹر کا بیگ میری دسترس میں تھا۔ تم کو معلوم تھا کہ اس میں نسخۂ شفا ہے تو زہرِ ہلاہل بھی ہے۔ میرے سامنے پڑا ہوا بیگ کیا کسی آتشیں اسلحے سے کم خطرناک تھا؟ اس کی جگہ ریوالور ہوتا تو تم فوراً ہٹا لیتے۔ یہ کس کی غلطی تھی؟" میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کے سب گولیاں نکال لیں۔ "یہ دیکھو!"

پیڈرو کا چہرہ ذرا سی دیر کے لیے متغیر ہوا۔ "تم بکتے ہو۔"

"اچھا اگر تم سمجھتے ہو کہ یہ ٹافیاں ہیں تو کھا لو۔" میں نے ہتھیلی پھیلا کے کہا۔ لیکن پیڈرو نے آگے بڑھ کر مجھ سے وہ گولیاں چھیننے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے سیمن کو اشارہ کیا۔

"اس کی تلاشی لینی ہے سیمن!" وہ ریوالور نکال کے بولا اور اسے سمجھایا کہ وہ مجھے قابو میں رکھے۔ سیمن نے میرے پیچھے آ کے اپنے دونوں ہاتھ میری بغل میں دیے اور گردن کو آگے جھکا کے انگلیاں یوں کس لیں کہ میں بے بس ہو گیا۔ میں نے کسی قسم کی مزاحمت نہیں کی ورنہ میں ایک جھٹکے سے سیمن کے شانوں کو بے کار کر دیتا۔ کلائی کے جوڑ الگ کر دیتا یا قریب آنے سے پہلے اس کو یوں ڈھال بنا لیتا کہ پیڈرو کے لیے گولی چلانا ناممکن ہو جاتا مگر میں اپنے سچ کا ثبوت فراہم کرنا چاہتا تھا۔ وہ عورت میرے نقطۂ نظر سے مجرم تھی اور اگر ممکن ہوتا تو میں خود اسے قانون کے حوالے کر دیتا۔ سخت ترین سزا کے لیے۔ اگر یہی لوگ اسے مار دیتے جن کے ہاتھوں میں وہ کٹھ پتلی تھی تو مجھے اس کی موت کا قطعی افسوس نہ ہوتا لیکن میرے سامنے اس پر جو ننگِ انسانیت ظلم ہو رہا تھا وہ ایک ناکردہ گناہ کا خمیازہ تھا۔ یہ بات صرف میں جانتا تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ انصاف کے تقاضوں کے برعکس ہے۔ ہر مجرم کو انہی جرائم کی سزا ملتی ہے جو اس پر ثابت ہوں۔

نرس ڈرتے ڈرتے میرے ہاتھ پر سے گولیاں اٹھانے بڑھی۔ اس کے لیے آگے کنواں پیچھے خندق والا مسئلہ تھا۔ ایک طرف پیڈرو ریوالور اور ہنٹر لیے کھڑا تھا تو دوسری طرف میں تھا جس کے متعلق وہ جانتی تھی کہ خالی ہاتھ اور بے بس نظر آنے کے باوجود خطرناک ہوں۔ ایک طرف یہ اندیشہ ہے کہ میرا ہاتھ اس کی نازک سی گردن کو بھی شاخِ گل کی طرح نہ توڑ دے تو دوسری جانب یہ ڈر کہ اس کشمکش میں چلنے والی گولی اسی کو نشانہ نہ بنا لے مگر وہ مجبور تھی۔

"ڈرو نہیں۔" میں نے سرنگوں ہونے کے باوجود مسکرا کے حوصلہ افزا لہجے میں کہا۔ "میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔" نرس نے گولیاں چُن لیں اور پیڈرو کی طرف پلٹی لیکن اس نے مکمل تلاشی کا حکم دیا۔ نرس نے ہر جیب میں ہاتھ ڈالا۔ میری یقین دہانی کے بعد اس کی گھبراہٹ کچھ کم ہو گئی تھی۔ جامہ تلاشی کے بعد میرے بیڈ کو اچھی طرح جھاڑ کر یہاں تک کہ تکیے کے اندر سے بھی پوشیدہ زہر برآمد کرنے کی کوشش کی گئی اور میں نے دشمنوں کے اطمینان کی خاطر اس کارروائی کی تکمیل میں عدم تعاون کا کوئی مظاہرہ نہیں کیا۔ میرا یہ اعترافِ شکست اپنی اس کامیابی کو کیموفلاج کرنے کے مترادف تھا جو میں نے ایک آلۂ قتل کو فلش ٹینک میں چھپا کے حاصل کی تھی اور یہ آلۂ قتل ایک چھوٹی سی سرنج تھا جس کے متعلق میں یہ نہیں جانتا تھا کہ اس میں کون سا ہلاکت خیز محلول ہے۔ جب سیمن نے مجھے رِہا کیا تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

مگر خلافِ توقع پیڈرو نے نرس کو میرا خیال رکھنے کا حکم دیا اور خود باتھ روم میں داخل ہو گیا۔ میری کامیابی پھر مشکوک ہو گئی۔ میری نگاہ کھلے دروازے پہ اور کان ہر آواز پر رہے جو باتھ روم سے سُنائی دے رہی تھی۔ اگر پیڈرو فلش ٹینک کا ڈھکنا اٹھاتا تو مجھے فوراً معلوم ہو جاتا مگر اس کا دھیان اُدھر گیا ہی نہیں۔ فلش ٹونٹی کو ہاتھ سے گھما کر دیکھے بغیر اسے معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ ٹونٹی کھلی ہوئی ہے یا بند ہے۔ اس نے فرض کر لیا ہو گا کہ ٹونٹی کھلی ہوئی ہے چنانچہ فلش ٹینک پانی سے بھرا ہوا ہے اور اس میں کوئی چیز نہیں ڈالی جا سکتی۔ اس نے روشندانوں کے اوپر ضرور دیکھا ہو گا کیونکہ پانچ منٹ بعد وہ ہاتھ سے گرد جھاڑتا نمودار ہوا۔ اس نے نرس کے ہاتھ سے گولیاں لے کر انہیں غور سے دیکھا۔ محتاط انداز میں سونگھا اور جیب میں ڈال لیا۔

"تمہیں معلوم ہے یہ کیا تھا؟" میں نے سخت کرب اور تکلیف کے احساس کو ظاہر کرنے کے لیے کراہ کر کہا۔ "نام تو اس کا بہت مشکل ہے۔ ٹرائی نائٹرو ڈائی آرسینک کلورائنڈ پوٹاشیم سائنائڈ۔" میں نے سائنسی اور کیمیائی مرکبات کے ناموں کو یوں جوڑا کہ پیڈرو کو صرف دو الفاظ سمجھ میں آ سکے۔ آرسینک یعنی سنکھیا اور سائنائڈ۔ اور اگر قائل ہو جائے تو اسے اندازہ ہو کہ دو قاتل زہر مل کے کس حد تک جان لیوا ہو سکتے ہیں۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟" وہ کچھ دیر مجھے گھورنے کے بعد بولا۔

"شیشی پر ایک لیبل تھا جو میں نے پھاڑ کے ہٹا دیا تھا۔" میں نے کہا۔ "تمہیں اس زہر کے خواص کا علم ہے۔ سائنائڈ تو اتنا ہی مہلک ہے نا کہ آدمی نے چکھا اور ختم ہوا۔ یہ سائنائڈ کا باپ ہے۔ چھونے سے جسم میں سرایت کر جاتا ہے۔ اب ہم تینوں نے بارہ گولیوں کو کم سے کم بارہ سیکنڈ تک تو ہتھیلی پر رکھا ہے۔ اس کی خاصی مقدار ہمارے خون میں شامل ہو چکی ہے۔ اس کی علامات آہستہ آہستہ ظاہر ہوں گی۔ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر ہمارا نروس سسٹم متاثر ہو گا۔ سارا جسم کانپنے لگے گا۔ رعشے کے مریض کی طرح۔ اور اس کے بعد کسی چیز پہ ہمارا اختیار نہیں رہے گا۔ نہ ہم اپنی مرضی سے ہاتھ ہلا سکیں گے نہ پیر۔ نظامِ اخراج اور اعصابی نظام پر ہمارا کنٹرول نہیں رہے گا۔ تم نے گردن توڑ بخار کے مریض کو مرتے دیکھا ہے کبھی؟"

"بکواس مت کرو۔ تم کہاں کے ڈاکٹر ہو؟ یہ سب کیسے جانتے ہو؟" پیڈرو نے اپنا اعتماد بحال رکھتے ہوئے کہا مگر نرس نے بلا ارادہ ہتھیلی کو دیکھا اور اپنی یونیفارم سے رگڑ کے صاف کیا۔

"میں نے جرائم پر مبنی کئی ناولوں میں پڑھا تھا۔" میں نے کہا۔ "پوسٹ مارٹم رپورٹ میں اس کا پتا نہیں چلتا۔"

"نہیں۔" نرس نے ایک چیخ ماری اور باتھ روم کی طرف دوڑی۔ "میں... میں مرنا نہیں چاہتی۔" اس کے اعصاب پہلے ہی جواب دے چکے تھے۔ یہ وحشت زدہ کرنے والا جھوٹ اس کو بڑا بھیانک سچ نظر آیا۔ اس نے دیوانہ وار چیخنا شروع کیا۔ "میں ابھی نہیں مروں گی۔ ہولی فادر، مجھے موت سے بچا۔ میں بہت گنہگار ہوں۔ مجھے شیطان سے بچا۔" واش بیسن میں بہنے والے پانی کی آواز سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ زہر آلود ہاتھ کو رگڑ رگڑ کے دھو رہی ہے۔

"بے کار ہے۔" میں نے باتھ روم کی طرف دیکھ کر ہمدردی سے کہا۔ "جو نقصان ہونا تھا ہو چکا۔ اب سوائے بہادری سے موت کا انتظار کرنے کے اور ہم کیا کر سکتے ہیں؟"

"جھوٹ بولتے ہو تم؟" پیڈرو چلّایا۔ نرس کے نروس بریک ڈاؤن نے اسے بھی پریشان کر دیا تھا۔

"ایک نرس تم سے زیادہ معلومات رکھتی ہے۔" میں نے کہا۔ "کیونکہ وہ ڈاکٹروں کے ساتھ رہتی ہے۔ اسپتالوں میں ہر قسم کے کیس آتے ہیں اور یہ بات مجھے معلوم ہے تو اس کو کیسے معلوم نہ ہو گی۔" نرس اب بھی پاگلوں کی طرح چلّا رہی تھی۔

"میری ماں مر جائے گی۔ پھر پیٹر تم سب کو مار ڈالے گا۔ ڈرٹی ڈاگ! اس نے مجھ کو پر وپوز کیا تھا؟" وہ باہر آ کے پیڈرو پر حملہ آور ہوئی۔ پیڈرو نے اسے ایک ہاتھ پر روکا اور پوری

قوت سے اٹھا کے دیوار پر دے مارا۔ وہ کسی لاش کی طرح ٹکرائی اور فرش پر گر کے بے حس و حرکت ہو گئی۔ پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ پیڈرو کچھ دیر اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ نرس کا ہاتھ تھام کے اس نے نبض دیکھی اور اطمینان کا سانس لے کر سیمسن کی طرف دیکھا۔ ہاتھ کے اشارے سے اس نے سیمسن کو میری طرف سے غافل نہ ہونے کی ہدایت دی اور یہ سمجھایا کہ نرس زندہ ہے۔ "ڈاکٹر کو بلاتا ہوں میں۔" اس نے مجھے سنانے کے لیے کہا اور جھک کر نرس کو اٹھا لیا۔ اسے کندھے پر ڈال کے پیڈرو نے ایک ہاتھ سے دروازہ کھولا اور پھر باہر سے مقفل کیا۔

میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ ایک بات جو میں نے قطعی غیر سنجیدگی سے کوئی مقصد سامنے رکھے بغیر کہی تھی اس کے حیرت انگیز نتائج ظاہر ہو رہے تھے۔ میں اس مختصر وقفے سے کوئی فائدہ اٹھا سکتا تھا جس میں میرا محافظ و نگراں صرف ایک گوریلا رہ گیا تھا۔ جو عقل و فہم میں کسی بچے سے بھی کم تھا حالانکہ اس کا وجود مجھ پر بھاری پڑتا تھا۔ اس کے خلاف صرف عقل استعمال کی جا سکتی تھی۔ وہ اپنے مالکوں کے اشارے پر چلتا تھا مگر حیوان کا کیا ہے۔ اسے پیڈرو اپنے قابو میں کر سکتا ہے تو میں کیوں نہیں کر سکتا۔ وہ صرف عمل کرتا ہے۔ نتائج اور انجام کے بارے میں سوچنا اس کے لیے ممکن ہی نہیں۔

"سیمسن" میں نے ہاتھ اٹھا کے چٹکی بجائی۔ وہ حرکت پر میری طرف متوجہ ہوا۔

"تم نے دیکھا" میں نے ہاتھ کے اشارے سے ہنٹر گھمایا اور دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ "اس نے ابھی نرس کو مارا ہے۔ وہ مر گئی ہے۔" مرے ہوئے آدمی کی اداکاری میں نے یوں کی کہ آنکھیں ساکت کر کے، گردن ڈھلکا کے اور ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ کے اپنا سانس روک لیا۔ چند سیکنڈ بعد مجھے سیمسن کی آنکھوں میں خوف و ہراس نظر آیا۔

"ابھی وہ واپس آئے گا" میں نے دروازے کے دوبارہ کھلنے اور پیڈرو کے اندر آنے کا تاثر دیا۔ "اس کے ہاتھ میں وہی ہو گا۔" میں نے ہوا میں ہاتھ لہرا کے ہنٹر کا مفہوم واضح کیا۔ "اور اب تمہاری باری ہے" میں نے انگلی سے اس کے سینے کی جانب اشارہ کیا۔ "وہ تم کو اتنا مارے گا۔ اتنا مارے گا۔"

سیمسن میری بات سمجھ رہا تھا اور بڑے انہماک کے ساتھ سمجھنے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ وہ منتظر تھا کہ میں اگلے منظر کا بیان کروں جو اس کی آنکھیں ابھی ابھی دیکھ چکی تھیں۔ شاید وہ سوچ رہا تھا کہ نرس تو ہلکی پھلکی عورت تھی جس کی لاش کو پیڈرو اٹھا کر لے گیا۔ خود اس کی لاش کو پیڈرو کیسے لے جائے گا۔ وہ کچھ کنفیوز بھی ہو رہا تھا۔ اشاروں کی زبان میں پیڈرو نے اسے اطمینان دلایا تھا کہ نرس زندہ ہے۔ میں نے اس کے برعکس بات کہی تھی اور وہ پریشان تھا کہ کس پر یقین کرے اور کس پر نہ کرے۔ اس نے دیکھا تھا کہ پیڈرو نے نرس کے ایک ہنٹر رسید کیا تھا پھر وہ پاگلوں کی طرح غسل خانے میں گئی تھی اور نکلی تھی تو پیڈرو پر لپکی تھی۔ اس کے بعد سیمسن نے سنا کچھ نہیں تھا۔ واقعات کی ایک خاموش فلم دیکھی تھی۔ اس کا انجام کیا تھا؟ وہی جو ڈاکٹر کا ہوا تھا؟ اور اس سے پہلے نہ جانے کتنے لوگوں کا ہو چکا تھا۔ سیمسن نے دیکھا تھا کہ وہ کس طرح مارے گئے تھے۔ اُسے اپنی سزا بھی یاد تھی۔ کیا اب اس کا بھی وہی حشر ہو گا۔ مالک اس پر سخت ناراض تھا۔ اس کی ناراضگی بُری چیز ہے۔

میں نے اسے ساکت و صامت کھڑا دیکھ کر ایک جست لگائی۔

میرا بایاں پیر پہلے زمین پر پڑا۔ دوسرا پاؤں زمین پر رکھتے ہی درد کی ٹیس اٹھی۔ میں لڑکھڑایا مگر جسم کے بوجھ کو پنجوں پر سنبھال کے میں نے ایک اور چھلانگ لگائی۔ مجروح پیر پر میرا وزن چند سیکنڈ سے زیادہ نہیں رہا اور میں نے کمرے کا آدھے سے زیادہ فاصلہ طے کر لیا۔ صرف ایک بار سر گھما کے میں نے تیسری کوشش کی۔ سیمسن کو ہوش آگیا تھا اور وہ میرے تعاقب میں آرہا تھا لیکن وہ بیڈ کے دوسرے کنارے پر تھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے یوں لگا جیسے میں گر رہا ہوں۔ میں نے جسم کی باقی ماندہ قوت کو مجتمع کیا۔ جان ہتھیلی پر رکھ کے بازی لگائی ہے تو ہارنی نہیں ہے۔ میں نے خود کو یاد دلایا۔ ورنہ یہ درندہ مجھے دبوچ لے گا اور میری ہڈیاں سلامت نہیں چھوڑے گا۔ باتھ روم کا کھلا دروازہ میرے سامنے آگیا تھا۔ صرف ایک اور کوشش۔ ایک اور ایسی ہی بھرپور جدوجہد۔ میں نے ہانپتے ہانپتے ایک گہرا سانس لیا۔ اور پھر دائیں پیر کا سہارا لے کر آخری چھلانگ لگائی۔ میں دروازے سے اندر جا کر گرا۔ سیمسن مجھے چند قدم دور نظر آیا۔ ایک بپھرا ہوا حیوان۔ میں نے لات مار کے دروازہ بند کیا اور بائیں گھٹنے پر اٹھ کے اندر سے لاک کر دیا۔ سیمسن کسی بیل کی طرح دروازے سے ٹکرایا۔ اس کے حلق سے خوفناک آوازیں نکل رہی تھیں۔

مہلت بہت کم تھی۔ میں نے اس حیوان کو اسی طرح مشتعل کر دیا تھا جس طرح ایک بل فائٹر کپڑا لہرا کے خونخوار سانڈ کو مقابلے کے لیے اکساتا ہے لیکن بل فائٹر اپنی پھرتی اور ذہانت سے کام لیتا ہے اور بالآخر سانڈ کی گردن توڑ دیتا ہے۔ وقت ضائع کیے بغیر میں اٹھا اور پھسل کے گرا۔ سیمسن نے دروازے پر زیادہ قوت سے ٹکر ماری اور دھماکا مختصر سے کمرے میں گونجا۔ مجھے یوں لگا جیسے دروازے کے ساتھ باتھ روم کی دیواریں تک ہل گئی ہیں۔ دو تین ٹکروں میں دروازے کے قبضے نکل جائیں گے یا پٹ ٹوٹ کے گر جائے گا۔ کسی جانور کی طرح چاروں ہاتھوں پیروں پر خود کو گھسیٹتا، میں اس فلش ٹینک تک پہنچا جس میں میرا پوشیدہ ہتھیار موجود تھا۔

سیمسن نے تیسری بار ٹکر ماری اور دروازہ لڑکھڑایا۔ اگر پیڈرو دھماکے سُن کے آ پہنچا تو میرا مشن ناکامی کے عبرتناک انجام میں بدل جائے گا۔ وہ سیمسن کو روک لے گا اور ریوالور سے فائر کر کے ڈور لاک کو اُڑا دے گا۔ میں نے فلش کا ڈھکنا اٹھا کے نیچے پھینکا۔ چینی کا ڈھکنا ایک آواز کے ساتھ سیمنٹ کے فرش پر گرا اور بکھر گیا۔ میرے ہاتھوں نے پلک جھپکنے میں اندر سے ڈبیا نکال لی۔ سرنج کو اپنے ہاتھ میں تھام کے میں تیزی سے پلٹا۔ اس کی قاتل سوئی کا رُخ مخالف سمت میں تھا۔ آخری مرحلہ اسے انتہائی احتیاط کے ساتھ، صحیح وقت پر اور موثر طور پر استعمال کرنے کا تھا۔ سیکنڈ کے ایک حصے کے فرق سے دروازے کا پٹ اندر کی جانب گرا اور سیمسن اپنی ہی جسامت کے باعث اپنے ہی زور میں اندر آیا۔ میری بائیں ٹانگ آگے بڑھی اور سیمسن منہ کے بل گرا۔ اس کے حلق سے "ہاہ" جیسی آواز نکلی اور اس کے دونوں ریچھ جیسے بازو اوپر اٹھ گئے۔ پھر وہ دروازے کے پٹ پر گرا۔ میں گھات میں بیٹھے ہوئے شکاری کی طرح لپکا اور اگلے لمحے انجکشن کی سوئی پُشت کی جانب سیمسن کی کمر سے ذرا نیچے گوشت میں اُتر گئی۔ وہ چُبھن کو اس لیے محسوس نہ کر سکا کہ گرنے سے اس کے سر پر چوٹ آئی تھی جس نے وقتی طور پر اسے چکرا دیا تھا۔

سرنج کی دوا اس انسان نما حیوان کے جسم میں اُتر گئی جس کی زندگی خود اس کے لیے بے مصرف تھی۔ اس کا مصرف دوسروں کے لیے یہی تھا کہ ایک حیوانی قوت سے کمزور انسانوں کو زیر کیا جائے اور ضرورت محسوس ہو تو انہیں ڈاکٹر کی طرح توڑ پھوڑ کے ختم کرنے میں استعمال کیا جائے۔ اس کا مرنا جینا اپنی مرضی پر منحصر نہیں تھا اور جو لوگ اس کی زندگی پر اختیار رکھتے تھے اسے ایک ہلاکت خیز قوت کے طور پر استعمال کر رہے تھے۔ وہ انسان نہیں، انسانوں کی زندگی ختم کرنے کا ایک ذریعہ تھا۔ پستول اور بندوق، ٹینک اور بم کی طرح جو خود خطرناک نہیں ہوتے۔ ان کو استعمال کرنے والے اور استعمال کرنے والوں کے عزائم خطرناک ہوتے ہیں۔ سیمسن اگر زندہ رہتا تو نہ جانے کتنے خون اور کرتا۔ اس خونی درندے کو ختم کر دینا کسی آدم خور شیر کو مار دینے کے مترادف تھا۔

میرا دل بڑے زور سے دھڑک رہا تھا۔ اگر انجکشن میں زہر نہ ہوا، صرف بی کمپلیکس ہوا؟ لیکن بی کمپلیکس کی مخصوص بُو ہوتی ہے۔ میں نے انجکشن کی سرنج کو سونگھا اور فلش میں پھینک دیا۔ اس کا شیشہ چُور چُور ہو کے فلش کے پانی میں گر گیا۔ دیو پیکر سیمسن نے اٹھنا چاہا تھا لیکن ناکام رہا تھا۔ اس کے حلق سے نکلنے والی آوازیں بھیانک خرخراہٹ میں بدل گئیں۔ اسی وقت پیڈرو اندر آیا۔ میں نے دروازے کا قفل کھُلنے کی آواز سُنی ہی نہیں تھی لیکن اس نے باتھ روم کے اندر کا منظر فوراً دیکھ لیا تھا۔

"سیمسن" وہ چلّایا اور ریوالور نکال کے دوڑا۔ "کیا ہوا ہے سیمسن کو؟" وہ جانتا تھا کہ سیمسن کے کان نہیں ہیں چنانچہ اسے پکارنے کے باوجود سوال پیڈرو نے مجھ سے ہی کیا تھا۔ سیمسن کا جسم بڑے عجیب اور بھیانک کرب میں مبتلا تھا۔ وہ پلٹ رہا تھا اور اینٹھ رہا تھا۔ پیڈرو اس کے پاس پہنچ کے جھکا۔ اسی وقت سیمسن کے جسم نے آخری جھٹکا لیا اور ساکت ہو گیا۔ اس کی کھُلی آنکھیں باتھ روم کی چھت پر مرتکز ہو گئیں۔ اگر میرے پاس کچھ ہوتا تو میں ایک لمحے کی اس مہلت سے فائدہ اٹھا سکتا تھا جب حیرت، خوف اور غصّے نے پیڈرو کو مفلوج کر دیا تھا لیکن میرے پاس صرف فلش ٹینک کے ڈھکنے کے ٹکڑے تھے۔ بے اختیار میں نے ایک بڑا ٹکڑا اٹھایا اور پیڈرو پر جا پڑا جس نے ریوالور کا دستہ میرے سر پر مارنے کے لیے جست لگائی تھی۔ موٹے پورسلین کے ٹکڑے نے تیشے کا کام کیا۔ ہم بیک وقت ٹکرائے۔ خطرہ محسوس کرتے ہی پیڈرو نے ٹریگر پر انگلی کا دباؤ بڑھا دیا تھا۔ دھماکا دو بار ہوا مگر گولی نہ جانے کدھر گئی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے ٹکرا کر گرے۔ پھر میرے ہاتھ نے تکون نما وہ ٹکڑا پیڈرو کے ہاتھ پر مارا جس کے کنارے آری کی طرح تیز تھے۔ اس نے سر جھٹکا اور سنبھلنا چاہا مگر میں نے بڑی پھرتی سے دوسرا وار کیا۔ پیڈرو ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ میں نے تیسری مرتبہ اپنا ہتھیار استعمال کرنا چاہا لیکن اس کی بیرونی سطح بہت چکنی تھی۔ چینی کی سطح میری انگلیوں میں سے پھسل گئی کیونکہ میرے ہاتھوں میں پسینے کی نمی بھی آگئی تھی اور میری ہمت بھی جواب دے چکی تھی۔ میں کسی بدمست شرابی کی طرح جھومنے لگا۔ ایک دھندلے سائے کی طرح میں نے پیڈرو کو سلو موشن میں اٹھتے اور ہاتھ اٹھاتے دیکھا۔ پھر ضرب میرے سر پر لگی اور میں اندھیرے کنوئیں میں گر گیا۔ بالکل پُرسکون ہو گیا۔

زندہ رہنے کی تمنا لاشعور میں موجود تھی اور اسی نے بیہوشی کے وقفے میں احساس کو بیدار کرنے کی کوشش جاری رکھی۔ یہ تمنا ایک آواز بن کے مجھے جگاتی رہی کہ اتنی جدوجہد کے بعد ہمت نہ ہارو، اٹھو، وقت سے فائدہ اٹھا لو اور نکل جاؤ۔ آزادی کی منزل کے راستے تک پہنچ جانے کے بعد واپسی کا کوئی سوال نہیں۔ پل بھر کے لیے گھُپ اندھیرے میں رابعہ ایک پیکر نور بن کے ابھری اور اس نے اپنے ہاتھ پھیلائے "اٹھو سکندر! اب نہ اُٹھے تو پھر کبھی یہ موقع نہ ملے گا۔ یہ لوگ تمہیں ایک ضرورت کے

تحت زندہ رکھے ہوئے ہیں مگر یہ ضرورت کوئی مجبوری نہیں ہے۔ یہ تمہیں قتل بھی کر سکتے ہیں مگر تم کو زندہ رہنا ہے۔ اپنے لیے، میرے لیے۔

میں نے آنکھیں کھول کے دیکھا۔ باتھ روم کے فرش پر تین افراد پڑے ہوئے تھے۔ ایک سیمن تھا جسے صورِ اسرافیل پھونکے جانے سے قبل نہیں اٹھنا تھا۔ دوسرا پیڈرو تھا جس کے سر پر میرے ہاتھ کی کوئی ضرب کاری ثابت ہوئی تھی اور مجھے لٹانے کے بعد وہ خود بھی لیٹ گیا تھا۔ تیسرا میں تھا جو سیمن کی لاش کے اوپر گرا تھا۔ میرا سر اس کے سینے پر تھا چنانچہ آنکھیں کھولتے ہی میری نظریں اس کی بے نور نظروں سے ملیں اور میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ میں اٹھ بیٹھا۔ میرے ہاتھ اور ٹانگ کے مقابلے میں سر کی چوٹ زیادہ درد کر رہی تھی اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میری گردن پر میرا سر نہیں کوئی چٹان ہے جس کا بوجھ اٹھانا میرے بس کی بات نہیں۔

دیوار کو ہاتھ سے تھام کر میں آہستہ آہستہ اٹھا۔ واش بین کے پاس رُک کر میں نے ایک ہاتھ سے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے تو میری حالت کچھ سنبھلی۔ میں نے دروازے کے خلا کا رُخ کیا۔ پھر مجھے پیڈرو کے ریوالور کا خیال آیا اور میں واپس ہوا۔ وہ کسی بھی وقت، ہوش میں آسکتا تھا اور میرا کام تمام کر سکتا تھا۔ میں نے سیمن کو مار دیا تھا اور دشمن کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا تھا۔ وہ ایک کی جگہ دوسرا ضمیر فروش ڈاکٹر تو لا سکتے تھے مگر دنیا کے بازار میں سیمن اتنی آسانی سے دستیاب نہیں ہے۔ میں نے پیڈرو پر یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ میری نگرانی میں اس سے کیا کوتاہی سرزد ہوئی اور اسے یہ دھمکی بھی دی تھی کہ میں دلاور کو اس کی حماقت سے آگاہ کر دوں گا۔ پھر میں نے اس کو دھوکا دے کر ناک آؤٹ کر دیا تھا۔ اب ہوش میں آتے ہی وہ انتقام لینے کے لیے، سزا دینے کے لیے یا اپنی ذات کے تحفظ کی خاطر مجھے کوئی سوال کیے بغیر گولی مار دے تو عجب نہیں۔ دلاور کے سامنے وہ اس اقدام کو ناگزیر قرار دینے کے لیے دس جواز پیش کر سکتا ہے اور اسے مطمئن کر سکتا ہے کہ وہ مجھے قتل نہ کرتا تو سیمن کے بعد خود مارا جاتا اور پھر نرس ماری جاتی۔ ان کے زنداں کا راز فاش ہو جاتا اور دلاور آتا تو سیدھا پولیس کے جال میں گرفتار ہو جاتا۔ مجھے قتل نہ کرنے کے احکامات بہت واضح تھے لیکن اس کا مطلب یہ بہرحال نہیں تھا کہ مجھے سب کو قتل کرنے کا لائسنس مل گیا ہے۔ اپنے دفاع کے لیے قتل کرنے کا حق تو قانون بھی دیتا ہے۔ مجھے یاد آیا کہ دو گولیاں تو پیڈرو نے بھی چلائی تھیں۔ میں نے اس کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کے دیکھا لیکن مجھے صرف ایک چابی ملی جو ڈور لاک سے زیادہ کسی ہتھکڑی کی لگتی تھی۔ میں نے اسے جیب میں ڈال لیا۔

پھر میں نے اِدھر اُدھر دیکھا مگر ریوالور نہ جانے کہاں تھا۔ ریوالور اگر پیڈرو کے ہاتھ سے گرتا تو اسی باتھ روم کے فرش پر ہی کہیں ہوتا۔ اگر گرتے گرتے بھی اس نے ریوالور کو نہیں چھوڑا تھا تو اس کے ہاتھ میں ہوگا۔ میں نے اس کے دائیں ہاتھ کو کھینچا جو اُس کے اُلٹے پڑے ہوئے جسم کے نیچے آگیا تھا۔ پیڈرو کراہا اور میں نے اسے پلٹ دیا۔ ریوالور نیچے دبا ہوا تھا۔ میں نے اُٹھایا ہی تھا کہ پیڈرو نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں اور اٹھنے کی کوشش کی۔

"خبردار" میں نے اس سے دُور ہو کے کہا "میں گولی مار دوں گا۔" لیکن ہوش میں آتے ہی پیڈرو نے صورتِ حال کا اندازہ کر لیا۔ میری دھمکی کی پروا کیے بغیر اس نے پلٹ کر ایک ہاتھ بڑھایا اور میری ٹانگ پکڑ لی۔ میں نے پیر کو جھٹکا لیکن یہ میرا صحت مند پیر نہیں تھا۔ پیڈرو نے اپنی گرفت اور سخت کر دی۔ ناقابلِ بیان درد نے مجھے اپنی بے بسی کا احساس دلایا اور مجھے گرنے سے سنبھلنے کے لیے دیوار کا سہارا لینا پڑا۔ اتنی اذیت برداشت کرنے اور زندگی کی اس جنگ کے آخری مرحلے میں جان کی بازی لگا دینے کے بعد ناکامی کا تصور ہی سوہانِ روح تھا۔ اب میں شکست کسی قیمت پر قبول نہیں کر سکتا تھا۔

"پیڈرو، چھوڑ دے مجھے کتے!" میں نے ہانپتے ہوئے کہا اور تکلیف کے باوجود اپنا پیر چھڑا کے دروازے کی طرف بڑھنے کی جدوجہد جاری رکھی۔ کمزوری مجھ پر پھر غالب آنے لگی تھی لیکن دوبارہ بیہوشی کا مطلب تھا موت۔ میں نے ریوالور سے نشانہ لیا اور ٹریگر دبا دیا۔ ریوالور میں گولی ہوتی تو پیڈرو کی کلائی کو توڑتی ہوئی نکل جاتی مگر میگزین خالی ہو چکا تھا۔ ریوالور میں سے "کلِک" کی آواز آئی۔ میں نے پھر کوشش کی اور آخری وقت میں جھک کر ریوالور کا دستہ پیڈرو کے ہاتھ پر مارا۔ پیڈرو کراہا اور میری ٹانگ آزاد ہوگئی۔ میں باہر بھاگا اور گرا۔ میری ٹانگ نے میرا ساتھ نہیں دیا تھا۔ پیڈرو اٹھ کے کھڑا ہو چکا تھا۔ میں نے ایک نظر اسے دیکھا اور دوسری نظر سے اس بیساکھی کو جو میرے بیڈ کے ساتھ کھڑی تھی اور مجھ سے دور نہیں تھی۔ بیساکھی ہاتھ میں آتے ہی میں ایک ٹانگ پر اٹھا اور تیزی سے گھوما۔ پیڈرو کسی زخم خوردہ درندے کی طرح مجھے دبوچنے کے لیے آگے بڑھ رہا تھا۔ میں نے بیساکھی گھمائی اور اس کے نچلے حصّے کو پیڈرو کے سر پر لگتے دیکھا۔ نچلا حصہ ڈنڈے کی طرح گول تھا اور اس پر لوہے کا خول تھا۔ پیڈرو نے اپنا سر پیچھے ہٹا کے بچنا چاہا تھا لیکن اس کا اندازہ غلط ہو گیا۔ بیساکھی اس کے سر کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ اگر وہ پوری طرح ہوش میں ہوتا تو اس معمولی ضرب کو جھیل جاتا۔ بیساکھی لگتے ہی وہ نیچے گرا۔ وہ بیہوش نہیں ہوا تھا لیکن چکرا گیا تھا۔

میں دروازے کی طرف لپکا جو پیڈرو نے اندر آتے وقت کھلا چھوڑ دیا تھا۔ چابی باہر ہی لگی رہ گئی تھی۔ میں نے ایک لمحے کا توقف کیے بغیر چابی گھما دی اور نکال کے جیب میں ڈالی۔ پھر میں نے اپنے زنداں کو باہر سے دیکھا۔ میں ایک زینے کے مقابل کھڑا تھا۔ دائیں بائیں کچھ بھی نہیں تھا جس سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا کہ وہ کمرہ جہاں میں قید تھا اور جہاں اب سیمن کی لاش کے علاوہ پیڈرو پڑا رہ گیا تھا کسی مکان میں سب سے اوپر والی منزل پر بنا ہوا واحد کمرہ تھا۔ کھڑکی سے نظر آنے والے درختوں کی بلندی سے اور پرندوں کو محوِ پرواز دیکھ کر میں نے یہ اندازہ کر لیا تھا کہ میں سطحِ زمین سے خاصا اوپر ہوں۔ تیسری یا چوتھی منزل پر۔ اب میں نے زینے کو دیکھا تو مجھے ایک اور طلبگارِ جاں مرحلے سے گزرنا مشکل دکھائی دیا۔ یہ زینہ صرف ایک ڈھانچہ تھا جس میں بغیر پلاستر کی سیڑھیاں تھیں اور کوئی ریلنگ نہیں تھی۔ دونوں طرف آڑے ترچھے زنگ خوردہ سریے نکلے ہوئے تھے۔ اگر دیوار اٹھائی جاتی تو یہ سریے اندر آ جاتے لیکن نہ جانے کیوں باتھ روم کی طرح زینہ بھی تکمیل کے آخری مراحل میں رُک گیا تھا۔ ایک طرف گھر کی نچلی منزل کا پورا نقشہ تھا لیکن دوسری طرف صرف خلا تھا۔ خالی میدان جس میں اینٹ پتھر کے ڈھیر تھے اور خودرو جھاڑیوں کے درمیان ایک ببول اُگا ہوا تھا۔ قریب ترین مکان بھی پچاس گز دُور تھا اور بیشتر مکان ایک دوسرے سے الگ، زیرِ تکمیل یا نئے بنے ہوئے تھے۔

میرا اندازہ درست تھا۔ میں دو منزلہ مکان کی چھت پر بنے ہوئے کمرے میں بند تھا گویا تیسری منزل پر تھا۔ سب سے اوپر کا یہ کمرہ فاضل تھا جسے مکین پورا نہ کر سکے تھے تاہم یہ رہائش کے قابل تھا اور اس میں مہمان ٹھہر سکتے تھے یا نوکر رہ سکتے تھے۔ غور سے دیکھنے کے باوجود میں گرد و نواح سے اندازہ نہ کر سکا کہ میں کہاں ہوں۔

بیساکھی بغل میں دبا کے میں نے پوری احتیاط کے ساتھ پہلے زینے سے دوسرے زینے پر قدم رکھا۔ اپنا توازن برقرار رکھنا انتہائی ضروری تھا ورنہ میں دائیں جانب بیس فٹ نیچے پتھروں پر گرتا اور بائیں جانب اس سے نصف فاصلہ طے کر کے صحن میں سیمنٹ کے پکے فرش پر۔ دو زینے اُتر کے مجھے احساس ہوا کہ یہ کام کتنا مشکل ہے۔ پہلے میں جسم کا سارا بوجھ ایک ٹانگ پر ڈالتا تھا جو ٹھیک تھی۔ پھر کسی چیز کا سہارا لیے بغیر بیساکھی اگلے زینے پر رکھتا تھا اور اس مصنوعی ٹانگ کے سہارے آگے جھک کر نیچے آتا تھا۔ دونوں زینوں پر میرے جسم کی ساری قوت صرف ہوتی تھی۔ آسان تو ایک ٹانگ پر چلنا بھی نہ تھا مگر بیساکھی کے نچلے گول حصّے پر توازن رکھنے کی مجھے مشق ہی نہ تھی۔ تیسرا زینہ اُترنے سے پہلے مجھے چکر سا آیا اور زینہ میری نظروں کے سامنے ہلنے لگا۔ میں فوراً بیٹھ گیا۔

بیٹھ کے اُترنا نسبتاً آسان تھا اور اس میں گرنے کے امکانات معدوم تھے۔ نیچے پہنچنے سے پہلے مجھے کئی بار پیڈرو کا خیال آیا۔ وہ کُھلی کھڑکی کے راستے نیچے اُتر سکتا تھا مگر آسانی سے نہیں۔ جسمانی طور پر وہ پوری طرح چاق و چوبند ہوتا تو روایتی انداز میں چادر پھاڑ کے پٹیاں بناتا اور پٹیوں کو گرہ دے کر رسّی۔ پھر وہ اسی رسّی کے سہارے ہر گانٹھ کو انگلی اور پیر کے انگوٹھے میں پھنساتا نیچے اُتر جاتا لیکن ابھی تو اس کا ذہن بھی اس حد تک معاون نہیں ہوگا اور بالفرضِ محال اُس نے رسّی بنا بھی لی تو اس کی جسمانی صلاحیت آڑے آئے گی۔ اسے سوچنا پڑے گا کہ اس کوشش میں وہ اپنا وزن نہ سنبھال سکا تو نیچے گر کر کیسے اُٹھے گا۔ بہر صورت وہ دس پندرہ منٹ سے پہلے کمرے سے باہر نہیں آسکتا تھا۔

نیچے والی منزل کا ہر کمرہ بند اور مقفل تھا۔ گرد و غبار کی تہ بتاتی تھی کہ مدّت سے یہاں کوئی بھی نہیں آیا۔ دلاور اینڈ کمپنی ہمیشہ ایسے ہی گھروں کا انتخاب کرتی تھی جن سے اُس کا دُور کا بھی تعلق ثابت نہ ہو۔ ہر آبادی میں ایسے گھر مل ہی جاتے ہیں جن کے مالک دوسرے شہر یا دوسرے ملک میں ہوں، مر چکے ہوں اور گھر لاوارث رہ گئے ہوں یا آسیب زدہ مشہور ہو گئے ہوں اور کوئی ان میں رہنے کے لیے نہ آتا ہو۔ دلاور اور اس کے حواری تو ایسے گھر تلاش کر کے نظروں میں رکھتے ہوں گے جو ان کے کام آئیں لیکن ان کا سراغ نہ دیں۔ ماضی میں ایسا کئی بار ہو چکا تھا۔

سب سے نیچے والی منزل تک پہنچنا کوئی مسئلہ نہ بنا کیونکہ زینے کے ایک طرف دیوار تھی تو دوسری جانب لکڑی کی ریلنگ۔ لیکن ابھی میں نے آخری زینے پر قدم رکھا ہی تھا کہ مجھے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ چھپنے کے لیے نہ جگہ تھی اور نہ وقت تھا۔ چند سیکنڈ بعد نرس نمودار ہوئی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بُری طرح چونکی اور اس کا ہاتھ خود بخود ریوالور نکالنے کے لیے بڑھا مگر میں خالی ریوالور کا رُخ پہلے ہی اس کی طرف کر چکا تھا۔

"بالکل سیدھی کھڑی رہو۔" میں نے سپاٹ لہجے میں حکم دیا۔ "ورنہ جس طرح میں دو گولیوں سے سیمن اور پیڈرو کو ٹھنڈا کر آیا ہوں اسی طرح تیسری گولی سے . . . " میں نے نشانہ لینے کے انداز میں ریوالور اُوپر اٹھایا۔

"پلیز . . . پلیز مجھے مت مارو . . . " وہ کانپنے لگی "تم جیسا کہتے ہو میں ویسا ہی کروں گی . . . "

"اچھا تو پہلے اپنے دونوں ریوالور نکالو۔ احتیاط سے آہستہ آہستہ اور نیچے میرے پیروں کی طرف پھینک دو۔" میں نے کہا۔ "یہ مت

بھولنا کہ مجھے صرف ٹرائگیر دبانا ہے۔ ذرا سی غلط حرکت کا شبہ بھی ہوا مجھے تو میں سوچوں گا نہیں۔"

اس نے اقرار میں سر ہلایا اور ایک جیب سے ریوالور نکال کر میری طرف سرکا دیا۔ میں نے جھک کر اُسے اٹھایا اور جیب میں رکھ لیا۔ "اب دوسرا۔ جس سے تم نے مجھے گینڈا سمجھ کر بے ہوشی کا انجکشن دیا تھا۔" میں نے کہا اور اس وقت مجھ سے ایک غلطی ہو گئی۔ میں نے اپنا خالی ریوالور رکھ کے جیب سے نرس کا دیا ہوا ریوالور نکال لیا۔ اس کا ردِ عمل انتہائی غیر متوقع تھا۔ نرس نے بڑی پھرتی سے دوسرا ریوالور نکالا اور پیچھے ہٹ کر میرا نشانہ لیتے ہی فائر کر دیا۔ میں اُسے گولی مار سکتا تھا لیکن میری خواہش یہ تھی کہ اس پیشہ ور قاتلہ کو زندہ گرفتار کروں اور اس سے وہ سب پوچھ لوں جو مجھے معلوم نہیں تھا۔ چنانچہ اپنی دھمکی پر عمل کرنے کے بجائے میں نے نیچے گر کے خود کو اس زہریلے تیر نما کارتوس سے بچا لیا جو میرے جسم میں کہیں بھی پیوست ہو جاتا تو تین منٹ کے اندر اندر مجھے لٹا دیتا۔

میں نے نرس کو ایک گالی دی جو بلا ارادہ میری زبان پر آ گئی تھی اور محض اُسے خوف زدہ کرنے کے لیے ریوالور اٹھا کے ٹریگر دبا دیا۔ میں مطمئن تھا کہ گولی اُسے چھوئے بغیر اس کے سر کے اوپر سے گزر جائے گی لیکن ایک بار پھر ٹریگر دبنے کی آواز نہ آئی۔

نرس قہقہہ مار کے ہنسی۔ "اب تم جہاں بیٹھے ہو وہیں بیٹھے رہو۔" اس نے مجھے حکم دیا۔ نہ جانے کیوں ہنسی کی طرح مجھے یہ حکم بھی ایک کھوکھلی دھمکی لگا۔ مجھے اپنی حماقت کا شدت سے احساس ہوا۔ غالباً پیڈرو نے اس کے ریوالور کی گولیاں نکال لی تھیں اور نرس یہ بات جانتی تھی۔ اس سے پیڈرو کا خالی ریوالور بہر حال بہتر تھا جس نے نرس کو دہشت زدہ کر کے میرا حکم ماننے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں نے بیٹھے بیٹھے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ وہ پھر مجھے نشانہ بنائے کھڑی تھی۔ ایک سیکنڈ منجمد ہو کے انتظار کا کرب بن گیا۔

"انتظار کس کا ہے؟" میں نے اس سیکنڈ کے بوجھ تلے دب کر کہا۔ لیکن وہ اسی طرح کھڑی رہی۔ پھر حقیقت کو میں نے اس کی آنکھوں میں پڑھ لیا۔ نشانہ خطا ہو جانے کے بعد وہ بھی خالی ہاتھ رہ گئی تھی۔ یہ ریوالور بے مصرف ہو گیا تھا۔ شاید دوسری بار چلانے کے لیے اُسے پھر لوڈ کرنا پڑتا تھا۔ نرس کی ہنسی ایک بے جان مسکراہٹ میں ڈھل کے غائب ہو گئی۔ میں آہستہ آہستہ اٹھا اور بیساکھی لے کر کھڑا ہو گیا۔

"اب ہم دونوں کے ہاتھوں میں بے مصرف کھلونے ہیں۔" میں نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "عملاً ہم دونوں خالی ہاتھ ہیں۔ میری ایک ٹانگ اور ایک ہاتھ پوری طرح کارآمد نہیں لیکن میرے پاس یہ اضافی ہتھیار ہے۔" میں نے بیساکھی اٹھے کہا۔ "اس کے علاوہ۔ جیسے مرا ہاتھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔ ایسے ہی آدھا مرد پوری عورت کے مقابلے میں بھاری پڑتا ہے تم آزما چاہو گی۔"

"اگر تم نے ... میری طرف قدم بڑھایا۔" وہ چلائی اور اس نے خالی ریوالور مجھ پر کھینچ مارا۔ ریوالور ایک فٹ دور سے گزرا اور زینے کی دیوار پر لگا۔ "میں شور مچا دوں گی۔" وہ نروس ہو کے بولی۔

"چور مچائے شور۔" میں نے کہا۔ "اپنا یہ شوق بھی پورا کر لو۔ فائدہ ہو گا یا نہیں۔ یہ تم کو یقیناً معلوم ہو گا۔ شور مچانے کی ضرورت محسوس ہوتی تو میں تمہارے مقابلے میں لاؤڈ اسپیکر کی طرح چلّا سکتا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ اس سے صرف میری آواز خراب ہو جائے گی۔ سُنے گا کون میری۔ تمہاری آواز بھی کہاں تک جائے گی۔ سُننے والے تو مر گئے۔" موت کی خبر نے اس پر کوئی اثر نہیں کیا تھا۔

"پھر ... مجھ سے کیا ... کیا چاہتے ہو تم ...؟" وہ ایک قدم پیچھے ہو کے بولی۔ "میرا کوئی قصور نہیں ... میں مجبور تھی۔"

"ہم سب کے پاس مجبوری ایک ڈھال کا نام ہے۔" میں نے ایک قدم آگے بڑھایا۔ "اس کی آڑ میں ہم اپنی ہر غلطی کو چھپا کے دنیا سے لڑتے ہیں۔ چور کہتا ہے میں مجبور تھا۔ طوائف خود کو مجبور کہتی ہے اسمگلر تک مجبور ہے یہاں۔ آخر کون سی مجبوری ہوتی ہے یہ ... پیٹ کی؟ پیٹ بھر روٹی تو شرافت اور عزت سے بھی مل جاتی ہے۔ مجبوری ہوتی ہے ہوسِ زر کی۔ اس دولت کی جس سے تن آسانی اور عیاشی کے اسباب پیدا ہوتے ہیں۔" جیسے جیسے میں آگے بڑھتا گیا، وہ پیچھے ہٹتی گئی یہاں تک کہ وہ ایک دیوار سے جا لگی اور اس کے لیے مزید مراجعت ممکن نہ رہی۔ میرے اور اس کے درمیان تین فٹ کا فاصلہ رہ گیا۔

"میرے پاس وقت کم ہے اس لیے میں تمہاری مجبوری کی کہانی سُننے نہیں بیٹھ سکتا۔" میں نے کہا۔ "مجھے اسلحہ چاہیے۔ ریوالور کی دونوں قسم کی گولیاں جو تم استعمال کرتی رہی ہو۔"

"میرے پاس کچھ نہیں ہے اب۔" وہ بولی۔ "تمہاری وجہ سے اُنھوں نے سب کچھ چھین لیا۔"

"میری وجہ سے۔ خوب۔ گویا وہ میری غلطی تھی جس کی وجہ سے تم نے مجھ پر گولی چلائی تھی۔" میں نے طنز سے کہا۔

"تم کو یقین نہیں تو میری تلاشی لے کر دیکھ لو۔" وہ بولی۔ "ابھی کچھ دیر پہلے ہی اس نے ریوالور سے گولیاں نکالی ہوں گی۔ بے ہوش کرنے والی گولی میرے پاس ایک ہی رہتی تھی۔"

"افسوس یہ ہے کہ میں تم جیسی عورت پر یقین نہیں کر سکتا۔" میں نے کہا۔ "تمھیں علم تھا کہ ریوالور خالی ہے؟"

"ہاں .... ابھی ہوش میں آنے کے بعد میں نے اُسے قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔" وہ بولی۔ "اس نے مجھے قابو کر کے ریوالور چھین لیا اور گولیاں باہر پھینک دیں۔"

"پھینک کیوں دیں؟" میں نے کہا۔ "جیب میں کیوں نہیں ڈالیں؟ وہ خود اُنھیں استعمال کر سکتا تھا۔"

نرس نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس کا ریوالور دوسری ساخت کا تھا۔ گولیاں باہر پڑی ہوں گی۔ تم ڈھونڈ سکتے ہو۔"

میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا رہا۔ یہ طے کرنا بہت مشکل تھا کہ وہ سچ بول رہی ہے یا مجھے اُلو بنا رہی ہے۔ اس کا چہرہ اور آواز دونوں ہر قسم کے جذبات سے عاری تھے۔ "تم نے اُسے قتل کرنے کی کوشش کی اور اس نے صرف ریوالور خالی کرنا مناسب سمجھا؟" میں نے کہا۔ "تمھیں کچھ نہیں کہا؟"

"اس نے ... مارا تھا مجھے ..." اس نے اپنا رخسار سامنے کیا جس پر چار انگلیوں کے نشانات بہت واضح تھے۔ "میں گر گئی۔ وہ سمجھا میں پھر بے ہوش ہو گئی ہوں۔ اُسی وقت اُوپر سے ایک دھماکا سنائی دیا۔ پھر دوسرا ... وہ مجھے چھوڑ کے اوپر بھاگا۔ اُسے دوسرا ریوالور لینے کا خیال نہیں آیا جلدی میں۔"

"اس دوسرے، بے ہوش کرنے والے ریوالور کی گولی وہ کہاں سے لاتا تھا؟" میں نے کہا۔

"مجھے نہیں معلوم۔ مجھے تو وہ اپنی جیب سے نکال کے دیتا تھا۔" وہ بولی۔ "اور میرا خیال ہے اس کے پاس ایک ہی ہوتی تھی۔"

میں نے غور کیا تو مجھے سب سے نچلی منزل کے سارے کمرے بھی بند نظر آئے۔ گھر زیادہ بڑا نہیں تھا اور شاید پانچ مرلے پر بنا ہوا تھا۔ ہر منزل کا نقشہ ایک ہی تھا۔ دائیں طرف ایک کمرہ سامنے دو کمرے۔ دونوں کمروں کے سامنے برآمدہ اور بائیں جانب ایک قطار میں تینوں خانے یعنی باورچی خانہ، غسل خانہ وغیرہ۔ برآمدے میں ایک تخت بچھا ہوا تھا۔ غالباً اس پر نرس سوتی ہو گی۔ سیمسن کے لیے فرشِ خاک اور بسترِ ریشم و کمخواب برابر تھے۔ وہ دونوں باری باری سوتے جاگتے ہوں گے اور میری نگرانی کرتے ہوں گے۔ کھلا باورچی خانہ اس بات کا ثبوت تھا کہ نرس کے لیے وہاں کھانے پکانے کی سہولت فراہم کر دی گئی تھی۔ چنانچہ وہ باورچن بھی تھی۔ اپنے علاوہ سیمسن کو بھی پکا کے کھلاتی تھی اور مجھے بھی۔ پیڈرو یا ولاور جیسے معزز مہمانوں کے لیے چائے، کافی بھی وہی بناتی ہو گی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اسلحہ ذخیرہ بھی کچن کے کسی خانے میں پوشیدہ ہو؟ میں نے سوچا۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟" نرس نے کہا۔ "باورچی خانے میں تمہارے مطلب کی کوئی چیز نہیں ہے۔"

"تم تو خیالات تک پڑھ لیتی ہو۔" میں نے تمسخر آمیز لہجے میں کہا۔ "ایسے اعتبار نہیں کر سکتا میں تم پر۔ اپنا منہ دیوار کی طرف کر لو۔ میں تلاشی لوں گا۔ حرکت بالکل نہ کرنا بلکہ سانس بھی احتیاط سے لینا۔ تم نے میرے خالی ہاتھوں کا کمال دیکھا ہے۔"

"تم وقت ضائع کر کے خطرہ مول لے رہے ہو۔" وہ چپٹ کر بولی۔ "یہ نہ ہو کہ کوئی آ جائے۔"

اس کا احساس مجھے بھی تھا لیکن فرار ہونے سے پہلے میں اس امر کو یقینی بنا لینا چاہتا تھا کہ یہ شکاری عورت زیرِ دام آ جانے والے شکار کو حلقۂ دام توڑ کے فرار ہوتا دیکھے گی تو گولی نہیں چلائے گی۔ پیڈرو کا کسی بھی وقت ہوش میں آ جانا ناممکن تھا اور اس کے لیے بند کمرے سے نکل آنا مشکل ضرور تھا، ناممکن نہیں تھا۔

"کیا سچ مچ تم نے پیڈرو کو مار دیا ہے؟" وہ میری صورت پر تذبذب کے آثار دیکھ کر بولی۔

"ہاں۔ اس میں شک کی کون سی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "تم لاشیں دیکھنا چاہتی ہو تو چلو۔ تمھیں بہت صدمہ ہے؟"

"نہیں۔" وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ "میرا کون سا سہاگ اجڑ گیا ہے۔ میں بھی تو وہی کرنے والی تھی جو تم نے کر دیا ہے۔ ولاور کی بات کر رہی تھی۔ یہ اس کے آنے کا وقت ہے۔ وہ آ گیا تو ہمارا نکلنا مشکل ہو جائے گا۔"

"ہمارا؟" میں نے جمع کے صیغے پر حیران ہو کے کہا۔ "اگر تم بھی میرے ساتھ ہی نکلنے کا سوچ رہی ہو تو یہ خیال دل سے نکال دو۔ میں کوئی خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں۔ میں تم کو یہیں باتھ روم میں بند کر جاؤں گا۔"

"پلیز۔ ولاور مجھے مار ڈالے گا ... مجھے یہاں مت چھوڑو۔" وہ عاجزی سے بولی۔ "میں تمہاری مدد کروں گی۔"

"کیسے اور کیوں؟" میں نے کہا۔ "مجھ سے کیا ہمدردی ہو گئی ہے اچانک تم کو؟" میں نے کہا۔

"اس جرح سے کیا فائدہ۔" وہ بولی۔ "نکلنا مجھے بھی ہے یہاں سے اور تم کو بھی۔ ساتھ لے جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے تو جاؤ مگر مجھے بند کر کے مت جاؤ۔ مجھے بھی زندہ رہنے دو۔ میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گی۔"

"اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم میرے لیے کوئی مشکل کھڑی نہیں کرو گی؟" میں نے کہا۔ "یہ کوئی نئی چال تو نہیں ہے؟"

"تم کو اعتبار تو ہے نہیں مجھ پر۔ ہونا بھی نہیں چاہیے۔ پھر

ضمانت میں کیسے دوں!" وہ بولی۔" جو پوچھنا ہے یہاں سے نکل کر پوچھ لینا۔ یقین کرنا چاہو تو کرنا ورنہ مجھے جہاں چاہو چھوڑ دینا۔ میرے تمہارے راستے الگ ہو جائیں گے۔"

"اچھا۔" میں نے کہا۔" تم آگے چلو۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ میں کہاں ہوں۔ یہ کون سی جگہ ہے اور کون سا شہر ہے۔" اس کے ساتھ ہی میں اُسے راستہ دینے کے لیے پیچھے ہو گیا۔

"تمہیں نہیں معلوم کہ تم راولپنڈی میں ہو؟" وہ حیرانی سے بولی۔" یہ شیخ بھاڑہ کا علاقہ ہے۔ ذرا آگے دھمیال ہے۔ جہاں پہلے ایک چھوٹا سا ایئر فیلڈ تھا۔ سڑک ایک میل دور ہوگی۔ ہم کھیتوں سے گزر کے ایک کستی عبور کریں گے۔"

"کستی کیا؟" میں نے کہا۔

"ایک نالہ ہے۔" وہ بولی۔" سارا سال تھوڑا بہت پانی ہوتا ہے۔ تم چل سکو گے نا؟"

"ہاں۔ چلنا ہی پڑے گا۔" میں نے کہا۔

اسی طرح؟ ننگے پاؤں۔" وہ بولی۔" میں اُوپر سے جوتے لے آتی ہوں تمہارے ..."

"نہیں۔" میں نے اس کا بازو پکڑ لیا۔" اس رعایت سے ناجائز فائدہ حاصل کرنے کی مت سوچو۔ میری فکر مت کرو اور باہر چلو۔" میں نے اُسے مخالف سمت میں دھکیل دیا۔ اگر پیڈرو واقعی مر گیا ہوتا تو شاید میں اُسے اوپر جانے دیتا لیکن اب میں افشائے راز سے ڈرتا تھا۔ نرس کی صورت پر دکھ کا ایک سایہ آ کے گزر گیا۔

باہر کھلا آسمان تھا اور اس کی نیلگوں وسعت میں پرندے آزادی سے پرواز کر رہے تھے۔ کھیتوں کے درمیان پگڈنڈی جیسی منڈیر پر چلتے ہوئے میں نے بھی انہی پرندوں کی طرح محسوس کیا جو پنجرہ کھلا پا کے اڑ جاتے ہیں۔ گندم کی فصل پک چکی تھی اور فضا میں خوشۂ گندم کی دلنواز مہک تھی۔ ہوا گرد و غبار اور دھوئیں سے پاک تھی اور اس میں سانس لینا ایک انتہائی فرحت بخش تجربہ تھا۔ پرندوں کی چہکار کے علاوہ کبھی کبھی فصل اُگانے والے محنت کشوں کی صدا بھی سنائی دے جاتی تھی۔" ہا آ ... ہو و۔" اور اس کے ساتھ ہی خوشہ چینی کرنے والی چڑیوں کا ایک غول پھر سے اُڑ جاتا تھا۔ اپنی محنت کے ثمر کو بچانے کے لیے کاشت کاروں نے ڈنڈے جوڑ کر عجیب و غریب نمونے کھڑے کر دیے تھے۔ پھٹے پرانے کوٹ، پتلون پہنے اور ٹوپی یا ہیٹ لگائے یہ ڈراؤنے ڈھانچے دُور سے آدمی کی طرح نظر آتے تھے چنانچہ کم عقل پرندے اُسے محافظ سمجھتے ہوئے قرب و جوار میں دانہ چگنے کی ہمت نہیں کرتے تھے۔ قریب سے دیکھنے پر یکارٹون جدید مجسمہ سازی میں کسی تجریدی تجربے کا شہکار

لگتے تھے۔ احتیاطاً میں نے منڈیر چھوڑ کے کھیتوں کے کنارے چلنا شروع کیا۔ زمین نرم تھی اور اس میں کنکر نہیں تھے۔ زیادہ حصے پر دوب یا چھوٹی مگر گھنی گھاس تھی۔ چنانچہ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہو رہی تھی۔" تم ان راستوں سے واقف ہو۔ یہیں رہتی ہو کیا؟" میں نے پیچھے سے کہا۔

"نہیں۔ لیکن میں آتی جاتی رہی ہوں۔" وہ آگے چلتے چلتے بولی۔

"آج دن کون سا ہے۔ اور تاریخ کیا ہے؟" میں نے اچانک پوچھا۔

"دن ہے جمعرات اور تاریخ ہے ستائیس۔" وہ بولی۔ میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ میرے حساب سے وقت تقریباً ایک ہفتہ پیچھے ہو گیا تھا۔ مجھے شک تو شروع سے تھا کہ میری بے ہوشی میں وقت کا حساب گڑبڑ کر دیا گیا ہے اور گھڑی، کیلنڈر یا اخبار کی عدم موجودگی میں صرف اندھیرے اُجالے سے وقت کی رفتار کا اندازہ کرنا محال تھا۔ دلاور اور پیڈرو نے مجھے یقین دلا دیا تھا کہ میرے اغوا کی واردات کو دو ہفتے بیت چکے ہیں۔ محسن کو مرے ہوئے چودہ دن ہو گئے ہیں۔ میرے دل میں ایک ٹھیس سی اٹھی۔ ایک ہفتہ۔ اب تک تو جیتے جاگتے محسن کا جسم فقط ہڈیوں کا پنجر رہ گیا ہوگا۔ ایک ہفتہ کم ہو گیا تو کیا ہوا۔ رابعہ کا کیا حال ہوگا؟ میرے تصور نے ایک تصویر پیش کی۔ وہ بالکل گم صم اور تنہا بیٹھی تھی۔ اس کے کپڑے میلے اور شکن آلود تھے۔ بال پریشان تھے اور آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ حلقے تھے۔ کیوں کہ اس نے کھانا پینا سونا سب چھوڑ رکھا تھا۔ ایک ہفتے بعد وہ ایک سال کی بیمار لگتی تھی۔ پھر میں نے فوزیہ کو دیکھا جس نے آخری بار میری آواز سنی تھی۔ وہ رو رہی تھی اور شیخ اسے تسلی دے رہا تھا کہ رونے کی کیا بات ہے، سکندر زندہ ہے تو لوٹ کر ضرور آئے گا۔ (کیا شیخ نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ نازو کے آنسو کیا کہانی سنا رہے ہیں؟)۔ تیسری تصویر شہلا کی تھی جو میرے تصور کی گرفت میں ہی نہ آئی۔ وہ سب سے کمزور، مظلوم اور بے سہارا لڑکی تھی۔ اس نے اپنے وجود کی بنجر ہو جانے والی زمین میں سخت جدوجہد کے بعد محبت کے پھول کھلائے تھے۔ محسن کی محبت میرے جیسے بھائی کی محبت۔ ان رشتوں کی محبت جو اجنبی ہو کے بھی اپنے ہو گئے تھے۔ موت کی آندھی نے وہ گلشن اُجاڑ دیا۔ ایک زندگی میں دوسری بار مرنے کے بعد اُس نے جینا قبول کیا ہوگا؟ جواب حد درجہ دل شکن تھا۔ وہ کم ہمت لڑکی مر گئی ہوگی۔

لیکن ابھی ابھی وقت ایک ہفتہ پیچھے لوٹ گیا تھا۔ ایک حقیقت جسے میرے ذہن نے قبول کر لیا تھا فریبِ خیال بن گئی۔ وہ بات جو

ہم جانے پیش کی گئی تھی دھوکا ثابت ہوئی۔ اُمید کا ایک ستارہ مایوسی کے تاریک اُفق پر یوں روشن ہوا کہ اس کی تابندگی نے میری عقل کو خیرہ کر دیا۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ یہ سب جھوٹ ہو۔ اوّل تا آخر۔ اغوا مجھے کیا گیا تھا اور باقی خبریں محض میرے ذہن کو مایوسی، شکست خوردگی اور بے بسی کے احساس سے دوچار کرنے کا ذریعہ ہوں؟ مقصد میرا حوصلہ پست کرنا ہو تاکہ میں احساسِ جرم و ندامت میں مبتلا ہو کے جینے کی جدوجہد ہی چھوڑ دوں۔ میرے ذہن میں یہ بات بیٹھ جائے کہ بالآخر میں اپنے عزیز ترین دوست محسن کی موت کا سبب بنا۔ اپنے محسن انکل رضوی کے کیریئر کی تباہی کا سبب بنا اور رابعہ کے مستقبل کی بربادی کا سبب بنا۔

میں اپنے خیالات میں محو چلا جا رہا تھا۔ اچانک میرے کانوں نے کچھ آوازیں سنیں۔ یہ ان آوازوں سے بالکل الگ تھیں جو کسان پرندوں کو اڑانے کے لیے نکال رہے تھے۔ کچھ لوگ تیز آواز میں باتیں کر رہے تھے یا ایک دوسرے پر چلا رہے تھے اور یہ آوازیں قریب آ رہی تھیں۔ بجلی کی طرح میرے ذہن میں تعاقب کرنے والوں کا خیال آیا۔ میں نے نرس کا ہاتھ پکڑا اور سیدھا چلنے کے بجائے کھیتوں کے اندر گھستا چلا گیا۔ وہ ایک جھٹکے سے میرے ساتھ آئی اور اس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ ابھی اس نے چلانے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے بیساکھی چھوڑ کے اس کا منہ دبا لیا اور کھڑی فصلوں کے درمیان گر گیا۔

"خبردار جو آواز نکالی۔" میں نے سرگوشی میں کہا۔" گلا گھونٹ دوں گا۔"

نرس نے وحشت زدہ سہمی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور مزاحمت بالکل نہیں کی۔ میں سانس روکے پڑا رہا اور ہلکی سی نم آلودہ مٹی کی، سبز پتوں کی اور گھاس کی خوشبو سونگھتا رہا۔ میرا صرف ایک ہاتھ پوری طرح کارآمد تھا اور اس سے میں نے نرس کو قابو کر رکھا تھا۔ اگر وہ ذرا بھی حرکت کرتی تو میں ایک ٹانگ سے بھی کام لے سکتا تھا۔ آوازیں اب واضح ہونے لگی تھیں۔

"وہ اور کہیں جا ہی نہیں سکتے۔" یہ آواز پیڈرو کی تھی۔" میں نے بیساکھی کے نشان زمین پر دیکھے تھے۔"

"تم اس سے بہت آگے نکل آئے ہو۔" دلاور نے کہا اور خوشوں کے نازک تنوں کی چلمن سے میں نے ان دونوں کو منڈیر پر کھڑا دیکھا۔" وہ نشان اب کیوں نظر نہیں آ رہے ہیں؟"

"عورت ذات میں وفا نہیں۔" پیڈرو نے دانت پیس کر کہا۔" وہ میرے ہاتھ آ جائے تو اس کے ٹکڑے کر کے یہیں ڈال دوں۔ کتے اور گدھ کھا جائیں۔ کیا نہیں دیا میں نے اُسے۔" وہ غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔

"اگر وہ نہ ملے تو یہی سلوک میں تمہارے ساتھ کروں گا۔" دلاور نے سکون سے کہا۔" تمہیں بھی سب کچھ دیا ہے میں نے۔ تمہاری اوقات سے زیادہ۔" ایک بل میں سے نکلنے والے چیونٹوں نے میری ٹانگ پر چلنا شروع کیا، میں نے پیر کو جھٹکا۔

"چوہدری صاحب۔ مجھے اب بھی یقین نہیں آتا کہ .... وہ اس ... کے ساتھ مل گئی ہوگی۔" پیڈرو نے میرے نام کی جگہ گالی استعمال کی۔

"کیوں؟ کیا وہ پہلے بڑی شوہر پرست اور باوفا تھی!" دلاور نے طنز سے کہا۔" سکندر بھی کم پُرکشش مرد نہیں ہے پیڈرو۔"

"جہاں آ کے بیساکھی کے نشانات ختم ہوئے تھے، وہاں سے دائیں اور بائیں جانب کھیتوں میں تلاش جاری ہے۔" پیڈرو نے دبے دبے لہجے میں کہا۔" وہ بچ کے کیسے نکل سکتے ہیں۔ شکاری کتے ان کے پیچھے ہیں۔"

"سڑک زیادہ دور نہیں ہے پیڈرو۔" دلاور نے کہا۔" اور ہوا کا رُخ مخالف ہے۔ کتے ان کی بو نہیں پا سکتے۔"

یہ بڑا لرزہ خیز انکشاف تھا کہ وہ تربیت یافتہ شکاری کتے لے کر ہمارے تعاقب میں نکلے تھے۔ ہوا کی موافقت ایک تائیدِ ایزدی تھی ورنہ اب تک آدم بو کو راڈار کی طرح محسوس کر لینے والے خون آشام کتے ہمارے دامن کی دھجیاں بکھیر چکے ہوتے اور اپنے دانتوں سے ہمارا گوشت اُدھیڑتے ہوئے ہمیں پھر اُن کے پاس پہنچا دیتے جو انسان کے بھیس میں زیادہ بے رحم درندے تھے۔

وہ دونوں کچھ دیر اِدھر اُدھر دیکھتے رہے۔" ایک کسان نے انھیں اسی طرف سے گزرتے دیکھا تھا ابھی کچھ دیر پہلے۔" پیڈرو نے کہا۔" اس نے جو حلیہ بتایا تھا وہی تھا۔" چیونٹے میری ٹانگ پر کاٹنے لگے تھے مگر میں ضبط کر رہا تھا۔

"اگر تم سڑک پر پہنچ کے پوچھو گے تو بہت سے لوگ بتا دیں گے کہ انھوں نے بھی ایک نرس اور ایک بیساکھی کے سہارے چلنے والے لنگڑے آدمی کو دیکھا تھا۔" دلاور تلخ لہجے میں بولا۔" تلاش کرو گے تو کوئی ٹیکسی والا بھی بتا دے گا کہ وہ کہاں سے بیٹھے تھے اور کہاں گئے تھے۔ ان کی جوڑی بہت نمایاں تھی۔ نرس کی سفید یونیفارم اور اس کے ساتھ ایک جوان اور ہینڈسم آدمی جو معذور تھا۔ مگر یہ معلومات ان کا بدل نہیں ہیں پیڈرو! مجھے ان کا سراغ نہیں، وہ دونوں چاہئیں۔"

"وہ ان ہی کھیتوں میں چھپے ہوئے ہوں گے چوہدری صاحب۔" پیڈرو نے لاجواب ہو کے کہا۔" مل جائیں گے۔"

"اچھا تو دیکھو۔ دو میل اِدھر اور دو میل اُدھر۔" دلاور نے زن سے اس کے منہ پہ ایک تھپڑ رسید کیا۔ بالکل نارمل لہجے میں بات کرتے کرتے چوہدری نے اتنی پھرتی سے ہاتھ چلایا تھا کہ پیڈرو دم بخود رہ گیا۔ اس کا ہاتھ غیر ارادی طور پر گال پر تھم گیا۔ طمانچے کی آواز بتاتی تھی۔ ضرب کتنی شدید ہو گی۔ چیونٹے اب میری پنڈلی پر رینگتے ہوئے بہت اُوپر تک چلے گئے تھے۔ ایک چیونٹے نے نرس کو کاٹا او وہ تڑپی لیکن چلّا نہ سکی۔ اُسی وقت دلاور پلٹا اور واپس چلنے لگا۔ پیڈرو کی بہت ذِلت ہوئی تھی مگر وہ پٹے ہوئے کتے کی طرح دُم دبائے پیچھے چلنے کے سوا کیا کر سکتا تھا۔ اُس نے خدا کا شکر ادا کیا ہو گا کہ تذلیل کا یہ تماشا سرِ عام نہیں ہوا اور کسی نے اُس کے منہ پر پڑنے والے تھپڑ کو نہیں دیکھا۔

پتلون کے دو پائنچوں کی سُرنگ میں داخل ہو جانے والے چیونٹے میرا گوشت نوچ رہے تھے اور یہ اذیت ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ نرس کا حال بھی کم خراب نہ تھا۔ چیونٹے اسے بھی کاٹ رہے تھے۔ وہ بار بار ٹانگیں چلاتی تھی اور میں مجبور تھا کہ اُسے حرکت بھی نہ کرنے دوں۔ ورنہ پودوں کے درمیان یہ ہلچل اور سرسراہٹ دشمنوں کو متوجہ کر لیتی جو ہم سے بمشکل تمام دس گز کے فاصلے پر موجود تھے۔

ان کے جاتے ہی میں نے نرس کو چھوڑ دیا اور اُٹھ کر زمین پر زور زور سے پیر مارے۔ پتلون کو اوپر سے جھاڑا اور بالآخر چیونٹوں سے نجات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ نرس نے بھی "ہائے اوئی" کرتے ہوئے ایک ایک چیونٹے کو نامراد، کم بخت اور بدذات قسم کے نام دے کر ختم کیا۔ پھر آہستہ آہستہ ہم دونوں کھیتوں سے نکل آئے۔

"تم نے مجھ سے پیڈرو کے متعلق جھوٹ کیوں بولا تھا؟" وہ کپڑے جھاڑ کے بولی۔

"کیا اُسے زندہ پا کے تمھیں افسوس ہوا ہے؟" میں نے غیر سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"ہاں۔ اگر تمھیں موقع ملا تھا تو تم نے اُسے قتل کیوں نہیں کر دیا؟" وہ بولی۔ "سیمسن کا ڈر تھا تمھیں؟"

"سیمسن؟ اس گوریلے کو میں پہلے ہی مار چکا تھا۔" میں نے اُسے حیرانی سے دیکھا۔ "مگر خود میری حالت ابتر تھی۔ پیڈرو کے ہوش میں آنے سے پہلے ہی میں بھاگ جانا چاہتا تھا۔ مجھے اس کا ریوالور بھی خالی ملا تھا۔"

"میں تو سمجھی تھی کہ اب میں آزاد ہوں۔" وہ خلا میں دیکھتے ہوئے بولی۔ "میری راہ میں کوئی مجبوری حائل نہیں۔"

"مجبوری کا حوالہ تم نے پہلے بھی دیا تھا۔" میں نے کہا۔ "کیا تھی وہ مجبوری؟"

"مجبوری یہ تھی کہ وہ میرا شوہر ہے۔" وہ چلائی۔ "لیکن مجھے اس سے نفرت ہے۔ تم میں اگر ہمت نہیں تھی تو مجھے بتاتے۔ میں خود اُسے قتل کرا آتی۔"

اس انکشاف نے مجھے ایک لمحے کے لیے سُن کر دیا۔ "تم۔۔۔ تم بیوی ہو اس کی۔ پھر یہ پیٹر کون ہے۔ تم نے کہا تھا کہ تمھاری ماں مر جائے گی۔ پھر پیٹر تم کو مار ڈالے گا۔"

"پیٹر۔۔۔ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ بہت چاہتا ہے مجھے۔ میری خاطر اُس نے اپنی زندگی برباد کر لی۔" وہ کھیت کی منڈیر پر بیٹھ گئی اور منہ چھپا کے رونے لگی۔ "پندرہ سال پہلے اس نے مجھے منگنی کی انگوٹھی پہنائی تھی جو اب تک اس کے پاس ہے۔"

"پھر شادی کیوں نہیں کی تم دونوں نے؟" میں نے اس کے پاس بیٹھ کے نرمی سے کہا۔

"اس لیے کہ ہمارا خاندان مقروض تھا۔ میرے شرابی باپ نے سب کچھ بیچ دیا تھا یا جُوئے میں ہار دیا تھا۔ پہلے بیوی کا زیور، پھر وہ گھر جس میں ہم رہتے تھے۔ وہ گھر میری ماں کا تھا اور میری ماں نرس تھی۔ ایسی نرس نہیں جیسی میں ہوں۔ خداوند یسوع مسیح کی قسم وہ ایسی نہیں تھی۔" وہ دھاڑیں مار مار کے رونے لگی۔

"پھر پیڈرو نے کہا کہ وہ تمھارے سارے قرض ادا کرے گا اور تمھارا گھر بھی تمھیں واپس مل جائے گا۔" میں نے کہا۔ "بشرطیکہ تم اس سے شادی کر لو۔"

اس نے روتے ہوئے سر اٹھا کے مجھے دیکھا۔ "کیا یہ سب کچھ پیڈرو نے بتایا ہے تمھیں؟"

"نہیں۔" میں نے کہا۔ "دنیا میں ایسا ہوتا آیا ہے اور ہوتا ہے۔ گو پیڈرو بھی محبت کرتا ہو گا تم سے۔"

"محبت۔" اس نے آنسو پونچھ کے نفرت سے کہا۔ "اس لفظ کا مطلب تک نہیں جانتا وہ۔ اس کے خون میں صرف نفرت ہے اور اس کا خون زہریلا ہے۔ اس نے پہلے میری ماں کو بلیک میل کیا پھر مجھے۔"

"تمھاری ماں کا قصور کیا تھا؟" میں نے کہا۔

"کوئی قصور نہیں تھا اس کا۔ تمام زندگی جہنم کا عذاب سہنے کے بعد اس نے ایک شیطان سے نجات حاصل کر لی تو کیا یہ اس کا قصور ہوا؟" وہ بولی۔ "کب تک سہتی وہ ہر ظلم۔ برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔"

"اور اس حد سے گزر کے تمھاری ماں نے اپنے شوہر کو قتل کر دیا؟"

"ہاں اُسے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ شراب نے اس کا جگر چھلنی کر دیا تھا۔ میری ماں نے تو اس کے ساتھ نیکی کی اور اُسے ایڑیاں رگڑ رگڑ کے مرنے سے بچا لیا۔ صرف ایک انجکشن سے اس کے اور اپنے تمام دکھوں کا خاتمہ کر دیا۔" وہ بولی۔

"تمھاری ماں اُس کا علاج بھی تو کرا سکتی تھی۔" میں نے کہا۔

"کس لیے! تاکہ وہ پھر اسی راستے پر چلنے لگے۔ جس پر وہ کئی مرتبہ موت کی دہلیز تک گیا لیکن میری ماں نے اُسے اسپتال لے جا کر رکھا جہاں ڈاکٹر اُس کے ہمدرد تھے۔ اس کی مشکلات کو سمجھتے تھے اِس کا اچھے سے اچھا علاج ہوا۔ اُسے بہترین دوائیں ملیں اور وہ ہمیشہ پہلے سے زیادہ صحت مند ہو کے لوٹا میری ماں کے ٹکڑوں پر پلنے، اس کی ہڈیاں توڑنے اور پُرانے دوستوں کے ساتھ پُرانی عادتیں اختیار کرنے کے لیے۔ ذلّت و رسوائی کی اس زندگی میں کوئی سیدھا موڑ نہیں تھا جس پر وہ اُمید کا سہارا لے کر چل سکتی۔ نجات اسی میں تھی کہ وہ اپنا خاتمہ کر لے یا اُسے مار دے جو اُس کے لیے کبھی ختم نہ ہونے والی سزا بن گیا تھا۔ اگر میں نہ ہوتی تو وہ خود مر جاتی لیکن مجھے ایک ایسے باپ کے سُپرد کر کے وہ کیسے قبر میں جا لیٹتی جو اتنا بے غیرت تھا کہ شراب کی ایک بوتل کے لیے مجھے بھی بیچ ڈالتا۔"

میں نے کلائی کی گھڑی دیکھی جو نرس نے باندھ رکھی تھی اور طے کیا کہ مجھے کم سے کم ایک گھنٹہ یہیں گزارنا چاہیے تاکہ سڑک تک پہنچ کے تلاش کرنے والے مایوس ہو کر لوٹ جائیں۔ یہ وقت نرس سے مفید معلومات حاصل کر کے گزارا جا سکتا تھا۔

"یہ بات پیڈرو کو کیسے معلوم ہو گئی؟" میں نے واقعات سے نتائج اخذ کرتے ہوئے کہا۔

"اسی اسپتال کی ایک اور نرس سے۔" وہ بولی۔ "اس کا پیڈرو سے ملنا جُلنا تھا۔ وہ میری ماں کی نجی زندگی کے مسائل سے بھی واقف تھی۔ سب ہی جانتے تھے کہ سسٹر شیبا کتنی مظلوم ہے لیکن پولیس کو میرے باپ کی اچانک موت نے شکوک میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے لے گئے۔ وہاں ڈاکٹروں نے رپورٹ دے دی کہ موت کا سبب کثرتِ شراب نوشی ہے۔ پولیس کچھ نہ کر سکی۔ پیڈرو کو معلوم ہوا کہ ڈاکٹروں نے میری ماں کی مدد کی ہے اور عمداً غلط رپورٹ دی ہے تو اُسے موقع مل گیا۔ حالاں کہ جس نرس نے اُسے یہ واقعہ سنایا تھا وہ میری ماں کی بدخواہ ہرگز نہیں تھی۔ بس وہ پیڈرو کی اصل فطرت سے ناواقف تھی۔ تین دن بعد وہ ایک حادثے میں مر گئی۔"

"اچھا! کیا حادثہ پیش آگیا اُسے؟" میں نے سب کچھ سمجھتے ہوئے کہا۔

"وہ رات کی ڈیوٹی ختم کر کے جا رہی تھی کہ ایک ویران سڑک پر کوئی گاڑی اُسے کچلتی ہوئی نکل گئی۔" وہ بولی۔ "ایک ہفتے بعد پیڈرو نے میری ماں سے بات کی۔ میں ساتھ والے کمرے میں میٹرک کے سالانہ امتحان کی تیاری کر رہی تھی۔ ہم اسپتال کے اندر ہی دو کمروں کے چھوٹے سے کوارٹر میں رہنے لگے تھے۔ چنانچہ میں نے ہر بات صاف سُنی۔ پیڈرو نے میری ماں کو بتایا کہ سنکھیا کے اثرات کا پانچ سال بعد بھی لاش کے ناخن اور بال دیکھ کے پتا چلایا جا سکتا ہے۔ ایک ہفتہ پہلے کی لاش دوبارہ نکال کے پھر پوسٹ مارٹم کرانا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ میری ماں کی منت سماجت، رونا دھونا سب رائیگاں گیا۔ اس نے پیڈرو کو یہ بھی بتایا کہ روبی کی منگنی ہو چکی ہے لیکن اس نے کہا منگنی کوئی شادی تو نہیں۔ توڑی بھی جا سکتی ہے۔ نہ اس میں کوئی گناہ کی بات ہے نہ یہ جرم ہے۔ بڑی مشکل سے وہ اس بات پر رضامند ہوا کہ جب تک میں میٹرک نہ کر لوں، وہ شادی نہیں کرے گا۔ اس عرصے میں پیٹر کو بھی مناسب الفاظ میں سمجھا دیا جائے گا کہ یہ شادی اب نہیں ہو سکتی۔ وہ چلا گیا تو میں نے بڑا کہرام مچایا۔ جان دینے کی دھمکی دی۔ ماں نے کہا تو کیوں مرتی ہے جوانی میں۔ زہر میں کھا لیتی ہوں۔ پیٹر نے ہم دونوں کو سمجھایا۔ ہماری عزت پر اس نے اپنی محبت کو قربان کرنا منظور کر لیا اور منگنی کی انگوٹھی واپس لے گیا۔ میں نے میٹرک کر لیا اور ماں نے مجھے بھی نرسنگ اسکول بھیج دیا۔ پیٹر ایک مشن اسکول میں ٹیچر تھا۔ اس نے اپنا اسکول چھوڑ دیا اور سیالکوٹ چلا گیا۔ جہاں اس کا باپ پادری تھا۔ پیڈرو نے مطمئن ہو کے مجھے مزید مہلت دے دی کہ میں نرس بن جاؤں۔"

"روبی۔ یہ تمھارا نام ہے اور تمھاری ماں کا نام شیبا تھا۔ پیٹر بھی عیسائی ہو گا۔ پیڈرو کیا تھا؟" میں نے کہا۔

"اس کے باپ دادا مسلمان تھے۔ دادا سیالکوٹ کے قریب ڈسکہ میں تھا جہاں مشنریوں نے تبلیغ سے اور مالی امداد سے مفلوک الحال افراد کو عیسائی بنانے میں خاصی کامیابی حاصل کی تھی۔" وہ بولی۔ "اس کا باپ سیالکوٹ میں خاکروب تھا اور ماں بھی خاکروب ہی تھی۔ ساس کا باپ مجرموں کو جلاد کی حیثیت سے جیل میں پھانسی دیا کرتا تھا۔ پیڈرو کا اصل نام عنایت مسیح تھا۔"

"پیڈرو میں ماں باپ کی مشترکہ صفات بدرجۂ اتم موجود ہیں۔" میں نے کہا۔ "کیا تم میں اور تمھاری ماں میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ خود زہر کھانے کا سوچنے کے بجائے پیڈرو کو وہی زہر دے کر مار ڈالتیں؟"

"نہ پیڈرو نہیں، عنایت مسیح تھا جس نے مجھ سے شادی کی تھی۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "اور شادی سے پہلے وہ بالکل مختلف انسان تھا۔ یہی شرافت کا لبادہ اوڑھ کے تو اُس نے مجھے دھوکا دیا تھا۔ اس نے اپنے سب وعدے پورے کیے۔ ہمارا قرض بے باق ہو گیا۔ ہم پھر اُسی مکان میں چلے گئے جو میری ماں کا تھا۔ پیڈرو نے اُسے دُگنی قیمت ادا کر کے واپس لے لیا پھر میری ماں کے نام کر دیا۔ اس گھر میں لوٹنے کے بعد ہماری زندگی کا بالکل نیا دور شروع ہوا۔ پیڈرو نے اس میں آرام و آسائش کے تمام اسباب فراہم کیے۔ پیٹر یہ سب کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے ساتھ میری زندگی بہت تنگ دستی میں گزرتی۔ میری ماں خوش تھی کہ جو ہُوا اچھا ہوا... خود میں نادان اور کم عقل... پیڈرو کو چاہنے لگی اور پیٹر کو بھول گئی۔ لالچ نے مجھے اندھا کر دیا تھا۔ عیش و آرام کیسے اچھا نہیں لگتا اور مجھے وہ زندگی مل گئی تھی جس کے میں خواب تو دیکھتی تھی لیکن اُن کی تعبیر پہ یقین نہیں رکھتی تھی۔ خواب تو خواب ہی ہوتے ہیں۔ مگر میرے خواب سچ ہو گئے تھے۔ پیڈرو میں بظاہر کوئی خرابی نہیں تھی۔ اس نے مرے کالج سیالکوٹ سے بی اے کیا تھا اور اُسے خاکروب کا بیٹا ہونے کے باوجود بہت سی مراعات حاصل تھیں۔ کرسچن مشنری اس کی ہر ممکن مدد کرتے تھے۔ اس کی فیس معاف تھی۔ کتابیں مفت مل جاتی تھیں۔ اس کو ہوسٹل میں رہنے کا خرچ نہیں دینا پڑتا تھا اور ماہانہ خرچ کے لیے وظیفہ الگ ملتا تھا۔ اس نے کبھی یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ کیا کرتا ہے۔ وہ کبھی ہفتہ بھر، کبھی پندرہ دن اور بعض اوقات ایک ایک مہینے کے لیے باہر چلا جاتا تھا اور لوٹ کر آتا تھا تو ہمارے لیے اتنے تحائف لاتا تھا اور میری ماں کو اتنا پیسہ دیتا تھا کہ اس نے زندگی بھر کی ملازمت میں نہ دیکھا تھا۔ شادی کے بعد میں ملازمت چھوڑ دینا چاہتی تھی لیکن اُس نے مجھے منع کر دیا۔ یہ بڑی عجیب بات تھی۔ اکثر شوہر تو یہی چاہتے ہیں کہ بیوی صرف گھر کی ہو کر رہے اور ملازمت کو معیوب سمجھتے ہیں۔ یہاں اُلٹا معاملہ تھا۔ میں چاہتی تھی کہ صرف گھر بار سنبھالوں کیوں کہ مجھے ملازمت کی ضرورت ہی نہیں۔ شوہر کی آمدنی اتنی تھی کہ میں خود ملازم رکھ سکتی تھی مگر پیڈرو نے کہا، وقت گزارنے کے لیے مشغلہ اچھا ہے۔ وہ اکثر باہر رہتا ہے۔ میں گھر کے اندر بند ہو کے کیا کروں گی۔ میں کیسے کہتی کہ جب بچے ہوں گے تو میں اکیلی کہاں رہوں گی اور مجھے فرصت کب ملے گی۔ سال بھر بعد میں اُمید سے ہوئی مگر میری گود نہ بھری۔ وہ بچہ پیدا ہونے سے پہلے ہی مر گیا۔ میں بہت روئی دھوئی لیکن اُسے تقدیر کا لکھا سمجھ کر خاموش ہو گئی۔ دوسری اور تیسری بار بھی ایسا ہی ہوا تو میں نے اس ڈاکٹر سے بات کی جو مجھے دیکھنے گھر آتی تھی اور اس نے رازداری کا وعدہ لے کر مجھے بتا دیا کہ میرے شوہر کو میرا ماں بننا منظور نہیں تھا۔ کیوں کہ بچوں کو وہ مصیبت سمجھتا ہے۔ میں تو سمجھتی تھی، بچہ خدا کی رحمت ہوتا ہے۔ انسان کے روپ میں فرشتہ ہوتا ہے۔ وہ پُل ہوتا ہے جو ازدواجی زندگی کی بقا کا ضامن ہوتا ہے۔ دو کناروں کو، دو رشتوں کو ملاتا ہے۔ غم و غصّے نے مجھے پاگل کر دیا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ڈاکٹر تھی ہی نہیں۔ کوئی تجربہ کار مڈ وائف تھی۔ میں نے اس پر حملہ کر دیا اور اس کا منہ نوچ لیا۔ اُسے گالیاں دیں۔ چڑیل، ڈائن اور قاتل کہا اور اس کے کپڑے پھاڑ دیے۔ وہ ایسی بھاگی کہ پھر نظر نہ آئی۔ میری ماں تو اس کے گھر بھی گئی تھی لیکن اس کا کوئی پتا نہ چلا۔"

"زمین کے اوپر پتا چل بھی نہیں سکتا تھا۔" میں نے کہا۔

"پیڈرو نے مجھے بہت مارا اور پھر دھمکی دی کہ میں نے اپنی زبان بند نہ رکھی تو نتیجہ میری ماں کے حق میں بُرا ہو گا۔" اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ "کیونکہ میرے باپ کو مرے ہوئے ابھی پانچ سال نہیں ہوئے۔ اِن حادثات کے بعد میں عورت نہیں بنجر زمین رہ گئی تھی۔ اس روگ نے میری ماں کو پلنگ سے لگا دیا اور علاج کے باوجود اس کی حالت بگڑتی گئی۔ میں نے کئی ڈاکٹر بدلے اور انھوں نے کئی نسخے بدلے لیکن ہر دوا بے اثر ہو گئی تھی۔ ایک رات میں نے پیڈرو کو اصل دواؤں کی جگہ دوسری دوائیں رکھتے دیکھا۔ میں نے دیکھا تو شیشیاں بھی وہی تھیں اور اُن کے لیبل بھی وہی تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ اس ردّ و بدل کا مقصد دوا کی جگہ زہر دینے کے سوا کچھ نہیں۔ میں نے ہنگامہ کیا تو پیڈرو نے مجھے ہنٹر سے مارا اور کہا کہ مجرم میں ہوں۔ وہ تو باہر رہتا ہے۔ ماں کے لیے ڈاکٹر لانا اور دوا دینا سب میں خود کرتی ہوں۔ مجھ سے پہلے وہ اپنے شک کا اظہار ڈاکٹروں سے کر چکا تھا۔ یہ سوال تو بعد میں پیدا ہوتا کہ کیا بیٹی بلاوجہ ماں کو زہر دے سکتی ہے۔ پہلے تو پولیس مجھے گرفتار کر لیتی اور ڈاکٹر بھی شوہر کے ساتھ میرے خلاف گواہی دیتے۔ شوہر نے تو پہلے ہی بیوی پر شبہ ظاہر کر دیا تھا۔ میں کیا کرتی؟ ماں کو صدمے سے بچانا بھی ضروری تھا۔ اس کے بعد میں نے دوائیں مقفل رکھنا اور خود ہر بار بازار سے دوا لانا شروع کیا مگر اس وقت تک زہر نے ماں کو موت کے کنارے تک پہنچا دیا تھا۔ اس کے جسم میں اتنا زہر جمع ہو گیا تھا کہ دوائیں کچھ نہیں کر سکتی تھیں۔ انہی دنوں میں اچانک پیٹر مجھے مل گیا۔ وہ خود خاصا بدل گیا تھا لیکن مجھے دیکھ کر تو وہ حیران رہ گیا۔ میں نے اُسے ساری بات بتا دی اور اس سے مدد مانگی۔ اس نے خاموشی سے پیڈرو کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور دو ہفتے بعد مجھے بتا دیا کہ جسے میں گھر کے اندر عنایت مسیح سمجھتی ہوں، وہ باہر کی دنیا میں استاد پیڈرو ہے اور اس کا بزنس کیا ہے۔ جو کچھ اس نے کہا وہ میرے لیے ناقابلِ یقین تھا۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ میرا شوہر جرائم پیشہ افراد کے گروہ میں شامل ہے اور اس کی تمام آمدنی غیر قانونی ہے۔ ہر بیوی کی نظر میں شوہر فرشتہ ہوتا ہے لیکن میرا شوہر شیطان تھا۔

میں اس کے ساتھ کب تک نباہ کرتی۔ میں نے اُسے بتادیا کہ اب وہ مجھے دھوکا نہیں دے سکتا کیوں کہ حقیقت مجھے معلوم ہوگئی ہے۔

"حقیقت۔" وہ زہرخند کے ساتھ بولا۔ "حقیقت کیا ہوتی ہے؟ اور اگر تمھیں معلوم ہوگئی ہے تو اس سے مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔ تم میری بیوی ہو۔"

"نہیں ہوں میں تمھاری بیوی۔" میں نے چلاّ کے کہا۔ "میں عنایت مسیح کی بیوی تھی، کسی استاد پیڈرو کی نہیں۔"

وہ چونکا۔ "کس نے بھرا ہے تمھارے دماغ میں یہ زہر؟ کس نے بتایا ہے یہ نام تمھیں؟"

"پیٹر نے۔ اور اس نے مجھے یہ بھی بتادیا ہے کہ تم کوئی شریف آدمی نہیں ہو۔" میں اسی طرح چلاّتی رہی۔ "تمھارے بزنس کا بھی پتا چلالیا ہے اس نے۔ تم مجرموں کے ساتھی ہو۔ سٹّے باز اور جُواری ہو۔ تم غنڈہ ٹیکس وصول کرتے ہو۔ شراب اور چرس اور مارفیا کے انجکشن بیچتے ہو۔ اب میں تمھارے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ مجھے طلاق چاہیے۔"

اُس نے میرے منہ پر ایک تھپڑ رسید کیا۔ "اپنے اس عاشق سے کہنا کہ میرے جیتے جی وہ تمھیں نہیں لے جاسکتا اور میرے خلاف کچھ ثابت نہیں کرسکتا۔"

"تم مجھے قتل کرسکتے ہو لیکن اپنی بیوی بناکے نہیں رکھ سکتے۔" میں نے چیختے ہوئے کہا۔ "میں تم سے عدالت کے ذریعے علیٰحدگی حاصل کرلوں گی۔"

"عدالت میں جانے سے پہلے یہ سوچ لینا کہ ابھی تمھارے باپ کو مرے ہوئے پانچ سال نہیں ہوئے۔" وہ بولا۔ "یہ پولیس کیس تھا جسے تمھاری ماں کے جاننے والے ڈاکٹروں نے مل کر دبا دیا۔ لیکن پولیس کے پاس تفتیش کا ریکارڈ موجود ہے۔ دوسری پوسٹ مارٹم رپورٹ سارا بھانڈا پھوڑ دے گی۔ کیوں اپنے باپ کی ہڈیوں کو خراب کرتی ہو اور اپنی ماں کو جیل بھیجنے کے کام کرتی ہو۔ اُسے سزائے موت نہ ہوئی تب بھی عمر قید ضرور ہوگی۔ اس کو اپنے گھر میں ہی مرنے دو۔"

"میں اب اس دھمکی میں نہیں آؤں گی۔" میں نے عزمِ مصمم کے ساتھ کہا۔ "میری ماں یوں بھی مرنے والی ہے۔ رسوائی سے پہلے وہ خودکشی کرلے گی۔ لیکن تم کیسے بچوگے؟ میں بیان دوں گی عدالت میں کہ تم نے اپنے تین بچوں کو قتل کیا، میری ماں کو زہر دیتے رہے۔ تم عنایت مسیح نہیں، استاد پیڈرو ہو۔ میں نے پیٹر سے کہہ دیا ہے کہ وکیل سے بات کرے۔"

اس نے مجھے ایک کمرے میں باندھ کے ڈال دیا۔ میرے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا اور دروازہ باہر سے مقفّل کرکے چلاگیا۔

تین دن تک میں اسی کمرے میں بھوکی پیاسی پڑی رہی لیکن بےغیرت تھی کہ مری نہیں۔ چوتھے دن میرا شوہر پھر آیا۔ اس نے مجھے آزاد کیا، کھانے پینے کو دیا اور بولا۔ "اب کیا خیال ہے، دماغ درست ہوا کچھ یا نہیں؟"

"میں یہیں مرجاؤں گی۔" میں نے بمشکل تمام کہا۔ "لیکن تمھارے ساتھ نہیں رہوں گی۔ پیٹر تمھیں چھوڑے گا نہیں۔ اب تک وہ وکیل سے بات کرچکا ہوگا اور میرا سراغ نہ ملا تو وہ پولیس کے ساتھ آجائے گا۔"

"اس کا مطلب ہے مجھے پہلے اس کتے کا بندوبست کرنا چاہیے۔" وہ بولا اور مجھے پھر بےبس چھوڑ کے چلاگیا۔ وہ ہمارے گھر کا ہی ایک اسٹور روم تھا جسے صاف کرنے کی ضرورت کوئی محسوس نہیں کرتا تھا۔ تقریباً آٹھ فٹ لمبا چوڑا اور صرف چھ فٹ اونچا یہ کمرہ کچن کے نیچے تھا۔ اُسے گھر کا ٹوٹا پھوٹا اور غیرضروری سامان پھینکنے کے لیے ہی کھولا جاتا تھا۔ چنانچہ اس میں دن کے وقت بھی اندھیرا رہتا تھا اور چوہے اِدھر سے اُدھر بھاگتے رہتے تھے۔ وہ اوپر کچن سے کھانے کی چیزیں لاتے تھے اور غلاظت پھیلاتے تھے۔ یہ سب چوہے بہت بڑے تھے۔ بلی کے بچے سے بھی بڑے۔ وہ بہت بھیانک آوازیں نکالتے تھے اور میرے قریب آکے بڑے خطرناک طریقے سے مجھے گھورتے رہتے تھے۔ میں دہشت سے کانپنے لگتی تھی اور میرا جسم ٹھنڈا پڑجاتا تھا۔ اس خیال سے کہ میں مرگئی تو یہ آدم خور میرا گوشت نوچ کر کھاجائیں گے اور دو دن میں صرف ہڈیوں کا پنجر چھوڑ دیں گے۔ کئی بار میں تھکن اور اذیت کے باوجود سوگئی یا بےہوش ہوگئی تو یہ چوہے میرے اوپر چڑھ آئے۔ ایک بار میں نے سوتے ہوئے درد کی شدید ٹیس سے تڑپ کر آنکھ کھولی تو میرے پاؤں کے ایک انگوٹھے سے خون بہہ رہا تھا اور کچھ فاصلے پر ایک بہت بڑا چوہا ڈھیٹ بنا بیٹھا تھا۔ اُس نے میرے انگوٹھے پر سے نوچا ہوا گوشت نگل لیا تھا اور اب تازہ گوشت کا دوسرا ٹکڑا اتارنے کی فکر میں تھا۔ میں نے اُسے ٹانگیں ہلا کے بھگایا تو وہ دوسری طرف آگیا۔ میرے چہرے سے ایک فٹ کے فاصلے پر۔ میں خوف سے چیخ بھی نہیں سکتی تھی اور چوہا شاید اندازہ کرچکا تھا کہ میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ وہ دوسرے چوہوں سے زیادہ سیانا اور جرأت مند تھا اور اس کی مکروہ شکل کو اتنا قریب پاکے مجھے یوں لگا جیسے اب وہ میری آنکھیں نکال لے گا۔ اس کے بعد میں کچھ بھی نہیں دیکھ سکوں گی اور وہ اپنے قبیلے کے دوسرے چوہوں کو بلاکے کہے گا کہ بےخوف ہوکر دعوت اڑاؤ۔ اب تک آدمی ہمیں چوہے دان میں پھنسا کر مارتا رہا

ہے۔ آج آدمی ہمارے درمیان پھنس گیا ہے اور اُتنا ہی بےبس ہے۔ اس وقت مجھ میں غیرمعمولی طاقت آگئی اور میں نے فرش پر گھوم کے لاتیں چلائیں تو ایک ٹوٹی ہوئی کرسی چوہے پر گر پڑی اور وہ بھاگ گیا۔ میرے ہاتھ پیر ایک ہی ہتھکڑی سے جکڑے ہوئے تھے اور ہتھکڑی کا دوسرا سرا ایک بہت بڑی کیل کے ساتھ دیوار میں ٹھوک دیا گیا تھا چنانچہ میں بیٹھ تو سکتی تھی لیکن کھڑی نہیں ہوسکتی تھی۔ دیوار سے پیٹھ لگا کر بھی میں کتنی دیر بیٹھی رہتی۔ میری کمر اور شانے جب درد کرنے لگتے تھے اور جسمانی ہمت جواب دے جاتی تھی تو میں خود ہی فرش پر گر پڑتی تھی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میرا یہ عذاب کب تک چلے گا۔ لیکن میں تہیہ کرچکی تھی کہ ان حالات میں پیڈرو کے ساتھ زندگی گزارنے کے بجائے مرجانا بہتر ہے۔ اگلے تین دنوں میں میری حالت اور بگڑگئی۔ مجھے خیالی شکلیں ڈرانے لگیں۔ خیالات کا انتشار آسیب بن کر سامنے آنے لگا اور میرا ذہنی توازن بگڑنے لگا۔ مجھے وہ نظر آتا تھا جو نہیں تھا اور جو سامنے تھا وہ دکھائی نہ دیتا تھا مثلاً وہ چوہے۔ اب وہ بےباکی سے میرے اردگرد اور میرے اوپر دندناتے پھرتے تھے اور جس چوہے نے مجھے کاٹا تھا اسے انسانی گوشت کے مزے نے آدم خور بنادیا تھا۔ وہ کئی جگہ سے میرا گوشت نوچ کرلے جاچکا تھا اور میرے جسم پر جگہ جگہ زخم تھے جن سے رِسنے والا خون جم گیا تھا۔ اس وقت میری سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ میں مرجاؤں۔ جلدازجلد۔ پھر جو ہونا ہے ہوتا رہے۔ لیکن پیڈرو پھر آگیا۔ اس مرتبہ وہ اکیلا نہیں تھا۔ وہ میری ماں کو بھی لے آیا تھا۔ اس نے کھانے پینے کا اور مرہم پٹی کا سامان، دوائیں، پانی کی ایک بالٹی اور صاف کپڑے لاکر دیے اور مجھے آزاد کردیا۔ میری ماں کی حالت بھی اچھی نہیں تھی لیکن مجھے دیکھ کر وہ پاگل ہوگئی۔ اس نے مجھے بہت پیار کیا اور گلے لگاکر زاروقطار رونے لگی۔ میں رو بھی نہ سکی۔

"دیکھ بڑھیا۔" پیڈرو کچھ دیر بےحسی اور بےرحمی سے تماشا دیکھنے کے بعد بولا۔ "اپنی بیٹی کو سمجھالے۔ یہ عورت ذات ہے اور میری بیوی بھی ہے۔ چیونٹی کی طرح مسل دوں گا۔ بڑے بڑے کانپتے ہیں میرے نام سے۔ یہ کیا مقابلہ کرے گی۔"

"میں سمجھالوں گی بیٹا۔" میری ماں نے ہاتھ جوڑ کے کہا۔ "جیسا تو چاہتا ہے ویسا ہی ہوگا۔"

"میں کل آؤں گا۔" وہ بولا۔ "آخری بار۔ اس کا دماغ درست ہوگیا تو ٹھیک ورنہ مجھے کچھ اور کرنا پڑے گا۔"

جب وہ چلاگیا تو ماں نے میرے غلیظ جسم کو کپڑا بھگو کے صاف کیا، میرا لباس بدلا اور مجھے کھانے کو دیا۔ بھوک کی مار بڑی سفاک ہوتی ہے۔ تم نے سنا ہوگا کہ بنگال میں قحط پڑا تھا تو عورتوں نے مٹھی بھر چاول کے لیے اولاد تک کو بیچ دیا تھا ــــ مجھے کھاتا دیکھ کر میری ماں پھر دھاڑیں مار مار کے رونے لگی۔ میں بالکل کسی جانور کی طرح کھانا نگل رہی تھی اور میری دماغی حالت کسی ذہنی مریض سے کم خراب نہ تھی۔ کھانے کے بعد مجھے ماں نے دوا دی اور جب میں سوگئی تو میرے زخموں کو آنسوؤں سے دھودھو کر ان پر مرہم لگاتی رہی۔ میں بارہ گھنٹے بعد سوکر اٹھی تو صرف جسمانی کمزوری رہ گئی تھی۔ ذہنی طور پر میری حالت میں حیرت انگیز افاقہ ہوا تھا اور میں صورتِ حال کو اچھی طرح سمجھنے اور سمجھانے کے قابل ہوگئی تھی۔ میں نے ماں کو وہ سب کچھ بتادیا جو مجھے پیٹر سے معلوم ہوا تھا اور وہ بھی جو مجھے پہلے سے معلوم ہوچکا تھا۔ میں نے ماں کو اس فیصلے سے بھی مطلع کردیا کہ اب کچھ بھی ہوجائے، میں پیڈرو کے ساتھ نہیں رہوں گی اور ماں نے بڑی مستقل مزاجی، صبر اور حوصلے کے ساتھ اس فیصلے کی تائید کی۔

اگلے دن پیڈرو آیا تو ہم نے اُسے بتادیا کہ نہ ہمیں ذلت و رسوائی کا خوف ہے اور نہ موت کا۔

"تم دونوں کی عقل خراب ہوگئی ہے۔" وہ بولا۔ "میں تم سے کچھ مانگ تو نہیں رہا ہوں۔ اس سے پہلے بھی میں نے تمھیں بہت کچھ دیا ہے اور آئندہ بھی دیتا رہوں گا۔ بدلے میں تمھیں خاموش رہنے کے سوا کیا کرنا ہے۔ عیش سے جیو۔"

"میری ممتا کا خون کرکے اور میرے اندر کی عورت کو مار کے کہتا ہے عیش سے جیو۔" میں نے اُس کے منہ پر تھوک دیا۔ "اپنی اولاد کو قتل کیا ہے تونے۔ غنڈے ــ بدمعاش ــ بلیک میلر۔"

"میری بیٹی سے پہلے مجھے مار دے۔" میری ماں نے کہا۔ "زہر دے دے یا خود پھانسی پر لٹکا دے۔ میں کسی پولیس کی دھمکی سے نہیں ڈرتی اب۔ جاکر دے رپورٹ تھانے میں۔ میں لکھ کر دیتی ہوں کہ میں نے اپنے شرابی اور بدکردار شوہر کو زہر دے کر مارا تھا۔"

پیڈرو کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے میری ماں کو ہتھکڑی لگاکے بٹھادیا اور مجھے چمڑے کے ہنٹر سے اتنا مارا کہ کپڑے ہی نہیں میری کھال تک پھٹ گئی۔ چیخ چیخ کر میری ماں پاگل ہوگئی اور دیوار سے سر ٹکرانے لگی۔ مجھے ہوش آیا تو نقشہ بدلا ہوا تھا۔ میں اپنے بیڈروم میں صاف ستھرے کپڑے پہنے لیٹی تھی اور پیڈرو کمرے میں ٹہل رہا تھا۔

"میری ماں کہاں ہے؟" میں نے اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ماں تمھیں۔" پیڈرو مسکرایا۔ "بوڑھی اور بیمار ہے نا۔ دو

دلن میں ہی مرجائے گی۔ تم نے تو دیکھے ہیں وہ چوہے جو اس کا گوشت کھائیں گے۔ میں نے ان کو بڑی محنت سے پالا ہے۔ وہ عام چوہے نہیں ہیں۔ آدمی کا گوشت انھیں بہت مرغوب ہے۔"

میں چیختی چلاتی باورچی خانے کی طرف بھاگی۔ پیڈرو نے میرا راستہ روکنے کی بالکل کوشش نہیں کی۔ لیکن کچن سے نیچے جانے والے زینے کا دروازہ مقفل تھا۔ میں نے دروازے سے کان لگا کے سُنا۔ چوہوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی مگر اس کے ساتھ ایک اور آواز بھی تھی جیسے کوئی نزع کے کرب میں کراہ رہا ہو۔ یہ میری ماں کی آواز تھی۔ میں نے دروازے کو ٹکریں ماریں اور ماں کو آوازیں دیں۔ میری آنکھیں ایک بھیانک منظر دیکھ رہی تھیں۔ کہ وہ ہوش و حواس سے بیگانہ پڑی ہے اور چوہے اس کے جسم پر چڑھے ہوئے اپنے نوکیلے دانتوں سے ہڈیوں پر منڈھی ہوئی کھال اتارتے جا رہے ہیں۔ میں نے دروازہ توڑنے کے لیے اس پر ہر چیز ماری جو میرے ہاتھ میں آئی مگر وہ اتنی آسانی سے ٹوٹنے والا دروازہ نہیں تھا۔

میں چیختی چلاتی باہر جانے کے لیے کچن کی کھڑکی سے کود گئی۔ پیڈرو کے مکان کے چاروں طرف کھلی جگہ ہے پیچھے ایک سرونٹ کوارٹر ہے۔ گیراج ہے اور ٹیوب ویل ہے۔ دائیں اور بائیں طرف درخت ہیں اور پھولوں کے پودے ہیں اور سامنے لان ہے۔ بدقسمتی سے اس کوٹھی کے ساتھ والا پلاٹ خالی پڑا ہے اور بائیں طرف ایک انجینئر رہتا ہے جس کی بیوی مر چکی ہے اور ماں بہری ہے۔ اس کے باوجود مجھے اُمید تھی کہ میں کسی نہ کسی کو مدد کے لیے بلا لاؤں گی لیکن میرے باہر آتے ہی ایک سیٹی سی سنائی دی اور تین طرف سے خوں خوار شکل والے کتے بھونکتے ہوئے لپکے۔ میں دوڑ کر واپس کھڑکی کے راستے کچن میں پہنچ گئی۔ پیڈرو قہقہہ مار کے ہنسا تو میں سمجھ گئی کہ سیٹی اسی نے بجائی تھی۔ میرا حوصلہ جواب دے گیا۔ میں زار و قطار روتی ہوئی اس کے قدموں میں گر گئی۔ "اسے چھوڑ دو مجھے بند کر دو اس کی جگہ۔" میں نے کہا۔

"اچھا۔" وہ بولا۔ "تمھاری اگر یہی مرضی ہے تو مجھے کیا۔" اس نے جیب سے چابی نکال کے دروازہ کھولا اور میں دیوانہ وار نیچے بھاگی۔ میری ماں ہوش میں تھی لیکن چوہے اس کے آس پاس مُردار خور گدھ کی طرح آس لگائے بیٹھے تھے۔

"اس کی کوئی بات مت ماننا روبی۔" میری ماں نے کہا۔ "مجھے یہ سزا منظور ہے۔" اس نے ہاتھ سے سینے پر صلیب بنائی۔

"نہیں ماں۔" میں نے روتے روتے کہا۔ "میں تمھیں اس طرح نہیں مرنے دوں گی۔" پیڈرو نے چابی میری طرف بڑھائی اور خباثت سے مسکرایا۔ میں نے ماں کی ہتھکڑی کھول دی اور خود اس کی جگہ بیٹھ گئی۔

"اب تم مجھے یہاں چھوڑ کے جا سکتے ہو۔ دوبارہ یہاں آنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔ میری ماں بہت چیخی چلائی اس نے پیڈرو کے علاوہ مجھے بھی گالیاں دیں کہ میں نے اس کی بات نہیں مانی لیکن پیڈرو اُسے کھینچ کر لے گیا۔

"ماں بیٹی دونوں کو شوق ہے مرنے کا۔" وہ بولا۔ "مرنا ہے تو باری باری مرو۔ ایک دوسرے کی موت کا نظارہ کر کے مرو۔" پھر دروازہ بند ہو گیا۔ میری ماں کی چیخیں بہت دیر تک سُنائی دیتی رہیں۔ میں نے دل پر پتھر رکھ لیا کہ مقدر میں یہی تھا۔ میرے بعد صدمے اور بیماری سے ماں بھی مر جائے گی لیکن اس کی موت میری طرح پُرعذاب تو نہیں ہوگی۔ پیڈرو اُسے گھر سے باہر نہیں جانے دے گا لیکن گھر کے اندر رہ کر بھی وہ زیادہ آسانی سے، جلد اور کسی تکلیف کے بغیر مرنے کی کوئی صورت نکال لے گی۔ جرم میرا اتنا کہ میں نے پیڈرو سے شادی کی۔ مجھے اُسی وقت پیٹر کے ساتھ نکل جانا چاہیے تھا۔ جب وہ میری ماں کو بلیک میل کر رہا تھا لیکن میں نے غریب پیٹر کی محبت کو چھوڑ کر دولت کو قبول کر لیا۔ میں اپنے ساتھ ماں کو بھی لے جا سکتی تھی اور ہم کہیں بھی گمنامی کی زندگی بسر کر سکتے تھے۔ اس نے ہماری کمزوری سے دُہرا فائدہ اٹھایا۔ باپ نے ہمیں بے گھر کر دیا تھا اور ہم سے سب کچھ چھین لیا تھا۔ پیڈرو نے ہمیں پھر اسی گھر میں آباد کیا اور وہ سکھ دیا جو کبھی میری ماں کا خواب ہو گا۔ پھر میری حسرت بن گیا تھا۔ اس کا رویّہ شریفانہ تھا اور میری رضامندی کے بعد اس نے کوئی بھی ناجائز مطالبہ نہیں کیا تھا۔ میں یہی سمجھی کہ پیڈرو بھی مجھ سے محبت کرتا تھا اور صرف مجھ سے شادی کرنے کے لیے اس نے بلیک میلنگ کا سہارا لیا تھا کیوں کہ وہ کسی قیمت پر مجھے کھونے کے لیے تیار نہیں تھا۔ کسی بھی لڑکی کے لیے یہ بڑا کٹھن مرحلہ بن جاتا ہے کہ وہ ماں کی عزت آبرو اور اپنی خوشی میں سے کس کا انتخاب کرے۔ مجبوری میں یہ سودا بہرحال بُرا نہ تھا۔ پیٹر سے مجھے صرف محبت ملتی۔ پیڈرو سے محبت کے ساتھ دولت بھی مل گئی۔ خود میری ماں کے لیے اپنے باپ کے گھر میں واپس جانا ایک ایسی تمنا تھی جس کے پورا ہونے کی کوئی اُمید نہ رہی تھی کیوں کہ زندگی کے دن بہت تھوڑے رہ گئے تھے۔ پیڈرو نے مکان دُگنی قیمت پر خرید کے ناممکن کو ممکن کر دیا۔ یہ مجھے بعد میں پتا چلا کہ اس نے میری ماں سے اس کی دُہری قیمت کیسے وصول کی۔ میری ماں چھپکے چھپکے اسپتال سے خطرناک قسم کی دوائیں لا کر دیتی رہی۔ اسٹور سے چوری کر کے۔ پیڈرو نے اُسے کبھی نہیں بتایا کہ وہ ان کا استعمال کہاں کرتا ہے۔ بدقسمتی سے پیٹر اسی دن ایک وکیل کے ساتھ آ پہنچا۔ پیڈرو

نے اُسے ٹالنے کی بہت کوشش کی مگر وکیل اڑ گیا کہ میں اپنی مؤکلہ سے ملے بغیر واپس نہیں جاؤں گا۔ مجھے وکالت نامے پر اس کے دستخط لینے ہیں کیوں کہ وہ طلاق چاہتی ہے اور اگر وہ نہ ملی تو مجھے پولیس کے پاس جانا پڑے گا کہ تم نے اُسے حبسِ بے جا میں رکھا ہوا ہے یا قتل کر دیا ہے اور پولیس خود اُسے برآمد نہ کر سکی تو عدالت تمہیں اس کا پابند کرے گی کہ اپنی بیوی کو حاضر کر دیا اس کے بارے میں بتاؤ کہ وہ کہاں ہے۔ پیڈرو مجبور ہو گیا اور انھیں اندر لے آیا۔ میری ماں نے وکیل کو سب کچھ بتا دیا اور پیڈرو نے چالاکی سے کام لیتے ہوئے مجھے بھی وکیل کے سامنے پیش کر دیا۔ اس نے میری بھی سُنی اور میں نے اوّل تا آخر اُسے اپنے ساتھ ہونے والے مظالم کی پوری روداد سنا دی۔ جب تک میں بولتی رہی وہ بڑے سکون اور اعتماد کے ساتھ بیٹھا رہا۔ وکیل سخت چراغ پا تھا کہ یہ انتہائی انسانیت سوز اور سنگین جرائم ہیں جن پر اُسے عمر قید کی سزا ہو سکتی ہے۔

"ٹھیک ہے وکیل صاحب۔" پیڈرو بولا۔ "میں ہر غلطی کا اعتراف کرتا ہوں۔ تم مجھے جیل بھجوا سکتے ہو لیکن اس سے مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ پریشانی روبی اور اس کی ماں کے لیے بھی پیدا ہو گی۔ تھانے کچہری تک بات جائے گی تو اخبارات میں بھی آئے گی۔ کیوں نہ گھر کا معاملہ گھر میں ہی طے کر لیا جائے۔ ابھی آپ کی موجودگی میں... ہم طلاق کا مسئلہ حل کیے لیتے ہیں۔"

"اور جو ذہنی اور جسمانی اذیت آپ نے روبی کو اور اس کی ماں کو دی۔" وکیل بولا۔ "اس کی تلافی کیسے ہو گی؟"

"ویسے تو میں پہلے ہی بہت کچھ کر چکا ہوں۔" وہ بولا۔ "لیکن اب بھی میں ہرجانہ ادا کرنے کے لیے تیار ہوں۔ جتنی رقم چاہیے بتا دیں۔"

"مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ تم اپنا دیا بھی واپس لے سکتے ہو۔" میں نے روتے روتے کہا۔ "بس مجھے اور میری ماں کو جانے دو۔"

"یہ جذباتی ہو رہی ہے وکیل صاحب۔" پیڈرو نے کہا۔ "آپ ذرا میرے ساتھ آئیے باہر۔ مجھے آپ کا فیصلہ منظور ہو گا۔" یہ اس کی چال تھی۔ وہ وکیل کو باہر لے گیا اور نہ جانے اس سے کیا بات کی اور اُسے کتنی بڑی رشوت دی کہ اس نے اپنا منہ بند رکھنا منظور کر لیا۔ واپس آ کے اس نے کہا کہ اب فکر کی کوئی بات نہیں۔ سارے معاملات خوش اسلوبی سے طے ہو گئے ہیں اور آئندہ تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ ہماری سابقہ تکالیف کا ازالہ ہو جائے گا اور پیڈرو سے قانونی طور پر میرا پیچھا بھی چھوٹ جائے گا۔ جب وہ رخصت ہو گیا تو پیٹر نے کہا۔ "میں روبی کو اور اس کی ماں کو ساتھ لے جاؤں گا۔ میں انھیں محفوظ نہیں سمجھتا۔"

پیڈرو ہنسا۔ "خود جاؤ گے تو انھیں لے جاؤ گے ہیرو۔"

"کیا مطلب؟" پیٹر نے کھڑے ہو کر کہا۔ جسمانی قد و قامت میں وہ پیڈرو سے کم نہیں تھا۔

"مطلب یہ کہ آنا ہمیشہ اپنی مرضی سے ہوتا ہے۔" پیڈرو نے کہا۔ "جانا دوسرے کی مرضی سے۔ یہ تمھیں اس گھر میں قدم رکھنے سے پہلے ہی سوچ لینا چاہیے تھا۔" خطرے کی بُو میں نے اس کے لہجے سے سونگھ لی تھی لیکن میں کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔

"تم کیا سوچ رہے ہو؟" پیٹر نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔ "تم میرا راستہ روک سکتے ہو؟"

"ہاں۔ میں بھی روک سکتا ہوں۔" پیڈرو نے اس کو نظروں سے ناپ کر کہا۔ "لیکن جو کام ملازم کر سکتے ہوں وہ میں خود نہیں کرتا۔"

"میرا وکیل جانتا ہے کہ میں یہاں ہوں۔" پیٹر نے دھمکی دینے کے انداز میں کہا۔

"لیکن وہ عقل مند آدمی تھا۔ سوداگر کے فائدے میں رہا اور خاموشی سے چلا گیا۔" پیڈرو بولا۔ "اب تم اس سے بات کر کے دیکھو، وہ تمھیں پہچانے گا بھی نہیں۔ یہ ماننا تو دور کی بات ہے کہ وہ تمھارے ساتھ یہاں آیا تھا۔"

"اگر اس ضمیر فروش کو تم نے اپنی حرام کی کمائی سے خرید لیا ہے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" پیٹر نے برہمی سے کہا۔ "میں دوسرا وکیل تلاش کر لوں گا۔ ہر وکیل ایسا نہیں ہوتا۔ تم کو بہت جلد معلوم ہو جائے گا۔" وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ پیڈرو اطمینان سے سینے پر ہاتھ باندھے کھڑا رہا اور مسکراتا رہا۔ پھر اس نے کھڑکی سے منہ نکال کے سیٹی بجائی۔ باہر سے کتّوں کے بھونکنے کی آواز آئی۔ دو منٹ بعد پیٹر دروازے سے ٹکرایا اور اندر آ گرا۔ دو جرمن نسل کے شیپرڈ کتّے اس کے اوپر حملہ آور ہوئے۔ اس نے اپنا بریف کیس گھمایا اور ایک کتّے کو لات ماری لیکن وہ بہت طاقت ور اور انتہائی خوں آشام کتّے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ پیٹر کے جسم کو چیر پھاڑ کے کھا جائیں گے۔ میری ماں خوف سے بے ہوش ہو گئی اور میں نے ایک چیخ ماری۔ پیٹر بڑی بے جگری سے لڑ رہا تھا لیکن صاف ظاہر تھا کہ ایک شریف آدمی دو وحشی کتّوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

"عنایت۔ خدا کے لیے اسے بچا لو۔" میں نے دوڑ کے پیڈرو کے قدموں میں سر رکھ دیا۔ "میں وعدہ کرتی ہوں، پھر کبھی تم سے طلاق کی بات نہیں کروں گی۔ جیسا تم کہو گے ویسا ہی کروں گی۔"

"اچھا۔" پیڈرو نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "یہ بات بعد میں بھول مت جانا۔" اس نے دوبارہ سیٹی بجائی اور دونوں کتّے ایک دم خاموش ہو کے پیچھے ہٹ گئے اور اس کے پاس آ کے دُم ہلانے لگے۔

"شاباش۔" اس نے دونوں کے سر پر تھپکی دی۔ "اب جاؤ۔" کتّے

چھلانگیں مارتے دروازے سے نکل گئے۔ پیٹر بڑی مشکل سے کھڑا ہوا۔ میں نے اسے سہارا دیا اور صوفے پر بٹھا دیا۔ اس کے کپڑے پھٹ گئے تھے چہرے اور بازوؤں پر گہری خراشیں آئی تھیں جن سے خون بہہ رہا تھا۔ ایک کتے نے اس کی ٹانگ کو دانتوں میں دبا لیا تھا اور ٹخنے کے اوپر جہاں اس نے دانت گاڑے تھے زخم کے نشانات زیادہ گہرے تھے۔ میں دوڑ کر اندر گئی اور اس کے لیے ایک گلاس پانی لے کر آئی۔ پانی پی کر اس کے اوسان کچھ بحال ہوئے۔

"میرے وکیل کیسے ہیں ہیرو!" پیڈرو بولا "تمہارے وکیل سے تو زیادہ ہی وفادار ثابت ہوئے۔"

"تم... تم بچ نہیں سکتے۔ شیطان کی اولاد!" پیٹر نے غصے میں کانپتے ہوئے کہا "ایک نہ ایک دن تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ تمہارے یہ بھائی بند تمہارے کام نہیں آئیں گے۔" اس کا اشارہ کتوں کی طرف تھا۔

پیڈرو نے اس کے پیٹ پر لات ماری۔ کھڑے کھڑے اس نے اتنی تیزی سے لات گھمائی کہ پیٹر خود کو بچانے کے لیے حرکت بھی نہ کر سکا۔ پانی کا گلاس اس کے ہاتھ سے اُڑ کر دور گیا اور وہ خود بلبلا کے فرش پر گر گیا۔ پیٹر نے پے در پے اس کو ٹھوکریں ماریں۔ اس کی پسلیوں میں، سر پر اور کمر پر۔ میں نے مداخلت کی کوشش کی تو اس نے ایک ہاتھ سے مجھے دھکا دیا اور میں دیوار سے اس طرح ٹکرائی کہ مجھے چکر آ گئے۔ ادھ کھلی آنکھوں سے میں نے دیکھا کہ پیڈرو بڑی بے رحمی کے ساتھ پیٹر کو بالوں سے پکڑ کے گھسیٹتا ہوا لے جا رہا ہے۔ وہ ضربات کی شدت سے بے ہوش ہو چکا تھا۔ اٹھنے کی کوشش میں دوبارہ گرنے کے بعد میں اس کے پیچھے بھاگی۔ اس وقت تک پیڈرو کچن سے گزر کے پیٹر کو تہ خانے میں لے جا چکا تھا۔ زینے کے قریب مجھے پھر چکر آیا اور سنبھلنے کی تمام جدوجہد رائیگاں گئی۔ میں اوپر سے نیچے تک لڑھکتی ہوئی گئی۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں نے پیٹر کو اسی آہنی زنجیر سے بندھا ہوا دیکھا جس سے مجھے اور میری ماں کو اسیر رکھا گیا تھا۔ وہ زمین پر بے سُدھ پڑا تھا اور وہی آدم خور چوہے اس کے اوپر کود رہے تھے۔ میں ایک چیخ مار کے اٹھی اور پیٹر کو پکارتی ہوئی بھاگی۔ خود میرے جسم پر گرنے سے شدید چوٹیں آئی تھیں۔ لیکن مجھے اس وقت اپنی تکلیف کا احساس نہیں ہوا۔ قریب جا کر دیکھنے پر مجھے وہ لمبے لمبے اُبھرے ہوئے نیل دکھائی دیے جو پیٹر کے سارے جسم پر پھیلے ہوئے تھے۔ پیڈرو نے اسے چمڑے کے ہنٹر سے اتنا مارا تھا کہ وہ مرنے کے قریب ہو گیا تھا۔ سوائے رونے کے میں اس کے لیے کیا کر سکتی تھی۔ ایک گھنٹے بعد پیڈرو پھر نمودار ہوا۔ ہنٹر اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ کچھ کہے بغیر وہ مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ میں چیختی چلاتی اس کے ہنٹر کی ضرب سے بچنے کے لیے اِدھر سے اُدھر بھاگتی رہی مگر اس مختصر سے کمرے میں بھاگنے کی جگہ ہی کہاں تھی۔ ہنٹر مجھ پر مسلسل برستے رہتے۔ ہر بار مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کسی نے انگارے سے میرے جسم پر ایک لکیر کھینچ دی ہے۔ بالآخر میں بے ہوش ہو کے گر پڑی۔

دوسری بار ہوش آنے پر میں نے خود کو اپنے بیڈ روم میں پایا۔ اسی بیڈ پر میری ماں سکون سے سوئی پڑی تھی۔ میرا سارا جسم زخموں سے چُور تھا اور میں ہاتھ لگا کے ہر اُبھرے ہوئے نیل کو بھی محسوس کر سکتی تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ درد کا احساس سرے سے مفقود تھا۔ پیڈرو نے یقیناً مجھے کوئی انتہائی مؤثر اور درد کے احساس کو ختم کر دینے والی دوا دی تھی۔ میرے کپڑے بدلے ہوئے تھے اور پیڈرو ایک کرسی پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا اور آنسو خود بخود میری زبان بن گئے۔

"اس سے پہلے کہ تم پیٹر کے متعلق سوال کرو" وہ بولا "میں خود ہی بتا دیتا ہوں۔"

اس نے عمداً بات ادھوری چھوڑ دی اور میں نے دہشت سے چیخ کر کہا "مار دیا اُسے تو نے... کتے... بے رحم خونی بھیڑیے... میں تیرا خون پی جاؤں گی۔" میں نے دیوانگی کی کیفیت میں اس پر حملہ کیا۔ اس نے سگریٹ پھینک کر میرے اُٹھے ہوئے ہاتھ کو کلائی پر سے پکڑ لیا اور بازو گھما کے میری کمر سے لگا دیا۔ میں بے بس ہو گئی سا گر ذرا بھی زور لگاتی تو بازو ٹوٹ جاتا۔

"وہ زندہ ہے" پیڈرو میرے کان میں بولا "اور زندہ رہے گا لیکن اس کا انحصار تمہارے رویّے پر ہے۔" اس نے مجھے آگے دھکیلا اور تہ خانے میں لے گیا۔ وہاں پیٹر صاف ستھرے کپڑے پہنے فرش کے بجائے گدے پر لیٹا ہوا تھا۔ ہتھکڑی اس کے ایک ہاتھ میں تھی۔ اس کے قریب ہی کھانے کے برتن اور پانی کا گلاس موجود تھے لیکن اس نے کسی چیز کو چھوا تک نہیں تھا۔ لکڑی کی ایک ڈنڈی اس کے پاس رکھی تھی۔ جسے دوسرے ہاتھ سے پکڑ کر وہ قریب آنے والے چوہوں کو بھگا سکتا تھا۔ وہ بے حد کمزور اور لاغر نظر آتا تھا۔ اس کا گندمی رنگ زرد ہو رہا تھا اور بڑھی ہوئی شیو کے باعث وہ قطعی بدلا ہوا نظر آتا تھا لیکن سب سے حیرت انگیز تبدیلی اس کے بالوں میں ہوئی تھی جو پہلے گھنے سیاہ تھے مگر اب بالکل سفید ہو چکے تھے ایسا لگتا تھا جیسے میں... پیٹر کو تیس چالیس سال کی نیند سے جاگنے کے بعد دیکھ رہی ہوں۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ مارفیا کے زیر اثر میں دو دن تک سوتی رہی اور اب درد کے احساس کا نہ ہونا بھی اسی کا نتیجہ تھا۔ صدمے نے دو دن میں پیٹر کے بال سفید کر دیے تھے۔

"پیٹر" میں چلائی "یہ کیا ہو گیا ہے تمہیں۔" اور اس کی طرف لپکی۔ مگر پیڈرو نے بال پکڑ کے مجھے پیچھے کھینچ لیا۔

"یہ مت بھولو کہ تم میری بیوی ہو۔" پیڈرو بولا "اور کوئی شوہر اتنا بے غیرت نہیں ہوتا کہ اپنی آنکھوں کے سامنے بیوی کو کسی غیر کے لیے مضطرب دیکھے۔"

"میری فکر مت کرو روبی۔" پیٹر نے کہا "اپنی جان بچاؤ۔ میں تو مر چکا ہوں۔"

"میں بھی زندہ نہیں رہ سکتی تمہارے بغیر۔" میں نے خون کے آنسو روتے ہوئے کہا۔ میں نرس تھی اور اسپتال میں ڈاکٹروں سے میں نے کئی بار سُنا تھا کہ ذہنی صدمہ انتہائی شدید ہو تو بال راتوں رات سفید ہو جاتے ہیں اور ایسے کیس میڈیکل ہسٹری میں عام ہیں۔

"ہیرو اور ہیروئن کے ڈائیلاگ مجھے یعنی وِلن کو پسند آئے۔" پیڈرو ہنسا۔ "لیکن ایسی باتیں فلموں کی حد تک تو اچھی لگتی ہیں۔ عملی زندگی میں جھوٹ ثابت ہوتی ہیں۔ زندگی سے سب کو پیار ہوتا ہے۔ چار دن کھانے کو نہ ملے تو عشق محبت سب ٹائیں ٹائیں فش ہو جاتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مسٹر پیٹر کتوں سے مقابلہ ہی نہ کرتے خود کو ان کے آگے ڈال دیتے اور تم میرے پاؤں پکڑ کر وعدہ نہ کرتیں کہ جیسا میں چاہوں گا ویسا ہی کرو گی۔"

"تم کیا چاہتے ہو آخر؟" میں نے زارو قطار روتے ہوئے کہا۔

"اوپر چلو۔ میں یہاں اس لیے لایا تھا تمہیں کہ تم پیٹر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔" پیڈرو نے کہا "قیدِ تنہائی کے سوا اس کو کوئی تکلیف نہیں۔ زندہ رہنے کے لیے کھانے کو مل جاتا ہے اور ڈاکٹر ہر روز دیکھنے آتا ہے۔ اگر تمہارا رویّہ درست رہا تو پیٹر کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ ورنہ یہ اسی تہ خانے میں سسک سسک کر اور تڑپ تڑپ کر بھوکا پیاسا مر جائے گا اور اس کی لاش کا گوشت میرے چوہے کھا جائیں گے تو ہڈیاں میرے کتے۔ اس کے وجود کا سراغ تک نہیں ملے گا۔ یہ بھی اچھی طرح سمجھ لو کہ پولیس سے یا کسی اور سے مدد حاصل کرنا بے سود ہوگا۔ سرچ وارنٹ کے بغیر پولیس یہاں قدم نہیں رکھ سکتی اور سرچ وارنٹ جاری ہونے سے بہت پہلے مجھے خود پولیس کے ذریعے اس کی اطلاع مل جائے گی۔ میں پیٹر کو ایسی جگہ شفٹ کر دوں گا جہاں تمہارے تصور کی رسائی بھی نہ ہو گی۔" اس نے مجھے واپس سیڑھیوں کی جانب دھکیلا "اپنا اور پیٹر کا مستقبل تمہارے ہاتھ میں ہے روبی۔ اسی دنیا میں تم دونوں مل بھی سکتے ہو۔"

"میری خاطر اس کمینے سے کوئی سودا مت کرنا روبی۔" پیٹر چلایا۔ "تمہارے ضمیر کے خلاف ہو۔"

پیڈرو نے رک کر سگریٹ اور ماچس اس کی طرف اچھال دی "روبی بے وقوف نہیں ہیرو۔"

"کھانا پینا مت چھوڑنا پیٹر۔ تمہیں میری قسم۔" میں نے جاتے جاتے کہا "میں سب ٹھیک کر لوں گی۔"

"یہ تم نے کیا کیا۔" پیٹر نے کہا "اپنی قسم کیوں دی مجھے۔ یہ ظلم کیوں کیا مجھ پر۔"

اوپر آنے کے بعد پیڈرو نے مجھے بتایا کہ یہ مکان واپس لانے سے پہلے اس نے ایک سودا میری ماں سے بھی کیا تھا اور اپنے مکان کے معاملے میں وہ اتنی جذباتی ہو گئی تھی کہ اُس نے پیڈرو کی بات مان لی۔ وہ اسپتال کے اسٹور سے اور وارڈوں سے ہر قسم کے خطرناک انجکشن اور زہریلی دوائیں پیڈرو کو فراہم کرتی رہی۔ شرط کے مطابق اس نے کبھی پیڈرو سے سوال نہیں کیا کہ وہ ان کا کیا کرتا ہے۔ پیڈرو نے بتایا تھا کہ اس کا ایک سائنس داں دوست ہے جسے اپنی تحقیقات اور ریسرچ کے لیے ان دواؤں کی ضرورت پڑتی ہے مگر یہ دوائیں بازار میں دستیاب نہیں۔ اب میری ماں نے نوکری چھوڑ دی تھی تھا کہ یہی کام میں کروں۔ اسی لیے پیڈرو نے مجھ سے شادی کی تھی۔ مجھے نرس بننے کا موقع فراہم کیا تھا اور شادی کے بعد نوکری جاری رکھنے پر مجبور کیا تھا میری ماں سکون کی نیند میں تھی۔ مجھے اس پر ترس بھی آیا اور غصہ بھی۔ جذباتی تعلق انسان کو کتنا مجبور اور بے بس کر دیتا ہے۔ اینٹ پتھر کے اس مکان کے لیے جو اس کے باپ کی نشانی تھا میری ماں نے اپنے ضمیر کی آواز کو دبا دیا۔ ایک انتقامی خواہش سے مغلوب ہو کے اس نے اپنے شوہر کو مار دیا تھا۔ یہ دوسری انتقامی کارروائی ایک لاشعوری خواہش کا نتیجہ تھی۔ وہ مرنے والے کی رُوح کو بھی عذاب دینا چاہتی تھی کہ جس گھر کو اس نے شراب اور جوئے کی نذر کر دیا تھا وہ اسے واپس مل گیا ہے۔ اس کے لیے میری ماں نے بہت بھاری قیمت ادا کی۔ اس نے بہت بڑے گھاٹے کا سودا کیا تھا۔ یہ بات اس نے مجھ سے کبھی چھپائی لیکن اس کے اپنے ضمیر کی خلش اس کا آزار بن گئی۔ ایک مکان کے بدلے اس نے اپنا سب کچھ گنوا دیا۔ اپنی عزتِ نفس۔ اپنی عاقبت۔ اپنی بیٹی کی خوشی اور اس کا مستقبل۔ ورنہ رہنے والے کیا فٹ پاتھ پر نہیں رہتے۔ عورتیں کیا جھگی میں خوش نہیں رہتیں اور کیا وہ محل کے بدلے اپنی عاقبت و آزادی کا سودا کرتی ہیں؟

اس جال میں اب میں گرفتار تھی اور ہر طرف سے زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی۔ ایک زنجیر میری اپنی زندگی تھی۔ دوسری ماں کا بڑھاپا اور بیماری۔ اور تیسری پیٹر کی محبت۔ میں اپنی ماں سے زیادہ مجبور تھی۔

"اگر تم نے ایک سال تک میرا حکم مانا اور کوئی غلط حرکت نہ کی تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں طلاق دے دوں گا اور پیٹر کو آزاد کر دوں گا۔" پیڈرو نے کہا "اس عرصے میں تمہیں پیٹر سے ملنے کی آزادی ہوگی۔ تم اس کے آرام کا اور اس کی صحت کا خود خیال

سکتا چاہو تب بھی مجھے اعتراض نہیں۔ اس کو کھانا اور دوا کھلانا اور اُسے ہر آسائش فراہم کرنا تمہاری مرضی پر منحصر ہے۔ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہوگی تو تم سب کچھ کر سکو گی۔ سوائے اس زنجیر کے جو پیٹر کے ہاتھ میں پڑی رہے گی۔ وہ کسی طرح بھی قید کی تکلیف نہیں اٹھائے گا۔ تم اُسے جو چاہو گی فراہم کر سکو گی۔ مثلاً اخبار، رسالے، ریڈیو۔ لیکن یہ سب میری منظوری سے ہوگا۔ جب میں دیکھوں گا کہ تم اپنے فرائض خوش اسلوبی سے سرانجام دے رہی ہو تو میں رعایت دیتا جاؤں گا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تمہیں اخلاقی حدود سے تجاوز کرنے کی اجازت ہوگی۔ نہیں۔ اس کی دیکھ بھال اور خاطر مدارت کا کام تم میری موجودگی میں کرو گی۔ بات صرف ایک سال کی ہے۔ باقی زندگی اپنی مرضی سے گزارنے کا حق حاصل کرنا ہے تو یہ سودا کر لو۔"

سودا کرنا میرے اختیار کی بات ہی کہاں تھی۔ وہ سال بھر بعد بھی مُکر جاتا تو مجھے تعجب نہ ہوتا۔ وعدے کا پاس تو وہ کرتے ہیں جن کا کوئی ایمان ہو۔ اصول ہو یا ضمیر ہو۔ پھر بھی ایک اُمیدِ موہوم پر میں نے پیڈرو سے وعدہ کر لیا کہ میں اس کی مدد کروں گی۔ ایک مہینے تک اس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ اور میں پیٹر سے مل کے اسے تسلی دیتی رہی کہ وہ حوصلہ نہ ہارے۔ سال ختم ہوتے ہی ہم نکل جائیں گے۔ اپنا نام، شہر، مذہب سب بدل لیں گے تاکہ پھر کبھی یہ سفاک مجرم ہمیں تلاش نہ کر سکیں۔ وہ کہتا تھا کہ پیڈرو کی بات پر اعتبار کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی بچھو سے یہ توقع رکھنا کہ وہ ڈنک نہیں مارے گا۔ اور حالات سال بھر بعد بھی یہی ہوں گے بلکہ بدتر۔ مگر میں نے پیٹر کو سمجھانا بجھانا جاری رکھا۔ ایک مہینے میں اس کی حالت پہلے سے بہت بہتر ہو گئی۔ ہتھکڑی کی زنجیر تین فٹ سے زیادہ لمبی تھی چنانچہ وہ بیٹھ سکتا تھا۔ کھڑا ہو سکتا تھا اور ایک ہی جگہ کھڑے کھڑے ہاتھ پیر چلا کے ورزش کر سکتا تھا تاکہ جسم کے رگ پٹھے ناکارہ نہ ہو جائیں۔ پیڈرو نے اتنی رعایت اور دی تھی کہ ہر تیسرے دن ہتھکڑی کو دوسرے ہاتھ میں ڈال دیتا تھا۔ ایک مہینے بعد پیڈرو نے مجھے بتایا کہ مجھے کیا کرنا ہوگا اور کیا نہیں کرنا ہوگا۔ دو دن تک وہ مجھے تفصیلات بتاتا رہا اور تیار رہنے کے لیے کہتا رہا۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ میری عدم موجودگی میں پیٹر کا ویسے ہی خیال رکھا جائے گا جیسے میں رکھتی ہوں۔ تیسرے دن وہ مجھے یہاں لے آیا۔ یہ ایک ہفتہ پہلے کی بات ہے۔ باقی تم جانتے ہو۔"

میں بہت دیر تک کچی گندم خوشوں سے نکال کے چباتا رہا اور سوچتا رہا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ پھر میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ "میرا خیال ہے کہ اب سڑک تک جانے میں کوئی ہرج نہیں۔ دو گھنٹے ہو گئے ہیں، وہ لوگ مایوس ہو کے واپس جا چکے ہوں گے۔ تمہیں اس شہر کے حالات کا علم ہے؟"

"پیدائش سے اب تک میں نے دوسرا شہر نہیں دیکھا۔" وہ بولا۔

"کیا... کیا اس کا مطلب ہے کہ پیٹر بھی یہیں ہے؟" میں نے کہا۔ "وہ گھر کہاں ہے؟"

"چوک بنی ماڈی ویو سے آگے جو سڑک مسلم ہائی اسکول اور ہولی فیملی اسپتال کی طرف جاتی ہے۔" وہ بولی۔ "... کے قریب میری ماں کا گھر ہے۔ وہ گھر جہاں پیٹر قید ہے، سٹلائٹ ٹاؤن میں ہے۔ مری روڈ اور سید پوری روڈ کے درمیان۔ تم اکیلے وہاں کیسے جاؤ گے؟ پیڈرو اور دلاور وہاں پہنچ چکے ہوں گے۔ پولیس کا ساتھ ہونا ضروری ہے۔"

میں کہتے کہتے رک گیا کہ اگر فی الحقیقت ایسا ہی ہوا تو پولیس بھی وہاں جا کے کیا کرے گی۔ کون ملے گا وہاں۔

"لاحول ولا قوۃ!" میں نے کہا۔ "یہ تم کو پہلے بتا دینا چاہیے تھا۔ ہم نے دو گھنٹے ضائع کر دیے ہیں۔ یوں چھپے رہنے کے بجائے ہم سیدھے وہاں جاتے اور پہلے پیٹر کو نکالتے۔" میں نے اپنی جیب سے وہ چابی نکالی جو مجھے پیڈرو کی جامہ تلاشی کے دوران میں ملی تھی اور بلاشبہ اسی ہتھکڑی کی چابی تھی جس نے پیٹر کو اسیر کر رکھا تھا۔

"یہ... یہ کہاں سے ملی تمہیں؟" روبی نے چابی میرے ہاتھ سے جھپٹ لی۔ "یہی تو ہے وہ چابی... چلو اب دیر مت کرو۔" وہ میرا بازو پکڑ کے کھینچنے لگی۔ میں نے خود کو سنبھالا۔ مجھے بیساکھی بغل میں دبا کے چلنے کی عادت کہاں تھی۔ میری دائیں بغل اس مشقت سے درد کرنے لگی تھی اور شانے کے ساتھ سینے کے پٹھے بھی اکڑ رہے تھے۔ ننگے پاؤں چلنے سے میرے پیر زخمی ہو رہے تھے۔ کنکروں کی رگڑ سے تلوے چھل رہے تھے تو کئی جگہ کانٹوں کے پیوست ہو جانے سے خون رسنے لگا تھا۔ یہ صرف میری قوتِ ارادی تھی اور زندگی کے لیے جدوجہد کو جاری رکھنے کا عزم تھا جس نے مجھے سڑک پر پہنچنے میں مدد دی۔ اب میں نئے مخمصے میں گرفتار ہو گیا تھا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ پَر لگا کے اڑ جاؤں اور انکل شیروانی کے آنگن میں شہلا کے سامنے جا اُتروں۔ پھر ٹیلی فون کر کے رابعہ سے بات کروں اور محسن کے بارے میں پوچھوں مگر اس عورت کو بھی بے آسرا نہیں چھوڑا جا سکتا تھا، جو حد درجہ مظلوم تھی۔

یہ سوال اپنی جگہ جواب طلب تھا کہ دوبارہ گرفتار ہوئے بغیر میں روبی کی کیسے مدد کر سکتا ہوں۔ اگر میں اس کے ساتھ جاتا تو اتنی ہی آسانی اور بے بسی کے ساتھ پھر پیڈرو اور دلاور کے جال میں پھنس جاتا جتنی آسانی سے چوہا چوہے دان میں پھنستا ہے۔ اپنے آدھے ادھورے جسم کے ساتھ اور کسی ہتھیار کی عدم موجودگی میں ان کا اور میرا کیا مقابلہ۔ قدرت نے مجھے ایک موقع فراہم کیا تھا، اسے گنوانا خودکشی کے مترادف تھا۔ اگر میں روبی کے ساتھ پولیس اسٹیشن جاتا تب بھی گرفتار ہوتا۔ مجھے یقین تھا کہ اب تک مجھے مفرور مجرم قرار دیا جا چکا ہوگا اور میری ضمانت منسوخ ہو چکی ہوگی۔ جیسے ہی میں نے بتایا کہ میں کون ہوں وہ مجھے حوالات میں بند کر دیں گے اور اس کے بعد روبی ہی کو سب کچھ کرنا ہوگا۔ حالات آدمی کو خودغرض بھی بنا دیتے ہیں۔ یہ قطعی ناممکن تھا کہ میں روبی کو اس کے محبوب پیٹر سے ملوانے کے لیے اُن سب سے جدا ہو جاؤں جن کو اب میں اپنے بہت قریب محسوس کر رہا تھا۔ شاید اس زنداں سے دوسری بار رہائی نصیب ہی نہ ہو۔ ہم اب سڑک کے کنارے ٹیکسی کے انتظار میں کھڑے ہوئے تھے۔

"دیکھو روبی!" میں نے کہا۔ "یہ تو ظاہر ہے کہ میں اور تم کچھ نہیں کر سکتے۔ ہم پھر پکڑے جائیں گے۔ بعض وجوہات کی بنا پر میں تمہارے ساتھ پولیس اسٹیشن نہیں جا سکتا۔ مجھے گرفتاری کا ڈر ہے۔ اس لیے تم ہی ہمت کرو اور پولیس کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔"

"وہ اتنی آسانی سے تو میرے ساتھ نہیں چلے چلیں گے۔" روبی نے مایوسی سے کہا۔

"وہ ضرور جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "تم تھانے جاؤ۔ آدھے پون گھنٹے میں اُن کو کسی اعلیٰ پولیس افسر کا فون موصول ہوگا۔"

"تم جانتے ہو کسی اعلیٰ پولیس افسر کو؟" وہ بولی۔ اسی وقت مجھے ایک ٹیکسی نظر آئی۔

"ہاں۔ براہِ راست تو نہیں لیکن میں فون کرا دوں گا۔" میں نے کہا اور ٹیکسی کو روک لیا لیکن وہ متذبذب کھڑی رہی۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ میری جیب میں ایک پیسہ بھی نہیں ہے اور مجھے اسلام آباد پہنچنے کے لیے ٹیکسی کا کرایہ بہرحال ادا کرنا ہے۔

"روبی۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "اگر تمہارے پاس سو روپے ہوں تو مجھے اُدھار دے دو۔ شام کو اسی پولیس اسٹیشن پر جا کے لے لینا یا اپنا پتا چھوڑ دینا، میں خود پہنچا دوں گا۔"

"تمہیں جانا کہاں ہے؟" روبی نے اپنی جیب سے ایک رومال برآمد کیا جس میں نوٹ لپٹے ہوئے تھے۔ سو کا ایک بوسیدہ نوٹ اس نے میرے حوالے کیا۔ میں نے شکریہ ادا کر کے قدرے خفت کے ساتھ نوٹ لے لیا۔

"مجھے پہلے تو اسلام آباد جانا ہے، پھر لاہور۔" میں نے کہا۔ "لیکن میں تمہاری مدد کے لیے ایس۔ پی۔ سی کو فون کرا کے جاؤں گا۔" ٹیکسی ڈرائیور ایس پی کے حوالے پر باادب باملاحظہ ہوشیار ہو گیا، ورنہ اب تک وہ مجھے، میری بیساکھی کو اور میرے گرد و غبار سے اَٹے ہوئے زخمی پیروں کو انتہائی مشکوک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"پھر تم کو دوسری ٹیکسی لے کر جانے کی کیا ضرورت ہے۔" وہ بولی۔ "مجھے راستے میں پولیس اسٹیشن کے سامنے اُتار دینا۔"

"اچھا۔" میں نے اس کے ساتھ پچھلی نشست پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ٹیکسی روانہ ہوئی تو مجھے خیال آیا کہ اس وقت آزاد ہونے کے باوجود میری حیثیت ایک مفرور مجرم سے زیادہ نہیں جس پر ایک نہیں، تین افراد کے قتل کا الزام ہو۔ کیا ایسی صورت میں انکل شیروانی کے گھر جانا مناسب ہوگا؟ ممکن ہے پولیس وہاں پہلے سے موجود ہو۔ انکل رضوی جیسے فرض شناس افسر سے کچھ بعید نہیں کہ انہوں نے میرے سارے ٹھکانے بتا دیے ہوں۔ کیوں نہ میں پہلے رابعہ کو فون کر لوں؟

"روبی۔" میں نے کہا۔ "یہاں کوئی ایسی جگہ ہے جہاں سے میں فون کر سکوں۔ تم تو یہاں کی رہنے والی ہو۔ بہت سے لوگ جانتے ہوں گے تمہیں!"

"ٹیلی فون آفس سے کیوں نہیں کر لیتے۔ راستے میں آئے گا۔" وہ بولی۔

"وہ... دراصل... وہاں اور بھی لوگ ہوں گے..." میں نے کہا۔ "اور مجھے ایک پرائیویٹ بات کرنی ہے۔"

"اچھا تو یہاں توپ خانہ بازار میں ایک ڈاکٹر رہتے ہیں۔ اس وقت وہ ڈیوٹی پر ہوں گے۔" وہ بولی۔ "لیکن ان کی ماں مجھے جانتی ہے۔" اس نے ٹیکسی ڈرائیور کو بائیں طرف ایک پتلی سی سڑک پر مڑنے کا اشارہ کیا۔

پانچ منٹ بعد میں اس نامعلوم ڈاکٹر کے ڈرائنگ روم میں اکیلا بیٹھا رابعہ کا ٹیلی فون نمبر ملا رہا تھا۔ روبی اندر ڈاکٹر کی ماں سے باتیں کرنے میں مصروف تھی۔ گھنٹی بج رہی تھی اور میرے دل کی دھڑکن میرے قابو سے باہر ہونے لگی تھی۔ ریسیور میرے ہاتھ کی گرفت میں کانپ رہا تھا۔ بالآخر کسی نے ریسیور اٹھایا اور میں نے رابعہ کی آواز سُنی۔ "ہیلو۔"

میرے دل نے سینے کے اندر قلابازی کھائی اور الفاظ میرے حلق میں پھنس گئے۔ کچھ دیر میں بول ہی نہ سکا۔

"ہیلو۔ کون ہے؟" رابعہ کی آواز پھر آئی۔ "کس سے بات کرنی ہے؟"

"رابعہ۔" میرے حلق سے بڑی عجیب و غریب آواز نکلی جو بالکل اجنبی لگتی تھی۔ خود میرے کانوں کو بھی۔

"کون صاحب بول رہے ہیں آپ؟" رابعہ نے کہا اور میں نے

اس کی آواز میں ہلکی سی لرزش کو محسوس کیا۔
"میں سکندر ہوں رالعہ۔" میں نے بالآخر اپنی آواز پر قابو پالیا۔ "تمھارا سکندر ــــ ہیلو ــــ رالعہ ــــ میں سکندر بول رہا ہوں۔"
"جھوٹ۔ تم جھوٹ بول رہے ہو۔" وہ ہسٹریائی لہجے میں کانپتے ہوئے بولی۔ "تم کوئی اور ہو۔ ابھی جب میں یقین کرلوں گی تو تم غائب ہو جاؤ گے۔ دھوکے باز۔ تم نے میری آنکھوں کو۔ میرے کانوں کو ــــ مجھے کئی بار ایسے دھوکے دیے ہیں۔"
"مگر یہ دھوکا نہیں ہے جانم۔" میں نے کہا۔ "میں ایک ڈاکٹر کے گھر سے بول رہا ہوں۔ یہاں راولپنڈی سے۔ تم تصدیق کرسکتی ہو۔ میں فون بند کردیتا ہوں تم یہ نمبر ملالو۔" میں نے اُسے فون پر لکھا ہوا نمبر بتایا۔
"کیا کروں گی تصدیق کرکے؟" وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ "تم اتنی دور ہو۔"
"میں شام تک پہنچ جاؤں گا۔ سُنا تم نے۔" میں نے اُسے تسلی دینے کی کوشش میں اپنے آنسوؤں کو بڑی مشکل سے روکا۔
"اس کے بعد کیا ہوگا؟ تم پھر کوئی معرکہ سر کرنے نکل جاؤ گے۔ پھر چھوڑ جاؤ گے مجھے اپنی تنہائی کے جہنم میں۔" وہ اسی طرح روتی رہی۔ "میں پاگل ہوں کہ تم سے گلہ کررہی ہوں۔ سارا قصور تو میرے نصیب کا ہے۔"
"رالعہ۔" میں نے کہا۔ "حوصلے سے کام لو۔ میں تو سمجھتا تھا تم بہت بہادر ہو۔ اتنی بڑی وکیل . . ."
"نہیں ہوں میں وکیل۔" وہ چلّائی۔ "میں صرف رالعہ ہوں۔ اس سے زیادہ میں کچھ بننا بھی نہیں چاہتی۔ مت دو مجھے بہادر ہونے کا الزام۔ میں انتہائی کمزور اور بزدل عورت ہوں۔ بالکل حوصلہ نہیں ہے مجھ میں دُکھ اٹھانے کا۔"
"اچھا دیکھو۔ میں جانتا ہوں کہ میری گرفتاری کے وارنٹ نکل چکے ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "انکل رضوی کو معلوم ہوا تو وہ مجھے فوراً گرفتار کرلیں گے۔ میں صرف تم سے ملنے آؤں گا۔ دس بجے کے بعد کھڑکی کھلی رکھنا۔ سُن رہی ہونا۔ محسن کے سوا یہ بات کسی کو مت بتانا۔ ہیلو۔ ہیلو رالعہ۔ محسن کے بارے میں یہ بات غلط ہے نا کہ وہ مرگیا..."
لیکن لائن کٹ گئی تھی۔ نہ جانے کب۔ مجھے بالکل اندازہ نہ تھا کہ رالعہ نے میری کتنی بات سنی اور کتنی نہیں سنی۔ میں نے دوبارہ کوشش کی تو مجھے معلوم ہوا کہ ٹیلی فون اچانک ڈیڈ ہوگیا ہے۔ اب میں انکل شیروانی کے گھر بھی فون نہیں کرسکتا تھا۔
بوجھل دل کے ساتھ بادلِ ناخواستہ میں روبی کے ساتھ باہر آیا اور پھر ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ مصروف پُرہجوم بازاروں سے نکلنے کے بعد قدرے غیر آباد علاقہ آگیا۔ پھر سٹلائٹ ٹاؤن کا وہ علاقہ شروع ہوا جو پوری طرح آباد تھا۔ روبی کی ہدایات کے مطابق ٹیکسی مختلف موڑ کاٹتی ہوئی بالآخر ایک کنال پر بنی ہوئی کوٹھی کے سامنے رک گئی۔ اس علاقے میں خالی پلاٹ کافی تھے۔
"جاؤ۔" میں نے روبی کی طرف دیکھ کر حوصلہ افزا لہجے میں کہا۔ "گڈ لک، پانچ دس منٹ تک یہیں ہوں میں۔ جاؤ۔"
"صاب جی۔ ہم اتنا انتظار نہیں کرسکتے۔" ٹیکسی ڈرائیور نے لجاجت سے کہا۔ "دھندے کا ٹیم ہے۔"
میں نے سو کا نوٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔ "یہ سب کافی ہے تمھارے قیمتی وقت کے لیے؟" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ اس نے نوٹ لے لیا اور انجن بند کرکے بیٹھ گیا۔ روبی نیچے اتری اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اندر گئی۔ اندر داخل ہونے سے قبل اس نے آخری بار پلٹ کے دیکھا اور ہاتھ ہلایا۔ میں نے ہاتھ ہلا کے جواب دیا اور ڈیش بورڈ پر لگی ہوئی گھڑی کو دیکھا۔ دو بج کر پانچ منٹ ہوئے تھے۔
"ہوسکتا ہے ہمیں ایک دم روانہ ہونا پڑے۔" میں نے کہا۔ "انجن اسٹارٹ رکھو۔ جیسے ہی میں اشارہ کروں گولی کی طرح نکل جاؤ سیدھے اسلام آباد کی طرف۔"
"یہ کیا چکر ہے سر؟" وہ انجن اسٹارٹ کیے بغیر بولا۔ "کوئی خطرے کی بات تو نہیں ہے؟ انجن اسٹارٹ ہوجائے گا۔"
"نہیں۔ تمھارے لیے خطرے کی کوئی بات نہیں۔" میں نے اطمینان سے کہا اور گھڑی کو دیکھا۔ دو منٹ ہوچکے تھے۔ میری نگاہ اندر ہی کہ پیڈر رد یا دلاور میں سے کسی کی جھلک بھی دکھائی دے تو ڈرائیور کو سگنل دے دوں۔ ڈائل پر لگی ہوئی گھڑی کی سوئی نے ایک اور چکر پورا کرلیا۔ تین منٹ۔ میں نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ اچانک اندر سے ایک فلک شگاف چیخ سنائی دی۔ پھر دروازہ جس سے روبی اندر گئی تھی پورا کھل گیا اور چیختی ہوئی روبی نمودار ہوئی۔
"چلو۔" میں نے گھبرا کے کہا۔ "جلدی کرو۔" مجھے یقین تھا کہ روبی کے تعاقب میں یقیناً شکاری ہوں گے۔ ٹیکسی ڈرائیور نے عجلت میں چابی گھمائی۔ انجن ایک بار غرایا اور رک گیا۔ اس نے دوسری کوشش کی۔
"اُلّو کے پٹھے۔ اسی لیے کہا تھا میں نے تم سے کہ انجن بند مت کرو۔" میں نے چیخ کر کہا۔ روبی پاگلوں کی طرح چیختی ہوئی بھاگتی چلی آرہی تھی۔ دہشت زدہ اور سراسیمہ۔ کسی آہوئے صیاد دیدہ کی طرح۔
"پتا نہیں کیا ہوگیا ہے سر۔" ڈرائیور سہم کر بولا۔ "انجن تو ٹھیک اسٹارٹ ہے۔ پٹرول نہیں ہے شاید۔" اس کا خیال صحیح لگتا تھا۔ فیول میٹر کی سوئی "ای" کے نشان سے بھی نیچے چلی گئی تھی۔ میں نے اس وقت کو کوسا، جب میں نے ہمدردی کے جذبات سے

مغلوب ہوکے روبی کے ساتھ آنا منظور کرلیا تھا۔
میں نے دیکھا کہ وہ بھاگتی ہوئی دروازے تک آگئی ہے لیکن ابھی تک کوئی شکاری کتا اس کمزور ہرنی کو دبوچنے کے لیے نہیں نکلا ہے۔ اسی وقت ٹیکسی کے انجن میں جان پڑ گئی۔
"اب کہاں سے آگیا پٹرول؟" میں نے کہا۔ "تم نے تو مجھے مروا دیا تھا۔" فیول میٹر کی سوئی بدستور وہیں تھی۔
"اس کا میٹر ٹھیک نہیں ہے صاب۔" وہ بولا۔ "دھوکا ہوجاتا ہے کبھی کبھی۔" ٹیکسی نے حرکت کی۔
"ٹھہرو۔" روبی ہاتھ ہلا کے چلّائی، ٹھوکر کھا کے گری اور پھر اٹھ کے دوڑنے لگی۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور کے شانے پر تھپکی دی اور اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ اب جو ہو سو ہو۔ میں ایک عورت کو مصیبت میں مدد کے لیے پکارتا چھوڑ کے بزدلوں کی طرح بھاگ نہیں سکتا تھا۔ میں نیچے اترا ہی تھا کہ روبی نے میرا بازو اپنے ہاتھوں کے شکنجے میں کس لیا۔ اس کے ہاتھ کنکروں کی رگڑ سے چھِل گئے تھے اور رِسنے والا خون میری آستین کو داغدار کررہا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح مجھے کھینچنے لگی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن شدّتِ جذبات نے اس کو قوتِ گویائی سے محروم کر دیا تھا۔ وہ مسلسل ہچکیاں لے رہی تھی۔
"کیا بات ہے روبی؟" میں نے اسے جھنجوڑ کر کہا۔
"وہ . . . انھوں نے مار دیا اسے۔" اس نے چیخ ماری۔ "مار دیا اسے۔" وہ دہاڑیں مار مار کے رونے لگی۔
"اچھا اچھا۔ میں دیکھتا ہوں۔ تم حوصلہ رکھو۔" میں نے کہا۔ ٹیکسی کا دروازہ بند ہوا تو میں نے پلٹ کر دیکھا۔ موقع پاتے ہی بدحواس ڈرائیور نے ٹیکسی سمیت فرار ہوجانا بہتر سمجھا تھا۔ میں نے اس پر لعنت بھیجی اور روبی کے ساتھ اندر گیا۔ مجھے امید یہی تھی کہ اندر کوئی نہ ہوگا۔ ہوتا تو روبی باہر نہ آسکتی۔
کمروں کے درمیان راہداری جیسا تنگ سا راستہ تھا دونوں طرف کے سب دروازے بند تھے۔ چنانچہ دن میں بھی وہاں اندھیرے اجالے کی ملی جُلی کیفیت تھی اور باہر اُجلی دھوپ سے یکلخت اندر آنے پر تاریکی کچھ زیادہ ہی محسوس ہوتی تھی۔ آخری دروازہ کھلا پڑا تھا۔ بین کرتی روبی کے ساتھ میں ویران کچن سے گزرا اور آخری گوشے کے دروازے سے نیچے اتر گیا۔ تہ خانہ زیادہ گہرائی میں نہیں تھا۔ اس کی چھت وہی تھی جو گھر کا فرش تھا۔ تہ خانے کے فرش سے اس کی [illegible] بھی نہ تھی .... دس فٹ کا یہ [illegible] کمرہ کا اسٹور تھا جسے پہلے عقوبت خانہ بنایا گیا اور پھر قتل گاہ کے طور پر استعمال کیا گیا۔
ایک دیوار کے قریب پیڈر مرا پڑا تھا۔ میں نے کبھی پیڈر کو دیکھا نہیں تھا لیکن وہ لاش کسی اور کی نہیں ہوسکتی تھی جو اردگرد پھیلے ہوئے خون میں اور فرش کی گرد میں بے حس و حرکت پڑی تھی۔ اس کی کھلی آنکھیں دروازے کو دیکھ رہی تھیں۔ امید اور انتظار کے آخری لمحات کا عکس ان آنکھوں میں منجمد ہوگیا تھا۔ ایک خنجر اس کے سینے میں عین دل کے مقام پر پیوست تھا مگر لہو دوسرے زخموں سے بہا تھا جو اس کے لاغر جسم پر جا بجا نظر آرہے تھے۔ روح کو جسم کی قید سے رہائی مل گئی تھی لیکن جسم ابھی تک اسیر تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ زنجیر میں جکڑے ہوئے تھے اور زنجیر کا دوسرا سرا دیوار سے ملا ہوا تھا۔ اسی طرح پیر ایک ہی رسّی سے باندھ کر رسّی کو ایک حلقۂ زنجیر کے ساتھ گرہ دے دی گئی تھی۔ روبی مسلسل رو رہی تھی لیکن میں اس شخص کو دیکھ رہا تھا جو اپنے خون سے محبت کے لازوال جذبوں کی ایک اور کہانی لکھ گیا۔ اس محبت کی جو کسی سے کچھ نہیں مانگتی اور سب کچھ محبوب کے قدموں میں ڈال دیتی ہے۔ اپنے سارے سُکھ سب خوشیاں، جان و دل۔
میں نے جھک کر اس کے جسم کو ہاتھ لگایا جسم ابھی بالکل ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔ کہیں کہیں زخم سے ابھی خون رِس کر نیچے بہہ رہا تھا۔ ہر سمت سے بند تہ خانے میں گرم لہو کی بُو بسی ہوئی تھی۔ مجھے اُبکائی سی آنے لگی۔ آدمی کا خون براہِ راست اعصاب کو متاثر کرتا ہے۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن ایک ہاتھ نے مجھے پیچھے سے دھکیل دیا۔ میں لاش کے اوپر گرا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے روبی کی چیخ سُنی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا مجھے دھکیل کر وہ دور جا کھڑی ہوئی تھی۔ "یہ کیا حرکت ہے؟" میں نے اٹھتے ہوئے برہمی سے کہا۔ میرے سب کپڑے خون میں بھر گئے تھے اور جب میں اٹھا تھا تو دونوں ہاتھوں کی سب انگلیاں بھی پیڈر کے خون میں تر ہوچکی تھیں۔ روبی نے کوئی جواب نہیں دیا۔
اٹھنے کے بعد میں نے ان سب کو دیکھا جو خاموشی سے اندر آگئے تھے۔ پیڈرو سمیت وہ چار تھے۔ پیڈرو زینے کے اوپر دروازے کے فریم میں کھڑا تھا۔ باقی تین جن کو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، مجھے تین طرف سے محصور کرنے کے لیے آگے بڑھ رہے تھے۔ میں نے روبی کو دیکھا۔ وہ کمر

پر ہاتھ رکھے مسکرا رہی تھی۔

"تم نے ایک اور قتل کر دیا ہے ہیرو۔" پیڈرو نے ایک خندۂ تحقیر کے ساتھ کہا۔

"ذلیل عورت۔" میں نے دانت پیس کے کہا۔ "تو یہ سب فریب تھا، تیرا رونا دھونا، تیری کہانی۔"

وہ ہنسی۔ "کہانی تو ایک رسالے میں پڑھی تھی میں نے، اداکاری میری اپنی تھی۔ اس کے بغیر میں تم سے خود کو کیسے بچاتی اور یہاں تک کیسے لے کر آتی۔ میں اسکول کے زمانے میں بھی ڈرامے کرتی تھی اور کچھ عرصہ ایکسٹرا بھی رہی تھی۔"

"ایکسٹرا تو اب بھی ہے۔ ایک فاضل پُرزہ۔" پیڈرو نے اوپر سے کہا۔ "جس کی اب کسی کو ضرورت نہیں۔"

"ایسا مت کہو۔" روبی سہم کے بولی۔ "تمھارے لیے میں نے سب کچھ کیا۔ جو تم نے کہا۔"

"نہیں۔ تو نے جو کچھ کیا تھا، پیسے کے لیے کیا تھا۔" پیڈرو نے ایک ایک سیڑھی اترتے ہوئے کہا۔ "کیا میں نے کہا تھا کہ عقل سے کام نہ لینا؟ وہ کوئی ایسا زہر نہیں تھا جو ہاتھ پر رکھنے سے جسم میں سرایت کر جائے۔ اگر تو اس وقت ہسٹریا میں مبتلا نہ ہوتی تو اسے سیمسن کی جان لینے کا موقع نہ ملتا۔ مجھے معلوم ہے تو اس کو یہاں کیوں لائی تھی۔ تو اس کو نکال کر لے جانا چاہتی تھی۔ اب مجھے بے وقوف بنا کے جان بچانا چاہتی ہے؟"

مجھے گھیرے میں لینے والے مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر رک گئے تھے۔ میں خالی ہاتھ تھا اور ان کے ہاتھوں میں لمبے پھل والے خنجر تھے۔ مجھے نفسیاتی طور پر خوفزدہ کرنے کے لیے انھوں نے ایک ساتھ بٹن دبائے تھے اور دستے میں چھپے ہوئے پھل کھٹ سے نکل آئے تھے۔ میں پوری طرح مستعد دیوار سے پشت لگائے کھڑا تھا تاکہ تینوں دشمن میرے پیچھے آ کے وار نہ کر سکیں۔ ریوالور صرف پیڈرو کے ہاتھ میں تھا۔ روبی کا رنگ اڑ گیا تھا۔ اداکاری اس کے کام نہیں آئی تھی۔

"یہ تمھارا شوہر عنایت مسیح کیسی باتیں کر رہا ہے روبی؟" میں نے کہا۔

"میں نے اس سے جھوٹ بولا تھا۔" روبی چلّائی۔ "میں بے بس تھی۔ اس کو روکے رکھنے کے سوا میں کیا کر سکتی تھی۔"

"اور جب تو کچھ نہ کر سکی تو اس کی مدد سے تو نے پیٹر کو آزاد کرانا چاہا؟"

"کیا مجھے اس کا بھی حق نہیں تھا؟" روبی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ "اسی لیے تو تم نے پیٹر کو یرغمال بنایا تھا کہ جب مطلب نکل جائے تو اسے مار دو؟ میں نے انکار تو نہیں کیا تھا کسی کام سے۔ پھر تم نے اس کی جان کیوں لی؟"

"سیمسن کی زندگی بہت قیمتی تھی۔ دس پیٹر مر جائیں تب بھی اس کا خون بہا ادا نہیں ہو سکتا۔ یہ تیری بے وقوفی کی سزا ہے۔" پیڈرو بولا۔ "صرف آدھی سزا۔ باقی سزا تو خود بھگتے گی۔" اس نے اچانک ریوالور اٹھایا اور گولی چلا دی۔ روبی کے سر سے خون کی دھار نکلی اور وہ نیچے گر گئی۔ یہ سب میرے لیے اتنا غیر متوقع تھا کہ میں ساکت و صامت کھڑا روبی کو دم توڑتے دیکھتا رہا۔ تہ خانے میں سائلنسر والے پستول کی آواز دب گئی تھی اور روبی کو چیخ مارنے کا موقع ہی نہ ملا تھا۔ اپنا آخری جملہ مکمل ہونے سے پہلے پیڈرو فائر کر چکا تھا۔ اب وہ نزع کے کرب میں تڑپتی ہوئی پیٹر کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کے پیٹر کو چھوا اور آخری جھٹکا لے کر ساکت ہو گئی۔

"اگر تم سب یہ خنجر، ریوالور لے کر نہ آتے تو میں تم کو بہادری کا سبق سکھاتا۔" میں نے کہا۔ "لیکن تم صرف کمزوروں کو زنجیر سے باندھ کے مار سکتے ہو۔ نہتی عورتوں کو قتل کر سکتے ہو عنایت مسیح۔"

"یہ نام تمھیں کس نے بتایا؟ اس عورت نے؟" پیڈرو مسکرایا۔ "اور تم نے یقین کر لیا؟"

"ہاں۔ میں جانتا ہوں اس نے مجھ سے جو کچھ کہا تھا، سچ تھا۔ وہ کسی رسالے میں پڑھی ہوئی کہانی نہیں تھی۔" میں نے کہا۔ "اسے تم پر اعتبار نہیں تھا۔ اس نے تمھارے ایک دشمن کو قابلِ اعتماد سمجھا اور اسے تمام حالات سے آگاہ کر دیا، تاکہ کوئی تو ہو جو تمھارے جرم کا گواہ بنے۔ اسے اندیشہ تھا کہ تم سب کچھ کر سکتے ہو۔"

"اس نے اعتراف کیا تھا تمھارے سامنے کہ وہ جھوٹ بول رہی تھی۔" پیڈرو بولا۔

"یہ بات اس نے تم کو اچانک روبرو پا کے کہی تھی۔" میں نے کہا۔ "خوف نے اسے سچ سے انکار پر مجبور کر دیا تھا۔"

"اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" پیڈرو نے بے نیازی سے کہا۔

"فرق اس عورت کو ضرور پڑے گا جو روبی کی ماں تھی۔" میں نے کہا۔ "جسے تم بلیک میل کرتے رہے۔"

پیڈرو ہنسا۔ "اس کے لیے بھی دکھی ہونے کی ضرورت نہیں۔ تین دن ہوئے، وہ بھی دنیا کے دکھوں سے چھوٹ گئی۔"

"اس بوڑھی اور بیمار عورت کے لیے بھی تم نے انھی قاتلوں کی فوج بھیجی تھی؟" میں نے افسوس سے روبی کی طرف دیکھا جس نے محبت کی پناہ میں ایک ایسے مستقبل کے خواب دیکھے تھے جو اس کے لیے اور اس کی ماں کے لیے عمرِ رفتہ کی ہر تلخ یاد سے نجات کا ضامن ہو۔ مگر وقت ایک بے رحم جلّاد تھا جو معاف کرنا نہ جانتا تھا۔ روبی کی ماں اپنی سزا کاٹتے ہوئے مر گئی اور بیٹی کو اس کی صورت بھی دیکھنی نصیب نہ ہوئی، پیٹر کے ساتھ روبی بھی مر گئی۔ ان کا یہ جنم تو امیدوں کا سراب تھا مگر وہ آبلہ پا چلتے رہے۔ اس منزل تک جہاں خون خون میں شامل ہو گیا تھا اور اس لکیر پر سفر تمام ہوا جہاں روبی کے بہتے ہوئے لہو کی لکیر نے پیٹر کے خون سے رشتہ استوار کر لیا تھا۔

"میں جا رہا ہوں پولیس کو بلانے کے لیے۔" پیڈرو نے زینے کا رخ کیا۔ "تم تیار رہنا اور اس کی طرف سے غافل مت ہونا۔ میرا اشارہ ملتے ہی تم کو یہاں سے نکلنا ہے۔"

بظاہر ان کا پلان یہی تھا کہ مجھے پیٹر کا قاتل بنا دیں اور پولیس کے حوالے کر دیں۔ اگر وہ مجھے ناک آؤٹ کر کے نکل جاتے تو ہوش آنے پر میں خود کو حوالات میں بند پاتا۔ شاید پیڈرو مجھے رنگے ہاتھوں پکڑوانا چاہتا تھا کہ اس نے ایسا نہیں کیا۔ میرے ہاتھ واقعی پیٹر کے خون میں رنگے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ بھی تہ خانے میں ایک عورت کی لاش پڑی تھی جس کے متعلق میں اس سے زیادہ کچھ نہیں بتا سکتا تھا کہ اس کا نام روبی ہے لیکن اس کا نام کچھ اور بھی ہو سکتا تھا۔

"یہ ریوالور اپنے پاس رکھو۔" پیڈرو نے زینے کے وسط میں پہنچ کے محسوس کیا کہ وہ خود تو محفوظ رہے گا مگر ان تین افراد کی سلامتی سو فیصد یقینی نہیں جن کے ہاتھوں میں صرف خنجر ہیں۔ وہ جانتا تھا کہ خالی ہاتھوں سے بھی میں کیا کر سکتا ہوں اور اس کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ میں طے کر چکا تھا کہ باری باری ان سے نمٹ لوں گا اور یہ خنجر ان کو نہ بچا سکیں گے۔ وار کرنے کے لیے ان کو قریب آنا پڑے گا۔ پہل چونکہ میری طرف سے ہوتی اس لیے پہلا شکار تو حرکت بھی نہ کر پاتا۔ باقی دو بیک وقت جھپٹتے لیکن اس وقت تک میں ایک خنجر حاصل کر چکا ہوتا اور ایک دشمن کو ٹھکانے لگا دیتا۔ یا اسے ڈھال بنا لیتا اور پھر باقی دو سے مقابلہ کرتا۔ اس سے میرے زخمی ہونے کے امکانات بھی تھے کیونکہ میں بالکل فٹ نہیں تھا اور چاروں ہاتھ پیر اپنی مرضی کے مطابق استعمال نہیں کر سکتا تھا لیکن بڑے خطرے سے بچنے کے لیے چھوٹا خطرہ مول لینا ضروری تھا۔ ریوالور کی گولی سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا تھا جو ابھی تک پیڈرو کے ہاتھ میں تھا۔

لیکن ریوالور اپنے ساتھیوں کو دینا اس کی غلطی بن گیا۔

اس نے زینے پر سے ریوالور اس کی طرف اچھالا جو عین میرے مقابل تھا۔ اس نے ریوالور کو کیچ کرنے کی کوشش کی۔ میں نے ایک جست لگا کے اس کو جسم کی ٹکر ماری۔ وہ سنبھل نہ سکا۔ خنجر کو اس نے دانتوں میں دبا لیا تھا۔ اس کے گرتے گرتے خنجر بھی فرش پر گر کے اچھلا۔ میں نے ریوالور پر قبضہ کرنے کے لیے غوطہ مارا تھا اور سیدھا اس کے اوپر جا پڑا تھا لیکن مجھے اٹھنے کا موقع نہیں ملا۔ باقی دو اچھل کر مجھ پر حملہ آور ہوئے۔ دوسرے نے مجھے فرش پر ہی دبانا چاہا لیکن میں کروٹ لے کر پلٹ گیا۔ ریوالور میرے ہاتھ میں آ گیا تھا مگر تیسرے نے میرے کِک ماری جو میری کہنی پر لگی اور ریوالور میرے ہاتھ سے چھُٹ گیا۔ اسی وقت پہلا شخص چلّایا۔ وہ خنجر جو اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گرا تھا، اچھلنے کے بعد اس کے اپنے پیٹ میں گھس گیا تھا۔ میں نے دیکھا تو وہ پیٹ کو دونوں ہاتھوں سے دبائے زینے کی طرف بھاگ رہا تھا اور اس کا اپنا خون دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں سے بہتا اس کے کپڑوں کو سرخ کر رہا تھا۔ وہ نہایت بھیانک آواز میں چلّا رہا تھا۔

تیسرے نے مجھے ایک اور کِک مارنے کی کوشش کی لیکن اس بار میں نے اس کا پنجہ اپنی گرفت میں لے لیا۔ میں نے اسے ایک ٹانگ پر گھما کر دیوار سے ٹکرانا چاہا مگر اس کا جوتا میرے ہاتھ میں آ گیا اور وہ دیوار پر لگنے کے بجائے منہ کے بل فرش پر گرا۔ صورتِ حال کو بدلتا دیکھ کے پیڈرو بھی زینے سے لوٹ آیا تھا۔ اس نے زیادہ حاضر دماغی کا ثبوت دیا اور پلک جھپکتے میں وہ ریوالور دوبارہ اس کے ہاتھ میں پہنچ گیا۔ اس نے بڑی پھرتی سے میرے سر پر ریوالور کا بٹ مارا۔ تہ خانہ تاریک ہو گیا اور میں دو لاشوں کے درمیان لیٹ گیا۔

آنکھ کھولنے پر مجھے اپنے اردگرد بڑی چہل پہل نظر آئی۔ پولیس والے دُہرے قتل کی اس واردات میں بڑی مستعدی دکھا رہے تھے جس میں سب کچھ تفتیش کی پریشانی کے بغیر مل گیا تھا۔ یعنی قاتل بھی، مقتول بھی اور آلۂ قتل بھی۔ دو پھول والا ایک سب انسپکٹر مقتل کا نقشہ بنوانے میں مصروف تھا اور ایف آئی آر کی زبان میں جائے واردات کا منظر تمام تفصیلات کے ساتھ بیان کرنے میں اپنا سارا زورِ قلم صرف کر رہا تھا۔ اس کی ماتحت ٹیم ایک نائک اور دو کانسٹیبلوں پر مشتمل تھی۔

ایک کانسٹبل میرے قریب کھڑا بے زاری سے تمام کارروائی کو دیکھ رہا تھا کیونکہ اس تہ خانے میں لاشوں یا دیواروں کے سوا دیکھنے کو کچھ تھا ہی نہیں۔ ان کا افسرِ اعلیٰ تین پھولوں والا انسپکٹر، سو فیصد تھانیدار تھا۔ بھاری بھرکم، بے رحم اور کرخت چہرے والا، بڑی بڑی مونچھوں والا اور سب سے بڑی توند والا۔ اس کے لیے کہیں سے ایک کرسی برآمد کی گئی تھی۔ جب وہ حرکت کرتا تھا تو کرسی کراہنے لگتی تھی۔

صورتِ حال اچانک انتہائی سنگین ہو گئی تھی۔ پیڈرو کے ساتھی بھاگ گئے تھے اور جاتے جاتے مجھے موردِ الزام بنانے کا پورا اہتمام کر گئے تھے۔ پولیس ان کے طلب کرنے پر ہی پہنچی ہو گی اور ریوالور پر سے اپنے انگلیوں کے نشانات مٹا دیے ہوں گے۔ اگر بے ہوشی میں میرے ہاتھ سے میرے فنگر پرنٹ بنا گئے ہوں تو کچھ عجب نہیں۔ یہ تو بہت بعد میں ثابت ہو گا کہ میں کسی مقتول کے نام سے بھی واقف نہیں۔ پہلے مجھے بتانا پڑے گا کہ میں کون ہوں۔ یہاں کیسے پہنچا اور کس طرح قتل کی اس واردات میں ملوث کیا گیا۔ اس سے پہلے ایف آئی آر میں ہر ثبوت میرے خلاف درج ہو جائے گا اور تفتیش ہو گی۔ تفتیش کیسے ہوتی ہے؟ اس کا مجھے عملی تجربہ تھا۔ پولیس مجھ سے ہر قیمت پر اعترافِ جرم حاصل کرنے کی پوری کوشش کرے گی اور میرے انکار کو اقرار میں بدلنے کے لیے تشدد کے سارے حربے آزمائے گی۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہیں یا ناکام۔ یہاں میرے خلاف دُہرے قتل کا دوسرا مقدمہ درج ہو جائے گا اور اس کے بعد وہی ہو گا۔ وکیل اور ضمانت حاصل کرنے کی کوشش، سماعت کے مرحلے، فیصلہ ہونے تک انتظارِ مسلسل کا عذاب۔

تقدیر نے مجھے ایک زنداں سے رہا کیا تھا تو دوسرے زنداں میں اسیر کر دیا تھا۔ بے وقوفی میری تھی کہ ایک بار آزاد ہونے کے بعد خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے لاہور کا رخ نہیں کیا۔ میں اس نرس سے کہہ سکتا تھا کہ بی بی تم بہت مظلوم ہو لیکن میں بھی گرفتارِ بلا ہوں۔ سب کے پاس اپنے اپنے غم کا اور دکھوں کا بار ہے جو اسے خود ہی اٹھانا ہے۔ اللہ ہم دونوں کا مددگار ہو۔ اب مجھے سب کو مطلع کرنا پڑے گا۔ رابعہ اور شہلا کو، عبدالودود منظر کو اور دونوں انکلوں کو۔ رابعہ کہے گی کہ تم نے تو فون کر کے مجھ سے کچھ اور کہا تھا۔ تم نے کسی نرس کا ذکر نہیں کیا تھا۔ پھر تم اس کے ساتھ کہاں جا پھنسے اور ودود منظر پریشان ہونے کے باوجود قہقہہ مار کے کہے گا۔ جا بھوتنی کے، ہر شہر میں قتلِ عام کر رہے ہم ہیں تو غم کیسا۔ انکل رضوی اور شیروانی بہت زیادہ خفا ہوں گے اور ان سب لوگوں کی پریشانی یا خفگی برحق ہو گی۔

اس بار شاید ضمانت پر بھی رہائی نہ ہو۔ جیسے ہی یہ بات معلوم ہو گی کہ مبینہ مجرم سکندر بخت پر لاہور میں تین افراد کے قتل کا الزام ہے جس میں ایک دُہرا قتل بھی شامل ہے، عدالت مجبور ہو جائے گی کہ ضمانت کی درخواست مسترد کر دے۔ ایسے مجرم کو چھوڑنے کا خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا۔ کیا پتا وہ پشاور یا کراچی جا کے کسی اور کا خون کر دے اور یہ بڑی مصیبت ہو جائے گی۔ قتل کے دو مقدمات لاہور میں تو ایک پنڈی میں۔ رابعہ اور منظر کہاں کہاں سماعت کی تاریخ پر حاضر ہوں گے۔ بے شک اصل مسئلہ تو مجھے میر شرافت علی کے قتل کے الزام سے بری کرانے کا ہے۔ لاہور میں عبدل اور رشیدے کا قتل اور پنڈی میں روبی اور پیٹر کا قتل مجھ پر ثابت نہیں ہو گا کیونکہ حالات اور واقعات کی شہادت سو فیصد میرے حق میں ہو گی لیکن طریقۂ کار کے مطابق سماعت تو ہو گی۔ دلائل دیے جائیں گے، گواہ پیش ہوں گے اور باعزت بری کیے جانے تک کیا ہو گا، یہ سب میں جانتا ہوں۔

اس مصیبت سے بچنے کی ایک صورت یہ تھی کہ میں سکندر بخت نہ رہوں۔ اپنا نام پتا غلط بتاؤں اور خود کو لاوارث ظاہر کروں۔ یا سمین کی طرح گونگا بہرا بن جاؤں۔ اُدھر رابعہ انتظار کرتی رہے، اِدھر میں انتظار کروں کہ تقدیر کوئی صورت پیدا کر دے کہ میں خود کو بے گناہ ثابت کر سکوں۔ کوئی وکیل ترس کھا کے میری پیروی پر آمادہ ہو جائے اور کوئی اللہ کا نیک بندہ میرا ضامن بن جائے۔ یا مجھے فرار ہونے کا موقع مل جائے۔ گو اس کے امکانات بہت کم تھے لیکن مجھے رابعہ کو اور اپنے دوستوں ہمدردوں کو یہ ایس او ایس دیتے ہوئے شرم آتی تھی کہ آؤ مجھے بچاؤ۔ کیونکہ میں نے یہاں بھی دُہرے قتل کا الزام اپنے سر لے لیا ہے، خواہ مخواہ مصیبت کو گلے لگا لیا ہے اور کوئے یار سے سوئے دار پہنچ گیا ہوں۔ صرف میری وجہ سے کتنے لوگ پریشان ہیں۔ ان کے لیے مزید پریشانیوں کا سامان کرنا غلطی نہیں تھی، گناہ تھا۔ یہ ان کے پُرخلوص جذبات کا استحصال تھا لیکن کیا میں ان سب کی مدد کے بغیر اس عذاب سے چھٹکارا پا سکوں گا؟

ابھی میرا ذہن اس الجھن کا کوئی حل تلاش نہیں کر پایا تھا کہ کسی نے میرے ایک لات رسید کی۔ "اٹھ او ئے..." کسی نے پوٹھوہاری لہجے میں ایک مقبول عام گالی دے کر کہا۔ "مکر نہ کر۔"

"چھتر لا ایس... کی۔" تھانیدار نے میرے نام کی جگہ گالی استعمال کی۔ "پتا لگ ویسی۔" مگر لات مارنے والے نے اس مشورے سے قبل ہی جلتی ہوئی سگریٹ میری گردن پر لگا دی تھی۔ مجھے اٹھ کر بیٹھنا پڑا جو سپاہی اب تک بیزار کھڑا تھا مجھ پر پل پڑا۔ میرے بال پکڑ کے اس نے مکّے اور لاتیں مارتے ہوئے مجھے اپنے افسرِ اعلیٰ کے سامنے کھڑا کر دیا۔

نصف درجن کے قریب گالیاں دینے کے بعد تھانیدار نے پہلا سوال کیا۔ "ناں دس اپنا؟"

"جی... اس بندۂ حقیر و پُر تقصیر کو... اے اے اے اے الٰہ آبادی..." میں نے ہچکیاں لیتے ہوئے نستعلیق لہجے میں کہا۔

"اے اے اے..." تھانیدار نے میرے پیٹ پر چھڑی ماری۔ "نام پوچھا ہے میں نے..."

"وہی عرض کر رہا تھا حضور والا!" میں نے بلبلا کے کہا۔ "آغا احمد علی عرش الٰہ آبادی۔ یہی نام ہے احقر کا۔"

"عرش الٰہ آبادی؟ گویا شاعر ہیں آغا صاحب۔" تھانیدار نے میرا سر جھکا کے دو زنّاٹے دار تھپڑ رسید کیے اور میری کمر پر مکّے مارے۔ میں نیچے گر پڑا۔ میں نے شدید تکلیف کا اظہار شور مچا کے کیا۔

"قتل تو نے کیے ہیں؟" تھانیدار نے کہا۔ "بھونک مت کتے کی طرح۔ سیدھی طرح جواب دے۔"

"جی... جی ہاں، میں نے کیے ہیں۔" میں نے آنسو پونچھ کے کہا۔ "اس کے سوا چارہ نہیں رہا تھا ڈی ایس پی صاحب۔"

تھانیدار کو عزت افزائی پسند آئی۔ اسے یہ بھی یقین آیا کہ یہ شخص جو پھٹے کپڑوں میں بال بکھرائے، ننگے پاؤں اور شکستہ حال کھڑا ہے، شاعر ہی نہیں، جاہل بھی ہے۔ اس کے نقطۂ نظر سے یہ ایک ہی بات تھی۔ "یہ عورت کون تھی تمہاری؟" وہ بولا۔

"منکوحہ تھی اس خاکسار کی بندہ پرور۔" میں نے کہا۔ "بے وفائی پر آمادہ تھی۔"

تھانیدار نے یوں سر ہلایا جیسے اس کا قائم کردہ مفروضہ درست ثابت ہوا ہے۔ "اور یہ اس کا آشنا تھا؟" وہ پیٹر کی لاش کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ "اسے بھی تم نے قتل کیا ہے؟"

"جی حضور۔ اسی نابکار کے طفیل مجھ بدبخت کی ازدواجی زندگی کا یہ انجام ہوا۔" میں نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

تھانیدار کے اطمینان کے لیے اتنا کافی تھا۔ اس نے لاشوں کو مردہ خانے پہنچانے کے احکامات صادر کیے اور اپنی باقی سپاہ کو حکم دیا کہ مجھے تھانے لے چلیں۔ "ہتھکڑی ڈال دو اس کے۔" تھانیدار بولا۔

"اجی حضور ڈی ایس پی صاحب۔" میں نے فریاد کی۔ "خادم کے تو دست و بازو شکستہ ہیں۔ بغیر بیساکھی کے چل نہیں سکتا۔ میں تو خود تھانے حاضر ہونے والا تھا۔ میں بھلا فرار ہو سکتا ہوں؟ آپ سب کے ہوتے ہوئے؟"

میری بات سے وہ قائل ہونے والا نہیں تھا لیکن قتل کی اطلاع پا کے آنے والے اپنے ساتھ ہتھکڑی نہیں لائے تھے، ان کو معلوم نہیں تھا کہ جائے واردات پر قاتل بھی دستیاب ہو گا۔ ایک کانسٹبل نے لات مار کے مجھے چلنے کا حکم دیا لیکن میں اسی طرح پڑا رہا۔

"میں تو سہارے کے بغیر اٹھ بھی نہیں سکتا جناب ڈی ایس پی صاحب۔" میں نے مظلوم بن کے کہا۔

بادلِ ناخواستہ دو افراد نے مجھے کھڑا کیا اور گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔ میرے جس ہاتھ اور پیر پر پٹیاں تھیں ان میں درد تو تھا لیکن ناقابلِ برداشت نہیں۔ بیساکھی وہ ٹیکسی والا لے گیا تھا جس میں روبی مجھے اپنے ساتھ لائی تھی اور اس کے ساتھ تہ خانے تک میں کسی سہارے کے بغیر آیا تھا۔ غالباً بستر پر پڑے رہنے سے اور پٹیوں میں بندھے رہنے سے میرے ہاتھ پیر سُن ہو گئے تھے اور دورانِ خون میں رکاوٹ کے باعث تکلیف زیادہ تھی جو تھوڑا سا چلنے سے کم ہو گئی تھی۔ اب پٹیاں کچھ اور ڈھیلی ہو گئی تھیں۔ چنانچہ میں مزید افاقہ محسوس کر رہا تھا لیکن میں نے ظاہر یہی کیا کہ جہاں پٹیاں ہیں وہاں میری ہڈیاں چُورا ہو چکی ہیں اور عملاً میں مفلوج ہوں۔

قتل کی سنسنی خیز خبر نے گرد و نواح سے پندرہ بیس تماشائیوں کو کھینچ لیا تھا۔ ان میں سے بیشتر ملازم یا راہ گیر تھے۔ یہ بے کار لوگوں کا علاقہ نہیں تھا۔ چنانچہ بچّے اسکول جا چکے تھے اور مرد اپنے اپنے کام سے۔ خواتین دور اپنے اپنے دروازوں کے سامنے خوف زدہ اور سوالیہ نشان بنی کھڑی تھیں۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ خبر محدود رہی اور کسی اخباری نمائندے تک نہیں پہنچی۔ کچھ لوگوں نے پولیس کے حکّامِ زیریں سے قتل کے پسِ پردہ اسباب و واقعات کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی واجبی سی کوشش کی مگر انھیں مایوسی ہوئی۔ پولیس نے مجھے اٹھا کے ایک جیپ میں پھینکا۔ میرے ساتھ دو ماتحت اور دو افسر بیٹھ گئے۔ ایک اور دو پھول والے افسر۔ ان کے پاس ریوالور تھے اور انھوں نے مجھے دونوں سیٹوں کے درمیان اپنے قدموں میں گاڑی کے فرش پر ڈال کے پیروں سے دبا رکھا تھا۔ تین پھول والا پکّا تھانیدار آگے فٹ ہوا اور جیپ روانہ ہو گئی۔ میں مسلسل کراہتا گیا۔

تھانے کی عمارت نئی تھی لیکن اس کے در و دیوار پر پھیلی ہوئی آسیب زدہ نحوست کی فضا پرانی تھی۔ میرے لیے اس کے ماحول میں بھی کوئی چیز اجنبی نہیں تھی۔ نہ پولیس کا رویّہ، نہ پکڑے جانے والوں کی مظلوم بے بسی۔ نہ حوالات میں بند افراد

کی حالتِ زار۔ ناانصافی اور لاقانونیت کی فریاد لے کر آنے والوں کی کس مپرسی۔ مرغابنے ہوئے مشتبہ افراد کی قطار اور دیواروں پر تھانے کی حدود میں ہونے والے جرائم کے بے بنیاد اور خود ساختہ اعداد و شمار کے چارٹ۔ ایس ایچ او کا کمرہ اور کمرۂ تفتیش جہاں مجھے لے جایا گیا۔

رات نو بجے ایک اے ایس آئی نے باضابطہ طور پر میرا بیان لینا شروع کیا۔ جماہیاں لیتے ہوئے ایک نیم خوابیدہ اور عمر رسیدہ حوالدار نے اسے ضابطۂ تحریر میں لانے کے لیے کرسی اور میز پر پوزیشن سنبھالی۔ میں یوں فرش پر پڑا رہا جیسے صرف ہاتھ پیر کی نہیں بلکہ میرے جسم کی بیشتر ہڈیاں ٹوٹی ہوئی ہیں۔ یہ سب کچھ میں ایک موہوم سی امید پر کر رہا تھا اور اس میں ابھی تک مجھے صرف اتنی کامیابی حاصل ہوئی تھی کہ میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی نہیں ڈالی گئی تھی۔ ایک مرتبہ پھر میرا نام پوچھا گیا اور میں نے "فائیو ائے" کی گردان شروع کی۔ ہائے اور آہ کے ساتھ۔

"بس بس۔" اے ایس آئی نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے مجھے لات ماری۔ "عرش کی اولاد، فرش میں گاڑ دوں گا۔ لکھ بھئی احمد علی۔" اس نے نائک کو مخاطب کر کے کہا۔ "باپ تھا؟ نام بتا اس کا؟"

میں مرغِ بسمل کی طرح تڑپا۔

"ہائے مر گیا۔ اس میں ایک اے کم تھا جی۔" میں نے کہا۔ "آپ ارشد علی لکھ لیں۔ ورنہ وہ بھی آغا اور الٰہ آبادی تھا۔"

"سکنہ؟" اے ایس آئی کے بجائے حوالدار نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ "قوم اور ذات؟"

"کیا جی؟" میں نے بے وقوفوں کی طرح کہا۔ "ہائے... اُف...۔" میں نے اپنا واویلا جاری رکھا۔

"اوئے رہتا کہاں ہے؟" اے ایس آئی نے پھر مجھے لات ماری۔ میں نے چیخ مار کے مزید شور مچایا۔

"کہیں نہیں جناب۔ اف۔ میں مر گیا تھانیدار صاحب۔" میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ "مجھے اسپتال بھجوادیں۔"

"اسپتال؟" تھانیدار نے اٹھ کر مجھے ٹھوکریں مارنی شروع کیں۔ "تجھے ہم قبرستان پہنچائیں گے پھانسی کے بعد۔" بہت سی گالیوں کے بعد اس نے مجھ سے باقی سوالات کیے۔ مجھے حالات امید افزا نظر آنے لگے تھے۔ وہ میری بات مان رہے تھے اور یہ چاہتے تھے کہ میرا اعترافِ جرم جلد سے جلد مکمل ہو جائے تو وہ میرے دستخط لیں اور دُہرے قتل کی اس واردات کے مجرم کو گرفتار کر لینے کے بعد عدالت میں پیش کر دیں۔ اس میں انھیں کوئی اُلجھن یا پیچیدگی نظر نہیں آ رہی تھی۔ ایسا ہوتا ہی رہتا تھا۔ گاؤں میں بھی اور شہروں میں بھی کہ غیرت مند شوہر بیوی اور اس کے آشنا کو قتل کر کے تھانے میں حاضر ہو جاتے تھے لیکن اس کارنامے کا سہرا تھانے کا عملہ اپنے سر باندھنا چاہتا تھا کہ اتنے کم وقت میں چالان مکمل کر لیا۔ ورنہ بیشتر صورتوں میں وہ کامیاب ہوتے تھے تو مخبروں کی مدد سے یا مشتبہ افراد پر تیرہ نمبر جوتے کی مشق سے۔ سراغ رسانی یہاں صرف قصے کہانیوں تک محدود تھی۔ خود پولیس کو اعتراف تھا کہ چوری، ڈکیتی اور قتل جیسی واردات کر کے ہاتھ نہ آنے والے مجرموں کا تناسب بڑھتا جا رہا ہے اور برسوں پرانے مقدمات کی فائلیں سرد خانے میں ڈھیر ہو رہی ہیں۔

میں نے بے ربط الفاظ میں جو کہانی سنائی اس کا خلاصہ یہ تھا کہ میں اپنی بیوی اللہ رکھی کے ساتھ ناجائز طور پر ہندوستان سے پاکستان پہنچا تھا۔ سرحد پر گرفتاری کے بعد ہم اپنا سب کچھ دے کر نکلنے میں کامیاب ہوئے۔ لاہور پہنچے تو جیب میں ایک پیسہ نہیں تھا اور رہنے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ دن میں چھوٹا موٹا کام تلاش کرتے۔ کوٹھیوں میں ملازمت مل سکتی تھی بشرطیکہ ہم کوئی حوالہ پیش کر سکتے یا ضامن فراہم کر سکتے لیکن ہمیں تو کوئی جانتا ہی نہیں تھا۔ کئی جگہ صاحب لوگوں کو ایسی عورت کی ضرورت بھی تھی جو کچن کا سارا کام سنبھال سکے اور مالی یا ڈرائیور کی جگہ بھی خالی تھی لیکن وہ سب پیسے والے لوگ تھے جن کو ہر اجنبی چور نظر آتا تھا۔ یوں گھومتے پھرتے کہیں نہ کہیں سے پیٹ بھر کھانا بہرحال مل جاتا تھا۔ بیگمات ہم پر ترس کھا کے مدد بھی کر دیتی تھیں لیکن صاحب کی اجازت کے بغیر گھر میں جگہ دینے پر تیار نہ ہوتی تھیں۔ سب صاحب ضرورت سے زیادہ ہوشیار ثابت ہوتے تھے۔ اسی چکر میں لاہور کا ایک بدمعاش ہمارے پیچھے لگ گیا۔ اس نے یہ بھی معلوم کر لیا کہ ہم ناجائز طور پر پاکستان میں داخل ہوئے ہیں۔ وہ کوئی دلّال یا بردہ فروش تھا جو اللہ رکھی کو ہتھیانا چاہتا تھا۔ میں اسے ساتھ لے کر راولپنڈی والی گاڑی میں بیٹھ گیا لیکن بدمعاش بھی ہمارے ساتھ سائے کی طرح رہا۔ ٹرین میں اس نے مجھے پیچھے سے دھکا دیا۔ رات کا وقت تھا لیکن اللہ رکھی نے اسے دیکھ لیا۔ اس نے زنجیر کھینچی تو وہ بھاگ گیا۔ میں دو ہفتے اسپتال میں رہا۔ وزیر آباد کے سرکاری اسپتال میں۔ پھر پنڈی آ گیا۔ یہاں بھی لاہور والا مسئلہ تھا یعنی نوکری کا اور سر چھپانے کی جگہ کا۔ ایک دن اس بدمعاش نے ہمیں دیکھ لیا اور ہمیں باتوں میں لگا کے ایک گھر میں لے گیا۔ اس نے کہا تھا کہ نوکری بھی ملے گی اور رہنے کی جگہ بھی۔

"اور تم بے وقوف۔ تم نے اسی پر اعتبار کر لیا جس نے تمھیں دھکا دیا تھا چلتی گاڑی سے؟" انسپکٹر نے افسوس سے مجھے دیکھا۔ "اور جو تمھاری بیوی کو اغوا کرنا چاہتا تھا۔"

"اس نے قسم کھائی تھی حضور۔" میں نے کہا۔ "کہ اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں اور مجھے غلط فہمی ہوئی ہے اور وہ ایک شریف آدمی ہے۔ صرف ہماری مدد کرنا چاہتا ہے۔ جو قسم پر بھی اعتبار نہ کرے وہ کافر ہو جاتا ہے۔ میں اور اللہ رکھی اس کے ساتھ آ گئے۔"

"کافر ہو جاتا ہے۔" انسپکٹر نے طنز سے کہا۔ "کیسے کیسے نمونے پڑے ہیں دنیا میں۔ عقل سے پیدل۔ اوئے کھوتے۔ تو نے اس اُلو کے پٹھے سے یہ نہیں پوچھا کہ آخر وہ کیوں مدد کرنا چاہتا ہے۔" اسے اب مجھ سے تھوڑی سی ہمدردی بھی ہونے لگی تھی کیونکہ اس کے خیال میں مجھ سے بڑا احمق کوئی نہیں تھا۔

"یہاں آتے ہی اس نے ریوالور نکال لیا حضور۔ اور ہمیں تہ خانے میں لے گیا۔" میں نے کہا۔ "میں نے قتل کر دیا۔"

"کیسے قتل کر دیا؟" انسپکٹر بولا۔ "کیا ہوا تھا تہ خانے میں؟ پوری بات بتاؤ۔"

"بس جناب اس نے اللہ رکھی پر دست درازی کی۔ میں ہندوستان سے ایک خنجر لایا تھا۔" میں نے کہا۔ "جو میری ڈب میں تھا۔ میں نے اسی سے مار ڈالا اس بدمعاش کو۔"

"لیکن پھر اس عورت اللہ رکھی کو قتل کرنے کی کیا ضرورت تھی؟" انسپکٹر نے مشکوک لہجے میں کہا۔ "اس نے تو کچھ نہیں کیا تھا۔ تم اسے لے کر فرار کیوں نہیں ہوئے؟"

"آپ کو کیا معلوم جناب عالی۔" میں نے رِقّت آمیز لہجے میں کہا۔ "وہ تو پہلے سے بھاگنے کو تیار بیٹھی تھی۔ میرے ساتھ دھکّے کھاتے کھاتے تنگ آ گئی تھی۔ کہتی تھی کب تک ایسے بھیک کے ٹکڑوں پر گزارا ہوگا۔ رہنے کو جھونپڑا تک نصیب نہیں۔ مجھے نکھٹو اور بے غیرت کہتی تھی۔ کہتی تھی، مزدوری کرو۔ ریلوے اسٹیشن پر جا کے قلی ہو جاؤ۔ میں نے کوشش کی تھی حضور مگر وہاں ٹھیکیدار نے مجھے بھگا دیا۔ اس تہ خانے میں اپنے سامنے ریوالور دیکھ کر وہ سب کچھ بھول گئی۔ یہ بھی بھول گئی کہ میں اس کا گھر والا ہوں۔ اس کے ساتھ میرا نکاح ہوا ہے اور اس کو دکھ میں بھی میرا ساتھ دینا چاہیے۔ میرے ساتھ مرنا پڑے تو مر جانا چاہیے۔ وہ تو فوراً اس کی طرف ہو گئی۔ اس سے کہنے لگی کہ گولی مارو اسے اور مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ اس کے ساتھ تو میں فاقے کرتی مر جاؤں گی۔ وہ خبیث کہنے لگا کہ میں تجھے رانی بنا کے رکھوں گا۔ عیش کراؤں گا۔ بس اسی وقت مجھے موقع مل گیا۔ میں نے اس کو مارنے کے بعد اسی کے ریوالور سے گولی چلائی اور اس بے وفا عورت کو بھی مار دیا۔ وہ میرا ساتھ چھوڑنے کا فیصلہ تو کر ہی چکی تھی۔ وہ قتل کی چشم دید گواہ بن جاتی اور جب مجھے پھانسی ہو جاتی تو اسے آزادی مل جاتی، موج کرنے کے لیے۔"

"کیا تمھاری بیوی زیرِ حراست تھی؟" سب انسپکٹر نے کہا۔ "اس نے وردی پہن رکھی تھی۔"

"وہ چوری کی تھی جناب۔" میں نے شرمندگی سے کہا۔ "اس کے تن پر کپڑوں کا ایک ہی جوڑا تھا۔ وہ کب تک ساتھ دیتا۔ ایک رات ہم نے اسپتال سے چوری کیا تھا۔ وزیر آباد میں۔"

بیان اس کی مرضی کے مطابق تھا اور بظاہر اس میں کوئی خامی نہیں تھی لیکن یہ پہلا بیان تھا۔ اس میں بہت سی باتیں تصدیق طلب تھیں۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ وزیر آباد کے سرکاری اسپتال سے ہمارے متعلق ضرور معلوم کریں گے۔ ممکن ہے ریلوے والوں سے بھی پوچھیں اور مقتول کے متعلق لاہور کی پولیس سے دریافت کریں۔ اس بات کا اندیشہ بہرحال نہیں تھا کہ وہ لاہور یا پنڈی میں ہمارے کسی آشنا کو تلاش کریں۔ میری کہانی کے مطابق تو پاکستان میں ہمارا کوئی جاننے والا نہیں تھا۔ ہمارا وکیل کون ہوگا اور ضامن کون؟ یہ بعد کی بات تھی۔

"اس بیان پر دستخط کرو گے یا انگوٹھا لگاؤ گے؟" انسپکٹر نے کہا۔ "بیان عدالت میں بھی یہی دینا چاہیے ورنہ یا در کھنا کھال میں بھس بھروا کے واپس ہندوستان بھیج دوں گا۔ کس شہر سے آئے تھے تم دونوں؟"

دو گھنٹے سے میرا بیان لیا جا رہا تھا اور اس عرصے میں صرف ایک بار چائے والا اندر آیا تھا۔ چنانچہ حالات خاصے سازگار تھے۔

"بریلی سے حضور۔" میں نے کہا۔ "دستخط کہاں کروں؟" میں نے محسوس کیا کہ وقت آ گیا ہے اور اگر میں نے اس وقت کچھ نہ کیا تو پھر کبھی مجھے کچھ کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔ حوالدار پہلے ہی میز کے نیچے ٹانگیں پھیلائے کرسی پر بیٹھا تھا۔ انسپکٹر نے تھوڑا سا جھک کر مجھے بتانا چاہا کہ بیان کے نیچے مجھے کس جگہ اپنے دستخط کرنے ہیں۔ دراصل وہ چاہتا تھا کہ میں کچھ خالی جگہ چھوڑ کے دستخط کروں تاکہ بعد میں وہ بیان کو بڑھانا چاہیں تو اس کے لیے گنجائش ہو۔ اسے یہ اندیشہ ہوگا کہ کہیں میں آخری سطر کو دستخط سے نہ ملا دوں چنانچہ اس نے کاغذ پر ایک جگہ انگلی رکھ دی۔ میرا دل آخری بار اس خیال سے دھڑکا کہ عین وقت پر یا میرے پروگرام پر عمل درآمد سے قبل کوئی آ گیا تو میرا حشر کیا ہوگا لیکن یہ خطرہ ٹالا نہیں جا سکتا تھا۔ اس جُوئے میں ہار جیت کے امکانات برابر تھے۔ جیت کا مطلب تھا، اس دُہرے قتل کے جھوٹے الزام سے چھٹکارا۔ ایک بار یہاں سے نکل جانے کے بعد میں محفوظ تھا۔ اسلام آباد اور لاہور میں میری بے گناہی کے گواہ بہت تھے۔ خدانخواستہ پولیس مجھے پھر پکڑنے میں کامیاب ہو جاتی تو انھیں سخت خفت اٹھا کے لوٹنا پڑتا۔

اس جوئے میں بازی ہارنے کا مطلب صرف سزائے موت تھا۔

پلک جھپکتے میں میرا بایاں ہاتھ حرکت میں آیا اور کھڑی ہتھیلی کا بھرپور وار انسپکٹر کی گردن سے ذرا نیچے شانے پر پڑا۔ وہی ہاتھ سیدھا آگے گیا اور حوالدار اونگھتے خاں کے نرخرے پر لگا۔ حوالدار کا تو سانس ذراسی دیر کے لیے رک گیا۔ اس نے بے اختیار منہ کھولا لیکن چلّانے کے لیے نہیں، ہوا کے لیے۔ لیکن ضرب اتنی شدید تھی کہ وہ دوسرا سانس نہ لے سکا اور وہیں کرسی پر ڈھیر ہوگیا۔ انسپکٹر لڑکھڑا کے آگے جھکا اور اس کا سر میز پر لگا۔ اس کے حلق سے عجیب سی آواز نکلی۔ وہ کراہتے ہوئے کسی کو پکارنا چاہتا تھا لیکن میں نے اس کا سر میز کے کونے پر اس طرح مارا کہ چوٹ کنپٹی پر آئی۔ وہ بے سدھ ہو کے کرسی سے گرا تو کرسی کے گرنے سے تھوڑی سی آواز پیدا ہوئی۔ یہ آواز کسی کو بھی متوجہ کرسکتی تھی۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر سب انسپکٹر کا ریوالور قبضے میں کیا اور دروازے کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔ اگر کوئی شامت کا مارا اندر آجاتا تو مجموعی صورتِ حال کو سمجھنے سے پہلے ہی ریوالور کا بٹ اس کے سر پر پڑ جاتا اور وہ خود بھی لمبا لیٹ جاتا۔

ایک منٹ انتظار کرنے کے بعد میں نے دروازے کو اندر سے بند کیا اور اپنے کام میں لگ گیا۔ کمرے کے ساتھ ایک چھوٹا سا بیت الخلا قسم کا باتھ روم تھا جس میں صرف دو بالٹیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک کو قیدی اور زیرِ تفتیش مجرم نظامِ اخراج کی ضروریات پوری کرنے کے لیے استعمال کرسکتے تھے اور کرتے رہے تھے۔ چنانچہ اس کی بدبو سے وہ کمرہ متعفن ہو رہا تھا۔ ایک رات میں بھی تھانے میں تفتیش کے پُرتشدد اور انسانیت سوز طریقوں کا شکار ہوا تھا۔ وہاں بھی ایسی ہی بالٹیاں تھیں۔ گندی بالٹی میں ان کی غلاظت بھی سمیٹی جاتی تھی جو وحشیانہ جسمانی اذیت کی تاب نہ لاتے ہوئے گندگی اور آلائش پھیلاتے تھے۔ الٹیاں کرتے تھے یا خون اگلنے لگتے تھے۔ دوسری بالٹی میں پانی تھا۔ پینے کے لیے، غلاظت صاف کرنے کے لیے، بے ہوش ہو جانے والوں کو ہوش میں لانے کے لیے یا کسی ضدی مجرم کا سر ڈبو کے اس کی زبان کھلوانے کے لیے۔ تھانے میں گزری ہوئی اس بھیانک رات کی یاد سے مجھے جھرجھری آگئی۔

میں نے جلدی جلدی بالٹی کے پانی سے ہاتھ صاف کیے اپنے کپڑے اتار کے چہرے اور جسم پر گیلا کپڑا پھیرا اور خون کے داغ رگڑے۔ پھر میں دروازہ بند کرکے بڑے کمرے میں آیا۔ سب انسپکٹر تقریباً میرے سائز کا تھا۔ پانچ منٹ میں اس کی وردی اتار کے میں نے اپنے جسم پر چڑھالی۔ اس وقت مجھے اپنے ایک ہاتھ اور پاؤں میں کسی قسم کی تکلیف کا احساس ہی نہیں ہوا۔ میرا ذہن سر پر منڈلانے والے خطرے سے نبرد آزما تھا۔ سب انسپکٹر کے جوتے پہننے میں بھی مجھے پانچ منٹ ہی لگے۔ اس کی ٹوپی سر پر لگا کے میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ خود کو آئینے میں دیکھوں کہ میں اپنا بھیس بدلنے میں کس حد تک کامیاب رہا۔ میرے چہرے پر کوئی لہو کا داغ تو نہیں ہے جو نمایاں ہو کے پکارنے لگے کہ دوڑو، پکڑو، مجرم فرار ہو رہا ہے۔ وردی مجھے چھوٹی بڑی تو نہیں ہے اور فرق اتنا واضح تو نہیں ہے کہ جو دیکھے وہ ایک نظر میں پہچان لے۔ لیکن وہاں آئینہ کہاں تھا۔ ہر طرف نصف شب کا ہولناک سناٹا تھا۔

میرے پاؤں پر بندھی ہوئی پٹی تو پتلون کے نیچے آگئی تھی لیکن دائیں ہاتھ کی پٹی وردی کی آدھی آستین سے باہر تھی اور یہ انتہائی نمایاں خطرہ تھا۔ کوئی بھی پولیس مین یا افسر مجھے دیکھتے ہی شک میں مبتلا ہوسکتا تھا۔ کیونکہ ان میں سے کسی کا ہاتھ زخمی نہیں تھا۔ سب انسپکٹر کی جیب سے چابیوں کے ساتھ چھوٹا سا ناخن تراش اور اسی کے برابر جیبی چاقو بھی نکلا تھا۔ میں نے ڈیڑھ انچ کے بلیڈ جیسی دھار والے چاقو سے پٹی کو ایک جگہ سے کاٹا اور کھولنے لگا۔ پوری پٹی ہٹانے کے بعد مجھے اپنا سوجا ہوا بازو دکھائی دیا۔ یہ صرف ہڈی پر ضرب کا اثر تھا۔ ہڈی میں فریکچر نہیں تھا۔ چلتے چلتے میں نے سب انسپکٹر کی گھڑی اتار کے اپنے بائیں ہاتھ کی کلائی میں پہنی۔ پھر حوالدار کی جیبوں کی تلاشی لی۔ اس میں سے سات سو بیس روپے نکلے۔ میں نے یہ بھی اپنی جیب میں منتقل کیے۔ ابھی میں نے سب انسپکٹر کی کوئی جیب ٹٹول کر نہیں دیکھی تھی لیکن میرا خیال تھا کہ حوالدار اونگھتے خاں جیب میں اپنی ماہانہ آمدنی سے دُگنی رقم لیے پھر رہے تھے تو انسپکٹر کے پاس بھی ہزاروں ضرور ہوں گے۔ وہ بہرحال افسر تھا۔ انسپکٹر کے رومال سے میں نے ہر اس جگہ کو صاف کردیا، جہاں مجھے اپنے فنگر پرنٹ کا شبہ ہوا پھر ریوالور ہاتھ میں لے کر میں نے اس کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور باہر جھانکا۔ راہداری میں کوئی نہیں تھا لیکن دوسری طرف سے ان آوازوں کا شور سنائی دے رہا تھا جو تھانے کی پہچان ہوتی ہیں۔ تھانہ ہی کیا ہر مقام آوازوں کی وجہ سے پہچان رکھتا ہے۔ ہر قسم کے جانوروں اور پرندوں کی آوازوں سے گونجتا جنگل۔ ہر طرح کی ٹریفک کے شور سے معمور شہر۔ ہر قسم کی مشینوں کی گڑگڑاہٹ سے بھرپور کارخانہ۔ طیاروں کی گھن گرج اور بم کے دھماکوں سے لرزتا محاذِ جنگ۔ سناٹے کی بازگشت کو دُہراتے برف پوش کوہسار۔ باہر نکلنے سے پہلے میں نے وہ بیان سمیٹ کر جیب میں رکھ لیا جس پر مجھے

دستخط کرنے تھے۔ میں نے آہستہ سے اپنے پیچھے دروازہ بند کیا اور مخالف سمت میں چلنے لگا۔ تھانے کی عمارت میں کسی عقبی دروازے کا ملنا یقینی تھا۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ اتنی بڑی عمارت میں آنے جانے کا ایک ہی راستہ ہو۔ چند قدم چلنے کے بعد مجھے ایک کمرے کا کھلا دروازہ نظر آیا۔ یہ کمرہ نہیں خاصا بڑا ہال تھا جس میں دونوں جانب دیوار کے ساتھ ساتھ چارپائیوں کی قطار تھی۔ ہر قطار میں تین چارپائیاں تھیں۔ ہر چارپائی کے بعد لکڑی یا ٹین کا ایک باکس رکھا تھا۔ یا میز تھی جس پر تیل، کنگھے اور ٹوتھ پیسٹ قسم کی اشیا رکھی تھیں۔ جہاں میز نہیں تھی وہاں سرہانے کی جانب دیوار پر شیلف سا بنا لیا گیا تھا۔ تین چارپائیاں بالکل خالی تھیں۔ دو پر وہ لمبی تان کے سو رہے تھے جو ڈیوٹی پر نہیں تھے۔ سر تک چادر لپیٹے، بالکل سیدھے لیٹے وہ لاش نظر آتے تھے۔ صرف ایک شخص بنیان، دھوتی باندھے سیدھا بیٹھا نسوار کی ڈبیا کے آئینے میں دیکھ دیکھ کر اپنی مونچھیں کتر رہا تھا۔ اگر وہ اس کام میں منہمک نہ ہوتا تو کسی افسر کو جوانوں کی رہائشی بیرک سے گزرتا دیکھ کے ضرور چونکتا لیکن اس نے مجھے ذرا دیر سے دیکھا۔ ہڑبڑا کے کھڑا ہوا اور پھر بیٹھ گیا کیونکہ سلیوٹ کرنے کا وقت گزر چکا تھا۔ چالیس واٹ کے بلب کی مدھم روشنی میں وہ میرا چہرہ صاف طور پر دیکھ ہی نہ سکا۔

میں نے اطمینان کی گہری سانس لی اور سیدھا بیرک کے دوسرے دروازے سے باہر آگیا۔ چند قدم کے فاصلے پر ایک قطار میں چار غسلخانے بنے ہوئے تھے۔ ان کے پیچھے بائیں جانب ایک اور دو کمروں والے چھوٹے چھوٹے رہائشی فلیٹوں کی سہ منزلہ عمارات کے تین بلاک تھے جن میں پولیس کے لوگ اپنی فیملی کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔ دائیں طرف احاطے کی دیوار تھی، اس میں دروازہ کوئی نہیں تھا لیکن فلیٹ میں رہنے والوں نے اپنی سہولت کے لیے دیوار کے ایک حصّے میں شگاف ڈال دیا تھا جو اتنا بڑھ گیا تھا کہ اس میں سے سر جھکا کر گزرا جاسکتا تھا اور تھانے کا چکر لگا کے نہیں جانا پڑتا تھا۔ میں بھی کسی دشواری کے بغیر اسی سے گزرا۔ میرے ساتھ ہی ایک نوجوان لڑکے نے اندر آنے کی کوشش کی۔ تصادم میں اس کے ہاتھ سے کتابیں گر گئیں اور میرے سر سے ٹوپی۔ غیرارادی طور پر میرے منہ سے "معاف کرنا بھائی" نکل گیا جو بڑی غلط بات تھی۔ کوئی پولیس کا تھانیدار ایسے شائستہ اور نرم لہجے میں ایک نوجوان سے معافی نہیں مانگ سکتا۔ اگر اس کے بجائے میں گالی دے کر کہتا کہ "اندھا ہے الّو کے پٹھے" تو لڑکا بالکل برا نہ مانتا اور حیران بھی نہ ہوتا۔ جب میں نے ٹوپی سر پر رکھی تو مجھے احساس ہوا کہ وہ کتابیں سمیٹنے کے بجائے غور سے میری صورت کو تک رہا ہے پھر اس کی نگاہ میری وردی کی جیب پر گئی جس پر نیلے پلاسٹک کی پٹی لگی ہوئی تھی اور پٹی پر اس افسر کا نام سفید حروف میں لکھا ہوا تھا جس کی یہ وردی تھی۔

"کون ہو تم؟" لڑکا ایک دم کھڑا ہوگیا۔ وہ یقیناً وہیں رہتا تھا۔ چنانچہ تھانے کے افسروں کو پہچانتا تھا۔

"تمھیں کیا نظر آتا ہوں میں؟" میں نے لہجہ بدل کے سخت الفاظ میں کہا۔ "شیشم کا درخت؟" لیکن میرے جواب اور لہجے نے نوجوان کو مطمئن نہیں کیا۔ وہ سترہ اٹھارہ سال کا لڑکا تھا، کوئی دودھ پیتا بچّہ نہیں جو کہیں سے پڑھ کے لوٹ رہا تھا۔

"یہ وردی تمھاری نہیں ہے؟" وہ کتابیں چھوڑ کے چلاتا ہوا بھاگا۔ اگر میں اس کے پیچھے دوڑتا تو اسے پچاس گز طے کرنے کے بعد پکڑ سکتا تھا اور خاموش بھی کرسکتا تھا لیکن پچاس گز دشمن کی سرحد کے اندر ہوتے۔ نوجوان کی چیخ پکار پر تھانے والوں کا متوجہ ہونا لازمی تھا۔ اس کے بعد میرا واپس پچاس گز دوڑ کر آنا اور فرار ہونا بہت مشکل ہو جاتا۔ میں نے غوطہ مار کے باہر نکل جانا بہتر سمجھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ باہر نکلنے کے بعد کیا ہوگا۔ مجھے فوراً کوئی سواری ملے گی یا نہیں۔ گلی ہوگی تو سڑک کس سمت ہوگی اور سڑک ہوئی تو مجھے کہاں لے جائے گی۔ تھانیدار کی وردی پہن کے بازار میں دوڑ لگانا تھانیدار کی شان نہیں۔ یہ منظر پبلک نے کبھی نہیں دیکھا۔ خواہ مجرم فرار ہو رہا ہو۔ اکثر تھانیدار بارِ شکم کے باعث اس قابل نہیں ہوتے کہ ایک فرلانگ بھی بھاگ سکیں۔ نوجوان اور پھرتیلے مجرم فرار ہو جاتے ہیں اور تھانیدار ایک آدھ ہوائی فائر کرکے ماتحت کی نااہلی پر گرجتے برستے لوٹ آتے ہیں۔ میں تو اپنی ایک ٹانگ کے جزوی طور پر ناکارہ ہونے کے سبب سیدھا بھی بڑی مشکل سے چل رہا تھا اور اب مجھے سخت پریشانی لاحق ہوگئی تھی۔ دور کہیں سے کسی کلاک نے ایک گھنٹا بجایا۔

میرے اور تعاقب میں روانہ ہونے والوں کے درمیان تقریباً دو سو گز حائل تھے۔ جو دس منٹ کا فاصلہ بھی نہ تھا۔ دُبلے پتلے سپاہی شکاری کتوں کی طرح دوڑتے ہوئے آتے تو میں چند قدم بھی نہ چل پاتا کہ پکڑ لیا جاتا۔ مجھ پر تشدد تو ہوا تھا لیکن بہت کم۔ صرف اس لیے کہ میں پولیس کے ساتھ تعاون کر رہا تھا اور ان کے لیے کیس میں کسی قسم کی الجھن پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ لیکن فرار کی کوشش تو ان سب کا خانہ خراب کرنے کے مترادف تھی۔ وہ نااہل قرار پاتے، لائن حاضر کیے جاتے یا معطل ہو جاتے۔ چنانچہ میں دوسری بار گرفتار ہوتا تو ان سب کی

انتقامی کارروائی کا نشانہ بنتا اور وہ میرے جسم پر تشدد کے وہ سب طریقے آزماتے جو برسوں کے تجربے کا حاصل ہوتے اور جن کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ بڑے بڑے سورما ان اذیت گاہوں میں محض شک کی بنیاد پر لائے گئے اور عبرتناک موت سے دوچار ہوئے، ان کی لاشیں سڑکوں پر ڈال دی گئیں اور جب ان پر سے گاڑیاں گزر گئیں تو یہ حادثاتی موت کہلائی۔ تشدد سے ہلاک ہونے والوں کے بارے میں کہا گیا کہ انھوں نے خودکشی کر لی۔ اخبارات نے یا لواحقین نے واویلا کیا تو تحقیقات کی رسمی کارروائی بھی ہوئی لیکن اس کے بعد کچھ نہ ہوا۔

میں گھبراہٹ کا شکار ہونے لگا تھا۔ میری ساری جدوجہد ایک غیر متوقع اور معمولی سے واقعے کے باعث ناکامی بن رہی تھی۔ اسی کو کہتے ہیں تدبیر کند بندہ، تقدیر کند خندہ۔ قسمت نے ساتھ دیا ہوتا تو وہ ریوالور واپس پیڈرو کے ہاتھ میں کیوں پہنچتا جو میں نے ہر طرف سے محصور ہونے کے باوجود دشمنوں سے چھین لیا تھا۔ اس وقت بھی میرے پاس بھرا ہوا ریوالور تھا لیکن میں بازار سے فائرنگ کرتا ہوا فرار نہیں ہو سکتا تھا اور پیچھے آنے والوں کو بے دریغ گولی نہیں مار سکتا تھا۔ البتہ وہ مجھے دور سے ہی نشانہ بنا سکتے تھے اور کتے کی موت مار کے سرخرو ہو سکتے تھے کہ انھوں نے ایک قاتل کے فرار کی کوشش کو ناکام بنا دیا۔ ابھی تک دیوار کے شگاف سے کوئی نہیں نکلا تھا لیکن مجھے کوئی رکشا یا ٹیکسی بھی نظر نہیں آئی تھی۔ یہ رہائشی علاقہ تھا جہاں گنتی کی چند دکانیں تھیں۔ پیچھے سے ایک پرائیویٹ کار آئی مگر اس میں کسی کی پوری فیملی بھری ہوئی تھی۔ میں چلتا گیا اور پلٹ پلٹ کے دیکھتا رہا۔ ایک اسکوٹر والا میرے اشارے کی پروا کیے بغیر گزر گیا پھر دوسری کار ایک کوٹھی میں سے نکلی۔ میں نے اسے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ کار رک گئی۔

”میں صدر تک جا رہا ہوں۔“ کار کے ادھیڑ عمر مالک نے کھڑکی سے سر نکال کے کہا۔

”مجھے بھی صدر ہی جانا تھا۔“ میں نے اس کے ساتھ بیٹھتے ہوئے کہا اور اپنی پتلون کا پائنچہ اٹھا کے اسے پٹیاں دکھائیں۔ ”میں کافی دیر سے پیدل چل رہا تھا۔ کوئی رکشا ٹیکسی نہیں ملی۔ پیر میں بہت تکلیف ہے۔“

کار کے مالک نے سر ہلا کے افسوس کا اظہار کیا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔ ”کیا ہوا تھا؟“ وہ بولا۔

لیکن میں سامنے ذرا اوپر لگے ہوئے شیشے میں پیچھے کا منظر دیکھ رہا تھا۔ تھانے کی دیوار کے شگاف سے بہت سے وردی والے نکل آئے تھے۔ میں نے کھڑکی سے سر نکال کے پیچھے جھانکا۔ وہ سب بے بسی سے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے اور ہاتھ اٹھا اٹھا کے چلا رہے تھے اور مجرم کی کار کو اپنی دسترس سے دور جاتا دیکھ رہے تھے۔ شاید اس وقت تھانے میں کسی کی موٹر سائیکل یا پکڑی ہوئی گاڑی تک نہ تھی۔ ورنہ وہ پیچھا ضرور کرتے۔ اب میری طرح ان کو بھی کسی سواری کا انتظار تھا جو فوری طور پر دستیاب نہیں تھی۔ یہ چند منٹ کی مہلت مجھے غالباً اس لیے مل گئی تھی کہ وہ پہلے اس سب انسپکٹر کی خیریت معلوم کرنے لپکے ہوں گے جو میرا بیان لے رہا تھا تاکہ نوجوان کے شکوک کی تصدیق ہو جائے پھر انھوں نے دیکھا ہو گا کہ بے وردی سب انسپکٹر بے جان تو نہیں ہے اور حوالدار اونگھتے خاں کو ہمیشہ کی نیند تو نہیں سلا دیا گیا ہے۔

اپنی کامیابی نے مجھے بے پناہ مسرت عطا کی اور میرا حوصلہ ہمالیہ پہاڑ سے بھی بلند تر ہو گیا۔ یہ میری بہت بڑی فتح تھی۔ دشمنوں نے مجھے دہرے قتل کے جھوٹے الزام میں ملوث کرنے کی پوری کوشش کی تھی اور وہ ابھی تک مطمئن ہوں گے کہ اس کوشش میں کامیاب ہے ایک شکاری دوسرے شکاری کو مبارک باد دے رہا ہو گا کہ اس بار سکندر بخت ایسا پھنسا ہے کہ نہ اسے چالاکی بچا سکے گی نہ وکیلوں کی مدد۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ سازش ناکام رہی۔ کسی کو میری گرفتاری کی خبر تک نہ ہوئی اور میں جھوٹ، مکر و فریب اور شیطانی حربوں کے جال سے صاف بچ کر نکل آیا۔ قانون مجھے بے گناہ تسلیم کر کے باعزت طور پر رہا کرتا تو برسوں بعد۔ بہت اذیت برداشت کرنے اور بہت خوار ہونے کے بعد۔

”میں نے پوچھا تھا کہ اس ٹانگ کو کیا ہوا ہے؟“ کار کے مالک نے کہا۔ ”تم پیچھے کیا دیکھ رہے ہو؟“

”کچھ نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”میں اپنی نظر ہمیشہ آگے رکھتا ہوں لیکن بقولِ شاعر، کبھی گزری ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو۔“

گاڑی اب ایک کم آباد سڑک پر سے گزر رہی تھی۔ ”آپ نے کیا نام بتایا تھا اپنا؟“

”نام نہ تم نے پوچھا تھا اور نہ میں نے بتایا تھا۔“ وہ ناگواری سے بولا۔ ”ویسے مجھے غلام کہتے ہیں۔“

”صرف غلام؟“ میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ ”اسی لیے آپ ہر ایک کی مان لیتے ہیں۔ مثلاً میرے لیے گاڑی روک لی تھی آپ نے اور ابھی میں آپ سے کہوں گا کہ گاڑی روک کے چابیاں میرے حوالے کر دیں تو یہ بات بھی مان لیں گے آپ۔“

”لاحول ولا قوۃ۔ میں ایسی فضول بات کیوں مانوں گا۔“ وہ برا مان کے بولا۔

”اس لیے کہ ہم دونوں کا بھلا اسی میں ہے۔“ میں نے ریوالور نکال کے کہا۔ ”گاڑی روک لیجیے غلام صاحب۔“

اس کا رنگ ریوالور دیکھ کے فق ہو گیا تھا۔ اس نے گاڑی روک دی۔ ”یہ... یہ صلہ ہے شرافت کا؟ اگر کوئی قانون پسند شہری پولیس کی مدد کرتا ہے تو... تو پولیس یہ کرتی ہے اس کے ساتھ؟“ وہ بولا۔

”پولیس جو کچھ کرتی ہے اس سے مجھے کوئی غرض نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”اب آپ یہاں اتر جائیں اور سیدھے چلنے لگیں. پولیس کو رپورٹ کرنے کے چکر میں مت پڑیں۔ آپ کو کار واپس لینی مشکل ہو جائے گی اور بہت الٹے چکر میں پھنس جائیں گے آپ. میں اپنے محسن کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کرنا چاہتا۔ آپ کی گاڑی اسی سڑک پر ایک میل آگے کھڑی ہو گی۔“

”مجھے شک ہے کہ تم پولیس کے بھیس میں چور ڈاکو ہو۔“ اس نے دروازے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

”چور ڈاکو نہیں جناب. مفرور چور ڈاکو۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن یہ میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ آپ شور ہنگامہ نہ کریں اور پولیس میں رپورٹ کا خیال بھی دل میں نہ لائیں۔ عین ممکن ہے وہ آپ کو بھی دھر لیں کہ آپ نے ایک مجرم کو فرار ہونے میں مدد دی اور آپ اس کے ساتھی ہیں۔ آپ گاڑی لیے تھانے کے باہر موجود تھے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ نہ میں چور ڈاکو ہوں، نہ آپ میرے ساتھی ہیں لیکن پولیس کی سمجھ کا کیا علاج. ایک میل زیادہ نہیں ہوتا۔ آپ اطمینان سے چلتے ہوئے بھی بیس منٹ میں پہنچ جائیں گے۔ اس کے بعد مجھ سے ملاقات کو بھول جائیے۔ ایسا کوئی واقعہ سرے سے پیش ہی نہیں آیا۔ آپ بیس منٹ دیر سے پہنچنے کی کوئی بھی معقول وجہ پیش کر سکتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ آپ کا ٹائر فلیٹ ہو گیا تھا۔ چابی گلوز کمپارٹمنٹ میں ہو گی۔“ گاڑی کی گھڑی رات کے دو بجا رہی تھی۔ وہ مجھے بڑی عجیب سی نظروں سے دیکھتا ہوا نیچے اترا۔ ”خدا حافظ۔“ میں نے ہاتھ ہلا کے کہا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔ جب میں نے دیکھا تو وہ اطمینان سے مارچ کرتا ہوا روانہ ہو چکا تھا۔ ایک میل سے کچھ آگے جا کے میں نے کار کو سڑک کے کنارے صحیح جگہ پارک کیا۔ انجن بند کر کے چابی گلوز کمپارٹمنٹ میں ڈالی اور دروازہ بند کر کے نیچے اتر آیا۔ چند منٹ اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد میں نے ایک سائڈ اسٹریٹ میں چلنا شروع کیا۔ میری کامیابی پر اب مہرِ تصدیق لگ گئی تھی۔ اس عقیدے پر میرا اعتقاد اور راسخ ہو گیا تھا کہ مارنے والے سے بچانے والا ہاتھ ہمیشہ زبردست رہا ہے اور رہے گا اور اس کے ہاں دیر ہے مگر اندھیر نہیں ہے۔ بالآخر میں پھر آزاد ہو گیا تھا اور وہ شکاری جنھوں نے مجھے زیرِ دام لانے کے لیے بہت مضبوط جال پھیلایا تھا پھر اپنی ناکامی پر نوحہ خواں تھے۔ کتنے اعتماد کے ساتھ دلاور نے مجھ سے کہا تھا کہ ہم تمھیں سات سال تک اسیر رکھیں گے۔ وقتاً فوقتاً تمھاری زندگی کا ثبوت فراہم کرتے رہیں گے لیکن تمھیں لاپتا رکھیں گے تاکہ تمھیں قانوناً مردہ بھی قرار نہ دیا جا سکے اور وراثت کا سرٹیفکیٹ کسی کو جاری نہ ہو سکے۔ یہ منصوبہ بہت مکمل تھا لیکن اس پر عمل درآمد کتنا مشکل ہو گا، اس کا وہ پوری طرح اندازہ نہیں کر سکے۔ میرے جیسے کسی بھی شخص کو سات سال تک ساری دنیا کی نظروں سے اوجھل رکھنا اور دن رات میری پہرے داری کرنا بہت دشوار کام تھا۔ سات برسوں کے ڈھائی ہزار سے زیادہ دنوں میں تقدیر مجھے ایک بھی موقع فراہم کر دیتی تو ان کی محنت اکارت جاتی مگر وہ ضدی اور کینہ پرور لوگ تھے، ان کو کم ہمت نہیں کہا جا سکتا اور غیر مستقل مزاج نہیں سمجھا جا سکتا۔ ان کا سرغنہ چوہدری دلاور انتہائی ذہین اور ٹھنڈے دل و دماغ والا آدمی تھا۔ اس نے منصوبے کی جزئیات اور تفصیلات پر اچھی طرح غور کر لیا ہو گا۔ یہ تو آنے والا وقت ہی بتاتا کہ سات سال تک وہ مجھے کہاں کہاں رکھتے اور کیسے رکھتے۔ میرا قید خانہ کتنے دور افتادہ اور اجنبی مقامات پر کتنی بار بدلتے۔ مجھے کب تک بے ہوش اور پابہ زنجیر رکھتے۔ ابھی تو سات دن ہی گزرے تھے کہ میں قید سے نکل بھاگا اور آزادی کی اس جنگ میں داروغہ زنداں کے علاوہ بھی تین افراد مارے گئے۔ روبی، پیٹر اور روبی کی ماں۔ میں ان کو مارنا نہیں چاہتا تھا لیکن قدرت پہلے ہی ان کو سزا دینے کا فیصلہ صادر کر چکی تھی۔ شاید یہ سزا انھی کے اعمال کا شاخسانہ تھی۔

میں جانتا تھا کہ چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کو اس ناکامی پر کتنا صدمہ ہو گا۔ سیمسن تو صرف ایک وحشی قوت تھا۔ اس کا جسم انسانی تھا لیکن عقل و فہم میں وہ لاکھوں کروڑوں سال پہلے کا انسان تھا جس کو سائنسداں بندر کے قبیلے کی مخلوق قرار دیتے ہیں۔ اسے قصوروار نہیں سمجھا جا سکتا۔ دلاور کا سارا عتاب پیڈرو پر نازل ہو گا۔ اس نے اپنی بے وفا بیوی پر بھروسہ کیا۔ اس کے آشنا کو یرغمال بنا کے قید میں رکھا اور اس خدمت کے انعام میں لیلٰے کو مجنوں کے وصل سے شادکامی کا یقین دلایا۔ وہ روبی سے بہرصورت نجات حاصل کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ پھر پیٹر کو وہ کیسے زندہ چھوڑتا لیکن اب اس پر الزام آئے گا کہ اس نے جو انتظامات کیے تھے، ناقص تھے اور اسی کی کوتاہی کا نتیجہ ہے کہ سات سالہ منصوبہ سات دن میں چوپٹ ہو گیا۔ اب وہ یہی کر سکتے ہیں کہ پولیس کو میرے ٹھکانے کی اطلاع دے دیں لیکن ان کو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ رالجہ اور منظر، پولیس کے پیچھے پڑ جائیں گے۔ کون آغا علی احمد عرش اللہ بادی؟ گھاس کھا گئے ہیں

آپ لوگ ؟ پھر ایس آئی اکرام شیخ ہوگا اور ایس پی ضامن رضوی۔ وہ چکرا جائیں گے کہ بظاہر ملزم وہی ہے۔ شکل صورت میں بھی صرف اتنا ہی فرق پڑا ہے کہ بڑھی ہوئی شیو، بکھرے بالوں اور غلیظ کپڑوں کی جگہ اب وہی شخص کلین شیو، صاف ستھرے اور بہترین سوٹ میں ہے مگر اس کے علاوہ بھی یہ سکندر بخت ہے ایک فیکٹری کا مالک، ولایت پلٹ انجینئر اور پولیس کے ایک اعلیٰ افسر کے گھر میں مقیم۔ وہ ہزیمت اٹھا کے لوٹیں گے تو اپنی کوتاہی پر ایک دوسرے کو الزام دیں گے اور مفرور مجرم کو گالیاں دیں گے جو اُن کی رعایت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انھیں بے وقوف بنا کے "ڈز" دے گیا۔ نہ ان کو یہ معلوم ہوگا کہ سیمسن کون تھا اور جس کے گھر میں قتل ہوا وہ کون ہے؟ ان کا آپس میں کیا تعلق تھا؟ پوسٹ مارٹم رپورٹ مزید الجھن پیدا کرے گی کہ اسے زہر دے کر کس نے مارا۔ روبی اور ہیٹر کے قتل کو وہ سیمسن کے قتل سے منسوب کر ہی نہیں سکیں گے۔ روبی کی ماں زندہ ہوتی تو شاید کچھ بتا دیتی۔ اب تو ان دونوں کو بھی لاوارث قرار دے کر دفن کر دیا جائے گا اور ان کی فائلیں بھی سیکڑوں ہزاروں فائلوں کی طرح کلوز ہو جائیں گی جن میں قتل کی واردات کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ اس مصیبت سے نجات پاتے ہی مجھے محسن یاد آیا اور میں تڑپ اٹھا۔ اپنی اور اس کی دوستی اور رفاقت کے تیس برسوں کو یاد کرتا میں چلتا گیا۔ سڑک آگے جا کے دو حصوں میں تقسیم ہوگئی اور وہاں مجھے ایک ٹیکسی بھی نظر آگئی جس نے سواریاں اتاری ہی تھیں۔ بالکل تھانیدارانہ شان کے ساتھ میں نے دروازہ کھولا اور پیچھے بیٹھ گیا۔ ڈرائیور نے جو ابھی سواریوں سے کرائے کے مسئلے پر مذاکرات میں مصروف تھا، بلا اجازت بیٹھنے والے کو سخت غصے میں پلٹ کر دیکھا۔ پھر اس کی آواز بند ہوگئی۔ "اسلام آباد چلو۔" میں نے اسے حکم دیا اور وہ خون کے گھونٹ پی کر چل پڑا۔ اسے دُہرا نقصان ہوا تھا۔ ایک تو وہ میٹر سے زائد پیسے وصول نہیں کر سکا تھا اور اتنی دیر میں خالی ٹیکسی پر ایک مفت خورا تھانیدار قابض ہوگیا تھا جس سے کرایہ ملنے کی کوئی امید ہی نہیں تھی۔ پھر رات کے تین بجے خالی واپس آنا بھی نقصان ہی تھا۔

میرے دل پر اب محسن کی موت کا صدمہ ایک بارِ گراں بن گیا تھا۔ عدم تحفظ کے احساس سے نجات پاتے ہی اس کا غم جاگ اٹھا تھا اور جیسے جیسے میں اسلام آباد کی طرف بڑھ رہا تھا، میری ہمت جواب دیتی جا رہی تھی۔ اس گھر میں اب کون ہوگا جہاں محسن ہی نہیں؟ اس کی ماں بھی جوان بیٹے سے جدائی کے بعد کہاں زندہ رہی ہوگی۔ صرف شہلا ہوگی جس کی محبت کا چمن ــــ فصلِ گُل کی خبر سے پہلے ہی خزاں نے اجاڑ دیا۔ نخلِ محبت جو حالات کی سخت زمین سے پھوٹا تھا جل گیا اور خواب ابھی پُورا بھی نہ ہوا تھا کہ ٹوٹ گیا۔ اپنی اس بہن کو میں کیسے تسلی دوں گا جو اپنا گھر بسنے سے پہلے ہی بیوہ ہوگئی۔ کیسے صبر کی تلقین کروں گا اسے جب خود مجھے صبر کا حوصلہ نہیں۔

"اسلام آباد میں کدھر جانا ہے سر جی؟" ٹیکسی ڈرائیور نے مؤدب ہو کے پوچھا۔ میں نے چونک کر اسے ہدایات دیں۔ پندرہ منٹ بعد ٹیکسی انکل شیردانی کے گھر کے سامنے جا رکی۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور سو کے نوٹوں کی ایک گڈی میرے ہاتھ میں آگئی جس میں کم سے کم بیس نوٹ تھے۔ دوسری جیب سے پچاس کا ایک اور دس دس کے دو نوٹ نکلے۔ میں نے اسے پچاس روپے دیے اور کہا "جاؤ۔" وہ پچاس کا نوٹ پکڑے ہکا بکا مجھے دیکھتا رہا اور پھر "سلام سر جی۔ بڑی مہربانی" کہہ کے بھاگ لیا۔ اس وقت صبح کے ساڑھے تین ہو چکے تھے۔

میں دروازے کے سامنے کھڑا رہا۔ میرے قدم من من بھر کے ہو گئے تھے ــــ دل چاہتا تھا کہ یہیں سے لوٹ جاؤں لیکن یہاں سے بھاگ کر لاہور کے سوا میں کہاں جا سکتا تھا۔ محسن وہاں بھی نہیں ہوگا۔ صرف رالعہ ہوگی جو اَب بھی کھڑکی کھولے بیٹھی ہوگی اور ویران آنکھوں سے خلا میں دیکھ رہی ہوگی۔ ہوائے راہ گزر سے سوال کرنے والی آنکھیں انتظار کے بعد مایوس ہوگئی ہوں گی کہ اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا مگر وہ بار بار دل کو سمجھاتی ہوگی کہ میرے وقت پر نہ پہنچنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں۔ دیر بھی تو ہو سکتی ہے۔ سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے۔ ہو سکتا ہے وہ آج رات نہ آئے، کل آئے۔

میں گیٹ سے اندر داخل ہوا اور لان میں پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ میری نظر میں رالعہ کا چہرہ گھوم گیا۔ اداس، پژمردہ، بیمار، ان سب دکھوں کی تصویر جو دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں دیے۔ بے آسرا اور تنہا اس مسافر کی طرح جو منزل پر پہنچ کے لُٹ جائے۔ ان خوابوں کے سوا اس کے پاس کیا رہا تھا جو اس نے اب میرے حوالے سے دیکھنے شروع کیے تھے۔ اپنے خوابوں کی اسے بہت بھاری قیمت ادا کرنی پڑی تھی۔ اس کا گھر تباہ ہو گیا تھا۔ پریکٹس ختم ہوگئی تھی اور اس نے نیک نامی کی جگہ بدنامی کمائی تھی۔ خود اس نے عورت ہو کے بھی شدید مشکلات کا سامنا کیا تھا۔ دشمنوں کے ہاتھوں ذلت برداشت کی تھی اور وہ اذیت اٹھائی تھی جو کسی عام عورت کے بس کی بات نہ تھی۔ اس کے لیے ماضی فقط ایک پُرعذاب سفر تھا لیکن اس نے مستقبل کو مجھ سمیت اپنا لیا تھا۔ مجھ سے کہا تھا کہ سکندر میری طرح تم بھی سب کچھ قربان کر دو اور چلو ہم اپنی دنیا کہیں اور بسا لیتے ہیں لیکن میں نے اس کی بات نہیں مانی تھی۔ کیوں انکار کیا تھا میں نے؟ کیا میں بزدل تھا؟ مجھے اپنی آرزوئے انتقام اس کی محبت سے زیادہ عزیز تھی؟ یا میری محبت میں اتنی وسعت نہیں تھی کہ سارے جہاں کو چھوڑ کے رالعہ کے خواب سمیٹ کر مطمئن ہو جائے؟ آخر کیا پایا میں نے اس زندگی سے؟ اپنے باپ کے علاوہ میں نے کتنے دوست گنوا دیے۔ منشی فوما پنجو اور سلامت شاہ کو، رالعہ اور شہلا کی ماں کو۔ ان کے علاوہ ان گنت لوگوں کو اور بالآخر محسن کو۔ میرے گرد شکاریوں کا حصار تنگ سے تنگ تر ہوتا جا رہا تھا۔ خطرات بڑھ رہے تھے اور میری مشکلات میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ابھی تک نہ کسی کو فتح ہوئی تھی نہ شکست لیکن نقصان دونوں طرف برابر ہو رہا تھا۔ پھر ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟ اصولوں پر مفاہمت کا کوئی سوال نہ تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ میں رالعہ کی مان لوں اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے نکل جاؤں۔ مجھ میں صلاحیت ہے، عزم اور حوصلہ ہے۔ اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم۔

میں اپنے خیالات میں محو تھا اور وردی کی جیب سے ملنے والی سگریٹ کو لائٹر سے سلگائے بیٹھا تھا کہ مجھے پودوں کے درمیان حرکت کا احساس ہوا۔ آخر شب کی مدھم چاندنی میں کوئی سایہ تھا جو شجر سے جدا ہوا۔ میں نے غور سے دیکھا اور شہلا کو پہچان لیا۔ وہ کسی بُت کی طرح کھڑی خلا میں نہ جانے کیا دیکھ رہی تھی۔ میں نے سگریٹ کو نیچے ڈال کے بجھایا اور دھڑکتے دل کو سنبھال کے دبے پاؤں آگے بڑھا۔ اسے بالکل احساس نہیں ہوا اور میں اس کے پیچھے چند قدم کے فاصلے پر جا کھڑا ہوا۔ اس نے آہستہ سے سسکی لی تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ رو رہی ہے۔ میرے دل میں یہ سسکی خنجر کی نوک بن کے اتر گئی۔

"شہلا!" میں نے آواز کی رِقّت پر قابو پا کے آہستہ سے کہا۔ "کیا رونے سے جانے والے لوٹ آئیں گے پگلی؟" وہ بری طرح چونک کے پلٹی۔ چند لمحے کے لیے اس کی آنکھیں بے یقینی کی کیفیت میں میرے چہرے پر منجمد ہوگئیں۔ پولیس کی وردی میں وہ اچانک مجھے اپنے مقابل دیکھتی تو بے اختیار چیخ مارتی لیکن اس نے میری آواز کو شناخت کر لیا تھا اور پھر اس اجنبی حلیے کے باوجود میری صورت بھی پہچان گئی تھی۔

"سکندر بھائی۔" اس نے بمشکل تمام کہا اور یوں لڑکھڑائی جیسے اس کے قدموں میں زمین متحرک ہوگئی ہے۔

"ہاں ہاں۔" میں نے اسے سنبھال لیا۔ "شہلا میں سکندر ہی ہوں۔ میں دشمنوں کی قید میں تھا لیکن اب نکل آیا۔"

روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی۔ "آپ... آپ نے تو رالعہ باجی سے کہا تھا..."

"ہاں۔ میں نے اس سے آج رات پہنچنے کا کہا تھا۔" میں نے کہا۔ "تمھیں کیسے معلوم ہوا؟"

"ان کا فون آیا تھا۔" شہلا نے کہا۔ "گیارہ بجے، پھر بارہ بجے۔ 'میں اب بھی کھڑکی کھولے ویران راہ گزر کو تک رہی ہوں۔ تم آؤ گے، ضرور آؤ گے۔' رالعہ کی آواز آئی۔"

"مجھے دیر ہوگئی۔" میں نے ندامت سے کہا۔ "لیکن اب میں لاہور ہی جاؤں گا۔ میں آخری بار تم سے ملنے آیا تھا۔"

"آخری بار۔" وہ رونا بھول گئی۔ "آخری بار کیوں سکندر بھائی؟"

"بس شہلا۔ اب مجھے ہار جیت کی پروا نہیں رہی۔" میں نے زخم خوردہ لہجے میں کہا۔ "میں اکیلا نہیں لڑ سکتا۔ اکیلے آدمی کی جیت بھی ہار سے زیادہ عذاب ناک ہوتی ہے۔ محسن میرے ساتھ تھا تو میں خود کو اکیلا محسوس نہیں کرتا تھا۔ اس کے مرنے کے بعد..."

شہلا نے تڑپ کر میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "خدا نہ کرے انھیں کچھ ہو۔ آپ ایسی بات منہ سے کیوں نکالتے ہیں سکندر بھائی! اپنی بہن کی خوشی تو بہت عزیز تھی آپ کو؟"

میں نے اس کی کلائی تھام کے ہاتھ ہٹایا اور اسے نظر جما کے دیکھا۔

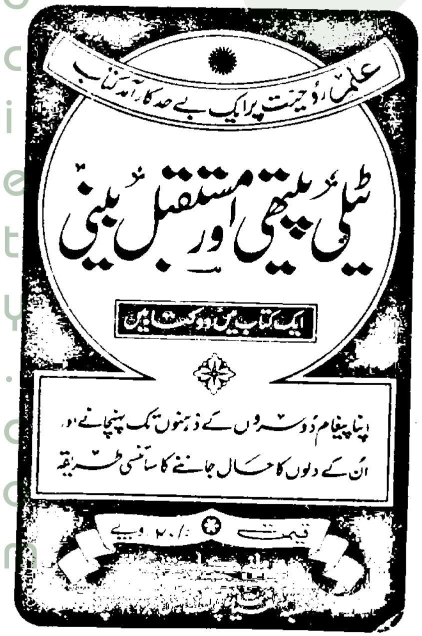

"تمہارا مطلب ہے، محسن زندہ ہے!"

"کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟ مجھے خوف آتا ہے۔" شہلا چلائی۔

"ابھی تو بات کی تھی انہوں نے انکل سے۔"

نہ جانے کتنی دیر بعد میں نے رُکی ہوئی سانس کو خارج کیا اور یہ محسوس کیا کہ میرا دل پھر دھڑکنے لگا ہے۔ شہلا کی کیفیت بھی مجھ سے پوشیدہ نہ تھی، وہ کانپ رہی تھی۔ "میں... دراصل مجھے غلط بتایا گیا تھا۔" میں نے بڑی مشکل سے کہا۔ "تم نے مجھے نئی زندگی بخش دی ہے شہلا!" پھر فرطِ جذبات سے میرے آنسو بہ نکلے۔ یہ تشکر کے آنسو تھے۔ احسان مندی کے جذبات تھے جو اشکوں میں ڈھل گئے تھے۔ میرے جسم کا رواں رُواں ایک نئی مسرت سے سرشار ہو کے اس خدا کی حمد و ثنا کر رہا تھا جس نے مجھے جینے کے سہاروں سے محروم نہیں کیا۔ ان کو زندہ رکھا جن کے لیے میں زندہ تھا۔ دور کسی مسجد سے فجر کی اذان کی آواز بلند ہوئی۔ خدا بہت بڑا ہے۔ خدا بہت بڑا ہے۔ یہ آواز اسلام آباد کے کوہساروں میں بازگشت بن کے پھیل گئی اور آسمانوں تک کُل کائنات پر محیط ہوگئی۔ میں بے اختیار سجدے میں گر گیا۔ یہ اپنے عجز و انکسار، اپنی بندگی اور اس کی بے پناہ قدرتِ کاملہ پر یقین کا سجدہ تھا۔

"سکندر بھائی!" شہلا نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "آپ کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔"

"شہلا!" میں نے سر اُٹھا کے کہا۔ "سچ بتاؤ، محسن خیریت سے ہے؟ انکل رضوی کو معطل اور برطرف نہیں کیا گیا...؟"

"یہاں کسی کو کچھ نہیں ہوا سکندر بھائی۔" وہ بولی۔ "لیکن آپ کے وارنٹ نکلے ہوئے ہیں۔ آپ کی ضمانت منسوخ ہو چکی ہے کیونکہ آپ پولیس کی نظر میں مفرور قاتل ہیں۔"

"مجھے دشمن اغوا کر کے لے گئے تھے۔" میں نے کہا۔ "میں راولپنڈی کے ایک گھر میں قید تھا لیکن میں یہ ثابت نہیں کر سکتا۔ اگر میں نے ثابت کرنے کی کوشش کی تو بہت سخت مشکل میں پڑ جاؤں گا۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" شہلا نے کہا۔ "میں کچھ نہیں سمجھی۔ یہ وردی کس کی پہن رکھی ہے آپ نے؟"

"یہ بڑی لمبی کہانی ہے۔" میں نے کہا۔ "پھر کبھی سناؤں گا۔ میں سیدھا لاہور چلا جاتا مگر میں نے پہلے یہاں آنا بہتر سمجھا۔"

"اچھا ہوا کہ آپ دن میں نہیں آئے۔" وہ بولی۔ "اور مجھے یہیں مل گئے۔ انکل شیروانی سے ملاقات ہو جاتی تو وہ فوراً پولیس کو بُلا لیتے۔ انکل رضوی نے انہیں بہت سختی سے تاکید کی تھی۔ صاف کہا تھا کہ تم نے اس کے ساتھ رعایت یا نرمی برتی تو ہمارے ذاتی تعلقات پر بُرا اثر پڑے گا۔"

"انکل رضوی ایسے ہی آدمی ہیں۔" میں نے فخر سے کہا۔ "ذاتی رشتے ان کو فرض کی ادائیگی سے نہیں روک سکتے۔"

"اسی لیے تو میں کہہ رہی ہوں کہ آپ نکل جائیں۔" وہ بولی۔ "صبح ہونے والی ہے اور انکل شیروانی اٹھنے والے ہی ہوں گے۔ لاہور جانا تو پہلے رابعہ باجی سے مل لیں۔ انہوں نے فون پر کہا تھا۔"

"کیا کہا تھا؟" میں نے ہنس کے کہا۔ "اور کیوں کہا تھا؟"

"کیوں کا جواب میں کیا دوں؟" وہ مسکرائی۔ "آپ انہی سے پوچھ لیجیے گا۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ سکندر آئے تو اسے بتا دینا کہ سیدھا گھر نہ آئے۔ انکل رضوی اسے پولیس کے حوالے کر دیں گے اور ایک بات نہیں سُنیں گے۔"

"تو یہ رابعہ بی بی کیا کریں گی آخر؟" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "اور میں ان سے ملوں گا کیسے؟"

"پہلے کہیں سے ان کو فون کر لیں۔" شہلا نے کہا۔ "پھر جیسا وہ کہیں، ویسا کریں۔ وہ اتنی بڑی وکیل ہیں۔"

"خاک وکیل ہیں۔ وہ تم سے زیادہ احمق اور جذباتی خاتون ہیں۔" میں نے کہا۔ ذرا سی دیر میں میری کایا پلٹ گئی تھی۔ اس رنج و غم کا کہیں نشان تک نہ تھا جس کا بار میں اپنی رُوح پر لے کر آیا تھا۔ محسن کی زندگی نے مجھے پھر پرانا سکندر بخت بنا دیا تھا۔ پہلے مجھے خیال آیا کہ میں نازو کے گھر سے فون کر کے اسے بُلا لوں گا لیکن ایک مصیبت نازو کا بھائی بھی تھا جو فرض شناسی میں عین انکل رضوی کے نقشِ قدم پر چلتا تھا۔

"اچھا میری بہن!" میں نے کہا۔ "اس سے پہلے کہ انکل شیروانی مجھے دیکھیں، میرا یہاں سے نکل جانا بہتر ہے لیکن میں اس فینسی ڈریس میں نہیں پھر سکتا۔ مجھے شریفانہ کپڑوں کا جوڑا چاہیے۔"

"آپ ایسا کریں کہ...." وہ سوچتے ہوئے بولی۔ "میرے کمرے میں جا کے سو جائیں۔ آپ کی حالت سے ظاہر ہے کہ آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔ لباس ہی نہیں آپ کو اپنا حُلیہ بھی ٹھیک کرنا ہے۔ میں اب جا کے ناشتے کا بندوبست کر دوں گی۔"

"بہت بہتر۔ پھر تم میرا اور انکل کا ناشتا ایک ساتھ بھیج دینا۔" میں نے کہا۔ "ناشتے کے بعد وہ دفتر چلے جائیں گے اور میں حوالات چلا جاؤں گا۔ گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے۔ حُلیہ وہ خود ٹھیک کر دیں گے۔"

شہلا مسکرائی۔ "آپ گھبرائیں نہیں۔ میرے کمرے میں کوئی نہیں آئے گا۔ میں امی کو چائے دوں گی۔ پھر انکل کے لیے ناشتا بنا کے لگا دوں گی۔ ان کے جانے کے بعد امی کو ناشتا دوں گی۔ نو بجے تک آپ سوتے رہیں گے۔ میں خود آپ کو جگا دوں گی۔ نہا دھو کے اور شیو کر کے حلیہ بدل لیجیے گا۔ ویسے بہت جلدی ہے جانے کی تو جائیں۔" وہ شرارت سے بولی۔

"معوذہ کے جانے کے بعد تم نے اس گھر کو سنبھال لیا ہے شہلا۔" میں نے کہا۔ "بہت خوش قسمت ہیں انکل کہ بیٹی سے اچھی بہو ملی۔ ورنہ وہ دونوں کیا کرتے؟"

جب تو صبح وہ بھاگ گئی اور میں چوری چھپے پیچھے سے گھر میں داخل ہوا اور اس کے کمرے میں گھس کر سو گیا لیکن نیند آنے کا کوئی سوال نہ تھا۔ محسن جو میرے لیے مر گیا تھا ایک معجزے سے پھر زندہ ہو گیا تھا۔ اس کی جتنی خوشی مجھے ہو سکتی تھی وہی نیند اُڑانے کے لیے کافی تھی۔ پھر میری ذہنی کیفیت بہت عجیب تھی۔ میں اس گھر میں تھا جسے ہوش سنبھالنے کے بعد سے ہمیشہ میں نے اپنا ہی گھر سمجھا تھا لیکن آج میں یہاں مجرموں کی طرح چھپا ہوا تھا۔ میرے کان مختلف آوازوں کو سُن رہے تھے۔ انکل شیروانی کے غسل کرنے کی، بار بار شہلا کو پکارنے کی۔ "ارے بھئی شہلا۔ وہ رومال نہیں مل رہا۔ شہلا بیٹی وہ چشمہ ابھی تھا ہاتھ میں، کدھر رکھ دیا۔" ان کی خفت سے ہنسنے کی آواز۔ "اب ایک چشمہ دوسرا چشمہ ڈھونڈنے کے لیے بنوانا پڑے گا۔ اچھا بھئی ہم جا رہے ہیں۔ خدا حافظ۔ خدا حافظ انکل!" گاڑی کا دروازہ بند ہونے اور اسٹارٹ ہونے کی آواز۔ کچن سے برتنوں کے کھنکنے کی صدا۔ وقفے وقفے سے بیگم شیروانی کے کچھ کہنے کی آواز جو صاف سنائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ آہستہ بولتی تھیں اور اپنے کمرے میں لیٹی ہوئی تھیں۔ میں نے اب پیر پر سے بھی پٹی اتار دی تھی جو ڈھیلی ہونے کے علاوہ بے مصرف ہو گئی تھی۔ نو بجے سے پہلے ہی شہلا نے آہستہ سے دروازہ کھول کے جھانکا تو میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ قریب آئی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "سکندر بھائی!" پھر میرا شانہ پکڑ کے ہلایا۔ میں بے سُدھ پڑا رہا اور پھر ایک دم اٹھ بیٹھا۔

"السلام علیکم بھابی صاحبہ! صبح بخیر۔" میں نے آلتی پالتی مار کے بیٹھتے ہوئے کہا۔

وہ ایک دم پیچھے ہوئی۔ پھر میں نے اس کا رنگ لال ہوتے دیکھا اور مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ "میں بتا دوں گا محسن کو کہ میں ایک بات کہنا چاہتا تھا لیکن تم نے میرا منہ بند کر دیا تھا۔ اصل الفاظ دُہرا دوں گا۔"

اس کی شکل رونے والی ہو گئی۔ "سکندر بھائی تنگ مت کریں مجھے۔ اندر امی کے کانوں تک باتوں کی آواز پہنچ گئی تو میں کیا بتاؤں گی۔ چلیں انسپکٹر صاحب اُٹھیں۔ نہائیں اور آدمی بن جائیں۔" اُس نے مجھے ہاتھ پکڑ کے کھینچا اور باتھ روم میں دھکیل دیا۔ غسل کے بعد میں نے محسن کا ایک سُوٹ پہنا جو ڈرائی کلینر کی دکان سے جیسا آیا تھا ویسا ہی لٹکا ہوا تھا۔ انسپکٹر کی وردی میں سے ستائیس سو بیس روپے برآمد ہوئے۔ میرا کُل سرمایہ چونتیس سو ہو گیا۔ وردی کی جیب میں سے ایک نوٹ بک اور ایک شناختی کارڈ کے علاوہ دو چار صفحے کا بیان بھی نکلا تھا جو حوالدار اونگھتے خان نے تحریر کیا تھا۔ میں نے اسے بھی جیب میں منتقل کیا اور شناختی کارڈ کی تصویر کو غور سے دیکھا۔ کوئی ماہرِ فن اس کی جگہ میری تصویر لگا دے تو یہ وردی اور یہ شناختی کارڈ میرے کام بھی آسکتے ہیں، میں نے سوچا۔ جوتے ٹھیک تھے۔ میں نے کپڑوں کو بڑے سلیقے سے ایک بریف کیس میں پیک کیا۔ یہ بریف کیس بھی محسن کا تھا۔ اس کے استعمال کا بیشتر سامان اس کے گھر میں ہی تھا۔ ناشتے کے بعد میں چلنے کے لیے تیار ہوا تو گیارہ بجے تھے۔

اچانک شہلا نے ایک انتہائی جذباتی حرکت کی۔ اس نے کپڑے کی ایک پٹی نکالی اور میرے بازو پر باندھ دی۔ "یہ امام ضامن ہے۔" وہ بولی۔ "خدا آپ کو اپنی امان میں رکھے۔" اس کی آنکھوں سے قطرۂ اشک کے موتی ڈھلک آئے۔ پھر اس نے مٹھی کھولی اور میرے سامنے پھیلا دی۔ "یہ آپ رکھ لیں۔ ڈیڑھ سو روپے ہیں۔ آپ کے لاہور پہنچنے تک کام آ جائیں گے۔ مجھے امی نے دیے تھے کپڑے بنانے کے لیے۔ میرے پاس ابھی بہت کپڑے ہیں۔"

"مجھے شرمندہ کرتی ہے؟" میں نے اس کی مٹھی بند کر دی۔ "بیوقوف۔ بھائی جب بہن کے گھر آتے ہیں تو کچھ لے کر نہیں جاتے، دے کر جاتے ہیں۔" میں نے اس کے آنسو صاف کیے۔ "سب سے زیادہ ضرورت مجھے دعاؤں کی ہے اور ایک ماں یا بہن سے زیادہ کس کی دُعا قبول ہو سکتی ہے۔ اس امام ضامن کے ساتھ جو دُعا تو نے دل سے دی ہے وہ میری سب سے بڑی محافظ ہو گی پاگل۔ ابھی میں مجبور ہوں کہ تیرے لیے کچھ نہیں کر سکتا لیکن زندہ رہا تو....."

ایک بار پھر اُس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "خدا حافظ۔ جاؤ بھیا، خدا کرے میری زندگی بھی تمہیں لگ جائے۔"

میں بریف کیس اٹھائے باہر آیا اور سڑک پر چلنے لگا۔ شہلا پہلے برآمدے سے اور پھر چھت پر چڑھ کے دیکھتی رہی۔ یہ سب لڑکیاں جب محبت کرتی ہیں تو اپنی ذات کو فراموش کیوں کر دیتی ہیں اور جسے چاہتی ہیں اسے ایک ہی دل سے اتنا پیار کیسے بانٹ دیتی ہیں؟ بہن ہوں تو بھائی کے لیے اور بیوی ہو تو شوہر کے لیے اور ماں ہو تو بیٹے کے لیے۔ سب کو مالا مال کر دیتی ہیں اور ان کے پیار کا خزانہ کبھی خالی نہیں ہوتا۔ شہلا کی سابقہ اور موجودہ زندگی میرے سامنے تھی۔ ذہنی طور پر اس نے ایک رشتہ محسن سے استوار کر لیا تھا تو اس کے گھر سے بھی جذباتی طور پر پوری شدت کے ساتھ وابستہ ہو گئی تھی۔ سارے رشتے اس کے اپنے رشتے ہو گئے تھے اور اس گھر میں وہ ایسے تھی جیسے ہمیشہ سے یہیں تھی اور اسے اب ہمیشہ رہنا بھی یہیں ہے۔ اسے وہ سب مل گیا ہے جس کی تمنا تھی۔ اب صرف سکون ہے، قناعت اور مسرت ہے اور ٹھہراؤ ہے۔

اسلام آباد کی سنسان سڑک پر بہت سی ٹیکسیاں خالی لوٹ رہی تھیں جو افسروں کو اور دفتروں کے بابوؤں کو پنڈی سے ہر روز آفس ٹائم پہ لاتی اور لے جاتی تھیں۔ ایک ٹیکسی نے مجھے کمپنی باغ کے اڈے پہ

پہنچادیا جہاں سے لاہور اور پشاور کی ویگن سروس ملتی تھی۔ سولہ سال بعد بھی اس شہر کے رہنے والوں نے کمپنی باغ کو لیاقت باغ کہنے کی عادت اختیار نہیں کی تھی۔ میں نے اپنا بریف کیس اگلی سیٹ پر رکھا اور نیچے اُتر آیا کیونکہ ابھی مسافر پورے نہیں ہوئے تھے۔ میری عاجزانہ درخواست اور کال کی قیمت ادا کرنے کے وعدے نے ٹکٹ جاری کرنے والے کو متاثر کیا اور اس نے مجھے ایک لوکل کال کی اجازت عنایت کی۔ یہ واضح کرنے کے بعد کہ "یہ پبلک فون نہیں ہے۔"

میں نے انکل شیروانی کے گھر کا نمبر ملایا۔ دو منٹ بعد شہلا نے ہی ریسیور اٹھایا "ہیلو۔" وہ بولی۔

"شہلا۔" میں نے کہا۔ "دیکھو میں ایک بات بتانا بھول گیا تھا۔ تم ذرا لاہور فون کر دو۔"

"ایسی کون سی بات ہے جو آپ خود جا کے نہیں کہہ سکتے؟" وہ بولی۔

"بہتر ہو گا کہ تم رابعہ میرے پہنچنے کی خبر دے دو۔" میں نے کہا۔ "بس یہ بتا دینا کہ آج کسی وقت میں اس سے رابطہ قائم کر لوں گا۔ میرے اچانک پہنچنے کا شاک نہ ہو اُسے۔"

"شاک تو اسے نہ پہنچنے کا تھا۔" وہ بولی۔ "آپ کے جاتے ہی فون آیا تھا۔ میں نے خوشخبری دے دی ہے۔"

"اور کچھ تو نہیں بتایا؟" میں نے کہا۔ "یہی کہ میں کیسے آیا تھا؟"

"فکر مت کریں۔ میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی جس سے آپ کی پوزیشن خراب ہو۔" وہ بولی۔ "بس اتنا ہی کہا کہ وہ چند منٹ کے لیے آئے تھے اور خیریت معلوم کر کے لاہور چلے گئے۔ ہاں اس کے بعد پولیس کی ایک جیپ آئی تھی۔"

"کیوں؟" میں نے سنبھل کر کہا۔ "کیا پوچھ رہے تھے؟"

"بڑا عجیب سا نام تھا۔" وہ بولی۔ "آغا علی احمد عرش الہ آبادی۔"

وہ ہنسی۔ "میں تو سمجھ گئی تھی لیکن میں نے ان کو بہت ڈانٹا کہ منہ اٹھائے ہر جگہ گھسے چلے آتے ہو۔ یہ وزارت خارجہ کے ایک ڈپٹی سیکریٹری مسٹر شیروانی کی کوٹھی ہے اور یہاں کوئی مرد نہیں رہتا۔ ان سے بات کرنی ہے تو آفس جا کے کر لو۔ فون نمبر بھی دے دیا تھا ان کا۔ وہ سخت پریشان واپس ہوئے، معافی مانگ کر۔"

"چلیں جناب چلیں۔" کنڈیکٹر نے ہانک لگائی۔ "گڈی فل ہو گئی ہے۔"

"اچھا شہلا، تھینک یو اور خدا حافظ۔" میں نے ریسیور رکھ کے بکنگ کلرک کا شکریہ ادا کیا اور اسے پانچ روپے نذر کر کے ویگن میں آ بیٹھا۔ میں بال بال بچ گیا تھا۔ پولیس مجھے کوٹھی سے نکلتے ہوئے بھی دیکھ سکتی تھی اور ٹیکسی میں بیٹھنے سے پہلے بھی۔ اس پتے کی نشاندہی کرنے والے وہی ہو سکتے تھے جو شکاری بن کے میرے پیچھے لگے ہوتے تھے۔ شہلا کی احتیاط پسندی کے باعث وہاں میری موجودگی کا کوئی ثبوت نہیں ملا تھا۔ اگر بعد میں انہوں نے شیروانی صاحب سے آفس میں رابطہ قائم کر کے آغا علی احمد عرش الہ آبادی کے متعلق پوچھا تو اور بُری ہو گی۔ انکل شیروانی بہت ڈانٹ پلائیں گے: "کون نامعقول ہو تم؟ نشے میں ہو؟ معلوم ہے کس سے بات کر رہے ہو؟ ابھی بات کرتا ہوں میں ڈی آئی جی سے۔ کیسے گدھے بھرتی کر لیے ہیں۔"

لیکن میری تلاش میں آنے والے گدھے نہیں تھے۔ اس مہم پر وہی بھیجے گئے ہوں گے جو مجھے دیکھ چکے تھے اور لباس بدلنے کے باوجود شناخت کر چکے تھے۔ اس سے مجھے یہ اندازہ بھی ہوا کہ اب تک میرا حُلیہ مشتہر کر دیا گیا ہو گا۔ پولیس کو انکل شیروانی کے گھر کا پتا بتانے والے اگر چوہدری دلاور کے گرگے تھے تو یہ بھی طے شدہ بات تھی کہ انہوں نے میرے لاہور کے ٹھکانے کی نشاندہی بھی کر دی ہو گی اور اگر شہلا جیسی لڑکی نے سمجھ لیا تھا کہ یہ عجیب و غریب نام میرے ذہن کی اختراع تھی تو رابعہ بھی سمجھ جائے گی۔ محسن اور انکل رضوی بھی سمجھ جائیں گے۔ اور یہ بہت پُرتشویش بات تھی۔ اب تک میرا ایک گھر تھا جہاں میں خود کو محفوظ اور مددگاروں کے درمیان محسوس کرتا تھا۔ اب اگر مجھے وہاں بھی پناہ نہ ملی تو میرا ٹھکانہ کہاں ہو گا؟ شکاری پہلے دلاور کے ساتھی تھے۔ اب پولیس بھی میرے تعاقب میں تھی اور وہ خود بھی مجھے پولیس کے حوالے کر دینے پر کمربستہ تھے جو میری مدد کر سکتے تھے۔ سوائے رابعہ یا محسن کے میں کسی سے یہ اُمید نہیں رکھ سکتا تھا کہ وہ غیر قانونی طور پر مجھے قانون کے خلاف تحفظ فراہم کریں گے۔

اگر میں خود کو قانون کے حوالے کر دیتا تو ہر مقدمے کا تصفیہ ہونے تک میرا جیل سے باہر آنا بھی ناممکن ہو جاتا تھا اور چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کے راستے کا پتھر خود بخود ہٹ جاتا۔ وہ یکے بعد دیگرے مجھے جیل کے اندر ہی نئے مقدمات میں اُلجھاتے رہتے۔ مار پیٹ، فرار کی کوشش، کسی سے سازباز کا الزام، اشتعال انگیزی۔ جیل کے اندر تو مجرم صرف مجرم ہوتا ہے اور اسے اندر ہی رکھنا مقصود ہو تو اس کے لیے جیل کے عملے کے پاس بہت سے اختیارات ہوتے ہیں۔ وہ خود ہی مدعی ہوتے ہیں اور خود ہی منصف۔ انہیں گواہ بھی مل جاتے ہیں جو ہر الزام ثابت کر دیتے ہیں۔ جھوٹے گواہوں کو زرِ رویے کی یا سزا میں تھوڑی سی تخفیف مل جاتی ہے۔ معمولی سے جرم میں جیل جانے والے کی سزا کبھی ختم نہیں ہوتی۔ اسے بے رحمی سے مارنے والے الزام عائد کر دیتے ہیں کہ قواعد و ضوابط کی خلاف ورزی سے روکنے پر ملزم نے حملہ کیا۔ کہیں بھی قیدیوں میں جھگڑا ہو تو اسے دھر لیا جاتا ہے۔ عینی شاہد مل جاتے ہیں کہ جھگڑے پر اکسانے والا وہی تھا۔ اگر کوئی بہت شوریدہ سر ہو اور برسوں بعد بھی حق و انصاف کی بات کرتا رہے تو اسے پاگل خانے ارسال کر دیا جاتا ہے اور کبھی عدالت میں پیش نہیں کیا جاتا۔

میں یہ سب نہیں چاہتا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ میرے ساتھ یہی ہو گا۔ شکاری مجھے اسیر کر کے آرام سے نہیں بیٹھ جائیں گے۔ ان کے ہاتھ بہت لمبے ہیں اور ان کے پاس دولت کی طاقت ہے۔ وہ میرے لیے انصاف کے سارے در بند کر دیں گے۔ میں ریمانڈ پر بھی جیل گیا تو دوبارہ باہر کی دنیا نہ دیکھوں گا۔ میری سزا میرے ہر نئے جرم کے ساتھ طویل سے طویل تر ہوتی جائے گی۔ محسن اور رابعہ جیسے دوست اندر میری کوئی مدد نہ کر سکیں گے۔ مجھے پاگل قرار دے دیا جائے گا یا سچ مچ پاگل کر دیا جائے گا۔ دوائیں اور انجکشن، نشہ آور ادویات، اندر کیا نہیں پہنچتا اور کس کام نہیں آتا لیکن مجھے باہر رہنا تھا تاکہ میں ایک ایک شکاری کو زیرِ دام لا سکوں اور اس سے پوچھ سکوں کہ بتاؤ میرے باپ کا جُرم کیا تھا؟ اسے کس نے بلیک میل کیا اور کیوں وہ لکھ پتی فیکٹری اونر ہونے کے باوجود غربت و افلاس میں ایسی بے کسی کی موت کیوں مرا؟ جو کچھ میرے ساتھ ہوا اور میرا ساتھ دینے والوں کے ساتھ ہوا کیوں ہوا اور اس کے بعد مجھے ایک ایک کو سزا دینی تھی۔ وہ سزا جس سے وہ اس لیے بچے رہے کہ وہ کسی عدالتِ انصاف میں پیش نہیں ہوئے۔ انہوں نے ثبوت، شہادت اور گواہ سب خرید لیے یا ختم کر دیے۔ اب میں کسی عدالت سے انصاف نہیں مانگ سکتا تھا۔ میری فریاد سننے سے پہلے قانون کے محافظ مجھے گرفتار کر کے پسِ دیوارِ زنداں پہنچا دیتے چنانچہ اب انصاف بھی خود مجھے ہی کرنا تھا۔ ثبوت بھی مجھے ہی فراہم کرنے تھے۔ شہادت بھی مجھے ہی حاصل کرنی تھی اور گواہ بھی مجھے ہی تلاش کرنے تھے لیکن یہ سب کچھ مجھے چھُپ کر کرنا تھا۔ پولیس کی نظر سے چھُپ کر۔ دشمنوں کی نظر سے چھُپ کر اور اپنوں کی نظر سے چھُپ کر۔ کوئی بھی مجھے پکڑوا سکتا تھا اور میرے مشن کو ناکام بنا سکتا تھا۔ اس مشن کو جس کے لیے بہت سے بے گناہوں نے بھی اپنی زندگی گنوا دی اور اپنی جان کا قرض مجھ پر چھوڑ گئے۔

ویگن نے مجھے ریلوے اسٹیشن سے کچھ دُور اتارا۔ اپنے ہی شہر میں پہلی بار مجھے سوچنا پڑا کہ کدھر جاؤں۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا تھا زندگی کی ہر نعمت اور آسائش مجھے میسر تھی۔ دولت مند باپ کا اکلوتا بیٹا اعلیٰ ترین اسکولوں میں پڑھتا رہا۔ کوٹھی سے باہر نکلا تو ہمیشہ کار میں۔ چار سال ولایت میں اعلیٰ تعلیم کے بہانے عیش کرتا رہا اور واپس آیا تب بھی ایک ایس ایس پی کی پناہ میں اس کے گھر میں خاندان کے ایک فرد کی طرح رہا۔ رابعہ اور محسن اب بھی وہیں تھے لیکن میں اس گھر میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ سارا شہر اجنبی ہو گیا تھا اور ہر نظر نامہربان لگتی تھی۔ پہلے مجھے خیال آیا کہ میں کسی ہوٹل میں کمرہ لے لوں اور وہیں سے فون کر کے رابعہ کو بلوا لوں۔ پھر میں طے نہ کر سکا کہ مجھے کس ہوٹل میں ٹھہرنا چاہیے۔ ہوٹل غیر محفوظ بھی تھے۔ اگر پولیس بہت زیادہ مستعد ہو گی تو سب سے پہلے ہوٹلوں کو چیک کرے گی۔ ایس ایس پی صاحب کو یہ تو معلوم نہیں کہ مجھے کس طرح اغوا کیا گیا اور کہاں قید رکھا گیا۔ وہ صرف اتنا جانتے تھے کہ قتل کے دو مقدمات میں مطلوب زیرِ ضمانت ملزم کی گرفتاری کے وارنٹ نکل چکے تھے چنانچہ وہ جہاں نظر آئے اسے گرفتار کر لینا ضروری ہے۔

وہ عدالت میں اپنی غیر حاضری کا سبب بیان کر سکتا ہے اور عدالت مطمئن ہو گی تو پھر اسے ضمانت پر چھوڑ دے گی لیکن میں جانتا تھا کہ میں عدالت کو قائل نہیں کر سکتا کہ مجھے اغوا کر کے محبوس رکھا گیا تھا۔ نہ اغوا کا الزام دلاور اینڈ کمپنی پر عائد ہوتا تھا۔ نہ میں بتا سکتا تھا کہ اغوا کرنے والے کون تھے۔ خود میں پولیس کو وہ جگہ تک نہیں دکھا سکتا تھا جہاں مجھے ایک ہفتے تک مقید رکھا گیا تھا۔ اوّل تو میں اس مکان تک ہی نہ پہنچ پاتا اور اگر پہنچ جاتا تو نئی مصیبت میں گرفتار ہو جاتا۔ وہاں سیمن کی لاش اب تک پڑی ہو گی یا کسی نے دیکھ لی ہو گی تو تفتیش جاری ہو گی۔ روبی اگر زندہ ہوتی تو شاید میری گواہ بن جاتی مگر وہ پیٹر کے ساتھ ماری گئی تھی اور دُہرے قتل کی اس واردات میں مجرم یعنی میں پولیس کی تحویل سے فرار ہو گیا تھا۔ وہاں میرے خلاف متعدد مقدمات درج ہوں گے۔ تفتیش کرنے والے پولیس کے افسروں پر قاتلانہ حملہ، پولیس افسر کی وردی اور آتشیں اسلحے کی چوری، غلط بیانی۔ ممکن ہے اس شخص نے بھی کار چھینے جانے کی رپورٹ کر دی ہو جو پولیس اسٹیشن کے قریب ہی رہتا ہے اور جس کے سامنے میں نے مفرور مجرم ہونے کا اعتراف کر لیا تھا۔ انکل شیروانی کے گھر سے تو پولیس ناکام لوٹ چکی تھی لیکن یہاں کی مجھے کوئی خبر نہ تھی۔ ایک بار وہ ہر جگہ سے ناکام ہو کے لوٹ گئے کہ یہاں اس نام اور حُلیے کا کوئی شخص نہیں رہتا تو شاید صبر کر کے بیٹھ جائیں مگر ان کو شبہ بھی ہو گیا تو مجھے پہچاننے والے بہت ہوں گے۔

مناسب یہی تھا کہ میں پہلے رابعہ یا محسن سے رابطہ قائم کر لوں۔ ایک جگہ "پبلک ٹیلی فون" کا بورڈ دیکھ کر میں نے اکرام شیخ کے گھر کا نمبر ملایا۔ کچھ دیر بعد نازک سی آواز آئی۔ "جی؟"

"ایس آئی اکرام شیخ صاحب گھر پر ہیں؟" میں نے کہا۔

"جی نہیں۔ وہ ڈیوٹی پر ہیں۔" وہ کچھ دیر بعد بولی۔ "کیا نے فون کر لیں آپ۔"

"وہ کب تک لوٹیں گے؟" میں نے کہا۔

"رات آٹھ بجے کے بعد۔" وہ بولی۔ "کون صاحب بول رہے ہیں آپ؟"

میں نے جواب دینے کے بجائے ریسیور رکھ دیا۔ ابھی شام کے ساڑھے چھ بجے تھے۔ چنانچہ ڈیڑھ گھنٹے کی مہلت سے فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا۔ ایک رکشہ نے مجھے بیس منٹ میں اکرام شیخ کے گھر کے دروازے پر اتار دیا۔ رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا لیکن گیٹ لائٹس ابھی آف تھیں۔ روشنی برآمدے میں تھی اور اندر کے کمروں میں نظر آ رہی تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا اور میرے قدم بے اختیار رک گئے۔ پورچ میں رابعہ کی بالکل نئی ڈینٹ پینٹ کی ہوئی فاکس ویگن کھڑی تھی۔ اس کی چمک دمک دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔

مجھے اس کا پرانا حلیہ یاد آگیا کہ میں نے اس کی صورت کس طرح بگاڑ دی تھی۔ وہ شخص یقیناً ماہرِ فن تھا کہ اس نے ایک ڈھانچہ نظر آنے والی کار کو ایسا بنا دیا جیسے وہ ابھی شوروم سے نکلی ہو۔

اب مسئلہ اندر اپنی تشریف آوری کی اطلاع دینے کا تھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے خیال آیا کہ کہیں وہ رابعہ جو وکیل ہے میرے بجائے قانون کا ساتھ تو نہیں دے گی۔ پھر میں نے اس خیال کو جھٹک دیا۔ میرے لیے رابعہ صرف وہ عورت تھی جو محبت کرنا جانتی تھی اور اس محبت میں میرے لیے آنکھیں بند کر کے اندھے کنویں میں بھی چھلانگ لگا سکتی تھی۔ میں نے دروازے کو آہستہ سے دھکیلا اور دبے پاؤں اندر داخل ہو گیا۔ آگے دائیں طرف کے کمرے سے ٹی وی کی آواز آ رہی تھی جس کا مطلب تھا کہ بڑے شیخ صاحب اور ان کی بیگم اسی کمرے میں ہیں۔ بائیں طرف نازو کے کمرے کا دروازہ بند تھا لیکن کان لگا کر سننے پر مجھے اندر سے ان دونوں کے باتیں کرنے کی آواز آئی۔

"شہلا نے فون کیا تھا مجھے۔" رابعہ نے کہا۔ "کہ سکندر لاہور کے لیے روانہ ہو چکا ہے۔"

"فون تو سکندر نے مجھے بھی کیا تھا۔" نازو نے کہا۔ اس کے لہجے میں عجیب دُکھ بھری حسرت تھی۔ "پھر کیا ہوا؟"

"مگر آج تو وہ شہلا سے ملا تھا۔ اس کی خیریت پوچھنے گیا تھا اور بالکل خیریت سے تھا۔" رابعہ نے کہا۔

"پھر بھی اس کا یہاں آنا مشکل ہے۔" نازو بولی۔ "وہ آپ سے ملنے جائے گا یا محسن سے؟"

"میرا خیال ہے وہ گھر نہیں جائے گا۔" رابعہ نے کہا۔

"تو کہیں سے آپ کو فون کرے گا۔ محسن سے بات کرے گا۔" نازو نے کہا۔ "یہاں اس کا انتظار بے سود ہے۔"

"معلوم نہیں کیوں.... آج صبح منہ دھوتے وقت مجھے یہ خیال آیا۔" رابعہ نے تذبذب کے ساتھ کہا۔ "اس وقت تو مجھے شہلا کا فون بھی نہیں ملا تھا۔ توہمات پر یقین کرنا کتنا عجیب لگتا ہے مگر کبھی کبھی تنکے کا سہارا بھی ضرورت بن جاتا ہے اور اتفاقات ایسے ہو جاتے ہیں۔ منڈیر پر کوا بول رہا تھا۔ اسی وقت بیگم رضوی نے کہا کہ آج کوئی آنے گا اور میں حیران رہ گئی کیونکہ اس وقت میں بھی یہی سوچ رہی تھی۔ دن بھر عجیب سی کیفیت رہی۔ کھانا کھا کے سوئی تو بڑا اُوٹ پٹانگ خواب دیکھا کہ سکندر میری گاڑی میں بیٹھا ہے لیکن گاڑی تمہارے گھر میں کھڑی ہے۔ اُٹھنے کے بعد کسی کام میں جی نہ لگا۔ میں یہاں آ گئی۔ بس ایسے ہی۔" اس کے لیے وضاحت مشکل ہو رہی تھی۔

"آپ بھی یقین رکھتی ہیں ایسی باتوں پر۔" نازو نے کہا۔ "میں سمجھتی تھی کہ بے وقوف میں ہی ہوں... میں جمعرات کو داتا صاحب کی درگاہ میں حاضر ہوئی تھی۔ اسی رات سکندر نے فون کیا۔ صبح ایک فقیر آیا۔ میں نے اسے اکرام بھائی کا ایک جوڑا دیا۔ پرانی شلوار قمیص۔ اُس نے دعا دی کہ اللہ تیرا دُکھ دور کرے اور بچھڑے ہوؤں کو ملائے۔ ہے نا بڑی عجیب بات۔ معلوم نہیں اس نے صورت دیکھ کر کہی تھی یا بس ایسے ہی۔" نازو جانتی تھی کہ میں رابعہ کے علاوہ کسی سے محبت کر ہی نہیں سکتا۔ اس کے باوجود وہ مجھے چاہتی تھی اور بڑی نیک نیتی سے اس کا اعتراف کر رہی تھی۔ رابعہ سے حسد کیے بغیر۔ اور رابعہ اس سے حالِ دل کہہ رہی تھی۔ رقابت کے جذبات کو بالائے طاق رکھ کر۔ "ہم پہ مشترکہ ہیں احسان غمِ الفت کے۔ جز تیرے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں" والا شعر ان کی ذہنی کیفیت کا آئینہ دار تھا۔ اسے بہت کچھ کہا جا سکتا تھا۔ فریبِ آرزو۔ سوچ کا نفسیاتی ردِ عمل۔ ٹیلی پیتھی۔ پہلے میں نے سوچا کہ باہر رابعہ کی گاڑی میں جا بیٹھوں اور اس کا خواب سچ کر دوں لیکن رابعہ کا پتا نہیں تھا کہ وہ کتنی دیر نازو سے گفتگو کرتی رہے اور یہ وقت ضائع جائے۔ میں تو اس نیت سے یہاں آیا تھا کہ رابعہ کو فون کر کے بُلوا لوں گا مگر وہ پہلے سے موجود تھی تو اس موقعے سے فائدہ اٹھانا حالات کا تقاضا تھا۔ میں نے دروازے کو آہستہ سے دھکیلا۔ دروازہ کسی آواز کے بغیر تھوڑا سا پیچھے ہو گیا۔ میں نے ایک انگلی خاموش رہنے کی تاکید کے طور پر ہونٹوں پر رکھی اور اندر داخل ہو گیا۔ نازو کی پُشت میری طرف تھی۔ اس کے سامنے رابعہ بیڈ پر پیر لٹکائے بیٹھی تھی۔ چنانچہ مجھے رابعہ نے پہلے دیکھا۔ اس کا رنگ متغیر ہو گیا اور وہ پلک جھپکانا تک بھول گئی۔ اس کی حالت کا یہ تغیر اتنا نمایاں تھا کہ نازو نے پلٹ کر دیکھا۔ رابعہ آہستہ آہستہ اٹھی مگر نازو نے ایک چیخ ماری۔ "سکندر!" وہ دیوانہ وار میری طرف لپکی۔ دونوں کے رویے کا فرق وہی تھا جو اُن کی شخصیت میں تھا۔ رابعہ کی حیرت اور خوشی میں متانت تھی، وقار تھا، ایک پُرسکون ٹھہراؤ تھا جو جذبات کی گہرائی کا پتا دیتا تھا۔ نازو کے انداز میں برساتی ندی کی تیزی تھی اور جولانی تھی۔ میں نے اسے بڑی مشکل سے سنبھالا۔

"خدا کے لیے عقل سے کام لو۔" میں نے خود کو نازو کی گرفت سے چھڑاتے ہوئے سخت شرمندگی محسوس کی کیونکہ رابعہ بُت بنی کھڑی سب کچھ دیکھ رہی تھی اور اپنے ہونٹ کاٹ رہی تھی۔

"ہم سے کہتے ہو عقل سے کام لو، خود کیا کرتے رہے؟" نازو نے روتے روتے کہا۔

"آہستہ بولو۔" میں نے اسے پھر کرسی پر بٹھا دیا۔ "میں نہیں چاہتا کہ کوئی مجھے یہاں دیکھے۔" پھر میں رابعہ کی طرف پلٹا۔ "ایسے مت دیکھو مجھے۔" میں نے اس کے قریب پہنچ کر نرمی سے کہا۔ "اگر میں آ سکتا تو کل رات ضرور آتا۔"

رابعہ نے ایک گہری سانس لی اور پھر بیڈ پر گر گئی۔ "کاش تم نے انتظار کرنا بھی سیکھا ہوتا سکندر!" وہ بولی۔ "تم کو بھی اندازہ ہوتا کہ اس میں کتنی اذیت جھیلنی پڑتی ہے۔" اُس نے آنکھوں میں اُتر آنے والی نمی کو ایک انگلی سے جھٹک دیا۔ میں اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ خاموشی کا ایک مختصر وقفہ سب کی زبان بن گیا۔

"مجھے ڈر تھا کہ کہیں شیخ اندر موجود نہ ہو۔" میں نے کہا۔ "میں اسے فرض اور دوستی کی آزمائش میں مبتلا کرتے ہوئے ڈرتا تھا۔ کیونکہ اس کے لیے فرض مقدم ہے۔ میں نے سوچا خاموشی سے تمہاری گاڑی میں بیٹھ جاؤں۔"

حسبِ توقع نازو نے چونک کر رابعہ کی طرف دیکھا۔ رابعہ کا چہرہ روشن ہو گیا۔ سو فیصد جانبداری سے کام لیتے ہوئے میں نے اس کی محبت کو فاتح قرار دے دیا تھا۔ رابعہ کا جذبۂ عشق صادق ہو گیا تھا۔

"پھر یہ سوچ کر میں اندر آ گیا کہ نہ جانے تم کتنی دیر گپ لگاتی رہو۔" میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ "مجھے شہلا نے بتا دیا تھا کہ میری گرفتاری کے وارنٹ جاری ہو چکے ہیں۔ انکل رضوی کے ڈر سے میں گھر نہیں گیا۔ میں تم کو یہیں بلانا چاہتا تھا۔ میں بڑی مصیبت میں پھنس گیا تھا لیکن یہ بات میں چائے پینے کے بعد سناؤں گا۔ صبح شہلا... اس سے ملنے کے بعد میں نے بازار میں ناشتا کیا تھا اور بس میں بیٹھ گیا تھا۔ اس کے بعد سے کچھ نہیں کھایا۔ چل نازو کی بچی۔ اُٹھ میرے لیے کچھ کھانے کو لا لیکن کسی کو یہاں میری موجودگی کی خبر نہیں ہونی چاہیے۔ تجھے میری قسم!"

نازو یوں اُٹھی کہ مجھے اس پر ترس آیا۔ وہ اپنے ہسٹریا پر قابو پانے کی سخت جدوجہد کر رہی تھی۔ میرے رویے نے اس کا دل توڑ دیا تھا اور وہ صرف ایک ایسی عورت رہ گئی تھی جس کو دوسری عورت کی موجودگی میں ٹھکرا دیا گیا ہو۔ اس کا بس چلتا تو وہ رابعہ کو اس ایک لمحے میں قتل کر دیتی جب میں نے اس سے پہلی بات کی تھی اور اس نے فراق کی ساری کیفیت اپنے مختصر سے جواب میں کسی گلے شکوے کے بغیر بیان کر دی تھی۔ میں چند لمحوں میں رونما ہو جانے والے اس انقلاب پر دنگ تھا۔ کتنی اپنائیت کے ساتھ وہ رابعہ سے میری ہی باتیں کر رہی تھی اور اب میں سامنے تھا تو شکست کے احساس نے اسے رابعہ سے کتنا دُور کر دیا تھا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ چائے کے بہانے میں اُسے رخصت کرنا چاہتا ہوں تاکہ رابعہ سے وہ سب کچھ کہہ سکوں جو میں اس کے سامنے نہیں کہہ سکتا تھا۔ میں نے اُسے یوں نکال پھینکا تھا جیسے وہ کباب میں ہڈی ہے۔ اسے حسبِ سابق یوں مخاطب کیا تھا جیسے وہ میرے سامنے ایک بچی ہے۔ چنانچہ وہ جلنے لگی تھی اور یہ میری لگائی ہوئی آگ تھی۔ اس کی یاسیت کا ردِ عمل تذلیل کے احساس میں ڈھل گیا تھا۔ اس سے پہلے بھی رابعہ کے سامنے اپنے رویّے سے نازو پر واضح کر چکا تھا کہ میں مجبور ہوں۔ صرف رابعہ سے محبت کر سکتا ہوں اور اس کی چاہت کا جادو مجھ پر چل ہی نہیں سکتا۔ ابھی ابھی میں نے اس کی انا کو نئی ٹھوکر ماری تھی۔ اس لیے کہ یہ حقیقت پھر اس پر عیاں ہو جائے۔ مجھ پر رابعہ کا اعتماد کم نہ ہو اور میں ان خطرات سے محفوظ رہوں جو دو کشتیوں میں قدم رکھ کے سفر کرنے والے کو لاحق ہوتے ہیں۔ لیکن اس طرح میں نے نازو کے اندر کی عورت کو مشتعل کر دیا تھا۔ اشتعال میں آ کر وہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔ اپنے بھائی کو بُلا کے مجھے گرفتار کروا سکتی تھی کہ میں اس کے ساتھ نہیں تو رابعہ کے ساتھ بھی کیوں رہوں۔ کسی غلط اقدام سے باز رکھنے کے لیے ہی میں نے اسے اپنی قسم دی تھی۔

چند منٹ بعد نازو واپس آئی تو میں کرسی پر بیٹھا تھا اور رابعہ خاموشی سے اپنی جگہ بیٹھی ٹانگیں ہلا رہی تھی لیکن اس کی آنکھیں برس کے کُھل جانے والے بادل کی طرح نظر آنے لگی تھیں۔ نکھری نکھری اور نمی سے بوجھل۔

"ہو گئے سب گلے شکوے دُور؟" نازو نے مسکراتے ہوئے طنز کا تیر چلایا۔ رابعہ نے نظریں جھکا لیں۔

"ہاں۔" میں نے ہمت سے کام لے کر کہا۔ "اب تو اپنی کہے گی یا میری سُنے گی؟"

"مجھے کیا کہنا ہے۔" وہ پھیکی ہنسی ہنس کے چائے بنانے لگی۔ "آپ دونوں کہیں۔"

"ہم نے تمہارے اغوا کی رپورٹ درج کرا دی تھی۔" رابعہ نے کشیدگی ختم کرنے کے لیے موضوع بدل دینا بہتر سمجھا۔ "لیکن ہم نے دیکھا کسی کو نہیں تھا۔ چنانچہ رپورٹ نامعلوم حملہ آوروں کے خلاف درج کی گئی۔ وہ کار جس نے ہمارا راستہ روکا تھا ڈی سلوا کے نام پر رجسٹرڈ تھی۔ پولیس کیا کرتی؟ ڈی سلوا زندہ ہوتا تو شاید اس سے پوچھ گچھ کی جاتی۔ چوہدری دلاور حسبِ توقع معصوم بن گیا اور اس نے بے حد افسوس اور حیرانی کا اظہار کیا، بتایا کچھ نہیں۔ میں نے تو کوشش کی تھی کہ کم سے کم ایک کو تو لپیٹ میں لے لوں لیکن وہ بچ گئے۔ ان کی گاڑی بھی تباہ ہوئی۔"

"اور انکل کی گاڑی؟" میں نے کہا۔ "اس وقت تم نے عقلمندی کا ثبوت نہیں دیا تھا۔ ایک بار تم کو موقع ملا تھا ریورس میں جانے کا تو پھر آگے آنے کی کیا ضرورت تھی؟ میں نے تم سے کہا تھا کہ نکل جاؤ۔"

"میں نے سُنا نہیں تھا اور سُن لیتی تب بھی تمہیں اور محسن کو دشمن کے نرغے میں چھوڑ کر میں کہاں جاتی؟" وہ بولی۔ "بس مجھے اس کے سوا کچھ نہ سُوجھا کہ اسی گاڑی سے ان سب کو کچل دوں۔ زخمی کر دوں یا مار ڈالوں۔ ان کے لیے فرار کے راستے بند کر دوں۔"

"تم خود بھی ٹکر سے زخمی ہو سکتی تھیں۔" میں نے کہا۔ "فائدہ کیا ہوا؟"

"نفع نقصان کا خیال مجھے آیا ہی نہیں۔ عقل ایسے وقت میں کہاں ساتھ دیتی ہے؟" رابعہ نے کہا۔ "تصادم کے بعد میرا اسٹیئرنگ وہیل پر بڑے زور سے لگا تھا۔ اِدھر اُدھر سے اور بھی لوگ آ گئے تھے چنانچہ وہ تو بھاگ گئے۔"

"باقی دو مجھے اٹھا کے لے گئے۔" میں نے کہا: "وہاں سے تو کندھے پر ڈال کے بھاگے ہوں گے۔ آگے ٹیکسی لے لی ہو گی یا کوئی دوسری گاڑی۔ مجھے معلوم نہیں۔ میں جھاڑیوں میں جا گرا تھا اور بیہوش ہو گیا تھا۔"

"انہوں نے رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھایا۔" رابعہ بولی۔ "بعد میں سب نے اِدھر اُدھر دیکھ لیا تھا لیکن تم نہیں ملے تھے۔ انکل رضوی وہیں آ گئے تھے۔ محسن نے کسی کو نمبر دے دیا تھا کہ فون کر دے۔ ان کی گاڑی ابھی تک گیراج میں ہے اور مہینہ بھر رہے گی۔ گیارہ ہزار کے قریب خرچ آئے گا اسے اصل حالت پر لانے کے لیے۔ میں نے ایک بار انکل سے کہا تھا کہ غلطی میری تھی تو وہ برہم ہو گئے کہ غلطی کسی کی نہیں تھی۔ ایک رستم خاں ہے تو دوسرا طرم خاں ہے۔ اور تم خاک وکیل ہو۔ عقل نام کو نہیں۔ میں گیارہ ہزار کا نقصان برداشت کر سکتا ہوں لیکن یہ حماقت برداشت نہیں کر سکتا جس میں تم مبتلا ہو۔ وہ خاصے پریشان رہے۔ ایک طرف تمہارا کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ دوسری طرف تمہاری ضمانت منسوخ ہو چکی تھی۔ کہہ رہے تھے استعفیٰ دے دوں گا یا تبادلہ کرا لوں گا ورنہ میرا نروس بریک ڈاؤن ہو جائے گا۔"

"بیچارے انکل رضوی۔ نہ ہمیں چھوڑ سکتے ہیں نہ اداے فرض سے کنارہ کشی اختیار کر سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ پھر میں نے اپنے اغوا، حبسِ بیجا اور قید سے فرار کی کہانی یوں سنائی کہ اس میں سیمن، ردنی یا پیٹر کا ذکر بالکل نہیں آیا۔ میں یہ باتیں رابعہ کو بتا سکتا تھا لیکن نازو کے سامنے نہیں۔ نہ جانے کیوں مجھے یہ احساس تھا کہ اسی جذباتی کیفیت میں وہ کسی دن کوئی ایسی حرکت کر بیٹھے گی جس سے رابعہ کو یا مجھے نقصان ہو گا۔ وہ کم عمری کے باعث ناپختہ شعور کی مالک تھی اور انتہا پسندی اس کی فطرت میں شامل تھی۔ وہ جتنی دیوانگی سے محبت کرنے کی اہل تھی اتنی ہی شدت کے ساتھ نفرت کر سکتی تھی۔ اس کا وجود ایک لمحے کے لیے گلیشیر تھا تو دوسرے لمحے آتش فشاں۔ کسی بھی کمزور لمحے کی یلغار سے مغلوب ہو کر وہ جان دے بھی سکتی تھی اور لے بھی سکتی تھی۔ خواہ اس سے اگلے لمحے کا حاصل صرف پچھتاوا ہی کیوں نہ ہو۔

اس کا ثبوت مجھے فوراً مل گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ اچانک کچھ خاموش اور نروس ہو گئی ہے اور منفعل نظر آنے لگی ہے۔ اس بچے کی طرح جو ایک غلطی کر چکا ہو اور اُسے چھپانے کی فکر میں ہو۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس غلطی کے نتائج سامنے آئیں گے تو اس کے لیے کوئی جواز پیش کرنا مشکل ہو جائے گا۔ ابھی میری بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ دروازے میں اکرام شیخ نمودار ہوا۔ اگر وہ دوست بن کے آتا تو میں اور وہ بڑے جوش و خروش سے گلے ملتے لیکن وہ پولیس افسر بن کے آیا تھا۔ میں اٹھا ہی تھا کہ اس کے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کے رُک گیا۔ پھر میں نے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی۔ اس میں ابھی ساڑھے سات ہی بجے تھے اور نازو نے فون پر مجھے بتایا تھا کہ آٹھ بجنے سے پہلے اس کے آنے کا کوئی امکان نہیں۔ میری نظر نازو کی طرف گئی۔ اس کا مجرم چہرہ خفت سے زرد ہو گیا تھا اور اس میں اتنی ہمت بھی نہ تھی کہ کسی سے نظر ملا سکے۔ اپنے بھائی سے بھی نہیں جسے اس نے فرض شناسی کے ایک مظاہرے کا موقع فراہم کیا تھا اور خود اپنے قانون پسند ہونے کا ثبوت دے کر ثابت کر دیا تھا کہ وہ کس بھائی کی بہن ہے۔

"آؤ شیخ جی!" میں نے ہاتھ اٹھا کے بے تکلفی سے کہا جس میں طنز آمیز تلخی نمایاں تھی۔ "بڑے وقت پہ پہنچے۔ ایک مفرور قاتل اور مجرم دیدہ دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے تمہارے ہی گھر میں بیٹھا چائے پی رہا ہے۔"

"تم میرے مہمان ہو، پرانے دوست ہو۔" شیخ آہستہ آہستہ آگے آیا۔ "میں تمہاری عزت کرتا ہوں سکندر اور تمہارا احسان مند ہوں کہ تم نے میری کئی بار مدد کی۔ لیکن...."

"اپنی صفائی پیش مت کرو۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "میں جانتا ہوں تم اور انکل رضوی ایک ہی مٹی کے بنے ہوئے ہو۔ قانون کے معاملے میں تم کسی کو رعایت دے ہی نہیں سکتے۔ میری جگہ تمہارا سگا بھائی ہوتا تب بھی تم اپنا فرض ادا کرتے۔ افسوس مجھے نازو پر ہے۔ کاش وہ بھی تم جیسی ہی ہوتی۔" میں نے نازو کی طرف دیکھا جس کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔

"اسی نے مجھے مطلع کیا تھا کہ تم یہاں موجود ہو۔" شیخ نے متانت سے کہا۔

"مجھے معلوم ہے۔ لیکن فرق اس جذبے کا ہے جس کے تحت تم ایک مجرم کو گرفتار کرتے ہو۔ تمہیں کوئی ندامت تو نہیں ہوتی ناخواہ ملے تم اپنے گھر سے گرفتار کرو اور وہ تمہارا دوست ہی کیوں نہ ہو۔" میں نے کہا۔ "نازو کی صورت دیکھو۔ اس کو شرمندگی کیوں ہے؟ اس نے کوئی غلط کام تو نہیں کیا۔ پھر یہ پشیمانی کیوں ہے اسے؟ جیسے مجرم یہ خود ہو!"

"میں جانتا ہوں کہ تمہیں تمہاری مرضی کے خلاف لے جایا گیا تھا۔" شیخ نے ریوالور کا رُخ میری طرف رکھتے ہوئے ایک خالی کرسی پر بیٹھ کے کہا۔ "لیکن مجھے عدالت سے تمہاری ضمانت کی منسوخی کے احکامات موصول ہو چکے ہیں۔ تمہارے اغوا کی رپورٹ بھی تو میں نے ہی لکھی تھی۔ اب اگر میں عدالتی حکم کی تعمیل کروں تو یہ میری مجبوری ہے اور تمہیں میری مجبوری کو سمجھنا چاہیے۔"

"میں صرف اپنی مجبوری کو سمجھتا ہوں۔ یہ خود غرضی نہیں یا میرے حالات کا تقاضا ہے۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "میں کسی قیمت پر گرفتار ہونا نہیں چاہتا۔ اس لیے کہ میں جانتا ہوں بعد میں تمہارا قانون میری کوئی مدد نہیں کر سکے گا۔ تم اس مشینری کے بہت چھوٹے سے پُرزے ہو جسے میرے دشمنوں کے بہت طاقت ور ہاتھ چلا رہے ہیں۔

کیا تم ضمانت دے سکتے ہو کہ میرے ساتھ انصاف ہوگا؟ اور ایک بار جیل جانے کے بعد میں زندہ سلامت اور باعزت طور پر باہر بھی آ سکوں گا؟ تم کیا کر سکو گے میرے لیے؟

"میں جانتا ہوں یا نہیں جانتا۔" شیخ نے آہستہ سے کہا۔ "کہ کل کیا ہوگا۔ مجھے تو اس وقت تم کو ہر حال میں گرفتار کرنا ہے۔"

"زندہ یا مردہ۔" میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "بے نا یہی بات؟ فرض اور دوستی کا کیا زبردست فلمی مرحلہ ہے۔ لیکن میں تم کو کسی غلط فہمی میں مبتلا رکھنا نہیں چاہتا۔ میں نے بارہا جان کی بازی لگا کے دشمنوں کی قید سے رہائی حاصل کی ہے۔ اس وقت بھی میں ہفتہ بھر ایک ایسے قید خانے میں رہ کے آیا ہوں جہاں سے رہائی کی بظاہر کوئی امید نہیں تھی لیکن میں نے ہمت کبھی نہیں ہاری اور امید کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ میں آخری سانس تک جدوجہد کیے بغیر شکست قبول نہیں کر سکتا اور اس وقت بھی نہیں کروں گا۔ مجھے اپنی آزادی کا تحفظ کرنا ہے۔ اس وقت تک جب تک میرا کام ختم نہیں ہوتا۔ اس کے بعد میں خود کو تمہارے حوالے کر سکتا ہوں۔"

"لیکن میں اس وقت کا انتظار نہیں کروں گا۔ مجھے جو بھی کرنا ہے وہ ابھی کرنا ہے۔" شیخ نے ریوالور اٹھا کے کہا۔

"بھیا!" نازو نے ایک ہسٹریائی چیخ ماری اور اچانک میرے سامنے آ گئی۔ "تم گولی چلاؤ گے سکندر پر؟"

میں نے اسے ایک طرف دھکیل دیا۔ وہ بیڈ پر جا گری۔ "میں اس چیلنج کو قبول کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں اپنی مرضی سے یہاں آیا تھا اور اپنی مرضی سے ہی جاؤں گا۔ تم وہی کر رہے ہو جو تمہیں کرنا چاہیے تو میں بھی وہی کروں گا جو مجھے کرنا چاہیے۔"

"تم دونوں پاگل ہو گئے ہو؟" رابعہ نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

"تم جانتے ہو شیخ کہ نہ میں قاتل ہوں، نہ مفرور۔" میں نے کہا۔ "میں وہ نہیں ہوں جو مجھے بنا دیا گیا ہے۔"

"میرے قاتل ہونے یا نہ ہونے سے فرق نہیں پڑتا سکندر۔" شیخ نے بے بسی سے کہا۔ "تمہیں عدالت کو قائل کرنا ہے۔ میں تو استعفیٰ دے چکا تھا اسی لیے۔ تم نے مجھے مجبور کیا تھا کہ میں آزمائش سے نہ گھبراؤں۔ اب تم ہی میری راہ میں حائل ہو رہے ہو۔ جب تک یہ وردی میرے جسم پر ہے میں تمہاری بے گناہی کی دلیل کو عدالتی احکامات سے برتر نہیں سمجھ سکتا۔"

"رابعہ!" میں نے کہا۔ "یہ بریف کیس لو اور چلو۔ اٹھاؤ اسے!" میں نے سخت لہجے میں کہا اور کھڑا ہو گیا۔

رابعہ نے بریف کیس اٹھا لیا۔ "یہ کیا ہونے والا ہے یہاں؟" وہ چلائی۔ "نازو۔ یہ کیا ظلم کیا تو نے؟"

"تم جاؤ باہر۔" میں نے برہمی سے کہا۔ "میں آ جاؤں گا دیکھنا

ہے زندہ کتنا بازو سے قاتل میں ہے؟"

نازو دروازے کی طرف بھاگی۔ "امی، ابو!" اس نے دیوانہ وار چیخنا شروع کیا۔ میں نے دروازے کی طرف ایک قدم بڑھایا۔ رابعہ وہیں بت بنی کھڑی رہی۔ پھر شیخ کے والد اور اس کی ماں بدحواسی میں ہانپتے کانپتے اندر آئے اور اس منظر کو دیکھتے ہی ٹھٹک کر رہ گئے جو ان کے لیے انتہائی غیر متوقع تھا۔

"بھیا کو سمجھائیں ابو۔" نازو نے دھاڑیں مار مار کے رونا شروع کیا۔ "یہ سکندر کو گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔ سکندر جانا چاہتا ہے۔ کوئی ایسی ویسی بات نہ ہو جائے۔"

"یہ ٹیلی فون کر کے مجھے بلانے سے پہلے سوچنا تھا۔" شیخ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "میں اس وقت ڈیوٹی پر ہوں اور مجھے ایک مفرور مجرم کو گرفتار کرنا ہے جس کے لیے وارنٹ میری جیب میں ہے۔ آپ لوگ جائیں۔"

"آپ لوگ جائیں پلیز۔" میں نے کہا۔ "بات صرف میرے اور شیخ کے درمیان ہے۔ اسے مزید مشکل میں نہ ڈالیں۔" میں نے رابعہ کو ہاتھ پکڑ کے کھینچا۔ "چلو رابعہ!"

"میں آخری بار وارننگ دے رہا ہوں سکندر، میں گولی مار دوں گا۔" شیخ نے چلا کر کہا۔

"تو پاگل ہو گیا ہے کیا؟" شیخ کی ماں نے چلاتے ہوئے کہا۔ "خون کرے گا دوست کا؟ اپنے ہی گھر میں؟"

"نہیں امی، غلطی میری تھی تو سزا بھی میں ہی بھگتوں گی۔" نازو نے پھر درمیان میں آ کر کہا۔ پھر اس سے پہلے کہ میں قدم آگے بڑھاتا یا نازو کو اپنے راستے سے ہٹاتا وہ تیزی سے ایک پنجے پر گھومی۔ اس کی دوسری ٹانگ سیدھی اوپر اٹھی اور شیخ کے ہاتھ پر لگی۔ ریوالور اس کی گرفت سے نکل گیا۔ جوڈو جاننے والی وہ لڑکی جسے میں نے ہمیشہ اسکول گرل، طفل مکتب اور مبتدی سمجھا تھا، بجلی کی طرح لہرائی اور میری حفاظت پر کمربستہ ہو گئی۔ شیخ سنبھلا بھی نہ تھا کہ اس نے غوطہ مارا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے بڑے بھائی کو اٹھا کے دور پھینک دیا۔ "جاؤ!" وہ چیخ کر بولی۔ "بھاگ جاؤ!"

میں رابعہ کا ہاتھ تھام کے بھاگا۔ مجھے یقین تھا کہ شیخ مجھ پر گولی نہیں چلا سکے گا لیکن میرا یقین غلط بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ چند منٹ میں راہداری عبور کر کے ہم کار میں بیٹھ چکے تھے۔ رابعہ بہت زیادہ نروس تھی چنانچہ اسٹیئرنگ میں نے سنبھال لیا۔ چابی لگاتے ہی انجن گرجا اور گاڑی تیزی سے آگے بڑھی۔ شاید اتنی دیر میں اندر شیخ نے ادائے فرض سے روکنے والی بہن کو قابو کر لیا تھا فائر کی آواز اس وقت آئی جب گاڑی گیٹ سے نکل چکی تھی۔ شیخ نے ہتھیار اور پھر حاصل کر لیا تھا لیکن وہ وقت گزر چکا تھا جب دوست کے ہاتھوں دوست کا خون ہو جاتا۔ اب مجرم نازو ہو گئی تھی جس نے ایک پولیس افسر پر حملہ

کیا تھا۔ رابعہ ہو گئی تھی جو ایک مجرم کو بھگا کر لے گئی۔

"وہ ہمارے پیچھے آئے گا۔" میں نے کہا۔ "اپنا اسکوٹر لے کر۔"

"میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا ہے۔" رابعہ نے کہا۔ "اب تم کیا کرو گے سکندر؟"

"ابھی میں کچھ نہیں بتا سکتا۔" میں نے کہا۔ "لیکن حالات پہلے سے زیادہ سخت ہو گئے ہیں۔ میں اکیلا رہ گیا ہوں اور سارے سہاروں سے محروم ہو گیا ہوں۔" میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ رو رہی تھی۔

"ایسا مت کہو سکندر۔ مجھے تو اپنے ساتھ رکھو۔" وہ گلوگیر لہجے میں بولی۔ "یہ سوچو کہ میں کہاں جاؤں گی۔"

"تم ابھی تو گھر جاؤ۔" میں نے اس کے ہاتھ پر تھپکی دی۔ "تم تو ہر وقت، ہر جگہ میرے ساتھ ہو۔ دل و جاں سے بھی قریب تر۔ تمہارا تصور اس وقت بھی میرا سب سے بڑا سہارا تھا جب خدا کے سوا کسی کی مدد میرے کام نہیں آ سکتی تھی۔ آج اگر مجھے اعتماد ہے تو صرف تم پر اور محسن پر۔ انکل رضوی یا شیخ یا انکل شیروانی میرے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ میں ان کے گھر میں قدم نہیں رکھ سکتا۔"

"پھر اس وقت تم کہاں جاؤ گے؟" رابعہ نے کہا۔ "کسی ہوٹل میں؟"

"ہوٹل میں؟ نہیں۔ کم سے کم ابھی دو چار دن نہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ دونوں فرض شناس پولیس مین بہت ذہین بھی ہیں۔ شیخ اور انکل رضوی۔ یہ سب سے پہلے ہوٹل ہی دیکھیں گے۔ میرا خیال ہے اب تک اکرام شیخ نے فون کر کے ایس ایس پی صاحب کو سب بتا دیا ہوگا۔ اس نے تو اگر نازو کو بھی گرفتار کر لیا ہو تو مجھے تعجب نہیں ہوگا۔ اس نے مجرم کو فرار ہونے میں مدد دی۔"

"اس کے والدین بھی تو ہیں۔ وہ اس کی اجازت نہیں دیں گے۔" رابعہ نے کہا۔

"تم بڑے شیخ صاحب کو نہیں جانتیں۔" میں نے کہا۔ "میں ان سے مل چکا ہوں۔ یہ انہی کی تربیت تھی جس نے اکرام شیخ کو اتنا کڑا اصول پرست بنا دیا۔ انہوں نے ہی شیخ کو سکھایا ہے کہ فرض کی ادائیگی اور راہِ حق میں جان چلی جائے تو یہ گھاٹے کا سودا نہیں۔"

گیٹ سے کچھ فاصلے پر میں نے گاڑی کو اچانک روک لیا اور نیچے اتر گیا۔ ہم اس وقت تک تقریباً سات میل کا فاصلہ طے کر چکے تھے۔ جانتے بوجھتے میں نے گاڑی کا رخ رضوی صاحب کے گھر کی طرف رکھا تھا کیونکہ ادھر اکرام شیخ کے آنے کا امکان کم تھا۔ وہ یہی سمجھے گا کہ میں اب گھر کیسے جا سکتا ہوں۔ اگر وہ تعاقب میں روانہ ہوا ہوگا تو مخالف سمت میں۔ اس کا اسکوٹر کسی طرح بھی فاکس ویگن سے تیز نہیں بھاگ سکتا تھا۔ چنانچہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اس نے تعاقب کیا ہی نہ ہو۔

"تم اب جاؤ۔ میں تم سے صبح رابطہ قائم کروں گا۔" میں نے کہا۔ "صبح سات بجے۔ شب بخیر۔" اور اسے جواب کا موقع دیے بغیر چل پڑا۔ ایک منٹ بعد رابعہ گاڑی لے کر آگے بڑھ گئی۔ میں رک گیا اور اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک اس کی ٹیل لائٹ نظر آتی رہی۔ یہ تقریباً وہی جگہ تھی جہاں سے مجھے اغوا کیا گیا تھا۔ وہ دیوار اب بھی ٹوٹی پڑی تھی جس سے ہمارا راستہ روکنے والی کار ٹکرائی تھی۔ میں نے اس شگاف سے تاریکی دیکھی اور آگے جا کے اندر جھانکا۔ اندر کسی کوٹھی کا باغ تھا۔ اور تقریباً سو گز دور کوٹھی کی بند کھڑکیاں روشن تھیں۔ اس گھر میں رہنے والوں کو یقیناً اس رات کا حادثہ یاد ہوگا۔ شاید انہوں نے رابعہ، محسن اور انکل رضوی کے ساتھ مجھے تلاش بھی کیا ہوگا۔ میں نے پلٹ کے سوچا۔ اسی وقت اکرام شیخ اپنے اسکوٹر پر میرے سامنے سے گزر گیا۔ ایک بے مقصد حرکت کے باعث میں اس کے سامنے آنے سے بچ گیا تھا۔ فون کرنے کے بجائے وہ خود رضوی صاحب کو بتانے جا رہا تھا کہ ملزم سکندر بخت کس طرح فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ رابعہ کو بھی موردِ الزام ٹھہرائے گا کہ وکیل صاحبہ! آپ کو تو قانون کا ساتھ دینا چاہیے تھا۔ وہ کیا کہے گی؟ یہ کہ میں بے بس تھی۔ سکندر زبردستی مجھے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ یا صاف مکر جائے گی کہ میں نے تو سکندر کو دیکھا تک نہیں۔ میں تو اسی کے کیس میں عبدالودود منظر سے بات کرنے گئی تھی۔ یقین نہیں تو فون کر کے پوچھ لو۔ منظر یاروں کا یار۔ بے فکرا اور بے جھجک جھوٹ بولنے والا۔ بالکل وہی کہے گا جو رابعہ چاہے گی۔ بےچارہ اکرام شیخ کس مشکل میں پڑ گیا۔

ابھی رات کے ساڑھے آٹھ بجے تھے۔ آئندہ کا لائحہ عمل طے کرنے کے لیے پوری رات پڑی تھی۔ پہلا مسئلہ پیٹ کی آگ بجھانے کا تھا۔ اچانک مجھے بریف کیس کا خیال آیا جو رابعہ کی گاڑی میں ہی رہ گیا تھا۔ اس میں پولیس انسپکٹر کی وردی تھی۔ اس کا ریوالور تھا اور پورے تین ہزار روپے تھے۔ اپنی جیب میں میں نے صرف چار سو چالیس روپے رکھے تھے اور اس میں سے بھی سو کم ہو چکے تھے لیکن باقی رقم ایک رات گزارنے کے لیے کافی تھی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ پولیس ایک رات میں سارے ہوٹل چیک کر لے؟ میں نے سوچا۔ جواب نفی میں آیا۔ شہر میں سیکڑوں ہوٹل تھے، فلیٹیز سے لے کر غریب نواز سرائے تک۔ یہ ہو سکتا تھا کہ وہ اسٹیشن سے میکلوڈ روڈ تک پھیلے ہوئے ہوٹلوں کے رجسٹر دیکھ لیں مگر ہوٹل تو اور بھی ہیں۔ انارکلی میں اور شاہ عالمی میں۔ اور رجسٹر دیکھنے سے کیا معلوم ہوتا ہے؟ میں اپنا نام کچھ بھی لکھوا سکتا ہوں۔ مسئلہ میرے خالی ہاتھ پہنچنے سے پیدا ہو سکتا ہے۔ اسباب ساتھ ہو تو کسی کو قیام کے لیے آنے والے پر شک نہیں ہوتا کہ وہ مسافر نہیں ہے لیکن جس کے ہاتھ میں بریف کیس تک نہ ہو، اس سے شناخت کا

ثبوت مانگا جا سکتا ہے۔ بے شک میں نے سوٹ پہن رکھا تھا۔ میں صورت سے شریف آدمی لگتا تھا اور گفتگو سے بھی اور اسباب نہ ہونے کی معقول وجہ بھی بتا سکتا تھا۔ ہوٹل والے آدمی کو صورت سے پہچان لیتے ہیں اور انہیں ایڈوانس مل جائے تو ان کے لیے عدم اطمینان کی کوئی وجہ نہیں رہتی۔ رہنے کو منظر کا گھر بھی تھا مگر میں نئے سرے سے اس کو ساری آپ بیتی سنانے کے موڈ میں نہیں تھا۔ استاد ٹیڈی کا پتا اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں بلاتکلف اور بے خوف و خطر اس کے گھر جا کے سو جاتا۔

میں نے شب بسری کے مسئلے کو التوا میں رکھا اور کھانے کے لیے بیڈن روڈ کے ایک ریسٹورنٹ میں جا بیٹھا۔ رش کا وقت گزر چکا تھا چنانچہ بہت کم لوگ میزوں پر موجود تھے۔ کھانا کھاتے ہوئے مجھے اچانک خیال آیا کہ کہیں رابعہ نے وہ بریف کیس کھول کے دیکھ لیا تو وہ کیا سمجھے گی؟ یہ کہ میں نے کسی سب انسپکٹر کو قتل کر کے اس کی وردی اور ریوالور حاصل کر لیے ہیں۔ اسے تو میں صبح ساری کہانی سنا کے مطمئن کر لوں گا لیکن خدانخواستہ انکل رضوی نے پوچھ لیا کہ یہ بریف کیس کس کا ہے؟ یا محسن نے اپنے بریف کیس کو ان کے سامنے شناخت کر لیا تو رابعہ کے لیے ان کو اپنے جواب سے مطمئن کرنا مشکل ہو جائے گا۔ اور رضوی صاحب نے شک رفع کرنے کے لیے حکم دیا کہ میرے سامنے بریف کیس کھولو تو رابعہ مجبور ہو جائے گی۔ خود اسے بھی معلوم نہیں کہ بریف کیس میں کیا ہے۔ جب اندر سے ایک سب انسپکٹر کی وردی نکلے گی تو صورت حالات بہت سنگین ہو جائے گی۔ وردی کے ساتھ انسپکٹر کا ریوالور ہی نہیں شناختی کارڈ بھی ہے۔ اس کی ایک جیب میں میرا وہ بیان بھی ہے جو حوالدار اداکتے خان نے تحریر کیا تھا۔ کل تک راولپنڈی سے پولیس آ جائے گی اور رضوی صاحب میری کوئی تصویر دکھا کے تصدیق کر دیں گے کہ دُہرے قتل کی واردات کر کے پولیس کی تحویل سے فرار ہونے والا آغا علی احمد عرش اللہ آبادی میرے سوا کوئی نہیں۔

یہ خیال اتنا پریشان کن تھا کہ میری بھوک اُڑ گئی۔ میں نے فوراً رابعہ کو فون کر کے اسے بریف کیس کی حفاظت کرنے کی تاکید کرنے کا فیصلہ کیا۔ کاؤنٹر پر پہنچ کے میں نے ایک لوکل کال کی اجازت طلب کی۔ مینیجر نے بڑی خوش اخلاقی سے ٹیلی فون میری طرف کھسکا دیا۔ نمبر ڈائل کرنے سے پہلے میں نے سوچا کہ کہیں رضوی صاحب کی لائن پر آبزرویشن نہ ہو۔ میرے اغوا کے بعد انہوں نے ٹیلی فون والوں سے ہر کال ریکارڈ کرنے کا کہا ہو۔ لیکن اغوا کی بات پرانی ہو چکی تھی اور ٹیلی فون والے یہ سمجھتے ہوں کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں تو تین دن بعد آبزرویشن ہٹا دیتے ہیں۔ ہمت کر کے میں نے نمبر ڈائل کیا۔ گھنٹی دو بار بجی۔ پھر رضوی صاحب کی آواز آئی۔ ”رضوی اسپیکنگ۔“

”ایس پی صاحب۔“ میں نے حواس بحال رکھے اور آواز کو تھوڑا سا بدل کے کہا۔ ”مجھے مس رابعہ قاری ایڈووکیٹ سے بات کرنی ہے۔“

”کون صاحب ہیں آپ؟ نام بتائیے اپنا۔“ انکل رضوی نے کہا۔ وہ آواز کے فرق کو محسوس نہیں کر سکے تھے۔

”غلام ربانی ایڈووکیٹ۔“ میں نے کہا۔ غلام ربانی پہلے رابعہ کا معتمد خاص اور ماتحت وکیل تھا۔

”ہولڈ پلیز۔“ رضوی صاحب نے کہا۔ ”میں بلواتا ہوں۔“ اور میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا کیونکہ کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے شخص نے آواز بدل کے بات کرنے پر مجھے چونک کر دیکھا تھا لیکن خاموش رہنا بہتر سمجھا تھا۔ یہ نمبر کسی ایس پی کا تھا۔ میں ایک ایڈووکیٹ تھا اور دوسرے ایڈووکیٹ سے بات کرنا چاہتا تھا چنانچہ آواز کی تبدیلی کو گلے کی عارضی خرابی ہی سمجھا جا سکتا تھا۔ ”غلام ربانی؟“ رابعہ کی حیرت زدہ آواز آئی۔ ”خیریت تو ہے۔ تم اس وقت...؟“

”مس رابعہ ایڈووکیٹ؟“ میں نے پھر اصل آواز میں کہا۔ ”میری ابھی ایس پی صاحب سے بات ہوئی تھی۔“

”سکندر؟“ وہ سرگوشی میں بولی۔ ”یہ تم نے کیا غلطی کی۔ اپنا بریف کیس چھوڑ گئے؟“

”ہاں۔ میرا بریف کیس تمہاری گاڑی میں رہ گیا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”اس وقت کہاں ہے؟“

”انکل رضوی کے پاس؟“ رابعہ نے کہا اور میرا دل ڈوبنے لگا۔ وہ آس پاس موجود ہوتے تو رابعہ ان کا نام نہ لیتی۔ ”کھول کے دیکھا ہے انہوں نے؟“ میں نے کہا۔

”نہیں۔ کوشش کی تھی لیکن اس کا قفل نمبروں والا ہے۔“ رابعہ بولی۔ ”انہوں نے مجھ سے لے کر اپنے کمرے میں رکھ لیا ہے۔ صبح پولیس کی تحویل میں دینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔“

”وہ کیوں؟“ میں نے کہا۔ ”کیا شک ہو گیا ہے انہیں؟“

”پہلے تو شک ہی تھا۔“ وہ بولی۔ ”انہوں نے مجھ سے پوچھا تھا اور میں نے ٹال دیا تھا۔ پھر محسن آ گیا اور سوچے سمجھے بغیر بول پڑا۔ اس نے ایک مونوگرام بنوا رکھا ہے نا۔ وہ پہچان گیا۔ میرے اشارے پر وہ چُپ ہوا مگر رضوی صاحب...“

”انہوں نے تاڑ لیا ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے اس بات کا ڈر تھا۔ تم نے اسے گاڑی میں کیوں نہیں رہنے دیا؟“

”مجھے کیا معلوم تھا کہ اس سے بھی کوئی خرابی پیدا ہوگی۔“ رابعہ نے کہا۔ ”کیا ہے اس میں؟“

”یہ پوچھو کہ کیا نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”وہ پنڈورا کا صندوق ہے۔ اس کے کھلتے ہی ساری آفات نازل ہو جائیں گی۔“

”تم نے مجھے کچھ نہیں بتایا تھا۔“ وہ دُکھ اور خفگی سے بولی۔ ”اب کیا ہو سکتا ہے۔ میرے ساتھ ہی اکرام شیخ پہنچ گیا تھا۔ تم بال بال بچ گئے۔“

”میں نے اسے گزرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ کس لیے آیا تھا وہ؟“ میں نے کہا۔

”اپنا استعفا دینے؟“ رابعہ نے کہا۔ ”میرا خیال تھا وہ سخت مشتعل ہوگا اور مجھے دیکھتے ہی جھپٹ پڑے گا۔ رضوی صاحب کو ایک ایک بات بتا دے گا لیکن وہ بہت دل گرفتہ اور خاموش تھا۔ اس نے استعفا ہی نہیں، اپنی وردی، شناختی کارڈ، ریوالور سب انکل رضوی کے سامنے رکھے اور کہا کہ میں ابھی اسی وقت پولیس کی ملازمت چھوڑ رہا ہوں۔ استعفا منظور ہو یا نامنظور۔ مجھے پروا نہیں۔ یہ ڈسپلن کے خلاف ہے تو آپ جو کارروائی کرنا چاہیں کر لیں۔ رضوی صاحب نے دیکھ لیا تھا کہ وہ جذباتی ہو رہا ہے اور ذہنی انتشار کا شکار ہے۔ انہوں نے کہا کہ تم فیصلہ کر ہی چکے ہو تو میں زبردستی نہیں کر سکتا لیکن اس فوری فیصلے کا سبب تو بتا دو۔ اس نے صرف اتنا کہا کہ میں اپنا فرض ادا کرنے میں ناکام رہا۔ مجھے سکندر بخت کو گرفتار کرنے کا موقع ملا تھا لیکن میں اسے گرفتار نہیں کر سکا۔ پھر وہ واپس چلا گیا کوئی تفصیل بتائے بغیر۔ لیکن اس کے بعد انکل رضوی نے مجھے طلب کر لیا اور جرح شروع کر دی۔ ابھی کہاں سے آئی ہو؟ محسن کا بریف کیس تمہیں کس نے دیا؟ تم تو خالی ہاتھ گئی تھیں۔ میں نے کہا کہ بریف کیس پہلے سے گاڑی میں موجود تھا اور محسن کا نہیں ہے۔ اسے غلط فہمی ہوئی ہے۔ ذرا محسن کی طلبی ہوئی۔ اسے کیا معلوم کہ میں نے ابھی ابھی کیا بیان دیا ہے لیکن اس نے میری صورت پر ہوائیاں اُڑتے دیکھیں تو تاڑ گیا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ اور جب بریف کیس دکھا کر اس سے پوچھا گیا کہ کیا یہ تمہارا ہے تو اس نے بڑے غور سے اس کا معائنہ کیا اور پھر انکار کر دیا کہ مجھے غلط فہمی ہوئی تھی۔ رضوی صاحب آپے سے باہر ہو گئے۔ بہت بگڑے کہ مجھے بے وقوف سمجھتے ہو۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ رابعہ نے تمہیں اشارہ کیا تھا لیکن سچ تمہاری زبان سے پہلے ہی نکل چکا تھا۔ اب اپنے ہی سچ کو جھوٹ ثابت کر کے میری آنکھوں میں دُھول جھونکتے ہو۔ تم دونوں کو معلوم ہے سکندر کہاں ہے۔ اس کے بعد انہوں نے بریف کیس اپنے کمرے میں رکھوا دیا کہ صبح تفتیش ہو گی، جس کا بریف کیس ہوگا اسے بل جائے گا۔“

”رابعہ صبح ہونے سے پہلے وہ بریف کیس وہاں سے غائب کر دو۔“ میں نے کہا۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ رابعہ نے کہا۔ ”شک کی زد میں براہِ راست میں اور محسن آ گئے۔ اس کے علاوہ ان کی خواب گاہ میں جانا اور بریف کیس چُرانا ناممکن ہے۔“

”تم محسن سے کہو۔“ میں نے کہا۔ ”انکل صبح جلدی اٹھتے ہیں اور گھاس پر چہل قدمی کرتے ہیں۔ دس پندرہ منٹ تک اس وقت کمرے میں کوئی نہیں ہوتا۔“

”میں پھر کہتی ہوں سکندر کہ یہ بہت خطرناک کام ہے۔“ رابعہ نے کہا۔

”تمہیں اندازہ نہیں ہے رابعہ کہ اس بریف کیس کی وجہ سے میں کتنی مشکل میں پڑ سکتا ہوں۔“ میں نے برہمی سے کہا۔ ”جو کچھ میں نے اب تک کیا ہے۔ اور جو میں کرنا چاہتا ہوں سب خاک میں مل جائے گا۔ تمام عمر پچھتاؤ گی تم کہ ایک چھوٹا سا کام نہیں کیا تھا۔“

”اچھا۔ میں اسے غائب کر دوں گی۔ پھر جو ہوگا دیکھا جائے گا۔“ رابعہ نے کہا۔ ”مجھ میں اب اور چھپانے کا حوصلہ نہیں ہے۔“

”آئی ایم سوری رابعہ۔ میں تم کو دھمکی نہیں دے رہا تھا۔ بلیک میل نہیں کر رہا تھا۔“ میں نے شرمندگی سے کہا۔ ”میں خود آتا ہوں۔ تمہیں اور محسن کو سب بتا دیتا ہوں۔“ میں نے ریسیور رکھ دیا۔ بل کے علاوہ میں نے کال کے پانچ روپے ادا کیے لیکن اس سے مینیجر کی تشفی نہیں ہوئی۔ اس نے گفتگو کا ایک ایک لفظ سنا تھا اور جو کچھ سنا تھا وہ انتہائی سنسنی خیز، پُراسرار اور پریشان کن تھا۔

”یہ کیا سلسلہ ہے مسٹر؟“ وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ”کس ایس پی کے گھر فون کیا تھا۔ نمبر بتائیں۔“

”ایس پی آغا احمد علی عرش اللہ آبادی کے گھر۔“ میں نے متانت سے کہا اور اسے ایک نمبر بتا دیا جو کسی زمانے میں چراغ دین کے گھر کا نمبر تھا۔ اس نے کچھ سوچ کر سر ہلایا اور نمبر لکھ لیا اور مجھ سے کہا کہ ریکارڈ رکھنے کے لیے یہ ضروری تھا۔ میرا نام وہ پہلے ہی لکھ چکا تھا۔ میں کسی گھبراہٹ کا مظاہرہ کیے بغیر اطمینان سے چلتا ہوا باہر آ گیا۔ مال روڈ کی اِکّا دُکّا دکانیں اب بھی کھلی ہوئی تھیں۔ میں نے رابعہ سے کہہ تو دیا تھا کہ میں آ رہا ہوں لیکن یہ نہیں بتا سکا تھا کہ میں کس وقت اور کس طرف سے آؤں گا۔ اتنا تو وہ خود بھی سمجھ سکتی ہے کہ میں اس طرح اندر نہیں جا سکتا جیسے پہلے جاتا تھا۔ میں چھپ کر جاؤں گا تو اسی کھڑکی کے راستے اندر پہنچوں گا جو رابعہ کے بیڈ روم کی کھڑکی تھی اور احاطے کے اندر بائیں جانب کھلی تھی۔ میرے ذہن میں خیالات کا ایسا انتشار تھا کہ میں یکسوئی کے ساتھ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں تھوڑی دور ہی پیدل گیا تھا کہ مجھے سوٹ کیس اور چمڑے کے سامان کی ایک دکان میں روشنی نظر آئی۔ ایک فوری خیال کے تحت میں نے تھوڑے سے کھلے ہوئے شٹر سے جھانک کر دیکھا۔ اندر پروپرائٹر ایک میز پر بیٹھا دن بھر کی فروخت کا حساب کر رہا تھا۔ شٹر بجا کے میں نے اسے متوجہ کیا۔ ”دکان بند ہو گئی ہے۔“ اس نے وہیں سے جواب دیا۔

"مجھے معلوم ہے۔ آپ ذرا ایک منٹ کے لیے قریب آ کے میری بات سن لیں۔" میں نے انتہائی عاجزی سے کہا۔

اُس نے میری صورت، حلیے اور لہجے سب پر غور کیا اور ہم کیش کو مقفل کر کے آگے آیا۔ "فرمایئے؟"

"بات یہ ہے جناب کہ ابھی ایک ریسٹورنٹ سے کوئی میرا بریف کیس لے بھاگا۔" میں نے کہا۔ "میں کھانا کھا رہا تھا۔ اب مجھے رات کی فلائٹ سے کراچی جانا ہے۔ مجھے ایک بریف کیس کی اشد ضرورت ہے۔ پیسہ تو گیا سو گیا۔ اس کے ساتھ کاغذات بھی گئے۔ غنیمت ہے ٹکٹ گھر پر تھا...!"

اس نے شٹر اوپر اٹھا دیا۔ "دیکھ لیجیے آپ کو کون سا پسند ہے؟ لیکن ذرا جلدی۔" اس نے ایک شیلف میں لگے ہوئے بریف کیسوں کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے سر ہلایا اور سب پر نظر ڈالتا گیا۔ نمبر لاک والے بریف کیس بہت تھے مگر کسی کا سائز مختلف تھا۔ کوئی زیادہ موٹا تھا یا بہت پتلا۔ پھر مجھے ایک بریف کیس ویسا ہی نظر آ گیا۔ اس پر مصنوعی مگرمچھ کی کھال جیسا کور تھا۔ فرق رنگ کا تھا۔ محسن کا بریف کیس سیاہی مائل براؤن تھا، یہ ڈارک براؤن۔ لیکن اتنا فرق چل سکتا تھا۔ دکاندار نے اس کی قیمت تین سو بتائی اور ڈھائی سو قبول کر لی۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور دکان سے باہر آ گیا۔ محسن اور رابعہ کا کام اب کچھ آسان ہو گیا تھا۔ چرانے کے بجائے اب بریف کیس بدلا جا سکتا تھا۔ صبح اگر رضوی صاحب کو رنگ کے فرق کا احساس بھی ہوا تو وہ سمجھیں گے کہ رات کو بلب کی روشنی میں اور صبح سورج کی روشنی میں دیکھنے سے ان کو رنگ کچھ ہلکا لگ رہا ہے۔ مونوگرام کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ ایک اسٹکر تھا اور محسن اسے کسی دشواری کے بغیر اکھاڑ کے نئے بریف کیس پر لگا سکتا تھا۔ سب سے نمایاں پرانے اور نئے کا فرق تھا۔ محسن کو یہ سمجھانا پڑے گا کہ بدلنے سے پہلے وہ نئے کو پرانا بنا دے۔ مٹی دھول میں، بگڑ کے اور کور کو میلا کر کے۔

اب میں جلد از جلد انکل رضوی کے گھر پہنچنا چاہتا تھا لیکن گھڑی میں دس بجے تھے۔ رضوی صاحب کا گیارہ بارہ بجے تک جاگتے رہنا بھی ممکن تھا۔ وہ پہلے بھی مصروف تھے اور اب مجھے خود رابعہ نے بتا دیا تھا کہ ان کا نروس بریک ڈاؤن ہو رہا ہے اور آج کے واقعات کا ان کے ذہن پر اثر ہونا لازمی ہے۔ سوچنا مجھے یہ بھی تھا کہ اس بریف کیس میں کیا بھروں۔ پھر میں نے اس مسئلے کو محسن اور رابعہ پر چھوڑ دیا۔ وہ خود باہمی مشورے سے سب ٹھیک کر لیں گے۔ انکل رضوی کے ذہن سے شک کو مٹانا تو ان کے لیے ممکن نہ ہو گا لیکن وقتی طور پر رابعہ کی پوزیشن محفوظ ہو جائے گی۔

مجھے افسوس تھا کہ میری وجہ سے شیخ کو مستعفی ہونا پڑا اور پولیس، مستقبل کے ایک دیانت دار فرض کو جان کا قرض سمجھنے والے ذہین پولیس افسر سے محروم ہو گئی۔ اس کے اپنے گھر کی فضا مکدر ہوئی۔ نہ جانے اس کے بعد کیا ہو گا۔ نازو چھوٹی بہن تھی۔ بڑا بھائی پولیس افسر تھا جو اس سے شکست کھا گیا تھا۔ شیخ دل میں میل رکھنے والا آدمی نہیں تھا۔ مگر نازو کی اس حرکت کا وہ کیا مطلب نکالے گا؟ خود نازو کے والدین کی نظر میں میری پوزیشن گر گئی تھی۔ اور اب میرے لیے اس گھر میں قدم رکھنا بھی محال تھا حالانکہ اب شیخ سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہ رہی تھی۔ وہ پولیس کی ذمے داریوں سے سبکدوش ہونے کے بعد صرف دوستی نبھا سکتا تھا لیکن مسئلہ اس سے کہیں زیادہ الجھا ہوا تھا۔ میں رابعہ کی خاطر دنیا کو چھوڑ سکتا تھا اور نازو اتنی ضدی لڑکی تھی کہ مجھے اس سے خوف آتا تھا کیونکہ میں نے اس کی محبت کو ٹھکرا دیا تھا۔

میں اطمینان سے پیدل چلتا جا رہا تھا۔ ایک موڑ پر پلٹ کر دیکھنے سے مجھے اسٹریٹ لائٹ کے نیچے دو افراد نظر آئے۔ اگر وہ تیزی سے اندھیرے کی پناہ نہ لیتے تو مجھے کوئی شک نہ ہوتا لیکن ان کی اس حرکت نے مجھے چوکنا کر دیا۔ میں موڑ کاٹ کے ایک جگہ سڑک کے کنارے لگے ہوئے لیٹر بکس کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ وہ دونوں میرے سامنے سے گزرے۔

"کہاں گیا وہ؟" ان میں سے ایک نے تشویش سے کہا۔ وہ مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر کھڑے تھے۔

"جائے گا کہاں؟" دوسرا بولا۔ "ابھی دیکھ لیتے ہیں۔" پھر اس نے ایک رکشا کو روک لیا۔ رکشا کچھ دور جا کے رکا چنانچہ میں ان کی بات نہ سن سکا لیکن روشنی پڑتے ہی میں نے ان کی صورت کو پہچان لیا۔ ایک بار دلاور نے میرے سامنے چھ جعلی فورمین پیش کیے تھے۔ یہ انہی میں سے دو تھے۔ رکشا روانہ ہو گیا تو میں لیٹر باکس کے پیچھے سے نکلا اور سوچنے لگا کہ یہ فرشتے کب اور کہاں سے میرے تعاقب میں تھے اور کہاں گئے ہیں؟ "ابھی دیکھ لیتے ہیں" کا کیا مطلب ہے؟ کیا انھوں نے ریسٹورنٹ میں ٹیلی فون پر میری اور رابعہ کی گفتگو سنی تھی اور وہیں سے میرے پیچھے لگ گئے تھے؟ اس سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جا سکتا تھا کہ رکشا میں وہ مجھ سے پہلے وہاں پہنچ جائیں گے جہاں ان کو میرے پہنچنے کا یقین ہے۔ اگر بریف کیس بدلنے کا مسئلہ اتنا سنگین نہ ہوتا تو میں اپنا پروگرام یقیناً ملتوی کر دیتا۔

گیارہ بجے کے بعد میں نے رکشا کو دھرمپورہ نہر کے پل سے سیدھے ہاتھ مڑتے ہی روک لیا۔ حالات بدل گئے تھے۔ اب میں دندناتا ہوا سردار تو کیا کوئے جاناں تک بھی نہیں جا سکتا تھا۔ نصف فرلانگ کا فاصلہ میں نے بہت احتیاط کے ساتھ کسی درخت یا دیوار کے سائے میں ٹھہر ٹھہر کے طے کیا۔ چاند ابھی نہیں نکلا تھا لیکن کسی کسی کھمبے پر روشن بلب کا اجالا سایوں کو تاریکی سے اس حد تک جدا کرنے میں کامیاب تھا کہ کہیں حرکت ہوتی تو منتظر نگاہیں ضرور دیکھ سکتی تھیں۔ چشم براہ تو رابعہ کی آنکھیں بھی ہوں گی لیکن اس کے علاوہ شکاری آنکھیں بھی تاک میں ہو سکتی تھیں۔ احتیاط کے خیال سے میں نے بڑے دروازے سے داخل ہونا مناسب نہ سمجھا۔

فضا میں خنکی بڑھ گئی تھی اور موسم سرما کی آمد کا پتا شہر کے کوچہ و بازار سے بھی چلتا تھا جہاں وہ رونق نظر نہ آتی تھی جو گرمیوں میں شام سے نصف شب کے بعد تک لوگوں کو گھر سے باہر رکھتی تھی۔ اب تو دس بجے ہی آدھی رات کا گماں ہوتا تھا اور ٹی وی پروگرام ختم ہونے کے بعد بہت کم لوگ جاگتے تھے۔ رضوی صاحب کے ساتھ والے گھر میں بھی اندھیرا تھا۔ میں خالی بریف کے ساتھ اطمینان سے اندر داخل ہوا اور اس دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگا جو رضوی صاحب کی کوٹھی کو اس کوٹھی سے جدا کرتی تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ اگر مجھ سے پہلے ہی آ کے گھات میں بیٹھ جانے والے دیوار کی دوسری جانب ہوں گے تو اس سکوت میں میری آواز پا بھی سن لیں گے چنانچہ میں محتاط تھا۔ تعجب تو مجھے اس بات پر بھی تھا کہ دو شکاری کب اور کیسے میرے پیچھے لگ گئے تھے لیکن اس سے زیادہ حیرت مجھے ان کے اعتماد پر تھی۔ رکشا میں بیٹھتے وقت انہیں یقین تھا کہ میں بچ کر کہیں نہیں جا سکتا اور وہ اس یقین کے ساتھ روانہ ہوئے تھے جیسے میری منزل کا پتا وہ پہلے سے جانتے تھے۔

ہاتھوں کے بل پر خود کو تھوڑا سا بلند کر کے میں نے دیوار پر سے دوسری جانب جھانکا۔ اس گوشۂ چمن کا پتہ پتہ بوٹا بوٹا شبنم میں بھیگی ہوئی گھاس۔ خوابیدہ درخت، سب میرے دیرینہ ہمدم و ہمراز تھے لیکن اس وقت وہ بھی اجنبی ہو گئے تھے۔ میں نے نظر جما کے دیکھا اور تاریکی میں ایک جگنو سا فروزاں دیکھ لیا۔ اگر میں سامنے والے دروازے سے اندر آتا تو جھاڑی کے پیچھے دبکے ہوئے اس شخص کو ہرگز نہ دیکھ پاتا جو وہاں اطمینان سے چھپ کر سگریٹ پی رہا تھا۔ اس یقین کے ساتھ کہ پتوں کی گھنی دیوار کے پیچھے یہ چنگاری کسی کو نظر نہیں آ سکتی۔

میں نے اس کے دوسرے ساتھی کو تلاش کیا اور ناکام رہا۔ اگر وہ بھی اندر تھا تو کسی ایسے مقام پر مورچہ بند بیٹھا تھا جہاں میری نظر کی رسائی نہ تھی۔ یہ بالکل ناممکن تھا کہ میں دیوار پر چڑھ کے دوسری جانب اتروں اور بے خبری میں اس کو دبوچ لوں۔ فاصلہ بہت کم تھا اور خاموشی اتنی گہری تھی کہ میرے دیوار پر چڑھنے کی سرسراہٹ بھی اسے متوجہ کر سکتی تھی۔ پھر دوسری طرف جا کے مجھے چند قدم چلنا تھا اور خواہ میں کتنی ہی احتیاط سے قدم کیوں نہ رکھتا، خشک گھاس اور سوکھے پتوں کی پکار اسے چوکنا کر دیتی۔ کچھ بائیں طرف مجھے رابعہ کے بیڈ روم کی کھڑکی کھلی نظر آ رہی تھی۔ اندر زیرو واٹ کے بلب کا برائے نام اجالا یہی فریب دیتا تھا کہ اندر جو بھی ہے محوِ خواب ہے مگر میں جانتا تھا کہ وہ جاگ رہی ہو گی۔ ایک میرے انتظار کی خلش تھی، میری ذات سے وابستہ اندیشہ ہائے دور و دراز تھے اور فکرِ سود و زیاں تھی۔ اس کی آنکھوں کے لیے نیند کہاں۔ اندر اپنی خواب گاہ میں محسن بھی جاگ رہا تھا۔ رفاقتوں کے یہ سلسلے نہ ہوتے تو وہ دونوں اپنے اپنے گھروں میں ساری دنیا کی طرح چین سے سوتے لیکن محسن میرے ماضی کا امین تھا تو رابعہ میرے مستقبل کی مالک تھی۔

گھات میں بیٹھے ہوئے شکاری کو فریب کے جال میں الجھا کے باہر بلانا بہت مشکل تھا۔ اور اندر محاذِ جنگ کھولنا خود اپنے منصوبے کی ناکامی کا سامان کرنے کے مترادف تھا۔ شور و غل پر رضوی صاحب تیسرے فریق بن کے آ جائیں گے اور دونوں کو پکڑ لیں گے۔ وہ پکڑا جاتا تو میری بلا سے لیکن اس مرحلے پر میں اپنی آزادی کسی قیمت پر گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ صبر کے ساتھ انتظار کے علاوہ میں کیا کر سکتا تھا۔ ایک امید یہ تھی کہ شاید وہ مایوس ہو جائیں۔ آخر کب تک وہ انتظار کریں گے؟ بالآخر انہیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان سے اندازے میں غلطی ہوئی اور اب میں یہاں نہیں آؤں گا۔ رضوی صاحب کے ڈرائنگ روم میں لگے ہوئے خاندانی کلاک نے بارہ گھنٹے بجا کے نئے دن کے آغاز کا اعلان کیا۔ میں مسلسل دیوار پر لٹکا نہیں رہ سکتا تھا، چنانچہ وقفے وقفے سے میں تانک جھانک میں مصروف رہا لیکن وہ خبیث انتہائی مستقل مزاجی کے ساتھ وہیں براجمان نظر آیا۔ میرے ذہن میں اس کو اٹھانے اور وہاں سے کھسکانے کی کوئی تدبیر نہ آئی۔ یہ ڈرا لگ رہا کہ جس کوٹھی کی سرحد میں، میں نے خود آبرو دشمن قائم کر رکھی تھی اس کا کوئی مکین مجھے چور نہ سمجھ لے لیکن تاریخ بدلتے ہی حالات بدل گئے۔ اچانک اندر سے رضوی صاحب برآمد ہوئے۔ انھوں نے نائٹ گاؤن پہن رکھا تھا اور اپنے دونوں ہاتھ اس کی جیبوں میں ڈال رکھے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ ذہنی بے سکونی کے باعث وہ نیند سے محروم ہیں۔ انھوں نے لان پر ٹہلنا شروع کیا۔ وہ لان کے دوسرے کنارے سے عین اس جھاڑی تک آتے تھے جس کے پیچھے غنیم کے لشکر کا تنہا سپاہی چھپا بیٹھا تھا۔ کئی بار مجھے یوں لگا کہ وہ جھاڑی سے کترا کے آگے نکل آئیں گے لیکن وہ میکانکی انداز میں پلٹ گئے۔ اگر وہ چند قدم آگے آ جاتے تو وہ شخص چھپا نہ رہ سکتا اور پھر یا تو وہ حملے میں پہل کرتا اور رضوی صاحب کو خاموش کر دیتا یا جوتیاں بغل میں دبا کے بھاگ جاتا۔ اگر وہ حملہ کرتا تو مجھے ان کو بچانے کی خاطر بے خطر آتش نمرود میں کودنا پڑتا اور اس احسان کا بدلہ انکل رضوی یوں چکاتے کہ مجھے فوراً گرفتار کر لیتے۔

پھر اچانک میرے ذہن میں ایک ترکیب آ گئی۔ اس میں تو شبے کی بات ہی نہیں تھی کہ خود وہ شخص بھی خوف اور اضطراب کی کیفیت میں مبتلا ہو گا اور اس کے اعصاب کے تار اس حد تک کشیدہ ہوں گے کہ خفیف سا صدمہ بھی برداشت نہ کر سکیں گے۔ جیسے جیسے رضوی صاحب کے قدم اس کی طرف بڑھتے ہوں گے اپنی موجودگی کا راز افشا ہونے کا خوف بڑھتا جاتا ہو گا اور وہ پلٹتے ہوں گے تو اطمینان کے ایک لمحے میں وہ دعا کرتا ہو گا کہ اس چکر کے بعد وہ اندر چلے جائیں۔ میں نے نیچے سے تقریباً ایک پاؤ کا پتھر اٹھایا۔ بریف کیس کو دیوار سے لگا کے کھڑا کیا اور خود اس کے اوپر چڑھ گیا۔ اب میرا سر دیوار سے چند انچ اوپر تھا۔ اندیشہ بس یہ تھا کہ کہیں بریف کیس میرے وزن سے ٹوٹ نہ جائے یا دیوار سے رگڑ کھا کے پھسل نہ جائے لیکن مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ رضوی صاحب جیسے ہی جھاڑی تک پہنچ کے واپس ہوئے میں نے اطمینان سے نشانہ لیا اور پوری قوت کے ساتھ وہ پتھر اس کی کمر پہ دے مارا۔

اسے چوٹ یقیناً آئی ہو گی لیکن وار اتنا غیر متوقع تھا کہ وہ چلا پڑا۔ رضوی صاحب ایک دم پلٹے اور اس سے پہلے کہ وہ شخص سنبھلتا، رضوی صاحب نے اس کی گردن دبوچ لی۔ وہ حشمت خان ٹائپ تندوری پیٹ والے تھانیدار نہیں تھے، اعلیٰ پولیس افسر تھے اور انہوں نے خود کو جسمانی طور پہ ہمیشہ فٹ رکھا تھا۔ میرا شکاری خود شکار ہو گیا۔

"کون ہو تم؟" رضوی صاحب نے گرج کر کہا "یہاں کیا کر رہے ہو؟ کیوں چھپے بیٹھے تھے؟" اب ان کی ساری توجہ زیرِ حراست ملزم کی طرف تھی چنانچہ میں اطمینان سے سارا تماشا دیکھ سکتا تھا۔ اس شخص کے پاس جواب تھا ہی نہیں۔ اس نے واجبی سی مزاحمت کی اور خود کو چھڑا کے بھاگنا چاہا لیکن حیرت انگیز طور پر رضوی صاحب نے کسی پیشہ ور باکسر کی طرح وار کر کے اسے ناک آؤٹ کر دیا۔ ہنگامے نے اندر ان کی بیگم کو متوجہ کر لیا تھا۔ انہوں نے باہر کی لائٹ جلائی۔ دو منٹ بعد وہ خود نکلیں۔ پھر ان کا نوکر اور آخر میں محسن۔

"اسے لے جاؤ اندر۔" رضوی صاحب نے حکم دیا "اور باندھ کے ڈال دو۔"

محسن اور رضوی صاحب کا ملازم نیم بے ہوش شخص کو تقریباً گھسیٹتے ہوئے اندر لے گئے۔

"کون تھا یہ؟" بیگم رضوی نے تشویش زدہ لہجے میں پوچھا "کچھ ہوا تو نہیں آپ کو؟"

"نہیں۔" رضوی صاحب نے سکون سے کہا "کوئی چور معلوم ہوتا ہے۔ یہاں چھپا ہوا تھا جھاڑی کے پیچھے۔"

"آپ نے کیسے دیکھ لیا؟" بیگم رضوی نے حسِ تجسس کے باعث بیویوں کی طرح بے موقع جرح کی۔

"ارے بھئی مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔" رضوی صاحب نے چڑ کر کہا "ٹہل رہا تھا باہر۔ اسے شاید کسی کیڑے مکوڑے نے کاٹ لیا۔"

میرے لیے یہ مناسب ترین موقع تھا جب کوئی میری طرف متوجہ نہ تھا۔ میں نے بریف کیس کو دیوار پہ رکھا، خود کو بلند کیا اور دوسری طرف اتر گیا۔ بریف کیس اٹھا کے میں دبے پاؤں اس گلی میں غائب ہو گیا جس میں کھلنے والی رابعہ کے بیڈ روم کی کھڑکی مجھے پناہ دینے کے لیے بلا رہی تھی۔ میں کھڑکی کے راستے کمرے میں وارد ہوا تو رابعہ ایک دم اٹھ بیٹھی۔

"یہ باہر کیا ہو رہا تھا؟" رابعہ نے جس لہجے میں کہا اس سے اس کے دلی اضطراب کی کیفیت کا اندازہ ہو رہا تھا۔

"انکل رضوی نے ایک چور کو گرفتار کیا ہے۔" میں نے بشاشت سے کہا "کیا دیدہ دلیری ہے۔"

"میں تو ڈر گئی تھی کہ تم پکڑے گئے۔" رابعہ نے سرگوشی کی۔

"بات یہ ہے خاتون۔" میں نے کہا "کہ آیا تو وہ بدبخت مجھے پکڑنے تھا لیکن وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔"

"تم جانتے ہو اسے؟" رابعہ نے کہا۔

"ہاں۔ بڑے کام کا آدمی ثابت ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "آپ کو شاید یاد ہو کہ ایک دن میری اپنی فیکٹری میں مجھے زرعی آلات کی جگہ کریٹ میں بند کر دیا گیا تھا اور یہ کارنامہ چھ افراد نے انجام دیا تھا جن کو میرے سامنے فورمین بنا کر پیش کیا گیا تھا۔ یہ انہی میں سے ایک ہے۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ اسے میرے حوالے کر دیا جائے؟"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" رابعہ نے کہا "انکل اسے پولیس کے حوالے کریں گے۔ وہ مسلح بھی تھا؟"

"یقیناً ہو گا۔" میں نے کہا "اچھا تم ذرا اندر جا کے انکل کی خیریت معلوم کرو۔ ویسے وہ بالکل خیریت سے ہیں اور محسن کے ساتھ مل کے ایک بیان دے دو کہ یہ مجھے اغوا کر کے لے جانے والوں میں سے ایک ہے۔ تم دونوں کی شناخت سے تفتیش کی لائن بدل جائے گی اور اسے اچھی طرح ٹھوک بجا کے پوچھا گیا تو ممکن ہے وہ بہت سے انکشافات کرے۔ ورنہ تو وہ اتنا کہہ کے بچ جائے گا کہ چوری کی نیت سے آیا تھا۔ اس سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ وہ باقی پانچ فورمین کون تھے؟"

فوری طور پر کسی کے ادھر آنے کا امکان نہیں تھا اس لیے

رابعہ کی واپسی تک میں اطمینان سے لیٹا رہا۔ وہ تقریباً پندرہ منٹ کے بعد آئی۔ رضوی صاحب کا فون خراب نہ ہوتا تو پولیس فوراً آ جاتی۔ فی الحال ملزم کو باندھ کر باتھ روم میں ڈال دیا گیا تھا۔ رابعہ اور محسن کے بیان پر اس کی حالت غیر ہو گئی تھی۔ رضوی صاحب نے اس پہ واضح کر دیا تھا کہ وہ اغوا کرنے والے باقی افراد کے نام بتا دے۔ یہ بتا دے کہ اسے کس نے اغوا پہ مامور کیا تھا اور وہ سکندر کو اغوا کرنے کے بعد کہاں لے گئے تھے تو اسے کچھ نہیں کہا جائے گا۔ ورنہ اس کی کھال کے جوتے بنوا کے ہر تھانے میں تفتیش کے لیے رکھوا دیے جائیں گے۔ معلوم کرنے والے سب معلوم کر ہی لیں گے۔"

"اس وقت گھر میں خاصی ہلچل ہے۔" میں نے کہا "ابھی کون سوئے گا۔ کسی کو بھی نیند نہیں آئے گی۔ تم انکل کے ساتھ ڈرائنگ روم میں رہو۔ مجھے یہ بتا دو کہ وہ بریف کیس کہاں ہے؟ میں یہ بریف کیس لایا ہوں۔"

رابعہ نے مایوسی سے سر ہلایا "اب کیا فائدہ؟" وہ بولی "انکل نے اسے کھول کر دیکھ لیا تھا قفل توڑ کے۔ اور بریف کیس اب ان کی الماری میں مقفل ہے۔"

"او مائی گاڈ!" میں نے سر پکڑ کے کہا "یہ تو بہت برا ہوا لیکن رابعہ مجھے بہرحال وہ بریف کیس حاصل کرنا ہو گا اس سے پہلے کہ میرے خلاف یہ شہادت ریکارڈ پہ آئے۔ مجھے معلوم ہے الماری کی چابیاں ان کے تکیے کے نیچے ہوں گی۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو سکندر!" رابعہ نے بے بسی سے کہا "صبح انکل کو خالی بریف کیس ملے گا تو الزام کس پہ آئے گا؟ سب سے پہلے مجھ پر اس کے بعد محسن پہ۔" اسی وقت محسن اندر آیا۔ اس نے رابعہ کی پوری بات سن لی تھی اور سب سمجھ گیا تھا۔

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ انکل کے ساتھ موجود رہو، تم دونوں۔" میں نے کہا۔

"مگر اس سے کیا فرق پڑے گا۔ کیا تم انکل کو جھوٹا بناؤ گے؟" رابعہ نے پریشانی سے کہا "وہ ہم دونوں سے ذکر کر چکے ہیں۔"

"صرف ذکر کیا تھا یا تمہیں... خود تم نے دیکھا تھا کہ اس میں کیا ہے؟" میں نے کہا۔

محسن نے حیرانی سے میری طرف دیکھا "اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"تمہارا مطلب ہے ہم بھی ان کے بیان کی تائید نہ کریں؟" رابعہ نے کہا "یہ کہیں کہ ایس پی صاحب! ہم نے تو آپ کے لبوں سے ایک بات سنی تھی، دیکھا کچھ نہیں تھا۔ ہمیں کیا معلوم کہ آپ جھوٹ بول رہے تھے یا سچ۔ سوچو ذرا اس کے بعد ان کی نظر میں ہماری کیا عزت رہے گی؟ اس شخص کو زمانہ دیانتدار تسلیم کرتا ہے اور جس کے ہم پر اتنے احسانات ہیں اور جس کے لیے ہم اپنے ہی بچوں کی طرح ہیں، ہم اس کو منہ پہ جھوٹا کہہ دیں؟"

"اگر تم نے ایسا نہ کیا تو میں دہرے قتل کے ایک اور جھوٹے الزام میں پھنس جاؤں گا۔" میں نے برہمی سے کہا "جو راولپنڈی میں درج ہے۔ وہاں میں نے اپنا جھوٹا نام لکھوا دیا تھا اور یہ تائید ایزدی تھی کہ میں اغوا کرنے والوں کی قید سے ہی نہیں، پولیس کے ہاتھ پڑنے کے بعد حوالات سے فرار ہونے میں بھی کامیاب ہو گیا۔ جب تک یہ ثبوت نہ ملے کوئی مجھے وہی مفرور مجرم قرار نہیں دے سکتا، محض صورت کی مشابہت پہ نہیں پکڑ سکتا۔ میں ثابت کر سکتا ہوں کہ میں لاہور میں تھا۔"

"بات ثابت کرنے کی نہیں...!" محسن نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا "ہم دونوں کیسے انکار کر سکتے ہیں۔"

"تم تو وکیل ہو رابعہ، مجھے بتاؤ کہ میرے خلاف دہرے قتل سمیت کچھ اور مقدمات راولپنڈی میں درج ہو گئے تو کیا ہو گا؟ تم کہاں کہاں پیروی کرو گی؟ اور کیا اس کے بعد میرے ضمانت پہ رہا ہونے کی کوئی صورت رہے گی؟" میں نے کہا۔

"ضمانت تو ویسے بھی منسوخ ہو چکی ہے تمہاری۔" وہ بولی۔

"ہاں لیکن انہی مقدمات میں جو یہاں درج ہیں۔" میں نے کہا۔ "شیدے اور عبدل کا کیس تو تقریباً ختم ہو چکا۔ صرف میر شرافت علی کے قتل کا الزام ہے جو اتنا ہی بے بنیاد ہے جتنا یہ راولپنڈی والا الزام۔ مقصد مجھے جیل پہنچانا ہے۔ تم جیل کے اندر کے حالات جانتی ہو۔ میں ایک بار بند ہو گیا تو اس زندگی میں باہر نہیں آ سکوں گا۔ دشمنوں کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ میرے خلاف اندر ہی اندر مقدمات کی تعداد بڑھتی جائے گی۔ مجرم اندر پاگل بھی ہو جاتے ہیں، مر بھی جاتے ہیں۔"

"بس بس... اور کچھ مت کہو۔ میں سب کچھ جانتی ہوں۔" وہ چہرے کو دونوں ہاتھوں سے چھپا کے رونے لگی "لیکن میں یہ جھوٹ کیسے بولوں؟ اور پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اسی گھر میں رہوں؟" محسن نے اس کے شانے پہ تھپکی دی اور تائید میں سر ہلایا۔

"یہ انتخاب تو تم کو کرنا پڑے گا، اسی وقت۔" میں نے کہا "یہ ٹھیک ہے کہ انکل رضوی تم دونوں سے وقتی طور پہ بدظن ہو جائیں گے۔ وہ دوبارہ تمہاری صورت بھی دیکھنا گوارا نہیں کریں گے اور ان کو بہت صدمہ ہو گا۔ لیکن دوسری طرف تمہارے سچ کا خمیازہ مجھے بھگتنا پڑے گا۔ میں جانتا ہوں، راولپنڈی میں دہرے قتل کی واردات میں نے نہیں کی لیکن وہاں کے حالات اور واقعات کی ساری گواہی میرے خلاف ہے۔ سو فیصد۔ مجھ پر ناجائز اسلحہ رکھنے کا، پولیس افسر پہ تفتیش کے دوران

حملہ کرنے کا اور تھانے سے فرار ہونے کے الزامات الگ ہیں۔ تم کیا، پاکستان کے بڑے بڑے وکیلوں کا پینل بھی مجھے سزا سے نہیں بچا سکتا۔ ایسے سچ کا کیا فائدہ رابعہ جو کسی بے گناہ کو تختۂ دار تک پہنچا دے۔"

"لیکن یہ جھوٹ بہت مشکل ہے، بہت مشکل۔" وہ روتے روتے بولی۔ "میں خود اپنی نظروں میں گر جاؤں گی کہ میں نے کیسے جھوٹا کہا۔ تم خود بھی یہ نہیں کر سکتے تھے۔"

"میرے لیے تمہارا یہ جھوٹ اشد ضروری ہے۔" میں نے کہا۔ "اس لیے کہ میں سچ کو ثابت کرنے کے لیے آزاد رہوں۔ میرے ہاتھ بندھے ہوئے ہوں گے رابعہ تو ان کی گردن تک کیسے پہنچیں گے جو اصل مجرم ہیں جو سب کچھ جانتے ہیں لیکن اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے مجھے مجرم بنانے پر کمربستہ ہیں۔ مجھے قربانی کا بکرا بنانے والے وہی ہیں جو میرے باپ کے قاتل ہیں۔ شہلا کی ماں کے قاتل ہیں۔ تمہیں تباہ کر چکے ہیں۔ ان کے دامن پر کتنے بے گناہوں کے لہو کا داغ ہے۔ وہ کس کس کو برباد کر چکے ہیں۔ یہ تم سے بہتر کون جانتا ہے۔ ان کی طاقت کا غرور آخر کون توڑے گا۔ وہ تو اپنے پیسے اور اپنی بدمعاشی کے بل پر سب کچھ کر رہے ہیں اور پھر بھی عزت دار ہیں کیونکہ قانون ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکا۔ میں اس بے بسی کے ساتھ پھانسی نہیں چڑھوں گا رابعہ۔ میں چاہتا ہوں کہ ایک ایک کو چُن چُن کے مارے بغیر نہ مروں۔ تم نے بھی میرا ساتھ چھوڑ دیا تو میں کیا کروں گا۔"

"میں تمہارے ساتھ تختۂ دار تک جا سکتی ہوں، مر سکتی ہوں لیکن یہ نہیں کر سکتی۔" رابعہ روتی رہی۔ "میں سب کچھ برداشت کر سکتی ہوں، تمہارے منہ سے بے وفائی کا طعنہ نہیں سُن سکتی۔ تم جانتے ہو کہ میں بزدل نہیں ہوں۔ میں اسی وقت تمہارے ساتھ نکل جاؤں گی اور تم کو کیا ضرورت ہے، میں خود وہ بریف کیس اٹھا لاتی ہوں۔ یہ الزام مجھے قبول ہے کہ رابعہ بھاگ گئی اور سکندر کی خاطر اس نے چوری ہی نہیں کی، اپنی زندگی بھی تباہ کر لی لیکن میں انکل کو اُن کے منہ پر جھوٹا نہیں کہہ سکتی۔"

"نہیں رابعہ نہیں۔ میں جھوٹے الزامات کی یہ گٹھڑی تمہارے سر پر نہیں رکھ سکتا۔" میں نے کہا۔ "تمہیں اس لیے مجرم نہیں بنا سکتا کہ تم نے مجھ سے محبت کی تھی۔ میری مدد کی تھی۔ ایسے وقت میں جب خدا کے سوا میرا کوئی نہیں تھا۔ اس محبت کی تمہیں پہلے ہی بہت سزا مل چکی ہے۔ باقی سزا مجھے اکیلے بھگتنے دو۔ تم میرے ساتھ کہاں جاؤ گی۔ میرا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہیں ہے۔"

"نہ ہو۔ مگر میرا ٹھکانہ وہیں ہوگا جہاں تم ہو گے۔" وہ عزم مصمم کے ساتھ بولی۔ "میں نے تو تم سے پہلے بھی کہا تھا سکندر کہ ہم کہاں تک دشمنوں سے لڑیں گے۔ زندگی تو بہت مختصر ہے اور خوشیوں کی عمر اس سے بھی کم۔"

"میرا جواب اب بھی وہی ہے۔" میں نے کہا۔ "میں بدنامی اور رسوائی کی سند کے ساتھ تمہیں نہیں اپنا سکتا۔ تمام زندگی تمہارے ساتھ گزارنی ہے۔ فرار ہونے کے بعد پکڑے نہ گئے تب بھی خود اپنی نظروں میں تو مجرم رہیں گی اور جو مجرم ہیں وہ فتح کا ڈنکا بجاتے پھریں گے کہ ہے کوئی ہمارے مقابل آنے والا۔ ہم سے کچھ پوچھنے والا۔ وہ چور ہو کے بھی سر اٹھا کے چلیں گے اور ہم بے گناہ ہو کے بھی چوروں کی طرح چھپ کر کسی گمنام گوشۂ زمین میں جئیں گے تو یہ خاک جینا ہوگا؟ میرے والد کی رُوح کتنی پشیمان ہو گی اور کتنے بے گناہوں کا لہو ہمیں الزام دے گا کہ اتنے بزدل تھے تو مقابلے کی کیا ضرورت تھی۔ ڈی سلوا اور دلاور نے اچھی منافع بخش پیشکش کی تھی، قبول کر لیتے۔"

"تو سمجھتا کیوں نہیں۔" محسن نے جھنجلا کے کہا۔ "جب تک انکل نے اسے کھولا نہیں تھا بات اور تھی، میں اسے غائب کر سکتا تھا۔ یہ دوسرا بریف کیس بالکل ویسا ہی ہے۔ انکل کو فرق کا احساس بھی نہ ہوتا لیکن صبح وہ خالی بریف کیس دیکھیں گے تو فرق بھی محسوس کر لیں گے۔"

"اس سے تو بہتر یہ ہے کہ اصل بریف کیس کو خالی کر دیا جائے۔ اس کا تالا تو ٹوٹا ہوا ہے۔" رابعہ نے کہا۔

"الماری کا تالا تو کھولنا ہی پڑے گا۔" محسن بولا۔ "چوری کا الزام تو بہرصورت آئے گا۔"

"لیکن اس بریف کیس پر میری زندگی اور موت کا انحصار ہے محسن!" میں نے کہا۔ "تم چوری کا الزام قبول کر لو یا مجھے پھانسی کے تختے تک پہنچا دو۔ اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں ہے۔ رابعہ کے لیے بھی یہ الزام قبول کرنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا تیرے لیے مگر رابعہ عورت ہے۔ اس گھر کے علاوہ رابعہ کا ٹھکانہ بھی کوئی نہیں۔ اس کے علاوہ رابعہ کا یہاں موجود رہنا ضروری ہے، تاکہ مجھے تازہ ترین صورت حالات کا علم ہوتا رہے اور قانونی طور پر رابعہ جس حد تک میری مدد کر سکتی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں وہ بریف کیس غائب کر دوں گا اور خود بھی غائب ہو جاؤں گا۔" محسن نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "رابعہ پر کوئی الزام نہیں آئے گا۔ انکل رضوی کیا کریں گے؟ میرے ڈیڈی سے شکایت کریں گے نا کہ محسن نے سکندر کی مدد کی جو قانون کی نظر میں ایک مجرم ہے۔ میں اعتراف کر لوں گا کہ میں نے ایسا کیا۔ میرے لیے دوستی کا رشتہ زیادہ اہم تھا۔ ہر شخص ایس پی ضامن رضوی جیسا نہیں ہو سکتا۔ رضوی انکل مجھے گرفتار بھی نہیں کروا سکتے۔ ایک تو ان کے پاس کوئی ثبوت نہیں رہے گا، اس کے علاوہ میرے ڈیڈی ہیں۔ وہ ان کو یہ قدم نہیں اٹھانے دیں گے۔ خودمی کی حالت کے پیشِ نظر انکل رضوی مجبور ہو جائیں گے۔ پھر اگر وہ اعانتِ مجرمانہ کی فردِ جرم عائد کرتے ہیں تو کر دیں۔ مجھے پروا نہیں۔"

"میں اب دربدر ہوں محسن۔" میں نے کہا۔ "ایک طرف شکاری میرے لیے نئے جال بچھا رہے ہیں، دوسری طرف پولیس کو میری جستجو ہے۔ میرا کام بہت کٹھن ہو گیا ہے لیکن ناممکن اب بھی نہیں ہے۔ مجھے اپنا کام چھپ کر کرنا ہے۔ تم کو نہ جانے کہاں کہاں میری مدد کرنی پڑے۔ مدد تو تم نے ہمیشہ کی ہے مگر اب تم ایک مجرم کی مدد کرو گے، چوری چھپے۔"

"میں جانتا ہوں، مگر میری نظر میں تو آج بھی وہی ہے جو آج سے سال بھر پہلے یا دس سال پہلے تھا۔ میں جانتا ہوں کہ تو مجرم نہیں ہے۔ تو واقعی مجرم ہوتا تو شاید میں تیرا ساتھ نہ دیتا لیکن مجھے حقیقت کا علم ہے، تیرے خلاف کتنے مقدمات درج ہیں۔ اس سے مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہیں تو سب جھوٹے مقدمات۔" محسن نے کہا۔ "کیا یہ بات ہمیں معلوم نہیں؟"

"مجھے اپنی تقدیر سے کوئی شکوہ نہیں۔" میں نے اطمینان اور فخر سے محسن کو دیکھا۔ "خدا کا یہ احسان کیا کم ہے کہ میں اکیلا نہیں ہوں اور اس نے مجھے اتنے قابلِ اعتماد سہارے فراہم کیے ہیں تو مجھے ناکامی کا ڈر کیوں ہو۔"

"میں بریف کیس لے کر آتا ہوں۔" محسن نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "تیرا یہاں زیادہ دیر ٹھہرنا مناسب نہیں۔" اس نے احتیاط سے دروازہ بند کیا اور غائب ہو گیا۔

"تم اب کہاں جاؤ گے؟" رابعہ نے ناخن کاٹتے ہوئے کہا۔

"معلوم نہیں، مگر میں... میں تم سے ملتا رہوں گا۔" میں نے خاموشی کے ایک بوجھل وقفے کے بعد کہا۔ "جب بھی موقع ملا۔"

"اور یہاں میں کیا کروں گی؟" رابعہ نے خلا کو گھورتے ہوئے کہا۔ "محض انتظار کسی امید کے بغیر۔"

"کیا میں کسی امید کے بغیر یہ سب کچھ کر رہا ہوں؟" میں نے کہا۔ "میری کامیابی کا کوئی امکان نہیں ہے؟"

"میں تمہاری حوصلہ شکنی کرنا نہیں چاہتی لیکن حقیقت سے نظر نہیں چرائی جا سکتی۔" وہ بولی۔ "پہلے تم سخت حالات اور مشکلات کے جنگل میں تھے۔ اس سے باہر نکلنے کا راستہ تلاش کرتے کرتے تم دلدل میں پھنس گئے ہو۔"

"تمہارا مطلب ہے میں اپنے حالات کی خرابی کا خود ذمہ دار ہوں؟" میں نے کہا۔ "میری کامیابی کا کوئی امکان نہیں ہے؟"

"کوئی تمہاری مدد کرنا بھی چاہے گا تو کیسے کرے گا؟" وہ بولی۔ "جب تک تم رُوپوش رہو گے، عدالتی معاملات میں پیش رفت نہیں ہو گی، میں اور منظر بے بس ہوں گے۔ ہمیں تو یہ بھی معلوم نہ ہوگا کہ تم کیا کرنا چاہتے ہو اور کیا کر رہے ہو؟ کہاں ہو اور کس حال میں ہو، یہ کم عذاب ہوگا ہم سب کے لیے؟"

"میں تم سے رابطہ رکھوں گا۔ تم سے اور محسن سے۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "اور کوئی ایسا قدم نہیں اٹھاؤں گا..."

محسن کے اندر آنے سے میری بات ادھوری رہ گئی۔ "انکل نے غلط کہا تھا۔ وہ بریف کیس لے آیا تھا۔" انہوں نے بریف کیس کھول کے نہیں دیکھا۔ اس کا تالا سلامت ہے۔" اس نے مسرت سے اعلان کیا۔

"پھر کیا مقصد تھا ان کی غلط بیانی کا؟" رابعہ نے سر اٹھا کے کہا۔

"میرا خیال ہے وہ تم سے اعتراف کروانا چاہتے تھے کہ بریف کیس سکندر کا ہے۔" محسن بولا۔ "اور ان کا خیال ہوگا کہ اس طرح کچھ اور باتیں معلوم ہو جائیں گی۔ مثلاً یہ کہ سکندر کہاں ملا تھا اور اب کہاں ہے؟ اس نے بریف کیس کیوں دیا تھا۔ یہ ٹرک تھی اُن کی۔"

رابعہ کا مایوس چہرہ امید کی روشنی سے دمکنے لگا۔ "اچھا ہوا جو میں اپنی بات پر قائم رہی کہ بریف کیس میرا ہے۔"

محسن نے بریف کیس کو بیڈ پر رکھا اور اس کے نمبر ملانے لگا۔ بریف کیس اسی کا تھا چنانچہ مجھے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں تھی لیکن اس کے کھلتے ہی وہ چونکا۔ "سکندر! یہ کیا ہے؟" اس نے سب انسپکٹر کی وردی نکال کے کہا۔ پھر وردی میں سے پولیس کا سروس ریوالور نیچے گرا۔

"اس میں تین ہزار روپے بھی ہوں گے۔" میں نے اطمینان سے کہا اور سامان نئے بریف کیس میں منتقل کرنے لگا۔

"لیکن یہ سب تیرے پاس کیسے آیا؟" محسن نے اپنی پریشانی کو چھپانے کی کوشش کی۔

"تو سمجھ رہا ہے کہ میں نے اس سب انسپکٹر کو قتل کر دیا ہوگا!" میں نے کہا۔ "اور اس سے سب کچھ چھینا ہوگا۔ یہ وردی، ریوالور اور رقم!" میں نے کن انکھیوں سے رابعہ کو دیکھا۔ رابعہ کا چہرہ پھر بجھ گیا تھا۔

"نہیں... یہ تو نہیں! لیکن اصل بات کیا ہے؟" محسن نے تذبذب کے ساتھ کہا۔

میں نے کم سے کم الفاظ میں وہ سب کچھ بتا دیا جو اغوا ہونے کے بعد میرے ساتھ ہوا تھا۔ ایک ویران اور غیر آباد گھر میں اپنی اسیری۔ دلاور سے میری ملاقات اور اس کے منصوبے کی تفصیل۔ سیمسن کی موت اور رہائی کے بعد روبی اور پیٹر کے قتل میں ملوث ہونے سے گرفتاری کے بعد تھانے سے فرار ہونے کے واقعات تک۔ یہ باتیں میں نے شہلا کو نہیں بتائی تھیں لیکن رابعہ میری وکیل بھی تھی۔ اسے حقائق کا علم ہونا ضروری تھا۔ محسن ایسا دوست تھا کہ میرے اعتماد کو دھوکا دینے کے بجائے میری جگہ ہنسی خوشی سزائے موت بھی قبول کر سکتا تھا۔ اتنا ہی اعتماد انہیں مجھ پر تھا اور میرے ذہن میں یہ خیال تک نہیں آیا کہ میری کوئی بات ان کے لیے قابلِ اعتبار نہیں ہو گی۔

"اسلام آباد میں تیری زوجہ نے کمال کیا۔" میں نے کہا۔ "اس نے میری تلاش میں آنے والوں کو بُری طرح جھاڑا۔"

"یہ کام تو تیری زوجہ بھی کر لے گی یہاں۔" محسن نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ رابعہ کا رنگ لال پڑ گیا۔

میری بات ختم ہونے تک محسن نے اپنے بریف کیس کا مونوگرام نئے بریف کیس پر چپکا دیا تھا۔ نیا بریف کیس بھی اب بالکل نیا نہیں رہا تھا کیونکہ میں اسے زمین پر رکھ کے جوتوں سمیت اس پر چڑھ چکا تھا۔ میری موجودگی میں ہی رابعہ نے اس میں اپنی کچھ فائلیں رکھیں۔ اپنا ایک رومال ڈالا اور محسن سے اس کو کھولنے کا نمبر پوچھا جو ہم دونوں ایک ہی رکھتے تھے۔ سات سو چھیاسی۔ پھر محسن بریف کیس کو رکھنے گیا۔ رابعہ نے اُٹھ کر اپنی الماری کھولی اور اس کے سیف میں سے نقد رقم نکالی۔

"یہ پانچ ہزار روپے ہیں۔" اس نے رقم میرے سامنے رکھ کے کہا۔

"ابھی مجھے یہ تین ہزار کافی ہیں۔" میں نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ "ضرورت پڑے گی تو لے لوں گا۔"

"تمہیں کیا معلوم کہ ضرورت کہاں پڑے گی اور اس وقت تم کسی سے مانگ سکو گے یا نہیں۔" وہ ایک چیک لکھتے ہوئے بولی۔ "یہ چیک بھی رکھ لو۔ میں نے اپنے اکاؤنٹ میں صرف دس روپے چھوڑے ہیں۔"

"تمہارا دماغ خراب ہے۔" میں نے کہا۔ "تم خود کیا کرو گی؟ اور میں کیا کروں گا اتنا پیسہ رکھ کر۔"

"اس سے اپنا خفیہ اکاؤنٹ کھول لینا۔" وہ بولی۔ "جہاں سے تم ضرورت پڑنے پر آسانی سے رقم نکلوا سکو۔ یہ رقم میرے اکاؤنٹ میں پڑی رہے یا تمہارے اکاؤنٹ میں، بات تو ایک ہی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ میں یہاں اکیلی نہیں ہوں۔ میری آمدنی بھی ہے اور انکل رضوی کے علاوہ محسن میری ضرورت پوری کرنے کے لیے موجود ہے۔ تم اکیلے ہو، اس لیے تمہارے ساتھ پیسہ ہونا چاہیے۔ پیسہ بہت بڑی طاقت ہے۔ بگڑے کام بنا سکتا ہے اور مشکل میں کام آ سکتا ہے۔"

اس کی دلیل میں بہت وزن تھا مگر اس سے زیادہ قیمت اس کے خلوص کی تھی۔ چیک تو کاغذ کا ایک پرزہ تھا۔ اس پہ لکھے ہوئے اعداد و شمار بھی محبت کی اس مُہر کے بغیر بے وقعت تھے جو رابعہ نے اپنے دستخط کی صورت میں چیک پر ثبت کر دی تھی۔ "بات تو ایک ہی ہے۔" اس نے اتنی اپنائیت اور یقین کے ساتھ کہا تھا کہ میں چیک لینے پر مجبور ہو گیا لیکن میں رابعہ کی محبت کا جواب اپنی محبت کے والہانہ جذبات سے نہ دے سکا۔ اس سے پہلے ہی محسن لوٹ آیا۔

"اب تو جا۔" اس نے اندر آتے ہی کہا۔ "اس وقت بال بال بچا ہوں میں۔ چابیاں تکیے کے نیچے رکھ کر نکل رہا تھا کہ انکل آ گئے۔ دروازے میں ٹکر ہوئی۔ کہنے لگے کہاں غائب ہو گئے تھے؟ ذرا اس بدمعاش سے پوچھو اس کے ہمدرد بن کر۔ پولیس کو شاید وہ کچھ نہ بتائے۔ میں نے فوراً کہا کہ یہی اجازت تو میں آپ سے لینے آیا تھا۔"

"دیکھو محسن۔" میں نے بریف کیس اٹھا کے نظروں ہی نظروں میں رابعہ کو الوداع کہا۔ "کیا تو اس موقعے سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا جو رضوی صاحب نے فراہم کر دیا ہے؟ تھوڑا سا ڈراما کرنا پڑے گا۔"

"کیسا ڈراما؟" محسن نے کہا۔ "پہیلیاں بوجھنے کا وقت نہیں ہے، صاف بات کرو۔"

"تو اسے موقع دے کہ وہ تجھے ناک آؤٹ کر کے فرار ہو جائے۔" میں نے کہا۔ "اس سے وعدہ کرنا کہ وہ باقی پانچ کے نام پتے بتا دے تو اس کی رہائی ہو سکتی ہے۔ اپنی نیک نیتی کا ثبوت دینے کے لیے اس کے ہاتھ پیر کھول دینا۔ باقی کام وہ خود کر لے گا۔ اس سے اسلحہ تو لے لیا ہو گا۔ وہ ایک ہاتھ مارے گا تو فوراً لیٹ جانا۔ آدھے پونے گھنٹے میں رضوی انکل کو خود معلوم ہو جائے گا کہ جسے انہوں نے افسرِ تفتیش مقرر کیا تھا، وہ اس کام کے لیے کتنا موزوں تھا۔"

رابعہ اور محسن نے پہلے ایک دوسرے کو اور پھر مجھے یوں دیکھا جیسے میرا دماغ چل گیا ہو۔ "مطلب یہ کہ مار کھاؤں۔ مجرم کو فرار ہونے دوں اور اس کے بعد انکل کو جواب دہی کروں؟" محسن بولا۔

"جواب دہی کیسی؟ خود انہوں نے ہمدرد بننے کے لیے کہا تھا۔ تُو نے ہمدردی میں اس کے ہاتھ کھول دیے تھے اور اسے سگریٹ پیش کی تھی۔ اس نے ناجائز فائدہ اٹھا لیا۔" میں نے کہا۔ "ظاہر یہی کرنا جیسے تیرا سر اس بدمعاش کی ضرب سے خاصا مجروح ہوا ہے، اندرونی طور پر۔ وہ ڈاکٹر کو بلانے کی فکر میں پڑ جائیں گے۔"

"اور اس مجرم کو فرار ہونے کا موقع فراہم کر کے تجھے کیا ملے گا؟" محسن نے کہا۔

"جب وہ فرار ہو گا تو سامنے والے حصے کا رُخ نہیں کرے گا جدھر مین گیٹ ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ ساتھ والی دیوار پھاندے گا۔ اُدھر میں اس کو کیچ کر لوں گا اور پھر اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ اگر پولیس اسے لے گئی نا تو چھڑانے والے اسے ضمانت پر چھڑا کے لے جائیں گے۔ اُس نے چوری کی ناکام کوشش کی ہے، چوری نہیں کی۔ تیرے اور رابعہ کے بیان سے یہ ثابت نہیں ہو گا کہ وہ مجھے اغوا کرنے والے گروہ کا رُکن ہے۔ لا اینڈ آرڈر کمپنی کی طرف سے پیش ہونے والا کوئی بہت بڑا وکیل اس الزام کو بے بنیاد ثابت کر دے گا۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ہمیشہ کی طرح اس کی زبان سے کوئی لفظ نکلنے سے پہلے ہی وہ اسے خاموش کر دیں۔"

"اور تو اس کا کیا کرے گا؟" محسن نے کہا۔ "کہاں لے جائے گا اسے؟"

"تفتیش کے لیے۔" میں نے کہا۔ "طریقہ میرا اپنا ہو گا جو میں نے پہلے کبھی اختیار نہیں کیا لیکن اب وقت بدل گیا ہے۔"

محسن کچھ دیر سوچتا رہا۔ اس کا ذہن تمام مثبت اور منفی پہلوؤں کا جائزہ لے رہا تھا۔ کامیابی اور ناکامی کے امکانات پر غور کر رہا تھا اور یہ سوچ رہا تھا کہ اتنا بڑا خطرہ مول لینا عقلمندی ہے یا بیوقوفی۔ پھر اس نے آہستہ سے سر ہلایا اور باہر چلا گیا۔ رابعہ مجھے اس وقت تک دیکھتی رہی جب تک میں دیوار پر سے دوسری جانب نہیں اُتر گیا۔

رات کے تین بج چکے تھے۔ میں نے بریف کیس کو پھر پہلے والی پوزیشن میں دیوار سے لگایا اور اس کے اُوپر چڑھ گیا۔ رابعہ اب بھی نیم روشن دریچے میں تصویر بنی کھڑی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق محسن کو میرے پلان پر عمل درآمد میں دس پندرہ منٹ بہرحال درکار تھے۔ تشویش مجھے تھی تو صرف محسن کی طرف سے۔ محسن اُسے آزاد کرتے وقت محتاط تو رہے گا لیکن اس کے باوجود رہائی پانے کے بعد اس بدمعاش نے بے رحمی کا مظاہرہ کیا اور بے ہوش کرنے کے بجائے محسن کو ختم کرنا چاہا؟ نہیں۔ میں نے خود کو تسلی دی۔ محسن اتنی آسانی سے نہیں مارا جائے گا۔ وہ مفرور ہونے والے کی نیت بدلتے دیکھے گا تو اپنا دفاع کرے گا۔ اسے پھر پکڑوا دے گا۔ محسن کی مدد کے بغیر وہ گھر سے نہیں نکل سکتا۔ اسے شک تو ہو گا کہ دشمن اچانک مہربان کیسے ہو گیا۔ ممکن ہے وہ پانچ غلط نام اور پتے بتا دے اور محسن کو اس کی خواہش کے مطابق "ناک آؤٹ" کر کے نکل آئے۔

میری پریشانی کا دوسرا سبب یہ تھا کہ اس وقت میں اپنے قیدی کو کہاں لے کر جاؤں گا اور کیسے لے کر جاؤں گا۔ اتنی رات گئے کسی سواری کا ملنا محال تھا۔ زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ مجھے رات کے پہریدار دیکھ لیں اور شک میں پڑ جائیں کیونکہ مجھے اس کو کندھے پر ڈال کے ہی لے جانا تھا۔ میں صبح ہونے کا انتظار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے جو کچھ کرنا تھا، مجرم کے فرار کا راز افشا ہونے سے پہلے کرنا تھا۔ ممکن ہے پندرہ بیس منٹ بعد ہی رضوی صاحب تفتیش کے نتائج معلوم کرنا چاہیں اور محسن کو "بے ہوش" پڑا دیکھ لیں۔ اس کے بعد جو افراتفری پھیلے گی اس میں مفرور ملزم کی تلاش بھی ہو گی۔ اسے گھر کے اندر باہر، باغ میں اور آس پاس کے گھروں میں دیکھا جائے۔ میرے لیے ضروری ہو گا کہ اس سے قبل ہی نکل جاؤں۔

مجھ پر انتظار کا ایک ایک لمحہ اس وقت بھاری محسوس ہونے لگا تھا کہ عقبی حصے کی جانب میں نے ایک سایہ سا متحرک دیکھا۔ وہ دبے پاؤں تیز تیز قدم اٹھاتا دیوار کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اسے کیچ کرنے کے لیے مجھے فوراً اپنی پوزیشن تبدیل کرنی پڑی۔ جب وہ دیوار پر چڑھا تو میں نیچے بیٹھا تھا۔ اس نے چھلانگ نہیں ماری بلکہ الٹا ہو کے ہاتھوں کے سہارے نیچے لٹکا۔ اسی وقت میں نے اسے دبوچ لیا۔ اس کے حلق سے آواز تک نہ نکل سکی۔ اسے حیران ہونے اور یہ سمجھنے کا موقع بھی نہ ملا کہ اس کی رہائی درحقیقت دوسری قید تھی۔ میں نے اس کے نرخرے پر وار کیا اور وہ ڈھیلا پڑ کے مجھ پر جھول گیا۔ میں نے بریف کیس اٹھایا۔ اسے کندھے پر یوں ڈالا کہ اس کی دونوں ٹانگیں میری پُشت کی جانب لٹکتی رہیں۔ باقی دھڑ اور دونوں ہاتھ آگے رہے۔ کسی توقف کے بغیر میں کوٹھی کے گیٹ سے نکل کر سڑک پر آ گیا۔ اس شخص کا وزن کافی تھا لیکن اسے خود اٹھا کے لے جانے کے سوا میں کیا کر سکتا تھا۔

محسن کس حد تک کامیاب رہا تھا، اس کا فیصلہ قیاس کی بنیاد پر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ابھی تو میرا جلد از جلد اس جگہ سے دُور چلے جانا ضروری تھا۔ سڑک بالکل اندھیری تھی۔ آخری دنوں کا چاند بھی غائب ہو چکا تھا۔ سو قدم کا فاصلہ طے کرتے کرتے میرا سانس پھول گیا۔ پھر دائیں جانب دیوار کا وہی شگاف آ گیا جو میرے اغوا کرنے والوں نے کار ٹکرا کے بنایا تھا۔ میں نے بے ہوش کو اس دیوار کے پیچھے ڈال دیا۔ اس کے لیے مجھے سنبھل سنبھل کر ملبے کے ڈھیر کو عبور کرنا پڑا۔ میرا پیر ذرا بھی لڑکھڑا جاتا تو پاؤں میں موچ آ جاتی۔ پھر میں سوچنے لگا کہ اس قیدی کو کس محفوظ مقام پر منتقل کروں اور اسے کیسے لے جاؤں۔ صبح کا اجالا پھیلنے تک میں اسی جگہ انتظار کرتا تو خود بھی پکڑا جاتا۔ ایک ڈر یہ بھی تھا کہ میں کہیں سے ٹیکسی پکڑ لایا تو ٹیکسی والا اس بے ہوش سواری کو دیکھ کر پریشان ہو گا یا شکوک میں مبتلا ہو جائے گا۔ ممکن ہے وہ انکار کر دے اور میں زبردستی کروں تو ہنگامہ کرے۔

رات کا باقی حصہ منتظر کے گھر گزارا جا سکتا تھا۔ وہ صبح ہونے سے دو گھنٹے قبل اُٹھے گا تو حسبِ عادت شور مچائے گا کہ خود تو شترِ بے مہار کی طرح لاوارث پھر رہا ہے، شادی شدہ لوگوں کی ازدواجی زندگی کیوں خراب کرتا ہے لیکن اسے تمام حالات بتانے ضروری تھے۔ صبح اس کے کورٹ جانے تک کوئی مسئلہ نہیں ہو گا۔ میں نہا دھو کے ناشتا بھی کر سکوں گا اور اس کے بعد دیکھی جائے گی کہ اپنا ہیڈ کوارٹر عارضی طور پر کہاں قائم کیا جائے۔ ٹرانسپورٹ کا انتظام پہلے کرنا تھا چنانچہ میں نے بریف کیس میں سے ریوالور نکالا اور پتلون کی جیب میں رکھ کے بے سُدھ پڑے ہوئے شخص کا معائنہ کیا۔ میرے اندازے کے مطابق ابھی اس کا آدھے گھنٹے تک ہوش میں آنا مشکل تھا لیکن میں نے احتیاط بہتر سمجھی۔ اس کی قمیص پھاڑ کے میں نے ایک حصے کو دونوں پیر باندھنے کے لیے استعمال کیا اور دوسرے کو ہاتھ کمر کے پیچھے باندھنے کے لیے۔ بنیان اس کے منہ میں ٹھونسنے کے کام آیا۔

قیدی کی طرف سے مطمئن ہو کے میں نے نہر کی سمت چلنا شروع کیا۔ نہر کے کنارے کے ساتھ چلنے والی سڑک بالکل

سنسان تھی اور گدلا پانی بالکل خاموشی سے نہر میں بہتا جا رہا تھا۔ سب سے پہلے آمدِ صبح کا اعلان کرنے والے مرغ بھی ابھی خاموش تھے، سائیکلوں اور ریڑھیوں پر دودھ لانے والے اور اخبار لے جانے والے بھی نمودار نہیں ہوئے تھے تو اس سڑک پر ٹیکسی کہاں سے آتی۔ میں دھرمپورے کے پُل کی جانب چلتا گیا۔ ابھی میں پُل تک پہنچا نہیں تھا کہ مجھے پیچھے سے پڑنے والی ہیڈ لائٹس نے کسی گاڑی کی آمد کی اطلاع دی۔ میں رُک گیا۔ اندھیرے میں ہیڈ لائٹس کی خیرہ کن روشنی میرے چہرے پر پڑی۔ میں نے بڑی بے قراری سے ہاتھ ہلا کے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ وہ ٹیکسی نہیں تھی۔ کوئی پرائیویٹ کار تھی۔ میرے شریفانہ حلیے نے یا میری اضطرابی کیفیت نے ڈرائیور کو بریک لگانے پر مجبور کر دیا اور کار مجھ سے بیس گز آگے جا رکی۔ میں دوڑ کر ڈرائیور کے پاس پہنچا۔ وہ تقریباً تیس سال کا خاصا صحت مند جوان تھا۔ اسے خود پر اعتماد نہ ہوتا تو اس سنسان سڑک پر کسی اجنبی کے لیے کبھی نہ رُکتا۔

"کیا بات ہے؟" اس نے رعونت آمیز سخت لہجے میں پوچھا۔

"دیکھیے پلیز۔ میری والدہ کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔" میں نے انگریزی میں کہا۔ "اور بدقسمتی سے میری گاڑی کا بریک ڈاؤن ہوگیا ہے۔ دوسری سواری کوئی نہیں مل رہی ہے۔ آپ کو زحمت تو ہوگی لیکن میری ماں کو فوراً ہسپتال نہ پہنچایا گیا تو وہ مر جائے گی۔"

بریک ڈاؤن کسی بھی کار کا ہو سکتا ہے۔ یہ بات سب کار والے جانتے ہیں اور کبھی نہ کبھی ان پر بھی ایسا وقت ضرور آتا ہے جب ان کو مدد کی ضرورت پڑتی ہے۔ خواہ مدد صرف اتنی ہو کہ گاڑی کو دھکا لگا کے اسٹارٹ کر دیا جائے چنانچہ کار والوں کے درمیان اشتراکِ باہمی کے جذبات پیدل یا بسوں میں سفر کرنے والے "بے کار" لوگوں کے مقابلے میں زیادہ ملتے ہیں۔ ایک ذہنی، معاشی اور معاشرتی فرق کے باعث کار والے اور "بے کار" صرف اپنے جیسوں کی مدد کرتے ہیں۔

"آل رائٹ۔" وہ بولا۔ "میں ڈیوٹی سے آ رہا ہوں اور بہت تھکا ہوا ہوں لیکن میں تمہاری مدد کروں گا۔" اس نے دروازہ کھول کے مجھے بیٹھنے کی دعوت دی۔ گاڑی کو ریورس گیئر میں ڈالا اور کھڑکی سے سر نکال کر پیچھے دیکھا کہ ٹائر فٹ پاتھ کے کنارے سے دور ہیں اور پیچھے کوئی پتھر یا کھمبا نہیں ہے۔ جب اس نے دوبارہ میری طرف رُخ کیا تو ریوالور کا رُخ اپنی طرف دیکھ کے بھونچکا رہ گیا۔ "یہ کیا ہے؟" اس نے مشتعل ہو کے کہا۔

"یہ ریوالور ہے۔" میں نے اُسے انگریزی میں سمجھایا۔ "اس میں چھ گولیاں ہوتی ہیں۔ آدمی عموماً ایک ہی سے مر جاتا ہے اور اتنے کم فاصلے سے تو نشانہ خطا ہونے کا چانس ہی نہیں۔ مجھے یہ کار چاہیے۔"

"بکواس بند کرو۔" وہ بولا۔ "مجھے معلوم نہیں تھا ڈاکو ایسے سوٹ پہن کر گھومنے لگے ہیں اور اتنے شریفانہ لہجے میں بات کرتے ہیں۔ بہت اچھے ایکٹر ہو تم۔"

"تھینک یو۔ جس دن اس پیشے سے آمدنی نہ رہی، میں کسی فلمساز سے بات کر دوں گا۔" میں نے کہا۔ "ویسے اس وقت بھی فلم انڈسٹری میں میرے جیسے ہی ہیں۔ اب آپ خود اُترنا پسند کریں گے یا میں آپ کو باہر پھینک دوں۔ میرے پاس وقت کم ہے۔"

"ہاں۔" نیچے اُتر کے اس نے دھڑ سے دروازہ بند کیا۔ "تمہاری ماں مرنے والی ہوگی نا۔" وہ تلخ لہجے میں بولا۔

"وہ اس وقت مر گئی تھی جب میں نے ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا۔" میں نے اس کی جگہ کھسکتے ہوئے کہا۔ "اب میں آپ کو ایک مخلصانہ مشورہ دے رہا ہوں، بالکل مفت۔ گاڑی آپ کو شام چھ بجے میاں میر صاحب کے قبرستان کے دروازے پر کھڑی ہوئی مل جائے گی۔ چابیاں گلوز کمپارٹمنٹ میں ہوں گی۔ اس میں سے ایک چیز بھی غائب نہیں ہوگی۔ اس لیے آپ شام تک گزارا کر لیں اور پولیس کے پاس رپورٹ لکھوانے نہ جائیں۔ بہت وقت ضائع کریں گے وہ آپ کا۔ گاڑی مل جائے گی تب بھی اے سی ایم سے ریلیز آرڈر لیے بغیر آپ کے حوالے نہیں کریں گے۔ دوڑ دھوپ اور پریشانی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا اور اگر آپ نے کنجوسی سے کام لیا تو ممکن ہے وہ ٹائر بدل دیں۔ ٹیپ نکال لیں یا کاغذات غائب کر دیں۔ جذبات سے نہیں، عقل سے کام لیں۔ آپ تو مجھے شریف آدمی تسلیم نہیں کریں گے لیکن میری طرف سے یہ شریفانہ وعدہ ہے۔ ورڈ آف آنر۔ تھینک یو سر اور خدا حافظ۔ اور ہاں۔ کار کسی واردات میں بھی استعمال نہیں ہوگی۔ ڈرنے کی بات نہیں۔" وہ دم بخود کھڑا اُلوؤں کی طرح میری شکل دیکھتا رہا۔ اس نے کاریں چھینے جانے کی خبریں تو بہت سُنی اور پڑھی ہوں گی لیکن اس قسم کی گفتگو کبھی نہیں سُنی ہوگی۔ "کوئی فون نمبر ہے آپ کا تو بتا دیں۔ ممکن ہے میں خطرہ محسوس کروں تو کار کو کسی اور جگہ چھوڑ دوں اور آپ کو اطلاع دے دوں۔"

اس نے جیب سے ایک کارڈ نکالا اور مجھے تھما دیا۔ "معلوم نہیں، تم ایسا کیوں کر رہے ہو۔ مگر یہ لو۔" اس کے پُرسکون لہجے نے مجھے مطمئن کر دیا کہ ذہنی طور پر وہ میرا مشورہ قبول کر چکا ہے۔

میں نے یوٹرن میں گاڑی کو موڑا اور اسپیڈ ایک دم بڑھا دی۔ پھر بانسوں والی سڑک پر مُڑ گیا۔ وہ ٹیل لائٹ دیکھتا رہتا تو اسے معلوم ہو جاتا کہ میں کس طرف جا رہا ہوں۔ وہ جگہ زیادہ دور نہیں تھی جہاں میرا قیدی پڑا تھا اور کار کا مالک ایتھلیٹ ہوتا تو دوڑ لگا کے چند

منٹ میں میری روانگی سے قبل ہی وہاں پہنچ سکتا تھا۔ کار روکنے کے بعد بھی میں نے اس امکان کو یکسر نظر انداز نہیں کیا اور گاڑی سے اُتر کے دو منٹ میں قیدی کو اٹھا لیا۔ اسے پیچھے والی نشست کے بجائے میں نے ڈکی میں بند کیا اور گاڑی کو سیدھا لے گیا۔ وہ نئی ٹویوٹا کرولا تھی۔ اسی سال کا ماڈل۔ مضبوط اور طاقتور انجن والی لیکن بالکل خاموش۔

منظر کے گھر پہنچتے پہنچتے مجھے ساڑھے چار ہو گئے تھے۔ میں نے گاڑی کو پچاس قدم دُور پلاٹ کے وسط میں کھڑا کیا جس کے تین طرف دوسرے گھروں کی دیوار نے احاطہ کر رکھا تھا۔ ڈکی کھول کر دیکھنے پر مجھے تقریباً دس گز لمبی رسّی نظر آئی۔ محتاط لوگ ایسی کوئی چیز ضرور رکھتے ہیں جس سے بریک ڈاؤن کی صورت میں گاڑی کو دوسری گاڑی کے پیچھے باندھ کر گیراج تک لے جایا جا سکے۔ اس وقت یہ رسّی مختلف کام کے لیے استعمال ہوئی۔ میں نے اپنے قیدی کو اس طرح باندھا کہ وہ کسی وقت ہوش میں آ جائے تب بھی لاتیں چلا کے یا ہاتھ مار کے کسی کو متوجہ نہ کر سکے۔ ڈکی لاک کر کے میں نے بریف کیس میں سے پولیس کی وردی نکالی اور گاڑی میں ڈال دی۔ پھر مجھے خیال آیا کہ خالی بریف کیس رکھنے کا بھی کیا فائدہ۔ میں نے اُسے بھی گاڑی میں چھوڑا اور گاڑی کو مقفل کر دیا۔

ابھی میں پلٹا ہی تھا کہ فاکس ویگن کی مخصوص آواز کے ساتھ ہی چمکتے ہوئے لال رنگ والی گاڑی زن دم سے گزر گئی۔ فرق چند ثانیوں کا تھا۔ اگر میں کچھ آگے ہوتا تو انکل رضوی کی نظر مجھ پر ضرور پڑ جاتی لیکن وہ سامنے دیکھ رہے تھے۔ غالباً منظر کے گھر کو۔ گاڑی رابعہ ڈرائیو کر رہی تھی۔ ان کی صرف ایک جھلک دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ دونوں اعصابی کشیدگی کا شکار ہوں۔ رات کے اندھیرے میں ابھی صبحِ کاذب کا اجالا بھی شامل نہیں ہوا تھا اور یہ بھی میرے نظر نہ آنے کی ایک وجہ تھی۔ میں نے ان کو اس وقت دیکھا جب گاڑی ایک اسٹریٹ لائٹ کے نیچے سے گزر رہی تھی۔

بے اختیار میرے قدم زمین میں گڑ گئے۔ میں نے پلٹ کر گاڑی کا دروازہ کھولا اور واپس ہوا۔ کسی انجانے خوف کے باعث مجھے خیریت اسی میں نظر آئی کہ اس جگہ سے فوراً نکل جاؤں۔ اس وقت انکل رضوی کا رابعہ کے ساتھ منظر کے گھر آنا بڑی تشویشناک بات تھی۔ کیا انہیں شک ہو گیا تھا کہ بریف کیس بدل دیا گیا ہے؟ محسن اور رابعہ نے حقائق کو چھپاتے ہوئے میری مدد کی ہے؟ لیکن یہ خیال میرے مجرم ذہن کی پیداوار تھا۔ رضوی صاحب یہ کیسے سمجھ سکتے ہیں۔ پھر ان کا رابعہ کو یہاں لے کر آنا چہ معنی دارد؟ سڑک پر گاڑی دوڑاتے ہوئے میرے خیالات کے گھوڑے ہر سمت میں دوڑتے رہے۔ ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ انہیں براہِ راست مجھ پر شک ہو کہ میں مجرم کو نکال کر لے گیا۔ محسن نے مجھے صرف شک سے محفوظ رکھنے کے لیے ظاہر کیا کہ خود مجرم اسے ناک آؤٹ کر کے بھاگ گیا۔ محسن کی اداکاری انہیں قائل نہ کر سکی ہو یا انہوں نے دیکھ لیا ہو کہ محسن کے سر پر کسی چوٹ کا نشان تک نہیں ہے۔ پرانے تجربہ کار اور ذہین پولیس افسر ہیں۔ ان کی نظر دھوکا نہیں کھا سکتی اور پولیس تو ہر قسم کے مفروضات قائم کر لیتی ہے اور سب کو قابلِ قبول سمجھتی ہے۔ رضوی صاحب نے سوچا ہوگا کہ میرے ٹھکانوں میں سرِفہرست منظر کا گھر ہے۔ وہ میرا دوست بھی ہے، وکیل بھی اور کوئی ایس ایس پی کیا آئی جی بھی سرچ وارنٹ لیے بغیر اس کے گھر میں داخل نہیں ہو سکتا۔

نہ جانے کتنی دیر بعد میں نے غور کیا تو گاڑی ماڈل ٹاؤن سے گزر رہی تھی۔ صبح کا دھندلکا افق کو روشن کر رہا تھا۔ سڑکوں پر اب بھی ویرانی کا بسیرا تھا اور گھنے درختوں میں چھپی ہوئی کوٹھیاں بے صدا تھیں۔ اذانِ فجر کی آواز کہیں بہت دُور سے آئی۔ پھر پیڑوں کی شاخوں میں ہر آشیاں سے پرندوں کی چہکار کا ملا جلا شور پھیلنے لگا۔ میں نے بریک لگا کے گاڑی روکی۔ وہ گھر جو کبھی میرا تھا آج بھی وہی تھا۔ چشمِ تصور سے میں نے اندر کی ہر خوابگاہ کا، ڈرائنگ روم کا، ان کو ملانے والے راستوں کا، ان کی کھڑکیوں اور دروازوں کا تصور کیا۔ سقف و بام سے دیوار و در تک سب کچھ وہی تھا۔ لیکن اس میں رہنے والے وہ نہیں تھے۔ وہ مجھے کیا، میرے نام کو بھی نہ جانتے ہوں گے۔ ایک بار پھر مجھے وزیر خان کا خیال آیا۔ جب اس نے بحالتِ مجبوری اس برسوں میں شب و روز کی محنت سے تعمیر ہونے والے گھر کی ملکیت سے محرومی قبول کی ہوگی تو اس کے دلی جذبات کی نوعیت کیا ہوگی۔

نہ جانے میں ادھر کیوں آ گیا تھا؟ راستے تو بہت تھے۔ سارے شہر میں ہر طرف پھیلے ہوئے تھے۔ یہ لاشعور تھا جس نے شعور کو الجھنوں میں گرفتار دیکھا تو مجھے اس سمت لے آیا۔ ایک نہ ایک دن مجھے یہ گھر پھر آباد کرنا ہے خواہ اس کے لیے مجھے موجودہ مالکوں کو دس گنا قیمت دینی پڑے۔ میں نے گاڑی کو پھر اسٹارٹ کرتے ہوئے عزم نو کے ساتھ فیصلہ کیا۔ مجھے اپنا حق حاصل کرنا ہے۔ انصاف کا حق۔ انتقام کا حق۔ وراثت کا حق۔ وزیر خان کے خوابوں کو تعبیر دینے کا حق۔ رابعہ سے وابستہ مستقبل کو حقیقت میں ڈھالنے کا حق۔ وقت کے تجربات نے مجھے بتا دیا تھا کہ یہ حق مانگنے سے نہیں ملے گا۔ مانگنے سے تو کوئی مجھے خیرات بھی نہیں دے گا۔ مجھے اپنا حق چھیننا پڑے گا۔ ان سے جو غاصب ہیں۔ آدمی اب حیوان کی سطح پر آ گیا ہے کہ جینے کا حق بھی لے حاصل ہے جو طاقتور ہے اور یہ فنا و بقا کی جنگ رہ گئی ہے جس میں کمزور کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ جو اصولوں اور قانون کا تحفظ مانگے، اسے خود اپنی حفاظت کے لیے نااہل سمجھ لیا جاتا ہے۔ اگر یوں ہے تو یونہی سہی۔ میں بتا دوں گا کہ مجھے ایسے بھی زندہ رہنا آتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ کس کس

نے وزیر خان اور مجھ سے وہ سب کچھ چھینا جو اُن کا نہیں تھا۔ اس کے بعد مجھے ایک ایک سے سب واپس لینا ہے۔ جب غاصب کوئی نہیں رہے گا تو حق خود بخود حقدار کو پہنچ جائے گا۔

اگلا موڑ کاٹنے سے پہلے میری نظر ایک اور جانی پہچانی مگر آسیب زدہ نظر آنے والی اور وسیع و عریض کوٹھی پر گئی۔ یہ نواب خسرو جمشید کا مسکن بھی رہی تھی اور اب اس کے ایک گوشے میں ان کا مدفن بھی تھا۔ ان کی قبر لوہے کی گرل والی چار دیواری کے آخری موڑ پر تھی۔ سنگِ مرمر کے چار ستونوں والی چھت کے نیچے۔ اس کی خانہ ویرانی کا تاثر پہلے کے مقابلے میں زیادہ عبرت آموز ہو گیا تھا۔ گھاس کچھ اور بڑھ گئی تھی اور سا ندر بند کھڑکیوں اور دروازوں کے ٹوٹے ہوئے شیشوں کی تعداد بھی زیادہ ہو گئی تھی جن سے کمروں کی تاریکی باہر جھانکتی تھی۔ گیٹ پوسٹ پر لگی ہوئی "قصر جمشید" کی پیتل کی تختی اپنی آب و تاب کھو چکی تھی۔ گزشتہ مرتبہ میں محسن کے ساتھ یہاں آیا تھا تو میری ملاقات ایک ضعیف العمر مالی سے ہوئی تھی لیکن اس وقت میری نگاہ نے ایک تبدیلی کو نوٹ کیا۔ لوہے کا بھاری بھر کم گیٹ جس کے دونوں پٹ زنجیروں سے مقفّل تھے اور برسوں بند رہنے کے باعث جام ہو گئے تھے اس وقت آدھا کھلا ہوا تھا۔ اس کو سنبھالنے والا ایک ستون گر گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی ایک پٹ بھی زمین بوس ہو گیا تھا۔ زنگ خوردہ زنجیر یا قفل کے ٹوٹنے سے دوسرا پٹ نہیں گرا تھا۔ نیچے گرنے والے فرش کی گرل میں مٹی بھر گئی تھی اور اس میں بھی گھاس اُگ آئی تھی۔ ٹوٹنے والے ستون کا ملبہ دوسری طرف پڑا تھا۔ تھوڑی سی احتیاط کے ساتھ میں نصف کھلے گیٹ سے گاڑی گزار کے اندر لے جا سکتا تھا۔ مجھے یہ جگہ اپنی ضرورت کے عین مطابق نظر آئی۔ اس کی وسعت اور ویرانی میں میرا وجود ساری دُنیا سے پوشیدہ رہ سکتا تھا۔

میں نے کار کو بیک کیا اور موڑ کر دونوں طرف سے بچاتے ہوئے اندر لے گیا۔ ایک طرف لوہے کا گیٹ تھا تو دوسری طرف گیٹ پوسٹ کے ملبے پر پڑا ہوا ستون کا نصف حصہ۔ اگر کسی طرف سے گاڑی ذرا بھی لگ جاتی تو اس کی ہموار چمکیلی سطح پر ڈینٹ پڑ جاتا یا پینٹ اُکھڑ جاتا۔ میں نے دیکھا تو دونوں طرف مشکل سے ایک ایک انچ جگہ تھی۔ اگر آگے وہ لوہے کا گیٹ نہیں پڑا ہوتا تو میں سیدھا گزر ہی جاتا لیکن گیٹ کے چوکور سریے ایک ایک انچ موٹے تھے اور ان پر سے گاڑی کے اگلے پہیے گزرے تو مجھے یوں لگا جیسے میں ریلوے لائن کے درمیان سلیپروں پر ڈرائیو کر رہا ہوں۔ گاڑی نے جھٹکے لیے اور اسٹیئرنگ وھیل اِدھر سے اُدھر ہوا تو پچھلا حصہ لوہے کے گیٹ سے چھو گیا۔ میں نے آگے جا کے گاڑی روکی اور نیچے اُتر کے دیکھا تو ٹیل لائٹ کے ساتھ والا حصہ پچک گیا تھا اور ٹیل لائٹ کو بھی نقصان پہنچا تھا۔ مجھے افسوس ہوا۔ غریب میں مالک کے لیے پانچ سو روپے چھوڑ دوں گا تاکہ جو کوفت اور پریشانی اسے ایک دن کار کے بغیر گزارنے سے ہوئی اس کا بھی ازالہ ہو جائے اور وہ اپنی نئی نویلی دُلھن جیسی کار کو پھر پہلے جیسا بنوا لے۔

گزشتہ بار مالی ہماری باتوں کی آواز پر یوں آ گیا تھا کہ ہمیں خبر تک نہ ہوئی تھی۔ اس وقت وہ گاڑی کی آواز پر بھی نمودار نہ ہوا۔ میں نے ہارن دیا اور انتظار کیا۔ پھر گاڑی کو قصر جمشید کے عقبی حصے میں لے گیا۔ ہر روش اور راستے پر گھاس اور خودرو پودے قابض تھے۔ مگر وہ اینٹوں سے بنی حاشیے جیسی چھ انچ اونچی لکیر اب بھی راستوں کی نشاندہی کرتی تھی۔ میں گھوم کر پیچھے پہنچا تو مجھے قدرے غریبانہ اور مختصر عمارت کا ملبہ نظر آیا۔ اس کے دو ہی کمرے سلامت کھڑے تھے۔ یہ دونوں گیراج تھے۔ ایک میں اُنیس سو چالیس کے ماڈل کی کار کا زنگ خوردہ، مٹی سے اَٹا ہوا ڈھانچہ کھڑا تھا جس کے ٹائر فلیٹ تھے لیکن شیشے بند تھے اور دروازے مقفّل تھے۔ شاید بیس پچیس سال سے یہ کار اسی حالت میں اسی جگہ کھڑی ہوئی تھی۔ باقی عمارت سرونٹ کوارٹر معلوم ہوتی تھی۔ جھاڑ جھنکاڑ کے درمیان اینٹوں کا ملبہ اور آدھی ادھوری بے چھت کی دیواریں۔ منہدم ہو جانے والی دیواروں سے لوگ کھڑکیاں اور دروازے نکال کر لے گئے تھے۔ بظاہر اب "قصر جمشید" روحوں کا مسکن رہ گیا تھا۔ ماضی کا ایک لاوارث مزار۔ میں نے ایک بار پھر ہارن دیا کہ مالی اگر ایک کنال پر پھیلی ہوئی عمارت کے کسی ایک کمرے میں مقیم ہو تو باہر آ جائے مگر اندر سے کوئی نہیں نکلا تو میں نیچے اُترا۔ آخر وہ مالی کہاں گیا جس نے مجھے اور محسن کو بتایا تھا کہ اصل نواب خسرو جمشید کو انتقال کیے زمانہ ہوا اور ان کے وارث جو صرف نام کے وارث تھے دس سال قبل انگلستان ہجرت کر گئے تھے تو وہیں کے ہو رہے تھے۔ ان کے اکلوتے بیٹے خسرو پرویز نے وہیں شادی بھی کر لی تھی اور آٹھ سال میں ایک بار بھی نہیں آئے تھے۔

کار ایسی جگہ کھڑی تھی کہ سڑک پر سے کسی کو نظر نہیں آ سکتی تھی۔ میں نے کار کی ڈکی کھولی اور اپنے قیدی کو دیکھا۔ وہ ہوش میں آ چکا تھا مگر تین گھنٹے تک دست و پا بستہ ڈکی میں پڑے رہنے سے نیم جاں تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ پیر کھولے تو وہ مجھے خوف کے باوجود ایسی خونی نظروں سے گھورتا رہا کہ دلی جذبات اس کی صورت پر تحریر بن گئے۔ آزاد ہونے کے بعد بھی اسے اُٹھنے میں کچھ دیر لگی۔ دورانِ خون میں رکاوٹ کے باعث اس کے ہاتھوں اور پیروں میں دَم نہ رہا تھا۔

"آپ خود تشریف لائیں گے یا میں آپ کو گھسیٹ کر نکالوں؟" میں نے طنز آمیز پُرتمسخر لہجے میں کہا۔

رومال منہ سے نکال کر آہستہ آہستہ وہ دونوں ہتھیلیاں ڈکی

کے فرش پر جما کے اٹھا۔ ٹانگوں کو دو تین مرتبہ حرکت دی اور ڈکی سے اُتر آیا۔ ایک بار لڑکھڑایا اور پھر سنبھل کے کھڑا ہو گیا۔ "میں اکیلا نہیں ہوں سکندر بابو۔" اس نے لمبے لمبے سانس لے کر کہا۔

"وہ تمہارا ساتھی تو بہت بے وفا نکلا۔" میں نے کہا۔ "تمہارے گرفتار ہوتے ہی بھاگ گیا۔"

"آئے گا، وہ بھی آئے گا اور بھی بہت سے لوگ آئیں گے تمہاری خبر لینے۔" وہ بولا۔

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم پہلے سے یہاں موجود ہوں گے سب کا استقبال کرنے کے لیے۔ اتنی بڑی حویلی ہے۔ سب کو الگ الگ کمروں میں دفن کرنا پڑا تب بھی جگہ کم نہیں ہو گی۔" اس کے ساتھ ہی میں نے بڑی پھرتی سے اس کے سینے پر لات ماری۔ وہ ڈکی سے ٹکرا کے اُچھلا اور نیچے گر گیا۔ میں نے نیچے جھک کر اُس کو بالوں سے اٹھایا اور پیروں پر کھڑا کر دیا۔ "اندر چلو۔ پہلے تمہارا کریا کرم ہو جائے۔" میں نے اُسے آگے دھکیلا۔ میں نے ایک دروازے کے ٹوٹے شیشے میں ہاتھ ڈالا اور جام ہو جانے والی کنڈی کو کھولنے کی کوشش کی لیکن زنگ نے چٹخنی کو تقریباً ویلڈ کر دیا تھا۔ وہ میرے پیچھے پڑا تھا مگر مجھے اس کی طرف سے کوئی تشویش نہیں تھی۔ میری لِک نے اس کی حالت بگاڑ دی تھی۔ اس میں اتنی جسمانی قوت ہی نہ تھی کہ مجھ پر حملہ کر سکے۔

دروازے کو کھولنے کی اب یہی ایک صورت تھی کہ میں دھکا مار کے لگے ہوئے قبضوں کو پٹ سے جُدا کر دوں یا چٹخنی نکال دوں۔ دروازہ اتنی مضبوط لکڑی کا اور اتنا بھاری تھا کہ اس کے ٹوٹنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے کندھے سے ایک ٹکر ماری۔ دروازے پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ میں نے دوسری مرتبہ زیادہ قوت صرف کی اور دروازہ کچھ اندر کی طرف جُھکا۔ میرا حوصلہ بڑھ گیا۔ میں نے مسلسل دائیں اور بائیں شانے کو باری باری استعمال کیا۔ دروازہ جھولنے لگا تھا اور شاید اگلی ٹکر سے نیچے جا پڑتا لیکن اسی وقت کوئی چیز میرے سر سے ٹکرائی۔ میری سانس پھُولی ہوئی تھی۔ ضرب نے مجھے چکرا دیا تھا۔ اس بدمعاش نے لیٹے لیٹے ہاتھ بڑھا کے پتھر اٹھا لیا تھا اور مجھ پر کھینچ مارا تھا۔ پتھر خاصا بڑا تھا اور نشانے پر بھی لگا تھا مگر بہت کم قوت کے ساتھ پھینکا گیا تھا۔ اس کے جسم کی توانائی میرے برابر ہوتی تو اسی پتھر سے وہ میرا سر پاش پاش کر دیتا۔ میں نے دَم لینے کے لیے دروازے کا سہارا لیا اور پھر نیچے بیٹھ گیا۔ ذرا سی دیر کے لیے ہر چیز آؤٹ آف فوکس ہونے لگی تھی۔ میں نے اسے دوسرے پتھر کے لیے رینگتے ہوئے اور ہاتھ بڑھاتے ہوئے دیکھا۔ اس کا ہاتھ اُٹھا تو میں نے اپنے سر کو جھٹکا، پتھر زن سے گزرا اور میرے سر کو مس کرتا ہوا دروازے پر جا لگا۔ اس دوسرے پتھر کو پھینکنے میں اس نے اپنی تمام قوت صرف کر دی تھی۔ اگر نشانہ خطا نہ ہوتا تو مجھے اس کی طرف سے غافل رہنے کی بہت سخت سزا ملتی۔ دو منٹ میں میرے حواس بحال ہو گئے۔ میں اٹھ کے اس کی طرف بڑھا۔ میرے جارحانہ عزائم کا اندازہ کرتے ہوئے اس نے پیچھے ہٹنے کی کوشش کی لیکن میں نے بڑی بے رحمی سے اس کے منہ پر ٹھوکر ماری۔ وہ زمین پر ہی لڑھک گیا۔ میں نے دوسری کِک اس کی پسلیوں میں ماری۔ وہ بلبلایا اور دُہرا ہو گیا۔ میں نے اسے دونوں ہاتھوں سے اوپر اٹھایا اور ایک وحشیانہ قوت کے ساتھ دروازے پر دے مارا۔ دروازہ بڑی آواز کے ساتھ اندر گرا۔ خالی کمرے میں اس کی گونج کے ساتھ ہی اس شخص کی آخری چیخ بلند ہوئی۔ میں نے اندر قدم رکھنے کے بعد نیچے بیٹھ کر اس کی نبض دیکھی۔ وہ زندہ تھا اور نبض کی رفتار کچھ کم ضرور تھی لیکن تشویش کی کوئی بات نہیں تھی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ بھاری بھر کم دروازہ اس کے اوپر نہیں گرا تھا ورنہ اس کی ہڈیاں ٹوٹ جاتیں اور شاید وہ مر جاتا۔

کمرے کے فرش پر گرد تھی۔ تنکے تھے اور اُن پرندوں کی بیٹ کے ڈھیر تھے جو اس وسیع و عریض کمرے کی بلند چھت میں آشیاں بندی کیے بیٹھے تھے۔ نہ جانے ان کی کتنی نسلیں اسی ویرانے میں پیدا ہو کے ختم ہو چکی تھیں یا کائنات کی وسعت کا اندازہ کرنے کے لیے پرواز کر گئی تھیں۔ کمرے کے وسط میں ایک فانوس کا آہنی ڈھانچہ لٹکا ہوا تھا جس میں نہ شیشہ تھا، نہ ہولڈر تھے اور نہ بلب۔ پنکھوں کی جگہ صرف ان کی لمبی لمبی ڈنڈیاں چھت سے آویزاں رہ گئی تھیں۔ نکالنے والے وہ سب کچھ نکال کر لے گئے جو نکالا جا سکتا تھا۔ دیواروں پر سے سوئچ بورڈ اور بجلی کے تار تک اتار لیے گئے تھے۔ اگر خسرو پرویز نے ولایت جاتے وقت اس محل میں فرنیچر چھوڑا تھا تو اب اس کا نشان تک نہ تھا۔ میں نے اندر کے کھلے دروازوں میں سے گزر کے دوسرے کمروں کو دیکھا۔ ان سب کی کہانی ایک ہی تھی۔ سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ۔

میں نے آدھے گھنٹے میں نیچے اوپر کے سب کمرے، باتھ روم، باورچی خانے دیکھ لیے۔ سب کمرے وسعت کے اعتبار سے ہال لگتے تھے۔ سب کی چھت کم سے کم سولہ فٹ بلند تھی۔ بجلی کا کنکشن بہت پہلے ہی کٹ چکا تھا۔ اب اندر پینے کے لیے پانی تک نہ تھا۔ کسی کمرے میں روشنی کا انتظام تک نہ تھا اور کوئی کمرہ اس قابل نہ تھا کہ رہائش کے لیے استعمال ہو سکے۔ کوئی ویرانی سی ویرانی ہے۔ میں نے لق و دق محل کا نظارہ کر کے سوچا۔ کتنے شوق سے اور کتنے غرور سے نواب خسرو جمشید نے یہ قصر بنوایا اور سجایا ہو گا۔ بنانے والوں اور سجانے والوں نے اس کو نواب صاحب کے ذوق و شوق کے مطابق ڈھالنے میں کتنا وقت صرف کیا ہو گا اور کتنا پسینہ بہا کے

کتنا پیسہ کمایا ہوگا؟ لوٹنے والوں نے اسے کیسا لوٹا کہ اندر کہیں کیل تک نہ چھوڑی۔ نہ جانے پیتل کی وہ تختی کوئی کیوں نہیں لے گیا جس پر "قصرِ جمشید" کے الفاظ کندہ تھے۔ اسے سنگِ لوحِ مزار کی طرح چھوڑ دیا۔

اپنے قیدی کو میں نے اوپر کی منزل پر ایک درمیانی کمرے میں منتقل کیا۔ اگر وہ وہاں چلاتا تب بھی اس کی آواز ان دیواروں کے سوا کوئی نہ سنتا۔ حفظِ ماتقدم کے طور پر میں نے اسے کار کی ڈکی سے رسی لا کے پھر باندھ دیا اور اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر نیچے اتر آیا۔ سورج طلوع ہو چکا تھا اور بھوک سے میری حالت غیر ہو رہی تھی۔ میں نے گزشتہ روز دوپہر کے وقت کھانا کھایا تھا۔ اس کے بعد مجھے چائے کی ایک پیالی بھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ کار کو دوبارہ نکالنا ایک اور ڈرائیونگ ٹیسٹ ثابت ہوا لیکن اس مرتبہ میں نے کار پر خراش نہیں آنے دی۔ میری ظاہری حالت سوٹ پہننے کے باوجود ایسی ہو رہی تھی کہ میرا کار میں ہونا ضروری تھا۔ سڑک پر سے گزرنے والے مزدوروں نے اس حویلی سے نکلنے والی شاندار کار کو حیرت سے دیکھا۔ میں نے سمن آباد کے بازار کا رخ کیا۔

ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں ناشتا کرنے کے بعد میں نے کچھ خریداری کی۔ ایک تھرماس میں چائے لے جانی تھی۔ بسکٹوں کے کچھ ڈبے، سگریٹ اور اسپرین لے کر میں نے واپسی اختیار کی۔ اگر مجھے اسی ویرانے میں رہائش اختیار کرنی پڑی تو مجھے اور بہت سی چیزوں کی ضرورت ہوگی۔ پہننے کے کپڑے، دو چار برتن۔ کم سے کم چائے کافی بنانے کا سامان۔ لالٹین اور مٹی کا تیل۔ فرش صاف کرنے کے لیے ایک جھاڑو۔ سونے کے لیے ایک دری اور ایک تکیہ۔ لیکن یہ شاپنگ بعد میں بھی کی جا سکتی تھی۔ پہلے یہ ضروری تھا کہ میں اپنے قیدی کو زندہ رکھنے کا سامان فراہم کر دوں۔ وہ مر گیا تو میری تفتیش دھری رہ جائے گی۔ جلدی کسی بات کی نہیں تھی۔ میرے کام میں مداخلت کرنے ...... والا کوئی نہیں تھا اور میں تہیہ کر چکا تھا کہ نہ اس شخص کو مرنے دوں گا اور نہ قتل ہونے دوں گا۔ میں اس کی زبان سے وہ سب کچھ سنوں گا جو اسے معلوم ہے۔ اس بار میں نے گاڑی کو سڑک پر چھوڑا اور اندر پہنچا۔ وہ پھر ہوش میں تھا اور آنکھیں کھولے پڑا تھا۔ اس کے بدن پر صرف بنیان رہ گئی تھی۔ چنانچہ رسی کے ہر نیل کا نشان، چوٹ کا ہر زخم اور ہر خراش اس کے شانوں، کمر، پیٹ اور سینے پر نمایاں تھے۔ آدمی وہ یقیناً سخت جان تھا اور بزدل بھی نہیں تھا ورنہ میرے سامنے گڑگڑاتا اور مجھ سے رحم کی بھیک مانگتا کہ وہ میرا دشمن نہیں محض حکم کا غلام ہے۔ لیکن ابھی تک اس نے شکست تسلیم ہی نہیں کی تھی۔ میں نے اسے آزاد کیا اور کھانے پینے کی چیزیں اس کے سامنے رکھ دیں۔

"اس تھرماس میں چائے ہے۔" میں نے کہا۔ "اور یہ بسکٹ ہیں اور اسپرین ہے۔"

"تم مجھے قتل کیوں نہیں کر دیتے؟" وہ رک رک کر بولا۔ "مجھے زندہ کیوں رکھنا چاہتے ہو؟"

"اس لیے کہ مجھے تم سے چند سوال کرنے ہیں۔" میں نے اپنے بیٹھنے کے لیے رومال بچھا کے کہا اور سگریٹ جلالی۔ "تم اگر مرنا چاہتے ہو تو یہ سمجھ لو کہ تمہاری موت آسان نہیں ہے۔ تمہیں قتل کرنا ہی ہوگا تو میں خود نہیں کروں گا۔ تمہیں تمہارے ساتھیوں کے حوالے کر دوں گا مگر یہ میری مرضی پر منحصر ہے۔ مجبوری میں بہت سے لوگوں کو میں نے خود ٹھکانے لگایا ہے۔"

اس نے بسکٹ چبانے شروع کیے اور دیکھتے دیکھتے پورا ڈبا صاف ہو گیا۔ وہ بھی میری طرح بھوکا تھا لیکن اس کی جسمانی توانائی مجھ سے زیادہ خرچ ہوئی تھی۔ گرم گرم چائے کے ساتھ اس نے اسپرین نگل لی اور بالکل تازہ دم نظر آنے لگا۔ "تم سمجھتے ہو میں تمہیں سب بتا دوں گا۔" وہ بولا۔ "میری زبان آج تک پولیس نہیں کھلوا سکی۔"

"ہماری پولیس واقعی بہت نااہل ہے۔" میں نے کہا۔ "کچھ بھی نہیں کر سکتی لیکن میں سمجھتا ہی نہیں، جانتا بھی ہوں کہ تم میری ہر بات کا صحیح جواب دو گے۔ تم چوہدری دلاور کے لیے کب سے کام کر رہے ہو؟"

"کون چوہدری دلاور؟" وہ بولا۔ "میں تو اپنا نام بھی نہیں جانتا۔"

"لیکن میرا نام جانتے ہو؟" میں نے طنز سے کہا۔ "ایس پی صاحب کے گھر میں کس سے ملاقات کرنے گئے تھے؟"

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے جیب سے ریوالور نکال کے ہاتھ میں تھام لیا۔

"مسٹر فورمین۔" میں نے کہا۔ "مجھے تمہارے نام سے کوئی غرض نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ تم فورمین بھی نہیں ہو لیکن ایک شام تم نے دیگر پانچ افراد کے ساتھ مل کر مجھے لکڑی کے ایک کریٹ میں پیک کیا تھا۔ وہ بھی تمہاری طرح نقلی فورمین تھے۔ ان میں سے دو مجھے ٹرک میں ڈال کے روانہ ہوئے تھے لیکن لوٹ کر نہیں آئے تھے۔ باقی تین کہاں ہیں؟"

"میں نہیں جانتا تم کیا کہہ رہے ہو؟" وہ بولا۔

میں نے سگریٹ کو فرش پر رگڑ کے بجھایا اور کھڑا ہو گیا۔ "ابھی وقت ہے، یاد کرو وہ لوگ کون تھے؟" میں نے آگے بڑھ کر ریوالور اس کی کنپٹی پر رکھ دیا۔ وہ سیدھا بیٹھا اپنے سامنے والی دیوار کو دیکھتا رہا۔ میں نے چھت کی طرف دیکھا۔ اس میں بھی ایک فانوس کا ڈھانچہ معلق تھا۔ اس کے ہر سمت پھیلے ہوئے بازو یقیناً پیتل کے ہوں گے لیکن اب لوہے کے ہی نظر آتے تھے۔ میں نے رسی کا

ایک سرا اوپر اچھالا اور دوسری طرف سے کھینچ لیا۔ دوسرے سرے کا پھندا بنا کے میں نے رسی کو کھینچا۔ آہستہ آہستہ گرہ اوپر پہنچ گئی اور فانوس کو چھت سے معلق رکھنے والے پائپ کے گرد جم کر سخت ہو گئی۔ وہ کچھ خوفزدہ نظر آنے لگا تھا۔ اچانک اس نے مجھ پر حملہ کیا لیکن اس بار میں غافل نہیں تھا۔ میں نے لات ماری جو اس کے سینے پر پوری قوت سے پڑی۔ وہ کراہ کے الٹ گیا اور فرش پر جا پڑا۔

"اس رسی سے میں ایک ایک کو پھانسی دوں گا۔" میں نے کہا اور اسے ٹانگ سے پکڑ کے گھسیٹ لایا۔ رسی کے جھولنے والے سرے کو میں نے دوبارہ فانوس کے اوپر سے گزارا اور پھر دہری ہو جانے والی رسی سے لٹک کر اس کی مضبوطی کا اندازہ کیا۔ جب میں نے پھندا بنایا تو اس کی صورت پر دہشت کے آثار پہلی مرتبہ نمودار ہوئے۔ "چلو اٹھو۔" میں نے کسی جلاد کی طرح اس کے قریب جا کر کہا۔ وہ آہستہ آہستہ اٹھا۔ اسے یقین آنے لگا تھا کہ میں اسے پھانسی دینا چاہتا ہوں۔ میں نے اچانک اس کے سر پر مکا مارا۔ وہ چکرا کے گرا تو میں نے اس کے دونوں پاؤں کے پنجے اٹھائے اور رسی سے باندھ دیے۔ پھر میں نے دوسرے سرے کو کھینچنا شروع کیا۔ وہ اوپر اٹھنے لگا۔ میں رسی کھینچتا گیا یہاں تک کہ وہ زمین سے تین فٹ کی بلندی پر الٹا جھولنے لگا۔ باقی رسی کو میں نے ایک دروازے کے ہینڈل سے باندھ دیا۔

"دلاور تم کو چھوڑے گا نہیں...." اس نے مجھے ایک غلیظ گالی دی اور ہاتھوں سے اوپر اٹھ کے رسی کو تھامنے کی کوشش کی۔ اس کے ہاتھ زمین تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اور وہ محض جسم کی طاقت سے خود کو اٹھا کے رسی کا سہارا بھی نہیں لے سکتا تھا۔ میں نے اسے آہستہ سے دھکیلا اور وہ پنڈولم کی طرح جھولنے لگا۔

"بہت جلد یاد آگیا اپنے باپ کا نام۔" میں نے کہا۔ "ابھی تم کہہ رہے تھے کہ کون دلاور؟ اب میں جا رہا ہوں۔ تم اور باتیں بھی یاد کرنے کی کوشش کرو۔ اس طرح جسم کا خون سر کی طرف آجاتا ہے اور سنا ہے یہ آسن یادداشت کو بہتر بنا دیتا ہے۔ میں واپس آکے پوچھوں گا کہ کتنا یاد آیا۔ تم چیخنا چلانا چاہو تو اپنا شوق ضرور پورا کرو۔ تمہاری آواز بیٹھ جائے گی، کسی کے کان تک نہیں پہنچے گی۔"

میں دروازہ بند کر کے باہر نکل آیا۔ صبح کے آٹھ بجے تھے۔ کوٹھیوں میں رہنے والے سو کر اٹھ چکے تھے لیکن باہر سے.... دیکھنے پر کہیں انسانی آبادی کے آثار نظر نہ آتے تھے۔ رہائشی علاقے سے گزرنے والی یہ مختصر اور تنگ سڑک عام آمد و رفت کے لیے استعمال نہیں ہوتی تھی اور بائی لین سمجھی جاتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ابھی تک کسی نے مجھے اس ویران کوٹھی میں آتے جاتے نہیں دیکھا تھا۔ جب میں گاڑی میں بیٹھ رہا تھا تو سامنے والی کوٹھی سے ایک کار نکلی اور مخالف سمت میں چلی گئی جسے خود مالک چلا رہا تھا۔ وہ کام پر پہنچنے کی جلدی میں معلوم ہوتا تھا کہ اس نے مجھ پر نگاہ نہیں ڈالی۔ میں نے ایک شاپنگ لسٹ بنائی اور انارکلی کی طرف روانہ ہو گیا۔ جی پی او کے سامنے گاڑی روک کے میں نے پبلک ٹیلی فون سے رابعہ کو کال کی۔ ریسیور بیگم رضوی نے اٹھایا۔ ہیلو کے جواب میں میں نے کہا کہ رابعہ سے بات کرنی ہے۔

"کون؟ تم سکندر....؟" بیگم رضوی نے میری آواز فوراً پہچان لی۔ "کہاں سے بول رہے ہو؟"

"سوری آنٹی۔ یہ تو میں نہیں بتا سکتا۔" میں نے کہا۔ "کیا فون آبزرویشن پر ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔" انہوں نے کہا۔ "لیکن سکندر۔ یہ تم کیا کر رہے ہو؟"

"میں جانتا ہوں کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں آپ کے اور انکل کے نقطۂ نظر سے غلط ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن مجھے یہی ثابت کرنا تھا کہ اس کے سوا میں اور کچھ کر ہی نہیں سکتا تھا۔ مجھے آپ سب کی مدد پر بہت بھروسہ تھا لیکن زمانہ بہت خراب ہے آنٹی۔ سیدھی انگلیوں سے گھی پہلے نکلتا ہوگا، اب نہیں نکلتا۔ میری مشکلات میں اضافہ ہوا اور میں الجھتا چلا گیا۔ کیونکہ میرے دشمن غیر قانونی حربے استعمال کرتے تھے۔ اینٹ کا جواب تو پتھر سے ہی دیا جا سکتا ہے۔"

"پتھر تمہاری عقل پر پڑ گئے ہیں۔ تمہیں کسی کا خیال نہیں۔" انہوں نے خفگی سے کہا۔

"آپ لوگوں کے لیے میرا وجود پریشانیوں کا سبب تھا اور سب کی پریشانی بڑھ رہی تھی۔" میں نے کہا۔ "آپ کے گھر میں سکون برباد ہو رہا تھا۔ محض میری وجہ سے انکل کشیدگی میں مبتلا تھے اور خطرہ آپ سب کو لاحق تھا۔"

"میں اپنی بات نہیں کر رہی تھی۔ رابعہ کا خیال ہے تمہیں؟" بیگم رضوی نے کہا۔ "کبھی غور کیا اس کی حالت پر کہ وہ کیا تھی اور کیا ہو گئی ہے؟ آخر کتنی قربانی چاہتے ہو تم اس سے؟ اپنا سب کچھ تو گنوا چکی ہے وہ۔ سوچو ذرا وہ کتنی کامیاب وکیل تھی۔ اس کا اپنا گھر تھا۔ اپنی مصروفیات تھیں۔ اب کیا ہے۔ نہ کہیں آتی ہے نہ جاتی ہے۔ اپنے کمرے میں بند پڑی رہتی ہے۔ کبھو تو کھا لیتی ہے، نہ کبھو تو اسے خیال ہی نہیں آتا۔ مجھ سے چھپاتی ہے لیکن کیا اس کی آنکھیں بتاتی نہیں کہ وہ روتی ہے۔ اس کی صحت کتنی گر گئی ہے۔"

"آپ رو رہی ہیں؟" میں نے دل میں اٹھنے والی ٹیس کو دبا کے کہا۔ "ایک ایس پی کی بیوی ہو کے ابھی سے ہمت ہار بیٹھی

ہیں؟ رابعہ تو آپ کے پاس میری امانت ہے۔ میں سمجھتا تھا آپ اس کو سنبھال کے رکھیں گی۔ اسے سمجھائیں گی کہ عقل سے کام لے۔ بھلا اس طرح مسائل حل ہوتے ہیں؟"

"میں کسی کو کیا سمجھاؤں"۔ انہوں نے کہا۔ "عقل میں تم سب افلاطون ہو۔ کسی کی مانتے ہو؟ جو سمجھانا ہے، اسے خود ہی سمجھا دو۔ یہ امانت کا بار مجھ پہ مت ڈالو۔ ایک پولیس افسر کی بیوی کسی مجرم کی امانت دار نہیں ہو سکتی۔"

انہوں نے رابعہ کو آواز دی اور ریسیور رکھ دیا۔ چند منٹ بعد رابعہ نے فون اٹھا لیا۔ "کیا بات ہے سکندر؟" وہ بولی۔

"بیگم رضوی تم سے بہت خفا ہیں"۔ میں نے کہا۔

"مجھ سے یا تم سے؟" وہ حیرانی سے بولی۔ "میں نے کیا کیا ہے؟"

"تم خود جانتی ہو"۔ میں نے کہا۔ "آج رات میں تم سے ملنے آؤں گا تو بتاؤں گا۔"

"ایسی حماقت مت کرنا"۔ وہ بولی۔ "یہاں پھر گارڈ پوسٹ کر دی گئی ہے اور غالباً سادے کپڑوں والے بھی ہیں جو باہر سے ہر آنے جانے والے پہ نظر رکھتے ہیں۔ میں خود آ جاؤں گی۔ کہاں ملو گے تم؟"

"شام چھ بجے میاں میر صاحب کے قبرستان آ جانا"۔ میں نے کہا۔ "گاڑی گیٹ کے سامنے کھڑی رکھنا۔ میں چھ اور ساڑھے چھ کے درمیان کسی وقت بھی آ بیٹھوں گا۔ یہ بتاؤ تم آج صبح و م انکل کے ساتھ منظر کے گھر کیوں گئی تھیں؟"

"انکل کو شک تو ہے کہ ہم تمہاری مدد کر رہے ہیں"۔ وہ بولی۔ "اور ہم نے ہی تم کو کہیں چھپا رکھا ہے۔ اچانک ان کو منظر کے گھر چھاپا مارنے کا خیال آ گیا۔ تم کو کس نے بتایا؟"

"میں نے دیکھا تھا۔ اگر انکل صرف پانچ دس منٹ بعد آتے تو ان کا چھاپا کامیاب رہتا"۔ میں نے کہا۔ "میرا ارادہ ان سے ملنے کا تھا۔ تمہاری گاڑی میرے قریب سے گزری۔ میں منظر کے گھر سے پچاس قدم دُور تھا لیکن اندھیرے میں تھا۔ کیا بتایا منظر نے؟"

"وہ کیا بتاتا؟ حیران بھی ہوا اور پریشان بھی"۔ رابعہ نے کہا۔ "کہنے لگا ایس پی صاحب بن کر آئے ہیں تو سرچ وارنٹ دکھائیے۔ ویسے آپ سکندر اور رابعہ کے انکل ہیں تو میرے بھی انکل ہی ہوئے۔ آپ کا گھر ہے شوق سے دیکھیے۔ میں ہر الماری اور صندوق بھی کھول کے دکھا سکتا ہوں۔"

"محسن کا کیا حال ہے؟" میں نے کہا۔ "اس پر شک تو نہیں ہوا انکل کو؟"

"نہیں وہ ایکٹرا چھا ہے"۔ رابعہ ہنسی۔ "اس نے ملزم کو آزاد کرنے کے بعد چیخ ماری تھی اور اداکاری میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے اپنے سر پہ کپڑے دھونے کا ڈنڈا مار لیا تھا۔ خاصی قوت سے۔ سر میں گومڑ نکل آیا۔ ہم سب نیچے پہنچے تو وہ مکر کیے بے ہوش پڑا تھا۔ انکل پریشان بھی ہوئے اور پشیمان بھی کہ کس نالائق پر بھروسہ کیا۔ تفتیش خاک بھی نہیں کی، ملزم کو موقع دے دیا کہ مار کے بھاگ جائے۔ ان کا خیال تھا کہ اسے ٹھیک طرح سے باندھا ہی نہیں گیا تھا۔ محسن کے باتھ روم میں داخل ہوتے ہی اس نے حملہ کر دیا اور بھاگ گیا۔ محسن نے اتفاق کیا کہ ایسا ہی ہوا تھا۔ انکل نے کہا۔ خدا کا شکر ہے، چوٹ زیادہ نہیں آئی۔ سر کی چوٹ خطرناک بھی ہو جاتی ہے۔"

مجھے بھی ہنسی آ گئی۔ "مجھے بھی اس کی طرف سے فکر ہے۔ قیدی کو میں لے گیا تھا۔ مگر رابعہ، فون آبزرویشن پر تو نہیں ہے؟ ساری گفتگو ٹیپ ہو جائے گی۔"

"ابھی تک تو نہیں ہے"۔ رابعہ نے کہا۔ "محسن نے معلوم کیا تھا۔ اسے اندیشہ تھا کہ تمہارا فون نہ آ جائے۔ یہ بتاؤ تم خود کہاں ہو اور اس قیدی کو کہاں رکھا ہے تم نے؟"

"شام کو چھ بجے"۔ میں نے کہا۔ "محسن کو ساتھ لا سکو تو لے آنا۔" اور ریسیور رکھ دیا۔

تمام اسبابِ ضرورت گاڑی میں بھر کے اور اپنا پنچ ساتھ لے کر میں واپس "قصرِ جمشید" پہنچا تو ساڑھے دس بجے تھے۔ اب مجھے شام پانچ بجے تک باہر نہیں جانا تھا۔ چنانچہ میں کار کو اندر لے گیا۔ اور عقبی حصے میں کھڑا کر دیا۔ سوٹ کیس، تیل کا چولہا، برتن اور چائے بنانے کا سامان میں نے نیچے والے پہلے ہی کمرے میں ڈال دیا۔ اپنے ساتھ میں صرف ایک دری، تکیہ اور جھاڑو اوپر لے گیا۔ قیدی کی حالت ابتر تھی۔ وہ بُری طرح ہانپ رہا تھا۔ اس کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا اور منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا۔

میں نے اس کے سر کو بالوں سے پکڑ کے اٹھایا۔ "اپنا نام یاد آیا؟" میں نے کہا۔ "دوستوں کے نام یاد آئے؟"

"میں... میں بتاتا ہوں"۔ وہ چلّایا۔ "سب بتا دوں گا۔ خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ سب پُرانے حربے ہیں۔ تم کو دَم لینے کی مہلت چاہیے۔ میں نے تمہیں چھوڑ دیا تو سنبھلتے ہی تم اپنے الفاظ سے پھر جاؤ گے۔ تم بہادر آدمی ہو، آج تک پولیس تمہاری زبان نہیں کھلوا سکی"۔ میں نے اس کا سر ایک جھٹکے سے چھوڑ دیا۔ وہ پاگلوں کی طرح چلّانے لگا اور مجھے گالیاں دینے لگا۔ اس کا سانس پھول گیا اور وہ مُردہ ہو کے لٹکنے لگا۔ میں نے اطمینان سے سگریٹ سلگایا اور ایک کش لیا۔

"ہاں"۔ میں نے جلتی ہوئی سگریٹ کو اس کی ناف پہ رکھ دیا۔ "کون تھے باقی تین آدمی؟"

وہ ذبح کیے ہوئے بکرے کی طرح بلبلایا۔ "بتاتا ہوں.... بتاتا ہوں..." اس نے تڑپ کر اپنا پیٹ ملا جس پر زخم کا جلا ہوا سیاہ بدنما داغ نمایاں ہو گیا تھا۔ "ایک کو جانتا ہوں میں۔ وہ مجھے لے گیا تھا۔ رحمت کباڑی۔"

"تمہاری یادداشت بہتر ہونے لگی ہے"۔ میں نے ایک اور سگریٹ سُلگا کے دوسرا کش لیا اور آگے بڑھایا۔

"نہیں... نہیں"۔ وہ چلّایا لیکن سگریٹ کا روشن حصّہ اس کے سینے پر دائیں طرف چپک گیا تھا۔ کمرے میں گوشت جلنے کی ہلکی سی بُو پھیلی اور اس نے دلخراش چیخ ماری۔ میں نے تیل کا چولہا روشن کیا اور اس کے عین نیچے رکھ دیا۔

"کہاں رہتا ہے یہ رحمت کباڑی؟" میں نے اطمینان سے کہا اور تیسری سگریٹ جلائی اور اس کے ہاتھ باندھ دیے۔

"مجھے نہیں معلوم"۔ وہ کراہتے ہوئے بولا۔ چولھے کی اٹھتی ہوئی حرارت اس کے سر کو گرم کرنے لگی تھی۔

"معلوم ہو جائے گا"۔ میں نے سگریٹ کو تیسری جگہ اس کے سینے پر بائیں طرف رکھ دیا۔ وہ اُچھلا اور دہاڑیں مار مار کے رونے لگا۔ اس کا جسم سخت اذیت میں بَل کھا رہا تھا، تڑپ رہا تھا اور جھُول رہا تھا۔ اس میں اب اتنی بھی جسمانی ہمت نہ رہی تھی کہ سر اُٹھا کے ہاتھوں سے رسّی تھام سکے اور بندر کی طرح سیدھا اس سے چپکا رہے ــــ وہ اونچا ہونے کے لیے ہاتھ اٹھاتا تھا اور سر اٹھانے کی بے سود کوشش کرتا تھا۔

"جب تک تم مجھے رحمت کباڑی کا پتا نہیں بتاؤ گے تمہاری گلو خلاصی نہیں ہو گی"۔ میں نے کہا۔

"وہ... وہ خود آیا تھا.... میرے پاس۔ اڈّے پر"۔ وہ کراہتے ہوئے بولا۔ تپش اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہو چکی تھی۔

"کس کے اڈّے پر؟" میں نے کہا اور چولھے کی بتیاں کچھ اور اونچی کر دیں، شعلہ اور بلند ہو گیا۔

"گامے ماچھی کے اڈّے پر، سٹہ ہوتا تھا وہاں"۔ الفاظ اس کے ہونٹوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر نکل رہے تھے۔

"کیا کام تھا اُسے؟" میں نے کہا اور چوتھی سگریٹ کا کش لیا۔ "کہاں لے گیا تھا وہ تم کو؟"

"میں... میں نہیں بتا سکتا۔ رات کا وقت تھا"۔ اس کے سر کے اندر اب بھیجا تک گرم ہونے لگا تھا۔

میں نے سگریٹ اس کے نرخرے پر لگا دی۔ "تم اسی شہر کے رہنے والے ہو، رات کو راستے نہیں پہچانتے؟"

وہ چیخ مار کے تڑپا اور ساکت ہو گیا۔ میں نے رسّی کی گرہ دروازے سے کھولی اور آہستہ آہستہ اسے نیچے اتار لیا۔ وہ فرش پر کسی بے جان لاش کی طرح پڑا رہا۔ میں نیچے اترا اور اپنا اسبابِ ضرورت اُوپر لے آیا۔ فرش کو جھاڑو سے صاف کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ میں نے صرف ایک کونے کی صفائی پر قناعت کی اور وہاں دری بچھا دی۔ سوٹ کیس دری پر اور باقی سامان میں نے دری کے پاس ہی رکھ دیا۔ میرا سوٹ تو پہلے ہی غارت ہو چکا تھا۔ صبح سے میں نے منہ تک نہیں دھویا تھا۔ رہی سہی کسر اب پوری ہو گئی اور میں گرد و غبار سے بھوت بن گیا۔ کپڑے بدلنے سے پہلے ضروری تھا کہ کہیں سے پانی کا بندوبست کیا جائے۔ اتنے بڑے "قصرِ جمشید" میں نہ جانے کتنے باتھ روم تھے مگر سب کے نلکے خشک پڑے تھے۔ مجھے اس مالی اور چوکیدار کا خیال آیا جو پہلے سے یہاں رہتا تھا۔ آخر وہ اپنی ضرورت کہاں سے پوری کرتا تھا۔ حویلی کے گرد پھیلے ہوئے کئی ایکڑ کے جنگل نما باغ میں کوئی ٹیوب ویل یا کنواں تو ہو گا۔

میری تلاش کامیاب رہی۔ سرونٹ کوارٹر کی منہدم شدہ عمارت کے ایک گوشے میں مجھے ہینڈ پمپ نظر آ گیا۔ میں نے اس کے ہینڈل پمپ کو اوپر نیچے کیا۔ کچھ دیر اس میں سے ہوا نکلتی رہی لیکن اُوپر چڑھنے والا پانی خود اپنی موجودگی کی خبر دے رہا تھا۔ مجھے ہینڈل پر پہلے سے زیادہ قوت صرف کرنی پڑ رہی تھی۔ بالآخر پانی ہینڈ پمپ میں بولا اور اس کا شفاف دھارا ابل کے باہر گرا ــ میں اس دریافت پر اتنا ہی خوش تھا جتنا امریکہ ملنے پر کولمبس خوش ہوا تھا۔ اُوپر آ کے میں نے اپنے قیدی کو دیکھا۔ وہ اسی طرح بے سُدھ پڑا تھا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ مکر تو نہیں کر رہا ہے، میں نے اس کے تلوے کو ایک تنکے سے سہلایا مگر اس نے جنبش نہ کی۔ ایک برتن اور تولیہ لے کر میں نیچے اتر گیا۔ ہینڈ پمپ دو نامکمل دیواروں کے گوشے میں نصب تھا۔ تیسری طرف ملبے کا ڈھیر تھا اور چوتھی سمت میں حویلی کی فصیل دُور ہونے کے باوجود پردہ فراہم کرتی تھی۔ میں نے اطمینان سے غسل کیا اور تولیہ لپیٹ کر اوپر پہنچا تو میرے ایک ہاتھ میں میلے کپڑوں کا بنڈل تھا اور دوسرے ہاتھ میں پانی سے بھرا ہوا برتن۔ سوٹ کیس میں سے کپڑوں کا ایک جوڑا نکال کر پہننے کے بعد میں نے وقت دیکھا تو دوپہر ہو چکی تھی۔ میرا قیدی کراہنے لگا تھا جس کا مطلب تھا کہ اب وہ ہوش میں آ رہا ہے۔ میں نے اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔ "پانی...." وہ بولا۔

میں نے رسّی کو پھر کھینچا اور اُسے اُوپر اٹھا لیا۔ وہ زیادہ اونچی آواز میں کراہنے لگا۔ "پانی نظر آیا تمہیں؟" میں نے کہا۔ "نیچے دیکھو، اس پتیلی میں پانی ہے... ٹھنڈا اور میٹھا"۔ میں رسّی کو زور لگا کے کھینچنے لگا۔ اس مرتبہ وہ فرش سے دس فٹ اوپر چلا گیا اور اس کے پاؤں فانوس کے ڈھانچے کو چھونے لگے۔ پھر

میں نے رسّی کو ایک دم ڈھیل دی۔ وہ چار فٹ نیچے آیا۔ اس کے حلق سے ایک خوفناک چیخ بلند ہوئی۔ اسے موت سامنے نظر آنے لگی ہوگی اور اس کا خیال یہی ہوگا کہ ایک لمحے بعد وہ دس فٹ کی بلندی سے سر کے بل فرش سے ٹکرائے گا لیکن میں نے رسّی کو پھر پکڑ لیا اور اسے چھ فٹ کی بلندی پر لٹکا دیا۔

"تمہارے بیوی بچے یقیناً نہیں ہوں گے۔ ورنہ تم ان کے لیے زندہ ضرور رہتے۔" میں نے کہا۔

"خدا.... خدا کے لیے.... رحم.... رحم کرو۔ میری لڑکی.... اس کی شادی ہونے والی ہے۔" اس نے ہاتھ جوڑ کے میری منت سماجت شروع کی۔ "اگلے مہینے.... اس کی ماں نہیں ہے۔"

"بہت افسوس ہوا یہ سن کر۔" میں نے سر ہلایا۔ "اب رخصتی کون کرے گا؟ کہاں رہتے ہو تم؟"

"محلّہ بی بی پاکدامن میں۔" وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں بولا۔

میں نے اسے نیچے اتار دیا۔ اسے پینے کے لیے پانی دیا اور دیوار کے سہارے بٹھا دیا۔

"تمہاری بیٹی کو رحمت کباڑی کا پتا معلوم ہے؟" میں نے کہا۔

"نہیں نہیں.... وہ کچھ نہیں جانتی۔" وہ چلایا۔ "اسے تو میرے بارے میں بھی نہیں معلوم۔ کہ میں کیا کرتا ہوں؟ کتنا خراب آدمی ہوں۔ محلّے میں کوئی نہیں جانتا۔"

"بیٹی کو باپ کے بارے میں معلوم ہونا چاہیے۔" میں نے کہا۔ "کیوں نہ اسے بھی بلا لیں یہاں؟"

وہ دیوانہ وار مجھ پر لپکا۔ "تم اسے کبھی تلاش نہیں کر سکتے۔"

میں نے اس کے ایک ٹکّر رسید کیا اور وہ وہیں جا گرا جہاں سے اٹھا تھا۔ "لوگ کہتے ہیں ڈھونڈنے سے خدا بھی مل جاتا ہے۔ گامے ماچھی کے اڈّے پر لوگ تمہیں جانتے ہوں گے۔"

"آج تک کسی کو میں نے گھر کا پتا نہیں بتایا۔" وہ سر اٹھا کے بولا۔ "تمہیں میرا نام بھی نہیں معلوم۔"

"تمہاری صورت تو بہت سے لوگ پہچانتے ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "شام کو ایک فوٹوگرافر آئے گا۔ کل تک تمہاری تصویریں بن جائیں گی۔ محلّہ بی بی پاکدامن میں کتنی گلیاں ہیں؟ کتنی دکانیں ہیں۔ تمہاری تصویر دیکھ کے کوئی نہ کوئی پولیس کو تمہارے گھر ضرور لے جائے گا اور جب پولیس اسے گرفتار کرے گی مثلاً اس جرم میں کہ تم اس سے عصمت فروشی کراتے تھے.... تو یہ خبر....؟"

"نہیں!" وہ چلّایا۔ "اس نے کچھ نہیں کیا۔ میرے جرم کی سزا اسے مت دو۔"

"رحمت کباڑی کہاں ملے گا؟" میں نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔

"میں بتا دوں گا لیکن ایک شرط ہے...." وہ ہانپنے لگا۔ "اسے معلوم نہ ہو کہ میں نے غداری کی تھی.... پہلے مجھے چھوڑ دینا۔ بس میری بیٹی کی شادی ہو جائے۔ پھر وہ بے شک مجھے مار ڈالیں.... مجھے پروا نہیں۔"

"مجھے تمہاری شرط منظور ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن یہ مت بھولنا کہ تم نے چالاک بن کے دھوکا دیا مجھے یا جھوٹ بولا تو اپنی بیٹی کے مستقبل کی تباہی کے ذمّہ دار تم خود ہوگے۔ میں پہلے تصدیق کروں گا کہ تم نے سچ بولا ہے یا نہیں۔ کوئی بات غلط ہوئی تو کل اسی جگہ تمہاری ملاقات بیٹی سے ہوگی جو تمہیں یاد رہے گی۔ تمہیں بھی اور تمہاری بیٹی کو بھی۔"

اس کی کمزور رگ میرے ہاتھ میں آگئی تھی۔ اس کے بعد وہ مجھے رحمت کباڑی کا پتا کیسے نہ بتاتا۔ اس نے ٹریننگ ماری تھی کہ پولیس اس کی زبان نہیں کھلوا سکی لیکن مجھے اندازہ تھا کہ انسان کا جسم کتنا کمزور قلعہ ہے اور تشدّد کے ذہنی اور جسمانی طریقے شطرنج کی چالوں کی طرح ہیں۔ لاتعداد اور ایک سے ایک موثر، قوّتِ مدافعت کو مات دینے والا اور برداشت کی طاقت سے کہیں زیادہ۔ ترقی یافتہ ممالک میں تو تشدّد ایک فن ہے اور سائنس ہے جس میں محض انسان کی بے رحم ذہانت ہی نہیں، ذہن کو تابع فرمان بنانے والی ادویات سے لے کر الیکٹرانک مشینوں تک سب کا استعمال ہوتا ہے۔ میں کوئی ماہرِ فن نہیں تھا مگر میرے مقابل ایک معمولی آدمی تھا۔ ایک ادنیٰ درجے کا مجرم جس کی قوّتِ ارادی بہت کم تھی اور جو مجبور بھی تھا۔

خلافِ توقع مجھے بہت جلد کامیابی حاصل ہوگئی تھی میں نے اسے کھانے کو دیا اور اس کے مانگنے پر سگریٹ بھی دی۔ کچھ دیر کے لیے میں نے اسے آزاد کر دیا اور ریوالور قریب رکھے دری پر نیم دراز رہا۔ اس کی حالت قابلِ رحم ہوگئی تھی۔

"تمہاری حیثیت وعدہ معاف گواہ کی ہوگئی ہے۔" میں نے کہا۔ "اس لیے میں تم سے اور کچھ نہیں پوچھوں گا اور کسی کو نہیں بتاؤں گا کہ تم نے مجھے کیا معلومات فراہم کی ہیں۔"

"ان کو معلوم ہو جائے گا۔" وہ مایوسی سے بولا۔ "اب تک دلاور کو پوری رپورٹ مل چکی ہوگی کہ میں پکڑا گیا ہوں۔"

"لیکن دلاور نے یہ بھی معلوم کر لیا ہوگا کہ تم قید سے فرار ہو گئے ہو۔ ورنہ ایس پی صاحب اب تک تم کو پولیس کے حوالے کر چکے ہوتے۔ تمہارے خلاف رپورٹ ہوتی تھانے میں۔"

"لیکن میں کیا بتاؤں گا کہ فرار ہونے کے بعد میں کہاں رہا، واپس کیوں نہیں پہنچا؟" وہ بہت نروس اور پریشان تھا۔ سوچ رہا تھا کہ اس نے بیٹی کا نام کیوں لیا۔ اسی مجبوری کے باعث وہ اپنے ساتھیوں سے غدّاری کا مرتکب ہوا۔ اس کے لیے یہ بھی ممکن نہیں

تھا کہ بیٹی سمیت اس شہر سے چلا جائے۔ اگلے مہینے اسے بیٹی کو رخصت کرنا تھا اور وہ خوفزدہ تھا کہ اسے اتنی مہلت بھی ملے گی یا نہیں؟

"تمہارے ساتھ ایک اور شخص تھا۔" میں نے کہا۔ "اس نے واپس جا کے بتایا ہوگا تمہارے بارے میں؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "وہ باہر موجود تھا۔ میں اس سے پہلی بار ملا تھا۔"

"پھر وہ کیا رپورٹ دے گا؟" میں نے کہا۔ "اسے تو صرف اتنا معلوم ہے کہ تم پکڑے گئے۔ فرار کا اسے علم نہیں ہوگا۔ تم کل شام تک اپنے گھر پہنچ جاؤ گے۔ ممکن ہے دوپہر کو میں تمہیں چھوڑ دوں۔"

"وہ پوچھیں گے اب تک کہاں تھا؟" وہ بولا۔ "وہ میرے زخم دیکھ لیں گے اور سب سمجھ جائیں گے کہ گرفتار کرنے والوں نے مجھ پر تشدّد کیا ہے۔ میری کون مانے گا کہ میں نے کچھ نہیں بتایا اور جب تم رحمت کباڑی کو پکڑو گے تو کیا وہ سمجھ نہیں جائیں گے کہ تم کو سب میں نے ہی بتایا ہوگا۔ وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

وہ زار و قطار رونے لگا۔ یہ تمام عمر کے اعمال کا کفّارہ تھا جو اسے اب ادا کرنا پڑ رہا تھا۔ یہ قدرت کی وہ سزا تھی جس سے مفر نہ تھا۔ وہ سب بھی قصور وار کہاں تھے جو اب تک مارے جا چکے تھے مگر ان کی مجبوری کی نوعیت مختلف تھی۔ کچھ اپنی اصول پرستی کے باعث مجبور تھے، کچھ انسانیت کے رشتوں سے مجبور تھے۔ وزیر خان کو بھی کچھ مجبوری تھی کہ میرے سر پر سہرا نہ دیکھ سکا۔ شہلا کی رخصتی سے قبل اس کی ماں مر گئی۔ رابعہ بھی دلہن بنی مگر اس کی رخصتی نہ ہو سکی۔ سب کی مجبوریاں ان کی خواہشات کے سامنے دیوار بن گئیں۔ یہ پہلے بھی ہوتا آیا ہے اور آئندہ بھی ہوگا۔ تقدیر کے سوا آدمی کے ہر المیے کا الزام کسے دیا جا سکتا ہے۔ قصور وار میں نہیں تھا۔ میں تو یہ نہیں چاہتا تھا کہ بیٹی کی ڈولی اٹھنے سے پہلے باپ کا جنازہ اٹھ جائے۔ قصور وار وہ خود بھی نہیں تھا جسے معلوم نہ تھا کہ اس مشن میں ناکامی کا انجام یہ ہوگا۔ قصور وار اس کی بیٹی بھی نہ تھی۔

"ہو سکتا ہے دلاور تمہیں کچھ مہلت دے دے۔" میں نے ہمدردی سے کہا۔ "اور تم بیٹی کو رخصت کر سکو۔"

لیکن وہ ساکت و صامت بیٹھا رہا۔ اس شخص کی طرح جسے سزائے موت دی جا چکی ہو اور جس کی رحم کی آخری اپیل بھی مسترد ہو چکی ہو۔ اس کے دامن میں امید کی ایک بھی کرن نہیں تھی۔

میں نے اسے ساتھ والے کمرے میں منتقل کیا اور اس کے ہاتھ کمر کے پیچھے باندھ کر رسّی کا دوسرا کنارہ بیچ کے دروازے سے یوں گزارا کہ دونوں پٹ ایک بل سے مل گئے۔ باقی رسّی میں نے ایک ٹخنے کے اوپر باندھ لی۔ پھندا بہت ڈھیلا تھا اور مجھے کوئی تکلیف نہیں دے رہا تھا مگر میرے پاؤں سے نکل نہیں سکتا تھا۔ اگر میرا قیدی زور لگاتا اور دروازہ کھینچ کر میرے قریب آنے کی کوشش کرتا تو رسّی کا دباؤ پڑتا اور ٹانگ کھنچی جاتی تو میں فوراً اٹھ بیٹھتا۔ میں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ کوئی غلط حرکت نہ کرے اور اگر خود نہیں سو سکتا تو مجھے سونے دے۔

میں ٹھیک پانچ بجے اٹھا کسی الارم کے بغیر وقت پر جاگنا میرے لیے کبھی مشکل نہ تھا۔ ہر شخص تھوڑی سی قوّتِ ارادی سے کام لے کر ذہن کو یہ تربیت دے سکتا ہے کہ وہ جس وقت چاہے اٹھ جائے اور بہت سے لوگ ایسا ہی کرتے ہیں کہ سونے سے پہلے اٹھنے کا وقت طے کر لیتے ہیں۔ ان کا لاشعور ٹھیک وقت پر شعور کو بیدار کر دیتا ہے۔ مجھے چھ بجے قبرستان میاں میر صاحب کے دروازے پر پہنچنا تھا اور وہاں تک کم سے کم آدھے گھنٹے کا راستہ تھا۔ میں نے اپنا لباس بدل کے اے ایس آئی کی پوری وردی پہنی۔ اپنے قیدی کو اس طرح باندھا کہ وہ ہل بھی نہ سکے۔ میں نے نوٹ کیا تھا کہ وہ رسّی کو فرش پر گھستا رہا ہے۔ اگر اسے زیادہ مہلت ملتی تو وہ کامیاب بھی ہو جاتا۔ میں کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ میں نے دور کے ایک گوشے میں لالٹین روشن کی اور اس سے کوئی بات کیے بغیر کار لے کر نکل آیا۔ کار کو میں نے قبرستان کے سامنے دم موڑ کی ایک گلی میں روکا۔ رومال سے ہر وہ جگہ صاف کی جہاں مجھے اپنے فنگر پرنٹ کی موجودگی کا شبہ ہوا۔ پھر میں نے کار کے گلوز کمپارٹمنٹ میں سے ایک بال پوائنٹ قلم اور کاغذ کا ایک پرزہ نکالا اور اس پر لکھا

"محترم۔ بارہ گھنٹے تک اپنی کار استعمال کرنے کی اجازت دینے کا شکریہ۔ آپ کو ہمدردی کا یہ جذبہ بہت مہنگا پڑا۔ غالباً آئندہ آپ کسی مستحق کو بھی لفٹ نہیں دیں گے۔ آپ کی پریشانی اور زحمت کے لیے معذرت۔ افسوس یہ ہے کہ احتیاط کے باوجود کار کا پچھلا حصّہ معمولی سی رگڑ سے خراب ہو گیا۔ امید ہے پانچ سو روپے میں آپ اس کو بہترین ڈینٹ پینٹ کرا لیں گے اور یہ نقص نظر بھی نہ آئے گا۔"

اسی کاغذ میں سو سو کے پانچ نوٹ لپیٹ کر میں نے چابیاں بھی گلوز کمپارٹمنٹ میں ڈال دیں اور کار سے اتر کے گلی سے سڑک پر آگیا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں میرے سمجھانے کے باوجود اس شخص نے پولیس کو رپورٹ نہ دے دی ہو اور اب پولیس سادہ کپڑوں میں میری منتظر ہو۔ عقلمند آدمی ہوتا تو ہرگز ایسا نہ کرتا لیکن اس نے میری بات کو قابلِ اعتبار نہیں سمجھا تھا۔ شاید اسے ڈر ہوگا کہ کار ڈکیتی یا اغوا کی واردات میں استعمال ہوئی اور اس نے رپورٹ بھی نہ لکھوائی تو وہ تفتیش کے لیے چکّر میں پھنس جائے گا۔ پولیس اسے مظلوم نہیں، مجرموں کا ساتھی فرض کرے گی۔ نتیجہ یہ کہ وہ قبرستان

کے دروازے پر کھڑا بے چینی سے انفرادی روڈ پر دونوں طرف دیکھ رہا تھا۔ فورٹریس اسٹیڈیم کی طرف سے آنے والی سڑک کو بھی اور دھرمپورے کے پُل کی جانب بھی۔ بے حد عقلمند اور مستعد پولیس والے وردی سمیت اس کے آس پاس موجود تھے۔ ان کی کھوپڑی میں یہ آیا ہی نہیں تھا کہ میں تیسری سمت سے بھی آسکتا ہوں۔ یعنی سامنے کسی بھی گلی سے۔ رابعہ کی سُرخ فاکس ویگن بہت سی دوسری کاروں کے درمیان موجود تھی۔ دوسری کاروں والے فاتحہ خوانی کے لیے آئے تھے اور جمعرات ہونے کی وجہ سے ان کی تعداد زیادہ تھی۔ میں اطمینان سے سڑک کے دوسرے کنارے پر چلتا رہا۔ پھر سڑک عبور کر گیا۔ پولیس کی نفری نے مجھے بالکل قابلِ توجہ نہیں سمجھا اور میں اچانک رابعہ اور محسن کے سامنے جا پہنچا۔ محسن خان آگے والی سیٹ خالی رکھنے کے لیے پیچھے تشریف فرما تھے۔ انہوں نے چونک کر مجھے دیکھا لیکن میں ان کے اظہارِ حیرت سے پہلے دروازہ کھول کے گاڑی میں بیٹھ گیا۔

"یہ کیا جعلسازی ہے؟" محسن نے کہا۔ "تو آدمی ہے کہ تھانیدار؟"

"آدمی بلبلہ ہے پانی کا۔ اٹھانوے فیصد پانی کا اور پانی اس برتن کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے جس میں رکھا جائے۔" میں نے کسی فلسفی کی طرح ارشاد کیا۔ "حالات کا یہی تقاضا تھا اور آئندہ بھی مجھے اپنا حلیہ اپنی ضرورت کے مطابق رکھنا پڑے گا۔ میں سکندر بخت بن کے نہیں رہ سکتا چنانچہ ع ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی۔"

"ایسے کتنی بار اپنا حلیہ بدلو گے؟" رابعہ نے کہا۔ "اور کب تک چھُپ چھُپ کے رہو گے؟"

"اس کا جواب وقت دے گا۔" میں نے کہا۔ "ابھی تو یہاں سے نکلو۔ مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔"

روانگی سے قبل میں نے رابعہ سے قلم لے کر ایک چِٹ پر لکھا۔ "آپ کی کار سامنے گلی میں کھڑی ہے۔" اور قریب سے گزرنے والے ایک بچّے کو بلایا۔ "یہ ان کو دے دو بیٹے۔" میں نے کہا۔ "وہ جو پولیس کے ساتھ کھڑے ہیں۔"

یہ بات محسن نے کہی ہوتی تو بچّہ بھاگ جاتا لیکن وہ میری وردی دیکھ کر ڈر گیا۔ رابعہ نے گاڑی نکالی تو میں نے دیکھا کہ بچّہ وہ چِٹ کار کے مالک کو دے رہا ہے۔ فاکس ویگن ان کی بھاگ دوڑ سے قبل ہی اتنی دُور جا چکی تھی کہ اس کا نمبر کوئی نہیں پڑھ سکتا تھا۔ مالک سے زیادہ پولیس کو حیرانی ہوئی ہو گی کہ وہ کون ذہین پولیس افسر تھا جو سامنے نہیں آیا اور کار کا سراغ لگا کے کامیابی کا اعزاز انہیں بخش گیا۔ رابعہ نے گاڑی کو گلبرگ کی طرف موڑ دیا۔

گلبرگ کے ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھ کے میں نے انہیں دن بھر کی روداد سنائی اور ان سے رضوی صاحب کے گھر میں پیش آنے والے واقعات کا خلاصہ سنا۔ جانتے بوجھتے میں نے رابعہ کو صرف اتنا بتایا کہ آج کی رات میں اور محسن رحمت کباڑی کا پتا لگانے جائیں گے۔ اگر میں اس کو اپنے حقیقی عزائم سے آگاہ کر دیتا تو وہ مجھے کچھ بھی نہ کرنے دیتی۔ نہ ایک وکیل کی حیثیت سے نہ اس عورت کی حیثیت سے جسے محبت بزدل بنا دیتی ہے۔ پھر محسن سگریٹ لینے چلا گیا۔

"قصرِ جمشید" کوئی محفوظ جگہ نہیں ہے۔" رابعہ نے کہا۔ "ایک طرح سے دشمن کی سرزمین ہے۔"

"ہاں۔ لیکن دشمن وہاں سے کوچ کر گیا ہے۔" میں نے کہا۔ "اس کی واپسی کا کوئی امکان نہیں اور اس کے ایجنٹ ہیں تو انہیں یہ خیال کیسے آسکتا ہے کہ میں انہی کے علاقے میں خیمہ زن ہوں۔"

"اور تم اُن بھوتوں، چمگادڑوں اور اُلوؤں کے ساتھ کب تک رہو گے؟ جہاں بجلی تک نہیں ہے۔" رابعہ نے دُکھی لہجے میں کہا۔ "خوف نہیں آئے گا تمہیں اتنے بڑے ویرانے کی تنہائی میں؟"

"نہیں۔ میرے ساتھ ایک تو یہ ہو گا۔" میں نے جیب کے اوپر نظر آنے والے ریوالور کو تھپک کر کہا ـــــ "دوسرے تمہارا تصور ہو گا۔ خوف کی گنجائش پھر کہاں ہو گی۔" لیکن میرے اس مذاق پر بھی وہ مسکرائی تک نہیں۔ تصور میں وہ مجھے گرد و غبار سے اٹے ہوئے تاریک کمرے میں ابابیلوں اور چمگادڑوں کے شور میں گھونسلوں سے گرنے والے تنکوں کی بارش میں اور غلاظت میں دری پر سوتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ جو ایک مل اونر، چار سال برطانیہ میں تعلیم حاصل کر کے لوٹنے والا، ناز و نعم اور عیش و عشرت کی زندگی کا پروردہ تھا۔ زمین کی پستیوں پہ آسمان نے ہم کو دے مارا۔ میں اب قاتل تھا اور مفرور مجرم تھا اور میری فردِ جرم طویل سے طویل تر ہوتی جا رہی تھی ـــ میں زمانے کی نظر سے، پولیس کی نظر سے اور ہر سمت جال لے کر پھرنے والے شکاریوں سے چھپنے پر مجبور تھا اور وہ میری کوئی مدد نہیں کر سکتی تھی۔

"کس فکر میں مبتلا ہو؟" میں نے کہا۔ "میرا ساتھ دینا مشکل نظر آ رہا ہے؟"

"اب کیسی مشکل؟" وہ تلخی سے بولی۔ "درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا۔ مجبور میں ہوں، تم نہیں ہو۔ تم جو چاہو اپنی مرضی سے کر سکتے ہو۔ میں کیا کر سکتی ہوں فکر کرنے کے سوا۔"

"دیکھو رابعہ۔ میری تو یہی زندگی ہے۔" میں نے کہا۔ "اس میں خطرات بھی ہیں اور مجھے معلوم نہیں کہ انجام کیا ہو گا لیکن میں اپنی فطرت کو بدل نہیں سکتا۔ میں اپنے ارادے پہ قائم رہوں گا۔ تخت ہو یا تختہ۔ تم کسی امید پہ انتظار کر سکتی ہو تو ضرور کرو۔ ورنہ مجھے میری تقدیر کے سپرد کر دو۔ میں واپس آیا تو صرف تمہارے لیے آؤں گا اور میرا دل کہتا ہے کہ وہ وقت میری جان بہت دُور

نہیں ہے۔ لیکن میں نہ آؤں تو ....؟"

"بس بس ....؟" اس نے آنکھوں میں اُتر آنے والے ایک قطرۂ اشک کو انگلی سے جھٹک دیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ "یہی ضروری باتیں کرنے کے لیے بُلایا تھا تم نے مجھے؟"

میں نے ہاتھ پکڑ کے اسے پھر بٹھا دیا۔ "آئی ایم سوری لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم حقیقت کو نظر انداز نہ کرو۔ ابھی تک میں آزاد ہوں تو تمہاری ہی مدد کے طفیل۔ تم نے اپنی بساط سے بڑھ کر قربانیاں دیں لیکن اب حالات ایسے ہو گئے ہیں کہ تمہاری مدد میرے کام نہیں آسکتی۔ میں نے ابھی تک اپنا دفاع کیا اور قانونی جنگ لڑتا رہا۔ اس سے مجھے کیا ملا؟ میں ہر طرف سے محصور ہو گیا ہوں۔ اب میں نے کھُلی جنگ لڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے کیونکہ میں بھاگتے بھاگتے تھک گیا ہوں۔ ساری عمر بھاگتے ہوئے کون گزار سکتا ہے۔ اب جو کچھ کرنا ہے خود مجھے کرنا ہے خواہ وہ قانونی طریقے سے ہو یا غیر قانونی طریقے سے۔ میرا مقصد بہرحال غلط نہیں ہے۔ یہ بھی غلط نہیں ہے کہ جنگ میں صرف ایک فریق کی جیت ہوتی ہے۔ میرا حوصلہ تم ہو، میرا مقصد تم ہو۔ اگر تمہاری آنکھ میں آنسو ہوں گے تو.... تو میں مارا جاؤں گا ... میں مقابلہ کر ہی نہیں سکوں گا... مجھے سہارا دو، پلیز۔ امّید کے ساتھ اور خوشی کے ساتھ...."

"خوشی مقدّر میں ہو تو ملتی ہے سکندر۔" وہ زبردستی مسکرائی۔ "کوشش تو سب ہی کرتے ہیں۔ پھر بھی میں کوشش کروں گی کہ تمہیں مجھ سے کوئی شکایت نہ ہو۔"

"تم نے بُرا مانا میری بات کا؟" میں نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ "میں کیا کروں رابعہ کہ تم ہی میری طاقت ہو اور تم ہی میری سب سے بڑی کمزوری بن گئی ہو۔"

"اچھا ڈائلاگ ہے۔" محسن نے کیبن میں قدم رنجہ فرما کے کہا۔ "میں نے نوٹ کر لیا ہے۔"

"ساڑھے سات بجے تم کو "قصرِ جمشید" پہنچنا ہے۔" میں نے کہا۔ "اس طرح کہ کسی کو معلوم نہ ہو۔"

"وعدہ کرو کہ تم لوگ کوئی حماقت آمیز بہادری کا کارنامہ سرانجام نہیں دو گے؟" رابعہ نے کہا۔

"خطرے کی کوئی بات ہی نہیں۔ ہم دو چار گھنٹے میں لوٹ آئیں گے۔" میں نے محسن کو رابعہ کی نظر بچا کے آنکھ ماری اور اٹھ کھڑا ہوا۔ "اب میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ یہاں سے رکشا یا ٹیکسی لے لوں گا۔"

اگر میں شریفانہ لباس میں ہوتا تو اس وقت کوئی مجھے ماڈل ٹاؤن نہ لے جاتا لیکن وردی والے تھانیدار کو رکشا والا کیسے انکار کر سکتا تھا۔ راستے میں دو جگہ رکشا روک کر میں نے کچھ اور چیزیں خریدیں۔ ایک بہت مضبوط زنجیر اور دو انتہائی مضبوط تالے۔ ایک فٹ لمبا اور آدھے انچ موٹا لوہے کا کھونٹا جس میں لوہے کا ایک کڑا تھا۔ ایسے کھونٹے گوالے اپنی گائے بھینسوں کو باندھنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ پھر ایک ہوٹل سے میں نے اپنے قیدی کے لیے روٹیاں اور کباب خریدے۔ ماڈل ٹاؤن پہنچ کر میں نے رکشا کو سامنے والی کوٹھی کے دروازے پر روکا اور اسے دس روپے دیے۔ اس نے سلام کیا اور بھاگ گیا۔ اندھیرے میں اوپر پہنچنے کے لیے مجھے لائٹر کی روشنی کا سہارا لینا پڑا۔ وہ اسی طرح بے بس بندھا ہوا پڑا تھا۔ کھانا قیدی کے سامنے رکھ کر میں نے کھونٹے کو ایک پتھر کی مدد سے دیوار میں ٹھونک دیا۔ پرانی ہونے کے باوجود دیواریں ٹھوس تھیں اور کھونٹے کو پورا گاڑنا آسان نہ تھا۔ میں پسینے پسینے ہو گیا لیکن پندرہ بیس منٹ کی محنت کے بعد صرف لوہے کا کڑا دیوار کے باہر لٹکتا رہ گیا۔ میں نے زنجیر کے ایک سرے پر دو حلقوں کو ملا کے ان میں کھٹکے سے بند ہونے والا ایک قفل لگا دیا۔ پھر میں نے اسے آزاد کر دیا۔ وہ میری اس کارروائی کو غور سے دیکھتا رہا تھا۔ "کھانا کھا لو۔" میں نے کہا۔ "مجھے واپس جانا ہے۔"

جب وہ کھانے سے فارغ ہو گیا تو میں نے زنجیر کے دوسرے کنارے کے آخری حلقوں کو آپس میں جوڑ دیا۔ یہ حلقہ اب اس کے ٹخنے سے ذرا اوپر دائیں ٹانگ پر پڑ گیا تھا۔ "جب تک میں نہ آؤں اس کو گھستے رہنا۔ بے کار رہنے سے کچھ کرنا اچھا ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر یہ رسّی نہیں کہ کٹ جائے۔" کمرے میں اب چمگادڑیں چکر لگا رہی تھیں اور ان کی بھیانک صدائے احتجاج سے پورا محل گونج رہا تھا۔ میں نے ایک چراغ روشن کر کے ان کی راتوں کے سکون اور ان کی خلوت میں رخنہ اندازی کی تھی۔ وہ ان آوازوں سے دہشت زدہ لگتا تھا۔

"اگر تم چاہو تو یہ لالٹین بجھا سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "لیکن اندھیرے میں بدرُوحیں چمٹ جائیں گی تم سے تو گِلہ مت کرنا۔ میں نے سُنا ہے یہ جگہ آسیب زدہ ہے۔" اس کا رنگ لاش کی طرح سفید ہو گیا لیکن وہ کچھ بولا نہیں۔ بے بسی، مایوسی خوف اور بے یقینی نے اس کی زبان گنگ کر دی تھی۔

ساڑھے سات ہو گئے تھے۔ میں نیچے اُتر آیا اور سڑک پر کھڑا ہو گیا۔ محسن دس منٹ بعد رکشا میں پہنچا۔ کرائے کے مسئلے پر ان کی تکرار جاری تھی کہ میں نے مداخلت کی۔ رکشے والے کی آواز بند ہو گئی۔ اس نے اچانک رکشے کو گیئر میں ڈالا اور کرایہ لیے بغیر فرار ہو گیا۔ کچھ دُور جا کے اُس کی رفتار کافی تیز ہو گئی تو اس نے سر گھما کے ہم دونوں کو ایک زبردست گالی دی اور رکشے کی رفتار بڑھا دی۔ میں اور محسن بے اختیار ہنسے۔

"چودہ روپے آٹھ آنے میں ایک گالی۔ سوا سات روپے فی کس۔" محسن نے کہا اور قصرِ جمشید کی تاریک عمارت کو دیکھنے لگا۔

"یہاں پہلے ایک مالی تھا؟"

"ہاں۔ یا تو وہ سب کچھ سمیٹ کر نکل گیا۔ کب تک انتظار کرتا۔" میں نے کہا۔ "یا مر گیا۔ سرونٹ کوارٹر کا ملبہ ہو گیا ہے۔ میں نے اسے اوپر رکھا ہے۔ اس کے چیخنے چلّانے کی آواز باہر نہیں آسکتی۔"

"ہم دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔" "تو مسلح ہو کے آیا ہے نا؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ میں سمجھ گیا تھا کہ کام خطرناک ہے۔" کھانا ہم دونوں نے درمیانے درجے کے ایک ہوٹل میں کھایا اور اسپیشل سروس کے باوجود پروپرائیٹر کے ساتھ وہی رویّہ رکھا جو تھانیداری کی شان کے مطابق تھا۔ کھانے کے بعد بوتل اور سگریٹ منگوائی اور ڈکار لے کر باہر نکل گئے۔ پروپرائیٹر نے صرف سلام کیا۔ اگر ہم بل ادا کرنے پر اصرار کرتے تو وہ حیران ہوتا کہ یہ کیسا تھانیدار ہے! اور میں ہر طرح سے ایک عام تھانیدار نظر آنا چاہتا تھا۔

"ایک مثل ہے کہ جیسا دیس ویسا بھیس۔" میں نے باہر آ کے کہا۔ "دوسری مثل یہ ہونی چاہیے کہ جیسا بھیس ویسا رویّہ۔"

"ہم کوٹ لکھپت تک مارچ نہیں کر سکتے۔" محسن نے کہا "اور ہمیں ان سے پہلے وہاں موجود ہونا چاہیے۔"

"سڑک اب بالکل سنسان تھی۔ میں نے محسن کو ایک درخت کے سائے میں تنے کے پیچھے چھپ جانے کے لیے کہا اور خود سڑک کے کنارے کھڑا رہا۔ پہلی ہیڈ لائٹس کے نمودار ہوتے ہی میں نے وسط میں آکے اشارہ کیا لیکن وہ ٹیکسی تھی۔" ساڈا قصور مائی باپ؟" ڈرائیور ہاتھ باندھ کے باہر نکلا۔

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ "کچھ نہیں، جاؤ۔ کوئی اور ٹیکسی دیکھی تھی تم نے ادھر آتے ہوئے؟"

"نہیں مائی باپ۔" ٹیکسی ڈرائیور نے اطمینان کا سانس لے کر خدا کا شکر ادا کیا اور بڑی گھبراہٹ میں روانہ ہو گیا۔ پھر جو کار آئی اس میں ایک فیملی تھی۔ میں نے اسے بھی روکا۔ رسماً چند ضروری سوالات کیے اور جانے کی اجازت دی۔ وہ میرے اخلاق سے متاثر ہوئے لیکن تیسرے کو قانون سے تعاون مہنگا پڑا۔ وہ اکیلا تھا۔ کانونٹ کے لہجے میں انگریزی بولنے والا۔ وہ ٹریک سوٹ میں تھا اور گاڑی کی پچھلی سیٹ پر اس کا ٹینس کا ریکٹ پڑا تھا۔ وہ بہت جلدی میں تھا۔

"یس آفیسر؟" اس نے کھڑکی سے سر نکال کے کہا اور میں نے کرخت اکھڑ لہجے میں اسے نیچے آنے کا حکم دیا۔ وہ سخت برا مان کے باہر نکلا ہی تھا کہ محسن نے اسے پیچھے سے دبوچ لیا اور اس کے سر پر ریوالور کا بٹ مارا۔ اس کے بے ہوش ہوتے ہی محسن اسے گھسیٹ کر ایک طرف لے گیا۔ ایک منٹ بعد ہم دونوں گاڑی میں بیٹھے کوٹ لکھپت کی طرف رواں تھے۔ یہ فور ڈی کورٹینا تین سال پرانی تھی مگر نئی لگتی تھی۔

"زیادہ چوٹ تو نہیں آئی اسے؟" محسن نے کہا۔ "میں نے سخت وار تو نہیں کیا تھا۔"

"میرا خیال ہے اسے چوٹ ہی نہیں آئی۔" میں نے کہا۔ "نازک مزاج تھا اس لیے بے ہوش ہو گیا۔ تھا کوئی رئیس زادہ۔"

ساڑھے نو بجے میں نے کار کو کچے راستے پر اتار دیا۔ غیر آباد علاقے میں مکان بہت دور بنے ہوئے تھے۔ میں نے نشانیوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے آخری موڑ کاٹا اور ہیڈ لائٹس آف کر کے گاڑی کو ایک احاطے کی دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا۔ باقی راستہ ہم نے پیدل طے کیا۔ چھوٹی سی مسجد کے مینار مجھے صاف نظر آرہے تھے۔

عشاء کی نماز قضا پڑھ کے نکلنے والے ایک شخص نے محسن کو غور سے دیکھا۔ "شاہ صاحب کا ڈیرا؟ کس سے ملنا ہے؟" میں ان سے ذرا فاصلے پر ان کی نظروں سے اوجھل سب کچھ سن رہا تھا۔

"شاہ صاحب سے؟" محسن نے کہا جو اس سوال کے لیے بالکل تیار نہ تھا۔

"بھولے بادشاہو۔" وہ شخص ہنس پڑا۔ "پھر چالیس سال پہلے آنا تھا۔ وہاں تو اب ڈیرا ہی ڈیرا ہے۔"

"کوئی تو ہوگا وہاں؟" محسن نے کہا۔

"ہاں ہاں۔ مجاور ہیں۔" وہ بولا۔ "گدی نشین کو اس کے بھائی نے مار دیا تھا۔ پھر مریدوں نے بکر کو مارا اور مجاور بن گیا۔ پتا نہیں گدی نشینی کی اس جنگ میں کتنے جان سے گئے۔ مرید بٹ گئے یا کٹ گئے۔"

"نذر نیاز سے بہت آمدنی ہوتی ہے کیا؟" محسن نے ایک اچھا سوال کیا۔

"تو اور کس لیے ہے یہ خون خرابہ بھولے بادشاہو۔" وہ شخص بولا۔ "لوگ ڈرتے ہیں ان سے۔ اور پولیس... خیر جی۔ آپ گامے شاہ سے مل لیں۔ پہلے وہ گاما ماچھی تھا۔ میں نے سنا ہے۔ آگے پکا احاطہ ہے اور گنبد ہے۔"

گامے ماچھی کے نام پر میں چونکا۔ وہ شخص جو میری قید میں تھا اس نے بتایا تھا کہ رحمت کباڑی اس کو لینے کے لیے گامے ماچھی کے اڈے پر آیا تھا اور وہاں سٹہ ہوتا تھا۔ گویا اب گاما ماچھی ڈبل رول کر رہا تھا۔ یہاں وہ گامے شاہ تھا۔ بدمعاشی کے سارے کاروبار پر سجادہ نشینی کا پردہ۔ پردہ تو عقیدت مندوں کی آنکھوں پر پڑا ہوا تھا جو حقیقت کو دیکھنے اور پرکھنے کے قابل نہ تھیں لیکن وہ باتونی شخص اندھا نہیں تھا۔ اس کی آنکھیں اور کان سب کھلے ہوئے تھے اور وہ بھولے بادشاہ سب سمجھتا تھا۔ گنبد ایک مختصر سے حجرے پر تھا جس کا رنگ سبز تھا اور اس کے اوپر سبز رنگ کا پرچم بھی تیس فٹ کی ڈنڈی سے باندھ دیا گیا تھا۔ پرچم پرانے کپڑے کا تکونا ٹکڑا تھا جس کے کناروں پر گوٹا بھی کالا پڑ گیا تھا اور اوپر لگے ہوئے چھوٹے سے بلب کی مدھم روشنی میں ماحول زیادہ سوگوار اور پراسرار لگتا تھا۔ مزار کے دروازے بند تھے۔ حجرے سے متصل دیوار دونوں طرف پھیلی ہوئی تھی اور تقریباً اتنی ہی اونچی تھی جتنی مزار کی دیواریں۔ میں نے اور محسن نے اس فصیل کو ہر طرف سے گھوم پھر کے دیکھا لیکن مجھے اندر جانے کا کوئی راستہ نظر نہ آیا۔ اس سے زیادہ حیرت مجھے چاروں کونوں پر لگی ہوئی سرچ لائٹس کو دیکھ کر ہوئی جو گھومنے والی اور بہت بڑی تھیں۔ بالکل ویسی ہی جیسی میں نے سینٹرل جیل کی بیرونی دیواروں پر نصب دیکھی تھیں۔

"سکیورٹی کا یہ اہتمام کس لیے؟" میں نے کہا۔ "یہ دس فٹ اونچی دیوار، سرچ لائٹس؟"

"ایسے انتظامات کی ضرورت وہی محسوس کرتا ہے جسے کوئی ڈر ہو۔" محسن نے کہا۔

"اندر جانے کے لیے وہی ایک دروازہ ہے، مزار والے حجرے کا۔" میں نے کہا۔

"دیوار کے اوپر بھی نوکیلے تیز دھار والے شیشوں کے ٹکڑے چن دیے گئے ہیں۔" محسن نے کہا۔

"بقولِ شاعر۔ پر کترنے کو لگی ہیں قینچیاں دیوار پر۔ لیکن کبوتر کو بامِ یار پر تو جانا ہے۔"

محسن نے میرے کندھے پر قدم جمائے اور اندر جھانکتے ہوئے رننگ کمنٹری شروع کی۔ "تیس درجہ دائیں جانب شمالی دیوار کے ساتھ ساتھ کمرے ہیں۔ ایک دو... تین چار۔ ان کی چھت دیوار سے ایک فٹ نیچے ہے اس لیے باہر سے کچھ نظر نہیں آتا۔ تیس درجہ بائیں طرف ایک ٹرک کھڑا ہے اور ایک ٹرک کا بچہ۔ سوری، ایک جیپ۔ ایک کمرے میں روشنی ہے۔ بندہ بشر کوئی دکھائی نہیں دیتا۔"

میں نے اسے نیچے گرا دیا۔ "میں ٹرانسمشن ٹاور نہیں ہوں کہ تیری نشریات چلتی رہیں گی۔ یہ بتا اندر جانے کا راستہ کوئی نہیں تو ٹرک اور جیپ اندر کیسے پہنچے؟"

"یہ فقیر کا ڈیرا ہے نابکار، بس کا اڈا نہیں۔" محسن نے کپڑے جھاڑ کر کہا۔ "اور فقیروں کی کرامات سے کون انکار کر سکتا ہے۔ وہ سوئی کے ناکے سے اونٹ گزار سکتے ہیں تو دروازے کی جھری سے ٹرک کیوں نہیں نکال سکتے۔"

"اب تو واپس جا، گاڑی میں ربڑ کے فٹ میٹ ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "چاروں نکال لا۔"

چار فٹ میٹ ایک کے اوپر ایک رکھنے کے بعد نوکیلے شیشوں پر قدم جمانا کوئی مشکل کام نہیں رہا تھا۔ میں نے محسن کو اوپر اٹھایا اور وہ ربر پر کم سے کم دباؤ ڈالے بغیر دیوار پر چڑھ گیا۔ اس کے پاؤں میں لیدر سول کے جوتے بھی تھے۔ چنانچہ وہ ایک فٹ چوڑی فصیل پر کھڑا ہوا تو اس کے وزن سے کچھ شیشے ٹوٹے۔ پھر اس نے جھک کر میرا ہاتھ تھاما اور مجھے اوپر کھینچ لیا۔ احاطے کی ہر دیوار تقریباً سو فٹ لمبی تھی۔ ہم ٹرک کے بالکل پیچھے کھڑے تھے اور وہ روشن حجرہ ہم سے سو فٹ دور تھا جس میں محسن نے روشنی دیکھی تھی۔ بالکل سامنے سے اور بلندی سے ہم روشنی میں کم سے کم تین سائے متحرک دیکھ سکتے تھے۔ "بسم اللہ کیجیے قبلہ۔" میں نے کہا۔ "گر جائیے۔"

"پہلے آپ بندہ نواز۔" محسن نے کورنش بجا لا کے کہا لیکن میں نے اسے آگے دھکیلا۔ وہ دھم سے کودا۔ پھر میں نے چھلانگ لگائی اور محسن کے قریب ہی لینڈ کر گیا۔ دونوں کے گٹے ٹخنے سلامت رہے اور ہم ٹرک کی اوٹ میں آگے بڑھے۔ ابھی تک کسی کو شاہ صاحب کے ڈیرے میں دو عقیدت مندوں کے تشریف لانے کی خبر نہیں ہوئی تھی۔

"ہے تو یہ ٹرک۔" میں نے اس کا معائنہ کرنے کے بعد کہا۔ "اور میں ایک سنسنی خیز انکشاف کرتا ہوں۔ یہ میرز ریاض اینڈ کمپنی کا وہی ٹرک ہے جس میں اس کے مالک یعنی خاکسار کو پیک کر کے ارسال کیا گیا تھا۔ میں نے اس کے نام 'ایم ڈبلیو ڈی' کے حروف کھرچ کر کچھ ترمیم کی تھی۔ اس کے مٹے ہوئے حصوں پر نیا رنگ ہے حالانکہ اس کا نمبر اب وہ نہیں مگر ہم ابھی دیکھ لیتے ہیں۔"

"لیکن اس میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔" محسن خان نے ٹرک کے اندر جھانک کر کہا۔

میں نے ریڈی ایٹر کے پانی میں رومال بھگو کر نمبر پلیٹ پر رگڑا۔ رومال سیاہ ہو گیا اور کچی سیاہی اتری تو وہ سات نظر آنے لگا۔ کمرشل نمبر پلیٹ کا رنگ کالا تھا اور حروف سفید تھے چنانچہ میں نے بھی نمبر آسانی سے بدل لیے تھے اور میرے طریقۂ واردات کی نقل کے لیے عقل کسی کو استعمال نہیں کرنی پڑی تھی۔ تھوڑا سا اور رگڑنے پر جو حرف ایل نظر آتا تھا وہ "ای" بن گیا۔ محسن اسی عمل کے ذریعے جیپ کا نمبر دریافت کرنے میں مصروف تھا کہ پہلے کسی ٹرک کی ہلکی سی آواز اور پھر روشنی جھلملائی۔ میں نے اور محسن نے چونک کر دیکھا۔ زمین سے بلندی کی جانب دو عمودی روشن لکیریں تاریک آسمان میں صاف نظر آرہی تھیں اور یہ... روشنی زمین سے پھوٹ رہی تھی۔ پھر ہم سے پچاس گز دور بائیں جانب اور مزار کے بالکل سامنے کی دیوار کے قریب زمین کے نشیبی خلا سے ایک ٹرک طلوع ہوا اور ہماری طرف آیا۔ میں اور محسن ابھی تک ٹرک کے پیچھے تھے۔ اگر ہم وہیں کھڑے رہتے

تو یقیناً پکڑے جاتے۔

پناہ کی واحد جگہ ٹرک کے نیچے تھی۔ میں نے اور محسن نے غوطہ مارا اور ٹرک کے چاروں پہیوں کے نیچے سمٹ کر لیٹ گئے دوسرا ٹرک سیدھا گزر گیا اور پھر ریورس میں واپس آیا۔ آہستہ آہستہ فاصلہ کم ہوتا گیا۔ ٹرک میں سے ڈرائیور کا نائب الامور نیچے اُتر آیا تھا۔ وہ ڈرائیور کو سگنل دیتا رہا۔ "آنے دو۔ آنے دو استاد۔ تھوڑا دائیں کو کاٹ کے... بس..." اگر وہ کھڑے ہوئے ٹرک سے ٹکرا جاتا تو ہم دونوں کا نہ جانے کیا حشر ہوتا۔ ہم پہیوں کے آگے بڑھنے سے کچلے جاتے یا ہاتھ پیر سے محروم ہو جاتے لیکن ڈرائیور ہوشیار اور بہت محتاط تھا۔ دونوں ٹرک چند انچ کے فاصلے سے یوں کھڑے ہو گئے کہ ایک کا منہ مشرق کی طرف تھا تو دوسرے کا مغرب کی طرف لیکن پشت کی جانب سے دونوں کے کھلے حصے تقریباً مل گئے تھے۔ زیرِ زمین اتنے بڑے راستے کی موجودگی نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ نہ جانے یہ راستہ کتنی دُور تک نشیب میں جانے کے بعد بلندی کی طرف پھیلتا ہو گا اور کسی ایسے احاطے یا بیرک نما گیراج میں نکلتا ہو گا جس کا شاہ صاحب کے ڈیرے سے تعلق کسی کے وہم و گمان میں نہ آسکے۔ عقیدتمند تو مزار کے حجرے تک آکے لوٹ جاتے ہوں گے۔ اندر کا حال انہیں کیا معلوم۔ ممکن ہے دن میں زیرِ زمین راستے کا شگاف بھی کسی ترپال یا تختے وغیرہ سے ڈھک کر بند کر دیا جاتا ہو۔

میں اور محسن دم سادھے لیٹے رہے۔ ڈرائیور نے اپنے ماتحت کو حکم دیا کہ وہ سامان رکھے اور خود گامے شاہ کو سلام کرنے چلا گیا۔ ہم نے نیچے سے سر گھما کے دیکھا۔ جس کمرے میں روشنی تھی اس میں سے تین افراد باہر نکل آئے تھے اور ڈرائیور انہی سے ملنے جا رہا تھا۔ اوپر کی دھما دھم سے میں نے اندازہ کیا کہ ماتحت ٹرک کے سامان کو منتقل کر رہا ہے۔ میں نے باہر نکل کے ٹرک کی سائڈ سے سامان کی منتقلی کے کام کا جائزہ لینے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ چاروں سرچ لائٹس روشن ہو گئیں۔ ان کا رُخ اندر کی طرف اور نیچے تھا۔ پورا احاطہ اس چندھیا دینے والی روشنی میں یوں نظر آنے لگا کہ گھاس کا تنکا بھی حرکت کرتا تو پتا چل جاتا۔ ڈرائیور نے باری باری تینوں افراد سے ہاتھ ملایا۔ ان کی آواز تو ہم تک پہنچ رہی تھی لیکن بات کوئی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے وہ سب ہم سے چند قدم کے فاصلے پر آکھڑے ہوئے۔

"رانجھے کا کوئی پتا نہیں شاہ صاحب۔" ڈرائیور نے کہا۔ "اس کی لڑکی کو بھی معلوم نہیں۔"

"اسے معلوم ہو گا۔" گامے ماچھی نے غرا کے کہا۔ "تم اسے یہاں لاتے۔ میں خود پوچھتا اس سے۔"

"وہ اکیلی تھی نا جی۔ ساتھ والوں کے گھر میں ہے۔ وہ کوئی لفنگی ہے۔" ڈرائیور نے کہا۔

"خیر اس کا پتا تو چل جائے گا۔" گامے نے کہا۔ وہ بھاری بھرکم پہلوانوں جیسے جسم والا دراز قد آدمی تھا جس کی گھنی داڑھی تھی۔ لمبی لمبی زلفیں تھیں اور پاٹ دار آواز تھی۔ اس نے ریشمی سُرخ لاچے پر بوسکی کا کرتا پہن رکھا تھا اور کندھے پر چار خانے والا رومال ڈالا ہوا تھا۔

"مال اب رحمت لے جائے گا۔ رحمت اور تم۔"

"گامے شاہ جی۔" ڈرائیور بولا۔ "کراچی میں کریم بھائی گڑبڑ کر رہا ہے۔ اس کے شیر شاہ والے گودام پر کوئی چھاپا نہیں پڑا تھا۔ وہ اس کے اپنے آدمی تھے۔ سارا ڈراما تھا۔ وہ مال ہضم کر گیا۔"

"مال تو میں اس کے حلق سے نکلوا لوں گا۔" گامے شاہ نے کہا۔ "لیکن تو کیسے جانتا ہے؟"

"ایکسائز والوں نے بتایا ہے جی۔ اپنا ہی آدمی ہے۔ اخبار کی خبر جھوٹی تھی۔" ڈرائیور بولا۔ "اور صرف ایک اخبار میں آئی تھی۔ اس نے کسی سے مل ملا کے چھپوائی تھی۔ رحمت کباڑی کو بھی معلوم ہے۔"

"ایکسائز میں میرا سالا انسپکٹر ہے جی۔" دوسرے شخص نے کہا۔ "پیار علی۔ اس نے میری بیوی کو فون کیا تھا۔"

"اپنے اس پیار علی کو سمجھا دینا کہ ایسی باتیں عورتوں سے کرنے کی نہیں ہوتیں۔" گامے نے برہمی سے کہا۔

"میں نے اسے سمجھا دیا تھا جی۔ اور بیوی کو بھی کہ زبان سے ایک لفظ نکلا تو زندہ گاڑ دوں گا۔" ڈرائیور سہم کر بولا۔

"یاد ہے نا اس سے پہلے والے ایکسائز انسپکٹر کو اس کی غلطی کی کیا سزا دی تھی ہم نے؟" گامے نے کہا۔

"یاد ہے شاہ جی۔ یہ نیا ہے لیکن بے وقوف نہیں ہے۔" ڈرائیور اب پشیمان تھا کہ اس نے بیوی سے فون پر گفتگو کا حوالہ ہی کیوں دیا۔

"کام سمجھ لے گا تو سب سے زیادہ کام کا ثابت ہو گا۔"

"کام ٹھیک کرے گا تو خود بھی موج کرے گا۔ کریم بھائی سے میں بات کر لوں گا۔" گامے نے کہا اور واپس ہو گیا۔

"کتنا مال رہ گیا ہے چھوٹے؟" ڈرائیور نے چلا کر کہا۔ "جانا بھی ہے گھنٹے بھر میں۔"

"مُک گیا استاد جی۔ بس دو منٹ۔" چھوٹے نے اسی لہجے میں جواب دیا۔ اور پھر "چھٹی لے کے آجا بالما" گانے لگا۔ بہت لہک لہک کر۔ پھر ایک عجیب بات ہوئی۔ چھوٹے سمیت چار افراد اپنی آرام گاہ کی جانب جاتے ہوئے رُکے۔ انہوں نے احاطے کے وسط سے ایک تختے کو گھسیٹنا شروع کیا۔ تختے میں یقیناً ہک تھے یا زنجیر تھی جس سے وہ اسے کھینچ رہے تھے۔ اس تختے کو انہوں نے زیرِ زمین راستے کے سوراخ پر رکھ دیا۔ پھر وہ دوسرا تختہ کھینچتے

ہوئے لے گئے اور پہلے تختے کے برابر رکھ دیا۔ تختے یقیناً بہت بھاری تھے کیونکہ انہیں پوری طاقت صرف کرنی پڑ رہی تھی۔ ایک کے بعد ایک وہ چھ تختے لے گئے اور انہیں برابر جما دیا۔ سرچ لائٹس آف ہو گئیں تو میں اور محسن ٹرک کے نیچے سے نکلے۔ پہلے ہم نے اس مال کا جائزہ لیا جو ایک ٹرک سے دوسرے ٹرک میں منتقل کیا گیا تھا۔ یہ سب لکڑی کے چھوٹے چھوٹے کریٹ تھے جن پر "میرو زیر اینڈ کمپنی" لکھا ہوا تھا۔ لائٹر جلا کے دیکھنے پر مجھے ہر کریٹ کے اوپر ایک چھپی ہوئی سلپ بھی چسپاں نظر آئی۔ ہر سلپ پر مال کی کیفیت درج تھی۔ بظاہر ان میں نٹ بولٹ تھے اور مختلف سائز کے پیچ تھے اور سب پر "زرعی آلات کے پُرزے" لکھا ہوا تھا لیکن ایک ہی کریٹ کو اٹھا کر دیکھنے سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ مال کچھ اور ہے۔ اگر ان میں لوہے کے نٹ بولٹ ہوتے تو ان کا وزن چار گنا ہوتا لیکن اس وقت نہ کسی کریٹ کو کھول کر دیکھا جا سکتا تھا اور نہ اس احاطے کے باہر اسمگل کیا جا سکتا تھا۔ اس میں شک و شبہے کی کوئی گنجائش نہ تھی کہ یہ ایکسائز اور کسٹم والوں کی گرفت میں آنے والا مال ہے۔ "زرعی آلات کے پرزے" ہوتے تو اتنا لمبا چکر ہی کیوں ہوتا۔

"کیا خیال ہے اب؟" محسن نے کہا۔ "سب کو دھرلیں؟ تیری پولیس کی وردی کام آسکتی ہے۔ ہم ایک ایک کو ہینڈز اَپ کرا سکتے ہیں، بلکہ گولی بھی مار سکتے ہیں۔"

"ابھی نہیں۔" میں نے کہا۔ "ایک تو ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ انڈر گراؤنڈ راستہ کہاں جا کے نکلتا ہے۔ اس کے لیے تجھے مال کے پیچھے چھُپ کر جانا ہو گا۔ میرا خیال ہے سرنگ زیادہ لمبی نہیں ہو سکتی۔ سو سوا سو گز کے اندر ہی دوسری جگہ ہو گی جہاں سے ٹرک باہر نکلے گا۔ پھر ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ مال کہاں جاتا ہے۔"

"مال کراچی جائے گا سیٹھ کریم بھائی کے پاس جس کا گودام شیر شاہ میں ہے۔" محسن بولا۔

"ہو سکتا ہے میں کراچی چلا جاؤں۔" میں نے کہا۔ "مجھے دو نام معلوم ہوئے ہیں۔ کریم بھائی اور ایکسائز انسپکٹر پیار علی کا۔ یہ بہت بڑا لنک ہے۔ مجھے اس اخبار کے دفتر جانا پڑے گا جس میں چھاپے کی خبر شائع ہوئی تھی۔ وہ ایک ہی اخبار تھا۔ میں دیکھوں گا رپورٹر کون تھا۔ وہ کریم بھائی کے شیر شاہ والے گودام کا صحیح پتا بتا سکے گا۔ پیار علی کو تلاش کرنا تو کوئی مشکل کام نہیں ہونا چاہیے۔"

آہستہ آہستہ ہم اس طرف چلنے لگے جہاں سے دوسرا ٹرک اندر آیا تھا۔ یہ انتہائی حیرت کی بات تھی کہ اس جگہ کا اب پتا بھی نہیں چلتا تھا۔ دس فٹ چوڑے اور کم سے کم بیس فٹ لمبے سوئمنگ پول جیسے راستے پر تختے بڑی صفائی سے بچھائے گئے تھے۔ تختوں کے اوپر مٹی تھی اور مٹی میں برابر کٹی ہوئی گھنی گھاس تھی چنانچہ وہ جگہ باقی احاطے میں مل گئی تھی جس میں ایسی ہی گھاس تھی۔ فرق صرف اوپر چلنے سے محسوس ہوتا تھا۔ دیکھنے سے نہیں۔ ہر تختہ اسی لیے بھاری ہو گیا تھا کہ اس پر چار چھ انچ مٹی اور گھاس کا وزن تھا لیکن وہ اپنے خفیہ راستے کو کیموفلاج کرنے میں کامیاب تھے۔ میں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ ہمارا آگے جانا خطرناک ہو سکتا ہے۔ اگر سرچ لائٹس اچانک روشن ہو گئیں یا وہ لوگ نکل آئے تو اس سپاٹ میدان میں ہم چھُپے نہ رہ سکیں گے۔

"میرا خیال ہے کہ ٹرک لے کر دو ہی آدمی روانہ ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جیپ ساتھ جائے۔ اگر جیپ پیچھے ہوئی تو میں کار لے کر آؤں گا۔ گھبرانا نہیں۔ ضرورت پڑے تو بے دریغ گولی مار دینا۔"

"یس سر۔ اگر میں زندہ سلامت یہاں سے نکلنے میں کامیاب رہا تو پھر ملاقات ہو گی۔" محسن نے ٹرک پر چڑھتے ہوئے کہا۔

"پیچھے غالباً چھوٹو ہی ہو گا۔" میں نے کہا۔ "جیسے ہی موقع ملے اسے ناک آؤٹ کر کے باہر پھینک دینا ورنہ اس نے تجھے دیکھ لیا تو یہی سلوک تیرے ساتھ ہو گا۔ میں سڑک پر گاڑی لیے کھڑا رہوں گا۔ یہ لوگ ایک گھنٹے میں روانہ ہوں گے۔"

میں نے چند کریٹ کھسکا کے محسن کے لیے جگہ بنائی۔ پھر اسے اپنے ساتھ لے کر واپس اسی جگہ پہنچا جہاں سے ہم اندر کود رہے تھے۔ محسن نے مجھے اوپر اٹھایا اور میں ربر میٹ پر قدم جما کے باہر کود گیا۔ کار تک پہنچنے میں میرے دس منٹ صرف ہوئے۔ یہ مشن جو رحمت کباڑی کی تلاش اور گرفتاری کے سوا کچھ نہ تھا اب غیر متوقع طور پر لمبا ہو گیا تھا کہ رحمت کباڑی کون ہے اور گاما ماچھی کون ہے لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے یہ بھی پتا چل گیا تھا کہ جس شخص کو میں نے قید کر رکھا ہے وہ رانجھا ہے۔ اس کا اصل نام یہ نہیں ہو گا۔ یہ اس کی عرفیت تھی۔ وہی ایک آدمی ہماری تحویل میں ہے جس کے بارے میں گامے کو تشویش تھی اور اس نے رانجھے کی بیٹی کا حوالہ بھی دیا تھا۔ یہ میرے لیے اطمینان بخش بات تھی کہ پڑوس میں رہنے والا کوئی لیفٹیننٹ ہے جو اس کی حفاظت کر سکتا ہے۔

لیکن کار سے [illegible] میں سڑک پر پہنچا تو مجھے خیال آیا کہ اب رانجھے کا [illegible] ہو گا۔ وہ رات بھر بھوکا پیاسا اور بندھا ہوا پڑا رہے گا۔ کچھ کھائے پیے بغیر؟ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ رحمت کباڑی مل گیا تو اگلے دن دوپہر یا شام تک اسے رہائی مل جائے گی لیکن اب ہماری واپسی غیر یقینی ہو گئی تھی۔ محسن کی طرف سے میں مطمئن تھا کہ اسے کوئی خطرہ لاحق نہیں۔ ایک گھنٹے بعد وہ روانہ ہوں گے تو بالکل مطمئن ہوں گے کہ ان کے سوا ٹرک میں کوئی نہیں اور لکڑی کے بکسوں کے درمیان چھُپا ہوا محسن ان کو نظر ہی نہیں آئے گا۔

قسمت ہی ساتھ نہ دے تو اور بات ہے۔ ایک چھینک اس کی موجودگی کا راز افشا کرسکتی ہے لیکن وہ مسلح ہے اور کسی کے قابو میں نہیں آسکتا۔ وہ ایک آدھ کو مار کے بھی نکل آنے گا۔

سڑک کے کنارے کار روک کے میں نے سگریٹ سلگائی اور آگے انجن کا بونٹ کھول دیا تاکہ معلوم یہ ہو کہ گاڑی گرم ہوگئی ہے یا کسی خرابی کے باعث میں وہاں رُکنے پر مجبور ہوں۔ پولیس کی وردی پہن کے میں نے بہت اچھا کیا تھا۔ اگر میں سادہ کپڑوں میں ہوتا تو مجھے ہر لحظہ پکڑے جانے کا خدشہ لاحق رہتا۔ وردی سے مجھے دوسرا فائدہ یہ تھا کہ میں ہر تھانیدار کی طرح من مانی کرسکتا تھا۔ پیسے نہ ہونے کی صورت میں کسی سے بھی رشوت لے سکتا تھا۔ کسی بس یا ویگن والے سے جس نے زیادہ یا بغیر ٹکٹ سواریاں بٹھا رکھی ہوں، ٹریفک کی خلاف ورزی کرنے والوں سے، کسی بھی پھڈے میں ٹانگ اڑا کر۔ بل ادا کرنے کے لیے رقم نہ ہو تو کہیں بھی کھانا کھا کے ڈکار لیے بغیر روانہ ہوسکتا تھا۔ سواری کے لیے کسی بھی رکشا ٹیکسی کو پکڑ سکتا تھا۔ شریفانہ لباس میں آدمی کتنا مجبور ہو جاتا ہے۔ تھانیدار کی وردی میں کتنا خود مختار۔ میری جیب میں ابھی ڈھائی ہزار کی نقد رقم موجود تھی اور یہ بھی اسی تھانیدار کی کمائی تھی جس کی وردی میں نے زیب تن کر رکھی تھی لیکن میں سوچ رہا تھا کہ وردی اور یہ رقم کب تک میرا ساتھ دیں گے۔

ابھی کچھ واضح نہیں تھا کہ گامے شاہ کے آدمی ٹرک لے کر کہاں جائیں گے۔ اپنا مال کسی مال گاڑی میں بُک کرائیں گے یا سیدھا کراچی لے جائیں گے۔ میں نے محسن سے کراچی جانے کی بات تو کر دی تھی مگر کراچی جانا آسان نہیں تھا۔ یہ بھی مشکل تھا کہ میں کراچی نہ جاؤں۔ کریم بھائی اور پیار علی سے مل کر بہت کچھ معلوم ہوسکتا تھا۔ یہ ضروری تھا کہ میں محسن کو واپس بھیج دوں تو یہ بھی ضروری تھا کہ میں رحمت کباڑی کو کراچی پہنچنے سے قبل ہی گرفتار کرلوں۔

اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ کیوں نہ میں ٹرک کو راستے میں ہی غائب کر دوں۔ رحمت کباڑی، چھوٹو اور ٹرک ڈرائیور کو گرفتار کرلوں اور ٹرک کو ایسے تباہ کروں کہ اس کا سراغ نہ ملے۔ گرفتاری کے بعد چھوٹو اور ٹرک ڈرائیور کو رہا کر دیا جائے تاکہ وہ واپس جاکے گامے شاہ کو اس واردات کی خبر دے سکیں۔ الزام پھر کریم بھائی پر آئے گا۔ اس نے پہلے ڈراما کیا تھا کہ گودام پر چھاپا پڑ گیا اور ایکسائز والے مال لے گئے مگر اس کا جھوٹ کھل گیا تھا۔ اب گامے شاہ کو شک ہوگا کہ ٹرک اس کے آدمی لے گئے۔ یہ رپورٹ بھی دلاور کو ہی کرنی پڑے گی کہ ٹرک میر وزیر اینڈ کمپنی کا تھا جس میں زرعی آلات کے پرزے تھے۔ وہ مجھ پر شک کرے گا مگر گامے شاہ اسے بتادے گا کہ کراچی میں کریم بھائی گڑبڑ کر رہا ہے اور یہ اس نے دوسرا ہاتھ مارا ہے۔

کچے راستے پر دُور سے ہیڈلائٹس نمودار ہوئیں تو میں نے بونٹ بند کیا اور انجن اسٹارٹ کر دیا۔ کار میں فیول میٹر کی سوئی آدھے سے زیادہ ٹینک فل بتا رہی تھی جس کا مطلب تھا کہ میں سو میل تک ٹرک کا تعاقب کرسکتا ہوں۔ ٹرک کے پیچھے کوئی جیپ نہیں تھی جو مزید حوصلہ افزا بات تھی۔ قریب آنے پر میں نے ٹرک کو پہچان لیا۔ ٹرک نے کراچی جانے والی سڑک پر سفر شروع کیا تو میں سو گز کے فاصلے سے اس کے پیچھے رہا۔ ایک موڑ پر ٹرک کی رفتار کم ہوئی تو میں نے ٹرک میں سے کوئی چیز اُڑ کر جھاڑیوں میں گرتی دیکھی۔ محسن نے چھوٹو کو اس طرح اور ایسی جگہ پھینکا تھا کہ اسے کم سے کم چوٹ آئے۔ میں نے کار روک کے دیکھا۔ وہ اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا اور بہت داویلا مچا رہا تھا۔

"کیا ہوا ہے تمہیں؟" میں نے کار روک کے پوچھا۔ "کیوں شور کر رہے ہو؟"

"اجی مر گیا میں تھانیدار صاحب۔ مجھے ٹرک میں سے پھینک دیا۔ وہ جا رہا ہے ٹرک؟" اس نے فریاد کرتے ہوئے کہا۔

"کس نے پھینک دیا؟" میں نے کہا۔ "اور وہ ٹرک کہاں کا تھا؟"

اس کے پاس دونوں سوالوں کا جواب نہیں تھا چنانچہ وہ چلایا۔ "آپ پہلے اسے پکڑیں۔ وہ نکل جائے گا۔"

"اچھا اچھا۔" میں نے اس کی تسلی کے لیے کہا۔ "تمہیں چوٹ تو نہیں آئی ہے نا۔ اسی جگہ کھڑے رہو۔ میں پکڑتا ہوں اسے۔" میں نے کار کی رفتار بڑھائی اور دس منٹ میں ٹرک کو جا لیا۔ محسن نے کریٹ کے پیچھے سے سر نکال کے ہاتھ ہلایا۔ میں نے جواب میں دو انگلیوں سے وی بنایا اور پھر مٹھی بند کر کے انگوٹھا دکھایا جس کا مطلب تھا کہ آل او کے۔ اب میں منتظر تھا کہ کہیں ٹریفک کم ہو تو ٹرک کو روکوں۔ اچانک ایک ریلوے کراسنگ آگئی۔ میں نے محسن کو اشارہ کیا کہ اُتر آئے۔ وہ پلک جھپکتے میں سڑک پر کود گیا اور کار میں آ بیٹھا۔ وہ اپنے کارنامے پر بہت خوش تھا۔

"بڑے موڈ میں کان پہ ہاتھ رکھے ہانک لگا رہا تھا۔ بہت لائٹ ویٹ تھا۔" محسن خان نے کہا۔ "ٹرک کا شور اتنا تھا کہ اسے میرے نکلنے کی خبر بھی نہیں ہوئی۔ چوٹ تو نہیں آئی اسے؟"

"نہیں۔ میں اُسے وہیں روک آیا ہوں۔ کسی اور سے اب کچھ نہیں کہے گا۔" میں نے کہا۔

تین میل بعد مجھے موقع ملا اور میں نے کار آگے نکالنے کا فیصلہ کیا اور رفتار بڑھائی۔

"میں ان سے بات کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "تو ایک بکس اٹھا کے کہیں سڑک کے کنارے رکھ دینا۔ میرا خیال ہے کہ پہلے ڈرائیور اُترے گا اور مجھے الگ لے جاکر معاملہ طے کرے گا۔ اسے فوراً کار

میں ڈالنا ہے۔ میں دوسرے سے نمٹ لوں گا۔"

میں نے کار آگے نکال کے ڈرائیور کو رُکنے کا اشارہ کیا اور اس کا راستہ روکنے لگا۔ آہستہ آہستہ میں بالکل ٹرک کے سامنے آگیا اور ٹرک ڈرائیور رفتار کم کر کے رُکنے پر مجبور ہوگیا۔ میں اطمینان سے نیچے اُتر آیا۔

"کیا بات ہے تھانیدار صاحب؟" ڈرائیور نے سلام کر کے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ "کوئی غلطی ہوئی ہم سے مائی باپ؟" وہ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ نیا انسپکٹر کہاں سے آیا۔ اس راستے پر وہ سب کو جانتے ہوں گے اور سب کو ان کا حصہ پہنچا دیتے ہوں گے چنانچہ ان کے لیے خطرے کی کوئی بات ہی نہیں تھی۔

"نیچے اُتر گورنر کی اولاد۔" میں نے کہا۔ "کاغذات دکھا۔"

وہ کاغذات لے کر نیچے اُتر آیا۔ کاغذات بالکل ٹھیک تھے۔ "کیا لے جا رہے ہو؟" میں نے پیچھے نظر ڈال کے کہا۔

"وہی جو ہمیشہ لے جاتے ہیں مائی باپ۔" وہ گول مول الفاظ میں بولا۔

"کیا لے جاتے ہو ہمیشہ، اپنی ماں کا سر؟" میں نے گرج کے کہا۔ "یہ اسپیشل چیکنگ ہے۔ خود ایس پی صاحب نگرانی کر رہے ہیں۔ منشیات کا ایک ٹرک پشاور سے آرہا ہے۔"

"توبہ توبہ۔" ڈرائیور نے دونوں کانوں کو چھو کر کہا۔ "اللہ معاف کرے ایسے دھندے سے۔ ہم تو جناب عالی پرزے لے جاتے ہیں۔ ٹریکٹر کے، چاول اور کپاس چھڑنے کی مشینوں کے، کمپنی زرعی آلات بناتی ہے۔"

میں نے ریوالور نکال لیا۔ "زیادہ وقت نہیں ہے میرے پاس۔ کریٹ کھولو۔"

اس کا چہرہ متغیر ہوگیا۔ "آپ مالک سے بات کریں جنابِ عالی۔ ہم تو نوکر ہیں۔"

وہ پلٹا ہی تھا کہ میں نے اس کے سر پر ریوالور کا بٹ مارا اور دوسرے ہاتھ سے اس کا منہ دبا لیا۔ وہ تھوڑا سا تڑپا اور ساکت ہوگیا۔ میں نے اُسے وہیں ڈال دیا اور پھر آگے گیا۔

"تم مالک ہو اس کے؟" میں نے کہا۔ "مجھے تلاشی لینی ہے۔ ڈرائیور کہتا ہے تم سے بات کروں۔" میں نے اسپیشل چیکنگ والی بات پھر دُہرائی۔ رحمت کباڑی چالیس سال کا ضرور ہوگا لیکن اس کی صحت قابلِ رشک تھی۔ وہ آہستہ آہستہ نیچے اترا۔ اسی وقت میں نے محسن کو کار سے اُتر کے ٹرک کی دوسری سائڈ سے پیچھے جاتے دیکھا۔ "اس میں کیا ہے تلاشی کے لیے تھانیدار جی؟" رحمت نے مالکانہ رعونت سے کہا۔

"ہے یا نہیں۔" میں نے کہا۔ "میں خود دیکھ لوں گا لیکن ایس پی...."

"ایس پی کون ہے؟" وہ بے نیازی سے بولا۔ "پراچہ صاحب؟"

"ایس پی اینٹی کرپشن اے آر مغل۔" میں نے کہا۔ "بہت سخت آدمی ہے۔"

"سخت تو سب ہی ہوتے ہیں بادشاہو۔ نرم کرلیں گے ہم۔" اُس نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔

"اپنے ہاتھ اُوپر رکھو۔" میں نے سخت لہجے میں حکم دیا لیکن وہ اتنی دیر میں ایک پیکٹ نکال چکا تھا۔

"اِدھر آجائیں سرجی۔" وہ بولا۔ "سڑک پر کھڑے ہو کے کیا بات کرنی۔ آپس کا معاملہ ہے۔"

وہ مجھے سڑک سے ذرا دُور لے گیا جہاں وہ درختوں کی اوٹ میں ہم کسی سڑک پہ سے گزرنے والی گاڑی کی روشنی میں نہیں آتے تھے۔ "سو میں روٹ پرمٹ مِل جائے گا جناب؟" وہ معنی خیز انداز میں دانت نکال کے بولا۔ اس کی مراد سو سو کے سو نوٹوں سے تھی۔

"مال کیا ہے؟" میں نے دس ہزار کی گڈی پر نگاہ ڈالے بغیر کہا لیکن لہجہ بدل دیا۔

"مال نوں چھڈو ویراں جی۔ گل مکاؤ۔" وہ بولا۔ "ابھی کوئی اور نہ آجائے حصے دار۔ ہم تو دونوں کے بھلے کی بات کرتے ہیں۔"

"ایسے مشکل ہے، پشاور سے پورا ٹرک روانہ ہونے کی اطلاع ملی تھی اور مخبر نے خود ایس پی صاحب کو بتایا تھا کہ پھیرا کتنے کا ہے۔" میں نے ریوالور جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ ہم اب دشمنوں کی طرح نہیں پارٹنرز کی طرح بات کر رہے تھے۔ راز داری کے ساتھ اور بے خوف و خطر۔

"چنگا جی۔ یہ لو اب مت بولنا۔" اس نے دوسری گڈی برآمد کی لیکن وہ بہت چالاک آدمی تھا۔ اگر میں اس کی طرف سے محتاط نہ ہوتا تو یقیناً مارا جاتا۔ میرے ریوالور جیب میں رکھنے کے بعد اس نے سمجھا تھا کہ اب فریقِ ثانی نہتا ہے اور اس کا کام آسانی سے تمام کیا جاسکتا ہے۔ نوٹوں کی دوسری گڈی کے ساتھ ہی اس نے دوسرے ہاتھ سے ریوالور نکال لیا۔ اس نے کچھ غیر معمولی جلدی کی یا گھبراہٹ میں اس طرح دوسرا ہاتھ جیب میں ڈالا کہ میں چوکنا ہو گیا ورنہ وہ مجھے گڈیاں تھمانے کے بعد بھی اطمینان سے ریوالور نکال سکتا تھا۔ شاید اسے ڈر تھا کہ دیر سے کام خراب نہ ہو جائے اور کوئی گاڑی نہ آجائے۔ گاڑیاں تو مسلسل گزر رہی تھیں لیکن شک کسی کو نہیں ہوا تھا کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔ ایک کار اور ایک مال بردار ٹرک ساتھ ساتھ کھڑے تھے تو یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ ممکن ہے ایک گاڑی خراب ہو اور دوسرا اس کی مدد کر رہا ہو یا دونوں آپس میں چھو گئے ہوں اور اب لڑ جھگڑ کے اپنے اپنے

نقصانات کی تلافی کر رہے ہوں۔ محسن اپنے کام سے فارغ ہو چکا تھا۔

فائر اس نے بڑی عجلت میں کیا تھا لیکن میں اس سے قبل ہی حرکت میں آ چکا تھا۔ عین اس وقت جب اس کی دوسری جیب سے ریوالور نکلا تھا، میں نے بڑی پھرتی سے گھٹنا اس کے ہاتھ پر مارا اور گولی آسمان کی طرف نکل گئی۔ ریوالور سائلنسر والا تھا چنانچہ اس کی آواز قریب سے گزرنے والی ایک بس میں کسی نے نہیں سنی۔ اس نے مجھے ٹکر مارنے کی کوشش کی اور میں نے اسے لات مار کے اچھال دیا۔ وہ منہ کے بل گرا اور پھر اٹھا لیکن میرے اگلے وار نے اسے خاموش کر دیا۔ وہ بے سُدھ ہو کے گر گیا۔ میں نے ریوالور اور بیس ہزار روپے جیب میں ڈالے اور اسے گھسیٹ کر لے گیا۔ "وہ کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

"کریٹ ڈکی میں اور مہمان پیچھے،" محسن نے پچھلی سیٹ کی طرف اشارہ کیا۔ "ان کو کہاں رکھنا ہے؟"

"ابھی تو یہیں رکھتے ہیں،" میں نے کہا۔ رحمت کباڑی کو اٹھا کے اندر پھینکا اور محسن کے ساتھ بیٹھ گیا۔ "یہاں سے نکل لے۔ بہت سی گاڑیاں گزر رہی ہیں۔ معلوم نہیں کس نے کیا دیکھا ہو اور آگے پولیس کو بتا دیا ہو۔"

محسن نے کار اسٹارٹ کر دی۔ تین میل آگے جانے کے بعد مجھے ایک کچا راستہ نظر آیا جو گھنے درختوں کے بیچ میں سے کسی قصبے یا گاؤں کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے محسن کو گاڑی موڑنے کو کہا۔ کچے راستے پر اُترتے وقت میں نے آگے پیچھے دیکھا۔ اس وقت دونوں طرف سڑک خالی پڑی تھی۔ محسن نے کار کو پھر موڑا اور درختوں کے گھنے جھنڈ کے پیچھے روک لیا۔

"ڈکی میں کوئی رسی ہے؟" میں نے کہا۔

"اس کار میں تو نہیں تھی، ٹرک میں تھی،" محسن نے کہا۔ "میں نے ضرورت کے خیال سے اُٹھا لی تھی۔"

"غلطی سے تو کبھی کبھی عقلمند ہونے کا ثبوت دے دیتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اب پہلے تو ان دونوں کو باندھنا ہے اور ان کے منہ بند کرنے ہیں۔"

"رشوت کتنی ملی؟" محسن نے رسی نکالتے ہوئے کہا۔

"بیس ہزار۔" میں نے جیب پر ہاتھ مار کے کہا۔ "اگر کچھ اور ملے تو رکھ لینا۔ سب مال اپنا ہے۔"

"ہاں کمائی تو میر و زیر اینڈ کمپنی کے نام پر ہو رہی ہے،" محسن نے کہا۔ ہم دونوں نے مل کر رحمت کباڑی اور جھوٹو کو ایک ساتھ ملا کے یوں باندھ دیا کہ وہ "تو من شدم من تو شدی" کی تفسیر بن گئے۔ ان کے منہ میں رومال ٹھونس کر میں نے ان پر وہ چادر ڈال دی جو ڈرائیور کے کندھے پر تھی۔

"اب تو واپس قصرِ جمشید جا،" میں نے کہا۔ "مجھے راستے میں ٹرک کے قریب اتار دینا۔"

"تو ٹرک لے کر کہاں جائے گا؟" محسن بولا۔ "اسے رہنے دے وہیں۔"

"میں صبح تک واپس پہنچ جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "اس ٹرک کا نام و نشان مٹا کر۔"

محسن نے گاڑی کو واپس سڑک پر لا کے لاہور جانے والی سڑک پر موڑ لیا۔ مجھے ٹرک کے پاس اُتار کے اور احتیاط کی تاکید کر کے وہ سیدھا نکل گیا۔ میں نے ٹرک ڈرائیور کی جگہ سنبھالی۔ چابیاں وہیں لٹکی ہوئی تھیں جہاں ڈرائیور نے انہیں چھوڑا تھا۔ میں ٹرک کو لے کر چلا گیا۔ تقریباً پندرہ میل چلنے کے بعد مجھے ایک خشک برساتی نالہ نظر آیا۔ جس کا پُل بہت اونچا تھا۔ میں نے جگہ دیکھ کر ٹرک کو نیچے اتارا اور اونچے نیچے کچے راستوں پر احتیاط سے چلاتا ہوا پُل کے نیچے لے گیا۔ ٹرک کی سیٹ کے نیچے ایک ڈبا موبل آئل کا تھا۔ اُسے میں نے آگے ہی چھڑک دیا۔ پیچھے اسپئیر وھیل کے درمیان پانچ گیلن پٹرول کا جیری کین رکھا تھا جو میں نے اسی وقت دیکھ لیا تھا جب ٹرک احاطے میں کھڑا تھا۔ گھاس پھونس جمع کرنے کے لیے مجھے کچھ دُور جانا پڑا لیکن بالآخر میں ہر ٹائر کے نیچے اور پٹرول ٹینک کے نیچے خاصی مقدار میں خشک گھاس اور ٹہنیاں جمع کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ بات صرف آگ پکڑنے کی تھی۔ اس کے بعد ٹائر خود ہی جلنے لگتے۔ ٹرک کا ڈھانچہ لکڑی کا تھا، اندر لکڑی کے کریٹ تھے۔ آگے ریگزین کی سیٹوں پر موبل آئل پڑا ہوا تھا۔ اور پٹرول ٹینک خود ایک پٹرول بم تھا۔ میں نے پانچ گیلن پٹرول پانچوں جگہ مساوی مقدار میں چھڑکا۔ لائٹر سے چاروں ٹائروں کے نیچے آگ دکھائی اور بھاگ کھڑا ہوا۔ آگ ایک دم بھڑکی تھی اور میرے سڑک پر پہنچنے تک نیچے الاؤ روشن ہو گیا تھا۔ ایک مسافر بس سے چھپنے کے لیے میں ایک درخت کے تنے کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ مسافر بس جنگل میں منگل دیکھ کر رُک گئی تھی۔ پھر مخالف سمت سے آنے والی بس وہیں آ رکی۔ دیکھتے دیکھتے پُل پر کئی گاڑیاں ٹھہر گئیں۔ پھر میں اطمینان سے نکلا اور ہجوم میں شامل ہو گیا۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات

چوتھے حصے میں

ملاحظہ فرمائیے جو کہ اس حصے کے ساتھ ہی شائع ہو چکا ہے

شکاری
چوتھا حصہ

شکاری

معاشرے کے اُن ناسوروں کی رُوداد جو گوشت پوست سے گزر کر انسانی ہڈیوں میں اُتر رہے تھے۔ ایک کفن بردوش نوجوان کی کہانی جس کے روز و شب موت کی بستی میں گزر رہے تھے۔ جلتے دن، سُلگتی راتیں، آس و یاس، خوف و ہراس

"کیا تماشا ہو رہا ہے یہاں؟" میں نے گرج کے کہا۔ "ساری ٹریفک بلاک ہو گئی ہے۔"

"وہ دیکھیں جناب!" ایک شخص نے کہا۔ "نیچے کہیں آگ لگی ہے۔"

"تو تم یہاں کھڑے رہ کر اسے بجھا لو گے۔" میں نے اُس کے ایک تھپڑ رسید کیا۔ "پھونک مار کے بجھاؤ گے۔ او نئے ہمت ہے تو نیچے جاؤ۔ جا کے فون کرو کوئی فائر بریگیڈ کو۔" باقی لوگ سہم گئے۔

"یہاں فون کدھر ہے؟ کسی پیڑ پر؟" ایک فیشن ایبل نوجوان نے مضحکہ خیز لہجے میں کہا۔

دونوں بس والوں نے مسافروں سے بیٹھنے کو کہا اور خیریت اسی میں سمجھی کر روانہ ہو جائیں۔

"اسمارٹ بوائے!" میں نے انگریزی میں کہا۔ "ویری فنی۔ اگر فون یہاں نہیں ہے تو کیا آگے کسی پٹرول پمپ یا کسی پولیس اسٹیشن پر بھی نہیں ہوگا؟"

اسمارٹ بوائے فوراً اپنی کار میں بیٹھ گیا۔ میں نے اُسے روک لیا۔ "ایک منٹ۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔ خود فون کر دوں گا۔"

"لیکن میرے ساتھ میری بیوی ہے۔" اس نے احتجاج کیا۔

"شٹ اَپ۔ میں پیچھے بیٹھوں گا اور بک بک کرو گے تو دونوں کو مار دوں گا۔" میں نے کہا۔

اسمارٹ بوائے خون کے گھونٹ پی کر خاموش ہو گیا۔ کوٹ لکھپت سے آگے میں نے ایک پٹرول پمپ کے سامنے اسے رُکنے کے لیے کہا۔ "تھینک یو ویری مچ۔" میں نے کہا۔ "آپ کو زحمت ہوئی خاتون! اس کے لیے معذرت۔" اسمارٹ بوائے نے مجھے گھور کر دیکھا۔ اس کی بیوی نے مسکرا کے کہا۔ "یو آر ویلکم۔"

رات کے دو بج چکے تھے۔ میں اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا اور رحمت کباڑی کو گرفتار کرنے کے علاوہ شکاریوں کے نئے ٹھکانے دیکھ آیا تھا۔ مجھے نئے شکاریوں کے نام معلوم ہو گئے تھے اور... ان کو لاکھوں کا نقصان پہنچانے کا بھی موقع مل گیا تھا۔ میں کچھ دیر پیدل چلتا رہا تھا۔ پھر میں نے لاہور جانے والی ایک ویگن کو روکا۔

"کوئی سیٹ ہے بھئی لاہور تک؟" میں نے کہا۔

"کیوں نہیں جنابِ عالی۔" کنڈیکٹر نے کہا اور اگلی سیٹ کے مسافروں کو اٹھا دیا۔ "چلو بھئی زنانہ سیٹ خالی کرو۔"

"کدھر ہے زنانہ سواری؟" ایک شخص نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ میں بالکل بے نیازی سے کھڑا رہا۔

"میاں تم کو ہم نے چڑھتے وقت ہی بتا دیا تھا کہ ضرورت پڑنے پر یہ سیٹ خالی کرنی پڑے گی۔" ڈرائیور نے ناگواری سے کہا۔ "اب زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں۔" لوگ بڑبڑاتے ہوئے اُٹھ کے پیچھے چلے گئے اور میں پوری شانِ بے نیازانہ کے ساتھ اگلی سیٹ پر براجمان ہو کے پبلک کی باتیں سنتا رہا جو وہ پولیس کے خلاف

کر رہے تھے۔ زنانہ سواری۔ پولیس؟ زنانہ سواری ہوتی ہے؟ سب بدمعاشی ہے جی۔ خود پولیس یہ کرے گی تو کسی اور سے کیا گلہ۔ لاقانونیت ہے سب۔ یہ قوم صرف باتیں کر سکتی ہے۔ قانونی کارروائی کی ہمت نہیں رکھتی۔ لاہور آتے ہی میں ویگن سے اتر گیا۔ اس وقت کسی رکشا یا ٹیکسی کا ملنا مشکل تھا چنانچہ مجھے ریلوے اسٹیشن تک مارچ کرنا پڑا۔

ایک رکشا کو بیگار میں پکڑ کے سمن آباد پہنچا۔ رکشا کو میں نے قصرِ جمشید سے بہت پہلے روک لیا اور اس پر ترس کھاتے ہوئے پورا پچاس کا نوٹ بخش دیا۔ میرے پاس کھلے تھے ہی نہیں۔ رکشا والے نے سلام کر کے رکھ لیا۔ بعد میں اس نے بھی گالی دی ہو گی مجھے کہ میرے پاس کون سا حلال کا مال تھا کہ مجھے دس کے پچاس دیتے ہوئے دکھ ہوتا اور اپنی خوش قسمتی کا یہ واقعہ متعدد بار سنایا ہو گا۔

آخری موڑ کاٹتے ہوئے میرے قدم رک گئے۔ قصرِ جمشید سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ اس کی پرانی لکڑی کے دروازے اور کھڑکیاں دھڑا دھڑ جل رہے تھے۔

سڑک پر خاصے لوگ جمع تھے اور دور ہونے کے باوجود وہ قصرِ جمشید کو ایک ملبے کا ڈھیر بنا دینے والی آگ کی حدت کو محسوس کر رہے تھے۔ اندر صرف ایک فائر بریگیڈ تھا جس میں سے پرانی وردیوں والے فائرمین اتر کے پائپ ہاتھ میں پکڑے اِدھر سے اُدھر دوڑ کر اپنی مستعدی کا مظاہرہ کر رہے تھے کیونکہ پبلک کے سامنے ان کو کچھ نہ کچھ بہرحال کرنا تھا۔ عام طور پر کاہل اور بے کار بیٹھے رہنے والے فائرمین عملاً ایسی سنگین آتش زنی کی واردات سے بہت کم دوچار ہوتے تھے۔ عموماً تو وہ کسی دکان کی یا گھر کی راکھ میں دبکنے والی چنگاریوں پر پانی چھڑک کر لوٹ آتے تھے یا کسی کی احمقانہ شرارت پر شرمندہ و مشتعل ہو کر جو انھیں بے وجہ دوڑاتا تھا۔ اس وقت ان کی پریشانی کا سبب پانی کی نایابی تھا۔ اتنے وسیع و عریض قصرِ جمشید کی آگ بجھانے کے لیے جتنے پانی کی ضرورت تھی اس کا منبع ایک ہینڈ پمپ کے سوا کچھ بھی نہ تھا اور اس میں سے صرف گلاس بھر بھر کے پانی پھینکا جا سکتا تھا۔ ہوا میں ٹائر جلنے کی بو تھی۔

میری نظر محسن کو تلاش نہ کر سکی لیکن اس نے مجھے دیکھ لیا۔ اس کی کورٹینا نہ جانے کہاں تھی۔

"سکندر!" اس نے مجھے دور سے آواز دی اور میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ ایک درخت کی شاخوں پر، زمین سے تقریباً بیس فٹ کی بلندی پر براجمان تھا۔ "یہاں آجاؤ ورنہ کوئی دیکھ لے گا۔ یہاں سے سب صاف نظر آتا ہے۔"

درخت کا تنا اوپر دس فٹ تک سیدھا گیا تھا پھر ایک سے زیادہ شاخوں میں تقسیم ہو گیا تھا مگر سب سے بڑی شاخ کی موٹائی ایک فٹ کے قریب تھی اور وہ باقی درخت سے الگ ہو کے یوں اوپر جا رہی تھی جیسے مسلسل ترقی کو ظاہر کرنے والے گراف کی لکیر اوپر جاتی ہے۔ اس کے قریب ایک غلیل نما حصے میں تشریف رکھنے کے بعد میں نے محسن سے سگریٹ لی اور سامنے کا پورا منظر دیکھا۔ فائر بریگیڈ والوں کی ایک اور خستہ حال ٹیم گھنٹیاں بجاتی آ پہنچی تھی لیکن اس کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ گھر میں کیا تھا کہ ترا غم اسے غارت کرتا؟

"محسن خان!" میں نے کہا۔ "اس کھنڈر میں آگ پکڑنے والی کون سی چیز تھی۔ کھڑکیاں دروازے تک تو لے جانے والے لے جا چکے تھے۔"

"ایک چیز تھی جو آپ چھوڑ گئے تھے۔" محسن خان نے کمال اطمینان سے فرمایا۔ "مسٹر رانجھا کو۔"

"ہاں۔ اب کون بتائے گا کہ کھنڈر میں آگ کس نے لگائی؟" میں نے افسردگی سے کہا۔ "اور کون جل گیا۔ تو نے کسی کو آتے جاتے دیکھا؟ دلاور اینڈ کمپنی کے کسی بندے کو؟"

محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "جب میں پہنچا تو یہی افراتفری کا عالم تھا۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ کون آیا اور کون گیا۔ فائر بریگیڈ کو بھی شاید کسی نے پاس پڑوس سے فون کیا ہو گا۔"

"اس وقت جب رانجھا کو آگ لگانے والے اپنا کام کر کے نکل گئے ہوں گے۔" میں نے کہا۔

"ٹرک کا کیا ہوا؟" محسن نے کہا۔ "آگ لگا دی تو نے اسے! یا کہیں غرق کر دیا ہے؟"

میں نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔ "ہاں۔ لیکن تجھے کیسے معلوم ہوا؟"

"تیری جگہ میں ہوتا تو میں بھی یہی کرتا۔" وہ ہنسا۔ "چوہدری دلاور کو بھی یہ خوش خبری سنا دیتا۔"

"اب ہم یہاں کیوں بیٹھے ہیں؟" میں نے کہا۔ "یہ تماشا تو بے مقصد چل رہا ہے۔ نقصان کسی کا بھی نہیں ہوا سوائے رانجھا کے ۔ ۔ ۔ جان سے گیا اور اس کی بیٹی یتیم ہوئی۔ ہم کچھ نہیں کر سکتے۔" محسن بولا۔

"صرف دعا کر سکتے ہیں کہ خدا رانجھا کے گناہوں کو معاف کرے۔" میں نے کہا۔ "اور اس کی بیٹی سلامتی کے ساتھ رخصت ہو کے اپنے گھر جائے۔ دنیا میں بہت لوگ ہیں محسن خان جن کے لیے ہم صرف دعا کر سکتے ہیں، دوا نہیں۔"

ہم دونوں ایک ساتھ نیچے اترے اور واپس چل پڑے۔ محسن نے کار کو سوگز پیچھے ایک احاطے کی دیوار سے لگا کے کھڑا کر دیا تھا۔ یوں کہ کوئی دیکھے تو سمجھے کہ آیا ہو گا کسی کا مہمان۔ اس مختصر سے فاصلے کو طے کرتے ہوئے میں نے محسن کو بتا دیا کہ میں نے ٹرک کو کس طرح ٹھکانے لگایا تھا۔

"گویا چوہدری صاحب کو اب تک اطلاع مل چکی ہو گی۔" محسن نے کہا۔ "چھوٹو بچ گیا تھا۔"

"اس نے گامے شاہ یا گامے ماچھی کو بتایا ہو گا کہیں سے فون کر کے یا کسی طرح واپس پہنچ کے۔" میں نے کہا۔ "لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ابھی وہ راہ میں ہو۔ یا گاما ماچھی سوچ رہا ہو کہ دلاور کو اس نقصانِ عظیم کی اطلاع کیسے دے اور اپنے دو قابلِ اعتماد کارندوں کی گمشدگی کا الزام کس پر عائد کرے۔ کراچی کے سیٹھ کریم پر یا ہم پر۔"

"پہلے تو یہ دیکھنا ہے کہ اس کریٹ میں کیا ہے جو ہم نے ٹرک سے اتار لیا تھا۔" میں نے کہا۔

بند کریٹ ابھی پچھلی سیٹ پر رکھا ہوا تھا۔ اسے کھولنا آسان کام نہ تھا۔ چاروں طرف سے اس کے کناروں پر کیلیں ٹھوک دی گئی تھیں اور تختے آدھے انچ کے قریب موٹے تھے، ان پر دونوں طرف سے آدھی انچ چوڑی اور چمکیلی ٹین کی پتی مشین سے پیسٹ کر کس دی گئی تھی۔ اسے کاٹے بغیر نہیں کھولا جا سکتا تھا اور ہمارے پاس اس کے لیے ضروری آلات نہیں تھے۔ کار کی ڈکی میں صرف بنیادی ضرورت کا سامان تھا۔ اسپیئر وہیل جیک اور وہیل اسپینر۔ اس میں اگر ایک معمولی سا پلائر بھی ہوتا تو ہمارا کام چل جاتا۔

"مجھے شک ہے۔" میں نے کہا۔ "شک ہی نہیں یقین ہے کہ اس میں منشیات ہوں گی۔"

"اب کہیں سے اسے کھولنے کا سامان ملے تو پتا چلے کہ آپ کس حد تک درست فرماتے ہیں۔" محسن نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

"رانجھا تو مر گیا لیکن مرنے سے پہلے بہت کچھ بتا گیا۔" میں نے کہا۔ "نہ بتاتا تب بھی کون سا زندہ رہتا۔ ہم اب تین نئے کرداروں سے متعارف ہو چکے ہیں۔ گاما ماچھی۔ کراچی کا سیٹھ کریم اور رائل کیسائز کا کوئی آدمی پیار علی۔"

"تو ان دونوں کو کیوں بھول رہا ہے جو ہمارے ساتھ ہیں۔" محسن بولا۔ "ان کو اگر زیادہ دیر اسی طرح رکھا گیا تو وہ کچھ بتانے کے لیے زندہ ہی نہیں رہیں گے۔"

"اس وقت انھیں کہاں لے جائیں؟" میں نے کہا۔ "میرا خیال تھا کہ قصرِ جمشید بہت محفوظ رہے گا۔ شکاری شک تک نہیں کریں گے کہ شکار انھی کے سایۂ عاطفت میں محفوظ بیٹھا ہے لیکن اب مجھے آنجہانی مسٹر رانجھا کی ایک بات یاد آ رہی ہے۔ اس نے کہا تھا کہ اور بھی بہت سے لوگ آئیں گے تمھاری خبر لینے۔ اس وقت میں نے سمجھا تھا کہ یہ کھوکھلی دھمکی ہے لیکن آتش زنی کی اس واردات نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ یہاں آتے رہتے ہیں۔ میرا تعاقب کسی نے نہیں کیا تھا کہ انھیں کچھ معلوم ہوتا۔ اگر یہ بات ہوتی تو مجھے اتنی مہلت نہ ملتی اور وہ فوراً آ پہنچتے۔ میں نے اس مالی کو بھی یہاں نہیں دیکھا تھا اور نہ اس بات کے آثار ملے تھے کہ وہاں کوئی رہائش پذیر ہے لیکن اب مجھے یقین نہیں کہ میرے اندازے صحیح تھے۔ یا تو وہی مالی بعد میں آ... اور اندر ایک نامانوس گاڑی کو دیکھ کر کھٹک گیا۔ ممکن ہے، وہ دبے پاؤں اوپر بھی آیا ہو اور میری تفتیش دیکھ گیا ہو۔"

"تیرا مطلب ہے وہ مالی بھی انھی کا ایجنٹ ... یا روسیلون ہو سکتا ہے؟" محسن نے کہا۔

"کوئی بات اب بعید از امکان نہیں رہی۔" ... نے کہا۔

"ان کے پاس ایک غریب آدمی کی وفاداریاں خریدنے کا سب سے مؤثر ہتھیار پیسہ ہے۔ پیسہ آج کی دنیا میں کیا نہیں ... رہا ہے۔ دین ایمان، شرافت اور انسانیت، ضمیر، اصول اور ... اور وہ ایسے لوگ ہیں کہ جب کچھ خریدتے ہیں تو اس ... کے ساتھ خریدتے ہیں کہ انھوں نے پیسہ ضائع نہیں کیا۔ شاید وہ ... مالی مجھے دیکھ گیا اور اس نے سب کچھ سن کر دلاور کو مطلع کر دیا۔ میری قسمت کہ میں اس کی جوابی کارروائی میں جل کے راکھ نہیں ہو سکا۔ دوسرا امکان یہ ہے کہ دلاور اینڈ کمپنی اس اجڑے دیار کو اپنے ناجائز کاروبار کے لیے استعمال کرتی ہے۔ ایسی ہی غیرآباد جگہ ان کے کاروباری نقطۂ نظر سے انتہائی محفوظ ہو سکتی ہے جس پر کسی کی نگاہ تک نہ جائے اور جائے تو کسی کے دل میں یہ خیال ہی نہ آئے کہ اسی کھنڈر میں مٹی سے سونا بنایا جاتا ہے۔ وہ رات کی خاموشی اور ویرانی میں یہاں جمع ہو کے کچھ بھی کریں، مال کی تقسیم اور ترسیل کا انتظام، میٹنگ یا رقم کی وصولی۔"

"تاہم یہ جگہ ان کا گودام یا فیکٹری نہیں ہو سکتی۔" محسن نے سوچتے ہوئے کہا۔

"ہاں — ورنہ وہ اتنی جلدی اسے آگ نہ لگا پاتے۔" میں نے اتفاق کیا۔ "انھیں مال یا مشینری کو شفٹ کرنے میں کچھ وقت لگتا۔"

"محسن!" میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا۔ "کیا یہ آگ

کوئی دھوکا تو نہیں ہے؟"

"نہیں۔ آگ بالکل حقیقی تھی۔" محسن بولا۔ "اس میں کوئی کیمرہ ٹرک نہیں تھی۔ اگر تو مرغی ہوتا تو میں تجھے روسٹ کرلیتا۔ میرا بھوک سے بُرا حال ہے۔"

"اسی لیے تیری عقل گھاس چرنے چلی گئی ہے۔" میں نے کہا۔ "میرا مطلب کچھ اور تھا۔ فرض کر جیسے دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے انھوں نے ایک کھنڈر میں اپنا ہیڈ آفس قائم کر رکھا تھا ایسے ہی راز افشا ہونے کا اندیشہ پیدا ہوتے ہی انھوں نے دنیا کی آنکھوں میں ایک مٹھی دھول اور جھونک دی ہو۔ آگ لگا کے انھوں نے دشمنوں کے یعنی ہمارے وسوسے مٹا دیے۔ ہمارا مقابلہ کسی عام شکاری سے نہیں ہے۔ انھوں نے ایک تیر سے دو شکار کیے۔ ایک تو رانجھا کو گرفتار ہونے کی سزا دی تاکہ دوسروں کو عبرت ہو اور وہ جان لیں کہ غلطی دانستہ ہو یا نادانستہ، بہرصورت اس کی سزا موت ہے۔ میرے یہاں آنے اور رانجھا سے تفتیش کے علاوہ اسی ویرانے میں قیام فرمانے کے ارادے نے انھیں شک میں ڈال دیا ہوگا۔ میں الو تو نہیں ہوں کہ ویرانوں میں رہوں۔"

"چشمِ بد دور۔ آپ تو جہاں بھی رہیں، الو ہی رہیں گے۔" محسن نے کہا۔

"آپ ڈرائیونگ فرما رہے ہیں، اس لیے جھانپڑ اُدھار۔" میں نے کہا۔ "چور تو دل کے اندر ہوتا ہے محسن خان شیروانی اور آدمی ہاتھ پھیرتا ہے داڑھی پر کہ تنکا کہاں ہے۔ دلاور نے سوچا ہوگا کہ یہ سکندرِ اعظم نے کہاں ڈیرا ڈال دیا اور کیوں؟ کیا اس نے معلوم کرلیا ہے کہ یہ جگہ کس کام آتی ہے اور اب اپنا جال پھیلانا چاہتا ہے کہ جو آئے پکڑا جائے۔ وہ جانتا ہے کہ انکل ٹھوی سے ہم کیا کام لے سکتے ہیں اور وہ کسی گروہ کے ہیڈکوارٹر کو ختم کرنے کے لیے خود بھی کس حد تک میدانِ عمل میں کُود سکتے ہیں۔ چنانچہ اپنے تیر سے دوسرا شکار انھوں نے ہمارے اندیشوں کو کیا۔ آگ لگا کے اس خیال کو غلط ثابت کر دیا کہ یہ سنسان کھنڈر کسی غلط قسم کے کام کے لیے استعمال ہو رہا تھا۔ ہمارے ذہن میں صرف یہی خیال آئے کہ آگ لگانے کا مقصد رانجھے کو راکھ کرنا تھا۔ اس کے سوا کچھ نہیں اور بلاشبہ ہم یہی سمجھے تھے۔"

"کیا ہم غلط سمجھے تھے اے دور اندیش مردِ دانا؟" محسن نے کہا۔

"ہاں عزیزم۔ غور فرما آتش زنی کے طریقے پر۔" میں نے کہا۔ "انھوں نے اوپر نیچے ہر کمرے میں آگ کیسے پھیلائی؟ دیواریں تو آگ پکڑ نہیں سکتی تھیں۔ اندر نہ فرنیچر تھا نہ پردے قالین اور نہ کھڑکی دروازے۔ پھر بھی دیکھنے سے تاثر یہی ملتا تھا کہ پورا قصرِ جمشید آگ کی لپیٹ میں ہے۔ میرا خیال ہے انھوں نے سب کمروں میں کھڑکیوں دروازوں کے پاس گھاس پھونس اور لکڑیاں رکھیں۔ ان پر پٹرول یا مٹی کا تیل ڈالا اور گھوم پھر کر خود آگ لگائی۔ تو نے ٹائروں کے جلنے کی بو محسوس کی تھی۔ وہ بھی انھوں نے ہی رکھے ہوں گے پرانے ناکارہ ٹائر زیادہ دیر جلتے ہیں اور بہت دھواں دیتے ہیں۔"

"اور اس اہتمام کا مقصد ہیں.. میرا مطلب ہے تجھے الو بنانا کیسے ہوا؟" محسن بولا۔

"میرا خیال ہے کہ وہ سلسلہ بدستور زیرِ زمین چلتا رہے گا۔" میں نے کہا۔ "انڈر گراؤنڈ بزنس ہے اور وہ عملی طور پر انڈر گراؤنڈ ہی کام کرتے ہوں گے۔ اوپر کا کھنڈر رہے یا نہ رہے، ان کا گودام، فیکٹری یا ہیڈ آفس محفوظ اور دنیا کی نظر سے اب بھی اوجھل ہے۔ پہلے کوئی اسے ویرانہ سمجھ کے قابلِ توجہ نہیں سمجھتا تھا، اب جلنے کے بعد اس کی ظاہری حالت پہلے سے زیادہ تباہ نظر آئے گی۔"

"تیری ناقص عقل میں یہ قابلِ رشک خیال کیسے آیا؟" محسن نے کہا۔ "مجھے تو حسد ہو رہا ہے۔"

"واضح ہو کہ پہلے تہ خانے بنانے کا رواج عام تھا۔" میں نے کہا۔ "اور قصرِ جمشید کے نیچے بھی کوئی تہ خانہ ہو تو عین ممکن ہے۔ اس کی وسعت بھی قصر کہلانے والی اس عمارت کے مطابق ہوگی۔ دلاور اینڈ کمپنی کے وسیع کاروبار کے لیے تو ایسی کوئی جگہ ضروریات کے عین مطابق ہے۔ شاید اس سے بہتر کوئی جگہ ہی نہ ہو۔"

"رائٹ۔" محسن نے بریک لگا کے کہا۔ "لیکن اس مرحلے پر میں تحریکِ التوا پیش کر کے منظور کرتا ہوں۔" اور گاڑی کو ایک ہوٹل کے سامنے روک لیا۔ جہاں سے آخری گاہک رخصت ہو چکا تھا۔ چنانچہ پروپرائٹر آمدنی کے علاوہ بہت سے مسائل پر غور فرما رہے تھے کہ کون سی چیز بچی اور کیوں بچی؟ زیادہ پکائی گئی تھی تو کیوں اور کم کھائی گئی تھی تو کیوں؟ اور ظاہر ہے کہ اب اس "پس خوردہ" کو اگلے دن معزز گاہکوں کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے بچا کر رکھنے ہی والے تھے کہ ہم نے بچا کھچا مال خرید کے انھیں تفکرات سے نجات دلائی۔ دو میل دور جا کے میں نے اور محسن نے ڈنر تناول فرمایا اور گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ ہم ملتان روڈ پر تھے اور آبادی تقریباً ختم ہو چکی تھی جس مکان کی اوٹ میں محسن نے گاڑی کو روکا تھا، وہ تقریباً مکمل ہو چکا تھا اور چھت پڑ جاتی تو مکمل ہی کہلاتا لیکن آثار یہ تھے کہ اسے نامکمل پڑے ہوئے زمانہ ہو گیا۔

میں پہلے گاڑی کی چھت پر اور اس کے بعد دیوار پر چڑھا۔ اندر خانہ ویرانی کا ڈیرا تھا اور بغیر پٹ کے دروازوں اور کھڑکیوں کے خلا سے اندھیرا جھانک رہا تھا۔ میں آہستہ سے اندر لٹک گیا اور ہاتھ چھوڑ دیے۔ پیروں کے زمین سے لگتے ہی میں اس دروازے کی طرف بڑھا۔ اچانک اندر سے ایک بھاری بیٹھی ہوئی اور گھٹی ہوئی آواز آئی۔

"بدذات چور، کہیں اور جا۔" میں اچھل پڑا اور بے ساختہ اندر لپکا۔ اندھیرے میں مجھے فرش پر ایک سایہ سا دکھائی دیا۔ میں نے لائٹر جلایا۔ فرش پر ایک ہٹا کٹا فقیر لیٹا ہوا تھا۔ اس کے جسم پر پیوند لگی ہوئی لمبی سی ایک قبا تھی جسے چُغہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ میل اور گرد میں اس کے کپڑے کا رنگ خاکستری ہو رہا تھا۔ سر کے لمبے جٹا دھاری بال داڑھی میں الجھ گئے تھے اور اس جھاڑ جھنکاڑ چہرے میں اس کی صورت کے نقوش چھپ گئے تھے۔ سامنے سے صرف ناک، لب اور لال لال آنکھوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ کشکول اور چمٹا سرہانے دھرا تھا۔

"ہم نے کہا ہے کہیں اور جا نامراد۔" وہ جلالی لہجے میں بولا۔ "فقیر کے آرام میں خلل ڈال کے کیا ملے گا تجھے؟"

مجھے تھوڑی سی دل لگی سوجھی۔ "مال تو آپ کے پاس بھی کم نہیں ہوگا سائیں جی۔ خیرات میں بڑی آمدنی ہے۔"

وہ ایک دم اٹھ بیٹھا۔ اس کے گلے میں پڑے ہوئے رنگین منکے آپس میں ٹکرائے۔ اس نے فوراً چمٹا اٹھا لیا اور چوکنا ہو گیا۔ بے اختیار اس کے ایک ہاتھ نے میلے چغے کی خفیہ جیب کو گرفت میں لے لیا۔ میں نے ریوالور نکال کر رخ فقیر کی جانب کر دیا۔ "ذرا کھیسا خالی کریں مگر پہلے یہ چمٹا ایک طرف رکھ دیں، پھر مال نکالیں۔"

فقیر کی حالت غیر ہو گئی۔ چمٹا رکھ کے اس نے دونوں ہاتھ جوڑے اور آہ و زاری پر اتر آیا۔ "قسم رب کی، سوکھی روٹی ہے جیب میں، مال کہاں سے آیا، یہ جان لینی ہے تو لے لے ظالم۔"

اسی وقت محسن اندر آیا۔ مجھے کافی دیر ہو گئی تھی اور وہ دروازہ کھلنے کا زیادہ انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ "یہ کیا ڈراما ہو رہا ہے؟" وہ حیران ہو کے بولا۔ "کون ہے یہ؟"

"بہت پیسے والے درویش ہیں۔" میں نے کہا۔ "کبھی انکم ٹیکس نہیں دیا۔ میں ذرا حساب مانگ رہا تھا۔"

فقیر نے پھر غلغلہ بلند کیا اور یقین دلانے لگا کہ یہ غلط ہے۔ "پیسہ اب کہاں بابا۔ دنیا بڑی کنجوس اور کمینی ہو گئی ہے۔ چمڑی اتار لیتی ہے اگر دمڑی مانگو۔ خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔ کسی سیٹھ ساہوکار کو لوٹو۔"

میں نے محسن کو آنکھ سے اشارہ کیا۔ "ذرا دیکھ یہ اللہ لوک جھوٹ کہہ رہے ہیں یا سچ؟"

محسن نے اسے کھڑا کر دیا۔ "آواز بند۔" محسن نے ڈانٹ کر کہا اور اس کے چغے پر ہاتھ مارا۔ فقیر کی گھگھی بندھ گئی۔ اندر ایک تھیلے جتنی جیب تھی۔ اس میں سے میلے کپڑوں میں لپٹے ہوئے سو اور پچاس کے نوٹ برآمد ہوئے۔ فقیر محسن کے قدموں میں گر گیا اور بڑے مضحکہ خیز انداز میں رونے لگا۔

"یہ میری تمام عمر کی کمائی ہے۔ پیسہ پیسہ جوڑا تھا میں نے بیس سال میں۔"

"کس لیے؟ اور کس کے لیے؟" میں نے کہا۔ "محل بنوانا تھا یا مزار شریف؟ یا دھی پتر بیاہنے تھے۔"

لیکن وہ کیا جواب دیتا۔ وہ ان دولت مند فقیروں میں سے تھا جو عادتاً مانگتے ہیں۔ کسی ضرورت کے تحت نہیں اور دنیا سے پوشیدہ خزانہ ان کی متاعِ غرور ہوتا ہے۔ بیشتر دینے والے ان کے مقابلے میں فقیر اور زیادہ غریب ہوتے ہیں۔ اس خفیہ دولت کو پھلتا پھولتا دیکھ کر خوش ہونا ہی ان کا نصیب ہوتا ہے جو نہ دنیا میں سکھ دیتی ہے اور نہ آخرت سنوارتی ہے۔ ایسے فقیروں کی نفسیات کبھی میری سمجھ میں نہیں آئی۔

"ستائیس ہزار دو سو بیس روپے۔" محسن بولا۔ "کتنا انکم ٹیکس بنا؟"

"چل بخش دے سائیں بادشاہ کو۔" میں نے ریوالور جیب میں رکھ لیا۔ فقیر کی حالت انتہائی قابلِ رحم ہو رہی تھی۔ اس نے اپنا خزانہ جھپٹ کر واپس اندر کی جیب میں چھپا لیا اور سہم کر کونے میں دبک گیا۔ اس کی خوف زدہ نظروں میں بے یقینی تھی اور ایک سوال تھا کہ

کیا سچ مچ ہم لے لوٹنے کا ارادہ ترک کر چکے ہیں ؟ یہ مذاق ہے یا ہم پاگل تو نہیں ہیں ؟" اب اسی جگہ ایسے ہی خاموش بیٹھے رہنا۔" میں نے کہا۔" ورنہ . . ." میں نے پھر ریوالور نکال کے اسے دکھایا۔ اس نے زور زور سے اقرار میں سر ہلا کے وعدہ کیا کہ سب کچھ ہماری مرضی کے مطابق ہوگا۔

رحمت کباڑی اور ٹرک ڈرائیور ہوش میں آ چکے تھے لیکن ان کی حالت خراب تھی۔ محسن نے انھیں آزاد کیا اور میں ریوالور کا رخ ان کی طرف کیے کھڑا رہا۔ تلاشی لینے پر محسن کو رحمت کباڑی کی جیب سے ایک اور ریوالور ملا جو اس نے اپنی جیب میں رکھ لیا پھر محسن فقیر کا کشکول لے کر گیا اور صحن میں لگے ہوئے ہینڈ پمپ سے پانی لے آیا۔ چند چھینٹے پڑتے ہی وہ ہوش میں آ گئے۔ کراہتے ہوئے انھوں نے کشکول سے منہ لگا کے تھوڑا سا پانی پیا اور لمبے لمبے سانس لینے لگے۔ لالٹین کا شعلہ روشن رکھنے کے لیے ایک ہاتھ کے انگوٹھے کو دبائے رکھنا ضروری تھا۔ یہ انگوٹھا اب سُن ہونے لگا تھا۔ میں نے چند سیکنڈ کے لیے انگوٹھا ہٹایا تو دیے سے بھی کم روشنی دینے والا شعلہ بجھ گیا۔

رحمت کباڑی نے اتنی پھرتی سے مجھ پر جست لگائی کہ میں حیران رہ گیا۔ میرا خیال تھا کہ جسمانی طور پر وہ اس قابل بھی نہیں ہوگا کہ اٹھ سکے۔ لالٹین میرے ہاتھ سے گر گیا مگر مجھے سنبھلنے میں دیر نہیں لگی۔ ایک میکانیکی ردِعمل کے طور پر میں نے جوابی کِک ماری جو رحمت کباڑی کے سینے پر لگی اور وہ الٹ کر گرتے ہی ساکت ہو گیا۔ محسن نے اتنی دیر میں لالٹین اٹھا لیا تھا۔

"کوئی ذرا بھی ہلا تو میں گولی مار دوں گا۔" اس نے لالٹین جلا کے ریوالور نکال لیا۔

فقیر نے بھاگنے کا ارادہ کیا تھا۔ وہ پھر بھد سے فرش پر بیٹھ گیا۔" یا میرے مولا! آدھی رات کو یہ موت کے فرشتے کہاں سے بھیج دیے۔ جل تو جلال تو۔" وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ ڈرائیور ساکت و صامت بیٹھا رہا۔ میں نے جھک کر رحمت کباڑی کو ہلایا لیکن اس کی طرف سے غافل نہیں ہوا۔ اگر وہ مجھے دھوکے میں رکھ کر پھر حملہ کرتا تو میں ریوالور کے بٹ سے اس کو یقیناً ناک آؤٹ کر دیتا لیکن وہ مکر نہیں کر رہا تھا۔ سچ مچ بے ہوش تھا۔

میں نے زمین پر بیٹھ کے اسے سیدھا کیا۔ مجھے یوں لگا، جیسے اس کی سانس نہیں چل رہی ہے۔ تشویش میں مبتلا ہونے کے باوجود میں محتاط رہا کہ سانس کو روک لینے کا مقصد بھی مجھے فریب دینا نہ ہو۔ پھر میں نے اس کا ہاتھ تھام کر نبض تلاش کی۔ نبض رکی ہوئی تھی۔ ایک لمحے کے لیے میری تشویش میں خوف اور گھبراہٹ شامل ہو گئی۔ محسن نے اندازہ کر لیا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔

"اسے دوسرے کمرے میں ڈال دے۔" محسن بولا۔" آ جائے گا تھوڑی دیر بعد ہوش میں۔"

میں نے سر ہلایا اور رحمت کباڑی کے دونوں ہاتھ تھام کر گھسیٹتا ہوا لے گیا۔ ڈرائیور اچانک ہنسا۔

"اوئے کیوں تکلیف دیتے ہو مردے کو۔" وہ بولا۔" پڑا رہنے دو یہیں۔"

میں نے رحمت کے ہاتھ چھوڑ دیے۔ فقیر متوحش انداز میں چلایا۔" مر گیا ؟ قتل کر دیا تم نے ؟"

"میں نے کہا تھا آواز نہ نکلے۔" محسن نے دانت پیس کر کہا اور اس کے سر پر لات ماری۔

"غلطی اس کی تھی۔" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔" اس نے خود مجھ پر حملہ کیا تھا۔ میں اسے مارنا نہیں چاہتا تھا۔"

"مگر یہ مر گیا۔" ڈرائیور بولا۔ یوں جیسے یہ بات اس نے ہم سے نہیں اپنے آپ سے کہی تھی۔ اس کی نظر رحمت کی لاش پر جمی ہوئی تھی جس کی کھلی آنکھیں آخرِ شب کے محوِ سفر ستاروں کو دیکھ رہی تھیں۔

"شاید چوٹ غلط جگہ پڑی۔" محسن بولا۔ لہجے سے وہ بھی متفکر نظر آتا تھا۔

ڈرائیور پھر ہنسا۔" موت بندے کو کھینچ لاتی ہے، وہیں پر جہاں اس کو مرنا ہو۔ اُس کنجر نے تو سمجھا تھا کہ رحمت کی موت کا فرمان جاری کر دیا۔ جیسے رحمت کی زندگی اس کے اختیار میں تھی، ایسے ہی موت بھی ہے۔" اس نے اچانک جیب میں ہاتھ ڈال کے ایک کاغذ نکالا اور ہماری طرف پھینک دیا۔

میں نے جھک کر وہ پُرزہ اٹھایا اور کھول کے لالٹین کی روشنی میں تحریر کو دیکھا۔ اس میں لکھا تھا" کریم سیٹھ۔ رحمت واپس نہ آئے۔ کراچی کا سمندر بہت بڑا ہے۔"

"گویا گامے ماچھی کی طرف سے کریم سیٹھ کو پہلے ہی احکامات جاری ہو چکے تھے کہ اسے قتل کر دیا جائے۔" میں نے کہا۔" کیوں ؟" میں نے فقیر کو ایک سگریٹ میں کچھ بھر کے جلاتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

ڈرائیور اب یوں ہنس رہا تھا جیسے اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا ہے۔ اس نے زور زور سے انکار میں سر ہلایا۔" اوئیں میری بھولی سرکار۔ ایہہ اُچیاں گلاں نے۔ تمھاری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ تم تو دن کو دن اور رات کو رات سمجھنے والے بچے ہو۔ ایہہ دوجی دنیا اے۔ یہاں کالے کا مطلب ہے سفید تو سفید کا مطلب کالا۔ موتیاں والیو۔" فقیر نے لمبے لمبے دو کش لگائے اور اس کی پتلیاں چڑھ گئیں۔ پھر وہ زمین پر لیٹ گیا۔

"سیدھی طرح بات کرو۔" میں نے اس کی گردن پکڑ کے
جھٹکے دیے۔" ہم اتنے بے خبر بھی نہیں ہیں۔"
"گامے کا مال نہ کراچی میں پکڑا گیا تھا اور نہ چھاپے کی خبر
... سیٹھ کریم کا ہاتھ تھا۔" محسن نے کہا۔" رحمت کباڑی نے اس کی
... ہوئی شکایت کی تھی۔"
"درحقیقت خرد برد کرنے والا وہ خود تھا۔" میں نے کہا۔" اور یہ
... گامے کو معلوم تھی کہ سیٹھ کریم بے قصور ہے لیکن رحمت خود
... ک سے بچانے کے لیے اس کا نام لے رہا ہے۔ اگر گاما یقین
... لیتا تو کریم سیٹھ کا قصہ پاک کر دیتا جو رحمت کے جرم کا واحد
... اہ تھا لیکن گامے نے اپنے طور پر حقیقت جان لی تھی۔"
ڈرائیور ہنستے ہنستے رونے لگا۔" تم نہیں سمجھو گے کیونکہ تم اپنی
... کھوں سے دیکھ رہے ہو۔ جب میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا
... مجھے نوٹ ہی نوٹ دکھائی دیے تھے۔ سبز ہی سبز نوٹ۔ سو سو
... ے ہزاروں نوٹ۔ کریم سیٹھ نے کہا تھا کہ تم گدھے ہو۔ بوجھ ڈھونے
... لے گدھے۔ تم ٹرک میں کیا لاتے ہو ؟ کیا معاوضہ ملتا ہے تمھیں
... مہینے ؟ اور میں نے بتا دیا کہ ہزار روپے مہینہ تنخواہ ہے جو کوئی
... یں دیتا۔ دوسرے اس کی آدھی تنخواہ بھی نہیں دیتے۔ کراچی کے
... پھیرے کے سو روپے الگ اور کھانا پینا مفت۔ اور کیا چاہیے
... ے ؟ لیکن سیٹھ کریم نے کہا کہ تم واقعی گدھے ہو۔ تمھیں معلوم ہے
... مہینے تم کیا لاتے ہو ؟ کتنے کا مال لاتے ہو ؟ میں نے جواب دیا
... ٹرک میں جتنا مال آ جائے وہ سب لے آتا ہوں۔ یہ مرضی ہے
... لوں کی کہ آدھا ٹرک دے کر بھیج دیں۔ قیمت یا مالیت سے
... ے کیا لینا دینا۔ کریم سیٹھ نے پھر کہا کہ اسی لیے تو تم گدھے ہو۔
... لاکھوں کا مال لاتے ہو اور اس میں لاکھوں کا منافع ہوتا ہے
... گامے ماچھی کو اور اس سے اوپر والوں کو ملتا ہے۔ اس کا
... وں حصہ مجھے بھی مل جاتا ہے مگر تم کو تو وہی ہزار روپے ماہوار
... تے ہیں اور لاکھوں کے پھیرے پر سو روپے۔ سو روپے کیا ہوتے
... ں ؟ کیا تمھاری زندگی کی قیمت سو روپے ہے ؟ تم کو معلوم ہے کہ
... ر کا نوٹ تھما کے وہ تمھیں موت کے سفر پر روانہ کر دیتے ہیں
... ر تم پھر بھی خوش ہو۔ کبھی پکڑے جاؤ گے تو وہ تم کو شناخت
... کرنے سے بھی انکار کر دیں گے یا تمھارے خلاف رپورٹ درج
... ہو جائے گی کہ تم ایک ٹرک سمیت فرار ہو گئے ہو۔ یہ بھی ہو سکتا
... ہے کہ تم مارے جاؤ اور تمھارے بیوی بچوں کو ہزار روپے ماہانہ
... بھی بند ہو جائے۔ سو روپے کی خاطر تم ان کے لیے منافع اور اپنے
... لیے سارے خطرات کا بوجھ ڈھو کر یہاں آتے ہو۔ اس لیے تم گدھے
... ہو۔ جب اس نے مجھے حقیقت بتائی تو میری آنکھیں کھل گئیں۔
... لے میں نے اسی بدذات کو مارنے کی کوشش کی جو خود کو سیٹھ کریم

کہتا ہے۔ اس نے مجھے یہ بات اتنے عرصے بعد کیوں بتائی کہ میں گدھا ہوں۔ غصّے نے مجھے پاگل کر دیا تھا کہ سیٹھ کریم سب جانتا تھا تو اب تک خاموش کیوں رہا لیکن اس نے ریوالور نکال لیا اور مجھے گولی مار دی۔" ٹرک ڈرائیور نے بائیں ہاتھ کی آستین اوپر چڑھائی۔ کہنی سے ذرا اوپر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ میں نے اور محسن نے سفید پٹی پر نظر آنے والے ننھے سے خون کے داغ کو دیکھا۔ "اس وقت تو اللہ نے جان بچالی۔ گولی ہڈی میں بھی نہیں لگی۔ گوشت میں سے گزر گئی۔ زخم بھر گیا تھا۔ آپ کی مہربانی سے پھر کھل گیا۔"

"تم سیٹھ کریم کی بات کر رہے تھے۔" میں نے کہا "تم اس کی باتوں سے گمراہ ہو گئے۔"

"گمراہ؟" وہ ہنسا۔ "پتا نہیں جی گمراہ میں پہلے تھا یا بعد میں ہوا۔ اس نے کہا بے وقوف مت بنو۔ اگر میں چاہوں تو اسی وقت تم کو ٹھکانے لگا دوں اور کہہ دوں کہ تم ٹرک لے کر پہنچے ہی نہیں۔ لیکن گاما ماچھی گدھا نہیں ہے۔ وہ بہت سے ثبوت حاصل کرے گا کہ لاہور سے کراچی تک ٹرک کس کس نے دیکھا ہے۔ اس کے اپنے کارندے ہیں، پولیس کے مخبر ہیں، ایکسائز والے ہیں۔ سب اس کا نمک کھاتے ہیں۔ اسے معلوم ہو جائے گا کہ بے ایمانی میں نے کی ہے لیکن تم میرا ساتھ دو تو دونوں کے حصّے میں پانچ پانچ لاکھ روپے آ سکتے ہیں۔ میں ڈر گیا تھا لیکن اس نے کہا کہ تم تو بالکل محفوظ ہو۔ میں ہمیشہ کی طرح ابھی فون کر کے گامے کو بتا دیتا ہوں کہ سب مال پہنچ گیا۔ پھر تم پانچ لاکھ لو اور جاؤ۔ یہاں کا بندوبست مجھ پر چھوڑ دو۔ آپ نے کبھی پانچ لاکھ دیکھے ہیں جی؟ نہیں دیکھے ہوں گے۔ میں نے دیکھے ہیں۔ ایک بار گامے ماچھی نے تھیلے میں ڈال کر رحمت کو دیے تھے اور میں رحمت کباڑی کو شاہ عالمی لے گیا تھا۔ وہ رقم اس نے وہاں جمع کرا دی تھی۔ پانچ لاکھ میں آدمی ساری دنیا کو خرید سکتا ہے۔ دنیا تو بہت چھوٹی چیز ہے۔ شاید ایک لاکھ میں بھی خریدی جا سکتی ہے۔ پانچ لاکھ کی سُن کے میرا دماغ گھوم گیا۔ میں مجبور ہو گیا، صرف لالچ سے نہیں، خوف سے بھی کیونکہ سیٹھ کریم نے کہا تھا کہ یہ بات کرنے کے بعد وہ خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ اس دھندے میں ایمان داری کا یا ایمان کا کیا کام۔ تم نے جا کے گامے سے یہی بات کہہ دی تو وہ میرا دشمن ہو جائے گا۔ میرا دھندا ختم اور شاید میں بھی ختم۔ پھر کیوں نہ میں تم کو ختم کر کے گامے کا سارا مال پی جاؤں۔ خطرہ تو ہو گا میرے لیے لیکن میں کوئی نہ کوئی طریقہ سوچ لوں گا جس سے اپنی بے گناہی ثابت کر سکوں۔ میں نے پانچ لاکھ لیے اور واپس آ گیا۔ شاید میری حالت دیکھ کر ہی گامے نے اندازہ کر لیا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ خوف پانچ لاکھ کا بھی تھا اور گامے کا بھی۔ پانچ لاکھ ہوں آدمی کے پاس تو اسے بہت ڈر لگتا ہے جی۔ میری حالت اس شخص کی طرح ہو رہی تھی جس نے پانچ لاکھ میں اپنی زندگی کا سودا کر لیا ہو۔ میں پچھتاتا تھا اور پھر ہوا میں اڑنے لگتا تھا۔ پانچ لاکھ میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ کبھی میں سوچتا تھا کہ اب بھی وقت ہے، گامے کو سب بتا دوں مگر دوسرے لمحے میرے سامنے کوئی خواب آ جاتا تھا۔ ہر آدمی کے پاس خوابوں کا عجائب گھر ہوتا ہے اور اسے خود بھی معلوم نہیں ہوتا کہ یہ سب خواب کہاں سے آئے۔ یہی سوچتے اور خوابوں کی تعبیر دیکھتے بہت وقت گزر گیا۔ سب سے بڑی غلطی میں نے وہی کی جو سب کرتے ہیں کہ یہ بات اپنی بیوی کو بتا دی۔ حوّا نے تو حضرت آدم کو بھی بہکا دیا تھا۔ میرے قدم تو پہلے ہی بہک چکے تھے۔ اس کی باتوں نے مجھے ہزار روپے ماہانہ کے بارے میں نہیں سوچنے دیا جس میں خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔ اس نے خواب خریدنے شروع کر دیے۔ میں ان خوابوں میں پھنس گیا۔ پھر کراچی سے کریم سیٹھ نے اطلاع دی کہ گودام پر چھاپا پڑ گیا اور اخبار میں خبر بھی لگوا دی۔ اس نے کہا کہ وہ خود بڑی مشکل سے جان بچانے میں کامیاب ہوا ہے لیکن یہی اس کی غلطی تھی۔ گودام تو کرائے کے تھے اور کرایہ نامہ فرضی نام سے بنوایا گیا تھا۔ اگر چھاپا پڑتا تو کریم کیسے پکڑا جاتا۔ پکڑے جاتے کرائے دار اور وہ نہ ملتے تو گرفتار ہوتا گودام کا مالک۔ اس نے رحمت کباڑی کو بھیجا اور سب کچھ معلوم کر لیا۔"

میری سمجھ میں اس کی بات نہیں آئی۔ "پھر اس نے رحمت ہی کو ختم کرنے کے بارے میں کیوں سوچا؟"

ڈرائیور ہنسنے لگا۔ "یہی تو اصل چکر ہے۔ اگر رقعہ رحمت کباڑی کو دیا جاتا اور اس میں لکھا ہوتا کہ ڈرائیور کو واپس نہ آنے دیا جائے تو رحمت مارا جاتا۔ پیغام کا مطلب ہمیشہ الٹا ہوتا تھا۔ سیدھا مطلب یہ ہوتا تھا کہ حاملِ رقعہ ہٰذا کو ختم کر دیا جائے۔"

"کیا یہ بات رحمت کباڑی نہیں جانتا تھا؟" میں نے کہا۔ "کہ تمھارے پاس ایک رقعہ ہے۔"

"نہیں۔" ڈرائیور بولا۔ "لیکن میں جانتا تھا۔ دو بار پہلے بھی ایسا ہو چکا تھا۔ ان دونوں نے میرے سامنے سیٹھ کریم کو رقعہ دیا تھا اور وہ دونوں لوٹ کر نہیں آئے۔ میں نے پھر کبھی ان کو نہیں دیکھا۔"

"اس کا یہ مطلب کیسے ہوا کہ وہ مارے گئے؟" محسن بولا۔

"سیٹھ کریم نے اگلے پھیرے میں مجھے ان کی موت کی خبر دی۔" ڈرائیور بولا۔ "یہ بتایا کہ ان کی لاشیں سمندر میں مچھیروں نے نکالی تھیں۔ ایسی ہر خبر پھیلائی جاتی تھی تاکہ دوسروں کو عبرت حاصل ہو۔"

"ذرا اس کا خیال رکھنا۔" میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا اور رحمت کباڑی کی لاش کے پاس بیٹھ کے اس کی جیبوں کی تلاشی لی۔ اندر کی جیب میں نوٹوں اور ذاتی کاغذات کے درمیان نئے سفید کاغذ کا ایک پُرزہ رکھا ہوا تھا۔ اس پر لکھا تھا۔ "کریم سیٹھ۔ ڈرائیور واپس نہ آنے پائے۔ کراچی کا سمندر بہت بڑا ہے۔" میں بہت دیر تک اس تحریر کو دیکھتا رہا۔ اگر وہ سب سچ تھا جو ٹرک ڈرائیور نے بتایا تھا تو گامے کی طرف سے رحمت کی موت کا فرمان بھی جاری ہو چکا تھا۔ یہ نوشتۂ تقدیر تھا کہ وہ کب، کہاں اور کیسے مارا جائے۔ گامے ماچھی کا فرمان قدرت کا فیصلہ نہیں بدل سکتا تھا اور رحمت کباڑی کے پاس کراچی تک پہنچنے کی مہلت ہی نہ تھی۔ آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں۔ مجھے پرانا گھسا پٹا شعر یاد آیا جو بہت حسبِ حال تھا۔ خود ٹرک ڈرائیور بھی جانتا تھا کہ وہ خود اپنی موت کا نامہ بر بن کے جا رہا ہے لیکن وہ انکار نہیں کر سکتا تھا۔ رقعہ اسے آخری وقت میں یا چلتے وقت دیا گیا ہو گا۔ وہ کیسے کہتا کہ میں اس کا مطلب سمجھتا ہوں۔ کہتا تو اسی وقت مارا جاتا۔ اس نے خاموشی سے موت کا پروانہ جیب میں رکھ لیا۔ صرف اس خیال سے کہ اس طرح کچھ مہلت تو ملے گی۔ لاہور سے کراچی تک کے سفر میں شاید کہیں فرار کا راستہ ہو۔ جہاں وہ رحمت کباڑی کو دھوکا دے کر نکل جائے۔ مشکل یہ تھی کہ وہ خود غیر مسلح تھا اور جانتا تھا کہ رحمت کے پاس ریوالور ہے۔ اگر اس نے بھاگنا چاہا تو رحمت اسے فوراً گولی مار دے گا۔

"یہ رقعہ دیکھو۔" میں نے کہا اور کاغذ ٹرک ڈرائیور کی طرف بڑھا دیا۔ "یہ تم دونوں کا آخری پھیرا تھا۔"

ٹرک ڈرائیور نے رقعہ پڑھ کے ہنسنا شروع کیا۔ اس کی ہنسی بہت عجیب تھی۔ جنون آمیز، خوف زدہ کرنے والی اور پُر آسیب۔ وہ مجھے پاگل نہیں لگتا تھا اور نشے میں بھی نہیں تھا لیکن اس کے اعصاب جواب دے گئے تھے۔ گردشِ حالات اسے خود بخود ایسے موڑ پر لے آئی تھی جہاں وہ نہیں آنا چاہتا تھا۔ پہلے سیٹھ کریم کی نیت میں فتور آیا۔ اس نے پانچ لاکھ روپے زبردستی تھما دیے اور وہ مجبور آدمی اپنی ہی کمزوریوں کے جال میں پھنس گیا۔ وہ سیدھا سادہ ٹرک ڈرائیور تھا، شکاری نہیں تھا لیکن وہ شکاریوں میں گھر گیا تھا تو شکار کیسے نہ ہوتا۔ راہِ حیات کے آگے جان لیوا موڑ پر میں اپنا جال پھیلائے کھڑا تھا۔ ایک اور شکاری جو اسی کی طرح حالات کی سازش کا شکار ہو کے شکاری بنا تھا۔ وہ سرحدوں پر دشمن فوجوں کے درمیان کھڑا درخت تھا جو ایک دوسرے پر گولہ باری کر رہی تھیں اور جن کو صرف فتح و شکست سے سروکار تھا۔ اس اکیلے درخت کی یا اس کی شاخوں میں بسیرا کرنے والے پرندوں کی سلامتی اتنی غیر اہم تھی کہ کوئی اس کے متعلق سوچتا بھی نہیں۔ اس کے لیے دونوں طرف موت تھی اور موت تو موت ہی ہوتی ہے خواہ دشمنوں کے ہاتھوں آئے یا دوستی کا صلہ ہو۔

"جس بات کا تمھیں علم تھا۔" میں نے کہا۔ "وہ بات رحمت کباڑی کو کیوں معلوم نہیں تھی؟"

"کون سی بات؟" ڈرائیور نے خالی خالی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ فقیر اب بھی انٹا غفیل پڑا تھا۔

"یہی کہ اپنی جیب میں وہ اپنی ہی سزائے موت کا حکم لے کر جا رہا ہے؟" میں نے کہا۔

"رحمت تو آج سال بھر کے بعد میرے ساتھ جا رہا تھا۔" وہ بولا۔ "میں نے سال میں بارہ پھیرے کیے اور بارہ آدمی میرے ساتھ گئے۔ ان میں سے اگر دس واپس آئے تو ان کے بارے میں رحمت کو کیسے علم ہو سکتا تھا۔ اسے تو یقین ہو گا کہ وہ پیغام میرے بارے میں ہے۔ اس کا مطلب وہی ہے جو۔۔۔ جو تم نے سمجھا تھا۔ اصل مطلب سمجھتا تو جاتا میرے ساتھ؟"

"تم بھی تو سب جاننے کے باوجود جا رہے تھے۔" میں نے کہا۔

"میں مجبور تھا۔" ڈرائیور نے کہا۔ "گھر سے چلتے وقت بیوی نے کہا تھا، آج مت جاؤ۔ رات میں نے ایک بہت بُرا خواب دیکھا تھا کہ تمھارے ٹرک کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ میں نے کہا نیک بخت، سب محبت کرنے والی بیویاں ایسے ہی خواب دیکھ دیکھ کر ڈرتی رہتی ہیں۔ وسوسے اور اندیشے ان کو سوتے میں بھی ڈراتے ہیں لیکن ٹرک تو ہر روز اتنے ہی چلتے ہیں، کسی ڈرائیور کی بیوی اچھا خواب دیکھے یا بُرا۔ موت کی طرح حادثے کا بھی وقت مقرر ہے۔ اس سے کون بچ سکتا ہے۔ وہ کہنے لگی، میں نے ایسا خواب تو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کبھی پہلے بھی روکا ہے میں نے تم کو؟ مگر مجھے موت بلا رہی تھی۔ میں بیوی کے روکنے سے کیسے رک سکتا تھا۔ میں نہ جاتا تو کوئی قیامت نہیں آتی۔ ٹرک اگلے دن چلا جاتا یا میری جگہ دوسرا شخص ٹرک لے جاتا۔ پھر باہر آتے آتے میں دہلیز سے ٹھوکر کھا کے گرا۔" وہ پھر ہنسنے لگا۔

"اس میں ہنسنے کی کون سی بات ہے؟" میں نے کہا۔

"رونے سے کیا ہو گا؟" وہ بولا۔ "تقدیر کے اس مذاق پر آخری بار بھی نہ ہنسوں۔ خود اپنی موت پر کون روتا ہے؟"

"لیکن تم ابھی زندہ ہو اور میں نے طے نہیں کیا ہے کہ تم کو قتل کروں۔ رحمت تو اپنی بہادری میں مارا گیا۔ مجھے اپنا دفاع تو کرنا ہی تھا۔ اسے قتل نہیں کہا جاسکتا اور عمداً میں نے ابھی تک کسی کو قتل نہیں کیا ہے۔" میں نے کہا "آئندہ کی بات نہیں کرتا۔"

"لیکن میں آئندہ کی بات کرتا ہوں۔" وہ بولا "تم چاہے قتل نہ کرو، قتل تو میں ہو چکا۔ جب روانگی کے وقت گامے ماچھی نے مجھے وہ رقعہ دیا تھا، تب ہی میں نے یہ بات سمجھ لی تھی۔ تم راستہ نہ روکتے تب بھی میرا انجام مختلف نہ ہوتا۔ میں گامے ماچھی کو دھوکا دے کر یا اسے قتل کر کے بھاگ جاتا۔ ناکام رہتا تو وہ مجھے گولی مار دیتا۔ اگر کراچی پہنچتا تو سیٹھ کریم بھی قتل کرتا۔ بچ جاتا تو کب تک بچتا۔ کبھی نہ کبھی تلاش کرنے والے مجھے تلاش کر لیتے اور مار دیتے۔ میں نہ ملتا تو میرے بیوی بچے انتقام کا نشانہ بنتے جو مجھے منظور نہیں تھا۔"

"تم انھیں کیسے بچا سکتے ہو؟" میں نے ان سب کو ذہن میں رکھ کے کہا جن کا نام بھی ڈرائیور نہیں جانتا تھا۔ اب تک وہ ایک معمولی ڈرائیور تھا۔ غیر معمولی وہ اس لیے ہو گیا تھا کہ اس نے غداری کی تھی، غبن کیا تھا اور مالکوں کو پانچ لاکھ کا نقصان پہنچایا تھا۔ چنانچہ اس جرم کی سزا کسی نہ کسی کو بہر حال ملنی تھی۔ اسے نہ سہی، اس کے بیوی بچوں کو۔ یہی تو آدمی کے پاؤں کی وہ زنجیر ہوتی ہے جو اسے بے بسی کے ساتھ پھانسی کا پھندا خود اپنے گلے کا ہار بنانے پر مجبور کر دیتی ہے۔

"مجھے معلوم تھا کہ بعد میں اس کے ساتھ کیا ہوگا۔" ڈرائیور بولا "پھر بھی میں نے کوشش ضرور کی تھی۔ میں نے راستے میں ٹرک روک کے فون کیا تھا۔ میرے پڑوس میں ایک ڈاکٹر رہتا ہے۔ بہت شریف آدمی ہے۔ اسے ایک پیغام دے دیا تھا۔ میں نے اپنی بیوی کے نام۔ کہ جتنی جلد ہو سکے اپنا سب نقد اور زیور لے کر فوراً چلی جائے۔ وہ خود جانتی ہے کہ پانچ لاکھ میں سے کتنے بچے ہیں جو صندوق میں رکھے ہیں اور اس کا زیور کتنا ہے اور یہ سب کہاں ہے، کیسے آیا ہے۔"

"تمھارے خیال میں وہ کہاں جائے گی؟" میں نے کہا۔

"اور کیا اب تک جا چکی ہوگی؟"

"وہ یقیناً اب تک جا چکی ہوگی۔" ڈرائیور بولا "کہاں گئی ہوگی، یہ میں مر کے بھی نہیں بتاؤں گا، نہ تمھیں نہ انھیں۔"

"اور اگر تم کو آزاد کر دیا جائے۔" میں نے کہا "تو تم اس کے پاس پہنچ جاؤ گے؟"

"ہاں، مجھے معلوم ہے۔ وہاں کوئی اور نہیں پہنچ سکتا۔" وہ بولا "لیکن وہاں پانچ لاکھ میرے کام نہیں آئیں گے۔ اس چھوٹے سے گاؤں میں کوئی لکھ پتی نہیں، زمیندار بھی نہیں، نمبردار بھی نہیں۔ اگر میں نے اس دولت سے سارا گاؤں خرید لیا تو سب میرے دشمن ہو جائیں گے۔ میرے اور میری بیوی کے چاچے ماما سب حسد کرنے لگیں گے۔ وہ خود ہی تھانے میں اطلاع دے دیں گے کہ یہ معمولی سا ڈرائیور کہیں سے ڈاکا ڈال کے لاکھوں لے آیا ہے۔ وہاں تو میں اسی طرح زندہ رہ سکتا ہوں کہ تھوڑی سی زمین خرید لوں اور ایک چھوٹا سا گھر بنا لوں اور اس سب دولت کو دفن کر دوں، کنویں میں ڈال دوں یا جلا کے راکھ کر دوں۔ ورنہ وہ آجائیں گے اور کسی کو زندہ نہیں چھوڑیں گے، میرے بچوں کو بھی نہیں۔"

"تم فرار ہو کے کسی ویسے ہی دوسرے گاؤں میں نہیں جاسکتے؟" میں نے کہا "پنجاب کے رہنے والے ہو تو بلوچستان یا سندھ کے کسی گاؤں میں؟ یا ملک سے باہر، میں تمھاری مدد کر سکتا ہوں ایک شرط پر۔ تم مجھے کراچی کے سارے ٹھکانوں کے پتے بتا دو۔ یہ بتا دو کہ مال کیا لے جاتے تھے۔"

"یہ تو مجھے آج تک معلوم نہیں ہوا، تمھیں کیسے بتاؤں؟" وہ بولا۔ اس کا لہجہ اب کچھ پُر امید محسوس ہوتا تھا "لیکن.... کہیں اور جاتے ہوئے مجھے ڈر لگتا ہے۔ باہر کی پولیس بہت چالاک ہوتی ہے۔ پھر ملک سے باہر بھی ان کے آدمی ہیں۔ کسی چھوٹے سے گاؤں میں اچانک کوئی اجنبی پانچ لاکھ لے کر کیسے وارد ہو سکتا ہے۔ کون قبول کرے گا اسے؟ اور یہ پٹواری، نمبردار اور تھانے دار۔ یہ کب برداشت کریں گے۔ نہیں جی، ہم سب اسی گاؤں میں رہ سکتے ہیں مگر اس دولت کے بغیر۔ اس دولت اور موت میں سے ہمیں ایک کا انتخاب کرنا پڑے گا۔ یہاں میں نے ایک لاکھ کا مکان خریدا تھا لاہور میں۔ پچاس ہزار کے قریب میری بیوی نے گھر کے سامان اور زیورات بنانے میں خرچ کیے تھے۔ ساڑھے تین لاکھ نقد ہوں گے۔ اس کے لیے میں اپنی، بیوی کی اور تین بچوں کی زندگی بیچ دوں؟"

"اچھا جو تمھارا دل چاہے کرنا۔" میں نے صبح کے آثار نمودار ہوتے دیکھ کر کہا "یہاں سے رہائی کی شرط وہی ہے۔ مال ہم ابھی تم کو دکھا دیتے ہیں۔ تم ہمارے ساتھ کراچی چلو۔"

"میں تمھیں پتا بتا سکتا ہوں۔" وہ بولا "نام بتا سکتا ہوں۔"

"اس بات کی کیا ضمانت ہوگی کہ پتا غلط نہیں ہوگا؟" میں نے کہا "ہم خطرہ مول نہیں لے سکتے۔"

"خطرہ میرے لیے نہیں ہوگا تمھارے ساتھ جانے میں؟" وہ بولا۔

"تم دور سے بتاؤ گے۔ ہم میں سے ایک تصدیق کے

لیے جائے گا۔ ایک تمھارے ساتھ رہے گا۔" میں نے کہا۔ "اگر کوئی بات غلط نہیں ہوئی تو تم کو چھوڑ دیا جائے گا۔ آگے جو تمھارا نصیب۔"

میں ڈرائیور سے گفتگو میں اتنا مصروف تھا کہ محسن کی طرف متوجہ نہیں رہا تھا۔ وہ اطمینان سے دیوار کا سہارا لیے بیٹھا تھا اور سگریٹ پی رہا تھا۔ فقیر گہری نیند میں خراٹے لے رہا تھا اور رحمت کباڑی کی لاش اکڑنے لگی تھی۔ مجھے فقیر پر رشک آیا جو ایک دم لگا کے بے غم ہو گیا تھا۔ اسے اپنی ذات کی حد تک ہم سے کوئی خطرہ نہیں رہا تھا۔ ہم نے اس کا پیسہ گن کر اسے واپس کر دیا تھا اور ہم اس کے دشمن بھی نہیں تھے لیکن جو کچھ اس کی نظروں کے سامنے ہو رہا تھا، وہ اس کو دہشت زدہ کر رہا تھا۔ اس کا آسان علاج یہ تھا کہ آنکھیں اور کان سب بند کر لیے جائیں اور احساس کو ختم کر دیا جائے۔ پھر ہوش آنے پر یا تو سب خیریت ہوگی یا ہوش آئے گا ہی نہیں۔ آنکھ کھلے گی تو معلوم ہوگا یوم حساب آگیا۔

طویل جسمانی اذیت برداشت کرنے کے باوجود ڈرائیور بھوک پیاس، تھکن یا درد کے احساس سے بے نیاز تھا۔ زندگی کا یقین ختم ہو جانے کے بعد جسم کی مادّی ضروریات بھی ختم ہو گئی تھیں اور ان حالات میں اسے جھوٹ بولنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ پھر بھی میں نے اسے زد میں رکھا اور محسن کے پاس بیٹھ کے اس سے مشورہ کیا۔ کچھ دیر بعد محسن باہر گیا اور گاڑی میں سے وہ کریٹ اٹھا لایا جو ہم نے ٹرک میں سے اتارا تھا۔ پھر وہ اسے کھولنے کے لیے کچھ تلاش کرنے نکلا۔

"تمھیں معلوم ہے ہم کون ہیں؟" میں نے ڈرائیور سے کہا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا جیسے اسے یہ بات معلوم ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ محسن ایک زنگ خوردہ سریے کا ٹکڑا لیے نمودار ہوا جو دو فٹ لمبا تھا۔

"ہم تمھارے نہیں، ان کے دشمن ہیں جن کی خاطر تم اب تک غلط کام کرتے رہے۔" میں نے سوچ کے کہا "مگر نہ ہم ایکسائز والے ہیں اور نہ پولیس والے۔" ڈرائیور نے ایک نظر میری پولیس انسپکٹر کی وردی پر ڈالی۔

"ہم نے وہ ٹرک تباہ کر دیا ہے جو تم اور رحمت کباڑی لے کر روانہ ہوئے تھے۔" محسن نے اسے مطلع کیا۔

"بس یہ نمونہ بچا ہے۔" میں نے اسے سریے کی مدد سے کریٹ پر زور آزمائی کرتے ہوئے دیکھا۔ "ہمارے آئندہ پروگرام میں ان سب کو تباہ کرنا شامل ہے جو رحمت اور گامے ماچھی کے ساتھی ہیں۔ اس سے اوپر بھی بہت سے لوگ ہیں لیکن تم بھی اس نمونے کی طرح بچ سکتے ہو کیونکہ تم محض آلۂ کار تھے اور تمھاری باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم کو ان کے اصل دھندے کا علم نہیں تھا۔ ورنہ تم ان کا ساتھ نہ دیتے۔ کہیں اور ڈرائیور کی نوکری کر لیتے۔ پھر تم پھنس گئے اور تمھارا نکلنا مشکل ہو گیا۔ یہ نا یہی بات؟"

ڈرائیور نے اقرار میں سر ہلایا۔ اسی وقت محسن نے کریٹ کے گرد لپٹی ہوئی پتی کو توڑنے میں کامیابی حاصل کی۔ اب اوپر کے تختے کھولنے کا مرحلہ درپیش تھا جو زیادہ مشکل تھا۔ ہمارے پاس کوئی تیز دھار والی یا نوکیلی چیز نہیں تھی جسے تختوں کی درز میں پھنسا کے زور لگانے سے تختہ اٹھ جاتا۔ یہ مسئلہ محسن خان نے اس طرح حل کیا کہ باہر سے ایک بھاری پتھر لا کے کریٹ کے کونے پر ضرب لگائی۔ تختے کا کونا ٹوٹ گیا اور لکڑی کی ایک چھوٹی سی مثلث الگ ہو گئی۔ اس سے کریٹ میں اتنا بڑا سوراخ بن گیا کہ آدھا انچ موٹائی کا سریا اندر ڈالا جاسکے۔ محسن نے سریا داخل کر کے لیور بنا لیا اور نیچے زور لگا لیا۔ نیچے کے تختے میں پیوست کیلوں نے مزاحمت کی اور تختہ چرچرایا لیکن بالآخر اوپر اٹھ گیا۔ اس کے بعد کام آسان ہو گیا۔ محسن سریے کو آگے کھسکا کے زور لگاتا گیا اور اوپر نیچے کے تختوں میں جڑی ہوئی کیلیں نکلنے لگیں۔

اچانک میری دلچسپی بڑھ گئی۔ افشائے راز کا وقت آگیا تھا۔ "میر وزیر اینڈ کمپنی" کے جائز کاروبار کی آڑ میں کون سا ناجائز کاروبار چل رہا تھا۔ یہ جاننے کے لیے میں نے کتنی ناکام اور پُر اذیت جدوجہد کی تھی۔ میرا ساتھ دینے والوں نے کتنی سزا پائی تھی اور کتنی قربانی دی تھی۔ وزیر خان نے ایمانداری اور محنت کو اصول بنا کے "وزیر خان انجینئرنگ" کی بنیاد رکھی تھی۔ پھر بے ایمان اور بے ضمیر لوگ اس کے ساتھی بن گئے جنھوں نے اسے ایم۔ ڈبلیو۔ ڈی انجینئرنگ کمپلیکس میں تبدیل کر دیا۔ اس کے نام سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے غیر قانونی کاروبار شروع کیا۔ لاکھوں کمائے مگر وزیر خان کو ایمانداری اور اصول پرستی پر قائم رہنے کے جرم میں کاروبار سے الگ کیا۔ کوڑی کوڑی کو محتاج کیا اور ختم کر دیا۔ اس راز پر برسوں پردہ پڑا رہا اور جب پردہ اٹھنے کا خطرہ لاحق ہوا تو انھوں نے مجھے خریدنا چاہا۔ دس لاکھ، بیس لاکھ، پچاس لاکھ میں مجھ سے صرف اتنا چاہا کہ میں خاموش رہوں اور جو ہوا اسے بھول جاؤں۔ اس کے بعد تباہی و بربادی، قتل و غارت گری اور خوں ریزی کا جو سلسلہ شروع ہوا، وہ اب تک جاری تھا کیونکہ میں نے ان کی لگائی ہوئی بولی مسترد کر دی تھی جو سمجھتے تھے کہ دولت لے کر میں سب فراموش کر دوں گا۔ وزیر خان کو، اس سے اپنے رشتے کو، اس رشتے کی آبرو کو، وزیر خان

کے بے گناہ خون کی پکار کو، مستقبل کی خوشی کے لیے ماضی کے غم بیچ دوں گا اور خوف زدہ ہو کے انتقام کے خیال سے تائب ہو جاؤں گا لیکن ایسا نہیں ہوا تھا اور افشائے راز کے خوف نے دوست بن کر وزیر خان سے دشمنی کرنے والوں کی نیند بھی حرام کر دی تھی۔ لندن سے آنے کے بعد جو کچھ میں نے دیکھا تھا اور سنا تھا اس کے بعد میرے ذہن میں سب سے پہلے یہی سوال آیا تھا کہ ایسا کیوں ہوا؟ دوسرا سوال یہ تھا کہ ایسا کس نے کیا؟ ابھی تک مجھے کسی سوال کا جواب نہیں ملا تھا لیکن اس باکس یا کریٹ کا کھلنا میرے پہلے سوال کے جواب کی بنیاد بن سکتا تھا۔ پردہ میری آنکھوں پر سے اٹھنے والا تھا کہ وہ "مال" کیا ہے جو ایسے پُراسرار اور پیچیدہ طریقے سے "میر وزیر اینڈ کمپنی" سے کراچی پہنچتا ہے اور لاکھوں کے منافع کا ضامن ہے۔ ٹرک ڈرائیور کے بیان کے مطابق ایک پھیرے میں دس لاکھ کا منافع تھا جو اس نے سیٹھ کریم کے ساتھ ففٹی ففٹی کر لیا تھا۔ زرعی آلات اور پُرزے سونے کے بنے ہوتے نہیں ہوتے کہ ایک ٹرک کا مال اتنا مہنگا فروخت ہو اور اتنا منافع دے۔

تختہ ہٹتے ہی میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ بالآخر مجھے معلوم ہونے والا تھا کہ چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کا اصل دھندا کیا تھا۔ ایک بار یہی معلوم کرنے کے لیے میں سر سے کفن باندھ کے فیکٹری میں جا گھسا تھا لیکن وہاں چھ بدمعاشوں نے فورمین بن کر مجھے لکڑی کے تابوت میں بند کر دیا تھا۔ ایک فورمین رانجھا تھا جو اس راز کی حفاظت میں نااہلی کا مظاہرہ کرنے پر زندہ جلا دیا گیا تھا۔ دوسرا فورمین رحمت کباڑی تھا جس کی بے حس و حرکت لاش آدمی کی زندگی کے ہر یقین کا، ہر دعوے کا اور فتح کے ہر غرور کے لیے تصویرِ عبرت بنی ہوئی تھی۔ باقی چار کون تھے اور ان کے لیے کاتبِ تقدیر نے کیا لکھا تھا، یہ کوئی وقت سے پہلے کیسے جان سکتا تھا۔

محسن نے کریٹ کے اندر جمی ہوئی گھاس ہٹائی۔ اس کے نیچے ایک گتا تھا۔ آخری تہ سیلوفین شیٹ کی تھی جو درحقیقت سیلوفین کی ہر طرف سے بند تھیلی تھی۔ بارش کا پانی کریٹ کے اندر پہنچ سکتا تھا لیکن سیلوفین کی تھیلی میں بند مال کو خراب نہیں کر سکتا تھا۔ محسن نے سیلوفین کو دانتوں سے کاٹا اور اس کا ایک منہ کھولا۔ ایک لمحے کے لیے ہم دونوں اپنی اپنی جگہ منجمد ہو گئے ہم دونوں کی نظر "مال" پر جم گئی۔ ہم گردوپیش سے اتنے بے خبر تھے کہ اگر ڈرائیور چاہتا تو ہماری غفلت کے اس لمحے سے فائدہ اٹھا کے ہم پر حملہ کر سکتا تھا۔ وہی سریا ہمارے سر پر مار سکتا تھا جو محسن کے ہاتھ سے نیچے گر گیا تھا یا میرے ہاتھ سے ریوالور چھین سکتا تھا لیکن ہم اس کے لیے زندگی کی نئی امید کے نامہ بر تھے۔ وہ حیرت سے ہماری صورتوں کو دیکھتا رہا۔

"ہمارے ساتھ دھوکا ہو گیا محسن!" میں نے مایوسی کے اس حوصلہ شکن وقفے کو ختم کیا جس میں میری توقعات خاک میں مل گئی تھیں۔ کریٹ کے اندر مجھے نٹ بولٹ بھرے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

"صرف اس لیے کہ وقت کم تھا" محسن نے امید افزا لہجے میں کہا "ہم نے سوچے سمجھے بغیر ایک کریٹ اٹھا لیا تھا۔ ہم کو دیکھنے میں سب ایک جیسے لگے تھے۔"

"لیکن ان سب میں نٹ بولٹ نہیں تھے۔" میں نے کہا۔

"شاید اوپر والے سب کریٹ ایسے تھے کہ ضرورت پڑنے پر کھول کے دکھائے جا سکتے تھے۔"

"ہاں، اصل مال نیچے تھا۔" محسن بولا "یا مال کے چند ہی کریٹ تھے۔ ہم کھول کر کیسے دیکھتے۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے محسن" میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا "کہ نٹ بولٹ اوپر ہی ہوں۔ نیچے ذرا دیکھ۔"

محسن نے تھیلی کو کھینچ کر باہر نکالنا چاہا لیکن پلاسٹک کی تھیلی وزن سے پھٹ گئی۔ محسن نے کریٹ الٹ دیا۔ ایک بار پھر ہمیں مایوسی ہوئی۔ اس میں ایک ہی سائز کے نٹ بولٹ تھے۔

"شکر ہے تیرا میرے مولا!" فقیر نے صدا لگائی اور ہم نے پلٹ کر دیکھا تو وہ انگڑائی لے کر اٹھ بیٹھا تھا لیکن ہماری طرف بالکل متوجہ نہ تھا۔ اپنی مایوسی کی کیفیت میں محسن کو اور مجھے یہ بات یوں لگی جیسے وہ ہمارا مذاق اڑا رہا ہو۔

"کس بات پر خدا کا شکر ادا کر رہے ہو؟" محسن نے جھنجلا کے کہا۔

"بڑا کرم ہے میرے رب کا" وہ رحمت کباڑی کو دیکھ کے بولا "سوئے تو دونوں ایک ساتھ تھے۔ اٹھنا صرف مجھے نصیب ہوا" اس نے چمٹا اور کشکول اٹھایا "جان اور مال دونوں کو بچانے والا وہی ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے" میں نے اٹھتے ہوئے کہا "لیکن سواری کہاں چلی؟"

"سویرا ہو گیا بابا۔ پنچھی بھی دانہ دُنکا چگنے نکل گئے" وہ بولا "فقیر کا بھی وقت ہو گیا۔"

"ابھی آپ تشریف رکھیں" میں نے ریوالور سے اشارہ کیا "ہم سے پہلے آپ نہیں جا سکتے۔"

"ارے بابا! پیٹ کھانے کو مانگتا ہے" فقیر فرش پر بیٹھ گیا "آنتیں قل ھو اللہ پڑھ رہی ہیں۔"

"فکر مت کرو۔ ایک دن کے فاقے سے اِنّا لِلّٰہ پڑھنے کی نوبت نہیں آئے گی" میں نے کہا "ابھی یہیں منّ و سلویٰ اترے گا۔ صبر کا پھل..."

"ارے بابا صبر کے پھل کا نہیں، روزی کا سوال ہے" وہ جھلا کے بولا اور پھر کھڑا ہو گیا۔

"یار محسن" میں نے کہا "یہ ایسے نہیں مانے گا۔ اس کا زرِ ضمانت ضبط کر لے۔ منہ ادھر کرو سائیں بادشاہ" اور کندھا پکڑ کے اسے گھما دیا۔ محسن نے اس کی مزاحمت کے باوجود جیب میں ہاتھ ڈال کے اس کا تمام سرمایہ نکال لیا پھر اسے دھکا دیا تو وہ کونے میں جا گرا۔ اس کا چمٹا اور کشکول اس سے پہلے ہی گر گئے۔

"ارے ظالمو، قاتلو، فقیر کی بددعا مت لو" وہ اپنی قبا سے ناک صاف کر کے پھُس پھُس رونے لگا "میرا مال کھاؤ گے تو بری موت مرو گے۔ ہضم نہیں ہو گا تمھیں۔"

"آرام سے بیٹھے رہو گے تو مال واپس مل جائے گا" میں نے کہا "ورنہ مال کیا ہم تمھیں بھی کھا جائیں گے اور ہضم بھی کر لیں گے" پھر میں محسن سے مخاطب ہوا "میں گاڑی لے کر جاتا ہوں اور ناشتے کے لیے کچھ لے کر آتا ہوں۔"

"اس گاڑی سے فوراً نجات حاصل کرنی ضروری ہے" محسن نے فرنچ میں فرمایا جو میں اور وہ گزارے کی حد تک جانتے تھے "اس کے مالک نے پولیس میں رپورٹ ضرور لکھوائی ہو گی۔"

میں باہر نکلا تو سورج بھی نکل رہا تھا۔ میرے پاس تقریباً اٹھائیس ہزار روپے نقد تھے۔ بیس ہزار میں نے رشوت لی تھی۔ پانچ ہزار نقد رابعہ نے دیے تھے اور تین ہزار اس وردی کے ساتھ ہی آئے تھے۔ اس کے علاوہ میرے پاس ایک چیک تھا۔ جس کے اعداد غیر اہم تھے۔ ان سے کہیں زیادہ بیش قیمت خلوص، محبت اور اعتماد کا وہ جذبہ تھا جو اس کاغذ کے پُرزے میں بھی خوشبو بن کے سما گیا تھا۔ ایک بار پھر مجھے تھرمس کی ضرورت کا احساس ہوا۔ میں نے ماڈل ٹاؤن کے بازار کا رخ کیا۔ ایک ریسٹورنٹ میں ناشتا کرتے ہوئے میں نے طے کیا کہ اب مجھے پولیس کی وردی میں پھرنے اور کاریں چھیننے کی مزید واردات کرنے کی ضرورت نہیں۔ خطرات جتنے کم ہوں اتنا ہی اچھا ہے۔ نقد رقم اتنی تھی کہ ہم ایک سیکنڈ ہینڈ گاڑی خرید سکتے تھے جو ہمیں کراچی پہنچا دے۔ رجسٹریشن تو اس کی پہلے سے ہو گی۔ ٹرانسفر کے لیے فرضی نام استعمال کرنے سے ہم محفوظ ہو جاتے تھے۔ بشرطیکہ ہم اسی نام سے ڈرائیونگ لائسنس بھی حاصل کر لیں۔

میں نے چار انڈوں کا آملیٹ بنوایا۔ ایک پوری ڈبل روٹی کے سلائس کٹوا کے مکھن لگوایا۔ تھرماس میں چائے بھروائی اور انتہائی مشتبہ نظروں سے دیکھنے والے منیجر کو گھورتا ہوا ریسٹورنٹ سے باہر آ گیا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ کسی ریسٹورنٹ کا منیجر اتنا بہادر کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک باوردی پولیس انسپکٹر کو اشتعال دلائے اور وہ بھی کسی وجہ کے بغیر۔ میں نے تو بل بھی پورا ادا کیا تھا۔ جب میں کار اسٹارٹ کر رہا تھا تو وہ ٹیلیفون کا ریسیور اٹھا چکا تھا اور گردن آگے بڑھا کے کار کا نمبر نوٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ والی بات تھی۔

واپسی کے بجائے میں نے کار کو سیدھا دوڑایا اور چند منٹ میں کئی موڑ کاٹنے کے بعد ریسٹورنٹ سے کئی میل دور لے گیا۔ ریسٹورنٹ منیجر کے رویّے نے مجھے پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا۔ مزنگ کی ایک سڑک پر میں نے کار کو روکا ہی تھا کہ ایک اخبار والا میرے سامنے آ گیا "اخبار صاحب" اس نے کھڑکی کے قریب آ کے کہا۔ میں نے اسے ایک روپیہ دیا اور اخبار خرید لیا۔ میرا ارادہ تھا کہ گاڑی کو یہیں چھوڑ دوں اور رکشا یا ٹیکسی لے کر واپس جاؤں۔ تھوڑا سا دم لینے کے لیے میں نے اخبار کھولا اور سرخیوں پر نظر دوڑائی۔ لیکن صفحہ پلٹتے ہی میری نظروں کے سامنے برق سی کوندی اور پل بھر کے لیے میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔ مقامی

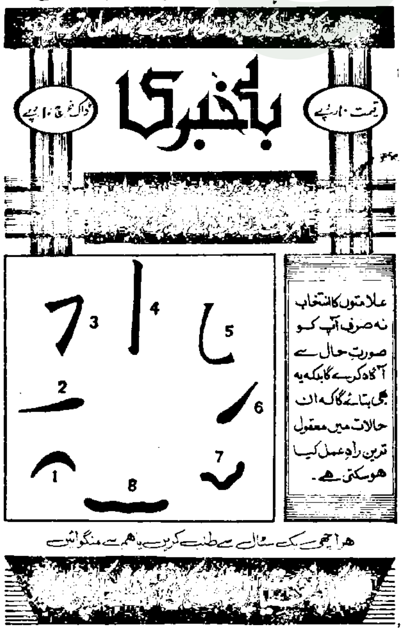

خبروں والے صفحے پر میری تصویر مسکرا رہی تھی۔ وہی تصویر جو میرے پاسپورٹ پر بھی موجود تھی۔ تصویر کے اوپر لکھا تھا "مطلوب ہے" اور نیچے تفصیلات میں یہ تھا کہ یہ شخص جو سکندر بخت ولد وزیر خان ہے اور کبیر بھی کہلاتا ہے، پولیس کو قتل اور رہزنی کی متعدد وارداتوں میں مطلوب ہے۔ اس کے خلاف راولپنڈی اور لاہور میں دُہرے قتل کے مقدمات درج ہیں اور عدالت اسے مفرور قرار دے چکی ہے۔ اس نے پولیس انسپکٹر کی وردی اور ریوالور سے فائدہ اٹھاتے ہوئے راہ چلتے لوگوں کو روک کر کم سے کم دو کاریں چھینی ہیں۔ اس کی گرفتاری یا نشاندہی کرنے والے کو دس ہزار روپے کا انعام دیا جائے گا۔

اشتہار پولیس کی طرف سے تھا لیکن مجھے شک ہوا کہ اس میں اگر چودھری دلاور اینڈ کمپنی کا ہاتھ نہیں تو عین ممکن ہے یہ انکل رضوی کی کوشش کا نتیجہ ہو۔ فرض شناسی میں وہ پہلے سے بہت نیک نام تھے لیکن اب میں ان کی بدنامی کا باعث ہو رہا تھا۔ انکل رضوی اب صفِ دشمناں میں شامل ہو چکے تھے اور مجھ پر ان کی شفقت کا سایہ نہیں رہا تھا۔ معلوم نہیں یہ تصویر کتنے اخباروں میں چھپی تھی اور اب تک کہاں کہاں پہنچ چکی تھی۔

صورتِ حال انتہائی سنگین ہو گئی تھی۔ ایک ریسٹورنٹ کے منیجر نے مجھے یقیناً شناخت کر لیا تھا۔ اب تک اس نے پولیس کو فون کر دیا ہوگا اور یہ بتا دیا ہوگا کہ ملزم ۱۹۶۵ء ماڈل کی سفید کورٹینا میں کہاں دیکھا گیا ہے اور کدھر گیا ہے۔ شاید اس نے کار کا نمبر بھی لکھوا دیا ہوگا۔

فوری طور پر مجھے بہت سے لوگوں کا خیال آیا۔ رابعہ کا اور شہلا کا۔ انکل شیر دانی کا اور فوزیہ کا۔ استاد میڈی کا اور میرے دوسرے وکیل عبدالودود منظر کا۔ وہ سب کیا سوچیں گے اور کس طرح میری مدد کریں گے۔ اچانک وہ سب جو کل تک میری طرف تھے، چودھری دلاور اینڈ کمپنی میں شامل ہو گئے تھے اور پولیس ان کے ساتھ ہو گئی تھی۔ تین طاقتور دشمن ایک ہو گئے تھے اور میں اکیلا رہ گیا تھا۔ دو شکاری واقعی طاقتور تھے یعنی پولیس اور دلاور اینڈ کمپنی۔ تیسرا فریق اس لیے طاقتور تھا کہ ان کے مقابل میری جذباتی کمزوری تھی۔ وہ خود میری کمزوری تھے۔ وہ سب جانتے تھے کہ میں بے گناہ ہوں لیکن ان کا یقین کوئی قانونی دلیل نہیں تھا۔ یہ فیصلہ تو عدالت کو کرنا تھا اور وہ مجبور تھے کہ مجھے عدالت سے باعزت طور پر زندہ رہنے کا حق دلوائیں۔ دوسری طرف میری عملی دشواریاں جن کی وجہ سے میں انصاف حاصل کرنے کا مروجہ طریق کار اختیار نہیں کر سکتا تھا اور اب جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا میرے اور دنیا کے نقطۂ نظر کے درمیان فاصلہ بڑھتا جا رہا تھا۔ انصاف حاصل کرنے کی جدوجہد میں میرے ساتھ ہونے والی ناانصافی میں اضافہ ہو رہا تھا۔

مَیں نے بڑی عجلت سے گاڑی اسٹارٹ کی اور واپسی کی راہ اختیار کی۔ پہلی ویران سڑک پر آتے ہی میں نے کار کو ایک دیوار کے ساتھ روکا اور رومال سے اندر باہر وہ جگہ صاف کر دی جہاں میرے فنگر پرنٹ ملنے کا امکان تھا۔ اب اپنی وردی سے نجات حاصل کرنا بھی اتنا ہی ضروری تھا لیکن میرے پاس دوسرے کپڑے نہیں تھے اور میں بازار جاتے ہوئے ڈرتا تھا۔ ابھی میں کچھ طے نہیں کر پایا تھا کہ میں نے اپنے سامنے سے سائیکل پر ایک پوسٹ مین کو آتے دیکھا۔ اسے نو بجے ڈاک خانے ڈیوٹی پر پہنچنا ہوگا۔ میں نے سوچا۔ اور اس غریب نے ابھی اخبار کہاں دیکھا ہوگا۔ اس ملک میں تو اخبار خرید کر پڑھنا بھی وہ عیاشی ہے جس کا شوق سب کو نہیں ہوتا خواہ ان کے پاس فرصت، تعلیم اور پیسہ سب کچھ ہو۔

میں اطمینان سے باہر نکلا اور پوسٹ مین کو اشارے سے قریب بلایا۔ وہ سراسیمہ نظر آنے لگا اور قریب آنے سے پہلے ہی سائیکل سے اُتر گیا۔ جب وہ سائیکل کو اسٹینڈ پر کھڑی کر رہا تھا تو میں نے موقعے سے فائدہ اٹھایا۔ اس کی آواز تک نہ نکل سکی اور مَیں نے اسے کار کی پچھلی سیٹ پر لٹا دیا۔ پانچ منٹ میں اس کی وردی میرے جسم پر تھی اور کھانے پینے کا سب سامان پولیس کی وردی سمیت ڈاک کے تھیلے میں سما گیا تھا۔ خاکی وردی خاصی بوسیدہ تھی چنانچہ جب میں کار کے دروازے بند کر کے اور چابی وہیں چھوڑ کے سائیکل پر پیڈل مارتا روانہ ہوا تو میری ذہنی کیفیت بہت عجیب تھی۔ مَیں نے شاید بچپن میں سائیکل چلائی تھی۔ اب اس پر سواری کرنا مجھے بہت مضحکہ خیز لگا۔ یہ خیال بھی بہت عجیب تھا کہ اس وقت مجھے دیکھنے والے کیا سمجھتے ہوں گے۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ میں کون ہوں۔ انگلینڈ سے اعلیٰ تعلیم پا کے لوٹنے والا۔ ایک صنعتکار۔ ایک پرنس یا دنیا کے نقطۂ نظر سے جعلی پولیس انسپکٹر۔ دُہرے قتل کی ... وارداتوں میں مطلوب ایک مفرور اشتہاری مجرم۔ کوئی کیسے سوچ سکتا ہے کہ ڈاکیے کے اس فرسودہ بیگ میں انسپکٹر پولیس کی وردی ہی نہیں، ایک ریوالور بھی ہے اور اٹھائیس ہزار روپے نقد بھی ہیں۔ پوسٹ مین کی ڈاک اور نقد رقم مَیں نے اس کے پاس کار میں ہی رکھ دی تھی۔

ایک جگہ مجھے "پبلک ٹیلی فون" کا سائن بورڈ نظر آیا۔ دکان ایک ہیٹ اینڈ ہارڈ ویئر اسٹور تھی لیکن اندر اسٹول پر ایک بچہ بیٹھا تھا۔ عقبی حصے میں ایک دروازہ تھا۔

"مَیں ابا کو اندر سے بلاتا ہوں" وہ مجھے گاہک سمجھ کے بولا "ناشتا کر رہے ہیں وہ"

"نہیں بیٹا۔ رہنے دو" میں نے کہا "مجھے صرف فون کرنا تھا"

"ایک روپیہ ہوگا" بچے نے بڑی متانت سے کہا اور روپیہ ایک صندوقچی میں ڈال دیا۔ اس شرح پر وہ بل ادا کر کے بھی کچھ نہ کچھ یقیناً بچا لیتے ہوں گے۔ مَیں نے دلاور کے گھر کا نمبر ملایا۔

"چودھری صاحب۔ السلام علیکم" میں نے کہا "میں رانجھا فورمین بول رہا ہوں جنابِ عالی"

"اچھا" دلاور نے خاصی دیر کے بعد کہا "کہاں سے؟"

"عالمِ ارواح سے جنابِ عالی" میں نے کہا "بچہ عالمِ ارواح کا مطلب بالکل نہیں سمجھا" "کوئی پیغام ہے اپنے ڈپٹی سلوا صاحب کے لیے؟ میرے ساتھ ہی ہیں جہنم میں۔ آپ کب تشریف لا رہے ہیں؟"

"دیکھو سکندر" دلاور کی آواز آئی "ہم اب بھی بات کر سکتے ہیں۔ جتنا نقصان ہو چکا سو ہو چکا۔ لیکن آئندہ جو کچھ ہو گا اس میں میرا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ تم نے اخبار دیکھا ہے آج کا؟"

"دیکھا ہے" میں نے کہا "اور اس سے مجھے خاصی مفید معلومات حاصل ہوئیں۔ کل کیا ہوگا' یہ علمِ غیب کے بغیر کوئی نہیں جان سکتا جو خدا نے نہ تمھیں دیا ہے اور نہ مجھے۔ اس لیے آج کی بات کرو۔ آج ایک چیز بھیج رہا ہوں میں تمھارے نام"

"کیا چیز ہے؟" دلاور نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔

"ایک خوش خبری ہے" میں نے کہا "اور ایک تحفہ ہے۔ ڈرو نہیں۔ کوئی ہلاکت خیز چیز نہیں ہے۔ فی الحال میرا کوئی ارادہ نہیں ہے تم کو جہنم رسید کرنے کا"

"تمھارا خیال ہوگا کہ وہ اشتہار میں نے لگوایا ہے؟" وہ بولا۔

"خیال تو آیا تھا مجھے لیکن خیال مجھے رضوی صاحب کا بھی آیا تھا" میں نے کہا۔

"راولپنڈی کی پولیس نے لاہور پولیس سے رابطہ قائم کیا تھا اور ان کے پاس تمھاری تصویر تھی"

"جو تم نے کسی طرح ان کو فراہم کر دی تھی" مَیں نے کہا "میرا مطلب ہے تمھارے کسی آدمی نے"

"اس کی ضرورت پیش نہیں" وہ بولا "ہم نے فون پر بتا دیا کہ مفرور ملزم کہاں مل سکتا ہے۔ تصویر تمھارے انکل نے دکھا دی اور انھوں نے شناخت کر لی"

میں نے ریسیور رکھ دیا۔ مجھے شبہ ہو گیا تھا کہ دلاور بات کو طول دینا چاہتا ہے اور اس کا مقصد صرف ایک ہی ہو سکتا تھا۔ اس کے گھر میں دو فون تھے۔ اس نے بیوی سے کہہ دیا ہوگا کہ وہ دوسرے فون پر پولیس کو بتا دے کہ ملزم سکندر فون پر بات کر رہا ہے اور وہ آپریٹر سے معلوم کر لیں کہ فون کہاں سے کیا گیا ہے۔ ایسی مستعدی کی توقع نہ مجھے اپنی پولیس سے تھی اور نہ اپنے ٹیلی فون کے محکمے والوں سے لیکن موجودہ حالات میں خطرے کے ایک فی صد امکانات سے بھی دور رہنا بہتر تھا۔

وہی فاصلہ جو میں نے کار میں آسانی سے بیس منٹ میں طے کر لیا تھا، سائیکل پر ایک گھنٹے میں طے ہوا۔ سائیکل کو میں نے اس گھر سے کافی دور چھوڑا اور ڈاکیوں کی طرح تھیلا لٹکائے پیدل گھر تک گیا۔ اس وقت نو بج چکے تھے اور دھوپ میں تمازت اتنی آ گئی تھی کہ میں پسینے میں شرابور تھا۔ اندر پہنچنے کے بعد میں نے محسن کو چونک کر ریوالور اٹھاتے دیکھا۔ "میاں خان صاحب" مَیں نے فریاد کی "ذرا یہ مکھڑا تو دیکھ لو گولی مارنے سے پہلے۔ ہم سکندرِ اعظم ہیں"

"اچھا کیا پہلے بتا دیا۔ ورنہ ہم خان لوگ گولی پہلے مارتے ہیں، سوال بعد میں کرتے ہیں" محسن خان نے کہا۔

"یا میرے مولا" فقیر نے آواز لگائی "کس عذاب میں ڈال دیا فقیر کو۔ دھندا گیا، مال گیا۔ اب جان جائے گی۔ گولی سے نہ مارا ان ظالموں نے تو بھوک سے مار دیں گے"

میں نے کچھ کہے بغیر اخبار محسن کے حوالے کیا اور ناشتے کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک حصہ ٹرک ڈرائیور کو اور دوسرا محسن کو دینے کے بعد میں نے باقی سلائس اور آملیٹ فقیر کے حوالے کیا تو اس کی شکل رونے والی ہو گئی "ارے ظالمو۔ اتنا انتظار کرانے کے بعد دو پراٹھے اور ایک پاؤ حلوہ بھی نہیں؟ اونٹ کے منہ میں زیرہ...."

"اونٹ کے بچے" میں نے اس کے ایک الٹا ہاتھ مارا "خدا کا شکر ادا نہیں کرتا کہ یہ بھی مل گیا" اس کی آواز بند ہو گئی۔ باقی ناشتا اس نے خاموشی سے ٹرک ڈرائیور کے ساتھ کیا۔ چائے سب کو باری باری اسی مگ نما پیالے میں ملی جو تھرمس کور تھا۔

"یہ تو معاملہ بہت بگڑ گیا ہے" محسن نے اخبار رکھ کے کہا۔ اور آواز کم رکھی "اب کیا ہوگا؟"

"اب آگے میں اکیلا جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "میں نے اپنا حلیہ بدل لیا ہے۔ تو واپس جائے گا۔"

"میں ان حالات میں تیرا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا۔" محسن نے قطعی لہجے میں کہا۔ "گفتگو فرنچ میں فرمایئے۔"

"پہلے میری بات سن لے۔" میں نے کہا۔ "رابعہ عورت ہے۔ وہ جب دل چاہے اکیلی گھر سے نہیں نکل سکتی۔ تو میرے اور رابعہ کے درمیان رابطے کا کام کر سکتا ہے۔ صرف اس لیے کہ وہ میری وکیل ہے اور میں اس کا مؤکل ہوں۔ ہمیں باہمی صلاح مشورے کی ہمیشہ ضرورت پڑے گی۔ ہم ٹیلی فون پر بات نہیں کر سکتے اور میں نے کوئے یار کا رخ بھی کیا تو شکاری مجھے سوئے دار لے جائیں گے۔ وقت اور مقام طے ہو جانے کے بعد بچھڑے ہوؤں کو ملانا تیری کوشش پر منحصر ہے۔ اس کا ثواب تجھے مفت میں ملے گا۔ میں نے یہ طے کیا ہے کہ اس ٹرک ڈرائیور کے ساتھ کراچی جاؤں اور کار میں جاؤں جسے یہ ڈرائیو کرے۔"

"کوئی اور گاڑی چھین لی ہے کیا؟" محسن نے کہا۔ "اخبار دیکھنے کے بعد؟"

"نہیں۔ اب تو شہر جا۔" میں نے کہا۔ "کوئی اچھی سی پرانی گاڑی خرید۔ بیس بائیس ہزار تک اچھی گاڑی مل جانی چاہیے۔ مجھے ایک سوٹ کیس چاہیے اور کچھ کپڑے۔"

"اس تصویر کی اشاعت کے بعد تو ہر لباس میں پہچانا جائے گا۔" محسن بولا۔

"باہر پھرنے کے لیے میرے پاس تین ڈریس ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "ایک تھانیدار کا۔ ایک ڈاکیے کا اور ایک فقیر کا۔"

"اور ان تینوں میں سے کار کا مالک کون ہوگا؟" محسن نے کہا۔

"کار کسی فرضی نام سے آج ہی ٹرانسفر بھی کرانی ہے۔" میں نے کہا۔ "ڈرائیونگ لائسنس اس کے پاس ہوگا۔"

"تو اس ٹرک ڈرائیور پر بہت اعتماد کر رہا ہے۔" محسن نے کہا۔

"وہ کسی بھی وقت اس پوزیشن میں نہیں ہوگا کہ مجھے دھوکا دے سکے۔" میں نے کہا۔ "بیوی، بچوں والا آدمی ہے اور زندہ رہنا چاہتا ہے۔ مرنا پسند نہیں کرے گا۔ شوروم دس بجے کھل جاتے ہیں۔ سو پچاس روپے خرچ کر کے تو ایک گھنٹے میں ٹرانسفر وغیرہ کی کارروائی مکمل کر سکتا ہے۔ باقی شاپنگ مکمل کر کے بارہ بجے تک لوٹ آ۔ شام تک اور بھی بہت سے کام ہیں جس کے بعد مجھے کراچی جانا ہے اور تجھے رابعہ کے پاس۔ وہ عورت پہلے ہے وکیل بعد میں۔ اسے کسی قسم کی جذباتی حماقت نہ کرنے دینا اور یقین دلانا کہ میں بالکل خیریت سے ہوں اور بہت جلد واپس آجاؤں گا۔"

"وہ پوچھے گی نہیں کہ کل سے کہاں تھے؟" محسن نے کہا۔ "اور انکل کو کیا جواب دوں گا میں؟"

"انکل سے کچھ بھی کہہ دینا۔ ناراض تو وہ بہرحال ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "رابعہ سے کہنا کہ منظر سے مشورہ کرے اور میرے خلاف پنڈی والے مقدمات کی پیروی کرے۔ وہ خود یا پنڈی میں اس کا کوئی دوست۔ کہنا صرف یہ ہے کہ پولیس کی کہانی جھوٹی ہے۔ سکندر بخت اغوا ہوا تھا اور اس کے بعد سے اب تک لاپتا ہے۔ اغوا کی رپورٹ لکھوا دی گئی تھی لیکن پولیس اسے برآمد نہیں کر سکی تو اس کے خلاف یہ جھوٹا چکر چلا دیا ہے اپنی نااہلی پر پردہ ڈالنے کے لیے۔"

"لیکن تیری عدم موجودگی میں مقدمہ خارج تو نہیں ہو سکتا۔" محسن بولا۔

"ہاں۔ حاضر تو مجھے ہونا ہی پڑے گا کبھی نہ کبھی۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس عرصے میں منظر کارروائی جاری رکھ سکتا ہے۔ گواہ وغیرہ پیش کر سکتا ہے کہ جس دن یہ واقعہ پیش آیا میں لاہور میں تھا۔ یا راولپنڈی میں تھا۔ اس بات کا پولیس کے پاس کیا ثبوت ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ وہ اغوا کیا گیا تھا اور اس کے چشم دید گواہ نہیں۔ باقی وہ شخص خود بتا سکتا ہے کہ اغوا کرنے والے کون تھے اور اسے کہاں لے گئے تھے۔ اس عرصے میں کراچی سے میرا رجسٹرڈ لیٹر موصول ہوگا۔ انکل رضوی کے نام۔ اس پر مُہر اور تاریخ بہت واضح ہوگی۔ میں ایک دردناک کہانی بیان کر دوں گا کہ اغوا کے بعد میری آنکھوں پر پٹی باندھ کے مجھے نامعلوم مقامات پر رکھا گیا۔ مجھے گاڑی میں ڈال کر مختلف شہروں میں لے جایا گیا لیکن میں کسی شہر کا نام بتانے سے قاصر ہوں کیونکہ عموماً میرا قید خانہ مضافات میں ہوتا تھا اور میں کمرے سے نہیں نکل سکتا تھا۔ مجھے بہت اذیت دی گئی اور مجبور کیا گیا کہ میں اپنے وکیلوں کی معرفت حق وراثت سے دستبرداری قبول کر لوں تو انھیں بلایا جا سکتا ہے یا مجھے ان کے پاس لے جایا جا سکتا ہے ورنہ میں سات سال تک قید رہوں گا۔ سات سال بعد عدالت میں ایم ڈبلیو ڈی کا موجودہ مالک درخواست پیش کرے گا کہ میرے پارٹنر کا ڈیتھ سرٹیفکیٹ جاری کیا جائے کیونکہ اس کی مسلسل عدم موجودگی سنگین قانونی مسائل پیدا کر رہی ہے۔ میں یہ بھی لکھوں گا کہ میں نے ظلم و جبر کے سامنے سر جھکانے کے بجائے جان دینے کا تہیہ کر رکھا ہے اس لیے میں اغوا کرنے والوں کی کوئی شرط تسلیم نہیں کروں گا۔ ممکن ہے سات

ان کی قید سے چھٹکارا حاصل کرنے کا کوئی موقع مل جائے۔ بالکل اسی طرح جیسے مجھے یہ خط پہنچانے کا موقع مل گیا ہے۔ میرا یہ دستخط شدہ بیان عدالت میں بھی پیش کیا جا سکتا ہے اور اخبارات کو بھی جاری کیا جا سکتا ہے۔ شامت پولیس کی آجائے گی اور کیس بہت کمزور پڑ جائے گا۔ ایک امیدوار بھی ہے۔ شاید میری تصویر اخبار میں دیکھ کر ایک عورت گواہی دینے عدالت پہنچ جائے۔ اس مقتول نرس روبی کی ماں۔ وہ پہلے ہی بیمار اور لب گور تھی۔ روبی کی موت کے بعد پولیس نے اس سے کوئی بیان نہیں لیا تھا۔ یہ میں نے اخبار میں دیکھ لیا تھا۔ روبی کی ماں کہیں اصغر مال روڈ کے قریب رہتی تھی اور اس کا نام شیبا ہے۔ اس نے مجھے نہیں دیکھا لیکن وہ سب کچھ جانتی ہے کہ روبی کو قتل کرنے والا کون ہو سکتا ہے کیونکہ روبی کی لاش پیٹر کی لاش کے ساتھ ملی تھی۔ وہ دونوں محبت کرتے تھے اور روبی کی ماں کو اس کا علم تھا۔ وہ عدالت میں حاضر ہو کے بیان دے سکتی ہے کہ روبی اور پیٹر کا قاتل عنایت مسیح ہے اور یہ بھی بتا سکتی ہے کہ رقابت میں عنایت مسیح نے اسے کتنی اذیت دی۔ پیٹر مشن ہائی اسکول میں ٹیچر تھا اور اس کا باپ ڈسکہ ضلع سیالکوٹ میں پادری ہے۔ ممکن ہے وہ بھی جانتا ہو کہ پیٹر کس کے لیے مارا گیا اور اسے مارنے والا کون ہو سکتا ہے۔ ایک مسز پادری کی گواہی بہت اہم ہوگی۔ روبی کی ماں کا پتا نہ ملے پنڈی کے آر لے بازار میں ایک ڈاکٹر سے رابطہ قائم کرنا۔ اس ڈاکٹر کا فون نمبر رابعہ کے پاس ہے کیونکہ اس کے گھر سے میں نے بعہ کو فون کیا تھا اور رابعہ سے کہا تھا کہ مجھے فون کر لے۔ اس ڈاکٹر کی ماں روبی کی ماں کو جانتی ہے۔ شاید اسے بھی کچھ علم ہو۔ رے خیال میں اتنا کافی ہے۔"

محسن نے تائید میں سر ہلایا۔ ایک نوٹ بک نکال کے س نے کچھ باتیں نوٹ کر لی تھیں۔ "تو خط میں لکھے گا نہیں کہ اغوا نندہ کون ہیں؟ تو ان کو پہچانتا ہے یا نہیں؟"

"لکھنے کو میں دلاور کا نام بھی لکھ سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ یکن اس کا فائدہ کوئی نہیں۔ وہ ثابت کر دے گا کہ یہ جھوٹ ہے۔ میں رحمت کباڑی کا نام لکھوں گا۔ باقی کے متعلق کہوں گا کہ ں نہیں جانتا۔ ابھی جب تو گاڑی خرید کر لوٹے گا ایک کیمرہ بھی تے آنا۔ میں رحمت کی آخری تصویر بھی اتار لوں گا۔ اس طرح کہ ف چہرہ آئے۔ یہ تصویر میں خط کے ساتھ ارسال کروں گا۔ لوم یہ ہوگا کہ پرانی تصویر ہے اور کہیں سے پھاڑی گئی ہے۔ سے عدالت میں پیش کر دینا اور کسی طرح اس لاش کی بازیابی کے س سے ملا دینا۔ لاش ملنے کا مقدمہ لاہور میں درج ہوگا کہیں نہ کہیں تو یہ سب رابعہ کو بتائے گا اور منظر کو تو باقی کام وہ خود کر لیں گے۔ اب تو جا اور جتنی جلدی ہو سکے لوٹ آ۔"

محسن کے جانے کے بعد فقیر نے پھر واویلا کیا۔ "ارے ہم کو بھی جانے دے ظالم۔ کس جرم میں قید کر رکھا ہے یہاں؟ ہمارا دھندا غارت کر دیا۔ خدا تجھے غارت کرے۔ ہم درویش۔"

"الو کے پٹھے۔" میں نے اس کے ایک جھانپڑ رسید کیا۔ "مفت خورے۔ ہٹا کٹا مشٹنڈا ہو کے بھیک مانگتا ہے۔ درویش کہتا ہے خود کو اور جیب میں ستائیس ہزار روپے لیے پھرتا ہے۔ بے وقوف بناتا پھرتا ہے کہ روٹی کھانے کو پیسہ نہیں۔ میرے پاس وقت نہیں ورنہ تجھے خرکاروں کے ہاتھ بیچ دیتا اور وہ تجھے محنت کرنا سکھا دیتے لیکن اب تیری آواز نکلی تو یہ سب مالِ حرام ضبط کر لوں گا اور تیری ان نظروں کے سامنے جلا کے راکھ کر دوں گا۔ قتل کر کے لاش یہیں چھوڑ جاؤں گا۔" فقیر کی حالت ابتر ہو گئی۔ وہ کونے میں دبک کر بیٹھ گیا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ ایک لات مار کے میں رحمت جیسے شخص کو قتل کر چکا ہوں۔ میرے جیسے قاتل سے کیا بعید کہ دوسری لات مار کے اسے بھی فنا کر دوں۔ وہ اتنا خوفزدہ ہو گیا تھا کہ مجھے اس کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں رہا۔ پھر میں نے ٹرک ڈرائیور سے بات کی اور اسے اپنے پروگرام سے آگاہ کیا۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ اندازہ اسے بھی ہو گیا تھا کہ ہم گامے ماچھی اور رحمت کباڑی کے حریف ہیں تو کمزور کیسے ہو سکتے ہیں۔ میر کا مقابلہ سوا سیر ہی کر سکتا ہے۔ وہ مجھ سے اتفاق نہ کرتا تو کیا کرتا۔ اس کے دشمن بھی وہی تھے جو ہمارے دشمن تھے چنانچہ ہم متحد ہو سکتے تھے اور یہ اتحاد اس کے لیے اور اس کے خاندان کے لیے سلامتی کی تھوڑی بہت ضمانت ضرور فراہم کرتا تھا۔

ایک بجے تک میں انتظار میں سگریٹ پھونکتا رہا۔ بار بار اخبار دیکھتا رہا اور اپنے خیالات کے گرداب میں غوطہ زن رہا۔ مستقبل انتہائی غیر یقینی ہو گیا تھا۔ رابعہ رگِ جاں سے بھی قریب تر تھی اور ہر لمحہ میرے تصور میں اس پہلے دن کی طرح زندہ تھی جب وہ جیل میں مجھ سے ملنے آئی تھی۔ نیلی ساری پہ زرد پھول کھلائے۔ لیکن وہ گھر بے یقینی کی دھند میں کھو گیا تھا جہاں مجھے اور اس کو اپنی خوابوں کی دنیا بسانی تھی۔ محسن ٹھیک ایک بجے نمودار ہوا۔

"یہ لے گاڑی کی چابیاں۔" اس نے چابی میری طرف اچھالی۔ "کاغذات گلوز کمپارٹمنٹ میں ہیں۔ کپڑوں کا سوٹ کیس ڈکی میں۔ ایک ڈاکٹر کی اوپل ریکارڈ ہے۔ ریڈ کراس کا نشان تک بنا ہوا ہے ونڈ اسکرین پہ۔ کراچی تک کسی قسم کی تکلیف نہیں

دے گی لیکن ایک مسئلہ اور پیدا ہو گیا ہے۔ شہر میں جگہ جگہ پوسٹر لگے ہوئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے تو کوئی انتخابی امیدوار ہے، اس نے جیب سے ایک پوسٹر نکالا۔ یہ تقریباً سات انچ چوڑا اور دس انچ لمبا پوسٹر تھا۔ اس میں میری تصویر بہت نمایاں تھی۔ وہی سامنے کا پوز جو اخبار میں تھا۔ لیکن اس کے اوپر لکھا ہوا تھا "تلاش گمشدہ" اور نیچے انتہائی مضحکہ خیز عبارت تھی۔ اس میں لکھا تھا۔

"سکندر بخت ولد وزیر خان مرحوم تیرہ نومبر کی شب سے لاپتا ہے۔ اگر وہ خود پڑھے تو واپس آجائے اسے کچھ نہیں کہا جائے گا اور اس کی ہر بات مان لی جائے گی۔ اس کی جدائی میں انکل رضوی اور اس کی بہن شہلا کی حالت خراب ہے۔ اس کا نام پتا بتانے والے یا اسے لانے والے کو شکریے کے ساتھ دس ہزار روپے پیش کیے جائیں گے۔ قریبی پولیس اسٹیشن یا براہِ راست ضامن رضوی ایس ایس پی لاہور سے آفس یا گھر میں اور رابعہ قاری ایڈووکیٹ سے فون پر رابطہ قائم کریں۔"

اس کے بعد ایک طرف انکل رضوی کے دونوں فون نمبر تھے اور دوسری جانب رابعہ قاری ایڈووکیٹ کے نام کے نیچے اس کے آفس کا فون نمبر تھا۔ تاریخ وہی تھی جب میں اغوا کیا گیا تھا۔

"یہ دلاور اینڈ کمپنی کا کمینہ پن ہے۔" محسن نے کہا۔ "ایک تیر سے کئی شکار کیے ہیں انھوں نے۔ دس ہزار کے انعام کا اعلان کر کے پبلک کو تیرے پیچھے لگا دیا ہے۔ براہِ راست لاہور کے ایس پی اور ایک خاتون وکیل کا ایک اشتہاری مجرم سے تعلق ثابت کر کے ان کی پوزیشن خراب کر دی ہے اور تجھے اس حلیے میں اور اس شکل کے ساتھ دنیا کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا ہے۔ اغوا کی رپورٹ تک جھوٹی سمجھی جائے گی اب۔"

"اور اب تک جن لوگوں نے اخبار میں میرا خوبصورت چہرہ نہیں دیکھا ہوگا وہ اشتہار میں دیوار پر ملاحظہ فرمائیں گے۔" میں نے کہا۔ "اور تھانے گئے تو دس ہزار ان کو ضرور ملیں گے۔ پولیس کہے گی کہ آپ نے مفرور مجرم پکڑ لیا۔ اس بہادری کے کارنامے پر انعام قبول فرمائیے۔"

"انکل رضوی اور رابعہ کیا کریں گے" محسن نے افسوس سے سر ہلایا۔ "کس کے خلاف کارروائی کریں گے۔ کس کس کو بتائیں گے کہ یہ اشتہار انھوں نے نہیں لگوایا۔ وہ زیادہ سے زیادہ ایک پریس کانفرنس میں تردید کر سکتے ہیں مگر اس تردید کو کتنے لوگ دیکھیں گے۔"

"اور اشتہار سارے ملک کے اخباروں میں چھپا ہوگا تو یہ پوسٹر بھی ہر جگہ لگائے گئے ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "بڑے بڑے شہروں میں، بس اسٹاپ اور ریلوے اسٹیشن۔ ایئرپورٹ اور بازار۔ وہ ایک لاکھ کیا دس لاکھ پوسٹر چھپوا سکتے ہیں۔ شہر کیا، ہر قصبے اور گاؤں تک پھیلا سکتے ہیں یہاں تک کہ سارا ملک مجھے پہچاننے لگے۔"

"اس لیے اب تیرا اس چہرے کے ساتھ باہر نکلنا مزید دشوار ہو گیا ہے۔" محسن نے کہا۔ "تو دس ہزار کا چلتا پھرتا چیک ہے جسے سب حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ پولیس والے بھی اور پبلک بھی۔"

"ابھی تو یہ خطرہ مول لینا ہی پڑے گا۔" میں نے کہا۔ "میں نقلی داڑھی اور مونچھیں لگانے سے رہا۔"

"تو اپنا ہیئر اسٹائل بدل دے اور بالوں کا رنگ تبدیل کرلے۔" محسن نے کہا۔ "کراچی پہنچنے کے بعد شیو چھوڑ دینا۔ ایک مہینے میں داڑھی مونچھوں کی فصل خاصی بڑھ جائے گی اور تو خود بھی اپنے آپ کو نہ پہچان سکے گا۔"

"اور اگر راستے میں پکڑا گیا تو کیا ہوگا؟" میں نے کہا۔ "ممکن ہے پولیس نے ناکہ بندی کی ہو۔"

"اپنی ڈلکیے کی وردی پر سے ڈاک خانے والوں کا مونوگرام ہٹا دے۔ تیرے اور ٹرک ڈرائیور کے قد میں معمولی سا فرق ہے۔" محسن نے کہا۔ "لیکن خاکی وردی میں وہ شوفر لگے گا۔ تو معزز آدمی کی طرح پیچھے بیٹھنا۔ پیچھے کے شیشے ڈارک ہیں، اس لیے جب تک کوئی اندر منہ نہ ڈالے یا تو منہ باہر نہ نکالے کسی کو کچھ نظر نہیں آسکتا۔ تو ایک ڈاکٹر کی کار پر سفر کر رہا ہے اور آگے ریڈ کراس کا نشان بھی چسپاں ہے اس لیے کوئی زیادہ تردد نہیں کرے گا اور تو محفوظ رہے گا۔ مشکل یہ ہے کہ تیرا ہم سفر بھی ڈاکٹر نہیں لگتا ورنہ تو زیادہ موزوں شوفر ہوتا۔"

محسن کے لائے ہوئے کپڑوں میں سے قمیص اور پتلون پہننے کے بعد میں نے ڈرائیور کو سمجھایا کہ اس کا حلیہ بدل کر سفر کرنا خود اس کے مفاد میں ہے۔ گامے ماچھی کا کوئی مخبر اسے تلاش نہیں کر سکے گا۔ ڈلکیے کے بیگ میں سے ریوالور نکال کر میں نے اپنی جیب میں رکھ لیا تو محسن نے مجھے فرنچ میں مطلع کیا کہ اس نے اپنا ریوالور گاڑی کے گلوز کمپارٹمنٹ میں کاغذات کے نیچے رکھ دیا ہے کہ خدانخواستہ ایک نہ رہے تو دوسرا کام آئے۔ جب وہ ڈرائیور کو ہمراہ لے کر نکل گیا تو میں فقیر کی طرف متوجہ ہوا جو ہماری ساری کارروائی سے سخت حیران و پریشان بیٹھا تھا۔ ہم نے نصف شب کو اس کی خلوت میں خلل ڈالا تھا اور اب تک ایک قتل کر چکے تھے۔ اس کا مال چھین کر واپس کر چکے تھے اور پھر چھین کر ضبط کر چکے تھے۔ اس کے دو جھانسے مار چکے تھے۔ اس کے پراٹھے حلوے کا ناشتا بند کر چکے تھے اور اس کو دھندے پر جانے سے روک چکے تھے۔ ہم نے اس کے سامنے حلیہ بدلا تھا۔ اردو پنجابی کے علاوہ انگریزی میں اور کبھی فرانسیسی میں گفتگو کرتے رہے تھے جو اس کی خاک سمجھ میں نہیں آئی تھی اور اب ہماری روانگی کا وقت آیا تھا تو اس کا یہ اندیشہ بڑھنے لگا تھا کہ ہم اس کے ستائیس ہزار روپے ہرگز واپس نہیں کریں گے بلکہ عین ممکن ہے جاتے جاتے اسے بھی رحمت کے ساتھ ہی لٹا جائیں تاکہ گواہ کوئی نہ ہو۔

"فقیر سائیں۔" میں نے کہا۔ "اب ہم چلتے ہیں۔ ہماری وجہ سے آپ کو بہت تکلیف ہوئی۔"

"ارے تکلیف کو مارو گولی۔" وہ چلایا۔ "میرا پیسہ تو دے جاؤ ظالمو!"

"تکلیف کے بجائے ہم تمھیں گولی نہ ماردیں؟" میں نے کہا۔ "دونوں لاشیں پولیس اٹھائے گی۔"

یکلخت اس کا حوصلہ جواب دے گیا۔ وہ دہاڑیں مار مار کے رونے لگا۔ ہمیں گالیاں دینے لگا۔ "تم خونی اور قاتل ہو، ڈاکو ہو۔" پھر اس نے اچانک میرے پاؤں پکڑ لیے۔ "دیکھو میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔ میں نے تمھارا کچھ نہیں بگاڑا ہے، مجھ پر رحم کرو خدا کے لیے۔"

مجھے بے اختیار ہنسی آئی۔ اپنے پیر چھڑا کے میں نے اس کی کپڑے میں لپیٹی ہوئی رقم نکالی۔ "یہ لو اپنا پیسہ۔" وہ چپ ہو کے ایک دم اٹھا۔ میں نے ایک قدم پیچھے ہو کے ہاتھ پشت کی جانب کر لیے۔ اس کا چہرہ لٹک گیا۔

"یہ سب رقم اگر میں نہ دینا چاہوں تو تم مجھ سے چھین نہیں سکتے۔" میں نے کہا۔ "اور اگر میں شریف آدمی نہ ہوتا تو تمھیں بھی گولی مار کے چل پڑتا لیکن میں تمھارے وعدے پر اعتبار کر رہا ہوں کہ تم کسی کے سامنے کچھ نہیں کہو گے۔"

"قسم خدا کی کچھ نہیں کہوں گا۔" وہ ہاتھ جوڑ کے بولا۔ "کبھی نام تک نہیں لوں گا۔ اِدھر لوٹ کر بھی نہیں آؤں گا۔"

"ہاں۔ دوبارہ اِدھر مت آنا۔" میں نے رقم آگے بڑھائی لیکن جیسے ہی اس کا ہاتھ بڑھا پھر پیچھے کر لی۔ "ایک شرط اور ہے۔ میں تمھارا یہ شاہانہ لباس خریدنا چاہتا ہوں۔ ستائیس ہزار دو سو بیس روپے میں۔ بولو منظور ہے؟"

"کیا؟ یہ تمھیں دے دوں؟" وہ بھونچکا رہ گیا۔ محسن نے اندھا کے قہقہہ مارا۔

"یہ چمٹا بھی اور کشکول بھی۔" میں نے کہا۔ "ستائیس ہزار دو سو بیس روپے میں اچھا سودا ہے۔"

"لیکن... میں خود... میں کیا پہنوں گا؟" وہ مری ہوئی آواز میں بولا۔ "ایسے ہی رہوں گا کیا؟"

"تمھاری مرضی۔" میں نے کہا۔ "منظور نہیں تو میں چلتا ہوں۔ کسی دوسرے فقیر سے بات کرتا ہوں۔"

اُس نے دوسرے کمرے میں جاکر وہاں سے کپڑے اچھال دیے جن میں منکوں کی مالا بھی شامل تھی۔ میں نے اس کے نوٹوں کی گڈی اس کی طرف اچھال دی۔ "اللہ کے نام پر ایک جوڑا نہ سہی ایک چادر، تولیہ کچھ تو دیتے جاؤ۔" وہ نوٹ سینے سے لگا کے بولا۔ "میں باہر کیسے جاؤں گا۔ اس لاش کے کپڑے ہی دے دو۔"

"نہیں۔ یہی تو ہم چاہتے ہیں کہ تم فی الحال باہر نہ نکلو۔" میں نے کہا۔ "شام تک تمھاری چیخ پکار پر متوجہ ہو کے کوئی ضرور آجائے گا۔ اس سے مانگ لینا جو مانگنا ہو۔ ورنہ نکل جانا اسی قلندرانہ شان سے۔"

"نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے۔" محسن نے ارشاد کیا۔

اس نے اندازہ کر لیا کہ ہم اس کی ایک نہیں سنیں گے۔ سینے پر صبر کی سِل رکھ کر وہ ایک کونے میں دبک گیا۔ میں نے اور محسن نے رحمت کباڑی کی لاش اٹھائی اور باہر لے جاکر گاڑی کی ڈکی میں بند کر دی۔ دس منٹ میں ہم اس جگہ سے تین میل دور جا چکے تھے۔ ہلکے نیلے رنگ کی ڈیلکس ماڈل اوپل کا انجن اٹھارہ سو سی سی کا تھا اور بے حد طاقتور اور خاموش تھا۔

"اب ایک آخری کام۔" میں نے محسن سے کہا جو میرے ساتھ پیچھے بیٹھا تھا۔

"سب سے پہلا کام ہے یہ پاپی پیٹ بھرنا۔" محسن نے پیٹ کو ڈرم کی طرح بجایا۔ "دیکھ کیسی خالی برتن جیسی آواز آرہی ہے۔"

"اچھا اس کے بعد مجھے دلاور کو ایک گفٹ پارسل بھیجنا ہے۔" میں نے کہا۔ "ایک بار اس نے مجھے کریٹ میں پیک کر کے عدم آباد کی جانب روانہ کیا تھا لیکن میں لوٹ آیا تھا۔ یہ اسی کے جواب میں ہے۔ مجھے ایک تابوت چاہیے۔"

"تابوت کہیں ریڈی میڈ نہیں ملتے۔" محسن بولا۔ "اور اتنے کم وقت میں بنوائے بھی نہیں جا سکتے۔"

"لوہے کا صندوق بھی تابوت کا کام دے سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

کھانا ایک رسمی کارروائی تھا۔ محسن نے مال پر ایک ریسٹورنٹ سے نصف درجن لنچ باکس خریدے۔ ان میں سے تین ہم نے

ختم کر دیے۔ باقی زادِ راہ کے طور پر محفوظ رکھے۔ پھر میں گاڑی لے کر دلاور کے گھر کی جانب روانہ ہو گیا اور اس کے گیٹ سے دو فرلانگ کے فاصلے پر رک کر انتظار کرنے لگا۔ ڈرائیور نچلی سطح کا آدمی تھا چنانچہ دلاور کے نام سے بھی واقف نہ تھا۔ اس نے ایک بار پوچھا کہ ہم کس کا انتظار کر رہے ہیں اور میں نے جواب دیا کہ خاموشی سے سب دیکھو اور غیر ضروری سوال مت کرو۔ محسن پون گھنٹے بعد نمودار ہوا۔ سڑک کے دوسرے کنارے پر ریڑھا رکا۔ کے اس نے موٹی چادر کا تقریباً پانچ فٹ لمبا اور اس سے نصف اونچائی کا اور چوڑائی کا صندوق اتارا۔ جب ریڑھی والا کرایہ لے کر چلا گیا تو محسن اور میں صندوق کو دونوں جانب کے کنڈوں سے اٹھا کر گاڑی کے پیچھے لائے۔ مناسب موقع دیکھ کر میں نے ڈکی کھولی اور محسن نے صندوق کا ڈھکنا اٹھایا۔ پلک جھپکتے میں رحمت کباڑی کی لاش صندوق میں جا گری۔ اسے ہم نے بڑی پھرتی سے اور خاصی بے دردی سے.......... صندوق کے اندر فٹ کر دیا۔ محسن نے اس کی دونوں کنڈلیوں کو دبا کے بند کیا اور دونوں میں تالے ڈال دیے۔ پھر اس نے جیب سے مارکر نکالا اور صندوق کی بے داغ چادر پر لکھا۔ "رابعہ کی طرف سے"۔ میں گاڑی لے کر واپس گیا۔ ایک فرلانگ کے بعد مجھے دوسرا ریڑھا ملا جسے میں نے پیچھے بھیج دیا "سڑک کے کنارے ایک صاحب صندوق لیے کھڑے ہیں"۔ میں نے یوں کہا جیسے میرا ان صاحب سے کوئی تعلق نہیں اور شاید انھوں نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ کوئی ریڑھا نظر آئے تو بھیج دوں۔ گھڑی دیکھ کر میں دس منٹ بعد پھر لوٹا اور محسن کو تیز تیز قدموں سے آتے دیکھا۔

"ویری گڈ۔ ریڑھے والا صندوق لے گیا"۔ محسن نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "میں نے اسے پچیس روپے دیے"۔

"شک تو نہیں ہوا تھا اسے؟" میں نے کہا اور گاڑی واپس کی۔ ہم دلاور کے گھر سے دور ہونے لگے۔

"نہیں۔ خوش ہو گیا اتنا کرایہ ملنے پر۔ میں نے کہا، بیگم صاحبہ سے کہہ دینا کہ صاحب نے بھیجا ہے"۔ محسن بولا۔

پبلک ٹیلی فون کا پہلا سائن نظر آتے ہی میں نے گاڑی کوئی اور محسن کو گاڑی میں چھوڑ کر نیچے اتر گیا۔ میں نے ایم ڈبلیو ڈی کمپلیکس کا نمبر ملایا۔ حسبِ توقع ریسیور اس کے پی اے نے اٹھایا۔ "کون صاحب ہیں آپ؟" وہ بولا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ دکاندار میری طرف متوجہ نہیں ہوا۔

"رحمت کباڑی"۔ میں نے کہا۔ خاموشی کا ایک مختصر سا وقفہ آیا۔ پھر دلاور نے ہیلو کہا۔

"چودھری صاحب"۔ میں نے کہا۔ "تحفہ آپ کے گھر پہنچ گیا ہے۔ میں نے وعدہ کیا تھا نا"۔

"سکندر! بہت جلد تم یہ مذاق وغیرہ سب بھول جاؤ گے"۔ دلاور نے غرا کے کہا۔

"مجھے ایک خوشخبری بھی سنانی تھی"۔ میں نے کہا۔ "جو ٹرک مال لے کر کراچی جا رہا تھا اسے فرشتے لے گئے"۔

"یہ کیا بکواس ہے"۔ چوہدری دلاور کے لہجے میں پہلی بار مجھے گھبراہٹ محسوس ہوئی۔

"حساب کچھ برابر ہو رہا ہے چوہدری صاحب"۔ میں نے کہا۔ "اور آئندہ بھی ہوتا رہے گا، انشاء اللہ"۔ میں نے ریسیور نیچے رکھ دیا اور پیسے دے کر دکان سے نکل آیا۔ دوسرا فون دس منٹ بعد دوسری جگہ سے محسن نے کیا اور بہت خوش لوٹا۔

"کوئی بہت فرض شناس۔ یا لالچی افسر بیٹھا تھا"۔ محسن نے کہا۔ "میں نے دلاور کا پتا بتایا اور کہا کہ وہاں قتل ہو گیا ہے اور لاش کو صندوق میں ڈال کے ٹھکانے لگانے کا بندوبست ہو رہا ہے۔ میں ان کا پڑوسی ہوں لیکن اپنا نام نہیں بتا سکتا۔ اس نے کہا ہم دس منٹ میں پہنچتے ہیں۔ کمال میری اداکاری کا تھا جس نے اسے قائل کیا"۔

"میرا خیال ہے دلاور نے بھی گھر فون کیا ہو گا"۔ میں نے کہا۔ "اور اسے معلوم ہوا ہو گا کہ ریڑھے والا اس کا نام لے کر ایک صندوق چھوڑ گیا ہے جو مقفل ہے۔ تو وہ بھی گھر کی طرف دوڑے گا"۔

"اپنا ایک یار اخبار کے دفتر میں سب ایڈیٹر ہے۔ ابھی آیا ہی تھا۔ میں نے کہا کسی رپورٹر کو اس پتے پر بھیج دو۔ قتل کی بہت سنسنی خیز خبر ہے"۔ محسن بولا۔ "خدا نے چاہا تو سب کا اجتماع ایک ساتھ ہو گا۔ دلاور پہلے پہنچا تو سب سے پہلے صندوق کو اندر چھپائے گا یا تالے توڑ کر دیکھے گا۔ پولیس پہلے پہنچی تو پھنس جائے گا اور صندوق کو کھولنے پر مجبور ہو گا لیکن وہ کائیاں آدمی ہے کوشش کرے گا کہ پولیس کو کچھ دے دلا کے رخصت کرے اور لاش ٹھکانے لگا دے لیکن پولیس کے ساتھ ہی اخبار والے پہنچ جائیں گے تو کچھ نہیں ہو سکے گا"۔

"وہ رپورٹر کو بھی خرید لے گا"۔ میں نے کہا۔ "اس وقت پیسہ اہم نہیں رہے گا دلاور کے لیے"۔

"مشکل ہے۔ اخبار والوں کو خبر زیادہ عزیز ہوتی ہے"۔ محسن نے کہا۔ "ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ بعد میں گھپلا ہو جائے اور پوسٹ مارٹم رپورٹ سے موت طبعی ثابت کر دی جائے مگر میرا وہ سب ایڈیٹر یار سب کا ملبہ کر دے گا"۔

"اپنے اخبار والے دوست سے کہنا دوسرے رپورٹروں کو بھی پیچھے لگا دے"۔ میں نے کہا۔ "ڈاکٹر عموماً تو صحیح رپورٹ دیتے ہیں لیکن بدنامی کا ڈر بھی ہو تو غلط رپورٹ دینا ناممکن ہو جاتا ہے۔ دوبارہ پوسٹ مارٹم کا چکر چل جاتا ہے اور میڈیکل بورڈ بن جاتا ہے۔ یہ قتل تو دلاور کے نام لکھا گیا سمجھو"۔

"یہ دلاور کون ہے جی؟" ڈرائیور سے بالآخر ضبط نہ ہو سکا۔

"اس کے پہلے بہت سے نام تھے۔ ابلیس، شیطان وغیرہ"۔ میں نے کہا۔ "اب نام بدل لیا ہے اس نے۔ کام وہی کرتا ہے۔ اس سے زیادہ جاننا تمھارے حق میں نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے"۔ وہ پھر خاموش ہو گیا۔

ایک جگہ میں نے کار رکوائی "اب جدائی کی گھڑی آئی ہے دوست"۔ میں نے کہا۔ "یہاں سے تو جا اپنے گھر۔ میں جاتا ہوں جدھر تقدیر لے جائے مگر فکر کی بات کوئی نہیں۔ ہر اتوار کی شام کو چھ بجے اور سات بجے کے درمیان عبدالودود منتظر کے گھر موجود رہنا۔ میں ٹیلی فون پر بات کروں گا۔ آج رات ملتان میں گزرے گی۔ کل سکھر سے بھی فون کروں گا"۔

"اور یہاں سے مجھے بات کرنی ہو یا خط لکھنا ہو تو؟" وہ بولا۔ "کراچی کا پتا کیا ہو گا؟"

"ظاہر ہے اس وقت میں کچھ نہیں بتا سکتا"۔ میں نے کہا۔ "وہاں جاتے ہی کوئی بندوبست کروں گا۔ اتوار کو بتا دوں گا"۔

"رابعہ سے مل کر نہیں جائے گا؟" محسن نے افسردگی سے کہا۔

"دل تو چاہتا ہے یار"۔ میں نے دردِ دل کو دبا کے کہا۔ "لیکن دل کی بات مانی تو دماغ کے ارادے کمزور پڑ جائیں۔ وہ میرے سامنے آئے گی تو میں کچھ نہ کر سکوں گا۔ اس کی مان لوں گا۔ مجھے ایسے ہی جانے دے۔ خیال رکھنا اس کا..."

"تو بھی اپنا خیال رکھنا"۔ وہ اچانک اتنا جذباتی ہو گیا کہ مجھے مجبوراً ہنسنا پڑا۔

"ایسے وداع مت کر مجھے جیسے کوئی سہاگن اپنے اکلوتے شوہر کو لام پر بھیج رہی ہو"۔ میں نے اس کے ایک ہاتھ رسید کیا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ میرے آنسو اس وقت نکلے جب بہت آگے جا کر میں نے پیچھے دیکھا اور محسن مجھے وہیں کھڑا دکھائی دیا۔ اس نے ایک ہاتھ ہلایا، شاید رومال سے آنسو صاف کیے۔

حسبِ توقع پولیس نے لاہور سے باہر جانے والی سڑکوں کی ناکا بندی کر رکھی تھی اور یہ رسمی کارروائی والی ناکا بندی نہیں تھی۔ شاید ان پر ایک طرف سے ایس پی ضامن رضوی کا دباؤ تھا تو دوسری طرف دلاور نے اپنے شکاری کتوں کو چوکنا کر دیا تھا کہ شکار نکلنے نہ پائے۔ میں جانتا تھا کہ پہلی چیک پوسٹ چھنگی نا کے پر ہو گی۔ اگر میں وہاں سے نکل گیا تو آگے بہت شہر آئیں گے جو ایس پی ضامن رضوی اور چوہدری دلاور کے حلقۂ اثر سے دور ہوں گے۔ ان کی ساری کوشش یہی ہو گی کہ مجھے لاہور میں رکھا جائے جہاں ان کا زور چلتا تھا۔ اگر میں اس پہلی رکاوٹ کو عبور کر گیا تو کراچی تک پہنچتے پہنچتے رکاوٹوں کا وجود ختم ہو جائے گا۔

چھنگی نا کے تک پہنچنے سے پہلے میں نے ایک جوا کھیلنے کا فیصلہ کیا۔

"تمھارا نام کیا ہے؟" میں نے ٹرک ڈرائیور سے کہا۔ "نام بتانے میں تو کوئی خطرہ نہیں"۔

"آپ سے اب کیا خطرہ۔ میں تو آپ کے ساتھ ہوں"۔ وہ بولا۔ "آپ ہی کے سہارے پر زندہ رہنے کی کوشش کر رہا ہوں ورنہ کوئی صورت نہیں تھی میرے بچنے کی ـــــ میرا نام الطاف ہے جی۔ طافو کہتے ہیں سب"۔

"بات یہ ہے طافو۔ کہ قسمت نے ہمیں ایک دوسرے کا ہم سفر بنا دیا ہے۔ ہم ایک ہی کشتی کے مسافر ہیں اور اسی طرح پار اتر سکتے ہیں کہ ایک دوسرے پر بھروسہ کریں۔ ہم دونوں کا دشمن ایک ہے اور بہت طاقتور ہے۔ اگر ہم نے مل کر اس کا مقابلہ نہ کیا تو وہ ہمارا بیڑہ غرق کر دے گا۔ تمھاری طرح مجھے بھی اپنی زندگی عزیز ہے اور ہم ایک دوسرے کی مدد کے محتاج ہیں۔ نہ تم اکیلے کچھ کر سکتے ہو اور نہ اکیلا میں۔ اب دیکھو یہاں سے چند میل کے فاصلے پر چھنگی نا کا ہے۔ ہو سکتا ہے وہاں پولیس مجھے پہچان لے۔ میں مجرم تو نہیں ہوں مگر بنا دیا گیا ہوں۔ تم گاڑی کو کچھ دیر کے لیے یہاں روکو۔ یوں جیسے اس میں کوئی خرابی ہو گئی ہے اور میرا انتظار کرو"۔

اس نے گاڑی روک لی۔ میں نے ڈکی میں سے وہ بیگ نکالا جس میں ایک فقیر کی پوری کٹ موجود تھی۔ قبا اور کشکول، منکے اور چمٹا۔ یہ سب کچھ لے کر میں کھیتوں میں گھس گیا۔ پندرہ منٹ بعد میں واپس آیا تو میں نے طافو کو بونٹ اٹھائے اس میں سر ڈالے مصروف دیکھا۔ "حق اللہ"۔ میں نے نعرہ لگایا اور اس نے سر نکال کے ایک بار مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ میں نے وہ لباس فاخرہ پہننے کے بعد منہ پر مٹی مل لی تھی اور بال بکھرا کے ان میں تنکے اور خس و خاشاک ڈال لیے تھے۔ شیو میں نے دو دن سے نہیں کی تھی چنانچہ گلے میں رنگین منکوں کی مالائیں ڈالے، کشکول اور چمٹا لیے اور ننگے پاؤں میں بالکل فقیر لگتا تھا۔ میں نے جوتے کپڑے گاڑی میں اچھال دیے۔

"اب لائٹ جلائے بغیر چلو۔ تم تو اس راستے سے واقف

ہو۔" میں نے پیچھے بیٹھ کر کہا۔" چنگی ناکا جب ایک میل رہ جائے تو مجھے اتار دینا اور لائٹ جلا کے گزر جانا۔ وہ تم سے کچھ نہیں پوچھیں گے۔ پوچھیں تو کہہ دینا کہ ڈاکٹر امجد صاحب کی فیملی کو لینے ملتان جا رہا ہوں۔ میں پیدل آؤں گا۔ چنگی ناکے سے ایک میل آگے میرا انتظار کرنا۔"

ڈرائیور نے سر ہلایا۔" یہ وردی نہ ہوتی تو میرے لیے بھی خطرہ ہوتا مگر اب کون پہچانے گا مجھے۔"

وہ چلنے ہی والا تھا کہ میں نے اسے پھر روک لیا۔" دیکھو، اوّل تو مجھے خطرے کی کوئی بات نظر نہیں آتی لیکن خدانخواستہ کوئی گڑبڑ ہو جائے مثلاً میں پکڑا جاؤں تو تم ایک گھنٹہ انتظار کرنا اور ملتان چلے جانا۔ صبح وہاں سے واپس لاہور جانا اور میرا نام لیے بغیر ایک وکیل سے ملنا۔ ان کا نام ہے منظر صاحب۔ یاد رہے گا نا یہ نام؟"

"یاد رہے گا جی۔ منظر صاحب۔" وہ بولا۔" لیکن میں پکڑا گیا تو؟ آپ انھیں نہیں جانتے..."

"میں سب کو جانتا ہوں طافو۔" میں نے کہا۔" اگر تم کو کسی نے چنگی پر روکا تو میں چھڑالوں گا۔ یہ میری ذمّے داری ہے۔"

میں اس سے کہنا چاہتا تھا کہ گلوز کمپارٹمنٹ میں ایک ریوالور بھی ہے لیکن ابھی اس پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کا مظاہرہ دانش مندی کے خلاف ہوتا۔ اسی لیے میں نے نقد رقم اور رابعہ کا دیا ہوا چیک اپنے پاس رکھا تھا۔

جب گاڑی میری نظر سے اوجھل ہو گئی تو میں نے آگے پیچھے دیکھا اور جھوم جھوم کر چمٹا بجاتے ہوئے گانے لگا۔" رکھ مولا تے اس بندے۔" یہ ٹیپ کا بند تھا جسے میں بُلھے شاہ کی ایک کافی کے بیچ بار بار لے آتا تھا۔ اور پھر ایک نعرہ لگاتا تھا۔

"مولا ای مولا۔ باقی سب رولا ای رولا۔" میں سڑک کے وسط میں بھی نہیں تھا اور بالکل کنارے پر بھی نہیں تھا چنانچہ دونوں طرف کی ٹریفک سے محتاط تھا۔ آتی جاتی بسوں اور کاروں کے مسافر مجھ پر دلچسپی کی ایک نگاہ ڈالتے تھے اور گزر جاتے تھے۔ کسی ملنگ کی ذات میں دلچسپی بڑھ جائے تو عقیدت کے جذبات میں ڈھل جاتی ہے لیکن حیرانی کسی کو نہیں ہوتی۔ ایک گزرتی ہوئی بس میں سے کسی نے ہاتھ نکال کے مٹھی بھر سکّے اچھال دیے۔" سائیں بادشاہ! رب خیر کرے۔"

"مولا ای مولا۔ باقی سب رولا ای رولا۔" میں نے سڑک پر بکھر جانے والے سکّوں پر نگاہ ڈالے بغیر نعرۂ مستانہ لگایا اور سیدھا چلتا گیا۔ چنگی ناکا اب مجھے سامنے دکھائی دے رہا تھا اور وہاں مختلف کاریں بسیں رک کر گزرتی جا رہی تھیں لیکن ان میں میری کار نہیں تھی۔ قریب پہنچ کے میں نے سڑک کے دونوں جانب دیکھا لیکن میری کار گزر گئی تھی۔ میں نے اب زیادہ لہک لہک کر گانا شروع کیا۔ میری آواز اگر اچھی نہیں تھی تو اس قسم کے تماشے کے لیے بری بھی نہیں تھی۔ دو تین مرتبہ میں رقص کے انداز میں گھوما اور کسی حال مست ملنگ کی طرح گرد و پیش پر نگاہ ڈالے بغیر سیدھا اس راستے سے گزرنے لگا جو پیدل چلنے والوں کے لیے تھا۔ گاڑیوں کو چیک کرنے کے لیے درمیان میں لوہے کا بانس جیسا ڈنڈا تھا جس نے چوڑائی کے رُخ سڑک کو بند کر رکھا تھا۔ ڈنڈے کے ایک کنارے پر من بھر وزن کا سیمنٹ کا بلاک تھا اور دوسرا کنارا ایک ڈوری سے بندھا ہوا تھا۔ جب کسی گاڑی کو کلیئرنس مل جاتا تھا تو ایک شخص ڈوری کو چھوڑتا تھا اور بلاک کے وزن سے ڈنڈا خود بخود اوپر اٹھ جاتا تھا۔ گاڑی کے گزرتے ہی وہ شخص ڈوری کھینچتا تھا اور بیریئر اشارے پر نیچے آ جاتا تھا۔

پہلے مجھے چنگی پر کوئی بات خلافِ معمول نظر نہ آئی تھی۔ راستہ کھولنے اور بند کرنے والے کے علاوہ وہاں دو افراد تھے، ایک پرچی کاٹنے والا اور دوسرا یہ پرچی گزرتی ہوئی گاڑی کے ڈرائیور کو تھمانے والا۔ پھر مجھے مختصر سے کیبن میں ایک سب انسپکٹر کے ساتھ دو پولیس مین نظر آئے۔ پولیس والوں کے پاس رائفلیں تھیں لیکن سب انسپکٹر کا ریوالور اس کی وردی کے ساتھ نظر آ رہا تھا۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ ایک مسلح سنتری تو عموماً نظر آ جاتا ہے مگر چنگی ناکے پر پولیس کی اتنی نفری کا مطلب تھا ناکا بندی۔ اصولاً تو انھیں ہر گاڑی میں جھانک کر دیکھنا چاہیے تھا، وہ میری تلاش میں آئے تھے یا کسی ڈاکو کو پکڑنے۔ ہر صورت میں انھیں باہر کھڑے رہ کر گزرنے والوں پر نظر رکھنی تھی لیکن وہ کیبن میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ انھوں نے میری طرف نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھا لیکن اچانک ایک اور شخص کیبن میں سے برآمد ہوا۔

"سائیں بادشاہ!" اس نے عقیدت بھرے لہجے میں کہا۔" اک پیالی چا دی ساڈے دی پی جاؤ۔"

چائے پینے کے لیے کیبن میں جانا شیر کی کچھار میں داخل ہونے کے مترادف تھا لیکن وہ عقیدت مند مگ ہاتھ میں اٹھائے کھڑا تھا۔" فقیر کا راستہ مت روک۔ منزل بہت دور ہے۔ سفر بہت لمبا ہے۔" میں نے گرج کے کہا لیکن وہ متاثر نہیں ہوا۔ ایسے کمزور عقیدہ لوگوں کے لیے کسی صوفی درویش کی برہمی بھی شانِ قلندری کی ادا ہے اور انھیں رام کر لینے کا مطلب ہے تقدیر کو رام کر لینا۔ اس نے میرا راستہ روک لیا اور میرے پیر پکڑنے ہی والا تھا کہ میں پیچھے ہٹ گیا۔

"چھ کڑیاں نے ملنگ سائیں۔ ایس واری مُنڈا چاہیدا اے۔" وہ گڑگڑاتے ہوئے بولا۔

وہ ان بے عقل اور بے نصیب لوگوں میں سے تھا جو آج بھی جہالت کے اسی اندھیرے میں بھٹک رہے ہیں جسے مٹانے کے لیے اسلام آیا تھا۔ یکے بعد دیگرے چھ لڑکیوں کی پیدائش اس کے نزدیک ایک سانحہ تھی اور نحس تھی اور وہ مجھ سے ایک بیٹا مانگ رہا تھا۔ یہی اس کی سب سے بڑی بیوقوفی تھی۔ اُسے کون سمجھاتا کہ عورت تو تخلیق کا سرچشمہ ہے جس نے پیغمبر، سائنسدان اور فنکار پیدا کیے اور عورت تو اس کی ماں بھی تھی۔ ایک بیٹے کی آرزو میں وہ چھ بیٹیوں کا باپ بن گیا۔ شاید بیوی کو احساسِ جرم میں مبتلا کر دیا کہ وہ سب کچھ اپنی مرضی سے کر رہی ہے اور میرے جیسے فراڈ درویشوں سے توقع رکھنے لگا کہ ان کی دُعا سے اس بچّے کی جنس بدل سکتی ہے جو ابھی ماں کی کوکھ میں اپنے وجود کی تکمیل کے مراحل طے کر رہا ہے۔

مجبوراً میں نے اس سے چائے کا مگ لے لیا جو اس نے کیبن کے اندر ہی سب کے لیے بنائی ہوگی اور اسے دعا دی کہ" اللہ سب ٹھیک کرے گا۔" جو درحقیقت کوئی دُعا نہیں تھی، حقیقت کا اظہار تھا مگر چند منٹ کی یہ تاخیر ہی مجھے مہنگی پڑی۔ چنگی وصول کرنے والے کارندے کا کسی ٹرک ڈرائیور سے جھگڑا شروع ہوا۔ ٹرک ڈرائیور نے اسے سو کا نوٹ دیا۔ منشی نے اس سے کھُلا دینے کو کہا اور بات بڑھ گئی۔ اے ایس آئی معاملے کو رفع اور ٹرک ڈرائیور کو دفع کرنے کے لیے نکلا اور مسئلہ یوں حل کیا کہ سو کا نوٹ جیب میں رکھا اور ٹرک ڈرائیور کو پرچی کے بغیر نکال دیا۔ انصاف کے تقاضوں کے مطابق بدزبان ڈرائیور کو اتنا جرمانہ تو ہونا ہی چاہیے تھا۔

شامتِ اعمال کہ واپسی پر اس کی نگاہ مجھ پر پڑ گئی۔ وہ سیدھا میری طرف آیا اور مجھے غور سے دیکھنے لگا۔" کیا نام ہے تمھارا ملنگ سائیں ہ؟" وہ بولا۔ شک اس کے لہجے سے عیاں تھا۔

میں نے نروس ہوئے بغیر پُراعتماد لہجے میں کہا۔" اسی دا تا دی نگری دے فقیر۔"

"میں نے نام پوچھا ہے۔" وہ سخت لہجے میں بولا۔" وہ نام جو ماں باپ نے رکھا تھا۔"

"اوئے ساڈا کی ناں تھانیدارا۔ ناں سچّا اس رب دا۔" میں نے اوپر انگلی اٹھائی لیکن انسپکٹر کا شک ایسے دور نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے حکم دیا کہ مجھے اندر لایا جائے۔ میں نے خود کو ہنگامی صورتِ حال کے لیے تیار کر لیا اور دونوں

سپاہی مجھے اندر لے گئے۔ تھانیدار نے اخبار اٹھایا تو میں نے "اللہ ہو" کا نعرہ لگایا اور اس کے بہت قریب ہو گیا۔ وہ اب میری تصویر کو میری صورت کے خدوخال سے ملا رہا تھا۔ غلطی اس نے یہ کی کہ اپنے ایک ماتحت سے تصدیق چاہی۔ اگر وہ کسی تذبذب کے بغیر ریوالور نکال لیتا تو میرا کام بہت مشکل ہو جاتا۔

سپاہی نے اقرار میں سر ہلایا ہی تھا کہ میں نے سب انسپکٹر کے ٹخنوں پر لات ماری۔ وہ سامنے کھڑے ہوئے سپاہی سمیت منہ کے بل فرش پر گرا۔ دوسرے سپاہی نے فوراً پوزیشن سنبھالی اور رائفل کا رُخ میری طرف کیا۔ میں نے رائفل کی نال تھام کے ایک جھٹکا دیا۔ رائفل میرے ہاتھ میں آ گئی اور جھٹکے سے وہ آگے آیا تو میں نے وہی رائفل پیچھے کی۔ رائفل کا چوڑا دستہ اس کے سینے پر لگا اور وہ ہاتھ اٹھا کے نیچے جھکا۔ میں نے اُلٹی پکڑی ہوئی رائفل کو گھما کے تھانیدار کے بازو پر مارا جو اٹھ کر ریوالور نکال چکا تھا۔ کہنی سے اوپر اس کے بازو کی ہڈی خاصی آواز کے ساتھ ٹوٹی۔ وہ بلبلایا اور اس کا ریوالور گرفت سے نکل گیا۔ دوسرا سپاہی چلانے کے علاوہ کچھ فاصلے پر پوزیشن لے رہا تھا کہ میں اس پر جا پڑا۔ اگر میں اپنی جگہ کھڑا رہتا تو اس کی رائفل سے نکلنے والی گولی کا نشانہ بن جاتا۔ دھماکے سے میرے کان سُن ہو گئے لیکن اس کے ساتھ ہی گولی نے تھانیدار کا کام تمام کر دیا۔ وہ ہمت والا آدمی تھا اور ایک ہاتھ ٹوٹ جانے کے باوجود ریوالور اٹھا چکا تھا۔ گولی اس کے سینے میں لگی اور وہ فرش پر گر کے تڑپنے لگا۔ دوسرے سپاہی کو میں نے ریوالور سے سر ٹکرا کے ناک آؤٹ کر دیا تھا لیکن اتنی دیر میں پہلا سپاہی اور مجھ سے اولادِ نرینہ کی دعا کا طالب باہر نکل چکے تھے "قتل ہو گیا، خون ہو گیا تھانیدار کا۔" انھوں نے چنگی والوں کو پکارنا شروع کیا جو ایک بس کی پرچی بنا رہے تھے۔

بس والا اگر کسی برطانیہ جیسے قانون پرست معاشرے کا ذمہ دار شہری ہوتا تو بس روک دیتا۔ وہ بس نہ روکتا تو مسافروں میں سے کوئی اسے رکنے پر مجبور کر دیتا لیکن یہاں ہر شخص قانون کے چکر میں پڑنے سے ڈرتا ہے۔ کوئی کسی کے قتل کا چشم دید گواہ ہو تب بھی بھاگ جاتا ہے۔ عدالت میں سالہا سال حاضری دینے کے علاوہ اسے مقتول کے ورثا کی دھمکیوں اور پولیس کی دستی کا شکار بھی ہونا پڑتا ہے جو اس کو اپنی تفتیش کے مطابق بیان دینے پر مجبور کرتے ہیں۔ بس ڈرائیور نے موقع پاتے ہی ٹال لی اور پرچی لیے بغیر فرار ہو گیا۔ چنگی والوں نے افراتفری میں اس کا نمبر نوٹ ہی نہیں کیا ہو گا اور باقی معاملہ بس کے ... نے سنبھال لیا ہو گا۔ خود مسافروں نے ڈرائیور کی تعریف کی ہو گی کہ وہ سب کو بچا لایا۔ پتا نہیں وہاں قتل کرنے والے کتنے ڈاکو تھے۔

میں نے تھانیدار کا ریوالور اٹھایا اور باہر نکل کے ایک ہوائی فائر کیا۔ سپاہی تو وہیں لیٹ گیا۔ میرا معتقد چند قدم دوڑ کے گرا۔ چنگی کا باقی عملہ مخالف سمت میں فرار ہوا۔ میں نے بہتر یہی سمجھا کہ خود بھی نکل جاؤں۔ سڑک پر ٹریفک جاری تھی اور کسی بھی کار یا بس میں کوئی شخص مسلح ہوتا تو مجھے نشانہ بنا لیتا یا میرے تعاقب میں دوڑنے لگتا تو دوسرے لوگ بھی ہمت کر کے پیچھے آ جاتے۔ اس فقیرانہ قبا کے باعث میرے لیے تیز دوڑنا مشکل تھا۔ پھر بھی میں سو گز تک بھاگا۔ کیبن کے بالکل پیچھے کھیت تھے اور رات کے اندھیرے میں سیاہ قبا میرے لیے رکاوٹ بن رہی تھی تو مجھے بچا بھی رہی تھی۔ تقریباً ایک فرلانگ تک کھیتوں میں دوڑنے کے بعد میں نے رُخ بدلا اور سڑک کے متوازی بھاگنے لگا۔ اندھیرے میں اونچے نیچے اور کچے راستوں پر ننگے پاؤں دوڑنا بہت مشکل کام تھا لیکن مجھے سڑک پر کھڑی گاڑی تک پہنچنے کی فکر تھی۔ میں نے طافو کو ایک گھنٹہ انتظار کرنے کے لیے کہا تھا۔ اس کے بعد وہ چلا جائے گا تو میرے لیے اس مصیبت سے نجات کے راستے بند ہو جائیں گے۔

مجھے وقت کا کوئی احساس نہ تھا اور میں اندازاً خطِ مستقیم میں دوڑ رہا تھا۔ ایک جگہ ذرا سی دیر کے لیے رک کر میں نے وہ قبا اتاری اور اس کی گٹھڑی سی بنا لی جس میں میرے اپنے ریوالور کے علاوہ سب انسپکٹر سے چھینا ہوا ریوالور بھی تھا اور میری ساری نقد رقم بھی تھی۔ صرف انڈرویئر میں ریس لگانا زیادہ آسان ثابت ہوا۔ اس وقت خنکی تھی اور نم آلودہ کھیتوں کے درمیان خاصی سردی ہو گی لیکن دوڑنے سے میرے جسم پر پسینہ آ رہا تھا۔ اندازے کے مطابق فاصلہ طے کر کے میں پھر دائیں جانب مڑا اور سڑک پر پہنچ گیا۔ کار کی پارکنگ لائٹ سب مجھے ایک فرلانگ دور نظر آئی۔ میں پھر بھاگا۔ سامنے سے اور پیچھے سے آنے والی گاڑیوں کی ہیڈ لائٹ مجھ پر کئی مرتبہ پڑی۔ ہر بار مجھے اس خوف سے جھرجھری آ گئی کہ اگر کوئی گاڑی آگے جا رکی اور اس میں سے پولیس یا چنگی کے عملے کا کوئی شخص اتر آیا تو میں کیا کروں گا۔ یا کوئی مجھے یوں ننگ دھڑنگ سڑک پر دوڑ لگاتے دیکھ کر شک میں مبتلا ہو گیا اور اس نے گاڑی روک کر مجھ سے سوال کیا تو میں کیا جواب دوں گا۔ اگر اچانک کسی بس میں سوار ہو کے پہنچنے والے مجروح پولیس مین نے بس روک لی اور مسافروں نے مجھے ہر طرف سے گھیر لیا تو میں کہاں فرار ہو سکوں گا۔ ان سب سے مقابلہ ناممکن ہو گا۔

... کے باوجود میں بھاگتا گیا۔ عین اس وقت جب کار مجھ سے سو گز کے فاصلے پر بھی نہیں رہی تھی، اس کی ہیڈ لائٹس روشن ہوئیں، انجن غرّایا اور کار روانہ ہو گئی۔ "طافو!" میں دیوانہ وار چلایا اور اس کے پیچھے زیادہ قوت کے ساتھ بھاگا لیکن میں اس کی تیز رفتاری کا کیسے مقابلہ کر سکتا تھا۔ سردی کی وجہ سے ڈرائیور نے شیشے بھی بند کر رکھے ہوں گے چنانچہ میری آواز انجن کی آواز میں دب گئی ہو گی۔ کار چند منٹ میں میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

چند سیکنڈ پریشان و سرگرداں رہنے کے بعد میں سڑک سے نیچے اتر گیا لیکن اس طرف نہیں جدھر سے میں آیا تھا۔ گاڑی تو محض میری بدقسمتی کے باعث عین اس وقت نکل گئی تھی جب میں اپنی کوشش کے کامیاب ہونے کا یقین کر چکا تھا۔ میرے سارے مسائل کا حل یہی تھا کہ میں کار میں بیٹھ کے نکل جاؤں۔ میں اپنے کپڑے بدل سکتا تھا اور آج کی رات بحفاظت ملتان پہنچ کر کسی ہوٹل میں سکون سے سو سکتا تھا۔ میں نے محسن سے وعدہ کیا تھا کہ سکھر سے اسے فون کروں گا لیکن اب سارا پروگرام چوپٹ ہوتا نظر آ رہا تھا۔ فوری مسئلہ اپنے تحفظ کا اور رات گزارنے کا تھا۔ سڑک پر سے اب گاڑیاں گزر رہی تھیں لیکن میں ان کی روشنی سے دور تھا۔ اب مجھے سردی محسوس ہونے لگی تھی۔ میں نے درختوں کے ایک جھنڈ کی اوٹ میں وہی فقیری لباس زیبِ تن کیا۔ گلے میں وہی منکوں کی مالائیں ڈالیں اور دوسرے ریوالور کو بھی اندر کی جیب میں چھپا لیا۔

اندر کی تھیلا نما جیب بہت بوجھل ہو گئی تھی کیونکہ اس میں دو ریوالوروں کے علاوہ تقریباً آٹھ ہزار روپے نقد بھی تھے۔ میرے پیر کنکروں اور کانٹوں سے زخمی تھے اور اب ٹھنڈی زمین بھی تلوے کاٹ رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ چنگی ناکے پر ہنگامہ آرائی کی خبر اوپر پہنچ چکی ہو گی اور اب تک مزید پولیس کی کمک نہیں پہنچی تھی تو بہت جلد پہنچنے والی ہو گی۔ وہ میرا تعاقب کریں گے اور تلاش کرنے والے اُدھر ہی جائیں گے جدھر میں بھاگا تھا۔ وہ ٹارچ لائٹس لے کر آئیں گے۔ عین ممکن ہے شکاری کتے بھی لے آئیں جو بو کے پیچھے دوڑتے ہیں۔ معاملہ ایک اشتہاری مجرم کا تھا جس نے سنگین جرائم کی فہرست میں مزید وارداتوں کا اضافہ کر لیا تھا۔ شاید وہاں موجود افراد طے کریں کہ سب انسپکٹر پر گولی چلانے کا الزام بھی مجھ سے ہی منسوب کر دیا جائے تو بہتر ہے۔ وہ سپاہی تو بچ جائے گا جس نے گولی مجھے مارنی چاہی تھی لیکن وہ نشانہ خطا ہونے سے اس کے افسر کو جا لگی۔ وہ مل کر بیان دے سکتے ہیں کہ مفرور مجرم نے سپاہی سے رائفل چھین کر گولی چلائی اور پھر تھانیدار صاحب کا ریوالور لے کر ہوائی فائر کرتا... دھمکیاں دیتا فرار ہو گیا۔ اس آخری بات کا گواہ تو چنگی کا عملہ بھی تھا۔ صبح کے بعد خبر آگے چھوٹے دیہات اور قصبوں تک پہنچ جائے گی اور اس طرف میری تلاش پورے زور شور سے جاری رہے گی۔

میرے بچنے کی صرف ایک ہی صورت تھی کہ میں راتوں رات ملتان جا پہنچوں اور اپنی کار کے ڈرائیور کو تلاش کر لوں۔ اگر وہ کسی ہوٹل میں قیام کرے گا تو اپنا نام ہرگز نہیں لکھوائے گا۔ ڈاکٹر امجد پرویز کا نام ہی لکھوائے گا جو گاڑی کے کاغذات میں درج تھا لیکن اس کا کسی اچھے ہوٹل میں قیام کرنا مشکل نظر آتا تھا۔ اسے یہ خوف بھی ہو گا کہ کہیں وہ پکڑا نہ جائے اور بڑے ہوٹلوں میں ٹھہرنے کا تجربہ بھی نہیں ہو گا۔ ملتان پہنچنے کے لیے ضروری تھا کہ میرے پاس معقول کپڑے ہوں اور اس ویرانے میں ان کا تصور بھی محال تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ میں سڑک پر پہنچ کر کسی موٹر سائیکل یا کار والے کا انتظار کروں جو مجھے لفٹ دینے پر راضی ہو جائے اور اس احسان کا بدلہ یوں چکاؤں کہ اس سے گاڑی بھی چھین لوں اور اس کے کپڑے بھی اتروا لوں۔ یہ کام ناممکن نہیں تھا لیکن اس واردات کی خبر عام ہونے کے بعد یہ ثابت ہو جاتا کہ مجرم میرے سوا کوئی نہیں اور یہ معلوم ہو جاتا کہ میرا رخ کس طرف ہے۔ اس کے علاوہ ملتان پہنچ کر ڈرائیور کو تلاش کرنا بھی مشکل کام تھا۔ میں اسے گنتی کے دو چار ہوٹلوں میں تو دیکھ سکتا تھا لیکن چھوٹے ہوٹلوں کا کوئی شمار نہ تھا اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ کسی ہوٹل کا رخ ہی نہ کرے۔ اپنے کسی عزیز دوست کے پاس رک جائے یا کار ہی میں سو جائے۔ اسے صبح لاہور واپس آنا تھا۔

چنانچہ اس سے ملاقات کی دوسری صورت یہ تھی کہ میں صبح ہوتے ہی سڑک پر آ بیٹھوں اور اسے واپس لاہور جاتے ہوئے روک لوں۔ آج کی رات کہاں گزاری جائے، یہ مسئلہ پھر بھی باقی رہتا تھا۔ اندھیرے میں فصلوں کے درمیان یا کھیتوں کی منڈیر پر چلنا تکلیف دہ ہی نہیں خطرناک بھی تھا۔ مجھے اس کی عادت نہیں تھی چنانچہ پیر کے نیچے کوئی کیڑا مکوڑا آ جاتا تھا تو میں اچھل پڑتا تھا اور پھر خدا کا شکر ادا کرتا تھا کہ پاؤں کسی سانپ بچھو پر نہیں پڑا۔ میری ہمت جواب دینے لگی تھی کہ کھیت اچانک ختم ہو گئے اور میرے سامنے ایک چھوٹا سا نالہ آ گیا۔ اس کے پار تھوڑا سا بائیں جانب مدھم روشنیاں کسی گاؤں کی موجودگی کا پتا دیتی تھیں۔ میں نے دونوں ریوالور اور نقد رقم ہاتھ میں اوپر اٹھائے اور نالے میں اُتر گیا۔ برساتی نالے میں پانی بہت کم تھا لیکن اتنا

ٹھنڈا تھا جیسے پگھلی ہوئی برف۔ نالے کی تہہ میں گول کنکر بچھے ہوئے تھے۔ میں سنبھل سنبھل کے ایک ایک قدم اٹھاتا' اپنا توازن برقرار رکھتا آگے بڑھتا گیا۔ چکنی سطح والی کنکریاں بھی اب میرے پاؤں کے نیچے شیشے کی نوکیلی کرچیاں بن گئی تھیں اور میری جسمانی طاقت بھی جواب دینے لگی تھی۔ مجھے پانی کی گہرائی کا اندازہ اگلا قدم بڑھانے کے بعد ہوتا تھا جو ابھی تک زیادہ نہیں تھی اور پانی میرے گھٹنوں سے اوپر نہیں پہنچا تھا۔ آدھا فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک گڑھا آ گیا اور اندازہ غلط ہو جانے کے بعد میں سنبھل نہ سکا۔

گرتے گرتے بھی میں نے اپنا اسلحہ اور سرمایہ بچا یا چنانچہ پانی میں غرق ہونے کے باوجود میرے دونوں ہاتھ پانی سے باہر رہے۔ جب میں پھر کھڑا ہوا تو وہ فقیرانہ قبا پانی میں تر تھی اور یخ بستہ پانی میرے جسم کو بھگو کر ہڈیوں میں پیوست ہو رہا تھا۔ سردی سے میرا پورا وجود کانپنے لگا اور دانت بجنے لگے۔ میں نے رہی سہی جسمانی قوت کو مجتمع کیا اور نالے کو عبور کر گیا۔ گاؤں کا پہلا گھر ایک فرلانگ کے بعد آ گیا۔ اب میرے لیے دوسرا مسئلہ پیدا ہوا۔ میں پانی سے تر کپڑوں میں ریوالور اور نقد رقم نہیں رکھ سکتا تھا اور اگر رکھ لیتا تو کپڑے بدلتے وقت انھیں نکال نہیں سکتا تھا۔ پناہ دینے والے خشک کپڑے، کھانا اور رات بھر کے لیے سونے کی جگہ دے سکتے تھے کیونکہ وہ سیدھے سادے مہمان نواز دیہاتی تھے لیکن کسی ملنگ کے پاس آتشیں اسلحہ اور اتنی نقد رقم دیکھ کر وہ خوف زدہ ہو جائیں گے اور یہی سمجھیں گے کہ ملنگ کے بھیس میں کوئی ڈاکو ان کے گھر میں گھس آیا ہے۔

میں نے ایک جگہ نرم زمین دیکھ کر چھوٹا سا گڑھا بنایا' اس میں ایک درخت کے پتے بچھائے اور سب چیزیں اوپر رکھ کے پتوں کی دوسری تہہ ڈال دی تاکہ مٹی کسی کو خراب نہ کرے۔ ایک احتیاط میں نے یہ بھی کی کہ دونوں ریوالور رکھنے سے پہلے اوپر نیچے خشک نوٹ بھی پھیلا دیے تاکہ ایک ذرہ بھی ریوالوروں کی گراریوں کے نظام تک نہ پہنچے۔ مٹی برابر کر کے میں نے پیروں سے دبا دی اور اس تازہ کھدی ہوئی زمین کو چھپانے کے لیے اس پر سوکھے پتے اور ارد گرد کا کوڑا ڈھیر کر دیا۔ نشانی کے لیے میں نے اسی درخت کو ذہن میں رکھا جس کے پتے نوچے تھے۔ گڑھا اسی کے نیچے شمال کی جانب ایک فٹ کے فاصلے پر تھا۔ پھر میں نے اس کچے گھر کے بند دروازے پر دستک دی جس کے مکین شاید سورج ڈھلتے ہی کھانا کھا کے سونے کے عادی تھے۔

بار بار دستک دینے پر کسی نے اندر سے کہا "کون اے بھئی۔ دم لے ذرا" پھر کنڈی گری اور ساٹھ ستر سال کا ایک بوڑھا دیہاتی لالٹین اٹھائے نمودار ہوا۔ لالٹین اٹھا کے اس نے میرا چہرہ غور سے دیکھا۔

"مسافر ہوں بابا!" میں نے قلندرانہ انداز میں کہا "ایک روٹی کا سوال ہے اور ایک رات کے لیے قبر جتنی جگہ سونے کے لیے چاہیے۔"

"ہمارے بھاگ پیر بادشاہ۔" وہ فرطِ عقیدت سے سینے پر ہاتھ رکھ کے جھکا "کہ آپ ہمارے مہمان ہوئے۔ اری بختے! دیکھ تو کون آیا ہے۔ رحمت کے فرشتے آئے ہیں ہمارے دروازے پر۔" اس نے پیچھے ہٹتے ہوئے مجھے اندر آنے کے لیے کہا اور شاید اپنی گھر والی کو پکارا۔ وہ کچا گھروندا صرف دو کمروں پر مشتمل تھا لالٹین کی روشنی میں مجھے ایک چارپائی پر لیٹی ہوئی بوڑھی عورت نظر آئی۔ اس نے تھوڑا سا اٹھنے کی کوشش کی اور کھانسی۔

"رب مبارک کرے۔" اس سادہ لوح عورت نے کہا۔ "شکر ہے تیرا مالک کہ یہاں بھی کوئی آیا۔"

"آپ بیٹھیں پیر بادشاہ۔" دیہاتی نے دوسری جھلنگا چارپائی پر میرے لیے جگہ بنائی "میں روٹی لاتا ہوں۔"

میں دل ہی دل میں اتنا شرمسار تھا کہ ممکن ہوتا تو اسی وقت بھاگ جاتا۔ اگر وہ مجھے دھتکار دیتے اور میری منت سماجت کے بعد کسی کونے میں ڈال کر ٹال دیتے، روٹی تھما دیتے تو میں خدا کا شکر بجا لاتا اور شرمندہ تو نہ ہوتا۔ شہر میں رات کو کسی اجنبی کے لیے کون گھر کا دروازہ کھولتا ہے خواہ دو ہزار گز کی کوٹھی خالی پڑی ہو۔ سب چور اُچکا سمجھ کے بھگا دیتے ہیں۔ کوئی شرافت سے کام لے تو کہہ دیتا ہے کہ معاف کرو بابا۔ لیکن یہاں میری ایسی پذیرائی ہو رہی تھی جیسے میں کوئی انتہائی اہم اور قابلِ احترام مہمان ہوں۔ یہ خیال میرے ضمیر کی خلش بن گیا کہ اگر ان سادہ دل، پُرخلوص اور نیک طبع لوگوں کو میری حقیقت کا علم ہو جائے تو انھیں کتنا دکھ ہو گا۔ مشکل یہ تھی کہ میں انھیں اس عزت و تکریم سے روک بھی نہیں سکتا تھا۔ یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ مجھے پیر شاہ کہہ کر گالی نہ دیں۔ میں تو ایک مفرور اشتہاری ملزم ہوں۔

بوڑھا دوسرے کمرے میں کسی کو جگا رہا تھا "ارے اب اُٹھ جا گلابو۔ مہمان آئے ہیں ہمارے گھر۔ ان کے کھانے کے لیے لا۔" لالٹین دونوں کمروں کے بیچ والے دروازے کی دہلیز میں ٹانگ دی گئی تھی چنانچہ اس کا اُجالا تقسیم ہو گیا تھا اور دونوں طرف پھیل گیا تھا۔ بڈھا پھر نمودار ہوا اور نیچے بیٹھ گیا۔

"یہ کیا کرتے ہو؟" میں نے کہا "یہاں میرے ساتھ بیٹھو۔"

"نہیں پیر بادشاہ۔ اس قابل نہیں ہوں میں گنہگار۔" وہ عاجزی سے بولا "مجھے اپنے قدموں میں رہنے دیں۔ کرمو خارش زدہ کتا ہے جسے گاؤں والے پتھر مار کے بھگا دیتے ہیں۔ اپنے گھر کے سامنے کھڑا نہیں رہنے دیتے۔ آپ ساتھ بیٹھنے کی کہتے ہیں۔"

"ایسی کیا بات ہے؟" میں نے ہمدردی' حیرت اور دکھ کے ملے جُلے جذبات کے ساتھ کہا "گاؤں والے ایسا سلوک کیوں کرتے ہیں تمھارے ساتھ؟ کیا خطا ہوئی ہے تم سے؟" عورت اچانک کھانسنے لگی۔ کھانستے کھانستے اس کا دم پھول گیا۔ اس نے بہت سا بلغم تھوکا اور کم روشنی کے باوجود مجھے اس میں خون نظر آیا۔

"ٹی بی ہے اسے تو؟" میں نے کہا۔

"ہاں... ہاں جی۔ دُعا کریں اللہ مجھے موت دے دے۔" عورت نے ہانپتے ہوئے کہا "اب اور نہیں جیا جاتا۔"

"مایوسی کفر ہے ماسی۔ اللہ سے شفا کی دُعا مانگنی چاہیے۔" میں نے کہا "کب سے ہے ٹی بی اسے؟"

"جب سے گلابو جوان ہوئی ہے پیر بادشاہ۔" کرمو بولا۔ "وہی روگ ہے اس کا۔"

"بیٹی تو خدا کی رحمت ہوتی ہے۔" میں نے کہا "اسے بُرا کیوں کہتے ہو۔"

"جس کے نصیب بُرے ہوں اسے اور کیا کہوں جی" کرمو بولا "خدا کو منظور نہ ہوتا تو اب تک ماں باپ کے گھر بیٹھی ہوتی جی۔ اتنی ذلت کے باوجود ہم زندہ رہنے پر مجبور ہوتے۔"

"ہر کام کا ایک وقت ہے کرمو۔" میں نے کہا "اور خدا کا کوئی کام مصلحت سے خالی نہیں۔ رشتہ ضرور ملے گا اور ایسا ملے گا کہ..."

"رشتے تو بہت پیر بادشاہ۔ اس کی تو منگنی بھی ہو گئی تھی۔" کرمو نے کہا "لیکن خدا غارت کرے اس کا جس نے ہم سے سب کچھ چھین لیا۔ ہمارا سکھ۔ ہماری خوشی۔ ہماری عزت۔ کرمو کی ماں کو ٹی بی دے دی اور گلابو کی رخصتی نہ ہونے دی۔"

"کون ہے وہ کرمو؟" میں نے کہا۔ اندر سے ایک لڑکی چنگیر اور ایک گلاس لیے اندر آئی۔ اگر اس کا نام گلابو تھا تو غلط نہیں تھا۔ غربت اور دیہاتی وضع کے کپڑوں میں بھی اس کا گلاب دمک رہا تھا۔ آنکھوں کے دیپ روشن تھے اور اس کے حسن کی آب و تاب پر نگاہ نہیں ٹھہرتی تھی۔ چہرے پر وہ معصومیت تھی کہ گنہگار نظر کو حجاب آتا تھا۔

"یہی ہے وہ بدبخت پیر بادشاہ۔" میں نے کرمو کی دُکھی آواز سنی۔

"کبھی کسی کو بدبخت مت کہو کرمو۔ تم کیا جانو کسی کے مقدر میں کیا ہے۔" میں نے برہمی سے کہا "یہ سچا رب جانتا ہے اور اسی کو معلوم ہے کہ زندگی میں دکھ کتنا ہے اور سُکھ کتنا۔ تقدیر بدلتے دیر نہیں لگتی۔ بس اس کا حکم چاہیے۔" میں نے انگلی اوپر اٹھا کے کہا۔ گلابو روتی ہوئی اندر بھاگ گئی۔

"اگر اس کی منگنی بھی ہو چکی تھی تو شادی کیوں نہیں ہوئی؟" میں نے چنگیر اپنی طرف کھسکا کے کہا۔ چنگیر میں مکئی کی گرم روٹی' مکھن کا پیالہ اور اچار تھا۔

"مر گیا جی وہ۔" کرمو نے گھٹنوں پر سر رکھ کے کہا "میرے بھائی کا بیٹا تھا۔ ایسا گبرو جوان تھا۔ جل کے مر گیا، اپنے ہی گھر کی آگ میں۔ آگ لگانے والا اب بھی ہمیں معاف نہیں کرتا۔ نہ جانے کتنے دکھی لوگوں کی بد دُعائیں لے کر بھی سانڈ کی طرح دندناتا پھر رہا ہے۔"

"کون ہے وہ؟" میں نے کہا۔ نوالہ میرے حلق میں اٹک گیا تھا "کوئی بدمعاش ہے؟"

"نہیں پیر بادشاہ۔ وہ تو شریف زادہ ہے۔" کرمو تلخی سے ہنسا "بدمعاش تو ہم ہیں، ہماری بیٹی ہے۔"

"رہنے دے کرمو۔" عورت پھر کھانستے کھانستے چلائی۔ "کس کس کے سامنے روئے گا اپنا دکھڑا اور کتنی بار سنائے گا۔ مجھے مت جلا اور۔ پیر بادشاہ ایک رات کے مہمان... مہمان ہیں۔"

"ہم اسے نیست و نابود کر دیں گے۔" میں نے جلالی لہجے میں کہا۔ یہ ڈراما کیے بنا چارہ نہیں تھا۔

"جاگیردار کا بیٹا ہے، اکرم۔" کرمو نے سر اٹھا کے کہا۔ "اکرم بدمعاش کہتا ہے خود کو۔ باپ کی شہ ہے اور دولت کا گھمنڈ ہے۔ پولیس بھی اس کے ساتھ ہے۔ پہلے اپنے ملنے کی لڑکی سے شادی کی تھی۔ وہ بچاری سال بھر بھی نہ گزار سکی اور گلے میں پھندا ڈال کے لٹک گئی۔ پورے دلوں سے تھی۔ جتنا ظلم

اس نے برداشت کیا تھا اس کے بعد وہ یہی سزا دے سکتی تھی، خود کو بھی اور جاگیردار کو بھی۔ اس نے اپنے ساتھ اکرم کے بیٹے اور جاگیردار کے پوتے کو بھی قتل کر دیا۔ تب سے اکرم بے مہار پھر رہا ہے۔ معلوم نہیں گاؤں میں کسی کی عزت اس کے ہاتھوں خراب ہونے سے بچی بھی ہے یا نہیں۔ وہ تو بے وقوف تھے جنھوں نے آبرو گنوا کے شور مچایا، فریاد کی اور جوتے کھائے۔ جاگیردار سے بھی اور تھانے میں بھی۔ ایک اس کا مزارع تھا جس نے بہن کو کاٹ کے گاڑ دیا اور کلہاڑی سمیت تھانے میں حاضر ہو گیا۔ پچھلے مہینے ہی پھانسی ہوئی ہے اسے۔ دوسری فتو چمار کی بیٹی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ میری طرف بری نظر سے دیکھا تو آنکھیں نکال دوں گی اور وہ سچ مچ ڈب میں خنجر لیے پھرتی تھی۔ اکرم نے اس کو کھیتوں میں اکیلا دیکھ لیا تھا۔ اس نے خنجر سے مقابلہ کیا مگر اکرم جیسے مشٹنڈے مرد کا مقابلہ کیا کرتی۔ اس کی ایک آنکھ ضائع کر دی۔" وہ اچانک چپ ہو گیا۔

"اور... اس کا خود کیا بنا؟" میں نے سوال کا جواب معلوم ہونے کے باوجود پوچھا۔

"اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا پیر بادشاہ۔" وہ بولا۔ "کہیں نہ کہیں مل جائے گی۔ گاؤں میں یا گاؤں سے باہر کسی ویران سی جگہ میں، پاگلوں کی سی دہشت ناک حالت میں دربدر اور آوارہ دو چار کتوں کو ساتھ لیے پھرتی ہے۔ انھی کے ساتھ رہتی ہے اور انھی کے ساتھ کھاتی ہے۔ جو بھی لوگ ڈال دیں۔ انھی کو اپنا خاندان کہتی ہے۔ اب تو بچے بھی پتھر نہیں مارتے۔ کوئی چڑیل بھی نہیں کہتا۔ صرف اکرم بدمعاش کہتا ہے کہ فتو چمار کی بیٹی کو دیکھا ہے نا؟ نہیں دیکھا تو اب دیکھ لو کہ اکرم سے دشمنی کرنے والے کا حشر کیا ہوتا ہے۔ وہ جب چاہے اسے مار سکتا ہے لیکن وہ مر گئی تو اکرم کی شہ زوری کا چلتا پھرتا نمونہ کہاں رہے گا...!"

میں نے افسوس کیا کہ اپنی جان بچانے کے لیے میں بھاگ کر اس گاؤں میں آیا۔

"یہ قصور کس کا ہے کرمو؟" میں نے کہا۔ "کیا گاؤں کے مردوں نے ہاتھوں میں چوڑیاں پہن لی ہیں؟ یا وہ اتنے بے غیرت ہو گئے ہیں کہ پڑوسی کی بیٹی کو بے آبرو ہوتا دیکھتے ہیں تب بھی نظر چرا کے گزر جاتے ہیں؟"

"وہ سب کا اَن داتا ہے پیر بادشاہ۔"

"کفر کا کلمہ مت بک کرمو۔" میں نے گرج کر کہا۔ "سب کا اَن داتا وہ نیلی چھتری والا ہے۔ اپنی کمزوری کو مان لے۔ تجھے بھی ایک روٹی ایک بیٹی کی آبرو سے زیادہ عزیز ہے؟ اس نے تیرے بھائی کا گھر جلا کے راکھ کر دیا۔ تیری بیٹی کو سہاگن ہونے سے پہلے بیوہ کر دیا۔ تیری بیوی خون تھوک رہی ہے اور تو ڈرتا ہے۔ اب بھی زندہ رہنا چاہتا ہے۔ جا کے اسے مار کیوں نہیں دیتا اور پھانسی کیوں نہیں چڑھ جاتا؟"

"میرے ہاتھوں میں اتنا دم نہیں رہا پیر بادشاہ کہ کلہاڑی بھی اٹھا سکوں۔" وہ رونے لگا۔ "میرا جوان بیٹا ہوتا کوئی تو میں قربان کر دیتا۔ کسی اور کو کیا کہوں۔ لوگ تو اس سے اتنا ڈرتے ہیں کہ اس کے خوف کے باعث ہم سے بات نہیں کرتے۔ ہمیں بلاتے نہیں۔ ہمارے گھر نہیں آتے۔ ہم بستی میں رہ کے اکیلے ہو گئے ہیں، شودر ہو گئے ہیں۔"

"اب کیا چاہتا ہے وہ؟" میرا خون آہستہ آہستہ گرم ہونے لگا تھا۔

"وہ گلابو کو مانگتا ہے۔" وہ بولا۔ "گلابو ضدی لڑکی ہے۔ کہتی ہے نہ زہر کھا کے مروں گی نہ گلے میں پھندا ڈال کے۔ میں فتو چمار کی بیٹی بھی نہیں ہوں۔ وہ بیاہ کر کے دیکھے مجھ سے۔ اسی رات جنازہ نہ اٹھے اس کا تو کہنا۔ باؤلی لڑکی، بھلا شادی کے بعد عورت کچھ کر سکتی ہے۔"

"عورت ہر وقت سب کچھ کر سکتی ہے کرمو۔" میں نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "آخری بار کب بات کی تھی اس لفنگے نے؟"

"بات تو وہ کرتا ہی رہتا ہے۔ راہ چلتے دست درازی پر بھی اتر آتا ہے لیکن اللہ نے اب تک عزت بچا رکھی ہے۔" وہ بولا۔ "اس نے ایک ہفتے کی مہلت دی ہے سمجھے کہ آخری بار سوچ لے۔ میں کیا سوچوں پیر بادشاہ! گلابو نے تو کچھ اور ہی سوچ رکھا ہے۔ کہتی ہے ہاں کر دو۔ مہلت تو پوری ہو چکی۔"

"میرا بھی خیال ہے کہ تم ہاں کر دو کرمو۔" میں نے کہا۔

اسی وقت دروازے پر کسی نے زور سے دستک دی۔ باہر سے کئی افراد کے آہستہ آہستہ باتیں کرنے کی آواز آئی۔

"اب کون آ گیا! رب خیر کرے۔" کرمو اٹھا۔

"ایک منٹ کرمو۔" میں نے کہا۔ "ذرا میں دیکھ لوں پہلے۔" اور اسے حیران چھوڑ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ جھری سے جھانکنے پر مجھے چار آدمی نظر آئے۔ میں پلٹ کر بھاگا۔

"باہر نکلنے کا کوئی اور راستہ ہے؟" میں نے کہا۔ "دروازہ میرے جانے کے بعد کھولنا۔"

"اُدھر دوسرے کمرے میں ایک کھڑکی ہے۔" کرمو گھبرا کے بولا۔ "پیچھے کی طرف کھلتی ہے۔"

میں دوسرے کمرے کی طرف لپکا اور کھڑکی کھول کے باہر اتر گیا۔

باہر گھپ اندھیرا تھا اور گلیوں میں بھونکنے والے آوارہ کتوں یا بہت دور چلانے والے گیدڑوں کی آوازوں کے سوا کہیں، کوئی صدا نہ تھی مگر یہ بھی اس بھیانک رات کے سکوت کا ایک حصہ لگتی تھیں۔ مجھے صرف اتنا اندازہ ہو سکا تھا کہ حملہ آور تعداد میں چار ہیں۔ انھوں نے شب رنگ کپڑے پہن کے اپنے چہرے بھی یوں چھپا لیے تھے کہ میں صرف تاریکی میں چار سائے دیکھ سکا تھا۔ زیادہ امکانات یہی تھے کہ وہ اس غریب گھر کی عزت کو تاخت و تاراج کرنے والے لیٹرے تھے جو اپنی طاقت کے زعم میں، جواں مردی کے غرور میں اور شہ زوری کے فریب میں مبتلا ہو گئے تھے یہ بھول گئے تھے کہ عاقبت کا سرمایہ اعمال کی نیکیاں ہیں۔ وہ فتوحات نہیں جو انھوں نے کسی مظلوم، بے بس اور کمزور حریف پر انسانیت سوز مظالم ڈھا کے حاصل کی تھیں کیونکہ انھیں قوتِ تسخیر کے اس مظاہرے کا معاوضہ مال و زر کی صورت میں ادا ہوا تھا۔ یہ حریص شیطان بھول گئے تھے کہ ان کے ہوس پرست، ظالم اور بے ضمیر آقا کے مقابلے میں ایک انصاف پرور اور محافظ قدرت کا ہاتھ کہیں زیادہ طاقتور ہے۔

لیکن یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ شکاری کتے ہوں جو مسلسل میرے تعاقب میں تھے۔ ان کے لیے میرا سراغ لگانا مشکل ضرور تھا، ناممکن نہیں تھا۔ باہر نکل آنے کے بعد میں نے خود کو بہت پُراعتماد محسوس کیا۔ وہ مسلسل دروازہ پیٹ رہے تھے اور کچے گھر کی دیواریں اتنی مضبوط نہیں تھیں کہ دروازے کو ناقابلِ شکست سہارا فراہم کر سکیں۔ گھر کے اندر ایک بیمار عورت تھی جو زندگی اور موت کی بے رحم جنگ کا شکار تھی اور جس کا شمار نہ زندوں میں لیا جا سکتا تھا اور نہ مردوں میں۔ وہ مرنا چاہتی تھی مگر مر نہیں سکتی تھی اور زندہ رہنے میں اس کے لیے موت سے شدید تر عذاب کا سلسلہ تھا۔ دوسری وہ لڑکی تھی جس کی جوانی کا حسن اس کا دشمن ہو رہا تھا اور وہ اپنے وجود پر بھی شرمسار تھی کہ آج اس کی وجہ سے والدین کی رسوائی اور موت کے اسباب پیدا ہو گئے تھے۔ وہ یقیناً سوچتی ہو گی کہ کاش وہ پیدا نہ ہوئی ہوتی یا خدا نے اسے بدصورت نہ سہی گاؤں کی دوسری لڑکیوں سے زیادہ خوب صورت نہ بنایا ہوتا۔ اس کا اکیلا، بوڑھا اور کمزور باپ اپنی بیٹی کی آبرو کے دشمنوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ صرف یہ کر سکتا تھا کہ جان کی بازی لگا دے اور یہ بھیڑیے اس کی لاش کو پامال کرتے ہوئے گھر کی عزت کا جنازہ نکال کر لے جائیں۔

بستی کے گھر زیادہ فاصلے پر نہیں تھے لیکن ابھی تک کوئی دروازہ نہیں کھلا تھا اور کسی نے آواز دے کر بھی نہیں پوچھا تھا کہ اتنی رات گئے یہ کیسا شور و ہنگامہ ہے۔ گلابو کے باپ کی فریاد و فغاں تو گھر کی دیواروں میں محصور تھی لیکن ان کی آواز تو دور دور تک رات کی خاموشی کو مجروح کر رہی تھی جو للکار رہے تھے، بنکار رہے تھے اور گالیاں بک رہے تھے۔ دروازے پر لاتیں مار رہے تھے اور مکّے برسا رہے تھے۔ ایک دیوار کی طوالت چند قدم تھی۔ میں پنجوں کے بل تیزی سے آگے بڑھا اور کونے سے سر نکال کے دیکھنے لگا۔ چار میں سے ایک کے پاس کلہاڑی تھی جسے وہ کندھے پر بندوق کی طرح جمائے سب سے پیچھے کھڑا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کمزور دروازے کو توڑنے کے لیے دو افراد کی قوتِ بازو کافی تھی۔ دوسرا لاٹھی کو زمین پر ٹیکائے اس کے ساتھ کھڑا تھا۔ باقی دو ہاتھ خالی تھے اور اب کندھوں سے دروازے کو ٹکریں مار رہے تھے۔ میرے لیے یہ حیرت کی بات بھی تھی اور افسوس کا مقام بھی تھا کہ ابھی تک حقوقِ ہمسائیگی، انسانیت کے رشتوں اور شرافت کے تقاضوں نے کسی کو بیدار نہیں کیا تھا۔ کیا گاؤں میں لوگ سکھ چین کی اور بے فکری کی اتنی گہری نیند سوتے ہیں کہ کسی کا گھر لٹے یا کسی کی آبرو، ان کے کان کسی کی مدد کی پکار تک نہیں سنتے؟ نہیں۔ گلابو کے باپ نے مجھے بتا دیا تھا کہ یہ محکوم و مجبور و حقیر لوگ ڈرتے ہیں۔ خوفِ خدا سے زیادہ ان کو زمین پر نمرود کی طرح خدائی کرنے والے مالکوں کا ڈر تھا۔ شاید وہ جاگ رہے تھے اور سب کچھ سن رہے تھے مگر انھوں نے اپنی مجبوریوں کی آڑ میں پناہ لے لی تھی۔ خود غرضی نے انھیں بزدل اور بے حس بنا دیا تھا۔ آخر ہمارے بھی تو بیوی بچے ہیں اور پھر ہم مقابلے کی طاقت کہاں رکھتے ہیں۔ کل یہی ہمارے ساتھ ہوا تو کوئی نکلے گا اپنے گھر سے؟ پھر ہم کیوں جائیں اور کیسے جائیں۔

میں کونے سے نکل کر اچانک ان کے سامنے آ گیا۔ "کیسا ہے یہ شور و غل؟"

دروازہ گرانے کی کوشش کرنے والے رک گئے۔ ایک ساتھ ان سب نے سر گھما کے مجھے دیکھا۔ پھر کلہاڑی والا ایک قدم آگے آیا۔ "اپنا کام کرو سائیں بابا۔" اس نے درشت لہجے میں کہا۔

"اور ہمیں اپنا کام کرنے دو۔" لاٹھی والے نے کہا۔

"جاؤ سائیں۔"

"اوئے ملنگ ہے کوئی یار۔" دروازہ توڑنے کی کوشش میں مصروف ایک شخص نے جھنجلا کے کہا۔

"حق اللہ۔" میں آہستہ آہستہ جھومتا ہوا آگے بڑھا۔ "او بدبختو، کیوں اس گھر کو گراتے ہو۔ جس گھر میں بستے ہو اسی کی دیواریں ڈھاتے ہو۔" میری آواز سے اندازہ ہوتا تھا کہ میں نے چرس کا دم لگا رکھا ہے۔

"یہ ہمارا گھر نہیں ہے موتیاں والیو۔" لاٹھی والا میرے سامنے آ گیا۔

سر تو بس گھر ہوتا ہے۔ اینٹ پتھر کے گارے کا۔" میں نے جلالی لہجے میں کہا۔ "کبھی تیرا، کبھی میرا۔ ایک جاتا ہے تو دوسرا آتا ہے۔ بندہ وہیں پہنچتا ہے جہاں سب گئے۔ تو بھی جائے گا۔"

"بس کر بابا، دفع ہو جا یہاں سے۔" کلہاڑی والے نے کہا۔

لاٹھی والے نے مجھے دونوں ہاتھوں میں لاٹھی تھام کے دھکیلا۔ میں اسی موقعے کا منتظر تھا۔ میں نے لاٹھی کو بیچ میں سے تھام کر جھٹکا دیا۔ لاٹھی پر اس کی گرفت بہت مضبوط نہ تھی اور اسے ایک چرس کے نشے میں دھت فقیر سے ایسی پھرتی اور قوت آزمائی کی امید بھی نہ تھی۔ لاٹھی میرے ہاتھ میں آگئی اور وہ دو قلابازیاں کھا کے دور جا گرا۔ میں نے لاٹھی کو یوں گھمایا کہ اس کا ایک سرا کلہاڑی والے کی گردن پر پڑے مگر وہ کندھے پر رکھی ہوئی کلہاڑی دونوں ہاتھوں میں اٹھا کے مجھ پر وار کر چکا تھا۔ لاٹھی اس کی کلہاڑی کے دستے پر لگی۔ کلہاڑی کے دستے کی لکڑی لاٹھی کے مقابلے میں بہت کمزور اور پتلی تھی۔ لاٹھی اور کلہاڑی کا دستہ یوں ٹکرائے جیسے بیک وقت ایک دوسرے پر وار کرنے والوں کی تلوار ٹکراتی ہے۔ کلہاڑی کا دستہ درمیان سے ٹوٹ گیا اور میرے حریف کے ہاتھ میں مشکل سے دو فٹ لمبا ڈنڈا رہ گیا۔

اس نے پیچھے ہٹ کر قدم جمانے کی کوشش کی۔ میں نے لاٹھی اس کے پاؤں میں اڑائی اور وہ منہ کے بل گر گیا۔ لاٹھی کا اصل مالک کمر پر ہاتھ رکھ کے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس نے زمین پر سے ایک پتھر اٹھا کے پوری قوت سے میری طرف پھینکا۔ اندھیرے کے باوجود میں نے اسے جھکتے اور زمین پر سے کچھ اٹھاتے دیکھ لیا تھا۔ جب اس نے مجھے گالی دینے کے بعد ہاتھ گھمایا تو میں غوطہ مار گیا۔ پتھر زن سے میرے کان کے پاس سے گزرا۔ میرے پیچھے کلہاڑی والا سخت اشتعال کے عالم میں اٹھ کے مجھ پر جست لگا چکا تھا۔ پتھر کتنا بڑا تھا، اس کا اندازہ تو مجھے نہیں ہو سکا لیکن اس کے حلق سے ایک بھیانک چیخ بلند ہوئی اور وہ میرے قدموں کے پاس آگرا تو میں سمجھ گیا کہ میرا ایک مدِمقابل کم ہو گیا ہے۔ اس کی منہ زور، بے مہار اور مغرور قوت ایک لمحے میں اس سنگِ راہ سے ٹکرا کے فنا ہو گئی جو فرشتۂ اجل نے اس کے اپنے ساتھی کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔ اس رات اگر وہ ایک غریب اور مظلوم آدمی کا گھر اجاڑنے اور اس کی جوان بیٹی کو اٹھا لانے کے لیے اپنے گھر سے نہ نکلتا تو زندہ رہتا۔ خود اس نے اپنی جرأت اور جواں مردی ثابت کرنے اور اپنی خدمت گزاری کا انعام لیتے وقت یہ سوچا تک نہیں ہوگا کہ کتنے کم داموں پر اس نے اپنی زندگی کا سودا کر لیا ہے۔ اس نے موت کی ہنسی نہیں سنی ہوگی جو طے شدہ وقت پر آدمی کو کسی نہ کسی بہانے وہیں پہنچا دیتی ہے جہاں وہ آخری بار سانس لیتا ہے۔ اسے حیران ہونے کی مہلت بھی نہیں ملی کہ آج کے دن تک یکسانیت اور تسلسل کے ساتھ جاری رہنے والا عمل یکلخت کیوں اور کیسے رک گیا۔ وہ عمل جس میں دل کا دھڑکنا، نبض کا گھڑی کی طرح چلتے رہنا، سانس کی آمد و رفت، حواسِ خمسہ کی صحت اور سلامتی اور جسم کے تمام اعضا کا اپنے اپنے افعال کی کارکردگی کو برقرار رکھنا شامل ہوتا ہے۔

صرف ایک لمحے کے لیے سکوت اور جمود اور بے یقینی کا وہ لمحہ آیا جس میں لاٹھی والے نے محسوس کیا کہ اس نے کلہاڑی والے کو قتل کر دیا ہے۔ پھر یہ لمحہ خوف اور پشیمانی اور قہر و غضب کے طوفان میں ڈھل گیا۔ اچانک ان سب کو احساس ہوا کہ مجھے ایک مخبوط الحواس، بے ضرر اور بے وجہ ٹیک پڑنے والا فقیر سمجھ کے انھوں نے کتنی مہلک غلطی کی تھی۔ میں نے لاٹھی کو گھٹنے پر رکھ کے دو ٹکڑے کر دیا اور دونوں ٹکڑے دور اچھال دیے۔ میں نفسیاتی طور پر ان کو خوف زدہ کرنا چاہتا تھا۔

ان سب نے ایک ساتھ مجھ پر حملہ کیا۔ پہلا توپ کے گولے کی طرح میرے پیٹ میں لگا۔ میں نے اسے رکوع کی حالت میں دیکھا۔ اپنے دونوں ہاتھوں کی مدد سے اس کو پیٹ کے نیچے سے پکڑ کے اٹھایا اور سر کے اوپر سے گزار کے پیچھے پھینک دیا۔ پھر میں نے ایک پنجے پر گھوم کے لات چلائی جو دوسرے کے پیٹ پر بالکل صحیح جگہ لگی۔ وہ بلبلایا اور ضرب کی قوت سے تقریباً پانچ گز دور گرا۔ میرے پیچھے گرنے والا اٹھ بھی نہ پایا تھا کہ میں چھلانگ لگا کے اس پر گرا۔ میرے مکے اس کے منہ پر گرز کی طرح پڑے۔ میں نے اس کے سر کو بالوں سے پکڑ کے اٹھایا اور زمین پر دے مارا۔ وہ بہت سخت جان اور طاقت ور حریف تھا۔ ورنہ پہلی بار ہی گرنے کے بعد اٹھ نہ پاتا لیکن اس نے مقابلہ کیا اور مجھے اپنی گرفت میں لیے رکھا۔ پھر اس کے دونوں بازو اپنا دفاع کرنے کے بجائے میری کمر کے گرد لپیٹ لیے۔ کیونکہ اس نے اپنے آخری ساتھی کو پیش قدمی کرتے دیکھ لیا تھا۔

خود کو چھڑانے کی خاطر مجھے تھوڑی سی جدوجہد کرنی پڑی اور اسے تقریباً ختم کرنا پڑا لیکن یہ تاخیر مجھے مہنگی پڑی۔ اس نے آخری حریف کو مہلت دے دی کہ وہ اطمینان سے مجھ پر حملہ کرے۔ میں نیچے پڑے ہوئے شخص کی گرفت میں آدھا منٹ بھی نہیں رہا تھا لیکن اس آدھے منٹ میں چوتھے آدمی نے لاٹھی کے نصف ٹکڑے سے میرے سر پر وار کیا۔ یہ ٹکڑا وہیں پڑا تھا

تھا جہاں وہ میری لات لگنے سے جا کر گرا تھا۔

ضرب اتنی شدید تھی کہ میں اُٹھ بھی نہ سکا۔ میرے ہاتھ پاؤں بے دم ہو گئے اور میں نے خود کو درخت سے کٹ کر گرنے والی شاخ کی طرح زمین پر گرتے محسوس کیا۔ پھر احساس نے ساتھ چھوڑ دیا۔ اندھیری رات زیادہ سیاہ اور بے صدا ہو گئی۔ بے ہوشی کا یہ وقفہ بہت مختصر رہا۔ کوئی آواز میرے لاشعور کو جھنجوڑتی رہی۔ سکندر! اُٹھو، یہ دوسرے شکاری ہیں، وہ نہیں جو تمھیں زندہ اور گرفتار رکھنا چاہتے ہیں اپنی قید میں، جیل خانے یا پاگل خانے میں۔ یہ خونی اور قاتل اجنبی ہیں جو تمھیں پہچانتے بھی نہیں مگر یہ تمھیں معاف نہیں کریں گے۔ اپنے ایک ساتھی کے خون کا بدلہ یہ تمھارے خون سے لیں گے کیونکہ قتل تم نے نہیں کیا لیکن قتل کا سبب تم ہی ہو۔ تم نے ان کی متحدہ قوت سے ٹکر لے کر ناقابلِ معافی گناہ کیا ہے۔ یہ تم کو اسی دشت کی تنہائی میں ایسی جگہ گاڑ دیں گے جہاں تمھارے کسی دوست اور ہمدرد کے خیال کی رسائی بھی نہیں ہو سکتی۔ وہ سب تو یہی سمجھے ہوئے ہیں کہ تم ایک کار میں کراچی کی جانب رواں ہو اور اس وقت ملتان کے کسی ہوٹل میں سو رہے ہو اور کل تم سکھر سے فون کرو گے۔

ہوش آنے کے بعد بھی میں نے اپنے ہی خیالات کی بازگشت سنی۔ آواز میری تھی اور بازگشت رابعہ کی۔ خیال میرا تھا اور صدا اُس کی لیکن یہ احساس کا فریب تھا اور آرزو کا سراب تھا۔ وہ آواز رابعہ کی نہیں گلابو کی تھی۔ وہ میرے مُنہ پر پانی کے چھینٹے مار رہی تھی، مجھے جھنجوڑ رہی تھی اور پکار رہی تھی۔

میرا سر میرے کندھوں پر رکھی ہوئی چٹان بن گیا تھا لیکن گلابو نے مجھے سہارا دیا تو میں اُٹھ کے بیٹھ گیا۔ پھر میں نے دیکھا کہ گلابو رو رہی ہے۔ کچے گھر کی دہلیز کے اندر ایک لالٹین جل رہی تھی۔

"گلابو!" میں نے کہا۔ "روتی کیوں ہے؟ وہ... وہ کہاں ہیں؟"

اور سر کو گھما کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ میرے سوال کا جواب میرے سامنے آگیا۔ اِدھر اُدھر چار افراد پڑے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک وہ تھا جو اس جنگ میں سب سے پہلے کام آیا تھا۔ دوسرے کو میں نے مار مار کے نیم جاں کر دیا تھا اور وہ بھی لاش کی طرح ہی پڑا تھا۔ دُور سے یہ اندازہ کرنا دُشوار تھا کہ وہ ابھی تک بے ہوش ہے یا مر چکا ہے۔ تیسرا جسم دو حصّوں پر مشتمل تھا۔ اس کا دھڑ، گردن تک الگ پڑا تھا۔ سر لڑھک کر چند قدم دُور چلا گیا۔ دُور سے آنے والے لالٹین کے مدھم اُجالے میں لہو کی سُرخی اور رات کی سیاہی نمایاں طور پر الگ نظر آتی تھی۔ یہ لہو گردن کی شہ رگوں سے بہہ کر زمین کو رنگین کر رہا تھا۔ آدھی گردن دھڑ کے ساتھ تھی اور آدھی سر کے ساتھ۔ دونوں حصّوں کو اتنی صفائی سے کاٹنے والا لٹو کا گلابو کے باپ نے تھام رکھا تھا حالانکہ وہ بھی مر چکا تھا۔ اس کی لاش کا سر تن سے جدا تو نہیں ہوا تھا مگر دو ٹکڑے ہو گیا تھا۔ اس دہشت ناک منظر نے مجھے وہ الیکٹرک شاک دیا جس سے میں ایک دم اُٹھ کھڑا ہوا۔

"گلابو!" میں نے اُسے ہاتھ تھام کے اُٹھایا۔ "تیرے باپ نے تو کہا تھا کہ تو بہت بہادر لڑکی ہے، بہادر باپ کی بہادر بیٹی ہے۔"

"نہیں نہیں۔" وہ چلائی۔ "میں منحوس ہوں، قاتل ہوں اپنے باپ کی، چڑیل اور ڈائن ہوں، سب کو کھا گئی میں۔" بالآخر اس کی ہمت جواب دے گئی تھی اور ہسٹریا کی دیوانگی نے اسے مغلوب کر لیا تو میں نے اس کو شانوں سے پکڑ کے جھنجوڑا اور اس کے رخسار پر مسلسل تھپڑ لگائے۔ روتے روتے اُس کی آواز یکلخت بند ہو گئی۔ وہ گرنے لگی تو میں نے اسے سنبھال لیا اور اُٹھا کے اندر لے گیا۔ اندر قدم رکھتے ہی سب سے پہلے میری نظر گلابو کی ماں پر گئی۔ وہ اسی طرح اپنے بسترِ مرگ پر دراز تھی اور سکون سے سو رہی تھی۔

میں جانتا تھا کہ ایسے وقت میں اس کے سکون سے سونے کا تصور ہی محال ہے جب اُس کی اکلوتی جوان بیٹی کی عزت پر ڈاکا ڈالنے والے دروازے کو توڑ رہے ہوں، گلابو کا ضعیف مگر غیرت مند باپ مدد کے لیے بہرے بن جانے والوں کو پکار رہا ہو اور مایوس ہو کے اپنی جان کی بازی لگانے نکل گیا ہو۔ باہر ایک عورت کی عزت کے دشمنوں اور محافظوں میں خونریز جنگ جاری ہو تو وہ سکون سے کیسے سو سکتی ہے۔ اس کے نحیف و نزار جسم پر پڑا ہوا لحاف بے ترتیب تھا۔ اُس کا سر بھی تکیے پر نہیں تھا۔ شبہے کی کوئی بات نہیں تھی کہ یہ موت کی نیند ہے جس نے اسے یہ سکون بخشا ہے اور اب وہ اس جنگ میں فتح و شکست کے غم سے بے نیاز ہے جو اس کے گھر کی آبرو کی سرحد پر جاری تھی۔

میں نے گلابو کو دوسرے کمرے میں لٹایا اور فوراً باہر نکل گیا۔ میرے قدم پہلے اس درخت کی سمت بڑھے جس کے نیچے میرا ریوالور اور میرا تمام سرمایہ دفن تھا۔ پھر پلٹ کر میں اس شخص کی طرف چلا گیا جو تین لاشوں کے درمیان بے ہوش پڑا تھا۔ اندھیری رات کے پردے میں اپنا لباس اُتارنے میں مجھے دو منٹ بھی نہیں لگے لیکن اس بے ہوش شخص کے کپڑے اُتارنے میں مجھے کچھ محنت کرنا پڑی۔ میرا سر درد سے پھٹ رہا تھا اور مجھے بار بار چکر سے آ رہے تھے۔ چار خانے کا ریشمی لاچا باندھ کے میں نے بوسکی کا کرتا پہنا جو مجھے کچھ تنگ رہا لیکن صرف شانوں اور بغلوں میں۔ تاریکی میں رنگ کی تمیز مشکل تھی۔ بوسکی کے کرتے کا رنگ گہرا تھا اور کالا، زرد یا سفید کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ اس کی پگڑی کھل گئی تھی۔ اسے میں نے ناڑی پن سے سر پر لپیٹا اور اپنا اسلحہ نکالنے لپکا جو میرے ذہن میں تھی اور بہت واضح۔ تازہ کھدی ہوئی مٹی کو دوبارہ کھودنا کوئی مشکل کام ثابت نہ ہوا اور میں لوٹ کر آیا تو نقدی گن کرتے کی جیب میں تھی۔ اسی میں ...

... بجز کا وہ بستہ اُلفت بھی تھا جس پر اس نے بڑے پیار سے دستخط ... کیے تھے۔ باقی بند سے تھے۔ حساب کی غیر جذباتی زبان کے ... الفاظ۔ ریوالور کو میں نے پہلے ڈب میں اُڑسا تھا لیکن اس سے ... کھلنے لگا تو میں نے اسے ہاتھ میں رکھا اور لاچے کو یوں لپیٹا کہ ... دونوں کناروں کو ملا کر دُہری گرہ لگا دی۔ ملنگ کی مسروقہ سیاہ قبا ... نے ریشمی لاچے والے پر ڈال دی تھی کہ ہوش میں آنا نصیب ہوا ... تو وہ بہن لے گا۔ مقدر میں کفن ہوا تو ملے گا ورنہ ناکامی کی سزا ... دینے والوں کے لیے آسانی ہو گی۔ وہ اسی قبا میں لپیٹ کر گاڑ دیں ... ایک مالا کے منکے اِدھر اُدھر بکھر گئے تھے۔ دو مالائیں اس ... سر پر پگڑی باندھنے میں خاصی مددگار ثابت ہوئی تھیں۔

گلابو اب کراہنے لگی تھی جس کا مطلب تھا کہ وہ پھر ہوش کی دنیا میں لوٹ رہی ہے۔ موت کے اس خونی ڈرامے کا ہر کردار اپنی ... خود گنتا تھا۔ لیکن گلابو کی تصدیق ضروری تھی۔ وہی بتا سکتی تھی ... حملہ آوروں کا پانچواں ساتھی کہاں گیا۔ اگر اس کی لاش بھی نظر آ گئی ... ہوتی تو میں پریشان نہ ہوتا۔ اس کی عدم موجودگی سے مجھے یہ خدشہ ... تھا کہ وہ بچ کر نکل گیا ہو گا۔ اس صورت میں خطرہ زیادہ تھا کہ ... اپنی غیر متوقع شکست کا بدلہ لینے کے لیے لوٹ آئے گا اور ... باس فتح کو یقینی بنانے کے لیے بہت زیادہ قوت کے ساتھ ... آئے گا۔

"ہوش میں آؤ گلابو!" میں نے اس کے پاس بیٹھ کر کہا۔ "میری ... دیکھو، میں کون ہوں؟ آنکھیں کھولو۔" اس نے آہستہ آہستہ ... آنکھیں کھولیں اور مجھے پہچاننے کی کوشش کرتی رہی۔ اپنے مددگار ... ملنگ سائیں کی جگہ اس نے میرے حلیے میں ایک دُشمن کو دیکھا ... اس سے سب کچھ چھین چکا تھا۔ اس کے ماں باپ کو قتل کر چکا تھا ... اس درندے کی ہوس ختم نہیں ہوئی تھی۔ وہ گلابو کے گھر میں ... داخل ہو چکا تھا اور گلابو پر جھکا ہوا تھا اس کے جسم کی بوٹیاں نوچنے کے لیے اور اس کے دامنِ عصمت کو تار تار کرنے کے لیے۔ گلابو کی آنکھوں میں دیوانگی کی ایک نئی تڑپ پیدا ہوئی اور اس نے ایک ... مجھ پر حملہ کیا۔ میں نے ریوالور کو جیب میں ڈال لیا۔

"کمینے، خونی کتے! میں خون پی جاؤں گی تیرا!" ایک وحشیانہ ... کے ساتھ اس کے ہاتھوں نے میری گردن دبوچنے یا میرا چہرہ ... نوچنے کی کوشش کی لیکن میں نے اسے چت کر دیا اور اس کے ... دونوں ہاتھ پکڑ کے اسے دبا لیا۔

"دیکھو گلابو! میں وہی ملنگ سائیں ہوں۔" میں نے بھولی ... مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "تم میرے لیے کھانا لے کر آئی تھیں، نا؟ ... صورت دیکھو، بس میں نے کپڑے بدل لیے ہیں، غور سے دیکھو۔" آہستہ آہستہ اس کی قوتِ مدافعت میں کمی آنے لگی۔ میں نے اس کے ہاتھ چھوڑ دیے اور چارپائی پر بیٹھا رہا۔ گلابو خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔ وہ آنکھیں اب ویران تھیں، دُکھ کے احساس سے عاری۔ اپنی تباہی کے غم سے، دُکھ سے اور سارے اندیشوں سے بے نیاز۔ احساس سے یہی محرومی مستقل دیوانگی میں بھی ڈھل سکتی تھی۔ جب آدمی زندہ رہے لیکن احساس مر جائے تو اُسے علم ہی نہیں ہوتا کہ وہ خود کیا کر رہا ہے اور دُنیا اس کے ساتھ کیا کر رہی ہے۔ جذبات ہی نہ ہوں تو عزت و غیرت اور شرم و حیا کا خیال کیا۔ جسم فرشِ خاک پر پڑا ہو تو کیا ہے بس ہو تب بھی کیا، وہ بے آبرو ہو تب بھی کیا۔

"تمھیں معلوم ہے گلابو کہ تمھارے باپ کے آنے سے پہلے میں اکیلا ان غیرت فروشوں سے لڑ رہا تھا؟" میں نے کہا۔ گلابو نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلا دیا اور میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ نہ وہ یادداشت سے محروم ہوئی ہے اور نہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت اور عقل و ہوش سے۔

"میں دیکھ رہی تھی۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"ایک دُشمن نے کوشش کی تھی کہ میرا سر پھاڑ دے۔" میں نے کہا۔ "پھر میں بے ہوش ہو گیا تھا لیکن اس کے بعد تمھارا باپ ٹوکا لے کر آ گیا تھا۔"

گلابو نے پھر آہستہ سے تائید میں سر ہلا دیا۔

"اور اُس نے ایک کا سر تن سے جدا کر دیا تھا۔" میں نے کہا۔

گلابو کچھ دیر سوچتی رہی۔ "مجھے معلوم نہیں۔" وہ بولی۔

"لیکن تم تو دیکھ رہی تھیں، تم نے ابھی مجھے بتایا ہے۔" میں نے کہا۔

"جب... جب اس نے ٹوکا اُٹھایا تو... تو میں چھپ گئی تھی۔" گلابو نے کہا اور آنسو پھر اُس کی آنکھوں سے اُبل پڑے۔ "ماں کے بعد وہ مجھے بھی مار دینا چاہتا تھا۔"

"باہر نکلنے سے پہلے اُس نے تمھاری ماں کا گلا گھونٹ دیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"میری ماں نے خود... خود کہا تھا... اسے مجبور کر دیا تھا۔" وہ بولی۔ "پھر وہ پاگل ہو گیا تھا۔ میں پیچھے سے باہر نکل گئی ورنہ وہ سب سے پہلے میرا خاتمہ کرتا۔ میں بے غیرت اور بزدل نہیں ہوں۔"

"پھر تم کو بھاگ کر جان بچانے کا خیال کیوں آیا؟" میں نے کہا۔

"میں اس طرح پہلے بھی مرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔" وہ بولی۔ "ورنہ میں زہر کھا لیتی، کنوئیں میں کود جاتی لیکن میں مر گئی تو اسے مارے گا کون۔ مجھے مرنے سے پہلے ایک شیطان کو مارنا ہے تاکہ پھر کوئی گلابو پیدا ہو تو اس کی طرف بُری نظر سے دیکھنے والا کوئی نہ ہو اور ہو تو دوسری گلابو میں بھی ہمت ہو کہ اسے کتے کی موت مار سکے۔"

"تم ان کا مقابلہ نہیں کر سکو گی گلابو۔" میں نے کہا۔ "تم عورت ہو اور کمزور ہو۔ میرے ساتھ چلو، میں تمھیں حفاظت کے ساتھ پہنچا دوں

گا، جہاں بھی تم جانا چاہو۔"

"مجھے کہیں نہیں جانا ویر۔" وہ بولی۔ "اب تو مجھے یہیں رہنا ہے۔ اپنے ماں باپ کے قاتلوں سے بدلہ لینا ہے اور اسے مارے بغیر میں کسی جگہ زندہ نہیں رہ سکوں گی۔ یہ خیال مجھے زندہ نہیں رہنے دے گا کہ میرے ماں باپ کو قتل کرنے والا اور گاؤں کی لڑکیوں کی عزت کا لٹیرا اسی طرح دندناتا پھر رہا ہے۔"

"بے وقوفی کی بات مت کرو۔ وہ لوگ آتے ہی ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "ایک کو اس کے ساتھیوں نے مار دیا تھا۔ ایک کو تمہارے باپ نے موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ دوسرے نے کلہاڑی سے تمہارے باپ کا سر پھاڑ دیا۔ تیسرا بے ہوش پڑا ہے لیکن چوتھے کا کوئی پتا نہیں۔ شاید وہی تمہارے باپ کا قاتل تھا، جو قتل کے بعد بھاگ گیا۔ اب تک وہ اپنے آقا کو ساری بات بتا چکا ہوگا اور وہ بدمعاش اکٹھے ہو کر ضرور آئیں گے۔"

"آنے دو ویر۔" وہ اطمینان سے بولی۔ "تم ان کے آنے سے پہلے یہاں سے نکل جاؤ۔ تمہارا احسان ہے کہ تم نے اس گھر کے لیے اپنی جان کی بازی لگائی لیکن تمہارا اتنا ہی احسان کافی ہے۔ اب معاملہ میرے اور ان کے درمیان ہے۔ باہر میرے باپ کی اور اندر میری ماں کی لاش پڑی ہے۔"

"میں تم کو چھوڑ کے نہیں جا سکتا۔ تمہیں میرے ساتھ چلنا پڑے گا۔" میں نے کہا۔ وہ آہستہ آہستہ اٹھی اور دیوار کے ایک طاقچے کی طرف بڑھی۔ اس نے جزدان میں لپٹا ہوا قرآن اٹھایا اور چارپائی پر رکھ دیا۔ میں اس کی حرکت کا مفہوم سمجھنے سے قاصر رہا تھا اور یہی سمجھا تھا کہ وہ میرے ساتھ چلنے پر آمادہ ہو گئی ہے۔ "میں تمہیں مسلمان سمجھ کے اس قرآن کی قسم دیتی ہوں۔" اس نے اچانک کہا۔ "مجھ سے پھر مت کہنا کہ نکل چلو۔ تمہارے اور میرے درمیان یہ مقدس کتاب ایک دیوار ہے۔ اس کے ادھر مت آنا۔ دروازہ تمہارے پیچھے ہے جس طرح آئے تھے اسی طرح لوٹ جاؤ۔"

میری زبان گنگ ہو گئی اور میں پتھر کے بت کی طرح منجمد کھڑا رہا۔

"تمہارے احسان کا قرض مجھ پر رہے گا۔ میرے ماں باپ پر بھی رہے گا۔ تم رحمت کے فرشتے بن کر نازل ہوئے تھے۔ ہر مہمان خدا کی رحمت ہوتا ہے اور تم نے تو اپنا فرض ادا کر کے ہمیں قیامت کے دن تک اپنا مقروض کر دیا ہے۔ اس سے زیادہ نہ تم پر فرض ہے اور نہ مجھ میں قرض اٹھانے کا حوصلہ۔ جاؤ میرے ویر۔ تمہارا رب راکھا۔ میں نے عہد کیا ہے کہ اس شیطان کو مارنے سے پہلے نہیں مروں گی۔ اللہ میرے ساتھ ہے۔ تم میری کامیابی کی اور مغفرت کی دعا کرنا۔"

خاموشی کا ایک بہت بوجھل اعصاب شکن...... اور عذاب جاں وقفہ آیا۔ اس کے بعد میں نے آہستہ آہستہ جیب سے ریوالور نکالا۔ "تم نے میرے پاؤں میں دوہری زنجیر ڈال دی ہے۔ ایک اتنی بڑی قسم دے کر اور دوسری مجھے اپنا بھائی کہہ کر۔" میں نے کہنا شروع کیا۔

"بھائی تو بے غیرت بھی ہوتے ہیں۔" وہ ریوالور کو دیکھ کر خوفزدہ ہونے لگی۔

"نہیں، میں بے غیرت بھائی نہیں ہوں گلابو۔ میں خود تیرا انتقام لیتا لیکن میں بتا نہیں سکتا کیونکہ وقت کم ہے اور مجھے دوسرے کام کرنے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ایسے ہی کچھ لوگ ہیں، جو میرے باپ کو قتل کر چکے ہیں اور اب میری جان لینے کے درپے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ میں زندہ رہوں گا تو ان کو دنیا میں کہیں امان نہ ملے گی۔ جیسے آج میرے لیے کہیں امان نہیں۔" حالات کی وضاحت کے لیے مناسب الفاظ کا انتخاب میرے لیے مشکل ہو رہا تھا۔

"تم نے ملنگ سائیں کا بھیس بدل رکھا تھا۔" وہ بولی۔ "کون ہو تم؟"

"میں اس سوال کا کیا جواب دوں۔ سخت مشکل میں پھنس گیا ہوں بس اتنا سمجھ لو، گلابو کہ میں اور تم ایک ہی کشتی کے مسافر ہیں۔ ہم دونوں عزت سے زندہ رہنا چاہتے تھے۔ ہمارے دشمنوں نے یہ بھی منظور نہیں کیا کیونکہ وہ عزت کا مطلب ہی نہیں سمجھتے تھے۔ نہ اپنی عزت کا اور نہ دوسروں کی عزت کا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ تم میرے ساتھ چلو تو پہلے میں اپنے دشمنوں سے نمٹ لوں کیونکہ وہ ہر جگہ، ہر وقت میرے تعاقب میں ہیں۔ وہ بھی بہت طاقت ور اور بے ضمیر ہیں۔ ان سے نمٹنے کے بعد میں تمہارے ساتھ آؤں گا۔"

"نہیں ویر، تم جاؤ۔" وہ بولی۔ "اللہ تمہارا نگہبان ہو۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔"

"تمہارے والدین کی لاشیں باہر پڑی ہیں گلابو۔ کیا وہ ایسے ہی پڑی رہیں گی؟" میں نے کہا۔

"نہیں، گاؤں کے لوگ انہیں دفن کر دیں گے۔" وہ بولی۔ "دو قاتل اور دو مقتول ایک ہی جگہ ساتھ ساتھ جائیں گے۔ ایک ہی قبرستان میں۔ مشہور ہو جائے گا کہ انہیں ڈاکو مار گئے۔ تفتیش یہاں کون کرتا ہے۔"

"تم مجھے پڑھی لکھی لگتی ہو، اپنی باتوں سے۔" میں نے کہا۔

"بدقسمتی ہے ویر کہ میں نے آٹھ جماعت تک یہاں کے اسکول میں پڑھا۔ دس جماعت پرائیویٹ۔" وہ بولی۔

میری قوت فیصلہ مفلوج ہو چکی تھی۔ میرا ضمیر مجھے اجازت نہیں دیتا تھا کہ میں اس لڑکی کو حالات کے سپرد کر کے بھاگ جاؤں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ اپنے دشمنوں کے مقابلے میں کتنی کمزور ہے

لیکن یہاں رک کر بھی میں اس کی مدد کرتا تو خود پھنس جاتا۔ یہ بھی مشکل نظر آتا تھا کہ میں اسے عقل سے کام لینے کو اور صبر کرنے کو کہوں۔ جو زندہ رہنا ہی نہ چاہتا ہو اور جس کے لیے زندگی کا مفہوم ہی کچھ نہ ہو اسے زندہ رہنے کی تلقین کرنا بے سود تھا۔ وہ طے کر چکی تھی کہ اپنا انتقام خود لے گی اور اسے احساس ہی نہ تھا کہ مارنے کے بعد مر جانا آسان ہو تو وہ کیا کرے گی۔ اس کے لیے والدین کی بے گور و کفن لاشوں کو چھوڑ کر جانے کا تصور بھی محال تھا۔ میرے دماغ میں الجھن بڑھتی جا رہی تھی اور وقت گزرتا جا رہا تھا۔

"یہ لو۔" میں نے ریوالور آگے بڑھا کے کہا۔ "تمہیں معلوم ہے یہ کس کام آتا ہے؟"

"ہاں۔" اس نے ریوالور کو اپنے ہاتھ میں لے کر تولا اور الٹ پلٹ کر دیکھا۔ "اسی کی ضرورت تھی مجھے۔"

"تمہیں چلانا آتا ہے؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔

"نہیں مگر جانے سے پہلے یہ بتا دو کہ کوئی میرے قریب آئے تو میں کیا کروں؟" وہ بولی۔

"جب یہ تمہارے ہاتھ میں ہوگا تو تمہارے قریب آنے کی جرأت کوئی نہیں کرے گا۔" میں نے کہا۔ "اور اتنے کم وقت میں تمہارا نشانہ اچھا نہیں ہو سکتا۔ تم یہ کر سکتی ہو کہ انہیں نزدیک آنے دو۔ اگر وہ بالکل تمہارے سامنے ہوں تو تم ایک گولی سے ایک جان لے سکتی ہو۔ اس میں چھ گولیاں ہیں۔ یوں پکڑو اسے...... ایسے۔"

"مجھے تو اپنا بدلہ صرف ایک آدمی سے لینا ہے۔" وہ بولی۔ "لیکن جیسے میرے والدین صرف اس لیے مارے گئے کہ میں ان کی بیٹی تھی، ویسے ہی اس کے ماں باپ کو بھی مرنا ہوگا صرف اس لیے کہ وہ اس شیطان کو جنم دینے کے ذمے دار تھے۔" میں نے سیفٹی کیچ ہٹا کے گلابو کو سمجھایا کہ اب گولی چلانے کے لیے اس کا صرف ٹرائیگر دبانا ہوگا۔ میرا ذہن ماؤف ہو رہا تھا اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس مظلوم لڑکی کے لیے کیا کروں۔ اس کی مدد کرنا جائز ہوگا یا نہیں، قانونی ہوگا یا غیر قانونی، اس کی حوصلہ افزائی بہتر ہوگی یا حوصلہ شکنی۔ اگر اس نے تین قتل کیے تو کیا میں بھی جرم میں اعانت کا مرتکب ٹھہروں گا؛ کس کی نظر میں؟ قانون کی نظر میں یا خود اپنی نظر میں؟

اچانک میں نے اس کی کلائی پکڑ لی۔ باہر سے مجھے دھیمے لہجے میں بات کرنے والوں کی آواز سنائی دی تھی۔ بھاگتے ہوئے قدموں کی چاپ الگ تھی جو نزدیک ہو رہی تھی۔ غالباً شکست خوردہ سپاہ کا ذلیل کا انتقام لینے کے لیے دوسرا لشکر بھیجا گیا تھا جو بہت بڑا اور زیادہ اسلحے سے لیس تھا۔ میں نے گلابو کو اپنے ساتھ کھینچا اور باہر بھاگا۔ گلابو نے تھوڑا سا احتجاج کیا اور کچھ مزاحمت بھی کی لیکن خود کو بے بس پا کر ہتھیار ڈال دیے۔ میں اسے کندھے پر ڈال کے بھی دوڑ لگا سکتا تھا۔

باہر آتے ہی قریب آنے والوں کی آوازوں کا ملا جلا شور زیادہ واضح ہو گیا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا اور ایک درخت کے سوا مجھے کوئی جائے پناہ نظر نہ آئی۔ "اوپر چڑھ سکتی ہو؟" میں نے کہا۔ "یہ لوگ ادھر سے ہی گزریں گے۔ تم ایک ایک کو دیکھ کر پہچان لو گی۔ بس مجھے بتا دینا۔" درخت پر چڑھنے کی مجھے بھی زیادہ مشق نہ تھی۔ میں اسے اوپر کیسے لے جاتا۔ میری بات کا مطلب اس نے یہ لیا کہ شناخت اور نشاندہی کے بعد ہر مجرم کو میں خود شوٹ کر دوں گا۔ یہ چال مؤثر ثابت ہوئی ورنہ میرے لیے اس کا بوجھ اٹھا کے یہ کارنامہ سرانجام دینا ناممکن ہوتا۔ کسی جوان اور صحت مند، مچلتی اور مزاحمت کرتی ہوئی لڑکی کو گھسیٹ کر بھاگا تو جا سکتا ہے۔ عموداً سفر نہیں کیا جا سکتا۔

وہ گاؤں کی آزاد فضاؤں کی پروردہ لڑکی تھی جس کا بچپن اسی طرح درختوں پر اترنے چڑھنے گزرا ہوگا۔ کبھی گھونسلوں میں جھانکنے کے لیے تو کبھی کچے آم توڑنے کے لیے۔ وہ بڑی پھرتی سے اوپر چڑھ گئی اور اس نے مجھے مشکل میں دیکھا تو اپنا ہاتھ نیچے بڑھا کے مجھے کھینچنے کے لیے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ زمین کی سطح سے دس گیارہ فٹ کی بلندی پر میں نے اس کے ساتھ ایک شاخ پر بسیرا کیا جو تنے کا ایک مضبوط بازو تھی۔ باقی دو بازو مختلف سمتوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ ابھی میں نے ٹھیک سے سانس بھی نہیں لیا تھا کہ چند قدم کے فاصلے پر وہ لوگ نمودار ہوئے۔ وہ سب ایک کے پیچھے ایک دوڑ رہے تھے اور ان سب کے کندھوں پر لاٹھیاں اور کلہاڑیاں تھیں۔

"اتنی جلدی وہ بھاگ کر نہیں جائے گا۔" کسی نے کہا۔ "تم چاروں طرف پھیل جاؤ۔"

"وہ گھر میں ہی ہوگا۔" کسی اور نے تائید کی۔ وہ ذرا سی دیر کے لیے رکے۔ ان میں سے ایک کو میں نے پہچان لیا۔

"ہاں، گلابو بھی تو اکیلی ہی ہوگی، نا گھر میں۔" کسی کے غلیظ ذہن کی بات زبان پر آ گئی۔

میں اور گلابو دم سادھے بیٹھے رہے۔ وہ کچا مکان مشکل سے پچاس فٹ کے فاصلے پر تھا جس کے مکین زندگی کی آخری جنگ میں شکست کو اپنا مقدر سمجھ کے قبول کر چکے تھے اور مقابلے سے دستبردار ہو چکے تھے۔ فاتحین نے مکان کو ہر طرف سے گھیر لیا تھا اور میرے اندازے کے مطابق ان کی تعداد بارہ تھی۔ ان میں دو عین درخت کے نیچے کھڑے محض ہدایات دے رہے تھے۔ اس خون آشام فوج کی قیادت خود بخود اس شخص کے ہاتھ میں آ گئی تھی جو گلابو کے باپ کو قتل کر کے بچ نکلنے میں کامیاب ہوا تھا۔ گولی چلنے کی آواز آئی تو میں اچھل پڑا۔ گلابو نے ایک دشمن کا کام تمام کر دیا تھا لیکن مرنے والا

اس کے باپ کا قاتل نہیں تھا۔ اس کو دوسری گولی نے ختم کیا۔ دونوں گولیاں چند فٹ کی بلندی سے ان کے سروں میں پیوست ہوگئیں۔

کچھ پوچھنے کا وقت ہی نہیں رہا تھا۔ میں نے گلابو سمیت نیچے چھلانگ ماری۔ وہ میرے اوپر گری اور میرے اٹھنے سے پہلے ہی بھاگ کھڑی ہوئی۔ میں اس کے پیچھے لپکا۔ وہ اپنے گھر سے دور بستی کی جانب دوڑ رہی تھی۔ وہ ان کچے راستوں کے نشیب و فراز اور پیچ و خم سے آشنا تھی، اور کوئی نازک اندام شہری لڑکی نہیں تھی۔ عام حالات میں اس کو پکڑنا دشوار نہ ہوتا لیکن میرے لیے بہت سی مشکلات تھیں۔ رات کا اندھیرا، ناہموار راستے، کنکر، پتھر اور ریشمی لاچا، جو میں نے پہلے کبھی نہیں باندھا تھا۔ کم سے کم کسی دیہاتی لڑکی سے نصف شب کو کھلے کھیتوں کے درمیان ریس لگانے کے لیے ہرگز نہیں۔ وہ شلوار میں تھی اور زیادہ آسانی کے ساتھ بھاگ سکتی تھی۔ میں بھی شلوار یا پتلون میں ہوتا تو ریس چند قدم کے بعد ختم ہو جاتی مگر اناڑی پن میں کس کر باندھے ہوئے لاچے نے مجھے لمبی چھلانگ لگانے سے روک دیا تھا۔ میں اسے آواز بھی نہیں دے سکتا تھا۔ دو گولیوں کی آواز نے سب حملہ آوروں کو متوجہ کر لیا ہوگا۔ ان پر پہلا انکشاف یہ ہوا ہوگا کہ وہ گھر اب قبرستان ہے جسے وہ تہس نہس کرنے کے لیے زیادہ تیاری کے ساتھ آئے تھے۔

دوسرا انکشاف مایوس کن ہوگا کہ اصل دشمن تو بھاگ گیا، جس نے ان کی کامیابی کو ناقابلِ تصور ناکامی میں بدل دیا تھا اور وہ جاتے جاتے گلابو کو بھی نکال لے گیا لیکن گولیوں کی آواز سن کے وہ دوڑے ہوں گے تو تیسرا اور آخری لرزہ خیز انکشاف ان پر یہ ہوا ہوگا کہ جن کو وہ گھر کے اندر تلاش کر رہے تھے وہ گھر کے باہر موجود تھے۔ وہ پہلے ہی طے کر چکے ہوں گے کہ حلیے سے ملنگ نظر آنے والا کوئی خطرناک مجرم تھا، شاید کسی جیل سے بھاگنے والا۔ درخت کے نیچے خاک و خون میں غلطاں لاشوں کو دیکھ کر شبہے کی کوئی گنجائش ہی نہ رہی ہوگی۔ گاؤں میں ریوالور تھانیدار، نمبردار یا زمیندار کے سوا کس کے پاس ہوتا ہے۔ گلابو کے لیے تو وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ یہ دونوں قتل اس نے ریوالور سے دو گولیاں چلا کے کیے ہوں گے۔

اگر میں گلابو کو آواز دیتا تو وہ سن لیتے اور انھیں معلوم ہو جاتا کہ ہم کس طرف فرار ہوئے ہیں۔ گلابو اچانک رک گئی۔ اس کے اور میرے درمیان اس وقت مشکل سے دس فٹ کا فاصلہ تھا۔

"آگے مت آنا ویرا!" اس نے دونوں ہاتھوں میں ریوالور مضبوطی سے پکڑ کے اس کا رخ میری طرف کر دیا۔ "پہلے میں نے تم کو قرآن کا واسطہ دیا تھا۔ اب اس رشتے کا واسطہ دے رہی ہوں کہ لوٹ جاؤ۔ بہن کو مجبور نہ کرو کہ بھائی پر گولی چلائے۔"

بالکل غیر ارادی طور پر میں نے اپنے ہاتھ اٹھا دیے تھے اور اپنی جگہ منجمد ہو گیا۔

"کیا تم پاگل ہو گئی ہو گلابو؟" میں نے کہا۔ یہ سوال بھی غیر ارادی تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ پاگل ہو چکی ہے۔

"ہاں، تم چاہو تو مجھے پاگل سمجھ سکتے ہو۔" وہ بولی۔ "لیکن مجھے معلوم ہے میں کیا کر رہی ہوں۔"

"تم... تمھیں اندازہ ہونا چاہیے کہ وہ لوگ ہمارے پیچھے آ رہے ہوں گے۔" میں نے کہا۔

"ہاں، اسی لیے میں دیر نہیں کرنا چاہتی۔"

"تم نے بہت جلدی کی گلابو!" میں نے کہا۔ "مجھے احساس ہو رہا ہے کہ یہ قاتل کھلونا میں نے نادان ہاتھوں میں دے دیا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ تم اپنی عزت کی حفاظت آخری وقت تک کر سکو اور جب دیکھو کہ اب آبرو پر جان قربان کرنے کے سوا کوئی صورت نہیں رہی تو آخری گولی خود پر چلا کے انھیں آخری شکست دے دینا، جو اب تک فتح مندی کے غرور میں بدمست ہیں لیکن تم نے ایک گولی کا ناجائز استعمال کیا۔ ایک تو تمھارے باپ کا قاتل تھا لیکن دوسرا اس سزا کا مستحق نہیں تھا۔ وہ مجرم تھا اور دشمنوں کے ساتھ تھا لیکن سزائے موت...!"

"وہ بھی سانپ تھا۔ ایک بار مجھے ڈس چکا ہے۔" گلابو نے کہا۔ "وہ گاؤں کا سب سے بڑا بدمعاش کہلاتا تھا۔ وہ تین لڑکیوں کے خون کا ذمے دار تھا۔ ایک نے خودکشی کر لی تھی۔ دوسری کا آج تک پتا نہیں چلا۔ انھوں نے تو یہ مشہور کیا تھا کہ وہ آوارہ تھی، گھر سے بھاگ گئی لیکن میری طرح اور بھی بہت سے لوگ جانتے ہیں کہ وہ اسی شخص کے پیچھے مٹی ہو چکی ہے۔" اس نے چاروں طرف پھیلے ہوئے کھیتوں اور ویران جنگل کی طرف ہاتھ لہرا کے اشارہ کیا۔ میں موقعے کی تاک میں تھا۔ اس نے ریوالور کا رخ بدلا ہی تھا کہ میں نے جست لگا کے اسے دبوچنا چاہا لیکن وہ بے حد ہوشیار، چالاک اور پھرتیلی ثابت ہوئی۔ اس نے مخالف سمت میں چھلانگ لگائی اور مجھے سخت خفت اٹھانی پڑی۔ وہ پھر مجھ سے چند قدم دور اسی طرح ریوالور کے ٹریگر پر انگلی رکھے موجود تھی۔ فرق صرف پوزیشن کا پڑا تھا۔ جہاں پہلے میں تھا وہاں گلابو تھی اور گلابو کی جگہ میں احمقوں کی طرح کھڑا تھا۔

"تیسری لڑکی سے تم مل سکتے ہو۔" وہ بولی۔ "وہ میری سب سے عزیز سہیلی تھی۔" گلابو نے اپنی بات جاری رکھی۔ "اس گاؤں سے باہر ایک قبرستان ہے جو ندی تک پھیلا ہوا ہے۔ اس میں سفید جالی کے گنبد والا مزار پیر علمدار شاہ کا ہے۔ جو وہاں ایک چلہ کاٹ لے اس کی من کی مراد پوری ہوتی ہے۔ وہ دو سال سے وہیں ہے۔ تم اسے دیکھو گے تو پہچان لو گے۔ وہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھی رہتی ہے یا پڑی رہتی ہے اور اس کے جسم پر مٹی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ سخت گرمی اور سخت سردی کے موسم میں بھی کسی نے اسے کپڑوں میں نہیں دیکھا۔

اگر تم ترس کھا کے اس پر چادر یا کمبل ڈالنے کی کوشش کرو گے تو وہ چلانے لگے گی اور تم سے کہے گی کہ گھر لے جا یہ کفن۔ تیری ماں اور بہن کو بھی تو کپڑوں کی ضرورت ہے۔ بہت لمبا چلہ ہو گیا ہے اس کا لیکن ابھی تک اس بے چاری کی مراد پوری نہیں ہوئی۔ معلوم نہیں وہ کیا مانگنے گئی تھی اور کس امید پر زندہ ہے۔ انھیں تو نہ شرم آتی ہے نہ موت، جو اس کی یہ حالت بنا کے بھی سینہ تانے پھر رہے ہیں۔ اگر یہ کھلونا اس کے پاس ہوتا تو دو سال پہلے ہی وہ سارے عذاب سے چھٹکارا پا لیتی اور جو کام میں نے آج کیا وہ خود کر لیتی۔"

اپنی ذہنی کیفیت کے اعتبار سے گلابو بھی دیوانگی کی سرحد پر کھڑی تھی۔ میں نے اسے ریوالور نہ دیا ہوتا تو شاید گاؤں والے دیکھتے کہ پیر علمدار شاہ کے مزار پر فریاد کرنے والے سائل دو ہو گئے ہیں۔ دونوں کا سوم گزیدہ وجود ایک ہے۔ ان پر کھلے ہوئے زخموں کے پھول ایک ہیں۔ دونوں کا دکھ ایک ہے اور دیوانگی کا سبب ایک ہے اور یہ دونوں بے لباس وجود آدمیت کا وہ اشتہار ہے جسے پڑھ کے آدمی کو اپنے آدمی ہونے پر شرم آتی ہے لیکن ریوالور ہاتھ میں آ جانے سے اس کا ذہن بھٹکنے سے بچ گیا تھا اور وہ خود انسانیت کا تماشا بننے سے بچ گئی تھی لیکن اس کی سوچ کے کچھ دروازے بند ہو گئے تھے۔ اب اسے دکھ نہیں تھا کہ بیمار ماں کو اس کے باپ نے گلا گھونٹ کر مار ڈالا۔ اسے فکر نہیں تھی کہ اس کی ماں کا جنازہ کون اٹھائے گا۔ باپ کو لوگ کیا کہیں گے اور وہ مرنے کے بعد بھی رسوا ہوں گے یا نہیں۔ اسے اپنے انجام کی بھی پروا نہیں تھی۔ صرف ایک خیال نے ذہنی و جسمانی طور پر اسے مغلوب کر لیا تھا، اس حد تک کہ وہ دکھ کے احساس سے بھی نجات پا چکی تھی اور بالکل خوفزدہ نہ تھی۔ پہلے اس کی خواہش تھی لیکن اب اس کے ہاتھ میں ریوالور آ گیا تھا تو اسے پانچ گولیوں سے ان درندوں کا خاتمہ آسان نظر آنے لگا تھا جن کی سفاکی اور بربریت نے کئی گھر اجاڑے تھے، عصمتوں کے چراغ گل کیے تھے اور زندگیوں کے نذرانے لیے تھے۔ وہ سب کا خون بہا لے سکتی تھی اور کم سے کم پانچ مجرموں کے وجود کو ختم کر سکتی تھی۔ چھٹی گولی اس نے اپنے مشن کی تکمیل کے بعد باعزت طور پر فتح مندی کے غرور کے ساتھ اور کامیابی کی سرخروئی کے ساتھ دنیا سے چلے جانے کے لیے رکھی تھی۔

دو مجرم اور گناہ گار اپنے انجام کو پہنچ چکے تھے۔ باقی تین کون تھے، یہ وہ خود بتا چکی تھی۔ ایک وہ سانپ تھا، جو گلابو کے والدین کو مار دینے کے بعد بھی اس کے سامنے پھن پھیلائے موجود تھا۔ دوسرے وہ مرد اور عورت تھے جنھوں نے اس سنپولیے کو دودھ پلا کے بڑا کیا تھا۔ اپنی تربیت سے اس کی سرشت میں بدی شامل کی۔ اسے ڈسنا سکھایا اور اس کے خون میں زہر بھرا۔ عقل کتنی تھی کہ بیٹے کی بدی

کی سزا والدین کو نہیں ملنی چاہیے لیکن یہ فیصلہ میری عقل کا تھا۔ گلابو کی عقل کا فیصلہ اس کے برعکس تھا۔ اگر میری وجہ سے میرے والدین کو قتل کیا جا سکتا ہے تو اس کی وجہ سے اس کے والدین کو قتل کرنا بھی بالکل جائز ہے، ضروری ہے اور منطقی ہے۔ میں اب پچھتا رہا تھا کہ میں نے جذباتی ہو کے اس کے ہاتھ میں ریوالور کیوں دیا۔ اب نہ میں اس کا فیصلہ بدل سکتا تھا اور نہ اس سے ریوالور چھین سکتا تھا۔ مجھے سو فیصد یقین تھا کہ میں نے کوشش کی تو وہ گولی چلانے سے دریغ نہیں کرے گی۔ سو وہ اپنے مقصد کی راہ میں حائل ہونے والے ہر شخص کو بلا مذہب مار ڈالے گی اور اسے کوئی افسوس نہیں ہوگا۔ میں نے آخری بار اس لڑکی کو دیکھا جو بغاوت اور سرکشی، انتقام اور مایوسی کی انتہا کو پہنچ کر اور صنفِ جنس کی قوتِ برداشت ختم ہو جانے کے بعد ایک تباہ کن قوت بن گئی تھی۔ اس ایٹم بم کی طرح جس میں فیوز لگا دیا گیا ہو اور جسے اب کوئی پھٹنے سے نہ روک سکتا ہو۔

"اچھا گلابو، میں جا رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "کیونکہ تمہیں میری مدد کی ضرورت نہیں رہی۔ میری دعا ہے کہ اچھا ہو یا برا لیکن وہی ہو جو تم چاہتی ہو۔" وہ سپاٹ نظروں سے مجھے دیکھتی رہی اور میں پلٹ گیا۔ آہستہ آہستہ میں اپنے اندازے کے مطابق سڑک کی طرف چلنے لگا۔ تقریباً بیس قدم جانے کے بعد میں نے گھوم کر دیکھا تو وہ اسی پوزیشن میں ریوالور لیے کھڑی تھی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے خیال آیا کہ میں اسے ڈاج کر جاؤں اور چکر کاٹ کے اسے پکڑنے کی کوشش کروں۔ اتنی دوری سے اس کا نشانہ خطا ہو جانے کے امکانات بہت زیادہ تھے لیکن پھر میں نے طے کیا کہ مجھے چلتے رہنا چاہیے۔ اس کی ایک گولی ضائع کرنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ اس کا مر جانا ہی بہتر ہے۔ وہ زندہ رہے گی تو روح اور جسم کی طویل اور ناقابلِ برداشت اذیت اٹھانے کے بعد پیر علمدار شاہ کے مزار پر اس حالت میں پہنچے گی جس حالت میں آج اس کی سہیلی ہے۔

میں نے پلٹ کر آخری بار اسے دیکھا اور ہاتھ ہلایا۔ خدا حافظ میری بہن۔ چند گھنٹوں کا یہ مقدس رشتہ ختم ہوا۔ اب ہم میدانِ حشر میں پھر ملیں گے۔ اس سے پہلے میں کبھی ادھر نہیں آؤں گا۔ نہ کبھی تیری بے نشاں قبر تلاش کرنے۔ نہ پیر علمدار شاہ کے مزار پر تیری ناکامی کی سزا کا تماشا دیکھنے۔ اوپر آسمان پہ صبح کا ستارہ چمکنے لگا تھا لیکن آج اس کی چمک ماند تھی۔ اس کی ہر کرن اداس تھی۔ بہت دور رابعہ بھی جاگ رہی ہوگی اور شاید اس کی نظر میں بھی یہی ستارہ ہوگا۔ وہ امید کی کوئی کرن تلاش کر رہی ہوگی۔ میرے پیچھے چھ لاشیں پڑی تھیں۔ دو کی بے نور آنکھیں اس ستارے کی روشن کرن میں گم نظر آتی ہوں گی۔ تیسری لاش ایک عورت کی تھی۔ میرے آنے سے پہلے اسے یقین ہوگا کہ ابھی وہ کچھ دن اور جیے گی۔ ایک لاش کا سر تن سے جدا پڑا تھا۔ دوسری لاش کو کلہاڑی کی ایک ضرب نے دو نیم کر دیا تھا۔ صبح ابھی بہت دور تھی۔ اس سے پہلے فرشتہ اجل کو یکے بعد دیگرے چار افراد کی کتابِ زندگی کے آخری صفحے پر لکھنا ہے THE END ۔ اس کو بالکل غرض نہیں کہ انجام اچھا تھا یا برا، فلم اچھی تھی یا بری، ختم ہوئی اور اب جس کا جو دل چاہے کہے۔

میں نے اچانک خود کو ایک شکستہ چار دیواری کے مقابل پایا۔ یہ شہرِ خموشاں کی فصیل تھی۔ تین ساڑھے تین فٹ اونچی پختہ اینٹوں اور گارے کی دیوار پرانی ہونے کی وجہ سے ٹوٹ رہی تھی اور اس میں جگہ جگہ شگاف پڑ گئے تھے۔ میں نے دور تک پھیلی ہوئی قبروں پر نگاہ ڈالی۔ ان میں کچی اور پکی قبروں کے فرق کے علاوہ جو بات غیر معمولی لگی تھی وہ جگہ جگہ نظر آنے والے اونچے نیچے حجروں اور چار دیواری والے سکوں کی موجودگی تھی۔ اس وقت میں دیکھ سکتا تھا کہ کئی جگہ گنبد بھی ہیں جن پر مختلف وضع اور سائز کے جھنڈے لگا دیے گئے ہیں۔ جھنڈے مجھے درختوں میں بھی نظر آ رہے تھے جو قبرستان میں بہت کم تھے۔ کچھ کو لوگوں نے پیر بنا دیا تھا، کچھ خود ساختہ پیر تھے۔ آدمی کی ضعیف الاعتقادی کے نشان، خدا کے علاوہ بھی کسی سے سہارا پانے کی آرزو کے مظہر اور کوشش کیے بنا محض منت مان کے خواہشات کی تکمیل چاہنے والوں کی بے چارگی کا ثبوت۔ اللہ نے تو کہا ہے کہ جس نے کوشش کی تو بلاشک اسے ملا۔

سفید جالی دار گنبد میرے ذہن میں تھا۔ میرے قدم مسمار یا ہموار ہو جانے والی قبروں کو بچاتے آگے بڑھنے لگے۔ گنبد بہت نمایاں تھا لیکن ایک درخت کی پھیلی ہوئی شاخوں کے باعث میری نگاہ سے اوجھل تھا۔ صبحِ کاذب کا اجالا پھیلنے لگا تھا۔ میں مزار کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ ایک موڑ کاٹتے ہی میں نے اسے دیکھ لیا جس کی خاطر گلابو نے پہلی گولی چلائی تھی۔ انسانیت کا وہ لوتھڑا جو انسان کی دنیا سے الگ موؤں سے بدتر حالت میں فرشِ خاک پر پڑا تھا۔ میں نے اسے صرف ایک بار دیکھا۔ شرم، کراہت اور نفرت کے جذبات نے مجھے منہ پھیر کر گزر جانے پر مجبور کر دیا۔ میں نے پہلے کبھی اپنے انسان ہونے پر ندامت محسوس نہیں کی تھی لیکن اس وقت ایک لمحے کے لیے مجھے شرم آئی کہ اشرف المخلوقات کیا اسی عورت کا نام ہے جسے میں نے دیکھا تھا اور میرے جیسے انسانوں نے ننگِ انسانیت بنا دیا تھا۔

میں قبرستان کی دیوار پہ بیٹھ گیا۔ صبح ہونے میں ابھی دیر تھی اور میں بہت تھک گیا تھا۔ لاہور سے روانہ ہوتے وقت میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ میرا سفر اپنی منزل تک پہنچنے سے پہلے ختم ہوا تو یوں ہوگا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ کوئی مجھے شناخت کرے اور دھوکے

سے پولیس کے حوالے کر دے یا خود پولیس مجھے گرفتار کرے لیکن رات گزارنے کے لیے ایک در پر صدا دینا مجھے بہت مہنگا پڑا تھا۔ یہ سب کچھ منجانب اللہ تھا۔ میں نہ آتا تب بھی وہ ضرور ہوتا جو نوشتۂ تقدیر تھا۔ آج کی رات کا سورج طلوع ہونے سے پہلے گلابو کو، اس کے ماں باپ کو اور نہ جانے کس کس کو موت کی سرحد عبور کر جانے والے قافلے میں شامل ہونا تھا لیکن کتنا اچھا ہوتا اگر میں ادھر کا رخ نہ کرتا اور یہ سب نہ دیکھتا۔ خدا کی ہر سمت پھیلی ہوئی زمین پر ہر لمحہ ایسے ہی واقعات پیش آتے رہتے ہیں۔ خوش نصیب ہیں وہ جو آدمی کو درندہ بن کے انسانیت کی لاش نوچتے نہیں دیکھتے۔ اب آئندہ جب بھی میں پیچھے مڑ کر دیکھوں گا تو مجھے اس شب کے واقعات کی یاد کا عذاب نئے سرے سے برداشت کرنا ہوگا اور ان مناظر کو فراموش کرنا میرے لیے ممکن نہ ہوگا جو میرے تصور میں تصویر بن کے زندہ رہیں گے۔

گولی چلنے کی ایک آواز نے میرے خیالات کا تسلسل توڑ دیا۔ دوسری اور پھر تیسری آواز رات کے سینے میں خنجر کی طرح پیوست ہو گئی۔ میں سانس روکے گوش بر آواز نہ جانے کتنی دیر بیٹھا رہا۔ افق پر صبحِ صادق کی روشنی پھوٹی۔ آسمان کا آخری کنارا دہکنے لگا اور سورج کا خونی گولا طلوع ہوا۔ نادیدہ مناظر کا تصور کرنے کی ساری کوشش بے مصرف ثابت ہوئی۔ پہلی گولی کی صدا کا کوئی منظر سامنے نہ آیا۔ کیسے اس لڑکی نے دشمن کے قلعے میں داخل ہو کے کہا ہوگا کہ سنو، میں یتیم اور لاوارث گلابو ہوں۔ میں اتنی خوبصورت تھی کہ تمہارے ہوس پرست بیٹے نے میرے جسم کی خاطر دو جسموں کی دیوار گرا دی۔ وہ دونوں جسم میرے والدین کے تھے جنہوں نے مجھے بڑے ارمانوں سے اور بڑی محبت سے پالا اور بڑا کیا تھا۔ اس لیے نہیں کہ وہ تمہارے بیٹے کی ہوس پر قربان ہو۔ وہ چاہتے تھے کہ میرا گھر بسے اور میں اس گھر میں سکھی رہوں، آباد ہوں۔ ان کو نواسے اور نواسیاں دوں لیکن ان کے مقدر کی خوشی اور ان کے خواب تمہارے بیٹے نے قتل کر دیے۔ تم نے ایسے شیطان کو جنم دینے کا گناہ کیا تھا اس لیے میں تمہیں سزائے موت دیتی ہوں۔ کل دیکھنے والے دیکھیں گے کہ میرے والدین اور تمہارے فرعون صفت شیطان بیٹے کے ماں باپ ایک ہی زمین میں دفن ہوئے اور ان کے جنازے ایک ساتھ اٹھے اور وہ کتنے حیران ہوں گے کہ فرشتۂ اجل گلابو جیسی لڑکی بن کے بھی آتا ہے۔

پھر تیسری گولی تھی جو ایک تصویر پیش کرتی تھی تمام قاتلوں کا قاتل، اپنی طاقت اور برتری کے غرور میں سرشار، خود کو سب کا ان داتا، سب کی جان و آبرو کا مالک اور ایک ناقابلِ تسخیر قوت سمجھنے والا ابھی اپنے لہو میں غرق۔ محض ایک بے جان لاشہ۔ ایک عام ذی کمپوز ہو جانے والا جسم بننا پڑا تھا۔ اس کا نامۂ اعمال یومِ حشر تک کے لیے لپیٹ دیا گیا تھا کہ دنیاوی سزا ختم ہوئی لیکن آخرت کا عذاب باقی ہے۔ اس نے سمجھا ہوگا کہ وہ ایک بھیانک خواب دیکھ رہا ہے۔ اس کے دو نمک خوار تو ایک حسنگ کی دیوانگی کے سبب مارے گئے لیکن وہ عظیم سیاہ کماں گئی جو پہلی ہزیمت کا بدلہ لینے کے لیے ارسال کی گئی تھی۔ خنجر، لوکا یا کلہاڑی کا تصور تو کیا جا سکتا تھا مگر گلابو کو یہ ریوالور کس نے تھما دیا؟ اسی فقیر نے؟ مگر فقیر بھی ریوالور تو نہیں لیے پھرتے۔ وہ ڈاکو ہوتے ہیں اور ڈاکو بھیس بدل کے کہیں پناہ لینے نہیں آتے اور کوئی ڈاکا ڈالے بغیر لوٹ کر نہیں جاتے۔ اپنا ریوالور کسی گلابو کے سپرد نہیں کرتے۔ شاید اس نے زندگی کی بھیک مانگی ہوگی۔ موت کو اپنے قریب دیکھ کر سارے گناہوں سے توبہ کی ہوگی۔ آئندہ کے لیے برائی سے تائب ہونے کا وعدہ کیا ہوگا۔ اپنے ہاتھ جوڑے ہوں گے، خدا رسولؐ کا واسطہ دیا ہوگا اور جب گلابو کے ٹرائیگر دباتے ہی گولی اس کے دل میں اتر گئی ہوگی یا اس کے سر کو پاش پاش کر چکی ہوگی تب بھی اس کی حیرت کم نہیں ہوئی ہوگی۔ ریوالور دینے والے نے گلابو کو ریوالور چلانا بھی سکھا دیا اور یہ حقیقت ہے کہ وہ مجھے گولی مار چکی ہے۔ ممکن ہے اسے حیران یا پشیمان ہونے کی مہلت ہی نہ ملی ہو۔

لیکن ریوالور میں ابھی ایک گولی باقی تھی۔ وہ آخری گولی جو گلابو کی باعزت موت کی ضامن تھی، وہ ابھی تک ریوالور سے کیوں نہیں نکلی۔ گلابو بے غیرت نہیں تھی۔ بے غیرت ہوتی تو خود کو بیچ دیتی۔ وہ زندہ رہنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ گلابو بہت پہلے مر چکی تھی۔ وہ لڑکی جو ریوالور لے کر تین افراد کو قتل کرنے گئی تھی، گلابو کے پیکر میں موت تھی۔ وہ بزدل بھی نہیں تھی کہ آخری گولی خود پر چلاتے وقت اس کا حوصلہ جواب دے گیا ہو۔ لیکن رات کا ماتمی سناٹا برقرار تھا اور چوتھی گولی کا منتظر تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وقت ٹھہر گیا ہے، سورج رک گیا ہے۔ آشیانوں سے صبح دم پرواز کر جانے والے پرند بھی آنکھیں کھولے اس صدا کے انتظار میں دبکے پڑے ہیں۔

پھر وہ چوتھی گولی چلنے کی آواز نسیمِ سحر کے ساتھ تیرتی ہوئی مسکراتی ہوئی آئی۔ آ جاؤ، اب تم سب آ کے دیکھ لو کہ میں وہی گلابو ہوں۔ ابھی اتنی ہی خوبصورت اور دلکش جتنی زندگی میں تھی لیکن یاد رکھو تو صرف مجھے یاد رکھنا، جیسی میں تھی یا ہوں۔ اب سے چند دن یا چند ماہ یا چند سال بعد میرا وجود زمین کے نیچے پہچانا بھی نہ جائے گا۔ کون مانے گا کہ اس مٹی کے نیچے کے لیے زمین پر کتنا خون بہا تھا۔ میں اچانک ہوش میں آ گیا۔ دل کو ایک قرار سا آ گیا تھا کہ چلو میاں مسافر، ایک شب کا قیام تھا سو وہ شب بیت گئی۔ اب اپنی زندگی ہے اور اسی زندگی کے مرحلے ہیں۔ یہاں تو نہ اب کوئی ظالم ہے نہ مظلوم۔ نہ مدعی نہ مدعا علیہ۔

کون کس کا قاتل ہے اور کس نے کس کو کیوں قتل کیا۔ اس بحث میں پڑ کے کیا ملے گا۔ اس رات کو اپنی زندگی سے خارج کر دو۔

میں سڑک کی طرف روانہ ہوا تو میرے ذہن کی کیفیت بہت عجیب تھی۔ میں بیک وقت دکھ کے گھاؤ کی اذیت کلا بو کی زندگی کے المیے اور آدمی کے آغاز و انجام کی جدوجہد کے لیے عبرت آموز انجام پر دل گرفتہ تھا اور بے حد قنوطی ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں پھر اپنے مسائل کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور تھا۔ میری اپنی زندگی خطرات کے جال میں الجھی ہوئی تھی لیکن میں کلا بو نہیں تھا کہ اپنے سارے مسائل کو ایک گولی سے حل کرتا۔ مجھے دمِ آخر تک جدوجہد کو جاری رکھنا تھا اور زندہ رہنا تھا۔ اپنے لیے بھی اور رابعہ کے لیے بھی۔ مجھے سکون اور عقل سے کام لینا تھا اور خیالات کے انتشار سے بچنا تھا۔

میرے قدم ایک میکانکی انداز میں اٹھ رہے تھے اور میں کچے راستوں پر مڑتا، کھیتوں کی منڈیر پر توازن رکھتا، گڑھوں سے اور راہ کی رکاوٹوں سے بچتا سڑک کی جانب بڑھ رہا تھا جو تقریباً دو فرلانگ دُور تھی۔ مجھے دن کے اجالے میں ملتان اور لاہور کی ٹریفک نظر آ رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ میری کار لے کر ملتان جانے والا ڈرائیور ملے گا بھی یا نہیں۔ وہ بہت پریشان ہوا تو صبح کا اجالا پھیلتے ہی چل پڑے گا۔ ایسی صورت میں ممکن ہے وہ لاہور کی جانب چل چکا ہو۔ اگر وہ تھک کر دیر سے سویا تو دیر سے اٹھے گا۔ اس صورت میں مجھے کافی دیر سڑک کے کنارے رک کر ہر آتی جاتی کار کو دیکھنا پڑے گا۔ اتنی دیر تک ایک مصروف شاہراہ پر آنے جانے والوں کی نظروں کے سامنے رہنا بھی پُرخطر تھا۔ کوئی بھی شخص جس کی نظر تیز ہو مجھے بدلے ہوئے حلیے میں بھی پہچان لے گا۔

اچانک میرے قدم رک گئے۔ میں نے نظر اٹھا کے دیکھا تو مجھے اپنے چاروں طرف اجنبی چہرے نظر آئے۔ ان کی دشمن آنکھیں بھری ہوئی تھیں۔ کم سے کم چار افراد دھوپ میں چمکتی دھار والی کلہاڑیاں لیے میرے چاروں طرف موجود تھے۔ درختوں کے پیچھے یا کھیتوں میں کتنے آدمی اور تھے، اس کا اندازہ کرنا ناممکن تھا۔ میں نے اندازہ کیا کہ عمداً صرف چار افراد سامنے آئے ہیں تاکہ میں ان سے نبرد آزما ہو جاؤں تو چھپے ہوئے مددگاروں میں سے کوئی مجھ پر پیچھے سے بے خبری میں حملہ کر دے۔

"کون ہے تُو؟" ان میں سے ایک نے اجڈ اور درشت لہجے میں کہا۔

میں نے فوراً ایک درخت کے تنے سے پشت لگالی۔ "تم کو کیا میں آدمی نظر نہیں آتا؟" میں نے کہا۔

"لیکن تُو اس گاؤں کا نہیں ہے۔" دوسرے نے غرّا کر کہا۔

"ہاں، میں اس گاؤں کا نہیں ہوں۔" میں نے ان کو مطمئن کرنے کے لیے کہا۔ "مسافر ہوں۔"

"مسافر اس راستے سے نہیں گزرتے۔" تیسرے نے کہا۔ "سڑک تو تین میل پیچھے ہے۔ تُو کیا ندی سے گزر کے آیا ہے۔ تیرے تو پاؤں بھی خشک ہیں۔"

"اس سے پوچھو کس گاؤں سے تعلق ہے اس کا؟" چوتھے نے پہلے سے کہا۔ "اور اسے جانا کدھر ہے؟"

اگر یہ سوال کیا جاتا تو میں لاجواب ہو جاتا۔ مجھے تو صرف معلوم تھا کہ میں لاہور کے نواح سے زیادہ دُور نہیں ہوں۔ چنانچہ میں نے سوال کے جواب میں سوال کر کے جان بچائی۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سب پوچھنے کا کیا مقصد ہے؟" میں نے کہا۔ "تم لوگوں نے میرا راستہ کیوں روکا ہے؟ کیا ادھر سے گزرنا منع ہے۔ کچھ چُرا کے لے جا رہا ہوں میں؟"

"ہاں۔" پہلے نے بدمعاشوں جیسے خطرناک لہجے میں کہا۔ "یہ کپڑے کس کے ہیں؟"

"میرے تن پر تم میں سے کسی کے کپڑے نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔ "جیسے تم سب نے اپنے اپنے کپڑے پہن رکھے ہیں۔"

"جھوٹ بکتا ہے تُو، میرے بھائی کے کپڑے ہیں یہ۔" وہ گرج کر بولا۔ "یہ لاچا بھی، کُرتا بھی اور تیری یہ پگڑی بھی۔ یہ چنیم میرے بھائی کی ہے۔"

صورتِ حال یکلخت خطرناک ہو گئی تھی۔ "کیا ان پر تمھارے بھائی کا نام لکھا ہوا ہے؟" میں نے بھی سخت لہجہ اختیار کیا۔ "اس نے پر بنوایا تھا اس نے یہ کپڑا؟ ایسا کپڑا بازار میں نہیں ملتا؟ کوئی نہیں خرید سکتا؟"

دوسرے نے ایک دم کلہاڑی اٹھالی۔ "سیدھی طرح بتا ورنہ...!"

"ورنہ کیا، تم ان کپڑوں کی خاطر مجھے قتل کر دو گے؟" میں نے بے خوف رہنے کی کوشش کی۔

"ہاں ہاں، میں قتل کر دوں گا تجھے۔" پہلا شخص چلایا۔ "اس لیے کہ کسی نے انہی کپڑوں کے لیے میرے بھائی کو قتل کر دیا ہے۔"

اس اطلاع سے مجھے افسوس ہوا کہ جو شخص بے ہوش تھا وہ بھی مر چکا ہے۔ میں نے زور سے اِناللہ پڑھا۔

"ایسے دو کپڑوں کی خاطر؟" میں نے بے یقینی سے کہا۔ "یہاں ایسا بھی ہوتا ہے؟ تم لوگ کر سکتے ہو ایسا؟"

"ہم نہیں کر سکتے مگر تُو نے سوانگ بھرنے کے لیے کیا۔" وہ بولا۔ "جب تُو کل رات آیا تھا۔ تو ملنگ کے حلیے میں تھا۔ تیرے گلے میں موٹے رنگین منکوں کی مالا تھی اور تُو نے کالا چولا پہن رکھا تھا۔ وہ تُو نے لاش کے اوپر ڈال دیا۔" اس نے پھر کلہاڑی اٹھالی۔ "ہم تجھے تلاش کر رہے تھے۔"

"ٹھہرو، پہلے میری بات سُن لو۔" میں نے کہا۔ "پھر تم چاہو تو مجھے مار دینا۔ تمھارے پاس کلہاڑیاں ہیں اور میں خالی ہاتھ ہوں۔ میں تمھارا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں اس گاؤں کا رہنے والا ہوں نہ آس پاس کے کسی گاؤں کا۔ میں لاہور میں رہتا ہوں اور پڑھا لکھا آدمی ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ تم کس ملنگ کی بات کر رہے ہو۔ میری تو گاڑی خراب ہوئی تھی۔ گاڑی کا مطلب بیل گاڑی نہیں، کار ہے۔ میرا ڈرائیور کار کو مرمت کے لیے لے گیا ہے اور واپس آتا ہی ہو گا۔ تم میرے ساتھ سڑک تک چلو اور اس کی واپسی تک ٹھہرو تو تمھیں خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں یا سچ۔ صرف وقت گزارنے کے لیے ذرا کھیتوں میں سیر کرنے آگیا تھا۔"

"پھر تُو نے جھوٹ کیوں بولا تھا کہ تو مسافر ہے؟" چوتھا ذرا بدلے ہوئے لہجے میں بولا۔ میری بات نے انھیں نفسیاتی طور پر متاثر کیا تھا۔ ان کے خطرناک جارحانہ تیور تو بدل گئے تھے لیکن ابھی تک انھوں نے میری بات کا پوری طرح یقین نہیں کیا تھا۔ باقی تین بھی مجھے غور سے دیکھ کر طے کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ کیا کاروں والے ایسے ہوتے ہیں؟

"جھوٹ کیا تھا اس میں؟" میں نے ماتھے پر بل ڈال کے کہا۔ "میں لاہور سے ملتان جا رہا تھا۔ مسافر نہیں ہوں تو اور کیا ہوں۔ میں تو ثبوت بھی دے رہا ہوں۔"

"کتنا پڑھا ہوا ہے تو؟" دوسرے نے کچھ سوچ کے کہا۔ "تیرا حلیہ تو پڑھے لکھے بابوؤں جیسا نہیں ہے۔"

"کیسی عجیب باتیں کر رہے ہو تم لوگ۔" میں نے برہمی سے کہا کیونکہ ان لوگوں کی قوتِ فیصلہ کو میرے اعتماد نے متزلزل کر دیا تھا۔ "اگر تم لوگ شہری بابو کی طرح کوٹ پتلون پہن لو گے تو کیا پڑھ لکھ جاؤ گے۔ تم میں سے کون زیادہ پڑھا ہوا ہے جو مجھ سے انگریزی میں بات کر سکے؟"

جواب کے لیے انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر مقتول کے بڑے بھائی نے کہا۔ "ہم تو نہیں لیکن گاؤں میں پڑھے لکھے بہت ہیں۔ اسکول ماسٹر ہے۔ ڈاک بابو ہے۔"

"تو اگر لاہور جا رہا تھا تو کسی واقف کار کے پاس جا رہا ہو گا۔ وہ کون ہے؟" دوسرے نے کہا۔ "ہم نے تو تیرا نام بھی نہیں پوچھا۔ تو ہمارے ساتھ چل۔ تھانے والے خود جھوٹ سچ کا پتا چلا لیں گے۔"

"تھانے؟" میں نے چونک کر کہا۔ "کیا جرم کیا ہے میں نے کہ تم زبردستی مجھے تھانے لے جانا چاہتے ہو؟ وہ جو میرا ڈرائیور ہے...!"

"بھاڑ میں گیا تیرا ڈرائیور۔" تیسرا دہاڑ کر بولا۔ "تیری کار کے رعب میں آ کے ہم تجھے چھوڑیں گے نہیں۔ یہ قتل کا معاملہ ہے اور گاؤں میں رات کو کم سے کم نو قتل ہوئے ہیں۔"

"نو قتل؟" میں اچھل پڑا۔ "تم لوگ جھوٹ بول رہے ہو۔ ایک آدمی اتنے قتل کیسے کر سکتا ہے؟"

"یہ تو ہم نہیں جانتے کہ سب قتل ایک ہی آدمی نے کیے ہیں یا نہیں۔ لیکن تجھے تھانے چل کے سب معلوم ہو جائے گا۔"

"کیا تم اسی طرح ہر اجنبی کو پکڑ پکڑ کے تھانے لے جاتے رہو گے؟" میں نے احتجاج کیا۔

"ہر شخص نے میرے بھائی کے کپڑے نہیں پہن رکھے ہیں۔" پہلا ایک دم کلہاڑی اچھال کے حملہ آور ہوا۔ میں فوراً درخت کے پیچھے ہو گیا۔ سیکنڈ کے سوویں حصے کے فرق سے کلہاڑی کا تیز پھل درخت کے تنے میں اتر گیا۔

"اچھا اچھا!" میں نے کہا۔ "تم لوگ کہتے ہو تو میں چلتا ہوں۔ اگر تمھارا بھائی قتل ہو گیا ہے تو مجھے تم سے ہمدردی ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم کسی بھی بے گناہ کا خون کر دو۔" میرا مقصد انھیں فوری طور پر انتہائی اقدام سے باز رکھنا تھا۔ وہ چاروں بیک وقت حملہ کرتے تو کسی ایک کی کلہاڑی یقیناً میرے دو حصے کر دیتی۔ لیکن یہ ہو سکتا تھا کہ تھانے جاتے ہوئے مجھے کوئی موقع مل جائے۔ وہ ذرا بھی غافل ہوں تو میں ان کو لمبا لِتا کے نکل جاؤں۔ میرے تھانے پہنچ کر لوٹنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ مجھے جو کچھ کرنا تھا راستے میں ہی کرنا تھا۔ اپنے اطمینان سے میں ان کو یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ میں خوفزدہ بالکل نہیں ہوں اور مقابلہ کرنے کا بھی کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔

معلوم نہیں اس وقت کس نے کیا اشارہ کیا کہ چار آدمی میرے پیچھے سے نمودار ہوئے اور انھوں نے مجھے دونوں طرف سے پکڑ لیا۔ ان کی گرفت بہت سخت تھی اور وہ سب صحت مند جوان آدمی تھے لیکن میں چاہتا تو پلک جھپکتے میں ان کو الٹ دیتا۔ اصل خطرہ چار مسلح افراد سے تھا جو اپنی کلہاڑیاں لیے بالکل تیار کھڑے تھے۔ میرا چیخنا چلانا اور میری یقین دہانی سب رائیگاں گئی۔ وہ جلوس کی صورت میں مجھے لے کر روانہ ہوئے۔ مجھے معلوم ہوا کہ گرفتار کرنے والوں میں سے دو مقتول کے بھائی ہیں اور محافظوں میں ایک بھائی کے ساتھ باقی اس کے کزن ہیں۔ چاچے اور مامے کے لڑکے۔ کلہاڑی والوں میں سے تین پیچھے

رہے اور ایک آگے چلتا رہا۔

اگر وہ مجھے گاؤں لے جاتے تو زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا کہ مجھے گلابو کی لاش بھی دیکھنی پڑتی اور شاید ان کی لاشیں بھی جن کو گلابو نے میرے دیے ہوئے ریوالور سے قتل کر دیا تھا۔ یہ نظارہ میرے لیے انتہائی باعثِ اذیت ہوتا لیکن اس میں خطرے کی کوئی بات نہ ہوتی۔ وہ سب مر چکے تھے جنھوں نے مجھے دیکھا تھا۔ میرا چہرہ پہچاننے والا کوئی نہ ہوتا لیکن تھانے کی صورتِ حال بالکل مختلف تھی۔ اگر میرا حلیہ اور تصویر انھیں بھی ارسال کی گئی ہوگی تو وہ مجھے فوراً شناخت کر لیں گے۔ میرا یہ نیا حلیہ بھی مجھے بچا نہ سکے گا اور ان گاؤں کے تھانے والوں کا کیا بھروسہ۔ وہ مجھ پر لوکا دسہی دو چار کے قتل کا الزام تھوپ دیں اور تفتیش کا آغاز کر دیں۔

"میرے ساتھ یہ سلوک کرنے کی کیا ضرورت ہے؟" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ "میں بھاگ تو نہیں رہا ہوں۔"

"ہم تجھے بھاگنے بھی نہ دیں گے۔" ایک بولا۔

"کوشش کی تو ٹکڑے کر کے اسی جگہ گاڑ جائیں گے۔" دوسرے نے کہا۔

پھر ایک فرلانگ تک ہم اسی طرح چلتے گئے۔ کسی نے کوئی بات نہیں کی لیکن مجھے خطرہ مول لیے بغیر رہائی پانے کی صورت نظر نہ آئی۔ مجھے گرفتار کر کے لے جانے والے پوری طرح مستعد رہے اور یوں آگے پیچھے ہوتے رہے کہ میں دو یا چار کو لٹا بھی دیتا تب بھی باقی چار ایک ساتھ مجھ کو دبوچ لیتے۔ لاچا پھر میری راہ کی سب سے بڑی دیوار بن گیا تھا۔ لاچے ان سب نے بھی باندھ رکھے تھے لیکن وہ اس لباس کے عادی تھے۔ میں نے پتلون پہن رکھی ہوتی تو خود کو چھڑانے کے بعد ایسی ریس لگاتا کہ وہ منہ دیکھتے رہ جاتے۔ ان کے پاس صرف کلہاڑیاں تھیں۔ ریوالور نہیں تھے جس کی گولی آدمی کو توقع سے پہلے آلیتی ہے۔ لیکن لاچے کے ساتھ نہ میں زیادہ تیز بھاگ سکتا تھا اور نہ زیادہ دور جا سکتا تھا۔ "لاچا ریس" میں جیت ان کی ہوتی اور اس کا اختتام بہت دردناک ہوتا۔ چار کلہاڑیوں سے میرے آٹھ ٹکڑے تو ضرور کر دیے جاتے۔ چنانچہ میں چلتا رہا۔

پھر میں نے محسوس کیا کہ مجھے مضبوطی سے بازوؤں کے شکنجے میں گرفتار رکھنے والے کچھ تھک گئے ہیں اور ان کی گرفت میں پہلے جیسی سختی نہیں رہی۔ یہ ایک امید افزا بات تھی لیکن میری سب امیدوں پر اس وقت پانی پھر گیا جب کسی خبیث محافظ نے تجویز پیش کی کہ اسے باندھ دیا جائے۔ تجویز کو اکثریت کی حمایت حاصل ہوئی اور کسی نے نہایت بدتمیزی سے ہاتھ مار کے میری پگڑی اتاری۔ میں نے بہت شور مچایا لیکن وہ مجھے کسی قسم کی رعایت دینے پر تیار نہ تھے۔ وہ سب ایک مقتول کے بھائی اور کزن تھے۔ معاملہ گاؤں یا ذات برادری کا ہوتا تو انتقام کی جنگ چلتی رہتی اور دونوں طرف کے لوگ مرتے رہتے لیکن میں باہر کا آدمی تھا اور میرے بارے میں بھی ان کو شک تھا یقین نہ تھا۔ شک کا پلڑا ذرا بھاری تھا چنانچہ وہ قانونی کارروائی کر رہے تھے۔ ان کو اس قانونی کارروائی تک محدود رکھنے میں خوف کے عنصر کا دخل بھی تھا کہ ایک کاروالے کو قتل کر کے وہ خود نہ پھنس جائیں۔

جب میرے ہاتھ پیچھے کر کے مضبوطی سے باندھ دیے گئے تو اپنے عبرتناک انجام کا نقشہ میری نظر میں پھر گیا۔ اس کے سوا میری مدد کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ نہ رابعہ کی محبت، نہ ممی کا خلوص۔ نہ رضوی صاحب کا اثر و رسوخ اور نہ قانون۔ تھانے والے تو اپنے اس کارنامے پر پھولے نہیں سمائیں گے کہ انھوں نے ایک خطرناک مفرور اشتہاری مجرم کو پکڑ لیا۔ حالانکہ مجھے پکڑنے میں ان کی کوشش کو ذرا بھی دخل نہ تھا لیکن اس کا سارا کریڈٹ وہ خود لے لیں گے۔ مقتول کے ورثا کو مایوسی ہوگی کہ انھوں نے ایک قاتل کو پکڑا تھا لیکن وہ ان کے بھائی کا قاتل نہیں تھا۔ میں نے غور کیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ مجھے گاؤں کی طرف نہیں لے جایا جا رہا ہے۔

"تھانہ کیا گاؤں میں نہیں ہے؟" میں نے کہا۔

"نہیں اس گاؤں کا تھانہ چار میل اُدھر ہے۔" اس نے بادلِ ناخواستہ ہاتھ سے اشارہ کیا۔

"یہ جگہ کون سی ہے؟" میں نے اس بستی کی طرف اشارہ کیا جہاں آج نوجوان اٹھے تھے۔

"قلعہ ستار شاہ۔" ان میں سے کسی نے کہا۔ "اتنا بھولا ہے۔"

"اور تھانہ کہاں ہے؟" میں نے کہا۔ تھکن، بھوک اور ہاتھ بندھے رہنے سے میرا چلنا مشکل ہو رہا تھا۔

"ہم تجھے 'جیجو کی ملیاں' کے تھانے لے جائیں گے۔" آگے چلنے والا پلٹ کر بولا۔ "اب بک بک نہ کر۔"

اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے۔ اور ہوئے بھی کہاں کس جرم کی پاداش میں۔ اپنی طرف سے میں نے ایک گھر کی عزت بچائی تھی۔ مارنے والے اور مرنے والے سب اجنبی تھے اور میں کسی کا دشمن نہیں تھا۔ میرے ہاتھوں اگر کوئی مارا گیا تھا تو وہ شخص جو پہلے بے ہوش پڑا رہا تھا لیکن اس کو بھی قتل نہیں کہا جا سکتا تھا۔ میں نے اپنے دفاع کا حق استعمال کیا تھا اور خود کو بچایا تھا۔ اگر حملہ آور نہ مارا جاتا تو میں مارا جاتا۔ مجبوراً طور پر صورتِ حال یہ تھی کہ ایک حملہ آور اپنے ہی ساتھی کے پتھر کی ضرب سے ہلاک ہوا تھا۔ قاتل اور مقتول اپنے اپنے انجام کو پہنچے۔ ایک کو گلابو کے باپ نے ٹوکے سے دو ٹکڑے کر دیا تھا اور خود دوسرے کے ہاتھوں کلہاڑی کے وار سے مارا گیا تھا۔ یہ مقدمہ بھی فیصل۔ باقی پانچ قتل گلابو نے کیے تھے اور پھر خودکشی کر لی تھی۔ اب کس کے خون کا دعویٰ کس پر رہا۔ نظامِ انصاف کے طویل مرحلوں اور پُرپیچ عمل سے گزرنے کے بجائے سب نے اپنا اپنا فیصلہ دمیں کر لیا تھا۔ پانچ قتل کرنے پر گلابو کو زیادہ سے زیادہ سزائے موت ہوتی۔ یہ سزا خود کو دے کر اس نے پولیس کا کام بہت ہلکا کر دیا تھا۔

اگر یہ لوگ اسی گاؤں کے رہنے والے تھے تو ان کو یقیناً علم ہوگا کہ ایک رات میں یہ نو آدمی کس کے لیے اور کس کے اشارے پر اور کیوں مارے گئے۔ ایک مقتول کے چار بھائی اور چار کزن یا تنا تو جانتے ہوں گے کہ ان کا مقتول بھائی کس قماش کا آدمی تھا اور کس کے اشاروں کا غلام تھا۔ گاؤں میں کون سی بات چھپی رہتی ہے۔ وہ یقیناً جانتے ہوں گے کہ گلابو کے گھر والوں پر یہ قیامت کیوں ٹوٹی۔ گلابو نے دوسروں کی اور اپنی جان لی تو کیوں لی۔ وہ پاگل تو نہیں تھی۔

"کیا سب مرنے والے تمھارے... عزیز اور دوست تھے...؟" میں نے کہا۔

"ہمارا تو ایک ہی بھائی تھا۔" کسی نے جواب دیا۔ "جس کے ٹکڑے تو نے چڑھا رکھے ہیں۔"

"جھوٹ سچ کا تو پتا چل ہی جائے گا۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "لیکن مجھے اتنا تو بتاؤ کہ باقی آٹھ مرنے والے کون تھے۔ ایک ہی گھر کے لوگ تھے یا الگ الگ۔"

"بتا دوں بھائیا جی؟" ان میں سب سے کم عمر نظر آنے والے نے کہا۔

آگے چلنے والے نے پلٹ کر مشکوک نظروں سے میری طرف دیکھا اور تند لہجے میں کہا۔ "بتا دے اگر تیرے پیٹ میں مروڑ اٹھ رہا ہے۔" باقی سب نے بھی اسے گھور کر دیکھا۔

"سارا فساد ایک لڑکی کا تھا۔" سب سے چھوٹے بھائی نے کہنا شروع کیا۔ "ایک بہت طاقتور اور بارسوخ آدمی اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ مگر وہ پڑھ لکھ گئی تھی۔ اس کا دماغ خراب ہو گیا تھا۔"

"واقعی پڑھنے لکھنے سے دماغ خراب ہو جاتا ہے۔ میری حالت اس کا ثبوت ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن خیر۔ تم یہ بتاؤ کہ کیا اس شخص نے لڑکی کے انکار سے مشتعل ہو کے اسے قتل کر دیا ہے؟"

"نہیں۔ الٹا یہ ہوا کہ لڑکی نے پہلے تو اس کے ماں باپ کو مارا۔" وہ بولا۔ "پھر وہ سامنے آ گیا تو اسے ڈز کر دیا۔ اور پھر خود کو گولی مار کے کنویں میں کود گئی۔"

چوتھی گولی چلنے کی آواز دیر میں کیوں آئی تھی۔ اس کا سبب معلوم ہو گیا۔

"بڑی خونخوار لڑکی تھی۔" میں نے کہا۔ "لیکن یہ گولی مارنے والی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ گاؤں کیا شہر میں بھی ایک پستول حاصل کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اور پھر لڑکی ذات۔ اسے ریوالور چلانا کس نے سکھایا تھا۔ اس کا کوئی بھائی یا باپ فوج میں تھے؟"

"نہیں۔ یہی بات تو کسی کی سمجھ میں نہیں آتی۔" وہ بولا۔ "گاؤں میں ریوالور صرف نمبردار کے پاس ہے اور اس کا لائسنس ہے۔ اس نے پولیس کو دکھا دیا۔"

"پھر وہ لڑکی ریوالور کہاں سے لے آئی؟" میں نے سخت حیرانی کا اظہار کیا اور جواب میں اس نے مجھے مفروضے کی بنیاد پر ایک کہانی سنائی کہ غالباً وہ ملنگ نہیں تھا۔ کوئی مفرور قیدی یا ڈاکو تھا جس نے دشمنی میں گلابو کی مدد کی۔ وہ خود قتل کرنے آیا تھا لیکن اسے موقع مل گیا کہ وہ گلابو کے ہاتھوں سب کو قتل کرا سکے۔ ویسے یہ بات ابھی پولیس والوں نے نہیں مانی۔ وہ گھر گھر کی تلاشی لے رہے ہیں۔"

"یہ نہیں بکتا کمینے کہ تیرے اپنے بھائی کو بھی اسی گلابو نے مارا یا اس نے جو ملنگ کے حلیے میں تھا۔" بڑے بھائی نے برہمی سے کہا۔ "کون تھا اس کا دشمن۔ کسی کا کیا بگاڑا تھا اس نے؟" وہ اچانک رونے لگا۔

"اب کیوں روتے ہو بھائیا جی۔" چھوٹے نے ہمت کر کے کہا۔ "جب ابا کہتا تھا کہ برے کام کا نتیجہ اچھا نہیں ہوتا اور جن کو وہ دوست کہتا ہے وہی اس کے دشمن ہیں..."

بڑے بھائی نے اس کے ایک طمانچہ مارا۔ اس نے گال پر ہاتھ رکھا اور چپ ہو گیا۔

تھانے میں قدم رکھتے ہوئے مجھے اپنی جد و جہد رائگاں جانے کا صدمہ بھی تھا اور گلابو کی موت کا بھی۔ صبح کا سورج بہت اوپر آ گیا تھا جس سے میں نے اندازہ کیا کہ شاید دس بجنے والے ہوں گے۔ تھانے میں صرف ایک ہیڈ کانسٹیبل موجود تھا۔ اس نے مجھے آڑے ہاتھوں لیا اور کچھ پوچھے بغیر میرے منہ پر تھپڑ اور سر پہ مکے مارے۔ پھر اس نے حکم دیا کہ مجھے کھول دیا جائے۔ مجھے لانے والوں نے بیک وقت بولنا شروع کیا تو اس

نے ایک کے سوا سب کو گردن سے پکڑ کر باہر نکال دیا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے فرض کر لیا تھا کہ میں چور یا ڈاکو ہوں ورنہ مجھے اتنے سخت حفاظتی انتظامات کے ساتھ نہ لایا جاتا۔

"ہے تو اس علاقے میں نیا۔" اس نے میرے ایک ملازم سے کہا "یہ کہاں ڈاکا ڈالنے آیا تھا؟"

"ڈاکا ڈالنے نہیں آیا تھا جناب عالی۔" سب سے بڑے نے کہا۔ "اس نے ہمارے بھائی کو قتل کر دیا ہے۔ جو کپڑے اس نے پہن رکھے ہیں وہ میرے بھائی کے ہیں۔ ہم قلعہ ستار شاہ سے آئے ہیں۔"

"ہیڈ کانسٹیبل کو سخت مایوسی ہوئی۔ "تمھارا بھائی بھی انہی میں شامل تھا۔ وہ جو نوبندے مارے گئے ہیں؟"

"ہاں جناب۔" وہ بولا۔ "یہ کھیتوں میں سے بھاگ رہا تھا کہ ہم نے دیکھ لیا۔"

"او میاں دیکھ لیا تھا تو ادھر کیوں تکلیف کی؟" ہیڈ کانسٹیبل نے درشت لہجے میں کہا۔ "ادھر ہی لے جانا تھا نا۔ شیخوپورہ سے ڈی ایس پی صاحب بھی آئے ہوئے ہیں۔ یہاں سے تھانیدار صاحب بھی گئے ہیں۔ سب تفتیش تو وہاں ہو رہی ہے۔ وہ شام سے پہلے تو یہاں آئیں گے نہیں۔"

"مجھے معلوم نہیں تھا... ہم تو رات سے اس ملنگ کو ڈھونڈ رہے تھے؟" اس نے ایک بار پھر کسی ریوالور والے ملنگ کی کہانی کا خلاصہ پیش کیا اور یہ ثابت کرنا چاہا کہ وہ جنگ میں ہی تھا۔ لیکن اس تمام عرصے میں جو بات میرے لیے سب سے زیادہ اطمینان کا باعث بنی تھی، وہ کانسٹیبل کی بے خبری تھی۔ اس نے مجھے شناخت نہیں کیا تھا۔ تاہم اس نے شکایت کنندہ کی بات سننے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھا۔

"اچھا۔ اب تم لوگ جاؤ۔" اس نے پوری بات سن کے کہا۔ "شام کو پھر آجانا۔ یا میں بتا دوں گا ڈی ایس پی صاحب کو۔ وہ ضروری سمجھیں گے تو تمھیں بیان دینے کے لیے بلوا لیں گے۔ میں ملزم کو حوالات میں بند کر دیتا ہوں۔ اب یہ کیس بہت اوپر چلا گیا ہے۔ میں تو تفتیش بھی نہیں کر سکتا۔"

مجھے گرفتار کر کے لانے والے بے نیل و مرام واپس ہوئے۔ شاید ان کو افسوس ہو گا کہ اتنی محنت کر کے مجھے یہاں لانے کے بجائے وہ کلہاڑیوں سے میرا قیمہ کر کے گاڑ دیتے تو ان کے دل کو کچھ اطمینان تو حاصل ہوتا۔ یہاں تو واحد حاضر افسرِ اعلیٰ نے مجھ سے میرا نام پتا اور ولدیت کچھ نہیں پوچھا تھا انکار یا اقرار کرانے کے لیے کوئی سوال تک نہیں کیا تھا۔ دو چار تھپڑ مار کے حوالات میں بند کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ ان کی تسلی تب ہوتی جب ہیڈ کانسٹیبل مجھے مُرغا بنا کے سترہ نمبر کے جوتے سے تفتیش شروع کرتا اور مجھ سے قتل کے جرم کا اعتراف کرائے بنا زندہ نہ چھوڑتا۔ یہ سب تائیدِ ایزدی تھی کہ میری جان بچ گئی۔

"ہیڈ کانسٹیبل!" میں نے اس قاتل ہجوم کے جانے کے بعد سکون کا سانس لے کر اطمینان سے کہا۔ "یہ تو بالکل جاہل لوگ ہیں۔ بلاوجہ مجھے قتل کرنے پر آمادہ تھے۔ آپ نے میری جان بچالی۔"

"آپ کی جان تو بچانی ہی تھی سکندر بخت صاحب۔" وہ عیاری سے مسکرا کے بولا۔ "میں تو آپ کو دیکھتے ہی پہچان گیا تھا۔ اب آپ کو گرفتار کر کے پیش کرنے سے مجھے انعام، تعریفی سند اور ترقی سب ملیں گے۔"

ہیڈ کانسٹیبل زبردست اداکار اور بہت چالاک آدمی تھا۔ اس معمولی سے تھانے میں اس جیسے چغد صورت شخص سے مجھے اتنی ہوشیاری کی توقع بالکل نہیں تھی۔ میرے اطمینان کا وہ غبارہ جو اب یقینِ کامل کے سہارے امید کے آسمان پر بہت اونچا اڑنے لگا تھا ایک دھماکے سے پھٹ گیا اور میں اوجِ افلاک سے زمین کی پستی پر آ گرا۔ تاہم میں نے اس ذہنی صدمے کے اثرات کو چھپانے کی بھرپور کوشش کی۔

"تم نے عقل مندی سے کام لیا۔" میں نے کہا۔ "مگر کیا یہ انعام کافی ہے؟"

"اور کیا مل سکتا ہے مجھے؟" وہ تلخی سے بولا۔ "گاؤں کے تھانے میں رہ کے۔ یہاں کسی کو پکڑو تو نمبردار کی سفارش اور زمیندار کا زور چلتا ہے۔ کسی کے پاس نقد نہیں ہوتا۔ چار چھ مرغیاں معمولی کیس میں۔ بڑا مسئلہ ہو تو بھینس۔ ورنہ وہی فصل کی گندم۔ دودھ اور سبزی۔ زندگی میں عیش کے لیے کیش چلتا ہے۔" اس نے اٹھ کر دروازہ بند کیا اور کرسی گھسیٹ لی۔

"تم تو میری توقع سے بہت زیادہ سمجھدار ثابت ہوئے ہو۔" میں نے کہا۔ "سب سے بڑی طاقت کیش کی ہے اور کیش تمھیں انعام میں ملا تو کتنا ملے گا۔ سو دو سو۔ حد سے حد پانچ سو۔ باقی یہ تعریفی سند یا وردی میں ایک پٹی کا اضافہ تمھیں کیا دے گا۔ تمھاری ماہانہ آمدنی میں پچاس روپے کا فرق بھی نہیں پڑے گا۔"

"چالیس روپے کا۔" وہ بولا۔ "لیکن اگلے مہینے میری بیوی کے بچہ بھی ہونے والا ہے۔"

"گویا آمدنی سے خرچ بڑھ جائے گا۔" میں نے کہا۔ میں ہیڈ کانسٹیبل کی جسمانی قوت کا اندازہ کر رہا تھا۔

"کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا تو بہتر ہی ہے۔" وہ بولا۔

"اور اگر میں نکل جاؤں تو تم کیا کرو گے؟" میں نے کہا۔ مشکل یہ تھی کہ اب وہ عین دروازے میں بیٹھا ہوا تھا۔

"کیسے بھاگ جاؤ گے؟" وہ بولا۔ "دیوار میں سے؟ یا دھواں بن کے اڑ جاؤ گے؟"

"ہم دونوں خالی ہاتھ ہیں۔ مددگار نہ کوئی تمھارا ہے اور نہ میرا۔" میں نے کہا۔ "مقابلہ کرو گے یا سودا؟"

"مقابلہ۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ "اس گاؤں میں ایک شخص خود کو پہلوان، بدمعاش اور بڑا زور آور سمجھتا تھا اور کبڈی کا چیمپئن تھا۔ پنجہ لڑانے میں کوئی اس کا مقابلہ نہیں تھا۔"

"اور تم نے اس کو ہر مقابلے میں نیچا دکھایا؟" میں نے حیرت سے منہ کھول کے احمقوں کی طرح کہا۔ "مگر خیر۔ تم اپنا برا بھلا خود سمجھتے ہو۔ کہاں مقابلہ کرو گے؟"

"ادھر چلو۔" اس نے عقبی دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ "پیچھے والا کمرہ خالی ہے۔ صرف تفتیش کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس وقت کوئی مجرم نہیں۔"

عقبی کمرے میں ایک نورا کشتی کا مقابلہ ہوا۔ کچھ دیر میں نے مار کھائی اور ہیڈ کانسٹیبل کے غرور کا بیرومیٹر اونچا ہونے لگا۔ پھر پلک جھپکتے میں نقشہ بدل گیا۔ میں نے اسے مسلسل سر کے اوپر سے اٹھا اٹھا کے نیچے پٹخا اور اٹھنے سے پہلے ہاتھوں پر گھمایا۔ ایک دیوار سے دوسری دیوار تک دوڑایا اور پلٹتے ہی الٹ دیا۔ دو منٹ بعد اس کی تمام چیمپئن شپ تمام ہو گئی۔

"اب بولو جوان۔" میں نے کہا۔ "میں کس راستے سے جاؤں؟ اور یہ تو نمونہ تھا۔ کہو تو دھواں بن کے دکھاؤں یا دیوار میں سے گزر کے۔ میں سب کچھ کر سکتا ہوں۔ تم سودا کر لیتے تو اچھا رہتا۔ خیر۔ خدا حافظ۔" میں نے بیچ کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ وہ کراہتا اور گالیاں بکتا اٹھا مگر پھر گر گیا۔

"سودا اب بھی ہو سکتا ہے۔" میں نے اچانک رک کر کہا۔ "ہو تم بھی مرد اور مرد اپنی زبان سے سودا کرتے ہیں۔ تم زبان پر قائم رہنے کی بات کرو تو میں کچھ کروں؟"

"اب... اب کیا... چاہتے ہو تم۔" وہ بالآخر اٹھنے میں کامیاب ہوا۔ "دفع ہو جاؤ..."

"میں تمھیں اپنی زبان بند رکھنے کا معاوضہ دے سکتا ہوں۔" میں نے جیب میں سے نوٹوں کی گڈی نکالی۔ گرفتار کرنے والوں نے مجھے بے قابو کرنے کے بعد جامہ تلاشی ضروری نہیں سمجھی تھی اور تھانے میں تفتیش کا آغاز ہونے کی نوبت نہیں آئی تھی ورنہ میرا یہ خزانہ کسی رسید کے بغیر بحقِ سرکار ضبط ہو جاتا۔ وہ خاموش رہا۔

"اگر تم سب کچھ بھول جاؤ۔" میں نے اطمینان سے کہا۔ "یہ کہ نہ کوئی مجھے یہاں لایا۔ نہ تم نے مجھے دیکھا۔ نہ پہچانا اور نہ میں ہنسا۔ نہ کوئی ہار جیت کا مقابلہ ہوا۔ تو اس کی اب بھی قیمت ہے۔ انکار کر کے اپنا اور نقصان کرو گے۔ گورنمنٹ کا انعام تو گیا۔ یہ ہزار رکھ لو۔" میں نے دس نوٹ الگ کیے۔

"ہزار۔ ہزار تو کم ہے۔" وہ بمشکل تمام بولا۔ "اگر تم تین ہزار دے جاؤ تو تمھاری مہربانی۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ "مہربانی؟ تم کو تو سودا کرنا بھی نہیں آتا۔ پانچ کیوں نہیں مانگے تم نے؟"

"شاید بے وقوف ہوں میں۔ ڈرتا ہوں۔ اور مجبور بھی ہوں۔ تم ہزار بھی نہ دو تو میں کیا کر لوں گا۔ مجھے یہ پہلا موقع ملا ہے۔ میرا مطلب ہے ایسا موقع۔ ورنہ بڑا ہاتھ تو افسر مارتے ہیں۔ اپنا حصہ وہی رہتا ہے جو میں نے بتایا تھا۔ اس سے قرض ادا نہیں ہوتا۔ رہن رکھی ہوئی زمین نہیں چھڑائی جا سکتی۔ بیٹی سے رخصت نہیں ہوتی اور گھر نہیں بنتا۔" وہ بولا۔ اس کے غرور کی جگہ اب شرمندگی مایوسی اور افسردگی نے لے لی تھی۔

"تم کو کیا کرنا ہے؟" میں نے کہا۔ "کون سی ضرورت پوری کرنی ہے؟"

"بیٹی کو... وہ دینا ہے جو میں اس تنخواہ میں... اور یہاں رہ کے نہیں دے سکتا۔" وہ مجھ سے نظر ملائے بغیر بولا۔ "یہ سال بھی گزر گیا تو وہ منگنی توڑ دیں گے۔ دس تولے سونا مانگتے ہیں وہ۔"

خاموشی کا ایک مختصر وقفہ آیا۔ پھر میں نے تین ہزار الگ کیے اور زمین پر رکھ دیے۔ "یہ ان کمینوں کے منہ پر مارنا جو پیسے سے پرائی بیٹی کو تولتے ہیں۔ اور یہ ہزار میری طرف سے۔ اسے جو چاہو سمجھ لو۔ اپنی زبان کے مطابق معاوضہ۔ یا ایک احسان کی قیمت۔ یا اپنی بیٹی کے لیے میری طرف سے تحفہ۔" میں نے کہا اور دروازہ بند کر کے باہر نکل آیا۔ پورے یقین کے ساتھ کہ اب مجھے کسی ضمانت کی ضرورت نہیں۔ پیسہ دے کر نہیں شرافت سے بات کر کے میں نے اس کی زبان بند کر دی ہے۔

میں سڑک پر پہنچا تو دونوں طرف سے گاڑیوں کی آمد و رفت پورے زور شور سے جاری تھی۔ بارہ بجنے والے تھے اور اب اس بات کا کوئی امکان نہیں رہا تھا کہ میری ملاقات ملتان سے لوٹنے والے ڈرائیور سے ہو۔ فوری مسئلہ بھوک مٹانے کا تھا۔ سڑک کے کنارے ایک جھونپڑا سا بنا ہوا تھا اور دو بھدی

مینوں کے گرد لکڑی کی چار بنچیں رکھی ہوئی تھیں۔ اس وقت یہ کیفے سرِ راہ زیادہ آباد نہیں تھا۔ پروپرائٹر کے علاوہ صرف ایک شخص تھا جو بنچ پر اکڑوں اور گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا تھا۔ لیکن ہو سکتا تھا کہ اچانک کوئی کار یا بس وہاں رک جائے چنانچہ میں نے اس چارپائی کا انتخاب کیا جو فاصلے پر ایک درخت کے نیچے پڑی تھی۔

"دو پیالی چائے لے آؤ اور کھانے کے لیے جتنا ہے وہ سب۔" میں نے کہا۔ بوڑھے نے ہونقوں کی طرح میری بات کا مطلب سمجھنے کی کوشش کی تو میں نے کہا۔ "میرا مطلب ہے چار پیالی چائے ایک کیتلی میں۔ خوب ابال کے۔ اور کل شام سے میں بھوکا ہوں۔ اس لیے پیٹ بھرنے کو جو ملے۔" پھر میں چارپائی پر لمبا لیٹ گیا اور گہرے نیلے آسمان کی گہرائی اور وسعت میں پرواز کرنے والے پرندوں کو دیکھنے لگا۔ قید سے نجات کے بعد میں بھی اتنا ہی آزاد تھا۔ اس احساس میں بڑی طمانیت تھی۔ اگر تھانے والے تفتیش کے لیے نہ گئے ہوئے ہوتے تو میرا اور اس ہیڈ کانسٹیبل کا نہ مقابلہ ہوتا نہ سودا۔ اس وقت میں زنجیروں میں جکڑا ہوا حوالات میں یا لاہور جانے والی کسی گاڑی میں پڑا ہوتا۔ اور میرا مستقبل وہی ہوتا۔ مسلسل قید۔ نت نئے مقدمات کے بہانے زندگی کی آخری سانس تک جیل میں رکھنے کا انتظام۔ یا پاگل خانے منتقلی۔ یہ آئندہ بھی ہو سکتا تھا کیونکہ میرے دشمن شکاری یہی جانتے تھے۔

چائے کے ساتھ خشک اسفنج ٹائپ کیک پیس کا مرتبان خالی کرنے کے بعد میرے جسم میں توانائی کی نئی لہر دوڑ گئی۔ میری قنوطیت میں کمی آئی اور حوصلہ بڑھ گیا۔ کتنا اچھا ہوتا اگر میں نے گزشتہ روز فرار ہوتے وقت قلعہ ستار شاہ کا رُخ نہ کیا ہوتا۔ میں دس ڈگری دائیں یا بائیں ہو جاتا تو کسی اور گاؤں پہنچتا اور مجھے علم ہی نہ ہوتا کہ آج گلابو نام کی ایک لڑکی کا جنازہ اٹھے گا تو ساتھ آٹھ جنازے اور بھی اٹھیں گے۔ بدبختی کے مقابلے میں بدصورتی یقیناً قابلِ ترجیح ہے لیکن انتخاب آدمی کے ہاتھ میں کہاں ہے۔ انتخاب کا حق ملتا تو گلابو اس خوبصورتی کو یقیناً ٹھکرا دیتی جس کے ساتھ نحوست کے ایسے بھیانک سائے تھے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ اس نے وہیں مرنے کے بجائے کنویں میں ڈوب کر مرنا کیوں پسند کیا؟ موت کو یقینی بنانے کے لیے اس نے خود کو گولی پہلے ماری تھی لیکن گولی تو وہ جائے واردات پر چلاتی تب بھی اس کی جان لے لیتی۔ جواب ایک ہی ہو سکتا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی لاش اس گھر سے اٹھائی جائے۔ وہاں مارا جانے والا اس کی عزت کا دشمن ہو رہا تھا اور یہ بات سب جانتے تھے۔ اب اس پر یہ الزام نہیں آتا تھا کہ مرنے سے پہلے وہ بے آبرو ہو چکی تھی۔ پولیس کو ایک ریوالور بھی تو ملے گا۔ یہ تو پتا چل ہی جائے گا کہ اس کی چھ گولیوں سے کون کون مرا۔ لیکن کیا سیریل نمبر سے وہ معلوم نہیں کر لیں گے کہ ریوالور کس کا تھا؟ کیا انھیں معلوم نہیں ہو جائے گا کہ اس مفرور اشتہاری مجرم نے کدھر کا رُخ کیا تھا۔ وہ ریوالور گلابو کو کیسے ملا۔ یہ تفتیش غیر اہم ہو جائے گی۔ اصل کامیابی میری سمت کا تعین ہو گی۔

میں گھبرا کے اٹھ کھڑا ہوا۔ نہ جانے کہاں جانے والی ایک ویگن نے بریک کیا مگر جانے والا میری طرف لپکا۔ "پیسے تو دے میاں!" وہ بولا۔ غالباً وہ تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا کہ میں استطاعت سے زیادہ مال کھا کے بھاگنے کی فکر میں ہوں۔ میں نے نوٹوں کی گڈی نکالی تو وہ قدرے شرمندہ ہوا۔ میں نے ایک نوٹ اسے پکڑا دیا۔

"کھلا تو نہیں ہے میرے پاس۔" اس نے نوٹ ہاتھ میں لے کر کہا۔ میں بے نیاز کھڑا رہا اور اس نے ویگن کی طرف رُخ کیا۔ "میں پوچھتا ہوں کسی سے۔" لیکن کچھ دیر بعد وہ پھر منہ لٹکائے لوٹا۔ پہلے اسے ڈر تھا کہ میں کھا پی کر بھاگ گیا تو اس کے پیسے مارے جائیں گے۔ پیسے اب بھی مارے جا رہے تھے مگر قصوروار وہ خود ہو گیا تھا۔

"اچھا چاچا!" میں نے کچھ سوچ کے کہا۔ "جتنے تمہارے پاس ہیں اتنے ہی دے دو۔"

"میں... میرے پاس تو بیس بائیس روپے ہوئے ہیں صبح سے۔" وہ بولا۔ "دس کا نوٹ نہیں ہے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "اچھا تم چائے کے پیسے کاٹ لو۔ جو ہے وہ دے دو۔ اور جتنی رقم بچے اس سے پھول خرید کر ایک قبر پر چڑھا دینا۔ ادھر قلعہ ستار شاہ میں آج ایک لڑکی قتل کر دی گئی ہے۔ گلابو نام تھا اس کا۔"

چند لمحوں کے لیے وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ "پھول... پھول یہاں کون بیچتا ہے۔ ویسے ہی مل جاتے ہیں۔"

"اچھا تو اس کے نام پر خیرات کر دینا۔ کسی مستحق کو دے دینا اور اس کی بخشش کی دعا کرنا۔" میں نے کہا۔

اس نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا اور واپس جانے لگا۔ اسے ویگن کے مسافروں کو بھی چائے دینی تھی۔

"کون تھی یہ لڑکی تمہاری؟" اس نے اچانک رک کر سوال کیا۔ اسے میرا رویّہ بہت عجیب لگا تھا۔

"بہن سمجھ لو۔" میں نے کہا۔ "بیٹی سمجھ لو۔ یا ماں سمجھ لو۔"

وہ مجھے بیس روپے پکڑا کے سخت بدحواسی میں فرار ہوا۔

خطرناک تو میں نہیں تھا لیکن پاگل ضرور تھا۔ میری باتوں سے اس نے یہی نتیجہ اخذ کیا تھا۔ جب میں واپس لاہور جانے کے لیے ایک بس میں سوار ہوا تو ایک بجنے کو تھا۔ میرا حلیہ خاصا بدل گیا تھا۔ اب میں عام دیہاتی لباس میں تھا جو کسی کو تھانیدار کی وردی یا ملنگ کی قبا کی طرح متوجہ نہیں کرتا۔ میرے سر پر بھی پگڑی تھی اور دو دن میں شیو خاصی بڑھ چکی تھی۔ کنڈیکٹر سے لاہور کا ٹکٹ لے کر میں اس ڈرائیور کے متعلق سوچتا رہا۔ گزشتہ شب بھی میرے بیٹھنے سے وہ پریشان ہوا ہو گا۔ معلوم نہیں وہ کہاں تک گیا اور کب واپس ہوا۔ کوئی بات پورے یقین کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی تھی۔ وہ کار چھوڑ کے فرار بھی ہو سکتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اس نے بعد میں میرے کسی ٹھکانے کا پتا لگانے کے لیے کار کی تلاشی لی ہو۔ اسے ایک تھانیدار کی وردی اور ایک ریوالور ملا ہو گا۔ وہ یقیناً پریشان ہوا ہو گا۔ اسے خیال ضرور آیا ہو گا کہ میں خفیہ پولیس کا آدمی تھا جس نے وردی اتار کے رکھ دی تھی اور جوگی فقیر کے کپڑوں میں اس کو بھی دھوکا دے رہا تھا اور گامے شاہ کے مخبروں کو بھی۔ جتنا میں نے غور کیا، مجھے اس کے گاڑی چھوڑ کر بھاگ جانے کے امکانات زیادہ نظر آنے لگے۔ وہ دھوبی کا کتا ہو گیا تھا۔ نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔ وہ گامے ماچھی سے غداری کا مرتکب ہو چکا تھا اور خفیہ پولیس کے جال میں پھنس گیا تھا۔ ان حالات میں اسے میرا سراغ لگانے کے لیے تردد کی کیا ضرورت ہے۔ کہ وہ مجھے تلاش کرتا ہوا لاہور جا پہنچے اور پھر پکڑا جائے۔ وہ یقیناً کار چھوڑ کے بھاگ گیا ہو گا۔ شاید اس جگہ سے روانہ ہونے کے کچھ دیر بعد جہاں میں نے اس سے ملنے کو کہا تھا۔

اس خیال نے مجھے اتنا قائل کر لیا کہ میری نظریں بس کے باہر بھاگتے ہوئے مناظر سے الجھنے لگیں۔ زندگی معمول کے مطابق رواں دواں تھی۔ مشرق سے آغاز سفر کرنے والا آفتاب مغرب کی طرف ڈھلنے لگا تھا۔ کھانے اور ستانے کے بعد کسان پھر کھیتوں میں مصروف ہو گئے تھے۔ کہیں کہیں عورتیں ندی نالوں میں کپڑے دھو رہی تھیں اور بچوں کو نہلا رہی تھیں۔ بچے مویشی چرا رہے تھے اور دونوں طرف سے مسافروں کی ریل پیل جاری تھی۔ کوئی کچھ نہیں جانتا تھا چنانچہ یہ تصور بھی نہیں کر سکتا کہ ایک بستی میں آج کتنے جنازے اٹھے یا اٹھیں گے تو کیوں اٹھیں گے۔ پانچ افراد کی قاتل یا اکیلی رہ جانے والی مظلوم عورت۔ اس نے

انصاف کیا یا خودکشی کر کے حرام موت مری۔

میرے خیالات کی ڈور ایک جھٹکے سے ٹوٹ گئی۔ "گاڑی روکنا بھائی۔" میں چلایا۔

"کیوں؟ کیا ہو گیا؟" کنڈیکٹر نے کہا اور بہت سے لوگوں نے سر گھما کے مجھے دیکھا۔ ان میں ڈرائیور بھی شامل تھا۔

"وہ... میرا بٹوہ... گر گیا ہے۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ڈرائیور نے بس روک دی اور میں کود کر اتر گیا۔ بس روانہ ہو گئی۔ یہ سوال بعد میں ضرور کیا گیا ہو گا کہ جو شخص کھڑکی سے دور بیٹھا تھا اس کا بٹوہ باہر کیسے گرا۔ اس کے اور کھڑکی کے درمیان تو دو مسافر حائل تھے۔ انھوں نے پورے یقین کے ساتھ کہا ہو گا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ خیر۔ اب ان کا جو دل چاہے سمجھیں۔ میں نے اپنی گاڑی کو سڑک کے کنارے کھڑا دیکھ لیا تھا۔ ایک مفروضہ یکلخت ایک حقیقت بن گیا تھا چنانچہ وقتی طور پر میں سب کچھ بھول گیا تھا اور تیز تیز قدموں سے دو فرلانگ پیچھے رہ جانے والی گاڑی کی طرف جا رہا تھا۔

گاڑی کے سب دروازے مقفل تھے۔ سوائے ایک دروازے کے جدھر ڈرائیونگ سیٹ تھی۔ میں نے دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ گیا۔ چابیاں سوئچ میں موجود تھیں۔ زیادہ وقت گاڑی رات کے اندھیرے میں لاوارث کھڑی رہی تھی چنانچہ کسی نے دیکھا بھی تھا تو یہی سمجھا ہو گا کہ ڈرائیور کسی ضرورت کے تحت اترا ہے اور اس پاس ہی موجود ہو گا۔ صبح کے بعد سے اب تک چند گھنٹے ہی گزرے تھے۔ اگر صبح سے پھر شام ہو جاتی یا گاڑی اگلے دن بھی نظر آتی تو اس کی پوزیشن یقیناً مشتبہ ہو جاتی اور کوئی نہ کوئی پولیس کو بھی مطلع کر دیتا۔ میں نے گلوز کمپارٹمنٹ کھولا۔ اس میں ریوالور موجود تھا۔ پھر اپنا سوٹ کیس دیکھا۔ اس میں کپڑوں کے ساتھ تھانیدار کی وردی بھی موجود تھی۔ میرا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا تھا۔ کسی غیر متوقع مصیبت میں گرفتار ہونے کے خوف سے ڈرائیور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے فرار ہو گیا تھا۔

اس گاڑی کا ملنا کسی گم شدہ خزانے کے ملنے سے کم نہیں تھا۔ میں نے انجن اسٹارٹ کیا اور کچھ سوچ کے واپس جانے کے بجائے آگے روانہ ہو گیا۔ مجھے یاد آیا کہ کس طرح پہلے میں چیک پوسٹ پر پکڑے جانے سے بال بال بچا تھا لیکن جان بچانے کی کوشش میں اس سے بڑی مصیبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ آسمان سے گرا اور کھجور میں اٹکا۔ پھر کھجور سے گرا تو کھڈ میں گیا۔ میرا تھانے جا کے نکل آنا تائید ایزدی کے بغیر ناممکن تھا اور اب گاڑی کا مل جانا نئے عزم اور حوصلے کے ساتھ جدوجہد جاری رکھنے کا اشارہ تھا۔ میں نے سب کچھ گنوا کے صبح ہونے تک پھر سب کچھ پا لیا تھا اور اب دوبارہ ملتان کی جانب یوں رواں تھا جیسے درمیانی وقفے میں کچھ بھی نہیں ہوا۔ جو کچھ ذہن میں تھا ایک خواب پریشاں کا نقش لگتا تھا۔

میرا حلیہ مضحکہ خیز ضرور تھا لیکن اطمینان بخش تھا۔ رابعہ، محسن یا شہلا مجھے اس بھیس میں دیکھ لیتے تو بہت ہنستے۔ مجھے ایک سے ایک نیا خطاب دیتے۔ اکرام شیخ، تازہ، انکل رضوی کی فیملی اور استاد ٹیڈی اور منظر۔ یہ سب لوگ عام حالات میں میرے "فینسی ڈریس شو" سے بے حد محظوظ ہوتے لیکن اب نہ میں ان کے سامنے جا سکتا تھا اور نہ یہ سب لوگ اکٹھے ہو کر پہلے کی طرح ہنس بول سکتے تھے۔ وقت نے اور حالات نے رشتوں میں دراڑیں ڈال دی تھیں اور مجھے سب سے الگ کر دیا تھا تو باقی سب کو ایک دوسرے سے دور۔ خیر۔ خدا وہ وقت لائے کہ اعتماد، خلوص اور محبت کے پرانے رشتے بحال ہوں اور ہم پھر ایک ہو جائیں۔ آمین۔ میں نے دعا مانگی۔

ملتان پہنچنے سے پہلے میں نے اپنا کفن اتارا۔ ایک مردہ شخص کے لباس کو کفن ہی کہا جا سکتا ہے۔ اور اس کی جگہ شلوار قمیص پہن لی۔ شام کے سائے پھیلنے لگے تھے کہ میں نے کار کو ایک اعلیٰ درجے کے ہوٹل کے مقابل روکا اور اندر چلا گیا۔ رجسٹر میں اپنے نام کا اندراج میں نے وہی کیا جو گاڑی کے کاغذات میں تھا۔ چابی منیجر کے حوالے کی کہ کسی کو بھیج کر اس کی سروس اور ٹیوننگ کرا دی جائے کیونکہ صبح مجھے کوئٹہ جانا ہے اور رقم پیشگی ادا کر دی۔ میرے انداز و اطوار میں متانت اتنی زیادہ تھی کہ حاکمانہ غرور لگتی تھی اور ظاہر یہ ہوتا تھا کہ میں کوئی بدتمیز، بدمزاج اور بدخو قسم کا پھنے خاں ہوں چنانچہ منیجر "یس سر۔ یس سر" کرتا رہا۔ اپنے کمرے میں پہنچنے کے بعد میں نے غسل کیا۔ کافی اور سینڈوچ طلب کیے اور پھر پڑ کے سویا تو رات کے دس بجے اٹھا۔ میں پوری رات جاگتا رہا تھا اور پھر پورا دن سفر کرتا رہا تھا چنانچہ میں پوری رات سو کے گزار سکتا تھا لیکن میرے لاشعور میں ایک بات تھی جس نے ٹیبل کلاک کے الارم کی طرح مجھے وقت پر بیدار کر دیا۔ میں نے محسن سے وعدہ کیا تھا کہ پرسوں سکھر سے فون کروں گا۔ سکھر کے بجائے میں ابھی ملتان ہی پہنچا تھا لیکن اسی وقت منظر کے گھر میں محسن اور رابعہ میری کال کے انتظار میں ایک ایک لمحہ گن کر کاٹ رہے تھے۔ وقت تو گزر چکا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ اتنی جلدی مایوس ہو کے لوٹنے والے نہیں ہیں۔ انھوں نے ہزار اندیشہ ہائے دور و دراز کو مدنظر رکھا ہو گا۔ اور کال میں تاخیر کے بہت سے اسباب تلاش کر لیے ہوں گے۔

میری ڈانٹ ڈپٹ کا اثر یہ ہوا کہ چند منٹ میں میرے کمرے کے فون کی لائن عبدالودود منظر ایڈووکیٹ کے فون سے ملا دی گئی۔ گھنٹی بجتے ہی وہ سب لپکے ہوں گے مگر لیڈیز فرسٹ کے اصول کی آڑ میں انھوں نے رابعہ کو ریسیور اٹھا کے پہلے بات کرنے کا موقع فراہم کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرا دل اس گاڑی کی طرح دوڑ رہا ہے جس کے بریک فیل ہو گئے ہوں۔

"ہیلو۔" رابعہ نے کہا۔ اور مجھے اس کی آواز میں ہلکا سا ارتعاش محسوس ہوا۔

"رابعہ!" میں نے بے حد جذباتی ہو کے کہا۔ "بولو بولو۔ کچھ تو اور کہو۔ تصور میں تم میرے سامنے ہو اور کان تمھاری آواز سن رہے ہیں۔ تم اداس تو نہیں ہو نا؟"

"تم خیریت سے تو ہو نا سکندر۔" اس نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "کہاں سے بول رہے ہو؟"

"ملتان کے ایک ہوٹل سے۔" میں نے کہا۔ "سویا ہوا تھا کہ تمھاری یاد نے گہری نیند سے جھنجوڑ کر اٹھا دیا۔"

"تم... تم کو... تم نے کہا تھا سکھر سے فون کرو گے۔" وہ بولی۔ پھر منظر کی آواز سنائی دی۔ "ارے بھائی کھڑی کھڑی کانپ رہی ہو۔ بیٹھ جاؤ۔ یہ کرسی اسی لیے رکھی ہوئی ہے" اور اس کا زبردست قہقہہ گونجا۔ میں نے تصور میں رابعہ کا چہرہ سرخ ہوتے دیکھا۔

"ہاں۔ مجھے کچھ دیر ہو گئی۔" میں نے کہا۔ "لیکن تشویش کی بات کوئی نہیں۔"

"یہ تو اچھا ہی ہوا۔" وہ بولی۔ "معلوم نہیں کیسے انکل رضوی کو اطلاع مل گئی تھی کہ تم حلیہ بدل کے گاڑی میں کراچی کی طرف جا رہے ہو۔ محسن کا خیال تھا کہ تم اب تک پکڑے جا چکے ہو گے۔"

"اور تمھارا خیال کیا تھا؟" میں نے کہا۔ "فرض کرو ایسا ہی ہوتا۔"

وہ ہنسی۔ "بہت تنگ کرتے ہیں مجھے یہ دونوں۔ محسن اور منظر۔ ابھی کہہ کر گئے ہیں کہ ہم ذرا دو نفل شکرانے کے ادا کر آئیں۔ مجھے موقع دینا چاہتے تھے کہ تم سے اکیلے میں بات کر لوں۔ معلوم ہے کل رات کیا ہوا۔ میری آنکھ اچانک کھل گئی۔ تم اور محسن باتیں کر رہے تھے۔"

"وہ... ایک بہت پرانا شعر ہے... کہ کہتے ہیں جس کو عشق...۔"

"وہ تمھارے دماغ کا خلل ہے۔ سچ بتاؤ کیا تم کل رات آئے تھے؟"

"رابعہ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ میں وہاں آؤں اور تمھیں دیکھے بغیر لوٹ آؤں؟" میں نے کہا۔ "خود سوچو کیا یہ ممکن ہے۔"

"میں نے تو صاف سنا تھا۔ تم محسن سے کہہ رہے تھے۔" وہ اچانک خاموش ہو گئی۔

"کیا کہہ رہا تھا۔ رک کیوں گئیں؟" میں نے کہا۔

"یہی کہ میں اکیلا کراچی نہیں جا سکتا... اور... اور بس..." وہ بولی۔ "رابعہ کو ساتھ جانا چاہیے۔"

"پھر محسن نے کیا کہا۔" میرا دل ایک اندرونی مسرت سے رقص کرنے لگا۔

"وہی جو تم نے ابھی کہا تھا۔" وہ بولی اور اس کا حیا سے گلنار چہرہ مجھے روبرو نظر آیا۔ اس نے کہا پی پی۔ سوتے وقت کم کھایا کرو۔ ولیم زیادہ۔ اور پھر بھی برے خواب آئیں تو مجھے بلا لیا کرو۔ میں سنسر کر دوں گا اور ان میں سے سکندر اعظم کو خارج کر دوں گا۔"

"وہ تمھارا خواب تھا۔ عشق کی چھٹی حس تھی یا ٹیلی پیتھی۔" میں نے کہا۔ "لیکن ہو گا یہی۔ میں تو کل نہیں آیا تھا لیکن کل آ جاؤں گا۔ بات وہی ہے جو تم نے سنی تھی۔"

"اچھا لو محسن سے بات کرو۔" رابعہ نے کہا اور دوسرے لمحے مجھے محسن کی آواز سنائی دی۔

"جہاں تک میرا خیال ہے تو پیدل روانہ نہیں ہوا تھا۔" محسن نے کہا۔ "کار تھی تیرے پاس۔"

"کار کبھی کبھی بے کار بھی ہو جاتی ہے۔ اب ذرا میری بات غور سے سن۔ اس کار کو میں کل صبح دس بجے کے قریب "ڈریم لینڈ" سینما کے سامنے چھوڑ کے لاہور روانہ ہو جاؤں گا۔ میں لمبی بات نہیں کر سکتا اس لیے اتنی دیر میں ملتان پہنچنے اور کچھ کیے بغیر لوٹ آنے کے اسباب ملاقات میں بیان کر دوں گا۔ تو کل صبح لاہور سے نکل اور ملتان پہنچ۔ گاڑی کے اندر سیٹ کے نیچے چابیاں ہوں گی۔ ریوالور میں نکال لوں گا۔ تیرا کام کار کو واپس لانا ہے۔ میں بس سے سفر کروں گا۔"

"اس ڈھنگ کا یا تھانیدار کا حلیہ بنا کے مت نکلنا۔"

"نہیں۔ وہ سب معلوم ہے مجھے۔ میں احتیاط کروں گا۔" میں نے کہا۔ "رات آٹھ بجے منظر کے گھر آ جانا۔"

"تو نے سیٹھ دلاور کے بارے میں نہیں پوچھا۔" محسن بنسا۔

"پوچھوں گا لیکن وہاں آ کے۔ کال لمبی ہو رہی ہے اور بل بڑھ رہا ہے۔" میں نے کہا۔ منظر سے رسماً اور اخلاقاً

غیر رسمی اور بد اخلاق گفتگو ہوئی جس میں گفتگو کم اور بکواس زیادہ تھی۔ پھر میں ریسیور رکھ کے سو گیا۔ اس سے پہلے کی قاتل تاریک ساعات کتنی قیامت خیز، خون آشام اور پُر آشوب تھی۔ اس دوسری رات کے دامن میں سکون تھا، محبت کی دلنواز مہک تھی اور خوبصورت خوابوں کی ہفت رنگ کرنوں کا اجالا تھا۔ یہ رات گلابو کے لیے بھی پُرسکون ابدی نیند کا پیغام لے کر آئی تھی اور وہ اپنی عزت و عفت کے پورے غرور کے ساتھ۔ تمام فکروں سے بے نیاز اور سارے دکھوں سے آزاد شہرِ خموشاں کے ایک گوشے میں بڑی معصومیت سے محوِ خواب تھی۔ اس کے قاتل بھی اس زمین کے نیچے تھے لیکن وہ شرمسار تھے اور خوفزدہ تھے کیونکہ وہ جانتے تھے ان کے نامۂ اعمال میں کیا کچھ لکھا جا چکا ہے۔

صبح ناشتے کے بعد میں نے حساب بے باق کیا اور گاڑی کی چابی لے کر نکل آیا۔ سروس کے بعد اس کی حالت بہت بہتر ہو گئی تھی اور چال بھی بدل گئی تھی۔ میں نے ڈریم لینڈ سینما کا صرف نام سنا تھا یا کسی اخبار کے اشتہار میں دیکھا تھا۔ ملتان کا شہر میرے لیے اجنبی تھا۔ مختلف لوگوں سے راستہ پوچھتا میں ٹھیک دس بجے سینما کے سامنے پہنچا۔ ہر طرف سے جائزہ لینے کے بعد میں نے گاڑی ایسی جگہ کھڑی کی جہاں ڈرائیونگ سیٹ والی طرف کے بالکل ساتھ دیوار تھی۔ درمیانی فاصلہ میں نے اتنا کم رکھا تھا کہ دروازہ پورا نہیں کھلا اور مجھے خاصی کوشش کے بعد خود کو تنگ سی جگہ میں سے گزارنا پڑا۔ چابیاں اگنیشن سوئچ میں ٹنگی ہوئی صاف نظر آتی تھیں۔ میں نے اسٹیرنگ پر ایک رومال ڈال دیا اور دوسرے دروازے سے گلوز کمپارٹمنٹ کھول کر ریوالور نکالا۔ پھر شیشہ بند کیا اور ڈور ناب دبا کے دروازہ بند کیا تو خود بخود لاک ہو گیا۔

پھر مجھے سوٹ کیس کا خیال آیا۔ میں نے محسن سے کہا تھا کہ میں سوٹ کیس نکال لوں گا لیکن وہ ڈکی میں بند تھا۔ ڈکی کھولنے کے لیے میرا دیوار کے ساتھ ساتھ چل کر ڈرائیونگ سیٹ والا دروازہ کھولنا اور پھر چابیاں نکالنا ضروری تھا۔ اب تک میں نے ہر کام پوری احتیاط کے ساتھ سب کی نظر بچا کے کیا تھا مگر اب کار کے سامنے ایک ریڑھی والا آ کھڑا ہوا تھا اور اپنے ٹھکانے پر ایک کار کی موجودگی سے خوش نظر نہیں آتا تھا۔ میں نے سوٹ کیس نکالنے کا ارادہ ترک کیا اور ریڑھی والے کی طرف نظر ڈالے بغیر چل پڑا۔ اس کی موجودگی نے مجھے تھوڑا سا تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ محسن کو گاڑی نہ نکالنے دے اور اڑ جائے کہ گاڑی کھڑی کر کے جانے

والے صاحب تو دوسرے تھے۔ مگر یہ کوئی ایسی بڑی پرابلم نہیں تھی۔ محسن اس سے بخوبی نمٹنے کا اہل تھا۔ خود میرے حق میں خالی ہاتھ رہنا بہتر تھا کہ بھاگنے کا موقع آئے تو سوٹ کیس کا بوجھ ساتھ نہ گھسیٹنا پڑے۔ نقد رقم اور ریوالور کی طاقت اضافی تھی۔

بس کے بجائے میں نے ٹرین سے سفر کرنے کا فیصلہ کیا۔ بس ہر جگہ، ہر شہر کی آبادی کے درمیان سے گزرتی تھی اور اس میں بیشتر لوگ مقامی ہوتے تھے۔ کراچی سے آنے والی ٹرین یوں بھی کھچا کھچ بھری ہوتی تھی اور اس کے مسافروں کو طویل سفر درپیش ہوتا تھا۔ رش اور بدانتظامی کے باعث انھیں اپنا یا اہل و عیال کا ہوش نہیں ہوتا تھا اور اگر آدمی اس میں ایسی جگہ فٹ ہو جائے جہاں کوئی اسے نہ پہچانے تو پھر آخر تک وہی لوگ رہتے تھے اور ٹرین کے ہزاروں مسافروں میں پولیس کی نگاہ ایک چہرے کو نہ تلاش کر سکتی تھی۔ نہ انھوں نے کبھی اس کی کوشش کی تھی۔ عملاً یہ ناممکن تھا چنانچہ ناکا بندی کی صف میں اسٹیشن صرف بیان کی حد تک آتے تھے۔

اس کے باوجود میں نے احتیاط سے کنارا نہیں کیا۔ ٹرین کے آنے تک میں بینچ پر بیٹھا اپنا چہرہ چھپائے اخبار پڑھتا رہا۔ اب نہ میں بابو تھا نہ دیہاتی۔ نہ ٹھگ اور نہ تھانیدار بلکہ ایک عام آدمی کے کپڑوں میں تھا۔ جو کسی کی توجہ کا باعث نہیں بنتے تھے۔ مجھے زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے کی مہلت درکار تھی۔ اس عرصے میں جہاں شیو بڑھ جانے سے میری صورت میں داڑھی کا اضافہ ہو جاتا وہاں عام لوگوں کے ذہن سے بھی ہفتہ بھر پہلے اخبارات میں چھپنے والی تصویر کے خد و خال مدھم پڑ جانے کا امکان بہت واضح تھا۔ سب لوگ ایک ہی اخبار نہیں پڑھتے بلکہ پچانوے فیصد تو شاید اخبار مانگ کر بھی نہیں پڑھتے۔ سنی سنائی سے حالاتِ حاضرہ کا اندازہ کرتے ہیں یا حالاتِ حاضرہ کو اتنا اہم ہی نہیں سمجھتے کہ ان پر دماغ سوزی کی جائے۔ باقی مختلف اخبارات دیکھتے ہیں اور ہر روز ہر اخبار میں اتنی تصویریں چھپتی ہیں کہ ذہن میں سب گڈمڈ ہو جاتا ہے کہ صورت تو دیکھی بھالی لگتی ہے مگر تصویر کسی مفرور مجرم کی تھی یا سیاسی لیڈر کی؟

ٹرین ایک گھنٹے سے زیادہ لیٹ تھی اور مشکل یہ تھی کہ ایک پسنجر ٹرین عرف مردار گاڑی اور ایک تیز رفتار ریل کار دونوں اس کے بعد ملتی تھیں۔ میں نے کچھ وقت ایک پرانے ریسٹورنٹ کے ویران اور گھٹن والے ماحول میں کھانا کھاتے گزارا اور وہاں سے اس وقت نکلا جب ویٹر خود مجھے نکالنے

برکر بستہ نظر آتے تھے۔ میرے باہر آتے ہی ٹرین آ گئی اور ... کھڑکی کے راستے اس بوگی میں داخل ہو گیا جس میں مسافر ... بھرے ہوئے تھے جیسے انار میں دانے لیکن ایک اور دلنہ ... اندر گرتے ہی شور مچ گیا کیونکہ میں نے براہِ راست نیچے کی ... بوڑھوں پر قابض ایک فیملی کے درمیان لینڈ کیا تھا۔ بدقسمتی ... سے فرش پر مقیم حضرات میں منحنی جسم اور سیانی وضع کے ایک ... بزرگ بھی تھے جو کچھ مراقبے کی حالت میں سر نگوں بیٹھے اونگھ رہے ... تھے۔ میں ان پر گرا تو وہ بے سُری کال بیل کی طرح چلانے لگے: "ابے گنوار، اجڈ! یہ راستہ ہے شرفا کے اندر آنے کا ... دروازے کیا نمائش کے لیے ہیں۔ ہائیں؟"

"معاف کیجیے گا۔" میں نے ان کو اٹھاتے ہوئے کہا: "کیا یہ دروازہ نہیں تھا؟ میری نظر کمزور ہے۔" ان کی فیملی کی ایک خاتون نے جو مزاج صورت اور عمر کے اعتبار سے ان کی شریکِ حیات ہو سکتی تھیں، میرے دو ہتڑ مارا۔

"موئے مشٹنڈے۔ اتنا کمزور تو نہیں ہے تو۔ مذاک کرتا ہے سر پھروں سے؟ نامراد۔ اللہ نہ کرے ان کو کچھ ہو جاتا تو بیوہ ہو جاتی میں۔ دس بچے یتیم ہو جاتے۔" وہ بانسری کی طرح بجنے لگی۔

"فکر مت کرو خالہ۔ یہ کہیں سے نہیں ٹوٹے۔" میں نے کہا: "ٹھوک بجا کے دیکھ لو۔" اور فوراً ان کے درمیان سے ... کے کھڑے ہوئے مسافروں میں شامل ہو گیا جو اس ایک ... سیٹ کی کامیڈی سے محظوظ ہوئے تھے۔

"ارے چھپا کی ماں! ٹیم کے کپتان نے آہ و بکا جاری ... کی: "کم بخت ایک ٹن کا گینڈا تھا۔ چورا کر دیا خبیث نے۔ ساتویں آسمان سے مجھ پر ٹپک پڑا۔ آہ۔۔" وہ شخص حلیے سے بھی ... خوجی کا دوسرا ایڈیشن تھا۔

"آدمی کو ساتویں آسمان پر سے ہی زمین پر پھینکا گیا تھا ..." میں نے نیم سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"نانا ہے؟" چورا ہونے کے باوجود وہ پٹاخے کی طرح چلے: "ابے اندھے۔ یہ بال دھوپ میں سفید ہو گئے ہیں ... سمجھتا ہے بڈھے ہیں ہم۔ ابے آج بھی تیرے جیسے جوان ... بھاری ہیں۔ اٹھا کے پٹخ دیں تو پانی نہ مانگے۔"

"ایسا غضب مت کرنا دادا میاں۔" کسی نے لطف لینے ... کے لیے کہا: "یہ کوکا کولا مانگے گا۔ مہنگا پڑ جائے گا۔"

"ایسی جوانی ہے تو کر ڈالو ایک اور شادی۔" کسی نے مشورہ دیا: "گھر کی دو ٹیمیں ہو جائیں گی۔"

اب خوجی کی زوجہ کی باری تھی۔ اس نے عقدِ ثانی کی تحریک پیش کرنے والے کو آڑے ہاتھوں لیا۔ یہ دلچسپ تماشا اس وقت تک جاری رہا جب تک چھیڑ چھاڑ کرنے والے خود ہی بور نہیں ہو گئے اور میاں خوجی کی فیملی نے محسوس نہیں کیا کہ عافیت خاموشی میں ہی ہے۔ بچے اس تماشے میں غیر جانبدار تماشائی بنے کبھی اماں ابا کو دیکھتے تھے تو کبھی ٹھٹھے لگانے والوں کو جو سب بٹے کٹے جوان اور تعداد میں زیادہ تھے۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ میاں خوجی بار بار ناک پر سے پھسل آنے والا چشمہ اونچا کر کے مجھے فوکس کر رہے ہیں اور کچھ کنفیوژن کا شکار ہیں۔ چور میرے دل میں تھا چنانچہ میں نے اس ہجوم میں سے کھسک جانا بہتر سمجھا۔

میں نے خوجی کو لوگوں کے درمیان سے گزر کے باتھ روم کی جانب جاتے نہیں دیکھا تھا۔ میں تو خود بھی باتھ روم جانا چاہتا تھا چنانچہ میں آگے بڑھ کے باتھ روم کے دروازے پر کھڑا ہو گیا کہ جیسے ہی کوئی برآمد ہو، میں اندر چلا جاؤں۔ دس منٹ بعد بالآخر وہ ہاتھ میں لوٹا پکڑے نمودار ہوئے۔ "پہچان لیا۔" وہ مجھے روبرو پاتے ہی چلائے: "بالکل پہچان لیا۔" اس سے زیادہ بولنے کی میں نے انھیں مہلت ہی نہیں دی۔ میں انھیں سمیٹتا ہوا اندر داخل ہو گیا اور دروازہ دھڑ سے بند کر کے لاک کر دیا۔ چار فٹ مربع جگہ میں دو افراد کا صرف کھڑا رہنا ممکن تھا۔ میں نے خوجی کو دیوار سے لگا کے گھٹنے سے دبا لیا۔ ایک ہاتھ سے ان کی نازک گردن دبوچی اور دوسرے ہاتھ سے ریوالور نکال لیا۔

"یہ دیکھا ہے کبھی؟" میں نے لہجے کو انتہائی خونخوار بنا کے کہا اور ریوالور کی نال ان کی پیشانی پر رکھ دی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا کہ ان کی آنکھوں کی پتلیاں ساکت ہو گئی ہیں۔ رنگ ان کا پہلے ہی لاش کی طرح سفید ہو رہا تھا لیکن انھوں نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔

"تم نے ٹھیک پہچانا ہے مجھے۔" میں نے بدمعاشوں کی طرح غرا کے کہا: "چھ قتل کر چکا ہوں۔ چوری، ڈاکے اغوا، سب کھیل ہیں میرے۔ جیل سے بھاگا ہوں اور ایک بار نہیں دس بار۔ آئندہ بھی بھاگ سکتا ہوں۔"

میں نے اپنی گرفت ڈھیلی کی تو اس نے کانپتے ہوئے ایک گہری سانس لی: "خدا۔۔۔ خدا کے لیے۔۔۔ معاف۔۔"

"معاف کرنا نہیں جانتا میں۔" میں نے اسی لہجے میں کہا: "اگر تمہاری زبان سے ایک لفظ بھی نکلا تو ساری گولیاں مار دوں گا۔ اور چلتی ٹرین سے کود جاؤں گا۔ بہت مشق ہے

مجھے اس کی۔" اس کے ہاتھ سے لوٹا گر گیا۔

"قسم... قسم اللہ کی... میں... میں بولوں تو کافر۔" وہ تھر تھر کانپتا رہا۔

"اچھی طرح سمجھ لو۔ تم اور تمھاری بیوی۔ چار بچے۔ یہ سب تمھاری بے وقوفی سے مریں گے۔" میں نے ریوالور کی نال اس کی کنپٹی پر رکھ دی۔ "ویسے میں تم کو اسی جگہ بھی مار سکتا ہوں۔ گاڑی کے شور میں آواز باہر نہیں جائے گی۔ تمھاری لاش کا پتا لگنے تک میں پچاس میل دور نکل جاؤں گا۔"

اس نے ہاتھ جوڑ کے منت سماجت اور رونا دھونا شروع کیا۔ قسمیں کھانے لگا۔ "میری توبہ۔ میرے باپ کی توبہ۔ ڈاکو صاحب۔ مجھے بخش دو۔ میرے بیوی بچوں پر رحم کرو۔"

"اچھا۔" میں نے کہا۔ "میں تمھیں ایک موقع دیتا ہوں۔ زبان بند رکھنا۔ یہ مت سمجھنا کہ تم لوگوں کی مدد سے مجھے پکڑ لو گے یا کنڈیکٹر گارڈ کو بتا دو گے۔ میں اگر جیل چلا گیا تا تب بھی میرے ساتھی باہر ہوں گے۔ تمھارے ایک ایک بچے کو تمھاری نظر کے سامنے ذبح کر دیں گے۔ یوں۔" میں نے قصابوں کی طرح چھری چلائی۔ میرا مقصد صرف اسے دہشت زدہ کرنا تھا اور اس کی ذہنی کیفیت یہ تھی کہ اس کی عقل جواب دے چکی تھی ورنہ وہ مجھ سے سوال ضرور کرتا کہ تمھارے ساتھی میرے گھر کا پتا کس سے معلوم کریں گے۔ جب میں نے اسے آزاد کیا تو اس نے جھک کر لوٹا اٹھایا اور گرتا پڑتا باہر نکل گیا۔ چند سیکنڈ بعد اس کے چلانے کی آواز آئی تو میں دروازہ کھول کے بھاگا اور باہر نکل گیا۔ ایک فٹ بورڈ پر چلتا ہوا میں بوگی کے آخری کنارے تک پہنچا اور ہاتھ بڑھا کے دوسری بوگی کے دروازے کا ڈنڈا پکڑ لیا۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ مرنا چاہتا ہے کیا؟ خودکشی کرنی ہے؟ پاگل ہوا ہے؟ مگر میں نے سب کو نظر انداز کر دیا۔ میں نے سوڈا واٹر بیچنے والوں کو اسی طرح ایک بوگی سے دوسری بوگی میں جاتے دیکھا تھا۔ ان کے ساتھ تو بوتلوں کی بالٹی کا وزن بھی ہوتا تھا لیکن مجھے مشق نہیں تھی۔ گاڑی کم سے کم چالیس پچاس میل کی رفتار سے جا رہی تھی۔ اگر میرا اندازہ ذرا بھی غلط ہو جاتا یا توازن باقی نہ رہتا تو دوسرے لمحے میں پٹری پر گرتا۔ اسی گاڑی کے پہیوں کے نیچے آ کے کٹ جاتا یا پتھروں سے ٹکرا کے میرا سر پاش پاش ہو جاتا۔

بدقسمتی یا خوش قسمتی تھی کہ اگلی بوگی ڈائننگ کار تھی۔ وہاں ویٹر حضرات کا اجتماع تھا۔ انھوں نے چلانا شروع کیا۔

"یہ مسافروں کے لیے نہیں ہے۔ نکل باہر۔"

"بغیر ٹکٹ سفر کرنا چاہتا ہے!" دوسرے نے کہا۔ کسی نے زنجیر کھینچنے کی دھمکی بھی دی۔

"ٹکٹ ہے میرے پاس بھائی۔" میں نے کہا جو غلطی ثابت ہوا۔ اگر میں تسلیم کر لیتا کہ میں بے ٹکٹ ہوں تو مجھ سے سو پچاس لے کر خاموش ہو جاتے اور مجھے بحفاظت لاہور لے جاتے۔ اب وہاں میری موجودگی کا جواز نہ رہا۔ انھوں نے مجھے دھکے دے کر دوسری بوگی میں دیا۔ تب مجھ پر انکشاف ہوا کہ ڈائننگ کار تو دونوں طرف ملی ہوئی ہوتی ہے۔ اگلی بوگی فرسٹ کلاس کی تھی جس میں برتھوں کے الگ الگ کیبن بنے ہوتے ہیں۔ یہ خیال آنے پر میں نے خطرے کو قریب تر محسوس کیا۔ اب اگر خوجی کی باتوں پر یقین کرتے ہوئے زیادہ جوشیلے اور فرض شناس جوان آدمی میرے پیچھے دوڑے تو وہ سیدھے آئیں گے۔ انھوں نے کھڑکی سے سر نکال کر مجھے فرار ہوتے دیکھ لیا ہوگا اور یہی میرے مجرم ہونے کا ثبوت بن جائے گا۔ اگر میں مجرم نہ ہوتا تو جان پر کھیل کر کیوں بھاگتا۔ اگلی بوگی میں داخل ہوتے ہی میں نے سب سے پہلے وہ راہداری دیکھی جس کے دونوں طرف کیبن ہوتے ہیں۔ اسی کے نصف حصے میں دوسرا باتھ روم تھا۔ اس سے پہلے کہ لوگ مجھے دیکھتے یا میں انھیں دھکیلتا ہوا ان کے بیچ میں سے راستہ بناتا ہوا آگے جاتا، پیچھے والا دروازہ کھلا اور ایک ویٹر چائے کی ٹرے لیے ہوئے نمودار ہوا۔ ٹرے کو اس نے ہاتھ پر یوں اٹھا رکھا تھا کہ اس کا چہرہ چھپ گیا تھا۔ ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر میں نے ٹرے کھینچ لی۔ اس نے پلٹ کر احتجاج کے لیے منہ کھولا بھی نہ تھا کہ میں نے دوسرے ہاتھ سے اس کو اپنی طرف کھینچا اور اس کی ٹرے نیچے رکھ دی۔ اس سے تھوڑی سی آواز پیدا ہوئی جو ٹرین کے شور میں دب گئی۔ ویٹر پہلے حیران ہوا تھا پھر اس نے اپنا توازن بحال کرنے کی کوشش کی تھی اور مجھے دیکھتے ہی پہچان کر شور مچانے والا تھا کہ میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کو دبوچ لیا۔ ایک ہاتھ سے اس کا منہ دبا کر میں نے اسے باتھ روم میں گھسیٹ لیا اور دروازہ بند کر دیا۔ وہ تندرست آدمی تھا۔ جدوجہد کرتے ہوئے اس نے منہ پر سے میرا ہاتھ ہٹا لیا۔ "یہ... یہ کیا ہے بدمعاش ہو۔" وہ چلایا۔ لیکن میں نے ریوالور نکال لیا۔

"اپنی آواز بند رکھو۔" میں نے کہا۔ "میں تمھاری جان لینا نہیں چاہتا۔"

"تو پھر کیا چاہتے ہو؟ مفت کی چائے پینی ہے؟ جیب میں ساٹھ ستر روپے ہیں۔ وہ بھی لے لو..."

"مجھے یہ وردی چاہیے۔" میں نے اس کی بات کاٹی اور کہا: "جلدی کرو۔" اور اس کے سر پر بڑی صفائی سے رکھی ہوئی کلاہ دار پگڑی اتار لی۔ نیچے اس کے سر کی سطح کی تمام فصل کسی حجام کے استرے نے بالکل صاف کر رکھی تھی۔ اور یہ واردات بالکل تازہ تھی۔ چنانچہ اس کے سر سے چھت کے بلب کی روشنی منعکس ہونے لگی۔

"اوئے۔" اس کا ہاتھ خود بخود سر کی طرف گیا اور اس نے مجھے ایک گالی دی۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے ریوالور چھینا چاہا اور مجھ سے بھڑ گیا۔ میں لڑکھڑا کے پیچھے ہٹا تو میرا ایک پیر اس گول سوراخ میں گیا جو دو قدمچوں کے درمیان بنا ہوا ہوتا ہے۔ گرتے گرتے میں نے اس کے سر کو دیوار سے دے مارا۔ اس سے خاصی آواز پیدا ہوئی۔ ریوالور اب بھی میرے ہاتھ میں تھا۔ میں پھر سنبھل کے کھڑا ہوا تو وہ میرے اوپر آیا۔ اس کے سر میں چوٹ ضرور آئی تھی لیکن وہ بے ہوش نہیں ہوا تھا۔ میری وقتی پسپائی نے اس کا حوصلہ بلند کر دیا تھا۔ اور اس نے مجھے دوسری زیادہ اشتعال انگیز گالی دی اور میرے سر پر مکا مارا۔ میں نے خود کو بچایا لیکن وہ پھر مجھ سے لپٹ گیا۔ شاید اسے یقین تھا کہ میں گولی چلانے کی صرف دھمکی دے رہا ہوں۔ مجبوراً مجھے اس کے سر پہ ریوالور مارنا پڑا۔ اس کی ساری گالی گلوچ اور مار پیٹ کی ہمت ختم ہو گئی۔ وہ آدمی یقیناً جی دار تھا کہ ریوالور دیکھ کر بھی ہراساں نہیں ہوا تھا۔ میں بھی خالی ہاتھ ہوتا تو مقابلہ سخت ہوتا اور مجھے کشتی یا باکسنگ کے بجائے جوڈو کا استعمال کرنا پڑتا۔

دروازے کو لاک کر کے میں نے ایک مرتبہ پھر کپڑے بدلنے کا عمل شروع کیا۔ اس کی بے داغ سفید وردی پہن کر میں نے پگڑی سر پر رکھی اور آئینے میں دیکھا۔ میرا یہ نیا روپ بہت بہتر تھا۔ اپنا سرمایہ اور ریوالور وردی کی جیب میں منتقل کرنے کے بعد میں نے اس بھاری بھرکم ویٹر کو شلوار قمیص پہنائی اور اس کی وردی سے نکلنے والی رقم اور دوسرے کاغذات بحفاظت قمیص کی جیب میں ڈال دیے۔ میں چاہتا تو اسے بے لباس چھوڑ کے بھی نکل جاتا لیکن یہ اس پر دہرا ظلم ہوتا۔ اس تمام کارروائی میں چھ سات منٹ لگ گئے تھے اور میرے کان باہر کی آوازیں سن رہے تھے۔ غالباً خوجی کی بات کو سچ مان کے کچھ لوگ ڈائننگ کار کے راستے میری تلاش میں آئے تھے۔ ویٹرز نے تصدیق کی ہوگی کہ اس حلیے اور لباس میں ایک شخص کو ادھر ارسال کیا گیا ہے۔

باہر نکلتے ہی میں نے ٹرے کو بالکل ویٹرز کے انداز میں ایک ہاتھ پر رکھا اور ہاتھ کو گھما کے شانے پر یوں رکھا کہ میرا چہرہ نمایاں نہیں رہا۔ تین افراد جو فرسٹ کلاس میں داخل ہو گئے تھے، ہر کیبن میں جھانکنے کے بعد ناکام واپس آ رہے تھے۔ "یار وہ بندہ آؤٹ ہے۔" ایک شخص نے کہا۔ اور انگلی کو کنپٹی پر گھمایا جس کا مطلب یہ تھا کہ میاں خوجی کا دماغ خراب ہے۔ "ایسے ہی بولتا آ رہا ہے۔"

"وہ نہیں، افیم کی گولی بول رہی تھی۔" دوسرے نے کہا۔

"مگر بھائی وہ آدمی ایسے کیوں بھاگا؟" تیسرے نے کہا۔ "میں نے خود دیکھا تھا۔"

"دیکھا تو میں نے بھی تھا۔" پہلے نے سر کھجایا۔ "اور بیرے نے بھی بتایا تھا کہ وہ ادھر ہی سے آیا تھا۔ پھر گیا کہاں؟"

وہ ایک قطار میں چلتے پھر ڈائننگ کار سے گزرے۔ میں ان کے پیچھے رہا۔ سارے ویٹر اب چائے کی ٹرے [illegible] جا چکے تھے یا خالی ٹرے رکھ کے نئی ٹرے اٹھا رہے تھے۔ کم سے کم وقت میں ان کو ٹرین کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک سب مسافروں کو چائے پہنچانی تھی چنانچہ کسی کو میری طرف غور سے دیکھنے کی فرصت نہیں تھی۔ وہ سب ایک دوسرے کو نمبر سے یاد کرتے تھے جو ان کی سفید پگڑی پر سامنے لگا ہوا تھا۔ پیتل کا بنا ہوا بیج جس کے درمیان میں یہ نمبر بہت نمایاں نظر آتا تھا۔ ان کے لیے میں صرف نمبر دو سو دس تھا۔ آنے جانے والے چلا رہے تھے۔ "او یار یہ غلط ہے۔ دو سو چھتیس نے میرے تین آرڈر لے لیے۔" "دو سو ایک کا پھڈا ہو گیا کسی مسافر سے۔ اس نے ٹرے کے پورے پیسے لیے۔" میں سب کی سنتا سیدھا گزرا اور واپس پہلی بوگی میں آ گیا جہاں سے میں نے سفر کا آغاز کیا تھا۔

میری تلاش میں جانے والے اور ناکام واپس آنے والے خفیف بھی تھے اور حیران بھی۔

"تم بھی کمال کرتے ہو چاچا۔ وہ آدمی نہیں تھا، جن تھا۔" کسی نے کہا۔

"لاحول ولا قوۃ۔ اے میاں کیا جن شرفا کو باتھ روم میں تنگ کرتے ہیں؟ پستول تان لیتے ہیں ان پر؟" خوجی نے خفا ہو کے کہا۔ "سب نے دیکھا تھا اسے۔ کیا جنات نظر آتے ہیں؟"

"جنات ہر روپ میں نظر آ سکتے ہیں۔" کسی نے فیصلہ دیا۔

"میرے دادا نے خود...!"

"جنات وغیرہ سب فضول باتیں ہیں۔ آدمی کے ذہن کی پیداوار۔" کسی ملحد دانشور نے کہا۔

اس سے پہلے کہ جنات کے وجود سے انکار کرنے والے اور دادا مذکور کے ذاتی تجربے کو فریبِ خیال قرار دینے کا مسئلہ نزاعی بنتا ٹرین کی رفتار سست پڑ گئی۔ لاہور آگیا۔ لاہور آگیا کا شور مچا اور سب نے اپنا اپنا سامان اور خاندان سنبھالنا شروع کیا۔ ٹرین تو کوٹ رادھاکشن کے بعد لاہور ہی میں تھی۔ کینٹ سے پہلے گلبرگ اور نواحی بستی کے درمیان سے گزر رہی تھی اور نان اسٹاپ جا رہی تھی۔ دھرمپورہ کی نہر کا پل آیا تو میں نے سر جھکا کے کھڑکی سے جھانکا اور مجھے بانسوں والی سڑک کی ایک جھلک دکھائی دی۔ پھر وہ سڑک آگئی جس کا پھاٹک بند تھا۔ ایک طرف گڑھی شاہو اور دوسری طرف صدر سے آنے والی ٹریفک رک گئی تھی۔ لوکو شیڈ میں سے نکلتے نکلتے پانچ منٹ گزر گئے۔ پھر ٹرین دندناتی ہوئی بلند و بالا چھتوں کے نیچے قلیوں اور لوگوں کے شور و غل سے گونجتے پلیٹ فارم پر جا رکی۔ میں نے چائے کی ٹرے ایک خالی ہونے والی سیٹ پر رکھی اور نیچے اتر گیا۔ یہ بھی ایک غلطی تھی۔ میں باہر جانے والے گیٹ کی سمت بڑھ رہا تھا کہ ایک ویٹر نے مجھے دیکھا۔ "ارے دو سو دس! تو کہاں جا رہا ہے" وہ چلّایا۔ "جانا تو مجھے تھا"

"تم بھی جاؤ" میں نے پلٹ کر دیکھے بغیر کہا۔ "میں نے کیا راستہ روکا ہے تمھارا"

شک اسے میری آواز ہی پر ہوگیا تھا۔ "لیکن تو نے میری جگہ پشاور تک جانے کا وعدہ کیا تھا" پھر اس نے میرے قریب آکے سر اکندھا پکڑا "تو... تم دو سو دس نہیں ہو"

میں نے اسے پوری قوت سے دھکا دیا اور وہ پیچھے آنے والے بہت سے مسافروں کو گراتا ہوا گرا۔ کچھ مسافروں کے ہاتھ سے سامان چھوٹ گیا۔ ایک قلی توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ اور سامان سمیت گرا تو دو خواتین نیچے دب گئیں۔ انھوں نے برقعوں کے اندر سے چیخنا شروع کیا۔ پلیٹ فارم پر بھگدڑ مچ گئی اور باہر جانے کا راستہ بند ہوتے ہی پلیٹ فارم پر ایک ہجوم اکٹھا ہوگیا۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر دوڑ لگائی اور اس کمرے میں داخل ہوگیا جس کے باہر "ٹکٹ کلکٹرز آفس" لکھا ہوا تھا۔ نیم تاریک کمرے میں چار ٹکٹ کلکٹر لمبی سی میز کے آخری کنارے پر فارغ بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔

ایک نے سر اٹھا کے مجھے دیکھا "کسے تلاش کر رہا ہے پہلوان؟"

"وہ... آپ کے ساتھ ہوتے ہیں نا ایک لمبے پتلے سے" میں نے سوچے سمجھے بغیر کہا۔

"پراچہ صاحب؟ کیا کام ہے ان سے؟" اس نے ... چلتے ہوئے کہا۔ "نکالو اپنا غلام"

میں نے سو کا ایک نوٹ نکالا "یہ دینا تھا ان کو۔ ادھار ... میں نے" میں نے کہا اور ساتھ والے کمرے کی طرف چل پڑا ... میں منہمک ٹکٹ چیکر نے دیکھے بغیر سو کا نوٹ جیب میں رکھ ... تھا۔ نہ جانے پراچہ کون تھا۔ شاید میں چوہدری کہتا تب بھی ... نہ کوئی نکل ہی آتا۔ کنفیوژن اس وقت پیدا ہوگا جب وہ ... نامعلوم پراچہ سو روپے کسی بھی ویٹر کو ادھار دینے کی بات ... نہیں ماننے گا۔ اس وقت تو میں کسی چور دروازے سے بھا... چاہتا تھا۔ پھر مجھے اچانک احساس ہوا کہ میں اسٹیشن ... ماسٹر کے کمرے میں موجود ہوں۔ اس نے عینک لگا کے ... گھور رہا تھا کہ میں "معاف کرنا جناب" کہہ کے پیچھے ... باہر نکل گیا۔

ریلوے اسٹیشن کے جنجال سے نکل کے میں نے اطمینان ... کا سانس لیا کہ مصیبت ٹل گئی۔ میں نے عظیم الشان کلاک ... دیکھا۔ اس میں چھ بج کر دس منٹ ہوئے تھے۔ میں نے آٹھ ... منظر کے گھر پہنچنے کا وعدہ کیا تھا۔ تاہم میرے ایک گھنٹہ پہلے ... پہنچ جانے میں بھی کوئی ہرج نہیں تھا۔ میرا خیال تھا کہ محسن ... صبح آٹھ بجے روانہ ہوا ہوگا تو تقریباً ایک بجے ملتان پہنچے گا ... سے رابعہ اسے اپنی کار میں لے گئی ہو۔ اگر دو بجے کے بعد ... الگ الگ کاروں میں واپس روانہ ہوئے تو سات بجے ... بعد ہی لاہور پہنچیں گے۔ مجھے اتنا وقت مل جائے گا کہ ... کی اس وردی کو اتار کے پھر سکندر بخت بن جاؤں اور وردی ... سنبھال کے رکھ لوں۔ تھانیدار اور ویٹر کی وردی حاضر اسٹاک ... میں دستیاب رہے گی تو وقتِ ضرورت کام آئے گی۔

میرا خیال تھا کہ رکشا لوں اور بازار سے گزرتے ہوئے ... اپنے سائز کا شلوار قمیص خرید لوں۔ لیکن میری مشکلات ابھی ... نہیں ہوئی تھیں۔ تانگہ اسٹینڈ پر خوجی نے مجھے دیکھ لیا۔ ... اپنی ٹیم کو دو تانگوں میں فٹ کر چکے تھے اور خود پانچویں سوار کی ... طرح کھڑے رہ گئے تھے۔ جس کے لیے جگہ کہیں نہ تھی۔

"تانگے میں تو جگہ ہے نہیں پہلوان۔ گھوڑے پر بیٹھو" ... کسی نے کہا اور میں ہنس پڑا۔ پلٹ کر دیکھتے ہی ہماری نظریں ... چار ہوئیں اور میں نے خود کو خوجی کی آتش فشاں نظروں ... دو فٹ کے فاصلے پر پایا۔ ان کے حلق سے ایک گھٹی گھٹی ... چیخ نکلی "اے بدمعاش" انھوں نے کہا جیسے تانگے والے ... نے اپنی بات کا ردِعمل سمجھا۔

"کسے کہا ہے بدمعاش پہلوان؟" تانگے والا جا...

لے کر پیچھے آیا۔ خوجی فیملی کی پروڈیوسر نے زنانہ گالیاں دینی شروع کر دی تھیں مگر میں وہاں سے رفوچکر ہوگیا۔ خوجی کو جارحیت پسند تانگے والے کی غلط فہمی دور کرنے اور اسے میرے بارے میں معلومات بہم پہنچانے میں جو چند منٹ لگے وہی میرے کام آئے۔ میں نے ایک موٹر سائیکل والے کو پان سگریٹ کی دکان کے سامنے رکتے دیکھا۔ اس نے موٹر سائیکل کو اسٹینڈ پر کھڑا کیا۔ انجن کو چلتا چھوڑ کے اترا اور جیب سے پرس نکال کے کچھ لینے کے لیے بڑھا۔ اس کے خیال میں خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔ موٹر سائیکل اس کے بالکل پیچھے دو قدم دور کھڑی تھی اور اسے دو منٹ میں لوٹ آنا تھا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا اور میدان صاف پا کے دوڑتے ہوئے موٹر سائیکل اٹھاتے ہی گیئر میں ڈال دی۔ نئی موٹر سائیکل کی پک اپ اچھی تھی مگر اس کے مالک کو فوراً علم ہوگیا تھا کہ موٹر سائیکل گئی۔ وہ میرے پیچھے بھاگا۔ موٹر سائیکل نے پورا ایکسیلریٹر دینے کے باوجود زیادہ اسپیڈ نہیں پکڑی تھی لیکن اس کی بدقسمتی کہ وہ ایک بدحواس شخص سے ٹکرا گیا جو رکشا سے اترا تھا۔ شاید وہ لیٹ ہوگیا تھا اور اسے گاڑی نکل جانے کا ڈر تھا کہ اس نے بھی مخالف سمت میں دوڑ لگائی۔ ان کے باہمی تصادم نے مجھے اس آخری مشکل مرحلے سے کامیاب و کامران گزرنے کا موقع فراہم کیا۔

بہت سے لوگ ویٹر کی وردی میں ایک موٹر سائیکل سوار کو دیکھ کر خوش ہوئے اور یوں ہنسے جیسے سرکس میں لوگ جوکر کو موٹر سائیکل چلاتے دیکھ کر خواہ مخواہ ہنسنے لگتے ہیں۔ موٹر سائیکل کو میں نے اطمینان سے ایک گلی میں چھوڑا اور وہاں سے تانگے میں بیٹھ گیا۔ کیا ایڈونچر تھا یہ مختصر سفر بھی۔ اپنی طرف سے میں نے بس کے سفر کو غیر محفوظ سمجھتے ہوئے ٹرین کا انتخاب کیا تھا لیکن ہوا اس کے برعکس۔ اب میاں خوجی کے علاوہ ان کے چند ہم سفر، باتھ روم سے دریافت ہونے والا بیہوش ویٹر اور وہ ویٹر جس نے پہچان لیا تھا کہ میں دو سو دس نمبر نہیں ہوں، ایک ٹکٹ کلکٹر، ایک تانگے والا اور ایک موٹر سائیکل والا میری جان کے دشمن تھے اور ان سب کی نظر میں میری حیثیت ایک مجرم کی تھی جسے وہ شناخت کر سکتے تھے۔ لاحول ولا قوۃ۔ اس سے تو کہیں بہتر ہوتا کہ میں کسی بس میں بیٹھتا اور سیدھا لاہور آکے اتر جاتا مگر جیسے گیدڑ کی شامت اسے شہر کی طرف لے جاتی ہے میری شامتِ اعمال مجھے ریلوے اسٹیشن لے گئی تھی۔ شلوار قمیص تو میں نے تانگہ ذرا سی دیر کے لیے رکوا کر خرید لیے مگر ان کو پہننے کی نہ جگہ تھی اور نہ فوری ضرورت۔

تانگے والے کو میں نے "خوش" کر کے ایک فرلانگ پہلے ہی رخصت کیا اور باقی فاصلہ پیدل طے کر کے عبدالودود منظر کے گھر پہنچا۔ رابعہ کی گاڑی باہر موجود تھی۔ مجھے اس کے قبل از وقت پہنچ جانے سے ایک عجیب سی خوشی ہوئی۔ اضطرابِ عشق نے اسے بہت پہلے کھینچ لیا تھا۔ محسن ابھی تک واپس نہیں آیا تھا ورنہ دوسری کار بھی وہیں موجود ہوتی۔ گھنٹی کا بٹن دبانے کی کوشش میں مجھے کرنٹ لگا۔ میں نے زیرِ لب منظر کو گالی دے کر دروازہ بجایا۔

"کون ہے بے؟" منظر نے ایک کھڑکی کا پردہ تھوڑا سا ہٹا کے کہا۔

"تمھارا باپ" میں نے کہا "نمبر دو سو دس۔ جسے دو سو بیس وولٹ کا کرنٹ لگا ہے"

آواز پہچان کے منظر نے دروازہ کھولا اور گلا پھاڑ کے ہنسا "ابے بھوتنی کے۔ دو سو دس نمبر کی اولاد۔ آگیا اپنی

اصل اوقات پر۔ چل اچھا ہوا کہیں نوکری سے تو لگا۔" اس نے میرے ایک دھپ مارا۔ میں نے اس کے دو ہاتھ مارے۔ "یہ خطیب کی گھنٹی لگانے کا مقصد کیا ہے؟ اندر بھی" الیکٹرک چیمبر، رکھوالیے۔"

اسی وقت رابعہ نمودار ہوئی۔ حیران ہوئی۔ ہنسی اور شرمائی۔ میں نے پیشہ ور ویٹر کے انداز میں کہا: "آپ چائے پسند کریں گی میڈم یا کافی؟ اور اس کے ساتھ کیا کھائیں گی؟ بلا تکلف لے آیئے اندر سے۔"

آدھے گھنٹے بعد جب میں نہا کے کپڑے بدل چکا تھا اور کافی کے ساتھ سینڈوچ کی پلیٹ صاف کر رہا تھا جو رابعہ نے بنائے تھے تو مجھے محسن کا خیال آیا۔ "معاف کیجیے گا بھوکے تو آپ لوگ بھی ہوں گے۔ مجھے خیال نہیں آیا پوچھنے کا۔ بڑی بداخلاقی کی بات ہے لیکن اس سے زیادہ تشویش کی بات یہ ہے کہ شیروانی صاحب لیٹ کیوں ہو گئے ہیں؟" میں نے کہا۔

"ارے وہ سالا کون سا کم ہے۔" منظر نے کہا۔ "جیسی روح ویسے فرشتے۔ بھاگ گیا وہ کار سمیت کسی کے ساتھ۔ ہمیں تو خیر کبھی ایسا موقع ہی نہیں ملا۔"

"یار منظر، اپنے چوہدری دلاور صاحب کا کیا حال ہے؟" میں نے کہا۔

"شکاری کی اولاد۔ پولیس ریمانڈ پر ہیں آج کل۔" وہ گلا پھاڑ کے ہنسا۔ "سالے کی ضمانت بھی نہیں ہوئی۔"

"ضمانت کیوں۔ یار ایسے شریف آدمی نے کیا جرم کیا تھا؟" میں نے کہا۔

منظر نے پھر مجھے ایک دھپ رسید کرنے کی ناکام کوشش کی۔ "اچھا پھنسایا ہے تم دونوں نے اسے۔ ادھر محسن نے وہ صندوق اندر اتروایا ادھر پولیس پہنچ گئی چوہدری صاحب کے گھر۔ بیگم صاحبہ نے بڑی خوشی سے صندوق رکھ لیا اور محسن تو خیر باہر سے ہی کھسک لیا تھا۔ وہ تانگے والا بھی چلا گیا تھا۔ چوہدری صاحب پولیس کے ساتھ ساتھ ہی پہنچے۔ بس چند منٹ کا فرق تھا۔ اب وہاں بڑی گرماگرمی ہوئی۔ پولیس مصر تھی کہ اس میں لاش ہے۔ چوہدری دلاور بہت گرم ہوا کہ یہ کس الو کے پٹھے نے کہا ہے۔ وہ کوئی اکرام شیخ نائب انسپکٹر تھا۔ کہنے لگا کہ کسی پڑوسی نے سب کچھ دیکھ کر فون کیا ہے۔ بیگم صاحبہ کی حالت غیر تھی کہ بیٹھے بٹھائے یہ کیا مصیبت نازل ہو گئی۔ میاں بیوی کا جھگڑا الگ شروع ہو گیا۔ چوہدری چلانے لگا کہ میرا نام لے کر کوئی ایٹم بم دے جائے تو لے لینا اور کر دینا تباہ اس گھر کو۔ پھر پولیس سے لڑنے لگا اندر آئے کیسے؟ خانہ تلاشی کے وارنٹ ہیں؟ یہ گھر کا سامان ہے۔ اس نے کہا کہ یہ چھاپا مارا ہے ہم نے۔ وارنٹ بھی لے لیں گے لیکن اچھا ہے آپ صندوق کھول کر دکھا دیں۔ اس نے انکار کیا۔ شک تو تھا ہی کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔ انسپکٹر نے کہا پھر میں تمھیں اپنی ذمے داری پر گرفتار کر کے لے جاتا ہوں اور یہ صندوق بھی۔ اس کے ساتھ پولیس کی نفری تھی۔ دلاور کی پوزیشن بڑی خراب ہونے لگی۔ انسپکٹر اسے ہتھکڑی لگا کے لے جانے پر مصر تھا اور یہ بڑی بے عزتی کی بات تھی۔ صندوق میں کیا ہے یہ وہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔ اس نے انسپکٹر کو اندر لے جا کے بات کرنی چاہی۔ مقصد تھا کچھ دے دلا کے اسے رخصت کرے۔ اس نے دوسری فرد جرم عائد کرائی۔ چوہدری دلاور نے اس سے فون کرانے کی اور اس سے بات کرنے کی دھمکی دی مگر وہ انسپکٹر تو اینٹھ گیا کہ اب تو چاہے نوکری جائے یا پھانسی مجھے ہو جائے، میں یا تو صندوق کھول کے دیکھوں گا یا ساتھ لے جاؤں گا۔ چوہدری کے لیے اس نے کوئی چارہ نہ رہا کہ صندوق کا تالا توڑے۔ اس کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ اندر سے کیا نکلے گا۔ نہ اسے یہ امید تھی کہ اکرام شیخ کے علاوہ بھی پولیس میں کتنی اکرام شیخ ہیں۔ تالا توڑنے کے بعد اس پر ہارٹ اٹیک ہو گیا۔ اس کی بیوی بے ہوش ہو گئی اور بڑا ہنگامہ ہوا۔ پولیس نے لاش قبضے میں لی اور چوہدری دلاور کو اٹھا کر لے گئے۔ ہارٹ اٹیک کو انھوں نے صاف مکر قرار دیا۔ اتنے بڑے جھوٹ کے بعد وہ دلاور کی کوئی بات ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔ معلوم نہیں وہ کیسے زندہ بچ گیا۔ ڈاکٹر نے اس کو تھانے میں آ کر دیکھا تھا۔"

"اس نے اسپتال بھیجنے کی سفارش نہیں کی؟" میں نے کہا۔

"کی تھی لیکن وہ سرکاری ڈاکٹر نہیں تھا۔" منظر بولا۔ "دلاور کا فیملی ڈاکٹر تھا۔ پھر دلاور ٹھیک ہو گیا اور اس کے خلاف ایف آئی آر درج ہو گئی۔ خاصے سنگین الزامات عائد ہو گئے اس پر۔ مزید یہ کہ اس کی شریک حیات کا نام چشم دید گواہوں میں آ گیا۔ اس کے اپنے ڈرائیور اور خانساماں کے ناموں کے علاوہ۔ اس نے ٹاپ کے وکیل کیے ہیں۔ چودہ دن کا ریمانڈ ختم ہو گا تو ضمانت ہو گی۔"

"ویری گڈ۔" میں نے جوش سے ہاتھ مل کے کہا۔ "یو انٹس برابر ہوتے جا رہے ہیں۔"

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ حسب عادت منظر نے پردہ ہٹا کے جھانکا اور مجھے اشارے سے بلایا۔ میں نے دیکھا تو دروازے پر محسن کھڑا تھا۔ لیکن وہ اکیلا نہیں تھا۔

اُس کے ساتھ ڈاکیے کی وردی میں شوفر کی خدمات بجا لانے والا وہ ٹرک ڈرائیور بھی تھا جو پہلے ہمارے نکتۂ نظر سے صف دشمناں میں شامل تھا اور اب ہم سے مل گیا تھا۔ وہ بھی اس کی مجبوری تھی اور یہ بھی مگر خود اپنی نظر میں وہ دھوبی کا کتا ہو گیا تھا جو نہ گھر کا رہے نہ گھاٹ کا۔ تقدیر بھی آدمی کے ساتھ کیسے مذاق کرتی ہے۔ طافو صرف ایک ہزار روپے ماہانہ پر ٹرک چلا کے لاہور سے کراچی آتا جاتا تھا۔ سیکڑوں ہزاروں ٹرک ڈرائیوروں کی طرح جو مال برداری کے سوا کچھ نہیں کرتے اور یہ مال کسی بھی اعتبار سے ناجائز نہیں ہوتا۔ وہ ایک بہت بڑے قانون شکن گروہ کا آلۂ کار تھا لیکن یہ بات اسے معلوم نہیں تھی۔ پھر اچانک حرص و طمع سے گمراہ ہو جانے والے رحمت کباڑی نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ مال حرام میں برابر کا شریک بن جائے۔ وہ انکار کرتا تب بھی مارا جاتا۔ شریک جرم ہو جانے کے بعد بھی اسے سزا تو موت ہی ملی۔ اُوپر والوں کو معلوم ہو گیا تھا کہ رحمت کباڑی نے اور اس ٹرک ڈرائیور نے مل کر دس لاکھ کے مال کو خورد برد کر دیا ہے۔ اپنی طرف سے انھوں نے دونوں کے لیے موت کا فرمان جاری کر دیا تھا مگر قدرت کی طرف سے اپنے انجام کو وہ پہنچا جو اصل مجرم تھا اور اس سزا کا مستحق تھا۔ طافو کو پانچ لاکھ کے عوض اپنی اور اپنے بیوی بچوں کی زندگی گروی رکھنا منظور نہ تھا اور وہ جینے کی آرزو میں ہمارا سہارا پا کے نئی امید کے ساتھ جدوجہد کر رہا تھا۔

طافو بہت تھکا ہوا اور پژمردہ تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرایا اور میں نے حیرت و مسرت کے ساتھ ہاتھ ملا کے اسے اندر کھینچ لیا۔ "میں تو سمجھا تھا تم کھو گئے۔" میں نے کہا۔ "کہاں چلے گئے تھے تم؟"

"میں نے تین گھنٹے سے گزر کر آپ کا بہت دیر تک انتظار کیا۔" وہ بولا۔ "پھر میں نے فائرنگ کی آواز سنی اور بہتر یہی سمجھا کہ گاڑی لے کر نکل جاؤں۔ گاڑی میں نے سڑک کے کنارے محفوظ جگہ پر چھوڑ دی تھی اور ملتان چلا گیا تھا۔"

"تمھیں مجھ سے زیادہ گاڑی کی فکر تھی۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"مجھے یقین تھا کہ آپ تو کبھی نہ کسی طرح ملتان پہنچ جائیں گے۔" وہ بولا۔ "گاڑی پکڑی جاتی تو میرے لیے بھی مشکل پیدا ہوتی اور آپ کے لیے بھی پریشانی میں اضافہ ہوتا۔ کیا میں نے غلط کیا جناب؟"

"نہیں۔ تم نے عقل سے کام نہ لیا ہوتا تو اس وقت گاڑی کے ساتھ یہاں نہ پہنچ پاتے۔" میں نے کہا۔ "میں تو نقلی ملتان پہنچ گیا تھا۔ تم نے گاڑی کو پھر کیسے تلاش کر لیا؟"

"بس جی میرا خیال تھا کہ آپ اگر ملتان گئے تو اچھے ہوٹل ہی میں ٹھہریں گے۔" وہ بولا۔ "میں نے ساری رات تمام فرسٹ کلاس ہوٹلوں میں دیکھا مگر گاڑی مجھے کہیں نظر نہ آئی۔ میں مایوس ہو کے واپس لوٹ رہا تھا کہ گاڑی ایک سینما کے سامنے مل گئی۔ میں دور کھڑا دیکھتا رہا۔ تین گھنٹے بعد میں نے محسن صاحب کو دیکھا۔ یہ گاڑی لے جانے کے لیے آئے تھے میرے سامنے سے گزرے تو میں نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور انھوں نے پہچان لیا۔"

"تم رات بھر مجھے تلاش کرتے رہے تو یقیناً سوئے نہیں ہو گے۔" میں نے کہا۔

"بس جی۔۔۔ فکر ہو تو نیند بھی کہاں آتی ہے۔" وہ بولا۔ "اپنا ڈر تھا۔ بیوی بچوں کا خیال تھا اور آپ کی طرف سے تشویش تھی۔ محسن صاحب نے بتایا کہ سب ٹھیک ہے تو تسلی ہوئی۔ راستے میں پلک جھپکی تھی کہ لاہور آ گیا۔"

"اچھا۔۔۔ اب تم نہا دھو کے کپڑے بدلو۔" میں نے کہا۔ "یہ ڈاکیے کی وردی اتار دو۔ کچھ کھا پی کے آرام کر لو۔۔۔ کل دیکھیں گے کہ تمھیں اور تمھارے خاندان کو بحفاظت کہاں منتقل کیا جائے اور کیسے؟"

منظر نے اور رابعہ نے یہ سب گفتگو خاموشی سے اور توجہ سے سنی تھی۔ محسن کو ڈرائیونگ نے تھکا دیا تھا اور وہ جوتوں سمیت صوفے پر دراز تھا لیکن سویا نہیں تھا محض آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ طافو کی نظر بار بار منظر اور رابعہ کی طرف سوالیہ انداز میں اٹھتی تھی۔

"یہ اپنے دوست ہیں طافو۔" میں نے کہا۔ "بہت بڑے اور قابل وکیل ہیں۔ یہ منظر صاحب تو تم کو بھی نظر آ رہے ہوں گے کہ کتنے بڑے ہیں اور یہ قانونی۔۔۔۔"

"یہ بہت قابل وکیل ہیں۔" محسن نے آنکھیں کھول کر کہا۔ "مگر ان کی قابلیت کے اور ان کے جملہ حقوق محفوظ ہیں۔"

محسن نے بڑی متانت سے بات کی تھی لیکن طافو کیا سمجھتا۔ رابعہ کا رنگ گلابی ہوا اور اُس نے گھور کر محسن کی طرف دیکھا لیکن وہ مزے سے لیٹا ٹانگ ہلاتا رہا۔ پھر منظر نے "ہو ہو ہو" کہہ کے ہنسنا شروع کیا تو رابعہ مزید خفیف ہوئی لیکن محسن کی سنجیدگی میں فرق نہیں آیا۔

"یار منظر" میں نے کہا۔ "یہ اپنے ساتھی ہیں۔ ان کے نہانے دھونے کا اور قیام و طعام کا کچھ انتظام کر۔ اس پوسٹ مین کی وردی کی جگہ اگر شریفانہ کپڑے مل جائیں تو اچھا ہے۔"

"شریفانہ کیا۔ اپنے کفن ہیں جو ہم تیری خاطر سر سے باندھے پھرتے ہیں ——" منظر بولا۔ "اسی سے یہ بھی گزارا کر سکتے ہیں تو چشمِ ما روشن دلِ ما شاد۔ آئیے جناب۔"

وہ طافو کو اندر لے گیا۔

میں نے جوتا اتارا۔ "نورِ چشمی! تمھاری زبان کے بریک فیل کیوں ہو جاتے ہیں بے موقع؟" اور جوتا کھینچ کر اس کی طرف پھینکا مگر وہ بڑی پھرتی سے اٹھ بیٹھا اور بچ گیا۔

"خاتون! دیکھ رہی ہیں یہ لاقانونیت؟" وہ چلایا۔ "آپ کی نظروں کے سامنے ہو رہی ہے یہ دست درازی —— میں اس قاتلانہ حملے کے خلاف احتجاج کرتا ہوں۔" اُس نے جوتا اٹھایا اور کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ باہر سے کسی کے ہلکٹر مچانے کی آواز آئی۔ میں کھڑکی کی طرف دوڑا۔

"مار دیا جوتا اپنے ماموں کو؟" میں نے کھڑکی سے باہر جھانک کر کہا۔ "آ رہے ہیں وہ جوابی کارروائی کے لیے۔ جا اُن سے جوتا وصول کر۔"

"جس کا جوتا اسی کا سر۔" محسن نے کہا اور اپنے دونوں جوتے سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ مجبوراً مجھے جانا پڑا۔ دروازہ کھولتے ہی میری نگاہ ایک پہلوان ٹائپ شخص پر پڑی جس کی شخصیت کا سب سے نمایاں حصہ مونچھیں اور پیٹ تھا۔

"بھوپے پہلوان کے سر پر جوتا رسید کرنے کی جرأت کس نے کی ہے؟" وہ جوتا اٹھا کے پھنکارنے لگا۔ اپنے جسم کے مقابلے میں پہلوان کی آواز مضحکہ خیز حد تک نسوانی تھی لیکن میں نے ہنسی کو ضبط کیا۔

"ایسی جرأت کون کر سکتا ہے پہلوان جی!" میں نے مسکینی سے کہا۔ "بچے نے غلطی سے باہر پھینک دیا۔"

"کس کا بچہ تھا اور جوتا کس کا تھا؟" پہلوان نے جوتا دیوار پر مار کر کہا۔ "تمھارا؟"

"توبہ توبہ —— میں تو ابھی خود بچہ ہوں پہلوان جی! وہ بھتوئی ہے میرا۔" میں نے کہا۔ "تھانیدار ہے نا، اس لیے بچے کو عادت پڑ گئی ہے۔ شرفا کو جوتے مارنے کی —— جوتا بے شک میرا ہے۔"

پہلوان کا سارا جوش و خروش ٹھنڈا پڑ گیا۔

"بھانجے اور جوتے کو سنبھال کے رکھو۔" اُس نے جوتا مجھے تھما کر کہا۔ عین اس وقت جب پہلوان واپس جانے کے لیے مڑا اور میں نے دروازہ بند کیا، ایک جیپ دروازے کے سامنے آ رکی۔ درز میں سے مجھے انکل رضوی کا چہرہ نظر آیا جو پوری وردی میں تھے اور اپنے ساتھ پولیس کی نفری بھی لائے تھے۔ میں واپس بھاگا۔ اُن کے یوں آنے کا مقصد میری گرفتاری کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا تھا لیکن میں حیران تھا کہ انھیں منظر کے گھر میں میری موجودگی کی اطلاع کیسے مل گئی؟ یہ فرض کرنا محال تھا کہ گھر کے کسی فرد نے انھیں فون پر مطلع کر دیا ہوگا۔ شاید مجھے کسی نے یہاں آتے ہوئے دیکھا اور پہچان کر پولیس کو خبر کر دی۔ اس وقت یہ سوچنے کی مہلت ہی نہیں تھی۔ چند سیکنڈ میں میں اندر جا پہنچا۔

"محسن! انکل رضوی نے میری گرفتاری کے لیے چھاپا مارا ہے۔" میں نے کہا۔ محسن ایک دم کھڑا ہو گیا اور اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ رابعہ کا رنگ اُڑ گیا تھا اور وہ بُت بنی کھڑی رہ گئی تھی۔

"وہ.... وہ یہاں کیسے آ پہنچے؟" محسن نے کھڑکی بند کر دی۔

"مجھے نہیں معلوم —— لیکن میں اس وقت گرفتار ہونے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔" میں نے کہا۔ "باہر جو گاڑی کھڑی ہے وہ ڈاکٹر امجد کے نام پر رجسٹرڈ ہے، اسے میں یہیں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔"

"لیکن.... کہاں؟" رابعہ نے گھبرا کے کہا۔ اطلاعی کال بیل بجنے لگی۔

"میں.... اب دروازے سے تو نکل نہیں سکتا۔" میں نے کہا۔ اسی وقت منظر نمودار ہوا۔

"منظر! باہر انکل رضوی اپنی پولیس فورس کے ساتھ کھڑے ہیں۔" میں نے کہا۔ "مجھے گرفتار کرنے کے لیے۔"

"پھر کیا ہوا؟" وہ بولا۔ "کھڑا رہنے دے —— ابے! وکیل کا گھر ہے۔ مینڈا لاٹ بھی وارنٹ کے بغیر اندر نہیں آ سکتا۔"

"یار انکل رضوی بے وقوف نہیں ہیں۔ وہ کھٹ سے وارنٹ نکال کے دکھا دیں گے۔" میں نے گھبرا کے کہا کیونکہ کال بیل اب مسلسل بج رہی تھی۔ "تو جا کے نہیں، روک میں اندر سے ہو کے چھت پر چلا جاتا ہوں۔ اور ساتھ والے گھر میں اُترنے کی کوشش کرتا ہوں راستہ ہے نا؟"

"راستہ تو ہے۔" منظر بولا۔ "مگر بھوتنی کے یہ ایک اور مصیبت پڑ جائے گی۔ وہ محلّے کا محاصرہ کریں گے۔"

"تو جا دروازہ کھول۔" میں نے کہا۔ "اور محسن! طافو پر آنچ نہ آنے دینا۔ کہہ دینا گھر کا نوکر ہے۔ میں پھر رابطہ قائم کروں گا۔"

میں نے ایک نظر رابعہ کو دیکھا اور غائب ہو گیا۔ مجھے معلوم تھا منظر کی بیوی پردہ کرتی ہے اور میں نے کبھی منظر کے گھر کے اندر کا نقشہ بھی نہیں دیکھا تھا۔ ایک کمرے سے گزرتے ہی میری نظر نے منظر کی بیوی کو دیکھا جو ہاتھ میں لوٹا لیے کھڑی تھی۔ مجھے یوں شترِ بے مہار کی طرح اندر آتے دیکھ کر وہ اتنی حیران ہوئی کہ لوٹا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ دوپٹے سے منہ چھپا کے اندر بھاگی۔ زینہ اچانک صحن کے دوسرے کنارے پر میرے سامنے آ گیا۔ تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ منظر کی اولاد کا ہجوم میری راہ میں حائل نہیں ہوا۔ اُن کو خبر ہونے تک میں زینے کے راستے چھت پر پہنچ چکا تھا۔ چھت پر وہ سب رنگ برنگے زنانہ اور مردانہ کپڑے لہرا رہے تھے۔ جو منظر کی زوجہ نے دھو کر سوکھنے کے لیے الگنی پر پھیلائے تھے۔ میں اُن کے نیچے سے گزرا اور چھت کی منڈیر تک پہنچا۔ ایک طرف تین منزلہ مکان کی سیدھی دیوار کھڑی تھی۔ پچھلے حصے میں دوسری قلعہ نما عمارت کھڑی تھی چنانچہ میرے لیے فرار کا راستہ صرف ایک طرف سے کھلا ہوا تھا۔ میں نے چھ فٹ کی دیوار کو دونوں ہاتھوں کے بل پر عبور کیا اور دوسری طرف کی چھت پر گرا۔ منظر کے گھر کی چھت بارہ فٹ بلند تھی مگر ساتھ والے گھر کی اونچائی دس فٹ تھی چنانچہ میں دو فٹ نیچے کودا تو دھمکے سے چھت میں گونج اور لرزش پیدا ہوئی۔ اپنی ناجائز تشریف آوری کا اعلان میں نے پہلے ہی کر دیا تھا۔ "ارے کون کم بخت ہے چھت پر؟" نیچے سے کسی عورت نے چلا کر کہا۔ "اجی ذرا دیکھنا۔"

میں کھٹ کھٹ کرتا نیچے اُتر گیا جیسے میں نے کوئی غیر قانونی حرکت نہیں کی اور یہ کسی اجنبی کا نہیں میرے ماموں کا گھر ہے۔ خستہ زینے سے نیچے قدم رکھتے ہی میں نے خود کو ایک مختصر سے صحن میں پایا۔ اتنی دیر میں اہلِ خانہ کے لیے شبہے کی کوئی گنجائش نہ رہی تھی کہ خلائی مخلوق کی اڑن طشتری چھت پر نہیں اُتری ہے تو کسی چور ڈاکو نے یقیناً دھاوا بولا ہے۔ خاتونِ خانہ اپنے خداوندِ مجازی کو پہلے ہی متوجہ کر چکی تھیں اور اب صحن میں میرے مقابل تین افراد تھے۔ ایک ساٹھ ستر سال کی بڑھیا جو خشک ہو کے چمڑا بن گئی تھی۔ ایک نسبتاً جوان اور فربہ بدن عورت جو بڑھیا کی بہو اور بیٹی ہو سکتی تھی اور ایک بانس کی طرح لمبا پتلا مرد جو مذکورہ بڑھیا کا بیٹا یا داماد تھا۔

"کو.... کون ہے۔ بے تو؟" مرد نے کہا جسے زوجہ محترمہ نے کپڑے دھونے کا ڈنڈا پکڑا کے مسلح کر دیا تھا۔ بڑھیا نے چیخ مارنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے ریوالور نکال لیا۔ "خبردار۔ کسی کے حلق سے آواز نکلی تو حلق میں سوراخ کر دوں گا۔" میں نے پنجابی فلموں کے ولن کی طرح آواز کو خطرناک بنا کے کہا۔ بڑھیا کا منہ بند ہو گیا اور وہ پیٹ سے نیچے گری مگر جوان عورت نے کسی ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا۔ جس سے ثابت ہوا کہ وہ بہو ہے۔

"اماں ——" مرد چلایا، پھر اس نے گھور کر بیوی کو دیکھا۔ "ارے دیکھ اماں کو۔ مر تو نہیں گئیں ——"

"اونہہ —— روز مرنے کی دھمکی دیتی ہیں۔ مرتی کہاں ہیں ——" عورت نے منہ بنا کر کہا اور بڑھیا کو اٹھانے کے لیے بڑھی۔

"تم کیا چاہتے ہو ڈاکو صاحب!" مرد مجھ سے مخاطب ہوا۔ اُس نے ریوالور سے نظریں چراتے ہوئے اپنے جسم کی کپکپی اور آواز کی لرزش پر قابو پانے کی ناکام کوشش کی۔ "قسم اللہ کی ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔"

"میں ڈاکو نہیں ہوں۔" میں نے کہا۔ "شریف آدمی ہوں۔"

"اچھا!" مرد بھونچکا رہ گیا۔ "یہ بات اگر تم زبردستی منوانا چاہتے ہو تو الگ بات ہے...."

"میں کسی کے ساتھ کوئی زبردستی نہیں کروں گا۔" میں نے کہا۔ "مجھے تھوڑی دیر کے لیے پناہ چاہیے کیونکہ میرے پیچھے کچھ دشمن لگے ہوئے ہیں۔ اُن کے جاتے ہی میں بھی چلا جاؤں گا۔"

"تم وکیل صاحب کے گھر سے اِدھر آئے ہو؟ ہائی جمپ لگا کے؟" وہ بولا۔

"میں.... اُن کو نہیں جانتا۔ وہاں بھی ایسے ہی گھسا تھا۔" میں نے کہا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ بعد میں منظر پر کوئی الزام آئے تو ہمسایہ اس کے خلاف ایک گواہ بن جائے۔

"پھر تو تم واقعی شریف آدمی ہو۔" وہ بولا۔ "ابھی میں دروازے سے جھانک رہا تھا اور میں نے پولیس کو آتے دیکھا تھا۔ اگر وہی تمھارے دشمن ہیں تو تمھیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، تمھاری شرافت ثابت ہے۔"

"اچھا! میں بدمعاش ہوں۔" میں نے جھنجھلا کر کہا۔ "اب تمھاری

خیریت اسی میں ہے کہ جو میں کہوں وہی کرو۔ اپنی بیوی سے کہو کہ ساس کو اندر لے جائے اور اسے فی الحال بے ہوش رہنے دے —— تم آگے چلو۔ مجھے بتاؤ کہ ضرورت پڑنے پر میں کس طرف سے باہر جا سکتا ہوں؟"

"باہر جانے کا ایک ہی راستہ ہے۔" وہ بولا۔ "لیکن وہ گلی میں کھلتا ہے اور گلی میں پولیس کھڑی ہے۔"

"پھر میں پولیس کے واپس جانے کا انتظار کروں گا۔" میں نے کہا۔ "مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔"

"لیکن پولیس یہاں بھی آ سکتی ہے۔ تمھارے ساتھ وہ مجھے بھی پکڑ کر لے جائیں گے۔" اس نے مردہ آواز میں کہا۔

"نہیں۔ وہ تمھارے گھر کا محاصرہ کر سکتے ہیں، اندر نہیں آ سکتے۔" میں نے کہا۔ "ان کے پاس وارنٹ نہیں ہو گا۔"

"اجی کیا بات کرتے ہیں آپ۔ پولیس کہاں پروا کرتی ہے وارنٹ کی۔" وہ بولا۔

"مگر جو پولیس افسر چھاپا مارنے... میرا مطلب ہے پولیس کی نفری کے ساتھ آیا ہے وہ بہت اصول پرست اور شریف آدمی ہے۔" میں نے کہا۔ تنومند بہو اپنی ازلی دشمن ساس کو اٹھا کے اندر لے گئی۔ زیرِ لب مجھے یا ساس کو کوستی ہوئی۔

"ہاں ہاں — ایک تم شریف آدمی ہو، ایک وہ شریف ہیں جیسی روح ویسے فرشتے۔" وہ بولا۔ "مارا جاؤں گا میں غریب آدمی۔ اِدھر سے تم گولی مار دو گے اُدھر سے پولیس۔ آگے کنواں پیچھے خندق۔"

"اندر چلو۔" میں نے غرا کے کہا اور ریوالور لہرایا۔ وہ خاموش ہو کے اندر چل پڑا۔

"بات سنو جی —" دروازے کی اوٹ سے خاتونِ خانہ نے پکار کے کہا۔ میں اُن کے شوہر کے ساتھ اندر داخل ہوا اور خاتون نے مجھے گھورا۔ "اجی ایک منٹ بات تو کرنے دیں۔ میاں بیوی کی بات ہے۔" اس نے کوئی چیز پیچھے چھپائی۔

"اچھا۔" میں نے کہا۔ "میں دور کھڑا ہو جاتا ہوں۔ جو کہنا ہے آہستہ سے کان میں کہہ دو — ویسے میں بھی بہرا ہوں۔"

میں نے کمرے کے دوسرے گوشے سے میاں بیوی کو زد میں رکھا اور بڑی بی کو دیکھا جو مسہری نما پلنگ پر سیدھی لیٹی تھیں۔ ان کی آنکھیں بند تھیں لیکن سانس ٹھیک چل رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے شبہ ہوا کہ بڑی بی مکر کر رہی ہیں اور بے ہوشی کو صرف تحفظ و سلامتی کی خاطر چھتری بنائے لیٹی ہیں۔

"کون سکندر بخت؟" صاحبِ خانہ نے اچانک بلند آواز میں کہا اور اپنے احمق ہونے کا ثبوت دیا۔ بیوی نے دیکھا کہ تیر ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ میں اپنا نام سن کر چونک پڑا تھا اور وہ دونوں مجرم بنے سہمے کھڑے تھے۔

"تو تم نے مجھے پہچان لیا ہے تمھاری بیوی نے۔" میں نے ریوالور لہ

"وہ... دیکھیں — یہ عورت فاتر ہے۔" مرد چلانے لگا۔ "بہت چالاک بنتی ہے۔ معاف کر دیں اس بے وقوف کو۔"

"بے وقوف تم ہو۔" میں نے آہستہ سے بات کی تھی کیا ضرورت تھی چلانے کی۔" بیوی نے جبار اس کے سر پہ دے مارا۔

"اب تمھارے بچنے کی صورت نہیں رہی۔" میں نے ریوالور کو ذرا اچھال کے گھمایا اور بڑی مہارت کے ساتھ پھر سیدھا تھام لیا۔ "ویسٹرن فلموں کے کاؤ بوائے کی طرح — تم سب جانتے ہو۔ اخبار میں میری تصویر دیکھ چکے ہو۔ اچھا ہوا مجھے بروقت معلوم ہو گیا ورنہ بعد میں تم میرے خلاف پولیس کو بیان دیتے۔"

"نہیں نہیں... قسم اللہ کی۔ ہم کچھ نہیں کہیں گے کسی سے۔" عورت نے رونا شروع کر دیا۔ اسی وقت انکل رضوی نے میگا فون پر بولنا شروع کیا۔

"سکندر — میں تم کو دس منٹ کی مہلت دیتا ہوں۔ خود کو گرفتاری کے لیے پیش کر دو۔ تم فرار ہو کے کہیں نہیں جا سکتے۔ پولیس نے ہر طرف سے گلی بند کر دی ہے۔" انکل رضوی کی آواز میرے کانوں تک صاف پہنچ رہی تھی جیسے وہ یہ غالباً میاں بیوی بھی سن رہے تھے۔ میرا ذہن صورتِ حال کی اس ڈرامائی تبدیلی سے نمٹنے کے لیے مصروف تھا۔ انکل رضوی کی وارننگ سے یہ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ انھیں میری جائے پناہ کا علم ہے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ خانہ تلاشی کا وارنٹ لے کے آئے ہوں اور منظر نے انھیں گھر میں داخل نہ ہونے دیا ہو۔ انھیں منظر کے گھر میں میری موجودگی کا یقین نہ ہوتا تو وہ اتنی تیاری کے ساتھ گرفتار کرنے نہ آتے۔ لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ وہ منظر کے گھر میں تلاش کرنے کے بعد ناکام ہو کے اس نتیجے پر پہنچے ہوں کہ میں چھت سے ساتھ والے گھر میں اتر گیا۔ میں کوئی جن بھوت نہیں تھا کہ غائب ہو جاؤں یا مکھی بن کے اڑ جاؤں۔ وہ ذہین آدمی تھے اور گھر میں نہ پا کے انھوں نے فرار کے امکانات کا جائزہ لیا ہو گا اسی نتیجے پر پہنچے ہوں گے کہ میں اور کہیں نہیں جا سکتا۔ اس نکلنے کا راستہ صرف ایک تھا جو ان کی نظر میں تھا اور وہ جانتے کہ میں اس راستے سے باہر نہیں گیا۔ میں کشمکش و پیچ میں مبتلا ہو گیا۔ اگر وہ مجھے منظر کے گھر سے باہر آنے کا حکم دے رہے تھے تو ڈھونڈنے کے گھر سے نکلنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی اور اگر وہ چاہتے کہ میں ساتھ والے گھر سے نکل آؤں تو مجھے یہ منظور نہیں تھا۔ ہتھیار ڈالنے کا مطلب میرے لیے صرف شکست نہیں تھا، میری جدوجہد کا خاتمہ تھا۔ میرے تمام مقاصد کی ناکامی تھا اور ان عزائم سے دستبرداری تھا جو مجھے زندگی سے زیادہ عزیز تھے۔

خود کو قانون کے حوالے کر دیتا تو فتح مند وہ شکاری کہلاتے جو مجھے شکار کرنے کے لیے گھیر کر ولایت سے پاکستان لے آئے تھے۔ میرے گرد سازشوں کے جال پھیلاتے رہے تھے لیکن مجھے ہر طرف سے محصور کرتے رہے تھے۔ ابھی تک مقابلہ برابر تھا۔ شکاری خود بھی شکار ہوئے اور جانی و مالی اعتبار سے ان کے نقصانات بھی کم نہ تھے — میں اپنی متحد قوت، اپنی اجتماعی طاقت اور اپنی دولت سے حاصل ہونے والی حمایت پر جتنا غرور پہلے تھا اتنا اب نہیں تھا۔ انھوں نے تو مجھے تنہا جانا تھا اور بہت کمزور حریف سمجھا تھا۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ مجھے نہ طاقت کے بل پر جھکا سکیں گے اور نہ میری کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کے شکار کر سکیں گے۔ جسے وہ ایک ناتجربہ کار، کھلنڈرا اور کم عمر لونڈا سمجھے تھے، وہ ان کی ٹکر کا حریف بن گیا تھا جس کے ہاتھوں انھیں پہلے پہلے ہزیمت کا سامنا تھا۔ یہ کتنی عجیب بات تھی کہ وہ سب میرے باپ کو بلیک میل کر کے قتل کرا چکے تھے، اس کے جائز کاروبار کی آڑ میں اپنا مذموم غیر قانونی کاروبار کر رہے تھے اور اپنے جرم پر پردہ پڑا ہوا رکھنے کے لیے اور افشائے راز سے بچنے کے لیے اَن گنت بے گناہوں کے خون سے اپنا دامن تر رکھتے تھے۔

وہ قانون کی نظر میں معزز، معتبر اور بے گناہ تھے کیونکہ اس نظام عدالت کے لیے انھوں نے اپنے خلاف ہر ثبوت کو اور ہر شہادت کو باقی نہ رہنے دیا تھا اور میں جو مظلوم تھا، انصاف چاہتا تھا، اپنا حق مانگتا تھا آج اس مقام پہ تھا جہاں انصاف کی نظر میں میری حیثیت ایک مفرور اور اشتہاری مجرم کی تھی جس کی فردِ جرم میں اتنے الزامات تھے کہ اگر میں اپنا معاملہ انصاف کے سپرد کرتا تو اپنے خلاف موجود شہادتوں اور گواہوں کے طفیل حق اور انصاف ملنے سے پہلے سزائے موت پاتا۔ حالات آج اس حد تک میرے خلاف ہو چکے تھے کہ اپنے بھی اپنے نہ رہے تھے، شکاری بن گئے تھے۔ شکاری اب چوہدری دلاور جیسے دشمن ہی نہیں تھے، پولیس بھی تھی۔ ساری وہ قانون بھی تھا جو آنکھ سے نظر آنے والے ثبوت اور شہادت و واقعات کی بنا پر مجھے مجرم گردانتا تھا۔ شکاری سارا معاشرہ تھا جن کی آنکھ نے میری صورت کو دیوار پر چسپاں اشتہاروں پر دیکھا تھا اور اخباروں میں دیکھا تھا۔ شکاری وہ سب لوگ تھے جو قانون کے ساتھ تھے اور مجھے گرفتار کرا دینے پر مستعد تھے — جو نہیں جانتے تھے کہ حقیقت کیا ہے اور صرف سکندر بخت کا چہرہ دیکھتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ وہ پولیس کو قتل و خونریزی، ڈکیتی، اغوا، رہزنی اور دھوکا دہی کے متعدد مقدمات میں مطلوب ہے۔ لیکن اب وہ گنے چنے افراد نہیں رہے تھے جنھوں نے وزیر خان کی کمپنی کو میرو زیبا اینڈ کمپنی بنایا اور پھر ایم ڈبلیو ڈی کمپلیکس کر دیا۔

یہ صرف نام کی تبدیلی نہیں تھی، اس تبدیلی نے حق دار سے حق چھین لیا تھا۔ مالک کو مجبور بنا دیا تھا اور جائز کو ناجائز کر دیا تھا — جو غاصب تھے وہ ظلم و استبداد سے سیاہ کو سفید ثابت کر چکے تھے۔ اب سیاہ و سفید کے مالک تھے اور حقداروں سے جینے کا حق تک چھین لینا چاہتے تھے۔

انکل رضوی نے نہیں، ایس ایس پی خان رضوی نے ایک مجرم کو دس منٹ کی مہلت دی تھی۔ یہ دس منٹ زندگی اور موت کی سرحدوں کے درمیان نو مینز لینڈ کی طرح تھے۔ چاہو تو اس حد سے گزر جاؤ جہاں اندھا انصاف میزانِ عدل لیے تمھارے ہاتھوں میں ہتھکڑی اور گلے میں پھانسی کا پھندا ڈالنے کے لیے تیار ہے۔ چاہو تو اس حد سے گزر جاؤ جس کے بعد کوئی نہیں۔ وقت کا ہر لمحہ صدا دینے لگا۔ "فیصلہ کرو سکندر! تم اس دنیا کے نظامِ انصاف کو قبول کرتے ہو؟ اس میں تمھیں مجرم پہلے سمجھا جائے گا، طالبِ انصاف بعد میں۔ سزا پہلے ملے گی حق بعد میں ملے گا۔ بشرطیکہ تم کو فرصتِ زندگی ملی اور تم ثابت بھی کر سکے کہ تم حقدار تھے اور ناانصافی تمھارے ساتھ ہوئی تھی اور بشرطیکہ تم وزیر خاں، سلامت شاہ، فومانچو۔ اس کی مفلوج بیوی اور بیٹے، رابعہ کی ماں اور شہلا کی ماں اور ان سب کو صفائی کے گواہ کی حیثیت سے پیش کر سکے جو سچ کو جانتے تھے۔ چنانچہ آج اپنی قبروں میں ڈھانچے سنبھالے منتظرِ یومِ مکافات ہیں۔ مگر ہے کہاں یومِ مکافات اے خدائے دادگیر! فیصلہ تو آج کرنا ہے۔ چنانچہ سکندر بخت! تم یہ بھی کر سکتے ہو کہ اس نظامِ انصاف کو مسترد کر دو۔ لو اپنی آگہی، اپنے شعور اور اپنی سچائی کو بنیاد بنا کے خود اپنا انصاف حاصل کرنے کے لیے اپنا نظامِ انصاف بنا لو۔ اپنے ضمیر کو اپنی عدالت جانو۔ اور اس عدالت میں اپنے ضمیر ہی کو منصف کرو۔ تم جانتے ہو مجرم کون ہیں اور ان کی فردِ جرم میں کیا کچھ ہے۔ کیا تم ان کو جو سزا دو گے غلط ہو گی؟ وہ اس کے مستحق ہیں مگر وہ جھوٹ اور مکر و فریب اور بے ضمیری کے غیر انسانی اور شیطانی لبادے پہنے آج کے دن کی سزا سے محفوظ ہیں اور یومِ حساب کی سزا کے خوف سے بیگانہ ہیں۔ قصور انصاف کرنے والوں کا نہیں اور انصاف کا نہیں — اس پورے نظام کا ہے جس میں سارے فیصلے ظاہر کی آنکھ کرتی ہے۔"

انکل رضوی قانون کی آواز بن گئے تھے اور وقت گزرتا جا رہا تھا۔ چیختا چلاتا، فریاد کرتا، بے رحم سفاک اور خونی وقت، وہی وقت جو دستِ اجل کے نذرانے لے کر گزر گیا تھا۔ جو ستم کشوں کا وقت نہ تھا، بے داد گروں کا وقت تھا۔ اندھا وقت جس نے بے گناہوں کو نہ پہچانا۔ حق سے محروم ہو جانے والوں کا ساتھ نہ دیا۔ اب وہ دل سے انصاف کا اور انتقام کا طلب گار تھا تو عقل سے تقاضا کرتا

تھا کہ میں دس منٹ کے چھ سو سیکنڈ لمبے مرحلہ کل مراحل پر گزرنے سے پہلے ہتھیار پھینک دوں اور کوئی حق رسی کا خوں بہا اور کوئی انصاف نہ مانگوں اور سزا و جزا کو اس کل پر اٹھا رکھوں جس کے بعد کوئی کل نہیں۔ یا میں بھی سارے اصول، اخلاق کے معیار اور قانون کے تمام ضوابط کو بالائے طاق رکھ کے وہی شکاری بن جاؤں، جو آج کے حالات سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اس کا نام چوہدری دلاور ہو یا سکندر بخت، فنا و بقا کی جنگ میں نام سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میدانِ جنگ میں اپنے مقابل آنے والے کا صرف ایک نام ہوتا ہے — دشمن — یہ کون پوچھتا ہے کہ تم کون ہو، کس کے بیٹے ہو اور کہاں سے آتے ہو؟ اس جنگ میں کیوں شریک ہو؟ میرے ہاتھوں کیوں مرنا چاہتے ہو؟ اور مجھے قتل کرنے آئے ہو تو کیوں؟ تمہارے اور میرے درمیان تو اختلاف نہ تھا اور نہ ہے مگر ان سب سوالات کا جواب مانگے بغیر پہلے گولی چلانے والا زندہ رہتا ہے۔ مانگنے والوں کو جینے کا حق کون دیتا ہے — یہ حق تو حاصل کرنا پڑتا ہے۔ وہ جو شکار ہوئے یہ بات سمجھتے تو اس بے کسی کے ساتھ نہ ہوتے۔

"سکندر — دس منٹ پورے ہونے والے ہیں۔" ایس ایس پی ضامن رضوی کی آواز آئی۔ "تمہارے لیے ایک منٹ — صرف ایک منٹ اور ہے۔" ریوالور میرے ہاتھ میں تھا اور میرے سامنے وہ میاں بیوی بت بنے کھڑے تھے۔ یہ بے یقینی ان کے اعصاب کو شکست دینے لگی تھی کہ اس ڈرامے کا انجام کیا ہو گا۔ جس کی کاسٹ میں انہیں یوں زبردستی شامل ہونا پڑا تھا کہ وہ خود ہی تماشا تھے اور خود ہی تماشائی۔ بڑھیا ویسے ہی لیٹی تھی اور بہو مسلسل رو رہی تھی۔

"ارے بھائی! خدا کے واسطے کچھ تو جواب دو انہیں۔" مرد نے ہمت کر کے کہا۔ "یہ لوگ مہلت ختم ہونے کے بعد دھائیں سے اندر گولا پھینک دیتے ہیں۔ گولی مار دیتے ہیں۔"

"اچھا۔" میں نے بے خیالی میں کہا۔ "یہ بتاؤ تم میری کیا مدد کر سکتے ہو؟ فرض کرو مجھے نکلنا ہو۔"

"ہم ... ہم کیا کر سکتے ہیں۔ باہر وہ بندوق تانے کھڑے ہیں۔" مرد نے بیوی کی طرف دیکھا جو اب بے ہوش ہونے کی تیاری کر رہی تھی۔ "اندر تم نے ریوالور نکال رکھا ہے۔ میری ماں مر جائے گی، بچے اسکول سے آنے والے ہیں۔"

"یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔" میں نے ڈانٹ کر کہا۔ "یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ میں خود کو آسانی سے پولیس کے حوالے نہیں کروں گا۔ اس کشت و خون میں کچھ بھی ہو جائے میں ذمے دار نہیں — مجھے اپنی جان بچانی ہے۔"

"سنو جی! اسے ادھر سے نکال دو۔" بیوی نے روتے روتے اچانک میاں کے کان میں کچھ کہا۔

میاں نے سر ہلایا۔ "ایک راستہ ... اگر بنا سکتے ہو۔ ویسے گزرنا مشکل ہے تمہارا ... پیچھے والا گھر اس کے بھائی کا ہے۔ درمیان میں ایک چھوٹی سی کھڑکی ہے جو پہلے کھلی رہتی تھی مگر میرے گھر کا مال ادھر سے ادھر آمگل ہوتا رہتا تھا اس لیے میں نے بند کرا دی۔ کھڑکی کے تختے کیلوں سے ٹھوک دیے۔"

دروازے پر دستک ہوئی۔ انسپکٹر رضوی نے حکم دیا کہ قانون کے نام پر دروازہ کھول دیا جائے۔ میں نے مرد کو بازو پکڑ کے گھسیٹا۔ "اتنی دیر میں عقل آ گئی تھیں۔ کدھر ہے وہ کھڑکی؟ تمہارا سالا شور ہنگامہ تو نہیں کرے گا؟" گھر کا دروازہ اب ... رہا تھا۔ وہ میرے ساتھ بھاگا اور مجھے پچھلے حصے میں لے گیا۔

"اپنی بیوی سے کہو دروازے پر جا کے بات کرے۔" میں نے کہا۔ "انہیں کچھ دیر روکے ..." عورت نے میری بات سمجھ لی اور دوپٹے کے آنچل سے آنسو پونچھ کر دروازے کی طرف گئی۔

"میرا سالا اس وقت گھر پر نہیں ہوتا۔" مرد نے کہا۔ "بیوی بھی میکے میں ہے۔ گھر بند ہو گا۔"

"ادھر باہر جانے کا راستہ ہو گا؟" میں نے کہا اور اس کھڑکی کو دیکھا جو مشکل سے ڈیڑھ فٹ چوڑی اور دو فٹ اونچی تھی۔ اس میں چوڑائی کے رخ چار چار انچ چوڑی اور آدھا انچ موٹی لکڑی کے تختے جڑ دیے گئے تھے۔ دونوں جانب کی دہلیز میں لگی ہوئی کیلوں کو نکالنے کے لیے لوہے کی سلاخ درکار تھی۔ لیکن درمیان سے تختے توڑے جا سکتے تھے۔ جب میں جوڈو کی تربیت حاصل کر رہا تھا تو لوگوں کے سامنے مہارت کا مظاہرہ یوں کرتا تھا کہ ہتھیلی کی ایک ضرب برف کی سل کے دو ٹکڑے کر دیتا تھا۔ ایسے ہی تختوں کو اوپر رکھ کے توڑتا تھا اور ان کی تعداد میں اضافہ کرتا جاتا تھا۔ ایک بار تو میں نے ہاتھ مار کے ہوسٹل میں ایک انگریز طالب علم کی میز توڑ ڈالی تھی اور اس کے شور مچانے پر واضح کیا تھا کہ یہ تو ریہرسل ہے۔ ایک دن میں حکمران قوم کی اکڑی ہوئی گردن کا غرور بھی توڑ دوں گا۔ وہ مذاق اور تماشے کی بات تھی۔ اس وقت وہی صلاحیت معاون ثابت ہوئی۔ میں نے وار کیا۔ کھٹا کھٹ سارے تختے ٹوٹ گئے۔ اور صاحب خانہ کا حلق خشک ہو گیا۔ اس کے نقطۂ نظر سے یہ تختے نہ توڑے جا سکتے نہ اکھاڑے جا سکتے تھے۔ اس نے اندازہ کر لیا کہ میرے لیے اس کی گردن یا گیارہ پسلیاں توڑنا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ لات مارتے ہی کھڑکی کے دونوں پٹ کھل گئے اور میں نے نیم تاریک بند کمرے میں جھانکا۔

"میں جا رہا ہوں لیکن میری ایک بات یاد رکھنا۔" میں نے کہا۔ "میں چھت پھاڑ کے پھر آ سکتا ہوں اور میرے ...

کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ تم کو بعد میں پولیس کے سامنے صرف یہ بیان دینا ہے کہ میں تمہاری عدم موجودگی میں اندر آیا تھا چنانچہ تمہیں کچھ معلوم نہیں کہ میں کس طرف سے داخل ہوا تھا۔ باقی سب سچ بتا دینا۔"

"یعنی۔۔۔ یہ کہ دیں کہ تم نے ریوالور نکال کر ہمیں مجبور کیا۔۔۔ کہ ہم فرار میں مدد دیں؟" اس نے کہا۔

"ہاں۔ بالکل یہی کہنا ہے۔" میں نے کھڑکی میں داخل ہو کے کہا "یہ مت کہنا کہ میں اوپر چھت پر کودا تھا اور زینے کے راستے اترا تھا۔ تم نے کچھ نہیں دیکھا چنانچہ تمہیں کچھ معلوم نہیں۔ بیان ذرا بھی مختلف ہوا تو میں نمٹ لوں گا تم سے۔"

پولیس اس کے گھر میں داخل ہو چکی تھی۔ میں نے اُن کے دوڑتے ہوئے قدموں کی صدا سنی اور انکل رضوی کو چلاتے ہوئے سُنا۔ میں نے لپک کر سامنے والا بند دروازہ کھولا اور باہر نکلتے ہی بند کر دیا۔ دو کمروں سے گزر کر میں نے ہر دروازے کو باہر سے کنڈی لگائی تاکہ میرے تعاقب میں آنے والوں کو کچھ وقت لگے اور میں اس مہلت سے فائدہ اٹھا کے نکل جاؤں۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ گھر خالی ملا ورنہ یہاں بھی مجھے زبردستی تعاون حاصل کرنا پڑتا۔ گھر کا صدر دروازہ باہر سے مقفل تھا۔ ڈرائنگ رُوم کا دروازہ اندر سے کھول کر میں نے گلی میں قدم رکھا۔ اسی وقت میرے قریب ایک موٹر سائیکل آ رکی "شادے کون ہے تو۔ اندر کیا کر رہا تھا؟" موٹر سائیکل والے نے چلانا شروع کر دیا "چور۔۔۔ چور۔" وہ ایک دم مجھ سے لپٹ گیا۔ وہ چھ فٹ قد کا صحت مند جوان آدمی تھا۔ اور یقیناً وہی شخص تھا جس کے لیے ہمشیرہ محترمہ کی اسمگلنگ سے حاصل ہونے والے فوائد کا سرچشمہ یعنی درمیانی دیوار کی کھڑکی کو تختے لگا کر بند کر دیا گیا تھا۔ اس کم بخت کو بھی اسی وقت آنا تھا۔ میں نے خود کو چھڑانے کی جدوجہد کرتے ہوئے سوچا اور مجبوراً اس کو ایک دھوبی پٹخا دیا۔ اس کے اٹھنے سے پہلے ہی میں نے چابیاں چھین کر موٹر سائیکل میں لگا دیں۔ وہ اُٹھ کر دوڑا مگر ایک لات کھا کر پھر لیٹ گیا۔ اس کے شور نے بہت سے لوگوں کو متوجہ کر لیا تھا مگر میری راہ میں حائل ہونے کی غلطی صرف ایک نے کی تھی۔ میں نے موٹر سائیکل کو اس پر چڑھا دینے کی نیت سے دوڑایا۔ وہ چھلانگ لگا کے ایک طرف گرا اور میں نے اس کی گالی سُنی۔ ابھی میں سو گز دُور بھی نہیں گیا تھا کہ پہلا فائر ہُوا اور گولی نہ جانے کدھر گئی میرے لیے اتنا ہی غنیمت تھا کہ نشانے پر نہیں لگی تھی۔ انکل رضوی نے گھر سے ساتھ والے گھر تک پہنچنے اور عقبی گلی تک آنے میں تین منٹ بھی نہیں لگائے تھے۔ اگر وہ موٹر سائیکل والا شامتِ اعمال کے باعث نمودار نہ ہوتا تو میرے لیے دوڑ لگا کے نکلنا مشکل ہو جاتا۔ میں بھی زیادہ انحصار کسی ٹیکسی یا گاڑی میں نکلنے پر کر رہا تھا لیکن اس گلی میں کوئی سواری دستیاب نہ تھی۔ موٹر سائیکل نے میری جان بچالی۔

خطرے کی حدود سے نکل کے میں نے دو پہیوں والی اس سواری کو اطمینان سے چلاتے ہوئے اس نئی صورتِ حالات پر غور کیا۔ بالآخر گردشِ فلک نے یہ دن دکھایا تھا کہ جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے۔ آج انکل رضوی نے کسی تذبذب اور تامل کے بغیر مجھ پر گولی چلائی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ فائر کرتے ہوئے اُن کا ہاتھ ذرا بھی نہیں کانپا ہوگا۔ انہیں ایک لمحے کے لیے بھی خیال نہ آیا ہوگا کہ میں اُن کے مرحوم دوست وزیر خان کا وہ بدنصیب بیٹا ہوں جس کے والدین اور بہن بھائی سب پہلے ہی قتل ہو چکے ہیں۔ ان کو قتل کرنے والے تو دشمن تھے مگر مجھے قتل کرنے کی کوشش کرنے والوں میں آج ایک پولیس افسر بھی شامل ہو گیا تھا۔ جذباتی تعلق کو اور رشتوں کے لحاظ کو فراموش کر کے۔ کیونکہ اس کی نظر میں ایک مفرور اشتہاری مجرم کے سوا میری کوئی حیثیت اہم نہ تھی۔ وہ جانتا تھا کہ میرے دشمن کون ہیں۔ مجھے کیا نقصان پہنچا چکے ہیں اور مجھ سے کیا کچھ چھین چکے ہیں۔ اسے معلوم تھا کہ ہر ناانصافی میرے ساتھ ہوئی ہے، ہر ظلم مجھ پر ہوا ہے اور ہر تیرِ ستم کا نشانہ میں رہا ہوں لیکن اس کی حیثیت ثانوی تھی۔ وہ میری مدد کر سکتا تھا بشرطیکہ میں عام لوگوں کی طرح اس کے پاس فریادی بن کے پہنچتا اور قانون کی مدد مانگتا۔ اس قانون کی جس کا وہ نمائندہ تھا لیکن خوب جانتا تھا کہ اس قانون نے وزیر خان کو تحفظ فراہم نہیں کیا تھا۔ اور اُس کی پُرعذاب موت سے شروع ہونے والے خونی کھیل میں جتنے بے گناہ اپنی جان سے گئے تھے سب قانون پرست اور پُرامن شہری تھے لیکن قانون نے کس کے قاتل کا ہاتھ تھاما۔ کس خنجر کی زبان سے جواب مانگا کہ لہو کے چھینٹے تو کسی آستین پر نہیں۔ تمام شہر نے پہنے ہوئے ہیں دستانے۔ پھر وہ سب جو تاریک راہوں میں مارے گئے، اُن کا قصاص کس پر واجب ہے، اُن کی جان کا خوں بہا کس سے لیا جائے۔ قانون کے ہاتھ تو بہت لمبے کہلاتے ہیں۔ کس قاتل کی گردن تک پہنچے یہ ہاتھ؟ ضامن رضوی ایس ایس پی کو اچھی طرح معلوم تھا کہ قاتل کون ہیں۔ اسے سب کے نام پتے اور چہرے معلوم تھے مگر وہ ضوابط کی زنجیر میں جکڑا ہوا، سرکاری قواعد کا پابند اور کتابوں میں لکھے ہوئے قانون کو واجب الاحترام سمجھنے والا پولیس افسر تھا جو ثبوت اور شہادت کے بغیر کسی کا دامن نہیں تھام سکتا تھا کہ اس کی آستین خون آلود ہے۔ اس نے پولیس افسر کی وردی پہن کے خود کو پابند کر لیا تھا کہ وہ دل کی نہیں عقل کی بات مانے گا اور اسی کو حقیقت تسلیم کرے گا جسے آنکھ دیکھے اور زمانہ تسلیم کرے۔

موٹر سائیکل کو فٹ پاتھ کے کنارے روک کر میں نے چابیاں اسی میں لگی رہنے دیں۔ پھر کچھ سوچ کے نکال لیں اور جیب میں ڈال کر ایک ریسٹورنٹ میں جا بیٹھا۔ میری جیب میں صرف تین نوٹ تھے۔ ایک دس کا، ایک پانچ کا اور ایک روپے والا ایک۔ باقی رقم ۔۔۔ میرے کپڑے اور رابعہ کا دیا ہوا چیک اور دوسرا ریوالور سب اس گاڑی میں تھے جو منظر کے گھر سے کچھ فاصلے پر کھڑی ہوئی تھی۔ گلی میں اور گاڑیاں بھی تھیں چنانچہ یہ گاڑی بالکل محفوظ تھی۔ رضوی صاحب کو یہ شک کیسے ہو سکتا تھا کہ ڈاکٹر امجد بھی میں ہی ہوں۔ اس گاڑی پر تو ڈاکٹروں کا نشان ایک ریڈ کراس آگے اور پیچھے کے ونڈ اسکرین پر چسپاں تھا۔ مسئلہ صرف اسے واپس لانے کا تھا۔ میرے فرار کے بعد منظر کے گھر میں کیا ہوا، یہ سب منظر، رابعہ یا محسن سے ملے بغیر معلوم نہیں ہو سکتا تھا اور فوری طور پر اُن سے رابطہ قائم کرنا انہیں بھی مشکلات میں مبتلا کر سکتا تھا۔ ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر چائے پیتے ہوئے غیر شعوری طور میں چوکس رہا اور چوری چوری یہ دیکھتا رہا کہ کہیں کوئی نظر میرے چہرے پر تو نہیں لیکن لوگ اپنی اپنی باتوں میں مصروف تھے۔ دیواروں پر میری تصویر والے اشتہار ابھی تازہ تھے۔ لیکن مجھے یقین تھا کہ بہت جلد فلموں کے اور دواخانوں کے پوسٹر اُن پر غالب آجائیں گے اور لوگ جو کاروبارِ حیات میں صرف لمحۂ گزراں کو یاد رکھتے ہیں سکندر بخت کو بھول جائیں گے۔ اخبار کی تصویریں تو صرف چوبیس گھنٹے میں پرانی ہو کے ذہن سے محو ہو جاتی ہیں۔ نئے اخبار میں نئی صورتیں نظر آتی ہیں اور نئی خبروں میں کسی مفرور مجرم کی خبر بھی دب جاتی ہے۔ کوئی اپنے دماغ میں کمپیوٹر نہیں لیے پھرتا کہ مہینے بھر میں نظر آنے والی سیکڑوں تصویروں کو یاد رکھے کہ کون سی تصویر "تلاشِ گمشدہ" کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔ حادثات اور قتل کی وارداتوں کا شکار ہونے والوں، اہم شخصیات، کبھی امتحان میں اوّل آنے والوں سے لے کر وظیفے پر بیرونِ ملک جانے والوں، کھلاڑیوں سے لے کر "نو اسیرانِ قیدِ شریعت" یعنی نئے میاں بیوی بننے والوں تک اور لاٹری یا ریفل میں انعام پانے والے خوش نصیبوں سے عاق ہونے والے بدنصیبوں تک سب کی تصویریں اخبار کی زینت بنتی ہیں۔ بعد میں کوئی چہرہ "مطبوعہ" لگے تب بھی یہ کسے یاد آتا ہے کہ اس سے منسوب خبر کیا تھی۔ لیکن ابھی بات پرانی نہیں ہوئی تھی چنانچہ مجھے محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ تازہ ترین واقعہ کچھ دیر پہلے کا تھا، جب ناقابلِ یقین طور پر ایک عورت نے اخبار کے حوالے سے مجھے شناخت کر لیا تھا۔ ورنہ عورتوں کا اخبار سے تعلق فلم اور فیشن کے صفحات تک محدود رہتا ہے۔ موٹر سائیکل کی چابیاں میں نے اسی لیے رکھ لی تھیں کہ پھر بھاگنا پڑے تو اپنی دو ٹانگوں کے بجائے دو پہیوں پر بھاگوں۔

فیصلہ کسی نتیجے پر پہنچے بغیر خود بخود ہو گیا تھا اور اب مجھے احساس ہونے لگا تھا کہ یہ فیصلہ غلط نہیں تھا۔ اگر میں شرافت کا ثبوت دیتے ہوئے انکل رضوی کا حکم مان لیتا اور خود کو قانون کے حوالے کر دیتا، تو میرا انجام بُرا ہوتا۔ انکل رضوی مجھے اپنے گھر نہیں تھانے لے جاتے اور اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاتے۔ مجھ پر پہلا سنگین الزام تو۔۔۔۔ میر شرافت علی کے قتل کا تھا۔ تب سے اب تک مجھ پر دو عینی چشم دید گواہوں کے قتل کا الزام عائد ہو چکا تھا اور اگرچہ اس مقدمے میں عبداللہ نے مرتے مرتے جو بیان دیا تھا اس سے میری بے گناہی ثابت ہو گئی تھی تاہم عدالت نے باقاعدہ سماعت کے بعد ابھی تک مجھے باعزت طور پر بری کرنے کا فیصلہ صادر نہیں کیا تھا۔ اس کے بعد میں کسی پیشی پر حاضر نہیں ہوا تھا چنانچہ مقدمہ اصولی طور پر ہنوز زیرِ سماعت تھا اور مسلسل غیر حاضری کی بنا پر میری ضمانت منسوخ ہو چکی تھی۔ دوہرے قتل کا تیسرا مقدمہ مجھ پر راولپنڈی کی سیشن کورٹ میں چل رہا تھا اور وہاں سے بھی میرے ناقابلِ ضمانت وارنٹِ گرفتاری بہت پہلے جاری ہو چکے تھے۔ ان حالات میں اگر میں خود کو پولیس کے حوالے کر دیتا تو مجھے خطرناک مجرم قرار دینے کے بعد ہتھکڑیاں اور بیڑیاں ڈال کے رکھا جاتا اور ہر مقدمے کی سماعت پر پیش کرنے کے لیے زبردست گارڈ اور پہرے میں لایا جاتا۔ رابعہ اور منظر کی قانونی قابلیت زیادہ سے زیادہ مجھے سزائے موت سے بچا لیتی یا مجھے شک کا فائدہ مل جاتا۔ لیکن ایک مقدمہ بھی میرے خلاف جاتا تو مجھے عمر قید کی سزا بہرحال ہوتی۔ ہائی کورٹ میں اپیل اور پھر سپریم کورٹ کے فیصلے تک چھ سات سال لگ جاتے

اور یہ تمام وقت میں دیوارِ زنداں کے پیچھے زنجیر و سلاسل کے ساتھ کاٹ دیتا۔ نہ جانے اس عرصے میں چوہدری دلاور کے پیسے کی طاقت اور اُن کا اثر و رسوخ کتنے مسائل پیدا کرتا اور وہ اپنے وسائل سے کیا انتظام کرتے کہ میں پھر ہوشمندوں کی دنیا میں آ کے اُن کے معاملات میں مخل نہ ہو سکوں۔ وہ مجھے پاگل خانے بھجوا سکتے تھے۔ فرار کی کوشش کا الزام لگوا کے مجھے اندر ہی گولی کا نشانہ بنوا سکتے تھے یا دنگے فساد، بغاوت اور شرپسندی کے الزامات کی فہرست کو طول دے کر میرے لیے زندگی کی آخری سانس بھی جیل خانے میں لینے کا انتظام کر سکتے تھے۔ میرے مددگار اور معاون تو سب باہر تھے اور اندر صرف جیل کے حکام کی حکمرانی تھی۔

قتل کے ان الزامات کے علاوہ بھی میرے خلاف بہت سی رپورٹیں درج تھیں۔ زبردستی لوگوں سے کاریں چھیننے کی۔ پولیس پر حملے اور اُن کے فرائض کی انجام دہی میں مداخلت کی۔ اغوا اور حبسِ بے جا میں رکھنے کی۔ بھیس بدل کر دھوکا دینے کی اور مختلف مواقع پر مار پیٹ کی۔ اس کے علاوہ پولیس کے ریکارڈ پر ضابطہ فوجداری کی کتنی دفعات کے تحت مقدمات درج تھے، ان کی صحیح تعداد خود مجھے بھی معلوم نہیں تھی۔ چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کی کوششوں کے طفیل بالآخر میں قانون کے شکنجے میں اس طرح جکڑا جا چکا تھا کہ قانونی طور پر اُن کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ اگر میں قانون کے چکر میں پڑتا تو میرا انجام وہی ہوتا جو یہ شکاری چاہتے تھے۔ وہ اپنے مقصد میں خاصے کامیاب رہے تھے کیونکہ ہر ننگِ انسانیت جرم کا ارتکاب کرنے کے باوجود بلیک میلنگ سے لے کر اسمگلنگ تک سارے ناجائز دھندے کرنے کے باوجود اور وزیر خاں کے علاوہ میر شرافت علی اور کم سے کم ایک درجن دوسرے بے گناہوں کے قاتل ہونے کے باوجود وہ قانونی طور پر بالکل محفوظ تھے۔ جس شخص سے اُن کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا وہ خود اپنے ہی جال میں گرفتار ہو چکا تھا اور رُوپوش رہنے پر مجبور تھا۔

ان حالات میں میرے لیے یہی ایک راستہ رہ جاتا تھا جو میں نے منتخب کیا۔ اگر قانون مجھے معاف نہیں کر سکتا تھا تو میں ان سب کو کیسے معاف کر سکتا تھا جو میرے تمام مصائب کے ذمے دار تھے۔ بہت پہلے میں فیصلہ کر چکا تھا کہ انہیں سزا ضرور ملے گی۔ اس شکارگاہ میں وہ اکیلے ہی شکاری نہیں اور میں وہ شکار نہیں جو خود نشانے پر آ بیٹھے۔ میں عملی طور پر ان کو سمجھا چکا تھا کہ شکاری میں بھی ہوں اور میرا شکار وہ سب ہیں جو وزیر خاں کو کاروبار سے بے دخل کر لینے کے بعد اسے غربت اور افلاس، ذلت و رسوائی اور بیماری و کس مپرسی کے عالم میں ہلاک کرنے کے بعد اب بے دھڑک کسی خطرناک اور ناجائز دھندے کو پھیلاتے جا رہے تھے۔ انھوں نے دباؤ کے ذریعے مجھے حق وراثت سے محروم کرنا چاہا تھا۔ مگر میری مزاحمت کی قوت بڑھتی گئی تھی اور اس جنگ میں دونوں طرف کے لوگ مارے گئے تھے۔ چوہدری دلاور کے ساتھی تو اس کے کارندے، جرائم پیشہ لوگ اور زرخرید افراد تھے مگر میرے لیے جان دینے والوں میں صرف وہ تھے جو حق کو تسلیم کرتے تھے، سچ بولنا جانتے تھے، خلوص کے جذبات رکھتے تھے اور وفاداری میں وضع داری کے قائل تھے۔ ان سب کا لہو مجھ پر قرض تھا۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ میں ان سب کے قاتلوں کو بخش دیتا۔ انھوں نے قانون سے تحفظ حاصل کر لیا تھا مگر مجھے اُن کے تمام جرائم کا اتنا ہی یقین تھا جتنا اپنے وجود کا۔ اور یہ یقین میرے ایمان کی طرح راسخ تھا۔ اگر میں اُن کو چھوڑ دیتا تو صداقت سے رُوگردانی کرتا۔ اور ضمیر کی قید سے فرار ہو کے کہاں جاتا۔ اب یہ میرا فرض تھا کہ میں مجرموں کو وہ سزا دُوں جس کے وہ مستحق ہیں۔ مذہب اگر آنکھ کے بدلے آنکھ اور جان کے بدلے جان لینے کی اجازت دیتا ہے تو مجھے دنیاوی قانون کی موشگافیوں سے کیا۔ اب تو میں خود ہی پولیس ہوں، خود ہی وکیلِ استغاثہ، خود ہی منصف، خود ہی جیلر۔ فردِ جرم عائد کرنے سے سزا پر عمل درآمد تک ہر مرحلہ مجھے اکیلے سر کرنا تھا۔ اور یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ پہلے کم از کم مجھے اتنی آزادی تو حاصل تھی کہ میں بے خوف و خطر جہاں چاہوں، جا سکوں لیکن اب میرے لیے رُوپوش رہنا شرطِ اوّل تھا۔ اس کے بغیر میرا پہلا قدم ہی آخری قدم ہوتا۔ میرے رُوبرو پرانے دشمن تھے۔ دوسری طرف پولیس کو میری جستجو تھی تو تیسری طرف ضامن رضوی اور اکرام شیخ جیسے اصُول پرست لوگ تھے جو تعلق پر فرض کو ترجیح دیتے تھے اور اُن کے ساتھ وہ سب تھے جو مجھے پہچانتے تھے۔ اور مجرم کو قانون کے حوالے کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ چنانچہ میرے تین طرف شکاری تھے اور میرے بے پناہ دوست تھے ... میں تھی۔ یہاں محسن اور رابعہ جیسے سہارے تھے۔ شہلا ... اور ... استاد (ٹیڈی) تھا۔ یہ سب ایسے لوگ تھے جو صرف میرے ساتھ تھے۔ انھیں اس سے کوئی سروکار نہ تھا کہ میں مجرم ہوں یا بے گناہ، اچھا ہوں یا بُرا اور جو کچھ کر رہا ہوں وہ غلط ہے یا صحیح ——

چائے کی پیالی میرے سامنے رکھی رکھی ٹھنڈی ہو گئی تھی اور یہ کوئی فرسٹ کلاس ریسٹورنٹ نہیں تھا جہاں کے مؤدب ویٹر کسی کی خلوت میں تاحکمِ ثانی حارج نہیں ہوتے اور کوئی دو گھنٹے چائے کی پیالی کو گھورتا رہے تو اسے دانشور سمجھ کر زیرِ لب مسکرانے کے سوا کچھ نہیں کہتے۔

"اور کچھ چاہیے صاحب؟" ایک ویٹر نے بہ آوازِ بلند برتن لے جاتے ہوئے میں جھنجھلاتے ہوئے سوال کیا۔

میں چونکا۔ "ہاں۔ میرا خیال ہے کھانا لے آؤ۔ کیا پکا ہے؟" میں نے کہا اور ویٹر نے فرفر مینو سنانا شروع کیا۔ بمشکل تمام میں نے اس کی نان اسٹاپ گردان کو آلو قیمے پر روکا۔ کھانے کے دوران بھی میں یہ سوچتا رہا کہ اب رابعہ یا محسن سے کیسے رابطہ قائم ہو؟ رضوی صاحب نے یقیناً منظر کے ٹیلی فون کو آبزرویشن پر کرا دیا ہوگا۔ میری تمام گفتگو ٹیپ ہو جائے گی۔ رضوی صاحب کے گھر یا رابعہ کے آفس کی پوزیشن بھی ایسی ہی تھی کہ میں آواز بدل کے کسی پبلک فون سے بھی کال کرتا تو میرا پیغام ریکارڈ ہو جاتا۔ اور ان دونوں سے ملنے ہر جائے ملاقات پر پولیس پہنچ جاتی۔ سادہ کپڑوں میں اور مسلح۔ سوچنے کی بات یہ تھی کہ رضوی صاحب اچانک منظر کے گھر چھاپا مارنے کیسے پہنچے۔ وہ قانونی کارروائی پوری کر کے آئے تھے۔ انھیں کس نے اطلاع دی کہ میں منظر کے گھر میں موجود ہوں۔ اس سوال کا ایک جواب تو یہی ہو سکتا تھا کہ رضوی صاحب کو مخبری کی گئی اور مخبر ان کے لیے اتنا مصدقہ تھا کہ انھوں نے پُورے وثوق کے ساتھ کامیاب چھاپا مارا۔ لیکن اس مخبری کا ذمے دار کون تھا۔ یہ معلوم کرنا بہت مشکل تھا۔ زیادہ قرینِ قیاس یہ بات لگتی تھی کہ رضوی صاحب نے رابعہ اور محسن کے پیچھے اپنے آدمی لگا رکھے تھے جو ہر جگہ اور ہر وقت ان کی نگرانی کرتے تھے۔ رضوی صاحب کو یہ یقین برحق تھا کہ کبھی نہ کبھی میں ان دونوں میں سے کسی کے ساتھ رابطہ ضرور قائم کروں گا۔ البتہ ابھی سائے کی طرح تعاقب کرنے والے فرشتوں نے رضوی صاحب کو اطلاع فراہم کر دی کہ رابعہ اور محسن ایک ساتھ کہاں پہنچے ہیں۔ عین ممکن ہے انھوں نے میری موجودگی کی تصدیق بھی کر لی ہو۔ باہر رہتے ہوئے میری آواز سن لی ہو یا کہیں سے اندر جھانک کر بھی دیکھ لیا ہو——

اس کا مطلب یہ بھی نکلتا تھا کہ عملاً اب رابعہ اور محسن زیرِ حراست ہیں۔ اُن پر کسی مجرم کو چھپانے کا جرم تو ثابت نہیں ہوتا تھا مگر رضوی صاحب جانتے تھے کہ مبینہ مفرور اشتہاری مجرم سکندر بخت اور وزیر خاں کا اِنھی دو سے رابطہ قائم ہے لیکن وہ قانون سے عدم تعاون پر کمربستہ ہیں۔ خود منظر بھی اسی چکر میں مشتبہ افراد میں شامل ہو چکا تھا۔ وہ بڑا دبنگ وکیل تھا اور رضوی صاحب مجھے اس کے گھر میں موجود نہ پا کر اس کے خلاف کوئی قانونی کارروائی نہیں کر سکتے تھے۔ رابعہ بھی آسانی سے دبنے والی نہیں تھی اور محسن کو دو دوستوں کے علاوہ اپنے والد کی پشت پناہی حاصل تھی ورنہ رضوی صاحب اسے پولیس کی تحویل میں دے دیتے کہ تھرڈ ڈگری کے مجرب نسخے آزما کے اس سے ملزم سکندر بخت کا پتا ٹھکانا دریافت کیا جائے۔ ان حالات میں رابعہ اور محسن کا رضوی صاحب ہی کے گھر میں رہنا مشکل سے محال ہوتا رہا تھا اور وہ ایک ہی کام کر سکتے تھے۔ یا رضوی صاحب جیسے پولیس افسر کے گھر میں رہیں یا میرے جیسے مجرم سے دوستی اور محبت کا حق ادا کریں۔

بہت سوچنے کے بعد مجھے نازو کا خیال آیا۔ ایک دم میری مشکل آسان ہو گئی اور کھانا ادھورا چھوڑ کے اٹھ کھڑا ہوا۔ دس کا نوٹ کاؤنٹر پر چھوڑ کے میں باہر نکلا اور موٹر سائیکل اسٹارٹ کی۔ چوری کی یہ سواری کام تو آ رہی تھی مگر اس سے خطرہ زیادہ ہو جاتا تھا۔ کہ ایک تو میں خود مجرم اور پھر شہر میں دندناتا پھروں، چوری کی موٹر سائیکل پر —— گویا کڑوا کریلا اور نیم چڑھا۔ ہزاروں افراد پر مشتمل پولیس اور خفیہ پولیس، سی آئی اے اور ایف آئی اے جیسے متعدد اداروں کی ساری نفری کے لیے ڈوب مرنے کا مقام۔ تاہم میں یہ جانتا تھا کہ چوری کی رپورٹ درج ہونے سے مشتہر ہونے تک سارا عمل کس رفتار سے ہوتا ہے۔ ابھی چند گھنٹے کوئی مجھے تو پکڑ سکتا تھا، موٹر سائیکل کو نہیں۔ حفظِ ماتقدم کے طور پر میں نے موٹر سائیکل کے ٹول بکس میں سے ایک پیچ کس نکالا اور آگے پیچھے کی نمبر پلیٹ اتار دی۔ رونی شکل بنا کے میں میکلوڈ روڈ پر نمبر پلیٹ بنانے والوں کے پاس گیا اور انھیں نمبر پلیٹوں کے چوری ہونے کی افسوس ناک کہانی سنائی۔ میری درخواست پر ایک عظیم پینٹر نے ٹین کی دو پلیٹوں پر سفید پینٹ سے فرضی نمبر لکھے اور مجھ سے وہی چھ روپے قبول کر لیے جو میری جیب میں تھے۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے مجھے چالان سے بچا لیا۔ میں چلنے ہی والا تھا کہ میری نظر تین افراد پر گئی جو میرے بہت قریب فٹ پاتھ پر کھڑے بحث کر رہے تھے۔ وہ سب تالوں کی چابیاں بنانے والے اور نمبر پلیٹ لکھنے والے لوگ تھے۔

"اوئے یار او ہی اے۔" ایک نے کہا۔ "ایہہ ویکھ اخبار۔"

دوسرے نے مخالفت کی۔ "او ہی اے تے فیر ہیا ساڈوں کی؟"

تیسرے نے ہاتھ ہلا کے دوسرے کو ٹوکا۔ "او پاغل دے پتر! وخت نہ ناپے جائے۔"

میں فوراً سمجھ گیا کہ اُن کے اتفاقِ رائے سے قبل مجھے نو دو گیارہ ہو جانا چاہیے۔ ابھی تک تین میں سے صرف ایک درست قانونی چارہ جوئی کے خلاف تھا مگر وہی سب مجھے پکڑنے کے لیے کافی تھے۔ بڑی پھرتی سے میں نے موٹر سائیکل کا رُخ پلٹا اور گرتے گرتے بچا۔ معلوم نہیں کس نے چلا کر مجھے پکڑنے کے لیے کہا لیکن میں اتنی دیر میں ہوا ہو گیا تھا۔ وہاں موٹر سائیکلوں کی کمی نہیں تھی اور وہ سب جو لاک ٹھیک کرا رہے تھے تعاون کے جذبے کا مظاہرہ کرتے تو کئی شہسوار سڑکوں پر نکل آتے اور جو زیادہ جیالے ہوتے یا زیادہ طاقتور موٹر سائیکل کے مالک ہوتے وہ یقیناً ایک سنسنی خیز مقابلے کے بعد مجھے آ لیتے۔ پھر میں اس کے سوا کیا کرتا کہ ایک دو کو ناک آؤٹ کر دوں یا ہوا میں فائر کروں اور سب کی پیش قدمی روک کے نکل جاؤں۔ میں موٹر سائیکل چلانے کے معاملے میں مہارت کا دعویٰ نہیں کر سکتا تھا چنانچہ میں نے ایبٹ روڈ پر گھومتے ہی موٹر سائیکل کو ایک سینما کے کمپاؤنڈ میں درجنوں

موٹر سائیکلوں کی صف میں کھڑا کیا اور خود منیجر کے کمرے میں گھس گیا۔
"وہ ایسا ہے کہ مجھے ایک کال کرنی تھی۔" میں نے کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔
منیجر کا چہرہ بگڑ گیا۔ "یہ کوئی پبلک کال آفس نہیں ہے جناب۔"
اس نے میری بے تکلفی کے جواب میں رکھائی سے کہا۔
"اچھا۔ لیکن وہ ایس آئی اکرام شیخ نے تو کہا تھا کہ یہاں سے فون کر لینا۔" میں نے کہا۔ "آپ نہیں جانتے انہیں؟"
"کیا نمبر ہے؟" منیجر نے چند سیکنڈ مجھے غور سے دیکھ کر کہا۔
میں نے اُسے نمبر بتا دیا جو اُس نے خود ڈائل کیا۔
"یہ ایس آئی اکرام شیخ صاحب کا گھر ہے؟" اُس نے پوچھا۔ "اچھا۔ لیجیے... بات کریں۔" اس نے کچھ خفیف ہو کے ریسیور مجھے تھما دیا۔
"کوئی خاتون ہیں۔"
"ہیلو۔ کون؟... نازو۔" میں نے بشاشت سے کہا۔
"بھئی میں سکندر بخت بول رہا ہوں۔"
حسبِ توقع ذہنی صدمے نے اسے کچھ دیر کے لیے مفلوج کر دیا۔
میں ریسیور سے کان لگائے مسکراتا رہا۔ "تم... تم واقعی... سکندر ہو؟ کہاں ہو اس وقت؟" اس کی آواز کانپ رہی تھی۔
"کیا بتائیں جی! ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی۔ کچھ ہماری خبر نہیں آتی۔ تم تو جانتی ہی ہو۔ تمہارے بھیا کہاں ہیں؟ ڈیوٹی پر ہیں یا گھر پر؟"
"خدا کا شکر ادا کرو کہ ریسیور انھوں نے نہیں اٹھایا۔" وہ بولی۔
"دوسرے کمرے میں ہیں جلدی سے بتاؤ کیا بات ہے؟"
"آج عجیب اتفاق ہوا۔" میں نے یوں کہا کہ منیجر کو کسی قسم کا شک نہ ہو۔ "میں اپنے دوست عبدالودود منظر کے گھر میں تھا۔ وہ ایڈووکیٹ ہیں نا۔ وہاں محسن بھی تھا۔ اچانک اپنے انکل ایس ایس پی صاحب آ گئے۔ ہاں انکل خاقان رضوی۔ ساتھ لے جانے پر مُصر تھے۔ میں نے بڑی مشکل سے جان چھڑائی۔ تم تو جانتی ہو وہ کیسے آدمی ہیں۔"
"میں سمجھ رہی ہوں۔" نازو بولی۔ "وہ تمہیں گرفتار کرنے پہنچے تھے اور تم پھر فرار ہو گئے۔"
"ہاں۔ اب ایسا ہے کہ فوری طور پر تو میں تمہارے گھر نہیں آ سکتا۔" میں نے کہا۔ "تم آ سکتی ہو؟"
"کہاں؟ جلدی سے بتاؤ۔ بھائی جان آ رہے ہیں شاید۔"
اس کے لہجے میں گھبراہٹ تھی۔
"شالیمار باغ کے گیٹ پر۔" میں نے کہا اور دوسری طرف سے ریسیور رکھے جانے کی آواز سنی۔ لائن کٹ گئی۔
منیجر اب مسکرا رہا تھا۔ اس نے نتیجہ یہ اخذ کیا تھا کہ معاملہ کچھ عاشقانہ ہے۔ جو کچھ غلط نہ تھا لیکن ایس ایس پی خاقان رضوی کو انکل کہنے والا اگر کسی ایس آئی کی بہن کو بغرضِ ملاقات شالیمار باغ بلائے تو اعتراض وہ کرے جسے تھانے جانا مقصود ہو۔ منیجر نے خوش دلی سے ہاتھ ملایا اور کچھ معذرت بھی کی۔ میں باہر نکلا تو ہر طرف امن تھا۔ اگر میرے تعاقب میں کوئی نکلا تھا تو بہت آگے نکل گیا یا شاید دُنیا کے گول ہونے کا ثبوت لینے کے لیے پھیرا لینے گیا تھا جہاں سے چلا تھا۔ میں نے موٹر سائیکل نکالی تو لڑکا ہاتھ پھیلائے والا لپکا۔
"واپس جا رہے ہیں باؤ جی! فلم نہیں دیکھنی؟" اس نے ہاتھ پھیلا کر کہا۔ "ایک روپیہ۔"
"وہ کس بات کا؟" میں نے کہا۔ "منیجر صاحب کے دوست ملنے آتے ہیں تو اُن سے ایک روپیہ لیتے ہو تم؟ جاؤ اندر جا کے اُن سے مانگ لو۔ کہنا وہ صاحب جو ابھی فون کر رہے تھے..." لڑکا مایوس ہو کے لوٹ گیا تھا اور یہ راز افشا نہیں ہوا تھا کہ اگر میرے پاس ایک روپیہ ہوتا تو میں منیجر کے کمرے میں گھسنے کا خطرہ کیوں مول لیتا۔ کسی پبلک کال آفس سے بات نہ کر لیتا اور جیب نہ ہوتا تو نازو سے شالیمار باغ کے دروازے پر ملنے کی کیوں کہتا، اسے کسی ریسٹورنٹ میں نہ بلاتا۔
بیس منٹ بعد میں نے شالیمار باغ کے مقابل ایک درخت کے نیچے اوٹ میں موٹر سائیکل کھڑی کی۔ مجھے سگریٹ کی سخت طلب ہو رہی تھی لیکن میری جیب میں ایک پیسہ تک نہ تھا۔ خیر نازو آئے گی تو اس کے پاس تھوڑی بہت رقم ضرور ہو گی۔ اصل مسئلہ تو محسن والا کے آتے ہی سے حل ہو گا اور نازو نامہ بَری کے فرائض کے لیے موزوں ترین انتخاب ہے۔ اس پر کوئی شک کر ہی نہیں سکتا۔ وہ میری آلۂ کار بنی ہے۔ مجھے تھوڑی سی شرم بھی آئی کہ میں اپنے مقصد کے حصول کی خاطر اس نو عمر عقل کی کچی اور جذبات کی اندھی لڑکی کو بے وقوف بنانا چاہتا ہوں جو یک طرفہ طور پر میرے عشق میں دیوانی ہے کہ میری خاطر آنکھیں بند کر کے اندھے کنویں میں کود سکتی ہے۔ اب تک میں نے بڑے خلوصِ نیت کے ساتھ اس کی حوصلہ شکنی کی تھی۔ مگر آج میں مجبور تھا اور میری مدد صرف وہی کر سکتی تھی۔ ہاتھ باندھے ٹہلتا رہا اور شالیمار باغ کے دروازے پر بس سے اُترنے والے چہرے اجنبی تھے۔ گھڑی کی سوئیاں ہمیشہ کی طرح ایک کا فاصلہ پانچ منٹ میں۔ پھر دس منٹ میں۔ پھر پندرہ منٹ میں طے کرنے لگیں۔ ٹیلی فون پر آخری بات کہنے سے اب تک ایک گھنٹہ کتنا لمبا تھا۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ پھر ایک رکشا رکا اور میں نے دُور ہونے کے باوجود نازو کو پہچان لیا۔
وہ اُتر کے کرایہ ادا کر رہی تھی کہ میں نے موٹر سائیکل اس کے پاس روکی۔ "بیٹھو۔" میں نے کہا۔ "دیر مت کرو۔ گولی مارو باقی پیسے۔" دس کا نوٹ ہاتھ میں لینے والے رکشا ڈرائیور نے مجھے بڑی مشتبہ نظروں سے دیکھا مگر یہ اغوا کا کیس نہیں تھا۔ لڑکی برضا و رغبت موٹر سائیکل پر بیٹھ گئی تھی۔
"اُف۔ ایسی کیا افراتفری ہے۔" نازو نے سنبھلنے کے لیے میری کمر کو مضبوطی سے تھام لیا تھا کیونکہ میں نے موٹر سائیکل کو ایک جھٹکے سے اسٹارٹ کیا تھا اور رفتار ایک دم بڑھا دی تھی۔
"تم ایک مفرور اشتہاری مجرم کے ساتھ فرار ہو رہی ہو لڑکی!" میں نے کہا۔ "اور وہ بھی چوری کی موٹر سائیکل پر۔ ایک تھانیدار کی بہن کی حیثیت سے یہ بہت غلط بات ہے۔ وہ تمہارے پیچھے تو نہیں لگے تھے نا؟"
"معلوم نہیں۔" نازو نے کہا۔ "جرح کر رہے تھے کہ کس کا فون تھا۔ رنگ کیوں اُڑا ہوا ہے؟ اچھا ہوا امّی آ گئیں اور میں نے شکایت کر دی کہ تنگ کر رہے ہیں۔ میری سہیلی نے فون کیا تھا۔"
"اچھا سہیلی! ذرا جیب سے پانچ کا نوٹ تو نکالو... دل دلا ؤ ذرا... ارے بھئی اپنی جیب سے۔" میں نے کہا۔
میں موٹر سائیکل کو کچے راستے پر اُتار چکا تھا اور اب اسی ویران قصبے میں تھا جس کے ایک مکان میں رالعہ اور میں قید رہ چکے تھے۔
نازو ہنسی اور اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ "پانچ کا نوٹ نکال کے کروں سہیلی؟" وہ بیگ کھول کر بولی۔
میں نے موٹر سائیکل روک دی۔ "سگریٹ پلاؤ اپنی سہیلی کو... سامنے سے جا کے ایک ڈبی کیپسٹن مع ماچس لاؤ۔"
نازو نے مجھے حیرانی سے دیکھا اور ایک درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے لڑکے سے سگریٹ ماچس لینے اُتر ہی۔ ابھی اس نے ایک قدم آگے نہیں بڑھایا تھا کہ میری نظر نے پیچھے سے نمودار ہونے والے اسکوٹر کو دیکھ لیا جس پر اکرام شیخ سوار تھا۔ میں نے چلا کر نازو کو پھر بیٹھنے کو کہا اور ابھی وہ ٹھیک سے بیٹھی بھی نہ تھی کہ موٹر سائیکل دوڑا دی۔ اکرام شیخ نے مجھے آواز دی اور رُکنے کو کہا مگر میں پیچھے دیکھے بغیر چلتا رہا۔ میری رفتار ستر میل سے تجاوز کر گئی۔
"سکندر۔ تم بھاگ نہیں سکتے۔ رُک جاؤ ورنہ میں گولی مار دوں گا۔" اکرام شیخ نے چیخ کر کہا۔ اسکوٹر اتنی رفتار پر اس کے قابو سے باہر ہو رہا تھا لیکن موٹر سائیکل کی رفتار میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ اور اسکوٹر پیچھے ہو رہا تھا۔
"رُکنا نہیں سکندر۔" نازو ہسٹریائی لہجے میں چلّائی۔ "وہ گولی نہیں چلا سکتے۔ پیچھے میں ہوں۔"
"مجھ سے بھی جھوٹ بول رہی ہو بے وقوف لڑکی!" میں نے رفتار کو یک دم بہت کم کر لیا۔ اسی وقت نازو نے چیخ ماری اور جھٹکے سے آگے آئی۔ "کیا میں تمہارے بھائی کو نہیں جانتا؟" میرا خیال تھا کہ نازو اچانک بریک لگانے سے مجھ پر گری ہے لیکن اپنی بات ختم ہونے سے پہلے میں نے فائر کی آواز سنی۔ آواز کے مقابلے میں تیز تر سفر کرنے والی گولی اس سے پہلے ہی نازو کے وجود میں پیوست ہو چکی تھی۔ میں نے موٹر سائیکل روکی تو وہ پھسل کر نیچے گری اور میں نے اس کی پشت پر زرد ریشمی قمیص کے چاک سے پھوٹنے والی لہو کی سُرخی کو دیکھا جو تیزی سے پھیل رہی تھی۔ دوسرے لمحے اسکوٹر میرے سامنے آ رُکا اور میں نے ایک وحشیانہ قوت کے ساتھ چھلانگ لگائی۔ اکرام شیخ اس کے لیے تیار تھا چنانچہ اسکوٹر کے رُکنے سے پہلے ہی وہ کود کر الگ ہو گیا تھا۔ اس کا اسکوٹر میری موٹر سائیکل کے پاس جا لیٹا تھا اور اس کا پچھلا پہیہ ابھی تک گھوم رہا تھا۔ اکرام شیخ نے جست لگا کے خود کو بچایا۔ پیچھے گرا اور اُلٹی قلابازی کھا کے بڑی پھرتی سے پھر کھڑا ہو گیا۔ ریوالور بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ "رُک جاؤ... وہیں ٹھہر جاؤ سکندر... میں اپنی بہن کو گولی مار سکتا ہوں تو تم کو بھی مار سکتا ہوں۔" اُس نے چیخ کر کہا۔ میں پاگل ہو رہا تھا لیکن اسے دیکھ کر میرے قدم رُک گئے۔ اس کی حالت مجھ سے زیادہ ابتر تھی۔ اس کا چہرہ دیکھ کر مجھے خوف آیا۔ وہ اکرام شیخ کا نہیں کسی جنونی کا چہرہ تھا۔ اُس کی آنکھیں دہکتے انگارے تھیں اور اس کی صورت پر وحشت عیاں تھی۔ زمین پر گر کے اُٹھنے سے اس کے بالوں میں خس و خاشاک بھر گئے تھے اور منہ پر گرد

جم گئی تھی۔ وہ کسی زخمی درندے کی طرح ہانپ رہا تھا۔

"اس کی جان بھی لے لی تم نے!" وہ چلایا۔ اور میں نے دیکھا کہ اس کی آواز ہی نہیں، اس کے ہاتھ بھی کانپ رہے ہیں۔ "اور کتنی زندگیوں کا نذرانہ لو گے آخر؟ کس کس کو اپنے انتقام کی آگ میں جھونکو گے؟ کوئی حد ہے تمھاری دیوانگی کی؟ تمھارا تو ایک باپ مرا تھا۔ اس کی خاطر تم نے کتنے گھر اجاڑ دیے ہیں اب تک؟ کیا سلامت شاہ، فو مانچو اور غلام علی، زرداد اور میر محمد باپ نہیں تھے؟ عبدل کی ماں، شہلا کی ماں اور رابعہ کی ماں کسی بھی ماں سے کم تھیں! آج تم نے بھائی کے ہاتھوں پر بہن کے خون کی لالی بھی دیکھ لی۔" میری زبان گنگ ہو چکی تھی۔ میں آہستہ آہستہ پیچھے بیٹھ گیا۔ میں نے نازو کو سیدھا کیا اور اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں لیکن سانس چل رہی تھی۔ گولی اس کے شانے پر ذرا نیچے لگی تھی۔

"اسے اسپتال لے چلو۔ نازو بچ جائے گی اکرام شیخ!" میں نے کہا۔ اکرام شیخ نے نفی میں سر ہلایا۔ "اب یہ مر بھی گئی تو کیا، پہلے میں اپنے فرض سے سبک دوش ہو جاؤں۔ تم فرار ہو گئے تو میں اس لڑکی کے ماں باپ کو کیا جواب دوں گا کہ اسے مار کے میں نے کیا پایا۔ اسے تو ایک دن گھر سے جانا ہی تھا، سسرال نہ گئی، قبرستان گئی۔ ماں باپ کو یہ اطمینان تو رہے گا کہ اس کی جان بلاوجہ نہیں لی تھی میں نے۔ سب مجھے شرمندگی تو نہ ہو کہ ......" انتہائی ضبط اور حوصلے سے کام لینے کے باوجود اس کی آواز حلق میں پھنس گئی۔

"میں وعدہ کرتا ہوں شیخ! کہ اسپتال پہنچنے کے بعد خود کو ......" میں نے کہا لیکن میرا جملہ نامکمل رہ گیا۔ میرے الفاظ پر اعتبار کرتے ہوئے شیخ نے ریوالور نیچے کر لیا تھا اور اس نے آہستہ سے اقرار میں سر بھی ہلایا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میں جھوٹ بول کر جان بچانے والے بزدلوں میں سے نہیں ہوں اور اگر میں نے وعدہ کیا ہے تو اب جان دے کر بھی الفاظ کی حرمت کا پاس کروں گا مگر نازو نے بڑی پھرتی سے اٹھ کے ہاتھ مارا اور اکرام شیخ کے ہاتھ سے ریوالور اڑ کر میرے قدموں میں آ گرا۔ دوسرے لمحے نازو نے بھائی کی کلائی مقام کے جھٹکا دیا اور گھٹنا اوپر اٹھایا۔ اکرام شیخ تھوڑا سا اوپر اچھلا اور پانچ گز دور جا لیٹا۔ میں دم بخود کھڑا رہا۔

"ریوالور اٹھا لو سکندر۔ اور جاؤ۔" نازو نے کراہ کے کہا اور پھر پیچھے گر گئی۔ میں ایک دم ہوش میں آ گیا۔ اور میں نے اکرام شیخ کا ریوالور جیب میں رکھ لیا۔ نازو نے جوڈو کی تھوڑی بہت مہارت کا استعمال بڑی کامیابی کے ساتھ کیا تھا۔ لیکن اس سے زیادہ جرأت کا مظاہرہ اس نے حاضر دماغی اور قوت برداشت کا کیا تھا۔ اس نے ٹھیک وقت پر اندازہ کر لیا تھا کہ ادائے فرض کی راہ میں حائل ہونے والی اکلوتی بہن کا لحاظ نہ کرنے والا بھائی مجھے کوئی رعایت نہیں دے گا۔ وہ مجھے گرفتار نہ کر سکا تو گولی مار دے گا اور ذرا بھی پشیمان نہ ہو گا۔ جب میں نے موٹر سائیکل روکی تو وہ جان بوجھ کے یوں سڑک پر گری جیسے بے ہوش ہو۔ اسے یقین تھا کہ تقدیر اسے ایک موقع فراہم کرے گی جب اس کی مدد سے میں جان بچا کے نکل سکوں گا۔ اس کا خون بہتا رہا لیکن اس لمحے کے انتظار میں وہ ہوش و حواس بحال رکھنے کی جدوجہد کرتی رہی۔ نازو جیسی نازک اور دھان پان لڑکی کے لیے اتنا خون ضائع ہو جانے کے باوجود جسم کی طاقت کو ضائع نہ ہونے دینا فقط قوتِ ارادی کا کمال تھا۔ اور جیسے کوئی اس سے یہ توقع نہیں کر سکتا تھا کہ وہ اپنے سے چار گنا لمبے چوڑے اور طاقتور مردوں کو نازک نظر آنے والے ہاتھوں کے ایک کاری وار سے چت کر سکتی ہے، ایسے ہی اکرام شیخ اور میں یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اس حالت میں وہ بجلی کی طرح لپک کے گیم کا پانسہ پلٹ سکتی ہے۔ اس نے اپنی جسمانی قوت کو امکان کی حد تک سنبھالے رکھا اور جب وہ لمحہ آیا جس کا اسے انتظار تھا تو وہ ساری توانائی مجتمع کر کے بے خطر آتشِ نمرود میں کود گئی۔ اکرام شیخ اپنے فرض کی خاطر جان دے بھی سکتا تھا اور نازو جیسی بہن کی جان لے بھی سکتا تھا تو نازو بھی اس سے کم نہ تھی۔ وہ اپنی محبت کی خاطر جان کی بازی لگا کے بھائی کا راستہ روک سکتی تھی اور نتائج کی پروا کیے بغیر مرنے سے نہیں ڈرتی تھی۔ جو گولی میرے جسم کا نشانہ لے کر چلی تھی اسے نازو نے ڈھال بن کے اپنے وجود میں سمیٹ لیا تھا۔

"مجھے ...... مجھے چھوڑ دو ...... چھوڑ دو مجھے سکندر!" اس نے نیم وا آنکھوں سے مجھے دیکھا اور اپنے کمزور ہاتھوں سے دھکیلا۔ "جاؤ تمھیں رابعہ کی قسم۔"

"میں اس حال میں تم کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گا نازو!" میں نے کہا۔ اس کے الفاظ آگ کے تیر بن کے میرے دل میں اتر گئے تھے۔ اس وقت بھی جب اسے یقین تھا کہ وہ زندہ نہیں رہے گی اس نے مجھے اپنی قسم نہیں دی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ میں اس سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ اس نے مجھے اپنی محبت کی خاطر جینے پر مجبور کرنا چاہا تھا۔

"اکرام شیخ! دیکھو۔ نازو کا زخم گہرا ہے لیکن گولی شانے سے ذرا نیچے ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر دل تک نہیں پہنچی ہے تو شاید ڈاکٹر نازو کی جان بچا لیں۔ لیکن اس میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔" اکرام شیخ آہستہ آہستہ آگے آیا اور گھٹنوں کے بل نازو کے پاس بیٹھ گیا۔ "یہ تو نے کیا کیا پاگل! مجھے کہیں کا نہ رکھا۔" اس نے نازو کا ہاتھ تھاما اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"بھیا ...... رونا نہیں ...... تمھیں تو فخر ہونا چاہیے۔ آخر میں بہن کس کی ہوں۔" نازو زبردستی مسکرائی۔ پھر اکرام شیخ نے اسے دونوں ہاتھوں میں اٹھا لیا۔ "ٹھہرو بھیا صرف ایک منٹ کی مہلت ...... دے دو ...... مجھے ...... مجھے کچھ کہنا ہے ...... تمھارے سامنے نہیں ...... اور دیکھو ...... وعدہ کرو اسے جانے دو گے ...... میری قسم تمھیں۔"

اکرام شیخ نے میری طرف دیکھا اور اس وقت مجھے ان آنکھوں میں نفرت کے الاؤ سلگتے دکھائی دیے جن میں کبھی میرے لیے خلوص اور یگانگت کے جذبات موجزن نظر آتے تھے۔ پھر اس نے آہستہ سے نازو کو زمین پر رکھ دیا۔ اپنے خون میں لتھڑے ہوئے ہاتھوں کو دیکھا اور چند قدم دور جا کے میری طرف پیٹھ کر کے کھڑا ہو گیا۔

"وقت ضائع مت کرو نازو!" میں نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"ابھی تک تم نے ...... وہ ...... وہ بات تو بتائی نہیں ...... جس کے لیے مجھے ...... بلایا تھا۔" وہ بمشکل تمام بولی۔

"مجھے تمھارے ذریعے محسن کو پیغام دینا تھا۔" میں نے کہا۔ "وعدہ کرو تم زندہ رہو گی ...... تم جیسی بہادر لڑکی مر نہیں سکتی۔ محسن آئے تو کہنا کل شام میں وہیں ملوں گا۔ جہاں تم سے ملا تھا۔"

اس نے آہستہ سے سر ہلایا۔ پھر اس کا ہاتھ گر گیا۔ "شیخ! یہ بے ہوش ہو گئی ہے۔ لے جاؤ اسے۔"

"میری نظروں سے دور ہو جاؤ ذلیل آدمی!" وہ زہریلے سانپ کی طرح پھنکارا۔ "یہ نہ ہو اس کے مرنے سے پہلے میں تجھے مار دوں اور اگر یہ مر گئی نا سکندر، تو خدا کی قسم میں تجھے تلاش کر کے کتے سے بدتر موت ماروں گا۔"

پھر اس نے نازو کو دوبارہ اٹھایا اور سڑک کی طرف چل دیا۔ بہت دور کسان کھیتوں سے لوٹ رہے تھے۔ شاید انھوں نے بھی دو مردوں کو ایک عورت کے ساتھ آتے دیکھا ہو گا۔ ایک موٹر سائیکل اور ایک اسکوٹر پر ایک ساتھ ...... اور یہی سمجھا ہو گا کہ وہ سب شہر کے اوباش لوگ ہیں جو اس ویرانے میں دنیا والوں کی نظروں سے چھپ کر مل رہے ہیں۔ کسی کے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ ان تین افراد کے درمیان محبت اور نفرت کے جذبات کی آگ کے شعلے کس طرح رشتوں کی آبرو کو خاک کر رہے ہیں۔ میں سڑک تک اکرام شیخ کے ساتھ گیا لیکن ہم نے آپس میں کوئی بات نہیں کی۔ پھر میں نے ایک ٹیکسی کو روکا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے ایک نظر ہم دونوں پر اور بے ہوش نازو پر ڈالی جس کے خون سے اکرام شیخ کے ہاتھ اور کپڑے تر تھے اور انکار میں سر ہلایا۔ وہ فرار ہونے کی تیاری کر رہا تھا کہ میں نے اس کی گردن پکڑ لی۔ "دیکھ رہے ہو کہ ایک زخمی عورت کو فوراً طبی امداد نہ ملی تو وہ مر جائے گی۔" میں نے کہا۔ "انسانیت بھی کوئی چیز ہے۔"

"کوئی زبردستی ہے؟" وہ باہر نکل آیا۔ "میری ٹیکسی ہے میں نہیں جاتا۔ نہیں ہے مجھ میں انسانیت۔ تم دوسری ٹیکسی لے لو۔"

میں نے اس کے ایک جھانپڑ رسید کیا اور پچھلا دروازہ کھول دیا۔ شیخ نے نازو کو سیٹ پر لٹایا اور اس کا سر اپنی گود میں رکھ کے بیٹھ گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور ایک بار گر کے پھر اٹھا اور گالیاں بکتا مجھ پر حملہ آور ہوا۔

"...... ساری سیٹ گندی کر دی۔ بدمعاشی الگ کر رہے ہو۔ تمھیں معلوم ہے یہ ٹیکسی ڈی ایس پی صاحب کی ہے۔"

"ایسی کی تیسی تیرے ڈی ایس پی صاحب کی۔" میں نے اس کے سینے پر لات ماری اور وہ قلابازی کھا کے دور جا گرا۔

"یہ کارڈ رکھو اپنے پاس۔" اکرام شیخ نے جیب سے کارڈ نکال کے اس کی طرف پھینکا۔ "ٹیکسی لینے کے لیے ڈی ایس پی کو تھانے بھیج دینا۔ اور خود بھی حاضر ہو جانا۔ تم پر مسافروں کے ساتھ بدسلوکی اور سواریاں بٹھانے سے انکار کرنے کا الزام ہے لیکن میں اس وقت تم کو گرفتار نہیں کر سکتا۔"

جب میں نے ٹیکسی میں لگی ہوئی چابی گھمائی تو اکرام شیخ نے اسے کارڈ اٹھا کے دوڑتے دیکھا۔ "غلطی ہو گئی مائی باپ۔" وہ چلاتا ہوا ٹیکسی کے سامنے آ گیا اور ہاتھ جوڑ کے کھڑا ہو گیا۔ "اس بار معاف کر دیں، ہزار بار میری توبہ۔"

میں نے اس کی سیٹ خالی کی اور ساتھ والی سیٹ پر سرک گیا۔ اس نے فوراً گاڑی اسٹارٹ کر دی کیونکہ سڑک پر اس کی درگت بننے کا تماشا دیکھنے والے جو پہلے اس کے ہمدرد تھے اب اس پر پھبتیاں کس رہے تھے۔ "بس اوئے؟" "اوئے اینا ای زور سی ڈی ایس پی صاب دا؟" "وڈا پھنے خاں دا پتر۔" ان میں راہگیر بھی تھے اور کچھ اس کے ہم پیشہ بھی۔ چنانچہ اس نے کسی کو جواب دینے کے بجائے نکل جانا بہتر سمجھا۔ میں نے کچھ دور جا کے اکرام شیخ کا ریوالور اسے واپس دینے کے لیے نکالا مگر کچھ سوچ کے واپس رکھ لیا۔ ڈرائیور نے اس کا مطلب کچھ اور نکالا اور اس کی حالت غیر ہو گئی۔

"باؤ جی! ...... تھانیدار صاحب ...... رب دا واسطہ ...... میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ میں اکیلا سہارا ہوں ان سب کا۔" اس نے گڑگڑانا شروع کیا۔ "پولیس میری ٹیکسی بھی بند کر دے گی

اور مجھے بھی ۔ میں کیا بتاؤں گا کہ گاڑی میں خون کس کا ہے اور کہاں سے آیا ۔ کون سُنے گا میری بات ۔ آپ تو بچ جائیں گے ۔"

وہ اپنے دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ ہم میں سے کسی نے اس لڑکی کو گولی ماری ہے اور جب ایک تھانیدار اور ایک بدمعاش کسی جوان اور خوبصورت لڑکی کو ویرانے میں لے جا کر گولی مار دیں تو معاملہ انتہائی سنگین ہوتا ہے ۔

"دیکھو ۔ یہ میری سگی بہن ہے ۔" اکرام شیخ نے اسے مطمئن کرنے کے لیے کہا ۔ "یہ ۔۔۔ اس کی اپنی بے وقوفی تھی ۔۔۔ کہ اسے گولی لگ گئی ۔۔۔" میں نے پلٹ کر دیکھا مگر اکرام شیخ نے مجھ سے نظر نہیں ملائی ۔

"تمھارا نام کوئی نہیں لے گا ۔ تم ہمیں البرٹ وکٹر اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ تک پہنچا دو ۔" اکرام شیخ نے کہا ۔ "اور جاؤ ۔ اس معاملے میں کبھی پریشانی لاحق ہو تو فون کر لینا یا میرے پاس آجانا ۔"

"ٹیکسی اسی جگہ روک دو ۔" میں نے اچانک کہا ۔ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ اکرام شیخ نے نازو کو کہاں لے جانے کا فیصلہ کیا ہے ۔ ڈرائیور نے تعمیل کی ۔ میں نے نیچے اُتر کے شیخ کو اس کا ریوالور واپس کر دیا ۔ اب مجھے یہ خطرہ لاحق نہیں رہا تھا کہ وہ پیچھے سے ریوالور میری گدّی پر رکھ دے گا ۔ اس کے باوجود میں نے اپنا ریوالور نکال کے ہاتھ میں رکھا ۔ ڈرائیور نے آنکھیں پھاڑ کے ایک شخص کی جیب سے دو ریوالور برآمد ہوتے دیکھے ۔

"جو کچھ ہوا ۔۔۔ اس کے لیے ۔۔۔ آئی ایم سوری ۔۔۔"

میں نے بے ربط الفاظ میں کہا ۔ "خدا کرے نازلی ۔۔۔"

"اُلو کے پٹھے ! گاڑی چلاؤ ۔" اکرام شیخ نے میری بات کاٹ کے اور ڈرائیور سے گرج کر کہا ۔ "میری بہن مر گئی تو میں تم کو بھی شوٹ کر دوں گا ۔"

ڈرائیور کے لیے یہ بہت منحوس دن تھا اور ہم سا انکار اُسے بہت مہنگا پڑا تھا ۔ وہ ٹیکسی لے کر ہوا ہو گیا ۔

میں سڑک کے کنارے اکیلا کھڑا رہ گیا ۔ میرے بائیں ہاتھ پر شالامار باغ کا دروازہ تھا جہاں صرف چالیس منٹ پہلے میں نے نازو کو رکشا سے اُترتے دیکھا تھا ۔ گلِ نوشگفتہ کی طرح اُس کے حسن کی ہر ادا ۔ ادائے حسن کی محبوبیت اور معصومیت میں ناز آفرینی کا انداز اتنا دلنواز اور ساحرانہ تھا کہ میں نے بہت سی نظروں کو اس کے حسن کی تجلی سے خیرہ ہوتے دیکھا تھا ۔ دائیں جانب وہ فرشِ خس و خاشاک تھا جس پر اس کا لہو زمین پر ایک داغ کی صورت میں موجود تھا ۔ یہ داغ میرے دل پر نقش ہو گیا تھا اور اکرام شیخ کے ذہن پر آ گیا تھا ۔ واپس جاتے ہوئے میرے کانوں میں اکرام شیخ کے الفاظ گونج رہے تھے ۔ "اور کتنی زندگیوں کا نذرانہ لو گے ؟ کس کس کو اپنے انتقام کی آگ میں جھونکو گے ؟"

اور میں ندامت و احساسِ جرم کے بارِ گراں کے نیچے دبنے لگا تھا ۔ میں نے تو نازو کو اپنی مدد کی خاطر بلایا تھا ۔ وہ میری مدد کر گئی اور مجھ پر قرض کا بوجھ چھوڑ گئی ۔ اسے کیا ضرورت تھی اس گولی کا راستہ روکنے کی جو میرا مقدر تھی ۔ اپنے خون سے اس نے میری آزادی کی قیمت ادا کی اور شاید پہلی بار اکرام شیخ ادائے فرض کی راہ میں شکست سے دوچار ہوا ۔ وہ فرض شناسی اور اصول پرستی میں کتنا ہی سخت کیوں نہ ہو بہرحال ایک گوشت پوست کا بنا ہوا انسان تھا جس کے سینے میں دل کی جگہ پتھر نہیں تھا ۔ مزاحمت اور قوتِ برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے ۔ وہ شیشے کا آدمی تھا جیسا اندر سے تھا ویسا ہی باہر سے نظر آتا تھا مگر اس میں لچک نہ تھی ۔ دباؤ نے اُسے یکلخت توڑ دیا ۔ چُورا چُورا کر دیا ۔ اب وہ کیا کرے گا ؟ اپنے وجود کے ٹکڑے کیسے سمیٹے گا ؟ کیا ان سے وہ پُورا آدمی بن سکے گا ؟ ۔۔ سوالات کی یلغار میرے ذہن کو ماؤف کر رہی تھی ۔ کچے راستے پر اترتے ہوئے میں نے نازو کے تصور کو ہر کاب دیکھا ۔ وہ اسپتال کے بے داغ بستر پر لاش کی طرح پڑی تھی ۔ نرس اور ڈاکٹر تیزی سے آ جا رہے تھے ۔ "کنڈیشن سیریس ہے مسٹر شیخ ! خون بہت ضائع ہو گیا ہے ۔ زخم تو اتنا خطرناک تھا لیکن آپ نے دیر کر دی ۔ ایمرجنسی آپریشن کر رہے ہیں ہم لیکن آپ خون کا بندوبست کریں ۔ کم سے کم چار بوتل ۔ بلڈ گروپ کیا ہے ؟"

اور اکرام شیخ اپنے گھر فون کر رہا ہے ۔ "البرٹ وکٹر ہوسپٹل میں آ جائیے ۔ نازو زخمی ہے ۔ نہیں ۔ کوئی خطرے کی بات نہیں !"

جھوٹ جھوٹ !! ۔۔ ایک جھوٹ تم نے ٹیکسی ڈرائیور سے بولا تھا ۔ کیا واقعی نازو اپنی غلطی سے زخمی ہوئی تھی ؟ غلطی اگر تھی تو میری جس نے اسے بُلایا تھا ۔ یا تمھاری جس نے اس کا نشانہ لیا ۔ کیا تم دیکھ نہیں رہے تھے کہ پیچھے تو وہ ہے اور میں بالکل محفوظ ہوں ۔ مگر تم کہہ سکتے ہو کہ غلطی نازو کی تھی ۔ آخر اسے کیا ضرورت تھی میرے جیسے مجرم سے ملنے کی ۔ یوں خاندان کی عزت آبرو اور اخلاقی و معاشرتی قیود کا خیال کیے بغیر گھر سے نکلنے کی ؟ کیا مُنہ دکھائیں گے وہ ماں باپ کسی کو جن کی جوان بیٹی ایک مفرور اشتہاری مجرم سے چوری چھپے ملنے پہنچی ہو ؟ بہن پر گولی چلانے والا بھائی کیا کہے گا کہ اس کی چھوٹی اور اکلوتی بہن نے اس پر ہاتھ کیوں اٹھایا تھا ؟ اسی مجرم کی خاطر ؟ کیا وضاحت پیش کرے گا وہ تھانیدار جو ایک زخمی لڑکی سے مار کھا گیا اور مسلح ہونے کے باوجود ملزم کو گرفتار نہ کر سکا ؟

جواب وہی تھا جو اکرام شیخ نے ٹیکسی ڈرائیور کو دیا تھا ۔ اس جواب میں سکندر بخت کا نام کہیں نہیں آئے گا ۔ وہ اپنی بہن کی عزت اور خاندان کی آبرو بچانے کا ۔ کوئی سیدھی سی جھوٹی کہانی سب کو قائل کرے گی ۔ جس کے واقعات روزمرہ زندگی کے مطابق ہوں گے مثلاً یہ کہ نازلی کو کالج سے واپسی پر چند غنڈوں نے اغوا کرنے کی نیت سے ٹھس جیپ میں ڈال کے لے جانا چاہا تھا اور اکرام شیخ نے ان کا تعاقب کیا مگر گولی نازلی کی پشت سامنے ہونے کے باعث اسے لگ گئی ۔ غنڈے اس کا اسکوٹر چھین کر بھاگ گئے ۔ اسکوٹر بعد میں واردِ غزالاپل کے قریب پڑا ہوا مل جائے گا ۔ وہ پولیس افسر ہے ، قانونی معاملات کی پیچیدگی کو سمجھتا ہے ۔ وہ خود ہی اس واردات کا ایسا تانا بانا بُن لے گا کہ سقم کوئی نہ رہے ۔ رپورٹ نامعلوم حملہ آوروں کے خلاف درج ہو اور کیس داخلِ دفتر ہو جائے ۔ وہ اپنی ناکامی اور بہن کی بدنامی پر خاموشی سے پردہ ڈال دے گا کیونکہ جو کچھ ہوا تھا اس کا میرے سوا کوئی عینی گواہ نہ تھا اور میرا اس کے کسی بھی بیان سے اختلاف کرنا بعید از قیاس تھا ۔

موٹر سائیکل اور اسکوٹر اب بھی ساتھ ساتھ پڑے تھے لیکن وہاں دس بارہ افراد جمع ہو گئے تھے ۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ خون کس کا پڑا ہے اور قاتل یا مقتول میں سے یہ کس کا سامان ہے ۔ وہ سب ایک دوسرے سے سوال کر رہے تھے اور مشورے کر رہے تھے کہ انھیں کیا کرنا چاہیے ۔ لیکن سب اپنی اپنی بولی بول رہے تھے ۔ آدھے تو اس چکر میں پڑ کے مصیبت میں گرفتار ہونے کے لیے بالکل تیار نہ تھے ۔ باقی نصف پولیس کو رپورٹ کرنے کے حق میں تھے ۔ مگر اس بات پر اتفاق نہیں کر پا رہے تھے کہ بلّی کے گلے میں گھنٹی باندھنے کون جائے ۔ اسی وقت میں نے قدم رنجہ فرمایا اور تھانیدارانہ لب و لہجے میں صورتِ حال پر قابو پا لیا ۔

"سب تماشا دیکھنے جمع ہو ؟" میں نے ڈانٹ کر کہا ۔ "نام بتلاؤ اپنا اپنا ۔ سب کے بیانات ہوں گے تھانے میں ۔" میں نے کہا ۔ آدھی پبلک فوراً چھٹ گئی ۔ باقی نے کہا کہ وہ کچھ جانتے ہی نہیں تو بیان کیا دیں ۔ نازو کا پرس ایک ریشمی لاچے والا لیے کھڑا تھا اور مجھے خاصی مشکوک نظروں سے گھور رہا تھا ۔

"تم کون ہو جی ! کہاں کے تھانے دار ہو ؟" لاچے والے نے کہا ۔

میں نے اُسے ایک خوفناک گالی دے کر اُلٹے ہاتھ کا طمانچہ مارا جس سے اس کا رخسار لال پڑ گیا ۔ "یہ پرس کیسے اٹھایا تم نے ؟ اس پر فنگر پرنٹ تھے ۔" میں نے گرج کر کہا ۔ "یہ اسکوٹر سب انسپکٹر اکرام شیخ کا ہے ۔ اور میں تھانیدار ہوں یا نہیں اس کا پتا تمھیں تھانے جا کر چلے گا ۔ اٹھاؤ یہ اسکوٹر ۔" میں نے اچانک ریوالور نکال لیا ۔

لاچے والے ہی کو نہیں جملہ حاضرین کو بھی میرے تھانیدار ہونے کا یقین ہو گیا ۔ اس نے نازو کا زنانہ ہینڈ بیگ مجھے پکڑا دیا ۔ میں نے اسے کھول کر دیکھا تو مجھے نوٹ ہی نوٹ نظر آئے ۔ سو کے پچاس کے ۔ دس اور پانچ کے ۔

"کتنی رقم پار کی ہے اس میں سے ؟" میں نے لاچے والے کی گردن پکڑ لی جو اسکوٹر اٹھانے کے لیے جھک رہا تھا ۔

"قسم مولا کی سرکارِ عالی ! حرام ہے جو کھول کے بھی دیکھا ہو ۔ پُوچھ لیں آپ ان سب سے ۔" وہ رونے کے قریب ہو گیا ۔

"اسکوٹر چلا سکتے ہو ؟" میں نے اسے کچھ دیر گھورنے کے بعد قدرے نرم لہجے میں کہا ۔

لاچے والے نے اطمینان کا سانس لیا کہ وہ مجھے قائل کرنے میں کامیاب ہو گیا ۔ "کہاں لے جانا ہے سرکارِ عالی ؟"

میں نے اُسے تھانے کا پتا بتایا ۔ "تم چلو میں پیچھے آ رہا ہوں ۔ اِدھر اُدھر مت ہو جانا ورنہ قبر سے نکال لاؤں گا ۔ سارے گھر کو بند کر دوں گا ۔" میں نے فحش کلامی میں پولیس مین کا مثالی کردار پیش کیا اور کامیاب رہا ۔ لاچے والے کو کچھ لوگوں نے حوصلہ دیا کہ تھانیدار صاحب کچھ نہیں کہیں گے بس تو اسکوٹر تھانے پہنچا کے لوٹ آئے گا ۔ دو ایک نے دست بستہ مجھ سے گزارش کی کہ میں ازراہِ بندہ پروری لاچے والے کو گھر واپس آنے دوں ۔ اور میں نے اکڑی ہوئی گردن پر سرِ پُر غرور کو جنبش دے کر صحیح تھانیدار کی طرح اس درخواست کو شرفِ قبولیت بخشا اور کہا ، وہ اسکوٹر تھانے کے باہر کھڑا کر کے بھاگ آئے ۔ جب لاچے والا بڑے خشوع و خضوع سے اسکوٹر لے کر تھانے جا رہا تھا تو میں ایک پبلک کال آفس سے البرٹ وکٹر ہوسپٹل فون کر رہا تھا ۔ ایمرجنسی کے نمبر پر میں نے ایک ڈاکٹر سے بات کی ۔

"میں ایس ایس پی ضامن رضوی بول رہا ہوں ۔" میں نے انگریزی میں کہا ۔ "ابھی ابھی ایک کیس آیا ہے ۔ میرے ایک ماتحت سب انسپکٹر شیخ کی سسٹر ہے ۔ غالباً وہ کسی حادثے میں گولی سے زخمی ہوئی تھی ۔ مس نازلی ۔"

"یس سر ۔ وہ آپریشن تھیٹر میں ہے ۔" ڈاکٹر نے کہا ۔ "بلٹ نے ہارٹ کو مس کر دیا ہے ۔ ویری لکی فار ہر ۔ شولڈر بلیڈ کے نیچے رہ گئی ۔ ہڈی پر معمولی سی خراش ہے ۔ ایکس رے بہت صاف ہے ۔"

"خطرے کی کوئی بات تو نہیں ہے نا ؟" میں نے کہا ۔ "مجھے یقین ہے وہ ماہر ہاتھوں میں ہو گی ۔"

"آف کورس سر ۔ لیکن خون کافی بہہ گیا ہے ۔ ہم ابھی کچھ نہیں کہہ سکتے ۔" وہ بولا ۔ "چوبیس گھنٹے بعد معلوم ہو گا ۔"

"حادثہ کیسے پیش آیا؟ شیخ نے کیا بتایا ہے؟" میں نے کہا۔

"تفصیلات تو مجھے نہیں معلوم۔" وہ بولا۔ "پولیس سرجن کی رپورٹ میں ہے کہ وہ اپنی سسٹر کے ساتھ جا رہے تھے کہ چند افراد نے اُن کا راستہ روکا اور انھیں لوٹنے کی کوشش کی۔ وہ اسکوٹر اور مس نازلی کا پرس چھین کر لے گئے جس میں کافی رقم بھی۔ مقابلے میں جو گولی انسپکٹر شیخ نے ایک ڈاکو پر چلائی تھی وہ اُن کی بہن کو لگ گئی جو خود بھی جوڈو وغیرہ جانتی ہے چنانچہ مقابلے میں شریک تھی اور اگر گولی نہ لگتی تو شاید وہ بدمعاش بھاگ نہ پاتے۔"

"اوہ یس۔ میں جانتا ہوں اُسے۔" میں نے اطمینان کا سانس لے کر کہا۔ "ویری بریو گرل۔ اچھا ڈاکٹر۔ ڈو می اے فیور۔ میری لائن کچھ خراب ہے۔ کسی سے کہو میرے گھر رنگ کر دے۔ میری وائف کو یا مس رابعہ کو۔ ورنہ وہاں محسن ہوگا، ان کو اس حادثے کی اطلاع دینی ہے۔ تھینک یو۔"

ایک ٹیلی فون سے کئی مسئلے حل ہو گئے تھے۔ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ اکرام شیخ نے میری توقعات کے مطابق سب کو مطمئن کرنے کے لیے اور سب کی پوزیشن محفوظ رکھنے کے لیے تقریباً ویسی ہی کہانی گھڑ لی جو میرے ذہن میں آئی تھی۔ کچھ دیر میں بیگم رضوی، رابعہ اور محسن کے ساتھ اسپتال پہنچ جائیں گی۔ انھیں تو البرٹ وکٹر اسپتال سے پیغام ملے گا۔ چنانچہ ان کے لیے شک کی کوئی بات نہیں ہوگی۔ اسپتال سے کسی نے ایس ایس پی کا حوالہ دیا تو تھوڑا سا کنفیوژن پیدا ہوگا مگر نقصان کوئی نہیں ہوگا۔ رضوی صاحب کا ذہن میرے سوا کسی کی طرف نہیں جائے گا کہ رابعہ اور محسن کو اسپتال بلوانے کے لیے میں نے ان کا نام استعمال کیا ہے۔ اکرام شیخ بھی یہ بات سمجھ جائے گا کہ اسکوٹر کو تھانے بھجوانے والا بھی میں ہی ہوں لیکن کہا یہ جائے گا کہ غالباً ڈاکو خود اسے وہاں پھینک گئے۔ حالات امید افزا تھے۔ اور اگرچہ ڈاکٹر نے واضح الفاظ میں امکانات کو ففٹی ففٹی قرار دیا تھا لیکن میرے دل کی آواز یہ کہتی تھی کہ وہ زندہ رہے گی۔ قدرت اتنی نامہرباں اور غیر منصف نہیں کہ ایک ناکردہ گناہ پر اس کو عمر کے دورِ بہار میں زندگی سے محرومی کی سزا دے۔ ویری لکی فار ہر۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ دل محفوظ رہا۔ ساری خرابی اسی دل کی تھی جس کے ہاتھوں مجبور ہو کے وہ مجھ سے ملنے آ پہنچی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں کبھی اس سے محبت نہیں کر سکتا، اس نے اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے میں ذرا بھی تامّل نہیں کیا تھا۔ کہ سکندر! یہ جان تو آنی جانی ہے۔ اس جاں کی تو کوئی بات نہیں۔ کیا یوں بھی کوئی کسی کو چاہ سکتا ہے؟

ایک خوش آئند امکان یہ تھا کہ انکل رضوی کے تعینات کیے ہوئے فرشتے اس سانحے سے غمزدہ رابعہ اور محسن کے ساتھ اسپتال پہنچ جائیں مگر وارڈ سے دُور رہیں۔ خصوصاً بیگم رضوی کے ساتھ ہونے کے باعث۔ نازو اگر ہوش میں ہوتی تو محسن کو میرا پیغام ضرور دیتی لیکن ابھی تو اس پر چوبیس گھنٹے بھاری ہیں۔ اس کے بعد بھی وہ کب اس قابل ہوگی کہ کسی سے بات کر سکے۔ یہ بالکل غیر یقینی تھا۔ مگر میں خود اسپتال میں موجود رہ کے اس سے رابطے کی کوئی صورت یقیناً نکال سکتا تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ میں پہلے ہی اسپتال پہنچ کے کوئی بندوبست کر لوں۔ موٹر سائیکل اس بے سروسامانی میں میری بہت مدد کر رہی تھی۔ اس کا نمبر تو پہلے ہی بدل چکا تھا۔ اس کی ظاہری صورت کو بدلنے کے لیے میں نے ٹول بکس کے اوزاروں کی مدد سے اس کے دونوں "بیک ویو مرر" اتار دیے، کیریئر ہٹا دیا۔ جو سیٹ کے پیچھے مڈگارڈ کے اوپر لگا ہوا تھا۔ اور ایک جگہ رک کر سیاہ ریگزین کی سیٹ پر شال کلا تھ کا نیلے رنگ کا کور چڑھا لیا۔ موٹر سائیکل کو اب اس کا حقیقی مالک بھی شناخت نہیں کر سکتا تھا۔

اسپتال میں داخل ہونے کے لیے میں نے عام راستے کے بجائے عقبی دروازے کو استعمال کیا جو ڈاکٹروں اور پیرامیڈیکل اسٹاف کے لیے مخصوص تھا۔ ادھر نرسیں اور ڈاکٹر ہی نہیں میڈیکل کے اسٹوڈنٹ اور اسپتال کے ملازم بھی پھر رہے تھے۔ کینٹین انہی کے دم سے آباد تھی۔ اب شام کے اندھیرے میں رات کی سیاہی کا رنگ گہرا ہونے لگا تھا چنانچہ ہر جگہ مرکری لائٹس اور ٹیوب لائٹس روشن تھیں۔ اور سائے میں صورتوں کی شناخت بھی دشوار تھی۔ میں نے کینٹین کی ایک خالی میز پر بیٹھ کے نازو کے ہینڈ بیگ کی رقم شمار کی۔ مجموعی طور پر اس میں تین ہزار سات سو چھپن روپے تھے۔ مجھے ایک پرانی کہانی یاد آئی جب کسی نے نصف شب کو اپنے دوست کے دروازے پر دستک دی تھی تو دوست تین چیزیں ساتھ لے کر باہر آیا تھا۔ شمشیر برہنہ کہ دشمنوں کا خوف ہو تو مقابلے کے لیے جان حاضر ہے۔ اشرفیوں کا توڑا کہ دنیاوی ضرورت کے باعث تنگی ہے مال حاضر ہے۔ اور ایک کنیز مہ لقا کہ شبِ تنہائی کا عذاب ہے تو چاندنی سی رات تیرے حوالے۔ نازو جانتی تھی کہ میں مصیبت میں ہوں۔ وہ خود تو مدد کے لیے سربکف پہنچی ہی تھی، اپنی تمام متاعِ نقد بھی ہمراہ لے آئی تھی کہ میرے کام آ سکے تو میں لے لوں۔ یہی وہ لڑکی تھی جو ایک دن کے لیے سو روپے ادھار دیتی تھی تو سوا یا ڈیڑھ سو واپس لیتی تھی اور زبردست سُود خور شمار ہوتی تھی۔ سود ادا کرنے میں اس کے بھائی کا دیوالیہ نکل جاتا تھا اور ایک بار تو یہ سُود مجھے بھی بہت مہنگا پڑا تھا۔ اب وہ اتنی بڑی رقم جو اس نے جیب خرچ سے پس انداز کی تھی اور سُود سے کمائی تھی، اپنا خلوص اور اپنی محبت شامل کر کے میرے حوالے کر چکی تھی میرا اسے بلانے کا اصل مقصد تو پیغام رسانی تھا مگر میں اس سے سوچا میں ادھار ضرور لیتا کیونکہ اس وقت میں بالکل قلاش تھا۔

"اگر آپ بُرا نہ مانیں تو۔۔۔" ایک نرس نے چائے کی پیالی اور دو مکھن لگے سلائس لے کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "وہ دراصل جگہ کہیں نہیں ہے۔۔۔ اور مجھے جلدی ہے۔" اُس نے توس دانتوں سے کاٹ کے کھاتے کھاتے مجھے دیکھا۔ "باہر کے آدمی ہو، جانتے نہیں یہ کینٹین۔۔۔"

"جانتا ہوں۔ لیکن میری مجبوری یہ ہے کہ میں ادھر نہیں جا سکتا۔" میں نے سخت مغموم صورت بنا کے رقت طاری کرتے ہوئے کہا۔ "ابھی کچھ دیر میں پولیس آئے گی اور مجھے پکڑ کے لے جائے گی۔۔۔ میں کیا کروں؟"

"کیا کرو؟ ارے بھئی بھاگ جاؤ۔" وہ گرم چائے کا گھونٹ لے کر بولی۔ "کیا۔۔۔ جرم۔۔۔ الزام ہے تم پر؟"

"کچھ نہیں۔۔۔ سب سے بڑا الزام میری غربت ہے۔" میں نے سر تھام کے کہا۔ "میرا دشمن وہ شخص ہے جس نے میری بہن کو گولی ماری۔ اور الزام لگا دیا کہ اسے اپنے دفاع میں گولی چلانی پڑی تھی مجھ پر۔"

"تم پر؟" نرس کی دلچسپی بڑھ گئی۔ "یا تمھاری بہن پر؟"

"بات سمجھا کرو۔" میں نے کہا۔ "وہ سُوّر کا بچہ دھوکے سے میری بہن کو ورغلا کے لے گیا تھا۔ اتفاق سے میں نے دیکھ لیا۔ وہ دست درازی پر آمادہ تھا کہ میں جا پہنچا۔ اُس نے نشے میں مجھے شوٹ کرنا چاہا۔ بہن مجھے بچانے کے لیے سامنے آ گئی لیکن الزام مجھ پر آیا۔ اس کے نوکروں نے گواہی دے دی کہ فائر کرنے والا میں تھا۔ میں نے سیٹھ پر گولی چلائی تھی جو میری بہن کے لگی۔ میری بہن سیٹھ کے پاس ملازمت کی درخواست لے کر گئی تھی۔ میں پولیس سے مار پیٹ کر کے فرار ہوا۔ لیکن میں جانتا ہوں، رپورٹ میرے خلاف لکھی جا چکی ہے۔ اب وہ ایمرجنسی وارڈ میں ہے۔ معلوم نہیں زندہ ہے کہ مر گئی ہے۔ میرا ایک دوست دیکھنے گیا تھا مگر وہ بھی لوٹ کر نہیں آیا۔ اب میرے دل کو دھڑکا لگا ہوا ہے کہ کہیں وہ بھی پکڑا نہ گیا ہو۔ تم میری کچھ مدد کر سکتی ہو؟"

"میں؟ میری ڈیوٹی ایمرجنسی وارڈ میں نہیں ہے۔" وہ چونک کر بولی۔

"لیکن تم جا تو سکتی ہو وہاں۔ پلیز۔ دیکھو تم مجھے مجرم سمجھو یا بے گناہ۔ مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بس مجھے اپنی بہن کی خبر لا دو۔ تم بھی تو کسی کی بہن ہو آخر۔ سوچو ذرا میری جگہ تمھارا بھائی ہوتا۔۔۔" میں نے فرفر بولنا جاری رکھا۔

"اچھا اچھا۔ نام بتاؤ۔" وہ گھبرا کے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"نازو۔۔۔ ہم نازو کہتے تھے۔ یہاں نازلی لکھوایا گیا ہوگا۔ پرائیویٹ وارڈ ہوگا۔" میں نے کہا۔ "ایک منٹ کے لیے یہ قلم دو۔"

"راوگاڈ۔ ارے بھئی وقت نہیں ہے میرے پاس۔" اس نے اپنا نازک سا زنانہ قلم مجھے تھما دیا۔

میں نے زمین پر سے سگریٹ کا خالی پیکٹ اُٹھایا اور درمیان میں سے پھاڑ کے لکھا۔ "نازلی کا کیا حال ہے؟" اور نرس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ "وہاں محسن کو دیکھ لینا۔ میرے ہی قد کا جوان آدمی ہے۔ درمیان سے مانگ نکالتا ہے۔ براؤن بال ہیں نیچرل براؤن۔۔۔ یا ایک لڑکی ہوگی رابعہ۔ فلم اسٹار زیبا کی ہمشکل۔ نام نہ لے لینا نہ ان کے متعلق پوچھنا۔ بس وہ نظر آ جائیں تو یہ اُن کے ہاتھ میں دے دینا۔ ایسے کہ کوئی دوسرا نہ دیکھے۔ اور سسٹر۔" میں نے ہینڈ بیگ میں سے سو سو کے پانچ نوٹ نکالے اور اس کی طرف بڑھائے۔ "فار یور ٹربل۔ اس احسان کا بدلہ پھر کبھی ادا کروں گا۔"

"واٹ؟ کیسا احسان؟ کیسی ٹربل؟ مجھے معاملہ گڑبڑ نظر آتا ہے۔" اس نے مختصر سے کارڈ کو پڑھ کر کہا۔ لیکن اس میں مشتبہ بات کوئی نہیں تھی۔ "تم رشوت دے رہے ہو مجھے؟"

"اوہ نو۔ کاش میں اس سے زیادہ کر سکتا۔ اس وقت میں بہت مجبور ہوں۔ معاملہ تو گڑبڑ ہے اور میں تم کو بتا بھی چکا ہوں۔ مجھے تم اعتماد کے قابل نظر آئی تھیں، ورنہ میں یہ سب نہ بتاتا۔ مگر کیا میں نے غلطی کی ہے؟ کیا تم پولیس کو اطلاع دو گی؟ بولو۔۔۔ اگر تمھارا بھائی ہوتا۔" بھائی کا ذکر اس کی کمزوری معلوم ہوتا تھا۔

"اچھا اچھا۔ میں جاتی ہوں۔" اُس نے پانچ سو روپے رکھ لیے اور میری طرف دیکھے بغیر باہر نکل گئی۔ اس کے ساتھ ہی میں بھی باہر نکلا۔ اور کینٹین کے روشن دروازے سے کچھ فاصلے پر کھڑا ہو گیا۔ انتظار ایک بار پھر میرے اعصاب پر مسلط ہو گیا۔ ایک ہی دن میں دوسری بار میں سسپنس کا شکار ہوا۔ امید اور ناامیدی۔ خوف اور بے یقینی اور آرزو کا اضطراب جھیلتے اور ایک ایک منٹ بعد گھڑی دیکھتے بارہ منٹ گزر گئے۔ تیرھویں منٹ پر محسن نمودار ہوا۔ اس نے میری تحریر شناخت کر لی تھی اور ذاتی عقل سے کام لیتے ہوئے یہ بھی معلوم کر لیا تھا۔ کہ میں کہاں دستیاب ہوں۔ پانچ سو روپے ضائع نہیں ہوئے تھے۔ اس نرس نے اپنا کام نہایت خوش اسلوبی سے کیا تھا۔ باقی محسن کی ذہانت تھی کہ وہ غائب ہو کے یہاں آ پہنچا۔ وہ سیدھا اندر جا کے اسی جگہ بیٹھ گیا جہاں میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے چند

منٹ میں ہر سمت دیکھا کہ اگر کوئی محسن کے تعاقب میں ہو تو نظر آ جائے۔ پھر میں اس کے سامنے جا بیٹھا۔

"تجھے کیسے معلوم ہوا کہ نازو کے گولی لگ گئی ہے؟" محسن نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ یوں جیسے ایک اجنبی دوسرے اجنبی سے کوئی فضول سا سوال کرے مثلاً وقت پوچھے۔ قطعی غیر جذباتی لہجے میں۔

"باہر میری موٹر سائیکل کھڑی ہے۔ یہاں سے نکل اور موٹر سائیکل اسٹینڈ پر میرا انتظار کر۔" میں نے کہا۔ پھر محسن نے چائے ختم کی۔ میں نے اس کے اٹھنے کے بعد چائے منگوائی، خاموشی سے پی اور دس منٹ بعد روانہ ہوا۔ محسن گیٹ کے پاس کھڑا تھا۔ "یہ موٹر سائیکل چھینی ہے کسی سے؟" اس نے سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "یا دی ہے؟"

"وہ نہیں ہے۔ جہیز میں ملی ہے سسرال سے۔" میں نے کہا۔ "مگر تجھے کیا موٹر سائیکل کے شجرۂ نسب سے۔ تو یہ بتا آج صبح انکل رضوی نے اچانک اتنا کامیاب چھاپا کیسے مارا؟ ان کو کس نے بتایا کہ میں وہاں موجود ہوں؟"

"مجھے طافو پر شک ہے۔" محسن نے کہا۔ "منظر نے تو یہی کہا تھا کہ وہ گھر کا ملازم ہے لیکن میں نے محسوس کیا کہ اس کی اور ایس ایس پی صاحب کی نظروں میں خفیہ پیغام رسانی ہو گئی تھی۔ کوئی بات تھی کہ طافو، پولیس کو دیکھ کر ذرا بھی پریشان نہیں ہوا حالانکہ اس کی پوزیشن بہت خراب تھی۔ وہ سیٹھ کریم سے پانچ لاکھ لے کر ایک ٹرک کا مال خورد برد کر چکا ہے۔ مجبوراً ہی سہی۔ اور اس بات کا علم ہو جانے کے بعد گلامے ماچھی نے ان دونوں کی موت کا فرمان جاری کر دیا تھا۔ رحمت تو اتفاقیہ مارا گیا لیکن طافو بچ گیا تھا۔ ہمارے بہت بند جانے پر وہ تیار ہو گیا تھا کہ بیوی بچوں سمیت نکل جائے مگر تیرا ساتھ چھٹ جانے کے بعد اس کا حوصلہ پھر جواب دے گیا۔ وہ دھوبی کا کتا ہو گیا تھا۔ خوف اسے پہلے بھی تھا کہ وہ لوگ اسے چھوڑیں گے نہیں اور وہ جہاں بھی ہو گا بالآخر تلاش کرنے والے اس تک پہنچ جائیں گے۔ جب تیرا مقابلہ پولیس سے ہوا تو وہ سمجھا کہ تو پکڑا گیا اور وہ جان بچا کے بھاگا۔ اسے یقین تھا کہ اب پولیس بھی اسے گرفتار کر کے ہی دم لے گی اور اگر ایک بار پولیس کے ہاتھ پڑ گیا تو مارنے والے اسے بڑی آسانی سے مار جائیں گے۔ خوف اور پریشانی کے عالم میں اس نے یہی بہتر سمجھا کہ اپنے پرانے آقاؤں سے تعلق کو پھر استوار کرے جو ابھی پوری طرح ٹوٹا نہیں تھا۔ طافو فرار نہیں ہوا تھا، اغوا ہو گیا تھا اور اغوا کرنے والے ہم تھے جو اسے سب کچھ بتا چکے تھے کہ ہم کون ہیں۔ میں نے تجھے خبردار کیا تھا کہ تو اس ٹرک ڈرائیور پر بہت زیادہ اعتبار کر رہا ہے۔ اس نے موقعے سے فائدہ اٹھایا اور ملتان پہنچتے ہی فون پر گلامے ماچھی کو بتا دیا کہ وہ کس وجہ سے کراچی نہ پہنچ سکا۔ یہ اپنی وفاداری ثابت کر کے جان بچانے کی ایک کوشش تھی جسے جوا کہا جا سکتا ہے۔ اس نے گلامے ماچھی کا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کی اور اسے یہ بھی بتا دیا کہ وہ جان کے خوف سے پانچ لاکھ لینے پر مجبور ہو گیا تھا کیونکہ وہ انکار کرتا تو رحمت کباڑی یا سیٹھ کریم اسے مار ڈالتے۔ لیکن اب رحمت کباڑی نہیں رہا تو وہ بتا رہا ہے کہ اس کا ارادہ کبھی غبن کا نہیں تھا اور اس کی نیت میں فتور نہیں آیا تھا۔ اس نے جو کچھ کیا تھا، جبر کے باعث کیا تھا اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ اعتراف جرم ہی نہیں کر رہا ہے، سکندر اور محسن نام کے دو افراد کے متعلق مفید اور اہم معلومات بھی فراہم کر رہا ہے۔ اس کے بعد گلامے ماچھی نے اسے حکم دیا کہ وہ ملتان کے ہوٹلوں پر نظر رکھے اور جیسے ہی سکندر بخت نظر آئے، اسے فون کر دے۔ تیری خوش قسمتی تھی کہ اس رات تو ملتان نہیں پہنچا۔ میرا یہ بھی خیال ہے کہ ڈرائیور نے جو کچھ بتایا، وہ گلامے ماچھی نے دلاور کو بتا دیا اور دلاور نے ہی طافو کے لیے یہ احکامات صادر کیے کہ وہ سکندر بخت کے ساتھ رہے اور اسے منظر صاحب کے گھر لے آئے۔ ڈبل ایجنٹ بن جائے۔"

"محسن خان! آپ مفروضات پر بات نہیں کر رہے ہیں؟" میں نے اسے ٹوک دیا۔ "جب میں نے ڈرائیور سے کہا تھا کہ دوبارہ ملاقات نہ ہو تو منظر نام کے وکیل صاحب کے گھر پہنچ جانا۔ اس وقت تو موجود نہیں تھا۔ کیا طافو نے تیرے سامنے اعتراف جرم کر لیا ہے؟"

"ہاں۔" محسن نے دانت نکال کے کہا۔ "اس کے رویے نے مجھے شک میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس سے زیادہ شک مجھے انکل رضوی کے رویے سے ہوا۔ وہ طافو کو بالکل نظر انداز کر رہے تھے۔ حالانکہ وہ آسانی سے کسی پر اعتبار نہیں کرتے۔ انھوں نے طافو کو پہلے تو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ کم سے کم اس سے پوچھ سکتے تھے کہ تم نے اس نام اور حلیے کے آدمی کو گھر میں دیکھا ہے؟ یہ سوال انھوں نے مجھ سے کیا۔ منظر اور رابعہ سے پوچھا۔ منظر کی بیوی اور بچوں سے پوچھا کہ سکندر کہاں ہے اور ہم سب نے لاعلمی کا اظہار کیا کہ اس کا یہاں کیا کام اور کون کہتا ہے کہ وہ یہاں آیا تھا۔ کمال تو منظر کی بیوی نے کیا کہ اتنے کم وقت میں خود بھی معاملے کی نزاکت کو سمجھ گئی اور اس نے بچوں کو بھی سمجھا دیا۔ منظر نے تو بہت ہنگامہ کیا لیکن وہ خانہ تلاشی کا وارنٹ لے آئے تھے۔ رضوی صاحب نے کسی کی بات پر یقین نہیں کیا تھا۔ انھوں نے منہ پر کہہ بھی دیا کہ ہم سب مجرم ہیں کیونکہ ہم سب

ایک مجرم کو چھپا رہے ہیں اور فرار میں مدد دے رہے ہیں۔ منظر نے بھی لحاظ نہیں کیا اور صاف کہا کہ یہ دھونس نہیں چلے گی — سکندر بخت کسی کی جیب میں نہیں ہے اور ہے تو جامہ تلاشی لے لو۔ اب گڑبڑ یہ تھی کہ تیرا سب سامان وہیں تھا لیکن انکل رضوی تیری تلاش میں نکل گئے اور کامیاب بھی ہو جاتے اگر تو موٹر سائیکل پر فرار نہ ہوتا۔ وہ تیرے پیچھے دوسرے اور پھر تیسرے گھر کے راستے باہر نکل گئے۔ اور منظر نے فوراً قانونی نکتہ پیدا کر لیا۔ غالباً رابعہ نے اس کے کان میں یہی بات کی تھی۔ اب دوبارہ ایس ایس پی صاحب تشریف لائے تو ان کا ارادہ تھا کہ تیرا سامان دیکھیں اور تیری موجودگی کے ثبوت حاصل کریں مگر منظر نے دروازے پر ہی روک لیا کہ ایک بار خانہ تلاشی کے وارنٹ تھے، وہ آپ لے چکے۔ دوسری بار گھر میں داخل ہونے کے لیے دوسرے وارنٹ لے کر آئیے۔ ناکامی نے رضوی صاحب کو ویسے ہی مشتعل کر رکھا تھا۔ وہ منظر پر برس پڑے اور بس اپنی افسری کی شان میں بلڈ پریشر کی وجہ سے زیادہ بول گئے۔ منظر نے کہا کہ ایک وکیل سے اس قسم کی زبان استعمال کرنے پر میں قانونی چارہ جوئی کا حق محفوظ رکھتا ہوں۔ یہ ہتک عزت کا کیس ہے۔ اور رضوی صاحب کو واپس لوٹنا پڑا۔ میں اور رابعہ اندر دبکے رہے۔ اس کے بعد میں نے طافو کو جکڑ دیا۔ میں حیران تھا کہ رضوی صاحب نے اس سے تیرے متعلق ایک سوال بھی نہیں کیا۔ ان کے رخصت ہوتے ہی میں نے طافو سے کہا کہ سکندر کا سامان گاڑی میں رکھو ہمیں ابھی جانا ہے۔ اسے مجھ پر اور میری نیت پر کوئی شبہ تھا ہی نہیں وہ بے خوف ہو کے دلاور اور گلامے ماچھی کا ایجنٹ زیرو زیرو سیون بنا میرے ساتھ چل پڑا۔ میں اسے استاد ٹیڈی کے گھر لے گیا۔ وہاں ہم نے تفتیش کی۔ اور تیرا خیال درست ہے۔ جو کچھ میں نے بتایا مفروضات پر مشتمل نہیں تھا۔ طافو کے اعتراف جرم پر مبنی تھا۔ ہم نے سب ریکارڈ کر لیا ہے۔"

"اور وہ خود اب کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

"استاد ٹیڈی کی قید میں۔ اسے چھوڑنے کا خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا۔" محسن نے کہا۔ "گاڑی کی نمبر پلیٹ میں نے بدل دی ہے اور گاڑی اس وقت ہوٹل فاران میں ہے۔ جہاں میں نے اپنے لیے اور رابعہ کے لیے کمرے بک کرائے ہیں۔"

"کیوں؟ انکل رضوی سے کوئی بات ہوئی ہے؟"

"یار! جو کچھ ہو چکا ہے اس کے بعد اس بات کی ضرورت کہاں رہتی ہے۔ ہم اب وہاں کیسے رہ سکتے ہیں۔" محسن بولا۔ "اگر ہم دونوں وہاں رہیں گے تو ہماری حیثیت وہاں نظر بندوں کی سی ہو گی اور ہم کسی طرح بھی تیرے کام نہیں آ سکیں گے۔ اب اگر وہ ایس ایس پی بن کے ایک طرف ہیں تو پھر ہم دوسری طرف ہیں، جدھر تو ہے۔ اب میں چلتا ہوں۔ یہ نہ ہو کہ انکل رضوی ہم سے پہلے پہنچ جائیں۔ رابعہ نے اپنا سامان پیک کر لیا ہے اور میرا بھی۔ بیگم رضوی بہت افسردہ ہیں مگر یہ معاملہ ایسا ہے کہ وہ دخل نہیں دے رہی ہیں۔"

"تمہیں یقین ہے کہ تم لوگ اتنی آسانی سے باہر نکل آؤ گے! کوئی تمھارا پیچھا نہیں کرے گا؟" میں نے کہا۔

"میں تو نکل آیا تھا۔" محسن بولا۔ "کیونکہ میں منظر کے گھر سے لوٹ کر گیا ہی نہیں۔ ہو سکتا ہے ایس پی صاحب کے حکم کے غلام رابعہ کے تعاقب میں آئیں۔ گزشتہ چند دن سے مجھے بھی شک ہے کہ جہاں میں جاتا ہوں، ایک چھوٹی چھوٹی آنکھوں اور مڑی ہوئی ناک والا چیچک رو شخص میرے ساتھ جاتا ہے۔ کل تو میں نے مذاق میں اسے روک لیا تھا اور اس سے ہاتھ بھی ملایا تھا۔ میں نے کہا کہ واہ بھئی خوب ملے۔ کہاں ہو آج کل۔ سنا ہے شادی کر لی ہے دوسری۔ آپ کے اسٹاک میں کتنی بیویاں ہیں؟ وہ ایسا بوکھلایا کہ آوں آں کرتا رہ گیا۔ اور میں نے دھپ مار کے کہا کہ بھئی اس وقت تو جلدی میں ہوں۔ کل آ جاؤ چھمیا جان کے کوٹھے پر۔ اور چل پڑا۔ ہمارے ٹیلیفون بھی ٹیپ ہوتے ہیں اس لیے میں رابعہ کو ایک ترکیب سمجھا کے آیا ہوں۔ امید ہے وہ بخیر و عافیت منزل مراد تک پہنچے گی۔ اب باقی باتیں ملاقات پر یار — وہ بیگم رضوی تاڑ چکی ہوں گی کہ میں غائب ہوں اور ایس ایس پی صاحب پہنچ گئے ہوں گے تو مسئلہ پیدا ہو جائے گا۔"

وہ چند قدم گیا اور پھر لوٹ کر آیا۔ "تو نے میرے پہلے سوال کا جواب نہیں دیا تھا نا کہ تو یہاں کیسے پہنچا؟"

"ہاں۔ اور ابھی اس سوال کا جواب دینا ضروری بھی نہیں۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "تو جا۔"

میں موٹر سائیکل پر دندناتا ہوا ہوٹل فاران پہنچا۔ "محسن حسن خاں شیروانی کون سے کمرے میں مقیم ہیں؟" میں نے کاؤنٹر کلرک سے سوال کیا۔

"محسن خاں شیروانی؟" اس نے دہرایا اور ایک نظر اپنے رجسٹر پر ڈال کے نفی میں سر ہلایا۔ "یہاں تو اس نام سے کوئی بھی نہیں ہے۔"

"اچھا۔ تو مس رابعہ قاری ایڈووکیٹ ہوں گی؟" میں نے سر کھجا کے کہا۔

کلرک نے پھر وہی عمل دہرایا اور پھر انکار کیا۔ مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ محسن نے یقیناً فرضی ناموں سے بکنگ کرائی ہو گی۔ میں نے ان کے اصلی نام لے کر غلطی کی تھی۔ اب یہ عین ممکن تھا کہ کلرک کو دونوں نام یاد رہ جائیں اور خدانخواستہ کوئی ان کا سراغ لگاتا ہوا آئے تو کلرک بتا دے کہ پہلے بھی ایک

شخص فلاں کمرے میں مقیم ایک خاتون اور فلاں صاحب کے یہی نام لے رہا تھا۔ میں فوراً واپس ہُوا۔ اب میرا اس ہوٹل میں قیام مناسب نہیں تھا۔ یُوں بھی احتیاط کا تقاضا تھا کہ ہم سب ایک ہی جگہ نہ ہوں۔ میرا اندازہ تھا کہ ابھی ایک گھنٹے سے پہلے وہ دونوں ہوٹل نہیں پہنچ سکتے اور اس وقت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے مجھے اپنے قیام کا بندوبست کر لینا چاہیے۔ میں نے لاہور ہوٹل کا انتخاب کیا۔ جو اپنی کئی منزلہ عمارت کی وسعت کے باعث اندر ایک پورا شہر ہے۔ اس کے چھوٹے سے چھوٹے کمرے سے لے کر بڑے سے بڑے کمرے تک مختلف شہروں سے آئے ہوئے ہر طرح کے لوگ بھرے رہتے ہیں۔ امیرے نقیر بیگ تک اور نزاکت علی خاں سے شہ زور خاں تک۔ اس بھیڑ میں میرا گم رہنا زیادہ آسان تھا۔ ڈاکٹر امجد کے نام سے میں نے نسبتاً بہتر قسم کا اٹیچ باتھ اور ٹیلی فون والا کمرہ ساٹھ روپے یومیہ پر حاصل کیا۔ اور پانچ دن کی ادائیگی بھی ایڈوانس کر دی۔ کلرک کچھ مرعوب تھا اور حیران بھی کہ ڈاکٹر صاحب خالی ہاتھ آ گئے۔ پہننے کے کپڑوں کا سوٹ کیس تک نہیں ویسے تو ڈاکٹر کے گلے میں سٹیتھسکوپ بھی ضرور ہونا چاہیے۔

"گاڑی کی پارکنگ کے لیے کوئی انتظام ہے؟" میں نے کہا۔ "ابھی کچھ دیر میں شوفر آئے گا۔ گاڑی کے علاوہ میرا سامان لے کر۔ وہ مجھے ڈراپ کر کے ایک کام سے گیا ہے۔"

"آپ بالکل مطمئن رہیں سر۔" کلرک نے مطمئن ہو کے کہا۔ "انشاءاللہ آپ کو شکایت نہیں ہو گی۔" وہ مجھے چابی دینا چاہتا تھا لیکن میں نے کہا کہ شوفر کو دیجیے اور خود ڈائننگ روم میں چلا گیا۔ جہاں امرتسر دُور درشن سے فلمی گانے سننے کے شائقین چائے پینے کے بہانے جمع تھے۔ ائیرکنڈیشنڈ ہال میں رنگین ٹی وی تھا اور چائے قدرے مہنگی تھی۔ بلیک اینڈ وائٹ ناظرین باہر کے عوام میں شامل تھے۔ اس طبقاتی فرق پر غور کیے بغیر میں نے ڈنر تناول فرمایا اور قیمت بل میں شامل کرانے کے بجائے نقد ادا کی پھر میں نے ایک شانِ بے نیازی سے گھڑی دیکھ کر شوفر پر خفگی کا اظہار کیا۔ کاؤنٹر کلرک کو تاکید کی کہ وہ آئے تو اسے چابیاں دے دے۔ نئی اوپل ریکارڈ گاڑی ہو گی۔ اس میں سے سامان نکلوا کے کمرے تک پہنچا دیا جائے اور گاڑی محفوظ جگہ پہنچا دی جائے۔ پھر میں باوقار طریقے سے باہر نکلا۔ چوری کی موٹر سائیکل تک پہنچا۔ اور اپنی خودی کو بلند رکھتے ہوئے ہوٹل فاران کی طرف چل پڑا۔ پَون گھنٹے تک میں نے ہوٹل کے دروازے کو مدِنظر رکھتے ہوئے چہل قدمی فرمائی۔ اور مجھے اُس وقت ایک خوشگوار حیرت ہوئی جب نہ محسن خاں اوپل ریکارڈ چلاتے ہوئے تشریف لائے اور نہ مس رالعہ قاری اپنی شہرۂ آفاق سُرخ رنگ کی فاکس ویگن میں آئیں بلکہ وہ دونوں ٹیکسی سے اُترے۔ محسن کو شیروانی، چوڑی دار پاجامے اور ترکی ٹوپی میں دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک عصا بھی تھا۔ ٹیکسی چلی گئی تو میں نے منہ میں انگلی ڈال کر لوفروں کی طرح سیٹی بجائی اور محسن نے میری طرف دیکھا۔ اس نے رالعہ کو اندر جانے کو کہا اور خود سٹرک عبور کر کے میری طرف آیا۔ "شرم نہیں آتی۔ شریف لڑکیوں کو دیکھ کر سیٹیاں بجاتے ہو، بدمعاش!" محسن خاں نے مجھے ڈانٹا اور عصا کو گھمایا۔

"معاف کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ شریف لڑکیاں ہیں۔ جیسے آپ کو نہیں معلوم کہ میں ڈاکٹر امجد ہوں۔ لاہور ہوٹل کے کمرہ نمبر ۸۸۸ میں مقیم ہوں اور آپ میرے شوفر ہیں۔ اب تک آپ کو میرا سامان لے کر وہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ صورت سے آپ بالکل کارٹون لگ رہے ہیں۔"

"اچھا۔" محسن نے ہاتھ ملا کے کہا۔ "غالباً آپ کو بھی معلوم نہیں کہ ہم نواب ننھے خاں ہیں اور یہاں ہوٹل کے سوئٹ نمبر ۴ میں اپنی سسٹر کے ساتھ قیام پذیر ہیں، پرنسس صوفیہ کے ساتھ۔"

"میں یہاں محسن خاں شیروانی اور مس رالعہ قاری کو تلاش کرتا رہا۔ معذرت چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "آدھے گھنٹے بعد ڈاکٹر امجد کی کار اور سامان لے کر لاہور ہوٹل پہنچ جانا نواب ننھے خاں! ورنہ شوفر کی نوکری بھی جائے گی۔"

"یس سر۔ صرف سامان لانا ہے؟ کوئی اور آنا چاہے تو ساتھ لاؤں یا نہ لاؤں؟" وہ ترکی ٹوپی لہرا کے بولا۔

"پولیس اور چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کے سوا جو بھی آنا چاہے تو چشم ما روشن دلِ ماشاد۔" میں نے کہا اور موٹر سائیکل کو لک ماری۔ اس نے تھوڑا سا شور مچایا اور خاموش ہو گئی۔ میں نے دوسری بار دولتّی جھاڑی اور نتیجہ پھر وہی نکلا جب لاتیں مار مار کے میری حالت غیر ہو گئی تو مجھے خیال آیا کہ پٹرول چیک کروں۔ ٹینک خالی برتن کی طرح بجنے لگا۔ میں نے اُسے ریزرو پر کیا اور چند منٹ بعد انجن غرایا۔

"عام طور پر یہ کاریں اور موٹر سائیکلیں بغیر پٹرول کے چلتی نہیں ہیں۔" محسن خاں نے جاتے جاتے بے حد اہم انکشاف کیا اور میں نے چلا کے کہا کہ ہم پر بھی حرام ہے جو اس میں ایک قطرہ پٹرول کا ڈلوائیں۔ ہم ایسی نامعقول سواری کو تین طلاق دے سکتے ہیں۔ موٹر سائیکل ریزرو پر آنے کے بعد بھی بیس کلومیٹر کے قریب جا سکتی تھی۔ اور اس سے پہلے ہی مجھے موٹر سائیکل کو کہیں چھوڑ دینا تھا۔ میں نے شیزان میں کافی پی اور رات دس بجے اسے وہیں دوسری موٹر سائیکلوں کی رفاقت میں چھوڑ کر براستہ بیڈن روڈ مارچ کرتا ہُوا لاہور ہوٹل پہنچا تو محسن خان گاڑی کی

کمرے کی چابیاں لیے کھڑے تھے۔ کلرک نے مجھے مطلع کیا کہ شوفر آپ کی گاڑی اور سامان وغیرہ لے آیا ہے۔

"شوفر؟ ہمارے دوست نواب ننھے خاں کو شوفر کہتے ہو؟" میں نے برہم ہو کے کہا۔ "میں مینجر سے شکایت کروں گا۔ میں بہت نادم ہوں حضور نواب صاحب!" میں نے کورنش بجا لا کے کہا۔ "آپ کے مزاج بخیر ہیں، پرنسس صوفیہ؟"

"بس ڈاکٹر صاحب! ہم نے دیکھ لی زمانے کی طوطا چشمی۔" محسن خاں نے سرد آہ بھری۔ "شوفر آپ کا پیغام لایا تھا ہم نے سوچا خود شرفِ ملاقات حاصل کریں مگر یہاں مقدر میں یہ عزت افزائی لکھی تھی۔ بخدا ہمشیرہ پرنسس صوفیہ والد ماجد نواب پھنّے خان کی روح مزارِ مبارک میں تڑپ اٹھی ہو گی کہ آج ریاست ہوتی تو ہم والئی ریاست ہوتے۔ اس گستاخ کے زن بچّہ کو کولھو میں پلوا دیتے۔ جو ہمیں شوفر، گویا کوچبان کہتا ہے۔ جی چاہتا ہے طمنچہ نکال کے دماغ سے داغ دیں۔ اور خودکشی فرمائیں۔"

کلرک سخت بدحواس اور پریشان تھا اور بار بار غلط فہمی کی معافی مانگ رہا تھا۔ بالآخر رالعہ یعنی پرنسس صوفیہ نے مداخلت کی اور ہم اوپر اپنے کمرے میں پہنچے۔ "کیسی رہی؟" محسن خاں نے ٹوپی اور عصا پھینک کر کہا

"ہر جگہ ڈراما شروع کر دیتے ہو۔ اور اتنی اوور ایکٹنگ۔" رالعہ نے کہا۔ "آج کل نواب بھی ایسے حلیے میں نہیں ملتے۔ فیشن ایبل ہوتے ہیں۔"

"ہم ذرا وضعدار قسم کے نواب ہیں۔" محسن نے کہا اور اچھل کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ "تمہارے لیے ایک اندوہناک اطلاع ہے بی بی، سناتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ جانتی ہو یہ اسپتال کیسے پہنچا تھا؟ مس نائلہ عرف نازو کی خاطر، اور حالات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ وہی کیس تھا کہ سنگ تجھ پر اٹھے اور زخم آئے مجھے۔ ٹیلی پیتھی سمجھو اسے ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ اسے نازو کے گولی لگنے کی اطلاع مل گئی اور اگر یہ دل سے دل کو راہ ہونے والا مسئلہ نہیں تو پھر بہت گمبھیر مسئلہ ہے۔ بصورتِ دیگر ثابت یہ ہوتا ہے کہ جب نازو کو گولی لگی تو یہ اس کے بہت قریب تھے۔ کتنے قریب تھے؟ اس کی وضاحت کرو، ورنہ میرا کیا ہے۔"

رالعہ ہنسنے لگی۔ "اکرام شیخ نے اس کی وضاحت کر دی ہے کہ گولی کیسے لگی۔"

"ارے بابا گولی کو مارو گولی۔ یہ پوچھو کہ اسے کس نے خبر دی؟" محسن بولا۔ "میں نے پوچھا تھا تو یہ گول کر گیا تھا۔"

ایک بار پھر میں ایک کمرے کی چار دیواری میں خوش و خرم اور محفوظ تھا۔ نہ غمِ جہاں نہ غمِ دوجہاں سے بیگانہ۔ ایک دوست کے خلوص اور ایک عورت کی محبت کے ناقابلِ تسخیر حصار میں مان کی وہی مہربان صورتیں تھیں اور وہی باتیں۔ دل نے پھر وہی چاہا کہ کاش وقت اسی مقام پر ٹھہر جائے۔ صورِ اسرافیل کی صدا تک اس شب کی سحر نہ ہو یا موت خوشی سے بھرپور اسی لمحے میں چپکے سے آ جائے لیکن دوسرے لمحے یہ طلسمِ خیال باقی نہ رہا۔ میں نے روم سروس سے کافی کے لیے کہا اور نازو کے زخمی ہونے کی اصل کہانی سنانے لگا۔ وہ دم بخود سنتے رہے۔ پھر محسن سگریٹ لینے چلا گیا۔

"حالات تمہارے میرے اختیار سے باہر ہو گئے ہیں سکندر!" رالعہ نے کچھ دیر بعد کہا۔

"ہاں۔ لیکن اس میں میرا کیا قصور ہے؟" میں نے کہا۔ "مجھے مقابلہ تو کرنا ہی تھا۔ دوسری صورت وہی تھی کہ میں دلاور کی پیش کردہ شرائط کو قبول کر لیتا۔ اس کے ناجائز کاروبار میں شریک ہو جاتا۔ میں نے صرف اپنے ضمیر کو قتل کر دیا ہوتا تو وہ سب لوگ قتل نہ ہوتے جو بعد میں ہوئے۔ لاکھوں کے نقصان کے بجائے مجھے لاکھوں کا فائدہ ہوتا۔"

"ایک تیسرا راستہ بھی تھا۔ جو میں نے تلاش کیا تھا۔" رالعہ نے نظر اٹھائے بغیر کہا۔ "مجھے ڈر تھا کہ ایک دن ایسا نہ آ جائے جب میرے اور تمہارے لیے سارے راستے بند ہو جائیں اور آج وہ دن آ گیا ہے۔"

"مجھے افسوس تو ہے رالعہ۔ کہ اس دن میں نے تمہاری بات نہیں مانی جب تم نے کہا تھا کہ یہ سب چھوڑ دو اور اس دنیا سے نکل چلو۔ آدمی اپنی جنت کہیں بھی بنا سکتا ہے پھر ہمیں کیا ضرورت ہے اس جہنم میں رہنے کی۔ وہ اپنی ذات کی حد تک تحفظ اور سلامتی کا راستہ تو تھا اور ہمارے لیے زندگی کے سارے خوابوں کی تعبیر کا ضامن بھی تھا لیکن فرار میرے نزدیک بزدلی تھا اور میں خود اپنی نظر میں بے عزت ہو کے نہ خوش رہ سکتا تھا اور نہ مطمئن۔ ایک مسئلہ ذاتی انتقام کا تھا لیکن دوسرا مسئلہ زیادہ سوہانِ روح تھا۔ اگر میرے باپ کو بلیک میل کر کے قتل کرنے والے کیفرِ کردار کو پہنچتے تو میں صبر کر لیتا مگر دُکھ کی بات یہ تھی کہ وہ چور، ڈاکو اور قاتل سینہ تانے بے خوفی سے انصاف کے اصولوں کا اخلاقی قدروں کا اور معاشرے کی احتجاجی قوت کا مذاق اڑا رہے تھے۔ انہیں کسی کی گرفت کا خوف نہیں تھا اور انہیں دولت کی طاقت کا اتنا گھمنڈ تھا کہ ان کے حوصلے بڑھتے جا رہے تھے۔ انہوں نے کیا نہیں کیا ہمیں تباہ کرنے کے لیے؟ مجھ سے اور تم سے بہتر یہ کون جانتا ہے مگر یہ کیسی بے بسی ہے اس پورے نظام کی رالعہ کہ غاصب کو حقدار تسلیم کر لیا گیا ہے۔ ناجائز کو جائز مان لیا گیا ہے اور بنے ہیں اہلِ ہوس مدعی

بھی منصف بھی۔ ان کی فردِ جرم میں کیا نہیں ہے مگر ان کو دولت کی دیوار نے تحفظ ہی فراہم نہیں کر رکھا ہے، وہ اس معاشرے میں شریف، معزز اور معتبر ہیں۔ مجرم وہ ہے جو اُن پر انگلی اٹھائے۔ ان سے اپنا حق مانگے یا انصاف کی بات کرے۔ یہ بات نہ جانے کتنے لوگ جانتے ہیں مگر وہ سب خود غرض ہیں کہ منہ بند رکھنے میں اپنا فائدہ دیکھتے ہیں اور وہی کہتے ہیں جس سے ان کے دنیاوی مفادات وابستہ ہوں۔ اگر وہ اکٹھے ہوں تو بہت بڑی طاقت ہیں۔ ان کے پاس مواخذہ کرنے کا، احتساب کا اور عدل اور انصاف کا حق ہے مگر اسی خود غرضی کے باعث وہ الگ ہیں اور منتشر ہیں۔ نتیجہ یہ کہ طاقتور وہ ہیں جو معاشرے کا ناسور ہیں۔ اعتراف سب کرتے ہیں کہ یہ ناسور سرطان بن گیا ہے مگر اس کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی ہمت کوئی بھی نہیں کرتا۔ میرے لیے یہ پہلے بھی ممکن نہیں تھا کہ انہی خود غرض، بزدل اور بے ضمیر افراد میں شامل ہو جاؤں اور آج بھی نہیں۔ حالانکہ پہلے کے مقابلے میں آج حالات بہت سخت ہیں۔ پہلے میں قانون کی طاقت پر بھروسہ کرتا تھا' دوستی کے سہاروں پر انحصار کرتا تھا اور اس خوش فہمی کا شکار تھا کہ زبانِ خلق سچ کہنے والے کی حمایت ضرور کرتی ہے۔ آج میں اکیلا ہوں۔ قانون میرے خلاف، میرے دشمنوں کے ساتھ ہے۔ میرے سہارے ختم ہو چکے ہیں یا جھوٹے ثابت ہوئے ہیں اور زبانِ خلق خاموش ہے۔ اس کے باوجود ذہنی طور پر میں ان کی بالادستی تسلیم کرنے کو تیار نہیں جو خود کو شکاری سمجھتے ہیں جو شرافت اور انسانیت کے شکاری ہیں۔ حق و انصاف کے شکاری ہیں اور آدمی کے ضمیر کے شکاری ہیں۔ اگر میں بھی خوفزدہ ہو کے بھاگ گیا رابعہ تو اس معاشرے میں کتنے چوہدری دلاور اور پیدا ہو جائیں گے کتنے ڈی سلوا پھر جنم لیں گے۔ رحمت کباڑی، استاد پیڈرو اور کریم سیٹھ جیسے لوگ غالب آتے جائیں گے اور معاشرے کو اتنا بے بس کر دیں گے کہ کسی شریف یا کمزور آدمی کو زندہ رہنے کا حق بھی ان سے خیرات میں مانگنا پڑے گا۔"

"مگر ہم اکیلے..... ان سب سے نہیں لڑ سکتے۔" رابعہ نے مجھ سے نظر چرا کے کہا۔

"اکیلا کون ہے رابعہ! میرے ساتھ تم ہو' محسن ہے اور یہاں تک کہ استاد ٹیڈی جیسا بدمعاش بھی ہے۔" میں نے کہا۔ "ایسا وقت کبھی نہیں آیا کہ دنیا میں سچ کہنے والے اور سچ کہنے والوں کا ساتھ دینے والے نہ رہے ہوں۔ ایسا ہوتا تو سچ کا لفظ ہی لغت میں نہ ملتا۔ پہلے میری جدوجہد صرف اپنے دشمنوں کے خلاف تھی مگر بات اب ذاتی انتقام کی نہیں۔ یہ لوگ تو سب کے دشمن ہیں معاشرے کے' ملک اور قوم کے اور انسانیت کے۔ ان کے خلاف جہاد تو عبادت کی طرح فرض ہے۔ اگر اکثریت اس فرض کو نہیں سمجھتی یا سمجھنے کے باوجود پہلو تہی کرتی ہے تو میں اس کی تقلید نہیں کر سکتا۔ میں ان لوگوں کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ خدا نے ہر دور میں ہر فرعون کے لیے ایک موسیٰ ضرور پیدا کیا ہے۔ نعوذ باللہ۔ میں اپنی ذات کو خدا کی طرف سے نیکی اور سچائی کا ... یافتہ مجاہد نہیں کہہ رہا ہوں۔ میں صرف ایک آدمی ہوں مگر میں ایک تحریک بھی ہوں۔ سقراط سے گلیلیو اور اُن سب ... جو غلامی کے خلاف لڑتے ہوئے مارے گئے۔ آزادی کے ... کالے پانی میں قید کی ہر صعوبت جھیل کے مرے تو سربلند اور سُرخ رُو ہوئے۔ لاکھوں گمنام سپاہی ہر عہد میں ایسے ہی ... انسانی مقصد کی خاطر شیطانوں کے خلاف جہاد میں جان ... گئے۔ انہی میں سے ایک میں ہوں۔ میں ان کا غرور توڑ کر ان کو نیچا دکھاؤں گا۔ ان کے مذموم عزائم کو خاک میں ملا دوں گا ... کو وہ عبرتناک سزا دوں گا کہ پھر کوئی دلاور کسی وزیر خان کو مفلس و گداگر کر کے نہ ختم کر سکے گا۔ یہ کام میں خود کروں گا جو حوصلہ مجھ میں ہے اور توفیق خدا دے گا۔ انجام کی مجھے پروا نہیں۔ میں ... ہوں میری جگہ خالی کبھی نہ ہو گی۔ میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ اب ... کسی پر انحصار نہیں کروں گا۔ سوائے اپنے خدا کے اور اپنی ذات ...

"مجھ پر بھی نہیں۔" رابعہ نے خلا میں دیکھتے ہوئے دکھی لہجے میں کہا۔

"تم مجھ سے الگ کہاں ہو؟" میں نے کہا۔ "میری ذات کا ایک حصہ ہو۔ ایسے ہی جیسے خدا پر میرا ایمان' میرے وجود کی تکمیل ... ہے۔ محبت اور دوستی بھی تو میری طاقت ہے۔ یہ جنگ اب تو شروع ہوئی ہے رابعہ۔"

"معلوم نہیں تم کیا کرنا چاہتے ہو مگر جو کچھ بھی کرو گے اکیلے نہیں کرو گے۔ میں تمہارے ساتھ رہوں گی۔"

"میرے ساتھ رہو گی؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے رابعہ۔" میں نے کہا۔ "میں نے تو سب کچھ داؤ پر لگانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میرے لیے اب کھلے میدان میں لڑنا ممکن نہیں رہا۔ میں دن کے اجالے میں کسی کے سامنے نہیں آ سکتا۔ مجھے رات کے اندھیروں میں شب خون مارنے ہیں اور چھپ کر رہنا ہے۔ جنگلوں میں اور ویرانوں میں ... کو تلاش کرنا ہے اور ان کے ٹھکانوں پر حملے کرنے ہیں۔ میں ... حقِ وراثت سے دستبردار ہوتا ہوں۔ ایم ڈبلیو ڈی کمپلیکس ... وزیر خاں کی تمام منقولہ و غیر منقولہ جائداد پر حقِ ملکیت سے د... ہوتا ہوں۔ ذاتی انتقام کے جذبات سے دستبردار ہوتا ہوں ... بار سفر میں میری ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی جس نے ... حضرت علیؓ کا ایک واقعہ سنایا۔ کہ آپ نے دشمنِ اسلام کو زیر ... اس نے آپ کے چہرۂ مبارک پر تھوک دیا۔ آپ کا خنجر بکف ہاتھ رک گیا اور آپ نے دشمن کو چھوڑ دیا کیونکہ پہلے دشمنی کے جذبات میں ذاتی مخاصمت نہیں تھی۔ تو بی بی میں نے بھی ذاتی دشمنی کا خیال چھوڑ دیا ہے۔ اب تو یہ ایک مقصد ہے معاشرے کو ظلم اور استحصال کے تسلط سے نجات دلانے کا۔ انسانی حقوق پامال کرنے والوں کے عزائم کو شکست دینے کا۔ قانون اور اخلاقی اقدار کی دھجیاں اڑا کے تماشا کرنے والوں کو تماشا بنانے کا۔ بدمعاشی اور زبردستی کے بل پر اکڑ کر چلنے والوں کی گردن توڑنے کا۔ قانون میرا ساتھ نہیں دے سکا تو نہ سہی۔ میں خود قانون کے مطابق سزا دینے کا فرض ادا کر دوں گا۔ کوئی میرا ساتھ دے یا نہ دے اور مجھ سے اتفاق کرے یا نہ کرے۔ میری یہ جدوجہد جاری رہے گی کیونکہ معاشرے کے یہ ناسور اپنی جڑیں بہت گہری کر چکے ہیں۔ مجھے ان کا قلع قمع کرنا ہے۔ اکیلا چنا بھاڑ پھوڑ سکتا ہے یا نہیں یہ مایوسی کا فلسفہ میں قبول نہیں کروں گا۔ جب تک یہ زندگی ہے میرا مشن جاری رہے گا۔ میں ایک راستہ تو بنا لوں۔ پھر دیکھوں گا اس پر چلنے کے لیے کون اگلا قدم بڑھاتا ہے۔"

"میں اب بھی تمہارے ساتھ رہنے کے ارادے پر قائم ہوں۔" رابعہ نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "خواہ تم جنگل میں رہو یا ویرانے میں۔ رات کے اندھیرے میں شکار کرو یا دن کے اجالے میں یلغار کرو۔ زمین پر رہو یا زمین کے نیچے یا پہاڑ کے اوپر۔ میں تم کو چھوڑوں گی نہیں سکندر! اکیلا کہیں نہیں جانے دوں گی۔ حالانکہ ابھی تک مجھ پر واضح نہیں ہے کہ تمہارا پروگرام کیا ہے۔"

"تم نے ابھی تک یہ نہیں سوچا کہ اس راہ میں کتنی سختی کا سامنا ہو گا۔" میں نے اسے غور سے دیکھ کر کہا۔ "کتنے خطرات ہوں گے۔ کہاں کہاں بھٹکنا پڑے گا۔ پتھروں کی ٹھوکریں ہوں گی اور کانٹوں کا بستر۔ ہر قدم پر دشمن پیچھے ہوں گے اور موت مقابل۔ مجھے ایک ایک دشمن کا پتا چلانا ہے۔ اس کی فردِ جرم تیار کرنی ہے اور پھر اسے ٹھکانے لگانا ہے۔ تم انتظار کر سکتی ہو بچی؟"

"نہیں۔ انتظار بہت مشکل ہے۔ اتنا صبر اور حوصلہ نہیں ہے مجھ میں کہ اکیلی تمہارے تصور میں نیند حرام کیے رات جاگ کر گزاروں اور دن خوف کے سائے میں لرزتے کانپتے۔" وہ اب رونے لگی تھی۔ "کسی امید کے بغیر۔ کسی سہارے کے بغیر۔ کسی یقین کے بغیر۔ مجھے اپنے ساتھ رکھو سکندر۔ جو کچھ تم جھیل سکتے ہو' میں بھی جھیل سکتی ہوں۔ بھوک، پیاس، جسمانی عذاب، حالات کی سختی، زندگی یا موت۔ مجھے سب قبول ہے مگر تمہارے ساتھ۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ کبھی شکایت نہیں کروں گی۔ کبھی پچھتاؤں گی نہیں اور تمہاری راہ میں رکاوٹ نہیں بنوں گی۔ تمہیں میری ضرورت ہو گی سکندر۔"

"ہاں۔ ضرورت تو ہو گی، روشنی کی جو مجھے راستہ دکھائے اور محبت کی جو مجھے قوت دے۔" میں نے ...

"جیسے مجھے اس وقت اشد ضرورت ہے کافی کی اور کچھ زہر مار کرنے کی تاکہ میری فوتیدگی نہ ہو۔" محسن نے اچانک اندر قدم رنجہ فرما کے کہا۔ "اُف، یہ کیا غیر نوابی زبان استعمال فرما گئے ہم۔" اس نے سر پر ہاتھ مارا۔

"نواب ننھے خاں۔ میں نے ابھی ابھی پرنسس صوفیہ کو مطلع کیا ہے کہ میں دشمنوں کے خلاف گوریلا جنگ شروع کر رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "دشمن نے ہمارے لیے کھلے میدان میں مقابلے کو ناممکن بنا دیا ہے۔"

"میں تو شروع سے تیسرے طریقِ جنگ کی افادیت کا قائل نہیں۔" وہ بولا۔ "میاں وہ دن اب نہیں رہے کہ جنگ' پانی پت کے میدان میں ہوتی تھی اور اہالیانِ شہر چین کی نیند سوتے تھے اور جنگ بھی کرکٹ میچ کی طرح تھی کہ صبح ناشتے وغیرہ کے بعد طبلِ جنگ بجا تو صفیں وغیرہ درست کر لیں اور پھر کہا کہ قبلہ آئیے تو ذرا دو دو ہاتھ ہو جائیں اور ادھر سورج ڈوبا اور جنگ ختم۔ چوہدری دلاور جیسے دشمن جو قانون کو کچھ سمجھتے ہی نہیں ان سے قانون کی جنگ لڑنے کا انجام دیکھ لیا مگر خیر۔ دیر آید درست آید۔ اب بھی تو نے فیصلہ کر لیا ہے تو ملا ہاتھ۔ دیکھتے ہیں کون بڑا شکاری ہے۔ وہ کہ ہم۔ براہِ راست مقابلہ ہو جائے۔ بیچ میں قانون نہ پہلے تھا نہ آئندہ ہو۔"

"یہ اپنی پرنسس صوفیہ بھی شانہ بشانہ میدانِ کارزار میں اپنے جوہر دکھلانے پر کمربستہ ہیں۔ حالانکہ نہ خنجر اٹھے گا نہ تلوار ان سے۔" میں نے کہا۔

"ریوالور تو اٹھ جائے گا۔" رابعہ نے کہا۔

"بالکل اٹھ جائے گا۔ یہ ایک بات ہے کہ نشانہ چوک جائے اور مارا جائے وہ جو پہلے ہی مارا ہوا ہے۔ تیغِ نگاہِ ناز کا۔ اور وہ کیا کہتے ہیں۔ عشوہ و غمزہ و ادا کا۔ اور ہجر و فراق کا۔" محسن خاں نے کہا۔

"کیا غضب کی اردو بول رہے ہیں ہم نورِ چشم۔"

"یہ تم اپنا ماجرائے دل بیان کر رہے ہو بیٹے۔" میں نے کہا۔ "میں لکھ دوں گا شہلا کو۔ اور بولو۔"

"پرنسس۔" محسن نے کہا۔ "ہم نے جو ترکیب بنائی تھی وہ کامیاب رہی؟"

"ہاں۔ ورنہ وہ فرشتے تو ساتھ ساتھ آتے۔" رابعہ ہنسی۔ "تم نے بہت اچھا کیا کہ ڈٹ کر ہی نہیں آئے۔ ورنہ انکل رضوی تو اتنے برہم تھے کہ ہمیں کبھی معاف نہ کرتے۔ ان حالات میں وہاں

…مکن تھا۔ پیچھا تو پہلے بھی کرتے تھے ان کے آدمی مگر تو پہرہ بٹھا دیا تھا انہوں نے۔ ظاہر ہے یہ پابندی نہ تم قبول کر سکتے تھے اور نہ میں برداشت کرتی۔ میں گاڑی لے کر نکلی ہی تھی کہ ایک جیپ میرے پیچھے لگ گئی جو دروازے پر کھڑی تھی، ہم اور آگے والے دونوں ٹائر فلیٹ ہو گئے۔"

"وہ کیسے؟" میں نے کہا "کوئی جال بچھایا تھا؟"

"ہاں محسن نے لکڑی کے دو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں دو دو انچ لمبی کیلیں لگا دی تھیں۔" وہ ہنسی "میں نے انکل کے بڑے بچے کو بھیجا کہ جاؤ باہر جیپ میں دو آدمی بیٹھے ہیں، انہیں کہو آپ کا فون ہے۔ وہ سمجھے کہ ایس پی صاحب کوئی ہدایت دینا چاہتے ہوں گے۔ وہ اندر آئے تو ریسیور الگ رکھا تھا … کسی کی نیت نہیں تھی۔ میں ایک منٹ کے لیے باہر نکلی اور دونوں پہیوں کے بالکل نیچے وہ لکڑی کے ٹکڑے رکھ آئی۔ دونوں میں کیلوں کے نوکیلے حصے اوپر تھے۔ چند منٹ بعد وہ دونوں باہر آئے اور سیدھے جیپ میں جا بیٹھے۔ دس منٹ بعد میں نے گاڑی میں … رکھا اور باہر نکلی تو شاید انہوں نے وائرلیس پر ایس پی صاحب کو اطلاع دی اور گاڑی اسٹارٹ کر کے بڑھائی ہی تھی کہ دونوں کیلیں دونوں ٹائروں میں گھس گئیں۔ مشکل سے دس گز دور آ کے گاڑی رکوع میں چلا گیا۔ سمجھ تو گئے ہوں گے وہ کہ کسی نے جان بوجھ کے انہیں روکنے کا بندوبست کیا تھا لیکن انہوں نے ایس پی صاحب کے سامنے یہی کہا ہو گا کہ گاڑی اچانک پنکچر ہو گئی۔ ورنہ جھاڑ کھاتے کہ اندھے ہو، سو رہے تھے یا نشے میں تھے کہ کوئی سامنے کیلیں رکھ گیا۔ انہیں صرف تعاقب کا حکم تھا گاڑی روکنے کا نہیں ورنہ وہ گولی چلا کے میری کار کا ٹائر برسٹ کر دیتے۔ بچارے بے بسی سے دیکھتے رہ گئے اور میں نکل آئی۔ یک نہ شد دو شد۔ باری باری دونوں ٹائروں کو لات مار رہے تھے۔"

"اور اب گاڑی کہاں ہے؟" میں نے قہقہہ مار کے کہا۔ "تم تو ٹیکسی میں آئی تھیں۔"

"گاڑی میں نے گیراج میں چھوڑ دی ہے۔ ایک ہفتے بعد ملے گی۔" وہ بولی "سفید رنگ کرنے کو کہہ دیا ہے۔ وہ لال رنگ ہر جگہ نظر آتا تھا۔ نمبر تو بدلا جا سکتا ہے۔"

"یہ تم نے عقلمندی کا ثبوت دیا پرنسس۔" میں نے کہا۔ "مگر تم دونوں کے یوں غائب ہونے سے انکل رضوی سمجھ گئے ہوں گے کہ اب ہم سب سرکشی اور بغاوت پر آمادہ ہیں۔ کھلم کھلا قانون شکنی کا تہیہ کر چکے ہیں۔ میں تو مفرور اشتہاری مجرم تھا ہی، اب تم دونوں بھی ہو گئے۔ وہ تمہاری تلاش میں بھی دن رات ایک کر دیں گے۔"

"اب تو ہم دن کو نکلیں گے ہی نہیں۔" محسن بولا۔ "رات کو اپنا کام کریں گے اور دن سو کر گزاریں گے۔"

"میرا تو خیال ہے کہ اس طرح زیادہ عرصہ نہیں گزارا جا سکتا۔" رابعہ نے کہا۔ "ہمیں کچھ دن کے لیے اس شہر سے نکل جانا چاہیے۔"

"ہاں۔ ہم اس طرح بہت زیادہ دن چھپے نہیں رہ سکتے ہمارے یہ نام ابھی تو ٹھیک ہیں مگر ہر نئی جگہ ہمارے نام بھی نئے ہونے چاہئیں۔" محسن نے کہا۔ "بلکہ ہو سکے تو ہمیں صورتوں کو بھی بدلتے رہنا چاہیے۔ ابھی تو صرف سکندر کو تلاش کیا جا رہا ہے۔ اور پولیس نے تو ایک بار اخبار میں اشتہار دے کر اپنی ضابطے کی کارروائی پوری کر دی۔ وہ ہر روز یا ہر ہفتے تصویر نہیں چھپوائیں گے مگر دلاور اینڈ کمپنی کے لیے ایسا کرنا مشکل نہیں۔ جب انہیں معلوم ہو گا کہ سکندر کے ساتھ ان کی..... وہ..... میرا مطلب ہے وکیل اور چمچہ بکارِ خاص محسن خاں بھی روپوش ہیں تو وہ بہت خوش ہوں گے کہ ہم نے ان کا کام آسان کر دیا۔ ایک آدمی کو ڈھونڈنا مشکل ہوتا ہے مگر ایک گروہ کو تلاش کرنا آسان ہوتا ہے اور بفضلِ خدا اب ہم ایک دہشت پسند گروہ ہیں۔ میرا تو خیال ہے اس کا کوئی نام بھی ہونا چاہیے کیونکہ اس کے بنیادی اراکین ہیں جو اتفاقِ رائے سے ایک منشور بھی رکھتے ہیں۔ ہمارے علاوہ اعزازی رکن مس شہلا فرام اسلام آباد اور استاد ڈینڈی ہیں۔"

"میں اتفاقِ رائے سے خود کو اس کا تاحیات صدر منتخب قرار دیتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"یہ جمہوری طریقہ ہے اور دہشت پسندوں کا جمہوری رویّوں سے کیا تعلق۔" محسن نے اعتراض کیا۔ "یہ فیصلہ ڈوئل کے ذریعے ہو گا مگر ڈوئل میں جوڈو کے داؤ ممنوع ہوں گے۔ دیسی طریقے سے نورا کشتی ہو گی۔ ابھی جو بات میں سنجیدگی سے فرما رہا تھا وہ اشکالِ مبارک کی تبدیلی ہے۔ چوہدری دلاور ہمیں ہراساں رکھنے کے لیے اور انڈر گراؤنڈ رکھنے کے لیے ہماری تصاویر ہر روز یا ہر ہفتے برائے اشاعت دے سکتا ہے اور اسی طرح بازاروں میں ہماری تصاویر سے مزین پوسٹرز لگوا سکتا ہے، تاکہ مسلسل دیکھنے والوں کے ذہن میں ہماری صورت نقش ہو جائے جیسے روز ٹی وی پر یا فلموں میں بار بار نظر آنے والی ہیروئن کے ساتھ اکثر ہوتا ہے کہ بچاری شاپنگ کے لیے بھی انارکلی جائے تو پبلک پہچان جاتی ہے اور ٹریفک جام ہو جاتا ہے۔"

"ہر روز اشتہار چھپوانے کا کوئی سبب بھی ہونا چاہیے" رابعہ نے کہا۔

"سبب وہ ایجاد کرے گا۔ برادرم سکندر بخت کا نام محتاجِ تعارف نہیں۔" محسن بولا۔ "میری تصویر اس عنوان سے شائع ہو سکتی ہے کہ مسمی فلاں بن فلاں جو ہمارے سیلز منیجر تھے فلاں تاریخ سے دس لاکھ کا غبن کر کے روپوش ہیں۔ ان کے بارے میں اطلاع فراہم کرنے والے کو دس ہزار روپے انعام دیا جائے گا اور ان سے معاملہ کرنے والا اپنے نقصان کا خود ذمے دار ہو گا۔ ایسے اشتہار آتے ہی رہتے ہیں۔ رابعہ کا معاملہ زیادہ نازک ہے۔ یہ بھی اشتہار دیا جا سکتا ہے کہ میری زوجہ مسماۃ رابعہ بعارضۂ خللِ دماغ فلاں تاریخ سے غائب ہے۔ اس کے بارے میں قریبی تھانے کو مطلع کیا جائے۔ تو نے کبھی غور کیا۔ جوان لڑکیوں اور بیویوں کے بارے میں غائب ہونے کی وجہ ہمیشہ یہی لکھی جاتی ہے۔ اگر صرف غائب ہے لکھ دیا جائے تو لوگ کہیں گے کہ بھاگ گئی۔ اب میرے اور رابعہ کے بارے میں اس قسم کا اشتہار ہمارے ہوتے ہوئے بھلا کون دے سکتا تھا۔ ہم اخبار کو بھی قانونی نوٹس نہ داغ دیتے؟ لیکن اب کوئی کچھ بھی لکھے، ہم نہ چیلنج کر سکتے ہیں اور نہ اس کی تردید کرنے کے لیے سامنے آ سکتے ہیں۔ میں ایک فرضی کمپنی کا سیلز منیجر ہو سکتا ہوں تو رابعہ بھی ایک فرضی شخص کی منکوحہ ہو سکتی ہے۔ اگر انہوں نے ہماری تشہیر کی ٹھان لی اور ساری دنیا کو ہمارے پیچھے لگانے کا فیصلہ کر لیا تو وہ کیا نہیں کر سکتے۔ سارے ملک کے اخبارات میں تصاویر چھپوا سکتے ہیں۔ ٹرینوں اور بسوں میں اور چند بڑے بڑے شہروں کے نمایاں مقامات پر پوسٹر لگانا بھی مشکل نہیں مگر اس سے ہمارے لیے کتنی مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔"

"مجھے اس کا اندازہ ہے۔ ابھی میری زیادہ پبلسٹی نہیں ہوئی تھی مگر اس کے باوجود میں کئی جگہ پہچانا گیا۔" میں نے کہا۔ "اور بال بال بچا۔ حد تو یہ ہے کہ منظر کے پڑوس میں ایک خاتون نے اخبار نکال لیا جن کا اخبار سے کیا عقل سے بھی دور کا واسطہ نظر نہ آتا تھا۔ رابعہ تو برقع اوڑھ کے پھر سکتی ہے۔ ہمیں یا تو میک اپ کرنا پڑے گا یا پھر مہینے دو مہینے میں شیو چھوڑ کر داڑھی مونچھیں کاشت کرنی ہوں گی۔ ہم سر منڈوا سکتے ہیں۔ آنکھوں میں کاجل لگا کے گلے میں ریشمی رومال ڈال سکتے ہیں اور بوسکی کے کرتے کے ساتھ ریشمی لاچہ پہن سکتے ہیں اور پان کھا کے اور کان میں بیڑی لگا کے....."

ہنستے ہنستے رابعہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "میرے لیے تصور کرنا بھی محال ہے۔ فرض کرو شہلا دیکھ لے محسن کو اس حلیے میں تو کیا کرے گی، قتل یا خودکشی؟"

"دونوں۔ پہلے میرا قتل پھر محسن کی خودکشی۔" میں نے کہا "اس کے بعد کسی جوانِ رعنا سے عقد۔"

"آج کے ڈرامائی دور میں اتنا مشکل طریقہ اختیار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔" محسن بولا۔ "ہر سائز اور رنگ کی داڑھی مونچھوں کے سیٹ ملتے ہیں۔ ہر قسم کی وِگ دستیاب ہے۔ کانٹیکٹ لینز ہیں آنکھوں کا رنگ بدلنے کے لیے اور لباس تو اس وقت بھی ہمارے پاس چار ہیں۔ ایک انسپکٹر کی وردی، ایک پوسٹ مین کی، ایک ڈاکیے کی اور ایک درویش کی خلعتِ فاخرہ۔ مزید حلیے حسبِ ضرورت اختیار کیے جا سکتے ہیں اور شہلا بھی آ سکتی ہے۔"

"مذاق کی بات چھوڑو۔ کیا سچ مچ تم فیصلہ کر چکے ہو کہ مقدما وغیرہ سب ختم۔" رابعہ نے کہا۔ "خود کو بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش ترک اور اس لاکھوں کی جائیداد سے کنارہ کشی جو تمہارا قانونی حق ہے؟"

"فیصلہ تو بہت پہلے بتا چکا ہوں میں رابعہ۔ مذاق کی کون سی بات ہے اس میں۔" میں نے کہا۔ "میں نے جس حد تک ممکن ہوا کوشش کی۔ اب میں کیا کر سکتا ہوں، سوائے بغاوت کے۔ کیا تمہیں احساس ہو رہا ہے کہ تم نے قانون پڑھا، اتنا عرصہ پریکٹس کی اور نام کمایا، پیسہ کمایا اور میرے ملتے ہی سب ختم۔ اب وکالت بھی ختم اور دنیا سے تعلق بھی ختم۔ الٹا تم کو ایک مفرور اشتہاری مجرم کے ساتھ خوار ہونا ہے اور ایک بالکل غیر قانونی جنگ میں شریک رہنا ہے۔ میں نے اسی لیے کہا تھا کہ یہ تمہارے لیے بہت مشکل ہو گا۔ میں تو مجبور ہوں، تم مجبور نہیں ہو۔"

"میں بھی مجبور ہوں۔ تم اپنی مجبوری کو سمجھتے ہو تو میری مجبوری سے کیوں انکار کرتے ہو؟" وہ نظر جھکا کے بولی۔

"تمہارے لیے ابھی سوچنے کا وقت ہے۔" میں نے کہا۔ "میں تو اپنی کشتیاں جلا چکا۔ تم اسے بے وقوفی کہہ سکتی ہو۔"

"نہیں کیونکہ میں نے اپنی کشتیاں تم سے پہلے جلا دی تھیں۔ اسی گھر کے ساتھ جس کی راکھ میں میرا ماضی بھی خاک ہو گیا۔ کون رابعہ اور کون ایڈووکیٹ ہائی کورٹ۔ میں تو پرنسس صوفیہ ہوں!!" وہ تلخی سے ہنسی۔

"میرا کام اور میرا مشن بہت کٹھن ہے رابعہ۔ کون جانے میں کدھر نکل جاؤں۔ لوٹ کر آؤں یا نہ آؤں۔ اپنے ماضی سے کٹ کر میں کسی مستقبل کی راہ کا تعین بھی نہیں کر سکتا۔ کل میں کیا تھا اور آج کیا ہوں۔ آنے والے دن کا پتا نہیں کہ مجھے کس حال میں نوشتۂ تقدیر کو قبول کرنا پڑے۔" میں نے کہا۔ "مرد کے لیے دنیا میں اکیلے رہنا کتنا بھی مشکل ہو، ناممکن نہیں ہوتا لیکن تم عورت ہو۔"

"کیا میں نے کبھی کہا ہے کہ میں عورت نہیں ہوں۔" وہ

برہمی سے بولی "کسی بھی عورت کے مقابلے میں وفا کے کس امتحان میں پوری نہیں اتری میں۔ عورت اگر محبت دے سکتی ہے قربانی دے سکتی ہے اور سہارا دے سکتی ہے تو کیا یہ سب کچھ میں نے نہیں دیا؟ عورت اگر صبر و رضا اور استقامت رکھتی ہے۔ تو کیا میں کم ہوں اور بار بار اکیلی عورت کیوں کہتے ہو مجھے۔ میرے ساتھ تم نہیں ہو؟"

"آئی ایم سوری رابعہ۔ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ مجھے معاف کر دو۔ تمہارا مقابلہ کوئی عورت نہیں کر سکتی۔" میں نے محسن کی موجودگی میں جذبات پر قابو رکھا ورنہ اس وقت رابعہ نے جس بیباکی سے اپنی محبت کا اعلان کیا تھا اس کے بعد میرے لیے ضروری تھا کہ میں اپنے عشق کا برملا اظہار کر دوں۔ خود محسن اس کی جرأت پر دم بخود رہ گیا تھا۔ یہ کوئی چھپ چھپ کے کی جانے والی، سماجی قیود سے ڈرنے والی مجرم محبت نہیں تھی۔ اس میں ناآسودہ خواہشات کی پکار نہیں تھی۔ جسم کی پیاس نہیں تھی اور ناجائز تعلق کی بات نہیں تھی۔ یہ محبت ایک لازوال جذبہ تھی۔ ایک ہمہ گیر احساس تھی اور وہ لافانی قوت تھی۔ من تو شدم تو من شدی سے اگلی منزل جہاں منصور کہتا ہے انا الحق۔ وہ مجھ میں ہے اور میں اس کے وجود سے ہوں یا اس سے الگ کچھ نہیں ہوں اور فلمی شاعر کی زبان میں پیار کیا تو ڈرنا کیا۔

"آپ لوگ شدید جذباتی بحران میں مبتلا ہیں۔" محسن نے فوراً صورت حال کو سنبھالا۔ "اور میرا خیال ہے کہ یہ نتیجہ ہے اعصابی کشیدگی کا۔ ہم اب چلتے ہیں۔ تو آرام کر کیونکہ کل رات بھی تو سویا نہیں تھا۔ میں رابعہ کو گھر چھوڑ کر ذرا اپنے استاد ٹیڈی کے پاس جاؤں گا۔ وہ قیدی سے تفتیش کر رہا تھا اور میرا خیال ہے طافو بہت کچھ بتا سکتا ہے۔ وہ بزدل آدمی ہے اور اس کی کمزوری ہے اس کے بیوی بچے۔ وہ غداری کے جرم میں ایک بار سزائے موت کا مستحق ثابت ہو چکا ہے۔ لیکن اسے ڈبل ایجنٹ کا رول دیا گیا تھا کہ وہ اپنی سابقہ غلطی کی تلافی کر دے۔ اب ناکامی کے بعد وہ ایک طرف سے تو گیا۔ چوہدری دلاور اور گاما بھی اس کو سخت ترین عذاب دے کر ماریں گے۔ اس کے لیے کوئی چانس ہے تو ہمارا ساتھ دینے میں۔ وہ جو کچھ جانتا ہے سچ سچ بتا دے تو ہم اتنا کر سکتے ہیں کہ اسے بحفاظت کہیں پہنچا دیں۔ میں نے اسے بتا دیا تھا کہ ہم معاف کرنے والے نہیں ہیں۔ دوسری بار دھوکا دیا تو اعتراف جرم کے ریکارڈ کیے ہوئے ٹیپ کے ساتھ چوہدری دلاور کے حوالے کر دیں گے۔ وہ بہت بری طرح پھنسا ہے۔"

"تو نے اپنے بارے میں کچھ نہیں کہا محسن۔ تو کس طرح روپوش رہے گا۔" میں نے کہا۔ "تیرے ماں باپ ہیں اور ہے۔ تیرے خلاف کوئی سنگین الزام بھی نہیں۔ انکل شیرازی کی پوزیشن ایسی ہے کہ وہ تیرے معاملات کو ٹھیک بھی کر سکتے ہیں تو......"

"ایسی باتیں مت کر۔ جب پیدائش سے اب تک زندگی کے اتنے لمبے سفر میں ہر لمحے ساتھ ساتھ قدم ملا کے چلتے رہے ہیں تو اب الگ کیسے ہو سکتے ہیں۔" وہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "میرا گھر تیرا ہے۔ تو نے یہ اپنے گھر کی ہوئی۔ مال اس گھر سے رخصت ہونے کی تیاری کر رہی ہے۔ باپ اس کے بعد کتنے دن جیے گا۔ اگر ہو گا تو میرا اور تیرا گھر ایک ہی زمین پر ایک ہی جگہ ہو گا۔ دونوں پر چھت ہو گی ایک ہی آسمان ہو گا۔ ورنہ جب تک یہ سانس ہے تب تک تو یہ ساتھ ہے۔ ہم سب ایک ہی کشتی کے مسافر ہیں اور تو نے یہ کشتی جلا دی ہے تو ہمارے لیے واپسی کہاں ممکن ہے۔"

جب وہ چلے گئے تو میں نے محسوس کیا کہ میں رو رہا ہوں۔ بہانے والے کون سے جذبات تھے جو اشک بن کے آنکھوں سے چھلک گئے۔ یہ رابعہ کی محبت تھی اور محسن کا خلوص تھا اور تشکر و افتخار کا یہ احساس تھا کہ اتنی بڑی دنیا کے مقابل اکیلا ہو کے بھی میں اکیلا نہیں اور خدا ہے تو پیچھے بھی اس نے سہارے فراہم کر دیے ہیں۔ اجنبی اور دشمن دنیا کے اس جنگل میں خون کی پیاس بجھانے کے لیے جو تعاقب کرنے والے سفاک شکاری ہیں تو...... ان کے مقابلے کے لیے میری پہلی طاقت اس کی ذات پر یقین ہے جس کا بچانے والا ہاتھ مارنے والے ہاتھ سے ہمیشہ زبردست رہا ہے۔ میری دوسری قوت رابعہ اور محسن ہیں جو محبت اور خلوص کے بے بہا خزانوں کے ساتھ ہر قدم پر اس جنگ میں میرے ساتھ شریک ہیں اور یہ خزانے چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کے ان دنیاوی مال و متاع کے خزانوں سے صد ہزار درجہ افضل و برتر ہیں جو خالی بھی ہو جاتے ہیں اور لٹ بھی جاتے ہیں۔ تیسری قوت اپنی ذات پر اعتماد اور ہر حال میں پُرامید رہنے کی صلاحیت ہے اور شکاری اگر تین طرف سے مجھے نرغے میں لیے ہوئے ہیں تو میں تینوں طرف مقابلے کی قوت رکھتا ہوں۔

رات کے بارہ بجے میں نے ٹیلیفون کا ریسیور اٹھایا اور آپریٹر سے کہا کہ مجھے البرٹ وکٹر اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ کا نمبر دے۔ پانچ منٹ بعد گھنٹی بجی اور آپریٹر نے کہا۔ "بات کیجیے۔" "ہیلو ایمرجنسی وارڈ؟" میں نے کہا۔

"ہاں بھئی۔ ابھی تو بتایا ہے۔" کسی چڑچڑے اور خرد ماغ شخص نے کہا۔ "کیا یقین نہیں آیا؟"

"سوری ڈاکٹر۔ وہ آپریٹر تھا۔" میں نے کہا۔ "میں ڈاکٹر امجد بول رہا ہوں۔ آج شام حادثاتی طور پر گولی لگنے کا ایک کیس آیا تھا مس نازلی شیخ......"

"نرس۔" اس نے میری بات مکمل ہونے سے پہلے چلا کر کہا۔ "یہ نازلی شیخ کو پوچھ رہا ہے کوئی۔" وہ یقیناً رات کی شفٹ میں آنے والا کوئی نیا ڈاکٹر تھا۔ پہلے میں نے جس ڈاکٹر سے بات کی تھی وہ اتنا بدخو نہیں تھا۔ "ہاں جی۔ کیا پوچھنا ہے آپ کو؟"

"یہ پوچھنا ہے کہ اس کی حالت کیسی ہے؟" میں نے کہا۔ "خطرے سے باہر ہوئی یا نہیں۔"

"ابھی تو انٹینسو کیئر میں ہے۔" وہ بولا۔ "لیں ان کے بھائی سے بات کریں۔" لیکن میں نے ریسیور رکھ دیا۔

اکرام شیخ خود بہن کے پاس موجود تھا اور میں اس کے ذہنی کرب کا اندازہ کر سکتا تھا۔ اس نے ادائے فرض کو مقدم رکھتے ہوئے بہن پر گولی چلا دی تھی مگر فرض اور محبت کی کشمکش کا وہ فیصلہ کن لمحہ گزر گیا تھا جب اس نے فیصلہ تو صحیح کیا تھا مگر اس کے نتائج بہت غلط نکلے تھے۔ اب وہ جذباتی بحران کا شکار ہو گا اور ہدفِ ملامت اس کی اپنی ذات ہو گی۔ جھوٹ بول کے اس نے الزام کسی پر نہیں آنے دیا تھا ورنہ اس وقت وہ ماں باپ کی نظر میں بھی فرض شناس پولیس افسر نہیں، بہن کا قاتل ہوتا۔ اس کی ہمت کی تعریف کرنے والے کم ہوتے، اس کی حماقت پر افسوس کرنے والے زیادہ۔ اب بھی وہ سوچ رہا ہو گا کہ ہوش آنے پر نازلی سے کیا کہے گا۔ اس سے معافی مانگے گا اور پھر اس سے کہے گا کہ ایک جھوٹ کو نباہنے میں مدد کرے۔ اپنے اس بھائی کی عزت رکھے جس نے اپنی طرف سے بہن کی جان لینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی اور بہن کی زندگی کو اس لیے اہم نہیں سمجھا تھا کہ خود پولیس کی وردی میں تھا۔ ایک غلطی وہ پہلے کر چکا تھا۔ جب بہن پر گولی چلانے کے بعد اس کے خون کو بہتا دیکھ کر وہ حوصلہ ہار گیا تھا اور اس نے بہن کی بات مان کے ایک مجرم کو فرار ہونے کا موقع فراہم کر دیا تھا ورنہ وہ دل کو پتھر کر لیتا تو بہن کو مرنے دیتا اور مجرم کو پہلے گرفتار کرتا۔ اب اس کے لیے اپنے احساسِ ندامت کا دہرا عذاب تھا۔ کہ اس نے نازو پر گولی کیوں چلائی تھی اور اگر چلا ہی دی تھی تو پھر اپنی کمزوری کا شکار کیوں ہوا۔ بہن کی جان جاتی لیکن وہ مقصد تو پورا ہوتا جس کے لیے وہ بھائی نہیں رہا تھا صرف پولیس افسر رہ گیا تھا۔ اب تو نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم والی بات تھی۔ اس نے نازو کی بات مان لی تھی۔ کیا نازو اس کی بات مان لے گی اور معاف کر دے گی؟ اگر اس نے بھائی کی خاطر جھوٹ بول دیا تب بھی اکرام شیخ تمام عمر اس کے سامنے شرمندہ رہے گا اور اس کے احسان کے بوجھ تلے دبا رہے گا۔ یہ انکشاف بھی اس کے لیے کم تکلیف دہ نہ ہو گا کہ اس کی بہن نے محبت بھی کی تو کس سے۔ ایک مجرم سے جسے قانون کا محافظ بھائی اپنا دشمن سمجھتا ہے۔ وہ اپنی ضدی اور خودسر بہن کی جذباتی فطرت سے واقف تھا۔ ایک انتہا پر وہ خود تھا۔ دوسری انتہا پر بہن پہنچ گئی تھی اور نتیجہ اس تصادم کی صورت میں برآمد ہوا تھا۔ اکرام شیخ کے ذہن کے لیے ایک صدمہ یہ بھی ہو گا کہ اس بیوقوف بہن کی محبت کے سیلِ بے عناں کی راہ میں بند کیسے باندھے۔ اسے کیسے سمجھائے کہ نادان لڑکی! سکندر بخت تجھ سے کبھی محبت نہیں کر سکتا خواہ تو اس کی خاطر جان ہی کیوں نہ دے دے۔ اس کا جواب بھی شیخ کے لیے غیر متوقع نہ ہو گا۔ وہ صاف کہے گی کہ محبت کرنا یا نہ کرنا میرے اختیار کی بات نہیں۔ اگر سکندر مجھ سے محبت نہیں کر سکتا تو یہ اس کی مجبوری ہے اور اگر میں صرف سکندر کو چاہتی ہوں تو یہ میری مجبوری ہے۔ اپنی اپنی مجبوریوں کے ساتھ سب ہی جیتے ہیں اور نہیں جی سکتے تو مر جاتے ہیں۔ اسے بہن کی زندگی کی اس بے بسی اور تباہی کا دکھ ہو گا۔ نہ یہ ممکن ہو گا کہ وہ اس کے جذبات کا رخ موڑ سکے اور اسے مجبور کر سکے کہ وہ ماں باپ کی پسند کے مطابق شادی کر لے اور اس شخص سے محبت کرے جو اس کا شوہر کہلائے گا۔ بفرضِ محال سب نے جبر کیا اسے کسی کے ساتھ رخصت کر دیا تو خواہ وہ دنیا کے نقطۂ نظر سے حسنِ صورت اور سیرت میں مثالی ہو وہ سکندر بخت نہیں ہو گا جسے نازو اتنی شدت سے چاہتی ہے۔ وہ کبھی کسی سے محبت نہ کر سکے گی اور مجبوری کا یہی زہر اس کی زندگی کو آخری سانس تک ایک عذابِ مسلسل بنا دے گا۔

مجھے نیند کی اشد ضرورت تھی لیکن ذہن پر ہر سمت سے پریشان کن خیالات کی یلغار اتنی شدید تھی کہ نیند قریب بھی نہ آ پاتی تھی۔ کئی بار میں نے آنکھیں بند کر لیں مگر نہ جانے کب مجھے احساس ہوا کہ میں اندھیرے میں لیٹا چھت کو گھور رہا ہوں جس کی مدھم سی سفیدی تاریک سینما ہال کے پردے کی طرح میرے خیالوں کے عکس کو متحرک فلم کی طرح پیش کرنے لگتی تھی اور یہ خیالات خوشگوار تصورات پر مبنی نہیں تھے۔ اس میں رابعہ کے اور میرے ارمانوں کی کسی خوشی کا اجالا نہیں تھا اور کسی خوابِ آرزو کا رنگ نہیں تھا۔ ان میں اندیشہ ہائے دور و دراز تھے اور خوف کے بھیانک فریب تھے جو شکلیں بدل بدل کے مجھے ڈراتے تھے۔ اچانک ٹیلیفون کی گھنٹی نے سکوتِ شب کو منتشر کر دیا۔ اس کی آواز مجھے بمباری سے خبردار کرنے والے اس سائرن کی طرح لگی جو بلیک آؤٹ میں سہمے ہوئے بند دروازوں کے پیچھے دبے

ہ نے دہشت زدہ شہریوں کے اعصاب کو جھنجوڑ دے۔ میں ایک دم اٹھ بیٹھا۔ اس وقت فون کرنے والا کون ہو سکتا تھا؟ میں نے ریسیور کی طرف دیکھ کر سوچا۔ گھنٹی مسلسل چلاتی رہی۔ رابعہ اور محسن کے سوا تو کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ میں یہاں ہوں۔ آپریٹر نے کسی اور کمرے کی کال غلطی سے یہاں تو نہیں ملا دی؟ پھر میں نے ریسیور اٹھا لیا کیونکہ ٹیلیفون خاموش ہونے پر رضامند نہ تھا۔

"سوری سر" آپریٹر نے کہا۔ "میں نے تو کہا تھا کہ آپ سو رہے ہوں گے لیکن مجھے مجبور کیا گیا کہ جب تک آپ بیدار نہ ہوں رنگ دیتا رہوں۔ اور پھر بھی آپ نہ سنیں تو کسی کو بھیج کر جگایا جائے کیونکہ معاملہ زندگی اور موت کا ہے۔" مہذب آپریٹر یقیناً ڈر رہا تھا کہ میں نصف شب کے بعد آرام میں مخل ہونے پر برہمی کا اظہار کردوں گا۔

"اٹ از آل رائٹ۔" میں نے کہا۔ "بات کون کرنا چاہتا ہے؟"

"نواب ننھے خاں صاحب۔ بہت دھمکیاں دے رہے تھے کہ اپنچ سمیت اٹھا کے لے جاؤں گا۔ ہوٹل خرید کے اصطبل بنا دوں گا۔"

"اچھا اچھا۔" میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ "بات کرائیں ان کی عادت ہی ایسی ہے۔ آدمی برے نہیں ہیں۔"

"سکندر"۔ محسن کی آواز آئی اور میں حیران ہوا کہ اس نے ڈاکٹر امجد کیوں نہیں کہا۔ "یار کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے۔"

میں نے اس کی آواز پر غور کیا۔ گو لہجہ وہی تھا مگر آواز میں معمولی سا فرق تھا۔ محسن اتنا بے وقوف ہو گیا ہے کہ میرا اصل نام لے رہا ہے اور پھر کسی گڑبڑ کی بات فون پر کرنا چاہتا ہے۔ کیا وہ جانتا نہیں کہ درمیان میں آپریٹر بھی ہے۔

"کیا بات ہے؟" میں نے محتاط ہو کے کہا۔ "نواب ننھے خان صاحب!"

"آپ اگر گھوڑے بیچ چکے ہوں تو سونا موقوف کریں اور نیچے آجائیں۔" محسن نے کہا اور اپنی گاڑی لے کر بیڈن روڈ کے راستے مال پر آئیں۔ پھر زمزمہ کی طرف چل پڑیں۔ میں کسی جگہ بھی روک لوں گا۔ رفتار گولی سے کم رکھیں تاکہ میں دیکھ سکوں۔"

میں نے لائن منقطع ہونے کی آواز سنی اور یہ اندازہ بھی کر لیا کہ معاملہ یقیناً سنگین ہے، ورنہ محسن مجھے ایسے وقت میں بیدار نہ کرتا۔ اس نے فون پر کچھ نہیں کہا تھا۔ یہ صرف ذہنی پریشانی کا اثر تھا کہ گفتگو کے آغاز میں اس نے میرا نام لے لیا۔ شاید خود اسے بھی احساس تک نہیں ہوا۔ ریسیور رکھتے ہی میں اٹھ کھڑا ہوا۔ محسن نے جاتے وقت کہا تھا کہ وہ رابعہ کو ہوٹل میں چھوڑ کے خود استاد ٹیڈی کے پاس جائے گا اور اب اس نے جس سمت بلایا تھا اس سے بھی یہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ٹیڈی کے گھر کی طرف سے چلا ہے اور اس نے راستے میں کسی جگہ سے فون پر بات کی ہے۔ کپڑے اور جوتے پہننے میں مجھے دس منٹ بھی نہیں لگے۔ کاؤنٹر پر اس وقت دوسرا کلرک بیٹھا تھا۔ میں نے چابیاں اس کے حوالے کرتے ہوئے تاکید کی کہ کوئی بھی میرا پوچھتا ہوا آئے اسے میرے کمرے کا نمبر ہرگز نہ بتایا جائے اور ملاقاتی ڈھیٹ ہو تو اسے نیچے ہی انتظار کرنے کو کہا جائے۔ اگر کسی کا پیغام وصول ہو تو نوٹ کر لیا جائے مگر فون پر بھی کمرے کا نمبر بہرحال کسی کو معلوم نہیں ہونا چاہیے۔ محض شکوک کا ازالہ کرنے کی خاطر میں نے وضاحت کر دی کہ میرے مریض اتنے زیادہ ہیں کہ ان کو دن رات دیکھتے دیکھتے میں خود مریض بن گیا تھا چنانچہ اب کچھ دن چھپ کر آرام کرنا ہی میرا علاج ہے۔

فون موصول ہونے کے ٹھیک پندرہ منٹ بعد میں گاڑی میں بیڈن روڈ سے گزرا۔ دودھ کی ایک مشہور دکان اس وقت بھی کھلی ہوئی تھی جہاں جان بنانے والے بڑے بڑے پیالوں میں لیدر سول ملائی والا اُبلتا ہوا دودھ پھونک پھونک کر پی رہے تھے۔ اِکا دُکا موٹروں اور سائیکلوں کے سوا سڑک پر سے گزرنے والا کوئی نہ تھا۔ مال روڈ کے موڑ پر ایک جگہ مجھے گشت کرنے والی پولیس نے روکا اور عادت کے مطابق سوال کیا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ میں نے عزا کے ریڈ کراس کے نشان کی طرف اشارہ کیا۔ "نظر نہیں آتا کیا؟ ڈاکٹر ہوں اور مریض کو دیکھنے جا رہا ہوں۔" میں نے ان کے سامنے سے ہٹتے ہی گاڑی چلا دی۔ پھر ان میں سے کوئی چلایا اور میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ ڈنڈا گھماتا پیچھے دوڑ رہا تھا۔ میں نے ایک دم لائٹس آف کر دیں تاکہ وہ گاڑی کا نمبر نہ پڑھ سکے اور رفتار ایک دم بڑھا دی۔ ظاہر تھا کہ بات کرنے والا تو مجھے نہیں پہچانا تھا مگر اس کے ساتھی نے غور سے دیکھ کر مجھے شناخت کر لیا تھا۔ میں بال بال بچ گیا تھا۔ ورنہ مجھے ان سے دست بدست جنگ لڑ کے راستہ بنانا پڑتا اور معاملہ سنگین واردات کہلاتا۔ اب تو وہ آپس میں ہی ایک دوسرے کو الزام دیں گے کہ اچھا بھلا دس ہزار کا انعام تھا ہاتھ میں آ کے نکل گیا۔ اپنی کوتاہی اور نااہلی کا ذکر کسی سے نہیں کریں گے۔

محسن نے مجھے جی پی او کے مین گیٹ کے سامنے روکا اور دروازہ کھول کے میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ "یار وہ طافو مر گیا۔" اس نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔ "آگے سنت نگر سے سیدھا نکل....."

"طافو مر گیا؟ وہ کیسے؟" میں نے چونک کر کہا۔ "استاد ٹیڈی کی تفتیش سے؟"

"نہیں۔ اس نے اور میں نے تھانے کا طریقہ بھی استعمال کیا تھا مگر بہت واجبی۔" محسن بولا۔ "اس نے خودکشی کر لی۔ وہ تھا ڈرپوک آدمی اور اسے جو کچھ معلوم تھا وہ اس نے بتا دیا تھا۔ اس کے باوجود ہم مطمئن نہیں تھے اور اسے گامے ماچھی کے سپرد کرنے کی دھمکی دیتے رہے تھے۔ ٹیڈی نے اسے غسل خانے میں بند کیا تھا۔ اس نے سیفٹی میں سے بلیڈ نکال کے گلا کاٹ لیا۔ ٹیڈی بہت پریشان ہے کہ خون نالی سے بہہ کر باہر چلا گیا ہے اور صبح صاف نظر آئے گا۔ میں اسے تسلی دے کر آیا ہوں کہ فکر نہ کرے۔ ابھی صبح ہونے میں بہت دیر ہے۔ ہم سارے سراغ مٹا دیں گے اور لاش کو بھی ٹھکانے لگا دیں گے۔"

"بیچارہ۔ ایسے چکر میں پڑا کہ جان سے گیا۔" میں نے افسوس کے ساتھ کہا۔ "وہ تو اپنی دانست میں صرف ایک ٹرک ڈرائیور تھا۔ تقدیر نے پانچ لاکھ کے جال میں پھنسا دیا تھا حالانکہ نہ اس کی نیت میں بے ایمانی تھی اور نہ دل میں دولت کی ہوس۔ نہ لیتا تو رحمت اور کریم سیٹھ مار دیتے، لیے تو مجرم بن گیا۔ ہماری پناہ میں آیا تو خود کو غدار سمجھنے لگا اور وفادار ثابت کرنے کی کوشش کی تو گلے میں پھندا پڑ گیا۔ اسے اطمینان تھا تو صرف یہ کہ بیوی بچے بحفاظت نکل گئے ہیں اور ان کے پاس پیسہ ہے۔ اس نے سوچا ہو گا کہ خطرہ صرف میرے وجود سے وابستہ ہے۔ اب کسی کی ذات کو خطرہ نہیں۔"

"الٹا وہ مصیبت میں پڑ گئے ہیں جو اسے بلیک میل کر رہے تھے۔" محسن نے کہا۔ "حالانکہ ہم واقعی یہ چاہتے تھے کہ اس سے تمام معلومات فراہم ہو جائیں تو اسے نکال دیں۔ جہاں بھی وہ کہتا ہم اسے بحفاظت وہاں ضرور پہنچا دیتے۔ آگے اللہ مالک تھا لیکن اس نے بہت جلدی کی۔ سانده کلاں جانا ہے ہمیں۔"

"شاید اسے تمہارے وعدوں پر اعتبار نہیں تھا۔" میں نے کہا۔ "اس نے کوئی کام کی بات بتائی؟"

"ہاں۔ استاد ٹیڈی کو بتا رہا تھا کہ کوئی بہت بڑی حویلی ہے۔" محسن سوچتے ہوئے بولا۔ "جو نقشہ اس نے بتایا وہ ٹیڈی کی سمجھ میں تو آیا نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ وہ قصرِ جمشید کا حوالہ دے رہا تھا۔ وہ بڑی عجیب کہانی ہے۔"

"مگر قصرِ جمشید کے کھنڈر میں اب کیا ہے؟" میں نے کہا۔ "وہ کس زمانے کی بات کر رہا تھا؟"

"زمانۂ حال کی۔" محسن نے کہا۔ "تجھے یاد ہے جب اس کھنڈر میں آگ لگائی گئی تھی تو میں نے کہا تھا کہ یہ آگ بھی پردہ ہے۔ کھنڈر میں جلنے والی کون سی چیز تھی؟"

"تیرا مطلب ہے کہ وہاں واقعی تہہ خانہ ہے؟" میں نے حیرانی سے کہا۔ "زیرِ زمین کچھ گڑبڑ ہے؟"

"طافو کی بات سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔" محسن بولا۔ "اس نے بتایا کہ وہ صرف ایک بار وہاں گیا تھا تو اس کے ساتھ غالباً چوہدری دلاور اور استاد پیڈرو کے علاوہ دو آدمی اور تھے جن کو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اور وہ ایک نالے میں اتر گئے تھے۔ کسی گٹر لائن کے مین ہول کا ڈھکنا ہٹا کے نیچے گئے تھے اور پھر ایک سرنگ جیسے راستے سے ہو کے نیچے ہی نیچے تقریباً سو گز تک گھٹنوں کے بل چلتے رہے تھے۔ وہ سرنگ اتنی اونچی نہیں تھی کہ کوئی کھڑا ہو سکتا اور اندر گھپ اندھیرا تھا اور اس کی سطح سخت اور کھردری تھی۔"

"گٹر لائن میں پانی نہیں تھا؟" میں نے کہا۔ "اگر گٹر لائن زیرِ استعمال تھی تو اس میں غلاظت ہو گی۔"

"نہیں۔ یہی تو میں نے بھی پوچھا تھا اور طافو نے پورے یقین کے ساتھ کہا تھا کہ لائن خشک تھی اور وہ سرنگ بالکل نیچے سے شروع ہوتی تھی۔ انہوں نے اندر اترتے ہی اوپر کا ڈھکنا برابر کر دیا تھا۔" محسن بولا۔

"اس کا مطلب ہے وہ گٹر لائن تھی ہی نہیں۔" میں نے کہا۔ "اوپر مین ہول کی طرح ڈھکنا لگا دیا ہو گا تاکہ وہ جگہ کسی کو مشتبہ نظر نہ آئے۔"

"اس نے دوسری قابلِ غور بات یہ بتائی تھی کہ مین ہول ایک ٹرک کے نیچے تھا اور ٹرک بھی ایک کوٹھی کے احاطے میں کھڑا تھا لیکن تہہ خانہ اس کوٹھی کا نہیں ہو سکتا کیونکہ کوٹھی مشکل سے ایک کنال پر ہو گی جب کہ وہ تہہ خانہ کئی کنال کی حویلی کا لگتا تھا۔" محسن نے کہا۔ "سرنگ کے ختم ہوتے ہی سیڑھیاں آ گئی تھیں جہاں سے وہ سیدھے کھڑے ہو کر کچھ اوپر گئے تھے اور ایک کال بیل بجائی تھی۔ دروازے سے گزر کر پھر نیچے جانے والی سیڑھیاں آ گئی تھیں اور وہ تہہ خانے میں پہنچ گئے تھے۔ جو حلیہ اس نے بتایا اس سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ ساتھ جانے والے دلاور اور پیڈرو تھے۔"

"اور تہہ خانے میں کیا تھا؟" میں نے کہا۔ "اس نے کیا دیکھا؟ ہال گودام وغیرہ؟"

"یہی تو اس نے بتایا نہیں۔ اگر اس نے تہہ خانے کی وسعت کا اندازہ کر لیا تھا تو یہ کیسے ممکن ہے کہ کچھ بھی نہ دیکھا ہو۔" محسن نے کہا۔

"اور یہ فرض کرنا بھی مشکل ہے کہ طافو کو آنکھوں پر پٹی باندھ کے لے جایا گیا تھا۔ اس نے جو کچھ دیکھا تھا کھلی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ یہ کچھ عجیب سی بات نہیں لگتی کہ اس نے باہر کا منظر تو اتنی تفصیل سے بیان کر دیا اور اندر کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔" میں نے کہا۔ "اگر وہ لوگ اس کو قابلِ اعتماد سمجھتے ہوئے

رے ہی گئے تھے تو یہ بھی مشکل ہے کہ اسے کچھ نہ بتایا ہو۔ پھر وہ اس کو رے کیوں گئے تھے؟"

"طافو نے تو یہ بیان دیا اور اسی پر قائم رہا کہ اندر اندھیرا تھا۔ وہ لوگ جو اس کے ساتھ تھے تہہ خانے کے راستوں سے واقف تھے اور ان کے ہاتھ میں ایک پین ٹارچ تھی جس کا اجالا صرف قدموں سے ایک فٹ آگے محدود دائرے میں پڑتا تھا۔ ایک طرف تو دیوار تھی جس کے ساتھ ساتھ وہ چل رہے تھے۔ درمیان میں کمرے بہت وسیع تھے اور دوسرے کنارے تک کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا تھا آخری حصے میں پہنچ کے ایک حجرہ سا آگیا۔ وہاں ایک قبر سی بنی ہوئی تھی۔ چوہدری دلاور اور استاد پیڈرو تو ایک طرف کھڑے ہوگئے۔ طافو اور اس کے ساتھ جانے والے دونوں افراد کو کدال اور بیلچے دے کر قبر کھودنے پر لگا دیا گیا۔ وہ پکی قبر تھی۔ اوپر سے سنگ مرمر کے تابوت کی طرح بنی ہوئی"

"نواب خسرو پرویز کی قبر؟" میں نے اچانک کہا "تمہیں یاد ہے اس محل کے کھنڈر میں باغ کے ایک گوشے میں آج بھی چار ستونوں پر وہ سائبان کھڑا ہے۔ وہاں ملنے والے مالی نے ہمیں بتایا تھا کہ وہ نواب خسرو جمشید ہی کا مدفن ہے ان کی اصل قبر نیچے ہوگی۔ یہ رواج پہلے تھا کہ اوپر علامتی قبر رکھی جاتی تھی اور عین اس کے نیچے تہہ خانے میں اصلی قبر بنائی جاتی تھی۔ تاج محل میں ملکہ ممتاز محل کی قبر ایسے ہی ہے اور کراچی میں قائداعظم کے مزار میں بھی ایسا ہی انتظام ہے۔ فاتحہ خوانی کے لیے آنے والے اوپر ہی فاتحہ پڑھ جاتے ہیں۔ نیچے اصل قبر تک رسائی کا اعزاز بہت کم لوگوں کو حاصل ہوتا ہے۔ خیر تو آگے بتا۔"

"وہاں اس قبر کو توڑ کے کھدائی کرنا بہت مشکل کام تھا۔ نیچے تک فرش انتہائی پختہ تھا اور شاید اسی لیے طافو کے علاوہ دو جفاکش قسم کے مزدور ساتھ لیے تھے۔" محسن بولا۔ "دو گھنٹے کی سخت محنت کے بعد ایک لاش کا ڈھانچہ برآمد ہوا۔ چوہدری دلاور اور پیڈرو خاصے مایوس تھے۔ انہوں نے خود نیچے اتر کے دیکھا اور ادھر ادھر کی دیواروں کو ٹھوک بجا کے دیکھتے رہے۔ دلاور بہت برہم تھا کہ محنت رائیگاں گئی اور بار بار پیڈرو سے کہتا تھا کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس نے ڈھانچہ ہٹا کے نیچے سے بھی زمین کھودنے کا حکم دیا مگر وہاں سے مٹی ہی نکلی۔ سائڈ میں کھودنے سے بھی کچھ حاصل نہیں ہوا معلوم نہیں وہ کیا تلاش کر رہے تھے۔ نواب صاحب مرحوم کا کوئی مدفون خزانہ، کوئی وصیت نامہ یا ان کے اہم ذاتی کاغذات۔ معاملہ پُراسرار تھا اور پُراسرار رہا۔ صبح ہوتے ہی انہوں نے واپسی کا فیصلہ کیا لیکن طافو کے ساتھ جانے والے دونوں افراد کو وہیں چھوڑ دیا گیا، گولی مارنے کے بعد۔ یہ بات بتاتے ہوئے طافو کی حالت غیر ہوگئی تھی اور وہ ایسے کانپنے لگا تھا دونوں قتل ابھی ابھی اس کی نظروں کے سامنے ہوئے ہیں اپنی موت کا بھی سو فیصد یقین تھا مگر اس سے پہلے کہ تیسری اس کا خاتمہ کرتی وہ ان کے قدموں میں لوٹنے لگا اور جان کے لیے رونے دھونے اور منت سماجت کرنے لگا کہ میرے چھوٹے بچے ہیں۔ اور نہ جانے کیوں دلاور اور پیڈرو کو رحم انہوں نے کہا کہ یہ دو آدمی صرف اس رات کی بات کو کیلیے مار دیے گئے ہیں اگر تم زندہ رہنا چاہتے ہو تو بھول جا ہمارے ساتھ آئے تھے۔ اس بارے میں تمہاری زبان سے لفظ غلطی سے بھی نکلا تو تمہیں ہی نہیں تمہارے بیوی بچوں اسی طرح دفن کر دیا جائے گا۔ طافو اتنا دہشت زدہ تھا کہ نے خدا رسولؐ اور قرآن کی قسم کھا کے انہیں یقین دلایا کہ جب تک زندہ ہے اس کی زبان بند رہے گی۔ انہوں نے لاشوں کو قبر کے گڑھے میں ڈالا اور باہر آگئے۔"

"اور آج اس نے ہر قسم توڑ ڈالی؟" میں نے کہا "کیا وہ فیصلہ کر چکا تھا مرنے کا؟"

"مرتے وقت تو کوئی گناہ کبیرہ کا مرتکب نہیں ہوتا یہ ہے کہ اس نے بیوی بچوں کی خاطر اپنی جان بچانے کی کوشش کی سوال جان بچانے کا ہو تو حرام شے بھی حلال ہو جاتی ہے۔ اس یقین ہوگا کہ اتنے سنسنی خیز انکشافات کے بعد ہمیں کوئی شک نہیں رہے گا کہ اسے جو کچھ معلوم تھا وہ اس نے نہیں بتایا یہ تو تفتیش میں ہوتا ہی ہے۔ کوئی بھی ایک دم سارا سچ نہیں دیتا اور اگل دے تو پوچھنے والا پھر بھی سمجھتا ہے کہ کوشش کر کچھ اور اگلوایا جائے۔ یہی ہم نے بھی کیا تھا۔ اسے بتا دیا تھا کہ خیریت چاہتا ہے تو سب بتا دے۔ میں سمجھ رہا تھا کہ اس تہہ خانوں میں خالی کمرے نہیں دیکھے ہوں گے۔ وہاں کوئی یا فیکٹری ہوگی۔ کریٹ یا بوریاں ہوں گی لیکن وہ واقعی سے زیادہ کچھ نہیں جانتا تھا تو اور کیا بتاتا۔ شدید مایوسی عالم میں اس نے خودکشی کر لی۔" محسن نے کہا اور مجھے گاڑی کا اشارہ کیا۔ تھوڑا سا فاصلہ ہم نے ایک تنگ گلی میں طے جس میں کار نہیں جا سکتی تھی۔ یہ گلی سامنے سے بند تھی اور میں دونوں جانب زیادہ مکان نہیں تھے۔ محسن نے ایک دروازے پر دستک دی جس کے پیچھے بظاہر تاریکی تھی۔

"کون ہے؟" استاد ٹیڈی نے بہت قریب آ کے آہ سے پوچھا۔

"پولیس،" محسن نے لہجہ بدل کے کہا "یہاں کسی کا قتل ہے؟" میں نے ہنسی کو بڑی مشکل سے ضبط کیا حالانکہ یہ ہنسنے

توقع نہ تھا۔ اندر سے چند سیکنڈ تک کوئی آواز نہیں آئی اور محسن اپنے مذاق سے محظوظ ہوا۔

"ارے یار! اس کا ہارٹ فیل نہ ہو گیا ہو۔" میں نے کہا۔

"زردمت استاد ٹیڈی! پولیس آئی تو پہلے ہمیں پکڑے گی۔"

"قسم مولا کی —" ٹیڈی نے حسبِ عادت دروازہ کھول شیخی ماری "کون سالا ڈرتا ہے پولیس سے۔ اور آپ ہمارے میں ہو۔ پولیس استاد ٹیڈی کی لاش پر سے گزر کر ہی پہنچ سکتی ہے یاروں تک۔ بھون کے رکھ دوں پولیس کو۔"

"مگر استاد! یہ تم کانپ رہے ہو سردی سے یا تمہاری آواز کانپ رہی ہے؟" محسن نے کہا اور اندر داخل ہوتے ہی دروازہ بند کر دیا۔ میں نے دوستانہ طریقے پر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا، واقعی وہ کانپ رہا تھا۔

"ارے بھائی محسن! آپ بھی مذاق کر لو۔ یہ مصیبت بھی آپ ہی لائے تھے۔" وہ مجھ سے فریاد کے انداز میں بولا۔

"گھبراتے کیوں ہو۔ ارے ہم تمہارے ساتھ ہیں استاد تم سے پہلے لٹکنے کے لیے۔" میں نے کہا "لاش کہاں ہے؟"

وہ مجھے اندر کے ایک کمرے میں لے گیا۔ لاش کو اس نے پلاسٹک بچھا کے کمبل میں لپیٹ رکھا تھا۔ میں نے وہ غسل خانہ دیکھا جہاں میں طافو نے اپنا کام تمام کیا تھا۔ اپنے ہاتھوں سے اپنے گلے پر خنجر چلانا آسان نہیں ہوتا۔ کسی بلند عمارت سے کود جانے، گاڑی کے آگے لیٹ جانے یا زہر کھانے میں ایک سیکنڈ لگتا ہے لیکن گلا کاٹنے میں قوتِ ارادی ہی نہیں اتنی جسمانی طاقت کی ضرورت بھی ہوتی ہے کہ ہاتھ اس وقت تک نہ رکے جب تک خنجر کی دھار شہ رگ کو بھی نہ کاٹ دے۔ طافو نے تو یہ مشکل کام بلیڈ سے کیا تھا اور کامیاب رہا تھا لیکن اس کوشش میں اذیت کے باعث تڑپا تھا چنانچہ خون کے چھینٹے ہر طرف دیواروں پر پھیل گئے تھے۔ خون فرش سے بہہ کر نالی کے راستے باہر نکل گیا تھا۔ ٹیڈی نے دیواروں کو دھو ڈالا تھا اور خاصا رگڑا تھا مگر چونے کی سفیدی میں جذب ہونے والی لہو کی لالی بدستور نمایاں تھی یا شاید مجھے نمایاں محسوس ہوتی تھی کیونکہ میں جانتا تھا کہ یہ داغ خون کے ہیں معلوم نہ ہوتا تو میں انہیں صرف داغ سمجھتا جو باتھ روم کی دیواروں پر پڑ ہی جاتے ہیں۔ ٹیڈی نے فرش کو بھی دھو ڈالا تھا اور کافی مقدار میں پانی بہایا تھا۔

"خون تو کافی صاف کر لیا ہے تم نے۔" میں نے اسے تسلی دینے کے لیے کہا۔

"وہ جی میں نے تو گرم پانی ڈالا، بالکل ابلتا ہوا اور سوڈا کے صابن سے رگڑا۔" وہ بولا۔

"گرم پانی سے باہر کی نالی میں بھی خون جما نہیں ہوگا اور پانی کے ساتھ بہہ گیا ہوگا۔ کوئی ٹارچ ہے؟" میں نے کہا۔

"ٹارچ تو نہیں ہے۔ موم بتی لاؤں؟" ٹیڈی نے کہا اور میرے اقرار میں سر ہلانے پر اندر سے ایک انچ موٹی موم بتی روشن کر لایا۔

باہر گلی بالکل سنسان تھی اور کسی کے اچانک آ جانے کا احتمال بھی نہیں تھا کیونکہ یہ بند گلی عام رہ گزر نہیں تھی۔ گلی کے مکین سوئے پڑے تھے اور ہر طرف خاموشی کا تسلط تھا۔ موم بتی کی مدھم روشنی میں محسن نے اور میں نے جھک کر گھر سے باہر آنے والی اور دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے والی نالی کا معائنہ کیا۔ ٹیڈی نے ابلتے پانی کے استعمال سے عقلمندی کا ثبوت دیا تھا۔ نالی پہلے ہی صاف نہیں تھی اور اس میں ملی جلی غلاظت کا رنگ سیاہی مائل چکنی تہہ بن کے چمٹا ہوا تھا۔ اس میں خون کی سرخی کے آثار بہت کم تھے لیکن شک کی نظر سے دیکھنے والے کو واضح طور پر دکھائی دیتے تھے۔

"تمہارے پاس کالی نیلی کوئی روشنائی ہے؟" میں نے اندر لوٹ کر کہا "یا کوئی پینٹ ہے؟"

"نیلی سیاہی ہے جی۔ اور کپڑوں میں دینے والا نیل ہے۔ ایک لال دوائی بھی ہے۔" ٹیڈی بولا۔

"سب لے آؤ۔" میں نے کہا "پہلے یہاں کا مسئلہ حل کر لیں۔"

نیلی روشنائی کو میں نے باہر چھڑکا جہاں بھی مجھے لہو کے رنگ کی جھلک محسوس ہوئی۔ باقی روشنائی کو میں نے اندر سے باہر آنے والی نالی کے دہانے پر شیشی توڑ کے پھیلا دیا۔ چھینٹے ہر طرف اچھلے اور کانچ کے ٹکڑے نالی میں گرے۔ یہ کیموفلاج کا طریقہ تھا۔ اب خون کے لال رنگ پر نیلا رنگ غالب آگیا تھا اور گزرتے ہوئے دیکھنے والے کو ٹوٹی ہوئی دوات دیکھنے کے بعد نیلے رنگ کے سوا کچھ دکھائی دے ہی نہیں سکتا تھا۔ میدانِ جنگ میں فوجی اپنے سر کے فولادی خود پر جھاڑیاں رکھ لیتے ہیں اور جنگل کی ہریالی میں گم ہو جاتے ہیں۔ اوپر سے دیکھنے والے کو وردی کا خاکی رنگ نظر ہی نہیں آتا کیونکہ ہر طرف پھیلا ہوا ہرا رنگ غالب رہتا ہے۔ یہی نیلا پردہ میں نے باتھ روم کے اندر بھی ڈالا اور جہاں جہاں سرخی نمایاں محسوس ہوئی وہاں پانی میں نیل گھول کے چھڑک دیا۔ اندر کا معاملہ اتنا باعثِ تشویش نہیں تھا۔ شک کا آغاز ہوتا تو باہر سے ہوتا لیکن اب صبح ہونے تک خون کے داغ دب جائیں گے اور کہیں نیلے چھینٹوں میں کوئی لال چھینٹا بھی نظر آیا تو اسے کوئی خون نہیں سمجھے گا۔

"یہاں تو خطرے کی کوئی بات نہیں رہی۔" میں نے کہا "طافو کے بارے میں کوئی نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہے۔ جاننے

والوں نے تو اسے لاہور سے ٹرک پر مال کے ساتھ کراچی بھیجا تھا۔ اس سے زیادہ ان کو کچھ معلوم ہے تو یہ کہ ٹرک ہم نے تباہ کر دیا۔ رحمت کباڑی کی لاش چوہدری صاحب کو ارسال کر دی اور چھوٹو بھاگ گیا۔ طافو کے بارے میں بھی وہ یہی فرض کر لیں گے کہ بھاگ گیا مگر صبح ہونے تک چوہدری صاحب کی خوش فہمی دور ہو جائے گی۔"

"کیا یہ بھی انہی کو ارسال کرنے کا پروگرام ہے؟" محسن نے کہا۔

"ہاں مگر ویسے نہیں جیسے رحمت کباڑی کو ارسال کیا تھا۔" میں نے کہا "گھر میں زمین کھودنے کے آلات ہوں گے؟"

"بس ایک بیلچہ ہے۔ وہ بھی آگے سے ٹوٹا ہوا۔" ٹیڈی نے اپنی بے سروسامانی پر ندامت سے کہا۔

"کافی ہے۔ ہمیں زیادہ نہیں کھودنا ہے۔ اسے فوراً لے آؤ۔" میں نے کہا۔ "ہم اتنی دیر میں لاش کو لے جاتے ہیں۔"

طافو کی لاش اکڑ چکی تھی۔ مجھے اور محسن کو اس کے ہاتھ پیر سمیٹ کر کار کی ڈکی میں فٹ کرنے کے لیے مرنے والے کے ساتھ خاصی زبردستی کرنی پڑی۔ خون اب نہیں بہہ رہا تھا اور جو پہلے نکلا تھا وہ جم چکا تھا چنانچہ ہمارے ہاتھ اور کپڑے محفوظ رہے۔ پلاسٹک نے بھی خون کی نمی کو کمبل میں جذب ہونے سے روکا تھا۔ میں نے ڈکی بند کی اور اندر آ کے روشنی میں اچھی طرح اپنے جسم کو اور لباس کو دیکھا۔ صرف ہمارے ہاتھوں کی انگلیاں خون سے داغدار ہوئی تھیں۔ صابن سے ہاتھوں کو رگڑ رگڑ کر دھونے کے بعد کوئی نشان نہ رہا۔ ٹیڈی نے بیلچہ بھی لاش کے ساتھ ہی رکھ دیا تھا۔ وہ خود پیچھے بیٹھا اور میں نے گاڑی کو بیک کیا۔

"ہم اب چوہدری دلاور صاحب کے دولت خانے پر تشریف لے جا رہے ہیں۔" میں نے کہا "تاکہ صبح ہونے سے پہلے ان پر ایک اور قتل کا الزام آ جائے۔ میرے خلاف اس کے پانچ الزامات ہیں، دو کا حساب تو برابر ہو۔"

"مگر اس وقت..... یہ ویسے بھی خطرناک ہے اور ہماری پوزیشن!" محسن نے کہا۔

"فکر مت کر۔ ہماری پوزیشن وہی رہے گی جو اس وقت ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر چوہدری صاحب کی نہیں۔ رہا خطرہ تو وہ ہماری جان کے ساتھ ہے اور ہمیں یہی کرنا ہے کہ خطرے کو تقسیم کر دیں۔ جتنے خطرات سے ہم دوچار ہیں اتنے ہی خطرات فریقِ ثانی کو لاحق ہو جائیں تو ترازو کے دونوں پلڑے برابر ہو جائیں گے۔ ابھی ہم کانے ہیں، اگر وہ بھی کانے ہو گئے تو کون کس کو کانا کہے گا۔ ایک حمام میں سب ننگے ہوں تو کسی ایک پر ننگے ہونے کا الزام نہیں آتا۔

"یہ ہماری دہشت پسند تنظیم کا پہلا کارنامہ ہوگا۔ کارنامے تو ہم پہلے بھی انجام دے چکے ہیں مگر اس وقت ہم منظم نہیں تھے۔" محسن بولا۔ "کتنی خوشی کی بات ہے استاد ٹیڈی کہ ہم اب باقاعدہ دہشت گرد ہو۔"

"دہشت گرد، قسم مولا کی۔ دہشت کس بات کی؟

"مُردوں سے کیا ڈرنا۔"

مجھے ہنسی آئی۔ "کون کہتا ہے تم ڈرتے ہو۔ دہشت گرد مطلب ہوتا ہے۔ زورِ بازو سے اپنا حق حاصل کرنے والا، اور ظلم کے خلاف آواز اٹھانے والا مثلاً تنظیمِ آزادیٔ فلسطین کو کشمیر لبریشن فرنٹ....."

"میاں جی، اپنی سمجھ میں یہ باتیں نہیں آئیں گی۔" بولا۔ "ہم ٹھہرے ان پڑھ لوگ۔ تم جو کہو ٹھیک ہے۔"

"اپنے سکندرِ اعظم صاحب اچیئرمین کا انتخاب تو ایک نزعی مسئلہ ہے جس پر انشاءاللہ اختلاف جاری رہے گا۔" محسن کہا۔ "لیکن تنظیم کے نام پر تو اتفاقِ رائے ہو سکتا ہے اور ابھی مجھ پر غیب سے ایک نام کا نزول ہوا ہے جو حسبِ حال ہے اس سے بہتر نام کوئی تجویز کر ہی نہیں سکتا۔ کرے گا تو شرمندہ ہوگا کیونکہ ہم اسے قبول نہیں کریں گے۔ ایم آر ایس۔ کیسا نام ہے؟ مائٹ از رائٹ سوسائٹی۔"

"گویا جس کی لاٹھی اس کی بھینس سوسائٹی۔" میں نے کہا۔ "بہت خوب۔"

"آپ ایم آر ایس پر غور کریں۔ ایم سے یہ خاکسار۔ آر سے آپ کی وہ۔ اور ایس سے آپ خود۔" محسن بولا۔ "کل پرسوں میں کے مونوگرام چھپوالوں گا۔ کیا زبردست پبلسٹی ملے گی اور کیا تاثر ہوگا۔"

"تو نے چوہدری دلاور کا گھر تو دیکھا ہے نا۔" میں نے کی بات کاٹ دی۔ "اب دھیان سے میری بات سُن۔ میں گاڑی ذرا آگے سے موڑ کر پیچھے لاؤں گا۔ اُدھر تنگ سی گلی اور دلاور کی کوٹھی کی عقبی دیوار ہے جس میں ایک چھوٹا سا دروازہ ہے۔ فٹ اونچی دیوار میں چار فٹ کا ایک پٹ والا گیٹ جو عموماً مقفل نہیں رہتا اور اُدھر سے نوکر آتے جاتے ہیں یا دودھ والا آتا میں اسی راستے سے اندر جا کے لاش کو دائیں جانب ڈال دوں پھر بالکل خاموشی کے ساتھ ہم سب بائیں طرف کے کھلے میں تھوڑی سی زمین کھودیں گے۔ اسی جگہ کے قریب جہاں ویل کی موٹر لگی ہوئی ہے۔ وہاں زمین نرم ہے اور ایک کھودنے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ بس آواز نہیں ہونی"

"طافو کو وہاں دفن کرنا ہے؟" محسن بولا۔ "اور پھر کو اطلاع دے دینی ہے کہ لاش نکال لے۔"

"نہیں باقی پلان بعد میں۔" میں نے گاڑی کی رفتار بڑھائی اور پھر انجن کو نیوٹرل کر لیا۔ گاڑی بالکل خاموشی سے دلاور کی کوٹھی کے مین گیٹ کے سامنے سے سیدھی گزر گئی۔ چوکیدار اندر کھڑا تھا اور پورچ میں صرف ایک گلوب روشن تھا جس کا اجالا کوٹھی کے دونوں طرف نہیں پہنچتا تھا۔ اس کے علاوہ روشنی صرف ایک روشندان میں تھی جو میرے خیال کے مطابق باتھ روم کا روشندان تھا کیونکہ اس کی بلندی سات فٹ کے قریب تھی۔ گاڑی چار کوٹھیاں چھوڑ کے بائیں طرف مڑی اور کارنر کی کوٹھی کا احاطہ ختم ہوتے ہی پھر بائیں جانب تنگ گلی میں داخل ہو گئی۔ موڑ پر ایک کھلا مین ہول تھا جو اچانک سامنے آ گیا تھا مگر اگلے دونوں پہیے دائیں بائیں رہے اور کھلا گٹر درمیان سے گزر گیا تو میں نے اطمینان کا سانس لیا ورنہ گاڑی کا ایک پہیہ مین ہول میں جاتا تو بہت بڑی مصیبت آ جاتی۔ ایکسل ٹوٹ جاتا یا قینچی ٹوٹ جاتی اور پھر گاڑی کو نکالنے میں کامیابی ہو جاتی تب بھی اس کو وہاں سے ہٹانا ناممکن تھا۔ صبح ہو جانے کے بعد لوگ مدد کے لیے آتے اور گاڑی کو "کرین" سے اٹھا کر اور لاد کے لے جانا پڑتا۔ اس خیال سے ہی مجھے جھرجھری آ گئی کہ ایک غیر متوقع حادثہ ہمیں پل بھر میں ناکامی سے دوچار کر سکتا تھا۔ سب سے پہلے تو ہم تینوں کو فرار ہونا پڑتا۔ کار کی ڈکی میں لاش تھی، ہم اسے اٹھا کے فرار نہیں ہو سکتے تھے اور یہ بھی ناممکن تھا کہ گاڑی کو ہم میں سے کوئی اٹھوا کے لے جائے۔ جائے حادثہ چوہدری دلاور کے گھر کے اتنے قریب تھی کہ اسے ضرور معلوم ہو جاتا اور ایسی صورت میں خود کو بچانے کی واحد صورت یہی ہوتی کہ ہم گاڑی کی ملکیت سے یکسر دستبردار ہو جائیں۔

گاڑی کو عین چوہدری دلاور کے بنگلے کی دیوار سے لگا کے میں نے بڑی پھرتی سے ڈکی کھولی۔ لاش کو میں نے اور محسن نے اٹھایا اور دبے پاؤں مختصر سے گیٹ کے راستے اندر لے گئے۔ ٹیڈی نے اتنی دیر میں بیلچہ نکال کے ڈکی بند کی تو ایک دھماکا ہوا اور ایک لمحے کے لیے میں اور محسن مفلوج ہو گئے۔ ٹیڈی نے بونٹ کو آہستہ سے دبانے کے بجائے زور سے دے مارا تھا۔ چند سیکنڈ تک ہم دونوں دم سادھے کھڑے رہے۔ پھر ٹیڈی نمودار ہوا۔

"اگر تم نے احتیاط نہ کی تو ہم اسی لاش کے ساتھ پکڑے جائیں گے۔" محسن نے کہا اور ٹیڈی نے اپنی غلطی پر ندامت کا اظہار کیا۔ لاش اب دیوار کے ساتھ پڑی ہوئی تھی۔ میں نے ان دونوں کو اشارہ کیا اور ہم ایک ایک قدم پھونک کر رکھتے ہوئے آگے بڑھے۔ ٹیوب ویل کی موٹر تقریباً پچاس فٹ کے فاصلے پر تھی۔ وہاں تک پہنچنے کے لیے ہمیں دو بند دروازوں اور چار کھڑکیوں کے سامنے سے گزرنا تھا۔ احتیاطاً ہم دیوار سے لگ کر رکوع کی حالت میں اپنا سر کھڑکی کی دہلیز سے نیچے رکھے گزرے۔ نہ جانے کیسے ٹیڈی کا سر دہلیز پر بنے ہوئے سیمنٹ کے چھجے سے ٹکرایا اور ٹیڈی کے حلق سے "آہ" کی آواز نکلی۔ میں اور محسن منجمد ہو گئے اور ہم نے ایک ساتھ پلٹ کر ٹیڈی کو غصے سے دیکھا۔

ٹیوب ویل کے پاس پہنچ کر میں نے ایک جھاڑی کی اوٹ سے دیکھا، چوکیدار وہیں بندوق تانے کھڑا تھا۔ میں نے محسن اور ٹیڈی کو اشارہ کیا اور وہ دونوں ہاتھوں سے زمین صاف کرنے لگے۔ خشک پتے اور سوکھی ٹہنیاں احتیاط کے ساتھ ہٹانے کے بعد انہوں نے بیلچہ زمین پر رکھ کے پیر سے دبایا اور دونوں ہاتھوں کا زور لگا کے اٹھا لیا۔ تقریباً ایک مکعب فٹ مٹی نکالنے کے لیے بیلچہ چار مرتبہ کام آیا۔ میری نظر چوکیدار پر تھی اور میں ہر آواز پر سانس روک لیتا تھا۔ میں اس کے لیے بھی تیار تھا کہ اگر چوکیدار یا خود دلاور اچانک نمودار ہو جائے تو اس سے مؤثر طور پر نمٹ لوں۔ میری جیب میں ریوالور بھی تھا اور میرے خالی ہاتھ بھی بہت کچھ کر سکتے تھے۔ ایسی صورت میں ہمارا مشن تو ناکام ہوتا لیکن مسئلہ اپنی جان بچانے کا ہو تو مشن قربان کرنے کے سوا چارہ نہ رہتا۔ گڑھا میری ہدایات کے مطابق تین فٹ قطر کا رکھا گیا تھا۔ ابھی اس کی گہرائی ایک بالشت بھی نہیں ہوئی تھی کہ چوکیدار نے گیٹ پوسٹ سے روانہ ہو کے کوٹھی کا راؤنڈ لگانے کا فیصلہ کیا۔ میں نے خطرے کا سگنل دیا اور ہم ایک ساتھ جھاڑیوں کے پیچھے روپوش ہو گئے۔ چوکیدار کے گھوم کر آنے میں پانچ منٹ بھی نہیں لگے ہوں گے مگر ضبط کا یہ اعصاب شکن وقفہ مجھے بہت طویل لگا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ دلاور نے حفاظت کے خیال سے کتے نہیں پال رکھے ہیں ورنہ ہمارا چوری چھپے اندر داخل ہوتے ہی پکڑا جانا یقینی تھا۔

چوکیدار مخالف گوشے میں نظر آیا۔ اس سے بہت کم فاصلے پر وہ چھوٹا سا گیٹ تھا جس کے ساتھ طافو کی لاش پڑی تھی لیکن وہ گوشہ تاریک تھا اور چوکیدار کی نظر کچھ نہ دیکھ سکی۔ تاہم باہر کھڑی ہوئی کار نے اسے متوجہ کیا۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ مجھے لاش نکالنے کے بعد کار کو آگے پیچھے کسی اور گھر کے سامنے کھڑا کرنا چاہیے تھا۔ چوکیدار گیٹ کی طرف گیا تو میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔ گاڑی میں تو شک کی کوئی بات نہ تھی کہ چوکیدار کو نمبر نوٹ کرنے کا خیال آئے مگر گیٹ سے چند فٹ دور ایک لاش لیٹی ہوئی تھی۔ میں نے محسن کو خبردار کیا مگر اس نے اشارے سے مجھے انتظار کرنے کو کہا۔ چوکیدار آہستہ آہستہ آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ گیٹ پر پہنچ جانے کے بعد وہ کچھ بڑبڑایا۔ غالباً اس نے ان کی مذمت کی ہوگی جو

مہمان تو کسی اور کے گھر آئے تھے لیکن اپنی گاڑی کو چوہدری صاحب کے گھر کی طرف پارک کر گئے تھے۔ پھر وہ پلٹا اور گیٹ کی کنڈی لگانے لگا۔ ہم سب سانس روکے بیٹھے تھے۔ اس کی نگاہ غلطی سے بھی اس گوشے میں چلی جاتی تو وہ ضرور چونکتا۔ اور میں فیصلہ کر چکا تھا کہ جیسے ہی چوکیدار نے لاش کے قریب جا کر تصدیق کی ضرورت محسوس کی، میں اسے جالوں گا اور کوشش کروں گا کہ اس کے حلق سے آواز نہ نکلنے پائے۔

چوکیدار نے واپسی کے لیے قدم بڑھائے تو میں نے گہری سانس لی۔ مجھے احساس ہوا کہ میرے ماتھے پر سردی کے باوجود پسینے کی نمی پھیل گئی تھی۔ یہ بات مجھے بعد میں سمجھ آئی کہ چوکیدار اس لاش کو کیوں نہ دیکھ سکا۔ لاش اگر عام کپڑوں میں ہوتی تو سیاہی میں سفیدی کی جھلک اسے ضرور متوجہ کرتی مگر لاش کالے کمبل میں لپٹی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ جاتے وقت اس کی نظر دیوار کے اوپر سے باہر کھڑی ہوئی گاڑی کی چھت کو دیکھ رہی تھی اور لوٹتے وقت اس کی پشت لاش کی طرف ہو گئی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ رائفل اٹھائے ہمارے بہت قریب سے گزرا۔ اس وقت ایک چھینک بھی آ جاتی تو بم کے دھماکے سے کم نہ ہوتی۔ مشن کی کامیابی کے امکانات شمار کرتے وقت انسان ایسی بدقسمتی کے امکانات کو کتنی آسانی سے نظر انداز کر دیتا ہے۔ میں نے محسن اور ٹیڈی کو کام پھر شروع کرنے کا اشارہ کیا اور خود بھی ان کے ساتھ شریک ہو گیا۔ کام زیادہ جسمانی مشقت کا نہیں تھا لیکن احتیاط کے تقاضے بہت مشکل تھے۔ ابھی تک گڑھا ایک فٹ ہو گیا تھا اور ہم میں سے کسی نے خفیف سی آواز بھی نہیں نکالی تھی۔ بیلچہ انتہائی خاموشی سے مٹی نکالتا جا رہا تھا اور اس کی سرسراہٹ صرف ہمارے کان سن سکتے تھے۔ کوٹھی کے اندر کسی کلاک نے تین بجائے۔ ہمارے پاس اب زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے تھے۔ اس عرصے میں ہمیں کئی کام نمٹانے تھے جن کی ترتیب میرے ذہن میں تھی۔ میں نے محسن اور ٹیڈی کو ہاتھ تیز چلانے کو کہا۔

"ایسے حکم چلا رہا ہے جیسے خرکار ہو۔" محسن نے زیرِ لب کہا۔ "اور ہم کو بیگار میں پکڑ کے لایا ہو۔"

"میں ڈسپلن کا سخت قائل ہوں۔" میں نے کہا۔ "ایم آر ایس کے چیئرمین کی حیثیت سے۔"

"چیئرمین کے انتخاب میں دھاندلی ہوئی ہے۔ میں نہیں مانتا۔" محسن نے کہا لیکن اس کی آواز ایک دم بند ہو گئی۔ کوئی کار ایک دم مڑ کر گیٹ کے سامنے آ گئی تھی۔ ہیڈ لائٹ کی روشنی سیدھی کوٹھی کے بائیں حصے کی خالی جگہ پر آئی لیکن زیادہ لائٹ گیٹ کے بند ہونے کی وجہ سے ہم پر نہیں پڑی۔ پلک جھپکتے میں ہم گڑھے میں سرنگوں ہو گئے۔ چوکیدار نے گیٹ کے دونوں پٹ کھولے تو روشنی کی تیز لکیر ہمارے اوپر سے گزری پھر کار پورچ کی طرف مڑی تو میں نے سر اٹھا کے دیکھا۔ یہ چوہدری دلاور کی کار تھی۔ وہ نہ جانے کہاں سے آ رہا تھا۔ شاید گامے ماچھی سے مل کر یا قصرِ جمشید کے تہہ خانے میں کوئی ضروری کام نمٹا کر۔ اس کے سب ناجائز دھندے رات کے اندھیرے میں ہی کامیابی سے چلتے تھے۔ دن میں وہ ایک شریف اور معزز صنعتکار تھا۔

"چوکیدار!" دلاور نے آواز دے کر کہا۔ "کوئی آیا تو نہیں تھا؟"

"کون آئے گا سرکار؟" چوکیدار نے کہا۔ "میں جو یہاں موجود ہوں۔"

"تم کیا توپ چلاؤ گے؟" دلاور نے حقارت سے کہا۔ "ایس پی صاحب نے ایسے ہی تو نہیں کہا تھا کہ اپنی حفاظت کی فکر کرو۔ وہ تینوں.... غائب ہو گئے ہیں۔" درمیان میں اس نے خاصی رواں سے ایک بھاری بھرکم گالی دی جو میرے، محسن اور رابعہ کے لیے بلاتخصیص استعمال ہوتی تھی۔ میں بھونچکا رہ گیا۔ رضوی صاحب واقعی ذہین افسر تھے، انہوں نے قبل از وقت اندازہ کر لیا تھا کہ ہم تینوں اگر تخریبی کارروائی کریں گے تو اس کا پہلا نشانہ کون ہو گا۔ تقدیر کی کیا ستم ظریفی تھی کہ ایک فرض شناس پولیس افسر ایک ایسے شخص کو خبردار کر چکا تھا جس کے کالے دھندوں کے متعلق اسے کوئی شبہ نہ تھا اور وہ کل تک ہمارا محافظ و نگراں، دوست اور مددگار اور ہم سب کا انکل تھا مگر آج دشمنوں سے زیادہ دشمن تھا۔ رضوی صاحب نے دلاور کو اس لیے بھی گرفتار نہیں کیا تھا کہ اس کے خلاف انہیں کوئی ثبوت نہیں ملا تھا اور کوئی شہادت سامنے نہیں آئی تھی۔ ہماری پوزیشن مختلف تھی۔ وہ جانتے تھے کہ پولیس کے ریکارڈ پر کیا کچھ ہے جو ہمیں مجرم ثابت کرتا ہے۔

دلاور نے چوکیدار کو ہوشیار رہنے کی تاکید کی اور اندر چلا گیا۔ ایک کھڑکی کے پٹ روشن ہوئے جو غالباً دلاور کا بیڈ روم تھا۔ یہ مخالف سمت سے پہلی کھڑکی تھی، اس چھوٹے سے گیٹ کے بالکل سامنے جس سے ہم اندر داخل ہوئے تھے جس کی اندرونی دیوار کے ساتھ طافو کی لاش پڑی تھی اور بیرونی دیوار کے ساتھ ہماری جہازی سائز کی اوپل ریکارڈ کھڑی تھی۔ مجھے ایک بار پھر شدت سے کار کو وہاں پارک کرنے کی غلطی کا احساس ہوا۔ میں نے محسن اور ٹیڈی کو انتظار کرنے کے لیے کہا۔

"ابھی تھوڑی دیر میں دلاور سو جائے گا۔" میں نے کہا، لیکن اسی وقت چٹخنی کھلنے کی آواز آئی اور کھڑکی کے دونوں پٹ کھل گئے۔ روشنی کا ایک مستطیل ٹکڑا باہر پھیلا اور اجالا ہر طرف منعکس ہونے لگا۔

دلاور نے زور سے کہا۔ "اُلو کی پٹھی۔" اور ایک بلی کو باہر پھینک کر زور سے کھڑکی بند کی۔ خوف، کشیدگی اور پریشانی کے باوجود ہم سب نے بڑی مشکل سے ہنسی کو روکا۔ غالباً بلی ہر روز اس کے بیڈ روم کو اپنا میٹرنٹی ہوم بنانے کی خاطر گھس جاتی ہو گی اور وہ ہر رات اسے نکالتے نکالتے عاجز آ گیا ہو گا۔ بلیوں کے معاملے میں میرا اپنا تجربہ ایسا ہی تھا کہ وہ ایک بار گھر دیکھ لیں تو میلوں دور چھوڑ آنے کے باوجود لوٹ آتی ہیں۔ یہاں تک کہ صاحبِ خانہ خود گھر سے نکلنے کی سوچنے لگتا ہے۔

"اسے کہتے ہیں تھیلے میں سے، بلکہ کمرے میں سے بلی نکالنا۔" محسن نے کہا۔ "سسپنس میں میرا دم نکلنے والا تھا۔ خیریت ہوئی کہ اس نے محض غصے کی وجہ سے گرد و پیش پر غور ہی نہیں کیا۔ ورنہ گاڑی تو اسے صاف نظر آ جاتی اور وہ چوکیدار تو ہے نہیں کہ خلافِ معمول کچھ بھی دیکھتا تو نظر انداز کر دیتا۔ وہ تصدیق ضرور کرنے جاتا کہ گاڑی کس کی ہے۔"

"کیا طافو نے مخبری کرتے وقت گاڑی کے متعلق بھی بتا دیا تھا؟" میں نے کہا۔

"میرا خیال ہے نہیں۔" محسن بولا۔ "ورنہ جب انکل رضوی نے چھاپا مارا تھا تو گاڑی منظر کے گھر کے سامنے نہ سہی، چند قدم کے فاصلے پر اسی گلی میں موجود تھی۔"

"انکل کا کچھ بھروسہ نہیں، یہ بھی ان کی چال ہو سکتی ہے۔" میں نے کہا۔ "گاڑی کو قبضے میں لے کر انہیں کیا ملتا۔ اب وہ گاڑی کا تعاقب تو کر سکتے ہیں۔ معلوم نہیں یہاں کی پولیس کے پاس وہ جدید قسم کے سگنل دینے والے آلات ہیں یا نہیں جن سے تعاقب بہت آسان ہو جاتا ہے۔ گاڑی اگر بھیڑ بھاڑ میں کھو جائے یا غچہ دے کر نکلنا چاہے تو پریشانی نہیں ہوتی۔ چھوٹا سا مقناطیسی ٹرانسمیٹر گاڑی کے نیچے کہیں چپکا دیتے ہیں اور وہ ایک مخصوص فریکوئنسی پر مورس کوڈ میں اپنے سگنل نشر کرتا رہتا ہے۔ پیچھے آنے والی گاڑی کے ریسیور میں اس کی ٹیں ٹیں صاف سنائی دیتی ہے۔ بس آواز کے پیچھے چلتے جاتے ہیں۔"

"اگر ایسا ہوتا تو وہ لاہور ہوٹل پہنچ کر ہم تینوں کو شرفِ ملاقات بخشتے۔" محسن بولا۔ "یا اب تک یہاں قدم رنجہ فرما کے اور ہماری کارروائی کو ملاحظہ کر کے ضرور خوش ہوتے۔"

"یار سکندر بادشاہ، گپ شپ چھوڑو۔" ٹیڈی نے ہانپتے ہوئے سرگوشی کی۔ "کیا یہاں کنواں کھودنا ہے؟"

"اچھا اچھا استاد۔ صاف کہو نا کہ دم نہیں رہا۔" میں نے کہا اور محسن نے تائید کی۔

"دم کی بات مت کرو۔ قسم مولا کی۔" استاد ٹیڈی کو جوش آ گیا۔ "تیل نکال کے دکھا سکتا ہوں یہاں سے۔"

"چلو چھوڑو۔ ہماری گاڑی میں پٹرول ہے ابھی۔" میں نے کہا۔ "بس اب اس مٹی کو برابر کر دو۔"

استاد ٹیڈی کے ساتھ محسن نے بھی بے وقوفوں کی طرح میری طرف دیکھا۔ "لاش کا کیا کروں؟"

"لاش کو وہیں رہنے دو۔ زمین برابر کر دو اور چلو۔ وقت کم ہے۔" میں نے کہا۔

"وقت کے گھوڑے، یہ بیگار کس لیے تھی؟ ہم اتنے بے کار تو نہیں تھے۔" محسن بولا۔ "ورنہ کپڑے پھاڑ کے سینا بھی جائز ہوتا۔"

"تنظیم کا بنیادی اصول ہے ڈسپلن۔" میں نے کہا۔ "اور میں بحیثیت چیئرمین کے حکم دیتا ہوں...."

"ایسی کی تیسی چیئرمین کی۔" محسن نے کھودی ہوئی مٹی واپس ڈالتے ہوئے کہا۔ "میں انتخاب کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے تعمیل کرتا ہوں۔"

گڑھے کو پھر مٹی سے پُر کرنا اسے کھودنے کے مقابلے میں بہت آسان کام تھا۔ دس منٹ میں یہ کام ختم ہو گیا اور ہم نے مٹی کو پیروں سے اچھی طرح دبا دیا۔ اس کے باوجود وہ جگہ نمایاں رہی جو کھودی گئی تھی۔ میں نے محسن اور ٹیڈی کو واپسی کا سگنل دیا اور ہم دبے پاؤں لوٹے۔ ایک بار پھر سیاہ کمبل میں لپٹے ہوئے طافو کے بے جان جسم کے پاس سے گزرے تو میرے قدم پل بھر کے لیے رُکے۔ نہ جانے کہاں ایک عورت اپنے بچوں کے ساتھ آنکھیں کھولے لیٹی ہوئی ہو گی۔ ہر روز کی طرح بچوں نے آج بھی پوچھا ہو گا کہ ابا کب آئے گا؟ اور اس نے انہیں تسلی دے کر سلا دیا ہو گا کہ کل وہ ضرور آ جائے گا۔ تمہارا ابا ٹرک چلاتا ہے نا اور کراچی تک جاتا ہے۔ اس کا ٹرک خراب ہو گیا ہو گا یا مالکوں نے اسے پھر کسی ضروری کام کے لیے کہیں بھیج دیا ہو گا اور جب بچے سو گئے ہوں گے تو اس کو پینے چار لاکھ روپوں کا خیال آیا ہو گا جو اس کے پاس کاغذ کے بے مصرف ڈھیر کی طرح موجود تھے۔ یہ کاغذ اس کے شوہر کا نعم البدل نہیں تھے چنانچہ وہ جاگ رہی تھی اور اپنے اندیشوں سے نبرد آزما تھی۔ آج کی رات کے بعد بھی ایسی ہی اَن گنت راتیں آئیں گی، انتظار کی اور تنہائی کے عذاب کی اور بے یقینی کے اندھیروں کی۔ بالآخر وہ کوئی جواب دے کر بچوں کو مطمئن کر دے گی لیکن یہ نہ بتا سکے گی کہ وہ اپنا اچھا بھلا گھر چھوڑ کے اس گوشۂ گمنامی میں کیوں آ گئے ہیں اور ابا آخر ٹرک لے کر کدھر نکل گیا ہے کہ لوٹ کر آنا ہی بھول گیا؟

"چیئرمین کی دُم۔" محسن نے میرا ہاتھ پکڑ کے کھینچا۔ "یہ تیرے بریک کہاں جام ہو گئے ہیں۔ کیا طافو کو بھی واپس لے جانا ہے؟ یہ کیا ایکسرسائز تھی؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے چونک کر کہا۔ "طافو کو یہیں سونے دو۔ اس کی تجہیز و تکفین چوہدری ... گے۔"

محسن نے اور ... وہ سمجھ گیا تھا کہ میرے ذہن میں لاش کو دفن کرنے کا منصوبہ تھا ... میں بلکہ میں اس لاش کو کسی مؤثر قسم کی جارحانہ کارروائی کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے گاڑی کی

چابی اسے دی کیونکہ میں بہت تھکا ہوا تھا۔ اگر یہ رات سکون سے سو کر گزر جاتی تو گزشتہ شب کی تھکان ختم ہو جاتی لیکن مقدر میں ایک اور شب بیداری لکھی تھی۔ اور یہ مسلسل دوسری رات تھی جو شدید اعصابی انتشار اور دباؤ سے میرا حوصلہ آزما رہی تھی۔

"گاڑی کو ریورس میں مت ڈالنا۔" میں نے کہا۔ "کونے پر گٹر کا مین ہول کھلا پڑا ہے۔"

"سامنے راستہ نہ ملا تو پھر بہت آگے سے لوٹنا پڑے گا۔" محسن نے کہا اور گاڑی کو الٹا چلاتا ہوا واپس لے گیا۔ میں ٹرن کے قریب پہنچ کر اتر گیا اور محسن کو ہدایات دیتا رہا یہاں تک کہ گٹر کا اندھا غار گاڑی کے نیچے سے اگلے اور پچھلے دونوں پہیوں کے درمیان سے نکل گیا۔ میں پھر اپنی جگہ پر آبیٹھا اور گاڑی صاف سڑک پر بے آواز انجن کی بھرپور قوت کے ساتھ دوڑنے لگی۔

"اب کدھر جانا ہے اور کیا کرنا ہے؟" محسن نے ٹیڈی کو اس کے گھر کے سامنے ڈراپ کرنے کے بعد کہا۔

"ہمارے حلیے خراب ہو رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہاتھ پیر اور کپڑے سب مٹی میں بھرے ہوئے ہیں۔ اس حالت میں نہ ڈاکٹر امجد اپنے ہوٹل لوٹ سکتے ہیں اور نہ نواب ننھے خاں۔"

"یہ تو اس قسم کے مشن پر آنے سے پہلے سوچنا تھا۔" محسن نے کہا۔ "واپس ٹیڈی کے گھر جا کر سو جاتے ہیں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "سونا کیسا نورِ چشم۔ ایکشن تو اب شروع ہوگا۔ یہ تو ہم نے ایک سیٹ لگایا تھا اور اگلے سین کی شوٹنگ کا آغاز میری ٹیلی فون کال سے ہوگا لیکن یہ فون کسی پبلک کال آفس سے کرنا ٹھیک نہیں لگتا۔ لمبی کال ہوگی جو کوئی نہ سنے تو بہتر ہے۔ میرا خیال ہے کہ تمہارے ہوٹل چلتے ہیں۔"

"کیوں نواب ننھے خاں اور پرنسس صوفیہ کی مٹی پلید کراتا ہے۔ اس مٹی کے ساتھ تشریف لے گئے تو ہوٹل والے سمجھیں گے کہ نوابی تو صرف نام کی ہے۔ ننھے خاں پارٹ ٹائم گورکن ہیں۔" محسن بولا۔ "جو زیادہ غلط بھی نہیں۔"

"تو پرنسس کو فون کر۔" میں نے کہا۔ "راستے میں کسی بھی جگہ سے۔ اس سے کہہ کہ تیرے دو جوڑے لے کر نیچے آجائے۔ بنڈل بنا لائے اور کاؤنٹر پر دے دے کہ ابھی کوئی لینے آئے گا۔ یا چھوڑ۔ وہ خود ایک بریف کیس میں ڈال لائے۔ ہم باہر گاڑی میں انتظار کریں گے اور کہیں بھی مناسب جگہ دیکھ کر بدل لیں گے۔ وہ جاگ ہی رہی ہوگی۔"

"تیرے فراق میں؟" محسن نے قہقہہ مارا۔ "مجھے تو شک ہے وہ جاگ ہی نہ گئی ہو کہ بھاڑ میں گیا ایسا عشق جس میں سو پیاز اور پھر سو جوتے۔ پھر پیاز اور پھر جوتے۔ محبت نہ ہوئی قید بامشقت ہو گئی۔"

"لگالے شرط وہ جاگ رہی ہوگی۔" میں نے ہاتھ بڑھایا۔

"سودا پکا ہو گیا۔"

مجبوراً محسن نے ہاتھ ملایا اور ہم نے میو اسپتال کے ایکسچینج سے ہوٹل فاران کا نمبر ملا کے پرنسس صوفیہ کا نمبر گھمایا۔ حسب توقع آپریٹر نے بتایا کہ پیغام دے دیا جائے۔ وہ محوِ خواب ہیں اور انہیں ڈسٹرب نہیں کیا جا سکتا۔

"کون گستاخ ہے؟" محسن نے گلا پھاڑ کے کہا۔ "ابے ہم نواب ننھے خاں ہیں۔ غصہ آگیا تو ہوٹل کو اصطبل بنا دیں گے۔ لات مار کے نکال دیں گے اور تیرا یہ ایکسچینج توڑ دیں گے۔ پرنسس کے چچا فوت ہو رہے ہیں نامعقول۔"

میو اسپتال کے ٹیلی فون آپریٹر نے ہمارے مشکوک حلیے دیکھے اور اس بے سروپا گفتگو پر غور کیا۔ میں نے اسے پچاس کا ایک نوٹ پیش کیا اور کندھے پر تھپکی دی تو اس نے خاموش رہنا بہتر سمجھا۔ ایک منٹ بعد محسن کا چہرا اتر گیا۔

"پرنسس۔ معافی ہم نے آپ کو خواب شیریں سے بیدار کیا....." محسن بولا۔

میں نے ریسیور چھین لیا۔ "تم سو رہی تھیں؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ سونے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔" رابعہ نے کہا۔ "محسن کہاں چلا گیا ہے؟"

"تم ایسا کرو کہ اس کے دو جوڑے بریف کیس میں ڈالو اور نیچے آجاؤ۔ گیٹ کے باہر ہم اسی اوپل ریکارڈ میں ملیں گے۔ دراصل ہمارے کپڑے خراب ہو گئے ہیں اور ان کپڑوں میں ہم اندر نہیں آسکتے۔" میں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔ محسن نے سو کا نوٹ نکالا اور میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ آپریٹر نے پھر سر کھجایا۔ یہ کارروائی اس کی ناقص عقل میں کیسے آتی۔ ہم اسے حیران پریشان چھوڑ کے باہر نکل آئے۔ میں نے محسن کی گدی پر ہاتھ مارا۔ "اور وہی چیونٹی کے ساتھ، ہم نے آپ کو خوابِ شیریں سے بیدار کیا۔" میں نے اس کی نقل اتاری۔ "شیریں اپنے فرہاد کے لیے جاگ رہی تھی۔"

"تم دونوں نے مل کر بے ایمانی کی۔" محسن بولا۔ "تو نے ٹیلی پیتھی سے پیغام دیا اور اس نے جھوٹ بول دیا۔"

ساڑھے چار بجے رابعہ بریف کیس لیے نمودار ہوئی۔ "یہ کیا بکواس ہے؟" اس نے اندر منہ ڈال کے ہم دونوں کو باری باری ملاحظہ کیا۔ "کس لیے کیا ہے ایسا میک اپ؟"

"جاؤ بی بی۔ جاگ کے اب تو سو جاؤ۔" محسن نے جھنجلا کے کہا۔ "ہماری اصل صورت ہے۔ میک اپ نہیں ہے۔"

"ہم ابھی دو منٹ میں آتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "تم یہیں انتظار کرو۔" اور گاڑی آگے بڑھا دی۔ سو گز کے فاصلے پر ایک تاریک اور ویران نظر آنے والی کوٹھی میں داخل ہوتے وقت میں نے ہیڈ لائٹس آف کر دیں۔

"ایم آر ایس کے معزز اراکین، یہاں لباسِ فاخرہ تبدیل کر لیں۔" میں نے کہا: "اندھیرا بھی ہے اور تخلیہ بھی۔"

"یہ تو بڑی بے شرمی کی بات ہوگی۔" محسن نے کہا "اور ہم خاندانی نواب ابنِ نواب۔"

"نواب ... پردہ ہوتا ہے آنکھ کا۔ ہم اپنی آنکھیں بند کرتے ہیں۔" میں نے کہا "اور آپ کو تین منٹ دیتے ہیں۔"

پانچ منٹ بعد ہم صاف ستھرے شریفانہ لباس میں لوٹے تو رابعہ ہوٹل کے دروازے پر اکیلی کھڑی ہوئی پریشان ہو رہی تھی۔ آنے جانے والے اسے کوئی غلط قسم کی عورت سمجھ رہے تھے۔ اس وقت کون سی شریف عورت یوں تنہا کھڑی ملتی ہے اور وہ بھی ایک ہوٹل کے صدر دروازے پر۔ ہم نے اسے ساتھ لیا اور گاڑی اندر جا رکی۔ کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے کلرک نے سر اٹھا کے ہمیں دیکھا اور غالباً اس مشکوک صورتحال پر غور کیا کہ پرنس ابھی کچھ دیر پہلے مختصر سا سوٹ کیس لے کر کہیں گئی تھی اور واپسی میں اپنے بھائی نواب ننھے خاں کے علاوہ ایک اور شخص کو ساتھ لے آئی۔ لیکن ہوٹل میں یہ سب کچھ ہوتا ہی رہتا ہے اور ایک معمولی کلرک کو وہاں صرف ریزرویشن کے لیے بٹھایا جاتا ہے۔ پبلک کے افعال و کردار کی نگرانی کے لیے نہیں۔

"ہوٹل کلرک نے بھی میرے بارے میں اچھی رائے قائم نہیں کی۔" رابعہ نے اوپر جاتے ہوئے کہا۔

"اگر ہم مٹی کے پتلے بنے ہوئے آجاتے تو وہ ہمارے بارے میں اس سے بھی بری رائے قائم کرتا۔" محسن نے جواب دیا۔

"مگر بقول شاعر یہ ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں۔ اصل رائے وہ ہے جو ہم اپنے بارے میں رکھتے ہیں۔" میں نے کہا۔

کمرے میں پہنچتے ہی میں نے ریسیور اٹھایا اور آپریٹر کو چوہدری دلاور کا نمبر دیا۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی چنانچہ اس بات کا امکان نہیں تھا کہ آپریٹر ہماری گفتگو سنے گا۔ تین منٹ بعد دلاور کی آواز آئی "ہیلو۔" نیند سے بوجھل آواز اور بیزار لہجے سے میں نے اندازہ کیا کہ وہ ابھی سویا ہی ہوگا اور ایسے وقت میں ٹیلی فون کی مداخلت اسے گراں گزری تھی۔

"اپنے چوہدری صاحب، گڈ مارننگ۔" میں نے بشاشت سے کہا "آپ کا پارٹنر بول رہا ہوں۔ الیگزنڈر دی گریٹ۔"

"اچھا۔ تو اب اتنی ہمت ہوگئی ہے تمہاری کہ تم ...؟" وہ ایکدم غصے سے بے قابو ہوگیا۔

"میں نے تو آپ کی بھلائی کی خاطر فون کیا تھا۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "اب دیکھیں نا جب اس سے پہلے ہم نے آپ کو ایک گفٹ پارسل بھیجا تھا تو پہلے سے اطلاع کر دی تھی کہ سنیں ہر حرکت آپ کے لیے زحمت بن گیا تو ہمارا کیا قصور؟"

"تم فکر مت کرو۔ ایسے ہتھکنڈوں سے تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے سکندر۔" وہ بولا "میری ضمانت منظور ہوگئی ہے اور مقدمہ بھی بالآخر ختم ہو جائے گا۔ میں تمہاری طرح مفرور نہیں ہوں۔"

"مفرور! لا حول ولا قوۃ چوہدری صاحب۔ آپ کے مقابلے پر ہم کس بات پر غرور کریں گے۔" میں نے کہا "نہ آپ کے برابر عمر، تجربہ، دولت اور اثر و رسوخ۔ اور نہ خاندانی شرافت اور عزت۔ بس فرق یہ ہے چوہدری صاحب کہ سارے کھیل تقدیر کے ہیں۔ صبح ہونے تک تقدیر کیا گل کھلاتی ہے؟ یہ آپ نہیں جانتے ہم جانتے ہیں۔"

"فضول باتوں کے لیے وقت نہیں ہے میرے پاس۔ فون کیوں کیا تھا؟" اس نے لہجے سے بے نیازی کا تاثر دینے کی کوشش کی مگر میں نے محسوس کیا کہ اس کا تجسس آمیز خوف اسے بیدار کر چکا ہے۔

"ابھی تو آپ کو یہ بات فضول لگے گی مگر ہمارا کام تو وقت پر خبردار کرنا تھا۔ ہم کم ظرف دشمن نہیں ہیں کہ چھپ کر وار کریں۔ بلکہ گھر میں آپ کچھ کر سکتے ہیں تو کر لیں۔" میں نے کہا "پھر صبح کا اجالا پھیل جائے گا تو دنیا دیکھے گی۔"

"کیا دیکھے گی؟ کیا مطلب ہے اس بکواس کا؟" دلاور نے کہا۔ اس کی آواز میں اب گھبراہٹ بہت نمایاں تھی۔

"مطلب تو اب تمہیں کھود کر نکالنا پڑے گا۔" میں نے کہا "اپنے محل کے پائیں باغ سے۔ مطلب کا نام ہے الطاف عرف طافو۔"

"کون طافو؟ میں کسی الطاف عرف طافو کو نہیں جانتا۔" وہ بولا۔

"صورت دیکھو گے قبر سے نکال کے تو شناخت کر لو گے۔ ہم رحمت کو بھی تو پہچان ہی لیا تھا تم نے۔" میں نے قہقہہ مارا "وہ کباڑی تھا اور یہ ٹرک ڈرائیور۔ پہلے ٹرک اللہ کو پیارا ہوا پھر رحمت صندوق میں چھپ کر تمہارے گھر پہنچا اور اب یہ طافو تمہارے گھر کی زمین میں گھس کر لیٹ گیا ہے۔"

"جھوٹ بولتے ہو تم۔ یہ کہنا چاہتے ہو مجھ سے کہ تم اسے یہاں گھر میں دفن کر گئے ہو؟" وہ نروس ہونے لگا۔

"کیا یہ کوئی بہت مشکل کام ہے؟" میں نے حیرانی سے کہا "ہم نے تو اس سے کہیں زیادہ مشکل کام کیے ہیں۔"

"یہ ... ناممکن ہے۔ گیٹ پر چوکیدار کھڑا ہے۔ وہ تمہیں دیکھتے ہی گولی مار دیتا۔" وہ بولا "اسے یہی حکم ہے اور میں نے اس کو تمہاری تصویر بھی دے دی ہے۔"

"تصویر سے تو شاید وہ کچھ نہ بتا سکے۔" میں نے کہا "لیکن ایک بات کی تصدیق وہ کر سکتا ہے۔ ابھی دو گھنٹے پہلے اُس نے تمہارے گھر کی عقبی دیوار کے قریب ایک کار کھڑی دیکھی تھی۔ ایک اوپل ریکارڈ ماڈل ۱۹۶۶ء۔ نیلا رنگ، بجھا کر ہیڈ لائٹس۔ اور اس نے گاڑی کو دیکھ کے بعد کھلا ہوا گیٹ بھی بند کیا تھا۔ وہ چھوٹا سا گیٹ جو پیچھے کی طرف ہے۔ میں پھر فون کروں گا۔ دو منٹ بعد۔" میں نے ریسیور رکھ دیا۔

"اس نے ایکسچینج کو بتا دیا تو کال ٹریس ہو جائے گی۔" محسن نے تشویش سے کہا۔ وہ اور رابعہ میری گفتگو بڑی دلچسپی سے سن رہے تھے۔

"عام حالات میں وہ کرتا مگر ایک تو وہ نروس ہے۔" میں نے کہا "پھر میں نے اسے دو منٹ کی مہلت دی ہے۔ دو منٹ میں وہ چوکیدار سے بھی بات نہیں کر پائے گا۔ ایکسچینج سے کیا کہے گا۔"

"پھر بھی احتیاط بہتر ہے۔" رابعہ نے کہا "عام لوگوں کے لیے یعنی ان لوگوں کے لیے جن کے کمروں میں ٹیلی فون لائن نہیں ہے، نیچے ہال میں پبلک ٹیلی فون ہے۔ شیشے کا ایک کیبن سا ہے۔ اندر کی آواز باہر سنائی نہیں دیتی۔"

"اچھا! یہ تم نے کام کی بات بتائی عزیزہ۔" میں نے کہا "تم قیام کرو۔ ہم نیچے سے دوسری کال کرتے ہیں۔"

اوپر سے نیچے تک آتے آتے ہمیں تین منٹ ہو گئے تھے۔ میں نے اور محسن نے کیبن میں گھس کر دروازہ بند کیا اور پھر نمبر ملایا۔ دلاور تصدیق کے بعد بہت بے چینی سے کال کا انتظار کر رہا تھا کہ اس نے گھنٹی بجتے ہی ریسیور اٹھا لیا۔ "چوکیدار نے کسی کو نہیں دیکھا۔" وہ مجھ سے پہلے بولا "گاڑی نہ جانے کس کی تھی؟"

"جی؟" میں نے آواز کو بھاری بنا کے اور لہجہ بدل کے کہا۔ "کیسا چوکیدار اور کس کی گاڑی؟"

"اوہ ... وہ ... آپ کون ہیں؟" دلاور بوکھلا گیا۔ "دراصل میں ایک اور کال کے انتظار میں بیٹھا تھا۔"

"ہمیں خوشی ہوئی یہ جان کر کہ تم انتظار کر رہے تھے۔" میں نے اصل آواز میں کہا "اس کا مطلب یہ ہے کہ بکواس قرار دینے کے باوجود تم کو ہماری بات پر تھوڑا بہت اعتبار ضرور آگیا ہے۔ تقریباً ستر فیصد۔"

"تم اب پولیس کو فون کرو گے نا؟" دلاور کا حوصلہ جواب دے گیا۔ "کہ دلاور کے گھر میں فلاں جگہ ایک لاش دفن ہے۔ کر دو۔ میں آج سارا دن گھر سے باہر رہا ہوں۔ رات تک جہاں جہاں میں گیا میری موجودگی کے گواہ ہیں۔"

میں نے قہقہہ مارا "تم اتنے بے وقوف تو نہیں ہو دلاور۔ تم کو بھی معلوم تو ہوگا کہ ان گواہوں کی باری تو بہت دیر میں آئے گی اور کون جانے ان میں سے کتنے گواہ منحرف ہو جائیں۔ قتل کے کیس میں کوئی اپنی گردن نہیں پھنساتا چوہدری صاحب۔ اور ہم پولیس کو فون کریں گے یا نہیں، اس کا انحصار تمہارے رویے پر ہے۔"

"مجھ سے کیا چاہتے ہو تم؟" دلاور نے قدرے تذبذب کے بعد کہا "کیا شرائط ہیں ...؟"

"ہماری شرائط؟ تم پوری کر سکو گے؟ مثلاً میں کہوں کہ مجھ پر جتنے مقدمات ہیں سب ختم کرا دو صبح تک۔" میں نے کہا۔

"تم سے میں ایسی شرط کی توقع نہیں رکھتا۔ صبح تک تو نہیں۔ لیکن..."

میں کوشش کروں تو۔۔۔۔"

"ہر مقدمے کا رُخ بدل سکتا ہے؟" میں نے کہا: "وکیلِ استغاثہ کے دلائل، گواہوں کے بیانات، ہر ثبوت اور شہادت کو بدلا جا سکتا ہے۔" میں نے کہا: "ویری گڈ۔ تم کچھ تعاون پر آمادہ نظر آتے ہو۔ اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم خود نہیں بدل جاؤ گے؟ تمہاری زبان پر کیسے اعتبار کر لوں۔"

"میں کیسے اعتبار کر لوں کہ تم مجھے بلا وجہ ہراساں نہیں کر رہے ہو؟" وہ جھلا کے بولا۔

"ارے چوہدری صاحب، آپ بھی ہراساں ہو سکتے ہیں؟ کبھی دیکھا نہیں آپ کو پریشان ہوتے۔" میں نے کہا: "ویسے بلا وجہ میں ہراساں کر رہا ہوں یا میری بات واقعی قابلِ توجہ ہے۔ اس کا ایک ثبوت تو دیا تھا میں نے۔ دوسرا ثبوت خود اپنی آنکھوں سے ملاحظہ فرمالیں۔ آپ کے گھر کے پیچھے جہاں پانی کی موٹر نصب ہے وہیں ٹارچ لائٹ سے دیکھیں۔ آپ کو الطاف کا مدفن نظر آجائے گا۔ تازہ کھدی ہوئی زمین ہموار کر دی جائے پھر بھی پتا تو چلتا ہے۔ اور آپ کی نظر تو ماشاء اللہ... چوہدری صاحب! ہیلو!"

میں نے ریسیور رکھ دیا اور قہقہہ مارا: "بڑی افراتفری میں دوڑا ہے سالا۔ ابھی دن میں تارے... نہیں۔ اس وقت تو محاورہ یوں ہوگا کہ رات کو سورج نظر آجائے گا۔" میں نے پھر ایک نمبر ملایا۔

"ہاں بھئی کیا بات ہے؟" کسی نے خالص تھانیداروں کے لب ولہجے میں کہا۔

"ایس ایچ او سے بات کرنی تھی۔" میں نے کہا: "ایک قتل کا کیس ہے۔"

"تو ضروری ہے ایس ایچ او کو بتانا؟" ڈیوٹی پر موجود افسر نے کہا۔ "او میاں ہم بھی دس سال سے ایس آئی ہیں۔"

"اچھا ایس آئی صاحب، آپ کے علاقے میں قتل کی ایک واردات ہوئی ہے۔" میں نے کہا: "الطاف عرف طافو نام کا ایک ٹرک ڈرائیور تھا۔ اسے آج دن میں چھرے سے ذبح کر دیا گیا ہے اور اس وقت قاتل اس کی لاش کو زمین میں گاڑ رہے ہیں۔ آپ اگر جلدی کریں تو جائے واردات پر پہنچ کے سب کو گرفتار کر سکتے ہیں اور لاش بھی برآمد کر سکتے ہیں جو وہیں پڑی ہے۔"

"تم کون ہو؟ یہ سب کچھ کیسے جانتے ہو؟ نام بتاؤ اپنا۔" سب انسپکٹر ایک دم چوکنا ہو گیا۔

"میں اپنا نام نہیں بتا سکتا جی۔ اسی گھر کا ایک معمولی سا ملازم ہوں، ڈرتا ہوں۔" میں نے کہا: "چوکیدار رکھا تھا مجھے مگر جناب میں لعنت بھیجتا ہوں اس نوکری پر۔ کل کو یہی انجام میرا ہو سکتا ہے۔"

"اوہ یار! اپنی بک بک بند کرو۔ بتا بتاؤ کس نے قتل کیا ہے؟" سب انسپکٹر گرم ہونے لگا۔

"وہ جی... چوہدری دلاور۔ بہت بڑے آدمی ہیں۔" میں نے کہا۔ "فیکٹری کے مالک ہیں۔"

سب انسپکٹر نے مجھے گالی دی: "فیکٹری کا مالک ہو یا مل کا، اس کے لیے تو ایک ہی پھانسی کا تختہ ہے۔"

"بس جی آپ جلدی کریں گے تو رنگے ہاتھوں پکڑ لیں گے۔" میں نے کہا: "ابھی میں نے ایس پی ضامن رضوی صاحب سے بھی بات کی تھی، انہوں نے کہا تھانے والوں کو بتا دو۔"

"ایس ایس پی... وہ کیا لگتا ہے تمہارا ماما؟" سب انسپکٹر بولنے لگا: "جلدی جلدی کرتا ہے پتا بتاتا نہیں۔"

میں نے اب پولیس کی بھرپور کارروائی کو یقینی بنا لیا تھا۔ اب انسپکٹر اب رشوت لے کر بیٹھنے والا بھی نہیں تھا کیونکہ اس کے علم میں یہ بات ایس ایس پی صاحب تک پہنچ چکی تھی۔ میں نے اسے دلاور کا پتا اور لاش کا محلِ وقوع دونوں بتا دیے تھے اور یہ بھی کہ ایس پی صاحب کا خانساماں میرا گرائیں ہے۔ اس لیے میں نے اتنی جرأت کی ورنہ ایک غریب چوکیدار میں تو تھانے فون کرنے کی ہمت ہی نہیں ہو... اوپر پہنچتے ہی محسن نے مجھے بڑے جوش سے گلے لگایا اور میرے بلائیں لے کر انگلیاں چٹخائیں۔

"برخوردار نورِ چشم۔ واللہ دل خوش کر دیا اس وقت تم نے ہمارا۔ تم واقعی چیئرمین بننے کے مستحق تھے۔" اس نے بیڈ پر ایک قلابازی لگائی اور حلق سے مرغ جیسی آواز نکالی۔ رابعہ نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

"یہ تو اچھا بھلا گیا تھا نیچے۔" وہ بولی: "اسے کیا ہو گیا ہے؟"

"جو ہونے والا ہے وہ دوسرا ایٹم بم کا دھماکا ہے بی بی۔ یک نہ شد دو شد۔" وہ آنکھیں بند کر کے بولا: "ہم بتاتے ہیں کیا ہونے والا ہے۔ ہماری آنکھیں سب دیکھ رہی ہیں۔ چوہدری دلاور نے چوکیدار کو... لیا ہے۔ وہ کدال بیلچے کی تلاش میں بھاگا پھر رہا ہے۔ اسے گھر کے ... ہی سب مل گیا ہے۔ مالی اپنے باغبانی کے آلات گیراج میں رکھتا ہے۔ اب وہ چلا رہا ہے اور چوکیدار کو گالیاں دے رہا ہے اور اسے کھودنے کا حکم دے رہا ہے۔ چوکیدار سخت پریشان اور ڈرا ہوا... یہ کون ہے؟ او ہو۔ یہ تو اندر سے اس کی زوجہ نکل آئی ہے۔ بیوی کی نہیں، چوہدری دلاور کی۔ وہ شور ہنگامے سے جاگ اٹھی تھی۔ دلاور اسے اندر دفع ہو جانے کو کہہ رہا ہے۔ اس کو یقین ہے کہ آدھے گھنٹے میں وہ لاش برآمد کر لے گا اور کہیں پھینک آئے گا۔ مگر یہ کیا... یہ تو دوسرا منظر ہے۔ تھانے سے ایک جیپ روانہ ہو رہی ہے... میں کون بیٹھا ہے۔ ایک تھانیدار، چار مسلح سپاہی مع ہتھکڑی... اس وقت تھانیدار اتنی نفری کے ساتھ کہاں جا رہا ہے؟ او ہو... چوہدری صاحب کے گھر جا رہے ہیں۔ چوہدری صاحب گڑھا کھودتے ہوئے پکڑے جائیں گے۔ کوئی نہیں ملنے گا کہ وہ لاش کھود کر نکال... تھے۔ لاش تو پچاس فٹ دور کمبل میں لپٹی ہوئی پڑی ہے اور یہ... عرف طافو کی لاش ہے۔ وہ اسی کو گاڑنا چاہتے تھے۔ طافو کو واقعی...

گیا ہے اور حضرات و خواتین، کڑی سے کڑی مل گئی ہے۔ چوہدری صاحب تو پہلے ہی رحمت کبا ڑی کے قتل کے الزام میں ملوث تھے اطافو بھی تو رحمت کباڑی کے ساتھ تھا۔ مقابلہ بہت سخت ہے اور لیجیے حضرات سکندر بخت کی ٹیم نے یہ دوسرا گول کر دیا ہے۔ بہت ہی خوبصورت موومنٹ بنائی تھی۔ سکندر نے محسن کو پاس دیا۔ محسن نے ٹیڈی کو۔ ٹیڈی سے طافو پھر سکندر کے پاس آیا۔ اور گول۔" وہ چلایا۔ وہ واقعی پاگل ہو گیا تھا۔ اس پر اچانک انکشاف ہوا تھا کہ میں نے چوہدری دلاور کو دوسری بار کتنی صفائی سے شکار کیا ہے۔ اسے پھڑپھڑانے کی مہلت بھی نہیں ملی ہوگی۔ میں نے جوا کھیلا تھا اور فرض کر لیا تھا کہ پولیس اتنی ہی دیر میں جا پہنچے گی جتنی دیر میں دلاور گڑھا کھودنا شروع کرے گا یا اسے کھودنے کے بعد پریشان کھڑا ہوگا کہ آخر میرے اس مذاق کا مطلب کیا تھا۔ مجھے سو فیصد نہیں نوّے فیصد امکانات یا نسہ اپنے حق میں پلٹنے کے نظر آتے تھے لیکن میری چال کامیاب رہی یا نہیں، اس کا پتا صبح ہونے سے پہلے نہیں چل سکتا تھا۔

محسن اب تفصیل سے رابعہ کو بتا رہا تھا کہ چوہدری دلاور پر دوسرے قتل کا یقینی الزام آنے کے بعد اس کی ضمانت منسوخ ہو جانا بھی یقینی ہے۔ "بہت ہوشیار بنتا تھا اُلّو کا پٹھا۔ اب سمجھ لو کہ گیا پھانسی کے تختے پر۔ کس کس بات کو جھٹلائے گا۔ پہلے والا کیس بھی بہت خراب ہو گیا تھا کیونکہ پہلے اس نے انکار کیا اور انسپکٹر سے لڑ پڑا تھا۔ پاگل ہو جائے گا آج تو وہ۔ مگر ہتھکڑی اور جیل سے اس کا باپ بھی نہیں بچا سکتا اسے۔" وہ بہت جوش میں تھا اور پٹاخے کی طرح اُچھل رہا تھا۔ رابعہ کا چہرہ تمتمانے لگا تھا اور میں خود اعصابی ہیجان میں مبتلا تھا۔

"ایسے بچوں کی طرح شور مچانے سے کچھ نہیں ہوگا ننھے۔ میرا مطلب ہے نواب ننھے خان۔" میں نے کہا: "وہ لوگ بروقت وہاں پہنچ گئے تو ضابطے کی کارروائی میں کچھ وقت لگے گا۔ دلاور انہیں دے دلا کر معاملہ دبانے کی پوری کوشش کرے گا مگر اب وہ سب انسپکٹر ماننے والا نہیں ہے۔ اسے اپنی نوکری خطرے میں نظر آئے گی۔ ملزم سمیت وہ لوگ آٹھ بجے تک تھانے واپس آئیں گے اور ابھی بجے ہیں صبح کے ساڑھے چار۔ ڈھائی گھنٹے کے لیے میں سوتا ہوں۔"

"جو سوتا ہے وہ کھوتا ہے۔" محسن نے کہا: "ایم آر ایس کا چیئرمین کھوتا ہے۔"

میں جوتوں سمیت رابعہ کے بستر پر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ بستر میں سے اس کے وجود کی مہک اٹھ رہی تھی۔ وہی حواس پر چھا جانے والی اور ہوش سے مدہوش کر دینے والی خوشبو جو اس کے قرب میں بھی محسوس ہوتی تھی۔ نہ جانے کیسے میرے اعصاب کی کشیدگی کم ہونے لگی اور میرا ذہن پُرسکون ہوتا گیا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے اس کے ہاتھ آہستہ آہستہ مجھے تھپک رہے ہیں۔ تصور عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر۔ رات کے آخری پہر میں اُترنے والی شبنم کی پھوار میں بڑی لطیف ٹھنڈک تھی۔ نسیم سحر کے جھونکے خوابیدہ کلیوں کو جگا رہے تھے اور سورج کی پہلی کرن کی نوید دے رہے تھے۔ اور کلی چٹکنے لگی تھی، مُسکرانے لگی تھی، خوشبو اور رنگ کا جادو جگانے لگی تھی۔ گہرا نیلا آسمان حدِ نظر تک پھیلا ہوا تھا اور افق کی لکیر تک سرسوں کے زرد پھول کھلے ہوئے تھے۔ رابعہ نیلے رنگ کی ساری میں پہلی بار مجھ سے ملی تھی تو اُس کے آنچل پر پیلے پھول جگمگا رہے تھے۔ "وہ پیلے پھولوں والی زرد ساری کہاں گئی؟"

محسن نے قہقہہ مارا: "بھیا چیئرمین۔ آج لے دیں گے تم کو زرد پھولوں والی ساری۔ شوق سے باندھ لینا۔ ابھی تو ہے نہیں۔"

پانی کے چھینٹے میرے منہ پر پڑے تو میں ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ محسن کو ہنستا دیکھ کر مجھے بھی ہنسی آئی۔ پھر بھی میں یہ نہ سمجھا کہ بات کیا ہے۔ رابعہ کی طرف دیکھ کر مجھے شک ہوا کہ محسن کی ہنسی سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا ہے۔ "کیا ہوا ہے مجھے؟ سینگ نکل آئے ہیں میرے سر پر تو نہیں؟" میں نے آئینے میں اپنی صورت ملاحظہ کی۔

"ایسے کیا نظر آئے گا۔" محسن بولا: "شاعر کہتا ہے جگر کی چوٹ اوپر سے کہیں معلوم ہوتی ہے۔ جگر کی چوٹ اوپر سے نہیں معلوم ہوتی ہے۔ سوتے میں آپ خاتون ایڈووکیٹ سے سوال کر رہے تھے کہ وہ پیلے پھولوں والی نیلی ساری کہاں ہے؟ میں نے ان سے کہا بھی کہ ہے آپ کے پاس ہے تو دے دیں اسے مگر انہوں نے ڈانٹا، بلاوجہ۔ کہ میرے پاس تو ہے نہیں۔"

"اچھا؟" میں نے کہا: "نہیں ہے تو ہونی چاہیے۔ کیا خیال ہے؟"

"اٹھتے ہی شروع ہو گئی لائن میں گڑبڑ۔ چلو تم اٹھ کے نہا لو تو ناشتا کریں۔"

"ارے ایسے نہیں رابعہ۔ یوں کہو۔ اجی اب اٹھ جائیں نا..." محسن نے نقل اتاری: "اللہ ناشتا ٹھنڈا ہو رہا ہے... ارے.... غضب خدا کا۔ مارتی کیوں ہو۔ اچھا بی بی مت کہو ایسے۔ ہماری طرف سے لٹھ مار کے اٹھاؤ۔"

میں تولیہ اُٹھا کے باتھ روم میں گھس گیا اور مجھے یہ سب بہت اچھا لگا۔ اس گھر کی زندگی کی ایک تصویر یا ایک جھلک جو ہنوز ایک خواب تمنا کی طرح ہمارے خیالوں میں آباد تھا اور اس کے خدّوخال وقت کی سخت ترین آزمائش میں بھی روشن رہے تھے۔ ایک نہ ایک دن میرے خیالوں سے نکل کر وہ گھر زمین پر زندہ حقیقت کا رُوپ ضرور دھارے گا۔ بشرطیکہ زندگی نے مہلت دی۔ ایسا ہی ایک شہرِ آرزو اپنی آنکھوں میں بسائے یہاں سے میلوں کے فاصلے پر شہلا بھی آنے والے دن کا انتظار کر رہی تھی۔ اس وقت مجھے تصویر میں اسی کی کمی محسوس ہوئی۔ جیسے چار رنگوں میں چھپنے والی تصویر مکمل تو ہو مگر ایک رنگ سے محروم رہ گئی ہو۔ وہ ہوتی تو میں بھی

اسے چھیڑتا۔ یہ محسن کی ہمت تھی کہ وہ اکیلا ہی ہنس رہا تھا اور ہمیں بھی ہنسا رہا تھا۔ ورنہ باقی دنیا تو خون کے آنسو رُلانے پر آمادہ تھی۔

باتھ روم سے نکل کر میں نے محسن کا ہی سُوٹ پہنا جسے رابعہ نے بڑی صفائی سے پریس کر دیا تھا۔ وہ رضوی صاحب کے گھر سے کوچ کرتے وقت اپنی سفری استری بھی رکھ لائی تھی جو بہت چھوٹی سی اور ہلکی پھلکی تھی مگر کام وہی کرتی تھی جو بڑی استری۔ جب اُس نے مجھے پیش کرتی ہوئی ٹائی دی تو ایک لمحے کے لیے میری اور اس کی نظر ملی اور میرا دل مچلنے لگا کہ یہ سب کچھ چھوڑ دوں اور وہی کروں جو رابعہ نے بہت پہلے کہا تھا۔ اس زمین کے کسی دُور افتادہ اور گمنام گوشے میں وہ گھر بسا لوں جس میں رابعہ ہر روز مجھے اسی طرح بیدار کرے جیسے محسن نے کہا تھا اور وہ اسی طرح...

"بھائی یہ جوتے بھی میں نے پالش نہیں کیے ہیں۔ وضاحت ضروری ہے۔" محسن نے کن انکھیوں سے مجھے دیکھ کر کہا اور ہنسا۔

"تو اگر اسی طرح ہمارے ساتھ رہا تو حالت دن بدن ابتر ہو گی۔" میں نے کہا۔ "شہلا کو بلوا لیتے ہیں۔"

"نہ جانے آج مجھے بھی وہ کیوں یاد آ رہی ہے۔" محسن نے آہ بھر کے کہا۔ "اور اس کے ساتھ ہی اماں کی یاد آتی ہے تو میں اپنے آپ سے نظر نہیں ملا سکتا۔ مجھ سے زیادہ بدقسمت بیٹا کوئی ہو گا جس نے ماں کے قدموں کے نیچے آباد جنّت پا کے گنوا دی۔ اس وقت میں ان کی خدمت کر لیتا تو یہ تمام عمر کی خدمت سے بڑھ کر ہوتا۔"

وہ بے حد سنجیدہ اور جذباتی ہو گیا تھا۔ رابعہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "تم آج ہی چلے جاؤ۔ اپنے ساتھ ہمیں احساسِ جرم میں مبتلا مت کرو۔ ان کی نظر میں تو گناہ گار ہم ہوں گے کہ ان کے بیٹے کو ان سے دور کر دیا ہے۔"

"نہیں۔ تم میری ماں کو نہیں جانتیں رابعہ۔" وہ اُداس ہو کے بولا۔ "انہوں نے تمام زندگی ہم سب کو صراطِ مستقیم پر چلنا سکھایا۔ عام لوگوں کی نظر میں وہ ایک سخت گیر ماں تھیں اور ایک ایسی بیوی جو شوہر پر حاوی رہی لیکن یہ حقیقت ہے رابعہ کہ ان کے بغیر ہم لوگ اس ریوڑ کی طرح ہوتے جس کا گڈریا اتنا کمزور اور بے بس ہو کہ ان کی حفاظت نہ کر سکتا ہو، انہیں جنگلی درندوں سے اور جنگل کے راستوں سے بچا کے سلامتی کے ساتھ گھر نہ لا سکتا ہو۔ میرے والد سرکاری فائلوں پر یقیناً بہت اچھے نوٹ لکھتے ہوں گے اور صحیح فیصلے صادر کرتے ہوں گے مگر ان کے پاس گھر اور ازدواجی زندگی کی ذمّے داریاں نبھانے کے لیے وقت ہی نہ تھا اور وقت اس لیے نہیں تھا کہ ان میں اس کی صلاحیّت نہ تھی۔ مجھے تعلیم کے لیے پردیس بھجوانے کا فیصلہ بھی میری ماں نے ہی کیا تھا۔ حالانکہ مائیں بہت جذباتی ہوتی ہیں۔ اولاد سے جدائی ان پر بھی شاق گزری ہو گی مگر انہوں نے میری بہتری کی خاطر خود پر جبر کیا۔ اور یہ بات میں آج بتا رہا ہوں۔ جب میں نے ان کے متعلق ڈاکٹروں کا حتمی فیصلہ سُن لیا اور خود ان کو بھی معلوم ہو گیا کہ وہ اب چند دن کی مہمان ہیں تو میں نے ان کے پاس رہنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن انہوں نے کہا۔ 'محسن، تو یہاں رہ کے میری کیا مدد کرے گا بے وقوف۔ مقدر کے لکھے کو کون بدل سکتا ہے۔ زندگی کا تو ایک ایک لمحہ دستِ قدرت میں ہے اور کوئی چاہے نہ چاہے اس سے آگے ایک سانس کی مہلت نہیں ملتی۔ فرق صرف یہ ہے کہ کچھ لوگوں کو اس وقت کے آنے سے پہلے کچھ معلوم نہیں ہوتا اور موت اچانک آ لیتی ہے۔ میں تو خوش قسمت ہوں کہ مجھے پہلے پتا چل گیا اور میں نے وہ سب کام کر لیے جو ضروری تھے ورنہ مجھے حسرت ہی رہتی کہ ذمّے داریوں کا بار نہ اتار سکی۔ اب فوزیہ اپنے گھر کی ہو گئی اور وہ خوش ہے۔ تیری فکر تھی تو خدا نے میری سُن لی اور گھر بیٹھے سب انتظام کر دیا۔ خدا کو رحم آ گیا مجھ پر کہ یہ بیمار کہاں چراغ لے کر ماری ماری پھرے گی۔ ہر ماں کو بہو لانے کا ارمان ہوتا ہے اور اس کی نظر خوب سے خوب تر کی تلاش میں اسے در در لیے پھرتی ہے۔ مجھ میں اتنا حوصلہ کہاں تھا۔ شہلا نے میرے کلیجے کو ٹھنڈا کر دیا ہے۔ اب مجھے تیری بھی کوئی فکر نہیں ہے کہ بعد میں تیری... زندگی کیسی گزرے گی۔ خدا تم دونوں کو لمبی زندگی دے۔ تم کو وہ ساری خوشی خود مل جائے گی جس کی سب تمنا کرتے ہیں مگر پاتے خوش نصیب ہی ہیں۔ اس کے بعد بھی میں ٹھہرنے پر مصر تھا مگر انہوں نے کہا کہ ایسے وقت میں سکندر کو مت چھوڑ۔"

میں دم بخود بیٹھا تھا اور خود بھی بے حد افسردہ ہو گیا تھا۔ "یہی کہا تھا انہوں نے؟ وہ خفا نہیں مجھ سے؟"

"نہیں یار۔ یہی تو وہ فرق ہے جو میری آنکھ دیکھتی ہے۔" وہ بولا۔ "ان کی ناراضی وقتی ہوتی ہے۔ جیسے کوئی بچے کو اس کی غلطی پر جھڑک دے یا ایک تھپڑ مار دے اور پھر بھول جائے۔ تیرے لیے ان کے دل میں جذبات کی گہرائی اس سے کہیں زیادہ رہی ہے جتنی مجھے محسوس ہوتی ہے۔ ان کا ایک بیٹا میں تھا تو دوسرا تو شاید۔ ان کی جذباتی وابستگی کا ایک سبب یہ تھا کہ تقدیر نے تیرے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی ماں کو چھین لیا تھا اور تو نے بچپن میں انہی کے دل میں مامتا کا درد پیدا کیا تھا۔ سالہا سال تک میں اور تو ایک ہی گھر کی چھت کے نیچے رہے۔ ایک ساتھ اٹھتے بیٹھتے، سوتے اور کھاتے رہے اور اسکول جاتے رہے۔ خیر جب میں نے بہت ضد کی تو انہوں نے کہا 'محسن، یہ حکم ہے میرا۔' ان کا یہی طریقہ تھا۔ جب وہ کسی مسئلے پر قائل نہیں کر پاتی تھیں تو اس طرح بات ختم کرتی تھیں اور ہم اس کے بعد اختلاف کی جرأت نہیں کرتے تھے لیکن اس دن پہلی بار میں نے ان کے حکم کو بھی نہیں مانا تو انہوں نے خفا ہو کے مجھے قسم دی اور کہا کہ تو نے سکندر کو اکیلا چھوڑا اور اسے... تو میں تجھے دودھ نہیں بخشوں گی۔ اس کے بعد میں مجبور ہو گیا۔"

خاموشی کا ایک بوجھل اور سوگوار وقفہ آیا جس میں...

دور اسلام آباد کے ایک گھر میں لے گیا جہاں دو بیٹوں کی ایک ماں خاموشی سے فرشتۂ اجل کے قدموں کی چاپ سن رہی تھی اور دستِ بدعا تھی کہ اے معبود! ان دونوں کی حفاظت کرنا۔ مجھے اپنی زندگی سے کوئی گلہ نہیں کیونکہ میں نے جو چاہا وہ تیری رضا اور تیری عنایت سے پایا۔ ایسی ہی آسودہ... زندگی ان کو بھی دے جس میں کوئی پچھتاوا نہ ہو اور ہر خوشی بِن مانگے ملے۔

"تجھے ایک اور بات بتاؤں۔" محسن نے کچھ دیر بعد کہا۔ "فوزیہ کے معاملے میں انہیں مایوسی ضرور ہوئی تھی... اور تو یہی سمجھتا ہے نا کہ ان کی خفگی کا سبب اور کچھ نہیں۔ بے شک وہ خفا تھیں تجھ سے لیکن اب نہیں رہیں۔ انھوں نے اعتراف کیا کہ اگر تم دونوں کی شادی ہو جاتی تو شاید فوزیہ خوش نہ رہتی۔ تم دونوں ایک دوسرے کو خوش نہ رکھ پاتے۔ یہ کتنی بڑی بات ہے سکندر۔ کوئی ماں کہہ سکتی ہے کہ اس کی بیٹی میں یہ... خامی ہے۔ خامی ہی ہوئی نا کہ وہ جس کے ساتھ جائے اُسے خوش نہ رکھ سکے۔ تو میری... نظر سے دیکھے تب بھی فوزیہ میں کوئی کمی نہیں تھی۔ اور عورتیں تو عموماً طور پر مردوں کو موردِ الزام ٹھہراتی ہیں۔ مگر انھوں نے حقیقت کو تسلیم کیا اور رابعہ سے ملنے کے بعد انھوں نے صاف کہا کہ یہ قدرت کے کھیل ہیں۔ اور خدا جو کچھ کرتا ہے بہتر کرتا ہے مگر ہم اس کی مصلحت کو نہیں سمجھتے۔ یہ بات انھوں نے میرے اور شہلا کے بارے میں کہی تھی وہی تم دونوں کے متعلق کہی تھی۔ میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔ ایسے وقت میں ان سے کوئی غلط بات منسوب کر سکتا ہوں میں؟"

نہ جانے یہ ذکر کیسے شروع ہوا تھا اور بات کہاں سے کہاں آ گئی تھی۔ میں جوتے کپڑے پہنے بالکل تیار کرسی پر بیٹھا تھا۔ محسن اور رابعہ مجھ سے پہلے تیار ہو گئے تھے۔ ہم ناشتے کے لیے ڈائننگ ہال جانے والے تھے اور اس کے بعد ہمارا خیال تھا کہ چوہدری دلاور کی خیریت دریافت کریں۔ محسن نے تو تجویز کیا تھا کہ ہم مٹھائی کا ایک ڈبا حوالات میں پہنچا دیں جس کے اندر ایک کارڈ پر "ایم آر ایس" کے حروف لکھے ہوئے ہوں اور دلاور کو اس کا مطلب سمجھنے دیں۔ مگر اب ہماری بھوک اُڑ گئی تھی اور ہمیں چوہدری دلاور کا خیال ہی نہ تھا۔

"میں پھر کہتی ہوں محسن کہ تم آج گھر چلے جاؤ۔" رابعہ نے سکوت کے اس وقفے کو ختم کیا۔

"ہاں۔ انھوں نے تمہیں میرے ساتھ رہنے کی تاکید کی تھی۔" اس نے کہا۔ "یہ تو نہیں کہا تھا کہ کبھی خیریت بھی معلوم نہ کرنا۔"

"اگر تم ایک گھنٹے میں روانہ ہو جاؤ تو شام چار بجے تک گھر پہنچ سکتے ہو۔" رابعہ نے کہا۔ "اس وقت نو بجے ہیں۔"

محسن نے اقرار میں سر ہلایا۔ "میں کل تک لوٹ آؤں گا لیکن تم دونوں ایک وعدہ کرو۔ مجھے واپسی پر اسی جگہ ملو گے۔ میری عدم موجودگی میں کچھ نہیں ہو گا۔"

"چلو اب ناشتا کریں۔" میں نے کہا۔ "اس کے بعد پہلے تو چوہدری دلاور کے متعلق پوچھنا ہے۔ تجھے ایک کام کرنا ہے۔ یہ گاڑی اسی ڈیلر کے پاس لے جا جس سے خریدی تھی۔ کہنا ضرورت پوری ہو گئی اور کچھ پیسے کی ضرورت ہے۔"

"پیسے کی ضرورت ہے تو نکلوا لیتے ہیں۔" رابعہ نے کہا۔

"وہ تو نکلوا ہی لیں گے۔ نقد پاس رہنا چاہیے ورنہ یہ نہ ہو کہ بنک بھی نہ جا سکیں۔" میں نے کہا۔ "میرا مقصد گاڑی بدلنا ہے۔ وہی ڈیلر محسن کو شناخت کرے گا تو ہزار دو ہزار کم پر گاڑی رکھ لے گا۔ اتنا تو ٹیکسی کا کرایہ بن جاتا اگر یہ گاڑی ہمارے پاس نہ ہوتی۔ ہزار دو ہزار ڈال کے کسی دوسرے ڈیلر سے بالکل مختلف گاڑی خرید لینا بہتر ہے جو کسی کی نظر میں نہ آئی ہو۔ اور اس کی رجسٹریشن پرنسس صوفیہ کے نام سے ہو گی تو میری طرف کس کا ذہن جائے گا؟"

ڈائننگ ہال میں بیٹھ کے میں نے ناشتے کا آرڈر دیا اور فون کرنے چلا گیا۔ بوتھ میں ایک صاحب پہلے سے موجود تھے۔ جب میں نے انہیں مسلسل غضبناک نظروں سے گھورنا شروع کیا تو انہوں نے دس منٹ بعد ریسیور رکھا اور مجھے انہی نظروں سے گھورتے ہوئے نکل گئے۔ میں نے پھر ڈائریکٹری سے پولیس اسٹیشن کا نمبر تلاش کیا اور اس مرتبہ خود ایس ایچ او صاحب سے بات ہوئی۔ رات کی ڈیوٹی والا سارا عملہ بدل گیا تھا اور مجھے اندیشہ نہیں تھا کہ کوئی میری آواز شناخت کر لے گا۔

"کس کے بارے میں معلوم کرنا تھا؟" ایس ایچ او نے بے رُخی کی حد تک بے حس لہجے میں کہا۔

"وہ ہمارے ایک دوست ہیں، چوہدری دلاور صاحب۔" میں نے آواز کو تھوڑا سا بدلا۔ "شاہدرے میں فیکٹری ہے ان کی۔ مجھے ان کے گھر سے فون ملا تھا کہ پولیس انہیں قتل کے الزام میں گرفتار کر کے لے گئی ہے۔"

"کس تھانے میں فون کیا ہے سرکارِ عالی شان۔ رہتے کہاں ہیں یہ تمہارے چوہدری بہادر؟"

"بہادر نہیں، دلاور۔" میں نے کہا اور اس کے گھر کا پتا بتایا۔

"اچھا۔ تو تم مجھے بتا رہے ہو کہ ہم نے اسے قتل کے کیس میں پکڑ لیا ہے؟ بہت چالاک بنتے ہو۔" وہ کتے کی طرح غرّایا۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ "چالاکی کیسی۔ جو بات مجھے معلوم ہوئی تھی وہ تم سے پوچھ رہا ہوں۔"

"بکواس نہیں کر اُلّو کے پٹھے۔ ذرا نام پتا بتاؤ نا اپنا ہمت ہے تو۔ یا مجھ سے یہاں آ کے پوچھو تو میں بتاؤں تمہیں۔ قتل کیا دن میں سو ہوتے ہیں میرے علاقے میں؟ کہ مجھے یاد نہ رہیں۔ آخری واردات

ایک ہفتے پہلے ہوئی تھی اور وہ ایک ریڑھی والا تھا جس نے دوسرے ریڑھی والے کو چھرا مار دیا تھا۔ سمجھ آئی؟ خبردار جو پھر مذاق میں میرا وقت برباد کیا۔" اس نے جملے کا اختتام ایک اور بڑی گالی پر کیا اور ریسیور رکھ دیا۔ میں احمقوں کی طرح چند سیکنڈ تک ریسیور تھامے کھڑا رہا۔ پھر اُترے ہوئے چہرے کے ساتھ باہر نکل آیا۔ میں نے ایک جوا کامیابی کے پورے یقین کے ساتھ کھیلا تھا اور ہار گیا تھا۔ بازی چوہدری دلاور نے جیت لی تھی۔ غلطی میرے اندازے کی ہو سکتی ہے یہ بات میرا دل نہیں مانتا تھا۔ کہیں نہ کہیں گھپلا ضرور ہوا تھا اور دلاور نے میری چال کو ناکام بنا دیا تھا۔ گھپلے کی صرف ایک ہی صورت تھی کہ دلاور نے گرفتاری کے لیے آنے والوں کو خرید لیا ہو۔ یہ اتنا بڑا سودا تھا کہ وہ پانچ لاکھ کیا دس لاکھ بھی خرچ کر سکتا تھا۔ بصورتِ دیگر اسے جیل جانا پڑتا۔ اس کی ضمانت نہ ہو پاتی اور ایک کیس سے چھٹکارا پانے کی خاطر ہی اسے سو جتن کرنے پڑیں گے۔ دوسرے کیس کے بعد تو اس کے لیے نجات کے سارے راستے بند ہو جاتے بعد میں وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی آزادی، عزت اور زندگی سب کی قیمت لگا دی۔ اس نے سب کچھ مانگنے والوں پر چھوڑ دیا ہوگا۔ اور انہوں نے بڑا تیر مارا ہوگا تو ہر کانسٹیبل کے لیے ایک لاکھ اور سب انسپکٹر کے لیے پانچ لاکھ طلب کر لیے ہوں گے۔ یہ اتنی بڑی رقم تھی کہ وہ ریٹائرمنٹ تک اپنی ساری تنخواہ جمع کرتے رہتے تب بھی ٹوٹل کم ہی رہتا۔ رشوت کے کیس میں بھی یہ ان کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہوگا۔ خطرہ صرف یہ تھا کہ معاملہ ایس ایس پی کے علم میں ہے تو انہوں نے طے کر لیا ہوگا کہ صاف انکار کر دیں گے۔ ایس ایس پی صاحب کون سے چشم دید گواہ تھے۔ ان سے کہا جا سکتا تھا کہ کسی نے بیہودہ مذاق کیا تھا۔ ورنہ دلاور نے ان کو تسلی دی ہوگی کہ ایس ایس پی صاحب سے ابھی معلوم کر لیتے ہیں۔ کسی نے ان کا نام لے کر جھوٹ بولا تھا۔ اگر ان کے خانساماں نے بتایا کہ اس کا کوئی بھائی میرے پاس چوکیدار ہے تو جھوٹ سچ کا پتا چل جائے گا۔ اور جب اس نے فون کیا ہوگا تو سب انسپکٹر کے لیے رازداری کی قیمت وصول کر کے رخصت ہو جانا مشکل نہیں رہا ہوگا۔ رضوی صاحب کے گھر میں سرے سے خانساماں ہی نہیں تھا تو اس کا بھائی کہاں سے آتا۔

"کیا ہوا؟" محسن نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ "بارہ کیوں بج گئے ہیں صورت پر؟"

"بازی اُلٹ گئی۔ سارا کھیل چوپٹ ہو گیا۔" میں نے خفت سے کہا کیونکہ اپنی طرف سے میں نے بڑی چالاکی کا ثبوت دیا تھا اور مجھے یقین تھا کہ دلاور میرے بچھائے ہوئے جال میں اس طرح پھنس جائے گا جیسے چوہے دان میں چوہا پھنستا ہے۔

"وہ کیسے؟" محسن نے کہا اور میں نے اسے اپنی قیاس آرائی کے بارے میں بتا دیا۔ خود اس نے بھی مجھ سے اتفاق کیا کہ: لاور کی قوتِ خرید نے معاملے کو دبا دیا۔ ہماری بھوک مر گئی تھی لیکن ہم نے جسم کی ضرورت پوری کرنے کے لیے ناشتا زہر مار کیا۔ رابعہ نے ہمارا مذاق اُڑانا شروع کیا۔

"اوہو ہو۔ یہ تو دوسرا منظر ہے۔ تھانے سے ایک جیپ چوہدری صاحب کو گرفتار کرنے کے لیے روانہ ہو رہی ہے۔" رابعہ نے محسن کی نقل اتاری۔ "کیا کشف و کرامات ہیں۔ بند آنکھوں سے غیب کا سارا حال بیان کر دیا تھا۔ بہت ہی خوبصورت مومنٹ بنائی ہے۔ سکندر نے محسن کو پاس دیا۔ محسن نے ٹیڈی کو۔ ٹیڈی نے پھر سکندر۔۔۔ اور حضرات گول۔"

"تم بدلہ لے رہی ہو۔" محسن نے دانت نکال کے ڈھٹائی سے کہا۔ "کیونکہ میں نے بھی تمہاری نقل اتاری تھی۔"

"اور محسن صاحب، گرتے ہیں شہسوار ہی میدانِ جنگ میں۔" میں نے کہا۔ "خاتون کیا گریں گی جو ہائی ہیل پہ چلیں۔"

پھر ہم نے سنجیدگی سے صورتِ حال کا جائزہ لیا اور اس پر ہر پہلو سے بحث کی۔ ایک بہت بڑی کامیابی کا خواب جھوٹا ثابت ہوا تھا جس نے ہمیں وقتی طور پر تھوڑا سا صدمہ پہنچایا تھا۔ دلاور اس بار ہمارے جال سے بچ نکلا تھا چنانچہ اس بات کا یقینی امکان تھا کہ آئندہ وہ حفاظتی اور احتیاطی انتظامات زیادہ سخت کر دے گا۔

"معلوم کرنا پڑے گا کہ وہ سب انسپکٹر کون تھا جس نے رات کو مجھے بات کی تھی۔" میں نے کہا۔

"تو نے اس سے نام نہیں پوچھا تھا؟" محسن بولا۔ اس کے لہجے میں برہمی نمایاں تھی۔

"نہیں یار۔ لیکن نام کا پتا چلانا کون سا مشکل کام ہے۔" میں نے کہا۔ "اس کے ساتھ چار سپاہی بھی تھے۔"

"ہماری ناکامی کے فرشتے وار دہی ہیں ساتھوں نے طافو کی لاش کا سودا کیا ہے۔"

"یہ سودا انھیں مہنگا پڑے گا۔ وہ تو بغلیں بجا رہے ہوں گے کہ رات ایک احمق نے لکھ پتی بنا دیا۔" میں نے کہا۔ آہستہ آہستہ میرے لیے ناکامی کا احساس جھنجلاہٹ اور کوفت کا سبب بننے لگا تھا اور محسن کی طرح مجھے بھی غصہ آ رہا تھا۔

"اب تم ان کو سزا دو گے؟" رابعہ نے ہمارے جذبات کا رُخ دیکھ کر کہا۔

"ہاں۔ مجرم وہ ہیں جنھوں نے اپنے فرائض کی قیمت وصول کی۔" میں نے کہا۔ "انھیں ایک ایک پیسے کا حساب دینا پڑے گا۔"

نکلتے نکلتے مجھے نازو کا خیال آ گیا اور اس بار میں نے رابعہ سے کہا کہ وہ البرٹ ڈکٹر اسپتال فون کرے۔

وہ فون آبزرویشن پہ نہ ہو۔" محسن نے مجھے یاد دلایا۔ "انکل چوہدری ہے نفسیات بھی ہیں ــــــــ انھیں یقین ہوگا کہ ہم سب نازو سے بے تعلق نہیں رہ سکتے۔"

"ہم دونوں تو اسپتال میں اس کی حالت بھی دیکھ چکے ہیں۔" رابعہ نے کہا۔ "اور اس کے بعد ہم نہایت پُراسرار انداز میں باقاعدہ فرار ہو گئے تھے۔"

محسن بولا۔ "باہر نکل کے بات کریں گے۔"

رابعہ نے ایک ٹیلر کی دکان سے فون کیا جہاں سے وہ کسی زمانے میں اپنے کپڑے سلواتی تھی۔ محسن کار لے جا چکا تھا چنانچہ میں اور رابعہ ٹیکسی میں روانہ ہوئے تھے جسے ہم نے تین سو روپے میں رات آٹھ بجے تک کے لیے کرائے پر حاصل کر لیا تھا۔ دس منٹ تک میں بیٹھا سگریٹ پھونکتا رہا پھر رابعہ دکان سے برآمد ہوئی۔ موٹر سائیکل پر گزرنے والے سیاہ کوٹ میں ملبوس ایک وکیل نے فوراً بریک لگائی اور رابعہ کا راستہ روک لیا۔ مجھے تھوڑی سی تشویش لاحق ہوئی۔ رابعہ کے لیے ایک مسئلہ یہ بھی تھا جس کا مجھے ابھی تک خیال نہیں آیا تھا۔ اسے۔۔۔ دل وکیل صورت سے پہچانتے تھے اور اس کے بارے میں افواہوں، قیاس آرائیوں اور خبروں کی بنیاد پر تجسس کا شکار ہوں گے اور پسِ پشت جتنے منہ ہوں گے، اتنی ہی باتیں ہوں گی۔ اتنی بڑی وکیل پریکٹس کو خیرباد کہہ دے۔ اس کے متعلق اخبارات میں سنسنی خیز واقعات آنے لگیں اور میرے نام کے ساتھ اس کا نام یوں منسوب ہو جائے کہ تعلق وکیل اور مؤکل کی حد سے زیادہ محسوس ہونے لگے تو رابعہ کی ذات کا وکلا کی برادری میں موضوعِ سخن بن جانا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔

وکیل نے بالآخر رابعہ کی جان بخشی کی۔ رابعہ تیز تیز قدم اٹھاتی ٹیکسی کی طرف آئی۔

"یہ کون تھا؟" میں نے پوچھا اور ٹیکسی کو چلنے کو کہا۔ رابعہ کا موڈ آف تھا۔

"تھا ایک وکیل۔" رابعہ نے برہمی سے کہا۔ "ایسے سیکڑوں ہیں جو مجھے جانتے ہیں۔ عورتیں گنی چنی ہیں نا۔"

"آخر بات کیا کر رہا تھا اتنی دیر تک؟" میں نے کہا۔

"فضول باتیں۔ مجھ سے زیادہ اس کو پریشانی لاحق تھی کہ میں نے پریکٹس کیوں چھوڑ دی ہے۔"

"خفا ہو کے خون جلانے سے کیا فائدہ۔ ایسے تو بہت ہوں گے۔" میں نے اسے تسلی دی۔

"لیکن یہ بہت فتنہ آدمی ہے۔ میں جانتی ہوں۔" وہ بولی۔ "اِدھر کی بات اُدھر لگانے کا ماہر۔ غلط بیانی اور غیبت کا شوقین۔ اوّل درجے کا حاسد اور تنگ نظر۔ پریکٹس وغیرہ تو چلتی نہیں۔ مشہور ہے کہ دھندا چلانے کے لیے گھروں میں پھوٹ ڈالتا ہے۔ میاں بیوی کے اختلافات کو ہوا دیتا ہے اور جھوٹ فریب سے تعلقات کو طلاق اور علیحدگی تک پہنچا دیتا ہے۔ پھر کمزور فریق کا مقدمہ لے لیتا ہے تاکہ ہار جائے تو اپیل تک روزگار لگا رہے۔"

"پھر تو پورا فن کار ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "تم نے کیا کہا؟"

"میں نے کہا کہ جناب! قانون پڑھنے کے بعد پریکٹس کرنا کون سے قانون کے تحت ضروری ہے۔" رابعہ بولی۔ "اور اگر کوئی وکیل یا ڈاکٹر وکالت چھوڑ کے پنساری کی دکان لگا لے تو کیا یہ خلافِ قانون ہے اور کوئی جرم ہے ڈھیٹ آدمی ہے۔ کہنے لگا۔۔۔"

"کیا کہنے لگا۔ خاموش کیوں ہو گئیں۔ کوئی غلط بات کی تھی تو مجھے بتاؤ۔"

"ہاں تاکہ تم جا کے اس کے دانت توڑ دو یا اس کی گردن۔" رابعہ نے کہا۔ "ایسے قدم قدم پہ آ بیل مجھے مار کے فلسفے پر عمل کرو گے تو دو قدم نہیں چل سکو گے۔ دنیا تو نامعقول لوگوں سے بھری پڑی ہے۔ جیسا ذلیل آدمی تھا ویسی ہی ذلیل بات کر گیا۔"

"تم بہت غصے میں ہو۔" میں ہنسا۔ "میں کچھ نہیں کروں گا۔ بات چھپانا چاہتی ہو تو تمہاری مرضی۔"

"آخر کیا تک ہے اس جرح کی؟" رابعہ بولی۔ "ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اس نے کہا کہ بہت بدنام ہو رہی ہو سکندر کی وجہ سے۔ تمہاری اتنی عزت ہے۔ تمہیں مجرموں کے بجائے قانون کا ساتھ دینا چاہیے۔ میں نے کہا، یہ میرا ذاتی معاملہ ہے اور تم میرے گارجین نہیں ہو۔ اس لیے اپنی نصیحت کی پوٹلی اپنے ساتھ لے جاؤ۔ کہنے لگا کیا یہ سچ ہے کہ تم سکندر سے شادی کر چکی ہو؟ میں نے کہا ہاں یہ بالکل سچ ہے اور جا کے بار روم کے نوٹس بورڈ پر یہ 'اطلاعِ عام' چسپاں کر دو تاکہ پھر کوئی اس طرح میرا راستہ روک کر مجھ سے سوال جواب نہ کرے۔ سب کے شکوک دور ہو جائیں گے۔" اس کا چہرہ کچھ غصے کے باعث اور کچھ حیا سے لال ہو رہا تھا۔

مجھے بے اختیار ہنسی آئی۔ "اور اس نے سچ مچ نوٹس بورڈ پر لکھ کے لگا دیا تو۔۔۔ خیر چھوڑو۔ نازو کی کیا خبر ہے؟"

"نازو کی حالت خطرے سے باہر ہے۔" رابعہ نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "اس کے بھائی سے بات ہوئی تھی۔"

"اکرام شیخ سے؟" میں نے چونک کر کہا۔ "اس نے تو آواز پہچان لی ہوگی تمہاری؟"

"میں نے خود ہی اسے بتا دیا تھا۔" رابعہ بولی۔ "وہ کہنے لگا کہ اسپتال آ جاؤ۔ مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔"

"جانا کدھر ہے جناب؟" ٹیکسی ڈرائیور نے سر گھما کے کہا۔ اب تک وہ اس امید میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا سیدھا جا رہا تھا کہ شاید کسی جگہ ہم خود ہی اسے دائیں بائیں کہیں مڑنے کو کہیں گے۔ لیکن ہم اپنی باتوں میں اتنے مگن ہو گئے تھے کہ اسے ہدایات دینے کا خیال بھی نہ رہا۔ اب

وہ مال روڈ کے آخری حصے میں کارپوریشن کے آفس تک پہنچ گیا تھا۔ اس کے آگے ضلع کچہری تھی جہاں ہزاروں وکیلوں کا اژدہام تھا۔ میں نے ڈرائیور کو واپس چلنے کو کہا اور گارڈینیا ریسٹورنٹ کے سامنے رکوا لیا۔ اندر صبح کے وقت ہال خالی تھا اور صرف ایک میز پر دو لیلیٰ مجنوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے نہ جانے کیا دیکھ رہے تھے کہ انہوں نے ہم شیریں فرہاد کے جوڑے کو نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھا۔

"اکرام شیخ تم سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتا تھا؟" میں نے لیلیٰ مجنوں سے دُور بیٹھتے ہی کہا۔ "یہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔"

"اُس نے استعفیٰ دے دیا ہے۔" رابعہ نے افسوس سے کہا۔ "کیا باضمیر آدمی کے لیے ایمانداری سے نوکری کرنا اتنا مشکل ہے؟"

"وہ انتہا پسند ہے۔ رضوی صاحب کی طرح۔" میں نے کہا۔ "پھر بھی استعفے سے تمہارا کیا تعلق؟"

"اُس نے لکھا ہے کہ وہ مجرمانہ کوتاہی کا مرتکب ہوا ہے۔" رابعہ نے کہا۔ "اس نے زخمی ہو جانے والی بہن کا خیال کیا اور فرار ہونے والے مجرموں کا تعاقب کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ان حالات میں وہ خود کو اس ملازمت کا اہل تصور نہیں کرتا۔ اس کا یہ فیصلہ حتمی اور ناقابلِ تنسیخ ہے۔"

گویا میرا نام لیے بغیر اس نے سب کچھ کہہ دیا۔" میں نے کہا۔ "فرار کا موقع تو اُس نے مجھے ہی فراہم کیا تھا۔ نازو نے اسے روکا تھا اور وہ رُک گیا تھا۔ اس نے اپنے ضمیر کی خلش کو میرے لیے باعثِ ندامت بنا دیا ہے۔ بہت عجیب آدمی ہے شیخ بھی۔ حالات سے مصالحت کرنا جانتا ہی نہیں۔ اب نازو ہوش میں آنے کے بعد اس کی مرضی کے مطابق بیان دے گی تو وہ نظر ملا کے اس سے یہ بات کہہ سکے گا کہ دیکھ لو، تمہارے رشتے پر میں اپنی نوکری قربان کر رہا ہوں۔ تم نے مجھے ادائے فرض سے روکا اور میں نے تمہاری ماں کے ایک جرم کیا تھا اس کا کفارہ بھی میں ہی ادا کر رہا ہوں۔ پھر بھی تم سے اسے کیا مشورہ کرنا تھا؟"

"اس کا خیال تھا کہ یہ قانونی معاملہ بنے گا۔ اقدامِ قتل کا کیس تو تھا ہی۔ گواہ وہ خود ہے یا نازو۔" رابعہ بولی۔ "عدالت کے روبرو صفائی بہرحال پیش کرنی پڑے گی۔ ایک الزام اس نے خود اپنے آپ پر عائد کر لیا ہے چنانچہ اسے وکیل کی ضرورت ہے۔ میں نے کہہ دیا کہ میں تو وکالت چھوڑ چکی ہوں اور آپ کو کیا وکیلوں کی کمی ہے۔ وہ بات کو طول دینا چاہتا تھا۔"

"یہ پتا چلانے کے لیے کہ تم نے فون کہاں سے کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"اس کے سوا اور کیا مقصد ہو سکتا ہے۔" رابعہ نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے استعفے والی بات بھی محض کہانی ہو سکتی ہے۔"

"ہاں۔ لیکن زیادہ پریشانی مجھے اس لیے لاحق ہو گئی تھی کہ وکیل میرا دماغ چاٹ رہا تھا۔" رابعہ نے کہا۔ "مجھے تو ڈر تھا کہ نہ آ پہنچے۔ چھ سات منٹ تو شیخ نے لگا ہی دیے تھے اور اتنی دیر دوسرے فون پر ایکسچینج سے کہا جا سکتا ہے کہ نمبر نوٹ کرو۔ نمبر کا ہے جو مجھے جانتا ہے۔ اسی کے سامنے گرفتار ہو جاتی۔"

"وہ بعد میں تو پہنچ جائیں گے۔ اپنی دیسی پولیس ہے نا۔ حرکت میں آتے آتے بھی وقت لگ جاتا ہے، ورنہ میں نے برطانیہ میں دیکھا تھا تین منٹ میں پولیس موجود۔ ان کے پاس اور گاڑیاں بہت ہیں اور یہاں عموماً تھانوں میں کچھ نہیں ہوتا۔ ٹیکسی وغیرہ کو زبردستی پکڑ کے پہنچتے ہیں یا ٹرانسپورٹ کی فراہمی کا مسئلہ ہوتی ہے۔ اس کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ پولیس کو بہترین وسائل سے لیس کر دیا جائے تب بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ان کی مستعدی اور کارکردگی کا تعلق ان کے مزاج سے ہے۔ یہاں وہ حاکم اور فرعون ہیں۔ وہاں عوام کے خادم اور دوست۔ یہاں لوگوں کی حفاظت سے زیادہ لوگوں کو حراساں کرنے کا ذریعہ ہے۔" میں نے کہا۔ "وہاں کمزور کا محافظ ہے۔"

"یہ تو ہے۔ اب وہ میرے پُرانے ٹیلر کو پریشان کرے گا۔" رابعہ بولی۔ "وہ تسلیم کرے گا کہ رابعہ بی بی آئی تھیں اور آتی رہتی ہیں۔ پوچھ گچھ کے لیے لے جائیں گے کہ بتاؤ ان کے ساتھ کون تھا، کیوں آئی تھیں اور کہاں گئیں؟ پانچ سو ہزار اینٹھ لیں گے۔ میری ایک کال اسے بہت مہنگی پڑے گی۔"

"محسن دو بجے ملے گا۔" میں نے کہا۔ "دوسری گاڑی لے کر آئے گا۔"

"اسے تو گھر بھی جانا تھا۔" رابعہ نے کہا۔

"مگر یہ کام وہی کر سکتا تھا۔" میں نے کہا۔ "تین چار بجے گھر جا سکتا ہے وہ۔ رات تک پہنچ جائے گا۔ میں نے کہا تھا کہ اتنی دیر میں تھانے سے اس سب انسپکٹر کا نام پوچھ لوں گا جس نے کل دلاور کو گرفتار نہیں کیا تھا۔"

"ابھی تو وہ ڈیوٹی پر نہیں ہوگا۔" رابعہ بولی۔

"تھانے میں کوئی بہت لمبا چوڑا عملہ نہیں ہوتا۔" میں نے کہا۔ "گنے چنے سب انسپکٹر اور انسپکٹر ہوتے ہیں جن کی ڈیوٹی شفٹوں میں بدلتی رہتی ہے۔ سب ایک دوسرے کو جانتے ہیں بلکہ ایک دوسرے کے بارے میں ساری معلومات رکھتے ہیں کہ کس نے کب کون سے کیس میں کتنا کھیلا، کیا وصول کیا، کسے بخشا اور کسے بلاوجہ پکڑا۔ کس کے پاس کتنا مال ہے تو کہاں، کس کے نام پر اور کتنا کرایہ آتا ہے۔ کس کی ٹیکسی یا ویگن کس روٹ پر ہے۔ ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہوتے ہیں سب، سب خود حفاظتی کا نظام ہے۔ کوئی ان پر الزام لگائے تو جواب میں وہ بھی لگا سکیں۔ اس طرح سب ایک دوسرے کا پردہ رکھتے ہیں۔ رات جو انسپکٹر لگا تھا، اگر اس نے پانچ لاکھ لیے ہوں گے تو دو لاکھ ایس ایچ او صاحب کو بھی نذر کیے ہوں گے کہ ان کی سرپرستی حاصل رہے۔"

"پھر تم اس کا نام کیسے معلوم کرو گے؟" رابعہ نے کہا۔

"ایک صورت تو یہی ہے کہ سب کے نام معلوم کر لیے جائیں۔" میں نے کہا۔ "اور پھر فرداً فرداً ہر ایک کا گھر دیکھا جائے اور براہِ راست ملاقات کی جائے۔ اصل مجرم کتنا بھی چالاک ہو، اپنے ردِعمل سے پکڑا جائے گا۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ میں دلاور سے بات کروں۔"

"وہ بہت چالاک آدمی ہے اور تمہیں کچھ نہیں بتائے گا۔"

"ایک چانس ہے کہ باتوں میں اس کی زبان سے خود ہی نام نکل جائے۔" میں نے کہا۔ "چائے پی لیں۔ نکلتے وقت بات کروں گا اس سے۔"

چودھری دلاور آفس میں تھا۔ کال اس کے پی اے نے ریسیو کی۔ "کیا نام ہے آپ کا؟"

"نام تمہیں نہیں بتا سکتا میں۔" میں نے کہا۔ "پرائیویٹ...."

"چودھری صاحب کی ایسی کوئی پرائیویٹ بات نہیں ہوتی جو مجھے معلوم نہ ہو۔" وہ بولا۔

"بکواس بند رکھو اپنی ورنہ سیکرٹری آ کے دماغ درست کر دوں گا۔ نوکری تو ضائع ہوگی لیکن تم خود بھی ضائع ہو جاؤ گے۔ تمہارے چودھری صاحب تم کو نہیں بچا پائیں گے۔ بات کی سمجھ آ رہی ہے نا؟" میں نے کہا۔ دھمکی کچھ کارگر رہی۔ اس نے مجھے ایک منٹ ہولڈ کرنے کو کہا اور دلاور سے انٹرکام پر بات کی۔ پھر لائن ملا دی۔

"کون رستم خاں ہے بھئی۔ دماغ تو میرا بھی خراب ہے۔ یہاں آ کے درست کر دو۔" دلاور نے کہا۔

"اپنے چودھری صاحب۔" میں نے کہا۔ "مجھے مبارکباد پیش کرنی تھی، آپ نے تو کمال کر دیا۔"

وہ ہنسا۔ "اس میں کون سا کمال ہے سکندر صاحب۔ بچوں والی حرکت کی تھی تم نے۔"

"میں تو تمہیں اس وقت پتا چلتا جب پولیس نے مجھ پر یقین کر لیا ہوتا۔" میں نے اچانک لہجہ بدل لیا۔

"یقین تو آ گیا تھا ان کو تمہاری بات پر۔" وہ بولا۔

"یہ تو مجھ سے بھی کہا تھا انھوں نے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا تھا کہ گمنام ٹیلی فون پر وہ کوئی کارروائی نہیں کرتے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے کہ پولیس آئی ہی نہیں تھی؟" وہ تمسخر آمیز انداز میں بولا۔

"سب حرام خور بیٹھے ہیں۔ انھیں بہانہ چاہیے کچھ نہ کرنے کے لیے۔" میں نے کہا۔

"تم نے تو ایس ایس پی صاحب کے نام کا تیر بھی چلایا تھا۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ نہ آتے۔" دلاور نے کہا۔ "مگر وہ سب انسپکٹر راجہ فخر شیر بھی شیر کا بچہ تھا۔ اس کا باپ شیر خان تھا۔ اس نے دیکھ لیا کہ بات کچھ بھی نہیں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" میں نے کامیابی کے جذبات کو دبا کر مایوس لہجے میں کہا۔ "وہ اندھا تھا کیا؟"

"آنکھوں والے کو بھی کچھ ہوتا تو نظر آتا۔" دلاور کے لہجے سے اس کی کامیابی کے غرور کا اندازہ ہوتا تھا۔ "اس نے دیکھا کہ ہم ایک گڑھا کھود رہے ہیں۔ اس نے پوچھا یہ کیا ہو رہا ہے؟ میں نے کہا کہ بھئی گڑھا کھود رہے ہیں اور کیا۔ کہنے لگا وہ کس لیے؟ میں نے کہا تفریحاً۔ کیا اپنے گھر کی حدود میں گڑھا کھودنا جرم ہے؟ وہ بولا کہ اتنی رات کو؟ میں نے پھر وہی سوال کیا کہ آدھی رات کے بعد کوئی اپنے صحن کے آنگن میں پیڑ پر چڑھ کے بیٹھنا چاہے یا گڑھا کھود کے، اس کی مرضی۔ وہ مانا نہیں اور کہنے لگا کہ تم نے کوئی لاش دبائی ہے۔ میں نے اسے کدال بیلچہ پکڑا دیا اور اس کے ماتحتوں نے خاصی گہرائی تک کھودا۔ پھر میں نے منع کر دیا کہ ٹیوب ویل ہے۔ فی الحال دوسرے کنویں کی مجھے کوئی ضرورت نہیں۔ آنے جانے کا کرایہ دے دیا میں نے۔"

"کوئی بات نہیں چودھری صاحب۔ یار زندہ صحبت باقی۔" میں نے کہا۔

"اس مرتبہ ناکافی انتظامات سے تم کو موقع مل گیا تھا۔" وہ بولا۔ "لیکن آئندہ کی امید مت رکھو۔ تم تو یہ بھی معلوم نہیں کر سکو گے کہ میں

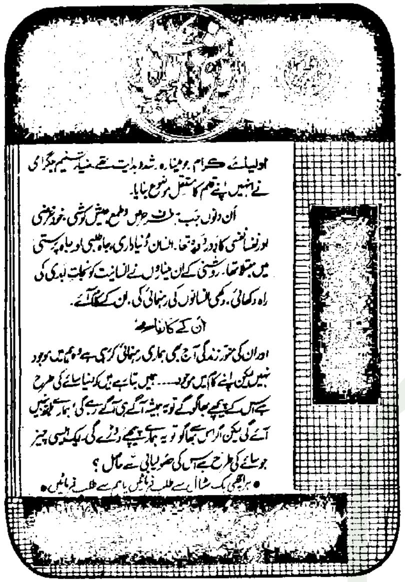

کہاں ہوں۔ میرے دس ٹھکانے ہیں سکندر اور دس ٹھکانے دس قلعے ہیں۔ میں نے بلٹ پروف کار کا بھی آرڈر دے دیا ہے اور میرے ساتھ مسلح باڈی گارڈز رہیں گے۔"

"کیا وہ فرشتۂ اجل کو بھی روک دیں گے؟" میں نے سادگی سے کہا۔ "امریکی صدر کینیڈی کے حفاظتی انتظامات پر سی آئی اے اور ایف بی آئی جیسے ادارے کتنی رقم خرچ کرتے تھے چوہدری صاحب۔ موازنہ اس ایک گولی کی قیمت سے کریں جس نے سب کو چوپٹ کر دیا۔"

میں ریسیور رکھ کے باہر آیا تو رابعہ ٹیکسی میں بیٹھی ناخن کتر رہی تھی۔ یہ اعصابی کشیدگی کی علامت تھی جس کا شکار ہم سب تھے۔

"مختصر بات نہیں کر سکتے تھے؟" رابعہ نے کہا۔ "اس کے آفس میں بھی دو فون ہیں۔"

"ہاں، میرے ذہن میں بھی یہ بات تھی۔ وہ اپنے پی اے سے کہہ سکتا تھا کہ کال ٹریس کرو۔" میں نے کہا۔ "لیکن وہ یہاں سے بہت دور شاہدرے میں تھا اور اس کے لیے فیکٹری کے فون کو آبزرویشن پر رکھوانا مشکل تھا۔ میں نے رسک لیا لیکن اس کے نتائج حسب توقع نکلے۔ سب انسپکٹر راجہ فتح شیر ولد شیر خان تھا۔ اب کام کچھ آسان ہو گیا ہے۔ یہاں سے نکل کے تم اور کسی جگہ سے تھانے فون کرنا۔ کہنا میں فتح شیر کی بہن ہوں۔ میرا خیال ہے وہ راولپنڈی کے گرد و نواح کا رہنے والا ہوگا۔ مری کہوٹہ یا گوجر خان کے علاقے کا۔ تم بتانا کہ میں راولپنڈی سے آئی ہوں۔ اور انہیں اسٹیشن بھیج دیں۔ وہ ڈیوٹی پر نہیں ہے تو اسے اسٹیشن کون بھیجے گا۔ پھر تم گھر کا پتا سمجھ لینا۔ ہم کل پرسوں ملاقات کریں گے جب محسن واپس آئے گا۔"

یہ چال کامیاب رہی۔ تھانے میں کسی نے رابعہ کو راجہ فتح شیر کا پتا یوں سمجھا دیا کہ ہم کسی پریشانی کے بغیر پونے ایک بجے آرائے بازار کی ایک گلی میں جا پہنچے۔ میں نے اس کے مکان کو اچھی طرح ذہن نشین کیا اور لوٹ آیا۔ ایک بجے ہم واپس ہوئے اور پونے دو بجے ٹیکسی کو ریگل کے چوک پر چھوڑ دیا۔ میں نے محسن کو ایک کورٹینا میں دیکھ لیا تھا۔ "مجھے روٹی کھانی ہے صاحب؟" خاموش طبع اور کام سے کام رکھنے والے ٹیکسی ڈرائیور نے کہا۔

"تم اب جو چاہو کرو۔" میں نے کہا۔ "ہمیں اب تمھاری ضرورت نہیں رہی۔"

"لیکن .... آپ نے تو پورے دن کا سودا کیا تھا۔" ٹیکسی ڈرائیور کا چہرہ اتر گیا۔

"ہم تمھیں معاہدے کے مطابق پوری ادائیگی کر رہے ہیں۔" میں نے اسے سو سو کے تین نوٹ پکڑائے۔ "جاؤ عیش کرو۔"

اس فیاضی پر خوش ہو کے اس نے ہمیں زبردست سلام کیا اور رخصت ہو گیا۔ پھر ہم سڑک پار کر کے محسن کی طرف گئے۔

"یہاں کیوں کھڑا ہے؟" میں نے کہا۔ "ہم نے گارڈن [illegible] کھڑنے کو کہا تھا۔"

"وہاں دال میں کچھ کالا تھا۔" وہ بولا۔ "پولیس آئی ہوئی [illegible]

"اچھا؟" میں نے رابعہ کے ساتھ پیچھے بیٹھتے ہوئے [illegible] تو کب سے کھڑا ہے یہاں؟"

"ایک بجے سے۔ پولیس اس وقت جا رہی تھی۔" اس [illegible] اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ ہلکے نیلے رنگ کی یہ کورٹینا بھی [illegible] اور چھیاسٹھ کا ماڈل تھی۔ لیکن صرف ستاون ہزار میل چلی [illegible] اور تھی۔ فرسٹ اونر بھی کوئی بہت معقول آدمی تھا جس نے [illegible] زوجہ کی طرح محبت سے سنبھال کے رکھا تھا۔ چنانچہ مجھے [illegible] وہ بہت مناسب لگی۔

"اب کہاں جانا ہے؟ میرے ریبٹ میں اتنا بڑا خلا [illegible] اس میں متعدد مربع سیاروں کی طرح گردش کر رہے ہیں۔ [illegible] مجھے چار شوزدم دیکھنے پڑے اور کوئی چار میل پیدل [illegible] صبح کا ناشتا بھی خاک کیا تھا۔"

"یہ خطرناک علاقہ ہے۔" میں نے کہا۔ "گارڈینیا کے [illegible] ٹیلر کی دکان پر بھی پولیس چھاپا مار چکی ہے اور یہ ٹیلر کی دکان [illegible] جہاں تو گاڑی لے کر کھڑا تھا۔"

"کس کی تلاش تھی انہیں؟" محسن بولا۔

"پہلے آنے والوں کو رابعہ کی۔" میں نے کہا۔ "بعد میں [illegible] ڈھونڈتے ہوئے آئے تھے۔ انھیں بالترتیب اکرام شیخ اور [illegible] دلاور نے ہماری فون کال ٹریس کر کے بھیجا تھا۔"

"گویا اب میری باری ہے۔" محسن ہنسا۔ "لیکن میں [illegible] ریسٹورنٹ کھاؤں گا۔"

"ریسٹورنٹ میں کھانا یا ریسٹورنٹ؟" رابعہ ہنسی۔ "بھوک [illegible] زبان لڑکھڑا رہی ہے۔"

"پورا ریسٹورنٹ بی بی۔ جو کچھ کچن میں ملا وہ۔ کرسیاں [illegible] سب کھا جاؤں گا۔" محسن نے اسے گھور کر کہا۔

کھانے کے بعد میں نے ڈرائیونگ سنبھالی اور ہم [illegible] باغ کے بس اسٹاپ تک چھوڑنے گئے۔ "رات کے ساڑھے [illegible] بجے تک گھر پہنچ جائے گا تو؟" میں نے کہا۔

"دس بجے ہمیں فون کر دینا۔" رابعہ بولی۔ "ہم انتظار کر [illegible] ہوٹل ایران میں۔"

"میں بھی وہاں گیارہ بجے تک ملوں گا۔" میں نے [illegible] لاہور ہوٹل جا کے سو جاؤں گا۔"

"اچھا کیا تو نے پہلے ہی وضاحت کر دی۔" محسن بولا۔ [illegible] یہ نصیحت کرنے والا تھا۔ تاہم ایک نصیحت اور بھی کرنی [illegible]

واپس آنے تک تمھیں ایک دوسرے کے سوا کسی سے نہیں ملنا ہے اور صرف مندرجہ ذیل کام کرنے ہیں۔ ایک دوسرے سے آنکھیں چار کرنا۔ ہلکے پھلکے رومانی مکالمے بولنا۔ دوگانے تحت اللفظ سنانا۔ سرد آہیں بھرنا اور خیالی پلاؤ زردہ پکا کے کھا لینا مگر اور کچھ نہیں۔ یہ نہ ہو واپسی پر میں تمھیں گلی کوچوں میں تلاش کرتا پھروں۔ تم نام بدل کے کہیں فرار ہو جاؤ یا چوہدری صاحب کے مہمان بن جاؤ۔"

ویگن کے روانہ ہوتے ہی ہم بھی چل پڑے۔ گاڑی کے شیشے بالکل بے رنگ اور شفاف نہیں تھے۔ ان میں ہلکا سبز رنگ جھلکتا تھا اور شیشے بند کر لینے کے بعد اندر بیٹھے ہوئے آدمی کی پرچھائیں سی نظر آتی تھی۔ صورت نہیں پہچانی جاتی تھی۔ یہ اور بھی اچھی بات تھی کیونکہ سڑک پر کوئی بھی ہمیں صرف سامنے سے دیکھ سکتا تھا۔ سائڈ سے کسی کی نگاہ پڑنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ میں نے جہانگیر کے مقبرے کا رخ کیا۔ صبح کے مقابلے میں اس وقت آنے والوں کی تعداد بہت کم تھی۔ میں اور رابعہ عقبی حصے کے لان پر ٹہلتے رہے۔ پھر میں گھاس کے ایک تختے پر لیٹ گیا اور بہت اوپر پھیلے ہوئے آسمان کے نیلے رنگ میں پرواز کرنے والے پرندوں کو دیکھتا رہا۔ رابعہ میرے قریب بیٹھی رہی اور باتیں کرتی رہی۔ وہ باتیں جو ہم بھول گئے تھے۔ جن کے لیے نہ ہمیں فرصت ملی تھی اور نہ حالات کی اجازت۔ میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ آج ایک دن کے لیے میں صرف یہ یاد رکھنا چاہتا ہوں کہ میں سکندر ہوں اور تم رابعہ ہو اور میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ تمام حادثات اور مسائل، تلخئ آلام اور گرانبارئ ایام۔ غیروں کی ریشہ دوانیاں اور اپنوں کی نامہربانیاں۔ ان سب پر آج کے دن عقل و نظر کے اور خیالوں کی گزرگاہ کے سارے دروازے بند کر دو۔ فرض کر لو کہ ہمارے سوا تمام دنیا بے وجود ہو گئی ہے۔ ہم آج ہی اس زمین پر اتارے ہوئے آدم و حوا ہیں جن کا ایک دوسرے کے سوا کوئی نہیں اور اب ہمارا کوئی مسئلہ ہے تو اپنی دنیا بسانے کا۔

"تم نے محسوس کیا رابعہ! اس احساس میں کیسی خوشی کی لذت اور سرور کی کیفیت ہے۔" میں نے کہا۔ "ایسی کئی شاموں کی، بہت سی راتوں کی اور صبحوں کی یاد میرا سرمایہ ہے۔ ایک شام تم اور میں گھر سے نکلے تھے اور شہر کی سڑکوں پر پھرتے رہے تھے۔ ایک رات تمھارے ساتھ میں اس کوٹھی کے مختصر سے لان میں تمھارے ساتھ بیٹھا رہا تھا اور ہم نے اپنی عمر گزشتہ کی کہانی سنائی تھی۔ اور پھر چاند نکل آیا تھا مگر ہم بیٹھے رہے تھے۔ اور ایک بار آدھی رات کے بعد سے صبح ہونے تک ہم انکل رضوی کے لان میں تنہا تھے۔ کتنی پرانے وقتوں کی بات لگتی ہے یہ سب جیسے میں سفر کے آغاز میں کسی صحن گلشن سے گزرا تھا اور اس کے بعد کوئی صحرا آ گیا۔ بے آب و گیاہ اور پر عذاب۔ دھوپ کی تمازت میں جلتا ہوا جس کی مصائب کے پرخار کیکٹس تھے اور آج پھر اچانک میں محبت کی خوشبو سے معمور سایہ دار ٹھنڈے نخلستان میں ہوں۔"

"یہ راستہ بہت طویل ہو گیا ہے سکندر۔" رابعہ نے گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکا کے کہا۔ "ہم چلے تھے منزل کی تلاش میں تو آنے والا دن اپنی دسترس میں لگتا تھا۔ راہ کتنی آسان تھی۔"

"راستے اور منزلیں ایسے ہی فریب دیتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہمارے قدم بھٹک گئے ہیں۔" اس نے گھاس کا ایک تنکا توڑ کے چبانا شروع کیا۔ "سوچو ہم کیا چاہتے تھے سکندر؟"

"آلو چھولے، آئس کریم، کوک صاحب۔" ایک دس بارہ سال لڑکے نے ذرا سے ٹرے لہرا کے کہا۔

میں قہقہہ مار کے اٹھ بیٹھا۔ "تم نے سچ کہا استاد۔ ہم یہی چاہتے تھے۔ جاؤ سب لے آؤ۔" رابعہ بھی ہنسی اور لڑکا کچھ نہ سمجھنے کے باوجود ہنسا اور آرڈر کی تعمیل کرنے دوڑ گیا۔

"زندگی یہی ہے۔ آلو چھولے، آئس کریم اور کوک۔" میں نے کہا۔ "تلخ ترش اور شیریں۔ گرم اور نرم۔ کوک کی طرح سنسناتی ہوئی اور آئس کریم کی طرح سرد۔ اس لڑکے نے تو سارے سوالات کا جواب دے دیا۔"

شام ڈھلے ہم واپس ہوئے تو بچوں کی طرح خوش تھے اور بات بات پر قہقہے لگا رہے تھے۔ یہ کئی ماہ کی جذباتی تھکن تھی اور تفکرات کا بار تھا اور ذہنی انتشار کا دباؤ تھا۔ آج کی شام مسیحائے غم دوراں بن کے آئی تھی۔ شب ابر غم میں اچانک رابعہ کے حسن کا ماہ کامل طلوع ہو گیا تھا اور محبت کی چاندنی نے دل میں اتر کے مایوسی کی سب تاریکی مٹا دی تھی اور روح کے ہر گوشے کو روشن کر دیا تھا۔ میں خود کو بہت ہلکا پھلکا، آزاد اور بدلا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ وہی جو میں تھا اور اب پھر ہونا چاہتا تھا۔ کل پھر وہی دشت کی مسافت ہوگی، نفرتوں، عداوتوں

اور عقوبتوں کے کانٹوں سے پُر راستے ہوں گے اور زندگی کے امتحان ہوں گے لیکن آج کی شام تو اپنی ہے اور اس کے دامن میں جتنے خوشبو کے پھول ہیں، اپنے ہیں اور چاہتوں کے جتنے اُجالے ہیں اپنے ہیں۔ آؤ کہ کوئی خواب نہیں کل کے واسطے۔

میں نے گاڑی کو ٹاٹسٹن مارکیٹ کے سامنے روک دیا۔ "اب یہاں کیا کام ہے؟" رابعہ بولی۔

"ایک ساڑی خریدنی ہے۔" میں نے کہا۔ "جس کا رنگ آسمان کی طرح شفاف نیلا ہو اور اس میں زرد پھول ہوں۔"

"یہ کیا خبط ہے؟" رابعہ نے نظر جھکا کے کہا اور شفق کا سارا رنگ اس کے عارض میں اُتر آیا۔

"جب میں نے پہلی بار تمھیں دیکھا اور یہ محسوس کیا تھا کہ تمھیں نہ چاہنا میرے اختیار کی بات نہیں تو تم نے ایسی ہی ساڑی باندھ رکھی تھی اور حالانکہ وہ جیل کا کمرۂ ملاقات تھا لیکن تمھارا وہ روپ ایک لازوال نقش ہے۔ دل چاہتا ہے آج تمھیں پھر اسی انداز میں دیکھوں۔" پھر میں اس کے ساتھ انارکلی بازار کی بہت سی دکانوں پر گیا۔ یہ پروا کیے بغیر کہ کہیں کوئی مجھے پہچان نہ لے اور میں نے ہر دکاندار سے ایک ہی سوال کیا۔ بالآخر میری جستجو کامیاب ہوئی۔ ایک دکاندار نے مجھے گہرے نیلے رنگ کی ہوا کی طرح سبک اور پردۂ آبشار کی طرح چمکتی ڈھلکتی ساڑی نکال دی جس کے شوخ پھولوں کی پیلاہٹ میں خوشبو بھی شامل لگتی تھی۔ رابعہ خاموش کھڑی ہونٹ کاٹ رہی تھی۔ دوپٹے کے ایک کونے کو انگلی پر لپیٹتی کھولتی رہی۔

"آج کی شام اور اپنی محبت کے نام۔" میں نے باہر آ کے پیکٹ اس کی نذر کیا۔ "پھر برق فروزاں ہو سرِ وادیٔ سینا اور وقت کا ایک بُجھا ہوا لمحہ جگنو بن کے میری مٹھی میں آ جائے تاکہ میں سمجھوں کہ خواب میری دسترس میں ہیں۔"

"ایسی باتیں مت کیا کرو سکندر۔ وقت تو گزر جاتا ہے لیکن اس کی بازگشت آسیب بن کے میرا پیچھا کرتی ہے۔" وہ میرے کندھے پر سر رکھ کے بولی۔ "کل بھی تو زندہ رہنا ہے مجھے۔ تنہائی میں یادیں زیادہ ستاتی ہیں۔"

میں نے اس کی طرف دیکھا اور چند سیکنڈ کے لیے ماضی، حال اور مستقبل اس ایک نظر میں سمٹ گئے۔ سب کچھ کہے بغیر ہم نے عہدِ وفا کو استوار کیا۔ محبت کے یقین کی اتنی دولت سمیٹ لی کہ مسافتِ عدم تک دل کبھی مفلس نہ ہو اور وہ سب کہہ دیا جو ساری دنیا کے ساری زبانوں کے الفاظ میں نہیں کہا جا سکتا تھا لیکن سمجھا جا سکتا تھا۔

"کیا تمھارا دل نہیں چاہتا رابعہ کہ موت اسی لمحے کو جاوداں کر دے؟ سچ کہو۔"

"نہیں سکندر۔ میں اس وقت تک مرنا نہیں چاہتی جب تک ہر خوابِ آرزو کو تعبیر نہ مل جائے۔ میں نے کتنے دن اور کتنی راتیں اپنے انہی خوابوں کو سجاتے سنوارتے گزار دی ہیں۔ اب تم چاہتے ہو کہ ان سے دستبردار ہو جاؤں۔ یہ سمجھ لوں کہ وہ سب فریب تھا جو میں نے خود کو دیا۔ اور خواب سب جھوٹے ہوتے ہیں؟" وہ آنکھیں بند کر کے بولی۔ "چلو آگے چلو۔ رُکنے سے منزل نہیں ملتی۔"

میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور ہم ہوٹل فاران پہنچے تو رات اپنا آنچل پھیلا چکی تھی۔

"تم تیار ہو کے آؤ۔" میں نے کہا۔ "میں اسی جگہ تمھارا انتظار کروں گا اور دیکھوں گا کہ گزرے ہوئے وقت کی ایک خوبصورت یاد کس طرح پھر زندہ حقیقت بن کے سامنے آتی ہے۔"

"اتنا دیوانہ تو مجنوں بھی نہیں ہوگا۔" رابعہ نے خمارِ عشق میں ڈوبی ہوئی شرابی ادا کے ساتھ کہا۔

"ہاں۔ اسے لیلیٰ بھی تو ایسی نہیں ملی تھی۔" میں نے ہنس کر کہا۔ میں اسے اندر جاتے اور شفاف شیشے کے دروازے میں غائب ہوتا دیکھتا رہا۔ دروازے میں رُک کر اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا اور مسکرائی۔ یہ مسکراہٹ بھی ایک پیغام دے گئی کہ تھوڑا سا انتظار کر سکتے ہو نا۔ اور میرے دل نے کہا۔ ہم انتظار کریں گے تیرا قیامت تک۔ خدا کرے کہ قیامت ہو اور تو آئے۔

میں اُٹھ کے تھوڑی دور تک گیا اور ہوٹل کے آرکیڈ سے باہر ہی ایک چھوٹی سی دکان سے سگریٹ خریدنے لگا۔ رابعہ کا دس پندرہ منٹ سے پہلے واپس آنا مشکل تھا۔ میں دوسرے گیٹ سے ہوٹل کے کاریڈور میں لگے ہوئے فون تک گیا اور البرٹ وکٹر ہوسپٹل کا نمبر ڈائل کیا۔ ریسیور ایک نرس نے اٹھایا چنانچہ مجھے فوزیہ کی خیریت دریافت کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ وہ خطرے سے بالکل باہر تھی اور اس کی حالت بہت تیزی سے بہتر ہو رہی تھی۔ باتونی نرس نے مجھے یہ بھی بتا دیا کہ اسے دو بار خون کی ضرورت پڑی تھی اور یہ خون دونوں بار فوزیہ کے بھائی نے ہی دیا تھا۔ بہن بھائی ایک جیسے صحتمند اور خوش تھے۔ ان کا بلڈ گروپ تو ایک ہونا ہی تھا۔ میں اطمینان کے احساس کے ساتھ پھر باہر آیا۔ گاڑی مجھ سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر اور دو تین موٹروں کے بعد کھڑی تھی۔ مجھے خالی ہاتھ دیکھ کر چابیوں کا خیال آیا۔ گاڑی کی چابیاں عادت کے مطابق میرے پاس نہیں تھیں۔ میں واپس فون تک گیا لیکن چابیاں وہاں نہیں تھیں۔ شاید میں سگریٹ خریدتے وقت چابیاں چھوڑ آیا۔ میں نے سوچا اور سگریٹ والے کے پاس گیا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر لاعلمی کا اظہار کیا۔

"چابیاں کون اٹھاتا ہے جی۔ آپ نے یہاں رکھی ہوں تو یہیں مل جائیں۔" وہ بولا۔

"شاید گاڑی میں ہی لگی رہ گئیں۔" میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ میں واپس چلنے ہی والا تھا کہ ایک گاڑی نے زبردست بریک لگائی۔ پھر تصادم کی آواز آئی۔ اور میں نے بے اختیار پلٹ کے دیکھا تو مجھے ایک اسکوٹر سڑک پر پڑا نظر آیا۔ میرے پہنچنے تک اسکوٹر والا اٹھ کر کھڑا ہوا تھا اور شاید غلطی اسی کی تھی کہ اس نے خود کو سنبھال کے سوری کہا اور اسکوٹر اٹھانے لگا۔ کار والے کے علاوہ کچھ لوگوں نے اسے ہمدردی سے ملامت کی اور خدا کا شکر ادا کرنے کو کہا۔ اس کی جیب میں سے کچھ چیزیں نکل کر سڑک پر بکھر گئی تھیں۔ میں نے لیمپ پوسٹ کی روشنی میں ایک پرس، کچھ سکے اور ایک قلم اٹھا کے اسے دیا۔ پھر مجھے اس کی کلائی کی گھڑی نظر آئی۔ وہ خود اتنا نروس اور بدحواس تھا کہ اسے کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔ اس نے میرا شکریہ ادا کیا۔ ایک پہلوان ٹائپ شخص اسے اپنے ساتھ لے گیا کہ ذرا دیر ٹھہر جائے..... اور ایک کپ چائے کا پی لے تاکہ اس کی حالت بہتر ہو جائے۔ ارد گرد سے جمع ہونے والے بیشتر افراد بھی اس معمولی سے حادثے پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے منتشر ہو گئے تھے لیکن کار وہیں کھڑی تھی اور اس کا انجن چل رہا تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی اور مجھے احساس ہوا کہ رابعہ میری منتظر ہوگی۔ وہ سوا آٹھ بجے اندر گئی تھی اور اب آٹھ پینتیس ہو رہے تھے۔

ایک شخص میری راہ میں حائل ہو گیا۔ "تم سکندر بخت ہو؟" اس نے بیٹھی ہوئی آواز میں کہا۔

"نہیں۔" میں نے راستہ کاٹ کے نکلتے ہوئے کہا اور حواس بحال رکھے۔

"تم جھوٹ بولتے ہو۔" وہ پھر میرے سامنے آگیا۔ وہ جوان تو نہیں تھا لیکن صحت مند تھا اور شاید اسی کار سے اترا تھا جس سے اسکوٹر والا ٹکرایا تھا۔ میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ جتنی دیر میں حادثے سے متاثر ہونے والے کے لیے امدادی کارروائی میں شریک رہا تھا وہ مجھے دیکھتا رہا اور اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔

"ہٹ جاؤ میرے راستے سے۔" میں نے ایک دم پیچھے ہو کے دفاعی پوزیشن لیتے ہوئے کہا لیکن اسی وقت کار کے دونوں دروازے کھلے اور میں نے پلٹ کر دو افراد کو باہر آتے دیکھا ہی تھا کہ پہلے شخص نے بڑی پھرتی سے مجھے بیل کی طرح سر سے ٹکر ماری۔ میں لڑکھڑا کے پیچھے ہٹا تو کار سے نکلنے والے ایک شخص نے مجھے تھام لیا اور میرا رُخ یوں بدلا کہ میں سیدھا کار کے کھلے دروازے کے اندر گیا۔ کار سے اُترنے والا دوسرا شخص میرے اوپر آیا اور میں نے آدھا اندر اور آدھا باہر ہونے کے باوجود اسے دونوں لاتیں ایک ساتھ ماریں۔ وہ پیچھے گرا۔ میں اٹھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ڈرائیور نے پیچھے پلٹ کر ریوالور کو میرے حلق سے چند انچ کے فاصلے پر تھام لیا۔ وہ سیٹ پر بہت پیچھے جھکا ہوا تھا۔ اور اس کا ہاتھ نیچے لٹکا ہوا تھا۔ میں وہیں ساکت ہو گیا۔ باہر سے کوئی چلایا۔ "اوئے۔ ایہہ کی ہو گیا اے؟" لیکن انھوں نے بڑی پھرتی دکھائی۔ پیچھے والا دوسرا دروازہ کھول کے ایک نے مجھے اندر گھسیٹا اور دوسرے نے میری ٹانگیں موڑ کے اندر کر دیں۔ اور وہ دروازہ بند کیا جس میں سے مجھے اندر دھکیلا گیا تھا۔ جگہ بہت کم تھی اور وہ دونوں سیٹ پر بیٹھ کے مجھے دبائے ہوئے تھے۔ ورنہ مجھے ایک موقع اس وقت ملا جب ڈرائیور نے ریوالور اپنے ساتھی کو دیا۔ میں نے اٹھنے کی بھرپور کوشش کی اور تقریباً کامیاب بھی ہو گیا تھا مگر میرے سر پر سوار دونوں حملہ آوروں نے بیک وقت مجھ پر مکے برسائے۔ دو مکے میرے سر پر لگے اور دو سینے پر۔ اس کے علاوہ انھوں نے ایڑیاں اٹھا کر مجھے پیروں سے کچلا۔ اور میں پھر گر گیا۔ اب ریوالور کا رُخ میرے سر کی طرف تھا اور میں یہ دیکھ سکتا تھا کہ اس کی نال کے آگے سائلنسر بھی ہے۔ اس کے ایک وار نے مجھے ہوش سے بیگانہ کر دیا۔ پھر ہوش آیا تو میں ایک کمرے میں بند حال پڑا تھا اور وہ چاروں میرے سامنے موجود تھے۔ مجھے اچانک گرفتار کر کے اغوا کرنے والے شریف لوگ نظر نہیں آتے تھے۔ ان کی عمروں میں ضرور فرق تھا لیکن حلیوں میں نہیں۔ سب سے کم عمر شخص پچیس چھبیس سال کا وہ ڈرائیور تھا جس نے سب سے پہلے مجھ پر ریوالور تانا تھا۔ سب سے زیادہ عمر میری راہ میں حائل ہونے والے کی تھی۔ ان کے کپڑے بوسیدہ اور میلے تھے۔ انجن آئل، گریس اور مختلف رنگوں کے دھبے دیکھ کر میں نے اندازہ کیا کہ وہ کسی گیراج کے مالک یا ملازم تھے جو اپنی یا مرمت کے لیے آنے والی کوئی گاڑی لے کر پھر رہے تھے۔ مجھے انھوں نے اچانک اور اتفاقیہ پہچان لیا تھا۔

"یہ کون ہے، وہی جو تیرے دبئی کے ویزا کی رقم لے کر بھاگ گیا تھا؟" ڈرائیور نے کہا۔

"او پاگل دے پُتر۔ ریوالور ایسے ہی نکال لیا تھا تُو نے؟" پہلے شخص نے کہا۔ "میں نے کہا تھا کہ گولی نہیں چلانی ہے۔"

"اور کیا کرتا میں؟" ڈرائیور نے تیز لہجے میں کہا۔ "مار پیٹ ہوتی وہاں تو ٹھیک تھا؟"

"وخت تو پہلے ہی پڑ گیا تھا استاد۔" دوسرے نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔ "اس..... اسکوٹر والے نے بھی آج ہی سامنے آ کے مرنا تھا۔"

"ایک مہینہ تیاری کی تھی۔ ایک منٹ میں ختم۔" تیسرا بھی سے بولا۔

"میرا کوئی قصور نہیں تھا اس میں۔" ڈرائیور نے تند لہجے میں کہا۔ "میں بہت احتیاط کے ساتھ گاڑی چلا رہا تھا لیکن وہ کنجر ہوٹل کے دروازے میں سے نکل آیا۔ جیسے سڑک پر کوئی نہیں۔ شکر کرو کہ اس کی جان بچا لی میں نے۔ ورنہ لمبا پھڈا پڑ جاتا۔ خواہ مخواہ پکڑے جاتے۔"

"تجھے کون الزام دے رہا ہے۔" استاد کہلانے والے نے ڈرائیور کو ڈانٹا۔" سب ذرا سی بات میں گھبرا جاتے ہو؟"

"یہ ذرا سی بات ہے؟ لوگوں نے گاڑی دیکھ لی۔" پہلے نے کہا۔

"یار گاڑی کو گولی مارو۔ دوسری بھی مل جائے گی۔" ڈرائیور نے کہا۔" لوگوں نے تو ہمیں بھی دیکھ لیا۔"

"کسی نے نہیں دیکھا ہمیں۔ اور دیکھا بھی تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" استاد نے کہا۔" اتنی خلقت پھرتی ہے وہاں۔ سب کی صورتیں کون یاد رکھتا ہے۔ ہم کل جائیں گے تو کوئی نہیں پہچانے گا۔ لوگ بھی دوسرے ہوں گے اور راستہ بھی...."

"نہیں استاد۔ ابھی دوبارہ وہیں جانا ٹھیک نہیں ہے۔" دوسرے نے کہا۔" کوئی اور جگہ دیکھو۔"

"تم لوگوں کا دماغ خراب ہے۔" استاد نے بگڑ کے کہا۔" او یار، چھوٹی چھوٹی باتیں تو ہوں گی۔ کتنا سمجھا چکا ہوں تمھیں کہ اس میں خطرہ کم ہے اور فائدہ بہت زیادہ۔ بنک کی بات مت کرو۔ وہاں مسلح گارڈ ہوتے ہیں اور پھر پیسہ کتنا ملے گا یہی دو چار لاکھ۔ بہت ہوا تو آٹھ دس لاکھ لیکن بنک ڈکیتی میں ساری پولیس فورس حرکت میں آجاتی ہے۔ ہوٹل میں کام بہت آسان ہے۔ چوکیدار بھی بس دروازے کھولنے کے لیے اور سلام کر کے ٹپ لینے کے لیے ہوتا ہے۔ آرام سے ایک آدمی نیچے سب کو قابو کر لے۔ باقی تین اوپر چلے جائیں۔ باری باری ہر مسافر کے دروازے پر دستک دیں اور جو کچھ اس کے پاس ملے رکھوالیں۔ سب بڑے لوگ ٹھہرتے ہیں وہاں۔ میں نے معلوم کر لیا ہے آج کل کون کون ٹھہرا ہوا ہے۔ ایک تو کوئی پرنسس صوفیہ ہے۔ تم ہر ایک سے سارا نقد زیور لو اور اسے ناک آؤٹ کر کے باتھ روم میں ڈال دو۔ تین آدمی پانچ منٹ میں ایک کمرے سے فارغ ہوں تو آدھے گھنٹے میں اٹھارہ کمروں سے بہت کچھ مل سکتا ہے۔ ساتھ والوں کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی۔ میں نے بیس نام نوٹ کیے ہیں۔ صرف انہی سے اتنا مل جائے گا کہ سب کو کافی ہوگا۔ نقد رقم، بانڈ، زیورات اور بہت کچھ۔ کیشیئر بھی خالی نہیں ہوگا۔ مجھے بیس پچیس لاکھ کی اُمید ہے۔"

"وہاں سے نکلنے کا مسئلہ ذرا ٹیڑھا ہے استاد۔" دوسرا بولا۔

"خاک ٹیڑھا ہے۔ میں نے بتا دیا ہے کہ کسی ایک مسافر کو یرغمالی بنا کے نکلیں گے۔" استاد نے کہا۔" ہوٹل والوں کو خبردار کر دیں گے کہ انھوں نے پولیس کو بتایا یا تعاقب کیا تو ہم اسے مار دیں گے۔ فرض کرو ہم پرنسس کو ہی لے آئیں۔ ہوٹل والے دم نہیں ماریں گے۔ ایک تو وہ بدنامی نہیں چاہیں گے جس ہوٹل میں یوں ڈاکا پڑے وہاں کون ٹھہرنا پسند کرے گا۔ وہ تمام مسافروں کے آگے ہاتھ پاؤں جوڑیں گے اور ان کے نقصانات کی تلافی کر دیں گے۔ بیس پچیس لاکھ کا نقصان ہوگا تو ہوٹل والوں کا۔ مگر وہ اس نقصان کو برداشت کر لیں گے اور کاروبار کو تباہ ہونے سے بچائیں گے۔ پرنسس کے علاوہ وہاں ایک نیا جوڑا بھی ٹھہرا ہوا ہے اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ کسی صنعت کار کی بیٹی ہے۔ لڑکا کسی زمیندار کا بیٹا ہے۔ دونوں نے چھپ کر شادی کی ہے۔ پرنسس کے ساتھ ہم انھیں بھی لے آئیں تو ہماری پوزیشن اور بہتر ہو جائے گی۔ ہوٹل والے یہ ہرگز نہیں چاہیں گے کہ معاملہ تین مسافروں کے قتل تک پہنچے جب ان کو معلوم ہوگا کہ یرغمالی وی آئی پی قسم کے لوگ ہیں تو ان کی سٹی گم ہو جائے گی۔"

"صنعت کار کی بیٹی اور داماد کے بدلے کچھ وصول نہیں ہو سکتا؟" ڈرائیور بولا۔" ماں باپ سے؟"

"نہیں۔ پھر کیس پولیس کے پاس ضرور چلا جائے گا۔" استاد نے سختی سے کہا۔" ورنہ وہ معاملے کو دبائیں گے اور ہوٹل والوں کو بھی کچھ نہیں کرنے دیں گے۔ ان کی اپنی بدنامی ہوگی اگر خبر چھپی۔ یہ ہو سکتا ہے، وہ مسافروں کا نقصان پورا کرنے میں ہوٹل والوں کے ساتھ مل تعاون کریں۔ دو چار لاکھ دے دیں اور اپنے بچوں کے علاوہ اپنی عزت بچائیں۔ ہم چوبیس گھنٹے بعد سب کو رہا کر دیں گے۔ پولیس کے چکر سے سب بچتے ہیں۔ نقصانات کی تلافی ہو جاتے گی تو سب خاموشی سے نکل جانا بہتر سمجھیں گے۔ ڈکیتی بنک کی ہو تو اخبار شور مچا دیتے ہیں۔ یہ معاملہ تو ایسا دبے گا کہ بعد میں کسی مسافر نے ذکر بھی کیا تو ہوٹل والے اسے صاف جھوٹ قرار دیں گے اور اس کی تردید بھی شائع کر دیں گے، ہم بالکل محفوظ۔"

"استاد، یہ سب تو ٹھیک ہے۔ لیکن یہ بندہ کیوں اٹھا لایا ہے؟"

"تم سب اندھے ہو گیا؟" استاد ہنسا۔" اسے پہچانتے نہیں؟ یہ ایک مفرور اشتہاری مجرم ہے۔ اس کی گرفتاری پر دس ہزار کا انعام ہے۔ اسے ہم پولیس کے حوالے کر دیں گے۔ دس ہزار کے علاوہ اس سے ثابت ہو جائے گا کہ ہم کتنے قانون پرست شہری ہیں۔ بعد میں کسی نے جھوٹے سے بھی شک کیا ہم پر تو ہمارے پاس یہ سند ہوگی کہ ہم مجرم نہیں، مجرموں کو پکڑ کے قانون کے حوالے کرنے والے شریف آدمی ہیں۔" اس نے فخر سے ان سب کی طرف دیکھا جو اسے استاد مانتے تھے۔ وہ سب اپنی اس کی استادی اور اس منصب کے لیے اس کی غیر معمولی صلاحیت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

میں بے ہوش بنا سب کچھ سن رہا تھا۔ ستم ایجاد تقدیر کا یہ تازہ شاہکار تھا کہ اس وقت رابعہ کے پیکر میں حسن و ناز آفرینی اور اس کے جلوہ ہائے دل وحشی کی حسرتوں کا نظارہ کرنے کے بجائے میں دست و پابستہ اس فرش خاک پر پڑا تھا۔ کتنا اچھا ہوتا اگر میں وہیں ستم کش انتظار رہتا۔ قسمت کی خوبی دیکھیے ٹوٹی کہاں کمند۔ اگر صرف ایک منٹ پہلے ہی میں نکل گیا ہوتا، وہ اسکوٹر سوار اس کار سے نہ ٹکراتا اور میں اس کی مدد کرنے کے لیے نہ رُکتا تو میں اور رابعہ نکل جاتے۔ بے شک اس کے بعد ڈاکے کی نیت سے آنے والے ہوٹل کو پروگرام کے مطابق ضرور لوٹتے لیکن

ہم بہر حال محفوظ رہتے۔ یہ سب قدرت کے کھیل تھے۔ عین وقت پر ایک شخص کو اسی طرح غیب سے نمودار ہو کے ان ڈاکوؤں کی گاڑی سے ضرور ٹکرانا تھا۔ قدرت کا مقصد محض ان کے اور میرے پروگرام میں رخنہ اندازی تھا۔ اسے حادثے سے دوچار کرنا نہیں۔ چنانچہ اسکوٹر والے کو خراش تک نہیں آئی تھی۔ نقصان مجھے صرف اس حد تک ہوا تھا کہ ایک شام جو اس کے حسن آرائی انجمن آرائی کی شام تھی شب فراق کی تنہائی پر تمام ہوئی تھی۔ وہ من ہی من میں شرماتی، آرائش خم کاکل سے اور جمال لب و رخسار سے جادو جگاتی، اسی لباس میں جانِ بہار اور رشکِ گلستان بنی آئی ہوگی۔ میری منتظر نگاہوں کی دید اور میرے اشتیاق و اضطراب کا نظارہ کرنے لیکن اسے کوئی نہ ملا ہوگا اور اس کا دل بجھ گیا ہوگا۔ آنکھوں میں ستاروں کی جوت مر گئی ہوگی اور اس نے بڑی مایوسی کے ساتھ میری واپسی کا انتظار کیا ہوگا۔ یہ سمجھا ہوگا کہ اسے یوں محو انتظار دیکھنا بھی میری شرارت ہے اور میں اُسے کہیں سے چھپ کر دیکھنے میں محو ہوں۔ پھر انتظار تشویش میں ڈھل گیا ہوگا اور اب وہ اندیشہ ہائے دور و دراز کا شکار اپنے کمرے میں پڑی رو رہی ہوگی۔ یہ فیصلہ کرنے سے قاصر ہوگی کہ اب وہ کیا کرے۔ اسے مشورہ دینے والا بھی تو کوئی نہیں کہ اسے پولیس سے رجوع کرنا چاہیے یا نہیں۔ وہ جانتی ہے کہ پولیس کے پاس جانے سے صورت حال کتنی مضحکہ خیز ہو جائے گی۔ وہ ہنسیں گے اور کہیں گے، بی بی، وہ اغوا ہوا ہے یا نہیں۔ ہم تو اسے پہلے ہی گلی گلی گھر گھر تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ رات کو محسن کا فون آئے گا تو وہ کیا بتائے گی۔ اور محسن کہے گا کہ میں اتنا سمجھا کے آیا تھا کہ کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے۔ لیکن اس کے بعد وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے چل پڑے گا۔ معلوم نہیں وقت کیا ہوا ہے۔ ممکن ہے اب تک اس کی کوئی کال آچکی ہو۔ میرے ہاتھ اس طرح بندھے ہوئے تھے کہ میں وقت دیکھنے سے قاصر تھا اور کمرے کے اندر رات کا اندازہ تو ہوتا تھا؛ وقت کا نہیں۔

اس غیر متوقع حادثے نے ہوٹل میں رہنے والوں کو اور منتظمین کو بہت بڑی پریشانی سے بچا لیا تھا۔ یہ ڈاکو اگر کامیاب ہو جاتے تو اس وقت اٹھارہ بیس دولت مند مسافر اپنا سب کچھ گنوا چکے ہوتے۔ تو یرج کے بعد ہنی مون منانے کے لیے اس ہوٹل میں قیام کرنے والے اب تک یرغمالی بن چکے ہوتے۔ صرف پرنسس صوفیہ ان کے ہاتھ نہ آتی مگر اس بارے میں بھی پورے یقین کے ساتھ کچھ کہنا دشوار تھا۔ اگر وہ میرے خرمنِ عقل و ہوش پر بجلی بن کے گرنے کے لیے سولہ سنگھار میں دیر لگا دیتی تو میری مشتاق نگاہوں کی جگہ خون آشام ڈاکو اس کا استقبال کرتے۔ انہیں بعد میں پتا چلتا کہ وہ جسے پرنسس سمجھ کے اٹھا لائے ہیں، وہ ایک وکیل ہے۔ کون جانے

وہ صنعت کار کی بیٹی بھی کسی ہیڈ کلرک کی دختر ہو اور زمیندار کا بیٹا اسی دفتر کا بابو۔ پرنسس کی طرح انھوں نے بھی اصلیت پر شان و شوکت کا پردہ محض خود کو پوشیدہ رکھنے کے لیے ڈالا ہو۔ ان لوگوں کی گفتگو سے مجھے اتنا اندازہ تو ہو گیا تھا کہ وہ پرانے مجرم نہیں ہیں اور کسی خطرناک گروہ سے تعلق نہیں رکھتے۔ ایسا ہوتا تو وہ مجھے پولیس کے پاس لے جانے اور میرے عوض دس ہزار کا انعام حاصل کرنے کی کبھی نہ سوچتے۔ دس ہزار کی رقم ڈکیتی کی اور رہزنی کی وارداتوں میں ملوث ہونے والے مجرموں کے لیے کیا اہمیت رکھتی ہے۔ انھیں پولیس کے ریکارڈ پر خود کو نیک نام اور قانون کا معاون ثابت کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی اور نہ پولیس انھیں یہ سند دیتی ہے۔ یہ اس میدان میں نووارد کھلاڑی تھے اور ان سے نمٹنا مشکل نہیں تھا۔

مجھے اغوا کر کے لانے والے مجھے نہتا کر چکے تھے لیکن ان کو یہ کہاں معلوم تھا کہ اپنے خالی ہاتھوں سے بھی ان سب کے آملیٹ بنا کے پارسل کر سکتا ہوں۔ میرا ابتدائی اندازہ بظاہر درست ہی تھا کہ وہ گیرج میں کام کرنے والے میکینک ہیں۔ جس کمرے میں انھوں نے مجھے ڈال رکھا تھا وہ بھی آئل اور گریس کی بُو سے معمور تھا۔ اس کے فرش پر میل کی سیاہ چکنی تہ تھی اور جو دیوار مجھے نظر آ رہی تھی وہ بھی کسی گھر کی اُجلی دیوار نہیں تھی۔ کمرے میں فرنیچر بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ چنانچہ یہ جگہ گیرج بھی ہو سکتی تھی۔ میں نے آہستہ آہستہ کراہنا شروع کیا۔

"اسے ہوش آ رہا ہے؟" نوجوان ڈرائیور نے کہا۔

"اس کا منہ بند کرنا ضروری ہے استاد؟" دوسرے نے کہا۔" یہ چلانے لگا تو...."

"ابے کیسے چلائے گا؟" استادِ محترم نے میرے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ میں نے آنکھیں بند رکھیں اور کراہتے ہوئے پانی مانگا جو المونیم کے ایک گلاس میں پیش کیا گیا۔ استاد نے میرا سر تھام کے اٹھایا اور میں نے بڑی مشکل سے دو گھونٹ لیے۔ ایک سُورما میرا ہی ریوالور لیے کے میرے سامنے کھڑا رہا۔ اس کا مقصد مجھ پر یہ واضح کرنا بھی تھا کہ میں خالی ہاتھ ہوں اور اگر میں نے ہنگامہ برپا کیا تو مجھے ہمیشہ کے لیے خاموش بھی کیا جا سکتا ہے۔ چوٹ کا اثر باقی تھا اور میرے سر میں ہتھوڑے چل رہے تھے لیکن میں زندگی میں اس سے کہیں زیادہ سخت جسمانی تشدد برداشت کر چکا تھا۔

"میں.... میری بات.... سُنو۔" میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں۔ خیریت چاہتا ہے تو چُپ چاپ پڑا رہ۔" استاد نے کہا۔

"میں.... میں خاموش ہی ہوں.... میں وعدہ کرتا ہوں۔ میرے ہاتھ پاؤں.... کھول دو۔" میں نے لجاجت سے کہا۔" میں بائیں

....بالکل شور.... شور نہیں مچاؤں گا...."

انھوں نے سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور نفی میں سر ہلایا۔ میری بے بسی کا نظارہ ان کو اپنی قوت کا احساس دلا رہا تھا۔ ان میں اعتماد پیدا کر رہا تھا۔

"تم.... تم کو.. کس بات کا ڈر ہے...." میں نے یوں کہا جیسے مجھ پر نزع کا عالم طاری ہے۔ "تم لوگوں.... کے پاس ریوالور ہے.... میں خالی ہاتھ ہوں.... یہ میرا ہی ریوالور ہے.... اگر میں... کوئی ایسی ویسی بات.... کروں.... تو تم مجھے گولی مار سکتے ہو.... مار سکتے ہو یا نہیں؟.... اکیلا آدمی.... میں اکیلا ہوں۔ تم چار.... پھر بھی ڈر ہے....؟"

میرا سوال براہِ راست ان کی جرأت کو چیلنج کرنے کے مترادف تھا۔ انھوں نے پھر ایک دوسرے سے خاموش مشورہ کیا اور ذرا سی دیر کے لیے کمرے کے آخری گوشے میں چلے گئے۔ جہاں سے میں صرف ان کی سرگوشی سن سکتا تھا۔ بالآخران کی کانفرنس ختم ہوئی اور سب سے کم عمر اور جوان شخص یعنی ڈرائیور نے میرے ہاتھ پیروں سے لپٹی ہوئی رسّی کی گرہ کھولنے کا خطرہ مول لیا۔ استاد کے ساتھ دوسرا شخص بھی فلمی وِلن کی طرح ریوالور لے کر میرے مقابل آگیا۔ اب ایک ہتھوڑا سا میرے دائیں ہاتھ پر تھا اور دوسرا بائیں ہاتھ کی جانب۔ وہ یقیناً خود کو اس آتشیں اسلحے کی توانائی کے سبب بہت بہادر محسوس کر رہا تھا۔ اس کے دونوں پیر مضبوطی سے جمے ہوئے تھے۔ اور ہتھوڑے سے پھیلے ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھ کی ایک انگلی ریوالور کے ٹریگر پر تھی جو ایک خطرناک بات تھی۔ کسی بھی اناڑی سے اندازے کی ذرا سی غلطی حادثاتی موت کا سبب بن جاتی ہے۔

میں نے "آہ۔ اوہ۔ ہائے" کرتے ہوئے آہستہ آہستہ ہاتھوں اور پیروں کو حرکت دی اور خاصی کوشش کے بعد دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھنے کے قابل ہوگیا۔ اب اس پورے کمرے کا منظر میری نگاہوں کے سامنے آیا۔ وہ واقعی گیرج تھا۔ ایک دیوار کے ساتھ موٹی سی لمبے تختے کی بینچ بنی ہوئی تھی۔ اس کے نچلے حصّے میں بھدّے اور بدوضع پٹ رکھے ہوئے تھے۔ کچھ بند اور کچھ کھلے ہوئے۔ اندر ہر قسم کا کاٹھ کباڑ جمع تھا۔ بینچ پر انجن کے پُرزے ڈھیر تھے اور نیچے دو نامکمل انجن رکھے ہوئے تھے۔ اسی دیوار پر چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑے اسپیز اس ترتیب سے آویزاں تھے کہ سیٹ کا ایک اسپینر بھی کم ہو تو جگہ خالی نظر آئے۔ زیرِ مرمت گاڑیاں یا تو باہر سڑک کے کنارے کھڑی تھیں یا پچھلے حصّے میں کوئی احاطہ یا میدان تھا۔ بیشتر گیرج اسی طرح زمین پر ناجائز تصرف سے چلتے ہیں۔

"میں.... میں تم لوگوں سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔" میں نے ہاتھ سے کلائیوں کو رگڑتے ہوئے کمزور لہجے میں کہا۔

"ہمیں معلوم ہے تو کیا کہے گا۔ یہی نا کہ تجھے چھوڑ دیں۔" استاد نے قائدِ حزبِ اختلاف کی حیثیت سے کہا۔

"وہ تمہاری مرضی ہے۔" میں نے کہا۔ "کیا تمھیں معلوم ہے کہ مجھ پر کیا الزامات ہیں....؟"

انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور اپنی لاعلمی پر شرمندگی کو مجھ سے چھپانے کی کوشش کی۔ "ہمیں معلوم ہے تجھ پر قتل اور ڈکیتی کے الزامات ہیں۔ ایسے ہی تو کوئی اشتہاری مجرم نہیں بنتا۔"

"میں نے پانچ قتل کیے.... کیے تو گیارہ ہیں مگر پولیس نے مقدمہ پانچ کا بنایا۔" میں نے بڑھی ہوئی شیو پر ہاتھ پھیر کے سوچتے ہوئے کہا۔ میرے پُرسکون انداز میں بہت بڑے بدمعاشوں کی شانِ استغنا تھی جس سے وہ متاثر ہوئے۔ "چوری ڈکیتی کا حساب رکھنے والے رکھتے ہوں گے۔ میں تیسری بار جیل سے بھاگا ہوں۔ تم لوگوں نے تو ابھی جیل کو باہر سے دیکھا ہوگا۔"

تین کی نظروں میں اس اعزاز سے محرومی پر شرمندگی کے آثار نظر آئے۔ استاد صرف اس لیے استاد ثابت ہوا کہ وہی ایک مردِ میدان تھا جس نے جیل یاترا کی تھی۔ "میں رہا ہوں چھ مہینے...." وہ بولا۔

"چھ مہینے....!" میں نے ہنسنا شروع کیا۔ "جیب کاٹی تھی یا مارپیٹ کی تھی؟"

ایسے گھٹیا جرم پر ہی اتنی کم سزا ہو سکتی تھی لیکن میری ہنسی نے استاد کو احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیا۔ وہ مشتعل ہونے لگا۔

"دیکھو.... میں تمہارے فائدے کی بات کروں گا۔ ہو تم بھی اپنی ہی ذات کے۔" میں نے کہا۔ "ہمارے ہی نقشِ قدم پر چل رہے ہو تو ہم سے کچھ سیکھ لو۔ کام آئے گا۔ یہ ڈکیتی کی پہلی واردات تھی نا جو تم کرنے والے تھے؟"

میرے سوال پر وہ سب بُری طرح چونکے۔ "تو مُکر کر رہا تھا سؤر کے بچے۔" استاد نے میرے ایک لات ماری۔ میں اسے پیر کے پنجے سے پکڑ کر مگدر کی طرح گھما سکتا تھا اور ان سب کو اس مگدر سے لمبا لٹا سکتا تھا۔ وہ گولی چلاتے تو استاد مکرّم میں سوراخ کرنے کا خطرہ مول لیتے۔ لیکن میں نے صبر و تحمّل سے کام لیا۔ میں نیچے لڑھکا اور پھر کراہتا ہوا اٹھا۔

"غلطی تم لوگوں کی تھی۔" میں نے کچھ دیر بعد کہنا شروع کیا۔ "تم کو احتیاط کرنی چاہیے۔ یہ کیسے فرض کر لیا تھا تم نے کہ میں بہرہ ہوں.... میں نے تمہاری گفتگو کا ایک ایک لفظ سنا ہے۔"

میں نے ایک مختصر سا ڈرامائی وقفہ دیا اور اپنی بات کا تاثر دیکھا۔ وہ سب ذہنی طور پر مرعوب ہونے لگے تھے۔

"میری فکر مت کرو۔ تم اپنے دس ہزار مجھ سے لینا چاہو تو لے لو۔ حکومت سے لینا چاہو تو تمہاری مرضی۔" میں نے کہا۔

"پہلی صورت میں تمہارے اور میرے درمیان دشمنی کی کوئی وجہ نہیں۔ دوسری صورت میں میرے ساتھی تم سے دس ہزار واپس لے جائیں گے۔ تم سب کو معلوم ہونا چاہیے کہ اکیلا آدمی کچھ نہیں کرسکتا۔ میں جیل سے تین مرتبہ انہی ساتھیوں کی مدد سے فرار ہوا تھا تو چوتھی بار بھی ہو جاؤں گا۔ یہ تمہاری خوش قسمتی ہے۔"

"کیسی خوش قسمتی ہے؟" استاد نے مایوسی سے کہا۔ "ایک معمولی سی بات تھی۔ سارے پروگرام کا طبہ ہوگیا۔"

"استاد جی یہی تو خوش قسمتی ہے تمہاری۔" میں نے کہا۔ "تم پہلی واردات کر رہے تھے۔ کیا تیاری کی تھی تم نے ایک مہینے تک۔ تمھیں خاک بھی معلوم نہیں کہ تم وہاں جاتے تو انجام کیا ہوتا۔ ڈاکا ڈالنے سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ حفاظتی نظام کیسا ہے۔"

"وہ میں نے دیکھ لیا تھا۔ چوکیدار کے پاس بھی ریوالور تک نہیں ہوتا۔" استاد نے خفّت سے کہا۔

میں پھر ہنسنے لگا۔ "ریوالور نہ ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ بہت کچھ تو نظر ہی نہیں آتا۔ مثلاً خفیہ الارم اور کیمرے۔ جو ہر جگہ لگے ہوتے ہیں اور آنے جانے والوں پر نظر رکھتے ہیں۔ منیجر اپنے کمرے میں سب کچھ سنتا اور دیکھتا رہتا ہے۔ ذرا بھی شک ہونے کی صورت میں اسے صرف ایک بٹن دبانا پڑے گا۔ گھنٹی کی آواز سنائی نہیں دے گی لیکن پولیس دس منٹ میں آجائے گی۔"

"کیا ثبوت ہے تمہارے پاس.... تمھیں کیسے معلوم ہوا ہے یہ سب کچھ؟" استاد کا اعتماد اب متزلزل ہو رہا تھا۔

میں پھر ہنسنے لگا۔ "تم میرے مقابلے میں ابھی بچے ہو۔ مجھے بھی یہ سب کچھ سولہ سال میں معلوم ہوا ہے۔ جب میں نے پہلی بار ایک گھر میں چوری کی تھی تو میری عمر بھی سولہ سال تھی لیکن میں پکڑا نہیں گیا تھا۔ میں نے گھر اور گھر والوں کے متعلق ضروری معلومات پہلے سے حاصل کر لی تھیں۔ وہ زمانے اور تھے۔ خودکار الارم اور کیمرے استعمال نہیں ہوتے تھے لیکن اب یہ چیزیں عام ہیں۔ تم ثبوت مانگتے ہو تو واقعی ثبوت کوئی نہیں ہے لیکن تم خود سوچو، جو بات تمہاری کھوپڑی میں آئی ہے کیا اتنا بڑا ہوٹل چلانے والوں کے ذہن میں نہیں آئی ہوگی۔ ایک معمولی جوہری بھی دکان کھولتا ہے تو اپنی حفاظت کا انتظام کرنے کی پہلے سوچتا ہے۔ دنیا کے سب بڑے بڑے ہوٹلوں میں بہترین حفاظتی انتظامات ہوتے ہیں۔ تم نے ابھی کیا دیکھا ہے۔ میں یورپ اور امریکہ بھی جا چکا ہوں فرار ہو کے۔ اور وہاں گورنر کی طرح رہ کے آیا ہوں۔ ان کے تو اپنے پرائیویٹ سراغرساں بھی ہوتے ہیں۔ ہوٹل والے جانتے ہیں کہ ان کے پاس ٹھہرنے والے معمولی لوگ نہیں ہوتے۔ ڈاکا پڑنا تو اتنی بڑی بات نہیں لیکن انھیں اغوا کیا جاسکتا ہے۔ جیسے تم ابھی پرنس کو اغوا کرنے کی سوچ رہے تھے۔ ان میں مخالف سیاسی لیڈر بھی ہوتے ہیں۔ ان کو قتل بھی کیا جا سکتا ہے۔ مگر ہوٹل محفوظ ہیں اور وہاں کوئی واردات نہیں ہوتی تو آخر کس وجہ سے؟"

استاد کے یقین کا غبارہ جو بہت بلندی پر اڑ رہا تھا ہوا نکلنے سے اتنا نیچا ہوگیا تھا کہ استادی کا بھرم قائم رکھنا مشکل ہو گیا تھا۔ "گروہ" کے جونیئر اراکین مجھے انتہائی عقیدت و احترام سے اور اپنے سرغنہ کو افسوسناک ملامت بھری اور سرکش نظروں سے دیکھنے لگے تھے۔

"اس کی باتوں میں مت آؤ۔ یہ اُلّو کا پٹھا پولیس سے بچنے کے لیے رُعب جھاڑ رہا ہے۔" وہ بولا۔

"میں نے تم کو بتایا نا کہ دس ہزار معمولی رقم ہے۔" میں نے سکون سے کہا۔ "پولیس تم کو آسانی سے نہیں دے گی۔ پہلے تو وہ تفتیش کریں گے اور تمھیں اس میں شامل رکھیں گے۔ دس ہزار میں سے اپنا حصّہ وصول کرنے کے لیے ان کی کوشش یہ ہوگی کہ تم کو بھی میرا ساتھی ثابت کر دیں۔ تیرہ نمبر کے جوتے سے وہ دن کو رات ثابت کر سکتے ہیں۔ ان کا مؤقف یہ ہوگا کہ تم نے باہمی اختلاف کے باعث مجھے پولیس کے حوالے کیا اور وہ تم سے ہزار طریقے آزما کر پوچھیں گے کہ اتنا خطرناک مجرم تمھیں کہاں ملا؟ تمہارے قابو میں کیسے آگیا۔ مجھے کوئی خالی ہاتھ تو پکڑ نہیں سکتا۔ صبح تک انھوں نے تم کو بجایا تو تم میرا ساتھی ہونے کا اقرار کر دو یا نہ کرو، اپنے دوسرے جرائم کا اقرار کر لو گے جن کی خبر انھیں بھی نہیں مثلاً بغیر لائسنس کا ریوالور رکھنے کا۔ وہ پوچھیں گے ریوالور کہاں سے حاصل کیا؟ کب سے تمہارے پاس ہے اور اب تک اس کا استعمال کہاں کہاں کر چکے ہو؟ دس ہزار جوتے کھا کے تم جیل چلے جاؤ گے۔ اور اگر عقل سے کام لیتے ہوئے انعام کی رقم آدھی کرنے پر تیار ہوگئے تو وہ ضابطے کی کارروائی مکمل کریں گے۔ پھر افسرانِ بالا کو رپورٹ کریں گے۔ معاملہ آئی جی تک جائے گا۔ وہاں سے منظوری آئے گی۔ پھر بل بنے گا اور سرکاری خزانے جائے گا۔ سال بھر تک پہلے تم چکر لگاتے رہو گے اور ان سے اپنا حق یوں مانگتے رہو گے جیسے خیرات مانگ رہے ہو۔ تم کو دس ہزار پورے مل سکتے ہیں۔ کسی پریشانی کے بغیر اور مجھ سے دشمنی کا خطرہ مول لیے بغیر۔ میں تم کو رقعہ دیتا ہوں۔ تم میں سے ایک جائے اور رقم لے آئے۔ دس کی جگہ پندرہ مانگو گے تو مل جائیں گے اور تم سے کوئی سوال نہیں کیا جائے گا۔"

"اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ جو جائے گا وہ واپس لوٹ کر بھی آئے گا؟" استاد نے کہا۔

"ضمانت میں ہوں۔" میں نے کہا۔ "تمہارے پاس۔ تم مجھے کسی اور جگہ لے جا سکتے ہو اور اپنے ساتھی کو وہ پتا دے سکتے ہو۔ مجھے بتائے بغیر۔ وہ کسی کو پیچھے آتا دیکھے تو رقم واپس کر دے۔ لیکن میں تم کو یقین دلاتا ہوں کہ پیچھے کوئی نہیں آئے گا۔ جو یہ رقم دینا جانتے ہیں وہ تمہاری طرح گدھے نہیں ہیں۔ وہ بدعہدی کرنے والے کے خاندان

تک کو نہیں چھوڑتے۔ وہ تمھارا سراغ لگالیں گے اور تمھیں یہ دس ہزار تو دینے ہی پڑیں گے، سود میں اپنی جان بھی دینی پڑے گی۔ ورنہ کچھ نہیں ہوگا۔ دس پندرہ ہزار کی خاطر وہ وقت برباد نہیں کریں گے اور یہ سمجھ لیں گے کہ سو بار دوسروں کو لوٹا، ایک بار خود بھی لُٹ گئے۔ آخر دنیا میں ایک ہم ہی تو نہیں ہیں۔ یہ دھندا دوسرے بھی کر رہے ہیں اور کسی نے غلط فہمی کے باعث اپنوں ہی کو لوٹ لیا۔"

میں نے انھیں سوچنے اور صورتِ حالات کو سمجھنے کا موقع دیا اور ان سے ایک سگریٹ طلب کی۔ جب میں وہ گھٹیا سگریٹ پی رہا تھا تو دوسرے کونے میں سر جوڑے وہ آپس میں کانا پھوسی کر رہے تھے۔ میں نے ذہنی طور پر ان کو اتنا خوفزدہ کر دیا تھا کہ اب ان کے لیے پولیس کے پاس جا کے انعام وصول کرنے کا تصور بھی محال تھا۔ انھیں احساس ہو رہا تھا کہ مجھے گرفتار کر کے وہ خود مصیبت میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ وہ تو رنگین تتلی کے پیچھے دوڑے تھے اور سامنے آ گیا آدم خور شیر۔ میں دل ہی دل میں ان کی پریشانی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ سالے چلے تھے ڈاکا ڈالنے۔ حلال کی کما کے کھانے میں محنت کرنی پڑتی تھی اور خون پسینہ ایک کرنا پڑتا تھا۔ عیش کے لیے کیش کا شارٹ کٹ انھیں یہی نظر آیا تھا۔ جرائم کی فلمیں دیکھ دیکھ کر اور جاسوسی ناول پڑھ کے انھوں نے سوچا ہوگا کہ ڈکیتی بہت آسان کام ہے۔ آسان نہ ہوتا تو اخبارات میں ہر روز ڈاکا پڑنے کی خبریں کیسے آئیں۔ پھر مل گیا ہوگا کہیں سے ایک ریوالور اور اس نے رہی سہی کسر پوری کر دی ہو گی۔ میکینک لوگ تھے۔ نہ جانے کب کس کی گاڑی چرائی اور اس کو بدل کے کیا بنا دیا۔ وہ تو خود پُرزے جمع کر کے گاڑی کھڑی کر سکتے تھے۔ استادِ مکرّم کے ذہن میں ہوٹل کے مسافروں کو لوٹنے کا اچھوتا خیال آیا اور گیرج میں تو استاد تھے ہی، گروہ کے استاد بھی کہلانے لگے۔ اب ہوا خراب ہو رہی تھی۔

"ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ تمھیں پولیس کے حوالے نہ کریں۔" استاد نے اتفاقِ رائے سے ہونے والا فیصلہ مجھ تک پہنچایا۔ "لیکن تم اپنا وعدہ پورا کرو گے؟"

"کون سا وعدہ؟" میں نے سادگی سے پوچھا۔

"یہی کہ.... ہمیں پندرہ ہزار مل جائیں گے۔ ابھی۔" استاد نے کہا۔ "اور ہمارے تمھارے درمیان کوئی دشمنی نہیں رہے گی؟"

میں بڑے مشفقانہ انداز میں مسکرایا۔ یوں جیسے میں نے فراخدلی اور عالی ظرفی سے کام لیتے ہوئے بچوں کی اس غلطی کو معاف کر دیا ہو۔

"یہ وعدہ چاہتے ہو تو ٹھیک ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"رقم کہاں سے ملے گی اور کون دے گا؟"

"اس کے لیے تمھیں وہیں جانا پڑے گا۔ ہوٹل غلران۔" میں نے کہا۔ "رقم پرنسس صوفیہ ادا کرے گی۔"

میری بات کا اثر وہی ہوا جو ہائی جیک ہونے والے مسافروں پر اس وقت ہوتا ہے جب ایک انھی جیسا مسافر اچانک کھڑا ہو کے دستی بم نکال لیتا ہے اور کہتا ہے کہ کسی نے حرکت کی تو جہاز دھماکے سے اڑا دیا جائے گا۔ کچھ دیر تو ساکت و صامت بیٹھے رہ جانے والے مسافروں کو یقین نہیں آتا کہ دھمکی انھیں دی گئی ہے اور جو گولا دکھا دینے والا ہاتھ میں اٹھائے کھڑا ہے وہ واقعی دستی بم ہے۔ گیرج میں موجود سب لوگ صدمے سے سُن کھڑے تھے اور یہ دیکھ رہے تھے کہ میری اس بات میں مذاق کا کون سا پہلو ہے۔ میں اطمینان سے ٹانگیں لمبی کیے دیوار کے سہارے بیٹھا رہا اور سگریٹ پیتا رہا۔

"پرنسس صوفیہ سے کیا تعلق ہے تمھارا؟" استاد نے بہت دیر کے بعد کہا۔

"وہی جو کسی بھی بیوی کا اپنے شوہر سے ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ انھیں چار سو چالیس وولٹ کا ایک اور شاک لگا۔

"تم بکواس کرتے ہو۔ بے وقوف بنا رہے ہو ہمیں۔" استاد چلّانے لگا۔ "میں کہتا ہوں اس شخص کی چال میں مت آؤ۔ یہ بہت خطرناک اور عیار سا آدمی ہے۔ عیار اور مکار۔ ہمیں اُلّو سمجھتا ہے۔" لیکن اس کی چیخ و پکار سے کوئی متاثر نہیں ہوا۔ باقی تین مجھے پلک جھپکانے بغیر دیکھتے رہے۔

"تم اُلّو ہو، سب اُلّو کے پٹھے ہو۔" میں نے کہا۔ "ہمت ہے تو گولی مار دو مجھے اور دفن کر دو اسی جگہ۔ کون ہے تمھارے جرم کا گواہ؟ اور پھر جاؤ ہوٹل میں ڈاکا ڈالو۔ اگر بھینس جاؤ تو رونا نہیں۔ میں نے تو تمھیں خبردار کر دیا تھا۔ پرنسس صوفیہ میری بیوی ہے۔ وہ تمھاری ان بیویوں کی طرح نہیں ہے جو گھر میں چولہے جھونک رہی ہیں، برتن مانجھ رہی ہیں اور بچے پیدا کر رہی ہیں۔ جو چھپکلی دیکھ کے تھر تھر کانپنے لگتی ہیں اور گھر میں چوہا کُود جائے تو بیہوش ہو جاتی ہیں۔ وہ خود پوچھ لے گی تم سے میرے بارے میں اور سارا حساب بے باق کر دے گی۔ میں نے ذرا ٹھنڈے دل سے کام لیا ہے۔ وہ عورت ہے اور جس عورت کا سہاگ کوئی چھین لے وہ بلی نہیں زخم خوردہ شیرنی کی طرح انتقام لیتی ہے۔" میں نے تھوڑا سا وقفہ دیا اور ایک گہری سانس لے کر پھر دھیمے لہجے میں بات شروع کی۔ "تم اس کو اغوا کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے نا۔ اب وہ اکیلی ہے۔ جاؤ لے اسے اٹھا لاؤ۔ سب مرد ہو اور بہادر ہو۔ پرنسس کے نام سے دھوکا کھا رہے ہو کہ وہ نازوں میں پلی نازک اندام شہزادی ہو گی۔ اب کہاں رہی ہیں شہزادیاں سوائے ولایت کے؟ ایسے معزز نام تو ہم اچھے لباس کی طرح بدلتے رہتے ہیں۔ میں تم کو ایک موقع اور دیتا ہوں۔ میرا رقعہ لے جاؤ اور میری بیوی کے پاس بے دھڑک پہنچ جاؤ۔ رقم لو اور واپس آ جاؤ۔ صبح ہونے سے پہلے پہلے اپنا اپنا راستہ لو۔"

"ٹھیک ہے۔ رقعہ لکھو۔" نوجوان ڈرائیور نے جوش میں آ کے بڑھ کر کہا۔ "پروا نہیں استاد! اگر میں واپس نہ آیا تو اس کو زندہ گاڑ دینا۔ میں ایک رقعہ لے کر جا رہا ہوں۔ یہ کوئی جرم تو نہیں ہے کہ کوئی مجھے پکڑے۔ میں کہہ دوں گا کہ مجھے یہ شخص سڑک پر ملا تھا اور اس نے مجھے رقعہ پہنچانے کے سو روپے دیے تھے۔ میں کیا جانوں وہ کوئی مفرور اشتہاری مجرم تھا۔ پرنسس صوفیہ اس کی بیوی ہو گی تو پولیس خود اس سے پوچھ لے گی۔"

استاد نے ذہین شاگرد کو قابلِ تعریف نظروں سے دیکھا۔ مجھے ایک بوسیدہ ڈائری اور ایک بال پوائنٹ پن فراہم کیا گیا۔ سادہ صفحے کی تلاش میں ورق گردانی کرتے ہوئے میں نے ڈائری میں ایک نام کی جگہ دیکھا۔ رنگ برنگ ڈینٹر اینڈ پینٹر۔ اس کے آگے مختلف رقوم لکھی ہوئی تھیں۔ اس گیرج میں گاڑیوں پر رنگ کا کام نہیں ہوتا ورنہ اس کے در و دیوار پہ ڈیکو اسپرے کے سارے رنگوں کی پھوار نظر آتی۔ غالباً گیرج والوں کا رابطہ کسی ڈینٹر پینٹر سے بھی تھا چنانچہ وہ میکینکل کا کام خود کرتے تھے اور رنگ روغن کے لیے رنگ برنگ ورکشاپ سے اشتراک کرتے تھے۔ یہ انھی کا حساب ہو سکتا تھا۔

میں نے ایک صفحے پر لکھا۔ "اسی وقت میری خاطر ان کو پندرہ ہزار دے دو۔" اور صفحہ پھاڑ کے آگے بڑھا دیا۔ استاد نے چھت سے معلق شیڈ والے چالیس واٹ کے بلب کی مدھم روشنی میں تحریر کو دیکھا اور باری باری گروہ کے اراکین کو ملاحظہ کے لیے پیش کیا۔ بات اتنی صاف اور سادہ تھی کہ شکوک پیدا کرتی تھی۔

"تم نے... کسی کو مخاطب نہیں کیا.... اپنے دستخط وغیرہ نہیں کیے۔" استاد نے کہا۔

"تم عقل سے بالکل پیدل ہو گیا۔" میں نے کہا۔ "استاد بنے پھرتے ہو۔ تمھیں تو ابھی دس سال شاگردی کرنی چاہیے میرے شاگردوں کی۔ ارے بھئی نام تمھیں بھی معلوم ہے۔ سیدھے پرنسس کے پاس چلے جاؤ۔ وہ میری ہینڈ رائٹنگ پہچانتی ہے تو نام کیوں لکھوں میں؟ اور اس میں تمھاری ہی بچت ہے۔ خدانخواستہ تم کسی مشکل میں پڑ جاؤ۔ حالانکہ اس کا امکان ایک فیصد بھی نہیں ہے تو اس ایک سطر سے تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ کسی کو معلوم نہیں ہو گا کہ تم کس سے ملنے آئے تھے اور تمھیں کس نے بھیجا تھا۔ اس پُرزے کو کہیں گرا دو گے تب بھی محفوظ رہو گے۔ تمھیں اصرار ہے تو لاؤ میں اپنا نام لکھ دیتا ہوں۔ یہ سوچ لو کہ تمھارے پاس سے یہ تحریر برآمد ہوئی تو تمھارے لیے وضاحت مشکل ہو جائے گی۔ تمھیں میرا آلۂ کار سمجھ لیا جائے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں خود جاؤں گا۔" استاد نے کہا۔ "لیکن ہم کوئی خطرہ مول نہیں لیں گے۔ تمھیں ہاتھ پیر باندھ کے دوسری جگہ منتقل کرنا ضروری ہے۔"

میں نے رضاکارانہ طور پر انھیں یہ موقع فراہم کیا۔ اس وقت بھی وہ میری گرفت اور رسائی میں تھے اور اگر میں چاہتا تو پلک جھپکتے میں ان کے ہاتھ پیر توڑ کے سب کو ناکارہ کر سکتا تھا اور ان کا اسلحہ جیب میں ڈال کے رخصت ہو سکتا تھا۔ مگر میں نے پھر ایکشن کو التوا میں رکھا۔ میں ان چاروں شوقیہ بدمعاشوں کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ ان سے اور کیا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے اور انھی کے ذریعے رابعہ کو اپنی خیریت سے آگاہ کرنا چاہتا تھا تاکہ اس کی تشویش ختم ہو۔ بعد میں یہ لوگ بدعہدی کرتے تو میں ان سے مؤثر طور پر نمٹ لیتا اور اپنی رقم وصول کر کے واپس پہنچ جاتا مگر مجھے یہ بھی دیکھنا تھا کہ ایسی صورتِ حال سے رابعہ کس طرح نمٹتی ہے۔ اسے آگے میرا ساتھ دینا تھا تو اس سے کہیں زیادہ خطرناک حالات کا سامنا کرنا تھا۔ یہ اس کی پہلی آزمائش تھی۔ اس کے صبر اور حوصلے کی، جرأت اور استقامت کی، مشکل گھڑی میں صحیح فیصلہ کرنے کی صلاحیت کی اور پُرسکون رہنے کی اور میری مدد کے لیے عملی طور پر کچھ کرنے کی ہمت کی۔

اس بار انھوں نے ایک اور احتیاط بھی ملحوظ رکھی کہ باہر لاتے وقت میری آنکھوں پر پٹی باندھی چنانچہ میں پھر یہ نہ دیکھ سکا کہ وہ علاقہ کون سا ہے۔ آس پاس خاموشی تھی۔ کہیں سے ٹریفک کے گزرنے کی اور کسی گھر میں سے زندہ انسانوں کے وجود کی خبر دینے والی کوئی آواز سُنائی نہ دیتی تھی جس سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ یہ گیرج آبادی سے دور کسی مضافاتی علاقے میں ہے ورنہ ابھی نصف شب نہیں ہوئی تھی کہ سناٹا اتنا گہرا ہوتا۔ مجھے گاڑی میں پیچھے بٹھایا گیا اور دو افراد میرے دائیں بائیں بیٹھے۔ تیسرے نے ڈرائیونگ سنبھالی اور گاڑی خاصی تیز رفتاری سے روانہ ہوئی۔ حادثے کے وقت میں نے گاڑی پر سرسری نگاہ ڈالی تھی۔ اور مجھے صرف اتنا یاد تھا کہ گاڑی بالکل نئی نہیں تھی۔ لیکن میکینک ہاتھوں میں اس کی کارکردگی نئی سے بہتر ہو گئی تھی۔ اگر مجھے روانہ ہوتے وقت اس جگہ کی صرف ایک جھلک دیکھنے کا موقع بھی مل جاتا تو میں ہر موڑ کو ذہن نشین کرتے ہوئے اپنی منزل کے راستوں کا تعین کرنے کی کوشش ضرور کرتا۔

گاڑی میں بیٹھے ہوئے تینوں افراد خاموش تھے اور دائیں بائیں بیٹھے ہوئے منکر نکیر بلاوجہ میری پسلیوں میں ریوالور کی نال چبھو کے مجھے یاد دلاتے تھے کہ میں بے بس اور اسیر ہوں جس سے میں خاصا محظوظ ہوتا تھا۔

"تمھارا استاد کیسے گیا ہے؟" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ "گاڑی تو ہم لے آئے۔"

"میں تمھارے ساتھ ہوں۔ کہو کیا بات ہے؟" استاد نے

آگے سے پلٹ کر جواب دیا۔

"اوہ.... معاف کرنا۔ میں سمجھا تھا، خیر وہ شخص کیسے گیا ہے...!"

"تم کیوں پریشان ہو؟" استاد نے کہا۔

"میں بالکل مطمئن ہوں۔ خصوصاً تم سب کے رویے سے۔" میں نے کہا۔ "بس یہ خواہ مخواہ ریوالور کو دونوں طرف سے میری پسلیوں میں داخل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انھیں سمجھاؤ کہ خود بھی آرام سے بیٹھیں اور مجھے بھی بیٹھنے دیں۔"

کسی نے میری بات کا جواب نہیں دیا لیکن دونوں طرف سے دباؤ کچھ کم ہو گیا۔

"کیا میرا پیغام لے جانے والا وہیں آئے گا جہاں تم مجھے لے جا رہے ہو؟" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔

"تم کو زیادہ بولنے کی عادت ہے۔" دائیں طرف والا بولا۔ "چُپ نہیں بیٹھ سکتے؟"

"کیا تمھیں خطرہ محسوس نہیں ہوتا کہ میری بیوی تعاقب کرتی ہوئی اس کے ساتھ آجائے گی؟" میں نے کہا۔

"ہم اس خطرے سے نمٹنے کا بند و بست کر چکے ہیں۔" استاد نے برہمی سے کہا۔ "اس بے وقوف عورت نے ایسا کیا تو...."

"وہ بے وقوف تو ہے لیکن اسی بے وقوفی میں حد سے زیادہ خطرناک کام بھی کر جاتی ہے۔" میں نے کہا۔ "اسے عورت ذات جان کے ناقص العقل اور کمزور سمجھنے والے مرد بھی بعض اوقات مارے جاتے ہیں۔"

گاڑی اچانک رُکی۔ میرے کان اب ٹریفک کی تھوڑی بہت آوازیں سُن رہے تھے۔ جو بند شیشوں سے گزر کر میرے کانوں تک پہنچ رہی تھیں اور ان سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ ہم شہر کے بارونق حصے میں ہیں۔ دروازہ کھلا تو یہ آوازوں کا ریلا ایک دم اندر آیا۔ دوسرے لمحے دروازہ بند ہو گیا اور مجھ پر بیک وقت انکشاف ہوا کہ گاڑی میں تین نہیں، چار آدمی تھے۔ میرے محافظ اسی طرح دونوں طرف موجود تھے اور گاڑی پھر روانہ ہوئی تو ڈرائیور کی موجودگی بھی ثابت ہو گئی۔ اس کے باوجود کوئی دروازہ کھول کے اترا تھا۔ پھر حقیقت حساب کے سوال کا جواب بن کے عیاں ہوئی۔ انھوں نے مجھے اندھیرے میں اور دھوکے میں رکھا تھا کہ چوتھا آدمی میرا نامہ بر بن کے الگ گیا ہے جبکہ اس نے بھی ہمارے ساتھ اسی گاڑی میں سفر کیا تھا۔ وہ بالکل خاموش بیٹھا رہا تھا کیونکہ ہدایات کے مطابق اس کو خود کو غیر موجود ثابت کرنا تھا۔ شاید ان کی مجبوری یہ تھی کہ جہاں وہ مجھے لے گئے تھے، وہاں کوئی اور سواری دستیاب نہیں تھی۔ اس مشکل کا حل انھوں نے یہ نکالا کہ ایک ہی گاڑی کو دونوں مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ میری منتقلی کے لیے بھی اور نامہ بر کو منزلِ مقصود تک پہنچانے کے لیے بھی۔ یہ نتیجہ اخذ کرنے سے مجھے بے حد مسرت اور تقویت حاصل ہوئی کیونکہ اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ میں ہوٹل فاران کے سامنے ہوں۔ [illegible] کی شدید خواہش سمندر کی طوفانی لہر کی طرح اٹھی لیکن میں نے [illegible] مقابلہ کیا۔ اگر یہاں میں ہاتھ پیر بندھے ہونے کے باوجود [illegible] ٹکر سے دونوں محافظوں کو ناک آؤٹ کر دیتا اور پھر ڈرائیور [illegible] گاڑی بے قابو ہو کے رُک جاتی۔ کسی درخت، کھمبے، عمارت [illegible] گاڑی سے ٹکرا کے گاڑی اُلٹ بھی سکتی تھی اور فٹ پاتھ پر [illegible] دو چار پیدل چلنے والوں کو بھی کچل سکتی تھی۔ اس کے علاوہ [illegible] دونوں اناڑی بدمعاش گولی چلا دیتے تو دو گولیاں نہ جانے [illegible] سوراخ کرتیں۔ گاڑی میں یا مجھ میں۔ ایسا خطرناک قدم اٹھانے [illegible] ضرورت کوئی نہیں تھی۔

گاڑی نے دائیں جانب ایک موڑ کاٹا۔ وقت اور رفتار [illegible] کرتے ہوئے میں نے طے کیا کہ پہلا موڑ تقریباً دو تین فرلانگ [illegible] آیا ہے۔ اب میں نے سیکنڈ شمار کرنے کے فارمولے پر [illegible] دستی بم پھینکنے والے پِن نکالنے کے بعد گھڑی دیکھے بغیر سیکنڈ اسی طرح شمار کرتے ہیں۔ میں نے زیرِ لب کہا۔ ایک ہزار، دو ہزار، تین ہزار۔ چار ہزار۔ پانچ ہزار۔ یوں پانچ سیکنڈ کے وقفے گزرے۔ میں نے پیچھے بندھے ہوئے ہاتھوں کی انگلیوں کے پور پر حساب رکھا۔ ایک دفعہ میں پندرہ وقفے گزرے۔ دو [illegible] بار تیس ہو گئے یعنی ڈھائی منٹ۔ گاڑی نے پھر دائیں طرف [illegible] رفتار کو تیس میل کے اندر رکھتے ہوئے یہ فاصلہ کوئی ایک میل [illegible] تھوڑا سا زیادہ یا کم۔ میں پھر وقت کے حساب میں مصروف ہو گیا۔ پانچ سیکنڈ کے پندرہویں وقفے کے دوران میں گاڑی نے تیسرا دایاں موڑ کاٹا۔ طے شدہ فاصلہ تقریباً نصف گویا آدھا میل [illegible] فرلانگ کے درمیان۔ اگر پہلا موڑ بھی تین چار فرلانگ کے بعد آیا تو میں تصور کی مدد سے طے کر سکتا تھا کہ ہم ایک ایسی مستطیل کے چار اضلاع طے کر چکے ہیں جس کے دو ضلعے دو تین فرلانگ کے [illegible] باقی دو ایک میل کے ہوں تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہم ہوٹل فاران کے گرد چاروں طرف گھوم کر پھر وہیں پہنچ رہے ہیں۔ اس خیال کی [illegible] اس وقت ہو گئی جب دو منٹ بعد گاڑی پھر رُک گئی۔ اور میں [illegible] آوازوں پر غور کیا۔ ایک گنڈیری بیچنے والی کی صدا پر میرا دل [illegible] زور سے دھڑکا۔ جب چوتھا آدمی اُترا تھا تو یہی صدا آئی تھی [illegible] "تے مٹھیاں، تے برفاں والیاں۔" اور یہ گنگناتی آواز اسی سُر میں [illegible] میرا دل مسرت سے معمور ہو گیا تھا کہ آنکھیں بند ہونے کے باوجود میں نے سب دیکھ لیا تھا۔ یہ ان کا مجھ پر اعتماد تھا یا بے وقوفی [illegible] حد تک بے خوفی کا مظاہرہ۔ لیکن وہ رقم وصول کر کے اپنے [illegible] وہیں سے ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ اور شاید اس کے رقم [illegible] بخیر و عافیت لوٹ آنے کی صورت میں وہ مجھے کچھ دُور [illegible]

سڑک پر چھوڑ دیتے۔

میں نے مطمئن ہو کر انتظار کا وقت کاٹنے کے لیے پھر ایک ہزار دو ہزار کی گردان شروع کی لیکن بہت جلد اس سے اکتا گیا۔ اب اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ دل کی تقویت کے لیے یہی احساس بہت تھا کہ میں اپنے ٹھکانے کے بہت قریب ہوں۔ رابعہ اگر کچھ کرنا چاہے تو اُسے دور نہیں جانا پڑے گا۔ دیکھنا یہ تھا کہ کیا واقعی وہ کچھ کر سکے گی؟ میرے ساتھی اپنی طرف سے مجھے تاریکی میں رکھ کے مطمئن بیٹھے ہوئے تھے اور میرے رویے نے ایک طرف ان پر اپنی ذات کا اعتماد متزلزل کر دیا تھا تو دوسری طرف مجھ پر ان کا اعتماد جائز ثابت ہو رہا تھا۔ میں نے کسی قسم کی ہنگامہ آرائی نہیں کی تھی۔ ڈکیتی اور بدمعاشی کے سلسلے میں ان کو مفید معلومات فراہم کی تھیں اور قابلِ قدر ہدایات دی تھیں چنانچہ میں استادوں کا استاد ہو گیا تھا۔ وہ سوچ رہے ہوں گے کہ مجھے گرفتاری کے لیے اٹھا کے انھوں نے کتنی بچگانہ حرکت کی تھی اور خدانخواستہ پھنا پکڑ وہ مجھے بیچ دیتے تو اپنی سلامتی کو گروی رکھ دیتے۔ ایک طرف پولیس سے دس ہزار وصول کرنا شیر کے منہ سے نوالہ چھیننا بن جاتا تو دوسری طرف میرے جیسے نامی گرامی بدمعاش کے شاگرد ان عزیزانِ من کو جینے نہ دیتے۔ میرے لیکچر سے ان کی آنکھیں کھل گئی تھیں اور انھوں نے ذرا اپنی غلطی کو محسوس کر لیا تھا۔ اسے انھوں نے ایک بہت بڑے بدمعاش کی بہت بڑے دل کا کمال سمجھا ہو گا کہ میں اسیر کرنے والوں کو دھمکی نہیں دی۔ ان کی حق تلفی نہیں کی اور ان کے سر پہ دستِ شفقت رکھتے ہوئے دس کی جگہ پندرہ ہزار روپے کا انعام دے دیا۔ وہ بہت فائدے میں رہے۔ پیسہ زیادہ ہی ملا اور آئندہ کے لیے بھی ایک سرپرست کی حمایت کے امکانات پیدا ہو گئے۔ وہ چھوٹے بدمعاش تھے۔ چور یا اٹھائی گیرے۔ ورنہ وہ مجھ سے پندرہ ہزار بھی کیوں لیتے۔ ڈکیتی میں بیس پچیس لاکھ کی امید رکھنے والے یکلخت اتنے گر گئے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی تھی کہ اب ڈکیتی ان کو مشکل نظر آنے لگی تھی اور یہ پندرہ ہزار یقینی تھے۔

"کیا ہو گیا استاد گولی کو؟" میرے ساتھ والے نے کہا۔

"بیس منٹ سے زیادہ ہو گئے، یار ڈِکی۔ ایسے کب تک کھڑے رہیں گے؟" دوسری طرف والے نے فوراً تائید کی۔

"آدھا گھنٹا تو صبر کرو۔" آگے والے نے قائم مقام استاد کی حیثیت سے انھیں ڈانٹا جسے ڈکی کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا۔

"فرض کرو آدھے گھنٹے بعد بھی استاد نہ آیا؟" دائیں ہاتھ والا زیادہ مضطرب تھا۔

"پھر دیکھیں گے، بندہ تو ہمارے پاس ہے۔" ڈکی نے ٹالنے کے انداز میں کہا لیکن صاف ظاہر تھا کہ وہ اس سوال کا جواب دینے کا اہل ہی نہیں اور... خود ابھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچا ہے۔ میرا اپنا بھی یہی خیال تھا کہ بیس منٹ بہت ہوتے ہیں۔ رابعہ کے پاس جا کے آنے میں دس منٹ سے زیادہ نہیں لگ سکتے تھے۔ پانچ منٹ اس کے رکھ لیے جائیں کہ رابعہ نے سوال جواب کیے ہوں اور رقم شمار کی ہو۔ تب بھی پندرہ منٹ میں استاد گولی کو آجانا چاہیے تھا۔ گو اس کا امکان کم تھا کہ رقم وصول کرنے کے بعد استاد گولی خود کو محفوظ رکھنے کی نیت سے رابعہ کو ناک آؤٹ کر کے یا باندھ کے ڈال آتے لیکن اس کا انحصار رابعہ کے رویے پر بھی تھا۔ اگر اس نے راست اقدام کرنا چاہا تو استاد گولی بہرحال مرد ہے اور مسلح ہے۔ وہ آسانی سے گرفتاری قبول نہیں کرے گا۔ رفتہ رفتہ میرے ذہن میں بھی اس پریشان کن خیال نے فساد پھیلانا شروع کیا۔ رابعہ ذہنی انتشار اور جذباتی بحران کا شکار ہو گی۔ اچانک میری تحریر دیکھ کر وہ ہسٹریا میں مبتلا ہو گئی تو کیا کرے گی؟ پیغام لانے والے پر حملہ کر دے گی۔ اس کے کپڑے پھاڑ دے گی، بال نوچ لے گی اور اس کی آنکھیں نکالنے کی کوشش کرے گی۔ چیخے گی چلّائے گی اور پوچھے گی "بتا سکندر کہاں ہے؟" لیکن رابعہ اتنے کمزور اعصاب کی مالک نہیں ہے۔ وہ خود اغوا ہو چکی ہے۔ دشمنوں کی قید میں جسمانی عذاب جھیل چکی ہے۔ ماں کی موت کے بعد گھر کی تباہی کا صدمہ سہہ چکی ہے اور ہر صدمہ برداشت کرنے کی اہل ہے۔

"لونٹ۔ کیا میں جا کے دیکھوں؟" دائیں ہاتھ والے نے کہا۔

"ڈکی سے پوچھ لے۔" وائیں ہاتھ والے نے بے چینی اور ناگواری سے کہا۔ مجھے ان ناموں پر ہنسی آئی۔ استادِ محترم گولی تھے تو شاگردوں میں سے ایک لونٹ تھا اور دوسرا ڈکی۔ اس سے ان سب کا موٹر میکینک ہونا ثابت ہوتا تھا۔ یہ بھی صاف ظاہر تھا کہ ان سب کے موجودہ نام ماں باپ کے دیے ہوئے نہیں ہو سکتے۔ غالباً یہ گیراج میں استاد گولی کے عطا کردہ تخلص تھے۔ آگے والا ڈکی تھا۔ دائیں ہاتھ والا لونٹ۔ اب اُلٹے ہاتھ کی طرف کلچ یا گیئر ہو تو کچھ عجب نہیں۔ لیکن بعد میں وہ 'پانا' ثابت ہوا۔

"اب تو آدھا گھنٹہ ہو گیا ڈکی۔" لونٹ نے زیادہ بے قرار لہجے میں کہا۔

"تو میں کیا کروں؟" ڈکی برہم ہو گیا۔ "مجھے وقت نہیں دے کر گیا تھا استاد گولی۔ کہ اتنی دیر انتظار کرنا۔"

"پھر کیا ہم ساری رات انتظار کرتے رہیں گے؟" بائیں ہاتھ والے نے کہا۔

"مجھے اس میں کوئی چال نظر آتی ہے۔" لونٹ بولا۔

"اس نے بتا دیا تھا کہ وہ عورت بہت خطرناک ہے۔" بائیں ہاتھ والے نے تشویش سے کہا۔

"یار پانے، یہ سب کچھ مجھے معلوم ہے۔ لیکن تم بتاؤ میں کیا کروں۔" ڈکی نے بے بسی سے کہا۔ "اس سے کیوں نہیں پوچھتے جو تمھارے ساتھ بیٹھا ہے۔ چال ہو گی تو اس کی...!"

"میں نے کوئی غلط چال نہیں چلی ہے۔" میں نے کہا۔ "ہر طرح سے تعاون کیا ہے۔"

"پھر دیر کیوں ہو رہی ہے؟" ڈکی نے کہا۔ "تو ہوگا بہت بڑا بدمعاش۔ لیکن استاد گولی کو کچھ ہوا تو ہم تیری لاش تیری بیوی کو بھیج دیں گے۔ کوئی... ہمیں پکڑ نہیں سکے گا۔" اس نے بیچ میں ایک گالی فٹ کی۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا ان کی جھنجلاہٹ اور غصے میں اضافہ ہو رہا تھا اور خود میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ کہیں رابعہ کو آزمائش میں ڈال کے میں نے حماقت تو نہیں کی۔ اگر وہ آسانی سے پندرہ ہزار گن دیتی تو استاد گولی اب تک لوٹ کے آجاتا۔ مگر رابعہ نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے کوئی جوابی کارروائی کی ہو گی۔ جوابی کارروائی کیا ہو سکتی ہے؟ ایک یہ کہ وہ استاد گولی کو میرے بدلے یرغمالی بنا لے۔ اور انتظار کرے کہ کوئی اسے چھڑانے کے لیے خود آئے یا فون کرے تو اس سے سودا کرے کہ سکندر کو لاؤ اور استاد گولی کو لے جاؤ۔ اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے والا معاملہ ہے۔ یا اس نے پندرہ ہزار دے کر ہوٹل کی انتظامیہ سے کہا ہو کہ اس شخص کو روک لیا جائے اور پولیس کے حوالے کر دیا جائے۔ وہ الزام لگا دے کہ استاد گولی اس کے کمرے سے پندرہ ہزار روپے چرا کے جا رہا تھا لیکن رابعہ ایسا نہیں کرے گی۔ وہ جانتی ہے کہ میرے کیس میں پولیس سے مدد لینا مشکل ہے۔ اگر وہ مجھے اغوا کرنے والوں کے قبضے سے رہا کرانے میں کامیاب ہو گئی تو پولیس پکڑ لے گی اور یہ آسمان سے گر کر کھجور میں اٹکنے سے بدتر صورت ہو گی۔ نہیں، رابعہ ایسی حماقت نہیں کر سکتی۔ ایک آخری صورت یہ تھی کہ وہ تعاقب کرے۔ محسن ہوتا تو یہی کرتا لیکن رابعہ یہ کیسے کر سکتی ہے۔

"ڈکی! میں کہتا ہوں نکل چل۔" پالنے نے اچانک کہا۔ "یہ کوئی گڑبڑ ہے۔"

ڈکی نے اسے گالی دی۔ "ایسے ہی بھاگ جائیں؟ استاد گولی کو چھوڑ کر؟"

"یہاں بیٹھ کے ہم استاد گولی کے لیے کون سی توپ چلا دیں گے؟" بونٹ نے تیز لہجے میں کہا۔

"تجھ میں ہمت ہے تو جا کے دیکھ آ۔ مگر ہم بتا دیتے ہیں کہ تیرا بھی صرف دس منٹ انتظار کریں گے۔" پالنا بولا۔

"اور خود میں ہمت نہیں ہے تو چل۔ یہاں کھڑے رہے تو ہم بھی پکڑے جائیں گے۔" بونٹ نے کہا۔

"آدمی ہمارے پاس ہے۔" پالنا بولا۔ "خود باہر ہوں گے تو استاد گولی کے لیے کچھ کر سکیں گے۔ اس کی بیوی سے بات کریں گے کہ شوہر چاہیے تو گولی دے جاؤ۔"

"اپنی بولتے جا رہے ہو...." اس نے دونوں کو ایک... سے نوازا۔ "استاد گولی نہ آیا تو ہماری بھی خیر نہیں۔ وہ ہمیں ... دے گا۔ اور اس کو مار کے بھی تم کو کیا ملے گا؟ دس دشمن ... گے۔ بیوی بچوں سمیت چھپتے پھرو گے۔ ساری غلطی استاد ... کہ اس کی باتوں میں آگیا۔"

"ڈکی! میں پانچ منٹ اور دوں گا۔" بونٹ نے کہا۔ "... پھر تجھے چلنا پڑے گا۔"

ڈکی نے اس کے لہجے کی خطرناک دھمکی کو محسوس کیا۔ "ا... پھر بھی میں نے بات نہ مانی؟"

"تیرا تو باپ بھی چلے گا۔" بونٹ نے ریوالور میری پسلی ... وہ شاید ڈکی پر اسے تان چکا تھا۔ پالنے نے بھی ریوالور میری پسلی ... تھا۔ ان دونوں کو بغاوت پر آمادہ دیکھ کر ڈکی خونخوار نظروں ... انھیں گھورنے کے سوا شاید کچھ نہ کر سکا۔ کیونکہ وہ مسلح تھے اور ... پیچھے بیٹھے تھے۔ وہ خود بھی کشمکش و پیچ میں مبتلا ہو گا۔ عہد ... اور ذاتی سلامتی کے دوراہے پر کھڑا سوچ رہا ہو گا کہ ترجیح ... دے۔ وہ سب اندرونی و بیرونی دباؤ کا شکار تھے۔ میرے ... ان کے جذبات میں شدت آتی جا رہی تھی۔

ابھی پانچ منٹ پورے بھی نہیں ہوئے تھے کہ ڈکی ... اگنیشن سوئچ میں چابی گھمائی۔ انجن تھوڑا سا غرایا اور پھر ... گاڑی آہستہ آہستہ روانہ ہوئی اور سیدھی چلتی گئی۔ پھر ... کے رُک گئی۔

"اس سے پوچھو استاد کیوں نہیں آیا۔" ڈکی نے ... کر میرے سر پر مُکا مارا۔

"میں... میں تو تمہارے ساتھ ہی ہوں۔ جتنا تم ... سکتے ہو اتنا ہی میں بھی بتا سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "مجھے علم غیب تو ہے نہیں۔ کیا معلوم کیا ہوا؟"

اس مرتبہ بونٹ نے میرے پیٹ میں مُکا مارا۔ "... ہے وہاں کیا ہوا ہو گا۔"

"تو نے اس پیغام کے بہانے کچھ اور لکھا تھا۔" ... اپنے دونوں ساتھیوں کی طرح مُکے بازی میں شریک ہو کے ...

"اس... اس میں کیا تھا...." میں نے کراہ کے کہا ... دیکھا تھا۔ تھی ایسی کوئی بات؟"

"کوئی بات ضرور ہو گی۔ کوئی خفیہ اشارہ ہو گا۔" ڈکی نے پھر ... "جسے وہ حرافہ سمجھتی ہو گی۔"

"میرے متعلق تم جو چاہو کہو۔" میں نے کراہ کے کہا ... کے متعلق بات کرتے وقت زبان کو قابو میں رکھو۔ میں ا... تمہاری مدد کرتا رہا ہوں اور میں نے تمہیں کسی مزاحمت

ہزار دینے کا وعدہ بھی اس لیے کر لیا تھا کہ تم کنگال ہو۔ بہت گھٹیا درجے کے بدمعاش ہو جن کو بدمعاش کہنا بھی بدمعاشی کی توہین ہے۔ تم شہدے اور لفنگے ہو۔ اچھا ہوتا اگر تم جلتے اور پکڑے جاتے۔ اس مار پیٹ سے تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔ کسی کو باندھ کے مار ڈالنا بھی کوئی بہادری نہیں ہے لیکن کسی بہادر آدمی کو مارنے کے بعد نتائج کا مقابلہ کرنے کی ہمت ہونی چاہیے۔ میں تو اپنی جان ہتھیلی پر لیے پھرتا ہوں اور وہ عورت جو میری بیوی ہے، یہ بات جانتے ہوئے بھی میرا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ جو شخص گیارہ قتل کر چکا ہو وہ تو پھانسی کے تختے کو بالکل اہمیت نہیں دیتا۔ تم نے کبھی قتل کیا ہے؟ پھانسی چڑھنے کی ہمت ہے؟ تمہاری بیویاں تمہارے ساتھ سُولی چڑھ سکتی ہیں؟"

ان سب کو سانپ سونگھ گیا۔ وہ ذہنی طور پر بزدل تھے۔ میرے پُراعتماد لہجے نے ان کے حوصلے کو بالکل پست کر دیا۔ انھیں پھر احساس ہوا کہ وہ پہاڑ کے دامن میں پڑے ہوئے کنکر ہیں۔ ان کے مقابل گیارہ قتل کرنے والا، چوری ڈکیتی اور ہر قسم کے جرائم میں ملوث ایک مفرور اشتہاری مجرم تھا۔ وہ خود کچھ بھی نہیں تھے۔ اپنی بیویوں کا تصور کر کے ان کی حالت غیر ہو گئی۔ انھیں یقیناً میری بیوی پر رشک آیا ہو گا۔

"یہاں سے چلو۔" میں نے کہا۔ "پھر دیکھتے ہیں اب کیا قدم اٹھایا جائے۔ مجھ پر اعتماد رکھو۔ جب ہم زبان دیتے ہیں تو اس پر قائم بھی رہتے ہیں۔ دھوکا دے کر نہیں مارتے۔ میں اسے فون کرتا ہوں۔"

"تمہارا دماغ خراب ہے۔" ڈکی نے کہا۔ "کہاں سے فون کرو گے اپنی بیوی کو؟ ہمارے پاس تو کوئی فون نہیں۔"

"پھر میں اس کے نام دوسرا پیغام دوں گا۔" میں نے کہا۔

ڈکی نے مجھے ایک اور گالی دی.... "اب چاہتا ہے کہ دوسرا آدمی بھی جائے اور لوٹ کر نہ آئے۔ ایک ایک کر کے ہم سب جائیں اور پھنس جائیں۔" لیکن اس نے مجھے مکا نہیں مارا۔

"میں تم کو اتنا بے وقوف نہیں سمجھتا۔" میں نے کہا۔ "پیغام رسانی کے دیگر ذرائع بھی ہیں میرے پاس۔ مثلاً میں وائرلیس پر بات کر سکتا ہوں۔ میری کلائی گھڑی دیکھی ہے تم نے؟ اس سے سگنل نشر ہوتا ہے۔"

جھوٹ ہونے کے باوجود اس بات نے ان کو یقین کرنے پر مجبور کر دیا کیونکہ جاسوسی قصے کہانیوں میں اور فلموں میں وہ پین، ٹارچ، ریوالور، گیس لائٹر، الم کیمروں اور سگریٹ کیس ٹرانسمیٹرز جیسی حیرت انگیز ایجادات کے بارے میں دیکھ اور پڑھ چکے تھے اور یہ جانتے تھے کہ ترقی یافتہ ممالک میں مجرم اور پولیس دونوں ایسی چیزیں استعمال کرتے ہیں۔

"لیکن... وہ گھڑی تو استاد کے پاس تھی۔" ڈکی نے کہا۔

"استاد اپنے ساتھ تو نہیں لے گیا ہو گا۔" پالنے نے کہا۔

"وہیں ہو گی۔"

"مگر استاد نے کہا تھا کہ لوٹ کر وہاں نہیں جانا ہے۔" بونٹ نے انھیں یاد دلایا۔

"اگر استاد واپس آتا تو ہم اسے وہاں ملتے جہاں اس نے کہا تھا۔" ڈکی نے کہا۔ "مگر وہ آیا ہی نہیں تو... پھر ہم وہیں چلتے ہیں۔"

گاڑی ایک مرتبہ پھر روانہ ہوئی۔ انتظار ختم ہو گیا تھا اور ان کے شکوک اب یقین کی صورت اختیار کر گئے تھے کہ استاد گولی کسی مصیبت میں پڑ گیا ہے۔ ان کے یقین میں میرا یقین بھی شامل تھا مگر مجھے اس کی نوعیت کا اندازہ نہ تھا۔ بیس منٹ میں ہم پھر وہیں جا پہنچے جہاں سے روانہ ہوئے تھے۔ مجھے اندر لے جا کر انھوں نے میری آنکھوں سے پٹی اتار دی۔ ڈکی اور بونٹ دور یوالور لے کر پھر میرے مقابل کھڑے ہو گئے اور پالنے نے میرے ہاتھ پیر کھولے۔ میں نے ہاتھوں کی کلائیوں اور ٹخنوں کو رگڑا اور اطمینان سے دیوار کے سہارے بیٹھ گیا۔ میں سگریٹ مانگنا ہی چاہتا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ سب اس بُری طرح چونکے جیسے دستک دینے والا پولیس کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔ ان کی گھبراہٹ اور بدحواسی، خوف اور افراتفری اور چہروں پر اُڑنے والی ہوائیاں دیکھ کر مجھے ہنسی آئی مگر میں ضبط کر گیا۔

"یہ.... یہ کون آگیا یہاں؟" ڈکی نے کہا۔ "استاد گولی؟"

"استاد تو یہاں نہیں آسکتا۔" پالنے نے کہا۔ "اور پھر اتنی جلدی؟"

"ہو سکتا ہے ہمیں روانہ ہوتے دیکھ کر وہ ٹیکسی میں چل پڑا ہو۔" بونٹ نے کہا۔ دستک پھر ہوئی۔

ڈکی نے نفی میں سر ہلایا۔ "کوئی ہمارا تعاقب کرتا ہوا آیا ہے۔ میں اس کو نشانے پر رکھتا ہوں۔ تم دروازہ کھولو مگر ایک دروازے کے پیچھے چھپ کر کھڑا ہو اور ریوالور ہاتھ میں رکھے۔"

بونٹ نے دروازے کے ساتھ ہی دیوار سے لگ کر ریوالور سنبھال لیا۔ پالنے نے دروازہ کھولنے سے پہلے کہا۔ "کون ہے؟"

"میں ہوں پالنے۔ استاد گولی۔" باہر سے آواز آئی۔ ایک دم ان سب کے چہرے کھل اٹھے۔ مایوسی اور پریشانی کی جگہ مسرت نے لے لی اور وہ احتیاط کے سارے تقاضے بھول گئے۔ دروازہ کھلتے ہی ایک ویٹر اندر آیا جو ہوٹل فاران کی وردی میں تھا۔ اس کے پیچھے رابعہ نمودار ہوئی جس نے ریوالور کو ویٹر کی کمر سے لگا رکھا تھا۔ وہ سب انتہائے حیرت سے منجمد ہو گئے۔ کیونکہ ویٹر کی وردی میں استادِ محترم تھے۔ اب میرے لیے صبر و تحمل کا مزید مظاہرہ بے کار

تھا۔ میں نے بڑی پھرتی سے سر کے بل فرش پر قلابازی کھائی اور میرے دونوں پیر ڈکی پر پوری قوت کے ساتھ پڑے۔ وہ پیچھے گرا اور اس کے ہاتھ سے ریوالور چھوٹ گیا۔ وہ پھر اٹھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ میری ٹھوکر اس کے منہ پر پڑی۔ وہ بلبلایا مگر میں نے اسے مہلت نہ دی۔ پے در پے ٹھوکروں سے میں نے اسے نیم جان کر دیا۔

"میں گولی مار دوں گا۔" بونٹ چلایا۔

"مارو۔" رابعہ نے کہا۔ "تمھارے استاد کے دو ٹکڑے کر دوں گی میں۔ ریڑھ کی ہڈی توڑ دوں گی۔"

استاد گولی کی حالت قابل دید تھی۔ ریوالور کی نوک اس کی کمر میں گڑ رہی تھی۔ اور وہ ہل بھی نہیں سکتا تھا۔ ڈکی فرش پر پڑا کراہ رہا تھا۔ میں نے اس کا ریوالور اٹھا لیا۔ رابعہ کو اپنی پناہ میں لے کر میں نے آگے قدم بڑھایا۔

"کیا خیال ہے اب؟" میں نے کہا۔ "پولیس کے پاس چلیں؟ کانے کی اولاد پانے؟ دس ہزار مل جائیں گے تمھیں۔ تم کیا احمقوں کی طرح دیکھ رہے ہو بونٹ کے بچے۔ ریوالور نیچے ڈال دو۔ اور چلو سب لائن بناؤ۔"

بونٹ نے جان کی بازی لگا کے آخری کوشش کی اور ایک دم ریوالور اٹھا کے فائر کر دیا۔ لیکن اس کے ہاتھ کے حرکت میں آتے ہی میں غوطہ مار گیا تھا۔ گولی میرے سر کے اوپر سے گزری۔ پھر میں نے جست لگائی اور بونٹ کو دبوچ لیا۔ پلک جھپکتے میں سر سے اوپر اٹھایا اور پانے پر دے مارا۔ وہ دونوں ایک ساتھ دیوار سے ٹکرائے۔

اسی وقت استاد گولی نے بھی ہمت کی اور بے بسی سے مارے جانے کے بجائے مقابلہ کر کے مرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے اچانک پیچھے لات چلائی اور نیچے گر گیا۔ رابعہ نے گولی بعد میں چلائی۔ استاد گولی کی ایڑھی رابعہ کے گھٹنے پر لگی تھی۔ وہ تھوڑا سا چلائی اور میں نے استاد گولی کو اٹھ کے حملہ آور ہوتے دیکھا۔ "تم ہٹ جاؤ رابعہ۔" میں نے چلا کر کہا۔ اس وقت میں یہ بھول گیا کہ مجھے اس کا نام نہیں لینا چاہیے تھا لیکن یہ بات کسی نے نوٹ نہیں کی۔ میں نے جمپ لگائی اور اڑتا ہوا گیا۔ فلائنگ کک اتنی زبردست تھی کہ استاد گولی ایک دھماکے سے چت ہوا۔ پانا اور بونٹ پھر ہمت کر کے کھڑے ہو گئے تھے لیکن اب میں آزاد تھا اور ایکشن کی فارم میں تھا۔ میں نے ان کو نمونے کے طور پر مارا کم، بے دم زیادہ کیا۔ کراٹے کے وہ داؤ جو بے ضرر تھے انہیں ادھر سے ادھر گھمانے، اڑانے، اچھالنے اور لٹانے اور گھن چکر بنانے میں کام آئے۔ وہ تینوں ایسے پٹ رہے تھے جیسے وہ جوان صحت مند نہیں بچے ہیں۔ ان کے لیے یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ جو شخص بے بسی کے ساتھ ان کا قیدی بنا رہا تھا وہ خالی ہاتھوں سے ان کی کیا درگت بنا سکتا تھا۔ دس منٹ بعد وہ سب ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے۔ ان میں سے کسی کی ہڈی نہیں ٹوٹی تھی۔ کسی کا خون نہیں بہا تھا اور کسی کا جوڑ نہیں ہلا تھا۔ مگر وہ بالکل بے جان ہو کر فرش پر لیٹے ہانپ رہے تھے اور مجھے رحم کی التجا بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"چلو اٹھو سب... فوراً۔ میں تین تک گنوں گا۔" میں نے کہا۔ "دیوار سے لگ کر ہاتھ اوپر کر لو۔ ایک..."

وہ ہائے ہائے کرتے اٹھے اور دیوار سے ٹیک لگا کے کھڑے ہو گئے۔ میں نے ریوالور اب جیب میں رکھ لیا تھا۔

"استاد گولی! کتنا پیسہ ملا؟" میں نے کہا۔ "دس ہزار کہ پندرہ ہزار؟ نکالو۔"

استاد گولی نے کانپتے ہوئے وردی کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور براؤن رنگ کا ایک لفافہ مجھے پکڑا دیا۔ میں نے اسے رابعہ کی طرف اچھال دیا۔ "ایک گولی کتنے کی آتی ہے؟" میں نے کہا۔ "مثلاً اس ریوالور کی گولی جو تمھاری جان لے گی۔ تم نے کبھی سوچا تھا کہ ایک ننھی سی گولی قیمت میں تمھاری جان کے برابر ہو سکتی ہے؟ گیدڑ کی شامت آتی ہے نا تو وہ شہر کا رخ کرتا ہے۔ تمھاری شامت آئی تھی کہ تم نے ہوٹل فاران کا رخ کیا۔ اور موت آئی تھی کہ مجھ پر ہاتھ ڈالا۔" میں نے اس کے گال پر دو طمانچے رسید کیے۔ "کتے، گلی کے آوارہ کتے شیروں پر بھونکنے لگے تھے۔ میرے ہاتھ پاؤں باندھ کے گولی مارنے کی دھمکی دیتے تھے مجھے؟" میں آگے بڑھ گیا۔ "اور یہ سورما ماموں نے مجھے بے بس ہوا دیکھا تو زور بازو آزمانے لگے۔" میں نے پے در پے ان کے گال پر رسید کیے۔ وہ بلبلا کے نیچے گر گئے لیکن میں نے ان کو پھر کھڑا کر دیا۔ ان کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔

"پرنس! ان کی جیب میں جو کچھ ہے سب نکال لو۔" میں نے کہا اور رابعہ نے آگے بڑھ کے ایک ایک کی جیب خالی کرنی شروع کی۔ مجموعی طور پر ان کی جیبوں سے تیرہ سو روپے نکلے۔ لیکن زیادہ اہم وہ کاغذات تھے جن سے ان کے نام پتے اور ان کے متعلق دوسری معلومات حاصل ہوتی تھیں۔

"تم لوگوں سے کیا کہا تھا میں نے؟" میں نے کہا۔ "اکثر مرد میری بیوی کو عورت سمجھ کے کمزور اور ناقص العقل فرض کر لیتے ہیں اور پھر اسی طرح مارے جاتے ہیں جیسے تم لوگ مارے گئے۔"

رابعہ نے مجھے گھور کے دیکھا اور میں بے اختیار ہنسا۔ یہ بات ہم دونوں کے سوا کوئی بھی نہیں سمجھتا تھا۔ ان کے خیال میں یہ کامیابی اور غرور کی ہنسی تھی جب کہ میں رابعہ کے گھورنے پر ہنسا۔ رابعہ پر میرے فخر کی کوئی انتہا نہ رہی تھی۔ "ادنیٰ گیدڑ کے بچو! جب کو نشانہ بناؤ تو شیرنی کے انتقام سے ڈرو۔" میں نے کہا۔ "ہے تم چوہوں میں سے کسی کی بیوی ایسی؟ یہ تو اکیلی ہی کافی تھی تمھیں۔"

کچھ میں کہہ رہا تھا وہ ایک بے پایاں مسرت کا ردعمل تھا۔ کیونکہ رابعہ میری توقعات سے کہیں بڑھ کے ذہین، حاضر دماغ اور جرأت مند ثابت ہوئی تھی۔ میں نے تو اس کے لیے آزمائش کو بہت سخت جانا تھا مگر اس نے خود کو میری رفاقت کا اہل ثابت کر دیا تھا۔ اس نے تو مجھے بھی شرمندہ کر دیا تھا۔

"میرا خیال ہے اب انھیں معاف کر دو۔" رابعہ نے کہا۔ "بہت سزا مل گئی۔ آئندہ کبھی ایسی غلطی نہیں کریں گے۔"

"کیسی غلطی ڈارلنگ؟" میں نے پہلی بار رابعہ کے لیے یہ لفظ استعمال کیا۔

"یہی اپنی اوقات فراموش نہ کرنے کی۔" رابعہ نے کہا۔

"اچھا۔ تم کہتی ہو تو معاف کر دیتے ہیں۔" میں نے وسیع القلب شوہر کی طرح کہا۔ "دے دو ان کے پیسے انھیں۔"

رابعہ نے براؤن لفافہ آگے بڑھایا۔ وہ سب ساکت و صامت کھڑے ایک دوسرے سے نظریں چراتے رہے۔ کسی نے ہاتھ بڑھا کے لفافہ پکڑنے کی جرأت نہیں کی۔ وہ کیسے یقین کر سکتے تھے کہ اتنی پٹائی کے بعد انھیں یہ انعام ملے گا۔ ان کے دل میں تو یہی خیال آیا ہو گا کہ ہم پھر کوئی جان لیوا مذاق کر رہے ہیں۔ اور کسی نے ہاتھ بڑھایا تو اور پٹے گا۔

"لے لو۔" میں نے حوصلہ افزا لہجے میں کہا۔ "تمھیں ضرورت ہے۔ پرنس! لفافہ نیچے رکھ دو۔"

رابعہ نے لفافہ نیچے رکھا اور میرے ساتھ آ کھڑی ہوئی۔ وہ اسی طرح بت بنے کھڑے رہے۔

"آئندہ بھی کبھی پیسے کی ضرورت پڑے تو آ جانا۔" میں نے کہا۔ "ضرورت میں آدمی ہی آدمی کے کام آتا ہے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کل کسی کام کے لیے ہمیں تمھاری مدد کی ضرورت پڑ جائے۔"

انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ کیا اس بات کا مطلب یہ نکالا جا سکتا تھا کہ میں ان کو اپنے "گروہ" میں شرکت کی دعوت دے رہا تھا۔ اس بات تک تو وہ قائل ہو چکے تھے کہ لاہور کا سب سے بڑا اور خطرناک ترین بدمعاش میں ہوں۔ میری دہشت ان کے دلوں میں بیٹھ گئی تھی اور میں انھیں اپنے مقاصد کی خاطر استعمال کرنے کی سوچ رہا تھا۔

"جو ہمارے کام آئے وہ نقصان میں نہیں رہتا۔" میں نے بدمعاشوں کے پرغرور لہجے میں کہا۔ "جیسے ہم سے ٹکرانے والا فائدے میں نہیں رہتا۔ جتنا پیسہ ضرورت پڑے گی، ملے گا اور ہم حفاظت بھی کریں گے۔ تم سب کے نام پتے ہم ساتھ لے جا رہے ہیں۔ ویسے بھی ایک بار شکل دیکھ کے ہم آدمی کو ایسے نکال لیتے ہیں جیسے کنویں میں ڈوبا ہوا ڈول۔ یہ جگہ بھی دیکھ لی ہے ہم نے۔ پرنس! تم چل کے اپنی گاڑی میں بیٹھو۔ میں آتا ہوں۔"

"پرنس کے سامنے میں یہ وردی نہیں مانگ سکتا تھا۔" میں نے استاد گولی سے کہا۔ "یہ ہوٹل فاران کی ہے اور ہم جہاں رہتے ہیں وہاں کی کوئی چیز نہیں اٹھاتے۔"

"لیکن... میں..." استاد نے بمشکل تمام تھوک نگل کے کہا۔

"تمھارے ساتھ تین آدمی اور ہیں۔" میں نے کہا۔ "کچھ نہ کچھ لا دیں گے تمھیں۔ یہاں کون دیکھنے والا ہے اپنوں کے سوا۔"

جب استادِ محترم نے شاگردانِ عزیز کے سامنے ویٹر کی وردی میرے حوالے کی تو ان کی حالت دیکھنے کے قابل تھی۔ بلاشبہ زمین شق ہو جاتی تو وہ اس میں سمانا پسند فرماتے۔ پہلے ہی ان کی کیا کم خاطر تواضع ہوئی تھی کہ چلتے چلتے میں نے ان کی عزت بھی اتار لی۔ وہ ایک کونے میں دبک کر اور منہ چھپا کے بیٹھ گیا۔

"میری بیوی کو حرافہ کس نے کہا تھا؟" میں نے وردی کو سمیٹ کر گولا سا بنا لیا۔ "تم نے؟" میں نے چٹکی بجا کے ڈکی کو متوجہ کیا جو اب اٹھ بیٹھا تھا۔ "باہر جاؤ۔ گاڑی میں پرنس بیٹھی ہیں۔ ان سے کہو کہ میں آپ کو حرافہ کہنے کی معافی مانگتا ہوں۔ میں خود کتا ہوں۔"

یہ بہت سخت سزا تھی۔ ڈکی جیسے مرد کو جو خود کو بدمعاش سمجھتا تھا، ایک عورت کے سامنے حاضر ہو کے معافی ہی نہیں مانگنی تھی، اپنے آپ کو کتا بھی کہنا تھا۔ خود اپنی نظروں میں اس حد تک گرنا بہت مشکل کام تھا۔ چنانچہ وہ بیٹھا رہا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے بالوں سے پکڑا اور سیدھا کھڑا کر دیا۔ "جاتے ہو یا میں دوسرے طریقے سے لے جاؤں۔ کتے کی طرح گلے میں پٹا ڈال کے گھسیٹتا ہوا۔" میں نے ویٹر کی وردی میں سے چمڑے کی بیلٹ نکالی اور اسے دروازے کی طرف دھکیلا۔ وہ یوں آگے بڑھا جیسے پھانسی کے تختے کی طرف بڑھ رہا ہو۔

"اتنا اونچا کہنا کہ میں سن لوں۔ ورنہ مجھے پرنس سے تصدیق کے لیے آنا پڑے گا۔" میں نے کہا۔ میں جانتا تھا کہ اس کے دل پر کیا بیت رہی ہو گی لیکن اسے مرعوب اور دہشت زدہ کرنے اور نفسیاتی طور پر مزاحمت کے ناقابل بنانے کے لیے یہ سب ضروری تھا۔ وہ گیا اور پھر اندر آ کے یوں کھڑا ہو گیا جیسے اپنے باپ کو دفنا کے آیا ہو۔

"اب ہم جا رہے ہیں۔" میں نے بارعب آواز میں کہا۔ "تمھاری گاڑی کے ڈسٹری بیوٹر کیپ ہم ساتھ لے جائیں گے۔ شور مچانے کی تمھیں اجازت ہے۔ سب سے پہلے تمھاری مدد کے لیے ہم ہی آئیں گے۔"

شب بخیر۔"

جب ہم اس گیرج سے دُور نکل آئے تو مجھ پر ہنسی کا دورہ پڑا۔ میں اتنا ہنسا کہ میرے آنسو نکل آئے۔ اور رابعہ نے بھی جو گاڑی چلا رہی تھی ہنستے ہنستے کہا۔ "خدا کے لیے بس کرو۔ گاڑی قابو سے باہر ہو جائے گی۔" لیکن میں ہنستا رہا۔ اس وقت رات کے بارہ بجنے والے تھے۔ باتیں تو بہت تھیں لیکن میں نے صبح پر اٹھا رکھیں۔ اور گاڑی لاہور ہوٹل کی طرف مڑ گئی۔

"واقعی۔ جیسی رُوح ویسے فرشتے۔" میں نے کہا۔ "تم نے تو اس وقت وہ کمال کر دکھایا ہے کہ میرا جی چاہتا ہے......"

"کیا جی چاہتا ہے؟" رابعہ نے ہنستے ہنستے روانی میں پوچھ لیا۔

"بس چھوڑو۔ جو دل چاہتا ہے اسکا اظہار نہیں ہو سکتا۔" میں نے کہا۔ "سنسر کے قوانین بہت سخت ہیں۔"

"بدتمیزی نہیں چلے گی جی۔" رابعہ نے مصنوعی غصے سے کہا۔ لیکن میری طرف دیکھا نہیں۔ چشم تصور سے میں نے اس کا حیا آلود چہرہ دیکھا۔

"دل کے جذبات کا اظہار کرنا بدتمیزی ہے یا نہ کرنا؟" میں نے کہا۔ "چلو یوں کرو، تم آج لاہور ہوٹل میں ٹھہر جاؤ۔"

"پاگل ہو گئے ہو کیا؟" رابعہ نے میری بات کا بالکل مختلف مطلب نکال کے کہا۔

"نہیں۔ بقائمی ہوش و حواس یہ بات کہہ رہا ہوں۔" میں نے ہنستے ہنستے کہا۔ "لاہور ہوٹل کا یہ مطلب نہیں کہ میرے ہی کمرے میں۔ بھئی وہاں اور بھی کمرے ہیں۔ اور نہ ہوں تو کیا، کوئی فیملی سوئٹ مل سکتا ہے جس میں ہم ایک رات تو گزار سکتے ہیں۔ ہمارے درمیان شرافت کی وہی دیوار حائل رہے گی جو اب تک رہی ہے۔ کیا میں شریف آدمی نہیں ہوں؟"

"اونہوں۔ تم نے ابھی خود کو سب سے بڑا بدمعاش ثابت کیا ہے۔" وہ شرارت سے بولی۔

"خطرے کی بات تو نہیں۔ لیکن احتیاط بہتر ہے۔" میں نے کہا۔ "آج کی رات تم فاران ہوٹل نہ جاؤ کیونکہ وہاں محسن بھی نہیں ہے، میں اپنے ہوٹل سے تمہارے ہوٹل ٹیلی فون کر دیتا ہوں کہ کوئی مہمان آئے تو نام پتا لے لیا جائے اور پیغام آئے تو لاہور ہوٹل میں ڈاکٹر امجد کو دے دیا جائے۔ محسن کی کال آئی تھی؟"

"آئی ہو گی تو ریسیو کرنے والا کوئی نہیں تھا۔" رابعہ نے کہا۔ گاڑی اس نے لاہور ہوٹل کے باہر روک دی اور میں اس کے ساتھ ریزرویشن آفس تک گیا۔

"ڈاکٹر امجد کے نام کوئی پیغام؟" میں نے کہا۔ "کسی ملاقاتی کا یا..."

"ایک فون آیا تھا اسلام آباد سے۔" کاؤنٹر کلرک نے ایک خانے میں سے کاغذ کا پرزہ اٹھایا۔ "صبح پھر بات کریں گے۔ کوئی نواب نخفے خاں صاحب تھے۔" اس نے مجھے کمرے کی چابیاں تھمائیں۔

"میری وائف آئی ہیں لندن سے۔" میں نے کہا۔ "مجھے اپنا کمرہ بدلنا ہے۔ کوئی فیملی سوئٹ مل سکتا ہے؟"

"یور آر لکی سر۔ ابھی کچھ دیر پہلے ایک ائیر کنڈیشنڈ سوئٹ خالی ہوا ہے۔" بکنگ کلرک نے رجسٹر دیکھ کے کہا۔ "اس کے چارجز کچھ زیادہ ہیں...... مگر وہ ہمارا سب سے اچھا سوئٹ ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ پورٹر سے کہو میرا سامان شفٹ کر دے۔" میں نے کہا اور مجھ سے پہلے رابعہ نے ہینڈ بیگ سے دو ہزار روپے نکال کر بکنگ کلرک کے سامنے ڈال دیے۔ سامان شفٹ ہونے میں دس منٹ بھی نہیں لگے۔ یہ سوئٹ واقعی شاہانہ تھا۔ اس میں کنگ سائز بیڈ کے علاوہ ایک کمرہ ملاقاتیوں کے لیے تھا جس میں ایک صوفہ سیٹ لگا ہوا تھا اور ایک سینٹر ٹیبل۔ اس میں چار افراد کے لیے کھانے کی گول میز تھی۔ فرش پر وال ٹو وال کارپٹ تھا اور بیڈ سائیڈ پر ایک چھوٹا سا ریفریجریٹر بھی موجود تھا۔ جتنی دیر میں میں نے غسل کیا، رابعہ نے کافی اور سینڈوچ منگوا لیے۔ شاندار باتھ روم میں گرم اور ٹھنڈے پانی کی لائن تھی۔ اور اس وقت گرم پانی سے غسل ایک نعمت ثابت ہوا۔ جس نے میری ساری تھکن دور کر دی۔ رابعہ نے صرف ہاتھ منہ دھونے پر اکتفا کیا۔

"کیا بدبختی کی انتہا ہے۔" میں نے کہا۔ "سوچا کیا تھا، کیا ہو گیا۔ ایسا خوبصورت پروگرام بنایا تھا کہ رات کا کھانا تمہارے ساتھ چاندنی لاؤنج میں کھاؤں گا۔ یا کینڈل لائٹ ڈنر ہو گا جہاں صرف میں اور تم ہوں گے۔ اور اس کے بعد راوی میں بوٹنگ کریں گے کامران کی بارہ دری تک۔ قسمت کہاں لے گئی، ایک گیرج میں جہاں کھانے کو گالیاں ملیں اور تھپڑ ملے۔ ایک تو عشق کی مار۔ دوسری درد فرقت کی مار۔ تیسری بھوک کی مار اور چوتھی استاد گولی، بونٹ، ڈکی اور پلسنے کی مار۔"

رابعہ ہنسی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ ویٹر نے ناک کیا اور اجازت ملتے ہی اندر آ گیا۔

"کھانا تو تم نے بھی نہیں کھایا ہو گا؟" میں نے ٹرے کو غور سے دیکھا۔ "یہ تو بہت کم ہے۔" پھر میں ویٹر سے مخاطب ہوا۔ "دیکھو اتنا ہی اور لاؤ۔ ذرا جلدی۔ اس سے پہلے کہ یہ ختم ہو۔" ویٹر نے "یس سر" کہا اور غائب ہو گیا۔

"تم کو مایوسی تو بہت ہوئی ہو گی مجھے غائب پا کے؟" میں نے سینڈوچوں پر حملہ کرتے ہوئے کہا۔ "سمجھا ہو گا کہ میں پھر موقع محل کا خیال کیے بغیر کوئی مہم سر کرنے نکل گیا؟"

"نہیں۔ مجھے یقین تھا کہ تم اپنی مرضی سے کہیں نہیں جاؤ گے۔"

وہ بولی اور ایک سینڈوچ اٹھا لیا۔ "بالکل ٹھیک سوچا تھا تم نے۔ بخدا فرشتۂ اجل بھی آتا تو میں تھوڑی سی مہلت مانگتا کہ اک نظر اسے دیکھ تو لوں۔" میں نے کہا۔

رابعہ کے چہرے پر حیا کا رنگ بادل کے سائے کی طرح آیا اور گزر گیا۔ "میں بہت فکر مند ہو گئی تھی۔ میں کچھ دیر تو اسی امید میں کھڑی رہی کہ تم آ جاؤ گے۔ شاید سگریٹ وغیرہ لینے نکل گئے ہو کیونکہ چابیاں گاڑی میں لگی ہوئی تھیں۔ پندرہ منٹ بعد میں نے اِدھر اُدھر تلاش کیا۔ لوگوں سے پوچھا کہ یہاں کوئی حادثہ تو پیش نہیں آیا۔ اگر کسی نے زبردستی تم کو اغوا کیا ہوتا تو یہ بھی ایک حادثہ کہلاتا۔ کوئی نہ کوئی مجھے بتا دیتا لیکن کسی نے کچھ نہیں دیکھا تھا۔ دوسری جانب ایک شخص نے صرف اتنا کہا کہ حادثہ تو ہوا تھا۔ ایک اسکوٹر والا کار سے ٹکرا گیا تھا مگر اللہ نے فضل کیا۔ کوئی ایسی ویسی بات نہیں ہوئی۔ میں آدھے گھنٹے تک پریشان رہی پھر کمرے میں لوٹ آئی۔"

"اور بستر پر لیٹ کر رونے لگی۔" میں نے کھاتے کھاتے لقمہ دیا۔ "ہوا تھا یہی کہ نہیں؟"

"جی نہیں۔" رابعہ جل کے بولی۔ "میں بہت خوش تھی چنانچہ بہت ہنسی اور پھر وہ گانا گانے لگی۔ تو کون سی بدلی میں میرے چاند ہے آ جا۔"

"اتنا پرانا! یہ تو غالباً تمہاری وہ...... میرا مطلب ہے نانی، دادی گاتی ہوں گی تقسیم سے پہلے۔" میں نے کہا۔ "جیسے میرے ابا گاتے تھے۔ چل چل رے نوجوان۔ اونچی تیری شان۔"

رابعہ ہنسی۔ "خیریت سے لوٹ آئے ہو تو شوخی سوجھ رہی ہے۔ یہاں میری جو حالت ہو رہی تھی، اس کا اندازہ ہے؟"

وہ یکلخت سنجیدہ ہو گئی اور اس کی آواز بھرّا گئی اور اس نے سینڈوچ رکھ دیا۔ رنج و الم کا وہ غبار جو اس کے دل میں جمع تھا ٹھیس لگتے ہی بہنے لگا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا۔

"ارے پاگل۔" میں نے کھانا چھوڑ کے اس کے دونوں ہاتھ ہٹائے۔ "رو رہی ہو۔ اس وقت تو اتنی ہمت سے ساتھ نبھایا اور اب یہ آنسو جب وقت گزر گیا ہے۔ خدا کی قسم رابعہ، میں اپنے دل کی کیا کہوں۔ الفاظ میں وہ کیفیت کیسے بیان ہو سکتی ہے۔ میری نظر میں تو تم تھیں۔ تمہارا وہ روپ جس کی یہ آنکھیں منتظر تھیں۔ اس سے بڑا ظلم کیا ہو سکتا تھا مجھ پر جو تقدیر نے کیا۔ اس زرد پھولوں والی نیلی ساری میں تم کو محو انتظار تصور کرتا تھا تو میرے دل پہ آرے چلنے لگتے تھے اور جگر کا خون آنکھوں میں آ جاتا تھا۔ مگر میں نے اسے بھی ایک آزمائش سمجھ کے قبول کیا۔ اور اب میں سوچتا ہوں کہ اگر ہم نے وہ گھنٹے کسی چاندنی لاؤنج یا کینڈل لائٹ ڈنر میں گزار لیے ہوتے تو ہمیں زیادہ خوشی ملتی یا اب چند گھنٹے کی جدائی کے بعد پھر مل کے حاصل ہوئی ہے۔ یہ خوشی کتنی بڑی، کتنی سچی اور انمول ہے۔ یہ رات ہماری محبت پر ایک اور صداقت کی مُہر ثبت کر گئی ہے کہ ہم ایک دوسرے کے لیے بنے ہیں۔ نہ ایک دوسرے کے بغیر مر سکتے ہیں اور نہ جی سکتے ہیں۔"

آہستہ آہستہ اس کے آنسو تھم گئے۔ پھر ویٹر دستک دے کر اندر آ گیا اور میں تھوڑا سا خفیف ہو کے اپنی جگہ جا بیٹھا۔ ویٹر نے مہذب ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے میاں بیوی کے "جھگڑے" کے متعلق بالکل تجسس کا اظہار نہیں کیا۔ لیکن یہ غور کیا کہ ایک ٹرے کو ناکافی سمجھنے کے باوجود ہم نے ابھی تک کچھ بھی نہیں کھایا ہے۔ وہ دوسری ٹرے رکھ کے نکل گیا تو میں نے رابعہ کو سینڈوچ پیش کیا۔ "رونے سے تمہارے دل کا اور آنکھوں کا غبار نکل گیا ہو گا۔" میں نے کہا۔ "دھل کے رنگ اور نکھر آیا ہے۔ چشم بد دور۔ اب کچھ کھا لو اور سلسلہ وہیں سے شروع کرو جہاں سے اشکوں کے سیلاب نے توڑا تھا۔"

وہ شرمیلے انداز میں مسکرائی۔ "تم ان لوگوں کے نرغے میں کیسے پھنس گئے تھے؟"

"پھنس گیا تھا! وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔ اب مجھے ہی دیکھو۔ کہاں چین سے لندن میں بیٹھا تھا۔ یہاں آ کے کہاں کہاں پھنس گیا۔" میں نے کہا۔ "کیوں اور کیسے کا جواب کوئی نہیں ہو سکتا۔ استاد گولی نے مجھے پہچان لیا تھا۔"

"میں نے بھی تمہاری تحریر پہچان لی تھی۔" رابعہ نے کہا۔ "استاد گولی نے وہ ایک سطر کا پیغام پیش کیا تو میں نے سمجھ لیا تھا کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔"

"اس میں تو گڑبڑ کا تذکرہ نہیں تھا۔" میں نے کہا۔ "کوئی ایس او ایس نہیں دیا تھا میں نے؟"

"اگر تم لکھتے کہ پندرہ ہزار دے دو۔" رابعہ بولی۔ "تو میں شک نہ کرتی۔ مگر اس میں تم نے لکھا تھا، میری خاطر۔ اور یہی دو لفظ غیر ضروری تھے جو مجھے کھٹکے۔"

"میرا پھر وہی دل چاہتا ہے۔ مگر خیر۔" میں نے کہا۔ "تم نے کمال ذہانت کا ثبوت دیا۔ یا میرے دل کی بات تمہارے دل نے سمجھ لی۔ حقیقت یہ ہے کہ میرا مقصد بھی اور کچھ نہیں تھا۔ ان کے سامنے میں کیسے لکھتا کہ میری جان خطرے میں ہے۔ پھر وہ پیغام لے کر آتے ہوئے ڈرتے۔ میں نے ان کو تسلی دی تھی کہ پولیس کا چکر چھوڑو۔ تم خود چکر میں آ جاؤ گے۔ جاؤ اور میری بیوی سے دس کے بندر ملے لو۔" میں نے کھانا ختم کیا اور کافی کا کپ لے کر بستر پر لیٹ گیا۔

"اور بہت تیر مارا تھا جناب نے یہ دعویٰ کر کے۔" وہ شرما کے ہنسی اور میرے پاس بیٹھ گئی۔

"تیر بھی ماریں گے کسی دن۔ دیکھ لینا۔" میں نے کہا۔ "ابھی تو دل پر تیر کھاتے بیٹھے ہیں۔ اس نے [illegible] گولی نے یہی کہا ہو گا تم سے۔ کہ آپ کے وہ منگا رہے ہیں۔"

رابعہ پھر ہنسی۔ "میں نے کسی قسم [illegible] مالی یا گھبراہٹ کا......

اظہار کیا ہوتا تو وہ بھاگ جاتا۔ یا اپنی جان بچانے کے لیے میری جان لیتا۔ میں نے پیغام پر غور کیا اور اسے تشریف رکھنے کو کہا۔ اس سے پوچھا کہ سکندر صاحب خیریت سے تو ہیں۔ بولا، بالکل خیریت سے ہیں جی۔ بس وہ خود نہیں آسکتے تھے اس لیے مجھے بھیج دیا۔ میں نے کہا 'تم دوست ہو ان کے ؟' اور اس نے کہا 'دوست کیا۔ خادم ہیں جی'۔ پھر میں نے پوچھا 'یہ پندرہ ہزار کس لیے منگوائے ہیں انھوں نے ؟' اور وہ بولا کہ "ہو گی کوئی ضرورت۔ مجھے نہیں بتائی انھوں نے۔ بس یہ کہا تھا کہ وہ کوئی سوال کیے بغیر دے دیں گی"۔

" وہ کون ؟" میں نے شرارت سے کہا۔" گویا میری زوجہ محترمہ۔ میں سمجھ گیا"۔

"اب تم شرافت سے نہیں سنو گے تو میں نہیں بولوں گی"۔ وہ لال ہو کے بولی "یہ منہ اور مسور کی دال"۔

"مسور کی دال ؟" میں نے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔" منہ تو خیر ٹھیک ہے۔ تم نے خود کو مسور کی دال کیسے سمجھ لیا ؟ تم تو گھر کی مرغی ہو جو دال کے برابر ہوتی ہے۔ مگر دال کون سی ہوتی ہے۔ کلام کے ساتھ طعام جاری رکھو"۔

" وہ کچھ ڈرا ہوا تھا"۔ رابعہ نے میرا ساتھ دیتے ہوئے کہا۔ "میں نے جتنی دیر میں پندرہ ہزار نکالے اور گنے اتنی دیر میں ترکیب میری سمجھ میں آگئی۔ میں نے بڑی شرافت سے چائے کے لیے پوچھا اور اس کے انکار کے باوجود گھنٹی دبا دی۔ وہ نروس تو ہوا تھا لیکن ویٹر کے آتے ہی میں نے نظر اٹھائے بغیر اسے فوراً چائے لانے کو کہا تو استاد گولی کے ذہن سے خطرے کا خیال ہی نکل گیا۔ میں نے نوٹ گننے کا عمل ذرا سست رکھا۔ ویٹر چائے لے کر آگیا تو میں نے استاد گولی سے کہا کہ چائے بنائے۔ اس نے مطمئن ہو کے ریوالور صوفے پر اپنے قریب رکھا اور چائے بنانے لگا۔ میں نے ویٹر کو روکا اور ڈانٹا کہ یہ کیا خالی چائے اٹھا لائے ہو۔ مہمان بیٹھے ہوں تو ساتھ کچھ کھانے کے لیے لانا چاہیے۔ ویٹر شرمندہ ہوا اور کچھ کہنا چاہتا تھا کہ استاد گولی نے اس کی طرف دیکھا اور اسے منع کر دیا۔ بس وہی ایک سیکنڈ تھا جب میں نے نوٹ پھینک کر جھپٹا مارا اور ریوالور پر قبضہ کر لیا۔ وہ اور ویٹر صدمے یا حیرت سے منجمد ہو گئے۔ استاد گولی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ عورت جو اتنی شرافت کا سلوک کر رہی ہے اور نوٹ گننے میں مصروف ہے پلک جھپکتے میں کامیابی کو ناکامی میں بدل دے گی۔ میں نے کہا 'اس غلط فہمی میں مت رہنا کہ مجھے ریوالور چلانا نہیں آتا۔ کہو تو تمہارے کان کو اڑا دوں ؟' اس کی حالت غیر ہو گئی لیکن اس سے زیادہ ویٹر کو پریشانی ہوئی۔ میں نے اسے دروازے سے دور ہو کے پیچھے ہٹ جانے کا حکم دیا۔ پھر استاد گولی

سے مخاطب ہو کے میں نے کہا 'ویسے تو میں تم کو پولیس کے حوالے بھی کر سکتی ہوں اور ہوٹل والے خود یہ کام کر سکتے ہیں مگر میں تم سے خود نمٹنا چاہتی ہوں۔ پہلے تو یہ بتاؤ کہ سکندر تمہارے پاس کیسے پہنچا ؟' اس نے بتا دیا۔ پھر میں نے کہا 'اس وقت وہ کہاں ہے ؟' استاد گولی نے جواب دینے میں تاخیر کی تو میں نے ریوالور کا سیفٹی کیچ ہٹا کے نشانہ لیا اور کہا 'میں کسی تذبذب کے بغیر تم کو جان سے مار ڈالوں گی۔ میں اکیلی عورت ہوں اور تم ایک بدمعاش ہوٹل میں مجھے لوٹنے کے لیے گھس آئے تھے۔ اس سے زیادہ سنگین الزامات بھی عائد کر سکتی ہوں میں اور ہوٹل والے میرے حق میں گواہی دینے پر مجبور ہوں گے۔ میرا کچھ نہیں بگڑے گا'۔ ویٹر چلانے لگا کہ بیگم صاحبہ مجھے تو جانے دیں۔ میں نے اسے تسلی دی کہ وہ خاموش کھڑا رہے تو بالکل محفوظ رہے گا۔ استاد گولی نے بتا دیا کہ سکندر ایک گاڑی میں میرے ساتھیوں کے ساتھ باہر موجود ہے اور پندرہ ہزار لیتے ہی ہم نیچے جا کے اسے اتار دیں گے۔ میں نے کہا 'اچھا، اٹھاؤ یہ پندرہ ہزار'۔ اس نے پھر ایک امید میں پندرہ ہزار اٹھائے اور ایک لفافے میں ڈال لیے۔ میں نے ویٹر سے کہا کہ گھنٹی بجا کے منیجر صاحب کو بلاؤ اور کہو بہت خطرناک معاملہ ہے۔ کسی کو بتائے بغیر میرے کمرے میں آجائیں"۔ ویٹر نے تعمیل کی اور استاد گولی کو یقین ہو گیا کہ اب اس کا نکلنا محال ہے۔ اس نے کہا 'پرنسس۔ تمہارے .... شوہر نے دھوکا کیا ہے اور تم سمجھتی ہو کہ اس طرح وہ بچ جائے گا۔ تم پندرہ ہزار تو بچا لو گی لیکن اس کی جان نہیں بچا سکو گی۔ اگر میں واپس نہ گیا تو اسے کوئی نہیں چھوڑے گا'۔ میں نے کہا 'تم اور ہم ایک ساتھ واپس جائیں گے۔ بے فکر رہو کیوں ہوتے ہو'۔ اتنی دیر میں منیجر حواس باختہ پہنچا اور دروازے سے اندر قدم رکھتے ہی اس پر بجلی گری۔ اندر عجیب سنسنی خیز فلمی منظر تھا کہ میں ریوالور سے ایک اجنبی کو ہینڈز اپ کرائے کھڑی ہوں اور ویٹر تھر تھر کانپ رہا ہے۔ میں نے انگریزی میں بات کی تو استاد گولی کی حالت قابل دید تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا اور وہ بول بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کی ہر دھمکی رائیگاں گئی تھی اور وہ بڑی آسانی سے اپنے ہی پھیلائے ہوئے جال میں ایسا پھنسا تھا کہ نکلنے کی کوئی صورت نہیں رہی تھی۔ منیجر کے آنے کے بعد اسے کوئی امید نہ رہی۔ اب نہ وہ دھمکی دے سکتا تھا اور نہ فرار ہو سکتا تھا۔ میں نے منیجر سے کہا کہ کچھ لوگوں نے میرے شوہر ڈاکٹر امجد کو یرغمال بنا لیا ہے۔ وہ لندن سے کراچی اور کراچی سے لاہور پہنچے تھے۔ ایئر پورٹ پر ان بدمعاشوں نے انہیں ٹیکسی میں بٹھا لیا اور اب ان کا ایک آدمی مجھ سے پندرہ ہزار روپے وصول کرنے آیا تھا جسے میں نے قابو کر لیا ہے۔ منیجر دم سادھے سنتا رہا اور پھر بولا کہ میڈم کو اس کیس میں خود کچھ کرنے کے بجائے

پولیس کو طلب کرنا چاہیے۔ میں نے کہا 'اگر کیس پولیس میں گیا تو میرے شوہر کی جان خطرے میں پڑ جائے گی۔ ان لوگوں کا کوئی اعتبار نہیں۔ یہ انھیں جان سے مار دیں گے'۔ منیجر نے پوچھا 'تو کیا آپ پندرہ ہزار دینا چاہتی ہیں ؟' اور میں نے کہا کہ پندرہ ہزار تو میں دے چکی ہوں۔ آپ دیکھ لیں اس کی جیب میں موجود ہیں۔ اور منیجر نے دیکھا تو رقم برآمد ہو گئی۔ 'پھر اب کیا کرنا چاہتی ہیں آپ ؟' وہ بولا اور میں نے کہا 'مجھے اپنے شوہر کو چھڑا کے لانا ہے اور اس کام میں آپ میری مدد کریں گے'۔ اس نے کہا "مدد کیوں نہیں کروں گا میڈم آپ حکم کریں"۔ میں نے کہا 'ڈاکٹر امجد نیچے ہوٹل کے قریب ہی کسی گاڑی میں اس شخص کے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھے ہیں۔ میں اس کے ساتھ جاؤں گی اور انھیں ساتھ لے کر آؤں گی'۔ منیجر نے کہا 'یہ بہت خطرناک کام ہو گا میڈم'۔ اور میں نے کہا 'خطرہ تو مجھے مول لینا ہی پڑے گا ورنہ یہ بدمعاش پندرہ ہزار روپے لے گیا اور انھوں نے ڈاکٹر صاحب کو مار دیا تو میں کیا کر لوں گی۔ ابھی تو میں اس کو گن پوائنٹ پر لے جاؤں گی۔ باہر میری اپنی گاڑی موجود ہے یہ اسی میں جائے گا اور جب ڈاکٹر امجد کو چھوڑ دیا جائے گا تو میں اسے چھوڑ دوں گی۔ وہ لوگ بھی نیچے کسی گاڑی میں انتظار کر رہے ہیں لیکن نہ تو میں ان کی گاڑی پہچانتی ہوں اور نہ ان لوگوں کو'۔ منیجر پریشان ہو گیا اور کہنے لگا۔ 'میڈم معلوم نہیں آپ ایسا کیوں کر رہی ہیں۔ یہی کام پولیس بھی کر سکتی ہے۔ بے شک آپ کی ہمت اور جرأت نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے'۔ آپ بہت غیر معمولی عورت ہیں کہ اپنے شوہر کی خاطر خود جان کی بازی لگا رہی ہیں لیکن میں کہتا ہوں 'یہ سب ضروری تو نہیں'۔ میں نے کہا۔ 'منیجر صاحب، پولیس کو دیکھتے ہی انھوں نے میرے شوہر کو مار کے باہر پھینک دیا اور بھاگ گئے تو میں کیا کروں گی۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتی کہ وہ کون ہیں اور انھوں نے ایسا کیوں کیا۔ ہمارا تو کوئی دشمن بھی نہیں اور یہ کام یقیناً بہت گھٹیا اور چھوٹے مجرموں کا ہے ورنہ وہ صرف پندرہ ہزار ہی کیوں مانگتے۔ پندرہ لاکھ مانگتے'۔ منیجر نے کہا 'اچھا بتائیے میں کیا کروں ؟ لیکن بعد میں خدا کے لئے مجھے الزام مت دیجیے گا'۔ میں نے کہا 'آپ کچھ مت کریں اور ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ آپ کا نام تک نہیں آئے گا اس کیس میں۔ بلکہ کسی کو معلوم تک نہیں ہو گا کہ ڈاکٹر امجد کا اغوا ہوا تھا۔ آپ صرف اتنا کریں کہ ایک ویٹر کی یونیفارم مجھے فراہم کر دیں'۔ وہ اتنا حیران ہوا کہ اس کا منہ کھلا رہ گیا۔ میں نے وضاحت کی اور کہا 'دیکھیے منیجر صاحب، یہاں سے میں کسی عام آدمی کے پیچھے ریوالور لے کر اور اسے ہینڈز اپ کرا کے نہیں جا سکتی۔ دس آدمی دیکھیں گے اور شک کریں گے۔ میں اس کو ویٹر کی وردی میں لے جاؤں گی۔ اس کے سر پر میرا سوٹ کیس ہو گا جسے یہ دونوں ہاتھوں سے تھام کر رکھے گا چنانچہ اس کے دونوں

ہاتھ تو خود ہی سر سے بلند ہوں گے۔ یہ آگے رہے گا اور میں دوپٹے کے نیچے ریوالور لے کر چلتی جاؤں گی۔ یہ گاڑی تک جائے گا۔ سوٹ کیس ڈکی میں رکھے گا تو چوکیدار کو بھی شک نہیں ہو گا۔ آپ میرے ساتھ گیٹ تک چلیں تاکہ کاؤنٹر پر کوئی مجھے چیک نہ کرے۔ پھر یہ گاڑی ڈرائیو کر کے لے جائے گا اور میں اس کے پیچھے والی سیٹ پر ریوالور لے کے بیٹھوں گی۔ آپ کا کام اور آپ کی ذمہ داری ختم۔ بعد میں آپ کہہ سکتے ہیں کہ نہ آپ نے کچھ دیکھا نہ سنا۔ کیا ہوا کیا نہیں ہوا ؟ آپ کو کچھ معلوم نہیں"۔ منیجر نے تھوڑی سی بحث کی مگر میں نے اسے قائل کر لیا۔ پھر اسی ویٹر کو کہا گیا کہ وہ اپنی وردی اتارے اور استاد گولی کو دے۔ خود استاد گولی کے کپڑے پہنے اور کمرے میں اس وقت تک موجود رہے جب تک میں واپس نہ آجاؤں"۔

"پھر تو وہ غریب ابھی تک کمرے میں ہی قید ہو گا"۔ میں نے کہا۔" اور منیجر الگ پریشان ہو گا"۔

" استاد گولی کچھ پس و پیش کرنے لگا تو منیجر نے اس کے دو ہاتھ مارے اور کہا کہ خدا کا شکر ادا کرو جان بچا کے نکلنے کا موقع مل رہا ہے"۔ رابعہ بولی۔" ورنہ لاش جاتی یہاں سے۔ اس نے باتھ روم میں جا کے کپڑوں کا تبادلہ کیا۔ اور میں نے اسے پھر منیجر کے سامنے پندرہ ہزار دیے۔ منیجر گواہ ہے اور ضرورت پڑنے پر استاد گولی کو پہچان سکتا ہے۔ میں نے ضروری کاغذات اور کپڑوں والا سوٹ کیس استاد گولی کے سر پر اٹھوایا اور ویٹر سے کہا کہ وہ چاہے تو کمرے کو مقفل کر کے جائے لیکن یہ نہ بھولے کہ آج جو کچھ اس نے دیکھا یا سنا وہ خواب تھا اور اس خواب کا وہ خواب میں بھی کسی سے تذکرہ نہ کرے۔ ہم یوں نکلے کہ آگے استاد گولی تھے، ہینڈز اپ اور لرزہ براندام، بالکل پیچھے میں تھی جس کے ہاتھ نے ریوالور کو دوپٹے میں یوں لپیٹ رکھا تھا کہ نال کا رخ مستقل استاد گولی کی طرف رہے۔ یہ بات ان پر واضح کر دی گئی تھی۔ منیجر نے اسے یہ بھی سمجھا دیا تھا کہ پرنسس نے گولی مار دی تو ہوٹل والے کیا کہیں گے۔ ان کا مؤقف یہ ہو گا کہ کوئی بدمعاش ہوٹل کے بیرے کی وردی میں پرنسس کا سوٹ کیس لے کر فرار ہو رہا تھا۔ روکنے پر اس نے مقابلہ کیا اور اپنے ہی ریوالور کی گولی کا نشانہ بن گیا۔ پولیس بیان کا نہیں، رشوت کی زبان کا یقین کرتی ہے چنانچہ کسی کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ منیجر پریشانی کے باوجود 'یور ہائی نس۔ یور ہائی نس' کرتا بڑی شرافت سے گیٹ تک آیا اور لوٹ گیا۔ میں نے اس کو چابی دے کر سوٹ کیس ڈکی میں رکھوایا اور اس سے پوچھا کہ ڈرائیونگ آتی ہے ؟

" اگر وہ انکار کر دیتا کہ نہیں آتی پھر ؟" میں نے کہا۔

"پھر میں منیجر کو بلاتی اور اسے کہتی کہ مجھے ایک ڈرائیور چاہیے"۔ رابعہ نے کہا۔ لیکن استاد گولی کی عقل مفلوج تھی۔ اس نے اقرار

میں سر ہلا دیا اور میں نے کہا۔ "گاڑی اسٹارٹ کرو اور ادھر ہی لے چلو جدھر تمہاری گاڑی ہے لیکن اس سے کچھ فاصلے پر روک لو۔ ہیڈ لائٹس آف رکھو اور اس وقت تک بیٹھے رہو جب تک تمہارے ساتھی مایوس ہو کے روانہ نہ ہو جائیں۔ میں ہوٹل کے سامنے ہی مار دھاڑ یا کشت و خون کا ڈراما نہیں چاہتی تھی۔ ان سب کا ٹھکانا بھی دیکھنا چاہتی تھی۔ مشکل سے پانچ منٹ کے بعد آگے والی گاڑی چل پڑی۔ میں نے استاد گولی کو مناسب فاصلے سے تعاقب جاری رکھنے کا حکم دیا۔ اور پھر بتا دیا کہ ذرا سی بھی بھول چوک ہوئی تو پیچھے سے کھوپڑی اڑا دوں گی۔ استاد گولی کے ساتھی محسوس ہی نہ کر سکے کہ کوئی ان کے تعاقب میں ہے۔"

"وہ استاد گولی کے نہ آنے سے بہت نروس تھے اور تقریباً خانہ جنگی کا شکار تھے۔" میں نے کہا۔ "صرف ایک تھا جو وفاداری کا حق ادا کرنا چاہتا تھا باقی مصر تھے کہ بھاگ چلو۔ انہی کی باہمی چپقلش میں میری تھوڑی سی ٹھکائی ہوئی لیکن تم کو کافی وقت مل گیا۔ اس کے باوجود تم نے آدھے گھنٹے میں بہت کچھ کر لیا۔ میرا دل پھر چاہتا.... خیر۔ آگے کہو۔"

"آگے کہنے کو کیا ہے۔" وہ خفا ہو کے بولی۔ "تم اپنے دل کے بریک ٹھیک رکھو جی۔ بار بار فیل ہو رہے ہیں۔ یہ نہ ہو کہ مجھے سونے کے لیے واپس ہوٹل فاران جانا پڑے۔"

"تم جاؤ گی تو کیا مجھے نہیں جانا پڑے گا۔" منیجر قائل تو ہو کہ بہادر پرنسس کس طرح تن تنہا اپنے شوہر کو بدمعاشوں کے قبضے سے چھڑا لائی۔ ان میں سے ایک نے پرنسس کی شان میں گستاخی کی تھی۔ ہم نے اسے معافی مانگنے کے لیے بھیجا تھا۔"

رابعہ بے اختیار ہنسی۔ "میں تو حیران رہ گئی اور ہنسی پر قابو نہ رکھ سکی جب اچھے خاصے ہٹے کٹے مرد نے چوہے کی طرح مریل آواز نکال کے کہا کہ پرنسس میں نے آپ کو حرافہ کہا تھا۔ میں کتا ہوں۔ مجھے معاف کر دیں۔ ہنسنے سے وہ اور خفیف ہوا۔ میں نے پوچھا تم کون سے کتے ہو؟ دھوبی کے؟ یا وہ جو صرف بھونکتے ہیں کاٹتے نہیں۔ وہ احمقوں کی طرح کھڑا رہا۔ میں نے کہا۔ جاؤ اچھے کتے بن کے رہو۔ مالک کے وفادار۔ پاگل کتے کو لوگ گولی مار دیتے ہیں۔"

"اندر اس سے بھی دلچسپ منظر تھا۔" میں نے ہنستے ہنستے کہا۔ "استاد گولی سے جب وردی اتروائی گئی تو شاگردان عزیز کے سامنے وہ سخت رسوا اور بے عزت ہوئے۔ چلتے چلتے میں نے استاد گولی کو گولی دی تھی کہ ہم ڈسٹری بیوٹر کیپ نکال کے لے جائیں گے جو ہم نہیں لائے مگر ان کو صبح معلوم ہو گا جب وہ گاڑی چلانے کے لیے دوسری ڈسٹری بیوٹر کیپ لائیں گے اور سخت جھنجلائیں گے کہ گاڑی بالکل ٹھیک اور قابل استعمال تھی۔ وہ خواہ مخواہ رات بھر خوار ہوتے۔"

"دو بج رہے ہیں۔" رابعہ نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ "تم آرام کی ضرورت ہے؟"

"ضرورت تو ہے لیکن نیند نہیں آ رہی ہے۔" میں نے کہا۔ "دل چاہتا ہے تم ایسے ہی بیٹھی رہو اور باتیں کرتی رہو۔"

"باتیں لیٹ کر بھی کی جا سکتی ہیں۔" وہ بولی۔ "میں تھک گئی ہوں۔"

"اچھا۔ تو تم یہاں لیٹو۔" میں نے بستر سے اٹھ کے کہا۔

"اور... تم کہاں جاؤ گے؟" وہ میری طرف دیکھ کے بولی۔

"جانا کہاں ہے اس وقت۔" میں نے کہا۔ "یہیں لیٹ جاؤں گا........ میرا مطلب ہے نیچے۔ کارپٹ پر۔"

"صوفہ جو گھسیٹ لاؤ یہاں۔" رابعہ نے کہا۔

"یس۔ یہ ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا اور دوسرے کمرے سے ... محنت کے بعد صوفہ گھسیٹ لایا۔

"تمہارے قد کے اعتبار سے تو یہ جھولا بہت ناکافی ہے۔" رابعہ مسکرائی۔

"اس کی تو مجھے فکر نہیں۔" میں نے کہا۔

"صبح اس کے آنے سے پہلے ہی صوفہ واپس ٹھکانے رکھ دینا۔" رابعہ نے لائٹ آف کی اور بیڈ سائڈ لیمپ جلا دیا۔ ... میں مدھم نیلگوں روشنی پھیل گئی۔ باہر سردی تھی لیکن کمرے کا ایئر کنڈیشنر نے بڑی خوشگوار حرارت پیدا کر دی تھی۔ دو میں سے ایک کمبل میں نے لیا اور سر کو صوفے کے بازو پر رکھ کے لیٹ گیا۔

"ایسی پرسکون رات میری زندگی میں پہلے کبھی نہیں آئی۔" میں نے سگریٹ جلا کے چھت کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ آگ اور دھواں تو چھوڑو خدا کے لیے۔" رابعہ نے سگریٹ میرے لبوں سے چھین کر پھینک دی۔

"ارے رے..." میں اٹھ کے دوڑا۔ "کارپٹ جل جائے گا۔ ابھی سے یہ فوجداری کنٹرول۔ ایسے ہی حالات میں کہا ہوگا کسی نے کہ۔ اکبر ڈرے نہیں کسی سلطان کی فوج سے۔ لیکن شہید ہو گئے بیوی کی فوج سے۔" میں سگریٹ کو ایش ٹرے میں بجھا کے پھر دبک گیا۔ اپنی نظر کو میں نے رابعہ کے چہرے سے بھی دور رکھا جو اس تنہائی، خاموشی، اس ماحول اور اس روشنی میں یوں دمک رہا تھا جیسے چودھویں کا چاند۔ اور مجھے اس کی کشش یوں تہ و بالا کر رہی تھی جیسے میں ... ہوں۔ اعصابی کشیدگی کو کم کرنے کے لیے میں نے باتیں شروع کیں۔ چپکے چپکے، آہستہ آہستہ، سرگوشی میں ہم گزرے وقت کی باتیں کرتے رہے۔ پھر آنے والے وقت کی بات خود بخود میرے لبوں پر آ گئی اور میرے خواب میرے الفاظ میں ڈھل گئے۔ نہ جانے میں کب تک بولتا رہا۔ جب میں نے دیکھا تو وہ سو چکی تھی۔ سکون کی ...

نیند میں بھی وہ مسکرا رہی تھی۔ اس بچے کی طرح جو کہانی سنتے سنتے سو جائے اور خواب اسی کہانی کا تسلسل بن جائے۔ شاید خواب سنتے سنتے وہ انہی خوابوں میں کھو گئی تھی۔ میں بھی اطمینان سے کروٹ بدل کے سو گیا۔

اس رات میں نے بہت سے ایسے خواب دیکھے جو قوس قزح کے سارے اُجلے رنگوں سے مزین تھے۔ صحن گلشن میں گلوں کے رنگ پر اترنے والی تتلیاں اُڑتے اُڑتے نیلے آسمان کی وسعت میں گم ہو جاتی تھیں اور ستارے بن کے چمکنے لگتی تھیں۔ پھر آسمان نیچے اتر آتا تھا اور نیلے رنگ کی ساری کا پلو بن کے اُڑنے لگتا تھا جس میں زرد پھول دمکتے تھے۔ برف پوش پہاڑ کی کسی چوٹی سے رابعہ مجھے پکارتی تھی اور اپنا ایک ہاتھ پھیلا دیتی تھی۔ "سکندر یہاں آؤ۔ یہاں سے دیکھو دنیا کتنی خوبصورت ہے۔" اور میں کہتا تھا "مجھے سب کچھ تمہاری آنکھوں میں نظر آ رہا ہے۔" پھر شفق پھیلنے لگتی تھی اور رابعہ اپنے گالوں کو چھو کر کہتی تھی "ارے یہ رنگ تو میرے گالوں پر اتر آیا ہے۔" اور اس کا شاخ گل جیسا بدن بل کھا کے کمان ہو جاتا تھا۔ خوابوں کے یہ سلسلے کسی سلسلۂ کوہ کی طرح حد نگاہ تک پھیلے ہوتے تھے۔ اور آپس میں یوں ملے ہوتے تھے کہ ایک دوسرے کو جدا کرنا محال تھا۔ آخری خواب جو مجھے یاد رہا مری اور نتھیا گلی کے کوہساروں کا تھا جہاں بلند و بالا یوکلپٹس کے گھنے درختوں کے ان گنت تنے تھے۔ اور ان کی شاخیں انتہائی اونچائی پر آپس میں یوں ملتی تھیں کہ سر سبز چھت کے سوراخوں میں سے بادل گزرتے دکھائی دیتے تھے۔ بادل نیچے وادیوں میں معلق تھے اور اردگرد کے جنگل میں بھی دھند کے پہاڑ بنے کھڑے تھے۔ غبار کے مرغولے بن کر گھوم رہے تھے اور دھوئیں کی چٹان بن کر ہماری راہ میں حائل ہو جاتے تھے۔ ٹپ ٹپ ٹپکتی بوندوں کے ساتھ یوکلپٹس کے بھیگے پتوں کی مہک تھی اور گہری وادیوں میں گونجنے والا بارش کا شور اپنی بازگشت کے ساتھ سنائی دیتا تھا۔ "رابعہ!" میں نے اِدھر اُدھر دیکھ کے پکارا اور وہ اچانک ایک بادل سے نکل آئی۔ پھوار تیز ہو گئی۔

ہنسی کی آواز پر میں نے آنکھیں کھولیں۔ پانی کے چند اور چھینٹے مجھ پر گرے۔ میں ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ رابعہ کی ہنسی جلترنگ بجانے لگی۔ "جناب، اٹھیے بس اب کہ لذت خواب سحر گئی۔"

"تو یہ تم تھیں جو مجھ پر چھینٹے اُڑا رہی تھیں۔ میں سمجھا بارش ہو رہی ہے۔" میں نے آنکھیں مل کے کہا۔

"تمہیں تو اپنی نہیں میری زیادہ فکر تھی۔ نیند کی حالت میں بھی مجھے پکار رہے تھے۔" وہ پھر ہنسی۔ لیکن میں دم بخود بیٹھا رہا۔ اس کے پیکر حسن کی تجلی نے میری نگاہوں کو خیرہ کر دیا تھا۔ وہ ابھی غسل کر کے نکلی تھی اور اس کے دھلے ہوئے چہرے کے گلابی رنگ میں اتنی تازگی اور شگفتگی تھی اور وہ آب و تاب تھی کہ میں پلک جھپکائے بغیر اسے دیکھتا رہا۔ سنگ مرمر سے تراشے ہوئے پیکر کے گرد وہی نیلی ساری لپٹی ہوئی تھی جس کے زرد پھول مجھے دیکھ کر مسکرا رہے تھے اور شوخ اشارے کر رہے تھے۔ رابعہ کی آنکھوں میں حیا کا رنگ تھا اور پیار کا رنگ تھا۔ غرور کا رنگ تھا اور وہ سب رنگ تھے جو محبت کے رنگ ہوتے ہیں۔

"کھلی آنکھوں سے بیٹھے بیٹھے پھر سو گئے؟" رابعہ نے جھک کر کہا اور میری آنکھوں میں جھانکا۔ "کیا دیکھ رہے ہو؟"

"ایک شعر کی تفسیر۔ رنگ پیراہن کا خوشبو زلف لہرانے کا نام، موسم گل ہے تمہارے سامنے آنے کا نام۔ ترمیم کے لیے معذرت۔"

"نو بج رہے ہیں ڈاکٹر صاحب۔" رابعہ بولی۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ "اُف۔ آگیا وہ رنگ میں بھنگ ڈالنے والا۔" میں نے چھلانگ لگا کے اُترتے ہوئے صوفے کو گھسیٹا اور بڑی مشکل سے وہیں پہنچایا جہاں رات کو تھا۔ کمبل کو بیڈ پر پھیلایا اور تکیوں کو ساتھ رکھا اور ایک نظر اس سیٹ کو دیکھا جو بیڈ روم کا صحیح نقشہ پیش کرتا تھا۔ ان میاں بیوی کے بیڈ روم کا جن کی ازدواجی زندگی انتہائی قابل رشک ہو۔ رابعہ نے آئینے میں سب کچھ دیکھا تو آئینہ بھی لال ہو گیا۔ پھر دستک ہوئی تو میں نے نیند سے بوجھل آواز میں کہا۔ "کون آگیا اتنی صبح صبح۔" اور دروازہ کھولا۔ دروازہ کھلتے ہی میری نیند ہاتھوں کے طوطے کی طرح اُڑ گئی اور میں بے اختیار پیچھے ہٹا۔ میرے سامنے محسن کھڑا تھا۔ تھکا ہوا پژمردہ تباہ حال۔

"تو! رات کو فون آیا تھا، صبح خود آ گیا۔" میں نے کہا۔ رابعہ نے پلٹ کر اسے دیکھا۔

"ہاں۔" وہ اندر آ کے دھڑام سے کرسی پر گر گیا۔ "مجھے ابھی لیے فوراً آنا پڑا۔ کہاں تھے تم دونوں؟"

"ہم؟ .... ہم کہاں تھے۔ یہیں تھے۔ کیوں رابعہ؟" میں نے اس بچے کی طرح کہا جس کی چوری پکڑی جائے۔ رابعہ نے مسکرا کے منہ پھیر لیا کیونکہ محسن بیڈ روم کے سیٹ کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔

"جھوٹ بکتے ہو تم دونوں۔ نہ رابعہ اپنے ہوٹل میں تھی نہ تو یہاں تھا۔" محسن بولا۔ "رات کے بارہ بجے تک۔"

"وہ کچھ ایسا ہے..... کہ ہم تو نیک بچوں کی طرح شام سے پہلے ہی لوٹ آنا چاہتے تھے مگر کھانے میں ذرا دیر ہو گئی۔" میں نے کہا۔ "پھر ایک جگہ پکنک پر جانا پڑا..... لیکن تیری شکل کیوں ایسی ہو رہی ہے؟ امی تو ٹھیک ہیں نا؟"

محسن نے نفی میں سر ہلایا اور دیوار کو گھورتا رہا۔ "کل امی کا انتقال ہو گیا۔ صبح نو بجے کے قریب۔"

"انتقال ہو گیا؟" میں نے یوں کہا جیسے یہ ناممکن تھا۔ رابعہ ڈریسنگ ٹیبل کے اسٹول پر سے اٹھی اور محسن کے قریب آ کے کھڑی ہو گئی۔ ہم سب بے حس و حرکت اور ساکت و صامت خلا میں دیکھتے رہے۔ ان سب باتوں کی بازگشت ایک پُرآسیب سرگوشی بن کے کمرے میں پھیلنے لگی جو محسن نے مجھ سے اور رابعہ سے گزشتہ روز اسی وقت کی تھیں۔ وہی وقت تھا جب اس کی ماں کے سرہانے فرشتۂ اجل قرض جاں کی وصولی کے لیے پہنچا تھا اور بیٹے کی دید کی منتظر نظروں نے اسے تصور میں دیکھا تھا۔ اس کے مجبور دل نے آخری بار دھڑکنے سے پہلے اسے یاد کیا تھا اور یہ یاد سیکڑوں میل کی مسافت طے کر کے وقت کی لہروں پر اس مقام تک پہنچی تھی جہاں بدقسمت بیٹا اس جنت کی بات کر رہا تھا جو ماں کے قدموں کے نیچے ملتی ہے۔ اس وقت میں نے سوچا تھا کہ یہ ذکر اچانک کیسے چھڑ گیا۔ بات کہاں سے شروع ہو کے کہاں آ گئی؟ جواب میری سمجھ میں اب آیا۔ وہ ایک ہی وقت تھا جب ماں نے بیٹے کو یاد کیا اور بیٹے کو ماں کی یاد آئی۔ ٹیلی پیتھی۔ ربط باہمی کی پُراسرار قوت جو قلب و نظر کو ہم آہنگ کر دیتی ہے۔ عالم بالا کی جانب محو سفر روح کے قیام کا مختصر وقفہ۔

"کتنی عجیب بات ہے۔" رابعہ نے کہا۔ "کل صبح اسی وقت ہم انہی کی باتیں کر رہے تھے۔"

"اور کتنی بدبختی کی بات ہے سکندر۔" محسن بولا۔ "کہ اس وقت ان کے پاس شہلا کے سوا کوئی نہیں تھا۔ نہ شوہر نہ بیٹا۔"

"انکل آفس میں ہوں گے۔" میں نے دکھ سے کہا۔ محسن کی آنکھوں سے بہنے والے خاموش آنسو اس کے رخساروں پر لکیریں بنا رہے تھے۔ اور اس کی گود میں گر رہے تھے۔

"نہیں۔ وہ اسپتال میں تھے۔ ایک دن پہلے ہی ان پر ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔" محسن روتے روتے بولا۔ "معمولی سا درد اٹھا تھا۔ ڈاکٹروں نے روک لیا۔ جب میں پہنچا تو تدفین بھی ہو چکی تھی۔ شہلا نے انکل رضوی کو فون کیا تھا مگر انھوں نے کہا کہ مجھے نہ تو محسن کا پتا ہے اور نہ رابعہ یا سکندر کا۔"

"یہ نہیں کہا انھوں نے کہ سب مفرور ہیں؟" میں نے تلخی سے کہا۔ "وہاں کی پولیس کو خبردار نہیں کیا کہ ان میں سے کوئی بھی جنازے میں شرکت کے لیے آئے تو گرفتار کر لیا جائے، بہترین موقع ملا ہے؟"

محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "معلوم نہیں انھوں نے ایسا کیوں نہیں کیا۔" محسن بولا۔ "انھوں نے شہلا کو تسلی دی اور پھر اسپتال میں ڈیڈی سے بات کی۔ ڈیڈی کو اب تک کچھ نہیں معلوم۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ یہ خبر سنانے میں خطرہ ہے۔ انکل رضوی نے ان سے بھی کچھ نہیں کہا بلکہ ڈیڈی نے تو خیریت پوچھی تھی۔ اور انکل رضوی نے کہہ دیا کہ سب ٹھیک ہے، تم فکر مت کرو۔ وہ فرض شناس آدمی کتنا بھی سخت نظر نہ آتا ہو، سینے میں تو آدمی کا دل رکھتا ہے۔ اور دل پتھر نہیں ہو سکتا۔ وہ بھی مجبور ہو گئے۔ پہلی بار انھوں نے افسری کو فراموش کر دیا اور جانتے بوجھتے اپنے نامۂ اعمال میں خود اپنے ہاتھوں ایک جرم لکھ دیا۔"

"یہ بات انکل شیروانی سے چھپائی تو نہیں جا سکتی؟" میں نے متفکر ہو کے کہا۔

"ہاں۔ ابھی ایک ہفتہ تو وہ اسپتال میں رہیں گے۔" محسن نے کہا۔ "ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ وہ خود آہستہ آہستہ انھیں ذہنی طور پر تیار کریں گے اور پھر بتا دیں گے کہ وہ اکیلے رہ گئے ہیں۔"

"تو ان سے ملنے تو گیا ہو گا؟" میں نے کہا۔ "شہلا بھی جاتی ہو گی۔"

"اس بیچاری نے تو سب سے زیادہ ظلم برداشت کیا۔" محسن بولا۔ "کوئی اور ہوتا تو اس کا نروس بریک ڈاؤن ہو جاتا۔ دونوں طرف کی تیمارداری۔ گھر سے اسپتال اور اسپتال سے گھر۔ بے تُک گاڑی تھی لانے لے جانے کے لیے۔ اسپتال میں ڈاکٹروں نرسوں کی دیکھ بھال بہت اچھی تھی اور گھر پر بھی ڈاکٹر صبح شام آتا تھا۔ لیکن شہلا کی اعصابی کشیدگی کا علاج کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ ادھر گھر میں بھی ہر وقت خطرے کی تلوار کا سایہ۔ اسپتال میں بھی ہر لحظہ خوف کا آسیب اور یہ دھڑکا کہ کہیں کچھ ہو نہ جائے۔ اسے تو کوئی تسلی اور حوصلہ دینے والا بھی نہ تھا۔ اس کی توجہ ہٹانا، کچھ دیر کے لیے تفکرات سے نجات دلانا اور تھوڑی بہت تفریح فراہم کرنا اس کی ذہنی و جسمانی صحت کے لیے ضروری تھا۔ مگر وہ اکیلی تھی اور اس کا نہ کوئی غمگسار تھا نہ ساتھی۔ فوزیہ ہوتی تو اسے کوئی ہم عمر تو ملتا باتیں کرنے والا لیکن وہ نہیں آ سکتی تھی۔ امی کے انتقال کے بعد وہ ہمت ہار گئی۔ ڈاکٹروں نے اسے سکون آور دوائیں دے کے سلا دیا۔ میں رات کو نو بجے پہنچا تو فوزیہ بھی آ چکی تھی، اس کا شوہر بھی تھا۔ وہ دونوں ابھی چہلم تک وہیں رہیں گے۔ میں رات ساڑھے نو بجے قبرستان گیا اور دس بجے اسپتال پہنچا۔ چہرے سے رنج و غم کے آثار مٹا کے، مسکراتا ہوا اور مطمئن۔ ڈیڈی بہت حیران ہوئے۔ کہنے لگے "رضوی صاحب نے بھیجا ہو گا تم کو؟ حالانکہ میں نے کہا تھا کہ کوئی سیریس بات نہیں۔"

"انکل رضوی جنازے میں شریک ہوئے تھے؟" رابعہ نے کہا۔

"نہیں۔ لاہور میں کچھ گڑبڑ تھی۔ اعلیٰ اختیاراتی میٹنگ تھی شام کو جو رات تک جاری رہی۔" محسن بولا۔ "انہیں بہت رنج تھا لیکن انھوں نے ٹیلی فون پر شہلا کو بہت تسلی دی۔ اور میرا خیال ہے اس کی حالت کے پیش نظر 'سب خیریت ہے' کے سوا کچھ نہیں کہا۔ شاید ہم چلے جاتے تب بھی وہ اس موقعے پر فرض شناسی کا وہ مظاہرہ نہ کر پاتے جس کی وجہ سے وہ سنگدل اور بے حس مشہور ہو گئے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میٹنگ میں شرکت بہانہ ہو۔"

"بہانہ ہی ہوگا۔ ورنہ یہاں تو کسی قسم کی گڑبڑ نہیں۔" میں نے کہا۔

"ان کو اندیشہ ہوگا کہ وہاں سب کا سامنا ہوگا۔ اور وہ آزمائش کے عذاب میں مبتلا ہو جائیں گے۔" محسن نے کہا۔ "چنانچہ وہ صاف دامن بچا گئے۔ جھوٹ بولتے پر بھی وہ اپنے آپ سے شرمندہ تو ہوں گے لیکن مطمئن بھی ہوں گے کہ ایک پُرالم موقعے پر ہمدردی اور غمگساری کے بجائے فرض شناسی کا مظاہرہ کرنے کی اذیت سے بچ گئے۔"

"تجھے ابھی وہیں رہنا چاہیے تھا۔" میں نے کہا۔

"اگر تم لوگ فون پر مل جاتے تو شاید میں سوئم کے بعد آتا۔" وہ بولا۔ "میں نے اسپتال سے واپس آتے ہی گھر سے فون کیا تھا۔ تمہارا نہ ملنا بہت غیر معمولی بات تھی کیونکہ میں تم کو بطورِ خاص ہدایت دے کر گیا تھا کہ میں فون کروں تو موجود رہنا۔ میں تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ شہلا تو سوئی پڑی تھی۔ میں نے فوزیہ سے کہا کہ مجھے دال میں کچھ کالا نظر آتا ہے، میں جا رہا ہوں۔ اس نے مجھے روکنے کی واجبی سی کوشش کی مگر میں نے کہا کہ اب تم ہو اور تمہارا شوہر ہے۔ تم دونوں گھر کا، شہلا کا اور ڈیڈی کا خیال رکھ سکتے ہو۔ ویسے بھی جب میں نہ امی کے انتقال کے وقت پہنچ سکا نہ تدفین کے وقت تو اب رُک کے کیا کروں گا۔ سچ بات یہ ہے سکندر کہ مجھے اس گھر میں ویرانی محسوس ہوتی تھی۔ اس کے ماحول سے وحشت ہوتی تھی۔ دیواریں کاٹنے کو دوڑتی تھیں اور ہر چیز مجھے ملامت کرتی نظر آتی تھی۔ میں بھاگ آیا۔ بارہ بجے فون کیا تھا۔ رات ایک بجے پھر امی کی قبر پر اجازت لینے گیا اور وہاں میں دل کھول کے رو دیا تو میری روح پر سے بارِ ندامت کچھ کم ہوا۔ نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگا جیسے امی نے مجھے معاف کر دیا ہے۔ انھوں نے مجھ سے کہا ہے کہ محسن! خدا نے میری مشکل آسان کر دی ہے۔ روتا کیوں ہے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔" میں نے سرد آہ بھر کے کہا۔ "ان کی زندگی کا عذاب بہت سخت تھا۔ خدا ان کو سکون دے اور ان کی روح کی مغفرت کرے۔ جب انکل شیروانی کو معلوم ہوگا تو کیا ہوگا؟"

"کچھ نہیں۔ اس صدمے کے لیے ذہنی طور پر تو ہم سب بہت پہلے سے تیار تھے۔" محسن نے کہا۔ "یہ ان کی ریٹائرمنٹ کا آخری سال ہے۔ ہو سکتا ہے وہ ایل پی آر لے لیں۔ چھ مہینے کی چھٹی مل جاتی ہے نا۔ اور شہلا کے ساتھ لاہور آ جائیں۔"

"وہ یہاں آئے تو انھیں بہت سی ایسی باتیں معلوم ہوں گی جو اب تک معلوم نہیں۔"

"لیکن وہ اسلام آباد میں نہیں رہ سکتے۔" محسن بولا۔ "ان کو سرکاری کوٹھی ملی ہوئی ہے جسے وہ زیادہ سے زیادہ چھ مہینے اپنے پاس رکھ سکتے ہیں۔ مگر مجھے یقین ہے وہ اس سے پہلے ہی وہاں سے نکلنے کی کوشش کریں گے۔ اس گھر میں ان کا اکیلے رہنا انتہائی مشکل ... میں وہاں ایک دن نہیں رہ سکا۔ اور تو کوئی جگہ نہیں ہے ... وہ جا سکیں۔"

"وہ فوزیہ کے ساتھ جا سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"جا تو سکتے ہیں لیکن جائیں گے نہیں۔" محسن بولا۔ "پرانے خیال کے آدمی ہیں نا۔ فوزیہ اور اس کا شوہر بھی یہ چاہتے تھے ... کا فیصل آباد والا گھر بہت بڑا ہے اور وہ اکیلے ہیں۔ ایک بزرگ ... گھر میں موجودگی کا سہارا بہت ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے ... سے مجبور ہو جائیں اور یہی کریں۔"

"میرا خیال ہے کہ اب تم نہا دھو لو تو ہم ناشتا کر ..." رابعہ نے کہا۔ "تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔"

"ہاں۔ میں بہت زیادہ تھکا ہوا ہوں۔" محسن نے اٹھ کر ... روم کا رُخ کیا۔ میں اور رابعہ وہیں بیٹھے اسے ہمدردی ... رہے۔

ناشتے کے بعد محسن نے میرے اور رابعہ کے منع کرنے کے باوجود ویلیم ٹین کی دو گولیاں کھائیں اور بے سُدھ ہو کر پڑ گیا۔ ہم نے اسے گزشتہ شب کی معرکہ آرائی کے بارے میں کچھ بتانے سے گریز کیا۔ میں نے رابعہ کو ساتھ لیا اور باہر نکل گیا۔ البرٹ وکٹر اسپتال فون کرنے سے ہمیں معلوم ہوا کہ نازلی اب ہوش میں ہے۔

"کیا ان کے بھائی موجود ہیں؟" میں نے کہا۔

"جی نہیں۔ وہ ڈیوٹی پر ہیں۔ ابھی ان کا بھی فون آیا تھا۔" نرس نے جواب دیا۔ "وہ شام کو آئیں گے۔"

"ان کے پاس کون ہے؟" میں نے محتاط لہجے میں پوچھا۔ "مس نازلی کے پاس؟"

"صرف ان کی والدہ۔" نرس نے کہا۔ "اور ایک کانسٹیبل جو کمرے کے باہر بیٹھا ہے۔"

میں نے رابعہ سے کہا کہ اس وقت نازلی کو دیکھنے کے لیے جانے میں کوئی ہرج نہیں مگر اس نے میرے خیال کی شدت سے مخالفت کی۔ "انکل اور شیخ کا اعتبار نہیں۔ ہو سکتا ہے انھوں نے سادہ کپڑوں میں پولیس وہاں متعین کر دی ہو۔ عملے میں پولیس افراد شامل ہوں۔"

"نرس کے جوابات سے شک تو مجھے بھی ہوتا ہے۔" میں نے ... کے کہا۔ "جتنا میں نے اس سے پوچھا تھا، نرس نے اس سے زیادہ ہی بتایا۔"

"اچھا تو تمہارے ہوٹل چلتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ نہ ہو ... پولیس کو فون کر دے کہ یہاں ایک پرنس مقیم تھیں جو بالکل ... کا زنانہ ایڈیشن تھیں۔ مار دھاڑ سے بھرپور۔ اپنے شوہر کو اغوا کرنے والوں سے چھڑانے کے لیے خنجرِ ابرو، تیرِ نظر اور شمشیرِ حُسن کے علاوہ ریوالور سے مسلح گئی تھیں مگر ابھی تک لوٹی نہیں ہیں۔"

"اور اگر اس نے پہلے ہی فون کر کے پولیس کو ساری کہانی سُنا دی ہو پھر؟"

"پھر کیا۔ پرنس غائب۔" میں نے کہا۔ "منیجر ثابت کرتا پھرے کہ اس نے نشے میں کوئی خواب نہیں دیکھا تھا۔ شام تک ہمیں ویسے بھی جگہ بدل لینی چاہیے۔ ہوٹل فاران میں اب تمہارا کیا ہے؟"

"میرا تو کچھ نہیں۔ اپنے کپڑوں کا سوٹ کیس اٹھا لائی تھی بلکہ اُٹھوا لائی تھی۔" رابعہ بولی۔ "محسن کے کپڑوں کا سوٹ کیس ہے۔"

"محسن میرے کپڑے پہن سکتا ہے۔ لیکن ہمارے وہ خصوصی ملبوسات اہم ہیں۔" میں نے کہا۔ "ایک پولیس افسر، ڈاکیے اور ڈرائیور کی وردی اور وہ فقیری لباس۔"

"وہ سب میرے سوٹ کیس میں ہیں۔" رابعہ نے کہا۔ "محسن کے سوٹ کیس میں جگہ نہیں تھی۔"

"ویری گڈ۔ پھر تو کوئی خاص ضرورت نہیں رہتی لوٹ کر جانے کی۔" میں نے کہا۔ "میں منیجر کو مطلع کر دیتا ہوں۔"

جی پی او کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے کار روکی اور فون کرنے کے لیے اندر چلا گیا۔ ہوٹل فاران کا نمبر مجھے ڈائریکٹری میں دیکھنا پڑا۔ اس کے بعد کوئی بوتھ خالی ہونے کا انتظار کرنا پڑا۔ تقریباً دس منٹ کے بعد مجھے ہوٹل فاران کے آپریٹر نے منیجر کی لائن دی۔

"منیجر صاحب، دیکھیے آپ کے ہوٹل میں ایک پرنس صوفیہ مقیم ہیں۔" میں نے کہا۔

"پرنس صوفیہ۔" منیجر چلّایا۔ "کہاں ہیں وہ خود؟ تم کون ہو؟ کون سی منحوس گھڑی تھی جب پرنس نے میرے ہوٹل میں قدم رکھا تھا۔ خدا معلوم وہ پرنس تھی کہ بہرام ڈاکو کی بیٹی۔"

"کیا ہوا منیجر صاحب؟" میں نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔

"ارے یہ پوچھو کیا نہیں ہوا؟" منیجر بولا۔ "اُلّو کا پٹھا ہوں، گدھا ہوں میں کہ اس کی بات مان لی تھی۔ عقل خبط کر دی تھی اس نے میری مسکرا کر۔ اسی وقت پولیس کو بلوا لیتا تو یہ مصیبت نہ آتی۔"

"کیسی مصیبت؟ آپ نے ابھی تک کچھ بھی نہیں بتایا ہے۔"

"ارے بھائی، کیا بتاؤں؟ دھماکا ہوا ان کے کمرے میں۔" فریاد کناں لہجے میں بولا۔ "آج ہی صبح۔"

"ان کا کمرہ تو بند تھا۔" میں نے کہا۔ "اور چابیاں آپ کے پاس تھیں۔"

"یہی تو مصیبت بن گئی میرے لیے۔" وہ بولا۔ "مگر تم یہ سب کیسے جانتے ہو؟"

میں نے باہر دیکھا۔ کاؤنٹر سے خاصے فاصلے پر کھڑا ہوا ایک شخص مجھے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ ٹیلی فون کرنے کے لیے باری کے انتظار میں نہیں تھا اور کسی کاؤنٹر سے ٹکٹ یا لفافہ بھی نہیں خرید رہا تھا۔

"میں پرنس کا پی اے ہوں۔" میں نے کہا اور دوبارہ اس شخص کی طرف دیکھا۔

"تو پی اے صاحب، خدا کے لیے میری جان چھڑاؤ۔" منیجر بولا۔ "یہاں تو پولیس نے دھاوا بول دیا ہے۔"

"دھماکا کس وقت ہوا اور کیسے؟" میں نے کہا۔ "آخر کوئی تو اندر گیا ہوگا۔"

"یہی تو غضب ہے کہ اندر کوئی نہیں گیا۔" منیجر بولا۔ "ساتھ والا کمرہ خالی تھا۔ ایک شریف صورت شخص نے لیا تھا۔ میں نے تو دیکھا بھی نہیں۔ ریزرویشن کلرک نے دیکھا تھا۔ میجر شریف کہتا تھا خود کو مگر وہ خبیث نہ میجر تھا نہ شریف۔ اس نے درمیان کی دیوار میں سوراخ کیا اور اندر بم پھینک دیا۔ دونوں کے باتھ روم ملتے ہیں نا۔ اس نے باتھ روم سے باتھ روم میں دستی بم اچھالا اور بھاگ نکلا۔ دھماکے سے افراتفری پھیلی تو وہ غائب ہو گیا۔"

میں نے پھر شیشے کے کیبن سے باہر جھانکا۔ وہ اجنبی بڑی مستقل مزاجی سے ہاتھ باندھے وہیں موجود تھا۔ مجھے اس کی صورت کچھ جانی پہچانی لگی۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ اس کا دوسرا مطلب یہ تھا کہ وہ یقیناً مجھے پہچان گیا ہوگا۔ میں نے اچانک ریسیور رکھا اور باہر نکل کے تیز تیز قدموں سے زینے کی طرف بڑھا۔ آدھا زینہ چڑھ کے میں نے پیچھے دیکھا تو وہ شخص میرے تعاقب میں آ رہا تھا۔ میں نے باقی زینہ طے کیا اور اوپر کی منزل کے مختلف راستوں، عملے کے افراد اور فائلوں کے بھرے کمرے سے گزرا اور دوسرے زینے سے نیچے اترا۔ اس وقت تک میں اپنے پیچھے آنے والے سے تقریباً پیچھا چھڑا چکا تھا۔ مجھے اس کی صورت ایک بار بھی نظر نہیں آئی تھی۔ لیکن دوسرے زینے سے دوسری راہداری میں اترتے ہی میری نظر اس پر پڑی۔ وہ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس نے پہلے سے اندازہ کر لیا تھا کہ میں کس راستے سے نکلنے کی کوشش کروں گا۔

میں نے باہر کا رُخ کیا تو وہ میری راہ میں حائل ہوا۔ میں نے اسے دھکا دیا اور باہر کی طرف دوڑا۔ مجھے یقین تھا کہ اس کے پھر اٹھنے تک میں رابعہ کے ساتھ کار میں بیٹھ کے نکل جاؤں گا۔ لیکن گاڑی وہاں نہیں تھی جہاں میں اسے چھوڑ گیا تھا۔ گاڑی آس پاس کہیں بھی نہ تھی۔

میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ رابعہ جسے میں انتظار کرنے کی تاکید کر گیا تھا اچانک کہاں غائب ہو گئی۔ میں تنہا ہوتا تو رکشا ٹیکسی جو بھی سامنے آتا اسی میں بیٹھ کے فرار ہو جاتا لیکن مجھے یہ احساس بھی تھا کہ رابعہ لوٹ کر آئی اور اس نے مجھے غیر حاضر پایا تو وہ مجھ سے بھی زیادہ تشویش کا شکار ہو گی اور اس کے دل میں ہزار اندیشے جنم لیں گے۔ دوسری طرف وہ اجنبی بدستور میرے تعاقب میں تھا جسے میں اب تک پہچان نہیں سکا تھا۔ وہ مجھ سے زیادہ چالاک ثابت ہوا تھا کہ جب میں جی پی او کی عمارت کے ایک زینے سے اوپر غائب ہو گیا تھا تو اس نے پہلے ہی اندازہ کر لیا تھا کہ میں اترنے کے لیے کون سا دوسرا زینہ استعمال کروں گا۔ میرے دھکیلنے سے وہ لڑکھڑا گیا تھا اور میں نے اس کے دیوار پر سر ٹکرانے کی آواز بھی سنی تھی لیکن دوسری بار پلٹ کر دیکھنے پر میں نے اسے سر سہلا کے اور جھٹک کے کھڑے ہوتے دیکھا تھا۔ مشکل سے آدھے منٹ کے وقفے سے وہ محرابی دروازے میں نمودار ہوا جو پوسٹ آفس کے برآمدے میں ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک بنے ہوئے تھے۔ میں اتنی دیر میں سیڑھیاں اتر کے گیٹ تک جا پہنچا تھا جہاں رابعہ کو کار سمیت موجود ہونا چاہیے تھا اور اگر ایسا ہی ہوتا تو یہی آدھے منٹ کا وقفہ مجھے کافی ہوتا۔ جتنی دیر میں وہ تعاقب کے لیے کوئی سواری دیکھتا ہم نکل جاتے اور گم ہو جاتے۔

میں نے ایک بار پھر پیچھے نظر ڈالی۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ کہیں وہ مفرور مجرم کو روکنے کے لیے ریوالور استعمال کرنے کا ارادہ تو نہیں رکھتا۔ وہ عام آدمی بھی ہو سکتا تھا جس نے مجھے دس ہزار کا چلتا پھرتا انعام سمجھ کے فیصلہ کیا ہو کہ یہ رقم اس کے بنک اکاؤنٹ میں جانی چاہیے۔ وہ پولیس یا خفیہ پولیس یا بے حد خفیہ پولیس کا آدمی بھی ہو سکتا تھا جن کو قانونی طور پر یہ اختیارات حاصل ہوتے ہیں کہ وہ قانون کی گرفت سے نکل بھاگنے والے مجرم کو شوٹ کر دیں۔ وہ آدمی جس کے عزائم اور قوتِ تسخیر کے سامنے کوئی رکاوٹ کوئی دیوار اور کوئی ہمالہ جیسا پہاڑ حائل نہ ہو سکے، جسے کوئی زنجیر بھی بے بس و پا گرفتہ نہ کر سکے اور جو خلا کی وسعتوں سے سمندروں کی عمیق تاریکی تک سب مقاماتِ آہ و فغاں سے خندہ زن گزرنے کا حوصلہ رکھتا ہو اسے کتنی آسانی سے ایک چھوٹی سی گولی شکست دے کر رکھ دیتی ہے۔ وہ گولی جو اس کے ہاتھ کی چھوٹی انگلی کے برابر بھی نہیں ہوتی وجود سے عدم کی مسافت کو ایک عمر سے ایک لمحہ بنا دیتی ہے۔

وہ شخص اب چلانے لگا تھا۔ "روکو۔ پکڑو کوئی اسے۔" لیکن پوسٹ آفس میں اپنے اپنے ضروری کام سے آنے جانے والے بیشتر لوگ فارغ نہیں تھے اور کچھ لوگ متوجہ تو ہوئے تھے مگر سمجھ نہ پائے تھے کہ وہ کیوں شور مچا رہا ہے اور کسے پکڑنے کی اپیل کر رہا ہے۔ میں فٹ پاتھ پر کھڑا تھا پھر پلک جھپکتے میں رواں دواں ٹریفک کے ریلے میں کود گیا۔ اور لہراتا بل کھاتا، گاڑیوں سے خود کو بچاتا اور کسی اچانک بریک لگانے والی گاڑی سے چھو کر نکلتا سڑک عبور کر گیا۔ نہ جانے کتنی گاڑیوں کے ڈرائیوروں نے مجھے کھڑکی سے سر نکال کے گالیاں دیں۔

"سالا خود تو مرتا ہمیں بھی مشکل میں ڈال جاتا۔"

"ابے مرنا ہے تو کسی ڈبل ڈیکر کے سامنے جا۔"

"پاگل کے بچے! اندھا ہے کیا؟"

مختلف آوازیں اٹھیں۔ میں نے دو گاڑیوں کے تصادم کی آواز بھی سنی۔ شیشہ ٹوٹنے کی اور لوہے سے لوہے کے رگڑنے اور ٹکرانے کی۔ غالباً کوئی پیچھے والی کار جس کے بریک بہت زیادہ قابلِ اعتماد نہ تھے اگلی گاڑی میں گھس گئی یا اگلی گاڑی کی بریک لائٹ کام نہیں کر رہی تھی کہ پیچھے والی کار کا ڈرائیور کچھ نہ کر سکا۔ اب دونوں ایک دوسرے کو قصوروار کہیں گے۔ اپنے اپنے نقصان کا اندازہ کریں گے اور بکتے جھکتے اپنی راہ لیں گے۔

سڑک عبور کرنے کے بعد میں نے پھر پیچھے دیکھا۔ وہ شخص اب شور تو نہیں مچا رہا تھا لیکن اس کے ارادے نہیں بدلے تھے۔ میری طرح اقدام خودکشی کرنے کے بجائے وہ مجھ پر نظر جمائے ٹریفک میں مناسب وقفے کا انتظار کر رہا تھا جس سے اس کی مستقل مزاجی اور ٹھنڈے دل کے ساتھ کام لینے کی صلاحیت کا اندازہ ہوتا تھا۔ میری بدقسمتی سے چند ہی سیکنڈ کے بعد ٹریفک کی لائن ٹوٹ گئی اور وہ گولی کی طرح میرے پیچھے آیا۔ میں اب سیدھا نیلا گنبد والے راستے کی طرف جا سکتا تھا مگر وہاں میں یقیناً پھنس جاتا۔ آگے انارکلی میں جانے والا راستہ بہت تنگ تھا اور وہاں دوڑ لگانا تو کیا بعض اوقات پیدل چلنا بھی مشکل ہوتا تھا۔ دائیں بائیں انارکلی بازار میں ریس ناممکن تھی۔ چنانچہ میں سیدھا لا ئٹ ہاؤس اور یونیورسٹی کے عقب والی سڑک پر دوڑ سکتا تھا مگر یہ بہت زیادہ رکاوٹوں والی ریس یقیناً تھا نہ انارکلی پر ختم ہوتی۔ چنانچہ میں نے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے ہوسٹل کا چکر لگا کے لوٹنا بہتر سمجھا۔ بہت سے لوگ اب ریس میں دلچسپی لے رہے تھے اور کچھ زیادہ جوشیلے عملی طور پر اس میں شریک ہونے کے خواہش مند نظر آتے تھے کیونکہ رائے عامہ مجھے جیب کترا قرار دے چکی تھی جو ہاتھ کی صفائی دکھا کے بھاگ گیا تھا اور شور مچاتا پیچھے دوڑنے والا شخص اس کے سوا کون ہو سکتا تھا جس کی جیب ہلکی ہو گئی تھی۔ مجھے اب پہلے جتنی مشق تو نہیں رہی تھی، اس کے باوجود میرا خیال تھا

کہ میں خاصا تیز دوڑ سکتا ہوں۔ گھوڑے کے علاوہ اگر کسی سواری کی مدد سے کوئی مجھے پکڑ سکتا ہے تو موٹر سائیکل کی مدد سے، لیکن اس شخص نے میرے خیال کو باطل کر دیا۔ وہ یقیناً ایتھلیٹ تھا یا رہ چکا تھا۔

جب اس کے اور میرے درمیان فاصلہ چند گز رہ گیا تو میں بک اسکوائر کی ایک گلی میں گھس کے کھڑا ہو گیا۔ جیسے ہی وہ شخص اندر آیا میں نے اسے دبوچ لیا اور کچھ کہے بغیر مارنا شروع کر دیا۔ میں نے کراٹے کے پیشہ وارانہ وار آزمانے سے گریز کیا اور مکے بھی اس شخص کی طرح چلائے جسے مار کٹائی کا تجربہ نہ ہو۔ ذرا سی دیر میں پندرہ بیس افراد اکٹھے ہو گئے۔ میرا حریف بھی کم نہ تھا اور اس نے میرے مکوں سے بچنے کے ساتھ ساتھ جارحانہ کارروائی بھی کی لیکن میں نے اپنا پورا دفاع کیا۔ جو مکے ہم نے ایک دوسرے کو مارے وہ قطعی بے ضرر رہے اور یہ جنگ دفاعی نوعیت کی رہی۔ نقصان اسے اپنی آواز کا ہوا جو مضحکہ خیز حد تک پتلی تھی اور اس کے بھاری بھرکم وجود سے ذرا میل نہیں کھاتی تھی۔ شور تو اس نے بھی مچایا مگر میں نے لاؤڈ اسپیکر کی طرح چلا چلا کے اس کی آواز کو دبا دیا۔

"او میں آج جانے نہیں دوں گا۔" میں نے گلا پھاڑ کے کہا۔ پھر میں نے اس کے شانے پر مکا مارا۔

"تو... تو کیسے... میں خود نہیں جانے دوں گا۔" وہ منمنایا اور اس نے ہاتھ گھمایا جو میرے سر کے اوپر سے گزر گیا۔

"ایک سال ہو گیا، آج کل کرتے۔ باپ کا مال سمجھ رکھا ہے؟" میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ہم نے ایک دوسرے کو جھنجھوڑنا ایک دوسرے کے بال نوچنا اور کپڑے پھاڑنا جاری رکھا۔ کچھ لوگوں نے بالآخر مداخلت کی۔

"اوئے میاں... اوئے بندے دے پتر بنو۔" ایک چھوٹے فروش صوفی نے ہمیں الگ کرنا چاہا۔ میں نے اس کے سر پر مکا مارا یوں جیسے اتفاق سے اس کا سر نشانہ بن گیا۔ صوفی نے زور سے "ہو" کہا اور پیچھے ہٹ گیا۔

"میں آج پیسے کے بغیر نہیں جانے دوں گا۔" میں نے کہا۔ "کپڑے اتروا لوں گا یہیں۔"

میرا حریف دم بخود رہ گیا۔ اس الزام نے اس کو اتنا حیران کیا کہ وہ لڑنا بھول گیا۔ "کون سے پیسے... بدمعاشی؟"

"یہ بدمعاشی تھی میری یا شرافت... وقت پر مدد نہ کی ہوتی تو اندر ہو جاتا۔" میں نے چیخ کر کہا۔ لوگ اب ہمارے درمیان حائل ہو گئے تھے اور دو معتبر قسم کے افراد نے ثالثی کے فرائض سنبھالتے ہوئے سوال شروع کر دیے تھے۔

"بات کیا ہے؟ زبان سے بات کرو یار۔ دونوں پڑھے لکھے لگتے ہو۔" ایک عینک والے بنک افسر قسم کے آدمی نے کہا۔

"بات کیا ہے۔" میرے حریف نے کہا۔ "جان بچا کے بھاگنا چاہتا ہے۔ سب کی آنکھوں میں دھول جھونک رہا ہے۔"

"جان بچا کے تو بھاگ رہا ہے۔ سال بھر ہو گیا، پورے دس ہزار لیے تھے اس نے۔ کہتا تھا بیوی کا زیور بیچنا پڑے گا۔" میں نے چلا کے کہا۔ "اب ملتا ہی نہیں، صورت نہیں دکھاتا۔ گھر جاؤ تو اندر سے..."

"جھوٹ بکتا ہے یہ۔" وہ چلایا۔ "میں نے اس کا کچھ نہیں دینا۔ میں تو اس کو تھانے لے جاؤں گا۔"

"تھانے تو میں لے جاؤں گا تجھے۔" میں نے دہاڑ کر اس کو اور کچھ نہیں کہنے دیا۔ "دس ہزار جیب کے کھا کے دس ہزار دے گا۔"

"یہ ایک مجرم ہے۔ قاتل اور مفرور۔" بالآخر میرے حریف نے چیخ کر کہا۔

"کیا؟ مجھے دنیا جانتی ہے میں ڈاکٹر ہوں۔" میں نے پھر اسے پکڑنے کی کوشش کی۔

"ارے بھائی جب دونوں ہی تھانے جانا چاہتے ہو تو جاؤ۔" کسی نے نیم سنجیدہ لہجے میں کہا لیکن میں نے یکلخت ثالث کو انگریزی میں مخاطب کیا اور کہا کہ میرا نام ڈاکٹر امجد ہے اور میں لاہور ہوٹل میں مقیم ہوں۔

"یہ سکندر بخت ہے، میں جانتا ہوں اسے۔" میرے حریف نے کہا۔ "پولیس نے اس کی گرفتاری پر دس ہزار روپے انعام رکھا ہے۔ اسے تھانے لے چلو سب معلوم ہو جائے گا۔"

"ہاں ہاں۔ تھانے چلو۔" میں نے اطمینان سے کہا۔ "روکو کسی ٹیکسی کو۔" لیکن میرا اطمینان ریت کی دیوار ثابت ہوا۔ اچانک دو افراد کو یاد آ گیا کہ میری صورت انہیں دیکھی بھالی کیوں لگتی ہے۔ وہ دونوں میرے دائیں بائیں ہو گئے۔

"یہ ٹھیک کہتا ہے۔" ایک نے میرے حریف کی طرف اشارہ کیا۔ دوسرے نے تائید میں سر ہلایا۔ مجھے اسی بات کا ڈر تھا۔ کیونکہ پرانی ہو جانے کے باوجود میری اخبار میں شائع ہونے والی تصویر اتنی پرانی نہیں ہوئی تھی کہ کسی کے ذہن میں اس کا دھندلا سا نقش بھی نہ ہوتا۔ ایک ٹیکسی کے فوراً نمودار ہونے سے میری مشکل کچھ آسان ہوئی ورنہ کچھ بعید نہ تھا کہ اس مجمع سے مجھے پہچاننے والے اور بھی نکل آتے اور وہ مجھے باعزت طریقے پر لے جانے کے بجائے مارتے ہوئے اور گھسیٹتے ہوئے تھانے کی طرف لے جاتے۔

"چلو اب رک کیوں گئے؟" میں نے بلاوجہ اپنے مخالفین کو ڈانٹا۔ انگریزی میں بات کی اور پہلے ٹیکسی کی طرف بڑھا۔

"ہاں ہاں، چلو۔ رُکا کون ہے؟ میرے حریف نے کہا اور وہ بھی ٹیکسی کی طرف بڑھے۔

لیکن ذرا سی پیش قدمی کے باعث میں اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔ انہیں میری چالاکی پر شبہ نہیں ہوا کہ اس طرح دوسرے دروازے کے ساتھ میں بیٹھ گیا ہوں۔ اور وہ مجھے دونوں طرف سے نرغے میں لے کر نہیں بیٹھے۔ اس غلطی کا احساس کسی کو ہوا بھی تو دیر سے۔ جب پوزیشن بدلنے کا وقت گزر چکا تھا۔ درمیان میں میری جگہ وہ شخص آ گیا جس نے میرے حریف کی سب سے پہلے حمایت کی تھی۔ آگے والی سیٹ پر وہ بنک منیجر ٹائپ عینک پوش تھا جس کی ظاہری ہمدردیاں میرے ساتھ تھیں اور جو ابھی تک پوری طرح قائل نہیں ہوا تھا کہ اتنی رواں اور شائستہ انگریزی میں بات کرنے والا ڈاکٹر امجد نہیں کوئی مفرور و مطلوب ملزم ہے۔ اسے شک تھا کہ معاملہ غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ میرے ساتھ بیٹھا ہوا دشمن نمبر دو ایک بانکا سا نوجوان تھا جس کو اپنا ہیئر اسٹائل بار بار درست کرنے کی عادت تھی اور اپنی پتلون کی کریز کی بہت فکر تھی۔ چنانچہ اس سے مجھے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا تھا۔ اصل خطرہ دشمن نمبر ایک سے تھا جو دوسرے پچھلے دروازے سے لگا بیٹھا تھا۔ مگر بار بار گردن بڑھا کے مجھے خونخوار نظروں سے گھورتا تھا۔ اس کو یہ فکر لاحق تھی کہ میں دروازہ کھول کے کود گیا تو وہ کیا کرے گا؟ اس کا یہ اندیشہ برحق تھا۔

میں نے آدھا مسئلہ حل کر لیا تھا۔ ایک غضبناک ہجوم کی جگہ اب میرے ساتھ صرف تین افراد تھے۔ ٹیکسی والا غیر جانبدار تھا۔ چنانچہ طاقت کا توازن برابر تھا۔ طے مجھے یہ کرنا تھا کہ میں کون سا راستہ اختیار کروں۔ دروازہ کھول کے چھلانگ لگاؤں اور بھاگ جاؤں۔ اس میں میری ٹانگ ٹوٹنے یا موچ سے پاؤں کے قابل استعمال نہ رہنے کے امکانات برابر تھے۔ اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ میں بقول شاعر۔ اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے۔ وہ پھر مجھے پکڑ لیں اور زیادہ سخت حفاظتی انتظامات کے ساتھ تھانے پہنچائیں۔ دوسری صورت یہ تھی کہ میں دشمن اور اُس کے حامی کو اندر ہی ناک آؤٹ کر دوں۔ پھر عینک پوش سے درخواست کروں کہ وہ اُتر کر واپس جائے اور کسی سے اس واقعے کا ذکر نہ کرے۔ سمجھ لے کہ کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ رہ گیا ٹیکسی والا تو اسے پچاس کا نوٹ یا ریوالور دکھا کے چلتے رہنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ تیسرا اور آخری طریقہ جو میری کامیابی کا سو فیصد ضامن ہو سکتا تھا یہ تھا کہ میں ریوالور نکال لوں اور ٹیکسی ڈرائیور کے علاوہ باقی سب کو کسی ایسی جگہ اتار دوں جہاں سے واپس جانے کے سوا ان کے پاس چارہ نہ ہو۔ وہ اب لاہور ہوٹل کی طرف جا رہے تھے جو کوئی اچھی بات نہیں تھی۔ یہ تو ثابت ہو جاتا کہ میں ڈاکٹر امجد ہوں مگر اس کے بعد ڈاکٹر امجد کا لاہور ہوٹل میں رہنا مشکل ہو جاتا۔ اور لوگوں کو میرے ساتھ دیکھ کر لاہور ہوٹل والے تصدیق و تفتیش کے خبط میں مبتلا ہو جاتے اور میں نکل بھی نہ پاتا۔

تاہم یہ غنیمت تھا کہ انھوں نے براہ راست تھانہ پرانی انارکلی جانے کا ارادہ بدل دیا تھا۔ یہ سب میرے حامی عینک پوش کی کوشش کا نتیجہ تھا جس نے تھانے سے گریز کی خاطر تجویز پیش کی تھی کہ پہلے اس بھلے مانس کی بات بھی سُن لو اور دیکھ لو کہ لاہور ہوٹل والے اسے ڈاکٹر امجد کی حیثیت سے پہچانتے ہیں یا نہیں۔ سوائے میرے حقیقی دشمن کے سب ہی تھانے کی کارروائی سے بچنا چاہتے تھے اور ان کے خیال میں یہ شبہ دور کرنے کا سب سے آسان طریقہ تھا۔ میری بات سچ ثابت ہو جائے تو میں اور فریق ثانی جانے۔ وہ اپنے اپنے راستے جائیں ورنہ دس ہزار کا انعام لینے والوں میں شامل ہو جائیں۔ غضب مجھے رابعہ پر تھا جو مجھے کچھ بتائے بغیر نہ جانے کدھر نکل گئی تھی۔ وہ وہیں مل جاتی جہاں میں نے اُسے چھوڑا تھا تو یہ سب چکر پڑتا ہی کیوں۔

اب مشکل یہ تھی کہ راستہ کہیں بھی غیر آباد نہیں تھا۔ میں خود اترتا تب بھی پکڑا جاتا اور انھیں اتارتا تو وہ فوراً کسی دوسری کار یا ٹیکسی میں تعاقب شروع کر دیتے۔ دشمن نمبر ایک میری دسترس سے کچھ دور تھا۔ درمیان میں وہ ہیرو ٹن ٹائپ ہیرو بیٹھا تھا۔ پہلے اسے اٹھا غفیل کرتا تو اصل دشمن فوراً ہوشیار ہو جاتا۔ اور ٹیکسی کے اندر کی محدود جگہ میں حرکت پذیری کی گنجائش بہت کم تھی۔ میں اتنی آزادی اور پھرتی سے ہاتھوں اور پیروں کا استعمال نہیں کر سکتا تھا جیسے کھلے میدان میں۔ با دلِ ناخواستہ میں نے ریوالور نکالا۔ اتنے اطمینان کے ساتھ جیسے جیب سے سگریٹ نکال کے سُلگانا چاہتا ہوں۔ سب سے پہلے درمیان میں نزاکت سے بیٹھے ہوئے شہزادہ گلفام نے ریوالور دیکھا۔ یہ آلہ اس نے اَن گنت فلموں میں دیکھا ہو گا اور جب کسی ہیرو نے ڈرا ڈیلکشنو کے لیتے لگائے ہوں گے تو وہ بھی تالیاں بجانے والوں میں شامل رہا ہو گا لیکن اصلی ریوالور کے نظارے نے اس کے حواس گم کر دیے۔ اس نے منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے بائیں ہاتھ کی کہنی اس کے منہ پر ماری۔ کہنی اس کی ناک پر لگی اور ضرب میری خواہش کے مقابلے میں زیادہ شدید ہو گئی کہ اس کا اوپر والا ہونٹ بھی کٹ گیا اور ایک دانت بھی ہل گیا۔ اس کا سر پیچھے جا لگا۔

"بس... ایسے ہی بیٹھے رہو" میں نے اس کو کہنی سے دبا کے ریوالور کا رُخ دشمن کی طرف کر دیا۔

میں بلا سبب قتل نہیں کرتا لیکن اپنی جان کی حفاظت کے لیے دس قتل بھی کرنے پڑیں تو کر سکتا ہوں" میں نے کہا۔ میرے حامی نے پلٹ کر دیکھا اور اس کی آواز حلق میں پھنس گئی ٹیکسی ڈرائیور نے شیشے میں پیچھے کا منظر دیکھا۔

"ٹیکسی کو ملتان روڈ پر لے چلو" میں نے سکون سے کہا۔ "تمہیں پتہ نہیں ہو گا"

ٹیکسی ڈرائیور نے فقط اقرار میں آہستہ سے سر ہلایا اور ٹیکسی موڑ لیا۔ "آپ کی بڑی مہربانی ہو گی جناب" وہ بولا۔

"لیکن ڈاکٹر صاحب... میرا مطلب ہے آپ جو بھی ہیں..." میرے حامی عینک پوش نے کہا "دیکھیے میں آفس سے اٹھ کر آیا تھا... اور میں نے مخالفت تو نہیں کی تھی آپ کی...."

"آپ نے ڈیوٹی کے وقت میں سیٹ چھوڑ کے بہت غلطی کی" میں نے کہا۔ "اگر آپ پرائے پھڈے میں ٹانگ اڑانے کے بجائے لنچ کے بعد واپس کام کے لیے حاضر ہو جاتے تو آپ کو کوئی پریشانی نہ ہوتی۔ اب ایک طرف آپ فرائض سے غفلت برتنے کے مرتکب ہوئے، دوسری طرف..."

میرے دشمن نے یکلخت حرکت کی اور مجھے غافل سمجھ کے ریوالور چھیننا چاہا۔ میں نے ہاتھ کو الٹا گھمایا اور ریوالور سمیت پوری قوت سے اس کی پیشانی پر ضرب لگائی۔ وہ کراہ کے پیچھے گرا میرے حمایتی کا رنگ لاش کی طرح سفید ہو گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے با آواز بلند درود شریف پڑھنا شروع کیا لیکن اسٹیئرنگ پر اپنی گرفت مضبوط رکھی اور سڑک پر بالکل ناک کی سیدھ میں دیکھتا رہا۔ وہ شریف آدمی مصیبت سے نجات کے لیے خدا سے دعا ہی مانگ سکتا تھا۔

"میں اس ریوالور کے بغیر بھی تمہاری گردن کا منکا توڑ سکتا ہوں" میں نے لہجے کو خطرناک بنا کے خونخوار لہجے میں کہا۔ "اس لیے پھر بہادر مت بننا" ضرب اتنی کاری تھی کہ اس کا سر گھوم گیا تھا اور غالباً وہ مجھے صاف دیکھ بھی نہیں پا رہا تھا۔ پیچھے پڑے ہوئے دوسرے شخص کی ناک سے اور منہ سے خون بہہ رہا تھا جسے وہ رومال سامنے رکھ کر جذب کر رہا تھا۔ تکلیف کے آثار اس کی صورت سے عیاں تھے اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔

"تو تم ڈاکٹر امجد نہیں ہو" میرے حمایتی نے افسوسناک انداز میں سر ہلایا۔

"ڈاکٹر امجد؟" میں نے فلمی ولن والا قہقہہ مارا۔ "وہ کون ہوتا ہے؟ میرا کیا تھا۔ کسی بھی ہوٹل کا نام لے کر کہہ دیتا کہ میں وہاں ٹھہرا ہوں۔ تم مان لیتے کیونکہ تم احمق تھے"۔ عینک والے نے اقرار میں سر ہلایا۔ اس میں اختلاف کی ہمت نہ رہی تھی۔ اب میں اس حد تک محفوظ تھا کہ بعد میں کوئی بھی فوراً لاہور ہوٹل جا کے کسی ڈاکٹر امجد کو تلاش کرتا تو خود کو گدھا سمجھتا۔ میں نے اپنے سچ کو جھوٹ تسلیم کر لیا تھا اور انھوں نے مان لیا تھا کہ یہ جھوٹ ہے۔

ملتان روڈ پر بھی ٹیکسی سیدھی چلتی گئی۔ پھر ڈرائیور نے کہا۔

"مجھے پٹرول لینا ہے"

"اچھا۔ تو تم گاڑی روکو اور جا کے پٹرول لو" میں نے کہا۔

"میں ٹیکسی لے جاتا ہوں۔ اس کے فیول میٹر کے مطابق ٹینک آدھا بھرا ہوا ہے" اپنی فضول سی کوشش پر ٹیکسی ڈرائیور یقیناً بہت نادم ہوا ہو گا۔ کیونکہ میں نے بیک ویو مرر میں دیکھا تو اس کی صورت رونے والی ہو رہی تھی۔ آبادی ختم ہو گئی تو میں نے ٹیکسی کو ایک پتلی سی سڑک پر موڑنے کا حکم دیا۔ جو دائیں طرف کسی نئی آبادی سے گزرتی تھی۔ آبادی کا نقشہ مکانوں کے رنگین ڈیزائن اور پرکشش تفصیلات کے ساتھ ایک بہت بڑے بورڈ پر موجود تھا۔ لیکن وہ آبادی ہنوز معماروں کی خیالی دنیا اور فائلوں میں بسی تھی۔ زمین پر اس کی بنیادیں تک نہیں کھودی گئی تھیں۔ مجھے ایسے بہت سے سائن بورڈ ملے جن پر مستقبل کی کسی حسین ترین، پُر آسائش اور بارونق آبادی کا مژدہ سنایا گیا تھا لیکن مجھے ہر طرف زمین اپنی قدرتی حالت میں نظر آ رہی تھی۔

موڑ کاٹنے کے بعد ٹھیک تیسرے میل پر میں نے ٹیکسی رُکوا لی۔ "اب آپ اتر جائیں" میں نے عینک والے سے کہا۔ "یہاں سے تین میل پیدل جانے میں آپ کو آدھا گھنٹہ لگے گا۔۔ آپ کو اتنا چلنے کی عادت تو نہیں ہو گی لیکن آج کے بعد آپ کی ایک عادت چھوٹ جائے گی، دخل در معقولات کی۔ پیچھے پلٹ کر مت دیکھنا"

"آدمی تم پڑھے لکھے ہو۔ اور مجھے یقین آنے لگا ہے کہ ڈاکٹر امجد ہی ہو"

"تھینک یو۔ آپ مجھے ڈاکٹر کرسچن برنارڈ سمجھ لیں" میں نے تشویش کی علامات ظاہر کیے بغیر کہا۔ "اس نے بھی ایک انسانی دل بدلا تھا اور میں نے بھی آپ کا دل اس حد تک ضرور بدلا ہے کہ آئندہ آپ صدقِ دل سے وہی کام کریں گے جس کی آپ کو تنخواہ ملتی ہے"۔ جب وہ چل پڑا تو میں نے دشمن نمبر دو کو آگے تشریف رکھنے کیلیے کہا۔ عینک پوش نے واقعی پلٹ کر نہیں دیکھا۔

"تم یقیناً یہ پسند نہیں کرو گے کہ میں تمہاری لاش اسی جگہ چھوڑ کر چلا جاؤں" میں نے کہا۔ "اس لیے کسی چیز کا غلط استعمال مت کرنا۔ نہ ہاتھوں کا، نہ عقل کا اور نہ ٹانگوں کا۔ تم گولی کی رفتار سے زیادہ تیز بھاگ سکتے ہو تو اور بات ہے"

چھٹے میل پر میں نے بانکے چھبیلے نوجوان کو اتار دیا۔ جسے اردو میں ٹانگ اڑانا کہتے ہیں اسے انگریزی میں ناک اڑانا کہتے ہیں۔ امید

ہے آئندہ تم کسی کے مسئلے کو اپنی ناک کا مسئلہ نہیں بناؤ گے۔ اچھی خاصی ناک ہے تمھاری۔ ابھی تو جُڑ جائے گی لیکن کٹ گئی تو بُرا ہوگا۔ دانت نقلی لگ جاتے ہیں لیکن ناک نہیں لگتی۔ پیچھے پلٹ کے مت دیکھنا۔"

"دائیں طرف ایک میل جا کے گاڑی کو پھر دائیں طرف موڑ لینا۔" میں نے کہا۔ ڈرائیور نے پلٹ کر دیکھا۔

"دائیں طرف؟ ادھر کون سی سڑک ہے جی؟" اس نے نقشِ فریادی بن کے کہا۔

"مجھے بھی کوئی سڑک نظر نہیں آرہی ہے۔" میں نے اس سے اتفاق کیا۔ "پھر بھی گاڑی موڑ لو۔" ٹیکسی ڈرائیور نے طوعاً کرہاً تعمیل کی اور پرانی ٹیکسی ہموار لیکن کچے میدان میں دوڑنے لگی تو اس کا جوڑ جوڑ صدا دینے لگا۔ اندر جھٹکوں سے خود مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں کنکریٹ مکسر میں سفر کر رہا ہوں۔ جھاڑیوں اور درختوں سے بچتا، خاروخس اور نوکیلے پتھروں سے گریز کرتا اور چھوٹے گڑھوں سے کتراتا ٹیکسی ڈرائیور میرے احکامات کے انتظار میں پُرامید نظروں سے اس شیشے میں سے دیکھتا رہا جس میں اب صرف میرا چہرہ ہی قابلِ دید رہ گیا تھا۔ چار میل سفر کرنے کے بعد میں نے ٹیکسی روک لی اور دشمن کو نیچے اُترنے کا اشارہ کیا۔ اس کا رنگ خوف سے پیلا پڑ گیا تھا اور وہ باہر نکلا تو اس کی حالت مُردوں سے بدتر ہو رہی تھی۔ اُسے یقین تھا کہ باقی دو کو میں نے رحم کھا کے چھوڑ دیا ہے لیکن اُس کے ساتھ کوئی رعایت نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے جو میری ساری پریشانی کا ذمہ دار تھا۔ "تم... تم مجھے یہاں قتل کرنے کے لیے لائے ہو؟" وہ تختۂ دار پر کھڑے ہوئے شخص کی طرح لرزنے لگا۔

"ہاں۔" میں نے کہا۔ "اتنے قتل پہلے کیے ہیں، ایک اور سہی۔ وہ سب بھی مجبوری کے تحت کرنے پڑے تھے۔"

"خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔ مجھے لالچ نے اندھا کر دیا تھا۔" وہ ہاتھ جوڑ کے بے ربط الفاظ میں بولا۔ "مجھے... میری جان بخش دو۔"

"تم میرے عوض دس ہزار روپے لیتے تو کیا کرتے...؟ جب کسی نامی گرامی اشتہاری مجرم کی گرفتاری کا انعام ملتا ہے تو اس سے دشمنی کا تحفہ ساتھ آتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اتنا بڑا بدمعاش اکیلا نہیں ہوتا۔ اس کے بڑے مضبوط سہارے ہوتے ہیں جو اس کے اَن گنت ہاتھوں کی طرح ہر طرف پھیلے ہوئے ملتے ہیں۔ ان کی دسترس سے باہر کچھ نہیں ہوتا۔ وہ جسے چاہتے ہیں پکڑ لیتے ہیں اور جسے چاہتے ہیں چھڑا لاتے ہیں۔ میں تمھیں گولی

مار دینے کے بعد یہاں چھوڑ جاؤں تو تمھاری لاش گدھ یا پھر گیدڑ اور بھیڑیے کھا جائیں گے۔ یہ ٹیکسی ڈرائیور خوا... مگر یہ گواہی کے چکر میں پڑنے والا آدمی نہیں ہے۔ ... جانے کے بعد سب کچھ بھول جائے گا۔ کیوں بھئی! اگر... کہاں رہے تو کیا کہو گے؟"

"میں... میں... جو آپ چاہیں گے۔ یہی کہ..." وہ حواس باختہ لہجے میں بولا۔

"ہاں۔ تم ملتان روڈ کی طرف تو گئے بھی نہیں، ... موچی بھائی اور شاہ عالمی تک آتے جاتے رہے۔"

"لیکن... سر جی... وہ دو... انھوں نے ..." وہ بولا۔

"نہیں۔ ان کو میں نے اسی لیے پلٹ کر نہ دیکھنے ... تھی۔" میں نے کہا۔ اور پھر اس شخص کی طرف متوجہ ہوگیا۔ "تم کون ہو! پولیس کے آدمی۔ یا خفیہ پولیس کے ..." میں نے کہا۔

"کچھ بھی نہیں۔" وہ بولا۔ "میرا ارادہ تمھیں پولیس کے ... لے جانے کا نہیں تھا۔ میں تمھیں اپنے ساتھ لے جاتا۔"

"کہاں؟ اپنی سسرال؟" میں نے اس کی بات ...

اس نے جیب سے ایک شیشی نکالی۔ "اس کی مہ... کر کے۔ یہ کلوروفارم ہے۔"

میں نے ہاتھ آگے بڑھا کے شیشی لے لی۔ اس کو ... سونگھنے کا خطرہ مول لینا مشکل تھا۔ میں نے اسے جیب میں ... میں بعد میں تصدیق کر لوں گا کہ اس میں کیا ہے، عرق گلاب ... تم مجھے بیہوش کیسے کرتے؟ آخر تم نے یہ کیسے فرض کر ... کام بہت آسان ہے؟ معاملہ الٹا بھی ہو سکتا تھا۔ یہی کو... اگر میں تم کو سُنگھا دیتا تو وہی گھوڑے والا کیس ہو جاتا جسے ... نلکی میں دوا ڈال کر پلانی چاہی تھی مگر مالک کے بجائے ... پہلے پھونک مار دی۔ دوسری بات یہ بتاؤ کہ کیا تم کو ... شیشی اسی طرح جیب میں لیے پھرتے ہو؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا اور میں نے اس کے ... ماری، وہ نیچے گر پڑا اور بُری طرح چلانے لگا۔

"کوئی اُلو کا پٹھا جیب میں کلوروفارم اس لیے ... پھرتا کہ اسے کوئی مفرور اشتہاری مجرم مل جائے گا تو وہ ... قابو کر لے گا۔" میں نے کہا۔ "کیا تمھارے فرشتوں نے خبر ... فلاں دن فلاں وقت پر اور فلاں جگہ تم کو سکندر بخت ... تم مجھے اگر پولیس کے پاس نہ لے جاتے تو کہاں لے ... مت بولنا ورنہ قتل کرنے سے پہلے ہڈیاں توڑ دوں ...

میں تم کو گھر لے جاتا۔ میرا ارادہ یہی تھا۔ میرا ایک جاننے والا ... کا مخبر ہے۔ وہ مجھے دس ہزار کے آدھے دے کر تم کو لے جاتا۔ خود کبھی تھانے نہ جاتا۔" وہ ہانپتے ہوئے بولا۔ "ہر تھانیدار میرا جانی ... ہے۔"

میں نے پے در پے اُس کے مکے مارے اور اس کو دوبارہ اوپر ... کے زمین پر پٹخا۔ وہ نیم جاں ہوگیا۔

"تم کون ہو آخر؟" میں نے کہا۔ "نہ مخبر ہو نہ پولیس کے آدمی۔ یہ ... کلوروفارم کیوں لیے پھرتے ہو؟ بچوں کو اغوا کرتے ہو؟"

اس نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا۔ میں نے اس کو ٹھوکریں ... کے زخمی کر دیا۔ "بچوں کو بیہوش کر کے کہاں لے جاتے ہو؟ خرکاروں ... ہاتھ بیچ دیتے ہو؟ یا والدین سے رقم وصول کر کے ان کی زندگی کا ... کرتے ہو! میرا خیال ہے تم اب بھی جھوٹ بول رہے ہو۔ اب ... کس کس کے بچے اٹھائے ہیں اور کہاں سے؟ ان کے یا والدین ... نام اور پتے بتاؤ۔ اگر جھوٹ ہوگا تو مجھے معلوم ہو جائے گا۔" میں نے ... اور جیب میں رکھ لیا۔ اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

وہ بزدل آدمی تھا اور اس میں مار کھانے کا بالکل حوصلہ نہیں ... اگر وہ جنگل نہ ہوتا تو اس کی چیخ پکار سے سارا محلّہ جمع ہو جاتا۔ ... کے اعترافات کے بعد ٹیکسی ڈرائیور ہکا بکا کھڑا تھا۔ اب تک اس ... یال تھا کہ مجرم میں ہوں۔ اب اچانک اس پر انکشاف ہوا تھا کہ ... نفس کتنے مذموم جرائم کا مرتکب ہو چکا ہے جسے میں اغوا کر کے ... سے اتنی دُور لایا تھا۔

"یہ تو بڑا..... ہے جی۔" ٹیکسی ڈرائیور نے نفرت اور ... ارت سے کہا۔ "ادئے بچے اُٹھاتا ہے خنزیر؟ آپ اس کو پولیس ... حوالے کر دیں جی۔"

"پولیس؟" میں نے طنز سے کہا۔ "وہ تو ایسے مجرموں کی معاون ... ان کے کاروبار میں برابر کی شریک ہے۔ وہاں سے یہ جوتے کھا کے ... رشوت کھلا کے چھوٹ جائے گا۔ یہاں سے بچ کر کیسے جائے گا۔ ... اسی وقت فیصلہ کرتا ہوں۔" میں نے چٹکی بجائی اور اس شخص کو ... ٹھوکروں پر کھڑا کر دیا۔ اُس کا رُخ پلٹ کے میں نے تلاشی لینے کے ... اس کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اس نے مزاحمت کی اور میں نے اس ... چہرے کا حلیہ بگاڑ دیا۔ وہ بلبلاتا رہا۔ "ہائے ہائے مر گیا۔ ہائے ... گیا میں۔" اس کی جیب میں سے بائیس ہزار روپے کی رقم برآمد ... ہزار کی دو گڈیاں تھیں۔ ہر گڈی میں سو کے سو نوٹ ... اور گڈی پر بنک کی مہر تھی۔ میں نے مہر دیکھی تو بنک اسکواڈ کے ... بنک کا نام صاف پڑھا جاتا تھا۔ باقی رقم کے نوٹ الگ ... ستے۔ ... نے نوٹ زمین پر یوں پھینک دیے جیسے وہ میرے ... بے مصرف کاغذ کے ٹکڑے ہیں یا کوئی بہت غلیظ چیز۔ ٹیکسی

ڈرائیور مزید متاثر ہوا۔ اس کے خیال میں وہ شخص بدترین سزا کا مستحق تھا اور میں اس کے ساتھ بہت مناسب سلوک کر رہا تھا۔ کاغذات میں ایک کسی ڈاکٹر کا نسخہ تھا، ایک اسکول فیس کی رسید جس پر کسی بچی کا نام تھا۔ بچی چوتھی جماعت کی طالبہ تھی اور رسید پر آج کی تاریخ تھی۔ دونوں دستاویزات کارآمد تھیں لیکن تیسری چیز ایک ڈرائیونگ لائسنس تھا جس پر اسی شخص کی تصویر تھی۔

"یہ تمھاری بچی ہے نا؟" میں نے رسید لہرا کے کہا۔ "فرض کرو، میں تمھیں اسی جگہ درخت سے باندھ جاؤں اور کل صبح اسے اٹھا لاؤں۔ اس وقت جب وہ اسکول جانے کے لیے گھر سے نکلے۔"

وہ دہاڑیں مار مار کے رونے لگا۔ "او بدمعاش! تو نے بھی تو ایسے ہی دوسروں کے گھر برباد کیے تھے۔" ٹیکسی ڈرائیور نے فرطِ جذبات میں اس کے ایک تھپڑ مار دیا اور اس کارِ خیر میں شریک ہونے کا ثواب حاصل کیا۔

"یہ بکواس کرتا ہے۔" میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو صبر کی تلقین کرتے ہوئے کہا۔ "ابھی اس نے سچ نہیں بتایا۔ جن کے اپنے بچے اسکول میں پڑھتے ہوں وہ کسی کے بچے نہیں اٹھاتے۔ یہ بیس ہزار کہاں سے ملے؟"

تھوڑی سی مار کھا کے اس نے اعتراف کر لیا کہ وہ جھوٹ بول رہا تھا اور اس نے کبھی کسی کا بچہ نہیں اٹھایا۔ ٹیکسی ڈرائیور کی عقل خبط ہوگئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ سچ کیا سمجھے اور جھوٹ کیا۔ حقیقت تو گرگٹ کی طرح رنگ بدل لیتی تھی۔ پہلے تو اس نے مجھے مجرم سمجھا تھا جسے شریف لوگ تھانے لے جا رہے تھے کہ میں نے ریوالور کی مدد سے سب کو ہائی جیک کر لیا۔ پھر اس پر یہ عقدہ کھلا کہ بدمعاش تو وہ تھے جن کو میں پکڑ لایا تھا اور جو سب سے بڑا بدمعاش تھا وہ کبھی ایک جرم کا اعتراف کرتا تھا تو کبھی دوسرے کا۔ میری حیثیت کا تعین وہ ابھی تک نہیں کر سکا تھا کہ میں پولیس کا آدمی ہوں تو اس کارروائی کا کیا جواز ہے۔ اصولاً مجھے یا تو مجرم کو برائے تفتیش تھانے لے جانا چاہیے تھا یا اب تک سودے کی بات کر کے رخصت کر دینا چاہیے تھا مگر میں نے تو اچھی خاصی رقم کو بھی پھینک دیا تھا اور اگر میں واقعی مجرم ہوں تو دوسرے مجرم کو سزا کیوں دینا چاہتا ہوں۔ جو کچھ میں اس کے سامنے کر رہا تھا وہ بہرحال جرم نہیں تھا۔ اگر میں ایسے مجرم کو زندہ گاڑ دیتا تب بھی وہ یہی سمجھتا کہ میں نے انصاف کیا ہے۔

"میرا خیال ہے کہ تم نے یہ بیس ہزار روپے کسی بنک سے نکلنے والے سے چھینے ہیں؟" میں نے کہا۔

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ وہ اب سیدھا کھڑا نہیں رہ سکتا تھا چنانچہ فرشِ خاک پر گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا تھا۔

"کیسے؟ جیب کاٹنے والے کلوروفارم کی شیشی نہیں استعمال

کرتے۔" میں نے کہا۔ وہ کچھ بتانے پر آسانی سے تیار نہ ہوتا تھا اور بظاہر اس کی حالت اتنی خراب ہو چکی تھی کہ اس پر مزید تشدد جان لیوا ثابت ہو سکتا تھا۔ مگر وہ الیہ اداکاری کی دردناک آوازیں نکالنے کا اور عالمِ نزع طاری کرنے کا ماہر تھا۔ بعد میں اس کی قوتِ برداشت کہیں زیادہ ثابت ہوئی۔ میں نے اسے کچھ اور بجایا تو اس نے حقیقت اُگل دی۔ وہ بنک سے نکلنے والوں کو لوٹتا تھا۔ اس کے لیے وہ بنک اسکوائر کے مختلف بنکوں میں گھومتا رہتا تھا۔ کہیں نہ کہیں اسے کسی دفتر کا کیشیئر یا کوئی شریف بزنس مین مل جاتا تھا جو معقول رقم لے کر نکلتا تھا اور رکشا ٹیکسی یا اپنی سواری لے کر جانے کے بجائے پیدل روانہ ہو جاتا تھا۔ اس اعتماد کے ساتھ کہ دن دہاڑے بھرے بازار میں اسے کون لوٹ سکتا ہے۔ وہ بیگ یا بریف کیس کو مضبوطی سے پکڑے رکھتے تھے اور اطمینان سے چلے جاتے تھے اور یہ بھی غور نہیں کرتے تھے کہ ان کے دائیں بائیں یا آگے پیچھے کون ہے۔ موقع پاتے ہی وہ کلوروفارم میں بھیگا ہوا رومال ان کی ناک پر رکھ دیتا تھا اور جب وہ چکرا کے گر پڑتے تھے تو وہ فوراً انہیں سنبھال لیتا تھا۔ یہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ خود بھی اچانک بیہوش ہو جانے والے شخص کے ساتھ ہے جسے مرگی کا دورہ پڑا ہے یا ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ اسے رکشا ٹیکسی میں ڈال کے اسپتال لے جاتے ہوئے وہ بیہوش آدمی کا نقد سرمایہ اپنے قبضے میں کرتا تھا اور اسپتال پہنچنے کے بعد رکشا ٹیکسی ڈرائیور کو ایمرجنسی وارڈ کے باہر روک کر انتظار کرنے کو کہتا تھا تاکہ وہ اندر سے اسٹریچر منگوا لے۔ لیکن وہ ایمرجنسی وارڈ میں ایک طرف سے داخل ہو کے دوسری طرف سے باہر نکل جاتا تھا۔ انتظار سے گھبرا جانے والا ڈرائیور جب کسی سے بات کرتا ہو گا تو پھنس جاتا ہو گا۔ کرنے والے اس سے نہ جانے کتنے سوال کرتے ہوں گے کہ مریض کون ہے؟ اس کا مریض سے کیا رشتہ ہے؟ مریض کو کیا ہوا تھا اور اسے لے کر کون آیا تھا؟ سب کا جواب اس کے پاس "مجھے معلوم نہیں" کے سوا کیا ہوتا ہو گا۔ پھر مزید غل غپاڑہ ہوش میں آنے والا کرتا ہو گا کہ وہ لٹ گیا اور سب سے پہلے تو پولیس رکشا ٹیکسی کے ڈرائیور کو دھر لیتی ہو گی اور اس مفروضے پر بزورِ بازو یہ اعترافِ جرم حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہو گی کہ وہ بھی اسی گروہ کا رکن ہے جو مل کر اس قسم کی واردات کرتا ہے۔ ایک آدمی تاڑتا ہے اور دوسرا فوراً رکشا لے کر پہنچ جاتا ہے۔ اور ظاہر ہے یہ تفتیش اس وقت تک جاری رہتی ہو گی جب تک پولیس کو یقین نہ آ جائے کہ اب ملزم کے منہ سے سچ نکلنے کے مقابلے میں اس کے تن سے جان نکلنے کے امکانات زیادہ روشن ہو گئے ہیں۔ یہ کام وہ مہینے میں ایک یا دو بار ہی کرتا تھا۔

یہ سب ٹیکسی ڈرائیور بھی سمجھتا تھا۔ اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ اس چار سو بیس اور شیطان نے لوگوں کا مال ہی نہیں ... کے ہم پیشہ افراد کی برادری کو بھی جھوٹے الزامات میں ... بدنام کیا تھا اور تھانوں میں تختۂ مشق بنوایا تھا۔ وہ ان سب ... بن کے سب کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ گالیوں کی ... کے ساتھ اس پر پل پڑا۔ میری تفتیش نے ملزم کو نیم جان ... ورنہ وہ ٹیکسی ڈرائیور سے کبھی مار نہ کھاتا اور شاید ٹیکسی ڈرائیور اتنی جرأتِ رندانہ کا مظاہرہ نہ کرتا۔ اس وقت میں یہ سو... کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟ اگر میں خود مفرور مجرم نہ ہوتا ... مجرم کو پولیس کے حوالے کرنا اپنا فرض سمجھتا اور یہ فرض ادا ... مطمئن ہو جاتا۔ اب بڑا چور چھوٹے چور کو کس منہ سے گرفتار ... سامنے لے کر حاضر ہو۔ ٹیکسی ڈرائیور اپنے انتقامی جذبے ... بجھا چکا تھا اور اگر میں یہ ذمہ داری اس کے سپرد کرتا تو ... کہ مجھے تو معاف رکھیے جناب۔ تھانے میں اپنی مرضی سے ... ممکن ہے وہاں سے آنا اپنی مرضی کی بات نہیں۔ وہ سب ... آنکھ سے دیکھتے ہیں اور ایک لاٹھی سے ہانکنے کی کوشش ... وہ کہیں کہ ایں ہمہ بچہ شتر است تو بلی سے اعتراف کرا لیں ... اونٹ کی بچی ہے۔

اگر میں اس کو چھوڑ دیتا تو وہ اپنے جاننے والے ... کے ذریعے یہ خبر آگے پہنچا دیتا کہ ملزم سکندر بخت یہاں ... یوں پکڑا گیا اور فلاں ٹیکسی میں تھانے لے جانے والا ... روڈ کی سیر کرانے لے گیا۔

"اوئے ہٹا کٹا بندہ، ایسے کرتوت..." ٹیکسی ڈرائیور ... گوشمالی کے بعد اسے راہِ راست پر لانے کے لیے تلقین ... سمجھی۔ اچانک مجھے اس کے ڈرائیونگ لائسنس کا خیال ... میں نے جیب کے اندر رکھ لیا تھا۔ یہ ہیوی وہیکل کا لائسنس ... جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ٹرک یا بس چلاتا رہا ہے۔ اس ... الف دین تھا۔

"الف دین تم کیا چلاتے تھے؟" میں نے تجدیدِ ... کی تاریخ دیکھی۔ "بس یا ٹرک؟"

"ٹرک۔ لاہور سے کراچی آتا جاتا تھا۔" وہ بولا۔

"پھر یہ محنت کی کمائی چھوڑ کے اس بدمعاشی کے ... میں کیوں پڑ گئے؟" میں نے کہا۔

"آدمی خود کیا کرتا ہے جی! سب تقدیر کراتی ہے۔ ... "پولیس کی گالیاں کھانا اور ان کو حرام کھلانا بھی منظور تھا ... بھی کرتا تھا میں مزدور بن کے اور ڈھائی من کی بوری بھی ... تھا۔ اطمینان تو تھا کہ میں اولاد کو حرام نہیں کھلاتا۔ ایک ... میری ما انگلش میڈیم اسکول میں پڑھتی ہے۔"

"میں نے رسید پر اسکول کا نام دیکھا تھا۔" میں نے کہا۔ بعد میں تمہارے خیالات کیوں بدل گئے؟"

اس نے سرد آہ بھری۔ "بس جی۔ دنیا میں ہیرا پھیری کے بغیر کام نہیں چلتا۔ میں ایک چکر میں آ گیا تھا۔ کراچی سے لے کر جا رہا تھا مال کہ چھاپا پڑ گیا۔ مجھے کہاں معلوم تھا کہ گڑ اور چاول کی بوریوں کے بیچ میں ایک بوری نشے کی بھی ہے۔ جن کا مال تھا وہ تو صاف مکر گئے کہ ہم تو آڑھتی لوگ ہیں۔ ساری منڈی میں ساکھ ہے ہماری۔ یہ بوری اسی نے رکھی ہو گی۔ یہی بتائے گا کس کی ہے۔ ان کے پاس پیسہ بھی تھا اور بظاہر وہ آڑھتی ہی تھے۔ میرا کون تھا جو مجھے بچاتا۔ میں نے کریم سیٹھ کا حوالہ دیا۔ وہ تھانے آیا اور مجھ سے کہہ گیا کہ فکر مت کرو۔ تمہارا کچھ نہیں بگڑے گا۔ ہم تمہیں بچا لیں گے اور انھوں نے مجھے بچا بھی لیا لیکن نوکری سے جواب دے دیا۔ پولیس کے سامنے تو وہ بھی اجنبی بنا رہا تھا، کریم سیٹھ۔"

"کس کریم سیٹھ کی بات کر رہے ہو؟" میں نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔

"کراچی کا بہت بڑا بدمعاش دلال ہے جی۔" وہ بولا۔ "ہر قسم کا ناجائز کاروبار کر کے سیٹھ بن گیا ہے۔ اسمگلنگ سے لاکھوں روپے بنائے ہیں۔ ہر قسم کا مال اِدھر سے اُدھر کرتا ہے۔ آج کل اسلحے کی ناجائز فروخت سے کروڑوں بنا رہا ہے۔"

"تم جانتے ہو، یہاں اس کا بزنس کس سے تھا؟" میں نے کہا۔

"پہلے تو منو بھائی عجب دین اینڈ کمپنی سے تھا۔" وہ بولا۔ "آج کل سیٹھ دلاور سے ملا ہوا ہے۔"

اگر وہ جیب سے توپ نکال کر میرے کان کے قریب داغ دیتا تب بھی مجھ پر وہ اثر نہ ہوتا جو دلاور کا نام سن کر ہوا۔ بے شک وہ دنیا میں واحد دلاور نہیں تھا لیکن اس سے پہلے الف دین سیٹھ کریم کا نام بھی لے چکا تھا جو کراچی میں تھا اور ان دونوں ناموں کا باہمی تعلق اتفاق نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور تو میری طرف دیکھ ہی نہیں رہا تھا لیکن الف دین سے میری حالت کا تغیر چھپا نہ رہ سکا۔ حالانکہ اپنے طور پر میں نے پوری کوشش کی تھی کہ صورت سے کچھ ظاہر نہ ہونے دوں۔ میں چند منٹ تک بے یقینی کے خلا میں معلق رہا۔ پھر آہستہ آہستہ میں نے حواس پر قابو پایا۔

"تم... تم الطاف کو جانتے ہو؟ طافو نام تھا اس کا۔" میں نے کہا۔ اب بالآخر میرا ذہن اس گتھی کو سلجھانے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ جی پی او میں پہلی بار الف دین کو دیکھ کر مجھے اس کی صورت جانی پہچانی کیوں لگی تھی۔

اس نے سر ہلایا۔ "وہ میرا چھوٹا بھائی ہے جی۔" مگر اس کی صورت پر حیرانی نظر آنے لگی۔

"آج کل کہاں ہے وہ؟" میں نے کہا اور دونوں بھائیوں کی صورت کی مشابہت پر غور کرنے لگا۔

"معلوم نہیں، ٹرک لے کر کہیں گیا ہو گا۔" الف دین نے کہا۔

"تم سے آخری بار کب ملا تھا؟" میں نے اس پر نظر جما کے کہا۔

"ایک مہینہ ہو گیا۔ شاید دو چار دن اوپر۔"

"تم دونوں بھائی اسی طرح مہینے میں ایک بار ملتے ہو؟" میں نے کہا۔ "تمہارے ساتھ رہتا ہے وہ؟"

"نہیں جی۔ اس کا اپنا گھر بار ہے، بیوی بچے ہیں۔" الف دین بولا۔ "مجھے اسی نے ٹرک چلانے کا لائسنس دلوایا تھا اور پھر مستقل کام بھی۔ ہماری بیویوں کی آپس میں نہیں بنتی تھی لیکن وہ بہت خیال کرتا تھا میرا۔"

"چھوٹا بھائی ہونے کا اچھا حق ادا کیا تھا۔" میں نے کہا۔ "یہ نہیں بتایا تھا کہ مستقل کام میں اندر ہو جاؤ گے۔"

"یہ تو اسے بھی معلوم نہیں تھا۔" وہ بولا۔ "وہ جانتے بوجھتے مجھے کنویں میں دھکا نہیں دے سکتا تھا، وہ دشمن نہیں تھا میرا۔"

"تم کو معلوم ہے وہ کس کے لیے کام کر رہا ہے؟" میں نے کہا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "ٹرک اس کا اپنا تھا۔ وہ کسی کا ملازم نہیں تھا۔"

"یہ بھی اس نے جھوٹ کہا تم سے۔" میں نے کہا۔

"آپ... آپ کو کیسے معلوم ہوا؟" الف دین کے لہجے میں اچانک تشویش کے آثار پیدا ہوئے۔

"تم نے دلاور کے لیے کام کیا تھا۔ کبھی ملے تھے اس سے؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ اس کا صرف نام چلتا تھا کہ سیٹھ دلاور کا مال ہے۔" وہ بولا۔

"اور مال تمہارے حوالے کون کرتا تھا؟" میں نے کہا۔ "ادائیگی کون کرتا تھا؟"

"اس کا ایک ایجنٹ، کوئی ملازم یا منشی۔" وہ بولا۔ "رحمت نام تھا اس کا۔"

"رحمت کباڑی؟" میں نے کہا۔ "کبھی اس کے ساتھ گاما ماچھی بھی آتا تھا۔ یا چھوٹو نام کا ایک کلینر؟"

"چھوٹو کو میں نہیں جانتا۔" وہ بولا۔ "گامے ماچھی کا نام بھی سنا تھا۔ رحمت کا پورا نام رحمت کباڑی تھا۔ آپ اس کو جانتے ہیں؟"

"میں اس کے علاوہ بھی بہت سے لوگوں کو جانتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "جن کا میں نے نام لیا، وہ سب دلاور کے کارندے ہیں اور افسوس کی بات یہ ہے الف دین کہ تمہارا چھوٹا بھائی طافو بھی اسی کے لیے کام کرتا تھا۔"

"تھا کا کیا مطلب؟" وہ چونکا۔ "کیا اس نے وہ کام چھوڑ دیا ہے؟ یا وہ اندر ہو گیا ہے؟"

"وہ قبر کے اندر ہو گیا ہے، قیدِ حیات سے چھوٹ گیا ہے الف دین۔" میں نے کہا۔

الف دین کی حالت ابتر ہو گئی۔ "جھوٹ... تم جھوٹ کہتے ہو۔ کب ہوا یہ حادثہ...؟" اس نے کانپتی آواز میں کہا۔

"حادثہ؟ میں نے تو کسی حادثے کا ذکر نہیں کیا۔" میں نے کہا۔ "لیکن یہ جھوٹ نہیں ہے الف دین کہ طافو مر چکا ہے۔"

"کیسے؟" وہ چلّایا۔ "اور کب؟"

"اسے دلاور نے مروا دیا ہے۔" میں نے بے رحمی سے کہا۔ "جس کے لیے وہ کام کرتا تھا۔ اس بات کو آج تین دن ہو گئے۔"

اس کا جسم لرزنے لگا۔ "تین... تین دن ہو گئے... طافو کو مرے تین دن ہو گئے...؟" وہ کھوکھلے لہجے میں بولا۔

"ہاں۔ اسے بھی تمھاری طرح سازش کے جال میں پھنسا لیا گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "وہ بھی محنت مزدوری کر کے حق حلال کی کمانے کو اچھا سمجھتا تھا اور اسے بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ جس کے لیے کام کرتا ہے اس کا اصل دھندا کیا ہے۔ وہ اپنی ہزار روپے مہینہ کی تنخواہ میں خوش تھا۔ پھر سیٹھ کریم نے اس کے ساتھ زبردستی کی۔ اس نے دلاور کا ایک مال سے بھرا ہوا ٹرک غائب کر دیا۔ رحمت کباڑی اور طافو کو خاموش رہنے کے پانچ پانچ لاکھ دیے اور دلاور کو اطلاع کر دی کہ گودام پر چھاپا پڑ گیا ہے۔ اس نے کسی سے مل کر اخبار میں خبر لگوا دی تھی لیکن دلاور کو معلوم ہو گیا۔ اس نے رحمت کباڑی اور طافو کو مروانے کا بندوبست کر دیا تھا۔ رحمت تو مارا گیا..." میں نے عمداً اس کی موت کے اصل واقعات بتانے سے گریز کیا۔ "طافو کو اتنا وقت مل گیا تھا کہ وہ رقم بیوی بچوں کے حوالے کر گیا اور انہیں تاکید کر گیا کہ وہ فرار ہو جائیں۔ طافو کو یقین تھا کہ دلاور کے کارندے انہیں کبھی تلاش نہیں کر سکتے۔ اپنی جان دے کر اس نے بیوی بچوں کی جان بچا لی ورنہ دلاور انہیں بھی نہ چھوڑتا۔ پیسہ ان کے پاس ہے۔ اُن کے لیے زندہ رہنا مشکل نہیں ہوگا۔ وہ خوش رہیں گے۔"

"طافو کے بغیر؟" الف دین دھاڑیں مار مار کے رونے لگا۔ "کیا پیسہ باپ ہوتا ہے؟ اس کی بیوی تو ہزار روپے مہینہ میں بھی خوش تھی۔ خوش نہ ہوتی تو اس کے ساتھ کیوں رہتی۔ کوئی بیوی اپنے گھر کو پانچ لاکھ میں بیچ کر خوش رہ سکتی ہے؟"

میں نے اس کے کندھے پر تھپکی دی۔ "میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ طافو تو کسی صورت نہیں بچ سکتا تھا۔ اگر وہ پانچ لاکھ لینے سے انکار کرتا تو غبن کرنے والے اُسے مار ڈالتے۔ غبن کرنے والوں کا ساتھی بنا تو مالک سے نمک حرامی اور غداری کرنے کی سزا پائی۔ سزا سے اسے کوئی نہیں بچا سکتا تھا مگر اس نے بیوی بچوں کے لیے کچھ تو کیا۔ صبر کرو اور ہمت سے کام لو۔"

"کیسے صبر کروں؟" وہ چلا چلا کے اور آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کے بولا۔ "کہاں سے لاؤں ہمت...؟"

ٹیکسی ڈرائیور پاگل ہونے کے قریب تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنی سی دیر میں صورتِ حال اس حد تک کیسے بدل گئی کہ ظالم و مظلوم ایک ہو گئے۔ کچھ دیر پہلے میں جس کو زندہ گاڑ دینے اور اس کی لاش کو گدھوں اور گیدڑوں کے لیے چھوڑ جانے کی دھمکی دے رہا تھا اور مار مار کے جان سے مار دینا چاہتا تھا اب میں اس کے ساتھ ہمدردی کر رہا تھا۔ اسے ہمت سے کام لینے اور صبر کرنے کی تلقین کر رہا تھا۔ اچانک اس بدمعاش کے بھائی سے میرا تعلق نکل آیا تھا اور میں اس کے خاندانی معاملات پر بات کرنے لگا تھا۔ باقی سب نام اس کے لیے غیر اہم اور اجنبی تھے۔ رحمت کباڑی، دلاور یا گامے ماچھی کے نام سے اس کو صرف یہ اندازہ لگانے میں مدد ملی ہوگی کہ وہ طافو کی موت کے ذمے دار تھے۔ بے ایمان اور غلط قسم کا کاروبار کرنے والے لوگ تھے اور میرا بھی ان سے تعارف ضرور تھا۔ اب یہ خدا جانے کہ میں بھی ان کا کارندہ تھا یا قانون کا نمائندہ۔ بدمعاشوں کو پولیس بھی جانتی ہے اور اکثر جاننے والوں سے زیادہ جانتی ہے۔

میں الف دین کے متعلق سوچ رہا تھا۔ وہ بھی مار گزیدہ تھا اور بھائی کے قتل کی خبر نے اس کو زخم خوردہ سانپ کی طرح انتقام کی آرزو میں پاگل کر دیا تھا۔ اس کی دشمنی کے اسباب جُدا تھے۔ وہ مختلف وجوہات کی بنا پر دلاور اینڈ کمپنی کا دشمن ہو رہا تھا۔ اور اس کے نقصانات کی نوعیت بھی مختلف تھی۔ لیکن دلاور کے خلاف اس کے اور میرے جذبات کی نوعیت یکساں تھی اور میں نے اسے اپنے ساتھ شامل کر لیا تھا۔ اس کے جذبات کو ہوا دینا اور اسے اندھے انتقام کے جنون میں مبتلا کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا کیونکہ وہ عقل و ذہانت میں اوسط درجے سے بھی کم تھا اور اگر میں احتیاط کے ساتھ اس کی ہمدردی حاصل کر کے اسے یقین دلانے میں کامیاب ہو جاؤں کہ اس کا اور میرا مشن ایک ہی ہے تو وہ بھی میرے لیے اتنا ہی کارآمد ثابت ہو سکتا تھا جتنا استاد ٹیڈی ہوا تھا۔ وہ بھی نچلے درجے کا بدمعاش تھا مگر ہم نے اسے عزت دی اور عزت کا احساس دیا تو وہ شاطر اور عیار ذہن رکھنے والے، شریف معتبر کہلانے والے دوست نما دشمنوں سے زیادہ مخلص دوست ثابت ہوا۔ لیکن یہ سب کچھ اس جنگل میں اور اس ٹیکسی ڈرائیور کے سامنے نہیں ہو سکتا تھا۔ احتیاط کا تقاضا یہ تھا کہ ٹیکسی ڈرائیور کو کم سے کم معلوم ہو۔ الف دین کو اتنا ہی معلوم ہو جتنا اس کا تعاون حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے اور لائحہ عمل رابعہ اور محسن کی مشاورت میں ہو۔

"اچھا اب اٹھو۔" میں نے پھر ریوالور نکال لیا۔ "مجھے سوچنا پڑے گا کہ ان حالات میں تمھارے ساتھ کیا رعایت کی جائے۔ تم کسی طرح بھی قانون سے کوئی رحم کی اپیل نہیں کر سکتے۔ اگر تم جیل چلے گئے تو تمھاری بیوی کو معلوم ہو جائے گا کہ تمھاری آمدنی کے ذرائع کیا تھے۔ اب تک تم نے اسے کچھ نہیں بتایا ہوگا۔"

"نہیں، وہ سمجھتی ہے میں کمیشن کی بنیاد پر کسی کے ساتھ کاروبار کرتا ہوں۔" وہ بولا۔

"اور مہینے میں ایک دو بار جتنی رقم اسے لے جا کر دیتے ہو وہ تمھارا کمیشن ہوتی ہے؟" میں نے کہا۔ "جب یہ راز فاش ہو گیا تو اس کی سزا صرف تمھیں ہی نہیں، تمھارے بیوی بچوں کو بھی ملے گی۔ اس آمدنی میں وہ خاصی آسائش سے رہتے ہوں گے۔ تمھاری انگلش میڈیم اسکول میں پڑھنے والی بچی بڑے فخر سے کہتی ہوگی کہ میرے پاپا بزنس مین ہیں مگر یہ خبر چھپنے کے بعد اسے یقیناً اسکول سے نکال دیا جائے گا۔"

اس نے انکار میں سر ہلایا۔ "اسکول سے اسے کوئی نہیں نکال سکتا، اسکول میرا اپنا ہے۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ "اسکول تمھارا ہے؟ وہ کیسے؟"

"ایسے کہ اسکول میرے پیسے سے بنا ہے اور میری بیوی اسکول کی سرپرست ہے۔" وہ بولا۔ "تو وہاں فیس آدھی لی جاتی ہے۔"

میرا دماغ گھوم گیا۔ پردہ اٹھتا ہے تو چشمِ تماشائی کو کیا کیا نظر آتا ہے۔ یہ دھوکے سے لوگوں کو لوٹنے والا شخص مالِ غنیمت سے اسکول چلا رہا تھا۔ قوم کے نونہالوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کر رہا تھا۔ اس کی بیوی درس و تدریس کے معزز اور مقدس پیشے سے وابستہ تھی۔ اس کا ایک ہاتھ چور اور گناہ گار تھا جو حرام کماتا تھا اور دوسرے ہاتھ میں تھما دیتا تھا اور یہ دوسرا ہاتھ کارِ خیر میں مصروف تھا۔ نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا۔ پُل بنا، چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا۔ شاعر نے یہ نکتہ نہیں سمجھایا کہ فیض کے اسباب بنانے کے لیے معاشی وسائل جائز طریقے سے پیدا کیے جائیں یا ناجائز طریقے سے، مجرم اور گناہگار وہ خود تھا مگر ایسا کام بھی کر رہا تھا جو فلاحِ انسانیت کا سبب تھا اور ثواب کا کام تھا۔ کیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ مالِ حرام سے جو تعلیم دی گئی وہ حرام تھی یا ناجائز تھی۔ اور وہ بچے قصوروار تھے جنھوں نے ایک چور، ڈاکو اور لٹیرے کے اسکول سے سند حاصل کی؟ نہیں، تعلیم تو تعلیم ہے۔ آدمیت کا لباس اور انسانیت کا گہنا۔ علم کی طلب میں آنے والے نیک نیتی کے ساتھ پہنچے اور خلوصِ نیت کے ساتھ فارغ التحصیل ہوئے۔ انھوں نے کبھی نہ جانا کہ اسکول کو چلانے والا پیسہ حلال کے راستوں سے آ رہا یا حرام ذرائع سے۔ وہ کالا دھن تھا یا سفید۔ اسکول کا پرنسپل گورا ہو یا کالا، اگر وہ پڑھاتا ہے اور چوری کرنا نہیں سکھاتا تو واجب ہے کہ اس کی تعظیم کی جائے۔ میں نے الف دین کو جیل میں بند کرا دیا تو آمدنی کا وہ ذریعہ بند ہو جائے گا اور سیکڑوں بچوں کے لیے آدھی فیس پر اچھی تعلیم کے دروازے بند ہو جائیں گے۔ کون یقین کرے گا کہ الف دین مجرم تھا۔ بددعائیں جو معصوم بچے دیں گے اس کو ملیں گی جس نے حصولِ علم کا یہ سرچشمہ بند کیا۔ آخر ننانوے اعشاریہ ننانوے فیصد مجرم تو چوری اور ڈاکے، رشوت اور اسمگلنگ سے حاصل ہونے والی دولت کو ذاتی شان و شوکت، عیش و عشرت اور دنیاوی جاہ و عزت حاصل کرنے کے لیے خرچ کرتے ہیں۔ کس بدمعاش نے آج تک بنک لوٹ کے اسکول بنایا ہے، کس جیب کترے نے طلبا کو وظائف دیے ہیں، کس اسمگلر نے اسپتال قائم کیا ہے، پھر الف دین کون ہے، مجرم اور گنہگار یا کارِ خیر کرنے والا محسنِ عظیم؟

لاحول ولا قوة۔ میں نے سر کو ان بدخیالات سے چھٹکارا پانے کے لیے جھٹکا۔ یہ قانون شکنی کا معاملہ ہے، اسے اخلاقی نقطۂ نظر سے یا مذہبی عقائد کی کسوٹی پر کیسے پرکھا جا سکتا ہے۔ تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا کہ الف دین اپنی نوعیت کا منفرد مجرم تھا۔ ایسا کہ پہلے نہ دیکھا نہ سنا۔ مشہور تھا رابن ہڈ یا بہرام ڈاکو جو امیروں کی تجوریوں سے دولت نکال کر انہی میں بانٹ دیتے تھے جن کا خون چوس کے دولت اکٹھی ہوتی تھی مگر الف دین نے تو بالکل الگ ہی مثال قائم کی۔

"ٹیکسی میں بیٹھو۔" میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "اپنا سارا پیسہ اٹھا لو۔" وہ اب بھی اپنے بھائی کو یاد کر کے رو رہا تھا لیکن اس نے میرے حکم کی تعمیل کی۔ ٹیکسی اسی راستے سے واپس ہوئی۔ مجھے راہ میں وہ دونوں مسافر نظر نہ آئے جن کو بالترتیب تین میل اور چھ میل مارچ کرنے کے لیے اتار دیا گیا تھا۔ اتنی دیر میں وہ سڑک تک پہنچ کے کسی بس کے ذریعے واپس جا چکے تھے۔ ملتان روڈ سامنے نظر آنے لگا تو میں نے ٹیکسی کو روک لیا۔

"مجھے افسوس ہے کہ تمھارا وقت بھی ضائع ہوا۔" میں نے کہا۔ "اور تم کو بلاوجہ پریشانی اٹھانی پڑی۔" میں نے دو سو روپے ٹیکسی ڈرائیور کی خدمت میں پیش کیے۔ "امید ہے یہ اس تلافی کے لیے کافی ہوں گے۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے نوٹ لے لیے۔ "مہربانی جی۔ میں تو سمجھا تھا آج ٹیکسی گئی یا جان گئی۔"

"اگر تم تعاون نہ کرتے تو ایک چیز ضرور جاتی۔" میں نے کہا۔

"یہ دونوں آنی جانی چیزیں ہیں۔ آئندہ بھی جا سکتی ہیں اگر تم نے وعدے کے مطابق سب کچھ فراموش نہ کیا۔ وہ سب جو تم نے دیکھا اور سنا۔ تمھاری ٹیکسی کا نمبر ہمارے پاس ہے اس لیے ہم تو تم کو تلاش کر سکتے ہیں مگر ہمارا پتا تمھارے پاس نہیں ہے اس لیے تم دوبارہ اکیلے یا کسی کے ساتھ ہم سے ملنے نہیں آسکتے۔" غیر شعوری طور پر میں نے جمع کا صیغہ استعمال کیا تھا اور ابھی سے الف دین کو اپنے ساتھ سمجھ لیا تھا۔

"خدا نہ کرے کہ پھر آپ سے ملاقات ہو جی۔ آج دو نفل پڑھوں گا شکرانے کے اور داتا صاحب کے مزار پر حاضری دوں گا۔" ٹیکسی ڈرائیور نے کہا۔ "آپ بھی کہا سنا معاف کر دیں تو بڑی مہربانی۔ اب میں جاؤں؟"

"جاؤ۔ یہاں سے سڑک تک پہنچنے میں تم کو دس منٹ بھی پیدل نہیں چلنا پڑے گا۔" میں نے کہا۔

"پیدل؟" وہ چلایا۔ "دیکھو یہ ٹیکسی میری نہیں ہے۔ میں کرائے پر چلاتا ہوں۔ مالک کو کیا جواب دوں گا میں؟"

"شام کو چھ بجے ریلوے اسٹیشن پر دیکھ لینا۔" میں نے کہا۔ "ٹیکسی مل جائے گی۔"

ٹیکسی ڈرائیور کا چہرہ بے یقینی کے باعث قابلِ رحم ہو گیا تھا۔ میں نے آگے بیٹھے ہوئے الف دین کے کندھے پر ریوالور سے تھپکی دی۔ "وہ بائیس ہزار روپے اسے دے دو زرِ ضمانت کے طور پر۔"

اب الف دین کا چہرہ اتر گیا لیکن اس نے بائیس ہزار روپے ٹیکسی ڈرائیور کو دے دیے۔

"ہو سکتا ہے کہ تمھاری ٹیکسی کی قیمت اس سے زیادہ ہو، تمھاری نظروں میں۔" میں نے کہا۔ "ویسے اس چھکڑے کو خریدنا ہوتا تو میں پندرہ سولہ ہزار سے زیادہ میں نہ لیتا۔ پھر بھی یہ رقم ضمانت کے طور پر رکھو۔ شام کو ٹیکسی مل جائے تو واپس کر دینا۔ ورنہ مالک کو دے دینا۔ میرا خیال ہے وہ تمھیں کچھ نہیں کہے گا۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے رقم جیب میں رکھی اور نیچے اتر گیا۔ ابھی تک اس کو پوری طرح یقین نہیں آیا تھا کہ میں اس کے ساتھ مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ میرا رویہ بہت عجیب اور ناقابلِ فہم رہا تھا۔ اُسے اتارنے کے بعد میں اُسے گولی مار دیتا اور پھر رقم چھین لیتا تو اسے بالکل تعجب نہ ہوتا۔ وہ آہستہ آہستہ مُردہ قدموں سے چل پڑا۔

"تم بس اور ٹرک چلا سکتے ہو تو یہ ٹیکسی تمھارے لیے کھلونا ہے۔" میں نے الف دین سے کہا۔ "ڈرائیونگ کرو لیکن میری ہدایات کو غور سے سنتے رہو۔ یہ بات مت بھولو کہ معمولی سی خلاف ورزی یا غلطی پر میں گولی چلانے میں دیر نہیں کروں گا اور ابھی تمھارا دم بھی نہیں نکلا ہو گا کہ میں لاش سڑک پر پھینک کے نکل جاؤں گا۔" الف دین نے کسی ردِ عمل کا اظہار کیے بغیر ڈرائیور کی جگہ کھسک کر ٹیکسی کو آگے بڑھایا۔ دو منٹ میں ہم ٹیکسی ڈرائیور کے پاس سے گزرے اور خیر سگالی کے جذبات کا اظہار کرنے کے لیے میں نے مسکرا کے ہاتھ ہلایا۔ وہ ڈر کے ایک طرف ہو گیا تھا کہ کہیں ہم اسے کچلتے ہوئے گزرنے کا ارادہ نہ رکھتے ہوں۔ ٹیکسی گزر گئی تو اسے اطمینان نصیب ہوا اور اس نے بھی جواب میں ہاتھ ہلایا۔ مین روڈ پر ٹریفک میں شامل ہونے سے پہلے الف دین نے ٹیکسی کو روک کر دائیں بائیں دیکھا اور اسی وقت میں نے پیچھے سے اس کی گردن پر ہاتھ مارا۔ وہ آواز نکالے بغیر اسٹیئرنگ پر جھک گیا۔ پیر کلچ پر سے ہٹا تو گاڑی نے ایک جھٹکا لیا اور اس کا انجن بند ہو گیا۔ میں اطمینان سے اُتر کے آگے آیا۔ الف دین کو ساتھ والی سیٹ پر لڑھکایا اور انجن پھر اسٹارٹ کیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ آبادی میں پہنچتے ہی وہ ایس او ایس دینے لگے یا ایک دم کود کر فرار ہو جائے۔ ابھی مجھے اس سے بہت کچھ پوچھنا تھا۔ بظاہر وہ تعاون پر آمادہ تھا لیکن اس کے دل میں کیا ہے؟ میں یہ کیسے جان سکتا تھا۔

آبادی شروع ہونے کے بعد میں نے اِدھر اُدھر کی دکانوں پر نظر رکھی اور جیسے ہی مجھے 'پبلک ٹیلیفون' کا سائن بورڈ نظر آیا، میں نے ٹیکسی روک لی۔ الف دین سیٹ کی پُشت سے یوں آنکھیں بند کیے سر لگائے بیٹھا تھا کہ نیند میں معلوم ہوتا تھا۔ میں نے لاہور ہوٹل کا نمبر ملایا۔

"نواب ننھے خاں صاحب اگر کمرے میں ہوں تو بات کرا دیں۔" میں نے کہا۔ "ڈاکٹر امجد کے کمرے میں ہوں گے۔"

"کیا کہوں ان سے؟" آپریٹر نے کہا۔ "کون بات کرے گا؟"

"نواب ننھے خاں کے ماموں۔" میں نے کہا۔ "لندن والے ماموں۔ وہ سو رہے ہوں تو ان کی ہمشیرہ پرنسس صوفیہ ہوں گی۔"

ایک منٹ کے بعد رابعہ نے ہیلو کہا تو میں نے اسے ڈانٹنا شروع کیا۔ "کوئی حد ہوتی ہے نامعقولیت کی۔ یعنی ہم نے آپ کو وہاں چھوڑا تھا تو آخر کس لیے؟ آپ ایسے غائب ہوئیں جیسے ننھے خان کے سر سے سینگ.... مطلب وہی کے گدھے کے سر سے۔"

رابعہ ہنسنے لگی۔ "جہاں سے بھی بول رہے ہو خوب بول رہے ہو۔ کوئی اور بھی ہے ساتھ؟"

"ہاں۔ چچا اونگھتے خاں ساتھ ہیں۔ ٹیکسی میں سو گئے ہیں۔" میں نے ٹیکسی کی طرف ایک نظر ڈالی۔

"ٹیکسی کس کی ہے؟" رابعہ نے بے حد عقلمند ہونے کا ثبوت دیا۔ میں بہت خوش بھی تھا کہ وہ بخیریت واپس پہنچی۔

"ابھی تو اپنی ہی ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم اِدھر ہی آ جاتے ہیں۔ تم اپنی بگھی لے کر آ جاؤ ٹھنڈی سڑک پر۔"

میں نے ریسیور رکھا تو دکاندار مسکرا رہا تھا۔ اگر میں اتنا جذباتی نہ ہوتا تو وہ میری گفتگو کو مذاق سمجھتا۔ میرے ٹیکسی تک جانے اور روانہ ہونے تک وہ مجھے بڑی دلچسپی سے دیکھتا رہا کہ آج کل بھی نوابی کے کیسے کیسے نادر نمونے دیکھنے میں آتے ہیں۔ میں نے الف دین کو سونے دیا۔ ابھی کم سے کم آدھے گھنٹے تک اس کے ہوش میں آنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ مال روڈ شروع ہوتے ہی میں نے ہر گاڑی پر نظر رکھی۔ جو سامنے سے گزری یا سڑک کے کنارے کسی نمایاں جگہ پر کھڑی ہوئی نظر آئی۔ رابعہ کی کورٹینا مجھے چڑیا گھر سے آگے گورنر ہاؤس کے گیٹ کے سامنے کھڑی ہوئی ملی۔ وہ خود ڈرائیور کی سیٹ پر نہیں تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اس کے ساتھ کوئی مرد تھا جو اسے وہیں چھوڑ کے کسی کام سے گیا تھا۔ اور ابھی تک لوٹا نہیں تھا۔ چنانچہ وہ ستم کشِ انتظار تھی۔ اس پر شک کیسے ہو سکتا تھا۔

میں نے ٹیکسی کو اس کے پہلو سے لگا کے روکا۔ "اکیلی ہو؟" میں نے کھڑکی سے سر نکال کے کہا۔

"جی نہیں ماموں۔" محسن جو پچھلی سیٹ پر لیٹا تھا فوراً اُٹھ بیٹھا۔ "ہم بھی ساتھ ہیں۔" اور میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص کو غور سے دیکھنے لگا۔

"یہ نمونہ تو پہلے بھی دیکھا ہے۔" رابعہ نے سوچتے ہوئے کہا۔ اس کی نظر الف دین پر رہی۔

"اُنیس بیس کا فرق ہے۔" محسن نے کہا۔ "ورنہ میں سمجھتا مُردہ پھر زندہ ہو گیا۔"

"بالکل۔ کیا یہ طافو کا بھائی ہے؟" رابعہ نے یوں کہا جیسے کوئی بہت مشکل سوال حل کر لیا ہو۔

"یہ باتیں کرنے کی جگہ نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "اسے جنگی قیدی سمجھو۔ بہت اہم مُہرہ ہے جو بازی پلٹ سکتا ہے۔ اس کو گاڑی میں شفٹ کرنے کے بعد یہ طے کریں گے کہ اس کی حفاظت کے لیے کیا خصوصی اقدامات کیے جائیں۔"

میں نے اور محسن نے الف دین کو کار میں ڈالا۔ اس وقت شام کے پانچ بجنے والے تھے۔ میں نے ٹیکسی کی چابی محسن کو دی اور اُسے کہا کہ وہ ریلوے اسٹیشن کی جانب چلے۔ ٹیکسی کو اسٹینڈ پر روک کر انتظار کرے۔

"کس کا انتظار کروں؟" محسن نے کہا۔

"ایک شخص آئے گا اور بائیس ہزار میں ٹیکسی خریدے گا۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "بات پکی ہو گئی ہے۔ بیعانہ بھی دے دیا ہے۔"

"یہ چکر کیا ہے؟" محسن نے میری بات میں مذاق کا کوئی پہلو نہ پا کے کہا۔

"چکر کیسا؟" میں نے کہا۔ "وہ شخص ٹھیک چھ بجے آئے گا۔" میں نے کہا۔ "ہلکے نیلے رنگ کی قمیص اور سفید رنگ کی شلوار۔ دُبلا پتلا آدمی ہے خشخشی داڑھی اور نوکیلی مونچھوں والا۔ جب تک پیسے نہ دے ٹیکسی کی چابی اُسے مت دینا۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ ہم گاڑیاں خریدتے تھے، چُراتے تھے اور چھینتے تھے۔" محسن بولا۔ "یہ دھندا کب سے شروع کیا ہے اور یہ ٹیکسی آخر آئی کہاں سے ہے؟"

"ابھی تو ملتان روڈ سے آئی ہے۔" میں نے کہا۔ "اب آپ ویسا ہی کریں جیسا میں فرما رہا ہوں۔ ہم تمھارے پیچھے ہیں اور پیچھے کار پارکنگ ایریا میں موجود ہوں گے۔ شک ہو تو پلٹ کر دیکھ لینا۔ خطرہ ہو تو دوڑ کر آ جانا۔ ڈرا ڈز کرتے کشتوں کے پُشتے لگاتے نکل جائیں گے۔"

ٹیکسی ڈرائیور ٹھیک چھ بجے اِدھر اُدھر دیکھتا نمودار ہوا اور سیدھا اپنی ٹیکسی کی طرف یوں بڑھا جیسے دیہاتی گمشدہ بھینس سے گلے ملنے لپکتا ہے۔ محسن خان ذرا فاصلے پر ٹہل رہے تھے معلوم نہیں ان کے درمیان کیا گفتگو ہوئی لیکن چند منٹ میں صورتِ حال واضح ہو گئی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے رقم ان کے ہاتھ پر رکھی اور انھوں نے چابیاں دے کر ہاتھ ملایا۔ پھر ڈرائیور اپنی ٹیکسی لے کر روانہ ہو گیا اور محسن پلٹا۔

"ویری گڈ۔" میں نے کہا۔ "آدمی شریف تھا یا بزدل۔ ورنہ اکیلا نہ آتا۔"

"بائیس ہزار میں سودا بُرا نہیں رہا۔" محسن نے الف دین کو تھوڑا سا سمیٹ کر اپنے لیے پچھلی سیٹ پر تھوڑی سی جگہ بنائی۔ "میں نے اس سے کہا کہ خوش قسمت ہو ورنہ یہی ٹیکسی میں پندرہ سولہ ہزار سے زیادہ میں نہ خریدتا۔ بہت حیران ہوا میری بات پر۔"

"وہ تو ہونا ہی تھا۔ پیسے دینے سے انکار تو نہیں کیا تھا؟" میں نے کہا۔

"کیا تھا۔ میں نے کہا پھر چلو ٹیکسی کے مالک سے بات کر لو۔"

محسن بولا" اس پر اور حیران ہوا کہ کون مالک؟ میں نے کہا جس نے چابیاں دیتے وقت کہا تھا کہ بائیس ہزار سے ایک پیسہ کم نہیں لینا ہے۔ وہ خود منٹ لے گا تم سے۔ اس کے بعد نہیں بولا۔ ویسے یہ ڈراما کیا ہے؟"

ساندہ کلاں میں استاد ٹیڈی کے گھر پہنچنے تک میں نے ان کو مختصراً وہ سب بتایا جو پوسٹ آفس میں الف دین سے ملاقات کے بعد سے اب تک پیش آیا تھا۔ میرے انکشافات ان کے لیے سنسنی خیز ثابت ہوئے۔ ٹیڈی گھر پر نہیں تھا یہ بڑی تشویش کی بات تھی۔ ہم اس بے ہوش آدمی کو کب تک کار میں ڈال کے گھوم سکتے تھے۔ تھوڑی دیر میں اس کا ہوش میں آجانا لازمی تھا۔ اس بات کا امکان کم تھا کہ وہ شور ہنگامہ کرے پہلے تو میں اکیلا ہی تھا لیکن اب میرے ساتھ محسن بھی تھا اس کے باوجود اسے ہوٹل لے جانے میں خطرہ تھا۔

"یہ بہت غلط بات ہے کہ ہمارا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔" میں نے کہا اور گاڑی کو واپس کیا۔

"تنظیم کا ایک مستقل ہیڈ کوارٹر ضرور ہونا چاہیے۔" محسن نے مجھ سے اتفاق کیا۔

"اگر ہم اسی طرح ٹیڈی کے گھر کو استعمال کرتے رہے تو ایک نہ ایک دن ہماری وجہ سے ٹیڈی مشکل میں گرفتار ہو جائے گا اور ہم اس کی مدد بھی نہیں کر سکیں گے۔" محسن نے کہا۔

"ہم کوئی چھوٹا سا مکان خرید سکتے ہیں۔" رابعہ بولی۔ "جو کسی گمنام سی جگہ پر ہو اور محفوظ ہو۔"

"مکان خریدنے کے لیے پچاس ساٹھ ہزار روپے کی رقم درکار ہو گی۔" میں نے کہا۔

"میں بنک سے اپنا سب پیسہ نکلوا لیتی ہوں۔" رابعہ نے کہا۔ "ایک لاکھ سے اوپر ہی ہو گا۔"

"پہلی بات تو یہ ہے کہ اس میں خطرہ ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ ہو سکتا ہے کہ انکل رضوی نے بنک والوں کو ہوشیار کر دیا ہو۔"

رابعہ نے نفی میں سر ہلایا۔ "پولیس والے عدالتی احکامات کے بغیر کسی بنک منیجر کو پابند نہیں کر سکتے کہ وہ کسی اکاؤنٹ ہولڈر کو اس کا پیسہ نہ دیں اور یہ بات انکل رضوی بھی سمجھتے ہوں گے کہ بنک منیجر صاف انکار کر دے گا۔ وہ کہے گا کہ اگر آپ خود گرفتار کر سکتے ہیں تو کر لیں، میں چیک نہیں روکوں گا۔"

"فرض کرو انھوں نے کہا کہ ہم میں سے کوئی چیک لے کر پہنچے تو پولیس کو اطلاع دے دی جائے۔"

"وہ تمہارے لیے ایسا کہہ سکتے ہیں۔" رابعہ بولی۔ "میں نے ابھی تک کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ پولیس کے پاس میرے خلاف کون سی رپورٹ ہے؟"

"تم ایک مجرم کا ساتھ دے رہی ہو اور اس طرح شریک جرم ہو۔" میں نے کہا۔

"انکل کو پہلے میرے خلاف اس الزام کے تحت رپورٹ لکھوانی پڑے گی۔" رابعہ نے کہا۔ "اور یہ کہنا تو آسان ہے ثابت کرنا بہت مشکل ہے۔ خصوصاً ایک وکیل کے خلاف۔"

"یہ آخری پوائنٹ بہت اسٹرانگ ہے۔" محسن نے اتفاق کیا۔ "کوئی عدالت آسانی سے پولیس کے الزام سے مطمئن نہیں ہو گی۔ الزام لگانے والے ایس ایس پی صاحب ہیں تو مقابل نہ کوئی عام عورت ہے نہ کوئی عام وکیل۔ تمہاری گڈ وِل اب تک اچھی تھی۔"

"تھی کا کیا مطلب؟" رابعہ نے اسے ڈانٹا۔ "کیا اب خراب ہے؟"

"یہ مسئلہ متنازع ہے۔" میں نے رکھائی کے کہا۔ "آج تمہیں ایک ہم پیشہ وکیل ملا تھا۔ اس کے نقطۂ نظر میں اچھی نہیں رہی جبکہ میرے خیال میں بہت بہتر ہے...... لیعنی، بد نام جو ہوں گے تو کیا نام نہ ہو گا۔"

"خیر کل صبح میں خود بنک منیجر سے ملوں گی۔" رابعہ بولی۔ "چیک اسی کو دوں گی۔ وہ میرا بہت لحاظ کرتا ہے۔"

"کرنا بھی چاہیے۔" میں نے کہا۔ "جو نہ کرے وہ ذوقِ جمال سے عاری ہے۔ یا اس کی نظر کمزور ہے۔"

"وہ آدمی نہیں ربوبوٹ ہے۔" محسن نے فوراً تائید کی۔ "یا ابھی سن بلوغت کو نہیں پہنچا۔"

"یا وہ فرشتہ ہے۔" میں نے کہا۔ "کسی نامحرم کی طرف نظر اٹھا کے نہیں دیکھتا۔"

"دنیا کی سب عورتوں کو اپنی ماں بہن یا بیٹی سمجھتا ہے۔" محسن نے گرہ لگائی۔

"اے ماؤں بہنو، بیٹیو دنیا کی عزت تم سے ہے۔" میں نے

"کیا مصیبت ہے۔ تم دونوں عامل معمول کی طرح بولنے پر آ ہو تو رکنے کا نام نہیں لیتے۔" رابعہ نے جھنجلا کے کہا۔

"سوری۔ تو آپ فرما رہی تھیں کہ بنک منیجر مطلوبہ رقم آپ کو فوراً فراہم کر دے گا اور پولیس کو کانوں کان خبر نہیں ہونے دے گا۔" میں نے کہا۔ "پولیس اگر وہاں پہلے سے موجود ہوئی، کسی نے آپ سے کچھ نہ کہا مگر آپ کے ساتھ ہو لیا تو پکڑا جاؤں گا یا من ھو المطلوب۔"

"میں سیدھے راستے سے نہیں جاؤں گی۔" رابعہ نے کہا۔ "منیجر کے پاس پہنچنے کے لیے بنک کا دوسرا راستہ بغلی گلی میں کھلتا تھا اور بنکنگ کے اوقات ختم ہو جانے کے بعد سامنے والا دروازہ تو مقفل کر دیا جاتا ہے، بعد میں یہی دوسرا راستہ استعمال ہوتا ہے۔ ٹھیک ایک بجے بنک کے شٹر گرا دیے جاتے ہیں اور جو لوگ اندر موجود ہوں انھیں بھی اسی راستے سے نکالا جاتا ہے۔ اگر مجھے کوئی بات مخدوش نظر آئی تو میں منیجر سے بات کر لوں گی۔"

"ذرا مسکرا کے بات کرنا۔" محسن نے کہا اور رابعہ نے اسے خونخوار نظروں سے گھورا۔

"مکان خریدنے کے بجائے کرائے پر لینا بہتر ہے۔" میں نے کہا۔ "اب ہم ایک فیملی ہیں جس سے کوئی بھی انکار نہیں کرے گا۔ اگر مکان چھوڑنا پڑا تو نقصان چار چھ ماہ کے ڈپازٹ کا ہو گا۔"

"میں یہ سوچ رہی ہوں کہ جس شخص نے نواب خسرو جمشید بن کے مجھے کوٹھی بیچی تھی وہ خود تو اتنے عرصے کے بعد مایوس ہو چکا ہو گا۔" رابعہ بولی۔ "اس نے ہم سب کو اس کوٹھی کے نیچے بارودی سرنگ بچھا کے ایک ساتھ اڑا دینے کا سوچا تھا لیکن اسکیم ناکام ہو گئی۔ اسے لاکھوں کا گھاٹا خواہ مخواہ ہوا۔ اب کیوں نہ اسے بھی فروخت کر کے نقد رقم محفوظ رکھی جائے۔"

"تم اسے بیچو گی کیسے بی بی؟" محسن بولا۔ "ایس پی صاحب خریدار بن کے پہنچ جائیں گے۔"

"ایس پی صاحب نہ ہوئے، فرشتۂ غیب ہو گئے کہ ہر جگہ موجود۔" رابعہ نے کہا۔ "میں منظر کو پاور آف اٹارنی دے دوں گی، جنرل پاور آف اٹارنی۔ رقم وہ اپنے اکاؤنٹ میں رکھ سکتا ہے اور فون کرنے پر ہمیں فراہم کر سکتا ہے۔ وہ بہت نڈر اور چالاک آدمی ہے۔ پولیس کے ایس پی صاحب بھی اسے چکر نہیں دے سکتے۔"

"تمہاری تجویز بھی قابلِ عمل ہے عزیزہ۔" میں نے کہا۔ "لیکن تمہاری بات سے ہمیں کچھ اور سوجھ رہا ہے۔ کیوں نہ فی الحال ہم اسی کوٹھی کو اپنا مستقر بنا لیں جو آج تک مکینوں کو ترس رہی ہے۔ اپنی کوٹھی ہے، کچھ دن تو رہ لیں اس میں۔"

محسن اچھل پڑا۔ "موزوں ترین وقت پر آنے والا یہ موزوں ترین خیال ہے۔" وہ جوش سے بولا۔

وہ کوٹھی کس مپرسی کے عالم میں خانہ ویرانی کا مرقع عبرت بنی پڑی تھی جو رابعہ کے نام لاٹری کی طرح نکل آئی تھی۔ شکاری تو سمجھے تھے کہ ہم لاکھوں کا فائدہ دیکھیں گے تو فوراً اس میں منتقل ہو جائیں گے اور وہ دو چار لاکھ خرچ کر کے ایک ہی بار میں ہم سب کو شکار کر لیں گے۔ کوٹھی کی پیشکش کرنے والے نے ہمیں ایک انتہائی پُراثر اور دلگداز کہانی بھی سُنائی تھی تاکہ ہم شکوک کا شکار نہ ہوں۔ نواب خسرو جمشید بن کر آنے والے دو تھے جو ایک دوسرے سے ناقابلِ یقین حد تک مشابہ تھے۔ باری باری اصل بن کے آتے تھے لیکن دونوں جعلی تھے۔ ہم نے عقل سے کام نہ لیا ہوتا تو یقیناً ان کی سازش کا شکار ہو جاتے مگر اس قاتلانہ سازش کے بعد ہی ہم نے ایسا بندوبست کر لیا تھا کہ ایک کی موت یا عدم موجودگی میں دوسرا فوراً اس کا وارث اور جانشین ہو جائے اور ایک وصیت نامے کی رُو سے ہم سات افراد یکے بعد دیگرے قانونی طور پر حق وراثت استعمال کر سکتے تھے۔ ہماری اس چال نے دشمنوں کے لیے ہمارے قتل کو بے مقصد بنا دیا تھا۔ اب اس بات کو بھی زمانہ بیت چکا تھا اور یہ کوٹھی کاغذات میں رابعہ کی ملکیت ضرور تھی لیکن یاد کسی کو نہ تھی۔

اندر داخل ہونے کے بعد مجھے پرانے واقعات کی یادوں نے گھیر لیا لیکن رات ہونے لگی تھی اور ہمیں بہت کام کرنے تھے۔ میرے لیے سرِ فہرست کھانے کا مسئلہ تھا کیونکہ صبح ناشتے کے بعد سے میں نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ الف دین ہوش میں آ چکا تھا اور اسے اندر منتقل کرنے کے بعد اس سے ضروری معلومات حاصل کرنی تھیں۔ کوٹھی میں پانی تھا لیکن اور کچھ نہیں تھا۔ مثلاً بجلی تھی لیکن کسی ہولڈر میں بلب نہیں تھا۔ مجھے نازلی کے بارے میں بھی اسپتال سے خیریت دریافت کرنی تھی۔ اور لاہور ہوٹل سے اپنا سامان بھی اٹھا کے لانا تھا۔ رابعہ کے پاس اب صرف اٹھارہ سو روپے تھے۔ محسن کے پاس آٹھ سو اور میرے پاس اللہ کا نام۔ الف دین کے بائیس ہزار الگ تھے جن کو ہم مالِ غنیمت کے طور پر استعمال کر سکتے تھے۔ اس رقم پر الف دین کا قانونی یا اخلاقی حق نہیں بنتا تھا اور اصل مالک کا پتا چلا کے اسے رقم لوٹانا ناممکن تھا۔ اس قسم کی واردات کی خبر اخبار میں آتی بھی ہے تو یوں کہ فلاں علاقے میں کوئی شخص اتنے ہزار چھین کے بھاگ گیا۔ لٹنے والے کا صرف نام ہوتا ہے اور اگر اس کا سراغ لگانا ہو تو تھانے سے رابطہ قائم کرنا پڑتا ہے جہاں وہ رپورٹ لکھوانے گیا ہو۔

میں نے اسی رقم سے دو ہزار لیے اور محسن کو الف دین کی نگرانی اور رابعہ کی حفاظت کے لیے چھوڑ کر باہر نکلا۔ بلب تو مجھے قریب ہی ایک دکان سے مل گئے جو میں نے محسن کو پہنچا دیے تاکہ میری واپسی تک وہ اندھیرے میں نہ رہے۔ ریوالور محسن کے پاس بھی تھا لیکن الف دین کی جسمانی حالت ایسی نہ تھی کہ وہ مقابلہ کر سکتا۔ کار لے کر روانہ ہوتے ہی میں نے سب سے پہلے نظر آنے والے صدر بازار کے ایک عام سے ریسٹورنٹ میں دو کپ چائے پی اور وہاں جو کچھ مل سکا غنیمت جان کے کھایا۔ ایک گھنٹے بعد میں نے لاہور ہوٹل میں اپنا بل ادا کیا اور جتنی دیر میں پورٹر نے سامان میری کار میں رکھا، میں نے البرٹ وکٹر ہوسپٹل کا نمبر ملایا۔ نازلی بہت تیزی سے صحت یاب ہو رہی تھی اور ڈاکٹروں کو امید تھی کہ دو ہفتے میں وہ چلنے پھرنے کے قابل ہو جائے گی۔ واپسی پر میں نے بازار سے گزرتے ہوئے ضرورت کا بہت سا اسباب خریدا۔ ان میں دریاں اور لحاف

تھے، تکیے اور تولیے تھے۔ بجلی کا ہیٹر اور برتن تھے اور چائے کافی بنانے کا سامان تھا۔ سگریٹ تھے اور بسکٹوں کے ڈبے تھے۔ حالی روڈ کی واحد کھلی ہوئی دکان سے میں نے ایک ٹیپ ریکارڈر لیا۔ پھر میں نے ایک ہوٹل سے لنچ باکس لیے اور واپس پہنچا تو رات کے نو بجے تھے۔ میری عدم موجودگی میں رابعہ نے محسن کو باہر بھیجا تھا کہ ایک جھاڑو لائے اور خود ریوالور لیے الف دین کی پہریداری کے فرائض انجام دیتی رہی تھی جس کی عقل اتنی حسین اور جوان عورت کے ہاتھوں میں اتنا خطرناک آتشیں اسلحہ دیکھ کر خبط ہوگئی تھی۔ اسی عورت نے بعد میں انتہائی سگھڑ اور گھریلو خاتونِ خانہ کی طرح دوپٹے سے ناک منہ لپیٹ کے گرد آلود فرش کو جھاڑو سے صاف کیا۔ کہاں جھاڑو کہاں ریوالور۔ ایک ہتھیلی پہ حنا ایک ہتھیلی پہ لہو۔

جب میں پہنچا تو رابعہ گرد میں ٹُھنتنی بنی کھڑی تھی اور محسن خان نے تفتیشی افسر کے فرائض سنبھال لیے تھے کوٹھی میں تو شاید چار باتھ روم تھے مگر ہم نے اسی ماسٹر بیڈ روم میں ڈیرے ڈال دیے جو سب سے بڑا تھا اور اسی سے ملحق باتھ روم کو استعمال کیا۔ جتنی دیر میں رابعہ نے مناسب فاصلے سے تینوں دریاں بچھائیں، یوں کہ محسن درمیان میں رہا، ان پہ تکیے رکھے اور لحاف رکھے میں نے ٹھنڈے پانی سے غسل صحت فرمایا اور تقریباً بیمار ہو کے نکلا۔ محسن نے میری تقلید کی لیکن رابعہ بزدل ثابت ہوئی۔ اس نے ٹھنڈے پانی سے نہانے پر منہ ہاتھ دھونے کو ترجیح دی۔ پھر ہم سب نے کافی پی اور ہیٹر کو آن چھوڑ دیا تاکہ خالی کمرے میں کچھ حرارت پیدا ہو۔

"ابھی تک تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں کہ مجھے جی پی او میں داغِ مفارقت دے کر تم کہاں نکل گئی تھیں؟" میں نے تازہ دم ہو جانے کے بعد سگریٹ جلا کے دیوار سے تکیہ لگایا اور نیم دراز ہوگیا۔

"جب تم نے پوچھا نہیں تو میں کیا بتاؤں؟ اور کیوں بتاؤں کہ میں اس شخص کو استاد پیڈرو سمجھ کے اس کے تعاقب میں نکل کھڑی ہوئی تھی"۔ وہ بولی۔ "وہ کامرس بنک کے سامنے گاڑی سے اترا اور مجھے دیکھ کر پھر گاڑی میں بیٹھا اور بڑی عجلت میں روانہ ہوگیا۔ اسی سے مجھے شک ہوا۔ میں نے کار اس کے پیچھے لگا دی۔ ہائی کورٹ کے سگنل سے تو وہ سیدھا گزر گیا لیکن ہال روڈ کے چوراہے پر میں نے اُسے جا لیا، وہ کوئی اور تھا"۔

"وہ کوئی اور تھا"۔ میں نے اسی کے لہجے میں کہا۔ "اگر وہ سچ مچ استاد پیڈرو ہوتا تو تم کون سی توپ چلاتیں۔ وہ پلٹ کر تم پر گولی چلا دیتا تو میرا انجام وہی ہوتا جو مجھ سے پہلے فرہاد اور مجنوں کا ہو چکا ہے"۔

"خواتین کو ویسے بھی سراغرسانی میں ٹانگ اڑانے سے گریز کرنا چاہیے"۔ محسن نے کہا۔ "یہ جاسوسی ادب کی روایات کے خلاف ہے۔ کوئی عورت آج تک شرلاک ہومز یا جیمس بونڈ نہیں ہوئی"۔

"تم متعصب اور تنگ نظر مرد ہو، دونوں"۔ رابعہ نے خفگی سے کہا۔ "ابھی کل ہی میں نے استاد گولی والا کارنامہ انجام نہ دیا ہوتا تو فرہاد اور مجنوں بننے کا دعویٰ کرنے والے کہاں ہوتے؟ حوالات میں!"

"مجھے شک ہے تمہارے کمرے میں دھماکا کرنے والا بھی وہی تھا"۔ میں نے کہا۔ "استاد گولی کا گروہ۔ ان سے بھی پھر ملاقات کرنی ہے اور اسے ہوٹل فاران کے منیجر کے پاس لے جائیں گے کہ پہچانو! کیا یہی وہ میجر شریف ہیں؟ اس کی خاصی تذلیل ہوئی تھی اپنے رفقا کے سامنے!"

"کیا تم لوگ رات بھر مجھے یہاں رکھو گے؟" الف دین نے مسلسل خاموشی کو ناقابلِ برداشت پا کے کہا۔

"ہاں۔ رات بھر یا مہینے بھر۔ سال بھر"۔ میں نے کہا۔

"یوم حشر تک"۔ محسن نے کہا۔ "یہاں تمہاری تدفین اور آخری رسومات کی راہ میں کون حائل ہے؟"

"لیکن میرا قصور کیا ہے؟" الف دین بولا۔ "میں نے تم سے کچھ چھپایا تو نہیں اور تم سے تعاون کیا"۔

"محسن! یہ طافو کا بھائی ہے"۔ میں نے بے نیازی سے کہا۔ "جسے دلاور نے مروا دیا تھا"۔

"وہ چوہدری دلاور کا ٹرک چلاتا تھا"۔ محسن نے بھی بے نیازی کا انداز برقرار رکھا۔ "پھر تو ہم اسے نہیں چھوڑ سکتے"۔

"میری بیوی پریشان ہوگی، تھانے فون کر دے گی"۔ وہ بولا۔

"اچھا۔ تو تمہارے گھر میں ٹیلی فون بھی ہے"۔ میں نے کہا۔ "مذاق کر رہے ہو؟ یہاں لوگ سالوں انتظار کرتے ہیں اور ضرورت مند ہوتے ہیں۔ یونیورسٹی کے پروفیسروں کو فون نہیں ملتا اور تم جیسے بدمعاش کے گھر میں فون ہے"۔

"نمبر بتاؤ اپنا، ہم تمہاری بیوی کو بتا دیتے ہیں کہ تم آج نہیں آ سکو گے"۔ محسن بولا۔ "بہانہ کیا کرنا ہے؟"

"کہہ دینا... طافو کی طبیعت بہت خراب ہوگئی تھی"۔ وہ بولا۔ اس کی آواز پھر بھرّا گئی۔

"میں دیکھتی ہوں آس پاس کہیں فون ہوگا"۔ رابعہ نے نمبر نوٹ کرنے کے بعد کہا اور اکیلی باہر نکل گئی۔

"تمہاری بیوی بہت بہادر ہے"۔ الف دین نے کہا۔

"بہت بے رحم بھی ہے۔ ذرا کوئی بات ناگوار گزری اور ..." میں نے کہا۔ "میں اس کا چوتھا... نہیں پانچواں شوہر ہوں"۔

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ دلاور نے تمہارے بھائی کی لاش کے ساتھ کیا ظلم کیا ہے؟" محسن نے کہا۔

وہ چونکا۔ "نہیں... مجھے کیسے معلوم ہو سکتا ہے... تم بتاؤ"۔

"ہمیں بھی نہیں معلوم"۔ میں نے کہا۔ "لیکن ہم معلوم کر سکتے ہیں۔ لڑکی لاش اس کے گھر سے غائب ہوگئی تھی۔ اس کام میں پولیس اس کی مدد کی۔ راجہ فتح شیر نام کا ایک سب انسپکٹر چار سپاہیوں ساتھ گیا تھا۔ اس نے رشوت لے لی اور لاش کو اِدھر اُدھر کر ... ہم اس سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ لاش کہاں ہے؟"

"اور یہ بھی معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ انہوں نے قاتل کو بے گناہ ... نے کا کیا معاوضہ لیا ہے"۔ محسن بولا۔

"تم نے جو کچھ مجھے بتایا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تم پہلے کسی ... بات فروش کے لیے کام کرتے رہے ہو"۔ میں نے کہا۔

"مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ منشیات بھی بیچتا ہے"۔ الف دین نے احتجاج کیا۔ "وہ گڑ چاول کا آڑھتی تھا"۔

"جب تم پکڑے گئے تو تم نے اس سے علیحدگی اختیار کر لی"۔ ... نے کہا۔ "اس نے تمہیں رہائی دلائی ورنہ تم جیل جاتے اور تم نے ... کی نیکی کا یہ صلہ دیا؟"

"میں کوئی غلط کام کرنا نہیں چاہتا تھا"۔ وہ بولا۔

"تمہارے چاہنے کی بات نہیں، یہ لوگ کمبل ہوتے ہیں"۔ میں ... کہا۔ "کوئی انہیں چھوڑنا چاہے تو یہ اس کو نہیں چھوڑتے۔ کیونکہ ان ... ڈر ہوتا ہے کہ گھر کا بھیدی لنکا ڈھانے پر نہ تُل جائے"۔

"انھوں نے مجھے بھی وہی دھمکی دی تھی جو تم نے دی تھی"۔ وہ ... سے بولا۔ "رحمت کباڑی نے کہا تھا کہ میری بچی کو میری نظروں کے ... منے ذبح کر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے گا"۔

"تمہارا مطلب ہے رحمت کباڑی بھی پہلے منشیات کا دھندا ... تا تھا؟" میں نے کہا۔

"میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ جو مال میں لاہور سے کراچی کے ... لو کریم کے لیے لے جا رہا تھا اس میں چاول اور گڑ کی بوریوں ... درمیان ایک بوری میں ہیروئن تھی"۔ الف دین نے کہا۔ "سب ... پاس ایک جیسی تھیں۔ انھوں نے اپنی شناخت کے لیے کوئی نشانی ... ہوگی۔ کراچی میں ٹول پلازہ سے آگے نکلتے ہی مجھے سڑک پر پولیس ... سمگلرز کے جوان نظر آئے"۔

"رحمت کباڑی تمہارے ساتھ نہیں تھا؟" میں نے کہا۔

"تھا لیکن اس نے مجھ سے پہلے سمجھ لیا تھا کہ معاملہ گڑبڑ ... ہے"۔ وہ بولا۔ "مجھے کیسے شک ہو سکتا تھا۔ پولیس تو پشاور سے کراچی ... تک ہے اور ناجائز مال روز پکڑا جاتا ہے لیکن مجھے معلوم ہو ... تب بھی میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ میں ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ ... نے ایک دم دروازہ کھول کے چھلانگ لگائی اور کھیتوں میں غائب ہوگیا۔ میں نے دوبارہ اس کو نہیں دیکھا۔ تھانے میں مجھے بہت مار پڑی لیکن میں وہی کہتا رہا جو سچ تھا۔ مال کے اصل مالک بھی مُکر گئے اور سیٹھ کریم نے بھی پہلے تو مجسٹریٹ کے سامنے مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ یہ ڈرائیور پہلی بار آیا ہے اور ہیروئن کی بوری اگر کسی نے رکھی ہوگی تو اسی کو معلوم ہوگا"۔

"ایک پوری بوری ہیروئن کی؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ اس میں بھی گڑ اور چاول تھے"۔ الف دین بولا۔ "درمیان میں چار کلو کی تھیلی چھپا دی گئی تھی۔ سیٹھ کریم بعد میں تھانے پہنچا اور مجھ سے ملا۔ اس نے رحمت کباڑی کے متعلق پوچھا اور یہ پوچھا کہ آخر پولیس کو کس نے خبر دی تھی؟ اسے یقین تھا کہ مخبر کی مدد کے بغیر پولیس کو کچھ معلوم نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ تھانیدار سے باتیں کرتا رہا اور اس رات مجھے زیادہ مار پڑی۔ پہلے وہ پوچھ رہے تھے کہ مال کس کا ہے؟ پھر وہ پوچھتے رہے کہ میں نے کس کو بتایا تھا جس نے کسٹم کے ایک اعلیٰ افسر کو فون کر کے ٹرک کا نمبر تک بتا دیا تھا۔ جب انھیں میری بے گناہی کا یقین آگیا اور میں مرنے کے قریب ہوگیا تو کریم سیٹھ پھر آیا اور اس نے مجھ سے کہا کہ معاملہ دبا دیا گیا ہے۔ آدھی رات کو مجھے چھوڑ دیا گیا۔ باہر رحمت کباڑی موجود تھا۔ اس نے مجھے جیپ میں بٹھا لیا اور وہ مجھے کسی کوٹھی میں لے گئے"۔

"کہاں؟ کراچی میں یا لاہور میں؟" میں نے کہا۔ اسی وقت رابعہ اندر آئی اور میرے قریب بیٹھ گئی۔

"وہیں کراچی میں۔ مجھے تو اس علاقے کا نام بھی معلوم نہیں"۔ الف دین بولا۔ "وہاں اور بھی دو افراد تھے"۔

"تم اگر تصویر دیکھو گے تو ان کو پہچان لو گے؟" میں نے کہا۔

"تمہاری بیوی بہت عجیب عورت ہے"۔ رابعہ نے کہا۔ "میری اطلاع پر چلّانے لگی کہ وہ مرنی ہوگا، اسے بیوی کا خیال نہیں، بھائی کی خاطر نکل گیا۔ گھر والی مرتی ہے تو مر جائے۔ پھر وہ مجھ سے پوچھنے لگی کہ تو کون ہے اس کی؟"

"وہ زبان دراز عورت ہے۔ محبت کرتی ہے نا اس لیے ہمیشہ شک اور حسد میں مبتلا رہتی ہے"۔ الف دین بولا۔

میں نے اور رابعہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ یہ بھی کیا انداز ہے محبت کا۔ لیکن یہ خوبصورت مکالموں اور دوگانوں والی فلمی محبت نہیں تھی۔ حقیقی زندگی کی ایک تصویر تھی جس میں سارے رنگ سچے تھے۔ نفرت کے بھی اور محبت کے بھی۔

"میں نے پوچھا تھا کہ تم تصویر کی مدد سے سب کو شناخت کر لو گے؟" میں نے کہا۔

"میرا خیال ہے پہچان لوں گا"۔ وہ بولا۔

"اچھا آگے چلو۔ ان لوگوں نے کیا کہا تم سے؟" میں نے پوچھا۔

وہی جو میں نے بتایا۔ وہ چاہتے تھے کہ میں بدستور کام کرتا رہوں۔" الف دین بولا۔" ایسا کبھی کبھار ہو جاتا ہے۔ انھوں نے میری تکلیف کے بدلے مجھے پانچ ہزار بھی پیش کیے لیکن میں نے انکار کر دیا کہ میں یہ کام نہیں کر سکتا۔"

" اگر وہ تمھیں قتل کر دیتے۔" محسن نے کہا۔" اور طافو کی لاش کی طرح تمھاری لاش بھی غائب کر دیتے؟"

" ان کا ارادہ یہی تھا لیکن میں نے ان کے پاؤں پکڑ لیے تھے اور رو دھو کر انہیں قائل کر لیا کہ میں کبھی اپنی زبان سے ایک لفظ نہیں نکالوں گا۔" الف دین بولا۔" انہیں رحم آ گیا اور انھوں نے مجھے دھمکی دے کر چھوڑ دیا۔"

" لیکن آج تم نے وعدہ خلافی کرتے ہوئے ہمیں ان کے خلاف معلومات فراہم کر دی ہیں۔" میں نے کہا۔

" ہاں۔ اب وہ پہلے والی بات نہیں رہی۔ انھوں نے طافو کو مار ڈالا ہے۔ میں خاموش نہیں رہ سکتا۔" وہ بولا۔

" تم کیا کرو گے؟ بدلہ لو گے ان سے؟" محسن نے کہا۔

" میں ان کے خلاف پولیس کو رپورٹ کروں گا۔" وہ بولا۔ "عدالت میں ان کے خلاف گواہی دوں گا۔"

" مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔" اور پولیس نے طافو کے قتل کا کیس تم پر بنا دیا پھر؟"

" مجھ پر؟ میں اپنے بھائی کو کیسے قتل کر سکتا ہوں؟" وہ بولا۔

" جیسے ہابیل نے قابیل کو کیا تھا۔" میں نے کہا۔" دنیا میں ہر روز ہوتا ہے یہ تماشا۔ سوال تو صرف یہ ہے کہ کون کس پر کیا ثابت کر سکتا ہے اور تمھارے مقابلے میں ان کے پاس سب سے بڑی دلیل ان کی دولت ہے۔ طافو کا قتل پہلے ثابت ہو گا۔ اس کے بعد قاتل کی بات ہو گی۔ ابھی تو قتل کی خبر بھی صرف ہم کو ہے۔"

" یا اس سب انسپکٹر اور اس کے چار ماتحتوں کو جن کا منہ بند ہے۔" محسن نے کہا۔" ہم ان کا منہ کھلوانا چاہتے ہیں پھر وہ بتائیں گے کہ طافو کی لاش کہاں گئی۔ عدالت میں نہ دلاور پہ جرم ثابت ہو سکتا ہے نہ اس جرم پر پردہ ڈالنے والوں کے خلاف الزام لگایا جا سکتا ہے۔ یہ جرم بھی ہم ثابت کر سکیں گے اور انہیں قانون کے مطابق سزا بھی ہم دیں گے۔ تم کو ہمارا ساتھ دینا ہو گا۔ ہمت ہے تم میں؟"

" ہمت تو ہے۔ لیکن..... تم لوگ کون ہو؟" الف دین نے متذبذب لہجے میں کہا۔

" وقت آنے پر معلوم ہو جائے گا۔" محسن نے کہا۔" ابھی صرف اتنا سمجھ لو کہ دلاور اور اس کے ساتھی ہمارے بھی دشمن ہیں۔ انھوں نے جتنا نقصان تمھیں پہنچایا ہے اس سے ہزار گنا نقصان ہمارا کیا ہے اور وہ پکڑے نہیں گئے ہیں۔ وجہ وہی ہے کہ اپنی دولت اور اثر رسوخ سے وہ ثبوت اور شہادت خرید لیتے ہیں۔ ان کے خلاف ہو اور وہ بھی جس سے ان کی بے گناہی...

" تم نے ذکر کیا تھا کہ دلاور نام کا ایک شخص ... کے ناجائز کاروبار میں لاکھوں سے کروڑوں بنا رہا ہے۔" کہا۔" تمھیں یہ کیسے معلوم ہوا؟"

" مجھے طافو نے بتایا تھا۔ طافو کا ایسے لوگوں سے ..." الف دین بولا۔

" خود تم نے کبھی دلاور کو دیکھا تھا؟" رابعہ نے ...

" نہیں۔ بہت سے اجنبی چہرے بھی سامنے آتے ... دلاور انہی میں شامل تھا تو الگ بات ہے۔" الف دین ...

رابعہ نے میرے بریف کیس میں سے ایک لفافہ ... اس میں سے چند تصویریں نکال کے الف دین کے سامنے ... "غور سے دیکھو، ان میں سے کس کس کو پہچان سکتے ہو؟"

الف دین نے ایک ایک تصویر اٹھا کے روشنی ... غور سے دیکھی۔ میں اس کی صورت کے تاثرات کا غور ... کرتا رہا کہ کسی تصویر کی شناخت کا ردِ عمل ظاہر ہو تو نوٹ ... اس کا چہرہ سپاٹ رہا۔ ڈی سلوا، استاد پیڈرو، میر ... اور دلاور میں سے وہ کسی کو نہیں پہچان سکا۔ اس سے ... سی مایوسی ہوئی۔ رابعہ نے تصویریں واپس بریف کیس میں ...

" جو ٹرک تم چلاتے تھے اس کا نمبر کیا تھا؟" میں نے ...

" اب تو مجھے یاد نہیں۔" وہ بولا۔" ایک سال پہلے کی بات ..."

" اس ایک سال میں تم ٹرک ڈرائیور سے لیٹرے کیسے ... میں نے کہا۔" جب کہ تم کوئی غلط کام کرنے کے خلاف تھے؟"

" میں نے تو کوشش کی تھی کہ ٹرک ڈرائیور ہی رہوں ..." دین نے کہا۔" لیکن ایک تو مجھے منع کر دیا گیا تھا۔ انھوں نے ... اگر تم ہمارے لیے کام نہیں کر سکتے تو پھر کسی اور کے لیے ... کرو گے۔ تم کسی اور ٹرک پر نظر آئے تو تمھاری خیر نہیں ... بھی ڈرتا تھا کہ ایسا ہی کھیلا پھر نہ ہو جائے۔"

" لیکن تم نے ڈرائیونگ لائسنس کی تجدید حال ... ہے۔" میں نے کہا۔

" وہ بس ایسے ہی کہ ضرورت پڑنے پر کام آ جائے ... " اومنی بس کا ڈرائیور تو بن ہی سکتا ہوں میں۔ لاہور ... روٹ پر لاری چلاتا رہا ہوں مگر وہ ڈیوٹی بہت سخت ... میں دو پھیرے کرنے پڑتے تھے۔ آدھی رات کو گھر ... تھا اور صبح چھ بجے پھر ڈیوٹی۔ میں بیمار پڑ گیا اور فاقو... آ گئی۔ ایک دن طافو مجھے دیکھنے آیا تو مجھے ایک ریوالو... اس نے کہا بھائی الف دین یہ کوئی زندگی نہیں ہے ...

... فاقے کرتے ہو۔ دیکھو کمانے والے کس طرح کما رہے ہیں ... عیش کر رہے ہیں۔ ہمت نہیں ہے تو سب کو مار دو اور ... خودکشی کر لو ورنہ اس سے کچھ کر کے دکھاؤ۔ یہ ہر خزانے کی چابی ہے۔ میں بہت ڈرا اور اپنی بیوی سے بھی ریوالور چھپا لیا مگر ... آہستہ شیطان مجھے بہکانے لگا۔ ایک بار میرا سسر آیا ہوا تھا۔ ... نے زمین بیچ دی تھی اور وہ شہر میں کھوکھا لگانا چاہتا تھا۔ ... کے بیٹے سب کماتے ہیں اور باہر سے پیسہ بھیجتے رہتے ہیں۔"

" تم نے اسی کو لوٹ لیا۔" محسن نے کہا اور رابعہ کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔

الف دین جھینپ کر مسکرانے لگا۔" اسے کون سی ضرورت ... تھی پیسے کی۔ وہ سو رہا تھا کہ میں رات کو اٹھا، منہ پر چادر کا ڈھاٹا باندھ کے اس کے کمرے میں گھس گیا۔ ریوالور دیکھ کر اس کی آواز بند ہو گئی۔ ... ہزار روپے تھے اس کے پاس جو اس نے سرہانے رکھے ہوئے تھے، تکیہ بنا کے سو رہا تھا۔ میں نے سب باندھ لیے۔ پھر اسے باندھا ... کمرے کو باہر سے بند کر کے باہر گیا۔ سارا پیسہ زمین کھود کے ... اور کپڑے بدل کے سو گیا۔ صبح میری آنکھ تو جلدی کھل گئی تھی ... پڑا رہا۔ میری بیوی اٹھی اور اس نے باپ کو جگانا چاہا تو باہر کنڈی لگی دیکھی۔ جب اس نے چیخ پکار مچائی تو میں اٹھا۔ بڈھے ... پر شک ہونے کا سوال ہی نہ تھا لیکن طافو کو معلوم ہوا تو وہ ... گیا اور بہت خوش ہوا۔"

ایک بار پھر ہم سب کو زور سے ہنسی آئی۔" اچھا راستہ دکھایا چھوٹے بھائی نے بڑے بھائی کو۔"

" سب قسمت کے کھیل ہیں۔ وہ خود کس راستے پر نکل گیا ہے ... اب واپس ہی نہیں آئے گا۔" الف دین ایک بار پھر رونے لگا۔" شاید ... لوگوں نے مجھے بچا لیا۔ میں خود کو بہت چالاک سمجھتا تھا۔ کسی کو قتل کر دیتا تو پھانسی چڑھ جاتا۔"

" تمھارا وہ ریوالور اب کہاں ہے؟" میں نے کہا۔" اگر آج تمھارے پاس ہوتا تو کام نہ آتا؟"

" اسی ڈر سے میں نے ریوالور ساتھ رکھنا چھوڑ دیا تھا۔" الف دین ... کہ اگر کسی دن استعمال نہ کر بیٹھوں۔ ایک بار ستر ہزار کی رقم ہاتھ آئی ... تو وہ ایک بہانہ بن گیا۔ میرے دل میں لالچ جاگ اٹھا اور میں ... لوٹتا جو مجھ پہ شک نہیں کر سکتے تھے۔ پاس پڑوس کے ... جاننے والے، رشتے دار اور عزیز۔ مجھے معلوم ہو جاتا تھا کہ ... کس کے گھر سے نقد یا زیور کی صورت میں زیادہ مال ملنے کی ... کہاں کون اکیلا ملے گا اور مقابلہ نہیں کرے گا اور کس کا گھر ... اکثر گھروں کو میں نے اس رات کو نشانہ بنایا جب گھر کی ... شادی کر کے لوٹی تھیں اور انھوں نے سارا گہنا پہن رکھا تھا۔

عام دنوں میں وہ زیور کو لاکر میں رکھتی تھیں۔ میں پہلے سے مشورہ دیتا تھا کہ رات کو بس لے کر پنڈی جانا ہے اور خود اپنا حلیہ بدل کے پہنچتا تھا۔ دو گھر ایسے تھے جہاں نقد رقم صرف ایک رات کے لیے آئی تھی۔ ایک کا پرائز بونڈ نکلا تھا اور جس دن اسے پچاس ہزار نقد ملے اس روز دیر ہو جانے کی وجہ سے وہ رقم بنک میں جمع نہ کروائی جا سکی۔ دوسرے گھر میں ایک ٹھیکیدار رہتا تھا، وہ کہیں سے رقم لے کر آ رہا تھا کہ بریف کیس کھل گیا اور سارے نوٹ گلی میں بکھر گئے۔ میں نے بھی دوسرے لوگوں کی طرح اس کی مدد کی اور جب وہ ساری رقم سنبھال کے چلا گیا تو اس کے پیچھے گیا اور اس کا گھر دیکھ آیا۔ دیکھنے والے تو کتنے ہی لوگ تھے، وہ کس پہ شک کرتا۔ پھر ایک رات خلاف توقع میرا پردہ چاک ہونے لگا تو مجھے ریوالور استعمال کرنا پڑ گیا۔ وہ گلی کا ایک لڑکا تھا جس کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ میں اسے کمزور اور بزدل سمجھتا تھا اور اس رات گھر میں وہ اکیلا تھا۔ اس کا بڑا بھائی اور اس کے والدین تقریب میں کسی دوسرے شہر گئے ہوئے تھے۔ وہ بیوی کی بیماری کے باعث نہ جا سکا تھا۔ مجھے معلوم تھا اس کی بیوی کو شادی میں کتنا زیور ملا تھا جو وہ گھر میں رکھتی تھی۔ اس لڑکے نے میرا راستہ روک لیا، بیوی کے منع کرنے کے باوجود۔ شاید وہ نئی نویلی دلھن کے سامنے خود کو بزدل شوہر ثابت کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے اس پہ گولی چلانی پڑی اور میں بڑی مشکل سے جان بچا کے فرار ہوا۔ ایک مہینے تک وہ لڑکا موت اور زیست کی کشمکش میں مبتلا رہا اور میں سخت اذیت میں۔ اگر وہ مر جاتا تو میرے لیے مصیبت ہو جاتی۔ معلوم نہیں میں کیا کرتا۔ تمام عمر ملامت کا عذاب جھیلنے کے بجائے میں دو چار سال کی قید کاٹنے کو ترجیح دیتا یا پاگل ہو جاتا۔ اس کے بعد میں نے ریوالور کبھی ساتھ نہیں رکھا۔ چوری ڈکیتی کی سزا دو چار سال ہی ہوتی ہے نا، پھانسی کے تختے پر تو نہیں لٹکنا پڑتا۔"

" میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تم آدمی برے نہیں ہو۔" میں نے کہا۔" پہلے تم حالات کی سازش کا شکار ہوئے۔ پھر تمھیں غلط مواقع بھی ملے۔ ایک ریوالور ہاتھ آ گیا، مفت میں ستر ہزار ہاتھ لگ گئے۔ تم کچھ ذہین تھے کہ تم نے آغاز گھر سے کیا۔ لوگ نیکی پہلے اپنوں سے کرتے ہیں پھر غیروں سے۔ تم نے اس کا الٹا کیا۔ اگر تم پکڑے جاتے تو شاید تمھارے خلاف سخت کارروائی نہ ہوتی۔ اس بات کا امکان تھا کہ لوگ تمھیں مار پیٹ کے اور شرمندہ کر کے چھوڑ دیں۔ اس سے تمھاری حوصلہ افزائی ہوتی۔ یہاں تک کہ آج قسمت نے تم کو مجھ سے بھڑا دیا اور یہی تقدیر کی ستم ظریفی ہے۔ تم نے مجھے لوٹا نہیں تھا۔ میں نے تم کو لوٹ بھی لیا اور گرفتار بھی کر لیا۔ اب بتاؤ تم کیا چاہتے ہو؟"

" تم وہی کرو گے جو تم چاہتے ہو۔" وہ بولا۔" پھر مجھ سے

کیوں پوچھتے ہو؟

"تمھیں اندازہ نہیں کہ ہم کیا کر سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہمارے مراسم بہت اونچی سطح پر پولیس سے بھی ہیں۔ اگر ہم تم کو پولیس کے حوالے کردیں تو تمھیں اپنے سب گناہوں کی سزا مل جائے گی۔ وہ خود ایک ایک واردات کی تفصیل پوچھ لیں گے اور سب حساب برابر کردیں گے۔ دوسرا طریقہ وہ ہے جو ہمارا طریقہ ہے۔ ہم تھانے کچہری کے لمبے چکر میں نہیں پڑتے جہاں چالان پیش ہونے سے آخری اپیل کے مسترد ہونے تک ہزار مرحلے آتے ہیں۔ سچ میں جھوٹ شامل کردیا جاتا ہے اور جھوٹ میں سچ۔ انصاف کی کرسی پر بیٹھنے والا سب کچھ سمجھنے کے باوجود فیصلہ انہی شہادتوں پر کرتا ہے جو اس کے سامنے اور دنیا کے سامنے پیش کی جاسکیں اور اس عمل کو پیچیدہ بنا کے اتنا طویل کردیا جاتا ہے کہ فیصلہ کئی سال بعد ہوتا ہے اور بعض اوقات غلط ہوجاتا ہے۔ اس میں منصف کا نہیں' نظامِ انصاف کی مشینری کا قصور ہوتا ہے۔ ہم حقائق سے آگاہی کے بعد ہی فیصلہ کرتے ہیں۔ مثلاً تم اپنا کیس لو۔ اب ہمیں کیا ضرورت ہے کسی ثبوت کی یا گواہ کی، بحث اور جرح کی۔ ہم تم کو وہی سزا دے سکتے ہیں جو قانون کی کتابوں میں لکھی ہوئی ہے۔"

"کیا تم نے قانون کی کتابیں پڑھی ہیں؟" الف دین نیم سنجیدہ لہجے میں بولا۔

"ہاں، میں نے پڑھی ہیں۔" رابعہ نے کہا۔ "میں اپنا نام تمھیں نہیں بتاؤں گی لیکن نیچے سے اوپر تک سب وکیل' مجسٹریٹ اور جج مجھے جانتے ہیں۔ میں ہائی کورٹ میں مقدمات لڑ چکی ہوں۔ کبھی کوئی مقدمہ نہیں ہاری اور میرے ماتحت چار وکیل ہیں۔"

الف دین کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ اسے رابعہ کی کہی ہوئی کسی بات کا یقین نہیں آیا تھا۔ اگر کوئی عورت واقعی اتنی بڑی وکیل ہو تو اسے کیا ضرورت ہے ایک مفرور اشتہاری مجرم اور دوسرے اتنے ہی بڑے بدمعاش کا ساتھ دینے کی اور اپنی کوٹھی کو چھوڑ کر اس خاک دھول سے اَٹی ہوئی زمین پر بسیرا کرنے کی۔ اگر رابعہ یہ کہہ دیتی کہ اس لاکھوں کی کوٹھی کی مالک بھی وہی ہے تو الف دین اسے سفید جھوٹ قرار دیتا۔ وہ رابعہ کو مٹی میں بھوت بنا جھاڑ دیتے بھی دیکھ چکا تھا اور ہاتھ میں ریوالور لے کر اس سُنسان کوٹھی میں تنہا پہرہ دیتے بھی۔ اس نے رابعہ کو اندھیری رات میں تنہا باہر جاتے بھی دیکھا تھا اور خانہ دار عورت کی طرح بستر بچھاتے، چائے اور کافی بناتے بھی اور برتن دھوتے بھی۔ اتنی بڑی وکیل کیا ایسی ہوتی ہے؟ اوّل تو عورت وکیل ہوتی ہی کب ہے۔ جو چند نظر آتی ہیں ان میں اتنی ناموری کا دعویٰ کون کرسکتی ہے۔

"تم جاننا چاہو گے کہ تمھارے جرائم کے پیشِ نظر تمھاری سزا کیا ہوگی؟" رابعہ نے کہا۔ "تم سمجھو گے نہیں ورنہ میں ضابطہ [illegible] کی دفعات کا حوالہ دے سکتی تھی۔ تم کو ایک لاکھ جرمانے [illegible] کم سات سال قید بامشقت کی سزا ہونی چاہیے۔"

"کیا تمھارا اپنا جیل خانہ بھی ہے؟" الف دین کچھ خوفزدہ [illegible]

"جیل کیا ہوتی ہے؟" میں نے کہا۔ "ایک ایسی جگہ جہاں [illegible] اپنی مرضی سے کچھ نہیں کرسکتا۔ وہ دوسروں کا غلام ہوتا [illegible] کا اپنا کوئی کام نہیں آسکتا۔ اس دنیا میں رہ کے بھی آدمی [illegible] رہ سکتا ہے۔ اس کے لیے نہ زنجیروں کی ضرورت ہے [illegible] کی۔ فرض کرو ہم جرمانے کے طور پر تمھاری ساری املاک [illegible] تمھارے گھر کو آگ لگا دیں جس کی کسی چیز پر تمھارا حق نہیں۔ پھر [illegible] اندھا کردیں۔"

"نہیں، تم ایسا نہیں کرسکتے۔" وہ دہشت زدہ ہو کے [illegible]

"تم اندھیرے میں قید ہوجاؤ گے۔" میں نے اپنی بات جاری [illegible] اندھیرے کی دیوار سے نکلنا تمھارے لیے جیل کی دیوار سے [illegible] زیادہ ناممکن ہوگا۔ تم دوسروں کے غلام رہو گے اور اپنے [illegible] سب تمھیں چھوڑ جائیں گے۔ کوئی تمھارے کام نہیں آسکے گا [illegible] گنوا دو گے پھر حاصل نہ کرسکو گے۔ اکیلے ہو جاؤ گے اور [illegible] زیادہ عذاب جھیلو گے جو قید بامشقت کاٹنے والے دیوار [illegible] کے پیچھے جھیلتے ہیں۔ تمھارے بیوی بچے جو پُرآسائش زندگی [illegible] رہے ہیں اس سے محروم ہو کے فٹ پاتھ پر تمھارے ساتھ بھیک [illegible] گے۔ بھائی ہوتا تو تمھارے کام آتا، شاید دو وقت کی روٹی [illegible]

"بس... بس کرو... خدا کے لیے بس کرو۔" وہ دیوانہ [illegible] لگا۔ "مجھے یہ سب کچھ مت بتاؤ۔"

"یہ سب تمھارے ہی سوال کا جواب ہے۔" میں [illegible] سے کہا۔ "جرائم کا اعتراف تم کرچکے ہو، سزا دینے کا اختیار ہمارا [illegible] ہے اور اس کے ذرائع بھی ہیں۔ اب تم بتاؤ کہ تمھارا انتخاب [illegible] تیسرا اور آخری راستہ توبہ کا ہے۔ تم نے جو کچھ کیا اُسے بھول [illegible] زندگی کا آغاز کرو۔ جو سزا دنیا کا قانون تم کو نہ دے سکا وہ [illegible] حساب آنے پر ضرور ملے گی۔ دنیاوی زندگی میں اس موقعے کو [illegible] جانو اور اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھو ورنہ تقدیر یہ موقع سب [illegible]

"میں... میں وعدہ کرتا ہوں، میں محنت کروں گا۔ کوئی غلط کام نہیں کروں گا۔"

"تمھیں ابھی یہ خوش فہمی ہوگی کہ وعدہ کر کے تم ایک [illegible] تو پھر ہم کہاں اور تم کہاں۔" میں نے کہا۔ "تم نے دوبارہ [illegible] اختیار کرلی تو ہم کو کیسے معلوم ہوگا؟ لیکن الف دین! ہم [illegible] پھر ہم تمھارے گھر آئیں گے۔ تم پولیس کو دھوکا دے سکتے [illegible] نہیں۔ تم اس شہر سے چلے جاؤ تب بھی ہم تمھیں تلاش کر [illegible] اور جب ملیں گے تو کچھ پوچھیں گے نہیں، صرف اپنی سزا پر عمل درآمد کریں گے اور لوٹ جائیں گے۔"

میرا حربہ کارگر رہا۔ الف دین اتنا ڈر گیا تھا کہ کانپنے لگا تھا۔ اس کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔

"یہ عجیب اتفاق ہے کہ تم مل گئے۔" میں نے کہا۔ "آج کی رات ہم ویسے بھی طافو کے قتل کے سلسلے میں کچھ لوگوں کو سزا دینے کے لیے جانے والے تھے۔ وہ قاتل تو نہیں ہیں لیکن انہوں نے قاتل کی مدد کی ہے اور... سزا دینے کا فرض ادا کرنے کے بجائے قاتل سے پردہ داری کی قیمت وصول کر کے اسے بچا لیا ہے۔ قاتل سے ہم بعد میں نمٹ لیں گے۔ پہلے ذرا ان کے مقدمے کا فیصلہ کرلیں جو قاتل کے مددگار بنے۔ ان کو سزا ہوگی تو قاتل کو معلوم ہوجائے گا کہ اس کے حفاظتی انتظامات کتنے کمزور اور ناقص تھے۔ اسے پیغام مل جائے گا کہ بالآخر اس کا نمبر بھی آئے گا۔ ہم آج رات یہی معلوم کرتے کہ طافو کی لاش کو کہاں ٹھکانے لگایا گیا ہے مگر لاش حاصل نہ کرتے۔ اب تم لاش کے وارث ہو۔ کیا تم نہیں چاہو گے کہ لاش کی صحیح طریقے پر تدفین ہو اور اس کی آخری رسوم ادا ہوں اور لاش نہ ملے تب بھی کیا تم ان کو سزا دینے والوں کے ساتھ نہیں رہو گے؟ ہمارا انصاف نہیں دیکھو گے؟"

"میں... میں خود ان کو سزا دوں گا۔" الف دین نے مٹھی بند کر کے دانت پیستے ہوئے کہا۔ "وہ میرا ایک ہی بھائی تھا، جیسا بھی تھا مجھ سے چھوٹا تھا، محبت بھی کرتا تھا مجھ سے۔ اگر میں اس کی جان مانگتا تو جان دے سکتا تھا۔" وہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ میں نے گھڑی دیکھی تو رات کے دس بجے تھے۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے اس کے کندھے پر تھپکی دی۔ "رونے سے کام نہیں چلے گا۔ ہمارا ساتھ دو۔ تم خود دیکھ لو گے کہ انصاف کیسے ہوتا ہے۔ اگلے چند دن میں ہم کیا کرنے والے ہیں، یہ بتانا قبل از وقت ہے لیکن ابھی ایک گھنٹے میں ہم کو توپخانہ بازار جانا ہے۔ ہاتھ منہ دھو کے کھانا کھالو۔"

ایک گھنٹے کے بجائے ہم صرف آدھے گھنٹے میں تیار ہوگئے۔ میں نے اپنا پورا پلان محسن کو بتایا اور الف دین کو اتنا ہی بتایا گیا تھا جتنا اس کے لیے جاننا ضروری تھا۔ میں نے تھانیدار کی وردی پہنی تو الف دین نے مجھے بڑی حیرانی سے دیکھا۔ اگرچہ رابعہ آخری وقت تک پُرسکون رہی لیکن میں اور محسن باہر نکلے تو اس نے آہستہ سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو اس کا رنگ اُڑا ہوا تھا۔

"سکندر! ذرا احتیاط سے کام لینا، میری خاطر۔"

میں ہنسا۔ "مجھے لام پر جانے والے سپاہی کی بیوی کی طرح الوداع مت کہو۔ اس سے میرا حوصلہ کم ہوتا ہے۔ جیب میں تمھارا تصور کروں تو میرے سامنے تمھارا مسکراتا ہوا پُرامید چہرہ ہونا چاہیے۔ پہلے بھی سمجھایا ہے تمھیں۔"

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "میں تو سمجھتی ہوں، دل نہیں سمجھتا۔"

"وکیل صاحب۔ جب حسن کی عدالت میں عشق کا معاملہ پیش ہو تو دل کی دلیل سننا۔" میں نے کہا۔ "اپنے دل سے کہو کہ دنیاوی معاملات میں ٹانگ شریف نہ اڑایا کرے۔" میں نے اس کے بکھرے ہوئے بالوں کو تھوڑا سا چھیڑ کر بکھیرا۔

"اُف۔ ارے بھئی رخصتی کا یہ جذباتی سین کتنی دیر چلے گا؟" محسن نے کہا۔

"گڑیا کی ماں... میرا مطلب ہے میری گھر والی بھی یہی کرتی ہے۔" الف دین بولا۔ "میں بس پر جاتا تھا تو امام ضامن ضرور باندھتی تھی۔ میں کہتا تھا نیک بخت ڈیوٹی پر جا رہا ہوں۔ آخر دفتروں کے بابو، اسکول کے بچے اور کاروباری لوگ سب ہی روز جاتے ہیں۔ مگر شاید اسی لیے مجھ سے کبھی ایکسیڈنٹ نہیں ہوا۔"

"اور شاید اسی لیے میں نے ابھی تک شادی نہیں کی۔" محسن بولا۔

میں نے رابعہ کو سمجھا دیا تھا کہ وہ لائٹ آف کر کے سو جائے اور اسے ایک ریوالور بھی دے آیا تھا۔ پھر بھی دل کو عجیب سی بے کلی تھی کہ میں اتنے بڑے لق و دق گھر میں اسے تنہا چھوڑ کے جا رہا ہوں۔ وہ بہت نڈر اور جرأت مند لڑکی تھی۔ ضرورت پڑنے پر وہ اچھے خاصے مردوں سے زیادہ بہادری کا مظاہرہ کرتی تھی۔ لیکن جب ضرورت نہیں ہوتی تھی تو وہ عام لڑکیوں سے زیادہ جذباتی، ڈرپوک اور کمزور نظر آنے لگتی تھی۔ کبھی شعلہ تو کبھی شبنم۔ کبھی چاندنی تو کبھی دہکتی آگ کا الاؤ۔ برگِ گل سے زیادہ نازک اور سنگِ خارا سے زیادہ سخت۔ یہی اس کے مزاج اور اس کی فطرت کے متضاد لیکن ساحرانہ قوت رکھنے والے رنگ تھے۔ ڈرائیونگ میں کر رہا تھا کیونکہ راستہ صرف میرا دیکھا ہوا تھا۔ چنانچہ ریوالور میں نے محسن کو پکڑا دیا تھا۔ وہ الف دین کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ ٹیپ ریکارڈر آگے رکھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ میں نے ایک ریموٹ کنٹرول مائیکرو فون لیا تھا جس کی رینج زیادہ نہیں تھی۔ لیکن پچاس گز کے دائرے میں کار کے ایف ایم ریڈیو پر اس کی آواز صاف سنائی دیتی تھی۔ یہ مائیکرو فون سائز میں کار کی ڈبیا کے برابر تھا اور مجھے خاصا مہنگا ملا تھا۔ دکاندار ایسی خلافِ قانون [illegible] فروخت کرتے ہوئے ڈرتے ہیں چنانچہ میں نے پانچ سو روپے دینے کے علاوہ دکاندار کو مطمئن کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی اور بالآخر وہ اندر سے مائیکرو فون نکال لایا تھا [illegible] اس وقت میری جیب میں تھا۔

رات کے دس بج کر دس منٹ ہوتے تھے [illegible] نے

جیپ کو آرلے بازار میں راجہ فتح شیر کے گھر سے دس گز دور پہلے موڑ پر کھڑا کیا اور اکیلا اس کے دروازے تک گیا۔ سردی کی وجہ سے بیشتر لوگ سو چکے تھے اور ان کے گھروں میں کوئی روشنی نہیں تھی۔ حسب توقع آج فتح شیر کی نائٹ ڈیوٹی نہیں تھی چنانچہ میں نے دستک دی تو وہ خود ہی باہر نکلا اور مجھے دیکھ کر حیران ہوا۔ "ایس آئی راجہ فتح شیر؟" میں نے کہا۔

"ہاں، میں فتح شیر ہوں۔" وہ ہاتھ ملا کے بولا۔ وہ چالیس سال سے اوپر کا بھاری بھرکم پیٹ والا پستہ قد آدمی تھا۔

"میں سب انسپکٹر ظفریاب ہوں۔ پولیس ہیڈ کوارٹر میں ڈی آئی جی کرائمز کے ساتھ۔" میں نے کہا۔

"خیر تو ہے ناجی؟" فتح شیر نے کہا۔ "ایک منٹ ٹھہریں، میں بیٹھک کا دروازہ کھولتا ہوں۔"

اگرچہ محسن کا سکے ایف ایم ریڈیو کو ٹیون کرکے میری آواز صاف سُن رہا تھا لیکن میرے پاس ایسی کوئی چیز نہیں تھی کہ میں اور وہ آپس میں بات کر سکتے۔ گویا ہمارا مواصلاتی رابطہ یکطرفہ تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ ایک دوطرفہ مواصلاتی نظام جسے عام طور پر "واکی ٹاکی" کہا جاتا ہے ہماری اشد ضرورت تھی۔ اگرچہ اس کا رکھنا سخت خلافِ قانون تھا مگر اسمگل کرنے والے باہر سے ہر وہ چیز لا رہے تھے جس کے یہاں ایک کی جگہ دس ملیں۔ ساری بات ضرورت ..... کی تھی اور قوتِ خرید کی تھی۔ تلاش کرنے پر اور منہ مانگی قیمت دینے پر واکی ٹاکی بھی مل سکتا تھا۔ لندن میں رہ کر مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ بلحاظِ مالیت وہ پاکستانی کرنسی میں ہزار روپے سے زیادہ کی چیز نہیں ہوگی مگر یہاں نایابی کے باعث وہی چیز ملی تو دس ہزار سے کم میں نہیں ملے گی۔

فتح شیر کا گھر باہر سے دیکھنے میں زیادہ بڑا نہیں لگتا تھا لیکن اندر اس کے ڈرائنگ روم کی وسعت اور آرائش دیکھ کر مجھے یقین آ گیا کہ اپنی تنخواہ کے علاوہ فتح شیر اپنے اختیارات کی کیا قیمت وصول کر رہا ہے۔

"گھر تو بہت شاندار ہے آپ کا راجہ صاحب۔" میں نے ایک قیمتی صوفے پر بیٹھ کے کہا۔

"بس جی گزارا کرتے ہیں۔" وہ عاجزی سے بولا لیکن اس کی ... کا غرور اس کے لہجے کی نفی کرتا تھا۔

... صوفہ مجھے یہاں کا تو نہیں لگتا۔" میں نے یوں کہا جیسے ... مبتلا ہو گیا ہوں۔

... کویت سے منگوایا تھا جی۔" وہ بولا۔ "میں یہ گھٹیا ... استعمال نہیں کرتا۔"

... ہاں پڑا آپ کو یہ صوفہ سیٹ۔ اور یہ سینٹر ٹیبل بھی تو باہر کی ہے۔" میں نے کہا۔

"یہاں لانے کا خرچہ ڈال کے کوئی بیس ہزار میں صوفہ سیٹ آیا۔" وہ بولا۔ "سات ہزار کا یہ ٹیبل سیٹ۔"

"کمال ہے راجہ صاحب! اور اس کے باوجود آپ یہاں رہتے ہیں؟" میں نے کہا۔ "کوئی کوٹھی لینی تھی گلبرگ میں۔"

وہ ہنسا۔ "کوٹھی تو بنوائی ہے گلبرگ میں۔ پورے چار کنال کی لیکن کرائے پر اٹھا دی ہے۔ بڑی مجبوری ہے جی۔ بندے کے دس سجن تو سو دشمن۔ فوراً کوئی اوپر رپورٹ کر دے گا اور پھر یہ اخبار والے ....." اس نے ایک زبردست گالی عادت کے مطابق دی۔ "میں تو کسی ایسے ویسے کو اندر بھی نہیں بلاتا۔ اب دیکھیں آپ، میں نے ایک ایک چیز باہر سے منگوائی ہے۔ پردے اور دوسرا سامان دوبئی اور کویت سے آیا ہے۔ یہ پنکھا اور دیواروں کا رنگ بھی باہر کا ہے۔"

"اچھا جی! بڑا خرچہ ہوا ہوگا اس پر تو؟" میں نے تعریفی انداز میں کہا۔ "مگر شوق کا کیا مول!"

"مجھے کیا۔ میری گھر والی کہتی ہے کہ چیز ہو تو باہر کی۔ یہاں کا تو کپڑا بھی پسند نہیں آتا اسے۔" وہ بولا۔ "خیر یہ بتائیں اس وقت کیسے تکلیف کی؟ اور ٹھنڈ ہو رہی ہے، چائے تو پیو گے۔ ویسے گھر میں سب سو گئے ہیں۔"

"تکلف مت کریں راجہ صاحب۔ آپس کی بات ہے۔" میں نے رازدارانہ لہجے میں سرگوشی کی۔ "سب کو ایک دوسرے کا خیال تو رکھنا ہی پڑتا ہے۔ کل کوئی بات ہمارے خلاف بھی ہو سکتی ہے۔ میں تو آپ کو خبردار کرنے آیا تھا۔"

"میرے خلاف کسی نے کچھ لکھا ہے؟" تشویش کے آثار پہلی بار اس کے لہجے سے عیاں ہوئے۔ شاید اسے یہ بھی احساس ہوا کہ اب تک وہ میرے سامنے غیر محتاط انداز میں گفتگو کرتا رہا ہے۔

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ "ابھی تو میں نے ڈاک روک لی ہے۔ بڑی لمبی درخواست دی ہے۔"

"میں نے تم کو پہلے بھی دیکھا ہے۔" وہ ماتھے پر ہاتھ رکھ کے بولا۔ "انسپکٹر کیانی بھی تو وہیں ہے۔"

"کیانی صاحب نے ہی کہا تھا کہ آپ کو بتا دوں۔" میں نے کہا۔ "ورنہ میں تو بس نام جانتا ہوں آپ کا۔ دو بار کیانی صاحب کے ساتھ تھانے آیا تھا۔ آپ کو یاد ہوگا وہ ایک کیس تھا دس پورے کا۔"

"اچھا اچھا ..... وہ جو اہلِ محلّہ نے کیانی کے سالے کے خلاف درخواست دی تھی۔" وہ اطمینان کا سانس لے کر بولا۔ میں نے اندھیرے میں تیر چلایا تھا جو نشانے پر بیٹھا تھا۔ دس پورے کا علاقہ اسی تھانے کی حدود میں آتا تھا۔ وہاں نہ جانے کتنے کیس ہوں گے جن میں فتح شیر نے دھاندلی کی ہوگی۔

"کیا بنا تھا اس کیس کا؟ کیانی صاحب نے کہا تھا سب ٹھیک ہو گیا۔"

"او جی ٹھیک کیسے نہ ہوتا۔ سارے مدّعیان کو بلوا لیا تھا میں نے۔ ایک بڑا استاد بنتا تھا۔ کہتا تھا میں ہیڈ ماسٹر ہوں اسکول کا۔" وہ بولا۔ "دوسرا لڑکا کسی کالج کا لیکچرار تھا۔ سب کو سیدھا کر دیا میں نے۔ دو دن بعد گھر والے اٹھا کے لے گئے۔ خود چل کر بھی نہیں جا سکتے تھے۔ اب کس نے شرارت کی ہے؟"

"آپ چوہدری دلاور کو جانتے ہیں؟" میں نے ہاتھ مل کے سوچتے ہوئے کہا۔

"کون ..... کون چوہدری دلاور؟" وہ ایک دم نروس ہو گیا۔ "وہ شاہدرے والا؟"

"ہاں جی۔ اس کی فیکٹری ہے شاہدرے میں۔" میں نے کہا۔ "بڑا مشکل سا نام ہے۔"

"ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس۔" فتح شیر نے میری مدد کی۔ "اُس نے کچھ لکھا ہے؟"

"نہیں جی، وہ کیوں لکھے گا۔ اس کی مدد کی تھی آپ نے۔" میں نے کہا۔ "کوئی بندہ مر گیا تھا اس سے۔ اس کا کوئی ڈرائیور تھا الطاف جس کا معاملہ وہ آپ کے پاس لایا تھا۔"

"اس کی گمشدگی کا پرچا کٹوا دیا تھا میں نے۔" فتح شیر بے چین ہو کے بولا۔ "اور کیا چاہیے؟"

"وہ تو آپ نے ٹھیک کیا تھا اور ظاہر ہے اس نے بھی اتنا بڑا معاملہ دبانے کے لیے جو کچھ دیا اپنی جان بچانے کے لیے ہی دیا تھا۔" میں نے کہا۔

"اتنا سنگین معاملہ تھا کہ لاش اس کے گھر کے اندر موجود تھی اور وہ اس کو اپنی کوٹھی کے باغ میں گاڑنے کی کوشش کر رہا تھا جب میں نے چھاپا مارا۔" فتح شیر نے برہمی سے کہا۔ "کوئی ٹیڑھا آدمی مل جاتا تو پانچ لاکھ میں بھی جان نہ چھوڑتا۔ پھانسی لگوا دیتا لیکن اس کو پھانسی لگنے سے الطاف زندہ تو نہیں ہو سکتا تھا۔ ہم نے بات ختم کی۔"

"سیانا بندہ تو بات ختم ہی کرتا ہے راجہ صاحب۔" میں نے کہا۔ "لیکن وہ چوہدری دلاور ذرا اوکھا بندہ ہے۔ کسی سے بنا کے نہیں رکھتا۔ معلوم نہیں اِدھر اُدھر کس سے لگتی ہے۔ کسی نے آدھی رات کو ہلچل دیکھی تو باہر نکل آیا اور دیوار کے اوپر سے سب دیکھتا رہا۔ اس نے درخواست دی ہے۔ نام نہیں لکھا....."

"اگر نام نہیں لکھا تو اس پر کارروائی نہیں ہو سکتی۔ گمنام درخواست دینے والوں کا کیا ہے۔"

"وہ سب تو مجھے معلوم ہے جی لیکن وہ آدمی بہت ہوشیار ہے۔" میں نے کہا۔ "اُس نے تو ڈی آئی جی صاحب کو بھی دھمکی دی ہے کہ تفتیش نہ کی گئی تو وہ کیس اخبار والوں کو دے دے گا۔ اس نے تھانیدار کو بھی دیکھا تھا اور اس کے ساتھ آنے والے چار ماتحتوں کو بھی اور وہ سب کو شناخت کر سکتا ہے۔ انھوں نے ایک لاش اٹھائی تھی جو کالے کمبل میں لپٹی ہوئی تھی اور چوہدری دلاور کے گھر میں پیچھے والے گیٹ کے قریب پڑی تھی۔"

"کون ..... کون ہو سکتا ہے ایسا آدمی ... اس سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ واقعی اس نے سب دیکھا ہے۔" فتح شیر گھبراہٹ کا شکار ہونے لگا۔ "اور کیا لکھا ہے؟ یہ بھی لکھا ہے کہ لاش کو ہم نے جیپ میں ڈالا تھا؟"

"ہاں جی! اس نے جیپ کا نمبر تک بتایا ہے۔ نام صرف آپ کا لکھا ہے اور کہا ہے کہ باقی لوگوں کو دلاور نے نام لے کر مخاطب نہیں کیا تھا۔ ان سب کو انسپکٹر فتح شیر حکم دے رہا تھا۔" میں نے کہا۔

"اچھا؟ کوئی تصویر تو نہیں لی اس نے۔ کچھ ٹیپ تو نہیں کیا؟" فتح شیر کی حالت ابتر ہونے لگی۔

"لکھا تو نہیں ہے لیکن اس نے کہا ہے کہ تفتیش کے وقت وہ اور ثبوت پیش کرے گا۔" میں نے کہا۔ "ایسے ثبوت جن کو جھٹلانا ناممکن ہوگا۔ تو ہو سکتا ہے کہ ..."

"لیکن ظفریاب! رات کے اندھیرے میں فلیش کے ساتھ کوئی تصویریں اتارتا ....." اس کی بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگی۔ وہ اٹھ کے کونے تک گیا اور ریسیور اٹھا لیا۔ اس وقت پورے گیارہ بجے تھے۔

"سب انسپکٹر راجہ فتح شیر۔" اس نے سخت بیزار اور اکھڑ لہجے میں کہا۔ پھر میں نے اس کی صورت کا رنگ بدلتے دیکھا۔ "ہاں۔ آج میری ڈیوٹی نہیں تھی اسی لیے گھر پہ ہوں۔ تم کون ہو ... کیا! ... اس بکواس کا کیا مطلب ہے ... میں کسی چوہدری دلاور کو نہیں جانتا۔ یہ جھوٹ ہے .... میں پرسوں رات تھانے میں تھا اور تھانے سے باہر نکلا ہی نہیں۔ دس گواہ ہیں میرے .... گواہ جھوٹے ہیں اور تم سچے ہو؟ کون سے؟ ذرا نام بتاؤ نا اپنا تاکہ میں تصدیق کر لوں کہ تم رپورٹر ہو یا بلیک میلر ..... کوئی ثبوت نہیں ہے تمھارے پاس۔" وہ خوفزدہ بھی تھا اور مشتعل بھی۔ اس کے ہر جواب سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ محسن نے کیا کہا ہوگا۔ راجہ فتح شیر کی کیفیت اس عورت سے مختلف نہ تھی جو ہسٹریا کے شدید دورے سے گزر رہی ہو۔ اس کی مٹھیاں بند تھیں اور آنکھوں میں وحشت تھی۔ وہ چلّانے لگا تھا اور اس کے جھکے ٹوٹے ہوئے تھے، بے ربط الفاظ کی صورت میں ادا

ہو رہے تھے۔ میں اٹھ کر اس کے قریب گیا اور آہستہ سے اس کے کاندھے پر تھپکی دے کر ہاتھ کے اشارے سے پوچھا کہ فون کس لے کیا ہے؟ فتح شیر نے درشتی سے میرا ہاتھ جھٹک دیا اور مجھے بیٹھنے کو کہا۔

"کیسی تصویریں؟ بے وقوف بناتے ہو مجھے۔ گدھا سمجھتے ہو مجھے اُلو کے پٹھے۔" وہ گالیاں دینے لگا۔ "رپورٹر کے تخم! میں بھی تھانیدار ہوں۔ گھاس نہیں کھودی ہے میں نے سات سال تک۔ ایک بھی تصویر اتاری ہوتی تم نے تو فلیش کی چمک ہوتی۔ میں وہی تمھاری ...... کر دیتا۔ اچھا اچھا لاش غائب کی میں نے اور جیپ میں لے گیا۔ تم آئی جی کے باپ ہو۔ جا کے بتا دو اُسے کہ میں نے لاش غائب کی۔ ٹکڑے ٹکڑے کر کے نالہ لئی میں پھینک دی، کتوں کو ڈال دی۔ تم سمجھتے ہو میں ڈر جاؤں گا۔ لے آنا تصویریں بھی۔ ہاں مجھے بالکل یقین نہیں۔ کیا؟ کونسا کیمرا؟ کیسی لال شعاعیں..؟ اچھا تو وہ کیمرا اندھیرے میں تصویریں اتارتا ہے؟ تمھارے پاس کہاں سے آیا؟ انفرا ریڈ کیا ہوتا ہے؟.... چلو وقت برباد مت کرو میرا۔ پھر فون کیا نا.... تو کر دوں گا۔"

اس نے دھڑ سے ریسیور رکھا اور ہانپتا ہوا میرے پاس آ بیٹھا۔ اس کا چہرہ غصے سے سُرخ ہو رہا تھا۔ اور منہ سے جھاگ نکلنے لگے تھے۔ اس نے دورانِ گفتگو ایک سے ایک فحش گالی دی۔

"کسی اخبار کا رپورٹر تھا۔" اس نے ایک اور غلیظ گالی دے کر کہا۔

"راجہ صاحب! آپ سیانے آدمی ہیں۔" میں نے کہا۔ "فون پر ایسی بات نہیں کرنی چاہیے۔ یہ اخبار والے بہت خطرناک لوگ ہوتے ہیں۔ آپ کسی نئی پریشانی میں مبتلا نہ ہو جائیں۔"

"وہ کوئی اخبار والا نہیں تھا۔" فتح شیر نے کہا۔ "ہوتا تو اپنا نام بتاتا۔ اخبار کا نام تو بتاتا۔ وہ بلیک میلر تھا۔"

"فرض کر لیں ایک منٹ کے لیے۔" میں نے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ "اگر وہ سچ مچ کوئی رپورٹر ہی ہوا جو آپ کو بلیک میل کرنا چاہتا ہے تو اس نے یہ گفتگو ٹیپ کر لی ہو گی۔"

فتح شیر کا رنگ فق ہو گیا۔ "ٹیپ کر لی ہو گی؟.... نہیں.... وہ فراڈ تھا کوئی۔ ایک لاکھ مانگتا تھا مجھ سے۔ کہتا تھا دس لاکھ اکیلے ہضم کر جاؤ گے۔ اس کے باپ نے دیے تھے دس لاکھ۔ مجھے تو وہی دو لاکھ ملے تھے۔ ایک لاکھ ایس ایچ او کو نہ دیتا؟ اور وہ جو چار فرشتے میرے ساتھ تھے، پچاس پچاس ہزار سے کم میں ان کا منہ بند ہوتا؟"

"میرا تو خیال ہے آپ سودا کر لیں.... میرا مطلب ہے راجہ صاحب کہ لاکھ دے کر جان چھڑائیں۔" میں نے کہا۔ "یہ معاملہ بڑھ نہ جائے۔ وہ انفرا ریڈ ریز کیمرے کی بات کر رہا تھا نا؟ اخبار والوں کے پاس یہ کیمرے ہوتے ہیں۔ گھُپ اندھیرے میں فلم بنا لیتے ہیں یہ لوگ۔"

"میں سوچ رہا ہوں یہ اخبار والا دلاور کے آس پاس نہ ہو۔" فتح شیر نے پریشانی سے سر پکڑ کے کہا۔ "وہ سب دیکھتا رہا اور تصویریں اتارتا رہا۔ ایک طرف گمنام درخواست دے دی میرے خلاف اور ادھر فون کر دیا۔"

"یہ ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر آپ نے اس کی بات نہ مانی تو پھر وہ تفتیش کے لیے پیچھے پڑ جائے گا اور یہی تصویریں تفتیش کے وقت پیش کر دے گا۔ ایک لاکھ دے دیے آپ نے تو خاموش ہو کے بیٹھ جائے گا۔"

"او نہیں یار۔ ایسے لوگ بہت چالاک ہوتے ہیں۔" وہ بولا۔ "اس نے لاکھ لے کے بھی تصویریں آگے ارسال کر دیں اور تفتیش کا معاملہ نہ دبا تو میرے لاکھ حرام گئے نا؟"

"یہ خطرہ تو ہے۔ آپ کو کیا معلوم وہ جیپ کے پیچھے بھی گیا ہو۔"

فتح شیر نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہاں دُور دُور تک چڑیا کا بچہ نہیں تھا۔ ہم لاش کو راول ڈیم کے پاس لے گئے تھے اور اس کے پیروں کے ساتھ پتھر باندھ کے نیچے پھینک دیا تھا۔ پڑا ہو گا وہ نیچے تہہ میں۔"

"پھر بھی راجہ صاحب! آپ بندوبست کر لیں۔" میں نے کہا۔ "ایک طرف تو وہ درخواست ہے۔ پھر یہ اخباری رپورٹر کہتا ہے کہ اس کے پاس تصویریں ہیں اور اب اگر اس نے ٹیلی فون پر ہونے والی یہ ساری بات چیت ٹیپ کر لی ہو گی تو...."

"بکواس بند کرو۔ تم کیا مجھے ڈرانے آئے ہو۔" فتح شیر کا حوصلہ جواب دے گیا۔ "نوکری چلی جائے گی میری؟ اور پھانسی ہو جائے گی مجھے؟ کیا ہو گا...؟"

"آپ خود جانتے ہیں کیا ہو گا۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "آپ کا جو دل چاہتا ہے کریں، مجھے فارغ کر دیں۔"

وہ چونکا۔ "فارغ کر دوں؟ کیا مطلب.... تم اگر جانا چاہتے ہو تو جاؤ۔"

"آپ اتنے بھولے بادشاہ تو نہیں ہیں راجہ جی! اتنی رات کو میں یہاں جھک مارنے نہیں آیا تھا۔" میں نے کہا۔ "کیا آپ چاہتے ہیں میں وہ درخواست ٹپ اپ کر دوں؟"

"تو صاف کہو کہ تم بھی سودا کرنے آئے ہو۔" وہ مشتعل ہو کے اٹھا۔

"ہاں، یہاں اکیلا کوئی نہیں کھا سکتا۔" میں نے کہا۔ "مل بانٹ کے کھانا پڑتا ہے۔ تم نے ایس ایچ او کو بھی تو ایک لاکھ دیے تھے۔ پچاس ہزار مجھے بھی دے دو تو معاملہ ختم ہو جائے گا اور ایک بات سُن لو، درخواست گمنام نہیں ہے۔"

"تم جھوٹ بول رہے تھے مجھ سے۔ کس نے دی ہے درخواست؟" وہ چلایا۔

"نام بتانے کے پچاس ہزار۔" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔ "وہ میرا جاننے والا ہے۔ میں اسے خاموش کر سکتا ہوں۔"

وہ ایک دم گالیاں بکنے لگا۔ اس کے منہ سے مغلظات کا دریا بہنے لگا۔ "پچاس ہزار درخواست آگے نہ کرنے کے، پچاس ہزار نام نہ بتانے کے، ایک لاکھ اس...... رپورٹر کے۔ میرے دو لاکھ ختم۔"

"نوکری ختم ہو گئی راجہ جی تو دو لاکھ کس کام آئیں گے؟" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "نوکری میں تو ہزار موقعے ملتے ہیں دو لاکھ بنانے کے اور آپ نے بنائے بھی ہیں۔ گلبرگ کی کوٹھی، یہ ساز و سامان سب کتنے لاکھ کا ہے۔"

"میں تم کو.... غلط سمجھا تھا....۔" وہ یوں صوفے پر گر گیا جیسے اس کا دم نکل گیا ہو۔ "میں سمجھا تھا تم میرے خیر خواہ بن کے آئے ہو لیکن تم کُتے ہو، لالچی کُتے۔ مردار کھانا چاہتے ہو۔ جہاں تم بیٹھے ہو وہاں تم کو کچھ نہیں ملتا تو تم دوسروں سے چھینتے ہو۔"

"تم کیا میرے مامے کے پُتر ہو کہ میں تمھارا خیر خواہ بن کے آتا؟" میں نے کہا۔ "یہ نوکری کا نہیں، زندگی کا معاملہ بھی ہے فتح شیر۔ تم لٹک سکتے ہو اور میں گواہ ہوں اب تو۔ تم نے میرے سامنے سب کچھ تسلیم کیا ہے۔ میرے سامنے ٹیلی فون پر بات کی ہے۔ میں پچاس ہزار بہت کم مانگ رہا ہوں۔"

وہ ایک دم مجھ پر حملہ آور ہوا۔ "میں تیری زبان ہمیشہ کے لیے بند نہ کر دوں۔ تجھے بھی وہیں نہ ڈال آؤں جہاں الطاف کو ڈالا تھا!"

میں نے اس پر ایک معمولی سا داؤ آزمایا اور وہ پلٹ کر پیچھے جا گرا۔ "بس۔ وہیں سے بات کر فتح شیر! میں خالی ہاتھ آیا ہوں لیکن خالی ہاتھ جاؤں گا نہیں۔ اب میرا مطالبہ ایک لاکھ کا ہے۔"

فتح شیر پٹے ہوئے کتے کی طرح ہانپتا اور کانپتا رہا۔ "ایک لاکھ، ٹھیک ہے، میں ایک لاکھ دے دوں گا مگر تم سوچو کیا یہ تاوان مجھے ادا کرنا چاہیے؟ جرم کیا تھا چوہدری دلاور نے۔ یہ اسی کو دینا پڑے گا۔"

"مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔" میں نے کہا۔ "تم اپنے پاس سے دے دو۔ سب مل کر دے دو یا دلاور سے لے کر دو۔"

"ہم سب.... نہیں۔ ان میں سے کوئی نہیں دے گا۔"

وہ مایوسی سے بولا۔ "سارا الزام مجھ پر آئے گا۔ ماتحت کہیں گے ہمیں راجہ فتح شیر نے حکم دیا تھا اور دھمکی دے کر مجبور کیا تھا۔ ایس ایچ او صاف مُکر جائے گا لیکن دلاور دے گا۔ اس کا تو باپ بھی دے گا۔ اس کے پاس بہت ہے۔ اگر دس لاکھ اور نکال دے گا تب بھی غریب نہیں ہو گا۔ میں اس سے بات کرتا ہوں۔ اسے بتا دیتا ہوں کہ اس اخباری رپورٹر کی زبان بند رکھنی ہے تو رقم نکالو۔ درخواست دبانی ہے تو۔" وہ اٹھ کر ٹیلی فون کی طرف لپکا۔ میں اطمینان سے بیٹھا رہا۔ راجہ فتح شیر نے ریسیور کان سے لگاتے ہی گالی بکی۔ کریڈل کو بار بار دبایا اور محکمہ ٹیلی فون کی ماں بہن کو ایک کر دیا۔

"ابھی ٹھیک تھا ٹیلی فون۔ ابھی مر گیا۔ ڈیڈ۔ اب کسی جگہ سے فون کرنا پڑے گا۔ پھر بھی کون آ جائے گا اس وقت ٹھیک کرنے۔ اور کسی جگہ سے ایسی بات نہیں کی جا سکتی۔" وہ پاگلوں کی طرح بڑبڑایا۔

"ہم دلاور کے گھر جا کے بات کر سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "یہی سب سے محفوظ طریقہ ہے۔"

"ہاں... تم نے ٹھیک کہا۔" وہ بولا۔ "میں تیار ہو کے آتا ہوں۔"

"نہیں، راجہ فتح شیر! چلنا ہے تو اسی طرح چلو۔" میں نے کہا اور اس کی راہ میں حائل ہو گیا۔

"کیا؟ میں بیوی کو بھی نہ بتاؤں؟" وہ رُک گیا۔

"مجھے کیا معلوم تم اندر جا کے بیوی کو بتاؤ گے یا ریوالور لے آؤ گے؟ مجھے شوٹ کرنے کے لیے۔ انھیں سونے دو۔"

"تم پاگل ہو۔ دلاور کے پاس خالی ہاتھ جا کے ایسی بات کرنا... بہت خطرناک ہے۔"

"میں خالی ہاتھوں سے دس دلاوروں کو قابو میں کر سکتا ہوں۔ ایک بچ کے نہیں نکل سکتا۔" میں نے کہا۔ "تم اس کی بالکل فکر مت کرو۔ تمھاری حفاظت بھی میں کروں گا۔"

فتح شیر کچھ دیر مجھے قاتلانہ نظروں سے گھورتا رہا۔ پھر اس نے اپنے آپ کو دیکھا۔ وہ شلوار قمیص اور چپل پہنے ہوئے تھا اور یہ اس کے لیے سونے کا لباس تھا باہر جانے کا نہیں۔

"میں ایک سوئیٹر تو پہن لوں یا کمبل لے لوں۔" وہ بولا۔ "باہر سردی ہے۔"

"اگر تم اندر جاؤ گے تو میں تمھارے ساتھ جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "اور اگر تم نے بدمعاشی کی...."

"بدمعاشی تم دکھا رہے ہو۔" فتح شیر آ[illegible] باہر ہو گیا۔

"میرے ہی گھر میں۔ میں شور مچا سکتا ہوں۔"

"کوشش کر کے دیکھو۔" میں نے خطرنا[illegible] جے میں کہا اور ایک قدم آگے [illegible] کسی کو معلوم نہیں ہو [illegible] تمھاری گردن کا منکا کیسے ٹوٹ گیا۔ دو چار لاکھ کی خاطر جا[illegible] بیوی

کو بیوہ اور بچوں کو یتیم مت کرو۔ یہ پیسہ بھی تم اپنی پاکٹ سے تو نہیں دے رہے ہو۔ فلاور سے وصول کرنے جا رہے ہو۔ اسی طرح چلو۔"

"لیکن... ہم جائیں گے کیسے؟" اس کا حوصلہ بالکل ختم ہو گیا۔ "موٹر سائیکل ہے تمہارے پاس؟"

"نہیں، کار ہے۔" میں نے کہا۔ "میں تمہاری طرح ڈرتا نہیں ہوں۔ گلبرگ میں ٹھاٹھ سے رہتا ہوں اور ہر سال کار بدلتا رہتا ہوں۔"

میں نے کار کے انجن کی آواز سنی۔ پھر محسن نے باہر سے سیٹی بجا کے سگنل دیا اور میں نے فتح شیر کو اشارہ کیا۔

"تم... تم طے کر کے آئے تھے۔" وہ بالکل بدلے ہوئے لہجے میں بولا۔ "تم اغوا کرنے آئے تھے.... کون ہو تم؟... تم۔ اپنا شناختی کارڈ دکھاؤ۔" اس کا شک پل بھر میں یقین کی صورت اختیار کر گیا۔ اس نے چلانے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے اسے دبوچ لیا۔ وہ میری گرفت سے آزاد ہونے کے لیے تڑپا لیکن اس کا حرام خور ڈھیلا جسم مقابلے کے قابل ہی نہ تھا۔ میں نے اسے صوفے پر گرا کے ایک ٹانگ سے دبا لیا۔ میرے دوسرے ہاتھ نے جیب سے کلوروفارم کی شیشی نکالی۔ اس کے چند قطرے رومال پر ڈال کے میں نے رومال اس کی ناک پر رکھ دیا۔ اس نے چند جھٹکے لیے اور ساکت ہو گیا۔ میں نے سانس روک کے رکھا اور کلوروفارم کی شیشی بند کر کے دروازہ کھول دیا۔ تازہ ہوا میں سانس لیتے ہوئے بھی مجھے رومال سے اٹھنے والی بو کی چبھن کا احساس ہوا مگر اب میرے لیے خطرے کی کوئی بات نہیں رہی تھی۔

"ویری گڈ۔" محسن نے آہستہ سے کار کا دروازہ کھول کے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ "سب ریکارڈ ہو گیا۔ تو نے بھی کمال کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسکرپٹ پہلے سے تیار تھا۔"

الف دین ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ "میں باہر آؤں جی، مدد کے لیے؟" اس نے جھک کر کہا۔

"نہیں۔ ہم دونوں کافی ہیں یہ جنازہ اٹھانے کے لیے۔" میں نے کہا۔ پھر محسن نے میری مدد کی اور ہم ساجد فتح شیر کو تقریباً گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔ گلی میں جھانک کر اطمینان کیا کہ باہر کوئی نہیں ہے اور فتح شیر کو پچھلی سیٹ پر ڈال دیا۔ میں نے واپس ڈرائنگ روم میں جا کے رومال سے ہر اس جگہ کو صاف کیا جہاں میری انگلیوں کے نشانات کی موجودگی کا شبہ ہو سکتا تھا۔ لائٹ آف کی اور دروازہ باہر سے بند کر کے نکل آیا۔ ساڑھے گیارہ بجے ہم اسی راستے پر رواں تھے جس راستے سے آئے تھے۔

صدر بازار کا چوراہا پار کر کے میں نے ہیڈ لائٹس آف کر دیں اور باقی راستہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے اس دھندلی روشنی میں طے کیا جو پارکنگ لائٹس سے پھیل رہی تھی۔ کوٹھی کے قریب پہنچ کے میں نے یہ چھوٹی لائٹس بھی بجھا دیں اور سیدھا عقبی حصے کے گیراج میں لے گیا۔ اوپر کی منزل کی کھڑکی روشن ہوئی تو میں نے جھانک کر دیکھا۔ میں نے اور محسن نے فتح شیر کو الف دین کی مدد سے اٹھایا۔ الف دین نے اس کے درمیانی حصے کو نیچے سے سہارا دیا جو خاصا بھاری تھا اور ہم اسے سیڑھیوں کے راستے اوپر لے گئے۔ رابعہ دروازہ کھولے اور ہاتھ میں ریوالور لیے مہمان کے استقبال کے لیے موجود تھی۔

الف دین نے تمام گفتگو گاڑی کے ایف ایم بینڈ کے ذریعے سنی تھی چنانچہ وہ بے حد مشتعل تھا اور راستے بھر ہم سے پوچھتا آیا تھا کہ ہم اس شیطان کو کیا سزا دیں گے؟ وہ جاننا چاہتا تھا کہ راول ڈیم کی جھیل کتنی گہری ہے اور کیا اس کی تہہ سے طاہر کی لاش برآمد کی جا سکتی ہے اور اس کی دلی تمنا تھی کہ فتح شیر کو اسی طرح پاؤں میں بھاری پتھر باندھ کر اسی جگہ غرقاب کرنے کا موقع اسے فراہم کیا جائے جہاں فتح شیر نے اس کی لاش ڈبو دی تھی۔ ہم نے اس کے جذبات کو قابو میں رکھا اور اسے بار بار تلقین کرتے رہے کہ غصے اور جلد بازی سے کوئی فائدہ نہیں۔ جب ہم نے فتح شیر کو فرش پر ڈال دیا تب بھی وہ وحشیانہ انداز میں اسے گھورتا رہا اور زیر لب کچھ کہتا رہا۔ اس کے لیے اپنے چھوٹے بھائی کی موت اور غرقابی کا تصور اتنا اذیت ناک تھا کہ وہ ذہنی طور پر نیم دیوانگی کی کیفیت سے دوچار تھا اور اس کے سامنے قاتل تو نہیں تھا مگر وہ مجرم ضرور تھا جس نے ایک لاش کا سودا کیا تھا اور اپنا ضمیر دو لاکھ میں بیچا تھا۔ لاش کی بے حرمتی کی تھی اور ایک آدمی کے تن مردہ کے ساتھ انسانیت سوز سلوک کیا تھا۔ انتقام کے جذبات الف دین کو بار بار مغلوب کر لیتے تھے۔

"یہ ابھی فوراً ہوش میں نہیں آئے گا۔" میں نے الف دین کو کھینچ کر فتح شیر سے دور کر دیا۔ "اور ہوش میں آنے کے بعد بھی کلوروفارم کا اثر رہے گا۔ اس سے صبح بات کریں گے۔"

"ابھی تم سو جاؤ۔" محسن نے کہا۔ "ہم بھی سونے کی کوشش کرتے ہیں۔"

"اور رات کو یہ اٹھ کر بھاگ گیا پھر؟" الف دین نے کہا۔

"جب ہم نے اتنی محنت سے اسے یہاں لانے میں کی تو کیا اتنی آسانی سے نکل جانے دیں گے؟" میں نے کہا۔

"میرا خیال ہے اسے باتھ روم میں ڈال دینا کافی ہے۔" محسن بولا۔ "یہ دروازہ توڑ کے نہیں جا سکتا۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا اور ایک بار پھر ہم نے فتح شیر کو گھسیٹا۔ اسے باتھ روم کے فرش پر لٹانے میں یہ خطرہ ضرور تھا کہ کہیں اسے سردی نہ لگ جائے۔

"ایک رات میں نہیں مرتا۔" محسن بولا۔ "زیادہ سے زیادہ نمونیا ہو گا، وہ ٹھیک کر لیں گے۔"

"اگر مر جائے گا تب بھی افسوس نہیں ہو گا۔" میں نے کہا۔ "ہر جرم کا اعتراف تو کر ہی چکا ہے۔"

"سزائے موت جرم کی نوعیت کے اعتبار سے زیادہ ہے۔" محسن کے پیچھے سے رابعہ نے کہا۔

"لیکن اس کے اعمال کی مناسبت سے کم ہے۔" محسن نے کہا اور دروازے کو کنڈی لگا دی۔ ہم دونوں ایک ہی لحاف میں گھس گئے۔

"کتنے ٹیپ استعمال ہوئے؟" میں نے کہا۔ "آواز صاف آ رہی تھی نا؟"

"بالکل صاف تھی۔ نوے منٹ کا ایک کیسٹ تقریباً دونوں طرف سے بھر گیا۔" محسن نے کہا۔ "مائیکروفون بہت حساس ہے۔"

"ریڈیو کے اسپیکر کی آواز باہر تو نہیں سنائی دیتی تھی؟"

"شیشے بند تھے۔" محسن بولا۔ "اس کے علاوہ گلی میں سے دو ہی آدمی گزرے۔ انہیں بالکل اندازہ نہیں ہوا کہ کار میں کوئی بیٹھا ہوا ہے۔ میں نے ریڈیو سے ٹیپ کے لیے ڈائریکٹ کنکشن لے لیا تھا۔"

"تو نے بی ایس سی کیا ہے محسن۔ تھوڑا سا وائرلیس اور ٹیلی کمیونی کیشن کی طرف توجہ دے۔ تیرا تو فطری رجحان ہے اس طرف۔" میں نے کہا۔ "ہمارے پاس دو طرفہ مواصلاتی رابطہ ہونا چاہیے۔"

"ہونا تو چاہیے۔ واکی ٹاکی بازار میں نہیں ملیں گے کیا، اسمگل کیے ہوئے؟"

"معلوم کرنا پڑے گا۔ اگر ملے بھی تو کراچی میں ملیں گے۔" میں نے کہا۔

"کراچی تو جانا ہی ہے ہمیں۔ وہاں دیکھ لیں گے۔ ورنہ پھر بنائیں گے۔" محسن بولا۔ رابعہ اپنے لحاف میں گھس کے سر نکالے ساری گفتگو سن رہی تھی۔ الف دین تیسرے لحاف میں بے سدھ پڑا چھت کو گھور رہا تھا اور شاید یہ غور کر رہا تھا کہ ایک دن میں تقدیر اسے کہاں لے آئی۔ اگر وہ میرے پیچھے نہ لگتا تو بائیس ہزار لے کر گھر لوٹ جاتا اور چین سے سوتا۔ اسے یہ سب معلوم ہی نہ ہوتا کہ طاہر کیسے مرا اور مر کے کہاں پہنچا؟

"مجھے نیند نہیں آ رہی ہے۔" رابعہ نے کہا۔ "ٹیپ ریکارڈر مجھے دے دو۔"

"لیکن ہم کچھ آرام کرنا چاہتے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "ڈیڑھ گھنٹے کا ٹیپ ہے صبح سن لینا۔"

"میں ایئر فون لگا کے سنوں گی۔" وہ بولی۔ "اسپیکر بند رہے گا۔"

محسن نے ٹیپ ریکارڈر اسے دے دیا۔ کمرے کی لائٹ جلتی رہی۔ پہلے محسن کو اور پھر مجھے نیند نے آ لیا۔ ریوالور جو میں نے رابعہ کو دیا تھا وہ اسی کے تکیے کے نیچے تھا۔ دوسرا محسن نے اپنے تکیے کے نیچے رکھا تھا چنانچہ خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔ میں زیادہ تھکا ہوا تھا اور نہ جانے کب تک سوتا رہتا اگر محسن مجھے جھنجوڑ کر بیدار نہ کرتا۔ "سکندر! وہ بھاگ گیا۔" وہ بولا۔

"کون، کون بھاگ گیا؟" میں ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ مجھے کھڑکیوں کے شیشوں سے دن کا اجالا نظر آیا۔ پھر رابعہ اور محسن کے متوحش چہرے دکھائی دیے۔

"الف دین کمینہ۔" محسن نے کہا۔ "اور وہ ہمارے کیے کرائے پر پانی پھیر گیا۔"

"کیا مطلب؟" میں نے کہا۔ "فتح شیر کو اپنے ساتھ لے گیا؟"

رابعہ نے نفی میں سر ہلایا اور محسن نے باتھ روم کی طرف دیکھا۔ اس کی کنڈی کھلی پڑی تھی۔ ہوا میں مجھے ایک مخصوص مہک کا احساس ہوا جو گزشتہ شب اس کمرے کی محبوس ہوا میں نہ تھی۔ یہ بند کمروں کے گرد و غبار کی بو نہیں تھی۔ نئی دیواروں پر سیمنٹ کے تازہ پلستر کی بو نہیں تھی اور کوئی ایسی بو نہیں تھی جو ہمارے وجود کی خبر دیتی ہو۔ یہ ایک دہشت زدہ کر دینے والی بو تھی۔ میں اٹھ کے باتھ روم کی طرف دوڑا اور دروازے تک پہنچنے سے پہلے ہی ٹھٹک کر رک گیا۔ باتھ روم کے فرش پر خون ہی خون تھا۔ خون کے چھینٹے اس کی دیواروں پر تھے اور خون سے اس کا فرش لال ہو رہا تھا۔ خون بہہ کے ڈبلیسی میں چلا گیا تھا اور مجھے خون آلودہ ہاتھوں کے نشان باتھ روم کی دیواروں پر نظر آ رہے تھے۔ درمیان میں فتح شیر مرا پڑا تھا۔ الف دین نے اس کو چھری سے پے در پے وار کر کے مار ڈالا تھا اور پھر اس کی گردن کاٹ کے الگ کر دی تھی۔ فتح شیر کا سر اپنی کھلی آنکھوں سے مجھے گھورنے لگا اور میں نے گھبرا کے دروازہ بند کر دیا۔

رابعہ اور محسن کی نگاہیں میرے چہرے پر جم کر رہ گئی تھیں۔ آخر اس لمحہ بھر کے سکوت کو محسن ہی نے توڑا۔ "ہم نے اس پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کر لیا تھا۔"

"اس نے... ایسی کوئی حرکت نہیں کی تھی۔" میں نے بازی میں سب کچھ ہار جانے والے جواری کی طرح کہا۔ "وہ تعاون کر رہا تھا اور اس کی کسی بات پر دیوانگی کا شبہ نہیں ہوتا تھا۔"

"جب تک اس نے فتح شیر کی گفتگو نہیں سنی تھی وہ نارمل تھا۔" محسن نے کہا۔ "میں اس کے ساتھ تھا اور کار ریڈیو میں سب کچھ

سُن کے اس کا ردِعمل دیکھ رہا تھا۔ وہ پہلے رونے لگا تھا پھر گالیاں دینے لگا تھا اور قسمیں کھانے لگا تھا کہ وہ کسی کو نہیں چھوڑے گا۔ اس نے دو بار اپنا سر ڈیش بورڈ پر مارا۔ میں نے اُسے قابو میں رکھا۔"

"ایسی حالت میں تو اس کو اکیلا چھوڑ کر بھی گیا ہوگا؟ جب تو فون کرنے گیا تھا؟"

"پہلے تو میں اسے چھوڑ کر چل پڑا تھا پھر مجھے خیال آیا کہ اس کا کوئی بھروسہ نہیں۔ کہیں فتح شیر کے گھر میں نہ گھس جائے اور ہنگامہ کر دے۔" محسن بولا۔ "پھر میں اسے ساتھ ہی لے گیا تھا۔ ٹیلی فون کے تار بھی اسی نے کاٹے تھے۔"

"یہاں بھی وہ نارمل ہو گیا تھا یار۔" میں نے کہا۔ "چُپ چاپ پڑا تھا۔"

"لیکن وہ نارمل نہیں ہوا تھا۔ اس کے اندر لاوا پک رہا تھا۔" محسن نے کہا۔ "اسی خیال نے اسے سونے نہیں دیا کہ مجرم اس کی دسترس میں ہے اور ہم اسے صبر و ضبط سے کام لینے کی تلقین کر رہے ہیں۔ وہ ہماری کارروائی سے مطمئن نہیں تھا۔ وہ خود کچھ کرنا چاہتا تھا اور فوراً لیکن اس کی راہ میں ہم حائل تھے۔ ہمارے سوتے ہی اسے موقع مل گیا۔"

"یہ تو بہت بُرا ہوا محسن۔" میں نے کہا۔ "کیا خیال ہے تیرا یہ کام اس نے کب کیا؟"

"کم سے کم دو تین گھنٹے پہلے۔" محسن نے کہا۔ "سب سے پہلے میں جاگا تو مجھے باتھ روم کا دروازہ کھلا دکھائی دیا۔ اس وقت تک میں نے الف دین کی غیر موجودگی کو نوٹ نہیں کیا تھا۔ جب مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ واردات کر کے فرار ہو گیا ہے تو میں نے بھی یہی سوچا تھا کہ قتل کس وقت ہوا؟ خون جما ہوا تھا اور کچھ سیاہ پڑنے لگا تھا۔ معمولی سی سیاہی کی جھلک ہے اب بھی۔"

"سردی میں خون جلدی ٹھنڈا ہو جاتا ہے اور باتھ روم میں خنکی زیادہ تھی۔" میں نے کہا۔

"اس وقت سات بجے ہیں۔" محسن بولا۔ "پانچ ساڑھے پانچ بجے سے پہلے اُجالا نہیں پھیلتا۔ اگر وہ اندھیرے میں نکل گیا ہوگا تو کسی نے نہیں دیکھا ہوگا۔" محسن بولا۔

"دیکھنے والا یہاں کون ہے؟" میں نے کہا۔ "جس نے بھی دیکھا ہوگا اسے سڑک پر پہنچنے کے بعد دیکھا ہوگا۔ اس کے ہاتھ اور کپڑوں پر خون کے داغ ہوں گے۔ وہ یقیناً پکڑا جائے گا۔ پاگل کا کیا بھروسہ۔"

"ہو سکتا ہے وہ پاگل نہ ہوا ہو۔ اس نے پورے ہوش میں ساری کارروائی کی ہو اور اپنے انتقام کی آگ ٹھنڈی کرنے کے بعد ہوش آیا ہو تو وہ چھپتا چھپاتا گھر پہنچ گیا ہو۔ اُجالا پھیلنے ..." محسن بولا۔

"ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں محسن، اگر وہ پکڑا گیا تو ہم بھی پھنس جائیں گے۔ پولیس کے ہاتھ پڑنے کے بعد تفتیش ہوگی تو وہ سب بتا دے گا۔ وہ کم ہمت اور بزدل آدمی ہے۔ زیادہ ... بھی برداشت نہیں کرے گا۔" میں نے کہا۔ "اسے سب کچھ معلوم ہے، ہم سب کے نام پتے۔ ممکن ہے گاڑی کا نمبر بھی یاد ہو۔ باتھ روم کی دیوار پر خون میں بھرے ہوئے ہاتھوں کے نشانات ہیں، وہ بھی الف دین کے ہاتھ کے ہوں گے۔ فتح شیر تو اٹھ بھی نہیں سکا ... الف دین نے بیہوشی میں ہی اس کو قتل کیا اور اس کا سر کاٹ کے الگ ڈال دیا۔ ایسی وحشت اور ایسے جنون میں اس کو احتیاط کا کہاں رہا ہوگا۔ اس کے کپڑے اور سارا ہاتھ خون میں بھر گئے ہوں گے جب اس نے دیوار کا سہارا لیا تو ہاتھوں کا پورا پرنٹ آ گیا۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم نے اسے دلاور کا پتا نہیں بتایا تھا ورنہ وہ فتح شیر سے فارغ ہو کے دلاور کے گھر میں گھس جاتا اور اس دیوانگی میں یا تو خود مارا جاتا یا دلاور کا بھی یہی حشر کرتا معلوم نہیں اب وہ کہاں ..."

"باتیں کب تک کرتے رہو گے؟ کچھ کرو۔" رابعہ نے پہلی بار لب کھولے۔ "یہاں سے نکلنے کی سوچو۔ اس لاش کا کیا کرنا ہے یہ نہ ہو پولیس اس کے ساتھ آ پہنچے۔"

"پولیس اتنی جلدی نہیں آ سکتی۔" میں نے کہا۔ "اگر وہ پکڑا گیا تب بھی اسے تھانے لے جایا جائے گا، وہاں اس کا بیان ہوگا۔ نام تو شاید وہ بتا دے.... لیکن اس کوٹھی کی نشاندہی کرنا اس کے لیے مشکل ہوگا۔ جب وہ یہاں آیا تھا تو بیہوش تھا۔ پھر ہمارے ساتھ گیا تو پیچھے بیٹھا رہا تھا اور گاڑی میں نے چلائی تھی۔ واپسی میں محسن راستہ بتاتا آیا تھا۔ اسے کچھ یاد نہیں تھا۔"

"لیکن اب اسے یاد ہوگا۔ ڈرائیور رہا ہے جو راستوں کو ... کی الگ حس رکھتے ہیں۔ ایک بار سمجھنے کے بعد وہ راستہ نہیں بھولتے۔" محسن نے کہا۔ "ہمیں یہاں سے نکلنے کی فکر کرنی چاہیے۔"

"لاش کا ہم اس وقت کچھ نہیں کر سکتے۔ اتنا وقت ہی نہیں ہے کہ اسے سمیٹ کر اٹھائیں اور محفوظ طریقے پر لپیٹ کر کہیں لے جائیں۔" میں نے کہا۔ "دفن کریں یا راوی میں ڈالیں۔ باتھ روم دھو کے صاف کریں اور خون کے نشانات مٹائیں۔ ابھی بہتر ہے کہ ہم روپوش ہو جائیں اور اپنی موجودگی کے سارے نشان مٹا جائیں۔ یہ تکیے بستر تو چھوڑ دو لیکن برتن سب اٹھا لو۔ فنگر پرنٹ ہوں گے۔ دروازوں پر جہاں بھی ہمارے ہاتھ ... ہوں صاف کر دو اور نکل چلو۔ رات تک دیکھیں گے کیا ... مجھے معلوم ہے الف دین کا پتا کہاں سے ملے گا۔"

ہم سب نے بڑی پھرتی دکھائی اور رابعہ نے دس منٹ میں سب برتن وغیرہ سمیٹ کر ایک تکیے کے غلاف میں ڈال دیے۔ ہم نے رات کو سگریٹیں پی تھیں اور ٹکڑے فرش پر ...ں کے بجھائے تھے۔ اُس نے جھاڑو کی مدد سے سب اکٹھے ...ے اور ہیٹر لگا کے اوپر ڈال دیے۔ ذرا سی دیر میں وہ راکھ ہو گئے۔ رابعہ نے جھاڑو سے فرش بھی صاف کر دیا۔ اور زینہ بھی جس کی گرد میں ہمارے نقشِ قدم نمایاں ہو گئے تھے۔ محسن نے اتنی دیر میں کپڑا لے کر سب دروازوں کے ہینڈل، کنارے اور کُنڈیاں، لاک وغیرہ صاف کر دیے۔ میں نے تھوڑا تھوڑا کر کے سب سامان کار کی ڈکی میں منتقل کیا۔ آخری بار میں اور محسن اس کمرے کا جائزہ لینے گئے جہاں ہمارا قیام صرف ایک رات رہا تھا۔ یہ رابعہ کا اپنا گھر تھا جہاں سے وہ مجرموں کی طرح فرار ہونے پر مجبور تھی۔ ایک مرتبہ پھر اسے اپنے کیے کی سزا مل رہی تھی۔ اگر بعد میں پولیس تفتیش کے لیے آئی تو اخبار میں بھی خبر ہو گی کہ مشہور ایڈووکیٹ خاتون رابعہ قادری کی کوٹھی میں پولیس افسر کا بہیمانہ قتل۔ خاتون وکیل روپوش۔ پہلی باتیں اخبارات زیبِ داستان کے لیے بنائیں گے، گڑے مُردے اکھاڑیں گے۔ رابعہ سے منسوب افواہوں کو واقعات کی صورت میں پیش کریں گے اور قارئین کو یاد دلائیں گے کہ یہ وہی خاتون وکیل ہیں جن کا نام سکندر بخت کے ساتھ لیا جاتا ہے اور سکندر بخت وہ مفرور اشتہاری مجرم ہے.... وغیرہ وغیرہ۔

کمرے میں اب تین بستر لگے رہ گئے تھے۔ ان سے کچھ معلوم نہیں ہو سکتا تھا تاوقتیکہ پولیس سراغ رساں کتے استعمال نہ کرے جو بستر کو سونگھ کر ہمارے جسموں کی بُو پہچان لیں۔ ایک بستر میں رابعہ سوئی تھی۔ میں اور محسن ایک ساتھ تھے۔ اور تیسرے بستر میں الف دین تھا۔ میری اور محسن کی ملی جُلی بُو سے کتے یقیناً کنفیوز ہوتے۔ الف دین اجنبی تھا چنانچہ صرف رابعہ تھی جس کے بدن کی خوشبو اس کے وجود کا سراغ دے سکتی تھی لیکن مجھے اس بات کا کوئی امکان نہیں نظر آتا تھا کہ قتل کی ایک واردات کے لیے پولیس اتنا اہتمام کرے گی۔ قتل ایک پولیس افسر کا تھا لیکن کسی غیر آباد کوٹھی میں کون آیا کون گیا؟ یہ کیسے معلوم ہو سکتا ہے۔ بیان کے لیے پولیس، رابعہ کو یقیناً تلاش کرے گی اور شاید ضامن رضوی صاحب سے بھی رابطہ قائم کرے گی لیکن وہ کیا بتائیں گے۔ یہی کہیں گے کہ مجھے معلوم نہیں وہ یہاں سے نکل کے کہاں گئی۔ تاہم سامنے نہ آنے کے باعث رابعہ کی حیثیت بھی مفرور مجرم کی سی ہو جائے گی اور چونکہ کوٹھی کی مالک وہ ہے اس لیے جتنے منہ ہوں گے، اتنی باتیں۔ اس کے ہم پیشہ بھی اس کی داستانِ ماضی کے ہر ورق سے ایک کہانی کا سلسلہ قائم کر لیں گے اور یہ کہانی جہاں سنائی جائے گی رنگ بدلتی جائے گی۔

باتھ روم میں پڑی ہوئی لاش سے بھی کچھ معلوم نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ گزشتہ شب فتح شیر کو میں کسی نے مجھے آتے جاتے نہیں دیکھا تھا۔ اس کے بیوی بچوں نے بھی نہیں اور میں نے اسے اندر نہیں جانے دیا تھا تو یہ اچھا ہی کیا تھا۔ اب تو اس کی بیوی بھی کسی کو نہیں بتا سکے گی کہ رات کو اس کے سونے کے بعد راجہ فتح شیر کس وقت باہر گیا تھا اور کس کے ساتھ گیا تھا۔ وہ پہلے تو اس کی واپسی کا انتظار کرے گی۔ پولیس والے ہنگامی حالات میں کچھ بتائے بغیر بھی نکل جاتے ہیں۔ ممکن ہے وہ یہ سمجھ کے چُپ رہے کہ فتح شیر ڈرائنگ روم کی کنڈی باہر سے لگا کے گیا ہے تو کہیں قریب ہی گیا ہو گا۔ اس کی وردی اور جوتے سب گھر میں موجود ہوں گے۔ نو دس بجے سے پہلے وہ بچوں کو اِدھر اُدھر بھیج کے محلے میں کسی سے پوچھیں، جہاں بھی وہ جاتا ہو گا کسی دوست، عزیز یا رشتے دار کے گھر۔ تھانے میں وہ ہر طرف سے مایوس ہونے کے بعد فون کرے گی اور تب اسے معلوم ہو گا کہ فون تو خراب ہے۔ دس گیارہ بجے سے پہلے تھانے میں گمشدگی کی رپورٹ نہیں ہو گی۔

میں نے نیچے آ کے ڈرائیور کی جگہ سنبھالی تو صبح کے آٹھ بج رہے تھے۔ سورج نکل آیا تھا لیکن اس کی دھوپ پر عجیب سی زردی اُداسی اور مُردنی تھی۔ ایک سوگوار سی فضا میں ایک سکوت منجمد محسوس ہوتا تھا۔ میں چلنے ہی والا تھا کہ محسن نے مجھے روک دیا۔ وہ باہر نکلا اور اس نے اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد زمین پر سے گیلی مٹی اٹھائی۔ باہر ایک نلکا قطرہ قطرہ ٹپک رہا تھا اور اس کے آس پاس کچی زمین پر گھاس اُگی ہوئی تھی۔ چھوٹے سے گڑھے کے گرد کیچڑ تھی اور درمیان میں تھوڑا سا پانی جمع ہو گیا تھا۔ اس نے کیچڑ کو آگے پیچھے کی نمبر پلیٹ پر یوں اچھال دیا کہ نمبر پڑھا نہ جائے لیکن یہ بھی معلوم نہ ہو کہ کسی نے جان بوجھ کے ملی ہے۔ نظر یوں آئے جیسے گاڑی کہیں کیچڑ پانی سے گزری تھی تو دوسری گاڑیوں کے پاس سے گزرتے ہوئے نمبر پلیٹ پر یہ چھینٹے پڑ گئے ہیں۔

"اب کہاں چلیں؟" محسن نے تھکے ہوئے مایوس لہجے میں کہا۔ "اچھا ٹھکانا مل گیا تھا۔"

"میرا خیال ہے ٹیڈی کے پاس چلتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "صبح کا وقت ہے، وہ مل جائے گا۔"

"الف دین کے بیس ہزار روپے بھی تو ہمارے پاس ہی ہیں۔" رابعہ نے کہا۔

"وہ اس کے نہیں تھے۔ اگر چھوڑ گیا ہے تو کوئی قرض نہیں ہے ہم پر۔" میں نے برہمی سے کہا۔ "اس سے بڑی تو وہ مصیبت چھوڑ گیا ہے ہم سب کی جان کے لیے۔ مجھے مل جائے تو..."

رابعہ نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ "کیا تم نروس ہو رہے ہو؟ ابھی سے..." وہ نرم پُرسکون لہجے میں بولی۔

میں نے ایک گہری سانس لی اور سر کو جھٹکا۔ رابعہ کے لہجے نے مجھے شرمسار کر دیا تھا۔ میں اطمینان سے کار چلانے لگا۔

"تو نے کہا تھا کہ الف دین کا پتا معلوم کیا جا سکتا ہے۔" محسن نے پیچھے سے کہا۔

"ہاں۔ مجھے معلوم ہے اس کی بچی کون سے اسکول میں پڑھتی ہے۔" میں نے کہا۔ "اسکول میں اس کا پتا ہو گا۔ نام اور کلاس رسید پر لکھے ہوئے ہیں۔ لیکن ابھی اس کی ضرورت نہیں۔"

"مجھے بار بار خیال آتا ہے کہ الف دین رات اپنا ذہنی توازن ہی کھو بیٹھا تھا۔" رابعہ بولی۔ "اس نے جو کچھ کیا، پاگل پن کے دورے میں کیا۔ اگر یہ پاگل پن عارضی ہو گا تو وہاں سے بھاگنے کے بعد اس کو اپنے جرم کی سنگینی کا احساس ہوا ہو گا۔ ممکن ہے اس نے ہاتھوں اور کپڑوں کو دھو کر خون کے داغ صاف کرنے کی کوشش کی ہو اور گھر پہنچ کے کپڑے بدل دیے ہوں۔ بیوی کو بتا دیا ہو کہ اس سے خون ہو گیا ہے۔"

"بیوی جیسی بھی ہے، شوہر کو بچانے کی پوری کوشش کرے گی۔" محسن نے کہا۔

"یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ پولیس سے اور ہم سے بچنے کی خاطر بیوی بچوں سمیت بھاگ جائے۔" میں نے کہا۔ "اسے معلوم ہے، دلاور سے بچنے کے لیے طافو نے بھی بیوی بچوں کو غائب کر دیا تھا۔"

"لیکن پاگل پن کے اثرات شدید اور دیرپا ہوئے تو... تو وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔" رابعہ نے کہا۔ "وہ خودکشی بھی کر سکتا ہے۔"

"جو کچھ ہو گا شام تک معلوم ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔ "اگر شام تک اس کوٹھی میں کوئی نہ پہنچا تو میں اور محسن رات کو لاش نکال کے باتھ روم صاف کر آئیں گے۔"

"یہ حماقت ہو گی، جرأت نہیں۔" رابعہ بولی۔ "پولیس آس پاس سادہ کپڑوں میں موجود ہوئی تو پکڑے جاؤ گے۔"

"استاد ٹیڈی شام کو معلوم کر آئے گا کہ پولیس آئی تھی یا نہیں۔" ملک نے کہا۔ "وہ ایک چکر تو لگائیں گے۔ جائے واردات کا معائنہ کریں گے، ایف آئی آر کاٹیں گے اور اگر اس کے بعد انہوں نے کوٹھی کی نگرانی کا فیصلہ کیا تب بھی لاش کو اسی جگہ نہیں پڑا رہنے دیں گے۔ یہ سب کارروائی ہو گی تو آس پاس کے لوگوں کے علم میں ضرور آئے گی۔ ہم یہ بھی کر سکتے ہیں کہ ٹیڈی کو ابھی بھیج دیں ایک گھنٹے کے اندر۔ اور اسے کہیں کہ وہ سارا دن دور ہی سے دیکھتا رہے۔"

"کیا پولیس رات کو نہیں آ سکتی؟" رابعہ نے کہا۔

"رات سے پہلے ہم الف دین کا سراغ لگا لیں گے۔ اگر وہ گھر سے بھی غائب ہوا اور کسی تھانے میں بھی نہ ملا تو پریشانی اور خطرے کی کوئی بات نہیں ہو گی۔" میں نے کہا۔ "پھر وہ کسی کے ہاتھ نہیں آئے گا۔ نہ پولیس کے، نہ ہمارے اور نہ دلاور کے۔"

"آج کے دن میں کوئی اور انتظام کر لو۔" رابعہ نے کہا۔ "مجھے اپنا پیسہ نکالنے دو اور تم لوگ کوئی کرائے کا مکان تلاش کر لو۔ زیادہ بہتر ہے کہ کراچی چلو۔ اس شہر سے کچھ عرصے کے لیے نکل جاؤ۔"

"آج کا دن تو گزرنے دو۔" میں نے کہا۔ "ٹیڈی کے گھر ہم محفوظ ہیں۔"

"لیکن میں وہ پیسہ ضرور نکالوں گی۔ پیسہ پاس ہو تو سہارا رہتا ہے۔" رابعہ بولی۔ "یہ نہ ہو بعد میں اپنا پیسہ بھی اپنا نہ رہے۔ جیسے اپنا کوئی گھر اپنا نہیں رہا۔ کوئی رشتہ اپنا نہیں رہا۔ پیسہ تو بہت بے وفا چیز ہے۔"

"پھر اس کو سہارا کیوں کہتی ہو؟" میں نے تلخی سے کہا۔ "اور اتنا دُکھ ہے رشتوں کے ٹوٹنے کا اور گھر سے بے گھر ہونے کا تو ابھی وقت ہے، لوٹ جاؤ۔"

"تمہارا دماغ ٹھکانے نہیں ہے۔ میری بات کا الٹا مطلب کیوں نکال رہے ہو؟" رابعہ نے کہا۔

"مطلب نہیں نکال رہا ہوں، بات ہی اُلٹی ہے۔" میں نے برہم ہو کے کہا۔ "کیا مجھ پر اعتماد نہیں ہے تم کو؟"

"اب بھی یہ سوال کرتے ہوئے شرم نہیں آتی تم کو؟" رابعہ نے چلا کے کہا۔

"گاڑی روک یہاں۔" محسن نے کہا۔ "ڈرائیونگ میں کروں گا۔ تم دونوں پیچھے بیٹھ کے لڑو۔"

ہم نے جگہ بدلی اور میں پیچھے آ گیا۔ رابعہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کے رو رہی تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔ "مجھے معاف کر دو پلیز۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میری بات سے تمہاری دل آزاری ہوئی ہے۔" میں نے کہا۔ "دراصل ہم سب اعصابی کشیدگی کا شکار ہیں، عدم اعتماد کا نہیں۔ بعض اوقات جو کہنا چاہتے ہیں کہہ نہیں پاتے۔ غلط الفاظ منہ سے نکل جاتے ہیں۔ یا ہم الفاظ کا غلط مطلب سمجھ لیتے ہیں۔ حقیقت کیا ہے یہ ہم سب جانتے ہیں۔ ایک دوسرے کو جتنا ہم لوگ سمجھتے ہیں کوئی اور نہیں سمجھ..."

"یہ غلط ہے۔" محسن نے کہا۔ "دلاور نے بھی ہم کو جتنا سمجھا ہے، یہ وہی جانتا ہے۔ اتنا تو مجھے میرے باپ نے بھی نہیں سمجھا۔"

اس کی نظر میں آج بھی میں جلیبی کی طرح سیدھا ہوں۔ بھولا بھالا اور معصوم۔"

رابعہ کو روتے روتے ہنسی آگئی۔ میں مسکرانے لگا۔ فضا مسکرانے لگی۔ اُمید کی ہر کرن مسکرانے لگی۔

ٹیڈی ابھی سویا پڑا تھا کہ ہم نے یلغار کی۔ وہ ہم سب کو ایک ساتھ اور ساز و سامان کے ساتھ دیکھ کر آلوؤں کی طرح دیدے گھمانے لگا۔ "صبح صبح کہاں سے نکالے گئے ہو جی آپ سب لوگ!"

"کہیں سے نہیں۔" میں نے کہا۔ "نکالے گئے نہیں، آئے ہیں۔ اتنے بے مروت تو تم ہو نہیں کہ اندر بلانے سے پہلے ہی نکالنے کی بات کرنے لگو۔ نکال دینا بعد میں یا خود نکل جانا۔"

"مہمان تو باعثِ رحمت و برکت ہوتے ہیں۔" ٹیڈی نے سر ہلایا۔ "خصوصاً بن بُلائے مہمان۔"

"اچھا اب تم نہا دھو لو۔" محسن نے ٹیڈی سے کہا۔ "رابعہ تمہارے لیے ناشتا وغیرہ بناتی ہے لیکن ذرا پہلے باہر گاڑی سے سامان اٹھا لاؤ، شاباش۔ اور دیکھو تکلف مت کرنا۔ اپنا ہی گھر سمجھنا اسے حالانکہ تم اقلیت میں ہو اب۔"

صحیح صورتِ حالات ٹیڈی پر ایک گھنٹے کے بعد واضح ہوئی۔ وہ ہکا بکا سب سنتا رہا۔

"یہ تو بڑا لمبا مسئلہ ہو گیا۔" وہ ساری بات سُن کے بولا۔ "اب کیا ہو گا؟"

"تم جاؤ سیدھے وہاں۔ ذرا دُور سے نظر رکھو اس کوٹھی پہ جہاں وہ شیر کا بچہ مرا پڑا ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھ سے دلاور نے بڑے فخر سے کہی تھی یہ بات کہ فتح شیر بھی شیر کا بچہ ہے۔"

"جب اسے معلوم ہو گا تو اس پہ کیا بیتے گی؟" محسن بولا۔ "اسے شک ضرور ہو گا کہ یہ بھی ہمارا کام ہے۔"

"مجھے تو ان چار کانسٹیبلوں کا خیال آ رہا ہے کہ ان پہ کیسی بجلی گرے گی۔ احساسِ جرم کا شکار تو وہ پہلے ہی ہیں۔"

"رابعہ کو میں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔" محسن نے کہا۔ "ہم بنک سے رقم نکلوائیں گے۔"

"اور میں الف دین کا سُراغ لگاؤں گا۔" میں نے جیب سے رسید نکال کے سب کو دکھائی۔

"اس کا ڈرائیونگ لائسنس بھی تو ہے۔" محسن بولا۔ "اس پہ پتا ہو گا۔"

"پتا اس کمپنی کا ہے جہاں وہ سب سے پہلے ٹرک ڈرائیور کی حیثیت سے ملازم ہوا تھا۔" میں نے کہا۔ "اس کا فائدہ نہیں کوئی۔"

ہم سب ایک ساتھ نکلے۔ کار کی نمبر پلیٹ تو گندی تھی ہی صفائی نہ ہونے سے پوری گاڑی گندی ہو رہی تھی اور ہم نے بہتر سمجھا کہ اسے صاف نہ کیا جائے۔ ٹیڈی کرشن نگر میں سُوری بلڈنگ کے اسٹاپ تک ہمارے ساتھ گیا۔ پھر اس نے بس یا رکشا سے جانے کا ارادہ ظاہر کیا اور ہم نے اسے تاکید کی کہ وہ محتاط رہے۔ "چابی چوکھٹ کے اوپر رکھی ہے۔" ٹیڈی نے کہا۔ "جو پہلے پہنچے دروازہ کھول لے۔"

"ہم تو دروازہ کھولے بغیر بھی گھس جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "تم اندر مت ہو جانا۔"

"قسم مولا علی کی۔" وہ مونچھوں پر تاؤ دے کر بولا۔ "اتنی عقل اپنے پاس بھی تھی۔ آپ سب نے مل کر دماغ درست کر دیا۔"

"یہ ٹھیک کہا تم نے معلوم نہیں کس کس کا دماغ ہم نے درست کر دیا اور کس کس نے ہمارا دماغ خراب کر دیا۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ پھر ہم نکل گئے۔ کار میں نے محسن کے حوالے کی اور اس نے مجھے ضلع کچہری کے پاس اُتار دیا۔ وہ گھوم کر مال روڈ پر ہو گئے اور میں پیدل چل پڑا۔ جس اسکول کا پتا رسید پر درج تھا وہ زیادہ دور نہیں تھا۔ دس منٹ بعد میں اسکول کی پرنسپل کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ "مجھے اس بچی سے ملنا ہے۔" میں نے رسید دکھا کے کہا۔ "پتا مل جائے تو مزید بہتر۔"

"کس سلسلے میں؟" پرنسپل نے عینک کے شیشوں کے اوپر سے مجھے دیکھا۔ "کیا لگتے ہیں آپ اس بچی کے؟"

"کچھ بھی نہیں۔" میں نے حقیقت کا اعتراف کرنا بہتر سمجھا۔ "میں ڈاکٹر امجد ہوں۔ اس بچی کا باپ اپنا پرس میرے کلینک میں بھول گیا جس میں خاصی بڑی رقم کے ساتھ یہ رسید بھی تھی۔ میں اس کی امانت اس تک پہنچانا چاہتا ہوں۔"

اس نے گھنٹی بجا کے چپراسی کو بلایا اور اسے کہا کہ الف دین کی بچی کو بُلا لائے۔ وہ پندرہ منٹ بعد لوٹا۔ اس تمام وقت میں پرنسپل نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی اور نہ جانے فائلوں میں کیا دیکھتی رہی۔ پھر چپراسی نے مجھے مطلع کیا کہ وہ بچی آج نہیں آئی۔

"ضرور وہ بیمار ہو گی۔" پرنسپل نے کہا۔ "ورنہ ٹرمینل ٹیسٹ چل رہے ہیں۔ خیر میں آپ کو پتا بتا دیتی ہوں۔" اس نے ایک خاصا بڑا رجسٹر طلب کیا۔ جی اے آر یا جنرل ایڈمیشن رجسٹر۔ اس میں سے ایک سلپ پر کچھ نوٹ کیا اور سلپ مجھے تھما دی۔

الف دین کا پتا معلوم کرنا بھی کوئی مشکل کام ثابت نہیں ہوا لیکن میں اس کے گھر تک پہنچا تو مجھے دروازے میں قفل نظر آیا۔ میں نے اِدھر اُدھر لوگوں سے دریافت کیا۔ اس وقت گھروں میں صرف عورتیں تھیں۔ انھوں نے مجھے سرسری طور پہ ٹال دیا۔ "معلوم نہیں کہاں گئے ہیں۔ گئے ہوں گے کہیں کسی سے ملنے یا بلانے۔ ہمیں بتا کے نہیں گئے۔ دوسری طرف والوں سے پوچھو۔" بالآخر

سامنے کے دروازے سے ایک شخص برآمد ہوا۔ میرے سوال پہ اس نے مجھے خاصی مشکوک نظروں سے دیکھا۔ "کیا کام ہے جی آپ کو اس سے؟" وہ بولا۔

"کام اس سے ہے تو تم کو کیا بتاؤں؟" میں نے چڑ کر کہا۔ "میرا فرینڈ ہے وہ۔"

"کیا ہے؟" اس شخص کا منہ حیرت سے کھُلا رہ گیا۔

"بھئی دوست ہے میرا۔" میں نے اُسے سمجھایا۔ "وہ کچھ پریشان تھا، اس نے کہا تھا کہ آپ راولپنڈی جائیں تو میری فیملی کو بھی جانا ہے۔ میرا نام ڈاکٹر امجد ہے۔"

"اچھا! تو یہ بات ہے ڈاکٹر صاحب۔" وہ رازدارانہ لہجے میں بولا۔ "وہ نکل گیا۔ صبح صبح میں نے دیکھا تو تانگے میں سامان لاد رہا تھا۔ میں نے پوچھا الف دین کدھر کا ارادہ ہے تو بولا کہ پنڈی جا رہا ہوں، سُسر کا انتقال ہو گیا ہے۔ میرا خیال ہے وہ جھوٹ بول رہا تھا۔"

"تم نے کیسے اندازہ کیا؟" میں نے کہا۔

"لو جی! سُسر اس کی بیوی کا کون ہوا؟ باپ ہوا نا؟" وہ بولا۔ "جس کا باپ مرے گا وہ رونے دھونے کے بجائے گھر والے سے لڑے گی۔ لڑائی کی آواز تو میں نے صبح فجر کی نماز سے پہلے سُنی تھی۔ وہ تانگے میں بھی ایسے بیٹھی تھی کہ معلوم ہوتا تھا لڑ کر بیٹھی ہے۔ بچے بھی ڈرے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ سُسر کی موت پر کوئی اتنا سامان لے کر نہیں جاتا۔ آپ کی بات ٹھیک ہے۔ وہ کچھ پریشان تھا۔ کسی کو بھی معلوم نہیں ہوا۔ وہ چُپ چاپ نکل گیا۔"

اس کی دلیل نے مجھے قائل کیا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور واپس چل پڑا۔ میرے اطمینان کے لیے یہ بات بہت تھی کہ وہ پولیس کے ہاتھ نہیں لگا، پاگل نہیں ہوا اور اس نے خودکشی نہیں کی۔ اس نے وقتی دیوانگی کے دورے سے مغلوب ہو کے ایک قتل تو کر دیا تھا لیکن اس کے بعد ہوش آیا تو وہ فرار ہو گیا۔ اسے میری دھمکی بھی یاد تھی کہ میں اس کی بچی کے اسکول سے پتا معلوم کر سکتا ہوں۔ اسے یہ بھی احساس ہو گا کہ اس نے جو غلطی یا حماقت کی ہے اس کی سزا میں کیا دوں گا اور میں نے نہ دی تو قانون کیا دے گا۔ وہ شریکِ جرم بھی رہا تھا اور قانون سے زیادہ ہم سے خوفزدہ تھا جو مقدمہ چلائے بغیر سزا دینے کے قائل تھے۔ یہ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔

ایک بار پھر میرا ذہن مستعد اور فعال ہو رہا تھا۔ وہ خطرہ جس نے کچھ دیر کے لیے میری شکاری قوتوں کو مفلوج کر دیا تھا بادل کے سائے کی طرح گزر گیا تھا اور صورتِ حال جو مخالف محسوس ہوتی تھی موافق نظر آنے لگی تھی۔ میں سوچتا گیا اور پیدل چلتا ہوا ریگل تک آ پہنچا۔ فتح شیر کو اپنے اعمال کی سزا ملی تھی تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ میرا ارادہ اسے قتل کرنے کا ہرگز نہ تھا۔ میں تو اس سے پوچھتا کہ اس نے دلاور کے ساتھ مل کر اور کیا گل کھلائے ہیں۔ اس سے وہ سب پیسہ وصول کرتا جو اس نے دلاور سے اس کے جرم کو چھپانے کے لیے لیا تھا اور پھر دلاور سے بات کرتا۔ اس ٹیپ کی موجودگی میں جو محسن نے کار کے ریڈیو سے میری اور فتح شیر کی گفتگو سن کر تیار کیا تھا، دلاور کو ایسے شکنجے میں کسا جا سکتا تھا کہ وہ رہائی کی خاطر مُنہ مانگی قیمت دینے پر تیار ہو جاتا۔ جو کچھ دلاور نے سب انسپکٹر فتح شیر کو دیا تھا اس کمائی کا حصہ تھا جس پر مجھ سے پہلے میرے باپ کا حق تھا۔ یہ کمائی اس کی میرے باپ کے کاروبار پر غاصبانہ قبضہ کرنے سے ہو رہی تھی۔ اس نے کاروبار ہی نہیں، اپنے مجرمانہ حربے استعمال کر کے میرے باپ کو اس کے جائز حصے کی ملکیت سے بھی محروم کیا تھا، پھر اس کو پیسے پیسے کا محتاج کر دیا تھا اور اس کی ساری کمائی چھین لی تھی، یہاں تک کہ وہ ایمانداری اور محنت سے ترقی اور خوشحالی کی منزل حاصل کرنے والا مفلس و بے نوا، تنہا اور مجبور ہو کے زندگی کی آخری منزل تک پہنچا تو اس کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ ایک شکستہ دل کے سوا۔ ایک فریاد کناں لبِ خاموش کے سوا۔ اپنی زندگی کی تمام جدوجہد کے رائیگاں جانے کے خیال کے سوا اور اس احساس کے سوا زندگی ایک سزائے ناتمام کے سوا کچھ نہ تھی۔ اس نے اپنا پورا خاندان گنوا دیا، اپنا کاروبار گنوا دیا، محنت سے حاصل ہونے والی کامیابی کا فخر گنوا دیا، مجھے گنوا دیا جو مستقبل کے اعتماد کی علامت تھا اور یہ سب کچھ گنوانے کے بعد اگر اس نے جان گنوا دی تو کون سا احساسِ زیاں رہا ہو گا۔

لیکن اب مجھے سارا حساب برابر کرنا تھا۔ اگر میں دلاور کو قتل کر دیتا تو یہ اس کے لیے کوئی سزا نہ ہوتی۔ مجھے اس کو اتنا ہی عذاب دینا تھا جتنا میرے باپ نے اٹھایا۔ اس سے وہ سب وصول کرنا تھا جو اس نے میرے باپ سے چھینا اور اسی طرح وصول کرنا تھا جیسے اس نے جمع کیا تھا۔

ریگل سینما کے ساتھ ہی روبینہ ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر میں نے پہلے چائے پی اور پھر دوپہر کا کھانا کھایا اور اس وقت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دوسرا لائحۂ عمل مرتب کیا۔ مسئلہ دلاور سے رابطہ قائم کرنے کا تھا۔ الف دین کے اس انکشاف نے میری سوچ کا رُخ موڑ دیا تھا کہ وہ منشیات کے نہیں، اسلحے کے ناجائز کاروبار میں ملوث ہے ـــ پہلے وہ صرف میرا دشمن تھا۔ اب میری نظر

میں ملک وقوم کا دشمن بھی ہوگیا تھا اور جتنی سزا میں اسے دینا چاہتا تھا اس سے کہیں زیادہ کا مستحق' اسے حالات ثابت کر رہے تھے۔ یہ اطلاع ابھی تصدیق طلب تھی کہ وہ اس ناجائز کاروبار میں کس طرح ملوث ہے؟ وہ ناجائز اسلحہ منگواتا ہے یا بھیجتا ہے؟ منگواتا ہے تو کہاں سے اور بھیجتا ہے تو کسے ہے؟ بے شک ساری دنیا اسلحے کی منڈی بن گئی تھی اور فتنہ و فساد میں شیطان کی پیروی کرنے والے آدمی کو اب دنیا آباد کرنے کی' اسے آنے والے دن کے لیے زیادہ خوبصورت بنانے کی اور اپنے بچوں کے لیے بہتر زندگی کی ضمانت کے طور پر قائم رکھنے کے بجائے اسے تباہ و برباد کرنے کی فکر تھی' آدمی کے خون کے سمندر میں بدلنے کی خواہش تھی اور جہنم بنا دینے کی آرزو تھی' چنانچہ وہ جنگ و جدل اور قتل و خونریزی میں مصروف تھا اور اسے کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ انسانوں کو ختم کرنے کے لیے ہر وقت' ہر قسم کے اسلحے کی ضرورت تھی۔ بندوق کی گولی اور توپ کا گولا۔ بم اور ایٹم بم۔ اعصابی گیس اور مہلک جراثیم کے بم۔ گھنٹوں کے بجائے منٹوں میں اور منٹوں کے بجائے سیکنڈوں میں لاشوں کے زیادہ اونچے انبار لگانے کا یہ مقابلہ مسلسل جاری تھا۔ اس تخریبی جذبے کی شدت تعمیر کی ضرورت پر غالب آگئی تھی۔ اتنی ہی جدوجہد کا رُخ اگر آدمی کی خوشی اور خوشحالی کے حصول کی طرف ہوتا تو۔ مگر یوں نہ تھا اور جو کچھ ہو رہا تھا وہ نہیں تھا جو کہ ہونا چاہیے تھا۔ چنانچہ یہ ہو سکتا تھا کہ طافو کی اطلاع غلط نہ ہو۔

ابھی تو مجھے یہ طے کرنا تھا کہ میرا اگلا قدم کیا ہونا چاہیے؟ ایک موقع تو ہاتھ سے نکل گیا تھا لیکن کیا دوسرے موقعے سے فائدہ اٹھانے کے امکانات پیدا نہیں ہو گئے ہیں؟ میں نے کھانا ختم کرتے کرتے دلاور سے رابطے کا فیصلہ تو کر لیا تھا۔ بل ادا کرنے کے بعد میں نے رکشا لیا اور ٹیڈی کے گھر پہنچا۔ محسن اور رابعہ کو بنک سے کیش لینے کے سوا کوئی کام نہیں تھا لیکن وہ ابھی واپس نہیں آئے تھے۔ میں نے بنک میں کسی قسم کی گڑبڑ کے امکانات پر غور کیا اور رابعہ کے اعتماد کے پیشِ نظر مسترد کر دیا۔ رابعہ کہیں کرائے پر مکان لینے کے حق میں تھی اور یہ ہو سکتا تھا کہ وہ محسن کے ساتھ مکان کی تلاش میں نکل گئی ہو۔ چابی دروازے کی چوکھٹ کے اوپر موجود تھی۔ اس بند گلی میں لوگوں کی آمدورفت نہیں تھی۔ صبح شام بچے اور مرد آتے جاتے دکھائی دیتے تھے لیکن رات کی طرح اس وقت بھی گلی سنسان پڑی تھی۔ مرد فکرِ معاش میں نکلے ہوئے تھے اور بچے اسکول سے تو واپس آچکے تھے لیکن ابھی کھیل کود کے لیے باہر نہیں آئے تھے چنانچہ مجھے چابی اٹھاتے اور ٹیڈی کے گھر میں گھستے دیکھ کر اعتراض کرنے والا کوئی نہیں تھا۔

دس منٹ میں فتح شیر کی گفتگو کا کیسٹ لے کر میں پھر باہر نکل آیا۔ کرشن نگر کی ہی ایک دکان سے میں نے اس کی دو کاپیاں بنوائیں۔ ضرورت تو مجھے صرف ایک کاپی کی تھی۔ دوسری میں نے احتیاطاً کسی ضرورت کے لیے بنوالی تھی۔ میوزک شاپ کا مالک مجھے اپنے آلات سے ہونے والی معیاری ریکارڈنگ بطور آزمائش اپنے کان پھاڑ اسپیکروں پر سنوانا چاہتا تھا لیکن میں نے اسے سمجھایا کہ کیسٹ میں گانے نہیں ہیں بلکہ کچھ پرائیویٹ گفتگو ہے۔ وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا اور پرائیویٹ گفتگو کو پبلک کے سامنے سنوانے سے باز رہا۔ واپس لوٹتے ہوئے مجھے اس خیال نے کافی اطمینان بخشا کہ میری تصویر کی اشاعت کے بعد اچانک سے مجھے شناخت کر لینے والوں کی تعداد پہلے جتنی نہیں رہی' وجہ وہی تھی کہ تصویر پرانی ہو گئی تھی اور زیادہ تر لوگ زندگی کی مصروفیات میں اسے فراموش کر چکے تھے۔ اوّل تو کوئی غور سے ہر چہرہ نہیں دیکھتا اور اگر دیکھے تو فوراً یادداشت کے تہہ خانوں میں محفوظ لاتعداد تصویروں سے نہیں ملاتا۔ بلاشبہ میں سکندر بخت نہیں' دس ہزار کا نوٹ تھا لیکن اپنے خوش بخت ہونے پر کسی کا یقین اتنا کامل نہیں ہوتا کہ میری تصویر لے کر صبح سے شام تک کوچہ و بازار میں سرگرداں رہے اور دست بہ دعا رہے کہ راہ چلتے نصیب کھل جائیں۔

گلی کے نکڑ پر گاڑی کو دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی۔ مجھے رابعہ اور محسن کے مشورے کی ضرورت بھی تھی۔ محسن کی عملی مدد کی ضرورت بھی اور گاڑی کی بھی لیکن اندر صرف محسن کو دیکھ کر مجھے مایوسی ہوئی۔

"رابعہ کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

"وہ البرٹ وکٹر ہوسپٹل گئی ہے۔" محسن نے ٹیڈی کی بان والی چارپائی پر لیٹے لیٹے کہا۔ وہ ایک ہاتھ سر کے نیچے رکھے اطمینان سے سگریٹ کا دھواں چھت کی جانب ارسال کر رہا تھا۔

"اور تو نے اسے جانے دیا؟" میں نے اس کے پاس ہی بید کی بنی ہوئی کرسی پر بیٹھ کر کہا۔

"وہ نازو سے ملنے گئی ہے' اپنی غیر سرکاری سوکن سے۔" محسن بولا۔ "بقولِ شاعر' ہم پہ مشترکہ ہیں احسان غمِ الفت کے۔"

"اور وہاں جو ڈبل ایس آئی بیٹھا ہے' ہم سب کا مشترکہ دشمن۔" میں نے برہمی سے کہا۔

"وہ اب سنگل ایس آئی رہ گیا ہے۔ صرف سید اکرام شیخ۔" محسن بولا۔ "اس نے پولیس کی نوکری کو لات مار دی ہے اور تارک الدنیا ہوگیا ہے۔ کسی سے نہیں ملتا اور کوئی بات نہیں کرتا۔ نازو بہت پریشان تھی۔ اس کے گھر والے بھی پریشان ہیں کیونکہ نازو خود کو مجرم سمجھتی ہے اور اکرام شیخ دہرے احساسِ جرم کے ردِعمل کا شکار ہے۔"

"جبکہ اس کے والدین ساری خرابی کا ذمے دار مجھے سمجھتے ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "میں نے ہی نازو کو بلایا تھا۔"

"رابعہ آئے گی تو معلوم ہوگا۔" محسن نے کہا۔ "اس نے تو خیریت معلوم کرنی چاہی تھی۔ نازو نے خود بات کی اور اسے بلایا۔ رابعہ کچھ تامل کر رہی تھی لیکن نازو نے اسے یقین دلا دیا کہ اس میں کوئی چال نہیں ہے اور اکرام شیخ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ اب کچھ نہیں کرے گا کیونکہ وہ اس قابل ہی نہیں رہا۔ ڈاکٹر کا خیال ہے کہ یہ ایک شدید نفسیاتی ردِعمل ہے۔ نروس بریک ڈاؤن کی ایک صورت۔ اکرام شیخ کو نارمل ہونے میں کچھ وقت لگے گا۔ ابھی تو وہ چوبیس گھنٹے نازو کے پاس بُت بنا بیٹھا رہتا ہے۔ نہ کسی سے کچھ کہتا ہے نہ کسی کی بات کا جواب دیتا ہے۔ رات کو بھی اسے خواب آور گولیاں دے کر سلایا جاتا ہے۔ رابعہ نے کہا تھا کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ اسے کون گرفتار کر سکتا ہے۔ ابھی تک اس کے خلاف کوئی الزام نہیں ہے۔ بے شک وہ رضوی صاحب کے گھر سے فرار ہوئی تھی لیکن رضوی صاحب اس کو فرار نہیں کہہ سکتے ـــ وہ اپنی مرضی سے وہاں رہتی تھی۔ نظربند نہیں تھی۔ یہ بات آن ریکارڈ آجائے کہ پولیس کو اس کی نگرانی یا تعاقب پر مامور کیا گیا تھا تو رضوی صاحب کو جواب دینا مشکل ہو جائے کہ انھوں نے ایسا کیوں کیا تھا؟"

"وہ اب پھر ایسا ہی کریں تو انھیں کون روک سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اسپتال سے کوئی اس کے پیچھے لگ جائے گا۔"

"وہ اسپتال سے سیدھی ادھر نہیں آئے گی۔" محسن نے کہا۔ "منظر کے پاس جائے گی۔ اسے اپنی رقم بھی منظر کو دینا تھی کہ اپنے اکاؤنٹ میں رکھے۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار نو سو اور کچھ۔ تقریباً پینتالیس۔"

"بنک میں کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی؟"

"ہوئی تھی۔ منیجر کو۔" محسن بولا۔ "ڈیپازٹ میں اتنی کمی واقع ہوگئی۔ عین کلوزنگ سے پہلے۔"

"الف دین غائب ہوگیا ہے۔" میں نے کہا۔ "میں اس کے گھر گیا تھا۔ وہ صبح مُنہ اندھیرے بیوی بچوں کو لے کر نکل گیا۔"

محسن ایک دم اٹھ بیٹھا۔ "اس کا مطلب ہے وہ پکڑا نہیں گیا۔"

"ہاں۔ اس نے پاگل پن میں موقعے سے فائدہ اٹھایا اور فتح شیر کو قتل کر دیا۔ اگر اسے دلاور کے ٹھکانے کا علم ہوتا تو وہ اسی دیوانگی میں دلاور کو بھی مار جاتا۔" میں نے کہا۔

"وہ ہمیں بھی مار کے جا سکتا تھا۔" محسن نے کہا۔ "ہم جاگتے تو معلوم ہوتا کہ یومِ حشر ہے۔"

"وہ ہمیں مجرم نہیں سمجھتا تھا۔" میں نے کہا۔ "ورنہ یہی کرتا۔"

"اس نے تجھے مجرم سمجھ کے ہی پکڑنے کی کوشش کی تھی۔" محسن بولا۔

"ہاں' لیکن بعد میں حالات نے اس کی سوچ بدل دی۔" میں نے کہا۔ "وہ ہمارے ساتھ ہوگیا تھا اور ہم اس کے مجرم نہیں تھے۔"

"مجھے ڈر ہے وہ اپنی بدحواسی کے باعث نہ پکڑا جائے۔" محسن نے کہا۔ "خوفزدہ ہو کے فرار ہونے والے مجرم کا رویّہ خود اس کو مشکوک بنا دیتا ہے۔ ہمارے ساتھ رہتا تو ہم اسے کوئی بے وقوفی نہ کرنے دیتے۔ اب یہی حماقت کیا کم ہے کہ وہ بلاوجہ اپنا گھر چھوڑ' بیوی بچوں کو اپنے ساتھ لے کر بھاگ گیا۔"

"اس کے ایک پڑوسی نے بھی اسی قسم کے شک کا اظہار کیا تھا۔"

"شک تو ہوگا۔ وہ جہاں بھی جائے گا کسی عزیز کے پاس یا کسی دوسرے شہر میں۔ کیا لوگ پوچھیں گے نہیں کہ ایسی کون سی آفت آ رہی تھی لاہور میں جو تم نے ہجرت کی۔ بچی کا اسکول چھڑا دیا اور بیوی کو بے گھر کیا۔ اسے سب کو مطمئن کرنے کے لیے سو جھوٹ بولنے پڑیں گے۔ بچی سے بھی کوئی جھوٹ تو بولا ہوگا اس نے۔" محسن نے کہا۔

"ہاں۔ اس کے ٹرمینل ٹیسٹ ہو رہے ہیں۔ مجھے اسکول جا کے معلوم ہوا۔" میں نے کہا۔

"جب بھی اس کا جھوٹ پکڑا گیا' وہ بھی پکڑا جائے گا۔" محسن نے کہا۔ "اور پولیس کے ہتھے چڑھ گیا تو سب بک دے گا۔"

"یہ تو ٹھیک ہے مگر فوری طور پر کوئی خطرہ نہیں۔ کم سے کم آج۔" میں نے کہا۔ "اور میں اس مہلت سے فائدہ اٹھانے کے موڈ میں ہوں۔ ظاہر ہے اب فتح شیر کی لاش کے دریافت ہونے کا امکان نہیں رہا۔"

"لیکن اب تک پولیس کو اس کی پُراسرار گمشدگی کا علم ہو گیا ہوگا۔"

"اس سے ہمارے لیے کوئی پریشانی پیدا نہیں ہو سکتی۔" میں نے کہا۔ "پولیس اسے تلاش کرتی پھرے۔ البتہ یہ خبر اپنے چوہدری دلاور صاحب کو ملے گی تو ان کے لیے فکر کی بات ہوگی۔ کل تک انھیں بھی معلوم نہیں ہو سکتا۔ فتح شیر کی گمشدگی کا دلاور سے بھی تعلق نہیں۔ ہے تو یہ بات صرف ہم جانتے ہیں یا اس پر وہ چار ماتحت شک کر سکتے ہیں جو اس کے شریکِ جرم تھے لیکن وہ بھی اپنے شک کا اظہار نہیں کر سکتے۔ اگر یہ خبر کسی اخبار میں اشاعت کے قابل سمجھی گئی تو نہایت غیر نمایاں مقام پا کے

گی اور ہو سکتا ہے اپنے چوہدری صاحب اخبار کا مطالعہ سرسری کرتے ہوں۔ مصروف آدمی سرخیوں پر ہی نظر ڈالتے ہیں۔ لیکن فرض کرو کل وہ خبر دیکھ لیتے ہیں۔ پھر بھی کافی وقت ہے۔ ابھی سوا تین بجے ہیں۔ کل صبح سات سوا سات سے پہلے وہ اخبار نہیں دیکھیں گے۔ سولہ گھنٹے میں ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں۔"

"تیری کھوپڑی میں کوئی پلان ہے تو اس کا بلیو پرنٹ نکال۔"

"بلیو پرنٹ؟ لاحول ولا قوۃ۔ میاں کس قدر عریانی و فحاشی بھری ہوئی ہے تمہارے افکار و خیالات میں۔ کیا صرف پرنٹ کہہ دینا کافی نہیں تھا۔" میں نے کہا۔ "بلیو کا لفظ انتہائی غیر اخلاقی ہے میاں۔"

"لوگ صرف آسمان کیوں نہیں کہتے۔ نیلا آسمان کیوں کہتے ہیں۔" وہ بے حیائی سے بولا۔ "اور سمندر کے کنارے ایک کیڑا ملتا ہے 'بلیو بوٹل' اسے صرف بوٹل کیوں نہیں کہہ دیتے۔ بڑے زور سے کاٹتا ہے ظالم۔"

"مگر کسے نورِ چشم، انہی کو جو نیم عریاں اور نہایت بے شرمی سے مخلوط طریقے پر سمندر میں سرِعام نہانے کی جسارت کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہمارا پلان نہایت پاکیزہ ہے۔ ہم چوہدری سے گلے ملنا چاہتے ہیں بلکہ گلے پڑنا چاہتے ہیں ان کے۔ اور اس وقت ہمیں ان کی بہت یاد آرہی ہے۔ ان کی آواز ہی سننے کو مل جائے۔" میں نے ایک سرد آہ بھری۔

"اچھا۔ اتنا آزردہ اور آبدیدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔" محسن اُٹھ کھڑا ہوا۔ "باہر چل کر بات کر لیتے ہیں ان سے۔"

میں نے ٹیپ ریکارڈر اٹھایا۔ دو میں سے ایک فاضل ٹیپ کی کاپی ہم نے گاڑی میں رکھی اور اصل ٹیپ ریکارڈر میں فٹ کر دی۔ دوسری کاپی کو ہم نے ٹیڈی کے گھر کے ایک محفوظ گوشے میں چھپا دیا۔ میں اور محسن مختلف دکانوں پر پھرتے رہے جہاں پبلک ٹیلیفون" کا بورڈ نظر آیا لیکن ہر جگہ ٹیلیفون ایسی جگہ ملا کہ دکاندار سر پر موجود رہتا تھا اور تمام گفتگو سن سکتا تھا۔ پھر ایک ہوٹل کے لاؤنج میں ہمیں موقع مل گیا۔ وہ بہت بڑا ہوٹل تھا اور اس کے ہال میں کاؤنٹر بائیں جانب تھا تو ٹیلیفون دائیں طرف دوسرے کنارے پر ایک کیبن میں لگا ہوا تھا۔ میں نے محسن کو سمجھا دیا تھا کہ اسے کیا کہنا ہے۔ نمبر ملاتے ہی اس کے پی۔ اے نے بات کی۔ میں نے ریسیور سے کان لگا دیا۔

"چوہدری دلاور صاحب نہیں ہیں۔" وہ عیاری سے بولا۔ "کیا کام ہے؟"

"جب وہ موجود ہی نہیں ہیں تو کام کیا بتاؤں۔" محسن آواز بدل کے بولا۔ "انھوں نے ہی کہا تھا کہ فون کر لوں۔"

"اچھا نام بتا دیں اپنا اور فون نمبر دے دیں۔" پی اے بولا۔ "آئیں گے تو بتا دوں گا۔"

"فتح شیر ہے میرا نام۔" محسن نے غرّا کے کہا۔ "بس اتنا ہی کافی ہے۔"

"کیا بات ہے بھئی؟" چوہدری دلاور کی آواز آئی۔ وہ کسی انٹرکام پر تمام گفتگو سن رہا تھا اور شاید ٹیپ بھی کر رہا تھا۔ محسن نے ریسیور مجھے تھما دیا۔

"آپ کی گاڑی میں جو ریڈیو ہے اپنے چوہدری صاحب" میں نے کہا۔ "اس میں ایف ایم بینڈ تو ہوگا؟"

"سکندر! کوئی اور کھیل کھیلنا چاہتے ہو؟" دلاور نے کہا۔ "یہ فتح شیر کون ہے؟"

"ریڈیو تو ہے تمھاری گاڑی میں۔" میں نے کہا۔ "دو بینڈ کا ہوا تو ایک ایف ایم ہوگا دوسرا اے ایم۔ اگر تیسرا بینڈ ہوا تو شارٹ ویو ہوگا۔ ٹھیک آدھے گھنٹے بعد ایف ایم پر ہنڈا کو ٹیون کرنا۔ اگر تم پولیس کو بھی سامعین میں شامل کر دو گے تو یقین کرو ٹھیک ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ تم کو گرفتار کر کے لے جائیں گے ہو سکتا ہے پہلے ہی لے جائیں لیکن نوّے منٹ بعد تمھاری آزادی ختم ہو جائے گی اس لیے بہتر ہو گا کہ تم اکیلے ہی ہماری نشریات سنو۔ اور اس بات کو کھیل مت سمجھنا دلاور۔ تمھارے اور تختۂ دار کے درمیان یہی نوّے منٹ حائل ہیں۔ اقبال پارک زیادہ دُور نہیں ہے۔ قلعے کی دیوار کے پیچھے آواز صاف سنائی دے گی۔ فیکٹری میں شیشے بند کر کے بیٹھو گے کار کے تو دیکھنے والے کیا سمجھیں گے۔ اینٹینا اُونچا رکھنا۔ ایف ایم بینڈ پر اس کے بغیر شور زیادہ آتا ہے۔" میں نے ریسیور رکھ دیا۔ مجھے اپنی کامیابی کا یقین آگیا تھا۔ اگر چوہدری دلاور نے اسے مذاق سمجھا ہوتا تو وہ میری اتنی لمبی بات نہ سنتا اور درمیان میں دخل ضرور دیتا، برہم ہوتا یا دھمکیاں دیتا، میرا مذاق اُڑاتا یا سرے سے بات ہی نہ سنتا لیکن اس نے میری بات بڑی توجہ سے سُنی تھی۔

چوہدری دلاور کو اپنی کار میں فیکٹری سے پارک تک پہنچنے میں مشکل سے بیس منٹ لگے ہوں گے۔ ہم بھی یہی چاہتے تھے کہ وہ پہلے پہنچ جائے تاکہ ہمیں آتا نہ دیکھے۔ آدھے گھنٹے سے کچھ کم ہم نے چالیس منٹ بعد کار کو لاہور سے گوجرانوالہ جانے والی سڑک پر ٹریفک میں شامل کر دیا لیکن پل سے پہلے ہی اقبال پارک آگیا اور ہم دائیں طرف گھوم گئے۔ میری نظر نے چوہدری دلاور کی کار کو سو گز کے فاصلے پر بہت سی دوسری کاروں کے درمیان دیکھ لیا۔ اسے نمایاں کرنے والا اس کی گاڑی کے ریڈیو کا اینٹینا تھا جو دس فٹ کے قریب اُوپر نکلا ہوا ہوا میں جھول رہا تھا اور دھوپ میں چمک رہا تھا۔ میں نے گاڑی کو اندازاً

چالیس گز کے فاصلے پر اسی طرح پارک کیا جیسے بہت سی دوسری گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ایک دوسرے کے متوازی اور سڑک پر تھوڑی سی ترچھی۔ یہ سب یادگارِ پاکستان دیکھنے کے لیے آنے والے لوگ تھے جو ہر روز اسی طرح آتے رہتے تھے۔ ملک کے کسی بھی حصے سے لاہور آنے والوں کے لیے اس تاریخی حیثیت رکھنے والی یادگار کا نظارہ بڑی اہمیت رکھتا تھا لیکن خود لاہور کے رہنے والے بھی اقبال پارک میں سیر و تفریح کے لیے آجاتے تھے۔ دُور دُور تک پھیلے ہوئے پارک میں مردوں، عورتوں اور بچوں کی ٹولیاں لان پر جمع تھیں یا اِدھر اُدھر گشت کر رہی تھیں۔ ہماری اور دلاور کی کاروں کے درمیان کم سے کم بیس دوسری کاریں حائل تھیں۔ چنانچہ وہ کوشش کرتا تب بھی ہمیں دیکھ نہیں سکتا تھا۔

میں نے ایف ایم مائکروفون نکالا اور وقفے وقفے سے دلاور کو مخاطب کرنے لگا۔ مجھے اندازہ تو تھا کہ وہ دس منٹ سے ریڈیو کی سوئی کو اِدھر سے اُدھر گھما رہا ہوگا کہ کہیں سے کوئی آواز سنائی دے۔ وہ اینٹینا بلند کیے بیٹھا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ ابھی تک وہ مایوس نہیں ہوا ہے۔ پانچ دس سیکنڈ بعد وہ پھر بینڈ کو ٹیون کرتا ہوگا۔ میں نے اسے دس منٹ دیے اور اس عرصے میں "ہیلو دلاور، ڈو یو ریڈ می؟ دِس اِز ایم آر ایس۔ ہیلو دلاور۔" کہتا رہا۔ ایک بار ٹیون کر لینے کے بعد میری آواز اس کے کانوں میں ریڈیو کے اسپیکر کی زبان سے صاف پہنچ رہی ہوگی لیکن وہ جواب دینے سے قاصر تھا۔ محسن نے باہر نکل کر اس کی کار کی پوزیشن پر غور کیا اور یہ دیکھا کہ کوئی دوسری گاڑی اسی وقت حرکت میں تو نہیں آئی۔ ہاتھ سے اس نے مجھے "آل اوکے" کا سگنل دیا لیکن میں وہی دہراتا رہا۔ "ڈو یو ریڈ می؟ دلاور۔ دس از ایم آر ایس" دل ہی دل میں اس نے ہزار بار کہا ہوگا۔ "یس۔ آئی ریڈ یو ایم آر ایس۔" لیکن اس بات پر سخت جھنجلاہٹ میں مبتلا ہوا ہوگا کہ یہ بات مجھے بتا نہیں سکتا۔ اضطراب اور سسپنس میں اس نے مجھے گالی دے کر یہ بھی کہا ہو کہ آگے بھی تو کچھ کہو، ایم آر ایس کی اولاد۔ ایم آر ایس کیا ہے؟ اس کے متعدد مفہوم نکالنے کے بعد اس نے طے کیا ہوگا کہ یہ مہمل اصطلاح ہے اور ہم اس کی جگہ اے بی سی یا ایکس وائی زیڈ بھی کہہ سکتے تھے تاہم وہ بے وقوف نہیں تھا اور اس کا ایم آر ایس سے "محسن رابعہ سکندر" سمجھ لینا بعید از قیاس نہ تھا۔

دس منٹ تک یہی بکواس سن سن کر وہ پاگل ہونے کے قریب ہوگا لیکن اس کے لیے ریڈیو بند کر کے چلے جانا بھی اتنا ہی مشکل کام تھا۔ وہ میری آواز پہچان کے رُکنے پر مجبور تھا۔

بالآخر میں نے ٹیپ ریکارڈر میں کیسٹ لگایا اور اس کا والیوم اتنا رکھا کہ آواز گاڑی سے باہر نہ جائے۔ سردیوں کی وجہ سے لوگ گاڑیوں کے شیشے بند ہی رکھتے تھے، خصوصاً اس سرد ہوا سے محفوظ رہنے کے لیے ورنہ گرمیاں ہوتیں تو ہماری حالت خراب ہو جاتی اور نہ جانے کتنے لوگ ہمیں مشکوک نظروں سے گھورتے۔ ایف ایم مائیکروفون کو ہم نے ٹیپ ریکارڈر کے اسپیکر کے بالکل سامنے رکھا۔ جہاں اسپیکر کی آواز مدہم پڑتی تھی وہاں میں والیوم بڑھا دیتا تھا۔ فتح شیر مر گیا تھا لیکن ٹیپ پر اس کی وہ آواز زندہ تھی جس میں اس نے گزشتہ شب اپنے ہر گناہ کا اور ہر جرم کا رضاکارانہ طور پر اعتراف کیا تھا۔ اگر وہ زندہ رہتا تو اس پر کتنے مقدمات قائم ہوتے؟ میں نے سوچا۔ طافو کی لاش کو راول ڈیم میں غرق کرنے کے علاوہ۔ راول ڈیم؟ اچانک میرے ذہن کو جھٹکا لگا۔ راول ڈیم تو لاہور سے ایک سو اسّی میل دور تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ رات کے آخری پہر میں اتنی دور جائے اور اگلے دن یوں لوٹ آئے کہ کسی کو اس کی غیر موجودگی کا احساس نہ ہو۔ ستر اسّی میل فی گھنٹا کی رفتار سے جانے والا بھی چار گھنٹے سے پہلے راول ڈیم تک نہیں پہنچ سکتا۔ شہر میں رفتار کا اوسط بہت کم ہو جاتا ہے۔ پھر یہ کیسے ہوا کہ فتح شیر نے اپنی کارروائی رات کے اندھیرے میں مکمل کر لی؟ ناممکن۔ وہ کسی طرح بھی صبح آٹھ نو بجے سے پہلے راول ڈیم نہیں پہنچ سکتا تھا اور آٹھ نو بجے سورج نکل آتا ہے۔ راولپنڈی کی کُہر آلود منجمد صبح میں دھوپ بھی چاندنی لگتی ہے لیکن روشنی ضرور دیتی ہے۔ ایسے وقت میں کسی لاش سے من بھر وزن کا پتھر باندھنے اور اسے ڈیم کی جھیل میں غرق کرنے کی کارروائی کیسے ہو سکتی ہے؟ اس نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔ وہ بہت کچھ سچ بتا گیا تھا لیکن یہ ایک ایسی بات تھی کہ اس نے مجھے بھی غلط بتائی۔ خود مجھے سوچنا چاہیے تھا کہ محض ایک لاش کو ٹھکانے لگانے کی خاطر کون چار سو میل آتا جاتا ہے اور پھر پولیس والے؟ جو زندہ کو دن دہاڑے ٹھکانے لگا دیں، وہ ایک لاش لے کر راولپنڈی جائیں گے! راوی جہلم اور چناب کو عبور کر کے راول ڈیم کی جھیل کے پانی میں لاش غرق کریں گے! معلوم نہیں اس وقت کیوں میں نے غور نہیں کیا۔ شاید میں نے غور سے سنا ہی نہیں تھا کہ وہ راول ڈیم کہہ رہا ہے۔ خیر، وہ نہیں تو کیا، اس کے ساتھ جانے والے چار ماتحت تو ہیں۔ لاش انھوں نے بحکمِ افسرِ اعلیٰ ٹھکانے لگائی ہوگی اور فرض شناسی، فرمانبرداری اور تعاون کے

اس مظاہرے کا انعام ان کو یہ ملا ہوگا کہ راتوں رات ان کے بینک بیلنس میں ایک لاکھ کے آدھے بڑھ گئے ہوں گے۔ وہ اب بھی صحیح بتا سکیں گے کہ لاش کہاں ہے۔ فتح شیر تو انہیں ہدایات دے کر گھر چلا گیا ہوگا۔ اصل کام کرنے والے تو وہی تھے۔ انھوں نے کس حد تک افسرِ اعلیٰ کے حکم پر عمل کیا' یہ وہی بتائیں گے۔

کیسٹ ختم ہوا اور خودکار نظام نے کیسٹ ریکارڈ کو کھٹ سے آف کر دیا۔

"یہ انٹرول ہے چوہدری صاحب۔" میں نے کہا۔ "کیسی فلم ہے؟" ظاہر ہے میرے سوال کے جواب میں دلاور نے کوئی زبردست گالی دی ہوگی لیکن وہ میں نے نہیں سنی۔ محسن ہنس پڑا۔

"تمھاری بے بسی پر ہنسی آ رہی ہے مجھے۔" محسن بولا۔ "تم ہماری آواز کتنی صاف سن رہے ہو مگر افسوس یہ ہے کہ ہم تین میل دور سے اپنی شبیہ مبارک تم کو ارسال نہیں کر سکتے ورنہ تم ہمارا دیدار کر کے بھی خوش ہوتے۔"

"باہر زیادہ ترقی یافتہ ملکوں میں پکچر ٹیلی فون اور شارٹ سرکٹ یا کلوز سرکٹ ٹی وی عام ہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن یہاں تو تمھارے جیسے وسائل رکھنے والے شخص کے پاس ایک ایم ایف مائکروفون تک نہیں۔" میں نے کہا۔

"حالانکہ یہ بہت معمولی سی چیز ہے۔ تم تو ہر چیز اسمگل کرتے ہو' یہ بھی منگوا لو۔" محسن بولا۔ "جیسے ہم نے منگوایا ہے جرمنی سے۔" ہماری ان تمام باتوں کا مقصد صرف اسے گمراہ کرنا تھا تاکہ وہ سمجھے کہ ہم واقعی تین میل دور سے بات کر رہے ہیں اور تین میل کی رینج کا یہ ایف ایم مائکروفون ہم نے لوکل مارکیٹ سے نہیں لیا۔

"اگر تم کوشش کرو تو ہمارے درمیان وائرلیس رابطہ قائم ہو سکتا ہے۔ چھوٹا موٹا سو پچاس گز کی رینج والا مائک شاید ہال روڈ سے مل جائے۔" محسن نے کہا۔

"میرا مشورہ ہے کہ تم آج ہی کوشش کرو۔" میں نے کہا۔ "شام کو پھر بات ہوگی تم سے۔"

"شام تو ہوگئی ہے۔" محسن نے مجھے ٹوکا۔ "رات کہو۔ بیشک چوہدری صاحب کی نظر میں دنیا اندھیر ہو رہی ہے۔"

"نہیں شام ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم سورج غروب ہونے سے پہلے ہی بات کرنا پسند کریں گے۔"

"پھر تو چوہدری صاحب کو اسی وقت جانا پڑے گا۔" محسن بولا۔ "میرا مطلب ہے یہ مزاحیہ پروگرام ختم ہوتے ہی۔"

"ہاں یار' خیر اب باقی پروگرام شروع کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "چوہدری صاحب بہت بے چین ہوں گے۔"

"بے چین؟" محسن ہنسا۔ "مشتعل ہوں گے بھائی۔ [illegible] دے رہے ہوں گے۔ افسوس کہ ہم ایک نہیں سن رہے۔"

"یہ پہلا اتفاق ہے کہ گالیوں کی یکطرفہ ٹریفک [illegible] ہے' ہم ان کے آبا و اجداد کا سارا شجرۂ نسب پڑھ کر گھر والوں سے ملا سکتے ہیں لیکن ہم شرفا ہیں۔" میں نے کہا۔ "زبان خراب نہیں کرتے۔"

"لیجیے انتظار ختم ہوا۔ گالیاں مت بکیے۔ ڈراما سنیے۔" میں نے کیسٹ کو پلٹ کر آن کر دیا۔ میں نے اور محسن نے [illegible] کر گاڑی لاک کی اور احتیاط کے ساتھ دوسری گاڑیوں [illegible] میں آگے بڑھے۔ دلاور کے بارے میں ہمیں یقین تھا کہ [اس] کی تمام تر توجہ آواز پر ہوگی۔ بعد میں دوبارہ غور سے سننے کے لیے وہ سب ریکارڈ بھی کر رہا ہوتا تو عجب نہ تھا۔ میں [اور] محسن عین اس کی گاڑی کے پیچھے جا پہنچے۔ اب درمیان صرف ایک کار تھی۔ اِدھر اُدھر نگاہ ڈال کے محسن نیچے [جھکا] تاکہ بیک ویو مرر میں نہ آ جائے۔ پھر اس نے دلاور کی کار [کے] پچھلے دونوں پہیوں کے نیچے وہی لکڑی کے ٹکڑے رکھ [دیے] جن میں کیلیں ایک انچ اوپر نکلی ہوئی تھیں اور جن سے [ہم] نے ایک بار پولیس کی پیش قدمی روک دی تھی۔

ہم لوٹ کر آئے تو کیسٹ کا آخری حصہ ختم ہونے کے قریب تھا۔ پانچ منٹ کے بعد اسپیکر میں صرف سرسراہٹ رہ گئی تو میں نے مائک اٹھا لیا۔

"فی الحال جو کچھ تم نے سنا اس سے زیادہ سنانے کو نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "اس سے تم کو بخوبی اندازہ ہوگیا ہوگا کہ تم نے جس سہارے پر بھروسا کیا تھا وہ کتنا ناپائیدار ہے۔ وقت آئے گا تو وہ خود کو بچائے گا تم کو نہیں اور کیسٹ کی موجودگی میں فتح شیر کے بچنے کی امید بھی نہیں۔ تم کیسے بچو گے؟ اس پر غور کر لو۔ تم نے ہماری آواز اور یہ گفتگو ٹیپ کا بندوبست ضرور کیا ہوگا۔ اس ٹیپ کو ایک بار پھر سنو۔ ہم سے بات کرنا چاہو تو دو گھنٹے بعد۔ اس وقت چھ بج کر دس منٹ ہوئے ہیں۔ پورے آٹھ بجے ریگل پر۔"

"ریگل پر ٹریفک کا شور و غل مخل ہوگا۔" محسن [نے کہا۔] "باغِ جناح کا پارکنگ ایریا جو لاہور جمخانہ کی طرف ہے انتہائی مناسب جگہ ہے۔ تم نہ آئے تو ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہوں گے کہ تم بات نہیں کرنا چاہتے۔"

"یہ بات ذہن میں رکھنا کہ گفتگو ٹیلیفون پر نہیں ہو[گی۔]"

[میں] نے کہا۔ "ایف ایم بینڈ ہماری گاڑی میں بھی ہے۔"

[مائ]کروفون بند کر کے میں نے ٹیپ کو بھی آف کیا اور باہر [دی]کھنے لگا۔ محسن نے گاڑی کو تھوڑا سا بیک کیا اور مجھے دلاور کی [گا]ڑی کا پچھلا حصہ نظر آیا۔ گاڑی تھوڑا سا پیچھے ہوئی اور ان [لک]ڑی کے بلاکوں پر چڑھ گئی جن پر ایک انچ سے لمبی نوکیلی [کیل]یں ابھری ہوئی تھیں۔ اسے جھٹکا سا لگا ہوگا اور اس کے [سا]تھ ہی گاڑی بیٹھنے لگی — میں نے دلاور کو باہر آتے دیکھا۔ [اس] بے بسی کے ساتھ دونوں ٹائروں کو فلیٹ ہوتے دیکھ رہا تھا۔ اسے [س]مجھنے میں دیر نہیں لگی ہوگی کہ ہم نے اس کے انہماک سے [فائ]دہ اٹھایا اور کار کو بے کار کر گئے۔ اس کی ذہنی کیفیت کا اندازہ کر کے مجھے بہت مسرت ہوئی۔ یہ ایک بچگانہ سی خوشی تھی۔ پہلے تو دلاور کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ثابت ہوا ہوگا کہ ٹیلیفون پر میرا پیغام وصول کرنے کے بعد اسے کیا کرنا چاہیے' پولیس کو رپورٹ کرنی چاہیے' کس کو ساتھ لے کر جانا چاہیے یا وہی کرنا چاہیے جو ہم نے کہا تھا۔ میں نے اتنے سنجیدہ لہجے میں بات کی تھی اور ایسے خطرناک الفاظ میں دھمکی دی تھی کہ وہ ڈر گیا۔ اسے اب ہمارے متعلق خوش فہمی کوئی نہیں تھی۔ یہ خواب و خیال کی بات ہوگئی تھی کہ ہم بلحاظِ عمر کم ہیں یا ہمارا تجربہ اس کے مقابلے میں کم ہے۔ ہم بدمعاشی میں اس کی طاقت کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں رکھتے یا اس کے مقابلے میں ہمارے وسائل بہت محدود ہیں اور وہ عیاری یا مکاری کے حربے استعمال کر سکتا ہے جو ہم سادہ لوح اور شریف لوگوں کو شکست دے سکتے ہیں۔ اس کا تنا آنا یہ ظاہر کرتا تھا کہ اس نے ہمیں برابر کا حریف تسلیم کر لیا ہے اور ہماری کوئی بات اس کے لیے غیر اہم نہیں رہی۔ میری اور فتح شیر کی گفتگو سنتے ہی یہ احساس شدت سے ابھر آیا ہوگا کہ دفاعی جنگ لڑنے والے اب جارحیت پر اتر آئے ہیں اور وہ دشمن جو قانون کے مورچے میں رہ کر لڑتا تھا لاقانونیت کی طاقت میں اس کے برابر ہونے کا ثبوت دینے کے لیے آگے بڑھ کر حملے کرنے لگا ہے۔ رحمت کباڑی کی لاش ارسال کر کے ہم نے دلاور کے غرور پر پہلی کاری ضرب لگائی تھی۔ ابھی وہ شکست کی تلخی کا ذائقہ بھولا بھی نہ تھا کہ ہم نے اسے طافو کے قتل میں ملوث کرنے کی کوشش کی۔ اس نے یہ محاذ پیسے کی طاقت سے سر کر لیا تھا لیکن اب اچانک اس پر خوف ناک انکشاف ہوا تھا کہ وہ عارضی کامیابی اس کی کتنی بڑی شکست کا سامان بن گئی ہے۔ اس نے پانچ لاکھ گنوا دیے تھے۔ یہ خطرہ بدستور موجود تھا کہ اس پر دوسرے قتل کا الزام بھی آ سکتا ہے [جس] کے بعد اس کی ضمانت منسوخ ہو جائے گی اور اسے جیل

کی سلاخوں کے پیچھے جانا پڑے گا۔

شاید وہ سیدھا فتح شیر کے پاس جاتا۔ اسے ٹیپ سناتا اور گالیاں دے کر کہتا کہ پانچ لاکھ واپس کرو یا مجھے اس مصیبت سے نجات دلانے کی صورت پیدا کرو ورنہ میرے ساتھ تم بھی گئے لیکن اب یہ بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ ایک ٹائر تو وہ بدل سکتا تھا لیکن دوسرے ٹائر کے لیے ضروری تھا کہ کسی پٹرول پمپ تک جائے اور پنکچر لگوا کے لائے۔ میں نے اسے ایریل نیچے کر کے چاروں طرف نگاہ ڈالتے دیکھا۔

"پاگل کا بچہ۔" محسن ہنسا۔ "دیکھ رہا ہے کہ ہم کہیں آس پاس ہیں تو کہاں ہیں۔"

"سخت طیش میں ہوگا کہ ہم نے اتنی جرأت کی۔" میں نے کہا۔ "اس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر لوٹ گئے۔"

"اور اب وہ سوچنے پر مجبور ہوگا کہ جو لوگ اتنا قریب آ کے ٹائر فلیٹ کر سکتے ہیں وہ کار کے نیچے ٹائم بم رکھ کے یا ڈائنامائیٹ لگا کے بھی جا سکتے ہیں۔" محسن بولا۔ اسی وقت دلاور نے ایک ٹیکسی روکی۔ میرا خیال تھا کہ وہ ایک ٹائر کی جگہ اسپیئر وھیل لگا کے اسی ٹیکسی میں دوسرا ٹائر لے جائے گا اور پنکچر لگوا کے لے آئے گا مگر دلاور نے اتنی جسمانی مشقت اور ذہنی کوفت برداشت کرنے کے مقابلے میں کار کو وہیں چھوڑ جانا بہتر سمجھا۔ وہ خود ٹیکسی میں بیٹھا اور سیدھا نکل گیا۔ غالباً اس نے طے کیا تھا کہ ڈرائیور بعد میں آ کے گاڑی لے جائے گا۔

"کیا یہ ہو سکتا ہے محسن خان کہ ہم دلاور کی مدد کر دیں؟" میں نے کہا۔

"تیرا مطلب ہے گاڑی کو یہاں سے لے جائیں؟" محسن نے خوش ہو کے کہا۔ "یہ تو میں بھی سوچ رہا تھا۔"

محسن نے کار کو دلاور کی گاڑی کے پاس لے جا کر روکا۔ ہم دونوں پورے اعتماد کے ساتھ اترے۔ میں نے دروازے کے بند شیشے میں جھانکا۔ ڈرائیور کی سہولت کی خاطر دلاور نے کار کی چابیاں لگی چھوڑ دی تھیں اور دروازہ لاک کر دیا تھا۔ اپنے حلیے اور اعتماد سے ہم کار چور نظر نہیں آتے تھے بلکہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک کار والا دوسرے کار والے کی مدد کر رہا ہے۔

ہمارا سابقہ تجربہ یہ تھا کہ گاڑیوں کے دروازے کھولنا مشکل نہیں ہوتا اور عموماً کوئی نہ کوئی چابی ڈور لاک میں لگ جاتی ہے۔ محسن نے یکے بعد دیگرے تین چابیوں کو آزمایا اور ایک کو تھوڑا سا ہلانے سے اندر کی وہ ڈور ناب اٹھ گئی جس نے دروازے کو مقفل کر دیا تھا۔ میں نے اطمینان سے چابیاں نکالیں اور پیچھے سے ڈکی کھولی۔ اسپیئر وھیل اور جیک نکالے اور محسن نے ایک پنکچر ہونے والے ٹائر کا دھیل کھولنا شروع کیا۔ کسی نے ہماری اس کارروائی کو قابلِ غور نہیں سمجھا۔ نہ ہمارے قریب سے پیدل گزرنے والوں نے، نہ کسی دوسری گاڑی میں آنے جانے والے نے۔ میں نے محسن کی مدد کی اور جتنی دیر میں وہ اسپیئر وھیل لگا کے فارغ ہوا میں نے گاڑی کے دوسرے وھیل کو جیک پر اٹھا لیا۔ اس سب کام میں پندرہ منٹ بھی نہیں لگے۔

پھر میں نے دوسرا ناکارہ ٹائر اپنی گاڑی میں رکھا اور اسے ایک پٹرول پمپ پر لے گیا جو کچھ پیچھے ایک موڑ پر تھا۔ پنکچر لگوا کے ہوا بھروانے اور واپس وہیں آنے میں مجھے آدھا گھنٹا لگ گیا۔ اس وقت تک اِدھر اُدھر کی گاڑیاں جا چکی تھیں اور ان کی جگہ نئی گاڑیوں نے لے لی تھی۔ محسن اطمینان سے بونٹ کا سہارا لیے کھڑا تھا اور گاڑی جیک پر یوں کھڑی تھی جیسے کوئی ایک مصنوعی ٹانگ پر سیدھا کھڑا ہو۔ میں نے ٹائر اس کے حوالے کیا اور اس نے دس منٹ میں اسے کس دیا۔ جیک کو گاڑی میں پھینک کر اس نے ڈکی بند کی اور اپنے ہاتھ صاف کیے۔ میرے یاد دلانے پر اس نے کپڑے سے جیک کو بھی صاف کیا اور ٹائر کو بھی تاکہ ہمارے فنگر پرنٹ کہیں نہ رہیں۔

"اب میں دلاور کی گاڑی لے کر جاتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "تو باغِ جناح کی طرف جا۔"

"ابھی ایک گھنٹے سے زیادہ وقت ہے۔" محسن نے کہا۔

"میں تیرے ساتھ چلتا ہوں ورنہ تیرا واپس آنا مشکل ہو جائے گا۔"

"میں آجاؤں گا ٹیکسی میں۔" میں نے کہا۔ "یہ نہ ہو دیر ہو جائے اور دلاور لوٹ جائے۔"

"دلاور اب ہماری مٹھی میں ہے، وہ کہاں جائے گا۔" محسن نے کہا۔ "وہ انتظار کرے گا۔"

دونوں گاڑیاں آگے پیچھے روانہ ہوئیں۔ آدھے گھنٹے میں شہر کی ٹریفک سے گزر کے صدر پہنچنا آسان کام نہیں تھا لیکن ہم دونوں ماسٹر ڈرائیور تھے اور دونوں کو اپنی اپنی منزل کا علم تھا۔ رش میں کئی جگہ ہم ایک دوسرے کی نظر سے اوجھل ہوئے اور پھر مل گئے۔ جب ہم نے دھرمپورے سے آگے صدر کے قریب ریلوے کراسنگ کو عبور کیا تو آدھا گھنٹا ہو گیا تھا اور کم سے کم دس منٹ کی مسافت باقی تھی لیکن اطمینان کی بات تھی کہ واپسی پر ہمیں نصف سے بھی کم فاصلہ طے کرنا تھا۔ واپسی کا راستہ بھی صاف تھا۔ رابعہ کی اس کوٹھی کے قریب میں فتح شیر کی لاش ایک باتھ روم میں سولہ سترہ گھنٹے پڑی تھی، میں نے ٹیڈی کو دیکھا۔ غالباً وہ کار کو پہچان کر آگے آیا تھا۔ میں نے اسے دیکھ کے ہاتھ ہلایا اور دلاور کی کار سیدھا کوٹھی کے گیراج میں لے گیا۔ ٹیڈی میرے پیچھے آیا۔ میں اس وقت کپڑے سے اسٹیئرنگ وھیل، گیئر اور دروازے کو صاف کر رہا تھا جہاں میرے ہاتھ لگے تھے۔

"یہ آپ نے کیا غضب کیا جی۔" ٹیڈی بولا۔ "یہاں پولیس ملتی آپ کو پھر؟"

"پولیس کیسے مل سکتی تھی؟" میں نے ہنس کر کہا۔ "تمہیں ٹیلیفون جو مل گیا تھا۔"

"میرا ٹیلی فون!" ٹیڈی کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ "قسم مولا علی کی.... میں نے کوئی فون نہیں کیا تھا۔"

"کیا تم نے نہیں کہا تھا کہ سب خیریت ہے؟" میں نے اس کی بوکھلاہٹ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔

"میں نے کہا نا سکندر بادشاہ۔ یعنی حد ہے۔" اس نے مجھے غیر سنجیدہ دیکھ کے کہا۔

"اچھا چھوڑو۔ جب خیریت ہے تو خیریت ہے۔" محسن نے اس کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا۔ "بس ہمیں معلوم ہو گیا تھا کہ پولیس نہیں آئی۔ ٹیلیفون کی جگہ تم نے ٹیلی پیتھی سے کام لیا۔"

"کس سے جی....؟ ذرا اردو میں بتاؤ۔ ہم جاہل ہیں۔" وہ بولا۔

"ٹیلی پیتھی۔ یہ ٹیلیفون کی ساس ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔ "جیسے ٹیلی وژن سسر ہوتا ہے۔ چلو بیٹھو۔"

ٹیڈی مذاق کو نہ سمجھنے کے باوجود ہنسا اور پھر ہمارے ساتھ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ "یہ تم کس کی شادی میں آئے تھے؟" وہ بولا۔ "کوئی نیا چکر لگتا ہے مجھے تو۔"

"یہ سب پرانے چکر ہیں استاد۔ تقدیر کے چکر۔" محسن نے کہا۔ "جنھوں نے ہمیں گھن چکر بنا دیا ہے۔"

"اور بقولِ شاعر، ایک چکر ہے میرے پاؤں میں زنجیر نہیں۔" میں نے کہا۔ "پندرہ منٹ ہیں میاں شیروانی۔"

"پھر تو ایک منٹ فالتو ہے۔" وہ بولا اور گاڑی کو موڑ کر سڑک پر لے آیا۔ چودہ منٹ میں باغِ جناح تک پہنچنے کے لیے اس نے کار کو سپر سانک جیٹ کی رفتار سے دوڑایا۔ میں تو اس قسم کی پُرخطر مہمات کا عادی تھا لیکن ٹیڈی کی حالت غیر ہو گئی۔ اس نے کئی بار محسن کو ٹوکا۔ "کیا مروانا چاہتے ہو بھائی محسن؟" محسن نے رفتار اور بڑھا دی۔ "یار سکندر بادشاہ، ایسے تو اُوپر پہنچ جائیں گے۔ کوئی پیچھے لگا ہوا ہے کیا؟" وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

"نہیں۔ محسن نشے میں ہے۔" میں نے رازدارانہ لہجے میں سرگوشی کی۔ "اس وقت کسی کی نہیں سنے گا۔"

"یا میرے مولا! ابھی سے مت بلا لینا۔ یہ تو کنوارا ہی مارنے پر تُلا ہوا ہے۔" وہ اُوپر مُنہ اُٹھا کے بولا۔

پہلے ہم چڑیا گھر کی طرف سے داخل ہوئے لیکن اوپن ایئر تھیٹر اور ریسٹورنٹ کی طرف جانے والی سڑک کو ریلوے لائن کے ٹکڑے گاڑ کر یوں بند کر دیا گیا تھا کہ درمیانی فاصلے میں سے موٹر سائیکل والے تو نکل ہی جاتے تھے لیکن کار کا گزرنا ناممکن تھا۔ اگر ہم دوسری طرف جاتے تو ہم کو دلاور کی گاڑی کے بہت زیادہ قریب محدود سے پارکنگ ایریا میں رکنا پڑتا اور ان حالات میں کہ ہمارے لیے اس کی گاڑی کو پہچاننا بھی مشکل تھا، یہ بہت خطرناک اقدام ہوتا۔ معلوم نہیں کہ وہ کس کی کار لے کر آیا تھا۔ ٹیکسی میں وہ اس لیے نہیں آسکتا تھا کہ عموماً ٹیکسیوں میں ریڈیو نہیں ہوتے اور ہوں بھی تو دلاور کسی ٹیکسی ڈرائیور کی موجودگی میں ہم سے بات کیسے کر سکتا تھا۔ اس نے دو گھنٹے سے بھی کم وقت میں ایک کار کا انتظام بھی کیا ہوگا اور شاید ہال روڈ سے کوئی ایف ایم مائکروفون بھی خریدا ہوگا۔

"جہاں اس وقت ہم کھڑے ہیں یہاں سے باغ کا دوسرا حصہ ایک فرلانگ دُور ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ لاہور جمخانہ کے پاس موجود ہوگا اور ہر گاڑی کا نمبر نوٹ کر رہا ہوگا۔" محسن نے کہا۔ "مواصلاتی رابطہ قائم ہوتے ہی وہ سمجھ جائے گا کہ ہم کس کار میں آئے ہیں۔"

"اگر ہم ہال روڈ کے متوازی کچے راستے پر لیڈیز کلب سے ذرا پیچھے رُک جائیں؟" میں نے کہا۔

"گویا گورنر ہاؤس کے گیٹ کے بالکل سامنے؟" محسن نے کہا۔ "فوراً کوئی تفتیش کے لیے آجائے گا۔ آگے رُکیں گے تب بھی مشکوک نظر آئیں گے۔"

"یار کیوں نہ ہم جمخانہ میں ممبروں کے لیے مخصوص راستے سے اندر چلے جائیں۔" میں نے کہا۔ "چوکیدار روکے گا لیکن پروا نہیں تو سیدھا گزر جا۔ میں بات کر لوں گا۔"

گاڑی نے ایک لمبا چکر کاٹا اور جمخانہ کی عمارت کے گیٹ میں پیچھے سے داخل ہوئی۔ حسبِ توقع ایک چوکیدار نے آگے بڑھ کے ہمیں بتایا کہ یہ جگہ صرف ممبروں کی گاڑیوں کے لیے ہے۔

"ہمیں بٹ صاحب نے یہاں ملنے کو کہا تھا۔" میں نے کہا۔ "ہم ذرا پہلے آگئے ہیں، یہیں انتظار کریں گے۔"

"کون بٹ صاحب؟ قیوم بٹ صاحب یا نصیر بٹ صاحب؟" وہ بولا۔

"قیوم بٹ صاحب۔" میں نے بغیر سوچے کہا۔ "انھوں نے ساڑھے آٹھ بجے کا وقت دیا تھا، ہم ان کے مہمان ہیں۔"

چوکیدار لوٹ گیا تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ مذکورہ قیوم بٹ صاحب موجود نہ تھے ورنہ ہمیں ان سے شرفِ ملاقات حاصل کرنا پڑتا یا ان کے آنے سے پہلے جانا پڑتا۔ میں نے مائک آن کر کے دلاور کو مخاطب کیا۔

"ہیلو دلاور۔ ڈو یو ریڈ می؟ دس از ایم آر ایس...."

محسن نے کار کے ریڈیو کو ایف ایم بینڈ پر ٹیون کرنا شروع کر دیا تھا۔ دلاور کی آواز اچانک آئی.... "یہ کیا بکواس ہے ایم آر ایس...."

"ویری گڈ۔ تمھیں بھی مل ہی گیا ایف ایم مائک۔" میں نے کہا۔ "ایم آر ایس بکواس نہیں ہے اپنے چوہدری صاحب۔ یہ بہت بڑی حقیقت ہے۔"

"محسن، رابعہ اور سکندر۔" دلاور نے میری بات کاٹ دی۔ "آواز صرف ایم اور ایس کی سُنی ہے میں نے۔"

"ایم آر ایس کا ایک اور مطلب بھی نکلتا ہے دلاور۔" میں نے کہا۔ "اور وہ ہے مائٹ اِز رائٹ سوسائٹی۔ مطلب سمجھتے ہو نا اس محاورے کا۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس سمجھ لو۔ یہ وہ تنظیم ہے جس کے تم بھی ایک ممبر ہو۔ ہم تو بعد میں شامل ہوئے۔ تم نے بہت پہلے اس اصول کو اپنا لیا تھا اور تم نے کیا، نہ جانے کب سے دنیا میں یہی اصول کار فرما رہا ہے۔ اسی نے لیگ آف نیشنز کے وجود کو بے مصرف بنا دیا تھا اور اسی نے اقوام متحدہ کو تماشا بنا دیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ افراد، ادارے اور ممالک اس تنظیم کے رکن بنتے جا رہے ہیں اور جس کی لاٹھی اس کی

بھیلس کا فلسفہ بین الاقوامی سچائی سمجھا جانے لگا ہے، یونیورسل ٹرتھ۔"

"کیا تم نے مجھے یہی لیکچر دینے کے لیے یہاں بلایا تھا؟" دلاور کی آواز آئی۔

"نہیں۔ لیکچر دینے سے میرا ہی وقت ضائع ہوگا۔ میں تم کو حکم دیتا ہوں۔" میں نے کہا اور تھوڑا سا وقفہ دیا۔ "تم جہاں کھڑے ہو وہاں سے اپنی گاڑی نکالو اور کشمیر روڈ سے بانسوں والی سڑک پر چلو۔"

"میرے پاس دوسری گاڑی ہے۔ تمھیں تو معلوم ہی ہوگا۔" وہ تلخی سے بولا۔

"گاڑی کا میک ماڈل، رنگ اور نمبر بتا دو۔" میں نے کہا۔ "اور ٹھیک تیس میل فی گھنٹا کی رفتار سے چلتے جاؤ۔"

"میں کہیں جانے کے لیے نہیں آیا۔ تم سے بات کرنے آیا ہوں۔" وہ بولا۔ "تم مجھ سے سودا کرنا چاہتے ہو یا نہیں؟"

"انکار نہ میں کرنا چاہتا ہوں اور نہ تم کر سکتے ہو دلاور۔" میں نے کہا۔ "لیکن میں سمجھتا ہوں کہ سودا کرنے کے لیے یہ جگہ مناسب نہیں ہے۔ میں خود کو یہاں محفوظ نہیں سمجھتا۔ مجھے کیا معلوم تم اکیلے ہو یا مجھے قتل کرنے کے لیے اپنی شکاری ٹیم کے ساتھ ہو۔"

"یہ اندیشہ تو مجھ کو ہے۔" دلاور نے کہا۔ "اب تمھیں قتل کیسے کر سکتا ہوں میں؟"

"تمھاری پوزیشن اس لحاظ سے بہتر ہے کہ تم اکیلے نہیں، پولیس بھی تمھارے ساتھ ہے۔" میں نے کہا۔ "جو کام تم خود سامنے آئے بغیر کرنا چاہو وہ پولیس سے بھی کروا سکتے ہو۔ اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تمھارے آس پاس دوسری گاڑیوں میں سادہ کپڑوں والی پولیس کی نفری موجود نہیں، تم نے دو گھنٹوں میں کچھ تو کیا ہی ہوگا؟"

"مجھے پونے دو گھنٹے ملے تھے۔" وہ بولا۔ "اگر میں اپنی گاڑی وہاں چھوڑ کے نہ آتا اور اس کے دونوں فلیٹ ہو جانے والے ٹائروں کو بدلتا تو مجھے ایک گھنٹا وہیں لگ جاتا۔"

"پھر تم کیسے آئے؟ کسی باڈی گارڈ کی گاڑی میں؟"

"میرے ساتھ کوئی نہیں تھا۔ مجھے وہاں سے ٹیکسی لینی پڑی۔" دلاور بولا۔ "گھر سے میں نے ڈرائیور کو اپنی گاڑی لینے بھیجا اور خود یہاں دوسری گاڑی میں پہنچا ہوں جو میری بیوی کے استعمال میں رہتی ہے۔ واکس ہال ہے تین سال پہلے کا ماڈل۔ ڈارک گرین۔ نمبر ہے......"

"نمبر کو چھوڑو۔ دور سے نظر بھی نہیں آتا اور غلط ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "میں گاڑی کو پہچان لوں گا۔ میرے پاس کوئی گاڑی نہیں ہوگی۔ میں کسی بھی رکشا یا ٹیکسی میں آؤں گا۔"

"یہاں بات کرنے میں کیا حرج ہے۔ تم سامنے آئے بغیر بھی تو سودا کر سکتے ہو؟"

"دیکھو دلاور! میں اس کھیل سے اکتا گیا ہوں۔" میں نے کہا۔ "مجھے احساس ہونے لگا ہے کہ تمھاری پہلی آفر ٹھکرا کر میں نے ایک جذباتی حماقت کی تھی۔ اس کا میں نے کیا خمیازہ بھگتا، یہ تم بھی جانتے ہو لیکن اس وقت میری جگہ تم بھی ہوتے تو یہی کوشش کرتے۔ میں نیا نیا ولایت سے آیا تھا اور ذہنی طور پر اس شدید صدمے کے لیے تیار نہیں تھا جو مجھے یہاں پہنچتے ہی اٹھانا پڑا۔ ان حالات میں غصے نے مجھے پاگل کر دیا اور میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفلوج کر دی تو یہ میرا قصور نہیں تھا، میرے جوان خون کا ابال تھا۔"

"کیا اب تم خود کو بوڑھا سمجھنے لگے ہو! اس عمر میں؟" وہ طنز سے ہنسا لیکن مجھے اس کے لہجے میں اطمینان کی جھلک محسوس ہوئی۔ وہ اطمینان جو آخری وقت میں شکست کی خبر کی جگہ فتح کی نوید ملنے سے حاصل ہوتا ہے۔ میں اس کو قائل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ بعد از خرابی بسیار میں راہِ راست پر آ گیا ہوں۔ وہ کب نہیں چاہتا تھا کہ یہ محاذ آرائی ختم ہو جس میں اندازوں کی غلطی کے باعث خود اسے بہت نقصان اٹھانا پڑ رہا تھا۔ وہ عدم تحفظ کے احساس کا شکار تھا اور مستقبل سے مایوس ہو چکا تھا۔ ایک ایسے وقت میں جب اس کا خیال تھا کہ حریف کی گوریلا جنگ کا نشانہ براہِ راست اس کی ذات ہونے لگی ہے، یہ اطلاع انتہائی تسلی بخش تھی کہ صلح کے آثار پیدا ہو چلے ہیں۔ وہ صلح کے لیے مجھے منہ مانگی قیمت دے سکتا تھا۔ اس کے ذہن نے میری بات کا منطقی تجزیہ کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ نقصان اگر دلاور کو ہوا تھا تو میرا اس کے مقابلے میں بہت زیادہ ہوا تھا۔ میرے ساتھ اور بہت سے لوگوں کو نقصان کا بوجھ اٹھانا پڑا تھا۔ خون دونوں طرف سے بہا تھا لیکن میرا ساتھ دینے والے تعداد میں زیادہ تھے۔ دلاور نے سمجھا کہ اسی حساب نے مجھے بے بس اور مجبور کر دیا ہے اور اب مجھ میں مزید نقصانات اٹھانے کی سکت نہیں رہی۔ وہ کاروباری ذہن رکھنے والا غیر جذباتی آدمی تھا۔ اگر وہ فتح کو انا کا مسئلہ بنا لیتا تو یہ نہ دیکھتا کہ نقصانات کا تناسب کیا ہے۔ اس نے صرف اپنے نقصان

دیکھا۔ صرف وہ شمار کیا جو اس نے گنوا دیا تھا اور آئندہ کے نقصانات کا تخمینہ لگایا۔ مجھے اگر دس گنا نقصان ہوتا تھا تو یہ اس کے لیے کوئی فائدے کی بات نہیں تھی۔ فائدہ وہ تھا جو اپنے خسارے کو منافع میں بدلنے سے حاصل ہو سکتا تھا اور آج بالآخر وہ وقت آ گیا تھا کہ دشمن خود ہی حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر اختیار کر رہا تھا کہ جنگ میں جیت کسی کی نہیں ہوتی۔ وہ یقین کرنا چاہتا تھا چنانچہ اس نے یقین کیا۔ محسن نے میرا اشارہ سمجھتے ہی ٹیڈی کو ہمراہ لیا اور باہر روانہ ہو گیا۔

"میرا مطلب یہ نہیں تھا کہ... تمھیں چیلنج کروں۔ بوڑھا تو میں ہوں تمھارے مقابلے میں۔" وہ مجھے خاموش پا کے بولا۔

"ایک وقت تھا دلاور جب تم نے مجھے دس لاکھ ماہانہ پر اپنے کاروبار میں شریک ہونے کو کہا تھا۔" میں نے کہا۔ "اور دوسرا متبادل یہ رکھا تھا کہ میں پچیس لاکھ لے کر واپس چلا جاؤں۔"

"اس وقت سے آج تک تم نے اپنا اور دوسروں کا کتنا نقصان کر لیا ہے؟" وہ ہنسا۔

"اس کا حساب کیسے لگایا جا سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "ایک آدمی کی زندگی کا کوئی بھی مول نہیں ہوتا۔"

"اور تمھارے پاس اب قربانی کے بکرے بھی نہیں رہے۔" اس کے لہجے میں فرعونیت کا غرور نمایاں ہونے لگا۔

"نہیں دلاور، ایسا مت کہو۔ قربانی کے بکرے تم نے خریدے تھے اور سب بکنے والے تھے۔" میں نے برہمی سے کہا۔ "میری خاطر جان دینے والوں نے مجھ سے کچھ نہیں مانگا تھا۔ کسی انعام کی توقع نہیں رکھی تھی مجھ سے۔ میں ان کو کیا دے سکتا تھا۔"

"اچھا اچھا۔ غصے میں مت آؤ۔" دلاور نے محسوس کیا کہ اس کا رویہ بننے والی بات کو بگاڑنے کا سبب ہو سکتا ہے۔ "لیکن مجھے اس بات کا یقین تو دلا دو کہ یہ تمھاری کوئی نئی چال نہیں ہے اور تم واقعی تصفیہ چاہتے ہو۔"

"میں بتا چکا ہوں دلاور کہ وقت نے میرے جذبات بدل دیے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہر غم کی شدت بالآخر کم ہو جاتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ جن حالات میں میرے والد کا انتقال ہوا، اس کے ذمے دار تم تھے اور اس وقت انتقام ہی میری واحد خواہش بن گیا تھا۔ کسی حد تک میں نے انتقام لے بھی لیا۔ آج تم مجھ سے ڈرتے ہو اور مجھ سے برابری کی بنیاد پر بات کرتے ہو۔ یہ نہیں سمجھتے کہ تم مجھے چٹکیوں میں مسل دو گے۔"

"لیکن اب تمھارے لیے مقابلہ جاری رکھنا مشکل ہے کیونکہ تم ہر طرف سے محصور ہو چکے ہو۔"

"تم مقابلہ جاری رکھنا چاہتے ہو؟" میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے، میں محصور ضرور ہوا ہوں دلاور لیکن مجبور نہیں۔ جب تک میں اکیلا بھی زندہ ہوں... ہتھیار نہیں ڈالوں گا... بات ختم۔"

"سنو سنو! بات ختم کرنے سے پہلے یہ بتا دو کہ تم کیا چاہتے تھے اور کیوں؟" وہ بولا۔

"اس کا کیا فائدہ جب تم مصالحت کی پیشکش کو میری کمزوری سمجھنے پر مصر ہو۔" میں نے کہا۔ "یہ تو سودا تھا۔"

"میں نے سودا کرنے سے انکار نہیں کیا۔ بس یہ سمجھا دو مجھے کہ تم کو سودا کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟"

"تم صاف سننا چاہتے ہو تو سن لو۔" میں نے کہا۔ "وہ بات کئی ماہ پرانی ہو چکی، مجھے کوئی امید نظر نہیں آتی کہ میں کبھی تم سے اپنا حق حاصل کر سکوں۔ اس دنیا کا قانون مجھے یہ حق دلانے میں میری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔"

"اس کے باوجود کہ تمھارے پاس ایک سے ایک قابل وکیل ہے۔" وہ پھر طنز پر اتر آیا۔

"وکیل، عدالت میں دلائل کی جنگ لڑ سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور اس جنگ میں جیت تمھاری ہو گئی ہے۔ میں کسی عدالت میں پیش نہیں ہو سکتا لیکن دنیا بہت بڑا میدانِ جنگ ہے۔ اس میں یہ جنگ غیر معینہ مدت تک جاری رہ سکتی تھی اور آئندہ بھی یہ امکانات مساوی ہیں کہ اس جنگ میں تم نہ رہو یا میں نہ رہوں۔ کیا تم یہ چاہو گے کہ تمھارا کاروبار رہ جائے، تمھارے بیوی بچے رہ جائیں اور تمھاری موت کا جشن منانے کے لیے میں رہ جاؤں؟ ہم تم اکیلے ہوتے تو کوئی فرق نہ پڑتا لیکن ہم دوسروں کے لیے زندہ بھی رہنا چاہتے ہیں۔"

"میں سمجھ گیا۔ اب تم کو کس کے لیے زندہ رہنے کی خواہش نے مجبور کر دیا ہے۔" وہ ہنسا۔

"بس تو یہ سمجھ لو کہ میری وہی مجبوری تمھارے ساتھ سودا کرنے کا سبب بنی ہے۔" میں نے کہا۔

"اس مجبوری کا نام رابعہ ہے۔" دلاور اب واقعی خوش تھا۔

"اس مجبوری کے بہت سے نام ہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ مجبوری بہت سے رشتوں کی آبرو کا نام ہے۔ دوسروں کی مجبوری کے سامنے اپنا سر جھکانے کا نام ہے۔ میرے آس پاس اور بھی لوگ ہیں جو زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ ان کا

گھر مجھے عزیز ہے اور میں ان گھروں کو آباد دیکھنا چاہتا ہوں اور اس کی واحد صورت یہ ہے کہ میں اس مقابلے سے خارج ہو جاؤں لیکن یہ شکست نہیں کہلائے گی۔"

"تم اس کو اپنی مرضی سے جو نام دینا چاہو دے لو۔" دلاور نے فیاضی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"میں اس پورے سیٹ اپ سے نکل جانا چاہتا ہوں۔ اس طرح کہ کسی کو معلوم نہ ہو کہ سکندر کب گیا اور کہاں گیا۔" میں نے کہا۔ "جب وہ کہیں نظر نہ آئے، کسی زبان سے اس کا نام سنائی نہ دے اور اس کی غیر موجودگی ثابت ہو جائے تو دنیا جو چاہے تسلیم کر لے۔ یہ کہ وہ مارا گیا، اس نے خودکشی کر لی کیونکہ وہ مقابلے کے لیے ہمت ہار چکا تھا یا وہ روپوشی میں ہی ہمیشہ کے لیے روپوش ہو گیا۔ دنیا بہت مصروف ہے اور کسی ایک آدمی کے بارے میں سوچنے اور باتیں کرنے کے لیے زیادہ وقت نہیں دے سکتی۔ خود تم بھی کوشش کرو گے تو ہمیں تلاش نہ کر پاؤ گے۔"

"ہمیں؟ گویا تمھیں اور رابعہ کو۔ بھئی! مجھے بھی فرصت کہاں ہو گی۔ ہماری طرف سے دُعا ہے کہ جہاں رہو خوش رہو۔"

"اب میں صورت حال کی اس سے زیادہ وضاحت کیسے کر دوں۔" میں نے کہا۔ "بات کو مختصر کرو۔ میں یہاں بات نہیں کر سکتا۔"

"کس بات کا ڈر ہے یہاں؟ آخر اتنی دیر سے ہم بات کر رہے ہیں۔"

"میں یقین کرنا چاہتا ہوں کہ تم اکیلے ہو۔" میں نے کہا۔ "اور یہ بات ٹیپ نہیں کر رہے ہو۔ جب تم چلو گے تو میں دیکھ لوں گا کہ گاڑی میں تم اکیلے ہو اور تمھارے ساتھ دوسری گاڑیاں نہیں ہیں۔"

"اس سے کیا ہو گا؟" دلاور نے کہا۔

"میں تم سے براہِ راست بات کروں گا تمھارے سامنے آ کے۔" میں نے کہا۔ "اگر بات بن گئی تو میں ٹیپ تمھارے حوالے کر دوں گا۔"

"ایک ٹیپ دینے کے بعد یہ ضمانت کون دے گا کہ اس کی دوسری کاپی نہیں ہے؟"

"بھروسا تو تم کو کرنا ہی ہو گا دلاور۔ یہ جُوا نہیں کھیلنا چاہتے تو تمھاری مرضی۔" میں نے کہا۔ "کچھ مجبوریاں تمھاری ہیں تو کچھ میری بھی ہیں۔ میں انھی مجبوریوں کا سودا کر رہا ہوں۔ میں عدالت کے ذریعے یا کسی اور طرح تم سے اپنا حق بھی نہیں لے سکتا۔ یہ میری مجبوری ہے۔ تمھاری مجبوری یہ ہے کہ تم عملی طور پر مالک ہونے کے باوجود غیر محفوظ ہو۔ اگر میں ہر طرف سے مایوس ہو گیا تو اپنے ساتھ تمھیں بھی تباہ کر دوں گا۔ تمھارے کاروبار کو، تمھارے ساتھ کاروبار کرنے والوں کو۔ تمھیں اور تمھارے گھر کو اسی طرح ختم کر دوں گا جس طرح میرا سب کچھ ختم ہوا۔ مایوسی کی انتہا کو پہنچ جانے والا آدمی بہت خطرناک ہو جاتا ہے۔ وہ مرنے کا فیصلہ کر لے تو اپنے ساتھ دس کو لے کر مرتا ہے۔ ایک آدمی کو پھانسی تو صرف ایک ہی بار دی جا سکتی ہے نا! میں آج مجبور ضرور ہوں اور اس لیے تم سے بات کر رہا ہوں کہ کچھ لو اور کچھ دو، جیو اور جینے دو۔ میں اس انتہا کو نہیں پہنچا ہوں جہاں میرے لیے عقل و ہوش سے کام لینا ممکن ہی نہ رہے۔ یہ نہ ہو، کل تمھیں ایک مرد گنوا دینے کی قیمت اس سے کہیں زیادہ ادا کرنی پڑے جو تم آج ادا کر سکتے ہو۔ میرا کیا ہے، روپوش ہوں اور روپوش رہ سکتا ہوں۔ تم کھلے میدان میں میرے نشانے پر ہو۔"

خاموشی کا ایک مختصر وقفہ آیا۔ میں نے اس لمحے کے فیصلہ کن ہونے کا یقین کیا۔ اس ایک لمحے میں میری ساری کوشش بے مصرف ثابت ہو سکتی تھی اور کامیابی میری ناکامی بن سکتی تھی۔

"اچھا، یہ بتاؤ تم کہاں بات کرو گے؟" دلاور نے کہا۔ "اور میں اگر یہ اطمینان کرنا چاہوں کہ تم بھی اکیلے ہو تو کیسے کروں؟"

"تمھارے لیے ڈرنے کی کون سی بات ہے؟" میں نے کہا۔ "اور اس سے پہلے تم کبھی نہیں ڈرے۔ میں نے تمھارے سامنے خود آ کے بات کی ہے یا تم نے مجھے بلوا لیا ہے۔ آخر ابھی کچھ دیر پہلے بھی تم اکیلے آ گئے تھے۔"

"تم مال روڈ کے کسی ریسٹورنٹ میں نہیں آ سکتے؟" دلاور بولا۔ "میں اکیلا ملوں گا۔"

"یقیناً پولیس تمھارے ساتھ ہے دلاور؟" میں نے طنزیہ لہجے میں تمسخر اڑاتے ہوئے کہا۔ "تم کو میری گرفتاری کا انعام لینا ہے۔"

"اچھا بتاؤ تم کہاں بات کرو گے؟" وہ کچھ شرمندہ ہو کے بولا۔

"میں تم کو اسی کوٹھی میں ملوں گا جو کسی جعلی نواب خسرو جمشید نے رابعہ کو فروخت کی تھی۔" میں نے کہا۔

"ناممکن۔ تم مجھے چوہے کی طرح چوہے دان میں پکڑنا چاہتے ہو؟"

"کیا فائدہ ہو گا اس سے مجھے؟" میں نے کہا۔ "کیا تمھیں اغوا کر کے قید رکھنے سے میرے خلاف مقدمات ختم ہو جائیں

گے؟ مجھے حقِ وراثت مل جائے گا؟ میں اگر تم کو قتل کر دوں گا تو میری فردِ جرم میں ایک اور قتل لکھ دیا جائے گا۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہو گا۔ اپنا حق حاصل کرنے کے لیے تو میرا عدالت میں حاضر ہونا اور وراثت کا سرٹیفکیٹ لینا ضروری ہے مگر عدالت اس کے ساتھ ہی مجھے ڈیتھ سرٹیفکیٹ بھی تھما دے گی۔ تم کو اغوا یا قتل کرنا ہوتا تو یہ کون سا مشکل کام تھا دلاور! تمھارے لیے کیا رسک ہے اس میں، رسک تو میں لے رہا ہوں۔"

"معلوم نہیں کیوں میرا دل یہ تسلیم نہیں کرتا کہ تم پُرامن تصفیے کی یہ پیشکش نیک نیتی سے کر رہے ہو۔" دلاور بولا۔ "میری چھٹی حس کہتی ہے کہ اس میں میرے لیے خطرہ ہے۔ تمھاری فطرت کے خلاف ہے یہ بات۔"

"ٹھیک ہے۔ پھر میں سمجھتا ہوں کہ میرا انتظار کرنا فضول ہے۔" میں نے کہا۔ "اب ایک آخری بات۔ میں دھرمپورے سے صدر کی طرف آنے والی سڑک پر موجود رہوں گا۔ نو بجے سے سوا نو بجے تک۔ تم چوراہے سے سیدھے گزرو گے تو میں تمھاری گاڑی دیکھ لوں گا۔ شیشے کھلے رکھنا تاکہ میں تم کو پہچان سکوں۔ اگر مجھے یقین آ گیا کہ تمھارے ساتھ یا تمھارے پیچھے کوئی نہیں ہے تو میں تم کو ہاتھ کے اشارے سے روک لوں گا اور تمھارے ساتھ بیٹھ کے چلوں گا پھر ہم براہِ راست سب معاملات طے کر لیں گے۔"

"مجھے منظور ہے۔" وہ بولا۔ "اس وقت پونے نو بجے ہیں۔"

"ہاں، اپنا ریڈیو بند مت کرنا۔" میں نے کہا۔ پھر مائکروفون کو بند کر کے میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور جمخانہ کی عمارت کے احاطے سے نکل آیا۔ چند سیکنڈ کے بعد میں نے گاڑی کی ہیڈلائٹس بند کر کے وہاں روکا جہاں سے میں دلاور کی گاڑی کو باہر آتے صاف دیکھ سکتا تھا۔ گہرے ہرے رنگ کی واکس ہال جو دُور سے ڈارک براؤن نظر آتی تھی آگے نکلی۔ دوسری ایک ٹیکسی تھی جو اس کے پیچھے آئی۔ دونوں ایک ساتھ کشمیر روڈ کی طرف روانہ ہوئیں۔ میں ایک فرلانگ کے فاصلے سے پیچھے گیا اور بالسنوں والی سڑک پر انکل رضوی کے گھر کے سامنے سے گزرا۔ وقت کی یادوں نے میرا راستہ روکا لیکن میرا دھیان ان گاڑیوں کی طرف تھا جو آگے جا رہی تھیں۔ واکس ہال اور ٹیکسی سو گز کے فرق سے آگے پیچھے ایک ہی رفتار سے چل رہی تھیں۔ نہر کی طرف مڑنے کے بعد جب دونوں گاڑیوں نے نہر کا پل بھی ایک ساتھ عبور کیا اور دھرمپورے کی سڑک پر بھی اسی فاصلے کے ساتھ رواں رہیں تو میرا شک یقین میں بدل گیا۔ دلاور اکیلا نہیں تھا۔ اگر وہ کار میں اکیلا تھا تو ٹیکسی میں اس کے ساتھ دوسرے افراد بھی تھے۔ اس کے اپنے ساتھی یا پولیس والے۔ دھرمپورہ تھانے کے بعد ٹیکسی آگے ہو گئی اور واکس ہال درمیان میں آ گئی۔ پھر میں نے رفتار بڑھائی اور دونوں سے آگے نکل گیا۔ اوورٹیک کرتے ہوئے میں نے ایک بس کو درمیان میں رکھا۔ بس پہلے ہی ان دونوں گاڑیوں کو اوورٹیک کر رہی تھی۔ جب میں نے بس کو اوورٹیک کیا تو سڑک کے دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔ سامنے سے آنے والی ایک کار کی ہیڈلائٹس نے مجھے اندھا کر دیا۔ اس نے زبردست بریک لگائی اور میں نے انتہائی خطرناک طریقے پر دوبارہ بائیں طرف ہونے کی کوشش کی تو بس کے سامنے آ گیا۔ میری رفتار بھی ساٹھ میل سے زیادہ تھی۔ اگر میں سامنے والی گاڑی کے تصادم سے نہ بچتا تو یہ حادثہ انتہائی خوفناک ہوتا کیونکہ مخالف سمت سے آنے والے کی رفتار بھی کم نہ تھی اور میں نے اس کے گزرنے کے لیے راستہ چھوڑا ہی نہ تھا۔ جب میں ایک دم بائیں طرف ہوا تو بس کے اگلے حصے اور میری کار کے پچھلے حصے کے درمیان ایک انچ کا فاصلہ بھی نہ رہا ہو گا۔ اگر میں ایک دم رفتار نہ بڑھاتا اور اس کے ساتھ ہی بس ڈرائیور فوراً بریک پہ پیر نہ رکھتا تو ٹکر خوفناک نہ ہوتی لیکن کار کا پچھلا حصہ یقیناً تباہ ہو جاتا۔ اس طرح اوورٹیک کر کے میں نے خود کو دلاور کی نظر میں آنے سے تو بچا لیا مگر خود بھی بال بال بچا۔ اس رفتار پہ کار کے بے قابو ہو کے الٹنے کے امکانات بھی تھے۔ سامنے سے آنے والی کار اور بس کے ڈرائیوروں نے یقیناً مجھے گالیاں دی ہوں گی۔ کسی نے یہ نہیں سمجھا ہو گا کہ میں ایمرجنسی کے باعث اتنی تیزی سے اور اتنے خطرناک انداز میں گاڑی چلا رہا ہوں۔ بیشتر لوگوں نے فرض کیا ہو گا کہ میں نشے میں ہوں۔ مجھے جدائی کا نشہ ہے یا میں کوئی جرم کر کے فرار ہوا ہوں۔

بس کے اچانک بریک لگانے اور مجھے بچانے کی خاطر بائیں طرف ہونے کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ ڈرائیور اپنی پوری کوشش کے باوجود ٹیکسی کو نہ روک سکا اور وہ بس سے ٹکرائی تو پیچھے آنے والی واکس ہال بھی ٹیکسی میں گھس گئی۔ دونوں اپنی رفتار پہ کافی حد تک قابو پا چکے تھے چنانچہ نقصان کسی کا بھی زیادہ نہیں ہوا اور یہ سب مجھے بعد میں خود دلاور کی زبانی معلوم ہوا۔ اس وقت تو بس بھی رُک گئی، ٹیکسی اور واکس ہال بھی۔ ہاں تھوڑی بہت گرما گرمی ہوئی ہو گی ٹیکسی

ڈرائیور اور دلاور نے مجھے آگے نکلتے نہیں دیکھا تھا چنانچہ انھوں نے بس ڈرائیور کو گالیاں دی ہوں گی اور بس ڈرائیور نے مجھے پھر بس کے مسافروں کی گواہی سے یہ ثابت کر دیا ہوگا کہ اس نے ایک حادثے سے بچنے کی کوشش کی تھی اور یوں تھوڑی سی ٹک ٹک جھک جھک کے بعد معاملہ رفع دفع ہو گیا ہوگا۔ بس تو سرکاری تھی اور اس کی خوبصورتی میں فرق پڑنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ ٹیکسی والے نے اور دلاور نے اپنی اپنی گاڑی کے ڈینٹ نکلوانے اور پینٹ کرانے کے اخراجات کا سرسری اندازہ کیا ہوگا اور چل پڑے ہوں گے۔

اس وقفے سے مجھے دو فوائد حاصل ہوئے۔ ایک تو میں آگے نکل کے سیدھے ہاتھ کی طرف مڑ گیا جہاں ایک گلی میں ہیجڑے رہتے تھے۔ اپنے روزمرہ کے کاروبار کے علاوہ ان کی آمدنی کا ایک ذریعہ یہ بھی تھا کہ وہ شادی بیاہ کے لیے ڈھولک کرائے پر دیتے تھے۔ میرا مقصد تو خود چھپنا اور کار کو چھپانا تھا۔ وہ بس ڈرائیور بعد میں دیکھتا رہا ہوگا کہ وہ کار نظر آ جائے تو اس کے مالک کو بے نقط سنائے۔ اگر وہ چاہتا بھی تو نمبر نوٹ نہیں کر سکتا تھا لیکن نیلے رنگ کی کورٹینا کو پہچان سکتا تھا۔ میں پیدل چلتا ہوا چوک تک گیا اور دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ میں دلاور کے پہنچنے سے پہلے ہی ایک تاریک گوشے میں جا کھڑا ہوا۔ اگر ان کا بس نے راستہ نہ روکا ہوتا تو وہ میرے پہنچنے سے پہلے وہاں سے گزر جاتے۔ سوا نو کے بجائے میں نے نو بج کر بیس منٹ پر پہلے ٹیکسی کو اپنے سامنے سے گزرتے دیکھا لیکن اس کی رفتار بہت زیادہ تھی اور اس کے شیشے بند تھے چنانچہ میں کچھ بھی نہ دیکھ سکا۔ یہ بھی نہیں کہ ٹیکسی کو چلانے والا کون تھا اور اس میں وہ اکیلا تھا یا اس کے ساتھ اور لوگ بھی تھے۔

دلاور کی گرین واکس ہال کار دو منٹ بعد آئی۔ میری ہدایات کے مطابق اس نے سردی میں بھی کار کے شیشے کھول دیے تھے اور وہ بہت آہستہ جا رہا تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ اس گاڑی کی عقبی سیٹ پر کوئی لیٹا ہوا ملتا یا دلاور نے کسی کو چالاکی سے ڈکی میں چھپا دیا ہوتا لیکن اتنا دیکھنے کے لیے وقت ہی نہ تھا۔ اس کے علاوہ دلاور اپنے ساتھیوں کو ٹیکسی میں بھیج چکا تھا۔ چنانچہ کار میں کسی کو ساتھ رکھنے سے اس کے پلان کے فیل ہونے کا امکان تھا۔ میں نے جوا کھیلا اور ایک دم کار کے سامنے آ گیا۔ دلاور نے دروازہ کھولا اور میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اگر کوئی پیچھے ہوتا تو اتنی دیر میں ریوالور میری گدّی پر رکھ دیتا۔

"شیشے بند کر لو اور گاڑی اسی جگہ روک لو" میں نے

"یہاں؟ لیکن تم نے تو کہا تھا....."

"عقل سے کام لو دلاور! میں پہلے سے کوئی جگہ بتا کر تم سے ملنے کیسے آ سکتا ہوں" میں نے کہا "تم اگر مجھ پر اعتماد کرتے ہو تو اس لیے کہ تم اس پوزیشن میں ہو۔ میں کسی پر بھی اعتماد نہیں کر سکتا۔ میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں"

"بے وقوف تو تم ہو اپنے سکندر صاحب معاف کرنا" وہ گاڑی روک کر بولا "تمھیں کیا معلوم کہ میں اکیلا ہوں یا میرے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟"

"مجھے معلوم ہے کہ ایک ٹیکسی میں کچھ افراد تمھارے ساتھ آئے ہیں" میں نے اطمینان سے کہا "میں تعداد نہیں بتا سکتا لیکن ٹیکسی کا نمبر بتا سکتا ہوں اور یہ بتا سکتا ہوں کہ وہ ٹیکسی ابھی ابھی سیدھی گئی ہے۔ میں نے اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا تھا کہ تمھارے ساتھ کار میں کوئی مسلح شخص پیچھے ہو۔ تھوڑا بہت رسک تو مجھے لینا ہی تھا"

"یہ سب تم نے اس وقت دیکھا ہوگا جب وہ ٹیکسی بس سے اور میری کار ٹیکسی سے ٹکرائی تھی" وہ برہمی سے بولا۔

"مجھے نہیں معلوم یہ حادثہ کہاں پیش آیا" میں نے حیرانی سے کہا "میں تو تمھارے پیچھے ہی تھا"

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔ حادثہ ریلوے کراسنگ کے پاس ہی تو ہوا تھا" وہ بولا "کسی الّو کے پٹھے نے بس آگے مارنے کی کوشش کی۔ بس والے نے اسے بچایا ہم نہ بچ سکے۔ خواہ مخواہ مجمع بھی لگا اور ہزار بارہ سو نقصان بھی ہوا۔ سرکاری بس نہ ہوتی تو معاملہ اتنی جلدی بھی نہ ہوتا۔ مجھے ہی معافی مانگ کے نکلنا پڑا"

"اسی لیے تمھیں دیر ہوئی" میں نے کہا "مزید منٹ بعد میں چلا جاتا"

"تم وہ کیسٹ لائے ہو؟" دلاور نے ناگواری سے کہا۔ اس کا موڈ حادثے اور اپنے منصوبے کی ناکامی پر ہو گیا تھا۔

میں نے کیسٹ اس کے سامنے رکھ دیا "تم اس کو سن کے اپنی تسلی کر سکتے ہو"

"تسلی کی بات مت کرو۔ میں اعتبار کرنے پر مجبور" وہ بولا "تمھارے پاس ایک دو یا دس نقلیں ہو سکتی ہیں"

"خود تم نے بھی تو ایک کاپی ضرور بنا کے دو بار سنی ہوگی؟" میں نے کہا۔

میں اس حرامزادے فتح شیر کو سنوانا چاہتا تھا" وہ بولا "لیکن وہ غائب ہے، کل رات سے۔ کیا وہ تمھاری قید میں ہے؟ اس کی گمشدگی کی رپورٹ بھی لکھی جا چکی ہے"

"فی الحال میں اس پر تبصرہ نہیں کروں گا" میں نے کسی گھاگ سیاستداں کی طرح کہا جس سے پریس کانفرنس میں کوئی چالاک صحافی انتہائی خطرناک سوال کر بیٹھے "تمھارے ساتھ کون تھا اور انھیں ساتھ لانے کا مقصد کیا تھا؟"

"جواب وہی ہے جو ابھی تم نے مجھے دیا تھا" دلاور نے تلخی سے کہا۔

"تمھاری اس حرکت نے اعتماد کی فضا باقی نہیں رہنے دی" میں نے کہا "اس لیے میں آگے نہیں جا سکتا۔ ایک بات ذہن میں رکھنا۔ ریوالور اگر تمھارے پاس ہے تو میرے پاس بھی ہے۔ تمھارے ساتھی تم سے کٹ گئے ہیں لیکن میرے ہاتھ میرے ساتھ ہیں اور جتنا بھروسا تم اپنے ساتھیوں پر کرتے ہو، اس سے زیادہ اعتماد مجھے اپنے ہاتھوں پر ہے"

"تم بھی مجھے بے وقوف بنا رہے تھے کہ تم تصفیہ کر کے باہر نکل جانا چاہتے ہو"

"نہیں، وہ سچ تھا۔ میں اور رابعہ اپنی تمام عمر اس طرح ضائع نہیں کرنا چاہتے" میں نے کہا "بے شک پہلے نہ میں ایسا سوچتا تھا اور نہ رابعہ کا یہ خیال تھا لیکن اس وقت حالات مختلف تھے۔ رابعہ صرف میری وکیل تھی اور میں اس کا مؤکل۔ اب ہم جیون ساتھی بننے کا فیصلہ کر چکے ہیں چنانچہ میں اس دلدل سے نکلنا چاہتا ہوں۔ یہاں رہ کر میں اس میں زیادہ ہی دھنستا جاؤں گا۔ میرا یہاں سے نکل جانا تمھارے مفاد میں بھی ہے لیکن میں اور رابعہ تمھارے لیے نہیں، اپنے مستقبل کی خاطر ایک سودا کر سکتے ہیں۔ تم ہمیں یہاں سے نکلنے کے مواقع فراہم کرو"

"کس قسم کے مواقع؟" دلاور نے کہا "تم نے تو زندگی ولایت میں گزاری ہے"

"ہاں۔ اور میں ولایت ہی لوٹ جانا چاہتا ہوں۔ رابعہ کو بیوی کی حیثیت سے ساتھ لے جانا میرے لیے مشکل نہیں" میں نے کہا۔ "مشکلات یہاں ہیں۔ سب سے بڑا مسئلہ وسائل کا ہے"

"تمھیں پیسہ چاہیے؟" دلاور نے کہا "کتنا؟"

"اپنے نفع نقصان کا حساب لگا کے بولی دو" میں نے کہا "یہ بھی ذہن میں رکھو کہ ہمیں زندگی گزارنی ہے"

"میری آفر یہ ہے" دلاور بولا "دس لاکھ ماہانہ پر وہاں میرے پارٹنر بن جاؤ یا پچیس لاکھ نقد لے لو"

"پارٹنر شپ پر لعنت۔ میں تم سے کسی قسم کا تعلق رکھنا نہیں چاہتا" میں نے کہا "آئندہ کبھی نہ تم میرا نام سنو اور نہ ہم کبھی تمھارا ذکر سنیں۔ پہلے میں اکیلا تھا، اب ہم دو ہیں"

"تمھارا مطلب ہے میں رقم دُگنی کر دوں؟" دلاور بولا۔

"پچاس لاکھ ٹھگنا چاہتے ہو مجھ سے؟..... اتنی کچی گولیاں

نہیں کھیلی ہیں میں نے سکندر۔"

"پہلے مجھ سے تمھارے بارے میں اندازوں کی غلطی ہوئی تھی۔" میں نے کہا۔ "لیکن اب میں تم کو کسی حد تک سمجھتا ہوں۔ اس کا ثبوت تمھارے سامنے ہے۔ اگر میں تمھاری باتوں میں آجاتا تو رابعہ کی خالی کوٹھی میں تمھارے ساتھی مجھے گرفتار کر لیتے اور پولیس کے حوالے کر دیتے۔ تمھارے سارے مسئلے ختم ہو جاتے۔ وہ ہوں گے کوئی دو ٹکے کے بدمعاش جن کو دس ہزار کے انعام کا لالچ ہوگا۔ شاید دس ہزار تم نے بھی دے دیے ہوں۔ مایوسی ان کو بھی تم سے زیادہ ہوگی۔ میں جانتا ہوں کہ تم سے پچاس روپے دھوکے سے حاصل کرنا مشکل ہے چہ جائے کہ پچاس لاکھ۔ تم یہ پچاس لاکھ مجھے نہیں دو گے، رابعہ کو دو گے۔"

"وہ کیسے؟ اور اس کے باوجود گارنٹی کیا ہوگی؟"

"تم اس کی کوٹھی خرید و گے پچاس لاکھ میں۔" میں نے کہا۔ "بے شک اس کی مالیت اتنی نہیں ہے لیکن کوئی ایک روپے کی چیز ایک لاکھ میں لینا چاہے تو یہ خرید و فروخت کسی طرح بھی غیر قانونی نہیں۔ اس کے خلاف کوئی الزام نہیں اور وہ تم سے سیل ایگریمنٹ کر سکتی ہے۔ اس میں کچھ وقت لگے گا۔ تم ادائیگی اس وقت کرنا جب تمھیں میرے لندن پہنچنے کا ثبوت مل جائے۔ تمھارے وسائل بہت وسیع ہیں، تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ میں لندن کب پہنچا اور وہاں کس نام سے مقیم ہوں۔ مجھے ایک بار وہاں سے تمھاری کوششوں کے طفیل ڈی پورٹ کر دیا گیا تھا۔ مجھے نیا نام نئی شخصیت اور نیا پاسپورٹ حاصل کر کے لندن میں داخلہ ملے گا۔"

"اور تم پھر لوٹ کر پاکستان آگئے تو مجھے کیسے معلوم ہوگا؟"

"میں یہاں کیوں آؤں گا اور کیا لینے آؤں گا؟" میں نے کہا۔ "دوبارہ انھی مقدمات میں پھنسنے کے لیے جن کی وجہ سے میں یہاں روپوش رہنے پر مجبور ہوں۔ میں جانتا ہوں میں ساری زندگی روپوش رہ کے نہیں گزار سکتا۔ خصوصاً ان حالات میں کہ رابعہ بھی میرے ساتھ ہے۔ غلط نام سے باہر جانے سے میرا ایک جرم اور بڑھ جائے گا اور اگر تم سال چھ ماہ مجھ پر نظر رکھو تو تمھیں یقین آجائے گا کہ میرا واپسی کا کوئی ارادہ نہیں۔"

"تم انتقام کی خاطر مجھے قتل کرنے کے لیے آسکتے ہو اور پھر فرار ہو سکتے ہو۔" وہ بولا۔

"کیا تمھارے وارث، دوست اور ساتھی، کاروباری شریک اور وکیل سب مل کے بھی مجھے واپس نہیں بلا سکیں گے؟" میں نے کہا۔ "وہاں تو میں ہر وقت تمھاری گرفت میں رہوں گا۔ کسی بھی وقت برطانوی وزارتِ داخلہ سے درخواست کی جاسکتی ہے کہ فلاں شخص جو اپنی بیوی کے ساتھ لندن میں فلاں جگہ مقیم ہے، درحقیقت سکندر بخت ولد وزیر خان ہے جسے سال بھر پہلے برطانیہ سے ڈی پورٹ کیا گیا تھا لیکن وہ جعلی دستاویزات کی مدد سے پھر وہاں پہنچنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ مجھے دوبارہ ڈی پورٹ کر دیا جائے گا اور واپسی پر مجھے پاکستان پولیس ریسیو کرے گی۔ تمھارے لیے تردد کی کوئی بات نہیں ہوگی۔ رسک تو میں لے رہا ہوں۔"

"پچاس لاکھ کی تو کوئی بات نہیں۔" وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا۔ "لیکن یہ معاملہ بہت پیچیدہ ہے۔ مجھے سوچنے کے لیے وقت چاہیے۔ ہو سکتا ہے میں تم سے اتفاق کروں مگر یہ بھی ممکن ہے کہ میرے ذہن میں تصفیے کا کوئی اس سے بھی بہتر فارمولا آجائے، کوئی ایسا طریقہ نکل آئے کہ تم اور رابعہ پچاس لاکھ لے کر نکل جاؤ اور خطرہ نہ تمھارے لیے رہے اور نہ میرے لیے، دونوں طرف ٹھوس ضمانت ہو۔"

"میں اس وقت پچاس لاکھ نہیں مانگ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "ایک ہفتے میں تم میری تجویز کا ہر پہلو سے جائزہ لے سکتے ہو۔ میں تم سے پھر رابطہ قائم کر لوں گا۔ جب بھی اپنی گاڑی میں نکلو، ریڈیو کو آن رکھو اور اسی جگہ ٹیون کیے رہو جہاں اب ہے، بات کسی بھی وقت ہو جائے گی جیسے آج ہوئی تھی۔ تمھارا ریوالور کہاں ہے؟"

"میری جیب میں۔ لیکن میں ہتھیار ڈالنے نہیں جا رہا ہوں۔" دلاور غصے سے بولا۔

"میں بھی نہ مرنا چاہتا ہوں اور نہ گرفتار ہونا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "ریوالور اپنے پاس رکھو۔ صرف گولیاں نکال کے مجھے دے دو، پھر میں اتر جاؤں گا۔ اگر میں ویسے ہی اتر گیا تو تم مجھے بھاگنے کہاں دو گے۔ تم کار میں ہو اور میں پیدل ہوں۔" میں نے ریوالور نکال لیا تو دلاور نے بادلِ ناخواستہ ریوالور نکالا اور خالی کر کے گولیاں مجھے تھما دیں۔

"تھینک یو۔" میں نے کہا۔ "ہم ایک دوسرے پر بالکل اعتماد نہیں کر سکتے۔" اور ریوالور کا رُخ اس کی طرف رکھے ہوئے ایک دم گلوز کمپارٹمنٹ کھول لیا۔ اس میں سائیلنسر والا دوسرا ریوالور موجود تھا۔ دلاور کا چہرہ غصے اور احساسِ بے بسی سے سرخ پڑ گیا اور اس نے مجھے دانت پیس کر گالی دی۔

"ہم ایک دوسرے کی فطرت کو اسی طرح سمجھتے ہیں جس طرح سانپ اور نیولا ایک دوسرے کی جبلت کو۔" میں نے کہا۔ "اب مجھے یہ بھی شبہ ہے کہ تیسرا ریوالور تمھاری سیٹ کے نیچے نہ ہو لیکن میں اتنا رسک لے لوں گا۔ میرے اترنے کے بعد پیچھے پلٹ کر مت دیکھنا اور سیدھے جانا۔ مجھے ذرا بھی شک ہوا تو میں اپنے دفاع کے لیے سب کچھ کروں گا۔ تمھیں قتل کرنا پڑا تو اس سے بھی گریز نہیں کروں گا حالانکہ میں یہ نہیں چاہتا۔" میں نے دروازہ کھولا اور ریوالور کا رُخ دلاور کی طرف کر کے کھڑا ہو گیا۔ دلاور نے کار اسٹارٹ کی، وہ دس گز دور ہی گیا ہوگا کہ میں نے اس کے سائیلنسر والے ریوالور سے دو فائر کیے۔ اس کی کار کے دونوں پچھلے ٹائر برسٹ ہو گئے۔ میں پلٹ کے بھاگا اور ایک گلی میں گھس گیا جو دو مکانوں کے بیچ میں خالی پلاٹ سے بن گئی تھی۔ موڑ پر طلوع ہوتے ہی میں نے اطمینان سے پیدل چلنا شروع کیا۔ فائروں کی آواز کسی نے نہیں سنی تھی لیکن ٹائر برسٹ ہونے کی آواز دور تک گئی تھی۔ دلاور نے پہلے کار کو سنبھالا ہوگا اور پھر نیچے اُتر کے مجھے دیکھا ہوگا مگر میں غائب ہو چکا تھا۔ صدر بازار کی سڑک عبور کر کے میں پیدل چلنے والوں میں شامل ہو گیا۔ کوئی شک بھی نہیں کر سکتا تھا کہ میری دو جیبوں میں تین ریوالور ہیں۔ ان میں سے ایک خالی ہے، دوسرا بھرا ہوا اور تیسرا سائیلنسر والا میرے کوٹ کی اندر والی جیب میں ابھی تک بارود کی بو دے رہا ہے۔

کار وہیں موجود تھی جہاں میں نے اسے چھوڑا تھا۔ ایک نیم زنانہ نیم مردانہ شخصیت نے تالی بجا کے اور کمر لچکا کے پھٹے بانس جیسی آواز میں کہا۔ "اے لو، وہ تو جا رہے ہیں میری سرکار۔ نہ لینا نہ دینا، مفت کی سیر کرنے آئے تھے کیا؟" کوئی نہایت پھکڑ پن سے ہنسا اور میں نے دس کا ایک نوٹ پھینک کر جان چھڑائی۔ کار کو بیک کر کے واپس جاتے ہوئے میں بہت مطمئن تھا۔ مجھے یقین تھا کہ محسن اور ٹیڈی بھی کامیاب لوٹنے والے ہوں گے۔ دراصل میری ساری کامیابی کا انحصار ہی ان دونوں کی بروقت کارروائی پر تھا۔ میں نے دلاور کو پندرہ بیس منٹ سے زیادہ روک کے رکھا تھا جبکہ رابعہ کا گھر وہاں سے پانچ منٹ کی ڈرائیو بھی نہ تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ دلاور کے ساتھی رابعہ کی کوٹھی میں ہی موجود تھے اور میرے وہاں پہنچنے کے شدت سے منتظر تھے۔ ان کے لیے میں دس ہزار کا چلتا پھرتا نوٹ تھا۔ دلاور نے ان کو سمجھا دیا ہوگا کہ سکندر بخت اسی کوٹھی میں ملے گا چنانچہ انھوں نے نیچے اُوپر ہر کمرے میں جھانک کر دیکھا ہوگا۔ ممکن ہے باتھ روم بھی کھول کر دیکھے ہوں۔ اس کارروائی میں دس پندرہ منٹ لگ سکتے تھے کیونکہ کم سے کم ایک آدمی کو انھوں نے باہر بھی چھوڑا ہوگا کہ گرد و پیش پر نظر رکھے اور کسی قسم کا خطرہ دیکھے یا محسوس کرے تو فوراً سگنل دے۔ دوسرا کوئی ڈرائیور ہوگا جو ٹیکسی میں بالکل تیار بیٹھا ہوگا کہ ضرورت پڑنے پر ان کو لے کر نکل جائے۔ وہ یقیناً کوئی بہت ماہر ڈرائیور ہوگا۔ تاہم ٹیکسی کے متعلق میں خاصے وثوق سے کہہ سکتا تھا کہ چوری کی ہوگی۔ اُوپر جا کے تلاشی لینے والا ایک ہی آدمی ہوگا یا زیادہ سے زیادہ دو ہوں گے۔ ہم نے وہاں سے چلتے وقت بیڈ بھی لگے چھوڑ دیے تھے۔ انھوں نے تینوں بستروں کو بڑی دلچسپی سے دیکھا ہوگا اور ہماری وہاں موجودگی کے آثار تلاش کیے ہوں گے۔

لیکن ناکامی کے اندیشے سے دوچار کرنے والا خیال صرف ایک ہی تھا کہ انھوں نے اُوپر والے باتھ روم کو دیکھا اور اس میں فتح شیر کی خون میں لت پت اور اکڑی ہوئی بے سر کی لاش دیکھ لی تو وہ سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگیں گے۔ انھیں یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگے گی کہ انھیں یہاں بلانے کا مقصد اس سازش کے سوا کچھ نہ تھا کہ وہ قتل کے جرم میں پکڑے جائیں۔ وہ پکڑے جاتے ہیں یا نہیں، یہ محسن اور ٹیڈی کی مشترکہ کوشش کی کامیابی پر منحصر تھا۔ محسن کو اپنے رپورٹر دوست سے مدد لینی تھی اور اسے یہ سمجھانا تھا کہ وہ پولیس کے ساتھ اس پتے پر پہنچے تو اسے سب انسپکٹر فتح شیر کی لاش بھی مل سکتی ہے اور قاتل بھی ہاتھ آسکتے ہیں۔ کسی بھی اخبار کے رپورٹر کے لیے رات کے نو ساڑھے نو بجے ایک سنسنی خیز خبر بہت بڑا انعام ہوتی ہے۔ اگر وہ کامیاب رہا تو صبح صرف ایک ہی اخبار کی سرخی چلّا چلّا کر کہے گی کہ گمشدہ پولیس افسر کو قتل کر دیا گیا۔ لاش کا سر کاٹ کے پھینک دینے والے قاتل گرفتار۔ اور یہ خبر دوسرے تمام اخبارات کے مالکوں سے رپورٹروں تک سب کے لیے باعثِ شرم اور نااہلی کے سرٹیفکیٹ کی طرح ہوگی کہ آخر انھیں کچھ معلوم کیوں نہیں ہوا۔ کہا یہی جائے گا کہ پولیس کی ملی بھگت ہے اور جس رپورٹر نے یہ تیر مارا ہے اس کا کوئی دوست یا رشتے دار پولیس میں ہوگا جس نے چپکے سے اسے بلا لیا اور پولیس نے بھی کون سا ذہانت سے

کام لے کر سراغ لگایا ہوگا کس نے مخبری کی ہوگی۔ بیشتر کامیابیوں کے ذمے دار مخبر ہوتے ہیں جو پس منظر میں رہ کے انعام پاتے ہیں۔ کامیابی کا سہرا پولیس کے سر باندھا جاتا ہے چنانچہ وہ مخبر بھی رپورٹر کا دوست ہوسکتا ہے۔ یہ بات کسی حد تک درست تھی۔

محسن کی کامیابی بہت سے عناصر سے مشروط تھی۔ ایک یہ کہ اس کو اپنا رپورٹر دوست مل جائے۔ دوسرا یہ کہ وہ فوراً اس کی بات پر یقین کر کے ساتھ چل پڑے۔ تیسرا یہ کہ تھانے میں کوئی اتنا ہی مستعد پولیس افسر بیٹھا ہو جو اس کامیابی کو اپنے ریکارڈ پر لانے کے معاملے میں ذرا بھی تساہل نہ برتے اور چوتھا یہ کہ وہ اس وقت رابعہ کی کوٹھی میں پہنچیں جب "ملزمان" اندر ہی موجود ہوں۔ دلاور کی گاڑی گیراج میں موجود تھی اور اس نے ابھی تک گاڑی کی گمشدگی کی رپورٹ بھی نہیں لکھوائی تھی۔ اگر وہ خود آجاتا تو کوئی جواب نہ دے پاتا کہ وہ یہاں کیا کر رہا ہے۔ اس کی قسمت تھی کہ وہ بچ گیا لیکن باقی لوگ پکڑے گئے تب بھی دلاور بہر حال پھنسے گا کہ اس نے فتح شیر کو قتل کیا تھا اور اب اس کی لاش کو ٹھکانے لگانے کے لیے اپنے آدمی بھیجے تھے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ سے ثابت ہوجائے گا کہ فتح شیر کی موت کم سے کم سولہ گھنٹے پہلے ہوئی تھی۔ سردی اور باتھ روم کے سرد خانے میں دو چار گھنٹے کا فرق پڑ جائے گا اور یہ تسلیم کیا جائے گا کہ موت کو بیس گھنٹے بھی ہوسکتے ہیں۔ ایسے موسم میں لاش کے سڑنے یا بُو دینے کا کوئی امکان نہ تھا۔

محسن کے مقابلے میں ٹیڈی کا کام زیادہ مشکل نہیں تھا۔ اسے لکڑی کے وہی بلاک ٹیکسی کے پیچھے والے پہیّوں کے نیچے رکھنے تھے جن سے کچھ دیر پہلے ہم نے دلاور کی گاڑی کو جام کر دیا تھا تاکہ ٹیکسی بیک ہو تو وہیں بیٹھ جائے لیکن اس پلان کی کامیابی سو فیصد یقینی نہیں تھی۔ یہ اسی صورت میں ممکن تھا جب ٹیکسی باہر کھڑی ہوئی ملے۔ وہ رات کے اندھیرے سے فائدہ اٹھا کر ہاتھوں پیروں کے بل کوئی آہٹ کیے بغیر ٹیکسی کے بالکل پیچھے پہنچ سکتا تھا۔ ٹیکسی کے کوٹھی میں داخل ہو کر کھڑے ہونے کی صورت میں یہ خطرہ مول نہیں لیا جاسکتا تھا اور میں نے اسے منع کر دیا تھا کہ وہ اپنی سلامتی کو خطرے میں ڈال کر کوئی کام نہ کرے۔ اس کا دوسرا کام چند افراد کو جمع کرنا تھا وہ آس پاس کے گھروں میں اور راہ چلتے لوگوں سے یہ کہہ سکتا تھا کہ ساتھ والی کوٹھی میں ایک لاش پڑی ہے اور وہ اس کوٹھی کا چوکیدار ہے اور اگر وہ دس پندرہ افراد کو جمع کرنے میں کامیاب ہوجائے اور کسی سے پولیس کو فون بھی کرا دے تو خاموشی سے کھسک لے۔ لوگ خود مجرموں کا راستہ روک لیں گے اور جب محسن کا رپورٹر دوست پولیس کے ساتھ پہنچے گا تو جائے واردات پر گواہ کافی مل جائیں گے۔ ملے گا تو وہی ایک نامعلوم شخص جو گواہوں کو مدد کے لیے وہاں کھینچ لایا اور انھیں گواہی کے چکر میں ڈال کر خود غائب ہوگیا۔ دلاور اس جگہ تک تو نہیں پہنچا تھا جہاں میں اس سے بڑا شکاری ہونے کا ثبوت دینے کی خاطر ایک جال پھیلایا تھا کہ وہ پھنس جاتا تو نکل نہ پاتا لیکن اس کی پوزیشن سو فیصد محفوظ نہ تھی۔ اس کی ایک کار تو جائے واردات پر کھڑی تھی اور اگر وہ لوگ جو اس کے ساتھی تھے پولیس کی گرفت میں آگئے تو وہ بھی اعتراف کرنے پر مجبور ہوں گے کہ ان کو وہاں بھیجنے والا دلاور تھا۔ پولیس کا محکمہ اپنے ہی ایک افسر کے بہیمانہ قتل کے مجرموں سے اعتراف جرم حاصل کرنے میں کسی کے ساتھ بالکل رعایت نہیں کرے گا۔ اگر تقدیر نے دلاور کا ساتھ نہ دیا تو وہ بھی پکڑا جائے گا اور اس سے پوچھا جائے گا کہ وہ اپنی دوسری یعنی... کار میں جائے واردات کے اتنا قریب کیوں پہنچا تھا۔

اس سوال کا جواب وہ کیسٹ دے گا جس کی اصل... پاس محفوظ تھی۔ بعد میں استغاثہ یہ ثابت کرے گا کہ دلاور نے الطاف کو قتل کیا تھا اور اس قتل کو چھپانے کے لیے... پانچ لاکھ روپے دیے تھے مگر وہ مطمئن نہیں تھا۔ اپنا... نکالنے کے بعد اس نے قتل کے عینی گواہ کو بھی قتل... ایسی جگہ لے جا کر جہاں الزام رابعہ پر آسکے۔ وہ اپنے... آدمیوں کے ساتھ لاش کو ٹھکانے لگانے پہنچا تھا... کرنے کہ قتل کے جرم میں رابعہ کے خلاف رپورٹ درج... گئی ہے یا خود اسے ہی یہ کام کرنا ہوگا۔ فتح شیر تو مر... چنانچہ اس کے خلاف سارے جرم بھی ختم ہوگئے... اس کے اعتراف کا خمیازہ اب دلاور کو بھگتنا تھا...

میں ٹیڈی کے گھر پہنچا تو رات کے سوا دس... تھے لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ دروازہ بدستور مقفل تھا... رابعہ کو بہت پہلے لوٹ آنا چاہیے تھا اور میرا خیال... وہ سخت انتظار کے کرب میں مبتلا ہوگی اور مجھ پر... گی کہ بڑے شکاری بنے پھرتے ہو، یہ خیال نہیں کہ... ہوں اور کتنی اذیت کا شکار ہوں۔ تالا کھول کے میں... اکیلا بیٹھا رہا۔ میں نے ایک سگریٹ پی اور کمرے...

...ٹہلتے ہوئے بار بار گھڑی دیکھی۔ محسن اور ٹیڈی کی واپسی کب ہوگی؟ یہ اپنی جگہ ایک سوال تھا لیکن اس سے کہیں زیادہ پریشان کن سوال رابعہ کا تھا جو صبح صرف چیک کیش کرانے نکلی تھی۔ اس نے بینک سے رقم حاصل کر لی تھی اور محسن کے بیان کے مطابق اسے نازلی سے ملنے اسپتال جانا تھا اور پھر یہ ڈیڑھ لاکھ کی رقم منظر کے پاس بحفاظت رکھوانی تھی۔ وہ خود بھی بحفاظت منظر کے پاس پہنچی تھی یا نہیں؟ یہ بھی ایک سوال تھا جس کا جواب صرف منظر دے سکتا تھا۔ یا شاید منظر بھی نہیں دے سکتا تھا۔ کوئی عورت جس کے پاس ڈیڑھ لاکھ کی نقد رقم ہو، خطرات سے محفوظ نہیں سمجھی جاسکتی اور پھر رابعہ کا تو معاملہ ہی مختلف تھا۔ کیا اس بات کا کوئی ثبوت ہے کہ وہ اسپتال پہنچ کے کسی مشکل صورت حال سے دوچار نہیں ہوئی؟ کیا مجھے دیوانگی کی حد تک چاہنے والی بے وقوف نازلی اپنے جذبات سے مغلوب ہو کے رابعہ کے خلاف دشمنی سے کام نہیں لے سکتی؟ وہ پاگل لڑکی جس نے میری خاطر جان دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی، اپنے بھائی کی مدد کر کے ایک تیر سے دو شکار نہیں کرسکتی؟ اس کا ناپختہ ذہن یہ یقین کرسکتا ہے کہ اگر وہ رابعہ کو راستے سے ہٹانے میں کامیاب ہوجائے تو وہ مجھے حاصل کر لے گی؟

میں نے دماغ کو خراب کرنے والے خیالات سے گھبرا کے کہا۔ ایسا نہیں ہوسکتا۔ میرے اندر کی آواز ایک ہنسی کی طرح سنائی دی۔ نہیں ہوسکتا یا تم چاہتے ہو کہ ایسا نہ ہو؟ نازلی جیسی انتہا پسند لڑکی سب کچھ کرسکتی ہے۔ وہ اپنی جان لے سکتی ہے تو کسی اور کی بھی لے سکتی ہے۔ وہ تو تمھیں بھی قتل کرسکتی ہے کہ سکندر تم اگر میرے نہ ہوئے تو کسی اور کے کیسے ہوسکتے ہو!

میں نے دروازے کو پھر تالا لگایا اور منظر کو فون کرنے کے لیے باہر نکل آیا۔

"منظر!" میں نے کہا۔ "یار وہ رابعہ تیرے پاس ہے؟"

"پاس سے کیا مراد ہے آخر تیری بھوتنی کے؟" منظر نے کہا۔ "اب اتنی پاس بھی نہیں...."

"بکواس بند کر۔ یہ بتا وہ تیرے گھر پہنچی تھی، اب کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

"اب؟.... اب میرے پاس ہے۔ پاس کا مطلب سمجھتا ہے نا تو؟" وہ ہنسا۔

"یار میں پریشان ہوں۔" میں نے بھنا کے کہا۔ "وہ ابھی تک وہاں کیا کر رہی ہے؟ واپس کیوں نہیں آئی؟"

"واپس کیوں نہیں آئی! یہ تیرے لیے واقعی پریشانی کی بات ہے اور ہونی چاہیے۔" وہ مکاری سے بولا۔ "دراصل عورت کی ذات میں وفا نہیں۔ جیسے تجھ میں حیا نہیں۔ وہ مجھ سے عقد ثانی پر بضد ہے۔ اب میں کیسے انکار کروں۔ مجھ سے کسی کا دل نہیں توڑا جاتا۔ ویسے بھی اس کے پاس ڈیڑھ لاکھ روپے تھے .... تھے پر غور کر۔ کیا ہے وہ شعر، بن گیا رقیب آخر۔"

"میں ٹیلی فون پر گولی مار دوں گا۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "اس سے میری بات کرا دے۔"

"دیکھ مجنوں کے چچا! میری بات مان اور اسے بخش دے۔ وہ عورت ذات تم دونوں کی معرکہ آرائی میں ہر جگہ ساتھ دینے کا حوصلہ تو رکھتی ہے مگر صرف حوصلے سے کیا ہوتا ہے؟"

"بجا فرمایا آپ نے، وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔ لیکن ...."

"کوئی لیکن ویکن نہیں۔" منظر نے میری بات کاٹ دی۔ "اس کا نروس بریک ڈاؤن تقریباً ہوچکا ہے۔ وہ ظاہر کچھ نہیں ہونے دیتی لیکن میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ اس سکون اور خاموشی کے نیچے اُبلنے والا آتش فشاں پھٹ گیا تو وہ پاگل ہوجائے گی۔ یہ مار دھاڑ، قتل و غارت گری کے خونی منظر، مسلسل ڈر اور خوف کا آسیب، یہ سب مل کر اس کو اندر سے کھوکھلا کر رہے ہیں اور غیر معمولی قوت مزاحمت رکھنے کے باوجود وہ ٹوٹ رہی ہے۔ کیا تو نے کبھی غور نہیں کیا کہ وہ اب پہلے والی رابعہ نہیں ہے؟ یاد کر تو نے اسے کب دیکھا تھا۔ کب چاہا تھا اور موازنہ کر آج کی حالت سے۔ تو اتنا اندھا تو نہیں ہوسکتا کہ فرق تجھے نظر ہی نہ آتا ہو۔ بس بات اتنی ہے کہ وہ محبت کے نام پر مر جانے کو بھی تیار ہے اور تو تیار ہے کہ اُسے مار دے۔"

"تیری سوچ کا یہ انداز ہے منظر؟" میں نے کھوکھلے لہجے میں کہا۔

"میں تیری سوچ کے انداز کی بات کر رہا تھا۔" وہ برہمی سے بولا۔ "یہ کون سا عشق ہے کہ ع ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے۔ یہ سب بکواس میں سننا نہیں چاہتا کہ اس سے ایک پل کی جُدائی مجھے منظور نہیں اور اس سے بچھڑ کے میں ایک لمحہ نہیں جی سکتا۔ چنانچہ میں جا رہا ہوں موت کے منہ میں مگر اسے ساتھ رکھوں گا۔ ارے بھائی! جدائی تو امتحان ہے اور تجھے واقعی اس سے محبت ہے تو جلد از جلد یہ امتحان پاس کرنے کے لیے محنت کر۔ محبت اور محنت میں ایک نقطے کا فرق ہے جو اوپر نیچے ہوتا ہے تو مفہوم بدل جاتا ہے۔"

"یہ آج تو کیسی فلسفیانہ گفتگو فرما رہا ہے؟" میں نے کہا۔

"کیا تو نے رابعہ سے بھی پوچھا ہے کہ وہ میرے ساتھ ہی مرنے پر کیوں کمربستہ ہے؟ میں نے تو اس سے نہیں کہا......"

"بھوتنی کے۔ تُو نے کیا نہیں کیا۔ ہر طرح سے تو خود کو عاشق صادق ثابت کر دیا ہے۔ اپنی محبت کا یقین دلانے کے لیے سارے شاعروں کے دیوان پڑھ ڈالے۔ تمام فلموں کے ڈائلاگ بول دیے اور اب پوچھتا ہے میں نے کیا کیا۔ وہ عورت ذات، کمزور اور جذباتی وکیل ہے تو کیا۔ دل کے معاملے میں تو ہے وہی ناقص العقل۔ تیل تُو نے چھڑکا، آگ تُو نے لگائی۔ دعوت تُو نے دی کہ اب کُود پڑے بے خطر آتش عشق میں۔ اس سے کیا پوچھوں؟ وہ ابھی نہیں رہے گی میرے پاس۔ کم از کم ایک مہینہ — میں اس کے سارے معاملات ٹھیک کر لوں گا اور وہ ڈیڑھ لاکھ نقد لائی ہے، مکان بیچنا چاہتی ہے، مجھے اپنا اٹارنی بنانا چاہتی ہے اور اپنے آفس کے معاملات میرے سپرد کرنا چاہتی ہے تاکہ میں اس کی لیگل فرم اور ماتحت وکیلوں کے مقدمات کی نگرانی کروں۔ پریکٹس تو وہ اب نہیں کرے گی لیکن قانونی طور پر اس کی حیثیت محفوظ ہونی چاہیے تم دونوں کا انکل رضوی اور تیری ہونے والی سوکن کا بھائی... میرا مطلب ہے انسپکٹر شیخ" یہ سب اسے مفرور سمجھنا چھوڑ دیں۔ کون سا جرم کیا ہے اس نے تیرا ساتھ دینے کے سوا اور ساتھ کسی جرم میں تو نہیں دیا ہے۔ کسی ضابطۂ فوجداری میں یہ نہیں لکھا ہے کہ ایک وکیل خاتون کسی چور، ڈاکو یا قاتل سے عشق نہیں کر سکتی۔ یہ اس کا ذاتی فعل ہے جس سے اس کی ساکھ خراب ہو سکتی ہے مگر اس کو جرم کہنے والا خود مجرم۔ میں چاہتا ہوں وہ تیری چاہت کا اقرار کرنے کے باوجود اعتماد اور بے خوفی سے جیے اور ایک معزز شہری کی طرح سر اٹھا کے چل سکے۔ بزدلوں کی طرح بھاگتی نہ پھرے۔"

"وہ تیری بات نہیں مانے گی۔" میں نے کہا۔

"اس کا تو باپ بھی مانے گا۔" منظر نے کہا۔ "ابھی سو رہی ہے۔ میں نے ایک اسپیشلسٹ کو بلایا تھا اور کہا تھا کہ یہ میری بہن ہے۔ اس نے کہا مرض کوئی نہیں۔ وہی اعصابی کشیدگی، ڈپریشن، ذہنی و جسمانی تھکن اور فرسٹریشن ہے۔ وہ یہاں آرام کرے گی جب تک کہ اس کی صحت بحال نہیں ہوتی —— میں اسے لاک کر دوں گا اور اس کا کھانا پینا سونا جاگنا سب میری مرضی سے ہوگا۔ ورنہ نہیں ہوگا خواہ تم دونوں غم کھاؤ اور خونِ جگر پیو۔"

"گویا میں اور وہ اب اگلے جہان میں ملیں گے بشرطیکہ تُو نے میدانِ حشر میں بھی خدائی فوجدار ہونے کا عہدہ اپنی مرضی سے... میں نے کہا۔ "اتنا تو بتا دے ظالم سماج کہ دیدارِ یار کب... ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں تو کتنے ہیں، فائنل کرنے... میں ابھی کون سے ایئر میں ہوں؟"

"تو فرسٹ ایئر فول ہے ابھی۔ ایم اے کر کے تجھے... آف عاشقی کی ڈگری لینی ہے۔" منظر ہنسا۔ "دیدارِ یار پر کو... نہیں ہے۔ اگر دل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار، جب... گردن جھکائی دیکھ لی۔ ورنہ فوٹو مل سکتا ہے اور آپ خود... ہتھیلی پر رکھ کے اور سر سے کفن باندھ کے آنا چاہیں تو فو... ہے موجود ہر بلا کے لیے۔"

"تُو نے بہت پی لی ہے اور غالباً کسی شاعر کے... میں نے کہا۔ "صاف بتا وہ کب تک رہے گی وہ وہاں ورنہ... ہوں اسے اغوا کرنے کے لیے۔ اپنے گھر کو میری سسرال... چاہتا ہے اُلو کے پٹھے۔" میں اب کچھ مشہور ڈائلاگ بول... وہ ساری زنجیریں توڑ دے گی۔ ساری دیواریں گرا دے... اور اس کا عشق سچا ہے تو اے ظالم سماج! شکست تیری... پیار کی جیت ہوگی۔ ہٰذا ھو المطلب۔"

"اسے ایک مہینہ یہاں رہنے دے۔ میں اور وہ تیرے... لیے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔" منظر بولا۔ "بس اپنی حماقت کا یقین... رہ اور ثبوت پیش کرتا رہ کہ... نہ تو فوت ہوا ہے اور نہ... میری طرح جلوۂ کثرتِ اولاد دکھانے سے پہلے مرنے کا ار... رکھتا ہے۔ مارنے پر کوئی پابندی نہیں جسے چاہے مار... سے زیادہ نصیحت میں نے کبھی اپنے کو بھی نہیں کی۔"

اس نے ریسیور رکھ دیا تو مجھے تھوڑی سی مایوسی ہو... واپس لوٹتے ہوئے میں نے خود کو زیادہ سبکدوش او... محسوس کیا۔ یہ احساس ہی کم ہمت افزا نہیں تھا کہ منظر ایک... بن کے رابعہ کے سامنے آگیا ہے اور اسے عورت ذات... یا مجرم اور غیر محفوظ سمجھنے کی غلطی کرنے والوں کو چیلنج د... کا ارادہ رکھتا ہے۔ اگرچہ رابعہ سے جدائی کے خیال میں کو... نہیں تھی مگر اس یقین میں بڑی طمانیت تھی کہ میں ہی نہیں رابعہ... محافظ اور بھی ہیں۔ مجھے ندامت بھی تھی اور میں نے رابعہ کی... کی انتہا کو دیکھا یہ نہیں سوچا کہ اس کی قوتِ برداشت بالآ... کی خواہشات کا ساتھ نہ دے سکی گی۔ افلاک پر نظر رکھنے... تو کچھ نہیں ہوتا۔ طاقتِ پرواز محدود رہتی ہے۔ وہ لاکھ... کہ ہر طلبگارِ جاں مرحلے میں میرے ساتھ رہنے اور ہر وا... میں قدم ملا کے چلے مگر کیا یہ اس کے ساتھ ظلم نہ ہوگا کہ اس کی...

کا سہارا حاصل کرنے کے لیے میں اسے اپنے عذاب میں شریک رکھوں؟ آخر میری نظر اس فرق کو کیوں نہ دیکھ سکی جو منظر نے دیکھ لیا؟ اور اس نے ٹھیک دیکھا ہی نہیں، ٹھیک قدم بھی اٹھایا۔ رابعہ کو وہ سب تو نہیں مل سکتا جو اس نے میری خاطر گنوایا مگر بہت کچھ اب بھی مل سکتا ہے۔ ذہنی سکون، جسمانی آرام۔ اپنے پیشے کا وقار اور اپنی شخصیت کا احترام۔ اس سے وہ جذبہ کہاں مجروح ہوتا ہے جس سے میرے اور اس کے تعلق کی بنیاد ہے۔ مجھے واقعی اسے بخش دینا چاہیے۔ میں اور محسن اور ہمارے دوسرے مددگار ہر شکاری کو شکار کرنے کے لیے ایک عورت کی مدد کے محتاج تو نہیں۔ وہ خود کو اور اپنے معاملات کو سنبھالے جو میرا ساتھ دینے کے لیے بگڑ گئے تھے۔ جدا ہیں آج اگر ہم تو کل ہم ہوں گے، یہ چار دن کی جدائی تو کوئی بات نہیں۔ اور جب فاصلے اہمیت اور وجود ہی نہ رکھتے ہوں تو جدائی کیسی؟

لیکن یہ سوال بھی ہے کہ کیا رابعہ اس منطقی فیصلے کو قبول کر لے گی۔ یہ معاملہ عقل کا تو نہیں ہے اور میرا دل کہتا ہے کہ رابعہ اس پاسبانِ عقل کی نگرانی میں تحفظ کی ضمانت کو مسترد کر دے گی۔ وہ سختئ حالات کو میرے ساتھ برداشت کرنا پسند کرے گی۔ یہ نہیں چاہے گی کہ وہ تمام تفکرات سے بے نیاز اپنے ذہنی و جسمانی سکون کی خاطر میری رفاقت چھوڑ دے۔ وہ جانتی ہے کہ میرے دشمن کون ہیں، کہاں کہاں ہیں اور ان سے میری ذات کو لاحق خطرات کی نوعیت کیا ہے۔ وہ میری فطرت کو بھی سمجھتی ہے، ایسے میں یہ ناممکن تھا کہ وہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دے اور منظر کے گھر میں پناہ گزین ہو جائے۔ میری ذات سے منسوب اندیشوں اور وسوسوں کے ساتھ نہ وہ جی سکے گی نہ مر سکے گی۔ چنانچہ وہ میرے ساتھ مرنے جینے کو ترجیح دے گی جس سے یہ اطمینان تو ہوگا کہ اس جدوجہد میں وہ ہر قدم پر آخری لمحے تک میرے ساتھ تھی۔

میں نے خاصی قنوطیت اور کوفت کے ساتھ جسم کی ضرورت پوری کرنے کی خاطر ایک معمولی سے ریستوران میں چند لقمے زہر مار کیے اور واپس آتے ہوئے اپنے ساتھ کھانے پینے کا وافر سامان لے آیا۔ محسن اور استاد ٹیڈی بھی کے واپس آتے تو یہی ان کا ڈِنائٹ ڈنر بن جاتا ورنہ اگلی صبح ناشتے کا سامان ہوتا۔ دو کمروں کے اس بے حد مختصر سے مکان کے کمرے بھی اتنے مختصر تھے کہ ایک کمرے میں استاد ٹیڈی کی جھولا نما بان کی چارپائی نے نصف کمرہ گھیر لیا تھا، اس کا سامان ٹین کے ایک صندوق میں بند اسی چارپائی کے نیچے رکھا ہوا تھا اور سرہانے کی میز پر باقی سب کچھ تھا جو ٹیڈی جیسے شخص کی ضروریاتِ زندگی میں شامل تھا۔ شیرِ پنجاب سوپ اور زلفِ بنگال آملہ ہیئر آئل سے لے کر سگریٹوں کی راکھ، خالی پیکٹ اور تاش کی گڈیوں تک۔ کمرے کی واحد کھڑکی میں نصف لُنگی کو بطور پردہ لٹکا دیا گیا تھا۔ لنگی کا بقیہ نصف حصہ دوسرے کمرے کی کھڑکی میں آویزاں تھا اور دونوں میں تقریباً برابر سوراخ تھے اور ایک جیسا میل تھا۔

میرے ذہن میں خلا تھا چنانچہ میں بان کی چارپائی پر جُوتوں سمیت لیٹا سگریٹ کے دھوئیں کو جالے لگی چھت کی جانب اُٹھتے اور تحلیل ہوتے دیکھتا رہا۔ میرا جسم تھکن سے چُور تھا اور دماغ کی کیفیت اس گاڑی جیسی تھی جو مسلسل چلتی رہے اور اس حد تک گرم ہو جائے کہ انجن بند ہو جائے۔ میرا دماغ ٹھُس تھا، نہ میں رابعہ کے متعلق سوچ رہا تھا نہ دلاور کے انجام کے بارے میں اور نہ اپنے مستقبل کے بارے میں۔ نہ جانے کس وقت سگریٹ میرے ہاتھ سے گر گئی اور مجھے نیند نے آلیا۔ آنکھ کھُلی تو صبح کے اُجالے کو دیکھنے کے بعد میں نے کلائی کی گھڑی کو دیکھا اس میں نو بج رہے تھے جس کا مطلب تھا کہ میں کم سے کم دس گھنٹے بیہوشی کی نیند میں سویا تھا۔ میں ہڑبڑا کے اٹھا تو چارپائی کے قریب ایک اجنبی کو دیکھ کر چونک پڑا۔ وہ فرش پر آلتی پالتی مارے، دیوار سے ٹیک لگائے اور آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔ وہ پینتیس سال کے قریب عمر کا... دُبلا پتلا اور درمیانے قد کا ایک جوان آدمی تھا۔ اس کا رنگ صاف تھا چنانچہ بڑھی ہوئی شیو کچھ زیادہ ہی بڑھی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اس کے بال گھنے اور اس حد تک لمبے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ اس نے سال بھر سے کسی نائی کے سامنے گردن نہیں جھکائی۔ وہ زین کی سفید پتلون اور آدھی آستین کی نیلی قمیص میں ملبوس تھا حالانکہ موسم اس وقت بھی خاصا سرد تھا۔ اپنا چشمہ اس نے ایک ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ میں سگریٹ تھی۔ اس نے سگریٹ کو پہلی اور دوسری انگلی کے درمیان چلم کی طرح پھنسا لیا تھا۔ جب اس نے ہاتھ اٹھا کر ایک طویل کش لیا تب بھی اس کی آنکھیں بند ہی رہیں۔ وہ گیان دھیان میں مستغرق درویش نہیں تھا چنانچہ میں نے فرض کیا کہ وہ سگریٹ کے ساتھ کوئی نشہ بھی کرتا ہے اور اس نتیجے پر پہنچا کہ اتنے اطمینان کے ساتھ گھر میں موجود ہونے والا دوست ہی ہو سکتا ہے دشمن نہیں اور یہ دوست جسے میں نے اب تک نہیں دیکھا تھا محسن کا رپورٹر دوست ثابت ہوا۔

"السلام علیکم جناب!" میں نے کھنکار کے کہا۔ "میں سکندر بخت ہوں۔"

"ہاں۔ مجھے معلوم ہے۔" وہ آنکھیں کھول کے متعجب ہوئے بغیر بولا۔ "میں سیہ بخت بھی نام کا غالب ہوں لیکن اس وقت مغلوب ہوں کمینی خواہشات سے۔ مثلاً اس وقت یہ شدید اندیشہ ہے کہ مجھے چائے کی ایک پیالی نہ ملی تو میری پیاسی روح خود فریاد کرنے خدا کے حضور حاضر ہو جائے گی اور ممکن ہے لوٹ کر نہ آئے۔ غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں!"

میں ہنس پڑا۔ "تم محسن کے دوست... وہی رپورٹر ہو؟"

"دونوں سے میری سیہ بختی ثابت ہوتی ہے نا؟" وہ بولا۔ "رپورٹر سے زیادہ پورٹر نظر آتا ہوں اور محسن کی دوستی کے باعث بھوکا پیاسا ہوں۔ صبح سے یہ آگ اور دھواں پی رہا ہوں اور بس۔"

"میں ابھی چائے بنا کے لاتا ہوں۔ ہم دونوں پٹ گئے۔" میں نے چٹکی بجاکے کہا۔ "ذرا اپنی روح کو روک کر رکھنا۔"

وہ آدمی دلچسپ تھا اور اس کی بے تکلفی مجھے پسند آئی۔ وہ محسن کا قابلِ اعتماد دوست تھا تو بُرا آدمی کیسے ہو سکتا تھا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ ابھی تک میں اور وہ نہیں ملے تھے لیکن گفتگو سے مجھے اندازہ کرنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ وہ میرے بارے میں سب کچھ جانتا ہے۔ یقینی طور پہ وہ گزشتہ شب کی ہنگامہ آرائی میں شریک تھا۔ محسن اور ٹیڈی دوسرے کمرے میں فرش پر کمبلوں میں سکڑے پڑے تھے اور غالباً بہت دیر سے لوٹے تھے کہ ابھی تک بے سُدھ تھے۔ میں نے ان کو ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا اور سیدھا کچن چلا گیا۔ پھر مجھے اس کافی کا خیال آیا جو میں رات کو مکھن اور ڈبل روٹی کے ساتھ خرید کر لایا تھا۔

"غالب صاحب!" میں نے کمرے میں لوٹ کر کہا۔ "اگر چائے کے بجائے کافی کا موڈ ہو تو بتا دیں؟"

"کافی؟" وہ اچھل پڑا۔ "یا مظہر العجائب۔ حوالات میں کافی؟ کیا واقعی کافی مل سکتی ہے یہاں؟ لاؤ لاؤ یار سکندرِ اعظم لیکن دیکھو بلیک۔ زلفِ محبوب یا بندۂ مجبور کی تقدیر کی طرح۔ نو شوگر۔ واہ بھئی واہ۔ اس وقت تو اپنے مولا سے کچھ بھی مانگ لیتا۔"

وہ میرے پیچھے کچن میں آگیا۔

"اب بھی وقت ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "مانگ کے تو دیکھو غالب صاحب۔"

"یہ دوسری بار گالی دے دی تم نے مجھے۔" وہ بولا۔ "آئندہ صاحب مت کہنا۔ ایک صاحب تو پہلے ہوتا تھا سفید چمڑی والا صاحب بہادر تو خود تھا، خطاب چمچوں کو دیتا تھا۔ پھر رہ گیا کالا صاحب۔ آئی سی ایس اور اب سی ایس پی والا بیورو کریٹ صاحب۔ تو بھائی ہم غالب ہی اچھے۔ نہ مسٹر میں نہ مولانا۔"

"غالب کیسے بن بیٹھے؟ ضرورتِ شعری کے تحت بھی ہو جاتی ہے۔ شعر نہ کہو تو اور نہ سناؤ تو بھئی...۔"

وہ ہنسا۔ "نہیں یار۔ بخت شرمندہ رہتا ہوں۔ چچا غالب سے لیکن حرکت یہ ابا جان کی تھی۔ میرا ہونا اور پھر یہ نام ... قصور میں نے نہیں کیے۔ نہ جانے کس حکیم نے لکھ دیا تھا... کہ اولادِ نرینہ ہو تو غالب احمد نام رکھنا۔ پھر غضب یہ ہوا کہ ... چودہ سال مجھ سے پہلا شعر تولد ہوا۔ شعر تھا کہ بس ایک بار ... اسے اور مر گئے۔ فرہاد و قیس سے بڑا کام کر گئے۔ گھر ... والوں نے کہا کہ میاں غالب تو تم ہو۔ غضب خدا کا! اصل ... پہلے نقل کی شہرت ہو گئی۔ ہم نے بھی مان لیا اور اٹھتے بیٹھتے ... دنادن شعر اس دورِ شباب کی غلطیاں شمار کرتا ہوں ... ہوتا ہوں، پچھتاتا ہوں اور روتا ہوں کہ کاش میں نے یہ ... نہ کیے ہوتے مگر اپنی کوکھ کے جنے ہیں، کیسے نہ کہوں کہ ... مکروہ، بدصورت، غلیظ اور متعفن شعر میں نے نہیں کہے ... خدا تو بندے کی غلطی شاید معاف کر دے، مرزا غالب ... حشر میں ہی ہر شعر پر ستر جوتے ماریں گے کہ میرا نام لے کر ... تھے، اب کہہ کے دیکھو۔"

کافی کا مگ میں نے اُسے تھمایا اور ہم کمرے میں لوٹ آئے۔ وہ بے حد باتونی اور انتہائی ذہین آدمی تھا۔ اس ... گفتگو میں ہی نہیں، شخصیت میں بھی ایک مسحور کر لینے والی ادا ... کچھ اس کی بے تکلفی، کچھ بے باکی اور صاف گوئی اور سادہ ...

"رات تم لوگ کس وقت لوٹے تھے؟" میں نے ایک سلائس پر مکھن لگا کے اُسے پیش کیا۔

"رات کہاں تھی وہ! صبح کی پہلی گھڑی تھی۔" پھر وہ زمین پر پاؤں پھیلا کے دیوار کے سہارے بیٹھ گیا تھا۔

"چوہدری دلاور کا کیا بنا؟" میں نے کہا۔

"یار یہ چکر کچھ اپنی سمجھ میں نہیں آیا۔" وہ سلائس کو دانت سے کاٹتے ہوئے بولا۔ "ایک بار پہلے محسن نے مجھے دوڑایا تھا کہ ایک گرماگرم خبر ہے، چوہدری دلاور کے گھر پہنچو۔ وہاں پولیس بھی موجود ہے اور ایک لاش بھی، یہ نہ ہو کہ دلاور اپنے مال کے نیچے اس لاش کو دبا دے۔ میں بڑی مشکل سے وہاں پہنچا اور کرم خدا کا یہ ہوا کہ پولیس افسر بھی تھا اپنے ہی مطلب کا، چنانچہ ... سے دال نہیں گلی۔ اب کل پھر وہی ہوشیار خبردار! اتنے ... فلاں جگہ اسی گرماگرم خبر کا حصہ دوم ملے گا۔ یہ نہ ہو خبر رات کی ... میں گم ہو جائے۔ اب یہ اپنا یار محسن مذاق تو کرتا ہے اپنے ساتھ لیکن ... اور پہلی بار اس نے جو خبر دی تھی وہ اچھی خاصی سنسنی خیز تھی ... گئی۔ چوہدری صاحب نے ایڈیٹر کا منہ بند کر دیا تھا کہ ...

... نے اور نام کے ساتھ حوالہ نہ آئے۔"

"اور اس بار پوری تفصیلات ہوں گی؟" میں نے کہا۔ "پوری آب و تاب کے ساتھ؟"

"کہا تو تھا میں نے کہ تصویر کے ساتھ پوری سہ کالمی سُرخی ہونی چاہیے۔" وہ بولا۔ "بڑی افراتفری میں ایک مختصر سا نیوز فیچر بنا کے دیا تھا۔ کاپی تیار تھی مگر میں نے جگہ نکالی۔ پتا نہیں کس نسل پرست نے افریقہ کی نسل پرست حکومت کے اقدامات کی مذمت کی تھی۔ میں نے وہ بیان خارج کیا اور چوہدری صاحب کے لیے جگہ نکالی۔"

"کیا کچھ دیا ہے اپنے نیوز فیچر میں؟" میں نے دلی اضطراب کو دبا کے ظاہری بے نیازی سے کہا۔

"حوالہ یہ دیا ہے کہ مشہور صنعت کار چوہدری دلاور پہلے بھی اپنے ایک ڈرائیور رحمت کباڑی کے قتل کے الزام میں گرفتار اور ضمانت پر رہا ہوئے تھے۔" غالب نے سوچتے ہوئے کہا۔ "پھر انسپکٹر فتح شیر کی گمشدگی کا ذکر ہے۔"

"الطاف عرف طافو کا کوئی حوالہ نہیں آیا؟" میں نے کہا۔

"آیا ہے۔ میں نے لکھا ہے کہ رحمت کباڑی اور الطاف نامی ڈرائیور ایک ہی ٹرک لے کر گئے تھے۔" غالب نے کہا۔ "طافو تاحال لاپتا ہے۔ دونوں زرعی مشینری کے پُرزوں سے بھرے ہوئے ٹرک سمیت غائب ہو گئے تھے جو چوہدری صاحب کے کارخانے میں بنتے ہیں۔ انسپکٹر فتح شیر کے قتل کے سلسلے میں سامنے آنے والی شہادت ناقابلِ تردید لگتی ہے۔"

ایک شب کی تگ و دو رائیگاں نہیں گئی۔" میں نے کہا۔ "خوشی ہوئی یہ جان کر۔"

"کیوں بھئی! تمھیں کس بات سے خوشی ہوئی؟ قتل سے یا قاتل کی گرفتاری سے؟"

"قاتل کی گرفتاری سے۔" میں نے کہا۔ "ممکن ہے کچھ لوگ انسپکٹر فتح شیر کے جانی دشمن ہوں لیکن میں ان میں شامل نہیں۔ اس کا قتل بہرحال نہیں چاہتا تھا میں۔"

"گویا تم چوہدری دلاور کے دشمن ہو؟" وہ میری بات کاٹ کر بولا۔ "اور محسن نے مجھے ایکس کلیوسو اسٹوری تو پہلے بھی دی تھی لیکن مزید کچھ بتائے بغیر بھاگ گیا تھا۔ خیر اس وقت میں نے سمجھا تھا کہ محسن کو اتفاق سے ایک بات معلوم ہو گئی تھی جو اس نے مجھے بتا دی تھی لیکن یہ سلسلہ کچھ اور ہے۔ وہ بھی چوہدری دلاور کی جان کا دشمن ہو رہا ہے اور یہ سب کچھ اس نے کیا بھی اس لیے ہے کہ چوہدری صاحب کے گلے میں پھانسی کا پھندا فٹ ہو جائے۔"

"کیا اب بھی کوئی کسر رہ گئی ہے؟" میں نے کہا۔

"میرا تو خیال ہے کہ اب پھندا اُن کے گلے میں ہے۔" غالب نے کہا۔ "خبر بھیجنے کے بعد میرے ہاتھ بے حد اہم ثبوت لگے جس سے واردات کی پوری تفصیل میرے سامنے آگئی۔ میں نے ایڈیٹر سے کہہ دیا تھا کہ یہ خبر اسی طرح شائع ہوگی جیسے میں کہوں گا ورنہ میں جا رہا ہوں اس کے حریف اخبار میں کرائم رپورٹر بننے کے لیے اور کل تو سب اخباروں میں کچھ نہیں ہوگا مگر جو پرسوں آنے والا ہے، وہ دوسرا ایٹم بم ہے۔ کسی کے باپ کو وہ سب معلوم نہیں ہے جو مجھے معلوم ہے۔"

"تم کو سب کچھ معلوم ہے؟" میں نے کہا۔

"یہی تو گڑبڑ ہے۔" وہ سگریٹ جلا کے بولا۔ "کہ مجھے سب کچھ معلوم نہیں۔ بے شک محسن نے جھوٹ نہیں بولا تھا لیکن وہ کوئی غیب کا علم نہیں رکھتا۔ اُسے پہلے سے کیسے معلوم تھا اور اس کا یا تمھارا اس کیس سے کیا تعلق ہے؟"

"اچھا! میں سمجھا تھا، تم جانتے ہو گے۔" میں نے کہا۔ "محسن نے تم کو بتا دیا ہوگا۔"

غالب نے نفی میں سر ہلایا۔ "خبر کو پریس اور چوہدری صاحب کو جیل بھول کے میں اِدھر آیا کس لیے ہوں؟ ہر روز تو دس گیارہ بجے تک اِدھر اُدھر جھک مارتا تھا۔ کسی تھانے سے کچھ لیا، کسی اسپتال سے معلوم کیا اور اگلے دن کے لیے عدالتوں کے کیس دیکھے۔ پھر عموماً گھر لوٹ جاتا تھا ورنہ پھر جو دلِ وحشی کہے۔ کہ اے دوست ویرانے میں چل۔ یا کسی زہرہ جبیں کے کاشانے میں چل۔ لیکن میں نے محسن سے کہا کہ میں تیرے ساتھ چل رہا ہوں۔ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ آخر یہ چکر کیا ہے۔ اس نے چکر دے دیا مجھے کہ ابھی تو خیر سے لمبی تان کے سو جاؤ۔ صبح بتائیں گے سکندرِ اعظم خود۔"

"تم اخبار نویس ہو کے ظاہر کر رہے ہو کہ تم کو میرے بارے میں کچھ علم نہیں۔"

"علم تو ہے۔ اور پبلک سے کچھ زیادہ ہے۔ مگر پسِ پردہ بہت کچھ ہے جو محسن نے نہیں بتایا۔"

"وہ ایسا رازدار اور قابلِ اعتماد دوست ہے کہ جب تک میری مرضی نہیں ہوگی، وہ چُپ رہے گا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم پر اعتماد نہیں ہے اسے۔" میں نے کہا۔ "جب وہ کسی پر بھروسہ کرتا ہے تو وہ آدمی بھروسے کے قابل ضرور ہوتا ہے مگر پسِ پردہ واقعات کا سلسلہ اتنا دراز ہے کہ بات تفصیل سے بتانے میں شام ہو جائے گی اور بات پھر بھی ادھوری ہوگی۔ یہ باتیں پھر بھی ہو سکتی ہیں۔ ابھی تو مجھے یہ بتاؤ کہ وہاں کیا ہوا؟"

"بھئی عجیب پُراسرار معاملہ ہے۔" وہ دوسری سگریٹ جلا کے بولا۔ "کس کا یقین کیا جائے کس کا نہ کیا جائے! دلاور چلا رہا تھا کہ اس کے خلاف سازش کی گئی ہے اور اسے باقاعدہ جال پھیلا کے شکار کیا گیا ہے لیکن یہ بات اس نے پہلی واردات کا راز افشا ہونے پر بھی کہی تھی اور ہر مجرم کہتا تو یہی ہے کہ وہ بے گناہ ہے۔ اگر واقعات کی شہادت اس کے خلاف جاتی ہو تو کہتا ہے دشمنوں نے اسے پھنسایا ہے۔"

"شک کس بات کا ہے؟" میں نے کہا۔ "تم دلاور کو بے گناہ کیوں سمجھتے ہو؟"

"وہ... مجھے اس پر اداکاری کا گمان نہیں ہوا۔ ایسا لگتا تھا وہ سچ بول رہا ہے۔" غالب نے سوچتے ہوئے کہا۔ "مگر دوسری طرف حالات و واقعات سے اس کا سچ بالکل جھوٹ ثابت ہوتا تھا۔ میں تو اخبار کے دفتر سے رپورٹ دے کر نکلنے ہی والا تھا جب محسن کا فون آیا کہ فوراً پہنچو۔ میں نے کہا۔ 'آج کا کام کل پر نہیں چھوڑا جا سکتا؟' وہ کہنے لگا کہ بعد میں شکایت نہ کرنا۔ یہ اسی خبر کی دوسری کڑی ہے۔ سیٹھ دلاور نے دو قتل کیے ہیں۔ ایک کی خبر سب سے پہلے تم نے دی تھی۔ یہ دوسری اس سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ دُہرے قتل کی واردات ہے اور ایک معاملہ تو بہت سنگین ہے۔ ایک پولیس سب انسپکٹر ہے فتح شیر' وہ راتوں رات غائب ہو گیا تھا۔ اس کی لاش فلاں جگہ پڑی ہے۔ میں نے کہا۔ 'تم کو کیسے معلوم ہوا؟' وہ کہنے لگا کہ خبر سے تعلق رکھو۔ کیوں اور کیسے مت کرو۔ میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔ سیٹھ دلاور نے رحمت کباڑی کے ساتھی ڈرائیور کو بھی قتل کر دیا ہے۔ وہ اس کو دفن کرنے والا تھا گھر کے عقبی حصے میں کہ کسی نے پولیس کو خبر دے دی۔ میں نے کہا۔ 'خبر تم نے تو نہیں دی تھی؟' وہ کہنے لگا کہ یہی سمجھو۔ بہرحال انسپکٹر فتح شیر وہاں پہنچا اور اس نے سیٹھ دلاور کو لاش دفن کرنے سے پہلے پکڑ لیا۔ دلاور قبر کھود رہا تھا اور لاش وہیں کمبل میں لپٹی ہوئی پڑی تھی لیکن دلاور نے انسپکٹر کو پانچ لاکھ دے کر معاملہ ختم کر دیا۔ انسپکٹر کے ساتھ چار سپاہی بھی تھے۔ انہیں اپنا حصہ ملا اور انچارج تھانہ کو بھی ملا ہو گا لیکن دلاور نے بعد میں فتح شیر کو ٹھکانے لگا دیا تاکہ گواہ کوئی نہ رہے اور اسے پھر بلیک میل نہ کر سکے۔ میں نے کہا۔ 'میاں محسن۔ بھاڑ میں گئی ہماری صحافت۔ یہ تم اتنی بال کی کھال کیسے نکالتے ہو جب نہ تم پولیس میں ہو' نہ سی آئی ڈی میں۔ فرشتے بتا جاتے ہیں یہ سب کچھ تمھیں؟' وہ پھر کہنے لگا کہ اس وقت باتوں میں وقت ضائع کرو گے تو موقع گنوا دو گے۔ آخر میں دوست ہوں تمھارا' تمھیں بے وقوف نہیں بنا رہا ہوں۔ میری بات غلط ثابت ہو تو مجھ سے کہنا۔ پھر میں کیا کرتا۔ [illegible] مار کے گیا۔ ایک شیطانی چرخہ ہے اپنے پاس۔ ایک بار کی دو پہیوں والی سواری۔ اسی کو بھگائے پھرتے ہیں زمانے میں۔ اب جو دیے ہوئے پتے پر پہنچا تو وہاں ایک مجمع تھا۔ بائیس افراد نے چار لفنگوں کو گھیر رکھا تھا جو ٹیکسی میں پہنچے تھے۔ کسی عقلمند نے ٹیکسی کی ہوا بھی نکال دی تھی۔ میں نے بتایا کہ میں بعد میں آیا ہوں اور بس لوگوں کے ساتھ پولیس کو دیکھ کر رُک گیا تھا۔ پولیس کے ساتھ ایک لطیفہ یہ ہوا کہ ایک شخص نے خود کو اس خالی کوٹھی کا چوکیدار بتایا۔ یہ بھی کہا کہ کوٹھی رابعہ قاری ایڈووکیٹ کی ہے لیکن وہ اس میں رہتی نہیں ہیں۔ وہ ہفتے میں ایک دن کے لیے شہر جاتا ہے بیوی بچوں سے ملنے اور باقی چھ دن یہیں رہتا ہے۔ اس نے آج واپس آنے کے بعد عجیب سی بُو محسوس کی اور پھر دیکھا تو اوپر والے ایک باتھ روم میں لاش نظر آئی۔ اس نے فوراً پولیس کو فون کر دیا۔ جس وقت پولیس لاش کی شناخت کر رہی تھی اور ضابطے کی کارروائی میں مصروف تھی اس وقت خود کو چوکیدار کہنے والا کھسک گیا۔ پولیس کو اندر سے دلاور کی کار بھی ملی اور جب چاروں نے دیکھا کہ وہ ایک پولیس افسر کے قتل میں پھنس گئے ہیں تو انھوں نے صاف کہہ دیا کہ ان کو دلاور نے بھیجا تھا اور کہا تھا کہ یہاں ایک اشتہاری مجرم ملے گا جس کی گرفتاری پر دس ہزار کا انعام ہے' پچیس ہزار خود اس نے دینے کا وعدہ کیا تھا۔ بعد میں پولیس نے چوکیدار کو تلاش کیا تو وہ بھی غائب اور اس کے ساتھی بھی۔ جو بچے تھے وہ صرف تماشائی تھے اور کچھ نہیں جانتے تھے لیکن دھر لیے گئے۔ پولیس نے کہا یہ نہ ہو بعد میں ایک گواہ نہ ملے۔ وہ بہت روئے پیٹے مگر کسی نے ان کی ایک نہ سُنی۔ وہ آٹھ دس افراد جو پہلے پیش پیش تھے اپنا کام کر کے نکل گئے تھے اور بندۂ حقیر کا خیال یہ ہے کہ وہ صرف دلاور کو اور اس کے ساتھیوں کو پکڑوانے کے لیے پہنچے تھے۔ یہیں سے مجھے شبہ ہوا کہ دلاور سچ نہ کہتا ہو اور واقعی اسے پھنسایا نہ گیا ہو۔ مگر بعد میں بہت سے دلچسپ انکشافات ہوئے۔ پولیس نے تو فوراً تفتیش کا آغاز کر دیا تھا۔ قتل کسی عام آدمی کا ہوتا تو وہ مشتعل نہ ہوتے مگر ایک پولیس افسر کا قتل گویا پورے پولیس کے محکمے اور اقتدارِ اعلیٰ کے منہ پر طمانچہ تھا۔ وہ تو چاہتے ہیں کہ عوام ان کے نام سے تھر تھر کانپنے لگیں۔ ان کو دیکھ کر اختلاجِ قلب میں مبتلا ہو جائیں اور ان کے اشارۂ ابرو پر عزت و آبرو اور جان و مال کا نذرانہ پیش کر دیں۔ ان کی یہ ہمت کہ ایک پولیس افسر کو مار دیں' اسے قتل کر دیں جو قاتلوں کو پکڑتا ہے اور تفتیش کے نام

پر قتل تک کے اختیارات اپنے پاس رکھتا ہے۔ بس جناب سکندرِ اعظم! انھوں نے خالی کوٹھی میں سے آلاتِ تحقیق اکٹھے کیے' ڈنڈے اور رسّے' درختوں کی ٹہنیاں اور اپنی بیلٹ۔ پہلے تو چار ملزمان کی شامت آئی۔ انھوں نے بہت جلد اُگل دیا کہ وہ کون ہیں۔ نولکھا اور ہیرا منڈی کے بدمعاش تھے۔ ٹیکسی چوری کی تھی۔ پھر گواہوں کی واجبی سی گوشمالی ہوئی مگر ان میں سے کسی نے قبول نہیں کیا کہ اس نے پولیس کو فون کیا تھا یا وہ ان میں سے کسی کو جانتا ہے جو کھسک گئے۔ وہ سب بڑے لوگوں کے شوفر اور نوکر وغیرہ تھے چنانچہ خاصے پُراعتماد تھے کہ ان کا صاحب انھیں تھانے سے چھڑا کے لے جائے گا۔ جب کوٹھی کے اندر ہی سے دلاور کی کار بھی دریافت ہوئی تو کچھ اور شواہد سامنے آئے۔ ایک تو یہ کہ گاڑی پر گرد نہیں تھی جس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ گاڑی وہاں زیادہ عرصہ کھڑی نہیں رہی۔ اس کی بیٹری بھی ٹھیک تھی اور پٹرول ٹینک بھی آدھا بھرا ہوا تھا۔ چاروں پہیوں میں ہوا پوری تھی صرف ڈکی میں رکھا ہوا ٹائر فلیٹ تھا۔ کاغذات دیکھتے ہی معلوم ہو گیا کہ گاڑی کس کی ہے۔ چابیاں اسی میں لگی ہوئی تھیں چنانچہ پولیس والے اِدھر اُدھر بھاگے کہ دلاور زیادہ دُور نہیں ہو گا۔ اگر وہ بھی کرائے کے چار بدمعاشوں کے پیچھے لگا ہوا تھا تو پہلے سے کوٹھی میں موجود تھا مگر اس نے جب معاملہ بگڑتے دیکھا تو فوراً جائے واردات سے فرار ہو گیا۔ کیونکہ اس وقت گاڑی میں نکلنا مشکل تھا۔ اس نے سوچا ہو گا کہ پہلے اپنی جان بچانے کی فکر کی جائے' گاڑی نکالنے کی بعد میں۔ اب خدا آپ کا بھلا کرے' گیدڑ کی شامت آتی ہے تو وہ شہر کا رُخ کرتا ہے۔ چوہدری دلاور کی شامت آئی تو وہ بھی جائے واردات کی طرف چل پڑا۔ معلوم نہیں کیوں' شاید اسے اعتماد نہیں تھا کہ وہ کرائے کے مجرم اس اشتہاری مجرم کو پکڑ سکیں گے۔"

"تم نے اب تک اشتہاری مجرم کا نام نہیں لیا۔" میں نے موقع پا کے کہا۔

وہ ہنسا۔ "بہت شوق ہے اپنا نام سُننے کا! میاں سکندرِ اعظم۔ تم کوئی غیر معروف شخصیت ہو گیا؟ ارے بھائی' کتنے دن کی بات ہے جب تمھاری تصویر ہر اخبار میں چھپی تھی۔ پبلک کا حافظہ اتنا کمزور نہیں ہے مگر ایک تو پولیس کو یہ چہرہ نہیں بھول سکتا۔ دوسرے ہم جیسے سرپھرے یادداشت پر بہت بھروسہ کرتے ہیں۔ تمھارے نام سے منسوب داستانوں کو اس بندۂ حقیر نے ہی تحریر کیا تھا۔ اور خدا گواہ کہ اس میں زیبِ داستاں کے لیے کچھ نہیں بڑھایا تھا۔ ورنہ تو کرائم رپورٹر کی مرضی ہے قاتل کو فرشتہ بنا دے اور فرشتے کو قاتل۔ تمھارا نام رابعہ قاری ایڈووکیٹ کے ساتھ یوں آیا کہ مجھے رشک آیا۔ نہ مجنوں کی خاطر لیلیٰ نے خود کو یوں خوار و برباد کیا تھا' نہ فرہاد کے لیے شیریں نے۔ میں نے رابعہ کو دیکھا بھی ہے بلکہ اس کی پہلی شادی میں شریک بھی تھا۔"

میں دم بخود رہ گیا۔ "تم... تم جانتے ہو اس کے سابق شوہر کو؟"

وہ عیاری سے مسکرایا۔ "میں اس کا دوست تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ اسے شادی نہیں کرنی چاہیے اور سوچا بھی تھا کہ ایک شریف لڑکی کی زندگی بچانے کے لیے مجھے کیا کرنا چاہیے۔ دوستی کا بھرم رکھنا زیادہ اہم ہے یا سچ بولنا۔ اور ظاہر ہے میں نے سچ بولنے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر وہ کہنے لگا کہ میرے معاملات مجھ پر چھوڑ دو۔ میں اس کی زندگی تباہ نہیں کروں گا اور خود کو بھی باعزت طور پر بچا لوں گا لیکن تم نے سقراط بن کے دخل اندازی کی تو میرا کچھ نہیں' میں خودکشی کر لوں گا۔ اور بات ختم۔ مگر اس کے بعد میرے والدین بھی زندہ نہ رہیں گے۔ سب کے قتل کا الزام لینے کی ہمت رکھتے ہو تو نیک کام میں دیر کیسی؟ ان کو خوشیوں سے محروم کر کے کیوں مارتے ہو' خوشی کی تمنا سے پہلے ہی قتل کر دو' مجھے اور انھیں زہر دے دو یا گولی مار دو۔ میں ایک تحریری بیان تھما جاتا ہوں تم کو کہ میں نے والدین کو قتل کر کے خودکشی کر لی ہے۔ تم اخبار نویس ہو۔ خبر کو مرضی کے مطابق بنا لینا۔ دنیا یہی سمجھے گی نا کہ میں پاگل ہو گیا تھا۔ یہ تو نہیں کہے گی کہ بے غیرت تھا۔ خیر میں نے اس سے بحث کی تو اس نے مجھے بتا دیا کہ وہ کیا کرے گا۔ اس کی دھمکی سے میں ڈر گیا تھا۔ بعد میں وہی ہوا۔ یعنی اس نے رابعہ سے نکاح تو کیا مگر رخصتی کو ٹالتا رہا۔ یہاں تک کہ والدین دنیا سے رُخصت ہو گئے۔ پھر اس نے رابعہ کو خاموشی سے طلاق دے دی۔ پرانی بات ہے یہ۔ میرا وہ دوست زندہ ہے اور بہت بڑے عہدے پر ہے۔ زندگی سے کسے پیار نہیں ہوتا۔ اب اگر قدرت نے اس کے ساتھ ناانصافی کی تھی تو کیا ہوا۔ باقی ہر لحاظ سے تو وہ ایک کامیاب اور مکمل انسان ہے۔ جینے کا حق تو ہے اسے۔"

"اچھا۔ تو خوب گاڑھی چھن رہی ہے؟" محسن نے دروازے میں نمودار ہو کے منہ پھاڑا اور جماہی لی۔ "رات کو کیسے گھوڑے بیچ کے سو گیا تھا۔ میں اور ٹیڈی گھوڑے کی طرح بحرِ ظلمات میں دوڑتے پھر رہے تھے۔ ہماری کوئی فکر نہیں تھی جناب کو' خوابِ شیریں کے مزے لے رہے تھے' شیریں یعنی رابعہ؟" اس نے مجھے ڈانٹنا شروع کیا۔

"کیوں؟ شیریں یعنی شہلا کیوں نہیں؟" میں نے غرّا کے

کہا۔"ہم نے کبھی تیرے خواب سنسر کیے ہیں گھوڑے۔ ہاں جی غالب جی۔ اے ہنہناتے دیں آپ۔ بیان جاری رکھیں۔ پھر دلاور کہاں ملا؟" میں نے جانتے بوجھتے موضوع بدل دیا اور یہ ظاہر کیا کہ ہم رابعہ کی بات ہی نہیں کر رہے تھے۔

"بس بھئی سکندرِ اعظم۔" غالب معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ "پولیس تو اِدھر اُدھر بھاگتی پھر رہی تھی اور اکا دُکا راہگیروں سے فضول پوچھتی پھر رہی تھی کہ انھوں نے اس حُلیے اور اس قماش کا کوئی آدمی تو نہیں دیکھا۔ ایک پولیس والے کے سامنے کون تسلیم کرتا کہ اس نے دیکھا ہے۔ میں نے سوچا کہ خبر تو بن ہی گئی۔ اب آفس چل کے لگا دیتے ہیں۔ فوری طور پر کچھ اور معلوم ہونے کا امکان نہیں تھا۔ اب ضابطے کی کارروائی ہوگی تو نتائج سب کو ہی معلوم ہوں گے لیکن صبح کے کسی اور اخبار میں یہ سرخی نہیں ہوگی کہ "رحمت کباڑی کے قتل میں ضمانت پر رہا ہونے والے صنعت کار چوہدری دلاور پر انسپکٹر فتح شیر کے قتل کا الزام۔"

میرے ذہن میں ذیلی سرخیاں بھی تھیں اور کچھ خبر سے متعلقہ مواد۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ اتنے کم وقت میں رحمت کباڑی اور دلاور کی تصویریں بھی نکالنی ہیں چنانچہ مجھے پہلے کہیں سے ایڈیٹر کو فون کر دینا چاہیے۔ اچانک میں نے سڑک کے درمیان رُکی ہوئی گاڑی کو دیکھا۔ وہ کچھ ترچھی کھڑی تھی۔ اس طرح کہ سڑک بلاک ہو گئی تھی۔ ادھر ٹریفک تو ہے نہیں اور رات کو تو بالکل نہیں ہوتی۔ ایک شخص کار کے پاس کھڑا تھا۔ میں سمجھا کہ گاڑی خراب ہو گئی ہے ورنہ شریف آدمی اپنی گاڑی کنارے پر کھڑی کرتے ہیں۔ اتنی دیر میں دلاور نے مجھے آواز دی۔ شامت اسی طرح بُلاتی ہے آدمی کو۔ وہ نہ بُلاتا تو میں اس کی صورت پر غور کیے بغیر نکل جاتا۔ مجھے فرصت بھی نہیں تھی کہ اس کی مدد کرتا اور گزشتہ ہفتے کی بیماری کے بعد اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ کم سے کم دھکا لگا کے گاڑی کو ایک طرف کرا دیتا۔ اس کی آواز پر میں مجبور ہو گیا اور دلاور نے کہا کہ اس کی گاڑی کا پچھلا ٹائر برسٹ ہو گیا ہے چنانچہ میں اگر ہاتھ لگاؤں تو وہ گاڑی کنارے پر لگا دے۔ میری ناک دیکھی تم نے؟

اس غیر متوقع سوال نے مجھے دنگ کر دیا۔ "ناک؟ کیا ہوا تمھاری ناک کو؟ اور ناک کیسے آگئی یہاں؟"

"یہ بہت اسپیشل ناک ہے۔" وہ اپنی ناک پر ہاتھ پھیر کر بولا۔ "تم اس کو کتے کی ناک کہو تو میں بُرا نہیں مانوں گا۔ لوگ تو میری عادتوں کی وجہ سے مجھے بھی کتے کی دُم کہتے ہیں۔ میری ناک حد درجہ حساس ہے۔ ہر قسم کی بُو کا بہت طاقت ور راڈار ہے۔ مجھے کچھ ٹائر جلنے کی بُو محسوس ہوئی۔ ٹائر برسٹ ہوتا ہے تو یہ بُو نہیں آتی۔ لیکن اس بُو سے الگ ایک بُو تھی۔ بارود کی بُو۔ کسی نے کچھ دیر پہلے پٹاخا چلایا ہو۔ لیکن پٹاخا اتنی رات کون چلاتا ہے اور چلاتا تو کیا میرے کان آواز نہ سنتے۔ موقع شبِ برات کا بھی نہیں تھا اور اس وقت دور کسی کیا بٹے کا بھی پتا نہ تھا۔ میں نے جھک کر دیکھا تو مجھے فلیٹ ہو جانے والے ٹائر میں سوراخ نظر آیا جس کے کنارے ... ہوئے تھے۔ "یہ ٹائر خود تو برسٹ نہیں ہوا۔" میں نے ... "نیا ٹائر تھا۔"

"تم نے اندھیرے میں یہ سب کیسے دیکھا؟" میں نے ...

"تمھیں کس نے بتایا کہ وہاں اندھیرا تھا؟" غالب نے مجھے غور سے دیکھا۔ یہ غلطی مجھ سے غیر ارادی طور پر سرزد ہوئی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ دلاور کی گاڑی پر میں نے کس جگہ ... کیا تھا اور جب غالب مجھے دلاور سے ملاقات کا حال ... رہا تھا تو میری آنکھیں اس مقام کو دیکھ رہی تھیں جہاں ... میں دلاور کو بے بس اور مجبور چھوڑ کے فرار ہوا تھا۔ وہ ... اندھیری سڑک تھی اور کوئی اسٹریٹ لائٹ روشن نظر نہیں آ رہی تھی۔ سڑک کے کنارے بجلی کے کھمبے تھے یا نہیں ... مجھے یاد نہ تھا اور میں نے فرض کر لیا تھا کہ اس اندھیری سڑک پر اندھیرا ہی رہتا ہوگا۔ حالانکہ یہ بھی ممکن تھا کہ اس وقت اسٹریٹ لائٹ بند ہو۔

"وہ... دراصل تم نے خود کہا ہے نا کہ رات ..." میں نے بات بنانے کی کوشش کی۔ "اور چاند کی آخری تاریخ تھی ..."

وہ کچھ دیر مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتا رہا۔ "... آدمی ہو۔" اس نے بالآخر کہا۔ "اچھا نکتہ تلاش کر لیا اپنے ... کے لیے مگر کیا اجالا صرف چاندنی سے ہوتا ہے؟ لاہور کارپوریشن نے اور کینٹ بورڈ نے سڑکوں پر روشنی کا کوئی انتظام نہیں کر رکھا ہے؟ وہاں بھی ایک پول تھا اور اس کی روشنی پیچھے سے کار کی ڈکی کے نیچے پھیل رہی تھی ... اسی روشنی میں مجھے گولی کا نشان نظر آ گیا تھا اور قریب سے دیکھنے پر میری ناک زیادہ فعال ہو گئی تھی۔ میں نے دلاور کی خاموشی پر اس کی طرف دیکھا تو وہ مجھے کچھ نروس ... نظر آیا۔ اس نے مجھے نہیں پہچانا تھا لیکن میں نے اسے فوراً شناخت کر لیا۔ 'دراصل... وہ بدمعاش بھاگ ... جس نے مجھ پر گولی چلائی تھی۔' وہ بولا۔ 'لوٹنا چاہتا تھا مجھے۔ اتفاق سے ایک گاڑی آگئی۔' اس کی بات بالکل بے ربط تھی۔ اس نے سوچا تک نہ تھا کہ وہ کسی سے دھکا لگانے کیلیے کہہ ... اور مدد کرنے والا شرلاک ہومز ثابت ہوگا کہ ایک سیکنڈ میں تاڑ ...

کے برسٹ ہونے کا سبب جان لے گا۔ اسے کچھ تو کہنا ہی تھا لیکن 'عذرِ گناہ بدتر از گناہ' والی بات ہو گئی۔" میں نے کہا۔ "عجیب بے وقوف آدمی تھا۔ پہلے اس نے آپ کو روکنے کے لیے گاڑی کے ٹائر پر فائر کیا اور یہ نہیں سوچا کہ اس طرح گاڑی بے قابو ہو کے اُلٹ بھی سکتی ہے۔ اس کے علاوہ پٹرول ٹینک اس ٹائر سے چند انچ اوپر تھا۔ نشانہ ذرا بھی خطا ہوتا تو ٹینک برسٹ ہوتا اور گاڑی میں آگ لگ جاتی۔ پھر وہ کسے لُوٹتا؟ اور پھر وہ گاڑی کو آتا دیکھ کر بھاگ گیا؟ وہ پولیس کی گاڑی تو نہیں تھی۔ اگر اس کا نشانہ اتنا ہی اچھا تھا تو وہ پروفیشنل ہوگا، پرانا پاپی۔ ایسے لوگ گھبراتے نہیں۔ وہ ریوالور کا رُخ آپ کی طرف کیے کھڑا رہتا اور مسکراتا۔ گاڑی والا دیکھتا تو مسکراتا کہ دو دوست باتوں میں مصروف ہیں اور سیدھا گزر جاتا مگر یہ اب میری یہی بُری عادت ہے کہ ضرورت سے زیادہ بولتا ہوں۔ چوہدری دلاور بھنا گیا۔ کہنے لگا کہ میں نے تم کو مدد کے لیے بُلایا تھا دماغ چاٹنے کے لیے نہیں، سراغرساں کی اولاد۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے! میں نے کہا کہ چوہدری دلاور صاحب۔ اگر میں دفع ہونے سے انکار کر دوں تو آپ کیا کریں گے؟ معلوم ہے اس نے جواب میں کیا کہا؟"

"اس نے تمھاری ناک پر مُکا مارا ہوگا اور اس کا راڈار سسٹم تباہ کر دیا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"رائٹ۔ اس نے صرف راڈار سسٹم ہی نہیں میرے دوسرے سسٹم بھی تباہ کر دیے تھے۔ کیا کہتے ہیں ان کو؟ حواس خمسہ۔" غالب نے سگریٹ باہر اُچھال کے کہا۔ "جیسے ہی میرے ہونٹوں سے اس کا نام نکلا اس کے ہونٹوں سے ایک گالی نکلی اور وہ اچھلا۔ پلک جھپکنے میں اس نے جیب سے ریوالور نکال لیا۔ 'کون ہو تم کتے کے بچے؟' وہ دانت پیس کر بولا۔ اب اگر اس وقت میں کہتا کہ چوہدری صاحب، میں باپ ہوں آپ کا تو وہ مانتا؟ سچ بولتا تو جان سے جاتا۔ وہ مجھے اپنے خلاف اتنا بھاڑ دے کر اخبار کے دفتر میں کبھی نہ جانے دیتا۔ چنانچہ میں نے کہا حضور۔ آپ کا پرانا نمک خوار ہوں، پہچانا نہیں آپ نے۔ ڈی سلوا صاحب کا اسسٹنٹ تھا بیڈن روڈ والے دفتر میں۔ اکاؤنٹ اسسٹنٹ۔ میرا مقصد تھا کہ اب کسی طرح جان چھڑاؤں اور گاڑی کی مجھاڑ میں۔ دلاور کا شک دور کر کے جلد از جلد نکل جاؤں۔ میں نے کہا بھی کہ چلیے میرے ساتھ زور لگائیے مگر وہ گھوم کر میرے قریب آ گیا۔ 'تم جھوٹ بول رہے ہو۔' اس نے میری صورت پر غور فرما کے کہا۔ 'تم کبھی اس کے اسسٹنٹ نہیں رہے لیکن تم نے اس کا نام استعمال کیا ہے اپنی جان بچانے کے لیے۔

سچ بتاؤ تم مجھے کیسے جانتے ہو؟ تم کوئی بہت چالاک اور مکار آدمی ہو مگر خیال رکھنا کہ میں بھی کم بے رحم نہیں ہوں۔ آدمی کو اتنی ہی آسانی سے گولی مار دیتا ہوں جتنی آسانی سے کارپوریشن والے کتے کو مارتے ہیں۔ تمھاری شکل مجھے دیکھی ہوئی لگتی ہے لیکن ذہن میں نہیں آ رہا ہے کہ تم دوست ہو یا دشمن۔ اس وقت تمھارا اور میرا یہاں ملنا اتفاق نہیں ہے۔' میں سوچ ہی رہا تھا کہ اب کیا کہوں۔ شاید اتنی دیر میں اسے یاد آ گیا۔ اس نے ہاتھ گھمایا اور ریوالور میرے سر پر مارا۔"

میں سوچ رہا تھا کہ ایک ریوالور تو میں نے دلاور سے خالی کرا لیا تھا۔ دوسرا سائلنسر والا خود گلوز کمپارٹمنٹ میں سے نکال لیا تھا اور اسی سے نشانہ لے کر ٹائر پھاڑا تھا۔ یہ وہی خالی ریوالور ہوگا جو میں چھوڑ آیا تھا اور دلاور نے غالب کے سر پر مارا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ غالب خاموش ہے۔ ٹیڈی بھی اب اٹھ چکا تھا اور محسن کے ساتھ کچن میں مصروف تھا۔

"پھر کیا ہوا؟" میں نے کہا۔

"مجھے کیا معلوم؟" غالب بولا۔ "خبیث نے ذرا بھی تو لحاظ نہیں کیا تھا۔ جب مجھے ہوش آیا تو وہ گاڑی سمیت غائب ہو چکا تھا۔"

میں نے بے وقوفوں کی طرح غالب کو دیکھا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"ہونے کو کیا نہیں ہو سکتا۔" غالب بولا۔ "میں بے ہوش ہو گیا تھا اور گھنٹا بھر بے ہوش پڑا رہا تھا اس لیے صرف قیاس آرائی کی بنیاد پر بتا سکتا ہوں کہ اس نے پہیہ وہیں بدلا ہوگا اور گاڑی نے سڑک کو بلاک تو رکھا ہوگا مگر اس نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ اس وقت پارکنگ کے اصولوں کا خیال رکھنا کتنی خطرناک حماقت بن گیا ہے۔ وہ جائے واردات کے بہت قریب تھا اور اس کے لیے فرار ہونے میں ہی عافیت تھی۔ وہ پکڑا جاتا تو انکار کیسے کرتا اور کیا بتاتا کہ گھر سے اتنی دور وہ کیا لینے آیا ہے۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو یا سچ۔" میں نے کہا۔ "پہلے تم نے کہا تھا کہ تم اس کے بارے میں تین کالمی سرخی اور تصویر کے ساتھ خبر دے چکے ہو۔"

"اس میں جھوٹ کیا ہے۔" وہ بولا۔ "اخبار دیکھ لینا۔ یقین آ جائے گا۔"

"لیکن تم نے یہ بھی تو کہا ہے کہ دلاور نے تمھیں ناک آؤٹ کر دیا تھا اور تم ایک گھنٹا بے ہوش پڑے رہے تھے؟"

"یہ بھی سچ ہے لیکن خبر میں اس کا تذکرہ نہیں ہے۔ ہوش

میں آتے ہی میں نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے ایڈیٹر صاحب کو فون کیا اور آخری کاپی رُکوادی۔" غالب نے کہا۔ "اخبار کمپلیٹ تو ہوا مگر......"

"مگر مرزا غالب، دلاور گرفتار تو نہیں ہوا۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"نہیں! میں نے کب کہا ہے کہ وہ گرفتار کرلیا گیا ہے؟" غالب نے سکون سے کہا۔ "خبر اتنی ہی ہے جو میں نے سنائی ہے اور اس میں گرفتاری کا کوئی ذکر نہیں۔ صرف الزام کی بات ہے جو پولیس نے عائد کیا ہے کیونکہ اس کی گاڑی جائے واردات پر ملی اور اس کے خلاف چار افراد نے ایک ہی بیان دیا ہے۔"

"لیکن یہ تو دُہرے قتل کی واردات تھی۔" میں نے کہا۔ "دلاور نے پہلے طافو کو قتل کیا۔ پھر اس معاملے کو دبانے کے لیے انسپکٹر فتح شیر کو استعمال کیا اور بالآخر اسے بھی ٹھکانے لگادیا۔"

"یہ تو وہ کہانی ہے جو مجھے محسن نے بھی سُنائی تھی۔" وہ ہنسا۔ "میاں سکندرِ اعظم! ہر سُنی سُنائی بات خبر نہیں بنتی۔ ممکن ہے تفتیش ہو تو یہ بات بھی ثابت ہو جائے لیکن ابھی کیا ثبوت ہے کہ ایسا ہی ہوا تھا؟ نہ کوئی چشم دید گواہ، نہ لاش، نہ آلۂ قتل۔ یہ لکھ دیتا خبر میں کہ میرے دوست محسن نے بتایا ہے اس لیے یہ بھی سچ ہے؟"

"ثبوت بھی مل جائیں گے اور چشم دید گواہ بھی۔" میں نے کہا۔ "بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی؟"

"ابھی تک تو بکرا خیریت سے ہے۔" غالب بولا۔ "اب مجھ سے پوچھو کہ مجھے ناک آؤٹ کرنے کے بعد فرار ہو کے بکرا کدھر گیا ہوگا۔ بکرا گیا ہوگا کسی تھانے اور وہاں اس نے تھانیدار کو رشوت دے کر ایک رپورٹ لکھوائی ہوگی کہ میری گاڑی اس علاقے سے چوری ہوگئی ہے۔ فرض کرو کسی تھانے میں آخری واردات کی رپورٹ شام چار پانچ بجے درج ہوتی ہے، وہاں اگلی رپورٹ دس پندرہ منٹ کے فرق سے درج کی جاسکتی ہے۔ کسی نہ کسی تھانے میں گنجائش نکل آتی ہے۔ گنجائش تو مال سے نکلتی ہے۔ اس نے کہا ہوگا کہ وہ کسی کام سے آیا تھا اور گاڑی کھڑی کرکے گیا تھا۔ واپس آنے پر اس نے گاڑی کو غائب پایا۔"

"لیکن اس طرح لاہور کے ہر تھانے میں جانے کے لیے وقت ہی کہاں تھا؟"

"بھولے شاہ۔ وہ اپنے کسی واقف تھانیدار کے پاس گیا ہوگا۔" غالب نے کہا۔ "اور واقفیت کو گولی مارو۔ وہ سب سے قریب یعنی دھرمپورے کے تھانے میں پہنچا۔ ہزار روپیہ رکھا ایس ایچ او کے ہاتھ پر کہ ٹیلی فون کرکے اتنا معلوم کردے کہ کس تھانے میں رپورٹ لکھوائی جاسکتی ہے۔ ایس ایچ او نے وہیں بیٹھے بیٹھے ایک تیر سے دو شکار کیے۔ ایک تو دلاور کی مدد کردی پھر دوسرے ایس ایچ او کو بتا دیا کہ ایک اسامی ارسال کردی ہے۔ فرض کرو تھانہ کرشن نگر کا ایس ایچ او کہتا ہے کہ [illegible] نے آخری ایف آئی آر پانچ بجے کاٹی تھی۔ دلاور نے آدھے گھنٹے میں کرشن نگر جاکے اپنی رپورٹ پہ سوا پانچ بجے کا وقت لکھوا دیا۔ اس کی پوزیشن محفوظ ہوگئی۔ پانچ بجے کے بعد کار کہاں گئی، کیسے گئی، یہ پولیس معلوم کرے۔ رابعہ قاری کی کوٹھی میں ملی تو رابعہ قاری جواب دے ورنہ پولیس بتائے اور پولیس یہ بتائے گی کہ گزشتہ روز سرقے کی فلاں واردات میں یہی کار استعمال ہوئی تھی۔ کون تردید کرے گا پولیس کی؟"

"زبردستی کسی کے سر منڈھ دیں گے گاڑی بھی؟"

"میں ایک واقعہ سناتا ہوں۔ اس سے عبرت پکڑ سکتے ہو تو ضرور پکڑو۔" غالب نے کہا۔ "سال بھر پہلے پولیس نے دو ڈاکو پکڑے۔ انھوں نے ایک ڈاکٹر کو ریوالور دکھا کے اس سے کار چھینی تھی جب وہ اپنی بیوی کے ساتھ کسی دوست کے گھر سے لوٹ رہا تھا۔ پھر انہوں نے ایک تاجر کے گھر میں ڈاکا ڈالا جہاں سے ان کو دو لاکھ کے زیورات ملے، نقد اور پرائز بانڈ بھی اور ڈی ایف سی کے شیئر سرٹیفکیٹ اور کالے دھن کا کوئی اندازہ نہیں۔ پولیس کی ایک گشتی پارٹی نے انھیں اس وقت گرفتار کیا جب وہ گاڑی چھوڑ کر فرار ہو رہے تھے۔ ڈاکوؤں سے تو معاملہ طے پاگیا۔ ففٹی ففٹی یا مال کے بدلے آزادی کے معاہدے پر۔ وہ گرفتار ہوتے تو کتنے کیس بنتے؟ گاڑی چھیننے کا ایک، ناجائز طور پہ ریوالور رکھنے کا دوسرا ایکس پلوسو ایکٹ کے تحت، ڈاکا ڈالنے کا تیسرا۔ وہ کم سے کم سات سال کے لیے اندر جاتے۔ پولیس نے مال تقسیم کیا اور گاڑی قبضے میں کرلی کہ فلاں جگہ کھڑی ہوئی ملی۔ ان کی تحویل میں ایک مخبر بھی تھا جو پولیس کا اپنا آدمی تھا مگر چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا تھا۔ جس گھر میں وہ چوری کرنے گیا تھا اس گھر کے لوگوں نے چور کو تھانے پہنچایا اور بہت خوش ہوئے کہ بڑا تیر مارا۔ وہ ڈیڑھ لاکھ نقد چُرا کے بھاگنے والا تھا۔ پولیس نے چور کو فوراً حوالات میں بند کردیا اور اگلے دن تفتیش شروع کی۔ پہلے تو گھر والوں سے ثبوت مانگا گیا کہ ڈیڑھ لاکھ کہاں سے آیا تھا؟ کتنے دن کی کمائی تھی؟ بینک میں کیوں جمع نہیں کرائی تھی؟ انھوں نے کہا کہ بینک عید اور اتوار کی چھٹیوں کے باعث تین دن بند رہے تھے۔ پولیس نے کہا اچھا تو یہ تین دن کی کمائی تھی۔ انکم ٹیکس کتنا دیتے ہو؟ سرٹیفکیٹ نکالو۔ انھیں ہر روز تھانے بُلا کے گھنٹوں بٹھایا جاتا تھا۔

اور وہ دیکھتے تھے کہ چور واقعی حوالات میں بند ہے مگر خود ان کی اپنی حالت اس تفتیش کے چکر میں خراب ہو گئی۔ وہ کاروباری لوگ ہر روز کس طرح تھانے جاتے اور جاتے تو کاروبار کون سنبھالتا۔ رپورٹ کر کے پھنس گئے تھے۔ پانچ ہزار دے کر انھوں نے اپنی جان چھڑائی۔ پولیس کے پاس صرف مجرم رہ گیا۔ انھوں نے اس مجرم کو دوسری جگہ استعمال کیا جب گاڑی چھین کر ڈاکا ڈالنے والے پولیس سے سودا کر کے نکل گئے تو اس مخبر نے ڈکیتی کی واردات کی ذمہ داری قبول کر لی۔ میں خود ایس ایچ او کے کمرے میں موجود تھا جب وہ میاں بیوی آئے اور ان کے سامنے "ڈاکو" پیش کیا گیا۔ میاں بیوی نے صاف انکار کر دیا کہ یہ وہ آدمی نہیں ہے۔ اب "ڈاکو" مُصر ہے کہ آپ دونوں مجھے پہچانیے، میں ہی آپ کا خادم ہوں۔ وہ پولیس کی فراہم کردہ تفصیلات بیان کر رہا ہے کہ میں نے فلاں جگہ آپ سے گاڑی چھینی تھی۔ اس رنگ اور ماڈل کی گاڑی تھی۔ اس میں یہ سامان تھا مگر میاں بیوی اَڑے ہوئے ہیں کہ یہ تو پہلوان ہے، وہ دُبلا پتلا لڑکا تھا، یہ کالا ہے وہ گورا تھا۔ پولیس بھی مُصر ہے کہ یہی وہ شخص ہے۔"

"اور وہ شخص چوری کے الزام سے بچ کر ڈکیتی کے الزام کو قبول کر رہا تھا؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

غالب ہنسا "یہی تو کمال ہے۔ اسے معلوم تھا کہ وہ محفوظ ہے۔ پولیس چالان پیش کرے گی اعترافِ جرم کے ساتھ تو عدالت میں ملزم بیان دے گا کہ اس سے زبردستی بیان حاصل کیا گیا ہے۔ پھر کار کے مالک آئیں گے ملزم کو شناخت کرنے کے لیے، شناختی پریڈ میں۔ وہ صاف کہیں گے کہ ان میں ڈاکو نہیں ہے۔ پولیس کا آدمی صاف چھوٹ جائے گا کہ پولیس نے غلط آدمی کو گرفتار کر لیا۔ اصل ڈاکو پہلے ہی نکل گئے تھے۔ اس کی جگہ لینے والا رہا ہونے کے بعد بھی پولیس کی خدمت کرتا رہے گا اور اسی طرح غلط ملزم بن کے پیش ہونے کا معاوضہ وصول کرتا رہے گا۔ تو میاں سکندرِ اعظم! کوئی چور یہ مان لے گا کہ وہ تمھاری گاڑی لے گیا تھا اور واردات کے بعد اس نے گاڑی فلاں کوٹھی میں کھڑی کر دی تھی۔ اسے نہیں معلوم کہ کوٹھی کس کی تھی۔ چوہدری دلاور بھی محفوظ اور رابعہ قاری ایڈووکیٹ بھی محفوظ۔ وہ ملزم تو پولیس کے سایۂ عاطفت میں محفوظ ہے ہی۔ اب رہ گئے وہ چار کرائے کے بدمعاش۔ وہ کچھ بھی بھونکتے رہیں۔ کرائے پر ملنے والے بدمعاش نہیں ہوتے، غنڈے بھی نہیں ہوتے، بہت گھٹیا درجے کے شہدے ہوتے ہیں۔ چوہدری صاحب کے مقابلے میں ان کی کون مانے گا۔ ٹیکسی کی چوری کا اعتراف ملاکر ہی چکے ہیں۔ اب ایک آدھ واردات کا اعتراف پولیس کرا لے گی اور جب چالان پیش کرے گی تو چوہدری صاحب کا نام کہیں نہیں آئے گا۔ نہ وہ عدالت کے روبرو ایسی کوئی بات کہیں گے کہ انھیں چوہدری صاحب نے کس لیے بھیجا تھا۔ انھیں پولیس کی طرف سے رعایت ملے گی اور چوہدری صاحب کی طرف سے انعام ملے گا۔ اب بولو تم چوہدری صاحب کے خلاف کون سے چشم دید گواہ لاؤ گے اور کیا ثبوت پیش کرو گے؟"

مجھے سخت مایوسی ہوئی تھی۔ دلاور کے نکل جانے سے بنا بنایا کھیل بگڑ گیا تھا اور مجھے غالب کے بیان پر ذرا بھی شک نہیں تھا۔ چوہدری دلاور کا پیسہ اور اثر و رسوخ بہت بڑی طاقت رکھتا تھا جس کے مقابل پولیس بھی بے بس تھی لیکن میں جانتا تھا کہ ابھی بازی مات نہیں ہوئی۔ میری تحویل میں ایک کیسٹ تھا اور فتح شیر کے مارے جانے کے بعد بھی چار افراد موجود تھے جو فتح شیر کے ماتحت تھے، جتھے دار تھے اور جرم میں شریک تھے۔ انھوں نے پچاس پچاس ہزار وصول کیے تھے اور طافو کی لاش کو ٹھکانے لگایا تھا۔ راول ڈیم والی بات غلط تھی۔ طافو کو کہیں قریب ہی دریا کے سپرد کیا گیا تھا یا زمین میں گاڑ دیا گیا تھا۔ زمین میں دفن کرنا زیادہ قرینِ قیاس تھا کیونکہ دریا میں پھینکی جانے والی لاش بہتی ہوئی کہیں بھی برآمد ہو سکتی تھی اور وہ چاروں کرائے کے جنازہ بردار بتا سکتے تھے کہ انھوں نے طافو کو کہاں گاڑا تھا۔

"تمھاری خاموشی تمھاری بے بسی کی ترجمان بن گئی ہے" غالب نے کہا۔

"ایسی کی تیسی خود کو بے بس سمجھنے والی کی" میں نے کہا۔ "ابھی میں نے سارے پتے نہیں پھینکے ہیں۔ وقت آنے دو، میں ثبوت بھی فراہم کر دوں گا اور شہادت بھی لے آؤں گا۔"

"اور خود عدالت میں حاضر ہو کے پیش کر دوں گا" غالب نے میرا مسخر اڑانے کے انداز میں کہا۔

"میں نہ سہی، میرا کوئی وکیل تو یہ کام کر سکتا ہے" میں نے مشتعل ہوئے بغیر کہا اور ٹیڈی کو آواز دی۔

"کیا بات ہے سکندر بادشاہ؟" اس نے سامنے آ کے کہا۔

"ٹیڈی آج کے اخبار لاؤ دوست، جتنے اخبار نکلتے ہیں" میں نے کہا۔

"قسم مولا علی کی! پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں اور کم بخت چوہے بھی اتنے بھوکے ہیں کہ اندر دل جگر گُردے اور آنتیں سب کھا گئے ہیں۔ خبروں سے پیٹ نہیں بھرے گا" ٹیڈی نے پیٹ پہ ہاتھ مارا "دیکھو کیسی ٹن ٹن کی آواز آ رہی ہے۔ بالکل خالی گھڑے جیسی۔ ذرا سا راشن ڈال لوں اس میں پھر لاتا ہوں اخبار۔ یہ نہ ہو بھوکا جاؤں اور کل خود خبر بن جاؤں۔"

محسن اسی وقت باقاعدہ ناشتا لیے نمودار ہوا۔ "یہ خود تو صبح ہی پیٹ کا دوزخ بھر چکا ہے۔ اسے کیا معلوم ہم بھوکے فاقہ کش حقیر فقیر بندوں پر کیا بیت رہی ہے۔" اس نے درمیان میں اُبلتی ہوئی چائے کی کیتلی رکھی اور اطمینان سے آلتی پالتی مار کے بیٹھ گیا۔

"محسن بھائی دری تو بچھانے دو۔" ٹیڈی نے کہا۔

"دری اس زمین سے بڑھ کر نہیں ہے۔ ہندو اس دھرتی کو ماتا کہتے ہیں۔" محسن نے توس پر مکھن پھیلاتے ہوئے کہا۔ "ہم بالآخر اسی زمین کا حصہ بنتے ہیں۔ دری اور بارہ دری سب دھری رہ جاتی ہیں۔ اسی لیے ہم خاک نشینوں کی ٹھوکر میں زمانہ ہے۔ تم بھی بیٹھو یہاں اور زمین کی عطا کردہ نعمتوں کو کھاؤ۔"

"ایک سانس میں اتنی عقلمندی کی باتیں! تیرے دماغ پہ بھوک کا اثر ہے۔" میں نے کہا۔

"آپ سب کو اس کوٹھری میں دیکھ کر مجھے یقین نہیں آتا۔" ٹیڈی جذباتی ہونے لگا۔ "آپ سب اتنے معزز لوگ ہیں، اونچے گھروں کے پڑھے لکھے اور عیش و آرام میں پلنے والے۔ میں ایک بدنام اور لاوارث شخص۔ جس کے پاس کچھ نہیں۔"

"تمھارا سب سے بڑا اثاثہ یہ زمین ہے۔" محسن نے اپنا فلسفہ جاری رکھا۔ "جس میں تمھارے خلوص کی خوشبو ہے استاد ٹیڈی۔ یہ خوشبو تو شرفا کی محفلوں میں بھی نہیں ملتی۔ اسی دوستی کی خوشبو نے ہم کو یہاں پہنچا دیا ہے اور ہمارے لیے تمھارا یہ گھر ماں کی گود سے زیادہ محفوظ اور پُرسکون جگہ بن گیا ہے۔"

"جب ایک بار تم کو دوست کہہ دیا تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ تم بادشاہ ہو یا فقیر۔" میں نے کہا "اور تم نے بھی تو دوستی کا حق ادا کر کے ہمیں جیت لیا ہے ٹیڈی۔ چوہدری دلاور ہمیں پچاس لاکھ دے کر بھی نہیں خرید سکا تھا مگر تم نے محبت سے ہمیں بے دام خرید لیا ہے۔ اب ہم ایک ہیں۔ ہم ایک ہی خاندان ہیں۔"

"میری زندگی بھی کتنی بدل گئی ہے اس خاندان میں شامل ہونے کے بعد۔" ٹیڈی بولا۔ "میں نے بہت کچھ چھوڑ دیا ہے جو میں پہلے کرتا تھا۔ وہ دوست اور قسم کے تھے اور دوست کہاں وہ تو دشمن تھے۔ اب تم جیسے دوستوں کے ساتھ میں خود کو بہت بڑا اور عزت والا محسوس کرتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کوئی مجھے بدمعاش کے یا سمجھے۔ شہلا میری بہن ہو گئی ہے تو مجھے ایسا کوئی کام نہیں کرنا چاہیے جس پر کل اسے شرمندہ ہونا پڑے۔ کوئی اسے میرے نام کا طعنہ دے۔"

"ہونے والے سالے جی! ایسی باتیں مت کرو۔" محسن نے رقت طاری کر کے کہا۔ "یہ کس کا نام لے لیا کہ نوالہ حلق میں اٹک گیا ہے۔"

"نوالہ؟ میں تو سمجھا تھا جان حلق میں اٹک گئی ہے۔" میں نے افسوس سے سر ہلایا۔

ناشتے کے بعد ٹیڈی اخبارات جمع کرنے نکل گیا تو میں، محسن اور غالب سگریٹیں جلا کے فرش پر نیم دراز ہو گئے۔ ہمارے کپڑے گرد و غبار سے خراب ہو گئے تھے اور ہم نے دو دن سے نہ شیو بنائی تھی اور نہ منہ ہاتھ دھویا تھا۔

"تم بہت عجیب لوگ ہو۔" غالب نے کہا "کہاں کی اینٹ کہاں کا روڑا، بھان متی نے کنبہ جوڑا۔"

"اس کنبے کا نام ہے آر ایم ایس۔" محسن نے کہا۔ "تم کو اس کا رکن بنایا جا سکتا ہے۔ میری سفارش پر۔"

"آر ایم ایس؟ یہ کیا بلا ہے؟" غالب نے حیرانی سے کہا۔

"مائٹ از رائٹ سوسائٹی۔" میں نے کہا "افسوس کہ تم دنیا کی سب سے بڑی، فعال اور حقیقی طاقت رکھنے والی تنظیم کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے۔ اس میں دنیا کی سپر پاورز، ہر دہشت پسند تنظیم، دنیا بھر کے سرمایہ دار اور وڈیرے،

قانون کے نام پر لاقانونیت مسلط کرنے والے، استحصال پسند ظالم حکمراں اور وہ سب شامل ہیں جن کا بول بالا ہے۔ یہ آج کے انسانوں کی تنظیم ہے جن کے ہاتھ میں لاٹھی ہے اور جو باقی دنیا کو بھینس کی طرح ہانک رہے ہیں۔ نظامِ انصاف انہی کا ہے۔ سچ وہی ہے جو لاٹھی والے کہتے ہیں۔ حق انہی کی عطا کردہ خیرات کا نام ہے خواہ وہ جینے کا حق ہو یا مرنے کا۔"

"تم اتنا سچ بولتے ہوئے ڈرتے نہیں؟" غالب نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہا۔

"پہلے ڈرتا تھا لیکن اب تو میں نے بھی لاٹھی اٹھالی ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "میں نے کتابوں میں لکھی ہوئی خوبصورت مگر کوئی حقیقت نہ رکھنے والی باتوں کو فراموش کر دیا ہے۔ ویسے بھی جنگ میں لاٹھی کام آتی ہے، کتابی نظریات کا اخلاقی فلسفہ نہیں چلتا۔"

"اگر سب لوگ تمہاری طرح ہو جائیں تو دنیا کا کیا ہوگا؟" غالب نے کہا۔

"دنیا! کون سی دنیا؟" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "ایک تو وہ دنیا ہے جسے یوٹوپیا کہتے ہیں۔ انسان کی مثالی جنت کے خواب کی تعبیر۔ اس کا وجود کہاں ہے؟ دوسری یہ عملی دنیا ہے جس میں ہم اور تم زندہ ہیں۔ یہ دنیا ہی ایم آر ایس ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو آج کوئی سقراط نہ ہوتا؟ کوئی منصور نہ ملتا؟ کوئی مسیحا نہ اٹھتا؟ سچ کون بول رہا ہے۔ یہ اخبارات؟ یہ سیاستدان؟ یہ شیخ و برہمن؟"

ٹیڈی اخبارات کا ایک بنڈل لیے نمودار ہوا۔ غالب نے فوراً اپنا اخبار الگ کر لیا اور جلدی سے اندر کا صفحہ کھول لیا۔ اس کی نگاہ نے اوپر سے نیچے تک دلاور کا چہرہ تلاش کیا۔ رحمت کباڑی کی تصویر کو دیکھا اور میں نے غالب کی صورت پر مایوسی کے آثار نمودار ہوتے دیکھے۔ محسن نے اور ٹیڈی نے دوسرے اخبارات پر نظر ڈالی لیکن میں غالب کے تاثرات کا مشاہدہ کرتا رہا۔ اس نے ہر کالم میں اوپر سے نیچے تک چھوٹی بڑی ہر سرخی کو پڑھا اور آہستہ آہستہ اس کی مایوسی پہلے جھنجلاہٹ اور پھر برہمی میں بدلنے لگی۔ اچانک اس نے اخبار زمین پر پٹخ دیا اور اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس کا چہرہ اشتعال سے سرخ ہو رہا تھا۔

"بزدل، بے ضمیر، گھٹیا اور دو ٹکے پر بکنے والے سالے لوگ۔" اس نے مٹھیاں بھینچ کر چلاتے ہوئے کہا۔ "یہ سالے غلام ولد غلام ولد غلام۔ یہ اخبارات کے مالک بن گئے ہیں۔ ایڈیٹر اور صحافی کہلاتے ہیں۔ صحافت ان کے لیے دکان ہے جہاں یہ اپنا اخبار بیچتے ہیں۔ ڈرتے ہیں کہ کمراں کی دکان بند نہ کرا دے۔"

"ہاں۔ لاٹھی والے ہر دکان بند کرا سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "سچ کی دکان، ضمیر کی دکان اور حق کی دکان۔"

"بکواس بند کرو۔ لاٹھی میرے ہاتھ میں ہے۔" غالب نے دہاڑ کر کہا۔

"تمہارے ہاتھ میں قلم ہے۔" میں نے نرمی سے جواب دیا۔ "جو لاٹھی سے بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ جب تم تقریریں کرتے تھے کہ قلم تلوار سے زیادہ طاقتور ہے تو تم بچے تھے۔ کالج یا اسکول میں پڑھتے تھے اس لیے ناتجربہ کاری کی باتیں کرتے تھے۔ تمہارا نیوز فیچر شائع نہیں ہوا تو تم کو جرنلزم کے سبق یاد آرہے ہیں۔"

"نیوز فیچر کیا، چند سطروں کی خبر تک نہیں ہے۔ میں سمجھ لوں گا اس.... ایڈیٹر سے۔"

"تم لاٹھی اٹھانے پر کمربستہ نظر آتے ہو۔" میں نے کہا۔ "خبر دینا یا نہ دینا ایڈیٹر کا حق ہے۔"

"اس نے اپنا حق استعمال نہیں کیا بلکہ میرا حق چھینا ہے، حق کو بیچا ہے۔" غالب کسی زخم خوردہ درندے کی طرح ٹہلتا رہا۔

"خبر چھپ گئی ہے۔" محسن نے اچانک کہا اور قہقہہ لگایا۔ "لیکن یہ دوسرا اخبار ہے۔ ایک سرکاری اخبار۔"

غالب نے اس سے اخبار جھپٹ لیا اور خبر کو پڑھ کر میری طرف پھینک دیا، اپنے مالک اور مدیر کی شان میں بھاری بھرکم گالیاں لڑھکاتے ہوئے۔ میں نے اخبار دیکھا۔ اس میں لکھا تھا کہ پُراسرار طور پر غائب ہو جانے والے انسپکٹر فتح شیر کی لاش ایک غیر آباد کوٹھی سے دستیاب ہوئی ہے۔ ان کو کسی نے انتہائی بے دردی سے گلا کاٹ کر ہلاک کر دیا تھا اور پولیس کا خیال ہے کہ یہ واردات کم سے کم چوبیس گھنٹے قبل ہوئی تھی۔ ابتدائی تفتیش سے سامنے آنے والے نتائج کے مطابق قتل کسی پرانی دشمنی کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ مرحوم کی بیوہ نے ہمارے نمائندے کو بتایا کہ انسپکٹر فتح شیر انتہائی ایماندار، اصول پرست اور فرض شناس افسر تھے۔ انصاف اور قانون کے معاملے میں وہ کسی سے رعایت نہیں کرتے تھے۔ تاہم وہ ایک فرض شناس شوہر، شفیق باپ اور نیک انسان تھے اور ان کی کسی سے دشمنی نہیں تھی لیکن خاندانی زمین کے مسئلے پر ان کا ایک پرانا تنازع چل رہا تھا۔ مرحوم کی میت کل ان کے آبائی گاؤں کھوڑ نزد راولپنڈی روانہ کر دی جائے گی۔ پولیس کے اعلیٰ حکام نے ان کی ناگہانی موت کو ناقابلِ تلافی نقصان قرار دیتے ہوئے پسماندگان سے دلی رنج و غم کا اظہار کیا ہے اور کہا ہے کہ قاتلوں کو بہت جلد کیفرِ کردار تک پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی جائے گی۔ ضروری ہوا تو خاندانی تنازع کے اسباب کی تفتیش کے لیے ایک خصوصی ٹیم راولپنڈی روانہ کی جائے گی۔ مزید تفصیلات کا انتظار ہے۔

"گڈ۔ ویری گڈ۔" میں نے اخبار رکھ کے کہا۔ "مائٹ از رائٹ۔ خبر اسی طرح آئی جیسے چوہدری دلاور نے چاہا۔ ایسے نہیں جیسے تم نے چاہا تھا مائی ڈیر رپورٹر۔ تمہاری صحافت کے زریں اصولوں کی ایسی کی تیسی۔"

"میں استعفا اس کے منہ پر ماروں گا۔ دوسرے اخبار میں چلا جاؤں گا۔" غالب نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ "اس خبر کو بیچا گیا ہے۔ اس کا مالک اپنا مفاد دیکھنے والا خود غرض اور بزدل سرمایہ دار ہے۔ اس نے دوسرے سے کہا کہ یہ خبر ہے، بولو، چھاپو گے؟ دوسرے نے شاید تیسرے سے سودا کیا ہو اور تیسرے نے دلاور سے رابطہ قائم کر کے پوچھا ہوگا کہ حضورِ والا! آپ کی شان میں ایک معمولی رپورٹر نے گستاخانہ خبر ارسال کی ہے، اسے کیسے لگایا جائے؟"

"چنانچہ خبر میں سے سب کچھ گول۔ رابعہ قاری کا نام، چوہدری دلاور کا نام، گواہوں کے نام، ٹیکسی چوروں کے نام۔ کل مزید تفصیلات کون دے گا؟ کل دوسرا دن ہوگا اور دوسرے دن کی خبریں بھی۔" میں نے کہا۔ "کتنی مکمل خبر ہے کہ ایک غیر آباد کوٹھی، ایک پرانا تنازع۔ اگر ضروری ہوا، مائی فٹ۔ وہ ایماندار تھا۔ فرض شناس تھا اور نیک آدمی تھا۔ جھوٹے تم ہو صحافی کی دُم۔ استعفا منہ پر مارو گے تو کون سا تیر مارو گے۔ ہر اخبار صرف اخبار ہوتا ہے اور اس کا مالک کوئی مردِ مجاہد نہیں ہوتا جو نیکی بدی کی جنگ میں ملوث ہو۔ وہ صرف اخبار فروش ہوتا ہے۔ تم خود بھی اخبار نکالو گے تو یہی کرو گے مرزا غالب!"

"شٹ اپ۔ تم زیادتی کر رہے ہو۔" غالب نے چلا کے کہا۔ "پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہیں۔ سب کو بُرا مت کہو۔ ان میں سچے اور کھرے صحافی بھی ہیں۔"

"وہ گھاس کھود رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ مولانا ظفر علی خان مرحوم کے 'زمیندار' اخبار کا یا مولانا محمد علی جوہر کے 'ہمدرد' اور 'کامریڈ' کا زمانہ نہیں ہے۔ یہ مائٹ از رائٹ کا زمانہ ہے۔"

"ایک اخبار ہے صدائے وقت۔" غالب نے محض میری دلیل کو رد کرنے کے لیے کہا۔ "دوسرا ہے روزنامہ حقیقت۔"

"پہلے اخبار کا ایڈیٹر جان بچا کے بھاگ گیا ہے۔" میں نے طنز سے کہا۔ "اس کا مالک بس میں دفتر آتا جاتا ہے اور عملے سے ہر ماہ پوری تنخواہ نہ دینے کی معافی مانگتا ہے اور عملہ اسے معاف کر دیتا ہے کیونکہ وہاں تم جیسے سر پھرے لوگ ہیں جو دال روٹی کھا کے سچ بولنے کے عہد پر کاربند ہیں۔ روزنامہ 'حقیقت' کا حال اس سے بھی ابتر ہے... کسی دن کوئی چوہدری دلاور اسے خرید لے گا۔"

"ایم آر ایس کا منشور کیا ہے؟" غالب نے دھم سے زمین پر بیٹھ کے کہا۔

"حق و صداقت کی خاطر جان کی بازی لگا دینا۔ ہر جھوٹے اور ظالم فرعون کے خلاف آواز اٹھانا۔ جہاں ضمیر کی گواہی سچی ہو وہاں کسی کی گواہی تسلیم نہ کرنا۔ اثر رسوخ اور دولت کی طاقت کے بل پر انصاف کو گمراہ کرنے اور سزا سے بچ جانے والوں کو اپنی عدالتِ انصاف سے قانون کے مطابق سزا دینا اور اس پر عملدر آمد کرنا۔ ایک بے کردار معاشرے کی بدنام پولیس اور کمزور نظامِ عدل کے بجائے اپنے وسائل، اپنی قوتِ بازو اور اپنے خدا کی تائید پر بھروسہ کرنا۔" میں نے کہا۔

"میں اس منشور کے مطابق ایم آر ایس سے وفاداری کا حلف اٹھاتا ہوں۔" غالب نے ہاتھ اٹھا کے کہا۔

"قسم مولا علی کی! ہم تو پہلے ہی ساتھ تھے۔" ٹیڈی نے کہا۔ "لیکن ہم بھی آج حلف اٹھاتے ہیں۔" پھر اس نے ہاتھ اٹھا دیا۔

"ایم آر ایس کے چیئرمین تم کو مصافحے کا شرف بخشتے ہیں۔" میں نے غالب سے ہاتھ ملا کے کہا۔ "وقت آنے پر تم کو دوسرے معزز ارکان سے ملوایا جائے گا۔ مسماۃ رابعہ قاری، شہلا خانم اور ایک غیر سرکاری رکن، مس نازلی۔"

"ایم آر ایس کے سات ارکان کی طرف سے میں خود کو چیئرمین نامزد کرتا ہوں اور تمہارا تختہ الٹتا ہوں۔" محسن نے کہا۔

"کورم پورا نہیں ہے، اس لیے میں آپ کو الٹتا ہوں۔" میں نے محسن کو بڑی پھرتی سے اٹھایا اور سر کے اوپر سے پلنگ پر پھینک دیا۔ غالب دم بخود بیٹھا رہا۔ اس کی نظریں مجھے حیرت سے بھی دیکھ رہی تھیں اور ستائش کے جذبات کے ساتھ بھی۔ ٹیڈی ہنس رہا تھا کیونکہ محسن ایک ہچکی لے کر یوں ساکت ہو گیا جیسے چیئرمین بننے کی حسرت دل میں لیے دنیا سے گیا۔

"ابھی تو میں اپنے ایڈیٹر سے نمٹنے جا رہا ہوں۔" غالب نے کہا۔ "شام کو کہاں ملو گے؟"

"اسی جگہ۔" میں نے کہا۔ "لیکن خیال رکھنا، رازداری اب تمہارے لیے شرطِ اوّل ہے۔"

"پہلے مجھے ہر راز معلوم ہونا چاہیے۔" غالب نے کہا۔ "پھر اوّل و آخر کرنا۔"

"شام کو ہم سب بتا دیں گے۔ اگر ہم نہ ملیں تو تشویش میں مبتلا نہ ہونا، انتظار کرنا۔" میں نے کہا۔

غالب کے جانے کے بعد میں نے محسن کو منظر سے ہونے والی گفتگو سنائی۔ محسن نے اتفاق کیا کہ فی الحال رابعہ کا ساتھ نہ ہونا

سب کے مفاد میں ہے لیکن یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ شاید رابعہ نہ مانے۔

"دلاور اپنی کامیابی پر بہت مسرور ہوگا۔" محسن نے کہا۔ "خوشی سے بغلیں بجا رہا ہوگا۔"

"بجانے دے۔ وقت آئے گا تو دیکھنا ہم کیا بجاتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اس عارضی فتح نے دلاور کو پھر اپنی طاقت کے غرور میں مبتلا کر دیا ہوگا۔ وہ خود کو ہم سے زیادہ چالاک اور اپنے اثر و رسوخ کو ہم پر حاوی سمجھتا رہے تو زیادہ اچھا ہے۔ ہم کو اب اپنی حکمت عملی یعنی اسٹریٹیجی بدلنی ہے۔ ہم اب کھلی جنگ نہیں لڑ رہے ہیں۔ اسے دھوکا دو کہ ہم پسپا ہوگئے اور ہم نے خود کو کمزور مان لیا۔ خود کو کیموفلاج کیے بغیر ہم کوئی کارروائی نہیں کر سکتے۔ کھل کر کارروائی کرنے سے کھیل بگڑ جائے گا۔ یہ اب میری اور دلاور کی جنگ نہیں ہے، یہ ملک کی بقا کے لیے دشمنوں کی اور محب وطن طاقتوں کی جنگ ہے۔ ہم نے ایک جگہ سامنے آ کے ایک محاذ پر فتح حاصل کر لی تو وہ سب دشمن زیر زمین چلے جائیں گے جو اس وقت اطمینان سے وطن دشمن سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ یہ تو ثابت ہوگیا ہے کہ دلاور منشیات کا نہیں ناجائز اسلحے کا کاروبار کرتا ہے۔ وہ ناجائز اسلحہ کسے فراہم کرتا ہے؟"

"چوروں اور ڈاکوؤں کو، سماج دشمن عناصر کو۔" محسن بولا۔

"یہ بھی ملک دشمن ہی کی صف میں آتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن میرا خیال ہے یہ کاروبار وسیع پیمانے پر نہیں ہو سکتا۔"

"تیرا مطلب ہے وہ ناجائز اسلحے کی درآمد برآمد کرتا ہے؟"

"بہت سے امکانات ہیں۔" میں نے کہا۔ "ایک تو یہ کہ وہ اسلحہ کسی بیرونی دشمنوں کو فراہم کرتا ہے لیکن دوسرا زیادہ سنگین مسئلہ اندرونی دشمنوں کا ہے۔ اس وقت کے سیاسی حالات پر غور کر۔ خصوصاً مشرقی پاکستان کے حالات پر جہاں کچھ شرپسند عناصر اور علیحدگی پسند عناصر کی تخریبی سرگرمیاں بڑھتی جا رہی ہیں۔ ان کی مدد کون کر رہا ہے؟ ایک تو ہمارا ہمسایہ اور پرانا دشمن ملک ہے جو یقیناً ہمارے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے میں دلچسپی رکھتا ہے۔"

"یہ اندیشے تو اب کھل کر سامنے آ گئے ہیں کہ وہاں بیرونی مداخلت جاری ہے۔" محسن نے کہا۔

"دشمن تو دشمن ہوتا ہے۔ وہ کچھ بھی کرے، ہم اس کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور اس کے لیے تیار بھی ہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن بات اندر کے دشمنوں کی ہے۔ مشرقی پاکستان میں ہندوؤں کی آبادی کا تناسب کتنا ہے؟ کیا ان سب نے پاکستان کے وجود

اور دو قومی نظریے کو صدق دل سے قبول کر لیا؟ ہندوؤں کا سرمایہ ہی علیحدگی پسندوں کی پشت پناہی کر رہا اور انہیں اپنے مذموم مقاصد کی خاطر استعمال کر رہا ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ دلاور بھی وہاں اسلحہ بھیجتا ہے۔"

"یہ ایک امکان ہے جسے مسترد نہیں کیا جا سکتا۔" کہا "کیا یہاں غدار نہیں ہیں؟ بیس سال کی تاریخ کا سبق... اور دلاور کا کردار ایک ضمیر فروش کا ہی نہیں، وطن فروش کا بھی ہو سکتا ہے۔"

"یہ تو بہت خطرناک چکر ہے۔" محسن نے کہا۔ "دلاور کے علاوہ نہ جانے ہمارے کتنے دشمن ہوں گے۔"

"ہاں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ دلاور کے مددگار دشمن کے ایجنٹ ہوں۔" میں نے کہا۔ "دلاور ان سے منہ مانگی قیمت وصول کرتا ہو اور پھر دشمن ملک کے راستے یہ اسلحہ پاکستان پہنچتا ہو اور تخریب کاروں میں تقسیم کر دیا جاتا۔"

"اور دلاور کو یہ اسلحہ کون فراہم کرتا ہوگا؟ کیا دلاور ایجنٹ ہے؟" محسن بولا۔ "اسلحے کی تقسیم و ترسیل کے لئے ایک ذریعہ ہے؟"

"میں دوسرے امکان پر غور کرتا ہوں تو حالات سلجھتی نظر آتی ہیں۔" میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ یہ اسلحہ بن رہا ہے، دلاور کی فیکٹری میں۔ ایم ڈبلیو ڈی کیمیکل اسلحہ ساز ادارہ ہے۔"

محسن ہونقوں کی طرح منہ کھولے بیٹھا تھا۔ میری صورت کو دیکھتا تھا کبھی محسن کی۔ ہم فارسی نہیں بول رہے تھے لیکن یہ باتیں اس کی عقل و فہم سے بالاتر تھیں۔

"میں سخت شرمسار ہوں کہ یہ موٹی بات میری عقل میں نہیں آئی۔ حالانکہ میں کافی باریک بین ہوں۔ یہ تو کوئی مشکل نہیں یہاں جن مشینوں پر زرعی مشینری کے پرزے بنتے ہیں وہاں ریوالور بھی بن سکتے ہیں۔ ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کوئی معمولی فاؤنڈری نہیں ہے اور وہاں صرف عام مشینیں نہیں ہیں۔ اس میں بالکل جدید قسم کی خودکار مشینیں ہیں جس سے ہر پیچیدہ پرزہ تیار ہو جاتا ہے۔ پھر پستول کیا چیز ہے۔ اس میں اعلیٰ فولاد سے ڈھلی نال کے علاوہ چند گنی چنی چرخیاں اور گراریاں ہی تو ہوتی ہیں۔ پرزے معمولی اور ساخت کے اعتبار سے سادہ۔ سارا کام بس مہارت اور معیار کا ہے۔ تو وہاں جو مشینیں ہیں وہ سوئی کے ہزارویں حصے کا فرق بھی نکال دیتی ہیں۔

...ٹھیک لگتا ہے۔ وہاں زرعی آلات کے بجائے یہ ...سامان تیار ہو رہا ہے۔ بھوکے انسانوں کا پیٹ بھرنے ...مشینری کے پرزے نہیں بن رہے ہیں بلکہ اس کی آڑ میں بھوکے انسانوں کے پیٹ میں... سیاں اتارنے کا سامان بن رہا ہے۔"

"لیکن سکندر، اس کی تصدیق کیسے ہوگی؟"

"ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ میں نے کہا نا کہ کیموفلاج بہت ضروری ہے۔ دلاور کو یہی تاثر دینا ہے کہ ہمیں کچھ معلوم نہیں اور یہ دشمنی ذاتی ہے۔ اس نے میرے باپ کو مارا، اس کا سب کچھ چھین لیا اور اسے بلیک میل کر کے خاموش رہنے پر مجبور کیا۔"

"وہ اتنا بے وقوف نہیں ہے۔" محسن بولا۔ "وہ جانتا ہے ہمیں اس کے کاروبار کی نوعیت پر بھی شک ہے۔"

"ہاں شک ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن ہمیں شک ہے کہ وہ منشیات کے کاروبار میں ملوث ہے۔ ہمیں شور یہی مچانا ہے کہ ہمیں سب معلوم ہے۔ ہر جگہ یہی کہنا ہے اور دلاور کو بھی بتانا ہے کہ ہم منشیات کا یہ دھندا نہیں چلنے دیں گے۔ باقی میرے ذاتی انتقام کا جھگڑا ہوگا۔ دلاور مطمئن رہے گا کہ ہم غلط راستے پر بھٹک رہے ہیں چنانچہ اس کے لیے خطرے کی کوئی بات نہیں اور اس کے ایجنٹ بھی محفوظ ہیں۔ درپردہ ہم کو یہی کھوج لگانا ہے کہ اسلحہ کہاں بنتا ہے، کتنا بنتا ہے۔ کس طرح کون کون اسے آگے پہنچاتا ہے، اس کا راستہ کیا ہے اور اس راستے پر منزل سے پہلے کتنے اسٹیشن ہیں؟ منزل پر پہنچنے کے بعد یہ اسلحہ کس کس کے ہاتھ سے تقسیم ہوتا ہے۔ یہ ایک زنجیر ہے اور ہمیں ایک کڑی سے دوسری کڑی کو پکڑنا ہے۔ اگر ہمارا راز فاش ہوگیا تو نہ صرف ...ہم ...تعداد نامعلوم دشمنوں کا نشانہ بن جائیں گے بلکہ ایک ناکامی سے سب کچھ بدل جائے گا۔ لوگ چہرے بدل لیں گے۔ نام بدل ...گے اور راستے بدل لیں گے۔ اگر یہ اسلحہ واقعی مشرقی پاکستان ...جاتا ہے تو اس کے دو تین راستے ہوں گے۔ ایک راستہ ...سے بحری جہاز کے ذریعے چٹاگانگ تک ہے جو سب سے محفوظ اور آسان راستہ ہے۔ اس سے زیادہ مال کم خرچ پر بھیجا جا سکتا ہے ۔۔۔ بڑے بڑے کریٹ، کارٹن اور کنٹینر ہوں ...تو چھپانا بھی مشکل نہیں ہوتا۔ دوسرا متبادل راستہ خشکی کا ہے ...ہمارا راستہ بند ہونے کی صورت میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ...اور راجستھان کے بعد بھارت کے اسمگلر یہ مال آگے ...جا سکتے ہیں لیکن ہمیں گلگت اور کشمیر کی طرف سے لداخ اور ...کا دشوار گزار راستہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے مگر یہ ...ہیں۔ پہلے یہاں تصدیق کرنی ہے مکمل رازداری کے ساتھ۔"

"میرے خیال میں تو اب تصدیق غیر ضروری ہے۔ یہ بات دو اور دو چار کی طرح سمجھ میں آتی ہے۔"

"یقین تو مجھے بھی ہے کہ میرے والد وزیر خان نے بھی اس کاروبار کی بو پالی تھی۔" میں نے کہا۔ "چنانچہ ان کا داخلہ فیکٹری میں بند کر دیا گیا اور جب انھوں نے شک کا اظہار کیا یا کوئی دھمکی دی تو ان پر واضح کر دیا گیا کہ یہاں ان کی اور ولایت میں ان کے بیٹے کی زندگی ختم کر دی جائے گی۔ ممکن ہے اس کا فیصلہ بھی کر لیا گیا ہو لیکن میرے والد نے میری خاطر ان سے رحم کی بھیک مانگی ہوگی۔ انھیں اپنی زندگی عزیز نہیں تھی صرف میرا خیال تھا۔ میری خاطر انھوں نے دلاور کی ہر بات مان لی۔ جیسا اس نے کہا ویسا ہی کیا اور لب نہیں کھولے۔ اس نے جہاں کہا وہاں دستخط کر دیے اور جیسی زندگی گزارنے پر مجبور کیا ویسی زندگی گزار لی۔ اس کے باوجود بھی دلاور اینڈ کمپنی مطمئن نہیں تھی۔ انھیں اندیشہ لاحق ہوگا کہ وزیر خان چپکے سے بیٹے کو چٹھی نہ لکھ مارے چنانچہ وہاں میرے کمرے کی تلاشی لی گئی اور میرے سارے خطوط دیکھے گئے۔ میری مصیبتوں کا آغاز بھی اس لڑکی نے کیا تھا جو میرے کمرے میں میری میز کی درازوں سے کچھ نکالنا چاہتی تھی۔ وہ اس لیے قتل ہوئی کہ پکڑی گئی۔ اس کی نگرانی کرنے والے شخص کتنے باخبر اور کتنے طاقتور تھے۔ پھر مجھے انگلستان سے یہاں بلوایا گیا تھا تو اس کا مقصد بھی یہ معلوم کرنا تھا کہ میں حقائق سے کس حد تک باخبر ہوں۔ ظاہر ہے مجھے کچھ معلوم نہیں تھا چنانچہ میں زندہ ہوں۔ دلاور سے ذاتی دشمنی کوئی مسئلہ نہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ اس کاروبار کو صرف دلاور کی ملکیت کیسے بنایا جائے۔ اب تو میں نے ایسا انتظام کر لیا ہے کہ میرے مرنے سے بھی مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ تیری جگہ رابعہ، رابعہ کے بعد شہلا۔ یہ انتظام ہڈی بن کے اٹک گیا ہے ان کے گلے میں اور وہ کوشش کر رہے ہیں کہ اب اس کھیل کو یونہی چلنے دیں تاکہ اصل کاروبار پہ نقاب پڑی رہے۔ ہم بھی یہی کریں گے کہ انجان بنے دشمنی نباہتے رہیں گے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونی چاہیے کہ اصل راز کو ہم پا چکے ہیں۔"

"ہم تین جو اس وقت یہاں موجود ہیں۔" محسن نے کہا۔ "ان کے علاوہ یہ بات اور کسے معلوم ہوگی؟"

"غالب کے بارے میں تیری کیا رائے ہے؟" میں نے کہا۔

"وہی جو تیرے اور ٹیڈی کے بارے میں ہے۔" محسن نے کہا۔

"پھر اسے بتایا جا سکتا ہے۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "اگر اس آئی شیخ واقعی مستعفی ہو چکا ہے تو اسے ہمارے ساتھ ہونا چاہیے۔"

"شیخ کو... وہ تیرا دشمن ہے۔ تو نے اس کا کیریئر، ذہنی سکون

اور ان کے گھر کی خوشی سب کو تباہ کر دیا؟"

"تو شیخ کو نہیں جانتا۔ وہ میری ذات کا دشمن ہو سکتا ہے لیکن میرا مشن وطن دشمنوں سے جہاد ہو تو وہ ذاتی دشمنی کے جذبات کو فراموش کر سکتا ہے۔ میری حفاظت کے لیے اپنی جان دے سکتا ہے۔ اس کے لیے سب کچھ اس کے اصول ہیں۔ وہ ادائے فرض کے معاملے میں انتہا پسند ہے۔ وہ ایک انتہائی مضبوط سہارا ثابت ہو سکتا ہے بشرطیکہ ہم اور وہ ذاتی سطح سے ہٹ کر ایک عظیم تر مقصد کی خاطر اکٹھے ہو جائیں اور یہ ممکن ہے۔ اس نے پولیس فورس میں بھی اسی عزم اور یقین کے ساتھ شرکت کی تھی کہ وہ اپنی تمام توانائی بدی کے خلاف جنگ کرنے اور لوگوں کو قانون کی مدد سے تحفظ فراہم کرنے میں صرف کر دے گا۔ اسے شکست اس لیے ہوئی کہ وہ کھلی جنگ لڑ رہا تھا اور قانون کے دشمن اس لیے زیادہ طاقتور ہو گئے تھے کہ خود قانون کے محافظان کے پشت پناہ تھے۔ ہمارا مقصد بھی مختلف نہیں۔ وہ ذہین بھی ہے، یہ بات سمجھ لے گا مگر فوری طور پر اس سے رابطہ قائم کرنا ضروری نہیں۔ رابعہ کو جب تک یہ بات معلوم نہ ہو ٹھیک ہے لیکن بالآخر اسے شریکِ راز کرنا پڑے گا۔ وہ ثابت کر چکی ہے کہ ہمت اور حوصلے، قوتِ برداشت اور صبر و استقامت میں وہ لاکھوں مردوں سے بہتر ہے۔"

"اور مشن تیرا ہو تو تن من دھن بہت کچھ قربان کر سکتی ہے۔ کسی اور کے لیے نہیں۔" محسن بولا۔

"چل یوں ہی سہی مگر اسے بتانا ہو گا ورنہ وہ ناراض ہو جائے گی مجھ سے۔" میں نے کہا۔

"ابھی شادی ہوئی نہیں اور تو نے ڈرنا شروع کر دیا؟ بعد میں تیرا انجام عبرتناک ہو گا زن مرید۔"

"تیری اس چوہیا کو کچھ بتانے سے نقصان ہو سکتا ہے جو ایک بزدل، بے وقوف اور کمزور لڑکی ہے۔ وہ امورِ خانہ داری میں تو بہت کچھ کر سکتی ہے لیکن باہر کچھ نہیں کر سکتی۔" میں نے کہا۔

"میاں ٹیڈی۔" محسن چلایا۔ "لانا کوئی توپ وغیرہ۔ اس نامعقول نے ایک سانس میں کیا کیا بک دیا۔ ہم کو چوہا قرار دے دیا۔ اپنی اہلیہ محترمہ کے بارے میں یہ گستاخانہ کلمات ہم برداشت نہیں کر سکتے۔ وہ کچھ نہیں کر سکتی مگر ہم تو بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ ہم قتلِ عام کر دیں گے۔"

"جب آم کا موسم آئے تو قتلِ آم ضرور کرنا۔" میں نے کہا۔ "ابھی میرے ساتھ چل۔ کچھ لوگوں سے ملنا ہے۔"

"میں سمجھ گیا وہ کون لوگ ہیں۔" محسن بولا۔ "تو انسپکٹر فتح شیر کے ہمراہ جانے والے چار ماتحتوں سے ملنا چاہتا ہے نا؟ میرا خیال ہے پہلے مرزا غالب کو ان کے نام پتے معلوم کرنے دے۔ اس کے لیے یہ کام مشکل نہیں۔"

"یہ تیرا رپورٹر دوست غالب رہتا کہاں ہے؟" میں نے کہا۔ "اس کا والی وارث ہے کوئی؟"

"سب ہیں۔ کراچی میں باپ کا بزنس ہے۔ وہ چاہتا تھا بیٹا اس کا کام سنبھالے۔" محسن نے کہا۔ "ایک کنسٹرکشن کمپنی تھی ریت کی دیواروں سے محل تعمیر کرتی تھی اور تا قیامت ان کی اور استحکام کی ضمانت دیتی تھی۔ کوئی عمارت تعمیر کے فوراً بعد گری اور اس میں خاصے لوگ ہلاک ہوئے۔ بیٹے نے تحقیقات میں باپ کے خلاف گواہی دی کہ جب سیمنٹ اتنا بھی نہیں ہو گا جتنا آٹے میں نمک ہوتا ہے تو عمارت کھڑی کیسے رہ سکتی ہے۔ اس نے باپ کی تمام دولت کی قلعی کھول دی اور اسے ان سب کا قاتل ٹھہرایا جو عمارت گرنے سے مرے تھے۔ باپ تو خیر رشوت سفارشوں کے زور پر بچ گیا لیکن اس نے ناخلف بیٹے کو عاق کیا جس کے سر پہ پہلے سے صحافت کا بھوت سوار تھا۔ کچھ لوگ ہوتے ہیں نا پیدائشی طور پر موسیقار۔ کرکٹر یا مصور، تو ایسے ہی صحافی بھی ہیں۔ شوق کے جراثیم موروثی طور پر خون میں شامل ہوتے ہیں۔ عمر کے ساتھ ساتھ یہ شوق خبط بن جاتا ہے اور پھر جنون۔ دنیا کی کوئی چیز ان کے شوق کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی۔"

"ہاں، یہ بالکل ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "موسیقار نو... نے فلسفے میں ایم اے کیا، گولڈ میڈل لیا۔ پھر آئی سی ایس میں ... لی۔ اس زمانے میں کتنے مسلمان آئی سی ایس ہوتے تھے؟ ... بھائی بنے کیا؟ موسیقار۔ سب نام و نمود اور حرص و ہوس کے دھندوں کو چھوڑ دیا۔ گل جی کو دیکھو۔ انجینئرنگ کی ڈگری لی اور بنے کیا؟ مصور۔"

"تو ایسے ہی اپنا یہ نیا مرزا غالب ہے۔ پیدا ہوا تو صحافی تھا، مرے گا تو صحافی۔" محسن نے کہا۔ "اب کبھی کبھی چوری چھپے لاہور جا کے ماں سے مل آتا ہے۔ ایک شادی شدہ بہن سرگودھا میں ہے کسی ایئر فورس آفیسر کی بیوی۔ اس سے مل آتا ہے۔ لیکن گھر سے کوئی رشتہ نہیں۔ یہاں ایک فلیٹ کرائے پر لے رکھا ہے۔ بہت کم وہاں ہے۔ آفس میں ٹیبل رکھ کے سو جاتا ہے کبھی پارک میں ڈیرہ جما لیتا ہے۔"

"رات کو سنتری بادشاہ نہیں پکڑتے آوارہ گردی میں؟"

"پکڑتے ہیں۔ پریس کارڈ دیکھتے ہیں تو رفو چکر ہو جاتے ہیں۔" محسن بولا۔ "اچھی خاصی تنخواہ ہے مگر سب کھانے پینے میں اڑا دیتا ہے، یار دوستوں کے ساتھ۔ کپڑوں کے یہی دو جوڑے ہیں۔ ایک دھوتا ہے تو دوسرا پہن لیتا ہے۔ پورا مرد ... ہے۔ یار ... اپنی موٹر سائیکل سے۔ اسے اپنی رفیقِ حیات کہتا ہے کہ ہر جگہ میرا ساتھ دیتی ہے۔"

"ایسا آدمی ہی ہمارے کام آ سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "جسے رشتے عزیز ہوں، وہ ڈرتا ہے۔ جس کی زندگی کا مقصد تن آسانی ہے پیسہ کمانا ہو وہ ڈرتا ہے۔ جو شہرت کا بھوکا ہو وہ ڈرتا ہے لیکن جس آدمی کو کچھ مطلوب ہی نہ ہو اور جو صرف اپنے لیے جیتا ہو وہ کیوں ڈرے گا۔ اس سے شام کو بات کریں گے۔ تیرا خیال ٹھیک ہے۔ ان چاروں سپاہیوں کا پتا وہ معلوم کر لائے گا تو باقی باتیں ہم معلوم کر لیں گے۔ لیکن اس وقت باہر نکل۔ ایک اور کام تو کر سکتے ہیں ہم۔ کام بڑا ہے مگر اس کا آغاز تو کیا جا سکتا ہے۔ الف دین نے بھی قصرِ جمشید کے نیچے ایک سرنگ کی موجودگی کی تصدیق کی تھی جو تہہ خانے سے کسی دوسری جگہ نکلتی ہے۔ جہاں سے ایک ٹرک مال لے کر روانہ ہوتا تھا، ہم وہ جگہ تلاش کر سکتے ہیں۔"

"قصرِ جمشید کے نیچے تہہ خانہ ہے۔" محسن بولا۔ "یہ تو میں مانتا ہوں۔ لیکن یہ کیسے معلوم ہو گا کہ وہاں سے نکلنے والی سرنگ کس طرف ہے؟"

"خدا نے جو چار سمتیں بنائی ہیں ان میں سے ایک سمت ہو گی۔" میں نے کہا۔ "ظاہر ہے پہلے سمت کا تعین کرنا پڑے گا اور یہ کوئی آسان کام بہر حال نہیں ہے۔ پہلے سروے کریں گے اور امکانات کا جائزہ لیں گے۔"

"اور سروے کرتے ہوئے پکڑے گئے تو ہمارا کیا بنے گا؟"

"مزار شریف۔" میں نے اطمینان سے کہا۔ "اسی قصرِ جمشید کے تہہ خانے میں۔ اکیلے نہیں ہوں گے ہم وہاں۔ دیگر ارواح بھی ہوں گی۔"

ٹیڈی نے باہر جا کے صورتِ حالات کا مشاہدہ کیا اور سب خیریت ہے کی رپورٹ دی تو میں اور محسن باہر نکلے۔ ساڑھے گیارہ سے اوپر کا وقت تھا اور سورج سر پر آنے لگا تھا۔ اس کی خوشگوار تمازت اور اجلی دھوپ نے دل میں جینے کی امنگ کو تازہ کیا اور میں نے اسٹیئرنگ سنبھالا تو گزشتہ شب کی ناکامی کا صدمہ کم ہو چکا تھا۔ استاد ٹیڈی نے ہماری ہدایت پر ایک پولیس انسپکٹر اور ایک پوسٹ مین کی وردی ساتھ رکھ دی تھی تاکہ ضرورت پڑے تو ہم حلیہ بدل سکیں۔ ایک ایک ریوالور ہم سب کے پاس تھا۔ دلاور کا تحفہ سائیلنسر والا ریوالور میں نے اپنے پاس رکھا تھا۔

"وقت کی ایک اہم ضرورت ہے کہ ہم شیو بنانا چھوڑ دیں۔" محسن نے کہا۔ "زیادہ سے زیادہ ہم دو ہفتے میں باقاعدہ قسم کی داڑھی مونچھ کے مالک بن سکتے ہیں۔ اصلی اور ناقابلِ انتقال۔ جن کو حسبِ ضرورت کاشت کیا جا سکتا ہے اور اپنے پسندیدہ شیڈ میں رنگا جا سکتا ہے۔ اس سے چہرہ پچاس فیصد بدل جاتا ہے۔"

"پچیس فیصد تبدیلی بالوں کا اسٹائل بدلنے سے لائی جا سکتی ہے۔" میں نے تائید کی۔ "مثلاً میں عالم لوہار کی طرح زلفیں رکھ لوں اور تو 'یل برائنز' کی طرح اسمارٹ ہو جائے۔ سر کی شیو کرتا تھا وہ ہر روز۔"

ٹیڈی ہنس پڑا۔ "قسم مولا علی کی، کیا چیز لگو گے۔"

"میں بحیثیت چیئرمین اس تجویز پر عمل درآمد کا حکم دیتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "آج سے شیو تا حکمِ ثانی معطل۔"

"مجھے منظور ہے لیکن عالم لوہار میں بنوں گا۔" محسن بولا۔ "یل برائنز کی طرح اسمارٹ تو ہو جا۔"

"ڈسپلن کے بغیر ایم آر ایس نہیں چل سکتی۔" میں نے غرا کر کہا۔ "آرڈر از آرڈر۔"

"میں علمِ بغاوت بلند کر چکا ہوں۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔" محسن نے مسرت سے کہا۔ "تجھے گنجا ہونا پڑے گا۔"

"اچھا ہم ٹاس کر لیتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "نفاق سے کیا فائدہ۔ ضد میری ہو یا تیری۔" میں نے گاڑی روک کر جیب سے سکہ نکالا اور اوپر اچھال کے دونوں ہاتھوں میں دبا لیا۔

"چاند تارا۔ اگر چاند تارا ہو گا اوپر تو میں جیتا۔ میں اپنی مرضی کا ہیئر اسٹائل منتخب کروں گا۔" محسن نے کہا۔

میں نے ہاتھ ہٹایا۔ سکہ الٹا تھا یعنی چاند تارا نیچے کی طرف تھا۔ میں نے قہقہہ مارا۔ "منگواؤں استرا؟" میں نے کہا۔

"یہ بے ایمانی تھی۔" محسن نے کہا۔ "سکے پر چاند تارا تھا ہی نہیں۔ اس کے علاوہ جیتنے والے کو اپنی مرضی کا ہیئر اسٹائل اختیار کرنے کا حق حاصل ہوا ہے۔ ہارنے والے پر اپنی مرضی کا ہیئر اسٹائل تھوپنے کا نہیں۔ بے شک اب تو چاہے تو عالم لوہار جیسی زلفیں رکھ سکتا ہے یا یل برائنز کی طرح فارغ البال ہو سکتا ہے مگر میں مجبور نہیں ہوں گنجا ہونے پر۔"

"تو لفظوں سے کھیل رہا ہے۔" میں نے بڑبڑایا۔

"ٹاس اسی لیے ہوا تھا۔" محسن بولا۔ "ویسے میں بھی بدل لوں گا بالوں کا انداز۔ میں کمانی ٹائپ بن سکتا ہوں یا افریقی۔ پاپ سنگر کا اسٹائل اختیار کر سکتا ہوں۔ بیا کے گھونسلے کی طرح۔"

اچانک میری نگاہ ایک دیوار پر گئی اور میں نے بریک

رنگ کے گاڑی کو احاطے کے دروازے سے اندر موڑ لیا۔ "تم دونوں بیٹھو۔ میں ابھی پانچ منٹ میں آتا ہوں۔" میں نے اترتے ہوئے کہا۔

ایک بار میں پھر اسی اسکول کی پرنسپل کے مقابل پہنچا جس نے مجھے الف دین کا پتا فراہم کیا تھا۔

"یس...؟" وہ تیکھے لہجے میں بولی۔ "اب کیا چاہیے؟" میں نے الف دین کا پتا دے دیا تھا تمھیں۔"

"وہ پتا غلط تھا۔" میں نے اطمینان سے کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

پرنسپل کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ "کیا مطلب؟ پتا غلط تھا؟ تم جانتے ہو میں نے خود رجسٹر سے لکھ کر دیا تھا؟"

"اس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟ یہ کہ آپ نے پتا درست لکھا تھا؟" میں نے کہا۔

"تمھارا مطلب ہے میں نے جانتے بوجھتے تم کو غلط پتا لکھ کر دیا تھا؟" وہ بگڑ کے بولی۔

"نہیں، میرا مطلب کچھ اور تھا۔" میں نے کہا۔ "مجھے الف دین وہاں نہیں ملا تھا۔"

"پھر میں کیا کروں؟" پرنسپل چڑ کے بولی۔ بے اختیار اس کا ہاتھ گھنٹی کی طرف بڑھا۔ میں نے گھنٹی اٹھا لی۔

"مجھے وہ پتا دے دو، جہاں الف دین آج مل سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"آج...؟ آج بھی اسے وہیں ہونا چاہیے اور اگر اس نے پتا بدل لیا ہے تو میں کیا جانوں وہ کہاں گیا ہے۔"

"آپ کو اپنی بڑی بہن کے متعلق معلوم ہونا چاہیے کہ وہ کہاں ہیں۔" میں نے نرمی سے کہا۔

میرے الفاظ کا وہی اثر ہوا جو میں چاہتا تھا۔ پرنسپل کا رنگ اڑ گیا اور اس کے مزاج کا سارا کرارا پن رخصت ہو گیا۔ وہ شکست خوردہ اور نروس نظر آنے لگی۔ اس کی نگاہیں مجھ پر جمی رہیں۔

"وہ آپ کی بڑی بہن ہی نہیں، اسکول کی مالک بھی ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور ریکارڈ پر وہ ہیڈ مسٹریس ہیں حالانکہ وہ ایک ان پڑھ خاتون ہیں۔ پرنسپل آپ ہیں۔"

"تم... تم کون ہو۔ اور یہ سب کیسے جانتے ہو؟" پرنسپل نے میز پر سے گلاس اٹھا کے ایک گھونٹ پانی پیا۔

"مجھے خود الف دین نے بتایا تھا اور بھی باتیں تھیں جو شاید آپ کے علم میں بھی نہیں۔" میں نے کہا۔ "آپ کی اور بڑی بہن کی صورت میں حیرت انگیز مشابہت ہے لیکن کوئی شک

بھی نہیں کر سکتا کہ الف دین کی جاہل بیوی سے آپ کا کیا ...
ہے اور آپ اسی کی ملازم ہیں۔ میں اسے ملازمت نہیں ...
بہن کی شفقت بھی سمجھتا ہوں اور ضرورت بھی۔ ایسا اسکول
چلانے کا کوئی تجربہ نہ تھا اور نہ اس میں اتنی صلاحیت تھی
وہ کوئی بھی پرنسپل رکھ سکتی تھی لیکن چھوٹی بہن تعلیم یافتہ ہو
سب سے بہتر۔ آپ کو باعزت روزگار مل گیا اور الف دین
باعزت روزی کا ذریعہ۔ وہ بہت عظیم آدمی ہے۔ بہت اچھا
ہے۔ اچھا آدمی وہ ہوتا ہے جس کا باطن اچھا ہو۔ ظاہر تو کسی
بھی اچھا نظر آجاتا ہے...۔"

"کیا اس نے تمھیں اس لیے ... یہ راز کیا تھا کہ تم اس کی تشہیر کرو؟" پرنسپل نے بالکل بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔

"یہ بات صرف میں جانتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "یا آپ ... ہیں۔ کسی تیسرے شخص کو اس کا علم نہیں ہوگا۔"

"میرا خیال تھا وہ اپنے گھر جائیں گے۔ اپنے گاؤں" وہ افسردگی سے بولی۔ "لیکن الف دین بہت زیادہ خوفزدہ ... اس نے بیوی کو بھی نہیں بتایا تھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔ اس نے کہا تھا کہ یہ زندگی اور موت کا معاملہ ہے اور وہ ملتے ہی مجھے اطلاع کر دے گا۔ میں کیا بتاؤں کہ آج وہ کہاں ہے۔"

"اس کے کچھ دشمن ہیں۔ جو بہت بااثر اور طاقتور ہیں۔" میں نے کہا۔ "کیا آپ کو خطرہ محسوس نہیں ہوتا کہ جو سوال میں نے آپ سے کیا ہے، وہی سوال لے کر الف دین کے دشمن بھی آسکتے ہیں؟ اور وہ ایسے لوگ ہیں کہ یا تو صحیح جواب لے کر جائیں گے ورنہ آپ کو لے کر جائیں گے۔ آپ کے دو چیزیں ہیں، جسم اور جان۔"

پرنسپل کا چہرہ لاش کی طرح سفید پڑ گیا۔ "میں نے ... کہ یہ بات کوئی نہیں جانتا۔" وہ بولی۔

"اگر آپ کو اتنا ہی یقین ہے تو ٹھیک ہے لیکن ... مشورہ ہے کہ آپ بھی اپنی حفاظت کے خیال سے غافل ... ہوں۔ آپ کا یقین... غلط بھی تو ہو سکتا ہے۔ جاننے والے سب جان لیتے ہیں۔" میں نے کہا اور اٹھنے لگا۔

"ایک منٹ۔ آپ کے خیال میں مجھے کیا کرنا چاہیے" وہ گھبراہٹ میں بولی۔

"آپ کو استعفا دے کر نکل جانا چاہیے۔ آج ہی۔" ... نے کہا۔ "کسی دوسرے شہر میں آپ پرنسپل نہیں ہوں گی ... ٹیچر تو بن ہی جائیں گی۔ کسی اجنبی شہر میں جہاں آپ کا شناسا کوئی نہ ہو۔ آپ ہوسٹل میں رہیں اور اپنے ... کسی کا نام

یلیں۔ کم سے کم ایک سال تک۔ وہاں کون ہے، آپ کے آبائی گھر میں؟"

"کوئی نہیں۔ والدین تھے دو سال پہلے۔ اب گھر بند پڑا ہے۔" وہ بولی۔

"پھر فکر کی کیا بات ہے۔" میں نے کہا۔

"لیکن میں یوں غائب ہو گئی تو بعد میں باجی سے کیسے رابطہ قائم ہوگا؟ ہو سکتا ہے الف دین خط لکھے۔"

"پہلے زندگی کو بچانے کی تدبیر کیجیے۔" میں نے کہا۔ "خدا چاہے گا تو ملاقات کی سبیل بھی نکل آئے گی۔ میں بس اتنا ہی کہنے کے لیے رکا تھا۔"

"اپنا نام پتا کچھ تو دے کر جاؤ۔" وہ ایک دم اٹھی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ خوف سے کانپ رہی ہے۔

"سوری۔" میں نے کہا۔ "بس اتنا ہی یاد رکھنا کہ میں ایک خیر خواہ تھا۔ خدا حافظ۔"

محسن اور ٹیڈی پانچ منٹ کے بجائے پندرہ منٹ تک انتظار کر کے بور ہو گئے تھے۔ میں نے ان سے معذرت کی۔ "میرا خیال تھا کہ یہاں سے الف دین کا پتا مل سکتا ہے۔" میں نے کہا اور گاڑی اسٹارٹ کی۔

"اب الف دین کی ہمیں کیا ضرورت ہے؟" محسن نے بھنا کے کہا۔

"وہ... دراصل اس نے وہ سرنگ دیکھی تھی۔ وہ جگہ دیکھی تھی۔" میں نے کہا لیکن میری بات نامکمل رہ گئی۔ میں نے ایک گاڑی کو تیزی سے اندر آتے دیکھا اور آخری وقت میں سامنے سے تصادم کو بچانے کی بھرپور کوشش کی۔ گیٹ کافی بڑا تھا۔ اگر پورا کھلا ہوا ہوتا تو دونوں گاڑیاں خیریت سے گزر جاتیں لیکن اس کا ایک لوہے کا پٹ بند تھا۔ دوسری گاڑی بند گیٹ سے ٹکرائی۔ اس کی رفتار اتنی زیادہ تھی کہ گیٹ ایک دھماکے سے اکھڑ گیا اور دور جا گرا۔ میں نے شیشہ ٹوٹنے کی آواز بھی سنی جو اندر جانے والی کار کی ہیڈ لائٹس کے پاش پاش ہونے سے پیدا ہوئی تھی۔ بے اختیار میرے ساتھ محسن اور ٹیڈی نے بھی سر گھما کے دیکھا۔

"کیا گاڑی کے بریک فیل ہو گئے ہیں؟" میں نے کہا۔ "یا ڈرائیور کا دماغ خراب ہے؟"

"اندر داخل ہونے کا کونسا طریقہ ہے۔ کوئی بچہ آ رہا ہوتا تو کیا ہوتا؟" محسن نے کہا لیکن اس وقت تک میں گاڑی روک چکا تھا۔ خلاف توقع وہ دوسری گاڑی رکی نہیں تھی۔ یہ ناممکن تھا کہ سامنے سے اس کا حلیہ نہ بگڑا ہو لیکن لوہے

کے گیٹ کو اکھاڑ پھینکنے والے اپنے نقصان کی پروا کیے بغیر سیدھے جا رہے تھے۔ اس قسم کے ایکسیڈنٹ سے عام آدمی حواس باختہ ہو جاتا ہے اور اگر جان بچ جائے تو خدا کا شکر ادا کرنے کے بعد سب سے پہلے یہ دیکھتا ہے کہ نقصان کتنا ہوا۔ عام شریف آدمی کسی بچوں کے اسکول میں یوں طوفانی رفتار سے گیٹ توڑ کر داخل بھی نہیں ہوتے اور اگر ان سے یہ غلطی گاڑی کے بے قابو ہونے کے باعث سرزد ہو تب بھی اس کا ردِ عمل مختلف نہیں ہوتا۔ لیکن اب مجھے شک ہو چلا تھا کہ یہ عام اور شریف لوگ نہیں تھے۔ میں نے اتر کے دیکھا تو سیاہ رنگ کی مورس پرنسپل کے دروازے کے مقابل ٹھہر چکی تھی۔ اس کے پیچھے بوگس نمبر پلیٹ تھی۔ کسی پرائیویٹ کار کے پیچھے کمرشل نمبر پلیٹ لگانا ان کی بہت بڑی حماقت تھی۔

"محسن! یہ معاملہ گڑبڑ ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ لوگ پرنسپل کے پاس کیوں گئے ہیں؟"

"کیوں گئے ہیں؟" محسن نے میری طرف تشویش سے دیکھا۔ میری نظر نے تقریباً سو گز دور ایک شخص کو گاڑی سے اتر کے پرنسپل کے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ ایک منٹ بعد وہی شخص پرنسپل کو گھسیٹتا ہوا باہر لایا۔ اسکول کے اندر ایک چیخ پکار مچ گئی تھی لیکن کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ آگے بڑھ کے پرنسپل کو اغوا کرنے والے کا راستہ روکتا۔ خود میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ میں دوڑ کر سو گز کا فاصلہ طے کرتا یا گاڑی کو پھر اسٹارٹ کر کے موڑتا اور ان سے براہِ راست تصادم کا خطرہ مول لیتا۔ میں دوڑ کر اپنی جگہ آ بیٹھا۔ اندر سے ایک فائر کی آواز سنائی دی۔

"تم دونوں اتر جاؤ۔" میں نے کہا۔ "ریوالور تیار رکھنا، میں ان کا راستہ کاٹتا ہوں۔"

"کیسے... تو اکیلا؟" محسن نے کہا۔ کار اب تیزی سے گیٹ کی طرف آ رہی تھی۔

"باہر نکل۔" میں نے چیخ کر کہا اور ان دونوں کو ایک ساتھ باہر گرتے دیکھا۔ مورس دروازے کے قریب پہنچ چکی تھی۔ میں نے اس کی رفتار کا اندازہ کیا اور خدا پر بھروسا کرتے ہوئے گاڑی کو موڑ کر گیٹ کے سامنے لے آیا۔ میرے پاس ایک سیکنڈ کا وقت بھی نہیں تھا۔ میں دروازہ کھول کے باہر کود ہی تھا کہ مورس نے گیٹ بلاک کر دینے والی گاڑی کو ٹکر ماری اور تصادم کی قوت میں اسے چند گز دور تک گھسیٹتی لے گئی — دھات سے دھات کے ٹکرانے اور رگڑنے کی سمع خراش آواز کے ساتھ پھر شیشہ بکھرنے کا چھناکا سنائی دیا۔ ایک عورت نے

دلخراش چیخ ماری اور میں نے سیاہ مورس کا ونڈ اسکرین ریزہ ریزہ ہو کے غائب ہوتے دیکھا۔ گاڑی چلانے والا اچھلا اور اس کا لہولہان چہرہ انتہائی کرب میں نظر آیا۔ شیشے کے ٹکڑے اس کے سارے چہرے میں چھرّوں کی طرح پیوست ہو گئے تھے۔ ہماری کورٹینا ایک سانڈ کے دونوں دروازوں کے بیچ گرا کر اندر گھس جانے کے بعد الٹ گئی تھی۔ سیاہ مورس کے پیچھے والے گیٹ سے دو افراد باہر کود ے۔ ان میں سے ایک نے نشانے کے لیے ریوالور اٹھایا مگر محسن اور ٹیڈی غافل نہیں تھے۔ دوسرے فائر کی آواز کے ساتھ ہی میرا نشانہ لینے والا گھوما۔ اس کے ہاتھ سے ریوالور اڑ گیا اور وہ منہ کے بل سڑک میں گر کے لوٹنے لگا۔ دوسرے نے مجھ پر حملہ کیا۔ میں نے اس کے پیٹ پر لات ماری اور اسے دونوں ہاتھوں سے اوپر اٹھا کے گاڑی پر دے مارا۔ کورٹینا میں آگ لگ گئی تھی لیکن وہ کچھ دور تھی۔

"خیال رکھنا یہاں کوئی رکنے نہ پائے۔" میں نے چلا کر کہا اور محسن نے ایک گاڑی والے پر فائر کیا جو رکنے لگا تھا۔ گاڑی ایک دم رفتار پکڑ کے نکل گئی۔ ایک اور فائر ہوا اور گولی میرے کانوں کو چھوتی ہوئی گزری۔ میں نے اپنے حریف کو اٹھنے سے پہلے دوسری زبردست کک مار کے اٹھا تو وہ کورٹینا پر جا پڑا۔ آگ نے اس کے کپڑوں کو لپیٹ میں لے لیا۔ وہ چلایا اور خاموش ہو گیا۔ میں پلٹ کر سیاہ مورس کی طرف دوڑا۔ اس کا زخمی ڈرائیور اٹھ کے پیچھے پلٹ رہا تھا۔ میں نے اپنا سائلینسر والا ریوالور اٹھا کے فائر کیا تب کن سیکنڈ کے ہزارویں یا دس ہزارویں حصے کی تاخیر نے اسے پہلے گولی چلانے کا موقع دے دیا۔ اس نے مجھ پر گولی نہیں چلائی تھی۔ میری گولی لگتے ہی وہ گرا اور اس کا جسم باہر کی جانب لڑھک گیا۔ میں اور محسن ایک ساتھ جست لگا کے مورس تک پہنچے۔ میں نے ڈرائیور کی خون آلودہ جگہ سنبھالی اور جب گاڑی کا انجن اسٹارٹ ہوا تو خدا کا شکر ادا کیا۔ ہماری کورٹینا اب دھڑا دھڑ جل رہی تھی اور اسی کے ساتھ ایک بدمعاش کا ناپاک وجود بھی خاکستر ہو رہا تھا۔ سڑک پر چلنے والے دور رک کر خوفزدہ نظروں سے یہ بھیانک تماشا دیکھ رہے تھے۔ دیر سے پہنچنے والوں کا خیال تھا کہ یہ حادثہ ہے مگر فائرنگ کی آواز سننے والوں کے نزدیک یہ حادثہ نہیں بدمعاشی کا مظاہرہ تھا۔

میں نے مشکل سے پچاس گز کا فاصلہ طے کیا ہو گا جب کورٹینا کا پٹرول ٹینک ایک دھماکے سے پھٹا اور میں نے دھوئیں کے بادل کے ساتھ بھڑکتے شعلے بھی اوپر اٹھتے دیکھے پھر میں نے پلٹ کر دیکھا۔ پچھلی سیٹ پر محسن اور ٹیڈی پرنسپل کے بے جان جسم کو سنبھالنے ہکا بکا بیٹھے تھے۔ وہ میرے ساتھ کسی اور کام کے لیے نکلے تھے اور میں نے ان سے کہ یہاں میں صرف الف دین کا پتا معلوم کرنے کے لیکن ذرا سی دیر میں موت کا ایک اور خونی ڈراما ختم ہو گ ان کی عقل یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ یہ سب کیوں ہوا۔

"یہ... یہ زندہ ہے؟" میں نے کہا حالانکہ میرا بے مقصد تھا اور مجھے احساس تھا کہ میں خود فریبی کا سہا ہوں۔

محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "گولی سر میں لگی تھی۔" او پھر وہ منظر دیکھا جب زخمی ڈرائیور نے اٹھ کر پیچھے فائر سیکنڈ کے ہزارویں یا دس ہزارویں حصے کا فرق زندگی او کا فرق بن گیا تھا۔ میری ہار بن گیا تھا اور یہ سب جلد گئی تھی۔ بہت دیر کی مہرباں آتے آتے۔ پرنسپل کی خو لاش نے طنز سے کہا۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں نے اس تھا کہ میں بس اتنا ہی کہنے کے لیے رکا تھا لیکن کیا یہ اسے کچھ دیر پہلے نہیں بتا سکتا تھا۔ خلاً گزشتہ روز جب اس مشابہت کا احساس ہوا تھا۔ الف دین کی بیوی میں نے اس کے پرس میں دیکھی تھی اور پرنسپل کو خود تو عمر کے فرق کے باوجود میں نے صورتوں کے نقوش کو محسوس کر لیا تھا۔ دیر میں نے کی۔ میں ایک گھنٹا پہلے آسکتا تھا۔ آدھا گھنٹا یا پندرہ منٹ قبل بھی پہنچ سکتا تھا منٹ پہلے اسے مجبور کر سکتا تھا کہ اسی وقت میرے سا چلے۔ میں نے گاڑی روک کر اسٹیئرنگ پر سر رکھ دیا۔ سرد سفاک قہقہہ میرا مذاق اڑا رہا تھا۔ تم کچھ نہیں کر سکتے نہ کل، نہ آج، نہ ایک گھنٹا پہلے، نہ ایک منٹ پہلے کیونکہ جو فرشتۂ اجل کے آنے اور جانے کا تھا اس وقت کو کیسے پہنچ سکتا تھا۔ وہ لمحہ کسی آدمِ فانی کی دسترس میں ہوتا جو فنا کا لمحہ ہوتا ہے۔" بس اتنا ہی یاد رکھنا کہ میں ایک تھا میرے اپنے الفاظ کی بازگشت میری روح کے تا جھنجوڑنے لگی۔ ایسے عیسےٰ ہو مریضوں کا خیال اچھا

محسن نے میرا کندھا ہلایا تو مجھے ہوش آیا۔ ہم ویران گلی میں کھڑے تھے لیکن اکا دکا گزرنے والوں کی سے جھانکنے والوں کی نظریں ہمیں گھور رہی تھیں۔ ایک کے گیٹ سے اور دوسری بار ہماری گاڑی سے ٹکرانے بعد سیاہ مورس کا سامنے والا حصہ بالکل تباہ ہو گیا تھا۔ کے ریڈی ایٹر کا سارا پانی بہہ گیا تھا اور اب وہ چل بھی نہ تھی۔ اندر خون ہی خون تھا اور شیشہ ہی شیشہ تھا۔ سا اسکرین نہ ہونے سے گاڑی ایک کھنڈر نظر آتی تھی اند بیٹھے ہوئے ہم تین افراد اس صورت

آتے تھے۔ ہمارے ہاتھ اور کپڑے بھی خون آلود تھے۔ ایسے میں کوئی بھی پولیس والا نمودار ہو جاتا تو ہمیں دھر لیتا اور ہم ایک لاش کے ساتھ پکڑے جاتے۔ باقی کسر اسکول میں درجنوں افراد کی گواہی پوری کر دیتی۔ ہم بھی تین تھے اور سیاہ مورس میں پرنسپل کو اغوا کر کے لے جانے والے بھی تین تھے۔ ایک منٹ کے مختصر وقت میں ان کی صورتوں پر غور کرنے کا موقع کسی کو نہ ملا ہو گا۔ سب ہم پر ہی انگلی اٹھا دیتے کہ یہی وہ مجرم ہیں۔

"اب یہاں سے نکلنے کی فکر کر۔" محسن نے کہا۔ "جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔"

"یا اللہ میری توبہ!" ٹیڈی نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "یہ کیا نیا عذاب آ گیا۔"

"اس حلیے میں باہر نکلے تو فوراً پکڑے جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "نہ ہم کسی کو مدد کے لیے بلا سکتے ہیں اور نہ اس کار میں فرار ہو سکتے ہیں۔ تو ایک گاڑی پیدا کر۔ ٹیکسی ہو تو بہتر ہے۔"

محسن باہر نکلا اور چند قدم چل کے گلی کے موڑ تک گیا۔ پرنسپل کا بے گناہ لہو اس کے دامن پر اور آستین پر پھیل گیا تھا اور ہر نگاہ سے فریاد کرتا تھا۔ تاہم مجھے امید تھی کہ محسن عقل سے کام لے کر مسئلہ حل کر لے گا۔

"یہ کون تھی سکندر بادشاہ؟" ٹیڈی نے خشک حلق کو تھوک نگل کر تر کیا۔ وہ جتنا بڑا بدمعاش اور ہمت والا بنتا تھا اس کا دل اتنا ہی چھوٹا تھا۔ گاڑیوں کی ٹکر، پرنسپل کا اغوا، فائرنگ اور خونریزی، ہماری گاڑی کی تباہی اور پرنسپل کی لاش کے ساتھ ہمارا فرار۔ یہ سب چند منٹ میں پیش آ جانے والے واقعات دیکھ کر اس کی حالت ابتر ہو رہی تھی۔

"تھی ایک بدنصیب ٹیڈی۔ اس کے مقدر میں بھی ہمارے سب اسی طرح مرنا لکھا تھا۔" میں نے کہا۔ "مجھے بہت افسوس ہے کہ میں نے اسے بچانے کی بے سود کوشش کی۔ جب میں اسے بچا نہیں سکتا تھا تو کیا ضرورت تھی مجھے یہ الزام اپنے سر لینے کی۔"

گلی کے موڑ پر ایک ٹیکسی نمودار ہوئی۔ محسن ٹیکسی کو بہت تیزی سے بھگاتا ہوا لا رہا تھا۔ میں نے ٹیڈی کو ہوشیار کیا۔ ٹیکسی ایک سیکنڈ کے لیے رکی اور ہم کار سے ٹیکسی میں منتقل ہو گئے۔ محسن نے ٹیکسی کو پوری طرح روکا بھی نہیں تھا کہ پھر اسٹارٹ کر دیا۔ وہ بار بار پیچھے پلٹ کر دیکھتا تھا۔ ہم گلی کے آخری کنارے پر تھے جب پیچھے سے چند افراد دوڑتے ہوئے نمودار ہوئے۔ محسن نے ٹیکسی کو بار بار موڑا اور مختلف گلیوں سے گزرتا ہوا خطرے کی حدود سے باہر نکل آیا۔ "بڑی مصیبت ہو گئی تھی۔" محسن نے گہری سانس لے کر کہا۔ "ٹیکسی والا مقابلے پر آمادہ تھا۔"

"تو نے کیا کہا تھا؟" میں نے کہا۔

"میں تو زخمی اور بیمار بن کے کھڑا ہوا تھا۔" محسن بولا۔ "اس سے کہا، اسپتال لے چلو جو مانگو گے دوں گا۔ اس نے بٹھا تو لیا لیکن راستے میں کہنے لگا کہ تم زخمی تو نظر نہیں آتے۔ میں نے ریوالور نکال لیا اور کہا کہ چپ چاپ نیچے اتر جاؤ لیکن وہ آدمی جی دار تھا۔ اس نے شور بھی مچایا اور مجھ پر حملہ آور بھی ہوا۔ اب یا تو میں گولی چلاتا یا اسے ناک آؤٹ کرتا۔ میں نے ریوالور کا دستہ دو بار اس کے سر پر مارا اور پھر اسے نیچے لڑھکا دیا لیکن اس کے ہنگامے نے لوگوں کو متوجہ کر لیا تھا اور وہ اتنا سخت جان تھا کہ سڑک پر گرا تو اس وقت بھی بے ہوش نہیں تھا۔ کچھ لوگ میرے پیچھے بھاگے تھے۔ ایک دو پتھر بھی آ کے لگے تھے ٹیکسی پر مگر خطرہ ایک لونڈے نے پیدا کر دیا تھا جو موٹر سائیکل لے کر تعاقب پر آمادہ تھا۔ ایک ہوائی فائر کیا تو وہ ٹیکسی کا پیچھا چھوڑ کر پلٹ کر بھاگا مگر خطرہ یہ تھا کہ کوئی اور پیچھے نہ لگ جائے۔"

"ہم سب کے کپڑے خون آلود ہیں۔" میں نے کہا۔ "گاڑی الگ گئی ہاتھ سے۔ اب کیا کریں؟"

"میری جیب میں تقریباً ڈھائی سو روپے موجود ہیں۔" محسن بولا۔

"چار سو کے قریب میرے پاس ہیں۔" میں نے کہا۔

"اپنی جیب میں تو سو بھی نہیں ہوں گے۔" ٹیڈی نے خفت سے کہا۔

"پیسے تو کافی ہیں۔ نئے کپڑوں کے تین جوڑے آسکتے ہیں لیکن بازار جا کے لائے کون؟" میں نے کہا۔

تھوڑا سا غور فرمانے کے بعد ہم نے مسئلے کا یہ حل نکالا کہ ٹیڈی نے میری پتلون پہنی جس پر خون کا ایک داغ تو تھا لیکن اوپر کی جانب اور محسن کی قمیص جس کی ایک آستین پر خون کا رنگ آیا تھا۔ اس آستین کو اوپر چڑھا کے وہ قمیص یوں پہن سکتا تھا کہ دامن باہر رہے اور پتلون کے داغ کو چھپا لے۔ میری پتلون اسے بڑی تھی اور کچھ ڈھیلی بھی تھی۔ اسی طرح محسن کی قمیص اس کو ڈھیلی تھی لیکن وہ اپنی مضحکہ خیز حالت کی پروا کیے بغیر پیدل چلتا ہوا ایک دکان تک گیا۔ اپنا سائز اسے معلوم تھا اور میں نے اسے بتا دیا تھا کہ محسن کا اور میرا سائز میڈیم ہے۔ تقریباً آدھا گھنٹا ہم ایک محدود علاقے میں پھرتے رہے۔ ہم انارکلی کے قریب سے سیدھے مال روڈ پر زمزمہ تک جاتے تھے۔ چند منٹ قیام کرتے تھے اور واپس آ کے ٹیڈی کو دیکھتے ہوئے سیدھے نکل جاتے تھے پھر پاک ٹی ہاؤس کے قریب سے موڑ کاٹتے تھے اور نیلا

گنبد سے گھوم کر دوبارہ بنک اسکوائر کے پاس مال روڈ پر طلوع ہوتے تھے۔ ابھی دوسرا چکر جاری تھا کہ میں نے ٹیڈی کو بنڈل بغل میں دبائے یونیورسٹی کے بس اسٹاپ پر دیکھ لیا۔ ہم بھنگیوں کی توپ کے پاس سے گھوم کر آئے اور اسے اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ ٹیکسی کو ہم نے میوزیم اور پنجاب پبلک لائبریری کے درمیان روک لیا جہاں نسبتاً خاموشی تھی اور دو چار گاڑیوں کے سوا کوئی نہ تھا۔ سب سے پہلے ٹیڈی گیا اور پنجاب پبلک لائبریری کے باتھ روم سے اپنے کپڑے بدل کے نکل آیا۔

"کسی نے دیکھا تو نہیں؟" میں نے کہا "کہ اندر کون گیا تھا اور باہر کون آیا؟"

"نہیں سکندر بادشاہ" وہ بولا "اندر تو قبرستان سے زیادہ خاموشی ہے۔ وہاں بھی چڑیاں کوے تو بولتے ہیں۔ یہاں سب کتابیں کھولے بیٹھے ہیں۔ کسی کی نظر اِدھر اُدھر جاتی ہی نہیں۔"

اب ٹیڈی باہر کھڑا ہوا اور اس نے ایک طرف سے شیشوں کو تھوڑا بہت کور کر لیا۔ دوسری طرف دیوار تھی۔ میں نے ٹیڈی کے بے داغ کپڑے محسن کو دیے۔ اس نے ٹیڈی کی روایت پر عمل کیا اور کچھ دیر بعد نیا شلوار قمیص پہنے نمودار ہوا۔ اس کے پاس دو جوڑے اتارے ہوئے بھی تھے جن کو اس نے بنڈل بنا کے بغل میں دبا رکھا تھا۔

"شک کی کوئی بات؟" میں نے کہا اور محسن نے اقرار میں سر ہلایا۔

"کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا ایک آدمی مجھے گھور رہا تھا۔ وہ اٹھ کے آگے آیا بھی تھا لیکن میں راستہ کاٹ کے تیزی سے باہر نکل آیا۔ اب تیرا اندر جانا ٹھیک نہیں۔" محسن نے کہا "کہیں اور چلتے ہیں۔"

میرا مسئلہ بنک اسکوائر کے عقب میں حل ہوا۔ اب ہم تینوں بے داغ نئے کپڑوں میں تھے اور یہ ضروری تھا کہ ہم اس ٹیکسی کو بھی کہیں چھوڑ دیں اور خون آلودہ کپڑوں سے بھی نجات حاصل کر لیں۔

"پیسے کتنے بچے ہیں؟" میں نے نیچے اتر کے کہا۔ ٹیکسی کو میں نے باغ جناح سے پہلے اسمبلی بلڈنگ کے پیچھے روک دیا تھا۔ وہاں اور بھی گاڑیاں تھیں لیکن لوگ بہت کم تھے۔ جو تھے وہ ہماری طرف متوجہ نہ تھے۔

"چار سو تیرے پاس ہیں؟ ٹیڈی نے مجھے سوا سو دیے ہیں۔" محسن بولا۔

"ابھی گزارے کے لیے کافی ہیں۔" میں نے کہا۔ ہم تینوں اپنے اپنے کپڑوں کے بنڈل لیے پیدل روانہ ہو گئے۔

"اب پہلے کھانا کھاتے ہیں اور کافی پیتے ہیں تاکہ عقل ٹھکانے آ جائے۔" میں نے کہا۔

"پہلے ان کپڑوں کو کہیں پھینک دیں۔" محسن نے کہا "اپنی جیبوں میں سے ہر چیز نکال لی ہے نا؟"

"نکال لی ہے۔ منظر تو ابھی کورٹ میں ہو گا۔ یا کورٹ سے نکل پڑا ہو گا تو راستے میں ہو گا۔" میں نے کہا۔

"لیکن تمہاری گھر والی تو گھر میں ہے کبیر خان۔" محسن نے کہا "اسے فون کر دے۔"

میں چونک پڑا۔ نہ جانے کتنے عرصے بعد اس نے میری بچپن کا نام لیا تھا۔ میں بے اختیار ہنس پڑا اور محسن نے محسوس کیا کہ یہ حرکت غیر شعوری تھی۔ ٹیڈی کچھ نہ سمجھنے کے باوجود ہنسنے لگا۔ اس کے خیال میں مجھے محسن کا کبیر خان کہنا مذاق تھا۔ کپڑوں کو ہم نے موقع پا کر تین مختلف مقامات پر کھلے گٹر دیکھ کے غرق کر دیا۔ گٹر کے گندے پانی میں شہر کی غلاظت کے ساتھ ایک مجرم کا خون ایک بے گناہ اور تعلیم و تدریس کے مقدس پیشے سے وابستہ عورت کے خون کے ساتھ مل کر بہنے لگا۔ موت سب کو برابر کر دیتی ہے۔ انگریز کہتے ہیں "گورے اور کالے" امیر و غریب، معصوم اور گنہگار سب مر کے رزقِ خاک ہوتے ہیں۔ وہی حشرات الارض ان کو کھاتے ہیں اور وہ ایک ہی طرح مٹی ہو جاتے ہیں۔ بندہ صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے۔ حشر انتظار مکافات کے سوا کچھ نہیں۔

مجھے بھوک نہیں تھی لیکن مال پر آنے کے بعد سب سے پہلے ریسٹورنٹ فیروز سنز کے ساتھ ہی نو تعمیر شدہ "گلیکسی" تھا۔ اس کے سکون پرور ماحول میں بیٹھ کر میں نے اور محسن نے کافی کے ساتھ سینڈوچ کھانے کا فیصلہ کیا۔ ٹیڈی نے باقاعدہ لنچ طلب کیا۔ میں نے ان کو مختصراً پرنسپل کے قتل کے اسباب بتائے۔

"اس کو تو مرنا ہی تھا۔" محسن نے کہا "دلاور اپنے ٹھکانے میں بیٹھا سوچ رہا ہو گا کہ پرنسپل کو بھی معلوم تھی کہ وہ کس کی بہن ہے۔"

"الف دین بھائی تھا طافو کا۔" میں نے کہا "وہ الف دین سے پوچھنا چاہتے ہوں گے کہ طافو نے اسے ہمارے بارے میں کچھ بتایا تھا یا نہیں۔ جب وہ نہیں ملا تو ان کا ذہن اس پرنسپل کی طرف گیا جو الف دین کی بیوی کی بہن تھی۔ وہ اس سے الف دین کے بارے میں ضرور پوچھتے اور اپنے طریقے سے پوچھتے۔ اسے کچھ معلوم ہی نہیں تھا تو وہ کیا بتاتی۔ انکار کرتے کرتے مر جاتی مگر وہ سمجھتے کہ بہن کو بچا رہی ہے۔ اب ظالم سے مری اور بہن کو بہر حال بچانے میں کامیاب رہی۔"

"ہم اس واردات میں بلاوجہ ملوث ہوئے۔" محسن نے کہا "کل یہ خبر بہت ہلچل مچائے گی۔ اس بار مسئلہ ایک اسکول کی پرنسپل کا ہے۔ جسے غنڈے دن دہاڑے اٹھا کے لے گئے اور قتل کر دیا۔ اس کی لاش تو مل ہی جائے گی۔"

"ہاں۔ پبلک کا اور پریس کا بہت دباؤ ہو گا پولیس پر۔" میں نے متفکر ہو کے کہا "ممکن ہے ٹیچرز ہڑتال کر دیں اور طلبا جلوس وغیرہ نکالیں۔ گورنر اور آئی جی بھی خصوصی تحقیقات کا حکم دیں گے۔"

"ہمارا تو پرنسپل سے دور کا بھی تعلق ثابت نہیں ہو گا۔" محسن بولا۔

"ہاں۔ لیکن میں دوبار اس سے ملنے گیا تھا۔" میں نے کہا "نہ جانے کس کس نے مجھے دیکھا ہو گا۔ اب پولیس نے تصویریں دکھائیں تو شاید کوئی شناخت کر لے۔"

"پرنسپل کے پاس دن بھر میں بہت سے لوگ آتے ہیں۔" محسن نے مجھے تسلی دینے کے لیے کہا "اس کے علاوہ گرلز اسکول میں سب لیڈی ٹیچرز ہیں۔ وہ گواہی سے دور رہیں گی۔ معاملہ بہت سنگین ہے۔ سب کو خوف ہو گا کہ تفتیش کا چکر لمبا ہو گا۔"

"کتنی بڑی کمزوری ہے یہ ہمارے قومی اخلاق و کردار کی۔"

"لوگوں کا اخلاق و کردار ٹھیک ہے۔ پولیس کا رویہ اور عدالتی طریق کار حوصلہ شکن ہوتا ہے اور اتنی پریشانی پیدا کرتا ہے کہ بڑے بڑے با اصول اور ہمت والے بھی جان بچاتے ہیں۔ صرف ایک بار کی بات نہیں ہوتی، برسوں عدالت اور تھانے میں چکر لگانے پڑتے ہیں۔ اتنا فاضل وقت کس کے پاس ہے؟ اور پھر معاملہ کبھی تو سیدھا نہیں چلتا۔ بعض اوقات سچی گواہی بھی جھوٹی کر دی جاتی ہے اور گواہ پھنس جاتے ہیں۔ پھر قاتل کے محافظ یا وارث الگ پریشان کرتے ہیں کہ گواہ منحرف ہو جائے۔"

"تھے تو وہ دلاور کے ہی آدمی اور اگر وہ بچ کر نکل جاتے تو یقیناً ہمارے متعلق اپنے آقاؤں کو سب بتا دیتے مگر کچھ شک تو اب بھی ہو گا دلاور کو۔" میں نے کہا "اس کے آدمی گولیوں سے ہلاک نہ ہوتے تو وہ سمجھتا کہ یہ حادثہ تھا لیکن اس کیس میں پولیس کی پوسٹ مارٹم رپورٹ ملے گی تو اس کا شک یقین میں بدل جائے گا۔ گاڑی کا ڈرائیور جب ریوالور کی گولی سے ہلاک ہوا ہے وہ دلاور کا ہی تھا۔ گاڑی تو جل کے خاک ہو جائے گی۔ بلکہ اب تک ہو چکی ہو گی۔ نہ ہی لاشیں رہ جائیں گی۔"

"چلو اچھا ہے۔" محسن بولا "دلاور یہ نہ سمجھے کہ ہم میدان چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں۔ وہ تو کل بھی مصیبت میں پھنس گیا تھا۔ معلوم نہیں اس نے اپنی جان بچانے کے لیے کتنے پاپڑ بیلے اور کتنا خرچ کیا۔"

"وہ ان چاروں کو اچھا انعام دے گا جو رابعہ کی کوٹھی میں گئے تھے میری گرفتاری کا انعام لینے مگر خود گرفتار ہو گئے۔" میں نے کہا "اتنے کم حوصلہ لوگ تھے کہ دو جوتے پڑے اور دلاور کا نام بک دیا۔"

"غلطی دلاور کی تھی۔ اس نے اتنے کم حوصلہ آدمی منتخب ہی کیوں کیے تھے؟"

"اسے تو ناکامی کا خیال تک نہ ہو گا۔" میں نے کہا "جیسے خود مجھے کامیابی کا پورا یقین تھا۔"

"وہ چاروں تو مارے گئے۔ دیکھ لینا دلاور انھیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔" محسن بولا "آج کے تین آدمی بھی شمار کر و تو کل سے اب تک اس کے سات آدمی کم ہو گئے۔"

"مرنے والے بہت ہیں۔" میں نے تلخی سے کہا "کیونکہ مروانے والوں کے پاس پیسہ بہت ہے۔ یہ سب غربت اور معاشی بدحالی سے جنم لینے والی برائیوں کا شاخسانہ ہے۔ ایسے ہزاروں لاکھوں ہیں جو بچپن میں سختیٔ حالات کے باعث گھروں سے بھاگ جاتے ہیں یا اسکول نہ جانے کے باعث بُری صحبت میں پڑ جاتے ہیں۔ ہمت یا صلاحیت کی کمی ہوتی ہے اس لیے جرائم کی طرف راغب تو ہوتے ہیں مگر کوئی بڑا کام نہیں کر پاتے کہ اپنی تقدیر بدل سکیں۔ یہی چھوٹے موٹے جرائم کر کے جیل جاتے ہیں اور باہر نکل کے پھر وہی زندگی گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ دلاور جیسے بڑے بدمعاش دس بیس ہزار میں ان مہروں کو خرید لیتے ہیں۔ بساط ان کی ہوتی ہے، بازی ان کی ہوتی ہے اور چال وہ چلتے ہیں لیکن پٹتے یہی مہرے ہیں۔ ان کی اہمیت پیادوں سے زیادہ نہیں۔ شطرنج میں بادشاہ کے ساتھ وزیر ایک ہوتا ہے۔ فیل دو تو پیادے آٹھ ہوتے ہیں۔ اس دنیا میں بھی مفلسی اور بے روزگاری نے پیادوں کا حصول بہت آسان بنا دیا ہے۔ مایوس آدمی سوچتا ہے کہ ایسی زندگی سے کیا حاصل۔ دس بیس ہزار اکٹھے مل گئے تو واہ۔ ورنہ ہارنے کو کیا ہے؟"

"اب تک منظر اپنے گھر پہنچ گیا ہو گا۔" محسن نے کہا "کچھ دیر بعد اپنے چیمبر میں چلا جائے گا۔"

"تو فون کر اسے۔" میں نے کہا "اس سے کہہ کہ ہمیں بیس پچیس ہزار روپے کی ضرورت ہے۔ کل تک انتظام کر دے۔"

"وہ نہ ملے تو رابعہ سے کہہ دوں کہ تمہارے اُن کو ایک نئی گاڑی چاہیے۔" محسن اٹھتے اٹھتے بولا۔

"یار اس نے اپنی گاڑی دی تھی کہیں رنگ ہونے کے لیے۔" مجھے اچانک یاد آیا "اس سے کہنا کہ وہی گاڑی لے آئے اور اس کا ایک ٹرانسفر لیٹر بنا دے۔ کسی بھی فرضی نام سے۔ خنا پرنس صوفیہ ہی کے نام کر دے۔"

"اس کی نمبر پلیٹ پرانی ہو گی۔" محسن بولا۔

"اوّل تو کسی کو یاد نہیں ہو گا وہ نمبر۔" میں نے کہا۔ "اور ہوا تو ہم حسبِ ضرورت اسے بدلتے رہیں گے۔ اس طرح ابھی پیسہ خرچ کرنے سے بچ جائیں گے اور وہ گاڑی بے حد آزمودہ اور قابلِ اعتماد ہے۔"

"تو نہیں کرے گا تو اور کون کرے گا اس کی تعریف۔" محسن بولا۔ "سگِ لیلیٰ کا زمانہ گزر گیا۔ اب لیلیٰ کی کار ہی ناقۂ لیلیٰ ہے۔"

"یہ ناقہ کیا ہوتا ہے سکندر بادشاہ؟" ٹیڈی نے ڈکار لے کر کہا۔ "لیلیٰ تو ہم سمجھتے ہیں۔"

"ناکہ نہیں سمجھتے؟ بھئی یہ پولیس اکثر ناکہ بندی کرتی رہتی ہے تاکہ اسمگلر وغیرہ آسانی سے گزر جائیں۔" میں نے کہا۔ "جیسے اونٹ سوئی کے ناکے سے گزر جاتا ہے۔ کچھ مجرم ہوتے ہیں چیونٹی کے برابر۔ وہ ناکا بندی میں پکڑے جاتے ہیں۔ کچھ ہوتے ہیں اونٹ سے بھی بڑے۔ وہ ناکے سے نکل جاتے ہیں۔"

ٹیڈی کا منہ کھلا رہ گیا۔ "اونٹ؟ ہم سے تو دھاگا نہیں گزرتا سوئی کے ناکے سے۔"

"یہی تو سارا فن ہے دوست... تم دھاگا نہیں گزار سکتے۔ گزارنے والے ناکے سے اونٹ گزار دیتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اٹھو اب چلیں۔ محسن خان اچکن واپس آ رہے ہیں۔"

"یہ آج کی باتیں اپنی کھوپڑی میں بیٹھ نہیں رہی ہیں۔" ٹیڈی نے سر کھجایا۔ "محسن نے تم کو کبیر خان کہا تھا اور اب تم اس کو اچکن کہہ رہے ہو۔ ہم سے بھی کچھ چھپایا ہے ہو دوست؟"

"ارے یار کیسی باتیں کرتے ہو۔" میں نے کہا۔ "تم سے کیا پوشیدہ ہے۔ کبیر خان میرے بچپن کا نام ہے اور اچکن کسے کہتے ہیں؟ شیروانی کو۔ اس کا نام محسن شیروانی ہے۔ اسی بات پر یاد آیا کہ ہم جو تم کو ہر وقت استاد ٹیڈی کے نام سے پکارتے رہتے ہیں تو آج تک تم نے اپنا اصل نام نہیں بتایا۔" میں نے محسن کو اشارہ کیا اور وہ پلٹ کر ہمارے ساتھ چل پڑا۔ ہم تینوں ریسٹورنٹ سے باہر آ گئے۔

"اصل نام تو ماں باپ نے نیک محمد رکھا تھا۔" ٹیڈی شرمسار لہجے میں بولا۔

"یہ شرمندگی کیسی؟ انھوں نے غلط نام نہیں رکھا تھا۔" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ "تم نیک آدمی ہو۔ نیک آدمی بُرے حالات میں پھنس جاتا ہے مگر اس کی فطرت کی نیکی ضائع نہیں ہوتی جیسے کیچڑ میں بھی ہیرے کی آب و تاب باقی رہتی ہے۔"

"وہ بقلم خود آ رہی ہیں۔" محسن نے کہا۔ "فرقت کی ایک رات نے مجبور کر دیا۔ دونوں تھے آم دونوں کو امجور کر دیا۔ ایک ہم ہیں،

شرم و حیا کے نمونے۔" اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

"نمونے تو نے اسے منع نہیں کیا؟" میں نے کہا۔

"میں ظالم سماج نہیں ہوں اور منع کرنے سے وہ شاہِ جنات کی محبوبہ مانتی؟" محسن بولا۔ "وہ گاڑی بھی لے آئے گی۔ تیرا حال پوچھ رہی تھی۔ میں نے کہا بُرا حال ہے۔ کبھی کہتا ہے زلیخا کی طرح کے ٹوکو کاٹ دوں؟ کبھی کہتا ہے مجنوں کی طرح نجد کے صحرا کی طرف نکل جاؤں؟ کل رات اختر شماری کرنا چاہتا تھا مگر آسمان پر بادل تھے۔" اس کی بکواس ٹیکسی میں بیٹھنے تک جاری رہی۔ ٹیکسی کو ہم نے ہمیشہ کی طرح کچھ دور چھوڑا اور باقی فاصلہ پیدل طے کر کے ٹیڈی کی گلی میں پہنچے تو مرزا غالب کو عجیب کیفیت میں دیکھا۔ مقفّل دروازے کے سامنے فرشِ خاک پر آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے اور پُرتکلف خوان میں کھانا تناول فرما رہے تھے۔

"بہت مہمان نواز لوگ ہیں تمھاری گلی کے۔" وہ بولا۔ "میں بھوکا پیاسا بیٹھا تھا کہ ایک فرشتہ صفت بزرگ گزرے۔ احوال پوچھا تو میں نے کہا مسافر ہوں۔ جس سے ملنے آیا تھا وہ موجود نہیں۔ انھوں نے کھانا بھجوا دیا۔"

"اپنے ساتھ کیوں نہیں لے گئے؟" میں نے اس وقت کہا جب ٹیڈی دروازہ کھول رہا تھا۔

"وہ دراصل ان کے ساتھ ایک خاصی دلکش خاتون تھیں جو مجھے مسکرا کر دیکھ رہی تھیں۔ میرا خیال ہے مجھ میں سیکس اپیل بہت زیادہ ہے۔ یہ انہی کی مہربانی ہو گی۔" وہ اپنا خوان اٹھا کے اندر آ گیا۔

"لیکن تم نے تو شام کو آنے کو کہا تھا اور تم اپنا استعفا ایڈیٹر کے منہ پر مارنے گئے تھے۔" میں نے کہا۔

"گیا تو تھا لیکن راستے میں مجھے تمھاری بات یاد آئی کہ استعفا منہ پر مارو گے تو کون سا تیر مارو گے۔ ہر اخبار کا مالک نے اخبار فروش ہی ملے گا۔ چنانچہ میں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔" وہ کھاتے بولا۔

"یہ تم نے بہت عقلمندی کا فیصلہ کیا۔" میں نے کہا۔ "ایم آر ایس کی رکنیت کے بعد تم پر یہ فرض ہو جاتا ہے کہ اپنے وسائل کا بہترین استعمال کرتے ہوئے ہماری مدد کرو اور جتنے وسائل اس بڑے اخبار میں رہ کر تمھیں میسر ہیں، وہ کسی چھوٹے اخبار میں نہیں ہوں گے۔ تم ایک قومی سطح کے اخبار کے کرائم رپورٹر ہو۔ چھوٹے اخبار میں جاؤ گے تو تمھاری یہ پوزیشن نہیں رہے گی جو اب ہے اور ہمیں تمھاری یہ پوزیشن بہت فائدہ پہنچا سکتی ہے۔ مثلاً تم ایک کام فوراً کر سکتے ہو۔"

"بولو، بولو۔" وہ کھانا ختم کر کے ہاتھ صاف کرتے ہوئے بولا۔

"انسپکٹر فتح شیر کے ساتھ چار ماتحت، چوہدری دلاور کے گھر گئے تھے۔" میں نے کہا۔ "انھوں نے رشوت لے کر طافو یعنی الطاف کی لاش وہاں سے ہٹا دی اور دلاور پر کوئی حرف نہیں آیا۔ بعد میں وہ لاش کو کہیں اور پھینک آئے۔ دریا میں یا کسی اور جگہ۔ فتح شیر نے تو کہا تھا کہ راول ڈیم میں ڈال دی تھی مگر وہ جھوٹ تھا۔ راتوں رات راول ڈیم تک جا کے لوٹ آنا ناممکن تھا اور پھر اس کام کے لیے اتنے تردّد کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ فتح شیر تو مارا گیا مگر وہ چار آدمی زندہ ہیں اور بتا سکتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کو کتنا پیسہ ملا تھا اور طافو کی لاش کہاں ہے؟ مشکل یہ ہے کہ ہمیں ان کے نام پتے معلوم نہیں اور ہمارا ان سے ملنا بے حد ضروری ہے۔ ایک تو وہ دلاور کے خلاف گواہی دینے پر مجبور ہوں گے۔"

"گواہی کس کیس میں؟" غالب نے کہا۔ "میری دلاور سے بات ہوئی تھی۔ اس نے خاصے تعجب کا اظہار کیا کہ کل رات اس کی گاڑی رابعہ قاری کی کوٹھی میں ملی۔ اس نے کہا کہ چوری کی رپورٹ لکھوانے کے بعد وہ مطمئن ہو گیا تھا کہ گاڑی کسی غلط مقصد کے لیے استعمال نہیں ہو گی اور پولیس نے یقین دلایا تھا کہ مل جائے گی لیکن ابھی تک ان کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں ملی۔ میں نے اسے فتح شیر کی لاش اور وہاں پکڑے جانے والے چار افراد کے متعلق بتایا کہ وہ تمھارا نام لے رہے تھے تو وہ ہنسنے لگا اور بولا کہ رپورٹر صاحب، اگر وہ آپ کا نام لے دیتے تو کیا ہوتا۔ میں نے اپنی اور اس کی ملاقات کا ذکر کیا تو کہنے لگا کہ آپ خدانخواستہ چرس یا ہیروئن سے تو شوق نہیں رکھتے۔ کل شام چھ بجے سے رات بارہ بجے تک میرے گھر میں پارٹی تھی اور اس میں خاصے معزز لوگ مدعو تھے۔ تعداد زیادہ نہیں تھی لیکن وہ سب گواہ ہیں کہ میں ایک منٹ کے لیے بھی باہر نہیں نکلا تھا۔ ایسے آدمی کا تم کیا بگاڑ سکتے ہو؟"

"یہ وقت بتلائے گا کہ تقدیر کس کو بگاڑتی ہے اور تدبیر سے کس کا مقدر بنتا ہے۔" میں نے کہا۔ پھر میں نے پیچھے دیکھا تو محسن مجھے بڑے مبہم سے اشارے کر رہا تھا۔ میں نے ان کا صحیح مفہوم اخذ کیا اور غالب سے اسکول میں پیش آنے والے واقعات کا تذکرہ نہیں کیا۔ "تم ہمارا اتنا ہی کام کر دو۔ کبھی نہ کبھی کسی کیس میں یہ گواہ سامنے آئیں گے۔"

"وہ کیس کون کرے گا اور کب کرے گا؟" غالب بولا۔ "اور اس بات کی کیا ضمانت ہو گی کہ گواہی کا مرحلہ آنے تک تمھارے یہ گواہ اس دنیا میں ہوں گے؟ عالمِ ارواح میں تو عدالت کے سمن نہیں پہنچتے۔"

"ہم کوشش کریں گے کہ انھیں خطرات سے آگاہ کر دیں اور تحفظ فراہم کریں۔ زندگی اور موت ہمارے بس میں نہیں لیکن گواہی ہم آج بھی لے سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "جیسے فتح شیر تو مر گیا مگر خود اپنے خلاف گواہی ہمارے پاس چھوڑ گیا۔ میں ابھی تمھیں سناتا ہوں۔"

دروازے پر دستک ہوئی اور ایک بزرگوار اندر آ گئے۔ "بھئی وہ مہمان تھے تمھارے میاں نیک محمد!" وہ بولے۔

"بڑی مہربانی آپ کی جناب۔" ٹیڈی نے برتن اٹھا کے کہا۔ "آپ نے ناحق تکلیف کی۔"

"تکلیف کیسی میاں! ارے بھئی ہمسایوں کا کچھ حق تو ہوتا ہے۔" وہ بولا۔

"آپ کی صاحبزادی نے بہت اچھا کھانا پکایا تھا۔" غالب نے بھی شرافت سے کہا مگر بزرگوار اچھلے۔

"لاحول ولاقوۃ۔ میاں نیک محمد! اتنے بدتمیز اور... اور بداخلاق و بدزبان ہوتے ہیں تمھارے مہمان!"

"میں... میں بہت... بہت معافی چاہتا ہوں۔" ٹیڈی نے ہکلا کے کہا۔ "ان کو معلوم نہیں تھا۔"

"خاک معلوم نہیں تھا۔" بڑے میاں نے پیر پٹخ کے واک آؤٹ کرتے ہوئے کہا۔ "منکوحہ کو بیٹی کہتا ہے۔ نامعقول!"

"اُف! کیا کہہ دیا یہ تم نے سوچے سمجھے بغیر۔" ٹیڈی نے سر پکڑ کر کہا۔ "غالب بھائی! وہ اس کی چوتھی بیوی تھی۔"

"کوئی بات نہیں۔ یہ نظر کا دھوکا ہے۔ ہم نے تو کھانے کی تعریف کی تھی۔" غالب نے بے نیازی سے کہا۔ پھر وہ کیسٹ سننے لگا جس میں دلاور کی اور میری گفتگو الگ تھی جو ہم نے ایف ایم مائک سے ریکارڈ کی تھی۔ دوسرا کیسٹ وہ تھا جس میں فتح شیر کی اور میری گفتگو تھی اور جو میں نے اس سے گھر میں بیٹھ کے کی تھی۔ یہ گفتگو محسن نے باہر اپنی گاڑی میں ریکارڈ کی تھی۔ غالب بہت توجہ کے ساتھ سنتا رہا۔ پھر میں نے اور محسن نے اسے انگلستان میں قیام سے اب تک پیش آنے والے تمام واقعات، ضروری تفصیلات اور ترتیب کے ساتھ سنائے۔ غیر اہم واقعات کو ہم نے اس روداد میں سے خارج کر دیا مگر باقی سب بتا دیا جو چوہدری دلاور نے اور میر شرافت علی نے پہلے میرے والد وزیر خان کے ساتھ کیا تھا اور پھر ہم سب

کے ساتھ۔ اُن میں رابعہ، محسن اور شہلا سب ہی کو نقصان ہوا تھا۔ جتنا نقصان ہم دلاور کو پہنچا چکے تھے وہ بھی ہم نے تسلیم کیا۔ اس آپ بیتی میں سب کا ذکر بالترتیب آیا تھا۔ فوما بچو سے لے کر رابعہ کی ماں، سلامت شاہ، عبدل اور اس کی ماں، شیدے، غلام علی اور ڈی سلوا سے لے کر کرائے کے بدمعاشوں تک سب کے مارے جانے کا ذکر تھا۔ ہم نے واقعات کو اختصار کے ساتھ پیش کیا تھا پھر بھی بہت کچھ رہ گیا۔ باہر سے رابعہ کی کار کا ہارن سنائی دیا، میرا دل ایک دم دھڑکا اور میں نے ایک جست لگا کے دروازے تک پہنچنے اور دیدہ و دل فرشِ راہ کرنے کا ارادہ کیا مگر عقل کے پہرے دار نے مجھے روک لیا۔ دو منٹ بعد رابعہ اندر آئی اور چند لمحے ایسے گزرے جب ہم نے صرف ایک دوسرے کو دیکھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے اور اس کے درمیان جدائی کی صدیاں بیت چکی ہوں اور وہ مجھے پہلے سے کہیں زیادہ حسین اور دلربا لگی۔ ان چند لمحوں میں زمان و مکاں کے فاصلے مٹ گئے تھے اور وہ مجھ میں سما گئی تھی تو میں اس کے وجود کا ایک حصہ بن گیا تھا اور وقت ٹھہر گیا تھا۔ پھر محسن نے چھینک ماری جو بے سبب تھی اور ہنسا۔

"یہ کم بخت عشق، مشک اور زکام چھپائے نہیں چھپتے۔" غالب بولا "اندر آئیں ناجی۔ اپنا ہی گھر ہے۔" رابعہ کا چہرہ ذرا سی دیر کے لیے اس کے گلابی لباس جیسا ہو گیا تھا۔ "میرا نام غالب ہے۔ میں بالکل شاعر نہیں ہوں اس لیے ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ میں ایک سچا یعنی بے وقوف صحافی ہوں۔ آپ کو جانتا ہوں۔ آپ رابعہ قاری ایڈووکیٹ ہیں۔" اس نے کسی تمہید کے بغیر کہا اور اپنا ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھایا۔ مجبوراً رابعہ نے بھی مصافحہ کیا۔ وہ اس کی عادی نہیں تھی لیکن غالب کی ادا میں بے ساختگی تھی۔ محض نیّت کا خلوص تھا اور دوستی کا عہد تھا۔ چنانچہ مجھے یہ حرکت ذرا بھی معیوب نہیں لگی۔

"یہ ایم آر ایس کے نئے رکن ہیں اور اتنے ہی قابلِ اعتماد ہیں جتنے ہم سب۔" میں نے کہا۔

"تم نے ایم آر ایس کا مذاق بنا لیا ہے۔" رابعہ مسکرائی اور پلنگ پر بیٹھ گئی۔

"مذاق؟ کتنے افسوس کی بات ہے کہ آپ جیسی سمجھ دار خاتون ایک سنگین حقیقت کو مذاق کہے۔" محسن بولا۔ "اس سے زیادہ سنجیدہ بات ہم نے پہلے کبھی کی ہے۔ کیوں میاں سکندرِ اعظم؟"

"میرا خیال ہے سنجیدہ بات کے لیے عقل و شعور کی ضرورت پڑتی ہے۔" میں نے کہا "سنجیدہ ہوں آپ"

رابعہ ہنسی۔ "اب تم لڑنے لگو گے۔ یہ تمہاری اس گاڑی کو کیا ہوا؟"

"وہی جو اس سے پہلے دوسری گاڑیوں کا ہوا تھا" نے کہا۔ "اور اب تمہاری اس گاڑی کا ہو گا۔"

"خدا نے تمہیں عقل دی ہوتی تو پہلی بار کے بعد اپنی گاڑی اس شخص کو دینے نہ آتیں۔" محسن نے کہا۔ "مگر وہ جو کہتے ہیں ....کہ خلل ہے دماغ کا۔ تو خیر بی بی! آپ یہ بتائیں کہ منظر ہوتا ہے دخل در نامعقولات کرنے والا؟"

میں نے محسوس کیا کہ رابعہ نروس ہو رہی ہے۔ ایک وجہ تو یہ تھی کہ محسن پر شوخی سوار تھی اور وہ دوسرا موجودگی کا خیال کیے بغیر رابعہ کے پیچھے پڑ گیا تھا لیکن بڑی وجہ یہ تھی کہ غالب اس کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ شک گزرا کہ رابعہ نے غالب کو پہچان لیا ہے۔

"میں ابھی چند دن منظر کے گھر میں ہوں۔" رابعہ نے

"اپنے مکان کی فروخت کے سلسلے میں اس کو جنرل پاور آف اٹارنی دینی تھی۔ کل پرسوں یہ کام ہو جائے گا۔ آفس کا چارج نے اسے دے دیا ہے۔ وہ فرم کے سارے کاروبار کی نگرانی کرے گا۔ دوسرے چاروں وکیل اپنا اپنا کام ویسے ہی کرتے رہیں گے جیسے پہلے کرتے تھے۔"

"ان میں سے کسی نے احتجاج نہیں کیا کہ یہ ذمے داری اسے کیوں نہیں سونپی گئی؟" میں نے کہا۔

"ان میں جو سب سے سینئر ہے وہ میرے ساتھ سب سے زیادہ مخلص ہے۔" رابعہ بولی۔ "مجھے اتنے عرصے بعد آفس میں دیکھ کر وہ خوش بھی ہوئے اور افسردہ بھی۔ ان میں سے ایک شاید جائے لیکن باقی تین نے کہا کہ جیسی آپ کی خوشی۔" پھر اس نے ہینڈ بیگ میں سے ایک چابی نکالی جس کے ساتھ ایک ٹیگ دھاگے سے بندھا ہوا چھوٹا سا کارڈ۔

"یہ مکان خالی ہے اور... اچھا ہے۔" وہ بولی۔ "فی الحال پوری کرے گا۔"

"کرائے پر لیا ہے تم نے؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ ابھی کرائے پر ہی ٹھیک ہے۔ جب سے والا میرا مکان تباہ ہوا ہے میں بے گھر ہوں۔ اب یہ کوٹھی جائے تو خیال ہے ایک مکان خرید لوں۔" وہ بولی۔ مجھے بات کچھ عجیب سی لگی۔ پہلے کبھی اس نے نہیں کہا تھا کہ وہ ہے۔ اس کو بے گھر کرنے کا ذمے دار بھی میں تھا چنانچہ مجھے سے بچانے کے لیے وہ اس ذکر سے بھی گریز کرتی تھی۔

مجھے احساس ہوا کہ دل کے اندر محرومی کے ایک کانٹے کی کسک آج تک اسے تڑپاتی رہی ہے اور اگرچہ میری محبت کے جذبات قوی تر تھے لیکن ان سے خلش آزار کم ہوئی تھی، ختم نہیں ہوئی تھی۔

"یہ گھر بھی تو تمہارا ہی تھا۔" محسن نے کہا۔ "جو تم بیچ رہی ہو۔"

"گھر جب بنائے جاتے ہیں تو بیچے نہیں جاتے، آباد کیے جاتے ہیں۔" وہ بولی۔ "اس کوٹھی میں آباد کون ہو سکتا ہے؟ وہ تو ایک منحوس اور آسیب زدہ کھنڈر ہے جس کی دیواریں بھی جیل کی دیواروں سے زیادہ بے رحم ہیں۔ تم دیکھنا جب میں کوئی گھر خریدوں گی تو اس گھر کی دیواریں میرے لیے اجنبی نہیں ہوں گی۔ میں اب چلتی ہوں۔"

"میں تم کو چھوڑ آؤں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ میں چاہتا تھا کہ اس سے کچھ باتیں کروں اور کچھ باتیں پوچھوں لیکن اس نے مجھے اور محسن کو ہاتھ سے منع کر دیا جو میرے ساتھ ہی کھڑا ہو گیا تھا۔

"میں ٹیکسی لے کر چلی جاؤں گی۔" وہ بولی۔ "تم لوگ ذرا احتیاط رکھو۔ نقد کا انتظام تو اس وقت ہو نہیں سکا۔ میرے پاس یہ دو ہزار ہیں۔" اس نے ہینڈ بیگ سے نوٹ نکال کر محسن کو تھما دیے۔

"کیا بات ہے؟ تم بہت عجلت میں ہو۔" میں نے کہا۔ "ذرا سی دیر بیٹھنے کی روادار بھی نہیں۔"

اس نے مجھ سے نظر ملائے بغیر ایک چیک نکالا۔ "یہ بھی رکھ لو۔ کام آئے گا۔"

"نہیں چاہیے مجھے یہ چیک۔" میں نے برہمی سے کہا۔ "مجھے یہ بتاؤ کہ یکلخت تمہارے لہجے میں یہ اجنبیت کیوں محسوس ہونے لگی ہے مجھے؟ تم صرف ہماری ضرورت پوری کرنے آئی تھیں؟ اپنے کاروبار، اپنے گھر اور اپنی ذات کے تحفظ کا خیال ہے تمہیں اور تم کہہ رہی ہو احتیاط رکھو۔ میرا خیال تھا تم منظر کے گھر میں رہنا منظور نہیں کرو گی۔ ان حالات میں تم ہمارے ساتھ رہو گی۔ کچھ کرو یا نہ کرو، سہارا ہی دو گی لیکن معلوم ہوتا ہے تم ڈر گئی ہو۔ اچانک تمہیں مصلحت اور عاقبت اندیشی کے تقاضوں کا احساس ہو گیا ہے۔ تم نفع نقصان سوچنے لگی ہو۔"

"اس وقت تمہارا دماغ خراب ہو رہا ہے۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ "اس لیے میں کسی بات کا جواب نہیں دوں گی۔"

"صاف کہو کہ جواب دینا نہیں چاہتی ہو۔ ہمت نہیں ہے صاف جواب دینے کی۔" میں نے چلا کے کہا۔ "میرا دماغ تو شروع سے خراب تھا مگر تمہارا دماغ اب ٹھکانے پر آ گیا ہے۔ آدمی ایک کی مانتا ہے... دل کی یا دماغ کی۔ تم نے مجھے مایوس کیا ہے رابعہ!"

وہ اچانک پلٹی اور باہر نکل گئی۔ محسن نے گھور کر مجھے دیکھا اور رابعہ کے پیچھے دوڑا۔ چند سیکنڈ کے بعد فاکس ویگن کا انجن گرجا اور میں سمجھ گیا کہ محسن زبردستی رابعہ کے ساتھ اسے پہنچانے کے لیے نکل گیا ہے۔

غالب نے ایک قہقہہ مارا۔ "کتنا غیر فلمی عشق ہے۔ سچا اور کھرا۔ قسم خدا کی میں نے کسی عورت کو کسی سے بھی یوں محبت کرتے نہیں دیکھا۔ میں تو سمجھتا تھا کہ یہ وکیل ہو گی لیکن یہ تو صرف عورت ہے۔ سچی اور کھری عورت۔"

"قسم مولا علی کی۔ تم نے اس وقت لاکھ روپے کی بات کہی ہے۔" ٹیڈی نے غالب کی طرف دیکھ کر سر ہلایا۔ میں کچھ دیر خالی الذہن کھڑا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ مجھے اپنے ہی الفاظ کے طمانچے اپنے چہرے پر محسوس ہونے لگے۔ یہ میں نے رابعہ سے کیا کہہ دیا! یہ کیا تھا؟ حالات سے حسد و رقابت کا جذبہ، عشق کا جنون یا نروس بریک ڈاؤن؟ رابعہ ناراض ہو گی؟ نہیں۔ وہ مجھ سے ناراض کیسے ہو سکتی ہے! وہ جانتی ہے کہ الفاظ بہت بے وقعت ہوتے ہیں اور جتنی محبت میں اس سے کرتا ہوں وہ لفظوں کی زبان میں نہیں سمجھی جا سکتی۔ جب وہ سب کچھ سمجھتی ہے تو فکر کی کیا بات ہے۔

پندرہ منٹ بعد پھر فاکس ویگن کی آواز آئی جس کا مطلب یہ تھا کہ محسن اسے گھر تک نہیں، قریب ہی کسی جگہ چھوڑ آیا ہے۔ "چلو سر سے بوجھ کچھ تو کم ہوا۔" محسن نے اندر آتے ہی کہا۔ "ایک مصیبت تو ٹلی۔"

"کہاں چھوڑ آیا ہے اسے؟" میں نے بے حد ڈھٹائی سے دانت نکال کے کہا۔ "گھر تک جاتے ہوئے موت آتی تھی۔"

"وہ کہنے لگی، مجھے دلاور صاحب کے گھر کا پتا معلوم ہے۔" محسن نے کہا۔ "اچھا ہے ان سے عقد کر لے گی تو آرام سے رہے گی۔ نہ کوئی مصیبت ہو گی نہ پریشانی۔ جتنا ہمارا ساتھ دینے میں کھویا ہے، اس سے زیادہ پا لے گی۔ میں نے تو کہا کہ دلاور ہر لحاظ سے بہتر ہے۔"

"شہلا کو بھی قائل کر۔ چوہدری صاحب بہت فراخ دل ہیں اور چار بیویوں کی بہر حال گنجائش ہے۔" میں نے کہا۔

"اور تو بھی ان کا پارٹنر بن جا۔ چھوڑ اس تمام جھمیلے کو۔"

"محسن بولا۔ "باپ مر گیا تو مر گیا، تو اپنا فائدہ دیکھ۔ ہم بھی اپنے گھر جاتے ہیں۔" اس کا موڈ آف تھا اور وہ لڑنے پر آمادہ نظر آتا تھا۔

"مجھے پتا ہے تو اس قسم کی زہریلی باتیں کیوں کر رہا ہے۔ رابعہ نے بُرا مانا ہے میری باتوں کا؟" میں نے کہا۔

"بُرا مانا ہے؟ وہ رو رہی تھی الو کے پٹھے!" محسن نے اچانک چلا کر کہا۔ "سب کے سامنے ذلیل کیا تو نے اسے۔"

"سب کے سامنے اس سے معافی بھی مانگ لوں گا میں۔" میں نے کہا۔ "پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔"

"تجھے معلوم ہے اس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟" محسن نے اسی برہمی سے کہا۔ "پولیس پہنچی تھی رضوی صاحب کے گھر۔ انھوں نے لاعلمی ظاہر کی مگر کہا کہ غالباً وہ منظر ایڈووکیٹ کے گھر میں ہو گی۔"

"انھیں کس نے بتایا؟ مطلب یہ کہ انکل رضوی نے کیا منظر کے گھر پر پولیس متعین کر رکھی ہے؟"

"وہ ایس ایس پی ہیں۔ کیا نہیں کر سکتے۔" محسن بولا۔ "سادے کپڑوں میں پولیس دور سے نظر رکھتی ہو گی کہ کون آیا اور کون گیا۔ پولیس نے منظر کے گھر پہنچ کے رابعہ کا بیان لیا۔ منظر اس کے ساتھ تھا چنانچہ وہ مایوس لوٹے۔ وہ ایڈووکیٹ نہ ہوتی اور منظر کا گھر نہ ہوتا تو وہ سلسلہ آگے بڑھاتے یا دبانے کا معاوضہ لیتے۔ اس پولیس انسپکٹر کے قتل کے سلسلے میں اعلیٰ افسروں کا بہت دباؤ ہے۔ رابعہ نے تو کہہ دیا کہ وہاں سے کسی انسپکٹر فتح شیر کی لاش برآمد ہو یا ببر خیر کی۔ میں کیا بتاؤں جب کہ میں کئی ماہ سے اُدھر گئی ہی نہیں۔ انھوں نے کہا کہ پھر آپ نے وہ کوٹھی کیوں خرید کے ڈال دی ہے؟ منظر نے کہا کہ اگر یہ خلافِ قانون ہے تو بات کرو ورنہ دفع ہو جاؤ۔ انھوں نے چند سوالات اور کیے تھے۔ ان میں ایک یہ بھی تھا کہ آپ کا ملازم سکندر بخت سے کوئی رابطہ ہے اور رابعہ نے کہا کہ ہاں وہ میرا موکل ہے لیکن میں بتا نہیں سکتی کہ وہ کہاں ہے۔ پولیس والے بتا گئے ہیں کہ وہ نام تو ایف آئی آر میں شامل نہیں کر رہے ہیں لیکن اس کیس میں ان کی گواہی بہر حال ہو گی اس لیے وہ پتا بدلیں تو پولیس کو ضرور آگاہ کریں۔ منظر نے کہہ دیا کہ پتا میرے گھر کا لکھ لو۔ میں ان کا وکیل بھی ہوں۔ آج کی خبر میں رابعہ قاری ایڈووکیٹ کا نام نہیں تھا مگر کل ہو گا جب دوسرے اخباری نمائندے تفصیلات حاصل کریں گے۔ رابعہ اس وقت بڑا خطرہ مول لے کر یہاں پہنچی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ باہر سادہ کپڑوں والے ہوں گے جو اس کا پیچھا کریں گے۔ اگر وہ گیراج تک جاتی تو گیراج والے کی شامت آ جاتی۔ وہ منظر کی بیوی کا برقع پہن کر نکلی چنانچہ کسی نے اس کا تعاقب نہیں کیا۔ گیراج تک پہنچنے سے پہلے اس نے برقع اُتارا اور اپنی گاڑی لے کر یہاں آ گئی۔ وہ غالب کو اجنبی سمجھ کے اس کے سامنے کچھ بتانا نہیں چاہتی تھی۔ واپسی میں وہ پھر برقع پہن کر جائے گی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ منظر کو کچھ معلوم ہو۔ اس کی بیوی کو سات بجے کسی بچے کو لے کر ڈاکٹر کے پاس جانا تھا اور منظر نے کہا تھا کہ وہ ساڑھے چھ بجے تک آ جائے گا۔ ظاہر ہے منظر کی بیوی کو برقع کی ضرورت ہو گی۔ وہ دیر تک کیسے ٹھہرتی۔"

"میں شرم سے پانی پانی ہو چکا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اب میں بلبلہ ہوں پانی کا۔"

"شاعر نے سچ فرمایا ہے۔" غالب بولا۔ "آدمی کے جسم میں ننانوے فیصد پانی ہی ہوتا ہے۔"

"چابی کس گھر کی ہے؟" میں نے کہا۔

"اس نے اپنا آفس شفٹ کر دیا ہے۔" محسن بولا۔ "اور ریکارڈ سمیت منظر کے حوالے کر دیا ہے۔ منظر کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اپنے آفس کو چھوڑ کر رابعہ کے آفس کے معاملات سنبھالنے آ جاتا۔ منظر نے ایک بڑا فلیٹ لیا ہے جس کے ایک کمرے میں وہ خود بیٹھے گا اور باقی دو کمروں میں رابعہ کے ساتھ کام کرنے والے وکیل۔ کچھ قانونی کارروائی ایسی بھی ہو رہی ہے کہ رابعہ کی لیگل فرم مشترکہ طور پر رابعہ اینڈ منظر ایڈووکیٹس کے نام سے رجسٹرڈ ہو جائے۔ چابی رابعہ کے پرانے آفس کی ہے۔ یہ کارروائی پوشیدہ طور پر نہیں کی گئی تھی چنانچہ پولیس بھی جانتی ہے اور اس کی خبر انکل رضوی تک بھی پہنچ چکی ہو گی۔ پرانے آفس کی طرف اب کسی کا دھیان ہی نہیں جائے گا۔ اس نے کہا ہے کہ ابھی دو چار دن پرانے آفس کو تالا لگا رہے اور وہاں رات کو بھی اندھیرا ہو تو اچھا ہے۔ اس کے بعد وہاں رہنے میں کوئی خطرہ نہیں۔"

"تم نے کہا تھا کہ الطاف کے قتل کو چھپانے میں فتح شیر کے علاوہ بھی کچھ لوگ شریک تھے۔" غالب نے اچانک کہا۔

"ہاں۔ چار ماتحت تھے۔ کانسٹیبل ہوں گے یا ہیڈ کانسٹیبل۔" میں نے کہا۔

"کیسٹ سننے کے بعد میں یہ سوچ رہا ہوں کہ کیا رابعہ کو دلاور کے خلاف استغاثہ دائر نہیں کر دینا چاہیے کہ اس نے فتح شیر کو مار کے یا مروا کے اس کے گھر میں پھینکا اور اسے قتل کر کے اس کا کیریئر اور اس کی گڈ ول تباہ کرنے کی کوشش کی۔"

غالب بولا۔ "اگر وہ گواہ بھی ہوں تو دلاور اب بھی پھنس سکتا ہے۔"

"رابعہ کے لیے کیس کرنا کیا مشکل ہے لیکن وہ یہاں کسی قانونی مسئلے میں اُلجھنا نہیں چاہے گی۔" میں نے کہا۔ "گواہ تو ہیں اور ان کی گواہی بھی حاصل کی جا سکتی ہے۔"

"اگر پولیس کے اپنے آدمی گواہ بن کے پیش ہو جائیں تو فتح شیر کا جرم ثابت ہو جائے گا۔" غالب بولا۔ "اس کے بعد فتح شیر کی گفتگو کے کیسٹ پیش کر کے دلاور کو گھسیٹا جا سکتا ہے۔"

"ہاں۔ صرف گھسیٹا جا سکتا ہے کیونکہ کیسٹ صرف فتح شیر کے خلاف ٹھوس شہادت فراہم کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "دلاور کے خلاف نہیں۔ بے شک قتل کرنے کا سبب موجود ہے اور لاش بھی دستیاب ہو چکی ہے مگر ایک تو اس کے اپنے صفائی کے گواہ بہت مضبوط ہوں گے۔ دوسرے وہ ہمارے گواہوں کو گواہی سے پہلے بدل سکتا ہے یا ختم کر سکتا ہے۔"

"میں اس کے خلاف خود بھی استغاثہ دائر کرنے کو تیار ہوں۔"

"رہنے دو مرزا غالب۔" میں نے کہا۔ "قانون کی بھول بھلیوں میں مت پڑو۔ جو حقیقت ہے وہ ہم بھی جانتے ہیں، تم بھی جانتے ہو۔ فتح شیر کو اس کے کیے کی سزا مل گئی۔ انھیں ہم خود سزا دیں گے جو اُس کے شریکِ جرم تھے۔ تم صرف یہ معلوم کر لو کہ اس رات تھانے میں ڈیوٹی پر کون لوگ تھے اور فتح شیر کے ساتھ گشت پر کون گیا تھا۔"

"چلو۔ مجھے اخبار جا کے اپنی رپورٹ دینی ہے۔" غالب بولا۔ "یہ بھی پوچھ لیں گے۔"

جب ہم باہر نکلے تو رات کا اندھیرا پھیل گیا تھا۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی تو بہت سی پرانی یادوں نے مجھے آزردہ کیا۔ اس گاڑی کا رنگ زمانے کے ساتھ بدل گیا تھا۔ ایک وہ وقت تھا کہ میں اور رابعہ اسی میں راتوں کو شہر کی سڑکوں پر پھرتے تھے۔ اس نے بہت سے مشکل وقتوں میں ہمارا ساتھ دیا تھا اور ہماری ہر زیادتی برداشت کی تھی۔ اب اس کا رنگ سفید تھا اور یہ چمکتی دمکتی کار کسی نئی نویلی دلھن کی طرح پھر حقِ رفاقت ادا کرنے کے لیے موجود تھی۔ میں نے غالب کی ہدایات کے مطابق گاڑی کو مختلف تھانوں کے قریب روکا جہاں وہ چند منٹ کے لیے رکا اور لوٹ آیا۔ اندھیرے کی وجہ سے ہم سب اندر بیٹھے ہوئے لوگ بالکل محفوظ تھے۔ بند شیشوں کے پیچھے کوئی ہماری صورت بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ آخری جگہ وہ تھی جہاں فتح شیر سب انسپکٹر تھا۔ غالب وہاں سے دس منٹ بعد لوٹا تو کچھ پریشان سا تھا۔ اس نے مجھے گاڑی چلانے کا اشارہ کیا۔

"ان میں سے ایک تو آج ڈیوٹی پر آیا ہی نہیں۔" وہ میرے ساتھ بیٹھ کر بولا۔ "دوسرے کا ڈیوٹی پر آتے ہوئے حادثہ ہو گیا۔ ایک ٹرک اسے کچلتا ہوا نکل گیا۔"

"اور ٹرک کا نمبر کوئی نوٹ نہیں کر سکا۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "کل تک دوسرے کے متعلق بھی معلوم ہو جائے گا کہ اس کو بچاس ہزار میں موت کیسے آئی۔ باقی دو کون تھے اور کہاں ہیں؟"

"ایک کانسٹیبل علی نواز ہے اور دوسرا ہیڈ کانسٹیبل چاند خاں۔" غالب نے کہا۔ "دونوں ڈیوٹی پر ہیں، آٹھ بجے تک۔ دونوں کی حالت خراب ہے۔ بظاہر خود کو بیمار بتاتے ہیں لیکن میرا خیال ہے وہ خوف زدہ ہیں۔ انھیں کوئی دھمکی ملی ہے یا وہ خود سمجھ گئے ہیں کہ ان کا انجام بھی مختلف نہیں ہو گا۔ چور تو ان کے دل میں ہے۔"

غالب کو اخبار کے دفتر میں چھوڑ کے ہم واپس گئے۔ مجھے اور محسن کو صاف نظر آ رہا تھا کہ اب دلاور باقی سے دو گواہوں کو زندہ چھوڑ دینے کا خطرہ مول نہیں لے گا۔ ہمیں ان کو بچانا تھا اور یہ کام آسان نہیں تھا۔ اس میں براہِ راست اُن سے تصادم کے امکانات بہت زیادہ تھے جو فتح شیر کی موت کے بعد اور الف دین کے غائب ہو جانے کے بعد فوری طور پر باقی چار افراد کے قتل پر مامور کیے گئے تھے۔ دو کو وہ ختم کر چکے تھے چنانچہ باقی دو کے لیے بھی بات صرف موقعے کی تھی۔ میں نے محسن کو تیار رہنے کو کہا۔ ہم جس مشن پر نکلے تھے اس کے لیے تمام ضروری سامان ہمارے پاس تھا۔ میرے پاس دلاور کا دیا ہوا سائلینسر والا پستول تھا جس میں ابھی چار گولیاں باقی تھیں۔ محسن کے پاس پورا بھرا ہوا ریوالور تھا اور ٹیڈی کے پاس کلوروفارم کی وہ شیشی تھی جو ہمیں الف دین سے ملی تھی۔ یہ ہو سکتا تھا کہ ہمیں ان ..... میں سے کسی کو اغوا کرنا پڑتا۔ اس کے لیے یہی سامان ہمارے کام آ سکتا تھا۔

تھانے سے کچھ فاصلے پر ہمیں ایک ٹرک کھڑا ہوا نظر آیا۔ ایک شخص ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا اور جب وہ کش لیتا تھا تو صرف ایک چنگاری سی روشن ہوتی تھی۔ اس کا اپنا چہرہ اندھیرے میں تھا۔ دوسرا بمپر کے اوپر چڑھا بونٹ میں سر ڈالے بظاہر کسی خرابی کو رفع کرنے کی کوشش میں مصروف تھا لیکن یہ کسی بھی جگہ ٹھہرنے کا وہ طریقہ تھا جو شک پیدا نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے گاڑی کی ہیڈ لائٹس

آف کر دیں۔

"یہ ٹرک پہلے تو نہیں تھا یہاں۔" میں نے محسن کو متوجہ کیا اور گاڑی کو ٹرک کے پیچھے لے جا کر روک لیا۔ "یہ وہی ٹرک تو نہیں ہے جس نے ایک گواہ ختم کر دیا۔ شاید دو۔"

"محض شک کی بنیاد پر کیا ہو سکتا ہے۔" محسن بولا۔ "ہم جا کے کیسے پوچھ سکتے ہیں کہ یہاں کیوں کھڑے ہو؟ علی نواز اور چاند خاں کا انتظار کر رہے ہو کہ وہ ڈیوٹی کر کے نکلیں تو انھیں بھی کچل ڈالو۔"

"ٹیڈی! ایک کام کرو استاد۔" میں نے کہا۔ "ذرا مکینک بن کے جاؤ۔ زبردستی اس شخص کی مدد کرو۔ میں ذرا پیچھے ہوں گا۔ ان کے رویے سے اندازہ ہو جائے گا۔ محسن، وہ اسپیڈ بریکر نکال۔"

میں اور ٹیڈی آہستہ سے دروازہ کھول کے اترے۔ لکڑی کے دو گٹکے میرے ہاتھ میں تھے۔ جن پر موٹی کیلیں ایک ایک انچ ابھری ہوئی تھیں۔ ٹیڈی چند قدم آگے گیا اور رک گیا۔ میں سائڈ میں دبک کے بیٹھ گیا۔ کوئی آواز کیے بغیر میں نے لکڑی کے بلاک دو پہیوں کے ساتھ لگا کے یوں رکھ دیے کہ کیلوں کا رخ اوپر کی طرف رہے۔

"کیا بات ہے بھائی؟" ٹیڈی کی آواز آئی۔ "کیا خرابی ہو گئی ہے؟"

"اپنا کام کر۔ خرابی کا ماما۔" انجن میں خرابی تلاش کرنے والے نے غرا کے کہا۔

"میں ایسے ہی نہیں پوچھ رہا ہوں۔" ٹیڈی بولا۔ "ٹرکوں کا کام کرتا ہوں۔ ایک نظر دیکھنے دو۔"

غالباً ٹیڈی نے بھی بمپر پر چڑھنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے ایک زبردست گالی سنی۔

"تو مکینک ہے تو میں جرنیل ہوں۔ دفع ہو جا۔" ٹیڈی کو ایک اور گالی ملی۔

"پہلے دھکا دیا اب گالی دیتے ہو۔" ٹیڈی گرم ہو گیا۔ "نیکی کا زمانہ ہی نہیں ہے۔"

"کون ہے یہ؟" ٹرک کے ڈرائیور نے نسبتاً نرم لہجے میں سوال کیا۔

"ایسے ہی استاد۔ خواہ مخواہ متھے لگ رہا ہے کہ مکینک ہوں۔" پہلے والے نے کہا۔ "کمبل ہو گیا ہے۔"

"میں واقعی بہت تجربے کار مکینک ہوں۔" ٹیڈی نے استاد کے پاس آ کے کہا۔ "میں نے کوئی پیسے تو نہیں مانگے تھے۔ ایسے ہی مدد کے لیے رک گیا تھا۔ اس نے گالی بکی۔"

"اچھا بھائی معاف کرو۔" ڈرائیور نے کہا۔ "خرابی کوئی نہیں اور ہو گی تو ہم ٹھیک کر لیں گے۔ تم جاؤ۔"

میرا شک اب یقین میں بدلنے لگا تھا۔ ٹیڈی اب چند قدم دور جا کھڑا ہوا تھا۔

"اب کیوں کھڑا ہے۔ جاتا کیوں نہیں ہے۔" ڈرائیور نے زیادہ سخت لہجے میں کہا۔

"اب سڑک پر کھڑے رہنے پر بھی پابندی ہے کیا" ٹیڈی بولا۔ "دیکھ رہا ہوں تم سے ٹھیک نہ ہو تو میں..."

ڈرائیور ایک خوفناک گالی بک کے اترا۔ "تو ایسے نہیں جائے گا۔ پابندی کے بچے۔"

"او چلا جا میاں۔ کیوں پنگا لیتا ہے۔" بمپر پر چڑھے ہوئے شخص نے کہا۔

"میں نہیں جاؤں گا۔" ٹیڈی نے چیخ کر کہا۔ "تمہارے باپ کی سڑک ہے۔ تم کھڑے ہو تو میں بھی کھڑا ہوں۔"

ٹیڈی کے الفاظ کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ وہ دونوں اس کی طرف لپکے اور ٹیڈی بھاگ کھڑا ہوا۔ پلک جھپکنے میں میں نے کھلے دروازے سے ٹرک کی چابیاں نکال لیں اور واپس ہوا۔ ڈرائیور کے واپس آنے تک میں کار کے اندر تھا۔ ٹیڈی کے پیچھے وہ مشکل سے بیس قدم دوڑ کر واپس لوٹ آئے تھے۔ ان کا ارادہ تعاقب کرنے یا اس کے ساتھ جھگڑا کرنے کا تھا بھی نہیں۔ ڈرائیور واپس لوٹ کر اوپر چڑھا اور پھر اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ اندھیرے میں اسے اندازہ نہ ہو سکا کہ چابیاں غائب ہیں۔ اسے اچانک جانا پڑا تھا چنانچہ اس نے چابیاں نکالنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ وہ یہ کیسے فرض کر سکتا تھا کہ اسے بے وقوف بنایا گیا ہے اور دو منٹ کے مختصر وقفے میں کوئی چابیاں نکال کر لے گیا ہے۔ ٹیڈی نہ جانے کدھر نکل گیا تھا۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی۔ امید یہ تھی کہ وہ لوٹ آئے گا اور اگر نہ آ سکا تو گھر پہنچ جائے گا۔ میں نے گھڑی کے روشن ڈائل کو دیکھا۔ آٹھ بجنے میں دس منٹ باقی تھے۔ اچانک میں نے ٹرک ڈرائیور کو چلاتے سنا۔ اس کا ساتھی اب بونٹ بند کر چکا تھا۔ میری طرح وہ بھی سمجھ رہے تھے کہ عمل کی گھڑی آ پہنچی۔ آٹھ بجے ڈیوٹی سے آف ہونے والے اگر پانچ دس منٹ پہلے نکل آئیں تو انھیں تیار ہونا چاہیے۔ چنانچہ غیر ارادی طور پر "سب ٹھیک ہے" کا اطمینان کرنے کے لیے اس نے چابیاں گھما کے یہ دیکھنا چاہا ہوگا کہ انجن بالکل ایک اشارے پر اسٹارٹ ہو سکتا ہے؟ میں ان کی آوازیں صاف نہیں سن سکتا تھا لیکن ان کی بدحواسی سے اندازہ ہوتا تھا کہ چابیاں نہ ملنے پر مسئلہ سنگین صورت اختیار کر گیا ہے۔ وہ ایک دوسرے کو الزام دے رہے تھے اور ٹرک کے اندر اوپر نیچے چابیاں تلاش کر رہے تھے۔ ٹرک کا رخ دیکھ کر میں نے اندازہ کیا کہ ڈیوٹی ختم کر کے نکلنے والے سپاہی کس طرف جائیں گے۔

"میں آگے جاتا ہوں۔" میں نے محسن سے کہا۔ "تو جیسے ہی انھیں نکلتا دیکھے تھوڑے سے وقفے کے بعد گاڑی لے کر آگے آ جانا۔ امید ہے ہم انھیں نکال لے جانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔" میں نے آہستہ سے کار کا دروازہ کھولا اور اترنے ہی والا تھا کہ محسن نے مجھے روک لیا۔

"میں ان کو پہچانوں گا کیسے؟ یہاں تو لوگ مسلسل آ جا رہے ہیں۔"

"وردی والوں کو چھوڑ دے۔ وہ ڈیوٹی ختم کر کے نکلیں گے تو بغیر وردی کے ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "اس کے علاوہ ان دونوں کی کوشش ہو گی کہ اکٹھے رہیں۔ ممکن ہے وہ خوفزدہ ہونے کی وجہ سے پہلے ہر طرف دیکھیں اور روانہ ہونے کے بعد بھی مڑ مڑ کر دیکھتے جائیں۔ ٹرک والوں کا ردعمل بھی....."

میری بات ادھوری رہ گئی کیونکہ اسی وقت تھانے میں سے دو افراد برآمد ہوئے۔ انھوں نے شلوار قمیص کے اندر کمبل سے یوں بکل مار رکھی تھی کہ سردی سے بچنے کے علاوہ اپنا چہرہ بھی چھپا لیں۔ وہ دونوں کچھ دیر گیٹ پر کھڑے رہے۔ پھر واضح طور پر ایک نے دوسرے کو سر کی جنبش سے چلنے کا اشارہ کیا اور وہ تھانے کی دیوار کے ساتھ ساتھ چل پڑے۔ ایک بار انھوں نے پلٹ کر دیکھا تو میں روانہ ہو گیا۔

"اب کیا ہو گا..." ٹرک کے ڈرائیور نے گالی دے کر کہا اور ٹرک کے لات ماری جو ایک احمقانہ اور اضطراری حرکت تھی۔ "تو اندھا ہو گیا تھا۔"

"مجھے الزام مت دو استاد۔ یہاں کوئی نہیں آیا۔ تم اندر بیٹھے تھے تو چابیاں تمہارے پاس تھیں۔"

"یہ سب اسی... کا چکر ہے۔ کون تھا وہ؟" ڈرائیور نے جو گالی دی وہ ٹیڈی کے لیے تھی۔

"کمال کرتے ہو۔ وہ باہر مجھ سے بات کرتا رہا اور بھاگ گیا۔ تم نے ہی کہیں گرا دی ہے چابی۔" کلینر بولا۔

"کہاں گرا دی ہے؟ کتے کی طرح بھونکتا جا رہا ہے۔ سب جگہ تو دیکھ لیا۔" ڈرائیور نے چیخ کر کہا۔

ان دونوں کے قریب سے گزرتے ہوئے میں نے قطعی بے نیازی کا انداز اختیار کیا لیکن ان کی گفتگو کا کچھ حصہ ضرور سن لیا۔ فٹ پاتھ پر دبک کر ساتھ ساتھ جانے والے دونوں مجرم کسی نادیدہ دشمن کے خوف میں مبتلا تھے چنانچہ بار بار پلٹ کر دیکھتے تھے۔ میں سمجھ سکتا تھا کہ اس وقت ان کے دلی جذبات کیا ہوں گے۔ عام دنوں میں وہ چھوٹے موٹے کیس کو دس بیس یا سو پچاس میں نمٹا دیتے ہوں گے۔ قدرت نے پہلی بار ان کو پچاس ہزار یکمشت دلوائے تھے لیکن اب انھیں اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ شیطان کا پھیلایا ہوا طمع کا جال تھا اور بازی الٹ جانے سے ان کی توقعات بھی غلط ہو گئی ہیں۔ انھوں نے پچاس ہزار میں کوئی بڑا کام کرنے کا سوچا ہو گا۔ کوئی مشکل حل کرنے کا سوچا ہو گا یا اس رقم سے اپنا مستقبل سنوارنے کا سوچا ہو گا۔ اب وہ خود مشکل میں تھے اور مستقبل خطرے میں پڑ گیا تھا۔ اتنی عقل تو خدا نے ان کو بھی دی تھی کہ فتح شیر کے عبرتناک انجام کے بعد اپنے ایک ساتھی کے ساتھ پیش آنے والے حادثے اور دوسرے کی اچانک گمشدگی کا سلسلہ ملا سکیں۔ میں پچاس قدم کے فاصلے سے ان کے پیچھے رہا۔ جب انھوں نے موڑ کاٹا تو میں نے رفتار بڑھائی اور فاصلہ کم کیا۔ دس منٹ بعد میں نے انھیں جا لیا۔

"تم چاند خاں اور علی نواز ہو نا؟" میں نے ان کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اچانک کہا۔

وہ دونوں اچھل پڑے۔ "تم... کون ہو تم؟ ہم تمھیں نہیں جانتے۔" ان میں سے ایک نے ہمت کر کے کہا۔

"ہاں، لیکن میں تمھیں جانتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں تمہارا دشمن نہیں، دوست ہوں۔ دشمنوں نے تو پورا بندوبست کر لیا تھا کہ تم کو بھی ٹرک سے کچل کر ہلاک کر دیں لیکن میں نے ان کی کوشش کو ناکام بنا دیا۔ پیچھے مت دیکھو، چلتے رہو۔"

"کیوں... کیا ثبوت ہے تمہارے پاس اس بات کا؟" دوسرا خوفزدہ لہجے میں بولا۔ "تم یہ سب کیسے جانتے ہو؟"

"میں تم کو سب بتا دوں گا۔ کیا یہ غلط ہے کہ تم بھی فتح شیر کے ساتھ چودھری دلاور کے گھر گئے تھے؟" میں نے کہا۔ "اور وہاں سے تم نے ایک لاش اٹھائی تھی۔ اس کام کے تمھیں پچاس پچاس ہزار روپے ملے تھے۔ فتح شیر مارا گیا اور تمہارے ساتھ جانے والا ایک آدمی بھی۔"

"اس کے ساتھ حادثہ پیش آیا تھا۔" پہلے نے تھوک نگل کے خشک حلق کو تر کیا۔

"دوسرے کے ساتھ بھی حادثہ ہی پیش آیا تھا۔ تم کو ابھی

معلوم نہیں" میں نے کہا "اور اگر میں کوشش نہ کرتا تو ابھی تم دونوں ایک ساتھ بالکل ویسے ہی حادثے کا شکار ہو جاتے۔ ایک ٹرک تم دونوں کے اوپر سے گزر جاتا۔ یقین نہیں تو جا کے تھانے کے باہر دیکھ لو۔ وہ ٹرک ابھی موجود ہوگا اور شاید صبح تک وہیں کھڑا رہے گا۔"

"تم... تم کو کیا... میرا مطلب ہے تم نے ہمیں کس لیے بچایا ہے؟" پہلے نے کہا۔

"اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تم ہی دوست بن کے مار جاؤ۔" دوسرا بولا۔ میں نے پیچھے سے فاکس ویگن کی آواز سنی۔

"دیکھو۔ میں بھی واقعی دوست نہیں ہوں۔ میں چوہدری دلاور کا دشمن ہوں۔" میں نے کہا "لیکن اب وہ تمہارا دشمن ہو رہا ہے تو میں اس کی مدد نہیں کر سکتا۔ یہ گاڑی آ رہی ہے۔ ہمارے ساتھ بیٹھو اور اپنے گھر چلو۔ پہلے بیوی بچوں کو کہیں پہنچا دو۔ کسی عزیز رشتے دار کے گھر جہاں وہ محفوظ ہوں۔"

فاکس ویگن قریب آ رکی اور محسن نے اس کا دروازہ کھول دیا۔ وہ دونوں ایک ساتھ چلانے لگے۔

"بیٹھو" میں نے کہا۔

"چاند خاں! دھوکا ہے یہ۔" علی نواز نے کہا "گاڑی میں مت بیٹھنا۔"

"جاؤ... جاؤ تم لوگ۔" علی نواز چلایا۔ مجبوراً میں نے ریوالور نکالا۔ ان دونوں کی آواز ایک دم بند ہو گئی لیکن وہ اپنی جگہ کھڑے رہے۔ میں نے سامنے سے دو افراد کو آتے دیکھا۔ ان کی مداخلت کام خراب کر سکتی تھی۔ شاید محسن نے میری مشکل کا اندازہ کر لیا۔ وہ باہر نکلا ہی تھا کہ میں نے چاند خاں کے سر پر ریوالور کا دستہ مار کے اسے ناک آؤٹ کر دیا۔ گرنے سے پہلے اسے محسن نے سنبھال لیا اور گھسیٹ کر لے گیا۔ دوسرا اپنے ساتھی کا یہ انجام دیکھ کر رضا کارانہ طور پر آگے بڑھا۔ فاکس ویگن کے دو دروازوں نے ہمارے لیے تھوڑی سی مشکل پیدا کی۔ محسن ابھی چاند خاں کو پچھلی سیٹ پر ڈال ہی رہا تھا کہ دونوں راہ گیر چلانے لگے۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟" اور ہماری طرف دوڑے۔ میں نے دیکھا تو پیچھے سے بھی تین آدمی شور مچاتے آ رہے تھے۔ وہ ایک لیمپ پوسٹ کے نیچے تھے چنانچہ دو کو میں نے فوراً پہچان لیا۔ وہ ٹرک کے ڈرائیور اور کلینر تھے جو ٹرک کے بے کار ہو جانے کے بعد وقت ضائع کیے بغیر اپنے شکار کے تعاقب میں روانہ ہو گئے تھے۔

"فائر کر محسن!" میں نے چلا کر کہا "ورنہ ہم پھنس جائیں گے۔" اور محسن نے جیب سے ریوالور نکال کے ایک ہوائی فائر کیا۔ ہماری طرف دوڑنے والے ایک دم رک گئے۔ ان میں ... گرا اور باقی پلٹ کر بھاگے۔

"ہیڈ لائٹس آف رکھنا" میں نے چاند خاں کو ... ڈال کے علی نواز کو دھکیلا اور خود محسن کے ساتھ بیٹھ ... بند کر لیا۔ محسن نے گاڑی کو پورا ایکسلریٹر دیا اور فاکس ... ایک زبردست جھٹکے سے آگے بڑھی۔ فٹ پاتھ پر اب ... ہو گیا تھا۔ ٹرک ڈرائیور اور کلینر شور مچانے والوں ... تھے اور اغوا کی اس واردات کا آنکھوں دیکھا حال بیان کر ... تھے جو ایک تھانے کے سامنے پیش آئی تھی۔

دو منٹ میں فاکس ویگن کئی موڑ کاٹنے کے بعد جائے واردات سے بہت دور نکل آئی تھی اور ہم کسی فوری خطرے سے محفوظ تھے۔ ریوالور اب بھی میرے ہاتھ میں تھا اور ... آگے دیکھنے کے بجائے پیچھے دیکھ رہا تھا۔ سیٹ کے اوپر ... ریوالور کا رخ علی نواز کی طرف تھا جسے اپنی موت کا یقین ... تھا۔ محسن نے گاڑی کو فورٹریس اسٹیڈیم کی دیوار کے سائے میں روک لیا۔ "تمہیں پچاس ہزار روپے جیب میں ڈالنے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا کہ جس شخص نے ایک لاش کو کسی ... جگہ پر دفن کرنے کا معاوضہ ادا کیا ہے وہ تمہاری لاش غائب کرنے کے لیے کسی اور کو بھی پچاس ہزار دے سکتا ہے۔" ... نے کہا۔

"چوہدری صاحب نے ہمیں بھی پچاس پچاس ہزار ... تھے۔" محسن بولا "چار افراد کے نام پتوں کے ساتھ۔"

"اب تم یہ بتاؤ کہ تم کو کہاں مرنا قبول ہے؟" میں نے ...

"ایک فتح شیر تھا۔ اس کا سر اور باقی جسم ایک ساتھ قبر میں ... دیے گئے ہیں۔ دوسرے کی لاش کا قیمہ مردہ خانے میں پڑا ... اور تیسرے کی لاش ابھی دو چار دن بعد دریافت ہو گی۔ جب ... کر بو دینے لگے گی۔ بیوی بچوں سے کچھ کہنا ہے تو بتا دو ... پہنچا دیں گے۔"

"دیکھیں جی! ہم سے غلطی ہوئی... مگر ہم کیا کرتے ... حکم کی تعمیل پر مجبور تھے۔ فتح شیر افسر تھا۔" علی نواز نے ... ہوئی آواز میں کہا "ہم نہیں جانتے کہ وہ کس کی لاش تھی۔"

"یہ تو معلوم ہوگا کہ وہ لاش کہاں ہے؟" میں نے ...

علی نواز نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"ہم تمہیں چھوڑ بھی سکتے ہیں۔" میں نے کہا "کیوں ..." میں نے محسن کو مخاطب کیا۔

"ہاں استاد۔ یہ تو سودے کی بات ہے۔" محسن نے کہا "ایک سودا ہم نے چوہدری صاحب سے کیا تھا ... الٹا سے بھی کر سکتے ہیں۔ چوہدری صاحب کو کیسے معلوم ہو سکتا ہے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔ ہم ان سے کہہ سکتے ہیں کہ آپ کا کام ہو گیا۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا "اور ان کو موقع دے سکتے ہیں کہ اپنے بیوی بچوں کو لے کر بھاگ جائیں اور پھر کبھی چوہدری صاحب کے سامنے نہ آئیں۔"

"مجھے... مجھے منظور ہے۔ دیکھو میری بیوی کے بچہ ہونے والا ہے۔" علی نواز رونے لگا "پہلا بچہ ہے یہ میرا۔"

"روتا کیوں ہے۔ کیا بچے یتیم پیدا نہیں ہوتے؟" میں نے بے رحمی سے کہا اور اس کے ایک چھانپڑ رسید کیا "تیری بیوی تو جوان ہو گی۔ پال لے گی اسے کسی نہ کسی طرح۔ اور اگر تجھے منظور نہیں تو ہم اس کو بھی نگلوا لیتے ہیں۔"

"خدا کے لیے رحم کرو مجھ پر۔ تم کیا چاہتے ہو؟ جو کچھ میرے پاس ہے وہ سب لے لو۔" علی نواز نے کہا۔

چاند خاں نے آہستہ سے حرکت کی اور اٹھ بیٹھا "بزدل بنتے!" وہ علی نواز کو حقارت سے دیکھ کر بولا "اتنا ہی ڈرپوک تھا تو پولیس میں کیوں بھرتی ہوا تھا۔ کیا بگاڑ سکتے ہیں یہ میرے اور تیرے بیوی بچوں کا۔ انھیں کیا معلوم وہ کہاں ہیں؟"

علی نواز نیا بھرتی ہوا تھا۔ چاند خاں اس کے مقابلے میں پرانا ہی نہیں دلیر بھی تھا۔ اس نے سر کو جھٹکا دیا اور پھر میری طرف دیکھا "میں جانتا تھا تم دھوکے باز ہو۔ ریوالور سے کام نہ لیتے تم تو میں بتاتا تمھیں۔"

"استاد! یہ بہادر آدمی ہے۔" میں نے محسن سے کہا "مقابلہ کرنا چاہتا ہے۔"

"مرد کے بچے ہو تو خالی ہاتھ سامنے آؤ۔" چاند خاں نے ہیکڑی سے کہا "ورنہ گولی مار دو ــــ ہم مرنے سے نہیں ڈرتے ہیں۔"

"چلو استاد" محسن بولا "ان کو اپنے تھانے لے چلتے ہیں۔ وہاں مقابلہ بھی ہو جائے گا اور تفتیش بھی کر لیں گے۔ تم اپنے تھانے میں تو روز ہی تفتیش کرتے ہو گے چاند خاں۔ آج دیکھو کہ ہم کس طرح تفتیش کرتے ہیں۔"

اس وقت تک میں سمجھا نہیں تھا کہ 'اپنے تھانے' سے محسن کی کیا مراد ہے۔ ان دونوں کو ہیڈی کے ٹھکانے لے جانا بھی ٹھیک نہیں تھا۔ وہاں پورا محلہ آباد تھا اور وہ ہماری واحد جائے پناہ تھی۔ جہاں کسی قسم کی پر تشدد کارروائی کرنا ہمارے حق میں برا ہوتا۔ دوسری جگہ وہ کوٹھی جہاں پہلے رابعہ کا آفس تھا اور جس کی چابی اب ہماری جیب میں تھی لیکن وہ جگہ بھی فی الحال محفوظ نہیں تھی۔ جب محسن نے گاڑی کا رخ رابعہ کی اسی کوٹھی کی طرف کیا جہاں فتح شیر کا قتل ہوا تھا تو میں نے اس کے انتخاب اس کی ذہانت اور ہمت کی داد دی۔ لاش وہاں سے اٹھائی جا چکی تھی اور تفتیش کا عمل بھی مکمل ہو چکا تھا۔ رات کے وقت وہاں اب ایک کانسٹیبل کی ڈیوٹی ہوگی ورنہ وہ بھی نہیں۔ پولیس نے عمارت کو سیل کرا دیا ہوگا اور یہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ اس عمارت کے اندر پھر کوئی واردات کرنے جا سکتا ہے۔ سڑک اب خالی تھی اور فاکس ویگن کی آواز اتنی تھی کہ چاند خاں شور کرتا تب بھی بند شیشوں سے باہر اس کی کوئی نہ سنتا۔

"کہاں لے جا رہے ہو تم ہمیں؟" چاند خاں نے کہا "تم کو پہچان لیا ہے میں نے سکندر بخت! تم خود ایک اشتہاری مجرم ہو اور تم نے ایک اور جرم کیا ہے دو پولیس والوں کو اغوا کر کے۔ پولیس والے سرکاری ملازم ہوتے ہیں۔"

میں نے اس کے منہ پر ریوالور کا بٹ مارا۔ وہ بلبلایا اور اس کے لبوں کے گوشوں سے خون بہنے لگا۔

"سرکاری ملازم کی اولاد! وہ سرکار کا کام تھا جو تو نے پچاس ہزار میں کیا تھا۔ مجھے میرا جرم بتاتا ہے۔ اپنا جرم یاد کر۔" میں نے کہا "میں تو اشتہاری مجرم ہوں۔ جہاں اتنے قتل کیے ہیں وہاں ایک اور سہی لیکن دلاور جس کا نام ہے وہ اشتہاری مجرموں سے بڑا مجرم ہے۔ میں تو اتنا لحاظ کروں گا کہ تیرے جرم کی سزا صرف تجھ کو ہی ملے مگر وہ تیرے خاندان کے بچے بچے کو مار ڈالے گا۔"

"خدا کے لیے ہم اپنی غلطی مانتے ہیں۔" علی نواز کانپتے ہوئے بولا "میں سب بتا دیتا ہوں۔"

میں نے اس کے بھی ایک جھانپڑ مارا "ہمیں پاس سورما سے پوچھنا ہے۔ تیری باری بعد میں آئے گی۔"

رابعہ کی اس کوٹھی کے گرد خاموشی تھی۔ اندر اندھیرا تھا اور آس پاس کسی کی موجودگی ثابت نہ ہوتی تھی۔ میں نے ریوالور محسن کو دیا اور خود نیچے اتر کے کوٹھی کے گرد ایک چکر لگایا۔ دیوار کے قریب سے مجھے باتوں کی آواز آئی۔ میں نے ہاتھوں کے بل خود کو اوپر کھینچا اور اندر جھانکا۔ دو کرسیوں پر دو پولیس والے بیٹھے تھے جن میں سے ایک کے کندھے پر ایک ستارہ تھا۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ پولیس اس کیس میں غیر معمولی دلچسپی لے رہی ہے اور رات کے وقت بھی ایک اے ایس آئی اور ایک کانسٹیبل جائے واردات پر پہرا دے رہے ہیں۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر مجھے ٹین کا ایک خالی ڈبا نظر آ گیا جو نہ جانے

کب سے یونہی پڑے پڑے زنگ سے گل گیا تھا۔ میں نے ڈبا دیوار کے اوپر سے اندر اچھال دیا اور خود بھی اندر کود گیا۔ ڈبا فرش پر گرنے سے آواز پیدا ہوئی۔ میں دیوار سے چپک کر ایک کونے میں کھڑا ہو گیا۔ حسبِ توقع افسر نے ماتحت کو بھیجا۔ کانسٹیبل ٹہلتا ہوا اور اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا آیا۔ وہ میرے سامنے سے گزرنے لگا تو میں نے اسے یوں دبوچ لیا جیسے گھات میں بیٹھی ہوئی بلی اپنے پنجوں میں چوہے کو دبوچتی ہے۔ اس کی آواز تک نہ نکلی اور میرے ہاتھ کی ایک ضرب نے اسے ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیا۔ میں نے اسے اپنے سامنے صاف جگہ پر لٹا دیا اور حلق سے ایک درد بھری آواز نکالی۔ اے ایس آئی دوڑتا ہوا آیا۔ "کیا بات ہے... کون ہے؟" ریوالور اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس کی نظر نے زمین پر پڑے ہوئے کانسٹیبل کو فوراً دیکھ لیا۔ وہ بہت محتاط طریقے پر آگے بڑھا اور بے ہوش سپاہی پر جھک گیا۔ اسی وقت میں نے جست لگائی اور اے ایس آئی چند سیکنڈ کی مزاحمت کے بعد ساکت ہو گیا۔ میں نے اس کا ریوالور اپنی دوسری جیب میں ڈالا اور باہر نکلا۔ فاکس ویگن سو گز کے فاصلے پر ایک شکستہ مکان کے پیچھے موجود تھی جس کی صرف دو دیواریں سلامت کھڑی تھیں۔ میں نے ڈرائیونگ سنبھالی اور فاکس ویگن کی ہیڈ لائٹس جلا کے گاڑی کو اطمینان سے کوٹھی میں لے گیا۔

"باہر نکلو دونوں۔" میں نے حکم دیا۔ "اور دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔ ہاتھ اوپر اٹھائے رکھو۔"

انھوں نے تعمیل کی اور محسن نے ان کی جیب سے ہر چیز نکال لی۔ دونوں کی جیب سے بارہ سو روپے برآمد ہوئے۔ محسن نے ان کی گھڑیاں بھی اتار لیں۔

"جب کسی ملزم کو تھانے لایا جاتا ہے تو تم بھی یہی کرتے ہو نا؟" میں نے کہا۔ "یہ ہمارا پرائیویٹ تھانہ ہے اور ہم یہاں تمھارے ساتھ وہی کریں گے جو تم بعض اوقات بے گناہوں کے ساتھ بھی کرتے ہو۔" جامہ تلاشی کے بعد میں ان کو اوپر لے گیا اور اپنا ریوالور محسن کو دیا۔ "اگر یہ بہادر سپاہی مرنا چاہے تو بلا تکلف گولی مار دینا۔ سائلینسر کی وجہ سے آواز باہر نہیں جائے گی۔"

نیچے آ کے میں نے دونوں بے ہوش پڑے ہوئے پولیس والوں کو دیکھا۔ باری باری میں نے ان کو کندھے پر ڈالا اور اوپر لے گیا۔ محمود و ایاز کو ایک ساتھ خلعتِ فاخرہ سے محروم کرنے کے بعد میں نے ان کے ہاتھ پاؤں باندھے۔ ہمارے بستر اب بھی وہیں بچھے ہوئے تھے۔ ان کی چادروں کو پھاڑ کے میں نے رسّی کا کام لیا اور پھر ان کے حلق میں ... ٹھونس دیا۔

"یہ بھی تمھارے افسر تھے۔" میں نے چاند خاں ... کہا۔ "باوردی افسر تھے اور ڈیوٹی پر تھے۔ ان کی حالت ... رہے ہو؟"

"میرا ساتھ بھی ایسے ہی پڑے رہیں گے اور ... اکڑ کے مر جائیں گے۔" مح... بولا۔

"آؤ میں تم کو فتح شیر کا مزار بھی دکھاؤں۔" م... چاند خاں کی گدّی پر ہاتھ رکھ کے ایک جھٹکا دیا۔ ... تھا کہ میں نے اسے لات ماری اور وہ آگے جا کے ... کے دروازے سے ٹکرایا۔ باتھ روم کا دروازہ کھل گ... چاند خاں منہ کے بل گرا لیکن گرتے ہی پھر کھڑا ہو گیا ... نے ریوالور ایک ہاتھ میں رکھا اور دوسرے ہاتھ ... لائٹر جلایا۔

"یہ دیکھو۔ یہ سب فتح شیر کا خون ہے۔" م... "فرش پر اور دیواروں پر۔ اس کا سر یہاں پڑا تھا ا... یہاں۔ تمھاری لاش کے چار ٹکڑے بھی کیے جا سک... باہر نکلو۔"

"تم اس طرح مجھے دہشت زدہ نہیں کر سکتے۔" ... نے کہا۔ وہ ضدی اور باہمت آدمی تھا۔

میں نے ریوالور ایک طرف رکھ دیا۔ "اب آ جا... مقابل۔ ہم اور تم دونوں خالی ہاتھ ہیں۔" میں نے کہا۔

چاند خاں نے بے یقینی سے مجھے دیکھا۔ مي... کو ٹھوکر مار کے کمرے کے آخری گوشے میں پھینک د... کھڑا ہو گیا۔

"ڈرو نہیں۔ مقابلے میں کوئی مداخلت نہیں کر..." میں نے کہا اور ہاتھ آگے بڑھایا۔ چاند خاں کچھ دیر ساکت... پھر اس نے میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے اپنی طرف کھینچا۔ ا... میں وہ نیچے لیٹ گیا اور اس نے مجھے اپنے اوپر سے گز... فرش پر پھینک دیا۔ اس کا اعتماد بے بنیاد نہیں تھا... کے داؤ جانتا تھا۔ میں بڑی پھرتی سے الٹی قلابازی... اٹھا۔ وہ میرے اوپر جست لگا کے آیا تھا لیکن م... ہٹنے سے اس کا اندازہ غلط ہو گیا تھا۔ وہ فرش پر... بل گرا۔ میں نے اسے کمر سے پکڑ کے اٹھایا اور ریو... اس کے پاؤں زمین سے اٹھ گئے۔ جب میں نے ا... تو وہ دیوار سے ٹکرایا اور ایک دم پلٹ کر آیا۔ میں... کے سینے پر فلائنگ کک ماری۔ دُہرے تصادم کی قو...

...چت کر دیا۔ وہ اب غیظ و غضب کا طوفان بنا ہوا تھا۔ ...ں کی آنکھیں خون رنگ ہو رہی تھیں اور اس کے لبوں سے ...ف کے ساتھ لہو جاری تھا۔ اس نے پھنکارتے ہوئے ...مجھے ٹانگ سے پکڑ کر کھینچا۔ میں نے دوسری لات اس ...کے سر پر ماری مگر اس نے اپنی گرفت نہیں چھوڑی۔ اگر میں ...ایک دم نہ پلٹتا تو وہ میری ٹانگ کو موڑ کر ناکارہ کر دیتا۔ ...میں نے پیچھے کی طرف جست لگا کے اس کی گردن کے گرد ...بازو حمائل کر دیے۔ وہ کمان بن گیا مگر میں اسے جھکاتا گیا۔ اگر وہ میری ٹانگ نہ چھوڑتا تو اس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ جاتی۔ آزاد ہوتے ہی میں نے اس کے پیچھے آ کر جھٹکا دیا اور وہ گھوم کر کھڑا ہوا تو میں نے اسے ایک اور چکر دے کر اٹھا لیا۔ کھیل ختم کرنے کے لیے میں نے اسے پوری قوت کے ساتھ دیوار پر دے مارا۔ وہ چلّایا۔ نیچے گر کے اس نے ہاتھوں کے بل پر اٹھنے کی اپنی سی کوشش کی اور پھر گر گیا۔

"ہاں۔ اب بولو۔" میں نے پھولی ہوئی سانس پر قابو پا کے کہا۔ "کون سیر ہے اور کون سوا سیر؟"

علی نواز کا رنگ لاش کی طرح سفید ہو چکا تھا اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے سورما ساتھی کی حالتِ زار دیکھ رہا تھا۔

"اس کو بھی انٹروگیشن سیل دکھا دو استاد۔" میں نے کونے میں سے اپنا ریوالور اٹھا کے کہا۔

محسن نے علی نواز کے ایک لات ماری۔ "چل آگے۔" اس نے خالص پولیس والوں کے انداز میں گالی دی۔ علی نواز خود بخود باتھ روم کی طرف چل پڑا۔ جہاں محسن نے اسے منجمد سیاہ خون دکھا کے نفسیاتی طور پر مفلوج کر دیا۔

"ہاں بھئی، اب بتاؤ ظافو کی لاش کہاں ہے۔" میں نے کہا۔ "اور وہ پچاس ہزار کہاں ہیں؟"

"میں نہیں بتاؤں گا۔" چاند خاں نے کہا۔

"تمھارے تھانے میں جب ملزم لائے جاتے ہیں تو وہ بھی یہی کہتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ان سے کیسے پوچھ لیتے ہو تم لوگ سب کچھ۔ استاد! اس چھوٹے بدمعاش کو بند کر دو اور ذرا اتارو اس کے کپڑے۔ میں لاتا ہوں اس کے باپ، مولا بخش کو۔"

محسن نے باہر آ کے درخت سے دو مضبوط شاخیں توڑیں اور ان پر سے پتے صاف کر دیے۔ گاڑی میں سے جیک اور ہینڈل نکالا اور پھر اوپر آ گیا۔ محسن نے میرے احکامات کی حرف بحرف تعمیل کی تھی۔

"تیرہ نمبر کا چھتر تو نہیں ہے ہمارے پاس لیکن اس سے زیادہ مؤثر ہتھیار ہیں۔" میں نے ہری شاخ کو شائیں سے لہرا کے وار کیا۔ چاند خاں تڑپا اور بلبلایا۔ "آج تم عامل نہیں معمول ہو۔ ہر رات تھانے میں دوسروں پر طاقت آزماتے تھے۔ آج دیکھتے ہیں تم کتنے طاقتور ہو۔" میں نے پھر لچک دار شاخ سے وار کیا۔ چاند خاں کی جلد پر دو گہری سرخی مائل سیاہ لکیریں سی نمودار ہو گئیں۔ وہ کتے کی طرح چلّایا۔ محسن نے دوسری شاخ سے کام لیا۔ وہ پھر چیخا۔

"اس کی آواز بند کرو استاد۔" میں نے کہا اور محسن نے چادر پھاڑ کے اس کا منہ بند کر دیا۔ ہمارا ارادہ اس کو ملزم بنانے کا نہیں تھا لیکن اس کی فرعونیت اور ضد نے ہمیں مجبور کر دیا کہ اسے تھوڑی سی سزا ضرور دیں۔ دس منٹ بعد اس کی کھال اُدھڑ گئی تھی اور وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ محسن نے باتھ روم میں سے دوسرے ملزم کو نکالا۔

"تم بھی تھانے میں روز نا اعترافِ جرم کراتے تھے، بے گناہوں سے۔ لاوارثوں سے۔" میں نے کہا۔ "اسی طرح۔" میں نے زمین پر پڑے ہوئے چاند خاں کی طرف اشارہ کیا۔

"میں سب بتانے کو تیار ہوں۔ خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔ میں پچاس ہزار بھی دے دوں گا۔" وہ چلّانے لگا لیکن اسے بھی یہ بتانا ضروری تھا کہ جب "تفتیش" کی جاتی ہے تو زیرِ تفتیش ملزم پر کیا بیتتی ہے۔ ہر تھانے میں کسی بھی جرم کا سراغ لگانے کا سب سے مؤثر طریقہ تشدد کا ہے اور جس غیر انسانی بے رحمی سے وہاں لائے جانے والوں کو مارا جاتا ہے اس کا تجربہ مجھے بھی تھا۔ ان میں سے آدھے مجرم تو سب اُگل دیتے ہیں۔ باقی آدھے مار کھا کے نکلتے ہیں تو خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ پولیس نے صرف مار کے چھوڑ دیا۔ ان کے لیے یہ بھی ممکن تھا کہ کسی جھوٹے مقدمے میں ملوث کر کے جیل بھجوا دیتے۔ بلاوجہ حوالات میں بند ہو کے تشدد برداشت کرنے والے پولیس کے خلاف حبسِ بے جا اور تشدد کا کوئی مقدمہ نہیں کرتے۔ پولیس سے دشمنی مول لینا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ ان کے خلاف ثبوت اور شہادت پیش کرنا جوئے شیر لانے سے مشکل کام بن جاتا ہے۔

جتنی دیر میں وہ ہوش میں آئے، میں نے اور محسن نے اطمینان سے ایک ایک سگریٹ پی اور یہ طے کیا کہ اب ہمیں کیا کرنا ہے۔ اس کام میں زیادہ وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا کیونکہ رات کے دس بجنے والے تھے۔

چاند خاں پہلے ہوش میں آیا اور کراہنے لگا۔ میں نے ہری شاخ پھر اٹھالی۔

"ہاں بھئی چندا میاں؟" میں نے شاخ کو ہوا میں لہرایا۔ "طافو کی لاش کہاں ہے اور وہ پچاس ہزار کہاں ہیں؟"

"میں بتا دوں گا۔" چاند خاں نے روتے ہوئے کہا۔ "اور مت مارو مجھے۔"

میں ہنسا۔ "بڑے کمزور دل ہو یار۔ یہ تو تم روز ہی دیکھتے تھے۔ کسی اور کی حالت پر بھی کبھی آنسو آئے تھے؟"

"میں تمھیں وہاں لے چلتا ہوں جہاں طافو کی لاش دفن ہے۔" چاند خاں نے بُری طرح کراہتے ہوئے کہا۔

"ہمیں وہ پچاس ہزار بھی چاہئیں جو تم نے اس شیطانی کام کے لیے تھے۔" میں نے کہا۔

"میں وہ بھی دے دوں گا۔ وہ بھی وہیں دفن ہیں۔" چاند خاں نے کہا۔ شکست اور احساسِ ذلت نے اسے موت سے بدتر عذاب میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ نامعلوم قاتلوں سے تو ڈر رہا تھا لیکن یہ اس کے تصوّر میں بھی نہ تھا کہ کوئی "پولیس کو پکڑنے والی پولیس" بھی ہے جن کے تھانے میں وہی سب کچھ ہوتا ہے جو عام تھانوں میں ہوتا ہے اور یہ سب اس کے ساتھ بھی ہو گا۔

"تم لوگوں نے اس لاش کو کہاں دفن کیا تھا؟" میں نے کہا۔

"قصور جانے والی سڑک پر۔ یہاں سے آٹھ دس میل دور۔" چاند خاں بولا۔ "مجھے وہ جگہ یاد ہے۔"

"تم کہتے ہو کہ رقم بھی وہاں دفن ہے۔ رقم تمھارے گھر میں کیوں نہیں ہے؟" میں نے کہا۔

"میں نے پہلے گھر میں ہی رکھی تھی۔ آج فتح شیر کے قتل کی خبر سن کے میں ڈر گیا۔" وہ بولا۔

میں نے اچانک اس پر حملہ کیا اور شاخ سے پے درپے وار کیے۔ وہ فرش پر گر کے تڑپنے لگا۔

"اب بھی جھوٹ بولنے سے باز نہیں آتا۔ رقم دفن کرنے کے لیے تو اتنی دور گیا تھا؟" میں نے کہا۔ "آٹھ دس میل دور جہاں لاش دفن ہے؟ کیوں؟ لاش کے ساتھ ضروری تھا رقم گاڑنا۔ میں تجھے یہیں گاڑ جاؤں گا اگر سچ نہ بتایا۔"

"رقم دوسری جگہ ہے۔" چاند خاں کراہتے ہوئے بولا۔ "علی نواز سے پوچھ لو۔"

علی نواز اب ہوش میں تھا۔ اس نے اقرار میں گردن ہلائی۔ "میں پورے ایک لاکھ دے دوں گا تمھیں۔ میرے گھر کے صحن میں دبے ہوئے ہیں۔"

میں نے محسن سے مشورہ کیا۔ "ان دونوں کو ساتھ لے چلتے ہیں۔"

"اور ان کا کیا کریں؟" اس نے فرش پر پڑے ہوئے اے ایس آئی اور پولیس مین کی طرف اشارہ کیا۔

"ان کو یہیں چھوڑ جانا چاہیے۔ ان کی وردی، ریوالور وغیرہ سب۔" میں نے کہا۔ "ورنہ یہ دوسرا کیس ہو جائے گا۔"

"کیس تو اب بھی ہو گا۔ کیا یہ لوگ رپورٹ نہیں کریں گے؟" محسن نے کہا۔

"ہم میں سے کسی کی صورت نہیں دیکھی انھوں نے۔" میں نے کہا۔ "ہوش آنے پر سب کچھ موجود پائیں گے تو خود کو شرمندگی سے اور محکمہ جاتی کارروائی سے بچانے کے لیے خاموش رہنا بہتر سمجھیں گے۔ ورنہ فرائض میں غفلت برتنے پر معطلی تو لازمی ہے۔ میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ رابعہ سے مزید پوچھ گچھ ہو۔ رقم سب نکال لو وردی میں سے اور ان کو بستروں پر لٹا کے نکل چلو۔ سردی سے مریں گے نہیں اور کچھ دیر میں ہوش آ جائے گا تو اپنی اپنی وردی پہن کے پھر مستعد ہو جائیں گے۔ ظاہر ہے پہلے تو دیکھیں گے کہ کسی نے ان کے ساتھ یہ سلوک کیا تھا تو کیوں کیا تھا اور جب وجہ کوئی سمجھ میں نہیں آئے گی تو ایک دوسرے سے رازداری کا سمجھوتا کر لیں گے۔ اپنی عزت اور نوکری بچائیں گے۔ ان کے شناختی کارڈ، پیٹی، وردی اور ریوالور محفوظ رہنے چاہئیں اور ہماری یہاں موجودگی کا کوئی سراغ باقی نہیں رہنا چاہیے۔ پھر کچھ نہیں ہو گا۔ میرا ارادہ تھا پہلے کہ ریوالور اور اے ایس آئی کی وردی لے لوں۔ جو وردی ہمارے پاس تھی وہ تو گاڑی میں جل کے خاک ہو گئی لیکن پکڑ دیے گئے کہ پھر کیس بنے گا تو رابعہ کے لیے وضاحت مشکل ہو جائے گی۔" میں نے پلٹ کر ان دونوں کو حکم دیا کہ وہ کپڑے پہن کر تیار ہو جائیں۔

"ان دونوں کو کہاں لے جانا ہے؟" محسن نے کہا۔

"جہاں یہ ہمیں لے جائیں۔" میں نے کہا۔ "پہلے طافو کا مدفن دیکھنا ہے۔ لاش نکالنی نہیں ہے۔ پھر اس چھوٹے سے علی نواز کے ساتھ جانا ہے۔ ایک لاکھ تو واپس لیں۔ اتنی سزا ضروری ہے ان کے لیے۔ یہ قانون کے محافظ کہلاتے ہیں اور اس طرح قاتلوں سے لاشوں کے سودے کرتے ہیں۔"

"اس کے بعد؟" محسن بولا۔ "ان کو کہاں چھوڑیں گے؟"

"یہ میں نے ابھی طے نہیں کیا۔" میں نے کہا۔ "ان کو آزاد چھوڑ دیں یا چودھری صاحب کو ارسال کر دیں؟"

"وہ ان کو قتل کر ڈالے گا۔" محسن نے کہا۔

"پھر کیا ہوا؟ خس کم جہاں پاک۔" میں نے کہا۔ "دنیا کو ایسے بے ضمیر شیطانوں کی ضرورت بھی کہاں ہے۔ ذرا اپنے چودھری صاحب کو بھی تو پتا چلے کہ ایم آر ایس کا بھی ایک تھانہ ہے۔ جہاں مجرموں کے ساتھ کیسا سلوک ہوتا ہے۔"

"کیا یہ لوگ چودھری دلاور کو اس جگہ تک نہیں لے آئیں گے؟"

"مشکل ہے۔ رات کا وقت تھا۔" میں نے کہا۔ "ایک بے ہوش پڑا تھا۔ دوسرے کی عقل بھی ٹھکانے نہیں تھی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آیا ہو گا کہ راستہ کیا تھا۔"

"چاند خاں یہ تو بتا سکتا ہے کہ اس کوٹھی میں فتح شیر کو قتل کیا گیا تھا۔" محسن نے کہا۔

"وہاں ہمارے یہ فرض شناس اے ایس آئی اور ماتحت کانسٹبل ہوں گے جو اسے فضول بکواس قرار دیں گے اور ثابت کر دیں گے کہ رات بھر انھوں نے پلک تک نہیں جھپکی تھی۔ مجال ہے کوئی پرندہ بھی پر مارتا۔" میں نے کہا۔

ہم نے چاند خاں اور علی نواز کو اتنی مہلت دی کہ وہ ہاتھ منہ دھو لیں اور اگلے مرحلے کے لیے تیار ہو جائیں۔ محسن نے ان پر نگاہ رکھی اور میں نے اتنی دیر میں دونوں پولیس والوں کو گھسیٹ کر بستر میں ڈالا۔ پھر میں نے سوچا کہ کیوں نہ وردیاں بھی انھیں پہنا دوں اور ہم انھیں وہیں ڈال دیں جہاں سے وہ پکڑے گئے تھے۔ محسن نے میری تجویز سے اتفاق کیا تھا۔

"اس طرح دونوں کو شک بھی نہیں ہو گا کہ کسی نے اوپر جا کے تفتیش وغیرہ کی تھی۔" محسن بولا۔

"وہ سمجھیں گے کہ حملہ آور چور لٹیرے تھے۔ جیب میں جو کچھ تھا وہ نکال کے لے گئے۔" میں نے کہا۔ "کتنی رقم ہاتھ لگی ہے ان سے؟"

"اے ایس آئی کی جیب میں ساڑھے چار ہزار تھے۔ کانسٹبل کا شاید بُرا دن تھا۔ اس کی جیب سے صرف ساٹھ روپے نکلے۔" محسن بولا۔

"دونوں کی جیب میں دس دس روپے چھوڑ دے۔" میں نے کہا۔ "بالکل کنگال نہ ہوں۔"

اوپر سے اپنی موجودگی کے سارے آثار مٹانے کے بعد میں نے کانسٹبل اور اے ایس آئی کو اسی جگہ لٹا دیا۔ بالکل اسی پوز میں کہ آنکھ کھلے تو وہ سمجھیں کہ لوٹنے کے سوا کسی نے ان کے ساتھ کچھ نہیں کیا۔ بفرضِ محال انھوں نے صبح ہنگامہ بھی کیا کہ کوئی چور ڈاکو رات کو ان کی جیب خالی کر گیا تو یہ رابعہ کے لیے تشویش کی بات نہیں ہو گی۔ کسی کے لیے فتح شیر کے قتل اور اس واردات کے درمیان تعلق ثابت کرنا ناممکن ہو گا۔ جب ہم پھر روانہ ہوئے تو ڈرائیونگ محسن کر رہا تھا اور میں نے چاند خاں کو آگے بٹھایا تھا۔ اس کے لیے بیٹھنا مشکل ہو رہا تھا اور ہر جھٹکے پر اس کے حلق سے آہ نکلتی تھی۔ علی نواز میرے ساتھ چوہے کی طرح دُبکا بیٹھا تھا۔

"خیال رکھنا کہ ریوالور کی نال تمھارے سر کے پیچھے ہے۔" میں نے نال کو چاند خاں کی گدّی سے لگا کے کہا۔ "تمھارا کس بل تو نکال دیا ہے ہم نے لیکن بعض اوقات رسّی جل جاتی ہے اور بل نہیں جاتا۔ ذرا سی غلطی کا انجام یہ ہو گا کہ کسی آزار کے بغیر اس ریوالور کی گولی تمھارے سر میں سوراخ کر دے گی۔ ویسے میں خالی ہاتھ سے منکا توڑنا بھی جانتا ہوں۔"

"پیچھے والے کا بھی خیال رکھنا۔" محسن نے کہا۔

"پروا نہیں استاد۔ ذرا ہلے تو سہی۔ گردن مروڑ کر باہر پھینک دوں گا۔" میں نے کہا۔

وہ ہمیں جلّو موڑ کی طرف لے گئے۔ جب ان دونوں نے اتفاقِ رائے سے کہا کہ اب وہ جگہ چند فرلانگ کے فاصلے پر ہے تو میں نے محسن کو اور چاند خاں کو اتار دیا۔ "پہلے یہ بتائے گا کہ انھوں نے لاش کہاں گاڑی تھی۔" میں نے کہا۔ "تو چاند خاں کو سنبھال۔ میں واپس آنے کے بعد دوسرے کو لے جاؤں گا۔ کسی نے غلط بتایا تو پتا چل جائے گا۔"

"خطرہ مول لینے کا فائدہ نہیں استاد۔" محسن نے کہا۔ "تو گاڑی یہاں چھوڑ دے اور اسے پیدل ٹہلاتا ہوا لے جا۔"

میں نے محسن کی تجویز سے اتفاق کیا اور گاڑی کو درختوں کے ایک جھنڈ کے پیچھے چھوڑ دیا۔ یہ وہی سڑک تھی جس پر سے میں تین سال پہلے بھی گزرا تھا۔ یہ سڑک بھارتی علاقے میں واقع قصبے کھیم کرن تک جاتی تھی اور یہ قصبہ فتح ہوا تو پاکستانی افواج نے اسے عوام کے لیے کھول دیا تھا چنانچہ لاہور کے جیالے جوق در جوق سائیکلوں، تانگوں اور اسکوٹروں پر کھیم کرن پہنچے تھے۔ میں لندن سے چند دن کے لیے آیا ہوا تھا اور شوقِ دید میں دشمن کی مفتوحہ سرزمین کو اپنے پیروں سے روندنے کے لیے نکل کھڑا ہوا تھا۔ وہ عجیب سماں تھا۔ جلّو موڑ سے آگے ٹریفک بند تھی کیونکہ سڑک پر ملٹری کے ٹینک اور ٹرک، آرمرڈ کاریں اور کانوائے آ جا رہے تھے۔ لوگ کچّی زمین پر پیدل میلوں چل کے کھیم کرن پہنچے تھے۔ وہ زمین بھی محاذِ جنگ ہی تھی چنانچہ ہل کے بجائے ٹینکوں نے کھود ڈالی تھی اور

اس مٹی میں چلنے والوں کے پاؤں ٹخنوں تک گرد میں دھنس جاتے تھے لیکن واماندگانِ شوق کے لیے یہ مسافت کی سختی کچھ نہ تھی۔ میں نے کیمم کرلی کے ویران قصبے میں ہزاروں افراد کو فتح کی خوشی میں سرمست گھومتے اور فاتح افواج کو ان کا استقبال کرتے دیکھا تھا۔ آج اسی سڑک پر ہر سُو سناٹا اور اندھیرا تھا۔ میں ایک اور دشمن پر فتح پا کے یہاں پہنچا تھا لیکن اس سفر کے مقاصد یکسر مختلف تھے۔

پتلی سی سڑک پر ٹریفک نام کو نہ تھی لیکن میں نے احتیاط کو مقدم سمجھتے ہوئے سڑک سے کچھ فاصلے پر رہنا مناسب سمجھا۔ میں نے علی نواز کو دس قدم آگے رکھا تھا اور اس پر واضح کر دیا تھا کہ وہ شرافت سے چلتا رہے گا تو اسی راستے سے واپس بھی آئے گا ورنہ صبح تک اس کی تدفین بھی یہیں ہو جائے گی۔ جہاں سے طافو کا مدفن دور نہیں ہے۔ راستے میں جھاڑیاں تھیں، درخت تھے اور اچانک گڑھے آجاتے تھے۔ کئی بار علی نواز نے ٹھوکر کھائی اور خود میں بھی گرتے گرتے بچا۔ میرے اندازے کے مطابق ہم تین فرلانگ آچکے تھے جب میں نے علی نواز سے کہا۔ "اب کیا صبح تک چلتے رہنا ہے؟"

"پہنچ گئے جناب! وہ سامنے دیکھیں۔ کھجور کے تین درخت۔" علی نواز نے کہا اور مجھے نیم روشن افق پر ان کا سایہ سا نظر آیا۔

تینوں درخت ایک دوسرے سے مساوی فاصلے پر تھے اور اگر ان کے درمیان خط کھینچا جاتا تو ایک مثلث بنتی۔ جس کے تینوں ضلعے برابر ہوتے۔ علی نواز وسط میں پہنچ کے رک گیا۔

"مجھے تو یہاں کوئی نشانی نظر نہیں آتی۔" میں نے کہا۔ "طافو کو دفن کرتے وقت کوئی پتھر وغیرہ رکھا تھا؟"

علی نواز نے نفی میں سر ہلایا۔ "دلاور نے کہا تھا زمین اس طرح برابر کر دینا کہ پتا نہ چلے، یہی جگہ ہے وہ۔"

"پھر اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ ہم طافو کی قبر پر کھڑے ہیں؟" میں نے کہا۔

"ثبوت تو کھودنے سے ہی ملے گا۔" علی نواز نے مایوسی سے کہا۔

"اچھا یہ بتاؤ کہ گورکنی کا سامان تم اپنے ساتھ لائے تھے؟" میں نے کہا۔ "لائے تھے تو کیا واپس بھی لے گئے تھے؟"

"نہیں... سامان دلاور صاحب کی کوٹھی سے ملا تھا۔" وہ بولا۔ "اسے ہم یہیں پھینک گئے تھے۔"

"یہیں... یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ یاد کرو کہاں پھینکا تھا؟" میں نے کہا۔ "یا میں یاد دلاؤں؟"

"میں... میں دیکھتا ہوں۔" وہ بولا۔ وہ کچھ دیر درختوں کے گرد و نواح میں پھرتا رہا لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ وقت ضائع کر رہا ہے۔ اس کی حرکات و سکنات مشتبہ تھیں۔ میں اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ اچانک میں نے اسے ایک لات ماری۔ وہ منہ کے بل مٹی میں گرا۔ میں نے اس کی پسلیوں میں پے در پے ٹھوکریں ماریں۔

"ہائے جی میں مر گیا۔ اف اللہ جی۔" اس نے لوٹتے ہوئے بلبلانا شروع کیا۔ "یا رب جی۔"

میں نے اسے پیروں پر کھڑا کر دیا۔ "تم کو معلوم ہے کہ وہ سامان کہاں ہے۔ سیدھی طرح بتا دو ورنہ مار مار کے ہڈیاں توڑ دوں گا اور لاش اسی جگہ چھوڑ جاؤں گا۔ گیدڑوں اور گدھوں کے کھانے کے لیے۔"

"وہ جی... میں بتاتا ہوں۔ لیکن ایک مہربانی کریں۔" اس نے ہاتھ جوڑ کر کانپتے ہوئے کہا۔ "قبر نہ کھدوائیں مجھ سے۔ میں بہت بزدل ہوں۔ دہشت سے مر جاؤں گا لاش کا ڈھانچہ دیکھ کر۔"

"اس وقت ڈر نہیں لگا تھا جب اسے گاڑا تھا؟" میں نے اس کے سر پر مکا مارا۔ وہ پھر گر گیا مگر ہمت کر کے اٹھا اور ذرا سی دیر میں ایک گڑھے میں پڑا ہوا کدال اور بیلچہ نکال لایا۔ میں نے اس کے ساتھ واپس مارچ کیا اور پندرہ منٹ میں پھر وہیں آ پہنچا جہاں محسن گاڑی سے باہر سخت سردی میں ٹہل رہا تھا۔ چاند خاں کو اس نے گاڑی میں بند رکھا تھا اور بتا دیا تھا کہ اس نے باہر قدم رکھا تو وہ گولی مار دے گا۔ چاند خاں کی جگہ علی نواز کو قید کر دیا گیا اور میں نے دوسری بار چاند خاں کے ساتھ اسی راستے کو طے کیا۔ چاند خاں چھ فٹے قد کا اور مضبوط جسم والا جوان تھا چنانچہ اتنی مار کھانے کے بعد بھی سیدھا چل رہا تھا۔ ایک فرلانگ چلنے کے بعد اس نے بائیں طرف مڑنے کی کوشش کی جہاں سے ایک پگڈنڈی الگ ہوتی تھی۔ میں نے پیچھے سے اس کے شانے پر پستول کا بٹ مارا۔ وہ درد سے کراہا۔

"ابھی کتے کی دُم سیدھی نہیں ہوئی۔" میں نے کہا اور ایک درخت سے انگلی کے برابر موٹی شاخ توڑ لی۔ "جگہ تو مجھے معلوم ہو گئی ہے اس لیے مجھے تمھاری ضرورت نہیں ہے۔ اتنا ماروں گا کہ تڑپ تڑپ کے مر جاؤ گے۔ یہاں تمھاری چیخ پکار سننے والا کوئی نہیں ہے۔ یہ آوازیں سن رہے ہو تا بھوکے گیدڑوں کی۔ یہ صبح تک تمھارا گوشت نوچ کھائیں گے۔ دن میں گدھ ہڈیاں صاف کر کے چھوڑیں گے۔" میں نے اس کو شاخ سے سونت کر رکھ دیا۔ وہ ہر ضرب پر چلاّتا رہا۔ پھر کھجور کے تینوں درختوں کی طرف چل پڑا۔ وہ علی نواز کو گالیاں دے رہا تھا اور اس کی ذہنی کیفیت نارمل نہیں تھی۔ جسمانی اذیت سے زیادہ اسے اپنی ذلت و رسوائی اور بے بسی کا ذہنی صدمہ تھا۔ اسے اپنے اختیارات پر ہی نہیں، اپنی قوتِ بازو پر بھی ناز تھا اور میں نے اس کا غرور خاک میں ملا دیا تھا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس جیسا پرانا پولیس کا شالی جوان جس نے ان گنت چور ڈاکو پکڑے تھے اور بڑے بڑے بدمعاشوں کو تکلے کی طرح سیدھا کر دیا تھا، کبھی خود ایک گھٹیا مجرم کی طرح کسی کے "پرائیویٹ تھانے" میں اتنی بے عزتی برداشت کرے گا اور وہ سب کچھ اس کے ساتھ بھی ہو گا جو اس نے ہمیشہ دوسروں کا حق سمجھا تھا۔

"کھڑے کیوں ہو؟" میں نے کہا۔ "اٹھاؤ یہ بیلچہ اور کدال۔"

"یہ علی نواز نے لا کر دیے ہوں گے۔" وہ حقارت اور نفرت سے بولا۔ "اسی سے کہنا تھا تاکہ..."

جملہ مکمل ہونے سے پہلے میں نے اس پر وہ شاخ توڑ ڈالی۔ "زبان کے بجائے ہاتھ چلاؤ۔"

"اس لاش کو اب نکال کر کیا دیکھو گے۔ گل سڑ گئی ہو گی۔" وہ زمین کھودتے ہوئے بولا۔

"اس کو میں تمھارے کندھے پر اٹھوا کے لے جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "اور تمھارے باپ کی قبر میں دفن کروں گا۔"

وہ ہنسنے لگا۔ "میرا کوئی باپ نہیں تھا۔ میری ماں کہتی تھی میرے دس باپ ہیں۔ کیا طافو بھی میرا باپ تھا؟"

میں نے محسوس کیا کہ چاند خاں کا ذہنی توازن جواب دے رہا ہے۔ لاش زیادہ گہرائی میں نہیں دفن کی گئی تھی۔ چاند خاں کی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے اعصاب جواب دینے لگے تھے اور احساسِ شکست کے بعد وہ جرم و گناہ کے اور خوف کے ردِ عمل کا شکار ہو رہا تھا۔ وہ اپنے آپ سے باتیں کرتا تھا، اچانک رک کر مجھے گھورنے لگتا تھا اور پھر زمین کھودنے لگتا تھا۔ کئی بار وہ بلاوجہ ہنسا اور ایک مرتبہ میں نے اس پر وار کیا تو اس نے چیخ کر مجھے گالی دی۔ میں محتاط ہو گیا۔ اس تن و توش کے دیوانے آدمی کو میں آسانی سے قابو نہیں کر سکتا تھا۔ پھر بدبو کا ایک بھبکا آیا جو زمین کے کسی شگاف سے اٹھا تھا۔ چاند خاں چلاّ کے باہر نکل آیا۔ اس کے انداز و اطوار میں وحشت اور جنون کے آثار نمایاں تھے۔ اس نے کدال اٹھا کے مجھ پر حملہ کیا۔ میں نے وار کو ایک ہاتھ پر روکا اور لات مار کے چاند خاں کو گرا دیا۔ وہ سیدھا قبر کے اوپر جا گرا جس کی نرم مٹی کا ڈھیر بکھر گیا تھا۔ اس نے ایک بار پھر دیوانگی کی چیخ بلند کی اور اٹھ کر بھاگا۔ میں اس کے پیچھے لپکا اور اسے رکنے کو کہا۔

"چاند خاں! رک جاؤ۔" میں نے چلاّ کر کہا۔ "میں آخری بار کہہ رہا ہوں۔"

"چھوڑ دے مجھے۔ طافو چھوڑ دے مجھے۔ جانے دے مجھے۔" چاند خاں نے چلاّنا شروع کیا اور اس کی رفتار میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔ "مر جاؤں گا طافو۔ مجھے معاف کر دے۔ طافو مجھے معاف کر دے۔"

"چاند خاں! میں گولی مار دوں گا۔" میں نے محسوس کیا کہ میرے اور اس کے درمیان فاصلہ بڑھنے لگا ہے۔ وہ عالمِ وحشت میں دیوانہ وار بھاگ رہا تھا اور یوں چلاّ رہا تھا جیسے طافو اپنی قبر سے نکل کر اس کے کندھوں پر سوار ہو گیا ہے۔ وہ یوں ہاتھ مار رہا تھا جیسے اپنے وجود سے چمٹ جانے والی متعفن لاش کو الگ کرنا چاہتا ہو۔ یہ اس بدبو کا اثر تھا جس نے چاند خاں کا دماغ الٹ دیا تھا۔ اس کا ذہنی توازن رفتہ رفتہ بگڑ رہا تھا لیکن اس دہشت ناک، آسیب زدہ اور انسانی گوشت کی سڑی ہوئی بدبو نے چاند خاں کا دماغ ایک دم الٹ دیا۔ وہ بدبو الطاف کے وجود کا احساس بن کر اس پر مسلط ہو گئی تھی۔

میں نے بہت احتیاط سے نشانہ لے کر اس کی ٹانگ پر فائر کیا تھا لیکن اس کی قضا تھی جو اسے یہاں تک لے آئی تھی۔ وہ ایک کٹے ہوئے درخت کے ٹھنٹھ سے ٹھوکر کھا کے گرا، جب وہ گر رہا تھا تو ریوالور سے نکلنے والی گولی نے اسے جا لیا اور وہ گولی جو زیادہ سے زیادہ اسے لنگڑا کر دیتی اس کے وجود میں پیوست ہو گئی۔ پشت میں شانے سے ذرا نیچے لگنے والی گولی شاید اس کے دل میں ہی رک گئی اور جب میں نے قریب پہنچ کر اور جھک کر اسے دیکھا تو وہ مر چکا تھا۔ اس کا جسم بڑے بے ڈھنگے طریقے پر الٹا پڑا تھا اور خون نیچے کی مٹی کو سیراب کر رہا تھا۔ یہ قتل نہیں تھا۔ میرا ارادہ اسے قتل کرنے کا کبھی نہیں۔ وہ خود اپنی دیوانگی کا نشانہ بنا ورنہ میرا نشانہ خطا بھی ہو سکتا تھا۔ میں نے اٹھ کر دیکھا تو ہم اس جگہ سے ایک فرلانگ دور نکل آئے تھے جہاں طافو کی تھوڑی سی کھدی ہوئی قبر کا شگاف اس کی لاش

کے موجود ہونے کا ثبوت فراہم کر رہا تھا۔

میں نے واپس جا کے محسن سے مشورہ کیا۔ "یہ نیا مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے۔ لاش کا کیا کریں؟"

"اگر اسے وہیں چھوڑ دیں؟" محسن نے کہا۔ "کیا یہ امکان ہے کہ کوئی اسے دیکھ لے گا؟"

"یہ امکان تو بہت کم ہے۔" میں نے تسلیم کیا۔ "سڑک سے دو فرلانگ کا فاصلہ تو ضرور ہو گا اور وہ ٹھوکر کھا کے گرا تھا تو ایک گڑھے میں گیا تھا۔ گڑھا زیادہ گہرا نہیں ہے لیکن سڑک پر سے گزرنے والا لاش نہیں دیکھ سکتا۔"

"اگر ہم نے اسے قبر کھود کے گاڑا تو بہت وقت لگے گا۔" محسن بولا۔ "واپس لے جانا تو ناممکن ہے۔"

"لاش ایسے چھوڑ کے جانا بھی خطرناک ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر کل یا پرسوں لاش کسی کو مل گئی تو اس کی شناخت بھی ہو جائے گی اور دلاور کو معلوم ہوا تو وہ سمجھ جائے گا کہ اسے یہاں لا کے مارنے والا ہمارے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔ جن کو اس نے قتل پر مامور کیا تھا، ان کا پروگرام دونوں کو ٹرک سے کچل دینے کا تھا۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ آج رات میں اسے گیدڑ کھا جائیں۔ یہاں بھیڑیے بھی ہیں۔" محسن بولا۔

"میرا تو خیال ہے اسے بھی طافو کے ساتھ ہی دفن کر دیں۔" میں نے کہا۔ "وہ قبر آدھی سے زیادہ کھدی ہوئی ہے۔"

علی نواز گاڑی میں تھا اور ہماری گفتگو نہیں سن سکتا تھا۔ محسن نے اسے باہر نکالا اور وہ دوسری بار ہم دونوں کے پہرے میں روانہ ہوا۔ "اب کیا ہے؟ میں نے تو صحیح جگہ بتائی تھی۔" وہ بولا۔

"ہاں۔ اور اسی لیے ہم تمھیں کچھ نہیں کہیں گے۔" میں نے کہا۔ "تمھارے ساتھی چاند خاں نے ہوشیار بننے کی کوشش کی تھی۔ چنانچہ وہ مارا گیا۔ وہ بے وقوف آدمی تھا۔"

"چاند خاں... مارا گیا...؟" علی نواز دہشت زدہ ہو کے بولا۔ "جھوٹ کہتے ہو تم۔ تم نے اسے مار دیا۔ اور اب تم مجھے بھی مارنے لے جا رہے ہو۔"

"تمھیں مارنا ہوتا تو ہم پہلے ہی نہ مار دیتے۔" میں نے کہا۔ "دوسری بار تمھارے ساتھ جانے کی کیا ضرورت تھی۔ اب ہمیں چاند خاں کی لاش کو ٹھکانے لگانا ہے۔ تم اگر مدد کرو گے تو فائدے میں رہو گے ورنہ تمھارا حشر بھی چاند خاں کی طرح ہو گا۔ تم زندہ رہنا چاہتے ہو علی نواز! کیونکہ تمھاری شادی کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ تم پہلے بچے کے باپ بننے والے ہو اور اسے یتیم پیدا نہیں ہونا چاہیے۔"

میری بات نے علی نواز کا حوصلہ بلند کیا۔ اس کی منت سماجت جاری رہی کیونکہ اسے ہمارے وعدے پر پورا اعتماد نہیں تھا لیکن وہ ہماری مدد کرتا رہا۔ اس نے قبر کھودی اور لاش کو گھسیٹ کر لایا۔ سردی کی وجہ سے خون جم گیا تھا چنانچہ زمین پر خون کی کوئی لکیر نہیں بنی۔ چاند خاں کے مقابلے میں علی نواز زیادہ مضبوط اعصاب کا آدمی ثابت ہوا۔ شاید اسے جینے کی زیادہ خواہش تھی جس نے اسے حوصلہ عطا کیا۔ اس نے طافو کی متعفن لاش کے اوپر چاند خاں کو لٹایا اور مٹی برابر کر دی۔ میں اور محسن کچھ فاصلے پر اپنی اپنی ناک پر رومال رکھے کھڑے تھے۔ اس تمام کارروائی میں ایک گھنٹا صرف ہوا اور جب ہم زمین کو ایک جیسا کرنے کے بعد کدال بیلچے کو دور پھینک کر واپس ہوئے تو رات کے بارہ بج چکے تھے۔

"اب ہم تمھیں گھر کے قریب چھوڑ دیں گے علی نواز" نے کہا۔

"لیکن وہ پیسہ جو میرے پاس... میرے گھر کے صحن میں دفن ہے۔" وہ بولا۔

"اگر تم سمجھتے ہو کہ تمھاری زندگی کی قیمت ایک لاکھ ہے۔" میں نے کہا۔ "تو یہ سمجھو کہ تم کو دوسری زندگی بہت سستی مل رہی ہے۔ چاند خاں خود اپنی غلطی سے مرا۔ غلطی تم نے بھی کی تھی لیکن اس کی سزا باقی ہے۔ وہ ایک لاکھ لے کر بھاگ جاؤ۔ اپنے بیوی بچوں سمیت غائب ہو جاؤ۔ یہ سمجھ لو کہ تمھاری جان کے دشمن شکاری تمھارے پیچھے ہیں۔ ایک ہم اور ایک چودھری دلاور کے کرائے کے قاتل۔ وہ تمھاری جان کا معاوضہ وصول کر چکے ہیں اور تمھیں جہاں دیکھ لیں گے وہیں مار دیں گے۔ یہی پوزیشن ہماری ہے۔ تم دوبارہ نظر آئے تو ہم بھی خطرہ محسوس کریں گے اور تمھیں قتل کرنے پر مجبور ہوں گے۔ بہتر یہی ہے کہ جو کچھ ہوا اسے بھول جاؤ۔ یہ سمجھ لو کہ تم کو دلاور کے ارادوں کا پتا چل گیا تھا اور تم جان بچا کر بھاگ گئے۔ ہم سے تمھاری ملاقات نہیں ہوئی۔"

"لیکن میں کہاں جاؤں گا؟" وہ فریاد کناں لہجے میں بولا۔ "نوکری تو چھوڑ دوں گا۔ ماں باپ کو اور بھائی بہن کو۔ گھر کو۔ دوستوں رشتے داروں کو بھی چھوڑ دوں؟"

"یہی تو تمھاری سزا ہے کہ اب تم اکیلے ہو۔ دنیا میں تمھارا کوئی دوست ہے نہ رشتے دار۔" میں نے کہا۔ "نہ تمھارا گھر ہے نہ ٹھکانہ۔ یہاں رہو گے تو دو دن بھی نہیں جیو گے۔ اللہ کی زمین بہت بڑی ہے۔ بیوی بچوں کی اور اپنی زندگی عزیز ہے تو بھاگ جاؤ اور بھاگتے رہو۔ شکاری بہت ہیں۔ کوئی جاننے والا بھی نظر آ گیا تو سب کو خبر ہو جائے گی۔ اس لیے بالکل اجنبی ہو جاؤ۔ اتنی دور نکل جاؤ کہ پھر لوٹ کر نہ آ سکو۔ بالکل اسی طرح جیسے تم مر گئے ہو۔ تمھارا واحد سہارا ایک لاکھ روپے ہوں گے۔ ان کی مدد سے زندہ رہنے کی کوشش کرتے رہو۔ اپنے بیٹے کو پالو۔ شاید وہ بھی ایک سہارا بنے۔"

ہم نے ایک جگہ گاڑی روک کر اسے اتار دیا۔ "میری بات یاد رکھنا۔" میں نے کہا۔ "تم تھانے سے نکلے تو تمھیں ڈر تھا کہ دلاور کے آدمی تمھیں قتل کر دیں گے۔ اس لیے تم گھر گئے اور بیوی بچوں کو لے کر بھاگ گئے۔ کسی کو کچھ بتائے بغیر۔ نہ تم ہم سے ملے، نہ ہمارے ساتھ کہیں گئے۔ اس کے علاوہ کچھ کہو گے تو اپنی موت کا سامان کر دو گے۔ ماں باپ یا بھائی بہن، یہ سب تمھیں نہیں بچا سکیں گے۔ اس لیے جاؤ، صبح ہونے سے پہلے نکل جاؤ۔ بیوی اگر تمھارا ساتھ دینے والی ہے تو اسے ساتھ رکھو اور کوئی بھی بہانہ کر دو۔ یا سچ بتا دو۔ اپنی زندگی بچانا اب تمھارا کام ہے۔ جیسے چاہو کرو۔"

گاڑی اسے سڑک پر چھوڑ کر آگے بڑھ گئی۔ میں نے تھوڑی دیر بعد پلٹ کر دیکھا تو وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا واپس جا رہا تھا۔ "الطاف کے قتل کا کیس تو ختم ہوا۔" میں نے کہا۔ "دو کو دلاور نے مار دیا۔ فتح شیر کو الف دین ختم کر گیا۔ چاند خاں نے خودکشی کی اور اب علی نواز بچا ہے تو وہ لمبی سزا کاٹے گا۔"

"ہاں، مگر اصل مجرم پھر بھی محفوظ ہے۔ چھوٹے مہرے پٹ رہے ہیں۔" محسن بولا۔

"اسے بھی شہ مات ہونے لگی تھی۔" میں نے کہا۔ "لیکن وہ بچ گیا۔ خیر۔ بازی ابھی جاری ہے۔"

ایک ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں ہم آخری مہمان بن کے داخل ہوئے۔ رات کی ڈیوٹی والے روم سروس کے ویٹر نے فوراً ہمیں کچن سے وہ کھانا لا کر دیا جسے بچا کھچا کہا جا سکتا تھا اور مینو کی سب سے کم مقبول ڈش ہونے کی وجہ سے اس کی باقی ماندہ مقدار اگلے دن کے لیے اٹھا کر رکھ دی گئی تھی مگر اس وقت ہم تھکن اور بھوک سے بے حال تھے چنانچہ ہم نے بہت کم وقت میں ڈنر ختم کیا۔ بارہ بجنے کے بعد اگلا دن شروع ہو چکا تھا اور اصولاً یہ صبح کا وقت تھا چنانچہ محسن نے اس کھانے کو بریک فاسٹ قرار دیا۔ کافی کے لیے ہمیں مال کے ایک ریسٹورنٹ جانا پڑا۔

"معلوم نہیں ٹیڈی کدھر نکل گیا تھا۔" محسن نے کہا۔ "اگر وہ ناک کی سیدھ میں نکل گیا ہو گا تو پھر وہیں پہنچے گا۔" میں نے کہا۔ "میں نے چھٹی کے جغرافیے میں دنیا کے گول ہونے کا یہی ثبوت پڑھا تھا اور بالکل یقین نہیں کیا تھا۔"

"ناک کی سیدھ میں بھلا کون سفر کر سکتا ہے۔" محسن نے مجھ سے اتفاق کیا۔ "خصوصاً شہر کا رہنے والا، کسی کھمبے یا عمارت سے نہ ٹکرایا تو کسی گاڑی کے نیچے آ جائے گا۔"

"پھر بھی پہنچے گا تو وہیں جہاں سے چلا تھا۔" میں نے کہا۔

"ایمبولینس میں، چارپائی پر یا چار کندھوں پر۔"

کھانے اور کافی کے علاوہ اس گفتگو کا مقصد ذہن کو اس بوجھ سے آزاد کرنا تھا جو گزشتہ چند گھنٹوں کے دوران پیش آئے تھے۔ میں اور محسن بار بار ہنسنے کی اور بے فکری سے باتیں کرنے کی کوشش کرتے تھے لیکن کچھ ہی دیر بعد ہمیں احساس ہوتا تھا کہ ہم اپنے اپنے خیالوں کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہے ہیں۔ میرے ذہن میں وہ قاتل ٹرک تھا جس کی خدمات سامان کو ادھر سے ادھر لے جانے کے بجائے چار انسانوں کو عالمِ فانی سے عالمِ ارواح پہنچانے کے لیے مستعار لی گئی تھیں۔ اس جیسے ان گنت ٹرک شہروں کے درمیان اور ہر شہر میں بار برداری کے لیے

استعمال ہو رہے تھے مگر یہ کمال تھا ایک آدمی کے ذہن کا جس نے اس غلام مشین کو آلۂ قتل کے طور پر استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ اگلے وقتوں میں بادشاہوں کا عتاب نازل ہوتا تھا تو وہ حکم دیتے تھے کہ مجرم کو ہاتھی کے پیروں کے نیچے ڈال دیا جائے۔ اب دلاور جیسے بے تاج بادشاہ ہاتھی کی جگہ مشینی ہاتھی استعمال کر رہے تھے۔ وہ ٹرک اب تک وہیں کھڑا ہوا ہوگا۔ ممکن ہے ڈرائیور اتنی دیر میں ڈپلیکیٹ چابی لے آیا ہو اور کلینر نے پنکچر ہونے والے ٹائر بدل دیے ہوں اور وہ اپنی ناکامی کی رپورٹ دینے جاچکے ہوں۔ دلاور کا ردِ عمل کیا ہوگا؟ وہ دونوں سے سوال کرے گا کہ ٹائر کس نے پنکچر کیے تھے؟ انھوں نے کسی کو قریب آتے دیکھا تھا؟ وہ کس حلیے اور شکل کا آدمی تھا جو زبردستی ٹرک کی خرابی دور کرنے پر مُصر تھا؟ پھر اس کا ذہن جس نتیجے پر پہنچے گا وہ بالکل درست ہوگا۔

پچاس فیصد کامیابی اور پچاس فیصد ناکامی پر شاید وہ ڈرائیور اور کلینر کو توایک موقع اور دے۔ اسے ابھی کہاں معلوم ہوگا کہ بالواسطہ طور پر ہم نے بھی اس کی مدد کرتے ہوئے تیسرے آدمی کو ختم کر دیا ہے لیکن چوتھا آدمی اس کی دسترس سے نکل چکا ہے۔ خیر مجموعی طور پر اس کو اپنے مقصد کے حصول میں مایوسی نہیں ہوگی۔ چار میں سے تین گواہ تو مارے ہی گئے اور چوتھا جان بچا کے بھاگ گیا تو اب ڈر کس کا ہے وقت بھی کیسا بازی گر ہے۔ ابھی آٹھ بجے دونوں واجب القتل گواہ تھانے سے نکلے تھے تو اپنی حفاظت کے خیال سے غافل نہ تھے۔ ان کو مارنے والے تو نہ مار سکے مگر ہم نے ان میں سے ایک کو مار دیا حالانکہ ہم محافظ بن کے پہنچے تھے۔ چاند خاں کو بہرحال مرنا تھا، سڑک پر ٹرک سے کچل کر موت نہ آئی کسی ویران جنگل میں آئی، اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یہاں مرتا تو اس کا خستہ تن لاشہ دنیاوی رسوم کے مطابق سپردِ خاک ہوتا۔ اب بھی وہ سپردِ خاک تو ہوا مگر اسے کوئی پرائیویٹ قبر نہ ملی۔ اسے ایک پہلے سے موجود مُردے کے ساتھ قبر میں شیئر کرنا پڑا۔ جیسے مجبوری میں لوگ ایک کمرے یا ایک فلیٹ میں شیئر کرتے ہیں۔

"دلاور نے خود کو فتح شیر کے قتل میں ملوث ہونے سے صاف بچا لیا۔" محسن بولا۔

"ہاں، اس کے اور فتح شیر کے ٹیپ اب بھی ہمارے پاس موجود ہیں لیکن ہم ان کا استعمال نہیں کر سکتے۔" میں نے کہا۔

"اگر رابعہ کیس کر دیتی۔ یا جیسا کہ غالب چاہتا تھا، وہ نجی استغاثہ کر دیتا تو یہ ثبوت ہم ان کے حوالے کر سکتے تھے۔" محسن بولا

"رابعہ کو کسی لمبے چکر میں نہیں پڑنا چاہیے۔" میں نے کہا۔

"یہ تو الف دین کے کرنے کا کیس تھا۔ ہم اس کو یہ ثبوت [illegible] دیتے اور وہ انھیں عدالت میں پیش کر دیتا لیکن اس نے [illegible] ہی مسلک اختیار کیا اور اپنے مجرم کو خود ہی سزا دے کر [illegible] جس کا وہ مستحق تھا۔ اس میں دلاور کے خلاف مُدعی بننے کا [illegible] نہیں تھا۔"

"اصل مجرم تو دلاور تھا۔" میں نے کہا۔ "قتل کرنا تھا [illegible] اسے کرتا۔"

"الف دین جیسے شخص کا کوئی بھروسا نہیں۔" میں نے [illegible] غائب تو ہوا ہے لیکن اس بات کا ثبوت کوئی نہیں کہ شہر سے نکل گیا ہے۔ وہ پاگل ہو گیا تھا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ دلاور [illegible] تاک میں ہو۔"

"تُو نے اس ٹرک کا نمبر نوٹ کیا تھا؟" محسن بولا۔

"نہیں۔" میں نے کہا۔ "وہاں اندھیرا ابھی تو تھا۔"

"ہاں، لیکن میں نے قریب جا کے دیکھا تھا۔" محسن [illegible] "اس وقت جب ٹیڈی زبردستی کلینر کے گلے پڑ رہا تھا کہ خرابی دور کر سکتا ہے اور تو ٹرک کے نیچے اسپیڈ پر بکر لگا [illegible] تھا۔ انھوں نے نمبر کو تھوڑا سا بدلا تھا۔ تین کو آٹھ بنا دیا [illegible] اور ایک کو سات۔ ای کو بھی الیف کر دیا تھا مگر ہم یہ چکر چلا [illegible] میں نے اصل نمبر نوٹ کر لیا تھا۔"

"کیا خیال ہے اگر پولیس کو یہ نمبر دیا جائے اور بتایا جا[ئے] کہ اسی ٹرک نے ان کے دو آدمی مارے تھے؟"

"دلاور کچھ نہیں ہونے دے گا۔ ایک تو اس لیے کہ [illegible] گمنام ٹیلی فون ہی کر سکتے ہیں اور اگر وہ کوئی سوال کر بیٹھے کہ تمھیں [illegible] معلوم ہوا تو ہم جواب سے مطمئن نہیں کر سکتے۔" محسن بولا۔ "یہ [illegible] ہے کہ ٹرک کے ٹائروں پر سے خون کے داغ ہزار بار دھو [illegible] کر بھی نہیں مٹائے جا سکتے لیکن وہ ٹائر ہی بدل دیے جائیں تو ممکن ہے۔"

"ہم نے فتح شیر سے اور دلاور سے اعتراف جرم [illegible] کرنے کے لیے بہت محنت کی تھی۔" میں نے کہا۔

"ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ہم وہ کیسٹ اپنے [illegible] رضوی کو ارسال کر دیں۔" محسن بولا۔ "جسے سن کر بے شک وہ [illegible] کہ فتح شیر اور دلاور کے ساتھ دوسری آوازیں ہماری ہیں [illegible] بھی اندازہ کر لیں گے کہ ہم نے چالاکی سے یہ گفتگو ریکارڈ [illegible] مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کریں گے جس کا اعتراف [illegible] بھی رضا کارانہ طور پر کیا ہے اور دلاور نے بھی۔ ہم نے ان [illegible] زبردستی کچھ نہیں کہلوایا ہے۔ فتح شیر تو مر گیا اور اس کے [illegible] نہ قانونی کارروائی ممکن ہے نہ محکمہ جاتی"

[illegible] محسن نے کہا۔

"تیری بات قابلِ عمل لگتی ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر ایس ایس [پی] صاحب نے تحقیقات کا حکم دیا تو اگلے مرحلے میں ہم یہ کر سکتے [ہیں کہ] پولیس کو طافو کے مدفن سے آگاہ کر دیں۔ رحمت کباڑی [کے] قتل کا کیس پہلے سے چل رہا ہے۔ اگر طافو کی لاش کی شناخت [ہو] گئی تو دلاور کے لیے وضاحت مشکل ہو جائے گی کہ رحمت کباڑی [کا] دوسرا ساتھی پُراسرار طور پر گم ہو گیا تھا۔ تحقیقات میں یہ بات [بھی] سامنے آجائے گی کہ طافو کے ساتھ برآمد ہونے والی دوسری [لاش] کس کی ہے۔ تھانے سے پتا چل جائے گا کہ فتح شیر کے [ع]لاوہ جو تین سپاہی مارے گئے ہیں وہی ہیں جن پر شک کیا جا[تا] ہے کہ وہ گشت کے بہانے نکلے تھے اور دلاور کے گھر جا [کے] انھوں نے طافو کی لاش پر پردہ ڈالنے کا معاوضہ وصول کیا [تھ]ا۔ یہ سوال تو خود بخود پیدا ہوگا کہ وہی چار آدمی ایسے پُراسرار حالات میں کیوں ہلاک ہوئے ہیں؟ اگر ایس ایس پی صاحب نے سختی سے کام لیا اور ٹرک ڈرائیور کو کلینر کے ساتھ طلب کر لیا تو وہ [ق]بول دیں گے کہ انھیں دلاور نے کس کام کے لیے کہا تھا اور [ک]یا معاوضہ ادا کیا تھا۔"

"ویری گڈ! ہم یہی کرتے ہیں۔" محسن بولا۔ "انکل رضوی یہ تفتیش بھی کریں گے کہ ہم نے یہ گفتگو کہاں کب اور کیسے کی [تھ]ی اور اب ہم کہاں ہیں؟ لیکن اصل بات یہ ہے کہ ان کو دلاور [پر] ہاتھ ڈالنے کا موقع مل جائے گا۔ ہم کچھ زیادہ محتاط ہو جائیں گے اور انڈر گراؤنڈ رہیں گے۔ ایس ایس پی صاحب خصوصی تفتیشی ٹیم بھی تشکیل دے سکتے ہیں اور تفتیش کرائم برانچ یا سی [آئی] اے کے سپرد بھی کر سکتے ہیں۔"

"فوری طور پر دلاور کو نقصان ہو نہ ہو، اس پر نفسیاتی [دب]ا[ؤ] تو بڑھے گا۔" میں نے کہا۔ "شکاری بھی خونخوار یا آدم خور شیر [کا] شکار کرتے ہیں تو اس کے گرد حلقہ تنگ کرتے ہیں۔ ڈھول [پی]ٹ کر اور چاروں طرف سے مشعلیں لے کر آگے بڑھتے ہیں [تو ش]یر خوف زدہ ہوتا ہے اور خود شکار گاہ کی جانب بڑھتا ہے۔ [د]لاور جیسے شکاری کو بھی اتنی الجھنوں میں اور ذہنی پریشانیوں [میں] مبتلا کر دیا جائے تا کہ وہ ذہنی طور پر مفلوج ہو جائے اور اس [ہمارے] خلاف کچھ کرنے کے بجائے اپنے دفاع میں کچھ کرنے [کا] خیال پریشان رکھے۔"

"یہ حکمت عملی مجھے پسند آئی۔ صبح کسی کے ہاتھ دونوں [کی]سٹ ارسال کر دیے جائیں۔" محسن نے کہا۔ "ٹیڈی ان کے [بج]ائے آفس کے کسی کلرک یا چپراسی کو دے آئے اور وہاں [ب]س نہیں۔ ہم میں سے کوئی بعد میں ٹیلی فون کر کے ٹرک کا نمبر بتا سکتا ہے۔ مثلاً یہ کام غالب کر سکتا ہے۔ وہ رپورٹر ہے اور رضوی صاحب اس کی بات کو ٹال نہیں سکتے۔ وہ اپنی معلومات کا ذریعہ بتانے کا بھی پابند نہیں۔"

"کچھ دن ہمیں باہر نہیں نکلنا چاہیے۔" میں نے کہا۔ "نکلنے کے لیے رات کا وقت موزوں ہے۔ یہاں کی پولیس یکلخت پھر ہماری جستجو میں سرگرم ہو جائے گی۔"

"یہاں سے تو اٹھ۔ ڈیڑھ بج رہا ہے۔" محسن نے کہا۔ "ٹیڈی اگر گھر پہنچا ہو گا تو پریشان ہوگا۔"

ہمیشہ کی طرح ہم نے فاکس ویگن کو دو گلیاں چھوڑ کے ایک خالی پلاٹ پر کھڑا کیا اور پیدل گھر پہنچے۔ ٹیڈی جاگ رہا تھا اور خاصا پریشان تھا۔ "یار میرے دل میں تو ہول اٹھ رہے تھے۔" وہ بولا۔

"غالب صاحب تشریف نہیں لائے؟" محسن نے کہا۔

"کوئی بھی نہیں آیا۔ میں اکیلا تھا۔" ٹیڈی بولا۔ "وہاں دوڑ لگائی تو کافی آگے نکل آیا۔ پلٹ کے گیا تو تم لوگ غائب تھے۔ میں نے دور سے ہی دیکھ لیا تھا۔"

"اور وہ ٹرک وہاں موجود تھا؟" میں نے کہا۔ ٹیڈی نے اقرار میں سر ہلایا۔

"تم کو واپس وہاں جانے کا خطرہ مول لینے کی کیا ضرورت تھی؟" محسن نے کہا۔ "اگر وہ تم کو پہچان لیتے تو کیا ہوتا؟"

"کیا ہوتا — میں نے کون سا جرم کیا تھا۔" ٹیڈی نے کہا۔ "میں تو اُن کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ وہ خود ہی گھبرا گئے تھے کہ کہیں اُن کا بنا بنایا کام نہ بگڑ جائے۔"

"کام تو اُن کا بگڑ گیا۔" میں نے کہا۔ "وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ ہم اُن دونوں کو نکال لائے تھے۔ کانسٹیبل چاند خاں اور علی نواز کو...."

"اور ہم نے اُن سے سب کچھ پوچھ لیا۔" محسن نے اسے مسرت سے اطلاع دی۔ "انھوں نے طافو کی قبر بھی بتا دی اور یہ بھی بتا دیا کہ انھوں نے اپنے حصے کا ایک لاکھ کہاں چھپا رکھا ہے۔ ہمیں اُن پر تھوڑی سی سختی بھی کرنی پڑی کیونکہ اُن میں سے چاند خاں ذرا ضدی اور خود کو تارزن سمجھنے والا آدمی تھا۔"

"اسی خوش فہمی کے باعث وہ مارا گیا۔ اس نے جسمانی طور پر مزاحمت کی مگر ذہنی طور پر وہ اتنا بُزدل ثابت ہوا کہ طافو کی لاش نکالتے ہوئے اس کا دماغ اُلٹ گیا اور اس نے بھاگنے کی کوشش کی۔ مجبوراً مجھے اُس پر گولی چلانی پڑی۔ علی نواز کو ہم نے چھوڑ دیا۔"

"چھوڑ دیا؟" ٹیڈی نے حیرانی سے کہا۔ "ایسے ہی چھوڑ دیا؟"

"ایسے ہی کا کیا مطلب — اُس نے تو سب کچھ بتا دیا تھا۔" میں نے کہا۔ "ہم کیا اُسے پھانسی چڑھا دیتے — ہمارے پاس تو اُسے قید میں رکھنے کے لیے بھی جگہ نہیں تھی۔"

"اس کے علاوہ۔" محسن نے کہا۔ "ہم اُسے بتا چکے تھے کہ وہ کہیں بھی محفوظ نہیں ہے۔ دلاور نے اُسے قتل نہ کروایا تو ہم اُسے نہیں چھوڑیں گے۔ اور اُس کے حق میں یہی بہتر ہے کہ ایک لاکھ لے اور اپنی نئی نویلی دُلہن کے ساتھ غائب ہو جائے۔ وہ حد سے زیادہ ڈرپوک آدمی تھا۔"

"لیکن استاد! اگر اُس نے تمھاری بات نہ مانی اور دلاور کے پاس چلا گیا پھر؟" ٹیڈی نے سوچتے ہوئے کہا۔ "اور اس نے تمھارے بارے میں سب کچھ بتا دیا — یہ بھی مان لیا کہ اُس نے طافو کی قبر کی نشاندہی کر دی ہے کیونکہ وہ مجبور تھا۔ وہ کہہ سکتا ہے کہ سکندر اور محسن مجھے بھی چاند خاں کی طرح قتل کر دیتے۔"

"اسے ہمارے نام معلوم نہیں۔" محسن نے کہا۔ "ہم نے ایک بار بھی نام لینے کی غلطی نہیں کی۔"

"لیکن اُس نے تم دونوں کے چہرے تو دیکھے ہیں۔" ٹیڈی بولا۔ "اگر اُس نے دلاور کے سامنے حلیہ بیان کیا تو کیا دلاور سمجھ نہیں جائے گا کہ علی نواز کس کا ذکر کر رہا ہے؟"

میں نے محسن کی طرف دیکھا۔ بیک وقت ہم دونوں کو احساس ہوا کہ ٹیڈی کی بات میں وزن ہے اور یہ ایسا نکتہ تھا جو ہمارے ذہن میں نہیں آیا تھا۔ علی نواز جیسے کمزور اور بُزدل شخص سے یہ حماقت بھی سرزد ہو سکتی تھی کہ وہ جان بچا کر فرار ہونے کے بجائے سیدھا دلاور سے معافی اور پناہ مانگنے جائے۔ ایک لاکھ بھی اُس کے سامنے رکھ دے اور اس کے پیر بھی پکڑ لے کہ میرا قصور معاف کر دیا جائے۔ اُس کے لیے فرار ہونا بھی مشکل کام تھا۔ بھاگنے والے میں اتنی خود اعتمادی چاہیے کہ وہ بھاگنے سے نہ ڈرے۔ یہ نہ سوچے کہ وہ بھاگ کر کہاں جائے گا اور کب تک بھاگتا رہے گا۔ یہ نہ سمجھے کہ فرار کے راستے بند ہو جائیں گے تو کیا ہوگا۔ راستے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں لیکن یہ ہمت سے زیادہ ذہانت کی بات ہے کہ ہر مشکل موڑ پر آدمی نئی راہیں نکال لے۔ آگے کے خطرات سے بے نیاز ہو کر خدا کے بعد اپنی ذات پر بھروسا رکھتے ہوئے آگے بڑھتا جائے۔ علی نواز میں نہ ہمت تھی اور نہ ذہانت — نہ اُسے یہ اعتماد تھا کہ اتنی بڑی دُنیا میں وہ کہیں محفوظ رہ سکتا ہے اور نہ اس کا یقین تھا کہ وہ پھر کبھی نہیں پکڑا جائے گا۔ وہ نفسیاتی طور پر دلاور سے بہت دہشت زدہ تھا۔ ہم نے بھی اُسے خوفزدہ کرنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی تھی۔ علی نواز کو اپنے جرائم کا فاش ہونے کا ڈر تھا اور وہ سمجھتا ہوگا کہ ایک پولیس مین چھپ کر کہیں نہیں جا سکتا۔ اس کے محکمے کے ریکارڈ پر سب کچھ ہے۔ اس کا نام پتا، تصویر اور حلیہ۔ اگر اس کے ساتھ ہی تمام تر تشہیر ہوئی تو وہ کہیں نہ کہیں اور کبھی نہ کبھی ضرور پکڑا جائے گا۔ اُس بے وقوف آدمی سے کچھ بعید نہیں کہ وہ خود کو دلاور کے رحم و کرم پر چھوڑ دے، اُسی سے کہے کہ مجھے بچاؤ اور اُسی کے ہاتھوں مارا جائے۔ دلاور وہ شخص تھا جس کے سینے میں دل ہی نہیں تھا۔ اور اگر تھا تو اس کا جذبات سے اتنا ہی رشتہ تھا جتنا پتھر کا زندگی کے احساس سے۔ شرافت اور انسانیت، رحم دلی اور نیکی یا مروّت اور لحاظ اُس کے لیے بے معنی الفاظ تھے تاوقتیکہ ان الفاظ سے اس کے مذموم شیطانی عزائم میں مدد نہ ملتی ہو۔ بالکل اسی طرح جیسے جیتے جاگتے انسان اس کے لیے اپنے مقاصد کے حصول کا ایک ذریعہ تھے۔ ایک آدمی کا ختم ہونا اس کے نزدیک ایک گولی کے نقصان سے زیادہ اہم واقعہ نہیں تھا۔ وہ کبھی غور نہیں کرتا تھا کہ گولی صرف موت کا نامہ بر ہوتی ہے اور آدمی سے رشتوں کی آبرو ہے۔ گولی کا کسی سے کوئی جذباتی تعلق نہیں ہوتا۔ اُسے ریوالور ایک ہاتھ سے دُوسرے ہاتھ میں پہنچ جائے تو کس کو فرق پڑتا ہے اور جو قتل کرنے کی نیت لے کر آتا ہے وہ قتل ہو جاتا ہے تو مانگ کس کی اُجڑتی ہے؟ ممتا کس کی لہو روتی ہے اور یتیمی کس کا مقدر ہوتی ہے۔

چنانچہ علی نواز نے دلاور کے ہاتھوں کو مضبوط سمجھتے ہوئے اگر اعتراف کر لیا کہ جان بچانے کے لیے اس نے سکندر اور محسن کے سامنے اقبالِ جرم کر لیا ہے اور وہ جگہ بھی بتا دی ہے جہاں طافو کو دفن کیا گیا تھا تو دلاور بڑی شاطرانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہے گا کہ پریشانی کی اس میں کیا بات ہے؟ ڈر تو آدمی کے ساتھ ہے۔ اب دیکھ لو چاند خاں نہیں رہا تو اُسے کسی کا ڈر بھی نہیں رہا۔ تم کو بھی میں خوف اور پریشانی سے ہمیشہ کے لیے نجات بخشتا ہوں۔ جاؤ زیرِ زمین سُکھ چین کی ابدی نیند سو جاؤ۔ یوں کہ قیامت تک نہ اٹھو اور نہ تم کو کوئی اُٹھا سکے۔

پھر وہ ایک گولی سے علی نواز کا سارا ڈر ختم کر دے گا۔ اور اُسے زمین کے کسی گمنام گوشے کے سپرد کر دے گا۔ آج نہ سہی کل علی نواز کا انجام بہرحال یہی ہونا تھا۔ دلاور نے فتح شیر سے معاملہ طے کرتے وقت ہی طے کر لیا ہوگا کہ طافو کی لاش ٹھکانے لگانے میں اس کی مدد کرنے والوں کا وجود اس کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ وہ ایک بار پانچ لاکھ وصول کر لینے کے بعد بھی جب چاہیں گے اصل رقم کا سُود وصول کرنے پھر آ جائیں گے۔ یہ کوئی اصول اور شرافت کی بنیاد پر ہونے والا سودا نہیں تھا۔ فتح شیر اور اس کے ساتھی دلاور کو بلیک میل کر سکتے تھے اور دلاور وہ شخص تھا جو جانتا تھا کہ بلیک میلر کی زبان پیسہ نہیں بند کر سکتا۔ پیسہ تو بلیک میلر کو حوصلہ دیتا ہے کہ وہ دستِ سوال کو ہمیشہ دراز رکھے۔ دلاور نے پانچ لاکھ دینے کے بعد انسپکٹر فتح شیر اور اس کے چاروں ساتھیوں کو موت کا فرمان بھی تھما دیا تھا جسے اس کی کوتاہ بین نظر نہ پڑھ سکی۔ فتح شیر کو ختم کرنے کے لیے دلاور کو تردد نہیں کرنا پڑا۔ اس کے چار میں سے دو ماتحت ٹرک کے نیچے آ گئے تھے۔ تیسرا چاند خاں "لاپتا" ہو گیا تھا اور چوتھا علی نواز، خود اُس کی خدمت میں حاضر ہو گیا کہ چوہدری صاحب! ایک لاکھ لیجیے اور مجھے تحفظ فراہم کیجیے تو دلاور اسے تمام دنیاوی مسائل خوف اور آلام سے محفوظ کر دے گا اور علی نواز کو طافو کی طرح کسی بے نشان مدفن میں لیٹ کر سوائے یومِ حساب کے کسی کا ڈر نہیں رہے گا۔ اس کے بعد دلاور کے لیے صرف دو افراد کا مسئلہ رہ جائے گا۔ ان دونوں کا جو ملک الموت سے ٹکر لے کر پھر بچے تھے — دو افراد کو کچل کر مطمئن تھے کہ نصف کامیابی تو ہوا ہے! باقی نصف اُن کو یقینی نظر آتی تھی معلوم نہیں دلاور نے ان کو ملک الموت مقرر کرنے کا کنٹریکٹ کتنے کی قیمت میں دیا تھا۔ لیکن ہمارا مقصد تو جو بھی تھی تو اس کا مقصد لاکھ۔ مگر وہ چار لاکھ میں چار انسانوں کو مزاحمت کیے بغیر ختم کرنے کا وعدہ کرنے والے یہ نہیں جانتے تھے کہ ان کو یہ ٹھیکہ پیسہ سنبھالنے کو ملک الموت ہی سمجھتا ہے اور چار لاکھ میں انھوں نے چار افرادی زندگی کا سودا نہیں کیا، اپنی زندگی رہن رکھ دی ہے۔ پانچ افراد سے نجات پانے کے لیے دلاور نے دو کی خدمات حاصل کی تھیں۔ دو کے لیے وہ کسی ایک سے بات کرے گا اور اس آخری آدمی کا قصہ خود پاک کر دے گا۔

"پریشان مت ہو۔" محسن نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "علی نواز ہماری طرف سے جہنم میں جائے۔"

"ہاں۔ ہمارا کیا بگاڑے گا وہ۔" میں نے چونک کر کہا۔ "بے وقوفی کرے گا تو خود جان سے جائے گا۔"

"لیکن وہ دلاور کو اور بہت سی باتیں بتا دے گا۔ جو ہم نے اسے بتائی تھیں۔" محسن نے کہا۔ "وہ لاکھ بے وقوف سہی ہے تو پولیس مین — اس کی نظر نے بہت کچھ دیکھ لیا ہوگا۔ مثلاً اس کوٹھی کا نقشہ، جہاں سے فتح شیر کی لاش ملی تھی۔ سفید رنگ کی اس فاکس ویگن کا نمبر۔ رابعہ کی اس کوٹھی میں موجودگی۔ ایک سب انسپکٹر اور سپاہی پولیس مین کے ساتھ ہمارا سلوک...."

"وہ انکار کر دیں گے۔" میں نے کہا۔ "علی نواز کی کون سُنے گا؟"

"دلاور۔" محسن بولا۔ "کوئی اور یقین کرے نہ کرے، دلاور جان لے گا کہ علی نواز جھوٹ نہیں بول رہا ہے۔"

"اس سے معاملات بگڑ سکتے ہیں۔" میں نے سوچ کر کہا۔ "ہمارے یا پولیس کے کچھ کرنے سے پہلے ہی دلاور اپنا کام کر جائے گا۔ وہ طافو اور چاند خاں کی لاشوں کو غائب کرا دے گا اور اس کے بعد ہمارے فرشتوں کو بھی خبر دینے والا کوئی نہ ہوگا کہ وہ دونوں لاشیں کہاں گئیں۔ مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک کتنے فاصلے پر الگ الگ یا ایک جگہ گاڑی گئیں۔ ان کے اعضا الگ الگ جلا دیے گئے یا غرق کر دیے گئے کسی بات کا سراغ لگانا ممکن نہ ہوگا۔ فتح شیر کے قتل کے الزام سے بچنے کا انتظام اس نے پہلے ہی کر لیا ہوگا۔" میں نے مایوسی سے کہا۔ "ہم نے کیسٹ پر جو گفتگو ریکارڈ کی تھی وہ انتہائی ناقص اور کمزور شہادت بن جائے گی — دلاور کے خلاف نہ کوئی مدعی نہ شہادت — نہ ثبوت نہ گواہ — لہٰذا قتل اور لاش کچھ نہیں ملے گا تو محض کیسٹ پر ریکارڈ ہونے والی گفتگو کی کیا اہمیت رہے گی؟"

"وہ صاف انکار بھی کر سکتا ہے کہ یہ میری آواز نہیں ہے۔" محسن نے کہا۔

"انکار کیسے کر سکتا ہے؟" میں نے کہا۔ "وہ ابھی مرا تو نہیں۔"

تم کو واپس وہاں جاؤ۔" محسن بولا۔ "عام زندگی میں دو مختلف آدمیوں کا ایک جیسی آواز رکھنا کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ نقال لوگ بھی کیا کیا نقلیں بنا بھی لیتے ہیں۔ پہچان اس وقت اور مشکل ہو جاتی ہے جب آواز ٹیپ پر ہو۔ انسانی آواز تو ٹیلی فون پر بھی اصل آواز سے مختلف سنائی دیتی ہے۔ دلاور کہہ سکتا ہے کہ سکندر کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا مگر دوسری آواز میری نہیں ہے، کسی ایسے شخص کی ہے جو میری طرح اور میرے لہجے میں بول سکتا ہے۔ غالباً یہی مؤقف فتح شیر کے وکیل کا بھی ہوگا۔"

"پھر بھی کوئی طریقہ تو ہوگا اصل اور نقل میں فرق معلوم کرنے کا؟"

"ہاں۔ طریقہ بہت سائنٹیفک ہے۔" محسن بولا۔ "اتنا تو سبھی جانتے ہیں کہ آواز کی لہریں ہوتی ہیں۔ اور یہ لہریں چھوٹی بڑی ہوتی ہیں۔ آواز کی ایک پچ ہوتی ہے۔ کسی کی آواز پتلی ہوتی ہے کسی کی بھاری۔ یہ پچ کا فرق ہے۔ باہر کے ملکوں میں ایسے حساس الیکٹرانک آلات موجود ہیں جن سے ہر شخص کی آواز کا گراف بنایا جا سکتا ہے بالکل اسی طرح جیسے دل کی دھڑکن کا گراف بنایا جاتا ہے جو ای سی جی کہلاتا ہے۔ دماغ کی برقی لہروں کے گراف کو ای ای جی کہتے ہیں۔ ڈاکٹر گراف پر ایک نظر ڈالتے ہیں اور فرق کا پتا چلا لیتے ہیں۔ ایسے ہی الیکٹرانک آلات سے آواز کا فرق معلوم کیا جاتا ہے۔ میری یا تیری آواز کا گراف دس دفعہ کیا ہزار دفعہ بنایا جائے تب بھی ایک ہی ہوگا۔ آواز کسی اور کی ہوگی تو فرق آ جائے گا خواہ سننے میں وہ آواز سو فیصد اصل آواز لگتی ہو۔ یورپ اور امریکا میں جہاں سکیورٹی کے انتظامات انتہائی سخت ہوتے ہیں وہاں اب شناختی کارڈ چیک نہیں کیے جاتے۔ شناختی کارڈ تو کسی بھی بن جاتے ہیں۔ غلط آدمی کو اندر داخل ہونے سے روکنے کے لیے بعض جگہ فنگر پرنٹ کا نظام ہے۔ یعنی اندر جانے والا آدمی اپنا انگوٹھا ایک خاص مقام پر رکھے۔ اندر کسی کمپیوٹر میں پہلے سے فنگر پرنٹ موجود ہے۔ دونوں ایک ہوں گے تو کمپیوٹر کا خودکار نظام دروازہ کھول دے گا ورنہ الارم دے گا کہ سکیورٹی خطرے میں ہے۔ اس سے بھی جدید نظام یہ ہے کہ آپ دروازے کے مقابل کھڑے ہو کے نام بتائیں۔ اصل آواز کا گراف اندر کسی کمپیوٹر کے ذہن میں محفوظ ہے۔ جب آپ نام بتائیں گے تو کمپیوٹر نام کی پروا کیے بغیر صرف آواز کے گراف ملائے گا اور ایک ہوں گے تو آپ کو اندر جانے کی اجازت دے گا۔ نام آپ کچھ بھی بتا دیں۔ اکرم خان یا پھنے خاں۔ کمپیوٹر صرف اس گراف کو سمجھتا ہے جسے ساؤنڈ پکچر بھی کہا جاتا ہے۔ بیچارا شیکسپیئر تو اسی لیے بہت پہلے کہہ گیا تھا کہ نام میں کیا رکھا ہے۔"

مجھے اس مثال پر ہنسی آ گئی۔ "اس بات کا مطلب تو میں سمجھ گیا۔"

"تو اب یہ بھی سمجھ لو کہ جب دلاور انکار کرے گا تو اس کی آواز کی تصویر خوانی ضروری ہوگی۔" محسن بولا۔ "مجھے نہیں معلوم کہ یہاں کی کسی لیبارٹری میں اتنا جدید الیکٹرانک سسٹم موجود ہے یا نہیں جو دلاور کی اصل آواز اور ٹیپ کی آواز کو ایک ثابت کر سکے۔ اگر ہے تو وہ بیچارا کمپیوٹر خود عدالت میں حاضر ہو کے نہیں کہہ سکتا کہ مائی لارڈ! دلاور جھوٹ بولتا ہے اور ٹیپ پر اسی کی آواز ہے۔ یہ رپورٹ بھیجنے والے فرشتے بھی نہیں ہوں گے میرے تیرے جیسے سر پھرے بھی نہیں ہوں گے جو اپنی ذات پر 'ناقابلِ فروخت' کا بورڈ کسی تمغے کی طرح سجا کے سمجھتے ہیں دنیا فتح کر لی۔ حالانکہ دنیا ہماری اسی فطرت سے نالاں ہے۔ وہ جو علامہ مرحوم نے کہا تھا کہ آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی۔ تو نہ جانے وہ دور گزر گیا یا اب آئے گا۔ فی الحال تو اس فلسفے کی مٹی پلید ہو رہی ہے۔ چنانچہ دلاور کو بھی سکۂ رائج الوقت میں مناسب اور قابلِ قبول قیمت ادا کرنی پڑے گی پھر اسے وہی رپورٹ مل جائے گی جو وہ چاہتا ہے اور کوئی راتوں رات دولت مند ہو جانے والا عدالت میں یہ رپورٹ دے گا کہ مائی لارڈ! سکندر بخت کا پیش کردہ کیسٹ جعل سازی کا نمونہ ہے۔ اس میں چوہدری دلاور کی آواز بنانے کی بھونڈی کوشش کی گئی ہے اور یہ ریڈیو ڈراما صداکاری کا کمال قرار دیا جائے گا۔ عدالت اسے مسترد کر دے گی۔ من ھو المطلوب۔"

"انکل رضوی تو یقین کریں گے؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ وہ ضرور یقین کریں گے کہ دلاور اور فتح شیر نے مل کر کس جرم کی پردہ پوشی کی تھی اور دلاور نے اس کا کیا معاوضہ ادا کیا تھا۔" محسن بولا۔ "وہ اتنے تجربہ کار پولیس افسر ہیں۔ یہ بھی تسلیم کر لیں گے کہ فتح شیر نے حرام کی کتنی دولت کمانے کا اعتراف کر لیا تھا۔ اور یہ بھی سمجھ جائیں گے کہ تم نے ان دونوں کو کس طرح ٹیپ کیا ہوگا۔ مگر وہ کوئی قانونی کارروائی اس ٹیپ کو بنیاد بنا کر نہیں کریں گے۔"

"کوئی بات نہیں۔ ان کو اتنا تو معلوم ہو کہ ہم کس کے خلاف صف آرا ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہماری جنگ کس سے ہے اور کیوں۔ ان کے نقطۂ نظر سے ہماری جدوجہد غیر قانونی ہے۔ مگر ہم بھی تو اس لیے مجبور ہیں کہ ان کا قانون ہمیں تحفظ فراہم نہیں کر سکتا اور اصل مجرموں کے سامنے بے بس ہے۔ کیا وہ خود اپنی بے بسی کو نہیں سمجھتے؟"

"سمجھتے ہیں۔ لیکن ان کو ادائے فرض سے غرض ہے۔ وہ قانون انصاف کی خامیوں اور کوتاہیوں کو عذر بنا کر فرض شناسی کے تقاضوں سے روگردانی نہیں کرتے۔" محسن نے کہا۔

رات کا آخری پہر تھا لیکن نیند ہم میں کسی سے بھی نہیں

آ رہی تھی۔ محسن نے دو سگریٹیں جلائیں اور ان میں سے ایک مجھے پکڑا دی۔ "میاں نیک محمد! آخر ہم تمہارے مہمان ہیں۔ تم پر خاطر مدارات واجب ہے۔ اور کچھ نہیں تو چائے ہی پلا دو۔"

"اس وقت تو میرے دل کی کہی تم نے۔ میں اٹھنے ہی والا تھا۔" ٹیڈی بولا۔

"حالات سخت ہوتے جا رہے ہیں استاد!" میں نے کہا۔ "رات کو جاگنے اور دن کو سونے کا اثر یہ ہوگا کہ عادات و اطوار ہی سے نہیں صورت سے بھی ہم وہی نظر آئیں گے۔ الف سے الو۔ مگر مجبوری میں آدمی الو بنتا ہے۔"

"کبھی دل کے ہاتھوں مجبور ہو کے۔" محسن نے کہا۔ "کبھی شامتِ اعمال کے باعث۔"

"لیکن تم محض دو الوؤں کی صحبت میں الو بن رہے ہو۔" میں نے کہا۔ "جاؤ بیٹے الو! چائے بنا لاؤ۔"

چائے بنانے کے لیے جانے سے پہلے استاد ٹیڈی نے دلائل سے ثابت کیا کہ اس وقت دنیا میں ہر شخص کسی نہ کسی کو الو بنا رہا ہے۔ بیوی شوہر کو اور شوہر بیوی کو۔ بچے ماں باپ کو۔ سیاستدان عوام کو۔ شاعر سے لے کر تاجر تک اور مزدور سے لے کر آجر تک، سب ایک دوسرے کو الو بناتے ہیں۔ چنانچہ دنیا میں انسان کوئی نہیں ہے سب الو ہیں یا الو کے پٹھے ہیں۔ پھر وہ واک آؤٹ کر گیا۔

"صبح کے اخباروں میں ایک خبر اس پرنسپل کے اغوا اور موت کی ہوگی۔" محسن نے کچھ دیر بعد کہا۔ "ہاں۔ اور اس میں جو گاڑی ملوث پائی جائے گی اس میں سے صوفیہ کے نام کے کاغذات برآمد ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "پولیس کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ نام پتا فرضی تھا۔ چنانچہ پولیس معلوم کرے گی کہ گاڑی کہاں سے خریدی گئی تھی اور وہ دکاندار الفاظ سے تیری تصویر بنا دے گا جس کے پاس تو دو مرتبہ جا چکا ہے۔ پہلے ایک گاڑی خریدنے کے لیے پھر اس کے بدلے یہ دوسری گاڑی لینے کے لیے۔"

"ممکن ہے تفتیش کا سلسلہ پرنسس صوفیہ کے ساتھ پیش آنے والے پرانے واقعات سے جا ملے اور ایک ہوٹل کا منیجر بھی گواہ بن کے دہائی دیتا آ جائے کہ اس آفت کی پرکالہ پرنسس صوفیہ کے باعث وہ خود کتنی تباہی و بربادی سے دوچار ہوا تھا۔ اور اس کی آنکھوں نے شرفا کے اس ہوٹل میں دھڑلے سے کتنا سنسنی خیز اور خونی ڈراما دیکھا تھا۔ وہ پرنسس کی تصویر اپنے الفاظ میں بنا دے گا۔ ممکن ہے دل سے کوئی پرنٹ نکال کر پولیس کو بتا دے کہ یہ تھی وہ غارت گرِ عقل و ہوش جس کا عکس اب تک دل کے آئینے میں ہے۔ اس کے بعد ہمارے انکل ایس ایس پی تک بات پہنچی تو وہ... دو اور دو چار سمجھتے ہیں چنانچہ اس نتیجے پر فوراً پہنچ جائیں گے کہ یہ سب کس کی کارروائی ہو سکتی ہے۔ پھنستے کی تھی تو اس کا مقصد سکندر۔ مائٹ از رائٹ سوسائٹی سے مزاحمت کیے بغیر

"محسن خان۔ ذرا اپنے چاروں طرف دیکھو۔" سنبھالے

"اس کمرے میں نہیں، میرا مطلب تھا اس دنیا کو دیکھو جس میں ہم جی رہے ہیں۔ آج یہ کلیہ صرف حیوانوں ہی پر نہیں انسانوں پر بھی صادق آتا ہے کہ بقا صرف طاقتور کے لیے ہے۔ زمانہ قبل از تاریخ کے جانور مثلاً ڈینوسار خود ختم ہو گئے۔ اب شیر ہاتھی اور دوسرے بہت سے جانوروں کی نسل رفتہ رفتہ معدوم ہوتی جا رہی ہے کیونکہ ان میں حالات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت اور طاقت نہیں۔ یا دوسرے الفاظ میں بدلے ہوئے حالات میں ان کے لیے زندہ رہنا ناممکن ہوتا جا رہا ہے۔ ایسے ہی ایک مس فٹ ایماندار اور اصول پرست آدمی کے لیے اس معاشرے میں جینا مشکل ہو جائے گا اور معاشرے سے اس کا وجود خود بخود مٹ جائے گا۔ مائٹ از رائٹ سوسائٹی میں ایسے آدمی کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔"

"یہ تو ٹھیک ہے یار۔" محسن نے کہا۔ "ڈھول تو ست پیٹا جاتا ہے کہ سب خیریت ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ دیانتداری اور ایمان کی سلامتی کے ساتھ آج کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ نہ ملازمت نہ کاروبار اور نہ محنت مزدوری۔ رزق حلال کما کے اپنا اور خاندان کا پیٹ بھرنے کے لیے کوئی چھابڑی بھی لگانا چاہے، تو پتھارے دار کا بھتہ ہے۔ پولیس کا بھتہ ہے۔ غنڈہ ٹیکس ہے۔ قلی بھی ٹھیکیدار کو بھتہ دیتا ہے اور فقیر بھی۔ کوئی مجبوری میں اپنا خون بھی بیچنا چاہے تو ہر ہسپتال کا ایک ٹھیکیدار ہے۔ پہلے وہ بھتہ لیتا ہے۔"

"یہی ہے مائٹ از رائٹ سوسائٹی دوست!" میں نے کہا۔ "جو کچھ ہم آج ہیں، اسی کے طفیل ہیں ورنہ کیا ہم ایسے تھے؟ ہم نے تو اصول اور انصاف کے مطابق اپنا حق مانگا تھا۔ بہت مجبور ہو کے ہم نے مائٹ از رائٹ کے فلسفے کی بالادستی قبول کی۔ اس کے بغیر چارہ نہیں تھا۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا نظریہ یہاں سکۂ رائج الوقت تھا۔ اس کے بغیر حق تو کیا کوئی ہمیں خیرات تک دینے پر تیار نہ تھا۔ اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا۔ ہم نے بھی اس معاشرے کی اصلاح کا ٹھیکا نہیں لیا ہے۔ ہم تو صرف اپنا حق حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اپنا حق غصب کرنے والوں کو یہ سبق دینا چاہتے ہیں کہ ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں۔ جو اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی سکت رکھتے ہیں۔"

جب ٹیڈی چائے لے کر اندر آیا تو ہم فرش پر دیوار سے ٹیک لگائے پیر پھیلائے بیٹھے تھے۔ رات کے آخری پہر میں سردی بڑھ گئی تھی چنانچہ ہم نے پیروں پر کمبل ڈال لیا تھا۔ میرے ہاتھ پھر

"تم کو واپس وہاں ... پر بچھی ہوئی دری بھی مجھے ناکافی محسوس ہو"

"بہرحال" محسن نے گرم چائے کا ایک گھونٹ لے کر کہا۔ "مزہ آ گیا۔ آج سردی بھی زیادہ ہے۔"

"تم اس ایک کمبل میں سردیوں کا پورا موسم گزار دیتے ہو؟" میں نے ٹیڈی سے کہا۔

"ایک کمبل سے کیا ہوتا ہے جی" ٹیڈی بولا "صبح تک آدمی کی قلفی جم جائے۔ میرا کمرہ ایئر کنڈیشنڈ ہے۔ سردی باہر کتنی بھی ہو، اندر پتا بھی نہیں چلتا۔" اس نے پلنگ کے نیچے سے الیکٹرک روم ہیٹر نکالا اور پلگ لگا کے آن کر دیا۔ ڈبل بار والے ہیٹر کی چمکدار سطح سے روشنی کے ساتھ حرارت کمرے میں پھیلنے لگی۔ میں نے حیرانی سے ٹیڈی کی طرف دیکھا۔

"استاد — یہ ہیٹر تو ستر اسّی روپے کا ہے" میں نے کہا "مگر یہ دو ہزار واٹ کا ہیٹر ہے۔"

"اس کا بجلی کا خرچ تو بہت زیادہ ہوگا" محسن نے کہا۔

"پتا نہیں جی — ہم نے مالکِ مکان سے دس روپے مہینہ طے کر رکھا ہے" ٹیڈی بولا۔

"دس روپے مہینہ؟" محسن نے کہا "اور مکان کا کرایہ کتنا دیتے ہو؟"

"پچاس روپے" ٹیڈی نے کہا۔

"کمال ہے! اس طرح تم دو سو روپے کی تو بجلی خرچ کر دیتے ہو" میں نے کہا "مالک مکان تو روتا ہوگا۔"

"اس نے تو اپنے گھر کے تین کمروں میں ہیٹر لگا رکھے ہیں!..." ٹیڈی نے دانت نکال کے کہا "بالکل ساتھ والا مکان اس کا ہے اور میٹر بھی اُدھر ہی ہے۔ بڑی ایمانداری سے ہر مہینے پندرہ بیس روپے کا بل ادا کرتا ہے۔"

"اچھا! گویا ڈائریکٹ کنکشن لے رکھا ہے؟" میں نے کہا۔

"یا وہ خود واپڈا میں ہے۔"

ٹیڈی نے نفی میں سر ہلایا "اس کا سالا میٹر ریڈر ہے۔"

"دیکھا محسن خان! اس معاشرے میں ایک میٹر ریڈر کتنا بااختیار ہے" میں نے کہا "حکومت کیا کرے اور نظامِ انصاف کیا کرے۔ پولیس کانسٹیبل سے لے کر سسٹم کے چپراسی تک سب کی طاقت اُن قوانین کی طاقت سے زیادہ ہو گئی ہے جو بدعنوانی کو ختم کرنے کے لیے بنائے جاتے ہیں۔"

"قصور تو اُن کا ہے سکندر جو قانون شکن عناصر کا ساتھ دیتے ہیں۔ مثلاً ہمارے استاد ٹیڈی کا مالکِ مکان" محسن نے کہا "یہ بھی سمجھتا ہے کہ قانون میرا کیا بگاڑ لے گا۔ ساری خدائی اک طرف، جورو کا بھائی اک طرف۔"

"کہیں جورو کا بھائی، کہیں پیسہ اور کہیں غنڈہ گردی" میں نے کہا "یہی تو لاقانونیت کے سہارے ہیں جن کی وجہ سے یہ معاشرہ دو حصوں میں بٹ گیا ہے۔ ایک ظالم اور دوسرے مظلوم۔ ایک طرف چوہدری دلاور جیسے لوگ ہیں جن کے ہاتھ میں لاٹھی ہے چنانچہ وہ بااثر سب کو بھینس سمجھتے ہیں اور جدھر چاہتے ہیں ہانک کر لے جاتے ہیں۔"

کمرے میں ہم تینوں وقت گزارنے کے لیے، اعصابی کشیدگی کم کرنے کے لیے اور ذہن کو پریشان کن خیالات سے دور رکھنے کے لیے باتوں میں مصروف تھے مگر باہر مکمل سکوت تھا۔ دسمبر کی سرد رات کا منجمد اندھیرا تھا۔ کہیں بہت دور ایک کتا رو رہا تھا اور وقفے وقفے سے چوکیدار کی سیٹی بھی سنائی دے جاتی تھی۔ میں نے رالعبہ کا تصور کیا اور اپنے دل کو اس خیال سے بہلانا چاہا مگر دماغ پر دہشتناک واقعات کا اثر تھا۔ ایک نقش الف دین کی سالی اور سکول کی پرنسپل کی المناک موت کا تھا۔ کیا عجیب آدمی تھا الف دین کہ چوریاں کرتا تھا، ڈاکے ڈالتا تھا اور سکول چلاتا تھا جہاں بچے کتابوں میں لکھی ہوئی باتیں پڑھتے تھے کہ ہمیشہ سچ بولو، خدا سے ڈرو، کسی کا حق نہ مارو — اور وہ بے گناہ عورت جو قوم کے نونہالوں کو یہ تعلیم دیتی تھی، استاد تھی اور جس کا مرتبہ بہت بلند تھا، تین بدمعاشوں کے ہاتھوں اغوا کی ناکام کوشش کے بعد کتنی سفاکی سے قتل ہوئی۔ دوسرا نقش طافو کی گل سڑ جانے والی لاش کے ساتھ چاند خاں کی تدفین کا تھا۔ ایسے میں رالعبہ کا خیال ہی کچھ روح کی تسکین کا سامان فراہم کر سکتا تھا۔ ایک خلش اس احساس کی تھی کہ میں نے آج اپنے غلط رویے سے اس کے جذبات کو مجروح کیا تھا۔ اور اس کے دل کو صدمہ پہنچایا تھا۔ محسن نے کہا تھا کہ وہ رو رہی تھی۔ کیا اس وقت وہ بھی جاگ رہی ہوگی اور خود کو قصوروار سمجھ کے احساسِ پشیمانی میں مبتلا ہوگی؟

میری طرح محسن اور ٹیڈی بھی کچھ سوچ رہے تھے اور چائے پیتے ہوئے سکوت کا ایک مختصر سا وقفہ آ گیا تھا۔ خاموشی میں اچانک میرے کانوں نے کسی کے اندر کودنے کی آواز سنی۔ آواز واضح تھی کہ بیک وقت محسن اور ٹیڈی بھی میرے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ میں نے ایک ہاتھ کی انگلی ہونٹوں پر رکھ کے انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ریوالور خود بخود میرے ہاتھوں میں آ گیا تھا۔

"تیرا ریوالور کہاں ہے؟" میں نے سرگوشی میں کہا۔

"دوسرے کمرے میں" محسن نے پیچھے ہٹ کر دروازے کا رخ کیا۔

"ابھی دروازہ مت کھولنا...... دروازہ ٹیڈی کھولے گا" میں نے محسن کو روکنے کے لیے کہا۔ ہم اس قدر آہستہ بات کر رہے تھے کہ باہر کوئی ہماری سرگوشی نہیں سن سکتا تھا۔ "دوسرے کمرے ہی میں ٹھہرنا۔"

"یا میرے مولا! آخر اس وقت آنے والا کون ہو سکتا ہے سکندر بادشاہ!" استاد ٹیڈی نے گھبرا کے کہا۔

"میں دیوار سے لگ کر کھڑا ہوتا ہوں" میں نے کہا "تم دروازہ کھولو اور اُسے اندر آنے دو۔"

"لیکن اندر آنے سے پہلے ہی اس نے مجھے گولی مار دی تو کیا ہوگا؟" ٹیڈی نروس ہو کے بولا "تم تو بچ جاؤ گے دیوار کے پیچھے چھپ کر۔" باہر اب بالکل خاموشی تھی۔ میں نے کمرے کی لائٹ آف کر دی۔

"فکر مت کرو استاد" میں نے دیوار کے ساتھ چپک کر ریوالور کا سیفٹی کیچ ہٹا دیا "معلوم نہیں آنے والا دوست ہے یا دشمن۔ اگر دشمن ہوگا تب بھی گولی چلانے کی حماقت نہیں کرے گا۔"

"کیا معلوم وہ کتنے ہیں" ٹیڈی نے کہا "اور کون ہیں آخر؟"

"یہ تو دروازہ کھولنے کے بعد ہی معلوم ہوگا" میں نے جھنجلا کر کہا "ابھی سے تمہارا دم کیوں نکل رہا ہے؟"

"دم کس کا نکل رہا ہے!" ٹیڈی نے تھوک نگل کے کہا "لیکن وہ انتظار کیوں کر رہے ہیں، کیا چاہتے ہیں آخر؟"

"ٹیڈی! وہ چاہتے ہیں کہ تم دروازہ کھول کے دیکھو" میں نے دانت پیس کر کہا "فرض کرو وہ ہمیں قتل کرنا چاہتے ہیں۔ آگ لگا کے اندر ہی راکھ کر دینا چاہتے ہیں۔ جب وہ سامنے آئیں گے تب ہی معلوم ہوگا نا۔ تم کچھ بھی مت کرنا۔ ہاتھ اوپر اٹھا لینا۔ پیچھے ہٹ جانا۔ وہ ایک ہوں یا دس، اُن سے ہم نمٹ لیں گے۔ چلو کھولو دروازہ۔"

خود کو استاد ٹیڈی کہلا کے خوش ہونے والے اور اپنی بدمعاشی کی ڈینگ مارنے والے نیک محمد نے اپنی کم ہمتی اور بزدلی کا ثبوت پہلے بھی بارہا دیا تھا مگر اس وقت مجھے ٹیڈی کی حالت پر ہنسی نہیں آ رہی تھی، تاؤ آ رہا تھا۔ وہ مردہ قدموں سے آگے بڑھا اور کانپتے ہاتھوں سے کنڈی کھولی۔ چند سیکنڈ وہ اس مجرم کی طرح کھڑا رہا جو تختۂ دار پر کھڑا جلاد کے لیور کھینچنے کا منتظر ہو مگر اس کے سامنے قضا کو دیکھ نہ سکتا ہو۔ پھر میں نے دروازے کی اوٹ سے نکل کے دیکھا۔ صحن میں کوئی بھی نہیں تھا۔ مختصر سے صحن کا ہر گوشہ اندھیرے کے باوجود اس حد تک روشن ضرور تھا کہ کوئی کسی کونے میں بھی کھڑا ہوتا تو نظر آ جاتا۔ کچن اور انتہائی مختصر باتھ روم کے دروازے کھلے ہوئے تھے چنانچہ یہ ہو سکتا تھا کہ اندر کودنے والا چھپ گیا ہو۔ اس میں شک کی بالکل کوئی گنجائش نہ تھی کہ صحن کی چھ فٹ سے زیادہ بلند دیوار کو پھاند کر کوئی اندر آیا تھا۔ وہ خاموشی سے بھی اندر اتر سکتا تھا مگر اس نے احتیاط کے تقاضوں کا خیال نہیں رکھا تھا۔ اگر یہ حرکت اس نے جانتے بوجھتے کی تھی تو اس کا مقصد ہمیں متوجہ کرنا تھا۔ تاکہ ہم باہر نکل آئیں اور مزاحمت کیے بغیر ہتھیار ڈال دیں۔ اگر کوئی کچن یا باتھ روم میں اپنا مورچا سنبھالے بیٹھا تھا تو یقیناً ہم سے بہتر پوزیشن میں تھا لیکن میں اپنے دشمنوں کو بے وقوف نہیں سمجھتا تھا۔ اپنے طرزِ عمل سے بہت پہلے ہی ہم یہ ثابت کر چکے تھے کہ نہ ہم اتنے احمق ہیں اور نہ بزدل۔ کسی کے یوں دھم سے کودنے کا دوسرا سبب اس کی بدحواسی ہو سکتی تھی لیکن ایسا کون تھا جو گھبرا کے اس غریب خانے میں پناہ لے۔

"نظر تو کوئی نہیں آ رہا ہے استاد!" میں نے ٹیڈی کے کان میں کہا جو اَب پیچھے ہٹ گیا تھا۔

"لیکن... سکندر بادشاہ — وہ آواز....؟" ٹیڈی نے سر ہلایا۔ "کیا کوئی چور تھا... جو بھاگ گیا؟"

"چور تمہارے گھر سے کیا لے جائے گا؟" میں نے کہا "کوئی قیمتی چیز ہے تو ہماری جان۔"

محسن نے دوسرے کمرے سے جھانک کر دیکھا اور میرا اشارہ پا کے قریب آ گیا۔ کمرے میں روم ہیٹر کی مدھم سی روشنی بھی اس وقت بہت زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ "باہر تو کوئی بھی نہیں ہے! اگر ہوا تو کچن یا باتھ روم میں ہوگا" میں نے کہا "میں پہلے کچن میں دیکھتا ہوں۔ تو مجھے کور کرنا۔"

محسن نے اقرار میں سر ہلایا اور میری جگہ ریوالور لے کر کھڑا ہو گیا۔ کمرے کے دروازے سے کچن کا دروازہ مشکل سے دس فٹ دور ہوگا۔ میں نے ایک جست لگائی اور توپ کے گولے کی طرح کچن میں جا گرا۔ اگر کوئی دشمن بھی محسن کی طرح نشانہ لیے منتظر ہوتا تو اس برق رفتاری کے باعث آسانی سے مجھے نشانہ نہیں بنا سکتا تھا لیکن کچن میں کوئی نہیں تھا۔ اندر گرتے ہی میں یوں اٹھ گیا تھا جیسے ربر کی گیند زمین سے ٹکرا کے اٹھتی ہے اور میری نظر نے ہر گوشہ دیکھ لیا تھا۔ کوئی اندر ہوتا تو مجھے اتنی مہلت کیونکر ملتی۔ میں نے کچن کی لائٹ جلا دی۔ روشنی صحن میں بھی پھیل گئی اور میرے مقابل باتھ روم تک پہنچی۔ کھلے دروازے سے میں نے چار فٹ لمبے چار فٹ چوڑے غسل خانے اور اس سے ملحق لیٹرین کو دیکھا۔ نظر کہتی تھی کہیں کچھ بھی نہیں ہے لیکن عقل اُسے فریبِ نظر قرار دیتی تھی۔ وہ آواز صرف میرے کانوں نے نہیں سنی تھی، محسن اور ٹیڈی بھی اس آواز پر چونکے تھے اور انھوں نے بھی وہی نتیجہ اخذ کیا تھا جو میں نے۔ چنانچہ اس کو وہم نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ ایک نظر میں نے دیوار کو دیکھا۔ کسی کے دیوار کے پیچھے ہونے کے امکانات پر غور کیا اور پھر ان امکانات کو مسترد کر دیا۔ دیوار کے پیچھے گلی تھی اور گلی میں چوروں کی طرح کھڑا رہنے والا پکڑا

جاسکتا تھا۔ میں نے محسن کو آواز دی اور اسے باہر آجانے کو کہا۔ میں خود بھی صحن میں آ گیا تو محسن سمجھ گیا کہ اب لائٹ جلانے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ہم نے اطمینان سے اندر اور باہر دیکھا لیکن کوئی ہوتا تو ہمیں نظر آتا۔

"یار! میں نہیں مان سکتا کہ میرے کانوں کو دھوکا ہوا تھا۔" میں نے کہا۔

"اگر کوئی اندر کودا تھا تو پھر کہاں گیا؟" محسن بولا۔ "بلاوجہ اندر آیا اور لوٹ گیا۔"

"کوئی اتنی رات کو ہائی جمپ کی مشق نہیں کرتا۔" میں نے اس سے اتفاق کیا۔ "اور وہ بھی دوسرے کے گھر میں۔"

"سکندر بادشاہ! ہو سکتا ہے کسی نے کچھ پھینکا ہو۔" ٹیڈی نے بالآخر لب کھولے۔

"تمہارا گھر ہے۔ تم خود غور کرو کہ کون سی چیز مشتبہ اور فالتو ہے، ہمارے سوا۔" میں نے کہا۔

"مجھے تو کچھ نظر نہیں آتا۔" ٹیڈی نے سر کھجا کے کہا۔ "یہاں ہے ہی کیا۔ فقیر کا ڈیرا ہے۔ وہی دو چار برتن ہیں اور اپنا بوریا بستر ہے۔"

مگر محسن کچھ سوچ رہا تھا اور میں اندازہ کر سکتا تھا کہ اس کے خیالات کی سمت کیا ہو گی۔ برسوں کے ذہنی اور جذباتی تعلق اور زندگی کے تجربات میں ہر قدم کی رفاقت نے ہمارے اندازِ فکر میں ایسی یکسانیت پیدا کر دی تھی کہ ہم ایک دوسرے کے بارے میں خاصے وثوق کے ساتھ بتا سکتے تھے کہ مخصوص حالات میں ہمارا ردِعمل کیا ہو گا۔

"میرا خیال ہے سکندر، کہ کوئی آیا ضرور تھا۔" محسن نے کہا۔ "لیکن کچھ کرنے کی نیت سے نہیں۔ صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ ہم موجود ہیں یا نہیں۔"

"اور وہ خاموشی سے جائزہ لے کر چلا گیا۔" میں نے اس سے اتفاق کیا۔

"خاموشی سے کیسے سکندر بادشاہ!" ٹیڈی نے کہا۔ "وہ تو دھم سے کودا تھا۔"

"ہاں۔ لیکن وہ اندر ٹھہرا نہیں۔ چند سیکنڈ میں پھر دیوار پر سے گلی میں اتر گیا۔" میں نے کہا۔ "جب لائٹ بجھا کے تم نے دروازہ کھولا تو شاید وہ دیوار کے اوپر سے جھانک رہا تھا۔"

"اگر وہ دیوار کے اوپر ہی سے مجھے ڈز کر دیتا پھر؟ تم نے تو آگے کر دیا تھا مجھے!"

"وہ ڈز کرنے نہیں آیا تھا۔ ڈز کرنے والے بعد میں آئیں گے۔" میں نے کہا۔ "وہ تو مخبری کرنے آیا تھا۔ دیوار کے اوپر سے اس نے مجھے اور محسن کو بھی دیکھ لیا ہو گا اور پانچ منٹ میں گلی سے گیا ہو گا۔ اس کا مقصد ہمارے اس ٹھکانے کی تصدیق کرنا تھا جو ہو گئی۔ اب باقی کارروائی دلاور کی ہدایات کے مطابق ہو گی۔ وہ میں کام کرنے کا قائل نہیں اس لیے یہ بتانا مشکل ہے کہ وہ کیا اور کب کرے گا۔"

"گویا اب یہ جگہ بھی محفوظ نہیں رہی؟" محسن نے تشویش سے کہا۔ "یار سکندر! اب یہاں سے نکل جانا چاہیے اور عقل مندوں نے کہا ہے آج کا کام کل پر مت چھوڑو۔"

"تو چاہتا ہے کہ ہم اسی وقت رختِ سفر باندھ لیں؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ اگر جانا ہی ہے تو یہاں سے فوراً چلے جانے میں بہتری ہے۔" محسن بولا۔ "دیر سے نقصان ہو سکتا ہے۔ تیرا خیال درست ہے کہ ڈز کرنے والے بعد میں آئیں گے لیکن کیا وہ صبح ہونے سے پہلے نہیں آ سکتے؟ اگر انھوں نے بھی سوچا کہ دیر کرنے سے نقصان ہو سکتا ہے تو وہ ابھی آ جائیں گے۔ انھیں ڈر ہو گا کہ موقع ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ آج یہاں ہیں تو کل کہیں اور نہ چلے جائیں۔ ہم تو اپنے ٹھکانے بدلتے رہتے ہیں۔ معلوم نہیں کس طرح اور کتنی جدوجہد کے بعد وہ ہمارا پتا لگانے میں کامیاب ہوئے۔ وہ کیوں خطرہ مول لیں گے کہ ہم پھر غائب ہو جائیں۔ اگر ایسی ویسی کوئی بات نہ ہوئی تو ہم لوٹ آئیں گے جب خطرے کی بات نہیں رہے گی۔"

محسن کی دلیل نے مجھے قائل کر لیا۔ ابھی تو صرف دس منٹ ہوئے تھے۔ اگر واقعی کسی کو ہمارے اس ٹھکانے پر ہماری موجودگی کی تصدیق کے لیے بھیجا گیا تھا تو اس کے واپس جا کر رپورٹ دینے اور صلاح مشورہ کرنے میں کچھ وقت تو لگے گا۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ ہمیں کتنی مہلت ملے گی۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ باقی لوگ کسی گاڑی میں ساتھ ہی آئے ہوں اور گلی کے موڑ پر موقعے کے منتظر ہوں۔ ایسی صورت میں مہلت نہ ہونے کے برابر تھی۔ اگر مخبر نے دلاور کو کہیں سے فون کیا اور اس نے دلاور نے اپنے کمانڈوز بھیجے تو اس کارروائی میں آدھا پونا گھنٹہ لگے گا۔ تیسری اور آخری صورت یہ تھی کہ مخبر خود دلاور کے پاس جائے، اسے تمام صورتِ حال سے مطلع کرے اور دلاور مکمل رازداری کے ساتھ کوئی مؤثر کارروائی کرنے کی منصوبہ بندی کرے۔

"محسن ٹھیک کہتا ہے استاد!" میں نے ٹیڈی سے کہا۔ "ہمیں اسی وقت بھاگ جانا چاہیے۔"

"لیکن... ہم جائیں گے کہاں؟" ٹیڈی نے پریشان ہو کر کہا۔

"کہیں بھی جانا جہنم میں جلنے سے بہتر ہے۔" میں نے اندر جا کے سامان سمیٹنے لگا۔

"ابھی کوئی آ کے دستی بم پھینک گیا تو خواہ مخواہ مرنا پڑے گا۔" محسن نے اپنا سوٹ کیس بھرنا شروع کر دیا۔

"اچھا تم کہتے ہو تو میں بھی چلتا ہوں۔" ٹیڈی نے بہ امرِ مجبوری کہا۔ "میں ساتھ کیا لوں؟"

"اپنی عقل ضرور ساتھ رکھنا۔" میں نے کہا۔ "باقی جو کچھ تم ساتھ لے کر نکل سکو۔ اصل مسئلہ تو جان کی سلامتی کا ہے۔"

"میں جا کر دیکھتا ہوں۔" محسن دروازے کی طرف لپکا۔ "کتنے شکاری آتے ہیں۔"

"ایسے مت جا۔" میں نے کہا۔ "یہ نہ ہو کہ دروازہ کھولتے ہی تو ان کا شکار ہو جائے۔"

"میرے پاس ریوالور ہے۔" محسن نے کہا۔ لیکن اتنی دیر میں اپنے ریوالور کے ساتھ اس کے پیچھے پہنچ گیا تھا۔ محسن نے دروازہ کھول کے گلی میں جھانکا اور پھر میری طرف دیکھا۔

"سامنے تو کوئی نہیں ہے۔" وہ بولا۔ "لیکن گلی کے موڑ پر مجھے ایک سایہ سا دکھائی دیا تھا۔"

اب میں نے گردن نکال کے دیکھا۔ "ایک نہیں دو سائے ہیں۔" میں نے کہا۔ "دو کے چار بھی ہو سکتے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے ناکا بندی۔" محسن بولا۔ "دوسری طرف سے نکلنے کا راستہ ہی نہیں۔ گلی بند ہے۔"

"استاد! اگر گلی دونوں طرف سے بند ہو تو ہم دشمنوں کو نظر آئے بغیر کس طرح نکل سکتے ہیں؟" میں نے ٹیڈی سے کہا جو میرے پیچھے آ کھڑا ہوا تھا۔ "ہے کوئی صورت؟"

"مانا کہ ہم کچھ دیر قبل خود کو الو ثابت کر چکے ہیں مگر ہم اڑ نہیں سکتے ورنہ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔" محسن بولا۔

"ہم کود پھاند کر ہی جا سکتے ہیں سکندر بادشاہ!" ٹیڈی نے اوپر دیکھا۔ "گرمی کا موسم ہوتا تو یہ بھی مشکل ہو جاتا مگر آج کل سب نیچے کمروں میں لحاف اوڑھے پڑے ہیں۔" "میرے گھر کی چھت مالک مکان کی چھت سے ملی ہے لیکن ہم چھت سے دوسری گلی میں نہیں اتر سکتے۔"

"کیوں نہیں اتر سکتے؟" میں نے کہا۔

"اس لیے کہ چھت سے جو زینہ نیچے جاتا ہے وہ صحن میں ختم ہوتا ہے۔" ٹیڈی بولا۔ "اور صحن پار کرنے کے بعد گلی میں کھلنے والا دروازہ ہے۔ سامنے والے مکان دو دو منزلہ ہیں اور ان کی چھت بہت اونچی ہے۔"

"کیا ہم صحن پار نہیں کر سکتے؟" میں نے کہا۔ "یا دروازہ مقفل رہتا ہے؟"

"دروازے کا مجھے صحیح علم نہیں، اندر سے بند کرنے کے لیے بڈھا تالا لگاتا ہے یا نہیں مگر وہ خود رات بھر جاگتا ہے۔ دمے کا مریض ہے۔" ٹیڈی بولا۔ "ذرا سی آہٹ پر وہ نکل آئے گا۔"

"دیکھو میاں نیک محمد! یہ موقع ڈرنے اور سوچ بچار میں وقت ضائع کرنے کا نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "معلوم نہیں کیوں تقدیر نے اتنی مہلت فراہم کر دی ہے ورنہ شکاری تو تیار کھڑے ہیں۔"

"کیوں کھڑے ہیں؟" ٹیڈی نے کہا۔ "میرا مطلب ہے کس کا انتظار ہے انھیں؟"

"شاید مناسب وقت کا۔ ہمیں کیا معلوم کہ وہ کیا چاہتے ہیں؟" میں نے کہا۔ "قتل کرنا ہوتا تو اب تک کر چکے ہوتے۔ اندر ایٹم بم پھینک جاتے یا شین گن لے کر آتے اور سب کو بھون جاتے۔"

"ممکن ہے وہ ہمیں اغوا کر کے ساتھ لے جانا چاہتے ہوں۔ یا ہم سے کچھ لینے آئے ہوں، مثلاً وہ کیسٹ جس کی ایک نقل ہم چودھری دلاور کو پہلے ہی دے چکے ہیں۔ یا چودھری صاحب ہم سے پوچھنا چاہتے ہوں کہ ہم اُن کے بارے میں کتنا جانتے ہیں اور کیا عزائم رکھتے ہیں۔" محسن نے کہا اور ایک بار پھر گلی میں جھانک کر دیکھا۔

"تیرا فرمایا ہوا بالکل درست تھا۔ دو کے چار ہو گئے ہیں۔ وہ اور گلی کے اندر کھڑے ہیں۔" محسن بولا۔

"غالباً اُن کو دلاور کا یا افسر بکارِ خاص کا انتظار ہے۔" میں نے کہا۔ "انھوں نے اطلاع دے دی ہو گی کہ آپ کے آدمی موجود ہیں۔ اور اس تصدیق کے بعد دلاور نے کہا ہو گا کہ وہیں رہو اور اُن پر نظر رکھو۔ کوئی نکلنے نہ پائے۔ وہ پوری تیاری کے ساتھ اپنے پلان پر عمل کرے گا۔ تاکہ ناکامی کا امکان نہ رہے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو اور ہم کو اٹھا لیا جائے۔ جیسے پولیس مجرموں کو تفتیش کے لیے اٹھواتی ہے۔"

"ہاں۔ بہت دن ہو گئے ہیں ہماری اُس سے بالمشافہ گفتگو نہیں ہوئی۔" محسن نے کہا۔

"اور اس عرصے میں ہم نے اسے پریشان بھی بہت کیا ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ سمجھ چکا ہے کہ اب ہم سودا تو کریں گے نہیں۔ چنانچہ وہ خوفزدہ بھی ہو گا کہ کہیں ہم اس کے اصل کاروبار کا سراغ نہ لگا لیں۔ بس اب نکل چلو۔"

میں نے اور محسن نے اپنے اپنے سوٹ کیس اٹھائے۔ ٹیڈی نے خاصی شرمندگی کے ساتھ ٹین کا ایک صندوق کندھے پر رکھا جس کو بند کرنے کے لیے اسے رسی لپیٹنی پڑی تھی۔ میرے سوٹ کیس میں کیسٹ کے علاوہ ایف ایم مائیکروفون بھی تھا۔ ایک ایک ریوالور میرے اور محسن کے ہاتھ میں تھا اور ایک ایک ہم دونوں نے سوٹ کیس میں چھپا لیا تھا۔ جو ریوالور میرے ہاتھ میں تھا وہ سائلنسر والا تھا اور میں نے دلاور سے

چھیننا تھا، جتنی نقد رقم تھی وہ محسن کے پاس تھی۔ اس کے علاوہ ہمارے سوٹ کیسوں میں ہمارے کپڑے تھے، ان میں ایک پوسٹ مین کی اور ایک ویٹر کی وردی بھی شامل تھی جنھیں میں استعمال کر چکا تھا۔ یہ سب سامانِ ضرورت تھا جسے ہم کہیں بھی چھوڑ کر نہیں جا سکتے تھے۔ ٹیڈی نے اپنے بکس میں کیا رکھا تھا؟ یہ ہم نے اس سے نہیں پوچھا تھا۔ ہمیں معلوم تھا کہ اپنے کپڑوں یا پیسوں کے سوا وہ کیا لے گا مگر وہ گھر سے بے گھر ہونے پر مغموم تھا۔ چند منٹ پہلے وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اسے گھر کھلا چھوڑ کے بھاگنا پڑے گا اور وہ بھی آدھی رات کے بعد، اتنی سردی میں۔ وہ زیرِ لب کچھ کہتا ہمارے پیچھے پیچھے چھت پر پہنچا تو سردی سے اس کے دانت بج رہے تھے۔

"آج تو مروا دیا تم نے سکندر بادشاہ!" وہ کانپتے ہوئے بولا۔ بے شک سردی زیادہ تھی مگر اتنی بھی نہیں کہ آدمی ہلنے لگے۔ ٹیڈی پر سردی کا ہی نہیں، خوف کا بھی اثر تھا۔

"سکندر بادشاہ کو بھی تقدیر نے مروایا تھا اُستاد۔" میں نے کہا۔ "دنیا فتح کرنے نکلا تھا اور ایک مچھر نے کاٹا تو ملیریا ہو گیا چنانچہ دنیا سے گیا تو دونوں ہاتھ خالی تھے۔ ہم خالی ہاتھ تو نہیں ہیں۔"

ٹیڈی کے گھر اور اس کے مالک مکان کے گھر کی چھت کسی زمانے میں ایک رہی ہوگی جب اس نے گھر کے ایک حصے کو کرائے پر دینے کے لیے الگ کیا تو اس گھر کی چھت کو بھی چار فٹ کی دیوار اٹھا کے تقسیم کر دیا۔ میں نے اس "دیوارِ برلن" کو عبور کر کے خطرناک علاقے میں پہلے قدم رکھا اور محسن نے مجھے دونوں سوٹ کیس پکڑا دیے۔ پھر ٹیڈی نے مجھے رسّی سے بندھا ہوا ٹین کا کھڑکھڑاتا صندوق پیش کیا۔ خلافِ توقع وہ بہت بھاری تھا اور میرے ہاتھ سے گرتے گرتے رہ گیا۔ اگر وہ چھوٹ کر گر جاتا تو اس کا دھماکا مکان کے مالک کو بم کے دھماکے کی طرح سنائی دیتا۔ وہ دوڑتا ہوا آتا اور پھر اپنے فرار کے منصوبے کو ناکامی سے بچانے کے لیے ہمیں اس کو ناک آؤٹ کرنا پڑتا۔

"کیا بھرا ہے اس میں اُستاد؟" میں نے کہا۔ "گولہ بارود یا سونا؟"

"دونوں سے آدمی کو اصل طاقت حاصل ہوتی ہے۔" محسن نے کہا اور اپنا سوٹ کیس اُٹھا لیا۔ ٹیڈی نے کوئی جواب نہیں دیا اور ہم نے دبے پاؤں چھت کو عبور کیا۔ زینہ اس کے شمال مشرقی حصے میں نظر آ رہا تھا۔ میں نے آخری زینے پر قدم رکھنے سے پہلے منڈیر سے نیچے جھانکا۔ صحن میں اندھیرا تھا۔ اچانک بند کمرے کے کسی دروازے سے روشنی کی ایک لکیر نکلی اور ٹیڈی کا لینڈ لارڈ کھانستا ہوا برآمد ہوا۔ ہم تینوں زینے میں دبک گئے۔ چند منٹ کی تاخیر نے ہمیں بچا لیا ورنہ ہم عین اس وقت پکڑے جاتے جب ہم دروازہ کھول رہے ہوتے۔ ایک دُبلا پتلا اور بوڑھا سا آدمی آہستہ آہستہ چلتا

ہاتھ روم تک گیا۔ ہم دم سادھے اس کی واپسی کا انتظار کر رہے

"سکندر!" محسن نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ "تو نے کچھ سنا؟"

ابھی تک میں نے کچھ نہیں سنا تھا لیکن اسی وقت میرے کانوں نے بھی دو افراد کو اُدھر کی آواز میں بولتے سنا۔ "یہ تو کوئی کے گھر میں معلوم ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ محسن نے اقرار میں سر ہلایا اور پیچھے پلٹ کر دیکھا۔

"وہ لوگ ہمیں غائب پائیں گے تو سمجھ جائیں گے کہ ہم کس سے فرار ہوئے ہیں۔" محسن بولا۔ "یہ ٹیڈی کا لینڈ لارڈ اندر جا گیا ہے کیا؟"

"وہ ہمارے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے آئیں گے اور ہم جگہ گرفتار کریں گے۔" میں نے کہا۔

"یا میرے مولا! اب کدھر جائیں؟" ٹیڈی نے لرزتی آواز میں کہا۔

"آگے کنواں، پیچھے خندق۔ اوپر وہ موت کے فرشتے نیچے تیرا لینڈ لارڈ۔" محسن نے کہا۔

"وہ اُوپر آنے ہی والے ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "میں جا کے انھیں روکتا ہوں۔ یہ نہ ہو وہ پیچھے سے اچانک نازل ہو جا یا ہمارے نکلنے کے بعد آئیں تو بے چارے مالکِ مکان پر مصیبت نازل ہو۔"

"مار دھاڑ اور کشت و خون کے لیے یہ جگہ مناسب نہیں سکندر!" محسن نے مجھے روک لیا۔ "اور نہ یہ وقت ہے جنگ و اس کی نظر بھی بار بار اُوپر جاتی تھی۔ ہم اسی جگہ چوہے کی طرح

"ہم اسی جگہ چوہے کی طرح دبکے ہوئے پکڑے جائیں محسن؟" میں نے کہا۔ "بہتر ہے ان کو مقابلہ کر کے روک دیا جا لمحے کوئی نمودار ہو سکتا ہے۔"

"اس سے تو بہتر ہے کہ ہم دروازہ کھول کر نکل جائیں او ہوئے باہر سے کنڈی لگا جائیں تا کہ کوئی فوراً ہمارے پیچھے نہ" محسن بولا۔ "مالک مکان شور مچاتا ہے تو مچانے دو۔ شکاری ہمارے تعاقب میں آئیں گے تو وہ بتا دے گا کہ میں تو ہاتھ روم میں تھا نہ جانے کون اندر آ گیا اور جاتے ہوئے دروازہ باہر سے بند کر گیا اس سے تو بہتر ہے نا کہ ہم میں سے کوئی مارا جائے یا ہم یہاں ایک مر کے اور باقی کو توڑ پھوڑ کے خود تو بھاگ جائیں اور بیچارا بد میں پولیس کے ہاتھ پڑ جائے۔ اور میاں نیک محمد کو کوستا کہ بڑا نیک کرایہ دار تھا۔"

ہماری کھسر پھسر بڑے میاں کے ہاتھ روم سے نکل سے ختم ہو گئی۔ ویسے بھی میں نے محسن کی تجویز

کی تھی اور بڈھا باہر نہ نکلتا تو ہم بے خوف و خطر دندناتے ہوئے دروازہ کھول کے باہر نکل جاتے۔ ٹیڈی کے گھر میں سے پھر کوئی آواز سنائی نہ دی تھی۔ اس کا یہ مطلب نہیں نکالا جا سکتا تھا کہ آنے بھی وہ گئے بھی وہ ختم فسانہ ہو گیا۔ نہ جانے کتنے پاپڑ بیل کر وہ ہمارا ٹھکانا تلاش کرنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ وہ آسانی سے واپس جانے والے نہیں تھے۔

ٹیڈی کا بوڑھا لینڈ لارڈ آہستہ آہستہ چلتا اور زور زور سے کھانستا واپس اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا اور ہم پر وہ وقت بھی گراں گزر رہا تھا جو وہ ایک قدم اٹھانے میں صرف کرتا تھا۔ بالآخر وہ زیرِ لب بڑبڑاتا، تقدیر کو کوستا اور اللہ کو یاد کرتا ہوا کمرے میں گیا۔ اس نے دروازہ بند کیا ہی تھا کہ ہم نے پیش قدمی کی۔ سب سے پہلے میں خالی ہاتھ آگے گیا اور میں نے بند دروازے کا جائزہ لیا۔ اندر زنجیر والی کنڈی تھی مگر اس میں کوئی قفل نہیں تھا۔ پوری احتیاط سے میں نے دروازے کے دونوں پٹ دبا کے کنڈی کو کھولا۔ دروازہ تھوڑا سا چرچرایا اور زنجیر کے الگ ہونے سے بھی معمولی سا کھٹکا ہوا۔ آواز بہت کم تھی لیکن اس وقت مجھے بہت زیادہ لگی۔ دونوں پٹ کھول کے میں نے گلی میں دیکھا موسمِ سرما کی ویران رات کی تاریکی اور رات کی آخری گھڑی میں دور دور تک کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ میں نے محسن اور ٹیڈی کو "آل کلیئر" کا سگنل دیا۔ ایک منٹ میں وہ دونوں باہر آ گئے۔ محسن کے ایک ہاتھ میں اپنا سوٹ کیس تھا اور دوسرے ہاتھ میں میرا۔ ٹیڈی نے اپنا ٹین کا بکس بڑی مشکل سے سنبھال رکھا تھا۔ کیونکہ جلدی میں باندھی جانے والی رسّی ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ اور اسے یہ اندیشہ لاحق ہو گیا تھا کہ بکس کھل نہ جائے۔

میں نے دروازے کو بند کیا اور پھر اس بات کا خیال رکھا کہ دونوں پٹ ملیں تو آواز پیدا نہ ہو۔ ٹیڈی کی حالت ہم دونوں کے مقابلے میں قابلِ رحم تھی۔ وہ ہانپ بھی رہا تھا اور کانپ بھی رہا تھا۔ ہانپنے کا سبب تو وہ بوجھ تھا جو اس کے شکستہ حال صندوق میں بند تھا۔ کانپنے کو وہ سردی سے منسوب کرتا تھا مگر ہم جانتے تھے کہ وہ ڈرا ہوا بھی ہے۔

"میاں خوجی۔" میں نے اپنا سوٹ کیس اٹھا کر کہا۔ "اب یہ بتاؤ کہ ہم کو اپنی گاڑی تک پہنچنا ہو تو ہمیں کون سا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ صراطِ مستقیم پر چلنے میں جان جانے کا خطرہ ہے۔"

"جو پہلے بھی رہا ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔ صراطِ مستقیم اور پل صراط میں کیا فرق ہے؟"

"معلوم نہیں آپ لوگ کیوں اتنی مشکل باتیں کرتے ہو۔" ٹیڈی چڑ کر بولا۔ "ادھر آؤ۔ لمبا چکر کاٹ کر جانا پڑے گا۔"

"خفا کیوں ہوتے ہو۔ ہم تو پہلے ہی لمبے چکر میں پڑے ہوئے ہیں۔" میں نے کہا۔

"اگر چوکیدار نے یا گشت کرنے والی پولیس نے دیکھ لیا تو چکر زیادہ لمبا ہو جائے گا۔" محسن بولا۔ "وہ سمجھیں گے کہ ہم چوروں کا ٹولا ہیں اور کسی کا گھر صاف کر کے فرار ہو رہے ہیں۔"

"اور میاں خوجی! جب وہ ہماری صورتیں ملاحظہ کریں گے تو ہمارا جرم بھی ثابت ہو جائے گا کیونکہ ہم صورت ہی سے چور لگتے ہیں پھر مجبوراً ہمیں قتل بھی کرنا پڑے گا۔" میں نے کہا۔ "جو بھی راستہ روکے گا مارا جائے گا۔"

ٹیڈی سمجھ گیا کہ ہم اسے ڈرا کے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ "یار سکندر بادشاہ! یہ دوسری بار تم نے مجھے خوجی کہا ہے۔ کوئی نیا نام رکھا ہے میرا؟" وہ دوستانہ لہجے میں بولا۔

"نہیں۔ تم بھی تو مجھے سکندر بادشاہ کہتے ہو۔" میں نے کہا۔ "کیونکہ سکندر، ایک بہت زبردست اور بہادر بادشاہ گزرا ہے۔ خوجی بھی ایک بہت بہادر شخص تھا تمھاری طرح۔ تم اس کا نیا ایڈیشن ہو۔"

"قسم مولا علی کی۔ اپنی تو کوئی فکر نہیں۔" ٹیڈی جوش میں آ گیا۔ "لیکن انھوں نے بڈھے کو مارا پیٹا تو مجھے بہت افسوس ہوگا۔ وہ ہے تو بیہودہ مگر اس نے میرے ساتھ کبھی برائی نہیں کی کوئی۔ میں اسے کچھ بتائے بغیر بھاگ کھڑا ہوا۔ نہ جانے وہ کیا سمجھے گا۔"

"کچھ بھی نہیں سمجھے گا۔" میں نے ٹیڈی کو تسلی دی۔ "اگر کوئی اس سے ہمارے متعلق پوچھے گا تو خود ہی سمجھ جائے گا کہ نہ تو وہ ہمارا ساتھی تھا اور نہ اس نے ہمارے فرار میں مدد کی ہوگی۔ حالات خود اس کو بے قصور ثابت کر دیں گے۔ تم دو چار دن بعد آ جانا اور شور مچا دینا کہ لٹ گیا، برباد ہو گیا۔ کوئی ایسا بیان دینا کہ تم چند دن کے لیے کانا کاچھا یا چھانگا مانگا گئے تھے اور پیچھے سے چوروں نے ہاتھ صاف کر دیا۔"

"کس چیز پر ہاتھ صاف کر دیا؟" ٹیڈی بولا۔ "مالک مکان کو معلوم ہے کہ میں تو کرایہ بھی مشکل سے دیتا تھا۔ چور اس گھر میں کیا لینے آئیں گے؟"

"یار تم بات کو سمجھا کرو۔" میں نے کہا۔ "دنیا میں تم جیسے کنگال نظر آنے والے بہت ہیں جو لاکھوں دبائے بیٹھے ہیں۔ فقیرانہ حلیوں میں پھر رہے ہیں مگر ان کی گدڑی میں لعل ہیں۔ ایسے بھی ہیں جو فاقے کرتے نظر آتے ہیں مگر خاندانی زر و جواہر کو آبا و اجداد کی نشانی سمجھتے ہوئے فروخت نہیں کرتے۔ تم بھی داغ دینا یہ بیان کہ دادی کی یادگار خالص سونے کی اور ہیرے کے نگینے والی انگوٹھی تھی۔

دادا جان کی تصویر تھی جو سونے کے فریم میں تھی۔ مرتے وقت ابا وصیت کر گئے تھے کہ ان کی حفاظت جان سے زیادہ کرنا۔"

"سکندر! مجھے دال میں کچھ کالا نظر آتا ہے۔" محسن نے کہا۔ "وہ گلی کے موڑ پر کیوں کھڑے رہے؟ اور جب وہ ٹیڈی کے گھر میں پہنچے تو ہمارے پیچھے کیوں نہیں آئے۔ فرار کا تو ایک ہی راستہ تھا۔ ہم کوئی جوتیاں بغل میں دبا کے بھی نہیں بھاگے تھے۔ اُن کو کافی وقت ملا تھا۔"

"آج میرا دماغ کام نہیں کر رہا ہے۔" میں نے کہا۔ "ورنہ یہ تو مجھے بھی سوچنا چاہیے تھا!"

"مجھے ایسا لگتا ہے سکندر کہ وہ ہمیں ہانک رہے ہیں۔" محسن بولا۔ "انھوں نے ہمیں اپنی آمد کی اطلاع دی۔ اپنی موجودگی ہم پر ثابت کی۔ اُن کی توقع کے مطابق ہم انھیں چکما دے کر نکل آئے۔ وہ جانتے تھے کہ ایسا ہی ہوگا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ٹیڈی کے گھر میں بھی اُس وقت داخل ہوئے جب ہم وہاں سے نکل گئے۔ مقصد صرف ہمارے لیے واپسی کا راستہ بند کرنا تھا تاکہ ہم آگے جائیں۔ اور ہم نے بالکل وہی کیا جو وہ چاہتے تھے۔ ہانکا کرنے والے جانتے ہیں کہ شیر اُدھر ہی جائے گا جہاں ایک نظر نہ آنے والا گڑھا موجود ہے۔"

میرے آگے بڑھنے والے قدم رک گئے۔ اس وقت جو بات میرے ذہن میں نہیں آئی تھی وہ محسن کی عقل نے اسے سمجھا دی۔ ایک اکیلا اور دو گیارہ ہوتے ہیں۔ ایک بار پھر یہ سچ ثابت ہو گیا تھا۔ میں نے اپنا سوٹ کیس ایک دیوار کے سائے میں رکھ دیا۔ محسن اور ٹیڈی نے میری تقلید کی۔

"تیرا خیال بالکل ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "ہمیں اپنا راستہ بدل دینا چاہیے۔"

"ہم نے بہت عقلمندی کی تھی کہ فاکس ویگن کو دو گلیاں چھوڑ کے کھڑا کیا تھا۔" محسن بولا۔ "انھوں نے ٹیڈی کا گھر معلوم کر لیا تو فاکس ویگن بھی تلاش کر لی ہوگی اور اب وہ وہیں ہمارے منتظر ہوں گے۔"

"تو نے اس وقت خود کو سکندر کا اُستاد افلاطون ثابت کر کے ہمیں بہت بڑے خطرے سے بچا لیا ہے۔" میں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ "ورنہ ہم خود چل کر موت کے منہ میں جا رہے تھے۔ اب تم کچھ فرماؤ میاں خوجی! کہ ان حالات میں ہم بیچارے کدھر جائیں؟"

"کہاں جائیں اس وقت!" ٹیڈی نے کہا۔ "رکشا ٹیکسی تو ملے گی نہیں یہاں۔"

"اچھا اگر ہم سیدھے چلے جائیں۔ کسی اور سمت میں نکلنا چاہیں تو کون سا راستہ اختیار کریں؟" میں نے کہا۔

"یار سکندر بادشاہ! راستے تو بہت ہیں۔" وہ بولا۔ "گلیوں ہی گلیوں میں ہم ہر جگہ جا سکتے ہیں لیکن پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم پکڑے جائیں گے۔ قسمت کی بات ہے کہ ابھی تک نہ گشت کرنے والی پولیس پارٹی ملی ہے اور نہ ہمیں کسی چوکیدار نے ٹوکا ہے۔ دوسری بات یہ کہ میں۔۔۔ میرا مطلب ہے صندوق بہت بھاری ہے میرا۔۔۔ اور مجھ میں اتنی ہمت نہیں رہی۔ رات بھر جاگنے کا اثر ہے شاید۔"

"کس عقلمند نے کہا تھا تم سے کہ اتنا وزن ضرور لو۔ آخر ایسی کیا چیز ہے اس میں؟" میں نے کہا۔

"صرف کپڑوں اور عام ضرورت کی چیزوں کا اتنا وزن نہیں ہو سکتا۔" محسن بولا۔ "کوئی فالتو اور بے مصرف چیز ہے تو اُسے پھینک دو۔"

ٹیڈی کے ردِ عمل نے ہمیں حیران کر دیا۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر صندوق کے سامنے یوں کھڑا ہو گیا جیسے اسے ہم سے خطرہ لاحق ہو گیا ہو کہ ہم اس سے صندوق چھین لیں گے۔ "اس میں کوئی فالتو اور بے کار چیز نہیں ہے۔" اس نے قطعی بدلے ہوئے لہجے میں کہا اور رسّی کو پھر صندوق پر مضبوطی سے لپیٹنے لگا۔

"فکر مت کرو۔ ہم تم سے یہ خزانہ چھین کر پھینکنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔" میں نے کہا۔ "لیکن اتنا تو بتا دو کہ کیا ہم صبح تک اسی طرح یہاں کھڑے رہ سکتے ہیں؟ ابھی کوئی آ گیا یا کسی نے دیکھ لیا تو تمھارے لیے بھی مشکل پیدا ہو جائے گی اور ہمارے لیے بھی۔ تم ایسا کرو کہ میرا سوٹ کیس اٹھا لو۔ میں تمھارا صندوق اُٹھا لیتا ہوں۔"

"نہیں۔ میں اپنا صندوق اپنے پاس رکھوں گا۔" وہ بولا اور ہم سے پہلے اس نے اپنا بوجھ اُٹھا لیا۔ ٹیڈی کا رویّہ میرے لیے بہت تعجب خیز تھا اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ آخر صندوق میں وہ کون سی چیز ہے جس کے بارے میں ٹیڈی ہم پر بھی اعتبار نہیں کرتا لیکن یہ اپنے تجسّس کے اظہار کا موقع نہیں تھا۔ ہم پھر چلنے لگے مگر ابھی دس قدم بھی نہ چلے تھے کہ ٹیڈی لڑکھڑایا اور اس کا صندوق ایک زبردست دھماکے سے نیچے گرا۔ صبحِ کاذب کے سکوت میں یہ شور مجھے صورِ اسرافیل کی طرح لگا جو مُردوں کو اٹھا دے۔ نتائج فوراً ظاہر ہوئے۔ کسی نے دُوسری منزل کی کھڑکی کھول کر نیچے دیکھا۔ چند سیکنڈ تک میں بھی اسے دیکھتا رہا۔

"کون لوگ ہو تم؟" بالآخر اس شخص نے سخت اور مشکوک لہجے میں کہا۔ "کس کا سامان ہے یہ؟"

"معاف کیجیے گا، ہم لوگ مسافر ہیں۔" میں نے شائستگی سے انگریزی میں جواب دیا۔ "ریلوے اسٹیشن سے آ رہے ہیں۔ رکشا والا۔۔۔

گلی میں آنے پر تیار نہیں ہوا۔ بھاری سامان تھا جسے خود اٹھا کے لا رہے تھے مجبوراً۔"

"کس کے گھر جانا ہے؟" سوال کرنے والا ذرا مطمئن ہوا۔

"مولوی عنایت اللہ کے گھر۔" میں نے سوچے سمجھے بغیر ایک نام لے دیا۔ "اس کا ہونے والا سسر ہے۔" میں نے محسن پر ہاتھ رکھا۔

"کون مولوی عنایت اللہ۔ وہ چوہدری عنایت اللہ؟" وہ سوچ کر بولا۔

"ہاں۔ ہم لوگ بے تکلفی میں اسے مولوی کہتے ہیں۔" میں نے بات بنائی اور ایک دم ٹیڈی کا صندوق اٹھا لیا۔

"آپ کی نیند خراب ہوئی۔ معذرت چاہتے ہیں۔" محسن نے بھی انگریزی میں کہا۔

"آپ لوگ جالندھر کے چوہدری عنایت کے مہمان ہیں نا؟ وہ جو ٹھیکے دار ہے؟"

"جی ہاں۔ ہمیں معلوم ہے وہ کہاں رہتا ہے۔" میں نے جان چھڑانے کے لیے کہا۔

"لیکن وہ اب وہاں نہیں رہتا ہے۔" اس شخص نے اوپر سے کہا۔ "ماڈل ٹاؤن چلا گیا ہے۔ ابھی ایک ہفتہ ہوا ہے۔ اس نے یہ گھر بیچ دیا ہے۔ آپ لوگوں کو نہیں معلوم؟"

"نہیں۔۔۔ ہمیں معلوم ہوتا تو یہاں کیوں آتے؟" میں نے پریشانی سے کہا۔ میری پریشانی کی وجہ ہرگز وہ نہیں تھی جو خوابِ غفلت سے جاگنے والا سمجھ رہا تھا۔

"اچھا میں نیچے آتا ہوں۔ آپ سامان اِدھر اٹھا لائیں۔" وہ بولا اور کھڑکی سے غائب ہو گیا۔

"مروا دیا نا اُتو کے پٹھے۔" محسن نے غضبناک ہو کے کہا۔ "یہ شخص تو چوہدری عنایت ٹھیکیدار کو میرا سسر بنا کے دم لے گا۔ کوئی اور نام نہیں لے سکتا تھا تو!"

"کمبل ہو گیا ہے سالا۔" ٹیڈی نے کہا۔ "ہم تو بات کر کے پھنس گئے۔"

"ابھی کہاں۔ ابھی تو دیکھنا چوہدری عنایت ٹھیکیدار جالندھر والا اپنے ہونے والے داماد کا کیا حشر کرتا ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "سب مولا کی دین ہے، جسے چاہے راہ چلتے سسر بخش دے۔"

"اندر آ جائیں جی۔" اس شخص نے بیٹھک کا دروازہ کھول دیا۔ "سامان لے آئیں۔ دراصل میں بھی جالندھر کا ہوں۔ اپنی بڑی یاری ہے عنایت سے۔ شمشاد نام ہے میرا۔"

"اچھا جی!" میں نے کہا اور صندوق کو بیٹھک میں رکھ دیا۔ "مر گئے پھر تو۔"

"میں جی؟ کیا کہا آپ نے؟" وہ پلٹ کر بولا۔ "میں نے سُنا نہیں۔"

"میں کہہ رہا تھا کہ بڑی خوشی کی بات ہے۔" میں نے کہا اور بید کی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"تو ان سے رشتہ ہوا ہے عنایت کی لڑکی کا۔" اُس نے دوسری کرسی پر بیٹھ کے محسن کو گھورتے ہوئے کہا۔ محسن کا چہرہ غصّے سے لال ہو رہا تھا مگر شمشاد نے اُسے شرم و حیا کا نتیجہ سمجھا۔ "خیر سے آپ کا کیا لگتا ہے؟"

"چھوٹا بھائی ہے میرا۔" میں نے متانت سے کہا۔

"اچھا اچھا۔ تو آپ دونوں سیالکوٹ سے آئے ہیں۔ وہیں رشتہ ہوا تھا اس کی بڑی لڑکی کا۔ بڑی نصیبوں والی ہے جی۔ میں نے سُنا تھا لڑکا دبئی میں پلمبر ہے۔ ماشاءاللہ سے آج دیکھ لیا۔" شمشاد نے محسن کو دیکھ کر مسرت کا اظہار کیا۔ "اچھا آپ لوگ چائے شائے پی لیں پھر میں چھوڑ آؤں گا آپ کو۔"

"آپ تکلیف مت کریں۔" میں نے کہا۔ "بس ہمیں ماڈل ٹاؤن کا پتا بتا دیں۔"

"لو جی حد ہو گئی۔ اپنے گھر کی گڈّی ہے۔ تکلیف کیسی!" شمشاد بولا۔ "عنایت کیا کہے گا کہ میرے گھر تک چھوڑتے موت آتی تھی۔ چنگا بھلا معلوم بھی تھا کہ پُرونے کہاں سے آئے ہیں۔" وہ اُٹھا اور اندر چلا گیا۔ مجھے بے اختیار ہنسی آئی کیونکہ محسن کی حالت اس شخص کی سی ہو رہی تھی جسے بہت زیادہ کھا لینے سے بدہضمی ہو گئی ہو۔ ٹیڈی نے مجھے ہنستے دیکھا تو خود بھی ہنسنے لگا۔

"پرونے کے بچّے!" محسن نے غرّا کے کہا۔ "میں دبئی میں پلمبر ہوں۔ یہ جھوٹ بولنے سے فائدہ؟"

"بہت فائدہ ہُوا ہے اس وقت نورِ چشم!" میں نے کہا۔ "خوار ہونے سے بچ گئے۔ پکڑے جانے سے بچ گئے۔ اور مارے جانے سے بچ گئے۔ صرف تیرے اس نادیدہ سُسر کے صدقے میں۔ بڑا مبارک نام آیا تھا زبان پر کہ سارے مسئلے حل ہو گئے۔ اب اطمینان سے گرما گرم چائے پیو۔ پھر اپنے گھر کی گڈّی میں چلتے ہیں یہاں سے۔"

"اس کو کہتے ہیں جو نیکی کرے اسے دریا میں ڈال۔" محسن بات سمجھ کے ہنسا۔ "ابھی تھوڑی دیر میں اپنے سُسر کے یار شمشاد جالندھر والے پیدل واپس آئیں گے تو پتا چلے گا کہ گھر کی گڈّی کو غیر لے گئے۔ آئندہ کسی بھی عنایت کے پُرونے پر عنایت نہیں کریں گے۔"

"اب تو بھی بن جا ایک شریف اور سعادت مند داماد۔" میں نے کہا۔ "بھولا بھالا اور شرمیلا۔"

"یار اس کو بھی تو دیکھ لوں جس کی نسبت سے ہم سب کو یہ عزت ملی ہے۔" محسن بولا۔ "آخر کون ہے وہ نصیبوں والی۔ بھاگ

بھری چھپن چھری۔ دختر چوہدری عنایت ٹھیکیدار۔۔۔“

اس کی بکواس شمشاد کے اندر آ جانے سے ختم ہو گئی۔ شمشاد نے ہمارے سامنے چائے کی کیتلی رکھی جس میں دودھ، چینی اور پتی کا کھولتا ہوا لذیذ مکسچر تھا۔ اس وقت جب ہمارے ہاتھ پیر سردی سے سن ہو رہے تھے اور ہم جسمانی طور پر بھی تھکن کا شکار تھے، اس گرما گرم مشروب نے ہمیں وہ توانائی اور حرارت عطا کی، جس کی ہمیں اشد ضرورت تھی۔ شمشاد نے معذرت کی کہ ابھی گھر والے سو رہے ہیں۔ اس لیے ناشتے میں کچھ دیر ہے۔ تاہم وہ ہمارے لیے ایک پلیٹ میں پاپے لے آیا تھا۔ جتنی دیر میں ہم نے تمام سامانِ خورونوش اپنے پیٹ میں منتقل کیا شمشاد بھی تیار ہو گیا۔ گھر کی گاڑی ایک گیراج میں سے نکالی گئی۔ یہ تقریباً چار سال پہلے کی فیٹ تھی جو اتنی بے دردی سے استعمال کی گئی تھی کہ دس سال پرانی لگتی تھی۔ اُسے چلانے والا نہ جانے اس کو کتنی بار کس کس چیز سے ٹکرا چکا تھا کہ اب گاڑی کا کوئی حصّہ ایسا نہ تھا جہاں ڈینٹ کا زخم نہ ہو۔ ہمارا اسباب بڑے اہتمام کے ساتھ ڈکی میں رکھا گیا اور شمشاد نے مہمان نوازی میں یہ کام خود کیا۔ اس کی شرافت دیکھ کر مجھے شرم آئی کہ ہم اس شرافت کا کیا صلہ دینے والے ہیں۔ محسن نے غالباً ایسے ہی جذبات سے مغلوب ہو کر کہا کہ اچھا ہوا چائے میں نمک نہیں تھا اور پاپے بھی میٹھے تھے ورنہ ہم نمک حرام بھی کہلاتے۔ سردی میں انجن ٹھنڈا پڑا تھا۔ چوک دینے کے باوجود اُسے سیلف اسٹارٹ کرنے کی کوشش میں کامیابی نہیں ہوئی تو ہمارے میزبان نے شرم سے پانی پانی ہونے کے بعد ہم سے دھکا لگانے کی درخواست کی اور یہ تکلیف دینے پر ہم سے باربار معافی مانگتا رہا۔ ”نامراد بیٹری بیٹھ گئی ہے۔“ اس نے متعدد بار وضاحت کی۔ ہم تینوں نے اسے تسلی دی اور بیس پچیس گز تک دھکا لگانے کے بعد گاڑی کا انجن غرّایا تو ہم سب نے خدا کا شکر ادا کیا۔ شمشاد نے مزید شرمندگی سے بچنے پر اور ہم نے تھوڑی سی جسمانی توانائی بچنے پر۔ ورنہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ہم اسے دھکا لگاتے ہوئے ماڈل ٹاؤن تک لے جاتے اور جب محسن کی سسرال آ جاتی تو شمشاد کہتا۔ ”بس جی۔ ہم پہنچ گئے۔ گھر کی گڈی میں یہی تو آرام ہے۔ آپ کو تھوڑی سی تکلیف تو ہوئی مگر نامراد بیٹری بیٹھ گئی ہے۔۔۔۔“

صبح کاذب کا اُجالا ذرا سی دیر کے لیے غائب ہو چکا تھا جب ہم اسی سڑک پر سے گزرے۔ فیٹ کے شیشے بند تھے چنانچہ باہر سے کوئی ہماری صورت نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اگلی سیٹ پر میں پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق بیٹھا تھا اور محسن کے ساتھ ٹیڈی پچھلی سیٹ پر تھا۔ گاڑی اس گلی کے سامنے سے گزری جس میں ٹیڈی کا مکان تھا تو میں نے سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے ٹرک کو دیکھا۔ یہ وہی ٹرک تھا جسے علی نواز اور چاند خاں کو کچلنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ دو افراد جو اس کا بونٹ کھولے بظاہر کسی خرابی کو دور کرنے میں مصروف لگتے تھے، وہی ڈرائیور اور کلینر تھے جن سے ٹیڈی کا جھگڑا ہوا تھا۔ ان کے علاوہ بھی دو افراد کچھ فاصلے پر گلی کے اندر سے آ رہے تھے لیکن میں اُن کی صورت نہ دیکھ سکا۔ غالباً ٹیڈی کچھ جذباتی ہو گیا تھا۔ اس خیال سے کہ اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا۔ اور اس کا یہ غریب خانہ جیسا بھی تھا سب کے لیے ایک پناہ گاہ تھا جہاں وہ ہر خوف سے بے نیاز اپنی آزاد زندگی گزارتا تھا۔ اپنی مرضی سے آتا جاتا تھا اور اپنی مرضی سے سوتا جاگتا تھا۔ ہمارا ساتھ کیا ہوا کہ وہ بھی گھر سے بے گھر ہوا۔ اس نے ایک خاصی سرد آہ بھر کے کہا۔ ”واہ میرے مولا!“ اور اتنی دیر میں فیٹ اس گلی سے بھی نکل گئی جس میں رابعہ کی فاکس ویگن تنہا اور اداس کھڑی تھی۔ وہی فاکس ویگن کبھی جس کا چمکتا دمکتا سُرخ رنگ کسی دلہن کے ہاتھوں کی مہندی سے زیادہ شوخ تھا۔ گردشِ حالات اس فاکس ویگن کو بھی کہاں سے کہاں لے آئی تھی۔ وقت یوں بدلا تھا کہ فاکس ویگن کا حنائی رنگ بھی بدل گیا تھا اور اب سفید رنگ میں وہ سہاگن سے زیادہ بیوہ نظر آتی تھی۔ جس کی خوشیوں کو سفید کپڑوں کا کفن مل چکا ہو۔

راستے ہنوز غیر آباد تھے۔ کہیں کہیں ہمیں مخالف سمت سے آ جانے والی کوئی گاڑی مل جاتی تھی۔ پیدل یا سائیکل سوار نظر آ جاتے تھے۔ سحر خیزی میں سرِفہرست رہنے والے اخبار فروش۔۔ اور دودھ والے بھی ہر روز کی طرح شہر کے باسیوں کو تازہ خبر اور خالص دودھ فراہم کرنے نہیں نکلے تھے۔ نہ روزمرّہ کی ضروریات بیچنے والے دکانوں پر آئے تھے۔ اُن میں بھی سب سے پہلے سبزی گوشت اور دہی دودھ والے اوّل رہتے تھے۔ میں نے کئی جگہ گشت کرنے والی پولیس پارٹیوں کو لوٹتے دیکھا۔ اُفق پر صبح صادق کی لکیر روشن ہونے لگی تھی اور شمشاد مجھ سے نہ جانے کیا باتیں کرتا ماڈل ٹاؤن کی طرف جا رہا تھا۔ غالباً وہ اپنے اور عنایت کے پرانے تعلقات کے بارے میں کچھ بتا رہا تھا۔

”شمشاد صاحب!“ میں نے ضلع کچہری سے ایک میل آگے نکل کر نرمی سے کہا۔ ”گاڑی ایک طرف روک کر میری ایک بات سُن لیجیے۔“

وہ میرے لہجے پر چونکا اور میرے چہرے کی متانت پر غور کرنے لگا۔ ”خیریت تو ہے نا جی؟“

”بالکل خیریت ہے۔“ میں نے کہا۔ ”دراصل ہم کو ماڈل ٹاؤن

جانا ہی نہیں تھا۔ ہم کو یہاں اُتر نا ہے۔“

وہ کچھ چونکا۔ لیکن اس نے گاڑی کو سڑک کے کنارے روک لیا۔ ”چنگا مذاق ہے جی!“

”آپ نے جتنی بھی خاطر تواضع کی ہے۔“ میں نے کہنا شروع کیا۔ ”اور جس شرافت کا ثبوت دیا۔ اس کے بعد ہمیں آپ کے ساتھ یہ سلوک بالکل زیب نہیں دیتا لیکن ہم مجبور ہیں۔ جو کچھ آپ نے کیا اس کا بہت شکریہ۔“

”کچھ سمجھ میں نہیں آتی جی یہ بات۔ یہاں رُک کر ایسی باتیں کرنے کا مطلب۔۔۔“ وہ اس پستول کو دیکھ کر باقی جملہ بھول گیا۔ جو میں نے اپنی جیب سے نکال کر اس طرح گود میں رکھ لیا تھا کہ اُس پر میری گرفت برقرار تھی۔

”مطلب بہت سیدھا اور صاف ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن آپ خود بہت سیدھے سادے آدمی ہیں، اس لیے آپ کو صاف الفاظ میں بتانا پڑے گا کہ ہمارا کسی چوہدری عنایت سے کوئی تعلق نہیں۔ ہم تو چور ہیں اور ایک گھر کا سامان لے کر نکل رہے تھے کہ آپ مل گئے۔ ہمارا ارادہ نہیں تھا آپ سے ملاقات کا مگر۔ یہ تقدیر کا لکھا تھا۔ میں نے اپنی جان بچانے کے لیے ایک نام بک دیا تھا۔ باقی سب اتفاق تھا کہ آپ نے ہمیں سمجھنے میں غلطی کی اور ہم وہ بن گئے جو ہم نہیں تھے۔“

شمشاد کا رنگ اُڑ گیا تھا اور وہ مجھے پلک جھپکائے بغیر دیکھ رہا تھا۔ اس شریف آدمی کو ابھی تک یقین نہیں آیا تھا کہ اُس نے اتنے شائستہ لہجے میں انگریزی بولنے والے چور تھے جن پر اعتبار کر کے اس نے اپنے سادہ لوح ہونے کا نہیں، بے وقوف ہونے کا ثبوت دیا ہے۔

”تم آدمی تو۔۔۔ پڑھے لکھے ہو۔۔۔“ وہ بڑی مشکل سے بولا۔ ”پھر۔۔۔ یہ غلط کام۔۔۔؟“

”غلط کیا ہے اور صحیح کیا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ہم یہاں اس پر بحث میں وقت ضائع نہیں کریں گے۔ بہت سے پڑھے لکھے بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں، لاکھوں کی رشوت لیتے ہیں اور مالِ حرام سے اپنی تجوریاں بھر رہے ہیں۔ اُن کو نہ عاقبت کا خوف ہے نہ ملک اور قوم کا خیال۔ پڑھے لکھے اسمگلر بھی ہیں، پولیس افسر بھی ہیں اور کسٹم افسر بھی۔ قانونی، مذہبی اور اخلاقی طور پر اُن کی اور ہماری کمائی کے طریقے ایک جیسے ناجائز ہیں مگر وہ چور نہیں کہلاتے۔ چور وہ کہلاتے ہیں جو بڑے چوروں کے ہاتھوں پکڑے جاتے ہیں۔ ہم تو بہت چھوٹے چور ہیں۔ چوری بھی کرتے ہیں تو اس کے گھر میں جہاں حرام کا مال بھرا پڑا ہو اور جہاں چوری سے کوئی فرق نہ پڑتا ہو۔ کسی کی بلیک کا جینز رشوت میں ضبط نہیں کرتے۔ کسی کا گھر نیلام کرا کے ایک خاندان کو بے آسرا نہیں کرتے۔ آپ نے ہمیں حفاظت سے نکلنے کا موقع فراہم کیا ورنہ ہم تو سمجھے تھے کہ پکڑے گئے۔ اب آپ سے ایک آخری مؤدبانہ گزارش ہے کہ شور مچائے بغیر نیچے اُتر جائیں۔ اور یہ کار ہمارے حوالے کر دیں۔“

”کیا؟ تم اب میری گاڑی بھی لے جاؤ گے؟“ شمشاد کی آواز اُس کے حلق میں پھنس گئی۔

”ہاں۔ ہمیں اس کی ضرورت ہے۔“ میں نے کہا۔ ”چند گھنٹوں کے لیے۔ ہم یہ مالِ غنیمت کسی ٹیکسی میں تو نہیں لے جا سکتے۔ ٹیکسی ہے بھی کہاں!“

”اگر۔۔۔ میں نہ آتا تمہارے ساتھ۔۔۔ تب تم کیا کرتے؟“ وہ خوفزدہ نظروں سے ریوالور کو دیکھنے لگا۔

”پھر ہم کسی کی گاڑی چھینتے۔“ میں نے کہا۔ ”اور اُسے اپنی گاڑی تو مل جاتی مگر رپورٹ درج کرانے کے کئی دن بعد۔ وہ پولیس کے پیچھے پھرتا۔ مجسٹریٹ سے ریلیز آرڈر حاصل کرتا اور اس کے بعد بھی پولیس کی تحویل سے گاڑی چھڑانے کے لیے بیلف کو اور متعلقہ تھانے والوں کو دو چار ہزار مٹھائی کے دیتا۔ آپ کی مہمان نوازی اور شرافت کی وجہ سے ہم آپ کو بالکل تکلیف نہیں ہونے دیں گے۔ اس وقت صبح کے پانچ بجے ہیں۔ بارہ بجے سے پہلے پہلے گاڑی واپس مل جائے گی آپ کو۔“

”آپ کو کسی سے کوئی بات کرنے کی ضرورت نہیں۔“ محسن نے کہا۔ ”ورنہ معاملہ بگڑ جائے گا۔“

”آپ کو واپسی پر رکشا یا ٹیکسی ذرا دیر سے ملے گی۔“ میں نے کہا۔ ”خاموشی سے گھر جائیے اور گاڑی کے متعلق گھر والوں کو بھی کچھ نہ بتائیے۔ کہہ دیں کہ مہمانوں کو چھوڑنے گیا تھا۔ خراب ہو گئی۔“

”اگر آپ نے ہماری بات نہ مانی تو اپنا نقصان کریں گے۔“ محسن بولا۔ ”پولیس کے چکر میں پڑے تو خوار ہو گے۔ بارہ بجے کے قریب آس پاس کی گلیوں میں دیکھ لیں۔ گاڑی موجود ہو گی اور چابی گلوز کمپارٹمنٹ میں ہو گی۔ اپنی گاڑی چلا کے گھر لے جائیں۔“

”ہاں۔ بارہ بجے تک گاڑی نہ ملے تو بے شک آپ ہمیں جھوٹا سمجھ کے پولیس کو رپورٹ کر دیں۔ ہم یہ آپ کے بھلے کے لیے کہہ رہے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”چنگی بھلائی ہے جی۔“ وہ مُردہ آواز میں بولا۔ ”بھلائی والے زمانہ ای نئیں رہے۔“

”ہم پھر معافی چاہتے ہیں۔ اب آپ اُتر جائیں۔ ہو سکتا ہے ابھی یا کچھ دیر میں آپ کو سواری مل جائے۔“ میں نے کہا۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم یہ ڈراما کرتے رہتے ہو۔" وہ بولا۔ "ڈائیلاگ اچھے یاد ہیں۔"

"بالکل ٹھیک خیال ہے آپ کا۔ جیسا آدمی ہوتا ہے ویسا ہی اس کے ساتھ سلوک کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ایک بار نہیں، چار بار ہمیں زبردستی بھی کرنی پڑی۔ کچھ لوگ اتنے بے وقوف ہوتے ہیں کہ گولی سے بھی نہیں ڈرتے۔"

وہ فوراً اتر گیا۔ "تم بے وقوف تو نہیں بنا رہے ہو مجھے۔ یہ نہ ہو تم گاڑی کو ڈاکا ڈالنے کی کسی واردات میں استعمال کرو اور میں خواہ مخواہ پکڑا جاؤں؟" وہ رونی صورت بنا کے بولا۔

میں ہنس پڑا۔ "شمشاد صاحب! میں نے کہا ناکہ ہم تو بہت چھوٹے چور ہیں۔ آپ ڈاکا ڈالنے کی بات کرتے ہیں۔ میں خدا رسول کی قسم کھاؤں تب اعتبار کریں گے آپ؟ کیا جھوٹی قسم نہیں کھا سکتا میں! گاڑی جیسی ہم نے لی ہے ویسی ہی آپ کو واپس ملے گی۔" میں نے اس کی جگہ سنبھالی۔ اور انجن اسٹارٹ کر کے گاڑی کو گیئر میں ڈال دیا۔ چند منٹ میں شمشاد بہت پیچھے رہ گیا۔

"بیچارا۔ خدا کرے وہ پولیس کے پاس جانے کی غلطی نہ کرے۔" محسن نے کہا۔ "ٹھیک کہتا تھا کہ بھلائی کا زمانہ نہیں ہے۔ پھر کبھی کسی کے ساتھ بھول کے بھی بھلائی نہیں کرے گا۔"

"اور ایسے ہی آہستہ آہستہ یہ زوال پذیر معاشرہ اخلاقی ابتری کا شکار ہوتا جائے گا۔ یہاں تک کہ اس پر ایٹ ازراٹط سوسائٹی غالب آجائے گی جس میں دلاور جیسے بے اصول، بے ضمیر اور بے ایمان لوگ ایک طرف ہوں گے اور ان کے ظلم کا اور ان کی شیطانی ہوس کا شکار ہونے والے دوسری طرف۔" میں نے کہا۔ "میرے والد وزیر خان، میں، تو اور رابعہ، شہلا، اس کی ماں اور ان گنت لوگ جو حق و انصاف کی بات کرتے تھے، آج کتنے مظلوم ہیں لیکن ظلم جب حد سے بڑھ جاتا ہے تو مٹ جاتا ہے اور ہم جیسے کمزور لوگ بھی بڑی سے بڑی طاقت کے دعویدار کے لیے چیلنج بن کے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔۔۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کے لیے۔"

"تو دلاور کی گزشتہ شب کی کارروائی پر مشتعل ہے؟" محسن نے کہا۔

"ہاں یار۔ آج اس کی وجہ سے ہمارے یار ٹیڈی کو بھی اپنا گھر چھوڑنا پڑا۔" میں نے کہا۔

"بڑے شکاری بن کے آئے تھے۔ اب ہاتھ مل رہے ہوں گے کہ شکار ہاتھ سے نکل گیا۔" محسن بولا۔

"معلوم نہیں وہ کیا چاہتے تھے۔" میں نے کہا۔ "مجھے دلاور سے بات کرنی پڑے گی۔ اتنا تو وہ بھی سمجھتا ہے کہ مجھے یا تجھے قتل کرنے سے اس کو حاصل کچھ نہیں ہوگا۔"

"ممکن ہے یہی بات وہ تجھ کو سمجھانا چاہتا ہو کہ لڑائی میں دونوں کا نقصان ہو جائے گا۔ وہ پھر کسی سودے کی بات کرے گا۔"

"سودا کیسے ہو سکتا ہے؟" میں نے کہا۔ "وہ چاہتا ہے کہ میں پیسہ لے کر الگ ہو جاؤں اور اگر مجھے پارٹنر بننا ہے تو میں سلیپنگ پارٹنر رہوں۔ کاروبار میں عملی طور پر دخل نہ دوں۔ یہ بھی پہلے کی بات ہے۔ اب وہ آفر بڑھا سکتا ہے۔ پچاس لاکھ کر سکتا ہے کہ یہ لو اور ملک سے چلے جاؤ جہاں دل چاہے۔ ایک کروڑ کا نقصان بھی برداشت کر لے گا وہ۔ مجھ سے جان چھڑانے کے لیے۔ کیونکہ جس قسم کا دھندا وہ کر رہا ہے اس میں ایک کروڑ کی کوئی حیثیت نہیں۔ اگر اس کا راز فاش ہو گیا تو اس کے کروڑوں جائیں گے۔ وہ ملک کا غدار اور مجرم کہلائے گا اور آج وہ جتنی عزت کے ساتھ زندہ ہے کل اتنی ہی رسوائی کے ساتھ مرے گا۔ وہ اسی خطرے کے خلاف تحفظ چاہتا ہے۔"

"وہ تو سمجھتا ہے کہ ہم اسے منشیات کے دھندے میں ملوث سمجھتے ہیں۔" محسن بولا۔

"ہاں۔ ابھی تو یہی سمجھتا ہے لیکن اسے ڈر تو ہے ناکہ ہم اس کے پیچھے پڑے رہے تو کسی کی غلطی۔ کسی کی غداری۔ بدقسمتی یا محض اتفاق کے باعث ہم اصل کاروبار کا کھوج لگانے میں کامیاب نہ ہو جائیں۔" میں نے کہا۔

"اس پریشانی کی وجہ سے جو ہم نے پیدا کر دی ہے اس کا کاروبار بھی متاثر ہوا ہوگا۔" محسن نے کہا۔

ہر کاروبار پوری توجہ چاہتا ہے۔ اور یہ تو ایسا کاروبار ہے کہ اس میں اپنوں سے بھی خطرہ رہتا ہے اور غیروں سے بھی۔" میں نے کہا۔ "اگر یہ بات پھیل گئی کہ دلاور کے بھی بہت طاقتور دشمن پیدا ہو گئے ہیں تو اس کی ساکھ خراب ہو گی۔ اس پر اعتماد کرنے والے اس پر اعتماد کرنا چھوڑ دیں گے کیونکہ ان کو اپنی سلامتی عزیز ہو گی۔ دلاور کے لیے ایک خطرہ وہ بھی بن جائیں گے جن کو آج وہ اپنا ساتھی تصور کرتا ہے۔ وہ ملک اور قوم کے دشمن ہیں اور غدار ہیں۔ خود کو بچانے کے لیے وہ دلاور کو ختم کرنا بہتر سمجھیں گے۔ ایسے کاروبار میں کون کسی کا دوست، کیسے اصول اور کہاں کی وفاداری!" میں نے کہا۔ گاڑی اب ماڈل ٹاؤن سے گزر رہی تھی۔

"یار۔ یہ ٹیڈی کیوں چپ ہے؟" محسن نے کہا اور اس کا کندھا پکڑ کے ہلایا۔ "میاں خوجی! واہ بھئی واہ! کیا مزے رہے تھے!"

"مزے سے تو اب قبر ہی میں سوئیں گے۔" وہ بولا۔ "ایسے ہی جھپکی آ گئی تھی۔ یہ تم لوگ کدھر جا رہے ہو؟"

"محسن کے سسر سے ملنے۔" میں نے کہا۔ "کیا زبردست لطیفہ ہوا ہے۔"

"مسئلہ پھر وہی ہے کہ جائیں تو جائیں کہاں؟" محسن نے کہا۔ "گاڑی بھی وہیں رہ گئی۔ کیا اس وقت ہم رابعہ کے پرانے آفس جا سکتے ہیں؟" میں نے کہا۔ "وہ چابیاں دے گئی تھی اور چابیاں میرے پاس ہیں۔ وہاں رہنا تو مشکل ہے۔ گاڑی کا کیا ہے، رابعہ خود دے جائے گی۔"

"اس عمارت میں زیادہ تر دفاتر ہیں۔" محسن بولا۔ "سب سے اوپر والی منزل پر کچھ شاہانہ قسم کے فلیٹ ہیں جن میں وی آئی پی قسم کے لوگ رہتے ہیں۔ چنانچہ چوکیدار دروازے پر ہی روک لے گا۔"

"ہم ثابت کر سکتے ہیں کہ چابیاں ہمارے پاس ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور ہم چور نہیں ہیں۔"

محسن نے قہقہہ مارا۔ "ابھی کچھ دیر پہلے تو ثابت کر چکا ہے کہ ہم چور ہیں۔ سچ کیا ہے؟"

"سچ بذاتِ خود کوئی چیز نہیں۔ کل یہ سچ تھا کہ زمین چپٹی ہے اور سورج اس کے گرد گھومتا ہے۔ آج یہ سچ ہے کہ زمین گول ہے اور سورج کے گرد گھوم رہی ہے۔" میں نے کسی فلسفی کی طرح کہا۔

"ہمارے پاس آٹھ دس ہزار ہیں۔" محسن بولا۔ "ہمیں رابعہ کے آفس جا کے خواہ مخواہ شکوک پیدا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ کسی ہوٹل میں چلتے ہیں۔ آج دن میں کوئی کرائے کا مکان تلاش کر لیں گے۔ بالکل ایسا ہی جیسا ہمارے دوست خوجی کا تھا۔ یار تم برا مت ماننا استاد ٹیڈی۔ کچھ اچھا نہیں لگتا۔ اور میاں نیک محمد بھی ذرا مشکل ہے۔ سب سے مناسب میاں خوجی ہے۔"

"آئندہ سے ہم تم کو میاں خوجی کہیں گے۔" میں نے کہا۔

"جو چاہو کہو سکندر بادشاہ۔" ٹیڈی نے ایک آہ بھر کے کہا۔ "ہم یاروں کی بات کا برا نہیں مانتے۔"

جب ہم ماڈل ٹاؤن سے گزر رہے تھے تو افق پر طلوع ہونے والے سورج کا اجالا بادل کے ٹکڑوں میں گہرا نارنجی رنگ بھر رہا تھا۔ پھر یہ رنگ زرد ہوا اور ہلکا پڑ گیا۔ میں نے واپسی کے خیال سے گاڑی کو موڑا تو وہ سڑک آ گئی جس پر پہلے میرا پرانا گھر تھا اور آگے قصرِ جمشید کا پراسرار کھنڈر تھا جس کے متعلق ہم بہت سی باتیں سن چکے تھے۔ کچھ پرانی، بے بنیاد اور کچھ ناقابلِ فہم۔ ایک کہانی وہ تھی جو ہمیں طافو نے سنائی تھی اور جس سے ثابت ہوتا تھا کہ اس کھنڈر کے نیچے تہ خانہ ہے اور تہ خانے تک جانے کے لیے ایک سرنگ ہے۔ ہمارے ذاتی تجربات بھی بہت بھیانک تھے اور ہم نے اس کھنڈر کو جلتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کھنڈر کی آگ میں جل کر ہم بھی خاکستر ہو جاتے مگر قدرت کو ابھی کچھ اور امتحان منظور تھے کہ ہم بچ گئے اور آگ اسے کھا گئی جس کو قضا اس اجڑے دیار میں لے آئی تھی۔

اپنے پرانے گھر کے سامنے سے گزرتے ہوئے مجھے گزرے ہوئے وقت کی بہت سی باتیں یاد آئیں اور بلا ارادہ میں رک گیا۔ چشمِ تصور سے میں نے اندر اپنے بچپن کی مانوس فضا کو دیکھا اور مجھے وزیر خان کی یاد آئی۔

نواب خسرو جمشید مرے تو انھیں قصرِ جمشید میں ہی ایک گوشۂ عافیت مل گیا۔ وزیر خان کو کہیں اماں نہ ملی۔ نہ اس کوٹھی میں جس کا وہ مالک کہلاتا تھا، نہ شہرِ خموشاں میں جہاں کوئی کسی کو ابدی نیند سے بیدار نہیں کرتا اور یومِ حشر تک کوئی پیچھے رہ جانے والی دنیا کے جھمیلوں میں نہیں پڑتا۔ پھر وزیر خان بار بار جلا وطن کیوں ہوا؟ ایک بار تقسیمِ ہند کے وقت۔ دوسری بار میرے ولایت جانے کے بعد جب اسے اپنے ہی گھر سے نکلنا پڑا۔ اور تیسری بار میرے ہوتے ہوئے اس کی لاش سے اس کا مدفن چھینا گیا۔ اچانک ایک خیال میرے ذہن میں بجلی کی طرح کوندا۔

"محسن! تجھے یاد ہے طافو نے کیا کہا تھا؟" میں نے کہا۔ "قصرِ جمشید کے بارے میں؟"

"اس نے تو بہت کچھ کہا تھا۔" محسن بولا۔

"اس نے کہا تھا کہ قصرِ جمشید تک پہنچنے کے لیے وہ ایک مین ہول میں اترے تھے۔" میں نے کہا۔ "وہ مین ہول عام گٹر کے مین ہول کی طرح نظر آتا تھا لیکن درحقیقت ایک زیرِ زمین سرنگ کا راستہ تھا اور یہ سرنگ سیدھی قصرِ جمشید کے تہ خانے تک پہنچتی تھی۔ تہ خانے سے بھی اوپر جانے کا ایک راستہ تھا۔ مجھے یاد ہے اس نے شاید یہ بھی کہا تھا کہ ٹرک اسی مین ہول پر آجاتا تھا۔"

"وہ بھی ایک سرنگ تھی جہاں سے ہم نے طافو اور رحمت کباڑی کو ٹرک میں مال بھر کے روانہ ہوتے دیکھا تھا اور وہ ٹرک نکلا بھی زمین میں سے تھا۔" میں نے کہا۔ "ہم اس ٹرک میں چھپ گئے تھے۔"

"ہاں۔ اوپر کوئی درگاہ بنا رکھی تھی۔" محسن بولا۔ "جب ٹرک آجاتا تھا تو وہ زمین برابر کر دیتے تھے۔"

"اور ٹرک اسی زیرِ زمین راستے کو طے کر کے ایک گیراج کے احاطے میں نکلتا تھا اور وہاں سے سڑک پر آجاتا تھا۔" میں نے کہا۔ "گیراج میں ٹرک آتے جاتے رہتے ہیں اس لیے کسی کو شک ہونے کا سوال ہی نہیں تھا۔ وہ مزار بھی ڈھونگ تھا جہاں گامے شاہ کا کام یہ تھا کہ وہ دلاور کے مال کو آگے بھجوائے۔ دیہات کے سیدھے سادے عقیدت مندوں کے لیے یہ سوچنا بھی گناہِ کبیرہ سے کم نہیں کہ مزار شریف دراصل ناجائز کاروبار کا اڈا ہے۔"

"اس وقت ان باتوں کو دہرانے کا مقصد کیا ہے؟" محسن نے کہا۔

"میں ایک بہت بڑی بات کہنے کے لیے جواز تلاش کر

"رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "یہ تو ثابت ہو چکا ہے محسن کہ دِلاور اور اس کے ناجائز کاروبار میں شریک افراد ایک گروہ کی صورت میں کام کرتے ہیں۔ ابھی یہ چھوڑ دے کہ وہ ناجائز کام کیا ہے، کام کے بارے میں صرف قیاس آرائی کر سکتے ہیں اور اندازے لگا سکتے ہیں لیکن طریقۂ کار ہم دیکھ چکے ہیں۔ یہ لوگ زیرِ زمین راستے استعمال کرتے ہیں۔ ایک سُرنگ میں ہم دونوں نے سفر کیا تھا۔ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ دوسری سرنگ کی بات بھی طافو کے دماغ کی اختراع نہیں تھی؟"

"شک تو مجھے اس وقت بھی نہیں تھا۔" محسن بولا۔

"ہاں۔۔۔ اور تُو نے ایک بات کہی تھی کہ کھنڈر کو بلاوجہ آگ نہیں لگائی گئی تھی۔" میں نے کہا۔ "وہ عمارت پہلے بھی ویران تھی۔ اسے جلا کے تباہ کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ہم بھی لوٹ کر ادھر نہ جائیں خواہ اس کے نیچے کچھ بھی ہوتا رہے۔"

"کسی کو خیال تک نہ آئے کہ اس جلی ہوئی دیواروں کے ڈھانچے میں بد روحوں کے سوا کسی کا گزر بھی ممکن ہے۔" محسن بولا۔ "اور کوئی شک بھی نہ کر سکے کہ یہاں کوئی ناجائز کاروبار ہو سکتا ہے۔"

"اگر کوئی اس خانہ ویرانی کی طرف متوجہ ہوتا تھا تو اسے اندر جانے سے پہلے ایک چوکیدار روک دیتا تھا۔" میں نے کہا۔ "اب سمجھ میں آیا میری بات کا مطلب؟ چونکہ دلاور اپنی فیکٹری میں کوئی ناجائز کاروبار کر رہا ہے چنانچہ اس نے افشائے راز کے خوف سے میرے والد کو بھی دُور رکھا۔ اور وہ مجھے بھی اسی لیے دُور رکھنا چاہتا ہے کہ میری طبیعت اپنے والد سے مختلف نہیں۔ میں دلاور کا ہم خیال ہوتا تو وہ مجھے بڑی خوشی سے اپنے کاروبار میں شریک کرتا۔ ساری گڑبڑ اسی وجہ سے ہے کہ جو خطرہ اُسے وزیر خان سے محسوس ہوا تھا وہی مجھ سے بھی محسوس ہوتا ہے۔ دلاور کی فیکٹری سے مال قصرِ جمشید پہنچتا ہے جو اس کا اسٹور سمجھا جا سکتا ہے۔ وہاں سے یہ مال محلے شاہ کو ارسال کیا جا سکتا ہے جسے ہم سول ڈسٹری بیوٹر فرض کر لیتے ہیں۔ قصرِ جمشید سے کسی نے کبھی کوئی ٹرک نکلتے نہیں دیکھا ہوگا۔ وہاں تو بس ویرانی ہے۔ ٹرک آتے جاتے تو سب کو شک ہوتا کیونکہ ٹرک کسی اور جگہ سے لوڈ ہوتے ہیں اور وہ جگہ قصرِ جمشید سے دور تو ہے مگر قریب بھی ہے۔" میں نے کوٹھی کے اندر دیکھا جو صبح دم ویران اور خالی نظر آتی تھی۔ سڑک پر کھڑے رہنا شکوک پیدا کر سکتا تھا۔ میں گاڑی کو اندر لے گیا اور گیٹ سے کافی اندر لے جا کر روک دیا۔ انجن کی معمولی سی آواز نے کوٹھی میں سونے والوں کو بیدار نہیں کیا تھا۔

"تجھے معلوم ہے میں یہاں کس لیے آیا ہوں؟" میں نے انجن بند کر کے کہا۔

محسن چونکا۔ "تیرا مطلب۔۔۔ تو کہنا چاہتا ہے۔۔۔؟"

"ہاں۔ میں کہنا چاہتا ہوں کہ کیا قصرِ جمشید کے تہ خانے تک جانے والا راستہ یہاں نہیں ہو سکتا؟ مرحوم وزیر خان کے پرانے گھر میں؟ یہ ہو سکتا ہے کہ وزیر خان کے کاروبار میں شریک ہونے کے بعد دلاور نے رفتہ رفتہ اس کے جائز کاروبار کی آڑ میں اپنا ناجائز کاروبار پھیلایا ہو۔ اس کی پشت پناہی نواب خسرو جمشید مرحوم کا بدبخت بیٹا کر رہا تھا جسے نواب صاحب نے عاق کر دیا تھا۔ وہ اپنے باپ کا ہمشکل تھا اور انگلینڈ گیا تھا تو لوٹ کر نہیں آیا تھا۔ فرض کرو یہاں آنے کے بعد اسی نے دلاور کے ساتھ مل کر ناجائز کاروبار کا آغاز کیا اور ان دونوں نے مل کر یہ جال پھیلایا۔ انھیں کسی اور نے یہ مشورہ دیا یا خود اُن کے شیطانی ذہن میں یہ خیال آیا کہ کاروبار کے لیے برسوں سے پڑے ہوئے قصرِ جمشید کو استعمال کیا جائے۔ بعد میں اپنی حفاظت کے خیال سے اور اپنے کاروبار کو محفوظ رکھنے کے لیے انھیں سرنگ بنانے کا خیال آیا۔۔۔ اور اس کے لیے انھوں نے اپنے ہی ایک شریکِ کار سے بات کی یعنی وزیر خان سے۔ وزیر خان کی کوٹھی ہر لحاظ سے موزوں تھی۔ اس کا لان کافی وسیع تھا اور اس کا فاصلہ بھی قصرِ جمشید سے زیادہ نہیں تھا۔ کسی اور کے گھر میں سُرنگ کھودنا ناممکن تھا اور سرنگ کو میلوں دُور لے جانا بھی اتنا ہی ناممکن تھا۔ انھوں نے وزیر خان کو سب سے پہلے یہ بتایا ہوگا کہ اس کاروبار میں کتنا زبردست فائدہ ہے مگر وزیر خان دنیا کے مالی فائدے کی خاطر عاقبت کے خسارے کا سودا نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے انکار سے حالات کی خرابی کا آغاز ہوا۔ چوہدری دلاور اور خسرو جمشید غلط امیدوں کے آسرے پر غلط آدمی سے غلط بات کرنے کی غلطی کر چکے تھے۔ وہ کوئی عام آدمی نہیں تھا۔ بزنس میں برابر کا پارٹنر تھا اور اگر وہ مخالفت پر تن جاتا تو دلاور اور خسرو جمشید کا ٹھکانا جیل کے سوا کہاں ہوتا۔"

"مجھے ایسا لگتا ہے کہ تو نے وزیر خان مرحوم کے حالات کی یکلخت خرابی۔ اس کی ذِلت و خواری۔ بلیک میل ہونے کے باوجود خاموشی اور اس کی پُراسرار موت کا سبب معلوم کر لیا ہے۔" محسن نے کچھ دیر بعد کہا۔

"یہ محض قیاس آرائی کی بات نہیں محسن! اس مفروضے کا ایک منطقی استدلال بھی ہے۔" میں نے کہا۔ "فرض کر آج وزیر خان کی جگہ میں ہوتا اور دلاور مجھ سے یہی بات کرنے آتا تو میں اسے کیا جواب دیتا؟ میں اسے ذلیل و خوار کر کے نکال دیتا اور اسے پولیس کے حوالے کرنے کی دھمکی دیتا۔ وزیر خان اس وقت تک دولت مند بارسوخ اور معزز صنعتکار تھا جس کی گڈوِل بہت اچھی تھی۔ اس کی رپورٹ دلاور اور خسرو جمشید کا بیڑا غرق کر دیتی۔ اُن کے سارے

خواب ادھورے رہ جاتے اور کروڑوں کا منصوبہ خاک میں مل جاتا۔ اور یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ ایک پرانے وقتوں کے اصولوں پر بند رہنے والے خبطی بوڑھے کی ایمانداری پر اپنا مستقبل خراب کریں۔ انھوں نے وزیر خان کو لالچ کے بعد دھمکی دی ہوگی اور جب ناکام رہے ہوں گے تو انھوں نے طے کر لیا ہوگا کہ اب اس خطرے سے بچنے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ خطرے کو ختم کر دیا جائے۔ وزیر خان کو سب کچھ معلوم ہو چکا تھا اور وہ کسی بھی وقت ان کے لیے تباہی و بربادی کا سبب بن سکتا تھا۔ آج میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اسے تو قیاس آرائی کہہ سکتا ہے لیکن دیکھ لینا کسی دن یہ ثابت بھی ہو جائے گا کہ میں نے غلط نہیں کہا تھا۔ دلاور اور خسرو جمشید نے وزیر خان کو کاروبار سے الگ کر دیا اور اسے گھر میں نظر بند کر دیا۔ شاید اسے باہر جانے کی اجازت بھی نہیں ہوگی۔ اس کی ٹیلی فون لائن بھی کاٹ دی گئی ہوگی اور اس کی نگرانی کے لیے دلاور نے پیڈرو یا کسی معتمدِ خاص کو مامور کر دیا ہوگا۔"

"انھوں نے وزیر خان کو قتل کیوں نہیں کر دیا؟" محسن نے کہا۔

"یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ قتل کے ارادے سے پہنچے ہوں اور وزیر خان نے ہاتھ جوڑ کر زندگی کی بھیک مانگ لی ہو۔ وہ اپنے لیے نہیں میرے لیے زندہ رہنا چاہتا تھا۔" میں نے کہا۔ "دلاور اور خسرو جمشید نے دھمکی دی ہوگی کہ یہاں اسے اور ولایت میں مجھے قتل کر دیا جائے گا اور وزیر خان نے وعدہ کر لیا ہوگا کہ وہ اپنی زبان بند رکھے گا۔ جیسا وہ چاہیں گے ویسا ہی کرے گا اور ان کے کسی معاملے میں دخل نہیں دے گا بشرطیکہ سکندر بخت کو بخش دیا جائے۔ اب یا تو اُن کو رحم آ گیا یا میر شرافت علی نے پرانے تعلق کا کچھ لحاظ کیا اور وزیر خان کو بچا لیا۔ میر شرافت علی نے دلاور اور خسرو جمشید کے نئے اور نافع بخش کاروبار میں شرکت قبول کر لی ہوگی چنانچہ اس نے لالچی اور بے ضمیر ہونے کے باوجود اتنا ضرور کیا کہ وزیر خان کی جاں بخشی کی سفارش کی۔ اس کے بعد وزیر خان نے اپنے وعدے کے مطابق ان کی ہر بات مانی لیکن مجھے کبھی کچھ نہیں لکھا۔ دلاور اینڈ کمپنی نے اس سے کوٹھی اس لیے چھین لی کہ اسے وہ اپنے کاروباری مقاصد کے لیے استعمال کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ انھوں نے مشہور کیا کہ وزیر خان بیمار ہے اور اسے چراغ دین کے گھر منتقل کر دیا۔"

"اگر یہ سچ ہے تو کتنا خوفناک سچ ہے سکندر!" محسن نے کہا۔

"وزیر خان اپنی مرضی سے اس نمک حرام چراغ دین کے گھر رہنے کے لیے نہیں پہنچا تھا محسن!" میں نے کہا۔ "دلاور جانتا ہوگا چراغ دین کے خلاف وزیر خان نے مقدمہ قائم کیا تھا اور چراغ دین [illegible] کیا بھی تھا مگر اس نظامِ انصاف کی فنی باریکیوں اور خامیوں کے باعث جرم ثابت نہیں ہوا اور غبن کرنے والا سزا پانے کے بجائے دولت مند بن گیا اور معزز ہو گیا۔ دلاور نے وزیر خان کو اس کے دشمن کے حوالے کر دیا کہ اس کی حفاظت کرو اور اسے کہیں مت جانے دو۔ کسی سے مت ملنے دو۔ چراغ دین کا گھر وزیر خان کے لیے ایک جیل تھی جہاں چراغ دین جیلر تھا۔ دلاور اور خسرو جمشید نے اسے بدلہ لینے کا موقع بھی فراہم کیا اور شاید اس سے کام لینے کا معاوضہ بھی ادا کیا۔ چراغ دین ایسا شخص تھا جو پیسے کی خاطر ہر کام کر سکتا تھا۔ اس نے وزیر خان کے اعتماد کو دھوکا دیا تھا اور وزیر خان نے اسے پکڑ لیا تھا۔ اب وزیر خان اس کی پکڑ میں آیا تو اس نے اپنی تذلیل کا انتقام لیا۔ اس نے وزیر خان کو گھر کے نوکر کی طرح رکھا۔ اسے جھاڑو دینے اور برتن مانجھنے پر لگا دیا۔ ممکن ہے اس نے اٹھتے بیٹھتے وزیر خان کو گالیاں بھی دی ہوں۔ اور وزیر خان نے یہ سب میری زندگی کو ان سفاک شیطانوں سے محفوظ رکھنے کی خاطر برداشت کیا۔ تو نے دیکھا مائٹ از رائٹ سوسائٹی میں کیا ہوتا ہے۔ غبن چراغ دین نے کیا اور سزا وزیر خان کو ملی۔ وہ انصاف کے لیے فریاد تک نہ کر سکا۔ اس نے اپنا سب کچھ گنوا دیا۔ کیا میری زندگی اتنی قیمتی تھی محسن؟"

"نہیں۔۔۔ وہ تیری زندگی نہیں اپنی زندگی بچا رہے تھے۔" محسن بولا۔ "وزیر خان کی جاں بخشی کرنے کے بعد انھوں نے اس کو ہر طرح سے آزمایا۔ اس سے جہاں چاہا دستخط کرائے اور اسے پیسے پیسے کو محتاج کر دیا۔ اسے چراغ دین جیسے کمینے اور کینہ پرور شخص کے سپرد کر دیا۔ اور ہر طرح سے اس کا حوصلہ آزمایا۔ صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ تیری زندگی بچانے کے لیے لب نہ کھولنے کے وعدے پر کس حد تک قائم رہتا ہے۔ وہ مرتے دم تک اس عہد پر قائم رہا۔"

"اس کے باوجود وہ وزیر خان کو جیتے جی قتل کر دینے والے مطمئن نہیں ہوئے تھے۔" میں نے کہا۔ "انھوں نے انگلستان میں مجھ پر نظر رکھی۔ میری ڈاک سنسر کی اور یہاں وزیر خان کے پرانے نمک خواروں کو مطمئن رکھنے کی پوری کوشش کی۔ یہاں تک کہ جب وہ مرا تو اس کا جنازہ چراغ دین کی کوٹھی سے اٹھا اور اس کے دوست احباب، بہی خواہ اور پرانے ساتھی بھی دھوکا کھا گئے۔ وہ سمجھے کہ یہ کوٹھی بھی وزیر خان کی ہوگی۔ انھیں کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ وزیر خان تو وہاں قیدِ بامشقت کاٹ رہا تھا لیکن اس کے دشمنوں کی کوشش کے باوجود کسی نہ کسی طرح یہ راز فاش ہو گیا اور وزیر خان کی موت کے بعد کسی کے ضمیر نے اسے اتنی ملامت کی کہ اس نے فوماچو کے ذریعے مجھے اصل صورتِ حالات سے آگاہ کر دیا۔"

"کیا یہ شخص خود فوماچو نہیں ہو سکتا؟" محسن نے کہا۔

"ہاں۔۔۔ وہ بھی وزیر خان کا پرانا ساتھی تھا۔" میں نے کہا۔ "ممکن ہے پہلے لالچ یا خوف کے باعث وہ خاموش رہا ہو۔۔۔ لیکن

آدمی عمر کے آخری حصے میں پہنچتا ہے تو اسے دنیا سے زیادہ عاقبت کی فکر لاحق ہو جاتی ہے۔ شاید وزیر خان کی موت کے بعد فوما پنچو کا حوصلہ جواب دے گیا اور اس نے جان پر کھیل کر مجھے حقائق سے آگاہ کر دیا۔ اس کی سزا فوما پنچو کو وہی ملی جو متوقع تھی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجھے برطانیہ سے نکلوا کر یہاں لے آیا گیا۔

"میرا بھی دل گواہی دیتا ہے کہ ایسا ہی ہوا ہوگا۔" محسن نے کہا۔

"یہ سچ ہے محسن۔ سچ کو گواہی کی یا دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی۔" میں نے کہا۔ "سچ کسی ثبوت کے بغیر اپنا وجود تسلیم کرا لیتا ہے۔ کبھی موقع ملا تو چراغ دین کی زبان اس سچ کا اعتراف کرے گی۔ ابھی تو وہ جیل میں اپنی سزا کاٹ رہا ہے مگر یہ اس جرم کی سزا ہے جو اسے بہت پہلے ملنی چاہیے تھی اور نہیں ملی تھی۔ جو کچھ اس نے بعد میں کیا اس کی سزا وہ جیل سے رہائی کے بعد پائے گا۔ ایک نہ ایک دن دلاور کی زبان یہ سچ بولے گی اور اگر مجھے خسرو جمشید ملا تو اس کی زبان بھی اسی سچ کی تصدیق کرے گی اور تو دیکھے گا کہ ان تینوں کا سچ ایک ہے۔ سچ ہمیشہ ایک ہی ہوتا ہے جس کا احساس مجھے اس وقت ہو رہا ہے۔"

"اس کا یقین مجھے بھی ہے۔" محسن نے کہا۔ "لیکن اب ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ اندر سے کوئی نکل آیا تو کیا کہیں گے؟"

"وہی جو سچ ہے۔" میں نے کہا۔ "میں کہہ دوں گا کہ یہ میرا گھر تھا۔ کیونکہ یہ میرے باپ کا گھر تھا۔"

"اس سے تجھے یہاں داخل ہونے کا قانونی حق نہیں حاصل ہوتا۔" محسن بولا۔ "اصل وزیر خان تو یہاں آنے سے پہلے کئی گھر بدل چکے تھے، کیا تو سب میں گھس سکتا ہے؟"

"دیکھ محسن! اب میں نے ایک نظریہ قائم کیا ہے تو اس کی تصدیق بھی چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "مجھے یہ تو دیکھنا ہی ہے کہ کیا واقعی یہاں کے کسی مین ہول سے شروع ہونے والی سرنگ قصرِ جمشید کے تہ خانے تک جاتی ہے۔"

"کوئی عقل کی بات کر سکندر۔" محسن نے کہا۔ "اس کی اجازت ہمیں کون دے گا؟"

"ظاہر ہے اجازت تو کوئی بھی نہیں دے گا۔" میں نے کہا۔ "لیکن میں بھی اسی وقت کھدائی شروع کرنا نہیں چاہتا۔ پہلے تو میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ اب یہاں کون رہتا ہے اور اس نے یہ کوٹھی کس سے خریدی تھی۔"

"یہاں جو بھی ہوگا انہی کا ساتھی ہوگا۔ وہ ہمارا دوست نہیں ہو سکتا۔" محسن بولا۔

"پھر بھی مل لینے میں کیا ہرج ہے؟" میں نے کہا۔ "جو بھی ہوگا بات تو سنے گا ہماری۔"

"کیا کہے گا تو؟ یہ کہ میں سکندر بخت ہوں۔ بچپن میں یہاں رہتا تھا اور کوٹھی میرے باپ وزیر خان کی تھی چنانچہ میں یہاں [illegible] کرنے آیا ہوں۔" محسن نے خفگی سے کہا۔ "وہ فوراً دلاور کو مطلع کرے گا کہ سکندر یہاں آیا تھا۔ یا پولیس کو طلب کرے گا کہ اپنے مفرور [illegible] کو لے جاؤ۔ اگر اندر سے دلاور یا اس کا دستِ راست استاد [illegible] نکل آئے تو مجھے تعجب نہیں ہوگا۔ ہم دشمن کے علاقے میں کھڑے ہیں سکندر اور یہ کس قدر بے وقوفی کی بات ہے کہ ہم نے رات [illegible] سے جان بچانے کے لیے کتنی سخت جدوجہد کی اور صبح ہوتے خود ان کی خدمت میں حاضر ہو گئے کہ سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے۔"

"ہم اتنے بے دست و پا بھی نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔ لیکن میری مزاحمت کمزور پڑ گئی تھی۔ اور محسن کی عقل کے دلائل میرے [illegible] پر غالب آتے جا رہے تھے۔

"تو پھر دیر کیسی؟" محسن نے برہمی سے کہا۔ "چل اندر۔ ریوالور لے کر چلتے ہیں جو سامنے آئے گا اسے گولی مار دیں گے۔ خونریزی کرنی تھی تو وہیں شوق پورا کر لینا تھا جہاں چار آدمی تھے۔ وہاں سے تو سامان اٹھا کر بھاگ آئے۔ یہاں بلاوجہ مرنے کی ضد ہے۔"

"کیا ہوا... کیا ہوا؟" ٹیڈی نے اچانک کہا۔ "کیوں لڑ رہے ہو آپس میں؟"

"تم پھر سو گئے تھے میاں خوجی۔" میں نے کہا۔ "چلو اچھا ہے کہ تم نے کچھ سنا نہیں۔"

"یہ کس کی کوٹھی ہے؟" وہ اِدھر اُدھر دیکھ کر بولا۔

"میرے باپ کی۔" میں نے کہا اور محسن کی طرف دیکھا۔ "[illegible] ہے پہلے میرے سسر کے گھر چلو۔" "اچھا بھائی! پہلے وہیں چلتے ہیں لیکن اب ڈرائیونگ تو کر۔ میں تھک گیا ہوں۔"

اس وقت تک سورج کافی اوپر آ گیا تھا۔ میں نے گھڑی میں وقت دیکھا، آٹھ بج کر دس منٹ ہوئے تھے۔ ہم نے شمشاد کے گھر میں چائے نہ پی ہوتی اور پراٹھے نہ کھائے ہوتے تو اب تک بھوک سے ہمارا برا حال ہوتا اور ہمیں بہت پہلے وقت کا احساس ہو جاتا۔ چابیاں اگنیشن سوئچ میں لگی چھوڑ کے نیچے اترا اور گھوم کر دوسری طرف گیا کہ ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ جاؤں۔ میرے ساتھ ہی [illegible] پیچھے والا دروازہ کھول کے ڈرائیور کی جگہ سنبھالنے نکلا۔ اسی وقت کوٹھی کا سامنے والا دروازہ کھلا اور ایک کارٹون نمودار ہوا۔ [illegible] ستر سال کا بوڑھا شخص تھا جس کا جسم ہڈیوں کا چلتا پھرتا ڈھانچہ تھا جس پر گوشت نام کو نہ تھا۔ سیاہ کھال ہڈیوں پر منڈھی نظر آتی تھی۔ اس نے بہت پرانا گول شیشوں والا نظر کا چشمہ لگا رکھا تھا۔

[illegible] کارٹون بنانے میں اس کے سوٹ کا اور ہیٹ کا بڑا دخل تھا۔ [illegible] کا اصل رنگ شاید براؤن تھا مگر کثرتِ استعمال سے ایک [illegible] نہیں رہا تھا۔ یہ رنگ کہیں گہرا تھا کہیں ہلکا۔ تراش خراش کے [illegible] سے بھی سوٹ کم سے کم دس سال پرانا تھا۔ اس کی پتلون کے گھٹنے نکل آئے تھے۔ کوٹ کی آستینوں کے اور کالر کے دھاگے [illegible] رہے تھے۔ قمیص کی حالت بھی ابتر تھی اور گلے میں بندھی ہوئی [illegible] بالکل لٹکنے والے ازار بند کی طرح نظر آ رہی تھی۔ اس کا فیلٹ ہیٹ بھی غالباً کسی انگریز کا چھوڑا ہوا تھا جب وہ ہندوستان چھوڑ کر گئے تھے تو بہت سی ناکارہ چیزیں پھینک گئے تھے اور بہت سی برائیاں ورثے میں دے گئے تھے مثلاً نسلی تعصب، تنگ نظری، حاکمانہ ذہنیت اور اپنی شہرۂ آفاق 'لڑاؤ اور حکومت کرو' کی پالیسی — یہ [illegible] صاحب بھی اسی دور کی نشانی تھا۔ اور مجھے خیال آیا کہ جب وہ باہر نکلتا ہوگا تو اس حلیے میں مذاق اڑانے والے اسے پاسنگ شو کہتے ہوں گے۔ ایک بڑے پرانے مقبول سگریٹ پر بنی ہوئی تصویر کچھ ایسی ہی تھی کہ وہ سگریٹ کا برانڈ تو ختم ہو گیا مگر اس پر بنے ہوئے صاحب بہادر کی تصویر کا نام رہ گیا ایسے نمونے ہر جگہ پاسنگ شو کہلاتے تھے اور کہیں نہ کہیں نظر آ ہی جاتے تھے۔

وہ بالکل سیدھا چلتا تھا مگر اس کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی شان، تمکنت اور حاکمیت کی نشانی۔ اس نے چھڑی سے کار کو بجایا۔ "کون ہے تم؟ کیا کرتا اِدھر؟" اس نے متانت سے کہا۔ "تم کو [illegible] نہیں کہ تم ٹریس پاس کرتا؟"

"سوری سر!" میں نے شائستہ لہجے میں کہا۔ میں کسی طرح اس کی دل آزاری نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو۔ [illegible] ایسے یادگارِ زمانہ لوگ اپنے ماضی کا عکس ہوا کرتے ہیں۔ میں نے وزیر خان کے دوستوں کو ترکی ٹوپی، اچکن اور سلیم شاہی جوتی میں بھی بڑے کر و فر کے ساتھ پیدل آتے جاتے دیکھا تھا۔ وہ مشرقی وضعداری کا نمونہ بھی کارٹون سمجھے جاتے تھے۔

"سوری کا کیا مطلب ہوتا ہے؟" اس نے پھر گاڑی کو بجایا۔ "ابھی [illegible] نکل جاؤ۔ ورنہ ہم تم کو بہت سخت سزا دے گا۔ ہم تم پر کیس کر دے [illegible] ہم کو نہیں جانتا۔ ہم انگریز کا ٹائم میں بھی مجسٹریٹ تھا۔ ایڈیشنل سیشن جج ریٹائر ہوا۔"

"آپ... آپ اس کوٹھی کے مالک ہیں سر؟" میں نے پُرتعظیم [illegible] لہجے میں انگریزی میں سوال کیا۔

"یس... اور ہم کیا سمجھا تم کو ہنگ مین!" وہ بولا۔ "ہمارا پرائیویٹ پراپرٹی [illegible] آؤٹ۔"

"دراصل ہم آپ ہی سے ملنے آئے تھے سر!" میں نے مسرت سے ان کی طرف دیکھا اور پُرامید لہجے میں بولا۔ "یو سی۔ پہلے یہ میرا گھر تھا۔ میں یہاں پیدا ہوا تھا۔ میرے والد نے خریدا تھا۔"

"کیا؟... یہ تمہارے والد کا گھر تھا؟" اس نے گوراشاہی اردو چھوڑ کر رواں انگریزی میں کہا۔

"یس سر! آج بہت عرصے کے بعد اِدھر سے گزرا تو میں نے سوچا کہ دیکھوں اب یہاں کون رہتا ہے۔ اور اگر وہ اجازت دے... تو میں اندر بھی جاؤں۔" میں نے کہا۔ میں ذرا جذباتی ہو گیا تھا۔

"کیا نام تھا تمہارے والد کا؟" اس نے عینک کے اوپر سے مجھے گھور کر کہا۔

"وزیر خان۔" میں نے کہا۔ "آپ اس مکان میں کب سے ہیں سر؟"

"تیس سال ہو گئے مجھے۔" وہ ایک دم افسردہ ہو گیا۔ "میں نے یہ مکان اپنی بیوی کی پسند پر خریدا تھا۔ اسے بہت اچھا لگا تھا یہ اولڈ اسٹائل بنگلو۔ مگر وہ مر گئی۔ اب میں اکیلا یہاں نہیں رہ سکتا۔ اس لیے میں اسے بیچ رہا ہوں۔ بلکہ بیچ چکا ہوں۔ اور تم ٹھیک کہتے ہو۔ مکان کسی وزیر خان کا ہی تھا لیکن میں نے اس کے اٹارنی سے خریدا تھا۔ اندر آؤ۔ میں اتنا بد اخلاق نہیں ہوں۔ میں غلط سمجھا تھا۔"

"غلطی ہماری تھی کہ ہم نے اجازت نہیں لی تھی اندر آنے کی۔ اور اپنا تعارف بھی نہیں کرایا۔" میں نے کہا۔ "میرا نام کبیر خان ہے اور یہ میرا چھوٹا بھائی ہے امیر خان۔ یہ ہمارا دوست ہے خواجہ۔ ہم اسے خوجی کہتے ہیں۔"

"ویل۔ ہاؤ ڈو یو ڈو۔" اس نے باری باری سب سے مصافحہ کیا۔ ایک دم وہ برطانوی ادب آداب اور شائستگی کا مرقع بن گیا تھا۔ "میں کے بی پال ہوں، کرم چند پال۔ پلیز اندر آؤ۔ میں ایک اکیلا بوڑھا آدمی ہوں، تنہا ریٹائرڈ لائف گزارنے والا۔ جس کے سب دوست مر چکے ہیں یا جا چکے ہیں۔"

میں اور محسن اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے یوں اس گھر میں داخل ہوئے جیسے ہم نیند میں چل رہے ہوں۔ چند منٹ پہلے کے خواب کی تعبیر مل رہی تھی۔ میں اپنے گزرے ہوئے وقت سے ملنے جا رہا تھا۔ اسی گھر میں جہاں کوئی میرا دشمن نہیں تھا۔ اگر وہ بوڑھا چند منٹ بعد آتا یا میں نے بحث کیے بغیر محسن کی بات مان لی ہوتی تو ہماری ملاقات نہ ہوتی اور میں اپنے ماضی کے بند دروازے پر دستک دیے بغیر لوٹ جاتا تو شاید کبھی پلٹ کر نہ آتا۔ آخر یہ سب کیا تھا؟ وہ کون سی غیر مرئی قوت تھی جس نے مجھے پھر میرے گھر میں پہنچا دیا؟ گزشتہ رات ٹیڈی کے گھر میں زمین پر بیٹھ کر سگریٹ یا چائے پیتے ہوئے میرے ذہن میں اس کا خیال تک نہ تھا۔ مگر پھر تقدیر کے ہاتھوں نے ایک چال چلی۔ ہم اس گھر سے نکلے شمشاد کے گھر پہنچے اور اس کی گاڑی میں یہاں آ گئے۔ آخر یہ سب انتظام کس نے کیا؟ کیا یہ ممکن تھا کہ کل رات میں

یہاں آنے کے لیے کوئی منصوبہ بنانا ہے کامیابی کا کیا سوال، میں اس کے امکانات پر بھی غور نہ کرتا۔ خود میں اسے ناممکن سمجھتا جو صبح تک ممکن ہو گیا تھا۔

"کم ان۔ رک کیوں گئے؟" پال نے شفقت سے کہا۔ "مجھے معلوم ہے تم جذباتی ہو رہے ہو۔"

"یو آر رائٹ سر!" میں نے کہا۔ "مجھے وہ وقت نظر آ رہا ہے جو ابھی تک اس گھر کی دیواروں میں موجود ہے۔ یہ احساس کی بات ہے۔ باقی دنیا کے لیے وقت بہت آگے نکل گیا ہے۔"

"ہاں۔ کبھی کبھی وقت رک بھی جاتا ہے۔" وہ بولا۔ "مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مریم میرے ساتھ ہے اور بالکل اسی طرح جیسے تین سال پہلے تھی۔ ظاہر ہے یہ سب کچھ احساس میں زندہ رہتا ہے۔ خیر، اندر آؤ۔"

میں اور محسن ایک ساتھ اس کمرے میں داخل ہوئے جو کبھی ہمارا ڈرائنگ روم تھا اور دم بخود کھڑے رہے۔ گھر کی پرانی دیواریں اپنے پرانے احساسِ شناسائی کے ساتھ موجود تھیں مگر ان کا رنگ بدل گیا تھا۔ کمرے کا فرنیچر بھی مختلف تھا اور اس کی ترتیب و آرائش کا انداز بھی جدا تھا۔ کھڑکیوں اور دروازوں کے پردے بھی دوسرے تھے۔ چنانچہ ماحول اجنبی تھا اور ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جاتے ہوئے مجھے گزر جانے والے وقت کی ایک ایک بات یاد آئی۔ چشمِ تصور سے میں نے گھر کا پرانا نقشہ دیکھا۔ کون سی چیز کہاں تھی اور کیسی تھی میرے اپنے کمرے میں بیڈ کہاں تھا، کس جگہ پڑھنے کی میز تھی۔ کپڑوں کی الماری کس طرف تھی۔ اپنے والد کے کمرے میں پہنچ کر فرطِ جذبات سے میری آنکھیں نم ہو گئیں۔ میں نے آنکھیں بند کر کے انہیں ہر انداز میں دیکھا۔ نماز پڑھتے ہوئے، اخبار کا مطالعہ کرتے ہوئے۔ لان میں ٹہلتے ہوئے، کھانے کی میز پر۔

"یہ تمہارے والد کا کمرہ تھا؟" بوڑھے نے اپنا ہاتھ مضبوطی سے میرے کندھے پر رکھا۔

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ محسن نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ "ہم یہاں رونے نہیں آئے تھے۔" وہ بولا۔

میں نے آنکھوں کو رومال سے صاف کیا اور باہر نکل آیا۔ "آئی ایم سوری۔" میں نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

گھر میں سامان کی کمی نہیں تھی اور سامان زیادہ پرانا بھی نہیں تھا۔ لیکن اس کے باوجود گھر میں خانہ ویرانی کا راج تھا۔ ہر چیز لاوارث لگتی تھی، توجہ کی طالب تھی اور اپنی کس مپرسی پر نوحہ خواں تھی۔ مجھے فرش پر ہی نہیں فرنیچر پر بھی گرد کی تہ نظر آئی۔ میز کی شفاف سطح پر گرد تھی، چوکھٹ اور دہلیز پر گرد تھی۔ چھت سے آویزاں فانوس پر، پنکھوں پر گرد تھی اور ان کتابوں پر گرد تھی جو ہر جگہ ڈھیر تھیں زندگی کی دلچسپیوں سے، مصروفیات اور ہنگامہ آرائیوں سے الگ ہو کر اپنے کمرے میں بند ہو جانے والے اس ریٹائرڈ جج کی دنیا اب ... تھیں۔ مجھے بہت عجیب لگا کہ تین بیڈ روم کی اس کوٹھی میں ... کیسے رہتا ہے۔

"آپ کے ساتھ اب کوئی نہیں ہے یہاں؟" میں نے ... روم میں آنے کے بعد کہا۔

"میرے ساتھ؟" وہ سوچ کے بولا۔ "عمر گزشتہ کی یادیں ... نصف صدی میں یادوں کا اتنا ذخیرہ جمع ہو جاتا ہے کہ آدمی اکیلا ... چاہے تب بھی نہیں رہ سکتا۔"

"میرا مطلب تھا آپ کے بچے....."

"بچے تھے۔ ایک دو نہیں چھ۔" وہ دیوار پر نظر جما کے بولا۔ "تین اللہ کو پیارے ہو گئے۔ تین دنیا کو۔ دو لڑکیاں ہمارے ساتھ ... آئی تھیں، ان کی شادیاں ہو گئیں۔ وہ ہر اتوار کو اپنے شوہر بچوں کے ساتھ ... آتی ہیں۔ بڑی لڑکی کا ایک بچہ ہے بہت شریر۔ چھوٹی ... لڑکی کھانا بہت اچھا پکاتی ہے۔ وہ لنچ تک ٹھہرتے ہیں اور ... گھنٹوں کے لیے میں زندہ ہو جاتا ہوں۔ ہفتے کے باقی دن ... پڑھتے اور اتوار کا انتظار کرتے گزار دیتا ہوں جب چرچ ... لوگ پھر آئیں گے۔"

"اور..... آپ کا لڑکا؟" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ... اور تنہا زندگی گزارنے والے نیک دل بوڑھے کی باتوں نے ہمیں بھی افسردہ کر دیا تھا۔ محسن اور ٹیڈی بالکل چپ بیٹھے تھے اور شاید میری طرح ان پر بھی اس گھر کی فضا کا اثر تھا۔

"مجھے یہ تو نہیں کہنا چاہیے کہ وہ مر گیا۔" وہ بولا۔ "لیکن ... اپنی زبان میں یہی کہتے ہیں۔ میں اس کو نیک آدمی بنانا چاہتا تھا۔ ... وہ تھا بھی بہت نیک۔ میں نے اسے مشن چرچ کے سپرد کر دیا۔ ... تین سال رہا لیکن نہ جانے کیوں وہ صراطِ مستقیم سے بھٹک گیا۔ ... کہ اسے شیطان نے بہکا دیا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ شیطان کو الزام ... زیادتی ہے۔ اسے اتنی فرصت کہاں کہ ہر شخص کو بھٹکاتا پھرے ... تو آدمی کے اندر ہوتا ہے۔ اگر آدمی کمزور ہو تو وہ غالب آ جاتا ہے ... اور پھر آج کل نیک بننا بہت مشکل ہے۔ کیا تم کو یہ ایک خبطی اور ... بوڑھے کا نقطۂ نظر لگتا ہے؟"

"جی نہیں۔ میں آپ سے سو فیصد متفق ہوں۔" میں نے کہا۔ ... ایسے ہیں کہ نیکی کے راستے پر چلنا ہر آدمی کے بس کی بات نہیں ... بڑی آزمائش بن گیا ہے کہ شاید صوفیاء اور اولیاء ہی اس سے ... سکتے ہیں۔"

"خدا تم پر اپنا کرم کرے۔ تم سمجھدار آدمی ہو۔" وہ خوش ہو کر بولا۔ "غلطی میری تھی کہ میں نے اسے اتنی بڑی آزمائش میں ڈالا۔ وہ ... انسان ہی تو تھا۔ کوئی سینٹ نہیں تھا۔ اسے دنیا نے کھینچ لیا اور وہ نفسانی خواہشات کی ترغیب کا شکار ہو گیا جس سے کوئی محفوظ نہیں۔ اس نے کہا میں بہت سا پیسہ کمانا چاہتا ہوں تاکہ مجھے عزت اور طاقت حاصل ہو۔ میں نے کہا بے وقوف! کیا عزت اور طاقت کا سرچشمہ دولت ہے؟ خداوند یسوع مسیح کی قربانی کو دیکھ۔ یہ بتا ایسٹو کے پاس کتنی دولت تھی؟ مگر وہ ہنسنے لگا کہ یہ بیسویں صدی ہے بابا اور اس میں سچائی کی اور علم کی طاقت سے کچھ نہیں ملتا۔ عزت تک نہیں ملتی۔ وہ ٹھیک کہتا تھا۔ میں نے وقت کا خیال کیے بغیر مثال دی تھی۔ خیر وہ باہر چلا گیا۔ اور اب بہت سی دولت اکٹھی کرنے میں مصروف ہے۔ وہ ہر مہینے مجھے باقاعدگی سے ایک کاغذ کا پرزہ بھیجتا رہتا ہے۔ جو میں اس کے بینک اکاؤنٹ میں جمع کرا دیتا ہوں۔ میرے گزارے کے لیے میری پنشن ہی کافی ہے۔"

"پنشن تو پرانی شرح پر بہت کم ہو گی۔" میں نے کہا۔ "آپ کو کیسے کافی ہوتی ہے؟"

"یہ تو ضروریات پر منحصر ہے کہ وہ زیادہ ہیں یا کم۔ پیسہ کبھی خواہشات کا ساتھ نہیں دے سکتا۔" وہ بولا۔

"پھر بھی مہنگائی تو بڑھتی جا رہی ہے۔" میں نے کہا۔

"صرف مہنگائی؟ بہت کچھ بڑھتا جا رہا ہے مائی سن!" وہ تاسف سے سر ہلا کے بولا۔ "زمین پر فتنہ و فساد۔ انسان کی فطرت میں لالچ اور کمینگی۔ مذہب اور اخلاق سے دوری۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ میری عمر کا ہر آدمی اسی طرح سوچنے لگتا ہے اور دنیا کہتی ہے کہ سٹھیا گیا ہے۔ تم بتاؤ کیا تم نے شادی کر لی ہے؟"

"نو سر! ابھی دنیا کے جھمیلوں سے فرصت نہیں ملی۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"تم غلطی کر رہے ہو نوجوان! دنیا کے جھمیلوں میں جتنا الجھو گے الجھتے جاؤ گے۔ تم فرصت کو تلاش کرتے رہ جاؤ گے۔ فرصت اگر دنیا کے جھمیلوں کے لیے ہے تو شادی کے لیے کیوں نہیں ہے؟ مگر ایسا لگتا ہے کہ تم شادی کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ تمہارا یہ بھائی بھی ایسے ہی سوچتا ہے؟" وہ بولا۔

"ہم دونوں ایک جیسے بے وقوف ہیں۔ دونوں ہی غلط وقت پر غلط کام کرتے ہیں چنانچہ نقصان اٹھاتے ہیں لیکن پھر وہی کرتے ہیں جو ہمیں نہیں کرنا چاہیے اور وہ کرتے ہیں جو نہیں کرنا چاہتے۔" میں نے بات کو گول مول کیا۔ "شادی کی اہمیت ہم دونوں کے لیے دنیا کے سارے جھمیلوں سے زیادہ ہے لیکن کبھی ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ آدمی کمبل کو چھوڑنا چاہتا ہے مگر کمبل آدمی کو نہیں چھوڑتا۔"

"پھر تو تمہارے والد بھی اکیلے رہتے ہوں گے؟" وہ بولا۔ "جب تم دونوں ان کے ساتھ نہیں ہوتے۔"

"ہاں۔ اکیلے ہی ہیں۔ اپنی قبر میں۔" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ "آپ یہ کوٹھی بیچ کر کہاں جائیں گے؟"

"دیکھو نا! بالآخر تو مجھے بھی وہیں جانا ہے جہاں تمہارا باپ گیا۔ پھر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ میری روانگی کہاں سے ہوتی ہے۔ ویسے میری چھوٹی لڑکی کہتی ہے کہ میرے ساتھ رہو اور اس کا شوہر بھی بضد ہے۔ میرا خیال ہے میں انہی کے پاس چلا جاؤں گا۔ جو رقم اس کوٹھی کو بیچ کر ملے گی، وہ میں دونوں میں بانٹ دوں گا۔ جب سسر بوڑھا اور مرنے والا ہو اور اس کے پاس دولت بھی ہو تو داماد اسے بہت عزیز رکھتے ہیں۔" وہ بڑے مضحکہ خیز طریقے پر ہنسا۔

"کتنے میں سودا کیا ہے آپ نے اس کوٹھی کا؟" میں نے کہا۔

"ساڑھے پانچ لاکھ میں۔" وہ بولا۔ "میں سامان بھی نہیں لے جانا چاہتا تھا۔ مگر بعد میں یہ طے ہوا کہ جو سامان میرے داماد پسند کریں گے وہ ان کا ہو گا۔ بہت کم چیزیں ہیں ان کی پسند کی۔"

"اور خریدار کون ہے؟ معاف کیجیے گا یہ آپ کے ذاتی معاملات ہیں لیکن یہ میرا بھی گھر تھا اور میرا اس سے بہت گہرا جذباتی تعلق ہے۔" میں نے کہا۔ "کیا یہ ممکن ہے کہ میں پھر کبھی آنا چاہوں تو مجھے آپ کی طرح خوش آمدید کہا جائے؟"

"میرا خیال ہے وہ اچھا آدمی ہے۔ ایک ایڈووکیٹ ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "وہ کسی کا اٹارنی ہے اور اس نے مجھے بتایا کہ ناگزیر وجوہ کی بنا پر اصل خریدار سامنے نہیں آ سکتا اور اس کا فوری طور پر اس کوٹھی میں رہائش اختیار کرنے کا خیال بھی نہیں ہے چنانچہ اس کی طرف سے مجھے اجازت ہے کہ جب تک چاہوں یہاں رہائش جاری رکھوں۔"

"ایسا کون بے وقوف ہے؟" میرے منہ سے نکل گیا۔ "میرا مطلب ہے اس کو اتنی جلدی کیا تھی..... یہ مکان خریدنے کی جب اسے رہنا نہیں ہے۔"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" وہ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد بولا۔ "میں نے پوچھا نہیں۔ ہر شخص اپنی ضرورت اور مصلحت کو بہتر سمجھتا ہے۔ ضروری تو نہیں وہ بے وقوف ہو۔ یہ ہو سکتا ہے کہ مکان اس کو اتنا پسند آ گیا ہو کہ وہ مجبور ہو گیا ہو۔ جیسے میں مجبور ہو گیا تھا۔ اس کے خریدار تو بہت تھے چنانچہ دیر کی صورت میں مکان کوئی اور خرید لیتا۔ کچھ لوگ بازار سے جو چیز خریدتے ہیں وہ اپنی قوتِ خرید کے مطابق لیتے ہیں۔ کچھ ذاتی

پسند کی قیمت ادا کرتے ہیں شوق کی بات کہ لو یا حسن نظر کی۔ ایک مکان بھی اتنا ہی خوبصورت ہو سکتا ہے کسی کے لیے۔ مثلاً جتنا تمہارے لیے یہ مکان ۔۔۔ کہ اگر تم کو اسے دگنی یا تین گنا قیمت پر بھی حاصل کرنا پڑے تو تم سمجھو گے پیسہ ضائع نہیں ہوا ۔۔۔ لاکھوں کی پینٹنگ آخر کیوں خریدتے ہیں لوگ! مصوری کا تعلق فنون لطیفہ سے ہے اور اس کی ایک جمالیاتی قیمت ہوتی ہے۔"

"مجھے معلوم ہے ۔۔۔ اصل بات جذبات کی ہے۔" میں بولا۔ "ایک عمارت بھی جذبات کو اسی طرح اپیل کر سکتی ہے جیسے ایک خوبصورت تصویر یا مجسمہ یا کمپوزیشن کرتے ہیں ۔۔۔ آپ کو معلوم تو ہوگا کہ اتنا بڑا قدردان کون پیدا ہو گیا اس پرانی کوٹھی کا؟" میں نے کہا۔ "کس کا اٹارنی ہے وہ؟"

"دراصل میں نے بھی یہ معاملات ایک وکیل کے سپرد کر دیے ہیں۔" وہ بولا۔ "میرا اٹارنی اور اس کا اٹارنی تمام قانونی کارروائی مکمل کریں گے وہی تم کو تمام تفصیلات فراہم کر سکتا ہے مگر تم کیا کرو گے جان کر؟"

"کچھ نہیں ۔ بس ایسے ہی ایک فضول سی خواہش تھی کہ شاید میں اس مکان کو پھر خرید سکوں ۔ اور جیسا کہ آپ نے کہا۔ اگر دگنی قیمت پر بھی ملے تو کسی نئے یا بڑے مکان کی نسبت مجھے یہی مکان عزیز ہوگا۔" میں نے کہا۔

"آئی سی ۔ آئی سی۔" وہ مسکرایا۔ "دگنی قیمت پر تو اب بھی بیچ دے گا وہ تم کو ۔۔۔ اس کے لیے یہ گھاٹے کا سودا نہیں۔ تمہارے لیے اس کی جذباتی قیمت ہے ۔ اس کے لیے نہیں۔ اگر تم قیمت ادا کرنے کی استطاعت رکھتے ہو تو خریدار کے اٹارنی سے بات کر لو ۔۔۔ ایڈووکیٹ اے ڈبلیو منظر سے۔"

"کس سے؟" میں نے یوں کہا جیسے دھوکا میرے کانوں کو ہوا ہے مگر بالکل خاموش بیٹھے ہوئے محسن اور استاد ٹیڈی بھی بری طرح چونکے تھے۔ میں نے ایک نظر محسن کو دیکھا جو میری طرف سوالیہ نظریں اٹھائے بیٹھا تھا۔

"اے ڈبلیو منظر۔" بوڑھا ہمارے چونکنے پر بہت حیران تھا۔ "مشکل سا نام ہے اس کا عبدالودود منظر ۔۔۔"

"یہ مکان عبدالودود منظر خرید رہا ہے؟" میں نے احمقوں کی طرح کہا۔

"کس کے لیے؟" محسن نے بھی جادو کے اثر سے مفلوج ہو جانے والے شخص کی طرح کہا۔ "اتنا تو معلوم ہوگا آپ کو کہ وہ عورت ہے یا مرد؟"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے! عورت بھی خریدتی ہے پراپرٹی۔" وہ بولا۔ "تم لوگ اس قدر حیران کیوں ہو آخر؟"

میرا خیال ہے کہ ہم میں سے کسی نے اس کی بات نہیں کی اور اسی طرح دم بخود بیٹھے رہے ۔۔۔ ہم سب کے لیے یہ انتہائی غیر متوقع خبر تھی جس کے ردعمل نے ہمیں رابعہ کے علاوہ کسی اور کے متعلق سوچنے کے قابل ہی نہیں چھوڑا تھا۔ اس میں شک کی کوئی بات ہی نہیں تھی کہ وہ منظر کے ذریعے اس کوٹھی کو خرید رہی تھی منظر نے بھی مجھے بتا دیا تھا کہ وہ اپنی اس کوٹھی کو بیچنا چاہتی ہے جو اس نے نقلی نواب خسرو جمشید سے خریدی تھی۔ اسی کی قیمت سے رابعہ نے یہ گھر خریدنے کا فیصلہ کیا ہوگا۔ اور اس فیصلے کے پس منظر میں کیا جذباتی عوامل کارفرما تھے، یہ میں بھی اتنی ہی اچھی طرح سمجھتا تھا جتنی اچھی طرح محسن۔ وہ اس مکان کو میرے لیے خرید رہی تھی ۔ بالکل سب سے زیادہ جذباتی عورت ۔ اپنا گھر میری خاطر تباہ کر لیا اور مجھے میرا گھر لوٹانا چاہتی ہے ۔۔۔ ایک قرض تو رابعہ کے اس گھر کا تھا جو میری وجہ سے اور صرف میری وجہ سے جل کے راکھ ہوا اور ملبے کا ڈھیر بن گیا ۔۔۔ اسے بھی تو وہ گھر عزیز ہوگا جہاں اس کا بچپن گزرا تھا۔ جہاں بچپن سے جوانی تک اس کی تمام زندگی گزری تھی ۔ جہاں سے پہلے باپ کا اور پھر اس کی ماں کا جنازہ بھی اٹھا تھا۔ کیا اس کو اپنی عمر گزشتہ کی وہ کتاب عزیز نہ تھی؟ جس کے ہر ورق پر یاد کا کوئی نقش تھا؟ اسے کوئی آرزو نہ تھی کہ اپنے نشیمن کی خاک پر نیا آشیاں بنائے؟ یکلخت وہ اپنی محبت کی تمام خوبصورتی کے ساتھ میرے تصور میں جلوہ گر ہوئی۔ "یہ تم کیا سوچ رہے ہو سکندر؟ جب میں نے خود کو تمہارے سپرد کر دیا تو میرا کیا رہا ۔ میری جذباتی وابستگی تو اب اس گھر سے ہوگی جو میرا اور تمہارا گھر ہوگا اور جہاں خوشیوں کے سارے خزانے ہمارے ہوں گے۔ میں نے جب زندگی کے راستوں پر تمہاری رفاقت قبول کی تھی تو اپنے ماضی کے سارے رشتے توڑ لیے تھے ۔ میرا سرمایۂ حیات میرا مستقبل ہے جو تمہارے ساتھ وابستہ ہے۔ اس وقت میں یہی کر سکتی تھی کہ تم کو ایک چھوٹی سی خوشی کا نذرانہ دے دوں۔ میرے اختیار میں ابھی یہی تھا۔ جب وقت ہمارے ساتھ ہوگا تو میں اپنی ہر خوشی تمہاری نذر کر دوں گی اور وہ وقت ضرور آئے گا۔ اعتماد کی یہ دولت تم نے مجھے بخشی ہے محبت کے اس انمول خزانے کے بدلے جو تم نے بن مانگے میری جھولی میں ڈال دیا ۔ میرا یہ حقیر نذرانہ کیا ہے۔ پھر تم خفا کیوں ہو؟ کیا مجھے تمہارے لیے اتنا کرنے کا بھی اختیار نہیں؟"

پھر وہ یکلخت غائب ہو گئی اور میں نے خود کو محسن کے روبرو پایا۔ جس کی نظر میں میرے لیے ملامت تھی۔ میرے اس سلوک پر جو میں نے رابعہ کے ساتھ روا رکھا تھا۔ میں نے اس کے دل کو اپنے طنز کے تیروں سے چھلنی کر دیا تھا۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ آج وہ اپنے نفع نقصان کے متعلق سوچنے لگی ہے ۔ میں نے اسے کہا تھا کہ آج اسے اپنے گھر کے تباہ ہونے کا دکھ ہے اور میں نے اس سے کہا تھا کہ آج اس کے رویے ہیں میرے لیے بے رخی اور بے التفاتی ہے اور یہ سب میں نے ایسے وقت میں کہا تھا جب وہ میرے لیے خوشیوں کا ایک بہت بڑا سودا کر رہی تھی ۔ چنانچہ وہ روتی رہی تھی ۔۔۔ لیکن اس نے پھر بھی محسن کو یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ کیا کر رہی ہے ۔ آہستہ آہستہ بہت سی باتیں میری سمجھ میں آنے لگیں۔ منظر نے مجھ سے کہا تھا کہ رابعہ فی الحال میرے پاس رہے گی۔ کیونکہ اسے کچھ ضروری کام نمٹانے ہیں ۔ اس نے رابعہ کی لیگل فرم کا انتظام سنبھالنے کا ذکر کیا تھا اور یہ کہا تھا کہ رابعہ کو وہ کوٹھی بیچنی ہے جو خالی پڑی ہے ۔ اس نے یہ بھی دلیل دی تھی کہ رابعہ کو سکون اور آرام کی ضرورت ہے ۔ کیونکہ وہ عورت ذات ہے اور ہماری پرخطر، مہم جو اور ہنگامہ خیز زندگی میں وہ ہر قدم پر ہمارے ساتھ نہیں چل سکتی ۔ اس کا نروس بریک ڈاؤن ہونے والا ہے اور مجھے چاہیے کہ میں خود غرضی سے کام نہ لوں ۔ اسے کچھ دن کے لیے بخش دوں منظر نے سب بکواس کی تھی ۔ وہ جانتا تھا کہ رابعہ کیا کرنا چاہتی ہے اور رابعہ نے اسے منع کر دیا تھا کہ مجھے کچھ معلوم نہیں ہونا چاہیے ۔۔۔ ورنہ میں اس کے ارادوں کی راہ میں حائل ہو جاؤں گا اور اسے وہ سب نہیں کرنے دوں گا جو وہ کرنا چاہتی ہے ۔۔۔ آرام کا محض بہانہ تھا ۔ اگر میں ساتھ رہتا تو وہ یہ سودا کیسے کرتی ۔۔۔ یہی وہ ضروری کام تھے جو اسے مجھ سے چھپ کر کرنے تھے۔

"تم سب کو کیا ہو گیا ہے! میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔" بوڑھے کی آواز مجھے پھر حقائق کی دنیا میں کھینچ لائی۔ "تم نے ہی اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ تم دگنی قیمت بھی دے سکتے ہو اس مکان کی۔"

"یس سر ۔۔۔ میں نے یہ کہا تھا۔" میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں اس کی آدھی قیمت بھی نہیں ادا کر سکتا ۔ یہ محض ایک خواہش تھی اور خواہشات کا کیا ہے، وہ بے لگام اور منہ زور گھوڑوں کی طرح ہوتی ہیں ۔ کیا آپ نے اس مکان کا اشتہار دیا تھا؟"

"نہیں ۔۔۔ اشتہار دیا تو نہیں تھا۔" وہ بولا۔ "دینے کا ارادہ تھا۔ کچھ بروکر تھے جو کبھی کبھی کوئی پارٹی لے آتے تھے جب وہ وکیل ۔۔۔ کیا نام ہے اس کا؟"

"عبدالودود منظر۔" میں نے کہا۔ یہ بالکل غیر ارادی حرکت تھی کہ میری زبان پر منظر کا نام آ گیا تھا۔

"یس ۔۔۔ کیا تم جانتے ہو اسے؟" بوڑھے نے کہا۔ "جب وہ میرے پاس آیا تو میں نے سمجھا اسے بھی کسی بروکر نے ہی بھیجا ہوگا ۔ اس نے پوچھا۔ آپ یہ مکان بیچنا پسند کریں گے؟ میں نے کہا۔ کوئی خریدار ملے گا تو ضرور بیچ دوں گا ۔ ابھی تک تو جو آتے ہیں وہ دیکھ کر گئے تو لوٹ کر نہیں آئے کیونکہ پرانی طرز کی کوٹھی ہے جن کے پاس پیسہ ہو وہ گلبرگ کی طرف جانا پسند کرتے ہیں۔ اس وکیل نے کہا کہ میں اپنے مؤکل کی طرف سے مکان خریدنا چاہتا ہوں تو مجھے کیا قیمت ادا کرنی ہوگی؟ اور میں نے اسے قیمت بتائی تو اس نے اوکے کر دی ۔ اس سے پہلے جو لوگ آتے تھے انھوں نے بارگین کرنے کی کوشش کی تھی اور بروکر نے مجھ سے کہا تھا کہ میں بارگین کا مارجن رکھوں کیونکہ خریدار منہ مانگی قیمت دینی پسند نہیں کرتے ۔۔۔ وہ کم ضرور کراتے ہیں ۔ میں نے اس وکیل کو قیمت زیادہ بتائی تھی ۔ تقریباً پچاس ہزار روپے کم کر سکتا تھا میں ۔ لیکن اس نے بالکل اصرار نہیں کیا تو میں کیوں بولتا ۔ ظاہر ہے وہ اپنی خوشی سے دے رہا تھا۔ کسی دباؤ کے تحت زیادہ قیمت نہیں دے رہا تھا۔"

"آپ اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ کسی دباؤ کے تحت یہ سودا نہیں کر رہا تھا؟" میں نے کہا۔ "آپ نے خود ہی ابھی کہا تھا کہ دباؤ جذباتی بھی ہو سکتا ہے ۔ کسی من پسند چیز کو ہر قیمت پر حاصل کرنے کا جنون ۔۔۔"

"ہاں مگر اس نے ظاہر نہیں ہونے دیا پھر مجھے کیسے معلوم ہو سکتا تھا؟" وہ بولا۔

"غالباً آپ تو کہیں جا رہے تھے، ہماری وجہ سے رک گئے۔" میں نے کہا۔

"اوہ نو ۔۔۔ میں کہیں بھی نہیں جاتا ۔ میں ایک بوڑھا فالتو آدمی ہوں ۔ دنیا بہت مصروف ہے۔" وہ بولا۔ "آج تم لوگ آ گئے تو کچھ باتیں کر لیں ۔ افسوس یہ ہے کہ میں تم کو کچھ پیش نہیں کر سکتا ۔ چائے کافی سب ہے ۔ لیکن ۔۔۔ ایک نوجوان ہے یہاں ۔ وہ صبح کام پر چلا جاتا ہے اور پھر شام کو آتا ہے ۔ یہاں سرونٹ کوارٹر میں اسے جگہ دے رکھی ہے، وہ میرے لیے ناشتا بنا لیتا ہے اور دوپہر کا کھانا پکا کر رکھ جاتا ہے ۔ رات کو میں کچھ نہیں کھاتا ۔ میں اس کو نوکر نہیں سمجھتا۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔ "بس ہم آپ سے مل

لیے اور آپ نے ہمیں اندر آنے کی اجازت دے دی یہی خلاق چاہئے اور کافی سے بہتر ہے۔ ہم تھوڑی دیر میں چلے جائیں گے۔ کیا آپ کو یاد ہے کہ وزیر خان کا اٹارنی کون تھا؟"

"ہاں۔ زیادہ پرانی بات نہیں ہے یہ، کسی نے اس کو قتل کر دیا۔" وہ بولا۔ "میں نے اخبار میں پڑھا تھا۔ اس کا نام تھا میر شرافت علی۔ وزیر خان تمہارے والد تھے تو انھوں نے مکان کیوں بیچا تھا؟"

"یہ حالات ہی ہوتے ہیں جو آدمی کو اپنا گھر۔ اپنا شہر۔ یہاں تک کہ اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور کر دیتے ہیں سر!" میں نے کہا۔ "میں یہاں ہوتا تو وہ اٹارنی بھی کیوں مقرر کرتے۔ میں خود بیچ سکتا تھا مکان کو۔ اور شاید بیچا بھی سکتا تھا۔ لیکن میں ہزاروں میل دور لندن میں تھا۔" میں نے کہا۔

"کس لیے گئے تھے تم لندن؟" وہ بولا۔

"اپنی جان بچا کے بھاگا تھا۔" میں نے کہا۔ "یہاں میری زندگی کے بہت دشمن پیدا ہو گئے تھے۔"

"اور تمھارے والد؟ ان کے ساتھ کون تھا؟"

"کوئی نہیں تھا۔ صرف خدا تھا۔" میں نے کہا۔

"تم کو شرم آنی چاہیے۔ جوان آدمی تھے۔ بوڑھے باپ کو چھوڑ کے چلے گئے تھے۔" وہ بولا۔ "زندگی بہت عزیز تھی تم کو۔ اور اگر تھی تو ان کو ساتھ لے جانے میں کیا حرج تھا؟"

میں نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔ "مجھے اتنا وقت ہی نہیں ملا۔ انھوں نے ضد کر کے مجھے فوراً روانہ کر دیا تھا اور میری نہیں مانی۔ میری عدم موجودگی میں دشمنوں نے ان سے بدلہ لیا۔"

"تمھارا مطلب ہے ان کو قتل کر دیا؟" وہ چونک کر بولا۔

"یس سر! انھوں نے میرے فرار کا ذمے دار انھیں قرار دیا۔" میں نے کہا۔ "پھر وہ مجھے قتل کرنے لندن پہنچ گئے تو میں یہاں بھاگ آیا۔"

"تم کو مکان کی فروخت سے حاصل ہونے والا روپیہ ملا؟" وہ متفکر ہو کے بولا۔

"ابھی تو بہت کچھ نہیں ملا سر! میرے دشمن بھی نہیں ملے مجھے۔" میں نے کہا۔ "میں چاہتا ہوں آپ میرے یہاں آنے کا ذکر کسی سے نہ کریں۔ یہ نہ ہو خبر میرے دشمنوں تک پہنچ جائے اور وہ آپ کو پریشان کریں۔ آپ کی جان کے خواہ مخواہ دشمن ہو جائیں۔"

وہ ہنسا۔ "مجھ سے دشمنی کر کے کسی کو کیا ملے گا۔ پھر بھی تم کہتے ہو تو میں کسی سے بات نہیں کروں گا مگر تم یہاں ان سے چھپ کر کہاں رہو گے؟ اور تم آئے کیوں ہو آخر؟" وہ بولا۔

"بس اپنے معاملات ختم کر کے میں واپس چلا جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ اس بوڑھے کو اصل حالات بتانا کچھ مناسب نہ تھا لیکن اس کو خاموش رکھنا ضروری تھا چنانچہ میں نے ایک قابلِ قبول جھوٹ پر مبنی حالات کی کہانی سُنائی اور اسے مطمئن کر دیا۔

"تمھارا چھوٹا بھائی بہت کم گو ہے۔" اس نے کہا۔

"جی بچپن سے ہی یہ کچھ فاترالعقل ہے۔" میں نے کہا۔ "جب بولتا تھا، بونگی مارتا تھا اور میرے والد کی یا کسی اور کی بے عزتی ہو جاتی تھی۔ اس کو جوتے پڑتے تھے بعد میں۔ اس کو کمپلیکس ہو گیا اور اس نے بات کرنی ہی چھوڑ دی لوگوں سے۔ اس کو پیر مولا بخش لے جانے کا خیال ہے۔ یا پاگل خانے۔"

"واٹ نان سینس۔ تم لندن میں رہے اور باتیں ایسی کرتے ہو۔ پاگل خانے میں نہیں اسے نفسیاتی علاج کے لیے کسی کلینک میں داخل کرا دو۔" وہ بولا۔

"یہی کرنا پڑے گا۔" میں نے غصے سے محسن کو گھورا جو میری بات پر اندر ہی اندر کھول رہا تھا مگر صورت سے بیچ بچ میں نظر آنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ "چلو امیر خان۔ تم جاؤ خوجی کے ساتھ۔ ان کی گاڑی واپس کرو۔ یہ تم کو ہوٹل میں چھوڑ دیں گے۔"

"میں ہوسٹل میں نہیں رہوں گا۔" محسن بولا۔ "لڑکے مجھے تنگ کرتے ہیں۔"

"ہوسٹل میں نہیں احمق! ہوٹل میں۔ اور بینٹ ہوٹل میں۔" میں نے کہا۔ "تم چلو میں آتا ہوں۔"

"دیر نہ کرنا ورنہ میں بھوک سے مر جاؤں گا۔" محسن اٹھتے ہوئے بولا۔ وہ میرا مطلب سمجھ گیا تھا۔

"تم انتظار مت کرنا، کھانا کھا لینا۔" میں نے کہا۔

"مرغی کھاؤں یا مرغا؟" محسن نے معصومیت سے کہا۔

"جو تمھارا دل چاہے کھا لینا مگر اب میرا سر مت کھاؤ۔ جاؤ۔" میں نے درشتی سے کہا اور محسن سہم کر نکل گیا۔ ٹیڈی یہ طے نہ کر سکا کہ وہ کیا کرے۔ ہماری بے سروپا باتوں پر ہنسنے سے پہلے اس نے ہماری صورتوں کی سنجیدگی کو دیکھا تو اسے بھی خاموش رہنا پڑا۔ وہ دونوں خاموشی سے چلے گئے۔

"تم کو اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرنا چاہیے۔" بوڑھے نے ان کے جانے کے بعد کہا۔ "وہ معذور ہے۔"

"بعض اوقات میں برداشت نہیں کر پاتا۔" میں نے شرمندہ ہو کے کہا۔

"جب تمھارے والد کا انتقال ہوا تو یہ کہاں تھا؟" بڈھے نے اچانک کہا۔

"اسے ہم نے پہلے ہی کراچی بھیج دیا تھا۔" میں نے کہا۔ "ایک

دار کے پاس۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔ اب بھی میں بہت سی باتیں اس کے سامنے نہیں کرتا کہ کہیں دوسروں سے نہ کہتا پھرے، میں نے اسی لیے اسے روانہ کر دیا ہے کہ مجھے آپ سے ایک ایسی ہی بات کرنی تھی۔ یہ بتائیے جب آپ نے یہ کوٹھی خریدی تھی تو کبھی ایسا ہوا کہ آپ نے کسی ٹرک کو اندر آتے جاتے دیکھا ہو؟"

وہ چونکا۔ "کبھی کا کیا مطلب۔ ایک ٹرک ہر روز اندر کھڑا ہوتا تھا۔ اب بھی ہوتا ہے۔"

"اب بھی ہوتا ہے؟" میں نے چونک کر کہا۔ "کہاں؟ میرا مطلب ہے گیراج میں تو ٹرک کی گنجائش نہیں ہے۔"

"گیراج میں نہیں۔ ٹرک باہر کھڑا ہوتا ہے۔" اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "دراصل وہی نوجوان جو میرے ساتھ رہتا ہے اور میرا کام کاج کر دیتا ہے ٹرک ڈرائیور ہے۔"

"اچھا، تو پھر ٹرک یہاں کیوں کھڑا کرتا ہے؟ کمپنی کے پاس جگہ نہیں ہے کیا؟"

"معلوم نہیں مگر عموماً ایسا ہی ہوتا ہے۔" وہ بولا۔ "کمپنی کو اس پر اعتراض نہیں ہوتا کہ ڈرائیور ٹرک کو اپنے پاس رکھے اس سے ڈرائیور کو آنے جانے کی سہولت رہتی ہے۔"

"آپ نے کہا تھا کہ ڈرائیور صبح شام آپ کے لیے کھانا پکا جاتا ہے۔" میں نے کہا۔ "کیا وہ صرف دن میں ٹرک چلاتا ہے؟"

"عموماً ٹرک رات کو بھی چلتے ہیں انھیں مال ایک شہر سے دوسرے شہر لے جانا ہوتا ہے۔ کراچی تک کا پھیرا ہو تو وہ ہفتہ ہفتہ لوٹ کر نہیں آتے۔"

"ہاں لیکن سب ٹرک شہر سے باہر نہیں جاتے۔ کچھ اندر ہی اندر لوڈنگ میں استعمال ہوتے ہیں۔" وہ بولا۔ اور جس سوال کا جواب میں تلاش کر رہا تھا وہ مجھے مل گیا۔ دلاور اینڈ کمپنی کا یہ ٹرک مال کو فیکٹری سے قصرِ جمشید کے گودام تک اور یہاں سے گامے شاہ تک لے جانے کے لیے مخصوص تھا۔ وہ دوسرا ٹرک تھا جس میں طافو اور رحمت کباڑی روانہ ہوئے تھے اور کراچی کے کسی سیٹھ کریم بھائی کو سامان پہنچانے نکلے تھے۔

"کیا وہ کوئی پرانا ٹرک ہے اور کیا اس کا نمبر ایل ای ڈی ایٹی ون...؟"

"ہاں۔ بالکل یہی نمبر ہے۔ تم جانتے ہو اس ٹرک ڈرائیور کو؟" وہ خوش ہو کے بولا۔

"جانتا ہوں۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "لیکن یہ کوئی اچھی بات نہیں میرے لیے بہت خطرناک بات ہے کیونکہ وہ میرے دشمنوں میں شامل ہے۔ اگر وہ مجھے دیکھ لے تو اسی وقت قتل کر دے۔"

بوڑھے نے غیرارادی طور پر انگلی سے سینے پر صلیب بنائی۔ "ہولی گاڈ۔ وہ ایسا آدمی لگتا تو نہیں۔"

"کوئی قاتل صورت سے پہچانا جائے تو پولیس اُسے واردات سے قبل ہی گرفتار کر لے۔" میں نے کہا۔ "وہ آپ کے لیے واقعی بے ضرر ہے مگر میرے اس کے درمیان جانی دشمنی ہے۔"

"کیوں؟ تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ اس دشمنی کا سبب کیا تھا؟" وہ بولا۔ "جس کی وجہ سے تم کو فرار ہونا پڑا اور تمھارے والد پھر بھی قتل کر دیے گئے۔"

"سر... ہم پٹھانوں کے خاندانی تنازعے ایسے ہی چلتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "نسل بعد نسل۔"

"اوہ۔" اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "میں سمجھ گیا۔ میں ایڈیشنل سیشن جج تھا اور ضلع ہزارہ میں بھی رہا ہوں، وہاں یہ چیز عام تھی۔ لیکن تم نئے زمانے کے پڑھے لکھے آدمی ہو۔ تم بھی اس خون ریزی کی روایت کو نبھانا چاہتے ہو؟ تم معاف نہیں کر سکتے؟ انتقام کی خواہش سے دستبردار ہو کے انصاف کو خدا پر نہیں چھوڑ سکتے؟"

"یہ سب باتیں ہمیں خدا نے اپنی کتاب میں وضاحت سے سمجھا دی ہیں۔ حسنِ سلوک اور عفو و درگزر میں کتنا ثواب ہے، یہ ہمارے نبیؐ نے اور صحابہؓ نے اپنے عمل سے ثابت کیا۔" میں نے کہا۔ "پھر انگریز نے ڈیڑھ سو سال تک اپنے نظامِ انصاف کو ہم پر مسلط کیے رکھا اور سمجھانے والے ہمیشہ سمجھاتے رہے مگر روایت اپنی جگہ برقرار ہے۔ میں اکیلا کیا کر دوں؟ میں تو انھیں معاف کر دوں لیکن وہ مجھے بخشنے والے نہیں ہیں۔ میرا کوئی بیٹا تو ہے نہیں اور امیر خان کو آپ نے دیکھ ہی لیا ہے۔ وہ سمجھے گا آپ کی بات؟ میرے بعد وہ بندوق اٹھا لے گا؟"

اس نے بڑے افسوس سے سر ہلایا۔ "کتنا عجیب ہے یہ احساس! کہ میں اس وقت تم سے باتیں کر رہا ہوں اور تم سے مل کر خوش ہوا ہوں۔ تم بہت مہذب، شریف اور ذہین آدمی ہو۔ لیکن معلوم نہیں تم کب تک ہو۔ کسی دن مجھے یہ اچانک معلوم ہو گا۔ یا شاید کبھی معلوم نہ ہو گا کہ اب تم نہیں ہو۔"

"آپ سے پھر یہی درخواست کر رہا ہوں کہ کسی کو میرے آنے کی خبر نہ ہونی چاہیے۔" میں نے کہا۔ "میں تو کوشش کر رہا ہوں کہ خاموشی سے واپس چلا جاؤں۔ ہو سکتا ہے دشمن مجھے تلاش کرنے میں ناکام رہیں تو مایوس ہو جائیں اور قتل و خونریزی کا یہ سلسلہ ختم ہو جائے لیکن ان کو معلوم ہوا کہ میں

یہاں ہوں تو وہ پھر مستعد اور سرگرم عمل ہو جائیں گے۔ قدرتی طور پر وہ سمجھیں گے کہ میں اپنے والد کا بدلہ لینے آیا ہوں۔ وہ پہل کرنے کا موقع تلاش کر رہے ہیں گے۔"

"میں نہیں بتاؤں گا۔ میں یہ گناہ اپنے سر کیسے لے سکتا ہوں۔" وہ بولا۔ "مجھے تو تمام عمر یہ احساس رہے گا کہ میری زبان سے ایک غلط بات نکلنے کے باعث ایک آدمی مارا گیا۔ زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم زندہ رہو۔ لمبی عمر پاؤ۔ جتنی میری عمر ہے اس سے بھی زیادہ لمبی عمر۔ شادی کرو۔ جو شاید تم نے اسی وجہ سے اب تک نہیں کی اور اپنا گھر بساؤ۔ اور وہ گھر ایسا نہ ہو جیسا میرا گھر ہے، وہ ایک آباد اور خوشحال گھر ہو۔"

"یہ نیک تمنائیں اور دعائیں ضرور میری محافظ ہوں گی۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "زندگی رہی تو میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ آپ سے ملنے ضرور آؤں گا۔ آپ مجھے کہاں ملیں گے؟"

"اگر قبرستان میں نہ ملا تو اپنی چھوٹی بیٹی کے پاس ملوں گا۔ میں تم کو اس کا پتا بتا دیتا ہوں۔" وہ جیب میں کچھ تلاش کرتے ہوئے بولا پھر اس نے ایک پرانی اور بوسیدہ نوٹ بک نکالی۔ دوسری جیب سے اتنا ہی پرانا قلم برآمد کیا اور نوٹ بک سے ایک صفحہ پھاڑ کے آہستہ آہستہ کچھ لکھنے لگا۔ یہ صفحہ اس نے مجھے پکڑا دیا۔ "میں تم سب کو خوش آمدید کہوں گا۔"

"خدا حافظ مسٹر پال۔" میں نے اس سے مصافحہ کیا اور باہر نکل آیا۔ وہ انصاف کی کرسی پر بیٹھنے والا ایک پرانا آدمی تھا۔ اور میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ اس نے اپنے منصب کی آبرو کو کس حد تک مقدس جانا ہوگا۔ ہر فیصلہ کرتے وقت اس نے اپنے ضمیر کی آواز سنی ہوگی۔ اور خدا سے دعا مانگی ہوگی کہ اسے انصاف کرنے کی توفیق دے۔ تاکہ اس کے قلم سے صرف گناہ گار کو سزا ملے۔ اگر اس سے غلطی ہو تو گناہ گار کو چھوڑ دینے کی، بے گناہ کو سزا دینے کی نہیں۔

باہر آ کے میں آہستہ آہستہ سڑک پر چلنے لگا۔ ابھی گیارہ بجے تھے اور مجھے امید تھی کہ ٹیڈی اور محسن میری ہدایت کے مطابق گاڑی کو شمشاد کے گھر کے آس پاس چھوڑ کر بارہ بجے تک اوربیٹ ہوٹل میں کمرے حاصل کر لیں گے۔ امیر خان اور کبیر خان کے نام سے۔ آج کا دن بہت اہم تھا اور انکشافات کا دن تھا۔ میرے بہت سے اندازے درست ثابت ہوئے تھے۔ قصر جمشید کے تہ خانے تک پہنچنے والا راستہ اب بھی اسی جگہ سے شروع ہوتا تھا اور بے خوف و خطر استعمال بھی ہو رہا تھا۔ بہت ہوشیاری کے ساتھ دلاور اور میر شرافت علی نے یہ کوٹھی میرے والد سے ہتھیالی تھی۔ میر شرافت اس کا آنارنی بن گیا تھا۔ اس کی معقول وجہ تھی۔ دنیا کو یہ باور کرا دیا گیا تھا کہ وزیر خان بیمار ہے۔ وہ آفس تک نہیں جا سکتا تھا تو کوٹھی کو فروخت کرنے کی قانونی کارروائی کیسے پوری کرتا۔ فرض اس نے اپنے دوست اور پارٹنر، میر شرافت علی کے سپرد کر دیا جس نے شرافت اور دوستی کا حق ادا کرتے ہوئے یہ کام کیا۔ اگر کوئی سوال کرتا کہ وزیر خان نے یہ کوٹھی کیوں بیچی تھی تو اس کے دو معقول جواب تھے۔ پہلا تو یہی کہ اس کی چیز تھی، وہ بیچے یا رکھے اس کا اختیار ہے۔ دوسرا یہ کہ اس نے ایک کوٹھی بیچ کر دوسری خرید لی۔ کسی نے تصدیق کی ضرورت محسوس کی، نہ کوئی تصدیق کر سکتا تھا کہ جس کوٹھی سے وزیر خان کا جنازہ اٹھا وہ اس کی نہیں، اس کے ایک نمک حرام ملازم چراغ دین کی ملکیت تھی۔ وزیر خان کے لیے وہ ایک عقوبت گاہ تھی جہاں وہ چپ چاپ بس گھنٹے ذہنی و جسمانی اذیت برداشت کر رہا تھا۔

دلاور اینڈ کمپنی نے ایک احتیاط یہ بھی ملحوظ رکھی کہ وزیر خان کی کوٹھی ان میں سے کسی کے نام پر نہ ہو۔ انھوں نے کوٹھی کو اشتہار دے کر فروخت کیا ہوگا۔ ان کی قسمت کہ خریدار بھی ان کو اپنے مطلب کا مل گیا۔ ایک پرانے وقتوں کا اپنی ذات کے خول میں بند رہنے والا اور باہر کی دنیا سے عملاً کوئی تعلق نہ رکھنے والا بوڑھا۔ اس کا ایک ہی بیٹا تھا جسے اس نے کانونٹ کے سپرد کر دیا تھا۔ اس کی دونوں بیٹیاں بیاہی جا چکی تھیں۔ اور وہ صرف اتوار کو دو چار گھنٹے کے لیے باپ سے ملنے آتی تھیں چنانچہ ان کی طرف سے مداخلت کا سوال ہی نہ تھا۔ باقی رہ جاتی تھی صرف وہ عورت جو گھر کی مالکن تھی اور جس کی پسند پر اس کے شوہر نے یہ پرانی کوٹھی فوراً خرید لی تھی۔ ایک فوری خیال کے تحت میں پلٹا اور واپس چلنے لگا۔

دس منٹ بعد میں پھر کرم چند پال کے سامنے تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر بہت حیران ہوا۔

"کیا بات ہے؟" اس نے کہا۔ "کوئی بات رہ گئی تھی؟"

"یس سر۔ اگر آپ برا نہ مانیں تو میں آپ کا تھوڑا سا وقت اور لوں گا۔" میں نے پھر وہیں بیٹھ کر کہا۔

"وقت تو میرے پاس ردی کاغذوں کا ڈھیر ہے۔ کوئی تھوڑا سا کیا جتنا چاہے لے لے۔" وہ بولا۔

"میں آپ کو پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ میرے لیے خود حفاظتی کی کتنی اہمیت ہے اس لیے میں جو کچھ پوچھ رہا ہوں اس کا مقصد خدانخواستہ آپ کی نجی زندگی کے معاملات میں مداخلت نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "میں آج پہلی بار آپ سے ملا ہوں۔ آئندہ کا کوئی بھروسا نہیں کہ میں نہ رہوں یا آپ نہ رہیں۔ اس لیے میری دلچسپی

"تمہید کے طور پر اتنی معذرت کافی ہے۔" وہ مسکرایا۔ "آگے بولو"

"مجھے آپ سے چند باتیں اور کرنی چاہئیں۔ یہ خیال مجھے

اتنے میں آیا چنانچہ میں نے لوٹ آنا بہتر سمجھا۔" میں نے کہا۔ "اس ڈر سے کہ پھر موقع نہ ملا تو میں کس سے پوچھنے جاؤں گا۔ ایک بات تو ڈرائیور سے متعلق ہے۔ مجھے اس کا نام نہیں بتایا تھا آپ نے۔"

"اس کا نام تو دلدار ہے لیکن سب اسے کبوتر کہتے ہیں۔" وہ بولا۔

اس نام کی بازگشت میرے ذہن میں تھی لیکن مجھے یاد نہ آیا کہ پہلے یہ نام میں نے کب اور کہاں سنا تھا۔ "یہ دلدار آپ کے پاس کیسے آیا تھا؟ کیا آپ نے کسی ملازم کی ضرورت کا اشتہار دیا تھا یا کسی نے بھیجا تھا اسے؟"

"دونوں میں سے کوئی بات نہیں۔" وہ بولا۔ "ہمارے یہاں آنے کے دوسرے یا تیسرے دن وہ خود آ گیا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ سابقہ مالکوں کی اجازت سے سرونٹ کوارٹر میں رہتا تھا اور ان کی جس حد تک خدمت کر سکتا تھا اپنا اخلاقی فرض سمجھ کے کرتا تھا۔ کوٹھی بیچتے وقت مالک نے خالی قبضہ دینے کے لیے سرونٹ کوارٹر بھی خالی کرا لیا تھا۔ اور کہا تھا کہ نئے مالکوں کی کچھ خبر نہیں ممکن ہے ان کے نوکر ہوں انھیں سرونٹ کوارٹر کی ضرورت پڑے۔ اگر نہ ہوں تو تم خود ان سے بات کر لینا۔ وہ تم کو رہنے دیں تو یہ ان کی مرضی۔ دلدار نے مجھے بتایا کہ وہ ٹرک چلاتا ہے اور صبح نو بجے ٹرک لے کر جاتا ہے تو شام کو چھ سات بجے لوٹ آتا ہے۔ صبح جانے سے پہلے اور رات کو آنے کے بعد وہ ہمارا سب کام کرے گا۔ بازار سے سودا سلف لانا، باغ کی دیکھ بھال، چوکیداری اور ڈرائیوری۔ ہم نے کہا گاڑی تو ہمارے پاس ہے نہیں۔ تم کو رہنے کے لیے جگہ چاہیے تو آ جاؤ۔ ہمارے پاس نوکر بھی نہیں ہیں اور سرونٹ کوارٹر خالی رہے گا تو ہمیں کیا فائدہ ہوگا۔ وہ اسی دن آ گیا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جو اس نے کہا تھا وہی کیا۔ ہمارا کوئی بیٹا بھی نہیں تھا چنانچہ میرے لیے ہر روز بازار جانا اور ادھر ادھر کے چھوٹے موٹے کام مشکل تھے، اس کے آنے کے بعد ہمیں بہت سہولت ہو گئی۔ وہ بہت اچھا اور فرماں بردار نوجوان ہے، مجال ہے جو اس نے کبھی کسی کام سے انکار کیا ہو یا ٹالنے کی کوشش کی ہو۔ بس ایک دفعہ دو ڈھائی دن کی چھٹی لے کر وہ گاؤں گیا تھا۔ ایک آدھ دفعہ... کام کہا اور وہ دوڑتا ہوا گیا۔ میری بیوی تو اس کو بہت پسند کرتی تھی اور بالکل اپنے بچوں کی طرح رکھتی تھی۔ وہ ہم دونوں بوڑھوں کا محافظ بھی تھا۔ اس نے کہا تھا کہ ایسے علاقوں میں چوریاں بہت ہوتی ہیں کیونکہ یہاں خوشحال لوگ رہتے ہیں اور یہ علاقہ دیکھنے میں غیر آباد لگتا ہے۔ ایک کوٹھی میں جو کچھ ہوتا ہے اس کی ساتھ والوں کو نہیں ہوتی۔ لیکن اس نے کہا کہ چور اس گھر میں آ گیا تو زندہ بچ کے نہیں جا سکتا۔ اس نے مجھے ریوالور بھی دکھایا تھا اور میں نے کہا تھا کہ ایسی خطرناک چیز کیوں ساتھ لیے پھرتے ہو تو اس نے کہا تھا کہ ٹرک ڈرائیور دوسروں کا مال لیے پھرتے ہیں۔ انھیں اپنی حفاظت کرنی پڑتی ہے ورنہ چور ڈاکو لوٹ لیں۔"

"ویری گڈ۔" میں نے دل ہی دل میں کہا۔ اتنی ذہانت سے تمام منصوبہ بندی کرنا یقیناً دلاور کا کام ہوگا۔ کتنی خوبی سے انھوں نے اپنا آدمی اسی گھر میں بٹھا دیا۔ انھیں سامنے بھی نہیں آنا پڑا اور جو مقصد وزیر خان کی موجودگی میں حاصل نہ ہوا تھا وہ بہتر طور پر حاصل ہو گیا۔ ایک ایماندار اور اچھی شہرت رکھنے والے ریٹائرڈ ایڈیشنل سیشن جج پر کون شک کر سکتا ہے کہ اس کا گھر کسی ناجائز کاروبار کے لیے استعمال ہو رہا ہے۔ اگر بدقسمتی کے باعث کوئی ایسی ویسی بات ہو جاتی تو وہ سب صاف بچ جاتے۔ دلدار عرف کبوتر غائب ہو جاتا اور ریٹائرڈ جج عذر بے گناہی پیش کر کے بچ تو جاتا مگر یہ رسوائی بھی اس کے لیے کم جان لیوا نہ ہوتی کہ اس کا نام منصفوں میں شامل تھا اور نیکنامی کی عمر کا سفر تمام ہوا تو یہ نام مجرموں کی طرح مشہور ہوا۔

"کبھی آپ نے اس سے پوچھا کہ وہ کس کا ملازم رہے؟" میں نے کہا کیونکہ خاموشی کا وقفہ طویل ہونے لگا تھا۔

"نہیں۔ اس کی مجھے کیا ضرورت تھی۔" وہ بولا۔ "اسے تنخواہ ملتی تھی اور پہلے مہینے اس نے کہا تھا کہ وہ کرایہ ادا کرنا چاہتا ہے۔ لیکن میں نے کہا کہ تم مجھے ایک چھوٹی سی نیکی سے محروم کرنا چاہتے ہو تو جاؤ کرائے کا مکان کہیں اور لے لو۔ اس نے بہت معافی مانگی کہ وہ مجھے ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔"

"آپ کی بیوی کا انتقال کیسے ہوا تھا؟" میں نے کہا۔ "کیا وہ بیمار تھیں؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس کی صحت قابل رشک تھی۔ عمر میں وہ مجھ سے دس سال کم تھی لیکن بیس سال چھوٹی نظر آتی تھی۔ میں تم کو اس کی تصویریں دکھاتا ہوں۔" وہ اٹھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا دوسرے کمرے تک گیا۔ اس کی واپسی تک میں ان امکانات پر غور کرتا رہا جو میرے ذہن میں تھے۔ وہ دس منٹ بعد واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک خاصی بڑی البم تھی۔

"اس میں ہماری سب تصویریں ہیں۔" وہ بولا۔ "شادی کے دن سے لے کر... اس کی آخری تصویر تک۔ ہمارے بچوں کی، ہمارے دامادوں کی۔ تم دیکھو۔ میں چائے بنا کے لاتا ہوں۔"

میرے بہت منع کرنے کے باوجود وہ چلا گیا اور میں نے البم کو پہلی تصویر سے دیکھنا شروع کر دیا۔ ہر یادگار البم کی طرح اس میں بھی کرم چند پال کی زندگی کے جاوداں لمحے حنوط شدہ لاشوں کی طرح اصل حالت میں موجود تھے۔ پہلی تصویر ۱۹۲۶ء کی تھی جس میں نوجوان ہینڈسم اور اسمارٹ کرم چند پال دولہا بنا اپنی بے حد حسین و جمیل بیوی کی بانہوں میں بانہیں ڈالے کھڑا تھا۔ اس نے بہترین سوٹ

پہن رکھا تھا اور ٹائی باندھ رکھی تھی۔ اس کی بیوی سجائی ہوئی سفید لباس عروسی میں تھی اور وہ تمام نوبیاہتا جوڑوں کی طرح انتہائی پُر اعتماد، مسرور اور ایک دوسرے کی رفاقت پر نازاں نظر آتے تھے۔ میں صفحے پلٹتا گیا اور وقت آگے بڑھتا گیا۔ جس نومولود کی تصویر میں نے ماں کی گود میں دیکھی تھی اسے میں نے اپنے بچے کو گود میں لیے دیکھا۔ اس البم میں ان کی پوری زندگی کی کہانی محفوظ تھی۔ اور میں نے ایک عجیب سا کرب محسوس کیا۔ آدمی گھر کس لیے بساتا ہے؟ اس عمر میں تنہائی کا دکھ اٹھانے کے لیے؟ اپنی سب خوشیاں وہ اپنے بچوں میں بانٹتا ہے اور خود تہی دست رہ جاتا ہے اور کوئی اسے خوشی کی خیرات دینے والا بھی نہیں رہتا، تو وہ رخت سفر باندھ لیتا ہے۔ یہ زندگی اسی طرح گزرتی تھی۔ ہم کو اس سے خوشیاں حاصل ہوئیں اور ہم نے وہی خوشیاں آگے تقسیم کر دیں۔ ہم سے پہلے ہمارے والدین نے یہی کیا تھا اور ہمارے بعد ہمارے بچے یہی کریں گے۔

"معاف کرنا۔ میں ذرا کاہل ہوں۔" وہ چائے کا ایک مگ میرے سامنے رکھ کر بولا۔ "ایک تو مجھے یہی بڑھاپے کا مرض ہے لیکن ذیابیطس کی وجہ سے میں چل پھر نہیں سکتا۔ کبھی کبھی ہمت کر لیتا ہوں چائے بنانے کی۔"

"یہ تصویر کتنی پرانی ہے؟" میں نے کہا۔ "آپ کی بیوی کی وفات سے کتنا عرصہ قبل لی گئی تھی؟"

"شاید دو مہینے پہلے۔" وہ میرے ساتھ بیٹھ کر بولا۔ "تم نے دیکھا اس کی عمر کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا۔ اس کو اتنی جلدی میرا ساتھ نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔ اس نے بہت زیادتی کی میرے ساتھ۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ میں اس کے سہارے کا محتاج ہوں۔ اس کی مدد کے بغیر کیسے جیوں گا میں؟"

"آپ کو یقین ہے کہ انہیں کوئی بیماری نہیں تھی؟" میں نے چائے کا ایک گھونٹ لے کر کہا اور تصویر پر نظر رکھی۔ مریم کی صحت واقعی اچھی تھی۔ "بعض اوقات بلڈ پریشر یا ہارٹ ٹربل کا پتا نہیں چلتا۔"

اس نے بڑے وثوق کے ساتھ نفی میں سر ہلایا۔ "میرا ایک دوست تھا، ڈاکٹر کرمانی۔ سول سرجن رہا اور ریٹائر ہونے کے بعد پریکٹس کرتا رہا۔ ابھی سال بھر پہلے انتقال ہوا ہے اس کا۔ وہ ہمارا فیملی ڈاکٹر تھا۔ زبردستی مجھے اور مریم کو ہر چھ ماہ بعد چیک کیا کرتا تھا۔ کہتا تھا تم اس عمر کو پہنچ چکے ہو جہاں یہ ضروری ہے۔ اس نے سب سے پہلے بلڈ شوگر لیول زیادہ ہونے پر خبردار کیا تھا اور میرے کھانے پینے پر پابندی لگائی تھی۔ مگر میں بہت بے پروا ہوں۔ میں سب کچھ کھاتا رہا۔ دوائیاں بھی۔" وہ ہنسا۔ "اور نتیجہ ظاہر ہے یہی نکلا کہ ذیابیطس کا روگ لگ گیا۔ ویسے بھی میرے خاندان میں موروثی ہے یہ۔ لیکن یہ بالکل صحت مند تھی۔ اس کا بلڈ پریشر کئی سال پہلے تھوڑا سا ہوا تھا لیکن بہت جلد نارمل ہو گیا۔ دل ذرا بھی ابنارمل ہو تو سب سے پہلے کرمانی کو فکر ہوتی۔ وہ ہمیشہ کہتا تھا کہ اس صحت کو برقرار رکھو مریم! ضروری نہیں کہ آدمی بوڑھا ہو تو بیمار بھی ہو۔ وہ یورپ اور امریکہ کی مثالیں بہت دیتا تھا جہاں لوگ صحت کی ہر بات کے زیادہ قائل ہیں۔"

"اس کے باوجود آپ کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ کیا انہیں اچانک کسی مہلک مرض نے آ لیا تھا؟"

کرم چند پال نے پھر پورے اعتماد سے انکار کیا۔ "ایک دن پہلے وہ بالکل تندرست تھی۔ وہ پیدل بازار تک گئی تھی اور شاید پانچ سیر سامان اٹھا کے اور دو میل پیدل چل کے لوٹی تھی۔ رات کو اس نے سوتے وقت یہ شکایت کی کہ اس کا دل گھبرا رہا ہے۔"

"کیا سونے سے پہلے وہ کچھ کھانے کی عادی تھیں؟" میں نے محتاط لہجے میں کہا۔

"ہاں۔ وہ ملٹی وٹامن کی ایک گولی کھاتی تھی۔" وہ بولا۔ "اور دودھ کا ایک گلاس پیتی تھی۔ ہم دونوں ہی دودھ پیتے تھے۔ یہ ہمارا پرانا معمول تھا کہ ہم رات کو کھانا نہیں کھاتے تھے۔"

"اس کے بعد کیا ہوا؟" میں نے بے چینی سے کہا۔ "جب انھوں نے شکایت کی...."

"ہاں۔ میں نے کہا، تم آرام کرو۔ بدہضمی سے بھی ایسا ہو سکتا ہے۔" وہ بولا۔ "یا تھکن کی وجہ سے۔ تم کو کیا ضرورت تھی گوشت سبزی اور پھل لینے کے لیے خود جانے کی اور اتنا وزن اٹھا کے پیدل آنے کی۔ دلدار لا دیتا۔ اور کیا واپسی میں سواری نہیں مل سکتی تھی؟ وہ کہنے لگی، دلدار نے تو مجھے معذور کر کے بند کر دیا ہے گھر میں۔ باہر کے سارے کام تو وہ کر دیتا ہے، مجھے بھی تھوڑا بہت چلنا چاہیے۔ خیر۔ اس کے بعد وہ سو گئی۔ لیکن صبح تک وہ خدا کے پاس پہنچ چکی تھی۔ میں نے اسے جگانے کی کوشش کی تب مجھے معلوم ہوا۔"

"اور آپ نے اس کی موت کو طبعی سمجھ کے کیسے قبول کر لیا؟" میں نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔

"نہیں طبعی اس اعتبار سے نہیں کہ عمر میں مجھ سے سینئر تو میں تھا لیکن یہ دل بہت ناقابلِ اعتبار چیز ہے۔ اس کا دل دھوکا دے گیا۔" وہ بولا۔ "چلتے چلتے اچانک بند ہو گیا۔"

"کس نے کہا تھا یہ آپ سے؟ آپ نے کسی ڈاکٹر کو بلایا تھا یا پوسٹ مارٹم رپورٹ لی تھی؟" میں نے کہا۔

"کیسی باتیں کرتے ہو۔ ڈاکٹر آتا تو کیا کرتا؟ زندہ کر دیتا اسے؟" وہ برہمی سے بولا۔ "اور پوسٹ مارٹم کیوں کراتا میں؟"

"اس لیے کہ موت پُراسرار حالات میں ہوئی تھی۔" میں نے کہا۔ "آپ کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ دل بہت ناقابلِ اعتبار چیز ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنی تمام سائنسی ترقی کے باوجود دل سے زیادہ پائیدار مشین نہیں بنا سکا۔ دل کبھی کسی وجہ کے بغیر اچانک جواب نہیں دیتا۔ دل تو اپنی خرابی کی اطلاع بہت پہلے دیتا ہے۔ اور اگر آپ کے دوست ڈاکٹر کرمانی نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ ان کا بلڈ پریشر ہائی ہے یا انھیں کوئی کارڈیک تکلیف ہے تو میں یہ نہیں مان سکتا کہ ان کی موت حرکتِ قلب بند ہونے سے واقع ہوئی تھی۔"

"آخر تم کیا ثابت کرنا چاہتے ہو؟" وہ چلایا۔

"میں معافی چاہتا ہوں سر! لیکن آپ ایڈیشنل سیشن جج تھے۔ آپ نے عدالت کی کرسی پر بیٹھ کے قتل کے بے شمار مقدمات کی سماعت کی ہو گی۔ لوگ کس کس طرح قتل کرتے ہیں، مجھے یہ آپ کو بتانے کی ضرورت نہیں لیکن آپ مجھے یہ بتائیے کہ ان حالات میں آپ نے موت کو طبعی کیسے مان لیا؟ آپ کو شک کیوں نہیں ہوا کہ انھیں قتل......"

"شٹ اپ... شٹ اپ اینڈ گیٹ آؤٹ۔" وہ کھڑا ہو کے چلانے لگا۔ غصے سے اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ اس کا جسم کانپنے لگا۔ "مریم کے بارے میں ایسی بات کہتے ہو میرے سامنے۔ وہ فرشتہ سیرت عورت تھی جس نے کبھی اپنی زبان سے بھی کسی کا برا نہیں چاہا۔ وہ سب سے محبت کرنے والی عورت۔ خدا ترس اور نیک دل۔ اسے کون قتل کرے گا یو ایڈیٹ۔ تمھارے دماغ میں یہ بے ہودہ خیال آیا کیسے؟ میں کہتا ہوں نکل جاؤ یہاں سے۔"

"میں چلا جاؤں گا۔ لیکن مسٹر کرم چند پال!" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اس سے میرے یقین میں کوئی فرق نہیں آئے گا کہ کسی نے انھیں قتل کیا تھا۔ ان کی ملٹی وٹامن کی گولیوں میں ایک گولی زہر کی رکھ دی تھی۔ یا ان کے دودھ کے گلاس میں زہر ڈال دیا تھا اور یہ کام کسی ایسے شخص نے کیا تھا جو آپ دونوں کے معمولات پر نظر رکھتا تھا۔ وہ آپ کو بھی قتل کر سکتا تھا۔ اس کی بلا سے آپ دونوں مر جاتے۔"

"لیکن کیوں؟ کیا مل سکتا تھا کسی کو ہماری موت سے؟" وہ ایک دم بیٹھ گیا۔ "ہم تو پہلے ہی کہہ چکے تھے کہ ہمارا جو کچھ ہے وہ ہماری بیٹیوں کا ہے اور ہمارے داماد بھی ایسے نہیں ہیں، وہ بہت نیک لوگ ہیں اور محنت کی کمائی کھاتے ہیں۔ میں جانتا ہوں وہ لالچی نہیں ہیں۔"

"میں نہیں چاہتا کہ آپ ان پر شک بھی کریں۔" میں نے کہا۔ "میں یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ مریم کا کوئی دشمن نہیں تھا اور وہ فرشتوں کی طرح نیک تھی مگر کرم چند پال! کیا شیطان ایسے ہی لوگوں کو راستے سے نہیں ہٹاتا؟ میں اپنے والد کے بارے میں یہی کہنا چاہتا ہوں کہ وہ بڑے ایماندار، خدا ترس اور نیک آدمی تھے۔ مگر ان کو قتل کر دیا گیا۔ خیر یہ بات پرانی ہو گئی۔ لیکن جس بات نے مجھے واپس آنے پر مجبور کیا وہ یہی تھی کہ آپ کو خطرے سے خبردار کر دوں۔ میری زندگی تو ہر لمحے خطرات میں گھری ہوئی ہے لیکن آپ نے بھولے سے بھی آج کی اس ملاقات کا یا ان باتوں کا کسی کے سامنے حوالہ دیا تو خود آپ کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔ مریم کو قتل کرنے والوں نے آپ کو اس لیے بخش رکھا ہے کہ آپ ان کے لیے بے ضرر ہیں۔ آپ سمجھیں کہ نہ ہم یہاں آئے نہ آپ سے ملے اور نہ اپنے بارے میں کوئی بات کی۔ آپ نے کبھی ہمیں دیکھا ہی نہیں۔ کسی کو اپنا سمجھ کے بھی یہ بات نہ کہیں۔ خواہ اس پر آپ کا اعتماد اپنی ذات پر اعتماد سے زیادہ ہو۔ ورنہ وہ آپ کو بھی قتل کر دیں گے۔ سُنا آپ نے؟"

"گیٹ آؤٹ۔ تم پاگل ہو گئے ہو۔" وہ پھر چلانے لگا۔ "تمھارا دماغ خراب ہے تمھارے بھائی کی طرح۔ تم خود کو صحیح دماغ کا سمجھتے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ...."

اس کی بات سنے بغیر میں واک آؤٹ کر گیا۔ مجھے اب احساس ہو رہا تھا کہ میں نے اس گھر میں قدم رکھ کر غلطی کی تھی۔ اس خبطی بوڑھے کا کیا بھروسا۔ وہ میرے منع کرنے کے باوجود یہ بات کسی سے کہہ دے کہ آج دو پاگل بھائی آئے تھے، امیر خان اور کبیر خان۔ کہتے تھے کہ ہم وزیر خان کے بیٹے ہیں۔ اور ان میں سے جو بڑا تھا وہ بڑا پاگل تھا۔ کہتا تھا مریم کو کسی گھر کے آدمی نے قتل کیا تھا اور اب وہ مجھے بھی قتل کر دے گا۔ وہ بہت ہنسے گا لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ مریم کے بعد دلاور کا ایجنٹ دلدار عرف کبوتر اس بوڑھے کو بھی ٹھکانے لگا دے گا۔ خود بوڑھے کی بیٹیاں کہیں گی کہ ہمارا باپ ذہنی طور پر تو اسی دن مر گیا تھا جس دن ہماری ماں کا انتقال ہوا تھا۔ اور اس عمر میں ان کو ذیابیطس کا برا عارضہ بھی تھا۔ چنانچہ یہ قتل بھی طبعی موت کا نام پائے گا۔

میں غصے میں تیز تیز چلتا گیا۔ غصہ مجھے اللہ پر بھی آ رہا تھا۔ آخر اسے کیا ضرورت تھی یہ مکان میرے باپ کے نام سے خریدنے کی۔ اگر یہ راز فاش ہو گیا کہ اب اس کا مالک کون ہے تو کیا اسے تباہ نہیں کر دیا جائے گا؟ شاید دلدار عرف کبوتر نے اب تک یہ خبر دلاور کو پہنچا دی ہو کہ اڈا بک رہا ہے۔ باقی سب وہ معلوم کر لے گا۔ میرے قدم اچانک ایک آواز پر رک گئے۔ ایک بچہ چلا چلا کر شام کا اخبار بیچ رہا تھا۔ "مشہور صنعتکار سیٹھ دلاور کا قتل۔ آج کی تازہ خبر۔" میں نے جھپٹ کر بچے کے ہاتھ سے اخبار چھین لیا اور اس کے ہاتھ پر ایک روپیہ رکھ دیا۔

خبر بالکل نمایاں اور مکمل تھی۔ شہ سرخی اس لیے نہیں بنی تھی کہ چوہدری دلاور ایک مقامی صنعت کار تھا۔ اسے ملک گیر یا بین الاقوامی سطح پر وہ شہرت حاصل نہیں تھی جو کچھ عرصہ قبل پاکستان کی معیشت پر حاوی "بائیس خاندانوں" کو ملی تھی لیکن خبر میں لہو کا رنگ تھا اور قتل کی لرزہ خیزی تھی چنانچہ اسے نمایاں جگہ ملی تھی۔ دلاور کی زندگی یا موت میں میری دلچسپی کے اسباب بالکل مختلف اور عیاں تھے کیونکہ اس کی ذات سے براہِ راست میری اپنی زندگی اور موت کے زمینی رشتے اور تنازعے منسوب تھے۔ ایسے چند اور بھی ہوں گے جن کے لیے دلاور کا جینا مرنا کسی اعتبار سے اہم تھا مثلاً اس کے خاندان میں شامل افراد۔ اس کے کاروباری حریف اور حلیف اور دوست آشنا۔ لیکن میں یہ کبھی سمجھ نہیں پایا تھا کہ کسی بھی شخص کے قتل کی واردات میں غیر متعلق افراد کے لیے تجسس اور دلچسپی کے اسباب کیا ہوتے ہیں جس کی وجہ سے قتل کی خبر سنسنی خیز کہلاتی ہے اور اخبار میں شائع ہو تو اعلان بن جاتی ہے۔ زر۔ زمین یا زن کیلیے آدمی کے ہاتھوں آدمی کا قتل ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔ ہوس اور حسد کا وہ کمینہ جذبہ جو انسان کو شیطان کے ہاتھوں یوں بے بس کر دیتا ہے آدمی کی سرشت میں شامل ہے۔ سڑک پر پیش آنے والے ٹریفک کے حادثات کی طرح قتل بھی روزمرّہ کی زندگی کا جزو ہیں۔ اور جتنے افراد قتل کی وارداتوں میں یا حادثات میں ہلاک ہوتے ہیں اس سے کئی ہزار گنا زیادہ افسوسناک اور پُر عذاب حالات میں دنیا سے رخصت ہوتے ہیں لیکن ان کے بارے میں کوئی خبر نہیں دیتا اور کوئی جاننا نہیں چاہتا کہ وہ کیسے مرے اور کیوں مرے۔

دلاور کے قتل کی خبر کو بھی اخبار نے اور اخبار فروش نے زیادہ فروخت کا ذریعہ بنایا تھا اور اخبار خریدنے والے ایسے بھی تھے جو شاید دلاور کے نام سے بھی واقف نہ ہوں گے مگر قتل کے ساتھ سفاکانہ، بہیمانہ اور وحشیانہ کے الفاظ کا بے دریغ استعمال خبر کو مزید چٹ پٹا بنا دیتا ہے حالانکہ کسی بھی قتل کو شریفانہ کہا ہی نہیں جا سکتا۔ بالکل اسی طرح جیسے آگ کو گرما گرم کہنا مضحکہ خیز ہے کیونکہ آگ کے یخ بستہ ہونے کا تصوّر ہی نہیں۔ مگر اب میری طرح دوسرے لوگ بھی بڑے انہماک اور اشتیاق کے ساتھ خبر کی تفصیلات میں گم تھے کہ قاتل کون تھا؟ قتل کیوں ہوا؟! مدانے کیا ہیں؟ پولیس کا نظریہ کیا ہے؟ اس کے ساتھ لواحقین کی تصاویر جو لاش پر گریہ کناں ہوں اور ممکن ہو تو ایک تصویر خون آلودہ لاش اور جائے واردات کے منظر کی۔ شاید یہ سب کچھ پڑھنے اور دیکھنے کے بعد لاشعوری طور پر آدمی یہ اطمینانِ قلب حاصل کرتا ہے کہ وہ خود سو فیصد زندہ ہے اور زندگی کتنی پُرمسرت، قابلِ قدر اور اہم چیز ہے۔

اخبار بیچنے والا لڑکا میرے رویے پر تھوڑا سا حیران ہوا تھا اور پھر اسی خبر کو چلا چلا کر نشر کرتا روانہ ہو گیا تھا۔ اُسے زیادہ حیران ہونے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ اس نے فرض کر لیا ہو گا کہ میں دلاور کا کوئی قریبی عزیز ہوں جسے اس خبر نے دوسروں کے مقابلے میں شدید تر ذہنی صدمے سے دوچار کیا تھا چنانچہ دلچسپی کی حد تک متاثر ہونے والے اطمینان سے اخبار خرید کر قیمت ادا کر رہے تھے تو میں نے اخبار جھپٹ کر چھین لیا تھا اور پانچ کا نوٹ پھینک کر ایسا حواس باختہ ہوا تھا کہ باقی پیسے لینا بھی بھول گیا تھا اور یہ بھی بھول گیا تھا کہ میں سڑک کے درمیان میں کھڑا اخبار پڑھ رہا ہوں۔ پھر کسی شریف آدمی نے شانہ ہلا کر مجھے متوجہ کیا اور بتایا کہ سڑک سے ہٹ کر جو بینچ لگی ہوئی ہے اس پر بیٹھ کر اخبار پڑھنے پر کوئی پابندی نہیں۔ میں نے سر ہلایا اور چل پڑا۔

سرخی میں نے پڑھنے سے قبل ہی سن لی تھی۔ باقی تفصیلات کو ایک نظر ڈال کر ذہن میں نقش کر لینے کے بعد میں نے ہر لفظ کو غور سے پڑھا تھا۔ اخباری نمائندے اور پولیس کے اشتراکِ باہمی سے جو خبر بنی تھی وہ کچھ یوں تھی کہ رات کے وقت نامعلوم افراد نے چوہدری دلاور کو ان کی خوابگاہ میں گھس کر قتل کر دیا۔ قاتل نے کلہاڑی سے پے درپے وار کیے اور سر کے ٹکڑے کرنے کے بعد کلہاڑی وہیں چھوڑ کر فرار ہو گیا۔ چوکیدار نے جسے پولیس نے سب سے پہلے گرفتار کیا تھا، یہ بیان دیا کہ دلاور کے افرادِ خانہ راولپنڈی گئے ہوئے تھے اور ان کا پروگرام مری جا کے اسنو فال دیکھنے کا تھا لیکن سخت سردی کے باوجود اسنو فال کے لیے موسمی حالات سازگار نہیں ہوئے تھے چنانچہ وہ کسی عزیز کے گھر بیٹھے انتظار کر رہے تھے کہ برسنے کے بجائے بادل برف کے گالے بن کر گرنے لگیں تو وہ مری جائیں۔ چوکیدار کو علم نہیں تھا کہ راولپنڈی میں وہ کہاں ہوں گے۔ اس نے کسی کو بھی بنگلے میں آتے جاتے نہیں دیکھا تھا اور (پولیس کی جوتا کاری کے باوجود) یہ اعتراف نہیں کیا تھا کہ وہ نشہ کرتا ہے یا رات کو حرام خوری کرتا ہے اور سو جاتا ہے۔ چوکیدار نے پورے وثوق کے ساتھ بیان دیا تھا کہ اس نے کوئی شور نہیں سنا۔ کسی کے اونچا بولنے، مارپیٹ کرنے یا چیخنے چلّانے کی آواز نہیں سُنی اور کوئی کھڑکی یا دروازہ کھلا نہیں دیکھا حالانکہ وہ ہدایات کے مطابق رات بھر کوٹھی کے گرد پھرتا رہا تھا۔ اس نے اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے بتایا تھا کہ چوہدری دلاور جیسے شریف اور بااخلاق آدمی کا دشمن کوئی نہیں ہو سکتا لیکن وہ خود صرف چھ مہینے پہلے ملازم ہوا تھا اس

لیے یقین کے ساتھ کچھ نہیں بتا سکتا کہ ان کے دوست کتنے تھے اور دشمن کتنے۔ وہ ان کی نجی زندگی کے معاملات سے باخبر ہونے کا دعوےٰ کیسے کر سکتا ہے۔ وہ اور گھر کے دوسرے ملازم کتنے بھی قابلِ اعتماد کیوں نہ ہوں بہرحال ملازم سے زیادہ کچھ نہیں۔ واردات کی شب چوہدری دلاور نصف شب سے کچھ پہلے سوئے تھے تو اکیلے تھے (پولیس کے سوال کے جواب میں) اس نے کہا کہ اگر کوئی شخص کار میں چھپا ہوا تھا اور چوہدری صاحب کے ساتھ ہی گھر میں داخل ہو گیا تھا تو وہ کیسے جان سکتا ہے۔ وہ چوہدری صاحب کی گاڑی دیکھتے ہی دروازہ کھول دیتا تھا اور رات کو بھی اس نے گاڑی کے گزر جانے کے بعد گیٹ بند کیا تھا۔ اس نے چوہدری صاحب کو گاڑی پورچ میں روک کر اترتے اور اندر جاتے اس لیے نہیں دیکھا تھا کہ وہ گیٹ کو دھکیل کر مقفل کرنے میں مصروف تھا تاہم اس نے گاڑی کے رکنے کی اور دروازہ بند ہونے کی آواز ضرور سُنی تھی۔ اُسے نہیں معلوم کہ وہ اکیلے اندر گئے تھے یا ان کے پیچھے کوئی اور بھی تھا۔ دوسرے نوکروں کے متعلق اس نے بتایا کہ مالی صبح آتا تھا اور شام ہونے سے پہلے اپنے گھر لوٹ جاتا تھا۔ اس کا گھر کے اندرونی معاملات سے کوئی تعلق نہیں تھا چنانچہ اسے اندر جانے کی اجازت بھی نہیں تھی۔ خانساماں ایک بوڑھا آدمی تھا جو اپنی بیوہ بہن کے ساتھ کئی سال سے اسی گھر میں مقیم تھا لیکن واردات کی شب وہ بھی گھر میں نہیں تھے۔ چوہدری صاحب نے ان کو بھی اپنی فیملی کے ساتھ بھیج دیا تھا۔ چوہدری صاحب معمول کے مطابق صبح سورج نکلنے سے پہلے لان میں ٹہلنے نہیں نکلے تو وہ سمجھا کہ شاید رات کو دیر سے سونے کی وجہ سے وہ صبح اپنے وقت پر نہیں اُٹھ سکے۔ چوکیدار نے تسلیم کیا کہ چوہدری صاحب رات کو دیر تک جاگتے تھے اور ان کو نیند نہ آنے کی شکایت رہتی تھی۔ کچھ عرصے سے وہ چڑچڑے بھی ہو گئے تھے اور انھوں نے کسی وجہ کے بغیر چوکیدار کو ڈانٹا ڈپٹا تھا کہ وہ ہوشیار رہے اور اگر کبھی اس کی طرف سے غفلت کا ثبوت ملا تو اُسے برطرف کر دیا جائے گا۔ وہ چوکیدار کو ہزار روپے ماہانہ دیتے تھے جو عام چوکیدار کو ملنے والی تنخواہ کے مقابلے میں دگنی تنخواہ تھی چنانچہ چوکیدار خود بھی نوکری کو برقرار رکھنے کے لیے بے حد مستعد رہتا تھا۔ چوہدری صاحب نے اُسے ایک ریوالور بھی لے کر دے رکھا تھا اور کئی بار کہا تھا کہ خطرہ محسوس ہو اور وہ کسی غلط آدمی کو زبردستی یا ناجائز طور پر اندر داخل ہوتا دیکھے تو بے دریغ گولی مار دے۔ باقی معاملات کو وہ خود سنبھال لیں گے۔

صبح نو بجے تک چوہدری صاحب کی گاڑی پورچ ہی میں کھڑی رہی تو چوکیدار کو تشویش لاحق ہوئی کہ کہیں ان کی طبیعت خراب نہ ہو گئی ہو۔ اندر سے تو وہ چلا کر آواز دیتے تب بھی باہر سنائی نہ دیتی۔ اسی اندیشے کی وجہ سے وہ حکم عدولی کرتے ہوئے اپنی ڈیوٹی چھوڑ کر اندر گیا اور چوہدری صاحب کے بیڈ روم کے دروازے تک پہنچا۔ اندر داخل ہونے کی نوبت ہی نہ آئی۔ اس نے کھلے دروازے سے ٹیبل لیمپ کو روشن دیکھا۔ چوہدری صاحب فرش پر مردہ پڑے تھے اور ان کا خون قالین کے زرد رنگ پر پھیلا ہوا تھا۔ لاش کی حالت دیکھ کر وہ اتنا دہشت زدہ ہوا کہ پہلے تو خود بیہوش ہو گیا۔ اُسے چکّر سا آیا جس کے بعد وہ دروازے کے قریب ہی گر پڑا مگر چند منٹ میں وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور دوسرے کمرے کی طرف ٹیلی فون کرنے بھاگا۔ ٹیلی فون تو بیڈ روم میں بھی تھا مگر اس میں اندر جانے کا حوصلہ نہ تھا۔ اسے معلوم تھا کہ دوسرا ٹیلی فون ڈرائنگ روم میں ہے۔ وہ اندر کے معاملات کی خبر رکھنے میں غیر ضروری دلچسپی نہیں لیتا تھا مگر اُسے خود چوہدری صاحب نے کئی بار ڈرائنگ روم میں بلایا تھا اس لیے وہ گھر کے نقشے سے واقف تھا اور اُسے معلوم تھا کہ کون سی چیز کہاں ہے، اس لیے وہ ٹیلی فون کرنے ڈرائنگ روم میں گیا تھا۔ اُسے ڈائریکٹری میں کوئی نمبر تلاش کرنا نہیں آتا لیکن چوہدری دلاور نے اُسے پولیس اسٹیشن کا ٹیلی فون نمبر یاد کرا دیا تھا۔

ان تمام باتوں سے پولیس نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ چوہدری دلاور کو کسی دشمن کا ڈر تھا، چنانچہ اس نے غیر معمولی حفاظتی انتظامات کیے تھے اور اس کے باوجود وہ عدم اطمینان کا شکار تھا۔ اس منطقی نتیجے پر پہنچنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ چوکیدار کے اندازے کے مطابق گھر میں کوئی بھی چیز اِدھر سے اُدھر نہیں ہوئی تھی۔ چوہدری دلاور کے ہاتھ کی بہت قیمتی گھڑی، اس کی ہیرے کے نگینے والی سونے کی انگوٹھی اور بیڈ سائیڈ ٹیبل کی دراز میں رکھے ہوئے سترہ ہزار روپے بھی محفوظ رہے تھے۔ کسی نے سیف کو توڑنے یا اس کا تالا کھولنے کی کوشش تک نہیں کی تھی اور سامنے رکھی ہوئی ہر قیمتی چیز چھوڑ دی تھی۔ کمرے کے اندر مزاحمت کے آثار ناپید تھے چنانچہ ڈکیتی یا چوری کو خارج از امکان قرار دے دیا گیا تھا اور یہ خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ کسی جانی دشمن نے ان پر سوتے میں وار کیا اور قاتل اپنے جذبۂ انتقام میں وحشت اور جنون کا شکار تھا ورنہ وہ دوسرا وار نہ کرتا۔ سر تو کلہاڑی کے تیز دھار والے پھل کی پہلی ضرب سے ہی دو حصّوں میں تقسیم ہو گیا ہو گا مگر قاتل نے چہرے کا قیمہ کر دیا۔ اخبار نے ایک پولیس افسر کے حوالے سے لکھا تھا کہ چوکیدار بظاہر بے قصور معلوم ہوتا ہے اور اصل حقائق کا انکشاف تو چوہدری دلاور کی فیملی کے

دیگر افراد کے بیانات اور مزید تفتیش کے بعد ہی ہوگا لیکن ابھی جو مفروضہ پیشِ نظر شہادتوں کی بنیاد پر قائم کیا جاسکتا ہے یہی ہے کہ چوہدری صاحب کا کوئی جانی دشمن گھر سے باہر ان کی گاڑی کے پچھلے حصے میں چھپ کر بیٹھا رہا اور ان کے ساتھ اندر جا پہنچا یا وہ کوئی ایسا قابلِ اعتماد آدمی تھا جسے وہ خود اپنے ساتھ اندر لے گئے اور جسے چوکیدار نہ دیکھ سکا۔ اس شخص نے چوہدری صاحب کو قتل کرنے کے بعد انتظار کیا کہ چوکیدار اپنی جگہ سے ہلے تو وہ باہر نکلے اور جب بالآخر چوکیدار اپنی تسلی کے لیے اندر گیا تو قاتل اطمینان سے باہر نکل گیا۔ اسے قتل کے سارے سراغ مٹانے اور اپنے ہاتھوں یا کپڑوں کو نظر آنے والے ہر داغ سے محفوظ رکھنے کے لیے کافی وقت مل گیا تھا۔

خبر تفصیلی ہونے کے باوجود نامکمل تھی اور اسی جملے پر ختم ہوئی تھی کہ پولیس تفتیش کر رہی ہے مزید سنسنی خیز انکشافات کی توقع ہے۔ وقت کی کمی کے باعث اخبار والوں کو چوہدری صاحب سے منسوب پرانی باتیں اپنے قارئین کو یاد دلانے کا موقع نہیں مل سکا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ اگلے دن اخبارات اپنی اپنی فائلوں سے گزشتہ واقعات کا پچھوڑ پیش کریں گے تو اس میں کیا ہوگا۔ جانی دشمنوں کی فہرست میں سب سے اوپر میرا نام ہوگا۔ پھر میری کیس ہسٹری ہوگی۔ یہ تذکرہ ہوگا کہ چوہدری دلاور پہلے سے رحمت کباڑی نام کے ایک ڈرائیور کے قتل کے الزام میں ملوث تھے اور حال ہی میں انھیں انسپکٹر فتح شیر کے قتل میں ملوث کرنے کی کوشش بھی کی گئی تھی۔ کرنے والوں نے بروقت بندوبست کر لیا تو کل کے اخبارات مجھے شیطان بنا کے پیش کریں گے کہ برطانیہ میں قیام سے اب تک میں نے قانون شکنی کے کتنے ریکارڈ توڑے ہیں اور کس کس نوعیت کے سنگین الزامات میں اشتہاری مجرم کی حیثیت سے مطلوب ہوں۔ اس کے برعکس چوہدری دلاور کو فرشتہ سیرت ثابت کرنے کے لیے بتایا جائے گا کہ کس طرح وہ "خود ساختہ" یعنی اپنی ذاتی صلاحیت اور محنت کے بل پر ترقی کر کے اس مقام تک پہنچنے والے آدمی تھے۔ کتنے خدا ترس تھے۔ کتنے رحمدل اور فیاض تھے۔ کتنے یتیموں کو پالتے تھے اور کتنی بیواؤں کی مدد کر چکے تھے۔ وغیرہ وغیرہ۔ مدح و ستائش یوں بھی ہر مرنے والے کا حق بن جاتی ہے اور اگر کوئی برا کہے تو لوگ کہتے ہیں کہ مرنے والے کی نیکی بدی اس کے ساتھ گئی۔ اب کرو تو دعائے مغفرت کر دو یا لواحقین کے لیے صبرِ جمیل کی دعا۔ اگر اس اہتمام کے لیے دولت بھی صرف کر دی جائے تو چوہدری دلاور جیسے شیطان بھی مر کے عظیم انسان کہلاتے ہیں اور ان کی وفات کو ناقابلِ تلافی نقصان بھی کہہ دیا جاتا ہے۔ عمر بھر بدنامی کمانے والے کے لیے نیک نامی کی سند خریدی جاسکتی ہے یہاں تک کہ ان کو جنتی قرار دینے والے بھی مل جاتے ہیں۔

لیکن مجھے چوہدری دلاور کے جہنمی ہونے کی نہ خوشی تھی اور نہ اس کا افسوس تھا میرے سامنے تو ایک ہی سوال تھا کہ یہ کس نے کیا؟ اور اس سوال کا جواب نہ ہونے کے باعث میرا ذہن یہ سوچنے پر مجبور تھا کہ اب کیا ہوگا؟ کیا واقعی قتل و خونریزی کی ننگِ انسانیت داستان کا حرفِ آخر آگیا؟ وہ طویل جنگ ختم ہوئی جس میں لاتعداد بے گناہوں نے زندگی کی رزم گاہ میں جان کا نذرانہ دیا؟ ان میں سے کچھ ایک طرف تھے اور کچھ دوسری طرف لیکن بیشتر کسی طرف بھی نہیں تھے مگر یہ تو ہر جنگ کا المیہ ہے کہ اس میں سب سے زیادہ وہی کام آتے ہیں جو امن اور صلح کے فلسفے پر کامل اعتقاد رکھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ جنگ کیا مسئلوں کا حل دے گی۔ جنگ تو خود ہی ایک مسئلہ ہے۔ کون کب مرا؟ کیسے مرا اور کہاں مرا؟ یہ سب بے معنی ہوگیا تھا اور سوال صرف ایک رہ گیا تھا کہ کیوں مرا؟ بالآخر دلاور بھی مر گیا تھا اور اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ اسے قانون کے ہاتھوں نے تختۂ دار تک پہنچایا یا کسی مظلوم نے کیفرِ کردار تک پہنچایا۔ مارا تو اسے ایک ہی بار جاسکتا تھا خواہ اس کی موت کتنی ہی ذلت آمیز اور عبرت آموز کیوں نہ ہو۔ اب صرف میں رہ گیا تھا اور مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ یکلخت وہ سب بارِ ملامت میرے کاندھوں پر منتقل ہوگیا ہے جو دلاور نے اٹھا رکھا تھا۔ وہ مر کے سبک سر ہوگیا تھا اور میں سرگرداں کہ اب حساب دوں تو کیا اور جواب دوں تو کسے کہ یہ سب کیا تھا؟ معرکۂ حق و باطل! خیر و شر کی جنگ؟ خود کو زیادہ طاقتور، زیادہ خوش قسمت اور زیادہ چالاک شکاری ثابت کرنے کی کوشش۔ اگر انجام یہی ہونا تھا تو آغاز سے کیا حاصل تھا؟ اس کا معاملہ تو یومِ حشر پہ گیا۔ جب اپنا اپنا دعویٰ رکھنے والے دلاور کا گریبان تھام لیں گے مگر اس دنیا میں صرف میرے وجود کا مسئلہ رہ گیا جس نے سارے مسائل کھڑے کیے تھے۔ دلاور چین سے قبر میں سوئے گا۔ میں بدستور آج کے غم اور کل کے اندیشوں میں گرفتار رہوں گا۔ چھپتا پھروں گا اور بھاگتا رہوں گا۔ کسی مقصد اور کسی سمت کے بغیر زندگی سے فرار کے عذاب کو جھیلتا رہوں گا اور سوچتا رہوں گا کہ اب اس ایم ڈبلیو ڈی کمپلیکس کا کیا بنے گا جسے وزیر خان سے چھین لیا گیا تھا اور جس کا وارث میں تھا؟ اس کا وارث اب کون ہوگا اور وہاں اب کیا ہوگا؟ وہی جو پہلے ہونا تھا یا وہ جو پہلے نہیں ہوتا تھا؟ رابعہ... بے وقوف جذبات کی رو میں بہ کر تباہ ہو جانے

والی لڑکی۔ تو کہاں جائے گی؟ کچھ اپنا ٹھکانہ کر لے۔ اس ٹھکانے بنایا ہے جہاں تو نے فکرِ آشیاں بندی کی تھی۔ اس گھر کی دیواریں ہیں تو صرف وقت کے آسیب زدہ رہ سکتے ہیں جہاں وزیر خان رہا اور اب وہ تنہا ریٹائرڈ زندگی گزارنے والا سیشن جج بھی رہے گا۔ یہ جگ رین بسیرا بندے نہ تیرا نہ میرا۔

میں نے محسوس کیا کہ میں بیٹھا رہا تو پاگل ہو جاؤں گا۔ میرے اردگرد کی دنیا بے وجود ہوگئی تھی جس میں انسان چلتی پھرتی اور آتی جاتی پرچھائیاں بن گئے تھے اور ٹریفک کے شور میں بھی ایک سناٹا تھا کہ صدا دیتا تھا اور شہر کو شہرِ خموشاں کی ویرانی نے یوں ڈھک لیا تھا جیسے ہزاروں صدیوں کی تہذیب کو مٹی ڈھانپ لیتی ہے۔ میں نے ایکبار پھر خبر کو دیکھا جس کا ہر لفظ مجھے پہلے ہی ازبر ہوگیا تھا اور بینچ سے اٹھ کر فٹ پاتھ پر چلنے لگا۔ نہ جانے کب مجھے خیال آیا کہ پیدل جانے کے بجائے میں ٹیکسی میں جا سکتا ہوں اور کم وقت میں زیادہ محفوظ طریقے سے اور ینٹ ہوٹل پہنچ سکتا ہوں جہاں محسن اور ٹیڈی میری واپسی کے منتظر ہیں۔ اس دشتِ تنہائی میں جہاں خیالات کی بادِ سموم میں راستہ سجھائی نہ دیتا تھا یہ خیال کسی نشانِ منزل کی طرح تھا۔ میں نے ناامیدی اور احساس بیچارگی کو کم ہوتے محسوس کیا۔ ہاں۔ اس وقت مجھے رفاقت کی اور دستگیری کی ضرورت ہے۔ ان سہاروں کی ضرورت ہے جو میرے یقین کو اور میرے اعتماد کو بحال کر سکیں اور میں اس قابل ہو سکوں کہ اس نئی اور غیر متوقع صورتِ حالات کا جائزہ عقلِ سلیم کی مدد سے لے سکوں۔

ایک رکشا والے نے بکمال مہربانی مجھے بٹھا لیا اور اس بات پر بہت ناراض ہوا کہ میں نے اسے روکنے کے لیے رکشا کے سامنے آکر لیٹنے کا طریقہ کیوں اختیار کیا حالانکہ میں پریشان خیالی کے باعث فٹ پاتھ سے سڑک پر اترتے وقت ایک گڑھے میں پیر پڑنے سے گرا تھا مگر فوراً کھڑا بھی ہوگیا تھا۔ سفر کے دوران میں بھی اس نے اپنی لن ترانی جاری رکھی اور مجھے متعدد مفید مشوروں سے مفت نوازا۔ ان میں ایک یہ تھا کہ میں اپنی ساری پریشانیوں کی تفصیل ایک خط میں لکھ کر پیر ڈونگے شاہ کے مزار پر سوا روپے نقد اور سوا تولے چاندی کے ساتھ رکھ آؤں تو اسی رات بابا مذکور خواب میں نمودار ہو کے سارے مسائل کا حل بتا جائیں گے۔ غالباً میں صورت سے اتنا پریشان لگتا تھا کہ وہ رحم کھانے پر مجبور تھا۔ وہ نان اسٹاپ بولنے کا عادی تھا چنانچہ اس نے آخری وقت میں ان شکوک کا اظہار بھی کر دیا کہ اسے میری صورت دیکھی ہوئی لگتی تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ ابھی تک اس کے لاشعور میں یا تحت الشعور میں میری اخبار میں شائع ہونے والی تصویر محفوظ ہے۔ اس سے پہلے کہ تصویر کا نقش شعور کے خانے تک پہنچتا میں نے رکشا رکوایا اور اس کی روانگی کے بعد پیدل چل کے اورینٹ ہوٹل پہنچا۔

خلافِ توقع محسن کو اور ٹیڈی کو ابھی تک اس خبر کا علم نہ تھا جو ہمارے لیے اتنی ہی بڑی خبر تھی جتنی دنیا کے لیے آخری ایٹم بم گرائے جانے کی ہوگی۔ انھوں نے انتظار سے اکتا کر قیلولہ شروع کیا تھا کہ میں نے دستک دی۔ اس سے پہلے کہ وہ مناسب الفاظ میں مجھے خوش آمدید کہتے اور میرے ساتھ وہی سلوک کرتے جو میں نے ان کے ساتھ اپنے پرانے (یا اب رابعہ کے) گھر میں کیا تھا انھوں نے میری صورت کے جغرافیے پر غور کیا اور نقشہ بدلا ہوا دیکھ کر تشویش میں مبتلا ہوگئے۔

"کیا ہے عزیزم!" محسن نے کہا۔ "تجھ پر چیل چلاڈ کی سی کیفیت ہے!"

"قسم اللہ کی سکندر بادشاہ! تمھارا چہرہ تو گھنٹا گھر بنا ہوا ہے، بارہ بجے ہوئے ہیں۔" ٹیڈی بولا۔ میں نے جواب دینے کے بجائے ان کے سامنے اخبار پھینک دیا اور خود ایک بیڈ پر دراز ہوگیا۔

"مشہور صنعتکار چوہدری دلاور کا قتل" محسن نے زور سے پڑھا اور اس کے الفاظ پر ٹیڈی یوں اچھلا جیسے ہر لفظ ریوالور سے نکلنے والی گولی تھا۔

"کیا؟ کس کا... کون...؟" اس نے گڑبڑا کے کہا اور اخبار چھین لیا۔ محسن نے بلاارادہ اسے ایک گالی دی اور اخبار پھر اس کے ہاتھ میں آگیا۔ پھر محسن نے اس کی درخواست پر خبر کو باآواز بلند پڑھنا شروع کیا۔ میں سگریٹ سلگائے خالی الذہن لیٹا چھت کو دیکھتا رہا جس پر گزرے ہوئے وقت کی پرچھائیاں اسی طرح گڈمڈ ہو رہی تھیں جیسے میرے خیالات... محسن نے خبر کو دوسری بار خاموشی سے اور زیادہ توجہ کے ساتھ دیکھا۔

"یہ... یہ کیسے ہوسکتا ہے یار..." اس نے طویل خاموشی کے ایک مضطرب وقفے کے بعد کہا۔

اخبار میں وہی آتا ہے جو ہو جاتا ہے۔ اور اس میں کون سی نہ ہونے والی بات ہے؟" میں نے کہا۔

محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "یقین نہیں آتا کہ چوہدری دلاور جیسے لوگ اتنی آسانی سے قتل کیے جاسکتے ہیں۔"

"قاتل بھی اس کی خوابگاہ تک اتنی آسانی سے نہیں پہنچا ہوگا، جتنی آسانی سے میں یہاں اس کمرے میں پہنچ گیا۔" میں نے کہا۔

"یار یہ... اتنا بڑا کارنامہ کون سرانجام دے سکتا ہے؟" محسن بولا۔ "ہم سے بڑا بھی کوئی شکاری تھا جو اس کی تاک میں تھا۔ کون تھا وہ شکاری؟"

"اصل شکاری تو قضا کا نامہ بر ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ جسے شکار کرنا چاہے کر لیتا ہے۔ اُسے بہانوں اور وسیلوں کی کمی نہیں۔ ہم کس زعم میں اس کی جان کے طلبگار بنے پھرتے تھے۔"

"پھر بھی سوچنے کی بات ہے۔" محسن نے کہا۔ "ہم تو اچھی طرح جانتے ہیں کہ در پردہ اس کی دوستی کس سے ہے اور دشمنی کس سے۔ میں اسے کاروباری رقابت کا نتیجہ نہیں سمجھتا۔ وہ لوگ جذباتی ہو کے قتل نہیں کرتے۔ ان کے لیے آدمی کی حیثیت مشین کے ایک پُرزے کی ہے جو صحیح کام کرتا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ بدل دیا جاتا ہے۔ اسے بدلنے کے لیے وہ کوئی خاص تردد نہیں کرتے اور کوئی پریشانی مول نہیں لیتے۔ ریوالور کی ایک گولی سے سر میں ایک سوراخ کر دینا کافی سمجھتے ہیں اور لاش پھر سڑک پر پڑی رہے یا مردہ خانے میں، وہ بھول جاتے ہیں اور اپنا کام کرتے ہیں۔ یہ تو کسی نے اس کے لہو سے انتقام کی پرانی آگ ٹھنڈی کی ہے اور وہ آگ اتنی شدید تھی کہ تھوڑے سے خون سے نہیں بجھ سکتی تھی جو ایک جان لینے والی گولی کے زخم سے بہتا ہے۔ اس نے دلاور کو اتنی بار قتل کیا کہ اس کے جسم سے خون کا آخری قطرہ بھی نکل جائے اور ایک نظریہ میرا یہ بھی ہے کہ اس قاتل نے خنجر سے دل پہ وار نہیں کیا اور ریوالور کی سب گولیاں سینے میں نہیں اتاریں۔ اس نے ایک شیطانی دماغ کو نیست و نابود کیا۔ جسم کے اس حصے کو تباہ کیا جو اس کے خیال میں سب سے زیادہ مجرم تھا۔"

محسن کی بات نے مجھے متوجہ کر لیا تھا۔ اس کی توجیہہ جذباتی نہیں عقلی تھی اور اس کی سوچ کا انداز میری سوچ کے مقابلے میں زیادہ ٹھوس اور منطقی تھا۔ "تیرے خیال میں ایسا شخص کون ہو سکتا ہے؟ ہمارے علاوہ؟" میں نے کہا۔

"میرے ذہن میں سب سے پہلے الف دین کا نام آتا ہے۔" محسن نے کہا۔ "اسی جنون کی کیفیت میں وہ فتح شیر کا سر کاٹ گیا تھا۔ طافو کے ساتھ ہونے والے سلوک اور اس کی لاش پر ڈھائے جانے والی غیر انسانی مظالم کے ذکر نے اس کا دماغ الٹ دیا تھا۔ اس کی وحشت فتح شیر سے بدلہ لے کر کم نہیں ہوئی تھی۔ دیوانے کے دماغ میں ایک خیال سما جائے تو اسے کون سمجھائے۔ اس کی اپنی عقل سو فیصد یقین کے ساتھ خود کو حق بجانب قرار دیتی ہو تو وہ دنیا کی کیسے سُنے۔ اس نے بیوی بچوں کے ساتھ فرار اختیار کیا تو صرف اس لیے کہ کہیں جذباتی رشتوں کا خیال اس کے ارادوں کو کمزور نہ کر دے۔ ایسے لوگ بہت خطرناک ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ پاگل ہو جاتا تو پہلے سب رشتوں کو ختم کرتا۔ پھر دلاور کو اور اس کے بعد اپنے آپ کو مگر وہ پاگل نہیں ہوا تھا۔ صرف ایک خیال سے مغلوب ہو گیا تھا چنانچہ اُس نے عقل کی ساری سپاہ کو ایک محاذ پر مجتمع کر لیا اور اپنے مقصد کو حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔ جیسے طافو کے قاتل نہیں پکڑے گئے تھے، ایسے ہی دلاور کے قاتل کو کبھی کوئی نہ پکڑ سکے گا۔ طافو کا جسدِ خاکی بھی سلطان کی عبرت بنا تھا اور دلاور کو بھی اس نے تماشائے عبرت بنا دیا۔"

"شاید تو ٹھیک ہی کہتا ہے!" میں نے کہا۔ "دشمن تو بہت تھے دلاور کے مگر ان میں الف دین کوئی نہ تھا۔ ہاں... اور اسی لیے یہ جرم خود بخود ہمارے نام لکھا جائے گا۔" محسن تلخی سے بولا۔ "الف دین کو بھلا کون جانتا ہے۔"

"مجھے ایسا لگتا ہے کہ الف دین نے ہمارے لیے سلامتی کے در بند کر دیے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اگر دلاور زندہ رہتا تو شاید کسی دن ہم اُسے دنیا کی عدالت میں بھی ثبوت اور شہادتوں کے ساتھ گھسیٹ لاتے اور خود اس کی زبان سے اعتراف کرا لیتے کہ مجرم کون تھا۔ اب تو یہ بھی نہیں ہو سکتا۔"

"میرا ذہن اس خبر کے بین السطور کچھ اور پڑھ سکتا ہے۔" محسن نے پھر اخبار پہ نظر جما کے کہا۔ "یعنی وہ بات، سارے فسانے میں جس کا ذکر نہیں۔"

"ان باتوں سے کیا فرق پڑتا ہے۔ نہ ہم مدّعی ہیں نہ منصف۔"

"حقیقت ہمیشہ ایک ہوتی ہے۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ کسی مختلف زاویے سے دیکھا جائے تو حقیقت بدل جائے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ تو ہو سکتا ہے کہ نگاہ کا زاویہ بدل جائے تو حقیقت کا ظاہری روپ بدل جائے لیکن حقیقت تو وہی رہتی ہے۔ زمین کی سطح پہ کھڑے ہو کر دیکھنے سے زمین نہ گول نظر آتی ہے اور نہ گردش میں محسوس ہوتی ہے۔ خلا کی بلندی سے یہ گول چمکتا ہوا سیارہ لگتی ہے۔ کبھی آدمی مریخ سے دیکھے گا تو کچھ اور لگے گی۔"

"بجا ارشاد! اب اس خبر کا پوسٹ مارٹم کرنے سے پہلے خبر کی لاش پہ ایک نظر ڈالتے ہیں۔ کوئی خاص بات؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "خاص بات تو خود خبر ہے۔"

"کیا تو نے اس سے پہلے قتل کی کسی واردات کا اتنا تفصیلی ذکر پڑھا ہے؟" محسن نے کہا۔ "جو کچھ کل آئے گا وہ اس سے بھی زیادہ ہو گا اور اس میں دلاور بمقابلہ سکندر کیس کی تفصیلات ایک خاص زاویے سے پیش کی جائیں گی۔ نہ جانے کیوں مجھے یہ احساس ہو رہا ہے کہ یہ قتل کی خبر نہیں، قتل پہ ایک فیچر ہے جو کسی رپورٹر نے خاصی محنت سے تیار کیا ہے اور ظاہر ہے جب کوئی غیر ضروری محنت کرتا ہے تو بلاوجہ نہیں کرتا۔ اسے محنت کا معقول معاوضہ دیا گیا ہو گا۔"

"اس خیال یا مفروضے کی کوئی اہمیت نہیں۔" میں نے کہا۔ "میں اسے مسترد کرتا ہوں۔"

"تو مجھے یہ بتا کہ اس فیچر میں تصویر کیوں نہیں ہے؟" محسن نے اخبار اٹھا کے کہا۔ "کیا اخبار والوں کو دلاور کی تصویر نہیں مل سکی تھی؟ عموماً مقتول کی تصویر بھی خبر کے ساتھ شائع ہوتی ہے، مردہ حالت میں یا زخمی چہرے کے ساتھ۔"

"اس کیس میں چہرہ اس قابل ہی نہیں رہا تھا کہ تصویر سے شناخت کیا جا سکے۔" میں نے کہا۔ "تصویر اتارنے سے فائدہ کیا ہوتا اور اگر..."

"استاپ! پہلے یہی نکتہ توجہ طلب ہے۔" محسن نے کہا۔ "کہ چہرہ شناخت کے قابل نہیں رہا۔"

ایک دم مجھ پر چودہ طبق روشن ہو گئے۔ "تو پاگل ہو گیا ہے؟ یہ کہنا چاہتا ہے کہ وہ دلاور کا چہرہ نہیں!"

"کیا یہ ناممکن ہے کہ چہرہ کسی اور کا ہو؟" محسن نے کہا۔ "مشکل تو ہے مگر کیا یہ ناممکن ہے؟"

"ناممکن بھی ہے۔" میں نے اٹھ کر ٹہلتے ہوئے کہا۔ "دلاور کی شناخت بغیر چہرے کے بھی ہو گئی ہے۔ پولیس نے ایسے ہی نہیں کہہ دیا کہ مشہور صنعت کار چوہدری دلاور کو قتل کر دیا گیا ہے... اخبار بھی ذمے دار ہے..."

"کس نے شناخت کیا ہے چوہدری دلاور کو؟" محسن نے میز پر مکا مارا۔ "اس کے چوکیدار نے اور اس نے شناخت کی بنیاد بنایا ہے حالات اور واقعات کو۔ چونکہ گزشتہ شب گاڑی میں چوہدری دلاور ہی آیا تھا اور لاش بھی اس کے بیڈ روم میں پائی گئی۔ اس کے کپڑوں میں، اس کی گھڑی انگوٹھی کے ساتھ اور وہ لاش حلاوہ کے قد و قامت کے مطابق بھی ہے اس لیے وہ دلاور کے سوا کون ہو سکتا ہے اور کون چاہے گا کہ اس کے گھر میں کمرے میں اسی کے کپڑوں میں لپٹا ہوا پڑا رہے اور فقط چاہنے سے کیا ہوتا ہے، میں اگر چاہوں کہ ہو بہو منظر بن کے اس کے گھر میں، اس کی خواب گاہ میں، اسی کا لباس اختیار کروں اور پھر یوں مر جاؤں کہ شناخت ممکن نہ رہے... تو کیا یہ ہو سکتا ہے؟"

"یہ کیا فضول بکواس ہے!" میں نے کہا۔ "ظاہر ہے کہ نہیں ہو سکتا۔"

"لیکن اگر دلاور یہ چاہے کہ دلاور مر جائے تو ہو سکتا ہے۔" محسن نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

میں بھونچکا رہ گیا۔ "تیرا مطلب ہے دلاور نے قتل کا یہ ڈراما ہوا سٹیج کیا ہے؟ وہ زندہ ہے اور اس نے کسی کو مار کر اپنی جگہ ڈال دیا ہے؟" میں نے کہا اور استاد ٹیڈی کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

"میرا بالکل یہی مطلب ہے۔ میری ساتویں حس کہتی ہے کہ دال میں کچھ کالا ہے۔" محسن بولا۔

میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کمرے کے دو چکر لگائے اور ایک گلاس ٹھنڈا پانی پیا۔ کھڑکی سے باہر جھانکا اور پھر اپنی جگہ آ بیٹھا۔ "مجھے سخت شک ہو رہا ہے کہ اگر میں پاگل نہیں ہوا ہوں تو پھر تو پاگل ہو گیا ہے۔ باقی دنیا ویسی ہی ہے جیسی تھی۔"

"باقی دنیا پاگل ہے جو اس خبر پر یقین کر چکی ہو گی۔" محسن نے کہا۔ "میں نے ابھی تک اس میں سے سچائی کے پچاس فیصد عنصر کو خارج کر دیا ہے... یا یوں سمجھ لے کہ اس میں پچاس فیصد جھوٹ کو تلاش کر لیا ہے۔ یہ خود تو بھی تسلیم کر چکا ہے کہ حقیقت کبھی پچاس فیصد نہیں ہوتی۔"

"دلاور یہ ڈراما اپنے لواحقین کی مدد کے بغیر نہیں کر سکتا۔"

"بالکل ٹھیک۔ مگر لواحقین تو کسی نامعلوم عزیز کے گھر میں ہیں۔" محسن بولا۔ "اور انتظار کر رہے ہیں کہ مری میں برف گرنی شروع ہو تو وہ آ گے جائیں۔ افسوس کہ وہ لاش کی شناخت کے لیے دستیاب نہیں۔"

"مگر آج نہیں تو کل انھیں معلوم ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔

"چوکیدار اَن پڑھ ہے، اس نے اخبار نہیں پڑھا تھا مگر مجھے معلوم ہے کہ کل سے مری میں برف پڑ رہی ہے۔" محسن بولا۔ "وہ واپس آ کے حیران یا پریشان ہو سکتے ہیں کہ انھیں یہ خبر نہیں ملی۔ مری کے اسنو فال میں اخبار نہیں پہنچتے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چوہدری دلاور ان کے ساتھ ہی لوٹ آئے اور ان سے زیادہ حیران پریشان ہو کہ میرے گھر میں میرے نام سے کوئی مقتول ہو گیا اور پولیس بعد میں یہ گتھی سلجھاتی رہے کہ وہ کون تھا جس نے ایسا کیا؟ اور کیا تو کیوں کیا؟ ظاہر ہے ان سوالات کا دلاور کیسے جواب دے سکتا ہے جو اپنی فیملی کے ساتھ مری میں برف باری کا نظارہ کر رہا تھا۔"

"پولیس چوکیدار کو پیش کرے گی۔ کیوں سکندر بادشاہ؟" استاد ٹیڈی نے کہا۔

"چوکیدار کہے گا سوری! مجھ سے شناخت میں غلطی ہو گئی۔" محسن ہنسا۔ "اور دلاور کہے گا سوری! میں تم کو بتا کے نہیں جا سکا، میں اپنی گاڑی دفتر میں چھوڑ گیا تھا۔"

"پولیس سوال کرے گی کہ آپ اپنی گھڑی اور انگوٹھی گھر پہ چھوڑ گئے تھے؟" میں نے کہا۔

"دلاور جواب دے گا کہ میرے پاس تین گھڑیاں اور چار انگوٹھیاں ہیں۔ میں اگر ایک بھی نہ پہنوں تو میری مرضی۔"

"اُلو کے پٹھے! سوال جواب کیسے جائے گا۔" یہ نہیں بتائے گا کہ دلاور کو اپنے قتل کا یہ ڈراما کر کے آخر کیا ملے گا؟" میں نے چلا کر کہا۔"کیا فائدہ ہو گا اُسے؟"

"یہ تو ایک جواری بھی نہیں جانتا کہ کچھ داؤ پر لگانے سے کیا ملے گا۔" محسن نے کہا۔"لیکن فرض کرو ہم اس خبر پہ یقین کر لیتے ہیں یا اس کی صداقت جاننا چاہتے ہیں تو ظاہر ہے ہم میں سے کوئی دلاور کی کوٹھی کا رُخ کرے گا۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ اب سانپ مر گیا ہے تو بل میں انگلی ڈالنے سے کیا ڈرنا۔ ہم خود کو ماشاء اللہ بہت ذہین، چالاک اور بہادر بھی سمجھتے ہیں۔ ہم ہاتھ ملائیں گے، ایک دوسرے کو مبارکباد دیں گے کہ بڑا دلاور بنتا تھا، مارا گیا اسی خوش فہمی میں۔ اور ہم اس خوشی کے علاوہ خوش فہمی میں اگر دلاور کے گھر کے قریب پھٹکے یا جنازے میں شامل ہوئے اور قبرستان گئے تو پکڑوانے والے ہمیں فوراً پکڑوا دیں گے۔ یہ تو بعد میں ثابت ہو ہی جائے گا کہ الحمدللہ چوہدری دلاور بخیر و عافیت ہیں۔ اس جال میں پھنس کر ہم بخیر و عافیت نہیں رہیں گے۔"

"تیری بات سے میں قائل ہو جاتا ہوں کہ یہ سب جھوٹ کا جال ہے۔" میں نے کہا۔"مگر یہاں بیٹھ کر صرف الفاظ سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ یہ سچ ہے تب بھی اور جھوٹ ہے تب بھی۔"

"تصدیق تو یقیناً کرنی پڑے گی۔" محسن بولا۔"لیکن ہم بھی جوابی چال سوچ سمجھ کر چلیں گے۔ وہاں دلاور کی جگہ کوئی اور مر گیا ہے تو ہماری جگہ بھی کوئی اور پہنچ سکتا ہے۔ مثلاً اپنے مرزا غالب ہیں۔"

"غالب نے دلاور کو قریب سے نہیں دیکھا ہے۔" میں نے کہا۔"اسے صرف ہم پہچان سکتے ہیں اور یہ بھی دیکھ سکتے ہیں کہ وہاں کون کون ہمارے لیے چشم براہ ہے۔ استاد پیڈرو اور نواب خسرو جمشید گاما ماجھی — اس کا منیجر اور دلاور کے سب دست راست۔ جب جنازہ چوہدری دلاور کا ہو گا، تو یہ صورتیں تو ضرور نظر آئیں گی۔ خواہ وفات اصلی ہو یا نقلی۔"

"بس تو ایسا کرتے ہیں کہ بقلم خود چلتے ہیں اور چوہدری صاحب کی آخری رسوم میں شرکت فرما کے ثوابِ دارین حاصل کرتے ہیں۔" محسن بولا۔"بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب۔ تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں۔ اگر یہ دامِ اجل ہمارے لیے پھیلایا گیا ہو گا تو سب شکاری چوکنے ہوں گے۔"

"ہم تسلیم بجا لائیں گے اور کہیں گے کہ سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے۔" میں نے کہا۔"آخر شرافت اور مروت بھی کوئی چیز ہے۔ وہ سب قبرستان سے گھر چلے جائیں گے اور ہم بڑے گھر۔"

"میں نے جو شعر ابھی پڑھا تھا اس پہ دوبارہ غور فرمائیے۔" محسن بولا۔"اس میں تماشائے اہلِ کرم کے ساتھ فقیرانہ بھیس کا بھی ذکر تھا۔ ہم ایسا بھیس بدلیں گے کہ خدانخواستہ قضاوطن… تو ایکبار خود فرشتۂ اجل بھی دھوکا کھا جائے۔"

"لیکن بھیس بدلنے کا فن مجھے تو نہیں آتا۔" میں نے کہا۔"اب تک جو تھوڑا بہت ظاہری حلیہ بدل کے کام چلا… وہ مذاق تھا۔ صورت بدلنا اتنا آسان نہیں۔ وہاں ہر نظر کو تلاش ہو گی تو بچنا محال ہو گا۔"

"ویسے تو میک اپ صرف خواتین ہی شوقیہ کرتی ہیں۔" محسن بولا۔"لیکن فلم، اسٹیج اور ٹیلی وژن کی دنیا میں کچھ ایسے ماہر ہوتے ہیں جو میک اپ مین کہلاتے ہیں اور ایسا کمالِ فن رکھتے ہیں کہ بادشاہ کو فقیر اور فقیر کو بادشاہ بنا کے دکھا دیں۔ جوان کو بوڑھا اور بوڑھے کو جوان کر دیں یہاں تک کہ ہم چاہیں تو تمھی چوہدری کو دلاور اور استاد پیڈرو کا ایسا نقشِ ثانی بنا دیں کہ خود دلاور اور پیڈرو چکرا جائیں اور مشکل میں پڑ جائیں کہ اصلی کون ہے نقلی کون۔"

"تو جانتا ہے کسی ایسے ماہرِ فن کو؟" میں نے کہا۔"ایک بات مت بھولنا نورِ چشم کہ یہاں جو کچھ ہم سوچ رہے ہیں تمہارے دشمن بھی سوچ سکتے ہیں اور انکل رضوی بھی سوچ سکتے ہیں۔ انکل رضوی کو بے وقوف نہیں بنایا جا سکتا۔ ان کی نظر چہروں کا ایکس رے کر سکتی ہے۔ وہ ہم سے پہلے وہاں پہنچیں گے کیونکہ وہ بھی کسی الف دین کو نہیں جانتے اور یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوں گے کہ یہ واردات ہم ہی کر سکتے ہیں۔"

"وہ دلاور کی موت پر یقین کر سکتے ہیں مگر یہ نہیں تسلیم کر سکتے کہ اس قتل میں ہمارا ہاتھ ہو گا۔" محسن نے پورے وثوق سے کہا۔"وہ ہماری فطرت سے واقف ہیں۔ ان کو معلوم ہے کہ ہم اپنے دفاع میں تو قتل کر سکتے ہیں لیکن کسی سوتے ہوئے شخص کو اتنی بے دردی سے ہلاک نہیں کر سکتے۔ ہم اتنے سفاک نہیں ہیں۔ تاہم ان سے وہاں ملاقات یقینی ہے۔"

"میرا خیال ہے ابھی تو لاش پولیس کے قبضے میں ہی ہو گی۔" میں نے کہا۔"وہ پوسٹ مارٹم کی قانونی کارروائی پر عمل کریں گے۔ کیا یہ زیادہ آسان نہیں ہو گا کہ ہم اسپتال میں ہی چوہدری صاحب کے درشن کر لیں۔"

"یہ بھی ہو سکتا ہے۔" محسن نے کہا۔"پہلے وہاں جا کے دیکھتے ہیں کہ وارث بن کے کون آیا ہے اور لاش کون لے کر جاتا ہے۔ وہاں ناکامی ہوئی تو پھر گھر پہنچیں گے۔ وہ ہمارا انتظار کریں گے اور جنازہ رات سے پہلے نہیں اٹھائیں گے۔"

"رات ہونے میں کتنی دیر ہے۔ کیا اتنے کم وقت میں ہمارا چہرہ بدلا جا سکتا ہے؟" میں نے کہا۔

"میں اپنے مرزا غالب پر انحصار کر رہا ہوں۔ اس کی تو ہر جگہ ہے۔" محسن نے کہا۔"اس کے فلیٹ میں چلتے ہیں یا اس کے آفس سے معلوم کرتے ہیں۔ ویسے تو اس کا کوئی ٹھکانہ نہیں اور کوئی وقت نہیں کہ کب کہاں ملے گا۔ پھر بھی کوشش کر کے دیکھنے میں ہرج نہیں۔"

"مجھے رابعہ سے بھی بات کرنی تھی۔" میں نے کہا۔"اس کی گاڑی کہاں ہے؟"

"وہیں کھڑی ہے۔" محسن بولا۔"ہم اس کے قریب جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔"

"شمشاد کی گاڑی کو کہاں چھوڑا تھا؟" میں نے کہا۔

"اس کے گھر سے دو گلیاں چھوڑ کر۔ اب تک اسے مل چکی ہو گی۔" محسن نے کہا۔

"رابعہ کو بتا دیتے ہیں کہ ہم اس کی گاڑی استعمال نہیں کر سکے۔" میں نے کہا۔"بہتر ہے وہ خود بھی گاڑی لینے نہ جائے۔ گاڑی کی گمشدگی کی رپورٹ لکھوا دے، پولیس پہنچا دے گی۔"

"یہ ٹھیک ہے۔ دلاور کے قتل کی خبر بھی اُسے مل ہی چکی ہو گی۔ اسے یہ بھی بتا دیتے ہیں کہ ہمارا پروگرام کیا ہے۔" محسن بولا۔"اگر منظر سیدھا دلاور کے گھر چلا جائے تو اس کے لیے کوئی خطرہ نہیں۔ ایک مشہور آدمی کے جنازے میں کوئی بھی شریک ہو سکتا ہے۔"

"اگر رابعہ ہمیں کہیں سے پک اَپ کر لے تو بہت سی باتیں ہو جائیں۔" میں نے کہا۔"اس کو یہ بتانا ہے کہ میں نے اپنے پرانے گھر میں جا کے کیا دیکھا اور اُس سے پوچھنا ہے کہ وہ اپنا پیسہ اس گھر کو خریدنے میں کیوں خرچ کر رہی ہے جس میں رہنا شاید ہمارے نصیب میں نہیں۔"

"نصیب کا لکھا کون جانتا ہے سکندر بادشاہ!" استاد ٹیڈی نے حوصلہ افزا لہجے میں کہا۔"اب ہم کو ہی دیکھو۔ کل کہاں تھے آج کہاں ہیں۔ وقت بدلتے دیر نہیں لگتی اور رابعہ کی نیت اچھی ہے تو نتیجہ بھی اچھا ہی نکلے گا۔"

باہر سے بہت اونچی آواز میں کچھ لوگوں کے بولنے کی آواز نے مجھے متوجہ کیا۔ دو افراد کی آواز نمایاں تھی اور وہ نہ جانے کس بات پر جھگڑ رہے تھے مگر وہی چھٹی حس جو انسانوں اور حیوانوں کو خطرات سے نمٹنے کے لیے قبل از وقت ہوشیار کر دیتی ہے، میرے کام آئی۔"یہ شور کیسا ہے میاں خوجی؟" میں نے کہا۔

"میں دیکھتا ہوں!" خوجی نے دروازے کا رخ کرتے ہوئے کہا۔

"اس ہوٹل کا منیجر میں ہوں۔" دروازہ کھلتے ہی آواز صاف سنائی دی۔"میں بتا چکا ہوں کہ یہاں کوئی نہیں۔"

"ہمارے پاس وارنٹ ہے۔" دوسری آواز نے کہا۔"بندہ نہیں ملا تو ہم چلے جائیں گے۔"

"عجیب تماشا ہے! جہاں دل چاہا وارنٹ لے کر گھس گئے! ارے بھائی یہ شرفا کا ہوٹل ہے۔ آپ لوگوں کا یہاں اس طرح تشریف لانا ہی بدنامی کا سبب بن جاتا ہے۔ میں تو کسی پولیس والے کو کرائے پر کمرہ نہیں دیتا۔ اگر وہ وردی میں ہو تو صاف انکار کر دیتا ہوں کہ کمرہ خالی نہیں ہے۔" منیجر نے برہمی سے کہا۔

"جس دن میں آؤں گا اُس دن دیکھوں گا۔" دوسرے شخص نے گرج کر کہا۔"سارے کمرے خالی ملیں گے۔"

"ہاں ہاں! اپنے ساتھ توپ لے آنا۔" منیجر بولا۔"جیل خانے کی گاڑی لے آنا۔ مسافروں کو اس میں بھر کر لے جانا اور توپ چلا کے ہوٹل گرا دینا۔ مجھے پھانسی لگا دینا یہیں۔ تم لوگ سب کچھ کر سکتے ہو اور کرتے ہو۔ بادشاہت ہے تمھاری۔ اسی لیے تو شریف آدمی تمھارے سائے سے بھی دور رہنا چاہتا ہے۔"

"بک بک مت کرو۔ یہ دوسرا کمرہ کھلواؤ۔"

خوجی کے اشارے سے قبل ہی صورتِ حال مجھ پہ واضح ہو گئی تھی۔ پولیس وہاں کسی کو تلاش کرتی ہوئی پہنچی تھی۔ ابھی تک میں نے مجرم کا نام نہیں سُنا تھا لیکن سب سے بڑا مجرم میں خود تھا۔ زیادہ امکانات اسی بات کے تھے، وہ میری گرفتاری کے وارنٹ لے کر آئے تھے۔ اگر وارنٹ کسی اور کے لیے تھے تب بھی میں محفوظ نہیں تھا۔ اسے تو پولیس اپنی خوش قسمتی شمار کرتی کہ وہ چھوٹے مجرم کو پکڑنے گئے تھے اور ہاتھ آ گیا بڑا مجرم۔

"کمرہ کس کے نام پہ ہے؟" میں نے کہا۔"میرا مطلب ہے، ٹیڈی کا نام کیا لکھوایا ہے۔"

"خواجہ نیک محمد۔" محسن بولا۔"کبیر خان تو لکھوا نہیں سکتا تھا۔ امیر خان بھی مجھے ٹھیک نہیں لگا تھا۔"

"پولیس تو یہاں بھی آ جائے گی سکندر بادشاہ!" ٹیڈی نے بدحواسی میں کہا۔

"کُل کتنے آدمی ہیں باہر؟" میں نے کہا اور کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا۔

"تین تو پولیس والے تھے۔ رائفل لیے ہوئے۔" وہ بولا۔"ایک تھانیدار قسم کی چیز تھا۔ ہوٹل کا منیجر تھا اور اس کے ساتھ دو بیرے تھے۔ آٹھ دس آدمی تھے۔"

"دروازے سے باہر نکلنے کی تو کوئی صورت نہیں۔" میں نے کہا۔"اب تم ذرا ہمت سے اور عقل سے کام لو۔ ابھی دروازہ بند رکھو اور ان کے دروازہ بجانے کا انتظار کرو۔ ہم یہاں

بیٹھے ہیں تب تک؟"

"کیا مطلب؟" ٹیڈی نے بوکھلا کے کہا۔ "مقابلہ کرو گے ان کا؟"

"نہیں۔ جب وہ دستک دیں تو تم ظاہر کرنا کہ سوتے سے اٹھے ہو۔" میں نے کہا۔ "ہم کھڑکی کے راستے باہر چلے جائیں تو پردہ برابر کر دینا۔ ان پر ختا ہونا کہ..."

"وہ میں کرلوں گا۔ لیکن تم کھڑکی سے کیسے نکلو گے؟ کمرہ تو چوتھی منزل پر ہے۔" ٹیڈی بولا۔

"تم ہماری فکر مت کرو۔ ہم پیراشوٹ کے بغیر بھی کود جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "پچاس فٹ کیا ہیں؟"

"تمہاری ہڈی پسلی سلامت نہیں رہے گی۔" ٹیڈی کا رنگ اڑ گیا مگر میں دیکھ چکا تھا کہ کھڑکی سے سات فٹ نیچے ایک چھجا ہے جو تیسری منزل کے تمام کمروں کی کھڑکیوں کے اوپر سے گزرتا ہے۔ دو فٹ چوڑے اس شیلف نما سائبان کا مقصد بارش کو براہِ راست کھڑکی پر گرنے سے روکنا تھا لیکن ہوٹل میں رہنے والوں نے اُسے کوڑے دان کے طور پر بھی استعمال کیا تھا اور ہر فاضل چیز جو سڑک پر یا کسی راہگیر کے سر پر نہیں گری تھی، وہ چھجے پر جمع تھی۔

"ہم لندن میں تھے تو پارٹ ٹائم سرکس میں یہی کام کرتے تھے۔" محسن نے کہا۔ اس کے اطمینان سے بھی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بھی فرار کے اس راستے سے واقف ہے۔

"وہ تو سو فٹ کی بلندی ہوتی تھی جہاں سے ہم کپڑوں میں آگ لگا کے چھلانگ مارتے تھے اور سیدھے پانی کے تالاب میں غڑاپ۔" میں نے کہا۔ "اب بھی ہم چاہیں تو یہ پیشہ اختیار کر سکتے ہیں۔"

"اس کمرے میں کوئی نہیں ہے۔" باہر سے منیجر کی برہم آواز آئی۔ "دروازہ مقفل ہے۔"

"مجرم باہر سے دروازے مقفل کر کے اندر بیٹھ جاتے ہیں۔" زیادہ تجربہ کار اور خرانٹ انسپکٹر نے کہا۔

"بیٹھ جاتے ہوں گے مگر یہ ہوٹل ہے۔ جو کمرہ بک نہ ہو اس کی چابی میرے پاس رہتی ہے۔" منیجر بولا۔

"یار گولی مارو چابی کو۔ میں کہتا ہوں دروازہ کھولو۔" انسپکٹر نے گرم ہو کے کہا۔ "ورنہ میں حکم دیتا ہوں دروازہ توڑنے کا۔"

"ایسا نارزن تو مجھے نہیں لگتا تم سب میں سے کوئی۔" منیجر نے طنزیہ کہا۔ "لیکن دیکھ لو۔ میں چابی منگواتا ہوں۔ یہ دروازے کاغذ کے بنے ہوئے نہیں ہیں تھانیدار صاحب۔ مارو ٹکر اگر دل چاہتا ہے تو۔"

"تم ضرورت سے زیادہ بھونکتے ہو۔" تھانیدار مشتعل ہو کے بولا۔

"زبان سنبھال کے بات کرو۔" منیجر نے بڑی دلیری سے جواب دیا۔ "تم کو نہیں معلوم کہ یہاں کون کون آتا ہے اور اس ہوٹل کے مالک کسے جانتے ہیں۔ تم تو مجھے بھی نہیں جانتے لیکن میں تم جیسے دس انسپکٹروں کو جانتا ہوں جو یہاں آئے اور گئے۔ تمہاری تنخواہ سے زیادہ یہاں ایک ویٹر کو تنخواہ ملتی ہے۔ مگر وہ رٹپ لیتے ہیں اور تم رشوت لیتے ہو۔"

"اچھی دلچسپ لڑائی ہو رہی ہے۔" میں نے کہا۔

"منیجر بھی سیر کے مقابلے میں سوا سیر ہے۔" محسن نے کہا۔

"ہر ہوٹل کے منیجر کو نڈر اور منہ زور بننا پڑتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اچھے خاصے ہوٹل کے مالک بااثر قسم کے بدمعاشوں کو یہ فرض سونپ دیتے ہیں تاکہ ہوٹل میں امن و امان رہے۔ غلط قسم کے لوگ ہوٹل میں داخل نہ ہونے پائیں اور ہو جائیں تو کوئی غلط کام نہ کر سکیں۔ منیجر پولیس کی مدد کے بغیر ہی ان سے نمٹ لے۔ بدنام ہوٹل چلتا نہیں۔"

"اس کے علاوہ یہ لوگ پولیس کو پیسہ دیتے ہیں۔ ہر تھانے کو اپنے علاقے سے اسی بات کا وظیفہ ملتا ہے کہ جہاں کسی ہوٹل میں غیر قانونی یا غیر اخلاقی دھندے چلتے ہوں وہاں قدم بھی نہ رکھیں۔" محسن بولا۔ "اور یہ لوگ جن کا کھائیں انھی پر غرائیں کو کون برداشت کر سکتا ہے۔"

"غالباً اس ہوٹل کا منیجر ایسے لوگوں میں شامل نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "جو غلط کام نہیں کرتا، وہ کسی سے نہیں ڈرتا۔"

"ممکن ہے اس کو اپنے اور مالکوں کے اثر و رسوخ پر اعتماد ہو۔" محسن بولا اور اس کا ثبوت فوراً ہی مل گیا۔

"لو دیکھ لو۔ چادر جھاڑ لو۔ تکیے کے اندر دیکھ لو۔ میز کے خانوں میں جھانک لو۔" منیجر نے دروازہ کھول کے کہا۔

"تم قانونی کارروائی میں رخنہ ڈال رہے ہو۔ میں تم کو بھی گرفتار کرلوں گا۔" انسپکٹر نے دہاڑ کر کہا۔

"پھر کیا ہوگا؟" منیجر نے تمسخر اڑاتے کے انداز میں کہا۔ "ابھی فون آجائے گا تمہارے ڈی آئی جی صاحب کا تو تمہاری ساری اکڑ فوں نکل جائے گی۔ میں ان سے فون پر بات کر چکا ہوں کہ تم شریف مسافروں کو پریشان کر رہے ہو۔ اخباری بیان دے دیا تا میں نے کہ تم نے مسافروں کے کمروں سے سامان اٹھایا ہے اور کسی مسافر نے تائید کر دی نا تو یہ دونوں پھول اتر جائیں گے کندھے پر سے۔ مجھے تو مالک دس منٹ میں چھڑا کے پھر یہیں بٹھا دیں گے۔ میری اور تمہاری نوکری میں فرق ہے۔"

"دیکھو منیجر صاحب! ہماری بھی مجبوری ہے۔" انسپکٹر کا لہجہ ایک دم بدل گیا۔ "ہمیں مخبر نے اطلاع دی ہے کہ اُس نے ایک اشتہاری مجرم سکندر بخت کو خود یہاں داخل ہوتے دیکھا ہے۔ ہم تصدیق کیے بغیر کیسے رپورٹ دے سکتے ہیں کہ وہ یہاں نہیں ہے۔ بعد میں اس نے کوئی ہنگامہ یا خون خرابہ کیا تو تمہارے لیے بھی پریشانی ہوگی اور ہمارے لیے بھی۔ اس ساتھ والے کمرے میں کون ہے؟"

"اس میں... خواجہ نیک محمد۔" منیجر نے غالباً رجسٹر سے تصدیق کر کے بتایا۔ انسپکٹر کی وضاحت کے بعد اس کا رویہ بھی مصالحت آمیز ہو گیا تھا۔ میں نے محسن کو اشارہ کیا اور ہم دونوں کھڑکی کی طرف لپکے۔

"تم کھڑکی بند کرو اور پردے ڈال کے لائٹ بجھا دو۔" میں نے سرگوشی میں کہا اور ٹیڈی نے سر ہلایا۔ ہمارے پیچھے دروازے پر دستک ہوئی۔ محسن چوکھٹ سے لٹک کر نیچے اتر چکا تھا۔ میرے لٹکتے ہی ٹیڈی نے آواز پیدا کیے بغیر کھڑکی بند کر دی۔

میں اور محسن اب زمین سے چالیس فٹ اوپر دیوار سے چپکے کھڑے تھے۔ جس چھجے پر ہمارے قدم تھے اس کی چوڑائی اتنی نہیں تھی کہ ہم اس پر سیدھے چل سکیں۔ بہت نیچے ہر قسم کی گاڑیاں آجا رہی تھیں اور انسانوں کی بستی کھلونوں کی دنیا نظر آتی تھیں۔ راہ چلنے والوں میں سے کوئی اوپر مُنہ اٹھا کے نہیں چل رہا تھا لیکن بہت سے لوگ دکانوں کے تھڑوں پر اور گھر کے چبوتروں پر بیٹھے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی سر اٹھاتا تو ہمیں دیکھ لیتا۔ اس کے علاوہ تنگ سڑک کے پار دو منزلہ سہ منزلہ مکان بھی تھے۔ یہ شام کا وقت تھا اور سردی بڑھ گئی تھی اس لیے چھت پر کوئی نظر نہیں آرہا تھا اور کھڑکیاں بھی بند کر دی گئی تھیں۔ اس کے باوجود ہمارے دیکھے جانے کے امکانات بہت زیادہ تھے۔ میں نے محسن کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا اور وہ دیوار کے ساتھ ساتھ ہاتھ پھیلا کے سرکنے لگا۔ ہم دونوں میں سے کسی کو بلندی کے خوف کا نفسیاتی مرض نہیں تھا، ورنہ چکر آجاتا تو ہم پہلے بجلی کے تاروں کو شارٹ سرکٹ کرتے۔ برقی دخات پاتے اور تار توڑ کے گھروں میں اندھیرا کرتے ہوئے سڑک پر گرتے تو ہماری ہڈیاں پسِ از مرگ سرمہ ہو جاتیں۔

ہم ساتھ والے کمرے کی کھڑکی تک پہنچ چکے تھے جب کسی نے نیچے سے چیخ کر کہا۔ "او نے اے کی ہو رہیا ہے۔ مرن دی صلاح ہے؟" اور میں نے دیکھا تو نصف درجن کے قریب افراد اوپر مُنہ اٹھائے کھڑے تھے۔ میں نے ہاتھ لہرا کے اشارے سے سب خیریت ہے کا مفہوم واضح کرنا چاہا اور مسکرایا بھی مگر اتنے نیچے کھڑے ہوئے لوگ تشویش میں مبتلا تھے کہ ہم کون ہیں اور کیا کرنا چاہتے ہیں۔ ان میں سے کچھ نے ہمیں نشے میں سمجھا ہوگا۔ کچھ نے کہا ہوگا کہ پاگل ہیں اور خودکشی کرنا چاہتے ہیں اور کچھ یہ بھی سمجھے ہوں گے کہ ہم بل ادا کیے بغیر ہوٹل سے فرار ہو رہے ہیں۔ چنانچہ ان میں سے کوئی ہمارے اشاروں سے مطمئن نہیں ہوا اور دیکھتے دیکھتے وہاں اچھا خاصا مجمع لگ گیا۔ میں نے کھڑکی کے قریب پہنچ کر شیشے پر آہستہ سے مکا مارا۔ شیشے پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ محسن نے زیادہ عقلمندی سے کام لیا اور ہاتھ پر رومال لپیٹ کر پھر زیادہ قوت کے ساتھ مکا مارا۔ چٹخنے کے بجائے شیشہ ٹوٹ کر اندر جا گرا اور اس کا چھناکا ہمیں بم کے دھماکے سے زیادہ محسوس ہوا۔ میں نے شیشے کے خلا میں ہاتھ ڈال کے چٹخنی کھولی اور کھڑکی کو تھوڑا سا دھکیلا لیکن اس کے پٹ مضبوطی سے ملے رہے۔ محسن نے دوسرے پٹ کی چٹخنی کھولی۔ نیچے سے مجمع اب اونچی اونچی آوازیں لگا رہا تھا اور یہ ضروری تھا کہ ہم فوراً اندر غائب ہو جائیں۔ نچلی منزلوں کے رہنے والے اس شور و غل پر متوجہ ہو چکے تھے اور اپنی اپنی کھڑکی سے سر نکال کے اوپر دیکھنے کی کوشش میں مصروف تھے لیکن ان کے اور ہمارے درمیان چھجا حائل تھا۔ تاہم ہوٹل میں مقیم کچھ لوگ یقیناً سمجھ چکے تھے کہ اوپر کوئی گڑبڑ ہے جدھر مجمع اشارے کر رہا ہے۔

محسن نے چوکھٹ تھام کر کھڑکی کو کندھے سے دھکیلا۔ پہلے تو میں یہی سمجھا تھا کہ اوپر سے بھی دونوں پٹ چٹخنی لگا کے بند کیے گئے ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو ہمارا کام بہت مشکل ہو جاتا۔ زیادہ طاقت صرف کر کے دھکا لگانے میں ڈر تھا کہ ہم اچھل کر نیچے نہ جا گریں۔ دوسری مرتبہ کی کوشش سے اندازہ ہوا کہ پٹ کچھ جام ہیں۔ تیسری دفعہ دھکیلنے سے کھڑکی کھل گئی تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ میں نے ہاتھوں سے چوکھٹ کو تھاما اور اندر اتر گیا۔ محسن میرے پیچھے پیچھے آیا اور میں نے فوراً کھڑکی بند کر دی۔

"لوگوں نے دیکھ لیا، یہ بہت بُرا ہوا۔" محسن بولا۔

"لوگوں سے زیادہ ہوٹل کی نچلی منزل پر رہنے والوں سے خطرہ ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ فون اٹھا کے کاؤنٹر پر کسی سے کہہ دیں گے کہ اوپر کیا ہو رہا ہے اور ہوٹل والے باہر نکل کر دیکھیں گے تو انھیں سب معلوم ہو جائے گا۔"

"پولیس ابھی ہوٹل میں ہی ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ فوراً تاڑ لیں گے کہ اصل بات کیا ہے۔"

"پھر اب کیا کریں؟" محسن بولا۔ "ہم آسمان سے گر کر کھجور میں اٹک گئے ہیں۔ اس کمرے سے کیسے نکلیں گے؟"

"کمرے سے باہر نکلنا کیا مشکل ہے۔ کمرے باہر سے مقفّل ہوتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اندر سے تو چابی کے بغیر کھولے جاسکتے ہیں۔ ہوٹل سے نکلنا زیادہ مشکل ہو جائے گا۔"

"بس جی ہو گئی تسلّی؟" میں نے منیجر کی آواز سُنی۔ "میں جو کہہ رہا تھا کہ اس نام اور حلیے کا کوئی آدمی میرے سامنے سے نہیں گزرا۔" اس کے ساتھ ہی بہت سے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اور میں نے ڈور لاک کے سوراخ پہ آنکھ رکھ کے دیکھا تو وارنٹ لے کر آنے والے واپس جارہے تھے۔ انسپکٹر اور منیجر کی تکرار جاری تھی لیکن اب الفاظ سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ یہ آوازیں دور ہوتے ہوتے معدوم ہو گئیں تو میں نے آہستہ سے دروازے کے گول ہینڈل کو گھمایا اور کوریڈور میں جھانک کر دیکھا۔ میرا اشارہ پاتے ہی محسن آگے بڑھا اور ہم باہر نکل آئے۔ چند سیکنڈ بعد ہم نے پھر اپنے کمرے کا دروازہ بجایا، دروازہ فوراً کھُل گیا۔ یوں جیسے ٹیڈی دروازے سے لگا کھڑا تھا۔

"تم نے پوچھے بغیر دروازہ کھول دیا؟" میں نے کہا۔

"مجھے معلوم تھا کہ تمہارے سوا اب کوئی آ ہی نہیں سکتا۔" ٹیڈی نے دانت نکال کے کہا۔ "میں دیکھ رہا تھا۔"

میں نے اور محسن نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ "کیا دیکھ رہے تھے تم؟"

"تالے کے سوراخ میں سے جھانک رہا تھا۔" ٹیڈی بولا۔

"اگر ہم نیچے کود گئے ہوتے تو اتنی جلدی لوٹ کر کیسے آسکتے تھے؟" میں نے کہا۔

"ارے سکندر بادشاہ! اب ہم بے وقوف ضرور ہیں لیکن اتنے بھی نہیں جتنا تم ہمیں بناتے ہو۔" ٹیڈی بولا۔ "جب پولیس چلی گئی تھی تو میں نے کھڑکی کھول کے دیکھا تھا۔ اس وقت تم دونوں ساتھ والے کمرے میں گھس رہے تھے۔"

"میاں خوجی! ہم تو سمجھے تھے مصیبت ٹل گئی لیکن نیچے لوگوں نے ہمارا سرکس مفت میں دیکھ لیا۔" محسن بولا۔

"ابھی پولیس نیچے پہنچے گی تو انھیں رپورٹ ملے گی کہ اوپر گڑبڑ ہے اور وہ باہر جا کے تفتیش کریں گے تو کوئی چشم دید گواہ بتا دے گا کہ دو بازیگر کس کمرے سے نکلے تھے اور کدھر گئے تھے۔" میں نے کہا۔

"پھر اب کیا کریں؟" ٹیڈی کا سارا اطمینان رخصت ہو گیا۔

"تم تو فوراً نکل جاؤ۔" میں نے کہا۔ "باہر جاتے وقت چابی کاؤنٹر پر دے جانا۔ میں ویٹر کی وردی بدل کر نکلتا ہوں اور محسن کے ساتھ آتا ہوں۔ محسن لباس ہی بدل لے گا تو پہچانا نہیں جائے گا۔ تماشا دیکھنے والے دونوں کا حلیہ بتائیں گے تو یہ بھی بتائیں گے کہ انھوں نے کیا کپڑے پہن رکھے تھے۔ ہم دروازہ مقفّل کر آئیں گے... تم جاؤ۔"

"کہاں جاؤں۔ تم لوگ کہاں ملو گے؟" وہ گھبراہٹ میں بولا۔

"رتن سینما کے اندر پوسٹر دیکھتے رہنا۔ ہم وہیں آ جائیں گے۔" میں نے اُسے باہر دھکیل دیا اور سوٹ کیس کھینچ کر بیڈ کے نیچے سے نکالا۔ محسن نے اپنے لیے جو لباس منتخب کیا وہ بالکل مختلف تھا۔ اس نے کریم کلر کی پتلون اور نیلی جرسی اتار کے دوسری جرسی پہن لی جس پر زرد اور سرخ آڑی دھاریاں تھیں اور سیاہ پتلون چڑھائی۔ اتنی دیر میں اپنے کپڑے اتار کے میں نے ویٹر کی سفید وردی پہنی جو مدت سے محفوظ پڑی تھی۔ اس پر ہوٹل کا نمبر اور مونوگرام نہیں تھا لیکن مجھے امید تھی کہ اس وقت پولیس کی موجودگی کے باعث جو افراتفری پھیلی ہوئی ہے اس میں کوئی میری صورت یا وردی کے بارے میں غور نہیں کرے گا۔ بڑی عجلت میں اپنے کپڑے سوٹ کیس میں بند کرنے کے بعد میں نے سوٹ کیس کو پھر بیڈ کے نیچے کیا اور کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرے میں کوئی بے ترتیبی نہیں تھی اور میں اپنے حلیے سے مطمئن تھا۔ ڈر یہ تھا کہ کسی بھی وقت پولیس پھر دوڑتی ہوئی اوپر آ جائے گی۔ میں کمرے سے ایک منٹ پہلے نکلا اور جب میں زینے سے اتر رہا تھا تو میں نے پولیس انسپکٹر کو دو سپاہیوں کے ساتھ اوپر لپکتے دیکھا۔ اسی وقت محسن کمرے سے نکلا اور اس نے دروازہ بند کیا۔ آٹومیٹک ڈور لاک سے کمرہ مقفّل ہو گیا۔ میں سر جھکائے نیچے چلا گیا۔ ظاہری اطمینان کے باوجود میرا دل دھڑک رہا تھا۔ میری آزادی اور اسیری کے درمیان کہیں ایک نامعلوم نظر آنے والا لمحہ حائل تھا۔ اگر اس لمحے میں کوئی بھی مجھے ایک نظر دیکھ لیتا اور میری صورت کے نقوش پر دھیان دیتا تو میں اسی زینے کے وسط میں پکڑا جاتا لیکن پولیس والے اپنی دھن میں اوپر جا رہے تھے اور کسی بھی ویٹر سے ان کو سروکار ہی نہ تھا۔ خود میں نے با ادب با ملاحظہ ہوشیار ہو کے انھیں راستہ دیا اور ایک کونے میں دبک گیا۔ وہ پیر کو زور زور سے پٹختے نکل گئے تو میں آگے بڑھا۔ ابھی مجھے محسن کی فکر تھی۔ وہ پولیس کو کوریڈور میں ملے گا اور پولیس کا کیا بھروسا کہ اسے پوچھ گچھ کے لیے روک لے۔ مگر اس کا امکان بہت کم تھا کیونکہ چشم دید گواہوں میں سے کوئی ساتھ نہ تھا اور ساتھ ہوتا بھی تو صورت سے محسن کو نہ پہچان پاتا۔ چالیس فٹ نیچے کھڑے ہوئے لوگوں نے صرف کپڑوں کا رنگ دیکھا ہو گا۔ صورت ان کو کہاں نظر آئی ہو گی اور محسن اب بالکل مختلف کلر اسکیم میں تھا۔

آخری زینے پر قدم رکھتے ہوئے میں نے پلٹ کر دیکھا تو محسن نے مجھے انگوٹھے کو بلند کر کے "آل اوکے" کا سگنل دیا۔

سیدھا نیچے گیا اور ایک ویٹر کے نقشِ قدم پر چلتا ہوا کچن میں داخل ہو گیا۔ پرانا تجربہ میرے کام آیا۔ میں نے چائے کی ایک ٹرے اٹھالی اور اسے ہتھیلی پر جما کے کندھے کی طرف کر لیا۔ اس طرح میرا چہرہ جزوی طور پر چھپ گیا۔ "یہ کہاں لے جا رہا ہے؟" کسی نے چلا کر کہا۔

"دو سو بیس! ارجنٹ آرڈر ہے۔" میں نے کہا اور پرانے ویٹرز کی پھرتی کے ساتھ باہر نکل گیا۔ کاؤنٹر کے قریب خاصی گرما گرمی تھی۔ منیجر کے پاس دو پولیس والے کھڑے تھے اور کوئی درجن بھر شوقین مزاج لوگ جو ہماری بازیگری کے چشم دید گواہ تھے۔ منیجر کا موڈ سخت آف تھا۔ گواہ مصر تھے کہ انھوں نے جو کچھ دیکھا تھا نظر کا دھوکا نہیں تھا اور سب متفقہ بیان پر قائم تھے چنانچہ سب کو جھوٹا بھی نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ وہ سب پولیس کے ساتھ مجاہدانہ اور رضاکارانہ جذبے کے تحت آئے تھے مگر اب پھنس گئے تھے کیونکہ پولیس والے ان کو تفتیش مکمل ہونے تک واپس جانے کی اجازت دینے پر تیار نہیں تھے۔ انھیں تھانے جا کے بیان لکھوانا تھا اور اگر مجرم پکڑے گئے تو ان کو شناخت کرنا تھا اور شاید ہر پیشی پر حاضرِ خدمت ہونا تھا۔ جب تک مقدمہ چلے اور فیصلہ ہو۔ وہ سب نوجوان، جوشیلے اور ناتجربہ کار لوگ تھے جن کے لیے قانون کی مدد کر کے مصیبت میں گرفتار ہونے کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ آئندہ وہ ایسی غلطی کبھی نہیں کریں گے اور کسی مظلوم کو قتل ہوتا دیکھیں گے تو آنکھیں بند کر کے گھر میں گھس جائیں گے، دروازے بند کر کے سو جائیں گے اور زبان بند کر کے بیٹھ جائیں گے۔ سمجھدار وہ ہوں گے جو تھانے جا کر بھی خاموشی کا نذرانہ پیش کر دیں گے اور نجات پا کے انجان بنے لوٹ آئیں گے۔

منیجر سر پکڑے بیٹھا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ ہوٹل تباہ ہو چکا۔ ایک بار تو اُس نے ہر مہمان سے بڑی شرافت اور شائستگی کے ساتھ زحمت دینے پر معذرت کر لی تھی اور کہا تھا کہ یہ اطلاع غلط ہے لیکن اب پولیس دوبارہ ہوٹل کو کھنگالنے پر آمادہ تھی اور ہر کونے کھدرے سے مجرم کو برآمد کیے بغیر نکلنے کا ارادہ نہیں رکھتی تھی۔ "معلوم نہیں کیا ہوا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔" اس نے ٹیلی فون اٹھا کے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ "ہیلو... ہیلو... ہاں جی... سر جی آپ فوراً آ جائیں اور معاملے کو سنبھالیں... یہاں میری کوئی نہیں سن رہا ہے۔ نہیں وہ ابھی تک نہیں گئے... آپ فون کرائیں تا جی کسی سے مگر ذرا جلدی... وہ بہت گڑبڑ پھیلا رہے ہیں۔" اس نے دھڑ سے ریسیور کو کریڈل پر مارا۔ غالباً اُس نے مالکوں کو فون کیا تھا۔ اس وقت تک میں دروازے تک پہنچ گیا تھا۔ اگر اس کے سامنے یہ مجمع نہ ہوتا تو وہ ضرور مجھے روک کر پوچھتا کہ چائے باہر کہاں جا رہی ہے مگر مجھے بڑا اچھا موقع مل گیا تھا۔

یہ اندازہ مجھے باہر نکلنے کے بعد ہوا کہ ہوٹل کو ہر طرف سے پولیس نے گھیرے میں لے رکھا ہے۔ ان کے مسلح آدمی ہر گیٹ پر کھڑے تھے اور ہر آنے جانے والے کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ ٹیڈی پہلے ہی نکل گیا تھا۔

میں ہاف سیٹ چائے کی ٹرے اٹھائے لوگوں سے بچتا بچاتا فٹ پاتھ پر چلتا گیا۔ اب میں محفوظ تھا اور کوئی مجھ سے نہیں پوچھ سکتا تھا کہ یہ چائے کہاں سے لائے ہو اور کہاں لے جا رہے ہو۔ اچانک میرا پیر ایک رسّی میں الجھا جو کسی نے اپنے کینوس کے سائبان کو دکان پر پھیلانے کے لیے باندھی تھی اور اس کا ایک سرا فٹ پاتھ کے ساتھ لگے ہوئے کھمبے پر لپیٹ دیا تھا۔ مجھ سے ایک قدم آگے چلنے والے نے رسّی کو دیکھ لیا اور اس کے اوپر سے گزر گیا مگر مجھے اتنا وقت ہی نہ ملا۔ میں چائے کی ٹرے سمیت منہ کے بل گرا۔ کینوس کے اس تنبو کے نیچے ایک عوامی ہیئر ڈریسر سیلون تھا جہاں اس وقت خلیفہ جی ایک گاہک کے سر کی کھیتی صاف کر رہے تھے۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر مراقبے کی کیفیت میں سر جھکا کے بیٹھنے والے گاہک کے آدھے سر پہ استرا پھر چکا تھا۔ برتن گرے تو غالباً چائے دانی گاہک کے سر پہ الٹ گئی۔ ورنہ وہ اس طرح بلبلا کے نہ اُٹھتا۔ گرما گرم قہوے نے اس کے نصف سر کو زیادہ متاثر کیا ہو گا جس کی کھال پر بال نہیں رہے تھے۔ دودھ اور چینی کہاں گئے، یہ مجھے معلوم نہ ہو سکا۔ ٹرے میرے ہاتھ سے نکل کر فٹ پاتھ پر ٹن سے گری اور میرے ساتھ ہی تنبو نیچے آ گیا۔ میری ٹھوکر نے رسّی توڑ دی تھی۔ پھر بہت واویلا مچا۔ خلیفہ نے مجھے اندھا بیل اور بہت کچھ کہا اور میں نے خالص بیروں کی زبان میں جوابِ آں غزل عرض کیا۔ فٹ پاتھ پر سے یوں کراہتا ہوا اٹھا جیسے میری بیشتر ہڈیاں ٹوٹ جانے کے بعد میرا بچنا محال ہے اور اس قتل کا ذمے دار خلیفہ ہے جس نے مجھے گرانے کے لیے رسّی باندھی تھی۔ گاہک بار بار چلاّ رہا تھا اور سر پہ ہاتھ پھیر رہا تھا۔ "اوئے توا دِتّا ای بیڑا غرق... اوئے میرا سر ساڑ دِتّا جے... اوئے خلیفہ! اوئے میرا باقی سر تیرا پیو صاف کرے گا۔" لوگ کسی کے طرفدار نہ تھے اور آگ بھڑکا کے تماشے کو طول دینے کے موڈ میں تھے چنانچہ وہ دونوں کو شہ دے رہے تھے اور ہنس ہنس کر بے حال ہو رہے تھے۔

جب میں خالی ہاتھ روتا بسورتا وہاں سے روانہ ہوا تو

محسن بھیڑ میں سے میرے ساتھ ہولیا۔" شرارت کا کوئی وقت ہوتا ہے۔" اس نے مجھے ڈانٹنا شروع کیا۔" اس شریف آدمی کے آدھے گنجے سر پہ چائے کی کیتلی پھینکنے کی کیا ضرورت تھی؟"

" اگر میں نے پہلے سے دیکھ لیا ہوتا تو میں ہاف سیٹ چائے اس کی ہاف ٹنڈ پہ ٹونٹی سے گراتا لیکن میں تو خود گر گیا تھا۔۔۔"

میں نے کہا۔" خلیفہ اگر ہوتا کوئی پہلوان تو اتنی آسانی سے نہ چلنے دیتا۔ میرا مطلب ہے ہم کشتوں کے پشتے لگائے بغیر نہ نکل پاتے۔ مار دھاڑ سے تو ہم نے ہوٹل میں بھی گریز کیا تھا ورنہ وہ تھانیدار اور اس کے چار یار کیا تھے، اسی کو اٹھا کے لے جاتے۔"

" ہمیں تو نکلنا مشکل نہ تھا۔ لیکن مسئلہ وہاں سے سامان نکالنے کا ہے۔" محسن نے اتفاق کیا۔

" اب خواجہ نیک محمد کو فوراً واپس بھیج دیتے ہیں۔" میں نے کہا۔" تاکہ شک نہ ہو۔"

خواجہ نیک محمد عرف استاد ٹیڈی بڑے انہماک کے ساتھ رنگین پوسٹر دیکھ رہے تھے۔

" میاں خوجی!" محسن نے ان کو پیچھے سے یوں پکڑا جیسے باپ اسکول جانے والے بچے کو سینما ہال میں پکڑ لے۔" یہ آخر کیا ہو رہا ہے۔ پرائی بہو بیٹیوں کی تصویریں دیکھتے ہو۔۔۔ وہ بھی سرِ عام۔۔۔"

" ہاں! واقعی یہ تو بڑی غلط بات ہے۔" میں نے کہا۔" لیکن ابھی تم کچھ نہ کہو۔ میاں خوجی! واپس ہوٹل جاؤ۔ جاتے ہوئے اپنے ساتھ کچھ لیتے جانا۔ پھل وغیرہ۔ معلوم یہ ہو کہ تم ذرا سی دیر کے لیے نکلے تھے۔"

" پولیس پھر سرگرمِ عمل ہے۔ ممکن ہے تم سے بھی پوچھے کہ اس کمرے سے ساتھ والے کمرے میں کون گیا تھا، کھڑکی کے راستے۔" محسن بولا۔

" انھیں کس نے بتایا؟" ٹیڈی نے پریشان ہو کے پوچھا۔

" نیچے جو بہت سے تماشائی جمع تھے نا' انھوں نے پولیس کی مدد کی اور اب پولیس کی گرفت میں ہیں۔" میں نے کہا۔

" تم ذرا گرم ہونا۔ کہنا کہ ابھی سوتے سے جگایا تھا۔ ذرا سی دیر کے لیے پھل لینے گیا تو یہ نیا ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ یہ ہوٹل ہے کہ شادی شدہ آدمی کا گھر۔" محسن بولا۔" پھر ہنگامہ کرنا کہ میرا بل بناؤ۔ میں جاتا ہوں اور آئندہ کے لیے اپنی سات نسلوں کو وصیت کر جاؤں گا کہ حوالات چلے جانا مگر فلاں ہوٹل میں مت جانا۔"

ٹیڈی نے سر ہلایا اور روانہ ہو گیا۔ پھر پلٹا اور واپس آیا۔" تم لوگ اسی جگہ ملو گے؟ سامان لے کر آنے میں آدھا پون گھنٹا تو لگے گا۔"

" تم ایسا کرنا کہ وہاں سے تو سامان اٹھا کے ٹیکسی میں روانہ ہو جانا۔ گھوم پھر کے واپس آنا اور ہوٹل ویسٹ اینڈ میں اسی نام سے قیام کرنا۔ تھوڑا سا آگے ہے یہ ہوٹل۔ میں اور محسن رات کو کسی وقت تمھارے قریب ہی دوسرے ہوٹل میں آجائیں گے بڑا اوسس، سمجھ لو۔ ابھی ہم ذرا کام سے جا رہے ہیں اور کام تمھیں معلوم ہے' اس لیے واپسی کا کوئی وقت نہیں بتا سکتے۔ تم اطمینان سے کھانا کھا لینا اور زیادہ انتظار مت کرنا۔ صبح ہم نہ ملیں تو پھر رابعہ سے ملنے کی کوشش کرنا یا منظر سے ٹیلی فون پر بات کرنا۔ اب جاؤ ورنہ وہ تمھارے کمرے کا تالا کھول لیں گے۔"

فرسٹ شو کا ٹائم ہو رہا تھا چنانچہ اندر اور باہر بڑی گہماگہمی تھی۔ ایک شخص نے مجھے کندھے سے پکڑ کر ڈانٹا کہ اتنی دیر ہو گئی ہے اسے ہاف سیٹ چائے کے لیے انتظار کرتے ہوئے اور وہ فیملی کیبن نمبر دو میں ہے۔ میں نے کہا کہ خلیفہ نے رتی نہ باندھی ہوتی تو چائے اب تک ضرور پہنچ جاتی اور اسے پہلے سے زیادہ پیچیدہ جواب پہ ہکا بکا چھوڑ کر چل پڑا۔ اندر ہی ایک ٹیلی فون کیبن تھا۔ میں نے منظر کا فون نمبر ملایا۔ وہ اس وقت گھر پہ مل ہی نہیں سکتا تھا۔ یہ وقت اس کے چیمبر میں بیٹھنے کا تھا اور اپنے کام کے ساتھ اب وہ رابعہ کی فرم کا انتظام بھی سنبھال چکا تھا چنانچہ میں اندازہ کر سکتا تھا کہ اب وہ کتنا مصروف ہوگا۔ ریسیور اس کے کسی بچے نے اٹھایا۔

" دیکھو بیٹے! تمھاری آنٹی رابعہ گھر پہ ہیں؟" میں نے آواز کو بدل کے کہا۔" یا منظر صاحب ہیں؟"

" آپ نام بتائیں اپنا۔" بچے نے کہا۔" میں ان کو بتا دوں گا۔ ابھی تو وہ بازار گئی ہوئی ہیں۔ ابو آفس میں ہیں۔"

" اچھا' آنٹی سے کہنا۔" میں نے سوچ کر کہا۔" کہ ریلوے کا ویٹر اب رتن سینما میں ہے اور اچکن کے ساتھ ہے۔" لڑکا اس پُراسرار پیغام پر یقیناً چکرایا ہوگا۔ اس نے دوبارہ پوچھا تو میں نے کہا کہ وہ لکھ لے۔ وہ کہیں سے پنسل کاغذ لایا اور بالآخر اس نے ہر لفظ پڑھ کے سنا دیا۔

" ابھی تو وہ گھر پہ ہی نہیں ہے۔" میں نے مایوسی سے کہا۔" اور معلوم نہیں کب لوٹ کر آئے۔"

" جب بھی آئے گی' پیغام پر غور کرے گی تو سمجھ لے گی۔" محسن بولا۔" تجھے وہ ریلوے ویٹر کی وردی میں دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھی۔ کہتی تھی' بس یہی ایک لباس سجتا ہے۔ اچکن کا مطلب شیروانی بھی نکال لے گی۔"

لیکن ہم یہاں بیٹھے نہیں رہ سکتے۔" میں نے کہا۔" پھر کوئی

بھی چائے کا آرڈر دے دے گا۔"

" ہم وقت ضائع نہیں کر سکتے۔" محسن نے کہا۔" اتنی دیر میں میو اسپتال ہو آتے ہیں۔ دیکھتے ہیں چوہدری صاحب کا پوسٹ مارٹم ہوا ہے یا کسی اور کا۔"

" وہاں ہمیشہ پولیس ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔" چوہدری دلاور کے چمچے بھی ہوں گے۔"

" ہم کون سا براہِ راست پولیس سرجن کے پاس جا کے پوچھیں گے۔" محسن بولا۔" یہ بات تو کسی سے بھی معلوم کی جا سکتی ہے۔ شعبۂ حادثات' میں سب کو علم ہوگا۔"

" اور رابعہ یہاں پہنچے گی تو۔۔۔ خیر وہ انتظار کر لے گی۔" محسن نے کہا اور ہم رتن سینما کے احاطے سے نکل آئے۔ سینما آنے والے رکشا خالی ہو کے قطار میں کھڑے تھے۔ ایک نے ہمیں دس روپے لے کر زندہ سلامت میو اسپتال پہنچانے پر آمادگی ظاہر کی حالانکہ ہم نے رونی صورت بنا کے مردہ خانے کا نام لیا تھا۔

" تم دونوں مردہ خانے میں کام کرتے ہو؟" رکشا ڈرائیور نے روانگی کے بعد کہا۔

" ہاں۔ تم کو ضرورت پڑے تو آجانا۔ ہم آدھے ریٹ پہ تمھارا پوسٹ مارٹم کر دیں گے۔" محسن نے بھنّا کر کہا۔

" اُلو کے پٹھے! کیا ہم تمھیں مردے ڈھونے والے لگتے ہیں؟" اس نے کہا۔ وہ نہایت بدتمیز اور بددماغ رکشا والا تھا۔ گالی سنتے ہی اس نے رکشا روکنے کی بے وقوفی کی۔ خود میں بھی یہی چاہتا تھا کہ اسے تھوڑی سی سزا دوں جس میں مروّت' لحاظ نام کی کوئی چیز ہی نہیں تھی۔ ہم نہ سہی' کل کوئی مصیبت کا مارا واقعی مردہ خانے جانا چاہے گا تو یہ اس سے پانچ کے دس طلب کرے گا۔

" گالی کینوں کڈھی جے! اشور دے پُتر۔" اس نے نیچے اترتے ہی مجھے باہر کھینچ لیا۔ وہ تما تما تندرست آدمی تھا اور اس کی نظر میں میری اہمیت ایک ویٹر سے زیادہ نہیں تھی۔ مجھے اس نے زیادہ دیر نہیں لگائی۔ باہر آتے ہی میں نے اس کا اٹھا ہوا ہاتھ پکڑ کے جھٹکا دیا۔ وہ بلبلا کے آگے آیا تو میں نے گھٹنا اٹھا دیا۔ وہ پلٹ کر سڑک پر گرا۔ دوبارہ بڑی مشکل سے اٹھا اور سیدھا کھڑا ہوا ہی تھا کہ میں نے پھر وہی داؤ آزمایا اور اس بار اسے مخالف سمت میں زیادہ دور پھینکا۔ پھر میں نے ہاتھ جھاڑ کر رکشا ڈرائیور کی جگہ سنبھالی اور رکشا اسٹارٹ کیا۔ جو کچھ ہوا اندھیرے میں ہوا اور دو کاروں اور چند راہگیروں کے سوا سڑک پر سے اس مختصر وقفے میں کوئی نہیں گزرا۔ اگر لڑائی لمبی ہوتی تو کوئی دوسرا رکشا ڈرائیور آجاتا اور اپنی برادری کے ایک رکن کے ساتھ میدانِ کارزار میں کود پڑتا اور رکشا والوں کے معرکے میں ٹیکسی ڈرائیور بھی شامل ہو جاتے تو ہم پھنس جاتے۔ ہمارے پاس جنگِ عظیم کے لیے وقت نہیں تھا۔

میں نے رکشا چلانے کا پہلا تجربہ حاصل کیا اور خاصی مہارت کے ساتھ رکشا کو میو اسپتال میں لے گیا۔ ایک چوکیدار میرے پیچھے دوڑا۔" اوئے! رکشا اندر کہاں لے جاتا ہے۔" وہ چلایا اور میں نے فوراً بریک لگا کے رکشا کو واپس کیا۔ چوکیدار سے معذرت کرنے کے بعد میں نے رکشا سڑک پر کھڑا کیا اور محسن کے ساتھ پیدل اندر پہنچا۔ اندر واقعی بہت پولیس تھی چنانچہ ہم نے خاصے فاصلے پہ رک کر صورتِ حال کا جائزہ لیا۔

" میاں محسن خان!" میں نے بزرگانہ شفقت کے ساتھ کہا۔" چشمِ بد دور۔ بہت اسمارٹ لگ رہے ہو اس وقت۔"

" اس وقت کیا' ہمیشہ سے ہوں۔" محسن نے کہا۔" تاریخ گواہ ہے۔"

" تاریخ مجھے یاد ہے۔" میں نے جلدی سے کہا۔" کہنے کا مقصد یہ تھا کہ میں اس خلعتِ فاخرہ میں کوئی ایسا کارنامہ سرانجام نہیں دے سکتا' جیسے کسی نرس سے گفتگو کرنا۔ اس حلیے میں تو یہاں کا کوئی بھنگی بھی مجھ سے مرعوب نہیں ہوگا اور مقصد ہمارا یہ معلوم کرنا ہے کہ ہمارے چوہدری دلاور کہاں ہیں۔۔۔ یہاں۔۔۔ گھر پر یا مرقد میں۔۔۔"

" یہ کیا مشکل ہے۔" محسن بولا۔" تو اشارہ کر۔۔۔ کس کی طرف دیکھوں جو ریشۂ خطمی ہو جائے۔ ایک تو مجھ میں مردانہ وجاہت کوٹ کوٹ کر بھری گئی ہے پھر یہ کہ میں نظر سے جادو کرتا ہوں۔"

" وہ جا رہی ہے تیری دور کے رشتے کی ایک کزن۔" میں نے کہا۔" تھپیڑ مارے تو رونا نہیں' مسکراتے ہوئے مردانہ وار واپس آجانا۔"

محسن خان دوڑا اور چند تیز تیز قدم اٹھا کے نرس کو جا لیا۔ میں ایک درخت کے نیچے کھڑا تھا اور دیکھ رہا تھا کہ محسن اسے روکے رکھنے میں تو کامیاب ہو گیا ہے لیکن ان کے درمیان ہونے والی گفتگو میں نہیں سن سکتا تھا۔ غالباً محسن کو کامیابی نے میرے سامنے خفت سے بچا لیا۔ وہ پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالے میرے قریب سے گزرا تو میں چند قدم کا فاصلہ رکھ کے پیچھے ہو لیا۔" وہ اور میں ایک ساتھ تھے ڈاکٹر صاحب!" نرس بولی۔

" اچھا! تو وہ روم میٹ تھی تمھاری' اسی لیے مجھے شک ہوا تھا کہ میں نے تم کو دیکھا ہے۔ خیر' اچھا ہوا اس نے شادی کر لی۔۔۔ اب کہاں ہے وہ؟" محسن نے کہا۔

"وہ دونوں باہر ہیں۔ کوئی کام تھا اس سے آپ کو؟"

"کام...؟ ہاں کام بھی تھا لیکن اصل مقصد تو ملاقات تھا۔ اس سے نہ سہی تم سے ہو گئی۔" محسن خاں نے پیشہ ور عاشقوں کے انداز میں پیش قدمی جاری رکھی۔ "تم شاید ڈیوٹی پر ہو۔"

"نہیں، ابھی آف ہوئی ہوں ڈیوٹی سے۔ ایمرجنسی میں تو حالت خراب ہو جاتی ہے۔" وہ تھکے ہوئے لہجے میں بولی۔ "ارادہ تھا کہ..."

"میرا خیال ہے کہ اب تم ارادہ بدل دو۔" محسن نے کہا۔ "میں بھی بہت تھکا ہوا ہوں اور بدقسمتی سے اکیلا بھی ہوں۔ تفریح کردوں تو جہاں اکیلا جاؤں گا احمق نظر آؤں گا۔ تم ساتھ دے سکتی ہو میرا۔ بس ذرا سی سیر۔ کہیں بیٹھ کے تھوڑی سی گپ شپ۔ کھانا تو آدمی کھا ہی لیتا ہے۔ پھر میں تم کو واپس ڈراپ کردوں گا۔"

وہ ہنس پڑی۔ "لیکن میرا ارادہ تھا کہ پہلے کپڑے بدل آؤں۔ اس وردی میں باہر کیسے جا سکتی ہوں۔ تم کہتے ہو کہ ارادہ بدل دوں۔"

"اوہ!" محسن نے خفت سے سر کھجایا۔ "دراصل تم ایسے بھی اچھی لگ رہی تھیں مگر یہ ٹھیک ہے۔ آؤٹنگ کے لیے وہ ہونا چاہیے۔ کیا کہتے ہیں اسے... سولہ سنگھار وغیرہ۔ او کے میں انتظار کرتا ہوں۔ تم تیار ہو کے آجاؤ۔"

"یہاں کھڑے رہو گے؟" وہ بولی۔ "ہوسٹل تک چلو۔ کوئی کچھ نہیں کہے گا تمھیں۔ سب کے کزن آتے رہتے ہیں۔"

"ویری گڈ! کتنا اچھا ہوا کہ میں اور تم کزن بھی نکل آئے۔" محسن بولا اور وہ ہنسی۔

مجھے اس کی کامیابی پر جو رشک آیا تھا وہ ختم ہو گیا۔ وہ نرس غالباً اپنی ہر شام کی تھکن اسی طرح اتارنے کی عادی تھی۔

میں پھر پیڑ کے نیچے آکھڑا ہوا اور سگریٹ پینے لگا۔ میرے آس پاس لوگ آجا رہے تھے مگر یہ کوئی تفریح گاہ نہیں تھی۔ یہاں سب کو اپنی اپنی پڑی تھی۔ سب پریشان تھے اور تقدیر سے نالاں تھے۔ وہ بھی جو کے زخمی ہو کے یا قتل ہو کے پہنچ رہے تھے اور وہ بھی جو اُن کی جان بچانے کی جدوجہد میں مصروف تھے اور موت کے خلاف مسلسل نبرد آزما تھے۔ دیہات میں ڈاکٹر یوں نہیں جاتے کہ نہ کام ہے نہ مریض کے علاج کی سہولت۔ نہ سوسائٹی اور نہ یہ گہماگہمی۔ شہر میں رہو تو یہ مصیبت کہ دن رات ایک سلسلہ ہے حادثات کا اور وارداتوں کا۔ لواحقین سے نمٹنا۔ پولیس کی ضابطے کی کارروائی اور کام کام کام۔ یا پیسہ پیسہ پیسہ۔ فرصت کاروبار شوق کسے۔ شوقِ نظارۂ جمال کہاں۔

"اچھا ہوا تو نے شرط نہیں لگائی تھی۔" محسن نے پیچھے سے آکے میری گردن پر ہاتھ مارا۔ "کیسی رہی؟"

"تو آگیا... اور وہ تیری کزن کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

"وہ بغرضِ تفریح میرے ساتھ جانے کے لیے بحال ہو کر آنے والی ہے۔" محسن نے ذرا اکڑتے ہوئے کہا۔

"الو کے پٹھے! اس کام کا کیا بنے گا جس کے لیے ہم یہاں آئے تھے؟" میں نے اس کی شاعری پر بھنا کے کہا۔

"وہ تو ہو گیا۔ میں نے باتوں باتوں میں اس سے پوچھ لیا تو" محسن ہنسا۔ "اب چلتے ہیں۔ میری کزن کی آج کی شام تو ضائع ہو گئی۔ نہ جانے کیوں اب مجھے افسوس ہو رہا ہے۔ وہ بڑی امیدوں کے ساتھ انتظار کرتی رہے گی اور جب اُسے یقین آجائے گا کہ میں کسی اور کے ساتھ نکل گیا ہوں تو اُسے دکھ تو یقیناً ہو گا ٹھکرائے جانے کا اور نقصان میں رہنے کا..."

"ابھی ایک جھانپڑ رسید کروں گا۔" میں نے چلتے چلتے کہا۔ "کیا بتایا اُس نے؟"

"اُس نے تو بڑی عجیب بات بتائی۔ پہلے تو مجھے یقین نہیں آیا تھا مگر اُس نے کہا کہ صبح سے اب تک وہی ڈیوٹی پر تھی اور اس کے ساتھ دوسری نرسیں بھی تھیں۔ سب تصدیق کر سکتی ہیں کہ اس قسم کا کوئی کیس نہیں آیا۔ نام تو اسے سب کے یاد نہیں تھے لیکن اس نے بتا دیا تھا کہ حادثات میں زخمی ہو کے کتنے آئے تھے اور لڑائی جھگڑے میں کتنے۔ ان میں سے کتنے مر چکے تھے کتنے اسپتال میں مرے، کتنے مرنے والے ہیں اور کتنے بچ جائیں گے۔ کوئی صنعت کار چوہدری دلاور ہوتا تو اتنا غیر اہم نہ ہوتا۔ اس کے علاوہ کلہاڑی کے وار سے سر کے ٹکڑے کرنے کی واردات تو ایسی نہیں کہ روز ہو۔ اُس نے کئی مہینے پہلے ایک کیس دیکھا تھا جس میں کلہاڑی سے سر پہ وار کیا گیا تھا۔"

"تجھے یقین ہے وہ سچ کہہ رہی تھی؟"

"یار، اُسے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی اور کیا ملتا اُسے جھوٹ بول کر۔ وہ تو ایک دن کی مصروفیات کا حال سُنا رہی تھی اور میں نے اُس سے پوچھا تھا کہ اخبار میں مشہور صنعت کار چوہدری دلاور کے قتل کی جو خبر ہے اس کے بارے میں پولیس نے کچھ بتایا۔ وہ حیران ہوئی اور رہنے کہنے لگی کہ اُس نے اخبار تو نہیں دیکھا مگر اسپتال میں یہ کیس نہیں آیا۔ اس کے علاوہ کہیں جا بھی نہیں سکتا۔ اس کا مطلب ہے چوہدری دلاور کا پوسٹ مارٹم نہیں ہوا۔ یا ہوا تو محض کاغذی خانہ پُری کر لی گئی جس کا نرسوں کو علم نہیں۔"

"گویا لاش یہاں نہیں لائی گئی؟" میں نے کہا۔ "پھر اب چلتے ہیں واپس۔ رابعہ انتظار کر رہی ہو گی۔"

"کرنے دے اسے انتظار۔ انتظار میں جو مزہ ہے..." اُس نے کہا لیکن میں نے اس کی بات سُننے کے بجائے ہانک لگا کے ایک رکشہ کو روک لیا۔

رابعہ سینما کے احاطے میں لیڈیز کے ٹکٹ کاؤنٹر کے قریب کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں تین ٹکٹ بھی تھے جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کسی کے ساتھ فلم دیکھنے آئی تھی مگر اس کے باقی دو ساتھی نہیں پہنچے۔ فلم کو شروع ہوئے ایک گھنٹا گزر چکا تھا چنانچہ اس کی پوزیشن خاصی خراب تھی۔ انتظار کی ایک حد ہوتی ہے۔ اس کے بعد ہر شخص یا تو چلا جاتا ہے یا اندر جا بیٹھتا ہے۔ چند تماشا کرنے والے پوسٹرز کے ساتھ رابعہ پر بھی غور کر رہے تھے اور خود میں نے بھی محسوس کیا کہ بے جان تصویروں کے مقابلے میں وہ یقیناً بہت زیادہ قابلِ غور ہے۔ رابعہ کی عمر کا اندازہ نہیں ہوتا تھا مگر اپنے پیشے، تعلیم اور زندگی کے تجربات نے اس کے انداز و اطوار میں ایک پُروقار متانت اور خود اعتمادی پیدا کر دی تھی جس کی وجہ سے اوباش قسم کے نوجوانوں کو بھی ہمت نہ پڑتی تھی کہ اس پر فقرہ بھی چست کر سکیں۔ پھر بھی وہ گیٹ کیپر اور سینما کے دوسرے ملازمین کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔

"یہ کیا مذاق ہے محسن بھائی!" اُس نے عمداً اونچی آواز میں برہمی سے کہا۔ "کھڑا کر کے چلے گئے مجھے یہاں... نہ میں کہیں آسکتی ہوں نہ جا سکتی ہوں۔"

"معاف کرنا باجی۔" محسن نے دانت نکال کے کہا۔ "گاڑی خراب ہو گئی تھی۔ تمھارا موڈ اس سے زیادہ خراب معلوم ہوتا ہے۔ پھینکو اب یہ ٹکٹ۔ کل پرسوں دیکھیں گے۔"

وہ خاصے احتجاجی انداز میں محسن کے ساتھ روانہ ہوئی اور ان کی گفتگو نے کافی شکوک دور کر دیے جو بلاوجہ پیدا ہو رہے تھے۔ میں نے اپنی وردی کو محسن اور رابعہ کے معزز لباس سے دور رکھا تھا تاکہ میرے اور ان کے درمیان کوئی تعلق نظر نہ آئے مگر میں اُن کے ساتھ ساتھ ہی تھا۔ رابعہ نے مجھے دیکھ لیا تھا مگر یوں کہ کسی نے نہ دیکھا تھا۔

باہر آنے کے بعد میں آگے بڑھا اور ان کے ساتھ ہو گیا۔

"خادم آداب بجا لاتا ہے میم صاحب!" میں نے کہا۔

"مسٹر خادم! آداب بجا لانے سے پہلے آپ معافی مانگ لیں کیونکہ میں سخت ناراض ہوں۔" رابعہ مسکرائی۔ "اور کسی ایک قصور پر نہیں، قصور بہت ہیں تمھارے۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ آج بھی تمھاری خیر خبر نہ ملی تو..."

"تو کیا؟" میں نے کہا۔ "بولو ڈرتی کیوں ہو؟"

"تو میں خود تمھاری خبر لینے نکل جاؤں گی اور ایسی خبر لوں گی۔" وہ ایک دم ہنس پڑی۔

"افسوس، مجھے تم نے کوئی موقع نہیں دیا شرمندہ ہونے کا، معافی مانگنے کا اور منانے کا۔ داستانِ شبِ ہجراں اور فسانۂ روزِ فراق کہنے کا۔" میں نے ہاتھ مَل کے کہا۔ "میں نے خاصی ذہنی ریہرسل کی تھی کہ تم کو کس طرح بے وقوف بناؤں گا۔ میرا مطلب ہے عموماً یہ روٹھنا منانا بھی بہرحال ضروری ہوتا ہے۔ شاعر صاحب نے ایسے ہی تو نہیں فرمایا ہے کہ بڑا مزہ اس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر۔"

"میں کسی بیرے سے لڑتی اچھی نہیں لگوں گی۔" رابعہ نے کہا۔

"تم ہر حال میں اچھی لگو گی خواہ ویٹر سے لڑو یا ہیڈ ویٹر سے۔" میں نے کہا۔ "آخر اس ریلوے کے ویٹر کی بیوی بھی ہو گی جس کی وردی میں نے زیبِ تن فرما رکھی ہے۔ کیا اُسے یہ خیال آتا ہو گا کہ میں اپنے میاں سے لڑتے ہوئے کیسی لگ رہی ہوں؟"

"میاں جی! ذرا اندر رہیں۔ میرا مطلب ہے جامے کے اندر رہیں۔" محسن نے کہا۔ "جامے سے باہر نہ ہوں ابھی۔"

"تم آئی کس طرح تھیں۔ ذریعۂ آمد و رفت کیا اختیار کیا تھا تم نے عزیزہ؟" میں نے کہا۔

"پہلے بس پھر رکشا اور پھر ٹیکسی۔" رابعہ نے کہا۔ "مجھے وہم ہو رہا تھا کہ کوئی میرے تعاقب میں نہ ہو۔"

"اگر یہ وہم مجھے بھی ہو جاتا تو تم کو میں اس فینسی ڈریس میں نظر نہ آتا۔" میں نے آہ بھر کے کہا۔ "میں ذرا سا غیر محتاط ہو کے گرد و پیش سے بے خبر ہو گیا تھا۔ کوئی میرے تعاقب میں رہا اور ہوٹل تک پہنچ گیا مگر مجھے پتا نہ چلا۔"

"گاڑی کہاں ہے تمھاری؟" رابعہ نے کافی دُور نکل آنے کے بعد کہا۔

"ہم فی الحال بے کار ہیں۔" محسن بولا۔ "اور وہ جو تمھاری کار تھی نا، وہ بھی بے کار کھڑی ہے۔ ان حالات پر مفصل روشنی ڈالنے کے لیے وقت نہیں ہے پہلے چوہدری دلاور کے بارے میں معلوم کرنا ہے۔ تم نے اخبار دیکھا تھا شام کا۔"

"میں نے کبھی شام کا اخبار نہیں پڑھا۔ ایسی کون سی اہم خبر ہے؟"

"خبر ناقابلِ یقین حد تک اہم ہے۔" میں نے جیب سے ضمیمہ نما اخبار نکال کر اُسے تھما دیا۔ ایک اسٹریٹ لائٹ کے نیچے رک کر اس نے صرف سرخی پر نظر ڈالی۔

"کیا یہ سچ ہے؟" اُس نے چونک کر باری باری مجھے اور محسن کو دیکھا۔

"کیا اس میں بھی ہماری شرارت ہو سکتی ہے؟" میں نے کہا۔ "بھئی یہ اخبار ہے کوئی ہینڈ بل یا پوسٹر نہیں ہے جو ہم نے چھپوا لیا ہو۔ بے شک اخبارات میں جھوٹ سچ سبھی کچھ ہوتا ہے

لیکن یہ ہاتھی سے بڑا جھوٹ ہے جسے چھپایا نہیں جا سکتا اور یہ نہیں لکھا ہے کہ "ایک افواہ کے مطابق" بلکہ اخبار کے رپورٹر نے پولیس کے حوالے سے تفصیلات ارسال کی ہیں۔"

رابعہ میری سننے کے بجائے خبر کا باقی حصہ پڑھنے میں مصروف تھی۔ میں نے اخبار اس سے چھین لیا۔ "یہاں کھڑے رہ کر دو کالم کی خبر پڑھنے میں کوئی معقولیت نہیں۔ ہم خلاصہ بتا دیں گے۔"

"تم نے کچھ معلوم کیا کہ یہ حرکت کس نے کی؟ اور کیوں کی؟" رابعہ کا سوال بالکل فطری تھا۔

"ہم نے کچھ اور معلوم کیا ہے؟" محسن بولا۔ "چوہدری دلاور کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال نہیں لے جائی گئی۔"

"محسن خان کا نظریہ کچھ یہ ہے کہ قاتل الف دین ہو سکتا ہے جو انتقام کے جنون میں مبتلا تھا مگر ان کا دوسرا نظریہ جو پہلے نظریے کی نفی کرتا ہے کچھ اور ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ ڈراما ہے۔" میں نے کہا۔

"یعنی چوہدری دلاور قتل نہیں ہوا۔" رابعہ نے غیر سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "اور کل خبر آئے گی کہ مردہ زندہ ہو گیا۔"

"کل نہ سہی دو چار دن میں یہ خبر آسکتی ہے۔" محسن نے کہا۔ "ایسے مت دیکھو مجھے۔ میں نے کوئی چرس کا دم نہیں لگایا ہے یا ٹھرا نہیں پیا ہے۔ میں اس نظریے پر قائم ہوں کہ مرنے والا دلاور نہیں تھا۔"

"پتا نہیں تم لوگ کیا باتیں کر رہے ہو۔" رابعہ نے کہا۔ "چلو تم پہلے تو آدمی بنو اور یہ کپڑے بدلو۔" اس نے ہینڈ بیگ میں سے ایک قمیص اور پتلون نکالتے ہوئے کہا۔ "تمہارے کچھ کپڑے میرے سوٹ کیس میں بھی پڑے تھے۔"

"چشم بد دور! تم نے بڑی دانائی کا مظاہرہ کیا سکندر کے لیے بخت آور۔" میں نے رقت انگیز لہجے میں کہا۔ "تم نے ثابت کر دیا کہ قاضی کے گھر کی چوہیا بھی سیانی ہوتی ہے اور اگر مجھے قاضی مان لیا جائے..."

"قاضی جی! جب مجھے وہ پیغام ملا تھا تو میں سمجھ گئی تھی کہ آپ کس حلیے میں ملیں گے اور آپ کے ساتھ کون ہو گا؟ میں اندازہ کر سکتی تھی کہ یہ بھیس آپ نے شوقیہ نہیں بدلا ہو گا بلکہ ہو گی کوئی مجبوری اور جب مجبوری نہیں رہے گی تو پھر مناسب کپڑوں کا مسئلہ ہو گا۔ جو کہیں سے خریدنے پڑیں گے۔" رابعہ نے کہا۔ "کیا باقی سامان بھی گیا؟"

"اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا۔" میں نے آداب بجا لا کے کہا اور ایک گلی میں غائب ہو گیا۔ گلی خاصی تاریک تھی اور تھوڑا سا آگے جانے کے بعد مجھے ایک پرانے منہدم ہو جانے والے مکان کا ملبہ نظر آیا۔ مکان شاید خستہ حالی کے باعث

کسی بارش یا سیلاب میں بیٹھ گیا تھا اور مکین ہجرت کر گئے تو اپنے مسکن میں ہی ان کا مدفن بن گیا تھا۔ اب یہ خالی جگہ منفعت عبرت سے زیادہ مقامِ ضرورت بنی ہوئی تھی اور مرجعِ خلائق... میں نے مشکل سے تین منٹ میں ویٹر کی وردی اتار کے قمیص پتلون پہنی ہو گی پھر ویٹر کی وردی کا بنڈل بنا کے بغل میں دبایا وہاں سے نکل آیا۔ جب میں دوبارہ سڑک پر پہنچا تو محسن نے اختصار کے ہنر سے کام لیتے ہوئے اہم واقعات کا خلاصہ دس منٹ کے لیکچر میں پیش کر دیا تھا چنانچہ رابعہ ہکا بکا کھڑی تھی۔ ... سے میرے دانت بجنے لگے تھے کیونکہ ویٹر کی وردی پھر بھی کچھ غنیمت تھی۔ پتلون قمیص تو گرمی کا لباس تھے۔ محسن نے ایک ٹیکسی کو روکا اور میں نے قدرے بہتر محسوس کیا۔

"تمہیں سو فیصد عاقل و بالغ اور دور اندیش ہونے کا سرٹیفکیٹ مل سکتا تھا اگر تم نے یہ بھی خیال رکھا ہوتا کہ اس درجۂ حرارت پر آدمی کم سے کم ڈبل نمونیے میں مبتلا ہوتا ہے۔" میں نے بتیسی بجاتے ہوئے کہا۔ "مجھے تو ڈبل ہو چکا ہے۔"

"میرا ہینڈ بیگ کوئی بوری نہیں تھا کہ اس میں گرم کپڑے بھی بھر لاتی۔" رابعہ نے خفگی سے کہا۔

"اچھا تو اب کہیں سے لے لو بوری، وہی ڈال لوں گا اپنی زندہ لاش پہ۔" میں نے کانپتے ہوئے کہا۔ محسن نے ٹیکسی کو روکا اور ایک دکان میں گھس گیا۔ چند منٹ میں وہ خاصی موٹی اون

جاری جرسی لیے واپس آیا۔

"یہ لے، یہ ایئر کنڈیشنڈ جرسی ہے۔ زندہ ہے تو پہن لے۔"

میں نے جرسی مجھ پر اچھال کے کہا۔

"محسن نے آج تمہارا سہاگ سلامت رکھا۔ خدا اسے سلامت رکھے اور ہماری طرح یہ بھی دودھوں نہائے پوتوں پھلے۔ آمین۔" میں نے ہاتھ مل کے کہا۔ رابعہ نے مجھے ٹھوکا دیا۔ یہ اشارہ تھا کہ میں زبان کو قابو میں رکھوں اور ٹیکسی ڈرائیور کی موجودگی کا خیال کروں۔ ٹیکسی ڈرائیور دانت نکال رہا تھا اور ٹیکسی ایک چوک سے گزری تو میں نے رابعہ کے لال رنگ کو دیکھا۔ اس لالی میں حیا سے زیادہ غصے کا عنصر شامل تھا۔

محسن کی ہدایات سے میں نے اندازہ کیا کہ وہ ٹیکسی کو دلاور کے گھر کی طرف لے جا رہا ہے۔ سردی کی وجہ سے شیشے بند تھے اور ہم کسی قابلِ شناخت پرائیویٹ کار میں نہیں تھے چنانچہ اس سڑک پر سے گزر جانے میں کوئی خطرہ نہ تھا۔ ہم سب کی نظر ایک ہی سمت میں دیکھ رہی تھی۔ دور سے اس کی کوٹھی کا گیٹ روشن نظر آیا۔ باہر دو کاریں اور ایک جیپ کھڑی دیکھ کر میں چوکنا ہوا۔ کوئی نہ کوئی بات ضرور تھی ورنہ اس وقت گیٹ بند ہوتا تھا اور آس پاس کی دوسری کوٹھیوں کی طرح موسمِ سرما کی ویرانی اور رات کا سناٹا ہر جگہ محیط نظر آتا تھا۔ عین سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے کوٹھی کے اندر آٹھ دس افراد کو دیکھا، جو برآمدے میں کرسیاں ڈالے مغموم اور سرنگوں بیٹھے تھے۔ کوٹھی کا ہر گوشہ روشن تھا اور چار پانچ پولیس والے ذرا فاصلے پر بے مقصد کھڑے تھے۔ محسن کا نظریہ مجذوب کی بڑ ثابت ہوا تھا۔ کوٹھی میں قتل کی واردات ضرور ہوئی تھی۔ اب صرف یہی بات تصدیق طلب رہ جاتی تھی کہ کیا مرنے والا دلاور تھا یا اس نے کسی اور کو مار کے اپنی جگہ ڈالا ہے اور خود غائب ہو گیا ہے؟ اور اس کی اس کارروائی کا مقصد ہمیں ٹریپ کرنا ہے۔ فوری طور پر مجھے کوئی ایسی صورت نظر نہ آتی تھی کہ ہم اس مفروضے کو تسلیم کریں تو اس کی صداقت کا ثبوت کیسے حاصل کریں۔ اس کے لیے لاش کو ایک نظر دیکھنا تو ضروری تھا ہی، یہ بھی ضروری تھا کہ ہم اس ڈرامے کے پلاٹ کو سمجھتے ہوئے کلائمکس کو اینٹی کلائمکس میں تبدیل کر دیں۔

اگر ہم اسی وقت اندر تشریف لے جاتے تو دلاور کے زندہ ہونے کی صورت میں بھی پکڑے جاتے اور زندہ نہ ہونے کی صورت میں بھی۔ میں اتنی رفتار سے اور اتنی دور سے گزرتے ہوئے تعزیت کے لیے آنے والوں کی صورت پر غور نہیں کر سکا تھا مگر ان میں ہمارے دشمنوں کا موجود ہونا یقینی تھا۔ پولیس بھی ہر صورت ہمیں پہلے گرفتار کر کے لے جاتی اور قتل کی تفتیش بعد میں کرتی۔

ہمیں اتنی مہلت ہی نہ ملی تھی کہ ہم مرزا غالب سے رابطہ قائم کرتے اور اس کے وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے میک اپ سے بدلی ہوئی صورت میں دلاور کے گھر میں داخل ہو جاتے۔ میرا یقین پہلے بھی کامل نہیں تھا اب شک کی گنجائش بہت کم رہ گئی کہ وہ محسن کی بے مہار سوچ تھی ورنہ موت وہ حقیقت ہے جس میں ڈرامے کو دخل نہیں ہوتا۔ تاہم یہ بات میں نے فوراً نہیں کہی۔

"اب کدھر چلنا ہے صاحب جی؟" ڈرائیور نے قدرے بیزاری سے کہا۔

یہ شاید محسن نے بھی نہیں سوچا تھا اور اس کا ذہن بھی دلاور کی کوٹھی میں نظر آنے والے منظر کا تجزیہ کرنے میں مصروف تھا کہ وہ فوراً جواب نہ دے سکا۔ رابعہ اس لیے نہیں بولی تھی کہ اس کا خیال تھا جواب ہم دیں گے۔

"او جی کچھ بولو! کیا ایسے ہی سیدھا چلتا جاؤں، مجھے گاڑی بند کرنی ہے۔" ٹیکسی ڈرائیور نے جھلا کر کہا۔

"ہاں ہاں! تم ایسا کرو کہ اگلے موڑ پر ہمیں اتار دو یا کسی ایسی جگہ جہاں سے ہمیں کوئی دوسری سواری مل سکے۔" میں نے کہا۔

ٹیکسی ڈرائیور نے خاصی مشکوک نظروں سے مجھے پلٹ کر دیکھا۔ "پھر بھی آپ کو جانا کہاں تھا؟ یہاں کون سی دوسری ٹیکسی ملے گی آپ کو؟ زنانی سواری ہے آپ کے ساتھ۔"

"اچھا تو تم ہمیں کرشن نگر پہنچا دو۔" میں نے کہا۔ میرے ذہن میں رابعہ کی گاڑی کا خیال آیا تھا۔ اگر اس وقت ہمارے پاس اپنی گاڑی ہوتی تو ہم کسی کے ذہن میں شکوک پیدا کیے بغیر کہیں بھی آ جا سکتے تھے۔

ڈرائیور نے ہماری بے وقوفی پر افسوس سے سر ہلایا۔ ہم سیدھا راستہ اختیار کرتے تو اپنا پیسہ بچاتے اور اس وقت تفریح کے لیے نہ یہ جگہ تھی اور نہ یہ موسم تھا چنانچہ وہ کچھ بڑبڑایا اور پھر ہمیں طوفانی رفتار سے کرشن نگر لے گیا۔ دس منٹ بعد ہم پچاس روپے ادا کر کے سڑک پر کھڑے رہ گئے۔

"اب یقین آ گیا کہ تیری کھوپڑی الٹی ہے۔" محسن نے ڈھٹائی سے کہا۔ "نہ جانے کیوں میں اپنی ساتویں حس کو غلط اور ناقابلِ اعتبار سمجھنے پر تیار نہیں۔ خیر، دلاور اگر مرا ہے تو اچھا ہے اور نہیں مرا ہے تو معلوم ہو جائے گا۔ مگر وہاں کچھ نہ کچھ ہوا ضرور ہے لیکن ہم میں سے کوئی اندر جا کے پوچھ نہیں سکتا کہ کیا ہوا ہے۔"

"غالب پوچھ سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اس وقت وہ اخبار کے دفتر میں ہو گا۔ اسے فون کر لیتے ہیں۔"

"فون کرنے کے لیے اتنی دور آنے کی ضرورت نہیں تھی۔" رابعہ نے کہا۔ "گاڑی کتنی دور ہے یہاں سے؟"

"گاڑی تو ایک فرلانگ آگے گلی میں ہوگی اور یہاں تک میں ٹیکسی اسی لیے لایا تھا مگر میری چھٹی حس..."

"تم دونوں کی چھٹی اور ساتویں حس بھی تمہاری طرح دخل در معقولات کی عادی ہے۔" رابعہ نے جھلّا کر کہا۔ "جیسی روح ویسے فرشتے۔ آدمی کے حواسِ خمسہ درست ہونے چاہئیں۔ کیا خطرہ ہے گاڑی لانے میں؟ آخر ہماری اپنی گاڑی ہے اور کوئی ہمیں چور سمجھ کے تو روک نہیں سکتا۔"

"کوئی اور تو روک سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "مثلاً فرشتۂ اجل۔ وہ بغیر اپائنٹمنٹ کے ملتا ہے۔"

"میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی ہے۔" میں نے کہا۔ "ابھی زیادہ رات نہیں ہوئی ہے۔ کوئی نہ کوئی گیراج کھلا مل جائے گا۔ ہم پیچھے رہتے ہیں۔ رابعہ چابی لے کر آگے جائے اور کسی مکینک سے بات کرے۔ اُسے بتائے کہ میری گاڑی فلاں جگہ بند ہو گئی ہے۔ خرابی کوئی معمولی سی لگتی ہے۔ ذرا مسکرا کے بات کرے، وہ سر کے بل جائیں گے اور طاقت کے بل پہ گاڑی کو کھینچ کر بھی لانا پڑا تو لے آئیں گے۔"

"وہ کہیں گے آپ ہمارے ساتھ چلیں بیگم صاحبہ!" رابعہ نے منہ بنا کے کہا۔

"تو تم کہنا' ہائے اللہ میں تو پہلے ہی اتنی تھک گئی ہوں دم نکلنے لگا ہے میرا۔" میں نے نخرے دار زنانہ آواز بنا کے اور ہاتھوں کے ساتھ نرت کر کے کہا۔ "پھر مسکراہٹ سے بجلی گرانا۔"

"شرم تو نہیں آتی۔" رابعہ کو بے اختیار ہنسی آگئی۔

"کہتا یہ ٹھیک ہے۔" محسن نے کہا۔ "چلو دیکھتے ہیں آگے گیراج کہاں ہے۔ مکینک کے لیے کوئی خطرہ نہیں۔"

"اور اس میں شرم کی کوئی بات نہیں۔ وہ جائے گا اور گاڑی اسٹارٹ کر کے لے آئے گا۔" میں نے کہا۔ "تم کچھ حیرانی کا اظہار کرنا اور پچاس روپے دے دینا اُسے۔ اس طرح یہ ہوگا کہ کوئی تاک میں ہوگا تو سامنے آجائے گا اور پیچھا کرے گا تو ہم دیکھ لیں گے۔ نہ وہ مکینک کو روک سکیں گے نہ رابعہ کو اور اگر کوئی نہ ہوا تو ہم کو رابعہ آگے سے پک اپ کرے گی۔ آدھے گھنٹے میں گاڑی ہمارے پاس ہوگی۔" پھر میں نے اُسے بتایا کہ گاڑی کس گلی میں ہے۔

"اگر کوئی تعاقب کرتا ہوا آئے تو میں اُسے کہاں لے جاؤں؟"

"اس سے پوچھ لینا... افوہ! ناراض کیوں ہوتی ہو۔" میں نے کہا۔ "کہنے کا مطلب یہ تھا کہ انھیں چکّر دے کر نکلنے کی کوشش کرنا ورنہ کسی چوک میں پولیس کی مدد لینا۔ اور جب یقین ہو جائے کہ وہ بھاگ گئے ہیں تو اب سے ایک گھنٹے بعد ہوٹل ویسٹ اینڈ میں خواجہ نیک محمد کے کمرے میں انتظار کرنا۔"

"گیراج!" محسن نے انگلی سے اشارہ کر کے کہا۔ ایک گلی [illegible] دکان کا آدھا شٹر گرا ہوا تھا لیکن اندر روشنی تھی اور باہر لگے ہوئے بدنما سائن بورڈ پر آٹو ورکشاپ کے الفاظ پڑھے جا سکتے تھے۔ میں نے چابیاں رابعہ کو دیں اور پھر سمجھانا چاہا کہ اسے کیا کرنا ہے لیکن وہ میری سُنے بغیر روانہ ہو گئی۔

"تیری جورو ہے شیر کی بچی۔" محسن خان نے ارشاد فرمایا۔ "تو نے اُسے چوہیا کہا تھا قاضی کے بچّے۔"

"اچھا چل تیری جورو چوہیا ہے۔" میں نے کہا۔ "آپس کی بات ہے۔ خفا کیوں ہوتا ہے۔" اور اُسے سگریٹ پیش کی۔ سردی بڑھ گئی تھی لیکن اب سردی سے زیادہ بھوک کی اہمیت بڑھنے لگی تھی۔ میں نے رابعہ کو کھلے شٹر کے نیچے سے جھک کر بات کرتے اور پھر کسی کو باہر آتے دیکھا۔ ان کے درمیان تھوڑی سی گفتگو ہوئی۔ حسبِ توقع وہ اندر گیا اور پھر کچھ اوزار اٹھا کے باہر نکلا۔ رابعہ جھک کر گیراج میں داخل ہو گئی۔

مکینک نوعمر لڑکا سا تھا جس نے تیل اور گریس کے داغوں سے سیاہ نظر آنے والی ڈانگری پہن رکھی تھی۔ غالباً استاد نے معمولی خرابی کا ذکر سُن کے اُسے روانہ کر دیا تھا اور خود بیگم صاحبہ کو اطمینان سے تشریف رکھنے کو کہا تھا۔ اب وہ ہم سے دس قدم آگے چل رہا تھا۔ دونوں ہاتھوں کو بغل میں دبائے اور سر کو جھکائے۔ وہ دن بھر کے کام کے بعد یقیناً تھکا ہوا تھا اور اس سردی میں یہ کام جو غیر متوقع طور پر آگیا تھا اسے بیگار لگتا ہوگا۔ وہ خود استاد اور گیراج کا مالک ہوتا تو کبھی باہر نہ نکلتا مگر زمانے کے گرم و سرد کا مزہ چکھے بغیر استاد بھی کون بنتا ہے۔ سڑک پر آمد و رفت برائے نام تھی۔

"تو نے کسی شکل کو پہچانا تھا' دلاور کے گھر کے سامنے گزرتے ہوئے۔" میں نے کہا۔

"نہیں۔ لیکن تو نے ایک بات نوٹ کی؟" محسن بولا۔ "لوگ برآمدے میں بیٹھے تھے۔ کیا کوٹھی کے اندر جگہ نہیں رہی تھی؟ زیادہ لوگ ہوتے تو باہر گاڑیاں بھی زیادہ ہوتیں۔ یہ کوئی گرمیوں کا موسم تو نہیں ہے۔"

"اس سے کچھ ثابت نہیں ہوتا۔" میں نے سخت حوصلہ شکن لہجے میں کہا۔ "اندر باہر سب دلاور کا گھر ہے۔"

"میں کہہ سکتا ہوں کہ باہر شکاری بیٹھے تھے۔" محسن نے کہا۔ "اور شکار کا انتظار کر رہے تھے۔"

"تو یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ پولیس والے جعلی تھے اور دلاور کے آدمی تھے جو وردیاں پہن کے کھڑے ہو گئے تھے کہ ہم کو... مطلب ہے مجھے ان کے اشارے پر گرفتار کر لیں۔" میں نے کہا۔

"میں سب کچھ کہہ سکتا ہوں اور کوئی مجھے کچھ نہیں کہہ سکتا۔" محسن نے چلّا کر کہا اور مکینک نے چلتے چلتے پلٹ کر دیکھا اور سڑک پار کی۔ اس کے خیال میں ہم دو راہ گیر تھے اور کسی مسئلے پر اونچا بول رہے تھے تو یہ کوئی ایسی بات نہ تھی۔

"میں صرف ایک بات کہہ سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "یہ کہ دلاور کی جگہ کسی اور کی لاش پڑی ہے۔ ابھی ہم غالب سے پوچھ لیں گے اور اس کو بتا دیں گے کہ ہمیں کیا شک ہے۔ وہ معلوم کر آئے گا۔"

گلی کے سامنے سے گزرتے ہوئے ہم نے فاکس ویگن کو اسی جگہ کھڑا دیکھا جہاں میں نے اُسے آخری بار پارک کیا تھا۔ مکینک گلی میں مڑ گیا اور ہم سیدھے گزر گئے۔ اس گھر کی عقبی دیوار سے ٹیڈی کے مالک کی دیوار ملتی تھی۔ مجھے اس بوڑھے کا خیال آیا جو سوچتا ہوگا کہ آخر نیک محمد کچھ بتلائے بغیر کہاں غائب ہو گیا۔ اسی گلی میں آگے شمشاد کا گھر تھا جسے ہم نے مروّت اور مہمان نوازی کا یہ صلہ دیا تھا کہ اُس سے گاڑی چھین لی تھی۔ خیر اب تک گاڑی اسے مل چکی ہوگی۔ وہ آئندہ سب کو بتائے گا کہ کس درجہ شریف اور مہذب چور اس کے مہمان ہوتے تھے اور وہ کتنے بااصول لوگ تھے۔

دھماکا اسی وقت ہوا۔ ہم تیسری گلی کے قریب پہنچ کر رکے تھے اور واپسی کی سوچ رہے تھے کہ درمیانے درجے کے کسی بم کے پھٹنے کی آواز نے ہمیں بوکھلا دیا۔ ہم گھبرا کے ایک ساتھ پلٹے کیونکہ دھماکا پیچھے ہوا تھا۔ رات ابھی زیادہ نہیں ہوئی تھی اس لیے کئی گھروں سے نکلنے والے دوڑ دوڑ کر اس جگہ تک آرہے تھے جہاں فاکس ویگن کے ڈھانچے کو آگ کھا رہی تھی۔ اس کے منتشر ہو جانے والے ٹکڑے دور دور تک پھیلے تھے اور جہاں گرے تھے وہیں روشن تھے۔ خالی پلاٹ کے تین طرف آباد گھر تھے۔ ان کی دیواروں میں سوراخ نظر آرہے تھے اور اندر سے عورتوں بچّوں کے چیخنے کا شور بلند ہو رہا تھا۔ کوئی گھر گرا نہیں تھا لیکن یہ اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ دھماکے کی شدت نے بالکل ساتھ والے گھروں میں کھڑکیوں کے شیشے چُورا کر دیے ہوں گے۔ اندر الماریوں اور شوکیسوں کے شیشے والے پٹ بکھر گئے ہوں گے اور ارتعاش سے برتن گرے ہوں گے۔ چنانچہ دھماکے نے اور پھر اس کے نتائج نے گھر کے مکینوں کو دہشت زدہ کر دیا تھا تو یہ ایک قدرتی بات تھی۔ شاید ایک لمحہ پہلے وہ بڑے سکون اور قناعت کے ساتھ دروازے بند کیے ہیٹر جلائے گرم کمروں میں ٹی وی کے سامنے بیٹھے ڈراما دیکھ رہے تھے اور اس انہماک اور اطمینان کو یکلخت دھماکے نے منتشر کر دیا تھا۔

فضا میں عجیب سی بُو تھی۔ تیل اور پٹرول کے جلنے کی، ٹائروں اور سیٹوں کا ربر جلنے کی۔ بارود کی اور ان سے الگ گوشت کے جلنے کی۔ صرف ہم جانتے تھے کہ یہ انسانی گوشت کے جلنے کی بُو ہے۔ وہ نوجوان مکینک جو تھکا ہوا ہونے کے باوجود اس سردی میں ایک عورت کی مدد کرنے اور اپنے لیے اور اپنے خاندان کے لیے کچھ کمانے کی خاطر چل پڑا تھا' یہ نہیں جانتا تھا کہ اس خوب صورت عورت کو فرشتۂ اجل نے اپنا نامہ بر بنا کے بھیجا ہے اور اپنی مسکراہٹ کی دلکشی سے اور ادائے حسن کی ساحری سے اس نے جھوٹ کا جو جال پھیلایا ہے' وہ موت کا جال ہے۔ اب اس نوجوان کی زندگی کا وجود ایک تصوّر رہ گیا تھا۔ اس کے جسم کے اجزا منتشر ہو کے راکھ ہو رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی وہ سب خواب بھی راکھ ہو رہے تھے جو خود اس نے کامیابی کے لیے اور خوشحالی کے لیے دیکھے تھے اور اس کے ماں باپ اور اس کے بھائی بہن اپنے گھر میں اس کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ ان میں شامل ہو چکے تھے جن کی آنکھیں ہمیشہ انتظار کرتی رہتی ہیں اور روتی رہتی ہیں مگر آنسوؤں سے امید کی وہ کرن نہیں بجھتی جو دل میں روشن رہتی ہے اور دھوکا دیتی رہتی ہے کہ دروازہ کھلا رکھنا، وہ آئے گا۔ وہ ہمیں چھوڑ کے کہاں جا سکتا ہے۔ وہ تو کسی مصیبت زدہ عورت کی گاڑی ٹھیک کرنے گیا تھا۔ بڑا ماہر کاریگر بن گیا تھا مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اب تک اس نے خرابی دور نہ کی ہو۔

"ہوش میں آ سکندر!" محسن نے مجھے کندھا پکڑ کے جھنجوڑا۔ "میں رابعہ کو لے کر آتا ہوں۔"

میں نے چونک کر دیکھا تو ہم اس گیراج کے قریب کھڑے تھے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں وہاں تک کیسے پہنچا۔ یہ خطرے سے دور ہو جانے کی لاشعوری خواہش تھی جس نے مجھے محسن کا ساتھ دینے پر مجبور کر دیا تھا ورنہ میرا ذہن تو نہ خطرے کے متعلق سوچ رہا تھا اور نہ فرار کے بارے میں۔ "کیا... کچھ کہا تھا تم نے؟" میں نے کہا۔

"تو بار بار کہہ رہا تھا' وہ آئے گا۔ وہ ضرور آئے گا۔" محسن نے کہا اور گلی میں غائب ہو گیا۔

میری آنکھیں خلا میں دیکھ رہی تھیں۔ فاکس ویگن دھڑا دھڑ جل رہی تھی اور اس کے آس پاس جمع ہو جانے والے سب ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ یہ سب کیا تھا اور کیسے ہوا؟ یہ کس کی گاڑی تھی اور کون ہے اس کا مالک؟ انھیں بتانے والا کوئی نہ تھا کہ اس کی مالک بڑے اطمینان سے ایک گیراج میں بیٹھی ہے جہاں خوش اخلاق مالک نے اسے ایک کرسی فراہم کر دی ہے۔ گیس ہیٹر کو اس کے قریب کر دیا ہے اور اس کے

لیے غلیظ سے مچو ٹے سے بدنما کپ میں گرما گرم چائے منگوا لی ہے۔ اور یہ لالچ نہیں، نیکی کا جذبہ ہے اور شرافت کا سلوک ہے ورنہ وہ انکار بھی کر سکتا تھا کہ اس وقت اتنی دور جانے والا... کوئی نہیں ہے صبح گاڑی لے آنا ٹھیک کر دیں گے۔ ایک کار کے جلنے کا نظارہ دیکھنے والوں کو یہ بتانے والا کوئی نہ تھا کہ یہ ایک بم کا دھماکا تھا جو اس لیے انجن میں فٹ کیا گیا تھا کہ ایک شخص سکندر بخت ولد وزیر خان اور اس کے کچھ مخلص و جاں نثار دوست اس میں فرار ہونے کے لیے انجن اسٹارٹ کریں تو ان کے وجود سے وابستہ مسائل پلک جھپکتے میں حل ہو جائیں لیکن تدبیر سے بڑھ کر تسکاری تقدیر ہے۔ شکاری جن کو ختم کر دینے کا بندوبست کر چکے تھے، وہ سلامت رہے اور ان کے حصے کی موت ایک بیگناہ محنت کش نوجوان کا مقدر رہو گی مگر کیا کوئی کسی کی جگہ مر سکتا ہے؟ یہ تو دستِ قدرت کے فیصلے ہیں جن میں تحریف آدمی کے بس کی بات نہیں۔ ہر شخص اپنی موت مرتا ہے۔ کسی اور کی موت نہ وہ لے سکتا ہے اور نہ کوئی اسے اپنی موت دے سکتا ہے۔ اس میں وقت کے ایک ثانیے کا یا مقام کے فرق کا اختیار کسی کو حاصل نہیں۔ چنانچہ ہماری جگہ وہ نوجوان مکینک پہنچا اور اس نے زندگی پر مکمل اعتماد رکھتے ہوئے اگنیشن میں چابی لگا کے دیکھنا چاہا کہ گاڑی آخر اسٹارٹ کیوں نہیں ہوتی۔ اگر قدرت کو اسے زندہ رکھنا منظور ہوتا تو وہ انکار کر دیتا جانے سے۔ اپنی جگہ کسی اور کو بھیج دیتا یا انجن کو اسٹارٹ کرنے سے پہلے کھول کر دیکھ لیتا۔ شاید اسے دیکھے بھالے انجن کے درمیان کسی غیر مانوس چیز کی موجودگی کا پتا چل جاتا۔

لیکن یہ سب ایسے ہی اور اسی وقت ہونا تھا اور میرا پشیمانی کا احساس جو میرا جرم بن رہا تھا، بے معنی تھا... سب مصرف تھا۔ میں نے رابعہ کو محسن کے ساتھ سڑک عبور کر کے آتے دیکھا اور پھر بلا ارادہ ان کے ساتھ چل پڑا مگر میرا دماغ غیر حاضر تھا۔ وہ بُو کسی آسیب کی طرح میرا پیچھا کر رہی تھی جو ایک جیتے جاگتے انسان کے جسم کے جلنے کی بُو تھی۔ جو ایک سیکنڈ پہلے تھا اور دوسرے سیکنڈ میں نہیں تھا۔

"تمھاری حالت کیوں غیر ہو رہی ہے سکندر!" رابعہ نے میرا بازو تھام کر کہا۔

"میں ہی تو ذمے دار ہوں اس کی موت کا رابعہ۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ اسے جھوٹ کے خوب صورت جال میں گرفتار کر کے مرنے کے لیے بھیج دینا۔" میں نے کھوکھلے لہجے میں کہا۔

"تم کو کہاں معلوم تھا کہ انجام یہ ہو گا۔" رابعہ نے نرمی سے کہا۔

"انجام کے بارے میں سوچ لینا چاہیے تھا مجھے۔" میں نے کہا۔ "میں نے خود کو بچا لیا اور اسے اپنی جگہ..."

"کیسی باتیں کر رہے ہو؟ تمھارا تو صرف یہ خیال تھا کہ شاید کوئی اس کا تعاقب کرتا ہوئے آئے گا۔ کوئی تمھارا پتا چلانے کے لیے وہاں موجود ہو گا تو معلوم ہو جائے گا۔ تم اس کے دشمن تو نہیں تھے۔" رابعہ نے کہا۔

"لیکن یہ خیال تو میرا ہی تھا۔" میں نے کہا۔ "کیا میں نے..."

"یہ خیال تو مجھے بھی آ سکتا تھا اور محسن کو بھی۔ اور زندگی یا موت تو خدا کی مرضی سے ہے۔" رابعہ نے کہا۔ "ایسا نہ ہوتا تو اب تک ہم کب کے مارے جا چکے ہوتے۔"

محسن اور رابعہ خود بھی احساسِ پشیمانی کا شکار تھے لیکن میری جذباتی کیفیت ان سے مختلف تھی۔ ان کو افسوس تھا کہ وہ نوجوان مکینک بے گناہ مارا گیا تو مجھے خیال تھا کہ وہ میری وجہ سے مارا گیا۔ رابعہ اور محسن کے تسلی دینے اور ان کی منطقی باتوں سے دلائل سے اور تسلی سے میرے ضمیر کا بوجھ فوراً کم نہیں ہو سکتا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ یہ خلش آزار بھی میری روح میں کانٹا بن کے موجود رہے گی۔

"اس گیراج میں اور کون تھا؟" میں نے رابعہ سے پوچھا۔

"ایک ادھیڑ عمر کا شخص تھا۔" رابعہ نے کہا۔ "بڑی شرافت سے پیش آیا تھا۔ میں نے پوچھا تھا کہ یہ تمھارا بیٹا تھا جو گاڑی ٹھیک کرنے گیا ہے۔ کہنے لگا خدا نہ کرے کہ میری ایسی اولاد ہو۔ بچپن میں ہی گھر سے بھاگ آیا تھا۔ زمانے بھر کی ٹھوکریں کھاتا رہا اور گاڑیاں صاف کرتے کرتے گاڑیاں ٹھیک کرنے لگا۔ نہ جانے کہاں کہاں سے نکالا گیا کیونکہ ایک بُری عادت چوری کی پڑ گئی تھی۔ ورکشاپ میں تو ہر قسم کی گاڑیاں ہوتی ہیں اور ان میں سب کچھ ہوتا ہے۔ بعض اوقات تو مالک نقد رقم وغیرہ تک بھول جاتے ہیں، یہ سب غائب کر دیتا تھا۔ کبھی کسی کا ریڈیو نکال لیا، کسی کا پرزہ مار لیا۔ ورکشاپ کے سیکڑوں اوزار ہوتے ہیں۔ کوئی سب پر نظر نہیں رکھ سکتا لیکن یہ پکڑا جاتا تھا بالآخر۔ اس نے بتایا کہ چاہے تو اچھا کام کر سکتا ہے اور بہت کما سکتا ہے مگر نشے کی لت میں برباد ہو رہا ہے۔ اب محنت بھی کرتا ہے تو اسی لعنت کی خاطر اور چوری بھی کرتا ہے تو اسی کے لیے۔ جوانی کا ناس کر لیا ہے۔ میں نے پوچھا تھا کہ ماں باپ کچھ نہیں کہتے۔ تو ہنسنے لگا کہ سات سال میں گھر سے نکلا تھا، اب اکیس سال کا ہے۔ اسے خود بھی یاد نہیں کہ سیالکوٹ میں اور کون تھا۔ ایک بار اپنے محلے میں گیا تھا مگر نہ گھر ملا، نہ کوئی جاننے والا۔ میں نے کہا کہ تم ہی منع کیا کرو۔ وہ بولا کہ جو ماں باپ کا نہ ہوا اس کے لیے میرے کچھ کرنے سے کیا ہو گا اور وہ سننے کا کب میری۔ بس

چھوڑ کر چلا جائے گا۔ کام تو مل ہی جاتا ہے کاریگر کو۔ ایسی زندگی بھی ہوتی ہے سکندر۔ یوں بھی جیتے ہیں لوگ، کسی رشتے کے بغیر۔"

"ہم سے اس کی زندگی کس طرح مختلف تھی۔" میں نے کہا۔ "ہم بھی تو اکیلے ہی ہیں۔"

"نہیں سکندر! ہم اکیلے نہیں ہیں۔" رابعہ نے کہا۔ "تمھارے ساتھ تو پہلے بھی محسن تھا۔ اکیلی تھی تو میں لیکن اب میرے ساتھ تم ہو اور محسن ہے، تھلا ہے۔ اس کے علاوہ ہم کو زندگی سے پیار ہے۔ ہم جینا چاہتے ہیں اور اپنی اپنی چھوٹی چھوٹی خواہشات کی خوب صورت دنیا بنانے کے لیے بھرپور جدوجہد کر رہے ہیں۔ وہ لڑکا آج یوں نہ مرتا تو کل زیادہ عذاب جھیل کے مرتا۔ نشے کی لت اسے چور تو بنا ہی چکی تھی۔ وہ جیل جاتا۔ نکلتا تو بڑا چور بنتا اور نشے کی عادت اسے تباہ کرتی۔ وہ اس کے لیے ڈاکے ڈالتا یا دوسروں کو یہ زہر بانٹتا۔ وہ تو خود اپنی زندگی کا دشمن تھا اور کسی کو دلچسپی نہ تھی کہ اس کو زندگی سے محبت کرنا سکھائے۔"

محسن نے بالآخر ایک ٹیکسی کو روک لیا۔ میں نے اندر بیٹھ کر اس بوجھ کو بہت کم محسوس کیا جو ابھی تک میرے لیے ناقابلِ برداشت بنا ہوا تھا۔ قیمت تو کسی زندگی کی کم نہیں مگر کچھ لوگ مرتے ہیں تو جینے والوں کو مار جاتے ہیں اور سارا دکھ ان کے حصے میں آتا ہے جو زندہ رہنے پر مجبور ہوتے ہیں لیکن اس نوجوان مکینک کی موت کا سب سے زیادہ صدمہ آج اگر تھا تو مجھے تھا۔ کل کو شاید وہ ایک گھر بنا لیتا تو اس کے بیوی بچے ہوتے جو اس کے اعمال کی سزا بھی کاٹتے اور عدم تحفظ کے باعث دنیا کے ہاتھوں بھی ان کا جینا دوبھر ہوتا۔

"یہ تو معلوم کرے گی پولیس کہ وہ گاڑی کس کی تھی۔" محسن نے انگریزی کے بجائے گفتگو کے لیے فرانسیسی کا سہارا لیا کیونکہ خاموش بیٹھنا بھی مشکل تھا اور ٹیکسی ڈرائیور کی وجہ سے اردو یا انگریزی میں اظہارِ خیال میں خطرہ تھا۔ بیروزگاری کے سبب گریجویٹ ٹیکسی ہی نہیں چلا رہے تھے، دفتروں میں چپراسی کی جگہ بھی لینے پر تیار ہوتے نکلے تھے۔

"انھیں یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ گاڑی میں کوئی شخص جل کر مرا ہے۔" میں نے کہا اور جواب فرنچ میں ہی دیا۔ "ممکن ہے اس کی شناخت بھی ہو جائے۔"

"اس گیراج کا مالک بھی رابعہ کا حلیہ ضرور بیان کرے گا۔" محسن بولا۔ "اور پھر پولیس رابعہ کو تلاش کرے گی۔ زیادہ مناسب یہ ہے کہ رابعہ اسی وقت جائے اور اپنی کار کے گم ہونے کی رپورٹ درج کرائے۔ طریقہ وہی استعمال کرے جو چوہدری دلاور نے استعمال کیا تھا یعنی رپورٹ درج کرانے کا وقت کم سے کم ایک گھنٹا پہلے کا ہو۔"

"تو رابعہ کے ساتھ چلا جا۔ تاکہ تھانیدار سے نوٹوں کی زبان میں بات کر سکے۔ اگر اس کے پاس گنجائش نہ ہوئی تو وہ خود کسی تھانے سے معلوم کر لے گا۔ جہاں بھی وقت کا فرق زیادہ سے زیادہ ہو وہاں چلے جانا۔"

"اور تو کہاں جائے گا؟ اتنی دیر کیا کرے گا؟"

"مجھے مرزا غالب کے دفتر کے سامنے اتار دینا۔" میں نے کہا۔ "اس سے مل کر میں ہوٹل اوسس چلا جاؤں گا اور ایس بی کے خان کے نام سے کمرہ لوں گا اور تمھاری واپسی کا انتظار کروں گا۔"

ایس بی کے خان میرے دونوں ناموں کا مجموعہ تھا۔ سکندر بخت کبیر خان اور محسن نے جس انداز سے سر ہلایا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بھی سمجھ گیا ہے۔ جب ٹیکسی مجھے اتار کے چلی گئی تو میں نے خود کو اخبار کے دفتر کی عمارت کے سامنے تنہا پایا۔ اس علاقے میں یہی ایک بلڈنگ روشنی اور گہما گہمی کا مرکز نظر آتی تھی۔ باقی کاروباری اداروں کے دفاتر تاریک اور ویران پڑے تھے۔ باہر ایک طرف موٹر سائیکلیں اور سائیکلیں قطار میں کھڑی تھیں تو دوسری جانب کاریں صف بستہ تھیں۔ میں ذہنی و جسمانی طور پر تھکن کا شکار تھا۔ دماغ پر ابھی تک اس نوجوان مکینک کی موت کا اثر تھا اور میری آنکھوں کے سامنے بار بار اس کی وہ تصویر آ جاتی تھی جب وہ ہم سے دس قدم آگے ڈانگری پہنے اور ہاتھ بغل میں دبائے چل رہا تھا۔ ہم میں سے کسی کو خواہش کے باوجود کھانا کھانے کا موقع نہیں ملا تھا اور اب یہی ایک صورت تھی کہ ہم اپنے اپنے طور پر جو ملے اسی سے پیٹ بھر لیں۔ سردی کے باعث مجھے گرم چائے یا کافی کی خواہش الگ تھی۔

اخبار کے دفتر میں میرا بنفسِ نفیس قدم رنجہ فرمانا کوئی دانش مندی کی بات نہ تھا۔ کوئی مجھے پہچان لیتا تو تازہ ترین خبر میری گرفتاری کی لگ جاتی لیکن مجھے اندازہ تھا کہ اخباری دنیا کے دانشور لوگ اس وقت کتنے مصروف ہوں گے۔ ایک مختصر سے وقفے میں شہر کی، ملک کی اور دنیا کی خبروں کو جمع کرنا، الگ کرنا اور طباعت کے آخری مراحل تک پہنچا کے صبح دم پورا اخبار پیش کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہوتا اور یہ وہ لوگ تھے جو ہر روز جوئے شیر لاتے تھے۔ ہر صبح اس اطمینان کے ساتھ رخصت ہوتے تھے کہ انھوں نے ایک کارنامہ سرانجام دیا ہے اور ہر شام اس احساس کے ساتھ لوٹتے تھے کہ انھیں پہاڑ کاٹنا

ہے۔ چنانچہ ایسے مصروفیت کے وقت میں ان کی ذہانت، قوتِ مشاہدہ اور یادداشت پر کام کا دباؤ ہوگا اور کوئی نہ مجھے قابلِ توجہ سمجھے گا نہ نظر اٹھا کے دیکھے گا۔

کاؤنٹر پر بھی رش تھا۔ لوگ پریس ریلیز دے کر جارہے تھے اور مصر تھے کہ ان کی انجمن کی تقریب یا ان کے جلسے کی خبر۔ کوئی بیان یا کوئی تصویر صبح کی اشاعت میں شامل کی جائے حالانکہ اب اس کا وقت گزر چکا تھا۔ پھر اندرونِ ملک نامہ نگاروں کے ٹیلی فون آرہے تھے اور وہیں بیٹھا ہوا آپریٹر مسلسل چلّا رہا تھا اور اِدھر کی لائن اُدھر ملا رہا تھا۔ اس ہڑبونگ میں میری آواز بھی بڑی مشکل سے سنی گئی۔ "کیا ہے جی؟ کس کو بلانا ہے؟" آپریٹر نے دسویں بار پوچھا۔

"اسے بھئی مرزا غالب کو۔ کہو رابعہ بی بی ان کا انتظار کر رہی ہیں۔" میں نے کہا اور اس مرتبہ آپریٹر نے لائن ملا کے میری بات دُہرائی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مرزا غالب نے خود ریسیور اٹھایا تھا۔ میں کاؤنٹر سے ذرا ہٹ کر کھڑا ہوگیا اور انتظار کرنے لگا۔ غالب دس منٹ بعد نمودار ہوا۔ جاگر ٹائپ جوتے، ڈینم کی گھٹنے نکلی ہوئی اور پیوند لگی پتلون اور چمڑے کی جیکٹ۔ پریشان بال اور پریشان صورت۔ وہ مجھے دیکھے بغیر میرے سامنے سے نظریں گھماتا گزر گیا۔ اس کے ذہن میں رابعہ کا نام تھا چنانچہ وہ صرف ایک مانوس زنانہ چہرے کو تلاش کر رہا تھا۔ باقی چہرے اُسے نظر ہی نہیں آرہے تھے۔ میں چند قدم اس کے پیچھے چلا اور جب وہ باہر نکل کے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا تو میں نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر کہا۔۔۔

"السلام علیکم مرزا!"

وہ چونک کر پلٹا "ارے تم سکندر بادشاہ! تو یہ تم تھے۔"

"یار ذرا آہستہ۔ اچھا ہوا کہ تم نے باہر آکے میرا نام لیا۔" میں نے کہا۔ "مجھے کام ہے تم سے۔ فرصت کب ہوگی؟"

"بھئی ہمارا کام تو ختم ہوگیا تھا۔ بس ایسے ہی دوسروں کے کام میں ٹانگ اڑا رہے تھے۔" وہ بولا۔ "لوگ جب کہتے ہیں کہ ایک کام ہے تو عموماً پیسہ ادھار مانگتے ہیں۔ دس روپے ہوں گے تمھارے پاس؟"

میں ہنس پڑا۔ "دس کیا سو لے لینا۔ لیکن کام ذرا لمبا ہے۔ میرے ساتھ چلو۔"

"اور کیسے چلیں بھئی! اپنا ہوائی گھوڑا لے لیں؟" وہ بولا۔ "مگر اس وقت بحرِ ظلمات کی جگہ بحرِ منجمد شمالی میں گھوڑے دوڑانے والی بات ہوگی۔۔۔۔۔۔ اسلاف میں شامل ہوجائیں گے۔"

"موٹر سائیکل چھوڑو ویسے ہی چلتے ہیں۔ میں نے کھانا بھی نہیں کھایا ہے۔"

"وہ تو ہم نے بھی نہیں کھایا۔ آپ نے یاد دلایا تو ہمیں یاد آیا۔" غالب نے کہا۔ "کس قسم کا کھانا کھاؤ گے بورژوا یا پرولتاری؟"

"جیسا قریب ملے اور کھایا جاسکے۔" میں نے کہا۔ "لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ چوہدری دلاور کے کیس کی تازہ ترین صورتِ حال کیا ہے؟"

"چوہدری دلاور کا کیس؟" وہ سوچتے ہوئے بولا۔ "کون سا کیس؟ کوئی نیا گل کھلایا ہے اس نے؟"

"یار اتنی سردی میں گرما گرم لطیفے بھی مزہ نہیں دیتے۔" میں نے کہا۔

"یار حد ہوگئی! ہم تو خود مانتے ہیں کہ ہم اُلّو ہیں۔ اب آپ کیوں اُلّو بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ بخدا ہم کو اس کے کسی کیس کی خبر نہیں۔ بڑا کیس ہوتا تو بڑی خبر بنتی اور ہم بھی سن لیتے۔" وہ جلایا۔

"یعنی چوہدری دلاور کا قتل اتنی چھوٹی خبر ہے کہ کسی نے پڑھی ہی نہیں؟" میں نے بھنّا کے کہا۔

غالب چونکا اور ایک دم رک گیا۔ "قتل! اُسے قتل کر دیا ہے کسی نے؟" وہ چلّایا۔ "یہاں آکے بتا رہے ہو مجھے یہ بات۔ چلو واپس۔" اس نے میرا ہاتھ پکڑ کے کھینچنا شروع کیا۔ "اسٹاپ پریس نیوز لائن ہے۔"

میں نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ "ایک منٹ ٹھہرو۔ کیا واقعی تم کو نہیں معلوم؟"

"قسم خدا کی! ابھی اس شہر میں کسی اخبار والے کو معلوم نہیں۔" وہ بے چینی سے بولا۔ "دیکھو سکندر بادشاہ! اپنا تو یہی کیریئر ہے۔ تم "ایکس کلیوسو" اسٹوری لائے ہو۔ جو معلوم ہے وہ بتاؤ۔۔۔ اتنا بڑا دھماکا۔۔۔"

"مرزا غالب! کیا تم نے شام کا اخبار نہیں دیکھا؟ جو صبح کے بعد آیا تھا۔" میں نے اسے پھر روک لیا۔

"کون سا اخبار؟" غالب نے کہا۔ "شام کے سارے اخبار میری ڈیسک پر پڑے ہیں۔"

"اور ان میں یہی خبر نہیں دیکھی تم نے؟" میں نے برہمی سے کہا۔ "بے وقوف بنانے کا ڈراما اب بند کرو۔"

"لاحول ولاقوۃ! تم نام بتاؤ اخبار کا۔ ہم تو ہر اخبار کی ہر سطر لائن تک خوردبین سے دیکھتے ہیں۔ ہماری اس عینک کے شیشے وہ بھی پڑھ لیتے ہیں جو شائع نہیں ہوتا۔" وہ بولا۔ "کس اخبار کی بات کر رہے ہو تم؟"

میرا دماغ چکرا گیا۔ غالب سنجیدہ تھا اور ہوش میں بات کر رہا تھا۔ میں نے اُسے نام بتایا تو وہ مجھے پانچ منٹ انتظار کرنے کا کہہ کر واپس گیا۔ کیا یہ ہوسکتا ہے کہ صرف ایک ہی اخبار کے

نمائندے کو سب سے پہلے خبر ملی ہو اور اس نے دوسروں کو بتائے بغیر دھماکا کیا ہو مگر دھماکے کو بھی اب تو دس بارہ گھنٹے ہو چکے۔ یہ خبر تو جنگل کی آگ بن کر پھیلنے والی تھی۔ اگر اس کو دبانا مقصود ہوتا تو اس وقت کچھ ہوسکتا تھا جب پہلا اخباری نمائندہ نمودار ہوا تھا۔ ایک اخبار میں چھپ گئی تو گویا سب میں چھپ گئی لیکن کمال ہے کہ اتنے بڑے اخبار کا ایک اتنا سینیئر اور پرانا صحافی ابھی تک بے خبر ہے۔

پانچ منٹ سے بھی کم وقت میں غالب پھر نمودار ہوا تو اس کے ہاتھ میں وہی شام کا اخبار تھا۔ "لو یہ دیکھو۔ بتاؤ کہاں ہے وہ خبر؟" اُس نے اخبار مجھے تھما کر کہا۔ "یہی اخبار تھا نا؟"

"ہاں! اخبار تو یہی تھا۔" میں نے پہلے صفحے پر ایک سرسری نگاہ ڈالی اور میری عقل خبط ہوگئی۔ میں نے اخبار کو اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ اس میں ہر خبر مختلف تھی۔ میں نے نظر اٹھا کے غالب کو دیکھا۔ وہ مجھے یوں دیکھ رہا تھا جیسے کوئی سمجھدار باپ اپنے شریف زادے کو پہلی بار نشے میں گم لوٹنے پر دیکھتا ہے۔ آہستہ آہستہ میرا ہاتھ اندر کی جیب میں گیا اور میں نے وہ اخبار نکال لیا جو اتفاق سے ابھی تک محفوظ تھا۔ ورنہ میرے محسن اور رابعہ کے پڑھ لینے کے بعد اس کی کوئی اہمیت نہیں رہی تھی کہ اُسے ضرورت کے لیے سنبھال کر رکھا جاتا۔ میں نے وہ اخبار غالب کی طرف بڑھا دیا۔

غالب نے تہ در تہ اخبار کو کھولا اور اسٹریٹ لائٹ کی روشنی کے رُخ کر کے پڑھا۔ وہ ایک دم ہنسا۔ "سکندر بادشاہ! تم وقت سے چوبیس گھنٹے پیچھے چل رہے ہو۔" وہ بولا۔ "یہ کل کا اخبار ہے۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے!" میں نے اخبار اُس سے چھین کر تاریخ دیکھی۔ تاریخ ایک دن پہلے کی تھی۔ "یار غالب! تم یہ مت سمجھنا کہ میں نے دانستہ نادانستہ چرس بھری سگریٹ پی لی ہے یا میرا دماغ ویسے ہی چل گیا ہے۔ یہ اخبار میں نے آج خریدا تھا اور ایک ہاکر سے۔ وہ چلّا چلّا کے اخبار بیچ رہا تھا اور یہی اعلان کر رہا تھا۔ تم دیکھو یہ خبر۔"

"خبر تو ہے مگر یہ کوئی گڑبڑ ہے۔" وہ اخبار دیکھ کر بولا۔ "چلو پہلے کچھ کھا پی لیں۔ پھر یہ معمّا بھی حل کرتے ہیں۔ تمھارے ساتھ کوئی فراڈ ہوا ہے۔"

"اخبار والوں نے فراڈ کیا ہے؟" میں نے کہا۔ "ان کو کتنے نفل کا ثواب ملا ہوگا؟"

"اس میں ثواب عذاب کا کیا ذکر! ہم سمجھ رہے ہیں بات کو۔ ابھی تم کو بھی سمجھا دیتے ہیں۔" اس نے ایک ریسٹورنٹ کا دروازہ کھولا۔ اندر سے گرم ہوا کا جھونکا آیا جس میں کھانوں کی اور چائے کی خوشبو تھی لیکن میری بھوک غائب ہوگئی تھی۔ البتہ غالب میرے مقابلے میں زیادہ پُرسکون رہا۔ اُس نے اصرار کر کے مجھے بھی کھانا کھلایا اور خود بھی ڈٹ کر کھایا۔ پھر اُس نے کافی منگوائی اور میرے پیکٹ میں سے سگریٹ جلائی۔ درمیان میں اُس نے مجھے بولنے ہی نہیں دیا۔

"اب سناؤ ذرا احوالِ واقعی! آخر یہ سلسلہ کہاں سے شروع ہوا؟" وہ بولا۔

میں نے اُسے کم سے کم الفاظ میں بتایا کہ کس طرح ہم ٹیڈی کے گھر سے فرار ہوئے تھے اور کس طرح شامتِ اعمال ہمیں اس گھر میں لے گئی تھی جہاں پہلے میرے والد رہتے تھے اور اب ایک ریٹائرڈ جج رہتا ہے۔ میں نے جج کی زبانی ہونے والے انکشافات کا تذکرہ کیا اور بتایا کہ اخبار میں نے واپسی میں ساڑھے بارہ ایک بجے کے قریب لیا تھا۔ بظاہر وہیں سے کوئی میرے پیچھے لگ گیا تھا جس نے اورینٹ ہوٹل تک میرا تعاقب کیا اور پولیس کو اطلاع دی۔ ہم وہاں سے کیسے نکلے، کس طرح رابعہ سے ملے اور اس وقت کہاں سے آرہے تھے، یہ سب غالب نے بڑی توجہ سے سُنا پھر میں نے محسن کے خیال کا تذکرہ کیا جسے اب تک مجذوب کی بڑ سمجھتے ہوئے میں نے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی

لیکن اب میں اعتراف کرنے پر مجبور تھا کہ محسن واقعی صاحب کشف و کرامات ہے۔

"لاحول ولاقوۃ! ابھی اس نے اندھیرے میں تیر چلایا تھا، نشانے پر لگ گیا۔ ایسے تو سب ولی ہونے کا دعوے کر سکتے ہیں۔ وہ باپ بیٹے تھے نا جو کہتے تھے کہ دنیا میں ہم سے سچا کوئی نہیں۔ باپ کہتا تھا کل بارش ہوگی بیٹا کہتا تھا کل بارش نہیں ہوگی۔ کبھی ایک کی بات سچ ثابت ہوتی تھی کبھی دوسرے کی۔ میں ابھی کہوں کہ صبح زلزلہ آئے گا۔ آ گیا تو میں صاحبِ کشف و کرامات ورنہ پاگل۔"

"مرزا غالب! اگر دلاور مرا نہیں ہے تو کون مرا ہے؟" میں نے کہا۔ "یہ تم کو معلوم کرنا ہے لیکن اس سے پہلے مجھے وہ بات بتاؤ جو میری ناقص عقل میں نہیں آ رہی ہے۔ یہ ایک تاریخ کے دو اخبار کیسے ہو گئے؟"

"جہاں تک ہماری فہم و فراست کو دخل ہے۔" مرزا غالب نے کہا۔ "تو ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ فراڈ اخبار والوں کے ساتھ کیا گیا ہے۔ کل جب اخبار چھپ گیا تو اس کی وہ کاپی چرا لی گئی یا کسی بے ایمانی سے خرید لی گئی جو بے مصرف ہو گئی تھی۔ مطلب اس کاپی سے ہے جس پر خبریں جوڑی جاتی ہیں اور اخبار چھاپا جاتا ہے۔ جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے اسی جگہ کل دوسری خبر تھی۔ کسی افریقی ریاست میں فوجی انقلاب آنے اور ناکام ہونے کی خبر تھی۔ کسی نے اس خبر کو نکال دیا اور ایک نئی خبر کی کتابت کرائی گئی۔ سرخی لکھوائی گئی اور اصل خبر کی جگہ لگا دی گئی۔ کتابت تو ٹھیک ہے لیکن خبر کی زبان صحافیانہ نہیں ہے۔ اس میں کچھ 'پرسنل ٹچ' ہے۔ رپورٹنگ میں اور اسٹوری رائیٹنگ میں فرق ہے اور یہ کسی رپورٹر کی زبان نہیں۔ اس میں افسانوی رنگ ہے۔ خیر تو یہ کل کی کاپی کافی مہارت کے ساتھ بدلی گئی۔ یہ خاصا ٹیکنیکل کام ہے اور بہت پلاننگ کے ساتھ کیا گیا ہے۔ یہ اسکیم پہلے ہی تیار کر لی گئی ہوگی۔ سرخی کے ساتھ خبر بھی کتابت کرائی جا چکی ہوگی۔ کسی کاپی جوڑنے والے سے بھی بات طے ہوگی۔ اب ممکن ہے یہ کوئی نہ بتا سکے کہ کاتب کہاں سے لیا گیا تھا اور کاپی جوڑنے والا کہاں سے۔ تاہم انھوں نے بھاری معاوضے پر یہ کام کر دیا۔ ایک کاتب یا کاپی پیسٹر کے لیے دس ہزار بھی بھاری معاوضہ ہے۔ پھر دن کے وقت کسی اخبار کے پریس میں مشین مین وغیرہ کی مدد سے بدلی ہوئی خبر کے ساتھ اخبار کی سو پچاس کاپیاں چھاپ لی گئیں۔

"کیا ان کو الہام ہوا تھا کہ اس وقت میں فلاں جگہ سے گزروں گا؟"

"ان کو معلوم ہو گیا تھا کہ تم کہاں ہو۔" غالب نے کہا۔ "ہو نے کسی لڑکے کو چند منٹ کے لیے وہاں کھڑا کر دیا اور اس نے تم کو دیکھتے ہی اناؤنسمنٹ شروع کر دی۔ چند منٹ میں اس کے پاس سے کتنے اخبار نکلے ہوں گے۔ یہی چار پانچ اور بھی غیر متعلق افراد نے محض تجسس میں خرید لیے ہوں گے یا جو نے جو پڑھتے ہی شام کا اخبار ہیں۔ خبر شہر میں کیسے پھیل سکتی ہے اب تو ہم کہیں کہ خریدار بھی انھی کے تھے تو بعید از قیاس نہیں اگر تم ادھر نہ جاتے تو یہ اخبار کسی اور جگہ تمہارے ہاتھ میں تھمایا جاتا۔"

"لیکن ہم تو کسی پروگرام کے بغیر ادھر چلے گئے تھے۔" میں نے کہا۔

"نہیں تم کو ہانک کر ٹیڈی کے گھر سے نکالا گیا تھا۔" غالب بولا۔ "اور ان کی توقعات کے مطابق تم نے سیدھا راستہ اختیار نہیں کیا تھا۔ تم پیچھے سے فرار ہوئے تھے جہاں وہ تم کو دیکھ رہے تھے۔ خلافِ توقع صرف ایک بات ہوئی تھی جب تم شمشاد کے گھر میں چلے گئے تھے اور پھر اس کی کار میں روانہ ہو گئے تھے۔ میرا خیال ہے انھوں نے بعد میں شمشاد سے ہی پوچھا ہوگا کہ وہ مہمانوں کو کہاں چھوڑنے گیا تھا اور اس نے بتا دیا ہوگا

"اسے ہم نے ضلع کچہری سے ذرا آگے اتار دیا تھا۔ اس نے کیا بتایا ہوگا؟" میں نے کہا۔

"باقی ان کا اندازہ تھا جو درست ثابت ہوا۔" غالب نے کہا۔ "تمہارا رُخ کدھر تھا آخر؟ اسی سمت میں جہاں تم اکثر جاتے رہتے ہو۔ گاڑی کہاں کھڑی کی تھی تم نے؟"

"اپنے پرانے گھر کے اندر۔" میں نے کہا۔

غالب ہنسا۔ "انھوں نے گاڑی دیکھ لی ہوگی۔ کتنی دیر کھڑی رہی تھی وہاں گاڑی؟"

"کافی دیر تک۔ میرا خیال ہے ڈیڑھ دو گھنٹے تک۔" میں نے احمقوں کی طرح کہا۔

"کافی مہلت دی تم نے انھیں۔" غالب بولا۔ "شمشاد تو آدھے گھنٹے بعد ہی واپس اپنے گھر پہنچ گیا ہوگا۔ اور اس کو کیا ضرورت تھی تمہارے غیر شریفانہ سلوک کے بعد کچھ چھپانے کی۔ وہ ڈرا ہوگا یا ڈرا دیا گیا ہوگا کہ جھوٹ بولنے سے زیادہ خرابی ہوگی۔ انھیں بہت زیادہ وقت تو نہیں ملا لیکن ان کی خوش قسمتی تھی یا تمہاری بدقسمتی کہ ان کا اندازہ درست ثابت ہوا اور تم ماڈل ٹاؤن میں دریافت ہو گئے۔ باقی انتظام مکمل تھا۔"

"مرزا غالب! محسن کی بات کو تمہاری بات کے ساتھ ملا کے سمجھا جائے تو مسئلہ حل ہو جاتا ہے لیکن ابھی اس میں ایک بہت بڑا سقم ہے۔" میں نے کہا۔ "ہمیں ٹیڈی کے گھر سے نکالنے والوں نے یہ نہیں چاہا تھا کہ ہم زندہ سلامت نکل جائیں۔ انھوں نے تو رابعہ کی گاڑی میں بم فٹ کر کے ہمارا کام تمام کرنے کا پورا بندوبست کر لیا تھا۔ پھر یہ اخبار کے ذریعے جعلی خبر مجھ تک پہنچانے کا انتظام انھوں نے کیوں کیا تھا؟ یہ انتظام پہلے کر لیا گیا تھا اور بم بعد میں رکھا گیا۔ وہ مجھے ختم کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے تو اخبار کے ذریعے جھوٹی خبر پہنچانے کا بندوبست تو بے مقصد ہو چکا تھا۔ کیا وہ اس کی کاپی مجھے عدم آباد ارسال کرتے؟"

"ہم نے آپ کی بکواس بڑے تحمل سے سُنی۔" غالب بولا۔ "اب آپ بھی ذرا تحمل سے کام لیتے ہوئے ایک حقیقت کو تسلیم کر لیں جس پر سے ہم پردہ اٹھانے والے ہیں۔ چوہدری صاحب کو ہرگز آپ کی وفات مطلوب نہیں تھی۔ رابعہ کی کار میں بم رابعہ کو ختم کرنے کے لیے رکھا گیا تھا۔"

مجھ پر دہشت سے سکتہ سا طاری ہو گیا۔ "رابعہ کو؟ اب وہ اس حد تک گر گئے ہیں!"

"وہ مقولہ ہمیشہ صحیح رہے گا کہ محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔" مرزا غالب نے کہا۔ "امریکی آج بھی کہتے ہیں کہ ہم ایٹم بم استعمال نہ کرتے تو جاپان ہتھیار نہ ڈالتا اور جنگ جاری رہتی تو اس سے کہیں زیادہ لوگ مارے جاتے جتنے ایٹم بم سے ہلاک ہوئے تھے۔ یہ جمع تفریق کا سیدھا سا سوال تھا لیکن اس کو دوسرے پہلو سے بھی دیکھا گیا کہ ایٹم بم سے ہلاک ہونے والے جارحیت کا ارتکاب کرنے والے ملک سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ ہتھیار نہ ڈالتا تو مرنے والے دوسرے ہوتے جو بقول فاتح کے امن پسند تھے۔ چنانچہ برادرِ کلاں! رابعہ کا قتل ایک ایٹم بم ہوتا جس کے بعد تم جنگ میں اپنی ہار مان لیتے۔ اس نقصانِ عظیم کے بعد تمہارے لیے فتح بے مقصد ہو جاتی اور تمہارا حوصلہ اتنا پست ہو جاتا کہ شاید تم انتقام کے پاگل پن میں سیدھے دلاور کو قتل کرنے پہنچتے اور پھر خود کو گولی مار لیتے۔ تمہاری جگہ میں ہوتا تو میں بھی یہی کرتا۔ کوئی اور ہوتا تو وہ بھی یہی کرتا۔ چنانچہ دلاور وقتی طور پر غائب ہو گیا اور تم کو یقین دلا دیا گیا کہ وہ خود بھی قتل ہو گیا۔ اب تم انتقام بھی لو گے تو کس سے۔ صرف اپنے آپ سے۔ دنیا کو چھوڑ کر بھاگ جاؤ گے۔ پاگل ہو جاؤ گے یا خودکشی کر لو گے۔ یہی دلاور چاہتا تھا۔ اس کی اسکیم کسی کی تدبیر سے فیل نہیں ہوئی بلکہ ایک اور صداقت کا وجود قائم رکھنے کے لیے یہ اہتمام تقدیر نے کیا۔ صداقت یہ ہے کہ مارنے والے سے بچانے والا ہاتھ زبردست ہے۔ شکاری رابعہ کے پیچھے پیچھے پہنچے تھے۔ جب وہ تمہارے پاس گئی تو اُن کو معلوم نہ تھا کہ وہ گاڑی تمہارے سپرد کرنے گئی ہے۔"

یکلخت مجھے ایک خیال آیا۔ "غلط۔ وہ مشکل سے چند منٹ رکی تھی پھر محسن اسے چھوڑنے گیا تھا اور اگر اس عرصے میں انھوں نے بم رکھ دیا ہوتا تو وہ دونوں مارے جاتے مگر محسن دس منٹ میں لوٹ آیا تھا۔"

"اچھا، تو پھر انھوں نے بم بعد میں رکھا۔" غالب بولا۔ "محسن اور رابعہ کے آنے سے ان کو وقت نہیں ملا ہوگا اور وہ چھپ گئے ہوں گے۔ دس منٹ بعد وہ دیکھ نہیں سکے ہوں گے کہ گاڑی میں صرف محسن واپس آیا ہے یا اس کے ساتھ رابعہ بھی واپس آئی ہے۔ انھوں نے سوچا ہوگا کہ وہ دونوں کسی کام سے گئے تھے اور جلدی ہی لوٹ آئے۔ پھر انھوں نے بم فٹ کیا اور چلے گئے۔ ان کو وہاں رُکنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ دوسری ٹیم تھی جس نے تم کو ٹیڈی کے گھر سے فرار ہونے پر مجبور کیا اور عقبی گلی سے نکالا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ تم سامنے سے نکلو اور گاڑی میں جاؤ۔ ان کے خیال کے مطابق رابعہ اندر ہی تمہارے ساتھ تھی اور جب تم نکلے تو تمہارے ساتھ نہیں تھی۔ ظاہر ہے ان کو اپنی کامیابی کا یقین تھا کہ اب رابعہ اپنی گاڑی میں ہی واپس جائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا اور گاڑی وہیں کھڑی رہی۔ کل کے اخبار میں گاڑی میں بم کا دھماکا ہونے کی خبر

نہ ہوتی تو دلاور شاید ایک نمبر ٹیم سے پوچھتا کہ یہ کیا ہے اور وہ دیکھتے جاتے لیکن اب اُسے معلوم ہو جائے گا کہ ایک نمبر ٹیم بھی کامیاب رہی اور دو نمبر نے بھی اپنا کام بالکل پلاننگ کے مطابق کیا اور بوگس خبر والا اخبار سکندر بخت کو پہنچا دیا۔"

" اور وہاں سے پولیس کا کوئی مخبر میرے پیچھے لگ گیا۔" میں نے کہا۔ اس خیال سے میرا وجود ابھی تک لرز رہا تھا کہ بم کے دھماکے سے سچ مچ رابعہ ماری جاتی تو میرا کیا ہوتا۔ شاید وہی ہوتا جو دلاور چاہتا تھا۔ ذرا سی احتیاط پسندی کی عادت کے باعث میں نے رابعہ کو روک لیا اور رابعہ کی جگہ وہ مکینک مارا گیا۔

" اب دلاور کو خبر مل چکی ہوگی کہ رابعہ اس کار میں جل کے مر گئی۔ وہاں کچھ گواہوں نے بھی تصدیق کر دی ہوگی۔ مثلاً گیراج کے مالک نے کہ ایک عورت آئی تو تھی۔ اور اسے کوئی بلا کے لے گیا تھا۔" غالب نے کہا۔"مرنے والا ایک مکینک تھا۔ کل تک یہ غلط فہمی رفع ہو جائے گی کیونکہ رابعہ اپنی کار کی گمشدگی کی رپورٹ لکھوانے گئی ہے۔ رپورٹ لکھوانے کا وقت دھماکے سے بہت پہلے کا ہوگا۔ دلاور سمجھ جائے گا کہ دھماکے سے رابعہ نہیں مری، مکینک مارا گیا ہے۔"

" لیکن اس ناکامی کی خبر دلاور کو بہت مشتعل کرے گی۔" میں نے مضطرب لہجے میں کہا۔" اور وہ ایک ناکامی سے دل برداشتہ ہونے والا آدمی نہیں ہے۔ رابعہ کی زندگی کو سخت خطرہ لاحق ہے غالب۔"

" میں اس خیال سے اتفاق کرتا ہوں۔" غالب نے کہا۔ 'وہ دوسرا ایٹم بم بہت جلد گرائیں گے۔"

مجھے فوراً کچھ کرنا ہوگا غالب۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔" رابعہ کو اس طرح نہیں پھرنا چاہیے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ میری شکست کا سبب بن سکتی ہے۔ وہ ہر جگہ ہر وقت شکاری کتوں میں گھری ہوئی ہے اور ہر شکاری دشمن کے لیے سب سے آسان نشانہ ہے۔" میں نے سو کا ایک نوٹ میز پر رکھا اور باہر نکل آیا۔

" تم کیا کرو گے؟ اسے جیب میں ڈال کے پھرو گے یا جادو سے غائب کر دو گے؟" غالب نے کہا۔" اور صرف چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ اگر تم نے اُسے دور بھیج دیا۔ کسی ایسی جگہ جہاں کسی کے خیال و گمان کا گزر نہ ہو۔ تو پہلی بات یہ کہ وہ ایسی جگہ جانا قبول ہی نہیں کرے گی۔ بعد میں یہ ہوگا کہ خود تم جدائی کی تاب نہ لا سکو گے۔ اُدھر وہ تمہاری فکر میں نیم جاں، اِدھر تم اس کے غم میں ہلکان۔ یہ تم سے نہ ہوگا۔"

" یہ تو ہمیں کرنا پڑے گا۔ وقتی دوری کی مجبوری اور زندگی میں سے ایک کا انتخاب کیے بغیر چارہ نہیں۔ دشمن نے ہر کمینگی اور بزدلی کا حربہ آزمایا تو میں شرافت اور اصول کو پہلے ہی بالائے طاق رکھ چکا ہوں۔ پھر مجھے بھی یہی کرنا پڑے گا۔ گو پہل میں نے کبھی نہیں کی لیکن جواب ہمیشہ اینٹ کا پتھر سے دیا ہے۔ وہ رابعہ کے بعد محسن کو میری کمزوری بنا کے وار کر سکتا ہے تو میں بھی اس کی کمزوریوں کو اپنی شہ زوری بنا سکتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے اس کی بھی ایک فیملی ہے، بیوی بچے ہیں۔ اس نے جنگ اپنی اور میری ذات تک محدود نہ رکھا تو نقصان دونوں طرف برابر کا ہوگا۔"

" اتنی سردی میں تمہارے دماغ کا انجن بہت گرم ہو رہا ہے۔ اس لیے ابھی یہ بات ختم کرو۔ بس اتنا طے ہے کہ تم کو رابعہ کی حفاظت کرنی ہے۔ کیسے کرنی ہے؟ یہ بعد میں اس وقت سوچنا جب دماغ سوچنے کے قابل ہو۔ اسی کام سے آئے تھے تم ہمارے پاس؟" غالب نے کہا۔" یا کچھ اور بھی ہے؟"

" اصل کام تو میں نے تم کو بتایا ہی نہیں۔" میں نے سر جھٹک کے کہا۔" تم کو ابھی دلاور کی کوٹھی پہ جانا ہے۔ وہاں کچھ سوگواران جمع ہیں اور پولیس بھی ہے لیکن وہ سارا اسٹیج جانے کے لیے بنایا گیا ہے۔ تم یہ جعلی خبر والا اخبار لے کر پہنچ جاؤ اور دیکھو کہ مرنے والا کون ہے۔ ان کا ڈراما فلاپ ہو جائے گا۔"

" گویا آپ فرما رہے ہیں کہ چڑھ جا بیٹا سولی، رام بھلی کریں گے"

" یار تمہارے لیے ڈرنے کی کون سی بات ہے۔" میں نے کہا۔" تمہاری روانگی کے بعد میں ایک فون کر دیتا ہوں دلاور کی کوٹھی کے نمبر پہ کہ کچھ ایسی بات ہے اور ہمارا ایک نمائندہ مسمّی مرزا غالب بقلم خود تصدیق کے لیے آ رہا ہے۔ اس سے بڑی افراتفری پھیلے گی وہاں۔ وہ تم کو غائب کرتے سے رہے۔ ڈراما ختم کر دیں گے۔ یا تو لاش کو فوراً تدفین کے لیے ارسال کر دیں گے اور تم سے کہہ دیں گے کہ وہ غلط فہمی کسی شرپسند نے پھیلائی تھی اور الحمدللہ کہ چوہدری صاحب سو فیصد زندہ ہیں۔ اور مری ایسی نہیں۔ صاف انکار کر دیں گے کہ یہاں اصلی یا نقلی کوئی چوہدری دلاور نہیں مرا۔"

" از روئے قانون رات دس بجے کے بعد کوئی لاش تدفین کے لیے قبرستان لے جانے پر پابندی ہے۔" مرزا غالب نے کہا۔

" پھر وہ صبح ہوتے ہی اس دلاور سمجھ لیے جانے والے یا دلاور کی جگہ استعمال ہونے والے کو ٹھکانے لگانے کے لیے روانہ کریں گے۔" میں نے کہا۔" تم پولیس کو پیچھے لگا دو۔ وہ معلوم کریں کہ کون قتل ہوا تھا۔ ہوا تھا تو اس کی رپورٹ پولیس کو کیوں نہیں دی گئی۔ اصل اور نقلی اخبار کا اسکینڈل اور چھوڑ دو۔ فی الحال اتنا

کافی ہے۔"

" ہمیں اپنے ہوائی گھوڑے پر جانا پڑے گا۔" مرزا غالب نے کہا۔" منجمد حالت میں پہنچیں گے ہم۔"

" میں بھی سر سے کفن باندھ کے پیچھے بیٹھوں گا۔" میں نے کہا۔" مجھے میکلوڈ روڈ کے لکشمی چوک پر اتار دینا۔ ہوٹل اوسس کے سامنے اور واپسی میں وہیں آنا۔ ایس بی کے خان کے نام سے میرا کمرہ بک ہوگا۔"

مرزا غالب تھوڑی دیر بعد سر پر کنٹوپ چڑھائے دستانے پہنے موٹر سائیکل لیے نمودار ہوا اور میرے پاس آ رکا۔ میں نے اس کے پیچھے بیٹھنے کے بعد دونوں پاؤں کہیں ٹکانے کی جگہ تلاش کی مگر دونوں طرف فٹ اسٹینڈ تھے ہی نہیں۔ پیچھے کیریئر کا سہارا بھی نہیں تھا چنانچہ موٹر سائیکل کے کسی بھی جگہ نیچے سے نکل جانے کے امکانات بہت روشن تھے۔ خود موٹر سائیکل پہ دو افراد کا سوار ہونا بے رحمی کا مظاہرہ لگتا تھا۔ وہ خاصی بے جان چیز تھی۔" یہ کیا مصیبت ہے مرزا جی! میں اپنے پیر کہاں رکھوں؟" میں نے کہا۔" ٹکانے کی جگہ ہی نہیں۔"

" ہوائی گھوڑے کی رکاب نہیں ہوتی۔" غالب نے چلا کر کہا۔ سائیں سائیں کرتی سرد ہوا میرے کانوں کو سن کرتی گزر رہی تھی۔ میرے دونوں پیر بریکٹ کی شکل میں سڑک سے چند انچ اوپر تھے اور گردش کرتے ہوئے پہیے سے بھی دور تھے۔ اس پوزیشن کو بدلا نہیں جا سکتا تھا۔ اگر پیر ذرا نیچے کرتا تو سڑک سے جا لگتے اور موٹر سائیکل زوم سے نکل جاتی تو میں سڑک پہ کھڑا یا پڑا رہ جاتا۔ اندر کرتا تو میری پتلون ضرور پہیے میں پھنس جاتی۔ جگہ ہوتی تو میں سیٹ کے پچھلے حصے پر اکڑوں بیٹھنا پسند کرتا لیکن اب میری حالت قابل رحم ہو رہی تھی۔ آخر کوئی شخص کب تک پیروں کو ہوا میں معلق رکھ سکتا ہے اور وہ بھی اتنی سخت سرد ہوا میں اور ناہموار سڑک پر۔ میرے پیر اکڑنے لگے تھے۔ لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری کیونکہ سفر مختصر تھا۔ پانچ منٹ بعد جو میرے لیے پانچ گھنٹے کی مشقت تھے میں ہوٹل اوسس کے سامنے اترا تو میرے لیے سیدھا کھڑا ہونا دشوار ہو گیا۔ میری ٹانگیں بدستور بریکٹ بنی ہوئی تھیں۔ یوں کہ ٹخنوں کے درمیان فاصلہ چھ انچ کا تھا تو گھٹنوں کے درمیان ایک فٹ کا۔

" یار مجھے کمرہ دلا جاؤ۔ خالی ہاتھ جاؤں گا تو ہوٹل والے شک کریں گے۔" میں نے بتیسی بجاتے ہوئے کہا اور میرا خیال درست تھا۔ اگر مرزا غالب اپنا اخبار کا پریس کارڈ نہ دکھاتے تو مجھے جگہ نہ ملتی۔ میں نے ایڈوانس ادائیگی کی اور کمرے میں جاتے ہی پہلے ہیٹر جلایا پھر ہوٹل ویسٹ اینڈ فون کیا۔ گیس ہیٹر کی حرارت سے میری ٹانگیں کانپنا بند ہو گئیں۔ ایک ہوٹل کے آپریٹر نے دوسرے آپریٹر سے بات کی اور نمبر مانگا۔ میں ریسیور تھامے لحاف میں گھس گیا۔

" میں ایس بی کے خان بول رہا ہوں لحاف کے اندر سے۔" میں نے کہا۔

" باہر مت نکلنا، میں آ رہی ہوں۔" رابعہ ہنسی۔" ابھی پانچ منٹ میں۔"

" وہ بھی کسی کے ساتھ۔ نیک محمد اور محسن زندہ ہوں تو انہیں ہی لے آنا۔" میں نے ریسیور رکھ دیا۔ دوسری بار میں نے روم سروس کو چار افراد کے لیے چار گیلن کافی اور چار پونڈ سینڈوچز ارسال کرنے کو کہا۔ کاؤنٹر کلرک نے مجھے بھی خبطی اخبار والا سمجھ کے صرف "یس سر!" کہا اور پھر پوچھا کہ کیا میرے مہمان آنے والے ہیں؟ میں نے اسے بتایا کہ ایک تو مہمان نہیں، بلائے جان ہے۔ اور اسے وہ شعر سنایا کہ بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات، عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا۔ اور ریسیور رکھ دیا۔

دروازہ کھلا ہوا تھا۔ دس منٹ بعد دستک ہوئی تو میں نے لحاف کے اندر سے ہی چلا کر کہا۔" یس!" پھر محسن نے لحاف کھینچ کر نیچے پھینک دیا۔ میں اٹھ بیٹھا اور میں نے محسن کا ہاتھ عقیدت سے پکڑ کے چوما اور آنکھوں سے لگایا۔

"اتنی سی دیر میں دشمنوں نے کچھ کر دیا؟" رابعہ نے تشویش سے کہا۔

"وہ سب گستاخیاں جو میں نے اب تک آپ کی شان میں فرمائیں۔" میں نے کہا۔"اور آئندہ فرماؤں گا۔ ان سب کو معاف کیا جائے تو یہ بندہ حقیر آپ کو اپنا پیر بلکہ منگل اور بدھ تک تسلیم کرنے کو تیار ہے۔ میں بکواس کرتا تھا اور آپ سچ کہتے تھے۔ دلاور زندہ ہے اور صرف اس لیے زندہ ہے کہ ہمیں دنیا کا سب سے بڑا بیوقوف ثابت کر سکے۔"

"جمع کا صیغہ مت استعمال کر۔" محسن نے بیٹھتے ہوئے گرج کر کہا۔"ہم پہلے ہی جانتے تھے۔"

"یار سکندر بادشاہ! کتنا اچھا ہوتا اگر یہ چوہدری صاحب سچ مچ مر جاتے۔" استاد ٹیڈی نے آہ بھر کے کہا۔ غالباً محسن اُسے پوری طرح بریف کر چکا تھا۔

"تم لوگوں نے کیا تیر مارا، رپورٹ لکھوا دی؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ پانچ سو روپیہ سکۂ رائج الوقت نے کام آسان کر دیا۔" محسن بولا۔"میں نے تو تھانیدار سے صاف بات کی کہ بھئی نقد سودا ہے۔ تکلف کیسا؟ اور اُس نے کہا کہ صاحب ہم بیٹھے ہی خدمت کے لیے ہیں۔ اب دستاویزی ثبوت موجود ہے کہ دھماکا ہونے سے دو گھنٹے قبل مس رابعہ قاری ایڈووکیٹ گاڑی کی چوری کی رپورٹ لکھوانے خود تھانے آئی تھیں۔ غالب ملا؟"

"ہاں۔ مجھے یہاں چھوڑ کے چوہدری دلاور کے گھر گیا ہے۔" میں نے کہا۔"تم لوگوں نے کچھ کھایا پیا؟"

"ہاں۔ بس اپنے خواجہ نیک محمد کے کمرے میں کچھ چر لیا تھا۔" محسن نے کہا۔ اسی وقت ویٹر نے دستک دی اور کافی کے ساتھ سینڈوچز لے کر دو ویٹر اندر آئے۔ انھوں نے اپنی اپنی ٹرے ایک ہی میز پر رکھی اور کچھ کہے بغیر نکل گئے تو میں نے ان کو بتایا کہ غالب سے ملاقات کے کتنے سنسنی خیز نتائج برآمد ہوئے ہیں۔

"دلاور کی موت ہی جعلی نہیں تھی، وہ خبر بھی جعلی تھی؟ اخبار بھی جعلی تھا!" رابعہ نے سخت حیران ہو کے کہا۔"کیا زرخیز ذہن ہے چوہدری دلاور کا! ایسے شیطانی منصوبے بناتے ہیں۔"

"اور جتنا وہ چالاک ہے تم اتنی ہی وہ ہو۔" میں نے کہا۔"کیا کہتے ہیں اسے محسن... عورت کو...؟"

"ہاں ہاں، ناقص العقل ہوں میں۔ تم بڑے عاقل خان بالغ خان ہو۔" رابعہ نے کہا۔

"آخر کیا کسی حکیم نے مشورہ دیا تھا کہ اپنا سرمایہ اس گھر کو خریدنے میں لگا دو؟" میں نے کہا۔

"میں سمجھی تھی تم کو خوشی ہوگی۔" رابعہ نے رونی شکل بنا کے کہا۔"میں تمھارے مستقبل سے ہی نہیں، ماضی سے بھی اپنا تعلق قائم کر رہی تھی۔" اُس نے اچانک رونا شروع کر دیا۔"مگر تمھارے نزدیک میری یہ جذباتی حرکت حماقت ہے۔"

میں سخت شرمندہ تھا کہ میں نے مذاق میں وہ بات کہہ دی جس نے ایک عورت کے جذبات کے آبگینے کو ٹھیس پہنچائی۔ رابعہ نڈر اور بے باک تھی، خود مختار اور جرأت مند تھی، بلند حوصلہ اور عام عورتوں کے مقابلے میں خطرناک ترین حالات میں ثابت قدم رہنے کی اہل تھی لیکن اس کے باوجود وہ اندر سے وہی عورت تھی جو محبت کرتی ہے تو جذبات و احساسات کی ساری وابستگی کے ساتھ......... اپنی چاہتوں کے سارے خزانے، اپنے وجود کی ساری خوشیاں اور راحتوں کے سامان، اپنی ذات کے سب رشتے ایک محبت پر قربان کر دینے والی۔ اسے بے وقوفی کہنا میری سب سے بڑی بے وقوفی تھی۔

"دیکھو رابعہ! آئی ایم سوری۔" میں نے کہا اور اس کے پاس جا بیٹھا۔ آہستہ سے اس کے ہاتھ چہرے پر سے ہٹائے اور اس کے آنسو صاف کیے۔"میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ تم کو میری نیت پر شک تو نہیں کرنا چاہیے۔ کیا میں نہیں جانتا کہ تم جو کچھ کر رہی ہو کیوں کر رہی ہو۔ اور یہ تو ایسی بات ہے جو دنیا جانتی ہے۔ بات صرف وقت کی ہے ورنہ ہم نے زندگی بھر کی رفاقت کا جو عہد کیا ہے اس میں سب سے بڑا عنصر اعتماد کا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ ایک عقلی فیصلہ ہے چنانچہ ہم کسی کے سامنے نادم نہیں اور پچھتانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔"

اس وقت محسن نے بہت عقلمندی سے کام لیا۔ اس نے سگے بھائی کی طرح رابعہ کا سر اپنے کندھے پر رکھا۔"سکندر کے بارے میں تم کو ایسا سوچنا بھی نہیں چاہیے کہ وہ مذاق میں کچھ کہتا ہے تو اس میں کوئی بُرا ماننے والی بات ہوتی ہے۔ میں نے تم کو آج باجی کہا تھا لیکن کہنے سے پہلے بھی کیا میں ایسا ہی سمجھتا بھی نہیں تھا؟ اور کیا مجھے معلوم نہیں کہ سکندر کے لیے شہلا واقعی چھوٹی بہن ہے۔ سگے سوتیلے کچھ نہیں، یہ حقیقی رشتے ہیں۔ آپس کے یقین اور اعتماد پر مبنی۔ صرف نیک نیتی اور خلوص کے مظہر۔ ہم سب مل کے ساتھ چل رہے ہیں تو اسی اعتماد کے سہارے پر اور اسی امید پر کہ کل ہمارا ہے۔ اور گزرے ہوئے کل کے مقابلے میں آنے والا دن ہماری دائمی خوشیوں کا ضامن ہے۔ وہ ایک ہی گھر اور ایک ہی خاندان ہوگا جس میں تم اور سکندر، میں اور شہلا ساتھ ساتھ ہوں گے۔"

"ہاں جی۔ بس ایک ہم رہ جائیں گے فٹ پاتھ پر کشکول لے کر بیٹھے ہوئے۔" ٹیڈی نے ایک سرد آہ بھر کے زور سے کہا۔ اور اس کی بات ایسی تھی کہ انتہائی بوجھل اور افسردہ فضا کے باوجود ہم سب بے اختیار ہنس پڑے۔ خود رابعہ ہنسنے لگی۔

"تمھارا کشکول بھی خالی نہیں رہے گا دوست!" میں نے کہا۔"بادل برستا ہے تو سب سوکھے کھیت سیراب ہوتے ہیں۔"

"مجھے تمھاری طرف سے بہت تشویش لاحق ہو گئی ہے رابعہ!" محسن نے کہا۔"اگر دلاور نے وہی چاہا تھا جو غالب کا خیال تھا تو یہ بہت خطرناک چال ہے۔ اُس نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے اس کے بعد ہمیں محتاط تو رہنا ہی ہوگا۔ تم کو بھی سوچنا ہوگا کہ دلاور جیسے شکاری کی اس چال کو ناکام بنانے میں تم کس طرح ہماری مدد کر سکتی ہو۔"

"تم کو یاد ہوگا میں نے بہت پہلے ایک بات کہی تھی۔" رابعہ نے نظر جھکا کے کہا۔"کہ اگر کبھی میں گھر بناؤں گی تو اس گھر کی دیواریں میرے لیے اجنبی نہیں ہوں گی۔ جو بات اس گھر میں ہے کسی نئے گھر میں نہیں ہو سکتی تھی۔"

"میں تمھارے جذبات کی قدر کرتا ہوں اور یہی میرے لیے دنیا کی سب سے بیش بہا دولت ہے لیکن حالات کچھ حقیقت پسندی کا تقاضا کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔"ہم اس گھر میں کیسے رہ سکتے ہیں!"

"کیا کبھی نہیں رہ سکتے؟" اُس نے کافی بناتے بناتے کہا۔"آج نہ سہی۔"

"یہ کون کہتا ہے! مستقبل کے یقین پر ہی تو ہماری جد و جہد کا انحصار ہے۔" میں نے کہا۔

"ابھی تو میں نے کہا ہے کہ آنے والا کل ہمارا ہے۔" محسن بولا۔

"لیکن وہ مکان آج برائے فروخت تھا۔" رابعہ نے کہا۔"کوئی اور اسے خرید لیتا تو پھر معلوم نہیں کیا ہوتا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ کل وہ مالک کسی قیمت پر مکان ہمیں نہ دیتا یا اُسے گرا کر اس کی جگہ ایک الٹرا ماڈرن اسٹرکچر کھڑا کر دیتا جو ہمیں بالکل نہ پہچانتا۔ میں نے تو کل کی خوشیوں کی ایک انشورنس پالیسی لی ہے۔ جو اپنے وقت پر ہی کام آئے گی۔"

اس زاویے سے میں نے واقعی نہیں سوچا تھا۔ رابعہ نے بروقت فیصلہ کیا تھا ورنہ تمام عمر میں اس گھر کے باہر سے گزرتے ہوئے پچھتاوے کا شکار رہتا۔ یہ سوچتا رہتا کہ اگر میں لندن نہ گیا ہوتا تو وزیر خان سے یہ مکان کوئی نہ چھین سکتا اور اس کا مالک میں ہوتا۔ رابعہ نے میرے بچپن کی یادوں کا موہنجو ڈارو خرید لیا تھا اور مجھے اپنے ہی وقت کی ٹوٹی ہوئی ڈور سے منسلک کر دیا تھا۔ اب میں کہہ سکتا تھا کہ یہ گھر میرا تھا اور میرا ہے۔

"کیا تم مجھے معاف نہیں کرو گی۔" میں نے کہا۔"سارا قصور میرا ہے۔ میں دماغ سے سوچ رہا تھا اور تم نے دل سے سوچا تھا اور آج کے مسائل نے مجھے اتنا گھیر رکھا ہے کہ میں کل کے بارے میں سوچنے کے قابل بھی نہ تھا۔ میں اب شکریہ ادا کر کے تمھارے جذبے کی توہین نہیں کروں گا۔ تم نے واقعی بہت اچھا کیا ورنہ موقع نکل جاتا تو سب کچھ مل جاتا مگر یہ گھر نہ ملتا اور اس کے بغیر میری زندگی میں ایک خلا رہ جاتا۔ ابھی ہم بھی انتظار کر رہے ہیں، اس گھر کو بھی انتظار کرنے دو۔ یہی احساس کی خوشی کیا کم ہے کہ وہ ہمارا ہے اور ہم اس کے ہیں۔"

"تم ابھی کہاں جاؤ گی میری پیاری باجی!" محسن نے کہا۔"مجھے کوئی شبہ نہیں رہا اب کہ قاتلانہ حملے کی اس واردات کا نشانہ تم تھیں اور نشانہ خطا ہو جانے سے شکاری اپنے عزائم نہیں بدلیں گے۔ تمھارا موجودہ ٹھکانا ان کے علم میں ہے اور تمھاری وجہ سے منظر کا گھر بھی خطرے کی جگہ ہے۔ وہ براہِ راست حملہ کریں گے تو تمھارے ساتھ منظر اور اس کے بیوی بچے بھی زد میں آئیں گے۔"

"کم سے کم منظر کو ہم سے دوستی کا یہ خمیازہ نہیں بھگتنا چاہیے۔" میں نے کہا۔"اس نے جس طرح ہماری مدد کی ہے اور اب بھی کر رہا ہے، اس کا یہ صلہ نہیں کہ ہم اسے بھی خطرات کی دلدل میں پھنسا دیں۔"

"وہ جس حد تک ہم سے بے تعلق رہے اچھا ہے۔" محسن بولا۔"اس طرح وہ رابعہ اینڈ منظر ایڈووکیٹس کی لیگل فرم کو بھی سنبھال سکے گا اور ہمارے قانونی مسائل سے بھی نمٹ سکے گا۔ پہلے تو رابعہ کا ایک سہارا بھی تھا، اب منظر کے سوا کون ہے۔"

"لیکن میں منظر کے گھر کے علاوہ کہاں رہ سکتی ہوں؟" رابعہ نے کہا۔

"ایک تجویز تو یہ ہے کہ تم اسلام آباد چلی جاؤ۔" میں نے کہا۔"شہلا کے پاس۔"

"میں اس شہر سے دور نہیں جا سکتی۔" رابعہ نے قطعی فیصلہ کُن لہجے میں کہا۔"مجھے ہر روز نہ سہی وقتاً فوقتاً تمھاری، تم سب کی خیریت معلوم ہونی چاہیے۔"

"پھر دوسری تجویز یہ ہے۔" میں نے رک کر کہا۔"کہ تم کسی گمنام آبادی میں گم ہو جاؤ لیکن وہاں تم اکیلی کیسے رہو گی اور ایسی جگہ ہم نے آنا جانا جاری رکھا تو تم کو فوراً غلط اور مشتبہ کردار کی عورت قرار دے دیا جائے گا۔ اس لیے میری تیسری تجویز یہ ہے...!" میں نے ایک بار محسن اور رابعہ کی طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھا۔"کہ تم انکل رضوی کے پاس چلی جاؤ۔"

میری بات کا اثر میری توقعات کے مطابق ہوا۔ وہ دونوں چونکے تو نہیں لیکن حیرت اور تذبذب کا شکار ہو گئے۔"ان کو تم سے تھوڑی بہت شکایت ضرور ہوگی۔" میں نے خاموشی کے طویل وقفے کے بعد کہا۔"مگر وہ میرے جرم کی سزا تم کو نہیں دے سکتے

نے معقول آدمی ہیں کہ تمہاری مجبوری کو بھی معاف کر سکتے ہیں کہ تم مجھ سے اپنی جذباتی وابستگی کو میری قانونی پوزیشن کے باعث ختم نہیں کر سکتیں۔ نہ وہ تم سے توقع رکھیں گے کہ سکندر کو گرفتار کرانے میں ان سے تعاون کرو اور نہ تمہاری مجبوری کی وجہ سے مجھے کوئی رعایت دیں گے۔ رعایت تم کو مل سکتی ہے اگر تم ان سے جا کر کہو کہ میری زندگی کسی اور جگہ محفوظ نہیں رہی۔ حالات سے وہ پوری طرح باخبر ہوں گے۔ دل سے وہ بھی قائل ہوں گے کہ میں مجرم نہیں ہوں اور جو کچھ کر رہا ہوں اس لیے کر رہا ہوں کہ قاعدے قانون اور ضابطے مجھے میرے درد کا درماں فراہم نہیں کر سکے اور مایوسی نے مجھے اس مقام پر پہنچا دیا جہاں میں نے قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ لیکن وہ خود کیا کر سکتے ہیں۔ جب تک یہ سروس ہے وہ سروس رولز سے انحراف نہیں کریں گے مگر تمہارے لیے وہ گھر اپنے گھر سے کم نہیں۔ اور خدا کے بعد اگر کوئی تمہاری زندگی کی حفاظت کر سکتا ہے تو وہ انکل رضوی سے بہتر طور پر کوئی نہیں کر سکتا۔ وہی ایک جگہ ہے جہاں چوہدری ولاور جیسے بھی تم پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔“

”یہ۔۔۔ یہ سب تو ٹھیک ہے سکندر۔“ رابعہ نے کہا۔ ”لیکن میں اب کس منہ سے وہاں جاؤں۔“

”تمہارا یہ منہ اچھا خاصا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اس سالے سے پوچھ لو۔“

ایک طویل مدت کے بعد میں نے محسن کو سالا کہا تھا۔ وہ بھولے بسرے وقتوں کی بات تھی جب اس کی بہن فوزیہ سے قریبی تعلق کو میں نے محبت سمجھ لیا تھا۔ وہ دونوں خاندانوں کی قربت اور اپنائیت کے ماحول کا اثر تھا کہ بچپن سے میں نے فوزیہ کو سب سے قریب اور سب سے بہتر پایا اور عمر کے ساتھ اس انس کو محبت سمجھ لیا۔ دونوں کے خاندان پہلے سے ایک تھے چنانچہ ہمارے ایک ہونے پر کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اسی نے ہمارے تعلق کو ایک آفیشل قسم کی نسبت دے دی اور اس رشتے سے محسن میرا سالا بنا رہا۔ پھر وقت کے ساتھ جذبات میں پختگی آ گئی اور عقل کے تقاضے تو بدلے ہی تھے، حالات بھی یوں بدلے کہ فوزیہ میری نظر میں وہ مثالی رفیقِ حیات نہ رہی جس کے ساتھ میں تمام عمر کا سفر طے کر سکتا۔ مجھے اس کی اور اپنی فطرت، مزاج اور عادات کا وہ فرق نظر آنے لگا جسے پہلے میری نظر نہیں دیکھ سکتی تھی اور میں اسی وقت رابعہ نے ایک بند دروازہ کھول کے میری زندگی میں دوبارہ قدم رکھا تو فوزیہ خود بخود فیڈ آؤٹ ہو گئی۔ آج سے پہلے بھی محسن نے رابعہ کو اسی طرح بڑی بہن سمجھا تھا جیسے وہ زندگی میں مریم کو سمجھتا تھا لیکن اچانک اس نے رابعہ کو باجی کہنا شروع کر دیا تھا۔ میری بات پر وہ چونکا۔ ایک لمحے کے لیے اس کا چہرہ متغیر ہوا۔ پھر وہ مسکرانے لگا۔ یہ سب کچھ رابعہ نے بھی دیکھا اور نوٹ کیا اور میں نے خفت محسوس کی۔

”ان کے لیے ہم سب بچے ہیں۔ بچے نادان بھی ہوتے ہیں۔“ میں نے بات جاری رکھی۔ ”سرکش اور نافرمان بھی مگر بڑے انکل رضوی جیسے حقیقت پسند اور معقول ہوں تو عمر کے ان تقاضوں کو سمجھتے ہوئے سب معاف بھی کر دیتے ہیں۔“

”وہ۔۔۔ یہ نہیں سمجھیں گے کہ یہ کوئی چکر ہے۔۔۔ اور تم نے مجھے بھیجا ہے جاسوس بنا کے؟“

”کیسی باتیں کرتی ہو۔ انکل رضوی مجھے اور محسن کو پیدائش کے وقت سے جانتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”وہ کبھی یقین نہیں کر سکتے کہ ہم ان کو بھی دشمنوں میں شامل کر سکتے ہیں۔ ان سے ہمارا اختلاف ہو سکتا ہے۔ وہ ہم کو مجرم سمجھ کے ہتھکڑی بھی لگا سکتے ہیں لیکن یہ بات نہیں بھول سکتے کہ ہم ان کے بچے ہیں۔ وہ اپنے بیٹے کے خلاف بھی قانون کے معاملے میں رعایت نہیں کریں گے۔ جو دکھ ان کو ہو گا وہ اپنی جگہ ہے۔ دکھ ان کو اب بھی بہت ہو گا کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں اس سے اپنے لیے مشکلات میں اضافہ کرتے جا رہے ہیں اور وہ ہمارے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ وہ بھی کم پریشان نہیں ہوں گے۔ تم جاؤ گی تو انہیں تھوڑی سی تسکین ملے گی۔ یہ احساس ہو گا کہ ان کے بچے اس گھر کو اب بھی اپنا گھر سمجھتے ہیں اور جب دنیا میں کہیں پناہ نہیں ملتی تو لوٹ آتے ہیں۔ ان کی عمر کے آدمی کو یہ یقین بہت سہارا دیتا ہے کہ اس کے بچے اسے برا نہیں سمجھتے اور اس کا احترام کرتے ہیں اور اس پر اعتماد کرتے ہیں۔“

”تم کو اپنی نالائقی کا اعتراف کرنا مشکل تو ہو گا لیکن میرا خیال ہے تم میں اتنی اخلاقی جرأت ہے۔“ محسن بولا۔ رابعہ نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا۔ اسی وقت دروازے پر دھماکا ہوا اور مرزا غالب وارد ہوئے۔ اس کی حالت دیکھ کر ہم سب بے اختیار کھڑے ہو گئے۔ اس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے اور چہرے پر مار پیٹ کے نشانات تھے۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات

پانچویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں

جاسوسی ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ
شکاری
پانچواں حصہ

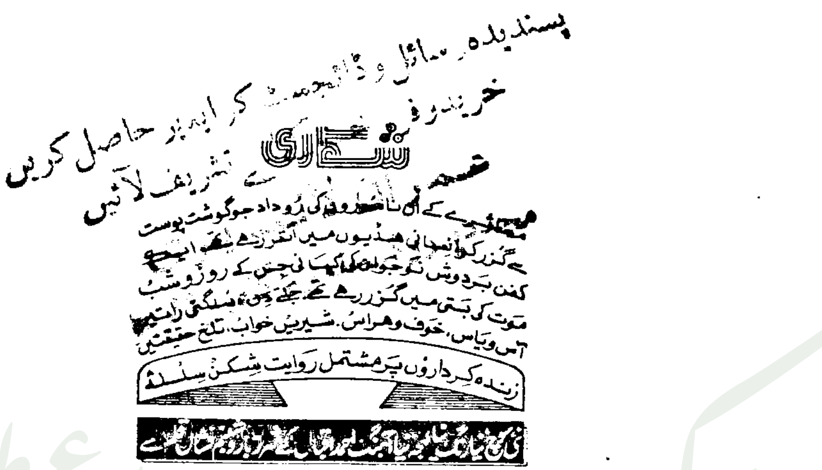

" یہ کیا ہوا غالب؟" مَیں نے اور محسن نے ایک ساتھ کہا لیکن وہ سیدھا بیڈ کی طرف گیا اور جوتوں سمیت لحاف کے اندر گھس گیا۔

" ارے بھائی' یہ پوچھو کہ کیا نہیں ہوا۔" وہ لحاف کے اندر سے بولا۔ "مثلاً ثابت یہ ہوا کہ ہم سے بڑا احمق اگر کرۂ ارض پر اس وقت کوئی ہے تو آپ دونوں حضرات میں سے کوئی ہے۔ مانتے ہو یا نہیں؟"

" چلو تمھارا دل رکھنے کو مان لیتے ہیں لیکن یہ بتاؤ کہ ڈاکٹر کو بلائیں؟"

" نہیں۔ ابھی ہم زندہ رہنا چاہتے ہیں۔" وہ بولا۔ "دردِ دل کی دوا کرے کوئی۔ کسی ایسی خوب صورت نرس کو بلا دو۔"

" نرس تو نہیں' ایک دکیل ہے۔ وصیت نامہ لکھوانا ہے تو بتاؤ۔" مَیں نے کہا۔

" سردی سے یہ پانی کا بلبلہ منجمد ہو رہا ہے۔" غالب بولا۔ "کوئی صورت ہے لحاف کے اندر ہی کافی پہنچانے کی۔"

محسن نے اس کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جو میرے ساتھ کیا تھا۔ لحاف ہٹتے ہی وہ اُٹھ بیٹھا۔ رابعہ نے اسے کافی دی۔ "دوستو! کلیجہ تھام لو، پہلے سنو پھر داستاں میری۔" وہ کافی کی چسکی لیتے ہوئے بولا۔ "یہ جو میری حالت ہے..."

" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمھاری خاصی ٹھکائی ہوئی ہے۔" مَیں نے کہا۔

" نہیں۔ وہ تو بس انھوں نے اُٹھایا اور باہر پھینک دیا تھا۔" وہ بولا۔ "مگر مَیں ہاتھ جھاڑ کے واپس کیسے آ جاتا۔ مَیں پھر اُن سے اُلجھنے اندر گیا۔ مَیں نے کہا تھا کہ بھئی چوہدری صاحب مریں یا جئیں' مجھے میرا اخبار تو واپس دے دو۔"

" اخبار چھین لیا انھوں نے؟" مَیں اور محسن ایک ساتھ چونکے۔

" ہاں۔ اسی لیے تو مَیں نے کہا تھا کہ ہم تینوں حماقت میں لاثانی ہیں۔" وہ بولا۔ "آخر ہم میں سے کسی کی عقل میں کیوں نہیں آیا کہ جب وہاں کچھ ہوا ہی نہیں ہے تو میرے ساتھ کیا ہوگا۔ وہاں سناٹا تھا۔ نہ سوگواران تھے اور نہ پولیس والے۔ چوکیدار خبیث مجھے روک سکتا تھا مگر اُس نے مجھ سے کہا کہ آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔ فون کس نے کیا تھا؟"

" مَیں نے لیکن مقصد تو تمھاری حفاظت تھا۔" مَیں نے کہا۔

" اُس سے میری حفاظت نہیں ہوئی۔ وہ پہلے سے ہوشیار ہو گئے۔ سارا اسٹیج ہٹا دیا اور سارا تماشا ختم کر دیا۔ مَیں نے اندر جا کے کہا کہ بڑا افسوس ہوا چوہدری صاحب کی وفاتِ حسرت آیات کا۔ اور وہ شعر بھی پڑھا کہ حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مُرجھا گئے مگر جو شخص مجھ سے بات کر رہا تھا' کہنے لگا کہ کیا بکتے ہو۔ مَیں نے کہا کہ بکتا نہیں' سناتا ہوں اور اخبار میں جو شائع ہوا تھا' وہ سنانے لگا۔ بس اس نے ایک ہاتھ مارا۔ پہلے اخبار پر اور پھر میرے اور دو آدمی اسکے اشارے کے منتظر تھے۔ وہ مجھے باہر پھینکنے کے لیے اُٹھا کر لے گئے۔ اخبار کی واپسی کے مطالبے پر تھوڑی سی ہاتھا پائی ہوئی۔ پائی تو نہیں صرف ہاتھا ہوئی۔ اُن کے ہاتھوں میری صورت خراب ہوئی اور مَیں پھر باہر پھینکا گیا۔ اپنی موٹر سائیکل کے پاس۔ گیٹ بند ہو گیا اور مَیں اُٹھ کے تمھاری بیوقوفی پر آنسو بہانا آ گیا۔"

" واقعی یار! ہمیں اس اخبار کو تمھارے حوالے نہیں کرنا چاہیے تھا۔" مَیں نے کہا۔

" اس کی فوٹو اسٹیٹ کاپی ہی دے دیتے۔" محسن نے افسوس سے سر ہلایا۔

"فوٹو اسٹیٹ کاپی اتنی رات کو بھلا کہاں سے بنتی؟" رابعہ نے سوال کیا۔

"بن جاتی سکندر کے لیے بخت آور۔" غالب نے کہا۔ "جب میں اپنے آفس کے سامنے کھڑا اس جعلی خبر کو پڑھ رہا تھا تو میری عقل میں یہ بات کیوں نہیں آئی کہ اوپر اپنے آفس میں جا کے اس کی دس فوٹو کاپیاں بنوالوں۔ اصل کو محفوظ چھوڑ کر جا سکتا تھا لیکن میں اور سکندر بھوکے تھے اس لیے ہماری عقل گھاس چرنے چلی گئی تھی۔"

"اب معلوم نہیں باقی دو چار جعلی اخبار کس نے لیے تھے۔"

"کسی نے بھی لیے ہوں مگر اب ہمیں کیسے مل سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "خبر چھوڑو۔ یہ بتاؤ وہاں کوئی لاش تھی؟"

"اندر جانے سے پہلے ہی تو میں دو بار باہر پھینکا گیا، میں کیا بتاؤں؟" غالب بولا۔

"یہ تو ناممکن ہے کہ اتنے کم وقت میں انھوں نے لاش کو کہیں دفن کرنے کے لیے بھیج دیا ہو۔" میں نے کہا۔ "حالانکہ بہت سے آدمی تھے مگر جیسا کہ تم نے بتایا، رات کو تدفین کی اجازت نہیں۔"

"تدفین ضروری بھی نہیں۔" محسن بولا۔ "اُسے دریا میں ڈالا جا سکتا ہے یا سڑک پر۔"

"تم نے ان لوگوں کو اچھی طرح دیکھا ہے۔ پھر دیکھو گے تو پہچان لو گے؟"

غالب نے اقرار میں سر ہلایا۔ "اُن میں سے ایک استاد پیڈرو تھا۔"

میں اور محسن اچھل پڑے۔ "تم کو کیسے معلوم ہوا؟" محسن نے کہا۔

"ایک شخص نے اس کا نام لیا تھا۔" غالب نے کہا۔

"مرزا غالب! تمھارا کوئی دوست میک اَپ مین بھی ہے؟" محسن نے کہا۔ "جو اپنے کام کا ماہر ہو۔"

"دوست تو نہیں ہے، جان پہچان ہے۔" غالب نے کہا۔

"اگر ہم اس وقت یہ چاہیں کہ وہ ہمارا میک اَپ کر دے۔" محسن بولا۔ "تو کیا یہ ممکن ہے؟"

"اس وقت!" غالب بھونچکا رہ گیا۔ "آدھی رات کو؟"

"اس وقت کہاں ملے گا وہ؟" میں نے محسن کی بات سمجھتے ہوئے کہا۔ "اس کے گھر پر میک اَپ کا سامان ہوگا؟"

"میں... کچھ کہہ نہیں سکتا۔" غالب بولا۔ "اگر آدھی رات کے بعد کسی کو بیدار کر کے یہ درخواست کی جائے تو اس کا ردِ عمل کیا ہوگا۔ ہو سکتا ہے وہ میک اَپ کے بغیر ہی حلیہ بگاڑ دے۔"

"اگر اس کو ایک ہزار روپے فی کس دیے جائیں۔" میں نے کہا۔ "تو وہ مجھے اور محسن کو کیا بنا سکتا ہے؟"

"وہ ہے تو لالچی آدمی۔" غالب سوچتے ہوئے بولے۔ "ایک بار میں نے افواہ سنی تھی کہ اس نے کسی مجرم کی مدد کی تھی اور وہ ملک سے فرار ہو گیا تھا۔ جاتے جاتے اسے اَنا دے گیا کہ اس نے اپنا مکان بنا لیا۔ ثبوت کوئی نہیں تھا اس لیے وہ پکڑا نہیں گیا تھا مگر دوست! دھواں تو وہیں سے اُٹھتا ہے نا جہاں آگ ہو۔ کچھ بات تو ہوگی۔"

"میرا خیال ہے تمھارا یہ دوست بہت صحیح آدمی ہے۔" میں نے کہا۔ "اسے ایک رات کی محنت کا معقول صلہ ملے گا تو وہ ہمیں اپنا باپ بنانے سے بھی گریز نہیں کرے گا۔"

"لیکن اس کا باپ بن کے تم کیا کرو گے؟" غالب بولا۔ "وہ تو مر چکا ہے۔"

"ہم بھی مر جائیں گے اگر ضروری ہوا۔" محسن نے مذاق میں ایک فضول سی بات کہی لیکن اس جملے نے میرے ذہن میں ایک نئے خیال کو جنم دیا۔ یہ خیال ایٹمی ٹیکنالوجی کی اصطلاح میں "چین ری ایکشن" کہا جا سکتا ہے۔ جیسے ایک دوسرے سے ملے ہوئے فیوز یکے بعد دیگرے اڑتے جائیں یہاں تک کہ دھماکا ہو جائے۔ ایک خیال سے دوسرا خیال زنجیر کی کڑی بنتا گیا اور آخری خیال نے ایک بالکل نئے امکان کو روشن کر دیا۔ یوں جیسے پُرپیچ گلیوں میں پھرتے پھرتے جہاں ہر قدم پہ راستہ بند ملنے کا اندیشہ ہو، آدمی اچانک کسی شاہراہ پہ آ نکلے۔

"مرزا غالب! محسن نے ٹھیک کہا۔ ضرورت پڑی تو ہم بھی مر جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "دیکھو نا! اگر چوہدری دلاور زندہ رہتے ہوئے بھی ہم کو یقین دلانے کی کوشش کر سکتا ہے تو کیا یہ کوشش ہم نہیں کر سکتے۔ وہ اپنی کوشش میں ناکام رہا مگر ضروری تو نہیں کہ ہم بھی ناکام ہوں۔ فرض کرو پہلے مرحلے میں کل صبح میرا انتقال ہو جائے۔ آج کی صبح تو ہونے والی ہے چند گھنٹوں میں۔ یہ فرض کر لو کہ آج میری زندگی کا آخری دن ہے اور کل تم یہ خبر چھاپ دو کہ مشہور مفرور مجرم سکندر بخت یوں تیرِ قضا کا نشانہ بنا۔ اور اگر دنیا یقین کر لے تو میرے لیے دنیا کے قانونی جھمیلے ختم۔ انتظام ایسا ہو کہ دلاور جیسا ہوشیار آدمی بھی نہ سمجھے کہ کوئی میرا داؤ مجھ پر ہی آزما رہا ہے۔"

وہ سب منہ کھولے بیٹھے تھے اور ان کے لیے وہ بات سمجھنا محال تھی جو میرے ذہن میں تھی۔

لیکن محسن کے اور میرے درمیان جو ذہنی ہم آہنگی تھی، وہ غیر محسوس طریقے پر کچھ ٹیلی پیتھی جیسے مواصلاتی رابطے کا کام کرتی تھی اور اکثر ایسا ہوتا تھا کہ جو بات میرے دماغ میں آتی تھی، وہ اس کے دماغ میں یوں پہنچتی تھی جیسے ایک ٹی وی اسٹیشن سے کیمرے کی آنکھ کوئی منظر دیکھے اور آواز کے ساتھ تمام تفصیلات اور سارے رنگ ٹی وی سیٹ میلوں دُور اُسے پلک جھپکنے سے بھی پہلے دکھا دے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے مگر یہ شاعرانہ بات ہے۔ سائنسی وضاحت پیش کرنے والوں کا نظریہ ہے کہ خیالات کی لہریں بھی ایک فریکوئنسی رکھتی ہیں اور جہاں دو افراد کے خیالات کی یہ فریکوئنسی مل جائے، وہاں الفاظ کا وسیلہ ضروری نہیں رہتا۔ حقیقت کچھ بھی ہو، یہ مشاہدہ میں نے بارہا کیا تھا کہ بات ابھی میں نے کہی نہیں تھی کہ محسن نے سمجھ لی تھی، یہی اس وقت بھی ہوا۔

"کام مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں ہے۔" محسن نے سوچ کر کہا۔ "اور پلان کی کامیابی کا انحصار سب کی مشترکہ کوشش پر ہے... کیوں مرزا غالب..."

"یارو... غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں۔" مرزا غالب نے نقشِ فریادی بن کر کہا۔ "ابھی تو پٹ کر لوٹا ہوں۔"

"کیسے بزدل صحافی ہو تم؟" میں نے کہا۔ "کیا تم نے سُنا نہیں کہ قلم میں تلوار سے زیادہ طاقت ہے۔"

"ہوگی... ضرور ہوگی... لیکن مقابلہ تلوار سے نہیں ہے برادرانِ عزیز... بندوق کی گولی سے ہے... فرق صاف ظاہر ہے۔" وہ بولا۔

"تم کو قلم ہی چلانا ہے۔" میں نے اُسے تسلی دی۔ "توپ نہیں چلانی ہے۔ سب سے پہلے تو ہمیں یہ معلوم کرنے جانا ہے کہ وہ لاش کس کی تھی جسے دلاور مرحوم بنا کے رکھا گیا تھا اور جو دراصل لاش نہیں تھی، شکاریوں کا پھیلایا ہوا جال تھا کہ ہم تجسس سے مجبور ہو کے ان کا آخری دیدار کرنے جائیں تو یہ دنیا دی زندگی میں ہمارا آخری ایڈونچر ہو۔"

"اب بھی آپ لوگوں کے عزائم بُرے نہیں ہیں چنانچہ کہا جا سکتا ہے کہ انجام بھی وہی ہوگا۔" غالب نے کہا۔

"تم ایسی باتوں سے ہمارا حوصلہ کم نہیں کر سکتے... ہمارے ساتھ خواجہ نیک محمد جیسے سورما ہیں۔" میں نے کہا۔

"خواجہ نیک محمد؟" غالب حیران ہو کے بولا۔ "یہ کون اُلّو کا پٹھا ہے؟"

استاد ٹیڈی نے سر اسے رضائی میں سے باہر کھینچ لیا۔ "وہ ہم ہیں۔" وہ غالب کی ناک سے ناک ملا کے بولا۔ "اچھی طرح دیکھ لو تاکہ غلط فہمی نہ رہے... ورنہ قسم مولا علی کی..."

میں نے فوراً ٹیڈی کو پیچھے کھینچ لیا۔ محسن اور رابعہ دانت نکالتے رہے۔ "کیا کرتے ہو استاد؟" میں نے کہا۔ "خانہ جنگی کے لیے ایم آر ایس میں بالکل گنجائش نہیں۔ سب لاٹھی والے مل کر رہتے ہیں تاکہ ہر بھینس ان کی رہے۔"

"لاحول ولاقوۃ۔" غالب نے پھر لحاف میں پناہ لی۔ "اے بھائی ہمیں کیا معلوم کہ تمھارا ایسا شریفانہ نام بھی ہو سکتا ہے۔"

"دیکھ لو سکندر بادشاہ۔" استاد ٹیڈی نے اکڑ کر مونچھوں کو تاؤ دیا۔ "اب یہ کارٹون ہمیں بدمعاش کہہ رہا ہے۔ ابے ہمارا نام شریفانہ ہے تو کیا ہم خود شریف نہیں ہیں؟"

"شریف کیا تم بدمعاش بھی نہیں ہو۔ مجھے تو تمھاری یہ مونچھیں بھی نقلی لگتی ہیں۔" غالب نے چلّا کر کہا۔

اس سے پہلے کہ ایم آر ایس کے دو مستند اور معزز اراکین بیچ مچ نہ سہی اصطلاحاً تلواریں سونت کر ایک دوسرے کے مقابلے پر آ جاتے، ہم سب نے دخل درمعقولات کیا اور جنگ بندی کرانے کے بعد انھیں زبردستی ایک دوسرے سے گلے ملوایا۔ یہ کارروائی گلے ملنے سے زیادہ گلے پڑنے کے مترادف تھی۔

"لاش کے بارے میں قیاس آرائی کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم کو جا کے دیکھنا ہی پڑے گا اور چونکہ رات کے وقت اس کوٹھی کا نے لگانا مشکل ہے اس لیے مجھے لاش کے کوٹھی میں ہی مل جانے کے امکانات خاصے روشن نظر آتے ہیں۔ جو کام آسانی سے کیا جا سکتا ہو اسے مشکل طریقے سے کوئی نہیں کرتا۔ کم سے کم دلاور گھبراہٹ میں جلدی کرنے والا آدمی نہیں ہے۔ ابھی تو اسے افسوس ہوگا کہ اس نے اتنی محنت سے جال پھیلایا تھا، اس امید میں کہ پکڑا جائے گا شیر لیکن آ پھنسا گیدڑ۔"

"غالباً آپ خود کو شیر سے اور مجھے گیدڑ سے تشبیہ دے رہے ہیں۔" غالب نے لحاف سے سر نکال کر کہا۔

"جی۔" میں نے کہا۔ "دلاور غصّے اور جھنجلاہٹ میں مبتلا ہوگا۔ اسے لاش کی فکر نہیں ہوگی، اپنی ناکامی کا صدمہ ہوگا۔ اسے فوری طور پر یہ ڈر نہیں کہ ہم میں سے کوئی اس وقت وہاں جانے کی حماقت کر سکتا ہے چنانچہ لاش کا کیا ہے، صبح کہیں گاڑ دی جائے گی اور دوستو! جنگ کی حکمتِ عملی یہ ہے کہ حملہ اس وقت کرو جب دشمن کو اس کی ذرا بھی توقع نہ ہو تاکہ اسے دفاع کا موقع ہی نہ ملے۔ جنرل آئزن ہاور نے دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں فرانس سے نازی جرمنی کی فوجوں کو نکالنے کا سب سے خطرناک مرحلہ ایک ایسی رات میں سرانجام دیا تھا جب موسم انتہائی خراب تھا۔ اس نے منصوبے کو آخری لمحے تک خفیہ رکھا اور چھ جون کو جسے "ڈی ڈے"

بھی کہتے ہیں، رات کے وقت اتحادی فوجوں کو سخت بارش اور طوفان میں نارمنڈی کے ساحل پر پیراشوٹ سے اتار دیا۔ نازی فوجی مطمئن تھے کہ کم سے کم آج کی رات اتحادی افواج کوئی کارروائی نہیں کریں گی اور وہ فراغت کے احساس سے سرشار کچھ جشن منا رہے تھے چنانچہ بے خبری میں مارے گئے اور فرانس سے نکالے گئے۔ آئزن ہاور کا جُوا کامیاب رہا۔ بس اسے سرفروشانِ ایم آر ایس، ہم بھی آج کی رات کو "ڈی ڈے" فرض کرتے ہوئے جاتے ہیں۔"

" لاکھ ٹکے کی بات کہی سکندر بادشاہ تم نے۔" ٹیڈی نے کہا جو تاریخ کی ایک مشہور روایت کے ذکر سے سخت متاثر ہوا تھا۔ باقی لوگ جنگِ عظیم کی تاریخ کے متعلق جانتے تھے چنانچہ وہ خاموش رہے۔

" اگر لاش کوٹھی کے اندر ہی مل جاتی ہے تو ہم لے آئیں گے۔" میں نے کہا۔

" وہ کیسے ؟" محسن کہنے لگا۔ "جا کے اپنے چوہدری دلاور سے کہیں گے کہ میں اندر حاضر ہو سکتا ہوں جناب۔ اور وہ انتہائی شائستگی سے کہے گا کہ چشمِ ما روشن دلِ ما شاد... تشریف لائیے۔ پھر ہم کہیں گے کہ ازراہِ عنایت وہ لاش عنایت فرمائیے جو ابھی کچھ دیر پہلے آپ کی جگہ بیٹھی تھی اور وہ کہے گا کہ ابھی پیش کرتا ہوں۔ وہ لاش کیا آپ میری اصل لاش بھی لے جانا چاہیں تو بصد شوق لے جائیں۔ اس سے زیادہ لاشیں درکار ہوں تو میں آپ سب کو بھی لاش بنا دیتا ہوں۔"

رابعہ کا ہنستے ہنستے بُرا حال ہو گیا۔ اتنے سنجیدہ اور بھیانک موضوع پر محسن کا اندازِ بیان مسخروں والا تھا۔

" ابھی تم کہہ رہے تھے کہ میں تمھیں میک اپ مین کے پاس لے جاؤں۔" غالب نے کہا۔ "تاکہ وہ تمھاری شکل بگاڑ دے۔"

" بہتر تو یہی ہوتا کہ ہم چہرے بدل کر جاتے۔" میں نے کہا۔ " لیکن کام زیادہ ہے۔ اسے کم سے کم تین چہرے بدلنے ہیں... میرا... محسن کا اور ٹیڈی کا۔ اور میرا خیال ہے کہ اس کام میں تین گھنٹے تو ضرور لگیں گے۔ اس وقت رات کے پونے دو بجنے والے ہیں۔ پانچ بجے کے بعد چوہدری دلاور کے گھر پہنچے تو دیر ہو جائیگی۔"

" دیر کیوں ہو جائے گی؟" محسن بولا۔ "سورج سوا سات بجے سے پہلے نہیں نکلتا، چھ بجے تو فجر ہوتی ہے۔"

" ہاں۔ کام تو وہاں لمبا نہیں ہے۔" میں نے محسن کی بات پر غور کیا۔ "آدھے گھنٹے سے زیادہ نہیں لگے گا۔ کیوں غالب خاں مغلوب؟ ہم اس وقت نکل جائیں اور تمھارے اس لالچی دوست یعنی میک اپ مین کو خوابِ غفلت سے بیدار کر دیں تو کیا یہ ممکن ہے کہ وہ ایک گھنٹا فی چہرہ محنت کر کے ہمیں پانچ بجے تک

کچھ اور بنا دے۔ فلمسٹار رنگیلا، ہٹلر یا شاہِ جنات کا ہم شکل؟"

" میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" غالب بولا۔ "اس کا کام ہے۔ وہی بتا سکتا ہے کہ تمھارے یہ چاند سے مکھڑے کتنی دیر میں ڈینٹ پینٹ کیے جا سکتے ہیں تاکہ ان کو گرہن لگ جائے۔"

" ہم معلوم تو کر سکتے ہیں اس سے۔" محسن نے جھلا کر کہا۔

" ہاں لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ اس کام پر رضامند ہو جائے۔" غالب بولا۔ "لالچی آدمی بھی بعض اوقات اڑ جاتا ہے یا ڈر جاتا ہے۔"

" آخر تم کس مرض کی دوا ہو؟" میں نے کہا۔ "تم کو اسی لیے تو ساتھ لے جائیں گے ہم کہ وہ مطمئن ہو جائے۔ تم اسے یقین دلا سکو کہ ڈرنے کی ضرورت نہیں اور ہم اپنے ساتھ صرف پیسہ لائے ہیں، خطرہ نہیں۔"

" اڑنے کی بات الگ ہے۔ اس کا علاج بھی الگ ہے۔" محسن نے جیب سے ریوالور نکالا اور پھر جیب میں رکھ لیا۔

رابعہ کچھ پریشان تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ہم اس خطرناک مشن پر روانہ ہوں۔ لیکن وہ ہماری فطرت کو بھی سمجھتی تھی اور یہ بھی جانتی تھی کہ منع کرنے سے ہم ماننے والے نہیں ہیں۔ اس کے نقطۂ نظر سے ہم خرابی میں مزید خرابی کا سامان کرتے چلے جا رہے تھے اور ہمارے معاملات کو سلجھانے کی کوشش کا نتیجہ اب تک اس کے سوا کچھ نہیں نکلا تھا کہ معاملات زیادہ اُلجھ گئے تھے لیکن وہ شرطِ وفا نبھانے پر مجبور تھی اور بہت پہلے اپنی زندگی پر میرے کامل اختیار کو دل کا فیصلہ سمجھ کے قبول کر چکی تھی چنانچہ اب وہ "سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے" کی عملی تصویر تھی۔ وہ خود کچھ نہیں تھی، اس کے لیے جو کچھ تھا میں تھا۔ اس کی عقل، اس کی قوتِ فیصلہ اور قوتِ ارادی سب میری خوشی تھی۔

" میں تم لوگوں کے ساتھ چلوں گی۔" اس نے اچانک کہا۔

" تمھارا دماغ خراب ہے؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔

" دماغ تو ہم سب لوگوں کا خراب ہے۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ "ہمارے درمیان یہ دیوانگی کا رشتہ نہ ہوتا تو ہم سب بہت پہلے ایک دوسرے کا ساتھ چھوڑ چکے ہوتے۔"

" لیکن تمھارا وہاں کوئی کام نہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم طے کر چکے تھے کہ تم انکل رضوی کے پاس لوٹ جاؤ گی۔"

" کیا میں آدھی رات کے بعد ان کو جگا کے کہوں گی کہ... کہ میں جھک مار کے واپس آگئی ہوں۔" اس کی شکل رونے والی ہو گئی۔

" نہیں عزیزہ۔ تم وہ شعر پڑھنا کہ شاید مجھے نکال کے پچھتا رہے ہوں آپ۔ محفل میں اس خیال سے پھر آگئی ہوں میں۔" غالب نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ہمارے ساتھ رابعہ بھی مسکرانے پر مجبور ہو گئی۔

" میرا مطلب تھا کہ اس وقت کیا میں اکیلی ہوٹل واپس جاؤں گی۔" رابعہ نے کہا۔ "تم سب لام پر جا رہے ہو۔"

" تم کہیں بھی نہ جاؤ، یہیں دروازے بند کر کے سو جاؤ۔" محسن بولا۔ "اور ہماری بالکل فکر نہ کرو۔"

" اچھا! اب مجھے فکرمند ہونے کا حق بھی نہیں۔" رابعہ نے طنز سے کہا۔ "تم اطمینان سے سو سکتے تھے اگر میری جگہ ہوتے؟"

" چلو سونا ضروری نہیں تو صبح تک ہماری واپسی کا انتظار کرو۔" میں نے کہا۔

" صرف انتظار ہوتا تب بھی عذاب کم نہ ہوتا۔ اب ہزار جان لیوا اندیشے بھی ہوں گے اور میں اکیلی۔ مجھے اپنے ساتھ رکھو پلیز۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ کل ڈھیٹ بن کر انکل رضوی کے گھر چلی جاؤں گی۔" وہ ہسٹریائی سے لرزنے لگی تھی۔

" سمجھنے کی کوشش کرو رابعہ۔" میں نے کہا۔ "ایک تو اس وقت ہمارے پاس اپنی ٹرانسپورٹ نہیں ہے۔ ایک تمھاری گاڑی کا آسرا تھا، اب وہ بھی نہیں رہا۔"

" بالآخر ہم گاڑیاں تباہ کرنے کا عالمی ریکارڈ قائم کر دیں گے۔" محسن نے مسرت سے کہا۔

" اس وقت ہم چار آدمی ہیں اور کسی ٹیکسی میں پانچویں سواری کی گنجائش نہیں ہوتی۔" میں نے محسن کو گھور کر کہا۔ "یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اتنی رات کو ٹیکسی ہی نہ ملے اور ہمیں... اپنی مدد آپ کے اصول پر متبادل انتظامات کرنے پڑیں۔"

" یعنی کسی سے گاڑی چھینو گے اس وقت؟" رابعہ نے خفگی سے کہا۔

" ضروری نہیں... کوئی شریف آدمی ہمیں لفٹ دینے پر تیار ہو جائے تو اچھا ہے۔" میں نے سر کھجا کے کہا۔ "لیکن ہمارے پاس وقت کم ہے۔ ہم صبح تک اس شریف آدمی کے انتظار میں کھڑے نہیں رہ سکتے اور صبح ہونے کا انتظار بھی نہیں کر سکتے کہ کاروں کے شوروم کھل جائیں تو ہم پھر چلتی کا نام گاڑی لے لیں۔"

" دیکھو یارو۔" میں نے ایم آر ایس سے نظریاتی اتفاق کیا تھا۔" غالب بولا۔ "لیکن ایسے مشکل کام میں نہیں کر سکتا۔ یہ مار دھاڑ اور مرنا مارنا، کشتوں کے پشتے لگانا...!"

" یہ کام ہمارے لیے چھوڑ دو۔" میں نے کہا۔ "ایک اکیلا دو گیارہ۔ میں اور محسن گیارہ کے برابر ہیں لیکن ٹیم میں بارھواں کھلاڑی ضرور رکھا جاتا ہے۔ خواجہ صاحب بارہویں کھلاڑی ہیں۔ اس کے بعد تم..."

" تیرہ نمبر... یا میرے خدا! کیا منحوس عدد ملا ہے۔" غالب نے کہا۔ "اپنی قسمت ہی ایسی ہے۔"

" اس وقت ہم چاروں کو جانے دو۔" میں نے رابعہ سے بات جاری رکھی۔ "کسی عورت کے ساتھ گھومتے ہوئے ہم یوں بھی مشتبہ نظر آئیں گے اور اگر ہم نے مائٹ از رائٹ کے بنیادی فلسفے پر عمل کرتے ہوئے ذرائع نقل و حمل کا بندوبست کیا تو تمھاری موجودگی ہمارا راز فاش کر دے گی۔ رپورٹ لکھوانے والے کو کسی اور کا چہرہ یاد رہے نہ رہے، تمھارا ذکر تو وہ یوں کرے گا کہ رپورٹ بھی غزل محسوس ہو گی اور جاننے والے جان لیں گے کہ یہ کس کا ذکر ہے۔"

محسن ہنسا اور رابعہ کا رنگ لال ہونے لگا۔ "صبح تک میں یہیں ہوں۔ کب تک لوٹو گے تم لوگ؟"

" سورج نکلنے تک۔" میں نے کہا۔ "لیکن دیر ہو جائے تو گھبرانا نہیں۔ انکل کے گھر چلی جانا۔"

" وعدہ کرو تم اپنا خیال رکھو گے۔" رابعہ نے روایتی بیویوں کی طرح کہا جو شوہر کو لام پر بھیجتے وقت بھی یہ جملہ کہتی تھیں اور اب خود میکے جاتے ہوئے بھی ٹرین میں بیٹھ کے کہتی ہیں۔ مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔

" ارے بابا! میں اکیلا تو نہیں ہوں اپنا خیال رکھنے والا۔ میرے ساتھ میرا خدا ہے، میرا اعتماد ہے، محسن اور فوجی ہیں اور مرزا غالب ہیں... اور تم ہو... تمھارے خیال کی رفاقت بھی تمھارے ساتھ سے کم تو نہیں۔"

" جو کچھ میرے پاس بچا ہے۔" رابعہ نے فوراً میرے جذبات کے دھارے کا رُخ موڑ دیا کیونکہ محسن کے علاوہ ٹیڈی اور مرزا غالب یکلخت سنجیدہ ہو گئے تھے۔ "اس سے کل کوئی دوسری گاڑی لے لینا... اور..."

" آپ بالکل فکر مت کرو آپا جی۔" ٹیڈی اچانک بولا۔ "قسم مولا علی کی! ہم نے ابھی تک یاروں کے لیے کچھ بھی نہیں کیا سوائے باتوں کے... ہمیں بڑی شرم آتی ہے جی آپ کو دیکھ کر... آپ کے سکندر کو کچھ نہیں ہو گا۔ اس کا خیال ہم رکھیں گے اور آپا جی... اب سارا انتظام ہم کریں گے۔ جان کی ضرورت ہو گی تو جان دیں گے اور مال کی ضرورت پڑے گی تو مال... استاد ٹیڈی ابھی تک سامنے نہیں آیا تھا۔ ایسے ہی استاد نہیں بن گئے ہیں ہم۔"

ہم سب اسے حیرت سے دیکھتے رہے۔ وہ ایکدم جوش میں آگیا تھا۔ اس نے پہلی بار رابعہ کو آپا جی کہہ کے مخاطب کیا تھا اور اس کے لہجے میں پہلی بار مجھے یقین اور اعتماد کی کمی کا احساس نہیں ہوا تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح بڑ نہیں ہانک رہا تھا۔ معلوم نہیں اس میں یہ انقلاب کیوں آیا اور اس نے یہ اعتراف کیوں کیا کہ ابھی تک وہ دوستی کے کھوکھلے دعوے کرتا رہا ہے اور اس نے حقِ دوستی ادا کرنے کے لیے کچھ نہیں کیا ہے۔

"اس بات کا کیا مطلب ہے استاد کہ ابھی تک تم سامنے نہیں آئے تھے؟" محسن نے مذاق میں کہا۔

"وقت آنے پر اس بات کا مطلب بھی سمجھ میں آجائے گا۔ اب چلو اٹھو۔" وہ ایک دم کھڑا ہو گیا۔ محسن نے اپنی جیب سے ایک ریوالور نکال کے رابعہ کو دینا چاہا مگر اس نے لینے سے انکار کر دیا۔ ہم چند منٹ میں باہر آگئے اور رابعہ نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ سردی اپنے شباب پر تھی اور سب سے زیادہ خراب حال غالب کا تھا۔ وہ ہوٹل چند قدم کے فاصلے پر تھا جہاں ہمارا سب اسباب خواجہ نیک محمد کے کمرے میں پڑا تھا۔ میں نے اور محسن نے نیچے دیوار کے سائے میں ٹھہرنے کا فیصلہ کیا۔ مرزا غالب اور ٹیڈی اوپر گئے۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ مسلح ہونے کے لیے گئے تھے۔ اب تک ہم نے مختلف ذرائع سے جو اسلحہ حاصل کیا تھا اُس میں بارہ ریوالور تھے۔ لیکن ان میں سے آدھے ضائع ہو گئے تھے۔ باقی چھ میں سے ایک ریوالور سائلنسر والا میرے پاس تھا جو میں نے دلاور سے چھینا تھا۔ بھیس بدلنے کے لیے ہمارے پاس صرف ایک ویٹر کی وردی رہ گئی تھی۔ محسن نے مجھ سے اتفاق کیا کہ ہمارے پاس ایک پورٹیبل ٹیپ ریکارڈر ہونا چاہیے اور ایک ایسی گاڑی جس میں ریڈیو موجود ہو۔ کار کے ریڈیو عام ہیں اور ان میں "ایف ایم" بینڈ ہوتے ہیں۔ ایف ایم ریڈیو ہو تو ٹیلی فون کے بغیر ایف ایم مائکرو فون کے ذریعے بات کرنا ممکن ہو جاتا ہے اور پکڑے جانے کا ڈر بھی نہیں رہتا۔ جو "ایف ایم" مائکروفون ہم نے پہلے ہال روڈ سے خریدا تھا، وہ بھی اب ہمارے پاس نہیں تھا۔ ہم نے طے کیا کہ اس بار زیادہ رینج کا مائکروفون لیں گے تاکہ ہم ایک میل دُور رہ کے بھی بات کر سکیں عمداً ہم نے مالی وسائل کے ذکر سے گریز کیا۔ پیسہ رابعہ کے پاس تھا اور اس سے لیا بھی جا سکتا تھا لیکن بار بار ضرورت کے لیے اس سے کچھ مانگنا معیوب لگتا تھا۔ یہ احساس اپنی جگہ تھا کہ رابعہ کا جو کچھ ہے میرا ہے۔ اس کے باوجود میں محسوس کرتا تھا کہ میری وجہ سے پہلے اس کی آمدنی کے وسائل ختم ہوئے۔ اب آمدنی نہ ہونے کے بعد میں اس کا بچایا ہوا پیسہ ختم کرتا جا رہا ہوں۔ جب یہ پیسہ ختم ہو جائے گا تو وہ کیا کرے گی اور پیسہ کہاں سے لائے گی اور اپنی ذاتی ضروریات کس طرح پوری کرے گی؛ یہ معاشی مسائل کا دوسرا غور طلب پہلو تھا۔ فی الحال نہ میں کچھ کر رہا تھا اور نہ محسن۔ ہم خرچ بھی اس انداز سے کر رہے تھے کہ مالی مسائل بڑھتے جا رہے تھے۔ ہوٹلوں کا خرچ تھا۔ باہر کھانے پینے کا خرچ تھا اور ہزار دیگر ضروریات کے اخراجات تھے۔ محسن اپنے تنخواہ دار اور محدود آمدنی رکھنے والے باپ سے کچھ نہیں منگوا سکتا تھا اور ہم دونوں میں سے کسی کو نہ جاگیر سے آمدنی تھی، نہ کاروبار سے نہ ملازمت سے

چنانچہ صاف نظر آتا تھا کہ بہت جلد یہ صورت حالات سنگین تر ہو جائے گی۔ کہنے کو میں لکھ پتی باپ کا لکھ پتی وارث تھا اور ایم ڈبلیو ڈی کمپلیکس میں آدھے کا مالک لیکن وہی قانون جب مجھے چوہدری دلاور کے کاروبار میں برابر کا شریک تسلیم کرتا تھا اور مجھے میرا حق دلوا سکتا تھا، اس وقت میرے خلاف استعمال ہو رہا تھا اور جو کچھ میرا تھا اس میں سے مجھے ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں مل سکتی تھی۔ میں نے اندازہ لگانے کی کوشش بارہا کی تھی کہ آخر ایم ڈبلیو ڈی کے اثاثے، کاروبار اور گڈوِل سب کی مجموعی مالیت کیا ہو گی؟ جتنا دلاور مجھے دینا چاہتا تھا اُس حساب سے تو میرا حق بہت زیادہ بنتا تھا۔ شاید پچاس لاکھ سے بھی زیادہ۔ مگر وہ پچاس لاکھ لینے کے لیے مجھے عدالت میں حاضر ہونا پڑتا اور عدالت مجھے ایک ہاتھ میں وراثت کا سرٹیفکیٹ تھماتی تو دوسرے ہاتھ میں موت کا فرمان۔ وہ رقم میرا عالی شان مقبرہ تعمیر کرانے کے سوا کسی کام نہ آتی۔ رابعہ کی فرم اب منظر نے سنبھال لی تھی تو یہ امید کی جا سکتی تھی کہ رابعہ کو پانچ دس ہزار روپے ماہانہ کا منافع ملنے لگے مگر وہ غیر یقینی تھا اور ناکافی تھا۔ رابعہ نے وہ کوٹھی تو بیچ دی تھی جو اسے نواب خسرو جمشید سے ملی تھی مگر رقم محفوظ رکھنے کے بجائے رابعہ نے میرے والد کی پرانی کوٹھی خریدنے میں لگا دی تھی۔ میں اسے ایک جذباتی قدم تو کہہ سکتا تھا، حماقت نہیں کہہ سکتا تھا۔ رابعہ کی سوچ کے انداز کو غلط نہیں کہہ سکتا تھا کہ میرے مستقبل کے ساتھ وہ میرے ماضی میں بھی شریک ہو گئی تھی اور اس نے اپنے لیے جو گھر منتخب کیا تھا، وہ میرا گھر تھا۔ چنانچہ جس گھر سے وزیر خان کو نکلنا پڑا تھا، وہ ہمارا گھر ہو گیا تھا۔ ہم دونوں کا گھر۔ وزیر خان کے بیٹے کا اور اس کی ہونے والی بہو کا گھر۔ خواب تو ائی نے بھی دیکھے ہوں گے کہ جب بیٹے کے علاوہ گھر میں بہو ہو گی تو گھر کتنا آباد ہو گا مگر اس خواب کی تعبیر دیکھنا اُسکے مقدّر میں نہ تھا اور ابھی تو میں اپنے بارے میں بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ میرے اور رابعہ کے خوابوں کو وہی تعبیر ملے گی یا نہیں جو ہم چاہتے ہیں۔ فقط چاہنے سے خواب سچ ہوتے تو دنیا جنت ہوتی۔

"آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں۔" مرزا غالب نے ریوالور لہرا کے کہا۔

"لاحول ولا قوۃ۔" میں نے گھبرا کے کہا۔ "اس نمائش کا مقصد کیا ہے۔ یہیں دھر لیے جائیں گے کچھ کرنے سے پہلے۔"

"یہ تم نے کس کے ہاتھ میں کیا چیز تھما دی ہے۔" محسن نے خفگی سے کہا۔ "یہ خود بھی مرے گا ہمیں بھی مروائے گا۔"

"اصل بات تو یہی ہے یارو۔" غالب نے ریوالور کو فوراً جیب میں رکھ لیا۔ "ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ۔ ہم جو

اپنی صورت سے اتنے چغد لگتے ہیں اور لوگ سمجھتے ہیں کہ زبان یا قلم کے سوا ہم کچھ چلا ہی نہیں سکتے تو آج دیکھنا ہم کیا کر دکھاتے ہیں۔ تم میں سے جس کو دعوےٰ ہو ابھی آزما لے۔"

ظاہر ہے نہ وہ جگہ نشانہ بازی یا جرأت اور ہمت کے مظاہرے کے لیے مناسب تھی اور نہ یہ وقت آپس میں مقابلے کا تھا چنانچہ ہم نے فوراً روانہ ہو جانے میں عافیت دیکھی۔ غالب نے بادلِ ناخواستہ چند قدم پیچھے رہ کر خواجہ نیک محمد کے ساتھ چلنا منظور کیا۔ ان کے درمیان خلوص اور دوستی کے سوا کوئی قدرِ مشترک نہیں تھی۔ غالب ایک اعلیٰ خاندان کا اعلیٰ تعلیم یافتہ ذہین اخبار نویس تھا۔ خواجہ نیک محمد نے جیب کاٹنے سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا تھا اور چوریاں کرتے کرتے بدمعاشی کے منصب پر فائز ہوئے تھے تو استاد ٹیڈی کہلانے لگے تھے۔ ٹیڈی نہ پڑھا لکھا تھا اور نہ اس کو اپنے حسب نسب پر ناز تھا۔ چنانچہ دونوں کے درمیان یہی فرق تھا جس کی وجہ سے ان کی آپس میں ٹھن جاتی تھی۔ میں نے جب حضرتِ غالب سے پیچھے ٹیڈی کے ساتھ رہنے کو کہا تھا کہ غالب نے احتجاج کیا کہ ایک شریف آدمی کو ایک بدمعاش کے ساتھ رکھنا گھوڑے گدھے کو ایک لاٹھی سے ہانکنے والی بات ہے۔ اس پر ٹیڈی نے چراغ پا ہو کے کہا کہ وہ جانتا ہے گدھا کون ہے اور گھوڑا کون اور خود کو شریف کہنے والے کتنے شریف ہوتے ہیں اور آئندہ کسی سالے نے اس کو بدمعاش کہا تو وہ بتلائے گا کہ بدمعاشی کیا ہوتی ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے انھیں خاموش کیا اور ڈسپلن بحال کیا۔ اس کے باوجود وہ ایک دوسرے کے ساتھ یوں چلتے رہے جیسے وہ میاں بیوی جو الگ ہو چکے ہوں۔

میں نے بہت مظلوم و مسکین بن کے سرگزرنے والی کار کے مالک کو لفٹ کا اشارہ کیا کیونکہ اس وقت ٹیکسی رکشا کا دور دور تک پتا نہ تھا لیکن کاریں زن زن گزرتی گئیں۔ اس ویران سڑک پر اتنی رات گئے کسی اجنبی کو بٹھانے کا خطرہ مول لینے پر کوئی تیار نہ تھا۔ بالآخر میں نے محسن سے مشورے کے بعد سڑک کے ایک کنارے پر پوزیشن لی۔ محسن دوسرے کنارے پر درخت کی اوٹ میں چھپا کھڑا رہا اور ہمارے باقی دو ساتھی خاصے فاصلے سے تماشا دیکھتے رہے۔ ایک کار کی ہیڈ لائٹس نمودار ہوئیں تو محسن سامنے آیا اور اس نے پہلے انگوٹھا دکھایا پھر گزرتی ہوئی کار پر پتھر کھینچ مارا۔ کار فوراً رک گئی اور حسبِ توقع اس کا مالک سخت مشتعل ہو کے باہر نکلا۔

"تمھارا دماغ خراب ہے؟" وہ ڈینٹ پر انگلی پھیر کر بولا۔ "یا خود کو بدمعاش سمجھتے ہو؟"

"میں نے شرافت سے لفٹ مانگی تھی۔" محسن نے دانت نکال کے کہا۔ "تم نے کار کیوں نہیں روکی؟"

"اُلّو کے پٹھے۔" کار والے نے محسن کے مُکّا مارنا چاہا... "تمھارے باپ کی..."

اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ میں نے اُسے دبے پاؤں پیچھے سے آکے دبوچ لیا۔ اپنا ایک ہاتھ اس کے مُنہ پر رکھا اور اسے گھسیٹ کر دُور لے گیا۔ وہ کمزور آدمی نہیں تھا چنانچہ اس کی مزاحمت کو ختم کرنے کے لیے مجھے اس کے سر پر ریوالور کا دستہ مارنا پڑا۔ تاہم میں نے اس بات کا خیال رکھا کہ اسے چوٹ زیادہ نہ آئے۔ اسے وہیں سڑک سے دو رفٹ پاتھ پر ڈال کے میں کار کی طرف لپکا۔ محسن کار میں لگی ہوئی چابیوں کی مدد سے انجن پہلے ہی اسٹارٹ کر چکا تھا۔ ہماری ہدایات کے مطابق ٹیڈی اور غالب بھی پیچھے بیٹھ چکے تھے۔ میرے بیٹھتے ہی کار روانہ ہو گئی۔

"میاں سکندرِ اعظم! قتل کر دیا ایک اور؟" غالب نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

"نہیں مرزا جی۔ بس تھوڑی سی دیر کے لیے لٹا دیا ہے۔" میں نے کہا۔ "ابھی دس منٹ میں اٹھ کھڑا ہو گا یا گشت کرنے والے پہریدار اٹھا کر لے جائیں گے۔"

"تم لوگ تو پیشہ ور مجرم ہو اور میں جذباتی ہو کے ایم آر ایس میں شامل ہو گیا ہوں۔" وہ بولا۔

"اس بات کا اختیار تم کو ہمیشہ حاصل رہے گا کہ جب چاہو الگ ہو جاؤ۔" میں نے برہمی سے کہا۔ "لیکن پھر کبھی ہم کو پیشہ ور مجرم کہنے کی غلطی مت کرنا۔ ہم نے تو پیشہ ور مجرموں کی بیخ کنی کے لیے ایک ٹیم بنائی ہے اور ہمارا مشن نیک ہے۔ صرف وسائل کے حصول کا طریقہ غلط ہے لیکن یہ ہماری مجبوری ہے۔"

"ہر مجرم کسی نہ کسی مجبوری کو جواز بنا لیتا ہے۔"

"فضول باتیں مت کرو۔ اگر میرا حق مجھے مل جاتا تو ایسی دس کاریں خرید سکتا تھا میں۔" میں نے مشتعل ہو کے کہا۔ "مگر میں اس وقت ایک ٹیکسی بھی حاصل نہیں کر سکتا تو کیا کروں۔ نہ کاریں چرانا میرا شوق ہے اور نہ پیشہ۔"

"قسم مولا علی کی، اب ایک لفظ بھی نکلا تمھاری زبان سے تو میں..." ٹیڈی نے ایک دم ریوالور نکال لیا۔

غالب ہنس پڑا۔ "یعنی گولی مجھ پر چلاؤ گے؟ ضرور چلاؤ۔ میں صرف سچ سے ڈرتا ہوں مگر سچ بولتے ہوئے نہیں ڈرتا۔"

"خدا کے لیے بند کرو یہ ڈراما۔ نہ یہ تم پر گولی چلا سکتا ہے اور نہ تم اتنے بہادر ہو۔ تم بھی یہ بات جانتے ہو ورنہ کوئی راہ چلتے نقلی پستول بھی دکھا دے تو تم کپڑے اتار کے دے دو گے۔" محسن نے سر گھما کے کہا۔ "یہ بتاؤ جانا کدھر ہے؟"

غالب کا دوست جو پہلے اسٹیج پر میک اپ کرتا تھا اور اب ٹیلی وژن سے بھی نکالا جا چکا تھا، کوئینز روڈ کی ایک گلی میں رہتا تھا۔ ہم نے کار کو چوراہے سے کچھ دُور کھڑا کر دیا۔ جہاں اور بھی بہت سی گاڑیاں خاموش اور سرد رات میں چپ چاپ کھڑی ٹھٹھر رہی تھیں۔ محسن نے کار ہی سے ایک کپڑا اٹھا کر فنگر پرنٹ مٹانے میں چند منٹ صرف کیے۔ پھر ہم سب گلی میں غائب ہو گئے۔ غالب کے ساتھ میں ایک عمارت کی تیسری منزل تک پہنچا۔ محسن اور ٹیڈی دو زینے طے کر کے رک گئے۔ بلڈنگ کے سب مکین سوئے پڑے تھے، اس کے باوجود ہم نے احتیاط سے کام لیا تھا اور دبے پاؤں اوپر گئے تھے۔ غالب نے کال بیل کا بٹن دبایا اور ایک دروازے کے پیچھے سے بزر کی کرخت آواز سنائی دی۔ کچھ دیر خاموشی سے انتظار کرنے کے بعد غالب نے پھر بٹن دبایا۔ اندر سے کسی نے خوابیدہ لہجے میں پوچھا۔ "کون ہے بھائی۔" اور پھر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ دروازہ کھلا تو میں نے اپنے سامنے غالب کے دوست کو دیکھا۔ وہ دُبلا پتلا اور گنجا صورت سے بیمار نظر آنے والا اُدھیڑ عمر کا آدمی تھا جس کا رنگ اندھیرے میں نظر بھی نہ آتا تھا۔ اس نے اندر کی لائٹ جلائی تو میں نے اُسے غور سے دیکھا۔ وہ شکل سے ہی کمینہ، لالچی اور عیار لگتا تھا۔ ایسے آدمی پر بھروسا کرنے میں یقیناً خطرہ تھا مگر اس وقت ہمارے پاس اور کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ "غالب بھائی تم... اس وقت..." وہ اپنی حیرانی پر قابو پا کے بولا۔

"ہاں موسلے بھائی۔" غالب نے خوشدلی سے کہا۔ "تم تو ایسے پریشان ہو رہے ہو جیسے میں قبر سے اُٹھ کر آ گیا ہوں۔ ارے بھئی، میں زندہ سلامت اپنے پیروں پر چل کے تمہارے دروازے تک پہنچا ہوں... تمہارا مہمان ہوں... کیا رات بھر باہر ہی رکھو گے سردی میں۔"

"نہیں! ایسی بات کاہے کو ہونا غالب بھائی۔" وہ خفیف ہو کے پیچھے ہٹا۔ "اندر آؤ۔"

"میں اکیلا نہیں ہوں۔" غالب نے کہا۔ "میرے ساتھ چند مہمان بھی ہیں۔ ایک تو یہ دوست ہیں ہمارے ایس بی کے خان جو مجھ سے زیادہ شریف آدمی ہیں۔" پھر اُس نے مجھے اشارہ کیا اور ہم اندر داخل ہو گئے۔

موسلے بھائی ہنسا۔ "ارے ہم کیا تم کو جانتا نہیں ہے کہ تم کتنا شریف آدمی ہے۔ ایک دم لفڑے باز۔"

"یہ ساری دنیا ایک لفڑا ہے۔ یہاں ہر شخص لفڑے باز ہے۔" مرزا غالب نے متانت سے کہا۔ "دروازہ کیوں بند کر دیا ابھی سے، میرے باقی مہمانوں کو بھی اندر آنا ہے۔"

"دیکھو یار غالب! ابھی میرے کو تھوڑا پریشانی ہونے لگا ہے۔" موسلے بھائی کے ماتھے کی ہر شکن گہری ہو گئی۔ "یہ ایک مہمان تو ٹھیک ہے لیکن اپنا گھر میں کوئی جلسہ جلوس کرنے کا جگہ نہیں ہے اور ابھی میرے کو سچ سچ بتا دے کہ تیرا کیا مقصد ہے، آدھی رات کے بعد یہاں آنے کا... میں اکیلا ہوں گھر میں۔"

"یہ تو اور بھی اچھا ہے۔" غالب نے کہا۔ "ویسے ایک بیوی تو تھی تیرے پاس جو ہر سال..."

"وہ ابھی اپنے میکے کے لیے گئی ہے۔ اپنا بھائی کا شادی بنانے کو۔" موسلے بھائی نے جلدی سے کہا۔ اسی وقت پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق محسن نے دروازے پر دستک دی۔ ہم نے محسن اور ٹیڈی کو بتا دیا تھا کہ ہمارے اندر پہنچ جانے کے ٹھیک پانچ منٹ بعد وہ آ جائیں۔ موسلے بھائی سے پہلے غالب نے مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے چٹخنی کھول دی۔ محسن اور ٹیڈی کے اندر آتے ہی دروازہ بند ہو گیا۔

"موسلے بھائی! یہ بھی اپنے جگری یار ہیں۔" غالب نے کہا۔ "یہ میاں خوجی اور یہ دوسرا مسٹر اچکن۔"

موسلے بھائی کا رنگ متغیر ہونے لگا تھا۔ "اچھا اچھا۔ تم سب بیٹھو۔" وہ خود بھی بیٹھتے ہوئے بولا۔ اس کمرے میں صرف ایک پرانی وضع کا صوفہ سیٹ تھا اور ایک گھسا ہوا قالین۔ درمیان میں رکھی ہوئی میز پر گرد تھی اور پرانے اخبار تھے۔ دواؤں کی آدھی پوری شیشیاں تھیں اور مجموعی طور پر کمرے کی ابتری سے مکینوں کی غربت کا اور عدم دلچسپی کا اظہار ہوتا تھا۔ موسلے بھائی سو تے سے اٹھا تھا چنانچہ خود اس کے کپڑے شکن آلود اور میلے تھے۔ اس کی آنکھیں جو چہرے کی مناسبت سے بہت چھوٹی اور کچھ گول تھیں، انتہائی مشکوک انداز میں ہم سب کا جائزہ لے رہی تھیں۔ مجھے وہ کسی ویرانے میں بسنے والا اُلّو نظر آیا جس کی تنہائی میں ہم سب مخل ہوئے تھے اور یہ بات اسے سخت ناگوار گزری تھی مگر وہ بے بس تھا۔ اس نے غالب کو دیکھ کر کسی خوشی کا اظہار نہیں کیا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ غالب اور موسلے بھائی کے درمیان دوستی کے رشتے کی بنیاد خلوص یا محبت پر نہیں ہے۔ بہت جلد اس کی تصدیق ہو گئی۔

"معلوم ہوتا ہے تم کو خوشی نہیں ہوئی مجھ سے اور میرے دوستوں سے مل کر۔" غالب نے کہا۔ "ایک ہم ہیں کہ تمہاری یاد آئی تو آدھی رات کو چلے آئے۔"

"دیکھ یار غالب۔ ابھی ایسا چکر مت دے میرے کو۔" موسلے بھائی نے تیز لہجے میں کہا۔ "تُو اُلّو سمجھتا ہے مجھے؟"

غالب نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہ...

کہ اُلّو اس کا کتنا بُرا مانیں گے... تم اُلّو نہیں... اُلّو کا پٹھا ہے... پٹھا سمجھتا ہے نا... شاگرد... جیسے ہر پہلوان کا پٹھا ہوتا ہے۔"

"فالتو بات مت کر... کیوں آیا ہے تو اس وقت؟" موسلے بھائی نے بگڑ کر کہا۔ "اور یہ کون لوگ ہیں تیرے ساتھ... اچکن... اور کھوجی... اور یہ کیا ایس بی کے خان... یہ کیا بکواس ہے... ان کا نام بھی تو نے غلط بتایا ہے۔"

"تم جیسے دولت مند آدمی کو اتنا کنجوس نہیں ہونا چاہیے موسلے بھائی۔" غالب نے اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد میری طرف ہاتھ بڑھایا اور سگریٹ کا پیکٹ لے لیا۔ "اتنی بڑی کوٹھی کے مالک ہو۔ ساڑھے تین ہزار روپے ماہانہ کرایہ آتا ہے۔ شاہ عالمی گیٹ کے اندر تمہارا جو میڈیکل اسٹور ہے اس کی جائز ماہانہ آمدنی بھی تین چار ہزار سے کم نہیں ہو سکتی۔ میڈیکل اسٹور کے نام پر تم کیا کچھ بیچتے ہو... اور کس کس کو بیچتے ہو۔"

"غالب! تو سالا رپورٹر نہیں، ایک دم خبیث بلیک میلر ہے۔" موسلے بھائی کا حوصلہ جواب دے گیا۔

"میں نے کبھی تم کو بلیک میل نہیں کیا موسلے بھائی۔" غالب بولا۔ "کبھی ضرورت پڑتی ہے تو تمہارے پاس آ جاتا ہوں لیکن اس میں کونسی بُری بات ہے۔ دنیا میں سب ہی ایک دوسرے کے کام آتے ہیں۔ پہلے میں تمہارے کام آیا تھا اور وہ کام اتنا بڑا تھا کہ اب تم میرے لیے جو کچھ کرتے ہو وہ اصل کا سود ہوتا ہے۔ تم خود سوچو کہ میں نے تمہاری مدد نہ کی ہوتی تو اس وقت تم کہاں ہوتے۔ یہ چار سال پہلے کی بات ہے لیکن بات ایسی ہے کہ چالیس سال بعد بھی تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ بات ختم ہو گئی۔ ان چار سالوں میں کتنی بار آیا ہوں میں تمہارے پاس؟ شاید چار بار۔ مجموعی طور پر تم نے مجھے دس بارہ ہزار روپے دیے ہوں گے۔ وہ بھی اس لیے کہ میں واقعی ضرورت مند تھا، بے روزگار تھا اور سالے دوست ایک وقت کھانا کھلاتے تھے تو احسان کرتے تھے۔ ادھار تو کوئی بھی نہیں دیتا تھا۔ میں اس پوزیشن میں ہمیشہ تھا کہ چاہتا تو تم سے ہر ماہ دو ہزار روپے کا وظیفہ لیتا رہتا اور تم یہ وظیفہ دیتے موسلے بھائی۔ تم چیختے چلاتے، گالیاں دیتے، مجھے قتل کرنے کی سوچتے یا خودکشی کرنے کی مگر مجھے دو ہزار ملتے رہتے۔ اس لیے کہ تم میں نہ مرنے کا حوصلہ ہے نہ مارنے کا۔ مگر میں نے تم سے انتہائی مجبوری میں کبھی دو ہزار لیے تو کبھی تین ہزار اور جب میرا سخت وقت گزر گیا تو میں کبھی پلٹ کر نہیں آیا۔ تم کو کیا معلوم کہ تم جیسے آدمی کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہوئے میرے دل پہ کیا گزرتی تھی لیکن مجبوری آدمی سے سب کچھ کراتی ہے، چوری سے قتل تک۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

موسلے بھائی نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ "اچھا! ابھی بولو کیا چاہیے۔ میرے پاس زیادہ کیش نہیں ہے۔"

غالب نے افسوس سے سر ہلایا۔ "ایک لکھ پتی کے مُنہ سے ایسی بات سن کر دکھ ہوتا ہے۔ اگر تم کروڑ پتی ہو گئے ہو تو بُرا مت ماننا کہ میں نے لکھ پتی کہہ کے تمہیں بے عزت کر دیا۔ تم کو دس بیس ہزار تو ہاتھ میں رکھنے ہی چاہئیں ہم جیسے بے غیرت لوگوں کے مُنہ پر مارنے کے لیے... اور کنگلے فقیروں کا کیا ہے... آدھی رات کو ہاتھ پھیلانے آ جائیں۔"

"قسم خدا کا غالب! ابھی اپنے پاس ایک ہزار بھی نہیں ہو گا لیکن تو بول، تیرے کو کتنا چاہیے۔ میں صبح بنک کھلتے ہی منگوا دوں گا۔" موسلے بھائی نے مُردہ آواز میں کہا۔

میں نے پانچ ہزار کے نوٹ جیب سے نکالے اور میز پر رکھ دیے۔ موسلے بھائی کی نظریں نوٹوں پہ جم گئیں۔ پھر اُس نے باری باری ہم سب کی صورتوں کو دیکھا۔

"اٹھا لو موسلے بھائی۔" غالب نے کہا۔ "پورے پانچ ہزار ہیں۔ آج میں تم سے کیش لینے نہیں، تم کو کیش دینے آیا ہوں۔ اس کو میرے حساب میں شمار مت کرنا۔ وہ دس بارہ ہزار الگ ہیں جو تم نے مجھے دیے تھے۔"

"پھر یہ کیا ہے؟" موسلے بھائی کی حالت غیر ہو گئی۔

"یہ ایک کام کا معاوضہ ہے جو تمہارے سوا کوئی نہیں کر سکتا۔" غالب نے کہا۔ "تم اپنے فن کے ماہر ہو۔ میرے تینوں دوستوں کے چہرے بدل دو۔ کام ارجنٹ ہے، اس لیے معاوضہ بھی اتنا بڑا ہے ورنہ تم کو اسٹیج پر تین افراد کے میک اپ کا کیا معاوضہ ملتا؟ زیادہ سے زیادہ سو روپے۔"

"لیکن... یہ کون لوگ ہیں... تم نے ان کا اصلی نام نہیں بتایا میرے کو..."

"نام کو چھوڑ موسلے بھائی، کام سے اور دام سے مطلب رکھو۔" غالب نے کہا۔ "جب میں نے کہا کہ میرے دوست ہیں اور تجھے تیرے کام کا پیسہ مل رہا ہے تو فضول سوالات میں وقت ضائع نہ کر۔ فرض کر لے کہ ان میں سے ایک نے سات خون کیے ہیں، دوسرا جیل سے فرار ہوا ہے اور تیسرا جاسوس ہے۔ صبح ہونے میں ساڑھے چار گھنٹے ابھی باقی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ تین گھنٹے میں ان کی صورت بالکل بدل جانی چاہیے اور یہ میک اپ وہ نہیں ہونا چاہیے کہ مُنہ پر پانی کا چھینٹا پڑے اور نیچے سے اصل چہرہ دکھائی دینے لگے۔ ان کو کافی عرصہ بدلے ہوئے چہرے کے ساتھ گزارنا ہے اس لیے کام پکا ہو گا۔"

"کیسا بات بولتا ہے غالب... تین گھنٹے میں۔" موسلے

بھائی نے گھبرا کے کہا۔

"ہاں تین گھنٹے میں۔" غالب نے دھڑ سے میز پر ہاتھ مارا اور جیب سے ریوالور نکال لیا۔ "تین گھنٹے سے ایک منٹ اوپر نہیں۔ کام کرانے کے دو طریقے ہیں اور ابھی میں نے دوسرا طریقہ آزمانے کا فیصلہ نہیں کیا ہے۔"

خوف سے موٹے بھائی کا دم نکلنے کو تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی ریوالور کو دیکھتا تھا تو کبھی پانچ ہزار کے نوٹوں کو۔ پھر باری باری ہم سب کے منجمد اور بے حس چہروں پر نظر ڈال کے وہ غالب کو گھورنے لگتا تھا۔ خود میں اور محسن بھی دم بخود بیٹھے تھے کیونکہ غالب کے ہاتھ میں وہ ریوالور نہیں تھا جو اسے ہم نے فراہم کیا تھا۔ اس کے پاس ایک انتہائی بیش قیمت بالکل نیا اور غیر ملکی ساخت کا آٹومیٹک ریوالور تھا جس پر سائیلنسر بھی لگا ہوا تھا۔ میرے سامنے اس وقت وہ غالب نہیں تھا جو بات بے بات شعر پڑھتا تھا، صورت اور حلیے سے کارٹون لگتا تھا، بے وقوف اور بزدل نظر آتا تھا اور صرف صحافی تھا جس کو سچ کی مار نے خوار کیا تھا، گھر سے بے گھر کیا تھا اور دربدر شہر بہ شہر بھٹکنے پر مجبور کیا تھا۔ جو بظاہر ایک کاہل آدمی تھا، زندگی کے تمام تفکرات سے بے پروا اور سارے مسائل سے بے نیاز۔ ایک غیر سنجیدہ اور بے مصرف زندگی گزارنے کا عادی۔ یہاں اس کا لب و لہجہ تک بدل گیا تھا۔ وہ کسی جرائم پیشہ تنظیم کا سرغنہ، کوئی خطرناک دہشت پسند یا جیمس بونڈ کا پاکستانی ایڈیشن بنا ہوا تھا۔ اس کا یہ بدلا ہوا روپ ایک دھماکے سے ہمارے سامنے آیا تھا چنانچہ حیرت کی انتہا کے ساتھ ساتھ ہم سب کو خوشی کا احساس بھی تھا کہ جسے ہم ایم آر ایس کا عضوِ ضعیف سمجھتے تھے، وہ درحقیقت کتنا مضبوط اور قابلِ اعتماد سہارا تھا۔

"تین گھنٹوں میں سے پانچ منٹ گزر چکے ہیں موٹے بھائی۔" غالب کی آواز آئی۔

"تم میں سے کون پہلے آئے گا۔" موٹے بھائی نے سر ہلایا۔ اور نوٹ اٹھانے لگا۔

غالب نے ریوالور سے نوٹوں کی گڈی اپنی طرف کھسکالی۔ "پہلے کام... پھر دام... اور جیسا کام ویسے دام۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم کو اس سے زیادہ مل جائیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ تمھیں ایک پیسہ نہ ملے۔ یہ فیصلہ میں کروں گا کہ تم کو صرف معاوضہ ملنا چاہیے یا انعام بھی ملنا چاہیے۔ یا دونوں میں سے کچھ بھی نہیں ملنا چاہیے اور صرف سزا ملنی چاہیے۔ تم ایچکن خاں سے پہلے نمٹ لو۔ ایک احتیاط لازمی ہے۔ کسی کی جیب میں ہاتھ مت ڈالنا۔ ہر جیب میں اسی قسم کی فضول چیزیں بھری پڑی ہیں۔" اس نے اپنا ریوالور لہرایا۔ اس کی بات کی صداقت کو ثابت کرنے کے لیے میں نے اپنی جیب سے سائیلنسر والا ریوالور نکالا، موٹے بھائی کو دکھایا اور جیب میں رکھ لیا۔ ذرا سی دیر کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا کہ موٹے بھائی بیہوش ہو کے گر جائے گا اور ہمارا کام دھرا رہ جائے گا۔

"تم اطمینان سے اپنا کام کرو موٹے بھائی۔" میں نے نرم لہجے میں اسے تسلی دی۔ "پانچ ہزار تمھارے ہیں۔"

موٹے بھائی کے ساتھ محسن اندر چلا گیا تو اس کمرے میں میرے ساتھ غالب رہ گیا اور استاد ٹیڈی جو بے وقوفوں کی طرح منہ کھولے بیٹھا تھا۔

"تم بڑے چھپے رستم نکلے استاد۔" استاد ٹیڈی نے موقع پاتے ہی کہا۔

غالب ہنسا۔ "ارے بھئی ہم کیا اور ہماری اوقات کیا۔ بس دنیا کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔"

"یہ ریوالور تم نے کہاں سے لیا؟" میں نے کہا۔

"پولیس سے۔" غالب بولا۔ "ان کے پاس سب کچھ ہوتا ہے۔ ضبط کیا ہوا ناجائز اسلحہ اور اسمگلروں سے تخریب کاروں سے یا ڈاکوؤں سے چھینا ہوا اسلحہ۔ اخبار میں تو صرف خبر آتی ہے۔ یہ کوئی کیسے جان سکتا ہے کہ اسلحہ کتنا تھا اور کس قسم کا تھا۔ زیادہ تر کیس فائلوں میں رہ جاتے ہیں۔ مثلاً رات کو کسی پولیس پارٹی کا اور ڈاکوؤں کا آمنا سامنا ہو گیا تو کچھ دو اور کچھ لو کی بنیاد پر یہ خبر لیول آتی ہے کہ ڈاکو رات کی تاریکی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے فرار ہو گئے یا جنگل میں روپوش ہو گئے۔ کبھی سچ مچ کسی کو پکڑنا پڑ جائے تو اخبار میں ملزم اور اسے گرفتار کرنے والے کی تصویر کے ساتھ تھوڑا بہت اسلحہ بھی دکھا دیا جاتا ہے تاکہ پبلک متاثر ہو اور اپنے پیارے وطن کی فرض شناس پولیس کی جرأت مندانہ فرض شناسی کی دھوم مچ جائے۔ دھوم کبھی نہیں مچتی کیونکہ اب پبلک بھی سارے ڈرامے کو سمجھتی ہے۔ اب اسی ریوالور کی مثال لو۔ کوئی باہر سے لایا تھا، مخبری ہو گئی اور وہ شخص پکڑا گیا۔ پولیس نے اسے ائیرپورٹ پر گرفتار کیا اور تھانے لے آئی۔ اس وقت میں ایس ایچ او صاحب کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ ساری بات میرے سامنے ہوئی۔ اس شخص نے ریوالور سے دستبرداری قبول کی۔ پانچ ہزار روپے ایس ایچ او صاحب کی خدمت میں "بچوں کی مٹھائی" کے لیے پیش کیے اور صبح ہونے سے قبل رخصت ہو کے اپنے گھر پہنچ گیا۔ ائیرپورٹ پر اسے پکڑنے والے مطمئن کہ ملزم کو حوالۂ پولیس کرنے کے بعد ان کا کام ختم۔ بعد میں کون آتا ہے پوچھنے اور مصیبت میں پڑنے کے لیے۔ ایس ایچ او نے مجھے ٹالنے کی بہت کوشش کی تھی مگر مجھے ریوالور پسند آگیا تھا چنانچہ میں کرسی سے چپک گیا اور جب سارے معاملات طے ہو گئے تو میں نے ریوالور جیب میں رکھ لیا۔ ایس ایچ او بہت جزبز ہوا مگر میں نے کہا کہ اپنے ساتھ بھی سودا کر لو گے تو فائدے میں رہو گے۔ تم پانچ ہزار کی مٹھائی گھر لے جاؤ، یہ خطرناک کھلونا مجھے دیدو، ورنہ میں ساری تفصیلات کے ساتھ خبر چھاپتا ہوں۔ میں نے تو پکڑے جانے والے مسافر کا نام پتا اور پاسپورٹ نمبر سب ازبر کر لیا تھا اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ کس فلائٹ پر کہاں سے آیا تھا۔ ایس ایچ او مجبور ہو گیا۔ اب تک اس کی گولیاں بھی فراہم کرتا ہے مجھے۔ بازار سے نہ یہ اعلیٰ قسم کا ریوالور مل سکتا ہے اور نہ اس میں کام آنے والی گولیاں۔ ایکبار خراب بھی ہو گیا تھا میرے اناڑی پن کے باعث۔ میں نشانہ بازی کی مشق کرتا تھا اور ظاہر ہے جس چیز کا استعمال نہ آتا ہو وہ خراب تو ہو ہی جاتی ہے۔ میں ایس ایچ او صاحب کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا کہ کسی ماہرِ اسلحہ کی خدمات مطلوب ہیں۔ اس نے مجھے پولیس کے ایک نائک سے رجوع کرنے کو کہا۔ کاظم نام تھا اس کا۔ کیا بتاؤں تمھیں یار، وہ کیسا ایکسپرٹ آدمی ہے۔ اس نے کام بھی کیا اور یہ بھی سمجھایا کہ ولایتی ریوالور ہے، اس میں دیسی گولیاں کبھی استعمال نہ کروں۔"

"یہ گولیاں چلاتے کہاں ہو مرزا غالب؟" میں نے کہا۔ "خدا کی قسم میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم جیسا چغد صورت آدمی اتنا خطرناک ہتھیار رکھ سکتا ہے۔"

"ارے بھائی سکندرِ اعظم! من آنم کہ من دانم۔" وہ اسی انکساری سے بولا۔ "ہم کسی سے کچھ کہتے نہیں مگر ہم نے کہا تھا نا کہ وقت آنے دو، ہم بتادیں گے کہ قلم کے علاوہ ہم کیا کچھ چلا سکتے ہیں۔"

"تمھارا نشانہ کیسا ہے؟" میں نے کہا۔

"ابھی بتاتا ہوں۔" غالب اٹھا اور اِدھر اُدھر دیکھ کر اس نے کونے میں سے فرش پر پڑی ہوئی موم بتی اٹھائی۔ "اسے جلاؤ اور خواجہ صاحب کے ہاتھ میں دو۔"

میں نے لائٹر سے موم بتی جلائی۔ پھر موم بتی ٹیڈی کی طرف بڑھا دی۔ ٹیڈی کا رنگ فق ہو گیا۔ "اب تم دیوار سے لگ کر کھڑے ہو جاؤ۔" غالب نے کہا۔ "اور یہ بتاؤ کہ موم بتی کو صرف بجھانا ہے یا درمیان سے دو ٹکڑے کرنا ہے۔"

"سکندر بادشاہ۔" ٹیڈی چلایا۔ "قسم مولا علی کی میں یہ کام نہیں کرنے کا۔ موم بتی نہیں یہ میرا ہاتھ اڑا دے گا۔ میں ٹنڈا ہو جاؤں گا... یہ موم بتی نہیں بجھائے گا، میری زندگی کا چراغ گل کر دے گا۔"

"واہ استاد کیا بات کہی ہے۔" میں نے کہا اور موم بتی لے کر دیوار کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ غالب نے پورے اعتماد کے ساتھ نشانہ لیا۔ ایک ہلکا سا دھماکا ہوا اور موم بتی بجھ گئی۔ میں دم بخود رہ گیا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ گولی موم بتی کو چھوئے گی بھی نہیں۔ غالب کا نشانہ قابلِ رشک تھا۔

"یہ... یہ کیا ہوا؟" اندر سے موٹے بھائی دوڑ کر آیا۔ "گولی کس نے چلائی ہے۔"

"کسی نے نہیں۔ تم جاؤ اپنا کام کرو۔" غالب نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ موٹے بھائی نے سب کو زندہ پا کے اطمینان کا سانس لیا اور اندر لوٹ گیا۔

صبح کے پانچ بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے جب موٹے بھائی نے اپنا کام ختم کیا اور مجھے اس کے فن کی مہارت کو تسلیم کرنا پڑا۔ محسن اور ٹیڈی کی صورت دیکھنے کے بعد میں پورے وثوق سے کہہ سکتا تھا کہ اب اگر میں خود سکندر بخت کے خلاف ایک اور رپورٹ لکھوانے کے لیے حشمت خان کے پاس چلا جاؤں یا اکرام شیخ کے پاس تو مجھے صرف آواز اور لہجہ بدل کے بات کرنا ہوگی۔ وہ مجھے ہرگز شناخت نہ کر پائیں گے۔ میرے بال گھنگریلے اور مہندی رنگ کے ہو گئے تھے، میرے چہرے پر اسی رنگ کی مشت بھر داڑھی تھی۔ ناک میں دو اسپرنگ سے لگے ہوئے تھے جن سے نتھنے بہت پھیل گئے تھے اور میری ستواں ناک پکوڑا بن گئی تھی۔ موٹے بھائی نے مجھے بتایا کہ یہ اسپرنگ کس طرح نکالے جا سکتے ہیں اور پھر کس طرح لگائے جا سکتے ہیں۔ میرے سامنے کے دو دانت سونے کے نہ ہونے کے باوجود سونے کے بنے ہوئے نظر آتے تھے اور میری آنکھوں کا رنگ جو پہلے سیاہ تھا اب سبز ہو چکا تھا۔ یہ کنٹیکٹ لینسز کا کرشمہ تھا۔ موٹے بھائی نے مجھے مشورہ دیا کہ اس چہرے کے ساتھ میں چار خانے کی لنگی باندھ لوں اور کندھے پر دسترخوان نما رومال ڈال کر رکھوں۔ قمیص کے بجائے کھدر کا بغیر گلے والا کرتا استعمال کروں جس سے میری گردن لمبی نظر آئے۔ جوتے کی جگہ پرانی پشاوری چپل استعمال کروں اور ممکن ہو تو تھوڑا سا جھک کر چلوں۔ اس کی ذہانت کا قائل میں یوں بھی ہوا کہ اس نے سو فیصد یہی حلیہ محسن کا رکھا تھا اور ہم دونوں کی شکلوں کو ناقابلِ یقین حد تک یکساں کر دیا تھا۔ قد و قامت میں ہم پہلے ہی برابر تھے۔ صورت مل جانے کے بعد جڑواں بھائی نظر آنے لگے۔ میں نے پانچ ہزار موٹے بھائی کو پیش کیے۔

"ابھی آپ دونوں ایک جیسا کپڑا پہن لے گا تو بھائی غالب بھی دھوکا کھا جائے گا۔" موٹے بھائی نے اپنے فن کی قیمت سے زیادہ مہارت کی تعریف پر خوش ہو کے کہا۔ "فرق

صرف دانت کا رکھا ہے میں نے۔"

"ویری گڈ۔ تم نے بہت سے مسائل حل کر دیے" میں نے محسن کے ساتھ کھڑے ہو کر کہا۔" اب اصل اور نقل میں کوئی فرق نکالے گا بھی تو کیسے۔ پہلے کی جگہ دوسرا اور دوسرے کی جگہ پہلا آسانی سے لے سکے گا۔"

یہ بالکل نیا خیال تھا اور اپنی صورت کے بدل جانے سے زیادہ خوشی مجھے اس خیال پر ہوئی کہ اب ہم دو ہونے کے باوجود ایک ہیں۔ ہمشکل بن کے ہم دلاور اینڈ کمپنی کی عقل خبط کر سکتے تھے۔

اب تک میں نے ایسی بہت سی فلمیں دیکھی تھیں اور ایسے بہت سے ناول پڑھے تھے جن کی کہانی کا تانا بانا ایک جیسی صورت رکھنے والے دو افراد کے کارناموں سے بنایا جاتا ہے اور ہر قسم کی صورتِ حال محض صورتوں کی مشابہت کو بنیاد بنا کے پیدا کی جاتی تھی۔ بعض اوقات مضحکہ خیز اور بعض اوقات لرزہ خیز، کبھی ایک کے کیے پر دوسرا پکڑا جاتا ہے اور کبھی دونوں مل کر کچھ کریں تب بھی خود کو بے گناہ ثابت کر دیں۔ غالباً یہی خیال محسن کے ذہن میں بھی جاگزیں تھا کہ وہ اچانک ہنسا اور اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔

"یہ ہوئی نا وہی بات کہ ایک نہ شد، دو شد" محسن نے کہا۔

"اگر فارسی ہی بولنا ضروری ہے تو کہو کہ من تو شدم تو من شدی" مرزا غالب نے محسن کو ٹوکا تھا "یعنی تو میں ہو گیا، اور میں تو۔"

خواجہ نیک محمد عرف اُستاد ٹیڈی کو بھی موسیٰ بھائی نے ناقابلِ شناخت بنا دیا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ چوہدری دلاور پر اس انقلاب سے جو گزرے گی سو گزرے گی، ہمارے اس حُلیے سے رابعہ کتنی محظوظ ہو گی اور اگر شہلا نے محسن کو دیکھا تو کتنا ہنسے گی۔ منظر ہمیں روبرو پا کر کتنی گالیاں دے گا لیکن اس تبدیلی سے لطف اندوز ہونے کا مرحلہ ابھی دور تھا۔ فوری طور پر شخصیت بدل جانے سے ہم محفوظ ہو گئے تھے اور ہمارے لیے شہر کی سڑکیں اور گلیاں، ہوٹل اور بازار علاقہ ممنوعہ نہیں رہے تھے۔ صبح ہونے میں ابھی ڈیڑھ دو گھنٹے کی مسافت حائل تھی اور ہمیں اس مسافت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ابھی بہت کچھ کرنا تھا۔

ہم روانہ ہونے ہی والے تھے کہ موسیٰ بھائی نے جیب سے پانچ ہزار کے نوٹ نکالے اور غالب کی طرف پھینک دیے "یہ اپنے ساتھ لے جاؤ غالب بھائی۔ اپن کا حساب برابر ہے" وہ بولا۔

"حساب برابر ہے کا کیا مطلب؟" غالب نے حیران ہو کے کہا "کون سا حساب؟"

"مطلب تم نے سمجھنا ہے غالب بھائی۔ ہم نے بولا تھا تم کو ابھی کہ یہ سب چکر ہے اور تم اُلّو بناتا ہے ہم کو۔ یہ بات ہم ایسے ہی نہیں کہا" موسیٰ بھائی ہنسا "ابھی ایک کارڈ تمھارا ہاتھ میں تو ایک ہمارا ہاتھ میں ہے۔ ایک بار تم نے ہمارا زندگی ہم کو دیا تھا، آج ہم تمھارا دوست سکندر بخت کا زندگی تم کو دیتا ہے۔ یہ حساب برابر ہو گیا نا؟ پھر کبھی ادھر مت آنا اور موسیٰ بھائی کو بلیک میل کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ تم نے کیا سمجھا تھا کہ ہم اندھا ہے۔ ارے غالب بھائی! ہم تو نقلی چہرہ دیکھ کر اصلی چہرہ بنا دیتا ہے۔ تم اپنا دوست کو ایس بی کے خان بنا کے لایا تو ہم دھوکا نہیں کھایا۔ ہم جانتا ہے اس کا گرفتاری پر کتنا انعام ہے، پانچ ہزار سے زیادہ اور ہم یہ بھی جانتا ہے کہ زندگی کا قیمت کوئی نہیں ہوتا۔ ابھی تم بولے گا تو ہم بھی بولے گا۔ ہم کو پھانسی ہو گا تو تمھارے فرینڈ کو بھی پھانسی ہو گا۔ تم چپ رہے گا تو ہم بھی چپ رہے گا۔ اسی لیے تو ہم بولا کہ حساب برابر۔"

"ہاں موسیٰ بھائی" غالب نے خاموشی کے طویل وقفے کو توڑا "تم ٹھیک کہتے ہو۔ یہ حساب آج بیباک ہوا۔ پھر بھی یہ پانچ ہزار تم رکھ لو کیونکہ یہ تمھارا حقِ محنت ہے۔ تمھاری خاموشی کی قیمت نہیں ہے۔ آئندہ ضرورت نے ہاتھ پھیلانے پر مجبور کیا تو میں یہ ہاتھ تمھارے سامنے نہیں پھیلاؤں گا۔"

موسیٰ بھائی ہنسا "ابھی تم بولا تھا کہ ہمارا پاس بہت دولت ہے۔ تم ٹھیک بولا تھا۔ ہم یہ پانچ ہزار لے کر کیا کرے گا۔ تم اپنا پاس رکھو یا اپنا دوست کے پاس رکھوا دو۔ جب ضرورت پڑے تو مانگ لینا۔ کسی اور کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے بچ جاؤ گے۔ تم سالا صحافی لوگ پھکڑ رہے گا ہمیشہ... تم خود کو بہت عقلمند سمجھتا ہے لیکن تم ایکدم... ارے بابا زمانہ کو دیکھو۔ تم کو خدا نے چانس دیا تھا۔ تم دو ہزار نہیں، ہم سے تین ہزار روپیہ ہر مہینے لے سکتا تھا مگر تم نہیں لیا۔ ابھی کوئی چانس نہیں کیونکہ حساب برابر ہو گیا ہے۔ اب تم جاؤ۔ ہم محنت کا کچھ نہیں لے گا۔ یہ محنت ہم اپنا گلا سے پھانسی کا پھندا نکالنے کے واسطے کیا تھا۔ تمھارا مدد کے واسطے نہیں" اس نے دروازہ دھڑ سے بند کر دیا۔

ہم سب شکست خوردہ اور شرمسار سے زینے میں کھڑے رہ گئے۔ موسیٰ بھائی نے صحیح وقت پر ترپ کا پتّا پھینک کر بازی جیت لی تھی۔ ہمارے کام نہ پانچ ہزار روپے آئے تھے اور نہ ہمارے ریوالور۔ ہم خاموشی سے نیچے اُترے اور اسی گاڑی میں بیٹھ گئے جس کا مالک شاید تھانے میں بیٹھا اپنی قسمت کو رو رہا ہو گا اور اپنی عقل کا ماتم کر رہا ہو گا کہ اس نے ایک پتھر کو نظر انداز کر دیا ہوتا تو یوں بے کار نہ ہوتا۔ یہ اندازہ تو میں نے موسیٰ بھائی کے گھر پہنچ کر فوراً ہی کر لیا تھا کہ غالب سے اس کا تعلق کسی خاص نسبت سے ہے اور غالب وہاں سچ مچ غالب ہے۔ غالب نے پہلے یہ تو بتا دیا تھا کہ موسیٰ بھائی نے کسی مجرم کی مدد کی تھی جو اسے ملک سے فرار ہوتے وقت بہت کچھ دے گیا تھا لیکن مجھے یہ علم نہ تھا کہ وہ مجرم کون تھا اور اس نے اپنی زندگی میں کیا جرم کیا تھا۔ اب یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ اس مجرم سے غالب کا بھی کوئی تعلق تھا لیکن اس تعلق سے غالب نے فائدہ کیسے اُٹھایا اور موسیٰ بھائی کو مغلوب کس طرح رکھا، یہ اب بھی ایک راز تھا۔ گاڑی سنسان سڑکوں پر تیزی سے دوڑتی ہوئی چوہدری دلاور کے گھر کے قریب ہوتی جا رہی تھی اور ہمارے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ غالب سے اس مجرم کے فرار کی داستان سنتے اور یہ پوچھتے کہ وہ خود اس ڈرامے کا ایک کردار کیسے بن گیا تھا۔ میری ساری توجہ اس ڈرامے پر تھی جو گزشتہ شب چوہدری دلاور کے گھر میں ہوا تھا اور بری طرح فلاپ ہو گیا تھا۔ اس نے کسی کو چوہدری دلاور بنا کے صرف ہم پر یہ ثابت کرنا چاہا تھا کہ وہ قتل ہو گیا ہے۔ اس کا مقصد ہمیں شکار کرنا تھا مگر ایک انتہائی ذہانت سے تیار کی جانے والی اسکیم آخری وقت میں فیل ہو گئی تھی۔ اب ہم جوابی چال چلنے والے تھے اور کامیابی یا ناکامی کا انحصار حُسنِ تدبیر سے زیادہ خوبیِ تقدیر پر تھا۔

"میرے خیال میں اس سے آگے گاڑی لے جانا ٹھیک نہیں" محسن نے کار کو چوہدری دلاور کے گھر سے دو فرلانگ دُور روکتے ہوئے کہا "گاڑی کا مالک رپورٹ درج کرا چکا ہو گا۔"

"اور اس نے ہمارے حُلیے بھی لکھوا دیے ہوں گے۔" ٹیڈی نے اتفاق کیا "اور اس سے پولیس نے یہ اندازہ بھی کر لیا ہو گا کہ گاڑی چھیننے والے کون تھے۔"

"مگر ہم اب وہ نہیں رہے" میں نے کہا "یہاں ہمیں تلاش کرتا ہوا کون آ سکتا ہے۔ گاڑی دُور ہو گی تو واپسی پر ہمارے لیے مزید مشکلات پیدا ہوں گی۔ ممکن ہے ہمیں فرار ہونا پڑے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہمیں ایک لاش اُٹھا کے ساتھ لانا پڑے... گاڑی کو گیٹ کے سامنے سے سیدھا گزار کے لے جا اور موڑ کاٹتے ہی دیوار کی اوٹ میں روک دے تاکہ ہم ضرورت پڑنے پر دیوار پھاند کر گاڑی میں بیٹھ جائیں۔"

"مرزا غالب! یہ تو ثابت کر دیا ہے تم نے کہ تمھیں بیوقوف سمجھنے والے زیادہ بیوقوف تھے اور تم قلم کے نہیں، تلوار کے بھی دھنی ہو" محسن نے گاڑی کی رفتار بڑھا کے کہا "یہ بتاؤ ڈرائیونگ بھی آتی ہے؟"

"ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں" مرزا غالب نے کہا "ورنہ کیا بات کر نہیں آتی۔ جب اسلاف نے بحرِ ظلمات میں گھوڑے دوڑا دیے تھے تو کیا ہم شہر کی سڑکوں پر گاڑی بھی نہیں دوڑا سکتے؟"

"ویری گڈ، تم کار میں شیشے بند کر کے بیٹھنا" میں نے کہا "تاکہ اگر کوئی چوکیدار گشت کرتا ہوا گزرے تو تم نظر نہ آؤ لیکن تیار رہنا۔"

محسن نے گاڑی کو چوہدری دلاور کی کوٹھی کے ساتھ ساتھ موڑا اور روک لیا۔ گیٹ کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے اندر کا جائزہ لے لیا تھا۔ گیٹ لائٹ کے سوا تمام کمروں کی لائٹس آف تھیں اور کوٹھی آخرِ شب کے سکوت میں ڈوبی ہوئی تھی۔ بند گیٹ کے پیچھے میں نے چوکیدار کو بھی دیکھ لیا تھا جو ایک آتشدان میں لکڑیاں جلائے بیٹھا تھا۔ اتنی سردی میں چوکیدار بھی زیادہ مستعد نہیں رہا تھا اور اسے شاید یہ بھی یقین تھا کہ اس وقت کسی دوست دشمن کے آنے کا امکان نہیں۔ ہماری گاڑی گزری تھی تو اس نے فقط سر اُٹھا کے دیکھا تھا مگر پھر ہاتھ تاپنے میں مصروف ہو گیا تھا۔ سڑک پر سے ایسی سیکڑوں گاڑیاں گزرتی ہی رہتی تھیں۔

میں اور محسن پوری احتیاط کے ساتھ نیچے اُترے۔ دروازے کو ہم نے آواز پیدا کیے بغیر کھولا اور اتنی ہی احتیاط سے بند کر دیا تھا۔ "میں چوکیدار کو قابو کرتا ہوں" میں نے سرگوشی میں کہا۔ "اس کے بعد تم دونوں اندر آ جانا۔ ٹیڈی لان کے کسی درخت کے پیچھے چھپ کر انتظار کرے گا اور ہم دونوں باری باری گھر میں داخل ہوں گے۔"

"اور میں... میں... میں کتنی دیر تک انتظار کروں گا... سکندر بادشاہ" ٹیڈی کانپتا ہوا بولا۔

"یہ کیا میں میں لگا رکھی ہے" میں نے کہا "تم ہمارے واپس آنے تک ٹھہرو گے۔ خدانخواستہ ہم کسی مشکل میں پھنس جائیں تو آگے آنا ورنہ نہیں۔ ہم دس پندرہ منٹ میں نکل آئیں گے، اندر گڑبڑ ہو گی تو تم کو آواز دے لیں گے لیکن خدانخواستہ گرفتار ہو گئے تو دشمن سے ہمیں تم ہی چھڑانے آؤ گے۔ ہمت کے ساتھ ذاتی عقل کو بھی استعمال کرنا اور ضرورت محسوس کرو تو غالب کو بھی بلا لینا۔" اس آخری بات کا ٹیڈی نے خاصا بُرا مانا لیکن میں اور محسن دیوار پر چڑھ گئے۔ محسن دیوار کے موڑ پر رُک گیا مگر میں ایک ایک قدم آگے بڑھتا گیا۔ درختوں کی وجہ سے دیوار پہ اندھیرا تھا اور میں خود ایک سایہ بن گیا تھا۔ ہر قدم اُٹھانے کے بعد میں رُک جاتا تھا تاکہ چوکیدار کی نگاہ کو کسی مسلسل حرکت کا احساس نہ ہونے پائے۔

تیس بتیس سال کا جوان چوکیدار مجھے خالی ہاتھ نظر آ رہا تھا لیکن میں اندازہ کر سکتا تھا کہ اس کی جیب میں کوئی انتہائی مؤثر اور خطرناک قسم کا خودکار آتشیں اسلحہ ضرور ہو گا۔ دلاور بیوقوف نہیں تھا کہ کسی کو روایتی قسم کا دربان بنا کے مطمئن ہو جاتا جن کا ایک کام تو یہ ہوتا ہے کہ اپنے آقائے ولی نعمت یا ان کی بیگم صاحبہ کو

شاہی سواری میں آتے جاتے دیکھیں تو دروازہ کھول دیں اور گاڑی گزر جائے تو مؤدبانہ سیلیوٹ جھاڑ کر دروازہ بند کر دیں۔ ان کا دوسرا کام ہر ایسے غیرے کو درِ خاص کی حد سے دُور رکھنا ہوتا ہے تاکہ بارگاہِ خاص تک صرف انھی کی رسائی ہو جو اس کے اہل ہوں۔ دوسری قسم کے چوکیدار سرکاری عمارات اور بینکوں کے دروازوں پر محافظت کی رسمی کارروائی پوری کرتے ہیں لیکن وقت آنے پر ایسی فرسودہ اور ناکارہ رائفل سے زیادہ بے مصرف ثابت ہوتے ہیں۔ دلاور جانتا تھا کہ اسے خطرہ کس سے ہے اور اس نے جسے حفاظت پر مامور کیا ہوگا اسے بہت سوچ سمجھ کے منتخب کیا ہوگا۔ پٹھان چوکیدار بہت صحت مند اور جسمانی طور پر مضبوط نظر آتا تھا اور اس کا اطمینان یہ ثابت کرتا تھا کہ خالی ہاتھ بھی وہ آسانی سے مغلوب ہونے والا نہیں ہے۔

میں ابھی گیٹ لائٹ سے چند قدم دُور تھا کہ چوکیدار اُٹھ کھڑا ہُوا۔ میں فوراً دیوار کے اُوپر سیدھا لیٹ گیا۔ احاطے کی دیوار تقریباً آٹھ فٹ اُونچی تھی مگر اس کی چوڑائی ایک فٹ سے بھی کم تھی چنانچہ اس پر پیٹ کے بل سانس روک کر اور توازن برقرار رکھتے ہوئے لیٹنا آسان کام نہیں تھا۔ میں نے اپنے جسم کو اکڑا لیا تاکہ دیوار کی سرد سطح اور سرد ہوا سے طاری ہونے والی کپکپی رُک جائے۔ میں ایک پتلون قمیص اور صرف ایک جرسی پہنے ہوئے تھا جو آخرِ شب کی نمی اور کھلی فضا میں محسوس ہونے والی سردی کا مقابلہ کرنے کے لیے ناکافی ثابت ہو رہی تھی۔ چوکیدار آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا میری طرف بڑھا۔ اس وقت میں کھڑا ہوا یا بیٹھا ہُوا ہوتا تو دیوار کی ہموار سطح پر اندھیرے میں بھی نمایاں ہو جاتا لیکن دیوار پر چپک جانے کے بعد میں اس کی بلندی کا حصہ بن گیا تھا اور ساکت وصامت ہونے کے باعث بیس فٹ دُور سے گزرنے والا چوکیدار مجھے دیکھ نہ سکا۔ میں نے دل ہی دل میں یہ دُعا مانگی کہ دوسری دیوار پر محسن بھی عقل سے کام لیتے ہوئے خود کو کیموفلاج کر لے۔

اچانک کوٹھی کے عقب سے ایک کتّے نے بھونکنا شروع کیا۔ چوکیدار کے قدم رُک گئے۔ پھر دائیں اور بائیں جانب سے دو جرمن شیپرڈ نسل کے کُتّے نمودار ہُوئے۔ وہ تربیت یافتہ محافظ کتّے تھے جو اجنبی آدمی کی بُو پر خطرے کے الارم کی طرح بجنے لگتے تھے۔ چوکیدار نے جیب میں ہاتھ ڈال کے ریوالور نکال لیا اور چاروں طرف دیکھنے لگا پھر کوٹھی کے چاروں گوشوں پر نصب سرچ لائٹس نے اندھیرے کو اُجالے میں بدل دیا اور چوکیدار نے میری طرف دیکھا کیونکہ ایک کتا تیر کی طرح میری طرف آ رہا تھا۔ دوسرے کتّے کو میں نے دائیں جانب کی دیوار کا رُخ کرتے دیکھا جہاں سے محسن کو اندر کودنا تھا۔ ہَوا کے غلط رُخ نے قبل از وقت ہماری موجودگی کا راز فاش کر دیا تھا اور اب مجھے چند سیکنڈ میں فیصلہ کرنا تھا کہ میں دیوار سے باہر کی طرف کُود کر فرار ہو جاؤں یا مقابلے کے لیے اندر اُتر جاؤں۔ اگر میں اسی طرح لیٹا رہتا تو وہ خوں آشام کتا ایک زبردست جست لگا کے مجھے دیوار پر سے نیچے کھینچ لیتا یا شاید اس سے پہلے ہی چوکیدار مجھے شوٹ کر دیتا۔ اسے یہی احکامات ہوں گے کہ وہ مشکوک افراد کو دیکھے تو بلا تامل گولی مار دے اور میں یہ فرض کرتا کہ چوکیدار کا نشانہ خطا ہو جائے گا تو یہ بڑی جان لیوا خوش فہمی ہوتی۔

میرا فیصلہ ایک فوری اور غیر شعوری ردِ عمل کا نتیجہ تھا۔ عین اس وقت جب کتا جست لگانے کو تھا، میں نے خود کو دیوار سے نیچے گرا دیا اور کوٹھی کے اندر پہنچ گیا۔ میں نے سائلنسر والے ریوالور کی دبی دبی آواز سُنی۔ یہ گولی یقیناً چوکیدار نے چلائی تھی اور اگر میں نے اندر اُترنے میں سیکنڈ کے ہزارویں حصّے کی تاخیر بھی کی ہوتی تو یہ گولی میرے وجود میں پیوست ہو جاتی۔ جست لگانے والا کُتا دیوار سے ٹکرایا اور میں نے بالکل نیچے سے اس پر فائر کیا۔

میں دیوار اور جھاڑیوں کے درمیان کی جگہ میں لیٹا ہُوا تھا اور کھُلی جگہ کے مقابلے میں کسی حد تک محفوظ تھا۔ کتّے نے ایک بھیانک آواز نکالی اور جھاڑیوں پر گرا۔ میں نے تیزی سے حرکت کی اور گھٹنوں کے بل چوپایوں کی طرح چلتا ہوا دیوار کے ساتھ ساتھ واپس ہُوا۔ چوکیدار کی چلائی ہوئی دوسری گولی بھی ضائع ہوئی۔ اس نے اندازے کی بنیاد پر اس جگہ کا نشانہ لیا تھا جہاں کتا گرا تھا مگر میں چند قلابازیوں میں اس مقام سے دس فٹ دُور ہو چکا تھا۔ میں ابھی سنبھلا بھی نہ تھا کہ میں نے تیسرے فائر کی آواز سُنی اور دوسرے کتّے نے بھونکتے بھونکتے ایک کربناک صدا بلند کی۔ میں سمجھ گیا کہ محسن نے بھی وہی کیا ہے جو میں نے کیا تھا۔ رات کی خاموشی میں دونوں دم توڑتے کُتّوں کی ہولناک آوازیں رفتہ رفتہ مدھم پڑ رہی تھیں لیکن ان آوازوں نے دشمنوں کو پوری طرح ہوشیار کر دیا تھا۔ ہمارے لیے نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن والی صورت تھی۔ ہم جھاڑیوں میں چھُپ کر بھی نہیں رہ سکتے تھے اور بے دھڑک باہر نکل کر خودکشی بھی نہیں کر سکتے تھے۔ چوکیدار بڑی آسانی سے ہم دونوں کو باری باری نشانہ بنا لیتا۔ مجھے یہ بھی علم نہ تھا کہ محسن کی پوزیشن کیا ہے۔ اس نے دیوار کے اُوپر سے کتّے کو شوٹ کیا تھا یا میری طرح اندر گر کے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ باہر کُود گیا ہو۔ ایسی صورت میں چوکیدار کا مقابلہ کرنے کے لیے میں اکیلا رہ گیا تھا۔ ٹیڈی کو اس وقت اندر آنا تھا جب ہم گھر میں داخل ہو جاتے۔ فائرنگ اور کتّوں کی چیخ و پکار سُنتے ہی وہ بھاگ گیا ہوگا اور گاڑی میں جا بیٹھا ہوگا اور شاید غالب کو مجبور کر رہا ہوگا کہ صورتِ حال کے خطرناک ہو جانے کے باعث انھیں تو نکل ہی جانا چاہیے۔ یہ عجیب بات تھی کہ پریشانی میں اُستادی کا درجہ حاصل کرنے والا ٹیڈی جرأت اور ہمت میں سب سے کمتر تھا۔ اس کے برعکس محض روایتی صحافی نظر آنے والا غالب کسی خطرناک ترین بدمعاش سے کم نہ تھا۔

اچانک چوکیدار نے ایک ٹارچ روشن کی۔ یہ بہت بڑی ٹارچ تھی جس کی روشنی کسی متحرک سرچ لائٹ کی طرح قدِ آدم جھاڑیوں کو کھنگال رہی تھی۔ اس کا دائرہ آہستہ آہستہ میری طرف سرک رہا تھا۔ میں نے اس کی زد میں آنے کے تناسب کا اندازہ کرتے ہوئے خود کو بچانا شروع کیا اور پیچھے ہٹتا گیا۔ پھر ایک اور فائر ہونے کی دبی ہوئی آواز سنائی دی اور ٹارچ کی روشنی غائب ہو گئی۔

"واہ مرزا غالب!" میں نے دل ہی دل میں بے اختیار کہا۔ کسی تذبذب یا سوچ بچار کے بغیر میں سمجھ گیا تھا کہ یہ کارنامہ وہی شخص سرانجام دے سکتا ہے جو موم بتی کے شعلے کو گولی کا نشانہ بنا سکتا ہے۔ فائرنگ کی آوازیں سُن کر خواجہ نیک محمد عرف اُستاد ٹیڈی، اگر رزم گاہ سے فرار ہوئے ہوں گے تو مرزا کو غیرتِ مردانہ اور جرأتِ رندانہ نے بے خطر آتشِ نمرود میں کُود پڑنے پر مجبور کر دیا ہوگا۔ خود کو تہ سے محفوظ پا کے میں نے قدرت کی عطا کردہ مہلت سے فائدہ اٹھایا اور ریوالور نکال کے ایک سرچ لائٹ کو گل کر دیا۔ اسی وقت دوسری سرچ لائٹ بھی گل ہو گئی۔ یہ بھی مرزا غالب کی ذہانت اور نشانے کی مہارت کا نتیجہ تھا کیونکہ فائر کی آواز بہت کم تھی گولی محسن نے چلائی ہوتی تو اس کا دھماکا انتہائی خوفناک ہوتا۔ ابھی تک جتنی گولیاں چلائی گئی تھیں ان سے اردگرد کے رہنے والوں کی نیند پر اثر نہیں پڑا تھا اور کسی طرف سے بھی کسی نے نہیں پوچھا تھا کہ آخر یہ کیا ہو رہا ہے۔ ممکن ہے کتّوں کی چیخ نے کسی کو بیدار کیا ہو لیکن کتّے کی آواز کو کون اہمیّت دیتا ہے۔ سخت سردی نے بھی ہمیں مداخلت بیجا سے محفوظ رکھا اور گولیاں چلنے کی معمولی سی آواز بند دروازوں کے پیچھے لحافوں میں منہ لپیٹ کر سونے والوں کے کانوں تک نہیں پہنچی۔

عقبی حصّے کی سرچ لائٹس براہِ راست ہم پر نہیں پڑ رہی تھیں مگر ان کی منعکس ہونے والی روشنی لان تک پہنچ رہی تھی۔ میں نے چوکیدار کو ریوالور ہاتھ میں تھامے پوری طرح چوکس ایک ایک قدم پیچھے ہٹتے دیکھا۔ کھلی جگہ پر وہ میرے اور غالب کے نشانے پر تھا اور غالب جیسا ماہر نشانے باز آسانی سے اس کی کھوپڑی میں سوراخ کر سکتا تھا لیکن ایک چوکیدار سے ہماری کوئی دشمنی نہ تھی۔ ہاں وہ میرے لیے براہِ راست خطرہ بن جاتا اور میں محسوس کرتا کہ اب اس پر گولی چلائے بغیر میرا بچنا ممکن نہیں تو میں بھی کوئی رعایت نہ کرتا یا کرتا تو صرف اس حد تک کہ چوکیدار کی جان نہ لیتا۔ اس کے دل یا سر کے بجائے اس کے شانے کو نشانہ بناتا اور اس ہاتھ کو ناکارہ بنا دیتا جو مجھ پر ریوالور اُٹھا سکتا تھا۔

کوٹھی کے اندر ابھی تک کوئی ہلچل کے آثار نہیں تھے۔ کیا اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اندر کوئی ہے ہی نہیں؟ یا ہے تو اتنی گہری نیند میں ہے کہ باہر کے شور سے بے خبر ہے؟ یہ دوسری بات عقل کے لیے قابلِ قبول نہیں تھی کیونکہ چوہدری دلاور کا عیار ذہن تو اس وقت پوری طرح ہوشیار اور بیدار رہتا ہوگا جب آنکھیں محوِ خواب ہوتی ہوں گی۔ ایک تیسری صورت یہ تھی کہ اس خاموشی کا مقصد ہمیں دھوکے میں مبتلا رکھنا تھا اور یہ تاثر دینا تھا کہ چوکیدار کے سوا کوٹھی میں کوئی بھی نہیں تاکہ ہم کسی طرح چوکیدار پر غالب آ کے اندر پہنچنے میں کامیاب ہو جائیں تو اس پُرفریب خاموشی کے جال میں گرفتار ہو جائیں۔ میں ابھی کچھ طے نہ کر پایا تھا کہ میں نے چوکیدار کے پیچھے دوسرا سایہ متحرک دیکھا۔ کوئی دبے پاؤں چوکیدار کی جانب بڑھ رہا تھا۔ وہ محسن تھا یا غالب۔ اتنی دُور سے میں صورت کے نقوش بھی نہیں دیکھ سکتا تھا اور چال سے بھی اندازہ نہیں کر سکتا تھا کیونکہ آگے بڑھنے والا پھُونک پھُونک کر قدم اُٹھا رہا تھا۔ میں سانس روکے اور پلک جھپکائے بغیر دیکھتا رہا۔ چوکیدار نے ایک قدم پیچھے ہٹایا اور اسی وقت دوسرا سایہ جست لگا کے بڑھا۔ چوکیدار کو پلٹ کر دیکھنے کی مہلت بھی نہ ملی۔ میں نے اس کے پیچھے ایک ہاتھ کو بلند ہوتے اور تیزی سے نیچے آتے دیکھا۔ محسن یا غالب میں سے کسی نے چوکیدار پر ریوالور کے دستے سے وار کیا تھا اور شاید پہلے اس کا منہ دبا لیا تھا کہ چوکیدار کے حلق سے آواز نہ نکل سکی۔

اب میدان صاف تھا۔ میں نے جھاڑیوں کی اوٹ سے نکل کر مختصر ترین راستہ اختیار کیا اور سر جُھکا کے دوڑتے ہوئے لان کو عبور کر گیا۔ قریب پہنچنے پر میں نے محسن کو شناخت کر لیا۔ چوکیدار اس کے قدموں میں ڈھیر پڑا تھا۔ محسن کے اشارے پر میں نے ریوالور کو جیب میں ڈالا اور ہم دونوں نے مل کر چوکیدار کے بھاری بھرکم جسم کو دونوں طرف سے اٹھایا۔ لان کے آخری حصّے میں جھاڑیوں کی دو فٹ سے کچھ کم اُونچی باڑھ تھی۔ ہم نے چوکیدار کو اس کے سائے میں لمبا لٹا دیا۔ اس کا ہاتھ تھام کر میں نے نبض کی رفتار پر غور کیا اور پھر سر جُھکا کے دل کی دھڑکن سُنی۔ سابقہ تجربے کی بنیاد پر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ محسن کا وار خاصا کاری تھا۔ چنانچہ چوکیدار کے آدھے گھنٹے سے پہلے ہوش میں آنے کا کوئی امکان نہیں۔ شکاری دشمنوں سے مسلسل معرکہ آرائی نے

محسن کو بھی گوریلا جنگ کا ماہر بنا دیا تھا۔ جس انداز سے اس نے چوکیدار کو بے بس کیا تھا وہ اس کا ثبوت تھا۔

"کیا اندر کوئی نہیں ہے؟" محسن نے سرگوشی میں کہا۔ ہم اب دیوار کے ساتھ چپکے کھڑے تھے۔

"اندر کوئی نہ ہوتا تو دروازے پر چوکیدار کو کیوں بٹھایا جاتا۔" میں نے اس کے کان میں کہا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے کہ اس خاموشی کا مقصد ہمیں ٹریپ کرنا ہے۔" محسن بولا۔

"چنانچہ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ کھلی آنکھوں سے یا کسی کیمرے کی آنکھ سے ہم کو بھی دیکھ رہے ہوں اور ہماری مار دھاڑ کی ساری کارروائی کو ایک کامیڈی سمجھ رہے ہوں۔" میں نے کہا۔

"پھر اب کیا کروں؟ اندر چل کے کہیں کہ آ بیل مجھے مار؟" محسن بولا۔ "بیل محوِ انتظار ہوگا۔"

"اس کے سوا ہم کچھ کر بھی نہیں سکتے۔" میں نے کہا۔ "کیونکہ واپسی بھی ہمارے اختیار کی بات نہیں۔ وہ ہمیں جانے نہیں دیں گے اور یہاں تک پہنچ کے اور آنا کچھ کرکے لوٹ جانا بے وقوفی کی بات ہوگی۔ غالب کہاں ہے؟"

"معلوم نہیں۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ تم گولی بالکل مت چلانا۔" محسن بولا۔ "پھر وہ ذرا سی دیر کے لیے غائب ہو گیا تھا۔ دوبارہ نمودار ہوا تو کہنے لگا کہ پیچھے سے جاؤ اور چوکیدار کا راستہ روکو اور پھر غائب ہو گیا تھا۔"

"وہ تو گاڑی میں تھا، اندر کیسے آ پہنچا؟" میں نے کہا۔

"خواجہ صاحب کتے کی آواز سنتے ہی دوڑ کر کار میں گھس گئے تھے اور بضد تھے کہ نکل چلو۔ غالب نے الٹا یہ کیا کہ ہمارا ساتھ دینے نکل آیا۔" محسن بولا۔ "اب معلوم نہیں کہاں ہے؟"

"میرا اندازہ بھی بالکل یہی تھا۔" میں نے کہا۔ "یہ غالب تو کمال کا پراسرار آدمی ہے یار، باہر سے کچھ اور اندر سے کچھ۔ ہم بھی اس کی شخصیت کے ظاہر سے دھوکا کھا گئے۔ خیر اب میں ایک طرف سے جاتا ہوں تو دوسری طرف سے جا۔"

"اس سے کیا فرق پڑے گا۔" محسن بولا۔ "وہ ہر دروازے پر ہمارا استقبال کرنے کے لیے موجود ہو سکتے ہیں۔"

"اچھا تو آگے میں جاتا ہوں۔ تو پیچھے آ۔" میں نے برآمدے کی طرف قدم بڑھائے۔ غالب کی عدم موجودگی مجھے بے سبب نہیں لگتی تھی۔ یہ فرض کرنا محال تھا کہ اس کارروائی میں پوری طرح شریک رہنے کے بعد وہ لوٹ کر گاڑی میں جا بیٹھا ہوگا۔ امید یہ تھی کہ وہ کہیں نہ کہیں مصروف ہوگا اور دشمن کے قلعے میں ہمارے ساتھ داخل ہو جانے کے بعد ہمارے خیال سے غافل نہیں ہوگا۔

میں نے اپنے سامنے آ جانے والے پہلے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا اور پوری احتیاط کے ساتھ آہستہ سے گھمایا۔ معمولی سی کلک کے ساتھ پٹ تھوڑا سا وا ہوا اور میں نے گھپ اندھیرے میں قدم رکھا۔ محسن نے اندر آکے دائیں جانب اور میں نے بائیں جانب چلنا شروع کیا۔ ہم اندھوں کی طرح ہاتھوں اور پیروں سے راستہ بناتے جا رہے تھے لیکن وہاں کوئی چیز تھی ہی نہیں جو ہماری راہ میں حائل ہوتی۔ بالآخر میں کمرے کے ایک کونے میں پہنچ گیا۔ دوسرے کونے میں سگریٹ لائٹر کا ننھا سا شعلہ روشن ہوا اور بیک وقت میں نے اور محسن نے اس خالی کمرے کو دیکھا جس کے وسط میں صرف ایک لاش پڑی تھی اور یہ الف دین کی لاش تھی۔ ذہنی صدمے نے چند لمحوں کے لیے ہم دونوں کو مفلوج کر دیا اور ہم پلک جھپکائے بغیر اس دیوانے کی لاش کو دیکھتے رہے جو خود اپنے انتقام کی آگ میں جل کر خاک ہو گیا تھا۔ اس کی لاش الٹی پڑی تھی۔ یوں کہ دونوں ہاتھ آگے پھیلے ہوئے تھے اور دونوں پیر پیچھے کی طرف۔ بائیں ہاتھ کو دائیں پیر کی سیدھ میں رکھا گیا تھا اور دائیں ہاتھ کو بائیں پیر کی سیدھ میں چنانچہ وہ جو الف دین تھا فرشِ خاک پر انگریزی حرف ایکس کی طرح نظر آتا تھا لیکن اس کو یوں مٹانے والوں نے ہماری آنکھوں کے لیے دوسرا پیغامِ عبرت الف دین کی کمر پر نقش کیا تھا۔ کمر کے ہموار حصے پر اس کی کھال کو داغ کر "ایم آر ایس" کے تین حروف لکھے گئے تھے۔ یہ کام جتنی سفاکی سے کیا گیا تھا اتنی ہی صفائی سے بھی کیا گیا تھا۔ لوہے یا کسی اور دھات کے دہکتے ٹکڑوں کو الف دین کے جسم پر یوں چپکایا گیا تھا کہ کھال جل گئی تھی اور نقش گہرے سیاہی مائل سرمئی رنگ کے زخم کی صورت میں باقی رہ گئے تھے۔ زخموں کے ہر نقش کی گہرائی بتاتی تھی کہ وہ آگ کتنی بے رحم ہوگی جس نے ایک زندہ جیتے جاگتے آدمی کے گوشت کو جلایا تھا۔ یہ تین حرف ایک پرعذاب موت کی پوری کہانی کہتے تھے۔ الف دین کی موت میں ہمارے لیے ایک پیغام تھا کہ شکاری دشمن ہماری ہر چال سے باخبر ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ایم آر ایس کیا ہے اور یہ بتانا چاہتے ہیں کہ "مائٹ از رائٹ سوسائٹی" کے مقابلے میں ان کی طاقت ہم سے کتنی زیادہ ہے۔ الف دین نے بیوقوفی کی تھی کہ اپنے بھائی کی موت کا بدلہ لینے کی کوشش کی تھی۔ وہ بھول گیا تھا کہ طافو اگر بھائی تھا تو صرف اس کے لیے۔ اس کے قاتلوں کے نزدیک وہ صرف ایک غدار تھا۔ ایک حقیر پیادہ جو بساط پر سب سے پہلے مرتا ہے کیونکہ وہ سب سے آگے رہتا ہے اور وہ بھی اس لیے کہ شاہ کو مات نہ ہو۔ شاہ ایک ہوتا ہے اور وزیر ایک ہوتا ہے مگر پیادے آٹھ ہوتے ہیں۔ بالکل... اسی طرح طافو جیسے ڈرائیور آٹھ ہوں تب بھی چوہدری دلاور کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ میں اور محسن گھٹنوں کے بل الف دین کی لاش کے پاس بیٹھ گئے۔ لائٹر کے کپکپاتے شعلے کا مدھم اجالا ہر زخم کے نقش کو اجاگر کرتا رہا۔

"اسے پہلے قتل کیا گیا۔" محسن نے کچھ دیر بعد کہا۔ "جسم کو موت کے بہت دیر بعد داغا گیا۔"

"ہاں، کسی زخم سے لہو کی سرخی عیاں نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"بیچارہ اپنی دیوانگی میں اس انجام تک پہنچا۔" محسن نے کہا۔ "آیا ہوگا بھائی کے قاتل کو قتل کرنے اور خود قتل ہوا۔ اس کا ذہنی توازن بگڑ چکا تھا۔"

"مگر مرنے سے پہلے اس سے وہ سب کچھ اگلوا لیا گیا ہوگا، جو اس کے علم میں تھا۔" میں نے کہا۔

"اس سوختہ تن کی تحریر سے تو یہی ثابت ہوتا ہے۔" محسن نے اتفاق کیا۔ "وہ تشدد کے تمام حربے جانتے ہیں اور الف دین کوئی فولاد کا آدمی نہیں تھا۔ اس نے 'ایم آر ایس' کے متعلق بھی بتا دیا۔"

"غالباً یہی وہ لاش تھی جس کو چوہدری دلاور کا جنازہ بنا کے رکھا گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "اگر ہم تدفین میں شرکت کے لیے پہنچ جاتے تو دشمنوں کی چال کامیاب رہتی مگر وہ ڈراما چل نہیں سکا۔"

"اس کے سارے کردار، وہ پولیس والے، سوگوار لواحقین اور تعزیت کے لیے آنے والے سب نکل گئے۔ خود چوہدری دلاور نے اپنا ٹھکانا بدل لیا۔" محسن بولا۔ "اسے ہمارے سارے عزائم کی خبر الف دین سے مل گئی ہوگی۔"

"پھر کوٹھی پر چوکیدار کھڑا کرنے کا مقصد کیا تھا؟" میں نے کہا۔

"ممکن ہے وہ صرف اس لاش کی حفاظت کر رہا ہو۔" محسن بولا۔ "اس کے علاوہ ابھی ہم نے دوسرے کمروں میں کہاں دیکھا ہے، اندر کوئی تو تھا جس نے سرچ لائٹس جلائی تھیں۔"

"ہم اس وقت شکارگاہ میں ہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ کسی عام آدمی کا نہیں چوہدری دلاور کا گھر ہے۔ اگر ہر گوشے سے کسی کیمرے کی آنکھ ہمیں دیکھ رہی ہو اور ہر دیوار کے کان ہماری باتیں سن رہے ہوں تو تعجب نہیں لیکن جب اوکھلی میں دیا سر تو پھر موصلوں کا کیا ڈر۔ اب دوسرے کمروں میں بھی دیکھ لیتے ہیں۔"

دوسرے سب کمرے خالی تھے۔ ایک ایک کرکے ہم سارے دروازے کھولتے گئے۔ دروازہ میں کھولتا تھا، محسن ریوالور سے مجھے کور کرتا تھا مگر یہ دفاعی نظام اتنا کمزور تھا کہ ہم خود بھی اس پر اعتماد نہیں کر سکتے تھے۔ اصل بات یہ تھی کہ چوہدری دلاور نے حفاظت کے خیال سے کوٹھی خالی کر دی تھی اور اپنی فیملی کو کسی نامعلوم مقام پر شفٹ کر دیا تھا۔ شاید اسے خطرہ ہوگا کہ رابعہ پر نامعلوم قاتلانہ حملے کی کوشش کا ردِعمل کیا ہوگا۔ کوٹھی میں ایک تنکا تک نہیں چھوڑا گیا تھا اور صفائی اتنی مکمل تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ ہر جگہ سے فنگر پرنٹ تک مٹا دیے گئے ہوں گے۔ یقین نہیں آتا تھا کہ اسی کوٹھی میں چوہدری دلاور اپنی فیملی کے ساتھ رہتا تھا اور شاہانہ ساز و سامان کے ساتھ آباد تھا۔

"غالباً چوکیدار صرف لاش کی حفاظت کر رہا تھا۔" میں نے باہر آکے کہا۔

"رائٹ۔ اور صبح ہونے کے بعد اسے ٹھکانے لگانے والے آئیں گے۔" غالب نے اچانک سامنے آکے کہا۔

"تم کہاں تھے؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"چھت پر۔" مرزا غالب نے کہا۔ "اگر کوئی تمھیں ہینڈز اپ کراتا تو میں اسے ہینڈز اپ کرا لیتا۔ تم نے غور نہیں کیا کہ اس پرانی وضع کی کوٹھی کے ہر کمرے میں روشندان ہیں۔ گزشتہ رات میرے یہاں چکر لگانے کے بعد ان لوگوں نے خطرہ محسوس کیا ہوگا کہ کہیں میں اصلی پولیس لے کر نہ پہنچ جاؤں۔ وہ سب الف دین کی لاش چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ چوکیدار کو شاید معلوم بھی نہیں تھا کہ اندر ایک لاش پڑی ہے۔ وہ گیٹ پر پہرہ دیتا رہا۔ پولیس آتی تو وہ پکڑا جاتا اور کچھ نہ بتا پاتا کہ لاش کس کی ہے اور اندر کیسے پہنچی...۔"

"مگر اندر کوئی اور بھی تھا۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "جو غالباً فرار ہو گیا۔ اس نے سرچ لائٹس جلائی تھیں...۔"

ہمارے قدم اچانک رک گئے۔ چوکیدار جسے ہم نے بیہوش کرکے جھاڑی کے پیچھے ڈالا تھا، برآمدے کے سامنے مرا پڑا تھا۔ اس کی گردن کاٹ دی گئی تھی اور وار کسی تیز دھار آلے سے کیا گیا تھا کہ باقی جسم کے ساتھ سر کا رشتہ برائے نام رہ گیا تھا۔ خون ابھی تک بہہ رہا تھا اور جسم گرم تھا۔ خطرہ کسی صدائے بازگشت کی طرح بار بار پکارنے لگا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" غالب نے کہا۔ "اندر یقیناً کوئی اور بھی تھا جس نے یہ قتل کیا ہے مگر اب ہمارا یہاں رکنا ٹھیک نہیں۔ یہ کوئی سازش ہے۔"

غالب کا خیال غلط نہیں تھا۔ اچانک ایک گاڑی گیٹ کے سامنے آ رکی اور میں نے جیپ سے اترنے والی پولیس کو دیکھا۔ وہ گیٹ کھولنے کے لیے اترے تھے۔ ہم تینوں ایک ساتھ اس دیوار کی طرف لپکے جس کے پیچھے ہماری گاڑی کھڑی تھی۔

"کون ہے؟ خبردار!" کسی نے چیخ کر کہا۔ "ٹھہر جاؤ، ورنہ گولی مار دوں گا" لیکن ہم نے رکے بغیر دوڑنا جاری رکھا۔ پھر ایک فائر ہوا لیکن گولی کسی کو چھوئے بغیر نکل گئی۔ اگر گیٹ بند نہ ہوتا تو ہمیں اتنی مہلت بھی نہ ملتی کہ ہم دیوار تک پہنچ سکیں۔ محسن دیوار کے اوپر تھا جب دوسری گولی آئی اور دیوار میں اس جگہ پیوست ہو گئی جہاں میں نے محسن کو دیکھا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے گولی محسن کو لگی ہے مگر دیوار

پھر سے ریت کے ذرات آڑے تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔
غالب اور میں سر جھکا کے دیوار کے ساتھ ساتھ آگے بڑھے۔ باہر سے کار کے اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ ہمارے پیچھے پولیس کی جیپ گیٹ سے سیدھی اندر آئی۔

"یہ میرا ریوالور لو اور جاؤ" غالب نے کہا "میں پولیس سے نمٹ لوں گا"

"کیسے؟" میں نے ریوالور لے کر کہا "وہ پوچھیں گے۔۔"

"ارے یار میں اخباری نمائندہ ہوں! کہہ سکتا ہوں مجھے کسی نے گمنام فون کر کے چوہدری دلاور کی کوٹھی میں قتل ہونے کی اطلاع دی تھی" غالب بولا "مگر میرے پاس سے ریوالور برآمد نہیں ہونا چاہیے۔ تم جاؤ"

غالب کے ریوالور کو میں نے جیب میں ڈالا اور دیوار پر چڑھ گیا۔ کسی نے چلا کے پھر کہا "کون ہے" مگر میں باہر کود چکا تھا۔ محسن کار کو تیزی سے آگے لایا۔ اس کا اگلا دروازہ پورا کھلا ہوا جھول رہا تھا۔ ابھی کار کی رفتار کم ہوئی ہی تھی کہ میں اندر جا گرا۔ دروازہ بند ہوتے ہی محسن نے ایکسیلریٹر دبا دیا۔

"خطرے کی اب کوئی بات نہیں رہی" میں نے سیدھا بیٹھ کے کہا "آہستہ چل"

"کیوں؟ پولیس کی جیپ ہمارے تعاقب میں آسکتی ہے" محسن نے کہا۔

"نہیں، جیپ اندر پہنچ چکی ہے" میں نے کہا "اور اندر ہمارے صحافی دوست مرزا غالب موجود ہیں"

"وہ پھنس جائے گا" محسن نے تشویش سے کہا "اندر دو لاشیں پڑی ہیں"

"اس نے ہمیں پھر بچا لیا ہے" میں نے کہا اور غالب کی بات دہرا دی۔

صبح صادق کے آثار نمودار ہونے لگے تھے جب ہم نے کار کو ایک سڑک پر چھوڑا اور اس میں سے اپنی موجودگی کے تمام آثار مٹا دیے۔ ہم بڑی افراتفری میں فرار ہوئے تھے لیکن سازش کے ایک اور جال سے بال بال بچ کے نکل آئے تھے۔۔۔ چوہدری دلاور ہماری توقعات سے زیادہ چالاک ثابت ہو رہا تھا۔ اس نے مجھے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کرنے کے لیے رابعہ کو قتل کرنے کی کوشش کی تھی مگر یہ بات نہیں بھولا تھا کہ میرے انتقام کا نشانہ اس کی فیملی بھی ہو گی چنانچہ اس نے کسی کو بتائے بغیر اپنے خاندان کو ساز و سامان سمیت کہیں منتقل کر دیا تھا۔ پھر اس نے ایک جعلی اخبار کی جھوٹی خبر کے ذریعے مجھے متوجہ کیا تھا اور اگر میری جگہ مرزا غالب نہ پہنچتے تو میں اس کی "تدفین" سے پہلے گرفتار ہو جاتا۔ پھر اس نے بڑی ہوشیاری سے وہ جعلی اخبار بھی واپس حاصل کر لیا اور اس دوران میں شامت کا مارا الف دین اس کے جال میں پھنس گیا تو اس نے پہلے الف دین سے ہماری تمام خفیہ سرگرمیوں کے بارے میں سب معلومات حاصل کر لیں یہاں تک کہ ہماری اس تنظیم کا نام تک پوچھ لیا جو درحقیقت کوئی تنظیم نہ تھی۔ یہ ایک مقصد کے حصول کی خاطر چند افراد کی جدوجہد تھی۔۔۔

الف دین کی لاش پر "ایم آر ایس" کا نام کندہ کر کے اس نے بالواسطہ طور پر ہمیں یہ بھی سمجھا دیا کہ ہم جو بزعم خود تیس مار خاں بنے پھرتے ہیں اس کی نظر میں کیا ہیں۔ آخری کام اس نے ایک مفروضے کو بنیاد بنا کے کیا تھا یعنی اپنے کسی معتمد کو الف دین کی لاش کے پاس چھوڑ کر یہ سمجھا گیا تھا کہ اگر ہم چکر لگائیں تو اسے کیا کرنا ہے۔ معتمد نے وہی کیا جو اسے کہا گیا تھا۔ چوکیدار اس بکرے کی طرح مارا گیا جسے شیر کا شکار کرنے والے مچان پر بیٹھ کے نیچے باندھتے ہیں اور جو شکاریوں کی زبان میں گارا کہلاتا ہے۔ شیر اس بکرے کو کھانے آتا ہے اور خود شکار ہو جاتا ہے۔ یہاں دلاور کے معتمد نے چوکیدار کو قتل کر کے پولیس کو مطلع کر دیا تھا کہ قاتل اندر ہی موجود ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر غالب ہمت کر کے پولیس سے نمٹنے کے لیے نہ رکتا تو میں دہرے قتل کے ایک اور الزام میں گرفتار ہو جاتا، شاید یہ میری آخری گرفتاری ہوتی مگر میں بچ کر نکل آیا اور چوکیدار کی جان بلاوجہ گئی۔

افق کے آخری کناروں پر صبح کا دھندلکا نمودار ہونے لگا تھا۔ ذہنی و جسمانی طور پر میں تھکا ہوا تھا اور مجھے ایک شب کی جدوجہد کے رائیگاں جانے کا افسوس تھا۔ ٹیڈی کچھ شرمندہ تھا کہ پوری طرح ہمارا ساتھ نہ دے سکا اور محسن کی خاموشی ظاہر کرتی تھی کہ وہ بھی اس صورتِ حالات پر تشویش اور اضطراب کا شکار ہے۔ اگلا قدم اٹھانے سے پہلے یہ ضروری تھا کہ ہم اپنی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پر اعتماد کرنے کے قابل ہو جائیں۔ ہماری قوتِ عمل ہمارا ساتھ دے۔ ہم حالات کے مطابق مستقبل کے لیے صحیح لائحہ عمل مرتب کر سکیں۔ ہمارے حلیے اتنے مضحکہ خیز نہ ہوتے تو ہم ہوٹل واپس لوٹ جاتے اور ایک دن سکون سے سو کر گزار دیتے تو شام تک وقتی ناکامی کے اس حوصلہ شکن ردِعمل کا اثر باقی نہ رہتا لیکن فوری طور پر ایسا کرنا ممکن نہیں تھا۔ کچھ دور پیدل چلنے کے بعد میں نے محسن کے مشورے کو قبول کرتے ہوئے کہیں بیٹھ کر چائے پینے کا فیصلہ کیا۔ بازار ابھی بند تھے چنانچہ ہمیں ریلوے اسٹیشن تک مارچ کرنا پڑا۔ اسٹیشن کے باہر بہت سے ہوٹل تھے جو ہمیشہ کی طرح آباد تھے اور گرد و پیش کی رونق میں کوئی کمی محسوس نہ ہوتی تھی۔ بہت سے لوگوں نے نظر اٹھا کے ہمیں واجبی سی دلچسپی سے دیکھا۔ کیونکہ میں اور محسن الگ الگ لباس میں ہونے کے باوجود ایک جیسی صورت سے نمایاں نظر آتے تھے۔ بیشتر

لوگوں نے ہمیں جڑواں بھائی تصور کیا لیکن ان کا وقتی تجسس زیادہ پریشان کن ثابت نہیں ہوا۔ اس ریسٹورنٹ یا چائے خانے کے آخری کونے میں بیٹھ کر میں نے اور محسن نے سگریٹ جلائی اور چائے کے انتظار میں خاموش بیٹھے دھوئیں کے ساتھ اپنے اپنے خیالات کی پرواز میں گم رہے۔ گرم چائے کا ایک کپ ہمارے جسم میں حرارت بن کر پھیل گیا تو ہم نے بہت بہتر محسوس کیا۔

"کیا واقعی غالب کسی مشکل میں نہیں پڑے گا؟" محسن نے خاموشی کے بوجھل وقفے کو ختم کیا۔

"میرا خیال ہے وہ اپنے تعلقات کی وجہ سے محفوظ رہے گا" میں نے کہا "اس کے مددگار بہت ہیں۔ ویسے بھی الف دین یا اس چوکیدار کے ساتھ غالب کا کوئی تعلق ثابت نہیں ہو سکتا۔ پھر یہ کوئی کیسے ثابت کر سکتا ہے کہ اس نے اتنے سفاکانہ طریقے پر الف دین کو مارا اور جلایا اور چوکیدار کا گلا کاٹا۔ پولیس کو وہاں گولیوں کے خول ملیں گے۔ فائرنگ میں نے کی تھی، چوکیدار نے اور غالب نے مگر اس کے پاس سے کوئی ریوالور برآمد نہیں ہو گا اور جائے واردات پر تین قسم کی گولیوں کے خول ایک معمہ بن جائیں گے"

"ممکن ہے پولیس کو تلاش کرنے پر وہ خنجر مل جائے جس سے چوکیدار کا گلا کاٹا گیا تھا" محسن بولا۔

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا" میں نے کہا "خنجر پر فنگر پرنٹ نہیں ہوں گے۔ اس کے علاوہ سوال وہی ہو گا کہ قتل کیوں ہوا؟ غالب پر کوئی شک کر ہی نہیں سکتا۔ وہ چالاک آدمی ہے۔ پولیس کو چکر میں ڈال دے گا کہ وہ تین ریوالور تلاش کرو جن سے تین قسم کی گولیاں چلائی گئی تھیں۔ ایک میرا اعشاریہ بور کا کولٹ تھا جو مجھے اپنے چوہدری دلاور سے ملا تھا۔ اس کا کوئی لائسنس کسی کے نام پر نہیں۔ دوسرا غالب کا اعشاریہ تین آٹھ کا "بیریٹا" ہے جو اس نے عقلمندی سے کام لیتے ہوئے میرے حوالے کر دیا۔ اس کا بھی کوئی ریکارڈ نہیں کیونکہ یہ مالِ غنیمت تھا۔ وہاں صرف چوکیدار کا ریوالور ملے گا"

"وہاں چوکیدار کا ریوالور بھی نہیں ملے گا" محسن ہنسا اور اس نے اپنا ایک ہاتھ جیب کی طرف بڑھایا پھر وہ اِدھر اُدھر دیکھ کر رک گیا "وہ میں نے بھاگنے سے پہلے اٹھا لیا تھا۔ میں نے سوچا کہ سائلینسر والا ریوالور ہے، چھوڑا کیوں جائے مگر وہ کچھ عجیب سی ساخت کا ہے"

"فکر اب غالب کی نہیں اپنی کرنی چاہیے" میں نے کہا۔

"صورت سے تو ہمیں کوئی نہیں پہچان سکتا مگر بدلے ہوئے چہرے کے ساتھ ہم لوٹ کر واپس ہوٹل نہیں جا سکتے"

"استاد ٹیڈی تم بہت چپ ہو" محسن نے کہا۔

"میں کیا بولوں محسن بھائی!" ٹیڈی زبردستی مسکرایا "اللہ نے خیریت رکھی ورنہ۔۔۔ میں تو شرمندہ ہوں"

"شرمندگی کیسی یار! ہر کام ہر آدمی نہیں کر سکتا" میں نے اسے دلاسا دیا "یہی کیا کم ہے کہ تم ہمارا ساتھ دے رہے ہو اور ایسے حالات میں کہ اپنے پرائے سب چھوڑ چکے ہیں۔ نہ جانے کتنی بار تمھارے گھر نے ہمیں پناہ دی اور ہم نے تم سے وہی گھر چھین لیا۔ تم کو تو ہماری دوستی بہت مہنگی پڑی"

"یہ سب قسمت کا لکھا ہے سکندر بادشاہ" ٹیڈی بولا۔ "تم نے مجھے عزت دی اور عزت کے ساتھ جینا سکھایا۔ مجھے اپنا سمجھا اور آج میرا ایک خاندان ہے۔ ورنہ میں اکیلا تھا اور اکیلا رہتا تو اسی غلط راستے پر چلتا رہتا۔ اب مجھے یہ خوشی ہے کہ میں برائی سے بچ گیا اور خدا نے مجھے توفیق دی کہ برائی کے خلاف جنگ میں شریک ہو کر تمھارے ساتھ رہوں۔ مجھے معلوم ہے میں نے ابھی کوئی تیر نہیں مارا اور کوئی بہت بڑا کارنامہ بھی سرانجام نہیں دیا"

"دل چھوٹا کیوں کرتے ہو استاد" میں نے اس کی پیٹھ تھپک کر کہا "تمھارا ساتھ دینا ہی اتنا بڑا کام ہے جو ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ اب تم یوں کرو کہ یہاں سے سیدھے رابعہ کے پاس جاؤ۔ اسے ساری بات بتا دو اور پھر انکل رضوی کے گھر چھوڑ آؤ۔ اس کے حق میں یہی بہتر ہے۔ اسے بتا دینا کہ ہم اپنا حلیہ کیا بنا چکے ہیں تاکہ کبھی وہ دیکھے تو پہچان لے۔ اس سے کہنا کہ جتنی نقد رقم فراہم کر سکتی ہے کر دے۔ ہم کو سب سے پہلے تو سر چھپانے کا کوئی مستقل ٹھکانا بنانا ہے۔ پھر ہمیں ایک اور گاڑی بھی چاہیے"

"برا مت ماننا سکندر بادشاہ!" ٹیڈی نے کہا "اپن عورت کی کمائی کے قائل نہیں"

ایک لمحے کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ٹیڈی نے میری غیرت کے منہ پر طمانچہ مار کے مجھے بے عزت کر دیا ہے مگر میں نے ضبط سے کام لیتے ہوئے اسے سخت جواب دینے سے گریز کیا "قائل تو میں بھی نہیں ہوں"

"ساری بات حالات کی ہے استاد!" محسن نے میری بات کاٹ دی "عام حالات میں کوئی بھی یہ پسند نہیں کرے گا مگر سکندر کی اور میری پوزیشن مختلف ہے۔ سکندر محتاج یا مفلس نہیں ہے۔ تم جانتے ہو کہ اس نے دلاور کے پچاس لاکھ قبول نہیں کیے تھے۔ اس لیے کہ وہ ناجائز تھے۔ جائز طور پر اس کی ملکیت کے حق کو تسلیم کیا جائے تو سکندر کے پاس اس سے دگنی مالیت کا کاروبار ہے۔ ایک نہ ایک دن یہ حق تسلیم ہو گا مگر اس وقت کے آنے تک ہم سب کو اپنے اپنے وسائل پر بھروسا کرنا ہے"

"اس کے علاوہ رابعہ مختلف قسم کی عورت ہے۔" میں نے برہمی سے کہا "کم سے کم میرے لیے۔"

"وہ تو ہے سکندر بادشاہ۔" ٹیڈی عاجزی سے بولا "میں جانتا ہوں کہ اس نے تمھارے لیے اور تم نے اس کے لیے کیا نہیں کیا اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ایک نہ ایک دن تم اس سے شادی کر لوگے اور جتنا آج اس نے دیا ہے، اس سے ہزار گنا واپس کردو گے۔ تمھارا سب کچھ اسی کا ہوگا۔ پھر بھی آج مجھے یہ اچھا نہیں لگتا۔ جب ہم خود ایک کام کر سکتے ہیں . . .!"

"وہ پیسہ حاصل کرنے کے لیے ہم صرف ڈاکا ڈال سکتے ہیں۔" میں نے تلخی سے کہا "چیک نہیں کاٹ سکتے۔ کسی سے اُدھار نہیں مانگ سکتے۔ ہمارے پاس تو بیچنے کو بھی کچھ نہیں ہے۔"

ٹیڈی اُٹھ کھڑا ہوا "چلو چھوڑو سکندر بادشاہ! یہ بتاؤ پھر کہاں ملو گے؟"

"رابعہ سے کہنا کہ ویسٹ اینڈ ہوٹل سے اپنا اور تمھارا سامان اُٹھالے۔" میں نے کہا "میرا بل کلیئر کرے اور تمھارے ساتھ انکل رضوی کے گھر چلی جائے۔ اپنا سب سامان الگ کرلے۔ باقی سامان کے ساتھ تم 'زمیندار ہوٹل' پہنچ جانا، ریلوے اسٹیشن کی طرف جانے والی سڑک پر۔"

"مجھے معلوم ہے۔" ٹیڈی نے کہا "کس نام سے کمرہ لوں؟"

"وہی امیر خاں، کبیر خاں کا نام چلانا۔" میں نے کہا "دو کمرے کافی ہوں گے۔ اگر رابعہ نے کوئی بندوبست کردیا تو کل کرائے کے کسی گھر میں منتقل ہوجائیں گے۔ ویسے میں محسوس کرتا ہوں کہ اب لاہور میں رہنے کا فائدہ نہیں۔ آج چوہدری دلاور نے اپنا گھر بدل دیا ہے، کل تک وہ اپنا کاروبار بھی بدل دے گا۔ جب تک ہم اس کے خلاف کوئی ثبوت حاصل کریں گے، وہ اپنی پوزیشن محفوظ کرلے گا۔ وہ ایم ڈبلیو ڈی کمپلیکس سے اپنے مجرمانہ کاروبار کا ہر سراغ مٹادے گا اور یہ کاروبار کسی اور جگہ شروع کردے گا۔ پھر اس کے لیے فیکٹری کو آگ لگوا کے تباہ کرنا یا دھماکے سے اُڑا کے ملبے کا ڈھیر بنا دینا کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ اس قسم کی تخریبی کارروائی کو آسانی سے میرے نام منسوب کیا جاسکتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم فوری طور پر اس کے خلاف کوئی ٹھوس قدم اُٹھائیں۔"

"لیکن ابھی تو اس کے بارے میں یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ . . . کہاں غائب ہوگیا ہے۔"

"چوہدری دلاور کو گولی مارو۔" میں نے کہا "کیا ہم گامے شاہ پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے۔ رحمت کباڑیہ اور طافو مارے گئے، پپندر لاپتا ہے۔ نقلی نواب خسرو جمشید کا کوئی سراغ نہیں لیکن گامے شاہ کا ٹھکانا ہم نے دیکھا ہے۔ اس کے علاوہ کراچی میں ایک سیٹھ کریم بھائی ہے۔ اس کا پتا گامے شاہ سے مل سکتا ہے۔ کراچی میں ہی پیار علی ہے جو یہاں سے جانے والے مال کو کلیئرنس دلواتا ہے۔ یہ سب چوہدری دلاور کے دست و بازو ہیں۔ ان کو ختم کردیا جاتے تو چوہدری دلاور ختم ہوجاتے گا۔"

"یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔" محسن بولا۔

"کام کوئی بھی آسان نہیں ہوتا اور ہم نے تو راستہ ہی وہ منتخب کیا ہے جس میں مشکلات کے سوا کچھ نہیں۔ ہمارے مقابل بہت طاقتور، منظم اور خطرناک شکاری ہیں لیکن ہم بھی اب اکیلے تو نہیں ہیں۔ تمھارے علاوہ غالب کو ملا کر ہم چار افراد ہیں اور ہم سب مسلح ہیں۔ سائیلنسر والے تین ریوالور اس وقت بھی ہمارے پاس ہیں، بغیر سائیلنسر کے بھی تین ریوالور ہیں۔ غالب ہماری مدد کرے تو پولیس کے اسلحہ خانے سے اور بھی بہت کچھ دلوا سکتا ہے۔ ہمیں ریموٹ کنٹرول مائک مل سکتے ہیں اور لانگ رینج کے واکی ٹاکی مل سکتے ہیں۔ ملنے کو کیا نہیں مل سکتا۔ اسی شہر میں دستی بم اور ٹائم بم مل سکتے ہیں۔ بس نقد پیسہ چاہیے۔" میں نے کہا "اتنا پیسہ کہ لٹایا جاسکے۔"

"چھوڑو سکندر بادشاہ! تم بھی پیسے کی فکر کرتے ہو۔" ٹیڈی بولا "ارے ہم کو دیکھو۔ ہمارا تو نام ہی ٹیڈی ہے۔ ٹیڈی پیسہ کیا ہوتا ہے۔ مگر اب دیکھنا ہم کیا کرتے ہیں۔ اب تک نہیں کیا مگر اب کریں گے۔"

"کیا کرو گے اُستاد!" محسن ہنس پڑا "سرکاری خزانے کی چابیاں ہمارے حوالے کردو گے؟"

لیکن جواب دینے کے بجائے ٹیڈی چل پڑا "دس گیارہ بجے تک میں آجاؤں گا۔" وہ جاتے جاتے بولا۔

"کیا عجیب آدمی ہے یہ بھی۔" اس کے جانے کے بعد محسن نے کہا "اُستادی کا زور بھی نہیں رہا مگر پھر بھی ڈینگ مارنے سے باز نہیں آتا۔"

"قسم مولا علی کی۔" میں نے ٹیڈی کے لہجے میں کہا "یاروں کا یار ہے اور سچا سہارا ہے۔ کمزور سہارے بھی بعض اوقات بھرم رکھ لیتے ہیں۔ کشتی ڈوب جائے تو ایک تختہ ساحل تک لے جاتا ہے۔"

اس وقت تک سورج نکل آیا تھا اور اُجلی دھوپ کی حرارت پھیلنے لگی تھی۔ میں نے اور محسن نے وہیں بیٹھے بیٹھے ڈبل بند مکھن اور چائے منگوا کے ناشتے سے فراغت حاصل کی اور بل ادا کر کے باہر نکل آتے۔ ہمارے پاس نقد رقم کی صورت میں اب ساڑھے سات سو روپے رہ گئے تھے اور اس میں سے کچھ رقم ہمیں اپنے لباس کو اپنے حلیے کے مطابق بنانے میں صرف کرنی تھی۔

ایک گھنٹے بعد ہم انارکلی میں تھے۔ میں نے محسن کو کپڑے لینے بھیجا اور خود جنرل پوسٹ آفس کی طرف چل پڑا۔ میں اخبار کے دفتر یا پولیس اسٹیشن فون کر کے غالب کی خیریت دریافت کرنا چاہتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ پولیس اس کو اپنے ساتھ تھانے ضرور لے گئی ہوگی اور اس نے وہاں سے اپنے دوستوں کو اور ساتھیوں کو مطلع ضرور کیا ہوگا کہ وہ کس مشکل میں پھنس گیا ہے۔ غالب جائے واردات پر پکڑا گیا تھا اور اسے ثابت کرنا تھا کہ کسی نے اسے واقعی گمنام فون کر کے چوہدری دلاور کے گھر میں ہونے والے قتل کی اطلاع دی تھی۔ اس کے اخبار کے ساتھی اپنی گواہی سے اس کو صاف بچا کر لے جاسکتے تھے، خود غالب کے لیے پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی مگر میں اپنا اطمینان چاہتا تھا۔

چہرے بدل جانے کے بعد میرے اور محسن کے لیے لاہور کی سڑکوں پر بے خوف و خطر پھرنا ایک تجربہ تھا۔ مجھے ایک بار خیال ضرور آیا تھا کہ موٹے بھائی نے مجھے پہچان لیا تھا اور وہ پولیس سے رابطہ قائم کر کے انھیں بتا سکتا تھا کہ مطلوبہ ملزم کس حلیے میں پھر رہا ہے مگر اس نے یہ بھی کہا تھا کہ حساب برابر ہے۔ کوئی ٹرمپ کارڈ غالب کے پاس بھی تھا جس کی وجہ سے موٹے بھائی اب تک دبا ہوا تھا۔ خود اس نے مانا تھا کہ اب پھانسی دونوں کو ہوسکتی ہے، مجھے بھی اور اسے بھی۔ وہ میری گردن پھنسانے سے پہلے اپنی گردن ضرور بچائے گا کیونکہ وہ غالب کو اچھی طرح جانتا ہے۔ یہی خیال میرے لیے تسلی کا باعث تھا۔

میں نے محسن سے جی پی او کے گیٹ پر ملنے کو کہا تھا۔ ابھی میں نیلا گنبد کی طرف سے گزر ہی رہا تھا کہ میں نے ایک کار کو سامنے سے آتے دیکھا۔ یہ چھوٹی سی "فیٹ ۔۔۔ ۶۰۰" تھی جسے ایک لڑکی چلا رہی تھی۔ میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس کے ساتھ ہی بے اختیار میرے قدم رُک گئے کیونکہ وہ لڑکی نازو تھی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو گاڑی کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کی طرف کاروں کی قطار میں لگ چکی تھی اور نازو اسی اندازِ محبوبی کی ساری معصومیت کے ساتھ شاخِ گل کی طرح لچک کر باہر نکل رہی تھی جس کے نظارے نے نہ جانے کتنے دل خون کیے ہوں گے۔ اس کا رنگین آنچل لہرایا اور وہ سرتاپا قیامت بنی ایک دکان میں داخل ہوگئی۔ میرے تصور میں صرف اس کے پیرہن کے رنگ رہ گئے اور پُرانی یادوں کا سیلِ بے عناں مجھے بہا کے لے گیا۔ میں زمانے سے چھپتا پھر رہا تھا مگر اس لڑکی سے منہ چھپاتے ہوئے مجھے شرم آئی جس نے عملاً مجھ پر اپنی جان نچھاور کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی تھی۔ شرمندگی کا یہ بار تو میں نہ جانے کب سے اُٹھائے پھر رہا تھا کہ اس شعلۂ جوالہ، سیماب صفت اور فتنۂ محشر لڑکی کو اس کی بے طلب چاہت اور دیوانہ وار اُلفت کے جواب میں میرے پاس دینے کو کچھ بھی نہیں ہے۔ اس وقت بھی میں دامن بچا کے نکل جاتا تو یہ بارِ ندامت دوگنا ہوجاتا۔

میں نے سڑک عبور کی اور اس کی گاڑی کے پاس جا کھڑا ہوا۔ وہ کراکری کی دکان سے کچھ لینے آئی تھی۔ میں اسے دکان دار سے باتیں کرتے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے رقم ادا کی اور دکان کا کوئی ملازم لڑکا گتے کا خاصا بڑا ڈبا اُٹھائے باہر آیا۔ نازو اس کے ساتھ لپکی کار کی طرف بڑھی۔ ملازم نے ڈبے کو پچھلی نشست پر رکھ دیا اور لوٹ گیا۔ نازو پھر رہی تھی۔ اسپتال میں موت اور زیست کی کشمکش سے گزرنے والی نازو کا رنگ روپ ذرا بھی ماند نہیں پڑا تھا۔ صحت مند ہوجانے کے بعد وہ پھر برگِ گل کی طرح شگفتہ اور تر و تازہ تھی اور اس کے حُسن کی جاں آفرینی کا سلسلہ طلسم وہی تھا۔ کوئی زخم اگر دل میں رہ گیا تھا تو اسے میرے سوا کسی کی آنکھ نہ دیکھ سکتی تھی۔ اس کے آس پاس پھرنے والے دل پھینک قسم کے پیشہ ور عاشقوں کی نظریں طواف کر رہی تھیں لیکن وہ اسی الھڑپن سے کسی کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی اور پھر بھی یہ گمان ہوتا تھا کہ سب کی طرف دیکھ رہی ہے۔ ان میں سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ یہ حد درجہ بھولی بھالی اور نازک دکھائی دینے والی لڑکی ایک چلتا پھرتا آتش فشاں ہے۔ اگر غلطی سے کوئی اس کی طرف ہوس پرست ہاتھ بڑھاتا تو وہ برق بن کے گرتی اور دوسرے لمحے وہ بدنیت اپنا ٹوٹا ہوا ہاتھ لیے سڑک پر یوں چت نظر آتا کہ پھر اسٹریچر پر اُٹھایا جاتا۔

گاڑی بالکل نئی نہیں تھی مگر زیادہ پُرانی بھی نہ تھی اور اس نے حال ہی میں لی تھی۔ ممکن ہے بھائی نے اپنی غلطی کا کفارہ ادا کر کے روٹھی ہوئی بہن کو منانے کے لیے یہ رشوت دی ہو۔ وہ خود رشوت لینے والا آدمی نہیں تھا مگر یہ محبت کی رشوت اسے دینا ہی پڑتی تھی کیونکہ وہ اکلوتے بھائی کی اکلوتی بہن تھی۔ میرے دل میں خلشِ آزار بڑھ گئی۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور بیک کر کے پوری احتیاط سے آگے بڑھائی۔ میں ابھی تک خاموش کھڑا تھا مگر اچانک مجھے یوں لگا جیسے نازو نے جس گولی کا راستہ روک کر مجھے بچایا تھا، وہ اب میرے جگر میں پیوست ہوگئی ہے۔ میں تڑپ کر آگے بڑھا اور اس نے مجھے بچانے کے لیے پوری قوت سے بریک لگائے۔ اس کی شرربار نظروں نے میری ہیئت کذائی کا جائزہ لیا مگر وہ مجھے پہچان نہ سکی۔

"آنکھوں والے اندھے ہو یا عقل کے اندھے؟" اس نے برہمی سے کہا "خود مرجاتے اور مجھے مصیبت میں ڈال جاتے۔"

"نہیں نازو۔" میں نے آہستگی سے کہا "مرنا ہوتا تو اسی دن مرگیا ہوتا۔"

"سکندر!" وہ چیخ کر بولی "تم . . . ." پھر الفاظ اس کے حلق میں پھنس گئے۔ اس کی چیخ نے بہت سی نظروں کو متوجہ کرلیا تھا۔ میں نے جلدی سے کار کا ساتھ والا دروازہ کھولا اور اس کے ساتھ بیٹھ گیا "یہاں سے نکل چلو۔ ایسا نہ ہو کہ میری وجہ سے تم واقعی

مصیبت میں پڑجاؤ۔" میں نے کہا۔

"سکندر! ایسے نصیب میرے کہاں!" وہ بے وقوف لڑکی ایک دم نروس بریک ڈاؤن کا شکار ہوگئی تھی۔ اس کے ہاتھ ہی نہیں، اس کا پورا جسم کانپ رہا تھا اور مجھے یوں لگتا تھا کہ وہ بیہوش ہو جائے گی۔ ایسی حالت میں وہ گاڑی چلاتی تو یقیناً حادثہ ہو جاتا۔ نہ جانے کب سے رُکے ہوئے آنسو اس کے گالوں پر بہنے لگے تھے۔

"چلو ہٹو اپنی جگہ سے۔" میں نے کہا۔ "گاڑی میں چلاؤں گا۔" اور نیچے اُتر کر سامنے سے اُدھر آیا جدھر وہ بیٹھی تھی۔ کچھ لوگ اس تماشے کو حیرت، دلچسپی اور شکوک کے ملے جلے جذبات، کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔ نازو جیسی آفت کی پرکالہ کو میرے جیسے کارٹون کے ساتھ دیکھ کر ایک لڑکے نے گزرتے گزرتے اپنے ساتھی سے کہا۔ "پہلو تے حُور میں لنگور، خدا کی قدرت!" اور وہ دونوں قہقہہ مار کے ہنسے۔ میں نے نازو کو زبردستی آگے کھسکایا اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ وہ مسلسل مجھے گھور رہی تھی اور رو رہی تھی۔

"یہ تم... تم واقعی... سکندر ہو نا؟ یا میرے کانوں کو دھوکا ہُوا ہے، تم ایسے تو نہ تھے۔" وہ میرے کندھے پر سر رکھ کر بولی۔

"ہاں۔ لیکن تم ذرا سیدھی طرح بیٹھو اور ہوش میں رہو۔" میں نے کہا۔ "ہم سڑک پر ہیں۔ میں ایسا بھیس بدلنے پر مجبور تھا، ورنہ اس شہر میں نہیں رہ سکتا تھا۔"

"یہ سب کیوں کر رہے ہو سکندر اور کب تک کرتے رہو گے؟" اس نے سر کو میرے کندھے پر سے ہٹا لیا مگر رونا جاری رکھا۔ "بتاؤ اس سے کیا ملے گا تمھیں؟ کیا ملا ہے آخر اب تک؟ سب کچھ تو گنوا دیا ہے تم نے، سب کو تو گنوا دیا ہے۔ اب تم کونسی دُنیا میں ہو، جہاں کوئی پہنچنا بھی چاہے تو نہیں پہنچ سکتا۔"

"مگر میں تو تم تک پہنچ گیا ہوں۔" میں نے کہا۔ "جب میں تم سے دُور تھا تب بھی تمھارے خیال سے تو غافل نہیں تھا میرے ساتھ ایک سہارا تمھاری یادوں کا بھی تھا۔"

نازو کا چہرہ یوں روشن ہو گیا جیسے برستے بادلوں سے نکلنے والے چاند کی روشنی سے آسمان پر اُجالا پھیل جائے۔ اس نے آنسوؤں کے درمیان مسکرا کے نظریں اُٹھائیں تو اس کے رُخسار گلابی ہو رہے تھے۔ "سچ... تم جھوٹ تو نہیں بول رہے ہو مجھ سے؟ تم واقعی مجھے یاد کرتے تھے؟ بہت یاد کرتے تھے؟"

"ہاں، میں بھی یاد کرتا تھا۔ رابعہ بھی یاد کرتی تھی۔" میں نے محتاط ہو کے کہا۔

نازو کی مسکراہٹ ماند پڑ گئی اور اس کا چہرہ بُجھ گیا۔ "رابعہ... وہ بھی تمھارے ساتھ ہے؟" وہ آنسو پونچھ کے خفت سے ہنسی۔ "میں تو بھول ہی گئی تھی اسے۔ ظاہر ہے وہ تمھارے ساتھ ہی ہو گی۔"

میں نے نوکِ خار کی چُبھن کو دل میں محسوس کیا۔ "ہاں، اس کے علاوہ محسن بھی ہے۔ ہم سب ساتھ ہیں۔"

"ہاں۔ بس میں اکیلی ہوں۔" وہ اداسی سے بولی۔ "کتنے اچھے تھے وہ دن جب..." وہ چُپ ہو گئی۔

"ہاں، جب یہ سب کچھ نہیں ہوا تھا۔" میں نے دُکھی دل سے کہا۔ "جب اکرام شیخ میرا دوست تھا اور رضوی صاحب کا گھر میرا گھر تھا۔ اب میں کسی کا نہیں ہوں اور اس دنیا میں سکندر بخت بن کے جینا میرے اختیار میں نہیں رہا مگر تم نے تو سب سُنا ہو گا، اپنے بھائی سے اور دیکھا بھی ہو گا۔ ان اشتہاروں میں جن میں میری تصویر تھی۔ تم نے اخبارات میں سب پڑھا بھی ہو گا۔ تم دیکھ رہی ہو اب میں کیا ہوں۔ آج تم کو دیکھا تو نظر چُرا کے گزر سکا۔ تم نے اپنی جان کا قرض میرے لیے چھوڑ دیا ہے جو میں کسی طرح نہیں چُکا سکتا۔"

"تم یہ قرض چُکانا چاہتے ہو؟" اس نے نظروں سامنے رکھ کر سپاٹ لہجے میں کہا۔

"میری جان ہی لینی تھی تو اپنی جان دے کر کیوں بچائی تھی؟" میں نے اس کا مطلب سمجھ کر کہا۔

"میں کب کہتی ہوں کہ مجھے تمھاری جان کا قرض جان سے وصول کرنا ہے۔ میں تو تم سے دل کا قرض بھی نہیں مانگتی کیونکہ میں سمجھتی ہوں، تمھارا ایک ہی دل ہے جو تم رابعہ کو دے چکے ہو۔" وہ پھر رونے لگی۔ "میں تو صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم مجھے اپنا سمجھو اسی طرح جیسے تم محسن کو اپنا سمجھتے ہو، شہلا کو سمجھتے ہو، مجھے اپنے ساتھ رکھو۔ میں تمھارے لیے بہت کچھ کر سکتی ہوں سکندر۔"

"کیا میں جانتا نہیں کہ تم میری خاطر اپنی جان بھی دے سکتی ہو؟" میں نے کہا۔

"اس کے باوجود تم مجھے اس قابل نہیں سمجھتے؟" وہ دُکھ سے بولی۔ "دیکھو، میں رابعہ کا حق نہیں چھینوں گی۔ میں تم سے نہیں کہوں گی کہ مجھے اس طرح چاہو جس طرح تم رابعہ کو چاہتے ہو لیکن مجھے اتنا حق تو دو کہ میں تمھیں چاہ سکوں، تمھارے قریب رہ سکوں۔ اس تمام عرصے میں جب تم میری نظروں سے اوجھل تھے..."

"دیکھو نازو! دل اس دیوانگی سے کچھ حاصل نہیں۔ مجھے ندامت ہوتی ہے اس احساس سے کہ میں تم کو کچھ بھی نہیں دے سکتا۔ تم بہت اچھی، بہت پیاری لڑکی ہو مگر خدا کے لیے حقیقت کی دُنیا میں زندہ رہنا سیکھو۔ میرا خیال چھوڑ دو، مجھے بھول جاؤ۔" میں نے کہا۔ "یہ ساری دُنیا تمھاری ہے۔ تمھاری قوتِ تسخیر بلا کی ہے۔ تمھاری زندگی کی راہوں میں پھول ہی پھول ہوں گے۔ اپنے دامن کے لیے

کانٹوں کی آرزو کیوں کرتی ہو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم سے ملتا رہوں گا، تم سے رابطہ رکھوں گا۔ یہ بتاؤ، کیا واقعی تمھارے بھائی نے استعفا دے دیا ہے؟"

"ہاں۔ اور مجھ سے زیادہ وہ تمھارے منتظر ہیں۔" نازو بولی۔ "تم کو تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔"

"کس لیے؟" میں نے کہا۔ "تاکہ مجھے پولیس کے حوالے کر دے؟"

"نہیں سکندر! جب سے انھوں نے نوکری چھوڑی ہے، ان کی حالت بدل گئی ہے۔ وہ عجیب سی ذہنی اذیت کا شکار ہیں۔ بار بار کہتے ہیں کہ میں بزدل تھا۔ میں نے نوکری کے قاعدوں اور ضابطوں کے لیے دوستی کے تقاضوں کو چھوڑ دیا حالانکہ وہ ضابطے کھوکھلے تھے اور سارے قاعدے قوانین ایک ڈھونگ تھے مگر دوستی کے تقاضے حقیقی تھے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ تم مجرم نہیں تھے مگر قانون کو اپنے ہاتھوں میں رکھنے والوں نے تم کو مجرم بنا دیا اور وہ تمھاری مدد نہ کر کے پچھتا رہے ہیں۔ تم ان سے مل لو۔"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو نازو!" میں نے کہا۔ "اکرام شیخ پر میں اعتبار کیسے کر سکتا ہوں؟"

"تم مجھ پر تو اعتبار کرتے ہو نا؟" وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بولی۔ "نہیں کرتے ہو تو کہو۔"

"پاگل ہوئی ہو۔ تم سے زیادہ میرے لیے کون قابلِ اعتبار ہو گا۔" میں نے کہا۔

"تو میں کہہ رہی ہوں کہ بھیا سے ملو۔ وہ تمھارے ساتھ ہوں گے، تمھارے خلاف نہیں۔ گرفتار کرانے کا کیا سوال! وہ تمھیں بچائیں گے اور اسی طرح جیسے میں نے بچایا تھا۔" وہ بولی۔

میں نے جواب نہیں دیا۔ میرا ذہن شدید اُلجھن کا شکار ہو گیا تھا... دھڑکتا ہوا دل کہتا تھا کہ یہ لڑکی تم کو دھوکا دے سکتی تو اپنی جان نہ دے سکتی۔ عقل کہتی تھی کہ عورت کی فطرت کو سمجھنے کا دعوے کرنا حماقت ہے اور جو عورت محبت کی انتہا میں جان دے سکتی ہے، وہ جان کا نذرانہ لے بھی سکتی ہے۔ اس کی انا مجروح ہوتی ہے تو عشق کے جذبے کی تسکین انتقام سے ہوتی ہے۔ میں گاڑی کو مال روڈ پر سیدھا چیرنگ کراس سے بھی آگے تک لے آیا تھا اور اب گورنر ہاؤس بھی پیچھے رہ گیا تھا۔ مجھے محسن کا خیال تھا مگر یہ بھی یقین تھا کہ وہ کم سے کم آدھا گھنٹا میرا انتظار ضرور کرے گا، چنانچہ میں فورٹریس اسٹیڈیم سے پہلے ہی پُل کے قریب سے واپسی اختیار کرنا چاہتا تھا۔ نازو سے گفتگو کے دوران میں مجھے بالکل احساس نہیں ہُوا کہ کوئی میرے تعاقب میں ہے۔ نازو سے یوں غیر متوقع اور سرِ راہ ملاقات ایک ایسا جذباتی حادثہ تھا جس نے مجھے گرد و پیش سے بے خبر کر دیا تھا۔ پھر

نازو کا ردِ عمل اتنا شدید تھا کہ اسے ہسٹریا سے بچانے کی جدوجہد میں مجھے اور کسی بات کا ہوش نہ رہا۔ ہوش مجھے اس وقت آیا، جب ایک جیپ نے اچانک سامنے آکر میرا راستہ روکا۔ کھلی جیپ میں ڈرائیور کے ساتھ ایک شخص بیٹھا تھا۔ وہ کُود کر میرے سامنے آگیا۔ باقی دو اطمینان سے اُترے۔

اگر میں ڈرائیونگ نہ کر رہا ہوتا تو شاید کچھ پھُرتی کا مظاہرہ کرتا اور ریوالور نکالتا مگر بریک لگانے اور گاڑی کو سنبھالنے کی کوشش میں مجھے بالکل مہلت نہ ملی۔ وہ نہ جانے کب سے ہمارے پیچھے تھے اور شاید اسی انتظار میں تھے کہ گورنر ہاؤس سے آگے مال روڈ کا نسبتاً غیر آباد علاقہ شروع ہو تو ہمارا راستہ روکیں۔ پہلے اُترنے والے کو میں نے پہچان لیا۔ وہ دلاور کا پی اے تھا اور اس کے ہاتھ میں ریوالور نہیں، اسٹین گن تھی۔

"ہوشیار نازو، اب جو کچھ کرنا ہے تمھیں کرنا ہے۔" میں نے کہا اور دونوں ہاتھ اٹھا کے باہر نکل آیا۔ بعد میں اُترنے والوں میں سے ایک نے نازو کو باہر کھینچ لیا۔ وہ میرا نام لے کر یوں چلائی جیسے مدد کے لیے پکار رہی ہو مگر وہ چاہتی تو پلک جھپکتے میں دونوں کو ہڈی پسلی توڑ کے ڈال سکتی تھی۔

"اس لڑکی کو میرے پاس لے آؤ۔" اسٹین گن والا بولا۔ "تم دونوں اس کی تلاشی لو، ذرا دھیان سے۔"

بعد میں اُترنے والوں میں سے ایک نے جھٹکا دے کر نازو کو بازو سے کھینچا اور دلاور کے سیکریٹری کے ساتھ کھڑا کر دیا۔ دوسرے نے میری جامہ تلاشی لی اور دونوں ریوالور نکال لیے۔

"ان میں سے ایک میرا ہے۔" میں نے دلاور کے سیکریٹری سے کہا۔ "دوسرا تمھارے باپ... میرا مطلب ہے صاحب کا۔"

"تم کو تفکر ہونے کی ضرورت نہیں۔" وہ درشت لہجے میں بولا۔

"میں سمجھتا تھا کہ میرے کارخانے میں تم ہی ایک شریف آدمی ہو۔" میں نے کہا۔ "مگر تم دلاور کے پی اے ہو تو شریف آدمی کیسے ہو سکتے ہو۔ اس کے کسی بھی آدمی کو شریف سمجھنا..." میری بات نامکمل رہ گئی۔ نازو نے جو مناسب موقعے کی منتظر تھی، ہاتھ جوڑ کے رونا دھونا اور منت سماجت کرنا شروع کیا اور ان سے التجا کرنے لگی کہ مجھے چھوڑ دیا جائے۔

"چھوڑ دیں کیسے دیں بلبل جان؟" دلاور کا پی اے بولا۔ "تمھاری ہی مہربانی سے تو یہ شکار ہاتھ لگا ہے۔ میں نے اسے بہت پہلے ایک بار تمھارے ساتھ دیکھا تھا۔ آج اگر تم نے اس کا نام نہ لیا ہوتا تو میں کبھی نہ پہچان سکتا۔ یہ میری خوش قسمتی یا اس کی شامتِ اعمال ہے کہ اسی جگہ میں بھی موجود تھا۔"

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" ایک شخص نے بالآخر وہاں کار روک کر سوال پوچھنے کی ہمت کی ورنہ اس وقفے میں کم سے کم چار دوسری گاڑیاں گزر چکی تھیں اور یا تو ڈرائیوروں نے اپنے انہماک میں سڑک کے کنارے ہونے والی اس غیر معمولی کارروائی پر غور ہی نہیں کیا تھا یا وہ عمداً جان بچا کے نکل گئے تھے۔ اسٹین گن کا نظارہ بڑے بڑے سورماؤں کا دم خشک کر دیتا ہے۔

"تمھارے باپ کی شادی ہو رہی ہے۔" دلاور کا پی اے دہاڑ کر بولا اور اس نے اسٹین گن کا رُخ کار والے کی طرف کیا۔ "دفع ہو جاؤ ورنہ تمھارا چہلم ہو جاتے گا۔" کار والا سخت بدحواسی کے عالم میں فرار ہوا لیکن اس کی مداخلت نے نازو کو موقع فراہم کر دیا۔ ابھی تک اسٹین گن کا رُخ میری طرف تھا۔ ایک سیکنڈ کے لیے رُخ بدلا تو نازو بجلی کی طرح حرکت میں آئی۔ اس نے ایک ایڑی پر گھوم کے دوسری لات اٹھائی اور یہ لات پوری رفتار کے ساتھ اسٹین گن والے کے پیٹ سے ذرا اوپر یوں لگی کہ وہ اچھل کر پیچھے گرا اور اس کے ہاتھ سے اسٹین گن نکل گئی۔ ایک مسلسل حرکت میں نازو نے دلاور کے پی اے کو زمین تک پہنچنے سے قبل ہی ہاتھ پکڑ کے گھما دیا اور وہ بلبلا کے اپنی ہی قوت میں سیدھا گیا اور جیپ کے عقبی حصّے سے ٹکرایا۔ اسٹین گن اس سے ذرا دیر پہلے کھلی جیپ میں گری تھی۔ دونوں آوازیں میں نے اس وقت سنیں جب میں اپنی جامہ تلاشی لینے والے کو اوپر اٹھا کے زمین پر مار چکا تھا۔ میری نظر شروع سے نازو پر تھی۔ چنانچہ اس کے حرکت میں آتے ہی میں بھی یوں جھپٹا تھا جیسے نازو کو اور مجھے ایک ہی اسپرنگ کی قوت نے روک رکھا تھا۔ مجھ سے ریوالور لینے والا دونوں ریوالور جیب میں رکھ رہا تھا اور مطمئن تھا کہ وہ خود محفوظ ہے کیونکہ میں اسٹین گن کی زد میں تھا۔ وہ بے خبری میں مارا گیا اور میں نے اسے ضرورت سے زیادہ مشتعل ہو کے پھینکا تو وہ اٹھ نہ سکا۔ اس کا سر بڑے غلط طریقے پر فٹ پاتھ کے اونچے کنارے پر لگا اور غالباً اسی جھٹکے نے اس کی گردن توڑ دی۔ دلاور کا پی اے بھی اتنی دیر میں جیپ کے پچھلے ٹائروں کے قریب لمبا لیٹ چکا تھا۔

"تم جاؤ سکندر!" نازو نے چلّا کے کہا، کیونکہ کچھ فاصلے پر گاڑیاں رُکنے لگی تھیں۔

میں تیسرے شخص سے نمٹنا چاہتا تھا مگر اچانک مجھے احساس ہوا کہ وہ نہتا ہے۔ اگر اس کے پاس بھی کوئی ریوالور یا پستول ہوتا تو وہ اتنی دیر میں مجھے شوٹ کر دیتا یا نازو کو گولی مار دیتا۔ غالباً وہ ڈرائیور تھا اور اس نے ایک اسٹین گن اور ایک ریوالور رکھنے والے دو محافظوں کی موجودگی میں خود کو مسلح رکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی ہو گی مگر ایک منٹ میں اس کے دونوں محافظ اسلحے سے بھی محروم ہو گئے اور ہوش و حواس سے بھی تو وہ بھاگا۔ پھر بھی اس نے دیر کر دی۔ پہلے تو کچھ دیر اسے یقین بھی نہ آیا ہو گا کہ جو کچھ اس کی آنکھوں نے دیکھا ہے وہ نظر کا دھوکا نہیں ہے اور ایک نازک سی اور بہت حسین لڑکی نے خالی ہاتھوں سے اسٹین گن لے کر آنے والے جوان اور صحت مند آدمی کا پٹڑا کر دیا ہے۔ نازو کی ایکشن کام کر گئی تھی اور اسے کمزور سمجھ کر نظر انداز کرنے کا انجام سب کے سامنے تھا۔ تیسرے شخص کو نازو نے ٹانگ پکڑ کر جیپ میں سوار ہونے سے پہلے ہی کھینچ لیا تھا۔

"خدا کے لیے تم جاؤ۔" نازو نے پھر چلّا کے کہا اور میں نے محسوس کیا کہ میں واقعی خطرے میں گھرنے لگا ہوں۔ نازو کے لیے تیسرے آدمی سے نمٹنا مشکل نہیں تھا لیکن اس وقت پولیس آ جاتی یا فرار کا راستہ مسدود ہو جاتا تو زیادہ پریشانی میرے لیے پیدا ہوتی۔ میں جلدی سے اس شخص کی طرف لپکا جو فٹ پاتھ کے پاس پڑا تھا۔ اس کی جیب سے دونوں ریوالور نکالتے وقت مجھ کو احساس ہوا کہ گردن ٹوٹ جانے کے باعث وہ مر چکا ہے۔ میں نے اس کا ریوالور بھی نکال لیا اور جیپ کی طرف بھاگا۔ اچانک تیسرا شخص درد سے چلّایا اور میں نے دیکھا کہ نازو نے پے در پے وار کر کے اس کے ہاتھوں پیروں کو ناقابلِ استعمال بنا دیا ہے۔ غالباً اس کا دایاں بازو ٹوٹ گیا تھا اور بڑے مضحکہ خیز طریقے سے کندھے پر لٹک رہا تھا۔ وہ دوسرے ہاتھ سے گھٹنا پکڑے چیخ رہا تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ نازو نے جوتی کی نوک پر رکھتے ہوئے چپنی کی ہڈی کا بھی ملبہ کر دیا ہے۔

"میں ان بدمعاشوں کو پولیس کے حوالے کر دوں گی۔" نازو میرے قریب آ کر بولی۔ "تمھارا نام بھی نہیں آئے گا لیکن مجھ سے رابطہ رکھنا۔"

"میں جیپ لے جا رہا ہوں۔" میں نے سر ہلا کے نازو کو خدا حافظ کہا اور آخری وقت میں آنے والے ایک خیال کے تحت دلاور کے پی اے کو سڑک پر سے اٹھا کے جیپ میں ڈال دیا۔ چابیاں انجن میں ہی لگی ہوئی تھیں چنانچہ میں نے سیٹ پر بیٹھتے ہی جیپ کو اسٹارٹ کر دیا۔ دور دور کھڑی ہو جانے والی بہت سی گاڑیوں سے اترنے والے اب اکٹھے ہو کر دوڑنے ہوئے آ رہے تھے، چنانچہ واپسی اختیار کرنے کے بجائے میں نے جیپ کو سیدھا آگے بڑھا دیا۔ کچھ لوگ مجھے بھی مشتبہ سمجھ کے اس غلط فہمی کا شکار ہو گئے کہ میں بھی ایک لڑکی پر حملہ کرنے والوں کا ساتھی ہوں اور اب فرار ہو رہا ہوں۔ ان میں سے کچھ "پکڑو۔ پکڑو" چلّانے لگے۔ ایک نے چلتی جیپ میں چڑھ کر مجھے روکنے کی کوشش کی۔ میں نے سیدھے ہاتھ کے وار سے وہ سڑک پر گرا۔ وہ بیوقوفی کی حد تک آدمی تھا یا ایک خوبصورت لڑکی کے سامنے ہیرو بن کے اپنی قسمت کو جگانا چاہتا تھا۔ بہر صورت مجھے اس کو گرا کے افسوس ہوا۔ جیپ کی رفتار خاصی بڑھ چکی تھی۔ چنانچہ اسے سڑک پر گرنے سے چوٹ آئی ہو گی۔ وہ پیچھے آنے والی کسی بھی گاڑی کے نیچے آ سکتا تھا یا خود اسی جیپ کے پہیوں کے نیچے آ سکتا تھا جسے میں چلا رہا تھا۔ آگے سڑک صاف تھی چنانچہ میں نے جیپ کو جیٹ طیارے کی رفتار سے دوڑایا اور پانچ منٹ میں فورٹریس اسٹیڈیم سے آگے نکل کے بائیں جانب مُڑ گیا۔ پھر انفنٹری روڈ آ گیا اور میں اسی پرانے راستے سے گزرا جس پر سے ہزار بار گزر چکا تھا۔ دھرم پورے کی نہر کا پل پار کر کے میں گڑھی شاہو کی طرف گیا تو بے اختیار میری نظر بائیں طرف گئی، جدھر بانسوں والی سڑک پر انکل رضوی کا گھر تھا اور میں نے سوچا کہ کیا اب تک استاد ٹیڈی نے رابعہ کو انکل رضوی کے گھر پہنچا دیا ہو گا۔

بغل میں کپڑوں کا بنڈل دبائے محسن جی پی او کے گیٹ سے کچھ فاصلے پر ٹہل رہا تھا کہ میں نے جیپ اس کے سامنے جا روکی۔ وہ چونک کر پیچھے ہٹا اور کچھ دیر مجھے احمقوں کی طرح دیکھتا رہا۔ یوں جیسے اسے شک ہو کہ میرا حلیہ بدل کے کوئی اور اس کے سامنے آ گیا ہے۔

"یہ تیرا آدھا گھنٹا ہوا ہے؟ اُلّو کے پٹھے۔" وہ ایک دم پھٹ پڑا۔

"پہلے بیٹھ جا آرام سے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "دیکھ تیرے لیے کیا شاہی رتھ لے کر آیا ہوں۔ تُو پیدل جوتیاں چٹخاتا پھر رہا تھا۔ ہم نے سوچا یار کے لیے اتنا تو کریں۔"

"اس وقت ہمارے پروگرام میں کسی سے جیپ چھیننا نہیں تھا۔" وہ بیٹھتے ہوئے بولا۔

"ہاں، پروگرام تو نہیں تھا۔" میں نے کہا۔ "لیکن میرے ماموں سسر ہیں نا بڑے پیسے والے اور بہت فراخدل ہیں۔ انھوں نے جیپ بھجوا دی تو میں کیسے انکار کرتا۔ بہت محبّت کرتے ہیں مجھ سے۔ تُو نے سُنا ہو گا ان کا نام، چوہدری دلاور کہلاتے ہیں۔" میں نے گاڑی کو میکلوڈ روڈ کی طرف موڑ لیا۔

"یہ دلاور کی جیپ ہے؟" محسن بولا۔ پھر اس کی نظر پیچھے گئی اور وہ بھونچکا رہ گیا۔

"اب تو کوئی شک کی بات نہیں رہی نا، یہ دلاور کا پی اے ہے۔" میں نے مسرّت سے کہا مگر محسن کچھ نہیں بولا۔ وہ دلاور کے پی اے کو پہچانتا تھا۔ جیپ میں اسے پڑا دیکھ کر بھی وہ اتنا ہی حیران تھا جتنا اس کے جسم کے نیچے دبی ہوئی اسٹین گن کو دیکھ کر۔

"تُو نے آدھے گھنٹے میں جھک مار کے کیا خریدا۔... دو لنگیاں، دو کُرتے، دو جوتے۔" میں نے کہا۔ "اور ہم اتنی دیر میں کیا غضب کے تحفے اٹھا لائے۔ ایک اسٹین گن، ایک ریوالور، ایک جیپ اور ایک پی اے۔ سب بالکل اصلی اور بے حد کارآمد۔ اس کے علاوہ ہم نے ایک گل بدن، گل پیرہن، غنچہ دہن، شیریں سخن سے بھی ملاقات کی۔ کچھ دُور کار پر اس کے ساتھ مال روڈ پر سیر کی، پھر..."

"سیدھی طرح بتا تُو کہاں گیا تھا؟ یہ سب کیا ہے؟" محسن نے بھنّا کے کہا۔ میں نے اسے آدھے گھنٹے کے بجائے ایک گھنٹے میں واپس آنے کے اسباب و واقعات اور نتائج سے آگاہ کیا اور کم سے کم الفاظ میں اسے نازو سے ملنے اور اس کو چھوڑ کر آنے تک کی ساری کہانی کہہ دی۔

"اس نے پھر تجھے بچا لیا اور خود مصیبت میں پڑ گئی۔" محسن نے افسوس سے کہا۔

"وہ مصیبت میں نہیں پڑے گی۔" میں نے کہا۔ "مصیبت میں وہ شخص گرفتار ہو گا جس کو نازو نے چکنا چُور کر دیا ہے۔"

"معاملہ تھانے کچہری تک جائے گا کیونکہ ایک آدمی مر گیا ہے۔" محسن متفکر ہو کے بولا۔

"مگر یہ قتل نہیں کہلائے گا۔" میں نے کہا۔ "ایک لڑکی پر دو غنڈوں نے کار روک کر حملہ کیا تھا۔ لڑکی کراٹے جانتی تھی۔ اس نے خود کو بچایا تو کوئی غلطی نہیں کی۔"

"وہاں لوگ بھی تو جمع ہوتے ہوں گے۔" محسن بولا۔ "جنھوں نے تجھے دیکھا ہو گا اور اس جیپ کو۔"

"ہاں، ممکن ہے نمبر بھی نوٹ کیا ہو۔" میں نے کہا۔ "اس سے ہماری صحت پر کیا اثر پڑتا ہے۔ معلوم ہو ہی جائے گا کہ جیپ کس کی تھی۔ سب نے یہی سمجھا ہو گا کہ جیپ میں تین افراد تھے جو غالباً لڑکی کو اغوا کر کے لے جانا چاہتے تھے۔ ان میں سے ایک مارا گیا، ایک پکڑا گیا اور تیسرا جیپ لے کر بھاگ گیا۔ بھاگنے والے کو صرف ایک شخص نے قریب سے دیکھا تھا۔ چنانچہ اس کا حُلیہ بھی وہی بیان کرے گا۔ ظاہر ہے یہ حُلیہ نہ مفرور ملزم سکندر بخت کا ہو گا نہ اس کے ساتھی محسن خان شبیر وانی کا۔ نازو صرف دلیر اور حوصلہ مند ہی نہیں ذہین بھی ہے۔ وہ پولیس کو کنفیوز کرے گی اور مجھے محفوظ رکھنے کے لیے بالکل مختلف حُلیہ بتلائے گی اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ کچھ نہ کرے۔ تشہیر اور خواہ مخواہ کے اسکینڈل سے بچنے کے لیے سب کو چکّر دے کر نکل جاتے۔ مددگار اور ہمدرد سر کھجاتے رہ جائیں کہ وہ لڑکی تھی یا چھلاوا۔ اب وہ پولیس کو کیا بتائیں کہ کیا ہوا تھا۔ کیوں ہوا تھا اور کس کے ساتھ ہوا تھا۔"

"اس کی گاڑی کا نمبر تو کسی نے دیکھا ہی ہو گا۔" محسن بولا۔

"جب میں نے نہیں دیکھا تو اور کسی نے کیا دیکھا ہو گا۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "نازو اپنی جان بچا کے فرار ہو گئی تو ایسے نہیں ہوئی کہ پھر

پھنس جائے۔ اگر ایک بار وہ جائے واردات سے غائب ہو گئی تو پھر وہ ہاتھ نہیں آئے گی۔ کوئی لاکھ کہے وہ صاف مُکر جائے گی۔ نہ وہ کہیں گئی تھی، نہ کسی سے ملی تھی اور نہ اس پر جیپ میں سوار تین غنڈوں نے حملہ کیا تھا۔ وہ کوئی اور ہو گی۔ چشم دید گواہوں کو چشمے لگا کے دیکھنا چاہیے تھا۔ اسے سچا ثابت کرنے والے بہت ہیں۔"

"چل وہ تو ٹھیک ہے مگر اب اس سب کا کیا کریں؟" محسن نے کہا۔ "تو جو اتنا مالِ غنیمت سمیٹ لایا ہے یہ کہاں لے جائیں؟ اتنا اسلحہ جس میں ایک اسٹین گن بھی ہے اور اس لاش کو لے کر ہم زمیندار ہوٹل میں نہیں جا سکتے۔ یہ جیپ بھی خطرناک ہے۔ اسے بہت دُور چھوڑنا چاہیے۔"

"باغ جناح چلتے ہیں۔" میں نے تجویز پیش کی۔ "وہاں اس وقت کوئی نہیں ہو گا۔ لباس بھی بدل لیں گے۔ اپنا اسلحہ پرانے کپڑوں میں لپیٹ لیں گے۔ اور جیپ وہیں چھوڑ آئیں گے۔"

"اس آدمی کا کیا ہو گا؟ اگر اسے ہوش آ گیا تو ——"

"ہوش آ گیا تو پھر بے ہوش کر دیں گے۔" میں نے کہا۔ "یہ بہت کام کا آدمی ہے۔ دلاور کا پی اے۔ وہ سب جانتا ہو گا جو ہم معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ اس کو تفتیش کے لیے محفوظ رکھنا ضروری ہے۔ چوہدری دلاور کے لیے اس سے بڑی پریشانی کی بات کیا ہو سکتی ہے کہ اس کا سیکرٹری اسٹین گن اور دو محافظوں کی موجودگی میں اغوا کر لیا جائے۔ اور وہ بھی اسی کی جیپ میں۔"

"اسے معلوم ہو جائے گا کہ اس کی ذمے دار ایک لڑکی تھی۔ وہ لڑکی اب محفوظ نہیں رہی سکندر۔" محسن بولا۔

"یہ واقعی پریشانی کی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ معذور ہو کے گرفتار ہونے والے کو پولیس سے چھڑا کے لے جائیں گے اور قتل کرنے سے پہلے اس سے سب پوچھ لیں گے کہ لڑکی کون تھی۔ کیسی تھی، کس کے ساتھ تھی، دونوں کا حلیہ کیا تھا۔ وہ کہاں سے آئی تھی اور کدھر جا رہی تھی۔ گاڑی کا نمبر یاد رہا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں مگر اس معذور شخص نے یہ بتا دیا کہ گاڑی کون سی تھی، رنگ اور ماڈل وغیرہ کی تفصیل دے دی۔ تب بھی چوہدری دلاور کے لیے نازو کو تلاش کرنا دشوار نہیں ہو گا۔ اس شہر میں اس رنگ کی کتنی فیئٹ ۔۔ ۲ ہوں گی؟ اور اُن کو چلانے والی لڑکیاں کتنی ہوں گی؟ پھر ان میں سے کتنی جوڈو کراٹے کی ایسی ماہر ہوں گی؟ — شاید نازو کے سوا کوئی نہیں —"

"میں نے کہا تھا نا کہ مجھے بچانے کے لیے وہ مصیبت میں پڑ گئی۔"

"نہیں محسن۔ اب خواہ مجھے خود کو دلاور کے حوالے کرنا پڑے، نازو پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔" میں نے کہا اور گاڑی کو شملہ پہاڑی سے ذرا آگے دائیں طرف موڑ کے کھڑا کر لیا۔ پہلے میں اپنے نئے کپڑے لے کر ایک جھاڑی کے پیچھے چلا گیا۔ پیلا قمیص کی جگہ لُنگی اور کُرتا اور بُوٹ کی جگہ پشاوری چپل پہن کر میں نے آئینہ دیکھا تو حیران رہ گیا۔ جیپ کے باہر لگے آئینے میں ایک دیہاتی نظر آ رہا تھا جس کے گھنگھریالے بال مہندی رنگ کے تھے۔ اسی رنگ کی داڑھی کے ساتھ وہ کھدر کے ڈھیلے ڈھالے کُرتے اور نیلی دھاریوں کے چیک ڈیزائن کی لُنگی باندھے پچاس سال کا بوڑھا آدمی نظر آتا تھا۔ ناک نقشے میں تبدیلی کا تاثر اس لباس میں مکمل طور پر بدل گیا تھا۔ موسیٰ بھائی نے یہ رنگ رُوپ بدلتے وقت جو ہدایات دی تھیں وہ کتنی اہم تھیں اس کا اندازہ مجھے اب ہو رہا تھا۔ قمیص پتلون میں صرف میرا چہرہ بدلا تھا۔ لباس کے بدلتے ہی میری پوری شخصیت میں انقلاب آ گیا۔ اور خود محسن نے ہنستے ہنستے اعتراف کیا کہ مجھے رالو نہیں پہچان سکتی۔ کچھ دیر میں وہ بھی میری دُوسری کاپی بن کے آ گیا تو ایک دُوسرے کے مقابل کھڑے ہو کر ہم نے موسیٰ بھائی کے کمال کا اعتراف کیا۔ ایک سے لباس میں ہم دونوں کے درمیان فرق محسوس کرنا آسان نہیں تھا اور ہم میں سے کوئی بھی ایک دُوسرے کی جگہ لے سکتا تھا لیکن ضرورت پڑنے پر میں اپنے نقلی سونے کے دانت دکھا کے فرق کو واضح کر سکتا تھا۔ پرانے کپڑوں کو ہم نے جیپ میں ڈال لیا اور وہاں سے چل پڑے کیونکہ اِکّا دُکّا راہگیر ہمیں بڑی دل چسپی اور حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے کوئی قریب آ جاتا تو اسے جیپ میں لاش کی طرح پڑا ہوا ایک آدمی بھی نظر آ جاتا۔ اور ہمارا آتشیں اسلحے کا ذخیرہ بھی۔ میں نے جیپ کو ریس کے گھوڑے کی طرح دوڑایا اور محسن نے جیپ کی تلاشی لی مگر اس میں کاغذات نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ شاید اسے لانے والے محتاط تھے کہ جیپ پکڑی جائے تو وہ نہ پکڑے جائیں۔" محسن بولا۔

"تیرا خیال بالکل غلط ہے۔" میں نے کہا۔ "جب دلاور کے پی اے نے مجھے دیکھا تھا تو وہ کسی مشن پر نہیں تھا۔ میرا ملنا محض اتفاقی تھا ورنہ وہ اپنے کسی کام سے نکلے تھے چنانچہ یہ فرض کرنا غلط ہے کہ گاڑی انھوں نے کسی اور سے لی ہو گی۔"

"کیا وہ اسی طرح اسٹین گن لے کر شہر میں گھومتے تھے؟" محسن نے کہا۔

"جیسے ان کے دھندے ہیں ویسے ہی حفاظتی انتظامات بھی ہیں۔" میں نے کہا۔ "خطرناک کام کرتے ہیں تو خطرے سے نمٹنے کے اسباب بھی رکھتے ہیں۔ اب یہ بہت ضروری ہے کہ ہم جلد از جلد اس جیپ سے نجات حاصل کر لیں۔ چوہدری کے کتے شہر بھر میں پھیل گئے ہوں گے اور جیپ کو ڈھونڈ پھر رہے ہوں گے۔"

محسن نے اپنی سیٹ کو ہٹا کے دیکھا۔ اس کے نیچے پلاسٹک پیپر میں لپٹا ہوا ایک پیکٹ تھا۔ محسن نے پلاسٹک ہٹایا تو اندر سے کاغذ کا ایک لفافہ نکلا۔ ایک ایک کر کے محسن نے اس میں سے نوٹوں کی چار گڈیاں نکالیں۔

"چالیس ہزار روپے!" محسن نے حیرت اور مسرت سے سیٹی بجائی۔ "تیرے ماموں سُسر واقعی تجھ پر بہت مہربان ہیں اور تیری ہر ضرورت پوری کرتے ہیں۔"

"اللہ بڑا کارساز ہے محسن خان۔" میں نے کہا۔ "اب یہ ضروری نہیں رہا کہ ہم زمیندار ہوٹل میں جائیں۔ اتنا اسلحہ اور ایک بے ہوش آدمی ساتھ لے کر ہم وہاں جاتے بھی کیسے۔ اب کوئی ٹھکانا تلاش کرنا ہو گا جہاں ہم بھی رہ سکیں اور یہ سب بھی ہمارے ساتھ رہے۔" اچانک مجھے اپنے دائیں ہاتھ پر "کرائے کے لیے خالی ہے" کا نوٹس نظر آیا جو لکڑی کے پرانے دروازے پر کسی نے چاک سے لکھا تھا۔ دروازہ ایک پرانی اینٹوں سے بنی ہوئی بیرک جیسی عمارت کا تھا جو تقریباً ساٹھ فٹ لمبی اور تیس فٹ چوڑی تھی۔ اس کے اوپر ورکشاپوں جیسی ڈھلوان چھت تھی۔ اور چوڑائی کے رُخ جو سڑک کی طرف تھا، بیک وقت دو نام لکھے ہوئے تھے۔ ایک عبارت کسی پینٹر نے انگریزی کے نیلے حروف سے لکھی تھی۔ اور یہ بتاتی تھی کہ اس جگہ کوئی آرا مشین رہی ہو گی۔ بیشتر حروف مٹ رہے تھے یا مٹ چکے تھے۔ دوسری عبارت بدصورتی کا شاہکار تھی اور غالباً کسی پرائمری فیل نے بقلم خود لکھی تھی۔ "یہاں ہر قسم کا فرنیچر بنایا جاتا ہے۔" یہ تحریر سیاہ تارکول کی تھی چنانچہ پڑھی جاتی تھی۔

"کیا خیال ہے محسن؟" میں نے جیپ روک کر کہا۔ "یہ کچھ تائیدِ غیبی نہیں ہے؟"

"یہ جگہ ہر لحاظ سے ہماری ضروریات کے سارے تقاضے پورے کرتی ہے۔" محسن نے کہا۔ "لیکن سوال یہ ہے کہ ہم بات کس سے کریں۔ خیر، میں نیچے اُتر کے دیکھتا ہوں۔"

وہ علاقہ ملتان روڈ کا تھا لیکن زیادہ آباد نہیں تھا۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مجھے اسی قسم کی بہت سی تعمیرات نظر آئیں جن میں چھوٹی چھوٹی گھریلو صنعتوں کا سلسلہ تھا مگر لکھنے والوں نے ان پر فیکٹری اور مل کے نام بھی لکھ مارے تھے۔ رہائشی مکان ان سے الگ نہیں تھے چنانچہ وہ رونق یہاں نظر نہیں آتی تھی جو صرف رہائشی آبادیوں میں ہوتی ہے۔ مجموعی طور پر یہ علاقہ ویران لگتا تھا۔ میں نے محسن کے جانے کے بعد اپنی سیٹ ہٹا کے دیکھی اور یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ اس کے نیچے اسٹین گن کے راؤنڈ رکھے ہوئے ہیں۔ میں نے سیٹ کو پھر برابر کر دیا۔ زیادہ باعثِ تشویش وہ شخص تھا جو پیچھے بے ہوش پڑا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھ کر اسٹین گن نکالی اور احتیاط کے ساتھ آگے والی دونوں نشستوں کے درمیان رکھ دی۔ اس کے اوپر میں نے وہ کپڑا پھیلا دیا جو گاڑی کو صاف کرنے کے لیے رکھا گیا تھا پھر میں نے دلاور کے سیکرٹری کو ہلا جُلا کے سیدھا کیا۔ اور اس کا سرسری میڈیکل چیک اَپ کرنے کے لیے نبض کی رفتار دیکھی جو قدرے سُست تھی لیکن دل کے دھڑکنے کا عمل نارمل تھا۔

"خیر ہے نا پُتر؟" کسی نے بہت قریب سے کہا۔ "کی ہو یا اے ایہنوں؟"

میں نے چونک کر خمیدہ کمر بوڑھے کو دیکھا۔ "کچھ نہیں چاچا۔ بیمار اے۔ اسپتال لے جا رہے آں۔"

"اچھا ایچھا، رب خیر کرے گا۔" بوڑھے نے جاتے جاتے کہا۔ اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ کوئی شکی مزاج پولیس مین نہیں تھا۔ ورنہ میرے لیے اس کو مطمئن کرنا مشکل ہو جاتا۔ آدھے گھنٹے تک میں یوں بیٹھا رہا جیسے واقعی کسی بیمار شخص کا تیمار دار ہوں۔ انتظار مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا تھا اور محسن نہ جانے کدھر غائب ہو گیا تھا۔ میں نے چار افراد کو اسی طرح مطمئن کیا۔ اُن میں سے ایک زیادہ متجسس تھا اور اس نے مجھ سے یہ بھی پوچھا کہ بیمار کو کیا بیماری ہے، میں اسے لے کر سڑک پر کیوں کھڑا ہوں؟ کس ڈاکٹر کے پاس لے جا رہا ہوں، جیپ کا ڈرائیور ایسی حالت میں گاڑی چھوڑ کر کہاں چلا گیا ہے اور کیوں چلا گیا ہے، مریض بے ہوش ہے کہ سو رہا ہے؟ میں نے اس کو بھی اطمینان بخش جوابات دے کر چلتا کیا۔ دُھوپ اب تیز ہو گئی تھی اور مجھے یہ اندیشہ بھی لاحق ہو چلا تھا کہ کہیں بیمار کو ہوش نہ آ جائے۔

بالآخر محسن ایک پستہ قد اور موٹے آدمی کو ساتھ لیے نمودار ہوا۔ اُس نے قفل کھولا اور وہ دونوں اندر غائب ہو گئے۔ محسن نے عمداً میری طرف نہیں دیکھا تھا تاکہ میرے اور اُس کے درمیان کسی قسم کا تعلق ثابت نہ ہو۔ اور وہ جیپ پر غور نہ کر پائے۔ پستہ قد اور موٹا شخص یقیناً لینڈ لارڈ تھا اور محسن کی جستجو کامیاب رہی تھی۔ میں نے دعا مانگی کہ ان کے مذاکرات بھی کامیاب رہیں۔ دعا فوراً قبول ہُوئی اور وہ دونوں باہر نکلے تو موٹا آدمی بہت خوش تھا۔ اس نے دروازہ بند کر کے قفل کی چابی محسن کے ہاتھ پر رکھ دی اور وہ جدھر سے آئے تھے واپس اُدھر ہی چلے گئے۔ انتظار کے اگلے دس منٹ زیادہ صبر آزما ثابت ہُوئے پھر محسن کی صورت دکھائی دی۔

"ہو گیا مسئلہ حل۔" محسن نے پُرمسرت لہجے میں اطلاع

دی ۔" تیرے ماموں سُسر کا پیسہ کام آ گیا ورنہ معاملہ لمبا ہو جاتا۔"

"کتنے میں بات ہوتی ؟" میں نے کہا۔

"ڈیڑھ ہزار روپے ماہانہ پر۔" محسن بولا۔" بچارا سخت ضرورت مند تھا۔ پہلے کسی کو آرا مشین لگانے کی اجازت دی تھی۔ اُس نے دُنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے دن کے وقت آرا مشین چلائی، رات کو اس جگہ جعلی نوٹ چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا۔ جب چھاپا پڑا تو اس کے ساتھ مالک مکان بھی گرفت میں آیا اور بڑی مشکل سے بچا۔ اس کے بعد کسی نے فرنیچر بنانا شروع کیا تھا۔ اُس کا دھندا نہیں چلا اور وہ چھ ماہ کا کرایہ واجب الادا چھوڑ کر بھاگ گیا۔ میں نے سال بھر کا کرایہ پیشگی دیا تو ساری جرح بھول گیا ورنہ بہت پوچھ رہا تھا کہ کیا کام کرو گے؟ اور کوئی ضامن ہے یا نہیں۔ اب کہہ رہا تھا کہ کرایہ نامہ وغیرہ ہوتا رہے گا۔ دراصل مقروض ہے بچارا۔ یکمشت ملنے والے اٹھارہ ہزار کیسے چھوڑتا ہے"

"یہ بہت اچھا ہوا۔" میں نے کہا۔" اب میں یہ سارا سامان تیری تحویل میں یہاں چھوڑتا ہوں اور خود یہ جیپ لے کر جاتا ہوں۔"

"میں یہاں اکیلا کب تک انتظار کروں گا تیرا؟" محسن بولا۔" میں بھی چلتا ہوں۔"

"نہیں۔۔ ویسے تیرا دل چاہے تو تالا لگا کے اپنے لینڈ لارڈ کے پاس چلے جانا اور گپ لگا کے پھر آ جانا۔" میں نے کہا۔" میں دو گھنٹے بعد واپس آؤں گا۔ خواجہ نیک محمد کو اور اپنے تمام سامان کو ساتھ لے کر۔ صبح میں غالب کے متعلق بھی معلوم نہیں کر سکا تھا، اس کا پتا چلے تو اسے بھی بتاؤں کہ اب ہم کہاں ہیں۔ پھر نازو کی خیریت دریافت کرنی ہے۔ دونوں گئے تو اس قیدی کی حفاظت کون کرے گا۔ میں اس بات کا انتظام کر جاؤں گا کہ یہ ہوش میں آ جائے تو بھی آواز نہ نکال سکے اور ہل جُل نہ سکے مگر پھر بھی تیری نگرانی اشد ضروری ہے۔"

میں نے جیپ کو دروازے سے ملایا اور محسن نے قفل کھولا۔ جیپ میں چار ریوالور تھے۔ تین سائیلنسر والے اور ایک سائیلنسر کے بغیر۔ اسٹین گن اور اس کے راؤنڈ اندر منتقل کرتے ہوئے میں نے یوں محسوس کیا جیسے میں کسی گوریلا تنظیم کے ہیڈ کوارٹر میں ہوں۔ یہ جگہ ظاہری طور پہ اتنی ویران اور غیر نمایاں تھی کہ ہم کسی مکان کے مقابلے میں خود کو یہاں زیادہ محفوظ سمجھ سکتے تھے۔ آخر میں ہم نے دلاور کے پی اے کو منتقل کیا اور اس بات کا خاص خیال رکھا کہ کوئی دیکھنے نہ پائے۔ اسے باندھ کر ڈالنے کے لیے ہم نے اپنے اتارے ہوئے کپڑے پھاڑے۔ اس کے مُنہ میں بھی کپڑا ٹھونس کر میں نے محسن سے ایک ہزار روپے لیے اور جیپ میں روانہ ہو گیا۔ ایک میل آگے جا کے میں نے جیپ کو ایک ویران احاطے میں روکا۔ اس کے پچھلے حصے میں پٹرول سے بھرا ہوا جیری کین تھا جو پٹرول کا اضافی ذخیرہ رکھنے کے کام آتا تھا۔ دو گیلن پٹرول جیپ میں بہا کر میں نے سگریٹ لائیٹر سے ایک کاغذ جلایا اور درمیان میں رکھ دیا۔ پٹرول کی آگ بھڑکی تو میں دوسری طرف سے دیوار پھاند گیا۔ جب پٹرول ٹینک کے پھٹنے کا دھماکا سُنائی دیا تو میں اس جگہ سے سو گز دُور تھا۔ میں پیدل چلتا گیا۔ تقریباً دو میل چلنے کے بعد مجھے خالی تانگہ نظر آیا۔ تانگے والے نے آدھے گھنٹے میں مجھے مزنگ چوک پہنچایا۔ وہاں سے رکشا میں زمیندار ہوٹل تک پہنچنے میں بیس مزید منٹ صرف ہوئے۔ مجھے غالب کا خیال بھی تھا اور نازو کا بھی لیکن پہلے میں خواجہ نیک محمد عرف اُستاد ٹیڈی سے مل کر رابعہ کے متعلق معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ خیریت کے ساتھ انکل رضوی کے گھر پہنچ گئی ہے یا نہیں۔ ٹیڈی نے میری ہدایات کے مُطابق دو کمرے امیر خان کبیر خاں کے نام سے لیے تھے اور میرے انتظار میں تھا۔ وہ اپنے ساتھ تمام اسباب سمیٹ لایا تھا جو اس سے پہلے دو ہوٹلوں میں پڑا تھا۔ اس میں ٹیڈی کا وہ پُراسرار ٹین کا صندوق بھی تھا جس کے راز سے ہم ابھی تک واقف نہ ہو سکے تھے۔ جب میں ہوٹل مینجر سے پوچھ کر اُوپر گیا اور دروازہ کھول کے کمرے میں داخل ہوا تو میں نے ٹیڈی کو وہی صندوق کھولے دیکھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے صندوق کو ایک دم بند کر دیا اور اس کے اُوپر بیٹھ گیا۔ اس نے نارمل نظر آنے کی کوشش کی لیکن میری نظروں سے اس کی صورت کا تغیّر پوشیدہ نہ رہ سکا۔ وہ ایسے گھبرا گیا تھا جیسے وہ میرے صندوق کا تالا توڑ رہا تھا کہ میں نے اسے چوری کرتے پکڑ لیا۔

"کیا ہوا استاد!" میں نے کہا۔" رنگ کیوں اُڑ گیا ہے تمھارا؟ کیا ہے آخر اس صندوق میں ؟"

"قسم مولا علی کی سکندر بادشاہ۔" وہ زبردستی مسکرایا۔" تم بھی کمال باتیں کرتے ہو۔ صندوق میں کیا ہو گا بھلا سوائے پھٹے پُرانے دو جوڑوں کے ۔"

"ہمیں بھی چکر دے رہے ہو دوست۔ یہ صندوق میں نے بھی اٹھایا تھا۔ اتنا وزن تو دو سو جوڑوں کا بھی نہیں ہو سکتا اور اگر واقعی پھٹے پرانے دو جوڑے ہیں تو پریشانی کی کون سی بات ہے؟" میں نے کہا۔

"پریشان کون اُلّو کا پٹھا ہے۔" ٹیڈی نے بیزاری سے کہا۔" اور اگر پریشانی ہے تو اس کی وجہ تم ہو کہ مجھے یہاں بھیج دیا اور بھول گئے۔ اب کہاں جاؤں اور کس سے معلوم کروں تمھارا پتا؟"

"چلو ناراضگی چھوڑو۔۔ میں تم کو ساتھ لے جانے آیا ہوں۔" میں نے کہا۔" ہوٹل ہوٹل کب تک بھٹکتے رہیں گے۔ اس بار ایسا محفوظ انتظام کیا ہے کہ کوئی وہاں نہیں پہنچ سکتا۔ صبح سے اب تک جو کچھ کیا ہے، اس کی تفصیل بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے یہ بتاؤ کہ رابعہ ملی؟ اُسے انکل رضوی کے گھر پہنچا دیا؟"

استاد ٹیڈی کا چہرہ بے جان ہو گیا۔ اس نے کچھ کہنے کی کوشش میں لب ہلائے مگر آواز اس کے حلق سے نہ نکلی۔ وہ نظر چرا کے دُوسری سمت دیکھنے لگا اور نروس نظر آنے لگا۔ میں نے اس کا بازو پکڑ کے ایک جھٹکا دیا اور اپنا سوال دُہرایا۔ ٹیڈی کی خوفزدہ آنکھیں پھڑ پھڑائیں پھر اس نے آہستہ سے نفی میں سر ہلایا۔

"اُس نے میری بات نہیں سنی۔" ٹیڈی نے مُردہ آواز میں کہا۔

"کیا بات نہیں مانی ؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"وہی ایس پی صاحب کے گھر چلنے کی۔" ٹیڈی بولا۔" میں نے تو بتا دیا تھا کہ سکندر نے مجھے کس لیے بھیجا ہے۔ وہ دوسری باتیں پُوچھنے لگی کہ رات کیا ہُوا تھا اور سب لوگ اس وقت کہاں ہیں۔ میں نے بتا دیا تو وہ سوچ میں پڑ گئی۔ پھر کہنے لگی۔ تم یہ سامان وغیرہ سمیٹو اور جاؤ۔ میں پہلے غالب کا پتا کروں گی اور پھر وہیں پہنچ جاؤں گی۔ غالب کو وکیل کی ضرورت پڑ سکتی ہے اور محسن یا سکندر میں سے کسی کے لیے کچھ کرنا مشکل بھی ہو گا اور خطرناک بھی۔ میں نے کہا کہ مجھے تو سکندر نے تاکید کی تھی کہ آپ کو بحفاظت رضوی صاحب کے گھر پہنچاؤں۔ تو سکندر بادشاہ معاف کرنا جو اُس نے کہا وہی میں دُہرا دیتا ہوں۔ اُس نے کہا کہ ایسی کی تیسی تمھارے سکندر بادشاہ کی اور تم ان کی تاکید بھی واپس اپنے ساتھ لے جاؤ۔ ان سے کہنا میری فکر نہ کریں، اپنی فکر کریں۔"

"اچھا۔" میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔" اس کے بعد تم اپنا بوریا بستر سمیٹ کر یہاں آ گئے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ مجھے تمھارے ساتھ یہاں سے بھی نکلنا تھا مگر رابعہ کے بخیر و عافیت لوٹ کر آنے تک میں انتظار کے سوا کچھ نہیں کر سکتا۔"

"ابھی تو یہاں آ کے بیٹھے بھی نہیں تھے۔" ٹیڈی نے فریادی لہجے میں کہا۔" اب کہاں جانا ہے ؟"

میں نے مختصراً اسے بتایا کہ محسن کہاں ہے اور کس کے ساتھ ہے۔ وہ سخت حیرت زدہ سُنتا رہا۔

"میں تو محسن سے کہہ آیا تھا کہ میں دو گھنٹے میں لوٹ آؤں گا۔" میں نے گھڑی دیکھ کر کہا۔" اب وہ بھی سوچتا رہے گا۔"

"معلوم نہیں یہ اچھا ہُوا کہ بُرا۔" ٹیڈی نے سر کھجا کر کہا۔" بے شک یہ لڑکی بھی توپ سے کم نہیں۔ قسم مولا علی کی، ہم نے تو تمھاری زبان سے اس کی باتیں اتنی سُنی ہیں کہ وہ شاہِ جنّات کی بیٹی لگتی ہے۔ اب تو ہمیں بھی شرم آتی ہے عورت کی ذات کو کمزور اور بُزدل کہتے ہوئے۔ اور اس کی ہمّت کو دیکھ کے وہ سب بھی ہمیں بس اپنی ہی طرح شہدے لگتے ہیں جو خود کو بدمعاش کہتے ہیں. . . یا کہلواتے ہیں۔"

"سچی بات نکلی ہے تمھارے مُنہ سے اُستاد۔" میں نے ہنس کر کہا۔" اصل طاقت اپنے سے کمزور پہ ہاتھ اُٹھانے کا نام نہیں۔ طاقت تو اپنے دفاع اور اپنے سے کمزوروں کی حفاظت کی صلاحیت کا نام ہے۔"

"مجھے اس لڑکی سے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا مگر اس کا بھائی بالکل اعتبار کے قابل نہیں۔ وہ اپنی بہن کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کرتا۔" ٹیڈی نے متفکر ہو کے کہا۔

"نازو نے مجھے بتایا ہے کہ وہ اب پہلے والا اکرام شیخ نہیں رہا۔ وہ ہمارا ساتھ دینا چاہتا ہے۔"

"ارے چھوڑو سکندر بادشاہ۔ میرا تو خیال ہے کہ وہ چکر دینا چاہتا ہے اپنی بہن کو بھی اور ہمیں بھی۔" اُستاد ٹیڈی نے کہا۔" ہم اس پہ بھروسا کریں اور پکڑے جائیں۔ یہی اس کا مقصد ہو گا۔"

"نہیں اُستاد! وہ استعفا بھی دے چکا ہے پولیس کی نوکری سے۔" میں نے کہا۔

"فرض کرو اس نے جھُوٹ بولا ہو اپنی بہن سے۔" ٹیڈی نے کہا۔" وہ جانتا ہے کہ بہن سے مدد کی اُمید رکھنا حماقت ہے۔ وہ ایک بار پہلے تم کو بچانے کے لیے اپنی جان دینے کی کوشش کر چکی ہے۔ قسمت اچھی تھی کہ بچ گئی ورنہ شیخ صاحب پر اپنی ہی بہن کے قتل کا الزام آ جاتا اور میں تو سمجھتا ہُوں، وہ ایسا آدمی ہے کہ عدالت میں بھی سر اُٹھا کے کہتا . . . اور اُسے کوئی شرمندگی نہ ہوتی کہ اس کی بہن اس کے فرض کی راہ میں رکاوٹ بن رہی تھی۔"

"تمھارا یہ تجزیہ غلط نہیں ہے اُستاد مگر جہاں تک مجھے معلوم ہُوا ہے، اس واقعے کا اکرام شیخ کے ذہن پر ایک منفی اثر ہُوا۔" میں نے کہا۔" آدمی فولاد کا عزم رکھتا ہو، فولادی اعصاب کا مالک نہیں ہوتا۔ نازو اس کی ایک ہی بہن تھی اور بہن بھی ایسی جس پر کوئی بھی فخر کر سکتا ہے۔ فرض شناسی کا دورہ ختم ہوتے ہی جذبات کی یلغار نے ضمیر کے صحیح فیصلے کو بھی باعثِ شرمندگی بنا دیا ہو گا۔ پھر والدین کی ملامت ہوئی اور ندامت جو نازو کو موت اور زندگی کی کشمکش سے دو چار دیکھ کر محسوس کی ہو گی۔ اُس نے کہیں اماں نہ پا کے خود کو فرض کے بارے سبکدوش کر لیا۔"

"دیکھو یار سکندر بادشاہ، ہم اتنی باریکی میں تو جاتے نہیں۔" ٹیڈی بولا۔ "موٹی عقل کے آدمی ہیں۔ فرض کرو کہ نازو کے بچ جانے کے بعد اس کے خیالات پھر تبدیل ہو گئے۔ کسی شخص کی فطرت ایسے نہیں بدلتی کہ وہ راتوں رات فرشتے سے شیطان بن جائے۔ جیسے ہم ہیں۔ آہستہ آہستہ پُرانی عادتوں کو چھوڑا... یادوں کو چھوڑا اور اب اتنے عرصے بعد سب کچھ چھوڑ کر تمہارے ساتھ ہو گئے ہیں لیکن سچی بات یہ ہے کہ پُرانی زندگی اب بھی بہت یاد آتی ہے۔"

"اکرام شیخ کی بات کرتے کرتے تم اپنی بات کرنے لگے۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"میں یہ کہہ رہا تھا کہ ہو سکتا ہے بعد میں اکرام شیخ پر اُلٹا اثر پڑا ہو۔ وہ سمجھنے لگا ہو کہ تمہاری وجہ سے اس کے ہاتھوں اپنی ہی بہن کا خون ہونے والا تھا۔" ٹیڈی بولا۔ "شرمندگی کے بعد اس نے تم کو ساری خرابی کا ذمّے دار سمجھنا شروع کر دیا ہو۔ اس کا یہ خیال بھی ہو گا کہ تمہاری وجہ سے اس کی بہن پاگل ہوئی۔ یہ پاگل پن ہی ہے نا اس کے نقطۂ نظر سے۔ وہ اسے عشق نہیں سمجھتا ہو گا اور اس کے ذہن میں یہی ہو گا کہ نازو کو اس عشق کی بیماری سے نجات دلانے کی ایک ہی صُورت ہے کہ بیماری کے سبب کو ختم کر دیا جائے۔"

"تمہارا مطلب ہے اکرام شیخ مجھے ختم کر سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ ناممکن ہے خواجہ صاحب!"

"ناممکن کچھ بھی نہیں ہوتا سکندر بادشاہ۔" ٹیڈی بولا۔ "تمہارے ساتھ رہنے کا ایک فائدہ یہ بھی ہُوا ہے کہ ہم دُنیا کی اُونچ نیچ کو تھوڑا بہت سمجھنے لگے ہیں۔ تم اپنی چھٹی حس پر بھروسا کرتے ہو اور محسن بھی ساتویں حس سے کام لیتا ہے۔ تم یہ سمجھ لو کہ ہمیں بھی ہماری آٹھویں حس..."

"آٹھویں حس!" مجھے بے اختیار ہنسی آئی۔ "اچھا خیر۔ آگے کہو، مگر پہلے کچھ کھانے پینے کو منگوا لو۔"

"بس ہمیں کچھ ایسا لگتا ہے کہ اکرام شیخ بہن کو بھی دھوکا دے رہا ہے۔" ٹیڈی نے تعمیلِ حکم کے بعد کہا۔ "اس کی مدد سے وہ تم پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ وہ تمہارا ساتھ دینے کی بات کرے اور بہن اس پر اعتبار کرتے ہوئے تم کو پھنسا دے۔ وہ ہمارا حمایتی بن کے آئے اور ہم سے سب کچھ معلوم کرنے کے بعد ہمیں ایسا گھیرے کہ ہمارے لیے نکلنے کی کوئی صُورت نہ رہے۔ یہ پولیس والے ایسے چکّر چلاتے ہیں بعض اوقات۔ نازو کو کیا پتا کہ اس نے سچ مچ استعفا دے دیا ہے یا نہیں۔ زیادہ سے زیادہ اس نے استعفے کی نقل دیکھ لی ہو گی مگر یہ نازو کیسے معلوم کر سکتی ہے کہ یہ استعفا آگے پہنچایا گیا تھا اور منظور بھی ہُوا تھا یا نہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ نازو پر اعتبار کیا جا سکتا ہے، اس کے بھائی پر نہیں۔"

"تم نے مجھے شش و پنج میں مُبتلا کر دیا ہے دوست۔" میں نے کہا۔ "میں خوش بھی ہوں کہ تم سوچنے لگے ہو اور بالکل صحیح سمت میں سوچنے لگے ہو۔ پھر بھی میرا ذہن یہ قبول نہیں کرتا کہ اکرام شیخ اس حد تک پتھر دل ہو سکتا ہے کہ ایک بار اپنی بہن کو گولی کا نشانہ بنانے کے باوجود بھی وہ شرمندہ نہ ہو اور پھر دوبارہ اُسے دُکھ دے۔"

"شرمندگی کیسی سکندر بادشاہ۔ آدمی غلط کام کر کے شرمندہ ہوتا ہے اور اکرام شیخ تو سمجھتا ہو گا کہ وہ بالکل ٹھیک کر رہا ہے۔" ٹیڈی بولا۔ "اس کے خیال کے مطابق غلطی اگر کر رہی ہے تو نازو اور نازو کو وہ ایک ناتجربہ کار اور جذباتی لڑکی سمجھتا ہو گا۔ وہ تم سے کھُلّم کھُلّا دشمنی کا اظہار کرے تو نازو اس کے مقابلے میں تمہارا ساتھ دے گی اور تمہاری مدد کرتی رہے گی لیکن وہ بہن کو قائل کر لے کہ اب وہ خود بھی سکندر کے ساتھ ہے تو تمہاری مدد کرنے والی نازو اس کی چال میں آ جائے گی اور کسی نہ کسی طرح خود ہی تم کو اس سے ملوا دے گی۔ وہ بہت بے وقوف لڑکی ہے سکندر بادشاہ۔"

"کیوں۔ اس نے ایسی کون سی حماقت کی ہے؟"

"بُرا مت ماننا۔ یہ بے وقوفی نہیں اس کی تو اور کیا ہے۔" ٹیڈی بولا۔ "کیا اُسے معلوم نہیں کہ تم کبھی اس کی محبّت کا جواب محبّت سے نہیں دے سکتے۔ پھر کیا ضرورت ہے اُسے تم سے ہی پیار کرنے کی۔ آدمی غلطی سے تو دیوار سے ٹکرا جاتا ہے مگر وہ تو جانتے بوجھتے دیوار سے سر ٹکرا رہی ہے۔ اچھی طرح سمجھتی ہے کہ اس سے دیوار کا کچھ نہیں بگڑے گا دیوار پر کوئی اثر نہیں ہو گا لیکن جو شخص عقل کے بجائے جذبات کا غلام ہو اور اس حد تک کہ اپنا بُرا بھلا بھی نہ سوچ سکتا ہو، وہ میری رائے میں بے وقوف ہے۔"

دلائل کے مطابق ٹیڈی کی بات بالکل دُرست تھی لیکن جو عشق نازو نے کیا تھا، وہ عقل کی دسترس سے بہت بالاتر تھا اور اس میں دل والوں کے لیے سب سے بڑی سند وہی دیوانگی تھی جس نے قیس بن عامری کو مجنوں کہلوایا۔ فرہاد کو تیشہ سنگ دیا کہ پتھر کے پہاڑوں سے جوئے شیر لائے اور پھر اپنے وجود سے جوئے خون بہا کے اس میں شامل کر دے۔"

"اُستاد ٹیڈی! کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی سوچ سمجھ کے عشق کرے؟" میں نے کہا۔

"پتا نہیں۔" ٹیڈی نے گڑبڑا کے کہا۔ "جب ہو گا تو پتا چلے گا۔"

"ہاں۔ میں بھی یہی کہتا ہوں کہ جب ہو گا تو پتا چلے گا۔ ابھی تم اس کو بے وقوف کہہ سکتے ہو۔ ایک تم ہی کیا، سارا زمانہ کہے گا کہ وہ بے وقوف ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس سے نازو کو ذرا بھی فرق نہیں پڑے گا۔"

"اس کے بھائی کا خیال بالکل اُلٹ ہو گا سکندر بادشاہ۔" ٹیڈی نے میری دلیل کو مسترد کر دیا۔ "وہ سمجھتا ہو گا کہ ساری خرابی سکندر بخت کی وجہ سے ہے۔ سکندر بخت نہیں ہو گا تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ نازو بھی کچھ دن روئے گی، دھوئے گی یا بھائی سے بات نہیں کرے گی۔ کھانا پینا چھوڑ دے گی اور مرنا چاہے گی لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ہر زخم بھر جاتا ہے۔ لوگ ان سب کو بھُول جاتے ہیں جن کے بغیر وہ سمجھتے ہیں کہ زندہ رہنا ہی ناممکن ہو گا۔ میں نے ان والدین کو دیکھا ہے جن کے جوان بیٹوں کو موت نے اچانک جُدا کر دیا۔ ان بیویوں کو دیکھا ہے جن کے سہرے کے پھُول مرجھائے بھی نہیں تھے کہ ان کے سہاگ اُجڑ گئے۔ میں نے ان کا غم بھی دیکھا ہے جسے دیکھ کر کلیجہ پھٹتا تھا مگر بعد میں یہ بھی دیکھا ہے کہ جو اُن کی قبروں سے لپٹ کر روئے تھے، وہ سال گزرنے سے پہلے جمعرات کے جمعرات قبر کے سرہانے چراغ جلانا بھی بھُول گئے اور دُنیا کے کاموں میں ایسے اُلجھے کہ انھیں برسی بھی یاد نہ رہی۔"

میں حیرانی سے ٹیڈی کو دیکھتا رہا۔ وہ زیادہ پڑھا لکھا تو نہیں تھا لیکن عقلِ سلیم سے بے بہرہ نہیں تھا۔ اور ذہانت تو ایک خُداداد چیز ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ اس ذہانت کے غلط استعمال میں بہت آگے بڑھ جاتا، قدرت نے اسے ہم سے ملوا دیا اور اس کی زندگی کی منزل بدل گئی۔ اپنی قوتِ مشاہدہ سے اُس نے مجھے پہلے بھی متاثر کیا تھا لیکن اس وقت تو میں قائل ہو گیا کہ وہ کسی طرح بھی ہم سے کم نہیں۔ میرے اور محسن کے پاس ڈگری تھی جو اس کے پاس نہیں تھی۔ باقی سب کچھ وہی تھا جس سے آدمی کے لیے انسان ہونے کی شرط پُوری ہوتی ہے۔ عقل و شعور، ذہانت اور شرافت، خلوص اور محبّت اور دردِ دل۔ رشتوں کے احترام کی صلاحیت اور نیکی پر یقین رکھنے کی طاقت۔

دروازے پر اُسی وقت دستک ہوئی تو میں چونکا لیکن وہ ویٹر تھا جو چائے لے کر آیا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ میں تہی دست ہوں۔ میں نے اپنے بدلے ہوئے رُوپ پر اتنا بھروسا کیا تھا کہ بے خوف و خطر خالی ہاتھ چلا آیا تھا۔ مجھے ان امکانات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے تھا کہ اس ہوٹل تک کوئی بھی شکاری، ٹیڈی کا یا رابعہ کا تعاقب کرتے ہوئے پہنچ سکتا تھا۔ ظاہری صُورت میں تبدیلی صرف ٹیڈی کی شکل میں ہوئی تھی، رابعہ وہی تھی۔ اور خُدانخواستہ کوئی اُسے پہچان لیتا تو اس کے پیچھے پیچھے ہر جگہ جا سکتا تھا۔ ایک تشویش ناک بات یہ بھی تھی کہ میرے اس بدلے ہُوئے حُلیے کو چوہدری دلاور کے کم سے کم تین آدمی دیکھ چکے تھے۔ ان میں سے ایک مر گیا تھا۔ دوسرا ہماری تحویل میں تھا لیکن تیسرا پولیس کی تحویل میں چلا گیا تھا اور یہ بھی فرض کیا جا سکتا تھا کہ اُسے دلاور اینڈ کمپنی نے چھڑا لیا ہو گا تو اب تک وہ ہماری محنت پر پانی پھیر چکا ہو گا اور بتا چکا ہو گا کہ سکندر بخت کا چہرہ اب کیسے پہچانا جائے گا۔ بے شک محسن کا دُہرا چہرہ میری حفاظت کے لیے تھا پھر بھی افشائے راز کے بعد یہ حفاظتی انتظام سو فیصد مؤثر اور قابلِ اطمینان نہیں رہتا تھا۔ اس میں پچاس فیصدی بے یقینی کے خدشات بھی شامل ہو جاتے تھے۔

دوسری بار کسی نے دروازے پر دستک دی تو میں نے چوڑیوں کی جھنکار بھی سُنی اور اس نغمۂ ساز کے ساتھ ہی میرے دل کی دھڑکن ہم آہنگ ہو گئی تو میں نے جان لیا کہ آنے والا کون ہو سکتا ہے۔ ٹیڈی نے دروازہ کھولا اور میں نے مرزا غالب کے ساتھ رابعہ کو اندر آتے دیکھا۔

"لو بھئی، اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔" غالب نے اپنی فطری شگفتگی اور مسخرے پن کے ساتھ کہا۔ "اور پہچان سکو تو دل کی آنکھ سے پہچانو۔"

رابعہ کے لیے دونوں چہرے اجنبی تھے مگر وہ مجھے دیکھ کر مُسکرائی۔ پھر اس پر ہنسی کا دَورہ پڑا۔ میرے کھدّر کے کُرتے، چار خانے کی لُنگی اور پشاوری چپل کے ساتھ مہندی رنگ کے گھنگریالے بالوں کو اور اسی رنگ کی مُٹھی بھری داڑھی کو دیکھ کر شاید رابعہ کو میرا اصل رُوپ یاد آیا جو اس کے حُلیے کے برعکس تھا۔ کہاں وہ روایت پسندی کی برطانوی عادت کہ میں سُوٹ کے ساتھ وہ ٹائی بھی نہیں باندھتا تھا جو میچ نہ کرتی ہو اور لباس کے معاملے میں اپنے جمالیاتی ذوق کو بہت اہمیت دیتا تھا اور کہاں یہ دیہاتی وضع قطع۔ لباس سب قابلِ احترام ہوتے ہیں مگر یہ لباس میری شخصیت سے متصادم تھا۔

"ایمان سے بالکل وہی لگ رہے ہو۔" رابعہ ہنستے ہوئے بولی۔

"ہاں ہاں۔ کہہ دو کارٹون۔" میں نے دانت نکال کے کہا۔ ٹیڈی مجھ سے زیادہ شرمسار کھڑا جھینپ رہا تھا۔

"کارٹون تو خیر نہیں۔ جب میں چھوٹی سی تھی نا تو ایک شادی میں گئی تھی۔" رابعہ نے اپنی ہنسی پر قابو پا کے کہا۔ "وہاں

ایک تماشا دیکھا تھا۔ ایسے ہی دو آدمی آگئے تھے اور انھوں نے حاضرین کے سامنے ایک ایکٹ کا مزاحیہ خاکہ پیش کیا تھا۔ ان میں سے ایک باپ تھا اور دُوسرا بیٹا۔ دونوں کے ہاتھ میں جُوتے کے تلے کی شکل کے بڑے بڑے چمڑے کے ٹکڑے تھے۔ ان میں سے ایک سوال کرتا تھا اور دوسرا کوئی نہایت ہی نامعقول قِسم کا جواب دیتا تھا اور وہ چمڑے کو لیں ایک دوسرے کے رسید کرتے تھے کہ آواز تو بڑی زوردار آتی تھی لیکن چوٹ بالکل نہیں لگتی تھی۔ ان صوتی اثرات کے ساتھ انھوں نے مار مار کے ایک دوسرے کا بُرا حال کر دیا لیکن اس سے زیادہ بُرا حال انھوں نے حاضرین و سامعین کا کیا۔ ایک تو انھوں نے باری باری سب کو رگڑا۔ سب کا تمسخر اُڑایا اور جس نے انھیں کچھ دے دیا اُسے تو بخش دیا مگر کنجوسی کرنے والے کے تو خاندان کی بھی ایسی تیسی کر دی، مذاق مذاق میں کہ کوئی بُرا مان ہی نہ سکے۔ ہنس ہنس کے لوگ الگ بے حال ہوئے اور ان کے ذو معنی جملے اور چٹکلے . . . "

" میں بتاتا ہوں آپ کو خاتون۔ وہ بھانڈ کہلاتے ہیں" میں نے کہا " یا میراثی۔ کہو تو تماشا بھی دکھا دیں"

" ابھی نہیں، جب تمھارا وہ جوڑی دار ہو گا تب ہو گا تماشا تو" وہ بولی " ایک ایک جُوتا دونوں ہاتھ میں رکھنا"

" پروا نہیں اُستاد" میں نے ٹیڈی سے مخاطب ہو کے کہا " بدتمیز لوگوں کو ہنسنے دو۔ ہیرا تو ہمیشہ ہیرا ہی رہتا ہے"

" خواہ وہ کھیرا نظر آئے" مرزا غالب نے فرمایا " میرے پیارے کوہِ نُور ہیرو! تم دونوں ہیرو نہیں زیرو ہو جاتے اگر گزشتہ شب میں نے تمھاری سب بلائیں اپنے سر نہ لی ہوتیں"

" ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام۔ ایک مرگِ ناگہانی اور ہے" میں نے کہا۔

" مرگِ ناگہانی سے بھی نہ جانے کس کی نیکی نے بچا لیا" مرزا غالب نے کہا " ورنہ ایک گولی کافی ہوتی"

" مجھے ایک تو تمھاری طرف سے تشویش تھی" میں نے کہا۔ " مزید پریشانی خاتون نے پیدا کر دی تھی"

" رابعہ نے تو بہت جلد میری گلو خلاصی کرا دی" غالب بولا " وہاں سب اس فکر میں تھے کہ مجھے کسی نہ کسی طرح اس چکر میں ڈال دیں۔ میں اپنی بات پر اڑا رہا اور انھیں دھمکی بھی دے دی کہ صبح تک اخبار کا مالک اور مدیر زمین آسمان ایک کر دیں گے۔ حالانکہ ان کو خاک خبر نہیں تھی کہ میں کہاں ہوں اور کس حال میں ہوں۔ وہ آدھی رات کے بعد اخبار پریس میں بھیج کر گھر جا چکے تھے۔ انھیں معلوم ہوتا بھی تو شام کو۔ رابعہ کے آتے ہی پولیس والوں کو پریشانی ہونے لگی حالانکہ اس سے پہلے ایک انسپکٹر بڑی خباثت دکھا رہا تھا کہ کیا اغوا، ریوالور، قتل نہیں کر سکتے۔ وہ بضد تھا کہ میں چوکیدار کے قتل کا اعتراف تو کر ہی لوں۔ رابعہ نے وہ ڈانٹ ڈپٹ کی کہ معافی مانگنے پر اُتر آیا۔ میں نے تو کہا کہ تم نے میرے ایڈیٹر پبلشر کی مستعدی دیکھی۔ اور کچھ دیر ہو جاتی تو تم پر حبسِ بے جا کا مقدمہ ہو جاتا۔ نوکری چلی جاتی تمھاری"

" چلو ابھی تو خدا نے سب کی عزّت و آبرو رکھی" میں نے کہا " تم نے بڑی ذہانت کا ثبوت دیا۔ ورنہ سازش کامیاب ہو جاتی۔ مگر یار! یہ سب باتیں کرنے کے لیے وقت چاہیے اور میں نے محسن سے کہا تھا کہ دو گھنٹے میں واپس آجاؤں گا"

" کہاں واپس آجاؤں گا؟ " رابعہ نے حیرانی سے کہا " ہوٹل سے تو سامان اُٹھا لیا تھا"

" وہ بھی کوئی ہوٹل تھا" میں نے کہا " ہم اب دُوسرے فائیو اسٹار بلکہ سکس اسٹار ہوٹل میں ہیں۔ خواجہ نیک محمد! میں غالب اور رابعہ باہر نکلتے ہیں، تم سامان اُٹھاؤ اور . . . "

" یہ کیا مصیبت ہے" ٹیڈی نے خفگی سے کہا " ابھی دو تین گھنٹے پہلے دو کمرے لیے تھے۔ امیر خان، کبیر خان کے نام سے"

" کوئی بات نہیں" میں نے اُسے تسلی دی " کہہ دینا کہ اب وہ نہیں آسکتے۔ دونوں غریب خان فقیر خان ہو گئے ہیں۔ ویسے بھی اس میں کوئی بات خلافِ قانون نہیں، کوئی ایک دن کے لیے کمرہ لے اور ایک گھنٹے کے بعد چلا جائے۔ ادائیگی تو چوبیس گھنٹے کی کر ہی دو گے"

میں رابعہ اور غالب ہوٹل کے اس حصّے سے گزرے جو استقبالیہ سمجھا جا سکتا تھا۔ تو منیجر اور چند دوسرے لوگوں نے ہم تینوں کو بڑی دلچسپی سے دیکھا۔ دلچسپی کا سب سے بڑا سبب رابعہ کا حُسن تھا۔ پھر میری ہیئت کذائی تھی۔ غالب صُورت سے احمق لگتا تھا تو رابعہ کی شخصیت میں دلکشی کے ساتھ ایسا وقار تھا جو سب سے جُدا تھا اور دیکھنے والوں کو ہمارے درمیان کوئی قدرِ مشترک نظر نہ آتی تھی۔ ٹیڈی کے دوبارہ نمودار ہونے تک ہم کچھ فاصلے پر انتظار کرتے رہے اور اس مُہلت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے میں نے انھیں وہ سب واقعات سنا دیے جس سے وہ بے خبر تھے۔ میں نے یہ بھی بتا دیا کہ ٹیڈی نے نازو کے بھائی ڈبل ایس آئی شیخ کی نیّت پر کس قِسم کے شبہات کا اظہار کیا ہے۔ غالب نے اس کے خیال کی تائید کی۔

" ان حالات میں اندھے اعتماد سے بہت نقصان ہو سکتا ہے" غالب بولا۔ " اس کے علاوہ وہ ہمارا ساتھ دینے سے نازو کے لیے مشکلات پیدا ہوں گی" رابعہ بولی " وہ ہم سے الگ رہ کے ہماری زیادہ مدد کر سکتی ہے"

" ابھی تو معلوم کرنا پڑے گا کہ اس نے بعد میں صُورتِ حال سے کیسے نمٹا" غالب نے کہا " تم ایسا کرو کہ مجھے اپنے سکس اسٹار ہوٹل کا جغرافیہ پُوری طرح سمجھا دو۔ میں ایک گھنٹے کے بعد پہنچ جاؤں گا"

" اور اس ایک گھنٹے میں تم کیا کچھ کرو گے؟ "

" ایک تو اپنے ایڈیٹر کو بتاؤں گا کہ رات کیا کچھ ہُوا تھا"

" کیا مطلب۔ اُسے کچھ معلوم نہیں ہونا چاہیے" میں نے کہا۔

" یار میں اپنے بارے میں بتاؤں گا۔ تمھارا حوالہ تک نہیں ہو گا" غالب نے بُرا مان کے کہا " مانا کہ صُورت سے میں چُغد نظر آتا ہُوں لیکن اتنا عقل سے پیدل نہیں ہُوں۔ اس کو یہی بتاؤں گا کہ مجھے ٹیلی فون پر کسی نے اطلاع دی تھی کہ چوہدری دلاور کی کوٹھی میں قتل ہو گیا ہے اور میں تصدیق کے لیے گیا تھا تو پھنس گیا تھا۔ ایڈیٹر کو معلوم تو ہونا چاہیے نا۔ وہ کہے گا کہ تم کو کتنا عرصہ ہو گیا رپورٹنگ کرتے ہوئے۔ اتنا نہیں سمجھتے کہ ہر گمنام فون پر دوڑ جانا کوئی عقل کی بات نہیں۔ اکثر لڑکے شرارت کرتے ہیں لیکن جانا ہی تھا تو بتا کر جاتے۔ پھر مجھے یہ پتا چلانا ہے کہ چوہدری دلاور کے گھر سے اُٹھائی جانے والی الف دین کی اور اس چوکیدار کی لاشوں کے سلسلے میں پولیس نے کیا رپورٹ لکھی ہے اور آخری بات یہ کہ مجھے اس شخص کے بارے میں معلوم کرنا ہے جسے تم نازو کے رحم و کرم پر چھوڑ آئے تھے"

" اگر وہ ٹوٹنے پھوٹنے کے باوجود زندہ بچا ہو گا تو اُسے پولیس لے گئی ہو گی" میں نے کہا " تم اس کے بارے میں یہ ضرور معلوم کرنا کہ اپنے بیان میں اس نے کیا کہا ہے۔ میرے متعلق کچھ بتایا ہے یا نہیں"

" میرا خیال ہے کہ بیان سے پہلے اُسے وہی لوگ لے گئے ہوں گے جنھوں نے اُسے بھیجا تھا" رابعہ بولی۔

غالب نے تائید میں سر ہلایا " اور اُس نے وفات پانے سے پہلے تمھارا نقشہ اپنے الفاظ سے کھینچ دیا ہو گا۔ خیر۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا"

" مرزا جی" میں نے کہا " تمھارا یار موسے بھائی تو کوئی گڑبڑ نہیں کرے گا"

غالب ہنسا " اس میں اتنی ہمّت نہیں۔ اپنی جان کا دُشمن کوئی نہیں ہوتا"

" تم نے اس سے کچھ قرض وصول کرنے کی بات کی تھی اور اس نے بعد میں کہا تھا کہ حساب برابر ہو گیا" میں نے کہا۔

" ہاں یار وہ۔ اس کا حساب بھی بہت پُرانا تھا" غالب نے سوچ کر کہا " اس نے موقعے سے فائدہ اُٹھا لیا۔ یہ بہت پہلے کی بات ہے۔ اس کا ایک چھوٹا بھائی تھا جو بہت اچھا فوٹو گرافر تھا لیکن اس نے اپنے پیشے سے غلط فائدہ اُٹھایا۔ اس کا چھوٹا سا اسٹوڈیو تھا جو دیکھتے ہی دیکھتے بہت بڑھ گیا۔ جیسا کہ میں نے سُنا تھا۔ وہ کچھ بلیک میلنگ کرتا تھا" غالب نے تذبذب کے ساتھ رابعہ کی طرف دیکھا۔ جیسے وہ کھُل کر بات کرتے ہوئے جھجک رہا ہو۔

" مرزا جی! یہ خاتون بڑی نامور وکیل ہیں۔ بلکہ رہی ہیں" میں نے کہا " ہر طرح کے مقدمات میں ان کی شہرت تھی اور ڈاکٹر کے علاوہ صرف وکیل کا پیشہ ایسا ہے جس میں کوئی بھی حقائق کو چھپاتا نہیں"

" وہ کچھ لڑکیوں کا چکّر تھا" غالب نے قدرے مطمئن ہو کر کہا۔ " اُس نے لڑکیوں کو اور اُن کے والدین تک کو بلیک میل کیا۔ پھر کچھ غلط قسم کے لوگوں نے اس کی خدمات حاصل کرنا شروع کر دیں جو خود بلیک میلر تھے۔ ظاہر ہے اُسے بہت پیسہ ملا لیکن اس کے بعد کرنا خُدا کا ایسا ہُوا کہ ایک لڑکی نے اُسے چکّر میں ڈال دیا۔ ہم نے تو پہلے ہی فرما دیا تھا کہ کہتے ہیں جس کو عشق، خلل ہے دماغ کا۔ اس کو ایسا عشق ہُوا کہ سب بھُول گیا۔ بھائی کے ذریعے اس نے نامہ و پیام دیے اور بات خاصی اُمید افزا حد تک آگے بڑھ گئی تھی کہ لڑکی کے بھائی نے اُسے دیکھ لیا۔ وہ خود اس فوٹو گرافر کے ہاتھوں بلیک میل ہو کے بہت نقصان اُٹھا چکا تھا۔ وہ کیسے برداشت کر سکتا تھا کہ ایسا بد قماش آدمی اسی کی بہن کا رشتہ ڈالے۔ اس نے اگر یہ سمجھا تھا کہ اب بہن بلیک میل ہو گی، تو غلط نہیں سمجھا تھا۔ جب فوٹو گرافر نے مُوسے بھائی کے ذریعے شادی کا باقاعدہ پیغام دیا تو لڑکی کا بھائی سخت مشتعل ہُوا۔ اس نے موسے بھائی کو بے عزّت کر کے نکال دیا اور لڑکی پر سختی کی۔ لڑکی اَڑیل تھی۔ باپ کے اور بھائی کے سامنے اَڑ گئی کہ شادی کہیں اور نہیں کروں گی اور اگر زبردستی کی گئی تو گھر سے بھاگ کر عدالت میں شادی کر لوں گی۔ بھائی سخت پریشان ہُوا کہ اب بہن کو کیسے سمجھائے۔ لیکن صورتِ حال کی سنگینی کے پیشِ نظر کچھ نہ کچھ تو کرنا تھا۔ مزید تفتیش کرنے پر پتا چلا کہ موسے بھائی بھی کم نہیں اور اپنے فوٹو گرافر بھائی کی طرح بدنام ہیں۔ اس نے بہن کو بتایا کہ وہ فوٹو گرافر لڑکا خود بھی بدنام ہے اور اس کا بڑا بھائی بھی۔ ایک بلیک میلر ہے اور دُوسرا

مجرموں کا معاون۔ بہن نے سن کر یقین کیا یا نہیں کیا غضب یہ کیا کہ ایک دن اپنے بھائی کو اپنے عاشق کے سامنے کھڑا کر دیا اور بتا دیا کہ تم پر کیا الزامات ہیں۔ پھر معلوم نہیں بات کتنی بڑھی اور کس نے کس سے کیا کہا۔ انجام یہ ہُوا کہ لڑائی ہوئی لڑکی کے بھائی نے فوٹوگرافر پر حملہ کیا اور اس کے ہاتھوں مارا گیا۔ لڑکی وہیں بے ہوش پڑی رہ گئی اور فوٹوگرافر وہاں سے بھاگ گیا۔ موٹے بھائی اُسے رات کے وقت میرے گھر لے کر پہنچا کہ پولیس اس کے پیچھے ہے۔ اسے رات بھر کے لیے چھپا لو۔ میں نے پُوچھا بھی کہ آخر اس پر الزام کیا ہے مگر موٹے بھائی نے کہا کہ الزام قتل کا ہے لیکن جھوٹا ہے۔ اگر تم اس کے حق میں گواہ بن جاؤ تو یہ بچ جائے گا۔ موٹے بھائی کی حالت دیکھ کر مجھے ترس آ گیا۔ میں نے کہا کہ اچھا تم جاؤ۔ یہ نہ ہو کہ پولیس اس کو تلاش کرتی ہوئی تمھارے پیچھے پہنچے۔ آدھی رات کے بعد یہی ہُوا۔ مجھے خدا نے بچا لیا۔ نہ جانے کیوں مجھے اندیشہ تھا کہ اس چکّر میں خود میں بھی پھنس جاؤں گا۔ میں موٹے بھائی کے بھائی کے ساتھ نکل گیا۔ اُسے ایک ہوٹل میں چھوڑا اور خود اپنے آفس چلا گیا۔

پولیس نے لڑکی کے بیان پر موٹے بھائی کو پکڑ لیا اور اس کے بھائی کا پتا پُوچھا۔ پہلے تو موٹے بھائی نے انجان بننے کی کوشش کی اور لاعلمی کا اظہار کیا مگر ہماری پولیس کسی کی زبان پر اعتبار کرنے والی نہیں ہے۔ وہ موٹے بھائی کو تھانے لے گئے اور تھوڑا سا بجایا تو موٹے بھائی نے بک دیا کہ قاتل کہاں چھُپا ہُوا ہے۔ پولیس دو بجے رات کو میرے فلیٹ پر پہنچی تو میں غائب تھا لیکن انھوں نے اجازت کا رسمی تکلّف نہیں کیا اور قانونی اجازت کو غیر ضروری سمجھتے ہوئے تالا توڑ دیا۔ وہاں ان کو ناکامی ہوئی تو وہ اخبار کے دفتر پہنچے۔ ایک تو میں پہلے ہی سے وہاں اپنے دفاعی انتظامات مکمل کر چکا تھا۔ پھر پولیس خود ایک غیر قانونی کام کر چکی تھی۔ ان کو بعد میں پتا چلا تھا کہ گھر کسی اخبار والے کا ہے۔ اُلٹا میں نے انھیں پکڑ لیا کہ ابھی خبر لگاتا ہوں اور ایس پی سے بات کرتا ہوں۔ وہ بڑی مشکل سے گلو خلاصی کرا کے بھاگے اور میں نے موقعے سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے کہا کہ چلو میں تم کو معاف کرتا ہُوں اور تمھاری نوکری تمھیں بخشتا ہُوں۔ تم میرے دوست موٹے بھائی کو بخش دو اور گھر جانے دو۔ میری مدد سے موٹے بھائی صبح تک گھر پہنچ گیا۔ پھر اُس نے میری خدمت میں حاضر ہو کے کہا کہ آئندہ عمر بھر کے لیے وہ میرا غلام۔ کیونکہ میں نے اس کے بھائی کی جان بچا لی۔ اس نے تھوڑی سی مدد اور چاہی۔ اپنے بھائی کے لیے اس نے دو پاسپورٹ بنوائے۔ ایک اصل صورت کی تصویر کے ساتھ۔ دُوسرا میک اَپ سے بدلی ہُوئی تصویر والا۔ اس کا بھائی بدلی ہوئی صورت لے کر باہر نکل گیا۔ یہ بڑی لمبی کہانی ہے کہ میں نے اور موٹے بھائی نے پاسپورٹوں پر ویزا اسٹیمپ کس طرح لگوائی۔ باہر جانے کے بعد اس نے میک اَپ اُتار دیا اور میک اَپ کی تصویر والا پاسپورٹ بھی ضائع کر دیا۔ اب وہ اصلی نام اور پاسپورٹ کے ساتھ باہر آباد ہے ....

میں .... یہ بھی جانتا تھا کہ وہ کہاں ہے اور اس کے جُرم کی نوعیت بھی مجھے معلوم ہو چکی تھی۔ میری مدد اور خاموشی کے بغیر موٹے بھائی کا بھائی محفوظ نہیں تھا۔ اس کے خلاف پورا کیس موجود ہے اور وہ ایک مفرور مجرم ہے۔ قتل کے کیس میں مقدمہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ بلا ارادہ اور کچھ اپنی حماقت کے باعث میں بھی شریکِ جُرم ہو گیا تھا۔ موٹے بھائی نے اس لیے میری مدد سے کبھی انکار نہیں کیا اور سچی بات یہ ہے کہ میں نے بھی صرف انتہائی ضرورت پڑنے پر اس سے رجوع کیا، اُسے بلیک میل کرنے کی نیّت سے نہیں۔ بھئی میں نے اس کی مدد کی تھی تو کیا اس کا فرض نہیں تھا کہ میری مدد کرتا۔ اس خبیث نے تم کو پہچان لیا ظاہر ہے اب حساب برابر ہے۔ میں بھی نہیں بول سکتا اور اس کے بولنے کا تو سوال ہی نہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اس نے تم دونوں کی تصویر میک اَپ میں اُتار لی ہو مگر کوئی بات نہیں۔" غالب چُپ ہو گیا کیونکہ خوجی یعنی خواجہ نیک محمد عُرف استاد ٹیڈی سخت برہمی کے عالم میں تشریف لا رہے تھے۔ باقی اسباب تو ایک قلی نما مزدور نے اُٹھا رکھا تھا لیکن ان کا وہ موہنجو دڑو کے آثارِ قدیمہ کا نمونہ صندوق خود ان کے پاس تھا اور ہمیشہ کی طرح اس کا بوجھ اُٹھا کے چلنا ان کے لیے بہت ہی مشکل ثابت ہو رہا تھا۔

"آج کچھ بھی ہو جائے" میں اس صندوق کو ضرور کھول کر دیکھوں گا۔" غالب نے کہا۔

"ہاں یار۔ آخر اسے یہ صندوق اتنا عزیز کیوں ہے جسے کباڑی لوہے کے بھاؤ بھی نہ خریدے" میں نے کہا۔" اور... اس زنگ خوردہ صندوق میں آخر ہے کیا۔ اتنا بھاری تو صرف سونا ہی ہو سکتا ہے۔"

"سونا" غالب ہنسا۔" بیس سیر سے زائد سونا ہوتا اس کے پاس تو یہ ہمارے ساتھ ہوتا۔"

"کیا بات ہے۔ کیوں ہنس رہے ہو تم لوگ؟" ٹیڈی نے ہانپتے ہوئے کہا اور پھر قلی سے مخاطب ہوا۔" رکھ دے سامان اِدھر ہی فٹ پاتھ پہ۔ اور دیکھ یہ تو ہیں اپنے یار۔ تو کیوں دانت نکال رہا ہے۔" اس نے پُرانی عادت کے مطابق فحش گالی بک دی۔ جس کا اُسے قطعی احساس نہیں ہُوا۔" سارے دانت نکال کے ہاتھ پہ رکھ دوں گا۔"

"کیوں اتنے غصّے میں ہو خواجہ صاحب؟" میں نے کہا۔ قلی سخت بدحواسی میں فرار ہُوا۔

"بھاڑ میں گئے خوجی صاحب اور خواجہ صاحب" ٹیڈی نے صندوق کو نیچے رکھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔" قسم مولا علی کی اپنا پُرانا خون کبھی کبھی جوش میں آ جاتا ہے۔ ابھی ایک بیرا بچ گیا ورنہ انتڑیاں ڈھیر کر دیتا۔ پہلے مجھ پہ فقرہ کسا اور میں پی گیا۔ پھر صندوق کے بارے میں ایک بات کہی۔ میں پھر بھی خاموش رہا۔ سالا آخر میں کہنے لگا کہ امیر خان کبیر خان اتنی جلدی غریب خان فقیر خان ہو گئے۔ میں نے کہا۔ الّو کے پٹھے میں تجھے، تیرے ہوٹل کو، اس کے مالک کو اور تیرے سارے خاندان کو خرید کے کوڑیوں کے مول بیچ سکتا ہوں۔ دوسرے درمیان میں پڑ گئے مگر وہ بھی سب کھی کھی کر رہے تھے۔ سب تم لوگوں کی وجہ سے ہُوا۔ ایک تو میری صُورت ایسی بنا دی ہے کہ اَمّاں بھی خواب میں دیکھیں گی تو ڈر جائیں گی۔"

ہم سب بے ساختہ ہنسنے لگے۔ ٹیڈی نے ہم سب کو ہنستے دیکھا اور پھر خود بھی ہنس پڑا۔ ایک بار پھر ٹیکسی حاصل کرنے کا مسئلہ پیدا ہُوا۔ غالب نے پہلے ہی الگ جانے اور بعد میں پہنچنے کو کہہ دیا تھا۔ میں نے اُسے سگریٹ کا ایک پیکٹ پھاڑ کر اُس جگہ کا نقشہ بنا دیا جہاں محسن تمام اسلحہ اور جنگی قیدی لیے ایم آر ایس کی ہائی کمان کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ اس نے یقینِ کامل کے ساتھ کہا کہ وہ ہمارے سکس اسٹار ہوٹل کو تلاش کر لے گا۔ جانے سے پہلے اس نے ہمارے لیے ٹیکسی کے حصول کا مسئلہ حل کیا کیونکہ شریفانہ درخواست پر کوئی ٹیکسی والا ایسے ویران علاقے میں جانے کو تیار نہ تھا، جہاں سے اس کو واپسی کی سواریاں ملنے کی اُمید نہ ہو۔ غالب نے ایک کانسٹیبل کو اپنا پریس کارڈ دکھا کر ڈانٹا اور کانسٹیبل نے تقریباً ٹیکسی کے سامنے خودکشی کی نیّت سے کُود کر ایک ڈرائیور کو بیگار میں پکڑا۔" خبردار جو صاب سے پیسے لیے۔" کانسٹیبل نے غرّا کے کہا۔

"پھر تو آپ بھی بیٹھ جاؤ صاب" ٹیکسی ڈرائیور نے طنز سے کہا۔" مُفت کی سواری ہے۔"

"نہیں بھئی۔ ہم موڈ میں نہیں ہیں۔" غالب نے کہا اور واپس چل پڑا۔ باقی سامان رکھنے سے پہلے ڈرائیور نے غلطی سے ٹیڈی کا صندوق اُٹھانا چاہا جو اس کی توقع سے کہیں زیادہ بھاری تھا۔ چنانچہ ہاتھ سے چھُٹا تو پیر پہ گرا۔ جلے بھُنے ڈرائیور نے صندوق کو اور اس کے ... نے والے کو گالی دینے پر اکتفا کی۔

وہ اس کے مالک کے بارے میں کچھ ارشاد کرتا تو پچھتاتا۔ ٹیڈی نے اُسے ڈانٹا کہ جب دَم نہیں ہے تو نازک چیز کو ہاتھ کیوں لگاتے ہو اور صندوق خود اُٹھا کے ڈِکّی میں رکھ دیا۔ ڈرائیور نے دم نہ ہونے والی بات کا اتنا بُرا نہیں مانا جتنا اس بے ہودہ صندوق کو "نازک چیز" کہنے پر حیران ہُوا۔ اس نے کہا کہ ابھی تو اس نازک چیز نے پیر ہی توڑا ہے کہیں آگے جا کے گاڑی کا ایکسل ہی نہ توڑ دے۔ ہم سب اس قِسم کی گفتگو سے محظوظ ہو رہے تھے۔ اس سے زیادہ لُطف ہمیں اس وقت آیا جب منزلِ مقصود پر پہنچ کر میں نے اُسے سو کا نوٹ دیا اور اس سے باقی رقم اپنے پاس رکھنے کو کہا۔

"ہم کسی پر ظُلم نہیں کرتے" میں نے فیاضی سے سرپرستانہ لہجے میں کہا۔

"لیکن ضروری ہے کہ تم لوگ بھی ظُلم کرنا چھوڑ دو۔ ٹیکسی میں سب ضرورت مند لوگ ہی بیٹھتے ہیں" ٹیڈی نے اُسے مشورہ دیا۔

جب ٹیکسی نظر سے اوجھل ہو گئی تو میں نے اشارے سے وہ جگہ بتائی جو ابھی وہاں سے سو گز دُور تھی" یہ ہے وہ سکس اسٹار ہوٹل جہاں قیدی کے ساتھ جیلر بھی بند ہے" میں نے کہا۔

"سکندر بادشاہ اتنی دور کیوں روک لیا ٹیکسی کو" ٹیڈی نے اپنے بھاری بھرکم صندوق کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تو کیا عین دروازے کے آگے روکتے۔ جہاں سے بالکل میرا ہمشکل دُوسرا انکل آتا" میں نے کہا" ٹیکسی والا یاد رکھتا۔ تم چھوڑو یہ صندوق میں اُٹھا لیتا ہُوں۔"

"نہیں نہیں۔ یہ بات نہیں" ٹیڈی جلدی سے بولا" اسے تو میں اُٹھا لُوں گا۔ بس ذرا میرے سر پر رکھوا دو۔"

جب میں نے صندوق اُٹھوانے کے لیے ہاتھ لگایا تو ایک بار پھر مجھے اس کے غیر معمولی وزن کا احساس ہُوا اور میں نے رابعہ کی طرف دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں اس عزم کا اعادہ کیا کہ آج اس صندوق کے راز سے آگاہی حاصل کر کے ہی دَم لیں گے۔

دروازے پر پہنچتے پہنچتے ٹیڈی کی حالت غیر ہو گئی لیکن اس نے صندوق کو گرنے نہیں دیا۔ میں اس کے پیچھے چل رہا تھا اور یہ دیکھ رہا تھا کہ.... صندوق کے گرد وہی ایک رسّی لپٹی ہوئی ہے جو ہم نے ٹیڈی کے گھر سے فرار ہوتے وقت صندوق کو بند رکھنے کے لیے باندھی تھی۔ یہ رسّی بھی اب ڈھیلی ہو چکی تھی اور اگر صندوق گر جاتا تو کھُل جاتی یا ٹوٹ جاتی۔ اس رسّی کے علاوہ مجھے صندوق کو بند رکھنے والی ایک پُرانی کُنڈی بھی نظر آئی تھی مگر صندوق

گرتا تو یہ کُنڈی یقیناً الگ ہو جاتی۔ مجھے تو صندوق کے بارے میں بھی شبہ تھا کہ اتنے وزن کے ساتھ گرا تو اس صندوق کا کیا بنے گا۔ مجھے اچانک شرارت سوجھی اور میں نے پیچھے سے ٹانگ آگے بڑھا کے ٹیڈی کی ٹانگ میں اڑا دی۔ وہ پہلے ہی لڑکھڑا رہا تھا چنانچہ مُنہ کے بل گرا۔ صندوق اس کے سر سے کافی فاصلے پر آگے گرا۔ میں نے یہ ظاہر کیا کہ میں خود ٹھوکر کھا کے سنبھل نہیں سکا تھا۔ رابعہ نے میری شرارت دیکھی تھی اور مُسکرا رہی تھی۔ مگر مسٹر ٹیڈی سچ مچ یہ ہی سمجھا کہ ہم دونوں کا تصادم ایک حادثہ تھا۔

"معاف کرنا یار۔" میں نے خود اُٹھنے کے بعد ٹیڈی کو اُٹھایا۔ "چوٹ تو نہیں آئی؟"

"نہیں،" وہ لنگڑاتا ہُوا اُٹھا اور کپڑے جھاڑنے لگا۔ ٹین کا صندوق اس شیڈ نما عمارت کی دیوار سے ٹکرایا تھا جو میں نے اور محسن نے کچھ دیر پہلے کرائے پر لی تھی۔ آواز پر محسن نے دروازہ کھولا۔

"آگئی بارات؟" محسن بولا۔ "بڑی دُھوم دھام اور دھماکے کے ساتھ آئی ہے۔"

"اور کتنی پابندیٔ وقت سے۔" میں نے اُسے چڑانے کے لیے کہا۔ میں دو گھنٹے کا کہہ کر چار گھنٹے میں لوٹا تھا۔

"آپ اکیلے تشریف نہیں لا سکتے تھے؟" اُس نے رابعہ کو دیکھ کر کہا۔ "یہاں خواتین کا داخلہ ممنوع ہے۔"

"تین کہاں محسن بھائی! میں اکیلی ہُوں۔" رابعہ نے اندر جاتے ہوئے کہا اور ہنسی۔ "اس کے علاوہ میں خود ہی ساتھ آگئی۔"

"ہاں۔ سکندر تو جب لائے گا تب لائے گا۔ ابھی تو مان نہ مان میں تیری مہمان اور بلائے جان۔" محسن بولا اور رابعہ نے اُسے گھور کر دیکھا مگر وہ باہر نکل آیا تھا اور سامان اُٹھانے میں مدد کر رہا تھا۔ ایک سُوٹ کیس رابعہ کا تھا، ایک محسن کا اور ایک میرا۔ آخر میں، ہم نے مل کر ٹین کے صندوق کو دونوں طرف سے اُٹھایا کیونکہ اس میں کبھی کوئی ہینڈل تھا تو بہت پہلے داغِ مفارقت دے چکا تھا۔

"ابے مروا دیا۔ اس مصیبت نے ابھی تک ساتھ نہیں چھوڑا ہمارا؟" محسن اندر پہنچ کے ہانپتے ہوئے بولا۔

"میاں شیروانی۔ اس میں خالص سونا ہے۔ تقریباً ایک من تو ہو گا۔" میں نے کہا تو محسن نے ایک دم ہی صندوق کو چھوڑ دیا۔

"لعنت اس سونے پر جس سے ٹوٹیں ہاتھ۔" محسن نے محاورے میں مناسب تبدیلی کر کے کہا۔

"لعنت تجھ پر۔" میں نے کہا۔ "ابھی محاورے کا ہی نہیں میرے پیر کا بھی بیڑا غرق ہو جاتا۔"

"یہ کوئی میری بیوی کی سُسرال نہیں ہے۔" محسن نے خفگی سے کہا۔ "یعنی میرے باپ کا گھر نہیں ہے کہ چلے آ رہے ہیں ایم بی اے" اور پھر دروازہ بند کر دیا۔ ٹیڈی جلدی سے اپنے صندوق پر بیٹھ گیا۔

"یہ ایم بی اے کون ہے؟" رابعہ نے جگہ کا معائنہ کرتے ہوئے سوال کیا۔

"میاں بیوی بچوں سمیت۔" محسن نے کہا۔ "کون آیا ہے یہاں؟ سوچنا چاہیے کہ آس پاس رہنے والے اعتراض کریں گے ہیں۔ آخر ہم بھی ہیں کہ جو شکر کے ساتھ جُدائی کی گھڑیاں کاٹ رہے ہیں۔"

"کون سی گھڑیاں؟ رلیسٹ واچ، ٹیبل کلاک یا پھر وال کلاک؟" رابعہ نے شرارت سے کہا۔ پھر اس کی نظر جنگی قیدی پر پڑی، جو اس وسیع و عریض ہال نما بیرک کے ایک نیم تاریک گوشے میں سیدھا بیٹھا تھا۔

"یہاں لائٹ نہیں ہے؟" میں نے کہا۔ دروازہ بند کر دینے سے اندر بہت کم روشنی رہ گئی تھی۔

"لائٹ تو ہے لیکن اندر صرف ایک ہی فیوز بلب لگا ہوا ہے۔" محسن بولا۔ "ٹیڈی سے کھانا بھی منگوا لے اور بلب بھی۔"

"اس کو کب ہوش آیا؟" میں نے آہستہ سے پُوچھا اور ٹیڈی کو سو کا ایک نوٹ دے دیا۔

"دو گھنٹے ہو گئے۔" محسن بولا۔ "میں بہت پریشان تھا کہ اس نے کوئی غلط حرکت کی تو کیا کروں گا۔"

"میں کہہ گیا تھا کہ گولی مار دینا۔" میں نے کہا۔ "کوئی ایسی حرکت تو نہیں ہوئی نا؟"

"نہیں۔ لیکن ہو سکتی تھی اور ہم اسے یہاں قتل کرنے کے لیے تو نہیں لائے تھے۔" محسن نے کہا۔

"اس سے کچھ پُوچھا؟" میں نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ ٹیڈی جا چکا تھا اور رابعہ ایک میز پر چڑھی بیٹھی تھی۔

"پُوچھا تھا۔ سالا کچھ بتانے پر آمادہ نہیں اور جو کچھ بتایا ہے وہ سب بکواس ہے۔" محسن نے کہا اور ہم دونوں اس کے سر پر جا کھڑے ہوئے۔ وہ چالیس پینتالیس سال سے زیادہ کا آدمی تھا مگر جسم کی ساخت کے باعث کچھ نوجوان نظر آتا تھا۔ ایک وجہ اس کے گھنے بال بھی تھے جن کا رنگ قدرتی سیاہ تھا یا ہیر کلر کے استعمال سے سیاہ دکھائی دیتا تھا۔ اس کے ہاتھ

بندھے ہوئے تھے اور مُنہ میں اس وقت بھی کپڑا ٹھُنسا ہُوا تھا لیکن وہ پریشان نظر نہیں آتا تھا۔ اس کی مکّار آنکھیں ہلکے اندھیرے میں چمکتی ہوئی نظر آئیں۔ اُس نے سر اُٹھا کے ہمیں دیکھا تو مجھے یوں لگا جیسے اپنی بے بسی کے باوجود وہ ہماری بے بسی کا تمسخر اُڑا رہا ہے۔ میں نے اُس کے مُنہ سے کپڑا نکال دیا۔

"یہ تو تم اچھی طرح سمجھتے ہو نا کہ یہاں تمھارا کوئی حامی اور مددگار نہیں آ سکتا۔" میں نے کہا۔ "اور آ جائے تو لوٹ کر جا نہیں سکتا۔ تم کو ہماری طاقت کا تھوڑا بہت اندازہ ضرور ہُوا ہو گا۔ وہ ایک لڑکی تھی جس کے بارے میں تم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ قیامت ہے۔ تین جوانمرد جو مسلح تھے اور راسٹین گن لے کر آئے تھے اس کمزور سی لڑکی کا مقابلہ نہیں کر سکے تھے جو خالی ہاتھ تھی۔ ہمارا مقابلہ تو تمھارے چوہدری صاحب کی پوری فوج بھی نہیں کر سکتی۔"

رابعہ اُسی وقت اسٹین گن لے کر یوں ہمارے ساتھ آ کر کھڑی ہو گئی جیسے پی ایل او جیسی تنظیم کی کوئی مجاہدہ ہو حالانکہ وہ اس قتلِ عام میں کام آنے والے اسلحے کے طریقۂ استعمال سے بھی ناواقف تھی پھر بھی اس نے اپنا پوز بالکل دُرست رکھا اور یوں مستعد کھڑی رہی جیسے ہمارے اشارے پر قیدی کے جسم کو چھلنی کر دے گی۔

"اس کی ضرورت نہیں رابعہ۔" میں نے کہا۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ میں نے رابعہ کا نام لینے کی غلطی کی ہے مگر رابعہ نے فوراً میری غلطی کی پردہ پوشی کی۔

"یہ ہر روز نام بدلنے سے کنفیوژن پیدا ہوتا ہے۔" وہ بولی۔ "جب تک ضرورت نہ پڑے۔۔۔"

دلاور کے پی اے کی ہنسی نے رابعہ کو خاموش کر دیا۔ "مجھے معلوم ہے کہ تم رابعہ قاری ایڈووکیٹ ہی ہو۔" وہ بولا۔

"پھر تو تم سب کے بارے میں صحیح معلومات رکھتے ہو گے؟" میں نے محتاط ہو کے کہا۔

"ہاں تم میں سے ایک سکندر رجنت ہے اور دُوسرا اس کا دوست محسن خان شیروانی۔" وہ بولا۔

"کیا اتنا سچ بول کے تم بے وقوفی نہیں کر رہے ہو؟" میں نے کہا۔ "اب یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم تمھیں جانے دیں۔ تم تو ہمارے بارے میں ساری خفیہ معلومات کو نشر کر دو گے۔ سب کو بتا دو گے کہ ہم کہاں ہیں اور۔۔۔"

"لیکن مجھے معلوم ہے کہ یہاں سے میرے زندہ سلامت نکلنے کا امکان ایک فیصد بھی نہیں۔" وہ بولا۔

"یہ تو ٹھیک ہے کہ فوری طور پر تمھاری رہائی ممکن نہیں۔" [illegible] سکتا ہے کہ ہم تمھیں قتل نہ کریں۔"

"اس کا انحصار تمھارے رویّے پر ہے۔" محسن نے کہا۔ "اگر تم تعاون کرو۔"

وہ پھر ہنسنے لگا۔ "یہ پولیس والا رویّہ اختیار مت کرو۔ میں تم سے کس طرح تعاون کر سکتا ہوں۔ جبکہ میں تمھارا دشمن ہُوں اور اگر میں یہ بے وقوفی کروں گا تو کیا وہ مجھے معاف کر دیں گے جو تمھارے دشمن ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اب میرے لیے زندگی کی اُمید رکھنا محض خود فریبی ہے۔ خواہ میں تم کو کچھ بھی نہ بتاؤں۔ چوہدری صاحب تو مجھ پر یقین نہیں کریں گے نا۔ وہ بالکل یہی سمجھیں گے کہ میں اپنی جان بچانے کی خاطر ان سے جھُوٹ بول رہا ہوں۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ ایک ایسا شخص جو دشمن کی قید میں ہو، وہ کچھ بتائے بغیر نکل آئے۔ خصوصاً تم جیسے ہوشیار دشمنوں کا قیدی سب کچھ بتائے بغیر نجات کیسے حاصل کر سکتا ہے۔ ہماری جاہل پولیس اپنے دقیانوسی طریقوں سے سب کچھ اگلوا لیتی ہے، تم ان کے مقابلے میں زیادہ ذہین اور چالاک ہو۔"

"اس خراجِ تحسین کا شکریہ۔" میں نے کہا۔ "تم چوہدری دلاور کے پی اے تھے اور رقاصی کے گھر کے چوہے بھی سیانے ہوتے ہیں۔ پھر تم بے وقوف کیسے ہو سکتے ہو۔ مگر انتخاب تو تمھیں کرنا ہی پڑے گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جب تک ہم تم سے ایک ایک بات معلوم نہیں کر لیں گے اور اس کی تصدیق نہیں کر لیں گے، نہ تم کو مرنے دیں گے اور نہ ہی جینے دیں گے۔ تم یقیناً مرنا چاہو گے مگر یاد رکھو کہ تمھارے لیے یہ بھی آسان نہیں ہو گا۔"

وہ پھر ہنسا۔ اس کی ہنسی میں عجیب سی آسیب زدہ ویرانی تھی۔ وہ ہنس نہیں رہا تھا، دغا باز تقدیر کو رو رہا تھا جس نے اس کے اعتماد کو بُری طرح شکست دی تھی۔ "کیا آسان ہے اور کیا مشکل، یہ سب فضول باتیں ہیں۔"

"تم اتنے مایوس کیوں ہو؟" میں نے کہا۔ "تم زندہ رہنے کی کوشش تو کر سکتے ہو۔"

"کوشش کسی اُمید پر کی جاتی ہے۔" وہ بولا۔ "میں کس سے اُمید رکھوں؟"

"خُدا سے اور کس سے۔ اتنی بڑی دُنیا میں تم ایک گوشہ تلاش نہیں کر سکتے جہاں تم چھُپ کر رہ سکو۔ تم ہمیں دیکھ رہے ہو۔ ہم کس طرح اس کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ وہ ابھی تک ہم پر ہاتھ نہیں ڈال سکا۔" میں نے کہا۔

"ہاتھ تو ڈالا تھا تم پر لیکن تم اکیلے تھے۔ جان کی بازی لگا کے نکل گئے۔" وہ بولا۔ "میں بھی اکیلا ہوتا تو مجھے کیا بُرا تھا مرنا لیکن میرے ساتھ میرے بیوی بچے بھی ہیں۔ ان سب کے ساتھ نہ میں

کہیں گم ہو سکتا ہوں اور نہ ہی میں تمام عمر بھاگتے ہوئے گزار سکتا ہوں۔"

"پھر تم کیا کرو گے؟ فرض کرو کہ ہم تمھیں ابھی چھوڑ دیں۔" میں نے کہا۔ "تم سے کوئی سوال جواب کیے بغیر۔"

"میں باہر نکلتے ہی خود کشی کر لوں گا۔" وہ بولا۔ "صرف یہی ایک صورت ہے میرے بیوی بچوں کے بچنے کی۔ پھر دلاور کو یقین آ جائے گا کہ میں وفاداری کے امتحان میں ناکام نہیں رہا۔ میں نے جان دے کر ان سے کیے ہوئے عہد کو نبھایا۔ یہ عہد ان سب کو کرنا پڑتا ہے جو چوہدری دلاور کے اتنے قریب ہوں کہ ان کا اعتماد حاصل کر لیں۔ انھیں ثابت بھی کرنا پڑتا ہے کہ وقت آنے پر انھوں نے اپنے سینے میں دفن رازوں کو اپنے ساتھ دفن کرنا قبول کیا۔ پھر اس کو نہ سہی اس کے لواحقین کو جاں نثاری کا صِلہ ضرور ملتا ہے ورنہ وہ غدار کہلاتے ہیں اور ان کی سزا میں بیوی بچے بھی شریک ہوتے ہیں۔"

"مجھے افسوس ہے کہ تمھارے لیے یہ صورتِ حال پیدا ہوگئی۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس کے ذمّے دار تم خود ہو۔ تم نے چوہدری دلاور کا ساتھ دینے کا فیصلہ کرنے سے پہلے دونوں امکانات کو ذہن میں رکھا ہوگا۔ اب تک تقدیر نے تمھارا ساتھ دیا اور تم چوہدری دلاور کا ساتھ دیتے رہے۔ اندازوں کی غلطی کہو اسے یا مکافاتِ عمل۔ نوشتۂ تقدیر سمجھو یا اپنی شامتِ اعمال کہ تم نے پوری قوت کے ساتھ ایک بہت چھوٹے سے مورچے کو سر کرنا چاہا مگر تمھیں شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ ہم تمھاری کوئی مدد نہیں کر سکتے اور تمھارے بیوی بچوں کا بھی خدا نگہبان ہے لیکن تمھاری جگہ میں ہوتا تو مرنے سے پہلے یہ موقع غنیمت جانتا۔ میں کوشش کرتا کہ اپنے بارِ گناہ کو جس حد تک کم کر سکوں کر لوں۔ یہ تم بھی کر سکتے ہو۔ تم نے اب تک دلاور کے انعام و اکرام اور دُنیاوی نعمتوں کو ترجیح دی لیکن وقت نے آج تمھیں اس مقام پر پہنچا دیا ہے کہ جہاں سے تم اپنی دُنیاوی زندگی کے اعمال کو بھی دیکھ سکتے ہو اور یہ بھی اندازہ کر سکتے ہو کہ تمھاری عاقبت کیا ہوگی۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ دلاور جو کچھ بھی کر رہا ہے اور کرتا رہا ہے وہ خلافِ قانون تھا۔ گناہِ کبیرہ سے کم ہرگز نہ تھا اور اس کی معاشرے میں کچھ بھی حیثیت ہو حقیقت یہ ہے کہ وہ معاشرے کا بھی مجرم ہے اور ملک کا بھی۔ تم اس کے ساتھ تھے چنانچہ شریکِ جُرم کی حیثیت سے تمھاری پوزیشن بھی مختلف نہیں۔ دلاور کبھی نہ کبھی دُنیا کے قانون کی گرفت میں ضرور آئے گا اور ہماری کوشش بھی یہی ہے کہ اسے وہ سزا ضرور ملے جس کا وہ دُنیا میں مستحق ہے۔ اس نے کتنے لوگوں کی زندگی کو اپنی ناجائز خواہشات پر قربان کیا، کتنے گھر اُجاڑے، کتنے بچوں کو یتیم کیا اور کتنی عورتوں کو بیوہ کیا۔

مالِ حرام سے کیا گناہ کیے۔ یہ سب تم جانتے ہو لیکن اب قدرت نے تمھیں دُنیا کی ذلت و رسوائی اور زمین کے قانون کے تحت ملنے والی سزا سے خود بچانے کا موقع فراہم کیا ہے یا یوں سمجھو تم مجبور ہو گئے ہو۔ اگر میں کہوں کہ اس وقت بھی تم صحیح سمت میں ایک قدم اُٹھا سکتے ہو، وہ کر سکتے ہو جو تم کو کرنا چاہیے تو لیکن تم نے نہیں کیا تھا۔"

"اب بھی میں کیا کر سکتا ہوں؟" وہ ایک دم ہنسا۔ "تم کیا چاہتے ہو آخر؟"

"تم کو یقیناً معلوم ہو گا کہ چوہدری دلاور کیا کرتا ہے؟"

"ہاں۔ وہ ناجائز اسلحہ فروخت کرتا ہے۔ اسمگل بھی کرتا ہے۔" وہ بے نیازی سے بولا۔ "بناتا بھی ہے۔"

میں نے اور محسن نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ہمارا اندازہ غلط نہیں تھا۔ "اسلحہ وہ آخر کہاں سے منگواتا ہے؟"

"دُنیا میں جہاں سے بھی سستا ملے۔"

"اور کسے فروخت کرتا ہے؟" محسن خان شیروانی نے سوال کیا۔

"ظاہر ہے زیادہ سے زیادہ قیمت دینے والے کو۔" وہ بولا۔ "آج کل مشرقی پاکستان بھیج رہا ہے۔"

اس سنسنی خیز انکشاف نے مجھے اور محسن کو ذرا سی دیر کے لیے مفلوج کر دیا۔ قیاس آرائی تو ہم نے بھی کی تھی مگر اب شک و شبے کی کوئی بات نہ رہی تھی۔ دلاور صرف ہمارا ہی نہیں اس سرزمین کا بھی دُشمن تھا۔ وہ غدار تھا جسے موت کے بعد اس زمین میں گاڑنا بھی اس مٹی کی رسوائی ہوتا ہے۔ یہ مادرِ وطن کی آبرو کو نیلام کرنے والا فرزند تھا جس کو دُنیا دی مال و متاع کی ہوس نے بے ضمیر کر دیا تھا۔ میں بھول گیا کہ وہ میرے باپ کا قاتل تھا اور اس نے مجھے میرے حق سے محروم کر رکھا تھا۔ وہ تو اس ملک کی خاطر قربانی دینے والے لاکھوں افراد کی اُمیدوں کا اور اُمنگوں کا قاتل تھا۔ وہ شہیدوں کے اس خون کا سودا کر رہا تھا جو اس ملک کو حاصل کرنے والوں نے راہِ طلب میں نذر کیا۔ ان لاکھوں جگر فگار انسانوں کے رشتوں کی آبرو کا تاجر تھا جن کے پیارے منزلِ مُراد تک پہنچنے سے قبل ہی جان دے کر سرخرو ہوئے۔ میرا ایک گھر یا رابعہ کا ایک گھر کیا تھا، ایسے ہزاروں گھر جس مقصد کے لیے جل کر خاک ہوئے وہ اسی مقصد کو بیچ رہا تھا۔ اسی شاخ کو کاٹ رہا تھا جس پر کاروانِ آزادی کے ساتھ مسافت کی ناقابلِ بیان صعوبت اُٹھا کے بسیرا کرنے کی فکرِ آشیاں بندی کر رہے تھے۔ انھی بنیادوں کا سودا کر رہا تھا

جن پر ایک اللہ اور ایک رسولؐ کے نام لیوا اپنے لیے ایک جنّتِ ارضی بنانے کی جدوجہد کر رہے تھے۔ اشتعال کی ایک لہر نے مجھے مغلوب کر لیا اور میں نے دلاور کے پی اے کو پے در پے لاتیں اور ٹھوکریں ماریں۔

"اوہ، تم ضمیر فروش شیطان۔ تم یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس کے ناپاک ہاتھوں سے کاغذ کے نوٹوں کی گڈیاں لیتے رہے۔ اس غدارِ وطن کے وفادار رہنے پر فخر کرتے رہے۔ اسی زمین سے اُگا ہوا اناج کھاتے رہے اور اسی کو دُشمنوں کے ہاتھ بیچتے رہے۔ اب امان کس سے چاہتے ہو؟ کیوں اُمید رکھتے ہو کہ تمھارے مالِ حرام سے پلنے والے بچّوں کو یہ زمین پناہ دے۔" میں نے وحشت میں اُس کو قتل کر دیا ہوتا مگر محسن نے مجھے روک لیا۔

"ہوش میں آ سکندر۔" محسن نے کہا۔ "یہ اکیلا نہیں، ایسے غدار اور بھی ہیں۔ ہم صرف اسے مار کے سب کو ختم نہیں کر سکتے۔ یہ ایک ایک چھوٹا سا سپنولیا ہے نہ جانے کتنے سانپ اور اژدھے ابھی باقی ہیں۔"

"میں پاگل ہوں، تم پاگل ہو، ہم سب پاگل ہیں۔" دلاور کے پی اے نے اپنی دیوانگی میں ہنسنا شروع کیا۔ اس کے لبوں سے لہو بہہ رہا تھا اور وہ کراہ رہا تھا مگر وہ خاک و خون میں غلطاں ہوش کی منزل سے گزر رہا تھا۔ "وہ اژدھے تم سب کو نگل جائیں گے۔"

"کون ہیں وہ وطن دُشمن، وہی تخریب کار اور دہشت گرد جو مشرقی حصّے میں علیحدگی پسندوں کی حمایت کر رہے ہیں؟" میں نے جھک کر کہا۔ "یہ اسلحہ انھی کو جاتا ہے؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "ان کو بھی اور دُوسروں کو بھی۔۔۔"

"دوسرے کون؟" محسن نے اس کے قریب بیٹھ کر کہا۔

"سرحد پار۔" وہ بولا اور پیٹ پکڑ کے دُہرا ہو گیا۔

"سرحد پار سے بھی یہ اسلحہ آگے وہیں جاتا ہوگا۔" میں نے کہا۔ "وہ سب ایک ہیں۔ علیحدگی پسند۔ ان کی حمایت کرنے والے۔ جو اندر رہ کر ان کی مدد کرتے ہیں اور جو باہر سے امداد دے رہے ہیں۔"

"اس کا مطلب کچھ اور معلوم ہوتا ہے۔" محسن نے کہا اور اُسے سیدھا کر دیا۔ "سرحد پار کون ہیں؟"

"وہ بھی دُشمن ہیں۔" وہ لمبے لمبے سانس لینے لگا اور ہانپنے لگا۔ "سرحد پر گڑبڑ پھیلاتے ہیں۔"

"اور یہاں سے یہ اسلحہ لے جانے والے کون ہیں؟" محسن نے صبر و ضبط کے ساتھ جرح جاری رکھی۔

"میرے جیسے سیہ بخت۔ جن کے لیے دُنیا و عاقبت میں رسوائی ہے۔" وہ بولا۔ میری بات نے اس پر اثر کیا تھا یا خود اس نے اپنے آپ کو موت کی سرحد پر پا کے اپنی تمام عمر کی غلطی کو محسوس کر لیا تھا مگر زندگی کے یہ چند لمحات اس کا کفّارہ ادا کرنے کے لیے بالکل ناکافی تھے۔ یوں بھی وہ توبہ قبول نہیں ہوتی جو دمِ آخر کی جائے۔ مجھے اس پر ترس آیا۔

"تم ان کے نام پتے جانتے ہو؟" محسن نے کہا۔

"نہیں۔ ان کے نام نہیں ہوتے۔" وہ شدید کرب کے باوجود ہنسا۔

"کیوں۔ آخر ڈی سلوا ایک نام تھا۔" میں نے کہا۔ "اس سے پہلے میر شرافت علی ایک نام تھا۔"

"تم کسی نواب خسرو جمشید کو جانتے ہو؟" محسن نے کہا اور گھٹنوں کے بَل اس کے قریب بیٹھ گیا۔

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "وہ نواب تو نہیں ہے۔"

"ہاں نواب تو نہیں ہے لیکن وہ دلاور کے کاروبار میں شریک ہے۔" میں نے کہا۔ "کہاں ملے گا وہ؟"

"کہیں نہیں۔ اس کا کوئی۔۔۔ ٹھکانہ نہیں۔ بس آتا جاتا رہتا ہے۔"

"اور اس کے کاروبار میں کون شریک ہے؟" محسن بولا۔

"ایک۔۔۔ ایک ڈی ایس پی۔۔۔ سراج۔" وہ بولا۔ "یہاں سے اسلحہ بارڈر کے پار بھجوانے کا وہی ذمّے دار ہے۔" وہ بڑی مشکل سے ایک ایک لفظ ادا کر رہا تھا۔ سراج کے نام نے مجھے بچھو کی طرح ڈنک مارا۔ اس کے نام سے میری زندگی کے اوّلین تلخ ترین تجربات کی یاد وابستہ تھی۔ دیارِ غیر سے ارضِ وطن پہ قدم رکھنے کے بعد مجھے ذہنی اور جسمانی اذیت کا شکار کرنے والا ایک درندہ صفت، بے اعتبار اور بے ضمیر شکاری جس نے بے خبری میں بھرپور وار کیا تھا اور وہ سمجھا تھا کہ وہ اپنی ایذا رسانی سے جسم کے ساتھ میرے عزم کو بھی شکست دے سکے گا۔ میں ایک قانون پرست جمہوری ملک کے معاشرے سے لوٹنے والا مہذب آدمی تھا۔ ایک دولت مند کا ناز و نعم میں پلا ہوا بیٹا تھا جو گھر سے ولایت تک حصولِ علم کی نیّت سے گیا تھا اور جوانی کی راتیں اُمنگوں کے دن بڑی بے فکری سے گزارتا تھا۔ گھر لوٹتے ہی مجھے زنداں کی عقوبت سے پالا پڑا اور میرے ساتھ وہ غیر انسانی سلوک ہوا کہ میں آدمیت بھول گیا۔ اُس نے مجھے ایک کم ہمّت اور بے سہارا، ناتجربہ کار اور ناپختہ ذہن کا مالک اور کھلنڈرا الڑ کا سمجھا تھا۔ ایک قانون کے محافظ کہلانے والے افسر نے میرے جسم پر اتنی مشقِ ستم کی تھی کہ اس کی یاد اتنا عرصہ

گزر جانے کے بعد بھی میرے لیے ایک لرزہ خیز خواب کی طرح تھی۔

"گامے شاہ بھی ان کا ساتھی ہے؟" محسن نے کہا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "باقی سب ایجنٹ ہیں، ملازم ہیں اور کارندے ہیں۔"

"کراچی کا سیٹھ کریم بھائی بھی، کسٹم کا پیار علی بھی۔" میں نے وہ نام گنوا دیے جو مجھے یاد تھے۔

اُس نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں صرف گامے شاہ ہی کو جانتا ہوں۔"

"گامے شاہ کے علاوہ کسی کو آتے جاتے دیکھا تھا، یاد کرو اور بتاؤ۔ کسی کا فون نمبر یاد ہے؟"

اُس نے پھر نفی میں سر ہلایا۔ "سب دلاور کے پاس ہوتا ہے۔ اس کی نوٹ بک میں۔"

"تم بکتے ہو۔ جھوٹ بولتے ہو۔" میرا غصہ پھر بھڑک اُٹھا۔ "جب تم اس کے اتنے قریب تھے تو تم کو بہت کچھ معلوم ہوگا۔ سارے نام، سارے پتے، ٹیلی فون نمبر۔" میں نے اُسے پھر پسلیوں پر ٹھوکریں ماریں اور ہر ٹھوکر کے ساتھ وہ بلبلا کے لڑھکتا گیا۔ "سب بتانے پڑیں گے۔ ابھی۔" میں نے اُسے اُٹھایا اور دیوار پر دے مارا۔ محسن نے پھر مجھے روکا۔ میرا خون کھول رہا تھا اور میری کنپٹی میں سائیں سائیں ہو رہی تھی۔ رالعہ نے میری آستین پکڑ لی۔

"ایسے تو تم اس کو جان سے مار ڈالو گے۔" رالعہ نے کہا اور مجھے دُور کھینچنے لگی۔

"یہ زندہ رہنے کا مستحق بھی کہاں ہے۔ میرے بس میں ہو تو اس کو دس بار ماروں۔ ہر بار زیادہ عذاب کے ساتھ۔"

"سب بے کار ہے سکندر۔" محسن نے اچانک جھک کر کہا۔ "یہ ہر عذاب کی حد سے گزر چکا ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے رالعہ کے ہاتھ سے آستین چھڑائی اور محسن کے پاس گیا۔ "کیا یہ مر گیا ہے؟"

"ہاں۔ لیکن تمھاری مار سے نہیں۔ یہ بہت پہلے ہی مرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔" محسن بولا۔

میں نے دیکھا تو مجھے اس کی پُتلیاں ٹھہری ہوئی نظر آئیں۔ قریب سے مجھے کڑوے باداموں کی بُو کا احساس ہُوا۔

"سائنائیڈ؟" میں نے سوالیہ لہجے میں کہا۔ رالعہ دہشت زدہ اور سہمی ہوئی سی میرے ساتھ آ کھڑی ہوئی۔

محسن نے اقرار میں سر ہلایا۔ "اسی لیے تو یہ اپنا فیصلہ بتا چکا تھا کہ یہاں سے نکلے گا تو خودکشی کر لے گا۔ موت اس کی دسترس میں تھی۔ غالباً اسی لیے اسے موت کا خوف نہیں رہا تھا۔"

"لیکن زہر اس کی جیب میں تو نہیں تھا۔" میں نے کہا

"نہیں۔ میں نے تلاشی لی تھی۔" محسن بولا۔ "لیکن ایسے لوگ جن کے لیے زندگی کا ہر لمحہ پُل صراط کا سفر ہو، خود کو موت سے بھی شدید تر عذاب کے لیے تیار رکھتے ہیں اور جب ضرورت محسوس کرتے ہیں تو دُشمن کی قید سے یوں نکل جاتے ہیں کہ پہرے بٹھانے والے اور حصار قائم کرنے والے دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ ہم بھی اسے روک نہیں سکتے تھے۔"

"چلو اچھا ہُوا، مرتے مرتے کچھ نیک کام کر گیا۔" میں نے کہا اور رالعہ کے کندھے پر تھپکی دی جو خوف سے کانپ رہی تھی۔ ٹیڈی نے کچھ دیر پہلے اندر آ کے بلب لگا دیا تھا۔ دو سو واٹ کے بلب سے بھی اس بیرک میں واجبی سی روشنی ہو رہی تھی۔ جو کھانا ٹیڈی لایا تھا، وہ ایک بنچ پر پڑا ٹھنڈا ہو رہا تھا لیکن اب کسی کو کھانے کی خواہش نہ تھی۔

"میں نے تو اُسے کوئی زہر کھاتے نہیں دیکھا تھا۔" رالعہ نے کہا۔

"زہر اس کے کسی دانت میں محفوظ تھا۔" محسن نے کہا۔ "یہ ایک مصنوعی دانت میں سائنائیڈ بھر کے لگوا لیتے ہیں۔ جب ضرورت پڑتی ہے تو دانتوں سے دبا کے اس کی سیل توڑ دیتے ہیں۔"

"کیا عام زندگی میں خطرہ نہیں ہوتا کہ کھانے پینے میں سیل ٹوٹ جائے۔" رالعہ متحیر ہو کے بولی۔

"نہیں سیل اتنی کمزور بھی نہیں ہوتی۔" میں نے کہا۔ "اور یہ لوگ خیال بھی رکھتے ہیں کہ اس طرف سے کوئی سخت چیز نہ چبائی جائے۔ ابھی اس نے فرش پر سے کوئی کنکر، پتھر درمیان میں رکھ کے دبا لیا ہوگا۔ پوٹاشیم سائنائیڈ جیسے زہر سے چند سیکنڈ میں جسم سے روح کا رشتہ ختم ہو جاتا ہے۔"

"چند سیکنڈ میں؟" ٹیڈی نے جھرجھری لے کر کہا۔ "کوڑیالے سانپ کے زہر کا سُنا تھا۔"

"تیرا کیا خیال ہے محسن کہ جتنا اُسے معلوم تھا وہ سب بتا گیا؟" میں نے کہا۔

"نہ بتانا ہوتا تو کچھ نہ بتاتا۔" محسن بولا۔ "اتنا بھی نہ بتاتا۔"

"اس کی بات سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ اصل کاروبار کو چلانے والے اور مالک تین ہیں۔" میں نے کہا۔ "ایک وہ نقلی نواب خسرو جمشید، دُوسرا وہ خبیث سراج جو قانون کا محافظ کہلاتا ہے۔ مجھے یقین نہیں آتا۔"

"کیوں یقین نہیں آتا۔ ضمیر فروش کس محکمے میں نہیں ملتے؟" محسن بولا۔ "اب تو مجھے کوئی شک نہ

کی جان کیوں گئی۔ ان کو اس وطن دُشمن کاروبار کی خبر مل گئی ہوگی؟"

"ہاں۔ اور مجھے شک ہے کہ میر شرافت علی بھی اسی میں مارا گیا۔" میں نے کہا۔ "جب اُسے علم ہُوا ہوگا کہ وزیر خان کے ساتھ کیا ہُوا تو مجبوراً وہ دلاور سے مل گیا ہوگا۔ اس ڈر سے کہ کہیں اس کا حشر بھی وہی نہ ہو جو وزیر خان کا ہُوا لیکن وہ انکار کرنے پر موقعے کی تلاش میں رہا کہ مجھے مطلع کر سکے۔ منشی فوما پچو کو اسی نے نامہ بر بنایا ہوگا۔ میں جانتا ہوں کہ وہ میرے والد کا پُرانا شناسا تھا اور کوئی بہت پارسا آدمی تو نہیں تھا مگر والد نے اُسے کاروبار میں شریک کیا تھا۔ وہ کسی بھی غلط آدمی کے ساتھ کبھی شراکت نہ کرتے۔ دلاور بعد میں گھسا اور وزیر خان کو نکال باہر کیا۔ میر شرافت علی کے بارے میں اُس کو جیسے ہی خبر ملی کہ وہ اندر ہی اندر مخالفت رکھتا ہے تو اس نے ایک تیر سے دو شکار کیے۔ شرافت علی کو پیڈرو کے ہاتھوں مروا دیا اور مجھے پاکستان بُلا کر قتل کے الزام میں ملوّث کر دیا۔ آج میں سوچتا ہوں کہ میں نے اچھا کیا جو اپنے ہاتھوں سے شرافت علی کو نہیں مارا۔ وہ وقت مجھے یاد آتا ہے جب وہ مجھ سے زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا اور میرے سامنے گھگیا کر ہاتھ جوڑ رہا تھا کہ وہ بے قصور ہے۔ وہ واقعی بے قصور تھا لیکن میرے سر پر خون سوار دیکھ کر دہشت زدہ ہو گیا تھا۔ مجھے اس پر ترس آ گیا تھا۔ اگر میرا دل گواہی دیتا کہ میرے باپ کا قاتل وہی ہے تو مجھے کبھی اس پر ترس نہ آتا۔"

"یہ سراج کا نام تو بہت عرصے کے بعد سامنے آیا ہے۔" محسن بولا۔

"ہاں۔ لیکن اس کی وجہ ہوگی۔" میں نے کہا۔ "اس زمانے میں وہ کھل کر سامنے آ گیا تھا۔ پھر اُسے جان بوجھ کے پیچھے ہٹا لیا گیا۔ تاکہ زیادہ بدنامی سے اس کو نقصان نہ ہو۔ اس کی پوزیشن سے دلاور اینڈ کمپنی کو بہت فائدہ حاصل ہوتا ہوگا۔ ایک تو پولیس والا اور وہ بھی افسر۔ اعلیٰ افسران کی نظر میں آ جاتا تو کسی دُور دراز کے علاقے میں تعینات کر دیا جاتا۔ یہاں وہ دلاور سے اشتراک کر کے جتنا فائدہ حاصل کر رہا ہے، اتنا تو ساری عمر بھی حاصل نہ کر پاتا۔"

"دیکھنا پڑے گا کہ اس کی پوسٹنگ کہاں ہے۔" محسن بولا۔

"اس نے اپنی پوسٹنگ خود کسی ایسی جگہ کرا رکھی ہوگی جہاں کوئی بھی جانا پسند نہیں کرتا ہوگا۔ کسی غیر منافع بخش جگہ پر اپنی خوشی سے جانے کے لیے کوئی تیار نہیں ہوتا اور عموماً وہ افسر جو معتوب ہوں یا جن کے پیچھے کسی زبردست آدمی کا ہاتھ نہ ہو، وہ ایسے ناپسندیدہ مقامات پر پھینک دیے جاتے ہیں یا ہیڈ کوارٹر میں انتظامی نوعیت کے افسر بنا دیے جاتے ہیں، سکیورٹی کی ڈیوٹی کے لیے نامزد ہو جاتے ہیں یا افسر بکارِ خاص بن کے جھک مارتے ہیں۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔" محسن سے پہلے ٹیڈی نے کہا۔ "ہم نے تو تھانے فروخت ہوتے دیکھے ہیں۔ جس علاقے میں غریب اور لاوارث لوگ رہتے ہوں یا جہاں جرائم کے اڈّے زیادہ ہوں وہاں پوسٹنگ کرانے کے لیے ایس ایچ او کو پچاس ہزار سے ایک لاکھ روپے نقد تک اُوپر والوں کو دینے پڑتے ہیں اور ہر ماہ کے نذرانے کا مُعاملہ الگ ہوتا ہے۔ بالکل کھُلی بولی لگتی ہے سکندر بادشاہ۔ جو زیادہ دینے کا حوصلہ اور ارادہ رکھتا ہے وہی کامیاب رہتا ہے۔ وہ اپنے لیے دو حصّے رکھتا ہے تو ایک حصّہ ان کے لیے جو اُس کو موقع فراہم کرتے ہیں کہ جیسے چاہے قسمت آزمائے۔ نیچے والے بھی زیادہ آمدنی کے تھانے میں جانے کی خاطر یا تو اُونچی سفارش لگاتے ہیں یا پھر نقد خرچ کر کے کام نکالتے ہیں۔ کوئی تھانہ چاندی کی کان ہے تو کوئی سونے کی اور کوئی ہیرے کی کان ہے۔"

محسن ہنسا۔ "یہ اچھی مثال دی تم نے۔ اب بھلا گلبرگ تھانے جا کے کسی کو کیا ملے گا جہاں سارے ہی پھنّے خاں رہتے ہوں اور پولیس افسر تک ان سے ڈرتے ہوں۔ وہ تو تھانے دار کو بھی ذاتی ملازم سمجھتے ہیں۔"

"تم لوگ کس بحث میں پڑ گئے یار۔" میں نے کہا۔ "یہ نئی مصیبت گلے پڑ گئی ہے، اس کا کیا ہوگا؟"

"کیا ہوگا؟ وہی جو دوسروں کا ہُوا۔" محسن بولا۔ "پلاؤ کھائیں گے احباب، فاتحہ ہوگا۔"

"اس نے اپنے بیوی بچّوں کو دلاور اینڈ کمپنی کے عتاب سے محفوظ رکھنے کی خاطر مرنا قبول کیا تھا۔" میں نے کہا۔ "اس کا یہ مقصد پُورا ہونا چاہیے۔"

"اس کے کیے کی سزا اس کے بیوی بچّوں کو واقعی نہیں ملنی چاہیے۔" محسن نے مجھ سے اتفاق کیا۔

"غالب نے ٹھیک کہا تھا کہ عشق نے ہم کو نکما کر دیا۔ ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے۔" میں نے کہا۔ "اکیلا آدمی صرف اپنے بارے میں سوچتا ہے اور ہر سختی جھیلنے اور ہر آزمائش سے گزرنے کا حوصلہ رکھتا ہے لیکن شادی کر کے وہی آدمی بُزدل ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے انجام سے نہیں، بیوی بچّوں کے انجام سے ڈرنے لگتا ہے۔ خود ہر تکلیف اُٹھاتا ہے مگر اپنے بیوی بچّوں کو ذرا تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔ خاندان اس کی ایسی کمزوری بن جاتا ہے جس سے پُورا فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔"

"اور پھر بھی لوگ شادیاں کرتے ہیں۔" اُستاد ٹیڈی بولا۔

"ہاں۔ اور پھر اسی طرح سارے خاندان پر ایک سائبان بن کے رہتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "سائبان انھیں دُھوپ سے اور بارش سے بچاتا ہے۔ زمانے کی گرم سرد ہَوا سے محفوظ رکھتا ہے۔ سارے پتھر جو دُنیا کے سنگسار کرنے والے ہاتھ اُٹھاتے ہیں، اپنے سینے پر روکتا ہے اور انھیں ہر آفت سے پناہ دیتا ہے۔ اب دیکھ لو اس نے جان دی تو صرف اس لیے کہ انھیں یہ پناہ حاصل رہے۔ وہ دلاور کو یقین دلانا چاہتا تھا کہ اس نے مرنا گوارا کیا، کسی کو کچھ بتایا نہیں لیکن اس کی لاش یہاں ملی تو دلاور اینڈ کمپنی کو شک ہوگا کہ مرنے والے نے وفادار رہنے کے عہد پر جان قربان کرنے میں اتنی دیر کیوں کی۔ وہ گرفتار ہو کے اس مقام تک آنے سے پہلے ہی کیوں نہ مر گیا۔ عہد تو سب کرتے ہیں مگر اس اُمید میں کہ جان دینے کی آزمائش کا مرحلہ کبھی نہیں آئے گا۔ جب وقت آتا ہے تو کون بے دھڑک اپنی زندگی قربان کرتا ہے اور کون ڈر کے پیچھے ہٹ جاتا ہے یا تذبذب کا شکار ہوتا ہے۔ دلاور یہ سوچنے پر مجبور ہوگا کہ اس کے پی اے نے بھی کمزوری کا مظاہرہ نہ کیا ہو۔ پہلے اپنی جان بچانے کی کوشش کی ہو۔ ہم سے سودا کیا ہو کہ اگر وہ سب کچھ بتا دے گا تو اِسے بخش دیا جائے گا۔"

"دلاور جانتا ہے کہ ہم نے براہِ راست تشدّد کے حربے آزمانے سے گریز کیا ہوگا۔ پہلے تو سمجھا بجھا کر اسے تحفّظ کی ضمانت دی ہوگی اور اس سے تھوڑا بہت معلوم کر لیا ہوگا۔ پھر اس یقین کے ساتھ کہ وہ بہت زیادہ جانتا ہے اور جو کچھ اس کے ذہن میں ہے وہ سب اُگلوانے کے لیے جبر کیا ہوگا۔ یہاں تک کہ اس جسمانی اذیت کی تاب نہ لا کے وہ خودکشی پر مجبور ہُوا۔ مجبوری کی اس انتہا تک پہنچنے سے پہلے وہ کتنے راز افشا کر گیا؟ یہی اس کی قربانی کو ناقابلِ قبول بنا دے گا۔" محسن خان شیروانی نے مجھ سے اتفاق کیا۔

"اور خمیازہ بھگتیں گے بیوی بچے جن کی خاطر وہ جان سے گیا۔ انھیں سزا نہ ملی تو وفاداری کا پسِ از مرگ انعام بھی نہیں ملے گا۔" میں نے کہا۔ "نہ خُدا ہی ملا، نہ وصالِ صنم والی بات ہو جائے گی۔"

"پھر اب کیا کریں؟" ٹیڈی نے کہا۔

"ظاہر ہے یہ لاش اِدھر پڑی نہیں رہ سکتی۔" میں نے کہا۔

"یہ تحفہ بھی چوہدری دلاور صاحب کو بھیج دیں؟" ٹیڈی نے کہا۔

"نہیں دوست۔ اس کو میدانِ کارزار میں ڈال آتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "پتا چلے کہ یہ وہیں لڑتا رہا مگر اسیر ہونے سے پہلے ہی مر گیا۔"

"کون سے میدانِ کارزار میں؟" محسن نے کہا۔ "اسی جگہ جہاں اس کا اور تیرا مقابلہ ہُوا تھا؟"

"ہاں۔ وہی سب سے مناسب جگہ ہے۔"

"لیکن یار۔ وہاں لوٹ کر جانے میں خطرہ بھی ہے۔" محسن بولا۔ "اور اب اس سے کیا فائدہ۔ سب کے سامنے تو وہاں سے فرار ہُوا تھا۔ نازو رہ گئی تھی اور ایک لاش۔ پھر وہاں پولیس پہنچ گئی ہوگی اور اب ہمارے مرزا غالب آ کے بتائیں گے کہ نازو نے اس تیسرے شخص کا کیا حشر کیا تھا۔ وہ بھی اس خوفناک حسینہ کے ہاتھوں شہید ہُوا یا پولیس کے ہاتھ لگا اور پھر پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا یا نازو اسے لمبا لِٹا کے خود وہاں سے نکل گئی تھی۔"

"تیری بات میں سمجھ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "ہر صُورت میں جو لوگ وہاں ذرا سی دیر کے لیے رُک گئے تھے، وہ ذرا دیر نہیں ٹھہرے ہوں گے اور پولیس کے آنے تک کوئی چشم دید گواہ نہیں رہا ہوگا۔ ہُوا بھی تو اس چکّر میں نہیں پڑے گا اور اپنی جان چھڑائے گا کہ اس نے کچھ نہیں دیکھا۔"

"پھر بھی پولیس نے جائے واردات پر پہنچ کر ضابطے کی... کارروائی کی ہوگی۔" محسن بولا۔ "اور وہاں نازو ملی ہو یا نہ ملی ہو، ان کو ایک لاش ضرور ملی ہوگی۔ ممکن ہے دُوسرا بھی زندہ یا مُردہ ہاتھ لگا ہو۔ انکی رپورٹ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوگا۔ اس لاش کو اتنی دیر بعد وہاں ڈالنا بے وقوفی ہوگی۔ کون مانے گا کہ یہ بھی وہاں پڑا تھا لیکن کسی نے دیکھا نہیں۔ اس سے تو ثابت ہوگا کہ بعد میں ہم اسے ڈالنے وہاں پہنچے تاکہ دلاور پر واضح ہو جائے کہ یہ بھی ہمارا ہی کارنامہ تھا۔"

"تو مجھے اتنا احمق کیوں سمجھتا ہے جتنا خود ہے۔" میں نے کہا۔ "لاش کو جائے واردات سے تھوڑا سا ہٹ کے ڈال دیں گے۔ کسی جھاڑی یا درخت کی اوٹ میں۔ معلوم یہ ہو کہ جنگ کا پانسہ پلٹتا دیکھ کے یہ وہاں سے نکل گیا تھا لیکن فرار کے راستے مسدود تھے۔ چنانچہ کسی کے ہاتھ پڑنے سے پہلے اس نے اپنا خاتمہ کر لیا اور لاش ایسی جگہ تھی کہ فوراً کوئی نہ دیکھ سکا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ سے تصدیق ہو جائے گی کہ موت کس طرح واقع ہوئی۔ دلاور مطمئن ہو جائے گا کہ وہ کسی کے ہاتھ نہیں پڑا اور اسی جگہ خودکشی کر کے اپنا عہد نبھا گیا۔ لاش ابھی نہ سہی صبح تک ضرور دریافت ہو جائے گی۔ یہ ابھی چند گھنٹے پہلے کی بات ہے، پولیس بھی اب تو وہاں سے تفتیش کر کے رخصت ہو چکی ہوگی۔"

میری بات نے محسن کو قائل کر لیا۔ ٹیڈی نے ہمیں یاد دلایا کہ شام ہونے والی ہے اور جو کھانا ہمیں دوپہر کے وقت کھانا تھا، وہ ایسے ہی پڑا ہُوا ہے۔ خواہش نہ ہونے کے باوجود ہم نے چند لقمے زہر مار کیے اور پھر اُس جگہ کا جائزہ لیا۔ بیرک اندر سے ویسی ہی تھی جیسی کسی ورکشاپ کی عمارت ہو سکتی ہے۔ چھت کی کڑیوں سے جالے اور گھاس پھُوس لٹک رہے تھے اور بجلی کے تار ہر طرف پھیلے ہوئے نظر آتے تھے۔ دیواروں پر کبھی رنگ نہیں ہُوا تھا چنانچہ سیمنٹ کے پلاستر کا رنگ بھی سیاہ دکھائی دیتا تھا۔ لمبائی کے رُخ دونوں دیواروں میں دو دو کھڑکیاں تھیں مگر ان کو اندر سے لکڑی کے تختے ٹھوک کر ہمیشہ کے لیے بند کر دیا گیا تھا۔ دوسرا دروازہ آخری حصّے میں تھا اور مختصر سے احاطے میں کھُلتا تھا۔ احاطے میں پانی کا ایک نل تھا اور سابقہ کرائے داروں کا بے مصرف سامان، لکڑی کے تختے، خالی ڈرم اور پُرانے ٹائر۔ باہر سے جو تھوڑی بہت روشنی اندر پہنچتی تھی، ان روشندانوں کے ذریعے پہنچتی تھی جو دروازوں کے اور کھڑکیوں کے اُوپر بنے ہوئے تھے۔ روشندانوں کے پَٹ بھی بند تھے لیکن کسی کا ایک شیشہ بھی سلامت نہیں تھا چنانچہ ہَوا اور روشنی کے ساتھ چھت کے نیم تاریک اور ویران سہاروں پر گھونسلے بنانے والے پرندے بھی اس راستے سے اندر آتے تھے۔ نیچے فرش پکّا تھا اور غالباً توڑ کر دوبارہ بنایا گیا تھا — آمنے سامنے کی دونوں لمبی دیواروں کے ساتھ اور کھڑکی سے متصل لکڑی کی بھاری بھرکم اور بھدّی بینچ نما میزیں تھیں جن کے پائے زمین میں پیوست تھے۔ اس پر فرنیچر بنانے والے لکڑی پر رندہ مارتے ہوں گے یا شاید اس جعلی نوٹ چھاپنے والے نے اپنی مشینیں لگا رکھی تھیں۔ تاہم یہ سامان ساتھ لے جایا نہیں جا سکتا تھا چنانچہ یہیں رہ گیا تھا۔ مجھے کئی لٹکتے ہوئے سوئچ بورڈ نظر آئے۔ ایک کونے میں تھری فیز کنکشن کے میٹر اور مین سوئچ کا بورڈ البتہ سلامت تھا۔ پاور لائن کے کئی پوائنٹ فرش سے ذرا اُوپر دیے گئے تھے جو ہمارے لیے بے کار تھے۔ اُوپر چھت پر کئی ٹیوب لائٹوں کے کھوکے لٹکے ہوئے تھے جن میں نئی ٹیوب لگا کے اندر خاطر خواہ روشنی کا انتظام ہو سکتا تھا۔ میں نے نوٹ کیا کہ میٹر بند ہے اور اس کی سِیل بھی ٹوٹی ہوئی ہے۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ حکومت کی بجلی کو مالِ مُفت سمجھ کر فراخدلی سے استعمال کرنے کی اجازت ہے لیکن اجازت دینے والا میٹر ریڈر ہر ماہ اپنا وظیفہ وصول کرنے ضرور آتا ہوگا۔ پچاس روپے اس کی نظر کرو اور پانچ سو بجلی کے بل میں سے بچاؤ۔ جیو اور جینے دو کا منفی فلسفہ۔

"اس جگہ پر مزدور اور کاریگر قسم کے لوگ تو رہ سکتے ہیں۔" میں نے فیصلہ دیا۔ "مثلاً ہم تینوں حضرات۔ لیکن محترمہ خاتون، آپ کو اپنا بندوبست کہیں اور کرنا ہوگا ورنہ شکوک پیدا ہوں گے اور آپ کی وجہ سے ہمارا یہ ٹھکانہ بھی محفوظ نہیں رہے گا۔"

"یہ ٹھکانہ نہیں، اسلحہ خانہ ہے۔" رالعہ نے کہا۔ "کہاں سے آیا ہے یہ سب کچھ ہما آخر اتنے ریوالور کس کے ہیں اور یہ اسٹین گن جیسی خطرناک چیز!"

"نازو اس کھلونے سے نہیں ڈرتی تھی۔" میں نے کہا۔

"ڈری تو میں بھی نہیں تھی۔" رالعہ نے کہا۔ "کیا میں نے اس کو بالکل ٹھیک نہیں پکڑا تھا؟ میں نے تو یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ وہ کہاں کی بنی ہوئی ہے۔"

"اسٹین گن کی ساخت ہی بتا دیتی ہے کہ وہ یورپی یا امریکی طرز کی نہیں۔" میں نے کہا۔

"یہ وہی اسلحہ ہے جو ایک طرف سے اسمگل ہو کے آتا تھا اور دوسری طرف اسمگل کر دیا جاتا تھا۔" محسن بولا۔ "اور اِدھر کی چیز کو اُدھر کرنے والے دونوں طرف کے ضرورتمندوں سے زیادہ فائدے میں رہتے تھے۔"

"میری بات پہ غور نہیں کیا تم نے؟" میں نے کہا۔

"ہم نے غور فرمایا اور بات کو فضول قرار دیتے ہوئے مسترد کر دیا۔" رالعہ ہنسی۔

"کیا مطلب؟ گویا تم اسی کارخانے میں ہمارے ساتھ رہنے پر مُصر ہو؟" میں نے کہا۔

"کارخانے سے پاگل خانے بلکہ مُردہ خانے تک میں تمھارے ساتھ رہوں گی۔" وہ فیصلہ کُن لہجے میں بولی۔

"تمھارا جذبہ فلمی عشق سے زیادہ صادق ہے مگر تمھارے ناقص العقل ہونے کا ثبوت ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ الزام تو ہم عورتوں کی ذات پر ہے اور رہے گا۔" رالعہ بولی۔ "میں نے اپنا فیصلہ بتا دیا۔"

"یہ کیا احمقانہ ضد ہے۔" میں نے برہمی سے کہا۔ "تمھاری وجہ سے ہم بھی پریشانی میں مُبتلا رہیں گے۔"

"پھر میں کیا کروں! پریشانی ہے تو سب کے لیے ہے۔ نہیں ہے تو کسی کے لیے نہیں ہے۔" وہ اسی لہجے میں بولی۔

"لیکن اس طرح یہاں کوئی عورت نہیں رہ سکتی۔"

"اس طرح نہ سہی، میں بھی اپنی وضع قطع بدل لوں گی۔" رالعہ نے کہا۔ "جو تم کہو گے بن جاؤں گی۔"

"دیس چھڑائے بھیس چھڑائے کیا کیا کرے نہ پریت۔"

محسن نے سرد آہ بھر کے کہا۔

"ہم تو کارٹون بن گئے ہیں۔ تم کو اس کی کیا ضرورت ہے۔" میں نے کہا۔" فیصلہ ہو گیا تھا کہ تم انکل رضوی کے پاس چلی جاؤ گی۔"

"فیصلے بدل بھی جاتے ہیں۔" رابعہ نے کہا۔" میں اب کہیں نہیں جا رہی ہوں اور تم اگر کارٹون بن کے رہ سکتے ہو تو میں بھی رہ سکتی ہوں لیکن الگ تھلگ رہ کے وہ ذہنی اذیت قبول نہیں کر سکتی جو اندیشوں اور وسوسوں سے ملتی ہے اور بے یقینی کا نتیجہ ہوتی ہے۔"

"تم ہمارے لیے اضافی مسائل پیدا کر دو گی' اپنی حفاظت کے لیے۔"

"ہم سب ایک دوسرے کی حفاظت کے خیال سے ساتھ ہیں اور کون ہے جو دوسرے کو پریشانی یا مسئلہ سمجھتا ہے؟ کس موقع پر میں نے تمہارا ساتھ دینے میں کمزوری کا مظاہرہ کیا؟" وہ بگڑ کر بولی۔

"بی بی! تم ناحق خفا ہو رہی ہو۔" میں نے کہا۔" تمہاری داستانِ شجاعت سے کون واقف نہیں لیکن تمہاری مدد کی نوعیت مختلف ہوتی تو زیادہ کارآمد تھی۔ تم الگ رہ کر ہمارے لیے زیادہ کچھ کر سکتی ہو۔ مثلاً ہماری قانونی مدد، مالی مدد۔ اور ہمیں حالات سے باخبر رکھنے کا کام۔"

"میں الگ رہنا ہی نہیں چاہتی تو بات ختم۔" وہ بولی۔ "قانونی مدد میں نے پہلے کی تھی' اب نہیں کر سکتی کیونکہ تمہارے معاملات قانون کی حدود سے بہت باہر نکل گئے ہیں۔ مالی مدد کا یہ ہے کہ جو کچھ میرے پاس ہے' وہ لے لو۔ ایک گھر کے سوا جسے میں نے بیچنے کے لیے نہیں خریدا ہے۔ رہی حالات سے باخبر رہنے کی بات' تو تم کبھی حالات سے بے خبر نہیں رہے لیکن میں تمہاری جانب سے بے خبر رہ کے دیکھ چکی ہوں۔ مجھ میں اب اکیلا رہنے کی ہمت نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے بھائی!" محسن نے ہاتھ اُٹھا کے کہا۔" اس بات پر مت لڑو لیکن ایک بات سمجھ لو۔ ہم یہاں کچھ لکڑی کا کام کریں گے۔ کام کیا خاک کریں گے' ایک پردہ رکھیں گے تاکہ ہم پس پردہ کچھ بھی کرتے رہیں۔ ہمارا حُلیہ تم دیکھ رہی ہو۔ اس کاروبار کے لیے یہی سب سے بہتر حُلیہ ہے۔ تم بھی یہاں مس رابعہ قاری ایڈووکیٹ ہائی کورٹ بن کے نہیں رہو گی۔ وضع قطع سے تمہارا الگ نظر آنا غلط ہو گا۔"

"میں بن جاؤں گی وہی جو تم ہو۔" رابعہ نے پورے یقین سے کہا۔

"لیکن وہ لینڈ لارڈ۔ کیا وہ اعتراض نہیں کرے گا؟ جگہ کام کے لیے دی تھی، رہائش کے لیے نہیں۔" میں نے کہا۔

"اس سے اپنی مجبوریاں بیان کر دیں گے کہ الگ گھر نہیں لے سکتے اور ایک عورت کھانے پکانے کے لیے ساتھ ہے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ میری بہن ہے۔" محسن نے کہا اور ہم اس کے ایک حصے میں پردہ ڈال کے کچھ گھریلو سا ماحول پیدا کر سکتے ہیں۔ زنان خانہ بنا سکتے ہیں۔ دو چار برتن اور چارپائی ڈالنے کی جگہ ہے مگر یہ سب کل دیکھیں گے۔"

"ہاں۔ غالب آ جائے تو صورت حال کا پتا چلے۔" میں نے کہا۔" مجھے نازو کی طرف سے تشویش ہے۔"

"عزیزہ۔ کیا اس بدبخت کی تشویش پر تم کو تشویش محسوس نہیں ہوتی؟" محسن نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"اس تشویش کے بارے میں تم تفتیش کر کے مشورہ دو' کیا واقعی مجھے تشویش میں مُبتلا ہونا چاہیے؟" رابعہ نے قدرے مُسکرا کے کہا۔

"بات مذاق کی نہیں یار۔ نازو تو چھلاوا ہے۔ کسی نہ کسی طرح نکل جائے گی۔" میں نے کہا۔" وہ شخص جسے میں نازو کے پیچھے چھوڑ کر آیا تھا' کہیں اس نے ہمارا راز نہ فاش کر دیا ہو۔ ہمیں پھر ٹھکانا بدلنا پڑے گا۔ میرا خیال تھا کہ کل گامے شاہ سے ملاقات کی کوئی صورت پیدا کی جائے۔ ایک نام کا سلسلہ دوسرے نام کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ ممکن ہے کہ گامے شاہ کسی اور کے متعلق بتا سکے۔"

"گامے شاہ تک پہنچنا آسان نہیں۔" محسن بولا۔" ایک تو ہمارے پاس کوئی ٹرانسپورٹ نہیں ہے۔"

"ہمارے پاس چالیس ہزار چہرۂ شاہی ہیں۔" میں نے کہا۔ "سکۂ رائج الوقت اور اس کے نصف سے یہ بندوبست بھی ہو جائے گا۔"

"دوسری بات یہ ہے کہ گامے شاہ واقعی انڈر گراؤنڈ ہے۔ اس تک پہنچنے کے لیے زیرِ زمین راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔" محسن نے کہا۔

"ہم عقیدت مند بن کے حاضری دے سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اپنی موجودہ صورت میں ہم کو بھلا کون پہچان سکتا ہے۔ ایک اسٹین گن سُوٹ میں تو نہیں چھُپائی جا سکتی لیکن اس لُنگی کے اُوپر اور کھدّر کے اس ڈھیلے ڈھالے کُرتے کے نیچے تو تم بھی کی توپ باندھ کر لے جا سکتے ہیں۔ اس کو نکال لائیں زندہ سلامت تو بات بن جائے۔"

"وہ بھی دلاور کے پی اے کی طرح مر جانا قبول کرے گا۔" محسن نے مایوسی سے کہا۔

"ہم اسے مرنے نہیں دیں گے۔" میں نے کہا۔" ایک بار تجربہ ہو گیا۔ اب یہ غلطی نہیں ہو گی۔"

ہم اپنی گفتگو میں اتنے مگن تھے کہ ہم نے ٹیڈی کی طرف دھیان ہی نہیں دیا۔ پھر اچانک میری نظر نے اُسے اپنے صندوق کو ٹٹولتے ہوئے دیکھا اور میں نے محسن کو اشارہ کیا۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہُوا کہ نہ صندوق ٹوٹا ہے اور نہ ہی کھُلا ہے۔ جب میں نے ٹیڈی کو گرایا تھا تو میرا مقصد اس شرارت سے یہ تھا کہ کسی طرح صندوق پر لپٹی ہوئی رسّی کٹ جائے یا اس کا ڈھکنا ٹوٹ جائے مگر محسن نکل آیا تو میں یہ بات بھُول گیا۔ اب پھر مجھے تجسّس نے آگھیرا کہ آخر اس صندوق میں کیا ہے کہ ٹیڈی اسے جان سے عزیز تر رکھتا ہے۔ صندوق پر رسّی کے بل اتنے ڈھیلے ہو گئے تھے کہ کسی کُنڈی کی عدم موجودگی میں صندوق کھُل جانا چاہیے تھا لیکن صندوق اب بھی بند تھا اور ٹیڈی اس کو چاروں طرف سے دیکھ کر نہ جانے کس بات کا اطمینان کر رہا تھا۔ میں نے محسن کی طرف دیکھا اور ہم دبے پاؤں ٹیڈی کی طرف بڑھے۔ وہ اتنا بے خبر تھا کہ اُسے ہمارے سر پہ پہنچ جانے کی خبر تک بھی نہ ہوئی اور پھر بیک وقت میں اور محسن صندوق پہ جھپٹے۔

"میاں خوجی! آج تو ہم نے قسم کھائی تھی۔" میں نے کہا اور ٹیڈی کو ایک طرف دھکیل دیا۔

"کیا یہ پنڈورا کا باکس ہے۔" محسن بولا۔" کہ تم اس کو کھولتے ہی نہیں۔"

ٹیڈی اس حملے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا میں اور محسن صندوق پر قبضہ کر چکے تھے لیکن ہماری یہ جدوجہد بے ثمر ثابت ہوئی۔ ہم صندوق کو کھول نہ سکے۔ میں نے اور محسن نے اسے ہر طرف سے اُلٹ پلٹ کے دیکھا لیکن وہ بند رہا۔ اس میں کوئی خفیہ تالا نہیں تھا اور تین فٹ لمبا، دو فٹ چوڑا اور ایک فٹ گہرا یہ ڈبا ہر طرف سے ایک ہی جیسا تھا۔ وہ جگہ جہاں ایک لکیر سی نظر آتی تھی اور جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ ڈھکنا الگ ہے، وہاں بھی کچھ نہیں تھا۔ اس لکیر کے ساتھ ساتھ ٹین کے باکس کو ٹانکے لگا کے ویلڈ کر دیا گیا تھا۔ میں نے اور محسن نے خفت اور حیرت سے ایک دوسرے کی طرف اور پھر ٹیڈی کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ مایوس، کچھ دل گرفتہ اور کچھ پریشان سا بیٹھا تھا کہ وہ کیا کرے اور کیا کہے۔

"یہ تو ہر طرف سے بند ہے!" میں نے صندوق پر ایک مکّا مارا۔

"اور یہ تم ہمیں بھی دھوکا دے رہے تھے اُستاد؟" محسن نے کہا۔" رسّی لپیٹ کر بے وقوف بنا رہے تھے!"

"محسن خان۔ یہ صندوق بھی دھوکا ہے۔" میں نے اپنا ہاتھ سہلا کے کہا۔" ایسے زنگ خوردہ اور پتلی چادر کے بنے ہوئے صندوق پر میں نے اتنی قوت سے مُکّا مارا تھا کہ اس ضرب سے تو نئی چادر بھی اندر بیٹھ جاتی لیکن اس صندوق کا کچھ بھی نہیں بگڑا۔"

"تم اس کا کچھ بگاڑ بھی نہیں سکتے۔" ٹیڈی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔" اس کے اندر بارہ گیج کی فولادی چادر کا ایک باکس ہے۔ اُوپر والا ٹین صرف لفافہ ہے۔ بے شک پھاڑ کے دیکھ لو۔"

"یہ کیا اسرار ہے اُستاد؟" میں نے کہا اور تعجب سے محسن کی طرف دیکھا۔

"کیا ہے اس پُراسرار صندوقچی کا راز؟" محسن نے میرے ساتھ ہی کہا۔ ٹیڈی منجمد بیٹھا اپنے ناخنوں کو دانتوں سے کُترتا رہا۔ ہماری گفتگو میں دلچسپی کے باعث رابعہ بھی ہمارے قریب ہی آ کھڑی ہوئی تھی۔

"اس میں کچھ بھی نہیں ہے۔" ٹیڈی بولا۔" میں بتا چکا ہوں۔" اس کا لہجہ بالکل کھوکھلا تھا۔

"ایسی کی تیسی تمہاری۔ ہم معلوم کر لیں گے۔" میں نے کہا۔ "بس اتنا ہمیں بتا دو کہ اس صندوق میں شاہِ جنات تو قید نہیں ہیں؟"

"یا پھر یہ کوئی بم تو نہیں ہے کہ دھماکا ایک ہو اور بیوہ دو کو کر دے' بیوی بننے سے پہلے ہی؟" محسن بولا۔

دروازے پر دستک نے ہمیں صندوق کے راز سے واقفیت کی خواہش سے دستبردار ہونے پر مجبور کر دیا۔ میں نے ایک نظر دلاور کے پی اے کی طرف دیکھا جس کی لاش کمرے کے آخری کونے میں بالکل سیدھی پڑی ہوئی تھی۔ میں نے رابعہ کو مخالف سمت میں جانے کا اشارہ کیا۔ خود ایک ریوالور لے کر دروازے کے ساتھ ہی دیوار سے لگ گیا اور پھر محسن خان شیروانی نے دروازہ کھولا۔

"ہم سب دیکھ رہے تھے باہر سے۔" مرزا غالب نے مسرت سے اعلان کیا۔" دروازے کی جھری میں سے صاف نظر آ رہا تھا۔ "ماشا اللہ سب بہت محتاط ہو اور ہوشیار بھی۔"

"بہت دیر کی مہربان آتے آتے۔" میں نے ریوالور کو ڈب میں ڈال کر کہا۔

"ارے بھائی! خُدا کا لاکھ لاکھ شکر کہ بالآخر صحیح جگہ پہنچے۔" غالب نے اندر آ کے بیرک پر ایک نظر ڈالی۔" ورنہ ایسی ہی جگہ تھی

وہ بھی۔ جہاں سے ہم کوئی دس منٹ پہلے نکالے گئے۔ بلکہ باہر پھینکے گئے تھے۔"

"کیا ضرورت تھی تصدیق کیے بغیر وہاں گھسنے کی؟" میں نے ہنس کر کہا۔ "نام یاد نہیں رہا تھا کیا؟"

"کچھ گڑبڑ ہو گئی تھی۔" غالب نے سر کھجا کے کہا۔ "اس پر بھی کچھ فرنیچر فیکٹری ہی لکھا ہوا تھا۔ ان کی بھی غلطی تھی نا یار دروازے کھلے رکھ کے بیٹھے تھے۔"

"تم کو سوچنا چاہیے تھا کہ ہم کبھی دروازے کھلے نہیں چھوڑ سکتے۔" میں نے کہا۔ "خیر یہ بتاؤ خبر کیا لائے ہو؟"

"خبر؟" غالب نے سر پہ ہاتھ مارا۔ "وہ تو میں بالکل بھول ہی گیا۔"

"کیا بھول گیا۔ یعنی یہ بھول گئے کہ تم کو کہاں جانا تھا اور کیا کرنا تھا!" میں نے جھلا کر کہا۔

"ارے نہیں یار۔ وہ خبر تو باہر ہی رہ گئی۔" غالب دروازے کی طرف لپکا۔ میں نے اسے روک لیا۔

"پہلے بتاؤ کون ہے باہر؟" میں نے کہا اور لائٹ آف کر دی۔

"ارے بھئی بڑی اچھی خبر ہے۔" غالب مسکرایا۔ "کم از کم ہمیں تو بہت اچھی لگی۔ نازو ہے اس کا نام بلکہ اس خبر کی سرخی ہے جو اس کے لبوں پر لپ اسٹک بن کر پھیلی ہوئی ہے اور اس کے عارض..."

"تم اسے یہاں لے آئے!" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "ہم سے پوچھے بغیر؟"

"اب کیا ہو سکتا ہے سکندر۔" رابعہ نے آگے آ کے کہا۔

"وہ بے چاری کیا باہر کھڑی رہے گی۔" اس نے دروازہ کھول دیا۔ غالب باہر گیا اور ایک منٹ سے بھی کم وقت میں لوٹ آیا۔ میں اور محسن پیچھے ہٹ گئے۔

"میں نے تم سے کہا تھا سکندر بادشاہ۔" ٹیڈی نے مجھے یاد دلانا چاہا۔

"ہاں۔ تم نے ٹھیک کہا تھا لیکن اسے میں نہیں لے کر آیا ہوں۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"یہ غالب نے اچھا نہیں کیا۔" محسن سوچتے ہوئے بولا۔

اتنی دیر میں نازو نے اندر قدم رکھا۔ اُس نے ایک نظر مجھے پھر محسن اور رابعہ کو دیکھا۔

"کیا تم لوگ خوش نہیں ہو میرے آنے سے؟" وہ ہم سب کی سنجیدہ صورت دیکھ کر بولی۔

"تمھارا یہاں آنا کسی بھی صورت میں مناسب نہیں تھا۔" میں نے کہا۔

"مگر میں اکیلی نہیں آئی ہوں۔" وہ بولی۔ "بھتیا بھی ساتھ آئے ہیں۔"

یک لخت مجھے بجلی کا جھٹکا لگا۔ "کون... اکرام شیخ...!" میں نے کہا اور اس کے بعد بے اختیار میرا ہاتھ ریوالور پر چلا گیا۔

"ہاں میں۔" اکرام شیخ نے اندر آنے کے بعد کہا۔ "مگر میں [illegible] بن کے آیا ہوں۔"

میں اور محسن دم بخود کھڑے رہ گئے۔ مجھے غالب پر اتنا غصہ آیا کہ میں نے اس کو مارنے کی خواہش پر بڑی مشکل سے قابو پایا۔ نادان کی دوستی جی کا جنجال۔ وہ میدانِ صحافت کا شہسوار، کاغذ کے میدان میں قلم کے گھوڑے دوڑانے والا ذہین تھا، مخلص تھا اور جرأت مند بھی تھا۔ اس کی زندگی کے تجربات شاید ہم سے بھی زیادہ تھے اور وہ شریف نظر آنے والا بہت بڑا بدمعاش بھی تھا مگر اس کو اندازہ نہیں تھا کہ ہمارے دوست کون ہیں اور دشمن کون... ہم ہر کسی پر اعتماد نہیں کر سکتے تھے اور اکرام شیخ کو ہم پرکھ چکے تھے۔ وہ اپنی سرشت کے اعتبار سے قانون پرست تھا، ہمارا دوست کیسے ہو سکتا تھا۔ ہم اور وہ دریا کے دو کنارے تھے جن کے درمیان کا بُعد ختم نہیں ہو سکتا تھا۔

"دوستی کے نام پر ہم دشمنوں کے فریب میں آنے کی غلطی ہرگز نہیں کر سکتے۔" میں نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا اور لائٹ جلا دی۔

"اور زبانی دعوے سے نہ کسی کی دوستی ثابت ہوتی ہے نہ ہم اس پوزیشن میں ہیں کہ اس دعوے کو پرکھ سکیں۔" محسن نے کہا۔

"قصور تمھارا نہیں ہے۔" اکرام شیخ نے ندامت زدہ لہجے میں کہا۔ "تمھارے حالات کا ہے کہ تم رسّی کو بھی سانپ سمجھ کے ڈرتے ہو۔"

"اور بزبانِ غالب۔ ڈرتا ہوں آدمی سے کہ مردم گزیدہ ہوں۔" غالب نے کہا۔

"ہماری جگہ تم ہوتے تو بِلا سوچے سمجھے اعتماد کرنے کی غلطی کر سکتے تھے؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ لیکن میرے بارے میں تم جانتے ہو۔" اکرام شیخ نے کہا۔

"ہاں۔ میں یہ جانتا ہوں کہ تم ایک انتہائی ایماندار اور فرض شناس پولیس افسر ہو۔"

"میں پولیس افسر تھا مگر اب استعفا دے چکا ہوں۔" شیخ نے احتجاج کیا۔

"یہ بھی تم کہہ رہے ہو۔" میں نے کہا۔ "کل تک تم کچھ اور کہتے تھے اور بالکل مختلف لہجے میں بات کرتے تھے۔"

"میں کل بھی تمھارا دوست تھا اور میں نے..."

"کل ہم سے زیادہ تم قانون کے دوست تھے۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "جب انتخاب کا وقت آیا تھا تو تم نے ہماری دوستی کو اپنی فطرت کے تقاضوں پر قربان کر دیا تھا۔ قانون کے تقاضوں کو تم بلا چون وچرا پُورا کرتے تھے اور اپنے فرض کی راہ میں کسی رشتے کو حائل نہیں ہونے دیتے تھے۔ کیا میں وہ وقت بھول سکتا ہوں جب تم نے نازو کو گولی کا نشانہ بنا دیا تھا؟"

"میں اپنی اس غلطی، اس گناہ یا جرم کا کفارہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔" وہ بولا۔

"کفارہ!" میں نے طنز سے کہا۔ "بچھو اگر کسی کو ڈنک مارنے کے بعد یہ کہے کہ سوری۔ آئندہ ایسا نہیں ہو گا تو میں اسے بھول کی طرح بے ضرر سمجھتے ہوئے ہتھیلی پہ نہیں بٹھا لوں گا۔ مجھے تو شک ہے کہ کفارہ تم اس کوتاہی کا ادا کرنا چاہتے ہو جو تم سے ایک مجرم کے سلسلے میں ہوئی تھی۔ جو تمھاری گرفت میں آ کے نکل گیا تھا۔ تمھاری فطرت میں اتنا بڑا انقلاب..."

"سکندر...! یہ تم کو کیا ہو گیا ہے۔" نازو نے چلّا کر کہا۔

"تم مت بولو نازو۔ تم ان باتوں کو نہیں سمجھو گی۔" میں نے برہمی سے کہا لیکن اپنی نظر شیخ پر رکھی اور اپنے ریوالور کا رخ بھی نہیں بدلا۔ محسن اور رابعہ کے ساتھ اب ٹیڈی بھی آ کھڑا ہوا تھا اور برائے نام روشنی میں اندر کھڑے ہوئے افراد کے دو گروہ بن گئے تھے۔ ایک طرف ہم چار تھے جن کے درمیان خیالات و نظریات، قول و فعل اور جذبات و احساسات کی مکمل ہم آہنگی تھی اور ناقابلِ شکست اعتماد کا رشتہ تھا۔ دوسری طرف کھڑے ہوئے تین افراد میں سے غالب نے خود کو اعتماد کا اہل ثابت کر دیا تھا لیکن اس وقت وہ اپنی جلد بازی کے باعث اور انجانے میں ایک غلطی کر بیٹھا تھا اور خود کو صفِ مجرماں میں پا کے برہم بھی تھا اور شرمسار بھی۔ نازو قدرتی طور پر ایک جذباتی صدمے سے دوچار تھی کہ ابھی تک وہ مجھے اپنی نیت کے خلوص کا یقین نہیں دلا سکی لیکن بات اس کی نہیں اس کے بھائی کی تھی۔ نازو کو یہ دُکھ تھا کہ میں نے اس کے کہنے کے باوجود اس کے بھائی پہ اعتبار نہیں کیا۔ یہ اُس کی اور میری سوچ کا نہیں نظر کا فرق تھا۔

وہ اکرام شیخ کو بہن کے جذبات کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔ میں اکرام شیخ کو ایک اچھا آدمی ضرور سمجھتا تھا لیکن اسے موجودہ حالات میں اپنا دوست تسلیم کرتے ہوئے ڈرتا تھا۔ وہ وقت بدل گیا تھا جب میرے اور اس کے درمیان پُرخلوص دوستی کا قابلِ رشک رشتہ تھا۔ میرا ذہن اس بات کو تسلیم نہیں کرتا تھا کہ وقت کے ساتھ کسی کی فطرت بھی بدل سکتی ہے۔ چنانچہ میں تذبذب کا شکار تھا تو یہ ایک قدرتی ردِعمل تھا۔

"اچھا۔" اکرام شیخ نے مایوسی سے ہاتھ پھیلا کے کہا۔ "اب تو میں یہاں آ گیا ہوں۔ تم میرے ساتھ جو بھی سلوک کرنا چاہو تمھیں اختیار ہے۔ میرا ضمیر صاف ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ میں نے کوئی غلطی کی ہو۔"

"تمھارا ضمیر اس وقت بھی صاف تھا جب تم نے دوستی کو بھلا کے مجھے ایک مجرم کی حیثیت سے زندہ یا مُردہ گرفتار کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔" میں نے کہا۔ "اس وقت بھی تم یہ سمجھتے تھے کہ تم غلطی پر نہیں ہو۔"

"غلطی مجھ سے ہوئی کہ تمھیں یہاں لا کے بے آبرو کیا۔" غالب نے تلخ لہجے میں کہا۔

"یہ آبرو کا نہیں، زندگی یا موت کا سوال ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم سب اچھے انسان ہیں لیکن ہمارے درمیان آج کے رشتوں کی نوعیت مختلف ہے اور رشتوں کی پہچان وقت کے ساتھ ہوتی ہے جب مجھے یہ ڈر نہیں ہو گا کہ تمھارے خلوص میں کوئی کھوٹ نہیں، تم نیک نیتی کے ساتھ مجھے گرفتار کرنے نہیں بلکہ میری مدد کرنے آئے ہو اور دوست کے پردے میں درحقیقت کوئی پولیس افسر چھپ کر نہیں آیا ہے تو میں اسی طرح تم پر اعتماد کروں گا جیسے اس سے پہلے کرتا تھا اور جیسے آج محسن پر کرتا ہوں۔"

"اور مجھ پر نہیں کرتے؟ ابھی تک نہیں کرتے!" غالب نے برافروختہ ہو کے کہا۔

"محسن کا نام تو مثال دینے کے لیے تھا ورنہ تم ہو، ٹیڈی ہے، رابعہ اور شہلا ہیں۔" میں نے کہا۔

"میں کس طرح خود کو اعتماد کا اہل ثابت کر سکتا ہوں؟" اکرام شیخ نے کہا۔ "اپنی نیّت کے صاف ہونے کا یقین دلانے کے لیے مجھے کیا کرنا ہو گا؟"

"اس کا کوئی ایسا ٹیسٹ نہیں جو نصاب کے مطابق ہو۔" میں نے کہا۔ "لیکن اپنے عمل سے تم بہت کچھ ثابت کر سکتے ہو۔ پیشہ ور افراد کسی کو اپنے ساتھ شامل کرتے ہیں تو اس کی آزمائش بھی کرتے ہیں۔ تم ہمیں جرائم پیشہ افراد کا گروہ فرض کر لو۔ یہ تو

ہمیں دیکھنا ہی پڑے گا کہ تم میں مجرمانہ صلاحیت کتنی ہے اور کہیں مجرم کے بھیس میں تم مخبر تو نہیں ہو۔ ہمارا اطمینان ہونے تک تم کو محتاط رہنا ہوگا۔ محسن، شیخ صاحب کی تلاشی لے۔"

"تمھارا رویّہ بہت ہتک آمیز ہے سکندر" نازو نے خفگی سے کہا۔

"یہ احتیاط کا تقاضا ہے جسے میں تمھاری خاطر نظرانداز نہیں کروں گا۔" میں نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ "تم اور غالب ایک طرف ہوجاؤ۔ تم اپنے ہاتھ اُٹھالو شیخ اور اس بات کو ذہن میں رکھو کہ جس طرح تم نے ضرورت پڑنے پر گولی چلاتے ہوئے تذبذب کا مظاہرہ نہیں کیا تھا، ایسے ہی میں بھی سوچوں گا نہیں۔ میری اُنگلی ٹرائیگر پر ہے۔"

شیخ نے مُسکراتے ہوئے ہاتھ اُٹھا دیے۔ محسن نے اس کی اچھی طرح تلاشی لی اور اس کی جیب میں سے ایک ریوالور کے علاوہ باقی چیزیں بھی نکال لیں۔ نازو کا چہرہ آتشِ قہر و غضب سے لال بھبھو کا ہورہا تھا، غالب کا رنگ خفّت سے زرد تھا مگر ٹیڈی خوش تھا کہ میں نے اس کے مشورے کو قابلِ غور سمجھا۔

"صرف ریوالور اپنے پاس رکھو، باقی چیزیں اکرام شیخ کو دے دو۔" میں نے کہا اور محسن نے میرے احکامات کی اس طرح تعمیل کی جیسے میں دہشت پسندوں کی کسی تنظیم کا کمانڈر ہوں۔ پھر میں نے بھی اپنا ریوالور ہاتھ میں رکھنا ضروری نہیں سمجھا۔ وہ کشیدگی کی فضا جو میرے غیر دوستانہ رویّے سے پیدا ہوئی تھی پھر بھی برقرار رہی۔

"ہم یہ سمجھتے تھے کہ اپنا چہرہ بدل کے اور اس محفوظ مقام پر سکونت اختیار کرنے کے بعد فوری طور پر ہمارے لیے خطرے کی بات نہیں رہی۔" میں نے کہا۔ "لیکن تحفظ کا یہ احساس پہلے کی طرح اطمینان بخش نہیں رہا۔"

"تم بتاؤ کہ مجھے تمھارے اطمینان کے لیے کیا کرنا ہوگا؟" اکرام شیخ نے تلخی سے کہا۔

"اس کمرے کے آخر میں دیکھو۔" میں نے ایک ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "کچھ نظر آتا ہے؟"

اکرام شیخ نے گھور کر دیکھا۔ "یہ... یہ کون سو رہا ہے اُدھر...؟"

"ایک بدبخت، جس نے زندگی حرام کی اور پھر اپنے لیے حرام موت قبول کی۔" میں نے کہا۔

اکرام شیخ آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ "کون ہے یہ؟ میں اسے نہیں جانتا۔"

"یہ چوہدری دلاور کا سیکریٹری تھا۔" میں نے کہا۔ "نازو اس کو پہچان لے گی۔"

"یہ... یہ تو وہی ہے بھیّا" نازو نے قریب جاکے بھائی کا بازو تھام لیا۔ "یہی تو اسٹین گن لے کے اُترا تھا۔"

"اس کو قتل کس نے کیا ہے؟" اکرام شیخ بولا۔

"اب بھی پولیس کے لہجے میں ہی سوال کر رہے ہو؟" محسن بولا۔ "اس کو کسی نے قتل نہیں کیا۔ اس نے خودکشی کرلی۔ یہ ہوسکتا تھا کہ ہم اسے قتل کردیتے لیکن اس نے خود کو عذاب سے محفوظ رکھا۔"

"اب ہم نے طے کیا ہے کہ اس لاش کو جائے واردات کے قریب ڈال دیا جائے۔" میں نے کہا۔ "تاکہ یہ لاش کل تک دریافت ہوجائے اور سمجھا یہ جائے کہ اس نے گرفتاری سے بچنے کے لیے خودکشی کرلی۔ تم یہ کام کرسکتے ہو...؟"

"کون سا کام؟" اکرام شیخ چونک کر پیچھے ہٹا۔

"یہی کہ اس لاش کو لے جاؤ اور اپنی عقل سے کام لیتے ہوئے صحیح جگہ ڈال آؤ۔" میں نے کہا۔

"لیکن کیسے؟ میرا مطلب ہے کہ میرے پاس تو کوئی گاڑی بھی نہیں۔" اکرام شیخ نے کہا۔

"ہم اپنے مسائل کے حل کے لیے وسائل خود پیدا کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "تمھیں ایک سہولت یہ بھی ہے کہ ابھی تک تم دوستوں سے محروم نہیں ہوئے ہو۔ کوئی بھی تمھاری مدد سے انکار نہیں کرسکتا۔"

اکرام شیخ نے فرداً فرداً ہم سب کے چہروں کو دیکھا۔ "اگر میں پکڑا گیا...؟" وہ سوچتے ہوئے بولا۔

"ہم تمھاری کوئی مدد نہ کرسکیں گے۔" میں نے کہا۔ "اُلٹا ہمیں یہ جگہ چھوڑ کے فرار ہونا پڑے گا۔ یہ تمھاری ہمّت کے لیے ہی نہیں، عقل اور ذہانت کے لیے بھی ایک چیلنج ہوگا کہ خود کو بھی محفوظ رکھو اور ہمیں بھی۔"

"ٹھیک ہے۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "میں جاتا ہوں۔ کوئی گاڑی منگواتا ہوں یا خود لے کر آتا ہوں۔"

"ہم کو غافل یا کمزور مت سمجھنا۔" میں نے کہا۔ "تمھارے ساتھ اگر مسلح پولیس کی پلاٹون آجائے تب بھی ہمیں آسانی سے نہیں پکڑ سکے گی۔ بہت کشت و خون ہوگا اور ہم زندہ ہاتھ آنے والوں میں سے نہیں ہیں۔ ہم سے مطلب ہے تمھارے علاوہ ہم چھ افراد جن میں نازو بھی شامل ہے۔ یہ پہلی آزمائش ہے بشرطِ کامیابی اصل مرحلہ کل درپیش ہوگا۔"

"اور ہمارے ساتھ ہر مرحلے میں کامیابی کا مطلب زندگی

اور ناکامی کا مطلب موت ہوسکتا ہے۔" محسن خان شیروانی نے کہا۔

"میں سمجھتا ہوں۔" اکرام شیخ نے سر ہلایا پھر دروازے کی طرف بڑھا اور رُک گیا۔ "مجھے اپنی حفاظت کے لیے ضبط شدہ ریوالور تو دے دو۔"

"اگر اپنی حفاظت کے لیے چاہیے تو ضرور لے جاؤ۔" میں نے کہا اور محسن نے ریوالور اس کی طرف اُچھال دیا۔ اکرام شیخ نے ریوالور کو کیچ کیا اور جیب میں ڈال لیا۔ پھر وہ دروازہ کھول کے باہر نکل گیا۔

"یہ تم نے اچھا نہیں کیا سکندر۔" بوجھل خاموشی کو نازو کی آواز نے ختم کیا۔

"ابھی کون کہہ سکتا ہے کہ کیا اچھا ہُوا اور کیا بُرا۔" میں نے کہا۔ "یہ تو وقت ہی بتائے گا۔ ہوسکتا ہے کل خود تم کہو کہ میں نے اچھا کیا تھا۔ تمھارا بھائی میرا بہت قابلِ اعتماد دوست تھا مگر آج میں خودکشی کے لیے قابلِ اعتماد نہیں رہا تو میں آگے بڑھنے والے ہر ہاتھ سے ڈرتا ہوں کہ میری دستگیری کرنے والا ہاتھ کس کا ہے اور میرے دامن تک پہنچنے والا کس کا۔ اگر اکرام شیخ نے واقعی فیصلہ کرلیا ہے کہ میری دوستی زیادہ اہم ہے تو اسے مجھ سے زیادہ جاں نثار دوست بھی کوئی نہ ملے گا اور دوستی کی آڑ میں یہ دشمنی کی چال ہے تو مجھ سے زیادہ خطرناک دشمن بھی اس کا کوئی نہ ہوگا۔ اس میں جو کچھ کرنا ہے تمھارے بھائی کو کرنا ہے۔ میرے ردِعمل کا انحصار اس کے رویّے پر ہے۔"

"اس نے تمھاری شرط قبول کرلی ہے۔" نازو نے ایک احساسِ تفاخر کے ساتھ کہا۔ "مجھے خوشی ہے کہ میرا بھائی منافق نہیں ہے۔ کل جو کچھ وہ کرتا تھا یقینِ کامل کے ساتھ خود کو یا کسی اور کو دھوکا دیے بغیر مردانہ وار کرتا تھا۔ آج بھی اس نے ثابت کردیا کہ وہ میرا بھائی ہے۔"

میں ہنسا۔ "تم نے بھی تو ثابت کردیا تھا کہ تم کس کی بہن ہو۔"

"طوفان کی بہن بجلی۔" غالب نے ایک گہری سانس لیکر یوں کہا کہ اتنی کشیدگی کے باوجود سب کے لبوں پر ہنسی آگئی اور پھر نازو ایک گہری سانس لے کر اُسی جگہ فرش پر بیٹھ گئی۔

"اُف! ارے غضب خُدا کا۔" غالب نے کہا۔ "اپنی قبائے ریشم اور اس رنگِ پیراہن کو خاک میں ملا دیا۔"

"یہاں سب کو خاک ہونا ہے مرزا غالب۔" نازو نے کہا۔ "عرش نشینوں کو بھی اور فرش نشینوں کو بھی۔" پھر اس سے پہلے کہ مرزا غالب اس فتنۂ محشر کی اس شعلہ بیانی پر مزید فریفتہ ہوتے، اس نے ہاتھ پکڑ کے کھینچا اور مرزا غالب بھد سے اس کے قریب گرا۔ فرش سے نہ جانے کب کی جمی ہوئی دُھول اُڑی۔ اس کی حالت اور اس کا چہرہ دیکھ کر میں ہنسا اور میں نے محسن کو کھینچ لیا۔ ٹیڈی ایک دم خود قلندرانہ شان سے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

"فرض کرلو کہ یہاں وال ٹو وال کارپٹ ہے۔" میں نے رابعہ کو تذبذب میں دیکھ کر بہلاتے ہوئے کہا۔

"فرض ہی کرنا ہے تو ہم فرض کرلیتے ہیں کہ یہ بکنگھم پیلس ہے اور ہم سب شاہی خاندان کے افراد ہیں۔" محسن بولا۔

"شاہی خاندان!" غالب نے حقارت سے کہا۔ "ہم خاک نشینوں کی ٹھوکر میں زمانہ ہے۔"

"یہ بتاؤ کہ تم نے اس خاک کے پُتلے اور پانی کے بُلبلے کا کیا حشر کیا جس کو میں تمھارے سُپرد کر آیا تھا؟" میں نے نازو سے مخاطب ہوکے کہا۔

"اس کا حشر تو باقی سب کا حشر دیکھ کر ہی خراب ہوگیا تھا۔" نازو بولی۔ "جب تم نکل گئے تو میں نے اس کی تھوڑی سی پٹائی کی اور اس کے بعد وہ فوراً ہی معافی مانگنے پر اُتر آیا۔"

"پھر...؟ معاف کردیا تم نے اُسے...؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ میں تو چاہتی تھی کہ جو ہُوا سو ہُوا، اب نکل جانا چاہیے۔" نازو بولی۔ "لیکن وہاں میرے ہمدرد بہت جمع ہوگئے تھے۔"

"ہمدرد کا لفظ ذرا... متنازع ہے، جمع ہونے والوں کے صحیح جذبات کی ترجمانی نہیں کرتا۔" غالب نے کھنکار کر کہا۔

"ان کے صحیح جذبات نے ہی تو مجھے مشکل میں ڈالا۔" نازو نے غالب کو ڈانٹ کے کہا۔ "سب تم جیسے کھڑے تھے آگئے تھے بعد میں مجرم کو پکڑ کر تھانے لے جانے کی بہادری کا مظاہرہ کرنے۔ میں نے بہت کہا کہ بابا مجھے جانے دو۔ مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں لیکن بدقسمتی سے کسی نے پولیس کو فون کردیا تھا، وہ اپنی کوٹھی میں سے یہ مار دھاڑ دیکھ رہا تھا اور پولیس آگئی۔ انھوں نے لاش کو دیکھتے ہی ضابطے کی کارروائی شروع کردی کہ یہ کیسے مرا اور کیوں مرا۔ میں نے بہت کہا کہ اسی سے پوچھو لیکن وہ نہ مانے۔ اصل عینی شاہد تو پولیس کو دیکھتے ہی فرار ہوگئے تھے۔ باقی سب نے بھی یہی کہا کہ انھیں کچھ نہیں معلوم۔

اب ظاہر ہے پولیس یہ تو نہیں مان سکتی کہ مرنے والا طبعی موت مرا اور ایک شخص جو واویلا کر رہا ہے وہ بلا وجہ کر رہا ہے۔ پولیس لاش اور اس نیم جان کو جلوس کی صورت میں تھانے لے گئی۔ جلوس میں باقی تماشائی تھے۔ پولیس ان سب کو عینی گواہ بنانے پر تلی ہوئی تھی۔ جنھوں نے کچھ دیکھا ہی نہیں تھا۔"

"تمھارے سوا کسی کو نظر بھی کیا آتا۔" غالب نے کہا۔ "آنکھیں خیرہ ہوگئی ہوں گی۔"

"میں ایف آئی آر سنا رہی ہوں اور تم شاعری کر رہے ہو۔" نازو نے کہا اور غالب نے جس طرح سر کھجایا اس سے سب محظوظ ہوئے۔

"جس شخص نے فون کیا تھا وہ سامنے نہیں آیا؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ کیا ہے ضرب المثل، 'بھس میں چنگاری ڈال جمالو دور کھڑی۔'" نازو بولی۔ "اس نے تھانے میں بھی فون کیا کہ فساد کی جڑ صرف وہی لڑکی ہے یعنی یہ خاکسار...! ہے نا غضب؟"

"بجا ارشاد بی جمالو۔ زمانہ ایسا ہے کہ کسی کو سچ بولنا ہی نہیں چاہیے۔" غالب نے اتفاق کیا۔

"تھانیدار میری گرفتاری کے خیال سے خاصا خوش تھا۔ میں نے صاف انکار کر دیا کہ مجھے کیا معلوم وہاں کیا ہوا تھا۔ میں تو بس وہاں سے گزر رہی تھی، لوگوں کو جمع دیکھا تو رک گئی۔" نازو نے کہا۔ "جب دیکھا کہ وہ کسی طرح بھی ماننے پر آمادہ نہیں تو میں نے کہا کہ اچھا آپ ایس ایس پی ضامن رضوی صاحب سے فون کر کے پوچھ لیں۔ وہ میرے ضامن نہ ہوں تو آپ کو اختیار ہے کہ بند کر دیں۔ تھانیدار کی ساری اکڑفوں غائب ہوگئی۔ پھر میں نے کہا کہ اے ایس آئی اکرام شیخ میرا بڑا بھائی ہے۔ اسے غالباً استعفے کے منظور ہو جانے کی خبر نہیں تھی۔ اس نے کہا کہ اچھا بی بی! آپ جائیں۔ ہم کسی اور کو ملزم بناتے ہیں۔ ایک ملزم تو ان کے پاس پہلے سے موجود تھا۔ ٹوٹا پھوٹا جیسا بھی تھا مگر ملزم تھا۔ وہ اسی کو بجاتے رہے اور کچھ زیادتی کر گئے کہ وہ مر گیا۔"

"پولیس کی مار سے مر گیا...؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"ہاں۔ کیا پولیس کی مار سے لوگ مرتے نہیں؟" نازو نے حیران ہو کے کہا۔ "ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے۔"

"تمھارے سامنے مارا تھا اسے؟" میں نے متفکر ہو کے کہا۔

"نہیں میرے سامنے تو نہیں۔" نازو بولی۔ "لیکن میں وہیں تھی جب ایک سپاہی دوڑتا ہوا آیا۔ اس کا رنگ فق ہو رہا تھا۔ اس نے تھانیدار کے کان میں کچھ کہا اور تھانیدار بھی پریشان ہو کے اٹھا۔ تھوڑی دیر میں معلوم ہوگیا کہ تشدد کے دوران میں کوئی ضرب کاری پڑ گئی اور وہ بے چارہ جاں بحق ہوگیا۔ تھانیدار کے سامنے سب قسمیں کھا رہے تھے کہ ابھی تو ریہرسل بھی شروع نہیں ہوئی تھی، تمہید کے طور پر دو چار چھتر رسید کیے تھے۔ وہ کچھ تھا ہی نازک یا بیمار تھا اور اسے مرنا ہی تھا۔" نازو کے بیان نے میرے شبہات کی تصدیق کر دی تھی کہ دوسرا آدمی بھی خودکشی سے مرا تھا۔

"ان پولیس والوں کی دفاعی منطق ایسی ہی ہوتی ہے۔" غالب نے اتفاق کیا۔ "ثابت یہ کرتے ہیں کہ موت کا ایک دن معین ہے اور اگر کوئی اس دن تھانے پہنچ کے فوت ہو جائے تو پولیس خواہ مخواہ بدنام ہو جاتی ہے۔ اچھے خاصے صحت مند آدمی کے بارے میں سند بھی لے آتے ہیں کہ یہ مرض الموت میں مبتلا تھا یا نفسیاتی مریض تھا جس نے طے کر رکھا تھا کہ تھانے میں خودکشی ضرور کرنی ہے تاکہ پولیس کا امیج خراب ہو۔"

"تمھارا اور مرزا غالب کا ملنا تو سمجھ میں آتا ہے۔" میں نے کہا۔

"کیوں... کیا یہ بھی ستاروں کا کھیل ہے؟" محسن نے کہا۔ "اور جن کو ملنا ہو وہ تھانے میں بھی مل جاتے ہیں۔"

مرزا غالب نے دانت نکال کے مسرت کا اظہار کیا اور نازو کی طرف دیکھا جو محسن کے غلط مطلب نکالنے پر کچھ برہم نظر آ رہی تھی۔ میں نے فوراً مداخلت کی۔ "میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ تمھارے بھیا کہاں سے ساتھ ہوگئے؟ کیا وہ بھی تھانے میں موجود تھے؟" میں نے نازو سے کہا۔

"نہیں۔ میں وہاں سے روانہ ہونے کو تھی کہ یہ پہنچے۔" نازو نے کہا۔ "مجھے پہچانتے تو تھے نہیں۔ مجھ سے ہی پوچھنے لگے کہ کیا آپ مس نازلی کے ساتھ ہیں۔ میں نے مذاق میں پوچھا، یہ نازلی کیا بلا ہے تو کہنے لگے کہ بھائی وہ بلا ہے تھرے آتش فشاں ہے اور مار دھاڑ سے لبریز عہدِ قدیم کی ہیروئن نادیا کا نیا ایڈیشن ہے۔ مار زن کو جوتی کی نوک پر مارتی ہے۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ اپنا تعارف عملی طور پر کرا دوں مگر پھر مجھے خیال آگیا کہ میں تھانے کی حدود میں ہوں جہاں ابھی ابھی میں نے خود کو شرافت کا پیکر اور قطعی طور پر بے ضرر ثابت کیا ہے۔"

"واللہ ہم تو دریائے حیرت میں ڈوب گئے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ ہوگی کوئی چھ فٹ قد کی روڈ رولر ٹائپ چیز۔" مرزا غالب نے کہا۔ "اس نزاکت اور قد و قامت اور اس حسن و لطافت سے قتلِ عام کا خیال تو آتا ہے مگر جنگ و جدل کا نہیں۔"

خلافِ توقع غالب کے اس بے باکانہ خراجِ تحسین نے نازو کو برہم نہیں کیا۔ عورت بہرحال عورت ہے۔ میں نے سوچا۔ اپنی تعریف سن کے خوش ہوتی ہے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ نازو کے ناز و انداز اور عشوہ طراز حسن نے اور اس کی ساحرانہ معصومیت نے غالب کے عقل و نظر کو اور ہوش و خرد کو جنوں میں مبتلا کر دیا ہے لیکن نازو ایسی لڑکی نہیں تھی جو کسی کی باتوں سے متاثر ہو جائے۔ عجیب اتفاق یہ تھا کہ خود مرزا غالب کی شخصیت کا ظاہر بہت دھوکا دیتا تھا اور خود ہم جو اس کے ساتھ روز و شب کی رفاقت رکھتے تھے اس کے نام، پیشے اور اس کی باتوں سے فرض کر بیٹھے تھے کہ وہ احمق اور بزدل قسم کا عملی طور پر ناکارہ شخص ہے۔ وقت پڑنے پر اس نے ثابت کر دیا تھا کہ ہمارے اندازے کتنے غلط تھے۔ نازو اور مرزا غالب میں یہ بات مشترک تھی کہ دونوں یکساں خطرناک تھے مگر وہ ایک جیسے بے ضرر نظر آتے تھے۔ چنانچہ صورت سے غلط فہمی کا شکار ہونے والا مارا جاتا تھا۔ ابھی تک نازو بھی وہی سمجھ رہی تھی جو ہم سمجھے تھے جس دن غالب کا دوسرا روپ سامنے آئے گا اس دن وہ کتنی حیران ہوگی۔ شاید اتنی ہی جتنا غالب اس کی صورت دیکھ کر حیران ہوا تھا۔

"خیر میں نے تسلیم کیا کہ آپ کی نظر کو جس کی تلاش تھی اور جسے ڈھونڈتے ہوئے آپ یہاں تک آپہنچے ہیں...؟" نازو بولی مگر اس کی بات ادھوری ہی رہ گئی۔

"گویا کوئے یار سے سوئے دار تک آپہنچے ہیں۔ خیر آگئے کیسے۔" غالب نے دخل در معقولات اور معذرت ایک ساتھ ہی کی۔

"پھر انھوں نے بتایا کہ تم کو میری طرف سے پریشانی لاحق ہے۔" نازو نے کہا۔

"پریشانی نہیں، تشویش۔" اب محسن نے بات کاٹی۔ "کیوں رالعہ بی بی! تشویش کی تفتیش۔"

"ان لوگوں کی زبان ان کے قابو میں نہیں اور یہ خود بھی کسی کے قابو میں نہیں ہیں۔" رالعہ نے کہا۔ "بولنے دو انھیں۔"

"میں نے پوچھا کہ سب لوگ ہیں کہاں؟" نازو نے مطمئن ہو کے کہا۔ "تو انھوں نے کہا کہ یہ تو ابھی میں بھی نہیں جانتا لیکن نقشہ میرے پاس ہے تو میں نے کہا کہ پھر کیا مسئلہ ہے۔"

"وہ جو چاہنے والے ہیں تیرے صنم تجھے ڈھونڈ ہی لیں گے کہیں نہ کہیں۔" محسن خان شیروانی نے تسلیم بجا لا کے کہا اور میری جوابی کارروائی کے ڈر سے مجھ سے ذرا دور ہٹ گیا۔

"قصہ مختصر... میں نے کہا بھیا بھی ان سے ملنا چاہتے ہیں اور یہ بتایا کہ وہ بھی بہت مخلص اور جاں نثار دوست ہیں تو اپنے غالب صاحب نے کہا کہ دوستوں کی تو ہمیں اشد ضرورت ہے۔" نازو بولی۔ "میں نے گھر فون کیا اور ان سے کہا کہ بھئی انتظار اور بھوک، دونوں کام مشکل ہیں۔ یہ فرمانے لگے کہ جب جیب خالی ہو تو آدمی کو بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ مجبوراً میں ہی ان کو لنچ کے لیے لے گئی اور پھر بھیا صاحب بھی وہیں پر آگئے، مجھے ڈانٹنے اور بل ادا کرنے کے لیے۔"

"گویا دیر اس لیے ہوئی کہ جناب دعوت اڑا رہے تھے؟" محسن نے آنکھیں نکال کے کہا۔

"جتنا خوار انسان کو اس کا پاپی پیٹ کرتا ہے اتنا دلِ بیمار بھی نہیں کرتا۔" مرزا غالب نے ایک آہِ سرد کے ساتھ فرمایا۔

"اب مسئلہ یہ ہے نازو کہ جس حال میں ہم ہیں، وہ خود ہمارے لیے باعثِ عبرت ہے۔" میں نے کہا۔ "تم کو ان معاملات سے دور ہی رہنا چاہیے۔ ہم سب تو بے گھر لوگ ہیں... خانہ بدوش اور جاں بکف پھرتے ہیں۔ ایک گھر محسن کا تھا جو ماں کی وفات اور بہن کی رخصتی کے بعد خالی ہوگیا کیونکہ والد اسپتال میں ہیں۔ خواجہ نیک محمد نے اپنا گھر چھوڑ دیا۔ رالعہ کا گھر تباہ کر دیا گیا اور میرا گھر مجھ سے چھین لیا گیا۔ چنانچہ ہم اور خانہ خرابی کے سامان لازم و ملزوم ہیں۔ تم بہت بلند حوصلہ اور بڑی بہادر لڑکی ہو لیکن تمھارے والدین بھی ہیں اور....."

"وہ مجھے اور بھیا کو ہمیشہ یہی تعلیم دیتے تھے کہ راہِ حق میں کسی قربانی سے دریغ کرو گے تو اس الزام کی شرمندگی مجھے ہوگی اور ضمیر کی آواز نہیں سنو گے، تب بھی مجرم میں خود کو سمجھوں گا کہ میں تمھاری شخصیت اور کردار کی صحیح تعمیر نہ کر سکا۔ تم نے مفاد پرست، بزدل یا خود غرض ہونے کا ثبوت دیا تو مجھے احساس ہوگا کہ مجھ سے تمھاری تربیت میں کوتاہی ہوئی۔ پولیس انسپکٹر کی حیثیت سے تم نے بھیا کے کردار کو

بدکھاہے، آبا ان پہ فخر کرتے تھے۔"

"یہ تم ٹھیک کہتی ہو۔" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ "لیکن یہ بھی تو سوچو کہ تمھارے کسی فعل سے تمھارے والد کی بدنامی ہوئی۔ ان کو دُنیا کے سامنے شرمندہ ہونا پڑا۔ ان پہ الزام آیا کہ اُن کی بیٹی ایسے افراد کا ساتھ دیتی رہی ہے جو قانون کی نظر میں مجرم ہیں اور ان کا بیٹا بھی قانون کی محافظت کا فرض ادا کرتے کرتے قانون شکن عناصر کا آلۂ کار بن گیا ہے تو کیا انھیں دُکھ نہیں ہوگا؟ ہم جو کچھ کر رہے ہیں، ہمارے نقطۂ نظر سے دُرست ہے لیکن پھر بھی قانون کی خلاف ورزی کہلاتا ہے۔ وجہ تم جانتی ہو۔ اصل مجرموں نے قانون کی پُشت پناہی حاصل کرلی ہے۔ ہوئے ہیں اہلِ ہوس مدّعی بھی، منصف بھی۔ چنانچہ ہم ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اور وہ ہمیں مٹانے پہ تُلے ہُوئے ہیں کیونکہ ہم ان کے معزز اور شریفانہ چہروں سے نقاب ہٹا کے ان کا مکرُوہ اور گھناؤنا چہرہ دُنیا کو دکھانا چاہتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ قانون غلط ہے یا پھر انصاف کرنے والے نادان ہیں، ساری بات یہ ہے کہ قانون بہت مظلوم ہوگیا ہے۔ اس کو غلط استعمال کیا جا رہا ہے اور اس کا غلط مطلب نکالنے والے بے ضمیر لوگ قانون کو کمزور کی حفاظت کے لیے استعمال نہیں کر رہے ہیں، کمزور کو ہراساں کرنے کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ وقت آئے گا جب ہم مجرموں کے خلاف ثبوت اور شہادت جمع کرلیں گے تو خود عدالت میں حاضر ہو جائیں گے اور اپنے ملک و قوم کے اور انسانیت کے ان دُشمنوں کو مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کر دیں گے۔ اگر ہم ایسا نہ کرسکے اور مارے گئے تو کیا۔ ہمارا مقصد تو زندہ رہے گا۔"

"قتل گاہوں سے چُن کر ہمارے عَلَم... اور نکلیں گے عُشّاق کے قافلے۔" غالب نے جذباتی ہو کر کہا۔

"میں تمھارے جذبات کی قدر کرتا ہُوں۔" میں نے کہا۔ "لیکن اپنے والدین کی خاطر ہمارے ساتھ مت رہو ورنہ اس بڑھاپے میں ان کی مٹی پلید ہو گی۔ ان کو تھانوں میں گھسیٹا جائے گا، ذلیل کیا جائے گا۔ شکاری ان کے پیچھے لگ جائیں گے تو ان کا جینا اجیرن کر دیں گے۔ تمام عمر کی کمائی ان سے چھین لیں گے۔ زندگی کی جدوجہد کا حاصل یہ سُکھ چین ہے جو اُن کو بڑی مشکل سے ملا ہے اور وہ تم ہو، تمھارا بھائی ہے۔ یہ سب نہ رہا تو وہ کتنے دُکھی ہوں گے اور خُدانخواستہ مرتے وقت ان کے لیے صرف تمھارے دیے ہوئے پچھتاوے اور عذاب ہوں گے تو تم سے زیادہ یہ ہم سب کے لیے ندامت کی بات ہوگی۔ ہم خود کو ان کا مجرم سمجھیں گے کہ ان پہ جو افتاد آئی، اُس کا سبب ہم تھے اور ہماری دیوانگی تھی۔ تم اپنے گھر جاؤ تاکہ ان کی عزت و آبرو اور ان کے بڑھاپے کا سکھ چین غارت نہ ہو۔"

"گویا میں تمھارے لیے کچھ نہیں کرسکتی۔" نازو نے سخت دل گرفتہ اور مایوس لہجے میں کہا۔

"کرنے کا کیا مطلب! جب آدمی کسی کے لیے نیک تمنّائیں رکھتا ہے تو بہت کچھ کرتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اخلاقی سہارا دیتا ہے، تب بھی بہت کچھ کرتا ہے۔ تم ہماری کامیابی کے لیے دُعا کرسکتی ہو۔"

"صرف دُعا!" نازو نے اسی افسوس کے ساتھ کہا۔

"ہاں۔ دُعا بھی بہت بڑی طاقت ہے۔" میں نے کہا۔ "اور جو دُعا نیّت کے خلوص اور عقیدت کے جذبات کے ساتھ اپنے لیے نہیں دوسروں کے لیے مانگی جائے، دُنیاوی دولت و جاہ و حشم کے لیے نہ مانگی جائے، صرف راہِ حق و انصاف پر چلنے والوں کے لیے رب العالمین کی رحمت کی خاطر مانگی جائے، وہ مستجاب ہوتی ہے اور مشکل وقت میں کام آتی ہے۔ ابدی شہرت رکھنے والے نابینا شاعر ملٹن نے کیا کہا تھا کہ خدمت تو وہ بھی کرتے ہیں جو صبر و استقامت کے ساتھ انتظار کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہو سکتا ہے کہ کبھی ہم خود تم سے کچھ کرنے کو کہیں، کوئی ایسا کام جو ہمارے لیے مشکل ہو۔ ہم آزادی اور آسانی کے ساتھ دُنیا میں گھوم پھر نہیں سکتے۔ کوئی ایسا بھی تو ہونا چاہیے جس پر کوئی نگرانی نہ ہو، جو ہمارے شکاری دشمنوں کے شک و شبے سے بالاتر ہو اور پسِ پردہ رہ کے ہمارے لیے مُفید ثابت ہو۔"

"تم تو ہمارا ففتھ کالم بن سکتی ہو۔" محسن خان شیروانی نے اچانک کہا۔

"رائٹ۔ ففتھ کالم بہت زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔" میں نے محسن کے خیال کی تائید کی۔

"کبھی اُردو بھی بولا کرو سکندر بادشاہ۔" ٹیڈی نے کہا۔ "تاکہ ہم اَن پڑھ بھی سمجھ لیں۔ تم یا تو بہت مشکل اُردو میں شعر وغیرہ پڑھ جاتے ہو یا پھر انگریزی میں کچھ کہہ دیتے ہو۔"

"ففتھ کالم کا مطلب بہت سے پڑھے لکھے نہیں جانتے۔" میں نے اُسے تسلّی دینے کے لیے کہا۔ "یہ ایک مخصوص اصطلاح ہے۔ پہلے جب فوجیں کسی شہر پہ حملہ کرتی تھیں تو چاروں طرف سے یلغار ہوتی تھی اور چار حصّوں میں بٹ کر حملہ آور ہونے والی فوج کا ہر حصّہ ایک کالم کہلاتا ہے۔ پانچواں کالم اُسے کہتے تھے جو شہر کے اندر موجود ہو اور شہر والوں کا نہیں، حملہ آوروں کا مددگار ہو۔ اس میں خریدے ہوئے غدّاروں کے علاوہ مظلوم و معتوب بھی ہوتے تھے جو انتقام کے آرزومند ہوں۔ اپنے حاکم کے مقابلے میں حملہ آور سے زیادہ ہمدردی رکھنے والے یا حملہ آور کو بہتر حاکم سمجھنے والے بھی ہوتے تھے اور بعض اوقات چوری چھپے اندر گھس جانے والے بھی۔ فوج باہر سے حملہ کرتی تھی۔ یہ لوگ اندر تباہی پھیلا دیتے تھے۔ اندر کی گڑبڑ اور انتشار سے اپنی مدافعت کرنے والوں کو دُہری مصیبت پڑ جاتی تھی کہ ایک دشمن تو باہر کھُلے میدان میں ہے اور دُوسرا اندر انہی کی صفوں میں گھسا ہُوا شکست کے اسباب پیدا کر رہا ہے۔ نازو ہمارا ففتھ کالم بن سکتی ہے۔ یعنی دُشمن کے ساتھ مل کر دشمن ہی کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔"

ٹیڈی نے میری وضاحت سے مطمئن ہو کے کہا۔ "ہاں۔ فرض کرو یہ اور اس کا بھائی کسی طرح دلاور اینڈ کمپنی سے مل جائیں۔" میں نے کہا۔

"وہ بہت عیّار آدمی ہے۔ فوراً ہی تاڑ جائے گا۔" محسن بولا۔

"اس کو قائل کرنا مشکل ضرور ہے، ناممکن نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "نازو کہہ سکتی ہے کہ سکندر کمینہ ہے۔"

"اس میں کون سی نئی بات ہوگی۔" محسن نے کہا۔ "یہ تو مجھے بھی معلوم ہے اور میں نے رالعہ کو بھی سمجھایا...."

میں نے ہاتھ گھمایا لیکن محسن غوطہ مار گیا اور شرافت سے مہاتما بُدھ کی طرح بیٹھا ہوا ٹیڈی اس کی زد میں آگیا۔ اس نے زور سے "ہاہ" کی اور فرش پر لڑھک گیا۔

"خونِ ناحق کر دیا ایک نیک آدمی کا۔" محسن نے شور مچایا۔ "خواجہ نیک محمد کو مار دیا۔ ایسا ہی زمانہ ہے کہ نیکی نہ کرو اور جو نیکی کرے اُسے دریا میں ڈال دے۔" نازو اور رالعہ نے ہنستے ہوئے ٹیڈی کو اُٹھایا۔ وہ کافی دیر تک اپنے سر کو جھٹکتا رہا۔

"میری بات سمجھ میں آئی کہ نہیں۔" میں نے امن بحال ہوتے ہی کہا۔ "تم ذاتی عقل و ذہانت سے کام لیتے ہوئے دلاور سے رابطے کی صُورت پیدا کرو۔"

"صُورت اچھّی خاصی ہے۔ رابطہ ہو جائے گا۔" محسن نے پھر شرارت سے کہا اور اس مرتبہ مجھے کچھ نہیں کرنا پڑا۔ پلک جھپکتے میں نازو لہرا کے اُٹھی اور اس نے محسن کو ہاتھ پکڑ کے کھینچا اور نہ جانے کیسے پنجے پر اُٹھا لیا۔ وہ ایک مسلسل حرکت تھی۔ جھٹکے سے محسن اُوپر آگیا تو پنجے نے سہارا دیا اور محسن کو میں نے قلابازی کھا کے فرش پر چت ہوتے دیکھا۔ میرے اور رالعہ کے لیے اس کی پھُرتی کا یہ مظاہرہ غیر متوقع اور نیا نہیں تھا لیکن میں نے دیکھا کہ ٹیڈی کا مُنہ کھُلا رہ گیا ہے اور غالب پھر دریائے حیرت میں ڈوب چکا ہے۔ وہ کبھی نازو کو دیکھتا تھا تو کبھی محسن کو۔ محسن نے عقلمندی سے کام لیتے ہوئے اُٹھنے کی زحمت نہیں کی اور دُور لیٹا مُسکراتا رہا۔ نازو اپنے ہاتھ جھاڑ کے بیٹھ گئی۔

"تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ دلاور سے ملو۔" میں نے یوں کہا جیسے کچھ ہُوا ہی نہیں۔ "تم اسے یقین دلا سکتی ہو کہ میری وجہ سے تمھارے بھائی کو مستعفی ہونا پڑا، تمھاری زندگی خطرے میں پڑی اور بھائی کے ہاتھوں بہن کا خون ہوتے ہوتے رہ گیا اور تاثر کچھ ایسا دینا کہ تمھاری اَنا مجروح ہوئی ہے اور تم بھی گویا کسی عام عورت کی طرح انتقام کی آگ میں جل رہی ہو۔ تم کو اپنی اداکاری سے دلاور کو یقین دلانا ہوگا۔ اور یہ بہت مشکل کام ہوگا کہ تم اس کی مدد کرسکتی ہو۔ اس سے نقد سودا کرو گی تو کامیابی کے امکانات زیادہ روشن ہوں گے۔ ایسے لوگوں سے جس طرح بھی لیا جائے اور جتنا بھی لیا جائے، جائز ہے کیونکہ خود اس نے بھی یہ دولت غلط ذرائع سے جمع کی ہے مگر ہمارے مقصد اور مشن کے لیے پیسہ بھی اہم ہے۔ وہ سمجھے گا کہ تم لالچ سے بھی مغلوب ہو اور انتقامی جذبات سے بھی۔ اگر اکرام شیخ کی مظلومیت کو بھی استعمال کرو تو اچھا ہے کہ سکندر کی وجہ سے اس کی نوکری گئی اور اب وہ بے روزگار بیٹھا ہے۔ کچھ پیسہ ہوگا تو کوئی چھوٹا موٹا بزنس کرلے گا۔ یہ کام تمھارے لیے ایک بہت بڑا چیلنج ہوگا کیونکہ دلاور ایسا شخص ہرگز نہیں جس کو اپنی باتوں سے بے وقوف بنایا جا سکے...."

"خواہ باتیں کرنے والی تم جیسی ہی کیوں نہ ہو اور اس کی باتوں میں گلوں کی خوشبو ہو۔" محسن خان شیروانی نے دُور سے کہا۔

"کیا تم واقعی چاہتے ہو کہ میں ایسا کروں؟" نازو نے سنجیدگی سے کہا۔ "اس طرح تمھاری مدد ہوگی؟"

"کیوں نہیں ہوگی۔ تم اس کے تمام جاننے والوں کو جان لوگی۔ تم میں پُوری صلاحیت ہے، دلاور جیسے شخص کا اعتماد حاصل کرنے کی اور اس کی سیکرٹری بننے کی۔" میں نے کہا۔ "اور خطرہ تمھارے لیے کوئی نہیں کیونکہ تم اپنا دفاع کرسکتی ہو۔ ایک بار تم اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئیں تو یہ ہماری بہت بڑی کامیابی ہوگی۔ دلاور کو چکر دینا آسان نہیں لیکن تقدیر جب آدمی کو چکر میں ڈالتی ہے تو

بڑے بڑے سُورما اور افلاطون چت ہو جاتے ہیں۔ عورت جیسی کمزور اور ناقص العقل کہلانے والی مخلوق کے ہاتھوں شکست کھانے والے فاتحین سے تاریخ بھری پڑی ہے اور کون جانے کہ جو کام ہم اپنی طاقت سے اور ذہانت سے نہ کر سکے وہ تم اپنی نزاکت سے کر لو۔ پھول کی پتّی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر۔"

"تم کیا مشورہ دے رہے ہو مجھے؟ یہ کہ میں اس پر ڈورے ڈالوں؟" نازو نے یک لخت برہمی سے کہا۔

"ڈورے ڈالنا کیا ہے، شکار کے لیے جال پھیلانا۔" میں نے اُسے سمجھایا۔ "ضروری تو نہیں کہ تم خود اس جال میں گرفتار ہونے کی کوشش کرو۔ یہ تو شکاری خود طے کرتے ہیں کہ کہاں کس موقعے پر ان کو شکار کے لیے کیسا جال پھیلانا ہے۔ جو جال تم پھیلا سکتی ہو، وہ ہم نہیں پھیلا سکتے۔ وہ خود کو بہت بڑا شکاری سمجھتا ہے اور اس کے شکاری کُتّے بھی کم خونخوار نہیں مگر عیار لومڑی۔۔۔!"

"لومڑی!" محسن نے قہقہہ مارا۔ وہ جہاں گرا تھا وہیں بیٹھا تھا چنانچہ خاصا محفوظ تھا۔

"میں اس کہانی کا حوالہ دے رہا تھا جس میں لومڑی نے عقل سے کام لے کر شیر کو کنویں میں کُودنے پر مجبور کر دیا تھا۔" میں نے کچھ خفّت سے کہا۔ "وہ شیر ہر روز ایک جانور کھاتا تھا اور اس دن لومڑی کی باری تھی۔ لومڑی اس کا کیا مقابلہ کرتی۔ اس نے شیر کو دھکّا بھی نہیں دیا تھا، صرف پانی میں اُس کا عکس دکھا کے کہا تھا کہ یہ آپ کا حریف ہے۔ پہلے اس سے نمٹ لیں تو بندی کی جان حاضر ہے اور جنگل کا بادشاہ ہونے کے باوجود شیر کی مت ماری گئی۔ اگر دلاور کی مت ماری گئی تو وہ آ جائے گا تمھارے چکّر میں اور اس کا حشر جنگل کے بادشاہ کی طرح ہو گا۔"

"اگر تم چاہتے ہو تو میں کروں گی۔" نازو نے میری طرف دیکھے بغیر زیرِ لب کہا۔ "یہ بھی کروں گی۔"

میں نے رابعہ کو دیکھا، وہ نازو کو بہت غور سے دیکھ رہی تھی اور اس ایک لمحے میں نازو کے لیے اُس کی آنکھوں میں حسد اور رقابت کا جذبہ اُتر آیا۔ اُسے نازو کا لہجہ اور اس کا جذبۂ ایثار اپنے عشق کی ہمسری کے دعوے کی طرح لگا۔ اُس نے یُوں محسوس کیا جیسے نازو اس کے ساتھ آ کھڑی ہوئی ہے اور یہ بتانا چاہتی ہے کہ ایک تم ہی نہیں، سکندر کے لیے میں بھی ہوں۔ جتنا تم کر سکتی ہو اتنا ہی حوصلہ میرا بھی ہے اور اگر قسمت جُدا ہے تو کیا۔ ہم پر مشترک ہیں احسان غمِ الفت کے۔ رابعہ جس مقام پر تھی، وہاں وہ کسی اور کو نہیں دیکھنا چاہتی تھی اور نہ ہی قبول کر سکتی تھی۔ ایسا ہو بھی نہیں سکتا تھا مگر وہ ایک عورت کی نظر سے دیکھ رہی تھی کہ دوسری عورت جانتے بوجھتے کوشش ضرور کر رہی ہے کہ یہی مقام اُسے بھی حاصل ہو جائے۔ آج کی ناکامی کے دُکھ سے وہ کل کی کلیاں کی خوشی کا رشتہ استوار کر رہی تھی اور جھوٹی اُمیدوں کے سچ ہو جانے کا خواب دیکھنا چاہتی تھی۔ اس ایک لمحے میں نازو نے بلا ارادہ رابعہ کے مقابل آ کے کہا کہ سکندر کس کا ہے، یہ فیصلہ تو ابھی ہونا ہے اور رابعہ نے بڑے غرور سے اور حقارت سے کہا کہ فیصلہ تو بہت پہلے ہو چکا ہے بے وقوف لڑکی۔ وہ صرف میرا ہے۔ کل بھی تھا اور کل بھی ہو گا۔

"یہاں کوئی کسی کی خاطر کچھ نہیں کر رہا ہے۔" میں نے فوراً رابعہ کے ساتھ کھڑے ہو کر کہا۔ "ہم سب ایک نیک اور عظیم تر مقصد کی جدوجہد میں شریک ہیں۔ پہلے یہ ذاتی انتقام کا مسئلہ تھا اور مجھے اپنا حق غصب کرنے والوں کو سزا دینا تھی۔ لیکن اب یہ وطن کے دُشمنوں سے نمٹنے کا معاملہ ہے۔ یہ جنگ غدّاروں کے خلاف ہے اور یہ اہلِ وطن کی سلامتی کی جدوجہد ہے اور ہم سب کے مستقبل کے تحفظ کی ضرورت ہے۔ تم کو اسی مقصد کی خاطر کام کرنا ہے۔"

نازو کا چہرہ مایوسی کے سلگنے سے بجھ گیا۔ "ہاں میرا بھی یہی مطلب تھا۔ کچھ اور نہیں۔" اس کے خفّت زدہ لہجے میں تلخی کا زہر گھل گیا جسے میں نے ہی نہیں، رابعہ نے بھی محسوس کیا اور وہ اپنے آپ سے شرمندہ نظر آنے لگی یا شاید یہ اُس کے ذہن میں آنے والے خود غرضانہ خیالات کا ردِّ عمل تھا جسے وہ چھپا نہ سکی تھی۔

"پھر یہ وعدہ کہ تم واپس جاؤ گی؟" میں نے کہا۔ "اور ویسا ہی کرو گی جیسا کہ میں نے کہا؟"

نازو نے اقرار میں سر ہلایا۔ "کوشش ضرور کروں گی۔"

"سب کوشش ہی کر سکتے ہیں۔" غالب نے اس کی طرفداری کرتے ہوئے کہا۔

"کامیابی سب کا نصیب نہیں ہوتی۔" محسن نے کہا جو اب قریب آ بیٹھا تھا اور سنجیدہ تھا۔ "پھر بھی اُمید کون چھوڑتا ہے۔"

"احتیاط تمھارے لیے سب سے بڑی آزمائش ہو گی۔" میں نے کہا۔ "تم کو ہمارے دشمن کا ساتھ دینا ہے تو اس رول کو نبھانا بھی ہے۔ وہ تم پر ہر گھڑی نظر رکھیں گے۔ تمھاری نقل و حرکت پر نہیں، تمھارے ٹیلیفون پر نجی گفتگو پر، یہاں تک کہ تمھارے گھر میں آنے جانے والوں کی نگرانی ہو گی۔ ان کے وسائل ان کے ارادوں کا ساتھ دیتے ہیں اور ان کی دسترس سے باہر کچھ بھی نہیں۔ وہ تمھارے گھر کے اندر خفیہ مائیکرو فون لگا دیں گے اور تمھارے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہو گی۔ تمھاری گاڑی میں ٹیپ ریکارڈ فٹ کر دیں گے اور تمھیں معلوم نہ ہو گا۔ ان کے جاسوس تمھارے تعاقب میں رہیں گے اور تمھیں احساس نہیں ہو گا۔ تم خود سمجھ دار ہو لیکن میں تم کو اس لیے بتا رہا ہوں کہ میں انھیں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ تمھاری ایک چھوٹی سی غلطی سارا کھیل چوپٹ کر دے گی اور تم ان کا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش میں ناکام رہو گی تو ان کے عتاب کا نشانہ بن جاؤ گی۔ میں ہرگز نہیں چاہتا کہ تم اس خطرناک کھیل کا آغاز کر کے پچھتاؤ۔ اگر اپنی ذات پر بھروسا ہے تو اپنا راستہ خود بناؤ ورنہ اطمینان سے گھر بیٹھو۔ اپنے لیے اور والدین کے لیے پریشانی کے اسباب پیدا نہ کرو۔"

"میں تمھارے پلان کو سمجھ گئی ہوں۔" نازو نے کہا۔

"لیکن تم اکیلی نہیں ہو۔" میں نے کہا۔ "تمھارا بھائی بھی ہے، کیا وہ مخالفت نہیں کرے گا؟"

"اسے میں منا لوں گی۔ وہ جانتا ہے، میں کتنی ضدّی لڑکی ہوں۔" نازو مسکرائی۔

"تو آج سے ہم تم دشمن۔" میں نے کہا۔ "زبانی ہی نہیں، بالکل عملی طور پر۔ دوستی کا خیال اگر رہے تو ذہن میں، لفظ نہ کے زبان پر نہ آئے۔ یہ چوبیس گھنٹے مسلسل ایک اداکاری ہو گی اور تم کو اس کردار کو حقیقی رُوپ دینے کے لیے اپنی تنہائی میں بھی نبھانا پڑے گا۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ نادیدہ آنکھیں تمھیں دیکھ رہی ہیں اور دیواروں کے بھی کان ہیں۔ وہ تم کو آزمائیں گے اور دلاور کی شیطانی ذہانت کا مقابلہ آسان نہیں۔"

"نازو کو تم نے بھی نہیں سمجھا۔" وہ جیسے خود سے بولی۔ "دلاور کیا ہے؟"

"نہ خنجر اُٹھے گا نہ تلوار ان سے۔" مرزا غالب نے اشارہ فرمایا۔ "یہ بازو مرے آزمائے ہوئے ہیں۔" اس نے نازو کے بازوؤں کی طرف اور پھر اپنی طرف اشارہ کیا۔ شعر کے اس مفہوم نے اس وقت بڑا مزہ دیا لیکن اسی وقت باہر سے کسی گاڑی کے رُکنے کی آواز آئی۔ انجن ایک مرتبہ زور سے غرّایا اور پھر کسی نے دروازہ بند کیا۔

"سب اِدھر سے اُدھر۔" میں نے ایک دم اُٹھتے ہوئے اشارہ کیا۔ "محسن اور غالب! تم ریوالور اٹھا لو اور میرے ساتھ رہو۔ دروازے کے ایک طرف میں ہوں گا۔ اس کے پیچھے دوسری جانب تم دونوں، رابعہ کے ساتھ ٹیڈی ہو گا۔ ادھر لاش کے پاس۔" دروازے پر دستک ہوئی۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" نازو نے اطمینان سے بیٹھے ہوئے لوگوں کو افراتفری کا شکار دیکھ کر کہا لیکن باقی سب احتیاط کے تقاضوں کو سمجھتے تھے۔ میں نے میز کے نیچے سے اسٹین گن اُٹھالی اور دروازے کے ساتھ دائیں طرف لگ کر کھڑا ہو گیا۔ دونوں سائلنسر والے ریوالور ہاتھ میں لے کر محسن اور غالب نے مخالف سمت میں پوزیشن سنبھالی اور ٹیڈی نے تیسرا ریوالور اُٹھا لیا۔ دوسری بار دستک کے ساتھ اکرام شیخ کی آواز بھی آئی۔

"اب تم دروازہ کھولو۔" میں نے نازو کو حکم دیا اور وہ محاذِ جنگ کے مورچے کی طرح نظر آنے والے منظر کو حیرت سے دیکھتی ہوئی آگے بڑھی۔ اس کے لیے یہ سمجھنا مشکل تھا کہ ہم نے جس شخص کو خود ہی ایک کام کے لیے بھیجا تھا، اس کی واپسی پر سراسیمہ ہونے کی کیا ضرورت ہے مگر میں سمجھتا تھا کہ ہم اپنے موجودہ حالات میں ایک فیصد خطرے کے امکانات کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اس کھیل میں کچھ بھی بعید از قیاس نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ بظاہر اکرام شیخ بھی دوست بن کے آیا تھا مگر ابھی ابھی ہم نے نازو کو ایک سبق پڑھایا تھا کہ اس کو دوستی کے پردے میں دشمن تک کیسے رسائی حاصل کرنا ہے۔ اکرام شیخ پہلے پولیس کا ایک ذہین افسر تھا اور اس کے ساتھ ہمارے انکل رضوی جیسے تجربہ کار اور گھاگ افسر تھے۔ یہ ناممکن نہیں تھا کہ ایسا ہی کوئی سبق انھوں نے اکرام شیخ کو پڑھا دیا ہو۔

نازو نے دروازہ کھولا اور شیخ اکرام سیدھا اندر آ گیا۔ میں نے لات مار کے دروازہ بند کیا تو وہ چونک کر پلٹا اور اس کی نظر نے میرے ہاتھ کی اسٹین گن کو پہلے دیکھا۔

"کیا بات ہے؟" شیخ نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔ "تمھاری نیّت بدل گئی ہے؟"

"نہیں، احتیاط کا تقاضا تھا۔" میں نے کہا۔ "تمھاری نیّت صاف ہے تو ڈر کیسا؟"

"میں گاڑی لے آیا ہوں۔" شیخ نے کہا۔

میں نے دروازے کو تھوڑا سا کھول کر جھانکا۔ باہر کوئی کار نہیں تھی۔ ایک ٹرک کھڑا تھا جس کا رنگ اندھیرے میں کالا نظر آ رہا تھا۔ "ایک لاش کو لے جانے کے لیے ٹرک؟" میں نے کہا۔ "کس کا ہے یہ ٹرک؟"

"کسی کا بھی نہیں۔" شیخ نے کہا۔ "کرائے پر لایا ہوں۔"

"کرائے کے ٹرک میں لاش لے جاؤ گے؟" میں نے مشکوک لہجے میں کہا۔

"یہاں کوئی چارپائی وغیرہ نہیں ہے جس پر تم اسے سواروں کی طرح لٹا سکو۔" محسن بولا۔

"اس کے علاوہ یہ لاش تمھیں مُردہ خانے نہیں پہنچانی ہے۔"

میں نے کہا۔ مال روڈ پر ایک جگہ چیکنگ ہے یا چھاپائی ہے۔

”ٹرک والا دیکھے گا نہیں؟“ محسن بولا۔ ”اسے کس طرح مطمئن کرو گے؟“

”میں ایک صندوق بھی لایا ہوں۔“ شیخ نے موقع پا کے کہا۔ ”تم لوگ بولے چلے جا رہے ہو۔“

میں نے پھر دروازہ کھول کے دیکھا مگر مجھے اتنے فاصلے سے ٹرک پر رکھے ہوئے باکس کے سائز کا اندازہ نہ ہو سکا۔ میں نے محسن کو اشارہ کیا۔ ”تم جا کے دیکھو کیسا صندوق ہے؟“

”میرا خیال تھا کہ.... کہ ہم صندوق اندر لے آتے۔“ شیخ بولا۔ ”پھر لاش اس میں ڈال کے لے جاتے۔“

”کیسی عجیب بات ہے۔“ میں نے کہا۔ ”کیا یہ زیادہ آسان نہیں ہو گا کہ ہم لاش اٹھا کے لے جائیں اور باکس میں ڈال دیں؟“

”ڈرائیور کو شک ہو گا۔“ شیخ نے کہا اور مجھے یوں لگا جیسے وہ کچھ نروس ہے۔

”ڈرائیور کو اس وقت شک نہیں ہو گا جب ہم باکس اٹھا کے لائیں گے اور پھر لے جائیں گے؟“ میں نے کہا۔

”صندوق بہت بڑا ہے۔“ محسن نے لوٹ کر واپس آنے کے بعد کہا اور لات مار کے دروازہ بند کر دیا۔ ”ایک لاش کو لے جانے کے لیے اس کے چوتھائی سائز کا صندوق بھی کافی تھا۔“

”مجھے اس وقت یہی ملا۔“ شیخ نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ”یہاں سے لاش کو ٹرک تک اٹھا کے لے چلو۔“

”مجھے ایک بات بتاؤ۔ کیا تمھیں کوئی پرائیویٹ گاڑی نہیں مل سکتی تھی؟“ میں نے کہا۔ ”اس کی ڈکی میں جگہ ہوتی ہے۔“

”میں نے کوشش کی تھی۔“ شیخ بولا۔ ”لیکن دوستوں میں سے ایک ملا نہیں، ایک نے انکار کر دیا۔“

اس وقت تک شیخ کے رویے نے میرے شکوک کو مزید تقویت پہنچا دی تھی۔ ”میں پہلے صندوق کو کھول کر دیکھوں گا۔“ میں نے کہا۔ ”باہر چلو میرے ساتھ۔“

”خالی صندوق میں کیا دیکھو گے؟“ وہ بولا۔

”اگر صندوق واقعی خالی ہے تو ہم اسے اندر لے آئیں گے۔“ میں نے کہا۔

”واقعی کا کیا مطلب؟“ شیخ نے برہمی سے کہا لیکن میں نے دروازہ کھول کے اسے باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ ”تم دونوں میرے ساتھ رہو، ذرا پیچھے اور دائیں بائیں۔“ میں نے غالب سے کہا اور شیخ کی حالت میں واضح تغیر محسوس کیا۔ وہ بوجھل قدموں سے آگے چلنے لگا۔

قریب پہنچ کے مجھے ٹرک کا نیلا رنگ نظر آیا۔ اس کے پیچھے والے کھلے حصے پر تقریباً چھ فٹ لمبا اور چار فٹ چوڑا صندوق رکھا ہوا تھا جس کی گہرائی تین فٹ ہو گی۔ صندوق بالکل نیا تھا لیکن مقفل نہیں تھا۔

”تم ذرا شیخ صاحب کا خیال رکھنا۔“ میں نے کہا اور خود ٹرک پر چڑھ گیا۔ ”لگتا تو خالی ہے۔“ میں نے صندوق کو لات ماری۔ آگے سے ڈرائیور نے سر نکالا اور پیچھے دیکھا۔ اس کا چہرہ اور اس کی مونچھیں دیکھتے ہی میرا شک یقین میں بدل گیا۔ وہ ٹرک بھی پولیس کا تھا اور ڈرائیور بھی۔

”غالب! ذرا ڈرائیور صاحب پر نظر رکھنا۔“ میں نے کہا اور الفاظ ابھی میرے لبوں سے نکلے بھی نہ تھے کہ ڈرائیور نے دروازہ کھول کے جست لگائی۔ اس نے کودتے کودتے فائر کیا مگر اس کے مقابل غالب تھا جو محاورے کے مطابق نہیں، عملاً اُڑتی چڑیا کو نشانہ بنا سکتا تھا۔ اس نے سیکنڈ کے ہزارویں حصے کا فرق رکھتے ہوئے پہلے فائر کیا اور میں نے نیچے گرنے والے ڈرائیور کے لبوں سے ایک غلیظ گالی سنی۔ غالباً ڈرائیور کے ہاتھ کا ریوالور اسی طرح اُڑ گیا تھا جیسے شیخ کے ہاتھوں کے طوطے فائر ہوتے ہی اُڑ گئے تھے۔ اگر محسن نے اسے نشانے پر نہ رکھا ہوتا اور میرے ہاتھ میں اسٹین گن نہ ہوتی تو پانسہ یقیناً پلٹ جاتا۔ ڈرائیور کچھ دیر بےبسی سے پڑا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ کھڑا ہو گیا۔ میں نے بند صندوق کی دونوں کنڈیاں لگا دیں، جو بظاہر خالی لگتا تھا۔

”اپنے دونوں ہاتھ سر پر رکھ لو۔“ غالب نے کہا۔ ”اور ٹرک سے لگ کے کھڑے ہو جاؤ۔“

”تم کو کچھ کہنا ہے؟“ میں نے پتھر کے بت کی طرح مبہوت کھڑے ہوئے شیخ سے کہا۔

شیخ کی نظر صندوق پر رہی اور اس نے نفی میں سر ہلایا۔ صندوق کے اندر اب بھی کوئی نقل و حرکت نہیں تھی۔

”اگر میں اس خالی صندوق کو چھلنی کر دوں تو تمھیں اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔“ میں نے کہا۔

”خدا کے لیے ایسا مت کرنا۔“ شیخ چلایا۔

”کیوں؟ کیا بہت مہنگا صندوق ہے؟“ میں نے کہا۔ ”ہماری زندگی سے بھی زیادہ قیمت ہے اس کی؟“ اس کے ساتھ ہی میں نے اسٹین گن کا رُخ صندوق کی طرف کیا۔ شیخ نے محسن کی پروا کیے بغیر مجھ پر جست لگائی اور میری اسٹین گن پر حملہ کیا۔ یہ بات تو وہ خود بھی اچھی طرح سمجھتا ہو گا کہ میرے ہاتھوں سے اسٹین گن چھینی نہیں جا سکتی۔ اس کے حملے کا مقصد نشانے کا رُخ بدلنا تھا لیکن میں نے اسے قریب آنے کی مہلت بھی نہ دی۔ میں نے ایک ایڑھی پر گھوم کے دوسری ٹانگ اٹھائی تو پنجہ شیخ کے سینے پر لگا۔ وہ ٹرک سے نیچے گر گیا۔ دروازے میں کھڑی ہوئی نازو نے چیخ ماری اور اس وقت مجھے احساس ہوا کہ بیرک کے دروازے سے رابعہ اور نازو باہر آ چکی ہیں۔

”یہ کیا ہوا سکندر؟“ نازو نے چلا کے کہا۔

”ابھی تک تو کچھ بھی نہیں ہوا۔“ میں نے کہا۔ ”اگر میں بیوقوف ہوتا اور احتیاط پسند نہ ہوتا تو بہت کچھ ہو جاتا۔ بس میں نے تمھاری طرح تمھارے بھائی پر اعتماد نہیں کیا اور یہ بات مجھے بھی ڈیڈی نے سمجھائی تھی کہ انسان کی عادت بدل سکتی ہے، فطرت نہیں۔ شیخ نے وہی کیا جو اس کی فطرت کا تقاضا تھا، جو ایک ذمے دار، فرض شناس اور ذہین پولیس افسر کو کرنا چاہیے۔“

”تم نے مجھے پھر دھوکا دیا تھا۔“ نازو کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔

”تم ایک بیوقوف لڑکی ہو۔“ شیخ نے بےخوفی سے کہا۔ ”ایک دن پچھتاؤ گی۔“

”میں تو اب بھی پچھتا رہی ہوں۔“ نازو نے منہ چھپا کے رونا شروع کیا۔ ”پہلی بار میں نے تمھاری غلطی کو معاف کر دیا تھا۔ اس غلطی کا خمیازہ تو مجھے اپنی جان دے کر ادا کرنا پڑتا۔ تمھیں ترقی ملتی یا پولیس میڈل ملتا۔“

”شیخ نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”اور نہ یہ میری غلطی ہے۔“ ”وہ میری غلطی نہیں تھی۔“

”کیا تمھارے لیے کوئی رشتہ اہم نہیں رہا؟“ نازو نے بڑے دُکھ سے کہا۔ ”تم اپنی ماں کو اور اپنے باپ کو بھی گولی مار سکتے ہو؟“

”ہاں، اگر وہ قانون شکنی کے مرتکب ہوں گے تو میرے لیے ان کی حیثیت ایک عام مجرم کی سی ہو گی۔“

”یہی بات ہے تو میں تھوکتی ہوں تمھارے اس رشتے پر، جس کی قیمت تمھاری نظر میں ہر ماہ ملنے والی تنخواہ سے زیادہ نہیں رہی۔“ نازو انتہائی جذباتی ہو گئی۔

”رشتوں کو پیسوں سے مت تولو نازو!“ شیخ سیدھا کھڑا رہا۔

”تم میری پیدائش کے دن سے میرے بھائی تھے، اپنے ماں باپ کے بیٹے تھے۔“ نازو نے روتے روتے کہا۔ ”لیکن اب تم ملازم سرکار ہو۔ تمھارے جسم پر وردی ہے اور ہاتھ میں ریوالور اور تمھیں یہ اختیار حاصل ہے کہ جسے چاہو گولی مار دو، کتنے دن کی بات ہے یہ، صرف تین سال پہلے تم ہم میں سے تھے... ہمارے تھے۔ آج اس پیسے کی خاطر جو تمھیں مل رہا ہے، تم نے قواعد و ضوابط کو ہم سے زیادہ اہم سمجھ لیا ہے۔ پہلے تم نے دوستی کو قربان کیا، پھر بہن کی محبت کا خون کیا۔ سکندر کی گرفتاری کے لیے تم نے مجھ سے جھوٹ بولا۔ مجھے آلۂ کار بنایا، اب میرے منہ پہ کہتے ہو کہ تم ماں باپ کو بھی قتل کر سکتے ہو۔ جاؤ، اب ہم سب تمھارے لائق نہیں رہے۔ ہم سب مجرم ہیں اور تم پولیس افسر ہو۔ اپنی فرض شناسی کے ساتھ رہو۔ مت کہنا آئندہ مجھے بہن۔ اپنی زبان سے میرا نام مت لینا۔“

میں دیکھ رہا تھا کہ نازو کے ہسٹریا میں شدت آتی جا رہی ہے۔ بھائی کی چالبازی نے اسے شدید ذہنی صدمے سے دوچار کیا تھا اور اتنے مضبوط اعصاب کی مالک ہونے کا اور حوصلہ مندی کا دعوےٰ رکھنے والی نازو جذبات کے ریلے میں کمزور تنکے کی طرح بہہ گئی تھی۔ میں نے رابعہ کو اشارہ کیا کہ اسے اندر لے جائے۔ رابعہ کے لیے یہ کام زخم خوردہ شیرنی کو کان سے پکڑ کر لے جانے سے کم مشکل اور خطرناک نہیں تھا مگر نازو نے مزاحمت نہیں کی۔ وہ خود کسی ہمدرد و سہارے کی متلاشی تھی چنانچہ وہ رابعہ کے کندھے پر سر رکھے روتی ہوئی لوٹ گئی۔ شیخ اسی طرح کھڑا رہا۔

”اس صندوق میں کتنے آدمی ہیں؟“ میں نے اطمینان سے سوال کیا۔

”تم خود کھول کے دیکھ سکتے ہو۔“ شیخ نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

”میں بتا چکا ہوں کہ میں اتنا احمق نہیں ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”یہ پنڈورا کا باکس ہے۔ اسے کھولتے ہی نہ جانے کتنی بلائیں ہم پر نازل ہو جائیں گی۔ میرے اندازے کے مطابق اس میں چھ آدمی چھپ کر بیٹھ سکتے ہیں۔ کیا وہ سب مسلح ہیں؟“

”دشمن کے شہر کی فصیل کے اندر اپنے لشکر کو پہنچانے کے لیے سب سے پہلے ٹروجن ہارس کا استعمال کیا گیا تھا۔ لکڑی کے اس دیوہیکل گھوڑے کے پیٹ میں مسلح جنگجو چھپ کر بیٹھ گئے تھے اور شہر والے خود ہی اسے گھسیٹ کر لے گئے تھے۔“ غالب نے کہا۔ ”اس کے بعد علی بابا کے گھر میں ڈاکوؤں کے سردار نے اپنے چالیس چوروں کو پہنچانے کے لیے تیل کے سوداگر کا بھیس بدلا تھا اور چالیس مشکوں میں چالیس چوروں کی فوج علی بابا کے گھر میں اُتار دی تھی۔ تم نے بیسویں صدی کے علی بابا کا رول ادا کیا۔ کیا ہم بھی وہی کریں جو علی بابا کی ہوشیار ملازمہ مرجینا نے کیا تھا؟ مرجینا کا رول رابعہ بخوبی ادا کر سکتی ہے۔“

"تم جو چاہو کر دو" شیخ نے چلّا کے کہا "جہاں اتنے قتل پہلے کیے ہیں . . ."

"ابھی تک ہم نے کوئی قتل نہیں کیا" میں نے اسے ٹوک دیا "کچھ لوگوں نے ہمیں قتل کرنے کی کوشش کی اور مارے گئے۔ ہم نے ہمیشہ اپنا دفاع کیا، جس کا ہمیں قانونی طور پر پورا حق حاصل ہے۔"

"علی بابا کے اس صندوق . . . " ابھی غالب کی بات ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ سائلینسر والے ریوالور کا دھماکا سنائی دیا اور ٹرک ڈرائیور آواز نکالے بغیر نیچے گر گیا۔ اس نے غالب کو مصروفِ گفتگو پا کے غافل سمجھنے کی غلطی کی تھی اور بڑی پھرتی سے اچھل کر غالب کے فلائنگ کِک مارنی چاہی تھی لیکن غالب کا ذہن اس کی توقعات سے زیادہ مستعد تھا۔ اس سے پہلے کہ ڈرائیور کے پیر غالب کو چھوتے، غالب کے ریوالور کی گولی اس کی پیشانی میں سوراخ کرتی ہوئی سر میں داخل ہو گئی اور وہ نیچے گرا تو لاش تھا۔ میڈیکل سائنس کی اصطلاح میں اصل موت دماغ کی موت ہے تو اس ڈرائیور کے دماغ کے پرخچے اُڑ گئے تھے۔ اس کا جسم رگوں میں دوڑنے والے لہو کی حدّت کے باعث کچھ دیر پھڑکتا رہا، پھر ساکت ہو گیا۔

"کیا تم اسے قتل کہو گے؟" میں نے شیخ سے کہا۔ "میرا خیال ہے ٹرک ڈرائیور نے خودکشی کی ہے اور اس کی موت کے تھوڑے بہت ذمے دار تم بھی ہو جو اسے یہاں لائے تھے۔ غالب نے تو صرف اپنا دفاع کیا ہے۔ ٹرک ڈرائیور کو معلوم تھا کہ اس قسم کی غلط حرکت کا انجام کیا ہوگا۔ آنکھوں والا جانتا ہے کہ اندھے کنویں میں گرنے کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ پھر وہ قدم آگے بڑھائے تو قصوروار کون؟ ہاں کوئی اسے دھکا دے یا مجبور کرے تو وہ مجرم۔ تم اب محسن کے ساتھ اندر جاؤ اور وہ لاش اٹھا لاؤ۔"

وہ کچھ تذبذب کا شکار تھا۔ اپنی سازش کی ناکامی، شکست اور بے بسی کے احساس نے اسے خفّت اور جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دیا تھا لیکن اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ سلوک وہ تھا جو نازو نے اس کے ساتھ ہم سب کے سامنے کیا تھا۔ محسن نے اسے کندھے سے پکڑ کے دھکیلا تو وہ آگے بڑھا۔

"قسم خدا کی میں تم سب کو چھوڑوں گا نہیں۔" اس نے دانت پیس کر کہا۔

"یہ بات ہم کئی بار سن چکے ہیں کئی لوگوں سے۔" محسن نے کہا۔

"جذبات کو قابو میں رکھو۔" میں نے مشورہ دیا۔ "وہ غلطی مت کرنا جو ٹرک ڈرائیور نے کی تھی۔"

"جس طرح تم فرض کی ادائیگی کے خیال سے غافل نہ ہوتے ایسے ہی ہم اپنی حفاظت کے خیال سے کبھی غافل نہیں ہوتے۔" محسن نے کہا اور اسے دھکیلتا ہوا لے گیا۔ میں صندوق پر ایسے لات ماری جیسے ڈرم بجانے والا کیمرہ گجر کے نیچے رکھے ہوئے بڑے ڈرم کو ٹھوکر مارتا ہے۔ اندر ایک گونج سی پیدا ہوئی۔

"ہیلو حضرات! میں باہر کی دنیا سے بول رہا ہوں" نے خوشدلی سے کہا "آپ لوگ اتنے گم صم کیوں ہیں۔ گپ شپ کریں۔ اتنے لوگ ہیں اور سب چپ ہیں اور نہیں تو خدا کا شکر ہی ادا کریں کہ موت اتنی قریب آئی اور ٹل گئی۔ صرف اس لیے کہ ہم کچھ رحمدل ہیں اور بے سبب خونریزی نہیں کرتے۔ یقیناً آپ سب کو بہت احتیاط کے ساتھ منتخب کیا گیا ہوگا۔ آپ سب جرأت اور ہمت میں لاثانی ہوں گے اور ممکن ہے تربیت یافتہ کمانڈوز ہوں لیکن اس وقت چوہوں کی طرح اس چوہے دان میں بند ہیں۔ میرے پاس اسٹین گن ہے۔ اس کا ایک راؤنڈ چلا دوں تو گولیاں دوسری طرف سے نکلیں گی آپ سب کی ارواحِ خبیثہ کے ہمراہ۔ خیر سے آپ میں سے کسی کا پیشاب تو خطا نہیں ہو گیا۔"

میرے الفاظ کا فوری ردِّعمل ہوا۔ اندر سے کسی نے باکس پر سر یا مکّا مارا اور مجھے ایک فحش ترین گالی دی۔ "وڈے سورما! مینوں کلے نوں بار آن دے۔ فیر میں دساں تینوں۔" پھر اندر سے گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی۔ ایک شخص کے بولنے سے سب کی موجودگی کا راز فاش ہو گیا تھا۔ ان کا اسلحہ یقیناً ان کے ساتھ تھا لیکن وہ مجھے دیکھے بغیر استعمال کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ انھیں نقل و حرکت کے لیے جگہ درکار تھی۔ احتیاطاً میں نے اپنی جگہ بدل لی اور بچ گیا۔ کسی نے اندھادھند فائر کیے اور گولیاں ٹین کی چادر میں سوراخ کرتی نکل گئیں۔ صندوق میں نظر آنے والے چھید مختلف فاصلوں پر ذرا اوپر نیچے تھے اور اگر میں پرانی جگہ پر کھڑا رہتا تو کسی نہ کسی گولی کا نشانہ ضرور بن جاتا۔ میں نے اسٹین گن کا ایک برسٹ مارنے کا سوچا اور پھر ارادہ بدل دیا۔ اندر والوں نے خود ہی اشتعال میں پاگل ہو جانے والے کو قابو کر لیا تھا۔ ان کی باتوں سے اور اس محدود جگہ میں ہونے والی کشمکش کی آوازوں سے یہی ظاہر ہوتا تھا۔ ریوالور کی ہر گولی کا دھماکا اندر والوں اور سننے والوں کے کان وقتی طور پر ضرور سن ہو گئے ہوں گے مگر یہ آوازیں باہر بھی سکوتِ شب کو منتشر کر چکی تھیں۔

"خبردار جو پھر کسی نے یہ حرکت کی۔ بھٹوں کے رکھ دوں گا سب کو۔" میں نے عزم کے کہا اور فوراً گھوم گیا۔ اب میں مخالف سمت میں صندوق کے پیچھے کھڑا تھا۔ میں نے شیخ کو لاش اٹھا کے باہر نکلتے دیکھا۔ لاش بالکل اکڑ چکی تھی۔ چنانچہ اسے ایک طرف سے غالب نے بھی سہارا دے رکھا تھا۔ قریب آنے پر شیخ نے مجھے یوں دیکھا جیسے مجھ سے صندوق نہ کھولنے کی وجہ جاننا چاہتا ہو۔

"لاش کو اوپر اٹھاؤ اور ٹرک میں لمبائی کے رُخ ڈال دو۔" میں نے کہا۔

"صندوق میں لے جاتے تو اچھا تھا۔" شیخ نے دبی آواز میں کہا۔

"کیا اچھا ہے اور کیا بُرا، یہ فیصلہ کرنا تمھارا کام نہیں ہے۔" میں نے کہا "ویسے بھی اکڑی ہوئی لاش صندوق میں نہیں آسکتی۔ اس میں پہلے ہی کافی لاشیں ہیں۔"

"لاشیں؟ کیا تم نے ان سب کو مار دیا ہے؟ خبیث!" شیخ چلّایا۔

"تم کو یقین نہیں تو ادھر سے آ کے یہ سوراخ گن لو۔" میں نے صندوق کی طرف اشارہ کیا مگر اندر والوں نے گالیاں دے کر اور مکّے چلا کر مجھے جھوٹا ثابت کر دیا۔ غالب اور شیخ نے لاش کو آدھے کھلے ٹرک کی دیوار کے اوپر سے گرا دیا۔

"تم پیچھے ہٹو۔" میں نے شیخ سے کہا "اور مرزا غالب! ٹرک میں دوسری لاش کو لٹانے کے لیے بہت جگہ ہے۔ خیال رکھنا، یہ پہلے ہمارے دوست تھے۔" میں نے شیخ کی طرف اشارہ کیا جو اوپر چڑھ چکا تھا۔

"شیخ صاحب سے رسم و راہ نہ کی، شکر ہے زندگی تباہ نہ کی۔" مرزا غالب نے شیخ کے سامنے بیٹھ کر کہا۔

"میں سب کو ٹھکانے لگا کے آتا ہوں۔" میں نے ہیڈی کو آواز دے کر کہا "محسن میرے ساتھ جا رہا ہے۔"

جب میں نے ٹرک کو اسٹارٹ کیا تو ارد گرد کے رہنے والے دور کے مکانوں سے سر نکال کر ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ یہ کیا ڈز ڈز ہو رہی ہے "ابھی کی رولا پایا اے" کسی بزرگوار نے کہا۔

"پٹاخے نیں چاچا پٹاخے۔" ایک نوجوان نے اعلان کیا۔

"کیوں؟ تیرے پیو دی جنج اے سور دے پتّر!" بزرگ نے اس گمراہ کن اعلان پر سیخ پا ہو کے کہا "ایہہ صاف گولیاں دی آواز اے۔" ہم جائے واردات سے اچھے وقت پر دور نکل گئے تھے۔ کسی نے ٹرک کا نمبر نوٹ کیا، ٹرک بھی غور سے نہیں دیکھا تھا۔

"یہ شیخ نے کسی کے ساتھ اچھا نہیں کیا" محسن متفکر لہجے میں بولا "نہ اپنے ساتھ نہ بہن کے ساتھ اور نہ ہمارے ساتھ۔"

"اس کے اعمال کو اپنے ضابطۂ اخلاق پر نہ پرکھو۔" میں نے کہا "یہ سوچ لے کہ اب کیا کرنا ہے۔"

"شیخ کو کسی بھی جگہ اتار دیں۔ جہاں سے وہ فوراً کچھ نہ کر سکے۔" محسن بولا "اس نے جگہ دیکھ لی ہے۔ صبح ہونے سے پہلے سارے لاہور کی مسلح پولیس کے ساتھ ہمیں گھیر لے گا۔"

"ابھی نہ سہی، صبح تو یہ ٹھکانا بدلنا ہی پڑے گا۔" میں نے کہا۔

"غالب کی حماقت سے اچھی خاصی محفوظ جگہ بھی گئی اور اٹھارہ ہزار بھی گئے۔"

"وہ کون سے ہمارے تھے۔ مالِ حرام بود بجائے حرام رفت۔" محسن بولا "جگہ بھی دوسری مل جائے گی۔"

"میں جگہ کے بارے میں نہیں، نازو کے بارے میں متفکر ہوں۔" میں نے کہا "ہم اسے ساتھ نہیں رکھ سکتے۔"

"تو کمبل کو چھوڑتا ہے، کیا کمبل بھی تجھے چھوڑ دے گا نورِ چشم؟" محسن بولا۔

"یہ تو مجبوری ہے۔ نازو کی وجہ سے ہمارے لیے خطرات میں اضافہ ہو جائے گا۔ ہمارے دشمن بڑھ جائیں گے لیکن اس سے بھی زیادہ افسوسناک بات یہ ہوگی کہ نازو کے والدین کو بیٹی کی یہ حرکت بہت مہنگی پڑے گی۔ ان کی رسوائی الگ ہوگی اور ہمارے دشمن ان کے بھی دشمن ہو جائیں گے۔ میں یہ ہرگز نہیں چاہوں گا کہ انھیں اس عمر میں ناکردہ گناہوں کی سزا ملے۔ میں نازو کو مجبور کر دوں گا کہ وہ واپس جائے۔"

"وہ جبر کے آگے جھکنے والی لڑکی نہیں ہے۔"

"ایسی کی تیسی جبر کرنے والے کی۔ ارے بھئی اس کو ماں باپ کے گھر پہنچانا ہے، پہنچا دیں گے۔" میں نے کہا "اپنی خوشی سے نہیں جائے گی تو بنڈل بنا کے چھوڑ آئیں گے۔ آگے وہ خود . . . سنبھالیں گے اور نازو جائے گی بھی کہاں۔ ہم پھر روپوش ہو چکے ہوں گے۔ اگر اسے ہمارے لیے کچھ کرنا ہی ہے تو پھر وہی کرے جو اسے سمجھا دیا گیا ہے۔"

"اس پروگرام میں شیخ بھی شامل تھا۔" محسن بولا "نازو کے ساتھ۔"

"نازو چاہے تو اکیلی بھی وہ کام کر سکتی ہے۔" میں نے کہا۔ "شیخ کی اہمیت پہلے بھی ثانوی تھی۔"

"مگر یہ ناممکن ہوگا۔ کیا شیخ اسے اجازت دے گا کہ وہ ہمارے لیے کام کرے اور دلاور کے کیمپ میں گھس جائے۔ اس کی سیکریٹری بنے؟ چودھری دلاور جیسے افراد کی سیکریٹری کوئی نیک نام نہیں ہوتی۔" محسن نے کہا۔

"یہ بات تو ہے۔ اگر شیخ نے مخالفت کی تو نازو کچھ نہ کر

سکے گی۔ خیر وہ کچھ نہ کرے۔ اس کا کچھ نہ کرنا ہمارے لیے کچھ کرنے سے بہتر ہوگا۔" میں نے کہا۔

اس وقت رات کے ساڑھے نو بجے تھے جہاں صبح میری اور نازو کی چوہدری دلاور کے ساتھیوں سے دست بدست جنگ ہوئی تھی، وہاں اب اندھیرا تھا اور ویرانی تھی جس میں وقفے وقفے سے گزرنے والی کوئی گاڑی خلل انداز ہوتی تھی۔ وہاں اب کوئی لاش نہیں تھی۔ پولیس نے ضابطے کی کارروائی مکمل کرنے کے بعد اس شخص کی لاش مُردہ خانے بھجوا دی ہوگی جس کی گردن فٹ پاتھ سے ٹکرانے کے بعد ٹوٹ گئی تھی۔ دُوسرا مجروح تھانے میں خودکشی کر چکا تھا اور شاید اس کی لاش بھی اپنے ساتھی کی لاش کے ساتھ میو اسپتال کے مُردہ خانے میں پڑی تھی۔ صبح تک اس تیسری لاش کو بھی وہیں پہنچنا تھا۔ میں نے ٹرک روکنے سے پہلے اِدھر اُدھر دیکھا کہ چوہدری دلاور کے سیکریٹری کی لاش کو کس بنگلے کی دیوار کے ساتھ جھاڑی کے پیچھے ڈالنا مناسب ہوگا۔ اسی وقت میں نے غالب کے چلّانے اور پھر فائر کرنے کی آواز سُنی۔

جب میں چھلانگ مار کے اُترا تو مجھے کچھ فاصلے پر اندھیرے میں دو سائے ایک دوسرے کے تعاقب میں رواں نظر آئے۔ بلاشبہ ان میں جو آگے تھا وہ ایس آئی اکرام شیخ تھا۔ وہ نہ جانے کیسے غالب کو جُل دے کر فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ وہ جسمانی طور پر زیادہ مستعد اور پُھرتیلا تھا لیکن یہ کام ذہانت کے بغیر ناممکن تھا۔ یوں پہل کر جانے سے وہ چالیس پچاس قدم کی برتری حاصل کر چکا تھا۔ اب وہ چالاکی سے کام لیتے ہوئے سیدھا دوڑنے کے بجائے لہراتا ہوا بھاگ رہا تھا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو یقیناً پہلی گولی کا نشانہ بن جاتا۔ ہماری فردِ جرم تو پہلے ہی کم طویل نہیں تھی۔ اس میں قتل یا اقدامِ قتل کے ایک اور الزام کا اضافہ کسی صورت مستحسن نہ تھا۔ اسی الزام کی سنگینی یوں بھی زیادہ ہو جاتی کہ جس پر گولی چلائی گئی تھی وہ پولیس آفیسر تھا۔ اس کا مستعفی ہونا فقط ڈراما تھا۔ اسے تو بطورِ خاص ہر قسم کی امداد دے کے ہمارے پیچھے لگایا گیا تھا۔ وہ دوسرے گروہ کا شکاری تھا جو خود کو قانون کا محافظ سمجھتے تھے اور ہمیں قانون شکن۔ شکاریوں کے اس دوسرے گروہ میں سب دشمن نہیں تھے۔ ان میں اگر اکرام شیخ جیسے پرانے اور مخلص دوست شامل تھے تو انکل رضوی جیسے مہربان اور شفیق لوگ بھی تھے جن کی عنایات اور محبتوں کا بدل نہ تھا۔ یہ میری بدقسمتی تھی کہ شیخ اور انکل رضوی اپنے فرائضِ منصبی کے باعث انہی کا ساتھ دیتے تھے جو روزِ اوّل سے میری دشمنی پر مامور تھے۔ پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی میرا واسطہ شکاریوں کے پہلے گروہ کے نمائندے

استاد پیڈرو سے پڑا تھا جو مجھے میر شرافت کے قتل میں ملوث کرنے پر مامور تھا اور اس نے اپنا کام بڑی خوش اسلوبی سے کیا تھا۔ پھر مجھے دوسرے شکاری لے گئے تھے جن میں انسپکٹر حشمت خان سے ڈی۔ایس پی سراج تک مختلف سطح کے لوگ تھے اور انھوں نے بھی مجھے زیرِ دام لانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ پہلی قسم کے شکاری بھی چوہدری دلاور کے زرخرید تھے اور دوسری قسم کے شکاری بھی اس کے حکم کے تابع تھے جو ایک طرف عوام کے ٹیکس سے بھرنے والے خزانے سے تنخواہ وصول کرتے تھے تاکہ عوام کو قانون کے ذریعے جان و مال اور آبرو کا تحفظ فراہم کریں مگر دوسری طرف چوہدری دلاور جیسوں سے ضمیر فروشی کا معاوضہ وصول کرتے تھے کہ اگر کوئی قانون کا نام بھی لے تو اس کی زبان پیروں تلے ڈال دیں یا اُسے کاٹ دیں۔

چنانچہ اب صورتِ حال یہ تھی کہ ہمارے دونوں طرف شکاری تھے۔ ایک وہ شکاری تھے جو کہتے تھے کہ خود کو قانون کے حوالے کردو اور انصاف کے عمل کی بالادستی قبول کرو۔ دوسری طرف وہ شکاری تھے جو کہتے تھے کہ قانون کیا ہے؟ قانون ہماری طاقت ہے اور ہماری دولت کی قوتِ خرید کا نام ہے اس لیے یا تو ہمارا ساتھ دو ورنہ ہم اسی قانون کے ہاتھوں تمھیں نیست و نابود کرا دیں گے جس کو تم اپنا محافظ سمجھتے ہو۔ یہ اللہ کا کرم تھا یا قدرت کا نظامِ توازن کہ جس نے ہمیں دونوں جانب سے محتاط رہنے کا شعور عطا کیا تھا اور اپنی حفاظت آپ کرنے کا اہل بنایا تھا۔ شکاریوں کے ایک گروہ میں جو تمام تر جرائم پیشہ، کردار فروش اور انسانیت سے دشمنی رکھنے والے افراد کا گروہ تھا، فوما پنچو اور غلام حسین جیسے افراد بھی شامل تھے جو اپنی جان دے کر اصولوں کی سچائی اور وفاداری کی عظمت کے انمٹ نقوش چھوڑ گئے۔ اسی طرح شکاریوں کے دوسرے گروہ میں سب برائے فروخت نہیں تھے۔ ان میں اکرام شیخ اور انکل رضوی جیسے بھی تھے جو فرض شناسی اور اصول پرستی کی راہ میں کسی رشتے کو اور اپنی ذات کی کسی انسانی کمزوری کو حائل نہیں ہونے دیتے تھے تاہم ایسے اصولی پولیس والے کا تناسب کم تھا۔۔۔ چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کا شیطانی ٹولہ شکاری تھا اور ان سب کا شکار ہم تھے جو حق اور انصاف کے لیے لڑ رہے تھے اور ہمارے دو مقاصد واضح تھے۔ ایک یہ کہ اس پورے نظام کی سازش کو ناکام بنا دیں جو ہمیں مجرم سمجھتا تھا کیونکہ ہمارے خلاف بے بنیاد شہادتوں کا سلسلہ بہت دراز تھا اور ہمیں مجرم ثابت کرنے والے جھوٹے گواہ دنیا کے بازار میں بڑی آسانی سے دستیاب تھے۔ ہمارا دوسرا مقصد انھیں مجرم ثابت کر کے کیفرِ کردار تک پہنچانا تھا جو ہر شیطانی خصلت کا مظاہرہ کرنے

کے باوجود عزت داروں میں شمار ہوتے تھے کیونکہ وہ اپنے جرم کی ہر شہادت اور ہر گواہ کو سامنے آنے سے قبل ہی ختم کر دینے یا خرید لینے کی طاقت رکھتے تھے۔ ظاہر ہے ہم انھیں قصور وار نہیں کہہ سکتے تھے جو انصاف کے فیصلے سناتے تھے کیونکہ وہ غیب کا علم نہیں رکھتے تھے اور دلوں کے بھید نہیں جانتے تھے۔ وہ اپنی سمجھ بوجھ کو گواہوں اور شہادتوں تک محدود رکھنے پر مجبور تھے۔

لیکن ہم مجبور نہیں تھے چنانچہ ہم خدا کی عطا کردہ عقل کی روشنی میں اور ضمیر کی راہنمائی کرنے والی قوت کے سہارے پر دونوں طرف سے محصور کرنے والے شکاریوں کے خلاف نبرد آزما تھے۔ ہماری تنظیم "ایم آر ایس" کا بنیادی مقصد تخریبی نہیں تعمیری تھا۔ ہم انصاف کو بہ زورِ بازو حاصل کرنا چاہتے تھے۔ کیونکہ ہم قانون کی مجبوریوں کو سمجھتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ہم ان سب کو سزا دینا چاہتے تھے جو سزا کے مستحق تھے مگر سزا سے بچے ہوئے تھے کیونکہ وہ قانون کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھانا جانتے تھے۔ اس طرح ہم بھی شکاری تھے مگر ان کے جو شرافت اور انسانیت کے دشمن تھے، ان کے جو آدمی کے ضمیر کو بھی بازار کی جنس جانتے تھے۔ سچائی کو قابلِ شکست سمجھتے تھے اور خود کو فرعون۔ ہم ان کے شکاری تھے جو کمزوروں کا شکار کرتے تھے۔ ہم ان سب کے شکاری تھے جو انصاف کے طلب گاروں کا شکار کرتے تھے۔ ظلم کے خلاف اٹھنے والی آوازوں کا شکار کرتے تھے۔ ہم خود انہی کی چیرہ دستی اور استحصالی قوت کا شکار تھے مگر پھر بھی ہم ان کے لیے شکاری تھے۔ بازی اب کچھ یوں چل رہی تھی کہ چوہدری دلاور کا شیطانی ٹولہ ہمارا شکاری تھا اور اس میں ان کے تمام زرخرید شامل تھے۔ پولیس ہمارے لیے شکاری تھی کیونکہ ہم اپنے خلاف مختلف دفعات کے تحت درج ہونے والی رپورٹوں کے مطابق مفرور اور مطلوب مجرم تھے اور ہم مٹھی بھر لوگوں کو جن کی ساری طاقت ان کا خلوصِ نیت تھا، اس نیکی پر یقین کامل تھا جسے نہ نمرود مٹا سکا تھا، نہ یزید۔ اس ذات پہ اعتماد تھا جس کا بچانے والا ہاتھ، مارنے والے ہاتھ سے ہمیشہ زیادہ طاقتور رہا ہے۔ ہم سب شکاریوں کے شکاری تھے۔

اس وقت ہم پولیس کے پھیلائے ہوئے جال میں گرفتار ہونے سے بچ گئے تھے مگر ابھی ہم خطرے کو اپنے ساتھ لیے پھر رہے تھے اور ہر جگہ خطرے میں تھے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ غالب کے ہاتھوں شیخ مارا جائے اور یہ بھی میں کسی طرح قبول نہیں کر سکتا تھا کہ صورتِ حال اس کے برعکس ہو۔ غالب اپنے دفاع کا حق استعمال کیے بغیر مارا جائے اور ہم ایک اچھے دوست کے سہارے سے

محروم ہو جائیں۔ میں نے ٹرک کی دوسری جانب سے محسن کو دوڑتے دیکھا۔

"غالب! گولی مت چلانا۔" محسن نے چلّا کر کہا۔

غالب کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ ہماری نظر کے سامنے شیخ نے جست لگائی اور ایک بنگلے کی دیوار پر چڑھ گیا۔

"اب یہاں ٹھہرنا بہت خطرناک ہوگیا ہے محسن۔" میں نے محسن کا بازو تھام لیا۔ وہ حرکت میں تھا۔ اس جھٹکے سے وہ خود بھی نہ سنبھل سکا اور میں بھی اس کے ساتھ گرا۔ اس اتفاق نے ہماری جان بچالی۔ شیخ نے دیوار پر رک کر فائر کیا اور گولی ہمارے اوپر سے سنسناتی ہوئی گزری۔ میں نے بے اختیار اپنا ریوالور اٹھا کے فائر کر دیا حالانکہ ابھی چند لمحے قبل میں خود ہی غالب کو اس حرکت سے روکنے کے حق میں تھا۔ جب اپنی زندگی کے وجود اور عدم کا مرحلہ آیا تو عقل کی کوئی دلیل کام نہ آئی۔

"یہ تو نے کیا کیا!" محسن نے میری کلائی تھام لی اور دیوار کی طرف دیکھا۔ اس پر کھڑا ہوا اکرام شیخ کا سایہ جو رات کے اندھیرے سے جدا نظر آتا تھا، غائب ہو چکا تھا۔ "تو نے اُسے مار دیا!"

"ہو سکتا ہے وہ اندر کود گیا ہو۔" میں نے کہا۔ گرنے کے بعد ہم غالب کے قریب ہوگئے تھے۔ "تم نے مجھے روک دیا تھا۔ ورنہ وہ بچ سکتا تھا؟" غالب نے ہمارے قریب آتے ہوئے کہا۔ جوابی فائر کی آواز پر وہ فوراً لیٹ گیا تھا اور دوسری بار شاید صحیح نشانہ لینے کے موڈ میں تھا مگر محسن کی آواز پر اس نے یہ ارادہ ترک کر دیا تھا۔

"میں نے بھی اس کا صحیح نشانہ نہیں لیا تھا۔" میں نے کہا۔ "بس جوابی کارروائی کی تھی۔"

"اب جیسے بھی ہو یہاں سے نکلو۔" محسن نے اُٹھ کر کہا۔ اسی وقت شیخ کی چلائی ہوئی گولی نے رات کے سکوت کو منتشر کر دیا۔

"شیخ اس بنگلے کے اندر مورچہ بند ہے۔" میں نے محسن کو پھر زمین پر کھینچ لیا۔ "آگے کھسکتے جاؤ۔" اس کے پاس ریوالور کہاں سے آیا سکندر؟" محسن بولا اور میرے ساتھ رینگنے لگا۔

"واقعی۔ یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔" میں نے کہا۔

"مرزا غالب! تم بیٹھے تھے اس کی نگرانی کے لیے۔"

"وہ... اس نے بڑا دھوکا دیا... بہت عیار آدمی ہے۔" غالب نے خفگی سے کہا۔ "مجھ سے کہنے لگا کہ اُدھر لاش پڑی ہے اور جگہ کم ہے۔ کیا میں ڈرائیور کے کیبن میں دیوار کے ساتھ بیٹھ جاؤں؟ میں نے اُسے صاف بتا دیا تھا کہ چالاکی سے کام لو گے تو تمھارا یہ

فعل خودکشی کہلائے گا مگر وہ میری بات ختم ہونے سے قبل ہی سرک چکا تھا۔ وہیں بیٹھے بیٹھے اس نے کسی خفیہ جگہ سے کوئی ریوالور برآمد کر لیا۔ اس صندوق کے نیچے سے یا کسی خفیہ خانے میں ہاتھ ڈال کے۔ بس میں اس کے ہاتھ کو حرکت کرتے نہ دیکھ سکا۔ بہت آہستہ آہستہ ہاتھ بڑھایا ہوگا اس نے۔ ریوالور ہاتھ میں آتے ہی اس نے چھلانگ لگا دی۔ اس وقت ٹرک بھی رک چکا تھا۔"

"چلو جو ہوا سو ہوا۔ اب کیا کرنا ہے۔" میں نے کہا۔ ہم تینوں ایک جھاڑی کے عقب میں کچی زمین پر پیٹ کے بل لیٹے ہوئے اور کیچوے کی طرح اپنے وجود کو گھسیٹتے ہوئے تقریباً دس گز کا فاصلہ طے کر چکے تھے۔ رگڑ سے میری کہنیاں چھل گئی تھیں اور جب میں تھوڑا سا اُٹھ کر گھٹنے سمیٹتا تھا تو سخت زمین مجھے شیشے کی کرچیوں کا فرش لگتی تھی۔

"شیخ ہمیں دھوکا دے رہا ہے۔" محسن بولا۔

"ہاں۔ وہ ابھی یہی ظاہر کرے گا کہ وہ بنگلے کی دیوار کے پیچھے موجود ہے اور پھر اچانک غائب ہو کے اندر چلا جائے گا۔" میں نے کہا۔

"اور اندر سے وہ بہ آسانی پولیس ہیڈ کوارٹر فون کر لے گا۔" غالب نے کہا۔ "آخر وہ ایک پولیس افسر ہے اور اپنے بااختیار ہونے کا ثبوت بھی دے سکتا ہے۔ اس قسم کی کوٹھی میں فون نہ ہونے کا کوئی سوال نہیں۔"

"وہ ہمیں فائرنگ کر کے اس جگہ دبکے رہنے پر مجبور کرنا چاہتا ہے۔" میں نے کہا۔

"اُسے یقین ہوگا، نا کہ جب تک ہم ٹرک میں رکھی ہوئی لاش کو ٹھکانے نہیں لگا دیں گے، واپس نہیں جائیں گے۔" محسن نے کہا۔

"ایمرجنسی پولیس بیس منٹ میں پہنچ جاتی ہے۔" میں نے کہا۔ "شیخ جانتا ہے کہ ہم کہاں ہیں۔"

"پولیس کے آتے ہی وہ ہر طرف سے ناکہ بندی کرا دے گا۔ ہم محصور ہو جائیں گے۔" غالب نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"اس ٹرک کے اندر رکھے ہوئے باکس میں کم سے کم چھ مسلح سپاہی ہوں گے۔" محسن نے کہا۔ "بھاگنے کے بجائے اگر شیخ ایک فائر سے تالا توڑ دیتا تو باکس میں بند سپاہ باہر آ جاتی۔ پھر ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔"

"مقابلہ کرنا پڑتا تو ضرور کرتے۔ اتنی آسانی سے خود کو اُن کے سپرد نہ کر دیتے۔ بلا سے ہم تین مارے جاتے اور وہ سب۔" میں نے کہا۔

"اب وہم سے کچھ حاصل نہیں۔ لاش پڑی ہے رُل میں۔" میں نے پیچھے دیکھ کر کہا۔ "ہم نکل جاتے ہیں۔ پولیس یہاں سے سیدھی اُدھر جائے گی جہاں رابعہ اور خواجہ نیک محمد ہماری بخیر و عافیت واپسی کے لیے دعاگو ہیں۔"

ہم تینوں ایک ساتھ اُٹھے اور بھاگے۔ کوئی گولی ہمارے تعاقب میں نہیں آئی۔ ٹرک اب ہم سے سو گز کے فاصلے پر تھا۔ بظاہر شیخ ہمارے اندازوں کے مطابق ٹیلی فون کر چکا تھا چنانچہ ہمارے پاس وقت بہت کم تھا اور ہمیں بہت دُور پہنچنا تھا۔

گورنر ہاؤس سے بہت پہلے ایک ٹیکسی ہمارے قابو میں آ گئی۔ اس کا ڈرائیور رات کے وقت کسی ایسی جگہ جانے پر رضامند نہ تھا جہاں سے واپسی کی سواری ملنا یا خود اپنی واپسی مشکل ہو جاتی لیکن ہم نے اس پر واضح کر دیا کہ وہ مُنہ مانگی قیمت پر تیار نہ ہوا تو ہم اُسے زبردستی لے جائیں گے اور پھر مُنہ مانگی قیمت لے کر چھوڑیں گے۔ ہمارے لہجے سے زیادہ اسے ریوالور کے نظارے نے قائل کیا جو مرزا غالب نے اُسے دکھا کے پھر جیب میں رکھ لیا تھا۔ سارا راستہ وہ ہماری منّت سماجت کرتا رہا۔

"دیکھو ڈاکو صاب... آپ شہنشاہ لوگ ہو۔ دس سال تک میں نے دوسروں کی ٹیکسی چلائی۔ پھر یہ ٹیکسی بھی قسطوں پر لی تھی اور ابھی صرف دو مہینے پہلے قرضہ ختم ہوا ہے۔ اب آپ اسے ڈاکے میں استعمال کرو گے تو میں پھنس جاؤں گا۔ ٹیکسی پہلے پکڑی جائے گی۔ میں اس کے بعد پکڑا جاؤں گا اور اس کے بعد... اللہ میاں توبہ... پولیس مجھ سے آپ لوگوں کا پتا پوچھے گی۔ میں کیا بتاؤں گا۔"

"ہم تمہیں اپنا پتا بتا دیں گے۔ پریشانی کی کون سی بات ہے۔" میں نے کہا۔

"آپ مذاق کرتے ہو جی... پولیس والے تو یہی فرض کریں گے کہ میں بھی آپ کا ساتھی تھا۔" وہ تقریباً رونے لگا۔ "میت مرنے کے بعد بھی وہ میری بات کا یقین نہیں کریں گے۔ اگر بچا تب بھی ٹیکسی تو گئی نا رشوت میں۔"

"یہ کیا بک بک لگا رکھی ہے۔ آخر تم چاہتے کیا ہو؟" غالب نے اُسے ڈانٹ کر کہا۔

"بس جی آپ مجھے بخش دیں۔" وہ ہاتھ جوڑ کر بولا اور جلدی سے اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔

"ایسے ہم کس کس کو بخشتے رہیں گے۔" محسن نے کہا۔ "آخر کب تک بھئی؟"

"ہاں۔ صبح سے تین کو تو بخش چکے ہیں۔ ایسی ہی درد بھری اپیل پر۔" میں نے کہا۔ "اتنے رقیق القلب لوگ ہیں ہم۔"

"بھئی یہ ڈاکا ڈالنے والے قتل بھی تو کر دیتے ہیں۔" غالب نے ہمیں یاد دلایا۔

ٹیکسی ڈرائیور چلّانے لگا۔ "حضور ڈاکو صاحب! میری بیوی بیوہ ہو جائے گی۔ بچے یتیم ہو جائیں گے۔"

"اچھا بھئی! تم کو بھی بخش دیتے ہیں۔" میں نے بے حد مجبور لہجے میں کہا۔ "بس اسی جگہ ٹیکسی روک دو۔ ہم اتر جاتے ہیں اور دیکھتے ہیں کوئی دوسری گاڑی مل جائے۔" ٹیکسی ڈرائیور کی بدحواسی پر غالب کو ہنسی آ گئی۔

"اس مرتبہ کوئی ایسی ٹیکسی روکنا جس کا ڈرائیور اتنا بزدل نہ ہو اور بخش دینے کی بات نہ کرے۔" محسن نے مجھے ڈانٹا۔ ٹیکسی والے نے ہم سب کو مشکوک نظروں سے دیکھا اور ٹیکسی روک دی۔ نہ ہماری صورت ڈاکوؤں والی تھی اور نہ گفتگو۔ جب نیچے اتر جانے کے بعد ہم نے اُسے پچاس کا نوٹ دیا تو اُس کا شرمندگی سے بُرا حال ہو گیا۔ اُس نے ہمیں بڑی بے یقینی کے ساتھ دیکھا۔

"آپ تو... شریف آدمی ہیں... میں بڑا گدھا ہوں۔ آپ لوگوں کو ڈاکو سمجھا تھا۔"

"ہم شریف ڈاکو ہیں گدھے۔" محسن نے گرج کر کہا اور ٹیکسی ڈرائیور ہوا ہو گیا۔ وہ بیرک ہمیں اپنے سامنے مشکل سے پچاس گز کے فاصلے پر دکھائی دے رہی تھی جہاں سے ہم ڈیڑھ گھنٹا پہلے روانہ ہوئے تھے۔

"کیا ہم رات کو یہاں قیام کریں گے؟" غالب نے کہا۔

"اگر ہم بیوقوف ہیں تو اتنے نہیں ہیں۔" محسن نے بُرا مان کر کہا۔ "سب بندوبست رکھتے ہیں۔"

"عزیزم! ہم اگر جائیں گے تو کہاں جائیں گے اور کیسے جائیں گے؟" میں نے کہا۔

"ایک صورت تو یہی ہے کہ ہم دادِ شجاعت دیتے ہوئے یہیں جامِ شہادت نوش کریں۔" محسن بولا۔ "دوسری صورت یہ ہے کہ میں کسی ٹریول ایجنسی کو فون کر دوں۔ ہم کوئی چارٹرڈ پلین منگوالیں اور یہاں سے جا کر قطبِ شمالی پر پیراشوٹ سے اتر جائیں۔"

"تیسری اور آخری صورت بھی بتا ورنہ تیری صورت بگاڑ دوں گا۔" میں نے کہا۔

"تیسری آسان سی صورت یہ ہے کہ ہم اپنا بوریا بستر یہاں سے بھی گول کریں۔ ہمارے مقدّر میں یہی خانہ بدوشی ہے اور زمین کے کسی گوشے میں پناہ نہیں ہے۔" محسن بولا۔ "آج سے پہلے کب سوچا تھا کہ ایک جگہ سے اُٹھے تو پھر کہاں بیٹھیں گے۔ چلے جائیں گے کہیں۔"

"یہ تو ٹھیک ہے لیکن ہمارا اسباب۔ اور ساز خانہ۔" میں نے کہا۔ "دو زنانہ سواریاں بھی تو ہیں۔"

"ان میں ایک یرغمالی ہے۔" محسن بولا۔ "اُسے ہم یہیں چھوڑ جائیں گے۔"

"اور اگر وہ نہ رُکی۔" غالب نے کہا۔

"اس کا تو باپ بھی رُکے گا۔" میں نے کہا۔

"بھائی تو رُکا نہیں۔ باپ کیسے رُکے گا۔" غالب نے ہنس کر کہا۔

"تم لوگ اسباب سمیٹو۔ میں ایک ہارس پاور کی رولز رائس لاتا ہوں۔" محسن نے کہا اور دروازے کے قریب سے پلٹ گیا۔ ہماری آواز نے اندر رابعہ کو متوجہ کر لیا تھا۔ اس نے دستک سے پہلے خود ہی دروازہ کھول دیا۔

"خیریت رہی نا؟" رابعہ نے کہا

"خیریت... یہ تو اس مار دھاڑ اور دھوکے فریب سے بھرپور حسینہ سے پوچھو۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

"مجھے الزام مت دو۔ اس نے مجھے دھوکا دیا تھا۔ میں نے اُسے سزا دی اور اس کو چھوڑ دیا۔" نازو غرّائی۔

"وہ الگ بات ہے۔ اُس نے تمہیں سامنے رکھ کر اعتماد حاصل کرنے کا ڈراما کیا تھا۔ تمہیں کوئی سزا ہونی چاہیے یا نہیں؟" میں نے کہا۔ "اور تمہاری معصومیت نے مجھے بھی دھوکا دیا بلکہ ہم سب کو دھوکا دیا۔"

"یہ تم مجھ پر الزام لگا رہے ہو۔" وہ چلّائی۔ "کہ مجھے سب کچھ معلوم تھا؟"

"ہاں تم کو سب کچھ معلوم تھا۔ اسی لیے تم نے مجھے بھی کچھ نہیں بتایا اور اچانک اپنے ساتھ بھائی کو لے آئیں۔" میں نے مشتعل ہو کے کہا۔ "تم نے کسی سے مشورہ نہیں کیا۔ آخر کیوں؟"

"سکندر! تمہاری قسم..."

"میری قسم کوئی چیز نہیں۔ تمہاری یہ بات میں نہیں مان سکتا کہ تمہارے بھائی نے سازش کا اتنا بڑا جال پھیلایا۔ اس نے تم کو یقین دلا دیا کہ وہ مستعفی ہو چکا ہے۔ اس نے تمہیں قائل کر لیا کہ وہ تمہاری خاطر ہمارا ساتھ دینا چاہتا ہے۔ وہ پورا بندوبست کر کے یہاں تک

آپہنچا اور تم کو خبر نہیں ہوئی۔ مَیں سمجھتا ہوں تم اتنی نادان تو نہیں ہو۔" مَیں نے کہا۔

"کیا تم بھول گئے ہو کہ اس نے میری جان تک لینے کی کوشش کی تھی۔" نازو ہسٹریا میں مبتلا ہونے لگی۔

"لیکن نادم نہیں تھا۔ اور سیدھی صاف بات یہ ہے کہ تمھیں جال بنا کے وہ مجھے پکڑنے کی کوشش آئندہ بھی کرے گا۔ مَیں یہ خطرہ کیوں مول لوں؟" مَیں نے کہا۔ "نہ تم سے رابطہ ہوگا نہ میرے لیے خطرے کی کوئی بات ہوگی۔ ہم یہاں سے جا رہے ہیں لیکن تم کو ساتھ لے کر نہیں۔ تمھارا بھائی کچھ دیر میں اپنی فوج کے ساتھ آ جائے گا ... یہ جائے گا۔"

"ایسا نہیں ہو سکتا۔" نازو نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں بے یقینی بھی تھی، منت سماجت کا انداز بھی تھا تو کھلی دھمکی کا رنگ بھی۔ "مَیں تمھارے ساتھ جاؤں گی۔ تمھارے ساتھ ہی رہوں گی۔ تم اتنی جلدی بھول گئے کہ تم نے مجھ سے کیا کہا تھا!"

"وہ حالات کچھ اور تھے جب ہم نے تمھیں بھی اپنے ساتھ رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔" مَیں نے قطعی لہجے میں کہا۔ "اور اب حقیقت کھل کر سامنے آگئی ہے تو ہم جانتے بوجھتے کنویں میں نہیں گر سکتے۔"

"تم نے تو ہماری آٹھویں حس کا مذاق اُڑایا تھا سکندر بادشاہ۔" ٹیڈی بولا۔ "ہم نے تو بتا دیا تھا کہ ناممکن کچھ بھی نہیں ہوتا اور تم نے دیکھا، اکرام شیخ نے بہن کو قائل کر لیا تھا کہ وہ بھی اب ہمارے ساتھ ہے اور یہ اُسے ہمارے پاس لے آئی۔"

"لیکن وہ دوبارہ مجھے دھوکا نہیں دے سکتا۔" نازو چلّائی۔ "مجھ پر اعتبار کرو خدا کے لیے۔ تم نے مجھ سے کہا تھا کہ مَیں دلاور کا اعتماد حاصل کروں اور اس کی سیکرٹری بن جاؤں۔ اور تمھیں اس کے عزائم سے باخبر رکھوں۔ مَیں اس سے بھی زیادہ کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

"وہ سب کچھ اب ممکن نہیں رہا۔ تمھارا بھائی اس کی اجازت ہی نہیں دے گا اور اگر اس نے اعتراض نہ کیا تو صاف بات ہے کہ تمھیں ذریعہ بنا کر وہ ہم پر نظر رکھے گا۔ تم اس کا کام بہت آسان کر دو گی۔ ادھر تم نے ہم سے رابطہ قائم کیا اُدھر اسے خبر ہو جائے گی۔ تمھارا ہم سے ملنا، ہمیں ٹیلی فون کرنا، کسی کی معرفت پیغام دینا یا کسی کو ہمارے پاس بھیجنا، سب ہمارے لیے خطرے کا سامان ہوگا۔"

"ویسے بھی ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بھائی تو مجرموں کی جان کا دشمن ہو اور بہن انھی مجرموں کی آلۂ کار بنے۔ وہ بھائی بھی کوئی احمق نہیں ہے۔ تمھارے ہاتھ پیر بہت چلتے ہیں مگر اس سے تم شیخ جیسے ہوشیار پولیس افسر کے شاطر ذہن کو شکست دینے کا سوچتی ہو تو یہ تمھاری خام خیالی ہے۔ بہتر یہی ہے کہ تم واپس جاؤ۔"

"مَیں فیصلہ کر چکی ہوں کہ واپس نہیں جاؤں گی۔ تم مجھے زبردستی واپس نہیں بھیج سکتے۔" نازو چیخ کر بولی۔ وہ مقابلے پر آمادہ تھی اور اس کا مقابلہ صرف مَیں ہی کر سکتا تھا۔ اسی وقت محسن اندر آیا اور سب کو ساکت و صامت دیکھ کر ٹھٹکا۔

"تم لوگ سامان اٹھاؤ اور نکلو۔ میرا سوٹ کیس غالب اٹھا لے گا۔" مَیں نے کچھ دیر بعد پُرسکون لہجے میں کہا اور نگاہ نازو پر رکھی۔

"شاہی سواری پیچھے کھڑی ہے۔" محسن نے کہا لیکن سب کی صورتوں پر تشویش آمیز سنجیدگی کم نہیں ہوئی۔

"دیر مت کرو۔" مَیں نے سخت لہجے میں کہا۔ "سامان نکالو، میری صورت مت دیکھو۔"

"کیا... تم... تم نہیں چلو گے۔" رابعہ نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔

"مَیں تمھارے ساتھ ہی جاؤں گا۔" مَیں نے نرمی سے کہا۔ "محسن ان سب کو لے جا اور میرا انتظار کر۔"

نازو کی حالت میں رونما ہونے والا تغیر بہت واضح تھا۔ اس کی منت سماجت بھی رائیگاں گئی تھی اور دھمکی نے بھی کسی کو مرعوب نہیں کیا تھا۔ میرا درشت رویہ اسے سب کی نظر میں ذلیل کر رہا تھا اور وہ ایسی لڑکی نہیں تھی جو اپنی شکست کے احساس کو کسی ردِعمل کے بغیر تسلیم کر لے۔ اپنے عزم کا اظہار وہ پہلے ہی کر چکی تھی اور مَیں اندازہ کر سکتا تھا کہ اپنی بات منوانے کے لیے وہ کس قسم کی احمقانہ جرأت کا مظاہرہ کرنے کی اہل ہے۔ آہستہ آہستہ اس کی آنکھوں میں ایک ایسی خطرناک چمک پیدا ہوئی جو کسی چیتے کی آنکھوں میں شکار پر جست لگانے سے پہلے نظر آتی ہے۔ اس کے جسم سے ایک کھنچاؤ کی کیفیت کا اظہار ہونے لگا اور اس کی نگاہ مجھ پر مرتکز ہو گئی۔ مَیں نے محسن اور غالب کو سوٹ کیس اٹھا کے احاطے کی طرف سے باہر جاتے دیکھا۔ رابعہ بدستور مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر بت بنی کھڑی تھی۔ شاید اُسے بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ اب کیا ہونے والا ہے چنانچہ وہ بےحد خوف زدہ تھی۔

"نازو! خدا کے لیے سمجھو۔" رابعہ چلّائی۔

"مَیں تمھارے ساتھ جاؤں گی۔" نازو نے اس کی طرف دیکھے بغیر خطرناک اور سپاٹ لہجے میں غرّا کے کہا۔ "اور مجھے روکنا ہے تو چلاؤ مجھ پر گولی۔ میرا بھائی تمھیں نہیں، میری لاش کو لے جائے گا۔"

مَیں نے اپنا ریوالور نکالا۔ "یہ مت سمجھنا کہ مَیں تم پر گولی چلانے کی ہمت نہیں رکھتا۔"

"سکندر!" رابعہ نے دہشت زدہ ہو کے چیخ ماری اور ایکدم آگے بڑھی۔ "پاگل ہو گئے ہو تم!"

ابھی وہ میرے قریب بھی نہیں پہنچی تھی کہ مَیں نے بائیں ہاتھ کو پھیلا کے اُسے پیچھے دھکیل دیا اور وہ دور جا گری۔ "اس بےوقوف عورت کو باہر لے جاؤ۔" مَیں نے ٹیڈی کو مخاطب کر کے کہا جو اپنے بھاری بھرکم، تجوری جیسے فولادی صندوق کو گھسیٹ کر باہر لے جانے کی کوشش میں مصروف تھا۔ اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور آہستہ سے سر ہلایا۔ پھر اُس نے سہارا دے کر رابعہ کو اپنے پیروں پر کھڑا کیا۔ رابعہ زار و قطار رو رہی تھی۔

"انھیں سمجھاؤ۔ آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے۔" وہ روتے روتے بولی۔

"سکندر سب ٹھیک کر لے گا۔ تم باہر چلو۔" ٹیڈی نے اُسے نرمی سے سمجھاتے ہوئے باہر کی طرف گھسیٹا۔ اس تمام عرصے میں میرے کان ہر آواز سنتے رہے اور مَیں ذہنی طور پر گرد و پیش سے غافل نہیں ہوا۔ میری نظر ایک لمحے کے لیے بھی نازو پر سے نہیں ہٹی اور نہ اسی لمحے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ مجھ پر جھپٹ پڑتی۔ محسن نے عقلمندی یہ کی تھی کہ سب سے پہلے تمام اسلحہ سمیٹ لیا تھا۔ سوائے اسٹین گن کے جو اُس نے کندھے سے لٹکا لی تھی۔ سب ریوالور اس نے میز پر سے اُٹھا کر اپنے سوٹ کیس میں بھر لیے تھے۔ نازو کو یقین آچکا تھا کہ اب میرے ارادے میں تبدیلی نہیں ہوگی۔ عین اس وقت جب مَیں نے محسوس کیا کہ مایوسی کی انتہا کو پہنچنے کے بعد وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کھو بیٹھی ہے اور خوف کے احساس سے بیگانہ ہو کے مارنے یا مارے جانے کا فیصلہ کر چکی ہے، مَیں نے اپنا ریوالور ایک طرف اُچھال دیا۔ ریوالور پھسلتا ہوا گیا اور دیوار سے ٹکرا کے ایک ایسی جگہ پر ٹھہر گیا جو میرے اور نازو کے درمیان دس فٹ کے مساوی فاصلے پر تھی۔ میرا خیال تھا کہ میری چال کامیاب رہی کیونکہ نازو نے بڑی پھرتی سے گھوم کر جست لگائی اور ریوالور اٹھا لیا۔ اس کے ساتھ ہی مَیں نے نازو کو دبوچنے کے لیے جست لگائی مگر اس نے میری چال کو سمجھ لیا تھا۔ وہ ایک دم قلابازی کھا گئی اور اس کے پیروں نے مجھے اوپر سے گزار دیا۔ دیوار قریب نہ ہوتی تو مَیں دس بارہ فٹ دور تک جاتا۔ کم فاصلے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ میرا سر دیوار سے نہیں لگا، ورنہ تصادم کی قوت مجھے ہوش سے بیگانہ کر دیتی۔ میرے پیر دیوار پر پڑے۔ ناکامی کے احساس نے مجھے ایک دم چوکس کر دیا۔ مَیں بھول گیا کہ میرے مقابل ایک لڑکی ہے اور وہ لڑکی عام آدمی پر بھاری پڑ سکتی ہے مگر میری حریف ثابت نہیں ہو سکتی۔ مَیں نے دیوار کو پیروں سے دھکیلا تو اسپرنگ کی قوت نے مجھے واپس پھینکا اور مَیں نے سیکنڈ کے سویں حصے میں گھوم کر قدم زمین پر جماتے ہی نازو کی طرف الٹی قلابازی کھائی۔ اس کا اٹھا ہوا ہاتھ میرے اٹھے ہوئے پیروں کے درمیان آیا تو مَیں نے دونوں پنجے ملا کے شکنجہ سا بنا لیا اور نازو کی کلائی کو گرفت میں محسوس کرتے ہی جھٹکا دیا تو نازو کے قدم اکھڑ گئے۔ وہ نصف دائرے میں گھوم کر گھسٹتی ہوئی مجھ سے تقریباً چھ سات فٹ تک دُور گئی۔ اگر اس کے بعد بھی وہ مقابلہ جاری رکھتی تو فیصلے میں چند سیکنڈ لگتے مگر نہ جانے کیسے اس کے ہاتھ میں آئے ہوئے ریوالور کا ٹریگر دب گیا۔ نازو نے ریوالور پر انحصار کرتے ہوئے پوری کوشش کی تھی کہ یہ ہتھیار اس کی گرفت سے نہ نکلنے پائے اور جیسے ہی موقع ملے وہ مجھے ہینڈز اپ کرا دے۔ وہ اچھی طرح سمجھتی تھی کہ خالی ہاتھوں سے میرا مقابلہ بےسود ہوگا۔ ریوالور مل جانے کے بعد طاقت کا توازن اس کے حق میں ہو گیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اُسے یہ موقع ملتا تو وہ کیا کرتی۔ کیا وہ سچ مچ مجھ پر گولی چلا دیتی یا صرف دھمکی پر اکتفا کرتی۔ وہ غیظ و غضب کے عالم میں بپھری ہوئی شیرنی بنی ہوئی تھی اور جب آدمی اپنی عقل سے زیادہ اپنی حیوانی جبلت سے مغلوب ہو تو وہ دوست دشمن یا اپنے پرائے میں تمیز کیسے کر سکتا ہے۔ غلطی مجھ سے ہوئی تھی کہ مَیں نے ریوالور پھینکتے وقت اس کے سیفٹی کیچ کو دیکھا نہیں تھا۔ ظاہر ہے سیفٹی کیچ ہٹا ہوا تھا اور انگلی پر اتفاقیہ دباؤ سے گولی چل گئی۔

فائر کی آواز کا فوری ردِعمل مجھ پر ہوا۔ مَیں ایک دم ہوش میں آگیا اور مَیں نے اپنے جسم کی منہ زور وحشی قوت کو سرکش گھوڑے کی طرح عقل کی لگام کھینچ کر قابو میں کیا۔ سب سے پہلا خیال مجھے یہ آیا کہ نازو نے وہ گولی مجھ پر چلائی تھی لیکن اس کا نشانہ خطا ہو گیا۔ یہ ذہنی صدمہ بہت شدید تھا۔ اس نے مجھے اپنے دفاع کی خاطر رک جانے پر مجبور کر دیا۔ نازو اگر اس حد تک پاگل ہو چکی تھی تو اس سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ شکست تسلیم کرنے کے بجائے پہلے مجھے مار دے اور پھر خود کو۔ میرے ہاتھ آہستہ آہستہ اوپر اُٹھے مگر اس وقت جب مَیں نے دیکھ لیا کہ اس گولی سے خود نازو کو بھی کوئی نقصان نہیں ہوا ہے۔ پھر باہر سے مَیں نے رابعہ کی چیخ سُنی۔

"خبردار! میرے قریب مت آنا۔" وہ ریوالور ایک ہاتھ میں تھام کر پیچھے ہٹنے لگی۔ "مَیں گولی چلا دوں گی سکندر۔" رابعہ طوفانی بگولے کی طرح اندر داخل ہوئی، دوسرے لمحے میں وہ میرے سامنے تھی اور اس کے دونوں ہاتھ پھیل چکے تھے اور

وہ اپنے جسم کو میرے لیے ڈھال بنا چکی تھی۔ "اگر تم کو اتنا ہی شوق ہے تو اب پہلے مجھ پر گولی چلاؤ۔" اس نے چیخ کر کہا۔

نازو کے کپڑے پشت کی جانب سے پھٹ گئے تھے۔ اس کا دوپٹہ فرش پر دہ گیا تھا۔ اس کے بال پریشان تھے اور اس کی آنکھوں میں وحشت تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ لمحہ جو کسی کی جان کا طلب گار بن کے آیا تھا اپنا نذرانہ لیے بغیر لوٹ گیا ہے۔ اس کے بعد آنے والا لمحہ پچھتاوا لے کر آیا تھا۔ پچھتاوا کچھ نہ کر سکنے کا اور پچھتاوا اس کا جو ہو چکا تھا۔ ریوالور اب نازو کے ہاتھ میں کانپ رہا تھا اور وہ خود پلک جھپکائے بغیر رابعہ کو دیکھ رہی تھی۔

"نہیں، میں تم پر گولی نہیں چلا سکتی۔" شکست کے احساس سے دوچار نازو نے کھوکھلے لہجے میں کہا۔

"کیوں؟ اتنے بہادر بھائی کی بہن ہو۔" رابعہ نے تلخ اور نفرت کے زہر آلود لہجے میں کہا۔

"میرا بھائی واقعی بہادر ہے۔" نازو ایک دم ہنسی۔ اس کی ہنسی میں دیوانگی کی پکار تھی۔ "کون بھائی اتنا بہادر ہوتا ہے کہ اپنی ہی بہن پر گولی چلا سکے اور یہ کام میں بھی کر سکتی ہوں۔ اُس بھائی کی بہن پر میں بھی گولی چلا سکتی ہوں مگر میں اپنی ہار نہیں مان سکتی۔ میں ان سب کو شکست دے سکتی ہوں جو سمجھتے ہیں کہ جیت ان کی ہوئی۔"

"ہار کیسی نازو؟" میں نے رابعہ کے شانے پر نرمی سے ہاتھ رکھا اور اُسے ہٹا دیا۔ "یہ ہار جیت کا تو مسئلہ ہی نہیں۔"

"تمھارے لیے نہیں ہے لیکن میرے لیے ہے۔" وہ پھر ہنسی۔ "جب میں نے تمھارا اعتماد کھو دیا تو کیا یہ میری ہار نہیں۔ تم مجھے بھروسے کے قابل نہیں سمجھتے۔ تم سمجھتے ہو میں نے جانتے بوجھتے سب کو دھوکا دیا۔ تم مجھے بھی اس ڈرامے کا ایک کردار سمجھتے ہو جو میرے بھائی نے کیا تھا۔ تم سب کو یقین ہے کہ مجھے اپنے بھائی کے دھوکے کا علم تھا۔ تم یہ ماننے کو تیار نہیں کہ دھوکا میرے ساتھ بھی ہوا اور تم سب مجھ سے ڈرتے ہو، مجھے اپنے لیے خطرہ تصوّر کرتے ہو۔ مجھے ساتھ نہیں رکھنا چاہتے۔"

وہ اس طرح بول رہی تھی جیسے اس پر ہپناٹزم کا اثر ہو اور میں بڑی احتیاط کے ساتھ آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ رابعہ سانس روکے پھٹی پھٹی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ غالب اور محسن دروازے کے فریم میں ساکت کھڑے تھے۔

"رک جاؤ سکندر!" نازو یکلخت ہوش میں آگئی اور ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ "مجھے معلوم ہے تم مجھ کو اپنے ساتھ نہیں لے جاؤ گے۔ لیکن میں تم کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر چکی ہوں۔ میں واپس نہیں جاؤں گی۔ بھائی میری لاش لے جا سکتا ہے... مجھے نہیں۔"

"ہم تمھیں ساتھ لے چلیں گے نازو۔" رابعہ نے کہا۔

نازو ہنسی اور مزید ایک قدم پیچھے ہو گئی۔ "تم بزدل ہو سکندر۔ اور جھوٹے ہو۔ نہ تم میں اتنی ہمت تھی کہ مجھے ساتھ رکھتے اور نہ تم میں مجھ پر گولی چلانے کی ہمت تھی۔ تمھاری مشکل کو میں آسان کر دیتی ہوں۔" اس نے ریوالور اٹھایا اور اپنی کنپٹی پر رکھ لیا۔

"نازو! میری طرف دیکھو! میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمھیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔" میں نے چلّا کر کہا۔

"جھوٹ۔ اس وقت بھی جھوٹ بول کے بے وقوف بنانا چاہتے ہو مجھے؟" وہ ہنسی۔

"یہ جھوٹ نہیں ہے نازو۔ لاؤ یہ ریوالور مجھے دیدو۔" میں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔

نازو نے نفی میں سر ہلایا۔ "تاکہ پھر تم مجھے ناک آؤٹ کر کے یہیں چھوڑ جاؤ، مسٹر بلیک بیلٹ عرف سکندرِ اعظم۔"

"میں اس کی ضمانت دیتی ہوں نازو کہ ایسا نہیں ہوگا۔" رابعہ آگے بڑھی۔ "تم نہیں جاؤ گی تو میں بھی نہیں جاؤں گی۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" نازو ہنسی۔ "مگر تم سکندر کی وکیل بھی ہو۔ اس لیے دلائل تو دو گی — سکندر سے کہو کہ تمھاری قسم کھائے۔ کیا تمھاری جھوٹی قسم کھا سکتا ہے سکندر؟ نہیں کھا سکتا نا، مجھے معلوم تھا۔"

"میں رابعہ کی قسم کھا کے کہتا ہوں نازو کہ ہم جہاں بھی جائیں گے تمھیں ساتھ لے کر جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "لاؤ، اب یہ ریوالور میرے حوالے کر دو۔"

نازو کی آنکھوں میں بے یقینی کے ایک لمحے کی جھلک اُبھری۔ میں نے اپنی آنکھیں اس کی آنکھوں سے ہٹائی نہیں تھیں۔ اسی تذبذب کا عکس دیکھتے ہی میں نے جست لگائی۔ دوسرے لمحے میں نازو اس مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی جسے ڈوری کا ایک جھٹکا پانی سے خشکی پر پھینک دے۔ اس کا نازک وجود اس پودے کی طرح زمین بوس ہو گیا جس پر پہاڑ ٹوٹ کر آ گرا ہو۔ میرے ہاتھ نے اس کی کلائی کو جھٹکا۔ ایک گولی نہ جانے کس سمت میں پرواز کر گئی اور ریوالور فرش پر پھسلتا ہوا دور چلا گیا۔

"چھوڑ دو... چھوڑ دو مجھے۔ مر جانے دو مجھے۔" نازو نے بل کھانا اور چلّانا شروع کیا۔ میں نے اس کے رخساروں پر زور سے طمانچے مارے۔ ہر تھپیڑ سے اس کا چہرہ گھوم جاتا تھا اور اس کی مزاحمت ختم ہونے لگتی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی آواز کم ہونے لگی اور اس کا سر ڈھلکنے لگا۔ میں نے اسے کندھے پر اٹھایا اور دروازے کی طرف چل پڑا جو چند قدم کا فاصلہ تھا۔ نازو کے دونوں ہاتھ میری پشت کی جانب جھول رہے تھے اور اس کا سر بھی کسی بے جان نعش کی طرح ڈول رہا تھا۔ آگے صرف اس کی ٹانگیں تھیں۔ رابعہ خود بخود میرے ساتھ ہو گئی۔ دروازے میں کھڑے رہ کر تماشا دیکھنے والے محسن، غالب اور ٹیڈی نے راستہ چھوڑ دیا اور آگے آگے چلے گئے۔ میں نے باری باری سب کی صورتوں کو دیکھا۔

اس صورتِ حال نے سب کو متفکر اور تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ کوئی بھی نازو کو اپنے ساتھ رکھنے کے حق میں نہیں تھا مگر نازو نے ایک بار پھر جان کی بازی لگا کے اپنے لیے یہ حق حاصل کر لیا تھا۔ اس میں شک کی کوئی بات نہ تھی کہ رابعہ نے بروقت مداخلت نہ کی ہوتی اور میں نے طاقت کے بجائے اس بحران سے نمٹنے کے لیے عقل استعمال نہ کی ہوتی تو نازو اپنے لہو سے خود کو معتبر ثابت کر دیتی۔ لیکن اس کے بعد ہم سب خود اپنی نظر میں موردِ الزام ٹھہرتے۔ وہ جذبات کے طوفان میں قیامت بن جانے والی لڑکی زندگی اور موت دونوں کو کھیل سمجھتی تھی۔ اس کا ہمارے ساتھ رہنا بھی کسی طور سود مند نہ تھا۔ ایک جذباتی مسئلہ میرے لیے تھی۔ انگریزی محاورے کے مطابق دو بیر دو کشتیوں میں رکھنے والا ڈوب جاتا ہے۔ ڈوبنا مجھے کبھی منظور نہ تھا لیکن کبھی ڈوبنا ہی ہوتا تو میں رابعہ اور صرف رابعہ کی خاطر ڈوبنا پسند کرتا۔ کسی اور کی وجہ سے یا کسی اور کی خاطر میں زندگی کے کسی بھنور میں اترنا قبول نہیں کر سکتا تھا اور اپنی محبت کو رابعہ کی امانت سمجھ کے اس کی حفاظت کے خیال سے غافل نہیں ہو سکتا تھا۔ دوسرا مسئلہ ہم سب کے لیے وہ خطرہ تھا جو نازو کے وجود سے الگ نہ تھا۔ یہ بات یقینی تھی کہ شیخ کی غیرت کے لیے یہ چیلنج بہت بڑا ہوگا۔ وہ فرض کے جنون کا شکار پولیس آفیسر کسی رشتے کی تقدیس کو کسی طرح بھی پیشے کے تقاضوں سے زیادہ اہم نہیں مانتا تھا۔ یہ اس کے منہ پر طمانچے سے کم نہ ہوگا کہ اسی کی بہن جرائم پیشہ افراد کے ساتھ گھر سے نکل جائے۔ کسی بھی بھائی کی عزت پر حرف آئے تو وہ برداشت نہیں کر پاتا۔ اکرام شیخ کے لیے یہ دہری جنگ ہوگی۔ ایک ادائے فرض کی خاطر، دوسری ناموس کے فرض کی خاطر۔ اس کی فرض شناسی میں اب انتقام کی آرزو بھی شامل ہو جائے گی۔

"اچھی طرح دیکھ لو۔" احاطے کی دیوار کے قریب پہنچ کر میں نے کہا۔ "پیچھے تو کچھ نہیں چھوڑا ہے نا۔"

"ایک لاش چھوڑ دی ہے تاکہ سند رہے اور کام آئے۔" محسن بولا۔ "اسے ساتھ لے جا نہیں سکتے۔"

"لاش؟ کس کی لاش؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"اس ڈرائیور کی جو پولیس کا ٹرک چلا کے یہاں تک لایا تھا۔" غالب نے مجھے یاد دلایا۔ "اور جس نے مجھے شوٹ کرنا چاہا تھا۔"

"اچھا ہوا کہ میں نے دیکھ لیا۔ ورنہ لاش باہر ہی پڑی رہ جاتی۔" محسن بولا۔

"لاش اب کہاں ہے؟" میں نے کہا۔ "مجھے تو نظر نہیں آئی تھی۔"

"لاش اندر ہے، میزوں کے نیچے —" محسن نے جواب دیا۔ "کہو تو اُٹھا لائیں۔"

"ابھی کچھ دیر میں پولیس پہنچنے ہی والی ہوگی۔ وہ لے جائیں گے۔" غالب نے کہا۔ "تم خود نکلو ورنہ وہ تمھیں بھی لے جائیں گے۔"

باری باری غالب اور ٹیڈی دیوار پر چڑھے۔ انھوں نے ہاتھ نیچے بڑھایا اور رابعہ کو اوپر کھینچ کر دوسری طرف اتار دیا۔ پھر انھوں نے نازو کو کھینچا اور اس کا بوجھ میرے کندھے سے دیوار پر منتقل ہو گیا۔ میں اور محسن دوسری طرف کودے اور نازو کو اسی بیہوشی کے عالم میں محسن نے اٹھا لیا۔ اندھیرے میں کچھ فاصلے پر مجھے ایک تانگا نظر آیا۔

"اس وقت کون جیالا کوچبان مل گیا؟" میں نے کہا۔

"تو میرے لینڈ لارڈ کی توہین تو نہیں کر رہا ہے۔" محسن ہنسا۔ "تانگا اسی کا ہے۔"

"تو نے اسی لیے ٹیکسی کو چھوڑ دینے پر اعتراض نہیں کیا تھا؟" میں نے ہنس کر کہا۔

"ہاں۔ دن میں میرا پیارا مالک مکان مجھے اپنے پیارے سے گھر میں لے گیا تھا تو وہاں میں نے اس کا پیارا سا تانگا اور پیارا سا گھوڑا دیکھا تھا۔" محسن بولا۔ "مجھے بہت پسند آیا تھا۔ بالکل نئے ماڈل کا گھوڑا ہے۔"

"تم لوگوں کے ساتھ تو نیکی کرنے والا بھی مارا جاتا ہے۔" رابعہ بولی۔

"وہ کیسے بی بی۔" محسن نے سخت بُرا مان کے کہا۔ "نیکی تو ہم نے کی ہے۔ اسے یکمشت اٹھارہ ہزار دے دیے۔ اس کا قرض بے باق ہو گیا اور ہم ایک دن بھی یہاں نہیں رہے۔ یہی کہے گا کہ رحمت کے فرشتے تھے۔"

"جو آئے اور تانگا گھوڑا کھول کر لے گئے۔" غالب نے کہا۔

"اب انھیں ڈھونڈھ چراغِ رخِ زیبا لے کر۔"

"اس تانگے گھوڑے کی قیمت بھی نکال دو تو وہ فائدے میں رہا۔ کم سے کم دس بارہ ہزار اسے خواہ مخواہ مل گئے۔ کل تک وہ اتنی رقم کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔" محسن نے برہمی سے کہا کیونکہ غالب کی بات پر رابعہ ہنس پڑی تھی۔

"کل تک وہ تمھارے بارے میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ تم تانگا چور رہو۔" رابعہ نے محسن کو چھیڑا۔

"تانگا ہم اسے واپس کر دیں گے کل تک۔ اپنی ضرورت کے لیے اس وقت یہی سواری دستیاب تھی۔" محسن نے کہا۔ "اور یہ تو ہم نے عزت افزائی ہی کی ورنہ ہم اس سے پہلے کاریں حاصل کرتے رہے ہیں۔"

"لینڈ لارڈ صبح دیکھے گا کہ کرائے دار بھی غائب اور تانگا گھوڑا بھی تو سمجھ جائے گا کہ کرائے داری تو محض بہانہ تھی۔" ٹیڈی نے کہا۔ "اصل مقصد گھوڑے تانگے کی چوری تھا۔ جیسے وہ دیہاتی جس کا رومال کھو گیا تھا میلے میں۔ وہ کہتا پھرتا تھا کہ میلہ کیا تھا سب میرا رومال چوری کرنے کا کھیل تھا۔"

"صبح تو وہ حوالات میں ہو گا۔" میں نے کہا۔ "ممکن ہے شیخ اس کی گلو خلاصی کرا دے ورنہ ہمیں پناہ دینا اس کو بہت مہنگا پڑے گا۔ پولیس ابھی تھوڑی دیر میں ہی اسے جگا کے پوچھے گی کہ وہ لوگ کہاں گئے اور اسے بھی لاش کے ساتھ لے جائے گی۔ یہ خبر شاید اسے حوالات میں ہی ملے گی کہ تانگا گھوڑا بھی نہیں ہے۔ وہ کیا بتائے گا کہ کرائے دار کون تھے، کہاں سے آئے تھے اور کدھر گئے۔"

"یہ سب تمھاری وجہ سے ہوا مرزا غالب۔" محسن نے کہا۔ اور تانگے میں آ کے بیٹھ گیا۔

"ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا۔" غالب نے آہ سرد بھر کے فرمایا۔ "ہمارے لیے اس فتنۂ محشر کا آنا واقعی قیامت کے آنے سے کم نہیں ثابت ہوا مگر مجھے کیا معلوم تھا۔ اگر اس کا وہ خبیث بھائی ساتھ نہ آتا تو کتنا اچھا ہوتا۔"

"گھوڑے کا اگنیشن سوئچ کہاں ہوتا ہے۔" محسن نے لگام تھام کے کہا۔ "کلچ اور ایکسیلریٹر گیئر اور بریک سب کچھ یہ لگام ہے؟"

میں نے نازو کو آگے ڈال دیا اور اس کے پیر سمیٹ دیے۔ وہ گٹھڑی سی بنی اس تھوڑی سی جگہ میں سما گئی جو اگلی سیٹ کے نیچے اور تانگے کے سامنے والے حصّے کے درمیان تھی۔ اسے سیدھا بٹھانا ناممکن تھا اور گود میں لٹا کے لے جانا خطرناک تھا۔ راستے میں گشتی پولیس پارٹی دیکھتی تو یہی سمجھتی کہ ہم کسی کو اغوا کر کے لے جا رہے ہیں۔ محسن اپنے چلنے سے

بالکل تانگے والا لگتا تھا۔ اس کے ساتھ بیٹھا ہوا ٹیڈی بھی دیہاتی نظر آتا تھا۔ ہم نے ٹیڈی کے ساتھ غالب کو آگے بٹھایا تھی کیونکہ وہ کچھ دور جانے کے بعد اترنا چاہتا تھا اور اخبار کے دفتر پہنچ کر حاضری دینے کے موڈ میں تھا۔ میں اور پیچھے بیٹھے اور اپنے پیر ان سوٹ کیسوں پر رکھ لیے جن سے ایک میرا تھا اور ایک محسن کا۔

"استاد ٹیڈی! تمھاری تجوری کدھر ہے؟" محسن نے چلانے سے قبل کہا۔

"وہ صندوق ہے نیچے ہے۔" ٹیڈی نے سیٹوں کے نیچے خلا کا حوالہ دیا۔ "تم کو اس کی اتنی فکر کیوں رہتی ہے؟"

"فکر ہمیں رہتی ہے؟" میں نے کہا۔ "چلو ٹھیک ہے، اس فکر سے چھٹکارا پا لیتے ہیں۔ اسے تانگے میں ہی چھوڑ دیں"

"نہیں میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" ٹیڈی نے گھبراہٹ کہا۔ اس کی گھبراہٹ نے ایک بار پھر مجھے اس پُراسرار صندوق متعلق سوچنے پر مجبور کر دیا جس کے راز سے آگاہی ابھی تک حاصل نہ ہو سکی تھی۔ محسن خان نے ماہر کوچبان ہونے کا ثبوت یوں دیا کہ لگام کھینچ کر گھوڑے کو ایک چابک رسید کیا۔ ہنہنا کے اچھلا۔ میں اور رابعہ گرتے گرتے بچے۔

"آپ نے پہلے کبھی تانگا یا گھوڑا چلایا ہے؟" رابعہ کہا۔ "نہیں تو گھوڑے سے جگہ بدل لیں۔"

"ایک ڈاکٹر نے بھی اپنے مریض سے ایسا ہی احمقانہ کیا تھا کہ کیا آپ پہلے کبھی فوت ہوئے ہیں؟" محسن نے گھوڑے کو قابو میں رکھنے کی کوشش کی۔ "ہر کام آدمی کو زندگی میں پہلی کرنا پڑتا ہے۔ وہ پہلی بار پیدا ہوتا ہے، پہلی بار عشق کرتا ہے۔ بدل جائے تو اس کا کیا قصور۔ اگر میں ایسا ہی سوال آپ سے کہ آپ نے پہلے کبھی شادی کی ہے"

بیک وقت میں نے اور رابعہ نے محسوس کیا کہ سوچے سمجھے بغیر بولنے والا محسن ہمیں طنز کا نشانہ بنا رہا ہے۔ کیا اس یہ بات دانستہ کی تھی؟ مجھے یاد دلایا تھا کہ میرا پہلا عشق فوزیہ اب میں دعوے کرتا ہوں کہ میرا پہلا عشق رابعہ ہے۔ اور رابعہ جو شادی کی تھی وہ اس کی زندگی کا بہت بڑا المیہ ثابت ہوا بھٹکا ہوا راہی میں بھٹکا ہوا راہی تو۔ تیرے بھی صنم جھوٹے بھی صنم جھوٹے۔ شاید محسن کو احساس بھی نہیں تھا کہ مذاق میں اس نے کتنی بڑی حقیقت کے زخموں کو کرید دیا۔ اس نے بالآخر گھوڑے پر قابو پا لیا تھا اور اب کسی ماہر کی طرح تانگا چلاتے ہوئے حلق سے وہ آوازیں نکال رہا جو تانگے والے اور اس کے گھوڑے [illegible]

غالب اور ٹیڈی ہنس رہے تھے۔

ہوتی ہیں۔ تقریباً تین چار فرلانگ دور آ جانے کے بعد ہمیں رات کو گشت کرنے والے سپاہیوں کی پہلی ٹولی ملی۔ "کی حال ہے سنتری بادشاہ بخیر ہو وے۔" اس نے پھر گھوڑے سے عبرانی یا لاطینی میں کچھ کہا۔ سنتری خاموشی سے گزر گئے۔

"اب ارادہ کدھر کا ہے؟" میں نے محسن کی بات سے پیدا ہونے والی چور خلش سے نجات پانے کے لیے کہا۔

"گھوڑا آٹومیٹک ہے۔ کسی کی مرضی کا غلام نہیں۔ چل بھئی میرے شیر تے سوا شیر۔" محسن بولا۔

"یار مجھے تو اتار دے۔" غالب نے کہا۔ "میں ایڈیٹر صاحب کو اپنی شکلِ مبارک دکھا دوں۔ کوئی تو گواہ ہو میری بے گناہی کا۔ شیخ صاحب چاہیں گے تو انھیں گواہی بھی فراہم کر دیں گے کہ ہم رات بھر وہیں تھے۔"

"اچھا اس دنیا میں پھر کہاں ملاقات ہو گی؟ جاتے جاتے یہ تو بتا جاؤ۔" محسن نے کہا اور نہ جانے کیسے گھوڑے کو بریک لگا کے روکنے میں کامیاب ہو گیا۔ "اور ہو گی یا نہیں ہو گی؟"

"مجھ سے آفس میں ہی رابطہ قائم کر لینا۔ میں کل صبح اخبار شائع ہونے کے بعد وہیں سو جاؤں گا۔" غالب نے اترتے ہوئے کہا۔ "چوکیدار کو بتا دوں گا کہ کوئی ملاقاتی آئے تو جگا دے۔ فون اسی کمرے میں ہو گا۔"

"تمھاری امانت بھی اسی کوٹھے آئیں۔ آخر وہ چوکیدار ہے؟" محسن نے کہا۔ وہ سخت شرارتی موڈ میں تھا۔ غالب نے آگے جا کے نازو کو دیکھا، ایک سرد آہ بھری اور چل پڑا۔ اسی وقت دُور سامنے سے موٹر سائیکلوں کی روشنی نمودار ہوئی اور پولیس کے سائرن سنائی دیے۔ "تم لوگ تانگے کو گلی میں موڑ لو۔" غالب نے جلدی سے کہا۔ "میں ان سے بات کرتا ہوں۔"

گھوڑے کو اس گلی میں موڑنا آسان نہیں تھا مگر محسن فوراً نیچے اترا اور اس نے لگام کو تھام کر گھوڑے کو گلی میں کر لیا۔ خالی اور خاموش گلی گھوڑے کی ٹاپوں سے گونجنے لگی۔ محسن نے گھوڑے سے آگے پیدل چلنے کو ترجیح دی۔

"یہ غالب ان سے کیا بات کرے گا؟" محسن نے سوال کیا۔ "اور بات کرنے کی ضرورت کیا ہے؟"

"ان کا دھیان ہماری طرف نہیں جائے گا۔" میں نے کہا۔ "غالب کا کیا ہے۔ اس کے پاس پریس کارڈ ہے۔"

"اور اگر ان کے ساتھ شیخ بھی ہوا؟" محسن بولا۔ "وہ غالب کو پہچان لے گا۔"

"نہیں۔ میرا خیال ہے اسے گولی لگ گئی تھی۔" میں نے کہا۔ "میں نے اس کی ٹانگ کا نشانہ لیا تھا۔ وہ ساتھ نہیں آ سکتا۔"

"ہو سکتا ہے یہ پولیس پارٹی ہماری تلاش میں نہ آئی ہو۔" محسن بولا۔

"ادھر اس وقت کوئی پولیس پارٹی چھاپا مارنے آئی ہے تو نوّے فیصد امکانات یہی ہیں کہ وہ ہم سب کو گرفتار کرنے کے لیے آئی ہو گی۔ اگر ہمارا تانگا راستے میں ملتا تو ہو سکتا ہے وہ چیک کرتے اور ظاہر ہے ہمیں پہچان لیتے۔ غالب بیوقوف نہیں ہے۔ وہ ان سے کوئی ایسی بات کرے گا کہ ان کا ذہن گمراہ ہو جائے اور ان کا دھیان تانگے کی طرف نہ جائے۔ ویسے بھی شاید انھوں نے ہمارے تانگے کو گلی میں مڑتے نہ دیکھا ہو۔ اس کی لائٹیں نہیں جل رہی تھیں۔" میں نے کہا۔

"اور اگر دیکھ لیا ہو گا تو وہ سیدھے گلی میں آ جائیں گے۔" رابعہ نے کہا۔ ان کی موٹر سائیکلوں اور گاڑیوں کی روشنی بہت تیز تھی

"اس وقت نہ ہم فرار ہو سکتے ہیں اور نہ ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔" میں نے رابعہ کے خیال کی تائید کی۔

محسن نے اچانک تانگے کو ایک کھلے گیٹ میں موڑ کر گھنے درختوں کی آڑ میں روک لیا۔ گیٹ کسی پرانی وضع کی کوٹھی کا تھا جس کے حدود دیوار تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ میں نے اس کی معاملہ فہمی، دور اندیشی اور قوتِ فیصلہ کو سراہا۔ اس وقت بڑے خطرے سے نجات پانے کے لیے محسن نے ایک چھوٹا خطرہ مول لے لیا تھا جو بالکل صحیح قدم تھا۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ سوٹ کیس اتار کے جھاڑیوں کے پیچھے رکھے جو بیرونی احاطے کے متوازی تین طرف پھیلی ہوئی تھیں اور بلندی میں احاطے کی دیوار سے اونچی نکل گئی تھیں۔ دیوار اور جھاڑیوں کے درمیان بہت کم جگہ تھی لیکن جہاں گیٹ تھا وہاں سے کچھ دور تک دیوار سے لگ کر کھسکنے کی گنجائش تھی۔ سوٹ کیس رکھتے ہی میں نے رابعہ کو اس محدود سی جگہ میں دھکیلا۔ سخت خشک اور نوکیلی جھاڑیوں کی رگڑ سے اس کے چہرے پر اور ہاتھوں پر خراشیں آئیں اور اس کے کپڑے بھی جگہ جگہ الجھ کر پھٹے۔ وہ تھوڑا سا کراہی مگر پھر چہرے کے سامنے دونوں ہاتھ رکھ کے آگے بڑھنے لگی۔ جب میں نازو کو اٹھانے کے لیے واپس ہوا تو ٹیڈی اپنے فولادی صندوق کو اٹھا کے لانے کی جدوجہد میں مصروف تھا۔ محسن نے صندوق کو تانگے کی سیٹوں کے نیچے سے نکال کر ٹیڈی کے سر پر رکھ دیا تھا لیکن اس بوجھ کے ساتھ جھاڑیوں اور دیوار کے درمیان کی جگہ میں گھسنا اس کے لیے آسان نہ تھا۔ جب میں نازو کو اٹھا چکا تھا تو میں نے ایک دھماکا سُنا۔ صندوق ٹیڈی

کے سر پہ سے گر گیا تھا اور وہ اُسے پوری طاقت لگا کے کھُردری اور ناہموار زمین پر گھسیٹ رہا تھا۔ میں نے سانس روک کر کوٹھی کی جانب دیکھا اور میرے ساتھ سب نے ٹیڈی کو گھورا جو ندامت کے باعث کسی سے نظر نہیں ملا رہا تھا۔

اندر سے کسی کی آواز سنائی نہیں دی۔ کوئی دریچہ روشن نہیں ہوا۔ کسی چوکیدار نے ہمیں نہیں للکارا اور کوئی کتّا بھونکتا ہوا نہیں نمودار ہوا تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ محسن نے پھر گھوڑے کی لگام تھامی اور اسے اپنے ساتھ کوٹھی سے باہر لے گیا۔ میں نے کچھ دیر اس کی ٹاپوں کی آواز سُنی۔ پھر اچانک گھوڑے کے ہنہنانے اور سرپٹ بھاگنے کی آواز آئی۔ میں نے نازو کو گیٹ کے پیچھے ڈال دیا اور خود ٹیڈی کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔

نازو آہستہ سے کراہی۔ "مر جلنے... وہ... مجھے..."

"اسے بھی ابھی ہوش آنا تھا۔" ٹیڈی نے خفّت مٹانے کے لیے کہا۔ "خواہ مخواہ اٹھا لائے۔"

"اس کی آواز تمہارے اس منحوس شکل والے صندوق کے دھماکے سے بہت کم ہے۔" میں نے کہا۔ "تم بھی تو اس مصیبت کو خواہ مخواہ ہی اٹھائے پھرتے ہو۔"

"کیا میں پاگل ہوں سکندر بادشاہ؟" ٹیڈی نے کہا۔ "اتنے عرصے سے تم مجھے جانتے ہو۔"

"تمہاری اس صندوق کو اٹھائے پھرنے کی حرکت اگر دیوانگی نہیں ہے تو اور کیا ہے؟" میں نے کہا۔ ٹیڈی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"کسی کو ویٹ لفٹنگ کا شوق ہے تو تمہیں کیا اعتراض ہے۔" رابعہ نے کہا۔ "ذرا آہستہ بات کرو۔"

"اور بوجھ کیا کم ہیں۔ ہم سب پر ایک دوسرے کی ذمّے داری کا بوجھ ہے۔ سب کے ساتھ اپنے اپنے گناہوں کا بار ہے اور اس پر ہماری زندگی کے سارے جھمیلوں کا بوجھ ہے۔" میں نے کہا۔ "ذرا اپنی حالت کا تصور کرو۔"

"اس وقت تو ہماری ٹانگوں پر ہمارا وجود بھی ایک بوجھ ہے۔" رابعہ بولی۔ "کیا ہم اسے یہاں رات بھر اٹھائے کھڑے رہیں گے۔"

"نہیں۔ ابھی کچھ دیر میں کوٹھی کا سخی، مہمان نواز اور فرشتہ سیرت مالک مسکراتا ہوا نکلے گا اور انتہائی شائستگی کے ساتھ اپنے مہمانوں کو خاطر مدارات کے لیے اندر لے جائے گا۔" میں نے کہا۔ "پھر ہاٹ شاور باتھ۔ پھر پُرتکلف طعام۔ مغلئی، چینی اور انگلش کھانوں کا مزہ۔ گرما گرم کافی۔ اس کے بعد سینٹرل ہیٹنگ لے پُر آسائش بیڈ روم۔ یہاں کھڑے کھڑے ان سب کا تصور کرو تو بہت آرام ملے گا۔"

"آج سردی بھی کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہی ہے۔" ٹیڈی نے کہا۔

"سردی سے زیادہ مجھے بھوک محسوس ہو رہی ہے۔" ... نے کہا۔

"مقدر میں تو صرف دھکّے کھانے لکھے ہیں۔" رابعہ بولی۔ "آخر چین سے بیٹھنا کب نصیب ہو گا۔"

"نکلنا تو یہاں سے بھی پڑے گا۔" ٹیڈی بولا۔ "نہ جانے یہ کس کا گھر ہے۔" اسی وقت نازو پھر بڑبڑائی۔

"نازو کو کچھ ہو نہ جائے۔" رابعہ نے فکرمندی سے کہا۔ "ہسٹریا کا دورہ اتنا شدید اور طویل نہیں ہوتا۔ کہیں تم نے ضرورت سے زیادہ جرأتِ مردانہ کا مظاہرہ تو نہیں کیا تھا؟"

"اگر اسے فوراً کمبل میں لپیٹ کر لٹا دیا جاتا اور کوئی گرم چیز پینے کو دی جاتی تو یہ آدھے گھنٹے سے پہلے ہوش میں آ جاتی لیکن ہم اسے کس طرح اٹھائے پھر رہے ہیں اور اب کہاں لا رکھا ہے۔" میں نے کہا۔

گلی کی خاموشی میں بھاری موٹر سائیکل کی آواز گونجی۔ یہ آواز قریب آئی اور میں نے گیٹ کے سامنے روشنی دیکھی۔ تھوڑا سا جھک کر اور گیٹ کے گرل والے حصّے میں سے دیکھا۔ پر میرے شبہات کی تصدیق ہو گئی۔ موٹر سائیکل پر کوئی پولیس انسپکٹر یا سب انسپکٹر تھا۔ وہ عین گیٹ کے سامنے رکا اور دونوں قدم زمین پر جمائے اس نے موٹر سائیکل کو موڑا تو ایک لمحے کے لیے میرا دل تیزی سے دھڑکا۔ وہ تھوڑا سا آگے گیا اور اس نے ایکسیلیٹر دبایا تو ہیڈ لائٹ نے گیٹ سے اندر آنے والے راستے کو روشن کر دیا۔ میں نے اپنا ریوالور نکال لیا اور ٹیڈی کی طرف دیکھا۔ اس نے اقرار میں سر ہلا کے واضح کیا کہ وہ بھی ہنگامی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے تیار ہے۔ موٹر سائیکل کا انجن دو تین بار بڑی قوت سے گرجا اور روشنی تیز ہوئی۔ ہم دم سادھے پتھر کے بُت بنے کھڑے رہے۔ معلوم نہیں وہ موٹر سائیکل کی روشنی میں اندر کیا دیکھ رہا تھا اور اس نے خاص طور پر اسی کھُلے گیٹ کو قابلِ توجہ کیوں سمجھا تھا۔ اگر وہ اندر آ جاتا تو ہمارا وہاں چھُپے رہنا مشکل ہو جاتا۔ جب وہ واپس جاتا تو ہیڈ لائٹ میں ہم سب بالکل نمایاں نظر آتے اور لائٹ کی حرکت کے ساتھ اسے دیوار پہ ہمارے متحرک سائے فوراً متوجہ کر لیتے۔ میں طے کر چکا تھا کہ اگر وہ اندر آیا تو میں اسے مہلت نہیں دوں گا اور پیچھے سے جست لگا کے یوں دبوچ لوں گا کہ اس کی آواز بھی نہ نکلنے پائے لیکن یہ بہت

جھاڑیوں سے نکلنے کی معمولی سی آواز پر چوکنا ہو جاتا تو کچھ نہ کچھ ضرور کرتا۔ مقابلہ کرنے کی گنجائش نہ دیکھتا تب بھی شور ضرور مچاتا۔ پھر اس کی موٹر سائیکل بھی گرتی تو کم آواز نہ کرتی۔

جب لائٹ کا رُخ بدلا اور موٹر سائیکل واپس ہوئی تو میں نے محسوس کیا کہ میرا دل پھر دھڑکنے لگا ہے۔ آدھے گھنٹے کی اعصابی کشیدگی نے ہم سب کو شدید ذہنی و جسمانی کرب میں مبتلا رکھا تھا۔ خوف کا احساس کم ہوا تو میں نے رابعہ کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ وہ کانپ رہی تھی مگر سردی سے نہیں۔ محسن ایک دم کود کر اندر آ گیا۔

"کیا پولیس آئی تھی یہاں؟" محسن نے بڑی تشویش سے کہا۔

"آئی تو تھی لیکن آ کے ٹل گئی۔" میں نے سکون کی گہری سانس لے کر کہا۔ "نہ اس کا یہاں رکنا میری سمجھ میں آیا نہ اس کا یوں لوٹ جانا۔"

"کیا اسے شک ہو گیا تھا؟" محسن نے کہا۔

"شک ہوتا تو اسے اندر آنے سے کون روک سکتا تھا۔" میں نے کہا۔

"مجھے تو سب سے زیادہ ڈر نازو کی طرف سے تھا کہ ایکدم ہوش میں آ کر چلّانے نہ لگے۔" ٹیڈی بولا۔

"تُو نے تانگے اور گھوڑے کو کہاں چھوڑا؟" میں نے کہا۔

"یہاں سے ایک فرلانگ آگے جا کے چوک سا آتا ہے۔ تین سڑکیں ملتی ہیں۔" محسن بولا۔ "میں نے ایک سڑک پر گھوڑے کے ساتھ دوڑتے ہوئے مسلسل چابک مارے اور اسے سرپٹ بھاگنے دیا۔ نہ جانے کہاں جا کے رکا ہو گا۔"

"خدا کے لیے یہاں سے نکلو۔" رابعہ نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔ "میرا حوصلہ جواب دے رہا ہے۔"

"نکل کر کہاں جائیں؟" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ بھوک سردی اور تھکن سے خود میری حالت ابتر ہونے لگی تھی۔ رابعہ تو عورت تھی اور اس نے ابھی تک جتنی قوتِ برداشت کا مظاہرہ کیا تھا وہ غیر معمولی تھا۔

"کہیں بھی چلو۔ کوئی جگہ ہو بیٹھنے کی۔" رابعہ بولی۔ "ورنہ میں بیہوش ہو کے گر جاؤں گی تو یک نہ شد دو شد والا مسئلہ پیدا ہو جائے گا تم سب کے لیے۔ نازو ایسے ہی پڑی رہی تو مر جائے گی۔ اسے نمونیہ ہو جائے گا۔"

"کیا انہیں جگائیں؟ رات بھر کے لیے پناہ مانگیں۔" میں نے کوٹھی کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ نہ ہو سکندر بادشاہ کہ لینے کے دینے پڑ جائیں۔" ٹیڈی نے کہا اور مجھے اس کی آواز بھی کانپتی ہوئی لگی۔

"تم لوگ منٹ یہیں رکو، میں دیکھ کر آتا ہوں۔" محسن بولا۔ "کوئی یہاں رہتا بھی ہے یا نہیں۔"

"تھوڑی سی ہمت سے کام لو۔ ابھی کچھ کرتے ہیں۔" میں نے رابعہ کا حوصلہ بڑھانے کے لیے کہا۔

"بلا سے کھانے کو کچھ نہ ملے۔ اتنا تو ہو کہ ہم اس سرد رات میں کھلے آسمان کے نیچے ٹھٹھر کر مرنے سے بچ جائیں اور صبح تک زندہ رہیں۔" رابعہ نے کہا۔ پھر وہ محسن کو آگے جا کر کھڑکیوں دروازوں کا جائزہ لیتے دیکھتی رہی۔

"تقدیر کا یہ کیسا امتحان ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "تم اتنی بڑی اور نامور وکیل! میں ایک صنعت کار۔ کیا نہیں تھا ہمارے پاس اور کیا نہیں ہے۔ اس وقت بھی ہمارے پاس بائیس تئیس ہزار کی نقد رقم ہے۔ اسٹین گن تک ہے ہمارے پاس لیکن ہم کیسے چوہوں کی طرح دبکے پڑے ہیں اور کس حال میں ہیں۔"

"اس وقت ایسی مایوسی کی باتیں کر کے کیا ملے گا۔" رابعہ نے کہا۔

محسن بہت تیز تیز قدم اُٹھاتا آ رہا ہے۔ کوئی خوش خبری لایا ہے شاید۔" میں نے کہا۔

"خوش خبری یہ ہے۔" محسن نے قریب آتے ہوئے میری بات سن لی تھی۔ "کہ مکان خالی اور مقفل ہے۔"

"پھر اب کیا ہو گا؟" رابعہ نے مایوسی سے کہا۔ "اب کہاں جائیں گے؟"

"سائڈ میں ایک گیراج ہے۔" محسن بولا۔ "رات وہاں گزاری جا سکتی ہے۔ کافی جگہ ہے ہم سب کے لیے۔"

"تُو نازو کو اٹھا۔" میں نے باہر آ کے جیپ بجائی۔ "میں دونوں سوٹ کیس اُٹھاتا ہوں۔ خواجہ نیک محمد! تم اپنا مصیبت خانہ خود اٹھاؤ یا چاہو تو اس کے ساتھ یہیں پڑے رہو۔"

چند منٹ بعد ہم گیراج میں تھے۔ میں نے جیب سے لائٹر نکال کے روشنی کی تو مجھے ایک دیوار پر لائٹ کے سوئچ نظر آئے۔ چھت سے ایک بلب بھی نیچے لٹکا ہوا تھا۔ نتائج کی پروا کیے بغیر میں نے بٹن دبا دیا۔ سو واٹ کے بلب کی روشنی میں ہماری آنکھیں چندھیا گئیں۔ میں نے گیراج کے دروازے کی طرف دیکھا۔ "اس کو بند کرنا ضروری ہے۔" میں نے کہا۔

"شٹر کھینچا تو بہت آواز ہو گی۔" محسن نے کہا۔

"اس وقت کون سُنے گا۔" میں نے ہاتھ اونچا کر کے شٹر کو نیچے لانے کے لیے زور لگایا۔ میرا ساتھ محسن نے دیا اور شٹر جو کافی عرصے سے استعمال نہ ہونے کے باعث جام تھا بڑی چیخ پکار کے ساتھ تھوڑا تھوڑا نیچے آ گیا۔ ٹین کے کھڑکھڑانے کا اور دھات کی رگڑ سے پیدا ہونے والا شور مجھے رات کی خاموشی

میں کچھ زیادہ ہی محسوس ہوا لیکن سردی کو روکنے اور روشنی کو چھپانے کے لیے شٹر گرانا ضروری تھا۔ بالآخر شٹر ایک جگہ ایسا پھنسا کہ ایک انچ نہ ہلا۔

"یہ... اپنے خواجہ صاحب!" میں نے ہانپتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا۔" کیا وہ سچ مچ وہیں رہ گیا! اپنی تجوری کے ساتھ؟"

"میں لاتا ہوں اس کو۔" محسن نے کہا اور اس دو فٹ کے خلا میں سے گزر گیا جو فرش اور شٹر کے درمیان باقی رہ گیا تھا۔ میں نے گیراج کا جائزہ لیا۔ اس کے فرش پر گاڑی کھڑی کرنے کے آثار واضح تھے۔ سیمنٹ پر انجن آئل کے دھبے تھے۔ کچھ بہت پرانے لیکن کچھ ہفتہ دس دن پہلے کے۔ صاف ظاہر تھا کہ جب کوٹھی کے مکین یہاں تھے تو اپنی گاڑی بھی یہاں کھڑی کرتے تھے۔ ایک گوشے میں دو پرانے ٹائر اور گاڑی کے ناکارہ پرزے پڑے تھے، جن کو دیکھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ گیراج میں جیپ کھڑی کی جاتی تھی۔ سب سے زیادہ خوشی مجھے دوسرے کونے میں لگی ہوئی پرانی چارپائی اور لپٹے ہوئے بستر کو دیکھ کر ہوئی۔ غالباً یہ بستر ڈرائیور کا تھا جو اب مالکوں کے ساتھ گیا ہوا تھا۔ میں نے رابعہ کی مدد کی اور بستر کو پھیلا دیا۔ بستر بہت میلا تھا۔ گدّے اور تکیے کی حالت ایک سی خستہ تھی اور تکیے پر سفید غلاف تیل سے چکنا ہو کے سیاہ پڑنے لگا تھا۔ لحاف اور گدّے میں سے ایک جیسی بُو اٹھ رہی تھی۔ مگر ان حالات میں یہ غلیظ اور متعفن بستر کسی شاہزادی کے ریشم و کمخواب کی نرمی اور لطافت رکھنے والے معطر اور پُرتکلف بستر سے کم نہ تھا۔ میں نے نازو کو پہلے لٹایا جو اَب پہلے کی نسبت زیادہ ہوش میں تھی اور مسلسل "مجھے مر جانے دو... مجھے قتل کر دو۔" کی گردان کرنے لگی تھی۔ میں نے رابعہ کو بھی اس کے ساتھ بستر میں گھسنے پر مجبور کر دیا کیونکہ میں دیکھ رہا تھا کہ سردی سے رابعہ کے ہونٹ بھی نیلے پڑ رہے ہیں اور اس کا گلابی چہرہ بے جان نظر آنے لگا ہے۔ جسمانی توانائی کی بحالی کے لیے اسے بھی آرام کی اتنی ہی ضرورت تھی جتنی نازو کو۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو کچھ دیر میں یقیناً رابعہ بھی بیہوش ہو کر گر پڑتی۔

جب شٹر سے کسی کے ٹکرانے کی آواز آئی تو پلٹ کر دیکھے بغیر میں نے اندازہ کیا کہ یہ محسن کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا مگر اُسی وقت رابعہ کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں اور اس کا رنگ لاش کی طرح سفید پڑ گیا تو میں نے گھوم کر دیکھا اور اپنی جگہ پر منجمد ہو گیا۔ بائیس بور کی دو نالی شکاری بندوق کا رُخ میرے سینے کی طرف تھا اور یہ بندوق ایک عورت کے ہاتھوں میں تھی۔ عورت کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ تھی لیکن اس کی صحت قابلِ رشک تھی۔ وہ موٹاپے کی طرف مائل تھی لیکن اسے موٹی نہیں کہا جا سکتا تھا مزید یہ کہ موٹی ہونے والی عورتوں کی طرح اس کا جسم غیر متناسب اور بھدّا نہیں ہوا تھا۔ اس کا رنگ روپ اب بھی عہدِ رفتہ کی کہانی سُنا تا تھا جب اس کا اپنے حسن و شباب کی غارت گری کے چرچے خود بھی سُنے ہوں گے۔ اس کے بالوں میں سیاہی پر سفیدی غالب تھی اور وقت نے چہرے پر مکڑی کے جالے کی طرح جھریوں کو پھیلانا شروع کر دیا تھا مگر اس کی آنکھوں کی سیاہ چمک اب تک دھندلی نہیں پڑی تھی۔ مجموعی طور پر اس کی شخصیت میں ایک بارعب اور باوقار تمکنت تھی۔ مجھے ایسا لگا جیسے یہ چہرہ میں نے پہلے کہیں دیکھا تھا۔

"میں اکیلی عورت ہوں اور جوان بھی نہیں ہوں۔" وہ متانت سے بولی۔" لیکن اسے میری کمزوری مت سمجھنا۔ میرا نشانہ بہت اچھا ہے۔ اور میں تم کو صفائی کا موقع دیے بغیر گولی مار دوں تب بھی کوئی مجھے قصوروار نہیں سمجھے گا۔ اس کے علاوہ میرا بیٹا..."

وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی کیونکہ باہر سے استاد ٹیڈی اور محسن جھگڑتے ہوئے قریب آ رہے تھے۔" خبردار جو حلق سے آواز بھی نکالی۔" عورت نے ایک کونے میں پوزیشن سنبھال کے کہا۔" میرے بیٹے نے جاتے وقت کہا تھا کہ جسے چاہو گولی مار دینا۔"

استاد ٹیڈی کا بدصورت اور بدوضع صندوق پہلے اندر آیا۔ ٹیڈی کے ساتھ محسن نے اسے باہر سے اندر دھکیلا اور پھر خود بھی سر جھکا کے اندر آ گئے۔ سیدھے کھڑے ہوتے ہی انھوں نے بندوق کی نال کو دیکھا۔ عورت نے انھیں میری طرف کھسکنے کا اشارہ کیا اور وہ پلک جھپکائے بغیر اسے دیکھتے ہوئے میرے ساتھ آ کھڑے ہوئے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ آسمان سے گریں گے تو اس طرح کھجور میں اٹک جائیں گے۔

"کون ہو تم لوگ؟" عورت نے اسی سپاٹ آواز میں کہا۔

"ہم چور یا ڈاکو نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔

"یہ تو میں نے اندازہ کر لیا تھا کیونکہ تمھارے ساتھ عورتیں ہیں۔" وہ بولی۔" لیکن تم شریف آدمی بھی نہیں ہو۔"

"یہ اندازہ کیسے کیا آپ نے؟" میں نے محسوس کیا کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں اور اگر میں اس عورت کو مطمئن کرنے میں کامیاب ہو گیا تو پھر ہمارے حق میں بہت اچھا ہو گا۔

"اس لیے کہ شریف آدمی نہ راتوں کو اس طرح جوان عورتوں کے ساتھ پھرتے ہیں اور نہ ایسے بلا اجازت لوگوں کے گھروں میں گھستے ہیں۔" وہ سخت لہجے میں بولی۔" کیا سمجھ کے ڈیرا ڈال لیا تھا یہاں؟ معلوم ہے میرا بیٹا کون ہے؟"

"ہم سمجھے تھے کہ گھر میں کوئی [illegible] تالا پڑا ہوا تھا۔" محسن نے کہا۔

"تو کیا تم لوگ یہی کرتے ہو؟" وہ بولی۔" جو گھر خالی نظر آئے اس پر قابض ہو جاؤ۔"

"قبضہ کرنا ہوتا تو ہم اس گیراج میں پناہ نہ لیتے۔ قفل توڑ دیتے۔" میں نے کہا۔

"قفل توڑتے تو کتے کی موت مارے جاتے۔" وہ بولی۔

"جب میرا بیٹا گھر میں نہیں ہوتا تو میں یہی کرتی ہوں۔ سامنے سے تالا ڈال کے باورچی خانے سے اندر چلی جاتی ہوں اور اندر کی ساری کنڈیاں بند کر لیتی ہوں۔ میرے بیٹے نے مجھے سختی سے تاکید کر رکھی ہے۔"

"کیا بیٹے ماں کو سختی سے تاکید کرتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"یہ ہمارا ماں بیٹے کا معاملہ ہے جی! تم کون ہوتے ہو مجھے لیکچر دینے والے۔" وہ برہمی سے بولی۔" سیدھی طرح بتا دو کہ تم لوگ یہاں کیا کر رہے تھے؟ صورت سے تم لوگ فقیر تو نہیں لگتے۔ پھر کون ہو؟ بردہ فروش یا ان عورتوں سے....؟"

"کیا یہ عورتیں صورت سے آپ کو ایسی نظر آتی ہیں؟" میں نے مشتعل ہو کے کہا۔" اچھی نظر ہے آپ کی... ہم آپ کو چور ڈاکو نہیں لگتے۔ فقیر نہیں لگتے؟"

"پھر تم خود ہی بتا دو کہ تم کون ہو؟" عورت نے کہا۔" ورنہ میرا بیٹا سب معلوم کر لے گا وہ تم جیسوں سے نمٹنا جانتا ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ! آپ کا بیٹا آخر کیا ہے؟" میں نے کہا۔" وہ آئے گا تو کون سی توپ چلا دے گا۔ ہم نے کوئی جرم کیا ہے تو صرف یہی کہ سردی سے بچنے کے لیے گیراج میں پناہ لے لی اور وہ بھی مجبوری میں۔ ہم چلے جاتے ہیں۔"

"ٹھہرو! پہلے بتاؤ کہ ایسی کون سی مجبوری تھی جس نے تمھیں آدھی رات کے بعد اور اس موسم میں گھر سے بے گھر کیا اور تم یوں میرے گھر میں آ گھسے۔" وہ بولی لیکن اب اس کا لہجہ پہلے کے مقابلے میں بہت نرم تھا۔" دیکھو جھوٹ بالکل مت بولنا اور مجھے بیوقوف بنانے کی کوشش ہرگز مت کرنا۔ ورنہ میرا بیٹا..."

وہ ذرا سی دیر کے لیے رُکی۔" خیر تم اس سے ملو گے تو تمھیں خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ وہ توپ چلا کے تمھیں توپ دم کر سکتا ہے یا نہیں۔"

"آپ ہماری غلطی کو معاف کر دیں ماں جی۔" رابعہ نے اُٹھ کر نرمی سے کہا۔" ہم گیراج خالی کر دیتے ہیں۔ ایک رات ہی کی تو بات تھی۔ رات بھی اب کتنی رہ گئی ہے۔"

"میں نے یہ نہیں کہا۔" عورت کا رویّہ ایک دم مشفقانہ ہو گیا۔" میں تو جاننا چاہتی ہوں کہ آخر تم لوگوں پہ کیا آفت آ گئی تھی کہ تم گھر سے بے گھر ہوئے ہو اپنے بارے میں کچھ بتاؤ تو سہی، شاید میں تمھاری کوئی مدد کر سکوں۔ میں نے جو کچھ پہلے کہا تھا، غصّے میں کہہ دیا تھا۔ اس کا بُرا مت ماننا۔ تم صورت اور لہجے سے اچھے گھر کی لگتی ہو۔ چلو تم بستر میں لیٹ جاؤ۔ تمھاری طبیعت ٹھیک نہیں لگتی مجھے۔"

"آپ اس دو نالی توپ کو ہٹائیں تو ہم کچھ کہیں۔" میں نے کہا۔" کہیں گولی چل گئی تو..."

"گولی کبھی خود نہیں چلتی۔" وہ مسکرائی۔ اس نے بندوق کو نیچے کر لیا اور اس کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی۔" اب بولو۔"

"ہم بڑے مصیبت زدہ ہیں بیگم صاحبہ۔" میں نے مظلوم صورت بنا کے کہا۔" سارے زمانے کے ستائے ہوئے ہیں۔ میرا نام اوّل خان ہے۔ یہ میری گھر والی ہے خیرات النسا مگر سب خیراتن کہتے ہیں۔ یہ سالا ہے میرا خیرات محمد۔ اسے سب خیراتی کہتے ہیں۔ اور وہ جو لڑکی لیٹی ہے نا وہ میری سالی ہے۔ خیراتی اور خیراتن کی بہن... نازو۔"

"اور یہ شخص؟ یہ تم میں سے کسی کا بھائی نہیں لگتا۔" عورت نے شک سے استاد ٹیڈی کو دیکھا۔

"یہ میرا دوست ہے جی۔ اس نے ہم سب کی زندگی بچا لی۔" میں نے مظلوم لہجے میں اپنی فریاد جاری رکھی۔" ورنہ ہم سب مارے جاتے۔"

"کس کے ہاتھوں؟ کھل کے بات کرو۔ جب میرا بیٹا آئے گا تو سب... اسے بھی بتانا۔" اس عورت کو اپنے بیٹے پر بہت فخر تھا۔" جس نے بھی ظلم کیا ہو گا تم پر، سب کا دماغ درست کر دے گا۔"

"بات یہ ہے بی بی جی۔ ابھی ہماری شادی ہوئی ہے چھ مہینے پہلے۔" میں نے کہا۔" ہم سب تحصیل و ضلع گوجر خان کے رہنے والے ہیں اور ہمارا گاؤں ہے کلیام اعوان۔"

"تم کلیام اعوان کے ہو؟" وہ بولی۔" میں ایک رات رہی تھی وہاں۔ جب میرا بیٹا گوجر خان میں تھا۔"

ایسی کی تیسی اس کے بیٹے کی۔ ہر جگہ ٹپک پڑتا ہے۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔" میری بیوی نے تھوڑا سا پڑھ لیا تھا۔ دس جماعت تک میں نے بھی پڑھا ہے اور خیراتن نے بھی۔ اس کا رشتہ پہلے سگے چاچے کے لڑکے سے ہوا تھا۔ اس وقت یہ بچّی تھی۔ دوسری یا تیسری میں پڑھتی تھی۔ دس جماعت پڑھ کے یہ گوجر خان میں پڑھانے لگی جہاں میں بھی پرائمری اسکول میں ٹیچر تھا۔"

"اور یوں تم دونوں کی ملاقات ہوئی۔ پھر تم ایک دوسرے

سے محبت کرنے لگے اور تم نے شادی کرلی۔" عورت بولی۔
میں نے احمقوں کی طرح مُنہ کھول کر اس عورت کو دیکھا۔
"ہاں جی... بالکل۔"
"اور وہ چچازاد بھائی جس کی منگیتر تم نے چھین لی تھی تمھارا دشمن ہوگیا۔" عورت ہنس کر بولی۔
"آپ کو... یہ سب آپ کو کس نے بتایا جی؟" میں نے ہکلا کے کہا۔
"ایسا ہی ہوتا ہے بھئی۔ کون ہے وہ تمھارا دشمن؟"
"وہ بڑا بدمعاش ہے جی۔ پرائمری میں تھا تو اسکول سے بھاگ گیا۔ ماں باپ کی عزت کا دشمن ہوگیا۔ پہلے چھوٹی موٹی چوریاں کرتا تھا پھر ڈاکے ڈالنے لگا اور جیل گیا۔ ماں باپ اسی دکھ میں مر گئے۔" میں نے ایک فی البدیہہ کہانی کا تانا بانا تیار کر لیا۔" جیل سے چھوٹا تو بہت بڑا غنڈہ کہلانے لگا۔ اب ایسے شخص سے را... خیراتن کی شادی ہو سکتی تھی... اس نے مجھے بھی بہت دھمکیاں دیں اور خیراتی کو بھی۔"
"خیراتی اور خیراتن کے ماں باپ نہیں کیا؟"
"نہیں بیگم صاحبہ۔ خیراتی ہی بڑا بھائی تھا۔ وہ غنڈہ اس کا بھی دشمن ہوگیا مگر کون بھائی جانتے بوجھتے اپنی بہن کو جہنم میں جھونکتا ہے۔" میں نے کہا۔
"ظاہر ہے ایسا ظلم کوئی نہیں کرتا۔" عورت نے ہمدردانہ لہجے میں کہا اور میں نے ان سب کو دیکھا جو ہنسی ضبط کیے بڑی سنجیدہ صورت بنائے میری کہانی سن رہے تھے۔ گرم بستر کی حرارت پاتے ہی نڈھال ہو جانے والی نازو کو نیند آگئی تھی۔
"بس جی شادی کے بعد ہماری زندگی عذاب ہوگئی۔" میں نے لہجے میں رقت پیدا کی۔" ہم پولیس میں گئے رپورٹ لکھوانے تو پولیس نے مجھے بند کر دیا۔ اس غنڈے نے پولیس سے سازباز کر لی تھی۔"
"اچھا یہ بات ہے؟ آنے دو میرے بیٹے کو..." عورت نے خفگی سے کہا۔
"پھر جی میرے یار نے تھانیدار کو دو ہزار رشوت کے دیے تو اس نے مجھے چھوڑ دیا۔" میں نے کہا۔" لیکن اس نے مجھ سے کہا کہ یہاں سے بھاگ جاؤ۔ بعد میں کچھ ہوا تو میں ذمے دار نہیں۔ تھانیدار بھی تو ڈرتا تھا اس غنڈے سے۔"
"اچھا۔ کیا نام ہے اس تھانیدار کا۔ خیر... میرا بیٹا معلوم کرے گا۔"
"ہم بڑی مشکل سے پہننے کے کپڑے لے کر نکلے تھے مگر کسی نے اس کو خبر کر دی۔" میں نے کہا۔" وہ ہمارے پیچھے لگ گیا۔ ہم اگر بس یا ٹرین سے آتے تو وہ ضرور ہمیں قتل کرا دیتا۔ اس سے چھپتے چھپاتے یہاں تک پہنچے ہیں۔ حالت دیکھ لیں آپ ہم سب کی۔"
"تم سب نے کلیام اعوان سے لاہور تک پیدل سفر کیا ہے؟" عورت نے بے یقینی سے کہا۔
"سارا راستہ تو نہیں جی... کبھی تانگے میں بٹھا لیا کسی نے کبھی بیل گاڑی میں۔" میں نے کہا۔ لیکن عورت ان خراشوں کو دیکھ رہی تھی جو ہم سب کے ہاتھوں پہ اور چہروں پہ لمبی لمبی خونی لکیروں کی صورت میں نظر آ رہی تھیں۔ یہ خراشیں اسی عورت کے گھر کی جھاڑیوں میں چھپنے سے آئی تھیں مگر ہماری دُکھ بھری کہانی نے اس کے دل میں رحم کے جذبات جگا دیے تھے۔ وہ غور کرتی تو یہ بھی دیکھ سکتی تھی کہ زخم تازہ ہیں اور ہمارے پیروں میں اتنے لمبے سفر کے بعد بھی آبلے نہیں پڑے ہیں۔ اس نے رابعہ کے اور نازو کے جگہ جگہ سے پھٹ جانے والے کپڑوں کو بھی دیکھا اور ان کی بیمار صورتوں کو بھی۔ پھر وہ بندوق ایک طرف رکھ کے آہستہ آہستہ آگے آئی۔" اس لڑکی... کیا نام بتایا اس کا... نازو... اسے کیا ہوا ہے؟" وہ لحاف اٹھا کے دیکھنے کے بعد بولی۔
"کچھ نہیں بیگم صاحبہ۔ یہ بیچاری دسویں میں پڑھتی تھی۔ وہ غنڈہ بعد میں اس کے پیچھے پڑ گیا تھا کہ چلو چھوٹی بہن ہی دے دو۔ مگر بات تو ایک ہی تھی۔ خیراتی نے ایک بہن پر ظلم برداشت نہیں کیا تو دوسری پر کیسے ہونے دیتا۔" میں نے کہا۔" ہم اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے اور بس عزت کے ساتھ جان بچا کر نکل آئے۔ نازو پر سردی کا اثر ہے۔ دو دن سے بھوکی بھی ہے۔"
"کھانے کا کسے ہوش تھا بیگم صاحبہ۔" محسن بولا۔" یہاں سر چھپانے آ گئے تھے۔"
"چلو اٹھاؤ اس لڑکی کو... اور تم سب بھی اندر چلو۔ یہاں تو یہ لڑکی مر جائے گی۔" عورت نے کہا۔" میں ڈاکٹر کو بلواتی ہوں اور تمھارے کھانے پینے کا انتظام کرتی ہوں۔ مجھے تو لگتا ہے تم سب ہی مرنے والے ہو۔"
میں نے باری باری محسن اور ٹیڈی کی طرف دیکھا۔ صورتِ حالات میں یہ تبدیلی ہمارے لیے خوش آئند بھی تھی اور باعثِ تشویش بھی۔ وہ کسی بہت بڑے تیس مار خاں کا گھر تھا جس میں ہم انتہائی مجبوری کے عالم میں پناہ گزین ہوئے تھے کیونکہ آج کی رات ہمارے لیے کسی ہوٹل میں قیام کرنا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ چوہدری دلاور کے گرگے تو پہلے ہی ہماری بدلی ہوئی صورتیں ملاحظہ کر چکے تھے اب پولیس کو بھی پتا مل گیا تھا کہ ہمارا حلیہ اب کیا ہے۔ میک اپ سے بھیس بدل کر پھرنے کا مقصد غارت ہوگیا تھا۔ اس سے تو کہیں بہتر تھا کہ ہم اپنی اصل شکل کو علاقے کے تقاضوں کے مطابق کیموفلاج کرتے رہیں۔ اور ہمیں صبح تک کی مہلت مل جاتی تو ہم یقیناً اس حلیے کو تبدیل کر لیتے۔ دھوکا ہمیں مقفل دروازے نے دیا اور ہم گھر کو خالی سمجھے۔ دونالی شکاری بندوق والی خاتون بےخبری میں بلائے ناگہانی بن کے نازل ہوگئیں۔ بات بات پہ بیٹے کی دھمکی دینے والی اس عورت کو آسانی سے قابو کیا جا سکتا تھا لیکن ایک تو عورت عمر رسیدہ اور ہم سب کی ماں کے برابر تھی۔ پھر یہ کہ وہ خطرناک نہیں لگتی تھی۔ اس کا چہرہ اس کے دل کے آئینے کی طرح صاف نظر آتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اسے مطمئن کر کے ٹال دوں لیکن میری جھوٹی کہانی نے بھی اس کے دل کو دکھی کر دیا اور جتنی آسانی سے اس نے ہمارا اعتبار کر لیا اسی سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کتنی سادہ لوح ہے۔ اس کا رویہ ذرا سی دیر میں ہمدردانہ اور محبت بھرا ہوگیا تھا۔ اگر ہم ضرورت کو دیکھتے تو مہمانداری کی یہ پیشکش بہت بروقت تھی۔ ہم سب کو صرف ایک گوشۂ عافیت کی ہی نہیں آرام کی اور خوراک کی بھی اشد ضرورت تھی لیکن دوسری طرف اس گھر میں قیام سے ہمارے جھوٹ کا پردہ چاک ہونے کا ڈر بھی تھا۔ میرے اندازے کے مطابق اس عورت کا بیٹا کوئی پولیس افسر تھا اور ہم جیسے مجرموں کا کسی پولیس افسر کے گھر مہمان ہونا ایسا ہی تھا جیسے ہرنوں کے غول کا بھوکے شیروں کی کچھار میں بسیرا کرنا۔ ایک خطرہ نازو کی طرف سے بھی تھا کہ ہوش میں آتے ہی وہ پھر چیخنا چلانا نہ شروع کر دے اور ہماری دُکھ بھری آپ بیتی سفید جھوٹ کا پلندا بن جائے۔
"سامان اٹھاؤ۔ میرا مُنہ کیا دیکھ رہے ہو۔" عورت نے ڈانٹ کر کہا اور پھر اپنی بندوق اٹھالی۔
"چلیے خواجہ صاحب! اٹھائیے یہاں سے بھی اپنا یہ صندوق۔" میں نے کہا۔
"چاہو تو اس ٹین کے ڈبے کو پڑا رہنے دو۔ کوئی نہیں اٹھائے گا۔" عورت نے ٹیڈی کے خستہ حال صندوق کی طرف اشارہ کیا۔
"نہیں بیگم صاحبہ۔ اسے میں اپنے ساتھ رکھتا ہوں۔" ٹیڈی نے ہماری طرف دیکھے بغیر کہا۔
"کوئی بہت اہم اور قیمتی سامان ہے اس میں؟" وہ مسکرائی۔ "کیا نام ہے تمھارا۔"
"یہ نیک محمد ہے بیگم صاحبہ۔" محسن نے فوراً کہا۔ پھر اس نے نازو کو اٹھا لیا۔ میں نے ٹیڈی کے ساتھ مل کر بستر کو دوبارہ اوپر کھینچا اور راستہ بنایا۔ دونوں سوٹ کیس پھر میں نے اٹھائے اور اس عورت کے پیچھے چل پڑا۔ آدھے گھنٹے بعد ہم سب ایک کمرے میں تھے جس میں آرام و آسائش کے سب اسباب مہیا تھے۔ بیڈ صرف ایک تھا مگر فرش پہ ایک کونے سے دوسرے کونے تک جو قالین بچھا ہوا تھا اس کی دبازت کسی بھی گدّے سے کم نہ تھی۔ اس عورت نے کونے میں رکھے ہوئے ڈبل راڈ والے ریفلیکٹر ہیٹر کو آن کر دیا۔
"میں کچھ کمبل بھجوا دیتی ہوں۔" وہ بولی۔" یہ مہمانوں کا کمرہ ہے، اس لیے بیڈ تو یہاں دوسرا نہیں لگ سکتا۔ تمھیں نیچے ہی سونا پڑے گا۔ عورتوں کو بیڈ دے دو۔"
"جی بہت بہتر۔" میں نے کہا۔" آپ کو ہماری وجہ سے بہت زحمت ہوئی۔"
"زحمت کیسی۔ اتنے بڑے گھر میں اکیلی ہوں۔ مجھے جگہ کم تو نہیں پڑ رہی ہے۔" وہ بولی۔" پہلے میں ڈاکٹر کو فون کر دوں۔"
"نہیں بیگم صاحبہ۔ اس کی بالکل ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔" نازو بیمار نہیں ہے... بس... ابھی ٹھیک ہو جائے گی۔"
"ہاں... اچھا دیکھو تم لوگ اگر ہاتھ مُنہ وغیرہ دھونا چاہو تو اس باتھ روم میں سب کچھ ہے۔ گرم پانی بھی ہے۔ میں تم لوگوں کے لیے کچھ کھانے پینے کا انتظام کرتی ہوں۔"
مجھے اب واقعی شرمندگی ہونے لگی تھی۔" آپ آدھی رات کو کیا انتظام کریں گی۔"
وہ ہنسی۔" ارے بیٹا، تھوڑا بہت تو فریج میں سے نکل آئے گا۔ پھر میرے ساتھ خادمہ ہوتی ہے۔ اسے جگا لوں گی۔ وہ ہی کرے گی سب کچھ۔ تم لوگوں کے پاس پہننے کے کپڑے تو ہوں گے۔" اس نے ہمارے سوٹ کیسوں کی طرف دیکھا۔" اتنی دیر میں بدلنا چاہو تو بدل لو۔"
کچھ دیر پہلے میں نے مذاق میں ایک بات کہی تھی کہ آرام دہ بستر، گرم پانی سے غسل، بہترین کھانے اور گرما گرم کافی کا تصور کرو تو اس میں بھی بڑی راحت ہے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ خواہش ایک دعا بن کے ہفت افلاک سے اوپر خدا کے حضور اس وقت پہنچی جب قبولیت کی گھڑی تھی اور پھر اس کا حکم ہوا تو خواب کو تعبیر ملی اور جو ناممکن سمجھا جا سکتا تھا، وہ ممکن ہوا۔ جب وہ عورت چلی گئی تو کمرے میں ہم چاروں کچھ دیر خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے اور پھر ایک ساتھ ہنس پڑے۔" اسے کہتے ہیں معجزہ۔" میں نے کہا۔" اور بھی کچھ مانگتے خدا سے تو مل جاتا۔"
"ابھی کی تو کوئی بات نہیں۔ صبح اس عورت کا توپ چلانے والا بیٹا آ گیا تو کیا ہوگا؟" رابعہ بولی۔
"صبح کی صبح دیکھی جائے گی۔" میں نے رابعہ کو بازو پکڑ کے کھڑا کر دیا۔" ابھی تو تم جاؤ اور موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے

غسل کر لو۔ اپنے کپڑے لیتی جاؤ اور دیر مت لگانا۔ ہم سب اپنی باری کے منتظر ہیں۔"

"میرے کپڑے تو تمہارے سوٹ کیس میں ہیں... اور سب... میرا مطلب ہے اچھے ہیں۔ شہری وضع کے۔"

"میں اسی لیے تم کو استانی قرار دے چکا ہوں۔" میں نے اسے کپڑے نکال کر دیتے ہوئے کہا۔ "نازو کے کپڑے ابھی ٹھیک ہیں۔"

"ابھی تو نازو تھکن سے نڈھال ہو گئی ہے، اس لیے سو رہی ہے۔" محسن نے اپنا سوٹ کیس کھولتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ نیند کا وقفہ بہت مختصر ہوگا۔"

"میرا خیال ہے اکیلی رہنے والی یہ خاتون اعصابی سکون کے لیے کوئی دوا ضرور استعمال کرتی ہوں گی۔ تنہائی ان کا روگ ہوگی اور اس عمر میں کوئی بھی دن رات سو کر وقت نہیں کاٹ سکتا۔" میں نے کہا۔ "ان سے کوئی ایسی دوا مل جائے تو اچھا ہے کہ نازو فوراً پُرسکون ہو جائے۔"

محسن کے سوٹ کیس میں سب سے اوپر ہمارا اسلحہ تھا۔ اس نے سب ریوالور کپڑوں کے نیچے چھپا دیے۔ اسٹین گن کسی سوٹ کیس میں نہیں آسکتی تھی چنانچہ میں نے اسے گیراج ہی میں پلنگ کے نیچے چھوڑ دیا تھا۔ عورت کے اندر سے باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ میں دروازہ کھول کے نکلا اور دو کمروں سے گزر کے کچن تک جا پہنچا۔ باہر سے پرانی نظر آنے والی کوٹھی اندر سے شاہانہ طرز پر آراستہ تھی اور میرے اندازے کے مطابق انتہائی بیش قیمت فرنیچر بھی امپورٹڈ تھا۔ اتنی بھاری اور جگہ گھیرنے والی اشیاء کو باہر سے منگوانے پر کتنی لاگت آئی ہوگی، اس کا اندازہ کرنا مشکل تھا لیکن یہ دولت مندی کی نمائش، یہ شان و شوکت اور سامانِ تعیش کی یہ فراوانی دیکھنے کے بعد مجھے یقین آ گیا کہ بڑی بی کا بیٹا واقعی بڑی چیز ہوگا۔ حسبِ توقع مجھے ان سے ویلیم کی گولیاں مل گئیں۔ میں نے پانی کا گلاس بھی کچن سے لے لیا جہاں ایک ادھیڑ عمر خادمہ بہت مصروف ہو گئی تھی۔ میں کمرے میں واپس آیا تو رابعہ غسل کے لیے جا چکی تھی اور محسن نے اپنے اور میرے لیے شلوار قمیص نکال لیے تھے۔ جو پہلے کے استعمال شدہ تھے مگر پھر بھی بہت صاف تھے۔ ٹیڈی اپنے ساتھ اس صندوق کے سوا کچھ نہ لا سکا تھا چنانچہ اسے بھی ہمارے ہی کپڑے ملے۔ میں نے قریب جا کے دیکھا تو نازو آنکھیں کھولے چھت کو گھور رہی تھی۔ ہوش میں آنے کے بعد اسے ماحول بدلا ہوا تو نظر آیا تھا لیکن یہ اس کے اپنے گھر جیسا ماحول تھا۔ اگر اس کی آنکھ تانگے میں کھلتی جب وہ ہمارے پیروں کے قریب گھوڑے کے چارے پر سمٹی پڑی تھی یا اسے گیسٹ کے پیچھے ہوش آتا جب وہ مٹی دھول پر جھاڑیوں میں اور پتھریلی زمین پر لیٹی ہوئی

تھی تو شاید وہ خوفزدہ ہو کے چلانے لگتی مگر اب وہ صا[ف]
ستھرے بستر پر ایک سجے سجائے کمرے میں تھی اور اس کے
آس پاس جانے پہچانے لوگ تھے۔ جذباتی ہیجان کا دورہ ختم ہو
تھا لیکن گزر جانے والے سیلاب کی طرح اپنے آثار چھوڑ گیا
وہ بےحد کمزور، تھکی ہوئی اور بیمار نظر آ رہی تھی۔

"میں تمہارے ساتھ ہوں نا سکندر؟" وہ آہستہ سے بولی۔

میں نے اس کا سر دونوں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں کے بیچ دبا لیا۔ "تم ہمارے ساتھ ہو اور ہمارے ساتھ ہی رہو گی۔"

اس کے زرد چہرے پر تھوڑی سی سرخی جھلکی۔ "تم واپس جانے کے لیے تو نہیں کہو گے؟"

"کبھی نہیں۔" میں نے کہا۔

"کبھی مجھے دھوکا دے کر تو نہیں چھوڑ جاؤ گے؟" وہ...

"ہرگز نہیں۔" میں نے کہا۔

"اگر تم نے کبھی ایسا کیا نا... تو میں مر جاؤں گی... ا[سے] مت سمجھنا۔ میرے لیے مرنا بہت آسان ہے۔" وہ بولی۔

"میں وعدہ کر چکا ہوں پھر ایسی باتیں کیوں کرتی ہو۔" میں نے کہا۔

"اس لیے کہ... تم مجھ پر اعتبار نہیں کرتے۔" وہ اداس ہو کر بولی۔ "یہ سمجھتے ہو کہ میں نے بھی تمہارے ساتھ دھوکا کیا تھا۔"

"اب میں ایسا نہیں سمجھتا۔ تم میرے لیے اتنی ہی قابلِ اعتبار ہو جتنی رابعہ ہے۔" میں نے کہا۔ "لو اٹھو۔ اب یہ دوا کھا لو۔"

"کیسی دوا ہے یہ؟ مجھے تو کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔" وہ ... ہو کے بولی۔

"ہاں۔ ہوا تو کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ دوا ذہنی و اعصابی سکون کے لیے ہے۔" میں نے کہا۔

نازو نے خاموشی سے گولیاں لے لیں اور پانی کے ساتھ نگل لیں۔ "ان کی ضرورت تو نہیں تھی، تمہاری باتوں نے زیادہ سکون دیا ہے مجھے۔"

اسی وقت رابعہ باتھ روم سے نکلی۔ تولیہ اس کے شانوں پر اور پشت پر پھیلا ہوا تھا اور گیلے بال تولیے پر پھیلے ہوئے تھے۔ نازو کی بات اس نے بھی سُنی اور میری طرف غور سے دیکھ کر مسکرائی۔ اس کا رنگ روپ گرم پانی سے دُھل کر ایسا نکھر آیا تھا کہ نگاہوں کو خیرہ کرتا تھا۔ اس کے کپڑے بھی ایک بار کے پہنے ہوئے تھے اور ان پر استری بھی نہیں تھی مگر ریشمی کپڑے کی آب و تاب باقی تھی اور جس طرح یہ پیرہن اس کے قالب کے سانچے میں ڈھلا تھا، اس سے تناسب کا حسن نکھر آیا تھا۔ پتا چلتا تھا کہ حسنِ ملبوس اور ملبوس سے پیدا ہونے والا حسن کسی ماہرِ فن درزی کا کمال ...

میٹرک پاس استانی نہیں لگتی تھی۔ مٹی کیچڑ دھو کر صاف کر دینے کے بعد ہیرے کو پتھر کہہ کر کسی اندھے کو بھی دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔ مشکل یہ تھی کہ اس کے پاس دیہاتی وضع قطع کے اور کم قیمت کپڑے تھے ہی نہیں۔

"یہ گھر کس کا ہے سکندر؟" نازو نے لیٹے لیٹے کہا۔ میں چونکا۔ "یہ... یہ ہے ایک ایسی جگہ جہاں ہم آج رات بھر کے مہمان ہیں۔" میں نے کہا اور محسن کو تولیہ لے کر باتھ روم میں گھستے دیکھا۔

"کل ہم کس کے مہمان ہوں گے، یہ ہم بھی نہیں جانتے۔" رابعہ نے بال سلجھاتے ہوئے ہنس کر کہا۔

"اب تم نے خود ہی گھر بار چھوڑ کے ہمارے ساتھ خانہ بدوشی اور خواری قبول کی ہے تو آنے والے دن سے امیدیں ضرور وابستہ کرو مگر اس کو یقین مت بنانا۔" میں نے کہا۔ "اب تمہیں نیند آنے لگی ہے لیکن ابھی مت سونا۔ ہماری میزبان ایک نیک دل خاتون ہیں۔ وہ تمہارے لیے گرم دودھ کا ایک گلاس لے کر آ رہی ہیں۔"

"کون ہیں وہ خاتون، نام کیا ہے ان کا؟" نازو بولی۔

"نام تو ہمیں ان کے طرم خاں بیٹے کا بھی معلوم نہیں جس کا یہ محل ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن وہ خاتون یہ سمجھتی ہیں کہ ہم بڑے مظلوم لوگ ہیں۔ ہم نے انھیں ایک ایسی کہانی سنائی تھی کہ پتھر بھی ہوتا تو پگھل جاتا۔ مختصراً یہ سمجھ لو کہ تم نازو ہو۔ رابعہ تمہاری بڑی بہن ہے مگر اس کا نام خیرات النساء عرف خیراتن ہے۔ محسن خاں تم دونوں کا بھائی ہے۔ خیرات محمد عرف خیراتی۔ میں رابعہ کا گھر والا ہوں اوّل خان۔"

"لو بھئی۔ یہ دودھ پلا دو اسے۔ اور اسے سونے دو۔" بڑی بی نے اندر آتے ہوئے کہا۔

نازو سونے لگی تھی اور شاید اس نے میری پوری بات سُنی ہی نہیں تھی۔ میں نے اسے شانے سے پکڑ کے ہلایا تو اس نے پھر آنکھیں کھولیں۔

"لو بیٹی، شاباش! اٹھ کر تھوڑا سا گرم گرم دودھ پی لو۔ اور یہ اسپرین کھا لو۔" بڑی بی نے اپنی تمام شفقت نچھاور کرتے ہوئے نازو کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ "صبح تک بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔ لو تم اس کو دودھ پلا دو۔" بڑی بی نے گلاس میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ جب وہ واپس جانے کے لیے مڑیں تو ان کی نظر نے رابعہ کو دیکھا، ان کے قدم رک گئے۔

"یقین نہیں آتا کہ یہ وہی لڑکی ہے۔" بڑی بی نے کہا۔ "خدا نظرِ بد سے بچائے۔ میں بھی کتنا غلط سمجھی تھی۔ مجھے معاف کر دینا بیٹی!"

"آپ کیوں شرمندہ کرتی ہیں اماں۔" رابعہ نے حیا سے سُرخ ہو کے کہا۔

"خدا نہ کرے کہ کسی پر بُرا وقت آئے۔ ہیرے کی قدر پتھر کے برابر نہیں رہتی۔" بڑی بی نے کہا۔ "اتنی مہذب، شریف صورت اور نیک سیرت لڑکی کیا بن گئی تھی۔ میں تو کہتی ہوں کہ لاہور کی رہنے والی بڑے بڑے گھروں کی فیشن ایبل لڑکیاں تمہیں دیکھ لیں تو رشک سے مر جائیں۔ کھانا تیار ہے، تم نے ابھی تک ہاتھ منہ نہیں دھویا۔" بڑی بی نے مجھے ڈانٹا۔

"بس ابھی دس منٹ میں ہم سب تیار ہو جاتے ہیں۔" میں نے ندامت سے کہا۔ بڑی بی کی شرافت اور شفقت میرے لیے باعثِ ندامت بن گئی تھی۔ وہ ہم سے یوں پیش آ رہی تھیں جیسے ہم انہی کے بچے ہیں۔ ہم نے ضرورت کے تحت ایک جھوٹ بولا تھا مگر اب یہ خیال میری شرمندگی کا سبب بن گیا تھا کہ ہم نے ایک نیک دل عورت کی ساری عنایات اسے دھوکا دے کر حاصل کی ہیں اور اگر اسے حقیقت کا علم ہو جائے تو اسے کتنا صدمہ ہوگا اور کیا پھر وہ ہمارے ساتھ یہی سلوک روا رکھے گی؟ نہیں۔ وہ تو اپنے بیٹے سے ہمیں واقعی توپ دم کرا دے گی۔

نہا دھو کر کپڑے بدلنے اور کھانے سے فراغت پا کے سوتے سوتے ہمیں صبح کے تین بج گئے۔ کھانا جیسا بھی تھا اس وقت کسی دعوتِ شاہانہ سے کم پُرلطف نہیں لگا۔ کھانے کے بعد کافی تو نہیں ملی مگر گرم چائے مل گئی اور جب محسن نے ڈھیٹ بن کے سگریٹ مانگے تو بڑی بی نے اندر سے نیا پیکٹ لا دیا۔ ان کا بیٹا گھٹیا سگریٹ نہیں پیتا تھا چنانچہ ایک مدّت کے بعد مجھے ہر آرزو کی تکمیل سے جو آسودگی ملی وہ میرے سارے رنج و غم اور دکھ درد کا مداوا بن گئی۔ میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کے یوں سویا جیسے مُردے سوتے ہیں اور میری طرح کسی کو بھی رات کے صبح میں اور صبح کے دوپہر میں ڈھل جانے کا احساس نہیں ہوا۔ سب سے پہلے نازو جاگی تھی۔ اس نے مجھے بیدار کیا۔ اندر سے مجھے بڑی بی کے علاوہ کسی مرد کی آواز سنائی دی۔

"غالباً بڑی بی کا بیٹا آ گیا ہے۔" میں نے جماہی لے کر کلائی کی گھڑی دیکھی۔ "دوپہر کے دو بج گئے! میرا خیال تھا کہ صبح نو دس بجے تک نکل جاتے۔" پھر میں نے محسن کو زور زور سے ہلایا۔ اس نے رابعہ اور ٹیڈی کو جگایا۔

"ہم بہت دیر تک سوتے رہے۔" محسن نے کہا۔ "اب بڑی بی کے جرنیل بیٹے سے بھی شرفِ ملاقات حاصل ہوگا۔"

"اخلاقاً اگر اس سے مل کر اس کا شکریہ ادا کر دیا جائے تو کیا حرج ہے؟" رابعہ نے کہا۔ "وہ ہمیں کھا تو نہیں

جائے گا۔"

"بشرطیکہ وہ پولیس والا نہ ہوا۔" میں نے کہا۔ "اور میری چھٹی حس مجھے خبردار کر رہی ہے کہ..."

"تم بھی کمال کرتی ہو ماں!" مرد نے ایک دم بہت اونچی آواز میں کہا۔ "کیا ضرورت تھی آخر انھیں گھر میں لانے کی؟"

"ارے بیٹا، وہ شریف اور مصیبت کے مارے ہیں۔" بڑی بی نے کہا۔

"آپ کو ساری دنیا شریف لگتی ہے مگر ایسا نہیں ہے ماں۔" مرد نے بگڑ کر کہا۔ "شریف نظر آنے والے چہرے دھوکا بھی دے جاتے ہیں۔"

"ارے چل رہنے دے، میں نے بھی دنیا دیکھی ہے۔" ماں نے کہا۔ "میں شرافت کو پہچانتی ہوں۔"

"اُف! آخر میں آپ کو کیسے سمجھاؤں کہ ہر اجنبی کو مہمان بنا لینا کوئی عقلمندی نہیں۔" بیٹا جھلانے لگا۔ "کسی دن آپ کو نقصان ہوگا تو آپ مانیں گی کہ میں غلط نہیں کہتا تھا۔ آپ اکیلی ہوتی ہیں۔ کوئی سب کچھ لوٹ کر لے جائے گا اور آپ کو قتل کر کے ڈال جائے گا۔ آپ کی انھی باتوں کی وجہ سے تو میں پریشان رہتا ہوں۔ ایک تو گھر سے باہر رہنے کی مصیبت۔ نہ وقت پر کھانا نہ آرام۔ اوپر سے آپ کی طرف سے فکر کہ پیچھے کوئی آپ کی دیکھ بھال کرنے والا بھی نہیں۔" اسے بالکل خیال نہیں تھا کہ اس کی بات کا ہم پر کیا اثر ہوگا۔

"میں خود اپنی دیکھ بھال کر سکتی ہوں۔" ماں نے کہا۔ "آخر اس عمر میں بندوق چلانی سیکھی ہے۔"

"اس کا کیا فائدہ۔ کوئی چور ڈاکو آ گیا تو اس کے پاس ریوالور ہوگا۔ یا اسٹین گن ہوگی۔" بیٹے نے کہا۔ "کیا کر لیں گی آپ بندوق سے۔ ہزار بار کہا ہے کہ رات کو کسی کے لیے دروازہ مت کھولیں۔ آپ نے پوری پلٹن کو گھر میں ڈال لیا۔ معلوم نہیں کون چور اُچکے ہیں۔ سب ایسے ہی گروہ بنا کے واردات کرتے ہیں۔ بڑی معزز اور شریف نظر آنے والی عورتیں بھی ہوتی ہیں ان کے ساتھ..."

میں نے محسن کی طرف دیکھا۔ "یہ آواز مجھے کچھ سنی ہوئی لگتی ہے محسن۔" میں نے سرگوشی میں کہا۔ "میں اٹھ کر دیکھتا ہوں۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ ایسی نیک اور شریف ماں کا بیٹا اتنا بداخلاق اور بدمزاج ہو سکتا ہے۔"

"میں دیکھتا ہوں آخر یہ کون لوگ ہیں۔" مرد کی آواز آئی اور میں اُٹھتے اُٹھتے بیٹھ گیا۔ میرے ایک اشارے پر سب پھر سوتے بن گئے۔ رابعہ اور نازو نے بیڈ کا رُخ کیا اور لحاف میں گھس کر ساکت ہو گئیں۔ نیچے ہم سب نے کمبل میں سر لپیٹ لیے لیکن میں نے کروٹ لے کر کمبل کا ایک کونا تھوڑا سا اٹھائے رکھا کہ ایک آنکھ سے اندر آنے والے کی صورت دیکھ سکوں۔

"ایسے سوئے پڑے ہیں جیسے باپ کا گھر ہے۔" مرد کی آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی وہ دروازے کے فریم میں نمودار ہوا۔ روشنی اس کے چہرے پر مقابل کی دیوار کی کھڑکی سے پڑ رہی تھی۔ ایک اَدھ کھلی آنکھ سے میں نے اس کا پورا چہرہ دیکھا اور مجھے یوں لگا جیسے خون میری رگوں میں منجمد ہو چکا ہے۔ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر ڈی ایس پی سراج کھڑا ہوا تھا جو میرا سب سے پرانا اور سب سے خطرناک اور سب سے زیادہ کینہ دشمن تھا۔ اسی شخص نے مجھ پر سفاکانہ مظالم سے میرے مصائب کے دور کا آغاز کیا تھا اور تب میں نے جانا تھا کہ انسانوں کی دنیا میں کتنے شیطان صفت درندے چہروں پر نقاب ڈالے پھر رہے ہیں جو آدمی نظر آتے ہیں لیکن ان کا وجود آدمیت کی تذلیل ہے۔ اس سے پہلے مجھے آدمی کی سرشت میں شامل نیکی پر کامل اعتماد تھا اور میری نگاہ صرف آدمیت کے تقدس کو دیکھتی تھی۔ ایک بے رحم رات کی یاد نے میرے جسم پر کپکپی طاری کر دی اور میری روح نے پرانے وقت کے آزار کو دوبارہ اسی طرح محسوس کیا۔ میرے وجود میں اُبلنے والا آتش فشاں پھٹنے کے قریب ہو گیا۔ مجھے یقین تھا کہ اس وقت میرے ہاتھ میں اسٹین گن ہوتی تو میں اپنے سامنے کھڑے ہوئے دشمن کے جسم کو چھلنی کر دیتا۔ میں نے انتقام کی سرکش قوت کو اس لیے قابو میں رکھا کہ میں نے ایک شریف النفس بوڑھی عورت کے گھر کا نمک کھایا تھا اور اس عورت نے ہم میں سے کسی کو بیٹا کہا تھا تو کسی کو بیٹی۔

وہ بڑی نخوت اور بد دماغی کا مظاہرہ کرتے ہوئے آگے آیا۔ نیچے جھک کر اس نے میرے چہرے پر سے کمبل کھینچ لیا۔ "اُٹھیے حضور! صبح ہو گئی۔" وہ حقارت آمیز طنزیہ لہجے میں بولا۔ "خدام ناشتا لیے دست بستہ کھڑے ہیں۔"

میں آنکھیں ملتا ہوا اٹھا اور بے وقوفوں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ سراج نے اسی طرح ٹیڈی اور محسن کے کمبل کھینچ لیے تھے۔

"شرم آنا چاہیے تم لوگوں کو۔" وہ بولا۔ "ایک رات کے لیے جگہ مل گئی، کھانے کو مل گیا، اب دفع کیوں نہیں ہو جاتے۔"

"ہم تو رات ہی کو جا رہے تھے سرکار۔" محسن نے کہا۔ "انھی کی اماں نے روک لیا۔"

"میری ماں... کیا اس نے [illegible] تک اینڈتے رہنا؟" سراج کا چہرہ [illegible]

نے چوبیس گھنٹے کا کرایہ ادا کیا ہے؟ دوپہر کے کیا جہاں کا کھانا بھی مفت ملنے کی امید ہو گی نا۔" اس نے بعد بات کا ... ہم تینوں کی طرف نفرت سے دیکھا۔ ہماری بدلی باری باری ہم تینوں کی طرف نفرت سے دیکھا۔ ہماری بدلی ہوئی صورتوں کی وجہ سے وہ ہمیں پہچان نہیں سکا تھا مگر میری اور محسن کی ایک جیسی شکل و شباہت پر وہ حیران نظر آتا تھا۔ وہ وردی میں تھا اور پہلے کے مقابلے میں اس کا جسم کچھ بھاری ہو گیا تھا لیکن جو چیز نہیں بدلی تھی، وہ اس کی فطرت کی خباثت تھی۔

"کیا تم دونوں بھائی ہو؟" وہ ہمارے مقابل ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ "جڑواں بھائی ہو؟"

"ہاں جی۔" میں نے دروازے کی طرف دیکھا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ سراج کی ماں سامنے نہیں تھی۔ اسے میں نے بتایا تھا کہ محسن میرا سالا اور رابعہ کا بھائی ہے۔

"تم جھوٹ تو نہیں بول رہے ہو؟" وہ بولا۔ "تمھاری صورت اتنی زیادہ تو نہیں ملتی۔"

"بس جی۔ خدا نے جتنی ملا دی، ملا دی۔" میں نے عاجزی سے کہا۔

"باقی حلیہ خود تم دونوں نے ملا کے ایک کر لیا۔ کیوں؟" وہ بولا۔ "ہے نا یہی بات؟ ایک جیسے بال اور ایک جیسی داڑھی اور بالوں کا ایک جیسا رنگ۔ یہ سب مجھے قدرتی نہیں لگتا۔"

میں نے اور محسن نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سراج کی نظریں ہم دونوں پر جمی رہیں۔ وہ بہت چالاک آدمی تھا اور عیاری اس کی آنکھوں سے ٹپکتی تھی۔ اس کی زندگی کے شب و روز مجرمانہ سرگرمیوں میں گزر رہے تھے اور اس ملازمت میں اس کا بیشتر وقت مجرموں کو سمجھتے اور ان سے نمٹتے گزرتا تھا۔ آدمی ذہین تھا مگر اس کی ذہانت منفی تھی چنانچہ صفِ اوّل کے مجرموں نے خود ہی اسے اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے موزوں سمجھ کے منتخب کر لیا ہوگا۔

"یہ عورتیں کون ہیں؟ تمھاری کیا لگتی ہیں؟" وہ پہلو بدل کے بولا۔

"ان میں سے ایک میری بیوی ہے۔ دوسری اس کی بہن۔" میں نے کہا۔ "یہ ان کا بھائی ہے نیک محمد۔" میں نے ٹیڈی کی طرف اشارہ کیا تھا۔

اس نے مجھ سے جرح شروع کر دی اور وہ ساری کہانی پھر سنی جو میں اس کی ماں کو سنا چکا تھا لیکن وہ مسکراتا رہا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ میری کسی بات کا یقین نہیں کر رہا تھا۔ اس کا سلوک ہمارے ساتھ ایسا ہی تھا جیسے ہم اس کے گھر میں نہیں، تھانے میں ہیں۔ اور وہ ہم سے تفتیش پر مامور ہے۔

"ان دونوں عورتوں کو اٹھا کر میرے سامنے لاؤ۔" اس نے مجھے حکم دیا۔

اس کے ذلیل کرنے والے اندازِ تخاطب کو نظر انداز کر کے میں نے رابعہ اور نازو کو اٹھایا اور میرے کہنے پر وہ سراج کے سامنے آ گئیں۔ میرے علاوہ سراج کو محسن نے بھی شناخت کر لیا تھا مگر اس نے بھی میری طرح جذبات کو قابو میں رکھتے ہوئے اس وقت تک انجان بنے رہنا بہتر سمجھا تھا جب تک کہ خود سراج پہل نہ کرے اور ہمارے خلاف عملی قدم نہ اٹھائے۔ رابعہ نے بھی سراج کو پہچان لیا اور اس کا رنگ ذرا سی دیر کے لیے اُڑ گیا۔ یہ ناممکن تھا کہ سراج جیسے شخص سے یہ تبدیلی پوشیدہ رہی ہو۔

"تم اس شخص کی بیوی ہو؟" سراج نے تمسخر اڑاتے ہوئے سوال کیا۔

رابعہ نے سر جھکا لیا۔ مجھے اس کے اقرار کا یہ انداز بہت اچھا لگا۔ بہت نیچرل اور بہت دلنواز۔

"بولتی کیوں نہیں؟" سراج نے ایک دم گرج کر کہا۔ "تو بیوی ہے اس کی، خیر لوتن ہے تیرا نام؟"

"جی سرکار۔" رابعہ نے بمشکل تمام کہا اور اس کے ساتھ کھڑی ہوئی نازو سمٹ کر پیچھے ہو گئی۔

"اور تم سب کلیام اعوان کے رہنے والے ہو؟" اس نے ہم سب کی طرف ایک نظر ڈالی۔ "تو پڑھاتی ہے گوجر خان میں؟"

"جی سرکار۔" رابعہ نے میری طرف نظر اٹھا کے دیکھا۔ اگر سراج اس سے اسکول کا نام پوچھتا تو وہ کبھی نہ بتا پاتی لیکن سراج نے ایک دم ہنسنا شروع کر دیا۔ وہ ہمیں آہستہ آہستہ نروس کرنے کے سارے طریقے آزمانا چاہتا تھا۔ اچانک وہ کھڑا ہو گیا اور ٹہلتا ہوا رابعہ کے بالکل سامنے اس سے چند انچ کے فاصلے پر جا کھڑا ہوا۔

"میری طرف دیکھو۔" اس نے حکم دیا اور پھر اپنے ہاتھ سے رابعہ کا چہرہ زبردستی اوپر کر دیا۔ میرا چہرہ سرخ ہو گیا اور خون کی سنسناہٹ میرے کانوں میں سنائی دینے لگی۔ محسن نے میرا ہاتھ تھام کر مجھے انتظار کرنے کا اشارہ کیا۔

"مجھے تمھاری صورت کچھ دیکھی ہوئی لگتی ہے۔" سراج نے کہا۔ "کہاں دیکھا تھا میں نے تم کو؟"

"میں کیا بتاؤں جناب!" رابعہ نے کہا۔ وہ اب واقعی خوفزدہ تھی۔

"اچھا تو میں بتاتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ تمھارا اصل نام

کچھ اور ہے۔ غالباً رابعہ۔ اور تم وکیل ہو۔" سراج نے کہا۔

میرا دل ایک لمحے کے لیے دھڑکنا بھول گیا اور مجھے یوں لگا جیسے رابعہ بے ہوش ہو کر گر جائے گی۔ میں ایک قدم آگے بڑھا ہی تھا کہ سراج ایک دم پلٹا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر میں رک گیا۔ بظاہر کھیل ختم ہو چکا تھا۔ اچانک سراج کی ماں دروازے سے اندر آئی۔

"سراج۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟" وہ چلا کے بولی۔

"ڈراما ہو رہا ہے ماں۔" وہ ہنس کر بولا "تم بھی دیکھو کیسے کیسے کردار ہیں۔ ان کے اصل چہرے دیکھو گی؟ اچھا جاؤ اپنی بندوق اٹھا لاؤ۔ آج استعمال کا وقت آ گیا ہے۔"

"تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟" سراج کی ماں نے ہم سب کی طرف دیکھا۔

"جو میں کہہ رہا ہوں وہی کرو۔ تم ساری دنیا کو شریف سمجھتی ہو اپنی طرح۔ میں ابھی تم کو دکھا دیتا ہوں کہ دنیا کیا ہے۔" وہ بولا۔

میں نے نظر اٹھا کے نازو کی طرف دیکھا۔ وہ سراج کے پیچھے پہنچنے کے لیے آہستہ آہستہ کھسک رہی تھی۔

"جب میں نے تمھیں پہچان لیا رابعہ بی بی... مس رابعہ تمھاری ایڈووکیٹ۔" سراج پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ "تو پھر دوسرے چہروں کو پہچاننا کیا مشکل ہے۔ ان دو جوکروں میں سے کوئی بھی تمھارا خصم نہیں۔ میرا مطلب ہے قانونی طور پر۔ ویسے تم جسے چاہو خصم بنا لو۔ ایک تمھارا موکل ہے۔ سکندر خان ولد وزیر خان۔ دوسرا اس کا ہمزاد۔ محسن حسن خان۔ دونوں کے کارناموں کی تفصیل سنانے لگوں تو آرسین لوپن، بلیک شرٹ اور بہرام ڈاکو کے کارنامے ہیچ نظر آئیں۔ لیکن تم سب کچھ جانتی ہو تو وقت ضائع کرنے سے کیا فائدہ۔ گیدڑ کی جب موت آتی ہے نا تو وہ شہر کا رُخ کرتا ہے۔ تم کو تقدیر کہاں لے آئی۔ مہمان بھی تم ہوئے تو کس کے۔"

سراج کی ماں دو نالی بندوق کے ساتھ پھر اندر آئی۔ اپنے بیٹے کی بات سے زیادہ اسے ہماری مجرمانہ خاموشی نے شکوک میں مبتلا کر دیا تھا۔ اگر ہم سچے ہوتے تو تردید کرتے۔ احتجاج کرتے اور جھوٹ کو جھوٹ تو کہتے۔ سراج نے ماں کو آگے آنے کا اشارہ کیا۔ اس وقت جب وہ میرے قریب سے گزر رہی تھی مجھے خیال آیا کہ میں اسے دبوچ لوں۔ ماں کی خاطر بیٹا ہم سب کو چھوڑنے پر مجبور ہو جائے گا اور ہم ماں کو یرغمال بنا کے اپنی جان بچا سکیں گے لیکن سراج کے ریوالور کا رُخ ہم تینوں کی طرف تھا۔ وہ کسی کو بھی

گولی مار دیتا۔ اس جیسے بیٹے سے یہ بھی بعید نہ تھا کہ [...] کی پروا بھی نہ کرے۔ پھر خود میرے ہاتھ اس بوڑھی [...] کی طرف نہ اٹھ سکے اور میں نے انتظار بہتر سمجھا۔ یہ ساری توقعات نازو سے وابستہ تھیں۔ نازو کی پہلی کوشش [...] نتیجہ کچھ نہیں نکلا تھا کیوں کہ سراج کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ پر اکیلی کھڑی رہ گئی تھی۔ نازو اب [...] خاموشی سے سرکتی ہوئی سراج کی پشت کی جانب پہنچنے [...] کوشش میں مصروف تھی اور اس کے پیر ایک ایک [...] فاصلہ یوں طے کر رہے تھے کہ وہ اپنی جگہ سے حرکت کرتی [...] محسوس ہی نہ ہوتی تھی۔

"تم اس عورت کو زد میں رکھو ماں۔" سراج نے رابعہ کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ ذرا بھی حرکت کرے تو اس کی کھوپڑی [...] اڑا دینا۔"

"لیکن بیٹا۔ یہ بے چاری تو اسکول ٹیچر ہے۔" سراج کی ماں نے دبے دبے لہجے میں احتجاج کیا۔

"اسکول ٹیچر؟" سراج قہقہہ مار کے ہنسا "میری بھولی اور بے وقوف ماں، یہ مکار عورت وکیل ہے۔ اس کا نام [...] نہیں، رابعہ قاری ہے۔ یقین نہیں آتا تو پوچھ لو اس سے اور یہ اس کا گھر والا نہیں، اس کا یار ہے۔ ایک بدنام مجرم......"

سراج کی ماں نے رابعہ کی طرف دیکھا اور پھر آہستہ [...] آہستہ دو نالی بندوق کا رُخ اس کی طرف کر دیا۔

"مسٹر اوّل خان، پہلے تم ادھر آؤ۔" سراج نے [...] اشارہ کیا۔ میں جانتا تھا کہ اس کے ہاتھ سے ریوالور چھیننا بہت آسان کام ہے مگر میری یہ بہادری رابعہ کے لیے [...] کا پیغام ثابت ہوتی۔ وہ عورت کسی تذبذب کے بغیر گولی [...] دیتی۔ میں نے خود کو صبر کی تلقین کی اور تعمیلِ حکم کے لیے آگے بڑھا۔ سراج کے ہاتھ بڑی تیزی سے حرکت میں آئے۔ اس نے کسی وحشی درندے کی طرح میری نقلی داڑھی نوچ ڈالی اور میرے گھنگریالے مہندی رنگ کے بالوں کی وِگ کے ٹکڑے کر دیے۔ میں اپنی اصل صورت میں ننگے ہوئے [...] کی طرح کھڑا رہ گیا۔ سراج زور زور سے قہقہے لگانے لگا۔

"دیکھا تم نے ماں۔ تم اسے شریف اور مصیبت [...] مارا کہتی تھیں۔ اب اس کی صورت پہچانو۔" سراج بولا۔ "[...] میں دوسرے کو بھی اصل روپ میں تمھارے سامنے پیش [...] ہوں۔ یہ جو خیراتن کا گھر والا تھا نا۔ یہ سکندر بخت ہے۔ [...] ہے اور بہت کچھ ہے۔ اس کے اتنے ہی نام ہیں جتنے اس [...]

جرائم۔ یہ نہ جانے کتنے قتل کر چکا ہے۔ گاڑیاں چھیننا اس کا شوق ہے۔ یہ سب مجرم ہیں۔"

وہ میرے جرائم کی تفصیل اپنی ماں کو بتا رہا تھا اور میری نظر نازو پر تھی۔ میں اس کے اشارے کے انتظار میں تھا۔ نازو سراج کے بالکل پیچھے اس سے ایک فٹ دور رہ گئی تھی جب اس نے اپنا بایاں ہاتھ تھوڑا سا اٹھا کے مجھے سگنل دیا۔ میں اڑتا ہوا گیا اور سراج کی ماں پر جا گرا۔ اس کی رائفل سے ہونے والے فائر کی آواز کمرے میں گونجی پھر وہ خود چلائی۔ میں نے رائفل کو اس کے ہاتھ سے نکل کر فرش پر گرتے دیکھا۔ جب میں سراج کی ماں کو اٹھا رہا تھا تو میں نے سراج کے بلبلانے کی آواز سنی۔ نازو نے اسے کرسی سمیت پیچھے اُلٹ دیا تھا۔ نازو کی نازک ہتھیلی کے ایک وار سے ڈی ایس پی صاحب کا مضبوط مردانہ بازو یوں ٹوٹ گیا جیسے کچی لکڑی والی شاخ۔ ہڈی کے ٹوٹنے کی آواز خود میں نے سنی۔ نازو نے ریوالور محسن کی طرف اچھال دیا اور جب میں نے سراج کی ماں کو اس کے پیروں پر کھڑا کیا تو میں نے سراج کو انتہائی طیش کے عالم میں ٹوٹے ہوئے بازو کی پروا نہ کرتے ہوئے نازو کو لات مارنے کی کوشش کرتے دیکھا۔ نازو نے بڑی پھرتی سے اس کا پنجہ تھام لیا اور اسے اپنے ہی زور میں گھما کے پھینک دیا۔ سراج صوفے پر گرا اور نیچے لڑھکا۔ اس کا بازو کلائی سے ذرا اوپر ٹوٹا تھا اور بڑے مضحکہ خیز طریقے پر جھول رہا تھا۔ سراج کو حیران ہونے کا موقع تک نہ ملا تھا۔ اس کو اصل خطرہ مجھ سے تھا یا ہم تینوں مردوں سے تھا۔ اس نے رابعہ کا بھی بندوبست کر لیا تھا مگر اس نے نازو کو بالکل اہمیت نہیں دی تھی جو ایک کمزور نظر آنے والی معصوم صورت دُبلی پتلی اور دھان پان سی لڑکی تھی۔ میں نے رابعہ کو بھی اپنے قریب کر لیا اور تماشا دیکھنے لگا۔

سراج اپنی مردانگی اور پولیس افسری کا بھرم رکھنے کے لیے آخری بار اٹھا اور آہستہ آہستہ نازو کی طرف بڑھا۔ پھر اس نے انتہائی پھرتی کے ساتھ نازو کو ٹکر مارنی چاہی۔ نازو صرف تماشا دکھانے کے لیے غوطہ مار کے فرش پر لیٹ گئی۔ اس کے دونوں پیر لیور کی طرح اوپر اٹھے اور سراج اس کے ساتھ ہی اٹھا۔ نازو نے تھوڑا سا جھٹکا دیا اور سراج ہوا میں کاغذی جہاز کی طرح تیرتا گیا۔ اس کے دیوار سے ٹکرا کے گرنے کی آواز پر اس کی ماں چلائی۔ سراج بے حس و حرکت پڑا رہا۔

"چھوڑ دو۔ خدا کے لیے میرے بیٹے کو چھوڑ دو بیٹی۔ میں ہاتھ جوڑتی ہوں تمھارے سامنے۔" اس نے دہاڑیں مار مار کے رونا شروع کیا۔ "میں نے تمھارے ساتھ کوئی برائی نہیں کی۔ اگر کوئی نیکی کی تھی تو اس کا واسطہ۔"

"ماں جی۔ آپ کے بیٹے کو کچھ نہیں ہوگا۔" میں نے کہا۔ "ہم احسان فراموش نہیں ہیں۔ اگر ہم آپ کے مہمان نہ ہوتے تو آج ڈی ایس پی صاحب کو ضرور ساتھ لے جاتے۔ اس کا ہاتھ ٹوٹا ہے، دس پندرہ دن یا مہینے میں ٹھیک ہو جائے گا۔ بہتر ہوگا کہ آپ ہمارے آنے اور جانے کے متعلق کسی سے کچھ نہ کہیں۔ سراج کہہ سکتا ہے کہ وہ گر گیا تھا جس سے اس کا ہاتھ ٹوٹ گیا۔" جیسے ہی میں نے اسے چھوڑا وہ چیخ مار کر سراج کی طرف لپکی اور اس کا سر اپنی گود میں رکھ کر رونے لگی۔

محسن نے آگے بڑھ کر ریوالور اٹھا لیا۔ اس ماں کا سارا غرور خاک میں مل گیا تھا جو ہر بات پر اپنے بیٹے کا حوالہ دیتی تھی کہ وہ زمین اور آسمان ایک کر سکتا ہے۔ اس نے دیکھا کہ ایک کم عمر اور کمزور لڑکی کے سامنے بھی وہ کچھ نہ کر سکا۔ اس کی ممتا کے جذبات بیٹے کو تکلیف میں دیکھ کر وہ دُکھ بن گئے تھے جو آنسو بن کے آنکھوں سے بہہ نکلا تھا۔ "تم سب کمینے اور بے غیرت ہو۔ ٹھیک کہتا تھا میرا بیٹا کہ تم سب مجرم ہو، وہ میری غلطی نہیں میرا گناہ تھا کہ میں نے تم کو مہمانوں کی سی عزت دی۔"

"یہ تو وقت خود آپ کو بتائے گا ماں جی کہ مجرم کون تھا۔" میں نے کہا۔ "ہم بے اختیار لوگ تھے اس لیے مجرم بنا دیے گئے اور دنیا نے اس کی بات کو سچ مانا جو بااختیار تھا۔ میری ماں اس دنیا میں نہیں ہے۔ ہم میں سے کسی کی ماں نہیں ہے۔ آپ نے ہمیں اپنے گھر میں ماں کی شفقت دی۔ ایک وقت کی روٹی اور سر چھپانے کی جگہ تو فقیروں کو خیرات میں بھی مل جاتی ہے لیکن آپ نے جس عزت اور شفقت کے ساتھ ہمیں گھر میں مہمان رکھا اس جذبے کی کوئی قیمت نہیں اور آپ کا یہ احسان ہمیں ہمیشہ یاد رہے گا۔"

"بہت جلد بدلہ دیا تم نے اس احسان کا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس طرح میرے گھر میں چور ڈاکو اور قاتل گھس کر بیٹھ گئے ہیں۔ ورنہ میں تمھیں گولی مار دیتی۔ تم نے مجھ سے جھوٹ بولا۔ مجھے دھوکا دیا۔" وہ اسی طرح روتی رہی۔

"ہم مجبور تھے ماں جی۔" محسن بولا۔ "ہم سچ بولتے تو سر چھپانے کے اس ٹھکانے سے بھی محروم ہو جاتے۔ ہم تو شاید سردی، بھوک اور تکان سب برداشت کر جاتے مگر یہ لڑکی ضرور مر جاتی۔ آپ نے اس کی حالت دیکھی تھی۔"

"اچھا تھا مر جاتی۔ جی کے بھی کیا کرے گی یہ۔ اگر اس

عمر میں گھر سے نکل کے یہ تم جیسے بدمعاشوں کے ساتھ اس قسم کے دھندوں میں پڑ گئی ہے۔" وہ بیٹے کا ٹوٹا ہوا ہاتھ اٹھا کے بولی: "دیکھ حرافہ۔ کیا حال کیا ہے تو نے میرے بیٹے کا۔ کتنی بھولی لگتی ہے صورت سے ناگن۔"

"اگر آپ کے بیٹے نے بھی ہمارے ساتھ یہی سلوک کیا ہوتا جو آپ کا تھا تو ہم اسے بھی سلام کر کے رخصت ہوتے مگر اس نے تو ہمیں جیل پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔" میں نے کہا۔

"یہی کام ہے اس کا۔ تم کو جیل نہ پہنچاتا تو کیا مہمان بنا کے رکھتا۔" عورت چلائی۔

"لیکن ہم اس طرح گرفتار نہیں ہو سکتے تھے۔" میں نے کہا۔ "جب تک ہم باہر تھے تمہارا بیٹا اور اس جیسے بہت سے ہمیں نہ پکڑ سکے۔ جب ہم اپنے پیروں سے چل کے خود اس گھر میں آ گئے تو ہمیں گرفتار کرنے میں کون سی بہادری ہے۔"

"ایسی ہی بہادری کا مظاہرہ ہم کرتے ماں جی تو کیا یہ گھر آپ کے بیٹے کے آنے تک محفوظ رہتا؟" محسن بولا۔ "یہ لڑکی جس نے صاحب بہادر کو دو منٹ میں چت کر دیا، کیا آپ سے بندوق نہیں چھین سکتی تھی؟ جو کچھ آپ نے دیا وہ ہم نے شکریے کے ساتھ احسان سمجھ کے قبول کیا۔ ہم آپ کو اور آپ کی خادمہ کو بند کر کے جو چاہتے خود لے لیتے۔ اور آپ کا بیٹا گھر لوٹتا تو اسی طرح پکڑا جاتا جیسے چوہے دان میں جا کر چوہا پکڑا جاتا ہے۔"

"ہم تالا توڑ کے گھر میں نہیں گھسے تھے حالانکہ ہمارا خیال تھا کہ گھر خالی ہے مگر ہم نے اسی گیراج کو کافی سمجھا تھا۔" میں نے کہا۔

سراج کراہنے لگا۔ "میں تم کو چھوڑوں گا نہیں۔"

"اس گھر کے باہر ہماری اور تمہاری کھلی جنگ ہے، ڈی ایس پی صاحب۔" میں نے کہا۔ "جنگ میں نہ تم نے کبھی رعایت کی اور نہ ہم کریں گے۔ ہم بھی تمہیں نہیں چھوڑیں گے۔ اگر کبھی تمہاری جان بخشی ہوئی تو اس ماں کی دعاؤں کے طفیل ہوگی جس کا تم ایک ہی سہارا ہو۔ اور جو تم پر اسی طرح ناز کرتی ہے جیسے ہر ماں کرتی ہے۔ ہم اس رات کی میزبانی اور اس سلوک کے بدلے جو تمہاری ماں نے ہمارے ساتھ کیا صرف ایک بار تم کو ضرور چھوڑ دیں گے خواہ اس وقت تمہاری جان لینے کے لیے انگلی کو تھوڑا سا ہلانا ہی کافی ہو۔ صرف ایک بار سراج۔ دوسری بار کا کوئی وعدہ نہیں۔"

"تم کو ایک موقع بھی نہیں ملے گا۔" سراج نے اشتعال میں گالیاں دیتے ہوئے اپنی ماں کی موجودگی کا اور وجاہ... کا بھی لحاظ نہیں رکھا۔

"ایک موقع تو اس وقت بھی ہمارے ہاتھ میں ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن ہم اس کو موقع شمار نہیں کرتے کیونکہ اس گھر میں خود کو اب بھی مہمان سمجھتے ہیں۔ نیت بدلی... میزبانوں کی۔ ہم نے تو وہ روایت بھی سنی ہے کہ بیٹے... میں مہمان ہونے والے باپ کے قاتل سے بھی انتقام نہیں... تھا۔" پھر میں نے محسن سے ریوالور لے لیا۔ "تم سامان گاڑی میں رکھو۔ استاد تم گیراج میں سے باقی سامان لے آؤ۔"

"کون سی گاڑی میں؟" محسن نے کہا۔

"جو بھی گھر میں ہو۔" میں نے کہا۔ "ہم سامان سر پر... کے خواتین کے ساتھ پیدل تو نہیں جا سکتے نا۔ ڈی ایس... صاحب ہمیں اپنی جیپ کی چابیاں دینے سے انکار نہیں کریں گے۔"

"میں تم کو چابیاں دوں گا!" سراج نے چیخ کر کہا... میں اس کا ٹوٹا ہوا ہاتھ ہل گیا تھا۔

"اچھا ہم خود لے لیں گے۔" میں نے ہنس کر کہا... ڈی ایس پی صاحب کو فرسٹ ایڈ دو۔"

محسن کے ساتھ ٹیڈی بھی نکل گیا۔ وہ "باقی سامان" کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ رابعہ آگے بڑھ کر گھٹنوں کے بل... کے پاس بیٹھ گئی۔ "میں اس ہاتھ کو صحیح طرح سے باندھ دیتی ہوں تاکہ تکلیف نہ ہو۔" وہ بولی۔ "اور ہلنے جلنے سے زیادہ خرابی نہ ہو۔ بعد میں تو آپ پلاسٹر کرا ہی لیں گے۔"

عورت نے کچھ نہیں کہا اور خاموشی سے بہنے والے آنسوؤں کو دوپٹے کے کونے میں جذب کرتی رہی۔ سراج شدید غصے اور احساس ذلت و شکست کا شکار زخمی سانپ کی طرح پھنکارتا رہا اور اپنی آنکھوں سے زہر برساتا رہا۔

"مجھے دو سیدھی لکڑیاں چاہئیں، پتلی اور چھوٹی۔ تقریباً چھ انچ کی۔" رابعہ نے مجھ سے کہا۔

صرف سراج کو متاثر کرنے کے لیے میں نے ہاتھ... وار سے اسی کرسی کے ٹکڑے کیے جس پر سراج بیٹھا تھا۔ ... ہاتھوں نے یہ کام اسی مہارت اور صفائی سے کیا جیسے قصاب... کے ہاتھ ہڈی پسلی کو بھاری چھرے کے وار سے کاٹتے ہیں۔ دو منٹ سے بھی کم وقت میں میں نے رابعہ کو اس کی ضرورت... مطابق دو لکڑیاں فراہم کر دیں۔ اس نے ٹوٹے ہوئے ہاتھ کو... کیا اور ہڈی کو اندازے سے بٹھایا۔ پھر اوپر نیچے دونوں لکڑیاں... کو متوازی رکھا۔ اب اسے پٹی کی ضرورت تھی۔ سوچے سمجھے...

اس نے اپنا دوپٹا الگ کیا اور سراج کی کلائی کے گرد مضبوطی سے لپیٹنے لگی۔ سراج بہت تکلیف میں تھا۔ پھر بھی وہ رابعہ کی یہ نیکی برداشت نہ کر سکا۔

"اسے اپنا دوپٹا دے دو ماں۔" وہ کراہتے ہوئے بولا۔

ماں نے اس کی بات کا مطلب کچھ غلط لیا۔ اس نے اپنا دوپٹا رابعہ کے سر پر ڈال دیا۔ رابعہ اپنے دوپٹے کو لپیٹنے میں مصروف رہی۔

"میں نے... میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ اپنا دوپٹا میرے ہاتھ پر باندھنے کے لیے دینا تھا۔" سراج بولا۔

"ایک ہی بات ہے۔ ماں کے سر کا دوپٹا میرے سر پر میری عزت کا اتنا ہی رکھوالا ہے جتنا یہ دوپٹا تھا۔" رابعہ نے پٹی لپیٹنے کا کام ختم کرتے ہوئے کہا اور کھڑی ہو گئی۔

"چابیاں تو گاڑی میں ہی لگی ہوئی مل گئیں۔" محسن نے اندر آ کے کہا اور اسٹین گن میری طرف اچھال دی۔ میں نے اسے تربیت یافتہ اور پیشہ ور کمانڈوز کی طرح ہوا میں ہی پکڑ لیا۔ محسن اندر گیا اور تھوڑی دیر میں دونوں سوٹ کیس لیے گزرا۔

"یہ دیکھا آپ نے سراج صاحب۔" میں نے کہا۔ "ہم کتنے طاقتور تھے۔ خالی ہاتھوں ایک لڑکی نے تمہارا پٹڑا کر دیا۔ خالی ہاتھ ہم مل کر تمہاری ایک پلٹن کا بٹرا کر دیتے۔ پھر اس ہتھیار کے سامنے بھلا کون ٹھہر سکتا تھا لیکن دیکھ لو ہم نے خالی سمجھنے کے باوجود تمہارے گھر کا تالا تک نہیں توڑا تھا اور تمہاری ماں کے ساتھ اتنی ہی تعظیم کا سلوک کیا تھا جتنا ہر ماں کا حق ہوتا ہے۔ ہم اس گھر سے ایک سوئی بھی اٹھا کے نہیں لے جا رہے ہیں۔ لے جا رہے ہیں تو بار احسان یا تھوڑی سی شرمندگی کا احساس کہ آپ کی وجہ سے تھوڑی سی زیادتی کے مرتکب ہوئے۔ تم دونوں چل کے گاڑی میں بیٹھو۔" میں نے رابعہ اور نازو کو اشارہ کیا۔

"ہم سے جو کچھ ہوا۔" رابعہ نے چلتے چلتے رک کر کہا۔ "اس کے لیے ہمیں معاف کر دینا ماں جی۔"

"اور مجھے بھی۔ ایک نہ ایک دن آپ کو یقین آ جائے گا کہ ہم ویسے نہیں تھے جیسا آپ نے سمجھا تھا۔" نازو بولی۔

"خدا تمہیں سیدھی راہ دکھائے۔" بڑی بی نے آنکھیں پونچھ کر کہا۔ سراج دیوار کا سہارا لیے سیدھا بیٹھا رہا۔

"تمہاری ماں کو تم پر بہت فخر ہے سراج۔" میں نے انگریزی میں کہا۔ "ہم اپنی صفائی پیش کرنا چاہتے تو کر سکتے تھے لیکن اس طرح تمہارے سارے جرائم کا پردہ بھی چاک ہو جاتا۔ اگر تمہاری ماں یقین کر لیتی تو اس کے غرور کی شکست کتنی اندوہناک ہوتی چنانچہ ہم اسے کچھ نہیں بتائیں گے لیکن تم نے اپنی روش نہ بدلی تو یہ غرور کب تک سلامت رہے گا؟ حقیقت سات پردوں میں اپنے وجود کو تسلیم کرا لیتی ہے اور سچ سامنے آتا ہے تو جھوٹ پر اعتقاد رکھنے والوں کے لیے یہ صدمہ زیادہ شدید ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے گھپ اندھیرے کمرے سے دوپہر کی دھوپ میں قدم رکھنے والوں کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔"

"میں ایسا کام نہیں کر رہا ہوں کوئی۔ تم کیا ثابت کرنا چاہتے ہو آخر؟" وہ عیاری سے بولا۔ اس کا مقصد یہ جاننا تھا کہ ہمیں اس کے اور دلاور کے گٹھ جوڑ اور ان کے کاروبار کی اصل نوعیت کے بارے میں کیا معلوم ہے۔

"تم اور دلاور آج منشیات کا زہر بیچ کر تباہ ہو جانے والوں کی زندگی کا معاوضہ وصول کر رہے ہو اور اپنی تجوریوں میں اپنے لیے جہنم کی آگ بھر رہے ہو۔" میں نے کہا۔ "تم انسانیت کی اگلی نسل کو تباہ کر رہے ہو۔ مجھے صرف اس بات کی سزا دے رہے ہو کہ میں نے تمہارے شیطانی کاروبار میں تمہارا ساتھ نہیں دیا۔ دولت کے لیے اپنے ضمیر کو نہیں بیچا۔ تم کو مجھ سے یہ اندیشہ لاحق ہو گیا کہ کہیں میں تمہاری سونے کی کان کو تباہ نہ کر دوں۔ تم نے مجھے تباہ کر دیا لیکن یہ بات خود بھی یاد رکھنا اور اپنے آقاؤں کو بھی سمجھا دینا کہ جب تک وہ میرا وجود نہیں مٹا دیں گے میں ان کے منشیات کے کاروبار کے لیے مستقل خطرہ بنا رہوں گا۔ آج وہ بھی اکیلے نہیں اور میں بھی اکیلا نہیں۔ لیکن تم دیکھو گے کہ کل وہ اکیلے ہوں گے، جیل کی سلاخوں کے پیچھے یا اپنی قبر میں۔"

میری تقریر کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ میں اسے یہ تاثر دینے میں کامیاب رہا کہ میں کتنا گمراہ ہوں اور حقائق سے کتنا بے خبر ہوں۔ اسے یقین آ گیا کہ میں سراب کے تعاقب میں ہوں۔ وہ ناجائز اسلحہ بنانے، اسمگل کرنے، بلیک میں فروخت کرنے اور ملک دشمن عناصر تک پہنچانے کا جو مذموم دھندا کر رہے ہیں، وہ میری نظر سے پوشیدہ ہے اور میں نے خود ساختہ مفروضات کی بنیاد پر یہ نظریہ قائم کیا ہے کہ چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کا بزنس منشیات کی ترسیل و تقسیم ہے۔ وہ یقیناً میرے اس احمقانہ یقین پر دل ہی دل میں بہت خوش ہوا ہوگا لیکن صورت سے اس نے بھی مجھے بے وقوف بنانے کی اداکاری جاری رکھی تھی۔

"یہ کاروبار پہلے بھی چلتا رہا ہے۔ تمہارے باپ نے مخالفت کر کے ہمارا کیا بگاڑ لیا۔" وہ حقارت سے بولا۔ "اور خود تم

نے کون سا تیر مار لیا؟ ماری ہے تو اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی ماری ہے۔ خود کو ہی نہیں، اپنے ساتھ دوسروں کو بھی تباہ کیا ہے۔ تم دلدل میں اُتر چکے ہو اور تمہارا واپس لوٹنا ناممکن ہے۔ ہم بدستور کنارے پر ہیں۔"

"تم آنے والے سیلاب سے بے خبر ہو۔" میں نے کہا۔ "کنارے پر ہونے کو تم تحفظ اور سلامتی کی ضمانت سمجھے ہوئے ہو مگر اسی یقین کے ساتھ تم سب ڈوبنے والے ہو۔ اگر تم صرف ایک پولیس افسر رہتے تو تمہاری جان و مال اور عزت سب بچ جاتے لیکن اب کوئی تم کو بچانے والا بھی نہیں ہے۔"

"میری طرف سے تم جہنم میں جا سکتے ہو۔" وہ بولا۔

"جانے کے لیے اب ہمیں تمہاری اجازت کی ضرورت نہیں رہی۔ لیکن تمہاری ماں سے ایک اجازت ضرور لینا ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ کوئی خطرہ مول لے سکیں اور یہاں سے نکل کے کسی محفوظ مقام تک پہنچنے سے قبل ہی پکڑے جائیں۔ ہمیں کوئی ایسا بندوبست ضرور کرنا پڑے گا کہ ہمارے جانے کے بعد تم کچھ نہ کر سکو۔" پھر میں اس کی ماں کی طرف مڑا۔ "انتخاب میں آپ پر چھوڑتا ہوں۔ ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ میں آپ کے بیٹے کو ساتھ لے جاؤں اور پھر ہم ان کو کسی بھی جگہ چھوڑ دیں جہاں سے یہ واپس آ جائیں۔"

"نہیں۔ اسے مت لے جاؤ۔ یہ زخمی ہے۔" سراج کی ماں چلائی۔ "اس کی جگہ مجھے لے چلو۔"

"آپ کو تکلیف ہوگی اور سراج کی طرف سے ہمارا اطمینان پھر بھی نہیں ہوگا۔" میں نے کہا۔ "دوسری صورت یہ ہے کہ ہم آپ کو اور سراج کو ایک ساتھ لے جائیں۔ تیسری صورت یہ ہے کہ میں آپ دونوں کو ایک ساتھ یا الگ الگ کمروں میں باندھ کر ڈال جاؤں۔ کچھ دیر میں کوئی نہ کوئی آپ کو آزاد کرانے والا آ جائے گا۔"

"کیا تم میرے وعدے پر اعتبار نہیں کر سکتے کہ میں خاموش رہوں گی۔" سراج کی ماں نے کہا۔

"آپ کی بات پر میں یقیناً اعتبار کر لوں گا۔ لیکن آپ کے بیٹے کی بات پر نہیں۔" میں نے کہا۔ "پھر بھی اتنا تو کرنا ہی پڑے گا کہ آپ کو کسی کمرے میں مقفل کر دوں۔ ہاں آپ صرف اپنے قول کی پابند رہیں گی۔ سراج کو میں دوسرے کمرے میں رکھوں گا۔ اب آپ مجھے بتا دیں کہ کس کمرے میں جانا پسند کریں گی، میرا مطلب ہے کس باتھ روم میں، اگر آپ یہ چاہتی ہیں کہ آپ کو باندھا نہ جائے۔ سراج کے لیے کوئی رعایت نہیں۔"

"مگر باتھ روم میں... اور... اس حالت میں تم سراج کو باندھ کر ڈالو گے؟"

"مجبوری ہے ماں جی۔ باقی سب کمروں میں کھڑکیاں ہوں گی۔ انھیں مقفل نہیں کیا جا سکتا۔" میں نے کہا۔ "سراج کا صرف ہاتھ ٹوٹا ہے۔ وہ معذور نہیں ہوا ہے۔ اس کا ہمارے پیچھے دوڑتا یا ہمارے تعاقب میں آنا خود اسی کے لیے خطرناک ہوگا۔ ہو سکتا ہے وہ کوئی دوسرا ریوالور استعمال کرے۔ جواب میں ہمیں بھی گولی چلانی پڑے گی۔ یہ بہت خطرناک چیز ہے۔" میں نے اسٹین گن لہرائی۔

"نہیں نہیں۔" سراج کی ماں چلائی۔ "میں اس کو کچھ نہیں کرنے دوں گی۔ تم جاؤ۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ اسے کمرے سے بھی نہیں نکلنے دوں گی۔ کوئی تمہارے پیچھے نہیں آئے گا۔"

"آپ کا بیٹا ایک پولیس افسر بھی ہے ماں جی۔ اس نے آپ کی بات نہ مانی تو آپ کچھ بھی نہیں کر سکیں گی۔" میں نے کہا۔ "اب آپ دیر نہ کریں۔ آپ اسی کمرے سے ملحق باتھ روم میں چلی جائیں۔ اٹھیں آپ بھی سراج صاحب۔" سراج گالیاں بکتا اور دھمکیاں دیتا اٹھا۔

"اچھا اس کو باندھ کر مت ڈالو۔ ایسے ہی دروازہ باہر سے بند کر جاؤ۔" سراج کی ماں نے التجا کی۔

"بہت بہتر۔" میں نے کہا۔ "آپ دونوں باتھ روم میں بالکل خاموش رہیں گے۔" میں نے کہا۔ "اگر گاڑی کے روانہ ہونے سے پہلے میں نے شور مچانے کی آواز بھی سنی تو میں واپس آ کے اس کی ٹانگ بھی توڑ جاؤں گا۔ غسل خانے کے دروازے کی چابی کہاں ہے؟"

تمام دروازوں کی چابیاں ایک گچھے میں تھیں۔ میں نے سراج کی ماں کو بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے اور اسے سمجھاتے مناتے دیکھا۔ وہ بہت زیادہ ڈری ہوئی تھی۔ سراج طیش میں پاگل ہو رہا تھا اور ایسی ذلت آمیز شکست کے ساتھ اپنی بے بسی کا احساس اس کے لیے سوہانِ روح بنا ہوا تھا۔ اس نے یوں ظاہر کیا جیسے وہ ماں کی وجہ سے مجبور ہو گیا ہے۔ یہ خود اپنی نظر میں اور دوسروں کی نظر میں عزتِ نفس کو مزید مجروح ہونے سے بچانے کی فضول کوشش تھی۔ میں نے دروازے کو قفل لگا کے تمام چابیاں ایک میز کی دراز میں ڈال دیں تاکہ خادمہ بھی شور پر متوجہ ہو کر آئے تو فوراً دروازہ نہ کھول سکے۔ چابیاں تلاش کرنے یا دروازہ توڑنے میں جتنا وقت لگتا، وہ ہمارے لیے کافی تھا۔

باہر آ کے میں نے ٹیلیفون کی لائن کو دیکھا۔ جہاں یہ لائن دیوار

سے گزر رہی تھی، وہاں میں نے اسٹین گن کے دستے سے کئی بار چوٹ ماری اور پھر تار کو موڑ کر الگ کر دیا۔ محسن جیپ میں سامان رکھنے کے بعد ٹیڈی کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ رابعہ اور ناز و پچھلی سیٹ پر تھیں اور سامان بیچ میں رکھا ہوا تھا۔ میں نے اسٹین گن کو ایک سیٹ کے نیچے چھپا دیا۔ سراج کا ریوالور میں نے محسن کو دے دیا۔

"چلو دھکا لگاؤ۔" میں نے کہا۔

"کیا مطلب... گاڑی تو ٹھیک ہے۔" محسن نے کہا۔

"مطلب باہر جا کے سمجھاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "دیر مت کرو۔ شاباش۔" میں نے رابعہ سے اسٹیرنگ سنبھالنے کو کہا۔ ہم تینوں کے زور لگانے سے جیپ آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھی۔ سڑک تک آنے میں ہمارے دو منٹ صرف ہوئے۔ آگے معمولی سا نشیب تھا۔ ہم سب کی متحدہ کوشش سے جیپ کی رفتار اتنی بڑھ گئی کہ ہمیں ساتھ دوڑنا پڑا۔ ذرا سی دیر میں ہم سراج کے گھر کو کافی پیچھے چھوڑ آئے۔ محسن اور ٹیڈی کا سانس پھولنے لگا۔

"یار یہ کیا مصیبت ہے۔ لوگ دیکھ رہے ہیں۔" محسن نے جھلا کر کہا۔

"کیا دیکھ رہے ہیں؟" میں نے ڈانٹ کر کہا۔ "اور کیوں دیکھ رہے ہیں؟ بدتمیز لوگ، پردہ دار خواتین بیٹھی ہیں۔"

"پردے دار خواتین کیا مزے سے بیٹھی دانت نکال رہی ہیں۔" محسن نے کہا۔ "جیسے گدھا گاڑی ہے تین گدھوں والی۔"

"یار سکندر بادشاہ! جس مصیبت کو ہم اتنی دیر میں یہاں تک خود کھینچ کر لائے ہیں۔" ٹیڈی ہانپتے ہوئے بولا۔ "اسے چلا کر لاتے تو اب تک دو میل دُور نکل گئے ہوتے۔"

"اچھا؟" میں نے حیرانی سے کہا۔ "یہ بات پہلے کیوں نہیں بتائی! چلو بیٹھو۔"

محسن نے فوراً ڈرائیونگ سنبھال لی۔ چابی گھماتے ہی انجن غرایا۔ "اب کدھر چلیں؟"

"جہاں سینگ سمائیں۔ یا جہاں تقدیر لے جائے۔"

"سینگ تو ہمارے سر سے غائب ہو چکے ہیں۔" محسن بولا۔ "اور جس پر ہم بیٹھے ہیں اسے جیپ کہتے ہیں، تقدیر نہیں۔"

"یہ جیپ بھی اُدھر ہی جائے گی جدھر اسے ہماری تقدیر لے جائے گی۔" میں نے کہا۔ "جیسے رات کو وہ گھوڑا خود تو بچ گیا مگر ہم پھنس گئے۔ ہماری شامت آئی تھی۔"

"یا جیسے ہم نکل گئے اور ہمارا لینڈ لارڈ پھنس گیا۔" محسن بولا۔ "اس کی بھی شامت آئی تھی۔"

"میں نے حضرت سراج کو مع والدہ ماجدہ باتھ روم میں بند کر دیا تھا۔" میں نے کہا۔ "اور ان سے کہا تھا کہ خبردار جو جیپ

کے روانہ ہونے تک آواز بھی نکالی۔ واپس آ کے ٹانگیں بھی توڑ دوں گا۔ وہ ابھی تک دم سادھے بیٹھے ہوں گے کہ جیپ اسٹارٹ ہونے کی آواز نہیں آئی۔ اب سمجھ میں آ گیا کہ میں نے اتنی دُور آ کے انجن کیوں اسٹارٹ کیا تھا؟"

ٹیڈی نے گھوڑے جیسا سر ہلایا۔ "پھر تو وہ نہ جانے کتنی دیر ویسے ہی بیٹھے رہیں۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ ابھی ہم نکلے نہیں۔"

"اس جیپ کو ہم شہر میں اپنے ساتھ لے کر نہیں پھر سکتے۔" محسن نے کہا۔

"پھر بھی اس علاقے سے تو نکلنا ہی ہے جہاں ہمیں رات کو پولیس نے تلاش کیا ہوگا۔" میں نے کہا۔ "ممکن ہے وہ ابھی تک ناکا بندی کیے بیٹھے ہوں۔ کسی پولیس والے کی جیپ کو کوئی نہیں روکے گا۔"

تھوڑا سا آگے جانے کے بعد میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ میں نے کئی جگہ پولیس والوں کو گاڑیاں روک کر اندر جھانکتے دیکھا۔ وہ ٹانگوں پر بھی نظر ڈال رہے تھے اور بسوں، ٹرکوں کو بھی دیکھ رہے تھے۔ اگر اس وقت ہم کسی پرائیویٹ کار یا ٹیکسی میں ہوتے تو ضرور پکڑے جاتے۔ پولیس کی جیپ اپنے رنگ کی وجہ سے دُور سے پہچانی جاتی تھی اور اس پر انگریزی میں لکھے ہوئے "[illegible]" کے حروف اتنے نمایاں تھے کہ ہمیں کسی نے قابلِ توجہ نہیں سمجھا۔ راستے میں ہمیں مخالف سمت سے آنے والی اسی قسم کی دو جیپوں سے واسطہ پڑا مگر وہ زن سے گزر گئیں۔ کسی نے غور بھی کیا ہوگا تو یہی سمجھا ہوگا کہ کسی پولیس افسر کی فیملی بیٹھی ہے۔

خطرے کی حدود سے بہت دُور آ جانے کے بعد میں نے محسن سے جیپ کو روکنے کے لیے کہا۔ میں نے اور ٹیڈی نے تمام سامان اُتار کے سڑک سے ذرا دُور رکھا۔ یہ میانی صاحب کے قبرستان کا عقبی حصہ تھا۔ اسٹین گن کو میں نے سوٹ کیسوں کے پیچھے چھپا دیا۔ "اب تو جیپ کو آگے لے جاؤ۔" میں نے کہا۔ "اور یہاں سے ایک میل دُور چھوڑ کر ٹیکسی میں لوٹ آؤ۔"

"کہاں جانے کے لیے؟" محسن نے کہا۔ "میں ٹیڈی کو بھی اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔"

"دروغہ والا۔" میں نے کہا اور محسن نے سر ہلایا۔ وہ جیپ لے کر ہوا ہو گیا۔ رابعہ اور ناز و سامان پر بیٹھ گئیں۔

"تم لوگوں کی جرأت بہت بڑھ گئی ہے۔" ناز و نے بہت دیر بعد ایک بات کی۔ "کسی بات سے نہیں ڈرتے؟"

"ہمارے لیے شاعر نے کہا تھا، مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "اب تو احساس بھی نہیں ہوتا کہ ہم کیسے سنگین خطرات سے دوچار تھے۔ کسی نہ کسی صورت نکل

ہی آتے ہیں۔ بھیگنے کا ڈر اس وقت تک رہتا ہے جب تک آدمی دُور کھڑا ڈرتا رہے۔ جب ایک بار پانی میں غوطہ مار لیا تو ڈر ختم۔ کیا تم بہت خوفزدہ ہو؟"

"وہاں تو تھی، سراج کی کوٹھی میں۔" وہ بولی۔ "وہ بھی۔ پولیس افسر ہے نا؟"

"لیکن وہ تم کو پہچانتا تو نہیں تھا کہ تم اکرام شیخ کی بہن ہو۔"

"اگر پولیس کے فون پر تمھارے بارے میں کچھ بتاتا تو میرے بارے میں بھی بتاتا۔" نازو بولی۔ "پھر اسے معلوم ہو جاتا۔"

"کیسے معلوم ہو جاتا؟" میں نے کہا۔

"کیا ہو گیا ہے تمھاری عقل کو؟" رابعہ نے کہا۔ "ارے بھائی اب تک اکرام شیخ اپنی بہن کے اغوا کیے جانے کی رپورٹ لکھوا چکا ہوگا اور یہ رپورٹ ہر تھانے کو مل چکی ہوگی۔ اغوا کنندہ تمھارے سوا کوئی نہیں ہوگا۔ ایف آئی آر میں ہم سب کا نام بھی ہو سکتا ہے۔"

مجھے افسوس ہوا کہ اتنی موٹی بات میری عقل میں نہیں آئی۔ "اکرام شیخ کیا کہے گا؟ یہ کہ ہم نازو کو گھر سے اُٹھا لائے؟"

"نہیں، وہ کہے گا کہ میں بہن کو رہنما بنا کے مجرموں کے ٹھکانے پر چھاپا مارنے گیا تھا۔" رابعہ نے کہا۔

"لیکن مجرم زیادہ طاقتور تھے۔ مقابلہ کر کے نکل گئے۔" میں نے کہا۔ "اور میری بہن نازو کو بھی لے گئے۔ یہ بات وہ ثابت کیسے کرے گا؟ وہاں اسے کوئی چشم دید گواہ نہیں ملے گا جو کہے کہ یہاں پولیس آئی تھی اور ان کا مجرموں سے مقابلہ ہوا تھا جہاں تک میرا خیال ہے، وہ معطل ہو جائے گا۔ اس نے افسرانِ بالا کو کامیابی کا پورا یقین دلانے کے بعد اس قسم کی کارروائی کا اختیار حاصل کیا ہوگا لیکن نتیجہ کیا نکلا! ڈرائیور مارا گیا جو گرفتار کرنے گئے تھے خود گرفتارِ بلا ہو گئے۔ سارے آپریشن کی ناکامی کا ذمے دار اکرام شیخ کو ٹھہرایا جائے گا جس کے اندازے غلط تھے ——— منصوبہ بندی غلط تھی اور توقعات غلط تھیں۔"

"معلوم نہیں غالب پر کیا بیتی۔" رابعہ نے کہا۔

"اسے تو اب رات ہی کو فون کریں گے کہیں سے۔" میں نے کہا۔ "جب وہ آفس میں ہوگا۔"

"اکرام شیخ کے بیان پر وہ حوالات میں بھی ہو سکتا ہے۔" رابعہ نے کہا۔

"کسی اے ایس آئی کا بیان ایک اخبار کے ادارتی عملے کے بیان کو رد نہیں کر سکتا۔" میں نے کہا۔ "غالب کے دوست بہت ہیں۔"

"داروغہ والا میں کون ہے؟" نازو نے سوچتے ہوئے کہا۔

"کوئی بھی نہیں۔ بس اس جگہ سے جتنی دُور ہوں اتنا ہی بہتر۔" میں نے کہا۔ "آج کی رات تو ہم ہوٹل میں بھی دیکھیں گے کسی جگہ پناہ مل جائے تو اچھا ہے۔ کرائے کا کوئی مکان سب سے بہتر رہے گا۔ میں چاہتا ہوں تم دونوں اپنے یہ شہری چہرے اور لباس بدل ڈالو۔"

"لباس تو بدل جائے گا، چہرہ کون بدلے گا؟" نازو مسکرائی۔

"وہ کیا مشکل ہے۔ اپنے یہ سیٹ کیے ہوئے کسی ہیئر ٹانک کے اشتہار میں نظر آنے والے بال بکھیر لو۔ ان میں بہت سا کڑوا تیل چپڑ کے خانہ بدوش عورتوں کی طرح گوندھ لو۔ مٹی پڑی گی تیل میں تو بال چکٹ نظر آئیں گے۔ ایسے شاداب چہرے دعوتِ نظارہ دیتے ہیں اور تمھاری طرف کسی کی نگاہ بھی نہ اُٹھے تو اچھا ہے۔ منہ پر تھوڑی بہت سیاہی مل لو۔ عورتیں تو خود میک اپ کی ماہر ہوتی ہیں۔ اپنے ذہن میں کسی جاہل دیہاتی عورت کا حلیہ رکھو اور خود کو ویسا ہی بنا لو۔" میں نے کہا۔ "کپڑے ہم لا دیں گے۔ گھگھرا، چولی یا لمبا کرتا اور دھوتی۔ ہاتھ میں حقہ۔ میں آپ دونوں سے مخاطب ہوں۔"

رابعہ اور نازو ہنستے ہنستے بے حال ہو گئیں۔ "ہم یہ نہیں کر سکتے۔" انھوں نے مشترکہ اعلامیہ جاری کیا۔

"کیوں؟" میں نے ماتھے پر بل ڈال کے کہا۔ "میں اور محسن بھی تو کارٹون بن کے پھر رہے تھے۔ وہ تو سراج نے ہمارا میک اپ خراب کر کے ہمیں پھر وہی بنا دیا جو ہم ہیں، ورنہ کیا تھے؟ اور آئندہ بھی ہم ایسے بہروپ بن کے تو نہیں پھر سکتے۔ ہمیں بھی بھیس تو بدلنا ہی پڑے گا۔ اس بار میرا خیال کچھ اور ہے، میک اپ کے بغیر کچھ حقیقی رنگ دینے کا۔"

"کیا؟" رابعہ نے دلچسپی سے میری طرف دیکھا۔

"میرا خیال ہے ہم سرِ عام صاف کروا دیں۔" میں نے کہا۔ "بے آب و گیاہ میدان۔ پگڑیاں باندھ لیں اور دھوتی کے ساتھ چُغنے پہن لیں۔ ہاتھ میں وہی حقہ۔ پیروں میں کھسا ملتانی، کانوں میں مُندریاں اور اس آن بان شان سے ہم سب صبح گامے شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوں۔ ان کے معتقد بن کے کوئی منّت ماننے جائیں اور ان کے مریدوں میں شامل ہونے کی کوشش کریں۔ اجازت ملے تو وہاں چلہ کاٹیں۔ گامے شاہ کے چیلم کا پکا بندوبست ہو جائے۔" محسن اسی وقت ٹیکسی لے کر نمودار ہوا۔ اس نے سب سے پہلے یہ خوشخبری دی کہ ڈرائیور کی مہربانی سے مکان بھی ...

ٹیکسی ڈرائیور مجذوب صفت آدمی تھا اور اس نے ... داروغہ والا کی جانب لے جاتے ہوئے اپنے عجیب و غریب عقائد ... نظریات کی تبلیغ کی جو سارے زمانے سے نرالے تھے مگر ہم نے ... میں کیا۔ وہ بہت جلالی شخص تھا اور اس کو دعوے ... سے اختلاف نہیں کیا۔ وہ بہت جلالی شخص تھا اور اس کو دعوے تھا کہ اب تک وہ چوبیس نافرمان جنات کو نیست و نابود کر چکا ہے۔ ہم آدمِ خاکی و فانی اس کے عتاب کو دعوت دینے کی ہمت نہیں رکھتے تھے۔ شالیمار باغ کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے ہمیں مادھو لال حسینؒ کے بارے میں متعدد ایسی روایات سے روشناس کیا جو مبالغہ آمیز اور کچھ گمراہ کن بھی لگتی تھیں مگر ہم نے ان کی تاریخی سند پر بھی اصرار نہیں کیا۔ اطمینان کی بات یہ تھی کہ اس نے ہم سے کوئی شرافت کی سند نہیں مانگی اور دو جوان عورتوں کو بے پردہ اپنے ساتھ لے کر گھومنے پر ہدفِ ملامت نہیں بنایا۔ موقع پاتے ہی میں نے اس سے مکان کے بارے میں سوال کیا۔

"مکان کیسا ہے!" وہ بولا۔ "سوہنو اس کی چار دیواری ہیں۔ اُتے پکی چھت ہے۔ اندر جان اور باہر آن کا رستہ ہے۔ ہور کی چاہیدا ہے؟ ذرا پرانا ہے تو تم کون سے نویں جمّے ہو؟"

یہ بڑی منطقی دلیل تھی۔ کیا پرانا ہے اور کیا پرانا نہیں ہے۔ یہ سب حالات اور دیکھنے والے کی نظر کا فیصلہ ہے۔ خریدار کے نکتۂ نظر سے دس سال پرانا مکان پرانا ہے۔ بیچنے والے کے لیے نیا بنا ہوا۔ کچھ لوگوں کے لیے گزشتہ سال کا کار ماڈل بھی پرانا ہے۔ کچھ کے لیے دس سال پہلے کی کار بھی نئی ہے۔ پچاس سال گزر جانے کے بعد بھی اسلام آباد نیا شہر رہے گا۔ آدمی نیا پرانا کب ہوتا ہے؟ سال بھر کا بچہ، دس سال کا لڑکا، بیس سال کا جوان۔ سب پرانے ہیں۔ اس نے ٹھیک کہا تھا کہ ہم کون سے آج پیدا ہوئے ہیں کہ خود کو نیا کہیں اور مکان کی اس نے ایک جامع تعریف کر دی تھی کہ اس میں بنیادی طور پر کیا کچھ ہونا چاہیے۔ باقی سب چونچلے ہیں، آسائش ہے یا عیاشی کے سامان ہیں۔ کیا دری اور کیا قالین۔ کیا پنکھا اور کیا ائیر کنڈیشنر۔ کیا تخت اور کیا فوم ربر کا کنگ سائز بیڈ۔ جہاں تک چاہو پاؤں پھیلاتے جاؤ۔

"لوجی اس مکان میں بھی چار جنات نے وخت ڈال دیا تھا۔" وہ بولا۔ "ہم ذرا غافل ہوئے اور نامرادوں نے کر لیا قبضہ۔ کرائے دار کو چک کے باہر سٹ دیا۔ وہ منجی بستر افیر اُٹھا کے لایا۔ انھوں نے فیر الٹ دیا۔ سویرے وہ نس گیا۔ فیر جی ہم نے ... ڈو جا بندہ رکھا، اس کا بھی حشر نشر کر دیا۔ چار کرائے دار نسا دیے جی۔ ہم نے کہا کہ اچھا بھئی۔ اب یا تم نہیں یا ہم نہیں۔ چالیس دن کا عمل تھا۔ خود ہم سولی پر لٹک گئے مگر رب دی شان۔ ہم نے سب کا خانہ خراب کر دیا۔"

"کچھ عذر فرمایا آپ نے؟" رابعہ نے کہا۔ "ہم جس مکان میں جا رہے ہیں وہ آسیب زدہ ہے؟"

"ہے نہیں سوہنو، تھا۔" ٹیکسی ڈرائیور کے کان بہت تیز تھے۔ "ہم جہاں ڈیرا ڈالتے ہیں وہاں سے بھوت خود بھاگ جانا پسند کرتے ہیں۔" محسن بولا۔ "ورنہ خانہ جنگی کا امکان رہتا ہے۔"

"اور بھوت کیا اُن کے آباؤ اجداد بھی ہم سے بگاڑ مول نہیں لیتے۔" میں نے کہا۔

"ضرور آپ کے پاس ہمارے پیر سائیں گامے شاہ کا تعویذ ہوگا۔" ٹیکسی ڈرائیور نے کہا۔

"گامے شاہ ... ہاں انھی کی تو کرامت ہے سب۔" میں نے فوراً کہا۔

"بڑی اُچی ذات ہے جی ان کی۔" ٹیکسی ڈرائیور خوش ہو گیا۔ "وہ ہم نے بڑی خدمت کی ان کی تو انھوں نے بڑا کرم کیا اور سانوں دس دِتّا اپنا خاص علم۔ بس جی اک دن دے بعد اُسی تے کر دِتّا کونڈا جنات دا۔ گامے شاہ دی کیا بات ہے، شاہ جنات نوں غلام بنا لیا ... کسی عورت تے جن آ جاوے۔ بس اک نظر اور جن دا بیڑہ غرق۔"

"اچھا جی، گامے شاہ جن اُتارتے ہیں۔" محسن بولا۔ "اور وہ بھی خواتین کے سر سے۔"

"لوجی! اور جن کیا مردوں کے سر آتے ہیں۔" وہ بولا۔

"بس جی آپ نے تو ہماری مشکل آسان کر دی۔" میں نے کہا۔ "یہ میری گھر والی ہے اور یہ اس کی۔ دونوں پر جنات کا اثر ہے۔ ہم اگر جائیں گامے شاہ کی خدمت میں تو جن اُتر جائیں گے؟"

"اُترنے والے جن تو نہیں ہیں۔" محسن آہستہ سے بولا اور رابعہ نے اس کو کہنی مار کے خاموش کیا۔

"آپ جا کے تو دیکھو۔ رب دی شان وڈی۔" وہ بولا۔ "مگر ایس طرح نہ لے جانا۔ میرا مطلب ہے عورت ذات نوں۔ چادر وزح ضرور ہونا چاہیے۔ شاہ صاحب کا حکم ہے کہ کسی زنانی دا مُنہ نہیں دیکھنا۔ بُرقعا چھپا کے جانا۔"

"برقع پہنا کے لے جائیں گے جی۔ گامے شاہ کو پُوتھا کسی کا نظر نہیں آئے گا۔" میں نے کہا۔ عین اسی وقت ٹیکسی رک گئی۔ چنانچہ ٹیکسی ڈرائیور نے اس موضوع پر گفتگو ختم کی اور نیچے اُتر کے ایک پرانے کواڑوں والا دروازہ کھولنے لگا۔ گلی میں دونوں طرف ایسے ہی پرانے مکان تھے۔ بیشتر ایک منزلہ لیکن کہیں کہیں دو منزلہ گھر بھی نظر آ رہے تھے۔ سب کا رنگ وہی تھا جو اینٹوں کا رنگ تھا اور موسمی اثرات سے سیاہی مائل بھورا ہو گیا تھا۔ گلی کی چوڑائی اتنی کم تھی کہ ٹیکسی کے کھڑے ہو جانے سے راستہ تقریباً بند ہو گیا تھا اور باقی ماندہ جگہ میں سے کوئی پیدل چلنے والا ہی نکل سکتا تھا۔ جتنی دیر میں ہم نے اپنا اسباب ٹیکسی سے اُتار کے اندر منتقل کیا ... ایک سائیکل سوار نے ویٹ لفٹنگ کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی

سائیکل دونوں ہاتھوں میں سر سے اُوپر بُلند کی اور اسی جگہ میں سے گزر گیا۔ دوبارہ سائیکل پر بیٹھ کے ہوا ہونے سے قبل اس نے بآواز بلند ٹیکسی والے سے جو کچھ کہا، اس کا مطلب یہ نکلتا تھا کہ آخر وہ اپنی ضعیف والدہ کو یہاں کیوں چھوڑ گیا ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور نے جواب میں برابر کی بات چلّا کے کہی مگر بات اس سے آگے نہیں بڑھی۔ اسی وقت مخالف سمت سے دوسری ٹیکسی آگئی اور اس نے ہارن دینے کے علاوہ گلے بازی بھی شروع کی۔ "اوئے، کون اے ایس گواچی گاں دا مالک؟" اس نے بنکار کے کہا۔ "اوئے ہٹا اینوں نئیں تے اسی آنوں لنگ جاواں گے۔"

"کیڑا اے بھئی آنوں لنگن والا؟" ٹیکسی ڈرائیور باہر نکلا۔

"اینان تادلا ایں تے فیر سے جا!"

ہم اپنا سامان اُتار چکے تھے اور ٹیکسی کا کرایہ بھی دے چکے تھے مگر مکان کے کرائے کے معاملات ابھی تصفیہ طلب تھے۔ ادھر دونوں ٹیکسی والوں میں براہِ راست تصادم کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ دونوں مقابلے پر ہارن بجا رہے تھے اور ایک دوسرے سے مطالبہ کر رہے تھے کہ وہ پیچھے جائے۔ پیچھے جانے پر کوئی آمادہ نہ تھا اور دونوں جانب رُک جانے والے صرف اس بات میں دلچسپی لے رہے تھے کہ دیکھیں بالآخر کون اپنی منواتا ہے۔ ایک کہتا تھا کہ تُو ادھر سے کیوں آیا تو دوسرا پوچھتا تھا کہ تُو ادھر کیوں آمرا۔ ان کی جنگ ختم ہونے والی نہیں تھی کیونکہ فریقِ ثانی سیریس نہیں تھا اور اس قدر قلندرانہ وضع کے ٹیکسی ڈرائیور کو مشتعل کر کے مزہ لے رہا تھا تاکہ پبلک بھی کچھ فقرے بازی سے لطف اندوز ہو۔

"خدا کے لیے پہلے ہم سے بات کر لو۔" میں نے چلّا کے کہا۔ "کرایہ لے لو اس مکان کا۔"

"کرایہ کیسے لے لیں جی؟" وہ جھلّا کے بولا۔ "لو ہے نا کمال دی گل۔ رہے ابھی ایک دن بھی نہیں۔ کرایہ لے لو۔ او میاں، جب رہو گے تو لے لیں گے کرایہ بھی۔ چل اوئے پچھاں کر اپنی ہے ہے نوں۔"

میں اندر آ گیا اور دروازہ بند کر لیا۔ ان کی آپس میں تکرار کی آواز کچھ دیر بعد آنی بند ہو گئی۔ معلوم نہیں ان میں سے کس نے اپنی ہار مان کر ٹیکسی پیچھے کی۔ محسن کا خیال تھا کہ دونوں ضدی تھے۔ اپنی ٹیکسی بیچ پر رکھ دوسرے کی ٹیکسی کے اُوپر سے گزار کے لے گئے ہوں تو عجب نہیں۔ مکان واقعی آسیب زدہ تھا۔ نقشے کے اعتبار سے عام قسم کا غریبانہ مکان جس کے دو کمرے تھے، دونوں ساتھ ساتھ۔ ان کے سامنے مختصر سا صحن، باتھ اور لیٹرین۔ آنگن بمشکل اتنا بچتا تھا کہ دو چار پائیاں ڈالی جا سکیں۔ دونوں کمروں کی ایک ایک کھڑکی گلی کی طرف کھلتی تھی اور ایک ایک برآمدے میں۔ ہر کھڑکی میں لوہے کی سلاخیں فٹ تھیں ——— خالی کمروں کی گرد سے اندازہ ہوتا تھا کہ آسیب زدہ مشہور ہونے کے بعد اس گھر میں کوئی آباد ہونے آیا تھا تو یہ بہت پرانی بات تھی۔ کرائے دار کے ذاتی تجربات مختلف تھے اور ان کا ذہن مکان سے منسوب واقعات سے خود بخود متاثر ہو گیا تھا۔

"وہ ٹیکسی ڈرائیور تو ہمیں یہاں چھوڑ کے ایسے ذ... جیسے ہم بھی خدانخواستہ وہ ہیں... جنّات۔" محسن بولا۔

"اس میں شک کی کونسی بات ہے۔" رابعہ بولی۔ "سے ظہور آدم زاد لگتے ہیں آپ حضرات...!"

"خواتین کو آپ نے ارواحِ خبیثہ کے قبیلے سے الگ فرما دیا۔" محسن بولا۔ "چڑیلیں بھی ایسی ہی ہوتی ہیں۔"

"یار، یہ لڑائی مت شروع کرو۔ ان کو گھر صاف کر..." میں نے کہا۔

"کیا فائدہ۔" رابعہ نے ٹہلتے ہوئے گھر کا معائنہ جا...

"تم کون سے یہاں ٹک کر رہو گے۔"

"ارے بھئی ارادہ تو ہے۔" میں نے کہا۔ "کل کے ... تقدیر میں کیا لکھا ہے، یہ کون جانتا ہے؟"

"میں جانتی ہوں کہ کل ہم خود فرار نہ ہوئے تو یہاں سے بھی نکالے جائیں گے۔" رابعہ نے کہا۔ "بس جب تک یہاں ہے ایسے ہی رہو، کوئی ساز و سامان نہیں، کوئی تکلف۔"

"تو کیا اسی طرح مٹی کے فرش پر سوئیں گے؟" ... نے کہا۔

"اے خاک کے پُتلے۔ ایک دن تجھ کو مٹی کے ڈ... ہی سونا ہے۔" محسن نے کسی فلسفی کی طرح کہا۔

"میں جا کے دری وغیرہ لاتا ہوں۔ کم سے کم فرش جھاڑ لو۔" میں نے کہا۔ "کھانا بھی بازار سے لے آئیں گے۔ فرض کرو، ہمیں یہاں رہنے کی مہلت ملی! ایک مہینے تک ... سے لا کر یا بازار جا کر نہیں کھا سکتے۔"

"چلئے تو بازار کی پی ری نہیں سکتے۔" محسن نے میری تائید کی۔

ایک بار پھر میں اور محسن بازار کی تلاش میں نکلے۔ ضرورت کا کافی سامان ہمیں وہیں سے مل گیا۔ ہم خواتین کی حفاظت کے لیے ... لیڈی کو چھوڑ آئے تھے چنانچہ کافی مطمئن تھے۔ رضا ٹیالی ... کے لیے ہمیں صدر جانا پڑا۔

"آخر یہ ٹیکسی ڈرائیور کرایہ کیوں نہیں لے کر گیا؟" میں نے کہا۔

"وہ دیکھنا چاہتا ہے کہ صبح تک کیا ہوتا ہے۔" محسن بولا۔ "جنّات ہمیں رہنے بھی... دیتے ہیں یا نہیں۔ ابھی وہ ہم سے مہینہ بھر کا کرایہ لیتا اور صبح ہم تھر تھر کانپتے اس کی خدمت میں حاضر ہوتے کہ بھائی ہمیں معاف کرو اور کرایہ واپس کرو۔ اگر ہم رہ سکے تو وہ کرایہ بھی لے جائے گا۔"

"اس نے ہمیں اپنا پتا تک نہیں بتایا۔"

"بتا دے گا، نہیں بتائے گا تو ہم معلوم کر لیں گے۔" میں نے کہا۔ "ٹیکسی کا نمبر مجھے یاد ہے۔"

"کیا اس کا اپنا گھر اس سے بھی بڑا اور اچھا ہو گا کہ وہ خود یہاں نہیں رہتا؟" محسن بولا۔

"ممکن ہے اسے بھی جنّات نے یہاں نہ رہنے دیا ہو۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "ہم سے کرایہ تو ملے گا ورنہ لوگ آسیب زدہ مکان سے دُور بھاگتے ہیں۔ نہ کرائے دار ملتا ہے نہ خریدار۔"

"مجھے تو وہ آدمی خبطی لگتا ہے۔ آخر اس نے خود ہی کیوں بتایا کہ یہاں جن بھوت ہیں۔" محسن بولا۔

"ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ صاف گو آدمی تھا اور دھوکے باز نہیں تھا۔" میں نے کہا۔ "اس نے پہلے سے اپنی پوزیشن محفوظ کر لی، اس ڈر سے کہ ہمیں بعد میں معلوم ہو تو ہم اسے قصوروار سمجھیں گے۔ ہمیں اس نے ایک کام کی بات بتا دی ہے۔ گامے شاہ کے بارے میں ــ ہمیں گامے شاہ کی خدمت میں حاضر ہونا ہی تھا۔"

"ہمارے چہرے تو پھر اصلی ہو چکے ہیں۔" محسن بولا۔ "ہم وہاں جائیں گے تو گامے شاہ فوراً پہچان لے گا۔"

"یہ بھی اچھا ہی ہوا۔" میں نے کہا۔ "نقلی چہرے بہت سے لوگوں کی نظر میں آ چکے تھے۔ اب کچھ اور کریں گے۔ میرا ارادہ ہے کہ ہم کسی دوسرے گاؤں سے آنے والے عقیدت مند بن کر جائیں۔ ہمارا حلیہ بالکل دیہاتیوں والا ہو۔"

"گامے شاہ کی نظر پھر بھی ہمیں شناخت کر لے گی۔"

"بات یہ ہے عزیزم!" میں نے کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ اس مہم میں خواتین آگے رہیں اور اس کے لیے میرے ذہن میں جو اسکیم ہے وہ یہ ہے کہ کل رابعہ اور نازو پُرانے دیہاتی وضع کے کپڑے اور میلے بُرقعے اوڑھ کر گامے شاہ کی درگاہ تک جائیں۔"

"ان کے لیے کپڑے اور بُرقعے کہاں سے ملیں گے۔ نئے تو مل جاتے ہیں مگر پُرانے کون دے گا؟"

"وہ بھی مل جائیں گے۔ شہر کی کسی بھکارن سے خرید لیں گے۔" میں نے کہا۔ "سو دو سو میں وہ اپنی خلعتِ فاخرہ کیوں نہیں دے گی جب کہ اسی قیمت میں نئے کپڑے مل جاتے ہیں۔ سو خلعتِ فاخرہ ان کی آمدنی کا ذریعہ ہوتی ہے۔ ڈیوٹی کے بعد وہ امپورٹڈ کپڑے کے سوٹ پہنتی ہوں گی۔" محسن بولا۔

"ارے یار، فقیرنی سے نہ سہی کسی غریب عورت سے لے لیں گے۔" میں نے کہا۔ "یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ مسئلہ ہے ہمارے گامے شاہ تک پہنچنے کا اور اسے قابو کرنے کا۔ میں نے یہ سوچا ہے کہ اگر نازو اور رابعہ برقعے اوڑھ کے عام عقیدت مندوں کے ساتھ اندر داخل ہو جائیں اور پھر کسی طرح وہاں ٹھہرنے میں کامیاب ہو جائیں، جب تک کہ وہاں کوئی نہ رہے..."

"گامے شاہ کی درگاہ میں حاضری تو سب دے سکتے ہیں مگر وہاں ہر وقت مجمع رہتا ہے۔" محسن بولا۔ "اس کے چیلے چانٹے ہر ایک پر نظر رکھتے ہوں گے، جیسے وہ فراڈ گامے شاہ ایک بار اپنی نظرِ کرم سے نواز دے اسے فوراً رخصت بھی ہونا پڑتا ہو گا۔ عرضِ مدعا اور گامے شاہ کی دُعا کے بعد وہاں رُکنے کا کیا سوال۔ نازو اور رابعہ کو اتنی دیر کون ٹھہرنے دے گا کہ تخلیہ ہو جائے۔"

"وہ کوشش کریں تو ٹھہر سکتی ہیں۔" میں نے کہا۔ "مثلاً وہ کہیں کہ ہمیں بشارت ہوئی ہے اور ہم یہاں چوبیس گھنٹے کا چلّہ کاٹنے کی آرزومند ہیں، یا ہمیں حکم ہے کہ گامے شاہ کی درگاہ میں اپنا وظیفہ مکمل کرو۔ کوئی بھی کہانی سُنا دیں کہ وہ کونسی مُراد پانے کے لیے حاضر ہوئی ہیں۔ زیادہ تر عورتیں ان جعلی پیروں فقیروں سے کیا مانگتی ہیں؟ اولاد یا شوہر کی توجہ۔ سوکن کی موت یا ساس کے مظالم سے چھٹکارا۔ بیماری سے نجات، خواہ وہ اپنی ہو یا اولاد کی۔ نازو اور رابعہ بھی گریہ و زاری کریں، روئیں اور مچلیں اور گامے شاہ کی درگاہ میں صبح سے شام تک نوافل پڑھنے کی اجازت حاصل کر لیں۔ میرا خیال ہے کہ پبلک کے سامنے وہ انکار نہیں کر سکیں گے۔ انھیں کوئی خطرے کی بات بھی محسوس نہیں ہو گی۔ اگر دو عورتیں ایک گوشے میں وظیفہ پڑھتی ہیں یا نوافل تو پڑھتی رہیں۔ اس طرح رابعہ اور نازو کو موقع مل سکتا ہے۔ رابعہ کے پاس بھی ریوالور ہو گا اور نازو کے پاس بھی لیکن خدانخواستہ ان سے اسلحہ چھن جاتا ہے اور وہ بدمعاش جو گامے شاہ کے ساتھ ہیں، انھیں قابو کر لیتے ہیں پھر نازو وہی کر سکتی ہے جو اس نے سراج کے ساتھ کیا تھا۔ وہ سب کے ہاتھ پیر توڑ سکتی ہے اور ہمارے لیے راستہ صاف کر سکتی ہے۔"

"فرض کرو نازو کامیاب ہو جاتی ہے۔ پھر ہم کیا کریں گے؟" محسن نے سوچتے ہوئے کہا۔

"یہ میں نے ابھی نہیں سوچا۔" میں نے کہا۔ "یہ ہو سکتا ہے کہ ہم باہر منتظر ہوں اور وہ گامے شاہ کو اس کے مُریدوں سمیت ـــ بے بس کر کے لے آئیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہم دوسری طرف سے داخل ہوں۔ گامے شاہ کی درگاہ کے احاطے میں پہنچنے کے لیے

ایک زیرِ زمین راستہ بھی استعمال ہوتا ہے جو ایک گیراج میں نکلتا ہے۔ ہم ایک مرتبہ ادھر سے باہر نکلے تھے۔ اگر ہم کسی اندر جانے والے ٹرک پر قابض ہو جائیں تو اندر پہنچنا مشکل نہیں۔ اندر ہماری فوج کا دُوسرا بازو...“

”ایم آر ایس کی زنانہ فورس“ محسن نے کہا۔

”ہاں، زنانہ فورس اندر سے آملے تو دشمن کا مورچہ سر“ میں نے کہا۔

”تیری تجویز خطرناک مگر قابلِ عمل ہے“ محسن بولا۔

”سراج سب کو خبردار کر چکا ہوگا۔ ان حالات میں دیر کرنے میں نقصان کا اندیشہ ہے“ میں نے کہا۔

”وہ پاگل کا بچّہ تو یہ سمجھ رہا ہے کہ ہم گدھے ہیں اور ہمیں ان کے اصل کاروبار کا علم ہی نہیں“ محسن بولا۔

”ہمیں غالب سے بھی مشورہ کر لینا چاہیے“ میں نے کہا۔ ”اس نے کہا تھا کہ مجھے آفس میں فون کر لینا۔“

غالب، ہمیں آفس میں سوتا ہوا ملا۔ ٹیلیفون پر اس کی آواز یُوں سنائی دی جیسے وہ اب بھی سو رہا ہے۔ ”ہاں بھائی ہاں۔ ہم سو رہے تھے۔ اور کیا کریں۔ مقدر میں سونا ہے یا رونا“ وہ بولا۔

”رات کو خیریت رہی نا؟“ میں نے کہا ”شیخ صاحب سے تو ملاقات نہیں ہُوئی؟“

”ہُوئی تھی۔ ہم نے کہا کہ میاں جاؤ۔ کیوں ہم قلندروں کے منہ لگتے ہو۔ ہم نہ کہیں گئے نہ کہیں سے آئے“ غالب نے جماہی لے کر کہا ”جھک مار کے تشریف لے گئے، البتہ ایک خبر ہے تمھارے لیے۔ تمہارے وہ چوہدری صاحب ہیں نا، وہ پھر وہیں آباد ہیں، اسی پُرانی کوٹھی میں اور مُصر ہیں کہ وہ نہ کہیں گئے تھے اور نہ کہیں سے آئے ہیں۔ کوٹھی کبھی خالی نہیں رہی۔“

”وہ ڈرامے کرنے والا آدمی ہے“ میں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔ جب ہم واپس پہنچے تو رابعہ اور نازو جھاڑو دے چکی تھیں۔ ایک صحن میں لگا ہُوا ہینڈ پمپ چلا رہی تھی اور دوسری اپنا مُنہ دھو رہی تھی۔ جھاڑو انھوں نے پڑوس میں سے مانگی تھی۔ خواجہ نیک محمد عرف اُستاد ٹیڈی بغور اپنے پُراسرار صندوق کا مُعائنہ کر رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر وہ چونکا لیکن میں نے اسے کھینچ کر الگ کر دیا۔ میں فیصلہ کر چکا تھا کہ آج تو صندوق کھول کر دیکھوں گا خواہ کچھ بھی ہو جائے۔

ٹیڈی نے ہمارے تیور دیکھے اور ہمارے عزائم کا اندازہ کر لیا۔ میرے دھکّے سے وہ کچھ دور جا گرا تھا لیکن اس نے اٹھنے کے بعد کوئی احتجاج نہیں کیا اور مزاحمت کی کوشش نہیں کی۔

”آج سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ تمھارے اس [illegible] میں کون سا قارون کا خزانہ ہے“ میں نے کہا۔

”یہ صندوق ایک معمّا بنا ہوا ہے“ محسن نے [illegible] کی ”یہ ہماری عقل کے لیے ایک چیلنج بن چکا ہے۔“

”اور عجیب بات یہ ہے کہ جب بھی ہم نے تم [illegible] تم ٹال گئے“ میں نے کہا ”اور جب خود ہم نے اپنے [illegible] اس راز سے آگاہی کا فیصلہ کیا تو کوئی نہ کوئی بات ایسی [illegible] کچھ نہ کر سکے۔“

”آخر تم اس کو معمّا کیوں سمجھتے ہو؟“ ٹیڈی نے کہا ”[illegible] کو جاننے کی فکر میں دُبلے کیوں ہو رہے ہو؟“

”ہم سے زیادہ تم اس کی حفاظت کے غم میں [illegible] رہے ہو۔ ہر جگہ یہ بوجھ اٹھائے پھرتے ہو اور اس [illegible] میں مبتلا رہتے ہو جیسے تمھاری جان اس ڈبّے میں [illegible]“ محسن بولا۔

”جیسے پرانے قصّوں کہانیوں میں ہوتا ہے کہ فلاں [illegible] میں ایک جزیرہ ہے، اس جزیرے کے فلاں دشوار گزار [illegible] ایک غار ہے۔ غار میں ایک پنجرہ ہے اور پنجرے [illegible] اس طوطے میں کسی ظالم کالے دیو کی جان ہوتی تھی“ میں [illegible]

”خواہ مخواہ خواجہ نیک محمد کو مشتعل کیوں کر رہے ہو“ [illegible] کہا ”نہ یہ کالا ہے، نہ ظالم اور نہ دیو۔“

”اس ڈبّے میں بھی کون سا طوطا ہے“ میں نے [illegible] ”جو کچھ ہے، وہ ہم دیکھ لیتے ہیں۔“

”قسم مولا علی کی، ایسے تمھیں کچھ معلوم نہیں ہوگا۔ تم کوشش [illegible] دیکھ لو“ ٹیڈی نے سنجیدہ رہتے ہوئے کہا۔

”پھر کیسے معلوم ہوگا“ محسن بولا ”تم سمجھتے ہو ہم اس [illegible] کو کھول نہیں سکیں گے؟“

”ہاں۔ ایسے خالی ہاتھوں سے تو بالکل ہی ناممکن [illegible] چھینی ہتھوڑی سے بھی مشکل ہے“ ٹیڈی بولا ”کسی ویلڈر کے پاس لے جاؤ گے تو وہ اپنی ویلڈنگ ٹارچ سے کاٹ [illegible] ہے مگر اتنی تکلیف کیوں کرتے ہو۔ بات یہ ہے اپنے بادشاہ کہ ہمیں تم سے کچھ چھپانا ہوتا یا تمھیں بتانا منظور [illegible] تو ہم اسے یوں ساتھ لیے پھرتے؟ اس صندوق کو کہیں [illegible] چھپایا جا سکتا تھا۔ اپنے ایسے بہت سے ٹھکانے تھے جہاں صندوق رکھ دیا جاتا تو کسی کو شک بھی نہ ہوتا۔ میں اس [illegible] نئے سوٹ کیس میں ڈال کر اوپر اپنے کپڑے رکھتا اور سوٹ کیس کو تالا لگا کے کسی بھروسے کے آدمی کے حوالے کر دیتا کہ [illegible] تو لے لوں گا۔ اوّل تو کوئی کھول کر ہی نہ دیکھتا اور دیکھتا [illegible] میں اس صندوق کو کسی جگہ گاڑ دیتا تب بھی اس کا کیا ملتا اسے۔ کچھ نہ بگڑتا۔ تم خود سوچو کہ جب میں نے اس کو بند رکھنے کے لیے ایسا انتظام کیا تھا کہ گھر میں چور بھی آ جاتا تو جھک مار کے لوٹ جاتا، اس پرانے بیہودہ صندوق پر وقت ضائع نہ کرتا۔ پھر یہ کون سا مشکل کام تھا کہ میں اسے اپنے ساتھ اٹھائے پھرنے کی مصیبت مول لینے کے بجائے تمھارے ساتھ خالی ہاتھ پھرتا اور اس صندوق کی طرف سے بے فکر رہتا کہ صندوق محفوظ ہے مگر قسم مولا علی کی سکندر بادشاہ، ہم تو جس کے دل سے ہو گئے اس کے لیے اپنا دل کھول کے رکھ دیا۔ یاروں سے راز کو چھپایا تو وہ یاری کیسی۔ ایک نہ ایک دن تو تمھیں بتانا ہی تھا کہ آخر اس بوجھ کو گدھے کی طرح لاد کر پھرنے کی کیا ضرورت تھی۔ تم سب کا شک میں مبتلا ہونا قدرتی بات تھی۔ میں نے سب کچھ سنا اور خاموش رہا۔“

”کیوں خاموش رہے۔ اتنا سسپنس پیدا کرنے میں بھی کوئی مصلحت تھی؟“ میں نے کہا۔

”نہیں۔ بس ایسے ہی تماشا دیکھ رہا تھا، تم سب کے تجسّس کا“ ٹیڈی بولا ”پہلے تم سب حیران ہوئے تھے۔ پھر ناراض ہونے لگے تھے کہ یہ کباڑ خانہ ساتھ لیے پھرنے کی کیا تُک ہے۔ اس کے بعد تمھارے شکوک میں اضافہ ہوتا گیا۔ تم لوگوں نے میرا مذاق بھی اڑایا۔ کبھی اسے قارون کا خزانہ کہا، کبھی پنڈورا کا باکس اور کبھی پُراسرار صندوق۔ مجھے پتا تھا کہ ایک نہ ایک دن تم اس کو کھول کر ہی دم لوگے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ اسے لے جاؤ اور کھلوا کے دیکھ لو کہ اس میں کیا ہے۔“

”گویا تم خود نہیں بتاؤ گے؟“

”یہ بات نہیں۔ میں بتا دیتا ہوں“ ٹیڈی بولا ”اس صندوق میں کم سے کم نصف وزن کا سونا ہے۔ باقی آدھا وزن تم اس فولادی سیف کا شمار کر لو جو ہر طرف سے بند ہے۔ اس کی مالیت کا اندازہ میں نہیں لگا سکتا۔ تم یہ حساب کتاب کر سکتے ہو کیونکہ تم پڑھے لکھے ہو لیکن یہ سچ ہے سکندر بادشاہ کہ اس میں قارون کا خزانہ ہے۔“

جب ٹیڈی نے اپنی بات شروع کی تھی تو رابعہ اور نازو بھی آ کھڑی ہوئی تھیں۔ انھوں نے ہماری طرف اور ہم نے ان کی طرف ناقابلِ یقین نظروں سے دیکھا لیکن ٹیڈی کی متانت میں فرق نہیں آیا تھا اور اس کی بات کو مذاق سمجھ کے نہیں ٹالا جا سکتا تھا۔ قارون کا خزانہ تو ایک محاورہ تھا لیکن ٹیڈی کی بات کو حقیقت مان لیا جاتا تو اتنے سونے کی قیمت ہمارے لیے قارون کے خزانے سے کم نہ تھی۔

”تمھارے خیال میں یہ کتنا سونا ہوگا؟“ ٹیڈی نے ہم سب کی حیرت زدہ خاموش صورتوں کو دیکھ کر کہا۔

”تمھارے اس صندوق کا وزن بیس سیر سے زیادہ ہی ہوگا، اگر ایک من نہیں“ میں نے کہا ”تو تیس سیر فرض کر لیتے ہیں۔“

”اور تمھارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس میں پندرہ سیر سونا ہے؟“ محسن نے کہا ”خواجہ صاحب! ایک تولہ سونا بھی آج کل دو سو روپے میں ملتا ہے اور ایک سیر میں ہوتے ہیں اسّی تولے۔“

”پھر تو آپ مجھے بھی حساب لگا کے بتا دو کہ یہ سب سونا کتنے کا ہوا؟“ ٹیڈی اسی سادگی سے بولا۔

”حساب تو ہم لگا لیں گے لیکن ٹیڈی، اتنا سونا تمھارے پاس آیا کہاں سے؟“ میں نے کہا اور سب دم بخود اس کی صورت کو دیکھتے رہے۔

”یہ بھی بتا دوں گا، پہلے حساب تو لگاؤ“ ٹیڈی نے کہا۔ ”پتا تو چلے کہ ہم کتنے دولت مند ہیں۔ تم ہمیشہ فکر مند رہتے تھے کہ مالی ضروریات کیسے پوری ہوں گی اور میں نے ایک دن کہا تھا کہ ہم بھی کسی سے کم نہیں اور وقت آئے گا تو ہم بتا دیں گے نہ دوستوں کی خاطر ہم کیا کر سکتے ہیں۔“

اس سے پہلے بھی تم نے کم تو نہیں کیا استاد“ میں نے اس وسیع القلب، مخلص اور طبعاً نیک شخص کو دیکھا جسے قدر ناشناس زمانہ ٹیڈی بدمعاش کہتا تھا لیکن جس کی ذات میں آدمیت کے تمام اوصافِ حمیدہ ان سب سے زیادہ تھے جو خود ساختہ یا زرخرید معیاروں کی کسوٹی پر اپنے آپ کو پرکھتے تھے تو انسانِ کامل ہونے کا دعوے کرنے لگتے تھے۔ ہم نے رفاقت کے اس دور میں جس کو حالات کی کسوٹی سمجھا جا سکتا ہے، ٹیڈی کو بہت قریب سے دیکھا تھا اور یہ تسلیم کر لیا تھا کہ اس کی فطرت کے اجزائے ترکیبی وہی ہیں جو ہماری فطرت کا حصّہ ہیں بے شک وہ اپنی تعلیم، اپنے ماضی کے رشتوں، اپنے ماحول اور اپنے ظاہری اعمال کے اعتبار سے مختلف نظر آتا تھا مگر اس کی باطنی صفات کا حسن ہماری نگاہ میں تھا۔ اس نے آزمائش کے ایسے دور میں دوستی کا حق ادا کیا تھا جب دنیا کی نظر بھی ہماری دشمن تھی۔ ہماری اور ٹیڈی کی دوستی کی عمر بہت کم تھی لیکن ہم نے شناسائی سے دوستی تک کے تمام مرحلے بہت کم وقت میں طے کر لیے تھے۔ کیونکہ ہم نے ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا اور جان لیا تھا۔

”پہلے ہم نے کون سا تیر مارا ہے سکندر بادشاہ“ ٹیڈی بولا۔ ”کچھ بھی تو نہیں۔ جتنا کرنا چاہیے تھا، اتنا بہرحال نہیں کیا مگر تم نے بھی تو ٹیڈی بدمعاش کو خواجہ نیک محمد بنایا۔ اسے اپنا سمجھا اور نے

وہ عزت دی جو پہلے کسی نے نہیں دی تھی۔ دولت کا کیا ہے، ناجائز ذرائع سے سب ہی حاصل کر لیتے ہیں مگر پیار کے رشتے، اعتماد، محبت اور خلوص، اپنائیت کا یقین اور اعتبار، یہ ناجائز ذرائع سے حاصل نہیں ہوتے، بازار میں نہیں ملتے اور اسمگل کر کے نہیں لائے جا سکتے۔ آج میں ایک دوسری دنیا کا آدمی ہوں۔ ہم سب ایک خاندان ہیں تو میں اس کا ایک رکن ہونے پر فخر کرتا ہوں تم لوگ مجھ سے مذاق کرتے ہو تو مجھے وہ خوشی ملتی ہے جو پہلے کسی بدمعاش کو نیچا دکھا کے حاصل نہیں ہوتی تھی۔ میں تاریک راستوں کا مسافر تھا۔ تم نے مجھے اپنایا اور میرا ہاتھ تھام کے اپنے ساتھ رکھا۔ اب میں روشنی کو دیکھ سکتا ہوں۔ تم نے ایک اندھے کو منزل کی راہ دکھائی۔ کیا تمہارا یہ احسان کم ہے۔ کیا اس اطمینانِ قلب اور تسکینِ روح کا بدلہ میں سارے زمانے کی دولت دے کر بھی ادا کر سکتا ہوں جو مجھے آج میسر ہے، میں شہلا کا بھائی ہوں۔"

"میرے بھائی نہیں ہو؟" رالعبہ نے اسے ضرورت سے زیادہ جذباتی ہوتے دیکھ کر کہا۔

ٹیڈی ہنس پڑا۔ "ایک بہن کا بوجھ بھی کم نہیں ہوتا۔ تم بھی ڈال دو اس رشتے کا بوجھ مجھ پر۔ میرے دونوں کندھے خالی تھے کیونکہ میں کسی کا بھی نہیں تھا۔ اب دو بہنوں کا بھائی ہوں۔"

"لے بھائی محسن ایک نہ شد دو شد۔ ہم دونوں اب کیا کریں۔" میں نے کہا۔ "ساری خدائی ایک طرف...!"

"اور ہم دونوں ایک طرف۔" محسن نے مظلوم لہجے میں رقت کے ساتھ یوں کہا کہ سب بے اختیار ہنس پڑے۔

"اب دیکھو لڑکیو! تم یہاں بےکار وقت ضائع مت کرو۔" میں نے رالعبہ اور نازو کو ڈانٹا۔ "یہ کوئی شریفانہ لچھن نہیں ہیں کہ مردوں کے ساتھ بیٹھ کے جوان لڑکیاں گپیں کریں۔ جاؤ اپنا ہانڈی چولہا کرو۔ چائے بناؤ۔"

"چولہے میں گیا ہانڈی چولہا۔" رالعبہ نے کہا۔ "اپنا اپنا کام کرو سب، ہم نوکر نہیں ہیں کسی کے۔"

"ہاں — تم نوکر نہیں کنیز ہو۔" محسن نے کہا۔ "تو اے کنیزانِ خوبرو..."

"اپنے بھائی کے لیے ہی کچھ کر لو۔ قسم مولا علی کی، نہ جانے خالی پیٹ میں دم کیسے اٹکا ہوا ہے۔" ٹیڈی بولا۔

"اچھا بھئی، مجبوری ہے تو تمہارے لیے چائے بنا دیتی ہوں۔" رالعبہ بولی۔

"خواجہ صاحب، اپنی ہمشیرہ سے ہماری بھی سفارش فرمائیے۔ دیکھیے نا، رالعبہ کے رشتے سے سکندر تو ہوا آپ کا جیجا جی اور میں بھی شہلا کے رشتے سے ہوا آپ کا بہنوئی۔" محسن بولا۔

"بدتمیزی کی بھی حد ہوتی ہے۔" رالعبہ نے نازو کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا۔ "ایک سیر ہے تو دوسرا سوا سیر۔"

"ایک شیر ہے۔" محسن نے کہا۔ "تو دوسرا سوا شیر، تیسرا ڈیڑھ شیر۔"

"حساب کچھ یوں بنا نیک محمد کہ ایک سیر سونا تقریباً سولہ ہزار کا ہوا۔" میں نے کہا۔ "اور تمہاری بات کو سچ مانتے ہوئے ہم فرض کر لیں کہ صندوق میں تقریباً پندرہ سیر سونا ہے تو کل مالیت تقریباً ڈھائی لاکھ کے قریب ہو گی۔"

"ڈھائی لاکھ...؟" محسن نے یوں آنکھیں چڑھائیں جیسے ابھی چکرا کے پٹ سے بیہوش ہو کے گر پڑے گا۔ "لاکھ وہی ہیں نا جس میں سو ہزار ہوتے ہیں؟"

"تو نے اس سردار جی کی بات کی جو کرکٹ کا ٹیسٹ میچ دیکھ رہے تھے۔" میں نے کہا۔ "ایک پلیئر نے سنچری بنائی تو بہت شور مچا۔ سردار جی نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص سے ہنگامے کا سبب پوچھا۔ اس نے بھی کہا کہ سنچری اور نعرہ لگا کے ٹوپی اچھالنے لگا۔ سردار جی نے اسکور بورڈ کی طرف دیکھا اور پوچھا رن کتنے ہیں۔ ٹوپی اچھالنے والے نے کہا پورے سو سردار جی۔ سردار جی نے اطمینان سے سر ہلایا اور کہا۔ اچھا۔ سو کی رکھی تھی سنچری۔" اور خود بھی تالیاں بجانے لگے۔

"اپنی خاندانی تاریخ بعد میں سنانا۔" محسن بولا۔ "ہم یہ جانتے ہیں کہ انگشت بدنداں ہیں کہ چشم بد دور اپنے پیارے دوست خواجہ نیک محمد لکھ پتی ہیں۔"

"ظاہر ہے، یہ جھوٹ نہیں بول رہے ہوں گے کہ ان کا ایک روپے سیر بکنے والے ٹین کے صندوق میں دو سو روپے کا سونا بھرا ہوا ہے۔" میں نے کہا۔ "سوال یہ پیدا ہوتا ہے..."

"ایک سوال نہیں، بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "مثلاً یہ کہ سونا کیسا ہے؟"

"سونا خالص ہے۔" استاد ٹیڈی نے سادگی سے کہا۔

"میرا مطلب تھا کہ مالِ حرام ہے یا مالِ غنیمت، ہو کہ بعض صورتوں میں مالِ غنیمت کو حرام نہیں سمجھا جا سکتا اور لشکر میں اس کی تقسیم اسلامی تاریخ کے حوالے سے ثابت ہے۔ سونا ٹیڈی کے پاس کہاں سے آیا اور کب سے ہے؟ اس نے سونے کی حفاظت کرنا کیوں ضروری سمجھا؟ اسے ذاتی استعمال میں لانے سے کیوں پرہیز کیا؟ کیا یہ کسی کی امانت ہے؟ اگر امانت ہے تو اب ہمارے لیے اس میں خیانت... باقی سوالات میں حسبِ ضرورت ایجاد کروں گا۔"

"میں تمھیں اوّل سے آخر تک سب بتا دوں گا۔"

"حرام حلال اور جائز، ناجائز کا فیصلہ تم خود کر لینا۔" بولا۔

رالعبہ نے چائے کی ایک کیتلی ہمارے سامنے رکھی۔ سلور کی اس کیتلی میں صرف قہوہ تھا۔ چینی اور پاؤڈر کا دودھ نازو نے دو مگ بھر کے الگ رکھے۔ پھر چائے بھی مگ میں ڈال کے دی گئی اور میں نے دودھ ملائے بغیر استعمال کی۔ ہماری عدم موجودگی میں یہ تمام بندوبست استاد ٹیڈی نے کیا تھا۔ وہ کسی مقامی بیکری سے ایک کیک بھی لایا تھا اور خاصی مقدار میں انڈے، مکھن اور ڈبل روٹی بھی۔ سگریٹ کے کارٹن ہم لائے تھے۔ اس وقت زمین پر آلتی پالتی مار کے بیٹھے ہوئے اور چائے پیتے ہوئے میں نے سکون اور اطمینان کے احساس کی آسودگی کو محسوس کیا۔ یہ احساس وقتی اور عارضی تھا مگر پھر بھی اس دورِ مصائب و آلام میں بہت غنیمت تھا۔ بھلا گردشِ فلک کی چین دیتی ہے کسے انشا۔ غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں۔ مجھے مرحوم انشا اللہ خان انشا کی یہ بات بہت حسبِ حال لگی۔ کل ہم کہاں تھے، کل کہاں ہوں گے، اس کی آج کیوں فکر کریں اور اس کا ذکر بھی کیوں کریں۔ شاید میری طرح دوسروں کو بھی احساس تھا کہ اس وقت ہم سب ایک دوسرے کے ساتھ ہیں اور محفوظ ہیں۔ باہر کی دنیا کی دسترس سے دور ہیں اور جس حال میں بھی ہیں ایک دوسرے کی رفاقت، اس گوشۂ عافیت اور قناعت سے ملنے والے احساسِ طمانیت کی ساری خوشی ہماری ہے۔ بے شک اس وقت کوئی کسی سے بھی پوچھتا کہ اس لمحے ان کے دل کی وہ کون سی تمنا ہے جس کی تکمیل کی خاطر وہ ایسی ہزاروں خواہشوں کو قربان کر سکتے ہیں کہ ہر خواہش پہ دم نکلے۔ تو سب کا جواب یہی ہوتا کہ کاش وقت یہیں رک جائے۔ اس احساسِ تحفظ و طمانیت کو دوام عطا ہو اور پھر خواہ ساری عمر اسی گھر میں اسی حال میں گزر جائے۔

میں نے اور محسن نے سگریٹ جلائی تو مجھے سراج کی ماں یاد آئی۔ یہ اسی کے دیے ہوئے سگریٹ تھے۔ اپنے دشمن کے گھر کی مہمانی کا تجربہ بھی اس اعتبار سے منفرد تھا کہ ہم وہاں شامتِ اعمال کے باعث جا پھنسے تھے اور پھر تقدیر کی یاوری سے بخیر و عافیت نکل آئے تھے۔ "کیا جو کچھ سراج کے ساتھ ہوا، اس کی خبر بنے گی؟" محسن بولا۔

"اب چھوڑ دے یہ فکر کہ اخبار میں ہمارے متعلق کیا آتا ہے اور کیا نہیں آتا —" میں نے کہا۔ "ایک وقت آئے گا کہ ہمارے بارے میں خبروں کی سنسنی خیزی بھی نہیں رہے گی، کچھ اور زیادہ اہم سرخیاں توجہ کا مرکز بن جائیں گی۔"

"نازو خاموش ہے۔" محسن نے نازو کی اتری ہوئی صورت کو دیکھا۔ محسوس تو میں نے بھی یہی کیا تھا مگر اس کا ذکر کرنے سے گریز کیا تھا۔ وہ ہمارے ساتھ ضرور تھی لیکن ذہنی طور پر وہ عدم اطمینان اور اندرونی خلفشار کا شکار تھی۔ یہ ردِ عمل بالکل فطری تھا۔ ہم سب اپنے جذباتی رشتوں کی قید سے آزاد تھے۔ ہم میں سے صرف محسن کی ایک بہن تھی جو اپنے گھر میں شاد و آباد تھی اور جسے بھائی کی خبر ہی نہیں تھی۔ محسن کبھی کبھار اسے چند سطروں پر مشتمل خط ڈال کے اپنی خیریت سے آگاہ کرتا رہتا تھا۔ اگر اپنے والد یا اخبارات کی معرفت اسے ہماری غیر قانونی، باغیانہ اور خطرناک مصروفیات کی اطلاع ملتی تھی تو وہ رونے دھونے، ہمارے لیے دعائے خیر مانگنے اور صبر کرنے کے سوا کیا کر سکتی تھی اور خود محسن اس کے لیے خیریت کی جھوٹی اطلاع دینے پر قانع نہ رہتا تو کیا کرتا۔ محسن کے والد عملاً دنیا سے منہ موڑ چکے تھے اور آخری اطلاع کے مطابق وہ اپنی بیٹی اور داماد کے ساتھ تھے جو انھیں بڑے اصرار کے ساتھ لے گئے تھے۔ وہ بھی محسن کے لیے عملاً کچھ کرنے سے قاصر تھے اور محسن کا ہونا نہ ہونا ان کے لیے برابر تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے ان کا زندہ رہنا یا نہ رہنا محسن کے لیے ایک جیسے دکھ کا سبب تھا۔ میں، رالعبہ اور ٹیڈی خون کے ان رشتوں کی کسی زنجیر کے غلام نہ تھے مگر نازو نے ابھی ابھی سب رشتوں سے قطع تعلق کیا تھا۔

اس نے اپنے بھائی کو سب کے سامنے ذلیل کیا تھا اور وہ ماں باپ کو چھوڑ آئی تھی۔ اس کی طبیعت بلا کی جذباتی تھی اور یہ زندگی کے سب سے بڑے جذباتی فیصلے کا ردِ عمل تھا کہ وہ چپ تھی۔ اس پر مثبت اور منفی حقائق کا دباؤ تھا۔ عقل کے تقاضے مصلحت کو مدِ نظر رکھنے کے حق میں تھے تو دل کا فیصلہ جذبات کی صدا پر لبیک کہنے کے حق میں تھا۔ اگرچہ وہ دل کی بات مان چکی تھی مگر عقل اسے پریشان کر رہی تھی اور شاید اسے بار بار ان نتائج سے خبردار کر رہی تھی جو اس کی اپنے گھر سے وابستگی کی صورت میں برآمد ہوں گے۔ گھر کے رشتے جن کی جڑیں بچپن میں ہوش سنبھالنے کے زمانے سے بھی پہلے کے وقت تک پہنچتی ہیں، آسانی سے نہیں ٹوٹتے اور اگر ٹوٹتے ہیں تو آدمی کی شخصیت میں بہت شکست و ریخت کرتے ہیں۔ اسے ہماری طرح ہم جیسا بننے کے لیے ابھی کہیں زیادہ سخت سے سخت آزمائشوں کے جان لیوا مرحلے طے کرنے ہوں گے۔ میں نے بڑے ملال سے سوچا، کیا اس وقت تک وہ اپنے عہدِ وفا کو استوار رکھ سکے گی؟ ہم نے تو اسے بہت سمجھایا تھا کہ وہ اس راہِ پرخار میں ہمارے

ساتھ چلنے پر اصرار نہ کرے جہاں ایسے سخت مقام بھی آجاتے ہیں کہ پیروں کے ہر آبلے سے رسنے والے لہو کے ساتھ انگاروں پر بھی چلنا پڑتا ہے مگر اس نے اپنے دل کی بات مانی تو اس میں کسی کا کیا قصور۔

"تم نے میرے کسی سوال کا بھی جواب نہیں دیا ہے استاد۔" محسن نے کہا اور میں خیالات سے حقائق کی دنیا میں لوٹ آیا۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ اتنی دیر سے باقی سب لوگ بھی خاموش تھے مگر وہ منتظر تھے کہ استاد ٹیڈی ڈھائی لاکھ روپے سے زائد مالیت کے اس سونے کے بارے میں بات کرے جو آج تک ایک زنگ خوردہ اور پرانے صندوق میں بند اس کے گھر میں بے مصرف پڑا ہوا تھا لیکن میں نازو کو دیکھ رہا تھا۔ میری یہ حرکت غیر ارادی تھی۔ میرا ذہن اس کے مسائل میں الجھا ہوا تھا۔ چنانچہ میری نظر بھی اسی پر تھی اور وہ نظریں جھکا لینے کے بجائے میرے انہماک کو غور سے دیکھ رہی تھی۔

"تقسیم ہند کے وقت میں اپنے والدین کے ساتھ کشمیری بازار کے عقب میں رہتا تھا۔" ٹیڈی نے کہا۔ "میں اس کہانی کو بہت پیچھے سے اس لیے شروع کر رہا ہوں کہ تم سب لوگ میری زندگی کے حالات کو سمجھنے کے بعد جو فیصلہ کرو، وہ غلط نہ ہو۔ میں آج جو کچھ بھی ہوں، اچھا یا برا، استاد ٹیڈی ہوں یا خواجہ نیک محمد، انھی حالات کی وجہ سے ہوں۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں۔ ہر شخص اپنے حالات کے باعث ہی استاد ٹیڈی یا نیک محمد بنتا ہے۔ اس کی اپنی مرضی اور اس کے والدین کی خواہش کیا ہوتی ہے؟ اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ ایسے تو سارے ماں باپ ہی کہتے ہیں کہ اپنے بیٹے کو انجینئر اور بیٹی کو ڈاکٹر بنائیں گے۔ خود بچوں کے دماغ میں بھی کامیاب مستقبل ایک ایسا خواب ہو جاتا ہے جس کی تعبیر کو وہ اپنے اختیار کی بات سمجھتے ہیں۔ مگر بعد میں ماننا پڑتا ہے کہ جو کچھ کرتی ہے تقدیر کرتی ہے۔ کشمیری بازار والے گھر میں میری عمر تیرہ سال تھی۔ چنانچہ مجھے اس وقت کی ہر بات یاد ہے۔ مڈل کے امتحان میں مجھے وظیفہ ملا تھا۔ اس زمانے میں آٹھویں جماعت کے سالانہ امتحانات کو مڈل کا امتحان کہا جاتا تھا۔ میری ذہانت اور شرافت پر والدین ناز کرتے تھے جن کی میں واحد اولاد تھا۔ میری پیدائش کے وقت کوئی ایسی بات ہو گئی تھی کہ میری ماں کی زندگی خطرے میں پڑ گئی تھی اور ایک وقت ایسا بھی آگیا تھا جب ڈاکٹروں نے انتخاب میرے باپ پر چھوڑ دیا تھا کہ وہ جسے چاہے بچانے کی اجازت دے دے۔ ماں اور بچے میں سے ایک کی زندگی بچائی جا سکتی تھی اور میرے باپ نے صحیح فیصلہ کیا تھا۔ اس نے میری زندگی قربان کر کے اپنی بیوی کی ز... بچانے کا فیصلہ کیا تھا۔ بے شک اس نے مجھ سے بہت توقعات وابستہ کر رکھی ہوں گی مگر میرا وجود صرف ایک نو... تھا جبکہ بیوی اس کی شریک حیات تھی اور ایک زند... تھی۔ مجھ سے اس کی جذباتی وابستگی اتنی نہیں ہو سکتی تھی جو بیوی سے تھی۔ خیر بعد میں خدا نے کرم کیا کہ دونوں کو... کی لیکن ڈاکٹروں نے صاف بتا دیا کہ میرے بعد وہ کسی... ماں نہیں بن سکتی۔ ان حالات میں ماں باپ مجھ کو کتنا... رکھتے ہوں گے، اس کا اندازہ تم لوگ کر سکتے ہو۔ میرا باپ ہنرمند کاریگر تھا۔ وہ سونے کے ڈلے کو زیورات میں... تھا تو ان کا حسن اور نقش و نگار کی خوبصورتی لوگوں کو حیران... تھی۔ اس کے ہاتھ میں اتنی صفائی تھی کہ ماہر سنار اس کے... کے بنے ہوئے زیور کو ایک نظر دیکھ کر پہچان لیتے تھے۔ باکمال کاریگر کو کام کی کیا کمی ہو سکتی تھی۔ اسے معاوضہ بھی... تھا۔ اگر کوئی بات اس کو ناگوار گزرتی تھی تو وہ فوراً کام... دوسری جگہ چلا جاتا تھا جہاں اس کی آؤ بھگت بھی زیادہ... اور معاوضہ بھی بہتر مل جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس نے اپنا... سے اتنا بچا لیا کہ خود اپنی دکان چلا سکے۔ بعد میں پرانے... نے اسے بدنام کیا کہ وہ ڈنڈی مارتا رہا۔ جو زیورات... اس میں کھوٹ ملاتا رہا اور ماشہ ماشہ بچاتا رہا کیونکہ... کام لاتا تھا۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ میں یہ دعویٰ نہیں... میرا باپ کوئی بہت ایماندار اور پرہیزگار آدمی تھا۔ ا... میں سو فیصد ایمانداری سے کام کون کرتا ہے۔ زیادہ تر... ہندو ہی تھے۔ ان کی گڈول ہر کاروبار میں بہت اچھی... پیشے ہمارے ہاتھ میں آئے تو بدنام ہو گئے۔ میرے باپ... بھی نئے مالکوں کے ساتھ دو سال بڑی مشکل سے کا... میں میرے باپ نے اندرون بھاٹی گیٹ دکان کھولی... علاقے میں رہائش اختیار کی۔ اس کے کام کی شہرت... وہ چھوٹی سی دکان رفتہ رفتہ گاہکوں کی توجہ کا مرکز بننے... کام بڑھنے لگا۔ میرے باپ کو اس پیشے کے دوسرے... کے بارے میں معلوم تھا۔ اس نے پہلے ایک کاریگر کو... بہت اچھا معاوضہ دیا لیکن بات صرف معاوضے کی... فنکار عزت بھی مانگتا ہے خواہ وہ سنار ہو یا مجسمہ ساز... یا پتھر کو خوبصورتی تو اسی کے ہاتھ دیتے ہیں۔ میرے... نے اس کی قدر بھی کی اور اسے بھائیوں کی طرح سمجھا...

کاروبار اور پھیلا تو اس نے دوسرے کاریگر کو بلا لیا۔

"اس نے تمہیں اس پیشے میں اپنے ساتھ کیوں نہیں رکھا؟" میں نے موقع پاتے ہی کہا۔ "عموماً سنار بچپن ہی سے اولاد کو تربیت دیتے ہیں تاکہ وہ بڑی ہو کر ان کا ہاتھ بٹائے اور ان کے کاروبار کو چلا سکے۔"

"یہ اس کی جذباتی غلطی تھی۔" ٹیڈی نے سوچ کر کہا۔ "پیشہ کوئی برا نہیں ہوتا اور اگر وہ مجھے یہ کام سکھاتا تو آج شاید میں بھی اس کی طرح ایک ماہر کاریگر ہوتا —— اور زیادہ کامیاب رہتا مگر اس کی سوچ کا انداز عملی نہیں تھا۔ وہ بیوی سے کہتا تھا کہ میں اپنے بیٹے کو سنار نہیں، ڈاکٹر بناؤں گا۔ سنار کے پاس سونا ہوتا ہے، ڈگری نہیں ہوتی۔ اس کو پیسہ ملتا ہے لیکن وہ عزت نہیں ملتی جو ڈاکٹر، پروفیسر یا وکیل کو ملتی ہے، انجینئر یا سرکاری افسر کو ملتی ہے۔ وہ مجھے بہت پڑھانا چاہتا تھا۔ اتنا پڑھانا چاہتا تھا کہ عزت مجھے بن مانگے مل جائے۔ اس نے تہیہ کر رکھا تھا کہ پیسے کی مجھے کوئی کمی نہ ہوگی۔ وہ میرے لیے ...نا چھوڑ جائے گا کہ مجھے دولت کی آرزو ہی نہ رہے۔ میں صرف غریبوں کا علاج کروں اور سب شفا پانے والوں کی دعائیں لوں۔ وہ طے کر چکا تھا کہ جس دن میں ڈاکٹری شروع کروں گا، اسی دن وہ سنار کا پیشہ ترک کر دے گا۔ میں ایک ڈاکٹر کا باپ کہلانا پسند کروں گا اور اس کے کلینک میں کمپاؤنڈر کا کام بھی کروں گا تو بڑے فخر کے ساتھ۔ نہ جانے کیوں اس کے دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ سنار کی عزت نہیں ہوتی۔ خیر، میں بات کر رہا تھا کاروبار کے پھیلنے کی۔ تین سال بعد اس نے دکان کو مال روڈ پر منتقل کر دیا جہاں پہلے "سول اینڈ ملٹری گزٹ" اخبار کا دفتر ہوتا تھا، اس کے بالکل سامنے مال روڈ کے دوسرے کنارے پر۔ اس نے دکان تو مہنگی لی ہی تھی، اس کی آرائش پر بھی بہت پیسہ خرچ کیا۔ اندر شیشے کے سارے شوکیس آئینوں والے تھے اور جب خوبصورت روشنیاں جلتی تھیں تو اس آئینہ خانے میں کئی عکس نظر آتے تھے۔ دکان بہت بڑی اور بہت زیادہ بھری ہوئی لگتی تھی اور اندر قدم رکھنے والے کی آنکھیں اس چمک دمک سے خیرہ ہو جاتی تھیں۔ میں اس زمانے میں ایف ایس سی کے فرسٹ ایئر میں اسلامیہ کالج کا طالب علم تھا۔"

"تم... تم نے ایف ایس سی تک پڑھا ہے؟" رابعہ اپنی حیرت کے اظہار پر مجبور ہو گئی۔

ٹیڈی شرمندگی سے ہنسا۔ "ایف ایس سی کیا نہیں۔ امتحان دیتا تو فرسٹ ڈویژن ضرور لیتا۔ یہ میرا خیال ہی نہیں، میرے اساتذہ کا خیال بھی تھا۔ اس کے بعد کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں داخلہ بہت آسان تھا۔ تقدیر ساتھ دیتی تو میں اپنے ماں باپ کو کبھی مایوس نہ کرتا اور پانچ سال میں ان کو ڈاکٹر بن کے دکھا دیتا مگر تقدیر کو ایسا منظور نہ تھا۔ ایک سال میں دکان نے دن دونی رات چوگنی ترقی ...ور میرا باپ صف اول کے جیولرز میں شمار ہونے لگا۔ ہم کرشن نگر میں سوری بلڈنگ کے قریب ایک بہت بڑے مکان میں منتقل ہو گئے۔ اس گلی کے ایک کمرے والے مکان کو تم نے دیکھا ہی ہے جہاں میں اب رہتا تھا، ہمارا وہ گھر اس کوٹھری سے زیادہ دور نہیں تھا اور میں آتے جاتے اسے دیکھتا تھا۔"

"لیکن تم نے ہمیں کبھی نہیں بتایا۔" میں نے کہا۔

"بتانے سے کیا ہوتا۔ تم یقین نہ کرتے اور کر لیتے تو کون سا فرق پڑتا۔" وہ ایک سرد آہ بھر کے بولا۔

"تمہارے دل میں کبھی اس گھر میں لوٹ کر جانے کی ...اہش پیدا نہیں ہوئی؟" رابعہ نے کہا۔

"کیا تم اس گھر کو خرید نہیں سکتے تھے؟" نازو بولی

"کوشش کرتا تو ضرور خرید لیتا لیکن اس کے بعد میں وہاں رہ نہیں سکتا تھا۔" ٹیڈی نے کہا۔ "اس گھر میں صرف پرانی یادیں ہیں جو بہت تلخ ہیں۔ وہاں ہر چیز اجنبی ہے۔ رہنے والے ہی نہیں ...ھر کا سازوسامان تک نیا ہے۔ مکان کی صورت بھی وہ نہیں جو پہلے تھی۔ نئے مالکوں نے اسے نئے فیشن کی کوٹھی میں ڈھال دیا ہے۔ نہ جانے کیوں خوش قسمتی ہمیں راس نہیں آئی۔ ابھی نئی جگہ ...کاروبار کو سال ہی ہوا تھا کہ لاہور میں .... فسادات شروع ہو گئے۔ مذہبی اختلاف نے بہت جلد جنون کی صورت ...ختیار کر لی اور اس میں شرپسند عناصر غالب آگئے۔ غنڈہ گردی ...وٹ مار سے سن سینتالیس کا نقشہ سامنے آگیا اور عام لوگوں کے لیے جان و مال اور آبرو کی حفاظت مسئلہ بننے لگی۔ پیشہ ور... معاش ہر طرف دندناتے پھرتے تھے اور انھیں کسی کے ...نے سروکار نہیں تھا۔ وہ جسے چاہتے تھے، لوٹ لیتے تھے اور ...نواہوں پر دکانیں اور مکان نذر آتش کر دیتے تھے۔ نہ جانے ...ن نے پرانی دشمنی کا بدلہ لیتے ہوئے ہمارے بارے میں..... غلط باتیں پھیلا دیں اور... ایک مشتعل ہجوم نے دکان کو ...س گھس کر کے پہلے لوٹا اور پھر اسے آگ لگا دی۔ دشمنی کا ...ز م میں اس لیے لگا رہا ہوں کہ بات صرف دکان کی تباہی پر ختم نہیں ہوئی۔ کسی نے دکان لوٹنے والوں کو یہ بھی بتایا کہ ہم کہاں رہتے ہیں اور کچھ لوگ پورے انتظام کے ساتھ کرشن نگر پہنچے۔ انھوں نے وہاں بھی شرپسندوں کو اکسایا اور ہمارے گھر کو ...طرف سے گھیر لیا۔ ہم سوئے پڑے تھے۔ انھوں نے ہر طرف پٹرول چھڑک کے آگ لگائی اور فرار کے راستے بند کر دیے۔

آگ بڑی تیزی سے پھیلی۔ میں نے اپنے ماں باپ کے چلّانے کی آواز سنی۔ وہ مجھے پکار رہے تھے مگر میں اتنا بدحواس تھا کہ ان کی مدد کے لیے جانے کے بجائے اپنی جان کی فکر کی اور زینے سے چھت پر چڑھ گیا کیونکہ مجھے باہر نکلنے کا اور کوئی راستہ ہی دکھائی نہ دیا۔ آگ کے شعلے ہر طرف سے بھڑک رہے تھے۔ میں اپنے پاگل پن میں چھت سے نیچے کود گیا۔ میری ایک ٹانگ ٹوٹی لیکن زیادہ نقصان سر کی چوٹ سے ہوا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں گنگا رام اسپتال میں تھا اور مجھے اپنا نام تک یاد نہیں تھا۔ میں جل کر خاک ہونے سے بچ گیا تھا لیکن میری یادداشت ختم ہو گئی تھی۔ وہاں بڑے بڑے ڈاکٹر آتے تھے جو مجھ سے باتیں کرتے تھے، بڑی نرمی سے اور محبت سے۔ کچھ کہتے تھے کہ یہ ذہنی صدمے کا اثر ہے۔"

"تمھیں گنگا رام اسپتال کون لے گیا تھا؟" میں نے کہا۔

"یہی تو ڈاکٹروں کو معلوم نہیں تھا۔" ٹیڈی نے کہا۔ "تھا کوئی شیطانوں میں انسان۔ اس نے اتنا کیا کہ مجھے ہجوم سے نکال لیا ورنہ ممکن تھا کہ میں بھی مارا جاتا۔"

"کیا تمھیں یقین ہے کہ تمھارے والدین اندر ہی جل کر مر گئے تھے؟" رابعہ نے کہا۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تمھاری طرح وہ بھی جان بچانے میں کامیاب ہو گئے ہوں۔" محسن نے سر ہلایا۔

"یقین کے ساتھ میں کیا کہوں۔ اپنی آنکھوں سے میں نے ... دیکھا تھا۔" ٹیڈی بولا۔ "میں یہ جانتا ہوں کہ ان کے لیے باہر نکلنا ناممکن تھا۔ اگر کمرے کی کنڈی باہر سے لگا دی گئی ہو گی تو وہ اندر قید ہو گئے ہوں گے۔ دروازہ اتنا مضبوط تھا کہ وہ اسے توڑ کر باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ دوسری طرف کھڑکی تھی جس میں لوہے کی سلاخیں تھیں اور قاتلوں نے انھی سلاخوں میں سے پٹرول یا مٹی کا تیل اندر پھینکا تھا۔ میرے جسم پر بھی جلنے کے نشانات تھے مگر بہت معمولی اور ڈاکٹر ان سے کچھ اندازہ نہیں کر سکتے تھے۔ مجھے اسپتال پہنچانے والا کسی کو میرے متعلق کچھ بتائے بغیر بھاگ گیا تھا۔ اسے اپنی جان کا ڈر تھا یا وہ پولیس کی قانونی کارروائی کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔"

"تمھارے دوست، رشتے دار اور جاننے والے بھی تو ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "ان میں سے کوئی نہیں پہنچا؟"

"کیسے پہنچتا؟ کسی کو معلوم ہوتا کہ میں گنگا رام اسپتال کے جنرل وارڈ میں پڑا ہوا ہوں، تب ہی آتا نا۔" ٹیڈی نے کہا۔ "جس خدا کے بندے نے میری جان بچائی تھی یا تو وہ اجنبی تھا جو میرے دوستوں رشتے داروں کو جانتا ہی نہیں تھا۔۔۔"

"لیکن وہ تمھارے پڑوس کے لوگوں کو تو بتا سکتا تھا؟"

محسن بولا۔

"ہاں۔۔۔ اور اسی لیے میرا خیال ہے کہ وہ شخص ہم ...
ٹیڈی نے کہا۔ "کسی حادثے کا شکار ہوا یا اس کے ...
ایسی ہی افسوسناک واردات ہوئی۔ ویسے سب عزیز ...
واقفوں، دوستوں اور ہمسایوں کو یقین تھا کہ ہم میں ...
نہیں بچا ہو گا۔ مکان میں جو کچھ تھا جل گیا تھا۔"

"کیا کسی کی تدفین نہیں ہوئی تھی؟" میں نے سوال ...

"ہوئی تھی۔ بتلانے والوں نے بعد میں بتایا کہ دو ...
ہو جانے والی لاشیں جو پہچانی نہیں جاتی تھیں، ایک ...
گاڑ دی گئی تھیں۔" ٹیڈی نے کہا۔

"اس وقت کسی کو خیال نہیں آیا کہ گھر میں تین افراد ...
آیا ہو گا لیکن تفتیش کون کرتا اور رپورٹ کرنے کون ...
ٹیڈی نے کہا۔ "بعد میں حالات پر قابو پانے کے لیے ...
نافذ کرنا پڑا تھا۔ یہ مارشل لا صرف لاہور تک محدود تھا ...
اس وقت فوج نے شہر کا نظم و نسق بحال کیا تھا ...
پڑوس کے لوگوں کو یہ بھی امید ہو گی کہ میں لوٹ آؤں ...
حالات کے معمول پر آنے کے بعد بھی میرا کوئی سراغ نہ ...
سب نے یقین کر لیا کہ میں زندہ نہیں۔ میرا اپنا یہ حال تھا ...
دماغ میں خلا تھا۔ میری یادداشت ایک کورے کاغذ ...
ہو گئی تھی۔ میں اپنے متعلق ڈاکٹروں کو کچھ بھی نہیں بتا سکا ...
نے تین مہینے تک علاج کے علاوہ بھی سب کچھ کر کے ...
مگر انھیں مایوسی ہوئی۔ وہ آخر کب تک مجھے بستر پر لٹائے ...

"وہ تمھاری تصویر تو اخبار میں شائع کرا سکتے تھے ...

"یہاں وہ سب کون کرتا ہے جو ہونا چاہیے۔" ...
بولا۔ "مردہ خانوں میں جا کے دیکھو کتنی لاوارث لاشیں ...
ہیں۔ میرا خیال ہے وہ سب لاوارث نہیں ہوتے۔ دیہات ...
دور دراز مقامات سے آئے ہوئے لوگ ہوتے ہیں جو حادثہ ...
کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اب وارث خود ہی پولیس کو گمشدگی ...
رپورٹ لکھوائیں اور پھر تمام اسپتالوں میں پتا کرنے پہنچ ...
تو الگ بات ہے ورنہ کیسے پردا ہوتی ہے۔ نہ پولیس کو ...
اسپتال والوں کو، ورنہ ان کے بھی فوٹو اخبار میں دیے جا سکتے ...
جب میں بھاگا تھا تو رات کے کپڑوں میں تھا۔ میری جیب ...
کچھ بھی نہیں تھا جس سے میری شناخت ممکن ہوتی۔ ایک ...
مجھے اسپتال سے بھی فارغ کر دیا گیا اور میں لاہور کی سڑکوں ...
بھٹکتا پھرا۔"

"یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تمھاری یادداشت ...
بحال ہونے کے بعد۔۔۔ تمھیں یہ سب کیسے معلوم ہوا؟" میں ...

... میں بارہ سال تک یادداشت سے محروم رہا۔" ٹیڈی بولا۔ "... اس کے بعد دوسرا حادثہ پیش آیا۔ ایسا تو فلموں میں ہوتا ہے لیکن میرے ساتھ بالکل یہی ہوا۔ میری یادداشت اچانک چلی گئی تھی اور اچانک لوٹ آئی اور اس کے بعد بے خبری کے دور میں بھی جو کچھ میں نے کیا تھا، وہ سب مجھے یاد آ گیا۔ گنگا رام اسپتال سے نکلنے کے بعد لاہور میں ہی پھرتا رہتا تو اس بات کا امکان تھا کہ کسی دن کوئی جاننے والا مل جاتا اور مجھے شناخت کر لیتا مگر ہوا یہ کہ میں بے مقصد پھرتا ہوا اسٹیشن کی طرف چلا گیا۔ وہاں ایک گاڑی تیار کھڑی تھی۔ میں گاڑی میں بیٹھ گیا اور پشاور پہنچ گیا۔ اگر گاڑی آگے جاتی تو میرا سفر بھی جاری رہتا لیکن پشاور آخری اسٹاپ تھا۔ میری حالت دیوانوں جیسی تھی۔ میرے جسم پر وہی پرانے کپڑے تھے اور میں ننگے پاؤں تھا۔ مجھے ہاتھ منہ دھوئے بھی کئی دن ہو گئے تھے۔ میں نے اِدھر اُدھر سے مانگ کر پیٹ بھرا تھا۔ پشاور میں دو بار مجھے پولیس نے آوارہ گردی کرتے پکڑا اور تھانے میں بند کر دیا لیکن بہت جلد وہ مجھے چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ میں ان کے کسی کام کا نہ تھا۔ نہ میں مخبری کر سکتا تھا اور نہ وہ مجھ پر کسی قسم کا الزام تھوپ سکتے تھے۔ پہلی پیشی پر ہی مجسٹریٹ مجھے ذہنی مریض یا پاگل قرار دے کر فارغ کر دیتا۔ اسی طرح پھرتے پھراتے میں فقیروں کے ایک گروہ کے ہتھے چڑھ گیا۔ وہ مجھ سے پشاور کی سڑکوں پر بھیک منگواتے رہے اور میری ساری آمدنی اپنے پاس رکھتے رہے۔ عملی طور پر میں ان کا قیدی تھا۔ وہ اس بات کا خاص خیال رکھتے تھے کہ میں بھاگ نہ جاؤں۔ میں جوان اور صحت مند آدمی تھا اور لوگ مجھے بھیک کم دیتے تھے، طعنے اور گالیاں زیادہ دیتے تھے۔ وہاں ایک سے ایک بڑا فنکار تھا۔ کچھ آنکھوں والے اندھے تھے۔ کچھ ایسے بیمار بن کے نکلتے تھے اور یوں فٹ پاتھ پر پڑے رہتے تھے کہ لگتا تھا ابھی دم توڑ دیں گے۔ انھوں نے مجھے بھی لیپ پوت کے کوڑھی بنانا شروع کر دیا۔ وہ میرے چہرے اور پیروں پر نہ جانے کیا کچھ تھوپ دیتے تھے اور مجھے ارباب روڈ پر ہاتھ سے دھکیل جانے والی ایک گاڑی میں بٹھا کے چھوڑ جاتے تھے۔ مجھے دھکیل کر لانے والا ہٹا کٹا اور مشٹنڈا فقیر کرپا رام بلڈنگ کے سامنے ڈراما کرتا تھا مگر درحقیقت مجھ پر نظر رکھتا تھا۔"

"پھر وہاں سے تمھاری گلو خلاصی کیسے ہوئی؟" رابعہ نے بے صبری کا مظاہرہ کیا۔

"اللہ نے ایک نیک بخت کو اس کا سبب بنا دیا۔" ٹیڈی مسکرایا۔ "فقیروں کے ڈیرے پر عورتیں بھی تھیں۔ ان میں سے جو بوڑھی اور خرانٹ تھیں، وہ تو دوسرے مردوں کی طرح صبح ہوتے ہی کمائی کے لیے نکل جاتی تھیں۔ جوان ڈیرے کو سنبھالتی تھیں۔ وہ صرف فقیر ہی نہیں، بردہ فروش بھی تھے۔ ان کے پاس دس سال سے سترہ اٹھارہ سال تک کی لڑکیاں آتی تھیں، کچھ دن ان کی قید میں رہتی تھیں اور پھر اجنبی لوگوں کے ساتھ چلی جاتی تھیں۔ بعض اوقات ان کو باندھ کر یا نشہ پلا کے رکھا جاتا تھا اور سخت جسمانی اذیت دی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ وہ مزاحمت کرنا چھوڑ دیتی تھیں۔ ایک لڑکی ان کے ہاتھوں مر بھی گئی تھی۔ ایک نے خودکشی کر لی تھی۔"

"اور تم۔۔۔ تم یہ سب کچھ برداشت کرتے تھے! اپنے ساتھ بھی اور دوسروں کے ساتھ بھی؟" رابعہ نے کہا۔

"ہاں۔۔۔ میں ان سے ڈرتا تھا۔" ٹیڈی نے اعتراف کیا۔ "کیونکہ میں ان کا بہت ظلم برداشت کر چکا تھا۔ پولیس کو وہ باقاعدگی سے بھتہ دیتے تھے۔ چنانچہ ایک بار پولیس سے مدد مانگنے پر میری کھال ہنٹر مار مار کے اُدھیڑ دی گئی تھی اور مجھے الٹا لٹکا دیا گیا تھا۔ ایک خبیث، وقفے وقفے سے میرے زخموں پر نمک ملا گرم پانی ڈالتا تھا۔ ذہنی طور پر میں ان کی طاقت سے اتنا خائف تھا کہ خود کو بے بس سمجھتا تھا اور سب کچھ دیکھنے کے باوجود کچھ نہیں کرتا تھا۔ میری سب سے بڑی کمزوری میرا یہ احساس تھا کہ دنیا میں میرا کوئی بھی نہیں ہے۔ میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ میرے ماں باپ نہیں ہیں اور بھائی بہن نہیں ہیں۔ میرا خیال تھا کہ وہ مر چکے ہیں۔ اسی ڈیرے پر میرے سامنے نہ جانے کتنی لڑکیاں بک گئیں اور میں نے ان کی کوئی مدد نہیں کی۔ اپنی بزدلی پر آج شرم سے میرا سر جھک جاتا ہے۔ شاید میری ساری عمر اسی ڈیرے پر بیت جاتی مگر ہوا یہ کہ فقیروں کے سرغنہ کی بچی جو میری آمد کے وقت چھ سال کی تھی، کچھ سالوں میں جوان ہو گئی۔ خود میں سولہ سال کی عمر سے اٹھائیس سال کا ہو گیا اور نہ جانے کیا بات ہوئی کہ وہ مجھ پر مرنے لگی۔ بات یہ ہے سکندر بادشاہ کہ اپنی جوانی میں ہم بھی تم سے کم نہیں تھے۔"

اس کی بات نے ایک دم سب کو ہنسا دیا۔ "تم اب بھی کس سے کم ہو استاد۔" میں نے ہنستے ہنستے کہا۔ "بزرگوں میں تو شامل نہیں ہوتے۔"

"... سی سیریس لائف اسٹوری میں کیا زبردست رومانس آیا۔" محسن بولا۔

"بالکل پاکستانی فلم کہ ابھی ہیروئن زار و قطار گا رہی تھی کہ سین بدلا اور رنگیلا آ گیا۔" رابعہ نے کہا۔

"سنو یار سنو! ایسی دردناک کہانی ہے اور تم لوگ ہنس رہے ہو۔" محسن بولا۔ "ہاں استاد۔۔۔ تو پھر کیا ہوا؟ کچھ ہیروئن کے بارے

میں بتاؤ :

"کیا بتاؤں اس کے بارے میں" استاد ٹیڈی رنجیدہ ہو گیا۔ "اس نے ایک دن مجھے شرمندہ کیا۔ کہنے لگی، تم کو ذرا احساس نہیں ہوتا کہ یہ زندگی کتنی خراب ہے۔ بھیک مانگنا کوئی اچھی بات ہے، آدمی بے غیرت ہو جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ اب غیرت کا کیا سوال" وہ ناراض ہو گئی کہ مرد ہو کے خود کو بے غیرت کہتے ہو۔ جاؤ ڈوب مرو۔ میں نے سمجھایا کہ میں کتنا مجبور ہوں لیکن اس نے میری ایک نہیں مانی اور کہنے لگی کہ جوان آدمی ہر مجبوری سے نمٹ لیتا ہے۔ میں تو عورت ذات ہوں اور اس کے باوجود میں سوچتی ہوں کہ کچھ کروں۔ تم ہمت کرو تو میں تمھارے ساتھ ہوں۔ میں ڈرتا تھا مگر اسے جب بھی موقع ملتا تھا، وہ مجھے اکسانے آجاتی تھی۔"

"اکسانے یا ورغلانے؟" محسن نے کہا۔ ایک دفعہ پھر سب کے ہونٹوں پر ہنسی بکھر گئی۔

"جو چاہو سمجھو" ٹیڈی نے دانت نکال کے کہا۔ "آہستہ آہستہ وہ مجھے مجبور کرنے لگی کہ ہم دونوں کو یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ بڑی عجیب لڑکی تھی وہ۔ کسی فقیروں کے ڈیرے میں اتنی حسین لڑکی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ وہاں سب چیتھڑوں میں رہتے تھے۔ گدڑیوں میں سوتے تھے۔ غلیظ نظر آتے تھے مگر وہ صاف ستھرے کپڑوں میں ہوتی تھی۔ کچھ فقیر اس پر طعنہ بھی کس دیتے تھے کہ ہے فقیر کی بیٹی مگر رہتی ہے شہزادیوں کی طرح۔ اس کا باپ بڑا سخت گیر اور بے رحم تھا، اس لیے زیادہ نہیں بولتے تھے۔ بری نظر سے دیکھنے والے بھی زبان نہیں کھولتے تھے۔ تم لوگ پھر ہنسو گے مگر سچی بات یہ ہے سکندر بادشاہ کہ ہمیں وہ بالکل اس کی طرح لگتی تھی، فلمسٹار نیلو کی طرح۔ ویسا ہی رنگ روپ بھی تھا اس کا اور میں بھی اسے دیکھتا ضرور تھا مگر ہمت مجھ میں بھی نہیں تھی کہ اس سے بات ہی کر سکوں۔ جب خود اس نے بات کی تو یوں سمجھو کہ میری ساری بزدلی ختم ہو گئی۔ ہم روز ملنے لگے اور چھپکے چھپکے ہم نے فرار کا پورا منصوبہ بنا لیا۔ وہ لڑکی جاہل تھی لیکن ذہانت میں کم نہ تھی۔ اس نے ہی سب طے کیا کہ ہمیں کیا کرنا ہوگا۔ وہ موقع پاتے ہی نوٹوں سے بھرا ہوا تھیلا نکال لائے گی۔ اس کے باپ نے بہت سے نوٹ تکیے کے غلاف میں بھر رکھے تھے اور اسے سرہانے رکھ کے سوتا تھا۔"

"نام تو بتا دو اس کا۔ یا نام لینے کی ہمت بھی نہیں پڑتی تھی؟" محسن بولا۔ "آپا جی کہتے تھے؟"

"فاطمہ تھا اس کا نام" ٹیڈی نے سب کی ہنسی کے درمیان کہا: "فاطمہ نے کہا کہ اسے کچھ اندازہ نہیں کہ تکیے میں کتنی رقم ہوگی مگر جتنی بھی ہے کافی ہے۔ ہم یہاں سے نکلیں گے تو سب فقیر شہر کے کونے کونے میں ہمیں تلاش کریں گے۔ پولیس ان کی مدد کرے گی اور ہم کو ہر بس اسٹاپ پر اور ریلوے اسٹیشن پر پکڑنے جائے گی۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم رات کو نکلیں۔ وہ سب نو بجے تک اتنا غفیل ہو جاتے تھے۔ کچھ نشے میں اور کچھ دن بھر کی تھکن کے بعد جلدی سو جانا ضروری سمجھتے تھے۔ خیبر میل وہاں سے رات کو دس بجے روانہ ہوتی تھی۔ فاطمہ کا خیال تھا کہ اگر ہم دس بجے خیبر میل سے نکلے تو رات کو ڈھائی بجے پنڈی جا اتریں گے۔ راولپنڈی بہت بڑا شہر ہے اور رات کے ڈھائی بجے سے صبح ہونے تک ہمیں چھپنے کے لیے کافی وقت مل جائے گا۔ یہاں ہماری گمشدگی سے صبح تک کھلبلی مچے گی مگر اس وقت ان کے فرشتے بھی ہم تک نہ پہنچ سکیں گے۔ فاطمہ نے ہی مجھے سمجھایا کہ میں نے ہمت نہ کی تو خود بھی تمام عمر اسی جہنم میں رہوں گا اور اس کو بھی کسی فقیر کے پلّے باندھ دیا جائے گا۔ اس سے بھی بھیک منگوائے گا اور اس کے بچوں سے بھی۔ اس نے کہا کہ ہم بعد میں کسی گاؤں کے مولوی کے پاس جا کے سب کچھ بتا دیں گے اور شادی کر لیں گے۔ رفتہ رفتہ اس کی باتوں سے میرا دل بڑا ہو گیا۔ محبت آدمی کو کیا سے کیا بنا دیتی ہے۔"

"سچ کہتے ہو بھائی" محسن نے ایک سرد آہ بھری۔ "ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے" اور میری طرف دیکھا۔

"آپ تو کبھی آدمی نہیں تھے" میں نے کہا۔ "اور ہم ہمیشہ آدمی رہیں گے۔"

"اچھا۔ گویا آپ انکار کر رہے ہیں کہ کبھی شوہر نہیں ہوں گے" محسن نے آنکھیں نکال کے کہا اور فوراً دور کھسک گیا۔

"تمھارے والد ماجد بھی ایک شوہر تھے" میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "مگر کیا تو آدمی کا بچّہ نہیں ہے؟"

"افوہ۔ تم دونوں بھی مصیبت ہو۔ شروع ہو گئی اب دونوں کی کائیں کائیں" رابعہ نے ہمیں ڈانٹا۔ حالانکہ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور نازو اسے بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ "آگے چلو بھائی نیک محمد۔"

"ایک رات خدا نے ہمیں موقع دیا۔ فاطمہ کا باپ چرس کا دم لگا کے غافل ہو گیا تھا اور اس کی ماں بخار کی وجہ سے لپیٹ کر پڑ گئی تھی۔ باہر بارش ہو رہی تھی۔ فاطمہ نے کہا کہ اس سے اچھا موقع ہاتھ نہیں آئے گا۔" ٹیڈی بولا۔ "اس نے باپ کے سر کے نیچے سے نوٹوں والا تکیہ کھسکایا اور مجھے پکڑا دیا۔ میں بری طرح کانپ رہا تھا۔ کچھ سردی سے اور کچھ خوف سے۔ اس نے کہیں سے ایک پلاسٹک اٹھایا اور ہم دبے پاؤں باہر نکل آئے۔

ہم نے بھاگنا شروع کیا۔ فقیروں کا ڈیرا شہر سے باہر تھا۔ باہر نکلتے ہی، ہم نے بھاگنا شروع کیا۔ کینٹ اسٹیشن تک کا فاصلہ کسی طرح بھی دو میل سے کم نہیں تھا۔ یہ پورا راستہ ہم نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر طے کیا۔ ہمارے پیر کیچڑ میں بھر گئے اور کپڑے پانی میں شرابور ہو گئے لیکن ہم نے اس تکیے کو بھیگنے سے محفوظ رکھا۔ میں ٹکٹ لینے گیا تو میری حالت غیر ہو رہی تھی۔ خیبر میل کی روانگی میں دس منٹ رہ گئے تھے، جب ہم ایک کمپارٹمنٹ میں گھس گئے۔ ایک بڈھے نے بڑی شفقت کا ثبوت دیا اور فاطمہ پر اپنا کمبل ڈال دیا۔ سفر مشکل سے چار ساڑھے چار گھنٹے کا تھا۔ جب ہم آدھی رات کے بعد راولپنڈی کے اسٹیشن پر اترے تو غضب کی سردی پڑ رہی تھی۔ ہمارے کپڑے بالکل خشک نہیں ہوئے تھے چنانچہ مجھے ڈر تھا کہ کہیں فاطمہ بیمار نہ پڑ جائے۔ ہم باہر نکلتے تو خالی ہاتھ سڑک پر پھرتے ہوئے پکڑے جاتے اور ہمارا تمام سرمایہ جو تکیے میں تھا، پولیس ضبط کر لیتی۔ میں نے رات پلیٹ فارم کے مسافر خانے میں گزارنے کا سوچا اور فاطمہ کو کئی مرتبہ گرم چائے لاکر پلائی۔ وہ بار بار کہتی تھی کہ یہاں سے نکل چلو۔ بالآخر میں نے فاطمہ کے ساتھ ریلوے لائن پر چلنا شروع کیا۔ کچھ آگے لکڑی کا ایک کیبن سا تھا۔ اندر لالٹین جل رہی تھی اور بستر بچھا ہوا تھا مگر کیبن خالی تھا۔ میں نے بڑی پھرتی سے بستر سمیٹا اور کندھے پر رکھ کے بھاگا۔ فاطمہ نے میرا ساتھ دیا۔ ہم نے ایک باڑ عبور کی اور خود کو سڑک پر پایا۔ ذرا آگے مال گودام تھا۔ میں نے اس کی بیرونی دیوار کے ساتھ فاطمہ کو بستر میں لپیٹ کر لٹا دیا اور خود بھی کونے میں دبک گیا۔ نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔ سورج نکل آنے کے بعد ایک پولیس والے نے میرے لات رسید کی تو میں جاگا۔ ہمارے آس پاس دوسرے لوگ بھی کھڑے تھے اور ہمیں مشتبہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ہم پولیس والے کے کسی سوال کا جواب اطمینان بخش نہ دے سکے اور وہ ہمیں تھانے لے گیا۔ راستے میں میں نے فاطمہ سے کہا کہ کیوں نہ اسے کچھ دے دلا کر معاملہ ختم کریں۔ فاطمہ نے انکار کر دیا اور پولیس اسٹیشن جانے کو ترجیح دی۔ پولیس اسٹیشن میں اس نے اپنا پورا بیان لکھوایا جو تمام اس کے باپ کے خلاف تھا۔ تھانیدار تو ہمیں معاملات کی تصدیق تک حوالات میں بند رکھنے پر آمادہ تھا لیکن ہماری خوش قسمتی کہ وہاں تھانیدار کا باپ بیٹھا تھا۔ وہ صورت سے نیک دل اور مہربان لگتا تھا اور اس کے کہنے پر تھانیدار نے ہمیں ایک ماتحت کے گھر بھیج دیا۔ تھانیدار نے کہا کہ یہ معاملہ تو لمبا جائے گا۔ پنجاب کی پولیس، سرحد کی پولیس سے رابطہ قائم کرے گی وہ چھاپا مارنے کا انتظام کریں گے اور اس کے بعد جب سارے ملزم گرفتار ہو جائیں گے تو مقدمہ درج ہونے سے پہلے ہمیں سب کی شناخت کرنا ہوگی۔ تھانیدار کے بزرگ والد کے خیال میں ہم مظلوموں کو اتنا عرصے حوالات میں رکھنا مناسب نہیں تھا۔ جس ماتحت پولیس والے کے ساتھ ہمیں بھیجا گیا تھا وہ حوالدار تھا اور تھانے کی حدود میں ہی رہتا تھا۔ فاطمہ بڑی چالاکی سے تکیے کو بچائے رکھنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ بستر اور تکیے کے علاوہ ہمارے پاس کپڑوں کا ایک بکس تھا جو کوئی رات کو لے گیا۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ فی الحال ہم خود کو میاں بیوی ظاہر کریں گے۔ میں اس کی ہر بات مانتا جا رہا تھا مگر بہت ڈر رہا تھا کہ اب نہ جانے معاملات کیا رخ اختیار کریں گے اور اس سے کتنی پیچیدگیاں پیدا ہوں گی مگر فاطمہ بہت پُر امید تھی۔ حوالدار کے گھر میں کپڑے بدلنے اور کھانے کے بعد فاطمہ نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ حوالدار کی بیوی کھانے کے بعد سو گئی تھی۔ فاطمہ نے اس کا برقع اوڑھا، باہر سے دروازے کی کنڈی لگائی اور پچھلی طرف سے ہم دونوں فرار ہو گئے۔ تکیے میں بھری ہوئی رقم ہمارا بہت بڑا سہارا تھی۔ ہم نے بازار سے کپڑے جوتے اور ایک صندوق خریدا اور لباس کے ساتھ ہی ہمارا حلیہ بالکل تبدیل ہو گیا۔ شام تک ہم کرائے کا ایک مکان تلاش کرنے میں بھی کامیاب ہو گئے لیکن میں نے فاطمہ کو صاف بتا دیا کہ دنیا کے سامنے ہم میاں بیوی ہوں گے مگر ایک دوسرے کے سامنے نہیں۔ ہم اس وقت تک ایک دوسرے کے لیے نامحرم ہیں جب تک ہمارا نکاح نہیں ہو جاتا۔ خدا گواہ ہے کہ میں نے آخری وقت تک اس عہد کو نبھایا۔ اگلے دو تین دن تک ہم نے اخبار میں کوئی ایسی خبر نہیں دیکھی جس سے فقیروں کے کسی بردہ فروش گروہ پر چھاپا پڑنے کا ذکر ہوتا۔ غالباً تھانیدار نے معاملہ گول کر دیا۔ اس نے ماتحت کو سخت بے عزت کیا ہوگا۔ ماتحت نے بیوی کی گوشمالی کی ہوگی۔ تھانیدار نے والد ماجد کو اس کوتاہی کا ذمے دار ٹھہرایا ہوگا۔ ہم سب سے بے نیاز اپنا گھر بنانے میں لگے رہے۔ ہم نے برتن خریدے اور گھر کا تھوڑا بہت دوسرا سامان۔ یہ بتانا تو میں بھول ہی گیا کہ اس تکیے میں سے سینتالیس ہزار کی رقم نکلی تھی مگر ہم بہت محتاط تھے۔ ہمارا مالک مکان بھی ایک سبزی فروش تھا جس نے مجبوری کے تحت اوپر والا کمرا ہمیں پچاس روپے مہینہ پر دے دیا تھا۔ میں یہ ظاہر کرتا تھا کہ صبح مزدوری کے لیے جاتا ہوں اور شام تک لوٹ آتا ہوں اور ہم جو کچھ خرچ کر رہے ہیں، وہ اپنی بچت میں سے کر رہے ہیں۔ ایک ہفتے بعد میرے لیے فاطمہ کے ساتھ اس کے اتنے قریب اور اس سے اتنا دور رہنا مشکل ہو گیا۔ میں

نے ایک چھوٹی سی مسجد کے مولوی صاحب سے بات کی اور اس سے تھوڑا سا جھوٹ بھی بولا۔ میں نے اس سے کہا کہ میں ایک ہندو لڑکی کو مشرف بہ اسلام کر کے اس سے عقد کرنا چاہتا ہوں۔ چونکہ لڑکی کے گھر والے اس پر تیار نہیں، اس لیے لڑکی اکیلی آئے گی اور کلمہ پڑھ لے گی۔ مولوی صاحب مان گئے۔ انھوں نے نکاح پڑھانے کے دو سو لیے اور "روپ متی" کا نام فاطمہ رکھا گیا۔ اللہ مجھے معاف کرے، میں نے بدنیتی سے کچھ نہیں کیا تھا بے شک وہ دلوں کے بھید جانتا ہے اور نیتوں کا حال بھی وہ جانتا ہے کہ ہم نے کوئی گناہ نہیں کیا بلکہ جو کچھ کیا، گناہ سے بچنے کے لیے کیا۔ اس روز فاطمہ میری بیوی بن گئی اور میں نے خود کو دنیا کا سب سے خوش قسمت آدمی تصور کیا۔ ہم نے چھ مہینے بڑے سکون سے گزارے اور وہ میری زندگی کا سب سے خوبصورت زمانہ تھا جس کی یاد آج بھی مجھے خون کے آنسو رلاتی ہے پھر فاطمہ اُمید سے ہوئی اور ہم نے وہ سب باتیں کیں جو میاں بیوی پہلی اولاد ہونے سے پہلے کرتے ہیں ابھی خوابوں کی تعبیر ملنے میں تین مہینے باقی تھے کہ دشمن ہمیں تلاش کرتے ہوئے آپہنچے۔

اس دن مجھے اٹک آئل کمپنی میں ملازمت مل گئی تھی اور میں گھر پہنچا تو بہت خوش تھا۔ اب ہم اپنی غربت اور سختی کو خیرباد کہہ سکتے تھے۔ بڑے اور زیادہ آرام دہ مکان میں منتقل ہو سکتے تھے اور گھر کو صحیح معنوں میں گھر بنا سکتے تھے۔ اب ہم مالِ غنیمت کو خرچ کرنے کا جواز پیش کر سکتے تھے۔ ایک محنت مزدوری کرنے والا ٹھاٹ سے نہیں رہ سکتا مگر ایک کلرک رہ سکتا ہے۔ لوگ فرض کر لیتے ہیں کہ اس کے پاس ناجائز آمدنی کے ذرائع ہوں گے اور حسد کرنے یا صبر کرنے کے علاوہ کچھ نہیں کرتے۔ میں گھر پہنچا تو فاطمہ سارے دروازے بند کیے بیٹھی تھی اور میرے لیے بھی اس نے دروازہ کئی بار کی تصدیق کے بعد کھولا۔ فاطمہ کا رنگ زرد تھا اور اس کی آنکھوں میں وحشت تھی۔

"یہ کیا ہوا ہے تمھیں؟" میں نے اس کی حالت دیکھ کر کہا۔ "پاگل تو نہیں ہو رہی ہو؟"

"تم کو نہیں معلوم۔۔۔" وہ کانپتے ہوئے بولی۔ "آج میں نے اسے دیکھا ہے۔۔"

"کسے دیکھا ہے؟ جن بھوت کو یا ملک الموت کو۔۔؟" میں نے جھنجھلا کے کہا۔ اسے خوشخبری سنانے کا سارا جوش ٹھنڈا پڑ جانے سے مجھے مایوسی ہوئی تھی۔ پھر میں نے اسے پلنگ پر بٹھا دیا اور اس کا برف جیسا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"وہ ملک الموت ہی ہے۔ وہ نیچے کھڑا تھا اور جب میں نے کھڑکی کھولی تو وہ مجھے گھورتا رہا۔ میں اتنی ڈر گئی کہ ایک دم پیچھے بھی نہ ہٹ سکی۔" وہ لرزتی ہوئی آواز میں "اور جب میں نے پیچھے ہٹ کر کھڑکی بند کی ہو چکی تھی۔ وہ مجھے اچھی طرح پہچان گیا تھا، کیونکہ وہ مسکرا اور اس کی مسکراہٹ بہت خطرناک تھی۔ پھر وہ چلا گیا کے بعد شام ہوتے ہی وہ دوبارہ نمودار ہو گیا تھا۔ میں نے تو وہ اسی جگہ موجود تھا۔"

"آخر اس کا کوئی نام بھی ہوگا۔" میں نے ضبط لیتے ہوئے نرمی سے کہا۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ ہسٹریا میں بیگانگی کی حد تک نہ جا پہنچے۔

"میرا باپ چاہتا تھا کہ میری شادی اس سے ہو" بولی۔ "پہلے وہ کام چور تھا۔ میرے باپ نے شرط رکھی بھر تک سو روپے روز لا کے دو، تو بات کروں گا۔ دس مہینے وہ سو کی جگہ ایک سو دس ہر شام میرے باپ کے ہاتھ پر رکھتا رہا"

"ایک سو دس روز کے؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "یہ کے تین ہزار تین سو۔ دس مہینے میں تینتیس ہزار۔"

"ہاں۔ اپنے آدھے بھی وہ میری خاطر میرے باپ کو رہا تھا۔" وہ بولی۔ "اور ظاہر ہے اس کی شرط کو تقریباً پورا چکا تھا۔"

"آخر وہ یہاں تک کیسے پہنچا؟" میں نے کہا۔ "ضرور تمھیں دھوکا ہوا ہے۔ اس سے ملتا جلتا ہوگا کوئی۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو۔ اسے میں نہیں پہچانوں گی تو پہچانے گا۔" وہ بولی۔

"لیکن ہمارے اس ٹھکانے کا تو پولیس کو بھی علم نہیں وہ ہمیں پہلے پکڑتے۔" میں نے کہا۔

"پولیس اس کیس کو بھول چکی ہے۔ میرا باپ مجھے نہیں ہوگا اور تمھیں بھی۔" فاطمہ نے کہا۔ "فقیروں کے آپس میں خفیہ قسم کے تعلقات ہوتے ہیں۔ اس نے یہاں کے فقیر ہمارے پیچھے لگا دیا ہوگا۔"

"مگر ہم تو اب فقیر نہیں ہیں۔ تلاش کرنے والے مخصوص ٹھکانوں پر ہی جا سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"افوہ۔ تم عقل سے بالکل پیدل ہو۔" وہ بولی۔ "فقیر کھڑے کہاں ہوتے ہیں۔ اہم شاہراہوں پر، بارونق بازاروں میں، اسپتالوں کے دروازوں پر، چوراہوں پر اور ہر ایسی جگہ پر سے سب گزرتے ہیں۔ تم کو کسی نے دیکھ لیا ہوگا۔ پھر تمھیں نہیں چلا اور تمھارا پیچھا کرتا ہوا کوئی یہاں تک آ گیا۔"

"ہوں۔ یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔" میں نے متفکر

کہا: "گزشتہ دنوں میں کچھ زیادہ ہی پھرتا رہا ہوں میں۔ کام کی تلاش میں بھی اور بازار آنا جانا بھی رہا ہے۔"

"بس اب جیسے بھی ہو یہاں سے نکل چلو۔ اسی وقت۔" وہ بولی۔

"اسی وقت؟ اس وقت کہاں جائیں گے؟" میں نے کہا۔ "دوسرا مکان تو تلاش کریں۔"

"مکان مل جائے گا ڈھونڈنے سے۔ ان کے آنے سے پہلے نکل جانا اچھا ہے۔" وہ بولی۔

"ایسے تو مالک مکان بھی ہمیں نہیں بھاگنے دے گا۔" میں نے کہا۔ "اسے ایک مہینے کا نوٹس نہ سہی کرایہ تو دے دیں۔"

"تو جاؤ ابھی دے دو۔ تمھارے پاس پیسے کی کمی تو نہیں ہے۔ وقت کم ہے۔" وہ بولی۔

"خدا کے لیے کچھ ہمت سے کام لو۔ مجھے کچھ سوچنے دو۔" میں نے کہا۔ "تم تو مجھے بھی نروس کر رہی ہو۔ اب تو رات ہو گئی ہے۔"

"رات کے اندھیرے میں ہمیں دیکھنے والا کوئی نہیں ہوگا۔"

"اور ہوا تو ہم اسے نہیں دیکھ سکیں گے۔ وہ چل پڑے گا ہمارے پیچھے۔" میں نے کہا۔ "رات کو خالی مکان بھی نظر نہیں آتے اور یوں سامان سمیت پھرنے والے کو مکان ملتا بھی نہیں، صبح دیکھیں گے۔"

"صبح۔" وہ سپاٹ اور کھوکھلے لہجے میں بولی۔ "صبح تو بہت دور ہے۔ صبح تک نہ جانے کیا ہو جائے۔"

"سب تمھارا وہم اور خوف ہے۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "ایک رات میں قیامت نہیں آ جاتی۔ کھڑکیاں دروازے سب بند کر کے سوئیں گے۔ مالک مکان کی عادت کو تم جانتی ہو۔ وہ خود سونے سے پہلے سارے دروازے مقفل کرتا ہے۔ صبح میں تم کو اکیلا چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ ہم دونوں کل مکان تلاش کریں گے۔ حالانکہ کل پہلا دن تھا اور مجھے ڈیوٹی پر پہنچنا تھا۔"

"ڈیوٹی۔ تو کیا تمھیں نوکری مل گئی ہے؟" وہ خوش ہو کے اپنا سب خوف بھول گئی۔

"ہاں۔ تم نے مہلت ہی نہیں دی۔" میں نے کہا۔ "ورنہ میں تو گھر میں قدم رکھتے ہی تمھیں یہ خوشخبری سنانا چاہتا تھا۔"

"ایک خوشخبری تو میرے پاس تھی۔ فیصلہ کر لو، کس کی خوش خبری بڑی ہے۔" اس نے میرے کان کے قریب سر لا کر سرگوشی کی۔ میں نے خوشی سے ایک چیخ ماری اور فوراً تسلیم کر لیا کہ اس نے جو خوشی کی خبر سنائی ہے، وہ انمول ہے۔ میری نوکری تو صرف تین سو روپے مہینہ کی تھی۔ اس کا ہمارے ہونے والے بچے کی زندگی اور اس کے مستقبل اور اس کے وجود سے وابستہ ہماری خوشیوں کی قیمت سے کیا مقابلہ۔ میرے تسلی دینے اور بہلانے پر وہ ایک رات کے لیے رک گئی۔ میں رات کو ہی مٹھائی لینے گیا اور میں نے دو ڈبے مالک مکان کے گھر میں بھی دیے۔ وہ بڑا حیران ہوا کہ دو ڈبے کیوں۔ میں نے اسے دُہری خوشخبری سنائی تو وہ نیک دل آدمی بھی خوش ہوا جس کے گھر میں ہمیں کوئی تکلیف نہیں تھی اور جس کا رویّہ ہمارے ساتھ بزرگوں کی طرح مشفقانہ تھا لیکن فاطمہ کے اندیشے درست ثابت ہوئے۔ اس نے ٹھیک کہا تھا کہ صبح تک نہ جانے کیا ہو جائے۔ ہم آپس کی باتیں کرتے نہ جانے کتنی دیر تک جاگتے رہے تھے۔ میری آنکھ عجیب سے شور کو سن کر کھلی۔ یہ شورِ قیامت میں نے پہلے بھی سنا تھا۔ میرے ذہن نے اس کو تحت الشعور کے گہرے مدفن میں دبا دیا تھا۔ مجھے پاگل ہونے سے بچانے کے لیے میرے دماغ نے یہ چال چلی تھی کہ ایک ذہنی صدمے کی شدت کا ہر نقش مٹا دیا تھا۔ دوسری بار اسی حادثے کا پیش آنا ایسا ہی تھا جیسے کوئی اوپر سے مندمل ہو جانے والے زخم کو نوکِ خنجر سے چیر دے۔ میں دہشت سے چیخ مار کے اٹھا اور دروازے کی طرف لپکا مگر دروازہ باہر سے بند تھا۔ نیچے سے مالک مکان کے چیخنے چلّانے کی آواز آ رہی تھی اور اس کے بیوی بچے آہ و بکا کر رہے تھے لیکن ان کے لیے بھی فرار کے راستے بند ہو چکے تھے اور پورے مکان کو آگ نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اس رات ہوا بھی نہیں چل رہی تھی کہ آگ اتنی تیزی سے پھیل جاتی۔ وہ آگ اس طرح لگائی گئی تھی کہ ایک دم بھڑک اٹھے اور ہر طرف پھیل جائے۔ دھواں تیزی سے کمرے میں بھر رہا تھا اور آگ کے شعلوں کی زبانیں چھت کی کڑیوں تک پہنچنے لگی تھیں۔ اندیشہ یہ تھا کہ چند منٹ میں ہمارا دم گھٹ جائے گا اور اگر ہم بیہوش ہو کے گر گئے تو جلی ہوئی چھت ہمارے اوپر گرے گی اور صبح ہماری کوئلہ لاشیں اسی طرح ملبے سے نکلیں گی جیسے میرے والدین کی لاشیں نکلی تھیں۔ میں نے فاطمہ کو صبر اور حوصلے سے کام لینے کی تلقین کی اور گلی میں کھلنے والی کھڑکی کو دیکھا۔ اس کی اونچائی کم سے کم بارہ فٹ تھی لیکن اس وقت زندگی اور موت کے درمیان یہی بارہ فٹ حائل رہ گئے تھے۔ کھڑکی سے کود جانا خطرناک بھی ہو سکتا تھا اور مہلک بھی۔ مگر کمرے میں ٹھہرنا تو خودکشی کے مترادف تھا۔ میں نے ایک نظر کمرے میں ڈالی۔ پلنگ کی پائنتی سے بندھی ہوئی رسّی کو کھولنے کے لیے وقت نہ تھا۔ پلک جھپکتے میں میں نے فاطمہ کو اٹھا کے کندھے پر ڈال لیا۔ میری اس وقت کی ذہنی کیفیت بہت عجیب تھی جسے میں آج

بیان کرنا چاہوں تب بھی نہیں کرسکتا۔ میرے کانوں میں جو شور گونج رہا تھا، وہ کچھ اور تھا۔ میرے دماغ میں اپنے والدین کی چیخوں کی آواز آرہی تھی۔ وہ مجھے میرا نام لے کر پکار رہے تھے۔ یہ مالک مکان کے بیوی بچوں کی چیخ و پکار سے بالکل الگ آوازیں تھیں اور اتنی واضح تھیں کہ ایک بار میں نے چلّا کے جواب بھی دیا اور کہا۔ ”میں آرہا ہوں۔“ اس وقت میرا وجود دو حصّوں میں بٹ گیا تھا۔ میری دوسری شخصیت جو بارہ سال تک مجھ پر حاوی رہی تھی، میری اصل شخصیت سے مغلوب ہو رہی تھی۔ میں پھر وہی بن رہا تھا جو تھا لیکن یہ انقلاب رفتہ رفتہ آرہا تھا۔ میں اپنے ماضی کی طرف لوٹ رہا تھا لیکن حال سے بے خبر نہیں تھا۔ میں نے فاطمہ کو اٹھا کے کھڑکی کا رخ کیا۔ پہلے اپنے پیر باہر لٹکائے پھر توازن قائم رکھتے ہوئے دہلیز پر بیٹھ کر فاطمہ کو باہر نکالا جو بیہوش ہوچکی تھی، خوف سے یا دم گھٹنے سے۔ پھر اللہ کا نام لے کر میں باہر کود گیا۔ اگر میں اکیلا ہوتا تو میں سیدھا کودتا۔ پنجوں کے بل اترتا اور خود کو سنبھال لیتا مگر فاطمہ کے بوجھ کو کندھے پر لٹکا کے میرا کودنا اور اتنی بلندی سے گرنا برابر تھا۔ فاطمہ میرے کندھے پر سے اچھل کے نہ جانے کدھر گئی۔ اس بار میری دوسری ٹانگ ٹوٹ گئی لیکن میں ہمت کر کے اٹھا اور چلّاتا ہوا فاطمہ کی طرف لپکا۔ وہ دیوار کے سہارے بڑے عجیب طریقے پر اوندھی پڑی تھی۔ اسے ایک نظر دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ وہ مرچکی ہے۔ اس کی گردن ٹوٹ گئی تھی اور ایسے مڑی ہوئی تھی کہ زندہ آدمی کی گردن مڑ ہی نہیں سکتی۔ میں پاگلوں کی طرح چیخا۔ ”فاطمہ!“ اور اسے گود میں اٹھا کے بھاگا۔ نہ جانے کیا چیز میری راہ میں حائل ہوئی اور میں ٹھوکر کھا کے گرا تو میرا سر کسی سخت چیز سے لگا اور میں فاطمہ کی لاش کے ساتھ ہی گر گیا۔ یہ بالکل ویسا ہی اور اتنا ہی بڑا حادثہ تھا جو میرے بچپن میں بارہ سال پہلے پیش آیا تھا۔ میرے گھر میں اسی طرح آگ لگی تھی۔ اسی طرح آگ نے میری دنیا کو خاکستر کیا تھا۔ ایسے ہی میری ٹانگ ٹوٹی تھی اور اسی طرح میرے سر میں چوٹ آئی تھی۔ یہ واقعات دوبارہ اس طرح پیش آئے جیسے کوئی پوری فلم دوبارہ چل جائے۔ ایسی ہی ایک فلم میں نے بارہ سال قبل دیکھی تھی مگر میں بھولا ہوا تھا۔ ہوش آنے پر مجھے پرانی فلم کے سارے واقعات یاد آگئے اور ذہن نے جب بارہ سال پیچھے سے سفر شروع کیا تو زمانہ حال تک ہر گزرا ہوا لمحہ ایک زنجیر کی کڑی بن گیا۔ فاطمہ کی موت سے مجھ پر کیا بیتی، اس کا بیان میں الفاظ میں کیسے کروں۔ مجھ سے سب کچھ چھن گیا تھا۔ میرا گھر، میرے بیوی بچے، میری ملازمت، مستقبل، میری خوشیاں اور میری امیدیں۔ سب اس آگ میں جل کر راکھ ہو گئے۔ بیالیس ہزار کے نوٹ بھی اسی آگ میں جل گئے ہوں گے لیکن ان کا مجھے خیال تک نہیں آیا۔ حواس بحال ہونے [illegible] میں پایا مگر چوتھے دن میں اسپتال سے فرار ہوگیا۔ ٹرین میں [illegible] لاہور آ پہنچا۔ یہ خدا کی بڑی مہربانی تھی کہ اس نے مجھے زندہ [illegible] کا اور اس صدمے کو برداشت کر جانے کا حوصلہ دیا۔ مجھے [illegible] دی کہ ان حالات پر غور کرسکوں اور فیصلہ کرسکوں کہ مجھے [illegible] فاطمہ مرچکی تھی اور میری دیوانگی اسے واپس نہیں لاسکتی [illegible] پیار کا جو دیا وہ میرے دل میں روشن کر گئی تھی، اس کا [illegible] تھا۔ کئی بار میں نے اسے خواب میں دیکھا۔ وہ مجھے [illegible] دے گئی کہ میں ہمت نہ ہاروں اور اپنے سب دشمنوں سے [illegible] ضرور لوں۔ بدلہ لینا آسان نہیں تھا کیونکہ میں اکیلا تھا۔ [illegible] ساری قوت میری عقل ہوسکتی تھی چنانچہ میں نے فاطمہ سے [illegible] کیا کہ عقل سے کام لیتے ہوئے میں اس کے قاتلوں اور [illegible] دشمنوں سے حساب ضرور چکاؤں گا اور اس کی محبت کو کسی [illegible] نایاب کی طرح دل میں چھپائے مصروفِ عمل ہو گیا۔ مجھے اپنی پرانی دکان تلاش کرنے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا [illegible] دکان کا نام بدل گیا تھا اور دکان پہلے کے مقابلے میں دگنی [illegible] تھی۔ غالباً کوئی ساتھ والی دکان بھی خرید کر اسی کے [illegible] شامل کرلی گئی تھی لیکن اس کے باوجود اندر کا نقشہ کافی حد تک [illegible] تھا۔ میرا حلیہ فقیروں سے بھی بدتر تھا مگر میں اس عالی شان [illegible] دمکتی دکان میں بے خوفی سے داخل ہوگیا، اس یقین کے ساتھ کہ آخر میں ہی تو اس کا مالک ہوں۔

”دکان کا مالک، سیٹھ یا منیجر کہاں ہے؟“ میں نے [illegible] شوکیس کو انگلی سے بجا کر ایک سیلز مین کو متوجہ کیا۔

سیلز مین نے حقارت اور غصے سے میری طرف دیکھا۔ [illegible] ٹوٹ جائے گا ایسے!“

”سالے فقیر بھی بدمعاش بن گئے ہیں۔ کس رعب سے [illegible] کرتے ہیں!“ دوسرے سیلز مین نے کہا۔

”باہر نکل سیٹھ کی اولاد!“ تیسرے سیلز مین نے ایک [illegible] طرف پھینک کر کہا۔

”اپنی بکواس بند کرو۔“ میں نے دہاڑ کر کہا۔ ”جو میں نے پوچھا [illegible] اس کا جواب دو۔“

انھوں نے حیرانی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ”کیا کام [illegible] تمھیں سیٹھ یا منیجر سے ہے؟“ ایک نے کہا۔

”کام مجھے سیٹھ یا منیجر سے ہے۔ تم سے نہیں کہ تمھیں [illegible] میں نے متانت سے کہا۔ ”میرے سوال کا جواب دو۔“

”ابے یہ اونچا کاری گر ہے۔ سیٹھ یا منیجر سے جب [illegible] ایک سیلز مین میرا تمسخر اڑا [illegible] تیری جوتی کی [illegible]

نہیں لے گا۔“

”ہٹئے آپ۔ میں اس دکان کا مالک ہوں۔“ میں نے انگریزی میں کہا۔

”ابے یار یہ تو کریک ہے۔“ ان کا ہنستے ہنستے برا حال ہوگیا۔ ”نکالو اسے باہر۔“

”ہے پڑھا لکھا پاگل۔“ دو سیلز مین مجھے دھکّے دینے کی نیت سے آگے بڑھے۔ میں نے گاہکوں کو بٹھانے کے لیے استعمال ہونے والا اسٹول اٹھا لیا۔

”اگر تم میں سے کسی نے بے وقوفی کی تو میں سارے شیشے اور شوکیس چکنا چور کر دوں گا۔“ میں نے کہا

وہ اپنی جگہ پر منجمد ہوگئے۔ یہ ایسی خطرناک دھمکی تھی کہ وہ کچھ نہ کرسکے۔ میں اس آئینہ خانے کو پاش پاش کرسکتا تھا اور ٹیلیفون کر کے پولیس کو وہ بعد میں بلاتے یا چار مل کر مجھے قابو کرلیتے مگر اس سے انھیں کچھ حاصل نہ ہوتا۔ کسی پاگل اور فقیر نظر آنے والے کو پولیس کے ہاتھوں اتنا پٹوایا جائے کہ وہ مر جائے۔ اس سے بھی نقصان تو پورا نہیں ہوسکتا تھا۔

”جو میں پوچھ رہا ہوں وہ بتا دو۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے دکان کے مالک یا منیجر سے بات کرنا ہے۔“

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔“ ان میں سے ایک بولا۔ ”تم یہ اسٹول رکھ دو۔ منیجر صاحب تو کسی کام سے گئے ہوئے ہیں۔ مالک گھر پر ہوں گے، میں فون پر بات کرلیتا ہوں۔“

میں نے سر ہلا کے اسے فون کرنے کی اجازت دی۔ نمبر ملتے ہی ریسیور میں نے لے لیا۔ ”ہیلو۔“ کسی مرد نے کہا۔

”میں خواجہ نیک محمد بول رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”اس دکان کے اصل مالک کا بیٹا۔“

چند سیکنڈ کی خاموشی سے میں نے اندازہ کیا کہ میرے الفاظ کا ردِعمل کیا ہوگا۔ ”آپ کہاں سے بول رہے ہیں؟“ بہت دیر کے بعد دکان کے مالک کی آواز آئی تو بالکل بدلی ہوئی تھی۔

”اپنی دکان سے۔ یہاں ملازموں نے میرے ساتھ سخت بدتمیزی کا سلوک کیا مگر میں ان کو معاف کرتا ہوں کیوں کہ یہ سب مجھے نہیں پہچانتے۔“ میں نے کہا۔ ”اب میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”بہت بہتر۔ میں حاضر ہوتا ہوں۔“ وہ بولا۔ ”آپ ریسیور منیجر کو دیجیے۔“

”منیجر کسی کام سے گیا ہوا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اپنے سیلز مین سے بات کرلیں۔“ اور ریسیور اسے تھما دیا۔ وہ کچھ دیر یس سر یس سر کرتا رہا۔ اس کی حیرت اور بدحواسی دیکھ کر مجھے بڑی ہنسی آرہی تھی لیکن میں نے اپنی مالکانہ متانت میں فرق نہیں آنے دیا اور صرف مسکراتا رہا۔ باقی سیلز مین بھی دم بخود کھڑے تھے۔

”آپ آفس میں تشریف رکھیے۔“ سیلز مین ریسیور رکھ کے بولا۔ ”ہم سے بڑی غلطی ہوئی!“

”کوئی بات نہیں۔ میں نے برا نہیں مانا۔“ میں نے اسی شان سے کہا اور آفس میں بیٹھ گیا۔ جو اتنی خوبصورتی سے سجا ہوا تھا کہ کسی چیز پر نگاہ نہ ٹھہرتی تھی۔ منیجر پہلے آیا اور اپنے آفس میں ایک فقیر کو رونق افروز دیکھ کر آگ بگولا ہوگیا۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھے گالیاں دیتا، کسی سیلز مین نے اسے اشارہ کردیا جو اس نے شیشے کی پارٹیشن سے دیکھا اور باہر چلا گیا۔ چند منٹ میں وہ سر ہلاتا آیا اور مجھے خونی نظروں سے گھورتا، خون کے گھونٹ پیتا اپنی جگہ جا بیٹھا۔ سیٹھ تھوڑی دیر بعد آیا مگر وہ اکیلا نہیں تھا؛ اس کے ساتھ پولیس بھی آئی تھی مگر انھوں نے احتیاط سے کام لیا تھا۔ دکان کا مالک صرف ایک انسپکٹر کے ساتھ اندر آیا۔ میں نے مالک کو حلیہ بدل جانے کے باوجود شناخت کرلیا۔ وہ اندر آنے کے بعد مجھے غور سے دیکھتا رہا۔

”تم کہتے ہو خود کو خواجہ نیک محمد؟“ وہ بولا۔

”کہنے کا کیا مطلب، میں خواجہ نیک محمد ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”اور میں نے تمھیں بھی پہچان لیا ہے۔ تم وہی کاریگر ہو نا جس نے بھاٹی گیٹ کی دکان میں میرے والد کے ساتھ کام شروع کیا تھا؟“

اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”اس جعلساز کو گرفتار کر لیجیے انسپکٹر صاحب!“

میں نے بہت شور مچایا لیکن کسی نے میری ایک نہیں سنی۔ سیلز مین نے وہ سب کہہ سنایا جو میں نے کہا تھا۔ پولیس مجھے تھانے لے گئی اور کسی رپورٹ کے بغیر بند کردیا۔ ایک بہت بڑے جیولر کے ملازم کا یہی کہہ دینا کافی تھا کہ میں نے اندر گھس کر توڑ پھوڑ کرنے اور دکان کو تباہ کرنے کی دھمکی دی تھی۔ میں نے ان کو اپنی کہانی سنانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ سب اندھے بہرے کردیے گئے تھے۔ انھوں نے تین دن مار مار کر مجھے یہ جھٹلانے کی کوشش کی کہ میں خواجہ نیک محمد ہوں۔ مگر میں بہت ڈھیٹ تھا۔ میری ڈھٹائی کا مطلب میرا حوصلہ تھا جو مجھے سچائی عطا کرتا تھا۔ میں خود کو کیسے قائل کرلیتا کہ میں کوئی اور ہوں۔ جو نوکر تھا وہ غاصبانہ طور پر مالک بن چکا تھا اور اس نے مالک کو پاگل قرار دے کر بند کرا دیا تھا۔ میں مرجاتا مگر اصل حقیقت سے کبھی انحراف نہ کرتا۔ خدا نے میری یوں مدد کی کہ چوتھے دن ایک اور حوالاتی کا ملنے والا آیا جو وکیل تھا۔ میں اپنی سرگزشت

اس حوالاتی کو سُنا چکا تھا اور شاید وہ اس پر یقین بھی کر چکا تھا کہ اس نے اپنے ملاقاتی سے میرا ذکر کیا۔ وکیل نے مختصراً بات سُنی اور پھر آنے کو کہہ کر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد تھانیدار کے شور مچانے کی آواز آئی اور وہی وکیل پھر نمودار ہوا۔ اس نے تھانیدار کو دھمکی دی تھی کہ بغیر فردِ جُرم عائد کیے، کسی قسم کی شکایت یا ایف آئی آر کی عدم موجودگی میں یہ حبسِ بے جا کا کیس ہے۔ اس نے مجھے اپنا بھائی ظاہر کیا اور تھانیدار کو بہت ڈرایا دھمکایا کہ وہ اس کے خلاف ہائی کورٹ میں رٹ کر دے گا۔ تھانیدار اتنی آسانی سے مجھے نہ چھوڑتا لیکن وکیل سیانا تھا۔ اس نے کہا کہ میرے بھائی کا دماغی توازن درست نہیں اور ہم اسے تین دن سے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ وکیل کی یقین دہانی پر تھانیدار نے مجھے آزاد کر دیا لیکن وکیل سے درخواست کی کہ مجھے سنبھال کر رکھے۔ تین دن میں وکیل کے گھر رہا اور وکیل نے میری ساری بات سننے کے بعد کہا کہ وہ تصدیق کرے گا۔ اگر تصدیق پر میری بات درست ثابت ہوئی تو وہ میرا کیس لڑے گا لیکن اس کے بعد شرط یہ ہوگی کہ میں اسے ایک لاکھ بطور فیس کے ادا کروں گا۔ ظاہر ہے یہ سودا مجھے دس لاکھ میں بھی مہنگا نہیں تھا۔ تین دن بعد اس نے مجھے بتایا کہ میں مر چکا ہوں۔

"یہ مذاق میری سمجھ میں نہیں آیا۔" میں نے کہا۔

"اس میں مذاق کی بات ہی نہیں۔ یہ عدالت کا فیصلہ ہے۔"

"عدالت ایک زندہ آدمی کو مُردہ قرار نہیں دے سکتی۔" میں نے کہا۔

"تم قانون کو نہیں سمجھتے۔" وہ بولا۔ "اصل صورتِ حال یوں ہے کہ جب تمھارے گھر میں آگ لگی تھی تو گھر کے اندر تین افراد تھے۔ تمھارے ماں باپ اور تم۔ ملبے میں سے دو جلی ہوئی لاشیں نکلیں۔ ان کی شناخت ناممکن تھی چنانچہ انھیں تمھارے والدین کی لاشیں قرار دے کر دفن کر دیا گیا۔ تمھاری لاش نہیں ملی تھی چنانچہ تم لاپتا رہے۔ تمھارے قریبی عزیز تو تھے نہیں۔ پاس پڑوس کے لوگ اور تمھارے والد کے دوست کیا کر سکتے تھے۔ وہ تمھاری واپسی کا انتظار کرتے رہے۔ تمھارا جلا ہوا مکان اسی طرح لاوارث پڑا رہا۔ تمھارے والد کے ایک پارٹنر نے سات سال گزر جانے کے بعد عدالت کو درخواست دی کہ تمھاری موت کا سرٹیفکیٹ جاری کیا جائے۔ از روئے قانون سات سال تک لاپتا رہنے والے کو مُردہ قرار دے دیا جاتا ہے چنانچہ تمھارا ڈیتھ سرٹیفکیٹ بھی مل گیا اور یوں وہ شخص جو نصف کاروبار کا مالک تھا پورے کاروبار کا مالک بن بیٹھا۔ اس نے کوئی خلافِ قانون کام نہیں کیا تھا چنانچہ اسے کسی کا ڈر نہیں تھا۔ اگر تمھارا کوئی چچا تایا یا دادا ہوتا تو الگ بات تھی۔ خود تم والدین کے اکلوتے تھے، اسے چیلنج کون کرتا۔ سات سال میں کوئی دعویدار سامنے آیا ہی نہیں تھا۔ دکان کا حقِ ملکیت حاصل کرنے کے بعد اس نے دوسرا چکر چلایا۔ ڈیتھ سرٹیفکیٹ کو بنیاد بنا کر تمھاری جلی ہوئی کوٹھی بھی فروخت کر دی۔ اس نے کافی لوگوں کو پیسہ کھلایا۔ کاغذات میں رد و بدل اور مکان کا اسٹرکچر زمین سمیت ایک ایسے شخص کو بیچ دیا جو پر قابض رہنے کا اہل تھا۔ آج کل اس مکان میں ایک خطرناک اسمگلر رہتا ہے۔ اب تمھارا معاملہ بہت پیچیدہ ہے۔ تمھیں عدالت میں درخواست دینا ہوگی کہ میں زندہ ہوں۔ اپنی شناخت کے ثبوت اور گواہ لانے ہوں گے۔ ان حالات کے گواہ پیش کرنے ہوں گے جن کی وجہ سے تم بارہ سال روپوش رہنے پر مجبور ہوئے۔ یہ معاملہ تمھاری یادداشت کی گم شدگی کا ہے۔ جس اسپتال میں تم زیرِ علاج تھے وہاں بارہ سال پہلے کا نہ ڈاکٹر ہے اور نہ ریکارڈ۔ اب تمھیں کسی میڈیکل بورڈ کے سامنے پیش ہونا پڑے گا جس میں ماہرِ نفسیات اور ڈاکٹر سب ہوں گے اور وہ مل کر طے کریں گے کہ کیا واقعی بارہ سال تک تمھاری یادداشت تمھارے ساتھ نہیں تھی۔ یقیناً وہ سب فقیر اس کے گواہ ہیں، وہ تو تمھارے دشمن ہیں اور تمھیں پہچاننے سے بھی انکار کر دیں گے۔ یہ ایک نہیں ایک درجن مقدمات ہیں۔ فوجداری اور دیوانی۔ تمھارے لیے ہر قدم پر قانونی ضابطوں کا مرحلہ ہے۔ خواجہ نیک محمد ثابت کرنا، یہ ثابت کرنا کہ تم بارہ سال کہاں رہے، میڈیکل بورڈ کو قائل کرنا۔ یاد رہے کہ تمھارا حریف لکھ پتی ہے۔ تمھارے خلاف ہر ثبوت کو جھوٹ بنا سکتا ہے اور ہر گواہ کو خرید سکتا ہے، منہ مانگی قیمت دے کر۔ وہ تمھیں مروا بھی سکتا ہے۔ تمھارا تو مدّعی بھی کوئی نہیں ہوگا۔ اس کے علاوہ جو مرحلے ہیں وہ دکان اور مکان کا قبضہ لینے کے ہیں۔ دونوں مقدمات دیوانی نوعیت کے ہیں اور فریقِ ثانی اس پوزیشن میں ہیں کہ مقدمات کو طول دے کر ہائی کورٹ تک لے جائیں اور اگر فیصلہ بیس سال بعد بھی تمھارے خلاف ہو تو بعید از امکان نہیں۔ پھر ذاتی دشمنی کا مسئلہ الگ ہے۔ اس جیولر سے تمھارے مکان میں رہنے والے تک سب بدمعاش ہیں یا بدمعاش خرید سکتے ہیں۔ تم ان سے نمٹنے کا تصوّر تک نہیں کر سکتے۔ اور تم کیا، میں ان سے نہ قانونی لڑ سکتا ہوں نہ غیر قانونی۔ کل کو وہ مجھے ایک لاکھ نقد دے کر تمھاری وکالت سے دستبردار ہونے پر مجبور کر دیں گے اور میں انکار نہیں کر سکوں گا۔ کیوں کہ تم سے مجھے فوری طور پر کچھ ملنے کی امید نہیں۔ تم ایک لاکھ کی جگہ دس لاکھ بھی دو گے تو کب دو گے۔ دس سال بعد

میرے لیے خطرہ بنے رہو گے۔ شاید مجھے اپنے پلّے سے ... کھلانا پڑے۔ آخری بات یہ کہ تمھارے دعوے کی ... لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ دعوے دائر کرنے کے لیے اس پر کم سے کم پچیس کس ہزار کی کورٹ فیس لگے گی، وہ کون دے گا۔ قصّہ مختصر۔ اس نے مجھ سے کہا کہ وہ میرے لیے کچھ نہیں کر سکتا اور مجھے اتنا ہی غنیمت جاننا چاہیے کہ وہ مجھے پولیس کے قبضے سے نکال لایا ورنہ مجھے پاگل خانے میں بند کر دیا جاتا۔ اب بہتر یہی ہے کہ میں جان بچا کے نکل جاؤں۔ زندگی کی قیمت ایک مکان اور ایک جیولر کی دکان سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔ میں نے کہا بھاڑ میں گیا مکان اور جہنم میں گئی دکان۔ مجھے تو بدلہ لینا ہے اپنے ماں باپ کے قاتلوں سے اور سزا دینی ہے غاصبوں کو۔ وکیل دل کا بُرا نہیں تھا۔ اس نے پہلے تو مجھے سمجھایا کہ بندے کو عفو اور درگزر سے کام لینا چاہیے اور سزا و جزا کو یومِ حشر پر اٹھا رکھنا چاہیے مگر اس نے دیکھا کہ میں عقل سے سوچنے کے قابل ہی نہیں تو اس نے مجھ کو ایک آدمی کا بتا دیا کہ وہ تمھاری مدد کر سکتا ہے۔ اس شخص کا نام تو کچھ اور تھا مگر وہ بہرام دادا کے نام سے مشہور تھا۔ وہ بہت طاقتور شخص تھا۔ سوا چھ فٹ قد اور بے حد مضبوط کسرتی جسم کا مالک لیکن اس کی اصل طاقت کچھ اور تھی۔ وہ بہت بڑا بدمعاش تھا اور اس کے مقابلے میں خود کو بڑا بدمعاش کہنے والے جوکر لگتے تھے۔ اور بالکل اس اونٹ کی طرح تھے جس نے پہاڑ نہ دیکھا ہو۔ اکثر لوگوں نے صرف اس کا نام سنا تھا، اسے دیکھا نہیں تھا۔ وہ عام بدمعاشوں سے بہت مختلف بھی تھا۔ اس کے چیلے چانٹے بھی معمولی حیثیت کے بدمعاش نہیں تھے۔ چونکہ میں نے اسے قریب سے دیکھا ہے، اس لیے میں بہرام دادا کے متعلق وہ سب جانتا ہوں جو اس کی ذات سے وابستہ افسانوں اور روایات کی بنیاد بنا۔ بہرام دادا کو آپ چور ڈاکو اور قاتل سب کچھ کہہ سکتے ہیں مگر اس کے چند اصول تھے جن پر وہ مرتے دم تک کاربند رہا۔ ایک تو وہ ان کو لوٹتا تھا جن کی دولت کا ذریعہ ناجائز آمدنی یا حرام کی کمائی ہو۔ مشہور ہے کہ غلطی سے ایک بار اس نے کسی گھر میں ڈاکا ڈالا اور تقریباً دو لاکھ کا زیور اکٹھا کر لیا۔ زیور کسی سیٹھ نے بیٹی کے جہیز کے لیے بنوایا تھا۔ سیٹھ اس کے قدموں میں گر گیا۔ اس نے بہرام دادا کو بتایا کہ وہ دیوالیہ ہو چکا ہے۔ اس کا نام ہاتھی کے دانتوں کی طرح رہ گیا ہے جو محض دکھانے کے لیے ہوں۔ اس کے قرض خواہ بہت جلد اس کا سب کچھ نیلام کرا دیں گے۔ وہ چاہتا ہے کہ کسی طرح بیٹی کو باعزت طریقے پر رخصت کر دے اور جو اسے دینا ہے وہ دے کر اپنا بھرم رکھ لے۔ اگر زیور چلا گیا تو شادی نہیں ہوگی۔ وہ دیوالیہ ہو گیا تو اس کا سب کچھ قرض خواہ لے جائیں گے اور پھر شاید اسے بھی جیل جانا پڑے۔ بہرام دادا کو معلوم تھا کہ سیٹھ نے اسمگلنگ سے مال اکٹھا کیا تھا۔ مگر اسمگلر پر بھی بُرا وقت آ جاتا ہے۔ اس کی سزا بیٹی کو مل رہی تھی۔ اس نے سارا زیور واپس کر دیا۔ سیٹھ سے وعدہ لیا کہ آئندہ اسمگلنگ نہیں کرے گا اور اس کے قرض خواہوں کا نام پوچھا۔ اگلے دن سارے قرض خواہوں کو بہرام دادا کا پیغام ملا کہ وہ سیٹھ کے قرضوں کی رسیدیں اسے واپس کر دیں اور انھیں ایک ہفتے کی مہلت دی گئی۔ دو نے پولیس میں جانے کی حماقت کی اور بہرام دادا کو خود ان سے رسیدیں لینے کے لیے جانا پڑا۔ باقی نے مجبوراً دل پر پتھر رکھ کے یہ گھاٹا کھانا منظور کیا۔ وہ بہرام دادا کو سب کچھ دینے سے بہتر یہ سمجھتے تھے کہ ایک سیٹھ کا تھوڑا سا قرض معاف کر دیں۔ وہ سیٹھ سنبھل گیا۔ اس کی بیٹی کی شادی میں بہرام دادا بھی شریک تھا۔ اور ڈائس پر بیٹھا تھا لیکن اسے کوئی نہ پہچان سکا۔ کمال کی بات یہ ہے کہ بہرام دادا نے کبھی ان سیٹھوں پر ہاتھ نہیں ڈالا جنھوں نے اس کے کہنے پر رسیدیں واپس کر دی تھیں بلکہ انھیں ٹیلی فون کر کے ان کا شکریہ ادا کیا۔ اس مثال سے تم سمجھ گئے ہو گے کہ بہرام دادا کس قسم کا آدمی تھا۔ وہ بڑے ٹھاٹ باٹ سے رہتا تھا۔ انتہائی معزز نظر آتا تھا لیکن خود اس کے خاص آدمی بھی نہیں جانتے تھے کہ اس وقت وہ کہاں ملے گا۔ پولیس کبھی اس پر کوئی جرم ثابت نہ کر سکی۔ چشم دید گواہ عدالت میں بیان سے منحرف ہو جاتے تھے یا شناخت میں غلطی کر جاتے تھے۔ اس کے بارے میں یہ کہانیاں بھی مشہور ہیں کہ وہ اچانک کسی حقیقی ضرورت مند کے پاس جا پہنچا اور تعارف کرائے بغیر اس کی مدد کر کے لوٹ آیا۔ خیر یہ سب میں نے نہیں سنا تھا کیوں کہ میں بارہ سال سے شہر بدر تھا۔ اس وکیل کے کہنے پر میں نے بہرام دادا کی تلاش شروع کر دی۔ میں ہر جگہ پہنچا اور ہر بدمعاش کے اڈے سے معلوم کیا۔ لوگ مجھ پر ہنستے رہے یا مجھے ڈراتے رہے مگر میں نے اپنی جستجو جاری رکھی۔ ہر جگہ میں یہی کہتا کہ خدا کے بعد دنیا میں میرا کام بہرام دادا کے سوا کوئی کر ہی نہیں سکتا۔ کام کیا ہے، یہ میں نے کبھی کسی کو نہیں بتایا۔ پندرہ بیس دن میں میری کوشش کے نتائج ظاہر ہوئے۔ میں ایک جگہ چائے پی رہا تھا کہ ایک مظلوم و مسکین اور مریل سا آدمی اسی ٹیبل پر آ بیٹھا۔ ہم دونوں خاموشی سے چائے پیتے رہے۔ درمیان میں اس نے اچانک کہا کہ مجھے بہرام دادا نے بلایا ہے۔ میں بھونچکا رہ گیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کہاں بلایا ہے تو وہ بولا کہ تمھیں اس سے کیا۔ وہ جہاں ہوگا مل جائے گا۔ میں نے اور کوئی سوال نہیں کیا اور خاموشی سے اُٹھ کر اس چڑی مار جیسے شخص کے ساتھ ہو لیا۔ باہر ایک گاڑی کھڑی تھی۔ ہمارے بیٹھتے ہی اِدھر اُدھر سے دو افراد نمودار ہوئے اور انھوں نے دروازے بند کر دیے۔ میں

نے دیکھا کہ دروازوں کو اندر سے کھولنے کا کوئی انتظام نہیں ہے۔
"تم کو بہرام دادا سے کیا کام ہے؟" ڈرائیور نے کہا۔
"جو کام مجھے بہرام دادا سے ہے وہ میں تمھیں نہیں بتا سکتا۔" میں نے کہا۔
"میں ہی بہرام دادا ہوں۔" ڈرائیور نے اسی سکون اور اطمینان کے ساتھ کہا۔ میں دوسری بار صدمے سے بیہوش ہوتے ہوتے بچا۔ میرے دونوں طرف اور آگے بہرام کے ساتھ بیٹھا ہوا آدمی سب مسلح تھے مگر بالکل خاموش تھے۔
"میری کہانی لمبی ہے۔ کیا ہم کہیں بیٹھ کے بات نہیں کر سکتے؟" میں نے کہا۔
"ہم کھڑے ہوئے نہیں ہیں۔" بہرام دادا نے کہا۔ "گاڑی سارا دن چل سکتی ہے۔ اس شہر کی سڑکیں لمبی ہیں یا تمھاری بات ان سے بھی لمبی ہے؟"
میں نے اسے اوّل تا آخر سب بتا دیا۔ معلوم نہیں اسے پوری آپ بیتی سنانے میں میرا آدھا گھنٹا صرف ہوا یا ایک گھنٹا۔ لیکن جتنی دیر تک میں بولتا رہا سب خاموش رہے۔ صرف ایک بار درمیان میں بہرام دادا نے کہا تھا۔ "سگریٹ" اور اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص نے اسے سگریٹ جلا کر دی تھی۔ گاڑی ایک ہی رفتار سے مسلسل چلتی رہی۔
"اگر یہ سب سچ ہے۔" بہرام داد نے میرے خاموش ہو جانے کے بعد کہا۔ "تو ہمیں معلوم ہو جائے گا۔" پھر اس نے گاڑی رکوائی اور مجھے اترنے کے لیے کہا۔ "کل اسی جگہ تم کو جواب مل جائے گا۔" میرے کچھ کہنے سے پہلے گاڑی روانہ ہو گئی۔ میری نظر نمبر پلیٹ پر گئی مگر پلیٹ اوپر اٹھی ہوئی تھی اور الٹی تھی۔ اگلے دن میں اسی ریسٹورنٹ میں اسی میز پر سر جھکائے بیٹھا تھا کہ بہرام دادا میرے مقابل آ بیٹھا۔ وہ ہمیشہ اتنی غیر متوقع بات کرتا تھا کہ دوسرے آدمی کے ہوش گم ہو جائیں۔
"تم نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔" وہ بولا۔ "ورنہ تمھاری قبر تیار تھی۔ اب میں نے اسے پیغام بھجوا دیا ہے کہ قبر تیار رہے۔"
"کسے پیغام بھجوا دیا ہے؟" میں نے بمشکل تمام کہا۔
"اسی کو جس نے تمھارے کاروبار پر قبضہ جما رکھا ہے۔" وہ بولا۔ "تم کو وہ سب کچھ مل جائے گا جو تمھارا حق ہے۔"
"بہرام دادا، ابھی تو آپ حق دلوا دیں گے۔" میں نے کہا۔ "بعد میں میری حفاظت کون کرے گا؟"
"تم خود اپنی حفاظت بھی نہیں کر سکتے۔" وہ مجھے شرمندہ کرتے ہوئے بولا۔ "کیا چاہتے ہو آخر؟"
"میں انتقام لینا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ میرے والدین کو اسی سور کے بچے نے مروایا تھا جو اب مالک بنا بیٹھا ہے۔ میں اپنی بیوی اور اپنے بچے کے قتل کا بدلہ بھی لینا چاہتا ہوں۔ میں ان بارہ سالوں کی قیمت بھی وصول کرنا چاہتا ہوں جب مجھے مجبور کیا گیا کہ میں بھیک مانگوں۔ مجھے پیسہ نہیں بدلہ لینا ہے۔" میں دھاڑیں مار مار کے رونے لگا۔ بہت سے لوگ ہماری طرف متوجہ ہو گئے مگر بہرام دادا بے نیازی سے بیٹھا رہا۔
"اچھا چل میرے ساتھ۔ باپ سب کے ہی مرتے ہیں۔" اس نے مجھے تسلی دینے اور لوگوں کو سنانے کے لیے کہا۔ میں اس کے ساتھ چل دیا۔ باہر اس کی وہی گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ میرے اندر بیٹھتے ہی دو آدمی نمودار ہوئے اور آگے بیٹھ گئے۔ ان میں سے ایک نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ آج شیشوں پر پردے تھے چنانچہ میں باہر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ جب گاڑی رکی تو میں نے خود کو ایک کوٹھی میں پایا۔ مجھے ایک کمرا دے دیا گیا اور یہ سمجھا دیا گیا کہ میں کوٹھی سے باہر نہ نکلوں۔ کوٹھی کے اندر میرے کہیں آنے جانے پر کوئی پابندی نہیں تھی اور میں ایک ... کے ہر حصے میں جا سکتا تھا۔ کوٹھی میں دن بھر سناٹا رہتا تھا۔ بہرام دادا سے بھی میری پھر ملاقات ... نہیں ہوئی۔ تیسرے دن مجھے میز پر ایک اخبار نظر آیا۔ "مشہور صرّاف کی دکان میں ڈاکا۔" مجھے بہرام دادا نے دھمکی دی تھی۔ بدنصیب مالک کا بیان۔" میں نے خبر کو غور سے پڑھا۔ یہ میری ہی دکان کے بارے میں تھی اور خبر میں یہ بھی تھا کہ ڈاکو دکان میں جھاڑو پھیر گئے ہیں۔ اس سے میں نے یہ بھی اندازہ لگایا کہ میرے کاروبار پر غاصبانہ قبضہ کرنے والے نے بہرام دادا کے پیغام کو نظر انداز کیا ہو گا۔ وہ پہلے شرافت سے اپنا مطالبہ پہنچا دیتا تھا۔ پولیس کے سامنے اس شخص کے بیان سے یہ بھی اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے بہرام سے ٹکر لینے کے لیے قانون کا سہارا لیا ہے۔ تاہم اس کے بعد بھی نہ مجھے بہرام دادا نظر آیا اور نہ پولیس کو اس کے بارے میں کوئی مصدقہ شہادت دستیاب ہوئی۔ جس رات ڈاکا پڑا بہرام دادا ایک شادی میں شریک تھا اور سارے باراتی ہمہ وقت اس کی موجودگی کے گواہ تھے۔ میں اس قیدِ تنہائی سے گھبرا گیا تھا۔ میں نے گھر کے ملازموں سے کہا مگر وہ خود نہیں جانتے تھے کہ بہرام دادا کون ہے، کب آتا ہے اور کب جاتا ہے؟ ساتویں دن ایک شخص آیا جسے میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ پشاور جانا ہے۔ باہر ایک نئی کار کھڑی تھی۔ میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا اور شاہدرے کا پل پار کرنے کے بعد دو افراد گاڑی رکوا کے ہمارے ساتھ آ بیٹھے۔ ان دونوں کو میں نے پہچان لیا۔ یہی مجھے پہلے دن بہرام دادا کے ساتھ کار میں نظر آئے تھے۔ میں نے ان سے بات کرنا چاہی تو انھوں نے مجھے جھڑک دیا۔
"کیا تم مجھے بہرام دادا کے پاس نہیں لے جا رہے ہو؟" میں نے کہا۔
"یہ تم نے کیسے فرض کر لیا؟" ان میں سے ایک نے غرا کے کہا۔
"مجھے ان کا شکریہ ادا کرنا تھا۔" میں نے خواہ مخواہ بات بڑھانے کے لیے کہا۔
"اُسے تمھارے شکریے کی ضرورت نہیں۔" دوسرا بولا۔ "اب بولو گے تو گاڑی سے اتار دیں گے۔"
پشاور پہنچنے میں ہمیں چھ گھنٹے بھی نہیں لگے۔ اس سے میں نے اندازہ کیا کہ وہ گاڑی کو کتنا تیز چلا کے لائے ہیں۔ لاہور سے پشاور تک کا فاصلہ پونے تین سو میل ہے۔ جی ٹی ایس اڈے کے پاس گورنمنٹ بوائز اسکول آیا تو گاڑی رکی اور بہرام دادا نے ڈرائیور کی جگہ سنبھالی۔ اس کا چہرہ بالکل سپاٹ رہا۔ یوں جیسے میں کوئی اجنبی ہوں۔ اس نے نہ اپنے کارنامے کا تذکرہ کیا نہ پروگرام کا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کرنا چاہا تو اس کے ایک ساتھی نے پھر مجھے خاموش کر دیا۔
"تم راستہ بتاؤ۔" وہ بولا۔ "فقیروں کا وہ ڈیرا کہاں ہے؟"
"اس وقت تو وہاں کوئی بھی نہیں ملے گا۔" میں نے کہا۔ "وہ سب رات کو آتے ہیں۔ بس کوئی ہوا تو عورتیں ہوں گی یا پھر وہ لڑکیاں جو کہیں سے لائی گئی ہوں گی۔"
"ہم دیکھ لیں گے۔" وہ بولا۔ میں ان کی رہنمائی کرتا گیا۔ یہاں تک کہ ڈیرا سامنے نظر آنے لگا۔ گاڑی سڑک پر سیدھی کوہاٹ کی جانب نکل گئی۔ تقریباً ایک میل آگے جا کر ہم واپس ہوئے۔ گاڑی سے اُترنے کے بعد بہرام دادا اور اس کے دو ساتھیوں نے میرے ساتھ پیدل چلنا شروع کیا۔ میں انھیں پیچھے کی طرف سے لے گیا تھا۔ ایک چٹان کی اوٹ سے بہرام دادا نے پورے علاقے کا جائزہ لیا اور ہم واپس آ گئے۔ بہرام دادا نے مجھے وہیں چھوڑ دیا اور انتظار کرنے کو کہا۔ میں گھبرا گیا کہ کہیں پکڑا نہ جاؤں لیکن میں بہرام دادا کی مخالفت کیسے کرتا۔ دوپہر سے شام اور پھر رات ہو گئی۔ بھوک پیاس سے میرا بُرا حال ہو گیا اور میں ایک چٹان کے پیچھے لیٹ گیا۔ رات کے آٹھ بجے ڈیرے کی طرف کچھ شور ہوا۔ میں چونک کر اٹھ بیٹھا۔ میں نے کچھ عورتوں کو دیوانہ وار سڑک کی طرف جاتے دیکھا۔ اسی وقت ڈیرے کو چاروں طرف سے آگ نے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ آگ اتنی تیزی سے آگے بڑھی کر چند سیکنڈ میں پیسٹل اور ڈیرے کے درمیان آگ کا دریا حائل ہو گیا۔ اندر رہ جانے والوں میں کسی کے لیے بھی بچ کر نکل جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ڈیرے کی ہر جھونپڑی جل رہی تھی اور اس کے آس پاس کا علاقہ پچاس گز تک جل رہا تھا۔ کوئی نکلتا بھی تو کدھر سے نکلتا۔ میں اس نظارے میں محو تھا کہ کسی نے پیچھے سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔
"تم یہاں تماشا دیکھنے نہیں آئے تھے۔" بہرام دادا نے کہا۔ "ویسے بھی تماشا تو ختم ہو گیا۔"
"کیا وہ سب موجود تھے؟" میں نے کہا۔
"ہاں، میں نے ان سے پوچھ لیا تھا اور انھوں نے اعترافِ جرم کر لیا تھا۔" وہ بولا۔ "لڑکیوں کو میں نے چھوڑ دیا۔"
میری ذہنی کیفیت بہت عجیب تھی۔ میرے ذہن پر سے آدھا بوجھ اتر گیا تھا۔ میں اپنے بیوی بچوں کے قاتلوں سے انتقام لے چکا تھا۔ ان سب کا انتقام لے چکا تھا۔ جن کے گھروں کی آبرو کو ان غیر نظر آنے والے ڈاکوؤں نے نیلام کیا۔ میں ان کو نہیں جانتا تھا لیکن میرا ان سے انسانیت کے نام پر رشتہ تو تھا۔ میں اپنی ذلت و خواری کا انتقام لے چکا تھا جو میں نے بے غیرت بن کے زندگی کے لیے ہاتھ پھیلا کے اٹھائی تھی۔ یہ سب اس سے بھی زیادہ سخت اور عبرتناک سزا کے مستحق تھے مگر خدا ایک حد تک ظالم کی رسّی دراز کرتا ہے۔ اس کے بعد یہ رسّی پھانسی کا پھندا بن کے انھی کے گلے میں اٹک جاتی ہے۔ واپس لاہور پہنچنے کے بعد مجھے بہرام دادا نے ایک سڑک کے کنارے اتار دیا۔ میرا کام ابھی باقی تھا چنانچہ میں نے اسے روکنے کی اور یہ پوچھنے کی کوشش کی کہ میں پھر کب اور کہاں اس سے مل سکتا ہوں لیکن وہ جواب دیے بغیر نکل گیا۔ تین دن تک میں لاہور کی سڑکوں پر جھک مارتا رہا۔ بہرام دادا کا کوئی پتا ٹھکانا میرے علم میں نہیں تھا اور اس کے بارے میں مجھے کوئی بھی نہیں بتا سکتا تھا۔ عام لوگوں میں یہ تاثر پایا جاتا تھا کہ بہرام دادا کا حقیقی وجود کوئی نہیں اور کچھ پیشہ ور مجرم محض یہ نام اپنی دہشت بٹھانے کے لیے استعمال کرتے ہیں لیکن کچھ اسے بہرام ڈاکو ثانی سمجھتے تھے۔ کچھ اس لیے کہ نام کے اعتبار سے بھی وہ بہرام تھا اور کچھ اس کے مذہب، شجاعت اور ذہانت کی روایت کے باعث جن سے وہ سیٹھ ساہوکاروں کا دشمن اور غریبوں کا ہمدرد ثابت ہوتا تھا۔ یہی کیفیت پولیس کی تھی۔ اصل بہرام دادا ایک صنعت کار تھا اور اسے دولت کی کوئی کمی نہ تھی مگر اس کی شخصیت بے حد پُراسرار تھی۔ کئی بار اسے جائے واردات پر موجود افراد نے شناخت کیا، تصویر سے بھی، اور صورت سے بھی.... کئی بار اس کی تصویر تک اتاری گئی مگر بعد میں ہر شہادت غلط ہو گئی۔ بہرام دادا کے زیادہ معتبر اور عزت دار گواہوں نے ثابت کر دیا کہ وہ کہیں اور موجود تھا۔ وہ صرف ایک بار گرفتار کیا گیا تھا لیکن اس کی فوراً ضمانت ہو گئی تھی اور بعد میں اس نے پولیس کے خلاف متعدد مقدمات قائم کر دیے تھے۔ پولیس کے اعلیٰ افسران کا اس سے میل جول تھا لیکن نیچے والے سمجھتے تھے کہ اپنی دولت اور اپنے تعلقات کے باعث ہی وہ

بہرام دادا بنا ہوا ہے مگر بہت سے اس خیال کے بھی حامی تھے کہ بہرام دادا سنسنی خیز خبریں پھیلانے والے صحافیوں کے ذہن کی اختراع ہے جنھوں نے پبلک کے لیے ایک دلچسپ کردار بنا دیا ہے تو دولت مندوں کے لیے ہوّا کھڑا کر دیا ہے۔ بعد میں ایسے لوگ بھی ملے جو سمجھتے تھے کہ بہرام دادا وہی صنعت کار ہے مگر وہ ایک ذہنی مریض ہے اور دُہری شخصیت کا مالک ہے۔ وہ پیشہ ور مجرم نہیں ہے۔ جرم کرنا اس کی دماغی بیماری ہے، جیسے کچھ لوگوں کو سوتے میں چلنے کی بیماری ہوتی ہے۔ خیر، تین دن کی آوارہ گردی میں میرا گزر ایک بار اپنی دکان کے سامنے سے ہوا۔ دکان بند پڑی تھی۔ اس کے شٹر گرے ہوئے تھے اور باہر موٹے موٹے تالے پڑے تھے۔ اسی روز میں نے خبر پڑھی کہ انشورنس کمپنی نے دکان میں ہونے والی چوری کے نقصانات کی تلافی کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ پولیس نے دُکان کے مالک کو حراست میں لے کر پوچھ گچھ شروع کر دی ہے کیونکہ جائے واردات سے چوری ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ملا۔ ایک سیلزمین نے یہ بیان بھی دیا ہے کہ اپنی دکان کا سارا مال خود سمیٹ کر بیمہ کمپنی سے رقم وصول کرنے کا منصوبہ خود سیٹھ نے بنایا تھا اور اسے بھی شریک کرنا چاہا تھا لیکن اس نے انکار کر دیا تھا۔ اب پولیس اس سے جعلسازی کا اقرار کرانے کے لیے تفتیش کے تمام حربے آزما رہی تھی اور اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ خود اپنی دکان میں ڈاکا ڈال کے اس نے مال کہاں چھپایا ہے۔ اس خبر کو پڑھ کر میرا رُواں رُواں مسرت سے سرشار ہو گیا۔ اس خبیث نے جو کچھ کیا تھا اس سے زیادہ بھگت رہا تھا اور صاف ظاہر تھا کہ اس میں بہرام دادا کا اثر و رسوخ کارفرما ہے۔ اسی نے پولیس کو یہ لائن دی ہوگی۔ جب خود پولیس چوری کو چوری نہیں مانے گی تو مدعی کیسے ثابت کرے گا کہ چوری تھی۔ رہی سہی کسر سیلزمین کے بیان نے پوری کر دی تھی۔ شاید اسے بھی بہرام دادا نے ہی سمجھایا ہوگا کہ کس قسم کا بیان دینے سے وہ محفوظ رہے گا۔ اگر بیمہ کمپنی نقصانات کی تلافی کر دیتی تو وہ سنبھل جاتا مگر اسے تو لینے کے دینے پڑ گئے تھے۔ وہ بہرام دادا کے خلاف بیان دینے کا خمیازہ بھگت رہا تھا۔ دوسرے دن میں اپنے مکان کو دیکھنے گیا تو وہاں عجیب منظر تھا۔ ہر طرف پولیس مسلح کھڑی تھی — شاید اِدھر اُدھر سادے کپڑے والے بھی ہوں گے جو ہر آتے جاتے مشکوک آدمی پر نگاہ رکھتے ہوں گے۔ کوٹھی کی دیواروں پر سرچ لائٹس نصب کی جا رہی تھیں اور بیرونی دیوار کے اوپر خاردار تاروں کی باڑھ لگائی جا رہی تھی۔ تار لگانے والوں کے ساتھ الیکٹریشن کام کر رہے تھے، جس سے میں نے اندازہ کیا کہ وہ تاروں میں کرنٹ بھی چھوڑیں گے۔ یہ تمام انتظام خود ثابت کرتا تھا کہ اس کوٹھی میں رہنے والے اسمگلر کو بہرام دادا کا کوئی پیغام ملا تھا اور اس نے چیلنج قبول کرتے ہوئے اپنی حفاظت کے لیے ایسا بندوبست کرنے کا فیصلہ کیا تھا کہ بچہ بھی پر نہ مار سکے۔ نہ جانے کیوں مجھے یقین تھا کہ یہ سب بے کار ہے اور بہرام دادا کا مقابلہ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ میں یہ جانتا تھا کہ بہرام دادا نے اس کوٹھی میں رہنے والے اسمگلر سے کہا ہوگا۔ غالباً یہ کہ جس طرح جعلسازی کے ذریعے وہ کوٹھی کا مالک بن بیٹھا ہے اسی طرح شرافت سے وہ کوٹھی اصل مالک نیک محمد کے نام کر دے۔ اس نے صاف انکار کر دیا ہوگا اور کہا ہوگا کہ تم میرا جو کچھ بگاڑ سکتے ہو بگاڑ لو۔

اگلے دن کے اخبار میں تفصیل آ گئی۔ اس بلڈنگ کو بم سے اُڑا دیا گیا تھا۔ حفاظت کرنے والے اسی طرح [illegible] لیس باہر کھڑے رہ گئے۔ جو اندر تھے وہ مکینوں کے ساتھ ہی [illegible] ہوئے۔ پولیس کو یقین تھا کہ باہر سے کسی نے کوئی بم نہیں پھینکا، بارودی مادہ عمارت کے نیچے کسی جگہ رکھا گیا تھا جس سے عمارت کی دیوار بھی سلامت نہیں بچی تھی۔ ابتدائی تفتیش میں یہ بات سامنے آئی تھی کہ دھماکا کرنے والوں نے پچھلی طرف سے گٹر لائن میں راستہ بنایا تھا اور غالباً پولیس کی وردی میں تھے کہ کسی نے ان کی صورتوں پر غور نہیں کیا اور وہ اندر کے حصے میں چار جگہ بارود [illegible] چلے گئے جہاں گٹر لائن کے ڈھکن تھے۔ اس بات کی وضاحت وہ بھی نہیں کر سکے تھے کہ اس بارودی مادے کو آگ کس نے کب اور کیسے دکھائی۔ کیا انھوں نے خودکار فیوز استعمال کیے تھے۔ اس [illegible] صرف ایک رپورٹر نے اشارہ کیا تھا کہ ممکن ہے خود انھی میں سے کسی نے تخریبی کارروائی کی ہو جو حفاظتی انتظامات کر رہے تھے۔ اسمگلر نے دھمکی ملنے کے بعد اپنے بیوی بچوں کو کہیں منتقل کر دیا تھا چنانچہ وہ اکیلا ہی مارا گیا۔ اس عمارت کے ملبے پر بعد میں [illegible] نے دوسری عمارت کھڑی کی جو اب تک موجود ہے لیکن اس سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا۔ جس جس سے مجھے انتقام لینا تھا لے چکا تھا مگر اب مجھے احساس ہونے لگا تھا کہ میرے ہاتھ کچھ نہ آیا۔ آخر مجھے بھی تو کچھ ملنا چاہیے تھا۔ یہ سب کچھ میرا ہی تھا [illegible] ہوا۔ بارہ سال تک میں بھیک مانگتا رہا اور میرے ساتھ جو زیادتی زمانے نے کی، اس کے بدلے میں مجھے کیا ملا؟ زندہ رہنے کے لیے بھی تو کوئی سہارا ہونا چاہیے۔ بے شک یہ سب جو میرا تھا، میں قانونی طور پر حاصل نہیں کر سکتا تھا اور اگر بہرام کی مدد سے کر لیتا تب بھی اس پر اپنا قبضہ برقرار نہیں رکھ سکتا تھا۔ اگر مجھے دس بیس ہزار ہی مل جاتے تو میں کوئی کام شروع کر دیتا۔

ان دنوں میں مجھے بہرام دادا کی ہر وقت تلاش رہتی تھی اس امید میں کہ شاید کوئی پھر مجھ سے رابطہ قائم کرے۔ [illegible] اسی ریسٹورنٹ میں جا بیٹھتا جہاں پہلی بار ایک شخص مجھے بہرام دادا کے پاس لے جانے کے لیے پہنچا تھا اور میں جاتا بھی اسی وقت تھا۔ چوتھے دن میری توقعات پوری ہوئیں اور ایک شخص مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔ ایک مرتبہ پھر میں پردہ نشینوں والی گاڑی میں بیٹھا اور گاڑی کو وہی شخص چلا کے لے گیا۔ نہ جانے کتنے موڑ کاٹنے کے بعد کار چلتے چلتے رکی تو میں اترا۔ اس کوٹھی میں آنے کا مجھے اتفاق نہیں ہوا تھا۔ مجھے اپنے ساتھ لانے والے کا چہرہ ضرورت سے زیادہ سنجیدہ تھا اور اس نے کسی قسم کی گفتگو نہیں کی تھی۔ کوٹھی میں بھی ویسی ہی مجھے اندر سے مکمل سکوت تھا۔ ایک سے دوسرے کمرے میں بڑھتا ہوا میں بالآخر اس شخص کی رہنمائی میں آخری دروازے تک پہنچا۔ اندر ایک بیڈ کے گرد دو نرسیں بے داغ سفید یونیفارم پہنے کھڑی تھیں۔ ایک ڈاکٹر سرہانے لگی ہوئی بہت سی مشینوں پر نظر رکھے کچھ لکھتا جا رہا تھا۔ دوسرا ڈاکٹر اس شخص پر جھکا ہوا تھا جو بستر پر سیدھا لیٹا ہوا تھا اور وہ پورا کمرا کسی اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ کی طرح نظر آتا تھا۔ بستر پر لیٹے ہوئے آدمی کو میں نے قریب جا کے پہچانا۔ وہ بہرام دادا تھا۔ اس کے چہرے اور سر کے گرد پٹیاں لپٹی ہوئی تھیں اور باقی جسم سرخ کمبل کے نیچے دبا ہوا تھا۔ دائیں بائیں گلوکوز اور خون کی بوتلیں لٹکی ہوئی تھیں اور ان میں سے ایک ایک قطرہ ٹپک کر بہرام دادا کی رگوں میں اترتا جا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے ہاتھ باہر نکالا اور ہلکا سا اشارہ کیا۔ مجھے ساتھ لانے والے نے چٹکی بجائی۔

”آپ سب لوگ ذرا سی دیر کے لیے باہر تشریف لے جائیں۔“ وہ بولا۔

”ہم اس حالت میں...“ ان میں سے سینئر نظر آنے والے ڈاکٹر نے احتجاج کیا۔

”حالت کا کوئی سوال نہیں، یہ حکم ہے۔“ وہ بے رخی سے بولا۔ ”چلیں جلدی کریں۔“

”لیکن ہماری عدم موجودگی میں کچھ ہوا تو اس کے ذمے دار ہم نہیں ہوں گے۔“ ڈاکٹروں نے باہر کا رُخ کرتے ہوئے کہا۔

”اس کے لیے آپ لوگوں پر کوئی ذمے داری عائد نہیں کی جائے گی۔“ اس شخص نے کہا اور خود بھی سب کے ساتھ نکل گیا۔

”بہرام دادا! یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے؟“ میں نے دروازہ بند ہوتے ہی اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”کچھ نہیں۔ چوٹ لگ گئی ہے معمولی سی۔“ وہ بولا۔ ”تیرا کام تو ہو گیا نا؟“

”کیا یہ چوٹ میرا کام کرتے ہوئے آئی ہے؟“ میں نے صدمے سے نڈھال ہو کے کہا۔

”کس نے بتایا ہے تجھے؟“ وہ بولا۔ ”خیر چھوڑ، اصل بات کر جس کے لیے میں نے تجھے بلایا ہے۔ تُو نے کہا تھا کہ مجھے مال و دولت کچھ نہیں چاہیے، تُو صرف بدلا لینا چاہتا تھا۔ مال تیرا تھا اور تجھے اس کو لینے کا پورا پورا اختیار تھا مگر تُو ڈرتا تھا۔ میں نے ایسا بندوبست کر دیا ہے کہ تیرا حق تجھے مل جائے اور تجھ پر حرف بھی نہ آئے۔ تیرے اصل دشمن جو تجھے جانتے تھے، باقی نہیں رہے۔ پھر بھی ذرا بچ کے رہنا۔“

پھر اس نے مجھے کاغذ کا ایک پرزہ دیا جس پر ایک نقشہ بنا ہوا تھا۔ اس نے کہا کہ میں اس نقشے کے مطابق صحیح جگہ پہنچ کر اپنا حق حاصل کر لوں۔ یہ حقیقت ہے کہ بہرام دادا کو اس حال میں دیکھنے سے پہلے میں یہی سوچ کر پچھتا رہا تھا کہ مجھے کچھ بھی تو نہیں ملا۔ اب مجھے بہت کچھ مل رہا تھا تو میں زیادہ پچھتا رہا تھا۔ غیر ارادی طور پر بہرام دادا نے اعتراف کر لیا تھا کہ اس کی یہ حالت میری وجہ سے ہوئی تھی۔ میں رونے لگا کہ بہرام دادا اب مجھے کچھ نہیں چاہیے آپ کی زندگی کے سوا مگر اس نے مجھے ڈسمس کر دیا۔ اس نے سرہانے لگے ہوئے ایک بٹن کو دبایا تو وہی شخص پھر نمودار ہوا اور مجھے باہر لے گیا۔ اگلے دن میں نے اخبار میں صنعت کار بہرام دادا کے انتقال کی خبر پڑھ لی۔ خبر میں موت کی وجہ حرکت قلب بند ہونا بتائی گئی تھی۔ میں اس کے جنازے میں شریک تھا لیکن کسی نے میری طرف دھیان ہی نہیں دیا۔ جو لوگ وہاں موجود تھے ان میں مجھے اعلیٰ پولیس حکام بھی نظر آئے مگر ان میں سے کوئی دکھائی نہ دیا، جو مجھے لاتے لے جاتے رہے تھے۔“

اُستاد میڈی خاموش ہو گیا۔ تب بھی ہم سب ہمہ تن گوش بے آواز بیٹھے رہے۔ یوں جیسے میڈی کی بات ابھی تمام نہیں ہوئی۔ بات ختم ہو گئی تھی مگر میڈی کی آواز کسی صدائے بازگشت کی طرح ہمارے ذہنوں میں گونج رہی تھی اور ہمارے تصور میں ایک فلم چل رہی تھی جس کا ہر منظر حقیقی زندگی میں ہمارے تجربات کا حصہ

لگتا تھا۔ میڈی استاد ستم رسیدہ اور مردم گزیدہ آدمی ہے! اس نے آلام و مصائب کے کتنے صبر آزما اور جان لیوا مرحلوں سے گزر کے جینا سیکھا ہے۔ زندگی کی مسافت میں آغازِ سفر سے اب تک وہ انگاروں پہ چلتا رہا ہے لیکن اس نے کبھی اپنے دُکھ کا اظہار نہیں کیا۔ کسی سے رحم کی بھیک نہیں مانگی اور کسی کو دل کے زخم نہیں دکھلائے۔ کبھی ہم سے بھی فسانۂ غمِ دل نہیں کہا کہ ہم اسے کہانی سمجھ کے اس کا تمسخر نہ اڑائیں۔ ہمارے لیے وہ ایک بیوقوفی کی حد تک سادہ دل، ادنیٰ درجے کا بدمعاش اور لاوارث آدمی تھا، جس کو ہمارے خلوص نے اپنا لیا تھا۔ ہم نے بات بات پر تمسخر مولا علی کی۔ کینے والے اور اپنی بہادری کی ڈینگ مارنے والے کی

بزدلی بھی دیکھی تھی۔ اسے خوبی بھی کہا تھا اور اس کے ساتھ ہر مذاق روا رکھا تھا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ ہم اسے اپنے سے ہمیشہ کمتر سمجھتے رہے۔ ہم نے اس کے خلوص اور اس کی شرافت کا ہمیشہ اعتراف کیا مگر یہ بات ہم سب کے ذہن میں تھی کہ اسے اپنی دوستی اور اپنائیت کے حلقے میں شامل کرکے اور اس کو جذباتی رشتوں کا امین بنا کے ہم نے اس کی عزت افزائی کی تھی اور ایک انسانی نیکی بھی ورنہ وہ غلط راستوں پہ چلتے چلتے نہ جانے کس عبرت ناک انجام سے دوچار ہوتا۔ ہم سب نے فرض کر لیا تھا کہ وہ بھی ان ہزاروں، صراطِ مستقیم سے بھٹک کر بدی کی راہ اختیار کرنے والوں کی طرح ہوگا۔ جن کا ماضی محض مفلسی اور احساسِ محرومی سے عبارت ہوتا ہے اور زندگی میں ان کی غلط روش درحقیقت ایک انتقامی ردِعمل کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اب ہم سب خود اپنی نظر میں شرمسار تھے۔ ٹیڈی کا ماضی کسی طرح بھی ہمارے اپنے ماضی سے کم قابلِ فخر اور باعزت نہ تھا۔ وہ ہم سب سے زیادہ نازونعم کا پروردہ تھا۔ اسے والدین کی محبت ہم سے زیادہ ملی تھی کیونکہ وہ ان کا ایک ہی بیٹا تھا اور جو کچھ اس نے گنوا دیا تھا وہ بھی ہم سب کے مقابلے میں زیادہ تھا۔ اس کی داستانِ حیات اور ہماری سرگزشت میں حیرت انگیز مماثلت تھی۔ اس کی زندگی کے بھی تین دَور تھے۔ ایک وہ جو خوش بختی، خوشحالی اور خوش باشی کا دَور تھا۔ دوسرا وہ جس میں وہ اپنے آپ سے بچھڑ گیا تھا اور بارہ سال تک بے خبری کا شکار رہا تھا اور تیسرا ابھی یہ دَور تھا جس میں اُس نے اپنی پرانی زندگی کی طرف لوٹ کر دیکھا تھا۔ اسے ہر طرف غاصب اور شکاری نظر آئے تھے اور اس نے سب سے انتقام لینے کے جنون میں جان کی بازی لگا دی تھی۔ اس کی زندگی میں بھی محبت کا تھوڑا سا [illegible] نے کے لیے فاطمہ نام کی ایک لڑکی آئی تھی اور اپنی یادوں کا دکھ دے کر چلی گئی تھی۔ یہی میری آپ بیتی تھی اور یہی رابعہ کا افسانۂ حیات تھا۔ ہم بھی والدین کی آغوشِ شفقت سے اسی طرح محروم کیے گئے تھے۔ ہم سے بھی غاصبوں نے ہمارے جینے کے سہارے چھین لیے تھے اور اب ان سے ہمارے انتقام کی جنگ جاری تھی۔ فاطمہ کی طرح میری زندگی میں فوزیہ آ کے نکل گئی تھی اور رابعہ کو ایک ایسے شخص نے نکاح کے بعد چھوڑ دیا تھا جو کسی طرح بھی شادی کے قابل نہ تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ٹیڈی کے ذاتی انتقام کی آگ بہرام دادا کی مدد سے بجھ گئی تھی اور اس نے حقِ وراثت کی جنگ کو اسی کے ساتھ ختم کر دیا تھا۔ اب ہم سب واقعات، حادثات اور اتفاقات کے اس سلسلے پر غور کر رہے تھے اور ہمارے ذہن پر سوالات کی یلغار تھی۔ وہ صندوق جسے ہم نے حقارت اور تمسخر کے ساتھ ہر خطاب دیا تھا، بیک وقت قارون کا خزانہ بھی ثابت ہوا تھا اور پنڈورے کا باکس بھی۔ اس میں دو لاکھ سے اوپر کا سونا تھا اور استاد ٹیڈی کہلانے والے خواجہ نیک محمد کا پُرعذاب ماضی سب بے رحم یادوں کے ساتھ بند تھا۔

"تو اس میں وہی سونا ہے جس کا پتا تمہیں بہرام دادا نے دیا تھا؟" بالآخر محسن نے خاموشی کے اس جمود کو توڑا۔

"ہاں، وہ نقشہ بہت پیچیدہ نہیں تھا۔" ٹیڈی بولا۔ "میں اسی کے مطابق گیا اور یہ صندوق نکال لایا۔"

"یہ کتنا عرصہ پہلے کی بات ہے؟" رابعہ بولی۔

"تقریباً چار سال ہو گئے۔" ٹیڈی نے کہا۔

"اور تم چار سال سے اس خزانے کو اسی طرح لیے پھر رہے ہو؟" میں نے کہا۔ "کسی مقصد کے بغیر؟"

"تم نے اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا؟" رابعہ نے کہا۔ "بلاوجہ غربت اور تنگدستی کی زندگی بسر کرتے رہے؟"

"حالانکہ اس سے تم بہت کچھ کر سکتے تھے۔" محسن بولا۔ "اور جو کچھ تم کرتے وہ اس سے یقیناً بہتر ہوتا جو تم کرتے رہے تھے۔"

"تم لوگ تو مجھے بیوقوف ہی کہو گے۔" وہ بولا۔ "لیکن سکندر بادشاہ! جب بھی مجھے خیال آتا تھا کہ میں اس سونے کو نکالوں تو مجھے بہرام دادا کی یاد آ جاتی تھی۔ وہ میری وجہ سے مارا گیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اس اسمگلر کی کوٹھی میں دھماکے ہونے کو کوئی ایسا حادثہ پیش آیا تھا جس میں وہ مہلک طور پر زخمی ہو گیا تھا۔ آخر میری خاطر اس نے جان کا خطرہ کیوں مول لیا؟ کیا لگتا تھا وہ میرا؟ کون سی نیکی کی تھی میں نے اس کے ساتھ کہ اسے قرض چکانا تھا؟ وہ ایک دولت مند آدمی تھا اور دنیا اسے صنعت کار ہی سمجھتی تھی۔ وہ صنعت کار تھا یا مجرم یا ذہنی مریض۔ میرے لیے اس نے جان کیوں دی؟ اور مجھے اس نے کبھی نہیں چھوڑا کہ میں اس کا قرض چکا سکوں۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اس کے وارث کون ہیں ورنہ میں ان کے لیے ہی کچھ کرتا۔ سونا مجھے بہرام دادا کے خون میں لتھڑا ہوا نظر آتا تھا۔ میں اسے چھوڑ بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ میں اس کا جائز وارث ہوں۔ یہ سب میرا ہی تو تھا۔"

"کیا تم نے اسی لیے میرا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا تھا؟" میں نے کہا۔

"ہاں، جب میں نے تمہاری بات سنی تو مجھے یوں لگا جیسے یہ میری ہی زندگی کی کہانی ہے سکندر بادشاہ! اور میں نے سوچا کہ استاد ٹیڈی، بدمعاشی تو بہت کر لی، اب کچھ نیکی کرکے تو آگے بڑھو۔ تم بہرام دادا کی خاک ماپو، نہیں، مگر اس کے لیے کچھ تو کر سکتے ہو۔ وہ بہت بڑا آدمی تھا اور تم بہت چھوٹے آدمی ہو لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ نیکی کا جذبہ تو ہر دل میں برابر ہی ملتا ہے۔ جو قرض بہرام دادا نے چھوڑا تھا وہ ادا کرنا چاہو تو قدرت نے ایک موقع فراہم کیا ہے۔ بہرام دادا اگر جان کی بازی لگا سکتا تھا تو کیا تم نہیں لگا سکتے۔ مقصد تو وہی ہے۔ آج اگر کوئی کسی اندھے کو سڑک پار کراتا ہے تو یہ نیکی کرکے اپنی راہ لیتا ہے مگر کبھی وہ خود اندھا ہو جائے تو اس کا ہاتھ تھام کے سڑک پار کرانے کے لیے وہی اندھا نہیں آتا، کوئی اور آتا ہے۔"

"تم بہرام دادا سے کسی طرح بھی کم عظیم آدمی نہیں ہو دوست!" میں نے فرطِ جذبات سے مغلوب ہو کے کہا۔

"ہمیں معاف کر دینا کہ ہم سے آج تک تمہاری عظمت کی شناخت نہیں ہو سکی۔" محسن بولا۔ "تم اسی طرح ہنستے رہے، مسکراتے رہے، ہمارے مذاق کو برداشت کرتے رہے۔ تم نے کبھی نہیں کہا کہ تم بھی مظلوم ہو۔"

"تمہارا ظرف ہم سے زیادہ تھا۔" میں نے اعتراف کیا۔ "ہم نے انسانوں کی زیادتی کو، ان کے مظالم کو اور اپنی محرومی کو اتنی فراخدلی کے ساتھ برداشت نہیں کیا اور سخت حالات میں اتنے پُرسکون نہیں رہ سکے جتنے تم رہے۔"

"چیخنے چلانے سے مجھے کیا مل جاتا۔ دنیا مجھ پر ہنستی۔" ٹیڈی بولا۔ "دنیا نے میری پہلے کب مدد کی تھی۔ حشر تو میرا بھی وہی ہوتا جو تمہارا ہوا، شاید اس سے بدتر ہوتا لیکن مجھے بہرام دادا مل گیا تھا۔"

"آخر کون تھا یہ بہرام دادا؟" میں نے کہا۔ "تم نے بعد میں اس کا سراغ لگانے کی کوشش نہیں کی؟"

"اس کی زندگی میں کوئی اس کا سراغ نہ پا سکا تو اس کے مرنے کے بعد وہ کیسے مل سکتا تھا؟" ٹیڈی بولا۔

"اور اس کے ساتھی؟" محسن نے کہا۔ "وہ پھر نظر نہیں آئے؟"

ٹیڈی نے نفی میں سر ہلایا۔ "کبھی نہیں۔"

"تم لاہور میں پھرتے تھے۔ کبھی ان کوٹھیوں میں ایسی کوئی کوٹھی نہیں ملی جہاں تم جاتے تھے؟"

"نہیں، ایک زمانہ تو ایسا تھا کہ میں دیوانہ وار ان علاقوں میں پھرتا تھا جہاں ایسی کوٹھی مل سکتی تھی۔" ٹیڈی بولا۔ "لیکن میری تلاش رائیگاں گئی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ سب جادو کا کھیل تھا۔ ایک جادوگر نے میری مدد کی تھی۔ اس کا ایک شاہی محل تھا اور اس کے غلام جنات تھے۔ جادوگر کی موت کے ساتھ ہی سب غائب ہو گئے۔ بہرام دادا تھا یا نہیں، یہ آج بھی کوئی نہیں جانتا، حالانکہ میانی صاحب کے قبرستان میں اس کی قبر بھی ہے۔"

"اس میں کوئی شک نہیں کہ تمہاری پوری داستانِ حیات میں بہرام دادا کا کردار بے حد افسانوی لگتا ہے۔" رابعہ بولی۔ "رابن ہڈ کے کردار کی طرح۔ اس کا نام اور ذکر تو میں نے بھی سنا تھا مگر جیسا کہ تم نے کہا، اکثر لوگ بہرام دادا کو اخبار والوں کا اسٹنٹ سمجھتے تھے۔ جرائم کی خبروں کو زیادہ سنسنی خیز اور پُرلطف بنانے کے لیے اس کردار کا نام کسی منچلے نے ایجاد کیا اور پبلسٹی ملی تو بہت جلد مقبول ہو گیا۔ صنعت کار بہرام دادا صرف نام کی مشابہت کے باعث موضوعِ سخن بنا تھا۔ بدنام نہیں ہوا تھا لیکن حقیقت کو تم نے بہت قریب سے دیکھا ہے۔"

"تم اس حقیقت کو تمام تفصیلات کے ساتھ غالب کے گوش گزار کر دو۔" محسن بولا۔ "وہ اس سچی آپ بیتی کو شائع کرے گا تو تہلکہ مچ جائے گا۔"

"تمہارا مطلب ہے میں اب بہرام دادا کے نام کو بیچ دوں؟" ٹیڈی ایک دم بھڑک اٹھا۔ "اس کی نیکی کا یہ صلہ دوں کہ اسے ایک دلچسپ اور پُراسرار کہانی بنا دوں جس سے اخبار خوب بکے؟"

"سوری استاد! میں مذاق کر رہا تھا۔" محسن نے خفت سے کہا۔

"عملاً بھی یہ بہت خطرناک کام ہوگا۔" میں نے کہا۔ "بہرام دادا مر گیا ہے مگر وہ سب تو زندہ ہوں گے جو اس کے نمک خوار اور حلیف تھے اور ایسے رازدار تھے کہ آج تک خاموشی اور گمنامی قبول کیے بیٹھے ہیں، وہ چھوڑیں گے ٹیڈی کو؟"

"چلو چھوڑو یہ بات۔" رابعہ نے کہا۔ "یہ بتاؤ کہ کیا تم کو افشائے راز کا اندیشہ نہیں تھا؟ تم پھر بھی صندوق ہمارے ساتھ لیے پھرتے رہے۔ ہمیں شک تو ہونا ہی تھا۔"

"مجھے معلوم تھا مگر میں ایک فیصلہ کر رہا تھا۔" ٹیڈی نے کہا۔ "تم پوچھتے رہے اور میں ٹالتا رہا۔ بالآخر میں نے طے کر لیا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ جب میں نے تمہارا ساتھ دینے کے لیے جان ہتھیلی پر رکھ لی سکندر بادشاہ! تو یہ سونا کیا ہماری جان سے زیادہ ہے؟"

"مگر اس کو ہم نہیں لیں گے۔" محسن بولا۔ "یہ صرف تمہارا ہے، جتنا تمہیں ملنا چاہیے تھا اس کا سواں حصہ بھی تم کو نہیں ملا۔ جو ملا وہ ہم کیسے لیں؟"

"چار سال سے یہ سونا میرے پاس پڑا تھا، شاید اسی دن اور اسی مقصد کے لیے۔" وہ بولا۔ "یہ تمہارے کام بھی نہ آتا

تو پھر کس کے کام آئے گا۔ تم نے پوچھا تھا کہ یہ مالِ حرام تو نہیں ہے۔"

"اب اور شرمندہ مت کرو استاد۔" میں نے کہا۔

"آج سے یہ استاد اور ڈیڈی جیسے نام کوئی نہیں لے گا۔" رابعہ نے کہا۔ "پھر کبھی تم نے خرچی کہا نا میرے بھائی کو تو تمہیں نہیں چھوڑوں گی۔"

"ہم بھی تمہیں نہیں چھوڑیں گے، قسم مولا علی کی۔" میں نے سخت عاشقانہ انداز میں آہ بھر کے کہا۔ سب کی سنجیدگی یک دم ختم ہو گئی۔ محسن نے زبردست قہقہہ لگایا اور میری کمر پہ ہاتھ ملایا۔ رابعہ کا رنگ اپنی بات کے یوں الٹ جانے سے گلنار ہو گیا مگر نازو بھی جو اسی طرح چپ بیٹھی رہی۔

"تم کو کیا ہوا ہے؟" میں نے ہی اس سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ "گھر یاد آ رہا ہے؟"

نازو نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا۔ ایک بار پھر سب سنجیدہ ہو گئے اور سب کی نظر نازو پر جم گئی۔

"ہم نے تو کہا تھا۔" محسن بولا۔ "مگر خیر، اب بھی دیر نہیں ہوئی ہے۔ تم واپس جا سکتی ہو۔"

"میں واپس نہیں جاؤں گی۔" نازو نے سر اٹھا کے کہا۔ "مجھے امی اور ابو کا خیال آ رہا ہے۔"

"وہ یقیناً پریشان ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "اور قصور وار مجھے سمجھیں گے۔"

"تمہیں کیوں؟ جو کچھ کیا ہے میں نے۔ وہ میرا فیصلہ تھا۔" وہ بولی۔ "میں چاہتی ہوں کہ یہ بات ان کو بتا دوں۔"

"تمہارے بتانے سے ان کی مشکل آسان نہیں ہو گی۔" میں نے کہا۔ "لڑکیوں کا گھر سے چلے جانا عزت کا مسئلہ بن جاتا ہے۔"

"وہ اس مسئلے کو الجھانے سے گریز کریں تو ان کی مشکلات میں کمی آ سکتی ہے۔" نازو بولی۔

"اور تم ان کو یہ بتانا چاہتی ہو کہ وہ اس مسئلے کو کس طرح ہینڈل کریں؟" محسن بولا۔ "آل رائٹ، چلو میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ کسی پبلک ٹیلیفون پر ان سے بات کر لو۔"

"ہو سکے تو غالب کو بھی بتا دینا کہ ہم کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔" میں نے کہا۔

"ہم شیر ہیں اور لوہے کے جال میں ہیں۔" محسن نے آغا حشر کا ڈائیلاگ دہرایا۔

"ہم احمق ہیں اور حماقتوں کے جال میں گرفتار ہیں۔" میں نے تردید کی۔ "تم اپنے والدین کو کیا سمجھاؤ گی؟ یہ تو بتا دو۔"

"میں ان سے صاف کہہ دوں گی کہ میری واپسی کا انتظار نہ کریں۔" وہ بولی۔ "اور بلاوجہ میری تلاش میں اس بات کی تشہیر نہ کریں کہ میں گھر سے نکل گئی ہوں۔ میں انھیں اپنی خیریت سے مطلع رکھوں گی۔ وہ مطمئن رہیں اور مجھ پر اعتماد رکھیں۔ میں جن لوگوں کے ساتھ ہوں، ان کو دنیا جو چاہے سمجھے اور کہے مگر میں خود کو ان کے درمیان اتنا ہی محفوظ تصور کرتی ہوں جتنا اپنے گھر میں کر سکتی تھی۔"

"وہ تمہاری اس جذباتی تقریر کو تمہاری کم عقلی کی دلیل سمجھیں گے۔ اور کچھ نہیں۔" میں نے کہا۔

"میرا فرض اتنا ہی ہے کہ انھیں سمجھا دوں۔" وہ بولی۔ "وہ اپنی رسوائی چاہتے ہیں تو جتنا شور چاہیں کریں۔ اخبار میں میری تصویر شائع کرا دیں اور پولیس کے ہر تھانے میں میری تصویر لگوا دیں۔ آسان طریقہ یہ ہے کہ وہ لوگوں سے کہہ دیں کہ مجھے تعلیم کے لیے باہر بھیج دیا گیا ہے یا میری خالہ بیمار ہیں اور میں پشاور میں ہوں۔ بات بگاڑنے سے کیا فائدہ۔ وہ چاہیں تو بات بنا سکتے ہیں، نہ چاہیں تو میرا کوئی نقصان نہیں۔"

جب وہ محسن کے ساتھ چلی گئی تو میں اور نیک محمد بیٹھے رہے۔ میں نازو کے بارے میں سوچتا رہا جو ناقابلِ یقین حد تک ضدی، نڈر، حوصلہ مند، خوبصورت اور خطرناک تھی۔ اس کی ہر خوبی انتہا تک پہنچتی تھی۔ مقابلہ حسن کا ہوتا تو وہ رابعہ سے کہیں زیادہ حسین تھی مگر معاملہ دل کا تھا چنانچہ اپنی تمام معصومیت، ادائے حسن کی ساری غارت گری اور وفا کے ہر امتحان سے سرخرو گزرنے کی صلاحیت کے باوجود وہ کبھی رابعہ کو شکست نہیں دے سکتی تھی۔ کچھ لوگ پاگل پن کی حد تک امید پرست ہوتے ہیں۔ کیا نازو بھی انہی میں شامل ہے؟ میرے دل نے سوال کیا۔ اس نے ایک موہوم سی امید کی نازک ڈور کا سہارا لے لیا ہے کہ جذبۂ عشق سلامت ہے تو ہم دیکھیں گے۔ کچے دھاگے سے چلے آئیں گے سرکار بندھے۔ مگر صحرا کے آبلہ پا مسافر بھی تشنہ لب اسی طرح سراب کے تعاقب میں چلتے چلے جاتے ہیں۔ ان کو امید کس طرح دامِ فریب دیتی ہے۔ رابعہ سب کے لیے بستر بچھانے کے بعد مٹی کے تیل کا بتیوں والا چولہا سلگا رہی تھی۔ اس نے میرا، محسن کا اور نیک محمد کا بستر ایک کمرے میں لگا دیا تھا۔ دریاں اور ان کے اوپر کھیس۔ تکیے غیر موجود مگر سر کے نیچے رکھنے کے لیے بہت کچھ تھا۔ لحاف کو یوں لپیٹ کر سونا کوئی مشکل نہ تھا کہ وہ کمر کے نیچے بھی آ جائے۔ نیک محمد شاید پرانی یادوں کے ساتھ سفر کر رہا تھا اور بہرام دادا کو یاد کر کے ملول تھا۔ کتنا گہرا اور پُراسرار آدمی تھا وہ شخص جسے ہم نے سطحی نظر سے پرکھا تھا۔ اس کی اہمیت اور قدر و منزلت پہلے بھی کم نہ تھی مگر اب وہ واقعی بہت قابلِ تعظیم ہو گیا تھا۔ اس کی وقعت کو دو ڈھائی لاکھ کے سونے میں نہیں تولا جا سکتا تھا۔ انمول اس کا دل تھا، اس کی شانِ قلندری تھی اور اس کی انسانیت تھی جو آدمی میں جوہرِ نایاب کی طرح عنقا ہوتی جا رہی ہے۔

محسن آدھے گھنٹے بعد نازو کے ساتھ لوٹا تو نازو کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ اس کا سبب پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ والدین کو بپتا سنا کے اور ان کی ان سنی کر کے لوٹی تھی۔ اس نے والدین کی دھمکی، التجا اور خفگی سب کو نظر انداز کیا تھا اور یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے خیال آیا کہ کسی دن اس انتہا پسند لڑکی کا وجود میرے لیے مسائل پیدا کر دے گا۔ وہ ناکامی اور شکست کو قبول کرنے والی لڑکی نہیں تھی۔ اگر اس نے نوشتۂ دیوار کو پڑھ لیا اور جان لیا کہ میرا اور اس کا میل مشرق اور مغرب کے میل کی طرح ناممکن ہے تو وہ کیا کرے گی؟ خاموشی سے اپنی دنیا میں لوٹ جائے گی؟ نہیں، اس طوفان بکف آتش فشاں، سیماب صفت اور محشر خیز لڑکی سے خاموشی کو کیا نسبت! وہ جان دے سکتی ہے اور جان لے سکتی ہے مگر ہار نہیں مان سکتی۔ بفرضِ محال اسے جان لینے یا دینے کا مرحلہ درپیش ہوا تو وہ کس کو ترجیح دے گی۔ جان دینے کو یا جان لینے کو؟ اس سوال کا جواب کوئی ماہرِ نفسیات، کوئی ریاضی داں، سائنسٹسٹ یا کمپیوٹر، نجومی یا دست شناس نہیں دے سکتا تھا۔ جواب صرف وقت دے سکتا تھا اور میں صرف اندازہ کر سکتا تھا کہ جان لینے کا مرحلہ آیا تو وہ کس کی جان لے گی۔ وہ میری خاطر اپنی جان دینے کی اہل ہے۔ میری جان وہ کبھی نہیں لے سکتی مگر رابعہ اس کے لیے غیر اہم ہے۔ وہ رابعہ کو اپنا حریف مان لے تو اسے بلا جھجک ختم بھی کر سکتی ہے۔ اس کے برعکس وہ میرے لیے قربانی دینے سے بھی گریز نہیں کرے گی۔ میرا دماغ اس سوچ کے بھنور میں الجھ گیا تھا۔ نہ جانے یہ لڑکی کیا کرے گی۔ اس کا ساتھ کسی ایسے ٹائم بم کا ساتھ تھا جس کے فیوز پر کسی کا کنٹرول نہ ہو۔ اسے نہ ٹھکرایا جا سکتا تھا اور نہ الگ کیا جا سکتا تھا، یہ اس کے پُرخلوص جذبوں کی توہین ہوتی۔ وہ ایم آر ایس کے مشن کے نکتۂ نظر سے بے حد کارآمد تھی اور وہ کر سکتی تھی جو کوئی اور نہیں کر سکتا تھا مگر یہ بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت تھی کہ وہ رابعہ کے سر پر لٹکنے والی خطرے کی تلوار تھی اور میرے لیے یہ انتہائی ضروری تھا کہ میں رابعہ کی حفاظت کے خیال کو نازو کی رفاقت سے زیادہ اہم سمجھوں۔

رات کے کھانے کے بعد ہم سوئے تو صبح کوئی بھی سورج نکل آنے کے بعد بھی نہ اٹھا اور شاید ہم ابھی مزید گھنٹا دو گھنٹا اسی طرح پڑے رہتے اگر ہمارے لینڈ لارڈ نے دروازے کو طبلِ جنگ کی طرح بجانا شروع نہ کیا ہوتا۔ بیک وقت میں اور محسن اٹھ بیٹھے اور ہم نے نظروں ہی نظروں میں سوال کیا کہ یہ بن بلایا مہمان کون ہو سکتا ہے۔

"اجی اٹھو سوہنیو، سرکار سویرا ہو گئی اے۔" [illegible] بنکارنا شروع کیا۔ "اچھا اسی فیر چلے۔"

"او جی ٹھہرنا۔" میں نے نعرہ لگا کے کہا اور دروازہ کھولنے دوڑا۔ ایک بار پھر وہ ٹیکسی کو گلی کے اندر لے آیا تھا۔ میں نے نقصِ امن ہونے سے پیشتر ہی معاملات طے کیے اور باہر نکل کے بات کی۔

"اب آپ کرایہ بتا دیں۔" میں نے کہا۔ "مکان ہمیں پسند آیا اور بھوت بھی پرانے آشنا نکلے۔"

"ہں جی؟" اس نے ہونقوں کی طرح کہا۔ "فیر آ گیا جے کوئی نامراد۔ اچھا آج شام کو ہم اسے بھی ملیامیٹ کر دیں گے اور صبح تک یا وہ نہیں یا فیر ہم نہیں۔ اِک رات دا عمل اے۔"

"نہیں نہیں۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "اب دات کو عمل وغیرہ کچھ نہیں کرنا۔ میں تو مذاق کر رہا تھا۔ آپ کرایہ بتائیں۔"

"کرایہ کی سوہنیو۔ جو خوشی نال مل جائے اوہی چنگا۔" وہ بولا اور میرے بہت اصرار کے باوجود اس نے کوئی رقم نہیں بتائی اور جب میں نے اس کے ہاتھ پر پانچ سو روپے رکھے تو اس کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔

"او سچا رب توانوں خوش رکھے، تسی مینوں خوش کیتا جے۔" وہ بولا۔ "لیکن سچ بولو جی! آپ نے اپنی خوشی نال دیا ہے، زور زبردستی کوئی نئیں، دل دچ ناراضگی تے کوئی نئیں؟"

میں نے اسے یقین دلایا کہ پانچ سو دے کر میں واقعی خوش ہوں اور حالات سازگار ہوتے تو اسی مکان کے پانچ ہزار دے کر بھی میں اتنا ہی خوش ہوتا۔ اس مردِ قلندر نے بے اختیار نوٹوں کو چوم کر اپنی واسکٹ نما قمیص میں رکھا اور مجھے گلے لگا کے ضرورت سے زیادہ دبایا لیکن میں نے برا نہیں مانا۔ اس کی خوشی کا ستیاناس مخالف سمت سے نمودار ہونے والی ٹیکسی نے کیا۔

"اوئے... اوئے فیر ایتھے لا کھڑا کیتا جے بے بے نوں؟" دوسرے ڈرائیور نے عادتاً ہارن بجا کے جنگ کا آغاز کیا۔ میں فوراً اندر گھس گیا۔ ان کے درمیان شوخ جملوں کا اور بے ضرر گالیوں کا تبادلہ کچھ دیر جاری رہا۔ پھر معلوم نہیں کس نے ٹیکسی پیچھے ہٹائی۔ اندر نازو اور رابعہ نے ناشتے کا اہتمام کیا۔ بہت عرصے بعد تحفظ کا احساس بڑی تسکین کا باعث بن رہا تھا۔ رات کو مجھے بڑی پُرسکون نیند آئی تھی اور میں نے کوئی خواب نہیں دیکھا تھا۔ دوسروں کی حالت بتاتی تھی کہ ان کی بھی یہی کیفیت رہی۔ ہینڈ پمپ چلا کے بالٹی بھرتے ہوئے تھوڑا سا فساد ہوا لیکن بالآخر پرچی نکال کے معاملہ طے کیا گیا۔ غسل خانے میں جانے کے لیے پہلا نمبر نیک محمد کا نکلا، آخری محسن کا اور اس نے قرعہ اندازی میں الیکشن کمشنر یعنی مجھ پر دھاندلی کا الزام عائد کیا۔ میں نے نازو کو حکم دیا کہ اس ناہنجار کو ڈسپلن خراب کرنے کی سزا دے مگر وہ کچھ بجھی بجھی سی تھی اور شاید رات کو روتی بھی رہی تھی۔ وہ بے دلی سے مسکرا کر

رہ گئی۔ بعد میں محسن نے مجھے اس کی اور والدین کی گفتگو سے آگاہ کیا۔ والدین نازو کی کوئی بات ماننے پر آمادہ نہ تھے اور انھوں نے نازو کو واپسی کے لیے چوبیس گھنٹے دیے تھے۔

ناشتے کے بعد میں نے مجموعی صورتِ حالات کا جائزہ لیا۔ ہمارے پاس مختلف مواقع پر مختلف افراد سے چھینے ہوئے اسلحے کی پوزیشن کچھ اس طرح تھی۔ کل آٹھ ریوالور تین سائلینسر والے تو پانچ بغیر سائلینسر کے۔ ہر ریوالور میں سے ایک دو گولیاں چلائی گئی تھیں مگر باقی میگزین میں تھیں۔ اسٹین گن کا ایک ہی راؤنڈ تھا اور یہ... خطرناک ترین ہتھیار صرف ایک بار کسی ایسی جنگ میں کام آ سکتا تھا جب ہم ہر سمت سے محصور ہو جائیں اور ریوالور بھی طلت نکلنے میں ہمارے مددگار ثابت نہ ہوں۔ اس کے بعد مزید راؤنڈ دستیاب ہونے تک اسٹین گن کو صرف ڈنڈے کی طرح گھما کے ... میں استعمال کیا جا سکتا تھا۔ ریوالور کے لیے ہر سائز کی گولیاں خفیہ ٹھکانوں سے بلیک میں خریدنا ممکن تھا مگر اسٹین گن کے راؤنڈ حاصل کرنا ناممکن تھا۔

"یہ قتلِ عام کرنے کا اسلحہ استعمال کہیں نہیں ہو گا۔" محسن نے کہا۔ "اس کا دیدار ہوتے ہی سامنے سے مسلح شکاری اپنی بٹالین کے ساتھ ہتھیار ڈال دیں گے یا پسپا ہو جائیں گے۔"

"کرنا بھی یہی ہے۔" میں نے کہا۔ "جہاں ضروری نہ ہو وہاں بھی اسٹین گن کو ساتھ رکھنے سے دہشت قائم رکھنے میں مدد ملتی ہے۔"

"کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ آج ہم کچھ بھی نہ کریں؟" رابعہ نے کہا۔

"کچھ نہ کرنے سے کیا مطلب؟ پلکیں بھی نہ جھپکائیں؟ سانس بھی نہ لیں؟" محسن نے کہا۔

"ہم یہ کر سکتے ہیں کہ ایک پرانے اور کبھی نہ بخشنے والے دشمن کی قید سے نکل آنے پر جشن منائیں۔" رابعہ نے کہا۔ "بیٹھ کے گپ لگائیں، کچھ ہنسیں۔ پلاؤ زردہ وغیرہ پکا کے غریب اور مسکین لوگوں کو یعنی اپنے آپ کو کھلائیں۔ تم ایک ریڈیو ٹیپ ریکارڈر لاؤ تاکہ کچھ گانے سنیں۔ ایک دن کے لیے عام انسانوں کی زندگی سے لطف اندوز ہوں۔ جو کبھی ہماری زندگی بھی تھی۔"

"ہاں، ان چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے بھی ہم کو محروم ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا۔" محسن گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکا کے بولا۔

"کسی بڑے مقصد کے حصول کی راہ میں زندگی کے چھوٹے اور غیر اہم تقاضوں کو نظر انداز کرنا ہی پڑتا ہے۔" میں نے کہا۔

"ہم بڑی خوشیوں کے پیچھے بھاگتے جا رہے ہیں اور نہیں جانتے کہ کب تک بھاگتے رہیں گے۔ ہمیں دکھ، مجبوری اور محرومی، رسوائی اور ناامیدی کے سوا کیا ملا ہے۔" رابعہ نے کہا۔

"آخر یہ کیا ہے، فرسٹریشن یا ڈیپریشن؟" میں نے کہا۔

"یہ تمہارا سر ہے۔ ایک دن میں آخر کیا ہو جائے گا" ... نے چڑ کر کہا۔

"گزرے ہوئے ایک دن کو دیکھو۔ اس ایک دن میں کچھ ہو گیا۔" میں نے کہا۔ "اگلے چوبیس گھنٹوں میں بھی بہت ہو سکتا ہے اور میں نہیں چاہتا کہ ہم ذرا سی کوتاہی یا غفلت باعث کوئی موقع گنوا دیں تو پچھتانے کا عذاب بھی جھیلنا پڑے"

"کچھ بھی ہو۔ آج میرا دل چاہتا ہے کہ ایک دن ... گی جائے۔"

"یہ دل کا معاملہ نہیں ہے نیک بخت۔" میں نے کہا "... سے کام لو۔"

"اب اس ناچیز ناقص العقل عورت ذات کے پاس ... نہیں، نہ دل نہ دماغ۔" رابعہ بولی۔

"ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی" محسن ... بھر کے بولا "چاہتے ہیں سو آپ کرے ہے ہم کو عبث ..."

"گویا تو بھی بغاوت پر آمادہ ہے؟" میں نے اسے گھورا۔

"تم کیا کہتے ہو نیک محمد؟"

"ہم تو وہی کہتے ہیں سکندر بادشاہ جو ہماری بہن کہتی ہے" نیک محمد دانت نکالنے لگا۔

"پھر تو ہو گئی ساری خدائی اک طرف۔" میں نے ہار مان کے کہا۔ "اچھا بھائی آج چھٹی، پکنک مناتے ہیں گھر میں۔"

وہ دن بڑے مزے میں گزرا۔ محسن پنگبع بازار سے پورٹیبل ٹیپ ریکارڈر لے آیا اور کچھ فضول سے گانوں کے کیسٹ بھی۔ سارا دن ہڑبونگ رہی۔ میں اور محسن بڑی بازی لگاتے رہے اور ہر بول کو رابعہ یا شہلا سے منسوب کرتے رہے۔ رابعہ اور نازو نے کھانے میں بڑا تکلف کیا اور نیک محمد نے ان ... ضرورت کا سارا سامان لا دیا۔ وہ پکانے میں مصروف رہیں اور ... اوٹ پٹانگ رقص فرماتے رہے۔ سوائے انگریزی ڈانس کے ... میں نے اور محسن نے انگلستان میں سیکھے تھے، ہمیں کچھ نہیں آتا ... چنانچہ جب محسن نے "کتھا کلی" اور میں نے "بھنگڑا" پیش کیا ... خواتین کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔ رات کو میرا دل چاہتا تھا کہ ... رابعہ سے وہی نیلے آسمان کے رنگ کی ساری باندھنے کی فرمائش کروں ... جس پر زرد پھولوں کے ستارے روشن تھے اور پھر اس کے ساتھ ... شملہ پہاڑی کے کسی نکتے کنج میں دل کی باتوں سے اپنے ... خواب جنوں جو میرے اتنے قریب اور پھر بھی مجھ سے بہت دور ... لیکن میں نے آرزو دئے دلِ ناشاد کو تھپک کر سلا دیا۔ خوابیدہ ... کو جگانے سے کیا حاصل، میں نے اپنے آپ کو سمجھایا۔ خواب ... میں پڑاؤ کے بعد حقیقتوں کی دنیا میں لوٹ کر کانٹوں پر سفر کو جاری ... زیادہ مشکل ہو جاتا ہے۔ پھر مجھے محسن کا خیال بھی تھا کہ اس ...

وہ خود کو زیادہ تنہا محسوس کرے گا۔ اگر میں رابعہ سے پوچھتا تو اس کے دل کی بات کہتا۔ وہ خود بھی چاہتی ہوگی کہ اس کی زندگی میں جو ہر دم رواں پیہم دواں ہے، ایک ہنگامۂ دار و گیر ہے اور مسلسل تگ و دو ہے اور قدم قدم رسن و دار کے مرحلوں سے عبارت ہے، فرصت اور خلوت کے چند پیار بھرے لمحے میسر آ جائیں تو وہ کہے اور میں سنوں۔ پھر میں کہوں اور وہ سنے مگر میں نے مصلحت کے پیشِ نظر یہ تجویز پیش کر دی کہ ہم سب رات کے کھانے کے لیے باہر چلیں۔

رات کے وقت پہچانے جانے یا کسی دشمن سے سرِ راہ ملاقات کے امکانات کم تھے مگر تھے تو ہم نے انھیں نظر انداز کیے رکھا اور بڑی بے خوفی سے ہر جگہ گئے۔ ہم نے ایک مدت کے بعد شیزان میں پرتکلف چائے پی۔ پھر ایک انگریزی فلم دیکھنے چلے گئے جو خلافِ توقع بہت اچھی ثابت ہوئی۔ رات کو ہم دارالکباب سے چکن تکے کھا کے پھر "لارڈز" سے کافی پی کر لوٹ رہے تھے کہ مجھے محسن کے والد کا خیال آیا۔ وہ آخری اطلاع کے مطابق ریٹائر ہونے کے بعد فوزیہ کے گھر منتقل ہو گئے تھے۔

"آج موقع بھی ہے۔" میں نے کہا۔ "ان کی خیریت تو پوچھ لے۔" میں نے کہا۔

"اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ تمھیں شہلا سے بات کرنے کی اجازت بھی ہو گی۔" رابعہ نے کہا۔ "واضح ہو کہ تمھاری منگنی ہو چکی ہے۔"

"ہاں، اس سے تو اچھا ہوتا کہ میں بھی سکندر کی طرح بے شرم ہو جاتا۔ جس نے کی شرم اس کے پھوٹے کرم۔" محسن نے سرد آہ بھری۔ فوزیہ کے گھر کا نمبر فوراً ملانے کے لیے ہم نے ٹیلیفون کال آفس کے ایک بہت بااختیار چپراسی سے مذاکرات کیے اور اس کو ٹیلیفون ڈیپارٹمنٹ کی فلاح و بہبود کے لیے پچاس روپے پیشگی دیے جسے اس نے جیبِ خاص میں ڈال لیا اور ہمارے دل کی مراد پوری کرنے میں بہت معاون ثابت ہوا۔ جب محسن نے بات شروع کی تو ہم باہر فٹ پاتھ پر کھڑے اس کا انتظار کرنے لگے۔ اچانک وہاں ایک موٹر سائیکل آ رکی۔ اس سے پہلے کہ موٹر سائیکل والا ہماری طرف متوجہ ہوتا، میں نے اسے شناخت کر لیا۔ یہ حشمت خان تھا۔ میں نے رابعہ اور نیک محمد کو پیچھے کھینچ لیا اور ہم سائے میں ہو گئے۔

"نازو جیسے بھی ہو اس خبیث کو اندر جانے سے روکو۔" میں نے کہا۔ "یہ انسپکٹر حشمت خان ہے۔" اس سے زیادہ کچھ کہنے کا وقت ہی نہیں تھا کیونکہ حشمت خان موٹر سائیکل کو اسٹینڈ پر ٹکا کے اندر جانے ہی والا تھا۔ اگر وہ اندر چلا جاتا تو محسن کو فوراً دیکھ لیتا اور بے خبر محسن ہینڈز اپ کرنے کے سوا کچھ بھی نہ کر پاتا۔ نازو ایک دم آگے بڑھی۔ معلوم نہیں اس نے حشمت خان سے کیا کہا۔ وہ دونوں اتنے فاصلے پر تھے کہ ہم ان کی گفتگو کے الفاظ صاف نہیں سمجھ سکتے تھے۔

"یہ کیا لمبی بحث ہو گئی۔" میں نے پریشانی سے کہا۔ "ایسا نہ ہو کہ اندر سے محسن نکل آئے۔"

"اگر نازو اسے زبان سے قائل نہ کر سکی تو اپنے ہاتھوں سے کرے گی۔" رابعہ نے کہا اور اس کی بات درست ثابت ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ محسن اپنی بہن سے بھی بات کرے گا تو اتنے عرصے کے بعد باتوں کا سلسلہ دراز ہو گا۔ ممکن ہے وہ شہلا سے بھی بات کرا دے۔ رات کے وقت آدھے ریٹ پر وہ آدھا گھنٹا بات کرتا تب بھی ٹرنک کال کا بل بھی سو روپے ہی رہتا یا اس سے بھی کم۔ خلافِ امید محسن بہت جلد نکل آیا۔ ابھی تک حشمت خان کو وہاں سے کھسکانے میں نازو کو کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ محسن ٹیلیفون آفس کی سیڑھیوں سے اترا تو حشمت خان نے سر گھما کے اسے دیکھا۔ اس کی نظر محسن پر جم گئی۔ میں بلا ارادہ ایک قدم آگے بڑھا لیکن نیک محمد نے مجھے روک لیا اور اس نے اچھا ہی کیا ورنہ محسن کے ساتھ میں بھی حشمت خان کی نظر میں آ جاتا۔

اس کے بعد وہ ہوا جو نہ ہوتا تو بہتر تھا مگر اس کے بغیر چارہ بھی نہ تھا۔

"تمھاری یہ جرأت بدمعاش۔" نازو نے چلا کے کہا اور حشمت خان نے حیران ہو کے نازو کی طرف دیکھا ہی تھا کہ نازو کا تھپڑ اس کے گال پر پڑا۔ ایک بہت بے ضرر قسم کا زنانہ تھپڑ۔ "لفنگے، شہدے، میں تجھے پولیس کے حوالے کر دوں گی۔"

"سور کی بچی۔" حشمت خان نے غضب ناک ہو کے اسے دوسری گالی دی، جو پولیس والے ہی دے سکتے ہیں۔ "یہ تو میں بتاؤں گا۔"

"ارے جا، تو کیا بتائے گا۔ شریف لڑکیوں کو اکیلا سمجھ کے چھیڑتا ہے۔ ماں بہن نہیں ہیں گھر میں۔" نازو نے اس کے دوسرا تھپڑ مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا تو معاملہ حشمت خان کی قوتِ برداشت سے باہر ہو گیا۔ اس نے نازو کی نازک کلائی تھامنے کی غلطی کی۔ کچھ لوگ دور سے یہ تماشا دیکھ ہی رہے تھے۔ ان کی حیرت زدہ آنکھوں نے ایک ناقابلِ یقین منظر دیکھا۔ ایک دھان پان سی نوعمر اور بے حد حسین لڑکی نے اپنے سے چار پانچ گنا وزن والے خطرناک صورت کے پہلوان ٹائپ غنڈے کو اسی تونددیت یوں اوپر اچھال دیا جیسے اس میں صرف ہوا بھری ہوئی تھی اور دوسرے لمحے وہ شخص بھدے سے ٹیلیفون آفس کی سیڑھیوں کے سامنے کنکروں کے فرش پر گرا۔ وہ زخم خوردہ شیر کی طرح اچھل کے اور

غرّا کے اُٹھا مگر پھر وہی ہُوا۔ اس لڑکی نے پینترا بدل کے کِک ماری۔ کِک مارنے سے پہلے وہ ذرا سی دیر کے لیے دونوں پیر اچھلکے ہوا میں بلند ہوئی۔ پھر اس کے پیر بہت قوت کے ساتھ ریلیز ہونے والے اسپرنگ کی طرح پھیلے اور اس بھاری بھرکم شخص کے سینے پر لگے۔ وہ ایک دم اُلٹ گیا۔ لڑکی نے انتہائی برق رفتاری سے پیروں کو سمیٹا اور پھر زمین تک پہنچ کے توازن برقرار رکھتے ہُوئے انھی پیروں پر کھڑی ہو گئی۔ دوسری بار وہ بھاری بھرکم آدمی یوں دیوار سے جا ٹکرایا تھا جیسے کوئی جنگلی بھینسا دوڑتے ہوئے ڈبل ڈیکر بس کو ٹکر مار دے۔ ٹیلیفون آفس کی عمارت ٹھیکے پر بنائی گئی تھی مگر ٹھیکیدار انگریزوں کے عہد کے تھے چنانچہ دیوار کا کچھ نہیں بگڑا۔ حشمت خان بڑے مضحکہ خیز طریقے پر ٹکرا کے لڑھک گیا اور ساکت ہو گیا۔

محسن اپنی جگہ پر منجمد کھڑا رہا۔ اچانک اسے ہوش آیا تو وہ آگے بڑھا۔ اتنی دیر میں کچھ ناظرین بھی اس مار دھاڑ سے بھرپور حسینہ کے لیے نعرہ ہائے داد و تحسین بلند کرتے چلے آ رہے تھے۔ نازو اچانک موٹر سائیکل کی طرف لپکی۔ حیران ہونے کی باری اب میری تھی۔ بڑے کمال کے ساتھ اس نے موٹر سائیکل کو سنبھال کے چابی گھمائی جو حشمت خان نے تھانیداری کے زعم میں نکالنا ضروری نہیں سمجھی تھی۔ ایک کِک میں موٹر سائیکل اسٹارٹ ہو گئی۔

"قلندر بخش!" وہ محسن کی طرف دیکھ کر بولی "پیچھے بیٹھو۔" یہ نام اس نے اتنی اونچی آواز میں لیا تھا کہ دوسروں نے بھی سُنا۔

"لیکن گلبدن خانم! یہ موٹر سائیکل ہم نہیں لے جا سکتے۔" محسن نے اس کی بات کا جواب بالکل صحیح دیا۔

"قلندر بخش! چلو۔ نکلو پہلے یہاں سے۔ موٹر سائیکل ہم تھانے پہنچا دیں گے۔" نازو نے کہا "اس بدمعاش کے ساتھی نہ آ جائیں۔"

"گلبدن خانم! اس طرح یہ تم کو اغوا کر کے نہیں لے جا سکتے۔"

محسن موٹر سائیکل کے پیچھے بیٹھ گیا۔ قریب آنے والے پھر فاصلے پر ٹھہر گئے تھے۔ ان میں سے کسی میں ہمت نہ تھی کہ قلندر بخش اور گلبدن خانم کی راہ میں حائل ہو سکتا۔ وہ ہکا بکا اور آنکھیں پھاڑے کھڑے تھے اور دیکھ رہے تھے کہ کیا زمانہ آ گیا ہے۔ ابھی تک انھوں نے لاہور کی سڑکوں پر ہر قسم کے تماشے دیکھے تھے۔ لڑکیوں کو سائیکلوں پر کالج آتے جاتے دیکھا تھا۔ غنڈے بدمعاشوں کی سینڈل سے مرمت کرتے بھی دیکھا تھا لیکن جو اس وقت دیکھا تھا وہ صرف فلموں میں دیکھا تھا۔ حقیقی زندگی میں اس کا تصور تک نہیں کیا تھا۔ ان کی نظروں کے سامنے اس معصوم صورت اور پتلی سی لڑکی نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور اپنے ساتھی کو بھگا لے گئی۔ یہ بیسویں صدی کا رومانس تھا۔ گلبدن اور قلندر بخش

پہلے مجنوں اور شیریں فرہاد کے قصّے دیکھنے والوں کو اتنے مضحکہ خیز محسوس ہوئے ہوں گے جتنے اب جنگِ عظیم سے قبل کی گاڑیوں کے ماڈل لگتے ہیں یا پورٹیبل ٹیپ ریکارڈر کے مقابلے میں بھونپو والا گراموفون باجا لگتا ہے، جس کو ہاتھ گھما کر چلایا جاتا تھا۔

"چلو اب ہم بھی نکل چلیں۔" میں نے مسرت سے رابعہ کے کندھے پر وہ ہاتھ مار دیا جو مجھے نیک محمد کے رسید کرنا تھا اور اپنی غلط حرکت پر معذرت کی۔ رابعہ کافی دیر تک کندھے کو اوپر نیچے کرتی رہی۔

"اس وقت نازو نے حیرت انگیز ذہانت کا مظاہرہ کیا۔" میں نے کہا۔

"موٹر سائیکل بھی چلا لیتی ہے وہ تو!" نیک محمد نے سر ہلایا۔

"اس لڑکی سے کچھ بعید نہیں۔ توپ چلا لے، جیٹ چلا لے۔"

"تمھیں مل جائے ایسی لڑکی تو تم کیا کرو گے؟" رابعہ نے کہا۔

"ہمہ صفت۔"

"میں طبعی موت مرنا پسند کروں گا۔" میں نے کہا اور اس کی بات کا کوئی دوسرا مطلب بھی تھا تو گول کر گیا۔ کیونکہ میں اسے لڑکی سمجھ ہی نہیں کرتا۔ وہ کوئی خطرناک قسم کی خودکار ایجاد ہے جو تباہ کن عشق سے تباہ کن جنگ تک سب کچھ کر سکتی ہے مگر اس وقت میں تعریف کر رہا تھا اس کے دماغ کی۔ کتنی خوبی سے اس نے چشم دید گواہوں کو قائل کر لیا کہ اس نے ایک غنڈے کی ٹھکائی کی ہے۔ اس نے اپنے ساتھی کا نام بھی بتلایا اور محسن نے بھی ویسا ہی نام پُچنا۔ دیکھنے والے یہ نام نہیں بھول سکتے۔"

"مگر حشمت خان اب کیا کرے گا؟" نیک محمد بولا۔

"جب ہوش میں آئے گا تو اپنے سر کے بال نوچے گا اور گواہوں کو تھانے لے جائے گا۔" میں نے کہا۔

"غیرت مند ہوتا تو کہیں اور جا کے چُلّو بھر پانی میں ڈوب مرتا۔" رابعہ بولی۔

"تھانے میں بہت گڑبڑ پھیلے گی۔" میں نے ہنس کر کہا "حشمت خان کہے گا کہ اس نے محسن کو دیکھا تھا اور وہ لڑکی اسی کے ساتھ تھی ــــ گواہ انکار کریں گے اور بتائیں گے کہ لڑکی کا نام گلبدن بیگم تھا اور اس کے ساتھی کا قلندر بخش۔"

"معلوم نہیں وہ شہلا کے منگیتر کو اغوا کر کے کدھر لے گئی اور واپس آئے گی بھی یا نہیں۔" رابعہ نے تشویش سے کہا۔

"وہ ہم سے پہلے گھر میں موجود ہو گی۔" میں نے کہا "وہ بلا ایک دفعہ ہو رہا ہے۔ وہ اپنے منگیتر کو اسی طرح بارات سے نکال لے جائے گی۔ اگر اس شامت کے مارے نے کسی اور سے عقد

رچانے کی تو وہ فلمی انداز میں بر وقت نمودار ہو کے یہی کہے گی کہ ٹھہرو! یہ شادی نہیں ہو سکتی بلکہ گھوڑے یا بائیک پر سوار ہو کے پہنچے گی اور دولہا کو اسی طرح اڑا لے جائے گی جیسے پرتھوی راج سوئمبر سے سنجوگتا کو لے گیا تھا۔"

"خدا مرزا غالب کی مغفرت کرے۔" رابعہ بولی۔

"آمین۔" میں نے ہنس کر کہا "گویا تمھاری نظر بھی اس کے دل کے چور کو پکڑ چکی ہے۔"

"دل کا چور کہاں چھپ سکتا ہے۔" رابعہ نے کہا "اس کی نظر کی مظلومیت تو سوال کرتی نظر آتی ہے کہ اللہ کے نام پر ایک نظرِ کرم کا سوال ہے بابا۔ ہے کوئی ایک غریب صحافی سے پیار کرنے والا۔"

"ہے وہ بھی بڑا چھپا رستم۔ اس اعتبار سے دونوں کے ستارے ملتے نظر آتے ہیں بلکہ ٹکراتے نظر آتے ہیں۔" میں نے قہقہہ مار کے کہا۔

نہ صرف محسن اور نازو گھر پہنچ چکے تھے بلکہ مرزا غالب بھی بقلم خود موجود تھے۔

"کمال کر دیا آج تو تم نے۔" نیک محمد نے بے اختیار نازو کی پیٹھ تھپکی۔

"ذرا سنبھل کے نیک محمد۔" میں نے کہا "ٹائم بم کو ہاتھ لگانے والوں کا حشر دیکھا ہے تم نے۔"

"حشمت خان کی شاہی سواری کہاں چھوڑی؟" رابعہ نے کہا۔

"خواہ مخواہ ایک سرکس کے سامنے کھڑی کر دی۔" محسن بولا۔ "میں نے تو کہا تھا کہ چلو، اندر موت کا کنواں بھی ہے۔"

"کسی نے دیکھا نہیں ہو گا ورنہ خود اصرار کر کے لے جاتے۔" میں نے کہا۔

"ہاں، آگے جا کر میں نے اس کی باگ ڈور سنبھال لی تھی۔" محسن بولا۔ مرزا غالب کبھی ایک کا منہ دیکھتے تھے کبھی دوسرے کا۔ جب اس کو تازہ ترین واقعات کی تفصیل سے آگاہ کیا گیا تو اس کی حالت دیکھ کر دوسروں کو ہنسی آ گئی۔

"واللہ مس نازو، خیال تو آتا ہے کہ تم پر ایک پورا تصویری فیچر چھاپ دوں۔" غالب نے کہا "کہ دنیا کی سب سے خطرناک اور خوبصورت لڑکی۔۔ مگر اپنے انجام سے ڈر لگتا ہے۔ ایڈیشن تو اتنا بک جائے گا کہ میرے لیے بہترین مزار بنانے کا خرچ نکل آئے۔"

"ابھی تک تمھارے مزار کی نہیں، تمھاری ضرورت ہے۔" نازو نے کہا اور میں نے اس کے چہرے پر حیا کی لالی کو دیکھا تو مجھے اپنے الفاظ واپس لینے کا خیال آیا۔ میں نے کہا تھا کہ وہ لڑکی نہیں ہے مگر وہ بالکل لڑکی تھی۔ غالب کے خراجِ حسن کو اس نے جس اندازِ محبوبی کے ساتھ قبول کیا تھا وہ دیکھ کر مجھے علامہ مرحوم کا ایک ہی مصرع یاد آتا تھا۔ پھول کی پتی اور ہیرے کے جگر والا۔ نازو کے لیے یہ سب سے موزوں عنوان تھا۔ متضاد صفات کی حامل اس لڑکی کو اور کیا سمجھا جا سکتا تھا جسے سمجھنے کی کوشش کرنے والا پاگل ہو جائے۔

"ہم کل ایک اہم معرکہ سر کرنے والے ہیں۔" میں نے غالب کو مطلع کیا۔ "آج ہی کر لیتے۔"

"مگر ہمارے گھر میں سے تحریک التوا پیش کر دی گئی۔" محسن نے کہا۔ غالب ہنس پڑا۔ ہاؤس کی جگہ محسن نے "گھر میں سے" کی اصطلاح کا استعمال کر کے رابعہ کو چھیڑا تھا۔ پرانے وقتوں کے لوگ اپنی بیوی کا حوالہ دیتے وقت اسی طرح "ہمارے گھر میں سے" کہتے تھے۔ اس کے بعد میں نے ایک اجلاس کی صدارت کی جس میں اس فیصلہ کُن معرکے کی تفصیلات پر بحث کی گئی اور اس کا ہر پہلو سے جائزہ لیا گیا۔ غالب کو ہمارے اقدامِ خودکشی سے اختلاف تھا۔

"گامے ماچھی کی طاقت کا اندازہ ہے تمھیں؟" اس نے کہا۔ "تمھیں کیا معلوم وہاں اس نے کیا حفاظتی انتظامات کر رکھے ہوں گے۔ اس کے پاس کس قسم کا اور کتنا اسلحہ ہو گا اور اندر کتنے افراد سے مقابلہ کرنا پڑے گا۔"

"تمھارے خدشات بجا۔" میں نے کہا "مگر ہم کوئی الٹی میٹم دے کر کھلی جنگ کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔"

"ایم آر ایس تو گوریلا جنگ ہی لڑ سکتی ہے۔" محسن نے کہا۔

"مگر تم تو گوری۔۔۔ میرا مطلب ہے گوریلی لڑکیوں کو آگے بڑھا رہے ہو۔" غالب نے کہا۔

"یہی تو ان کی یعنی ہماری اسکیم کی خوبصورتی ہے۔" میں نے کہا "یہ گامے ماچھی کے ہیڈ کوارٹر کو نہیں، گامے ماچھی کو تہلکہ کرنے کی اہل ہیں۔ اگر وہ یرغمال بنا لیا جائے تو مور چاسر۔ جہاں تک مجھے امید ہے اس کے اردگرد سب اسی کے چمچے موجود رہتے ہوں گے، جو اس کے باڈی گارڈ بن کے ہر آنے جانے والے پر نظر رکھتے ہوں گے۔ وہ شک کی صورت میں مردوں پر ہاتھ ڈال سکتے ہیں اور ان کی تلاشی بھی لے سکتے ہیں مگر عورتوں کی بات مختلف ہے۔"

"فرض کرو ان کا مشن پورا ہو گیا۔" غالب نے کہا "لیکن دوسری طرف سے تمھارا حملہ ناکام ہو سکتا ہے۔ اگر تم اندر نہ داخل ہو سکے تو کیا ہو گا؟"

"پلاؤ کھائیں گے احباب، فاتحہ ہو گا۔" محسن نے کہا "سوئم ہو گا، چہلم ہو گا۔ کیا اتنا کافی نہیں؟"

"کچھ بھی نہیں ہو گا۔" میں نے کہا "مجھے یقین ہے کہ ہم قلعے کے بیرونی حصار تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

اگر کسی وجہ سے اندر جانے کا راستہ نہ بنا سکے تو یہ گوری گوری... میرا مطلب ہے دو گوریلا لڑکیاں ہی اندر مردانگی کے 'سوری' زنانگی کے جوہر دکھائیں گی۔ گامے ماچھی کے سر پہ کفن باندھ کے اور اس کی جان ہتھیلی پہ رکھ کے آگے لائیں گی اور بند دروازے کھلوانے میں کامیاب رہیں گی۔ شرط یہی ہے کہ ایک گامے ماچھی کو ڈھال بنائے رکھے اور دوسری اپنی حفاظت کرے۔ پہلا کام گلبدن بیگم کر سکتی ہیں اور دوسرا دکیلن بیگم۔ ریوالور تو دونوں کے پاس ہوگا اور انھیں دُہرے قتلِ عام کی اجازت ہوگی۔ ایک تیرِ نظر اور بندوقِ حسن اور شمشیرِ ادا سے اور دوسرا گولیاں چلا کے۔"

"پہلے اس کو کیا کہتے تھے، میمنہ اور میسرہ" غالب نے کہا "دائیں طرف سے اور بائیں طرف سے حملہ کرنے والے۔ تو کیا بائیں بازو میں ہم بھی شامل ہو جائیں؟"

"اب تک تم کدھر ہو؟" میں نے کہا "بہتر ہے کہ تم جہاں ہو وہیں رہو۔ کوئی ہم پر قطعۂ تاریخ وفات حسرت آیات کہنے والا اور شہدائے الفت کی شہادت کی خبر لگانے والا بھی تو ہونا چاہیے۔ تم ریزرو فورس میں ہو۔"

"لیکن صبح سے شام تک ہم کیا کریں گے؟" غالب بولا "بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیسے ہوئے؟" اس نے چوری چوری نازو کی طرف دیکھا لیکن نازو اس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ اس مشن میں اہم ترین رول اس کا بھی ہو سکتا ہے مگر یہ رول کیا ہوگا اور اس کی ضرورت کب پڑے گی یہ فیصلہ وقت سے پہلے نہیں ہو سکتا۔"

"آج سراج آیا تھا" غالب نے اچانک کہا۔

"کس لیے؟" میں نے اور محسن نے ایک ساتھ کہا۔

"بظاہر تو مجھ سے ہی ملنے آیا تھا" غالب نے کہا "ایک ٹوٹا ہوا ہاتھ گلے میں پڑا ہوا تھا۔ کسی نے اسے بتا دیا تھا کہ میں اس کو کہاں مل سکتا ہوں۔ بڑی اکڑفوں میں تھا جیسے مجھے تھانے میں اُلٹا لٹکا کے میری کھال میں بھس بھروا دے گا اور سب کے بارے میں پوچھے گا۔ وہاں واسطہ پڑ گیا ایڈیٹر سے۔ وہ ایک خردماغ آدمی۔ اس نے کہا کہ ڈی ایس پی صاحب کوئی ٹیلیورٹ ہے یا وارنٹ ہے؟ نہیں ہے تو یہ بتلائیے کہ آپ کو اوپر آنے کی اجازت کس نے دی؟ اسٹاف کو پریشان کرنے آئے ہیں آپ؟ وہ کہنے لگا کہ میں کہیں بھی آنے جانے کا اختیار رکھتا ہوں اور کسی کو بھی شک میں گرفتار کر سکتا ہوں۔ ایڈیٹر تو آگ بگولا ہو گیا۔ اس نے کہا کہ تم ہو کون؟ اسی وقت نکل جاؤ ورنہ دھکے دے کر نکلوا دوں گا اور سارے رپورٹر تمہارے پیچھے لگا دوں گا۔ بال کی کھال نکالنے والے اور کھال کے جوتے بنا کے مارنے والے۔

تمہارے اگلے پچھلے سارے کرتوتوں کا کچا چٹھا چھاپ دوں گا۔ سراج کی حالت غیر ہو گئی۔ جس قسم کا دھندا وہ کر رہا ہے اس میں یہ دھمکی بہت خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ چودہ نہ ہوتا تو ڈرتا کیوں۔ فوراً نرم ہو گیا کہ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ ایڈیٹر نے کہا کہ مطلب کی ایسی تیسی۔ میں جانتا ہوں اس علاقے کا ڈی ایس پی کون ہے۔ تم کہاں سے آگئے، میرے اخبار کے دفتر میں گھس کر افسری کا اور اختیارات کا رعب جمانے کے لیے۔ میں نے کہا کہ یہ موجودہ ڈی ایس پی سراج صاحب ہیں اور غالباً بارڈر ڈیوٹی پر ہیں۔ ایڈیٹر اچھل پڑا کہ اچھا! حضرت بارڈر سے آؤٹ آف بارڈر ہیں۔ میں بات کرتا ہوں ابھی آئی جی سے کہ ان کا ایک بہت فرض شناس افسر بے لگام ہو رہا ہے اسے نکیل ڈال کے لے جائیں۔ سراج سخت مشتعل ہو کے گیا۔ چلتے چلتے میں نے پوچھ لیا کہ ڈی ایس پی صاحب یہ ہاتھ بارڈر پر کسی معرکے میں دادِ شجاعت دیتے ہوئے ٹوٹا ہے کیا؟ یا کسی اور کا تمغۂ شجاعت ہے۔ بڑا قدر ناشناس محکمہ ہے۔ نہ ایک ایسے افسر کی ایمانداری پر انعام دیتا ہے نہ اس کی بہادری کی خبر۔ مت پوچھو، اس نے دل ہی دل میں مجھے کتنی گالیاں دی ہوں گی۔ وہ ضبط کرنے پر مجبور تھا۔ سڑک پر ہوتا تو مجھے گولی مار دیتا۔"

ہم سب کو سراج کی حالت کا تصور کر کے بہت ہنسی آئی۔

"تم نے کچھ پتا چلایا کہ وہ کہاں ہوتا ہے؟" میں نے کہا۔

"اتنا تو اس کے رویے سے اندازہ ہو ہی گیا تھا کہ وہ واقعی بارڈر کے کسی ضلعے میں ہے" غالب نے کہا "کہاں ہے یہ بھی پتا چل جائے گا۔"

صبح میں اور محسن الگ الگ گھر سے روانہ ہوئے۔ میرا کام زیادہ مشکل تھا۔ میری بغل میں زنانہ کپڑوں کے دو جوڑے تھے۔ دونوں رابعہ کے تھے اور خاصے قیمتی تھے۔ ان کے بدلے کوئی بھی غریب عورت اپنا پھٹا پرانا جوڑا مجھے دے سکتی تھی لیکن کسی عورت سے اس موضوع پر بات کرنا آسان نہ تھا۔ اس کا شک میں مبتلا ہو جانا یقینی تھا۔ کئی جگہ میں نے غریب عورتوں کو کام کاج میں مصروف دیکھا۔ ان میں سڑک پر جھاڑو دینے والی بھی تھیں اور زیرِ تعمیر مکانوں میں مزدوری کرنے والی بھی لیکن کسی سے بات کرنے کی ہمت نہ پڑی چنانچہ پہلے میں نے اپنا مسئلہ حل کرنے کا سوچا۔ مال روڈ پر ایسی دکانیں تھیں جہاں ملازمین کے لیے ہر قسم کی وردیاں تیار کی جاتی تھیں لیکن وہاں سے مجھے نئی وردیاں ہی مل سکتی تھیں۔ اچانک مجھے ایک دھوبی نظر آیا۔ وہ ریڑھے پر اپنی گھر والی کو میلے کپڑوں کے ڈھیر پر بٹھائے جا رہا تھا۔ میں نے اسے روک لیا۔

"مہینہ بھر میں کپڑے دھو کر کتنے کما لیتے ہو؟"

میں نے اسے ایک طرف لے جا کر کہا۔

"اب تو گزر اوقات بھی مشکل سے ہوتی ہے جی۔ ڈرائی کلینر کپڑے دھونے والی مشینیں آگئی ہیں۔ ہزار روپے ہو گئے ہیں اور کپڑے کے ساتھ اس جناور کا پیٹ بھی بھرنا پڑتا ہے" اس نے گدھے کی طرف اشارہ کیا۔

"اچھا ایک بات تمہارے فائدے کی ہے" میں نے ادھر اُدھر دیکھ کر کہا "یہ سب پرانے کپڑے ہیں نا؟ اگر ان میں سے کوئی کھو جائے یا پھٹ جائے تو کیا کرتے ہو؟"

"بس جی ہاتھ پیر جوڑ کے معافی مانگ لیتے ہیں" وہ بولا۔

"اچھا فرض کرو میں تم سے چند جوڑے خریدنا چاہوں" میں نے کہا "دو بہت پرانے اور زنانہ۔ ان کے بدلے تم کو یہ دو جوڑے دوں۔"

"یہ میرے کس کام کے جی" وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ "مطلب کیا ہے آپ کا؟"

"اگر میں تم کو ایک ہزار نقد دوں ابھی" میں نے صاف بات کرنا مناسب سمجھا "اور تم سے دو زنانہ جوڑے مانگوں، تین مردانہ۔ ایک ایک جوڑے کی قیمت دو دو سو روپے۔ تم تو پورے ہزار کے فائدے میں رہو گے۔ ہاتھ پیر جوڑ کے نقصان معاف کرا لو گے۔"

"یہ کیا چکر ہے جی! آپ پرانے کپڑوں کے ایک ہزار کیوں دے رہے ہو؟" وہ بولا۔

"کوئی چکر نہیں۔ تم خواہ مخواہ ڈر رہے ہو" میں نے کہا۔ "اگر ایک ہزار کم ہیں تو پندرہ سو لے لو۔"

"پندرہ سو" اس کی آواز بند ہو گئی "دیکھو سرکار! یہ ضرور کوئی گڑبڑ معاملہ ہے۔ پرانے کپڑے لنڈا بازار میں ملتے ہیں۔"

"مجھے بھی معلوم ہے" میں نے کہا "مگر وہاں میموں کے کپڑے ہوتے ہیں۔ مجھے انگریزی کپڑے نہیں، دیسی کپڑے چاہئیں اور وہ بھی پرانے۔ ہم ایک ڈراما کر رہے ہیں کالج میں، جس کے لیے میلے اور پرانے کپڑوں کی ضرورت ہے ورنہ ایسے نئے اور قیمتی کپڑوں کی تو ہمارے گھروں میں بھی کمی نہیں۔ تم کو دینے ہوں تو دو ہزار میں دے دو ورنہ میں کسی اور دھوبی سے بات کرتا ہوں۔"

"لے لیں سرکار لے لیں" وہ مجھے روانگی اختیار کرتے دیکھ کر بولا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ میں دھوبی گھاٹ چلا گیا تو اس سے آدھی رقم میں میرا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ میں نے کپڑوں کے ڈھیر میں سے چھانٹ کر تین پرانے مردانہ جوڑوں کا انتخاب کیا۔ تینوں کسی ہمارے قد و قامت کے آدمی کی وردیاں تھیں۔ ایک خاکی، ایک نیلی اور ایک سفید۔ پھر کچھ سوچ کے میں نے صرف نیلی وردی رہنے دی اور دو زنانہ جوڑے منتخب کر لیے۔ دونوں جوڑے بہت میلے تھے۔ ان میں سے ایک رابعہ پہن سکتی تھی اور دوسرا نازو۔ دونوں ہی کسی غریب عورت نے اپنے ہاتھ سے سیے تھے چنانچہ ان کا فیشن سے دُور کا تعلق نہ تھا اور مجھے امید تھی کہ وہ رابعہ اور نازو کو تھوڑے بہت ڈھیلے ہی رہیں گے۔ دونوں بہت معمولی سوتی کپڑے کے پرنٹ تھے۔ پھر میں نے دو سفید لٹھے کے ٹینٹ ٹائپ برقعے منتخب کیے تو دھوبن نے واجبی سا احتجاج کیا کہ سودے میں یہ شامل نہیں تھا اور اس مرتبہ میں مرعوب نہیں ہوا بلکہ اسے معاہدہ منسوخ کرنے کی دھمکی دے دی۔ وہ چپ ہو گیا اور میں نے گن کر اس کے ہاتھ پر سو سو کے بیس نوٹ رکھ دیے۔ دھوبن منہ کھولے اس کارروائی کو دیکھتی رہی۔ سو کے اتنے نوٹ اس نے ایک ساتھ پہلی بار دیکھے ہوں گے۔ وہ دھوبی کے مقابلے میں بہت صحت مند اور جوان تھی۔

"تھینک یو میڈم" میں نے دھوبن کی طرف دیکھتے ہوئے سر جھکا کے کہا اور تقریباً رکوع میں چلا گیا۔ دھوبن مسکرائی "چلو، اب جاؤ۔ یہ تھیٹر والی مسخری مت کرو ہماری جورو کے ساتھ" دھوبی نے بُرا مان کے کہا اور گدھے کے ایک دولتی ماری۔ گدھے نے بے سبب تشدد پہ واجبی سا احتجاج کیا اور چل پڑا۔ گدھے کو کیا معلوم کہ درحقیقت دھوبی نے دولتی میرے رسید کی تھی۔ کپڑوں کے بنڈل کو بغل میں دبانے سے پہلے میں نے ایک گٹھری سی بنائی۔ نیلی وردی کے علاوہ میں نے ایک برقعے میں چار زنانہ جوڑے ڈالے۔ دو نئے اور ریشمی۔ دو پرانے اور سوتی۔ دوسرا برقع بھی اسی میں ڈالا۔ "برقع در برقع" میں نے گٹھری کو کندھے پر ڈالتے ہوئے خود سے کہا اور واپسی اختیار کی۔ مجھے تین وردیاں خریدتے وقت یاد آگیا تھا کہ دو وردیاں تو پہلے سے ہمارے پاس ہیں۔ ایک ویٹر کی اور ایک پوسٹ مین کی۔ اسی خیال نے مجھے "فضول خرچی" سے روک لیا تھا۔

میں واپس پہنچا تو محسن لوٹ کر آگیا تھا۔ اس کا ثبوت وہ ٹیکسی تھی جو گلی میں پھنسی کھڑی تھی۔ تھوڑا سا غور کرنے پر میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ ہمارے لینڈ لارڈ کی ٹیکسی تھی۔

"یہ ٹیکسی کہاں سے مل گئی تھے؟" میں نے کہا۔

"بس ایسے ہی سرِ راہ ان سے ملاقات ہو گئی" محسن بولا۔ "زبردستی مجھے اپنے ساتھ بٹھا لیا تھا کہ سوہنیو، ایہہ وی ستے گڈی ہی اے۔ چنگا بھلا چلدی اے" اس نے مالک مکان کی نقل اتار کے بتایا۔ "میں نے اچانک اپنا ارادہ بدل دیا۔ جبھی جو کام چٹکی بجانے سے ہو جائے اس کے لیے مُکا مارنے کی کیا ضرورت

ہے۔ میں نے کہا کہ اس وقت آپ خوب ملے۔ مجھے بھی ایک ایسی ہی گڈی کی تلاش تھی جو چلتی ہو۔ ان سے دن بھر کے لیے معاملہ طے کر لیا۔ بہت وضعدار آدمی ہے۔ کہتا تھا کہ آپ کی گڈی ہے، جو خوشی ہو دے دینا۔ یہ بہت مسئلہ بن جاتا ہے۔ جب کوئی سب کچھ ہماری خوشی پر چھوڑ دے۔"

"ہاں، اپنے منہ سے وہ مانگتا تو کتنا کرایہ مانگتا۔ تین سو، زیادہ سے زیادہ چار سو۔" میں نے کہا "میری خوشی پر چھوڑا تو مجھے پانچ سو روپے دینے پڑ گئے۔"

"میں نے بھی تین سو دیے۔" محسن نے کہا۔ "اور یہ بھی بتا دیا کہ رات کو دیر ہو جائے تو فکر مت کرنا۔ ہو سکتا ہے ہم ٹیکسی کو دو دن استعمال کریں۔"

"اگر ہم لوٹ کر ہی نہ آئے۔" میں نے کہا "یا کسی وجہ سے بھاگنا پڑا تو ٹیکسی کیسے واپس کریں گے اور اگر اس معرکے میں ٹیکسی بھی کام آگئی تو کیا ہوگا۔"

"اسے قیمت دے دیں گے۔ اتنی کہ وہ اس سے بہتر حالت کی گاڑی خرید لے۔" محسن بولا "ویسے ہم واپس آئیں گے۔"

میں نے سر ہلا کے اس کے یقین کی تائید کی۔ "اب آپ خواتین ذرا یہ میدان جنگ کا لباس بدل کے آئیں۔" میں نے کہا۔

جب وہ ڈھیلے، بد وضع اور انتہائی میلے کپڑے پہنے، اور سر پہ نہایت واہیات طریقے سے دوپٹہ ڈالے واپس آئیں تو ہنستے ہنستے میری اور محسن کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ رابعہ نے مجھے تھوڑا سا جھک کر اپنی چال بھی دکھائی اور بدلی ہوئی آواز بھی سنائی۔ پھر ہم نے وردیاں زیب تن فرمائیں۔ ان کی حالت بھی بہت زیادہ اچھی نہیں تھی۔

"تم پر تو یہی ویٹر کی وردی جچتی ہے۔" رابعہ نے کہا۔

"ہاں، کیونکہ میں واقعی ویٹر ہوں، انتظار کرنے والا۔" میں نے سینے پر ہاتھ رکھ کے اور آنکھیں بند کر کے انتہائی عاشقانہ انداز میں کہا "کتنے جنم بیت چکے تھے تمہارے انتظار میں مگر یہ ویٹر پھر بھی انتظار کر رہا تھا۔" رابعہ کا رنگ لال ہو گیا۔

"ہم سب ویٹر ہیں، انتظار کر رہے ہیں۔" محسن نے کسی فلسفی کی طرح فرمایا۔ "اپنی اپنی امیدوں کے بر آنے کا۔ اپنے اپنے خوابوں کی تعبیر ملنے کا۔ دنیا میں ہر شخص ویٹر ہے۔ کسی نہ کسی کا انتظار کر رہا ہے، وقت کا، خوش قسمتی کا، اس محبوبہ کا جو رقیب رو سیاہ کے چھ بچوں کی ماں بن چکی ہے۔ گاڑی کے لیٹ ہونے کا۔"

"ان دونوں کو موقع ملنا چاہیے۔ ایک مصرع کہتا ہے تو دوسرا گرہ لگاتا ہے۔" رابعہ نے ہنستے ہنستے نازو سے کہا جو خود بھی ہنس رہی تھی۔

"یہ گاڑی کے لیٹ ہونے کی کیا بات ہوئی؟" میں نے کہا

"وہ ہے ایک لطیفے کی بات، خواتین سے معذرت کے ساتھ"

وہ بولا "ایک سردار صاحب ہر روز ایک ہی فلم کو کئی دن دیکھتے رہے ... ایک خاص وقت پر ٹکٹ لے کر پہنچتے اور روزانہ تقدیر کو کوستے نکل آتے۔ بالآخر ایک دن بکنگ کلرک نے پوچھا کہ یہ چکر کیا ہے۔ سردار جی نے سر پہ ہاتھ مار کے کہا کہ چکر تقدیر کا ہے۔ مجال ہے جو گاڑی ایک منٹ لیٹ ہو جائے۔ فلم میں ایک سین تھا جب ہیروئن کسی جھیل میں غسل کا ارادہ کرتی ہے اور اتنی دیر میں ٹرین آنے سے اس کے غسل کا منظر غائب ہو جاتا تھا۔ ٹرین کے گزر جانے کے بعد پانی میں صرف اس کا سر نظر آتا تھا۔"

"بسنر بسنر" رابعہ نے چلا کے کہا "شرم آنا چاہیے تم اپنی بات کو سردار جی سے منسوب کرتے ہو۔"

"چلو بھئی اب تیاری پکڑو۔" میں نے فوراً مداخلت کی سب کی ہنسی بند ہی نہ ہوتی۔ "آپ دونوں کے پاس ایک سائیلنسر والا ریوالور ہوگا۔ اسے کہاں محفوظ طریقے پر چھپایا جا سکتا ہے۔ یہ آپ دونوں کا مسئلہ ہے۔ ہم لوگ آپ کے ساتھ نہیں جا رہے ہیں۔ آپ دونوں برقعے میں نکلیں اور کسی تانگے والے سے بات کریں۔ وہ آپ کو گامے ماچھی ... میرا مطلب ہے گامے شاہ کی درگاہ تک پہنچانے کے بیس پچیس روپے لے گا۔ آگے کیا کرنا ہے، یہ میں سمجھا چکا ہوں۔ سب کچھ آپ دونوں کی اداکاری اور حاضر دماغی پر منحصر ہے۔"

"تم لوگ کتنی دیر میں پہنچ جاؤ گے؟" رابعہ نے کہا۔

"میرا اندازہ ایک گھنٹے کا ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر کچھ ہماری توقعات کے مطابق ہوا تو ہم دو بجے اندر ہوں گے۔ دیر بھی ہو سکتی ہے۔ تم گامے ماچھی کو اور اس کے کسی چیف سیکرٹری کو ہولڈ اپ رکھو گی۔ گن پوائنٹ پر انہیں کھڑا رکھنا اور ہمارے ہارن کی آواز سن کر اندر سے راستہ کھلوا دینا۔ ہم پہلے روانہ ہو رہے ہیں۔"

ٹیکسی کی ڈرائیونگ محسن نے سنبھال لی۔ اس کے ساتھ میں رہا اور نیک محمد پیچھے۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم نے تانگے کو گامے ماچھی کے اڈے سے سو گز کے فاصلے پر رکا۔ تانگا ڈیڑھ گھنٹے میں ٹھیک ایک بجے پہنچا اور ہم نے برقعے میں چھپی ہوئی رابعہ اور نازو کو تانگے سے اتر کے درگاہ کی جانب بڑھتے دیکھا۔ میری نگاہ دروازے پر گئی، جس میں سے لوگ آ جا رہے تھے

مجھے وہ شخص صورت آشنا لگا اور عین اس وقت جب میں اسے دیکھ رہا تھا اس کی اور میری نظریں ملیں۔ ہم اپنی ٹیکسی میں بیٹھے ہوئے اس شخص سے بہت دور تھے اور درمیانی فاصلہ ڈیڑھ دو سو گز کے درمیان تھا چنانچہ اس بات کا امکان بہت کم تھا کہ وہ شخص مجھے پہچان لے گا۔ ایک تو میں وردی میں تھا اور میرے سر پر جو پی کیپ تھی وہ میرے آدھے چہرے کو چھپا لیتی تھی پھر یہ کہ میرا چہرہ کھڑکی کے شیشے کے پیچھے تھا۔ اس کے برعکس وہ پوری روشنی میں تھا اور اس کی صورت کو میں ہر پہلو سے دیکھ سکتا تھا۔ اس کے باوجود میرے دل میں بیٹھا ہوا خوف مجھے پریشان کرنے لگا۔

"یار محسن! اب اچانک مجھے احساس ہونے لگا ہے کہ ہم نے دونوں لڑکیوں کو اکیلا بھیج کر اچھا نہیں کیا۔" میں نے کہا

"دونوں اور اکیلی؟" محسن دانت نکال کر بولا۔ "یہ تو وہی بات ہوئی کہ چور اور لاٹھی دو۔ میں اور بابو اکیلے۔"

"ان کے ساتھ شہلا ہوتی تو یہ تینوں کو اکیلا مان لیتا سکندر بادشاہ۔" نیک محمد بولا۔

"بات مذاق کی نہیں۔" میں نے کہا۔ "اس شخص کو غور سے دیکھو جو گامے شاہ کے مزار کی عمارت کے بڑے دروازے پر کھڑا ہے۔ اس کے تیور خطرناک ہیں۔"

"اس کا مونچھوں کو بل دینے کا انداز بھی خطرناک ہے۔ اس کی مونچھیں بھی خطرناک ہیں۔" محسن بولا۔ "مگر یہ تو سارا مشن ہی خطرناک ہے۔ اس میں کسی ایک آدمی کے خطرناک ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"کیا تجھے اس کا چہرہ جانا پہچانا محسوس نہیں ہوتا؟" میں نے کہا۔

"تجھے اور مجھے ہر رسی اگر سانپ نظر آتی ہے تو قصور ہماری نظر کا نہیں ہے۔" محسن نے کہا۔

"مجھے ایسا لگتا ہے کہ اس شخص سے ہماری سابقہ ملاقات انتہائی غلط حالات میں ہوئی تھی۔"

"حالات اس وقت بھی سازگار نہیں ہیں۔" محسن نے جواب دیا۔

"میرا خیال ہے کہ ..... کہ ہم میں سے کسی کو ان کے ساتھ رہنا چاہیے۔" میں نے اترنے کی نیت سے ہینڈل پر ہاتھ رکھا۔

"اب کچھ نہیں ہو سکتا۔" محسن نے میرا بازو تھام لیا۔ "وہ اندر جا چکی ہیں۔ تو ان کی طرح داخل نہیں ہو سکتا۔ اس نے تجھے شناخت کر لیا تو سارا پلان چوپٹ ہو جائے گا۔ وہ ہوشیار ہو جائیں گے۔"

"اگر نیک محمد چلا جائے۔" میں نے قائل ہو کر مایوسی سے کہا۔ "اسے کون پہچانتا ہے۔"

"میں ..... میں اکیلا کچھ نہیں کر سکوں گا سکندر بادشاہ، سچی بات ہے کہ ہم تمہارے کہنے پر توپ سے لڑ جائیں مگر خود اپنی عقل سے کام لینا پڑے تو ساری ہوشیاری دھری رہ جاتی ہے۔" نیک محمد نے خفت اور عاجزی کے ساتھ اعتراف کیا۔

"یہ نہ ہو بنا بنایا کام بگڑ جائے۔"

"اب منصوبے میں کوئی تبدیلی ہوئی تو کنفیوژن پیدا ہوگا۔" محسن نے کہا۔ "بس اب آگے چلو۔"

ابھی دل اور دماغ کی کشمکش جاری تھی کہ محسن نے ٹیکسی کو آگے بڑھا دیا۔ پندرہ منٹ کے بعد اس نے سڑک کو چھوڑ کر سیدھے ہاتھ پر کچا راستہ اختیار کیا جو تانگوں، بیل گاڑیوں اور موٹروں کی آمد و رفت سے مٹی مٹی ہو رہا تھا۔ راستے کی چوڑائی اتنی تھی کہ ایک وقت میں اس پر سے ایک ہی گاڑی گزر سکتی تھی چنانچہ سامنے سے تانگا نمودار ہوا تو محسن کو ٹیکسی انتہائی بائیں طرف کرنا پڑی۔ اس کے دو پہیے ایک کھیت کی منڈیر پر تھے اور دو کچے راستے پر۔ اس سے ٹیکسی بہت زیادہ ایک طرف جھک گئی تھی۔ گھوڑے کی ہر ٹاپ کے ساتھ گرد اڑتی تھی۔ تانگا گزر گیا تو محسن نے ایک دم کلچ دبا کے ایکسلریٹر دبایا اور انجن گرجا تو پیچھے دھول کا بادل سا اٹھا۔ تانگے والے نے ہماری شان میں کیا ارشاد فرمایا، وہ ہم کافی آگے نکل جانے کی وجہ سے نہ سن سکے۔ ہم اب ایک خاصی چوڑی گلی میں داخل ہو چکے تھے۔

"راستہ تو وہی ہے لیکن مجھے بہت سی تبدیلیاں نظر آ رہی ہیں۔" محسن نے کہا۔

"تبدیلی تو ایک قدرتی امر ہے۔ بہت سے مکانات نئے بنے ہیں اور پرانے مکانات کا نقشہ تبدیل ہو گیا ہے۔" میں نے کہا۔

"میں اس مسجد کو پہچان رہا ہوں۔ یہ بھی بہت پھیل گئی ہے۔"

"اس سے آگے دائیں طرف جانا ہے۔" میں نے کہا۔

"گیراج سامنے آئے گا۔"

گیراج کا بیرونی احاطہ موڑ کاٹتے ہی نظر آ گیا۔ محسن نے فوراً ٹیکسی کو روک لیا اور نیچے اتر کے بونٹ اٹھا دیا۔ چند منٹ وہ اس کے اندر گھسا انجن کا معائنہ کرتا رہا پھر میں بھی اتر گیا اور میں نے اس کی مدد کی۔ میں نے ڈسٹری بیوٹر کیپ کھولی

اور محسن نے اس کے اندر گھومنے والا "روٹر" نکال لیا۔ میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ اس پر ایک پتھر سے ضرب لگائی۔ روٹر کے دو حصے ہو گئے۔ ہم یہی چاہتے تھے۔ دونوں حصوں کو آپس میں ملا کے میں نے پھر ڈسٹری بیوٹر کیپ کے اندر لگا دیا لیکن اس کا اپنی جگہ پر ٹھہرنا محال تھا۔ میں نے کیپ بند کی اور محسن نے بونٹ گرا دیا۔ اب ٹیکسی کے اسٹارٹ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن اناڑی ڈرائیوروں کی طرح محسن نے اگنیشن سوئچ کو آن کیا اور سیلف کو گھماتا رہا۔ بیٹری کہاں تک ساتھ دیتی۔ ذرا سی دیر میں سیلف کے گھومنے کی رفتار کم ہو گئی اور کاربوریٹر میں بہت زیادہ پٹرول آ گیا۔ 'اوور' ہو جانے سے پٹرول کی بو آنے لگی۔ اب اگر بیٹری میں جان ہوتی تب بھی گاڑی دھکا لگائے بغیر اسٹارٹ نہیں ہو سکتی تھی لیکن محسن نے سیلف کو گھمانے کا عمل جاری رکھا۔ یہاں تک کہ بیٹری ڈسچارج ہو گئی اور ریڈی ایٹر کا پنکھا آخری بار تھوڑا سا ہل کے ساکت ہو گیا۔ اگنیشن سوئچ میں چابی گھمانے سے اب 'کٹ کٹ' کی آواز سنائی دیتی تھی اور ہارن کا بٹن دبانے سے ایک بیٹھی ہوئی بے سُری اور مضحکہ خیز آواز نکلتی تھی۔

سر ہلا کے ہم نے ایک دوسرے سے "اوکے" کہا اور ہمارے اشارے پر نیک محمد بھی نیچے اتر آیا۔ اس نے پیچھے سے گاڑی کو دھکیلنا شروع کیا اور محسن کے ساتھ مل کر میں نے کھلی کھڑکی میں ہاتھ ڈال کر زور لگایا۔ میں نے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ کو بھی کنٹرول کیا اور بیس منٹ کی سخت مشقت کے بعد ہم ٹیکسی کو گیراج کے بیرونی احاطے تک لے گئے۔ دوپہر کا سورج ڈھل چکا تھا چنانچہ دھوپ ہمارے چہروں پر سیدھی پڑ رہی تھی۔ نیچے زمین ناہموار تھی اور گرد میں آدھے دھنسے ہوئے پہیوں والی گاڑی کو دھکا لگانے میں دگنا زور صرف ہوتا تھا۔ گیراج کے بیرونی احاطے کی دیوار اتنی ہی بلند تھی جتنی پہلے تھی مگر اس کے اوپر پانچ پانچ گز کے فاصلے سے اینگل آئرن کے پول کھڑے کر دیے گئے تھے۔ ہر پول کی بلندی تین فٹ تھی اور اس سے اوپر کا حصہ باہر کی جانب تقریباً ایک سو دس درجے کے زاویے پر مڑا ہوا تھا۔ اس مڑے ہوئے حصے کی لمبائی ایک فٹ تھی۔ خاردار تاروں کی تین قطاریں ایک دوسرے کے متوازی اور آپس میں ایک فٹ کا فاصلہ برقرار رکھتے ہوئے دیوار کے ساتھ ساتھ چلتی جاتی تھیں۔ پول کے باہر کی جانب جھکے ہوئے حصے پر ایسی دو قطاریں تھیں چنانچہ ان کا درمیانی فاصلہ چھ چھ انچ رہ گیا تھا۔ اتنا زبردست حفاظتی نظام خود شکوک کو دعوت دیتا تھا۔ گیراج کوئی ٹکسال یا سرکاری خزانہ، جیل یا انتہائی اہم اور ٹاپ سیکرٹ سرکاری ادارہ۔۔۔ جہاں مداخلتِ بے جا کو جرم تصور کیا جائے۔

"کیا ان تاروں میں کرنٹ بھی ہوگا؟" نیک محمد نے ہانپتے ہوئے سر اٹھایا۔

"اگر ہو تو مجھے تعجب نہیں ہوگا۔" میں نے کہا۔۔۔ تصدیق کے لیے تم کسی تار سے جھول کے دیکھ لو۔"

"ارے سکندر بادشاہ، کیوں اس دنیا سے ناراض ہو۔" نیک محمد بولا۔ "ابھی تک تو کسی کا برا بھی نہیں۔۔۔ ہم نے۔"

فصیل نما احاطے کی دیوار کے وسط میں لوہے کا۔۔۔ ہی گیٹ تھا جو کھلا ہوا تھا اور اندر پانچ گاڑیاں کھڑی۔۔۔ تھیں۔ ایک بس تھی جس کے چاروں ٹائر غائب تھے۔۔۔ ڈھانچہ اینٹوں کے سہارے پر کھڑا ہوا تھا۔ اس کے نیچے۔۔۔ نوجوان لیٹے ہوئے کچھ کر رہے تھے۔ دوسرا ٹرک تھا جو۔۔۔ سے الگ کھڑا ہوا تھا اور بظاہر اس میں کسی خرابی کا۔۔۔ نظر نہیں آتا تھا کیونکہ ٹرک نیا تھا۔ ایک کار پر رنگ۔۔۔ رہا تھا اور اس کی حالت قبر سے نکلے ہوئے ڈھانچے کی۔۔۔ لگتی تھی کیونکہ آگے پیچھے کی تمام لائٹس، بمپر اور شیشے۔۔۔ لیے گئے تھے۔ اس کی باڈی پر سلیٹی سا رنگ تھا جسے۔۔۔ کم عمر لڑکے پانی ڈال کے ریگ مال سے گھسنے میں مصروف۔۔۔ تھے اور بار بار اس کی ہموار سطح پر ہاتھ پھیر کے دیکھتے جا۔۔۔ تھے۔ ورکشاپ میں نظر آنے والے حصے کے مقابل ایک گاڑی۔۔۔ بونٹ آگے سے اٹھا ہوا تھا اور دوسری کا پیچھے سے۔۔۔ گاڑی فاکس ویگن تھی مگر اس کا انجن غائب تھا اور غالباً۔۔۔ اوور ہال کرنے کے لیے نکالا گیا تھا۔ ان دونوں گاڑیوں۔۔۔ کوئی بھی کام نہیں کر رہا تھا۔

ہم نے ٹیکسی کو ٹرک اور ورکشاپ کے درمیان۔۔۔ روکا۔ ہمارے قدموں کی آواز اور ٹیکسی کے مختلف حصوں۔۔۔ برآمد ہونے والی فریاد و فغاں نے بس کے نیچے لیٹے۔۔۔ نوجوانوں کو متوجہ کر لیا تھا۔ وہ اپنے کام میں اتنے منہمک۔۔۔ تھے کہ انہیں گرد و پیش کی خبر نہ ہوتی۔ ان میں سے جو۔۔۔ تھا وہ سگریٹ پی رہا تھا اور مشکل سے سولہ سال کا تھا۔۔۔ تیور بتاتے تھے کہ اپنے آپ کو بدمعاش ظاہر کر کے۔۔۔ حاصل ہوتی ہے۔ دوسرا بیس بائیس سال کا نسبتاً۔۔۔ صورت مکینک تھا۔

"کیا بات ہے جی؟ حکم کرو۔" بڑے لڑکے نے کہا۔

"حکم صرف یہ ہے موتیاں والیو کہ اس گڈی۔۔۔ دلو۔" نیک محمد بولا۔

چھوٹا لڑکا ہنسنے لگا۔ "او جی! اس نے اب نہیں چلنا۔ اتنی عمر میں تو بندہ بھی فوت ہو جاتا ہے۔"

اس کے جواب سے یوں محسوس ہوا جیسے ٹیکسی واقعی ستر اتنی برس پورے کر چکی ہے۔ "تم اس عمر میں بے شک فوت ہو جانا لیکن یہ ٹیکسی ہے کاکا۔" نیک محمد نے خفگی سے کہا۔

"استاد کدھر ہے تمہارا؟" میں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا ورنہ ان کی زبانی جنگ بڑھ جاتی۔

دوسرا جوان آگے بڑھا۔ "ہمیں بتاؤ جی کیا ہوا ہے؟"

"بتایا ناکہ گاڑی چل نہیں رہی ہے۔ اسے چالو کر دو۔" میں نے کہا۔ نوجوان نے بونٹ کھول کر انجن کا ایک نظر میں جائزہ لیا، پلگ ہلا کے دیکھے۔ کوائل اور کنڈنسر کے تار چیک کیے اور محسن سے کہا کہ وہ گاڑی اسٹارٹ کرے۔ محسن نے تعمیل کی مگر پنکھا تھوڑا سا ہل کر رک گیا۔ مکینک نے بڑی مایوسی کا اظہار کیا کہ بیٹری بالکل گل ہو گئی ہے، خرابی کیسے چیک کی جائے۔

میں نے اتنی دیر میں گرد و پیش کا جائزہ لے لیا تھا۔ احاطہ دو کنال کا تھا۔ ورکشاپ اس کے دائیں جانب دو حصوں پر مشتمل تھا۔ ایک حصہ تو وہی عارضی سا شیڈ تھا جس کی دیواریں بھی لکڑی کی تھیں اور جس پر ٹین کی چھت تھی۔ دونوں زیرِ مرمت کاریں اس کے سامنے کھڑی ہوئی تھیں۔ دوسرا حصہ کچھ ہوائی جہازوں کے ہینگر کی شکل کا تھا مگر اتنا بڑا نہیں تھا۔ یہ اینٹوں کی پختہ عمارت تھی جس کی دو دیواریں پندرہ فٹ اونچی اور تیس تیس فٹ لمبی تھیں۔ پچھلی طرف سے اس کی دیوار وہی تھی جو بیرونی فصیل پر اٹھائی گئی تھی اور اس طرح یہ بیرک ایک کونے میں سما گئی تھی۔ مجموعی طور پر ورکشاپ اور بیرک نے احاطے کا نصف کے قریب حصہ گھیر رکھا تھا۔ بیرک کے سامنے والا حصہ دو بھاری بھرکم کواڑوں پر مشتمل تھا جو لوہے کی موٹی چادر پر اینگل آئرن کو ویلڈ کر کے بنائے گئے تھے اور اس وقت مقفل تھے۔ انہیں کھولنے کا نظام قبضے والے دروازوں کی طرح نہیں تھا۔ پندرہ فٹ چوڑے دونوں پھاٹک دھکیل کر اِدھر سے اُدھر کیے جا سکتے تھے اور فرش کی ریلنگ پر چلتے تھے۔ احاطے کا دوسرا حصہ بالکل مخالف سمت میں تھا اور رہائش کے لیے استعمال ہو رہا تھا۔ چنانچہ یہ بات بلا شک و شبہ کہی جا سکتی تھی کہ گاما ماچھی کے اڈے تک جانے والا زیرِ زمین راستہ اسی مقفل بیرک میں ہی تھا۔

"تمہاری سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا۔ استاد کو بلاؤ۔" محسن نے مکینک کو ڈانٹا۔

"بیٹری گل ہے تو استاد بھی کیا کرے گا۔" مکینک نے اپنی سُبکی کو نظر انداز کر دیا مگر استاد کا وقار بلند رکھا۔ "وہ چھوٹا کام نہیں کرتا۔"

"چھوٹے کام کے بچے، وہ دوسری بیٹری لگا کے نہیں دیکھ سکتا۔" میں نے ایک دم گرج کر کہا۔ "اتنی گاڑیاں کھڑی ہوئی ہیں۔ سب میں بیٹری ہوگی۔ پھر لگا دینا چارجر پر۔"

مکینک پر اس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ اس نے چھوٹے کی طرف دیکھا اور استاد کو بلانے کے لیے رہائشی مکان کی طرف چل پڑا۔ میں نے استاد کو گھر کے دروازے پر لہرانے والا ٹاٹ کا پردہ ہٹا کے باہر آتے دیکھا۔ معلوم نہیں مکینک نے اسے کیا بتایا کہ وہ سر ہلا کے نپے تلے قدم اٹھاتا ہماری طرف آیا۔ وہ درمیانے قد لیکن مضبوط جسم کا آدمی تھا جس نے ڈھیلی ڈھالی اور میلی سفید جرسی کے ساتھ براؤن رنگ کی گرم پتلون پہن رکھی تھی۔ میں بے نیازی سے مخالف سمت میں دیکھتا رہا۔ اصل مقصد اسے اپنا چہرہ نہ دکھانا تھا۔ استاد نے کسی سے بات کیے بغیر انجن کو دیکھا اور پھر شاگردِ محترم کے ایک جھانپڑ رسید کیا جو اس کی گدی پر پڑا۔

"حرام خور، بس تار دیکھ لیے اور کام ختم۔ یہ ڈسٹری بیوٹر کیپ تیرا باپ کھولے گا۔" استاد نے کہا اور کھٹ سے کلپ ہٹا کے کیپ کا اوپر والا حصہ الگ کر دیا۔ "یہ دیکھو۔" اس نے سینئر اور مظلوم صورت شاگرد کے دوسرا ہاتھ بڑی پھرتی سے مارا جس کے لیے وہ بالکل تیار نہیں تھا۔ "کیا ہے یہ؟ ہدوٹر کو دیکھ۔ یہ گاڑی چل سکتی ہے۔" پھر وہ محسن سے مخاطب ہوا جو اس کے بالکل سامنے آ گیا تھا۔ "یہ چیز لے آئیں۔ شہر ہی سے ملے گی۔" وہ ٹوٹے ہوئے روٹر کے دونوں حصے محسن کو تھما کے بولا۔

"ارے استاد، ان میں سے کسی گاڑی کا روٹر ڈال دو۔" محسن نے کہا۔

"وہ میرے باپ کی گاڑیاں نہیں ہیں۔ اگر کسی میں کیپ کا سائز یہی ہوا تب بھی گاہک کے ساتھ بے ایمانی۔۔۔"

"بے ایمانی کیسی استاد۔" محسن نے خوشامدانہ لہجہ اختیار کر لیا۔ "تم بعد میں نیا منگوا کر لگا دینا۔ پیسے ہم سے لے لو، آنے جانے کے بھی مگر ہمارا کام کر دو۔"

استاد نے اضافی منافع کے امکان پر غور کیا اور محسن پر رحم کھاتے ہوئے سر ہلایا۔ "دیکھ! اس فاکسی کے انجن میں سے روٹر لگا دے۔ اسے تو ابھی کھول کر باندھنے میں ہفتہ لگے گا۔"

استاد کو اس سے زیادہ کچھ کہنے کی مہلت دینا بے سود تھا۔ اصل مقصد یہ جاننا تھا کہ ضرورت پڑنے پر ہم کس گاڑی کی کیپ سے سالم پُرزہ نکال کے اپنی ٹیکسی کو رواں کر سکتے ہیں۔ میں نے اطمینان سے اپنا ریوالور نکالا اور استاد کی پشت سے لگا دیا۔ سامنے سے محسن نے یہی حرکت کی اور کچھ فاصلے پر کھڑے ہوئے نیک محمد نے تیسری طرف پوزیشن سنبھال لی جہاں دو بچے کار کی گھسائی میں مصروف تھے۔ ان دونوں کے ہاتھ رک گئے اور ان کی صورت پر خوف سے زیادہ حیرت کے آثار نمودار ہوئے۔ یہ خطرناک کھلونا اس سے قبل انہوں نے صرف فلموں میں استعمال ہوتے دیکھا تھا لیکن یہاں نہ مار دھاڑ ہو رہی تھی اور نہ کوئی ایسی صورتِ حال نظر آئی تھی کہ سچ مچ کے ریوالور نکال لیے جائیں۔ میں نے اس وقت استاد کی صورت کو غور سے دیکھا۔ اس کی صورت بھی اجنبی نہیں تھی مگر ذہن پر بہت زور دینے کے باوجود مجھے یاد نہیں آیا کہ پہلے یہ صورت کب اور کہاں نظر آئی تھی۔ آدھے گھنٹے میں حافظے کا ساتھ نہ دینے کا یہ دوسرا واقعہ تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ دلاور اینڈ کمپنی سے معرکہ آرائی میں مختلف مواقع پر ان کے ساتھ آنے والے چمچے بھی بہت ملے تھے اور ان سب کے نام تک ہمیں معلوم نہ ہو سکے تھے۔ ان میں سے کچھ کو قضا لائی تھی کہ وہ رزقِ خاک ہوئے اور دوبارہ نہیں ملے۔ یہ دونوں بھی ایسے ہی کرائے کے گوریلے یا حکم کے غلام تھے جو دلاور اینڈ کمپنی کی شیطانی بساط پر پیادوں سے زیادہ اہم نہیں تھے۔

"اس حرکت کا مقصد کیا ہے؟" استاد نے اپنی خود اعتمادی اور ظاہری حالت کے سکون کو برقرار رکھتے ہوئے کہا۔

"ہم بہت کچھ بے مقصد بھی کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"کچھ لوگ بے مقصد جیتے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "لیکن بے مقصد مرنا کوئی پسند نہیں کرتا۔ تم بھی یہی چاہو گے۔"

"مجھ سے تم کیا چاہتے ہو؟" استاد نے غرّا کر کہا۔ اس کو اب یہ اطمینان ہو گیا تھا کہ ہم اسے بے سبب قتل نہیں کریں گے۔ ہمیں یہی کرنا ہوتا تو اب تک تین طرف سے تین گولیاں اس کو پنکچر کر چکی ہوتیں۔ شاگردوں کے سامنے اس کو یہ بھی ثابت کرنا تھا کہ وہ واقعی استاد ہے اور ہر قسم کی خرابی سے نمٹ سکتا ہے خواہ وہ انجن کی ہو یا حالات کی۔

"سب سے پہلے تو تمہیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ہم سب کے ہاتھوں میں جتنے ریوالور ہیں، اصلی اور ایک جیسے مہلک ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم تینوں کی صورت سے بھی اندازہ لگا نے کی غلطی مت کرنا۔ ہم سب ایک جیسے بے رحم ہیں۔ دشمن کے ساتھ کوئی رعایت کرنے کے قائل نہیں اور کسی کو بتائے کے بغیر گولی چلاتے ہیں۔ ہم سب کا نشانہ بھی خطا نہیں ہوتا۔"

"اس فضول بکواس کا مطلب کیا ہے؟"

"تمہیں یہ بتانا کہ ہم تمہیں قتل کرنے کے لیے نہیں آئے ہیں مگر تم ہمارے ہاتھوں مرنا چاہو تو بہادری یا بے وقوفی کا مظاہرہ کر سکتے ہو۔" میں نے کہا۔ "اگر تم ویسا ہی کرو جیسا ہم کہیں گے تو کل بھی زندہ نظر آؤ گے۔"

"ویسے تو موت کا ایک دن معیّن ہے۔" محسن بولا۔ "تمہارے کیس میں وہ آج کا دن ہے تو اسے کون ٹال سکتا ہے۔"

"تمہارے یہ شاگردانِ عزیز تو بچے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ان کو بھی سمجھا دو کہ دخل در معقولات نہ کریں۔ بہتر ہوگا یہ رضاکارانہ طور پر گیراج میں چلے جائیں اور محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے ہو جائیں۔ منہ دیوار کی طرف اور ہاتھ سر سے اوپر۔"

استاد نے میری بات کو ظاہری بے نیازی سے سنا اور سیدھا کھڑا رہا۔ اس کے شاگرد بھی ساکت و جامد رہے۔

"تم ان سب کے سامنے پٹنا چاہتے ہو۔" میں نے کہا۔ "ابھی اپنی عزت بچا سکتے ہو کیونکہ تم تین طرف سے محصور ہو اور ریوالور کا مقابلہ کوئی عقلمند آدمی نہیں کرتا جو خالی ہاتھ ہو۔"

"تم اپنے عقلمند ہونے کا ثبوت تیس سیکنڈ میں دے سکتے ہو۔" محسن نے کہا۔ "ان سے کہو شرافت سے گیراج میں چلے جائیں اور الٹے لیٹ جائیں۔ لیٹ کر ایک دوسرے سے گپ شپ کریں یا اظہارِ افسوس مگر آواز کا والیوم کم رکھیں۔ باہر کوئی کچھ نہ سنے۔"

"پہلے استاد کو خالی ہاتھ تو کر دو۔" میں نے محسن سے کہا۔ "یہ خود کو مسلح سمجھتے ہوئے خواہ مخواہ موقع ملنے کا انتظار فرما رہے ہیں۔"

صورتِ حال پوری طرح ہمارے کنٹرول میں تھی۔ بڑے اطمینان کی بات تھی لیکن یہی اطمینان ایک غلطی کا سبب بن گیا۔ نیک محمد نے طے شدہ پروگرام کے مطابق اتنی دیر میں گیراج کا باہر والا گیٹ بند کر دیا تھا اور اس کی بلیک بورڈ والی سطح پر چاک سے واضح الفاظ میں لکھ دیا تھا۔ "استاد کی زوجہ کے عقد کے باعث گیراج بند ہے۔" جو بڑی فضول سی بات تھی مگر محسن کا خیال تھا کہ آس پاس کے رہنے والے بھی کم فضول نہیں ہیں چنانچہ وہ اس نوٹس کو دیکھ کر خاموشی سے لوٹ جائیں گے اور اسے بالکل مذاق نہیں سمجھیں گے۔ رنگ ہونے والی گاڑی کو ریگ مال سے گھسنے والے بچے قطعی بے ضرر تھے اور ہم نے انہیں اہمیت نہیں دی تھی مگر باقی دو سینئر شاگردوں کو سامنے رکھا تھا۔ غلطی ہم سے یہ ہوئی کہ ہم نے انہیں استاد کے برابر خطرناک نہیں سمجھا اور عین اس وقت جب محسن نے میرے کہنے پر استاد کی جیب سے اسلحہ برآمد کرنے کے لیے قدم بڑھائے، مظلوم صورت نظر آنے والے نوجوان نے بڑی پھرتی سے اچھل کے لات ماری۔ محسن اس غیر متوقع حملے کے لیے بالکل تیار نہ تھا۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے اڑ گیا۔ محسن لڑکھڑا کے پیچھے گیا اور وہ نوجوان نیچے گرا مگر اس سے پہلے ہی استاد نے ایک لات پیچھے کی طرف چلائی اور دوسرے پیر کی ایڑی پر گھوم کر میرے سامنے آنا چاہا۔ اس کا ہاتھ خود بخود ریوالور نکال چکا تھا مگر اس نوجوان کے محسن پر حملہ آور ہوتے ہی میں ذہن اور جسم کے خودکار عمل سے پوری طرح مستعد ہو چکا تھا۔ نیک محمد نے دونوں جوانوں کو للکارا اور پھر اٹین شن کھڑا کر دیا۔

میں نے ہاتھ کو استاد کی ٹانگ کی ضرب سے بچایا اور دوسرے ہاتھ سے اسی ٹانگ کے پنجے کو گرفت میں لے لیا۔ ادھر استاد نے ایڑی پر گھومنے کی کوشش کی ادھر میں نے جھٹکا دیا اور استاد کا توازن بگڑ گیا۔ وہ منہ کے بل گرا۔ اس کے باوجود استاد نے پلٹ کر فائر کرنا چاہا لیکن میں اپنا ایک پیر اس کے ہاتھ پر رکھ چکا تھا۔ وہ درد سے کراہا۔

"بس استاد، اسے سجدۂ شکر سمجھو۔" میں نے کہا۔ "شاید خدا کو منظور نہیں تھا کہ تمہاری بیوی اس عمر میں بیوہ ہو اور تمہارے جتنے بھی بچے ہیں وہ یتیم کہلائیں لیکن یہ بالکل آخری موقع تھا۔ سو فیصد آخری۔"

محسن نے جھک کر ایک جھٹکے سے استاد کا ریوالور قبضے میں کر لیا۔ "استاد کہلاتے ہو تم۔ ایسے اناڑی پن کا ثبوت تو نہیں دے سکتے کہ ایک ہی جھٹکے میں چت ہو جاؤ۔ اور کتنا مال ہے تمہارے پاس؟" محسن نے ایک دم اس کی جرسی کے گلے میں ہاتھ ڈال دیا۔ پیٹ کے قریب ایک نمایاں ابھار واضح طور پر دوسرے ریوالور کی موجودگی کا پتا دیتا تھا۔

"میں ستم دونوں کی....." استاد نے چیخ کر کہا۔ اس کی گالی نے مجھے مشتعل نہیں کیا لیکن اس کے چلّانے کی وجہ سے میں نے اس کے منہ پر ایک ٹھوکر ماری۔ بوٹ کی ٹو اس کے جبڑوں پر پڑی اور وہ بلبلایا۔ اس کے ہونٹوں کے کناروں سے خون رسنے لگا۔ محسن نے دوسرا ریوالور بھی اپنی پتلون کی دوسری جیب میں رکھ لیا۔

"میں نے تم کو خبردار کیا تھا کہ آواز باہر نہ جائے۔" میں نے کہا۔ "اس پستول کے فائر کی آواز بھی باہر نہیں جاتی۔"

"چلو بچّو اندر۔" نیک محمد نے ان دونوں لڑکوں کو مخاطب کیا جو بہت سہمے ہوئے کھڑے تھے اور گاڑی ریگ مال سے گھسنا بھول چکے تھے۔ انہوں نے فوراً ریگ مال کے ٹکڑے پھینک دیے اور سیدھے شیڈ میں جا کر الٹے لیٹ گئے۔ محسن نے استاد کے جانشین ہونے والے نوجوان کو چٹکی بجا کر متوجہ کیا۔ ان میں سے ایک نے جان پر کھیل کر نمک خوار ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے جانشینی کا مقابلہ بظاہر جیت لیا تھا اور زیادہ بہادر بننے والا اب زیادہ شرمندہ نظر آتا تھا کہ خود کو جانشین ثابت کرنے کا یہ سنہرا موقع اس نے کچھ نہ کر کے گنوا دیا تھا۔

میں نے استاد کے مڑے ہوئے ہاتھ پر سے پیر کا وزن ہٹایا۔ وہ ایسی پوزیشن میں لیٹا ہوا تھا کہ کروٹ بھی نہیں لے سکتا تھا۔ وہ زور لگاتا تو مونڈھے پر سے اس کا بازو اتر جاتا یا کلائی کے پاس سے ہاتھ ٹوٹ جاتا۔ وہ ہاتھ کو دباتا اور جرسی کی آستین سے منہ کو صاف کرتا اٹھا۔ سفید جرسی پر مٹی کا اور خون کا رنگ نظر آنے لگا۔

"اب ہماری گفتگو سننے والا کوئی نہیں رہا۔" میں نے کہا۔ "ہم تینوں کو تم ایک سمجھو۔"

"تم مار پیٹ کیے بغیر بھی اپنا مطلب بیان کر سکتے تھے۔" وہ شکایتی لہجے میں بولا۔

میں ہنس پڑا۔ "کیا واقعی تم شرافت کی زبان میں بات کر سکتے ہو؟ صورت سے تو ایسے نظر نہیں آتے مگر خیر، ابھی معلوم ہو جائے گا کہ ہم نے جو سلوک تمہارے ساتھ روا رکھا وہ کس حد تک جائز تھا۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ یہاں سے منشیات اسمگل ہونے کے لیے جاتی ہیں۔"

"منشیات؟" وہ چونکا۔ "کیسی باتیں کرتے ہو استاد۔"

میں نے اس کے منہ پر الٹے ہاتھ کی ضرب لگائی۔ وہ پیچھے مڑ گیا۔ "دوبارہ خود کو میرا شاگرد مت کہنا۔ میری بے عزتی ہوتی ہے۔"

وہ اسی لب و لہجے میں بات کرنے کا عادی تھا اور میری برتری کو تسلیم کرتے ہوئے غیر شعوری طور اس نے مجھے استاد کہہ دیا تھا۔ میں اس کو ذہنی طور پر مرعوب رکھنا چاہتا تھا اور جسمانی طور پر مغلوب۔

"میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ ایک گیراج میں منشیات کا کیا کام" وہ پھر کھڑا ہوگیا۔

"یہی تو میرا بھی سوال ہے کہ ایک گیراج میں منشیات کا کیا کام ہے" میں نے پھر اس کے ایک جھانپڑ رسید کیا۔ "لیکن ابھی میں نے اس سوال کا جواب مانگا ہی نہیں تھا۔ سیدھے کھڑے ہوجاؤ۔ ورنہ تھپڑ کے مقابلے میں میری کک سے زیادہ چوٹ آئے گی۔"

"ہاتھ میں ریوالور لے کر بہادری کے دعوے کرنا کوئی بہادری نہیں ہوتی۔" وہ اٹھ کر بولا۔

میں نے ریوالور محسن کی طرف اچھال دیا جو اسے کیچ نہ کرسکا کیونکہ پہلے ہی اس کے ہاتھ میں ایک ریوالور تھا — نیا محمد خود ہی گیراج میں چلا گیا تھا اور چاروں فرشِ خاک پر لیٹے ہوئے جنگی قیدیوں کی نگرانی کررہا تھا۔ محسن نے خود ہی جھک کر زمین پر گرنے والا ریوالور بھی اٹھا لیا۔ اب دو ریوالور اس کی جیب میں تھے اور دونوں ہاتھوں میں بھی دو ریوالور تھے۔

"میں یہ عرض کررہا تھا استاد صاحب،" میں نے دونوں ہاتھوں کو رگڑ کر پھونک ماری۔ "کہ یہاں سے کئی بار ایک ٹرک کو جاتے دیکھا گیا ہے جس میں اوپر زرعی آلات اور مشینری کے پرزے ہوتے ہیں لیکن نیچے والے کریٹ منشیات سے بھرے ہوتے ہیں۔ ایسا ہی ایک ٹرک لے کر رحمت کباڑی اور طافو روانہ ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ ایک کلینر چھوٹو بھی تھا۔ اس ٹرک کا نمبر بھی بتا سکتا ہوں میں، لیکن آدمی اور نمبر میں بہت فرق ہوتا ہے۔ شاید تمہیں معلوم ہوگا کہ اس ٹرک کا کیا حشر ہوا تھا۔ زیادہ افسوس ان دو افراد کے انجام پر ہونا چاہیے۔ رحمت کباڑی اور طافو کیسے مارے گئے تھے، کیا یہ تم نہیں جانتے؟"

استاد کا رنگ متغیر ہوگیا۔ "میں کسی کو نہیں جانتا۔ خدا کی قسم میں نے یہ نام پہلی بار سنے ہیں۔"

میں کچھ دیر اس کی صورت کو دیکھتا رہا۔ "ہم جھوٹ کو سچ سے الگ کرنا جانتے ہیں۔ اس میں آدمی کو اتنی ہی تکلیف ہوتی ہے جتنی ناخن کو گوشت سے جدا کرنے میں ہوتی ہے۔ کیا تم اس محاورے کا مطلب سمجھتے ہو؟"

استاد نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں زیادہ پڑھا لکھا آدمی نہیں ہوں۔"

"میرا خیال ہے کہ تم آدمی ہی نہیں ہو۔" میں نے کہا۔ "اس کا مطلب ہوتا ہے کہ رشتے توڑے نہیں جاسکتے لیکن سر توڑے جاسکتے ہیں تو رشتے کیوں نہیں توڑے جاسکتے

فرض کرو ابھی میں تمہارے سب سے بڑے بیٹے یا بیٹی کو منگوا لوں ....."

استاد نے ایک دم مجھ پر حملہ کیا۔ وہ میری طرف دوڑ آیا اور میں نے اسے ایک قدم پیچھے اور تھوڑا سا دائیں ہوکر پلٹ دیا۔ ایک قلابازی کھا کے وہ نیچے گرا مگر الٹی کھا کے پھر اتنی تیزی سے پلٹا جس کی مجھے امید نہ تھی۔ اس نے میرے قدم اکھڑتے ہی پے در پے وار کیے۔ اسے ماہر نہیں کہا جاسکتا تھا لیکن وہ کراٹے جانتا تھا۔ اس کی تھیلی کی ضرب سے میرے دونوں بازو شل ہوگئے۔ پھر اس نے لات گھمائی جو میری ٹانگ پر گھٹنوں سے اوپر لگی۔ میں گیا اور وہ اچھل کر میری پسلیوں میں کک مارنے لگا۔ میں پلٹا کھایا اور دوسری ٹانگ گھمائی۔ لات اس کے پیٹ پر پڑی اور ایک لمحے کے لیے اس کا منہ پورا کھل گیا کیونکہ وہ سانس لینے کی کوشش کررہا تھا۔ میرے بازوؤں کی توانائی اب بحال ہوگئی تھی۔ وہ گر کے پھر اٹھا ہی تھا کہ میں نے اسے دبوچ لیا۔ چند منٹ میں اس کو اندازہ ہوگیا کہ مجھے چیلنج کرتے وقت اس نے اپنی صلاحیت کو بہتر اور میری صلاحیت بہت کمتر سمجھنے کی غلطی کی تھی اور خالی ہاتھ بھی میں اس کے مقابلے میں بہت زیادہ خطرناک ہوں۔ اب اس کے لیے اپنے پیروں پر سیدھا کھڑا رہنا مشکل ہورہا تھا۔ میں نے اس کو مارا نہیں تھا، جسمانی گزند نہیں پہنچایا تھا اور اس کی ہڈیاں سلامت چھوڑ دی تھیں مگر پھر بھی وہ یوں محسوس کررہا تھا جیسے کسی نے اس کو ایک گھنٹے تک کنکریٹ مکسر میں ڈال کے گھمایا ہو۔

"تو بات تھی ناخن سے گوشت کے جدا ہونے کی" میں نے اطمینان سے کھڑے ہوکر دونوں ہاتھ سینے پر باندھ لیے۔ "اگر تمہارے بیوی، بچے تم سے جدا کردیے جائیں تو تم کو کتنی تکلیف ہوگی اور اس کے بعد ہم تمہارے سامنے ان کے گوشت سے ناخن جدا کریں تو تکلیف سے زیادہ چلائے گا؟ تم، تمہاری بیوی یا تمہارے بچے۔"

"دیکھو میں ان بچوں کی قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ میں کچھ نہیں جانتا۔" وہ بری طرح کانپنے لگا۔ "میں نے کسی کباڑی یا طافو کے انجام کے بارے میں نہیں سنا۔ میں چھوٹو کو جانتا ہوں۔"

"کون ہے چھوٹو؟"

"وہ اس ٹرک ڈرائیور کے ساتھ رہتا ہے جو ٹرک لے جاتا ہے۔" استاد نے کہا۔

"اس ٹرک ڈرائیور کا نام بتاؤ؟" محسن نے کہا۔

"ٹرک ڈرائیور کوئی ایک نہیں ہوتا۔" وہ بولا۔ "ہر مرتبہ نیا آدمی ہوتا ہے۔"

تو یہ گامے ماچھی یا چوہدری دلاور کا نیا طریقۂ واردات ہے۔ میں نے سوچا۔ ہر بار آدمی بدلنے سے اتنا فائدہ یقیناً ہوتا ہے کہ کسی کو واقفِ راز ہونے کا موقع نہیں ملتا۔ پرانے ڈرائیور صرف اس لیے مارے گئے کہ وہ کچھ جان گئے تھے اور ان کا قابلِ اعتماد ہونا ہی بالآخر نقصان دہ ثابت ہوا تھا۔ یہ زیادہ محفوظ اور آسان طریقہ تھا کہ کسی ضرورت مند اور نئے بے وقوف اور بے خبر ڈرائیور سے ایک ٹرک کو کراچی تک لے جانے کا سودا کرلیا جائے۔ اگر وہ سلامتی کے ساتھ پہنچ جائے تو اس کو توقع سے زیادہ معاوضہ ادا کردیا جائے، وہ پکڑا جائے تو کچھ نہ بتاسکے۔

"تمہارا اپنا نام کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"برکت۔" وہ بولا۔ "مگر تم لوگ کون ہو؟ پولیس کے آدمی؟"

"تمہیں کوئی سوال کرنے کی اجازت نہیں ہے۔" میں نے غرا کے کہا۔ "استاد برکت، یہ ٹرک جو اس وقت بھی یہاں کھڑا ہوا ہے، یہ روانہ کب ہوگا؟"

"جب چھوٹو آئے گا، کسی ڈرائیور کو لے کر۔" وہ بولا۔

اچانک مجھے ایک اور خیال آیا۔ "تم نے بھی تو ڈرائیور فراہم کیے ہوں گے۔ تمہارا گیراج ہے۔"

"ہاں۔ دو... تین ڈرائیور تھے ایسے جن کو کام کی ضرورت تھی، میں نے ان کی سفارش کردی تھی۔"

"میں جاننا چاہتا ہوں کہ وہ تینوں کون تھے اور اب کہاں ہیں؟"

"وہ خود میرے پاس آئے تھے۔ میں کبھی ان کے پتے ٹھکانے پر نہیں گیا۔ وہ میرے دوست تو نہیں تھے۔" برکت بولا۔

"تم شروع سے اس گیراج کے مالک نہیں ہو۔" میں نے کہا۔ "پہلے یہ گیراج کس کا تھا؟"

"پیڈرو نام کا ایک شخص تھا۔ استاد پیڈرو کہلاتا تھا۔ میں نے اسی سے لیا تھا۔" وہ بولا۔

"استاد پیڈرو۔" میں نے فاتحانہ نظروں سے محسن کی طرف دیکھا۔ "چوڑی ناک، مکڑیوں جیسے بال، کانوں میں مندریاں۔"

"تم..... تم کیسے جانتے ہو اسے؟"

"تم نے پھر سوال کیا! یہ آخری بار معاف کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اگلے سوال کے جواب میں دانت توڑ دوں گا۔ یہ بتاؤ کہ تم نے یہ گیراج کتنے میں لیا تھا اور کب لیا تھا؟"

"تقریباً دو مہینے پہلے۔ اس کا صرف کرایہ دیتا ہوں میں۔" برکت نے کہا۔ "صرف چار سو روپے مہینہ۔"

"صرف چار سو روپے مہینہ! اتنا تو تم روز کماتے ہوگے۔" میں نے کہا۔ "اتنا کم کرایہ لینے کی کوئی وجہ تو ہوگی؟"

"وجہ..... وجہ کیا۔ اس کی مرضی۔" برکت نے کہا اور میں نے اس کی اچھی طرح پٹائی کی۔ اسے میں نے تین بار زمین سے اٹھایا اور اس کے منہ پر اور پیٹ پر مکے مارے۔ وہ نیم جان ہوگیا۔

"وجہ یہ تھی استاد برکت کہ استاد پیڈرو نے ایک چھوٹی سی شرط رکھی تھی۔" میں نے کہا۔ "شرط یہ تھی کہ کبھی کبھی ان کے ٹرک پر یہاں سے سامان لوڈ ہوگا۔" میں نے ہینگر ٹائپ بیرک کی طرف اشارہ کیا۔ "اور تم اعتراض نہیں کرو گے بلکہ اس کا ذکر بھی نہیں کرو گے۔ یہ بیرک بدستور انہی کے قبضے میں رہے گی۔ یہی شرط تھی نا؟"

استاد برکت نے بڑی مشکل سے اقرار میں سر ہلایا۔

"اس دروازے کو کھولو۔" میں نے اسے پیروں پر کھڑا کر کے حکم دیا۔

"میں..... میں کھولوں ....." وہ لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ "کیسے کھولوں؟ اس کی چابی چھوٹو کے پاس ہوتی ہے۔"

"تمہارے گیراج میں گاڑیوں کی ڈینٹنگ پینٹنگ بھی ہوتی ہے" میں نے کہا۔ "ڈینٹر کے لیے ویلڈنگ ٹارچ ضروری سامان میں شامل ہے۔ اس سے وہ ٹیڑھی چادر کو گرم کر کے نرم کرتے ہیں، جوڑ لگاتے ہیں اور مجھے تمہاری ورکشاپ میں دونوں طرح کی ویلڈنگ کا انتظام نظر آرہا ہے۔ گیس ویلڈنگ کے لیے تمہارے پاس آکسیجن اور ایسی ٹیلن کے سلنڈر بھی ہیں اور تم الیکٹرک ویلڈنگ بھی کرتے ہو۔ تالے کو کاٹ دو۔"

"کاٹ دوں! اس سے کچھ نہیں ہوگا۔" برکت ہونٹوں پر زبان پھیر کے بولا۔ "گیٹ اندر سے بھی بند ہیں۔ اوپر نیچے تین جگہ لوہے کی سلاخیں فٹ ہیں۔"

"اگر تمہیں یہ معلوم ہے تو تم یہ بھی جانتے ہوگے کہ وہ سلاخیں اوپر نیچے درمیان میں، ایک دوسرے سے کتنے فاصلے پر کہاں کہاں ہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن فرض کرو تمہیں یہ لوہے کے گیٹ اوپر سے نیچے تک کاٹنے پڑیں، الیکٹرک ویلڈنگ ٹارچ سے تو یہ کتنی دیر میں ختم ہونے والا کام ہے؟"

"تم..... تم سمجھتے نہیں۔ یہ بہت خطرناک کام ہے۔" وہ بولا۔ "اس نے... استاد پیڈرو نے مجھے بتایا تھا کہ کبھی کسی کے کہنے یا مجبور کرنے سے بھی میں نے اس دروازے کو کھولنے کی کوشش کی تو بہت برا ہوگا۔"

"کیا برا ہوگا؟" میں نے کہا۔

"اس نے کہا تھا کہ دھماکا ہوگا اور.....ن کو ویسے بھی پتا چل جائے گا۔" برکت بولا۔ "اس کے اندر الارم لگے ہوئے ہیں۔"

میں نے اس کے ایک جھانپڑ مارا۔ "پاگل کے بچے، تمہیں شک نہیں ہوا تھا کہ یہ خطرناک کام ہے۔ تم نے اس سے پوچھا نہیں تھا کہ آخر اتنا زبردست حفاظتی انتظام کرنے کا مقصد کیا ہے۔"

"پوچھا تھا۔ اس نے کہا اپنے کام سے کام رکھو اور منہ بند رکھو۔" برکت بولا۔ "اور مجھے یہ بہت فائدے کا سودا لگتا تھا۔ میں اپنا نقصان کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے ان کی شرط منظور کرلی۔"

"فائدے اور نقصان کا تو اب پتا چلے گا تمہیں۔" میں نے کہا۔ "الیکٹرک ویلڈنگ کا تار وہاں تک پہنچ جائے تو بہتر ورنہ گیس کے سلنڈر اٹھواؤ اور جہاں سے ضروری ہو وہاں سے گیٹ کاٹ دو۔"

"میں یہ نہیں کرسکتا۔ یہ خودکشی ہوگی۔ میرے ساتھ تم بھی مارے جاؤ گے۔"

"ہاں۔ ہم تمہیں اور صرف تمہیں مارنا نہیں چاہتے۔ اگر اس کام میں کوئی خطرہ ہے تو وہ خطرہ ہمارے لیے بھی ہوگا۔" میں نے کہا۔ "میں تم کو یقین دلا سکتا ہوں کہ دھماکا کسی قسم کا نہیں ہوگا۔ پہلے تالے کو کاٹو۔ پھر ادھر کی کنڈی کھولو۔ اس کے بعد اندر کی طرف کی سلاخیں اپنے اندازے کے مطابق کاٹو۔ اس کے لیے تمہیں گیٹ میں شگاف کرنا ہوگا۔"

"خدا کے لیے مجھے اس پر مجبور مت کرو۔ وہ مجھے مار ڈالیں گے۔" استاد کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"ہماری بات نہ مانی تو ہم بھی تمہیں مار ڈالیں گے۔" میں نے کہا۔ "کیا تم پسند کرو گے کہ ہم تمہارے گھر میں گھس کر تمہاری بیوی کو باہر گھسیٹ لائیں۔ اس کے منہ میں اسی کے کپڑے ٹھونس کر، ویلڈنگ ٹارچ کو چھوڑو، دیا سلائی بھی جلا کے بجھا دی جائے اور فوراً جلد پر لگا دی جائے تو تکلیف کم نہیں ہوتی۔"

"نہیں، نہیں....." وہ ہکلانے لگا۔ "تم اتنے بے رحم نہیں ہو۔ تم ایسے نہیں ہوسکتے۔"

"یہ وضاحت میں نے آتے ہی کردی تھی کہ ہم ایک جیسے بے رحم ہیں۔" میں نے کہا۔ "کیا تم ہماری بے رحمی کے عملی مظاہرے کو اپنی آنکھوں سے دیکھے بغیر قائل نہیں... ٹھیک ہے۔ محسن ذرا ہماری استانی جی کو لے آ۔ عزت... کے بغیر۔"

"ٹھہرو! میں.... میں دروازہ کھولتا ہوں۔" برکت نے محسن کو پلٹتے دیکھ کر کہا۔ "مگر مجھے یہ بتادو کہ ان سے میں کیوں گا؟"

"جب تم دروازہ کھول دو گے تو ہم تمہیں اور تمہارے شاگردوں کو ہاتھ پیر باندھ کے اور منہ میں کپڑا ٹھونس کر گیراج میں ڈال دیں گے۔" میں نے کہا۔ "جس سے یہ ظاہر ہوگا کہ ہم نے تمہیں بے بس کردیا تھا اور پھر باقی کام خود... تم سب کو اپنی جان پیاری ہے تو اسی بیان پر قائم رہنا۔ وہ خود ویلڈنگ کرکے دروازہ کاٹتے رہے تھے۔ تم ہمارا... بھی غلط بتاؤ گے ورنہ یاد رکھنا ہم دوبارہ آجائیں گے۔"

استاد برکت نے آہستہ آہستہ گیراج کی طرف... شروع کیا جہاں نیک محمد بھی چار افراد کو الٹا لٹائے... کے کام سے بور ہونے لگا تھا۔ وہ چاروں شور مچا رہے... کہ انہیں کمر کے بل لیٹنے کی اجازت دی جائے اور ان... سے ایک باقاعدہ بھوں بھوں کرکے رو رہا تھا۔

"چپ کرو سُور کے بچو۔" نیک محمد نے کہا۔ "تمہیں ہم دفن بھی الٹا کریں گے۔"

"انہیں اٹھنے دو بھئی۔" میں نے کہا۔ "یہ استاد برکت کی مدد کریں گے۔"

"اٹھو! ...ئے سُور کے بچو۔" استاد برکت نے طیش میں سب کے ایک ایک لات رسید کی۔ "کتنے مزے سے پڑے ہیں سالے۔"

وہ مزے میں بالکل نہیں تھے اور دونوں طرف ان کو ایک جیسے خطابات دیے گئے تھے مگر وہ احتجاج کیے... اٹھے۔ استاد برکت کے حکم پر انہوں نے ویلڈنگ کا سامان گھسیٹا اور بیرونی گیٹ تک لے گئے۔ گیٹ بیس گز کے فاصلے پر تھا لیکن خوش قسمتی سے الیکٹرک ویلڈنگ کا کیبل بیس... سے زیادہ لمبا تھا۔ استاد برکت کے ہاتھ کانپ رہے تھے... میرے ہاتھوں اس کی جو درگت بنی تھی وہ شاگردوں کے سامنے اس کی بے عزتی کا سبب بن رہی تھی مگر وہ مجبور تھا... نے ایک منٹ سے بھی پہلے تالے کو کاٹ دیا۔ وہ جھوٹ... کہ اپنی جان بچانا چاہتا تھا ورنہ اس کو اندر کی جانب جمی ہوئی لوہے کی سلاخوں کی بالکل صحیح پوزیشن معلوم تھی۔ اس نے نیچے بیٹھ کر اس جگہ کو کاٹنا شروع کیا جہاں دونوں پٹ ملتے تھے۔ ذرا سی دیر میں چادر کٹ گئی اور شگاف اتنا بڑا ہوگیا کہ اس کے پیچھے پھنسی ہوئی ایک انچ موٹی سلاخ نظر آنے لگی۔ ویلڈنگ ٹارچ سے چنگاریاں اڑ رہی تھیں۔ استاد برکت نے اپنی آنکھوں کے سامنے گہرے رنگ کے شیشوں والا مین کا ڈھکنا سا کر لیا تھا چنانچہ اندھا کردینے والی روشنی اس کی آنکھوں کے لیے قابل برداشت ہوگئی تھی مگر ہم سب دوسری طرف منہ پھیر کر کھڑے ہونے پر مجبور تھے۔ میں نے برکت کے دونوں سینئر شاگردوں کو اور دونوں بچوں کو سامنے کھڑا کیا تھا اور ریوالور ہاتھ میں رکھا تھا۔ خیرہ کن شعلے کی طرف نہ دیکھنے کے باوجود میں برکت کی طرف سے بے خبر نہیں تھا۔ اس نے ایک بار اٹھنے کی کوشش کی تھی لیکن جیسے ہی میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ پھر بیٹھ گیا۔

دس منٹ بعد پہلی سلاخ کٹ گئی تو میں نے پھر گھوم کر دیکھا۔ وہ جگہ اب بھی انگارے کی طرح دہک رہی تھی جہاں سے دروازہ کاٹا گیا تھا۔

"دھماکا تو کوئی نہیں ہوا نا۔" میں نے برکت کو تسلی دینے کے لیے کہا۔ "تم کو ڈرا دیا گیا تھا خواہ مخواہ۔"

"لیکن الارم تو بج رہا ہے۔" وہ بولا اور میں نے دروازے سے کان لگا کے سُنا۔ اندر سے واقعی ایک سائرن کی ہلکی سی آواز کی گونج آرہی تھی۔

"اب تم جلدی کرو۔" میں نے اپنی گھبراہٹ پر قابو رکھتے ہوئے کہا۔ "وقت کم ہے۔ یہ نہ ہو کہ تمہارا کام ختم ہونے سے پہلے وہ لوگ آجائیں۔" مجھے یہ فکر بھی تھی کہ اندر ناز و اور رابعہ کو ناکامی سے دوچار ہونا پڑا تو کیا ہوگا۔ ان کو بحفاظت نکالنے کے لیے ہمارا مقررہ وقت کے مطابق اندر پہنچنا ضروری تھا۔ الارم کی آواز میرے اعصاب پر اثر انداز ہونے لگی تھی اور میں اس اندیشے سے دوچار تھا کہ ہم دشمن کے حفاظتی انتظامات سے گزر سکیں گے یا نہیں۔ یہ تو ہمیں اس حصار میں قدم رکھنے سے پہلے سوچ لینا چاہیے تھا کہ شکاری کتنا ہی پُراعتماد اور ہوشیار کیوں نہ ہو اپنی حفاظت کے خیال سے غافل کبھی نہیں ہوتا۔ دشمن کو کمزور سمجھنا ہی بے وقوفی کہلاتا ہے۔ کسی الارم سسٹم کی موجودگی کی طرف ہمارا دھیان ہی نہیں گیا تھا اور ہم نے فرض کرلیا تھا کہ ہم زبردستی اور طاقت کے بل پر اس سرنگ نما راستے کے ایک کنارے سے داخل ہوگئے تو دندناتے ہوئے گامے ماچھی کے اڈے تک چلے جائیں گے جو اب ایسا مشکل نظر آتا تھا۔ الارم نصب کرنے والوں نے اور بھی بہت کچھ نصب کر رکھا ہوگا جس سے غیر متعلقہ افراد کے داخل ہونے کی صورت میں مزاحمت کی جاسکے۔ اب الارم کی آواز نے انہیں خبردار کردیا ہوگا اور وہ جوابی کارروائی کے لیے اپنی قوت مجتمع کرنے میں مصروف ہوں گے۔

"محسن! تو ٹرک کو اسٹارٹ کرکے یہاں لے آ۔" میں نے کہا۔

"اس میں چابیاں نہیں ہیں، سکندر بادشاہ۔" نیک محمد نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے۔ محسن سیلف کو ڈائریکٹ کرنٹ دے کر اسٹارٹ کرے گا۔" میں نے کہا۔ "تم اتنی دیر میں ان سب بچوں کو واپس گیراج میں لے جاؤ۔ ان کے ہاتھ کمر کے پیچھے باندھنا گیراج میں تار بہت ہوں گے۔ وہی تار دوسرے آدمی کے لیے بھی استعمال ہوجائے تو اچھا ہے۔ دونوں کی پشت مل جائے۔ پھر دونوں کو ایک ساتھ جوڑ کر کسی کھمبے یا کھونٹے سے باندھ دینا۔ اور ہاں، ان کے منہ بند کرنا مت بھولنا۔ اندر پرانا سوت بھی ہوگا۔ نہ ہو تو انہی کے کپڑے پھاڑ لینا مگر یہ سب پھرتی سے کرنا۔ کوئی گڑبڑ کرے تو بس ایک گولی چلانا۔ سر کا بھیجا نکال دینا۔"

برکت کے چاروں شاگردوں نے احتجاجی شور بلند کیا۔

"یہ کیا ظلم ہے استاد!"

"چپ کرو ظلم کے تخم۔" استاد برکت نے پلٹ کر کہا۔ "اس کے بغیر جان نہیں بچے گی۔"

"ہاں، تم کو یہی کہنا ہے کہ ہمیں مار باندھ کر ڈال دیا گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "اس کے علاوہ نہ ہمارے نام بتانا ہیں نہ حلیہ۔ نام تم نے کسی کی زبان سے سُنا ہی نہیں تھا اور حلیہ تم اس لیے نہیں دیکھ سکے کہ حملہ آور منہ پر نقاب ڈال کر آئے تھے۔ اگر تم نے کچھ اور کہا تو دونوں طرف سے مارے جاؤ گے۔ پہلے وہ ماریں گے۔ انہوں نے چھوڑ دیا تو ہم ماریں گے۔ اب جاؤ۔" وہ نیک محمد کے ساتھ چل پڑے۔ اسی وقت محسن نے ٹرک کو میرے قریب لا کے کھڑا کیا۔ میری پریشانی میں دم بدم اضافہ ہو رہا تھا۔ میں نے محسن سے کہا کہ وہ اسٹین گن نکال لائے۔ اس کے اترتے ہی میں ڈرائیور کی سیٹ پر چڑھ بیٹھا، اس کا انجن بند نہیں کیا۔

"نیک محمد!" میں نے چلّا کے کہا۔ "ہم جا رہے ہیں۔ تم یہ ٹیکسی لے کر نکل جانا۔"

نیک محمد گیراج کے دروازے تک آیا۔ "کہاں چلا جاؤں؟" وہ چلّا کے بولا۔ "واپس گھر؟"

"نہیں، گامے شاہ کے مزار پر۔ دروازے کے سامنے ہمارا انتظار کرنا۔" میں نے کھڑکی سے سر نکال کے کہا۔ "ہم اگر شام تک نہ آئیں تو واپس گھر جا کے انتظار کرنا۔ ہو سکے تو غالب کو بلا لینا۔"

محسن ٹیکسی میں سے اسٹین گن نکال کے دوڑتا ہوا آیا اور میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

"اسٹین گن کے استعمال کی ضرورت اچانک پڑ سکتی ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ مشکل مرحلہ اس کے بغیر ہی سر ہو گیا تو پھر اس کی ضرورت نہ جانے کب پڑے۔ تُو تیار ہے نا؟"

محسن نے اقرار میں سر ہلایا۔ "تو اپنی توجہ ڈرائیونگ پر رکھنا۔ اِدھر اُدھر دیکھے بغیر ٹرک کو نکال کرلے جانا۔ کوئی سالا سامنے آئے تو اسے بھی مت دیکھنا۔"

"استاد برکت!" میں نے پھر چلّا کر سر نکالا۔ "ہٹ جاؤ سامنے سے۔"

"ابھی..... اوپر والی سلاخ باقی ہے۔" وہ ٹرک کو آگے بڑھتا دیکھ کر چلّایا۔

"تم اتنے اوپر تک کیسے پہنچ گئے؟" میں نے ٹرک کی رفتار بڑھائی اور اسٹیئرنگ کو مضبوطی سے تھام لیا۔

"گیٹ تمہارے اوپر گرے گا۔" برکت نے چیخ کر کہا اور ایک طرف چھلانگ مار دی۔ اس وقت تک ٹرک اور گیٹ کا درمیانی فاصلہ گھٹ کر بیس فٹ کے قریب رہ گیا تھا۔ میں نے ایکسیلیریٹر کو دبایا اور طاقتور انجن کی گرج کے ساتھ ٹرک ایک دم آگے بڑھا۔ اس نے کسی دیو ہیکل اور بھاری بھر کم گینڈے کی طرح لوہے کے دروازے کو ٹکر ماری۔ ٹرک کی قوت کے سامنے پٹ یوں وا ہو گئے جیسے وہ لوہے کے گیٹ نہیں تھے، کپڑے کے دو پردے تھے جن کو اوپر سے ٹانکا لگا کے ایک ساتھ جوڑ دیا گیا تھا۔ اوپر کی سلاخ کے باقی رہ جانے سے دونوں پٹ ایک دم نہیں گرے۔ جتنی دیر میں سلاخ کا رشتہ ٹوٹا، ٹرک نیچے سے اپنا راستہ نکال چکا تھا۔ تصادم کے جھٹکے نے مجھے اور محسن کو بھی ہلا دیا تھا مگر ہم اس کے لیے پہلے سے تیار تھے۔ ہمارے کانوں نے مضبوط بمپر کی رگڑ کو سنا۔ پھر ہیڈ لائٹس کا شیشہ بکھرنے کی آواز آئی اور ٹرک کی باڈی ——— دروازے کو ادھیڑتی اور اس کی فولادی پنجوں جیسی رگڑ سے مجروح ہوتی گزری۔ سائڈ مرر ٹوٹ کر الگ ہوئے اور مڈگارڈ کھڑکھڑائے، ایک سیکنڈ میں ٹرک کو راستہ مل گیا۔ میرے سامنے ایک تاریک اور نشیبی راستہ آ گیا۔ ٹرک کی رفتار میں یکلخت اضافہ ہوا اور میں نے اِدھر اُدھر ہاتھ مار کے بالآخر دونوں ہیڈ لائٹس جلانے میں کامیابی حاصل کی۔ اسی وقت دروازے کے دونوں پٹ ایک خوفناک دھماکے سے ہمارے پیچھے گرے۔ پھر اینٹوں کی بارش ہونے لگی جو لوہے کے دروازے کو معلق قائم رکھنے کی ضامن تھیں۔ چند سیکنڈ میں ہو جانے والی اس تباہی کا نظارہ میں نے صرف ایک بار پیچھے دیکھ کر کیا اور مجھے یقین آیا کہ ہم بال بال بچ گئے ہیں۔ اگر دروازہ زیادہ مضبوط ہوتا یا ٹرک کی قوت میں کمی رہ جاتی تو شاید ہم اس صفائی کے ساتھ نہ نکل پاتے اور کہیں الجھ جاتے تو دونوں فولادی گیٹ ہمارے اوپر گرتے جو اَب چند فٹ پیچھے رہ گئے تھے۔

میں نے ایک گہری سانس لے کر اپنے سامنے دیکھا۔ وہ سرنگ نما راستہ جسے ٹرک کی ایک سالم رہ جانے والی لائٹ نے کچھ روشن کر دیا تھا اتنا ہی چوڑا اور بلند تھا جتنا کہ اس میں داخل ہونے کا راستہ۔ اوپر چھت بھی پختہ تھی اور دونوں جانب کی دیواروں پر سیمنٹ کا پلستر تھا۔ ٹرک کے انجن کی آواز سے سرنگ میں زبردست گونج پیدا ہو رہی تھی۔

"ہم زمین کی کتنی گہرائی میں سفر کر رہے ہیں!" محسن نے رومال سے ماتھے کا پسینہ صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

"میرے اندازے کے مطابق چھ فٹ۔" میں نے کہا۔ "لیکن خدا کا شکر ہے کہ زندہ سلامت سفر کر رہے ہیں اور یہ عالمِ بالا کی جانب روح کا سفر نہیں ہے۔" کم روشنی کی وجہ سے میں نے ٹرک کی رفتار کو بہت کم کر دیا تھا۔

"ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں، سکندر بادشاہ!" محسن نے کہا۔ "آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔"

میں نے مڑ کر دیکھا تو مجھے شق ہو جانے والے دروازے کی روشنی بہت دور لگی۔ "مجھے تو حیرت ہے کہ ابھی تک ہماری راہ میں کوئی حائل نہیں ہوا۔ کیا انہوں نے خطرے کا الارم نہیں سنا ہوگا؟" میں نے کہا۔

"اگر ہم نے سن لیا تھا تو انہوں نے کیسے نہیں سنا ہوگا۔ الارم نے اپنا کام کیا تھا۔ وہ خبردار ہوں گے۔"

"اور خبردار ہونے کے باوجود وہ چپ بیٹھے ہیں!" میں نے کہا۔ "اس کا کیا مطلب ہے؟"

"اس کے دو ہی مطلب نکالے جا سکتے ہیں۔" محسن بولا۔ "یا سب خیریت ہے یا خیریت بالکل نہیں ہے۔"

"ماشاء اللہ، کس قدر ذہانت کی بات کہی ہے تو نے۔" میں نے اسٹیئرنگ کو سنبھالے رکھا کیونکہ راستہ خم کھاتا تھا تو ٹرک کے ذرا سے بے قابو ہونے کی صورت میں شکستہ حال باڈی کے دیوار سے ٹکرانے کا خطرہ لاحق ہو جاتا تھا۔

"میں حیران ہوں کہ اتنی لمبی سرنگ کی موجودگی سے سب بے خبر رہے۔" محسن بولا۔

"اب نہیں رہیں گے۔" میں نے کہا۔ "آج دوسروں نے بھی دیکھ لیا ہے۔"

"یہ ناممکن ہے کہ استاد برکت کو کچھ بھی علم نہ ہو پھر بھی تُو نے اسے چھوڑ دیا۔"

"اسے اپنے کیے کی سزا مل جائے گی۔ ہمارے ہاتھوں نہ سہی کسی اور کے ہاتھوں سہی۔" میں نے کہا۔

"تیرا خیال ہے کہ وہ گامے ماچھی کے ساتھیوں میں شامل نہیں ہے؟" محسن بولا۔

"صرف اس حد تک کہ اس نے سرنگ کے راستے ٹرک سے مال کے آنے جانے کے راز کو راز رکھا۔" میں نے کہا۔ "صرف اپنے فائدے کی خاطر وہ چپ رہا یا پھر خوف کے باعث۔ اسے تو یہ بھی ہم نے ہی بتایا ہے کہ ٹرک میں منشیات روانہ کی جاتی تھیں۔"

"یہ معلوم ہو جانے اور افشائے راز کے بعد وہ کیا کرے گا؟"

"سمجھداری سے کام لے گا تو وہی کرے گا جو ہم نے سمجھایا تھا اور بے وقوفی کرے گا تو بھاگ جائے گا۔ مگر بھاگ کر وہ کہاں جائے گا۔ استاد پیڈرو اسے پھر پکڑ لے گا۔ وہیں سے جہاں سے وہ پہلے لایا تھا۔" میں نے کہا اور ٹرک کو روک لیا کیونکہ اب میرے سامنے کا راستہ بلندی کی جانب اٹھتا نظر آتا تھا۔

"یہ سرنگ ایک فرلانگ لمبی تو ہوگی۔" محسن نے کہا۔ "کتنا خرچہ آیا ہوگا اس کو بنانے پر؟"

"کروڑوں کا بزنس کرنے والے لاکھوں خرچ کرتے ہیں تو اپنے فائدے کے لیے۔" میں نے کہا۔

"اب ہم گامے شاہ کے مزار کے احاطے میں ہیں۔ عین اس کے نیچے۔" محسن نے منہ اوپر اٹھا کے کہا۔

"ہاں۔ اور آگے جو پچاس ساٹھ گز کی بلندی ہے، یہ نکلنے کا راستہ ہے جس سے ٹرک اندر اترتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم نے خود دیکھا تھا کہ کچھ لوگوں نے مل کر اس راستے کے اوپر سے زمین ہٹا دی تھی۔"

"ہاں۔ لان کی گھاس پر اس خلا کا پتا بھی نہیں چلتا تھا مگر ان لوگوں نے ایک پورا تختہ الگ کر دیا تھا۔" محسن بولا۔

"اس تختے پر مٹی ڈال کے گھاس اگائی گئی تھی۔ جب اسے لان کے درمیان خالی جگہ پر رکھ دیا جاتا تھا تو لان برابر اور ایک جیسا نظر آتا تھا۔ اسے اٹھا لینے سے نیچے جانے کا راستہ بن جاتا تھا۔" میں نے کہا۔ "اس میں کوئی مشینی نظام نہیں تھا اور نہ کوئی ایسا دروازہ تھا جیسا ہم پیچھے گرا آئے ہیں۔ اب میں ٹرک پوری رفتار سے اوپر لے جاتا ہوں۔ ٹرک کی باڈی کا اوپر والا حصہ اس تختے کو اٹھا کے ساتھ لے جائے گا اور ہم احاطے کے وسط میں طلوع ہوں گے۔"

"پہلے سوچ لے کہ باہر طلوع ہونے پر جو صورتِ حال درپیش ہوگی کیا ہوگی؟"

"غیب کا علم رکھنے کا دعویٰ میں نے کبھی نہیں کیا۔" میں نے کہا۔ "صورتِ حال جیسی بھی ہوگی اس سے نمٹنا تو ہے۔"

"یہ پُراسرار خاموشی مجھے کسی طوفان کا پیش خیمہ لگتی ہے۔" محسن بولا۔ "انہوں نے ابھی تک کارروائی کیوں نہیں کی جبکہ انہوں نے ایسے سخت حفاظتی انتظامات کر رکھے تھے اور ان کو معلوم ہو چکا ہے کہ کوئی ساری رکاوٹوں کو عبور کر کے اندر داخل ہو چکا ہے۔ جو اُن کا اپنا آدمی نہیں ہے۔"

"یہ ہو سکتا ہے کہ جب ہم پھر خدا کی بنائی ہوئی سطحِ زمین پر نمودار ہوں تو وہ دونوں جانب ٹینک اور توپیں لیے انتظار کرتے ملیں۔" میں نے کہا۔ "ان کے مقابلے میں ہماری اسٹین گن دھری رہ جائے۔"

"تاریک پہلو کو مت دیکھ۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ رابعہ اور نازو کی ٹیم نے اس غیر قانونی مملکت کے بے تاج بادشاہ سلامت کو یرغمالی بنا رکھا ہو۔" محسن بولا۔ "اور اعلانِ عام کر دیا ہو کہ کسی نے جارحانہ کارروائی کی تو وہ بادشاہ سلامت کی جان کا دشمن ہوگا۔"

"خیر اب جو ہوگا سامنے آ جائے گا۔" میں نے ٹرک کو پھر گیئر میں ڈالا۔ "خدا کرے نیک محمد وہاں سے نکل گیا ہو۔ کوئی تو ہو ہماری خبر پہنچانے والا۔ آگے غالب ہے جو سب کی خبر لے سکتا ہے۔"

"بس تو پھر چڑھ جا بیٹا سولی پر، رام بھلی کریں گے۔" محسن نے کہا۔

میں نے کلچ چھوڑ دیا اور ٹرک چلا ہی تھا کہ سیکنڈ گیئر میں ڈال دیا۔ ٹرک بڑی گھن گرج کے ساتھ اوپر چڑھا۔ آگے فرش کی بلندی میں بتدریج اضافہ ہوا مگر چھت اسی مناسبت سے اوپر اٹھنے کے بجائے ہموار رہی اور اس کا ٹرک کے سب سے اوپر والے حصے سے فاصلہ بتدریج کم ہوا پھر ٹرک کی باڈی چھت سے لگی اور چھت ایک دم اٹھ گئی۔ ٹرک آگے بڑھا تو

چھت اس کے اوپر آگئی اور ٹرک اندھیرے سے اچانک اجالے میں پہنچا تو ذرا سی دیر کے لیے میری آنکھیں بھی چندھیا گئیں۔ ٹرک اس سرنگ سے باہر آنے کے بعد گامے شاہ کے مزار کے عقبی حصے میں لان پہنچ چکا تھا۔ میری حیرت زدہ نظروں نے ہر سمت خالی پڑے ہوئے میدان کو دیکھا۔ میں نے انجن کو بند کیا اور سوالیہ نظروں سے محسن کی طرف دیکھا جو خود بھی اس خاموشی اور ویرانی کا مطلب اخذ کرنے سے قاصر تھا۔

پہلے میں اترا اور میں نے اترنے سے پہلے اپنا ریوالور محسن سے واپس لیا۔ میرے بعد محسن نے نیچے قدم رکھا۔ وہ اسٹین گن لیے کھڑا رہا اور میں ریوالور تھامے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ ایک طرف قطار میں حجرے بنے ہوئے تھے۔ انہی حجروں سے متصل گامے شاہ کے مزار کی عمارت تھی جو ایک وسیع اور بلند دیواروں والے کمرے اور چاروں طرف بنے ہوئے برآمدے پر مشتمل تھی۔ برآمدہ بھی سطح زمین سے چھ سات فٹ اونچا تھا اور اس کی چھت محرابی دروازوں پر قائم تھی۔ وسط میں مزار کی عمارت کی ہر دیوار بیس فٹ بلند تھی اور سب سے اوپر نیلے رنگ کا گنبد تھا۔ عمارت کی چاروں دیواروں میں ایک ایک دروازہ تھا مگر اس وقت ہر دروازہ کھلا ہونے کے باوجود نہ کوئی آرہا تھا، نہ جارہا تھا۔

"یہ معاملہ تو مجھے خطرناک لگتا ہے محسن"۔ میں نے کہا۔

"کیا وہ رابعہ اور نازو کو بھی لے گئے؟" محسن نے وہ بات کہہ دی جو میں نہ کہہ سکا تھا۔ "لیکن کچھ فرض کرنے سے کیا حاصل۔ ہم دیکھ لیتے ہیں۔ پہلے ان حجروں میں جھانک لیں"۔

میں نے تائید میں سر ہلایا۔ "میں آگے رہوں گا۔ تو اسٹین گن کے ساتھ میرے پیچھے آ۔"

ہر حجرے کی خاموشی ایک ہی کہانی کہتی تھی۔ وہاں چارپائیاں تھیں، بستر اور میلے کپڑے تھے مگر وہ لوگ نہیں تھے جو ان حجروں میں رہتے تھے۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے سکندر کہ وہ سب بھاگ گئے ہوں، وہ اتنے کمزور لوگ نہیں تھے۔ ان کا دھندا ایسا نہیں تھا کہ وہ اتنی آسانی سے میدان چھوڑ دیتے"۔ محسن نے کہا۔ "اور سب سے بڑی بات یہ کہ انہوں نے اپنا ایک اڈا بنا رکھا تھا جو ہر جگہ نہیں بنایا جا سکتا۔ اسے وہ کیسے خالی کر سکتے ہیں"۔

"مجھے ان کی نہیں، رابعہ اور نازو کی فکر ہے"۔ میں نے بمشکل سے کہا۔ "وہ ہماری حماقت کی بھینٹ نہ چڑھ گئی ہوں۔ ہم نے انہیں ضرورت سے زیادہ بہادر اور نڈر سمجھ لیا تھا۔ ان کو تھپکی دے کر ایک ایسی مہم پر روانہ کر دیا تھا جسے سر کرنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ تھیں تو وہ لڑکیاں ہی۔ اور ان کے مقابلے پر تھے پیشہ ور بدمعاش مرد"۔

"ان کو کچھ بھی نہیں ہوا ہوگا"۔ محسن نے مجھے تسلی دینے کے لیے کہا مگر مجھے اس کے لہجے کا کھوکھلا پن اچھا نہیں لگا۔

"یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ وہ انہیں قتل نہیں کریں گے۔ قتل کا مطلب صرف جان لینا ہی تو نہیں ہوتا۔ وہ انہیں زندہ رکھتے ہوئے بھی سو بار قتل کر سکتے ہیں"۔ میں نے کہا۔

ہم شکستہ دل، آزردہ اور ملول ایک حجرے سے دوسرے حجرے میں جھانکتے گئے۔ کہیں ہمیں کوئی بھی نہ ملا جو ہمیں کچھ بتا سکتا اور ہمارے ذہن پر یلغار کرنے والے سوالات کے جواب دے سکتا۔

"یہاں تو ان کے کارندے رہتے تھے۔ ڈرائیور اور مال اِدھر سے اُدھر کرنے والے"۔ محسن بولا۔

"مزار کے مجاور کہاں گئے؟" میں نے چیخ کر کہا۔ "گامے شاہ کے چیلے چانٹے کہاں گئے؟"

"تو ابھی سے پاگل کیوں ہو رہا ہے"۔ محسن نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "چل، ہم مزار میں بھی دیکھ لیتے ہیں"۔

"وہاں بھی کچھ نہیں ملے گا محسن۔ مجھے لگتا ہے کہ اپنی بے وقوفی کے باعث ہم نے ان دونوں کو کھو دیا ہے"۔

"اگر وقتی طور پر کھو دیا ہے تو ہم انہیں پھر پالیں گے سکندر"۔ محسن نے دوست کی حیثیت سے غمگساری کا فرض ادا کرتے ہوئے کہا۔

"پالیں گے مگر کیا کچھ گنوانے کے بعد"۔ میں نے کہا اور ہم مزار کے برآمدے کی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ اس وقت تک شام کے سائے ڈھلنے لگے تھے اور مزار کے اندرونی حصے میں باہر کی نسبت گہرا اندھیرا تھا۔ آگے پیچھے چلتے ہوئے ہم ایک ہی دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ ہماری ذہنی کیفیت ان کمانڈوز کی طرح تھی جو ہتھیلی پر جان رکھ کر اور سر پر کفن باندھے دشمن کے کسی مورچے کو سر کرنے جائیں اور انہیں پتا چلے کہ دشمن تو بہت پہلے مورچا چھوڑ کر جا چکا ہے۔ وہ بہت آگے نکل آئے ہیں اور محصور ہو چکے ہیں۔ ایک نامعلوم خوف اپنے وجود کا پتا دیتا تھا جو ہماری رگوں میں دوڑنے والے خون کو سرد کرتا تھا اور ہمارے حوصلوں کو مفلوج کرتا تھا۔

بلند و بالا اور وسیع و عریض حجرے کے وسط میں فرش پر کوئی چیز پڑی تھی۔ اچانک بہت اوپر گنبد کی چھت سے روشنی کا ایک دھارا پھوٹا اور یہ روشنی دس فٹ کے ایک دائرے پر محیط ہو گئی جس کے درمیان میں گامے ماچھی کا بے جان جسم درد و کرب کے اس آخری لمحے کی تصویر بنا پڑا تھا جب روح نے (جو بے وجود ہے) جسم کا ساتھ چھوڑا (جو فانی ہے)۔ بے اختیار میری نگاہ نے بہت بلندی پر آویزاں نظر آنے والے روشنی کے منبع کو دیکھا اور آگے بڑھ کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ موت کی تصدیق کے لیے گامے ماچھی کے دل کی دھڑکن کو سننے یا نبض کی رفتار کو محسوس کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اس کی کھلی آنکھوں کی ساکت پتلیوں میں زندگی کی رمق ہی نہ تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام کے اوپر اٹھایا۔ ہاتھ دو جگہ سے مڑ گیا۔ ایک کہنی کے پاس سے اور پھر کہنی سے اوپر شانے کے قریب سے۔ اس کے بازو کی ہڈی ٹوٹی ہوئی تھی۔

"یہ تو کیا کر رہا ہے؟" محسن نے کہا۔ "یہاں سے نکلنے کی فکر کر، کہیں پولیس نہ آجائے۔"

میں نے اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا اور پہلو کے بل پڑے ہوئے گامے ماچھی کو سیدھا کر دیا۔ اس کی گردن سے نیچے کی کالر بون بھی ٹوٹی ہوئی تھی۔ ہاتھ سے دبا کر دیکھنے پر مجھے اس کے سینے میں دائیں جانب لچک محسوس ہوئی کیونکہ اس طرف سب سے نیچے والی دو پسلیاں بھی ٹوٹی ہوئی تھیں لیکن اس کی موت کا سبب وہ چھوٹا سا سوراخ تھا جو بائیں طرف عین دل کے مقام پر سرخ دائرے کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ اس سے رسنے والا خون زمین میں ایک ہی جگہ پیوست ہو گیا تھا اور بہت کم تھا۔ گامے ماچھی کے سینے پر بائیس بور کا ریوالور رکھ کر گولی چلائی گئی تھی یا زیادہ سے زیادہ ایک فٹ کے فاصلے سے۔ گولی دل میں اتر کے اپنا کام کر گئی تھی اور شاید ابھی تک دل میں چھپی بیٹھی تھی۔

"سکندر! یہاں ٹھہرنا خطرناک ہے"۔ محسن نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "باہر نیک محمد ٹیکسی لے آیا ہوگا"۔

"لیکن ابھی ہم کیسے جا سکتے ہیں"۔ میں نے کھڑے ہونے کے بعد کہا۔

"مجھے تو یہ کوئی سازش لگتی ہے۔ آخر سب لوگ کہاں گئے"۔ محسن نے کہا۔

"ہمیں تو یہ دیکھنا ہے کہ رابعہ اور نازو کدھر گئیں"۔ میں نے کہا۔ اضطراب، خوف یا پریشانی کے بجائے میرے ذہن پر عجیب سا اعتماد اور یقین دینے والا سکون غالب آنے لگا تھا اور یہی وجہ تھی کہ میں نے چیخنے چلانے، رونے دھونے اور واویلا کرنے سے گریز کیا۔ میں نے ایسا جانتے بوجھتے نہیں کیا۔ مجھے اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ اگر میں دیوانگی کا مظاہرہ کرتا تو یہ منظر کی ... اس کی بنیاد منفی نوعیت کے جذبات پر ہوتی۔ یوں تو وجودِ آدم ہی تخلیقِ کائنات کا سب سے بڑا کرشمۂ قدرت ہے مگر اس کی ذات میں پوشیدہ قوت کے مظاہر اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز ثابت ہوئے ہیں۔ وہ کتنے بڑے چیلنج کو قبول کر سکتا ہے، سختی حالات کو ذہنی و جسمانی طور پر کس انتہا تک برداشت کر لیتا ہے، قوتِ ارادی کے بل پر کیسے ناقابلِ یقین کارنامے سرانجام دیتا ہے جن کی عقلی طور پر توجیہہ ناممکن ہے۔ عام حالات میں ایک عام آدمی جتنی صلاحیت کو بروئے کار لاتا ہے، غیر معمولی حالات میں وہ اس سے سو گنا یا ہزار گنا ہمت کے ساتھ بڑی سے بڑی قیامت سے گزر جاتا ہے۔ یہ ایک مثبت ردِ عمل ہوتا ہے اور میری ذہنی کیفیت بھی اس وقت میرے حق میں حوصلہ افزا ثابت ہوئی۔

"جب وہ یہاں نہیں ہیں اور ہمیں بتانے والا بھی کوئی نہیں ہے، تو ہم کس سے پوچھیں۔ یہ دیواریں تو کچھ بتانے سے رہیں"۔ محسن نے کہا۔

"دیواریں بھی بہت کچھ بتا دیتی ہیں"۔ میں نے بے خیالی میں کہا۔ اسی وقت وہ دروازہ بند ہوا جس سے ہم اندر آئے تھے اور ہم دونوں اچھل پڑے۔

"ہاں، یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں"۔ ایک آواز نے کہا جسے ایک لمحے کے لیے میں نے محسن کا جواب فرض کیا مگر ابھی وہ لمحہ گزرا بھی نہ تھا کہ میں اور محسن منجمد ہو گئے۔ وہ اجنبی آواز جس کی کوئی سمت نہ تھی، اپنی شناخت رکھتی تھی اور ایسے ہی وقت میں احساس دلا سکتی تھی کہ شکاری بے خبر نہیں تھے مگر ہم یہ بات بھول گئے تھے کہ یہ دلاور کی آواز تھی۔

"اگر دیواروں کے کان سب کچھ سن سکتے ہیں تو کیا ان کے لب کچھ نہیں بتا سکتے؟" اسی آواز نے کہا جو اس ویران مرقد کی دیواروں میں گونج رہی تھی اور اوپر سے آتی ہوئی روشنی کے ساتھ نیچے پہنچتی محسوس ہوتی تھی مگر ان بے جان اور بے حس دیواروں کے "لبِ گویا" کو نہ میری نظر دیکھ سکتی تھی اور نہ محسن کی۔

"وہ کیا کہتے ہیں اپنے سکندر صاحب! کہ آپ کے لبوں پر یہ مُہرِ خاموشی کیسی؟" دلاور کی طنزا ور تمسخر آمیز آواز نے کہا۔ آواز کسی پوشیدہ اسپیکر سے ہم تک پہنچ رہی تھی جو اوپر کسی دیوار میں نصب تھا، لیکن آواز بہت صاف تھی اور اصل آواز سے بہت مشابہ تھی۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ اسپیکر بہت اچھی کوالٹی کا تھا اور کم والیوم پر اس کی آواز میں خفیف سی سرسراہٹ تک نہ تھی۔

"سانپ کیوں سونگھ گیا ہے تمہیں۔" دلاور آہستہ سے ہنسا۔ "میں نے تو بڑے چرچے سنے تھے تمہاری بہادری کے۔"

"رابعہ اور نازو کہاں ہیں دلاور؟" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

وہ پھر ہنسا۔ "کیا مجنوں نے کبھی کسی سے یہ سوال کیا تھا کہ میری لیلیٰ کہاں ہے؟ اگر تم اسے تلاش کرنے نکلے ہو تو غالباً غلط جگہ آ گئے ہو۔"

"اسی لیے تو تم سے پوچھ رہا ہوں کہ اب وہ کہاں ہیں۔" میں نے کہا۔

"تمہاری طرح میری نگاہ بھی انھیں دیکھنے سے قاصر ہے۔ اس لیے میں کیا بتاؤں کہ اب وہ کہاں ہیں۔ ہاں تمہارے بارے میں بڑے وثوق سے بتا سکتا ہوں تمہیں بھی اور تمہیں تلاش کرنے والوں کو بھی کہ تم کہاں ہو۔" دلاور نے بڑی عیاری سے کہا۔ "تم کچھ دیر پہلے آ گئے ہوتے تو یہی شخص تم کو بہت سے سوالات کے جواب دے سکتا تھا جس کی لاش پر تم ریوالور اور اسٹین گن لیے کھڑے ہو۔ ڈرو نہیں، یہ لاش تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔"

"میں نے رابعہ اور نازو کے بارے میں پوچھا تھا۔"

"تم نے انہیں خوامخواہ زحمت دی۔ عورتوں سے وہی کام لینے چاہییں جو اُن سے سب لیتے ہیں۔" وہ معنی خیز طریقے پر ہنسا۔ "بھئی! اگر اس شخص کو تم زندہ نہیں دیکھنا چاہتے تھے تو مجھ سے کہہ دیتے۔ چلو تمہارا کام تو ہو گیا مگر اپنے سکندر صاحب! یہ کوئی مردوں والی بات تو نہ ہوئی نا کہ عورتوں کو برقعے پہنا کے اور ریوالور دے کر بھیج دیا۔"

"میں تمہارے کسی کارندے کا ذاتی دشمن نہیں ہوں۔ اس قتل کو مجھ سے منسوب مت کرو۔"

"پھر کس سے منسوب کروں؟" دلاور کی آواز میں حیرت نمایاں ہو گئی۔ ہمیشہ کی طرح اس نے ایک ڈرامائی صورتِ حال پیدا کر دی تھی اور اب مجھ سے یوں مخاطب تھا جیسے پہلے سے لکھے ہوئے اسکرپٹ کے ڈائیلاگ کوئی منجھا ہوا اداکار اسٹیج پر بولتا ہے۔

"اب تمہیں نہیں معلوم کہ استاد برکت کی موت کیسے واقع ہوئی۔" دلاور نے خاموشی کے مختصر سے وقفے سے فائدہ اٹھایا۔ میرے ذہن کو ایک جھٹکا لگا۔ "تم نے اسے بھی مار ڈالا! شیطان کی اولاد!"

"کیسی بے معنی گالی دیتے ہو۔" دلاور ہنسا۔ "شیطان لاولد ہے۔ پولیس سے اتنا واسطہ پڑ چکا ہے۔ ابھی تک گالیاں دینے کا فن بھی نہیں سیکھا اور کچھ تو کیا کر سکتے تھے تم!"

"میں کہتا ہوں برکت کا کیا قصور تھا۔ اسے ... سے مار ڈالنے کی دھمکی دی تھی۔" میں نے کہا۔

"اگر وہ تمہاری بات نہ مانتا تو کیا تم سچ مچ اسے ... ڈالتے؟" دلاور نے کہا۔ "تمہاری بات مانی تو ہم نے اسے ... اس میں حیرانی کی کون سی بات ہے۔ انتخاب برکت کے ... میں نہیں رہا تھا۔ اپنے سکندر صاحب! تم یہ دخل در معقول ... نہ کرتے تو اس کی زندگی یوں مختصر نہ ہوتی۔ وہ کل بھی ... گاڑیاں ٹھیک کرتا رہتا اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پالتا ... اس عورت کی دیوانگی کا اندازہ کرو جس کے شوہر کو زندہ ... دیا گیا ہو۔ دیلڈنگ ٹارچ سے۔"

اس سے پہلے کہ غیظ و غضب سے پاگل ہو کے ... دلاور کو گالیاں دیتا اور اسے بتاتا کہ گالیاں دینا اگر ... تو پولیس کو مجھ سے سیکھنا چاہیے، اسپیکر سے ایک شور ... ہوا جس میں کسی عورت کے دیوانہ وار چیخنے، بین کرنے کوسنے کی آوازوں کے ساتھ بہت سے بچوں کے بلک بلک کر رونے اور لوگوں کے بولنے کی آوازیں شامل تھیں ... میں نے سُنا وہ میرے رونگٹے کھڑے کر دینے کے لیے کافی تھا ... نے بڑی ذہانت سے یہ دہشت زدہ کرنے والی آوازیں ... کر میرے ذہن کو ایک حوصلہ شکن الیکٹرک شاک دیا ... اگر وہ اپنی زبان سے اس عورت کی حالتِ زار کا نقشہ ... کرتا تو اس کا یہ اثر نہ ہوتا جو ایک مختصر سے دورانیے ... اثرات دینے سے ہوا۔ یہ حقیقی زندگی کا المیہ تھا۔ دلاور ... مجھے انسانیت کی لاش پر ننگے ناچنے والے شیطانوں کا ... زیادہ بھیانک لگا۔

"تم اس کی موت کا ذمّے دار مجھے نہیں ٹھہرا سکتے ... نے اپنی آواز کی لرزش پر قابو پا کے کہا۔ "یہ سب تم نے کیا ...

"مجھے ایسا کرنے پر مجبور کرنے والا کون ہے؟" دلاور ... غیر سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"یہ غلط ہے۔ تم نے اس کی مجبوری کے عذر کو ... نہیں کیا۔"

"کیا تم نے اس عذر کو قبول کیا تھا؟" دلاور نے ... سے کہا۔ "اس نے یقیناً انکار کیا ہوگا۔ بتایا ہوگا کہ ... انجام کیا ہو سکتا ہے۔ خود تم بھی اندازہ کر سکتے ہو کہ ... سے مکینک کی کیا حیثیت ہے۔ پھر بھی تم نے جبر کیا ... نتیجہ تمہارے سامنے ہے۔ پارٹنر! میری عادت اور میری ... سے تم اچھی طرح واقف ہو۔ رعایت دینے کی گنجائش ... میں ان چاروں کو بھی ...

باندھ کر بھاگ گیا تھا....."

"تو کیا تم نے ان بچوں کو بھی قتل کر دیا ہے....؟" میں نے چیخ کر کہا اور میرے لبوں سے مغلظات کا دھارا پھوٹ بہا۔

"بھئی میں خود کچھ بھی نہیں کرتا۔ اب یہ کام بھی میں کرنے لگوں تو دوسرے کام کون سنبھالے۔" دلاور نے بڑی سفاک بے نیازی کے ساتھ جواب دیا۔ "لوگوں نے تو بس یہی دیکھا کہ کسی نے ان چاروں بچوں کو جن میں دو خاصے جوان تھے اور ماں باپ کا سہارا تھے، ایک اکلوتا تھا اور اس کا باپ کئی سال سے مفلوج پڑا ہے، دوسرا چار بہنوں کا ایک بھائی تھا۔ ان سب کو کسی نے اکٹھا کیا اور ان کی گردنوں کے گرد ایک ہی تار لپیٹ کر اتنا کس دیا کہ ان کا دم نکل گیا۔ بے چارے تڑپ بھی نہ سکے۔ تم لوگوں نے انہیں باندھ دیا تھا اور ان کے منہ میں کپڑے ٹھونس دیے تھے۔"

اچانک ایک خیال میرے ذہن میں جگنو کی طرح چمکا۔ دلاور جھوٹ بول رہا ہے۔ اس نے مجھے جو فریاد و فغاں کا اور آہ و زاری کا شور سنوایا تھا وہ پہلے سے ریکارڈ کر لیا گیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ بارِ ملامت جو چٹان سے بڑھ کر کوہِ ہمالیہ سے زیادہ بڑا ہو چکا تھا اور جس کے نیچے میری مجرم روح تڑپ تڑپ کر پکار رہی تھی اور مجھے چار معصوم لڑکوں کا قاتل قرار دے رہی تھی، ایک مکینک کے خون کا ذمّے دار کہہ رہی تھی اور میری شرافت اور انسانیت کے دامن پر آنے والے لہو کے ہر داغ کو میرا کارنامہ قرار دے رہی تھی، وہ پہاڑ یکلخت بخارات کی طرح فضا میں تحلیل ہو گیا ہے۔ میں اب انسانوں کی طرح سانس لے سکتا تھا کیونکہ میرا ضمیر میری فردِ جرم واپس لے چکا تھا۔ میں نے کسی مفلوج باپ سے بڑھاپے کا سہارا نہیں چھینا تھا۔ چار بہنوں سے ایک بھائی کی محبت کا خزانہ نہیں چھینا تھا۔ ایک عورت سے اس کا سہاگ نہیں چھینا تھا اور اس کے بچوں کے سر سے باپ کا سایہ نہیں چھینا تھا۔ اگر سچ مچ میری وجہ سے اتنے قتل ہو جاتے اور اتنی سی دیر میں ہر قتل کی خبر بھی عام ہو جاتی تو کیا اب تک مشتعل، انتقام کی خواہش سے مغلوب، مجرموں کو قانون کے حوالے کرنے کے خواہشمند، قتل ہونے والوں کے لواحقین اور غمگسار ایک فرلانگ سے بھی کم لمبی سرنگ کے راستے ہم تک نہ پہنچ چکے ہوتے۔ انہیں روکنے والا کون تھا۔ سرنگ کا ٹوٹا ہوا دروازہ تو خود خبر دیتا تھا کہ قاتل اسی طرف گئے ہیں مگر ابھی تک اس طرف سے ... آہٹ بھی سنائی نہ دی تھی۔

اس نتیجے پر پہنچ جانے کے باوجود میں نے دلاور پر کچھ ظاہر نہیں ہونے ... تے محسن کو اشاروں میں بھی کچھ نہیں بتایا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ دلاور صرف ہماری آواز ہی نہیں سُن رہا ہوگا، عین ممکن ہے کہ اس سرچ لائٹ جیسی روشنی میں کسی کیمرے کی آنکھ سے وہ میری صورت کے تاثرات کا مشاہدہ بھی کر رہا ہو۔

"تم جیسے لوگ ضمیر کی ملامت سے بڑی جلدی پریشان ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ بنتے بہت بہادر ہیں۔"

"بنتے بہت دلاور ہیں۔" میں نے تلخی سے اس کی بات کاٹ دی۔ "حالانکہ خود شیطان بھی چاہے تو دلاور نہیں بن سکتا۔"

"اچھا لطیفہ پیدا کیا تم نے الفاظ سے۔ پڑھے لکھے آدمی ہو نا۔" دلاور طنز سے بولا۔ "افسوس یہ ہے کہ تم نے اپنی عقل کا کبھی صحیح استعمال نہیں کیا، ورنہ تم کو کرنے کے بعد یوں نہ پچھتانا پڑتا۔"

"میں اپنے اعمال کی سزا کے لیے ہر وقت تیار ہوں۔" میں نے کہا۔ "فیصلہ کرنے والا اوپر بیٹھا ہے۔ اگر میرے لیے سزا یہاں بھی ہے اور وہاں بھی تو یہ اس کی مرضی۔ وہ نیتوں کا حال خوب جانتا ہے۔"

"گویا تم تسلیم کرتے ہو کہ تمھارے احمقانہ جرأت کے مظاہرے کے باعث جتنے لوگ مارے گئے ان کی موت کا تمھیں کوئی صدمہ نہیں... خیر... اس طرح معلوم نہیں تم کسے دھوکا دینا چاہتے ہو۔ مجھے یا اپنے آپ کو۔ کیا تمھیں ابھی تک اندازہ نہیں کہ اس وقت تم کہاں ہو؟" دلاور نے کہا۔

"مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ تم کہاں ہو۔" میں نے کہا۔ "لیکن میں یہ جاننا بھی نہیں چاہتا۔"

"تم صرف رابعہ اور نازو کے متعلق جاننا چاہتے ہو کہ تمھاری زنانہ فوج کی ان دلیر اور خوب صورت کمانڈوز پر کیا بیتی۔" دلاور نے ہنس کر کہا۔ "لڑکیاں مجھے دونوں پسند آئیں لیکن میں شوقین مزاج آدمی نہیں ہوں۔ میں نے انھیں اپنے کمانڈوز کے سپرد کر دیا۔ سیمی فائنل میں چار جوانمرد پہنچے تھے۔ قرعہ اندازی سے میں نے دو کے حق میں فیصلہ کر دیا۔"

"تم بھونکتے ہو، بکواس کرتے ہو۔" میں نے چیخ کر کہا۔

"تم توپ سے بھی ڈرتے ہو۔" دلاور نے کہا۔ "اچھا بھئی، انھیں ہم نے عزت و احترام کے ساتھ لوٹا دیا۔"

"دیکھو دلاور، میرا انجام کچھ بھی ہو۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی میری زندگی مجھ سے چھین لے۔ تمھارے یہ انصاف کے ٹھیکے دار، خود تم یا تمھارے بھیجے ہوئے قاتل۔" میں نے کہا۔ "لیکن رابعہ یا نازو کو کچھ ہوا....."

"تو تم جھینگیوں کی توپ سے بھی بڑی توپ لا کے ان سب کو توپ دم کر دو گے جو اُن کے ساتھ کوئی زیادتی کریں گے... ذکر

خوب صورت لڑکیوں کا ہو تو زیادتی کا لفظ بہت شریفانہ ہے۔ تم تو سانس بھی اس لیے لے رہے ہو سکندرِ اعظم کہ میں نے تمھیں رعایت دے رکھی ہے اور میں بے سبب قتل کرنے یا کرانے کا عادی نہیں ہوں۔ ایک آدمی صرف ایک آدمی ہوتا ہے جیسے ایک گولی ٹھنڈا کر دیتی ہے۔ کیا میرے پاس کوئی گولی نہیں تھی؟ تم اس وقت اُس چوہے سے زیادہ بے بس ہو جو سینہ تان کے چوہے دان میں گھس گیا ہو۔"

"یہاں مجھے روکنے والا کون ہے۔" میں نے کہا۔" دروازہ میرے سامنے ہے۔"

"لیکن دروازہ بند ہے اور ہر دروازہ آسانی سے نہیں کھولا جا سکتا۔ تم کوشش کر کے دیکھو۔" وہ بولا۔

"جو میری راہ میں آئے گا مارا جائے گا اور میں مرا تو کم سے کم دس کو ساتھ لے کر مروں گا۔" میں نے کہا۔

"اچھا تو پھر باتوں میں وقت کیوں ضائع کر رہے ہو۔" دلاور نے کہا۔" میں باہر موجود ہوں۔ یہ گفتگو تو ریموٹ کنٹرول کے۔۔۔۔ ایف ایم مائکرو فون کے ذریعے ہو رہی ہے۔ میں بھی دیکھنا چاہوں گا کہ تم کیسے نکلتے ہو۔"

خاموشی سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ اب میرے لیے دلاور کے دیے ہوئے چیلنج کو باعزت طور پر قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ میں اس روشنی کے دائرے سے نکل گیا اور محسن کی طرف ہو گیا۔

"سب دروازے باہر سے بند ہیں۔" محسن نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

"دلاور بکواس کرتا ہے کہ اس نے برکت کو اور اس کے شاگردوں کو قتل کروا دیا ہے۔" میں نے اس کے کان میں کہا۔

"مجھے اندازہ ہے۔" محسن بولا۔" رابعہ اور نازو کے متعلق بھی دلاور کی بات پر یقین نہیں کیا جا سکتا۔"

"پھر بھی معلوم تو ہونا چاہیے کہ وہ گئیں کہاں؟" میں نے کہا۔" ابھی تو صرف یہ اندازہ ہوا ہے کہ اندر داخل ہونے کے بعد نازو نے گامے ماچھی کو قابو کر لیا تھا اور غالباً مزاحمت کرنے کی وجہ سے ہی گامے ماچھی کی ہڈی پسلی ٹوٹی۔ بعد میں اس کو بے بس دیکھ کر کسی نے گولی مار دی۔ کیا نازو اور رابعہ کو اپنے ریوالور نکالنے کا موقع ملا ہو گا؟"

"اگر گامے ماچھی کا یہ حشر نازو نے کیا تھا تو یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ اس وقت تک رابعہ اپنا ریوالور نکال کے پوزیشن سنبھال چکی ہو گی۔ ریوالور سے انھوں نے کیا کام لیا، چاہے اپنا دفاع کرتے ہوئے نکل گئیں یا دو چار کو مارنے کے بعد۔۔۔ ماری گئیں یا کچھ کرنے سے پہلے ہی پکڑ لی گئیں؟ یہ ہم یہاں کھڑے کھڑے نہ جان سکتے۔"

"ہاں۔ خدا کی مرضی کے بغیر تو کچھ ہو نہیں سکتا۔" میں نے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔" اور تقدیر کے لکھے کو ہم مٹا نہیں سکتے۔ مقدر میں اتنا ہی ساتھ تھا تو ہمت ہارنے سے کیا ہو گا۔ اگر اُن کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی۔۔۔ ہوئی اور ہم ایک بار یہاں سے نکلنے میں کامیاب رہے تو بدلہ ضرور لیں گے۔"

"دروازہ باہر سے کس نے بند کیا ہے؟" محسن نے۔۔۔

"ہمیں تو کوئی نظر نہیں آیا تھا۔"

"لیکن اب تو شک کی بات نہیں رہی۔ باہر نہ جانے کتنے لوگ موجود ہوں گے یا اتنی دیر میں آ چکے ہوں گے۔"

"کہاں سے آ چکے ہوں گے؟" محسن بولا۔

"سرنگ کے راستے، اگر دلاور باہر موجود تھا تو ممکن ہے وہ بھی ہو۔" میں نے کہا۔" لیکن یہاں جتنے حجرے خالی پڑے تھے ان میں رہنے والے لوٹ آئے ہوں گے۔"

محسن نے اقرار میں سر ہلایا۔" جو لوگ ایک ٹرک گزارنے کے لیے پوری سرنگ بنا سکتے ہیں اور اتنی رازداری کے ساتھ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہر حجرے کے نیچے حجرہ ہو۔ کوئی تہ خانہ ہو اور ہمارے اندر آنے سے پہلے الارم کے سبب انڈر گراؤنڈ ہو گئے ہوں۔"

"اتنا عمدہ اور کارآمد خیال تیری عقل میں کچھ پہلے آ جاتا تو شاید ہم اس صورتِ حال سے دوچار ہونے سے بچ جاتے۔" میں نے کہا۔

"انھوں نے تمام حفاظتی انتظامات کر رکھے تھے۔" محسن بولا۔" ظاہر ہے اس بات کا خیال رکھنا یہ لوگ نہیں بھول سکتے تھے کہ اچانک چھاپا پڑ جانے کی صورت میں وہ خود کہاں جائیں گے اور مال کو کہاں چھپائیں گے۔"

"افسوس، یہ سب ہمیں وقت پر نہیں سوجھا۔" میں نے کہا۔" لیکن جو ہونا تھا اُسے کیا رونا۔ اب یہاں سے نکلیں کیسے؟"

"ہم واقعی چوہوں کی طرح یہاں بند ہو گئے ہیں۔" محسن نے سپاٹ دیواروں کو اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ ہم ابھی تک گفتگو کے معاملے میں بہت محتاط تھے اور باری باری اپنا کان دوسرے کے ہونٹوں کے سامنے رکھ کر اتنی دھیمی آواز میں بول رہے تھے کہ اگر مائکرو فون ہمارے ہاتھ میں ہوتا تب بھی ایک لفظ نشر نہ ہو سکتا تھا۔ چھت کے وسط میں گنبد کی وسیع گولائی تھی جس کے چاروں طرف محرابی در تھے اور ایک دائرے میں بنے ہوئے یہ در۔۔۔ فٹ نیچے سے کھڑکی کے شیشے تھا جس سے باہر کی روشنی تو آتی تھی مگر گرد رُک جاتی تھی۔ جو گنبد باہر سے گہرا نیلا تھا، وہ اندر سے انڈے کی طرح سفید تھا۔ محرابی دریچوں میں سرخ، نیلے، زرد اور سبز رنگ کے شیشے تھے چنانچہ اس وقت گنبد کے زیریں حصے کے ساتھ ساتھ ایک رنگین جھالر سی دکھائی دیتی تھی۔ باہر شام کی روشنی ابھی باقی تھی لیکن کچھ دیر میں اندھیرا ہونے والا تھا۔ ہمارے لیے کسی سہارے کے بغیر دیواروں پر چڑھنا اور شیشہ توڑ کے دریچوں سے باہر نکلنا بالکل ناممکن تھا۔

"ہم نے نیک محمد کو شام تک انتظار کرنے کو کہا تھا۔" میں نے مایوسی سے کہا۔

"وہ رات تک انتظار کرے گا اگر پکڑا نہ گیا۔" محسن بولا۔

"معلوم نہیں دلاور سچ کہتا تھا کہ وہ باہر موجود ہے۔" میں نے کہا۔" یا دھوکا دے رہا تھا اور وہ اوپر چڑھا بیٹھا ہے۔"

محسن نے اوپر دیکھا۔" کیا تو اپنا نشانہ آزمانا نہیں چاہتا؟"

"تیرا مطلب ہے اس روشنی کو گُل کر دوں؟" میں نے ریوالور نکالا۔" اس سے کیا ہو گا؟"

"یہ تو روشنی کو گُل کرنے کے بعد معلوم ہو گا۔" محسن بولا۔" کچھ نہ کرنے سے کچھ کرنا بہتر ہے۔ یہ نہ ہو کوئی اس روشنی کے دائرے کو گھٹا کے ہم پر لے آئے۔ اندھیرا زیادہ موثر پناہ فراہم کرتا ہے۔"

"رائٹ۔" میں نے کہا۔" تو بھی نکال اپنا ریوالور، ایک ساتھ فائر کریں گے۔"

"اس طرح تو معلوم ہی نہیں ہو گا کہ کس کا نشانہ خطا ہوا۔"

"ہم یہاں آپس میں نشانہ بازی کا مقابلہ نہیں کر رہے ہیں۔" میں نے کہا۔" میں چاہتا ہوں کہ ہم صرف ایک کوشش میں کامیاب ہو جائیں۔ گولی کسی کی بھی لگے۔ دوسری کوشش پر انحصار نہیں کرنا چاہیے۔"

محسن نے سر ہلایا اور اپنا ریوالور نکال لیا۔ ہم نے نشانہ لے کر چند سیکنڈ تک انتظار کیا پھر میں نے ون ٹو تھری کہا اور اندر دو فائروں کی آواز گونجی۔ مزار یکلخت تاریک ہو گیا اور گنبد کے گرد بنی ہوئی محرابی دریچوں کی رنگین جھالر پہلے سے زیادہ روشن دکھائی دینے لگی۔ میں نے محسن سے کہا کہ وہ دیوار سے لگ کر ایک دروازے کے قریب کھڑا ہو جائے۔ خود میں دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا دوسرے دروازے سے جا لگا۔

"دلاور۔" میں نے چلّا کر کہا۔" تم نے دیکھا، میں باہر نکل گیا۔ تمھارا یہ بے وقوف نہیں ہوں کہ باہر نکلنے کے راستے بند کر کے کسی حصار میں قدم رکھ دوں۔ میں چوہے دان میں پکڑا جانے والا چوہا نہیں ہوں دلاور۔"

میں نے چند سیکنڈ جواب کا انتظار کیا مگر روشنی کے ساتھ ہی آواز بھی گم ہو گئی تھی۔ شاید اسی روشنی کے ساتھ اسپیکر تھا یا ہم دونوں میں سے کسی ایک کی گولی نے ساؤنڈ سسٹم کو اُڑا دیا تھا۔ تاہم میں نے اس امکان کو مسترد نہیں کیا کہ مائکرو فون بچ گیا ہو اور دلاور ہماری آواز سُن سکتا ہو لیکن جواب نہ دے سکتا ہو۔ مکمل خاموشی میں سانس روکے میں ہمہ تن گوش رہا۔ ایک منٹ گزر گیا پھر میرے کانوں نے دیوار کی دھمک سُنی۔ میں نے دیوار سے کان لگائے۔ ایسا لگتا تھا کہ اسی دیوار کے کسی حصے سے زینہ منسلک ہے جس پر کوئی بہت تیزی سے نیچے اُترتا آ رہا ہے۔ میں تیزی سے آگے بڑھا۔ خود محسن نے میری تقلید کرتے ہوئے دیوار کی آہٹ سُن لی تھی۔ دو دروازوں کے درمیانی فاصلے کو اس نے طے کیا اور باقی دو کو میں نے دیکھا۔ آواز ایک دروازے کے بالکل پیچھے سنائی دی تو میں رک گیا اور میں نے محسن کو ہاتھ سے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ محسن دیوار کے ساتھ ساتھ پھسلتا ہوا آیا۔

ابھی وہ دروازے سے کچھ فاصلے پر تھا کہ دروازہ ایک دم کھل گیا اور بیک وقت دو افراد نے اندر آتے ہی ہمارے چہروں پر ٹارچ سے روشنی ڈالی۔ روشنی اتنی تیز تھی کہ اس کے پیچھے کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا مگر ہم نے اندازے سے وار کیا۔ ان دونوں کی پوزیشن ہم نے دروازہ کھلتے ہی دیکھ لی تھی۔ محسن نے ایک کے سر پر اسٹین گن کا بٹ مارا۔ میں نے اس کی دردناک آواز سُنی، "ہائے میں مر گیا۔" پھر وہ فرش پر گرا۔ دوسرے نے میرا ہاتھ اُٹھتے دیکھ لیا تھا۔ اس نے گولی تو چلائی مگر وہ میری ضرب سے نہ بچ سکا۔ میرے بائیں ہاتھ میں شانے سے ذرا نیچے آگ بھر گئی اور میں سمجھ گیا کہ گولی ضائع ہو گئی ہے۔ یہی گولی چند انچ سینے کی طرف آتی تو میرے دل میں جگہ بناتی اور میرے لیے قبر میں جگہ بناتی۔ بازو میں پیوست ہو کے بھی گولی زیادہ نقصان کا سبب بن سکتی تھی۔ اگر بازو کی ہڈی ٹوٹ جاتی تو میں مہینہ بھر اس ہاتھ کو گلے کا ہار بنا کے پھرتا اور ہڈی کا چُورا ہو جاتا تو شاید بائیں بازو کا نہ رہتا یا میرے جسم کے جینوئن پارٹس میں ہڈی کی جگہ اسٹین لیس اسٹیل کی راڈ شامل ہو جاتی لیکن مجھے یقین تھا کہ ہڈی محفوظ ہے اور جتنی تکلیف ہے وہ گوشت کے پھٹ جانے سے ہے۔ تھوڑی سی سرجری اور ڈریسنگ اور معمولی سے علاج کے بعد زخم کا مندمل ہو جانا یقینی تھا۔

میرا زخم خوردہ ہاتھ اپنا کام بہرحال کر گیا تھا۔ میں اس

شخص کی صورت بھی نہیں دیکھ سکا تھا جو اس ضرب کاری کا شکار ہوا۔ میں اس وقت اپنے دشمن کو رعایت دے کر خطرہ مول لینے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میرا وار مُہلک ثابت ہوا۔ اس شخص کی گردن خاصی آواز کے ساتھ ٹوٹی۔ اس کے حلق سے ایک ہچکی سی نکلی پھر ٹارچ فرش پر گری۔ وہ شخص خود فرش پر گرا تو مر چکا تھا۔ بغیر دیکھے مجھے اس کا یقین آچکا تھا۔

ایک لمحے کے توقف کو بھی غیر ضروری سمجھتے ہوئے میں نے وہ ٹارچ اُٹھالی جو سلامت بچ گئی تھی اور واپس اسی دروازے کی طرف بھاگا جس سے وہ دونوں اندر آئے تھے۔ میرے بازو کے زخم سے خون بہہ کر آستین کو تر کرنے لگا تھا۔

"اسے رہنے دے محسن۔" میں نے چلّا کر کہا کیونکہ محسن اپنے حریف کی جیب میں کچھ تلاش کر رہا تھا اور میرا خیال تھا کہ وہ ریوالور نکالنا چاہتا ہے مگر ٹارچ کی روشنی میں میری نظر نے ایک چمکتی ہوئی لکیر سی دیکھی جو محسن کے ہاتھوں ناک آؤٹ ہو جانے والے کی کمر سے اوپر نکلی ہوئی تھی۔ یہ کسی وائرلیس، ریسیور یا ٹرانسمیٹر کا ایریل تھا جو اس شخص کی کمر سے بندھا ہوا تھا۔ محسن کے ماہر ہاتھوں نے بیلٹ کھولنے میں دیر نہیں لگائی اور وہ ایریل سے منسلک چار انچ چوڑے، اس سے دُگنی لمبائی کے ایک انچ موٹے ریڈیو کو نکال لینے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ دو طرفہ نظام والا پورٹیبل ریڈیو ریسیور بھی تھا اور شارٹ ویو ٹرانسمیٹر بھی۔ عام طور پر اسے واکی ٹاکی بھی کہا جاتا ہے۔ محسن نے اس کے انٹینا کو دبا کے فولڈ کیا اور سیٹ کو اپنی پتلون کی بیلٹ میں اُڑس لیا پھر ہم دونوں ایک ساتھ باہر نکلے تو ہمیں اپنے مقابل سیڑھیاں نظر آئیں۔ سوچے سمجھے بغیر ہم اوپر چڑھنے لگے۔ محسن کے ہاتھ میں اسٹین گن فائر کے لیے بالکل تیار تھی۔ سات آٹھ زینوں کے بعد ایک موڑ آیا۔ ایک طرف کچھ اور سیڑھیاں تھیں لیکن دوسری طرف دروازہ تھا۔

"کیا دلاور اوپر ہوگا؟" محسن نے رک کر کہا اور تشویش سے میرے بازو کے زخم کو دیکھا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔" وہ اتنے قریب آنے کی حماقت نہیں کر سکتا۔ وہ یقیناً باہر سے بات کر رہا تھا۔ اوپر یہی دونوں تھے۔"

"پھر اوپر جانے سے کچھ حاصل نہیں، میرا خیال ہے کہ ہمیں دوسرا دروازہ باہر جانے کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔"

میں نے تائید میں سر ہلا کے دروازے کو دھکیلا۔ دروازہ تھوڑا سا ہلا مگر اس کے پٹ بند رہے۔" یہ اندر سے بند ہے مگر ایسا لگتا ہے کہ صرف اوپر سے چٹخنی چڑھا دی گئی ہے۔" میں نے کہا۔

"صرف چٹخنی ہوگی تو نکل جائے گی۔" محسن نے کہا اور ہم نے ایک ساتھ دروازے کو اپنے شانوں سے ٹکر ماری، خلافِ توقع چٹخنی بہت کمزور ثابت ہوئی۔ پٹ ایک دم وا ہو گئے اور میں اپنے ہی زور میں آگے نکل گیا۔ آگے زینہ تھا جو نیچے جا رہا تھا۔ میں سنبھل نہ سکا اور پہلے زینے سے مُنہ کے بل گیا۔ ٹارچ مجھ سے آگے گئی اور سات آٹھ زینوں سے ٹکراتی نیچے پہنچ کر بجھ گئی۔ آخری وقت میں محسن نے مجھے پکڑنا چاہا تھا لیکن اس کا ہاتھ میرے شانے تک ہی پہنچا۔ بازو کو گرفت میں لینے کی ناکام کوشش کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے ہاتھ نے میرے زخم کو چھوا اور آستین کو پکڑ لیا۔ آستین اگر خون آلود نہ ہوتی تو شاید محسن کی گرفت میں آجاتی اور اگر میرے وزن کو سنبھال پاتی تو پھٹ کر الگ ہو جاتی مگر خون کی چکناہٹ کے باعث محسن کا ہاتھ میرے خون سے بھر گیا تھا۔ آستین اس کی انگلیوں سے پھسل کر نکل گئی۔ اس جھٹکے نے مجھے پوری قوت سے نہ گرنے دیا ورنہ میرا سر چوتھے پانچویں زینے کے سخت دھار والے کونے سے ٹکراتا۔ میں تھوڑا سا ترچھا ہو کے گرا اور لڑھکتا ہوا نیچے پہنچا۔ مجھے پکڑنے کی اس ناکام کوشش نے محسن کا توازن بھی بگاڑ دیا اور وہ بھی اسی طرح میرے پیچھے آیا۔

ہم دونوں ذرا سے فرق سے فرش پر گرے۔ ہر پلٹے کے ساتھ میرے بازو کا زخم میرے ہی جسم کے بوجھ تلے دب جاتا تھا اور سخت کھردرے زینے کی رگڑ سے مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے بیٹّھر کے ہاتھ میرے زخم کو ادھیڑ رہے ہیں۔ چوٹ میرے سر، میری کمر اور جسم کے دوسرے حصوں پر بھی آئی تھی مگر بازو کے زخم کا درد اتنا شدید تھا کہ مجھے کسی اور درد کا احساس بھی نہ ہوا۔ محسن کے ہاتھوں سے بھی اسٹین گن چھوٹ گئی تھی۔ محسن نے عقل مندی یہ کی کہ وائرلیس سیٹ کو سنبھالا اور اس پر دونوں ہاتھ رکھ کے سیٹ کو دبا لیا۔ اسٹین گن ٹوٹنے والی چیز نہیں تھی مگر واکی ٹاکی زینے پر گرتا تو ناکارہ ہو جاتا۔ اسٹین گن بڑی آواز کے ساتھ ہر زینے سے ٹکراتی نیچے تک آئی اور ہر ہماری گھٹنے پر لگی ۔۔ واکی ٹاکی کو محفوظ رکھنے کی کوشش میں محسن خود کو نہ بچا سکا۔ ورنہ وہ دونوں ہاتھ اپنے سر کو بچانے کے لیے استعمال کرتا۔ مشکل سے آدھے منٹ کے بعد وہ میرے اوپر آگرا۔ ایکبار پھر میرا زخمی بازو دب گیا مگر میں نے ضبط سے کام لیا۔ اپنی فکر کرنے کے بجائے ہم دونوں نے ایک دوسرے کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ ہم اب ایک حجرے میں پہنچ چکے تھے۔

"تجھے زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟" ہم دونوں کے لبوں سے ایک ہی جملہ نکلا پھر ہم نے ایک ساتھ نفی میں سر ہلایا اور اس افسوسناک حالت میں ہونے کے باوجود ہنس پڑے۔ خدا نے ہم دونوں کو محفوظ رکھا تھا اور جو چوٹیں آئی تھیں وہ معمولی تھیں۔ "تیرے بازو کے زخم کی حالت خراب ہو رہی ہے۔" محسن نے تشویش سے کہا۔

"زخم خطرناک نہیں ہے اور ہو بھی تو یہاں تیرے اور میرے پاس کیا ہے۔" میں نے کہا اور دیوار کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔

"یہ گولی کا زخم ہے۔ سیپٹک ہو سکتا ہے۔" محسن بولا اور اس نے بھی اسٹین گن اٹھالی۔

"اتنی جلدی نہیں ہوگا۔" میں نے کہا اور ٹارچ کو اٹھا کے جھٹکا۔ وہ پھر روشن ہو گئی تو مجھے خوشی ہوئی۔

محسن نے اسٹین گن کو الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد دیوار سے ٹکا دیا پھر اس نے پیٹ سے بندھے ہوئے واکی ٹاکی کو نکالا اور اس کا ایریل کھینچا۔ اس کے سامنے والے حصے میں صرف دو بٹن تھے۔ ایک آواز کو کم زیادہ کرنے والا اور دوسرا فریکوئنسی ملانے والا۔ آن آف کرنے کا سوئچ سائڈ میں تھا۔ محسن نے اس کی پوزیشن دیکھی پھر اُسے آن کر دیا۔ چھوٹا سا اسپیکر ایک دم سگنل دینے لگا۔ سگنل مورس کوڈ میں تھا۔ محسن نے والیوم کم کیا اور ہم دونوں نے اسپیکر کی ٹیں ٹیں کو دھیان سے سُنا۔ پپ پی ی ی پ... پپ... پپ... پی ی ی پ... ڈاٹ اور ڈیش... نقطے اور لکیریں جو اے سے زیڈ تک انگریزی زبان کے سب حروف تہجی بناتے تھے۔ مورس کوڈ ہم نے لندن میں شوقیہ سیکھا تھا اور اس طرح پیغام رسانی کے بین الاقوامی نظام کی زبان کو سمجھنے لگے تھے۔ ہمیں جوابی پیغام دینا بھی آتا تھا لیکن اس واکی ٹاکی میں ایسی کوئی "کی" نہیں تھی جس کو دبا کے ہم مورس کوڈ میں بات کر سکتے۔ یہ بھی حیرانی کی بات تھی کیونکہ واکی ٹاکی براہِ راست گفتگو میں کام آنے والا آلہ تھا۔ ایک طرح کا چلتا پھرتا ٹیلی فون۔ اس میں مورس کوڈ سگنل نشر کرکے پیغام کی ترسیل کا رازداری کے سوا کوئی مقصد نہیں ہو سکتا تھا۔ عام فہم زبان میں گفتگو کرنے سے یہ خطرہ ہمیشہ لاحق رہتا ہے کہ پیغام کسی اور ریسیور پر سُن لیا جائے گا۔ ایف ایم شارٹ ویو یا اے ایم ٹرانسمیٹر سے نشر ہونے والے ہر پیغام کو عام آدمی اپنے گھر کے ریڈیو پر بھی سن سکتا ہے اور اس کے لیے زیادہ تردد بھی نہیں کرنا پڑتا جیسے کوئی بھی اسٹیشن کیچ کرنے کے لیے بینڈ کا انتخاب کرنے کے بعد سوئی گھمانی پڑتی ہے اور جہاں مطلوبہ اسٹیشن کی آواز سُنائی دے وہیں روک دی جاتی ہے۔ ایسے ہی سوئی گھماتے ہوئے کسی پیغام کا اتفاقیہ ریڈیو پر سنائی دے جانا عین ممکن ہے۔ غالباً اسی لیے یہ لوگ مورس کوڈ میں بات کر رہے تھے جو ریڈیو پر بلاواسطہ بے معنی ٹیں ٹیں لگتی ہے مگر یہ بے معنی ٹیں ٹیں نہیں ہوتی۔ تربیت یافتہ لوگ مسلسل تار گھر میں تار بھیجنے والے اس زبان کو سمجھ سکتے ہیں۔ تاہم عام آدمی اس سے کوئی مفہوم اخذ نہیں کر سکتا۔

"یہ لوگ پوچھ رہے ہیں کہ جواب کیوں نہیں دیتے۔" محسن نے کہا۔

"ہاں مگر یہ کون لوگ ہیں اور کیا جواب چاہتے ہیں؟" میں نے کہا۔ "جب تک یہ معلوم نہ ہو..."

"ہم جواب دے بھی کس طرح سکتے ہیں۔" محسن نے سیٹ کو اوپر نیچے سے دیکھا۔

"کیا وہ لوگ ہماری گفتگو نہیں سُن رہے ہوں گے؟" میں نے کہا۔

محسن نے مجھے دوسری سائڈ پر لگا ہوا "آن آف" جیسا دوسرا سوئچ دکھایا جو اوپر اٹھا ہوا تھا۔ اس کے اوپر "ریسیور" لکھا ہوا صاف پڑھا جاتا تھا۔ ذرا نیچے "ٹرانسمیٹر" کا لفظ چمک رہا تھا۔ اگر یہ سوئچ نیچے ہوتا تو ہماری گفتگو کا ایک ایک نقطہ نشر ہو جاتا۔ محسن نے پلاسٹک کور کی بیک پر لکھے ہوئے باریک حروف کو ٹارچ کی روشنی میں پڑھا۔

"یہ چھ وولٹ کی سی بیٹری پر چلتا ہے۔" محسن نے کہا، "اور اس کی رینج دو سو میٹر ہے۔ ایک فرلانگ سے کچھ زیادہ۔"

"کیا تو نے ان دونوں کی صورت پر غور کیا تھا؟" میں نے کہا۔

محسن نے نفی میں سر ہلایا۔" غور کرنے کی مہلت ہی نہیں ملی، سالوں نے اندھا کر دیا تھا۔"

"جو میرے سامنے آیا تھا وہ تو مارا گیا۔" میں نے کہا۔ "یہ ٹرانسمیٹر دوسرے کے پاس تھا۔ وہ کیسے جواب دیتا ہوگا۔"

اسپیکر پھر بولنے لگا۔ وہ اب پوچھ رہے تھے کہ کیا کوئی فنی خرابی ہو گئی ہے یا خطرے کی بات ہے۔

"ان کو کچھ نہ کچھ تو بتانا ہی چاہیے۔" میں نے کہا "تاکہ وہ مطمئن رہیں اور دور رہیں۔"

"اگر میں نے اپنی زبان میں کچھ کہا تو وہ آواز کے فرق کو محسوس کر لیں گے۔" محسن نے کہا۔

"آواز تو میری بھی مختلف ہوگی۔" میں نے کہا۔ "خیر میں ایک چال چلتا ہوں۔ شاید کامیاب رہے۔"

میں نے محسن کو انگلی سے خاموش ہونے کا اشارہ کیا اور واکی ٹاکی کے سوئچ کو نیچے ٹرانسمیٹر کی پوزیشن پر کر دیا۔ اسپیکر خاموش ہو گیا اور مائکرو فون کام کرنے لگا۔ میں نے پلاسٹک باڈی پر انگلی بجائی۔ ایک ڈاٹ کے لیے ایک بار کھٹ، ڈیش کے لیے باڈی پر رگڑ۔ دو نقطوں کے لیے کھٹ کھٹ، دو ڈیش لگانے کے لیے باڈی کے اوپر ناخن سے دو بار رگڑ۔ اس رگڑ سے ہلکی سی مگر مسلسل آواز پیدا ہوتی تھی۔ باڈی کے اندر کا مائکرو فون اسے یوں نشر کرتا ہوگا کہ سننے والوں کو اپنے

اسپیکر پر چند سیکنڈ کی کھرکھر سنائی دیتی ہوگی۔ اس طرح میں نے لندن میں بہت سے شوقین لوگوں کو پریکٹس کرتے دیکھا تھا۔ وہ کسی بھی چیز سے کام چلا لیتے تھے۔ ایک کیل کو دیوار پر مار کے اور اسی سے لکیر کھینچ کر وہ ڈاٹ اور ڈیش بنا لیتے تھے۔ چمچے کو میز پر بجا کے اور رگڑ کے نقطوں اور لکیروں کا مفہوم پیدا کر لیتے تھے۔ نہ جانے کیسے مجھے خیال آگیا تھا کہ مورس کوڈ کو سمجھنے والا اگر واکی ٹاکی پر جواب دے گا تو اسی طرح دے گا۔ میں سیٹ پر ناخن مارتا رہا اور ناخن سے لکیریں بناتا رہا جو کچھ اس طرح سنائی دیتے تھے۔ ٹک ٹک… کھر… ٹک… کھر کھر… جو پیغام میں نے دیا وہ یہ تھا۔ "سب خیریت ہے… ہم آرہے ہیں۔" پھر میں نے سوئچ کی پوزیشن بدلی اور اسے "ریسیو" پر کر دیا۔

چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد اسپیکر نے چہکنا شروع کیا۔

"کیا تم کامیاب رہے؟ اوور۔"

محسن کا چہرہ کھل اٹھا۔ آواز نکالے بغیر اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ میں نے پھر ریسیور کی پوزیشن بدلی۔

"یس…" میں نے جواب دیا۔ "ہمارا انتظار کریں۔ اوور اینڈ آل۔" اور اس کو بند کر دیا۔

"ہم توقع کر سکتے ہیں کہ کچھ دیر کے لیے خطرہ ٹلا۔" محسن بولا۔ "حالانکہ ہم ابھی خطرے میں گھرے ہوئے ہیں۔"

"ہم خوش بھی ہو سکتے ہیں کہ اس مزار کی قید سے باہر نکلنے میں کامیاب ہوئے۔" میں نے کہا۔ "حالانکہ ہم ابھی اندر ہی ہیں۔"

"لیکن اب اگلا مرحلہ اصل آزمائش ہے… ہم کو یہاں سے نکلنا ہے۔" محسن نے اتفاق کیا۔

"پھر دیکھیں گے کہ یہ سب کیسے ہوا اور کیوں ہوا۔" میں نے کہا۔ "رابعہ اور نازو کی فکر کریں گے۔"

محسن نے حجرے کا دروازہ دوسری طرف سے کھولا۔ ہمارے سامنے وہی صحن آگیا جس میں خستہ و شکستہ ٹرک ہمارے ظلم کی تصویر بنا کھڑا تھا۔ ہم نے زبردستی کر کے بالکل نئے ٹرک کو اسکریپ کر دیا تھا لیکن اس میدان میں کم سے کم دس افراد اسی راستے میں دیوار بنے کھڑے تھے جو باہر کی دنیا تک پہنچنے کا واحد راستہ تھا۔ ہم اسی راستے سے اندر آئے تھے لیکن اس وقت کسی نے ہمیں نہیں روکا تھا۔ اتنے کم وقت میں دس مسلح افراد کی فوج کا نمودار ہو جانا کوئی معجزہ نہیں تھا۔ یقیناً وہ حجروں میں چھپے ہوئے تھے لیکن ہماری نظر ان کو دیکھ نہیں سکی تھی۔ محسن نے دروازہ پھر بند کر دیا۔ مخالف سمت کی دیوار میں ایک اور دروازہ تھا۔ اس سے گزر کر ہم دوسرے حجرے میں پہنچے۔ اس دوسرے حجرے میں بھی دو دروازے تھے۔ ایک صحن میں کھلنے والا اور دوسرا آگے والے حجرے سے ملانے والا۔ آگے بڑھتے جانا بے سود تھا۔ ہر جگہ باہر نکلنے کا وہی ایک راستہ تھا جس کے سامنے دلاور کے جاں نثار اور اس کے زرخرید کارندے موت کے نامہ بر بنے کھڑے تھے۔ میں نے [illegible] قدمی چوتھے حجرے میں روک دی۔ اس کا دروازہ کھولنے سے ہم براہِ راست ان کی نظر میں نہیں آئے تھے۔ درمیان ٹرک آجاتا تھا اور تھوڑا سا ہمت سے کام لیتے ہوئے آدھے صحن کو عبور کر کے ٹرک تک پہنچ سکتے تھے۔ ٹرک [illegible] اوپر سے لکڑی کا وہ لمبا چوڑا تختہ اتار لیا گیا تھا جس پر [illegible] لگائی گئی تھی اور جو زیرِ زمین راستے کو بند کرنا تھا۔

"ابھی کچھ دیر میں اندھیرا ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ یہاں سرچ لائٹ روشن ہو جائیں گی۔" محسن بولا۔ "ابھی یہ لوگ ایک ہی راستے کی دیوار بنے کھڑے ہیں پھر یہ پھیل جائیں گے کہ کہیں ہم دیوار پھاند کر نہ نکل جائیں۔"

"اس قلعے کی فصیل کو بھلا کون آسانی سے عبور کر سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر ہمیں سیڑھی یا رسی فراہم کر دی جائے تب بھی یہ ناممکن ہوگا اور اسی لیے یہ لوگ مطمئن ہیں کہ ہم کسی طرف سے بھی نکل نہیں سکتے۔ سوائے اس ایک راستے کے جو یہ روکے ہوئے ہیں جب تک انھیں نہ ہٹا دیا جائے ہماری نجات مشکل ہے۔"

"مگر یہ ہٹنے والے لوگ نہیں ہیں۔"

"میں ہٹانے کی بات کر رہا تھا۔" میں نے کہا۔ "اگر ہم ٹرک تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائیں تو…"

میری بات نامکمل رہ گئی کیونکہ میں نے ساتھ والے پانچویں حجرے میں سے باتیں کرنے کی آواز سنی۔ دو افراد چپکے چپکے آپس میں کسی مسئلے پر الجھ رہے تھے۔ اختلافِ رائے کے سبب ہمیں اس لیے معلوم نہ ہو سکا کہ گفتگو کے الفاظ ہماری سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ میں نے محسن کو اشارہ کیا اور ہم نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کمرے کی پچھلی دیوار کے ساتھ لگے ہوئے پلنگ کو منتخب کیا۔ میں اور محسن اس کے نیچے گھس گئے۔ اس طرح کہ اُلٹے لیٹنے کے بعد ہم سر اٹھا سکتے تھے اور اپنے ہاتھ آگے کی طرف پھیلا سکتے تھے۔ اپنے بہت قریب مجھے کوئی بھی چیز نظر آئی تو میں نے ٹارچ کو دور پھینک دیا۔ دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور وہ دونوں اندر آگئے۔

"تم نے بھی سنی تھی کوئی آواز؟" ایک نے کہا۔

"اور کیا میں بہرا ہوں۔ [illegible] سمجھ کر بھاگا تھا۔" دوسرا بولا۔

"وہ نٹ جلا کے دیکھو۔"

"کوئی باہر تو نہیں گیا؟" پہلے نے دروازے کی طرف دیکھا۔ ان کے ساتھ ایک ساتھ آگے بڑھے۔ میں نے اور محسن نے اپنے دائیں قدم ایک ساتھ آگے بڑھا کے ان کی ایک ایک ٹانگ کو ٹخنے سے اوپر ہاتھ ڈال کے پکڑا اور جھٹکا دے کر پیچھے کھینچا۔ اس کے ساتھ ہی ہم باہر نکلے۔ وہ منہ کے بل پکے فرش پر گرے۔ اس سے قبل کہ وہ اٹھتے، میں ایک کی پشت پر سوار ہوگیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھنے اور مجھے گرانے کی کوشش میں وقت ضائع کر دیا ورنہ اتنی دیر میں وہ چلا کے باہر سے اپنے ساتھیوں کو مدد کے لیے بلا سکتا تھا۔ میں نے اس کا سر زمین سے ٹکرایا۔ اس کے لمبے بال آسانی سے میرے ہاتھ میں آگئے تھے۔ وہ ایک زوردار "آہ" کر کے بے حس و حرکت ہوگیا۔ پھر میں نے دوسرے کی طرف دیکھا۔ محسن نے اسے بھی بالکل اسی طرح ناک آؤٹ کر دیا تھا۔ ہم نے ان کی جیبوں کی تلاشی لی مگر ہمیں ریوالور کے سوا کچھ نہ ملا۔ فی الحال ہمیں مزید ریوالور درکار نہیں تھے چنانچہ ہم نے چیمبر سے گولیاں نکال کے جیب میں ڈال لیں۔

"کیا ان کے چہرے بھی تجھے شناسا محسوس ہوتے ہیں؟"

محسن نے پھر اسٹین گن اٹھالی۔

"نہیں… یہ سب دوسرے اور تیسرے درجے کے خدمت گزار ہیں جو صرف جاں نثاری کا صلہ لیتے ہیں اور کوئی سوال نہیں کرتے۔" میں نے کہا۔ "بعض اوقات یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ کیا کر رہے ہیں، کس کے لیے کر رہے ہیں اور کیوں کر رہے ہیں؟ اپنی زندگی کی طرح یہ اپنی موت پر بھی دنیاوی آقاؤں کا جبر و اختیار تسلیم کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ آقا بھی عام فانی انسان ہوتے ہیں خدا نہیں ہوتے۔"

محسن نے اس دروازے کو دیکھا جس میں سے وہ دونوں گزر کے آئے تھے۔ بظاہر وہ بھی اسی قسم کا حجرہ تھا جس میں ہم کھڑے تھے لیکن اس میں ایک روشن مستطیل سی نظر آرہی تھی۔ میں نے محسن کو ایک چادر سے لمبی سی پٹی پھاڑتے دیکھا۔ چادر اسی پلنگ پر بچھی ہوئی تھی جس کے نیچے ہم نے پناہ لی تھی۔ چادر بالکل نئی تو نہیں تھی مگر بہت صاف تھی۔ میرے بازو کا زخم زور آزمائی کے سبب پھر رسنے لگا تھا۔ محسن نے آستین کا نصف حصہ پھاڑ کے الگ کیا اور زخم پر پٹی اس طرح لپیٹ دی کہ خون رک جائے۔

"تم نے دیکھا یہ دونوں تہ خانے سے اوپر آئے تھے۔" میں نے کہا۔

"تہ خانے کے سوا اور کہاں سے نکل سکتے ہیں۔" محسن بولا۔ "پہلے ہم انہی حجروں سے گزر چکے ہیں۔ اس وقت سب خالی پڑے تھے۔"

"یہ زیرِ زمین راستہ شاید بیچ کے حجرے میں ہے اور کہیں نہیں ہے۔" میں نے ساتھ والے کمرے کے فرش کی طرف اشارہ کیا۔

وقت گزرتا جا رہا تھا۔ ہمیں فوری طور پر نازو یا رابعہ کے بارے میں تردد کرنے کی فرصت بھی نہیں تھی۔ نیک محمد کا خیال ضرور تھا کہ وہ انتظار کرنے کے بعد مایوس ہو کر نکل گیا تو ہمیں اپنے فرار کے وسائل خود پیدا کرنے ہوں گے اور بعد میں اگر غالب نے کوئی عملی قدم اٹھایا تو یہاں آنے سے انھیں کچھ حاصل نہیں ہوگا لیکن فوری طور پر ہم صرف اپنے بارے میں سوچ رہے تھے۔ اگر ہم اس بار شکاریوں کے نرغے سے نکل گئے تو دوسروں کے لیے بھی کچھ کر سکیں گے ورنہ خدا کے بعد دوسروں کی مدد کے طلب گار ہوں گے۔ زخم کا اثر اب پورے بازو تک پھیلنے لگا تھا اور درد کا احساس میری انگلیوں کی پوروں تک اتر آیا تھا مگر میں اس بازو کو استعمال کرنے پر مجبور تھا۔

پانچویں حجرے سے نیچے اترنے والا راستہ ایک چوکھٹے پر مشتمل تھا۔ بالکل کسی کھڑکی جیسا جو دیوار کے بجائے فرش میں نکالی گئی ہو۔ یہ چوکھٹا بالکل درمیان میں ہوتا تو پہلی بار اس کے اوپر سے گزرتے ہوئے ہمیں اس کی موجودگی کا احساس ضرور ہوتا۔ سیمنٹ کے پختہ فرش پر چلتے چلتے ہمارے قدموں کے نیچے لکڑی کا فرش آجاتا جس کے نیچے خلا تھا تو ہمارے پیروں کی دھمک بالکل جدا اور بالکل واضح ہوتی مگر چوکھٹا ایک گوشے میں تھا اور اسی مقام پر تھا جہاں دوسرے حجروں میں پلنگ لگے ہوئے تھے۔ نہ جانے کیوں اس کمرے میں سے پلنگ ہٹا دیا گیا تھا ورنہ وہی چوکھٹا کسی پلنگ کے نیچے آجاتا تو ہمیں بالکل دکھائی نہ دیتا۔ اس خیال نے مجھے کچھ اور سوچنے پر مجبور کر دیا۔

"محسن! ایسے سوچے سمجھے بغیر نیچے جانا ٹھیک نہیں۔" میں نے کہا۔

"سوچنے سمجھنے کے لیے وقت نہیں ہے۔" محسن بولا۔

"ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ ہمیں تہ خانے میں پہنچانے کا انتظام ہے۔" میں نے کہا۔ "ایک قید سے آدھے تو نکل آئے ہیں۔ یہ نہ ہو کہ بدتر قید میں پوری طرح گرفتار ہو جائیں۔ پہلے زمین کے اوپر تھے۔ اب نیچے چلے جائیں تو کوئی مددگار بھی نہ پہنچ سکے۔"

"تو خواہ مخواہ ڈر رہا ہے۔"

"ڈر تو رہا ہوں مگر خواہ مخواہ نہیں۔" میں نے کہا۔ "تو ذرا

واقعات کو ذہن میں رکھ۔ پہلی بات تو یہ کہ ہمیں یہاں اسیر رکھنے والوں نے آزاد چھوڑنا کیوں ضروری خیال کیا' وہ ہمیں بند رکھنا چاہتے تو رکھ سکتے تھے۔ دوسری بات یہ کہ انھوں نے ہمیں گرفتار کرنے کے لیے ایسے اناڑیوں کو کیوں بھیجا۔ کیا ان کو معلوم نہیں تھا کہ ہم آسانی سے قابو میں آنے والے لوگ نہیں ہیں۔ وہ ذرا بھی مقابلہ نہ کر سکے۔ چوہدری دلاور کی ذہانت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے ہمیں بڑی خوب صورتی سے ٹریپ کیا تھا اور جس طرح ہم سے مخاطب تھا وہ بھی اس کی عقل و فراست کا ثبوت تھا۔ گامے ماچھی کی لاش کو وہیں چھوڑ دینا بھی ایک ڈرامائی تاثر دینے کی کوشش تھی۔ مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ ہم جو کچھ پلان کرتے ہیں اسے پہلے سے معلوم ہو جاتا ہے۔ آخر اس کو کس نے بتایا کہ ہم یہاں آنے والے ہیں؟"

"یہ اسے رابعہ اور نازو میں سے کسی نے بتا دیا ہو گا۔" محسن بولا۔ "میرا قیاس کہتا ہے کہ نازو اپنے مشن میں کامیاب رہی تھی مگر گامے ماچھی کو یرغمالی رکھنا بے سود ثابت ہوا۔ گامے ماچھی کے کسی اپنے آدمی نے جو اوپر والوں کا ایجنٹ تھا، فوراً گامے ماچھی کا کام تمام کر دیا۔ اس سے قبل کہ نازو اسے اپنا اسیر بنا کے اس سے کچھ پوچھتی یا قیدی کو ہمارے حوالے کرتی اس کو قتل کر دیا گیا۔ ممکن ہے اس کے بعد قاتل بھی مارا گیا ہو۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس کارِ خیر کے بعد وہ بھاگ گیا ہو۔" میں نے قائل ہو کے کہا۔ "اور چوہدری دلاور کو خبر پہنچا دی ہو کہ دقیانوسی لبھنے کے تسلسل کا کٹ برقعوں میں کمانڈوز خواتین نے گامے ماچھی کا تختہ اور خود گامے ماچھی کو الٹ دیا تھا مگر اس نے بروقت وہ زبان بھی خاموش کر دی جس سے افشائے راز کا ڈر تھا۔ باقی بندوبست خود چوہدری صاحب نے کر لیا۔ اس نے فوراً تاڑ لیا ہو گا کہ یہ کمانڈوز کون ہو سکتی ہیں اور ان کا آنا کس کے آنے کی تمہید ہے۔ چوہدری دلاور نے جانتے بوجھتے ہمارے مقابلے پر دو پیدل بھیج دیے۔ ان کے ہاتھ میں تو ریوالور تھا مگر وہ عقل سے بھی پیدل تھے۔ وہ مارے گئے تو کوئی بات نہیں۔ ہم کو غلط فہمی تو ہو گی نا کہ ہم مردانہ وار لڑ کے نکل آئے۔ تو خود سوچ' کیا فرار کے دروازے عقیدت مندوں پر بند کیے جا سکتے ہیں لیکن باہر عام لوگوں کے آنے جانے۔۔۔ میں استعمال ہونے والے دروازے پر ضرور کوئی نوٹس ہو گا یا عبارت ہو گی کہ خانقاہ کو مرمت تزئین اور آرائش کے بعد کھولا جائے گا۔ چوہدری دلاور نے مائکروفون کے ذریعے ہم سے مذاکرات کیے۔ کیا ایسے

نظام کو نصب کرنے کے وسائل رکھنے والا یہ نہیں کر سکتا کہ اندر بیہوش کرنے والی گیس چھوڑ دیتا۔ کلورین یا امونیا کی تو سی مقدار کافی تھی مگر اس نے ہمیں نکل جانے دیا اس طرح کہ ہم اسے اپنی کامیابی سمجھیں پھر اس نے ہمیں بھی فراہم کیا۔ وہ ہم سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے لیے درخواست کرنا چوہدری دلاور کی شان کے خلاف اس نے مورس کوڈ میں پیغام دیا اور ہمارے جوابی پیغام وہ بہت خوش ہوا ہو گا کیونکہ ہم نے اس کے اندازے ثابت کر دیا تھا۔ اس نے سوچا ہو گا کہ یہ ولایت پلٹ جو اتنا کچھ جانتے ہیں، مورس کوڈ سے بھی واقف ہوں گے ہم نے جواب دیا تو اس نے مان لیا کہ جواب دینے والے اسی کے آدمی ہیں حالانکہ وہ اچھی طرح سمجھتا ہو گا کہ جواب ہم دے رہے ہیں۔ واکی ٹاکی میں مورس کوڈ کے استعمال کا مطلب ہے۔ براہِ راست گفتگو میں کیا حرج تھا۔"

"مسئلہ رازداری کا بھی ہو سکتا تھا۔"

"اوہو۔۔۔ اتنی سی دیر میں پیغام کے کہیں اور سنے جانے اور اس سے کسی قسم کا نقصان ہونے کے امکانات ہزار میں ایک بھی نہیں تھے۔ دس ہزار میں ایک بھی مشکل تھے۔" میں نے کہا۔ "بس وہ چاہتا تھا کہ اپنی آواز نہ سنائے اور ہم مورس میں جواب دیں۔ وہ ہمیں دھوکا دے رہا ہے کہ وہ ہمارے دھوکے میں آ گیا ہے۔ ہم تو ہر طرف سے محصور ہیں اور زیر زمین ہیں۔ چوہدری دلاور اندر کیوں نہیں آ جاتا؟ اسے ڈر کا ہے؟"

"اچھا تیری بات مان لی جائے تو پھر اب کیا کرنا چاہیے؟" محسن نے کہا۔

"یہ کھڑکی یا زیرِ زمین راستہ بھی عمداً کھلا چھوڑ دیا گیا ہے۔" میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ "ورنہ اس راستے سے باہر جانے والے اسے بند کر کے بھی آ سکتے تھے۔ دوسرے کمرے والی جگہ بیڈ لگا ہوا ہے۔ یہاں سے بیڈ بھی اٹھا دیا گیا ہے اور روشنی بھی ہے۔ یہ ٹریپ ہے یا نہیں؟ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ یہ جو سامنے مسلح فوج کا ایک پورا دستہ کھڑا ہوا ہے یہ پیادے ہیں۔۔۔ حکم کے غلام جن کو مہلک اسلحہ دے کر کھڑا کر دیا گیا ہے۔ ان کو نہیں معلوم کہ وہ سب مارے جائیں گے ہیں اور ان کی موت سے آقاؤں کو صرف اتنا فائدہ ہو گا کہ ڈرامے کا ایک سین بالکل حقیقی نظر آئے گا۔ ہو سکتا ہے بعض نے زندگی میں پہلی مرتبہ ریوالور اٹھایا ہو۔" محسن

"میں نے مان ا

"بولا: اب بتا آگے بڑھنا ہے، نیچے اترنا ہے یا یہیں رکنا ہے؟"

"اگر دلاور چاہتا ہے کہ ہم سب کچھ دیکھ لیں اور پھر خیریت سے ساتھ نکل جائیں تو ایسا ہی ہو گا۔" میں نے کہا۔ "چل نیچے چلتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ دلاور کا مقصد کیا ہے۔ اس بات کو ذہن میں رکھ کہ وہ ایک چھوٹے ڈرامے سے' جسے ریڈیو ڈراما کہنا چاہیے' ہمیں پہلے ہی شرمندہ اور ڈی مورلائز کر چکا ہے۔ اس نے مکینک برکت یا اس کے کسی شاگرد کو قتل کیے بغیر ہمیں یقین دلا دیا تھا کہ ہماری وجہ سے ان کی جان گئی۔ اب وہ کیا ثابت کرنا چاہتا ہے' یہ بھی دیکھ لیتے ہیں۔۔۔ چل نیچے۔"

محسن نے مجھ سے پہلے زینے پر قدم رکھا اور نیچے اترنے لگا۔ روشنی کسی زیرِ زمین کمرے سے آ رہی تھی اور ہمیں راستہ دکھلانے کے لیے کافی تھی۔ پھونک پھونک کر قدم رکھتے اور سر آہٹ پر کان دھرتے ہم تہ خانے میں اترتے گئے یہاں تک کہ میں نے خود کو ایک طویل ہال میں پایا۔ اسے ایک بہت لمبا برآمدہ یا سرنگ نما راہداری بھی سمجھا جا سکتا تھا۔ پندرہ فٹ چوڑا اور تقریباً آٹھ فٹ گہرا یہ پختہ فرش اور دیواروں والا تہ خانہ اوپر کے دس حجروں کی چھت کے نیچے پھیلا ہوا تھا۔ چنانچہ اس کی چوڑائی تو پندرہ فٹ ہی تھی مگر لمبائی ڈیڑھ سو فٹ سے بھی زیادہ تھی۔ درمیان میں کہیں کہیں سیمنٹ کنکریٹ کے کالم چھت کو سہارا دیتے تھے اور ایک ایک ستون چھوڑ کر جو لائٹس نصب کی گئی تھیں وہ بہت تیز تھیں۔ ایک کا رخ میری طرف تھا تو دوسری کا مخالف سمت میں اور یوں درمیان کا پورا علاقہ روشن تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اتنا طویل اور پختہ تہ خانہ بالکل خالی پڑا ہوا تھا۔

میں نے اور محسن نے ادھر ادھر نگاہ رکھتے ہوئے آگے بڑھنا جاری رکھا۔ کسی بھی ستون کی اوٹ سے کسی کے اچانک نکل آنے اور ہم دونوں کے جسم چھلنی کر دینے کے امکانات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ محسن ایک دم جھکا اور اس نے فرش پر سے کوئی چیز اٹھا لی۔ یہ شفاف پلاسٹک کی چھوٹی سی سر بند تھیلی تھی۔ چائے کی پتی کی چار چار آنے والی پڑیوں کے برابر۔ "یہ سفید چینی تو نہیں ہو سکتی۔" محسن نے کہا۔

"اتنے چھوٹے پیکٹ چینی کے نہیں ہو سکتے۔" میں نے کہا اور اس ننھی سی تھیلی کو محسن سے لے لیا جس کا وزن مشکل سے سو گرام ہو گا۔ "چینی آدھا سیر یا سیر کی تھیلی میں ہو سکتی تھی۔ یہ نمک ہے نہ باریک پھٹکری۔"

"پھر یہ کیا ہے' ہیروئن؟"

میں نے تھیلی کا ایک کونا دانت سے کاٹ کر اس سفید چیز کو ہتھیلی پر نکالا اور ایک انگلی کی پور پہ لگا کے چکھا۔۔۔ "ہیروئن۔" میں نے پورے یقین کے ساتھ فیصلہ دیا اور ایک طرف تھوک دیا۔ "میرا خیال غلط نہیں تھا۔"

"یہ خیال میرا تھا کہ یہ ہیروئن ہے۔" محسن نے کہا۔

"میں دلاور کے متعلق رائے دے رہا تھا۔" میں نے کہا اور ہیروئن کے پیکٹ کو جیب میں رکھ لیا۔ آخر تک جانے سے ہمیں مختلف کونوں میں پڑے ہوئے دو پیکٹ اور ملے بلاشبہ ان میں ہیروئن تھی اور جس انداز سے پیکٹ پھیلائے گئے تھے اس سے خیال یہی آتا تھا کہ یہ پیکٹ مال اٹھاتے وقت گر گئے اور کسی کو خبر نہیں ہوئی۔ تہ خانے کے استعمالات اور تہ خانے کی وسعت کو دیکھتے ہوئے یہ فرض کیا جاتا تو غلط نہ ہوتا کہ یہ گودام ہے جہاں بہت زیادہ مال آتا جاتا ہے اور سیکڑوں ہزاروں تھیلوں میں سے کسی جگہ ایک تھیلی کا گر جانا کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ پھر یہ کہ تھیلی سڑک پر تو نہیں گری، گودام میں ہی رہی' اگلی بار اٹھالی جائے گی۔

"مبارک ہو عزیزم کہ بزعم خود اپنی ذات کو احمق الاحمقین ثابت کرنے والے بالآخر چوہدری صاحب کے طفیل ضمانت کی اعلیٰ ترین سند حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔" میں نے کہا۔

"سلیس اردو میں ارشاد ہو کہ آپ کیا بک رہے ہیں؟"

"ہم یہ فرما رہے ہیں کہ اپنی کوشش کامیاب رہی۔" میں نے کہا۔ "ہم چوہدری دلاور کو جس بات کا یقین دلانا چاہتے تھے اس بات کا انھوں نے یقین کر لیا۔ ہم یہ ظاہر کرنے میں مصروف تھے کہ ہمیں اصل کاروبار کی خبر ہی نہیں۔ وہ بیچتے اور بھیجتے ہیں اسلحہ اور گولہ بارود مگر ہم انھیں منشیات فروش سمجھتے ہیں۔ ان کو یقین آ گیا ہے کہ ہم اصلیت کو نہیں جانتے اور ضرورت اس بات کی تھی کہ ہمیں ناقابلِ تردید ثبوت فراہم کر دیا جائے۔ ثبوت ہماری جیب میں پہنچ چکا ہے۔ ہم اب چوہدری دلاور کے خلاف کوئی قدم اٹھائیں گے تو یہی نا کہ اس خانقاہ کو منشیات کا اڈا ثابت کرنے کے لیے یہ تین تھیلیاں پیش کریں گے؟ اس سے کیا ہو گا؟ کیا ان تھیلیوں پر امپورٹر یا ایکسپورٹر کی مہر ہے یا ٹریڈ مارک ہے؟۔۔۔ نہیں تو کچھ نہیں۔ ہم ضعیف الاعتقاد اور جاہل عقیدت مندوں کے جذبات کو مشتعل کریں گے جو مجاور دلاور کی ذات پر ایسے ناپاک الزام کو برداشت نہیں کر سکتے۔ ہم چوہدری دلاور سے واکی ٹاکی پر بات کریں گے۔ اس پر واضح کریں گے کہ ثبوت ہمیں مل چکا ہے اور بہت جلد ہم ثابت بھی کر دیں گے کہ چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کی حقیقت اور اصلیت کیا ہے۔ وہ اپنی کامیابی پر بہت خوش ہو گا اور کہے گا کہ تم نے پہلے

میرا کیا بگاڑ لیا ہے۔ جو کرنا چاہتے ہو شوق سے کرو۔ اپنی دانست میں وہ ہمیں گمراہ سمجھتا ہے۔ خالی گودام میں ہیروئن کے تین پیکٹ پھینک کر اس نے ہمیں صراطِ مستقیم سے زیادہ دور کر دیا ہے۔ اُس نے ہمیں یقین دلا دیا ہے کہ وہ واقعی منشیات کے دھندے میں ملوث ہے اور اس طرح اپنے اصل کاروبار کو تحفظ فراہم کیا ہے۔ ہم بھٹک کر غلط راستے پر چلنے والے احمق ہیں محسن خان صاحب!"

"میں آپ کی حد تک اس رائے سے سو فیصد اتفاق کرتا ہوں۔" محسن کھنکار کر بولا۔ "ماشاءاللہ آپ بچپن سے ہی حماقتوں میں طاق تھے۔"

"اب اس بے وقوف بنانے اور بننے والے ڈرامے کا سب سے مشکل سین آتا ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم دو ناداں گولیاں چلاتے غنیم کی صفوں کو چیرتے ہوئے نکل جائیں گے۔ اپنے اسی ٹرک میں سوار ہو کے جسے ہم نے ٹینک سے زیادہ بدصورت بنا دیا ہے۔"

اوپر شام کا اندھیرا بڑھتے بڑھتے رات کے اندھیرے میں ڈھل چکا تھا اور احاطے کی فصیل کے اوپر تھوڑے تھوڑے فاصلے سے سرچ لائٹس روشن ہو گئی تھیں مگر وہ صفِ دشمناں اپنی جگہ پر موجود تھی۔ وہ عجیب کاٹھ کے اُلو تھے کہ ان کے ہاتھ میں بندوق دے کر انھیں جہاں کھڑا کر دیا گیا تھا، وہاں سے وہ ایک انچ بھی ہلنے پر آمادہ نہ تھے۔ شاید ان کے آقاؤں کا ان کو یہی حکم تھا۔ معلوم نہیں ان کو کیا سمجھایا گیا تھا کہ وہ جان کے خوف سے بے نیاز ایک راستے کو بند کیے کھڑے تھے۔ شاید ان سے کہا گیا ہو کہ اُدھر سے دو بدمعاش گزرنے کی کوشش کریں گے۔ ان سے ڈرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ان کے پاس صرف خنجر ہوں گے۔ میں نے افسوس سے سوچا۔

"اب صورتِ حالات زیادہ موافق ہے۔" محسن نے کہا۔ "ہم سر جھکا کے ایک قطار میں دوڑ لگاتے ہیں۔ قدموں کی آہٹ نہیں ہونی چاہیے۔ ترچھا جانے سے ہم ٹرک کے پچھلے پہیّوں کی آڑ میں رہیں گے۔"

"اگر ضرورت نہ پڑے تو قتلِ عام مت کرنا۔ ریوالور سے کام نکالنے کی کوشش کرنا۔" میں نے کہا۔

پھر ہم دونوں نے اتفاقِ رائے سے پیٹ کے بل رینگتے ہوئے جانا مناسب سمجھا۔ ٹرک ہم سے کوئی پچاس گز دور کھڑا ہوا بہت معلوم لگ رہا تھا۔ آدھا فاصلہ طے کرنے کے بعد میرے لیے زخمی بازو کی کہنی پر جسم کے بوجھ کو آگے گھسیٹنا مشکل ہو گیا۔ میں رک کر لمبے لمبے سانس لینے لگا اور سر کو گھاس پر رکھ کے لیٹ گیا۔ محسن نے میری ہمّت بندھائی اور پانچ منٹ بعد میں نے باقی راستہ طے کرنے کے مشکل سفر کا آغاز کیا۔ ٹرک تک پہنچنے میں مجھے جسمانی کمزوری اور تھکن کے سوا کسی پریشانی کا احساس نہیں ہوا مگر میں یہ سوچ کر پریشان تھا کہ کیا میں اس دیوہیکل ٹرک کو چلا کے نکال لے جانے میں کامیاب ہو سکوں گا۔ اس کے اسٹیئرنگ وہیل کو کنٹرول کرنے کے لیے دونوں ہاتھوں کی قوت درکار تھی جبکہ میرا ایک بازو عملاً ناکارہ ہو رہا تھا۔ ٹرک کے قریب پہنچ کر میں کھڑا ہوا تو مجھے چکر سا آیا۔ میں نے ہینڈل کو تھاما تو دروازہ خود بخود کھل گیا۔

"سکندر! تو چلا سکتا ہے ٹرک کو؟" محسن نے میرا کندھا ہلا کے پوچھا۔ "آگے سرنگ ہے۔"

"میں... میرا خیال ہے کہ مجھ سے حادثہ ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔

"اچھا تو پھر تو پیچھے جا۔" محسن نے اسٹین گن مجھے تھمائی۔ "اسٹین گن چلا لے گا؟"

میں نے اقرار میں سر ہلایا لیکن اسٹین گن پکڑنے سے پہلے میری حالت میں کچھ بہتری کے آثار نمودار ہوئے۔ ٹرک میں سوار ہو کے اسٹین گن چلانا بھی آسان کام نہیں تھا۔ ایک تو ٹرک کے چلنے سے پہلے میں اس پر چڑھتا تو سامنے کھڑی ہوئی فوج مجھے دیکھ لیتی۔ وہ مجھے اتنی مہلت کبھی نہ دیتے۔ یہ کام اسی طرح ہو سکتا تھا کہ جیسے ہی ٹرک گھومے اور سرنگ کی طرف چلنے لگے، میں دوڑ کر اس کے عقبی حصّے میں پائدان پر قدم جما لوں اور پھر چھلانگ مار کے دو فٹ سے زیادہ اونچے تختے پر سامنے کود جاؤں پھر فوراً ہی پلٹ کر پوزیشن سنبھالوں اور جیسے ہی اندھا دھند دوڑتا ہوا ٹرک اس کرائے کی فوج کو روندنے کی نیت سے آگے بڑھے میں فائر کھول دوں۔ یہ بہت پھرتی اور مستعدی کا مشکل کام تھا جو ڈرائیونگ سے زیادہ توجہ اور حاضر دماغی مانگتا تھا۔ میں نے گردن ہلائی اور اوپر چڑھ گیا۔

ڈرائیونگ کیبن کے اندھیرے میں میرے دشمن مجھے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ میں ونڈ اسکرین کے پیچھے سیدھا بیٹھا انھیں گھورتا رہا۔ میرے ہاتھ اسٹیئرنگ پر جمے رہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ میں نے مفروضات کی بنیاد پر غلط نتائج اخذ کر لیے ہوں اور سامنے کھڑے ہوئے دشمن اناڑی نہ ہوں، مجھ سے بڑے شکاری ہوں۔ جن کو میں نے کاٹھ کا اُلو سمجھ لیا تھا وہ سچ مچ خطرناک قسم کے خونی قاتل ہوں جو اپنے ریوالور مجھ پر خالی کر دیں اور کسی ریوالور کی ایک گولی بھی ضائع نہ جائے۔

"کیا سوچ رہا ہے؟" محسن نے میرے قریب سے کہا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے کہا اور اگنیشن سوئچ کی طرف ہاتھ

بڑھایا۔ سیٹ پر بیٹھا ہوا میں بہت اونچا تھا۔ میں نے چابی گھماتے ہی سر کو جھکا لیا۔ انجن غرّایا اور ایک سیکنڈ کا توقف کیے بغیر میں نے کلچ کو چھوڑ دیا۔ ٹرک کسی زخمی درندے کی طرح دہاڑ کر آگے بڑھا۔ سامنے سے آنے والی گولی نے ونڈ اسکرین پر مکڑی کا جالا پھیلا دیا۔ میں نے اسٹیئرنگ وہیل کو اپنے ہاتھوں سے چھلتے محسوس کیا۔ اسے پورا چکر دینے کے لیے ایک ہاتھ کی طاقت ناکافی تھی اور دوسرے ہاتھ کی رگیں کھنچ کر رہ گئی تھیں۔ میرا سر کچھ اور جھک گیا اور میں نے تیز رفتار ٹرک کو لہراتا محسوس کیا۔ ٹرک جسے سیدھا جانا چاہیے تھا، ایک دم دائیں ہاتھ کی طرف مڑ گیا۔ میں نے اُسے سنبھالا تو ٹرک تیزی سے بائیں جانب گیا۔ دوسری گولی ٹرک کی باڈی سے ٹکرائی۔ پھر مسلسل فائر ہوئے۔

"یہ کیا کر رہا ہے تو...؟" محسن چلّایا۔ "کدھر جا رہا ہے؟"

میں نے سر اٹھا کے دیکھا۔ "اچھا اچھا... راستہ تو ادھر رہ گیا۔" میں نے کہا اور ٹرک کو پھر موڑا لیکن اسٹیئرنگ میرے قابو میں نہیں تھا۔ کبھی وہ ضرورت سے زیادہ گھوم جاتا تھا اور کبھی گھومنے سے انکار کر دیتا تھا۔ میں نے اسٹین گن کے فائر کی مسلسل آواز سُنی۔ یہ بڑی خوفناک اور خونی آواز تھی۔ ٹرک کا ایک ٹائر دھماکے سے پھٹا۔ ٹرک لڑکھڑایا۔ میں نے سر اُٹھا کے دیکھا۔ دشمن تتر بتر ہو رہے تھے مگر میدان چھوڑ کر نہیں بھاگے تھے۔ راستہ میرے سامنے تھا لیکن نہ جانے کون بیچ میں اٹک پڑا تھا۔ پلک جھپکتے ہی ٹرک اس شخص کے اوپر سے گزر گیا۔ گولیاں اب بھی چل رہی تھیں مگر میں ٹرک کو نیچے اُتار لے جانے میں کامیاب رہا۔ ٹرک کی ایک ہیڈ لائٹ کام کرتی تھی لیکن میں نے اُسے روشن نہیں کیا تھا۔ مجھے اچانک خیال آ گیا کہ سرنگ میں آگے ایک موڑ بھی ہے۔ میں نے دائیں پیر کا وزن بریک پر ڈالا اور سیدھے ہاتھ سے لائٹ کا سوئچ کھینچا۔ بلیاں ہاتھ اتنی دیر میں اسٹیئرنگ کو چھوڑ چکا تھا۔ جب ایک ہیڈ لائٹ کا اجالا اس اندھیرے کی سرنگ میں پھیلا تو میں نے ایک دم سیدھے ہاتھ سے اسٹیئرنگ کو پکڑ کے اُلٹے ہاتھ کی جانب گھمایا مگر اس عمل میں سیکنڈ کے ہزارویں حصّے کی دیر ہو گئی۔ ٹرک کی باڈی نے سرنگ کی دیوار کو رگڑ دیا۔ ٹرک اُلٹتے اُلٹتے بچا۔ اس کی وہ سائڈ جو دیوار کی جانب تھی ٹوٹ کر گری اور اگلا مڈگارڈ ٹائر کے ساتھ ٹکرانے لگا۔ پھر کسی نے پیچھے سے گولی چلائی اور ٹرک کا دوسرا پچھلا ٹائر پھٹا۔ سرنگ میں اس کی آواز کسی بم کے دھماکے کی طرح سنائی دی۔ اگر پیچھے دونوں طرف دو دو ٹائر نہ ہوتے تو ٹرک پیچھے سے بیٹھ جاتا اور ایک قدم آگے نہ جاتا۔

میں نے سر اٹھا کے سامنے دیکھا۔ موڑ ایک دم آ گیا اور میرے بچانے کی جدوجہد کے باوجود اس مرتبہ ٹرک کی دوسری سائڈ نے دیوار سے رگڑ کھائی۔ لکڑی کی باڈی بکھر گئی اور میں نے دوسری بار ٹرک کو الٹنے سے بچایا۔ میرا تمام جسم سردی کے باوجود پسینے میں تر تھا اور میری جسمانی توانائی بڑی تیزی سے زائل ہو رہی تھی۔ تعاقب کرنے والے شاید پیچھے دوڑتے چلے آ رہے تھے۔ محسن نے پے در پے ریوالور سے فائر کیے۔ ہر فائر کی آواز اس سرنگ میں گونجتی رہی پھر ساری جدوجہد ختم ہو گئی۔ کسی گولی نے پیچھے والا دوسرا ٹائر بھی پھاڑ دیا۔ ٹرک ایک دم گھوما اور بریک لگاتے لگاتے بھی دیوار سے ٹکرا گیا۔ تصادم کی قوت نے ٹرک کو تھوڑا سا گھمایا اور میں باہر جا گرا۔ میں نے محسن کو چیسس کے نیچے سے رینگ کر آتے دیکھا۔ ٹرک ترچھا ہو کے سرنگ میں اس طرح پھنس گیا تھا کہ نہ اُسے آگے کھسکایا جا سکتا تھا نہ پیچھے ہٹایا جا سکتا تھا۔ اس کی موجودہ ظاہری حالت کو دیکھتے ہوئے یہ تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ یہ کچھ دیر پہلے ایک بالکل نیا ٹرک تھا۔

محسن نے ایک جھٹکے سے میرا ہاتھ کھینچ کر مجھے کھڑا کیا اور اپنے ساتھ گھسیٹنے لگا۔ میں اس کے ساتھ یوں چلتا رہا جیسے انجن کے ساتھ بوگی چلتی ہے۔ یہ محسن کا سہارا تھا، میری قوتِ ارادی تھی یا زندہ رہنے کی خواہش جس نے مجھے گرنے نہ دیا۔ میرے سامنے اب وہ پھاٹک تھا جسے کاٹ کر اور گرا کر ہم اندر گئے تھے۔ اس کا آہنی وجود فرشِ خاک پر سرنگوں پڑا تھا۔

"ذرا سنبھل کے۔" محسن نے مجھے جھنجوڑا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کے دیکھا اور اگلا قدم اٹھایا مگر اندازہ غلط ہو گیا۔ میں لوہے کے پھاٹک پر مُنہ کے بل گرا۔ اندھیرے میں کئی گولیاں میرے سر پر سے سنسناتی گزر گئیں۔ وہ بہرحال کاٹھ کے اُلو اور اناڑی نہیں تھے۔ وہ ابھی تک مقابلہ کر رہے تھے اور پیچھے آ رہے تھے۔ محسن نے گھوم کر دو فائر کیے اور خالی ہو جانے والا پستول پھینک دیا پھر اُس نے مجھے اٹھایا۔ میرے ٹخنوں اور گھٹنوں پر چوٹ آئی تھی۔ محسن نے مجھے سہارا دیا اور میری کلائی تھام لی۔ "بس چند قدم۔" محسن نے کہا۔ "ہم باہر نکل آئے ہیں۔ تجھے تو بخار ہو گیا ہے۔"

"بخار... نہیں... وہ تو بس ایسے ہی۔" میں نے کہا۔

اسی وقت میں نے نیک محمد کی آواز سُنی۔ تازہ ہوا میں میری طبیعت کچھ بحال ہوئی۔ ہمارے تعاقب میں آنے والے شاید

مایوس ہو کے یا ڈر کے واپس چلے گئے تھے۔
"تم نیک محمد!" محسن نے اندھیرے سے نکل کر سامنے آنے والے سائے سے کہا۔ "تم یہاں کہاں؟"
"ہم نے تو تمہیں خانقاہ کے دروازے پر انتظار کرنے کو کہا تھا" میں نے کہا۔
"ابھی تک تو میں وہیں تھا۔" نیک محمد نے میرا ہاتھ تھامنے کی کوشش کی اور سہارا دینے کے لیے وہی بازو پکڑ لیا جو زخم خوردہ تھا۔
"اسے چھوڑ دو۔" میں نے کراہ کے کہا۔ "گولی کا زخم ہے۔"
"گولی... کوئی خطرے کی بات تو نہیں ہے سکندر بادشاہ؟" وہ گھبرا کے بولا۔ گیراج کے احاطے میں بالکل خاموشی اور تاریکی کا راج تھا۔
"نہیں... معمولی سا زخم ہے۔ ہڈی بچ گئی ہے۔" میں نے کہا۔ "تم یہ بتاؤ کہ اگر ابھی تک تم وہیں انتظار کر رہے تھے تو کیا تم نے فائرنگ کی آواز نہیں سنی تھی۔" ہم احاطے سے نکل کر نیک محمد کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔
نیک محمد نے سر ہلایا۔ "بالکل نہیں، سنی ہوتی تو میں وہاں مجمع اکٹھا نہ کر لیتا۔"
"آج وہاں لوگ کیوں نہیں آرہے تھے؟" محسن بولا۔
"میں نے ایک شخص سے پوچھا تھا۔" نیک محمد بولا۔ "وہ دروازے تک جا کے لوٹا تھا۔ اس نے بتایا کہ گامے شاہ صاحب کا چلہ ہے چالیس دن کا۔ وہاں دروازے کے باہر کوئی مجاور بیٹھا تھا۔ وہی آنے والوں کو واپس جانے کا کہہ رہا تھا۔"
"ان کا تو اب چالیس دن بعد جہلم بھی شاید ہی ہو۔" میں نے کہا۔ "وہ مارا جا چکا ہے۔"
"تم نے ہدایات کی خلاف ورزی کیوں کی؟ اگر ہم ادھر سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے تو تم نہ ملتے۔ پھر ہم فرار کیسے ہوتے؟"
"تم لوگ ادھر سے نہیں نکل سکتے تھے۔" نیک محمد نے کہا۔ "میں نے دیکھا تھا، دروازے کے باہر اتنا بڑا تالا پڑا ہوا تھا۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے تالے کا سائز بتایا جو خاصا مبالغہ آمیز تھا۔ تربوز کے سائز کا تالا بھلا کہاں ہوتا ہے۔ "اس کے علاوہ وہاں کچھ اور بھی آدمی تھے ان کے سکندر بادشاہ... وہ وہیں آس پاس پھر رہے تھے اور باہر بیٹھے ہوئے مجاور سے بھی بات کر لیتے تھے۔ میں وہاں بلاوجہ ٹھہرتا تو وہ مجھے بھگا دیتے۔ میں نے ظاہر یہ کیا کہ گاڑی خراب ہو گئی ہے اور بونٹ کھولے کھڑا رہا۔ ان میں سے ایک نے قریب آ کے کہا بھی تھا کہ یہ ٹیکسی اسٹینڈ نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ اسٹیئرنگ کا بال بیرنگ ٹوٹ گیا ہے اور میں مکینک کا انتظار کر رہا ہوں۔ وہ بیرنگ لینے کے لیے شہر گیا ہے۔"
"لیکن ہم نے کہا تھا کہ مغرب کے بعد گھر چلے جانا اور ... غالب کو بتانا۔"
"ہاں ہاں... وہ ٹھیک ہے سکندر بادشاہ! ... پہلے میری بات تو پوری سن لو۔"
"یہاں کھڑے ہو کر بات کرنے میں کون سی عقل مندی ... یہاں سے تو نکلو۔" محسن نے کہا اور نیک محمد نے ٹیکسی چلا ...
"وہاں میں فالتو نہیں کھڑا رہا۔" نیک محمد نے کچھ دیر ...
"ایک ہوٹل ہے سڑک کے کنارے، وہاں چائے پینے ... بہت دیر بیٹھا رہا۔ ہوٹل کا مالک پہلے سے دیکھ رہا تھا کہ ... میری ہے۔ وہ باتیں کرنے لگا اور باتوں باتوں میں اس نے ... گامے شاہ بڑے جلال میں تھے۔ اُن کا مقابلہ جنوں کی فوج ... ایک بہت بڑے جرنیل سے پڑ گیا۔ میں نے کہا کہ کیا جنات ... بھی کرنل جنرل ہوتے ہیں۔ وہ بولا کہ جنات کی ایک سلطنت ... ہے۔ شاہِ جنات اس کا نظام بغیر فوج کے کیسے چلا سکتے ہیں ... جہاں بادشاہ ہوتا ہے وہاں وزیر بھی ہوتے ہیں اور ... کے عہدیدار بھی۔ خیر میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ دو ... آئی تھیں کسی دور دراز کے گاؤں سے۔ اُن میں سے ایک ... آتا تھا اور سارے عامل اس سے ہار چکے تھے۔ سب کا ... جاتا تھا اور خود جن اتارنے کی کوشش کرنے والے کی ... لالے پڑ جاتے تھے۔ خون کی اُلٹیاں شروع ہو جاتی تھیں ... وہ ذبح کیے ہوئے کبوتر کی طرح پھڑکتا تھا۔ رسّی سے ... کے رکھنا مشکل ہو جاتا تھا اور کیوں نہ ہوتا! وہ کوئی معمولی ... تھا، جرنیل جن تھا۔ گامے شاہ صاحب سے بھی اس نے ... بچھاڑ شروع کی۔ سنا ہے بڑی اٹھا پٹخ ہوئی اندر۔ پھر ... کو نکال دیا گیا اور شاہ جی کے ساتھ اس جرنیل جن کے ... دو ہاتھ ہوئے۔"
"وہ عورتیں کون تھیں؟"
"اپنی رابعہ اور نازو۔" نیک محمد نے یوں کہا جیسے ... سوال نے اُسے مایوس کیا ہے کیونکہ وہ مجھے اتنا کند ذہن ... سمجھتا تھا۔ "میں نے اس ہوٹل والے سے حلیہ بھی پوچھا ... اور حلیہ انہی کا تھا۔"
"اچھا تو جن جرنیل اور گامے شاہ کے ڈوئل کا انجام ... ہوا؟" محسن بولا۔
"ہوٹل والے کے بیان کے مطابق ان عورتوں کو ... دیا گیا تھا۔" نیک محمد بولا۔ "مگر اس کے بعد ہی گامے شاہ نے بھی صاف کہہ دیا کہ یا وہ جرنیل جن نہیں یا ہم نہیں۔ چالیس دن کا بڑا سخت عمل ہے۔ وہ پہلے بلند شروع ہوا۔ گامے شاہ نے بھی صاف کہہ دیا کہ یا وہ جرنیل ...

گامے شاہ نے بھی صاف کہہ دیا کہ یا وہ جرنیل پلٹ شروع ہوا۔ گامے شاہ نے بھی صاف کہہ دیا کہ یا وہ جرنیل جن نہیں یا ہم نہیں۔ چالیس دن کا بڑا سخت عمل ہے۔ وہ پہلے کی طرح اسے الٹنے کی کوشش کرے گا۔ اب دیکھو کس کا پلّہ بھاری رہتا ہے۔ گامے شاہ کے مرید تو سخت پریشان ہیں، کیونکہ ایسا زبردست مقابلہ پہلے کبھی نہیں ہوا۔ انھیں ڈر ہے کہ گامے شاہ کے عمل میں شیطان رخنہ ڈالنے نہ آجائے۔ جرنیل جن کے ہاتھوں گامے شاہ کی جان بھی جا سکتی ہے۔"
"بہت خبیث اور چالاک لوگ ہیں۔" میں نے کہا۔ "کیا کہانی گھڑی ہے۔"
"اور گامے شاہ کی موت کو باعزت بنانے کے لیے کیسے موافق حالات پیدا کر دیے ہیں۔" محسن بولا۔ "سب کہیں گے، ایک جبنی عورت کی خاطر جان کی بازی لگا دی۔ خلقِ خدا کو ارواحِ خبیثہ سے محفوظ رکھنے کے لیے جہاد کرتے ہوئے شہید ہوئے۔"
"اس کو بھی یہیں گاڑ دیں گے اور لوحِ مزار پر اس لعنتی آدمی کے سیاہ کارنامے لکھنے کے بجائے القاب و آداب اور استغا لکھ کے آئندہ سال سے اس کا عرسِ مبارک شروع کر دیں گے۔ داستانیں پھیلا دیں گے کہ جرنیل جن کے ساتھ مقابلے میں ان کی شہادت کا کیا درجہ ہے اور بے چارے سادہ لوح دیہاتی، کمزور عقیدے والے اور پریشان حال لوگ آنے لگیں گے ڈھول ڈھمکا لے کر چادریں چڑھانے۔" میں نے کہا۔
"یار بھاڑ میں گیا جن جرنیل اور جہنم میں گیا گامے شاہ۔ وہ خواتین کہاں گئیں؟" محسن بولا۔
"ان کی بھی عجیب کہانی ہے۔" نیک محمد نے ٹیکسی کو سڑک پر روک لیا۔ "اسی کی وجہ سے میں ادھر آگیا۔ میں نے سوچا تھا کہ اس راستے سے اندر چلا جاؤں اور تمہیں دیکھوں۔"
"ہم کیا سامنے کھڑے تھے کہ نظر آجاتے؟" محسن بولا۔ "تم اکیلے گھس رہے تھے دشمنوں کے قلعے میں؟"
"یہی بات ہے سکندر بادشاہ! ڈر تو بہت لگ رہا تھا مگر میں نے سوچا جہاں تک چھپ کے جا سکا، جاؤں گا۔ واپس لوٹ کر جانے پر طبیعت راضی نہیں ہوتی تھی۔ پھر جب اس ہوٹل والے کی بات سنی تو اور کچھ سوجھا ہی نہیں۔ اُس نے بتایا کہ وہ عورتیں گرتی پڑتی باہر نکلی تھیں۔ باہر ان کے گھر والے موجود تھے۔"
"گھر والے!" میں نے اور محسن نے ایک ساتھ چونک کر کہا۔
"کون گھر والے؟ ایک تو ہوتے ہیں بھائی، بہن، ماں، باپ وغیرہ۔" محسن بولا۔
"دوسرا مطلب عام فہم زبان میں خداوندِ مجازی سے ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ "کم سے کم ایک کا گھر والا وہاں موجود نہیں تھا۔ میں قسم کھا سکتا ہوں۔"
"مگر باہر دو آدمی ان کے گھر والے... میرا مطلب ہے، ان کے وہ... شوہر بنے کھڑے تھے۔" نیک محمد نے خداوندِ مجازی جیسے مشکل لفظ سے گریز کرتے ہوئے کہا۔ "انھوں نے بڑا ہنگامہ کیا۔ عورتوں نے بھی اور مردوں نے بھی۔ مرد زبردستی کر رہے تھے اور ان کا ہاتھ پکڑ کے اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ عورتیں... میرا مطلب ہے رابعہ اور نازو بھلا ایسے مان سکتی تھیں! انھوں نے چیخنا چلانا شروع کیا کہ وہ ان کی صورت سے بھی واقف نہیں مگر مردوں نے اپنی بات منوا لی۔ لوگوں سے کہا کہ دونوں پر جنات کا اثر ہے اسی لیے گامے شاہ کے پاس لائے تھے کہ وہ کسی طرح یہ جن اتار دے۔ دورے کی حالت میں یہ اسی طرح کی باتیں کرتی ہیں اور گھر کے ہر فرد کو پہچاننے سے انکار کر دیتی ہیں۔ نہ جانے کس کس کے نام لیتی ہیں جو سب جن ہی ہو سکتے ہیں۔"
"پھر کیا ہوا؟ کیا وہ انھیں لے گئے؟" میں نے چلا کے کہا۔
"ہاں سکندر بادشاہ! وہاں ان کی کون مدد کرتا جہاں سارے ایسے ہی الو کے پٹھے موجود ہوں۔" نیک محمد نے کہا۔ "سب کی ایسی ہی کہانیاں ہیں۔ کچھ سنی ہوئی اور کچھ اپنے ناکارہ دماغ کی پیداوار۔"
"نازو نے کچھ نہیں کیا؟ اُس کے ساتھ زبردستی کرنا آسان تو نہیں تھا۔" میں نے ڈوبتے دل کے ساتھ کہا۔
"ہوٹل والے نے ہی بتایا تھا کہ ایک لڑکی پر بڑا شہ زور جن سوار تھا۔" نیک محمد بولا۔ "اس نے پہلے تو اپنے گھر والے کو کئی بار دھوبی پٹخا دیا اور پھر کئی حمایتی مٹا دیے۔ اس کے گھر والے کی تو حالت خراب تھی مگر پھر اتنے سارے لوگ چمٹ گئے کہ ہر طرف سے نازو بے بس ہو گئی۔ کسی نے ان کی ایک نہیں سنی اور انہیں باندھ کر گاڑی میں ڈال دیا۔"
"او مائی گاڈ... ان جاہلوں نے تو گاڑی کا نمبر تک نہیں دیکھا ہوگا۔" میں نے سر پکڑ کے کہا۔
"وہ ہوٹل والا کچھ سیانا ہے سکندر بادشاہ! میرا خیال ہے، وہ سامنے بیٹھا رہتا ہے اس لیے گامے شاہ کے مریدوں کی کارستانی دیکھتا رہتا ہے اور سمجھتا ہے کہ گامے شاہ کی پیری مریدی کا فراڈ کس طرح چلتا ہے مگر اس کے حق میں خاموش رہنا ہی بہتر ہے کیونکہ اس کا تو کاروبار ہی گامے شاہ کے عقیدت مندوں کی

بدولت چلتا ہے۔ اگر وہ خود کو گامے شاہ کا سچا عقیدت مند نہ ظاہر کرے تو مجاور لوگ اس کا ریسٹورنٹ دوسرے دن اٹھوا دیں۔ یہی سوال میں نے اس سے کیا تھا کہ گاڑی کا نمبر بھی دیکھا تھا کسی نے؟ وہ چونکا اور مجھے گھورتا ہوا پھر کہنے لگا کہ میں نے دیکھا تھا مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟ میں نے کہا کہ یہ بھی ہو سکتا ہے وہ بدمعاش ان عورتوں کے گھر والے نہ ہوں اور لوگوں کی مدد سے انھیں اغوا کرنے میں کامیاب ہو گئے ہوں۔ خدانخواستہ ایسی بات ہوئی تو پولیس تک جائے گی مگر پولیس کو کم سے کم گاڑی کا نمبر تو معلوم ہونا چاہیے۔ اس کے بغیر تو وہ کارروائی کا آغاز ہی نہیں کریں گے۔ پولیس کو حرامخوری کے لیے بہانہ چاہیے۔ ہوٹل والے نے کہا کہ تم بندے سیانے ہو اس لیے تمھیں بتا دیتا ہوں۔ نمبر اس نے پنسل سے دیوار پر لکھ لیا تھا۔" نیک محمد نے اپنی ہتھیلی سامنے کی جس پر وہ بال پوائنٹ سے نمبر اتار لایا تھا۔

"نمبر کے علاوہ بھی کچھ دیکھا تھا اس نے؟" محسن بولا۔

"نمبر غلط بھی ہو سکتا ہے۔"

"ہاں۔ لال رنگ کی شیورلٹ گاڑی تھی، وہ پرانا امپالا ماڈل جس کا پچھلا حصہ جہاز کے پروں کی طرح اٹھا ہوا اور پھیلا ہوا لگتا ہے۔" نیک محمد بولا۔ "ہوتی بھی وہ گاڑی جہاز کے برابر ہی ہے۔ اس کے پیچھے کی ایک لائٹ ٹوٹی ہوئی تھی اور پیچھے والا بمپر بھی غائب تھا۔"

"ویری گڈ۔ اس شخص سے ملنا کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔" محسن بولا۔

ہوٹل میں رات کے وقت بہت کم لوگ تھے۔ رش نہ ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ مردوں نے خانقاہ پر آنے والوں کو شاہ جی کے چلّے کی خبر سنا کے لوٹا دیا تھا پھر بھی ایک دو میزوں پر کچھ لوگ کھانا کھا رہے تھے اور چائے پی رہے تھے۔ سامنے کے 'ریسٹورنٹ' والے حصّے کو آڑی ترچھی لٹکی ہوئی ٹیوب لائٹوں نے روشن کر رکھا تھا۔ پچھلے حصّے کی جانب کھلے صحن میں کم سے کم سو چارپائیاں لگی ہوئی تھیں اور کاؤنٹر کے قریب لگی ہوئی تختی پر 'منجی بسترا پانچ روپیہ' لکھا ہوا تھا۔ لاہور کے ریلوے اسٹیشن کے مقابل بنے ہوئے سرائے نما ہوٹلوں میں رات بھر کے لیے منجی بسترا ایک روپے میں ملتا ہے مگر یہاں اس کے بھی بلیک کے ریٹ چل رہے تھے کیونکہ دُور سے آنے والوں کے لیے قیام و طعام کا دوسرا ٹھکانہ کوئی نہیں تھا۔ ہمارے ایک میز پر بیٹھتے ہی پروپرائٹر بقلم خود آیا۔ اُس نے نیک محمد کو پہچان لیا تھا۔ نیک محمد نے اس سے پرانے دوستوں کی طرح ہاتھ ملایا۔

"ہم کھانا کھائیں گے۔" میں نے کہا۔ "جو بھی ملے گا کھا لیں گے۔"

"اور اس کے بعد تم سے کچھ بات کریں گے۔" محسن بولا۔ "تم ہمارے دوست کو جانتے ہو؟"

"ہاں۔ یہ بہت چالاک آدمی ہے۔" وہ بولا۔ "اس کی نیت میں خرابی کوئی نہیں تھی۔ یہ ایسے ہی یہاں کھڑا تھا۔"

"ارے نہیں استاد...۔" نیک محمد نے اپنی صفائی پیش کرنی چاہی۔

"نہیں کیا... نہ کوئی مکینک آیا نہ تم نے کچھ کیا۔" وہ بولا۔ "گاڑی لے کر چل پڑے۔"

"تم ہر چیز کو بہت غور سے دیکھنے کے عادی ہو۔" میں نے کہا۔ "اور تمھاری نظر سب پر رہتی ہے۔ یہ بڑی اچھی بات ہے۔"

"ہم اسی لیے یہاں آئے ہیں کہ ہمارے اس دوست نے وہ سب بتا دیا تھا جو تم نے اُسے بتایا تھا۔" محسن بولا۔

"اس کے علاوہ تو کوئی بات ہے نہیں جو میں بتاؤں۔" وہ بولا۔ "اور کیوں بتاؤں؟ میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ تم لوگ کون ہو؟"

"تم یقین کرو یا نہ کرو۔" میں نے افسردہ لہجے میں مغموم صورت بنا کے کہا۔ "ان میں ایک اس کی بہن تھی اور دوسری میری بیوی۔"

"یہ سالا ہے تمھارا۔" وہ محسن کو غور سے دیکھ کر بولا۔ "لگتا تو نہیں۔"

"کیوں؟ سالوں کے ماتھے پر لکھا ہوتا ہے کہ وہ سالے ہیں۔" محسن نے بُرا مان کے کہا۔ "وہ بہن تھی میری۔"

"تم لوگ پولیس کے پاس کیوں نہیں گئے؟" اُس نے ایک جائز اور منطقی سوال کیا۔

"اگر خود کچھ نہ کر سکے تو جائیں گے۔" میں نے ایک سرد آہ بھری۔ "معاملہ عزت کا ہو تو پولیس کے پاس نہ جانا ہی اچھا ہے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔ غیرت مند آدمی مار دیتا ہے یا مر جاتا ہے۔" ہوٹل کے مالک نے میرے نکتۂ نظر سے اتفاق کرتے ہوئے فرمایا۔

"بس تو پھر ہماری کچھ مدد کر دو۔" میں نے لجاجت سے کہا۔ "اللہ تمھیں اجر دے گا۔"

"اللہ تو اجر آخرت میں دے گا۔" وہ سوچ کر بولا۔ "اُس کے بندے دنیا میں میرا کڑھائی گوشت نہ بنا دیں۔"

"تم جن بندوں کی بات کر رہے ہو، انھیں کچھ معلوم نہیں ہوگا۔" محسن بولا۔ "ہم تمھاری پوزیشن کو سمجھتے ہیں۔"

"اچھا جی۔ جو سوہنے رب نوں منظور۔" وہ چوتھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ "اپنے بھی بیوی بچے ہیں۔ ان کا خیال کرنا۔"

"تم نے گاڑی کے متعلق سب کچھ بتا دیا۔" میں نے کہا۔ "ان دونوں کا حلیہ بھی بتا دو۔ تم نے یقیناً انھیں بھی غور سے دیکھا ہوگا۔"

"ایک تو تھا جی قد اُگٹھا۔ پانچ فٹ سمجھ لو۔" وہ بولا۔ "جان تھی اس کی بھی۔ مُنہ اس کا تھا کچھ رنگیلے ورگا۔ آپ واہ واہ فلماں تو دیکھتے ہو گے۔ اس نے لال اچار غلتے کا ریشمی لاچا باندھا ہوا تھا اور اوپر دھوڑا بوسکی کا کرتا پہنا ہوا تھا۔ دوسرا اچھا لمبا جوان تھا۔ یہی آپ کے قد کا۔ وہ ذرا رنگ کا بھی صاف تھا۔ اس نے پہنی ہوئی تھی آسمانی رنگ کی قمیص اور سفید لٹھے کی شلوار۔ وہ جو گٹھا تھا وہ بات کرتا تھا تو تھوڑا ہکلاتا تھا۔ اور دوسرا... اس کی آواز کڑیاں ورگی تھی۔ زنانہ آواز تھی مگر ایسی جیسے اُس نے اچار کھا کے اوپر سے یخ ٹھنڈا پانی پی لیا ہو۔"

"وہ ایک دوسرے کو کس نام سے پکار رہے تھے؟" میں نے دل ہی دل میں اس شخص کی قوتِ مشاہدہ کا اعتراف کیا۔

"ایک تو تھا نکو۔" وہ سوچ کر بولا۔ "وہی گٹھا جس کا قد پانچ فٹ تھا۔ دوسرا تھا کولمبو۔"

"کیا؟" میں نے کہا۔ "یہ نام تو نہ ہوئے عرفیت ہو گی۔"

"چلو جی کچھ بھی ہو، جو ہم نے سُنا بتا دیا۔ اب پورا نام تو راشن کارڈ والے جانیں۔" وہ اُٹھنے لگا۔

"یار تم تو بلاوجہ خفا ہو گئے۔" محسن نے اُسے فوراً ہاتھ پکڑ کے بٹھا لیا۔ "کچھ بتا سکتے ہو وہ کون تھے؟ پہلے کبھی ان کو یہاں دیکھا تو ہوگا تم نے...؟"

"ایک کو دیکھا تھا... کولمبو کو۔" وہ بولا۔ "وہ ایک موٹی سی کالی مجھ ورگی عورت کے ساتھ آتا تھا۔ وہ ماں تھی اس کی۔ گامے شاہ سے تعویذ لینے آتی تھی۔ ایک بار ادھر روٹی کھائی تھی اس نے تو کسی سے کہہ رہی تھی کہ 'منڈا ویاہ لئی ہاں نئیں کردا۔' اس کی کوئی مانگ تھی۔ منگیتر بولتے ہیں نا جی اسے۔ وہ غریب بیٹھی تھی کئی سال سے ماں پیو کے گھر۔" اُس نے ایک شریر سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"ہم سمجھ گئے۔ مگر یار اس کی ماں نے بھی بیٹے کا اصل نام نہیں لیا تھا۔" میں نے کہا۔

"لوکر لوگل... وہ تو میرا پُتر میرا پُتر کے سوا کچھ کہتی ہی نہیں تھی۔ ہاں وہ تھی ذات کی مراثن اور اس کا ایک کان تھا۔ اُس نے بتایا تھا کہ وہ اُدھر تیس میل دور کسی پنڈ سے آتی ہے۔ پنڈ کا نام مجھے اس وقت یاد نہیں آ رہا ہے۔"

"چلو کوئی بات نہیں۔ نکو، کولمبو، بھینس کی ہم وزن اور ہم رنگ ایک کان والی میراثن جس کا گاؤں شمال میں تیس میل دور ہے۔" میں نے تمام نکات کو انگلیوں پر شمار کیا۔ "پرانے ماڈل کی لال شیورلٹ' امپالا یا بیلئیر جس کی ایک ٹیل لائٹ نہیں ہے اور پچھلا بمپر نہیں ہے۔ تم نے تو اتنا بتا دیا ہے جتنا پولیس کی خصوصی تفتیشی ٹیم ایک مہینے میں معلوم کر کے نہ بتا سکتی۔"

"اب تم روٹی کھلاؤ ہمیں اور پھر ہم چلتے ہیں۔ ہمارے بارے میں کسی سے بات مت کرنا۔" محسن بولا۔

"یہ بات تو میں کہنے والا تھا۔" وہ سر ہلا کے اٹھا۔ "دال فرائی دوں کہ آلو قیمہ۔"

کھانے کی خواہش کسی کو نہیں تھی مگر کھانا جسمانی ضرورت تھا اور جسم کی مشین اس ایندھن کے بغیر نہیں چل سکتی تھی۔ رہی سہی کسر کھانے کی اعلیٰ کوالٹی نے پوری کر دی۔ اس کے باوجود ہم نے ایک ایک روٹی کے ٹکڑے کو پانی کی مدد سے بہا کر حلق سے اتارنے میں کامیابی حاصل کی۔ صورت سے گاؤدی نظر آنے والے مگر بے حد ذہین، باریک بین اور چالاک آدمی کا شکریہ ادا کیا جس کی مدد کے بغیر ہم اپنے راستے کا تعین بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اب اتنا تو تھا کہ ہم شمال کی سمت تیس میل تک اپنا سفر جاری رکھنے کے بعد مزید معلومات حاصل کر سکتے تھے۔ ہوٹل کا مالک آخری وقت تک ہمیں دیکھتا رہا۔ وہ ذہنی الجھن میں مبتلا تھا کہ ہم سے اتنی باتیں کر کے اس نے غلطی تو نہیں کی؟

"اس کے میلومیٹر پر نگاہ رکھو۔ اس وقت کیا ریڈنگ ہے؟" میں نے ٹیکسی میں پیچھے لیٹ کر کہا۔

"تیس ہزار سات سو نوے۔" نیک محمد نے کہا۔ "آٹھ سو بیس پر روک لوں گا۔"

"یہ محسن کدھر رہ گیا؟" میں نے سر اٹھا کے کہا۔ محسن نہ جانے کون سی ضروری بات پوچھنے کے لیے واپس چلا گیا تھا۔

"میں نے سوچا کہ اس عالم فاضل شخص سے کسی ڈاکٹر حکیم وید کا پتا ہی پوچھ لوں۔" محسن نے واپس آ کے آگے بیٹھنے کے بعد کہا۔

"پھر کچھ بتایا اُس نے؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ یہاں سے تیس میل دور ڈونگا پتن میں کوئی ایسا حکیم ہے جس کے سامنے دنیا بھر کے میڈیکل اسپیشلسٹ ہیچ ہیں۔"

"ڈونگا پتن! ٹھیک تیس میل؟" میں اُٹھ بیٹھا۔ "یہ تو کمال ہو گیا۔"

"ہاں۔ اس بہت ہوشیار آدمی نے ہمیں اس بہلنے گاؤں

کا نام بھی بنا دیا ہے۔" محسن نے کہا۔ جو وہ پہلے سے جانتا تھا مگر اس کی صحیح نشاندہی کرتے ہوئے ڈرتا تھا۔ "تیس میل کے دائرے میں تیس گاؤں تو ایسے ضرور ہوں گے جہاں کم سے کم ایک حکیم لقمان کا شاگرد ضرور ملے گا مگر اس نے پتا دیا اتنی دور کا۔ مقصد یہ بتانا تھا کہ میاں سیدھے وہاں چلے جاؤ۔ سب کچھ مل جائے گا۔"

"تمہارا فیول میٹر کیا کہتا ہے؟" میں نے کہا۔

"میں نے ٹینک فل کرا لیا تھا۔ ابھی تو تین چوتھائی کے قریب بھرا ہوا ہے۔" نیک محمد نے جواب دیا اور میں نے اطمینان کا سانس لیا کیونکہ بخار کا اثر اب مجھے بھی محسوس ہونے لگا تھا۔ ایسے وقت میں اسپرین بھی مل جاتی تو بہت کارآمد ثابت ہوتی لیکن تقدیر لے جا رہی تھی کسی ڈونگے پتن کے نیم حکیم کے پاس جو شاید نیم کے درخت کے نیچے اپنا کلینک قائم کر کے بیٹھا ہوگا اور نسخۂ شافی کہہ کے ہر مرض کا علاج نیم کی چھال، نیم کے پتوں یا نمبولیوں کی گولیاں کھلا کے کرتا ہوگا۔ ویسے زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

پچھلی سیٹ پر آرام سے لیٹنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ میری آنکھ جھٹکوں سے کھلی۔ ٹیکسی رک رک کر ہچکیاں لیتی چند گز چلی اور رک گئی۔ "کیا ڈونگا پتن آ گیا؟" میں نے سر اٹھا کے کہا۔

"ابھی ہم منزلِ مقصود سے ایک محتاط اندازے کے مطابق آٹھ دس میل دور ہیں۔" محسن نے کہا۔ "اور خواجہ نیک محمد صاحب کے محتاط اندازے کے مطابق جمود کی یہ کیفیت انجن کی کسی خرابی کا نتیجہ نہیں ہے۔"

"پھر کیا ہوا؟" میں نے اندھیرے میں چاروں طرف پھیلے ہوئے جنگل کو آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔

"کچھ نہیں، پٹرول ختم ہو گیا ہے۔" محسن نے اسی اطمینان سے جواب دیا۔

"صرف بائیس میل میں؟" اس وقت پانچ گیلن کے قریب تھا۔" میں نے کہا۔

"اس وقت یہ گاڑی ایک گیلن میں بائیس میل جاتی تھی۔ اب بائیس گیلن میں ایک میل کر رہی ہے تو ہم کیا کریں۔" محسن بولا۔

"یار یہ کیا بکواس ہے۔ فیول میٹر غلط نہیں تھا۔ نیک محمد خود ٹینک فل کرا کے لایا تھا۔" میں نے کہا۔

"یہ خواجہ صاحب کا دعویٰ ہے۔ ہو سکتا ہے پٹرول پمپ والے نے میٹر کو زیرو پہ نہ کیا ہو۔" محسن بولا۔ "اب تو ٹینک خالی ہے۔"

"میں نے دیکھا تھا۔ اس نے چھ گیلن پٹرول ڈالا تھا زیرو سے چھ تک میں خود دیکھتا رہا تھا۔" نیک محمد نے کہا۔

"پھر کیا پٹرول بہہ گیا یا کسی نے نکال لیا؟" محسن نے چلا کر کہا۔

"یار سکندر بادشاہ... یہ تو بڑی زیادتی ہے نا۔ اب میں دیکھوں گا تو پتا چلے گا۔" نیک محمد روتی صورت بنا کے بولا۔

"یار محسن! اتنی پرانی گاڑی ہے۔ ہو سکتا ہے اس کی فیول لائن لیک کرنے لگی ہو۔" میں نے کہا۔

نیک محمد نے اتر کے دیکھا تو میرا خیال درست ثابت ہوا۔ سڑک پر سیاہ تارکول میں ایک زیادہ سیاہ لکیر دکھائی دے رہی تھی۔ غالباً پہیوں سے اچھل کر کوئی نوکیلا پتھر پٹرول ٹینک کے زیریں حصے میں لگا تھا اور پرانے زنگ خوردہ ٹینک کی چادر میں سوراخ ہو گیا تھا۔ سوراخ بہت چھوٹا تھا مگر اس میں سے بہنے والی پتلی سی پٹرول کی دھار نے ہمارے سفر کو وسیلۂ ظفر نہیں ہونے دیا تھا۔ اب ہم انگریزی زبان میں سفر کر رہے تھے۔

"کیا ہم رات بھر اس سنسان سڑک پر کھڑے رہیں گے؟" میں نے باہر سر نکال کے کہا۔

"اس خوب صورت منظر سے لطف اندوز ہونے کے لیے ذرا مختلف انداز سے سوچیے۔" محسن نے گاڑی کا سہارا لے کر سگریٹ جلائی۔ "فرض کریں یہ ایک پکنک ہے یا ایڈونچر ہے۔ لیلےٰ کی جستجو میں قیس سر سے کفن باندھ کے نکلا ہے۔ محملِ لیلےٰ کا سراغ ابھی نہیں ملا اور ناقۂ مجنوں پنکچر ہو گیا ہے۔"

"اونٹ پنکچر نہیں ہوتے۔" میں نے کہا۔

"کیا سہانا سماں ہے۔" محسن نے اپنی بات جاری رکھی۔ "جنگل میں منگل ہے... سوری... جنگل میں بدھ ہے۔ ہر طرف بھوت ڈسکو کر رہے ہیں۔ ارواحِ خبیثہ کی دلکش آوازیں، گیدڑوں کی سُریلی تان، الوؤں کا چہچہانا..." وہ بات ادھوری چھوڑ کے دوڑا۔ دور سے کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس نمودار ہوئی تھیں۔ محسن سڑک کے درمیان میں ہاتھ پھیلا کے کھڑا ہو گیا۔ قریب آنے والی نئی اور بیش قیمت کار کے خرد ماغ مالک نے بریک لگا کے دروازہ کھولا۔

"میں اگر چاہتا تو تمہاری خودکشی کی کوشش کو کامیاب کر سکتا تھا۔" وہ بولا۔ "اور تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے ایڈیٹ۔ واٹ ڈو یو وانٹ۔"

"چاہتا تو میں بہت کچھ ہوں۔" محسن نے صاف انگریزی میں جواب دیا۔ "مثلاً یہ کہ آپ ہمارے لیک کرنے والے پٹرول ٹینک کا سوراخ بند کر دیں اور پھر اس میں پانچ گیلن پٹرول بھر دیں۔ مگر یہ آپ نہیں کر سکتے۔ چنانچہ آپ ہمیں ڈونگا پتن پہنچا دیں۔"

"ڈونگا پتن؟" اس شخص نے حیرانی سے کہا۔ "وہاں گاڑی نہیں جا سکتی اور پھر یہاں سے ڈونگا پتن ہے بھی کتنی دور... زیادہ سے زیادہ دو فرلانگ۔" اس نے بائیں طرف گھنے جنگل کی سمت اشارہ کیا مگر مجھے اندھیرے کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا۔

"دو فرلانگ... آپ کا مطلب ہے اسی جگہ سے دو فرلانگ؟" محسن نے کہا۔

"ہاں۔ تم پہلے کبھی ادھر نہیں آئے؟" وہ شخص بولا جو بہترین سوٹ و ٹائی میں تھا۔ اس کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ تھی۔

"پھر تو واقعی افسوس ہے کہ میں نے آپ کو روکا اور بلاوجہ خودکشی کا ڈراما کیا۔" محسن نے کہا۔ "بہرحال بہت شکریہ کہ آپ نے ہمیں منزلِ مقصود تک پہنچا دیا۔"

"ایسے وقت میں جب ہم سمجھ رہے تھے کہ ہم منزلِ مقصود سے آٹھ میل دور ہیں۔" میں نے کہا۔

"کوئی اور بھی ہے تمہارے ساتھ۔" وہ شخص آگے بڑھا اور اس نے کھڑکی میں سے جھانکا۔ "کوئی بیمار ہے؟"

"جی... بہت سے روگ لاحق ہیں اسے... سب ناقابلِ علاج۔" محسن بولا۔

"ڈونگا پتن میں قبرستان بھی ہے۔" وہ شخص اپنی گاڑی کی طرف بڑھا۔ چند منٹ میں اس کی گاڑی کی ٹیل لائٹس بھی ہماری نظر سے اوجھل ہو گئیں۔ سڑک ایک بار پھر ویران ہو گئی۔

"کیا زبردست آٹومیٹک گاڑی ہے۔ صحیح جگہ پہنچ کر خود بخود رک گئی۔" محسن بولا۔

"غالباً اس نے سُن لیا تھا۔" میں نے تائید کی۔ "مگر اس ایک کان والی بھینس کا اندازہ کتنا غلط تھا جس نے ڈونگا پتن کو تیس میل دور بتایا تھا... کولمبو کی ماں۔"

"عورتوں کا حساب اور پھر دیہاتی عورت کا حساب۔" میں نے کہا۔ "وہ عقل سے بڑی چیز قابلِ معافی ہے محسن خان۔"

"دو فرلانگ تو ہم پیدل بھی جا سکتے ہیں سکندر بادشاہ۔" نیک محمد نے کہا۔

"تم لوگ جا سکتے ہو، مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"اچھا تو ہم ڈونگا پتن تک ہو آتے ہیں۔" محسن بولا۔ "تنے چھوٹے سے گاؤں میں اتنی بڑی شیورلٹ چھپی نہیں رہ سکتی۔"

"تم یہیں لیٹے رہو۔ بہتر ہے سو جاؤ۔" نیک محمد نے مجھے نیک مشورہ دیا۔

"کوشش کروں گا لیکن تم اکیلے کوئی معرکہ سر کرنے کی کوشش مت کرنا۔" میں نے کہا۔ "اگر وہ گاڑی نظر آ جائے تو پتا ٹھکانا دیکھ کر لوٹ آنا کہ کس گھر کے سامنے کھڑی ہے اور کس کی ہے۔ گاؤں میں شاید ایک ہی گاڑی ہوگی۔ یہاں لوگ ایسی گاڑیوں کو لاک کرنے کا تکلف نہیں کرتے۔ تم کاغذات دیکھ سکو گے۔"

"تو بالکل فکر مت کر۔ ہم دھاوا بولنے نہیں، سراغ لگانے جا رہے ہیں۔" محسن بولا۔ "جو کارروائی کرنی ہوگی مل کر کریں گے۔"

"دو فرلانگ آنے جانے میں ایک گھنٹا لگ جائے گا۔" میں نے کہا۔ "گاڑی کو تلاش کرنے میں شاید ایک گھنٹا بھی نہ لگے۔ اس قسم کے گاؤں کی حدود بہت مختصر ہوتی ہیں۔ میں دو گھنٹے بعد تشویش میں مبتلا ہو جانے کا وعدہ کرتا ہوں۔"

"بخار کے ساتھ تشویش میں مبتلا ہونے سے فائدہ ہوتا ہے۔ بخار کے جراثیم کو بھی تشویش لاحق ہو جاتی ہے اور وہ ختم ہونے لگتے ہیں۔" محسن بولا۔ "تیرے پاس ریوالور ہے؟"

"ہے۔ لیکن مجھے ریوالور کی اتنی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔ "جتنی تم دونوں کو ہے۔ اسٹین گن لے جاؤ۔"

"وہ ایک ڈنڈے سے زیادہ فائدہ مند نہیں رہی۔" محسن ہنسا۔ "اس کے راؤنڈ ختم ہو چکے ہیں۔ ریوالور سے کام چلائیں گے۔"

جب وہ چلے گئے تو میں ان کو ٹیکسی کی کھلی کھڑکی سے اندھیرے میں گم ہوتے دیکھتا رہا۔ کچھ دیر ان کے باتیں کرنے کی آواز بھی سنائی دیتی رہی پھر اجنبی رات کی آسیب زدہ خاموشی نے مجھے گھیر لیا۔ آسمان پر چاند نہیں تھا۔ اچانک میرے سر پر بجلی کا کوندا لہرایا۔ میں نے حیرانی سے آسمان کو دیکھا۔ بادل چپکے چپکے امڈ آئے تھے اور اب اپنی صف در صف سیلاب فوج کی آمد کا اعلان کر رہے تھے۔ بجلی کی چمک کے ساتھ ہی گرج کی ہلکی سی آواز آئی اور ہوا ایک دم تیز ہو گئی۔ بڑے بڑے درخت سنسنانے لگے جن کا وجود کالے آسمان کے کینوس پر سیاہی سے بنی ہوئی تصویر کی طرح تھا۔ ہوا میں جھومتے ہوئے ان کی شاخیں یوں آگے جھکتی تھیں جیسے میرے خیالوں کے عفریت مجھے اپنے منحوس بازوؤں میں اٹھا لینا چاہتے ہوں۔ میں نے رابعہ کا تصور کیا۔ اس کے رُخِ زیبا کی چاندنی سے اس رات کی تاریکی کو منور کیا جو میرے رگ و پے میں تنہائی کا خوف بن کے اترنے لگی تھی لیکن میرے اپنے خیالات میرے دشمن ثابت ہوئے۔ انہوں نے رابعہ کی وہ تصویر پیش کی جو میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میرا تصور بھٹک رہا تھا اور یہ اذیت میرے لیے

ناقابلِ برداشت تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر کے تمام خیالات کو ذہن سے خارج کرنا چاہا تاکہ میں سو سکوں۔

یکلخت میری پلکوں پر روشنی کی جھلملاہٹ اتری۔ میں نے آنکھیں کھول کے دیکھا۔ یہ بجلی نہیں چمکی تھی۔ پیچھے سے ایک کار آ رہی تھی۔ اس کی روشنی نے پیچھے سے ٹیکسی کے اندر اجالا پھیلا دیا۔ میں نے ایک کہنی کے بل اُٹھ کر دیکھا۔ کار تیزی سے آئی اور ٹیکسی کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ شاید کسی نے تجسّس یا انسانی ہمدردی کے جذبے سے مجبور ہو کے گاڑی روکی ہو گی۔ بارش سر پر تُلی کھڑی ہے اور ایسے میں کون ہے جس کی ٹیکسی اس بیاباں میں نقشِ فریادی بنی کھڑی ہے۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس ابھی تک روشن تھیں اور انجن چل رہا تھا۔ ڈرائیور دوسری طرف تھا چنانچہ میں اسے نہ دیکھ سکا لیکن میں نے اس شخص کو فوراً پہچان لیا جو میری طرف والے دروازے سے اتر چکا تھا۔ میں نے پلک جھپکتے میں ریوالور نکالا۔ اس شخص نے جست لگائی اور میں نے دوسری بار ٹرائگیر دبایا۔ ہلکی سی "کلِک کلِک" کی آواز آئی۔ ریوالور کے میگزین میں ایک ہی گولی تھی جو شاید میں ضائع کر چکا تھا۔ پھر ایک اور شکاری نمودار ہوا اور چار مضبوط ہاتھوں نے مجھے گھسیٹ کر کار میں ڈال دیا۔

بیماری اور تھکن نے مجھے جسمانی طور پر مقابلے کا اہل نہیں چھوڑا تھا ورنہ وہ اتنی آسانی سے مجھے قابو نہ کر پاتے۔ میں نے واجبی سی مزاحمت کی مگر ان کا اسلحہ بھی ان کی بہت بڑی طاقت تھا۔ میرے گاڑی میں گرتے ہی ان میں سے ایک نے ریوالور کے دستے سے میرے سر پر وار کیا۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ چشم زدن میں ہوش و حواس میرا ساتھ چھوڑ گئے۔ ریوالور کی جس گولی نے میرے بازو کو ناکارہ کر دیا تھا اس کے درد کی شدت میرے لیے ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ بے ہوشی نے مجھے اذیت کے عذاب سے بھی نجات عطا کی۔ آخری خیال محسن اور نیک محمد کا تھا کہ واپسی پر وہ مجھے غیر موجود پائیں گے تو کتنے پریشان ہوں گے۔

دوبارہ ہوش اور احساس کی دنیا میں واپسی ایک انتہائی ناخوشگوار تجربہ ثابت ہوئی۔ درد میرے بازو سے میرے سارے وجود تک اپنی جڑیں پھیلا چکا تھا اور مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میرے سر کو بھاری پتھر کی دو چٹانوں نے شکنجے کی طرح دبا رکھا ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں شدید گھبراہٹ اور بے چینی کا شکار تھا۔ میں نے سیاہی کو پہلے کی طرح ہر سمت محیط دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے خیال آیا کہ شاید میری بصارت ابھی بحال نہیں ہوئی ہے۔ روشنی تو ہے لیکن میری آنکھیں اسے دیکھنے سے قاصر ہیں۔ میں نے کوشش کر کے اپنے ہاتھوں اور پیروں کو جنبش دی تو مجھے یقین آیا کہ میں آزادی سے حرکت کر سکتا ہوں۔ میں کسی بستر پر لیٹا ہوا تھا جو بہت آرام دہ تھا لیکن جسم کو رسیوں یا زنجیروں سے باندھ کر رکھنا ضروری نہیں سمجھا گیا تھا۔ رفتہ رفتہ مجھے اس بات کا یقین بھی آنے لگا کہ ... ابھی باقی ہے اور قصور میری آنکھوں کا نہیں کہ ..... مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ شاید یہ وہی رات تھی جب شکاری مجھے بے بس و تنہا پا کے اٹھا لائے تھے۔ درمیانی وقفہ کا اندازہ کرنا محال تھا۔ یہ اس رات سے اگلی رات بھی ہو سکتی تھی اور اس کے بعد آنے والی رات بھی۔ میرے شکاری مجھے ایک بار زیرِ دام لانے کے بعد ایک دن یا دو دن بے ہوش رکھنے پر قادر تھے تاہم عقل کہتی تھی کہ میری بے ہوشی کا وقفہ بہت زیادہ طویل نہیں رہا اور بالآخر دن نکلے گا تو مجھے وقت کا اندازہ بھی ہو جائے گا اور اپنی اسیری کی غرض، اسیری کے مقام اور اسیر کرنے والوں کے بارے میں کچھ تو معلوم ہو...

میری بے قراری اور میرے ذہنی اضطراب میں زیادہ دخل جسمانی کمزوری کا تھا۔ میرا بدن بخار میں جل رہا تھا اور مجھے یوں لگتا تھا جیسے کسی نے مکّے مار مار کے میرے بدن کو پلپلا کر دیا ہے۔ یہ کسی بے ہوش رکھنے والی دوا کا اثر بھی ہو سکتا تھا اور بخار کی تیزی کا بھی جو بارود کے زہریلے اثرات کے خون میں سرایت کر جانے سے چڑھا تھا۔ آہستہ آہستہ مجھے یاد آنے لگا کہ میں کہاں تھا اور وہ کون لوگ تھے جو مجھے اغوا کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ان میں سے ایک کو میں نے شناخت کر لیا تھا جو میرے پاس آ کے رکنے والی گاڑی میں سے پہلے اترا تھا۔ اس نے اپنی شناخت کی بہت سی علامات کو مٹا دیا تھا یا بدل دیا تھا مثلاً اس نے گھنگھریالے مکرانیوں جیسے سخت سیاہ بالوں پر وِگ لگا لی تھی اور اپنے کانوں میں پڑی ہوئی پیتل کی مُندریاں ہٹا دی تھیں لیکن اس کے باوجود وہ اپنی صورت کے نقوش کو بدلنے میں ناکام تھا اور میں نے استاد پیڈرو کو پہچان لیا تھا۔ اندھیرے میں اس کے سیاہی مائل رنگ کے باعث چہرہ چھپا رہتا مگر اس نے بولنے کی غلطی کی تھی اور یہ آواز ایسی تھی کہ میں برسوں بعد بھی سنتا تو شناخت کر لیتا۔ پھر جب انہوں نے مجھے گاڑی میں ڈالا تھا تو دروازے کھلنے سے گاڑی کے اندر کی لائٹ جل گئی تھی اور اس کی روشنی میں میری آنکھوں نے پیڈرو کی صورت کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ اتنے کم فاصلے سے مجھے اس کے کانوں کی لو کے سوراخ نظر آ گئے تھے جن میں برسوں پیتل کی مُندریاں لٹکتی رہی تھیں۔ چنانچہ سوراخوں کے نیچے کا گوشت بھی کچھ لٹک گیا تھا۔

پیڈرو کے ساتھ دوسرا شخص وہی تھا جس نے ہمیں کار روک کے "ڈونگا پتن" کا راستہ بتایا تھا۔ وہ معزز آدمی جو بہترین سوٹ میں تھا اور جس کی عمر کا اندازہ میں نے پچاس سال لگایا تھا۔ اس کی جسمانی طاقت اس کی عمر کے مقابلے میں ناقابلِ یقین حد تک زیادہ تھی۔ جب وہ ہمیں ڈونگا پتن کا پتا سمجھا رہا تھا تب بھی مجھے شک ہوا تھا کہ وہ اپنی اصل آواز میں گفتگو نہیں کر رہا ہے مگر میں نے اس خیال کو اہمیت نہیں دی تھی کہ آخر اس سڑک سے گزرنے والے کسی اجنبی کو آواز بدل کر بات کرنے کی کیا ضرورت پیش آ سکتی ہے۔ بعد کے واقعات نے بالآخر یہ ثابت کر دیا تھا کہ میرا شک قطعاً غلط نہیں تھا اور اب میں یہ بھی فرض کر سکتا تھا کہ اس کی پوری شخصیت بدلی ہوئی تھی ـــــ وہ ہمارے ہی تعاقب میں آیا تھا مگر وہ اکیلا کچھ نہیں کر سکتا تھا یا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مخالف سمت میں کہیں استاد پیڈرو موجود تھا۔ غالباً ہمارے تعاقب میں آنے والوں نے ہم پر نظر رکھی تھی اور آگے پیچھے سے ہمارے لیے فرار کے راستے مسدود کر دیے تھے۔ اگر پیٹرول ختم ہو جانے کے باعث ہماری ٹیکسی اس جگہ کھڑی نہ ہوتی تو تھوڑا سا آگے جانے کے بعد پیڈرو ہمارا راستہ روک لیتا اور ہم واپس بھاگنا چاہتے تو وہ سوٹ والا گاڑی میں آ جاتا۔

لیٹے لیٹے میں نے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا کہ سوٹ والے نے گاڑی روک کر ہمیں اچھی طرح دیکھ لیا تھا اور پھر جانتے بوجھتے غلط پتا بتا دیا تھا۔ اس نے ہمارے اندازے کو غلط ثابت کر دیا تھا حالانکہ اپنے حساب کے مطابق ہم ڈونگا پتن سے کچھ تو میل دور تھے اور یہ حساب ٹھیک تھا۔ محسن کو اور ... بلکہ غلط راستے پر ڈالنے کا مقصد مجھے اکیلا کرنا تھا۔ اس مقصد میں وہ کامیاب رہا۔ اس کی خود اعتمادی قابلِ تعریف رہی تھی کہ ہم نے کسی تذبذب کے بغیر اس پر یقین کر لیا تھا۔ یہ نیا کردار تھا یا پیڈرو کی طرح روپ بدل کر آنے والا پرانا چہرہ تھا۔ پھر جو ہو گا سامنے تو آئے گا۔ میں نے سوچا۔

ہمت کر کے میں اس بیڈ پر سے اٹھا۔ حیرت کی بات تھی کہ ابھی تک میری آنکھیں اس اندھیرے سے مانوس نہیں ہوئی تھیں اور ایک گہرے سیاہ خلا کے علاوہ میں اپنے آس پاس کچھ بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ یہ بڑی حیرانی کی بات تھی۔ اگر اس کمرے میں کوئی دروازہ ہوتا تو اس کی درز سے باہر کی روشنی دکھائی دیتی اور اندھیرے کی چادر میں سفید ڈوری نظر آتی۔ کہیں کوئی کھڑکی ہوتی تو اس کے شیشوں کا رنگ اندر کی سیاہی کے مقابلے میں سفیدی کے ٹکڑوں کی طرح دکھائی دیتا لیکن اس کمرے میں تو جیسے دیواریں بھی سیاہ تھیں۔ اس کی چھت بھی کالی تھی۔ کھڑکیوں، دروازوں پر کالا پینٹ تھا اور ان پر کالے پردے پھیلے ہوئے تھے۔ میں اندھوں کی طرح ایک ہاتھ آگے بڑھا کر ٹٹولتا ہوا قدم قدم رکتا آگے بڑھا۔ مجھے مزید حیرانی ہوئی جب میری راہ میں کوئی چیز حائل نہیں ہوئی۔ میرے زخمی ہاتھ میں اینٹھن ہو رہی تھی اور اس کی خفیف سی حرکت سے بھی درد کی ٹیس کسی الیکٹرک شاک کی طرح محسوس ہوتی تھی۔ بالآخر میرے تندرست ہاتھ کی انگلیوں نے دیوار کے سخت اور سرد لمس کو محسوس کیا۔ میں نے اپنا رخ بدلا اور دیوار کے متوازی چلنے لگا۔ وقفے وقفے سے میں نے دیوار کے اوپر نیچے کی سطح کو دیکھا مگر مجھے سپاٹ دیوار میں کسی دریچے کے آثار بھی نہ ملے۔

کمرا بہت بڑا بھی نہیں تھا اور اتنا چھوٹا بھی نہیں کہ اسے جیل کی کوٹھری سمجھا جاتا۔ میرے اندازے کے مطابق کمرے کی لمبائی اور چوڑائی آٹھ اور دس فٹ تھی۔ یہ اندازہ میں نے دو دیواروں کا ہاتھ سے چھو کر جائزہ لینے کے بعد قائم کیا۔ تیسری دیوار میں اچانک دروازہ آ گیا۔ تقریباً ڈھائی فٹ چوڑا اور ساڑھے چھ فٹ اونچا مگر دروازہ باہر سے بند تھا۔ اندر سے اس کی سطح دیوار سے مل گئی تھی۔ اور اس میں اوپر نیچے کوئی کنڈی، ہُک یا چٹخنی اور ہینڈل نہیں تھے۔ دروازہ کمرے میں کھلتا ہو گا چنانچہ اس کے قبضے چوکھٹ کے بیچ میں آ گئے تھے۔ دروازے کو بڑی صفائی سے فٹ کیا گیا تھا۔ کہیں کوئی جھری تھی تو میری آنکھیں اسے دیکھنے سے قاصر تھیں اور ہاتھ پھیرنے سے بال برابر فرق کا احساس بھی نہیں ہوتا تھا۔ ایسے دروازے کو اندر کی طرف کھینچنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ مجھے یہ اندازہ بھی ہو گیا کہ ٹکر مار کے میں اپنے کندھے توڑ سکتا ہوں مگر دروازے کو ہلا بھی نہیں سکتا۔

آدھے گھنٹے بعد میرے لیے شبے کی کوئی گنجائش نہ رہی کہ میں ایک قید خانے میں ہوں جہاں ازراہِ مروّت مجھے سونے لیٹنے یا بیٹھنے کے لیے ایک بیڈ تو فراہم کر دیا گیا ہے مگر اور کچھ بھی نہیں ہے۔ مجھے پا بہ زنجیر یا دست بستہ رکھنا بھی

ضروری نہیں تھا۔ خالی ہاتھوں سے اس زنداں کی دیواروں سے صرف میری روح نکل سکتی تھی۔ میں کمرے کے اندر پھرتے پھرتے اتنا تھک گیا تھا کہ بے دم ہو کے دوبارہ بیڈ پر گر گیا۔ مجھے بخار کی حرارت اپنے جسم سے خارج ہوتی محسوس ہوتی تھی۔ جو سانس میرے نتھنوں سے خارج ہوتی تھی وہ گرم ہوا کی طرح تھی اور میرا چہرہ تپ رہا تھا۔ یہ عجیب کسمپرسی اور بے کسی کا عالم تھا کہ مجھے مناسب دیکھ بھال کی، خوراک، دوا اور آرام کی ضرورت تھی لیکن میں گھپ اندھیرے کی قید میں اکیلا تھا۔ مجھے محسن کا اور نیک محمد کا خیال آیا کہ شاید وہ "ڈو نگا پن" کو تلاش کرنے میں ناکام ہو کے لوٹ آئے ہوں۔ وہ سمجھ جائیں گے کہ انہیں بے وقوف بنایا گیا تھا اور اس طرح گمراہ کر دینے کا مقصد اس کے سوا کچھ اور نہ تھا کہ مجھے اغوا کر لیا جائے۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ بعد میں انہیں بھی الگ الگ اغوا کر لیا گیا ہو اور اب وہ بھی میری طرح کسی تاریک زنداں کی تنہائی کے اسیر ہوں۔ میری طرح انہیں بھی معلوم نہ ہو کہ وہ کہاں ہیں اور باقی دو کے بارے میں صرف خیالوں کے گھوڑے دوڑا سکتے ہوں۔ مجھے رابعہ اور نازو کا خیال بھی آیا جو ہم سے پہلے اغوا ہو گئی تھیں۔ نہ جانے تقدیر کو اب کیا منظور تھا کہ اس نے ایم آر ایس کے اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا تھا اور ہم سب کو ایک دوسرے سے اس طرح جدا کر دیا تھا جیسے خزاں کی ہوا ایک ہی ٹہنی سے گرنے والے پتوں کو مختلف سمتوں میں اڑا لے جائے۔

یہ سب جرأتِ رندانہ میں حد سے گزر جانے کا شاخسانہ تھا۔ ہم نے اپنی قوتِ تسخیر کا غلط اندازہ کیا تھا اور دشمن کے حصار میں قدم رکھ دیا تھا۔ مجھے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ اتنی بڑی مہم پر روانہ ہونے سے پہلے اپنی حفاظت کے لیے مناسب انتظام نہیں کیا تھا۔ اس امکان کو ذہن میں نہیں رکھا تھا کہ ناکامی کی صورت میں کوئی ہماری مدد کے لیے پہنچ سکے گا یا نہیں۔ کم از کم دو افراد عملاً ہمارے کام آ سکتے تھے۔ عبدالودود منظر اور مرزا غالب لیکن ان دونوں کو علم ہی نہیں تھا کہ ہمارے عزائم کیا ہیں اور اب تو ہم خود بھی نہیں جانتے تھے کہ ہم کہاں ہیں تو کسی اور کو یہ بات کیسے معلوم ہو سکتی تھی۔ جب تک ہم ایک ساتھ تھے ہمارا اعتماد ناقابلِ شکست تھا اور ہماری قوت ہمارا اتحاد تھا مگر اب ہم اکیلے ہو چکے تھے اور ایک دوسرے کی مدد کی امید بھی نہیں رکھ سکتے تھے۔

میں نے چشمِ تصور سے ہر مہربان صورت کو خوابیدہ کرنا چاہا۔ میں نے کوشش کی کہ انہیں ہنستا مسکراتا اور اکٹھا دیکھوں لیکن میرا ذہن مایوسی کے احساس شکست خوردہ تھا۔ میں نے ان سب کو اپنی ہی طرح میں... بے بس اور اکیلا دیکھا۔ ان سب کو ایک دوسرے کا خیال تھا اور ایک دوسرے کی مدد سے رہائی کی توقع تھی لیکن انہیں معلوم نہ تھا کہ وہ سب ایک سے بے بس ہیں۔ ذہنی انتشار کی اس کیفیت میں مجھے خیال یہ بھی آیا کہ ممکن ہے، ہم سب ایک دوسرے کے بہت قریب ہوں۔ آگے پیچھے، دائیں بائیں یا اوپر نیچے کے کمروں میں قید ہوں۔ مگر ذہنی طور پر اس احساس کا شکار ہوں کہ ہمارے درمیان طویل فاصلے حائل ہیں جو مختلف سمتوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔

میں نے جسمانی اذیت کے احساس کو مٹانے کے لیے نیند کی آغوش میں پناہ لینے کی کوشش کی۔ میری کلائی پر سے گھڑی بھی اتار لی گئی تھی ورنہ میں اس کا گلاس توڑ دیتا اور انگلیوں کی مدد سے ٹٹول کر سوئیوں کی پوزیشن سے وقت دیکھنے کی کوشش کرتا۔ مجھے اتنا تو معلوم ہوتا کہ صبح کی منزل کتنی دور ہے۔ اس حالت میں نیند کی بھی جرم لگتی تھی اور اس کی خواہش ایک فریب مگر کے لیے ضرورت بن گئی تھی۔ میں آنکھیں بند کیے کروٹیں بدلتا رہا۔ بار بار میں آنکھیں بند کر کے ذہن سے خیالات جھٹکنے کی کوشش کرتا تھا مگر مجھے احساس ہوتا تھا کہ یہ بھی کم اذیت ناک نہیں۔ میری آنکھیں خود بخود کھل جاتی تھیں اور خیالات بے قابو بلوائیوں کی طرح ساری رکاوٹوں کو گراتے میرے ذہن کو تاخت و تاراج کرنے لگتے۔

اب میں دیواروں کا نہیں وقت کا اسیر تھا۔ آزادی سے زیادہ صبح کا اجالا دیکھنے کی فکر لاحق تھی اور روشن افق کا تصور میری ساری خواہشوں کا حاصل تھا مگر وہ رات تھی کہ طولِ شبِ فراق سے کہیں صبر آزما بنتی جا رہی تھی۔ اس کا ہر لمحہ ایک درد کی گھڑی اور ہر گھڑی ایک لمبی کالی رات کی طرح تھی۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس رات وقت رک گیا ہے یا اس کی رفتار کم ہوتی جا رہی ہے۔ انتظار کا عذاب مجھے پاگل کرنے لگا۔ میرے چاروں سناٹا تھا اور ایسی خاموشی تھی جو کالی دیواروں سے زیادہ منجمد محسوس ہوتی تھی۔ میں اٹھ بیٹھا اندھیرے کو گھورتا رہا۔ پھر ننگے پاؤں فرش پر چلنے لگا

کے ساتھ ساتھ۔ میں نے دروازے کو بجانا اور چلاّنا شروع کیا کوئی ہے۔ کوئی ہے۔" مگر دروازہ بھی بیصدا ثابت ہوا۔ اس پر مکے مارنے سے اتنی ہی آواز ہوئی جتنی دیوار پر مکے مارنے سے ہوتی۔ معلوم نہیں اس دروازے کے پیچھے کیا تھا کہ اس کی آواز میں گونج نہیں تھی۔

میرے جسم پر صرف میرے کپڑے تھے۔ میری جیب میں سے ہر چیز نکال لی گئی تھی اور کمرے میں ایسی کوئی بھی چیز نہیں تھی جو میں دروازے پر مار سکتا۔ میری نقاہت بڑھتی جا رہی تھی اور دروازے پر طاقت آزمائی کے بعد میں بالکل نڈھال ہو گیا تھا۔ ایک مرتبہ پھر بستر پر لیٹ کر میں نے جسم کی تھکن کے احساس کو کم کرنا چاہا لیکن میں زیادہ دیر نہ لیٹا رہ سکا۔ میں چاہتا تھا کہ اب خواہ جلاد ہی آئے مگر مجھے اس قید خانے کی سیاہی سے نکالے۔ مجھے بتائے کہ میرے لیے کیا سزا تجویز کی گئی ہے اور پھر چاہے تو میری گردن اڑا دے۔ چوہدری دلاور، استاد پیڈرو میں سے کوئی بھی سامنے آئے۔ میرا سینہ گولیوں سے چھلنی کر دے یا مجھ سے پوچھے کہ میں نے اس احمقانہ جرأت کا مظاہرہ کیوں کیا تھا؟ مجھ پر تشدد کرے اور مجھ سے حقیقت اگلوانے کی کوشش کرے۔ مجھے جسمانی اذیت منظور تھی۔ یہ اندھیرا، خاموشی اور اپنی تنہائی میرے لیے ایک ناقابلِ برداشت ذہنی عذاب بن رہی تھی۔

میں نے چارپائی کو ہلا کے دیکھا۔ وہ لوہے کے پائپ کا بنا ہوا بھاری بیڈ تھا جس کے درمیان میں لوہے کے اسپرنگ تھے۔ اس کے سرہانے کی طرف کا کچھ حصہ اٹھا ہوا تھا اور ایسے بستر میں نے اسپتالوں میں استعمال ہوتے دیکھے تھے۔ اسے توڑنا ناممکن تھا۔ ورنہ میں ایک پٹی الگ کر لیتا اور دروازے پر مارتا۔ میں نے لوہے کے بیڈ کو گھسیٹ کر دروازے سے ٹکرانے کی فضول سی کوشش کی اور مجھے احساس ہوا کہ ذہنی طور پر میں دیوانگی کی سرحد کے کتنا قریب ہوں۔ اگر جسمانی طور پر میں بالکل صحت مند ہوتا تب بھی اس لوہے کی چارپائی کو دروازے پر مار کے دروازے کو توڑ دینے کی امید نہ رکھتا۔ اپنی موجودہ حالت میں تو میں اس کو ہلا بھی نہیں سکتا تھا۔

"دلاور!" میں نے چیخ کر کہا۔ "یہ کون سی بہادری ہے ذلیل کتے۔ سور کے بچے۔ بیمار اور زخمی آدمی کو دھوکے سے اٹھا لیا اور اس طرح قید کر دیا۔" میری آواز کے جواب میں بازگشت بھی نہیں آئی۔ ہر سو وہی بے حس اور سفاک خاموشی نوحہ خواں رہی۔ میں نے دروازے پر لاتیں ماریں اور دلاور کو چلا چلا کر گالیاں دیں۔ پیڈرو کو پکارا اور پھر وہیں گر کر بے ہوش ہو گیا۔

نہ جانے کتنی دیر بعد پھر مجھے ہوش آیا۔ وہی بھیانک کالی رات ابھی تک مجھ سے چمٹی ہوئی تھی۔ جیسے وہ رات نہیں، نہ مٹنے والی سیاہی ہے جس میں میرا وجود غوطہ زن ہے۔ میں کاجل کے پہاڑ میں گھس گیا ہوں اور اب روشنی کا ایک ذرہ دیکھنے کے لیے دیوانہ وار اس منجمد تاریکی سے لڑ رہا ہوں جس کو شکست دینا میرے بس کی بات نہیں۔ رحم۔ رحم۔ میں نے خدا سے فریاد کی۔ میں اس رات کے منحوس اندھیرے سے پناہ مانگتا ہوں۔ مجھے تھوڑی سی روشنی چاہیے۔ کاش کوئی مجھے بتا سکے کہ صبح ابھی کتنی منزلوں کی مسافت پر ہے۔ وقت کا احساس فنا ہونے کے بعد میں یہ سمجھنے لگا تھا کہ اس رات کی کوئی سحر نہیں ہے۔ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس رات کے اندھیرے میں دفن کر دیا گیا ہوں اور اب مجھے روشنی کی ایک کرن بھی نہیں مل سکتی۔ یہی رات میرا مدفن ہے اور یہی رات میرا مقتل ہے۔

ہوش اور بے ہوشی کے مختلف وقفوں میں مجھے صرف اتنا احساس رہا کہ میں فرش پر پڑا ہوا ہوں۔ پیاس سے میرے حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے اور میری آواز مر چکی تھی۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ میرے جسم پر میرا کنٹرول ختم ہونے لگا ہے اور میں فرش پر اپنی ہی پھیلائی ہوئی غلاظت میں لوٹ رہا ہوں۔ میں نے فرض کیا کہ یہ جانکنی کا عالم ہے اور اس کے بعد موت ہے۔ یہ خیال بڑا تسکین دہ تھا کہ بہت جلد میرا سارا عذاب ختم ہو جائے گا مگر بہت جلد میں بھی بہت دیر تھی۔ میرے جسم کی ہر حیوانی جبلت مجھے مغلوب کر رہی تھی۔ وہاں کھانے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا مگر مجھے یقین ہے کہ اس وقت کمرے میں گھاس پھوس، کنکر پتھر کچھ بھی ہوتا میں چبا ڈالتا۔ نیم دیوانگی کی کیفیت میں میرے ہاتھوں نے خود اپنے کپڑے پھاڑ کر چبانے اور نگلنے کی بے سود کوشش کی۔ میری زبان سوکھ کر چمڑا ہو رہی تھی اور میرے منہ میں اتنا لعاب بھی نہ تھا جو کپڑے کو تر کر سکتا۔ معلوم نہیں اس کمرے میں زندگی کی ایک بنیادی ضرورت کہاں سے پوری ہو رہی تھی۔ اس میں اتنی تازہ ہوا ضرور پہنچ رہی تھی کہ میں دم گھٹنے سے ہلاک نہیں ہوا۔ آہستہ آہستہ میری جلد چٹخنے لگی۔ میرے بدن کا پانی خشک ہو رہا تھا اور میں اپنی موت کو قریب آتے دیکھ رہا تھا۔ مجھے اس وقت محسن یا رابعہ کا خیال تک نہیں آیا۔ میں صرف اپنی زندگی کے لیے لڑ رہا تھا اور ایک ایک سانس کی خاطر رحم کی بھیک مانگ رہا تھا۔

مجھے اب تک یقین آچکا تھا کہ یہ رات نہیں کوئی تاریک زنداں ہے جس کے راستوں سے سورج کی روشنی کی ایک کرن کا گزرنا محال ہے۔ باہر کی دنیا کے مقابلے میں یہ قید خانہ ایک قبر کی طرح تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس کا عذاب قبر کے عذاب سے زیادہ محسوس ہوتا تھا۔ باہر نہ جانے کتنی بار سورج نکل کر غروب ہو چکا تھا، گھڑیوں کی سوئیاں نہ جانے کتنی بار چکر کاٹ کے پھر وہیں پہنچ چکی تھیں۔ دنیا کی مصروفیات اور زندگی کے کاروبار اسی طرح چل رہے تھے مگر یہاں اندھیرا منجمد ہو گیا تھا اور رات ٹھہر گئی تھی۔ یہ رات موت کی سرحد تک پھیلی ہوئی تھی۔ وہ بڑے بے رحم اور سفاک قاتل تھے جنہوں نے مجھے ایک طویل رات کے عذاب سے مارا۔ وہ مجھے بہت پہلے زیادہ آسانی کے ساتھ مار سکتے تھے لیکن وہ خونی شکاری بڑے اذیت پسند تھے۔ وہ مجھے گھیر کر اس اندھیرے کے جال تک لے آئے جو موت کی کمیں گاہ تھی۔

مجھے دوبارہ زندگی کب ملی؟ یہ میں یقین کے ساتھ نہیں بتا سکتا۔ وہ قاتل سیاہ رات چوبیس گھنٹوں پر محیط تھی، اڑتالیس گھنٹوں تک پھیلی ہوئی تھی یا اس سے بھی زیادہ، اس کا اندازہ میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ احساس اور ہوش ختم ہونے سے قبل ہی میں وقت پر اپنی گرفت کھو چکا تھا۔ آزاد انسانوں کی دنیا میں صبح ہوتی ہے، شام ہوتی ہے، سائے گھٹتے بڑھتے ہیں، اندھیرا روپ بدلتا ہے اور اجالا سمٹتا پھیلتا ہے تو گھڑی پر نگاہ ڈالے بغیر بھی وقت کے مسلسل آگے بڑھتے رہنے کی خبر ملتی رہتی ہے۔ یہ نہ ہو تب بھی نیند اور بھوک کی ضرورت انسانی جسم کو وقت سے آگاہ رکھتی ہے مگر میں ایک ایسی مصنوعی رات کے اندھیرے کا قیدی تھا جس میں وقت کا تصور بھی محال تھا۔ بہت پہلے مجھے یقین آچکا تھا کہ میں مر رہا ہوں اور مجھے ذرا بھی شبہ نہیں تھا کہ اسی کیفیت میں موت یوں آئے گی کہ مجھے خبر بھی نہ ہو گی۔

اچانک ٹھنڈک نے میرے جسم میں پھیلنا شروع کیا۔ زندگی... کا پہلا جھٹکا الیکٹرک شاک کی طرح تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں جھلسا دینے والی ریت پر پڑا ہوا تھا کہ مجھے اٹھا کر برف میں دفن کر دیا گیا ہے۔ میرا بکھرتا ہوا وجود پھر اپنی اصل حالت کی طرف لوٹنے لگا۔ آبِ حیات کا ایک ایک قطرہ میرے خشک حلق سے اترتا جا رہا تھا۔ میری خشک چمڑے جیسی زبان ہر قطرے کو چوس رہی تھی، جذب کرتی جا رہی تھی اور نمی کا اثر پھیلنے لگا تھا۔ یہ کرب کی ایک نئی کیفیت تھی۔ جب میرے جسم کا صحرا ایک ہی بار میں سمندر کو پی جانے کے لیے تڑپ رہا تھا لیکن برسوں کی کڑی دھوپ میں جلنے والا زر... پر بادلوں کی پھوار پڑ رہی تھی۔ آرزو کی شدت سے میرا... اینٹھنے لگا۔ دوبارہ زندگی پانے میں بھی اذیت کا دہی... لیکن اس میں میری جد وجہد کو تقدیر کی یاوری کا سہارا... پانی میں غالباً گلوکوز کی مٹھاس تھی اور ہلکی سی نمکینی... اور پانی۔" میں نے اپنے ہونٹوں سے ادا ہونے والے... کو اپنے کانوں سے سنا۔

"ہاں ہاں۔ یہ لو۔" میری آواز کا جواب آیا۔ جواب دینے والی کوئی عورت تھی۔ پھر چمچہ میرے دانتوں سے ٹکرایا... ایک چمچہ پانی میرے حلق سے اتر گیا۔ "تھوڑا تھوڑا کر کے... ایک دم نہیں۔" چمچہ کسی گلاس کے کنارے سے لگا۔

میرے بے قرار ہاتھوں نے اچانک حرکت کی اور اندھیرے میں گلاس پر قبضہ کرنا چاہا تا کہ میں سارا پانی ایک سانس میں غٹاغٹ چڑھا سکوں۔ گلاس فرش پر گرا اور پانی کے چند چھینٹے میرے چہرے تک پہنچے۔

"گرا دیا سارا پانی۔" اسی عورت نے ملامت آمیز... میں کہا۔ "میں نے تمہارے ہی فائدے کے لیے ایک بات کہی مگر تمہاری سمجھ میں نہیں آئی — اب صبر کرو۔"

"پانی... خدا کے لیے... میں پھر ایسا نہیں کروں گا۔" میں نے کراہ کے کہا اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"چھوڑو میرا ہاتھ۔" وہ ایک جھٹکا دے کر درشت لہجے میں بولی اور اپنی کلائی چھڑا لی۔ میرے ناتواں ہاتھوں میں اتنا دم ہی نہیں تھا کہ میں اپنی گرفت قائم رکھ سکتا۔ "مجھے یہاں آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ میں جا رہی ہوں۔"

"ٹھہرو، میری بات سنو۔" میں نے بڑی مشکل سے کہا۔ "مجھے یہ تو بتا دو کہ میں کہاں ہوں... تم کون ہو؟"

جواب میں میرے کانوں نے دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنی لیکن اس سے میرے گرد پھیلی ہوئی تاریکی میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ جب وہ میرے قریب تھی اور میں نے اس کے ہاتھ کو پکڑا تھا تب بھی میں اسے دیکھ نہیں سکا تھا۔ وہ فقط ایک آواز تھی۔ اندھیرے کی آواز۔ اس کی صورت کا اور اس کے پیکر کا تصور کرنا میرے لیے ناممکن تھا۔ میں نے آخری بار چلا کر اسے روکنا چاہا اور اٹھنے کی کوشش بھی کی مگر نقاہت کے باعث میں وہیں گر گیا۔ میرے ہاتھوں نے فرش کی نمی کو محسوس کیا جہاں پانی گرا تھا اور بے اختیار میں نے اس ٹھنڈک پر اپنے رخسار رکھ دیے۔ ایسا کرنے سے... اپنی بصارت کو بچانے میں کامیاب رہا۔ اگر میرا چہرہ اوپر... میری آنکھیں کھلی ہوتیں تو سوا نیزے پر یکلخت اتر آنے والے سورج کی خیرہ کن روشنی مجھے ہمیشہ کے لیے اندھا کر دیتی۔ مسلسل تاریکی میں رہنے کے بعد میری آنکھیں اس قابل نہیں تھیں کہ ہزاروں واٹ کی سرچ لائٹ سے یلغار کرنے والی روشنی کو برداشت کر سکیں۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے روشنی کسی طاقتور اور طوفانی سمندری موج کی طرح میرے جسم سے ٹکرائی ہے۔ میں اپنی جگہ پر اس طرح سمٹ گیا جیسے خطرے کا احساس ہوتے ہی کچھوا اپنے خول میں سمٹ جاتا ہے۔ میں نے چہرے کو نیچے کر لیا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اس روشنی کو روکا جو بند پلکوں سے گزر کے آنکھوں میں کرچیوں کی طرح چبھ رہی تھیں۔

"تم اس حالت میں کتنے قابلِ رحم لگ رہے ہو۔ ایک کیڑے سے بھی زیادہ حقیر اور کمزور۔" ایک آواز کی گونج نے کہا۔

"خدا کے لیے اس روشنی کو بند کر دو۔" میں چلایا۔

اس آواز کا قہقہہ میرا مذاق اڑانے لگا۔ "روشنی سے اتنا ڈرتے ہو؟ تم یقیناً تمام زندگی اسی اندھیرے میں گزارنے کے خواہش مند تو نہیں تھے۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ پھر اجالا دیکھو۔ اگر ہم چاہتے تو ایسا ہو سکتا تھا۔ تم جس اندھیرے میں تھے قبر کا اندھیرا اس سے مختلف نہیں ہوتا۔ تم کو معلوم بھی نہ ہوتا اور تمہارے وجود کو اس جگہ سے تمہاری خاک کے ابدی زنداں میں منتقل کر دیتے مگر ہم نے ایسا نہیں کیا۔"

"کیوں نہیں کیا؟" میں نے ہاتھوں کو تھوڑا سا زمین سے اوپر اٹھایا اور آہستہ سے تھوڑی سی آنکھیں کھولیں۔

"اس لیے کہ ہم تمہیں سچ بول کر اپنی زندگی بچانے کا ایک موقع دینا چاہتے تھے۔" اس آواز نے کہا۔

میں اب بھی سجدے میں پڑا ہوا تھا اور میرا چہرہ زمین کی طرف تھا۔ اس طرح کہ دونوں ہاتھوں نے دونوں جانب سے آنکھوں کو پردہ فراہم کر رکھا تھا۔ ہتھیلیاں فرش سے آدھا انچ اوپر اٹھانے سے بھی جتنی روشنی آئی اس نے مجھے پھر پلکیں بند کرنے پر مجبور کر دیا لیکن میں نے ہمت سے کام لیتے ہوئے پھر آنکھیں کھولیں۔ دونوں طرف مجھے فرش یوں نظر آیا جیسے دوپہر کا سماں۔ میری آنکھوں کی تکلیف کچھ کم ہوئی۔ جیسے میرے سوکھے ہونٹ بوند بوند پانی کے ترسے ہوئے جسم کو تھوڑا تھوڑا پانی دینا ضروری تھا ورنہ وہی آبِ حیات میرے حق میں زہر بن جاتا۔ ایسے ہی میری اجالے کو ترسی ہوئی آنکھوں کو تھوڑی تھوڑی روشنی دی جا سکتی تھی اور اس کی مقدار میں آہستہ آہستہ اضافہ کیا جا سکتا تھا۔

"میں نہیں جانتا تم مجھ سے کیا سچ جاننا چاہتے ہو۔" میں نے کہا اور ہتھیلیوں کو کچھ اور اوپر اٹھا لیا۔

"کیا تمہیں اندازہ ہے کہ موت کی جانکنی کی اذیت میں تم نے کتنا وقت گزارا؟"

"نہیں۔ لیکن مجھے اس اذیت کا اندازہ ہو گیا ہے۔" میں نے کہا اور آنکھیں کھلی رکھیں۔

"کیا دوسری بار اسی تجربے سے گزرنے کے بجائے تم موت کو قبول کر لو گے؟" اس آواز نے کہا جسے میں ابھی تک شناخت نہیں کر سکا تھا۔ وہ دلاور کی آواز بہر حال نہیں تھی۔

"مجھے معلوم ہے کہ تم مجھے مرنے نہیں دو گے۔" میں نے کہا اور ہاتھ فرش سے اٹھا لیے۔ اب میری آنکھیں روشنی کو براہِ راست تو نہیں دیکھ رہی تھیں لیکن میں فرش سے منعکس ہونے والی روشنی کو دیکھ سکتا تھا۔

"تمہارا خیال غلط نہیں ہے۔ تم سچ بولو گے۔" وہ ہنسا۔ "لیکن ہمیں جلدی نہیں ہے۔ ہم پہلے یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ تم مکمل طور پر اپنے ہوش و حواس میں آجاؤ۔ جب تمہاری ذہنی و جسمانی توانائی بحال ہو جائے گی تو تم بہتر طور پر سمجھ سکو گے کہ تمہارے لیے سچ بولنا کتنا ضروری ہے۔ اگر تم نے مزاحمت کی تو عذاب کا دوسرا دور طویل تر ہو گا اور جتنا اذیت ناک ہو گا اس کا تم ابھی تصور نہیں کر سکتے۔ اس لیے ہم تمہیں موقع دیں گے کہ تم صحیح فیصلہ کر سکو۔ تمہیں یہ غلط فہمی نہ ہو کہ تم اپنی قوتِ ارادی کے بل پر اس عذاب کو جھیلنے میں کامیاب رہے تو اگلے عذاب سے بھی گزر جاؤ گے۔ تمہاری قوتِ برداشت کے غیر معمولی ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن اسے ناقابلِ شکست تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔"

"میں جاننا چاہتا ہوں کہ تم کون ہو۔" میں نے سر اٹھا کر کہا۔

"یہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔" وہ ہنسا۔

"تم یہ تو بتا سکتے ہو کہ میں کہاں ہوں؟" میں نے کہا۔

"اس سے تمہیں کیا فرق پڑے گا، اگر میں کہہ دوں کہ تم زمین پر نہیں، آسمان پر ہو۔ اپنا پتا جان کر تمہیں کیا فائدہ ہو گا۔ تمہیں اس پتے پر کون سی ڈاک منگوانی ہے۔" وہ میرا مذاق اڑانے لگا۔ "جو بات تمہارے پوچھے بغیر میں بتا سکتا ہوں اور جو تمہارے لیے صحیح فیصلے کو آسان بنا سکتی ہے، یہ

ہے کہ میں تم کو تمہارے دوستوں کے بارے میں بتاؤں یہ کہ وہ کہاں ہیں، کس حال میں ہیں۔"

میں سانس روکے بالکل سیدھا بیٹھا رہا۔ اب میں دلوار کی طرف منہ کیئے آنکھیں کھولے اس کمرے کو جزوی طور دیکھ سکتا تھا جس میں مجھ پر ستم کی طویل سیاہ رات گزری تھی۔ میری آنکھیں روشنی کی عادی ہو رہی تھیں لیکن میں براہِ راست اس اندھا کر دینے والی روشنی کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھا جو میرے پیچھے والی دیوار پر نصب تھی۔ کمرے کی دیواروں کا رنگ بالکل سیاہ تھا۔ میرے مقابل کی دیوار شاید دس فٹ لمبی تھی۔ دائیں اور بائیں ہاتھ کی دیواریں آٹھ فٹ کی تھیں مگر سب پر جیسے تارکول مل دیا گیا تھا۔ اس سیہ خانے کی چھت بھی اندھیری رات کے آسمان سے زیادہ سیاہ تھی، چنانچہ میں فرض کر سکتا تھا کہ پیچھے والی دیوار اور اس کمرے کے واحد دروازے کا رنگ بھی کالا ہوگا۔ انتہا یہ تھی کہ کمرے کے فرش پر بھی کالک مل دی گئی تھی۔ اس پورے منظر میں جو میری نظروں میں تھا کہیں کوئی در، یا دریچہ، کوئی روزن یا روشندان نہ تھا جس سے روشنی یا ہوا کا گزر ممکن ہوتا۔ پھر بھی کمرے میں نہ حبس تھا اور نہ گھٹن تھی۔ اس میں یقیناً ہوا کو گردش میں رکھنے کا کوئی نظام پوشیدہ تھا۔

"ابھی تم آرام کرو۔" اس آواز نے مجھے چونکا دیا۔ "کچھ کھاؤ پیو اور سوچو۔ سوچنے کے لیے تمہارے پاس بہت اچھا دماغ ہے اور تم اپنے علاوہ دوسروں کے بارے میں سوچ سکتے ہو۔ تم امکانات پر غور کر سکتے ہو۔ مثلاً تم رابعہ اور محسن کے متعلق سوچو کہ اگر وہ بھی ہماری تحویل میں ہوئے تو کہاں ہوں گے؟ کیا ان کے ساتھ بھی وہی ہوا ہوگا جو تمہارے ساتھ ہوا۔ کیا ان میں بھی اتنی ہی مزاحمت کی صلاحیت ہے جتنی تم میں ہے؟ اور اگر ہم نے تمہارے بعد ان سے سچ معلوم کرنے کی کوشش کی تو کیا ان کے ساتھ ہونے والی زیادتی کے ذمّے دار تم ہوں گے۔ تم انہیں بچا سکتے ہو یا بہادروں کی طرح جان دے سکتے ہو اور اپنا عذاب منتقل کر سکتے ہو۔ تمہارے بعد محسن، اس کے بعد رابعہ پھر وہ احمق جو دُم چھلے کی طرح تمہارے ساتھ لگا پھرتا ہے۔ خواجہ نیک محمد عرف خوجی عرف استاد ٹیڈی۔"

میں سوچ رہا تھا کہ ان حالات میں مجھے کس قسم کے ردِعمل کا مظاہرہ کرنا چاہیے کہ اسی وقت روشنی مدھم ہونے لگی۔ آہستہ آہستہ۔ یوں جیسے آفتاب غروب ہوتا ہے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ کیا وہ اعصاب شکن اندھیرا پھر ایک لامحدود رات کی صورت میں نازل ہو رہا ہے۔ میں نے ڈوبتے دل کے ساتھ سوچا۔ وہ روشنی چھت کے اور دیوار کے سنگم پر نصب تھی اور اب ایک دہکتے سرخ انگارے کی طرح تھی۔ پھر یہ انگارہ بھی بجھنے لگا اور ایک بار پھر میری آنکھیں اس سیاہ دلواروں والے زنداں میں بھٹکنے لگیں۔

"تم کیا جاننا چاہتے ہو؟" میں چلّایا لیکن ابھی کمزوری کا اثر باقی تھا۔ تھوڑے سے گلوکوز اور نمک ملے ہوئے پانی سے میری طاقت گویائی ضرور بحال ہوگئی تھی مگر میں جسمانی توانائی سے محروم تھا۔ میری سانس پھول گئی اور میں یوں ہانپنے لگا جیسے سخت مشقت نے مجھے نڈھال کر دیا ہو۔ میری آواز کا جواب کسی نے نہیں دیا۔ پھر میں نے دروازہ کھلنے کی آواز سنی اور اٹھ کر بھاگا۔ نہ جانے مجھ میں ایک دم اتنی طاقت کہاں سے آگئی تھی۔ میں پوری قوت کے ساتھ بند دروازے سے ٹکرایا اور نیچے گر گیا۔ کمرے کے اندر ہی کوئی قہقہہ مار کے ہنسا۔

"زیادہ چوٹ تو نہیں آئی ہیرو؟" وہ بولا اور میں نے اس آواز کو پہچان لیا۔ یہ وہی شخص تھا جو مجھ سے کسی خفیہ لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے بات کر رہا تھا۔ اب میری نگاہیں اسے دیکھنے سے قاصر تھیں جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ بھی اس سیاہ کمرے میں سر سے پیر تک سیاہ لباس پہن کر آیا ہے۔

"تم مجھے نہیں دیکھ سکتے۔ لیکن میں تم کو دیکھ رہا ہوں۔" وہ بولا۔ "کیونکہ میں نے مخصوص عدسوں والی عینک لگا رکھی ہے۔"

میں مخصوص عدسوں کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ وہ انفرا ریڈ شعاعوں کی مدد سے اندھیرے میں فوٹو گرافی کرنے والے کیمروں میں بھی استعمال ہوتے تھے۔

"میں تمہارے لیے کچھ کھانے پینے کا سامان لایا ہوں۔" وہ بولا اور اس مرتبہ آواز دوسری سمت سے آئی۔ وہ محتاط تھا کہ کہیں میں آواز کی سمت کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس پر حملہ نہ کر دوں۔

"تم کو جو کچھ پوچھنا ہے پوچھ کیوں نہیں لیتے؟" میں نے بڑی مشکل سے خود کو اٹھایا۔

"ہمیں اس کی جلدی نہیں ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ تم کو سوچنے سمجھنے کا موقع دیا جائے۔" وہ بولا۔ "اب تم دروازے کے سامنے سے ہٹ جاؤ تاکہ میں باہر چلا جاؤں۔"

"ہٹ کر کدھر جاؤں جب کہ میں کچھ دیکھ ہی نہیں سکتا۔"

وہ ہنسا۔ "ناک کی سیدھ میں روانہ ہو جاؤ۔" میں نے کہا۔ "میں تمہیں دیوار تک پہنچنے سے پہلے روک لوں گا۔" وہ دوسری طرف سے بولا۔

میں آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ وہ چالاک آدمی آسانی سے قابو میں آنے والا نہیں تھا۔

"میرا مشورہ ہے کہ سوپ تھوڑا تھوڑا کر کے پینا اور اسی طرح پانی بھی۔" وہ دروازے کی سمت آگیا۔ "ابھی میرے جانے کے بعد اتنی روشنی کر دی جائے گی کہ تم یہ چیزیں دیکھ سکو گے۔ فی الحال تمہیں بہت زیادہ تو کچھ بھی نہیں دیا جا سکتا مگر وقفے وقفے سے اشیائے خور و نوش کی فراہمی جاری رہے گی۔"

دروازہ بند ہونے کی آواز کے ساتھ ہی روشنی لوٹ آئی مگر اس بار میری آنکھیں خیرہ نہیں ہوئیں۔ میں نے کمرے کے ایک گوشے میں دو پیالے فرش پر رکھے ہوئے دیکھے۔ بظاہر دونوں میں پانی ہی نظر آتا تھا لیکن ایک میں گرم اور نمکین سوپ تھا۔ اسے میں نے ضبط سے کام لیتے ہوئے چمچے کی مدد سے پینا شروع کیا۔ درمیان میں وقفے وقفے سے میں پانی کے گھونٹ بھی لیتا رہا۔ ابھی میں اپنی آزادی کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کچھ کرنے کے قابل ہونے کے لیے میرا ذہنی و جسمانی طور پر کسی قابل ہونا ضروری تھا۔ چنانچہ میں نے بلاوجہ عقل کے کمزور گھوڑوں کو بحرِ ظلمات میں دوڑانے سے گریز کیا۔ معلوم نہیں اس پیالے کے سوپ میں کیا تھا کہ میری کھوئی ہوئی طاقت تیزی سے بحال ہونے لگی لیکن ابھی اس لنچ یا ڈنر سے فارغ ہوئے مجھے دس منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔

میں سو کر اٹھا تو مجھے اسی جگہ دونوں خالی پیالوں کی جگہ دو بھرے ہوئے پیالے نظر آئے۔ اس مرتبہ میں ضبط سے کام نہ لے سکا اور ندیدوں کی طرح سوپ پر ٹوٹ پڑا۔ یہ سوپ زیادہ گاڑھا تھا۔ اسے میں نے چمچے سے کچھ پیا اور کچھ کھایا پھر پانی سے بھرا ہوا پیالہ حلق میں انڈیلا اور خود کو بہت بہتر محسوس کیا۔ نیند نے دوسری بار مجھے دس منٹ میں آلیا۔ سونے سے پہلے مجھے خیال آیا کہ خوراک میں مجھے خواب آور یا ذہن کو سُن کرنے والی کوئی دوا دی جا رہی ہے۔ سوپ کے ذائقے سے کچھ پتا نہیں چل سکتا تھا۔ پانی کا ذائقہ مجھے عجیب سا لگا تھا۔ میں پھر سو کر اٹھا تو وہ پیالے اسی طرح بھرے ہوئے رکھے تھے۔ یہ سلسلہ، رطاعجب اور طلسماتی کھیل لگتا تھا۔ بالکل کسی جادوئی کہانی کی طرح۔ میں کسی دیو کی قید میں تھا اور وہ جگہ جہاں مجھے قید کیا گیا تھا خیالوں کی سرحد سے بھی دور تھی جہاں کوئی پرندہ پر نہیں مار سکتا تھا۔ وہ جب چاہتا تھا مجھے سلا دیتا تھا اور میری نیند کے دوران میں کوئی دو خالی پیالے اٹھا کے بھرے ہوئے پیالے رکھ جاتا تھا اور ان پیالوں میں جو کچھ ہوتا تھا وہ نہ میں نے پہلے چکھا تھا اور نہ دیکھا تھا۔

بھوک محسوس کرنے کے باوجود میں نے کھانے کی طرف نظر اٹھا کے نہیں دیکھا۔ اب میں اس قابل ہوگیا تھا کہ سوچ سکوں۔ کمرے میں وہی ایک لائٹ اس چراغ کی طرح جل رہی تھی جس کی لَو انتہائی کم کر دی گئی ہو۔ یہی لائٹ تیز ہوتی تھی تو اس کی طرف دیکھنا ناممکن ہو جاتا تھا۔ مجھے اس شخص کا خیال آیا جو مجھ سے لاؤڈ اسپیکر پر مخاطب تھا اور بعد میں کمرے کے اندر آکر مجھ سے باتیں کرتا رہا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ اندھیرے میں دیکھ سکتا ہے۔ اس نے خاص قسم کے شیشوں والی عینک کا ذکر بھی کیا تھا۔ وہ مجھے انفرا ریڈ یا الٹرا وائلٹ شعاعوں کی روشنی میں دیکھ رہا تھا۔ سورج کی روشنی کے سات رنگ ہوتے ہیں مگر ان میں بھی یہ شعاعیں انسانی آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔ مخصوص کیمرے اس روشنی کو دیکھ لیتے ہیں اور ایسی فلمیں بھی ہوتی ہیں جن پر ان شعاعوں سے تصویر اتاری جا سکتی ہے۔ ریموٹ کنٹرول والے آلات انہی شعاعوں سے کام کرتے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس وقت اندھیرے میں وہ مخصوص قسم کی روشنی کس طرف سے آرہی تھی جسے میری آنکھ نہیں دیکھ سکتی تھی؟

میں نے دلوار کا اور چھت کا بغور معائنہ کیا۔ دیواریں بالکل سپاٹ تھیں اور دروازے میں بھی کوئی درز تک نہ تھی۔ اگر اس مخصوص روشنی کی صرف ایک لکیر ہوتی یا وہ کسی محدود دائرے میں پڑتی تو وہ شخص مجھے پورے کمرے میں چلتا پھرتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ روشنی پورے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے چھت میں نصب واحد لائٹ کے عین نیچے جا کر دیکھا۔ یہ تقریباً ایک فٹ لمبی اور آٹھ انچ چوڑی چوکور لائٹ تھی جس کے اوپر روشنی کو تیز کرنے والا عدسہ لگا ہوا تھا لیکن عدسہ پوری لائٹ کے فریم پر نہیں پھیلا ہوا تھا۔ ایک طرف تقریباً تین انچ چوڑی پٹی میں لکیریں سی نظر آرہی تھیں۔ ان لکیروں کے پیچھے اسپیکر تھا۔ لائٹ دیوار میں جُڑی ہوئی تھی اور ایسے زاویے پر لگائی گئی تھی کہ روشنی سامنے کے حصّے میں پورے کمرے کو روشن کر دے۔ اس وقت بھی روشنی

ہر حصے میں پہنچ رہی تھی، سوائے اس جگہ کے جو لائٹ کے بالکل نیچے تھی۔ چراغ تلے اندھیرا والی بات تھی مگر اندھیرا وہیں تھا جہاں دروازہ تھا۔ اگر میں اس جگہ کھڑا ہو جاتا تو دروازہ نہ کھلتا اور انہیں فوراً معلوم ہو جاتا کہ میں دروازے کے پیچھے موجود ہوں۔

پھر میرے ذہن میں یکے بعد دیگرے دو خیال آئے۔ ایک یہ کہ جب روشنی تیز ہوتی ہے تو اسی میں پوشیدہ کیمرے کا لینس ایک سو اسّی درجے کے زاویے پر کمرے کو فوکس کرتا ہے چنانچہ جب وہ مجھ سے بات کر رہا تھا تو کسی ٹی وی اسکرین پر میری تصویر بھی دیکھ رہا تھا۔ ابھی یہ لائٹ عام قسم کی روشنی تھی۔ اتنی کم روشنی میں کلوز سرکٹ کیمرا کام نہیں کر سکتا تھا۔ دوسرا خیال زیادہ حوصلہ افزا تھا۔ وہ مخصوص رنگ کی روشنی جس میں کیمرا تاریک محسوس ہوتا تھا اُسی سرچ لائٹ سے خارج ہوتی ہوگی۔ گویا اس ایک سرچ لائٹ کے تین فنکشن تھے۔ اس وقت یہ ایک بلب کی طرح جل رہی تھی۔ اگر یہ تیز ہو جاتی تو کلوز سرکٹ کیمرے کی فلیش گن کا کام کرتی اور بند ہو جاتی تو اسی سے وہ مخصوص روشنی خارج ہونے لگتی جو نظر نہیں آتی۔

یہ دریافت کر کے مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ میں نے کمرے کا دوبارہ جائزہ لیا اور اسی نتیجے پر پہنچا کہ اس زنداں کا سارا جادو ایک لائٹ میں پوشیدہ ہے۔ اگر میں اس کا شیشہ توڑ سکتا تو شاید اس کے امکان پر غور بھی کرتا مگر میں خالی ہاتھ تھا۔ میرے پاس صرف چینی کے دو پیالے تھے۔ اگر وہ میں لائٹ پر کھینچ مارتا تو لائٹ کا کچھ نہ بگڑتا اور دونوں پیالے ٹوٹ جاتے کیونکہ لائٹ کے اوپر لوہے کی حفاظتی جالی بھی تھی۔ اس کے علاوہ لائٹ کے ٹوٹتے ہی انہیں معلوم ہو جاتا اور وہ مسلح ہو کر آ پہنچتے۔ میرے پاس سوچنے کی مہلت کم تھی۔ اصولاً جاگنے کے بعد مجھے کھانے کی طرف رجوع کرنا چاہیے تھا اور میں بھوک محسوس بھی کر رہا تھا مگر میں اس من و سلویٰ کو کھا پی لیتا تو پھر سو جاتا جبکہ میں ذہنی و جسمانی طور پر بہت مستعد اور فعال محسوس کر رہا تھا اور اس زنداں سے نکلنے کی کوئی صورت پیدا کرنے پر آمادہ تھا۔ رابعہ اور محسن کے خیال کو میں نے پیچھے دھکیل دیا تھا کیونکہ ان کے بارے میں سوچنے سے ذہن میں مایوسی اور انتشار کی کیفیت پیدا ہوتی تھی۔ اس سے صرف حوصلہ پست ہوتا تھا۔ عمل کی قوت کا منفی ردِ عمل سے دوچار ہونا بہت نقصان دہ تھا۔ میرے لیے یہ بہت ضروری تھا کہ پہلے خود آزادی حاصل کر دوں اور پھر دوسروں کے متعلق... ممکن ہے شکاری صرف مجھے گرفتار کر کے لانے میں ... ہوئے ہوں لیکن دوسرے بھی ان کی قید میں ہیں تو ... قیدی کی حیثیت سے میں ان کی رہائی کے لیے کچھ ... تب بھی نہیں کر سکتا۔

ترکیب فوراً میرے ذہن میں آگئی۔ میں نے کھانے کے پیالے کو اٹھایا اور فرش پر کم سے کم جگہ پر پھیلا دیا۔ ... اندازہ تھا کہ خواب آور دوا پانی میں ہے مگر یہ اندازہ غلط بھی ہو سکتا تھا چنانچہ میں نے کوئی رسک نہیں لیا۔ ... پیالہ پانی بہت زیادہ نہیں تھا۔ میں نے اسے اور ... کے اپنے کپڑوں کو بھگو لیا اور زمین پر نہیں گرنے دیا ... پیالوں کو اپنی جگہ پر رکھ کے میں عین اسی جگہ پر لیٹ ... جہاں میں نے کھانے کا پیالہ خالی کیا تھا۔ گاڑھا سوپ میرے کپڑوں کے نیچے آگیا۔ میں نے لائٹ کی طرف پشت رکھی اور اپنے بھیگے ہوئے کپڑوں کے علاوہ فرش پر گوند کی طرح چپکنے والے سوپ کو روشنی سے محفوظ رکھنے میں کامیاب رہا۔ مجھے یقین تھا کہ اندر آ کے خالی پیالے لے جانے اور دو خوراک سے بھرے ہوئے پیالے چھوڑ جانے والا ... وقت میں آتا ہوگا جب دیکھنے والے کیمرے کی آنکھ سے مجھے نیند میں مدہوش دیکھ لیتے ہوں گے۔ اگر لائٹ تیز ہو گئی تو میرے خیال کی تصدیق ہو جائے گی۔ میں نے سوچا اور اسی پوز میں بے حس و حرکت پڑا رہا۔

اسی وقت کمرا روشنی سے جگمگانے لگا۔ اگرچہ سیاہ دیوار، چھت اور فرش روشنی کو جذب کر رہے تھے مگر میری آنکھیں اس کی چکاچوند کو محسوس کر سکتی تھیں۔ میں نے پلٹ کر دیکھنے سے گریز کیا اور آنکھیں بند کیے لیٹا رہا۔ یقیناً اس وقت وہ مشاہدہ کر رہے ہوں گے کہ ان کی دی ہوئی خوراک کے زیرِ اثر میں پھر خوابِ غفلت میں کھو گیا ہوں یا نہیں۔ آخر ان کا مقصد کیا تھا؟ اگر میں اسی طرح سوتا جاگتا رہتا تو میرے ذہن پر کیا اثرات مرتب ہوتے؟ ایک صلاحیت سے تو میں اب بھی محروم ہو چکا تھا یعنی وقت میرے احساس کی گرفت سے نکل چکا تھا۔ مجھے بالکل معلوم نہیں تھا کہ اس وقت دن ہے یا رات، آج پیر ہے یا منگل ہے۔ کی کون سی تاریخ ہے اور میں اس قید خانے میں کتنے دن گزار چکا ہوں۔

روشنی اچانک کم ہوئی اور میرا دل دھڑکا۔ وہ لوگ مجھے بے حس پا کے مطمئن ہو گئے تھے۔ اب کوئی نہ کوئی آنے والا

تھا۔ کب اور کتنی دیر میں، میں اس کا اندازہ نہیں کر سکتا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ آنے والا مسلح ہو یا جسمانی طور پر اتنا طاقت ور حریف ثابت ہو کہ میں اس پر غالب نہ آ سکوں۔

"سکندر! کیا تم اس وقت جاگ رہے ہو؟" لاؤڈ اسپیکر نے کہا۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"تم اس آواز کو سن سکتے ہو سکندر۔" وہ بولا۔ "تمہارا جسم سویا ہوا ہے لیکن تمہارا ذہن بیدار ہے۔ تم اپنی مرضی سے ایک انگلی بھی نہیں ہلا سکتے کیونکہ تمہارے دماغ کا تمہارے جسم پر کوئی کنٹرول نہیں ہے۔"

وہ بہت عجیب باتیں کر رہا تھا اور میں اس کے مفروضات کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔

"تم صرف وہی کر سکتے ہو جس کا تمہیں حکم دیا جائے۔" وہ بولا۔ "تمہارے اور میرے درمیان عامل و معمول کا رشتہ ہے۔ تم معمول ہو اور میں عامل ہوں۔ تم میری آواز کے تابع ہو۔"

میں نے خاموشی سے اس کی یکطرفہ بکواس سننا جاری رکھا۔ ابھی تک اس نے صرف میری کیفیت بیان کی تھی۔ مجھے کوئی حکم نہیں دیا تھا۔ آخر وہ کون تھا؟ کوئی مسمریزم کا ماہر یا ماہرِ نفسیات، جادوگر یا عامل؟

"میں نے تم کو ہپناٹائز کر کے سونے پر مجبور کر دیا ہے۔ تمہارا دماغ اس نیند سے نجات نہیں پا سکتا۔ تم اگر جاگنا چاہو تب بھی نہیں جاگ سکتے۔ تمہاری ذہنی اور جسمانی مزاحمت کی قوت بالکل ختم ہو گئی ہے۔ جو دوا تم کو دی گئی تھی اس نے تمہارے شعور کو سُلا دیا ہے لیکن تمہارا لاشعور جاگ رہا ہے سکندر بخت۔ یہی وجہ ہے کہ تم میری آواز سن رہے ہو اور ایک ایک لفظ کو سمجھ رہے ہو۔ سمجھ رہے ہو نا۔"

"ہاں..... میں..... سن رہا ہوں۔" میں نے نیند میں ڈوبی ہوئی بوجھل اور بھاری آواز میں رک رک کر جواب دیا۔

"جب تم خواب دیکھتے ہو تو بہت کچھ کرتے ہو۔" وہ بولا۔ "تم دوسروں سے باتیں کرتے ہو اور دوسرے بھی تم سے بہت کچھ کہتے ہیں۔ بعض اوقات آنکھ کھلنے کے بعد تمہیں سب یاد آ جاتا ہے لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بہت کوشش کرنے کے باوجود تم کو خواب یاد نہیں آتا۔ تم سمجھتے ہو کہ گزشتہ رات تم نے خواب دیکھا ہی نہیں تھا۔ بات یہ نہیں ہوتی۔ تمہارا ذہن سوتے میں کوئی کام نہیں کرتا۔ سارا کام لاشعور کرتا ہے۔ وہ بہت سی باتیں خواب بنا کے دکھاتا ہے۔ اور ان میں سے کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کو بھلائے رکھنا تمہارے حق میں بہتر ہوتا ہے۔ کیا یہ بات تم نے سمجھ لی؟"

"ہاں.... تم غلط کیسے کہہ سکتے ہو۔ یقیناً ایسا ہی ہوتا ہے۔" میں نے اسی بدلی ہوئی آواز میں جواب دیا اور یہ ثابت کیا کہ ایک مکمل طور پر مطیع ہو جانے والے معمول کی طرح میرا اپنے عامل پر اعتقاد کتنا راسخ ہو چکا ہے۔

"ویری گڈ۔" وہ میرے جواب سے خوش ہوا۔ "تم کو یہ بھی سمجھنا ہوگا سکندر کہ اس وقت بھی تم مجھ سے خواب میں ہمکلام ہو۔ جب تم جاگو گے تو تمہیں کوئی بات یاد نہیں رہے گی۔ اسی میں تمہارا فائدہ ہے۔ تم خود کو ذہنی پریشانی سے بچاؤ گے سکندر اور مجھ سے تعاون کرو گے۔ اگر تم نے تعاون نہ کیا تو رابعہ بڑی مشکل میں پڑ جائے گی۔ اس کی موت انتہائی پُر اذیت ہوگی۔ تم اس کی موت کا منظر دیکھو گے تو پاگل ہو جاؤ گے۔"

"خدا کے لیے رابعہ کو چھوڑ دو۔ تم اس کی سزا مجھے دینا چاہو تو دے لو۔" میں نے کہا۔

"تم واقعی رابعہ سے بہت محبت کرتے ہو۔ کیا اس کی خاطر تم سچ بولو گے؟"

"میں سچ بولوں گا۔ کیا اس کے بعد تم رابعہ کو چھوڑ دو گے؟" میں نے کہا۔

"ابھی میں کوئی وعدہ نہیں کر سکتا۔" وہ بولا۔ "مجھے تمہارے سچ پر اعتبار آ گیا تو اسے چھوڑ دیا جائے گا۔"

"تم مجھ سے کیا معلوم کرنا چاہتے ہو؟"

"کیا تمہیں چوہدری دلاور اور اس کے ساتھیوں کے کاروبار کی اصل نوعیت کا علم ہے؟" وہ بولا۔

"ہاں، مجھے سب معلوم ہے۔"

"تمہارے علاوہ رابعہ اور محسن کو بھی معلوم ہے؟" وہ بولا۔

"ہم سب جانتے ہیں۔ جو بات ایک کو معلوم ہو وہ سب کو معلوم ہوتی ہے۔"

"تمہارے خیال میں چوہدری دلاور اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر کیا غیر قانونی کام کر رہا ہے؟" وہ بولا۔

"وہ منشیات کی اسمگلنگ کرتا ہے۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو سکندر۔ تم اصل بات نہیں بتا رہے ہو۔" وہ بولا۔

"میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں۔" میں نے کہا

"ہیروئن کے پیکٹ میرے پاس ہیں۔"

"یہ پیکٹ تمہیں کس طرح ملے تھے؟" وہ بولا۔

"گامے ماچھی کے اڈے سے۔" میں نے کہا۔ "وہ ایک جعلی پیر ہے اور مارا جا چکا ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے اسی کی خانقاہ کے تہ خانے سے یہ پیکٹ ملے تھے۔"

"تم وہاں کیوں گئے تھے؟"

"یہی دیکھنے کے لیے کہ کیا واقعی وہاں کے تہ خانوں سے ہیروئن باہر بھیجی جاتی ہے۔" میں نے کہا۔

"تم کو یہ کس نے بتایا تھا کہ وہ تہ خانے ہیروئن کے گودام ہیں؟"

"مجھے مختلف ذرائع سے اطلاعات ملتی رہی تھیں۔" میں نے کہا۔ "جب میں انگلینڈ میں زیرِ تعلیم تھا تو..."

"تو کیا سکندر؟" وہ بولا۔ "کیا تمہارے والد نے تم کو کچھ بتایا تھا؟"

"ہاں۔ انہوں نے اپنا شک ظاہر کیا تھا۔ خط لکھ کر۔"

"تم پھر جھوٹ بول رہے ہو سکندر۔" وہ بولا۔ "ہمیں ان کا ایسا کوئی خط نہیں ملا تھا۔"

"ان کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے میں نے اس خط کو فوراً جلا دیا تھا۔"

"اس کے علاوہ تمہیں کس نے بتایا تھا؟" وہ بولا۔

"بہت سے لوگ تھے۔ ایک اکاؤنٹنٹ تھا غلام علی۔" میں نے کہا۔ "وہ بس کے حادثے کا شکار ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے منشی فوبانچو نے اطلاع دی تھی۔ پھر میں نے ڈی سلوا کی گاڑی میں لاکھوں روپے کی ہیروئن دیکھی تھی۔"

"ایسا نہیں ہو سکتا سکندر۔" میری غلط بیانی نے اسے کنفیوز کر دیا تھا۔ "وہ گاڑی کسی اور کی ہو گی۔"

"ڈی سلوا کا گھر بھی ہیروئن کی اسمگلنگ کا ایک ٹھکانا تھا۔" میں نے کہا۔ "میں نے اپنی آنکھوں سے وہاں گاڑیوں کی ڈکی میں ہیروئن بھری ہوئی دیکھی تھی۔"

"کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ ہیروئن تھی؟" وہ ڈی سلوا کے بارے میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ در پردہ اس نے دوسرا کاروبار بھی شروع کر رکھا تھا جس کی خبر دلاور کو بھی نہیں تھی۔

"میں ہیروئن کو اچھی طرح پہچانتا ہوں۔"

"اور وہ لوگ کون تھے جو ڈی سلوا سے ہیروئن لے جاتے تھے؟" وہ بولا۔

"میں ان میں سے کسی کو نہیں جانتا۔ اگر وہ ڈی سلوا حادثے کا شکار نہ ہوتا تو میں اس سے سب کے نام پوچھ لیتا۔" میں نے کہا۔ "وہ مجھ سے اسی لیے خوفزدہ رہتا تھا کہ میں سب کچھ جان چکا تھا۔"

"کیا تم نے ان گاڑیوں کے نمبر نوٹ کر لیے تھے؟" وہ بولا۔

"کیے تو تھے مگر پھر ایک نوٹ بک میں لکھ لیے تھے۔ میرا خیال تھا کہ وہ بوگس ہوں گے۔" میں نے کہا۔

"ڈی سلوا کی کار کی ڈکی میں کتنی ہیروئن تھی، کتنا وزن تھا اور وہ ہیروئن کہاں گئی؟" وہ بولا۔

"مجھے معلوم نہیں۔" میں نے کہا۔ "ہو سکتا ہے وہ پولیس لے گئی ہو۔ وزن کا بھی مجھے صحیح اندازہ نہیں۔ بہت سی تھیلیاں تھیں۔ پانچ سو گرام اور ایک کلو کی۔"

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ گامے شاہ کے اڈے سے ہیروئن کہاں جاتی تھی؟" وہ بولا۔

"مجھے ابھی تک صرف یہ پتا چلا ہے کہ ہیروئن کراچی پہنچائی جاتی تھی۔"

"تم ان لوگوں سے بھی واقف ہو جو یہ کام کرتے تھے؟" وہ بولا۔

"مجھے طافو نے کچھ نام بتائے تھے۔ جو ڈی سلوا کے ایجنٹ تھے۔" میں نے کہا۔ "مگر طافو مارا گیا۔"

"وہ کیا نام تھے؟ تم کو ان کا پتا بھی معلوم ہو گا؟"

"نہیں۔ اس نے کہا تھا کہ یہ سب لوگ اڈے پر پہنچ کر ٹرک سے اپنا اپنا مال پہچان کے ساتھ وصول کرتے تھے۔ ایک لالو کھیت کا بالو مستری تھا۔ دوسرا لیاری کا شاہ محمد اور ایک قصبہ کالونی کا ہزار خان تھا۔" میرا جھوٹ اسے یقیناً مطمئن کر رہا ہو گا۔

"تمہیں یاد ہے کہ تم نے ایک ٹرک تباہ کر دیا تھا۔ اس میں تو ایسی کوئی بھی چیز نہیں تھی۔" وہ بولا۔

"اس میں ڈی سلوا نے اپنا مال گھر سے رکھوایا تھا۔ رحمت کباڑی اس کا ایجنٹ تھا۔" میں نے کہا۔ "رحمت کباڑی نے مرنے سے پہلے تسلیم کر لیا تھا کہ وہ دلاور کے علاوہ ڈی سلوا کے لیے بھی کام کرتا تھا اور دونوں کے مال کا ذمے دار تھا۔ اس نے کبھی دلاور کو معلوم نہیں ہونے دیا تھا کہ چوری چھپے ڈی سلوا اپنا کاروبار بھی کرتا ہے۔ رحمت کباڑی کو دونوں طرف سے فائدہ تھا۔"

"یہ اس نے تم کو خود بتایا تھا؟"

"وہاں آسانی سے تو نہیں بتایا تھا۔ شرافت سے بتا دیتا تو مارا کیوں جاتا۔" میں نے کہا۔

"تم جھوٹ بول کے مجھے بے وقوف تو نہیں بنا رہے ہو سکندر؟ میں نے تمہیں بتا دیا تھا کہ اس کا نتیجہ تمہارے حق میں بہت برا ہو گا۔" وہ بولا۔ "تم سے زیادہ رابعہ کو اس کی سزا بھگتنا پڑے گی۔"

"میں رابعہ کی قسم کھا کے کہہ سکتا ہوں کہ میں جو کچھ بتا رہا ہوں وہ سچ ہے۔" میں نے کرب زدہ لہجے میں کہا۔ میں نے رابعہ کی جھوٹی قسم کھائی تھی مگر میرے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔ ایسے مخصوص حالات میں جہاں زندگی کو خطرہ لاحق ہو، مذہب نے بھی حرام و حلال کے فرق کو نظر انداز کرنے کی اجازت دی ہے۔ میرا مقصد اپنی حفاظت تھا اور رابعہ کو بچانا تھا اور اس کے لیے دشمنوں کو اپنے سچ کا یقین دلانا ضروری تھا۔ جتنا جھوٹ میں نے بولا تھا اس کو بھی گناہ نہیں سمجھا جا سکتا تھا کیونکہ اس کے بغیر نجات کی توقع عبث ہوتی۔ میں نے بہت سے جھوٹ ان سے بھی منسوب کیے تھے جو اب دنیا میں نہیں تھے اور ان کے اعمال کا حساب قدرت کے سپرد ہو چکا تھا۔ تاہم یہ بھی دشمن کے خلاف فنا و بقا کی جنگ کا ایک حصہ تھا اور میرے کسی فعل کو بدنیتی پر مبنی قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔

"اگر تم یہ بات معلوم کرنے میں کامیاب ہو جاتے کہ گامے ماچھی نے پیری فقیری کی آڑ میں ہیروئن کا دھندا چلا رکھا ہے...؟"

"مجھے یہ بات معلوم تھی۔ اور یہ ثابت بھی ہو گیا تھا۔"

"اس کے بعد تم کیا کرتے؟" وہ بولا۔

"میں معلوم کرتا کہ کراچی میں کون کون لوگ اس کاروبار میں ملوث ہیں۔ پھر ہم پولیس کو بلا لیتے۔"

"تم خود پولیس کو کیسے بلا سکتے تھے۔ سب سے پہلے تم خود پکڑے جاتے۔" وہ بولا۔

"میں انکل رضوی کو بتاتا تو وہ مجھ پر یقین کرتے۔" میں نے کہا۔ "میں یہ نہ بتاتا کہ کہاں سے بول رہا ہوں۔ اس کے علاوہ ہمارا ایک دوست عبدالودود منظر ایڈووکیٹ بھی ہے۔ سپرنٹنڈنٹ بھی دیر نہ کرتا خواہ کال گمنام ہوتی۔"

"یہ تم نے اچھا نہیں کیا سکندر۔" وہ بولا۔ "یہ کاروبار ہمیشہ ہی چلتا تھا اور تمہارے والد کی مخالفت کے باوجود چلتا رہا۔ نقصان کسے ہوا؟ تم نے اتنی پریشانی اور مصیبت اٹھا کے یہ بات معلوم کر لی تو کون سا تیر مار لیا۔ مجرم تم ہی بنے اور جو کچھ تمہارے پاس تھا وہ سب تم نے گنوا دیا۔ کیا تم نہیں جانتے تھے کہ دلاور جب ہیروئن اسمگل کرتا ہے تو اس کاروبار میں اکیلا نہیں ہے۔ اس کے مددگار ایک سرے سے دوسرے سرے تک موجود ہیں جو منافع میں برابر کے شریک ہیں۔ ان میں پولیس بھی ہے جو ابھی کچھ دیر میں یہاں آئے گی اور تم کو سوتے میں اٹھا کے لے جائے گی۔ تم پر چوری، ڈکیتی ——— اغوا اور قتل کے کتنے مقدمات ہیں! کیا ان سب کی سزا پھانسی سے کم ہو سکتی ہے؟"

"مجرم تم لوگ ہو۔ جب تک میں زندہ ہوں تمہارے خلاف لڑتا رہوں گا۔" میں نے کہا اور بہت اطمینان کا سانس لیا کہ اپنی کوشش سے بالآخر ایک جھوٹ کو سچ بنانے میں کامیاب رہا۔ اب میرے دشمنوں کو یقین تھا کہ مجھے ان کے اصل کاروبار کا علم نہیں اور میں اسلحے کی خرید و فروخت کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔ ان کے لیے یہ ایک اچھا انکشاف تھا کہ مجھے ڈی سلوا کی وجہ سے ہیروئن کے کاروبار کا پتا چلا اور میں غلط راہ پر چل پڑا۔ ڈی سلوا نے دلاور کے اعتماد کا ناجائز فائدہ اٹھایا تھا اور اپنا کاروبار الگ چلا کے اچھا نہیں کیا تھا۔ اگر اس کی زندگی میں یہ بات دلاور کو معلوم ہو جاتی تو ڈی سلوا بہت پہلے مارا جاتا۔ اس کے مرنے کے بعد اس کی ذات سے منسوب ایک برائی کا انکشاف ہو رہا تھا مگر وہ سزا کی حد پار کر چکا تھا اور اس کی خرابی اس لیے قابلِ معافی ہو گئی تھی کہ اسی کی وجہ سے ہمارے شکوک و شبہات کی بنیاد غلط ہو گئی تھی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ میری کوشش رائیگاں نہیں گئی اور فوری طور پر دشمن مطمئن ہو گئے ہیں کہ ان احمقوں سے کوئی خطرہ نہیں جو بزعمِ خود بڑے تیس مار خاں اور سراغرساں بنے پھرتے ہیں۔

تشویش کی بات میرے لیے یہ تھی کہ وہ مجھے پولیس کے سپرد کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ اپنی تفتیش مکمل کرنے کے بعد وہ یہاں سے نکل جائیں گے اور پولیس کو میرے بارے میں بتا دیں گے۔ پولیس بھی تو انہی کی ہے اور ان سے زیادہ میری دشمن ہے۔ لائٹ ایک دم بہت کم ہوئی تو میں نے کروٹ بدلی۔ میری ایک سائڈ بالکل سُن ہو گئی تھی اور اگر مجھے فوراً اٹھنا پڑتا تو میں اٹھ نہیں سکتا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ میرا بخار باقی نہیں رہا تھا اور میرے اس بازو کی حالت بھی بہتر تھی جس میں گولی کا زخم تھا۔ اس کا مطلب یہی نکالا جا سکتا تھا کہ میری نیند یا بے ہوشی میں وہ مجھے اینٹی بائیوٹک دوا کے انجکشن لگاتے رہے تھے

اور شاید سوپ میں دوائیں شامل کرتے رہے تھے۔ ان کا مقصد میری جان بچانا نہیں تھا۔ وہ مجھے ضروری معلومات حاصل کرنے کے لیے زندہ رکھنا چاہتے تھے۔

آہستہ آہستہ میں نے خود کو ایک بازو کے سہارے پر اٹھایا اور تھوڑی سی کوشش کے بعد سیدھا بیٹھنے میں کامیاب ہو گیا۔ میرے کپڑے نمی اور غلاظت میں بھر گئے تھے لیکن مجھے ایک امید کا سہارا حاصل ہو گیا تھا۔ اگر خدا نے یہ امید کا وسیلہ بھی نہ پیدا کیا ہوتا تو مجھے یقین ہے کہ میں اس قید خانے میں کسی سے کچھ کہے بغیر پاگل ہو جاتا اور دیواروں سے سر پھوڑ کر مر جاتا۔ عام زندگی میں آدمی روشن دیواروں کے درمیان رہتا ہے۔ زمین کی..... سرسبزی اور آسمان کی نیلاہٹ کے درمیان رہتا ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ یہاں ہر سو تاریکی کا احساس تھا اور روشنی ان کالی دیواروں میں اتنی پُرآسیب لگتی تھی کہ خوف آتا تھا۔ اوپر نیچے اور اپنے چاروں طرف ایک ہی سیاہ رنگ کو دیکھتے رہنے سے ذہن اور اعصاب پر اس آسیب کا اثر ہونے لگتا تھا۔ اب میں بے چینی سے منتظر تھا کہ کچھ ہو۔ تفتیش کے عمل کے بعد یکسانیت، جمود اور خاموشی پھر مجھے خوفزدہ کرنے لگے تھے۔ میں اس خیال سے بھی دور رہنا چاہتا تھا کہ میری امید کی کرن فقط سرابِ آرزو ثابت ہوئی تو کیا ہوگا۔

دروازے کے پیچھے ہلکی سی آہٹ سن کر میں فوراً لیٹ گیا اور اپنا رخ یوں رکھا کہ میرے کپڑے اور فرش کی آلودگی اندر آنے والے کو فوراً نظر نہ آئے۔ وہ صرف یہ دیکھے کہ میں آنکھیں بند کیے مدہوش پڑا ہوں۔ میں نے آنکھوں کو اس وقت تک بند رکھا جب تک کوئی دروازہ کھول کے اندر نہیں آ گیا۔ میں قدموں کی چاپ پر کان رکھے لیٹا رہا۔ آہٹ میرے قریب آئی۔ کسی نے آہستہ سے میرے زخمی ہاتھ کو ٹھوکر ماری۔ میں درد کی ٹیس کو برداشت کر گیا اور اسی طرح پڑا رہا۔ ٹھوکر مارنے کا مقصد یہ اندازہ کرنا تھا کہ کہیں میں مکر تو نہیں کر رہا ہوں۔ اگر میں چاہتا تو اس وقت بھی ٹھوکر مارنے والے کو گھسیٹ کر گرا سکتا تھا۔ یہ تو میں سمجھ چکا تھا کہ اندر آنے والا کوئی مرد ہے۔ وہ عورت نہیں جس نے پہلی بار مجھے چمچے سے آبِ حیات پلایا تھا۔ آخر وہ کون تھی؟ اس کا لہجہ نامہرباں نہیں تھا اور اگر وہ آتی رہتی تو شاید میرے لیے کچھ کرتی۔ عورتوں کا دل کسی کو مصیبت میں دیکھ کر نسبتاً جلد پسیج جاتا ہے۔ ممکن ہے اسی وجہ سے بعد میں عورت کو نہ بھیجا گیا ہو کہ میں جسمانی توانائی کی بحالی کے بعد اسے تا... میں کامیاب نہ ہو جاؤں۔

پیالوں کی آواز پر میں نے ایک آنکھ کھول کر... وہ پیالے نیچے رکھ چکا تھا اور اب دونوں خالی پیالے... رہا تھا۔ اس کی پشت میری طرف تھی چنانچہ وہ مجھے اٹھ... دیکھ سکا۔ یہ میرے لیے زندہ رہنے کے لیے جان کی بازی... دینے کا آخری موقع تھا۔ ہار جیت کی پروا کیے بغیر میں... تھا۔ اسی احساس نے مجھے غیر معمولی قوت عطا کی اور میں... جست میں اس کے اوپر جا پڑا۔ آخری وقت میں اسے... ہو گیا تھا کہ میں نے اسے دھوکے میں رکھ کر حملہ کر دیا ہے... وہ ایک دم پلٹا تھا۔ اٹھتے ہوئے اس کا ہاتھ جیب کی طرف... میں نے اس کے بازو پر لات ماری اور ایک ہاتھ مار کے... نیچے گرا دیا۔ اس کا بازو ٹوٹ گیا تھا۔ وہ فرش پر گرا تو... کا سر بڑی آواز کے ساتھ نیچے لگا اور وہ بلبلایا۔ وہ بیس... سال کا نوجوان لڑکا تھا مگر جسمانی طور پر اس کی صحت کسی گوریلے سے کم نہ تھی۔ اس کا قد بھی ساڑھے چھ فٹ کے قریب تھا اور وزن شاید ڈھائی سو پونڈ سے زیادہ تھا۔ اس... توش کے باوجود وہ پھرتیلا تھا اور سخت جان بھی تھا۔... پھر اٹھ کر لپکا اور میری طرف آیا۔ میں نے جھک کر اسے... اٹھایا اور دوسرے ہاتھ سے گھما کے دیوار پر دے مارا۔... کے فرش پر گرتے ہی میں پھر اس کے سر پر سوار ہو گیا۔ میں نے اسے اٹھایا تو وہ شرابی کی طرح جھول رہا... میں نے اس کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ریوالور نکال لیا۔ "... تمہارا صرف ایک بازو ٹوٹا ہے۔" میں نے ریوالور کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور نال کو اس کی گردن پر رکھ دیا۔ "اسی وار سے... تمہاری گردن بھی توڑ سکتا تھا۔ میں نے تم کو زندہ رہنے کا ایک موقع عطا کیا ہے۔"

وہ بالکل سیدھا کھڑا اپنے سامنے دیکھتا رہا۔ اس کا ٹوٹ جانے والا بازو مضحکہ خیز طریقے پر جھول رہا تھا اور اسے یقیناً بہت تکلیف ہو رہی ہوگی لیکن وہ درد کو برداشت کر رہا تھا۔ "میں تمہاری کوئی مدد نہیں کروں گا۔" وہ بولا۔

"اب میں اس کے بغیر بھی یہاں سے نکل جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "تمہارے علاوہ جو بھی میری راہ میں حائل ہونے کی کوشش کرے گا مارا جائے گا۔ اس ریوالور کی ہر گولی سے ایک آدمی تو یقیناً مرے گا۔ تم پر میں گولی ضائع نہیں کروں گا۔"

"تمہاری مدد کر کے بھی میں مارا جاؤں گا۔" وہ...

"اور بعد کی موت زیادہ تکلیف دے گی۔ تم انتظار مت کرو...

...ہاتھ مار دا اور منکا توڑ دو۔" اس کی آواز اس کے بھاری بھرکم وجود کے مقابلے میں بہت پتلی تھی، کسی حد تک زنانہ۔

"تم کسی کو مدد کے لیے نہیں پکار رہے ہو۔" میں نے جبر سے کہا۔

"یہاں سے کوئی آواز باہر تک نہیں پہنچ سکتی۔" وہ بولا اور اس نے سر گھما کے سرچ لائٹ کی طرف مایوسی سے دیکھا۔

"میں سمجھ گیا۔ یہ دوطرفہ نظام اس وقت کام نہیں کر رہا ہے۔" میں نے کہا۔ "چلو تم مدد نہ کرو، یہ تو بتا دو کہ یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ ہے؟"

اس نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا۔ "آخر میں کسی طرف سے تو آیا ہی تھا۔"

"باہر نکلنے سے پہلے مجھے کتنے لوگوں سے مقابلہ درپیش ہوگا؟" میں نے کہا۔

"مجھے نہیں معلوم۔ تین آدمی بھی دیکھے ہیں میں نے اور چھ بھی۔ میرا بس یہی کام تھا۔"

"کیا تم ان کے ساتھی ہو۔ یہ بتا سکتے ہو کہ ان کے نام کیا ہیں؟ حلیے کیا ہیں؟" میں نے کہا۔

"وہ ایک دوسرے کو نمبروں سے یاد کرتے ہیں۔" وہ بولا۔ "مجھے ایک نمبر نے بلایا تھا اور کہا تھا کہ تہ خانے میں ایک بہت خطرناک مجرم ہے۔ اس کو کھانا پہنچانا ہے۔ جب بھی ہم کہیں۔ میں صرف نمبر ایک کو پہچان سکتا ہوں۔ وہ سیاہ فام مکرانی ہے۔ لمبے لمبے کانوں والا۔"

"کیا تم واقعی نہیں جانتے کہ وہ استاذ بیڈرو ہے؟" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "تمہیں اس کے پاس کون لایا تھا؟"

"نمبر ایک نے مجھے چیئرنگ کراس سے اٹھایا تھا۔" وہ بولا۔ "وہاں میں بے روزگار بیٹھا تھا، ڈرائیوروں، بیروں اور خانساموں کے ساتھ۔ اس نے پوچھا کہ گاڑی چلا سکتے ہو؟ میں نے کہا ہاں۔ اس پر وہ بولا کہ گولی چلا سکتے ہو؟ میں نے کہا کہ ہاں تو وہ بولا آؤ میرے ساتھ اور مجھے اپنی گاڑی میں یہاں لے آیا۔"

"تم نے پوچھا نہیں کہ گولی کس پر چلانا ہے؟"

"نہیں کچھ لوگ ایسے چوکیدار بھی رکھتے ہیں جو بندوق چلا سکتے ہوں۔" وہ بولا۔

"یہ کب کی بات ہے؟" میں نے کہا۔ "کتنے دن ہوئے تم کو یہاں کام کرتے؟"

"آٹھ... ن ہوئے ہیں۔" وہ بولا۔ "اس نے دس دن کی بات کی تھی۔ اور دس ہزار دیے تھے۔"

"دس دن کے دس ہزار، تم نے کسی شک کے بغیر قبول کر لیے؟"

"مجھے پیسے کی بہت ضرورت تھی۔ اور دس ہزار میں تو میرے سارے مسئلے حل ہو جاتے تھے۔" وہ بولا۔ "میں انکار کیسے کرتا۔"

"خواہ وہ تم کو کسی بے گناہ پر گولی چلانے کو کہتا۔"

"اس نے مجھ پر کام کی نوعیت واضح کر دی تھی۔" وہ بولا "اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ مجھے آنکھوں پر پٹی باندھ کے جانا پڑے گا۔"

"تم بہت احمق اور ناتجربہ کار لڑکے ہو۔ تم کو اندازہ نہیں کہ دس ہزار لے کر تم نے اپنی زندگی ان کے پاس رہن رکھ دی۔" میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ "کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ تمہیں زندہ جانے دیں گے؟"

"تو کیا وہ مجھے مار ڈالیں گے؟" اس نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

میں نے ریوالور جیب میں رکھ لیا۔ اب اس دیوزاد سے مجھے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا تھا۔ وہ اپنی نادانی کے باعث ایک ایسی ذمے داری قبول کر بیٹھا تھا جس کی صحیح نوعیت کا خود اسے بھی علم نہ تھا۔ پیڈرو بہت چالاک اور پرانا شکاری تھا۔ ملکہ کے محبت والے مختصر سے باغیچے میں بیٹھنے والے بے روزگاروں کے ہجوم میں سے اس نے بالکل صحیح آدمی کا انتخاب کیا تھا تو میں یہ فرض کر سکتا تھا کہ اس نے اپنے طور پر ضرورت مند کے کوائف پہلے جمع کر لیے ہوں گے اور یہ بھی معلوم کر لیا ہوگا کہ اس کام کو ان میں سے کون سب سے بہتر طور پر کر سکتا ہے۔ اب مجھے اپنی زیادتی کا احساس ہو رہا تھا جو مجھ سے دانستہ ہوئی تھی مگر ایک غلط فہمی کے باعث۔ اگر مجھے معلوم ہو جاتا کہ وہ لڑکا میرا دشمن نہیں ہے بلکہ جو کچھ وہ کر رہا ہے مجبوری میں کر رہا ہے تو میں اس کو بے بس کر دیتا اور صورتِ حال واضح ہو جانے کے بعد چھوڑ دیتا۔ اب مجھے یہ مشکل نظر آتا تھا کہ میں اس حال میں اسے بے یار و مددگار چھوڑ جاؤں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کوتاہی پر اسے موت سے کم سزا نہیں ہوگی۔ کوئی بھی اس کا عذر قبول نہیں کرے گا اور رحم کھا کے اسے معاف نہیں کرے گا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" میں نے کہا۔ "مجھے افسوس ہے کہ تمہارا بازو ٹوٹا۔ یہ ٹھیک ہو جائے گا بشرطیکہ ہم یہاں سے جان بچا کے نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔"

"میرا نام تو ماں باپ نے نزاکت علی رکھا تھا۔" وہ بولا۔

"سب پہاڑ خان کہنے لگے۔"

ایسی خطرناک اور سنگین صورتِ حال میں بھی مجھے ہنسی آ گئی۔ قصور دار والدین بھی نہیں تھے جن کو نام رکھتے وقت قطعی اندازہ نہ ہوگا کہ ان کا نرم و نازک بچہ بڑا ہو کے پہاڑ بن جائے گا اور اس کے ساتھ نزاکت کا تصوّر ہی مضحکہ خیز محسوس ہوگا قصور وار دنیا والے بھی نہیں تھے جو پہاڑ کو پہاڑ ہی کہہ سکتے تھے۔

"دیکھو پہاڑ خان! جیسے میں تمہاری مدد کے بغیر یہاں سے نہیں نکل سکتا۔" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "ایسے ہی تم بھی میری مدد کے بغیر شاید لوٹ کے زندہ گھر نہ جا سکو۔ گھر کہاں ہے تمہارا؟"

"گھر؟ ایک تو ہے مامے کا گھر۔" وہ خلا میں دیکھتے ہوئے بولا۔ "وہاں مامی نہیں چین لینے دیتی۔ تیسری بیوی ہے مامے کی۔ دوسرا گھر چاچا کا ہے۔ اس کا بس چلے تو مجھے زہر دے کر ختم کر دے۔ ماں باپ اس کے حوالے کر گئے تھے مگر وہ دشمن ہے میرا۔"

"وہ کیوں؟ آخر تم اس کے بھائی کی نشانی ہو۔"

"وہ میرا گھر ہے۔ اس میں سب کچھ میرے ماں باپ کا ہے لیکن وہ کہتا ہے کہ پہلے وہ سب ہمیں دے جو ہم نے تجھے چیونٹی سے پہاڑ بنانے میں لگایا۔" وہ بولا۔ "جتنا کھلایا' جو پہنایا' جو مصیبت تجھے پالنے اور زندہ رکھنے میں اٹھائی' سب کا معاوضہ دے تو مکان دیں گے۔ میں نے اتنا تو نہیں کھایا جی ان کا۔ دس سال کا تھا تب سے تو گھروں میں برتن دھونے پر رکھوا دیا تھا۔ دس سال سے اپنا کما کے کھا رہا ہوں۔ انہیں الٹا اپنی کمائی دیتا رہا ہوں۔"

"اچھا اچھا، پھر کریں گے یہ باتیں۔" میں نے کہا۔ "تمہارے چاچا سے بھی نمٹ لیں گے۔ اب یہاں دیر کرنے میں خطرہ ہے۔ وہ سوچ رہے ہوں گے کہ تم نے کھانا رکھ کر آنے میں اتنی دیر کیوں کی۔"

"ان کو کیا معلوم۔" پہاڑ خان بولا۔

"ان کو سب معلوم رہتا ہے بے وقوف۔ وہ تم پر بھی نگاہ رکھتے ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "یہ بتاؤ' تم ریوالور چلا لیتے ہو؟"

"ہاں جی۔ کچھ عرصہ میں ایک کرنل صاحب کا چوکیدار رہا تھا۔ انہوں نے سکھایا تھا۔"

"نشانہ کیسا ہے تمہارا؟" میں نے ریوالور نکال کے اسے تھما دیا۔

"آپ خود دیکھ لیں۔ اپنی جیب میں سے چونّی نکال کے اچھالیں۔" وہ ریوالور اٹھا کے بولا۔

"نہیں نہیں۔ عملی مظاہرے کا یہ وقت نہیں۔" میں نے کہا۔ "بس ضرورت پڑے تو لحاظ مت کرنا۔ جو سامنے آ کر راستہ روکے، اسے شوٹ کر دینا۔ ورنہ وہ تم کو شوٹ کر دیں گے۔"

"کیوں جی! میں نے کیا جرم کیا ہے ایسا؟" وہ ... کر بولا۔

"بات جرم کی نہیں۔ اور تمہارا یہ جرم کیا کم ہے کہ تم میرے ساتھ فرار ہو رہے ہو۔" میں نے کہا۔ "انہوں نے تم سے غلط کہا تھا کہ میں کوئی خطرناک مجرم ہوں۔ میں ایک شریف آدمی ہوں۔"

"اچھے شریف آدمی ہو جی۔ میرا بازو توڑ دیا۔" وہ بولا۔

مجھے حیرانی ہوئی۔ وہ بازو ٹوٹنے کا یوں ذکر کر رہا تھا جیسے کوئی تکلیف وہ بات نہیں' صرف افسوس کی بات ہے۔ ... کو برداشت کرنے کی حیرت انگیز صلاحیت کا مظاہرہ کر رہا ... اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو بلبلاتا رہتا۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں پہاڑ خان۔" میں نے کہا۔ "اصل مجرم یہ لوگ ہیں۔ یہ مجھے اغوا کر لائے تھے اور قتل کر دینا چاہتے تھے۔ وجہ بعد میں بتاؤں گا۔ اب نکل چلو۔ تم آگے رہو۔"

"اور تم خالی ہاتھ چلو گے؟" پہاڑ خان نے دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔

"تم تو دیکھ ہی چکے ہو کہ میں خالی ہاتھوں سے کیا کر سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "تم کس طرف سے آتے تھے؟"

"وہ کمرا الگ ہے۔" پہاڑ خان نے کہا۔ "اس کے ساتھ دروازہ مگر اس میں سے باہر جانے کا کوئی راستہ نہیں۔"

"کیا وہ بھی ایسا ہی سیاہ خانہ ہے؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ دیواریں تو اس کی دھوئیں سے کالی ہیں کچھ۔" وہ بولا۔ "لیکن اس میں بس ایک کھڑکی ہے بہت اوپر اور اس میں بھی سلاخیں لگی ہوئی ہیں۔"

مجھے پہاڑ خان کی سادہ لوحی اور ذاتی عقل ... سے محرومی کا اندازہ ہو گیا تھا۔ وہ ایسا شخص تھا جس کا جسم عام جوان آدمی کے مقابلے میں قابلِ فخر حد تک بڑھ گیا تھا لیکن اس کا دماغ اس دوڑ میں پیچھے رہ گیا تھا اور ... ایک ناتجربہ کار لڑکے کا دماغ تھا۔ بہت سے چودہ سال کے بچے بھی اس سے زیادہ ذہین اور چالاک تھے لیکن وہ اگر ذہانت سے محروم تھا تو اس میں قدرت کو موردِ الزام کیسے ٹھہرایا جا سکتا تھا۔ خدائی کے رموز اور اس کے ہر کام میں پوشیدہ مصلحت کو خدا ہی جانتا ہے۔

اگر ... پوست کے پہاڑ کی ذہنی استعداد کی پیمائش کرتے تو اس کا آئی کیو "بہت کم" بتاتے اور شاید اپنی اصطلاح میں اسے "مورون" قرار دیتے۔ عام آدمی کی اوسط عقل بھی نہ رکھنے والا۔ ایسے لوگ بہت زیادہ سوچ بچار نہیں کر سکتے۔ قوتِ فیصلہ سے محروم ہوتے ہیں یا تمام عوامل و عواقب کا تجزیہ کیے بغیر فوری فیصلے کرتے ہیں تو ان کے فیصلے غلط ہو جاتے ہیں۔ وہ معمولی سی مشکل میں گھبرا جاتے ہیں اور باریک بات ان کی موٹی عقل میں نہیں آتی تو وہ لوگوں کی تفریح اور تمسخر کا سامان بن جاتے ہیں۔ بچپن سے جوانی تک بے وقوف اور احمق کا خطاب پاتے پاتے' وہ اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ وہ واقعی اپنے اردگرد بسنے والے لوگوں سے بہت کمتر حیثیت کی مخلوق ہیں۔

پہاڑ خان نے سوچے سمجھے بغیر استاد پیڈرو سے دس ہزار روپے لے لیے تھے۔ شاید اتنی رقم اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی ہوگی۔ وہ بہت خوش ہوا ہوگا کہ اب اپنے دوستوں اور ہمیشہ ذلیل کرنے والے رشتے داروں کے سامنے وہ بڑے فخر سے اعلان کر سکے گا اور قسم کھا کے کہہ سکے گا کہ یہ سب رقم اس نے کہیں سے چرائی نہیں ہے بلکہ اپنی محنت سے کمائی ہے۔ شاید اس طرح اپنی ذات پر پہاڑ خان کا اعتماد بحال ہوا ہوگا کہ وہ بھی بڑے کام کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن اس کی محدود عقل کے ساتھ اس کا تجربہ بھی محدود تھا۔ اس کے لیے یہ سمجھنا دشوار تھا کہ ایسے کاموں میں کیا خطرات مضمر ہو سکتے ہیں۔ اس نے تو جو کہا وہ کیا اور اس کے نقطۂ نظر سے کوئی بھی غلط کام نہیں کیا کسی خطرناک مجرم کو کھانا پہنچانے میں گناہ یا جرم کی تو بات ہی نہیں تھی کہ وہ تذبذب یا شک میں پڑتا۔ کوئی اسے چوری کرنے یا قتل کرنے کو کہتا تو وہ یقیناً بھاگ جاتا۔

مگر جتنی آسانی سے وہ پیڈرو کی باتوں میں آ گیا تھا' اتنی ہی آسانی سے اس کے دماغ نے میری بات کی صداقت کو تسلیم کر لیا۔ وہ ایسا بچہ تھا جسے کوئی بھی ہوشیار آدمی باتوں میں لگائے تو انگلی پکڑ کے جہاں چاہے لے جائے۔ ذرا سی دیر میں پیڈرو کا طلسم ٹوٹ گیا تھا اور اس نے میری بات مان لی تھی کہ خطرناک مجرم میں نہیں' وہ ہیں۔ کسی دلیل کے بغیر کوئی ثبوت مانگے بغیر اور اپنی عقل سے مشورہ کیے بغیر۔ خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں۔ ایک طرف تو اسی دنیا میں وہ ہیں جن کے لیے شاعرِ مشرق نے کہا تھا کہ اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے۔ دوسری طرف پہاڑ خان جیسے بھی تھے کہ دل تو رکھتے تھے مگر پاسبانِ عقل نہیں رکھتے تھے۔ یہ جب تک جیتے تھے دوسروں کی عقل انہیں اپنے مفادات کے لیے استعمال کرتی تھی۔ یہاں تک کہ اپنی زندگی کا سوال ہوتا تھا تو ان کی زندگی کو داؤ پر لگا کے قربان کرنے سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ اگر قدرت نے یوں ہم دونوں کو نہ ملایا ہوتا تو شکاری کامیاب ہو جاتے مگر مارنے والے ہاتھ سے بچانے والا ہاتھ ہمیشہ زبردست رہا ہے۔ اب ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے زندگی کی امید بن گئے تھے۔

باہر بھی گھپ اندھیرا تھا لیکن میں نے دروازہ کھلا چھوڑ دیا تو باہر پہنچنے والی مدھم سی روشنی میں مجھے ایک سرنگ نما راستہ نظر آیا۔ راستے کی بلندی آٹھ فٹ اور چوڑائی اس سے نصف تھی۔ یہ راستہ میرے سامنے بیس پچّیس گز تک پھیلا ہوا تھا اور اس کے دونوں جانب سپاٹ دیواریں تھیں جن کا رنگ اسی قید خانے کی طرح سیاہ تھا جس میں سے مجھے تین دن کے بعد رہائی نصیب ہوئی تھی لیکن مجھے یوں لگتا تھا کہ میں نے تنہائی اور عذاب کے تین ہفتے موت اور زیست کی کشمکش میں گزار دیے تھے۔ اس سے پہلے سنی سنائی باتوں کی بنیاد پر مجھے یقین تھا کہ عام آدمی کچھ کھائے پیے بغیر ایک ہفتہ گزار سکتا ہے۔ پھر میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا کہ صرف تین دن میں میری قوتِ برداشت صفر سے بھی کم ہو گئی؟ تین دن میں میرا یہ حال ہو گیا کہ میرا اپنے جسم پر کوئی کنٹرول نہ رہا اور بھوک پیاس سے میں مرنے کے قریب ہو گیا۔ یہ بڑی عجیب بات تھی۔ اس سے پہلے ایسے بہت سے دن آئے تھے جب میں نے اور جین نے صبح سے شام تک اور پھر شام سے صبح تک کچھ بھی کھایا پیا نہیں تھا اور مسلسل اپنے دشمنوں سے برسرِ پیکار رہے تھے۔ اس وقت ہمیں بالکل احساس تک نہیں ہوا تھا کہ تھکن یا نیند کی کمی اور بھوک پیاس کا ہمارے جسم کی توانائی پر اتنا برا اثر پڑا ہے کہ ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ کبھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ مزید چوبیس گھنٹے اسی طرح گزرے تو ہم اسٹریچر پر ڈالنے کے قابل ہو جائیں گے ورنہ اٹھ بھی نہیں سکیں گے اور تیسرے دن اس دارِ فانی سے کوچ فرماتے نظر آئیں گے۔

یقیناً تین دن تک مجھے کوئی ایسی چیز دی گئی تھی جس نے میری ساری توانائی سلب کر لی۔ مجھے کوئی زہر دیا گیا تھا یا کوئی نشہ کہ میں شدید جسمانی اذیت میں بھی مبتلا ہوا اور میرے حواس بھی بحال نہ رہے۔ پھر جب اس کا اثر زائل ہوا اور مجھے مناسب خوراک کے ساتھ آرام ملا تو میری جسمانی

قوت کی بحالی میں وقت نہ لگا۔ اس برآمدے نما کوریڈور کے آخری حصے تک دبے پاؤں چلتے ہوئے میرے ذہن میں یہ سب خیالات آئے اور گزر گئے۔ میں نے چند قدم چلنے کے بعد اپنے پیچھے سے آنے والی روشنی کو سیاہی میں دم توڑتے محسوس کیا۔ باقی راستہ میں نے پہاڑ خان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پیچھے پیچھے چلتے ہوئے طے کیا۔ یوں جیسے وہ آنکھوں والا ہے اور میں اندھا ہوں۔ میری نظریں سامنے بھی دیکھ رہی تھیں۔ جہاں یہ سرنگ نما راستہ ختم ہوتا تھا وہاں چھت سے ایک بلب معلق تھا۔ بلب کی روشنی بہت کم تھی اور اس کے اوپر شیڈ تھا جو روشنی کو نیچے ایک مختصر دائرے تک محدود رکھتا تھا۔ دائرے کے تین جانب مجھے تین بند دروازے نظر آ رہے تھے۔ ایک بالکل سامنے، دوسرا دائیں جانب اور تیسرا بائیں طرف۔ بے آواز قدموں سے چلتے ہوئے میرے کان ہر آہٹ پر تھے۔

پہاڑ خان میرے لیے ایک ڈھال بھی بنا ہوا تھا۔ اگر اچانک کوئی کمرے سے نکل آتا تو ایک سرسری نگاہ میں شاید مجھے دیکھ ہی نہ پاتا اور مجھے بہت قریب پہنچ کر حملہ کرنے کا موقع مل جاتا۔ جب آخری دروازے تک کچھ بھی نہیں ہوا تو میں نے اطمینان کا سانس لے کر پہاڑ خان کے کندھے پر تھپکی دی۔ وہ بائیں طرف کا دروازہ کھول کر اندر گیا تو میں بھی بڑی پھرتی سے اندر پہنچ گیا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز پر کوئی دوسرے دروازے سے جھانک کر دیکھ لیتا اور جنگ اچانک چھڑ جاتی۔ اب میں نے اس کمرے کا جائزہ لیا۔ پہاڑ خان نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ اس کی ساری دیواریں ہموار تھیں۔ صرف ایک دیوار میں چھت سے ملی ہوئی ایک فٹ چوڑی اور تین فٹ لمبی کھڑکی تھی جسے روشندان کہنا زیادہ مناسب ہوگا مگر اس میں لمبائی کے رخ آڑی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ ہر سلاخ آدھ انچ موٹی تھی اور روشندان کے دونوں طرف کی دیواروں میں پیوست تھی۔ ایک فٹ کی چوڑائی میں ایسی تین سلاخیں تھیں چنانچہ اس روشندان سے اسی صورت میں گزرا جا سکتا تھا جب میں اپنے قالب کو بلی کے قالب میں ڈھالنے پر قادر ہوتا۔ پھر بھی سلاخوں سے نظر آنے والے روشن آسمان کی جھلک نے مجھے بڑا حوصلہ دیا۔ "ذرا آہستہ بات کرنا۔" میں نے پہاڑ خان سے کہا۔ "کیا وہ لوگ ہر وقت موجود رہتے ہیں؟"

"مجھے معلوم نہیں۔" پہاڑ خان بولا۔ "مجھے اس کمرے سے نکل کر سامنے والے کمرے میں جانے کی بالکل اجازت نہیں ہے۔"

"کیا یہ تیسرا دروازہ باہر جانے کے لیے ہے؟" میں نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

"ہاں۔ مگر اس میں اوپر سے نیچے تک تین قفل ہیں۔" پہاڑ خان بولا۔ "ہر ایک کی چابی الگ ہے۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟" میں نے حیرانی سے کہا کیونکہ مجھے پہاڑ خان کی قوتِ مشاہدہ پر بالکل اعتبار نہیں تھا۔

"میں نے انہیں ایک بار باہر جاتے دیکھا تھا۔" وہ بولا۔ "پہلے ایک شخص نے ایک چابی لگا کے گھمائی، پھر دوسرے نے۔ آخر میں نمبر ون نے تیسری چابی لگائی۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ دروازہ کھولنے کے لیے تین سے نمٹنا پڑے گا۔" میں نے مایوسی سے کہا۔ "دروازہ توڑنے کا تو سوال ہی نہیں۔"

"اگر تم نے میرا ہاتھ نہ توڑا ہوتا تو میں یہ سلاخیں اکھاڑ دیتا۔" وہ بولا۔

"یہ ٹوٹنے والی سلاخیں نہیں ہیں۔ تم ان کو موڑ سکتے تھے یا دیوار سے نکال سکتے تھے؟" میں نے کہا۔ "کیا تمہارے ہاتھ میں تکلیف محسوس ہو رہی ہے؟"

"ہاں۔ پہلے تو زیادہ درد نہیں تھا۔ اب ہو رہا ہے۔" وہ رونی شکل بنا کے بولا۔

"اچھا فکر مت کرو۔ ابھی باہر نکلنے کی کوئی تدبیر کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "پھر تمہارا بازو بھی ٹھیک ہو جائے گا۔"

اس مختصر کمرے میں جو آٹھ فٹ لمبا چوڑا تھا اور کچن کے طور پر استعمال ہو رہا تھا، چند برتن تھے اور ایک مٹی کے تیل کا چولھا۔ ایک طرف زمین پر وہ بستر بچھا ہوا تھا جس پر پہاڑ خان سوتا ہوگا۔ مجھے تعجب ہوا کہ اس کمرے میں چوبیس گھنٹے قیدِ تنہائی کے دس دن پہاڑ خان کیسے گزارتا ہوگا۔ وہ دن میں ایک دو بار اندر جا کے مجھے کھانا دے آتا تھا۔ کھانا تیار کرنے میں اس کا زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹا صرف ہو جاتا ہوگا۔ باقی تئیس گھنٹے وہ کیا کرتا ہوگا۔

"پہاڑ خان! یہاں تمہارے لیے کوئی باتھ روم تک نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

اس نے ایک کونے کی طرف اشارہ کیا جہاں ایک کرسی نما چیز رکھی تھی۔ "میں یہی استعمال کرتا تھا۔ پانی کی ایک بالٹی بھری ہوئی تھی جو اب خالی ہو گئی ہے۔"

"اچھا۔" میں نے

ادھر کر دو۔" غسل کی خواہش کرنا بھی غلط تھا مگر میں منہ پر چند چھینٹے ضرور مارنا چاہتا تھا۔ اب اس کو بھی میں نے التوا میں رکھا اور فرض کر لیا کہ میں حالتِ جنگ میں ہوں۔ دشمن کے علاقے میں، کسی مورچے پر ڈٹے ہوئے یا خندق میں بیٹھے ہوئے سپاہی کے لیے اپنی مرضی کے یا ضرورت کے مطابق کھانے پینے یا نہانے دھونے کا کیا سوال۔ وہی اس کا بیڈ روم، وہی اس کا ڈائننگ روم، وہی باتھ روم۔ اور وقت آ جائے تو وہی بے نشاں مدفن۔

"کیا وہ خود تمہیں کھانے پکانے کا سامان لا کر دیتے تھے؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ وہ جو کہتے تھے، میں ویسا ہی کرتا جاتا تھا۔" پہاڑ خان بولا اور مجھے حیرت ہوئی کہ اتنے معمولی سے کام کے لیے انہوں نے دس ہزار خرچ کیے اور ایک آدمی کی زندگی خرید لی۔ اتنے بڑے بڑے کام کرنے والے پہاڑ خان کی مدد کے اتنے محتاج تو نہ تھے مگر بات وہی تھی کہ تقدیر دھوکا دیتی ہے تو شامت کا مارا گیدڑ شہر کا رخ کرتا ہے اور بہت سیانا مجرم ذرا سی حماقت کرتا ہے تو کامیابی کی پوری عمارت کو اپنے ہاتھوں گرا دیتا ہے۔ اگرچہ ابھی میرے لیے بھی کامیابی کا دعویٰ قبل از وقت تھا مگر حالات جس حد تک پہلے میرے مخالف تھے، اب اتنے ہی موافق محسوس ہوتے تھے۔

"ہمیں یہاں سے زندہ بچ کے نکلنے کے لیے کوشش تو کرنا ہی پڑے گی پہاڑ خان۔" میں نے کہا۔ "اور کسی ایک کی کوشش سے کام نہیں بنے گا۔ شاید اسی لیے تمہارا اور میرا ساتھ ہو گیا۔ اب جو میں کہتا ہوں وہ کرو۔"

"میں وہی کروں گا جو تم کہو گے۔" پہاڑ خان نے اپنی زبان سے یہ بات دہرا کے گویا عہدِ وفاداری کیا۔

"معلوم نہیں اس وقت اندر کون کون ہے۔" میں نے کہا۔ "ان سب سے ایک ساتھ مقابلہ کیا تو ہم مارے جائیں گے۔ تم انہیں ایک ایک کر کے بلاؤ۔"

"اچھا۔ میں پہلے ایک کو بلاتا ہوں۔" پہاڑ خان دروازے کی طرف بڑھا۔

"سنو، ایسے نہیں۔" میں نے سر پر ہاتھ مار کے کہا۔ "تم یہاں بیٹھ کے کوئی برتن زمین پر مارو جس سے شور ہو۔ مثلاً یہ بالٹی لو اور اس کو اٹھا اٹھا کے نیچے پھینکو۔ ذرا دروازے سے دور، دوسری طرف میں کھڑا ہو کے انتظار کرتا ہوں۔"

پہاڑ خان نے ایسا ہی کیا۔ اس نے ٹین کی بالٹی کو ہینڈل سے پکڑ کر زمین پر مارنا شروع کیا۔ اس سے نہایت بے ہودہ اور کرخت آواز پیدا ہوئی اور بے اختیار میرا ذہن اس رات کی طرف چلا گیا جب ایسی ہی ایک بالٹی کو تھالے میں میرے سر پر الٹا کے بجایا گیا تھا۔ میرا منہ گردن تک بالٹی میں تھا اور بالٹی کو لوہے کی سلاخ سے کوٹنے کا اعصاب شکن شور میرے کانوں کے پردے پھاڑ رہا تھا اور پھر میرے دماغ میں یوں گونجنے لگا تھا کہ مجھے یہ شور اپنے وجود کو آری کی طرح ہر جگہ سے کاٹتا ہوا، کنکریٹ مکسر کی طرح گھماتا ہوا اور روڈ رولر کی طرح پیستا ہوا محسوس ہوتا تھا اور اس شور نے میرے ذہن کو اس طرح مفلوج و ماؤف کیا تھا کہ میری ساری مزاحمت ختم ہو گئی تھی۔ میں وقتی طور پر دیوانہ ہو گیا تھا۔

دروازہ کھلا تو میں ایک دم چونکا اور یادِ ماضی کے عذاب سے نکل کر حقیقتِ حال سے مقابلے کے لیے تیار ہو گیا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" اندر آنے والے نے چیخ کر کہا اور اس کی نگاہ پہاڑ خان پر گئی۔ میں ایک دم حرکت میں آ گیا اور میں نے کھڑی ہتھیلی سے اس کے کان کے قریب وار کیا۔ میں بہت محتاط تھا اور اوچھے وار سے اس کے بچ جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اس کے حلق سے کراہ نکلی اور وہ لڑکھڑا کے گرا تو پھر اٹھ نہ سکا۔

"شاباش۔ بالکل اسی طرح نمٹا جا سکتا ہے ان بدمعاشوں سے۔" میں نے جوش میں ہاتھ مل کے آہستہ سے کہا اور اس اجنبی شخص کو گھسیٹ کر دروازے سے دور اپنے پیچھے والے کونے میں ڈال دیا۔

"اب تم ایک چیخ مارو گے۔" میں نے کہا۔ "آواز کو بدل کے۔"

"میری آواز بدل سکتی ہے؟" حیرت سے پہاڑ خان کا منہ کھلا رہ گیا۔

"اچھا تم خاموش ہی رہو عقلمند۔" میں نے کہا اور حلق سے ایک کربناک آواز بلند کی۔

"دیکھو۔ اب ہو سکتا ہے کہ ایک کی جگہ دو آ جائیں۔" میں نے کہا۔ "ایک سے تم نمٹ لینا۔ سر پر ریوالور مارنا۔"

"کون ہے..... کیا ہو رہا ہے یہ؟" بیک وقت دو افراد نے چلا کر کہا اور تقریباً ایک ساتھ دوڑتے ہوئے اندر آئے۔ ان میں سے ایک نے مجھے دیکھا اور اس کے ہاتھ کا ریوالور ایک دم اٹھا۔ میں ایک دم جھک گیا اور گولی میرے کان کو چھوتی ہوئی گزری تو میرے دونوں کان سن ہو گئے۔ میں

نے اسے دوسرے فائر کا موقع نہیں دیا اور اس کی ٹانگوں میں گھس گیا۔ میرے ہاتھوں نے اسے پیچھے پھینک دیا۔ پھر میں بڑی پھرتی سے پلٹا اور دائیں پیر سے اس کے ہاتھ پر لگ ماری۔ وہ بلبلایا۔ ایسی شدید ضرب کے بعد اس کی کلائی کی ہڈی سلامت رہنے کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ میں نے اسے دوسرا ہاتھ پکڑ کے جھٹکا دیا۔ وہ اوپر اٹھا اور اپنے زور میں دوڑتا ہوا گیا۔ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ دیوار بہت قریب ہے اور وہ خود کو روک بھی نہیں سکتا۔ میں نے اس کے دہاڑنے کی آواز پہلے سنی، اس کے دیوار سے ٹکرانے کی بعد میں۔ جب وہ نیچے گر کر ساکت ہوا تو عجیب مزاحیہ انداز میں پڑا رہا۔ اس کا سر سجدے میں تھا، پچھلا دھڑ اوپر اٹھا ہوا تھا اور دونوں ہاتھوں سے اس نے کانوں کو ڈھک لیا تھا۔ ایک زمانے میں سول ڈیفنس کی ٹریننگ میں مجھے بتایا گیا تھا کہ بمباری ہو رہی ہو تو میں اسی طرح کی حفاظتی تدبیر کروں اور اسی طرح زمین پر پڑا رہوں۔

دوسرے دشمن کو ٹھکانے لگاتے ہوئے میرا دھیان پہاڑ خان کی طرف گیا ہی نہیں تھا۔ اب میں نے دیکھا تو وہ بڑی دلچسپی کے ساتھ میری لڑائی کو دیکھ رہا تھا۔ میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اس نے دوسرے آدمی کو ریوالور کا دستہ مار کے ناک آؤٹ کر دیا تھا اور وہ آدمی بالکل چت پڑا ہوا تھا۔ اگر ان دونوں کے علاوہ بھی وہاں کوئی ہوتا تو اتنی دیر میں ضرور پہنچتا۔ اب میں نے ان تینوں کی شکل کو غور سے دیکھنے کے لیے انہیں ایک قطار میں لٹا دیا۔ دو چہرے بالکل نئے تھے لیکن تیسرا وہ تھا جسے میں نے گامے ماچھی کی خانقاہ کے دروازے پر کھڑا دیکھا تھا۔ میں نے ان کی جیبوں کو ٹٹولا۔ ان دونوں کی جیب میں سے ایک ایک چابی برآمد ہوئی جو میرے مقابلے پر آئے تھے۔ ان میں نمبر دن یعنی استاد پیڈرو شامل نہیں تھا چنانچہ تیسری چابی مجھے نہ مل سکی۔ میں اپنے گندے کپڑوں سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا چنانچہ میں نے ایک کی قمیص اور دوسرے کی پتلون پہنی۔ دو ریوالور پتلون کی دونوں جیبوں میں رکھے اور تیسرا ہاتھ میں رکھا۔ ان کی جیبوں میں سے مجموعی طور پر دو ہزار سات سو کی رقم برآمد ہوئی جو میں نے قمیص کی جیب میں رکھی۔ پھر میں نے پہاڑ خان کو اشارہ کیا۔

”اب یہاں سے باہر جانے میں کوئی رکاوٹ تو نظر نہیں آتی۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن ہو سکتا ہے کہ تیسری چابی کے بغیر دروازہ نہ کھلے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی زیادہ چالاک شخص ابھی چھپا ہوا ہو۔ اب تم ایسا کرو کہ چلاتے ہوئے دوسرے کمرے میں جاؤ۔ اپنا ٹوٹا ہوا بازو سامنے رکھنا۔ ہائے مر گیا کا شور مچا دینا۔“

”وہ مجھے ماریں گے تو نہیں جی؟“ وہ بولا۔

”نہیں۔ وہ سمجھیں گے تم کو میں نے مارا ہے۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”کوئی ہو تو تم یہی کہنا۔ وہ باہر ضرور آئے گا۔ پھر میں اسے سنبھال لوں گا۔ باہر نہ آیا تب بھی دروازہ کھولے گا۔ میں اسے ہینڈز اپ کرا لوں گا۔“

پہاڑ خان نے ایسا ہی کیا۔ اس نے دروازہ بجاتے ہوئے ”ہائے۔ ہائے مر گیا۔“ کا شور مچایا۔

میں ابھی پہلے کمرے سے نکلا ہی نہیں تھا کہ دروازہ کھلا اور پیڈرو باہر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ خود میں نشانہ لینے تیار کھڑا تھا اور میری ذرا سی احتیاط پسندی اور مستعدی پہاڑ خان کے لیے زندگی کا بہانہ بن گئی۔ جب پیڈرو نے ریوالور اٹھایا تو میں سمجھ گیا کہ اب کیا ہوگا۔ پیڈرو نے پہاڑ خان کو اس کی بے وقوفی اور نااہلی کی سزا دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ غالباً اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ میں قید سے نکل گیا ہوں اور شاید اس نے اپنے ساتھیوں کے واپس نہ آنے کا سبب بھی دریافت کر لیا تھا۔ مجھ سے ایک بہت بڑی غلطی یہ ہوئی تھی کہ جب میں اپنے قید خانے سے نکلا تھا تو میں نے روشنی کے لیے دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا۔ پیڈرو نے دور سے اسی کھلے دروازے کو دیکھا ہوگا جو تاریکی میں روشنی کی مستطیل نظر آتا تھا اور سب سمجھ گیا ہوگا کہ خود اس سے بھی ایک غلطی سرزد ہوئی تھی جب اس نے میرے محافظوں میں پہاڑ خان جیسے بے عقل آدمی کو شامل کیا تھا۔ اس کی نظر میں سکندر بخت ایک بہت چالاک اور خطرناک شکاری تھا جسے شکار کرنے کے بعد اسیر رکھنے کے لیے حفاظتی انتظامات میں کوئی کمی نہیں چھوڑی گئی تھی۔ بس نادانستگی میں اس نے پہاڑ خان کا انتخاب کر لیا جو دیکھنے میں واقعی پہاڑ تھا مگر عقل کے اعتبار سے ان کے حفاظتی حصار کا سب سے کمزور حصہ تھا۔ میں اسی کمزور حصے ہی سے راستہ بنا کے نکل گیا تھا۔ پہاڑ خان کو ویسے بھی مرنا ہی تھا۔ اب اس کا بے وقوف ثابت ہونا ناقابلِ معافی جرم بن گیا۔

پیڈرو نے ریوالور اٹھایا ہی تھا کہ میں نے اس کی نیت کو بھانپ لیا۔ اس کا ارادہ اس کی آنکھوں میں اتر آیا تھا جب آدمی کسی دوسرے آدمی کی جان لینے کے درپے ہوتا ہے یا میری چھٹی حس نے مجھے پہلے سے خبردار کر دیا تھا۔ وجہ کچھ بھی ہو مگر استاد پیڈرو کے ریوالور اٹھانے ہی میں نے فائر کر دیا اور جب میرا نشانہ خطا نہیں ہوا تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا جس نے مجھے ایک زندگی کو بچانے کا وسیلہ بنایا۔ ریوالور پیڈرو کے ہاتھ سے دور جا گرا اور اس کے ہاتھ کی پشت سے خون ٹپکنے لگا۔ اس نے ایک غلیظ گالی بکی اور ایک دم واپس پلٹا۔

”ٹھہر جاؤ پیڈرو۔“ میں نے چیخ کر کہا اور گولی چلا دی مگر وہ بڑی تیزی سے پلٹ کر پھر کمرے میں گھس گیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے افسوس ہوا کہ ہاتھ کا نشانہ لینے کے بجائے میں نے اس شیطان کی کھوپڑی کیوں نہ اڑا دی۔ میں اسے زندہ گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا اور اسی لاشعوری خواہش نے پیڈرو کو نکل جانے کی مہلت دے دی۔ میں سمجھتا تھا کہ پیڈرو بلاوجہ استاد نہیں کہلاتا۔ اس کے ہاتھ سے ایک ریوالور نکل گیا تھا لیکن اس بنیاد پر اسے خالی ہاتھ سمجھ لینا بے وقوفی ہوتا۔ کمرے کے اندر اس کے پاس سب کچھ ہو سکتا تھا۔ ریوالور سے مشین گن تک۔

”دروازہ توڑ دو پہاڑ خان۔“ میں نے باہر آتے ہی چلا کے کہا۔ ”میں اور تم مل کے زور لگاتے ہیں۔“

پہاڑ خان کا ایک ہاتھ ٹوٹا ہوا تھا لیکن وہ حیرت انگیز جسمانی قوتِ برداشت اور طاقت کا مالک تھا۔ اس نے اقرار میں سر ہلایا اور اپنے دوسرے بازو کے شانے سے دروازے کو ٹکر ماری۔ میں نے اس کا ساتھ دیا۔ دروازہ بڑے زور سے ہلا مگر نہ ٹوٹا اور نہ کھلا۔

”میرے ہاتھ میں مشین گن ہے سکندر بخت۔“ اندر سے پیڈرو نے چلا کر کہا۔ ”میں تم کو چھلنی کر دوں گا۔“

ذرا سی دیر کے لیے میں رک گیا پھر عقل نے مجھے جھنجوڑا۔ یہ دھوکا ہے سکندر بخت۔ اگر پیڈرو کے پاس مشین گن ہوتی تو اب تک وہ ایک برسٹ مار چکا ہوتا اور مشین گن کی گولیاں دروازے میں سوراخ کرتی ہوئی تمہارے جسم کے بھی پرخچے اڑا چکی ہوتیں۔ وہ تمہارا لحاظ کبھی نہ کرتا۔ خصوصاً ایسے حالات میں جب کہ وہ خود محصور ہو اور اپنی زندگی کے لیے تم کو خطرہ سمجھتا ہو۔

”تم کر دو چھلنی مجھے پیڈرو۔“ میں نے چیخ کر جواب دیا۔ ”آج یا تم نہیں یا میں نہیں۔“

میں نے پھر پہاڑ خان کو اشارہ کیا اور اس نے میرے ساتھ زیادہ قوت صرف کرتے ہوئے دوسری ٹکر ماری۔ دروازہ ایک دم پورا کھل گیا۔ اس کے اوپر نیچے کی چٹخنی نکل گئی تھی۔ پہاڑ خان اندر جا گرا۔ قدرت کو اسے بچانا منظور تھا۔ پیڈرو کے ریوالور کی گولی اس کے اوپر سے نکل گئی اور دیوار میں پیوست ہو گئی۔ پیڈرو کو میں نے اپنے بالکل سامنے دیکھا۔ وہ دوسرا ریوالور لیے بقا کی جنگ میں اپنے محاذ پر ڈٹا ہوا تھا اور ہتھیار ڈالنے پر آمادہ نہ تھا۔ یکلخت مجھے وہ وقت یاد آیا جب میں نے پیڈرو کو پاکستان میں وارد ہونے کے بعد ائرپورٹ پر ٹیکسی ڈرائیور کے روپ میں دیکھا تھا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ سلامت علی کے گھر لے گیا تھا۔ پھر وہ اس وقت نظر آیا تھا جب میں شرافت علی کے گھر سے نکل رہا تھا۔ مجھے قتل کے پہلے جھوٹے جرم میں ملوث کرنے والا یہی شخص تھا جس نے میر شرافت علی کا خون کیا تھا اور میں یہ بھی یقین رکھتا تھا کہ اسی نے سلامت علی کو بھی مارا تھا۔ بعد میں مارے جانے والے ہر بے گناہ شخص کے لہو کے داغ اس کے دامن پر صاف نظر آتے تھے۔ یہ انتقام کا اندھا جذبہ تھا یا ایک ایسے دشمن کو کم کرنے کی خواہش جو میرے محسن اور رابعہ کے تمام مصائب کا ذمّے دار تھا اور جس کے لیے موت سے کم کوئی سزا کافی نہ تھی۔ کہ میں نے اندھا دھند فائر کیے اور دیوانہ وار پیڈرو پر جا پڑا۔ مجھے معلوم نہیں کہ اس نے جواب میں کتنی گولیاں چلائیں۔ جب میں نے اسے زمین پر پڑا ہوا اور خود کو اس کے اوپر سوار دیکھا تو مجھے یقین آیا کہ میں زندہ ہوں اور پیڈرو زخمی ہے۔ اپنی موت کو سامنے دیکھ کر اس کا حوصلہ جواب دے گیا تھا۔ اس نے میری فائرنگ سے بچنے اور بھاگ نکلنے کی کوشش کی تھی اور اسی بدحواسی میں گولی چلائی تھی لیکن وہ نشانہ نہ لے سکا تھا۔ مجھ پر خون سوار تھا۔ میں نے پیڈرو کی گردن کو دونوں ہاتھوں سے دبوچ لیا۔

”تیرا وقت آ گیا پیڈرو۔“ میں نے وحشت زدہ آواز میں کہا جو اس حد تک بدلی ہوئی تھی کہ میرے کانوں کو بھی اپنی آواز نہیں لگی۔ ”میں تجھے چند سیکنڈ دوں گا کہ خدا سے ہر گناہ کی اور ہر جرم کی معافی مانگ لے۔“ میں نے اس کے منہ پر تابڑ توڑ مکّے مارے۔ ”بول اپنے منہ سے۔ خدا کے سامنے اقرار کر کہ تو نے میر شرافت علی کو مارا، منشی فوما نجو کو

مارا، اس کی بیوی کو مارا، بیٹے کو مارا، سلامت علی کو مارا، غلام علی کو مارا۔" ہر بار میں اس کی گردن کو دبا کے اس کا سر اٹھاتا تھا اور فرش پر دے مارتا تھا۔

"اس کو گولی لگ گئی ہے۔" پہاڑ خان نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ "پھر اسے کیوں مار رہے ہو؟"

ایک دم مجھے ہوش آ گیا۔ ایک بے عقل نے مجھے عقل کی لگام ہاتھ میں تھما دی تھی۔ اگر وہ مجھے نہ روکتا تو پیڈرو وہیں میرے ہاتھوں قتل ہو جاتا۔ میں نے سر سے دیوانگی کو جھٹکا اور کھڑا ہو گیا۔ گولی پیڈرو کی ٹانگ میں لگی تھی اور اب وہ بے ہوش پڑا تھا۔ پشیمانی کے ردِعمل نے مجھے مغلوب کر دیا۔ مجھے فوراً خیال آیا کہ کہیں پیڈرو کے سر میں اندرونی چوٹ ایسی نہ آئی ہو کہ وہ ہوش میں ہی نہ آئے اور مر جائے۔ پیڈرو جیسے دشمن کا ہاتھ میں آنا تو دشمن کے سب سے مضبوط قلعے کی تسخیر سے بڑا کارنامہ تھا۔ مجھے اب جوش سے نہیں، ہوش سے کام لیتے ہوئے پیڈرو کو زندہ رکھنا تھا۔ وہی ایک شخص تھا جو اوّل تا آخر ہر راز سے پردہ اٹھا سکتا تھا اور وہ سب کچھ بتا سکتا تھا جو میں جاننا چاہتا تھا۔ اس کی فردِ جرم بہت طویل تھی اور اگر ہم کسی طرح اس سے اعترافِ جرم کرانے میں کامیاب رہتے تو خود کو بہت سے الزامات سے بچا سکتے تھے اور قانون کے سامنے اصل مجرم کو پیش کر کے یہ ثابت کر سکتے تھے کہ ہم کس حد تک بے گناہ ہیں۔

اچانک میں نے اپنے پیچھے آہٹ سی سنی اور میں تیزی سے پلٹا۔ نیچے گرتے گرتے میں نے گولی چلائی اور وہ شخص جو ہوش میں آنے کے بعد اٹھ کر خاموشی سے اندر آ گیا تھا، چکر کھا کے نیچے گرا۔ اس نے پہاڑ خان کی بے خبری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ریوالور چھیننے کی کوشش کی تھی اور کسی حد تک اپنی کوشش میں کامیاب بھی رہا تھا لیکن وہ گولی نہ چلا سکا۔ میری گولی اس کی گردن میں لگی تھی اور جب اس نے گولی چلائی تھی تو خود اسے علم نہیں تھا کہ اس کا نشانہ کون بنا۔ میں یا کوئی دیوار یا چھت۔

وہ حلق سے بڑی کربناک آوازیں نکال رہا تھا اور فرش پر ایڑیاں رگڑ رہا تھا۔ اس کی گردن سے پھوٹنے والا خون کا فوارہ دیکھ کر پہاڑ خان کا رنگ لاش سے زیادہ سفید ہو رہا تھا۔ اچانک وہ لڑکھڑایا اور نیچے گر کر بے ہوش ہو گیا۔ اس نادان لڑکے نے جسمانی طاقت کا مظاہرہ تو پہلے بھی دیکھا ہو گا اور خود بھی اس میں شریک رہا ہو گا۔ اپنے دعوے کے مطابق ایک کرنل نے اسے گولی چلانا بھی سکھایا

تھا مگر کسی جیتے جاگتے آدمی کا خون بہنے اس نے کم دیکھا ہو گا۔ یہ نفسیاتی کمزوری بہت عام ہے اور ... لوگ جو بہت بہادر، نڈر اور جرأت مند کہلاتے ہیں ... کمزوری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ ذہن یا جسم کا ... ردِعمل ہوتا ہے جسے وہ روکنا بھی چاہیں تو نہیں ... سکتے۔ ایک ڈاکٹر نے مجھے بتایا تھا کہ سرجیکل شاک ... ہوتا ہے۔ یہ اسی قسم کی کیفیت تھی۔

میں نے پہاڑ خان کو وہیں چھوڑا اور پلٹ کر ... کمرے میں آیا تاکہ باقی دو افراد کو ہوش میں آنے ... ہی باندھ کر ڈال دوں۔ انہیں باندھنے کے لیے میں ... انہی کے کپڑے پھاڑے اور دونوں کے ہاتھ کمر کے ... باندھ دیے۔ پیروں کو ملا کر ٹخنے کے قریب سے باندھ ... بعد میں نے ان کو یکجا کیا۔ اس طرح کہ ان کی کمر سے کمر ... گئی لیکن منہ مخالف سمتوں میں رہے اور دونوں کا ایک بنڈل بنا دیا۔ اس میں ان کے تقریباً تمام ہی کپڑے استعمال ہو گئے جن میں میرے پرانے کپڑے بھی شامل تھے۔

اب دیر کرنا خطرہ مول لینے کے مترادف تھا۔ میں ... دوسرے کمرے میں گیا۔ ابھی تک مجھے دوسرے کمرے کے ... غور کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اطمینان سے دیکھنے پر ... ایک ٹیبل پر تین چیزیں نمایاں نظر آئیں۔ ایک ٹی وی ... دوسرا ٹیپ ریکارڈر اور تیسرا ویسا ہی واکی ٹاکی جیسا ہم ... گامے ماچھی کے اڈے سے ملا تھا یا وہاں کسی خاص مقصد کے تحت ہمارے حوالے کیا گیا تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ دونوں سیٹ ایک ہی فریکوئنسی پر ٹیون کیے ہوئے ہوں۔ اس ... چیز کو صرف باہر سے اسمگل کر کے لایا جا سکتا تھا۔ ہمارے لیے یہ انتہائی کارآمد چیز تھی۔ بظاہر یہ شارٹ ویو ٹرانسمیٹر تھا جس سے طویل فاصلوں تک پیغام رسانی ممکن ہوتی ہے اور ایک دوسرے سے الگ رہتے ہوئے بھی باہمی رابطہ قائم رکھنے کی اس سے بہتر صورت کوئی نہیں ہوتی۔ ٹیپ ریکارڈر میں یقیناً وہ سب گفتگو محفوظ ہو گی جو ہم سے سچ پوچھنے کے نام پر کی گئی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ یہ سچ دشمنوں تک پہنچ جائے چنانچہ میں نے صرف واکی ٹاکی ... اٹھایا اور باقی چیزوں کو چھیڑنے سے گریز کیا۔ ایک دیوار ... کے ساتھ اسٹول سے ذرا بڑی میز پر ایک چپٹا سا باکس رکھا ... تھا۔ میں نے اسے کھول کر دیکھا تو اندر اس سارے نظام ... کو کنٹرول کرنے والا سوئچ بورڈ دکھائی دیا۔ اس میں ... درجن کے قریب پُش بٹن، گھومنے والی ناب اور سلائیڈ ... لیور تھے۔ اسی سے وہ ... کنٹرول ہوتی تھی ...

... تھی۔ کبھی مجھے بصارت عطا کر دیتی تھی، کبھی مجھ پر حکمران ... کو صرف میرا مقصد بنا دیتی تھی اور کبھی میری حالت زار کی تصویر اتار کے آگے ارسال کرتی تھی۔ میں نے ریوالور نکالا اور پے در پے اس پر فائر کیے۔ اس میں سے چنگاریاں اڑیں، دھواں اٹھا اور دھماکے سنائی دیے۔ میں نے وہی قرار محسوس کیا جو شاید میں پیڈرو کے سینے کو چھلنی کر کے محسوس کرتا اگر مصلحت کے تقاضوں نے مجھے روک نہ لیا ہوتا۔ انسانوں کے ساتھ یہ آلات بھی میرے دشمن تھے اور اس مشین سے میں نے تین دن کی اذیت کا بدلہ لے لیا۔ پھر میں نے دوسرا خالی ہو جانے والا ریوالور بھی پھینک دیا۔

اب مجھے کئی مسائل درپیش تھے۔ سب سے پہلے مجھے پہاڑ خان کو ہوش میں لانا تھا۔ اس کو پہاڑ خان کہنا مجھے اچھا نہیں لگتا تھا لیکن اسے نزاکت علی کہنا اس سے بھی زیادہ مضحکہ خیز بات ہوتی۔ ایک جگ میں مجھے تھوڑا سا پانی ملا۔ میں نے پہاڑ خان کے منہ پر چھینٹے مارے اور ایک چمچے کی مدد سے کچھ پانی اس کے حلق میں اتارنے میں کامیاب رہا۔ وہ ہوش میں آنے لگا تو میں نے اس کے گال تھپکے۔ "پہاڑ خان... شاباش اٹھو... ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔ ہمت سے کام لو۔ ایسا نہ ہو کہ کچھ اور لوگ آ جائیں۔" میں نے اس کے کانوں میں کہا۔

"اور کون آ سکتا ہے؟" وہ ایک دم اٹھ بیٹھا۔

"کیا معلوم ان کے کتنے ساتھی تھے اور اس وقت وہ کہاں ہیں۔" میں نے کہا۔

پہاڑ خان کے اتنی جلد ہوش میں آ جانے سے مجھے خوشی ہوئی۔ اگر مجھے اس پہاڑ کو اٹھا کر لے جانا پڑتا تو یہ کام آسان نہ ہوتا۔ ابھی میں سو فیصد فٹ نہیں تھا۔ اس کے بازو کو ٹوٹے ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی اور میں چاہتا تھا کہ جتنی جلد اس کے ہاتھ پر پلاستر چڑھ جائے اور اسے درد کو کم کرنے والی دوائیں مل جائیں اتنا ہی اچھا ہے۔ یہ اسی صورت میں ممکن تھا جب ہم جلد از جلد اس جگہ سے نکل جائیں۔ معلوم نہیں ہم کس بستی یا ویرانے میں تھے اور کسی سڑک سے کتنی دور تھے۔ مجھے پیڈرو کو بھی اٹھا کے لے جانا تھا اور اپنی موجودہ حالت میں مجھے یہ بوجھ اٹھا کے بہت زیادہ فاصلہ طے کرنا محال لگتا تھا لیکن ناممکن کو ممکن بنانا پڑتا تب بھی مجھے خدا پر بھروسا کرتے ہوئے یہ کام ضرور کرنا تھا۔

میں نے پیڈرو کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور میرے ہاتھ ... پیسی چابی آ گئی۔ ایک تالا جو مضبوط اور موٹے پٹوں میں نصب تھا سب سے ... اور ... الے حصے میں تھا۔ دوسرا وسط میں اور تیسرا بالکل نیچے۔ ان کے صرف سوراخ باہر نظر آتے تھے اور جس ترتیب سے تالے لگائے گئے تھے اس سے بخوبی اندازہ ہو جاتا تھا کہ دیواروں کا حصہ بن جانے والے دروازے کو اتنی آسانی سے نہیں توڑا جا سکتا تھا جتنی آسانی سے ہم نے اندر والے دروازے کو کھول لیا تھا۔ اس کی تو ہر چٹخنی عام قسم کی تھی لیکن یہ تالے بہت مضبوط تھے۔ دروازہ کھولنے سے پہلے میں نے تیسرے ریوالور کو بالکل تیار رکھا کہ باہر بھی کسی پہریدار کا سامنا ہو تو اس سے نمٹا جا سکے لیکن انہیں اپنے حفاظتی انتظامات کے ہر طرح سے مکمل ہونے پر اتنا اعتماد تھا کہ باہر کسی چوکیدار کی موجودگی کی ضرورت کو انہوں نے نظرانداز کر دیا تھا۔

مجھے اپنے مقابل کچھ سیڑھیاں نظر آئیں۔ میں شوق و اضطراب میں دوڑتا ہوا اوپر گیا۔ زینے پر آخری قدم رکھتے ہی میں نے خود کو ایک کھنڈر میں دیکھا۔ یہ کوئی پرانا مکان تھا۔ پتھروں سے بنے ہوئے بیرونی احاطے کی دیوار مجھ سے سو گز دور تھی اور مکان یا قدیم حویلی کے چاروں طرف اس کا فاصلہ اتنا ہی تھا۔ ہو سکتا ہے کسی زمانے میں یہ باغ رہا ہو مگر اب ایک جنگل تھا۔ کیکر کے خودرو کانٹے دار درخت تیزی سے پھیلے تھے اور بیشتر رقبے پر قابض تھے۔ کہیں کہیں ان سے اوپر نکل جانے والے شیشم اور پیپل کے درخت بھی تھے۔ نیچے لمبی لمبی تیز دھار کے پتوں والی خشک اور زرد گھاس پھیلی ہوئی تھی جس میں سانپ، گرگٹ اور دوسرے رینگنے والے جانوروں کی بھرمار ہوتی تو مجھے تعجب نہ ہوتا۔

باقی مکان کی دیواریں بھی باہر سے پرانے پتھروں کو جوڑ کر اٹھائی گئی تھیں۔ مختلف کمروں کے درمیان اگر دروازے تھے تو لوگ نکال کر لے گئے تھے چنانچہ سب کمرے مل کر ایک ہو گئے تھے۔ چھت صرف ایک کمرے پر باقی رہ گئی تھی مگر اس کے شہتیر اور کڑیاں بھی اتنے جھک گئے تھے کہ درمیان میں خم محسوس ہوتا تھا اور لگتا تھا کہ چھت ابھی سر پہ آ پڑے گی۔ باقی کمروں میں چھت کا ملبہ کمروں کی دیواروں میں ڈھیر تھا۔ پچھلی طرف جا کر دیکھنے سے مجھے باہر جانے کا راستہ نظر آیا۔ کم سے کم بیس فٹ چوڑے اور کنکروں والے راستے پر بھی جگہ جگہ گھاس اُگ آئی تھی جسے حال ہی میں گاڑیوں نے روندا تھا۔ یہ کچلی ہوئی گھاس مجروح تھی مگر پھر بھی سر اٹھا رہی تھی۔

میں بیرونی فصیل کے گیٹ تک گیا اور چاروں طرف پھیلی ہوئی ویرانی کو مایوسی سے دیکھا۔ میری نظر کسی آبادی کے آثار تلاش نہ کر سکی۔ ہر سمت ویسا ہی بیابان تھا جیسا فصیل کے اندر پھیلا ہوا تھا۔ میں نے فصیل کی دیوار پر چڑھ کے دیکھا تو دو فرلانگ کے فاصلے پر مجھے سڑک نظر آ گئی۔ میرا حوصلہ ایکدم

بلند ہوگیا۔ میں فوراً واپس ہوا۔

"پہاڑ خان! ہمیں دو فرلانگ تک جنگل سے گزر کے سڑک تک پہنچنا ہے۔" میں نے کہا۔"امید ہے وہاں کوئی نہ کوئی سواری ضرور ملے گی اور معلوم ہو جائے گا کہ ہم لاہور سے کتنی دُور ہیں۔"

"میں دو فرلانگ تک پیدل جا سکتا ہوں۔" اُس نے فخر سے یوں کہا جیسے یہ کام اور کوئی کر ہی نہیں سکتا۔

"تمھارے ہاتھ میں یقیناً بہت تکلیف ہوگی۔" میں نے کہا۔"تم دوسرے ہاتھ میں ریوالور رکھنا۔ میں اس شخص کو اپنے کندھوں پر ڈال لیتا ہوں۔"

"دو اور بھی تو ہیں۔" اس نے مجھے یاد دلایا۔

"ان کو ساتھ نہیں لے جانا ہے۔" میں نے کہا۔"صرف استاد پیڈرو کو اُٹھانا ہے۔"

"اس کا نام تمھیں کیسے معلوم! یہ تو نمبر وَن تھا۔" پہاڑ خان نے حیران ہو کے کہا۔

"میں جانتا ہوں ان سب بدمعاشوں کو۔" میں نے کہا۔"جو بات میں سمجھانا چاہتا ہوں وہ کچھ اور ہے۔ دو فرلانگ کا راستہ بہت لمبا ہوتا ہے۔ مجھ میں اتنی طاقت نہیں ہے۔ ہم باری باری اسے اٹھائیں گے۔ اس کا وزن بہت زیادہ ہے۔"

"تم فکر مت کرو۔ اس کو اُٹھا کے میرے کندھے پر ڈال دو۔" پہاڑ خان نے کہا۔"اب میں بالکل ٹھیک ہوں اور اگر میرا ایک بازو ٹوٹا ہوا نہ ہوتا تو میں ایسے ایسے دو کو اُٹھا کے دو میل بھی جا سکتا تھا۔"

"تم واقعی پہاڑ سے زیادہ مضبوط ہو۔" میں نے تعریفی لہجے میں کہا۔"مگر یہ نام پہاڑ خان کچھ اچھا نہیں لگتا۔"

"تو تم مجھے نزاکت علی کہہ سکتے ہو۔" وہ بولا۔

"میں تمھیں فولاد خان کہوں گا۔ تم فولادی آدمی ہو۔" میں نے کہا اور پیڈرو کو اُٹھا لیا۔

"ابھی تک تم نے اپنا نام نہیں بتایا۔" وہ بیٹھتے ہوئے بولا تاکہ مجھے پیڈرو کو زیادہ اوپر نہ اٹھانا پڑے۔

"میں... تم سمجھ لو کہ میں بھی نمبر وَن ہوں۔" میں نے کہا اور پیڈرو کو اس کے کندھے پر ڈال دیا۔"نمبر وَن لوگ دو طرف ہوتے ہیں۔ نمبر وَن بدمعاش اور نمبر وَن شریف۔ نمبر وَن چالاک اور نمبر وَن احمق۔"

وہ احمقوں کی طرح میری صورت دیکھتا رہا اور پھر آسانی سے کھڑا ہوگیا۔"تمھارا نام کوئی نہیں؟"

میں نے کچھ دیر سوچا اور پھر اُسے بتا دیا کہ میرا نام سکندر ہے۔ اس جیسے نادان سے کچھ چھپانے میں نہ کوئی نقصان تھا نہ اس سے کوئی فائدہ تھا لیکن اس سے آئندہ کبھی نقصان [...] سکتا تھا۔ صرف اس کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے [...] اپنا نام بتا دیا تھا کیونکہ فوری طور پر مجھے فولاد خان کو [...] رکھنے کے سوا چارہ نظر نہ آتا تھا اور ایسا لگتا تھا وہ [...] ہو کے کہیں جانا پسند بھی نہیں کرے گا۔ جب تک [...] کے باعث اس کا ٹوٹا ہوا بازو ٹھیک نہیں ہوگا اُسے تیمارداری کی ضرورت ہوگی اور اس وقت تک وہ سب [...] مانوس ہو جائے گا۔ ایک ایسا شخص جس کے لیے سگے [...] اور چچا کے گھر میں جگہ نہ ہو کسی بھی ایسے گھر میں رہنے کو ترجیح [دے] گا جہاں کوئی اس سے نفرت نہ کرتا ہو۔ زمانے بھر کے [...] ٹھکرائے اور ترسائے ہوئے ستم رسیدہ اور مردم گزیدہ ایک [...] چھپر کے نیچے جمع ہو رہے تھے۔ یہ کسی اینٹ چونے کی دیوار پر پڑا ہوا چھپر نہیں تھا۔ کسی گھر کی چھت کا سایہ نہیں تھا جسے ہم میں سے کوئی اپنا کہہ سکتا۔ یہ تو رفاقت اور عہد و وفا، خلوص اور اپنائیت کے احساس، محبت اور اعتماد کا وہ چھپر تھا جو سب کو تحفظ فراہم کر سکتا تھا اور سب کے کام آ[تا] تھا۔ اس چھپر کا نام ہم نے شرارت میں "ایم آر ایس" رکھ دیا تھا۔

میرے ایک ہاتھ میں ریوالور تھا اور دوسرے میں [...] واکی ٹاکی۔ میں نے جنگل میں سے گزرنے والا راستہ دیکھ لیا تھا مگر [...] اس سے ہٹ کر چلنا پسند کیا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اچانک سامنے سے کوئی گاڑی نمودار نہ ہو جائے۔ پیڈرو کو وہاں کا محافظ کا نگران اعلیٰ بنا کے جانے والے کسی بھی لمحے آ سکتے تھے۔ انھوں نے تفتیش کے لیے ایسی جگہ کا انتخاب کیا تھا جہاں واقعی کسی کے خیال کا بھی گزر نہ تھا۔ میرے لیے اطمینان کی بات یہ تھی کہ تفتیش خاطر خواہ ہوئی تھی۔ وہ مجھ سے سچ اگلوانا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے تشدد کا حربہ آزمانے سے گریز کیا تھا اور زیادہ سائنٹفک بنیادوں پر کام کرتے ہوئے ایسی دوائیں استعمال کی تھیں جو واقعی ذہن کو مفلوج کر کے لاشعور پر اثر انداز ہو سکتی ہیں۔ ایسی ہی ایک دوا "اسکوپولیمائن" تھی مگر [...] کا زمانہ تھا۔ شاید اب زیادہ موثر اور سریع الاثر دوائیں ایجاد ہو چکی ہوں۔ میڈیکو لیگل کیس میں اس قسم کی تفتیش ضروری [...] جاتی ہے۔ خصوصاً اس وقت جب کوئی شخص پہلے بقائمی ہوش و حواس قتل کرے اور پھر پھانسی سے بچنے کے لیے [پاگل] بن جائے اور ثابت کرنا چاہے کہ اس کا یہ فعل ہوش سے بیگانگی کا نتیجہ تھا چنانچہ قابلِ مواخذہ نہیں۔ ان دواؤں کے زیرِ اثر [...] جھوٹ بول ہی نہیں سکتے چنانچہ اسے "ٹرتھ سیرم" یا سچائی [کی] دوا کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ شکاری مجھے کوئی ایسی ہی دوا [دے] چکے تھے جس کے بعد میں [...]

[...] جھوٹ بول رہا ہوں۔ اس تفتیش کے نتائج ان کے نقطۂ نظر سے بہت اطمینان بخش تھے۔ اب وہ مطمئن ہو کر بیٹھ سکتے [تھے] کہ اتفاقات اور غلط سوچ کے علاوہ ان کی کوشش سے ہم غلط سمت میں چل پڑے ہیں۔ وہ اسلحے کی اسمگلنگ میں [...] سے کوئی خطرہ محسوس نہیں کریں گے کیونکہ ہم تو ہیروئن کے [...] دھندے کو ختم کرنے کے چکر میں پڑ چکے ہیں۔ آئندہ بھی [...] ہمیں گمراہ رکھنے کے لیے وہ مزید ثبوت فراہم کریں گے کہ وہ واقعی ہیروئن کی اسمگلنگ میں ملوث ہیں۔

اُدھر پہلے سے موجود تھی۔ وہ کیسے فرض کر سکتے تھے

سڑک کوئی قومی شاہراہ نہیں تھی بلکہ کسی گاؤں، قصبے کو جانے والی ذیلی سڑک تھی۔ میں نے فولاد خان یعنی سابقہ پہاڑ خان سے ایک پیپل کے نیچے انتظار کرنے کو کہا۔ صرف دو فرلانگ چلنے سے میرا سانس پھول رہا تھا اور میں کمزوری محسوس کرنے لگا تھا لیکن فولاد خان پر تھکن کا بالکل اثر نہ تھا حالانکہ وہ پیڈرو کا وزن بھی اُٹھا کے لایا تھا۔

"تم اس پر نگاہ رکھنا۔" میں نے کہا۔"اس کو اُٹھنے مت دینا۔ یہ بہت خطرناک آدمی ہے۔"

"اگر یہ ہوش میں آ جائے تو کیا کروں؟" فولاد خان نے سر ہلایا۔

"اس کو پھر بے ہوش کر دینا۔" میں نے کہا۔"تمھارے آس پاس اتنے پتھر پڑے ہیں۔"

"پتھر... پتھر مارنے سے اس کا سر پھٹ جائے گا۔" وہ بولا۔

"اچھا، یہ لو ریوالور..." میں نے کہا۔"اس کو ہلنے مت دینا اگر یہ ہوش میں آ جائے۔"

وہ کسی چھوٹے سے برساتی نالے کا پُل تھا جو اس وقت خشک پڑا تھا۔ سڑک اس کے اوپر سے گزر رہی تھی اور اینٹوں سے بنے ہوئے واحد محرابی دروازے کے سائے میں چھ فٹ بلند اور چھ فٹ چوڑی جگہ بہت محفوظ تھی۔ میں باہر نکلا اور برگد کے ایک درخت کے بہت چوڑے تنے کے پیچھے چھپ کر کھڑا ہوگیا جہاں سے میں دونوں جانب سڑک کو دُور تک دیکھ سکتا تھا مگر سڑک پر سے گزرنے والے کسی شخص کی نگاہ مجھے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ درخت کے آگے پیچھے وہ جال سا تھا جسے برگد کی داڑھی کہا جاتا ہے اور اس کے ریشے زمین میں جڑوں کی طرح پیوست ہو کر چھوٹے موٹے درختوں کا تماشا بنے تھے۔ طویل اور پُرعذاب انتظار کی قید سے رہائی کے بعد اب پھر انتظار تھا کہ سڑک پر کوئی سواری نظر آئے تو ہم منزل کا نشان پوچھیں اور آگے روانہ ہوں۔ منزل کے تصور کے ساتھ ہی رابعہ کا خیال اندھیری رات کے مسافر کے لیے چاند کی طرح ابھرتا تھا اور میری بے قراری میں اضافہ کرتا تھا۔ ابھی تک میں خود آزاد نہیں تھا تو میں نے خیال کو بھی پابند کر رکھا تھا مگر اب دلِ ناصبور کے لیے ساعتِ دیدار کی خواہش ایک تڑپ بنتی جا رہی تھی۔ میں اس کے جمالِ لب و رخسار اور اس راحتِ قلب و جاں کی محبت کے خیال کے طلسم میں گرفتار، ہر دھڑکن کو شمار کر رہا تھا جو عالمِ فراق میں گزرتے ہوئے وقت کی خبر دیتی تھی اور اس وقت جب میں اسے رگِ جاں سے بھی قریب تر دیکھتا تھا، وہ نہ جانے کہاں تھی۔ اس کے بارے میں آخری خبر یہ تھی کہ اسے شکاری اغوا کر کے ڈھنگا پتن نام کے کسی گاؤں کی طرف لے گئے تھے اور عین اس وقت جب ہم ڈونگا پتن کے قریب تھے شکاری اپنی دوسری چال میں کامیاب رہے تھے اور مجھے بہت دُور کسی نامعلوم مقام پر لے گئے تھے۔ محسن اور نیک محمد کامیاب لوٹے ہوں یا ناکام، مجھے غائب پا کے بہت پریشان ہوئے ہوں گے۔ کیا معلوم وہ رابعہ اور نازو کی تلاش میں جانے والے خود بھی گرفتار ہو گئے ہوں اور اب آس لگائے بیٹھے ہوں کہ میں ان کی رہائی کے لیے کچھ کروں گا کیونکہ میں آزاد ہوں۔

یہ تقدیر کی عجب ستم ظریفی ہوگی کہ وہ مجھے آزاد فرض کیے اور مجھے خدا کی مدد کا وسیلہ سمجھے امید اور عذاب کی گھڑیاں کاٹ رہے ہوں — جبکہ میں ایسی جگہ قید تھا جہاں سے میرا زندہ بچ کے نکل آنا ہی تائیدِ ایزدی کے بغیر ممکن نہ تھا۔ میری پوزیشن مختلف تھی، میرے بارے میں ان کو علم نہیں تھا کہ دشمن مجھے کس طرف لے گئے ہوں گے۔ چنانچہ مجھے ان میں سے کسی کے آنے اور مجھے رہائی دلانے کی امید بالکل نہیں تھی اور یہ حقیقت ہے کہ وہ کبھی وہاں نہیں پہنچ سکتے تھے جہاں میں قید تھا لیکن ان کے بارے میں مجھے اتنا ضرور معلوم تھا کہ وہ ڈونگا پتن کی سمت گئے ہوں گے۔ واپسی پر ان میں سے کوئی بھی مجھے نہ ملا تو میری تلاش کا آغاز ڈونگا پتن سے ہی ہوگا۔ جو واقعات گامے ماچھی کی جعلی خانقاہ پر پیش آئے تھے ان کی کڑیاں آپس میں ملی ہوئی تھیں۔ نازو اور رابعہ کو وہیں سے لے جایا گیا تھا پھر محسن اور نیک محمد میرے ساتھ ان کو تلاش کرنے نکلے تھے تو ان کا اتنا سراغ پایا تھا کہ دو افراد جن میں سے ایک لمبا اور دوسرا چھوٹا تھا انھیں ایک ایسی پرانے ماڈل کی شیورلیٹ میں ڈال کے لے گئے ہیں جس کی ایک ٹیل لائٹ نہیں ہے اور پچھلا نمبر غائب ہے۔ اس کے بعد کوئی ہمارے تعاقب میں لگ گیا تھا اور ٹھیک وقت پر شکاری آ پہنچے تھے۔

اس سوٹ والے نے جو کار میں گزرا تھا اور جس نے

ہمیں بتایا تھا کہ ڈونگا پتن قریب ہی ہے' صرف ہمیں اسی جگہ روکنے کے لیے غلط بیانی کی تھی اور آگے جاکر اپنے سائنسی استاد پیڈرو کو بلا لایا تھا۔ کیا اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ شکاری صرف مجھے پکڑنا چاہتے تھے؟ نہیں۔ اگر میں ان کو وہاں نہ ملتا تو وہ مجھے ڈونگا پتن میں آ کے پکڑ لیتے۔ انھوں نے محسن اور نیک محمد کو بھی پکڑ لیا ہوگا جو ٹیکسی کو اسی جگہ چھوڑنے کے بعد زیادہ دُور نہیں جا سکے ہوں گے۔ ممکن ہے ڈونگا پتن سچ مچ وہاں سے قریب ہو جہاں انھوں نے رابعہ اور نازو کو رکھا ہو اور بعد میں نیک محمد اور محسن کو بھی انھی کے ساتھ قید کر دیا ہو جو شامتِ اعمال کے باعث خود چل کے اپنے زنداں تک جا پہنچے تھے۔

لیکن انھوں نے سب کو گرفتار کیا ہوتا تو وہ سب کو ایک ہی جگہ رکھتے۔ میں نے خالی سڑک پر اِدھر اُدھر نگاہ ڈال کے سوچا۔ جو "سچ" انھوں نے مجھ سے اگلوایا وہی "سچ" دوسروں سے بھی پوچھتے۔ اس کالے قید خانے میں تو سب کے لیے جگہ تھی اور وہاں سے کسی کا نکلنا ناممکن تھا۔ قدرت کی بات الگ ہے جس نے فولاد خان جیسے شخص کو مدد کے لیے بھیج دیا تھا حالانکہ اس کے پہاڑ جیسے وجود کی سب سے اوپر والی منزل تقریباً خالی تھی۔ شاید شکاری اس بار زیادہ محتاط تھے۔ انھوں نے سب کو الگ الگ رکھا ہوگا اور سب سے اپنے طور پر "سچ" اگلوانے کی بھرپور کوشش کی ہوگی۔ وہ اپنی کوشش میں کس حد تک کامیاب رہے' کون اس آزمائش اور عذاب کو جھیل کر وفا کے امتحان میں سرخرو ہوا اور کس نے ہمت ہار دی؟ جھوٹ بالآخر جھوٹ ثابت ہوگا یا میرا سچ ہی سب کا سچ بن جائے گا' اس کا علم مجھے سب سے ملے بغیر نہیں ہو سکتا تھا۔

تشدد کے حربے کا مقابلہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی کیونکہ سب کی قوتِ برداشت ایک جیسی نہیں ہوتی اور سارے حربے ایک جیسے نہیں ہوتے۔ اگر انھوں نے محسن اور نیک محمد کو تشدد کا نشانہ بنایا ہوگا تو کچھ اور طریقے اختیار کیے ہوں گے اور نازو یا رابعہ سے کچھ پوچھنا چاہا ہوگا تو دوسرے طریقے آزمائے ہوں گے لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جو سائنٹیفک طریقۂ کار مجھ پر آزمایا گیا تھا وہی انھوں نے باقی سب پر آزمایا ہوگا تو سب نے واقعی سچ بتا دیا ہوگا۔ میں تو اس لیے بچ گیا تھا کہ میں ایک بات کو سمجھ گیا تھا اور قدرت نے مجھے اس ذہن کو متاثر کرنے والی دوا سے بچنے کا ایک موقع عطا کر دیا تھا۔ ضروری نہیں کہ دوسروں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہو۔ ان دواؤں کے زیرِ اثر مزاحمت ختم ہو جاتی ہے اور آدمی چاہے بھی تو جھوٹ نہیں بول سکتا۔ اگر انھوں نے الگ الگ حاصل ہونے والے بیانات کا مقابلہ کیا تو ان کو معلوم ہو جائے گا کہ جھوٹ صرف میں نے بولا تھا اور سمجھ جائیں گے کہ ہم حقیقت سے باخبر ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ وہ منشیات کا نہیں' اسلحے کی اسمگلنگ اور ناجائز خرید و فروخت' تقسیم اور ترسیل کا کام کرتے ہیں۔ ممکن ہے وہ پیڈرو کو میری حفاظت کے لیے چھوڑ کر کسی جگہ اکٹھے ہوئے ہوں اور ہم سب کے بیان سے اصل سچ اخذ کرنے کے بعد یہ طے کرنا چاہتے ہوں کہ ایسی صورت میں ہمارا انجام کیا ہونا چاہیے۔

اگر انھیں واقعی علم ہو گیا کہ ہم سب جانتے ہیں تو وہ ہمیں زندہ چھوڑنے کا خطرہ کیوں مول لیں گے۔ اس کے بعد ان کے لیے تشویش کی صرف ایک بات رہ جائے گی کہ ہم نے اور کس کس کو شریکِ راز کیا ہے؟ کون کون جانتا ہے کہ چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کا اصل دھندا کیا ہے؟ پھر وہ اپنے اڈے بدلیں گے اور ایجنٹ بدلیں گے۔ نیچے سے اوپر تک سب کو خبردار کریں گے کہ محتاط ہو جائیں کیونکہ راز فاش ہو چکا ہے۔ اگر واقعی ایسا ہوا تو یہ بڑی مایوس کن اور حوصلہ شکن بات ہوگی۔ ہمارا سارا پروگرام چوپٹ ہو جائے گا اور "ایم آر ایس" جس کا مشن ملک و قوم کے غداروں کو چن چن کر ٹھکانے لگانا تھا ناکام ہو جائے گی۔ پھر چوہدری دلاور کے خلاف میری جنگ صرف ذاتی انتقام کی جنگ رہ جائے گی اور یہ جدوجہد صرف حقِ وراثت کی جدوجہد بن جائے گی جس میں اب تک بہت سے بے گناہ اپنی جانوں کا نذرانہ دے چکے ہیں۔

انتظار میرے لیے اتنا ہی صبر آزما ثابت ہو رہا تھا جتنی پریشان خیالات کی یلغار میرے حوصلوں کو پست کرنے لگی تھی کہ اچانک میں نے ایک چیخ سنی۔ یہ نیم مردانہ نیم زنانہ چیخ فولاد خان کی تھی۔ میں ایک دم بھاگا لیکن پھر بھی مجھے دیر ہو گئی۔ غلطی مجھ سے یہ ہوئی تھی کہ اس جگہ سے کچھ دور آ گیا تھا جہاں میں نے بے ہوش پیڈرو کو بیوقوف فولاد خان کی تحویل میں چھوڑا تھا اور یہ فرض کر لیا تھا کہ ریوالور ہوگا تو پیڈرو اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ میں نے اس بنیادی حقیقت کو نظرانداز کر دیا تھا کہ آدمی کی اصل طاقت تو اس کی عقل ہوتی ہے۔ اسلحہ عقل کے بغیر استعمال کیا جائے تو فائدے کی جگہ نقصان کا سبب بن سکتا ہے۔ میں نے ایک فائر کی آواز سنی۔ پھر مجھے پیڈرو کے ہاتھ میں ریوالور نظر آیا۔ اگر میں فوراً درخت کے تنے کے پیچھے نہ چھپ جاتا تو پیڈرو کی نگاہیں یقیناً مجھے دیکھنے میں کامیاب ہو جاتیں۔

وہ کچھ دیر مجھے تلاش کرتا رہا اور ایک بار اس درخت کی سمت بھی آیا جس کے پیچھے میں دبکا ہوا تھا۔ زندگی میں پہلی

بار مجھے احساس ہوا کہ ریوالور کتنی بڑی طاقت ہے اور مسلح آدمی کے مقابل تہی دست آدمی کتنا بے بس ہوتا ہے۔ اس وقت پیڈرو میری جھلک دیکھ لیتا یا میری آہٹ بھی پا لیتا تو مجھے شوٹ کرنے میں تاخیر نہ کرتا۔ وہ سخت مشتعل تھا اور ناکامی کے ردِعمل نے اسے زیادہ خطرناک بنا دیا تھا۔ ایک وقت وہ تھا جب میں اسے قتل کرنے والا تھا کہ ایک کم عقل شخص نے مجھے روک کر اس کی زندگی بچا لی تھی اور پیڈرو نے اس احسان کا بدلہ یوں چکایا تھا کہ سب سے پہلے اپنے اسی محسن کا کام تمام کر دیا تھا۔ اب وہ اپنی شکست کا بدلہ مجھ سے لینے کے لیے پاگل ہو رہا تھا۔ دلاور کی موجودگی میں ایسے متعدد مواقع آئے تھے جب وہ مجھے قتل کر سکتا تھا مگر دلاور نے دیکھ لیا تھا کہ مجھے قتل کرنے سے اسے کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا۔ اصل شکاری صرف دلاور تھا جو پُرسکون رہتے ہوئے عقل اور ذہانت سے چال چلتا تھا اور جال بچھاتا تھا لیکن اس وقت یہاں صرف پیڈرو تھا جس کو گولی چلانے سے روکنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ اسے ایک تو یہ صدمہ تھا کہ اب دلاور کے سامنے وہ میرے فرار ہو جانے کے الزام کو قبول کرنے پر مجبور ہوگا۔ بے شک وہ اسے مطلع کرے گا کہ پہاڑ خان کو جس کی کوتاہی سے سکندر فرار ہونے میں کامیاب ہوا تھا وہ سزا دی جا چکی ہے جس کا وہ مستحق تھا اور جو اس کا مقدر بھی تھی مگر میرے ہاتھوں اس کی جو درگت بنی تھی اور پھر جس طرح میں اس کو اُٹھا لایا تھا' اس پر پیڈرو کا احساسِ ذلت میں مبتلا ہونا اور مجھے بھی قتل کرنے کے جنون کا شکار ہونا فطری ردِعمل تھا۔

اگر وہ میرے اتنے قریب آ جاتا کہ میں ایک جست میں اس پر جا پڑتا تو اپنے خالی ہاتھوں سے بھی میں اس کا کام تمام کر دیتا لیکن درمیانی فاصلہ زیادہ تھا۔ وہ پلٹ کر میرے حرکت میں آنے سے پہلے فائر کر سکتا تھا اور یہاں اس کا نشانہ خطا نہیں ہو سکتا تھا۔ بلاشبہ اسے انتقام کی خواہش نے پاگل کر رکھا تھا۔ اگر وہ پاگل نہ ہوتا تو اتنی بے خوفی سے میری نظروں کے سامنے نہ پھرتا۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ میرے پاس بھرا ہوا ریوالور ہوتا۔ ایسی صورت میں وہ کتے کی موت مارا جاتا۔ میں اطمینان سے اس کا نشانہ لے کر اس کی کھوپڑی اُڑا دیتا اور پھر اس کی لاش کو حشرات الارض' جنگلی جانوروں اور گدھوں کا لقمہ بننے کے لیے چھوڑ جاتا۔ اگر وہ مجھے دیکھ لیتا تو صورتِ حال اس کے برعکس ہوتی۔

مجھے اس وقت خیال آیا کہ کس طرح جلد بازی میں اور جذباتی ہو کے میں نے دو ریوالور خالی کر ڈالے تھے اور پھینک دیے تھے۔ اس شیطانی نظام کو ناکارہ بنانے کے لیے تو ایک گولی بھی کافی تھی۔ میں اُسے زمین پر مار کے بھی چُور چُور کر سکتا تھا لیکن میں نے اس پر فائر کھول دیا تھا۔ وہ میرا انتقامی ردِعمل تھا جس کا خمیازہ میں اب بھگت رہا تھا کہ شکاری میرے نشانے پر تھا مگر میں خالی ہاتھ ہونے کے سبب اپنی جان بچانے کی جدوجہد میں مصروف تھا حالانکہ اس وقت نزاکت علی عرف پہاڑ خان عرف فولاد خان کی موت کے صدمے نے میرے ذہن کو شدید صدمہ پہنچایا تھا اور میں اس شخص کی بے بسی کی موت کا انتقام بھی لینا چاہتا تھا جو اپنا بُرا بھلا تک نہیں سمجھتا تھا۔ جو نہ کسی کا دوست تھا نہ دشمن۔ فقط ایک تماشا تھا دستِ قدرت کی صنعت گری کا۔ ایک دیوزاد جس کا دماغ بچے جتنا تھا۔ اس کو مکر و فریب کی دنیا میں اسی طرح دوسروں کے مذموم مقاصد کے لیے استعمال ہو کے ایسے ہی مرنا تھا کہ نہ کوئی اُسے رونے والا ہو نہ اس کی کمی کو محسوس کرنے والا۔ اب اس کے لالچی اور کمینے چچا کے لیے پریشانی کی کوئی بات نہیں رہی۔ اس کا احمق بھتیجا جو اس کا خون تھا' اپنا حق مانگنے کی بات کرنے کے لیے بھی نہیں آئے گا۔

بالآخر پیڈرو نے میری تلاش ترک کر دی۔ مجھے اس کو جاتے دیکھ کر بہت افسوس ہوا۔ یہ جنگل نہ ہوتا تو میں اس کا تعاقب کرتا لیکن یہاں پیچھا کرنا ناممکن تھا۔ خشک پتے اور سوکھی ٹہنیاں میرے قدموں کے نیچے چلانے لگتے اور اُسے فوراً معلوم ہو جاتا کہ کوئی اس کے پیچھے آ رہا ہے۔ میرے آس پاس صرف پتھر پڑے تھے اور میں چاہتا تھا کہ پتھر مار کے اس کا سر پھاڑ دوں مگر مجھے اپنے نشانے پر اعتماد نہیں تھا اور نشانہ خطا ہو جانے کے تمام نقصانات میرے ذہن میں تھے۔ پیڈرو اسی راستے پر چلا گیا' جدھر سے کچھ دیر پہلے ہم آئے تھے۔ جب مجھے اس کی طرف سے کوئی خطرہ نہ رہا تو میں اپنی پناہ گاہ سے نکلا اور اس چھوٹے سے پُل کے نیچے گیا جہاں میں نے پیڈرو کی زندگی پر فولاد خان کو اختیار دیا تھا۔ تدبیر کند بندہ تقدیر کند خندہ۔ میں بھول گیا تھا کہ زندگی اور موت پر اختیار صرف کسی کے ہاتھ میں ریوالور تھما دینے سے نہیں مل جاتا۔ یہ تو کاتبِ تقدیر کا وہ فیصلہ ہے جو کسی بھی فانی انسان کی مرضی کی بات ہی نہیں۔ دنیا سے اسے ہی جانا پڑتا ہے جس کے لیے قدرت کی عطا کردہ فرصتِ عمر تمام ہو جاتی ہے۔

فولاد خان اپنے ہی خون میں غلطاں فرشِ خاک پر چت پڑا تھا اور برساتی نالے کی سوکھی مٹی اب تک اس کے رِسنے والے لہو کو پی رہی تھی۔ یہ خون اس کے دل سے سینے کے سوراخ ہی سے ہو کر باہر آ رہا تھا۔ فولاد خان مر چکا تھا اور اس کی کھلی آنکھیں تماشائے اہلِ کرم دیکھ رہی تھیں۔ پہلے اُسے

دس ہزار روپے کر ایک شکاری نے اسیر کیا اور اس کے ہاتھ میں ریوالور دے کر کہا کہ دیکھو یہ خطرناک مجرم بھاگنے لگے تو اسے گولی مار دینا پھر اسی خطرناک مجرم نے کہا کہ میں تو شریف آدمی ہوں اور خطرناک مجرم یہ ہے اور اس دوسرے شکاری نے بھی اس کو ریوالور تھما کے وہی بات کہی۔ وہ کس کی مانتا اور کس کی نہ مانتا۔ اس کی محدود عقل تجزیہ اور فیصلہ کرنے سے قاصر رہی اور انجام یہ ہوا کہ خود اسے مرنا پڑا۔ اس کے قریب بیٹھ کر میں نے بڑے دکھ سے اس وقت کو یاد کیا جب میں نے سوچا تھا کہ پہاڑ خان اب فولاد خان بن کے "ایم آر ایس" کا رکن ہو جائے گا جہاں اسے وہ سب ملے گا جو دنیا نے نہیں دیا۔ پیار، محبت، خلوص اور اعتماد، عزت نفس اور حوصلہ۔ ہم اسے بھی اس کا حق دلوائیں گے اور وہ ہم سب کا ہو کر ہمارے درمیان رہے گا۔ میں نے تو اس سے جینے کا حق بھی چھین لیا تھا۔

مجھے معاف کرنا میرے معصوم دوست! میں ایسا کبھی نہیں چاہتا تھا اور خدا میری نیت کا گواہ ہے پھر بھی میں خود کو کبھی معاف نہیں کر سکوں گا کہ اصل کوتاہی مجھ سے ہوئی تھی۔ مجھے تمہارے ہاتھ میں وہ قاتل کھلونا پکڑانا ہی نہیں چاہیے تھا جو تمہارے قاتل کے ہاتھ میں چلا گیا۔ پیڈرو مکر کیے پڑا رہا ہو گا اور موقع پاتے ہی ایک جست میں اس نے ریوالور پر قبضہ کر لیا ہو گا۔ ان سب باتوں کو میں نے پہلے سے ذہن میں رکھا ہوتا تو میں یہ غلطی نہ کرتا لیکن خود میرا ذہن گزشتہ تین دن کی اذیت برداشت کرنے کے بعد سو فیصد فعال اور مستعد نہیں ہوا تھا۔ یہ بھول مجھ سے زیادہ میرے نادان نجات دہندہ کو مہنگی پڑی۔ میں اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ فوری طور پر اس کی تدفین کا انتظام بھی کر سکتا چنانچہ میں نے خدا سے ہاتھ اٹھا کے دعا مانگی کہ اس بدبخت کی مغفرت فرما جس نے سکندر بخت کے لیے حق دوستی ادا کر دیا تھا۔

میں زیادہ دیر نہیں رک سکتا تھا۔ پیڈرو کو دو فرلانگ جانا تھا۔ وہاں اس کے دو ساتھی بندھے پڑے تھے اور اتنی دیر میں ان کا ہوش میں آ جانا بھی یقینی تھا۔ وہ تینوں واپس لوٹے تو پھر مجھے تلاش کریں گے۔ میں ایک سے تو بچ گیا تھا، تین سے کیسے بچوں گا۔ یہی سوچ کر میں پھر سڑک تک گیا اور اندازے سے سمت کا تعین کر کے چلنے لگا۔ دھوپ میں اب تیزی آنے لگی تھی میرے جسم کے لیے اس سڑک پر پیدل سفر کرنا مشکل ہونے لگا اور ایک میل بعد میری ٹانگیں کانپنے لگیں۔ ابھی تک مجھے آبادی کے آثار کہیں نظر نہ آئے تھے جو بہت عجیب بات تھی۔ آخر وہ سڑک کس لیے بنائی گئی تھی۔ ایک سڑک تو متعدد گاؤں اور بستیوں کو ملاتی ہے پھر آمد و رفت کیوں نہیں؟ کوئی تانگا یا ریڑھا، بیل گاڑی ابھی تک میرے قریب سے نہیں گزرے تھے اور مجھے دونوں جانب صرف جنگل نظر آ رہا تھا۔ اگر کھیت ہوتے تو شاید کھیتوں میں کام کرنے والے کسی نہ کسی آبادی کا پتا ضرور بتا دیتے۔

تین دن.... ایک سیاہ خانے میں تین برسوں کی تنہائی اور سخت ترین اذیت کی سزا کے برابر تھے۔ چنانچہ مجھے صحیح خوراک کی اور آرام کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ نہ جانے کب سے میں نے ڈھنگ کا کھانا نہیں کھایا تھا۔ کافی اور چائے تک نہیں پی تھی۔ اس وقت ایک وحشت کی ویرانی میں مجھے گزرا ہوا وقت یاد آیا۔ وہ وقت جو کسی اور کی زندگی کا خواب لگتا تھا۔ جو ولایت میں شہزادگی کے شب و روز میں بسر ہوا تھا۔ اور عیش کوشی کا وہ زمانہ جو میں نے اور محسن نے حسینان از لندن کے دلوں پر قسم کے جھنڈے گاڑتے گزارا۔ وقت جو اس کے بعد رابعہ کے حسن دلآرام کے لطف و عنایات کا صلہ ہوا۔ جو رفاقتوں کے رنگ سے مہکتا گزرا اور دوستوں کے خلوص کا ثمر بن کے ملا۔ ایسے وقت میں جب میں سب سے جدا اپنی تنہائی کے خوف اور مایوسیوں کے حوصلہ شکن آسیب میں گھرا ہوا تھا، مجھے وہ دوستی اور محبتوں سے معمور دن بہت یاد آئے۔ ان سب سہاروں کی ضرورت آج بھی تھی۔

اچانک میرے کانوں نے قریب آتی ہوئی کسی گاڑی کی آواز سنی۔ اس راستے پر ابھی تک مجھے ایک آدمی بھی گزرتا نظر نہیں آیا تھا۔ ادھر کسی گاڑی کا آنا چہ معنی دارد۔ یہ تشکیک پر مبنی سوال بالکل منطقی تھا چنانچہ میں تھوڑا سا کھسک کر ایک درخت اور اس کے دامن میں اگی ہوئی جھاڑی کے پیچھے ہو گیا۔ اس سناٹے میں انجن کی آواز کو میرے کانوں نے اس وقت سن لیا تھا جب گاڑی ایک فرلانگ سے بھی زیادہ فاصلے پر تھی۔ چند منٹ بعد ایک جیپ دھول اڑاتی میرے سامنے سے گزری اور مجھے تسک گزرا کہ میں نے ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر چوہدری دلاور کا چہرہ دیکھا تھا۔ وہ خاکی سفاری سوٹ میں تھا اور اس نے سر پر گرد سے بچنے کے لیے فیلٹ ہیٹ رکھ لیا تھا جس سے اس کا پورا چہرہ میری نظر میں نہیں آیا۔ میں نے اس کا سائڈ پوز دیکھا اور وہ بھی گزر گیا۔ گاڑی کے کھلے دروازے میں۔ جیپ کے آگے والے دروازے تھے ہی نہیں کیونکہ وہ ۱۹۵۲ء کی ملٹری ماڈل جیپ تھی۔ جو کچھ میں نے دیکھا تھا جھاڑی کے پتوں کے خلاء سے دیکھا تھا اس کے باوجود میرا ...

دلاور کی تھی۔ یہ شک اس لیے بھی بے سبب نہیں لگتا تھا کہ جیپ کا رخ اسی قید خانے کی طرف تھا جہاں سے میں بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوا تھا اور جہاں اب اپنی نااہلی کا اعتراف کرنے اور اس جرم کی سزا پانے کے لیے پیڈرو اپنے دو نائبین کے ساتھ موجود تھا۔

میں پھر اٹھا اور مخالف سمت میں دوڑنے لگا۔ میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی جب وہ پتلی سی نیم پختہ سڑک ایک نسبتاً بڑی سڑک سے جا ملی اور میں نے سڑک پر دونوں طرف سے تانگے آتے دیکھے۔ میں رک گیا اور انتظار کرنے لگا کہ میری پھولی ہوئی سانس قابو میں آ جائے۔ دونوں تانگے بھرے ہوئے تھے اور میرے سامنے سے گزر گئے۔ کسی نے مجھے وہاں تنہا کھڑا دیکھ کر حیرت یا تجسس کا اظہار نہیں کیا۔ پھر ایک سائیکل والا نوجوان نمودار ہوا اسے میں نے اشارہ کر کے روک لیا۔

"یہ کون سی جگہ ہے جوان۔" میں نے نرمی اور شفقت سے پوچھا۔

"یہ سڑک ہے جناب عالی۔" نوجوان میرے سوال پر دم بخود رہ گیا۔

"سڑک تو ہے... لیکن یہ سڑک کہاں جاتی ہے؟" میں نے کہا۔

نوجوان نے مجھے مشتبہ نظروں سے دیکھا۔ "اِدھر پیچھے شیخوپورہ جانے والی سڑک سے مل جاتی ہے۔ آگے لاہور والی بڑی روڈ ہے۔"

"اِدھر اُدھر کوئی گاؤں ہے؟" میں نے کہا "کوئی آبادی ہے؟"

"ہے جناب عالی۔ آپ اِدھر چلے جاؤ۔" اس نے میرے دائیں ہاتھ کی طرف پھیلے ہوئے جنگل کی طرف اشارہ کیا۔ "ایک چک آئے گا۔ یا دوسری طرف جانا ہو تو موضع کرماں والی ہے۔ مگر آپ نے جانا کدھر ہے۔"

"میں شکار کے لیے آیا تھا" میں نے کہا "راستہ بھول گیا۔ اب بھوکا پیاسا بھٹک رہا ہوں رات سے۔"

نوجوان کی صورت پر تشویش کے آثار نمودار ہو گئے۔ "آؤ جی بسم اللہ... میں آپ کو اپنے گھر لے چلتا ہوں۔ کرماں والی تک ایک میل ہے۔" اس نے مجھے بڑے خلوص کے ساتھ سائیکل پر کیریئر پر تشریف رکھنے کی دعوت دی۔ میں دونوں پیر بائیں جانب لٹکا کے اور ہینڈل تھام کے بیٹھ گیا اور نوجوان نے بڑی پھرتی سے سائیکل کو پیڈل مارنے شروع کیے تو میں نے سکون، فراغت اور تحفظ کے احساس کی وہ آسودگی محسوس کی جو میرے لیے ایک نیا مسرت بخش تجربہ تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں افریقہ کے آدم خور قبائل کے جنگل سے نکل بھاگنے کے بعد مہذب دنیا کی طرف لے جانے والی پہلی فلائٹ پر سیٹ حاصل کرنے میں کامیاب رہا ہوں۔ میرے تھکے ہوئے جسم کو جتنا آرام اس سائیکل کے ڈنڈے پر بیٹھ کر ملا اتنی ہی تسکین میرے ذہن کو ملی۔

"یہ کرماں والی بھلا کیا نام ہوا؟" میں نے نوجوان سے کہا۔

"وہ ایک بڑی کرماں والی تھی جناب عالی۔ سائیں پاپڑ والے کی مہربانی سے ملنگ ہو گئی۔" وہ بولا۔

"سائیں پاپڑ والے؟" میں نے کہا۔

نوجوان نے میری حیرت پر تاسف سے سر ہلایا۔ "ہاں۔ وہ صرف پاپڑ کھاتے تھے۔ نذر لانے والے بھی صرف پاپڑ لاتے تھے۔ غریب تو وہی دال کے پاپڑ لاتے تھے لیکن کبھی کسی کے من کی مراد پوری ہو جاتی تھی تو وہ چاندی یا سونے کے پاپڑ بھی خوشی سے نذر کرتا تھا۔"

"سونے چاندی کے پاپڑ؟" میں نے حیرانی سے کہا۔ "لوہے کے چنے چبانے کا محاورہ تو سنا تھا۔ سونے چاندی کے پاپڑ کھانے کا آج پہلی بار سن رہا ہوں۔"

"لو جی۔ سائیں وہ پاپڑ کھاتے نہیں تھے۔ وہ تو انھیں ہاتھ بھی نہیں لگاتے تھے۔" وہ بولا "کہتے تھے یہ ہوس اور لالچ کا زہر ہے۔ اسے مٹی میں گاڑ دو... فنا کر دو۔ ان کی خوراک صرف دال کے پاپڑ تھے، جو بچتے تھے وہ تبرک کے طور پر بانٹ دیتے تھے۔"

"اچھا؟ اور کیا واقعی وہ سونے چاندی کے پاپڑ گاڑ دیے جاتے تھے؟" میں نے دلچسپی سے کہا۔

"ہاں جی۔ ان کے حکم سے کوئی انکار کر سکتا تھا۔ وہ تو بس نذر قبول ہو جاتی تھی۔" نوجوان بولا۔ "اس کے بعد وہ مٹی میں مل کر مٹی۔ سب کو ایک دن مٹی ہو جانا ہے۔ پھر یہ سونا چاندی کیا ہے۔"

نوجوان کے فلسفے نے مجھے سائیں پاپڑ والا کی عیاری اور دیہات کے عقیدت مندوں کی سادہ لوحی کا قائل کر دیا۔ سونے چاندی کے پاپڑ لانے والے حرص و طمع سے بے نیاز پیر سائیں کی شان قلندری سے بے حد متاثر ہوتے ہوں گے اور اتنا ہی کافی سمجھتے ہوں گے کہ ان کے نذرانے کو سائیں پاپڑ والے نے مسترد نہیں کیا۔ پھر وہ پیر کے ڈیرے کے آس پاس کہیں بھی وہ پاپڑ تھوڑی سی مٹی ہٹا کے گاڑ جاتے ہوں گے۔ گہری قبر کھودنے کی نہ وہ ضرورت محسوس کرتے ہوں گے اور نہ ان کے پاس زمین کو کھودنے کے لیے آلات ہوتے ہوں گے۔ آخر خالی ہاتھوں سے کوئی کتنی گہرائی تک کھودے گا۔ زیادہ سے زیادہ ایک فٹ۔

سائیں پاپڑ والے کے معتمد چیلے دیکھتے رہتے ہوں گے کہ "ہوس اور لالچ کا زہر" کہاں دفن کیا گیا ہے۔ یا بعد میں رات کے وقت خود سائیں پاپڑ والے کو تازہ کھدی ہوئی مٹی دیکھ کر اندازہ کرنا مشکل نہ ہوتا ہوگا کہ مال کہاں ہے۔ سب کے سامنے دال کے پاپڑ کھانے والا کتنا دولت مند ہوگا' اس کا کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اس سونے چاندی کو شہر کے ہوشیار ایجنٹ سناروں تک پہنچا کے دام کھرے کرتے ہوں گے۔ سائیں پاپڑ والے کی سالانہ آمدنی کا کوئی حساب نہ تھا چنانچہ وہ انکم ٹیکس کے جھمیلوں سے بھی محفوظ تھا جن سے محنت کر کے رزقِ حلال کمانے والوں کے لیے مفر نہیں۔

"ان کے پاس دولت مند اور رئیس تو سونے کے پاپڑ ہی لاتے ہوں گے؟" میں نے کہا۔

"ہاں جی۔ جن کو خدا نے دیا ہے وہ راہِ خدا میں بھی دیتے ہیں۔" نوجوان نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ "اور بزرگوں' پیروں فقیروں کے آستانے پر تو غریب امیر سب کو آنا ہی پڑتا ہے۔ امیروں کو خدا سب دیتا ہے تو کبھی ایسی بیماری دے دیتا ہے جس کا علاج نہیں دیتا اور کبھی اولاد نہیں دیتا' یا بیٹی پر بیٹی دیتا جاتا ہے مگر ایک بیٹا نہیں دیتا۔"

"اور سائیں پاپڑ والے کے حاضر اسٹاک میں بیٹے موجود رہتے تھے کہ جیسا کسی نے مانگا فوراً اسٹور سے نکال کر دے دیا۔" میں نے کہا۔ "اور خیر سے سائیں میڈیکل اسپیشلسٹ بھی تھے۔"

"لو جی۔ آپ کیسی کفر کی باتیں کرتے ہو۔" سائیکل سوار نے بُرا مانتے ہوئے کہا۔ "وہ تو سب کو دعا ہی دیتے تھے۔"

"کیا وہ سب جو اُن کے پاس مراد مانگنے آتے تھے' خود دعا کرنا نہیں جانتے تھے؟" میں نے کہا۔ "یا خدا کسی کی دعا قبول ہی نہیں کرتا تھا' سوائے سائیں پاپڑ والے کی دعا کے؟"

"آپ میرے مہمان ہو جی۔ اس لیے میں آپ سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔" نوجوان کا چہرہ سُرخ ہوگیا۔ "مگر ایسی باتیں گاؤں میں مت کرنا ورنہ بُرا ہوگا۔"

ایک میل کی مسافت بھی طے ہو چکی تھی چنانچہ میں نے اپنی شرانگیزی بند کی۔ ایسی باتیں ان سادہ دل لوگوں کے ذہن میں انتشار پیدا کرتی تھیں۔ ان کے جذبات کو عقل کی تائید سے ٹھیس لگتی تھی۔ وہ فوراً تسلیم نہیں کرسکتے تھے کہ اب تک اُن کا عقیدہ غلط تھا اور ایسی بات ذہن سے خارج بھی نہیں کرسکتے تھے جو خود اپنی صداقت کا ثبوت ہو۔ کرماں والی میں مشکل سے دو سو گھر ہوں گے۔ ان میں بیشتر کچے تھے۔ مسجد کے مینار کی بلندی اور سفیدی سب سے جدا تھی اور دائیں طرف ایک پیپل کے درخت سے بندھے ہوئے چھوٹے بڑے مختلف رنگ کے گوٹے کناری والے درجن بھر جھنڈے اعلان کرتے تھے کہ وہی سائیں پاپڑ والے کی خانقاہ ہے۔

"یہ سائیں پاپڑ والے کی خانقاہ ہوگی؟" میں نے کہا۔

"یہ ان کا مزار شریف ہے۔" نوجوان نے کہا۔ "وہ شہید ہو چکے ہیں۔"

"شہید؟ کیا انھوں نے پاک بھارت جنگ میں دشمنوں کے خلاف جہاد کیا تھا؟" میں نے کہا۔ "یا راہِ حق میں جان دی تھی؟"

"آپ شہری لوگ بڑے ہیر پھیر کرلیتے ہو۔" نوجوان سنجیدگی سے کہا۔ "ان کے آستانے پر ایک رات شیطانوں کے لشکر نے بدبخت ڈاکوؤں کے بھیس میں حملہ کیا۔ آپ نے مقابلہ کیا اور شہید ہوئے۔"

"ڈاکو سب مالِ غنیمت لے گئے ہوں گے!" میں کہتے کہتے رک گیا۔ سائیں پاپڑ والے کے آستانۂ عالیہ سے ان کو سونے کے پاپڑ سیروں کے حساب سے ملے ہوں گے۔ پاپڑ کا کوئی بین الاقوامی معیاری وزن تو مقرر ہے نہیں سلانے والے ایک تولے کا پاپڑ بھی بنوا لاتے ہوں گے اور ایک چھٹانک کا بھی۔ مالِ حرام بود بجائے حرام رفت مگر سائیں پھر بھی شہادت کے منصب پر فائز ہوئے خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں؟

"اب وہاں کرماں والی مجاور ہے۔" نوجوان نے کہا۔ "اس کی کرامات کا شہرہ دُور دُور تک ہے۔"

لیکن میں اب پیروں فقیروں کی عیارانہ کرامات پر اظہارِ خیال فرما کر اپنے میزبان کے جذبات کو زیادہ مجروح نہیں کرنا چاہتا تھا کہ مشتعل ہو کے وہ مجھے مجروح کردے۔ "یہ ڈھونگا پتن بھی ایک گاؤں ہے؟" میں نے کہا۔ "یہیں آس پاس؟"

"ہاں جی' ہے۔" وہ چونکہ اس نے اب اپنی سائیکل کا ہینڈل ہاتھوں میں تھام رکھا تھا اور ہم دونوں کھیتوں کی کچی منڈیر پر آگے پیچھے چلتے جارہے تھے۔ "یہاں سے پانچ کوس پر ہے۔"

"گویا دس میل۔ اگر میں وہاں جانا چاہوں تو کیسے جاؤں؟" میں نے کہا۔

"ایک طریقہ تو یہ ہے کہ آپ تانگے پر چلے جائیں۔" نوجوان بولا۔ "گاؤں میں دو تانگے ہیں۔ ایک چوہدری صاحب کا۔ دوسرا ایک موچی کا۔ موچی کا بیٹا چلاتا ہے۔ وہ آپ سے بیس روپے لےگا۔"

"اور دوسرا طریقہ کیا ہے؟" میں نے بے خیالی میں کہا۔

"دوسرا طریقہ یہ ہے کہ آپ شام تک انتظار کریں۔" وہ بولا۔ "ڈھونگا پتن کے نمبردار سادھو رام جی ہر جمعرات کو کرماں والی کی خدمت میں حاضری دینے آتے ہیں اور سائیں پاپڑ والے کے مزار شریف پر چراغ جلا کے لوٹ جاتے ہیں۔"

"سادھو رام؟ یہ تو ہندوانہ نام ہے۔" میں نے حیران ہو کے کہا۔

"ہاں جی۔ سادھو رام ہندو ہے مگر دل سے سائیں پاپڑ والے کا اور کرماں والی کا معتقد ہے۔" نوجوان بولا۔ "آخر ہندوستان میں بھی کتنے ہندو ہیں جو خواجہ نظام الدینؒ اولیاء اور اجمیر کے خواجہؒ صاحب کی درگاہ میں جا کے منت مانتے ہیں۔ بمبئی میں حاجی علی مراد کی درگاہ پر سب جاتے ہیں۔ ہندو' مسلمان' پارسی۔"

"تم یہ سب کیسے جانتے ہو؟" میں نے اُسے غور سے دیکھا۔ "تم نے پڑھا ہے یا ہندوستان جا چکے ہو؟"

"یہ سب سادھو رام جی نے بتایا ہے۔ انھوں نے بہت سی باتیں بتائی ہیں کہ گرو نانک جی ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی اور پھر کبیر داس تھے۔ راجہ اکبر ہندو اور مسلمان دونوں مذہب کو مانتا تھا اور اس نے دونوں مذہب کی عورتوں سے شادی کی تھی۔"

میں دم بخود رہ گیا۔ گاؤں کا یہ جاہل لڑکا کیسی دانشورانہ گفتگو کر رہا تھا۔ بے شک بہت سے حوالوں سے یہ سب باتیں غلط بھی ثابت ہوتی تھیں لیکن کرماں والی میں یہ باتیں پھیلانے والا سادھو رام تھا۔ اس نے اپنی چالاکی سے گاؤں والوں کے ذہن کی سوچ بدل دی تھی۔ وہ ہندو تھا اور اسلامی سمجھے جانے والے عقائد پر عمل پیرا تھا۔ مگر اس نے اپنی عقیدت مندی کا جواز تاریخ کے حوالے سے پیش کردیا تھا اور اب گاؤں والے اس کی فراخدلی' نیکی اور عظمت کے معترف تھے۔ یہ بات میرا ذہن تسلیم نہیں کرتا تھا۔ آج پاکستان کے ایک گاؤں میں جو شخص نمبردار بنا بیٹھا ہے۔ وہ مسلمانوں کے ساتھ اور ان کی تعلیمات سے جذباتی وابستگی ظاہر کرتا ہے تو یہ ڈھونگ ہے۔ وہ اپنے مظاہر میں سچا ہے تو مسلمان کیوں نہیں ہو جاتا۔ مسلمانوں کے ملک میں اپنے آباؤ اجداد کا دھرم اور اسی دھرم کا نام سنبھالے کیوں بیٹھا ہے؟

"تمہارا مطلب ہے میں سادھو رام کے ساتھ ڈھونگا پتن چلا جاؤں۔" میں نے کہا۔

"ہاں جی! وہ اپنی گاڑی میں آتے ہیں۔ بہت لمبی سی گاڑی ہے نا۔" نوجوان نے کہا۔ "آپ کو ضرور ساتھ لے جائیں گے وہ۔"

نوجوان کے گھر میں اس وقت صرف اس کی ماں تھی اور ایک بہن۔ اس کا باپ اور بھائی کھیتوں کی طرف گئے ہوئے تھے۔ انھوں نے میری آؤ بھگت میں کوئی کسر نہیں رکھی۔ مجھے پاؤ بھر خالص مکھن کے ساتھ ایک فیملی سائز روٹی دی گئی۔ میں نے دونوں کا بیس فیصد حلق سے اتارا اور پھر میزبانوں کا دل رکھنے کے لیے بالٹی بھر لسّی کے گلاس کو بھی آدھا خالی کردیا مگر اس کے بعد میری حالت اس شخص کی طرح ہوگئی جس نے ایک ساتھ کئی ولیمے کھا لیے ہوں۔ میں خوش خوراکی کے مظاہرے کے ساتھ ساتھ اِدھر اُدھر کی باتوں کا جواب بھی دے رہا تھا لیکن میرا ذہن سادھو رام کی طرف تھا۔

"وہ جو لمبی سی گاڑی ہے۔" میں نے اچانک کہا۔ "کیا وہ شیورلیٹ ہے۔ ۱۹۵۲ء کے ماڈل کی۔"

"کیا جی؟" نوجوان ہکا بکا رہ گیا۔ "وہ گاڑی ہے جی... موٹر کار... کالے رنگ کی..." ظاہر ہے وہ کاروں کے ماڈل اور فرق کو نہیں سمجھ سکتا تھا۔ میں نے اسے ہاتھوں کے اشارے سے کچھ سمجھایا اور پھر اپنی مصوری کی صلاحیت سے کام لینے کا فیصلہ کیا۔ گھر میں کاپی پنسل قسم کی کوئی چیز نہیں تھی مگر کوئلہ وافر مقدار میں موجود تھا۔ میں نے فرش پر ایک ڈرائنگ بنائی اور مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ میں نے گاڑی کی بہت صحیح تصویر بنائی ہے۔ نوجوان نے سر ہلا کے اقرار کیا کہ سادھو رام کی گاڑی بالکل ایسی ہی ہے۔

رفتہ رفتہ مجھے اس کار کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل ہوگئیں اور میرے لیے شبہے کی گنجائش نہ رہی کہ سادھو رام کی گاڑی وہی ہے جس میں رابعہ اور نازو کو اغوا کر کے لے جایا گیا تھا۔ سائیں پاپڑ والے خود بھی فراڈ تھے اور یہ ان دیہات کے رہنے والوں کی سادہ مزاجی اور خوش اعتقادی تھی کہ انھوں نے اس لٹیرے کو ڈاکوؤں کے ہاتھوں جہنم رسید ہونے کے باوجود شہید کہنا شروع کردیا۔ وہ خود کچھ نہیں کہتے تھے' وہی کہتے تھے جو مشہور کردیا جاتا تھا اور یہ سائیں پاپڑ والے کے چیلوں کی عیاری کا کرشمہ تھا کہ انھوں نے فوراً سائیں پاپڑ والے کی خانقاہ تعمیر کردی اور اس جگہ نذر نیاز کا سلسلہ بدستور جاری رہا۔ سال کے سال عرس مبارک کا سوانگ رچانے کا موقع الگ ہاتھ آیا۔

سوچنے کی بات یہ تھی کہ سائیں پاپڑ والے کی جانشین ایک عورت کیوں بنی؟ یہ سارا کھیل دھوکے بازی کا تھا اور اسے کوئی دھوکے باز ہی جاری رکھ سکتا تھا۔ کیا کرماں والی دوسرے مریدوں اور چیلوں سے زیادہ سائیں پاپڑ والے کی جانشینی کے قابل تھی؟ اس میں مردوں سے زیادہ ذہانت اور صلاحیت تھی کہ اسے مجاور اور صحیح گدّی نشین تسلیم کرلیا گیا؟ یا دوسرے چالاک مریدوں نے اس کو اپنا آلۂ کار بنا رکھا ہے۔ وہ کوئی بے وقوف عورت ہے جو بدمعاشوں کے ہاتھ میں کھیلنے پر مجبور ہے۔ اگر اس فراڈ کا بھانڈا پھوٹنے کا وقت آیا تو وہ غائب ہو جائیں گے۔ پیچھے رہ جائے گی ایک مجہول' فاترالعقل قسم کی عورت جسے سب نے مجذوب کا درجہ دے رکھا ہے۔ سادھو رام کا اس

جگہ آنا بے سبب نہیں تھا۔ ملاور اینڈ کمپنی کا ڈونگا پتن سے تعلق ثابت ہو چکا تھا۔ وہاں کوئی جگہ ایسی تھی جہاں نازو اور رابعہ کو لے جایا گیا تھا۔ جس گاڑی میں ان کا جانا ثابت ہوتا تھا وہ سادھو رام کی ملکیت تھی اور سادھو رام ڈونگا پتن سے یہاں آتا تھا تو یہ عجیب سی مثلث بنتی تھی۔ ملاور اینڈ کمپنی..... ڈونگا پتن، کرماں والی؟

میں نے کرماں والی کے ڈیرے پر جانے کا فیصلہ کیا مگر مناسب یہ سمجھا کہ اپنے ارادے کو اپنے میزبان سے پوشیدہ رکھوں۔ یہ نہ ہو کہ میرے عزائم کی خبر مجھ سے پہلے صفِ دشمن ان تک پہنچ جائے۔

"کیا یہ گاؤں شروع سے کرماں والی کے نام پر مشہور ہے؟" میں نے کہا۔ "یا پہلے پاپڑ والا کہلاتا تھا؟"

نوجوان تھوڑا سا حیران ہوا۔ "یہ تو ٹھیک ہے۔ پہلے یہ ایک گاؤں تھا۔ چک دو سو بارہ الف۔ پھر پاپڑ والا کہلانے لگا۔ مگر ابھی دو سال پہلے سائیں پاپڑ والا کے حکم پر اسے کرماں والی کہا جانے لگا۔"

"ہلاکت کے بعد ان کا حکم کیا عزرائیل کے ذریعے پہنچا تھا؟" میں نے ہنس کر کہا۔ "یا وہ کرماں والی کو خواب میں نظر آئے تھے؟"

"وہ خواب میں نظر آئے تھے۔" نوجوان نے برہمی سے کہا۔

"اسی طرح جب کرماں والی کسی دن ماری جائے گی تو اس گدی پہ بیٹھے گا کوئی کرماں والا یا نصیباں والا۔" میں نے کہا۔ "اور وہ جو شروع میں چک نمبر دو سو بارہ الف تھا پھر پاپڑ والا ہوا پھر کرماں والی بنا۔ کہلانے لگے گا نصیباں والا۔ اچھا میں اب چلتا ہوں۔ تمھاری مہمان نوازی کا بہت شکریہ۔ میری باتوں کا بُرا مانا ہو تو معاف کر دینا۔"

نوجوان کی ساری خفگی دُور ہو گئی۔ "روٹی کھا کے جانا تھا جی۔ اب آپ ڈونگا پتن جاؤ گے؟"

"نہیں بھائی۔ میں لاہور جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "کھانا ابھی تو کھایا ہے۔ اچھا ماں جی اجازت۔"

"اچھا پتّر، رب راکھا۔ چنگا سی جے روٹی کھا کے جاندا۔" نوجوان کی ماں نے کہا اور میں ان سے اجازت لے کر باہر نکل آیا۔ نوجوان نے مجھے سڑک تک سائیکل پر لفٹ پیش کی اور اس وقت تک سڑک پر کھڑا رہا جب تک میں ایک لاری کو روک کر سوار نہیں ہو گیا۔ میری جیب میں اتنی رقم تھی کہ میں آسانی سے لاہور پہنچ جاتا مگر وقت کم تھا۔ میں نے ڈونگا پتن کا ٹکٹ مانگا تو کنڈکٹر نے بہت بُرا منایا۔

"یہ کوئی ادمنی بس ہے۔ ایک اسٹاپ پہ چڑھ کے اگلے پہ اتر گئے۔" وہ بولا۔ "ٹکٹ لاہور تک کا لگے گا۔"

"جو تواڈی خوشی شہنشاہو۔" میں نے دیہاتی لہجے میں کہا اور اُسے پانچ کا نوٹ پیش کر دیا۔ اس نے کسی حساب کے بغیر بقایا پیسے لوٹا دیے۔ بس ایک منٹ کے لیے رُکی تو میں سڑک پر کود گیا۔ اب مجھے کسی سے راستہ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے اندازے سے ڈونگا پتن کی سمت سفر شروع کیا۔ آدھے گھنٹے بعد میں نے ایک گاؤں دیکھا جو کرماں والی کے مقابلے میں قصبہ تھا۔ وہاں اگر دو سو گھر تھے تو یہاں دو ہزار مزور تھے۔ زیادہ فکر مجھے اپنا حلیہ بدلنے کی تھی۔ ایک مکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے مجھے کھٹا کھٹ کی آواز آئی۔ یہ کھڈی پر کپڑا بُننے کے عمل کا شور تھا۔ میں نے ایک بڈھے کو ہاتھ کی دیسی کھڈی پہ کام میں مصروف دیکھا۔

"چاچا! مینوں چاہیدا اے اک لاچا۔" میں نے دروازے میں سر ڈال کر کہا۔ "اسلام علیکم۔"

چاچا نے مجھے گھور کر دیکھا۔ "سلام پہلاں کریدا اے پتر۔" وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے مجھے ایک سوتی لاچا اور ایک کھیس صرف چالیس روپے میں دے دیا اور مجھ سے غیر ضروری سوالات بھی کیے کہ میں کون ہوں، کہاں سے آیا ہوں اور کدھر جا رہا ہوں؟ میں نے سب کے غلط جوابات دیے اور لاچا بدلنے کے بعد کھیس لپیٹ کر چل پڑا۔ ایک بار پھر میں نے سابق موضع پاپڑ والا اور اب کرماں والی کا رُخ کیا۔ مجھے ایک کچا راستہ نظر آ رہا تھا جس کی چکنی مٹی میں سائیکل کے ٹائروں، تانگوں اور بیل گاڑیوں کی آمد و رفت کے نشانات بہت نمایاں تھے۔ دس میل کا راستہ بہت لمبا تھا اور میں چاہتا تھا کہ کوئی بھی سواری مل جائے۔ دونوں گاؤں کے درمیان چلنے والی واحد تانگا ایکسپریس میری امید تھی مگر مجھے مایوسی ہوئی۔ وہ سارا راستہ مجھے پیدل طے کرنا پڑا جو کھیتوں اور کہیں کہیں جنگل سے گزرتا تھا۔ مجھے ایک جگہ سانپ بھی نظر آیا جو سڑک پہ سے رینگتا ہوا جا رہا تھا۔ میں نے اس کے گزر جانے کا انتظار کیا۔ وہ دوسری طرف کے جنگل میں غائب ہو گیا۔ کسی اور سانپ یا اژدھے سے ملاقات کا مجھے اتنا ڈر نہیں تھا جتنا راستے سے بھٹک جانے کا۔ جنگل کے سانپ اور دوسرے جانور بھی جو عام طور پر خطرناک سمجھے جاتے ہیں آدمی سے ڈرتے ہیں جو خدا کی پیدا کردہ مخلوق میں سب سے زیادہ ہلاکت خیز جانور ثابت ہوا تھا۔ اور جب تک ان کو چھیڑا نہ جائے یا وہ مجبور نہ ہو جائیں آدمی کے سامنے سے دُور ہی رہتے ہیں۔

اب دوپہر ڈھل چکی تھی۔ پیدل چلنے سے میں بُری طرح تھک گیا تھا اور مجھ پر بھوک بھی غالب آنے لگی تھی لیکن میں پھر موضع کرماں والی میں کسی کے سامنے نمودار ہونے سے گریز کرنا چاہتا تھا۔ گاؤں کے قریب پہنچ کر میں نے سمت کا تعین کیا اور اس راہ دوسری جانب سے اس پیپل کے درخت تک گیا جس کے نیچے کرماں والی کا ڈیرا اور سائیں پاپڑ والے کا مزار شریف تھا۔ بیری والا میں ایک برساتی نالہ آیا جس کے بعد قبرستان تھا۔ یہ گاؤں کا قبرستان تھا چنانچہ اس کی وسعت زیادہ نہیں تھی۔ زیادہ تر قبریں کچی تھیں اور ان پہ کتبے بھی نہیں تھے۔ انہیں لیپ پوت کر اور کنکر پتھروں سے گھیر کر محفوظ رکھنے کی کوشش ناکام نظر آتی تھی۔ موسمی حالات خصوصاً برسات کی یلغار آدمِ خاکی کے فنا ہو جانے کا نقشِ عبرت بھی مٹاتی جاتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ قبرستان کے بائیں جانب زمین کی بلندی بتدریج بڑھتی چلی گئی ہے یہاں تک کہ ایک فرلانگ کے فاصلے پر پتھریلی زمین کا سلسلہ پتھر کی سیاہ چٹانوں سے جا ملتا ہے۔ پھر یہ چٹانیں بلند ہونے لگتی ہیں اور افق پر معمولی بلندی کی پہاڑیاں ایک سیاہ لکیر کی طرح پھیلی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس سمت سے بارش کا ریلا آتا تھا تو نشیب کی سمت سیلِ آب کچی قبروں کو روندتا جاتا تھا اور یہ پانی برساتی نالے میں بہہ جاتا تھا۔ کچی قبروں کی خستہ حالی کا سب سے بڑا سبب یہی تھا۔

قبرستان سے نکلنے کے لیے میں نے دائیں جانب کا رُخ کیا اور درختوں کے اس جھنڈ سے گزرا جس کے بعد پیپل کا وہ بہت بڑا درخت تھا جو رنگ برنگے جھنڈوں سے سجا ہوا تھا۔ وہ ایک مختصر سا جنگل تھا جس کی وسعت دائیں اور بائیں طرف ایک ایک فرلانگ سے بھی کم تھی مگر زیادہ تر درخت شیشم اور پیپل کے یا "دریک" کے تھے۔ دریک بالکل نیم کی طرح کا درخت تھا اور معلوم نہیں کس فرق کے باعث مقامی لوگ اسے دریک کہتے تھے۔ یہ سب اونچے مضبوط تنوں والے درخت تھے جن کی شاخیں زمین سے تقریباً پندرہ بیس فٹ اوپر جا کے پھیلتی تھیں۔ نچلی شاخیں موٹے موٹے تنوں کی طرح تھیں اور ان سے پھوٹنے والی شاخوں کا سلسلہ بلندی تک یوں پھیلتا تھا کہ ہر شاخ سے کئی شاخیں پھوٹتی تھیں جو چھوٹی اور پتلی ہوتی جاتی تھیں اور ان کے پتے چاروں طرف ایک سرسبز چھتری سی تان دیتے تھے۔ درختوں کے درمیان زمین کی سطح ہموار اور صاف تھی۔ تنے کسی عمارت کو سہارا دینے والے ستونوں کی طرح لگتے تھے اور اوپر کہیں کہیں شاخیں آپس میں یوں مل جاتی تھیں کہ گھنے پتوں کا سائبان سا بن جاتا تھا جس میں سے آسمان کی جھلک بھی نہیں دکھائی دیتی تھی۔ چنانچہ نیچے روشنی کم تھی اور ایک مربع فرلانگ کا یہ جنگل گرد و نواح کے روشن علاقے کے مقابلے میں تاریک محسوس ہوتا تھا۔ شاید اسی وجہ سے نیچے خودرو نباتات کی کمی تھی۔

اچانک مجھے درختوں کے بیچ میں کچلی ہوئی گھاس اور مسلے ہوئے پودوں کے ساتھ ٹائروں کے نشانات نظر آئے۔ میں نے جھک کر دیکھا تو مجھے یہ نشانات تازہ لگے کیونکہ پھول اور پتیاں ابھی خشک نہیں ہوئے تھے حالانکہ ان کے نازک تنے اور باریک ریشوں جیسی شاخیں پس کر الگ ہو گئے تھے۔ کوئی گاڑی ابھی ابھی اس جگہ سے گزری تھی، زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے پہلے۔ اس سے زیادہ وقت گزرا ہوتا تو پھول اور پتیاں کمہلا چکے ہوتے اور ان کے رنگ پھیکے پڑ گئے ہوتے۔ میرے خیال کی تصدیق آگے جانے سے بھی ہوئی۔ بھاری ٹائروں کے نشان زمین پر نقش چھوڑ گئے تھے اور ایک ہی سمت کی نشاندہی کرتے تھے۔ ایک جگہ یہ نشان اتنے نمایاں تھے کہ میں نے ٹائروں کے پرنٹ کی چوڑائی دیکھ لی۔ یہ میری ایک بالشت سے زیادہ تھی۔ اتنے چوڑے ٹائر کسی ٹرک کے ہی ہو سکتے تھے۔ میں الجھن میں پڑ گیا۔ پلٹ کر دیکھنے پر مجھے درخت ہی درخت نظر آئے لیکن غور کرنے پر میں نے اندازہ کیا کہ ایک ماہر ٹرک ڈرائیور انہی درختوں میں سے راستہ نکال سکتا ہے۔ بے شک اس کا راستہ سیدھا نہیں ہو گا۔ اسے دائیں بائیں نظر رکھتے ہوئے ایسے درخت تلاش کرنے پڑتے ہوں گے جن کی بلندی ٹرک کی راہ میں حائل نہ ہو اور جن کے درمیان سے بھی ٹرک کو گزارا جا سکتا ہو۔

ذرا سی دیر میں وہ راستہ بھی میری نظر نے تلاش کر لیا۔ اس پورے راستے پر ٹرک کے بھاری پہیّوں کے گزرنے سے جو نقش باقی رہ گئے تھے وہ خود راستے کی نشاندہی کرتے تھے مگر جو بات میں نے نوٹ کی وہ مختلف درختوں پر جگہ جگہ نظر آنے والا زرد رنگ تھا۔ کہیں کہیں درختوں کے تنوں پر زمین کی سطح سے دس فٹ اوپر گہرے اور شوخ زرد رنگ کا چمکیلا دائرہ بنا ہوا تھا۔ مجھے یہ اندازہ کرنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ فلورسینٹ پینٹ تھا جو اندھیرے میں روشنی پڑنے پر روشن نظر آتا ہے۔ اس کا مطلب یہی نکلتا تھا کہ یہ زرد دائرے رات کے وقت آنے والے ٹرک کو صحیح راستہ دکھانے کے لیے بنائے گئے تھے۔ اندھیرے میں ٹرک کی ہیڈ لائٹس سے یہ دائرے روشنی کے سگنل نظر آتے ہوں گے اور ٹرک آدھی رات کے بعد آتے ہوں گے کہ گاؤں کے لوگ تو زیادہ سے زیادہ عشا کی نماز پڑھنے تک جاگتے تھے۔ اب میں نے محتاط ہو کے آگے بڑھنا شروع کیا۔

کرماں والی کا ڈیرا ایک پختہ عمارت تھی۔ اس کے لیے اینٹیں، سیمنٹ اور راج مزدور سب شہر سے لائے گئے

ہوں گے۔ عمارت کے دو حصے تھے۔ سامنے والا حصہ ایک بڑے اور اونچی چھت والے حصے پر مشتمل تھا جس کے چار گوشوں پر چار چھوٹے گنبد تھے اور وسطی گنبد کے ساتھ یوں لگتے تھے جیسے تربوز کے چاروں طرف چار سیب رکھے ہوں۔ اس پوری عمارت پر سبز رنگ تھا جو عام طور پر پاکیزگی اور طہارت کا مظہر سمجھا جاتا ہے مگر یہاں اس کا مقصد عمارت کو کیموفلاج کرنا معلوم ہوتا تھا تاکہ گھنے سبز درختوں میں یہ سبز عمارت دکھائی ہی نہ دے۔ عقبی حصے میں ایک بہت بڑا سیمنٹ کا پلیٹ فارم سا تھا جو میرے اندازے کے مطابق پچاس گز لمبا پچاس گز چوڑا اور زمین کی سطح سے ایک گز اونچا تھا۔ اس پلیٹ فارم پر سبز عمارت کی عقبی دیوار کا ایک دروازہ کھلتا تھا جو اس وقت بند تھا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ کسی خانقاہ کے ساتھ اس قسم کے پلیٹ فارم کا کیا مصرف ہو سکتا ہے۔

مجھے عمارت کے آس پاس کوئی بھی نظر نہیں آرہا تھا لیکن میں قریب جانے سے احتراز کر رہا تھا۔ نہ جانے اس میں کیا بات تھی جس نے میرے قدم روک لیے۔ بظاہر ایک غیر معروف گاؤں کی اس غیر معروف خانقاہ میں کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا تھا لیکن میری چھٹی حس خطرے کی بو کو واضح طور پر محسوس کر رہی تھی۔ میں نے اپنی قوتِ مشاہدہ یا سراغ رسانی کے باعث بہت سی غیر معمولی باتیں دریافت کر لی تھیں۔ ایک یہ کہ قبرستان اور جنگل کی سمت سے یہاں ٹرک آتا ہے۔ ابھی یہ معلوم کرنا باقی تھا کہ ٹرک کیوں آتا ہے؟ پھر یہ کہ ٹرک اس خفیہ اور پوشیدہ راستے... سے عموماً رات کے وقت آتا ہے اور ٹرک کو یہاں لانے والے اتنے ہوشیار ہیں کہ انھوں نے تاریک جنگل میں روشن ہو جانے والے نشان لگائے ہیں جو دن میں کسی دیہاتی کے لیے شک کا باعث نہیں بن سکتے۔ لیکن اس طرح ٹرک کو سیدھے اور آسان راستے سے لانے کے بجائے مشکل اور پوشیدہ و پیچیدہ راستے سے لانے کا مقصد بھی نیک نہیں ہو سکتا۔ میری ناقص معلومات کے مطابق مرحوم سائیں پاپڑ والے بھی کوئی نیک مقصدِ حیات نہیں رکھتے تھے۔ کیا وہ پیری فقیری کے ڈھونگ اور سونے چاندی کے پاپڑ جمع کرنے کے علاوہ بھی کوئی خفیہ اور خطرناک کاروبار کرتے تھے۔ گامے ماچھی کی جعلی خانقاہ کا راز فاش ہو جانے کے بعد مجھے سائیں پاپڑ والے کا مزار شریف بھی بالکل شریف نہیں لگا۔ یہاں کچھ اور بھی ہو رہا تھا...... ڈونگا پتن کا سادھو رام یہاں عقیدت مندین کے صرف چراغ جلانے کے لیے نہیں آتا تھا۔

قدرتی طور پر مجھے یہ خیال بھی آیا کہ سائیں پاپڑ والے کی "شہادت" میں ڈاکوؤں کے علاوہ بھی کسی کا ہاتھ ہو۔ غلطی یا غلط فہمی کے باعث سائیں پاپڑ والے کو مجبوراً ان کی "خودکشی" کرا دی گئی ہو یا بہتر سمجھا گیا ہو کہ اب ان کا مزار بنا دیا جائے۔ بعض اوقات زندہ پیر سے مردہ پیر زیادہ کارآمد ثابت ہوتا ہے۔

ابھی میں گامے ماچھی سے ڈونگا پتن کے سادھو رام اور کرماں والی کے ڈیرے تک سب کے درمیان مفادات کے مشترک رشتے کو تلاش ہی کر رہا تھا کہ کسی گاڑی کا طاقتور انجن گونجا۔ میں فوراً دو درختوں کے پیچھے ہو گیا جن کے تنوں کے درمیان ایک قدِ آدم جھاڑی پھیل گئی تھی۔ آواز بہت دور سے آئی تھی مگر میرے کانوں نے اس کی سمت کا صحیح اندازہ کر لیا تھا۔ میرے ہی دریافت کردہ راستے سے کرماں والی کے ڈیرے کی طرف آرہا تھا چنانچہ اس کی رفتار بہت کم تھی۔ جب میں نے اسے دیکھا تو ٹرک بڑی احتیاط کے ساتھ دو قریب قریب درختوں کے درمیانی تنگ راستے سے نکل رہا تھا اور ڈرائیور راستے والے درخت سے بچا کے دائیں جانب موڑنے کی جدوجہد کر رہا تھا۔ یہ بیڈ فورڈ ٹرک تھا جس کا پچھلا حصہ ایک ہموار سطح کی طرح تھا۔ اس حصے پر لکڑی کے باکس ایک دوسرے پر ڈھیر کیے گئے تھے۔ سب باکس ایک ہی سائز اور ایک ہی شکل صورت کے تھے۔ سب کی لمبائی میرے اندازے کے مطابق چھ فٹ اور چوڑائی دو فٹ تھی۔ ہر باکس اتنا ہی گہرا بھی تھا چنانچہ یہ سب تابوت لگتے تھے۔ صندوقوں کو لمبائی کے رُخ ٹرک پر لادا گیا تھا۔

ٹرک میرے سامنے تقریباً دس فٹ دور سے گزرا تو میں نے دیکھا کہ لمبائی کے رُخ تین تابوت نما باکس رکھے گئے ہیں۔ چوڑائی کے رُخ مجھے چار باکس نظر آئے۔ ہر باکس کے اوپر چار باکس تھے۔ اس طرح میرے حساب سے ٹرک میں ساٹھ باکس لدے ہوئے تھے۔ کسی بھی نوعیت کے سامان کی پیکنگ اور ٹرانسپورٹ کے لیے یہ بہت عجیب سائز کے صندوق تھے۔ پھل انڈے اور سبزیاں بہت چھوٹے کریٹ میں پیک کیے جاتے ہیں۔ مشینری بھی باہر بھیجی جائے یا باہر سے منگوائی جائے تو ان کے باکس تابوت نما نہیں ہوتے اور کرماں والی کے ڈیرے کا مشینری کی درآمد یا برآمد سے کیا تعلق؟ ایک قابلِ غور بات یہ بھی تھی کہ سب باکس بڑی اچھی لکڑی سے اور بہت مضبوطی کے ساتھ بنائے گئے تھے۔ اگر ان پر سیاہ رنگ کر دیا جاتا تو یہ تابوت تسلیم کیے جاتے اور کسی بھی ملک کی کسٹم چیک پوسٹ سے گزارے جا سکتے تھے بشرطیکہ ان میں لاش کا چہرہ نظر آتا۔ ٹرک میرے بائیں ہاتھ پر بیس فٹ دور جا کر رک گیا۔ اس کو ریورس گیئر میں ڈال کے گھمایا اور اس کا پچھلا حصہ پلیٹ فارم سے ملا دیا۔ اگلے حصے سے ڈرائیور کے علاوہ دو آدمی اترے۔ پھر سائیں پاپڑ والے کے مزار کا عقبی دروازہ کھلا اور دو افراد سبز یونیفارم جیسا لباس پہنے نکلے۔ اس وقت میں نے غور کیا کہ ڈرائیور کے ساتھیوں نے بھی سبز کپڑے پہن رکھے ہیں۔ صندوقوں کے اوپر بھی سبز رنگ ہے اور ٹرک پر بھی۔ یہ سب کیموفلاج کرنے کے لیے تھا۔ اوپر سے یا دور سے دیکھنے والے کو جنگل میں ہونے والی کوئی پراسرار کارروائی نظر نہیں آسکتی تھی۔ ٹرک میں سے اترنے والے مزدور اوپر چڑھ گئے تھے لیکن خود ڈرائیور اپنے ہاتھ میں اسٹین گن لیے مستعد کھڑا رہا۔ اس کی نگاہ ہر طرف تھی۔ غور سے دیکھنے پر میں نے اسے شناخت کر لیا۔ وہ گامے ماچھی کی جعلی خانقاہ کے سامنے والے ہوٹل کا پروپرائٹر تھا جس سے ہم نے رابعہ اور نازو کے بارے میں معلومات حاصل کی تھیں۔ اس نے عینی شاہد کی حیثیت سے جو دیکھا تھا سب بتا دیا لیکن بعد میں اسی نے ہمارے بارے میں اور ہمارے عزائم کے بارے میں ملاور اینڈ کمپنی کے شکاریوں کو تمام معلومات فراہم کر دیں۔ ان میں سے ایک شکاری ہمارے تعاقب میں آیا اور ہمیں گمراہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

ٹرک پر چڑھنے والے دو مزدوروں نے باری باری ہر باکس کو نیچے کھسکا کے ان دو افراد کے سپرد کرنا شروع کیا جو سائیں پاپڑ والے کے مزار سے نکلے تھے۔ صندوقوں کے دونوں جانب کنڈے تھے مگر مزدوروں کے چہرے دیکھ کر اندازہ ہو جاتا تھا کہ باکس کتنے بھاری ہیں۔ ان کے بازوؤں کے رگ پٹھے کھنچ جاتے تھے تو اس مشقت سے ان کے چہرے بھی لال ہو جاتے تھے۔ یہی کیفیت پکڑنے والے مزدوروں کی تھی۔ وہ بوجھ کو سنبھالتے ہوئے لڑکھڑا جاتے تھے۔ اگر ہر باکس کا وزن ایک من ہوتا تو وہ صحت مند افراد کے لیے زیادہ نہیں تھا لیکن جتنی محنت انھیں کرنی پڑ رہی تھی، اس سے یہی اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ وزن کسی طرح بھی دو من سے کم نہیں ہوگا۔ جو باکس نیچے اتارے جاتے تھے انھیں وہی دو افراد کھینچتے ہوئے مزار کے اندر لے جاتے تھے۔ ابھی پورا مال اترا بھی نہیں تھا کہ میں نے پھر ایک موٹر کے انجن کی آواز سنی مگر یہ آواز ٹرک کے انجن کی آواز کے مقابلے میں دھیمی تھی۔

درختوں کی اوٹ سے جہازی سائز کی شیورلیٹ امپالا نمودار ہوئی اور ٹرک کے قریب جا رکی۔ جب کار میرے سامنے آئی تھی تو میں نے ڈرائیور کے چہرے کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ وہ لیفٹ ہینڈ ڈرائیو کار تھی اور ڈرائیور کی صورت اسی کھڑکی میں نمایاں تھی جدھر میں چھپا کھڑا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میرے ذہن کو دوسرا زیادہ شدید جھٹکا لگا کیونکہ سادھو رام کی گاڑی میں مجھے کوئی روایتی قسم کا ہندو نظر نہیں آیا تھا جس کے گنجے سر پہ لودی ہوتی، ماتھے پر تلک اور گلے میں جنیو ہوتا اور جو واسکٹ دھوتی اور نہرو کیپ پہنے ہوتا۔ وہ سوٹ میں تھا اور مجھے اس کو پہچاننے میں ذرا دیر نہیں لگی۔ اسی شخص نے ہمیں ڈونگا پتن کے بارے میں بتایا تھا کہ وہاں گاڑی نہیں جا سکتی اور پیدل پہنچنا ممکن ہے چنانچہ محسن اور نیک محمد مجھے ٹیکسی میں چھوڑ کر چلے گئے تھے اور یہ خبیث آگے جا کے اپنے ساتھ دوسروں کو بھی لے آیا تھا۔ وہ بھی ایک شکاری تھا جو مجھے لے جانے والوں کا مددگار بنا تھا۔ میرے ذہن میں سادھو رام کی یہ صورت ہرگز نہ تھی اور اب مجھے بالکل شبہ نہ رہا کہ سادھو رام کا ظاہر اور باطن ایک مکر و فریب ہے۔

سادھو رام گاڑی سے اترا اور پلیٹ فارم کے چند زینے چڑھ کر عقبی راستے سے پاپڑ والے کے مزار کی عمارت میں داخل ہو گیا۔ مزدور بدستور باکس اتار اتار کے اندر پہنچاتے رہے۔ فوراً مجھے خیال آیا کہ اس عمارت میں جو سائیں پاپڑ والے کے مزارِ مبارک اور کرماں والی کی کرامت کے باعث مرجع خلائق ہے، اتنا سامان کہاں رکھا جا سکتا ہے اور کیسے رکھا جا سکتا ہے۔ پھر یہ کہ مزدور ایک پھیرا تقریباً چھ منٹ میں پورا کر رہے تھے۔ اگر انھیں باکس اندر چھوڑ کے آنا ہوتا تو یہی کام اس سے نصف وقت میں ہو جاتا۔ زیادہ وقت اس لیے صرف ہو رہا تھا کہ وہ باکس کو نیچے لے جا رہے تھے۔ انھیں سیڑھیاں اتر کے کسی تہ خانے میں پہنچا رہے تھے اور جو کچھ میرے سامنے تھا اس سے میں یہی اندازہ کر سکتا تھا کہ اوپر سے جو سیمنٹ کا مضبوط پلیٹ فارم نظر آتا ہے وہ درحقیقت ایک تہ خانے کی چھت ہے۔

خالی ہو جانے والا ٹرک روانہ ہو گیا مگر کار وہیں کھڑی رہی۔ تقریباً دس منٹ بعد سادھو رام پھر نکلا لیکن اس مرتبہ وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ایک عورت بھی تھی جس نے سر سے پیر تک میکسی ٹائپ سبز چغہ پہن رکھا تھا۔ وہ کوئی بہت عمر رسیدہ عورت نہیں تھی لیکن وہ بے حد صحت مند تھی۔ اس کا قد پانچ فٹ دس انچ ضرور تھا اور جسمانی طور پر وہ بے حد فٹ نظر آتی تھی مگر اس کے چغے نے جسم کے خد و خال کو چھپا رکھا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ عورت کی قلندرانہ وضع بھی ایک بہروپ ہے۔ اچانک مجھے آسمان کی طرف سے عجیب قسم کی آواز سنائی دی۔ سادھو رام منہ اٹھا کے اوپر دیکھنے لگا۔

یہ آواز مجھے بھی اپنے پیچھے جنوب مشرق کی سمت سے سنائی دے رہی تھی اور یوں لگتی تھی جیسے کوئی بغیر سائلنسر والی موٹر سائیکل چلا رہا ہو۔ جیسے جیسے آواز قریب آتی گئی اس کی شناخت نمایاں اور واضح ہوتی گئی۔ یہ کوئی ہیلی کاپٹر تھا۔ میں نے خود کو گھنے درختوں کے سائبان کے نیچے اس طرح چھپا لیا کہ اوپر سے پائلٹ یا اس کا کوئی ساتھی دوربین لگا کے دیکھتا، تب بھی میں نظر نہ آتا۔ نیچے سادھو رام اور گیروے رنگ کے چغے والی صحت مند عورت اب آپس کی باتیں چھوڑ کر ہیلی کاپٹر کی طرف دیکھ رہے تھے جو ہنوز میری نظر سے اوجھل تھا۔ عورت کے بارے میں یہ فرض کرنا غلط نہیں تھا کہ وہی ڈبا پیر سائیں یا پڑ والے کی اس فراڈ خانقاہ کی گدی نشین کرماں والی ہوگی۔ سادھو رام کے اور ان کے درمیان کوئی بہت پُراسرار قسم کا تعلق تھا جس کو سادہ دل دیہات کے رہنے والوں نے سادھو رام کی عقیدت مندی سمجھا تھا۔ میرے سامنے ایک مرتبہ سادھو رام نے اس کی کمر کے گرد اپنا ہاتھ حمائل کرنے کی کوشش کی تھی مگر کرماں والی نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا تھا۔ اب وہ مجسم تصویرِ انتظار و اشتیاق بنے کسی تیسرے فریق کے لیے چشم براہ تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ آنے والا کون ہوگا چنانچہ وہ نہ حیرت زدہ تھے اور نہ خوف زدہ۔

سیمنٹ کے وسیع و عریض پلیٹ فارم کی تعمیر کا ایک مقصد مجھ پر واضح ہو چکا تھا۔ یہ ایک ہیلی پیڈ تھا اور یہاں ہیلی کاپٹر کو بحفاظت اتارنے کا یہ بندوبست کسی غیر معمولی ضرورت کے پیشِ نظر کیا گیا تھا۔ جب ہیلی کاپٹر قریب آیا تو میں نے اس پر بنے ہوئے نشان کو آسانی سے پہچان لیا۔ یہ ایک پڑوسی دشمن ملک کا فوجی مقاصد کے لیے استعمال ہونے والا ہیلی کاپٹر تھا۔ میں نے اس پر لکھا ہوا نمبر بھی پڑھا اور آنکھیں بند کر کے زیرِ لب کئی بار دہرایا تاکہ... ذہن نشین ہو جائے۔ ہیلی کاپٹر نیچے اترنے لگا۔ سیمنٹ کے اس پلیٹ فارم یا ہیلی پیڈ کے آس پاس سے درخت یقیناً صاف کر دیے گئے تھے۔ سادھو رام نے ایک ہاتھ اوپر اٹھا کے آنے والوں کو خوش آمدید کہا یا انھیں سگنل دیا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔

میں نے اس شور سے فائدہ اٹھایا جو ہیلی کاپٹر کے اترنے اور درختوں کے پتوں کے تیز ہوا میں ہلنے سے پیدا ہو رہا تھا۔ اس وقت سادھو رام اور کرماں والی کی ساری توجہ بھی ہیلی کاپٹر کی طرف تھی۔ میں تیزی سے آگے بڑھا اور ہیلی پیڈ کے سب سے قریبی جھاڑ جیسے درخت کے نیچے دبک کر بیٹھ گیا۔ اب وہ مجھ سے دس فٹ کے فاصلے پر تھے اور میں ان کی گفتگو سن سکتا تھا۔ خطرہ مجھے صرف یہ تھا کہ کہیں ان پر میری موجودگی کا راز فاش نہ ہو جائے۔ ایک چھینک بھی ایسے وقت میں بم کے دھماکے سے کم تباہ کن ثابت نہ ہوتی۔ میں بالکل خالی ہاتھ تھا اور ان کا مسلح ہونا شبہے سے بالاتر تھا۔ اگر وہ مجھے خفیہ مائکروفون کی طرح اتنے قریب دریافت کر لیتے تو بلاتوقف تباہ بھی کر دیتے۔ وہ جنگل کی زمین تھی جس پر حشرات الارض کا بسیرا تھا۔ کوئی دخل در معقولات کرنے والا اچانک مجھے کاٹ لیتا تو اس کی یہ حماقت مجھے بہت مہنگی پڑتی۔ بعد میں وہ کیڑا مجھے دس بار کاٹنا چاہتا تو مجھے اعتراض نہ ہوتا۔

ہیلی کاپٹر کے اوپر گھومنے والا دیوہیکل پنکھا انجن کے بند ہو جانے کے بعد بھی کچھ دیر گھومتا رہا۔ اس کے مقابلے میں کسی حد تک کوتاہ نظر آنے والے دُم کے پنکھے کی رفتار بھی کم ہو گئی۔ ہیلی کاپٹر سے ایک بلند قامت، صحت مند اور سیاہی مائل گندمی رنگت والا شخص پہلے اترا۔ اس نے گرے پتلون اور آدھی آستین کی سفید قمیص پہن رکھی تھی۔ وہ کلین شیو تھا اور اس کے بال گھنے سیاہ تھے چنانچہ اس کی عمر کا اندازہ مشکل کام تھا۔ وہ چالیس سال کا بھی ہو سکتا تھا اور پچاس سے زیادہ کی عمر کا بھی۔ اچھی صحت کی وجہ سے وہ جوان، جوشیلا اور مستعد نظر آتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں تقریباً ڈیڑھ فٹ کی پتلی سی سیاہ چھڑی تھی جس کے نسبتاً موٹے کنارے پر چاندی کی چمکیلی دھات کی منقش پتری چڑھی ہوئی تھی۔ اس چھڑی سے وہ عادتاً اپنی پتلون کے پائنچوں کو جھاڑتا تھا۔ یہ چھڑی اس کے فوجی ہونے کی علامت تھی۔ اس کے بال بھی فوجی طرز کے تھے اور اس کی چال میں فوج کی افسری کا نظم و ضبط بھی تھا اور متوازن انداز بھی۔ سادھو رام کے قریب پہنچ کر اس نے چھڑی کو ایک خاص انداز سے بائیں جانب بغل میں دبا لیا۔ یہ بھی ایک غیر شعوری حرکت تھی۔ چونکہ میں بہت توجہ اور انہماک سے سب کچھ دیکھ رہا تھا اس لیے یہ باتیں خود میری نظر میں آ گئیں۔

"نمستے کرنل صاحب۔" سادھو رام نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا اور خوشامدانہ انداز میں مسکرایا۔

"ہیلو سادھو رام۔" کرنل نے دایاں ہاتھ بڑھا کے اس سے مصافحہ کیا۔ "کیا حال ہے؟"

"سب بھگوان کی کرپا ہے۔" سادھو رام نے کہا۔

"آپ خیریت سے ہیں کرنل جگن ناتھ۔" کرماں والی نے باری باری ہاتھ ملا کے کہا۔ مجھے اس کے ہاتھ کی گداز سفیدی اور اس کی آواز کا لوچ محسوس ہوا۔ اس کے لہجے میں ایک بولتی تھی جو سمجھتی تھی کہ اس کی ناز آفریں شوخی کے جادو کا...

"اینڈ ہاؤ آر یو مائی سویٹ گرل۔" کرنل جگن ناتھ مسکرایا۔ اسی لمحے میں نے سادھو رام کا چہرہ دیکھا جو کوشش کے باوجود اپنے جذبات کو چھپانے سے قاصر رہا تھا۔

"اس بار تو بڑی دیر کی مہربان آتے آتے۔" سویٹ گرل کسی وفا پیشہ محبوبہ کے شکایتی لہجے میں کہا جس نے فراق کی اور ہجر کی راتیں آہیں بھرتے گزاری ہوں۔

"وہ بس۔ ساری بات تو مناسب وقت اور موقع ملنے کی ہے۔" جگن ناتھ نے کہا۔ "پھر یہ کہ مجھے نومین لینڈ سے واپسی میں تاخیر ہوئی۔ اچانک ہے میرا شیڈول اپ سیٹ ہو گیا۔"

"نومین لینڈ کی صورتِ حال کیا ہے کرنل صاحب؟" سادھو رام معنی خیز لہجے میں مسکرایا۔

"حالات ابتر ہوتے جا رہے ہیں۔" کرنل نے کہا۔ "سنہرے ریشے کی زمین اب ریشہ دوانیوں کی سرزمین ہے۔ وہ سچ مچ نومین لینڈ بنتی جا رہی ہے۔ ایک تو وہی بیورو کریسی ہے جو سب ٹھیک ہے کا تاثر دیتی ہے۔ پھر مقامی انتظامیہ ہے جو اپنے طور پر تخریب کاری سے نمٹنے میں ناکام ہے۔ کس کس کو پکڑیں اور کہاں کہاں حفاظتی دستوں کو بلائیں۔ ہمارے لیے سب سے زیادہ موزوں وہی نیم فوجی گوریلا تنظیمیں ہیں جن کی قیادت علیحدگی پسند کرتے ہیں۔ مختلف مقامات پر انتشار برپا کرنے والے۔ اس کے علاوہ چھاتر دیگ یعنی طلبہ کی تنظیم جو حد درجہ جوشیلی اور جذبات کے سیلاب میں بہہ جانے والی ہے۔ ہمارے مقاصد کے لیے کام کرنے والوں کے لیے سب سے موثر افرادی قوت طلبا ہی ہیں جن کو استحصال اور استعمار کے نعروں سے کسی بھی سمت میں لے جایا جا سکتا ہے۔ ان کے علاوہ مکتی باہنی، شانتی باہنی اور سیاسی جماعتوں کے متحارب گروپ جو اپنے اپنے حلقۂ اثر میں لا اینڈ آرڈر کو اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں چنانچہ خانہ جنگی اور انارکی کے اسباب پیدا کرتے ہیں۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں سادھو رام کہ وہ خطۂ زمین اب کسی کا بھی نہیں اور سب کا ہے۔ حکومت کسی کی نہیں مگر سب حاکم ہیں... ایسے صوبے میں دس سیاسی اور نظریاتی ریاستوں کے درمیان محاذ آرائی ہوگی تو اور کیا ہوگا۔ ہم تو اس صورتِ حال کو ایک ایسی سول وار کی شکل میں بدلنے میں مدد کر رہے ہیں جہاں کسی ایک فریق کی طرف سے ہمیں براہِ راست مداخلت کرنے کی دعوت ملے۔ اور ظاہر ہے سادھو رام کہ ہم اسی فریق کی دعوت قبول کریں گے جو غالب ہو۔ ہمارے دشمن کا دشمن ہو اور بعد میں ہمارے مفادات کا تحفظ کر سکے۔"

"آپ کو بھگوان کی آشیرباد حاصل ہے کرنل صاحب۔ ایک دن ایسا ہی ہوگا اور وہ دن دور نہیں ہے۔" سادھو رام نے کہا۔

"نہیں سادھو رام! یہ کام بہت مشکل ہے۔ ابھی تک مزاحمت کرنے والوں کی قوت بہت زیادہ ہے۔" کرنل جگن ناتھ نے ہونٹ بھینچ کے کہا۔ "جذباتی اور ذہنی طور پر وہ خود کو پاکستانی سمجھتے ہیں۔ ان کی وطن پرستی کا یہی جذبہ ہمارے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ خیر تم یہ بتاؤ کہ اس عرصے میں تم نے کیا کچھ جمع کیا ہے؟"

"جتنا ہم نے کیا وہ آپ کی توقع سے زیادہ ہی ہوگا۔" کرماں والی نے مسکرا کے کہا۔

"ویری گڈ۔ میں اس دفعہ زیادہ توقعات لے کر آیا تھا۔" جگن ناتھ نے کرماں والی کے شانے پر ہاتھ رکھ کے مسرت کا اظہار کیا۔ "دراصل مجھے گزشتہ بار اپنے حریف کرنل راما راؤ کے مقابلے میں شرمندگی ہوئی۔ وہ راجستھان کی طرف سے تین ٹرک نکال لایا حالانکہ وہ راستہ زیادہ لمبا اور دشوار گزار ہے۔"

"اس راستے پر نگرانی اتنی کڑی نہیں ہے کرنل صاحب۔" سادھو رام نے کہا۔ "ریگستانی سرحد سے دن میں اونٹ بھی گزر جائے تو دیکھنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ میلوں تک غیر آباد علاقے ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر سادھو رام تم خود سوچو کہ ہم کتنا رسک لے کر آتے ہیں۔" کرنل جگن ناتھ نے ایک سگار سلگا کے کہا۔ "ہمیں بہت لو لیول پر فلائنگ کرنی پڑتی ہے کہ راڈار کی آنکھ سے محفوظ رہ سکیں۔ پھر بھی اس ہیلی کاپٹر کی آواز۔ ڈیم اٹ۔ ہر وقت یہ خطرہ لاحق رہتا ہے کہ بارڈر پیٹرول نے سن لی تو وہ صرف ایک فائر کریں گے۔ یہ کوئی سپرسانک فائٹر پلین نہیں ہے۔ اینٹی ائرکرافٹ گنز سے اس کا نشانہ لینا اتنی ہی آسان ہے جتنا میرے لیے پستول سے تمھارے دل کا نشانہ لینا۔"

"میرا دل تو ویسے ہی نشانہ بن چکا ہے جگن ناتھ۔" عورت ہنسی۔

"اس مرتبہ آپ کرنل راما راؤ کے مقابلے میں زیادہ فائدے میں رہیں گے۔" سادھو رام نے جلدی سے کہا۔

"ایڈیٹ۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ اس بار تمھیں بہت زیادہ فائدہ حاصل کرنے کی امید ہے۔ تم بہت لالچی ہوتے جا رہے ہو سادھو رام۔" کرنل جگن ناتھ نے کہا۔

"صرف مجھے تو الزام نہ دیں کرنل صاحب۔" سادھو رام نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔ "جب آپ زیادہ مال لے کر جائیں گے تو کیا آپ کو زیادہ فائدہ نہیں ہوگا۔ آپ کو بھی تو وہی لوگ پیسہ دیتے ہیں۔ وہ بھی ضرورت مند ہیں اور ہم بھی۔ آپ دو ضرورت مندوں کے درمیان کمیشن ایجنٹ بنے ہوئے ہیں کہ ادھر کا مال اُدھر پہنچا دیتے ہیں۔ ہمیں کیسے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ آپ کو کیا دیتے ہیں۔ اور ہمارا منافع زیادہ ہے یا آپ کا کمیشن۔"

"تم بدگمانی کا شکار معلوم ہوتے ہو سادھو رام۔" کرنل جگن ناتھ نے سنجیدہ ہو کر کہا۔

"آپ کو غلط بات نہیں کہنی چاہیے کرنل صاحب!" سادھو رام بولا۔ "لالچی ہم ہیں تو آپ کون سی ملک و قوم یا انسانیت کی خدمت کر رہے ہیں۔ اور کیا آپ کا یہی کام ہے جو آپ پیسہ کمانے کے لیے کرتے ہیں۔ ہزاروں کرنل صرف تنخواہ لیتے ہیں۔"

"شٹ اپ۔" کرنل جگن ناتھ نے بجھ جانے والے سگار کو دور پھینک دیا۔ "میں وہی کر رہا ہوں جو مجھ سے کرنے کو کہا گیا

ہے اور یہ ایسا کام نہیں ہے جو ہرایرا غیرا کرنل کر سکے۔ یہ انٹیلی جنس کا مشن ہے اور میں کمانڈوز کے آپریشن پلان کرتا ہوں۔ کیا تم کو معلوم ہے کہ میں کتنے خطرات مول لیتا ہوں۔ میں ہر جگہ جان ہتھیلی پر رکھ کے پھرتا ہوں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میری کامیابی کا انعام کیا ہے۔ ایک میڈل، تھوڑی سی زمین یا محض تعریف لیکن میری ناکامی کی سزا بہت سخت ہے۔ خواہ میں سرحد کے اُدھر پکڑا جاؤں یا اِدھر۔ تم کیا کر رہے ہو؟ میرے دیے ہوئے پیسے سے اسلحہ خرید رہے ہو اور بس۔ تمھارے لیے کوئی رسک نہیں ہے۔"

"یہ تم کہہ سکتے ہو مگر اپنا رسک میں جانتا ہوں۔" سادھو رام نے سپاٹ لہجے میں کہا: "میں ہندو ہوں اور میری وفاداری پہلے سے ہی مشکوک ہے۔ میرے بارے میں ایک اطلاع کافی ہے جو تم بھی دے سکتے ہو۔ میں ملک کا غدار ہوں۔ مجھے کتے کی موت مار دیا جائے گا اور تمھارا دیا ہوا پیسہ مجھے نہیں بچا سکے گا۔ قانون کی سزا سے پہلے یہی لوگ میری بکا بوٹی کر دیں گے جو آج مجھے سلام کرتے ہیں۔"

"میرے خیال میں تم دونوں خواہ مخواہ کی بحث میں الجھ گئے ہو۔" کرماں والی نے مداخلت کرتے ہوئے کہا: "کیا فائدہ ان باتوں سے۔ چلو اندر چل کے بیٹھتے ہیں۔"

"تو۔ یہاں مجھے اچھا لگ رہا ہے۔" کرنل جگن ناتھ نے کہا: "تم یہاں کافی لا سکتی ہو مائی ڈیئر۔"

"وعدہ کرو کہ تم دونوں پھر کوئی جھگڑا نہیں کرو گے۔" کرماں والی مسکرائی: "بلکہ بہتر ہو گا کہ اگر تم نیچے جا کر مال کا اندازہ کر لو۔ اتنی دیر میں کافی بنا کے میں باہر ہی لے آتی ہوں۔"

"ناٹ اے بیڈ آئیڈیا۔" کرنل مسکرایا: "چلو سادھو رام! بزنس کی بات پہلے ہو جائے۔"

وہ تینوں سائیں پابڑ والے کی خانقاہ کا عقبی دروازہ کھول کے اندر چلے گئے۔ جو کچھ میں نے سُنا تھا اور دیکھا تھا وہ حقائق کی منہ بولتی تصویر تھا۔ کرماں والی اور سادھو رام ملک دشمن ایجنٹ تھے اور دلاور کے مال کو کرنل جگن ناتھ کے ہاتھ بیچتے تھے۔ وہ اسلحے کی قیمت ادا کرتا تھا اور اسے بھارت کے راستے مشرقی بنگال کے علیحدگی پسند تخریب کاروں تک پہنچاتا تھا۔ تخریب کار غیر ملکی قوتوں کے آلۂ کار تھے اور انھیں سرمائے کی کمی نہیں تھی چنانچہ دلاور کا مال دھڑا دھڑ بک رہا تھا۔ کرماں والی اور سادھو رام کے خزانے بھر رہے تھے اور اگرچہ کرنل جگن ناتھ اپنی حکومت کی پالیسی اور ہدایات کے مطابق کام کر رہا تھا مگر اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ اس مشن سے بے حساب مالی فوائد بھی حاصل کر رہا تھا مگر اس کو پوچھنے والا کوئی نہیں تھا۔ جو بات اب تک ایک خیال تھی یا مفروضہ تھی، وہ اچانک حقیقت بن کے میرے سامنے آگئی تھی اور میں خوف زدہ بیٹھا تھا۔

خوف مجھے اپنی جان کے جانے کا نہیں تھا۔ اس وقت رابعہ یا محسن اور اپنے سب دوستوں کی زندگیوں کو لاحق خطرات کے احساس سے بھی بے گانہ تھا۔ میں یہ سوچ سوچ کر خوف زدہ ہو رہا تھا کہ کرنل جگن ناتھ یا راما راؤ کے علاوہ کتنے وطن دشمن اپنے پیسے کی طاقت سے اور اپنے مذموم سیاسی عزائم کی تکمیل کی خاطر میرے ملک کے دو حصوں کو ایک دوسرے سے جُدا کرنے کی سازش میں مصروف ہیں ـــ کتنی کرماں والی جیسی پُر فریب عورتیں اور سادھو رام جیسے کتنے وطن فروش دولت کی ہوس میں غدّاری کر رہے ہیں۔ نوین لینڈ انھوں نے مشرقی پاکستان کو کہا تھا جہاں بیرونی طاقتوں کی مدد سے انتشار پسند قوتیں ہر محاذ پر سرگرم عمل تھیں۔ وہ معاشی محاذ پر محب وطن بنگالیوں کو شکست دے رہے تھے۔ ناپختہ ذہن رکھنے والے طلبا کی صفوں میں قدم جما رہے تھے۔ اور ان کے خیالات کا رُخ وطن دشمنی کی طرف موڑ رہے تھے۔ وہ مزدوروں میں نفرت کا زہر پھیلا رہے تھے اور کاشت کاروں میں تعصب کا بیج بو رہے تھے۔ بے چینی کے اسباب پیدا کر کے عوام کو حکومت سے بدظن کر رہے تھے مسائل اور مشکلات سے بغاوت کی آگ بھڑکا رہے تھے۔ طلبا لیڈروں اور سیاسی بے ضمیروں کو خرید کر عوام کو گمراہ کر رہے تھے جھوٹ اور بے بنیاد باتوں پر مبنی پمفلٹ، کتابچے اور پوسٹر شائع کر کے ایک صوبے کو پورے ملک کے خلاف کھڑا کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے گوریلا جنگ کے لیے مختلف ناموں سے باغی تنظیموں کو ہتھیاروں کی فراہمی شروع کر دی تھی چنانچہ ملک کے اس حصے میں جگہ جگہ بموں کے دھماکوں سے بے گناہ ہلاک ہو رہے تھے۔ معیشت تباہ ہو رہی تھی۔ کارخانوں کی ہڑتالوں سے پیداوار رک گئی تھی، بے روزگاری مزید مسائل کو جنم دے رہی تھی۔ پُل اور ریلوے لائنوں کی تباہی سے ذرائع مواصلات درہم برہم ہو رہے تھے چنانچہ ملک تیزی سے خانہ جنگی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ مقامی اور غیر مقامی کے فرق کو نمایاں کر کے اور ان کے درمیان نفرتوں کو ابھار کر اور فاصلے پیدا کر کے مہاجر کو انصار سے، بھائی کو بھائی سے اور مسلمان کو مسلمان سے لڑانے کی سازش کامیاب ہوتی نظر آتی تھی۔

میرا رُواں رُواں غیظ و غضب کی آگ میں جل رہا تھا لیکن اس سے زیادہ عذاب اپنی بے بسی کا تھا کہ میں کرماں والی اور سادھو رام جیسے شیطانوں کے خلاف کارروائی میں سرکاری مشینری کو کچھ نہیں بتا سکتا اور کسی سے مدد نہیں مانگ سکتا کیونکہ ملکی قانون کے تحت میں ایک مفرور قاتل اور متعدد وارداتوں میں مطلوب ملزم ہوں۔ میری سننے سے پہلے ہی مجھے پابندِ سلاسل کر دیا جائے گا اور میری زبان کھلنے سے پہلے ہی مجھے قید خانے کی سلاخوں کے پیچھے بند کر دیا جائے گا۔ ان حالات میں جو کچھ کرنا تھا مجھے خود ہی کرنا تھا۔

کی مدد پر بھروسا کرتے ہوئے اور اپنے چند رفیقانِ باصفا کی مدد پر انحصار کرتے ہوئے۔ ایسی اَن گنت سادھو رام ہوں گے اور نہ جانے کتنی ہی کرماں والیاں ہوں گی جو اس ملک میں رہ کر اسی کی تباہی کے لیے دشمنوں سے ضمیر کے سودے کر رہے ہوں گے۔ میں اکیلا ان سب کا کیا بگاڑ سکتا تھا۔ خدا نے مجھے کوئی غیبی قوت نہیں دی تھی اور کوئی مافوق الفطرت صلاحیت نہیں بخشی تھی۔ جو کچھ تھا، میرا عزم تھا اور میرا حوصلہ تھا۔ یہ یقین تھا کہ میں اکیلا نہیں ہوں۔ اگر میں ان وطن دشمنوں کے خلاف سر سے کفن باندھ کے نکلوں گا تو اور نکلیں گے ہزاروں کے قافلے۔ قتل گاہوں سے چن کر ہمارے علم۔ اور سب کو تہ تیغ کر دیں جتنے بھی ملک دشمنوں کو ٹھکانے لگا سکا، وہی یومِ حشر میری سرخروئی کی سند ہو گا۔

سادھو رام اور جگن ناتھ کے باہر آجانے سے میرے خیالات کا تسلسل باقی نہ رہا۔ انھوں نے مشکل سے دس منٹ اندر گزارے ہوں گے لیکن دس منٹ میں مجھے کچھ آرام مل گیا تھا، ورنہ میں کشیدہ اعصاب اور ذہنی تناؤ کی کیفیت میں بے حس و حرکت اور ساکت و جامد بیٹھا ہوا تھا۔ تقریباً ان کے ساتھ ہی کرماں والی ٹرے میں کافی کے مگ لیے نمودار ہوئی۔ مگر اب وہ کرماں والی نہیں رہی تھی۔ اس کو دیکھ کر میرے ذہن کو زبردست جھٹکا لگا۔ گیروے رنگ کے چغے کی جگہ اس نے بہت چُست قمیص اور شلوار پہن رکھی تھی۔ قمیص کی آستین بہت تنگ تھیں اور اس کے صحت مند بازوؤں میں پھنسی ہوئی تھیں۔ قمیص کے گہرے سرخ رنگ میں اس کی بے داغ جلد کا مرمریں رنگ بہت روشن دکھائی دیتا تھا۔ یہی روشن خیالی قمیص کے گلے سے بھی عیاں تھی جو کسی لیڈیز فیشن ڈیزائنر نے ایجاد کیا تھا۔ اس کے الجھے ہوئے، میلے اور بے رونق، خاکستری بالوں کی وِگ بھی ہٹ چکی تھی اور نیچے سے اس کے کندھوں تک آنے والے، بڑی نفاست سے تراشے ہوئے اور بہت سلیقے سے سیٹ کیے ہوئے بال نمودار ہو گئے تھے جو ریشم کے سرتے ڈھیر کی طرح پھسلتے ہوئے اس کے چہرے پر آتے تھے اور پھر موجِ آب کی طرح لوٹ جاتے تھے۔ اس کا یہ کایا کلپ چند منٹ لگے تھے چنانچہ میں اندازہ کر سکتا تھا کہ لباس گیروے چغے کے نیچے پہلے سے موجود تھا۔ چغے کے ساتھ ہی اس نے وِگ بھی اتار دی تھی۔ بالوں کو تھوڑا سا برش کر لیا تھا اور جتنی دیر میں کافی تیار کی تھی اس نے لب و عارض کو تھوڑا سا رنگ دے دیا تھا۔ اس تبدیلی کا تاثر انتہائی مسحور کن تھا۔ یکلخت وہ ایک خوبصورت، تندرست اور پُر شباب عورت بن گئی تھی جس کے حُسن کی کشش سے کوئی مرد انکار کر ہی نہیں سکتا تھا۔

"کرماں والی! کاش مجھے آج تھوڑی سی فرصت ہوتی۔" کرنل جگن ناتھ نے بہت دیر تک کرماں والی کو حسرت سے دیکھ کر کہا۔

"اب تو مجھے میرے نام سے پکار سکتے ہو تم۔" وہ شرما کے بولی۔

"سوری دلربا۔ تمھارا تو نام بھی وہی ہے جو تم ہو۔" کرنل جگن ناتھ نے کہا۔

"یہ نام اس نے بعد میں رکھا تھا۔" سادھو رام نے ناگواری سے کہا: "ماں باپ نے تو..."

"چھوڑو اس نام کو۔ اس کا نام یہی ہونا چاہیے تھا۔" جگن ناتھ نے کہا۔

"وقت کم ہے جگن ناتھ۔ سودے کی بات کرو۔" سادھو رام نے رقابت کے پُر حسد لہجے میں کہا۔

"مال میں نے دیکھ لیا ہے۔" جگن ناتھ بولا: "دام تم بتا دو۔"

"پندرہ لاکھ نقد۔" سادھو رام بولا۔

"پندرہ لاکھ!" جگن ناتھ نے حیرانی سے دُہرایا: "کیا تم پاگل ہو گئے ہو سادھو رام؟"

"پندرہ لاکھ میں سے نصف پاکستانی کرنسی، نصف انڈین۔" سادھو رام نے اسی سپاٹ لہجے میں کہا۔

"تم حد سے بڑھتے جا رہے ہو۔" جگن ناتھ نے برہمی سے کہا۔

"جب تم نے سرحد عبور کر لی تو حد کہاں رہی۔" سادھو رام نے عیاری سے کہا: "تم کہاں بیٹھے ہو...!"

"یہ... یہ تم دھمکی دے رہے ہو مجھے۔" جگن ناتھ نے ایکدم ریوالور نکال لیا۔

"ناتھ..." دلربا چلائی: "یہ کیا ہو رہا ہے۔" اس نے جھپٹ کر ریوالور والے ہاتھ کو دبوچ لیا۔

"یہاں جو کچھ ہو رہا ہے اچھا نہیں ہو رہا ہے۔" جگن ناتھ نے پھنکار کے کہا۔

"ہاں۔ کسی کے نقطۂ نظر سے بھی یہ اچھا نہیں ہو رہا ہے۔" سادھو رام بولا: "جاؤ تم اچھے اچھے کام کرو۔ جتنا مال اب تک کمایا ہے اس سے اپنے جیون کا پرائسچت کرو۔ اناتھ آشرم... ہردوار میں کوئی مندر، کوئی وِدھوا آشرم بناؤ... یہ بُرے کام چھوڑ دو میرے لیے... میں کرنل راما راؤ سے بات کروں گا۔"

"سادھو رام! میں نہیں چاہتا کہ تم کو واقعی قتل کر دوں..." جگن ناتھ نے ریوالور جیب میں رکھ کر دلربا کے ہاتھ پر تھپکی دی اور سگار جلانے لگا: "اگلی مرتبہ دلربا تمھیں نہیں بچا سکے گی۔ یہ اس سے نصف قیمت کا مال ہے جو تم مانگ رہے ہو۔"

"قیمت کوئی چیز نہیں ہوتی کرنل صاحب۔" سادھو رام بولا: "صرف ضرورت ہوتی ہے اور ضرورت کو پوری کرنے کے لیے آدمی سب کچھ کرتا ہے۔ غلامی سے اسمگلنگ تک ضرورت زیادہ ہو تو قیمت بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ تم کو تو یہ معمولی سی بات سمجھ ہی لینی چاہیے

آگے جا کے تمہاری ضروریات میں اضافہ ہوگا۔ مال اتنا ہی ہوگا اور مانگنے والے زیادہ تو کون لے جائے گا؟ وہی جو قیمت زیادہ لگائے گا۔ اس میں کون سی غلط بات ہے۔ منافع ہمیشہ تو زیادہ نہیں ہوتا جب یہ دن گزر جائیں گے تو ہمیں کون پوچھے گا۔ آج کچھ کما سکتے ہیں تو کیوں نہ کمائیں۔"

"تمہاری یہ بکواس سننے نہیں آیا ہوں۔" جگن ناتھ نے کہا۔ "میں اس کے دس لاکھ دے دوں گا۔"

"پورے پندرہ لاکھ جگن ناتھ۔ مجھے معلوم ہے پیسہ تمہاری جیب سے نہیں جا رہا ہے۔" سادھو رام نے کہا۔ "لیکن تمہارے حصے کا منافع یقیناً کم ہو رہا ہے تو اس کا توڑ تمہارے پاس ہے۔ تم بھی وہی کرو جو میں کر رہا ہوں۔ جن کو مکتی چاہیے ان سے کہو کہ مکتی کا بھاؤ چڑھ گیا ہے۔ قیمت نہیں دے سکتے تو ڈنڈوں سے لڑیں۔ چمٹا چھکنی اٹھا لیں۔ چاقو چھری لے لیں۔"

"تم بہت بڑے رذیل ہو سادھو رام۔" کرنل جگن ناتھ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"چھوٹے بڑے کیا یہاں تو سب ایک ہیں۔" سادھو رام بولا۔ "لنکا میں جو ہے سو باون گز کا۔ جو میرا نام سو تمہارا نام۔"

ہیلی کاپٹر کا پائلٹ نیچے اتر کر خاصے فاصلے پر ٹہل رہا تھا۔ دلربا اس کو بھی ایک مگ کافی کا ایک واجبی سی مسکراہٹ کے ساتھ دے آئی تھی۔ غالباً اسے قریب آنے کی اجازت نہیں تھی تاکہ مذاکرات کی رازداری برقرار رہے۔ اس نے جگن ناتھ کو اٹھتے دیکھا تو سگریٹ پھینک کر آگے بڑھا۔

"میرا دل چاہتا ہے دلربا کہ کسی دن تم کو بھی اڑا لے جاؤں۔" جگن ناتھ نے چلتے ہوئے کہا۔

"کہاں؟" دلربا نے شوخی سے کہا۔ "نیل گگن کے اس پار، فلمی زبان میں۔"

"کہیں بھی۔ ہیلی کاپٹر کو کسی پہاڑ کی چوٹی پر اتار دوں۔" جگن ناتھ ہنسا۔

"اور اتر نا پڑا بحر اکاہل میں، تو تمہارے ساتھ میرا بھی بیڑا غرق۔" دلربا ہنسی۔ اس کے سارے ناز و انداز طوائفوں جیسے تھے۔

"اگر میں کہوں کہ میرے ساتھ بھاگ چلو تو؟" جگن ناتھ مسکرایا۔ "کیا کرو گی تم؟"

"میں تو ہر وقت تیار ہوں۔" دلربا ہنسی۔ "تم بھگوڑے ہو جاؤ گے۔ اور تمہاری وہ دھرم پتنی جو تمہارے سات بچوں کی پروڈیوسر ہے، وہ بھی ساتھ ہو لی تو تم کیا کرو گے؟"

سادھو رام یہ چونچلے اور چاہت کے جھوٹے سلسلے بھی بڑی مشکل سے برداشت کر رہا تھا۔ ہیلی کاپٹر اڑ گیا تو وہ پھٹ پڑا۔

"مجھے یہ سب بالکل اچھا نہیں لگتا۔ تم اس کے سامنے مجھے نظر انداز کر دیتی ہو... سب کچھ بھول جاتی ہو۔"

"تم یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ میں تمہاری دھرم پتنی نہیں ہوں۔" دلربا نے ترش ہو کر کہا۔ "میری ہی وجہ سے وہ تم کو اتنی قیمت دے رہا ہے۔ وہ تمہارے مال کی نہیں، میری مسکراہٹ کی قیمت دیتا ہے۔ جو کچھ میں کرتی ہوں، وہ کاروباری ضرورت ہے۔ اس میں میرا ہی نہیں، تمہارا بھی فائدہ ہے۔"

سادھو رام کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ "پتا نہیں مجھے کیا ہو جاتا ہے۔ لیکن دلربا... دیکھ لینا اسی پاگل پن میں کسی دن میں اس کو گولی مار دوں گا۔"

دلربا ہنسی۔ "جس دن یہ کام کرنا ہو مجھے بتا دینا۔ میں یہ زیادہ آسانی سے کر سکتی ہوں۔"

"سچ دلربا۔ میں تو سمجھتا تھا کہ تم اس پر ریجھ گئی ہو... دماغ خراب ہے میرا۔"

"دیکھو سادھو رام! ہم نے اور تم نے مل کر ایک کام شروع کیا تھا۔ سائیں پاپڑ والے کا تم نے کام تمام کیا۔ پھر تقدیر نے ایک بہت بڑے کام کے لیے ہمیں منتخب کر لیا۔" دلربا نے کہا۔ "اب تک کتنا کما چکے ہیں ہم۔"

"سینتالیس لاکھ اس کاروبار میں۔ تین لاکھ تمہاری پیری مریدی سے۔" سادھو رام بولا۔

"پیری مریدی کو گولی مارو۔ یہ تو ایک ادلا ہے کاروباری فرائض کے لیے۔" دلربا نے کہا۔ "مجھے اپنی جوانی یہاں جاہل مردوں کو اولاد کے لیے تعویز لکھ کر دیتے اور بدبخت، بدصورت لڑکیوں کی ماؤں سے ان کے پیلے کراتے کے نذرانے لیتے نہیں گزارنی ہے۔ لڑکی بدصورت ہو تو کوئی بات نہیں، بدنصیب نہ ہو۔ بدنصیبی کا تعویذ کہیں نہیں ملتا اور جو بے اولاد ہیں ان کو بھلا میں اولاد کہاں سے دلوا سکتی ہوں۔ جب تم نے مجھے سائیں پاپڑ والا کی مریدی میں دیا تھا تو تمہارا ہمارا ایک ہی مقصد تھا۔"

"مجھے... نہ جانے کیوں شک ہونے لگتا ہے کہ تم مقصد کو بھول نہ جاؤ۔" سادھو رام نے خفت سے کہا۔

"وہم کا علاج تو حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا۔ دلربا بولی۔ سمجھو یہ آخری سودا... سب ملا کے ہمارے پاس ایک کروڑ کے لگ بھگ ہو جائیں گے۔ تیس چالیس لاکھ کے سونے چاندی کے پاپڑ بھی تو ہیں میرے پاس۔ اب ہمیں نکل جانا چاہیے۔"

"ہاں دلربا! میں بھی کچھ دنوں سے ایک انجانا خوف محسوس کرنے لگا ہوں۔" سادھو رام بولا۔ "جیسے وہ سب کچھ جو ہم نے سوچا تھا، وہ نہیں ہوگا۔ میں اور تم دونوں آگ ...

"... ہر طرف دشمن ہیں۔ حقیقت آشکار ہوتے ہی یہ سب ... تمہارے خون سے پیاس بجھا کے بھی مطمئن نہیں ہوں گے۔ ... کر کے کتوں کے آگے ڈال کر بھی مطمئن نہیں ہوں گے۔ ... ذہن پر آسیب سوار ہے جسے صرف میں محسوس کرتا ہوں۔ بعض اوقات میں رات کو سو نہیں سکتا۔ مجھے لگتا ہے کہ کوئی اندر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سادھو رام... میں تمہاری موت کا..."

"کیوں کرتے ہو ایسی باتیں۔" دلربا نے کہا۔ "دماغ پر زور مت دو۔ چند دن میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آؤ اندر چلیں۔"

"تم بھی اپنا حلیہ ٹھیک کر لو۔ شام ہونے والی ہے۔" سادھو رام نے کہا اور دلربا کے ساتھ اندر چلا گیا۔ دروازہ بند ہو گیا۔

"تمہارے خوف کا آسیب ایک زندہ حقیقت ہے سادھو رام۔" میں نے دل ہی دل میں کہا۔ "بس تم یہ نہیں جانتے کہ اس کا نام سکندر بخت ہے اور وہ اس وقت بھی تمہارے بہت قریب ہے۔ وہ تم کو دیکھ سکتا ہے مگر تم اس کو نہیں دیکھ سکتے۔ البتہ آج رات تم پھر مجھے دیکھو گے۔"

ایسا لگتا تھا کہ اب کچھ دیر میں سادھو رام کی واپسی ہو گی۔ اس وقت میں اندر جا کے کوئی تیر نہیں مار سکتا تھا اور باہر بھی سادھو رام کا راستہ نہیں روک سکتا تھا۔ وہ اسلحہ بردوش تھا چنانچہ اس کا مسلح ہونا یقینی بات تھی۔ وہ مجھے قریب آنے کی مہلت دیے بغیر گولی مار دیتا۔ سادھو رام کی گاڑی مجھ سے پچاس گز دور کھڑی تھی۔ میں نے درختوں کی آڑ میں بڑھنا شروع کیا اور سنبھل سنبھل کے قدم اٹھاتا گاڑی تک جا پہنچا۔ حسبِ توقع چابیاں گاڑی کے اندر ہی لگی ہوئی تھیں۔ یہاں سادھو رام کو یہ خطرہ کسی سے نہیں تھا کہ کوئی اس کی گاڑی لے جائے گا۔ مجھے پہلا خیال یہی آیا کہ میں گاڑی لے کر سادھو رام سے پہلے ڈونگا پتن جا پہنچوں مگر کچھ سوچ کر میں نے اس پروگرام پر عمل درآمد کے پروگرام کو مسترد کر دیا اور دوسرا زیادہ خطرناک پروگرام بنا لیا جس میں کامیابی کے امکانات بھی زیادہ تھے۔ میں نے چابیاں اگنیشن سوئچ سے نکالیں اور اس جہازی سائز گاڑی کی ڈکی کھول کر واپس اسی سوئچ میں لگا دیں کہ سادھو رام دیکھے بھی تو اسے شک نہ ہو۔ پھر واپس آ کر میں ڈکی میں اترا۔ ڈکی میں اسپیئر وہیل اور جیک وغیرہ کے ساتھ انجن آئل کا ایک ڈبا اور بریک آئل کا ایک ڈبا پڑے تھے۔ ڈکی خاصی کشادہ تھی۔ میں نے اپنی جگہ بنائی اور قفل کو کھولنے والے میکنزم کو غور سے دیکھنے کے بعد ڈکی کو بند کر دیا۔ ڈکی اب مقفل تھی اور اس کو چابی کے بغیر نہیں کھولا جا سکتا تھا۔

اس محدود سی جگہ میں آرام سے لیٹنے کی گنجائش نہیں تھی ... تھا۔ ڈکی میں ہر طرف کونے نکلے ہوئے تھے اور نٹ بولٹ تھے جو میرے جسم میں کانٹوں کی طرح چبھ رہے تھے۔ اس کی سخت سطح پر گرد تھی اور اندر رکھی ہوئی چیزوں کی ملی جلی بو تھی اور گھپ اندھیرا تھا۔ ڈرنے کی صرف ایک بات تھی کہ سادھو رام واپسی میں کوئی پیٹی یا بھاری بھرکم چیز نہ اٹھا لائے جس کو ڈکی میں رکھنا ضروری ہو۔ تاہم اس خطرے سے نمٹنے کے لیے میں بالکل تیار تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ جب وہ ڈکی کھولے گا تو اس کے قفل میں چابی لگنے کی آواز آئے گی اور ایک سیکنڈ بعد مضبوط فولادی اسپرنگ ڈھکنے کو خود ہی اٹھا دیں گے۔ اس وقت سادھو رام مجھ سے ایک ڈیڑھ فٹ دور ہوگا اور ڈکی میں میری یا کسی اور کی موجودگی اس کے لیے ناقابلِ یقین سی بات ہو گی۔ اس کی حیرانی ختم ہونے سے قبل ہی میں اچھل کر باہر نکلوں گا اور اس کی گردن دبوچ لوں گا یا ہاتھ بڑھا کر اسے بھی اندر کھینچ لوں گا۔ اس طرح کہ رکوع کی حالت میں سادھو رام کا جسم جھکا رہے۔ اس کا سر اندر میری گرفت میں ہو اور ٹانگیں باہر ہوں۔ اس حالت میں اس سے اسلحہ چھیننا بھی ممکن ہو گا اور اس کی مدد کے لیے آنے والے کو روکنا بھی۔

یہ بڑا سنسنی خیز انکشاف تھا کہ کرماں والی درحقیقت سادھو رام کی ایجنٹ ہے جس کو خود اسی نے سائیں پاپڑ والے کو قتل کرنے کے بعد پیری فقیری دی ہے۔ کرماں والی کے بھیس میں وہ ایک غلیظ بالوں سے میلی کچیلی نظر آنے والی، گندے اور پرانے گیروے لباس میں ملنگ نظر آنے والی عمر رسیدہ عورت تھی جسے لوگ مجذوب کہتے تھے کیونکہ وہ فرشِ خاک پر بیٹھتی تھی۔ وہ ایسی باتیں کرتی تھی جسے گاؤں والے "معرفت" کے اسرار و رموز سمجھتے تھے۔ دنیا دی اسبابِ ظاہری سے بے تعلق نظر آنے والی یہی عورت دلربا کے روپ میں ایک خوب صورت عورت تھی۔ صاف ستھری اور نکھری ہوئی جو آرائشِ جمال کے فن سے آشنا تھی۔ لباس کی حسن آرائی کے انداز جانتی تھی۔ مردوں کے دلوں کو اپنی عشوہ گری سے غلام بنا سکتی تھی اور ایک خطرناک گروہ کی آلۂ کار تھی۔ اس کو سادھو رام نے کہاں سے حاصل کیا؟ یہ سوال غور طلب تھا۔ وہ کوئی مقامی عورت نہیں تھی، اس کے فیشن اسے شہری ثابت کرتے تھے اور اپنی باتوں سے وہ تعلیم یافتہ لگتی تھی۔ اس کی اداکارانہ صلاحیت کو تسلیم نہ کرنا بھی مشکل تھا کیونکہ وہ اپنی شانِ قلندری میں بھی یکتا تھی اور اپنے اصل کاروبار میں بھی۔ گمان کہتا تھا کہ وہ دشمن کی منتخب کی ہوئی اور ان کی تربیت یافتہ ایجنٹ تھی۔ اسے سادھو رام کے پاس اسی لیے بھیجا گیا تھا کہ اس مشکل مشن کے لیے کوئی بہتر عورت مل ہی نہیں سکتی تھی۔ معلوم نہیں وہ سادھو رام کے پاس کیسے پہنچی تھی مگر بعد میں سادھو رام نے اسے سائیں پاپڑ والے کی خدمت میں پیش کر دیا۔ دلربا نے سائیں پاپڑ والے کی عقل خبط کر دی ہو گی اور

دلربا کے سحر میں گرفتار ہونے کے بعد اس نے سینئر مریدوں کو نظر انداز کرتے ہوئے دلربا کو اپنا گدی نشین بنا دیا۔ گاؤں والوں نے..... سائیں پاپڑ والے کی زندگی میں ہی دلربا کو اس کا جانشین بھی تسلیم کر لیا ہوگا اور اس کی پیری فقیری کا دھندا چل پڑا ہوگا تو سادھو رام نے اُسے ٹھکانے لگا دیا ہوگا۔

اب دلربا جسے یہ مقام سادھو رام کی مدد سے حاصل ہوا تھا، اسے یقین دلا رہی تھی کہ ایک کروڑ کا ہدف حاصل ہوتے ہی وہ یہاں سے نکل جائیں گے۔ اس گاؤں سے اور پھر اس ملک سے لیکن صاف نظر آتا تھا کہ دلربا کو سبز باغ دکھا کر یہاں لانے والا اب دلربا کے ہاتھوں میں کھیل رہا ہے۔ وہ جگن ناتھ کے عشق میں مبتلا نظر آتی تھی اور اس بات کا قوی امکان تھا کہ اس مثلث کا وہ ضلع باقی نہیں رہے گا جو سادھو رام کہلاتا تھا۔ لیکن معاملہ اس کے برعکس بھی ہو سکتا تھا۔ سادھو رام رقابت میں اچانک جگن ناتھ کو قتل کر سکتا تھا۔ ایک کروڑ کی رقم اتنی تھی کہ سادھو رام باقی دو کو بھی ٹھکانے لگا سکتا تھا اور یہی کام دلربا بھی کر سکتی تھی۔ یہ اعتماد کا کھیل نہیں تھا۔ اس میں محبت بھی دھوکا ہو سکتی تھی۔ جگن ناتھ ایک خطرناک، جہاں دیدہ اور خرانٹ شخص تھا۔ جذبات کو عقل کے تابع رکھے بغیر کوئی بھی کمانڈر ایسے مشن میں کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔ پھر وہ شادی شدہ اور بقول دلربا کے سات بچوں کا باپ تھا۔ بے شک وہ ایک دلکش اور وجیہہ مرد تھا مگر دلربا جیسی عورت کو سات بچوں کے باپ پر فریفتہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ خود جگن ناتھ کی دل لگی کو دل کی لگی سمجھنا محال تھا۔ وہ دلربا کو اپنی مٹھی میں رکھنے کے لیے اس کے عشق کی دیوانگی کا ناٹک رچا رہا تھا۔ یہ بلی چوہے کا کھیل تھا جس میں یہ طے کرنا بھی آسان نہ تھا کہ بلی کون ہے اور چوہا کون۔ وہ سب موقع ملتے ہی ایک دوسرے کے وجود کو ختم کر سکتے تھے۔

میرا جسم درد سے اینٹھنے لگا تھا جب میں نے کسی کے قدموں کی آہٹ سُنی۔ پھر گاڑی کا دروازہ کھُلا اور بند ہو گیا۔ گاڑی کا انجن دو مرتبہ غرا کے خاموش ہوا اور تیسری مرتبہ اسٹارٹ ہو گیا۔ سادھو رام نے ریس دی اور گاڑی ایک جھٹکے سے واپس ہوئی۔ دلربا نے سادھو رام کو سی آف کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ شاید وہ پھر جوگن کا بھیس بنائے بے وقوف عقیدت مندوں کو جھوٹی دعائیں اور بوگس تعویذ دے رہی تھی اور ان کے نذرانے ظاہری حقارت کے ساتھ ٹھکرا تی جا رہی تھی۔ دال کے پاپڑ، چاندی کے پاپڑ، سونے کے پاپڑ۔ راہِ طلب میں آدمی کو کتنے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔

گاڑی نے موڑ کاٹا اور اونچے نیچے راستوں پر دوڑنے لگی۔ ہر جھٹکے پر میرا جسم ڈکی میں تہ و بالا ہو جاتا تھا اور بعض اوقات کیل کانٹوں کے چبھنے یا کسی نوکیلے کونے سے لگنے والی چوٹ کی ٹیس سے میری آہ نکل جاتی تھی تاہم میری آواز کے سادھو رام تک پہنچنے کا ڈر نہیں تھا۔ اتنی لمبی کار میں وہ مجھ سے کافی فاصلے پر تھا جہاں انجن کا شور زیادہ محسوس ہوتا تھا۔ پھر دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ ڈکی میں دھواں بھر رہا ہے۔ سائلنسر جو ڈکی کے نیچے سے گزرتا تھا کسی جگہ سے لیک کرتا تھا اسی لیے گاڑی کی آواز بھی زیادہ محسوس ہوتی تھی لیکن میرے لیے زیادہ تشویش کی بات یہ تھی کہ اس سوراخ سے خارج ہونے والا زہریلا دھواں اوپر اُٹھ کر ڈکی میں داخل ہو رہا تھا۔ ڈکی ایئر ٹائٹ نہیں تھی۔ اس کے نیچے والے حصے میں سوراخ تھے جن سے ڈکی دھونے کے بعد پانی نکل جاتا ہے مگر اب انہی سوراخوں سے وہ دھواں اندر آ رہا تھا جس میں انجن سے خارج ہونے والی کاربن مونو آکسائیڈ گیس کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اگر یہ گیس ڈکی میں جمع ہوتی رہتی اور میں اسی زہریلی ہوا میں سانس لیتا رہتا تو کچھ دیر میں بے ہوش ہو جاتا اور بالآخر اسی بے ہوشی میں دنیائے فانی سے کوچ کر جاتا۔ اطمینان کی بات یہ تھی کہ ڈونگا تین تک فاصلہ زیادہ نہیں تھا اور میرا اتنے کم وقت میں انتقال فرما جانا مشکل لگتا تھا۔ آدمی کے جسم میں زندگی کے لیے جد و جہد کی قدرتی مدافعت کی صلاحیت کم نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ ڈکی میں تھوڑی بہت تازہ ہوا بھی آ رہی تھی۔ چنانچہ ڈکی میں کاربن مونو آکسائیڈ کے جمع ہونے کا تناسب کم تھا۔ میں خود بھی آکسیجن خرچ کر رہا تھا اور کاربن مونو آکسائیڈ خارج کر رہا تھا۔ اگر میں آدمی نہ ہوتا پودا ہوتا تو اس عمل کو الٹ سکتا تھا۔ میں نے سوچا اور کسی فارمولے کے بغیر حساب لگانے کی کوشش کی کہ اندر کی ہوا میں آکسیجن کو ختم ہونے میں کتنی دیر لگے گی؟ گاڑی پہلے ڈونگا تین پہنچے گی یا میرے ہوش و حواس پہلے ساتھ چھوڑ جائیں گے؟ وغیرہ وغیرہ۔

چند منٹ بعد میرا سر بھاری ہونے لگا اور میری طبیعت مالش کرنے لگی۔ یہ کاربن مونو آکسائیڈ کے زہریلے اثرات کا نتیجہ تھا۔ الوداع رابعہ! میں نے دکھی دل سے سوچا۔ تمھارا عاشق ناہنجار جو ہزار جان لیوا مرحلے طے کر کے تمھارے حضور پیش ہونے کا آرزومند تھا، ناشاد و نامراد اس دنیا سے جاتا ہے۔ اب ملیں گے عرصۂ محشر میں دیوانے تیرے۔ چوہدری دلاور کے بچ جانے کا داغ دل پر ہے۔ مگر موت سے کس کو رستگاری ہے۔ نہایت فضول اور بے سر و پا خیالات کے ساتھ آہستہ آہستہ میں بے ہوشی اور بے حسی کے سمندر میں غرق ہو گیا جہاں نہ رابعہ تھی اور نہ دلربا۔ بس ایک خلا تھا جو موت کے بعد کی بے خبری سے کم نہیں تھا۔

معلوم نہیں مجھے کتنی دیر بعد ہوش آیا۔ اندھیرا اب بھی میرے گرد محیط تھا لیکن میں بہت کچھ محسوس کر سکتا تھا۔ مثلاً یہ کہ میرا جسم اکڑ چکا ہے اور اب حرکت کرنا بھی باعثِ آزار ہے۔ میرا سر اندھوں بدر رکھی ہوئی چٹان لگتا تھا اور میری توانائی کا لیول صفر تھا۔ تاہم اپنے خود کو اسی دنیا میں پا کے خوشی ہوئی اور یہی خوشی میرے لیے حوصلے اور توانائی کے حصول کا سبب بن گئی۔ غالباً گاڑی کے رک جانے سے انجن کی زہریلی گیس کا اخراج بند ہو گیا تھا اور رفتہ رفتہ ڈکی میں زندگی بخش تازہ ہوا بھرتی گئی تھی۔ اگر گاڑی چلتی رہتی تو میرا ہوش میں آنا ناممکن تھا۔ میں نے خاصی کوشش سے ہاتھوں پیروں کو حرکت دی اور درد کی اذیت کو برداشت کیا۔ میرے کان کسی آواز کو سننے کی کوشش میں ناکام رہے۔ گاڑی کے آس پاس کوئی نہیں تھا۔

بالآخر میں اس قابل ہو گیا کہ ہاتھ بڑھا کے ڈکی کے قفل کو اندر سے کھول سکوں۔ اس کے لیے مجھے اندازے کی مدد سے ایک لیور کو ہٹانا تھا جسے ایک اسپرنگ نے دبا رکھا تھا۔ ڈکی کے ڈھکنے کو اوپر اُٹھانے والے اسپرنگ بھی اپنا کام کر رہے تھے چنانچہ لیور بڑی سختی سے ہک میں دبا ہوا تھا۔ اُسے ہٹانے کے لیے ضروری تھا کہ ڈکی کو اوپر سے دبایا جائے۔ میں نے ایک ہاتھ اوپر اٹھایا۔ ڈکی کے ڈھکنے میں اندر کی جانب لگی ہوئی فولادی پٹیاں ایک کراس کی شکل میں پھیلی ہوئی تھیں۔ میرے ہاتھ نے ایک پٹی کو گرفت میں لے کر نیچے کھینچا۔ دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے میں نے لیور کو دبایا۔ لیور ہلا اور ہک سے نکل گیا۔ اس کے ساتھ ہی ڈکی کا ڈھکنا اُٹھ گیا اور میں نے تازہ کھُلی فضا میں سانس لے کر اپنے سر پر پھیلے ہوئے تاریک آسمان کو دیکھا جس کی وسعت کو ستاروں نے سجا رکھا تھا۔

میں ایک جست میں باہر آ گیا۔ مجھے دیکھنے والا کوئی نہیں تھا کیونکہ گاڑی ایک کچی فصیل کے اندر کھڑی ہوئی تھی۔ ایک طرف باغ تھا یا جنگل۔ دوسری طرف ایک مختصر سی عمارت تھی جس کے سارے دروازے اور کھڑکیاں بند تھے مگر شیشوں کے پیچھے روشنی تھی۔ یہ روشنی کسی گھریلو قسم کے جنریٹر سے پیدا ہونے والی بجلی کے دم سے تھی۔ پیٹرول یا مٹی کے تیل سے چلنے والے جنریٹر کی آواز سکوتِ شب میں صاف سنائی دیتی تھی۔ میں اسی آواز کی طرف بڑھا۔ یقیناً یہ سادھو رام کا گھر تھا۔ میں اس کو اپنے شہری معیار سے مختصر عمارت قرار دے رہا تھا مگر گاؤں میں یہی ایک حویلی تھی۔ پکی اینٹوں کی بنی ہوئی اس عمارت میں چار پانچ کمرے ہو سکتے تھے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ سادھو رام اکیلا رہتا ہے یا بیوی بچوں کے ساتھ تاہم حویلی میں نوکروں کی موجودگی کے امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔

میں نے پورے مکان کا ایک چکر لگاتے ہوئے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ خود دیوار کے سائے میں رہوں اور میرے قدموں کی آہٹ تک سنائی نہ دے۔ اچانک ایک دروازہ کھُلا اور کوئی شخص باہر نکلا۔ میں دیوار سے چپک گیا مگر وہ اپنے خیال میں سیدھا گزر گیا۔ میں نے اس کو فصیل کے دروازے کی طرف جاتے دیکھا جو شاید سو گز کے فاصلے پر تھا۔ گاڑی اسی راستے سے اندر آئی تھی اور وہاں کھڑی ہوئی تھی جہاں ایک میدان سا آتا تھا۔ میں اندر داخل ہونے کی سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے ایک اور خیال آیا۔ میں تیزی سے گاڑی کی طرف گیا اور اس کا دروازہ کھول کر دیکھنے کی کوشش کی۔ دروازہ مقفل نہ پا کے مجھے خوشی ہوئی۔ میں نے اندر جھک کر ڈیش بورڈ پر ہاتھ مارا۔ پھر گلوز کمپارٹمنٹ کو دیکھا۔ اس میں کاغذات تھے مگر درمیان میں کوئی سخت ابھار سا تھا۔ میں نے کاغذات کو باہر کھینچا تو کوئی چیز آواز کے ساتھ گاڑی کے فرش پر گری۔ ربر میٹ کی وجہ سے آواز زیادہ نہیں ہوئی اور میں نے جھک کر سیٹ کے نیچے پڑے ہوئے ریوالور کو اٹھا لیا۔

یکلخت میں ایک بے بس آدمی نہیں رہا۔ میں ایک طاقت بن گیا۔ ایک ایسی طاقت جس کے سامنے وہ چالاک اور دھوکے باز سادھو رام کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ اسی طرح جیسے طوفان کے مقابل گھاس کا تنکا اور سیلاب کی یلغار کے سامنے ریت کی دیوار کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ اب تک میرے ساتھ صرف میرا عزم تھا اور میری قوتِ ارادی تھی اور میرا یقین تھا لیکن میرے ہاتھ خالی تھے۔ اب میں نے جانا اور مانا کہ اسی یقین نے مجھے پھر وہ قوت عطا کی جو ریوالور کی صورت میں میرے ہاتھ میں تھی۔ میرے ایمان کو تقویت حاصل ہوئی کہ وہ دستِ غیب میرے ساتھ ہے جو حق و باطل کی معرکہ آرائی میں ہمیشہ ان کے لیے اسی قسم کے اسباب فراہم کرتا ہے جو اپنے یقین کی راہ پر چلتے ہیں اور اپنے اندر کی سچائی کو تسلیم کرتے ہوئے اسی روشنی کو راہنما رکھتے ہیں جو ایک ازلی و ابدی حقیقت ہے۔

میں نے ریوالور کو چوما اور اس کے میگزین کو چیک کیا۔ اس کے ہر خانے میں گولی تھی۔ اعشاریہ چار پانچ کیلیبر کی یہ عام سائز کی گولیاں نہیں تھیں اور اس قسم کے ریوالور پولیس یا لازمی سروس کے ارکان کو ہی ملتے تھے لیکن اسمگلنگ اور ہیرا پھیری نے کسی بھی چیز کا حصول آسان بنا دیا تھا۔ ابھی تک میں خاموشی سے موقع محل اور حالات کا جائزہ لے کر یہ دیکھ رہا تھا کہ خود کو محفوظ رکھتے ہوئے میں کیا کچھ معلوم کر سکتا ہوں۔ مثلاً یہ کہ رابعہ اور نازو میں سے کوئی اب تک یہاں ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو کہاں ہے اور سادھو رام کے حفاظتی انتظامات کس نوعیت کے ہیں۔ بعد میں اپنی پوری قوت کے ساتھ میں واپس آؤں تو میری کامیابی کے امکانات کیا ہوں گے۔ لیکن اب میں نے اندر گھس کر تنِ تنہا وہ کام آج ہی کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا جو پہلے میں کل پر

اُٹھا رکھنا چاہتا تھا۔

میں اسی دروازے سے اندر گیا جس سے نکل کر کوئی باہر گیا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی مجھے ایک دروازہ اپنے سامنے دکھائی دیا جو کھلا ہوا تھا اور اس میں سے روشن کمرے کا پورا منظر دکھائی دیتا تھا۔ یہ سادھو رام کا ڈرائنگ روم تھا جو اپنے جدید ترین طرز کے سامانِ آرائش سے لاہور یا کراچی کے کسی بھی فیشن ایبل علاقے کی کوٹھی کے ڈرائنگ روم سے کم نہیں تھا اور ڈونگا پتن جیسے پسماندہ علاقے میں اس منظر کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ نیم پختہ حویلی کو باہر سے دیکھنے والا بھی کچھ نہیں جان سکتا تھا مگر یہ سب اس دولت کا کرشمہ تھا جو اس بے ضمیر شخص نے وطن فروشی کے کاروبار میں کمائی تھی۔ کمرے میں ٹیوب لائٹس کا دودھیا اجالا تھا اور ٹی وی چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ جہاں میں کھڑا تھا وہ ایک مختصر سی راہداری یا ڈیوڑھی تھی۔ دوسرا دروازہ مجھے دائیں ہاتھ پر دکھائی دیا جو بند تھا۔ بائیں جانب دو دروازے تھے۔ ان میں سے ایک کھلا ہوا تھا اور اس کی روشنی بھی باہر آ رہی تھی۔ یہ سادھو رام کا بیڈ روم ہو سکتا تھا۔

"سیوک، کہاں مر گیا کم بخت؟" کسی عورت نے تیز اور اونچی آواز میں چلّا کر کہا۔

"ابھی خود تم نے اسے ملک صاحب کے گھر بھیجا ہے۔ آتے جاتے کچھ وقت تو لگے گا اسے۔" سادھو رام کی آواز آئی۔

"ایک نوکر سے کام نہیں چلتا۔ ہزار بار کہا ہے تم سے مگر تم کو کیا۔" عورت اسی آواز میں بولی جو کان کو چھیدتی محسوس ہوتی تھی۔

"کہاں سے لاؤں دوسرا نوکر؟" سادھو رام بولا۔ "یہ ایک بھی کسی نے بھیج دیا ہے ورنہ کون ہے اعتبار کے قابل۔ یہاں تو سب ہمارے دشمن بنے ہیں جن کو میں نے بڑی کوشش سے دوست بنا رکھا ہے۔ پھر بھی ان کی دوستی پر اعتبار کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی بچھو یا سانپ کو دودھ پلا کے پالے اور پھر اس سے توقع رکھے کہ وہ ڈنک نہیں مارے گا۔ کوئی اور مسلمان گھر میں نوکر بن کے آ گیا نا تو سارا بھانڈا پھوڑ دے گا۔ گھر کا بھیدی ہی لنکا ڈھاتا ہے۔ اسے معلوم تو ہو ہی جائے گا...!"

"بس شروع ہو گیا تمہارا بھاشن۔" عورت نے جھلّا کر کہا۔ "سر میں پہلے ہی درد تھا۔ ایک پیالی چائے بنانے کے لیے بھی خود ہی جانا پڑے گا۔"

"کومل! تم لیٹو، میں چائے بنا لاتا ہوں۔" سادھو رام نے نرمی سے کہا۔

میں نے ادھر اُدھر دیکھا اور بائیں ہاتھ کے دوسرے دروازے سے اندر چلا گیا کیونکہ اس آدھے کھلے دروازے [illegible] مجھے اندھیرا نظر آیا تھا۔ بدقسمتی سے وہ کچن ثابت ہوا۔ سادھو [illegible] چائے بنانے کے لیے ادھر ہی آیا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں اس گھر کا نقشہ بنانے والے کو اُلّو کا پٹھا کہا۔ پیسہ آنے سے سلیقہ اور زندگی کے مہذب طور طریقے تو نہیں آ جاتے۔ یہ بھلا [illegible] نقشہ ہوا کہ صدر دروازے کے فوراً بعد کچن۔ پھر بیڈ روم اور [illegible] میں ڈرائنگ روم۔ شہر میں یہ نقشہ بڑا مضحکہ خیز اور احمقانہ کہا جاتا۔ ہونا اس کا الٹ چاہیے تھا۔ یعنی پہلے ڈرائنگ روم [illegible] روم اور آخر میں کچن۔ مگر اس وقت گھر کا نقشہ نہیں بدلا جا سکتا تھا۔ نقشہ تو میری اسکیم کا ایک دم بدل گیا تھا۔ میں نے [illegible] کے پیچھے پناہ لی اور ریوالور سنبھال کے سادھو رام کا استقبال [illegible] کے لیے تیار ہو گیا۔

سادھو رام اندر آیا اور اس نے دوسری طرف ہاتھ بڑھا کے کوئی سوئچ آن کیا۔ کچن میں پچیس واٹ کے بلب کی [illegible] روشنی پھیل گئی۔ ٹیوب لائٹس اور چھوٹے بلب استعمال کرنے [illegible] غالباً یہی تھی کہ ایک جنریٹر سے پورے گھر کو روشن رکھنا [illegible] فریج چلانا ضروری تھا اور جنریٹر کی پیداواری صلاحیت زیادہ [illegible] تھی۔ میری طرف دیکھے بغیر اس نے ماچس سے مٹی کے تیل کا چولہا جلایا۔ اسی وقت میں آگے بڑھا اور میں نے ریوالور اس کی گدی پر رکھ دیا۔

"آواز مت نکالنا سادھو رام۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "ورنہ وہ تمہارے حلق سے نکلنے والی آخری آواز ہوگی۔"

سادھو رام اپنی جگہ پر منجمد ہو گیا۔ "تم... کون ہو... کون ہو تم...؟" وہ پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر ہکلایا۔

"میں سائیں پاپڑ والے کا سالا اور تمہارا باپ نمرود ہوں۔" میں نے کہا۔ "لیکن زیادہ اہم بات یہ ہے کہ میرے ہاتھ میں جو [illegible] ہے اس میں سائلنسر لگا ہوا ہے۔" میں نے اسے مزید دہشت زدہ کرنے کے لیے یہ جھوٹ بولنا ضروری سمجھا۔

"کیا... آخر کیا چاہتے ہو تم...؟" وہ بولا۔ "میرے پاس کچھ نہیں ہے۔"

"تمہارے پاس تمہاری جان تو ہے۔" میں نے کہا۔ "اور کچھ نہ ملا تو مجبوراً وہی لینی پڑے گی۔"

"تم... وہی ڈاکو ہو جس نے... اس علاقے میں [illegible] رکھی ہے؟" وہ بولا۔

"وہ تو میرا ایک شاگرد کا پٹھا ہے۔ شاگرد کا نام ہے اُلّو۔" میں نے کہا۔ "سنسنی اس وقت زیادہ پھیلے گی جب [illegible] جی کی لاش کو گاؤں والے کسی درخت سے انتہائی افسوسناک

حالت میں اُلٹا لٹکا ہوا دیکھیں گے اور تمہاری دھرم پتنی کے کٹے ہوئے سر بھی اسی درخت کی شاخوں پر ڈیکوریشن پیس کی طرح لٹکے ہوئے ہوں گے۔"

سادھو رام کے جسم کی کپکپی کو میں نے واضح طور پر محسوس کیا۔ "بھگوان کے لیے سب کچھ لے لو..." وہ گھگھیانے لگا۔

"جو کچھ چاہیے مجھے اپنے لیے چاہیے۔ بھگوان کو اس دنیاوی مال و متاع سونے چاندی کے پارچوں اور گولہ بارود کے ذخیروں سے کیا؟" میں نے کہا۔

میرے الفاظ کا خاطر خواہ ردِعمل ہوا۔ وہ ایک دم پلٹا اور میں نے اس کے سر پر ریوالور کا دستہ مارا۔ اس کے حلق سے ایک کراہ نکلی اور وہ فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ میں نے اس کو گھسیٹ کر دروازے کے پیچھے کر دیا۔

"سادھو رام! یہ کیسی آواز تھی؟" اندر سے اس کی بیوی نے پکارا۔ میں خاموش کھڑا رہا۔

"سادھو رام... جواب کیوں نہیں دیتے؟" سادھو رام کی بیوی نے زیادہ تشویش کے ساتھ چلّا کے کہا۔

"آہ..." میں نے حلق کی گہرائی سے ایک درد بھری آواز نکالی۔ "کومل..."

میری صداکاری رائیگاں نہیں گئی۔ کومل دوڑتی ہوئی آئی۔ اُس کو دیکھ کر میں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ برعکس نہند نام زنگی کافور۔ کومل ذرا بھی نازک نہیں تھی۔ نزاکت کا اس سے اتنا بھی واسطہ نہیں تھا جتنا اس کے پتی کا شرافت سے۔ وہ پانچ فٹ لمبی تھی تو تین فٹ چوڑی بھی تھی۔ کمر اور پیٹ کا محیط شاید چھ فٹ سے بھی بڑھ جاتا۔ وزن اور رنگ کے اعتبار سے بھی وہ کسی بھینس کی قبل از وقت جوان ہو جانے والی صاحبزادی لگتی تھی۔ اپنے کالے رنگ کو غیر اہم سمجھتے ہوئے اس نے سرخ ساٹن کا لہنگا اور چولی زیبِ تن کیے تھے اور گھر کے اندر ہونے کی وجہ سے دوپٹہ یا چنری بے خبر آ گئی تھی۔ اپنی بدصورتی میں اس نے میک اپ سے خاصا اضافہ کر لیا تھا۔ کالی چمڑی پر پاؤڈر یوں لگتا تھا جیسے دھوئیں سے سیاہ ہو جانے والے باورچی خانے کی دیواروں پر اناڑی ہاتھ نیلے پانی جیسے چونے سے سفیدی پھیر دیں۔ موٹے ہونٹوں پر لپ اسٹک کی سرخی تہ جم کر خشک ہو جانے والے لہو کی طرح نظر آتی تھی۔ ایسی بے ڈول اور بھاری بھرکم چیز کا نام کومل رکھنا اتنا ہی ظلم تھا جتنا گوبھی کے پھول کو پھولوں کی نمائش میں رکھنا۔

مجھے دیکھتے ہی اس نے کالے انجن کی طرح حلق سے سیٹی بجانے کے لیے منہ کھولا مگر میں نے فوراً کچن کا ایک میلا کپڑا (جسے عرفِ عام میں صافی کہا جاتا ہے) اس کے حلق میں ٹھونس دیا۔ چیخ اس کے گلے میں گھٹ گئی اور میں نے اس کی چٹیا پکڑ کے ایک جھٹکا دیا تو وہ اندر آ گری۔ پھر اس نے اپنے پتی دیو کو لمبا لیٹا دیکھا۔

"افسوس کہ تم ودھوا ہو گئی ہو۔" میں نے کہا۔ "تمہارے سر کے درد کا اب کیا حال ہے۔ کہو تو اس کا بھی علاج کر دوں۔ میں سر توڑ کے اندر سے خرابی پیدا کرنے والی سب چیزیں نکال دیتا ہوں۔ مثلاً غرور، ہوس، لالچ کے جذبات..."

وہ اپنی پھٹی پھٹی دہشت زدہ آنکھوں سے مجھے دیکھتی رہی۔ خوف نے اس کی عقل کو اس حد تک مفلوج کر دیا تھا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے وہ کپڑا بھی نہ نکال سکی جس نے اس کا منہ بند کر رکھا تھا حالانکہ اس کے ہاتھ آزاد تھے۔ اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے تھے اور وہ بری طرح ہانپ رہی تھی۔ اچانک اس نے اپنا ایک ہاتھ سینے پر دل کی جگہ رکھا اور میں نے اس کا رنگ لاش کی طرح سفید ہوتے دیکھا۔ مجھے فوراً خیال آیا کہ اس قد کے ساتھ اتنے وزن کی عورت ہائی بلڈ پریشر کی مریض ہو سکتی ہے۔ وہ مزاج کے اعتبار سے بھی آتش فشاں تھی اور سادھو رام کے ساتھ اس کی ازدواجی زندگی ایک مسلسل خوف کے سائے میں بسر ہو رہی تھی۔ خوف اس کا کہ دولت مند اور اسمارٹ سادھو رام اسمگلر ہے اور کسی بھی وقت پکڑا جا سکتا ہے یا مارا جا سکتا ہے، خوف اس کا کہ ایسے خطرناک کام کرنے والا اسے ٹھکانے بھی لگا سکتا ہے اور پھر کسی خوب صورت عورت سے بیاہ رچا سکتا ہے۔ ممکن ہے وہ کرماں والی کے اصل روپ سے بھی واقف ہو۔ ایسی صورت میں سادھو رام کی طرف سے یہ خوف بھی لاحق تھا کہ وہ اسے تنہا چھوڑ کر دلربا کے ساتھ بھاگ جائے گا۔ غالباً ان کی اولاد بھی نہیں تھی۔ چنانچہ وہ سب سے مضبوط بندھن جو میاں بیوی کو ہزار اختلافات کے باوجود یکجا رہنے پر مجبور کر دیتا ہے اُن کے درمیان مفقود تھا۔ تفکرات کے روگ اور خوف سے متاثر ہونے والے اعصاب کے ساتھ ہائی بلڈ پریشر جیسا دشمن بھی شامل ہو جائے تو دل کا متاثر ہونا قدرتی بات ہے۔

میں نے اس کے منہ سے کپڑا نکالا تو میرے خدشات کی تصدیق ہو گئی۔ اس کا دل شدید صدمے کو برداشت نہیں کر پایا تھا اور اب اس کی حالت بگڑتی جا رہی تھی۔ اسے فوری طبی امداد کی ضرورت تھی مگر میں اس کو پانی پلانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میرے ہاتھوں سے اس نے گلاس کو منہ لگا کے دو گھونٹ پیے اور بے ہوش ہو گئی۔ میں نے اس کو بڑی مشکل سے اٹھایا اور بیڈ روم تک لے گیا۔ بستر پر سیدھا لٹا کے میں نے اس کی نبض دیکھی جو بہت سست تھی۔ میں بہرحال کوئی ڈاکٹر نہیں تھا کہ نبض کی رفتار دیکھ کر کسی نتیجے پر پہنچ سکتا۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا اور میرے لیے یہی اطمینان کافی تھا۔

"کیا ہوا ہے مالکن کو؟" کسی نے میرے پیچھے سے کہا۔
میں چونک کر پلٹا۔ کون... سیوک... غالباً ان کو دل کا دورہ پڑ گیا ہے... گھر میں کوئی دوا ہے؟"
"دوا تو ہے مگر تم کون ہو؟" سیوک نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔
"بتادوں گا یار۔ عجیب آدمی ہو تم بھی... یہ نہیں دیکھتے کہ پہلے کیا کرنا چاہیے۔" میں نے مصنوعی ناراضگی کا اظہار کیا۔
سیوک نے ایک میز پر رکھی ہوئی بہت سی شیشیوں میں سے ایک اٹھائی۔ "ان کا منہ کھولیں۔" اس نے مجھے حکم دیا۔ میں نے تعمیل کی اور سیوک نے ایک ڈراپر سے کومل کے حلق میں چند قطرے ٹپکا دیے۔
"میں سادھو رام جی سے ملنے آیا تھا۔" میں نے سیوک رام کی نظروں میں پرانے سوال کو پڑھ کے کہا۔ "وہ کہیں گئے ہوئے تھے میں کومل کے پاس بیٹھ گیا۔"
"جب میں گیا تھا تو وہ یہیں تھے۔" سیوک نے کہا۔ "ان کو کہیں بھی نہیں جانا تھا۔"
"جب وہ آجائیں تو پوچھ لینا کہ تم سے اجازت لیے بغیر انھوں نے کہیں جانے کی جرأت کیسے کی۔ تم نوکر ہو ان کے یا مالک۔"
"تم کومل... سادھو رام کو کیسے جانتے ہو؟" وہ بولا۔
"میں تو تم کو بھی جانتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم ملک صاحب کے گھر گئے تھے۔ مجھے کومل نے بتایا تھا۔"
"میں نے تم کو پہلے کبھی اس گھر میں نہیں دیکھا!" سیوک کا تسک برقرار رہا۔ اس کا لہجہ ہرگز نوکروں کی طرح نہیں تھا۔ وہ مجھ سے جرح کر رہا تھا اور مطمئن ہونے پر آمادہ نہ تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ بھی دشمنوں کا ایجنٹ تھا جو نوکر کے بھیس میں سادھو رام پر نظر رکھتا تھا۔ کرماں والی بھی دشمنوں کی تربیت یافتہ ایجنٹ تھی اور انھیں جس مشن پر بھیجا گیا تھا اس میں سادھو رام ان کا مددگار تھا لیکن وہ اس پر بھروسا نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے دو آدمی اس کے ساتھ لگا دیے تھے۔ وہ تینوں ایک ہی کام کر رہے تھے۔ یعنی پاکستان سے اسلحے کو بھارت کے یا دیگر ممالک کے راستے مشرقی پاکستان کے علیحدگی پسندوں تک پہنچانے کا انتظام۔ مگر ساتھ ساتھ وہ ایک دوسرے کی نگرانی کا کام بھی کرتے تھے تاکہ کسی کی نیت بدلتی نظر آئے تو اس کا کام تمام کر دیا جائے۔
"تم نے ابھی زندگی میں بہت کچھ نہیں دیکھا میرے لختِ جگر۔" میں نے کہا۔ "مثلاً کیا تم نے ایٹم بم دیکھا ہے؟"
"بکواس بند کرو۔" سیوک نے مشتعل ہو کے کہا۔ "ایٹم بم کے بچے۔"
"میں ایٹم بم کا بچہ نہیں، خود ایٹم بم ہوں۔" میں نے ایک دم ریوالور نکال لیا۔ "بزبانِ شاعر۔ میں خود ہی تماشا ہوں اور خود ہی تماشائی... دیکھنا یہ ہے کہ تم کیا ہو؟"
میں پہلے ہی سمجھ چکا تھا کہ سیوک گھریلو نوکر نہیں ہے چنانچہ میں اس کی طرف سے محتاط تھا۔ اپنے سامنے ریوالور دیکھ کر بھی وہ ہراساں نہیں ہوا۔ اس نے بڑی پھرتی سے جست لگائی اور مجھے فلائنگ کک مار کے گرانا چاہا۔ میں غچہ دے گیا اور وہ کمر کے بل فرش پر گرا لیکن قالین پر اس کو چوٹ نہیں آئی۔ وہ اسپرنگ کی طرح اچھلا اور پلٹ کر آیا۔ اس نے ایک ٹانگ کی ایڑی پر گھوم کر دوسری ٹانگ میرے شانے پر ماری۔ میں لڑکھڑا کے گرا تو وہ ہوا میں اڑتا ہوا میرے اوپر آگرا۔ میں نے ایک جھٹکا لیا اور اس کو دونوں پیروں کی مدد سے پیچھے اچھال دیا۔ پھر مجھے اٹھنے میں دیر نہیں لگی۔ وہ آگے آیا ہی تھا کہ میری لات اس کے سینے پر پڑی اور وہ پیچھے جا کر دیوار سے ٹکرایا اور سیدھا کھڑا ہونے کی کوشش میں جھومنے لگا۔ میں نے اس کے منہ پر تابڑ توڑ گھونسے مارے یہاں تک کہ وہ نیم جان ہو گیا اور سیدھا منہ کے بل گرا۔ اس کا ماتھا باورچی خانے کے فرش پر لگا اور یہ آخری ضرب اسے دنیا و مافیہا سے بے خبر کرنے میں کافی ثابت ہوئی۔ میں نے ہاتھ جھاڑ کر سادھو رام اور سیوک کو دیکھا تو مجھے "ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز" والا مصرع یاد آیا۔ فرق صرف یہ تھا یہاں وہ کھڑے نہیں تھے پڑے تھے اور یہ صفِ مجرماں تھی۔
سیوک کے فوراً ہوش میں آجانے کا اندیشہ کم تھا لیکن سادھو کو کسی مردہ کتے کی طرح گھسیٹتا ہوا اس کے بیڈروم تک لے گیا اور اسے قالین پر ڈال دیا۔ پھر میں نے اس کی بیوی کا معائنہ کیا۔ میری نگاہ نے فوراً زندگی اور موت کے فرق کو دیکھ لیا۔ سانس کی آمد و رفت سے پیدا ہونے والی خفیف سی حرکت بھی مفقود تھی۔ دل کا دورہ مہلک ثابت ہوا تھا۔ بلا اختیار میری نظر نے وہ دوا تلاش کی جو سیوک نے دلِ بیمار کو زندگی کی جدوجہد کی توانائی دینے کے لیے استعمال کی تھی۔ بہت سی شیشیوں میں بھی اس کو تلاش کرنا دشوار ثابت نہ ہوا کیونکہ وہ ایک ہی شیشی تھی جس کو کسی ڈبے میں نہیں رکھا گیا تھا۔ حالانکہ میرے سامنے وہ ایک زرد رنگ کے ڈبے میں سے نکالی گئی تھی۔ تصدیق کے لیے میں نے دوسری شیشیوں کو دیکھا لیکن وہ سب یا تو بڑی چھوٹی تھیں یا ان کے رنگ مختلف تھے۔ پھر مجھے زرد رنگ کا وہی ڈبہ نظر آگیا جس میں سے یہ شفاف رنگ کی اور پانی جیسے محلول والی شیشی نکالی گئی تھی۔ ڈبے پر وٹامن بی کمپلیکس کے شربت کا نام، بنانے والی کمپنی کا نام، خوراک اور اجزائے ترکیبی سب لکھے ہوئے تھے لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہ آئی کہ دل کے دورے میں وٹامن بی

کمپلیکس کے شربت کے چند قطرے کیا اعجازِ مسیحائی دکھا سکتے تھے۔ میں نے اس شیشی کا ڈھکنا کھولا اور احتیاط کے ساتھ بے رنگ محلول کو سونگھا۔ یقین تو مجھے پہلے بھی تھا کہ یہ وٹامن بی کمپلیکس کا شربت نہیں ہے جو بہت گاڑھا۔ زرد۔ نارنجی یا سرخی مائل زرد ہو سکتا تھا مگر بے رنگ نہیں۔ پھر بی کمپلیکس کی مخصوص بو ہے جو کچھ عرصہ استعمال کے بعد پسینے سے بھی خارج ہوتی محسوس ہوتی ہے۔ یہ بو بالکل جدا تھی۔ یہ ایک سفاک قاتل بو تھی۔ یہ کڑوے باداموں کی بو تھی۔ یہ سائنائڈ کی بو تھی جو اتنا زود اثر زہر ہے کہ خود مرنے والے کو موت کی خبر نہیں ہونے دیتا۔
میں نے شیشی کو مضبوطی سے بند کر کے جیب میں رکھ لیا۔ اس جنگ میں سب سے پہلے ایک عورت کام آئی تھی۔ سیوک نے اندازہ لگایا تھا کہ سارے حفاظتی اور دھوکے دینے والے انتظامات ناکافی ثابت ہوئے ہیں اور ایک خطرناک دشمن اندر آگیا ہے۔ وہ عام آدمی نہیں تھا۔ میں اندازہ کر سکتا تھا کہ وہ بھی کوئی سر بکف کمانڈو ہوگا جو اس قسم کی صورتِ حالات سے نبرد آزما ہونے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ سمجھ گیا ہوگا کہ راز کو راز رکھنے کی سب سے کم صلاحیت اسی عورت میں ہے جو سادھو رام کی بیوی تھی۔ اس نے سب سے پہلے کومل کی زبان کو خاموش کر دیا۔ مجھے کومل کی موت کا بالکل افسوس نہیں ہوا۔ جس قسم کے کھیل میں وہ شریک تھی اس میں خاموش تماشائی بھی محفوظ نہیں رہ سکتے۔ وہ کچھ کرتی تھی یا نہیں کرتی تھی سادھو رام کی نصف بہتر ہونے کا جرم ایسا تھا کہ اسے نہ اپنے معاف کر سکتے تھے اور نہ بیگانے۔ اس کے دشمن دونوں طرف تھے کیونکہ اس کے شوہر کا دوست کوئی نہیں تھا۔ انگریزی کا وہ مقولہ ہمیشہ سچ ثابت ہوگا کہ جاسوس اور غدار کا دوست کوئی نہیں ہوتا۔
ایک چادر پھاڑ کر میں نے احتیاطاً سادھو رام کے ہاتھ پیر باندھے اور پھر باورچی خانے میں آیا جہاں سیوک اسی طرح بے سدھ پڑا ہوا تھا۔ اس کو میں گھر کے تیسرے کمرے میں لے گیا۔ تلاشی لینے پر مجھے اس کے پاس سے بھی ایک خودکار ریوالور اور بہت خطرناک قسم کا خنجر ملا۔ وہ خنجر کے استعمال پر بھی پوری طرح قادر ہوگا۔ ریوالور خالی ہو جانے یا چھن جانے کی صورت میں وہ دو چار دشمنوں کی گردن کاٹ سکتا تھا یا پیٹ چاک کر سکتا تھا۔ اس کے پاس شناخت کی کوئی دستاویز نہیں تھی۔ اگر وقت ہوتا تو میں اس سے پوچھ گچھ کرتا لیکن اس کے مقابلے میں سادھو رام سے تفتیش کے نتائج جلد برآمد ہونے کی امید تھی۔ میں نے دوبارہ دوسرے بیڈروم کا رخ کرنے سے پہلے سیوک کو ایک رسی کی مدد سے جکڑ کر بیڈ کے ساتھ باندھ دیا۔ اس کے دونوں ہاتھ پیچھے تھے اور بیڈ کے ایک کنارے سے بندھے ہوئے تھے تو سر دوسرے کنارے سے۔ اس کے منہ میں میں نے اتنا کپڑا ٹھونس دیا کہ اس سے زیادہ یا کم منہ کھولنا اس کے اختیار کی بات نہ رہا۔
سادھو رام کو ہوش میں لانے کے لیے پانی کے چند چھینٹے اور تھوڑا سا گلوکوز ملا ہوا پانی کافی رہا جو میں نے چمچے کی مدد سے اس کے حلق سے اتار دیا۔ اس کے مکمل طور پر ہوش میں آنے تک میں ریوالور لیے اس کے سامنے بیٹھا رہا اور سگریٹ پیتا رہا۔ میں نے کچن میں ریفریجریٹر بھی دیکھا تھا۔ اس میں مجھے کچھ نہ کچھ کھانے کے لیے بھی مل جاتا لیکن ایک ہندو کے گھر کا کھانا کھانے پر طبیعت مائل نہ ہوئی۔ وہ ہندو بھی کوئی نیک چلن اور پارسا نہیں تھا۔ وہ میرے لیے ایک نجس کتے سے زیادہ ناقابلِ برداشت تھا۔ کیونکہ وہ نمک حرام میرا ہم وطن ہونے کے باوجود میرے وطن کے دشمنوں کی سازش میں شریک تھا۔ اگر میں اس کے گھر کا نمک کھا لیتا تب مجھے احساس ہوتا کہ میرے اور اس کے درمیان دشمنی کی بنیاد میں فرق آگیا ہے۔ بالآخر وہ ہلا اور اٹھنے لگا۔
"جہاں ہو وہیں اٹھ کر بیٹھ جاؤ سادھو رام۔" میں نے ریوالور کے اشارے سے کہا۔
"کیا... یہ..." اس کی نظر اپنی بیوی کے ساکت جسم پر جم گئی۔
"ہاں۔ اسے تمہارے سیوک نے زہر دے کر مار دیا ہے۔" میں نے کہا۔
"وہ... نمک حرام..." سادھو رام چلایا۔
"نمک حرام۔" میں ہنسا۔ "یہ تو تم اپنی بات کر رہے ہو۔ جیسے تم تھے ویسا ہی وہ تھا تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔"
"میں اس کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" وہ مٹھی بند کر کے بولا۔
"اگر وہ زندہ رہتا تو تمہیں بھی زندہ نہ چھوڑتا۔" میں نے کہا۔
"خیر تمہارا کام میں نے کر دیا۔ اب صرف تم بچے ہو۔ جب تم بے ہوش پڑے تھے تو میں تم کو آسانی سے قتل کر سکتا تھا۔"
"پھر تم نے ایسا کیوں نہیں کیا؟" وہ تلخی سے بولا۔
"کیا تم کو زندگی سے پیار ہے سادھو رام؟" میں نے کہا۔
"زندگی کسے عزیز نہیں ہوتی۔" وہ بولا۔
"میرا بھی یہی خیال تھا جب آدمی فاقہ کشی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو تو یہ ہو سکتا ہے کہ وہ ایسی زندگی پر موت کو ترجیح دینے کی سوچے۔" میں نے کہا۔ "لیکن جس کے پاس ساری دنیا کی خوشیاں خرید لینے کے لیے دولت ہو وہ کبھی مرنا نہیں چاہے گا۔ اسی لیے میں نے تم کو نہیں مارا کہ میں تم کو ایک چانس دینا چاہتا تھا۔"
"کیسا چانس؟" اس نے خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھا۔
"اس دولت کو خرچ کرنے کے لیے زندگی کی مہلت دینے کا چانس جو تم نے بڑے ناجائز مگر جان لیوا ذرائع سے حاصل کی

تھی۔" میں نے کہا۔ "مجھے سب معلوم ہو چکا ہے کہ تم اور تمہارے ساتھی کیا کرتے ہیں۔"

"میں نہیں سمجھا کہ تم میرے کون سے ساتھیوں کی بات کر رہے ہو۔" وہ بولا۔

"دیکھو سادھورام! صبح سے پہلے یہ کھیل ہر صورت میں ختم ہو جانا ہے۔" میں نے کہا۔ "تم کو جگن ناتھ... کرنل جگن ناتھ سے جتنا لینا تھا، وہ تم لے چکے۔ باقی پندرہ لاکھ کا صبح تک نام و نشان بھی باقی نہیں رہے گا۔ کرماں والی دلربا بڑی حسین عورت تھی۔ تھی میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اس کی زندگی کے باقی رہ جانے والے چند گھنٹوں کو شمار کرنے کا کیا فائدہ۔ موضع کرماں والی کے عقیدت مندوں کو صبح سے پہلے ایک المناک حادثے کا شکار ہونا پڑے گا۔"

"تم کون ہو... وہی..." سادھورام کی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہوئی۔

"ہاں۔ میں سائیں جھا پڑ والا ہوں۔" میں نے کہا۔ "سائیں پاپڑ والے کا باپ... میں نے تم کو... کرنل جگن ناتھ کو اور دلربا کو اصلی روپ میں دیکھ لیا ہے۔ دلربا کے لیے کوئی چانس نہیں۔ تم وہ سب دولت جو تمہارے پاس ہے، اپنے ساتھ لے کر روپوش ہونا چاہو تو میں تمہیں ایک موقع فراہم کر سکتا ہوں۔ یاد رکھو! افشائے راز کے بعد تمہارے لیے نہ اِدھر پناہ ہو گی اور نہ اُدھر۔ شاید وہی جو اَب تک تمہارے دوست تھے، تمہارے زیادہ بڑے دشمن ہو جائیں گے۔ لیکن خدا کی بنائی ہوئی زمین پر تم جیسے حشرات الارض کہیں بھی گم ہو سکتے ہیں۔ سادھورام بنو، بوٹا سنگھ یا راک ہڈسن... تمہاری دولت تمہاری زندگی کی اور اس کی خوشیوں کی ضامن ہو گی لیکن تمہارے لیے ایک بہت سادہ سی شرط ہے۔"

"کون سی شرط...؟" میری باتوں نے سادھورام کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔

"تم مجھے صرف یہ بتا دو کہ رابعہ اور نازو کہاں ہیں؟" میں نے کہا۔

"رابعہ اور نازو؟ میں نے یہ نام پہلے نہیں سُنے۔" وہ بولا۔ میں اُٹھ کر آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب گیا۔ "میں سچ کہتا ہوں۔" سادھورام نے خوف زدہ لہجے میں کہا اور اوپر دیکھا۔ میرے جوتے کی ٹو سے اس کی ٹھوڑی پر لگ پڑی۔ وہ پیچھے گرا تو میں نے اس کی پسلیوں میں، اس کے سر پر اور پیٹ میں اتنی ٹھوکریں ماریں کہ وہ مرنے کے قریب ہو گیا۔

"اب یاد آیا... رابعہ اور نازو کہاں ہیں؟" میں نے کہا۔

"ایک رات تم نے ان کو گامے ماچھی کی جعلی خانقاہ کے باہر سے اپنی گاڑی میں اٹھایا تھا۔"

"اچھا... تم ان کی بات کر رہے تھے... میں اُن کے نام نہیں جانتا تھا۔" وہ کراہتے ہوئے بولا۔

"اسی رات تم نے میرے دو ساتھیوں کو گمراہ کر کے گوجرانوالہ کی طرف بھیجا تھا۔" میں نے کہا۔ "تاکہ مجھے اغوا کر سکو۔"

"ان لڑکیوں کو چھوڑ دیا گیا تھا..." سادھورام نے کہا۔

"چھوڑ دیا گیا تھا یا میرے ساتھی چھڑا کے لے گئے تھے؟" میں نے کہا۔

"وہ... وہ دونوں انھیں نکال کر لے گئے تھے۔" سادھو رام نے کہا اور میں نے خود کو بہت پُرسکون محسوس کیا۔ اگر یہ اطمینان جھوٹا تھا تب بھی بہت غنیمت تھا۔ اس کی تصدیق کی جا سکتی تھی کہ سادھورام کی بات میں جھوٹ کتنا ہے اور سچ کتنا۔

"اٹھو سادھورام۔" میں نے کہا۔ "تم کو میرے ساتھ چلنا ہے۔"

"کہاں... اس وقت...؟" سادھورام نے دہشت زدہ ہو کے کہا۔

"مجھے معلوم ہے وہ لڑکیاں کہاں ہوں گی۔ اگر وہ وہاں نہ ملیں تو تمہارا یہ چانس ضائع ہو جائے گا۔ صرف ایک ہی چانس تھا تمہارے پاس۔" میں نے کہا۔

میں نے سادھورام کو اٹھتے ہی ناک آؤٹ کر دیا۔ پھر میں نے اس کو باندھ کر باہر کھڑی ہوئی گاڑی کی ڈکی میں منتقل کیا۔ دوسرے چکر میں سیوک بھی ڈکی میں بند ہو گیا۔ اب گھر میں صرف ایک لاش رہ گئی تھی۔ میں نے اس کو بھی اٹھایا اور گاڑی کی پچھلی سیٹ پر ڈال دیا۔ ایک لاش مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی تھی۔ پھر میں نے سب کھڑکیاں اور دروازے بند کیے۔ باہر قفل ڈالے اور جنریٹر کو آف کر دیا۔ پوری عمارت تاریک ہو گئی۔ میں نے گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور سوئچ آن کر کے فیول میٹر کو دیکھا۔ ٹینک میں کم سے کم تین گیلن پٹرول تھا جو میری ضرورت کے لیے بہت کافی تھا۔

چند منٹ بعد لمبی چوڑی شیورلیٹ سڑک کی طرف جا رہی تھی۔ کچے راستے پر مجھے ہچکولے محسوس ہو رہے تھے۔ میں اس سے ہی اندازہ کر سکتا تھا کہ ڈکی میں پڑے ہوئے سادھورام اور سیوک کا کیا حال ہو رہا ہو گا۔ یہ کچا راستہ تقریباً چار میل لمبا تھا۔ دھول اور مٹی اڑاتی کار بالآخر پکی سڑک پر پہنچی۔ سمت کا تعین کرنے کے لیے میں نے قطبی ستارے کو دیکھا اور پھر دائیں جانب چل پڑا۔ سڑک پر گاڑی کی ہیڈ لائٹس بہت دُور تک اجالا پھیلا رہی تھیں۔ کبھی کبھی کوئی گاڑی میرے سامنے سے نمودار ہوتی تھی تو مجھے لائٹ ڈِم کرنا پڑتی تھی کیونکہ تنگ سڑک پر راستہ نظر ہی نہیں آتا تھا۔ میری رفتار غیر معمولی طور پر زیادہ تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک گاڑی جب اتنی ہی رفتار سے مخالف سمت میں جلنے کے ...

... زوردار دھماکے کی آواز آئی۔ چند سیکنڈ میں دونوں گاڑیوں کا فاصلہ اتنا زیادہ ہو چکا تھا کہ دوسری گاڑی والا کچھ نہ کر سکا۔ جتنی دیر میں اس نے بریک لگا کے گاڑی روکی ہو گی اور نیچے اتر کے رگڑ سے سائڈ میں پڑ جانے والے ڈینٹ کو دیکھا ہو گا، اتنی دیر میں شیورلیٹ کئی میل کا فاصلہ طے کر چکی تھی۔ دوسری گاڑی کا نقصان یقیناً زیادہ ہوا ہو گا کیونکہ وہ نسبتاً چھوٹی گاڑی تھی اور اتنی مضبوط بھی نہیں تھی جتنی ۱۹۵۲ء ماڈل کی یہ شیورلیٹ۔ تم وہ خاک نوٹ کرتا۔ شیورلیٹ کا نہ پچھلا نمبر تھا اور نہ ٹیل لائٹس تھیں۔ مجھے نقصان کی ذرّہ برابر پروا نہیں تھی۔ میں تو ایک وجدانی کیفیت میں خیالوں کے ساتھ پرواز کر رہا تھا۔ گاڑی کی رفتار میرے تصور کا ساتھ نہیں دے سکتی تھی جس میں رابعہ کی صورت کے سوا کچھ نہیں تھا اور یہ ایک ایسی قوت تھی جس کی کشش مجھے نتائج کی پروا کیے بغیر تیز سے تیز تر چلتے رہنے پر مجبور کر رہی تھی۔ جب تک اس کی امید اور اس کا خیال نہ تھا، میرے دل کی یہ حالت نہ تھی مگر اب اس ایک ساعتِ دیدار سے پہلے چند منٹوں کا یہ انتظار ایک صدی تک ہجر کے عذاب کو جھیلنے کا کرب بننے لگا تھا۔

جس گلی میں ایک ٹیکسی داخل ہو جاتی تھی، اس میں شیورلیٹ امپالا جیسی جہازی کار نہیں جا سکتی تھی۔ مجبوراً میں نے اسے گلی کے نکڑ پر چھوڑا۔ دروازے کا قفل خراب تھا۔ اس کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب میں نے چابی نکال کے قفل میں گھمائی مگر دروازہ پھر بھی کھل گیا۔ میرے لیے ایک پریشانی کی وجہ وہ لاش بھی تھی جو پچھلی سیٹ پر پڑے پڑے اکڑ گئی تھی۔ اب مجھے اپنی بے وقوفی کا احساس ہو رہا تھا۔ آخر مجھے اس لاش کو یہاں تک لانے کی کیا ضرورت تھی۔ میں سادھورام کے گھر میں کوئی لاش چھوڑ کے آنا نہیں چاہتا تھا اور میں نے اس کے گھر کو ایسے بند کیا تھا کہ بعد میں کوئی آئے تو اُسے کوئی شک پیدا کرنے والی بات نظر نہ آئے۔ وہ یہی سمجھے کہ گھر والے کہیں گئے ہوئے ہیں۔ مگر گھر سے نکلنے کے بعد لاش باہر کہیں بھی گرائی جا سکتی تھی۔ راہ میں کئی سنسان موڑ آئے تھے اور ویران علاقے آئے تھے۔ لاش کسی گڑھے یا ندی نالے میں ڈالا جا سکتا تھا۔ یہاں اس کی موجودگی میرے لیے مشکلات پیدا کر سکتی تھی۔ بے شک باہر اندھیرا تھا اور اس وقت گزرنے والے بھی بہت کم تھے لیکن یہ ہو سکتا تھا کہ بچے کھیلتے ہوئے اندر جھانکنے لگیں یا دروازہ کھول کر شور مچا دیں۔ ڈکی میں قید دونوں افراد کی طرف سے مجھے کوئی خطرہ تھا تو یہ کہ وہ ہوش میں آ کے اندر ہی لاتیں نہ چلانے لگیں۔ ان کے ڈکی کو کھول کر فرار ہو جانے کا امکان بہت کم تھا۔

چند منٹ تذبذب میں گزر گئے۔ پھر میری قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ میں سب سے بچھڑا ہوا، دوستی کے سہاروں سے محروم ہو جانے والا، محبت کی روشنی کے گم ہونے سے مایوسی کے اندھیرے میں بھٹکنے والا وہ مسافر تھا جو پھر اپنے رفیقانِ ہمسفر سے آملا تھا۔ پھر محبت کے اُجالے کو دل میں یوں اترتا محسوس کر رہا تھا جیسے دامنِ ابر سے برسنے والی چاندنی ہر گوشۂ چمن کو منوّر کر دے۔ اور اس مرحلے پر جب مجھے بے خطر آتشِ نمرود میں بھی کود پڑنا چاہیے تھا، میری عقل کیوں محوِ تماشائے لبِ بام تھی۔ میں نے اپنی وارفتگیٔ عشق اور جذبات کی بے خودی کے سامنے سر خم کیا اور اس دروازے کی طرف لپکا جو اپنائیت، خلوص اور یگانگت، تحفّظ اور عافیت اور اعتماد اور چاہت کے شہر کا دروازہ تھا۔ دھڑکتے دل کو سینے میں دبائے میں نے آہستہ سے دستک دی۔ دروازہ غالب نے کھولا۔

"تم... سکندر بخت...!" اس نے فرطِ جذبات میں میرے بازو تھام لیے۔ "تم آ گئے... تم تو مرحوم ہو گئے تھے۔"

"میں محروم ہو گیا تھا... تم سب سے۔" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ "ایسے کیا دیکھ رہے ہو مجھے؟"

"وہ... ہم ذرا یقین کر رہے تھے بھائی کہ تم بقلم خود ہو... بھوت نہیں ہو سکندر بخت کے۔" غالب نے آنکھیں مل کر کہا۔

"بھوت کے بچے... باقی سب کہاں ہیں؟" میں نے کہا۔

"باقی سب بھوت کے بچے کہاں ہیں؟" غالب نے کہا۔ "آؤ... اندر آؤ... اطمینان سے بیٹھو۔"

"میرے پاس وقت کم ہے۔ مجھے فوراً واپس جانا ہے۔" میں نے کہا۔

"لوٹ کر تو آنا ہے نا؟" غالب نے کہا۔ "نہیں آنا تو مجھے بتاؤ، میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔"

"یار مجھے وحشت ہو رہی ہے۔ تم بتاتے کیوں نہیں...؟" میں نے گھر کی ویرانی سے گھبرا کے کہا۔

"اپنے بھائی محسن حسن خان تو گئے ہیں بھیس بدل کے اسلام آباد۔" غالب نے کہا۔

"کیوں؟ بھیس بدل کے کیوں؟"

"اور کیا کرتا بے چارہ باپ کے جنازے کو کندھا تو دے نہیں سکا۔" غالب نے کہا۔ "دل ہلکا کرنے کو قبر پر فاتحہ پڑھے گا... اپنی بدبختی کا نذرانہ کچھ آنسو قبر کی مٹی پر بہائے گا۔ بہن سے ملے گا اور لوٹ آئے گا کل تک۔"

"اوہ... تو انکل شیروانی بھی دنیا کے دکھوں سے چھوٹ گئے۔" میں نے بوجھل دل کے ساتھ کہا۔

"ہاں، اولاد کا سکھ دیکھنا ان کے نصیب میں نہ تھا۔ آخری وقت میں ان کے لب پر محسن کا ہی نام تھا۔" غالب نے

کہا۔ "مگر نہ اتنے کم وقت میں محسن کو بلایا جا سکتا تھا اور نہ وہ جا سکتا تھا۔ چلا جاتا تو واپس نہ آتا۔"

"اور شہلا... وہ کہاں رہے گی اب؟" میں نے کہا اور وہیں چارپائی پر بیٹھ گیا۔

"ابھی تو فوزیہ کے ساتھ ہی تھی۔ ظاہر ہے اس کا وہی ایک ٹھکانا ہے۔" غالب نے کہا۔

پہلی بُری خبر سن کے میرا سارا جوش و خروش سرد پڑ گیا تھا اور اشتیاق کا جذبہ دکھ میں ڈھل گیا تھا۔ میں ایک بار پھر خود کو مجرم سمجھنے پر مجبور تھا۔ یہ میری دوستی نبھانے کی سزا تھی جو انکل شیروانی نے برداشت کی۔ ان کا بیٹا جو اُن کے آخری دنوں کا سہارا بن سکتا تھا اُن کا نہ رہا اور وہ نہ چاہتے کے باوجود اسی بیٹی کے گھر میں پناہ گیر ہوئے جسے وہ اپنے گھر سے رخصت کر چکے تھے۔ وہ پرانی وضع پر قائم رہنے والوں میں سے تھے۔ داماد کے گھر میں رہنا ان کو سخت گراں گزرا ہوگا مگر انھوں نے یہ بے غیرتی بھی بیٹے کی وجہ سے برداشت کی۔ محسن کی قربانی اتنی بڑی تھی کہ میں نے خود کو بہت چھوٹا محسوس کیا۔ کیا یہ سب کچھ میں کر سکتا تھا؟ شاید نہیں۔ محسن نے دوستی کا حق ادا کرنے میں حد سے گزر کر وہ روایت قائم کر دی تھی جو شاید کسی نے نہ کی ہوگی۔ اس کو آخری وقت میں باپ کے پاس نہ ہونے کا کتنا رنج ہوگا' اس کا میں بخوبی اندازہ کر سکتا تھا۔ لیکن اس سے محسن کے دل سے غم کا بارِ گراں کم نہیں ہوتا تھا۔ شاید یہ غم کی خلش اس کے دل سے کبھی نہ جائے گی اور وہ کبھی فیصلہ نہ کر سکے گا کہ اس نے میرا ساتھ دے کر والدین کو جو دکھ دیے تھے' وہ تقدیر کے گناہ تھے یا تدبیر کی مجبوری کے جرم۔ اس نے غلط فیصلہ نہیں کیا تھا مگر وقت نے اس فیصلے کو غلطی بنا دیا۔ اس نے کبھی نہ چاہا تھا کہ وہ دوستی پر والدین کے حقوق کو قربان کرے مگر آزمائش کے یہ مرحلے بعد میں پیدا ہوئے اور پھر وہ بے بس ہو گیا۔ اس کے لیے ممکن ہی نہ رہا کہ وہ والدین کے لیے کچھ کر سکے۔ والدین نے اس کی مجبوریوں پر اُسے معاف کر دیا تھا کیونکہ وہ سب جانتے تھے۔ پھر کیا خدا اس کے گناہوں کو معاف نہیں کرے گا جو نیتوں کا بھید جانتا ہے۔

"نازو اسپتال میں ہے۔" غالب نے خاموشی کے وقفے کو توڑنے کے لیے کہا۔

"اسپتال میں! کیا ہوا اسے؟" میں نے چونک کر سر اٹھایا اور وہ آنسو پونچھ دیے جو میری اجازت کے بغیر ہی آنکھوں سے بہنے لگے تھے۔

"وہ زخمی ہو گئی تھی۔" غالب نے کہا۔ "مگر تشویش کی کوئی بات نہیں۔ اس کا بھائی اور والدین اس کے ساتھ ہیں۔"

"کس اسپتال میں؟" میں نے کہا۔ "زخمی کیسے ہوئی تھی وہ؟"

"رابعہ کو نکال کر لانے کی کوشش میں۔" غالب نے کہا۔ "محسن اور تمھارا وہ استاد ٹیڈی' خواجہ نیک محمد تو بعد میں پہنچے تھے۔ تم تو جانتے ہو نا اسے۔ اسے بھلا کون قید رکھ سکتا تھا۔ وہ تو تیغ کیا جنھیں ہم توپ سے لڑجاتے ہیں' کی عملی تفسیر ہے۔ بس نکل آئی مار دھاڑ کر اور رابعہ کو بھی لے آئی۔ پھر اچھا ہوا کہ محسن اور نیک محمد مل گئے وہ بے ہوش ہونے ہی والی تھی۔ یہاں اس کی دیکھ بھال نہیں ہو سکتی تھی اور اسے کسی پرائیویٹ اسپتال میں داخل کرانا بھی ناممکن تھا۔ وہ اس قسم کے کیس لیتے ہی نہیں۔ نازو کے شانے میں ایک گولی لگی تھی اور پسلی ٹوٹی تھی۔ غالباً دائیں جانب کی... میاں سکندر بخت، تم سب کی شانِ سکندری ایک طرف اور اس نازک سی لڑکی کی سرفروشی ایک طرف۔ اسے تو شاید موت بھی آسانی سے تسخیر نہ کر سکے۔ ہم نے یہی بہتر سمجھا کہ اُسے سرکاری اسپتال لے جائیں۔ میں نے اُسے شعبۂ حادثات میں پہنچایا اور ڈاکٹروں کے سپرد کر کے اس کے بھائی کو اطلاع دے دی۔ میرے پریس کے کارڈ نے مجھے پولیس کے چنگل سے محفوظ رکھا۔ میں نے کہا کہ تحقیق تفتیش جو چاہو کر لینا۔ اس کا بھائی بھی سب انسپکٹر ہے' ابھی آجاتا ہے۔"

"انھوں نے پوچھا تو ہوگا کہ یہ سب کیسے ہوا؟"

"ہاں۔ میں نے کہا کہ مجھے کیا معلوم۔" غالب بولا۔ "میں تو مال روڈ پر گورنر ہاؤس کے سامنے سے گزر رہا تھا کہ فائر کی آواز سنی اور ایک چیخ۔ میرے پہنچنے سے پہلے ہی کچھ لوگ ایک گاڑی میں بیٹھ کر بھاگ گئے۔ نمبر وغیرہ میں نے کچھ نہیں دیکھا۔ اس لڑکی کو میں پہچانتا تھا چنانچہ میں اسے لے کر اسپتال بھاگا۔ اس کا بھائی میرا بھی دوست ہے۔ میرا بیان وقتی طور پر چل گیا اور میں نے دیکھا کہ موقع ہے تو پچھلی طرف سے بھاگ لیا۔ سیدھا اپنے اخبار کے دفتر پہنچا اور کام میں لگ گیا۔ شیخ پہنچا تو میں غائب تھا۔ پولیس والے جو شعبۂ حادثات میں ڈیرا ڈالے رہتے ہیں کچھ بھی نہ بتا سکے۔ ادھر اُدھر دیکھا ہوگا مجھے اور سمجھ گئے ہوں گے کہ میں چکر دے کر نکل گیا۔ میرا نام یاد تھا انھیں۔ بعد میں شیخ کا فون آیا۔ میں نے کہا کہ نازو زخمی ہوئی وہ کیسے؟ وہ کہنے لگا کہ مجھے معلوم تھا تم یہی پوچھو گے اور ثابت بھی کر دو گے کہ تم اخبار کے دفتر سے نکلے ہی نہیں، بہرحال تم نے اپنا اخلاقی فرض تو پورا کیا۔ اس کے لیے شکریہ۔ میں نے کہا کہ کیا میں نے اپنا قانونی فرض پورا نہیں کیا؟ تو کہنے لگا کہ وہ الگ معاملہ ہے۔ خیر اتنا کے بعد نازو کی طرف سے ہمیں بے فکری ہو گئی۔ وہ اب خطرے سے باہر ہے۔"

"مرزا غالب! مجھے بتاؤ میں کیا کروں۔ اس لڑکی کا قرض کیسے چکاؤں۔" میں نے کہا۔ "میرے ... ہے۔"

"اکثر لوگ قرض لے کر بھول جاتے ہیں' مثلاً ہم۔" غالب نے کہا۔ "تم بھی یہی کرو۔ عزت آنی جانی چیز ہے۔ کبھی کوئی قرض خواہ مل جاتا ہے تو..."

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ وہ قرض نہیں ہے مرزا غالب۔ میں احساس کے قرض سے نجات پا کے کدھر جاؤں۔ وہ تو مجھ کو اسی طرح زیر بار کرتی رہے گی۔ ایک بار اس نے مجھے میری زندگی دی تھی۔ رابعہ کو بچا کے اس نے مجھے دوسری بار زندگی دی ہے۔"

"رابعہ بھی اسپتال میں ہے۔" غالب نے کہا۔ شاید وہ میرے ذہن کو آہستہ آہستہ ہر صدمے کے لیے تیار کر رہا تھا۔ میں نے غالب کا گریبان تھام لیا۔ "جو کچھ بتانا ہے ایک ہی بار میں بتا دو... میں سب کچھ برداشت کرنے کا حوصلہ رکھتا ہوں۔"

"یہ تم اپنے اسی حوصلے کا ثبوت دے رہے ہو!" غالب نے مزاحمت کیے بغیر نرمی سے کہا۔ میں نے شرمندہ ہو کے اُسے چھوڑ دیا۔ "کیا وہ بھی زخمی ہوئی تھی؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ جسمانی طور پر وہ بالکل ٹھیک ہے۔" غالب نے اپنی قمیص کا کالر ٹھیک کیا۔ "وہ ایک نفسیاتی معالج کے زیرِ علاج ہے۔"

"نفسیاتی معالج! صاف کیوں نہیں کہتے کہ وہ پاگل ہو گئی ہے۔" میں نے کھوکھلے لہجے میں کہا۔

"تم جیسے معقول آدمی کو ایسی نامعقول بات نہیں کرنی چاہیے۔" غالب نے کہا۔ "نفسیاتی مسائل' اعصابی کشیدگی، ذہنی دباؤ' صدمات اور تفکرات۔ ان سب سے ذہن کا متاثر ہونا پاگل پن نہیں کہلاتا۔ کوئی آدمی فولاد کا بنا ہوا نہیں ہوتا۔ عورت جذباتی طور پر بھی زیادہ کمزور ہوتی ہے۔ ہسٹریا اس کے جذباتی دباؤ کے حد سے گزر جانے کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جو کچھ رابعہ کے ساتھ ہوتا رہا ہے' وہ اس نے عام عورت کے مقابلے میں بہت زیادہ حوصلے کے ساتھ برداشت کیا۔ مگر بالآخر اس میں ہمت نہ رہی۔"

"اب کیا حال ہے اس کا؟ میرا مطلب ہے اس کی کیفیت کیسی ہے؟" میں نے کہا۔

"کیفیت ٹھیک ہے۔ وہ کسی کو کاٹنے کے لیے نہیں دوڑتی' کپڑے نہیں پھاڑتی اور چیختی چلاتی نہیں۔" وہ بولا۔ "گم صم بیٹھی رہتی ہے۔ اور صرف خواب آور انجکشن دینے سے سوتی ہے۔ پہلے اڑتالیس گھنٹے تک اُس نے پلک نہیں جھپکی تھی۔ اس کے علاوہ... وہ کسی کو نہیں پہچانتی۔ وہ اپنے پُرعذاب ماضی سے کٹ گئی ہے۔ یہ وہی کیفیت ہے جو ایک شاعر نے بیان کی ہے کہ یادِ ماضی عذاب ہے یارب۔ چھین لے مجھ سے حافظہ میرا۔"

"اور اس کی یہ کیفیت کب تک رہے گی؟" میں نے کہا۔

"تم یہ سمجھ لو کہ وہ ریت کا ایک کمزور پشتہ تھی۔" غالب بولا۔ "اس نے ہر سیلابِ بلا کا مقابلہ کیا اور اُسے روکے رکھا مگر بالآخر سیلاب اُسے بہا کر لے گیا۔ جب سیلاب گزر جائے گا تو اس پشتے کی تعمیر پھر کرنی ہوگی۔ تمھیں... مجھے... ہم سب کو..."

"وہ کون سے نفسیاتی اسپتال میں ہے؟" میں نے کہا۔

"وہ اسپتال نہیں ہے' ایک ڈاکٹر کا گھر ہے۔" غالب نے کہا۔ "وہ ڈاکٹر بہت مشہور نیورو فزیشن ہے۔ ماہر نفسیات اب صرف تحلیل نفسی کرنے والے نہیں ہوتے، اسپیشلسٹ ہوتے ہیں۔ برین اسپیشلسٹ۔ ذہن کے مخصوص امراض عارضی ہوں یا دیرپا سب کا علاج کرتے ہیں اسی طرح جیسے دوسرے اسپیشلسٹ جسم کے دوسرے حصوں کا علاج کرتے ہیں۔ دواؤں سے اور خصوصی آلات سے۔ وہ ڈاکٹر میرا جاننے والا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ یہ میری بہن ہے اور اس کا رشتہ طے ہو چکا ہے۔ اگر اس کے بارے میں کوئی افواہ بھی پھیلی تو رشتہ ٹوٹ جائے گا۔ اس نے مکمل رازداری کی خاطر رابعہ کو اپنے گھر میں رکھ لیا۔ وہ بالکل محفوظ ہے اور بہت اچھے ہاتھوں میں ہے۔"

"تم نے بھی موقع پاتے ہی مجھ پر ایک احسان کا قرض لاد دیا۔"

"یہ تمھارا کمپلیکس بنتا جا رہا ہے۔ اگر کوئی تمھارے لیے کچھ کرتا ہے تو اس لیے کہ تم دوست ہو۔ دوستی میں احسان کا لفظ گالی سے کم نہیں ہوتا سکندر بخت۔" مرزا غالب نے کہا۔ "کیا ضرورت پڑنے پر تم میرے لیے کچھ نہیں کرو گے؟"

"کیا میں رابعہ کو دیکھ سکتا ہوں؟" میں نے کہا۔ "آج رات تو میرے پاس وقت نہیں... لیکن کل..."

"ڈاکٹر کا خیال ہے۔ اور ہم سب اس خیال سے متفق ہیں۔" غالب نے کہا۔ "کہ اس کی ذہنی صحت کی بحالی میں دعا اور دوا کے بعد سب سے اہم کردار تمھارا ہے۔ تم ہی اسے واپس اپنی دنیا میں لا سکتے ہو۔ تمھارے بغیر وہ اس دنیا میں لوٹنے کے لیے تیار ہی نہیں ہوگی۔ اور تم کو بھی اسے یہ یقین دلانے کی جدوجہد کرنی ہوگی کہ تمھاری دنیا بھی بدل گئی ہے۔ تمھاری وہ دنیا جس میں ولاور اینڈ کمپنی کے شکاری تھے۔ نفرتوں کے' قتل و غارت گری کے' ظلم اور ناانصافی کے' تشدد اور بے رحمی کے عفریت منڈلاتے تھے۔ موت کے خطرات کے سائے تعاقب کرتے تھے۔ خانہ بدوشی اور دربدری تھی۔ زندگی ایک مسلسل فرار تھی یا تعاقب تھی۔ شاید وہ اس دنیا میں لوٹ کر آنا ہی نہ چاہے۔ پھر تم کو اسے یقین دلانا ہوگا کہ اب تم اسی دنیا میں ہو جس کے خوابوں کی تعبیر تلاش کرتے کرتے

وہ تمھاری دنیا سے اتنی دور چلی گئی۔ تم اسے بتاؤ گے کہ اب دنیا وہی جنّت ہے جسے وہ آباد کرنا چاہتی تھی۔ تمھارے ساتھ مل کر۔ پھر ہم سب اسے واپس لے آئیں گے۔ وہ یقیناً واپس آئے گی۔"

" غالب! تم اب بھی اصل حقیقت کو مجھ سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کر رہے ہو۔" میں نے کہا۔

" اصل حقیقت یہی ہے جو میں نے بتا دی۔" غالب نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔

" مجھے شک ہے کہ رابعہ کی یہ ذہنی کیفیت نفسیاتی مسائل اور صدمات کا نتیجہ نہیں۔" میں نے کہا۔ "کیا اس پر تشدّد ہوا تھا؟ اسے اغوا کر کے لے جانے والوں نے اس سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی ہوگی۔"

" رابعہ سے ان کو کیا معلوم ہو سکتا تھا؟"

" وہی جو انھوں نے مجھ سے معلوم کرنا چاہا تھا۔" میں نے کہا۔ "ان کو ہماری طرف سے یہ اطمینان نہیں تھا کہ ہم ان کے اصل کاروبار کے بارے میں کتنا علم رکھتے ہیں۔ ہم نے ان کو تاثر دیا تھا کہ ہمارے نزدیک وہ ہیروئن کے اسمگلر ہیں اور خود انھوں نے بھی کوشش کی تھی کہ خود کو منشیات کے دھندے میں ملوّث ثابت کر دیں۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ وہ اس سے زیادہ سنگین جرم میں ملوّث تھے۔ وہ اسلحے کی اسمگلنگ کر رہے تھے اور یہ اسلحہ مشرقی بنگال کے غیر ملکی تخریب کاروں اور ان کا ساتھ دینے والے علیحدگی پسندوں تک پہنچا رہے تھے۔ منشیات کا دھندا تو اس کے مقابلے میں بہت معمولی جرم تھا۔ انھوں نے خود اپنے خلاف اپنے جرم کے ثبوت مہیا کیے اور ہمیں موقع دیا کہ ہم یہ ثبوت دیکھ لیں... یہ کوشش ہمیں گمراہ رکھنے کے لیے تھی۔ اگر کوئی لڑکا شراب پیے تو اُسے یہ ڈر ہوتا ہے کہ شرابی کو ماں باپ اور سارے گھر، خاندان اور محلّے میں کتنی مخالفت اور نفرت کا سامنا ہوگا۔ وہ خود اپنے بارے میں مشہور کرائے کہ اس کو جوئے کی عادت ہے تو سب اسے بُرا کہیں گے مگر شرابی کے مقابلے میں جواری پھر بھی قابلِ قبول ہوتا ہے۔ انھوں نے مجھے اسی لیے اغوا کیا تھا کہ مجھ سے حقیقت جان سکیں۔ انھیں اطمینان ہو جائے کہ ہم جو کچھ جانتے ہیں وہی ہے جس کا ہم اظہار کرتے رہتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے بہت سائنٹیفک طریقے پر کام کیا۔ انھوں نے مجھ پر جسمانی تشدّد نہیں کیا۔ میرے ذہن کو معطل کیا۔ ایسی دوائیں دینے کی کوشش کی جن سے میرا ذہن میرے اختیار میں نہ رہے۔ اور اگر مجھے شبہ نہ ہوتا تو وہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہو جاتے لیکن میں بچ گیا۔ یہ میں بعد میں بتاؤں گا کہ کیسے۔ میں پوچھنا یہ چاہتا ہوں کہ کیا یہی رابعہ کے ساتھ کیا گیا تھا؟ اور کیا اس کے ذہن پر انہی دواؤں کا اثر ہے؟"

" تمھارا اندازہ درست ہے۔" غالب نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد یہ اعترافِ جرم کرتے ہوئے کہا۔ "رابعہ پر بھی ذہنی تشدّد ہوا تھا۔"

" اس کا ایک نتیجہ تو یہ نکلا کہ وہ دماغی توازن کھو بیٹھی۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "لیکن کیا اس نے قبول دیا کہ ہم حقیقت کو جانتے ہیں؟"

" یہ وہ خود تو بتا نہیں سکتی۔ نازو کے کہنے کے مطابق اس نے بھرپور مزاحمت کی۔" مرزا غالب نے کہا۔ "اور ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ اس کے دماغ پر منفی اثرات اسی مزاحمت کا نتیجہ ہیں۔ جس طرح جسمانی تشدّد کے خلاف قوتِ برداشت کا مظاہرہ کرنے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جسم ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے اور ناکارہ ہو جاتا ہے ایسے ہی ذہن پر ہونے والے تشدّد کو برداشت کرنے سے ذہنی معذوری اور شکست و ریخت ہوتی ہے۔ علاج سے جسم بھی ٹھیک ہو جاتا ہے۔ علاج سے اس کا ذہن بھی نارمل ہو جائے گا۔ یہ کہنا غلط ہے کہ وہ دماغی توازن کھو بیٹھی ہے۔"

" اس وقت میں اتنی دیر رکنے کے لیے نہیں آیا تھا۔" میں نے کہا۔ "میں اپنے ساتھ ایک خطرہ لیے پھر رہا ہوں۔ مجھے آج رات ایک کام ختم کرنا ہے جو کل نہیں ہو سکتا۔"

" اس کا مطلب ہے تم واپس جاؤ گے؟" مرزا غالب نے کہا۔

" ہاں۔ مجھے مدد کی ضرورت تھی۔ تم تینوں میں سے کوئی میرے ساتھ رہتا تو اچھا تھا۔" میں نے کہا۔ "لیکن محسن ہے نہیں اور نیک محمد بھی غائب ہے۔"

" میں تمھارے ساتھ چلتا ہوں۔" مرزا غالب نے کہا۔

" اور بعد میں نیک محمد آئے گا تو پریشان ہوگا۔" میں نے کہا۔ "کل محسن بھی آجائے گا۔"

" میں ان کے لیے پیغام چھوڑ جاتا ہوں۔" وہ بولا۔

" یہ ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "اسے چند سطروں میں بتا دو کہ فکر نہ کرے۔ میں خیریت سے واپس آگیا ہوں اور ضروری سمجھے تو یہ اطلاع رابعہ یا نازو کو بھی دے دے۔ محسن کو بتا دے کہ ہم [illegible] سے آگے موضع کریاں والی میں ہوں گے۔ اوّل تو ہم صبح تک لوٹ ہی آئیں گے لیکن کسی وجہ سے نہ آسکے تو محسن اور نیک محمد کے علم میں ہوگا کہ ہم کہاں گئے تھے۔"

غالب نے یہی بات کاغذ کے ایک پُرزے پر لکھی اور پیغام کو ایک نمایاں جگہ پر رکھ دیا۔ میں نے غالب کو اپنے ساتھ دو ریوالور رکھنے کو کہا اور اپنے لیے بھی ایک اور ریوالور اٹھا لیا۔ مسروقہ، ضبط شدہ اور مالِ غنیمت کی صورت میں ہمارے پاس اتنا اسلحہ جمع ہو گیا تھا کہ ہم جہاں جاتے تھے ایک اسلحہ خانہ لیے پھرتے تھے۔ ویسے تو ہمارے پاس دشمن سے چھینی ہوئی گن بھی تھی لیکن اس کے راؤنڈ ختم ہو جانے کے بعد وہ ہمارے لیے بے مصرف ہو گئی تھی۔ اس ملک میں ایک معمولی ریوالور بھی پرمٹ اور لائسنس کے بغیر نہیں ملتا تھا اور لائسنس حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا۔ ایسی صورت میں ہمارے لیے مقابلے کی یہی ایک صورت رہ جاتی تھی کہ ہم دشمنوں سے ہی ان کا اسلحہ چھین کر جمع کرتے جائیں اور ناجائز ذرائع سے حاصل ہونے والا اسلحہ رکھیں۔ ابھی تک اسلحے کی ضرورت پوری کرنے میں سب سے زیادہ مددگار چوہدری دلاور کے شکاری ہوئے تھے جو ہمارا شکار بنے تھے۔ ہمارے ہاتھوں مارے گئے تھے یا بھاگنے پر مجبور ہوئے تھے تو اپنا اسلحہ چھوڑ گئے تھے۔

غالب نے دروازے کو مقفل نہیں کیا۔ دونوں پٹ ملا کے چھوڑ دیا۔ جب میں چلنے لگا تو مجھے زہر کی وہ شیشی یاد آئی جو میری جیب میں پڑی تھی۔ میں نے واپس اندر جا کے اسے ایک محفوظ مقام پر چھپا دیا جہاں اس پر کسی کی نظر نہیں پڑ سکتی تھی۔ پھر میں غالب کے ساتھ گلی کے موڑ تک پہنچا۔ میرا خیال تھا کہ میں رابعہ اور نازو، محسن، نیک محمد اور غالب سب کو اپنی اچانک آمد سے حیران کر دوں گا اور ان کی خوشی سے بھرپور گالیاں سن کے اور ان کے مسرت سے لبریز آنسو پونچھ کے لوٹ جاؤں گا۔ اسے کہتے ہیں: اے بسا آرزو کہ خاک شدہ، مجھے ویرانے میں تنہا بھٹکنے والی روح کی طرح غالب ملا تھا۔ باقی سب غیر حاضر تھے۔ حوصلہ شکن ملی تھیں۔ پانچ دس منٹ کے بجائے مجھے آدھا گھنٹا لگ گیا تھا اور اب میں ڈر رہا تھا کہ اتنی دیر میں ایک حقیقی اور دو زندہ لاشوں کے وجود کا راز فاش نہ ہو گیا ہو۔

وہ مختصر سا مجمع میں نے دُور سے ہی دیکھ لیا جو شیورلیٹ کے آس پاس حیرت اور خوف کے ملے جلے جذبات کے ساتھ حلقہ بنائے کھڑا ہوا تھا۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ یہ سب باتیں میں فرصت پر اٹھا رکھتا تو اس نئی آفت سے بچ جاتا لیکن باتوں باتوں میں آدھا گھنٹا گزر گیا اور اتنی دیر میں کسی نے گاڑی میں پڑی ہوئی لاش کو دیکھ لیا۔ معلوم نہیں اب کیا ہونے والا تھا۔

" مرزا غالب!" میں نے کہا۔ "اس گاڑی میں ایک عورت کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ ایک ہندو عورت کومل کی لاش۔"

" لاش... اور وہ بھی ایک عورت کی... عورت بھی ہندو!" مرزا غالب نے سر پکڑ لیا۔ "سبحان اللہ... کیا بات ہے جناب کی۔ اپنے لیے مصیبت بھی تلاش کرتے ہیں تو ایسی کہ "ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے۔""

" شاعری مت کرو، کام کرو۔" میں نے کہا۔ "اس مصیبت سے چھٹکارا پانا بے حد ضروری ہے۔ دیر کی تو مصیبت تین گنا ہو جائے گی۔ دو بہت خطرناک قسم کے بندے ڈکی میں بھی بندھے پڑے ہیں۔ اب ہم قریب جا کے صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہیں۔

یہ لوگ گاڑی والے کی واپسی کا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

" ممکن ہے کسی کو بھیج چکے ہوں کہ پولیس کو بلا لائے۔" مرزا غالب نے کہا۔

" ہاں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "ہر صورت میں تم قریب جا کے لوگوں سے بات کرو۔ عام تماشائی کی طرح پوچھو کہ بات کیا ہے۔ پھر جاؤ اور کسی باوردی پولیس مین کو پکڑ لاؤ۔ اُسے دو چار سو کی جگہ ہزار بھی دینے پڑیں تو کوئی بات نہیں۔ کسی صورت اسے یہاں تک لے آؤ۔ اور اس سے کہو کہ مجمع کو منتشر کر دے۔ ڈانٹ ڈپٹ کر کے بھگا دے۔ تمھارا پریس کارڈ کام آسکتا ہے۔"

" کوئی پولیس والا اگر مل بھی گیا تو کیا وہ خود لاش کو نہیں دیکھے گا؟" غالب نے کہا۔

" ایک پولیس والا ایک آدمی ہوتا ہے۔ اُس سے نمٹا جا سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اتنے بڑے مجمع سے میں اکیلا نہیں نمٹ سکتا۔"

" چلو میاں سکندر... تمھاری دوستی میں جو بھی ہو جائے کم ہے۔" مرزا غالب نے آہ بھری۔ "تم تو پوری کوشش کر رہے ہو کہ اپنے ساتھ ہمیں بھی فوت کر دو مگر نہ جانے کیوں تقدیر ہمیں بچا رہی ہے۔"

گاڑی کے آس پاس دس بارہ آدمی جمع تھے۔ ان میں سے کچھ دہشت زدہ سے کھڑے تھے اور کچھ گاڑی کے شیشوں سے ناک لگائے اور اندر تاریکی میں پڑی ہوئی لاش کو دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اگر یہ شارعِ عام ہوتی تو اتنی دیر میں دس بارہ نہیں سو ڈیڑھ سو افراد کا ہجوم ہوتا۔ میں نے اور غالب نے انجان بن کے اپنے تجسّس کا اظہار کیا۔

" کیا ہوا ہے جی؟" میں نے ایک بابو ٹائپ شخص سے کہا۔

" گاڑی میں لاش پڑی ہے۔" اس نے بے حد پُراسرار انداز میں سرگوشی کی۔

" اچھا! کس کی لاش؟" میں نے بھی آہستہ سے کہا۔

" عورت کی۔" بابو نے کہا۔ "دیکھو... دیکھو تم بھی..."

" گاڑی کس کی ہے؟" میں نے اسی رازدارانہ انداز میں پوچھا اور لاش کو دیکھنے سے گریز کیا۔

" معلوم نہیں... یہاں چھوڑ کر بھاگ گیا ہے کوئی۔" بابو نے بتایا۔

" تمھارا مطلب ہے گاڑی یہاں رہنے والے کسی شخص کی نہیں ہے۔" میں نے تعجب سے کہا۔

بابو نے نفی میں سر ہلایا۔ "اتنی بڑی گاڑی ہو سکتی ہے یہاں کسی کے پاس۔ یہاں تو کسی کے پاس سائیکل بھی ہو تو وہ اسے گاڑی کہتا ہے۔"

" ابھی آجاتی ہے جی پولیس۔" کسی نے بہ آوازِ بلند کہا اور میں

نے اس لاؤڈ اسپیکر کو دیکھا۔ وہ کوئی پہلوان لگتا تھا۔

"کیا کوئی گیا ہے پولیس کو بلانے کے لیے؟" مرزا غالب نے معصومیت سے کہا۔

"ہاں۔ بھیجا تو تھا ایک بندہ۔" پہلوان بولا۔ "اب وہ گھر جا کے بیٹھ گیا ہو تو پتا نہیں... سب ڈرتے ہیں۔"

"لاحول ولا قوۃ... ڈرنے کی کیا بات ہے۔" مرزا غالب نے کہا۔ "میں لاتا ہوں ابھی پولیس کو... مگر آپ لوگ ایسا کریں کہ یہاں مجمع بالکل اکٹھا نہ ہونے دیں... آپ پہلوان جی... اور آپ مولانا صاحب... خان صاحب آپ بھی... آپ تینوں سب کو چلتا کریں اور کسی کو مت رُکنے دیں۔"

"چنگا جی..." پہلوان نے فوراً یہ ذمے داری قبول کرلی۔ "آپ ذرا فٹافٹ پولیس کو لے آؤ... اور ہاں... چلو باقی سب اِدھر سے چلتے پھرتے نظر آؤ... کوئی دنگل نہیں ہو رہا ہے یہاں۔"

"ہاں بھئی توبہ استغفار کرو۔" مولانا نے کہا۔ "اپنے گھر جاؤ اور موت کو تماشا مت سمجھو... خود ہمیں بھی مرنا ہے ایک دن۔"

"واہ اوئے صوفی... بات ایسے کرتا ہے جیسے خود کو نہیں مرنا۔" ایک نوجوان نے جاتے جاتے فقرہ کسا۔ "خود بھی تو گھر جا۔"

"چل اوئے سُور دے پُتّر... گھسن مار کے دند کڈ دیاں گا..." پہلوان نے غرا کے نوجوان کی بات کا جواب دیا۔ لوگ فوراً کھسکنے لگے۔ تیسرا شخص میں تھا جس کو غالب نے خان صاحب کہہ کے مخاطب کیا تھا۔ میں نے بھی حسبِ توفیق اس ڈانٹ ڈپٹ میں حصہ لیا اور بالآخر وہاں ہم تین رہ گئے۔ اس کے بعد ہم نے کسی کو بھی وہاں نہیں رُکنے دیا۔

غالب دس منٹ بعد ایک وردی والے ٹریفک کانسٹیبل کے ہمراہ نمودار ہوا۔ بے شک یہ ٹریفک کا مسئلہ نہیں تھا مگر کانسٹیبل تو کانسٹیبل ہی ہوتا ہے۔ اس نے قانون کے محافظ کی حیثیت سے فوراً جائے واردات کا معائنہ کیا۔

"تھانے کون چلے گا؟" کانسٹیبل نے پہلوان اور مولانا کی طرف نظر ڈالی۔

"میں تو مسجد جا رہا تھا۔ عشاء کا وقت ہو گیا ہے۔" مولانا نے کہا۔ "مجھے تو آپ معاف ہی رکھیے۔"

"تم چلو گے خان صاحب؟" غالب نے پھر مجھے مخاطب کیا۔

"کیوں نہیں جی... مجھے تو جانا ہی پڑے گا۔" میں نے کہا۔

"چلو ایہہ چنگا ہویا، میں وی جانا سی۔" پہلوان نے اطمینان کا سانس لیا۔ "کل دنگل اے... کالو پہلوان توں ملنا سی۔"

جب میں نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر چابی لگائی تو کانسٹیبل حیران ہوا۔ "یہ گاڑی تمہاری ہے... تم نے پہلے نہیں بتایا؟" وہ مجھے ڈانٹ کر بولا۔ ہم تینوں آگے بیٹھ گئے۔ کانسٹیبل دوسری طرف آ کر میں رہا۔

"تم نے پوچھا ہی کب تھا۔" میں نے کہا۔ "اور ابھی تو کہا ہے نے کہ مجھے جانا ہی پڑے گا... گاڑی میری نہ ہوتی تو میں جاتا؟"

"پھر تو میاں جی پھانسی ہوگئی تمھیں... بیوی کو قتل کر کے کہاں پھینکنے جا رہے تھے؟" کانسٹیبل نے ماہر سراغ رساں کی طرح اپنے مفروضات پر کیس بنانا شروع کیا۔ "کس سے لگائی تھی یاری؟"

"میں اپنا بیان تھانے جا کر دوں گا۔" میں نے گاڑی چلاتے ہوئے کہا۔ "راستے میں بک بک کرو گے تو ایک جھانپڑ دوں گا۔"

ٹریفک کانسٹیبل کا میری گستاخی پر غصے سے برا حال ہو گیا...

"جھانپڑ دے گا... مجھے... تیری تو..."

"ہاں تمھیں۔" مرزا غالب نے کہا۔ "دوسرا اور تیسرا جھانپڑ میں رسید کروں گا۔" اس وقت تک گاڑی بہت دور آ چکی تھی اور ایک سنسان سڑک پر ساٹھ ستر میل فی گھنٹا کی رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ کانسٹیبل کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔

"چھوڑو یار! اسے بھی ٹھنڈا کرو... بہت گرمی دکھا رہا ہے۔" میں نے غالب سے کہا۔

"تم... تم دونوں ساتھی ہو...؟" کانسٹیبل کا رنگ اُڑ گیا۔ "قتل تم دونوں نے کیا تھا؟"

"ہاں۔ ہم یہ کام مل کر کرتے ہیں۔" مرزا غالب نے کہا۔ "جتنے قتل کیے ہیں اتفاقِ رائے سے کیے ہیں۔ ویسے تم رہتے کہاں ہو؟"

"کیوں... میرے گھر سے کیا لینا ہے تم کو۔" کانسٹیبل اب سچ مچ پریشان ہونے لگا تھا۔

"ہم تمھاری سہولت کے لیے پوچھ رہے تھے۔" مرزا غالب نے کہا۔ "تمھارے دروازے پر ہی ڈال دیتے تمھیں۔"

"ورنہ لواحقین پریشان ہوتے پھریں گے مردہ خانوں، پاگل خانوں اور جیل خانوں میں۔" میں نے کہا۔

"دیکھو یار، میں نے تمھارا کچھ نہیں بگاڑا ہے... مجھے جانے دو۔" کانسٹیبل کی حالت غیر ہو گئی۔

"اچھا... تم کو ہم یہاں گرا دیتے ہیں۔ میرا مطلب ہے ڈراپ کر دیتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "شرط یہ ہے کہ تم پلٹ کر نہیں دیکھو گے۔ چالیس قدم ناک کی سیدھ میں سفر کرو گے۔ ذرا بھی گردن گھمائی تو خودکشی کہلائے گی۔"

"توبہ... میرے باپ کی بھی توبہ جو میں مڑ کے دیکھوں... اب مجھے جانے دو۔" وہ منت سماجت کرنے لگا۔ میں نے ذرا سی دیر کے لیے گاڑی روکی اور اُسے اتر جانے کا موقع دیا۔ اُس نے ہمیں ایک مشترک گالی دی اور سرپٹ بھاگا۔

"اُس کو واپس وہاں پہنچنے کے لیے پانچ چھ میل چلنا پڑے گا، جہاں یہ ڈیوٹی پر تھا۔" مرزا غالب نے ہنس کر کہا۔

"کیا یہ ہمیں پھر تلاش نہیں کرے گا؟" میں نے کہا۔ "جہاں گاڑی کھڑی ہوئی تھی وہاں تک تو پہنچ ہی جائے گا۔"

"وہاں کیا معلوم ہوگا... میں مانتا نہیں۔" غالب نے کہا۔ "تم کئی دن سے غائب تھے۔ لوگوں کے لیے ہم بھی اجنبی تھے۔ اتنی بڑی گاڑی کے مالک کا پتا اسے کون بتائے گا۔ مگر اب آپ یہ فرمائیں کہ اِس بُت کافر نے آپ پر اپنی جان کیوں فدا کی؟"

میں نے اُسے کم سے کم الفاظ میں وہ سب بتا دیا جو میرے اغوا ہو جانے کے بعد سے میری واپسی تک ہوا تھا۔

"اس لاش سے تو کچھ معلوم ہو نہیں سکتا۔" مرزا غالب نے ساری روداد سُن کر کہا۔ "اسے کیوں لیے پھر رہے ہو؟"

"کبھی نہ کبھی آدمی کو حماقت بھی کرنی پڑتی ہے۔" میں نے کہا۔ "اب تم جہاں کہو اس کا کریا کرم کر دیتے ہیں۔"

"اس میں سوچنے کی کونسی بات ہے۔" غالب نے کہا۔ "اسے پھر وہیں چھوڑ دیں گے جہاں سے اٹھایا تھا۔ ہم واپس جا رہے ہیں نا؟"

"ہاں! ابھی تو سادھو رام کے گھر ہی جانا ہے۔" میں نے کہا۔ "ہمارے قبضے میں دشمن کے بہت اہم آدمی ہیں۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔" غالب نے کہا۔ "لیکن سیلوک سے یا دلربا سے ایک رات میں کچھ معلوم کرنا مشکل ہوگا۔ یہ عام لوگ نہیں ہیں کہ فوراً سب کچھ بتا دیں۔ ان کی تربیت ایسی ہوتی ہے کہ ان کا مزاج اور ان کی فطرت سب بدل جاتے ہیں۔ عموماً یہ لوگ جان دے دیتے ہیں مگر بتاتے کچھ نہیں۔ بہت سخت جان لوگ ہوتے ہیں۔"

"ہوتے تو گوشت پوست کے انسان ہی ہیں۔" میں نے کہا۔ "جسم کے عذاب جھیلنے کی حد بالآخر آ جاتی ہے۔"

"بالکل آ جاتی ہے۔ لیکن ہمارے پاس تو آج کی پوری رات بھی نہیں ہے۔" غالب نے کہا۔ "اور یہ رات بھی ہم تفتیش کرتے نہیں گزار سکتے۔ میرا خیال ہے کہ صرف سادھو رام کو آئندہ استعمال کے لیے رکھ لیتے ہیں۔ تمام ضروری معلومات اسی سے حاصل ہو جائیں گی۔ باقی سب کی کسی کو ضرورت نہیں۔ نہ ہمیں، نہ ہمارے دشمنوں کو۔ انھیں ہم نے چھوڑ دیا تب بھی وہ مار دیں گے اور ہمارے مقابلے میں زیادہ عذاب دے کر ماریں گے۔"

غالب کی بات بہت معقول تھی۔ ہمیں پہلے وہ کام کرنا تھا جو ضروری تھا اور جسے صبح ہونے سے پہلے ختم کرنا تھا۔ سادھو رام کے ذہن سے مفید معلومات برآمد کرنے کا عملِ جراحی اس وقت تک جاری رہ سکتا تھا جب تک ہمیں یقین نہ آجائے کہ اب اس غدار ضمیر فروش کی کھوپڑی خالی ہو چکی ہے۔ میں نے گاڑی کو کچے راستے پر اتارا اور دس منٹ میں ہم پھر سادھو رام کی حویلی میں تھے۔ میں نے جنریٹر چلایا، دروازے کھولے اور بیڈ روم کی لائٹ جلائی۔ غالب نے میری مدد کی اور ہم کومل کی لاش کو واپس اٹھا کر اس کے بیڈ روم میں لے گئے۔ ہم نے اسے یوں لٹا دیا کہ وہ فطری انداز میں سوتی ہوئی دکھائی دے۔

"بس اب جتنا مالِ غنیمت مل سکتا ہے، وہ سمیٹو اور چلو۔" میں نے کہا۔ "ہے تو یہ ہمارے ہی دشمنوں کا مال۔"

"تو مالِ غنیمت جمع کر، میں دیکھتا ہوں کاغذات اور دستاویزات۔" غالب نے کہا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "ایسے کام کرنے والے کوئی ثبوت گھر میں نہیں رکھتے جو کسی کے ہاتھ لگ جائیں تو مصیبت بن جائے۔"

"منطقی طور پر یہ بات تسلیم کی جا سکتی ہے۔" غالب نے کہا۔ "پھر بھی تلاش کرنے میں کیا ہرج ہے۔"

میں نے گھر کے اندر مختلف خانوں اور الماریوں کی درازوں سے چالیس ہزار روپے کی پاکستانی کرنسی برآمد کی۔ تقریباً اس سے دگنی مالیت کی انڈین کرنسی ایک سوٹ کیس میں بند تھی۔ معلوم نہیں سادھو رام نے اُسے کس مقصد کے لیے جمع کیا تھا۔ غالباً آڑے وقت کے لیے جب اسے اچانک بھاگنا پڑے تو وہ ایک سوٹ کیس لے کر سرحد پار کر جائے۔ مصیبت کے وقت سب سے بڑا دوست اور سب سے زیادہ قابلِ اعتماد سہارا پیسے کا ہی ہوتا ہے جو سارے مسائل حل کر دیتا ہے اور تمام مشکلات سے نجات دلا دیتا ہے۔ سادھو رام جیسے لوگ بے یقینی کے خوف کے سائے میں جیتے ہیں۔ انھیں ایک طرف اپنے خزانوں کے بھرے جانے سے خوشی ملتی رہتی ہے تو دوسری طرف یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ تقدیر نامہرباں ہو گئی تو ایک چھوٹی سی غلطی بہت بڑی سزا بن جائے گی۔ پھر پناہ کون دے گا۔ جن کی تھالی میں کھایا اور پھر انہی کی تھالی میں چھید کیا، وہ تو برا حشر کریں گے، جن کے لیے یہ سب کیا تھا، وہ بھی اس چھوٹی سی غلطی کو ناقابلِ معافی جرم بنا دیں گے۔ پیسہ ہوگا تو کسی گوشۂ گمنامی میں چھپ چھپا کے بھی زندگی گزارنے کی گنجائش رہتی ہے۔ میں نے اس سوٹ کیس کو بھی باہر لے جا کر ڈِکی میں ڈالا۔

سادھو رام بدستور بے ہوش تھا لیکن سیلوک ہوش میں آ چکا تھا اور آنکھیں کھولے پڑا تھا۔ میں نے اسے کھینچ کر باہر گرا دیا اور پھر اپنے پیروں پر کھڑا کیا لیکن وہ دوبارہ گر گیا۔ میں اس کو گھسیٹ کر اندر لے گیا اور اس کے منہ میں سے کپڑا نکال کر اسے ڈرائنگ روم کے قالین پر ڈال دیا۔ وہ لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ اس کے ہاتھ ابھی تک کمر کے پیچھے بندھے ہوئے تھے۔

"تمھارا اصل نام کیا ہے سیوک؟" میں نے کہا اور ریوالور لے کر اس کے سامنے یوں بیٹھ گیا کہ وہ سائلنسر کو بھی دیکھ لے۔

"اصلی نقلی نام سے تم کو کیا لینا ہے؟" وہ بولا۔

"ویسے تو تم سادھورام کے ملازم تھے۔" میں نے کہا۔ "لیکن درحقیقت سادھورام تمھارا ملازم تھا۔ کیا تمھارا تعلق بھی آرمی سیکرٹ سروس سے ہے۔ کرنل جگن ناتھ کی طرح۔ یا تم کمانڈوز میں سے ہو؟"

"معلوم نہیں تم یہ فضول سوالات کیوں کر رہے ہو؟" وہ حقارت سے بولا۔ "تم مجھ سے یہ توقع کیوں رکھتے ہو کہ میں تمھیں سوالات کے درست جواب بھی دوں گا۔ فرض کرو میں کہوں ہاں۔ اور یہ بتاؤں کہ میرا نام کیپٹن ٹام، میجر ڈک یا کرنل ہیری ہے۔"

"ٹام ڈک اینڈ ہیری۔ ایرا غیرا نتھو خیرا۔" میں نے کہا۔ "واقعی نام میں کیا رکھا ہے لیکن تمھارے جواب سے مجھے تمھارے تعلیم یافتہ ہونے کا پتا چل گیا ہے۔ تمھارے کام کی نوعیت کے پیشِ نظر میں فرض کر لیتا ہوں کہ تم خصوصی مقاصد کے لیے منتخب کیے جانے والے خاص آدمی ہو۔ ایسے خطرناک مشن کی نگرانی معمولی لوگ نہیں کر سکتے۔ یہ بات دلربا کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ وہ واقعی بہت غیر معمولی عورت ہے۔ میں نے اس کو اصل روپ میں دیکھا ہے اس لیے میں ایسا کہہ رہا ہوں۔ وہ حُسن و شباب کے اسلحے کو بے دریغ استعمال کرنا جانتی ہے مگر اس سے زیادہ خطرناک وہ ذہانت ہے جس سے کام لے کر وہ دلربا سے کرماں والی بن گئی۔ اس نے اپنی جگہ بنانے کے لیے سائیں پاپڑ والے کو غائب کر دیا۔ یہ اس کرماں والی کی کرامت تھی یا اُسے وہاں پہنچانے والوں کی۔ مگر اُس نے بہت ہوشیاری سے گاؤں والوں کے سامنے اپنی قلندری کا سوانگ رچایا۔ اس ڈبل رول میں وہ بہت کامیاب رہی۔ لیکن وہ بات آج بھی سچ ہے کہ سو دن چور کے تو ایک دن کوتوال کا۔ تم نے فرض کر رکھا تھا کہ اس ملک کی انٹیلی جنس سوئی ہوئی ہے جب کہ وہ کھلی آنکھوں سے سب دیکھ رہے تھے۔"

"یہ میرے لیے کوئی حیرت انگیز انکشاف نہیں۔" وہ بولا۔ "جب کوئی اس قسم کے مشن پر دشمن کی سرزمین پر قدم رکھتا ہے تو اسے کوئی خوش فہمی نہیں ہوتی۔ دشمن کو بھلا کون بے وقوف اور کمزور سمجھتا ہے۔ سب ہی جان ہتھیلی پر رکھ کے سرحد پار کرتے ہیں۔ اگر دوسرے ملک کی انٹیلی جنس باخبر ملے تو حیرانی کیسی! جنھیں جان عزیز ہوتی ہے وہ ایسے کام کرتے ہی نہیں۔"

غالب کا خیال ٹھیک تھا۔ سیوک جیسے تربیت یافتہ جاسوس یا کمانڈو سے کچھ بھی نہیں پوچھا جا سکتا تھا۔ اسے موت کی پروا ہی نہیں تھی۔ "پھر بھی صبح تک تم سوچ لو۔" میں نے کہا۔ "تم اپنے تمام ساتھیوں کے پتے ٹھکانے بتانا پسند کرو گے یا زندہ رہنا؟"

"تمھاری پیش کش احمقانہ ہے۔ میں غداری کا مرتکب ہونے سے بہتر یہ سمجھتا ہوں کہ خود کو گولی مار لوں۔" وہ بولا۔

"تمھاری مرضی۔ ہمیں سادھورام سے بھی کچھ نہ کچھ تو معلوم ہو گا۔" میں نے کہا۔

"اس اُلّو کے پٹھے کو تو میرا اصل نام تک معلوم نہیں۔" سیوک ہنسا۔ "وہ زیادہ سے زیادہ یہ بتا سکتا ہے کہ اس نے کتنا اسلحہ کتنی رقم میں بیچا تھا۔ جگن ناتھ... دلربا... یہ سب نام بے مقصد ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ میں نے جس ہیلی کاپٹر کا نمبر وغیرہ نوٹ کیا تھا وہ سب بھی بوگس تھا۔" میں نے کہا۔ "خیر... ہم معلوم کر لیں گے... ہم بہت کچھ معلوم کر چکے ہیں لیکن تمھیں نہیں معلوم۔"

"تمھارا تعلق بھی آرمی انٹیلی جنس سے ہے؟" وہ بولا۔

"بھی؟" میں مسکرایا۔ "گویا تم نے اپنے آرمی انٹیلی جنس سے تعلق کو تسلیم کر لیا ہے۔ بس میرا تعلق بھی اسی سے ہے۔ تمھارے سب ایجنٹ... ان کی سرگرمیاں... ٹھکانے اور عزائم... ان کا ساتھ دینے والے ضمیر فروش، پیسے کے لالچ میں ملک کو بیچنے والے یہ سب سامنے آتے جا رہے ہیں۔"

"یہ سب تم مجھے کیوں بتا رہے ہو؟" وہ بولا۔

"مجھے کوئی کام کی چیز نہیں ملی۔" غالب نے اندر آتے ہوئے کہا۔ "اس سے کچھ معلوم ہوا؟"

"معلوم تو ہو جاتا لیکن وقت نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "میں سادھورام کو لاتا ہوں۔ ہمیں جانا بھی ہے۔"

غالب نے میری جگہ سنبھال لی اور ریوالور لے کر بیٹھ گیا۔

میں دوسری بار باہر گیا اور سادھورام کو اُٹھا لایا۔

"دوبارہ غور کرنے پر میں نے اپنا خیال بدل دیا ہے۔" غالب نے کہا۔ "سادھو مہاراج کو ہمارے ساتھ ہی رہنا چاہیے۔ یہ بہت کارآمد چیز ہے۔ اگر اسے ہم یہاں چھوڑ گئے اور کوئی چھڑا کے لے گیا یا تباہ کر گیا تو نقصان ہمارا ہو گا۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔ چلو اسے ساتھ ہی رکھتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "مگر صبح واپس آئیں گے تو مسئلہ ہو گا۔ یہ گاڑی ہمیں واپس نہیں لاتی ہے۔"

"نکال لیں گے اس کا بھی کوئی راستہ۔" غالب نے کہا۔ "مال کتنا ملا؟"

"چالیس نقد... سونا ہے کافی۔" میں نے کہا۔ "انڈین کرنسی کا ایک سوٹ کیس بھرا ہوا تھا جو میں نے گاڑی میں رکھ دیا ہے۔"

"یار بھوک لگی ہے۔" ہم نے وہاں سے اپنی موجودگی کے سارے نشانات مٹا دیے تھے۔ (جلنے سے) والے تھے کہ غالب نے کہا۔

"ہوں... ہاں... بھوک تو لگی ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن یار ہندو کا گھر ہے۔"

"کھانا تو ہندو نہیں ہوتا۔" مرزا غالب نے دلیل دی۔ "مثلاً بسکٹ پاکستانی ہیں۔ انڈے پاکستانی مرغیوں نے دیے ہیں۔ اور یہاں اس گھر میں تو جو کچھ ہے ہمارا ہی ہے۔ آخر ان گھروں میں ہم جیسے مسلمان ہی رہتے ہیں جو سادھورام کے ہم مذہب چھوڑ گئے تھے۔"

"اچھا تو پھر آ جو ملے۔ اللہ کا نام لے کر کھائیں گے تو پاک ہو گا۔" میں نے کہا۔ "بعد میں نہ جانے کب کچھ ملے۔"

آدھے گھنٹے بعد ہم دوبارہ روانہ ہوئے تو سادھورام اور سیوک دونوں پہلے سے بھی زیادہ سختی کے ساتھ بندھے ہوئے ڈکی میں بند تھے۔ ہم میں سے کسی کو پروا نہیں تھی کہ وہ مر جائیں گے۔ زناتوان کو بہرحال تھا۔ موضع کرماں والی تک کا راستہ رات کے وقت بہت دشوار گزار ثابت ہوا۔ اگر میں اس راستے سے پہلے نہ گزرا ہوتا تو ہم مشکل میں پھنس جاتے۔ ہیڈ لائٹس کو ہم نے آف کر رکھا تھا اور پارکنگ لائٹ کی روشنی جو صرف آگے تھی، راستہ دکھانے کے لیے ناکافی تھی۔ جب مجھے کرماں والی کا ڈیرا نظر آنے لگا تو میں نے گاڑی روک لی۔ رات کے وقت کچے راستے سے کسی کے گزرنے کا امکان نہیں تھا۔ لیکن میں نے گاڑی کو تھوڑی دُور لے جا کر گھنی جھاڑیوں کے پیچھے کھڑا کیا جہاں اُسے کوئی دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔

غالب نے اور میں نے باقی فاصلہ پیدل طے کیا۔ ہم دونوں کے ہاتھ میں سائلنسر والے ریوالور بالکل تیار تھے۔ دُور گاؤں میں کتے بھونک رہے تھے اور آدھی رات کے سناٹے میں جھینگر اور مینڈک ہر طرف بولتے سنائی دیتے تھے۔ ہم دونوں سمجھتے تھے کہ سب سے مشکل اور خطرناک مرحلہ اب درپیش ہے۔ اس میں کامیابی کا انحصار تائیدِ ایزدی پر تھا ورنہ ہم دونوں کیا تھے۔ سیمنٹ کے پلیٹ فارم پر چڑھ کے ہم دبے پاؤں آگے بڑھے۔ غالب کی مسکینی اور صورت پر برسنے والی حماقت آمیز بے چارگی سے کوئی بھی دھوکا کھا سکتا تھا لیکن میں اس کی جرأت رندانہ کا، بے جگری کا اور ہلاکت آفریں جارحانہ انداز کا، اس کے نشانے کے بے خطا ہونے کا مشاہدہ کر چکا تھا اور اس کی مدد پر اتنا ہی بھروسا کر سکتا تھا جتنا اپنی ذات کی صلاحیت پر۔ دروازے کے قریب پہنچ کر میں نے غالب کو پیچھے رہنے کا اشارہ کیا اور دستک دی۔ تیسری دستک پر کسی نے اندر سے پوچھا۔ "کون ہے... نام بتاؤ اپنا؟" آواز کسی مرد کی تھی مگر جگن ناتھ کی نہیں تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اندر اور لوگ بھی تھے۔

"میں ہوں سادھورام۔" میں نے کہا۔ "دلربا سے بڑا ضروری کام ہے۔"

دروازہ پھر بھی نہیں کھلا۔ میں پوری طرح مستعد اور گوش بر آواز کھڑا رہا۔ ایسا لگتا تھا کہ میرے جواب نے انھیں مطمئن نہیں کیا تھا۔

"سادھورام۔ تمھاری آواز کیوں بدلی ہوئی ہے؟" اس مرد نے پوچھا۔

"مجھے گلے..." میں نے کھانس کر کہا۔ "زکام سے گلا خراب ہو رہا ہے۔"

"کیا تمھارے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟"

"ہاں۔ سیوک ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس جرح کا مقصد؟ اتنی رات کو یہاں میرے سوا اور کون آئے گا؟"

سیوک کے حوالے نے اسے مطمئن کر دیا۔ دروازہ تھوڑا سا کھلا اور میں ریوالور ہاتھ میں لے کر اندر داخل ہوتے ہی فرش پر گر گیا۔ پہلی گولی جو یقیناً کسی نے مجھ پر چلائی تھی میرے سر کے اوپر سے گزر گئی۔ میں نے دلربا کے چلانے کی آواز سنی اور اس کے بعد دوسری گولی کی جس کے ساتھ ہی کوئی مرد بڑی دلخراش آواز میں چلایا اور اس کا بھاری بھرکم وجود دھم سے فرش پر گرا۔

"باادب۔ باملاحظہ۔ ہوشیار۔" غالب نے اتنی خطرناک اور غیر یقینی صورتِ حال میں بھی اپنی عادت کے مطابق کہا۔ "کسی نے حرکت ہونے کی کوشش بھی کی تو گولی مار دوں گا۔ الف کی طرح سیدھے کھڑے رہو۔"

میں نے زندہ بچ جانے پر خدا کا شکر ادا کیا اور کھڑا ہو گیا۔ غالب نے دانش مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سب کو مغلوب کر لیا تھا۔ مارا جانے والا شخص وہ تھا جس نے مجھ پر گولی چلائی تھی۔ غالب کو یقین تھا کہ ایسا ہی ہو گا چنانچہ وہ میرے زمین پر گرنے کے بعد اندر آیا۔ اس وقت شاید ایک ہی شخص کا ریوالور اُٹھا ہوا دکھائی دیا تو اس نے مہلت دیے بغیر اسے گولی مار دی۔ غالب کی گولی کا نشانہ بننے والا اب فرش پر تڑپ رہا تھا۔ گولی نے اس کے حلق میں سوراخ کر دیا تھا۔ یہ اتفاق نہیں تھا، غالب کے نشانے کا کمال تھا۔ وہ اگر چاہتا تو اس کی دائیں آنکھ غائب کر سکتا تھا یا بائیں نتھنے سے گولی اندر اتار سکتا تھا۔ خون کا فوارہ گردن کے سوراخ سے اُبل کر جعلی خانقاہ کے فرش کو رنگین کر رہا تھا اور مرنے والے شخص کے حلق سے بڑی بھیانک خرخراہٹ بلند ہو رہی تھی۔

حجرے میں میرے مقابل چند قدم کے فاصلے پر دلربا کھڑی تھی۔ غالباً اسے سوتے سے اُٹھایا گیا تھا چنانچہ وہ جس قسم کے لباسِ شب خوابی میں تھی اس کا تصور موضع کرماں والی کے عقیدت مند کر ہی نہیں سکتے تھے اور خود میرے لیے اس کا نائٹ گاؤن باعثِ حیرت

تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ یہ پیرس نہیں بلکہ پاکستان جیسے غریب اور پسماندہ ملک کا ایک دور افتادہ گاؤں ہے مگر دُہری شخصیت رکھنے والی دلربا سادھو رام، سیوک اور جگن ناتھ کی بھنڈال جو کڑی اپنے مالِ حرام سے عیش کر رہی تھی۔ ان کی نجی زندگی وہی تھی جو اوباش طبع دولت مندوں کی ہو سکتی ہے۔ دلربا کی خوبصورت آنکھوں میں خوف سے زیادہ پریشانی تھی۔ شاید اس خیال سے کہ اس کی پیری فقیری کا پردہ چاک ہو گیا ہے اور اسے ایک ملنگی کے روپ میں دیکھنے والے اس حالت میں دیکھیں گے تو اس کا کیا حشر کریں گے۔ سائیں پا پڑ والے کا ڈھونگ جو کئی سال سے چل رہا تھا، بڑی بے آبروئی کے ساتھ ختم ہو گا۔ ابھی اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ خود اس کے ختم ہونے کا وقت آ گیا ہے اور اس کے وطن دشمن کاروبار کا اور اس کی ساری کمائی کے ختم ہونے کا وقت آ گیا ہے جو اس نے خود کو اور اپنے ضمیر کو بیچ کر اکٹھی کی تھی۔ اس کی میلی ملگجی اور دھندلائی ہوئی نظر آنے والی غلیظ آنکھیں اس وقت سیاہ اور روشن لگتی تھیں اور اجڑے میلے کچیلے بکھرے بالوں کی وگ نہ ہونے کے باعث اصل تراشے ہوئے بالوں کے ریشمی غلاف نے اس کے آدھے چہرے کو ڈھک رکھا تھا۔ دلربا بلاشبہ ایسی عورت تھی کہ اس کی خاطر جوشِ رقابت میں کرنل جگن ناتھ اور سادھو رام ایک دوسرے کی جان بھی لے سکتے تھے۔

دلربا کے علاوہ کمرے میں دو افراد اور بھی تھے۔ یہ سب کرماں والی کے کاروباری ایجنٹ یا اس کے محافظ تھے۔ جو دن کے اجالے میں جعلی خانقاہ کے خادم اور کرماں والی کے خصوصی عقیدت مند نظر آتے ہوں گے۔ وہ سب بھی سوتے سے اٹھے تھے اور عام انسانوں کی طرح شلوار قمیص میں ملبوس تھے۔ غالب کی مستعدی نے ان کو بے بس کر دیا تھا اور ان کے ہاتھ اپنے اسلحے تک نہ پہنچ پائے تھے۔ وہ سب خطرناک قسم کے لوگ تھے جو کرماں والی کے کاروبار میں اس کے قابلِ اعتماد معاون تھے۔

"حضرات و خواتین۔ میرا مطلب ہے خاتون۔" غالب نے کہا۔ "ہتھیار ڈال دیجیے۔ سیدھے ہاتھ سے نہیں، الٹے ہاتھ سے اپنا اپنا ریوالور نکالیے، آہستہ آہستہ۔ پھرتی کا مطلب خودکشی ہو گا۔ ریوالور اپنے قدموں میں پھینک کر سب پیچھے والی دیوار کے ساتھ لگ جاؤ اور اپنے اپنے ہاتھ اوپر کر لو۔"

"ہو سکے تو دونوں پیر بھی اٹھا لو۔" میں نے ریوالور سے اشارہ کیا۔

"کسی غلط فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔" غالب نے اچانک فائر کیا اور ایک موم بتی کو گل کر دیا مگر موم بتی اسی طرح کھڑی رہی۔ "میرا نشانہ آج تک خطا نہیں ہوا۔ نمونے آپ سب کے سامنے ہیں۔ دونوں جانب۔" اس نے مرجانے والے کی طرف اشارہ کیا۔

سب سے پہلے دلربا نے خود کو سنبھالا اور اپنا ریوالور نیچے پھینک دیا۔ ریوالور غالب کے پیروں کے پاس پہنچا۔ دلربا نے بڑی اچھی چال چلی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ شاید غالب جھک کر ریوالور اٹھانے کی حماقت کرے گا اور اسی ایک لمحے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے باقی

دو محافظ کچھ ضرور کریں گے لیکن غالب صرف مسکرایا اور رسید ھا کر اسے صورت سے بے وقوف سمجھنے والے پہلے بھی خود بیسد ترین بستے تھے۔ اس نے تیسری گولی چلائی جو دونوں محافظوں میں سے ایک کے کان کو چھو کر گزر گئی۔ ان دونوں نے ایک دم ریوالور نیچے پھینک دیے اور پیچھے ہٹے۔ دیوار سے چپک کر ہاتھ اٹھانے کے بعد وہ دلربا کو دیکھنے لگے جو ابھی تک وہیں کھڑی تھی۔

دلربا ذہین اور چالاک عورت تھی۔ صورتِ حالات اس کے قابو سے باہر ہو چکی تھی مگر اس نے ہمت نہیں ہاری اور ہمارے مقابلے پر ایک عورت کی طرح اتر آئی۔ اس نے مسکرا کے ایک ہاتھ سے زلفوں کو پیچھے کیا۔ "آخر کون ہو تم؟" وہ اپنی خمیریں مترنم آواز میں بولی۔

"پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے؟" غالب نے میری طرف دیکھ کر افسوس سے سر ہلایا۔

"کیا چاہتے ہو تم؟" دلربا نے ایک انگڑائی لے کر کہا جو یقیناً تو بہ شکن تھی۔

"چاہتے ہیں خوب رُو یوں کو اسد۔" غالب نے پھر شاعرانہ جواب دیا۔ "چاہتوں کے یہ سلسلے بڑے دراز ہیں مس دلربا۔"

"کرنل جگن ناتھ بھی تم کو چاہتا تھا اور سادھو رام بھی۔" میں نے کہا۔ "لیکن تم جانتی ہو کہ وہ تم سے زیادہ دولت کو چاہتے تھے۔ خود تم کیا تھیں؟ اس کا بھی تمھیں علم ہے۔"

"لیکن تمھیں جان کر خوشی ہو گی کہ اب اس کا علم ہمیں بھی ہے۔" غالب نے کہا۔

"موضع کرماں والی کے سادہ دل لوگ سائیں پا پڑ والے کا مرد خاص کرماں والی سے بہت کچھ چاہتے تھے۔" میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ "مثلاً دعا، اولاد کے لیے، بیماری سے شفا کے لیے یا روزگار کے لیے۔ مگر انھیں معلوم نہیں تھا کہ کرماں والی درحقیقت دلربا ہے جو ایک غدار اور بے ضمیر عورت ہے۔ طوائف سے بدتر۔ طوائف تو صرف خود کو بیچتی ہے مگر ماں والی نے تو اس زمین کو بیچنا چاہا تھا جس نے اسے جنم دیا تھا اور جس میں اس کے آباؤ اجداد کی ہڈیاں بھی دفن ہیں۔ انھیں معلوم نہیں تھا کہ سادھو رام اور سیوک جیسے لوگوں کے ساتھ مل کر تم رات کی تاریکی میں کیا کر رہی ہو اور کرنل جگن ناتھ کے ساتھ ذہب سودے میں کتنا فائدہ حاصل کر رہی ہو۔"

"اور تمھیں یہ جان کر خوشی ہو گی کہ اس کا بھی ہمیں علم ہے کہ کل برا مت کرو۔ قسمت کو بھی برا مت کہو کیونکہ جیسی تم ہو ویسی ہی تمھاری قسمت تھی مگر جیسے تمھارے ظاہر سے لوگ دھوکا کھاتے تھے ویسے ہی تم قسمت کے دھوکے میں آ گئیں اور دیکھنے میں تم خوبصورت لگتی ہو شاید تمھیں اپنا مستقبل بھی اتنا ہی خوبصورت ہو گا۔ مگر عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے۔"

"تم بہت دلچسپ باتیں کرتے ہو۔" دلربا مسکرائی۔ میری طرف

مایوس ہو کر اس نے غالب پر اپنا جادو چلانے کی کوشش کی جو ورت سے تو احمق لگتا ہی تھا۔ جسمانی طور پر بھی وجیہہ اور پُرکشش ردانہ شخصیت کا مالک نہیں تھا اور کسی خوبصورت عورت کا اس پر فتنت ہونا مشکل لگتا تھا۔ دلربا یہ مشکل کام کر کے ایک جُوا کھیلنے پر آمادہ تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ ہیرا پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر مگر غالب کی عقل کو کسی عورت کا حسن شکست نہیں دے سکتا۔ میں نے بہت پہلے محسوس کر لیا تھا کہ نازو اس کارٹون ٹائپ جوان کو پسند کرنے لگی ہے مگر اس کے دل میں غالب کے لیے چاہت اور یہ پہلی نظر کے عشق کا نتیجہ نہیں تھا اور فلمی قسم کا جذباتی حادثہ نہیں تھا۔ آہستہ آہستہ اس نے غالب کے اندر چھپے ہوئے مرد کی صلاحیتوں کو تسلیم کیا تھا۔ پھر یہ اعتراف ایک احترام میں ڈھل گیا تھا اور احترام نے رفتہ رفتہ نازو جیسی حسین اور خونخوار لڑکی کے دل کو موم کر دیا تھا۔ غالب ایک ناقابلِ تسخیر قوت کا نام تھا۔ اس کی جاں نثاری، سرفروشی، دوستی، نشانہ بازی، ذہانت اور بے غرضی سب اس کی شخصیت کے ایسے اجزائے ترکیبی تھے جو ایک نظر میں سامنے نہیں آتے تھے۔ اسے جاننے کے بعد وقت کے ساتھ ساتھ اس کی ذات کے سارے اسرار و رموز کھلتے تھے تو پتا چلتا تھا کہ وہ کیا ہے۔

"میں یہاں باتیں کرنے نہیں آیا ہوں۔" غالب نے اچانک تھانیداروں والا لہجہ اختیار کر کے اپنا جملہ ایک انتہائی خوف ناک لہجے پر ختم کیا جو عام حالات میں کوئی مرد کسی عورت کی موجودگی میں نہیں لے سکتا۔ یہ دلربا کے ذہن کو حقیقت سے آشنا کرنے والا دوسرا دور تھا۔ غالب آگے بڑھا اور اس نے دلربا کے سنبھلنے سے پہلے اس کے چہرے پر الٹے ہاتھ کا زبردست تھپڑ رسید کیا۔ دلربا ایک چیخ کے ساتھ گر پڑی۔ غالب نے اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کے اٹھایا اور دیوار کی طرف پھینک دیا۔ وہ پھر چلائی مگر غالب نے اسے زمین پر نہ گرنے دیا۔ "سیدھی کھڑی ہو جا۔" اس نے دوسری گالی دی۔

اچانک میں غالب کی چال سمجھ گیا۔ وہ دلربا کے ساتھ یہ تھانیدارانہ سلوک صرف اس کے محافظوں کو مشتعل کرنے کے لیے کر رہا تھا جو اس کے حقیقی جاں نثار تھے۔ دلربا جیسی عورت اپنے پالتو کتوں کو اپنے پیچھے دُم ہلا کے آنے پر مجبور کر دینے کی پوری صلاحیت رکھتی تھی خواہ کتے کتنے ہی خونخوار کیوں نہ ہوں۔ ایک کتے نے غرا کے جست لگائی اور غالب غوطہ مار کے ایک طرف ہو گیا۔ حملہ آور سیدھا میری طرف آ گیا اور میں نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ محاورے کی بات نہیں ہے۔ جاپانی فنِ حرب جوڈو کراٹے میں آڑے ہاتھوں کے وار بڑے کارگر ہوتے ہیں۔ ایسی خطرناک عورت کے محافظ بھی کم خطرناک نہیں تھے۔ اس کا اندازہ مجھے اسی وقت ہو گیا جب میری سمت بڑھنے والے نے ہوا میں اچھل کر

مجھے فلائنگ کک لگانا چاہی۔ وہ کسی حد تک کامیاب بھی رہا مگر میں لڑکھڑا کے سنبھل گیا اور وہ زمین تک پہنچ کے اٹھنے نہ پایا تھا کہ میں نے اسے جا لیا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ غالب ریوالور لیے بہت ہوشیار کھڑا ہے مگر میرے درمیان میں آ جانے کا نتیجہ یہ ہو سکتا تھا کہ دوسرا کتا اس پر چھلانگ مار دے۔ غالب بلا کا نشانے باز تھا مگر دست بدست جنگ میں وہ یقیناً مار کھا جاتا۔ وہ میری طرح خالی ہاتھوں سے لڑنا نہیں جانتا تھا جب کہ دلربا کے دوسرے محافظ کی جسمانی صحت بہت بہتر تھی اور یہ بھی یقینی بات تھی کہ وہ جوڈو کراٹے پر آ گیا تو غالب کے مرحوم ہونے میں دیر نہ لگے گی۔

میں نے پہلے حملہ آور کو ہاتھ کی کلائی کے قریب سے پکڑ کے جھٹکا دیا اور وہ آگے آیا تو میں نے گھٹنا اوپر اٹھا کے مارا۔ وہ بلبلایا اور اوپر اٹھ کے نیچے آیا۔ اس کا ایک ہاتھ گھوما اور میں فوراً خود کو بچانے کے لیے جھک گیا ورنہ وہ ضرب میری گردن پر پڑ جاتی تو فیصلہ کن اور مہلک ثابت ہوتی۔ میری گردن ٹوٹ جاتی اور مجھے عالمِ فانی سے عالمِ جاودانی تک کا سفر طے کرنے میں ایک منٹ بھی نہ لگتا۔ کراٹے کے ایسے وار صرف جانی دشمنی میں اس وقت استعمال کیے جاتے ہیں جب مقصد ہی حریف کو ختم کرنا ہو اور اس جنگ میں جاپانیوں کے فنِ حرب کے اخلاقی اصولوں کی ویسے بھی گنجائش نہ تھی۔ ایک فوری ردِعمل کے طور پر میں نے وہی جوابی وار کر دیا اور دوسرے لمحے میرا حریف کٹے ہوئے درخت کے تنے کی طرح گر گیا۔ مجھے اپنی جلد بازی پر افسوس ہوا لیکن میرا فعل غیر ارادی تھا۔

"ان کو مزید مہلت مت دو۔" غالب نے کہا۔ "یہ نہ ہو ان کے ساتھی آ جائیں۔ معلوم نہیں اور کتنے ہوں گے۔"

"تم فکر مت کرو۔" میں نے کہا۔ "میں انھیں باندھ کر ڈال آتا ہوں۔" دلربا اور اس کے ایک ساتھی کو اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ کتنے بے بس ہیں۔ میں نے ان کے ہاتھ کمر کے پیچھے باندھے اور انھیں آگے چلنے کا حکم دیا۔

"تہ خانے کا راستہ کدھر ہے؟" میں نے کہا۔

"کون سا تہ خانہ؟" دلربا نے سرکش لہجے میں کہا۔ میں نے اس کے ایک لات رسید کی۔

"ابھی تک یہ گستاخ لہجہ۔" میں نے کہا۔ "یہاں ایک ہی تہ خانہ ہے اور اس کا راستہ ہم خود بھی تلاش کر سکتے ہیں۔"

دلربا بگڑ کے اٹھی۔ "کر سکتے ہو تو کر لو۔" وہ بولی۔ "میں کچھ نہیں بتاؤں گی۔ یہاں کوئی تہ خانہ ہے تو اس میں قدم رکھنے سے پہلے یہ سوچ لینا کہ انجام کیا ہو گا۔ تمھارے پرخچے اڑ جائیں گے۔"

"اس تہ خانے کا دروازہ تمھارے باپ کے گھر کا دروازہ نہیں ہے کہ دستک دو اور کھل جائے۔" دلربا کا محافظ بولا۔

"اگر وہ تمھارے باپ کے گھر کا دروازہ ہوگا تب بھی میں کھلوالوں گا۔" غالب نے کہا۔ ظاہر ہے اس نے دلربا کی دھمکی کا اثر نہیں لیا تھا۔ اگر یہ سچ تھا تب بھی ہم پیچھے ہٹنے والے نہیں تھے اور جھوٹ تھا تو اس کے فریب میں آنے والے نہیں تھے۔

اندر والے ہال جیسے وسیع و عریض کمرے کے وسط میں سائیں پاپڑ والے کی قبر تھی جس پر نہ جانے کتنے ریشمی، سنہرے اور گدیلے غلاف پڑے ہوئے تھے۔ ان کے نیچے اصل قبر چھپ گئی تھی۔ اوپر ایک فانوس روشن تھا جو کسی عقیدت مند یا صاحبِ مراد کا تحفہ نہیں تھا تو پاپڑوں کی کمائی سے بنوایا گیا تھا۔ اس کی روشنی میں کتبہ صاف پڑھا جاتا تھا۔ سائیں پاپڑ والے کے نام سے پہلے بہت سے القاب و آداب تھے اور ایک شعر بھی تھا لیکن کارآمد معلومات صرف اس حد تک تھیں کہ موصوف انیس سو چودہ میں غالباً پہلی جنگِ عظیم کرانے کے لیے دنیا میں وارد ہوئے اور ۱۹۷۱ء میں جہنم رسید ہوئے۔ اس کے فریب میں آجانے والوں نے بہرحال لکھے رحمۃ اللہ علیہ اور شہید وغیرہ لکھا تھا۔ قبر کے گرد چمکتی ہوئی سنہری جالی تھی۔ میں نے اسے چھوکر دیکھا۔

"کیا یہ ٹھوس سونا ہوسکتا ہے؟" میں نے غالب کی طرف دیکھا۔

"سونے کے پاپڑوں سے سونے کا کلچر تو کیا ہی جاسکتا ہے۔" غالب نے کہا۔ "تم کیا سناروں کی طرح پرکھ رہے ہو۔ اپنے مستقبل کی منکوحہ کے لیے نیکلس بنوانے کا خیال آرہا ہے کیا؟"

"ہاں یار۔ ماں باپ تو ہیں نہیں جو بہو کے لیے بنوا لیتے۔" میں نے کہا۔ "مگر خیر۔ میں زیرِ زمین جانے کا راستہ دیکھتا ہوں۔"

چاروں دیواریں سپاٹ تھیں۔ میں نے ایک راؤنڈ میں ہر دیوار کو ریوالور کے دستے سے بجا کے دیکھا کہ کوئی دیوار اندر سے کھوکھلی ہو تو پتا چل جائے مگر میرے کانوں نے صرف ٹھوس دیواروں کی آواز سنی۔ میں نے دلربا کو بڑی حوصلہ شکن مسکراہٹ کے ساتھ گھورتے دیکھا۔ میری ناکامی اسے وقتی خوشی دے رہی تھی۔ اس کا ساتھی شکست خوردہ اور مظلوم صورت بنائے کھڑا تھا اور بظاہر مقابلے کے خیال سے دستبردار ہوچکا تھا مگر ہم اب ظاہر سے دھوکا نہیں کھا سکتے تھے۔ خود غالب بھی ہر بات سمجھتا تھا لیکن دلربا کا واحد جاں نثار غالب کو نہیں سمجھتا تھا۔ اس نے فرض کرلیا کہ غالب اب مطمئن اور بے فکر ہے اور اس کو بے خبری میں اچانک مغلوب کیا جاسکتا ہے۔ وہ ایک دم پلٹا اور اس نے ہاتھ بندھے ہوئے ہونے کے باوجود سر سے ٹکر مار کے غالب کو گرانا چاہا۔ غالب اطمینان سے ایک طرف ہوگیا اور جب وہ گزر گیا تو اس کو پیچھے سے گھما کے لات ماری۔ اس کی رفتار میں خاطر خواہ اضافہ ہوا اور اس کا سر خوف ناک آواز کے ساتھ دیوار سے ٹکرایا۔ اس کی بدقسمتی کہ جہاں اس کا سر لگا وہاں دیوار میں ایک کھونٹا سا لگا ہوا تھا۔ ایسے کھونٹے ہر دیوار کے وسط میں تھے اور معلوم نہیں ان کا مصرف کیا تھا لیکن وہ کھونٹا آخری محافظ کے کاسۂ سر کو توڑتا ہوا مغز میں پیوست ہوگیا۔ وہ بڑا دردناک اور دل گداز منظر تھا۔ وہ شخص نہ کھڑا ہوا تھا نہ بیٹھا ہوا اور نہ لیٹا ہوا۔ وہ ایک کھونٹے سے اٹکا ہوا تھا اور بری طرح تڑپ رہا تھا۔ شدید اذیت کے باعث اس کے حلق سے دلخراش چیخوں کے سوا کچھ نہیں نکل رہا تھا۔ کھونٹے میں پھنسے ہوئے سر کے ساتھ پورے جسم کی حرکت سے اس کی اذیت کا اندازہ کیا جاسکتا تھا۔ وہ کرب میں بلبلا رہا تھا اور ہاتھ پیر چلا رہا تھا مگر جو کھونٹا سر میں سوراخ کرکے گھسا تھا وہ اس حرکت سے اور اندر چلا گیا تھا۔ بے شک اس کے اعمال ہی ایسے تھے کہ اجل نے اس کے لیے ایک عبرت آموز موت کا اہتمام کیا تھا مگر ہم جیسے انسان جو سینوں میں پتھر نہیں، دل رکھتے تھے اپنے دشمن پر بھی رحم کھاسکتے تھے۔ اس کے عذاب کو ختم کرنے کے لیے میں نے ریوالور اٹھا کے نشانہ لیا اور اس کے سر میں بہت قریب سے گولی ماردی۔ وہ ایک بار تڑپا اور ساکت ہوگیا۔

"تم نے دیکھا دلربا! قدرت سزا بھی دیتی ہے تو کس طرح۔" میں نے کہا۔

"تمھاری موت اس سے بھی زیادہ عذاب ناک ہوسکتی ہے۔" غالب نے کہا۔

دلربا بالکل ساکت و صامت کھڑی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی کہ سب کھیل تماشا ختم ہوا۔ نہ سیوک رام کام آیا، نہ کرنل جگن ناتھ اور نہ سائیں پاپڑ والا۔ اس کی دولت، سونے کے پاپڑ وطن کی حرمت کی قیمت، جسم کا معاوضہ۔ وہ عقل اور ہمت جس پر اعتماد کرتے ہوئے اس نے کرماں والی بننا منظور کیا تھا۔ اسلحے کی اسمگلنگ کرنے والوں کے پُرخطر مشن میں شرکت کی تھی۔ سب رائیگاں گئے۔ دولت سے اس نے مستقبل کے خوابوں کے جتنے سنہرے محل کھڑے کیے تھے کھنڈر بن گئے۔ اس کے چاروں طرف لاشیں پڑی تھیں اور وہ اپنے پھیلائے ہوئے جال میں گرفتار ہوچکی تھی۔ اس کے لیے اب جھوٹی امید پر تکیہ کرنا بھی مشکل تھا۔

"تمھیں موقع دیا جاسکتا ہے کہ جان بچا کے جہاں چاہو چلی جاؤ۔" میں نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے کہ تم یہ پیشکش کروگے۔" وہ ایک دم ہنس پڑی۔ "میں بھلا کہاں جاسکتی ہوں؟"

"یہ تو ہے۔ تمھارے دشمن دونوں طرف ہوں گے۔" غالب نے کہا۔ "یہ دوست کسی طرف نہ ملے گا۔"

"مجھے معلوم ہے کہ تم یہ رعایت کی رشوت کیوں دے رہے ہو۔" وہ بولی۔ "تم مجھ سے تہ خانے کا راستہ پوچھنا چاہتے ہو۔"

اس کی حقیقت پسندی نے مجھے اس کی بہادری کا قائل کیا ورنہ عورت اب تک بے ہوش ہوچکی ہوتی۔ "اگر تم اتنی سمجھ دار ہو تو راستہ خود ہی بتا دو۔" میں نے کہا۔

"تم مجھ سے سودا کرسکتے ہو۔" وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی اور میں نے اس کے اندازِ حسن کی غارت گر قوت پوری طرح محسوس کیا۔ اس کام کے لیے وہ موزوں ترین عورت تھی۔ بدقسمتی سے اس کا واسطہ میرے اور غالب جیسے مردوں سے پڑ گیا تھا جن کے سامنے اس کی قوتِ تسخیر بے اثر تھی۔

"سودا؟" میں نے تمسخر اڑانے کے انداز میں کہا۔ "کیا تم اس پوزیشن میں ہو کہ سودا کرسکو؟"

"نہیں۔ مگر رعایت کی پیشکش خود تم نے کی تھی۔" وہ بولی۔

"تم یہ کیوں سمجھنے لگی ہو کہ ہم کبھی راستہ تلاش نہیں کرسکیں گے۔" میں نے کہا۔

"تمھیں دیر لگے گی۔ اور پریشانی ہوگی۔" وہ بولی۔ "پھر تم مجھ پر تشدد کروگے۔ بالآخر مجھے قتل کردوگے لیکن اس میں تمھارا بہت وقت ضائع ہوگا۔ میں تمھارا وقت بچا سکتی ہوں۔"

"کس شرط پر؟" میں نے سوچ کر کہا۔

"تم مجھے آسان موت دوگے۔" وہ بولی۔ "میں مرنے سے نہیں ڈرتی مرنے سے پہلے اپنے لیے رحم کی بھیک بھی نہیں مانگتی۔ میرا معافی مانگنا شرمندگی یا ندامت کا اظہار کرنا، آئندہ کے لیے توبہ کرنا سب غلط ہوگا اور جھوٹ ہوگا۔ جب میں نے اس راستے پر قدم رکھا تھا تو مجھے معلوم تھا کہ میری منزل ایک نہیں ہے۔ یہ راستہ دو منزلوں تک پہنچا سکتا تھا۔ یہ ہوسکتا تھا کہ میں اپنا بے حساب سرمایہ بیرونِ ملک منتقل کرکے کرنل جگن ناتھ اور سادھو رام کے سب ساتھیوں کو ٹھکانے لگا کے کہیں نکل جاتی اور ساری عمر عیش و عشرت کی زندگی گزارتی۔ میرے پاس فرانس یا سوئٹزرلینڈ دونوں جگہ شہریت حاصل کرنا ممکن تھا اور وہاں کوئی ہاتھ مجھ تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ میں یورپ کے کسی صنعتکار، بینکر یا فلم میکر سے بھی شادی کرسکتی تھی۔ لیکن دوسری طرف یہ بھی ممکن تھا کہ جگن ناتھ یا سیوک ہی مجھے ٹھکانے لگانے میں پہل کرجاتے۔ سادھو رام میں اس کی ہمت نہیں تھی۔ ان کی جگہ تم آپہنچے۔ بات تو ایک ہی ہے۔ مجھے سنہرے خوابوں کی منزل نہ ملی۔ آسیبوں کی تعمیر مل گئی۔ یہ ایک جوا تھا اور یہ جوا ہار گئی۔ میں نے جیت کی امید میں جوا نہیں کھیلا تھا۔ جیت میری ہوتی تو میں اسے اپنی کامیابی نہیں، تقدیر کی یاوری سمجھتی۔ چنانچہ مجھے ہارنے کا افسوس نہیں۔"

"تم ایک بہادر اور سمجھ دار عورت ہو۔" میں نے کہا۔ "نادان دوست سے دانا دشمن کی قدر کرنا بہتر ہوتا ہے۔ اگر تم نے وطن کے دشمنوں کے بجائے وطن کے محافظوں کا ساتھ دیا ہوتا تو یہ مٹی تم پر فخر کرتی۔ میں تمھاری شرط منظور کرتا ہوں۔ میں تم کو وہ موت دینے کی کوشش کروں گا جس میں تمھارے لیے عذاب کا احساس ہی نہ ہو۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ ایک گہرا سانس لے کر بولی۔ "قبر سے ساری چادریں اور غلاف ہٹا دو۔ نیچے جانے کا وہی راستہ ہے۔"

میں نے غالب کی طرف اور غالب نے میری طرف حیرانی سے دیکھا۔ گاؤں کے جاہل، کمزور عقیدے رکھنے والے اور ہر چمکتی چیز کو سونا سمجھنے والے سیدھے سادے لوگوں کے درمیان سائیں پاپڑ والا کی خانقاہ کتنا زبردست مکر و فریب کا کارخانہ تھی جس کی حقیقت کو بڑے بڑے عاقل اور افلاطون نہیں سمجھ سکتے تھے۔ کون تصور کرسکتا تھا کہ جس مرقد پر دنیا عجز و انکسار کے ساتھ ہاتھ اٹھا کے دعا مانگنے آتی ہے، وہ مرجعِ خلائق ایک ضمیر فروش ٹولے کے اسلحہ خانے کا راستہ ہے اور پیرِ طریقت کے مزار کا ہر غلاف مکر و فریب کا ایک پردہ ہے۔ کسی کے دھیان میں یہ بات آہی نہیں سکتی تھی کہ قبر کی جگہ ایک خلا ہے جس میں کبھی کسی سائیں پاپڑ والے کو دفن نہیں کیا گیا تھا۔ اس کی لاش تو نہ جانے کہاں پھینک دی گئی تھی۔ کسی دریا میں، کنویں میں یا جنگل میں۔ اسے ہلاک کرنے والے ڈاکو نہیں، دشمن کے ایجنٹ تھے اور ان کا آلۂ کار کرماں والی تھی۔ انھوں نے بڑی ہوشیاری سے ایک ایسا اڈا حاصل کرلیا تھا جہاں ان کا وطن دشمن کاروبار بھی جاری رہ سکے اور انھیں اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے سرمایہ بھی فراہم ہوتا رہے۔ سونے کے پاپڑ ملتے رہیں اور وطن کی یک جہتی کو پارہ پارہ کرنے والوں تک اسلحہ پہنچتا رہے۔

میں نے ایک ایک کرکے سارے غلاف ہٹا دیے اور ان کپڑوں کا ایک ڈھیر لگ گیا جن میں سے عطر کی تیز خوشبو اٹھ رہی تھی۔ یہ خوشبو اتنی کرخت تھی کہ دماغ میں چبھتی تھی۔ اور اعصاب پر اثر انداز ہوتی تھی۔ اندر سالہا سال سے سلگنے والی اگربتیوں کی اور لوبان کی خوشبو کے ساتھ ان عطر میں بسے ہوئے غلافوں کی خوشبو خانقاہ کے اندر ہوا میں بسی ہوئی تھی اور دیواروں سے پھوٹتی محسوس ہوتی تھی۔ اندر قدم رکھنے والوں کے حواس پر یہ خوشبو یکلخت حملہ کرتی ہوگی اور وہ تقدس و احترام کے ماحول میں ذہنی طور پر وہ سب خود کو انتہائی کمزور اور بے بس پاتے ہوں گے۔

آخری غلاف کے ہٹتے ہی پکی بنی ہوئی قبر کا چوکھٹا نمودار ہوا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس قبر میں اوپر کی طرف سنگِ مرمر کا استر نہیں تھا۔ اس کی جگہ ایک دروازہ تھا جسے انگریزی میں "ٹریپ ڈور" کہا جاتا ہے۔ ایک کنڈی کھولتے ہی اس کے دونوں پٹ نیچے

گر گئے اور تین فٹ چوڑا خلا نمودار ہوگیا جس میں جانے والا زینہ دو فٹ نیچے سے شروع ہو جاتا تھا۔ زینہ روشن تھا۔ اس کے آخری حصے کی روشنی اوپر بھی آ رہی تھی۔ میں نے غالب کو اشارہ کیا اور اس نے دلربا کو آگے دھکیلا۔ میں نے غالب سے کہا کہ وہ دلربا کے بندھے ہوئے ہاتھ کھول دے۔ جب وہ نیچے اتر گئی تو اس کے پیچھے میں نے پہلے زینے پر قدم رکھا۔

"یار، کیا میں بھی نیچے تمھارے ساتھ چلوں؟" غالب نے اشتیاق اور تجسّس کو دبا کے کہا۔

"اوپر کا خیال کون رکھے گا؟" میں نے کہا۔ "اگر کوئی اچانک آگیا؟" پھر میں نے اس کا مایوس چہرہ دیکھا۔ "اچھا بھائی۔ آپ بھی آجائیں۔ اللہ مالک ہے اوپر کا۔"

"بے شک اللہ اوپر نیچے سب کا مالک ہے۔" غالب نے سر ہلا کے کہا۔

آخری زینے سے اندر قدم رکھتے ہی میں اور غالب پتھر کے بُت بنے کھڑے رہ گئے۔ وہ ایک بہت بڑا تہ خانہ تھا۔ اس کی لمبائی اور چوڑائی اتنی ہی تھی جتنی اوپر ہیلی پیڈ کے طور پر استعمال ہونے والے پلیٹ فارم کی۔ دائیں جانب دیوار کے ساتھ ساتھ وہی لکڑی کے تابوت نما صندوق رکھے تھے جو ایک ٹرک سے اتارے گئے تھے۔ سامنے ذرا مختلف قسم کے بکس تھے۔ سائز میں کچھ چھوٹے مگر اونچائی میں زیادہ۔ میری اور غالب کی نظر ایک کونے سے دوسرے کونے تک اور تیسرے کونے سے چوتھے کونے تک پہنچی۔ ہر دیوار کے ساتھ صندوق تھے۔ ہر صورت اور سائز کے۔ اس میں شبہے کی کوئی گنجائش نہ تھی کہ ان سب میں اسلحہ بھرا ہوا ہے اور اتنا بڑا اسلحے کا ذخیرہ میں نے کسی فلم میں بھی نہیں دیکھا تھا۔

میں نے تابوت نما صندوق کو پہلے کھولنے کا فیصلہ کیا۔ مجھے اندر ہی ایک ہتھوڑی اور کچھ دوسرے اوزار بھی مل گئے جو عموماً بڑھئی استعمال کرتے ہیں۔ یہاں یہ اوزار صندوقوں کو بند کرنے اور کھولنے کے کام آتے تھے۔ سامان لے جانے والے بھی پہلے ہر بکس کو کھول کر اپنا اطمینان ضرور کرتے ہوں گے کہ اس میں پتھر تو نہیں بھرے ہوئے ہیں۔ پہلے تابوت نما صندوق کو کھولنے میں مشکل سے دس منٹ صرف ہوئے۔ میں نے ایک درز تلاش کی اور اس میں لوہے کی وہ سلاخ پھنسا دی جس کا دوسرا کنارا پیچ کس کے سرے کی طرح چپٹا تھا۔ سلاخ کے دوسرے حصے کو نیچے دبا کر میں نے درز کو چوڑا کیا۔ مضبوطی سے لکڑی میں جڑی ہوئی کیلوں نے احتجاج کیا لیکن اس لیور کی طاقت کے سامنے کیلوں کی ایک نہ چلی۔ ڈھکنا آہستہ سے اوپر اٹھا اور میں نے سلاخ کو آگے بڑھا کے زور لگایا تو ڈھکنا الگ ہوگیا۔ میں نے بکس میں کسی لاش کو نہیں خودکار رائفلوں کو دیکھا جو اوپر تلے پڑی ہوئی تھیں۔ میں نے شمار کیا تو اس ایک تابوت میں بارہ رائفلیں تھیں۔ اس ایک تابوت سے کتنے جیتے جاگتے انسان لاشوں میں تبدیل ہو جائیں گے۔ شاید سیکڑوں، ہزاروں۔ ہر رائفل نہ جانے کس کس کے ہاتھ میں جائے گی۔ جب رائفل کو تھامنے والا ایک ہاتھ بے جان ہوگا تو یہ دوسرے ہاتھ میں چلی جائے گی۔ دوست کے ہاتھ میں یا دشمن کے ہاتھ میں۔ رائفل اور رائفل کی گولی نہ کسی کے دوست ہوتے ہیں، نہ دشمن۔

"کس سوچ میں پڑ گیا ہے بھائی۔ یہ موت و حیات کے فلسفے پر غور کرنے کا نہ مقام ہے نہ وقت۔" غالب نے کہا۔

میں چونک پڑا۔ "ایسے ہی خیال آگیا تھا یار کہ یہ کتنے بے گناہوں کی موت کا سامان ہے۔ کون حساب کر سکتا ہے اس کا؟"

"ہم اس ذخیرے کو تباہ کر دیں گے۔" غالب نے مجھے یقین دلایا۔

"ہاں۔ مگر ایسے اور کتنے ذخیرے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اگر یہ بھی معلوم ہو جاتا۔" "مگر خیر۔ ہر وقت کے لیے ایک کام اور ہر کام کے لیے ایک وقت ہے۔"

میں نے سب بکس نہیں کھولے۔ ہر نمونے کا ایک بکس کھولا اور دیکھ لیا کہ اس میں کیا ہے۔ مختلف سائز اور شکل و صورت کے صندوقوں میں وہ سب کچھ تھا جو موت کہلاتا ہے۔ گولہ بارود، پستول اور ریوالور، گولیاں اور مشین گنوں کے راؤنڈ، دستی بم اور مشین گنیں، بموں کے فیوز، ڈائنا مائیٹ اسٹکس، بارودی سرنگیں۔ ایک بکس میں جو اپنی نوعیت کا ایک ہی تھا، مجھے گھڑیاں سی نظر آئیں۔ یہ ٹائم بم تھے۔ میں آتشیں اسلحے کا ماہر نہیں تھا۔ چنانچہ یہ اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ ہر بم کی تباہ کاری کا دائرہ کس حد تک ہو سکتا ہے۔ مرزا غالب نے صحافت کے پیشے میں بہت پاپڑ بیلے تھے۔ چنانچہ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں محاذ پر بھی خاصے گھومے تھے۔ انھوں نے ارشاد فرمایا کہ بم بہت بڑے تو نہیں ہیں لیکن ہر ٹائم بم سے ایک ریلوے پل یا عمارت تباہ ہو سکتی ہے۔

"کون سی عمارت؟" میں نے اس بیان کو مبہم قرار دیا۔

"عمارت تو یہ بھی ہے اور الفلاح بلڈنگ بھی۔"

"میرا مطلب درمیانے درجے کی عمارت سے تھا۔ مثلاً کوئی دفتر یا ریلوے اسٹیشن۔" غالب نے کہا۔

"کون سا ریلوے اسٹیشن؟" میں نے پھر اس کی بات کاٹ دی۔ "لاہور کا یا ٹھنڈا چوہا؟"

"ٹھنڈا چوہا؟" غالب نے سر کھجا کے کہا۔ "یہ تو عمارت نہ ہوئی۔ جانور اور وہ بھی...."

"یہ ایک اسٹیشن کا نام ہے۔" میں نے شرط لگانے کے انداز میں کہا۔ "پنڈی سے لاہور تک پسنجر ٹرین میں سفر کرو تو ضرور اتفاق ہوگا ٹھنڈا چوہا دیکھنے کا۔ ایکسپریس اور میل ٹرین کوئی ٹھنڈا چوہا..."

"بھاڑ میں گیا ٹھنڈا چوہا اور گرم چوہا۔" غالب نے کہا۔ "نہیں مانتے تو نہ مانو۔ یہ ٹائم بم نہیں خربوزے ہیں۔"

"وہ... یار دراصل... میرا مطلب تمھیں ابوجہل ثابت کرنا نہیں تھا۔" میں نے خفت سے کہا۔ "تم ان کو سیٹ کر سکتے ہو؟"

غالب نے نفی میں سر ہلایا۔ "کوشش کر سکتا ہوں مگر اسے خودکشی کی کوشش بھی کہا جا سکتا ہے اور وہ تم بھی کر سکتے ہو۔"

"پھر مت کرو۔" میں نے کہا۔ "ہم کچھ اور کرتے ہیں۔ کیا تم نے کبھی دستی بم پھینکا ہے؟"

"یار میں صحافی کی حیثیت سے محاذ پر گیا تھا۔ سپاہی کی حیثیت سے نہیں۔" غالب نے بھنّا کر کہا۔

"میں پھینک سکتا ہوں۔" میں نے اعلان کیا۔ "منہ سے پن نکالی۔ پانچ سیکنڈ شمار کیے اور پھینک دیا۔"

"یہ سب تو میں نے بھی فلموں میں دیکھا ہے۔" غالب نے کہا۔ "چھ سیکنڈ ہو گئے تو کیا ہوگا؟"

"پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا۔" میں نے کہا۔ "چنانچہ ہم غیر فوجی طریقہ اختیار کرتے ہیں۔"

میں نے اور غالب نے لکڑی کے صندوقوں کو دیوار سے دور ہٹا کے وسط میں جمانا شروع کیا۔ یہ دشوار اور تھکا دینے والا کام تھا۔ ہماری نظر دلربا پر بھی تھی لیکن وہ عملاً دنیا سے قطع تعلق کر چکی تھی اور فرش پر گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی تھی۔ اسے نہ ہمارے کام سے سروکار تھا، نہ ہماری باتوں سے لیکن میں پھر بھی محتاط تھا کہ وہ اچانک کچھ کر نہ بیٹھے۔ مثلاً کوئی دستی بم اٹھا لے اور منہ سے پن نکال کے آخری قہقہہ لگائے۔ انگریز کہتے ہیں کہ اپنی کامیابی پر ہنسنے والوں کو ہنسنے دو۔ یہ دیکھو کہ آخری ہنسی کس کی ہوتی ہے۔ ہم نے ٹائم بم والے بکس کو اتفاقِ رائے سے الگ رکھا۔ اس کے بارہ ٹائم بم صحیح وقت پر ہمارے لیے بھی کارآمد ہو سکتے تھے۔ فی الحال تو سب کی سوئیاں بارہ بجا رہی تھیں مگر صحیح وقت کا تعین کرنا سیکھا جا سکتا تھا۔ ہم نے سب سے نیچے دستی بم رکھے۔ ان کے اوپر صندوقوں کی گولیاں، ریوالور، پستول اور مشین گنوں کے راؤنڈ والے صندوق سجائے اور سب سے اوپر خالی مشین گنیں۔ خودکار رائفلیں اور ریوالور وغیرہ رکھ دیے۔ سارا بارود سے بھرا ہوا اسباب نیچے تھا اور اس کو دھماکے سے اڑا کے ہی باقی اسباب تباہ کیا جا سکتا تھا۔ ایک ایک رائفل، پستول یا مشین گن کو توڑنا مشکل ہی نہیں، ناممکن تھا۔ یہ سارا کام ایک گھنٹے میں ختم ہوگیا تو میں اوپر گیا۔

سائیں پاپڑ والے کے مرقد پر عقیدت سے چڑھائے جانے والے سارے غلاف اور سب چادریں اسی طرح ڈھیر ہوئے پڑے تھے۔ میں نے انھیں ایک ایک کر کے زینے سے نیچے پھینکا۔ پھر نیچے جا کر میں نے ایک چادر کے کونے کو دوسری چادر سے باندھا اور غلافوں کو پھاڑ کر ساتھ ساتھ رکھتا گیا۔ تہ خانے کے درمیان میں صندوق کے گرد لپیٹ کر میں نے اس کپڑے کی زنجیر کو زینے تک فرش پر بچھا دیا اور زینے پر جاتا ہوا اوپر لے گیا۔ جعلی خانقاہ کے عقبی دروازے تک پہنچنے سے قبل ہی چادریں ختم ہو گئیں۔ دروازہ اب مشکل سے ایک گز دور رہ گیا تھا جو کوئی فکر کی بات نہیں تھی۔ اگلا مرحلہ زیادہ دشوار تھا جس پر ہماری کامیابی کا انحصار تھا۔

میں سادھو رام کی کار تک گیا۔ دروازہ کھول کے میں نے سوئچ آن کیا۔ فیول میٹر کی سوئی آگے بڑھنے لگی۔ میرا دل اس کی حرکت کے ساتھ چلنے لگا۔ شاباش۔ شاباش۔ اور آگے۔ میں نے ریس کورس میں بیٹھے ہوئے تماشائی کی طرح کہا۔ جو اپنے گھوڑے کو سب سے آگے دیکھنا چاہتا ہو۔ بالآخر سوئی ایک جگہ ٹھہر گئی۔

"وہ مارا پاپڑ والے کو۔" میں نے خوشی سے نعرہ لگایا کیونکہ ٹینک تقریباً فل تھا۔ گاؤں میں رہنے والا سادھو رام احتیاطاً اپنی گاڑی کا ٹینک فل رکھنے کا عادی ہوگا۔ اس کی یہ احتیاط پسندی آج میرے حق میں سود مند ثابت ہوئی۔ میں نے ڈکی کھولی جس میں کار کا مالک اور اس کا غلام یعنی سیوک اکٹھے بندھے پڑے تھے۔ وہ زندہ ضرور تھے لیکن ہوش سے بے گانہ تھے۔ اِدھر اُدھر ہاتھ مارنے پر مجھے پلاسٹک کا نرم شفاف پائپ بھی مل گیا۔ میں سائیں پاپڑ والے کے اڈے میں گیا اور اندر سے ایک بالٹی اٹھا لایا۔ پائپ کو میں نے پٹرول ٹینک میں ڈالا اور اس کے دوسرے سرے کو منہ سے لگا کے سانس اندر کی طرف کھینچا۔ پٹرول تیزی سے آیا اور میں نے اس کا ذائقہ منہ میں محسوس کیا۔ پٹرول کی شفاف دھار بالٹی میں گرنے لگی۔ پٹرول ٹینک بہت اوپر تھا اور بالٹی بہت نیچے تھی چنانچہ سائفن سسٹم سے پٹرول بالٹی میں منتقل ہوتا رہا۔ میں نے دوبارہ تھوکا لیکن پٹرول کا تلخ ذائقہ میرے منہ میں باقی رہا اور میرے ہونٹوں پر معمولی سی جلن برقرار رہی۔

بالٹی کے بھرتے ہی میں نے پلاسٹک کی نلکی کو کھینچ لیا۔

میرے اندازے کے مطابق بالٹی میں دو ڈھائی گیلن پٹرول تھا اور اتنا ہی گاڑی میں بھی ہونا چاہیے تھا۔ پٹرول ٹینک کی کیپ کو لاک کر کے میں نے بالٹی اٹھائی اور سائیں پاپڑ والا کی خانقاہ کا نام و نشان مٹانے کی نیت کر کے چل پڑا۔ میں بہت محتاط تھا کہ کسی ٹھوکر سے یہ پٹرول کی بالٹی نہ چھلکے۔ گاڑی میں سے دوبارہ اتنا پٹرول نکالنا مشکل تھا۔ جب میں بالٹی لے کر نیچے پہنچا تو دلربا کسی بات پر غالب کو گالیاں دے رہی تھی اور غالب مسکرا رہا تھا۔

"خیال رکھنا اپنی دلربا کا۔" میں نے کہا "یہ بالٹی نہ الٹ دے۔"

"تم اب کہاں جا رہے ہو؟" وہ بولا "وقت کم ہے۔"

"ہاں — میں ذرا مس دلربا کے ہمسفر کو لے آؤں۔" میں نے کہا "راہِ عدم پر اکیلی کیسے جائے گی بے چاری عورت۔"

دلربا کے اعصاب طویل انتظار کے باعث جواب دے چکے تھے۔ وہ ہسٹریا کا شکار تھی اور اپنے بال نوچ رہی تھی، چلا رہی تھی اور بار بار کہہ رہی تھی کہ مجھے مار دو۔ خدا کے لیے مجھے مار دو۔ میں لوٹ کر باہر گیا تو ڈکی کھلی ہوئی تھی۔ میں نے اس میں سے سیوک کو کھینچ کر باہر نکالا اور ڈکی بند کر دی۔ اب میں اتنا تھک چکا تھا کہ سیوک رام کو اٹھا کے پلیٹ فارم کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میرے پاؤں لڑکھڑا گئے۔ سیوک رام میرے کندھے پر سے نیچے گر گیا۔ میں نے رک کر سانس لیا اور پھر سیوک رام کو گھسیٹنا شروع کیا۔ دروازے کے اندر تک میں اسے آسانی سے کھینچ کر لے گیا۔ اسے اٹھا کے قبر کے گرد بنے ہوئے سنہرے جنگلے سے قبر کے کھلے حصے تک پہنچانا پھر مشکل بن گیا۔ میں نے اسے بوری کی طرح اٹھا کے لڑھکا دیا۔ زینے سے اس کو کندھے پر اٹھا کر لے جانے میں یہ خطرہ تھا کہ میں خود بھی ساتھ ہی لڑھک جاؤں گا۔ چنانچہ میں نے سیوک کو پہلے روانہ کر دیا۔ وہ قلابازیاں کھاتا ہوا نیچے گیا۔ مجھے اس بات کی فکر نہیں تھی کہ وہ زندہ رہتا ہے یا نہیں۔ پھر میں خود اطمینان سے نیچے اترا۔

سیوک رام کو میں نے گولہ بارود کے ڈھیر پر رکھ دیا۔ "کیا غضب کی چتا ملی ہے اسے!" میں نے کہا "لاکھوں روپے کی آتش فشاں چتا۔ سب اسمگل کیے ہوئے اور مقامی اسلحے کی وہ کھیپ ہے جو بڑی مشکل سے یہاں تک پہنچی تھی مگر بڑی آسانی سے سیوک کو پرلوک پہنچا دے گی۔" میں نے کہا "اور ہماری مس دلربا کو جہنم تک پہنچنے میں ایک سیکنڈ بھی نہیں لگے گا۔"

"نہیں۔" دلربا نے خوفزدہ ہو کے چیخ ماری اور دہشت سے کانپنے لگی۔

"میں اپنا وعدہ پورا کر رہا ہوں۔" میں نے کہا "اس سے آسان موت کیا ہو گی۔ ایک دھماکا اور سب ختم۔ کسی زہر کا اثر بھی اتنی جلدی نہیں ہوتا۔ میں تمہیں گولی مار دیتا۔ تب بھی کچھ دیر لگتی تمہاری جان نکلنے میں۔"

"خدا کے لیے۔" دلربا نے چیخ ماری "مجھے چھوڑ دو، مجھے معاف کر دو۔" اس کا حوصلہ آخری وقت میں اس شخص کی طرح جواب دے گیا تھا جسے پھانسی دینے کے لیے تختے کی جانب قدم بڑھانے پر مجبور کیا جا رہا ہو۔ وہ ایک دم اٹھی اور چیختی ہوئی بھاگی۔ غالب کا ہاتھ اٹھا اور پوری قوت سے نیچے آیا۔ سر پر ریوالور کی ضربِ کاری پڑی اور دلربا اٹھتے ہی پھر گری تو بے حس ہو گئی۔ میں نے غالب کی مدد کی اور ہم نے اسے بے ہوشی کے عالم میں سیوک کے ساتھ لٹا دیا۔

ایک مگ کی مدد سے میں نے اس کپڑے پر پٹرول ڈالنا شروع کیا جو نیچے سے اوپر تک پھیلا ہوا تھا۔ کپڑے کی تہ اتنی موٹی تھی کہ پٹرول جذب ہوتا گیا۔ میں آگے بڑھتا گیا اور پٹرول کی بھری ہوئی بالٹی آہستہ آہستہ خالی ہونے لگی۔ غالب نے ٹائم بم اٹھائے اور بکس کو گھسیٹتا ہوا زینے تک لایا۔ اس کو اٹھانا خاصا مشکل کام تھا۔ چنانچہ میں نے غالب کی مدد کی اور بکس کو اوپر تک ہم دونوں نے مل کر اٹھایا۔

دروازے تک پہنچتے پہنچتے پٹرول بہت کم رہ گیا تھا۔ مجھے یہ بھی اندیشہ تھا کہ وہ پٹرول نہ اڑ جائے جو میں نے پہلے ڈالا تھا مگر کپڑے کی نمی سے اندازہ ہوتا تھا کہ ایسا نہیں ہو گا۔ دروازے کے قریب آخری مگ ڈالنے کے بعد میں نے دیکھا تو تھوڑا سا پٹرول باقی تھا۔ میں دوڑ کر نیچے گیا اور یہ پٹرول صندوقوں کے آس پاس پھیلے ہوئے کپڑے پر الٹ دیا۔ آگ کا اب یہاں تک پہنچ جانا چند منٹ کی بات تھی۔ اس کے بعد خشک لکڑی کے بنے ہوئے صندوقوں کو آگ سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔ دالان اوپر پہنچ کر میں نے غالب کو دیکھا تو وہ ماچس ہاتھ میں لیے کھڑا تھا۔

"تم جا کے گاڑی اسٹارٹ کرو۔" غالب نے کہا۔ میں گاڑی کی طرف لپکا ہی تھا کہ مجھے ہیلی کاپٹر کی آواز سنائی دی۔ ہیلی کاپٹر سیدھا ادھر ہی آ رہا تھا اور میں اندازہ کر سکتا تھا کہ چند منٹ میں کرنل جگن ناتھ سینٹ کے چبوترے پر اتر رہا ہو گا۔ میں نے چلا کر غالب کو آواز دی۔ معلوم نہیں وہ دیر کیوں کر رہا تھا۔ ابھی تک مجھے ماچس کا شعلہ دکھائی نہیں دیا تھا۔

بالآخر ماچس کا شعلہ نظر آیا اور میں نے ہیڈ لائٹس جلائیں۔ اس کے بغیر ہم گھنے جنگل کے مخصوص راستوں سے گزر ہی نہیں سکتے تھے۔ غالب دوڑتا ہوا آیا اور میرے ساتھ بیٹھا ہی تھا کہ میں نے گاڑی چلا دی۔ جھٹکے سے دروازہ جو ابھی بند بھی نہ ہوا تھا پھر کھل گیا۔ میں اس وقت گاڑی موڑ رہا تھا۔ کھلا دروازہ ایک درخت کے تنے سے ٹکرایا اور ٹوٹ کر نیچے گر گیا مگر میں نے پروا نہیں کی۔ مجھے رات کے اندھیرے میں ہیلی کاپٹر کسی دیو ہیکل پرندے کی طرح اپنے سر کے اوپر منڈلاتا نظر آیا۔ پھر اس کی سرچ لائٹ جیسی تیز روشنی چبوترے پر پڑی۔ پائلٹ نے سابقہ تجربے کی بنا پر اب تک تاریکی میں سفر کیا تھا اور ہیلی کاپٹر کو بالکل ٹھیک جگہ تک لے آیا تھا مگر اب اُسے لینڈ کرنے کے لیے روشنی کی ضرورت تھی تاکہ وہ اپنے ہیلی پیڈ کو دیکھ سکے۔

میں ایک منٹ بعد گاڑی کو بحفاظت سو گز دور لے جا چکا تھا۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں درختوں پر چمکنے والے زرد رنگ کے دائرے بالکل ٹریفک سگنل کا کام دے رہے تھے اور میری رہنمائی کر رہے تھے۔

"یہ کیا چکر ہے سکندر بادشاہ..." غالب نے اعصابی کشیدگی میں پلٹ کر دیکھا۔ "دھماکا کیوں نہیں ہوا۔"

"کہیں آگ بجھ نہ گئی ہو۔" میں نے دل میں چھپے ہوئے اندیشے کا اظہار کیا۔

"نہیں یار ایسا نہیں ہو سکتا۔" غالب بولا "سب کپڑے پٹرول میں بھیگے ہوئے تھے۔ شروع سے آخر تک ایک پٹرول لائن تھی۔ آگ رک نہیں سکتی۔"

اُسی وقت پہلا دھماکا ہوا جو اتنا شدید تھا کہ مجھے نیچے کی زمین ہلتی محسوس ہوئی۔

"وہ مارا پاپڑ والے کو۔" غالب نے نعرہ لگایا اور قہقہہ مار کے ہنسا۔ پھر دوسرا دھماکا ہوا۔

"میرا خیال ہے جگن ناتھ بھی انہی کے ساتھ گیا۔" میں نے کہا۔ مسرت سے میرے جسم کا رُواں رُواں سرشار ہو رہا تھا۔ بہت عرصے کے بعد میں نے زندگی کے اس انوکھے تجربے کی لذت کو محسوس کیا جو فتح یابی کا انعام تھی۔ یقینِ محکم عملِ پیہم محبت فاتحِ عالم۔ اب تک میرا اور ایم آر ایس کا یہی نصب العین اور مقصدِ حیات رہا تھا۔ اس فاتحِ عالم محبت کے ان گنت روپ تھے۔ ایک محبت وہ تھی جو مجھے ولایت سے پاکستان کھینچ لائی تھی۔ یہ خون کے رشتے کی محبت تھی جس نے مجھے پاگل کر دیا تھا اور اپنے باپ کے قاتلوں سے انتقام کے جنون میں مبتلا کر دیا تھا۔ محبت کا دوسرا روپ بن کے راجہ نمودار ہوئی تھی اور یہ محبت میری زندگی کی روشنی تھی جو ہر جگہ ہر لمحہ میرے ساتھ میری شریکِ سفر تھی۔ محبت کا ایک اور روپ ان سب کے خلوص اور رفاقت کے عہد میں نظر آتا تھا جو دوستی کی آن پر جان دینے کے لیے میرے ساتھ سر کف پھرتے تھے۔ محسن اور نیک محمد۔ غالب اور نازو۔ وطن کی مٹی سے جذباتی وابستگی محبت کا سب سے انمول روپ تھی جس نے مجھے ذاتی انتقام کے جنون کی راہ سے ہٹا کے اس راستے پر گامزن کر دیا تھا جس پر چلنے والے غازی اور مر جانے والے شہید کہلاتے ہیں۔ وہ سب میرے بھی دشمن تھے جو میرے وطن کے دشمن تھے۔ اور ان کا نام و نشان مٹا دینے کا مقصد بہت اعلیٰ و ارفع تھا۔ میرے ذاتی انتقام کے جذبات اس مقصد کے سامنے کوئی حیثیت نہ رکھتے تھے۔ میں وہ شخص تھا جو ریت کے ایک ٹیلے کو سر کرنے کی سوچتا تھا مگر قدرت نے مجھے اس عزم سے نوازا جو ہمالیہ سے بھی اونچے پہاڑ کو سر کر سکتا تھا۔

دھماکے ایک تسلسل سے ہو رہے تھے۔ غالباً ہر پیٹی جس میں ہر قسم کے بم بھرے ہوئے تھے اور بارود کی سرنگیں تھیں، باری باری آگ پکڑ رہی تھی۔ آخری دھماکا اتنا لرزہ خیز تھا کہ ارتعاش سے گاڑی کے شیشے بجنے لگے۔ میں نے گاڑی روک دی کیونکہ اب ہم خاصے محفوظ فاصلے پر پہنچ چکے تھے۔ میں نیچے اترا اور سائیں پاپڑ والے کو اس کی مریدِ خاص کرماں والی کو اور اس کے ساتھ سیوک کو بے وجود ہوتے دیکھتا رہا۔ یہ باطل اعتقادات اور جھوٹی کرامات پر یقین کے ایک سلسلے کی شکست تھی۔ چشمِ تصور سے میں نے دلربا کو دیکھنے کی کوشش کی۔ اس کا حسن و شباب بارود کی تباہ کن قوت سے بکھر کر ریشہ ریشہ اور ریزہ ریزہ ہو گیا تھا اور اس کے خوب صورت جسم کے ذرات دور دور تک مٹی میں مل گئے تھے یا راکھ بن کے اُڑ گئے تھے۔ اپنے وعدے کے مطابق میں نے اُسے جو موت کا سامان فراہم کیا تھا، اس میں احساس کی اذیت کا وقفہ انتہائی مختصر تھا۔ مجھے سیوک کا کوئی خیال نہیں آیا۔ اگر میرے امکان میں ہوتا تو میں اسے کسی شہر کے چوک میں پھانسی دیتا اور اس کی لاش کو درسِ عبرت دینے کے لیے وہیں لٹکتا چھوڑ دیتا مگر میرے پاس اس کارِ خیر کے لیے وقت نہیں تھا۔

"اگر ہیلی کاپٹر ساتھ ہی تباہ نہ ہوتا تو اتنی دیر میں یقیناً اڑ جاتا۔" غالب نے کہا۔

"ہیلی کاپٹر اور کرنل جگن ناتھ کے بچنے کا کوئی سوال ہی نہیں۔" میں نے کہا: "ہیلی کاپٹر اس پلیٹ فارم پر اتر چکا تھا جس کے نیچے سلا آتشگیر مادہ ڈھیر کیا گیا تھا۔ بقولِ شاعر... بارود کے اک ڈھیر پہ بیٹھا تھا پرندہ۔"

"ہاں، میرے کان بھی اس کے انجن کی آواز پر لگے ہوئے تھے۔" غالب نے کہا "انجن پہلے دھماکے سے چند سیکنڈ قبل ہی خاموش ہوا تھا۔"

"چند سیکنڈ میں تو وہ ہیلی کاپٹر سے نکل بھی نہ پائے ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "صرف ایک سیکنڈ پہلے بھی کرنل جگن ناتھ کے تصور میں دلربا کا حسین چہرہ ہوگا۔ دوسرے سیکنڈ میں اس نے خود کو پرلوک میں پایا ہوگا تو سخت حیران ہوا ہوگا۔"

"حیران تو اس وقت موضع کرماں والی کے رہنے والے بھی ہوں گے کہ کیا واقعی قیامت آگئی۔ قربِ قیامت کی نشانیاں تو بڑے بوڑھوں کو ہر دور میں نظر آتی رہی ہیں۔" غالب بولا۔

"دوسروں کی جوانی کے دَور میں۔" میں نے کہا ——— "دھماکے تو شاید ڈونگا پتن اور گرد و نواح کے دیہات میں بھی سُنے گئے ہوں گے ——— اب وہ سارے بے مراد کہاں جائیں گے جو ہر خواہش کی تکمیل کے لیے منّت ماننے یہاں آجاتے تھے۔ خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں۔ جو دستِ دعا اٹھا کے تجھ سے کچھ مانگنے یا جدوجہد کرنے کے بجائے اس فراڈ سائیں بابڑ والے سے رجوع کرتے تھے۔"

"انھیں زیادہ دُور نہیں جانا پڑے گا۔" غالب نے کہا۔ "آس پاس کوئی دوسرا ٹھگ بابا پیر پہلے سے موجود ہوگا اور اپنی پُرفریب کرامات کا ڈھونگ رچا کے سیدھے سادھے دیہاتیوں کو لوٹ رہا ہوگا۔ یہ سائیں بابڑ والا تھا جو صرف [illegible] کھاتا تھا کہیں ہوگا سائیں مُوڑھے والا جو صرف مُرے مُرے کھاتا ہوگا اور چاندی کے مرمرے جمع کرتا ہوگا۔ نہ ہوا تو بہت جلد یہ ایکنسی پُر کرنے کوئی ضرور آجائے گا۔ سائیں کبوتر والا۔ پیر لنگوٹ شاہ۔ بابا درختاں والا جو زمین پر قدم نہیں دھرتا۔ کسی شاخ پر بسیرا کرتا ہے۔ یہ ایک پیشہ ہے سکندر بادشاہ! اگر تو بھی اختیار کر لیتا تو بڑا کامیاب رہتا۔ اس بزنس میں صرف ذہانت اور موقع شناسی کام آتی ہے۔ تقدس کا نقاب تو بڑی آسانی سے چڑھایا جا سکتا ہے۔ قلندرانہ وضع اختیار کرنے کے لیے رنگ برنگے چُغے، موٹے موٹے منکوں کی مالا، بکھرے بالوں کی وِگ۔ ہر رنگ اور سائز کی داڑھی مونچھ یہ سب سامان آسانی سے مل جاتا ہے۔ کرامات کا شعبدہ کرنے کے لیے دو چار ڈرامے کافی ہوتے ہیں۔"

"اور کمال افسوس کی بات یہ ہے مرزا غالب کہ لوگوں کو ان دھوکے بازوں کے اصل چہرے دکھانے کی ہمت کوئی نہیں کرتا۔" میں نے کہا۔ "کاش یہ ممکن ہوتا کہ ہم کرماں والی کو اس انجام تک پہنچانے سے پہلے اس کے تمام عقیدت مندوں کا اجلاسِ عام بلاتے جس میں وہ خود اپنی زبان سے اپنے تمام جرائم کا اعتراف کرتی اور لوگ اس کا اصل روپ بھی دیکھتے۔"

"اب یہاں ٹھہرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔" غالب نے کہا۔

میں نے دھوئیں اور گرد و غبار کے اس بادل کو دیکھا جو اندھیرے میں سیاہ بگولے کی طرح اُٹھا تھا لیکن اب رات میں تحلیل ہونے لگا تھا۔ دُور سے میں لوگوں کے چیخنے چلّانے کی آوازیں سن رہا تھا۔ اندازہ تھا کہ موضع کرماں والی کے سب زن و مرد، بچے اور بوڑھے گاؤں پر نازل ہونے والی اس آفتِ ناگہانی کا نظارہ کرنے آپہنچے ہیں۔ ان میں زیادہ کمزور عقیدہ رکھنے والے اسے بھی سائیں بابڑ والے کی کسی کرامت کا نام دے دیں گے کہ بستی کے اعمال خراب تھے جب زمین پھٹ گئی اور سائیں بابڑ والا کرماں والی کو اپنے ساتھ لے کر جنت کی طرف پرواز کر گئے۔ یا وہ اسے قہرِ خداوندی کے نازل ہونے کا شگون قرار دیتے ہوئے توبہ استغفار کریں گے کہ اب دنیا بھی ختم ہونے ہی والی ہے۔ وہ جو حقیقت کو جانتے تھے، میں اور غالب ہی نہیں تھے۔ سرحد کے پار کرنل جگن ناتھ اور دلربا کو اس مشن پر بھیجنے والے بھی تھے۔ ان کے تین آدمی مارے گئے تھے تو کیا ہوا۔ اگر جل گیا اِک نشیمن تو کیا غم۔ ابھی دوسرے ٹھکانے ہیں، دوسرے راستے ہیں اور دوسرے بہت سے قابلِ خرید غدار ہیں جن کے لیے پیسہ سارے اخلاقی و روحانی اور جذباتی رشتوں سے زیادہ اہم ہے۔

اگر سائیں بابڑ والا کی جعلی خانقاہ کے آس پاس درخت ہوتے تو یقیناً جنگل بھی آگ کی لپیٹ میں آجاتا لیکن انھوں نے ہیلی کاپٹر کے اترنے کے لیے ایک طرف پلیٹ فارم بنایا تھا تو باقی تین طرف پچاس گز تک درخت صاف کر دیے تھے۔ میں سادھو رام کی شیورلیٹ کو اس جنگل سے گزار کے ڈونگا پتن جانے والی کچی سڑک پر لے گیا۔ اگر کسی شاہراہ تک پہنچنے کا کوئی اور راستہ تھا تو میرے علم میں نہیں تھا اور اس رات کی سحر ہونے میں بہت کم وقت رہ گیا تھا۔ میں یہ وقت اسی علاقے میں بھٹکنے کا تجربہ کرتے نہیں گزار سکتا تھا۔ واپسی پر مجھے پھر سادھو رام کی حویلی کے سامنے سے گزرنا پڑا اور سب مجھے اس بدبخت عورت کا خیال آیا جس نے سادھو نام کے شیطان کے ساتھ مقدس آگ کے گرد سات پھیرے کیے تھے اور اس سے عہدِ رفاقت کا گناہ کیا تھا۔ شاید اس وقت بھی دل نے اسے دھوکا دیا ہوگا جو سادھو رام پر آگیا ہوگا۔ وہ ایک وجیہہ مرد تھا اور جوانی کے جذبات میں کوئی بھی لڑکی اس پر فریفتہ ہو سکتی تھی۔ دل نے سادھو رام کی دھرم پتنی کو پھر دھوکا دیا تھا۔ اسی دل نے پہلے زندگی کا سکون چھینا تھا اور خوشیاں چھینی تھیں۔ اسی دل نے اب زندگی چھین لی تھی۔

"کس سوچ میں گم ہو فلاسفر بادشاہ؟" غالب نے کہا۔

"کچھ نہیں مرزا جی۔" میں نے چونک کر کہا۔ "بس ایسے ہی طبیعت دنیا کی بے ثباتی کے خیال سے قنوطی ہو رہی تھی۔"

بڑی سڑک اب زیادہ دور نہیں رہی تھی۔ دُور اُفق پر صبح کاذب کا دھندلکا نمودار ہو کے غائب ہو چکا تھا۔ صبح صادق قریب تھی۔ میں نے اب تک بڑی محنت اور انہماک کے ساتھ ڈرائیونگ کی تھی چنانچہ میں ذہنی طور پر بھی تھک چکا تھا اور جسمانی اعتبار سے بھی۔ ادھر اُدھر دیکھنے پر مجھے بائیں طرف ایک نشیب سا دکھائی دیا۔ میں نے گاڑی اس میں اتار دی۔ یہ کوئی خشک ہو جانے والا برساتی تالاب تھا۔ شاید برسات کے موسم میں یہ پانی سے بھرا رہتا ہوگا، چکنی مٹی میں بھینسوں کے کھُروں سے چھوٹے چھوٹے گڑھے بن گئے تھے۔ عقل سے بڑی نہ سمجھی جانے والی بھینس کس حد تک صفائی پسند ہوتی ہے اس کا اندازہ ہر جوہڑ کے باتھ روم میں غسل فرمانے والی بھینسوں کی تعداد سے کیا جا سکتا ہے۔

گاڑی ہچکولے لیتی اچانک ایک گہرے کھڈے میں سرنگوں ہوئی۔ اس کے دونوں اگلے پہیّے کھڈے میں اتر گئے اور ناک کھڈے کے دوسرے کنارے سے ٹکرا کے چپٹی ہوگئی۔ جھٹکے نے مجھے بھی ہلا دیا اور مرزا غالب نے تو سامنے والے شیشے کو ٹکر ماری۔ کچھ دیر ہم دونوں صدمے سے سنبھلنے کی کوشش کرتے رہے۔

"شیشۂ دل تو پہلے ہی ٹوٹ چکا تھا۔" غالب سر کو دبا کے بولا۔

"غالباً نازو کے جوڑ کرنے کی ادائے ناز سے۔" میں نے کہا۔

"کاسۂ سر کو تم نے توڑنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔" غالب نے میرے سوال کا جواب گول کر دیا اور یوں اعتراف کر لیا کہ نازو اس کے خیالوں سے کبھی دُور نہیں رہتی۔

"سر کا کیا ہے!" میں نے نیچے اترتے ہوئے کہا۔ "اور لے آئیں گے بازار سے گر ٹوٹ گیا۔"

"یہ بازاری سر نہیں ہے۔ ایک سچے صحافی کا سر ہے۔" مرزا غالب کراہتے ہوئے اترے۔ میں نے ڈکی کھول کر سادھو رام کو باہر نکالا۔ اُسے اُٹھانا مشکل تھا۔ میں نے اور غالب نے رسّی کا ایک ایک کنارا تھاما اور اُسے گھسیٹتے ہوئے اوپر لے چلے۔ اس طرح کہ سادھو رام کی ٹانگیں زمین سے رگڑ کھا رہی تھیں مگر باقی جسم تھوڑا سا اوپر اُٹھا ہوا تھا۔ اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا تھا لیکن وہ مرا نہیں تھا، بے ہوش تھا۔ اُسے بلندی کی جانب گھسیٹ کر لے جانا بھی سخت آزمائش بن گیا۔ بالآخر ہم سڑک تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ اس وقت تک آسمان کے مشرقی کنارے روشن ہو گئے تھے اور درختوں میں بسیرا کرنے والے پرندوں کے شور سے جنگل گونج رہا تھا۔ آشیانوں سے نکلنے والے طیور اوپر چکر لگا رہے تھے اور تلاشِ رزق میں نکلنے کے لیے پَر تول رہے تھے۔

"اس حالت میں ہم خود کو نہیں سنبھال سکتے۔" مرزا غالب نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "اسے کہاں تک سنبھالیں گے۔"

"ابھی تو گاڑی میں بھی ہمارا اسباب پڑا ہے۔" میں نے کہا۔ "آپ کو زحمت نہ ہو تو وہ پیٹی اُٹھا لائیے جس میں ٹائم بم ہیں۔"

"کیوں نہ میں ایک ٹائم بم پر وہیں بیٹھ جاؤں اور اس وقت کا انتظار کروں جب ساری مشکلیں آسان ہو جائیں۔" وہ جھنجھلا کے بولا۔

"تم بھول رہے ہو کہ تمھیں ٹائم بم سیٹ کرنا نہیں آتا۔" میں نے کہا۔ "خیر تم یہاں کچھ آرام کرو۔ ان درختوں کے پیچھے کوئی بھی تم کو نہیں دیکھ سکتا۔"

"یہاں ہے کون دیکھنے والا۔ ہم خود ہی تماشا ہیں اور خود ہی تماشائی۔" غالب نے سرد آہ بھر کے کہا۔

"میں ایک گھنٹے میں فوراً لوٹ آؤں گا۔" میں نے کہا۔ "اس سے پہلے انتقال مت کرنا۔ میرا مطلب ہے کہیں مت جانا۔"

"تم بھی میری طبعی موت کا وقت آنے سے پہلے لوٹ آنے کی کوشش ضرور کرنا۔" غالب نے کہا۔

میں سڑک تک گیا اور پیدل چلتا رہا۔ میری جسمانی طاقت کا ذخیرہ تمام ہو چکا تھا اور اب میں قوتِ ارادی کے سہارے پر چل رہا تھا۔ اس اونٹ کی طرح جو ریگستان میں اپنے ہی کوہان کی چربی کو فیول کے طور پر استعمال کر لیتا ہے۔ سڑک پر دور دُور تک کوئی نہیں تھا۔ سورج میرے سامنے عین سڑک کے وسط میں طلوع ہوا اور اس کی پھیکی روشنی میرے سرد جسم کو بالکل چاندنی کی طرح بے اثر لگی۔ دس منٹ بعد دھوپ میں تھوڑی سی تمازت آگئی اور چلنے سے میرے جسم میں حرارت پیدا ہوگئی لیکن میں نے محسوس کیا کہ اب قوتِ ارادی کا فیول ٹینک بھی خالی ہو گیا ہے۔ عین اس وقت جب میں سڑک پر گرنے والا تھا، ایک بیل گاڑی نمودار ہوئی۔ میں زمین پر بیٹھ کے اس کے قریب آنے کا انتظار کرتا رہا۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ بیل کتنی کاہل مخلوق ہے۔ دو بیل ایک گاڑی کو بادلِ ناخواستہ یوں کھینچ رہے تھے جیسے ان کے درمیان سُست رفتاری کا مقابلہ ہے۔ اس گاڑی کو ایک گھوڑا دس گنی رفتار سے دوڑا کے لے جا سکتا تھا۔ بالآخر چرچوں کرتی ہوئی گاڑی میرے سامنے آئی۔

"کیا ہوا ہے رے بھائی؟" بیل گاڑی کے پائلٹ نے بیلوں کو رُکنے کا سگنل دے کر کہا۔ جامحور بیل فوراً رک گئے۔ پائلٹ جو ایک طرف ٹانگیں لٹکائے بیٹھا تھا، دھوتی سنبھال کے نیچے کودا۔ وہ اوپر صرف ایک واسکٹ پہنے ہوئے تھا۔ وہ جوان آدمی ضرور تھا مگر بہت زیادہ صحت مند نہیں تھا۔ پھر بھی وہ سردی کے احساس سے بیگانہ لگتا تھا۔ وہ میرے قریب پنجوں کے بل بیٹھ گیا۔

"میں بیمار ہوں بھائی۔" میں نے سنجیدہ کمزور کانپتی آواز میں کہا۔ "ڈونگا پتن پہنچا دو۔۔۔ اللہ اجر دے گا۔"

"اور کھانے کو کون دے گا بھائی؟" وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

"کیسی کفر کی بات کرتے ہو بھائی۔" میں نے کہا۔ "کھانے کو بھی وہی دیتا ہے۔"

"مگر پکی پکائی تو حاضر نہیں کرتا بھائی۔" [illegible] تو

کمائی ہی پڑتی ہے۔ مجھے منڈی پہنچنا ہے۔"

"میں تم کو معاوضہ بھی ادا کروں گا بھائی۔" میں نے کہا۔ "آج منڈی کی چھٹی کرو۔"

"منڈی کی چھٹی کیسے ہو سکتی ہے بھائی۔" وہ بولا۔ ہم دونوں کے درمیان بھائی بھائی کی تکرار مسلسل جاری تھی۔

"جیسے دفتر سے چھٹی ہوتی ہے بھائی۔" میں نے کہا۔ "تم کوئی بہانہ کر دینا۔ مثلاً یہ کہ بیل کے ماموں جان کا انتقال ہو گیا تھا۔"

"بیل کے ماموں جان؟" وہ مجھے مشکوک نظروں سے دیکھ کر بولا۔ "میں اپنے ماموں کو مار سکتا ہوں بھائی... لیکن پیسہ کتنا دو گے؟"

"کتنے کے ہیں تمہارے ماموں بھائی... میرا مطلب ہے تم ہی بتا دو کہ وہ کتنی رقم میں وفات پا سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

وہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ "بیس روپے ہوں گے بھائی۔"

"مجھے منظور ہے بھائی۔" میں نے اٹھ کر گاڑی کا رخ کیا۔

"ادھار نہیں چلے گا بھائی۔" اس نے مجھے روک لیا۔ "وہاں پہنچ کر تم نے خالی جیب دکھا دی یا بیہوش ہو گئے تو میں کیا کروں گا۔"

میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور پچاس کا ایک نوٹ نکالا۔

"تم بڑے باسٹرڈ ہو بھائی... میرا مطلب ہے بہت اچھے آدمی ہو۔ ...یہ لو۔"

"میرے پاس واپس دینے کے لیے تیس روپے نہیں ہیں بھائی۔" وہ نوٹ اچک کے بولا۔

"میں واپس کب مانگ رہا ہوں بھائی۔" میں نے گاڑی میں نیم دراز ہو کے کہا۔ "سب رکھ لو لیکن میرا ایک کام اور بھی ہے۔"

"ہر کام پیسے سے ہوتا ہے بھائی۔" اس نے پھر کاک پٹ میں پائلٹ کی جگہ سنبھال لی اور بیلوں کو فرسٹ گیئر میں ڈالا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ مجبوراً اس نے ایک نوکیلی لکڑی سے وہی کام لیا جو گاڑی کے ٹھنڈے انجن کو اسٹارٹ کرنے کے لیے چوک سے لیا جاتا ہے۔ بیل چل پڑے اور رینگنے لگے۔

"بیلوں کے رنگ پسٹن جواب دے گئے ہیں بھائی۔" میں نے کہا۔ "ان کی پک اپ ختم ہو چکی ہے۔"

"کیا ختم ہو چکی ہے بھائی؟" میرے منہ بولے بھائی نے سخت تشویش سے کہا۔

"ڈھونگا پتن کے راستے میں تمھیں دو اور بھائی ملیں گے بھائی۔" میں نے کہا۔ "وہ بھی بیمار ہیں۔"

"اللہ انھیں بھی شفا دے گا بھائی۔" اس نے بیلوں کو ٹاپ گیئر میں ڈالنے کے لیے ایک نہایت نازیبا حرکت کی۔

"شفا اسپتال میں ملتی ہے بھائی۔" میں نے کہا۔ "اگر تم انھیں ... پہنچا دو تو پورے پچاس تمہارے۔"

"یہ تو ایک طرف کا کرایہ ہوا بھائی۔" وہ کچھ سوچ کر اور مجھے گھور کر بولا۔ "ایک نوٹ اور دے سکتے ہو؟"

"دے سکتا ہوں بھائی۔" میں نے کہا۔ زیر لب میں نے اس کو ایک گالی بھی دی۔ سو پچاس کی رقم میرے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی مگر وہ جس یہودی ذہنیت کا مظاہرہ کر رہا تھا، وہ قابل مذمت تھی۔ عموماً دیہات میں بیل گاڑی چلانے والے اتنے چالاک اور کاروباری ذہن کے مالک نہیں ہوتے۔ بھائی بھائی کرتے ہوئے اس نے مجھے بتا دیا کہ وہ اللہ کے فضل سے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے یعنی مقامی درس گاہ سے (جو کہ ایک مڈل اسکول تھا) اعلیٰ ترین سند حاصل کر چکا ہے۔ چنانچہ اب پٹواری کا افسر بکار خاص ہے۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ اس آٹھویں جماعت پاس جوان کو پیسے اینٹھنے کا فن ورثے میں نہیں ملا۔ اس کا باپ تو سیدھا سادا شریف آدمی ہو گا مگر پٹواری کی صحبت میں اس نے سب کو بھائی کہہ کر سب کی جیب پر ڈاکا ڈالنا سیکھ لیا تھا۔ ہر کہ در کان نمک رفت نمک شد۔ پٹواری خود حرام کھاتا تھا۔ اسے دیکھ کر افسر بکار خاص کو حرام خوری کا شوق ہوا اور انتہا یہ تھی کہ اب بیل تک حرام خور ہو چکے تھے۔ انہی کے لیے غالب پریشان تھا کہ اب یہ سادہ دل بندے کہاں جائیں؟

بھائی نے کسی کام سے انکار نہیں کیا لیکن ہر کام کی قیمت وصول کی۔ جیسے جیسے اس کو اندازہ ہوتا گیا کہ ہماری قوت خرید بہت زیادہ ہے اس کے نرخ بھی چڑھتے گئے۔ اس نے تالاب نما گڑھے میں پڑی ہوئی گاڑی سے نکال کر سامان کو بیل گاڑی تک لانے اور اس سامان کو شہر تک ڈھونے کے مزید سو روپے طلب کیے۔

"یہ تمہاری گاڑی ہے بھائی؟" اس نے سادھو رام کی کار کو دیکھ کر کہا۔ "گڑھے میں کیسے گر گئی؟"

"اللہ کو یہی منظور تھا بھائی۔" غالب نے کہا۔

"میں اسے بھی کھینچ کر باہر نکال سکتا ہوں بھائی۔" وہ بولا۔ "بس دو سو روپے..."

"تم ایسا کیوں نہیں کرتے بھائی۔" میں نے بھنا کر کہا۔ "کہ اپنی گاڑی ہمیں دے دو... اور خود یہ کار کھینچ کر لے جاؤ۔"

اس کے بعد بھائی چارے کی فضا میں کچھ کشیدگی پیدا ہو گئی۔ میں اور غالب ہچکولے کھاتی بیل گاڑی میں آمنے سامنے بیٹھے رہے۔ بیل گاڑی کا وہ حصہ جو ایک جھٹکے کی طرح فرش سے دو فٹ کے قریب اونچا تھا، ہماری کمر میں اور پسلیوں میں گڑتا رہا اور ٹاپ گیئر میں بھی بیل یوں چلتے رہے کہ ہم اس سے زیادہ تیز رفتاری سے پیدل چل سکتے تھے لیکن سارا مسئلہ انرجی کا تھا۔ ہم میں تو اب بیٹھنے کی طاقت بھی نہ تھی۔ مزید ظلم یہ کہ ہم سگریٹ پی رہے تھے۔ خالی پیٹ میں دھواں بالکل اشک آور گیس کی طرح پھیلتا تھا۔ ہمیں سادھو رام کی طرف سے

... رہی تھی کہ وہ تفتیش کے عمل کا آغاز ہونے سے قبل ہی وفات پا جائے۔ بالآخر شہر کے مضافات شروع ہوئے اور مجھے سڑک ... ایک کیفے "ڈی پھونس" نظر آیا۔ میں نے اپنی لوٹن انجن اسپورٹس ... روک لیا اور نیچے اتر گیا۔ اس چھپر نما عمارت کا پروپرائٹر دنیا و ... سے بے نیاز بیٹھا تھا۔ میں نے اس کے خشک بسکٹوں کا سارا ... خرید لیا اور اسے حکم دیا کہ وہ ایک وقت میں جتنی چائے بنا ... بنا لائے۔ اس نے فاخت گوبر کے اپلوں پر سلور کی کیتلی بھر ... جو دھوئیں سے اتنی کالی ہو گئی تھی کہ اب اور کالی نہیں ہو سکتی ... چنانچہ اسے صاف کرنے کی کوشش بہت پہلے ترک کر دی گئی ... آدھے گھنٹے میں ہمارے سامنے تقریباً ایک لیٹر چائے بیٹھی ... جس میں پانی کے بعد سب سے زیادہ مقدار دودھ کی تھی۔ پھر ... اور سب سے کم پتی کی۔ یہ مشروب ایک ٹانک ضرور سمجھا ... جاتا تھا مگر وہ چائے نہیں تھی جو ہم شہری پیتے ہیں اور اپنی صحت ... برباد کرتے ہیں۔ تاہم اس وقت خشک بسکٹ اور یہی گرما گرم ... پینے سے میری اور مرزا غالب کی زندگی میں چند سانسوں ... کا اضافہ ہو گیا۔

سفر پھر شروع ہوا تو ہمارے جسم میں توانائی یوں بھر گئی تھی ... جیسے فلیٹ ہو جانے والے ٹائر میں پنکچر لگانے کے بعد ہوا بھر ... جاتی ہے۔ ہم زور زور سے ہنسے اور باتیں کرنے لگے اور سگریٹ ... کے لمبے لمبے کش لینے لگے۔ ہماری اس کایا پلٹ پر بیل گاڑی کا ... ڈرائیور اور پٹواری کا افسر بکار خاص سخت حیران تھا۔ اس نے بھی ... کسی مریض کو صرف چائے سے شفا پاتے یوں چٹکی بجاتے ... صحت مند ہوتے نہ دیکھا تھا۔ اس کو یہ بھی حیرانی تھی کہ ہم ... نے تیسرے بیمار کو یہ آب حیات کیوں نہیں پلایا جبکہ ہم اس کی استطاعت ... رکھتے تھے اور تقریباً دو پیالی چائے بچ بھی گئی تھی۔ بالآخر اس سے ... رہا نہ گیا۔

"اس کو تم نے چائے کیوں نہیں دی بھائی؟" وہ بولا۔

"اس لیے کہ چائے اس کے لیے زہر ثابت ہوتی بھائی۔" میں نے کہا۔

"تمہارے لیے تو زہر نہیں بنی بھائی۔" وہ جرح کے انداز میں بولا۔

"ہم تو اس بیمار کو اٹھا کر لانے سے بیمار ہو گئے تھے بھائی۔" میں ... ورنہ ہم بیمار نہیں تھے... جیسے کہ یہ ہے۔"

"لیکن چائے تو..."

"فضول بک بک مت کرو بھائی۔" غالب نے کہا۔ "اب ہر ... جواب ہم پانچ روپے میں دیں گے۔"

"پانچ روپے نہیں کاٹیں گے بھائی تو ایک جھانپڑ دیں گے۔"

"سوچ لو کہ تمہیں کیا قبول ہے بھائی؟" غالب بولا۔ "پانچ ... یا ایک جھانپڑ۔"

برادرانہ تعلقات اس کے بعد بالکل منقطع ہو گئے اور ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ میں نے غالب سے انگریزی میں بات شروع کی تو ہمارے سابقہ بھائی نے ہمیں گھور کر دیکھا مگر خاموش رہا۔

"یہ بہت چالاک اور خطرناک بھائی ثابت ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اس نے سب کچھ دیکھا ہے۔ سادھو رام کی کار کو اس علاقے میں سب پہچانتے ہوں گے۔ جب یہ بات پھیلے گی تو اس کے کانوں تک بھی پہنچے گی اور یہ بک دے گا کہ اس نے کیا دیکھا تھا۔"

"میرا تو خیال ہے کہ یہ سیانا کوا خطرے سے دور رہے گا۔" غالب بولا۔ "اسے ہم سے بھی تو ڈر رہے گا۔"

"ہم سے کس بات کا ڈر...!" میں نے کہا۔ "یہ ہمارے حلیے بیان کر دے گا۔"

"اس نے ہم سے دو سو روپے لیے ہیں۔" غالب نے کہا۔ "یہ شریک جرم سمجھا جائے گا۔"

"میرا خیال ہے اس کو اب رخصت کر دینا چاہیے۔" میں نے کہا۔ "جب یہ واپس چلا جائے تو ہم باقی فاصلہ کسی ٹیکسی میں طے کر لیں۔"

"ٹیکسی یہاں کہاں ہے؟"

"ہے نہیں تو آ جائے گی۔ ورنہ کوئی رحمدل کار والا لفٹ دے دیگا۔" میں نے کہا۔ "اس خبیث کو اپنے ٹھکانے کا پتا نہیں ہونا چاہیے۔"

"ہم یہاں اتریں گے بھائی۔" غالب نے اتفاق کیا اور پائلٹ کے کندھے پر تھپکی دی۔ "یہاں روک لو اپنی سپر ایکسپریس۔"

"مجھے جو کہنا ہے کہہ لو بھائی۔" وہ برا مان کے بولا۔ "لیکن میری بیل گاڑی کو گالی مت دو..."

جب ہم نے اپنا سامان اتار لیا اور سادھو رام کو سڑک کے کنارے لٹا دیا تو اس نے بیلوں کو واپسی کا سگنل دیا اور ہم اس وقت تک انتظار کرتے رہے جب تک کہ بیل گاڑی دو فرلانگ دور نہیں چلی گئی۔ صبح کے نو بجنے والے تھے اور سڑک پر ٹریفک میں کچھ اضافہ ہو گیا تھا۔ کئی سائیکلوں اور موٹر سائیکلوں والے ہم پر نگاہ ڈالے بغیر گزر گئے۔ چند ایک نے ہمیں واجبی سے تجسس کے ساتھ دیکھا۔ شک کی کوئی بھی بات نہیں تھی۔ ہم دونوں عام قسم کے انسان تھے۔ میں وضع قطع سے دیہاتی لگتا تھا اور غالب کوئی کلرک ٹائپ چیز... ہم کسی بیمار کے ساتھ کسی سواری کے آنے کا انتظار کر رہے تھے اور ہمارے سامان میں بھی کوئی بات عجیب نہ تھی۔ یہ کون تصور کر سکتا تھا کہ دیہاتی نظر آنے والا وہ سکندر بخت ہے جس کے پیچھے ہر طرف سے شکاری لگے ہوئے ہیں۔ ایک شکاری پولیس ہے جس نے مجھ پر ان گنت مقدمات قائم کر رکھے ہیں اور جو مجھے خطرناک اشتہاری اور مفرور مجرم قرار دے چکی ہے۔ دوسرے شکاری میرے آبائی چوہدری دلاور اور اس کے گرگے ہیں اور تیسرے ...

اپنے ہی نامہرباں دوست ہیں جن میں انکل رضوی اور ڈبل ایس آئی شیخ شامل ہیں۔ وہاں سے گزرنے والے یہ بھی تصور نہیں کرسکتے تھے کہ لکڑی کے باکس میں بارہ خطرناک قسم کے ٹائم بم ہیں اور جو شخص بیمار نظر آتا ہے وہ درحقیقت ایک خطرناک وطن دشمن ہے جسے ہم ایک معرکۂ شب کے بعد گرفتار کرلائے ہیں۔ کوئی یہ بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ ہمارے سوٹ کیس میں نقد چالیس ہزار روپے ہیں۔ اس سے زیادہ مالیت کی انڈین کرنسی ہے اور اس سے بھی زیادہ قیمت کا سونا ہے۔ ایسے بے سروسامان مہاجر نظر آنے والے کتنے بے ضرر لگتے تھے مگر کتنے دولت مند تھے اور کتنے خطرناک تھے۔ غالب نے بالآخر ایک ریڑھے کو خالی آتے دیکھا اور روک

لیا۔ اس سے پہلے جتنے ریڑھے گزرے تھے وہ سب دودھ والوں کے تھے جو خالی برتن لے کر واپس جارہے تھے۔ غالب نے ریڑھے والے سے پچاس روپے میں معاملہ طے کیا اور ہمارا سفر پھر شروع ہوا۔ اب ہم پہلے کی نسبت زیادہ رفتار سے جارہے تھے اور ریل گاڑی کے مقابلے میں ریڑھا ایک لگژری کوچ محسوس ہوتا تھا۔

ایک گھنٹے بعد ہم نے ریڑھے کو گلی کے نکڑ پر روک لیا۔ ریڑھے والا بہت خاموش طبع اور اپنے کام سے کام رکھنے والا شخص تھا۔ اس نے سامان اتار کے نیچے رکھا، پچاس روپے جیب میں ڈالے اور پلٹ کر دیکھے بغیر سیدھا نکل گیا۔ غالب وہیں کھڑا رہا اور میں چلتا ہوا اس گھر کے دروازے تک پہنچا جہاں اب نیک محمد کے سوا کوئی ہمارا منتظر نہ تھا۔ نہ وہاں رابعہ تھی اور نہ نازو... رابعہ میرے خیال و خواب کی دُنیا میں تو میری تھی لیکن اس کے خیالوں کی دنیا میں شاید میں بھی نہیں تھا۔ صرف خلا تھا۔ نازو دُہرے عذاب میں اسیر تھی۔ ایک طرف اس کے جذبات کا طوفانی دھارا تھا جس کی راہ میں کوئی بند نہیں باندھ سکتا تھا لیکن دوسری طرف رشتوں کے محافظ تھے جو اس کے سامنے دیوار بن گئے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ لڑکی سب زنجیریں توڑ کر اور تمام دیواریں گرا کے اپنے جسم کے زخموں کی پروا کیے بغیر یوں نکل پڑے گی کہ سب دیکھتے رہ جائیں گے۔ رابعہ کے بارے میں یہ سوچ کر میرا دل آگ پر رکھے ہوئے شیشے کی طرح چٹخنے لگتا تھا کہ اس کی واپسی کب ہوگی۔ جسمانی طور پر اس کا لوٹ آنا بے مقصد تھا۔ وہ اپنی چاہت کے سارے جانفزا جذبوں کے ساتھ پھر کب میرے دل کی تنہائی اور ویرانی دُور کرنے آئے گی۔ یہ کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔

استاد ٹیڈی نے دروازہ کھولا اور چند سیکنڈ گم صم کھڑا رہا۔ پھر وہ مجھ سے لپٹ گیا "یہ... یہ تم ہو سکندر بادشاہ..." وہ مجھے زور زور سے ہلانے لگا۔ "واقعی تم ہو... یا میری آنکھیں خواب دیکھ رہی ہیں؟"

"میں آگیا ہوں نیک محمد..." میں نے اس کے شانے پر تھپکی دی۔ "میں پہلے بھی آیا تھا لیکن تم نہیں تھے۔"

"ہاں! میں نے غالب کا چھوڑا ہوا رقعہ دیکھ لیا تھا۔" وہ بولا۔

"غالب کہاں ہے؟"

"وہ گلی کے نکڑ پہ کھڑا ہوا ہے۔" میں نے کہا۔ "جاؤ اور اُسے لے آؤ۔"

"کیا وہ خود نہیں آسکتا تھا؟" نیک محمد کا چہرہ تشویش اور پریشانی کی تصویر بن گیا۔

"اُسے کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔" میں نے نیک محمد کو تسلی دی۔ "اُس کے پاس کچھ سامان ہے جو ذرا بھاری ہے۔ وہ خود اُٹھا کے نہیں لاسکتا تھا... اور ایک مہمان بھی ہے۔"

"کون مہمان؟"

"خود جا کے دیکھ لو۔" میں نے کہا۔ "یہاں تم سوالات کرتے رہے اور میں جواب دیتا رہا تو مرزا غالب بھی لیٹ جائے گا۔ اس کا بھی تھکن سے بُرا حال ہے۔"

"میں جاتا ہوں سکندر بادشاہ۔" ٹیڈی بولا۔ "تم لیٹو... آرام سے لیٹ جاؤ۔"

"نیک محمد..." میں نے آواز دے کر کہا۔ "رابعہ کیسی ہے؟"

"وہ ایسی ہی ہے... میرا مطلب ہے ٹھیک ہے۔" ٹیڈی نے دروازے میں رک کر کہا اور پھر غائب ہوگیا۔ میں ایک چارپائی پر لیٹ گیا۔ ایک بار پھر میں اپنے گھر کی چھت کے نیچے تحفظ کے سائے میں تھا اور یہ احساس ہی اتنا سکون بخش تھا کہ میری آنکھیں خود بخود بند ہوگئیں۔ جو کچھ مجھ پر بیت چکی تھی نقشِ ماضی بن گئی۔ گزشتہ چند دن کے واقعات محو ہوگئے اور میرا ذہن نیند کے تاریک خلا میں پناہ لینے کے لیے وقت سے کٹ گیا۔

جب میری آنکھ کھلی تو دن کا اجالا کمرے کے باہر صحن میں پھیلا ہوا تھا۔ مجھے اپنے قریب ہی دوسری چارپائی پر غالب گھٹنے سمیٹ کر سینے سے لگائے گٹھری کی طرح پڑا نظر آیا۔ نہ جانے کس وقت نیک محمد نے مجھ پر لحاف ڈال دیا تھا۔ وہ خود شاید دوسرے کمرے میں تھا اور کسی سے چپکے چپکے باتیں کررہا تھا۔

"نیک محمد۔" میں نے آواز دے کر اُسے بلایا اور اٹھ بیٹھا۔

"اُٹھ گئے سکندر بادشاہ۔" وہ دروازے میں نمودار ہوا۔ "قسم مولا علی کی... یوں گھوڑے بیچ کر سوتے ہم نے تمہیں کبھی نہ دیکھا۔"

"تم باتیں کس سے کررہے تھے؟" میں نے کہا۔

"اپنے مہمان سے۔" وہ ہنسا۔

"وہ زندہ تو ہے نا؟" میں نے کہا۔

"زندہ تو اُسے رہنا پڑے گا۔" نیک محمد نے کہا اور ... بیٹھ گیا۔ "میں اسے مرنے کہاں دوں گا۔"

"آج دن اور تاریخ کیا ہے اُستاد؟" میں نے انگڑائی لے کر ... میں کب سے سو رہا ہوں؟"

"کل دوپہر سے تم اور غالب دونوں ہی مُردوں کی طرح پڑے ..." نیک محمد نے کہا۔ "میں نے تو کئی بار آ کے دیکھا ... کہ سانس چل رہی ہے یا نہیں۔" میں ہنس پڑا۔ "ارے ... استاد! ہم بڑی ڈھیٹ چیز ہیں ورنہ کب کے مر گئے ہوتے۔"

"یہ تمہاری حالت کیا ہورہی ہے سکندر بادشاہ۔" نیک محمد ... بولا۔ "قسم اللہ کی! میں تو ذرا سی دیر کے لیے چکرا گیا تھا تمہیں دیکھ کر... میں سمجھا کسی گاؤں کی مسجد کے پیش امام صاحب آگئے ہیں۔ ... داڑھی... زلفیں اور... یہ لباس..."

میں نے اپنی کئی دن کی بڑھی ہوئی شیو پر ہاتھ پھیرا۔ "یہ تو بغیر ... ضرورت کا حلیہ ہے۔ مجھے مرنے کی فرصت نہیں تھی۔ ہاتھ مُنہ تک ... نہیں دھویا تو شیو کہاں سے بنوانا۔ لیکن باقی سب بھی ضروری تھا۔ ... بڑا اچھا میں نے خریدا تھا۔ بال کٹوائے ہوئے زمانہ ہوگیا اس لیے کچھ ... ضرورت سے زیادہ لمبے ہورہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اپنی اس ... وضع قطع کو فی الحال برقرار رکھوں۔"

"ضرور رکھو۔ لیکن نہا تو لو۔" نیک محمد نے کہا۔ "یا میل کو بھی ... جسم پر برقرار رکھنے کا ارادہ ہے۔"

نیک محمد نے مجھے غسل کے لیے گرم پانی فراہم کیا۔ میل کے ساتھ میرے جسم کی تھکن بھی بہہ گئی اور میں بالکل تازہ دم ہو کے باہر نکلا تو مرزا غالب چارپائی پر مہاتما بدھ کی طرح آلتی پالتی مارے آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔ میں نے اُسے دھکیلا تو وہ لڑھک گیا۔ ... بیٹھے بیٹھے پھر سو گیا تھا۔ نیک محمد کے کہنے پر وہ اُٹھا۔

"تمہارے ساتھ کیا کم دھکے کھائے ہیں کہ اب تم بھی دھکے ... دے رہے ہو۔" مرزا غالب نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"جاؤ نہا دھو کے پھر آدمی بن جاؤ۔" میں نے کہا۔

"تمہارا مطلب ہے کہ اس وقت زندہ آدمی ہوں... مردہ آدمی بن جاؤں۔" غالب نے کہا۔ "ارے ظالم! اتنی سردی میں ... مجھے ... آپ کہتے ہو۔ ڈبل نمونیا تو مجھے فسل کا سُن کے ہی ہونے لگا ہے۔" لیکن ہم نے اس کی ایک نہیں سُنی اور اُسے غسل خانے میں بند کردیا۔ وہ اندر سے چلّاتا رہا کہ میرا خون تمہاری گردن پر ہوگا ... اب نہالوں تو میری میت کو دوبارہ مت نہلانا۔ وہ شخص جو ... "ہو حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن" کی عملی تفسیر تھا۔ بے خطا آتشِ ... نمرود میں کود پڑنے والا جگر رکھتا تھا۔ دوستی کے نام پر جان بیچنے کو آسان سمجھتا تھا... "جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی" کے اصول پر عمل کرتا تھا اور موت کے روبرو ... مسکراتا تھا۔ سردی میں نہاتے ہوئے مرا جا رہا تھا۔

میں نے کپڑے بدلے اور پھر آئینے میں اپنی صورت کو دیکھا تو مجھے استاد ٹیڈی کی حیرانی حق بجانب محسوس ہوئی۔ میں واقعی بہت بدل گیا تھا۔ میری صحت بھی اب پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ مسلسل سختی حالات، بے آرامی اور فاقہ کشی اور مسلسل تگ و دو میرے جسم پر اثر انداز ہوئی تھی۔ میرا وزن یقیناً پہلے کے مقابلے میں پندرہ بیس پونڈ کم ہوگیا تھا۔ میرا چہرہ ستا ہوا لگتا تھا اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے سے نمودار ہوگئے تھے۔ میرے رخساروں کے گرد بے قاعدہ قسم کی خشخشی داڑھی بھی نمودار ہوگئی تھی جس کا سلسلہ مونچھوں سے جا ملتا تھا۔ عمداً میں نے بال پیچھے کی طرف بنائے تو مجھے اپنی صورت میں کسی میک اپ کے بغیر خاصی تبدیلی کا احساس ہوا۔ نیک محمد کچن میں ناشتے کا اہتمام کررہا تھا۔ میں دوسرے کمرے میں گیا جہاں سادھو رام بندھا پڑا تھا۔ غالب یا استاد ٹیڈی نے اسے چارپائی پر لٹا کے اس کے ہاتھوں پیروں کو الگ الگ چارپائی کی پٹی سے باندھا تھا اور اس کے مُنہ میں کپڑا ٹھونس دیا تھا۔ وہ اب ہوش میں تھا اور بے چینی سے گردن کو اِدھر اُدھر جھٹک رہا تھا۔ اس کا رنگ نقاہت سے سفید ہورہا تھا۔

"کیوں سادھو رام!" میں نے کہا۔ "کیا دریا کی یاد آرہی ہے؟ اُس سے ملنے کے لیے تمہیں بہت دُور جانا پڑے گا۔ اور معلوم نہیں پھر بھی وہ بے وفا عورت تمہیں ملے گی یا نہیں۔ وہ دنیا میں کبھی کسی کی نہیں تھی مگر دنیا سے کرنل جگن ناتھ کے ساتھ گئی۔ کیا پتا پرلوک میں وہ اسی کے ساتھ رہنا پسند کرے۔ دنیا میں تو اس کا دھرم ایمان، مہر و وفا اور پیار محبت سب پیسہ تھا۔"

سادھو رام کی آنکھیں مجھ پر ٹھہر گئیں۔ اُس نے میری بات کو بے یقینی کے ساتھ سنا تھا مگر میری سنجیدگی کو دیکھتے ہوئے وہ مجھ پر یقین کرنے پر مجبور تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ پیر کھول دیے اور اُسے سیدھا بیٹھنے میں مدد دی۔ اپنے مُنہ میں سے کپڑا خود اس نے نکال دیا۔ پھر وہ لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ اس صورتِ حالات میں وہ کوئی غلط حرکت کر ہی نہیں سکتا تھا۔ شور مچانا اس کے لیے بے سود تھا۔ جو اس کی مدد کے لیے آتے وہ ایک غدار اور وطن فروش ہندو کا نام سنتے ہی اس کی تکا بوٹی کردیتے۔ فرار کی اس میں ہمت ہی نہ تھی۔ وہ تو سیدھا بیٹھتے ہوئے بھی دشواری محسوس کررہا تھا۔

"یہ بات تو پرانی ہوچکی..." میں نے کہا۔ "لیکن تمہارے لیے یقیناً ایک خبر ہوگی کہ ہم نے سائیں پاپڑ والے کی اس خانقاہ کو اُڑا دیا جو تمہارا اڈا تھی۔ سیوک رام اور دریا کو ہم نے تمام گولا بارود اور اسلحے پر رکھ دیا تھا۔ ان کی تو راکھ بھی نہیں ملے گی۔ کرنل جگن ناتھ کو اس کی قضا ٹھیک وقت پر لے آئی۔ وہ اپنے ہیلی ... سے

اترا ہی تھا کہ اڑ گیا، ہیلی کاپٹر سمیت۔ اور اس مرتبہ کرنل کی پرواز سیدھی پرلوک پہنچی۔"

وہ کانپتے ہاتھوں سے ہاتھوں کی کلائیوں اور ٹخنوں کو رگڑتا رہا اور جھومتا رہا۔ اس کے لیے توازن برقرار رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔

"تمہارے لیے اور بھی بہت سی دلچسپ خبریں ہیں۔" میں نے کہا۔

"مجھے... مجھے تھوڑا سا پانی... دے دو..." وہ بولا

"جو کچھ تمہارے مقدر میں ہے وہ تم کو ضرور ملے گا... جب تک تمہارا آب و دانہ نہیں اٹھتا۔" میں نے کہا: "ابھی تمہیں پانی ہی نہیں، چائے بھی ملے گی۔ کھانے پینے کو بھی ملے گا اور موت کے سوا جو مانگو گے ملے گا۔ یہی ایک چیز ہمارے اختیار میں نہیں۔"

اسی وقت نیک محمد اندر آیا: "کیا حکم ہے سکندر بادشاہ؟"

"اس کتے کو کچھ کھانے کے لیے لا دو نیک محمد... اور دو گھونٹ پانی بھی پلا دو۔" میں نے کہا: "اور پھر باندھ دو۔"

"تم بھی تو ناشتا کر لو۔" نیک محمد نے کہا: "غالب زندہ سلامت باتھ روم سے نکل آیا ہے۔"

استاد ٹیڈی نے میری ہدایت پر عمل کیا اور چند منٹ میں سادھو رام کو پھر بے بس کر کے ڈال دیا۔ غالباً گزشتہ چوبیس گھنٹوں میں اسے کچھ نہ کچھ کھانے پینے کو ملتا رہا تھا ورنہ اب تک وہ زندہ نہ رہتا۔

"ہم ابھی کچھ دیر میں پھر حاضر ہوں گے۔" میں نے کہا: "اس وقت تک تم تازہ خبروں کی روشنی میں سوچو کہ تمہیں کیا کرنا چاہیے۔ ایک خبر یہ بھی ہے کہ تمہاری بیوی بھی تمہارا ساتھ چھوڑ گئی ہے۔ نہیں... وہ کسی کے ساتھ فرار نہیں ہوئی ہے۔ وہ اس دنیا سے ہی چلی گئی ہے جس میں تم جیسے بے ضمیر اور کمینے شخص کو وہ اپنا شوہر تسلیم کرنے پر مجبور تھی۔ میرا خیال ہے اب تک اس کا بھی کریا کرم ہو چکا ہوگا اور کریا کرم کرنے والے وہی ہوں گے جو تمہارے آقا تھے۔ جن کے اشارے پر تم کتے کی طرح دُم ہلاتے جاتے تھے اور جو تم کو پیسے کا راتب ڈال کر تمہاری وفاداری خرید لیتے تھے۔ تم سے تو کتا بھی بہتر ہے جو اپنے مالک سے وفاداری کو نہیں چھوڑتا۔ تمہارے ان جگن ناتھ اور سیوک جیسے ایجنٹوں نے اب تک گرد و نواح کا سارا علاقہ کھنگال ڈالا ہوگا۔ وہ کرماں والی کے ڈیرے کے آس پاس سرگرم عمل ہوں گے اور یہ جاننے کی فکر میں ہوں گے کہ یہ کارروائی کس دشمن کی ہے لیکن اطمینان رکھو، ان کے فرشتے بھی ہمارا سراغ نہیں لگا سکتے۔ کچھ دیر بعد ہم تمہیں بہت سی چیزیں دکھائیں گے جو تمہارے لیے فیصلے کو آسان کر دیں گی۔ تمہیں ابھی بہت سے مشکل فیصلے کرنے ہیں۔"

سادھو رام جانتا تھا کہ یہ مشکل فیصلے کیا ہوں گے۔ ہم پہلے اس کی قوتِ مزاحمت کو کم سے کم کر دینا چاہتے تھے۔ اُسے یہ احساس دلانا چاہتا تھا کہ وہ بازی ہار چکا ہے اور اس بات کا امکان ایک فیصد بھی نہیں کہ بازی پھر پلٹ جائے۔ میں اس کی ہر امید کو ختم کر دینا چاہتا تھا کہ وہ خوش فہمی کے فریب کا شکار نہ ہو اور یہ نہ سوچے کہ اس کو بچانے والے یہاں تک پہنچ جائیں گے کیونکہ وہ تربیت یافتہ کمانڈوز ہیں جو بیحد ذہین اور نڈر ہوتے ہیں اور ان کے مقابلے میں ہم کچھ بھی نہیں۔ ہم نے کوئی غلطی ضرور کی ہوگی جو ہمارا سراغ دے گی اور وہ اس کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کریں گے جن کے لیے وہ آج تک سب کچھ کرتا رہا تھا۔ ایک بنیادی حقیقت اس نے پہلے نہیں سمجھی تھی تو اب سمجھ لے گا کہ جاسوس کا دوست کوئی نہیں ہوتا۔

غالب کے ساتھ میں نے لنچ کے وقت ایک پُرتکلف ناشتا کیا جو مجھے بہت دن بعد ملا تھا۔ اس چائے کے ذائقے کو میری زبان ترس گئی تھی۔ تاہم ہر لحظہ مجھے اپنے اطمینان اور آسودگی کے احساس میں وہ کمی محسوس ہوئی جو رابعہ اور نازو کی عدم موجودگی کے باعث گھر میں ویرانی کا تاثر بن کے پھیلی ہوئی تھی۔ ان کے بغیر یہ گھر خالی لگتا تھا اور دیواروں کے حصار میں افسردگی کا سونا پن کاٹتا تھا۔

"یار، میری نوکری کا کیا بنے گا؟" غالب نے کہا: "اخبار والے میری جان کو رو رہے ہوں گے۔"

"نہیں مرزا غالب! اس دنیا میں کسی ایک آدمی کی موجودگی یا غیر موجودگی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" میں نے کہا: "کاروبارِ حیات جاری رہتا ہے۔ زمین کی رفتار... سورج، چاند ستاروں کا نکلنا، ڈوبنا ہونا۔ پرانے ہو جانے والوں کا نئے آنے والوں کے لیے جگہ خالی کر دینا۔ انسانوں کا سونا جاگنا... ہنسنا رونا... محبت کرنا اور نفرت کرنا سب وہی رہتے ہیں خواہ تم موجود رہو یا میں نہ رہوں۔ کیا تمہاری غیر حاضری میں اخبار شائع نہیں ہوا تھا؟ ذرا پوچھ کر دیکھنا۔"

"مجھے نہ اخبار کی فکر ہے نہ دنیا کی۔ فرق تو مجھے پڑے گا جس کی نوکری نہیں رہے گی۔" غالب نے بھنا کر کہا: "معلوم نہیں اب تک کسی نے میری پُراسرار گمشدگی کی رپورٹ نہ لکھوا دی ہو۔"

"میرا مشورہ بھی یہی ہے کہ تم آج سے پھر صحافت شروع کر دو۔" میں نے کہا: "تمہارے ڈبل رول سے ہمیں بہت مدد ملے گی۔ تم ہی ایک ایسے شخص ہو جس پر کوئی الزام نہیں اور لگا یا بھی نہیں جا سکتا۔ تم ہمارے ساتھ بھی ہو لیکن اس دنیا میں بھی ہو جس سے ہمارا کوئی براہِ راست رابطہ نہیں۔ اچھا ہے اگر تمہاری یہ پوزیشن برقرار رہے۔ تم ہمارے بہت سے کام کر سکو گے جو ہم نہیں کر سکتے۔"

"ہو سکتا ہے آج محسن بھی لوٹ آئے۔" استاد ٹیڈی نے کہا: "اور شہلا کو بھی لے آئے۔"

دروازے پر دستک سُن کے ہم سب چونکے: "کون آسکتا ہے اس وقت؟" میں نے کہا۔

"تم ٹھہرو! میں دیکھتا ہوں۔" استاد ٹیڈی نے کہا۔

"ذرا احتیاط کے ساتھ استاد۔" میں نے کہا اور اپنا ریوالور لے لیا۔ غالب میرے ساتھ آیا۔ ہم نے کمرے کے دونوں دروازوں کے پیچھے پوزیشن لے لی۔ ان میں سے ایک صحن میں کھلتا تھا اور دوسرا ساتھ والے کمرے میں۔ دستک دوبارہ ہوئی اور اس مرتبہ چوڑیوں کی جھنکار بھی سنائی دی۔ ٹیڈی کے قدم رک گئے۔ پھر اس کا ہاتھ کنڈی کی طرف بڑھا۔

"اندر آجاؤ۔" ٹیڈی نے دروازہ کھولے بغیر دیوار سے لگ کر کہا۔ دروازہ اندر کی طرف کھلا اور پھر میری آنکھوں نے ایک ناقابلِ یقین منظر دیکھا۔ ایک لڑکی اندر آئی جو بالکل دلہن لگتی تھی۔ وہ نئی دلہن تھی چنانچہ اس کے ہاتھوں پر مہندی کا رنگ بہت شوخ تھا۔ اس کی مانگ میں افشاں بالکل یوں لگتی تھی جیسے تاریک رات کے آسمان پر کہکشاں۔ اس نے دلہنوں کی طرح سرخ عروسی جوڑا نہیں پہن رکھا تھا مگر اس کے ریشمی لباس اور کرن والے دوپٹے کی مسکراہٹ اعلان کرتی تھی کہ وہ دلہن ہے۔ اس کے عارض پر حیا کی لالی اور اس کی آنکھوں کی پُرغرور فتح مند چمک بتاتی تھی کہ وہ کسی کی ہو گئی ہے اور کسی کو جیت چکی ہے۔ اس کے گلے میں پڑے ہوئے سونے کے نیکلس، کانوں کے جھلمل کرتے آویزے اور ہاتھوں میں کھنکتی سونے کی چوڑیاں سب پکار پکار کے کہتے تھے کہ وہ ایک دلہن ہے اور یہ دلہن شہلا تھی۔ دروازے کے سامنے استاد ٹیڈی منجمد کھڑا تھا۔ اس کے پیچھے ہاتھوں میں ریوالور تھامے میں اور غالب منجمد کھڑے ہوئے تھے۔ یہ سب ناقابلِ یقین تھا۔ ابھی ہم نے محسن کا اور شہلا کا نام ہی لیا تھا کہ وہ آگئے۔ ایسے لمحے زندگی میں صرف ایک بار آتے ہیں جب آدمی کے لبوں سے نکلنے والے الفاظ پلک جھپکتے میں سچ ہو جاتے ہیں۔

"کیا مجھے یہیں کھڑا رکھو گے بھیا۔ اندر نہیں آنے دو گے؟" شہلا نے کہا اور یکلخت خواب کا طلسم ٹوٹ گیا۔

"شہلا! میری مُنی سی بہن۔" ٹیڈی نے ریوالور پھینک کر اُسے گلے لگا لیا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا: "تو دلہن بن گئی۔ بھائی کو بھی نہیں بتایا۔ بھائی تو خود آتا۔" فرطِ جذبات سے اس کی آواز گلوگیر ہو گئی: "مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ دلہن میری بہن ہے۔"

میں اور غالب آہستہ آہستہ آگے بڑھے۔ شہلا آگے آئی اور مجھ سے چمٹ گئی۔ میں بھی اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے کے علاوہ کچھ نہ کر سکا۔ کچھ بھی نہ بول سکا۔ پھر محسن نمودار ہوا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں دو سوٹ کیس اٹھا رکھے تھے جو اس سے غالب نے لے لیے۔

وہ ایک دم میری طرف آیا اور مجھ سے لپٹ کر رونے لگا۔ میں نے آنسوؤں کو آنکھوں تک نہیں آنے دیا۔ آنسو میرے دل میں سمندر کی طوفانی لہریں کے اٹھے اور انھوں نے میرے وجود کو اندر سے تہس نہس کر دیا لیکن میں نے اپنے مقابل شہلا کو دیکھا اور ضبط کی ساری قوت سے آنسوؤں کے بہائے جانے والے ریلے کو روک لیا۔

"خوشی کے اس موقعے پر روتا ہے پاگل۔" میں نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام کر خود پر جبر کرتے ہوئے مسکرا کے کہا: "تو شہلا کو اس گھر میں دلہن بنا کے لایا ہے۔" پھر میں نے شہلا کی طرف دیکھا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے گالوں پر بہہ رہے تھے۔

"ابا نے مرنے سے پہلے کہا تھا کہ محسن کو رونے مت دینا۔" محسن نے اپنے آنسو پونچھ کر کہا: "اس وقت میں ان کے ساتھ نہیں تھا ورنہ وہ یہی بات مجھ سے کہتے۔ اور خدا گواہ ہے میں ان کی قبر پر جا کے بھی نہیں رویا تھا۔ رو رو کے فوزیہ کا اور شہلا کا بُرا حال تھا۔ مگر میں نے اپنی آنکھوں میں آنسو نہیں آنے دیے تھے۔"

"پھر اب رو کے ان کی روح کو کیوں تکلیف پہنچاتا ہے؟" میں نے کہا۔

"معلوم نہیں... مجھے کیا ہو گیا تھا۔" وہ چارپائی پر بیٹھ گیا... غالب خاموش تماشائی بنا سب کی صورتوں کو دیکھتا رہا۔

استاد ٹیڈی نے شہلا کو سنبھال لیا تھا: "بیٹھ جا... تو بھی بیٹھ جا میری مُنی سی بہن۔ مجھے تو لگتا ہے کہ تو بہت بڑی ہو گئی ہے... معلوم نہیں کتنے عرصے کے بعد تجھے دیکھا ہے۔ آخری بار دیکھا تھا تو... شاید تو چھوٹی سی بچی تھی... یا مجھے لگتی تھی۔ کتنی خوب صورت لگ رہی ہے تو اس لباس میں۔" وہ بیحد جذباتی ہو رہا تھا اور شہلا کے آنسو بہنے کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لیتے تھے۔

"معلوم ہے ابھی کیا ہوا!" میں نے کہا: "ایک معجزہ۔ اُسے کوئی کچھ بھی کہے لیکن میں نے ایسا ہوتے نہ دیکھا نہ سُنا۔ ابھی خواجہ نیک محمد نے تمہارا نام لیا ہی تھا... صرف محسن کا نہیں... شہلا کا بھی۔ اس نے کہا تھا کہ ہو سکتا ہے آج محسن اور شہلا آجائیں۔ اور اسی وقت شہلا نے دستک دے دی۔ اس کے لبوں سے الفاظ کے نکلتے ہی... بڑی طویل عمر ہوگی تم دونوں کی۔"

"معلوم نہیں شہلا کا خیال مجھے کیوں آیا۔" استاد ٹیڈی نے کہا: "ہمارا خیال تو یہ تھا کہ محسن اسے فوزیہ کے پاس چھوڑ کر آئے گا۔ کوئی وجہ نہیں تھی ایسا سوچنے کی۔"

"دنیا میں بہت کچھ بے سبب بھی ہوتا ہے استاد۔" میں نے کہا: "مثلاً محبت... جادو، ٹیلی پیتھی کی عقل کیا توضیح کرے گی۔ یہ بھی کچھ ایسی ہی بات تھی۔ یہ محبت کا کرشمہ تھا کہ تیرے دل میں وہ خیال آیا جو کسی اور کے دل میں نہیں آسکتا تھا... اور یہ محبت

وہ تھی جو سچ کی قوت رکھتی تھی۔ اُس نے خیال کو حقیقت بنادیا اور سچ کردیا۔ اس وقت تم کچھ اور کہتے تو وہ سچ نہ ہوتا۔"

"میاں خوجی اور سکندر بادشاہ..." غالب نے اچانک ہاتھ مل کے کہا۔ "میں آتنی دیر سے دیکھ رہا ہوں کہ تم دونوں ظالم سماج کی طرح دو محبت کرنے والوں کے درمیان حائل ہو... ایسے نہیں چلے گا... چلو ہٹو دونوں۔"

"یہ میری بہن ہے مرزا غالب کے بچے۔" استاد ٹیڈی نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

"یہ تھی تمہاری بہن۔ اب اس کے ہاتھ پیلے... سوری لال ہو چکے اور اس کی رخصتی ہونے کے بعد یہ صرف محسن کی بیوی ہے اور تم سالے... کتے زیادہ سے زیادہ..." غالب نے کہا۔ "کیونکہ تم نے سُنا ہوگا کہ بہن کے گھر میں بھائی کتا۔"

"وہ رخصت ہو کے میرے گھر میں آئی ہے۔" ٹیڈی نے کہا۔ "تم بھونکتے ہو۔"

"یہ اب محسن اور شہلا کا گھر ہوگا۔" غالب نے کہا۔ "رخصت تم کو ہونا پڑے گا۔ ورنہ اسے دوبارہ رخصت کرنا ہوگا۔ کہیں اور۔"

"ارے لڑتے کیوں ہو بھائیو!" محسن بولا۔ "یہ ہم سب کا گھر ہے، ہم میں سے نہ کوئی رخصت ہوگا نہ کسی کو رخصت کرے گا۔ شہلا اپنے میکے میں بھی ہے اور سسرال میں بھی۔ اس گھر کا ڈبل رول ہے۔"

"ڈبل رول ہے تو ٹھیک ہے۔" غالب بیٹھ گیا۔ "اب یہ بتاؤ کہ ایسا کیوں ہوا کب ہوا کیسے ہوا؟"

"ڈیڈی کی آخری خواہش یہی تھی۔" محسن بولا۔ "انھوں نے فوزیہ سے کہا تھا کہ اس نیک کام میں دیر مت کرنا۔ میرے سوئم چہلم کا انتظار ہرگز نہ کرنا۔ میں نے محسن کے آخری وقت میں قریب نہ ہونے کا قصور معاف کردیا۔ صرف اس شرط پر کہ وہ میری اس وصیت پر عمل کرنے میں بالکل دیر نہ کرے۔ اس کو سمجھا دینا کہ میں اُسے بالکل روتا دیکھنا نہیں چاہتا۔ اگر اسے میرا ذرا بھی خیال ہے کہ میری روح کو تکلیف نہ ہو تو وہ اس طرح شہلا سے شادی کرے جیسے میں اپنی زندگی میں کرتا۔ فوزیہ نے سب مجھے بتادیا... پھر میں مجبور ہوگیا۔ جس دن میں پہنچا اس دن ان کا سوئم تھا۔ اگلے دن ہماری شادی ہو گئی۔ میں سادگی سے نکاح چاہتا تھا لیکن فوزیہ نے کہا کہ ابا کی آخری خواہش کچھ تو پوری ہو۔ اس نے ہی شہلا کو مہندی لگانے پر مجبور کیا اور دلہن بنایا۔"

ہم سب چپ چاپ بیٹھے رہے۔ چشم تصور سے میں نے اس گھر کو دیکھا جس میں نوحۂ ماتم تھم بھی نہ ہوا تھا کہ نغمۂ شادی گونجنے لگا۔ دنیا نے کیا سمجھا ہوگا اور کیا کہا ہوگا۔ لیکن پھر میرے تصور میں انکل شیروانی کا مسکراتا ہوا چہرہ آیا۔ تم تو جانتے ہو سکندر کہ دنیا کیا دیکھتی ہے اور کیا سمجھتی ہے۔ اصل بات وہ سچ ہے جسے ہمارا دل یا ہمارا ضمیر قبول کرتا ہے۔ یہ دنیا کی خوشی کا معاملہ نہیں تھا۔ میری، محسن اور شہلا کی اور ہم سب کی خوشی کا سوال تھا۔ کیا تم خوش نہیں ہو اس وقت سکندر؟

"چلو اب تم دونوں ہاتھ مُنہ دھو کے یا نہا کے تازہ دم ہو جاؤ۔ بڑے لمبے سفر سے آئے ہو اور تھکے ہوئے ہو۔" استاد ٹیڈی نے کہا۔ "ہم تو لنچ یا ناشتے سے ابھی ابھی فارغ ہوئے ہیں۔ تمہارے ساتھ پھر شریک ہوں گے۔"

"پھر تم آرام کرنا۔ مفصل باتیں ہوتی رہیں گی۔" میں نے ٹیڈی کی تائید کی جو شہلا کو باہر لے جا چکا تھا۔

"مجھے تیری شکل دیکھ کر ہول آرہا ہے۔" محسن نے کہا۔ "تو بالکل مجنوں لگ رہا ہے۔ دو دن کے فراق نے یہ حال کردیا تیرا۔"

"معلوم نہیں یہ دو دن کی بات ہوگی کہ دو برسوں کی۔" میں نے کہا۔

"کیا تو اس سے ملا نہیں؟" محسن نے کہا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "مجھے اس کے اور نازو کے بارے میں معلوم تو ہوگیا تھا۔ ملنے کی فرصت ابھی تک نہیں ملی۔"

"میرا خیال ہے کہ وہ ٹھیک ہو جائے گی۔" محسن نے کہا۔

"عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے۔" میں نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "حقیقت کسی خیال سے نہیں بدلتی... اس سے ملوں گا تو پتا چلے گا کہ وہ کہاں ہے۔ نازو یہ تو جانتی ہے کہ وہ کون ہے اور کہاں ہے؟"

"شاید رابعہ تجھے دیکھے گی تو خود کو پہچان جائے گی۔" محسن نے کہا۔ "اس کی شناخت تجھ سے تھی اور کوئی بھی اس کی ذات کے خلا کو پُر نہیں کرسکتا چنانچہ وہ خود کو نامکمل محسوس کرتی ہے اور ادھوری ہے۔"

"محسن کا خیال بہت حقیقت پسندانہ ہے۔" غالب نے کہا۔ "اس قسم کے نفسیاتی کیس میں 'شاک ٹریٹ منٹ' کی کامیابی کے امکانات روشن ہوتے ہیں۔ ایک صدمہ ذہن پر منفی اثرات مرتب کرتا ہے۔ دوسرا خوشگوار صدمہ مثبت اثرات کا حامل ہو تو ذہنی توازن پھر قائم ہو جاتا ہے۔ میں کوئی ماہرِ نفسیات تو نہیں ہوں لیکن رابعہ کے معاملے میں بہت پُرامید ہوں کہ اُسے واپس لایا جاسکتا ہے۔ بس اس کے لیے سخت محنت کرنی ہوگی۔ یہ ہوسکتا ہے کہ پہلا صدمہ کارگر نہ ہو... تم یہ کرسکتے ہو کہ اُسے ماضی کی کسی خوشگوار یاد کی تصویر دکھا دو۔ مثلاً اُسے وہاں لے جاؤ جہاں..."

"میں سمجھ گیا مرزا جی۔" میں نے کہا۔ "اور اب میں پہلے سے زیادہ پُرامید ہوں۔"

شہلا غسلخانے سے نکل آئی تھی اور اُس نے لباس بھی بدل لیا تھا۔ مجھے تھوڑا سا رنج ہوا کہ ہم سب اس خوشی میں پوری طرح شریک نہ ہوسکے اور شہلا کی شادی جس دھوم دھام سے ہونی تھی، وہ انکل شیروانی کے لیے بھی حسرت ہی رہی۔ محسن کی ماں، فوزیہ اور ہم سب کے لیے بھی حسرت رہی اور شاید خود شہلا کے لیے بھی۔ بھلا کون لڑکی نہیں چاہتی کہ اس کی شادی روایتی طریقے پر پورے انتظام و اہتمام کے ساتھ ہو جس میں ڈھولک بجے، مہندی کے گیت گائے جائیں۔ گھر سجے اور چراغاں ہو۔ زیادہ سے زیادہ لوگ شریک ہوں۔ تحفے تحائف، دعائیں اور مبارکبادوں اور دعوتوں کے سلسلے ہوں۔ پھر شہلا کی تو ساری زندگی ہی ایک المیہ تھی۔ تقدیر نے جتنا اُسے دیا تھا اس سے زیادہ چھین لیا تھا۔ میرا دل خوف سے بیٹھنے لگا... بے اختیار میرے دل سے دعا نکلی کہ خداوندا اب تو اس لڑکی کو وہ سب خوشیاں بخش دے جن سے وہ اب تک محروم رہی ہے۔ اگر اس کو آئندہ زندگی میں محبت کی رفاقت اور چاہت کے اعتماد کی مسرت حاصل رہی تو اس کی سب محرومیوں کی تلافی ہو جائے گی۔ بینڈ باجے اور دھوم دھام سے ہونے والی شادی کی مسرت تو وقتی ہوتی ہے۔ اگر اس کے بعد خوشیوں کے خواب جھوٹے ثابت ہوں تو دامن میں پچھتاوے کے سوا کیا رہ جاتا ہے جو تمام عمر ساتھ چلتے ہیں۔ اس سے وہ شادی لاکھ درجہ بہتر ہے جو خاموشی سے ہو جائے مگر مستقبل کی لازوال اور لامحدود خوشیوں کی ضمانت کا تحفہ دے جائے۔

"یہ دوسرے کمرے میں کون صاحب تشریف فرما ہیں؟" محسن کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ تولیہ کندھے پر ڈال کر غسلخانے تک جانے کے لیے اُٹھا تھا کہ اُس کی نظر نے سادھو رام کو دیکھ لیا۔

"اپنے مہمان ہیں... اور ابھی کچھ دن رہیں گے۔" میں نے کہا۔ "تو نہا دھولے، پھر تعارف بھی ہو جائے گا۔"

نہانے دھونے کے بعد استاد ٹیڈی نے اپنی چھوٹی بہن کو زبردستی ڈانٹ ڈپٹ کے سلا دیا۔ اُس نے شہلا کے آتے ہی تمام برادرانہ حقوق اپنے نام محفوظ کرالیے تھے اور اس اجارہ داری کو قائم رکھنے پر مُصر تھا۔ میں نے یہی سلوک محسن کے ساتھ کرنا چاہا مگر وہ شہلا کی طرح فرمانبردار اور شریف نہیں تھا۔ اس نے نہایت سرکشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سونے سے انکار کردیا۔

"میں کون سا لمبا سفر کرکے آیا ہوں۔" وہ بولا۔ "صبح ویگن میں بیٹھے تھے اور وہ ائرکنڈیشنڈ کوچ تھی۔ میں بالکل تھکا ہوا نہیں ہوں اور اگر تم لوگوں نے میری موجودگی میں پیش آنے والے واقعات نہ بتائے تو مجھے رات کو بھی نیند نہیں آئے گی۔"

"اچھا تو چلو اُدھر دوسرے کمرے میں۔" استاد ٹیڈی نے حکم دیا۔ "یہاں میری بہن سو رہی ہے۔"

"سالے... یہ تھانیداری نہیں چلے گی۔" محسن نے غرا کے کہا۔

"ساری خدائی اک طرف جورو کا بھائی اک طرف۔" ٹیڈی نے آستین چڑھا کے کہا۔ "کیسے نہیں چلے گی تھانیداری۔"

میں محسن کو دوسرے کمرے میں لے گیا۔ وہاں اپنی داستانِ مہم جوئی کا کچھ حصہ میں نے سنایا اور کچھ مرزا غالب نے۔ نیک محمد اور محسن دم بخود سنتے رہے۔ سائیں بابا پڑ والے اور کرماں والی کے گروہ کا ایک رکن ان کے سامنے تھا اور اس تفصیلی تعارف کے بعد وہ سمجھ چکے تھے کہ سادھو رام کو شرفِ مہمانی بخشنے کا مقصد کیا ہوسکتا ہے۔ غالب نے وہ سوٹ کیس کھول کے رکھا جس میں مالِ غنیمت تھا۔ اس میں اب بھی تقریباً چالیس ہزار کی پاکستانی کرنسی تھی۔ شمار کرنے پر انڈین کرنسی کی مالیت ستّر ہزار روپے بنی۔ سونے کا تخمینہ استاد ٹیڈی نے اس سے نصف لگایا۔

"یہ سب تو ہاتھ کا میل ہے ہمارے لیے۔" محسن نے کہا۔ "ہمارے استاد ٹیڈی بھی ایک قارون کا خزانہ رکھتے ہیں۔"

"انڈین کرنسی کسی مرحلے میں ہمارے کام آسکتی ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن سب سے نایاب چیز یہ ٹائم بم ہیں۔"

"اس میں کیا شک ہے۔ پہلا تو سادھو مہاراج کے نیچے رکھیں گے۔" محسن بولا۔

"سادھو مہاراج اتنے قیمتی نہیں ہیں۔" میں نے اُسے ڈانٹا۔ "کہ ان پر ایک ٹائم بم ضائع کیا جائے۔ اِنھیں ویسے ہی ضائع کردیں گے۔ ایک پتھر کافی ہوگا۔ یہ بتا تجھے ٹائم بم سیٹ کرنا آتا ہے۔"

"میں اس کا عملی مظاہرہ ابھی کرسکتا تھا۔" محسن نے سادھو رام پر حسرت کی نظر ڈالی۔ "آخر بی ایس سی پاس ہوں اور سول ڈیفنس کے دو کورس کرچکا ہوں۔ ایک عام کورس۔ دوسرا بم ڈسپوزل کورس۔"

"میں تو اب اپنے اخبار کے دفتر جاتا ہوں دوستو!" غالب نے اُٹھ کر کہا۔ "صبح ملاقات ہوگی۔"

"میں بھی رابعہ کو دیکھنے جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "نیک محمد کو ساتھ لے جاؤں یا تمہارے ساتھ چلوں؟"

"میرے ساتھ چلو۔" غالب نے کہا۔ "رکشا کے پیسے بچ جائیں گے۔"

"اب ایک گاڑی پھر ناگزیر ہوگئی ہے۔" میں نے کہا۔ "اور... موجودہ حالات میں اگر دو گھر ہوں اور دو گاڑیاں تو مزید بہتر۔"

"اتنی فضول خرچی کا جواز پیش کیجیے۔" محسن نے کہا۔

"جواز دوسرے کمرے میں خوابیدہ ہے اور آپ اپنے ساتھ لائے ہیں۔" میں نے کہا۔ "نئے دولہا دلہن کو کچھ عرصہ مار دھاڑ اور کشت و خون کرنے والوں کی صحبت سے دُور کہیں ہنی مون منانا

چاہیے؟"

"ایسی کی تیسی ہنی مون کی۔" محسن نے کہا۔

"کیا کہا؟" میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ "تیرا تو باپ... میرا مطلب ہے میں دیکھتا ہوں کیسے نہیں جاتا تو ہنی مون پر... نیک محمد... کل ایک چھوٹا سا گھر تلاش کرو جو یہاں سے پانچ میل دُور ہو۔ اُسے دلہا دلہن کی ضروریات کے مطابق آراستہ کرو۔ ان کے لیے دروازے پر ایک کار کھڑی کرو۔ بلکہ کار یہاں سے آؤ۔ ہم انھیں باندھ کر لے جائیں گے اور وہاں ڈال آئیں گے۔ دوسری گاڑی کا انتظام میں کر دوں گا جو ہمارے کام آئے گی۔"

"جو حکم سکندر بادشاہ۔" استاد ٹیڈی نے خوش ہو کے کہا۔

"یار یہ کیا پاگل پن ہے... ہمیں یہیں رہنے دو۔" محسن نے بے بسی سے کہا۔

"یہ ناممکن ہے۔" میں نے کہا۔ "تم دونوں کا گھر الگ ہوگا۔ اس گھر کا ہمارے کاروبارِ زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ ہم شہلا کو ان تمام معاملات سے الگ رکھنا چاہتے ہیں جو ہمارے لیے خطرات کا باعث ہیں۔ یہ ہم سب کی مشترکہ ذمّے داری ہے۔ اس کے علاوہ ہم سب کے لیے وہ گھر بھی ایک گوشۂ عافیت ہوگا۔ وہاں کوئی بھی پناہ لے سکے گا۔ یوں سمجھ لے کہ یہ "اسٹینڈ بائی" قسم کا انتظام ہے۔ ایک گاڑی نہ رہی تو دوسری ہوگی۔ یہ گھر نہ ہوا تو دوسرا ہوگا۔ تاہم جب تک ممکن ہوا ہم اس دوسرے گھر کو ٹاپ سیکرٹ رکھیں گے۔ ممکن ہے مجھے رابعہ کو وہاں لے جانا پڑے اور اُسے شہلا کی تیمار داری کی ضرورت ہو اور جناب! اس کے بعد سال بھر کے اندر اندر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ معاملہ اُلٹ جائے یعنی شہلا کو رابعہ کی تیمار داری کی ضرورت پڑے۔"

"بڑی دور کی کوڑی لائے جناب لیکن اب میں کیا کروں۔ شرم سے لال ہو جاؤں؟ شہلا ہوتی تو یہی کرتی۔" محسن ہنسا۔

"میاں جب شادی کی ہے تو اور بھی سب کچھ ہوگا۔" غالب نے کہا۔ "جرم سب کو بھگتنا پڑے گا۔ کوئی چاچا کے منصب پر فائز ہوگا تو کوئی ماما بنے گا۔ مرزا غالب پھر ماما غالب کہلائیں...۔"

"تم کہاں سے بن بیٹھے ماما؟" ٹیڈی نے پھر اعلانِ جنگ کر دیا۔ "ماما صرف میں ہوں... ٹیڈی ماما۔"

"ٹیڈی ماما۔" غالب نے اس کی نقل اتاری۔ "شکل دیکھی ہے اپنی میاں خوجی... ہر وقت کی دھونس نہیں چلے گی۔"

"قسم مولا علی کی... دھونس بھی چلے گی اور دھاندلی بھی...۔" ٹیڈی نے میز پر مُکا مارا۔ "ماما بن کے تو دیکھے کوئی۔"

"لاحول ولاقوۃ۔" محسن کا ہنستے ہنستے بُرا حال ہو گیا۔ "سوت نہ کپاس۔ جولاہے سے لٹھم لٹھا۔"

میں مرزا غالب کو فوراً اپنے ساتھ لے گیا ورنہ ماموں چاچوں کی بے سبب جنگِ عظیم چلتی رہتی۔ وہ مجھے لٹن روڈ کی ایک کوٹھی میں لے گیا جس کے دروازے پر بہت خطرناک عزائم رکھنے والا کتّا بیٹھا ہوا تھا۔ میرے قدم رک گئے۔

"بالکل بے ضرر اور پالتو قسم کا جانور ہے۔" غالب نے مجھے یقین دلایا۔ "اور میں کوئی اجنبی ہوں؟"

"لیکن میں تو اجنبی ہوں۔" میں نے کہا۔ "اس کے علاوہ یہ تو کتّے کے موڈ کی بات ہے کہ دوست کو کاٹتا ہے یا دشمن کو۔"

"چلو میں آگے چلتا ہوں... کیا نام ہے اس کا... لاحول ولا قوۃ..." مرزا غالب نے کہا۔ "ہیلو... ٹائیگر... ڈبلو... اور بتاؤ نا یار کیا نام ہوتے ہیں کتّے کے؟"

"کتّے کو کسی بھی نام سے پکارو وہ کتّا ہی رہے گا۔" میں نے کسی فلسفی کی طرح کہا۔ اسی وقت کتّے نے غرّانا شروع کیا اور پھر باقاعدہ بھونکنے لگا۔ بظاہر وہ مرزا غالب ہی سے زیادہ خفا لگتا تھا۔ اندر سے کسی نے اُسے ڈانٹا۔ وہ کتّا کال بیل بھی تھا جس نے ہماری آمد سے اہلِ خانہ کو مطلع کر دیا تھا۔ اس کے خاموش ہو جانے کے بعد غالب نے بڑی فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ پیش قدمی کی۔ برآمدے میں بارہ سال کا ایک گول مٹول لڑکا کھڑا ہوا تھا۔

"آپ بھی موش سے ڈرتے ہیں انکل؟" وہ بولا۔

"موش؟ یعنی چوہے سے؟" غالب نے کہا۔ "لاحول ولاقوۃ۔ اللہ کے سوا ہم کسی سے نہیں ڈرتے۔"

"مگر موش کے بھونکنے پر آپ رُک گئے تھے۔" لڑکے نے کہا۔

"موش! اس کا نام موش ہے؟ سُنا تم نے سکندر!" غالب نے کہا اور السیشن نسل کے گدھے کے برابر کتّے کو دیکھا۔ "خیر چھوڑو موش کو... تم اس کا نام فیل بھی رکھ دو تو کیا... جا کے ابّا سے کہو انکل غالب آئے ہیں۔"

"وہ تو میں پہلے ہی بتا چکا ہوں۔" لڑکا بولا۔ "وہ ڈرائنگ روم میں آپ کے منتظر ہیں... چلیے۔"

ڈرائنگ روم میں جس شخص نے ہمارا استقبال کیا وہ عمر میں غالب سے بہت زیادہ تھا۔ اس کے سر کے بال گھنے مگر بالکل سفید تھے۔ سُرخ و سفید چہرے اور دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ مجموعی طور پر اس کی شخصیت کا تاثر بہت خوشگوار محسوس ہوتا تھا۔ اُس نے بڑی گرمجوشی سے مصافحہ کیا۔

"یہ غالباً سکندر بخت ہیں۔" وہ بولا۔ "تمہارے دوست۔"

"آپ آدمی کو پہچاننے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "صورت دیکھ کر نام بتا سکتے ہیں۔"

"یہ ڈاکٹر لطیف ہیں۔ مشہور ماہرِ نفسیات۔ نیورو فزیشن۔" غالب نے کہا۔ "ان کی ڈگریوں میں اے سے زیڈ تک تمام حروف ہیں مگر ترتیب مجھے یاد نہیں۔ تم پوچھ لینا۔ میں تو چلتا ہوں۔"

"اتنی جلدی کیا ہے لڑکے۔" ایک معمر خاتون نے دروازے میں نمودار ہو کے ڈانٹنا شروع کیا۔

"آنٹی! کئی دن سے بھاگا ہوا ہوں ڈیوٹی سے۔" غالب نے معصوم صورت بنا کے کہا۔ "بہت مار پڑے گی اگر آج بھی دیر سے پہنچا۔" وہ خدا حافظ کہہ کے بھاگ گیا۔ میں نے خاتون کو کھڑے ہو کے آداب کیا۔ "بیٹا" لیس پچاس کی عورت تھی جس نے بڑے سلیقے سے ساڑی باندھ رکھی تھی۔ اس کی صورت کے نقوش اب بھی اتنے دلکش تھے کہ اس کی جوانی کے حسنِ بے مثال کا صرف تصور کیا جا سکتا تھا۔

"بیٹھو بیٹا۔ تم سکندر ہی ہو نا۔" وہ بولی۔ میں پھر چونکا۔ قاضی کے گھر کے چوہے بھی سیانے۔ یہ اس کی مثال تھی۔

"آپ نے اتنا صحیح اندازہ کیسے لگا لیا؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"تم ایسے ہی ہو سکتے تھے۔" وہ مسکرائی۔ "بس میرے ذہن میں تم کو دیکھ کر خیال آیا کہ تم اور کوئی نہیں ہو سکتے۔ اور پھر تم آئے بھی تو غالب کے ساتھ تھے۔ چائے پیو گے یا کافی۔"

"کافی بڑے شوق سے پیوں گا۔" میں نے کہا۔ ان کے شفیق رویّے نے اجنبیت کا احساس یوں ختم کر دیا تھا کہ چند منٹ میں یہ گھر مجھے اپنا گھر محسوس ہونے لگا تھا جیسے یہاں میں پہلی بار نہیں آیا بلکہ بچپن سے آتا رہا ہوں۔ اس احساس نے مجھے بڑی تسکین دی۔ رابعہ کو ایسے ہی گھر کے ماحول اور ایسے ہی لوگوں کی توجہ کی ضرورت تھی۔ جو بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی وہ غالب کے ساتھ ان کا رویّہ تھا۔ غالب نے تو ڈاکٹر کو اپنا دوست کہا تھا مگر عمر کے اتنے فرق کے ساتھ وہ دوست نہیں ہو سکتے تھے۔

"معاف کیجیے گا ڈاکٹر صاحب۔" میں نے کہا۔ "میرا خیال تھا کہ آپ غالب کے دوست ہوں گے!"

"اب شک کیوں ہو رہا ہے؟" ڈاکٹر لطیف نے مسکرا کے کہا۔ "بھئی اس کا باپ تو کالج کے زمانے میں میرا دوست بنا تھا۔ اس وقت ملا تھا جب ہم دونوں کو دنیا میں آئے ہوئے تقریباً بیس سال ہو گئے تھے مگر یہ لڑکا تو پیدائش کے روزِ اوّل سے میرا دوست ہے۔"

"غالب نے... مجھے کبھی اپنے والد کے بارے میں نہیں بتایا۔" میں نے خفت سے اعتراف کیا۔

"ہاں۔ وہ عموماً کسی کو نہیں بتاتا۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "وہ ایک ماہر سرجن تھا۔ وہ بیٹے کو بھی ڈاکٹر بنانا چاہتا تھا۔ اسی لیے اکثر میرے اور اس کے درمیان لڑائی ہو جاتی تھی۔ میں کہتا تھا کہ زبردستی کسی کی شخصیت کو مت بگاڑو۔ اسے اپنی زندگی پر اتنا اختیار تو دو کہ وہ اپنی افتادِ طبع اور رجحان کے مطابق کچھ کر سکے... اکتسابی علم اور فطری صلاحیت میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ غالب کبھی ڈاکٹر نہیں بن سکتا تھا۔ اس کے دماغ میں زبردستی ایم بی بی ایس کی ڈگری ٹھونسنا مشکل تھا۔ وہ فنکار قسم کا آدمی تھا۔ تخلیقی ذہن رکھنے والا... اور بے حد عملی آدمی۔ چنانچہ تم دیکھو کہ وہ کیا بنا۔ اس کی قوتِ ارادی اتنی مضبوط تھی کہ وہ گھر سے نکل گیا۔ ایک ہی لڑکا تھا ماں باپ کا۔ ماں باپ نے اسے اپنی انا اور اپنی ضد پر قربان کر دیا۔ یہ ہمارے معاشرے میں ہوتا ہی رہتا ہے اور والدین کی دلیل ایک ہی ہوتی ہے کہ ہم تمہارا بُرا تو نہیں چاہتے۔ مگر ان کی اچھائی بالآخر بُرائی بنتی ہے۔ غالب لوٹ کر گھر نہیں گیا۔ وہ دونوں ایک حادثے میں مارے گئے۔ میاں بیوی ایڈنبرا میں ہونے والی کوئی عالمی ادارۂ صحت کی کانفرنس اٹینڈ کر کے آ رہے تھے کہ جہاز گر گیا۔ غالب کو یقیناً پتا چلا ہوگا مگر وہ پھر بھی نہیں آیا۔ غالباً اپنے احساسِ جرم اور پشیمانی کے ساتھ وہ آ ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کا گھر ابھی تک مقفل پڑا ہوا ہے۔ دس سال ہو گئے۔ معلوم نہیں اس کا کیا ہوگا۔ اچھی خاصی آٹھ دس لاکھ کی کوٹھی ہے اور بھی سامان ہے مگر اسے کوئی سروکار نہیں۔ دوسرا بھائی ہوتا یا کوئی بہن ہوتی تو اُسے مل جاتا۔ اب لاکھوں کی جائداد غارت ہو رہی ہے۔"

"آپ نے کبھی غالب کو سمجھایا نہیں۔" میں نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا۔ پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے۔ میرے کانوں میں مرزا غالب کی آواز آئی۔ "آج تم نے جانا سکندر کہ میں کون ہوں۔ میں کیا تھا۔ میں کچھ نہیں تھا۔ میں کچھ نہیں ہوں۔ مگر میں غالب ہوں۔"

"ایک بار سمجھانا چاہا تھا۔ وہ غائب ہو گیا۔ دوبارہ بڑی مشکل سے ہاتھ آیا اور اس شرط پر یہاں آنے لگا کہ اس کے والدین اور ان کی چھوڑی ہوئی جائداد کے مسئلے پر بالکل بات نہیں ہوگی۔ میرے پاس کوئی قانونی اختیارات نہیں۔ ایک وارث کی موجودگی میں کوئی بھی فیصلہ کرنے کا مجاز نہیں۔ اور وارث کچھ نہیں کرتا۔ ارے بھائی اگر تم کو یہ سب نہیں چاہیے تو کسی کو دے دو۔ بیچ کر رقم کسی رفاہی ادارے کو دے دو۔ ریڈ کراس کو یا بلڈ بینک والوں کو۔ کوئی وارڈ بنوا دو کسی اسپتال میں۔ ٹرسٹ بنا دو غریبوں کے علاج کے لیے۔ مگر وہ کچھ بھی تو نہیں کرتا۔ خیر چھوڑو۔ کبھی موقع ملے تو خود ہی بات کر کے دیکھنا۔ شاید وہ تمھاری مان لے۔ تم رابعہ کو دیکھنا چاہو گے پہلے۔ مگر میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے غالب نے سب بتا دیا ہے۔"

"کیا بتا دیا ہے؟" میں نے سنبھل کر کہا۔ اسی وقت ڈاکٹر لطیف کی بیوی ٹرے لے کر اندر آ گئی تھی۔

"وہ سب جو ضروری تھا۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "میرے نقطہ نظر سے مجھے تمہارا انتظار تھا کیونکہ تم میری مدد کر سکتے ہو۔"

"رابعہ کے سلسلے میں ہاں" میں نے کہا۔ "وہ اب کیسی ہے؟"

"ویسے تو ٹھیک ہے۔ جسمانی طور پر بالکل صحت مند ہے۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "وقت پر سوتی ہے۔ کھاتی پیتی ہے۔ ایک عام آدمی اُسے دیکھ کر کوئی غلط رائے نہیں قائم کرے گا۔ اگر اسے کسی سے ملوایا جائے گا تو وہ بڑی شائستگی سے ملے گی۔ تعارف کرایا جائے گا تو کہے گی آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ پھر جب بیٹھے جائے گی۔ سوال کیا جائے گا تو صحیح جواب دے گی۔ اُٹھنے کو کہا جائے گا تو اُٹھ جائے گی۔ بیٹھنے کو کہو تو بیٹھ جائے گی۔ اس سے کہو کہ چائے پی لو تو چائے پی لے گی۔ منع کرو کہ چائے مت پیو، شربت پیو تو چائے کا کپ رکھ دے گی اور شربت کا گلاس اُٹھا لے گی۔ اُس نے خود کو مکمل طور پیچھے ہٹا لیا ہے۔ وہ ڈرا کر لیا ہے۔ مطلب یہ کہ ذہنی طور پر اس نے خود کو میرے حوالے کر دیا ہے تو میری اطاعت کرے گی۔ میری بیوی کے سامنے ہوگی تو اس کے تابع ہوگی۔ بالکل ایسے جیسے عامل اور معمول کا رشتہ ہوتا ہے۔ خود معمول کی نہ کوئی سوچ ہوتی ہے اور نہ قوتِ ارادی۔ اس کی اپنی شخصیت بالکل صفر ہو گئی ہے۔ اُس نے مدافعت یکسر ختم کر دی ہے۔ تم بھی اس سے کہو گے کہ رابعہ آگے بڑھو اور اس کھڑکی سے نیچے کود جاؤ۔ تو غالباً وہ کود جائے گی۔ اپنے تمام ذہنی فیصلے وہ خود نہیں کر رہی ہے... تم سمجھ رہے ہو نا میری بات؟"

"جی... مگر ایسا کیوں ہوا؟" میں نے مایوسی کے گھپ اندھیرے میں امید کی ایک کرن تلاش کرنے کی جدوجہد کی۔

"اسباب... ان کا صحیح تعین مشکل ہے۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "بہت سے عوامل تھے۔ اس کی نجی زندگی کے حادثات۔ کچھ جذباتی صدمات۔ شدید اعصابی دباؤ۔ مسلسل دباؤ۔ مگر اس کے علاوہ نروس بریک ڈاؤن میں کچھ... اذیت۔ جسمانی اذیت۔ میری تشخیص کے مطابق اس کے ذہن کو بریک اپ کرنے کے لیے کچھ دوائیں استعمال ہوئی ہیں۔ ایسی بہت سی دوائیں ہیں۔ ان کا اثر وقتی ہوتا ہے مگر اس کیس میں ابھی تک باقی ہے۔"

"اور کب تک باقی رہے گا ڈاکٹر صاحب؟ کیا ایسی دوائیں نہیں ہیں جو اُن کا اثر زائل کر سکیں؟" میں نے کہا۔

"میں محض تحلیل نفسی نہیں کر رہا ہوں۔ یعنی صرف نفسیات کے اصولوں کے مطابق علاج نہیں کر رہا ہوں۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "میں اُسے دوائیں بھی استعمال کرا رہا ہوں اور مجھے یہ بتاتے ہوئے خوشی ہوتی ہے کہ اس کی پروگریس بہت حوصلہ افزا ہے۔ ویری پازیٹو۔"

"کیا اس کے سامنے آپ نے کبھی میرا نام لیا؟" میں نے کہا۔

"میرے متعلق کوئی بات کی؟"

"ہاں۔ لیکن اس کا ریسپونس بہت مبہم رہا۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "وہ کچھ کنفیوز ہو گئی۔ ویسے تو اسے بھی ایک ردِعمل ہی سمجھا جا سکتا ہے کیونکہ کسی اور کے نام پر وہ سوچ میں نہیں پڑتی... ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ خود کو کچھ یاد دلانا چاہتی ہے مگر اس میں ناکام ہے۔ وہ لاشعور کے بند دروازوں کے پیچھے سے دستک سنتی ہے مگر اس کا شعور خوابیدہ ہے۔ وہ دستک کو پہچاننے سے قاصر ہے۔ نام کے ساتھ میموری کی ایسوسی ایشن ضرور ہے۔ صورت کے ساتھ یہ وابستگی زیادہ شدید ردِعمل پیدا کر سکتی ہے۔ میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ تم اوپر جاؤ۔ سیدھے ہاتھ پر دوسرا بیڈروم۔" اس نے ایک زینے کی طرف اشارہ کیا۔ "میں اسی جگہ انتظار کرتا ہوں۔"

میں دھڑکتے دل کو سنبھال کے اُٹھا۔ بے یقینی کے اس عذاب سے میں پہلے کبھی نہ گزرا تھا۔ پہلے کبھی میں نے نہ سوچا تھا کہ ایک وقت ایسا بھی آ سکتا ہے جب رابعہ بھی مجھے پہچاننے گی۔ پہچاننا چاہے گی مگر نہ پہچان پائے گی اور ان سب کی طرح ہوگی جو جانتے ہیں کہ میں مجرم نہیں اور چاہتے ہیں کہ میری مدد کریں لیکن مدد کر نہیں پاتے۔ زینے پر اُٹھنے والے ہر قدم کے ساتھ میں نے ایک دعا مانگی اور اس وقت کے خوف سے مغلوب ہوتا گیا جب میری ترسی ہوئی پیاسی آنکھیں اس کے دیدار کی دولت سے روشنی پائیں گی۔ اس وقت رابعہ کی آنکھوں میں کیا ہوگا؟ اقرار شناسائی یا بے التفات اجنبیت؟ کوئے یار سے سوئے دار تک وسوسوں اور اندیشوں کے کانٹے بچھے ہوئے تھے مگر میں امنگوں اور امیدوں کے پھولوں کی خوشبو کے ساتھ چلتا گیا۔ بند دروازے پہ ایک بار پھر میرے قدم رُکے۔ ٹھہرنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے۔ کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے۔

دستک دیے بغیر میں نے ہینڈل گھمایا اور دروازہ تھوڑا سا کھلا۔ میں نے اندر قدم رکھتے ہی دروازہ بند کیا اور میری نظر نے اُسے دیکھا۔ وہ کھڑکی سے باہر خلا میں نہ جانے کیا دیکھ رہی تھی۔ آہٹ پر وہ پلٹی اور اس کی نگاہ مجھ پر ٹھہر گئی۔ میں ٹھہر گیا۔ میرے ساتھ میرے دل کی دھڑکن ٹھہر گئی۔ وقت ٹھہر گیا۔ مگر ہر انتظار کا لمحہ امیدوں کو شکست دے رہا تھا۔ وہ پیکرِ رعنائی کسی سنگِ مرمر سے تراشے ہوئے مجسّمے کی طرح کھڑی لاشعور کے بند دروازوں کی دستک سن رہی تھی مگر وہ بے بس تھی۔ جیسے نام کے بعد میری صورت سے شناسائی کا احساس بھی اس کے خوابیدہ شعور کو جگانے میں ناکام رہا تھا۔

"رابعہ..." میں نے سخت جدوجہد سے اپنے لہجے کو پُرسکون رکھا۔ "تم رابعہ ہی ہو نا؟"

"میں... ہاں... رابعہ ہی ہوں۔" اُس نے کھوکھلے لہجے میں کسی یقین کے بغیر کہا۔

"کس نے بتایا ہے تمہیں کہ تم رابعہ ہو؟" میں نے کہا۔

"معلوم نہیں... مگر سب کہتے ہیں کہ میں رابعہ ہوں۔" وہ سوچتے ہوئے بولی۔

"میں سکندر ہوں... سکندر بخت..." میں نے کہا۔

اس کا چہرہ بالکل سپاٹ رہا اور اُس کی آنکھیں ویران رہیں۔ پھر اس نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا۔ صرف یہ بتانے کے لیے کہ اسے مجھ سے کوئی اختلاف نہیں ہے اور اگر میں خود کو سکندر بخت کہتا ہوں تو ٹھیک ہے۔

"کیا تم نے مجھے نہیں پہچانا رابعہ؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر کہا۔

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ الجھن کے آثار اس کی آنکھوں میں نظر آتے تھے۔ "میں نے آپ کو... پہلے دیکھا ہے کہیں۔"

"میں تم سے محبت کرتا ہوں رابعہ۔" میں نے جذباتی لہجے میں کہا۔ "یاد کرو، ہم کیا چاہتے تھے... ہم اپنا گھر بنانا چاہتے تھے۔ میں اور تم، محسن اور شہلا نے تو شادی کر لی ہے۔ وہ اتنی پیاری لگ رہی تھی۔"

رابعہ نے پھر آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا اور مان لیا کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اسے وہ تسلیم کرتی ہے۔

"دیکھو رابعہ! کیا تمہیں یاد نہیں کہ تم اور نازو کہاں گئی تھیں۔ تم کو میں نے گامے ماچھی کے پاس بھیجا تھا۔" میں نے کہا۔

"نازو اور گاما ماچھی کون ہیں؟" وہ بولی۔

"گاما ماچھی تو مارا گیا۔ وہ چوہدری دلاور کا ایجنٹ تھا۔" میں نے مختلف ناموں سے اس کے ذہن کو جھنجوڑنا جاری رکھا۔ "اور تم کو اچھی طرح معلوم ہے کہ چوہدری دلاور کون ہے۔"

"ہاں۔ یہ نام میں نے سُنا ہے... وہ کوئی اچھا آدمی نہیں ہے۔" رابعہ کے لہجے میں پہلی بار تھوڑا سا یقین اترا۔

"ہاں رابعہ... وہ ہمارا دشمن تھا۔" میں نے کہا۔ "اسی کی دشمنی کے باعث میرے والد مارے گئے تھے۔ وزیر خان... اور تمہاری والدہ کے انتقال کے بعد اس نے تمہارے گھر کو بم سے اُڑا دیا تھا... اُن کا جنازہ اُٹھتے ہی۔"

کرب کے آثار رابعہ کی صورت پر عیاں ہوئے۔ اس کے دل کے ناسور کو چھیڑ کر میں احساس کو جگانے میں کامیاب ہو رہا تھا۔ "اور رابعہ! اس چوہدری دلاور کے ساتھ استاد پیڈرو نام کا بدمعاش ہے۔" میں نے اپنی کوشش جاری رکھی۔ "اس نے میرے شرافت علی کو قتل کرا دیا تھا اور اس قتل کے الزام میں مجھے گرفتار کرا دیا تھا۔ ان کا ایک ساتھی ڈی ایس پی سراج بھی ہے۔ وہ اب تک بہت سے لوگوں کو قتل کرا چکے ہیں۔ یاد ہے تمہارے پاس لال رنگ کی ایک فاکس ویگن تھی۔"

"ہاں! ایک لال رنگ کی فاکس ویگن تھی... کہاں گئی وہ؟" رابعہ کا لہجہ اب سپاٹ نہیں رہا تھا۔ وہ دُکھی نظر آنے لگی تھی۔

"اسی چوہدری دلاور نے تمہاری فاکس ویگن کو دھماکے سے تباہ کرا دیا تھا۔ وہ تم کو قتل کرانا چاہتا تھا لیکن خدا نے تمہیں بچا لیا تھا۔" میں نے کہا۔

اس کا چہرہ پھر بلینک ہو گیا۔ اس ٹی وی کے اسکرین کی طرح جو بجلی جاتے ہی خالی رہ جائے۔ میں نے اسے اور بہت سے واقعات یاد دلائے۔ بہت سے نام لیے مگر وہ اسی طرح کھڑی رہی۔ ایک وقت میں اس کا ذہن جس حد تک اپنے ماضی کی طرف پیش قدمی کر سکتا تھا کر چکا تھا۔ وہ اب مجھے زیادہ دلچسپی کے ساتھ دیکھ رہی تھی مگر میری باتوں کا اس پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ تاہم میری ملاقات رائیگاں نہیں گئی تھی۔ اسے چوہدری دلاور کا نام یاد آنے لگا تھا اور اسے اپنی فاکس ویگن یاد آ گئی تھی۔ اب ضروری تھا کہ میں اسے پرانی یادوں کے روبرو کروں۔ اسے جانے پہچانے مقامات پہ لے جاؤں۔ اسے محسن اور شہلا اور استاد پیڈرو کی صورت دکھاؤں۔ موجودہ حالات میں فوری کامیابی کی امید نہیں رکھی جا سکتی تھی لیکن اس امید کی بنیادیں استوار ہو گئی تھیں کہ رفتہ رفتہ رابعہ کو ذہنی خود فراموشی کے اس بحران سے نکالا جا سکتا ہے۔ یہ صبر آزما کام تھا اور بلاشبہ اس میں دوا علاج کے بعد سب سے اہم کردار میرا تھا مگر دوسرے لوگوں کو بھی اس جدوجہد میں اپنا اپنا کردار حسبِ ضرورت ادا کرنا تھا۔

"اچھا رابعہ! میں اب جا رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"تم... پھر آؤ گے؟" وہ آپ سے تم پر آ گئی تھی اور اس کا لہجہ التجا آمیز ہو گیا تھا۔

"کیا تم چاہتی ہو کہ میں پھر آؤں؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔" رابعہ نے کہا اور نظر اٹھا کے مجھے غور سے دیکھا۔

"کیوں رابعہ؟" میں نے اس کی آنکھوں میں کوئی آشنا جذبہ تلاش کرنے کی بے سود کوشش کی۔

"تم... اچھے آدمی ہو..." وہ بہت سوچ کر بولی۔ اس تمام عرصے میں اس کی نظر مجھ پر جمی رہی۔ صاف محسوس ہوتا تھا کہ وہ مجھے پہچاننے کی غیر شعوری جدوجہد کر رہی ہے لیکن اس کی یادوں کے زنداں میں تاریکی ہے اور اسے کہیں کوئی کھلا دروازہ نظر نہیں آتا۔ کسی دیوار میں کوئی روزن نہیں اور کوئی دریچہ نہیں۔ وہ اس اندھیرے میں مہرباں آوازوں کی سرگوشی سن سکتی ہے۔

مانوس صورتوں کے نقوش سایوں کی طرح متحرک دیکھ سکتی ہے اور وقت کے ٹوٹے ہوئے رشتوں کی کرچیاں چن سکتی ہے مگر وہ بھٹک رہی ہے اور اس کے لیے آوازوں اور صورتوں کو یکجا کرنا مشکل کام ہے۔ اس کے ماضی کا ہر لمحہ یاد کی ایک تصویر تھا جو تاریخ کی ترتیب اور وقت کے تسلسل کے ساتھ یادداشت کے فریم میں محفوظ تھا۔ ایک زلزلے نے اس تصویر خانے کو تہس نہس کر دیا۔ ہر تصویر اپنے فریم سے نکل گئی اور فریم گڈمڈ ہو گئے۔ اب ہر تصویر کو صحیح فریم میں فٹ کرنا اور فریم کو وقت کی ترتیب کے ساتھ یادوں کے تصویر خانے میں لگانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ چاہت کا ختم نہ ہونے والا جذبہ اپنی شدت اور قوت کے باعث صرف اس حد تک جاگا تھا کہ پسندیدگی کے اظہار کا ذریعہ بن گیا تھا اور وہ یہ کہنے پہ مجبور ہو گئی تھی کہ تم اچھے آدمی ہو۔ اگر میں اس سے پوچھتا کہ وہ مجھے اچھا آدمی کیوں سمجھتی ہے تو وہ زیادہ کنفیوز ہوتی کیونکہ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی کہ ایسا کیوں ہے چنانچہ میں نے اس سے پھر آنے کا وعدہ کیا اور لوٹ آیا۔ اس سے مختصر سی ملاقات نے مجھے بہت سکون اور قرار دیا تھا۔ امید اور یقین دیا تھا اور حوصلہ دیا تھا۔ میں اب ذرا بھی مایوس نہیں تھا۔

"کیسی رہی ملاقات؟" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ وہ ڈرائنگ روم میں میرا منتظر تھا۔ "بہت جلد واپس آ گئے تم۔"

"زیادہ دیر ٹھہرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔" میں نے کہا۔

"کیوں؟ کیا اس نے تمھیں بالکل نہیں پہچانا۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔

"میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔" میں نے کہا۔ اور اپنی گفتگو کا ہر لفظ اس کے سامنے دہرایا۔

"یہ حوصلہ افزا علامات ہیں۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "پھر تم اتنے مایوس کیوں ہو؟"

"شاید اس لیے کہ میں ضرورت سے زیادہ توقعات لے کر گیا تھا۔" میں نے کہا۔

"تمہارا خیال ہو گا کہ تمھیں دیکھتے ہی اس کا ذہنی ردِ عمل شدید ہو گا... اور یہ شاک اسے نارمل کر دے گا۔" ڈاکٹر لطیف مسکرایا۔

"جی... میں کچھ ایسا ہی سوچ رہا تھا۔" میں نے خفت سے کہا۔ "کسی معجزے کی امید رکھنا میری بے وقوفی تھی۔"

"نہیں ینگ مین... اس عمر میں سب ہی امید پرست ہوتے ہیں اور پھر محبت کرنے والے..." وہ ہنسا... "ان کے یقین کی ایک جذباتی بنیاد ہوتی ہے۔ یہ تو نہیں سمجھا جا سکتا کہ وہ بے بنیاد یقین رکھتے ہیں۔ ہم سب اپنی کوشش جاری رکھیں گے۔"

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ کب تک؟" میں نے کہا۔ "جیسے تو امید پر تمام عمر بسر ہو جاتی ہے۔"

"اب تک علم غیب پر کوئی کتاب میڈیکل سائنس کے کسی کورس کے لیے نہیں لکھی گئی۔" وہ بولا۔ "کچھ بیماریاں ایسی ہوتی ہیں کہ ایک اندازے کے مطابق پیشگوئی کی جا سکتی ہے کہ دو چار دن یا دو چار ہفتوں میں صحت حاصل ہو جائے گی لیکن دماغ کا عمل بہت پیچیدہ ہے۔ اس کے سب اسرار و رموز ابھی تک سامنے نہیں آئے۔ اس کی شعوری کیفیت کو کسی حد تک EEG سے سمجھا جا سکتا ہے مگر لاشعور اور تحت الشعور میں کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے یہ ہم کبھی نہ جان سکیں گے۔ تشخیص کے لیے ہم کتنے بھی پیچیدہ آلات اور مشینیں بنا لیں۔ ایکس رے۔ ای سی جی۔ پیتھالوجی۔ ریڈیو گرافی۔ الٹرا سونک اور ایکو گرافی۔ یہ سب ٹسٹ مادی وجود رکھنے والے جسمانی نظام کے لیے ہیں۔ ذہن کا عمل کوئی مادی وجود نہیں رکھتا۔ چنانچہ میں نہیں بتا سکتا کہ ہماری کوشش دو ہفتوں میں بار آور ہوگی دو ماہ میں یا دو سال اور بار آور ہو گی بھی یا نہیں۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" یکلخت میری امیدوں کا ٹمٹماتا چراغ گل ہونے لگا۔ "کیا یہ کیفیت دائمی بھی ہو سکتی ہے؟"

"سب کچھ ہو سکتا ہے ینگ مین۔ خود کو بدترین خبر کے لیے ہمیشہ تیار رکھو۔" وہ بولا۔ "پھر تمھیں ہر خبر ایک خوشخبری لگے گی۔ یہ مت سوچو کہ صرف وہی ہو گا جو تم چاہتے ہو۔ لیکن ویسا ہی ہو جائے تو یو آر لکی... میں بھی سمجھتا ہوں کہ وہ ٹھیک ہو جائے گی مگر ڈاکٹروں کے اندازے بھی غلط ہو جاتے ہیں۔ رابعہ بیمار ہے اور کسی بھی مرض میں یہ ہو سکتا ہے کہ نئی علامات نمودار ہو جائیں۔ اگر تمہارا دعا پر اعتقاد ہے تو تمہارے پاس ایک بہت بڑا سہارا ہے۔ اس کے لیے دعا کرو کہ دوا کارگر ہو۔ ہم کوشش کرتے رہیں گے۔ باقی سب خدا کے ہاتھ میں ہے۔ دوا یا دعا دونوں کا رابعہ کے لیے فائدہ مند ہونا یا نہ ہونا۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں ڈاکٹر صاحب۔" میں نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا میں اسے ہر روز دیکھنے کے لیے آ سکتا ہوں؟"

"بالکل۔ کسی بھی وقت جب تم چاہو۔" وہ بولا۔ "تم بھی ڈاکٹر سے کم تو نہیں ہو۔"

"میرا خیال ہے کہ کل یا جب آپ اسے اجازت دیں۔" میں نے کہا۔ "تو اسے اپنے ساتھ کچھ ایسی جگہوں پہ لے جاؤں جہاں اس کے ذہن کو بہت کچھ یاد آ سکتا ہے۔ اس کی جذباتی وابستگی بہت شدید رہی ہے، بہت طویل رہی ہے ان مقامات سے۔"

میری واپسی تک رات ہو چکی تھی۔ رابعہ سے مل کر جسے دل کو قرار بھی ملا تھا اور میری بے قراری بھی بڑھی تھی۔ میں گھر پہنچا تو طبیعت اداس تھی اور میری نظروں میں رابعہ کی تصویر پھر رہی تھی۔

خاموش۔ جذبات سے عاری چہرہ لیے۔ بے حسی اور جمود کا شکار نظر آنے والی۔ پتھر کی منجمد مورت جس میں کسی سنگ تراش کے فنکار ہاتھوں کی صناعی نے حسن کو مجسم کر دیا ہو۔ کچھ سوئی سوئی۔ کچھ جاگی ہوئی۔ ماضی اور مستقبل کے درمیان بے یقینی کے صحرا میں سرگرداں۔ خود اپنا سراغ پانے کی جستجو میں حیران۔ کانوں میں اس کی آواز گونجتی تھی... تم پھر آؤ گے نا؟ تم اچھے آدمی ہو۔ اس کے اتنے ہی الفاظ طلِ ناصبور کے لیے مژدۂ امید بن گئے تھے۔ امید کہتی تھی کہ آج اس نے دل کے کسی نامعلوم جذبے کی صدا سنی تھی۔ ایک دن اس کا دل اس کی زبان بن کر پکارے گی کہ تم میرے ہو... تم میرے سکندر ہو۔ جو کبھی کسی کے نہ تھے اور نہ ہو سکو گے۔ جیسے رابعہ تمہاری تھی اور ہے... اور رہے گی... مگر وہ دن کب آئے گا۔

محسن اور نیک محمد کے درمیان کسی فضول سی بات پر ٹھنی ہوئی تھی اور شہلا ان کی زبانی جنگ سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہی تھی۔ تنازعہ شہلا کی بات پر شروع ہوا تھا۔ اس نے نیک محمد سے کہا تھا کہ آخر وہ اپنا گھر بسانے کی کیوں نہیں سوچتا۔ استاد کے کچھ عرض کرنے سے پہلے محسن نے خیال ظاہر کیا کہ گھر آباد کرتی ہے کوئی لڑکی اور وہ بدبخت لڑکی ابھی پیدا ہی نہیں ہوئی جو اجڑی صورت والے نیک محمد کی زوجہ کہلا کے دنیاوی عاقبت میں رسوا ہو۔ نیک محمد کے آگ لگ گئی۔ اس نے جواب میں محسن سے کہا کہ اپنی شکل پہلے دیکھ لی ہوتی جو گھسے ہوئے سول والی پشاوری چپل کی طرح ہے جسے کباڑیا بھی نہ لے۔

"اس صورت پر تو حسینانِ عالم فریفتہ ہیں۔ ایک تمہارے سامنے موجود ہے۔" محسن نے اعلان کیا۔ "باقی کے نام صیغۂ راز میں ہیں۔"

"یہ تو احسان ہے شہلا کا کہ تم پہ ترس کھا کے اس نے تمہارا رشتہ قبول کر لیا۔" استاد ٹیڈی نے کہا۔ "میری بہن نہ ہوتی تو تم جھک مارتے رہتے۔"

"تمھاری بہن میرے پاؤں کی جوتی ہے۔" محسن نے ایک جوتے کو تڑ سے فرش پر مارا۔ "محاورے کے مطابق۔"

"یہ جوتی تمھارے سر پڑنی چاہیے۔" استاد ٹیڈی نے کہا۔

"اچھا اپنی بہن کو اٹھا کے میرے سر پہ مار دو۔" محسن نے کہا۔

"لاحول ولاقوۃ..." میں نے ریفری کی طرح ہاتھ اٹھایا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"کچھ نہیں!" محسن نے دانت نکال کے کہا۔ "ایسے ہی وقت گزارنے کے لیے لڑ رہے تھے۔"

"وقت گزارنے کے لیے یہی مشغلہ رہ گیا ہے۔ پھر شادی کیوں کی تھی۔" میں نے ڈانٹ کر کہا۔ "اور لڑنا ہے تو بیوی سے لڑو... کچھ فائدہ تو ہو گا اس ریہرسل کا۔ ورنہ ساری زندگی بغیر لڑے کیسے کٹے گی۔"

"تیری ملاقات کیسی رہی؟" محسن بولا۔ "اس نے جھوٹ کہہ کر چیخ تو نہیں ماری تھی؟"

"نہیں یار۔" میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "وہ تو ٹکٹکی مک دیدم، دم نہ کشیدم کی تصویر بنی رہی۔ حالات امید افزا ہیں۔"

"پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ۔" محسن نے کہا۔ "اگر اللہ نے چاہا تو اس صدی کے ختم ہونے کے بعد تیرا گھر بھی آباد ہو جائے گا۔ ورنہ کتبہ کچھ یوں لکھا جائے گا کہ عمرِ دراز مانگ کے لائے تھے چار دن۔ دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں۔"

"مجھے خوشبوئے پلاؤ آتی ہے۔" میں نے ناک کے راڈار کو گھما کے سوں سوں کی۔ "اور کچھ بوئے کباب۔"

"آج ہماری طرف سے آپ سب کی دعوتِ ولیمہ ہے۔" محسن نے اعلان کیا۔ "کچھ فقیروں مسکینوں کو بھی دینا چاہیے ایسے مواقع پر۔"

"سب میں پکار رہی ہوں سکندر بھائی۔" شہلا نے شرماتے ہوئے اعلان کیا۔

"یہ بھی سمجھا دو کہ پہلا تجربہ ہے۔ سب اپنی ذمے داری پہ کھائیں گے۔" محسن نے کہا۔ "نہ کھانے کا کوئی سوال نہیں۔ کھانے کے بعد تعریف ضروری ہے۔"

چونکہ ابھی کھانے میں دیر تھی اس لیے میں نے محسن کو دوسرے کمرے میں بلا لیا۔ سادھو رام کی حالت پہلے سے بہت بہتر تھی۔ میری غیر حاضری میں اسے کچھ کھانے پینے کا موقع بھی ملا تھا اور آرام کرنے کا بھی۔ تاہم وہ بندھا ہوا تھا اور اس کے حلق میں کپڑا ابھی تھا۔ میں نے یہ کپڑا نکال دیا۔

"سادھو رام! کیا تم زندہ رہنا چاہتے ہو؟" میں نے اس کے قریب بیٹھ کر کہا۔

سادھو رام نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ عملاً خود کو ہمارے رحم و کرم پہ چھوڑ چکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے اپنے اختیار میں کچھ نہیں رہا۔ وہ بازی ہار چکا تھا اور اس کی حیثیت جنگی قیدی سے بھی کم ہے۔ وہ ایسی جگہ ہے جہاں اس کی مدد کے لیے کوئی آ بھی نہیں سکتا اور وہ اگر خود فرار ہو کے جانا چاہے تو کہیں نہیں جا سکتا۔ اس کا کوئی گھر نہیں رہا تھا اور کوئی دوست آشنا نہیں رہا تھا۔ دلریا اور سیوک سب مارے جا چکے تھے اور سائیں پاپڑ والے کا اڈا پولیس اور ملٹری انٹیلی جنس کی تحویل میں تھا۔ اگر وہ ادھر کا رخ بھی کرتا تو پکڑ لیا جاتا اور ہم سے تو وہ کچھ لو اور کچھ دو کے اصول پہ زندگی کا سودا بھی کر سکتا تھا۔ انٹیلی جنس والے اس کے سر میں سے تمام مفید معلومات نچوڑ کر نکال لیتے اور پھر اسے ٹانگ دیتے۔

"یہ ٹھیک ہے سادھو رام کہ یہاں اب تمھارے جینے کے لیے کچھ بھی نہیں رہا۔" میں نے کہا۔ "مگر تم چاہو تو کسی نئے نام سے، نئی جگہ پر نئی زندگی کے اسباب پیدا کر سکتے ہو۔ ہم تمھیں ایک موقع دے سکتے ہیں۔"

"اس موقعے کے ساتھ جو شرط ہوگی وہ مجھے معلوم ہے۔" سادھو رام نے مایوسی سے کہا۔

"کیا تم اب بھی پرانے آقاؤں سے وفاداری کے عہد پر قائم رہنے کو ترجیح دیتے ہو؟" میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ "اس سے تمھیں کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ اگر تمھیں بحفاظت ان آقاؤں کے پاس پہنچا دیا جائے۔ تو یہ بھی بہت گھاٹے کا سودا ہوگا۔ وہ تمھیں زیادہ اذیت دے کر ماریں گے۔ تم ہمیں کچھ بتاؤ یا نہ بتاؤ، وہ اپنے طور پر یقین کرنا چاہیں گے کہ تم وفاداری کے امتحان میں پورے اترے تھے؟ تو بھی وہ تمھیں خلعت فاخرہ اور سند کے ساتھ انعام واکرام سے نہیں نوازیں گے۔ تم ان کے لیے بے مصرف ہو چکے ہو... وہ تمھارا کریا کرم تک نہیں کریں گے کہ تمھاری آتما ہی سُکھی رہے۔"

"ہماری شرط بہت آسان ہے۔" محسن نے کہا۔ "اور یہ موقع تمھیں صرف ہم سے سودا کر کے مل سکتا ہے۔ کسی اور سے نہیں۔"

"تم ان سب کے نام بتاؤ جن کو تم جانتے ہو۔" میں نے کہا۔ "ادھر بھی اور ادھر بھی۔"

"صرف نام بتانے سے کیا ہوگا۔" سادھو رام نے کہا۔

"سب کے پتے تمھیں نہیں معلوم تو کوئی بات نہیں۔" میں نے حوصلہ افزا لہجے میں کہا۔ "جتنے نام پتے یاد آئیں وہ ایک کاغذ پر لکھ کر ہمیں دے دو۔ تم اس کاروبار میں کس کس سے ملتے رہے ہو اور کہاں ملتے رہے ہو؟ یہ کاروبار کب سے جاری ہے؟ تم کب سے شریک ہو؟ کس نے کتنا منافع کمایا؟ پہلے تم پاکستان میں رہنے والوں کے متعلق بتاؤ۔"

"میں... میں سب کو نہیں جانتا۔" سادھو رام بولا۔ "یہ بندوبست ہی ایسا تھا کہ کوئی بھی سب کو نہیں جان سکتا۔"

"یہ ہم سمجھتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "کہ خرابی کا یہ سلسلہ بہت دراز ہے اور ایسے کاروبار میں ہر شخص زنجیر کی صرف ایک کڑی ہوتا ہے جسے ابتدا اور انتہا کی خبر نہیں ہوتی۔ مگر وہ اپنے پیچھے اور آگے والی کڑی سے ضرور منسلک ہوتا ہے۔ کڑی سے کڑی ملانا ہمیں آتا ہے۔ تم صرف ان کے بارے میں بتاؤ گے جن سے تمھارا رابطہ تھا۔ باقی رابطے ہم معلوم کر لیں گے۔"

"تمھاری یادداشت تازہ کرنے کے لیے میں صرف ایک نام لیتا ہوں۔" محسن نے کہا۔ "یہ زنجیر کی پہلی کڑی ہے اور اس کا نام چوہدری ملاور ہے۔"

"اور جہاں تک میری ناقص معلومات کا تعلق ہے۔" میں نے کہا۔ "پاکستان میں اس زنجیر کا دوسرا سرا ایک پولیس افسر ڈی ایس پی سراج ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے ہماری سرحد میں یہ زنجیر اور لمبی ہو۔ ہمیں درمیانی کڑیوں کا سراغ لگانا ہے۔"

"اس میں بھی ہم کسی حد تک کامیاب رہے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "مثلاً ہم ڈی سلوا کو جانتے تھے جو مارا گیا۔ گاما ماچھی بھی درمیانی کڑی تھا۔ ایک استاد پیڈرو ہماری نظر میں ہے۔ جس طرح گامے ماچھی کے اڈے سے ہمیں ڈونگا پتن کا راستہ ملا۔ وہاں سے سائیں پاپڑ والے کا اور کرماں والی کا پتا چلا۔ دلربا اور کرنل جگن ناتھ کے نام معلوم ہوئے۔ تم سے ملاقات ہوئی۔ یہ سب ایک نام جاننے سے ہوا۔ گامے ماچھی کے نام سے۔ اب تمھاری مدد سے ہمیں ایک بھی نیا نام معلوم ہو جائے تو اس سے مزید نام پوچھے جا سکتے ہیں۔"

"اور میرا خیال ہے کہ تم سے ایک نہیں، زیادہ نئے نام معلوم ہو سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ سب تمھیں بتا کے ہم کوئی خطرہ مول نہیں لے رہے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ تم اب کسی کو خبردار نہیں کر سکتے۔ کسی کو نہیں بتا سکتے کہ ہم کتنا جانتے ہیں۔ تمھارے لیے یہاں سے ہماری اجازت کے بغیر زندہ بچ نکلنے کی کوئی صورت ہی نہیں ہے۔ تم خود سوچ لو کہ ہم کس درجہ خطرناک لوگ ہیں اور ہمارے عزائم کیا ہیں۔ ہماری مدد کر کے تم جاں بخشی کا وعدہ لے سکتے ہو مگر یہ یاد رہے کہ مدد میں دھوکے کی ایک فیصد بھی گنجائش نہیں ہوگی... ہم تصدیق کریں گے اور کوئی اطلاع غلط ثابت ہوئی تو یہ معاہدہ ختم ہو جائے گا۔"

"دوسری بات یہ کہ تم جتنا جانتے ہو سب بتاؤ گے۔ ایک فیصد بھی چھپاؤ گے تو پچھتاؤ گے۔" محسن بولا

"ہم تمھیں کل تک سوچنے کا موقع دیتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "تمھاری جگہ میں ہوتا تو تعاون کر کے جان بچاتا۔ پرانے دوست اب بالکل کام نہیں آ سکتے۔ وہ تمھارے بدترین دشمن ہیں۔ ہمارا ساتھ دے کر دیکھو، شاید تمھیں پناہ اور عافیت مل جائے۔"

ہم باری باری بولتے رہے تھے اور ہم نے سادھو رام کو بالکل نہیں بولنے دیا تھا۔ ہمارا مقصد اس کے دماغ میں یہ ڈالنا تھا کہ اس پر زندگی کے سب دروازے بند نہیں ہوئے۔ ایک دروازہ ایسا بھی ہے جس کی چابی ہمارے پاس ہے اور وہ چاہے تو یہ چابی اسے مل سکتی ہے۔ فیصلہ اُسے کرنا تھا۔ ہمارا مقصد کسی دشواری کے بغیر اس سے سب کچھ اگلوانا تھا اور ہمارا مقصد اسے تصویر کا دوسرا رُخ دکھانا بھی تھا۔ میں نے کپڑا دوبارہ اس کے منہ میں ٹھونسا اور ہم دوسرے کمرے میں آ گئے جہاں سے اشتہا انگیز خوشبو براہِ راست ہمارے معدے پر حملہ کر رہی تھی۔ نہ جانے کب سے

ہماری زندگی ایک بیہودہ معمول بنی ہوئی تھی جس میں کسی بات کا کوئی وقت مقرر نہ تھا۔ نہ کھانے کا نہ سونے کا۔ نہ مرنے کا نہ جینے کا۔ وہ وقت خواب کی صورت لگتا تھا۔ ہم گھومتے پھرتے تھے۔ ہوٹلوں میں دعوتیں اُڑاتے تھے۔ قہقہے لگاتے تھے اور مسکراتے تھے اور محبت کرتے تھے۔ چین کی نیند سوتے تھے اور اپنے شب و روز کے ہر لمحے کی مسرت پر مکمل اختیار رکھتے تھے۔ اب تو یہ تھا کہ جہاں جو ملا، کھا لیا۔ نہیں ملا تو گزارا کر لیا۔ پسند ناپسند کا کوئی سوال نہ تھا۔ سوکھی روٹی بھی خواہش سے نہیں ملتی تھی۔ بے خواب راتیں، خوف، پریشانی اور بھاگ دوڑ میں گزرتی تھیں اور جسم مجبور ہو جاتا تھا تو سولی پر بھی نیند کی ضرورت پوری کر لیتا تھا۔

بہت عرصے بعد مجھے یہ پناہ گاہ ایک گھر کی طرح لگ رہی تھی۔ وہ گھر جو بچپن میں مجھ سے بچھڑ گیا تھا۔ پھر کئی سال سفر میں گزرے۔ دیارِ غیر میں گھر کا صرف تصور ساتھ تھا۔ واپس آیا تو بے گھر ہو چکا تھا۔ گھر جانے اور بسانے کی آرزو کو رابعہ نے نئی زندگی بخشی تھی مگر وہ گھر بھی ہنوز ایک خواب تھا جس کی تعبیر کے امکان تک خیالوں کی رسائی بھی نہ رہی تھی۔ تقدیر نے مجھے اور رابعہ کو ملا کے بھی دُور رکھا تھا اور اس کے لیے بھی کوئی گھر نہ چھوڑا تھا۔ انکل رضوی کا گھر۔ رابعہ کی ماں کا گھر۔ فوزیہ کا گھر۔ انکل شیروانی کا گھر۔ نازو اور اکرام شیخ کا گھر۔ استاد ٹیڈی کا گھر۔ سارے گھر عارضی پناہ گاہیں ثابت ہوئے تھے جہاں سے ہم ایک بار نکلے تھے تو لوٹ کر نہ جا سکے تھے۔ یہ مکان بھی ایک ایسی ہی پناہ گاہ تھی مگر یکلخت اسے شہلا نے قدم رکھتے ہی یوں آباد کر دیا تھا کہ اس کی دیواروں کی اجنبیت باقی نہ رہی تھی اور یہ ایک آباد گھر نظر آنے لگا تھا۔ اس نے بڑے سلیقے سے دعوت کا اہتمام کیا تھا اور فرش پر دری بچھا کے اتنے قرینے سے کھانا لگایا تھا کہ میں بہت دیر تک اس منظر کو حیرانی سے دیکھتا رہا۔ ایسی پُرتکلف دعوت کا میں صرف چوبیس گھنٹے پہلے تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

"تو بہت خوش قسمت ہے محسن۔ تجھے تیری منزل مل گئی۔" میں نے کہا۔

"آہ! افسوس جو مزہ منزل کی آرزو میں اور راستے کی مسافت میں تھا وہ نہ رہا۔" محسن نے دردناک لہجے میں کہا۔ "منزل پر پہنچنے کے بعد کیا رہ جاتا ہے۔"

"ابھی وہ ماسے چاچے والی منزل باقی ہے۔" میں نے اُسے یاد دلایا اور محسن قہقہہ مار کے ہنسا۔ شہلا کا رنگ لال پڑ گیا اور وہ اندر بھاگ گئی۔ "یہ تو ایسا سفر ہے جس میں ایک منزل سے اگلی منزل کا نشان ملتا ہے۔" میں نے فلسفیانہ لہجے میں کہا۔ "جب تو صاحبِ اولاد ہوگا تو تیری منزل ہوگی ان کی تعلیم و تربیت۔ جب وہ پرورش

کے مرحلے سے گزر جائیں گے تو ہمارے ساتھ وہی سلوک کریں گے جو ہم نے اپنے والدین کے ساتھ کیا تھا یعنی ہم دنیا سے رخصت ہوں گے تو وہ دنیا کے جھمیلوں میں پڑے ہوئے اور ہم سے بہت دور ہوں گے۔"

"اتنے بدقسمت صرف میں اور تو ہی تھے سکندر۔" محسن نے اداسی سے کہا۔

"نہیں یار! یہ اتفاق ہے یا پھر دنیا کا چلن ایسا ہو گیا ہے کہ آپ بیتی بھی جگ بیتی لگتی ہے۔" میں نے کہا۔ "غالب کے ساتھ بھی ہوا تھا۔"

"غالب کے ساتھ؟" محسن نے کہا۔ "اُس نے تو کبھی کچھ نہیں بتایا۔"

"ہاں۔ لیکن اس ڈاکٹر نے مجھے آج سب کچھ بتا دیا جو رابعہ کا علاج کر رہا ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ غالب کے سرجن باپ کا دوست تھا۔" چونکہ شہلا ابھی کھانا لگانے کے عمل میں مصروف تھی اس لیے میں نے چند منٹ میں مختصراً وہ سب بتا دیا جو ڈاکٹر لطیف سے معلوم ہوا تھا۔ استاد ٹیڈی اور محسن دم بخود سنتے رہے۔ ایک ٹیڈی کی سرگزشت ہی کیا کم عبرت آموز تھی کہ غالب کے افسانۂ حیات کا المیہ عیاں ہو گیا۔ دونوں بڑے سطحی نظر آنے والے، اپنی ذات کے محاسن پر خاموشی کا پردہ ڈال کر رہنے والے، زندگی کے ہر دکھ پر خوش باشی کی مسکراہٹ کا پردہ ڈالے رکھنے والے اور کبھی حرفِ شکایت زباں پر نہ لانے والے لوگ تھے۔ اندر سے ان کی شخصیت کے رنگ بالکل جدا تھے۔ وہ ہم سے زیادہ مردم گزیدہ تھے اور ان کے غم کی جڑیں ان کے وجود کی گہرائی میں اتری ہوئی تھیں مگر کسی نے ان کو روتے نہ دیکھا تھا۔ ان میں اب بھی دوسروں کے غم کا بار اٹھا لینے کی سکت تھی۔ دنیا نے ان کے ساتھ بڑی بے رحمی کا سلوک کیا تھا مگر ان کا دل پھر بھی پتھر نہیں ہوا تھا۔ وہ اب بھی خلوص و مہر و وفا پر یقین رکھتے تھے اور دوستی یوں نبھاتے تھے کہ جان بیچنے کو آئے تو بے دام بیچ دی۔ ظاہر کی آنکھ سے دیکھنے والے کے لیے استاد ٹیڈی ایک بدمعاش تھا اور غالب ایک صحافی مگر ہم نے دیکھا تھا کہ دونوں ہی انسان تھے اور انسانیت کی صفات کی خوبیوں کا حُسن دونوں کے باطن میں جلوہ گر تھا۔

دروازے پر ایک دھماکا ہوا تو ہم تینوں اچھل پڑے جو بڑی بے صبری سے شہلا کے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔

"یہ کون ہو سکتا ہے۔" محسن نے کہا اور ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ میں دوسرے کمرے کی طرف ریوالور لینے لپکا۔

"کون ہے بھئی؟" استاد ٹیڈی نے ڈانٹ کر کہا۔

"ایک اور اُلو کا پٹھا۔" غالب نے دروازے پر لات ماری۔ میں رک گیا اور محسن نے دروازہ کھول دیا۔

"آئیے... آئیے۔ بڑے وقت پر آئے۔" محسن بولا۔ "چشم ما روشن دل ما شاد۔"

"نہ میرا دل شاد ہے اور نہ میری آنکھ روشن ہے۔" غالب نے چلا کر کہا اور اپنا ٹوٹا ہوا چشمہ لہرایا۔ "میں اندازے سے یہاں بیٹھا ہوں۔"

وہ اتنا برہم تھا کہ اس نے دعوت کے سامان کی طرف بھی نہیں دیکھا اور اس خوشبو پر بھی توجہ نہیں دی جو کمرے میں بھری ہوئی تھی۔ اس کی آنکھ کے پاس ایک نیل تھا جو مار پیٹ کا نتیجہ معلوم ہوتا تھا۔

"یہ کیا ہوا چچا غالب؟" میں نے کہا۔

"وہی جو تم لوگوں کے ساتھ رہ کر ہو سکتا ہے۔" غالب نے برہمی سے کہا۔ "اتنا پرانا صحافی ہوں میں۔ اور میری کتنی خدمات ہیں اس اخبار کے لیے۔ اسے فٹ پاتھ پر ٹکے سیر بکنے والے اخبار سے ایک معتبر اور باأثر اخبار بنانے میں میرا خون پسینہ ایک ہوا۔ آج وہ ایڈیٹر کی اولاد چند دن کی غیر حاضری پر مجھے برطرف کرنے کی دھمکی دیتا ہے۔ مجھ سے پوچھتا ہے کہاں مر گئے تھے؟ میں نے کہا مر گیا تھا تو تم نے خبر لی؟ کہنے لگا خبر تو اب لوں گا میں تمہاری بہت اچھی طرح۔ ابھی چھٹی کر دوں گا تو چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا۔ میں نے کہا کہ پھر برطرفی کا نام لیا تو دودھ کی کھیر بنا دوں گا۔ پھر اس نے مکا گھمایا جو میری ناک پر لگا۔" غالب نے پھر ٹوٹی ہوئی عینک کو واقعاتی شہادت کے طور پر پیش کیا۔ "اور میں نے عینک ٹوٹ جانے کے بعد مکا تو اس کے سر پہ مارا تھا مگر لگا اس کے دانتوں پر۔ میں ادھر آگیا۔ وہ دانداں ساز کے پاس چلا گیا۔"

ہنستے ہنستے ہم سب کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔ "اب کیا ہوگا مرزا غالب... تمہارا، اس کا اور اخبار کا؟"

"جو ہونا تھا ہوگیا۔ اب کیا ہوگا۔" غالب نے کہا۔ "کل میں اور وہ دونوں اس واقعے کو بھول جائیں گے۔ اخبار تو نکالنا ہی ہے۔"

"چلو اچھا ہوا۔ نہ لڑائی ہوتی نہ تم دعوتِ ولیمہ میں شرکت کے لیے پہنچتے۔" محسن نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تمہاری کمی واقعی محسوس ہو رہی تھی۔" میں نے کہا۔ "آؤ... بیٹھ جاؤ۔"

"اب تک ہمارے ساتھ دھکے کھاتے رہے ہو یا جوتے۔" استاد ٹیڈی نے کہا۔ "آج پلاؤ زردہ کھا لو۔"

"یار آج اس دشمن کا بھی قلع قمع کرا دو۔" غالب نے مکا لہرایا۔

"پلاؤ زردہ تو اس کے سوئم پر بھی ملے گا۔"

"میں تو سوئم کا انتظار بھی نہیں کروں گا۔ تم مر کے دیکھو۔ اسی دن زردے کی دیگ تقسیم کروں گا اخبار والوں میں۔" ٹیڈی بولا۔

"چلو چلو۔ ہر وقت لڑتے ہو۔" شہلا نے آکر سب کو ڈانٹا۔ "آرام سے بیٹھو۔"

"ہاں۔ آرام سے بیٹھو۔" محسن نے فوراً تائید میں سر ہلایا۔ "جیسا کہ ہماری زوجہ محترمہ نے حکم دیا ہے۔ خلاف ورزی کرنے والے کو دعوتِ ولیمہ سے اٹھا کے باہر گلی میں پھینک دیا جائے گا۔"

"او واہ بھئی واہ..." کسی نے کھلے دروازے میں نمودار ہو کے کہا۔ "کیسی سوہنی خوشبو آرہی ہے۔ ہم نے تو لنگدے سے نظر ماری کہ یہ کیا معاملہ ہے شہنشاہو!"

یہ ہمارا لینڈ لارڈ ٹیکسی ڈرائیور تھا۔ "آؤ بھئی آؤ... تمہاری ہی کسر تھی۔"

"او جی ہم تو آ ہی گئے ہیں۔" وہ جوتیاں اتار کے ہمارے ساتھ آبیٹھا۔ "لیکن دسو تے سہی ایہہ گل کی اے موتیاں والیو۔"

"یہ جو اپنا یار ہے نا۔" میں نے محسن کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ شادی کر کے آیا ہے۔"

لینڈ لارڈ نے غور سے لجائی ہوئی شہلا کو دیکھا۔ "پر... ایہہ تے والد صاحب کے فوت ہونے پر گئے تھے!"

"ہاں جی... مگر وہاں حالات ایسے ہوئے کہ بیوی کو ساتھ لانا پڑا۔" میں نے کہا۔

"اچھا جی... تیریئں کی آکھاں۔" ٹیکسی ڈرائیور نے سر کھجایا۔ "بڑا افسوس ہے... یا بڑی خوشی ہے... چلو جی رب جو کروا لے چنگا کروا لے۔ ماشاء اللہ خیر پر جائی نے سب خود پکایا ہے... واہ بھئی وا... شروع کرو نا موتیاں والیو... یا ہور کسے دا انتظار اے؟"

ہم سب ندیدوں کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ غالباً شہلا کو پہلے سے اندازہ تھا کہ ہم ترسے ہوئے لوگ ضرورت سے زیادہ کھائیں گے خواہ ہمیں ہیضہ ہو جائے۔ یا پھر اندازے کی غلطی کے باعث اس نے زیادہ پکا لیا تھا کہ دو افراد کے اضافے سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ کھانے کے دوران میں بھی ایک جنگ محسن اور ٹیڈی کے درمیان ہوئی۔ ایک کا اصرار تھا کہ میری بہن سے اچھا کھانا کوئی نہیں پکا سکتا۔ محسن نے گرج کے کہا کہ میری بیوی سے اچھا تمہاری بہن نہیں پکا سکتی... پھر شہلا نے محسن کو اس کے الفاظ یاد دلا کے شرمندہ کرنا چاہا جو اس نے اپنے کھانا لگنے سے پہلے کہے تھے۔ محسن نے ڈھٹائی سے جواب دیا کہ وہ ہر بیان سے منحرف ہونے کی ہمت رکھتا ہے۔ درمیان میں باہر سے کسی نے چلانا شروع کیا۔

"اوئے... ایہہ تیرے پیو دی گلی اے۔ ہٹا اپنی ایس ماں فولہ..." یہ ہمارے لینڈ لارڈ کا دیرینہ دشمن دوسرا ٹیکسی ڈرائیور تھا جس کی ٹیکسی پھر مخالف سمت سے نمودار ہوگئی تھی۔ لینڈ لارڈ نے حسبِ عادت اپنی ٹیکسی گلی میں یوں پارک کی تھی کہ راستہ بلاک ہوگیا تھا۔

...مشتعل ہو کے جوابی کارروائی کے لیے اٹھا ہی تھا کہ ٹیڈی نے اسے ...لیا اور خود دروازے تک گیا۔

"یہ کیا بکواس لگا رکھی ہے... شرفاء کا محلہ ہے یہ۔" ٹیڈی ...گرج کر کہا۔

"او بھائی شرفا... یہ ٹیکسی ہٹوا دو... کدھر ہے اس کا مالک..." ...ٹیکسی والا بولا۔

"وہ میو اسپتال میں ہے۔" ٹیڈی نے کہا۔ "گاڑی کو اٹھا کے ...جا سکتے ہو تو لے جاؤ۔"

"میو اسپتال میں؟" دوسرا ٹیکسی ڈرائیور ایک دم فلیٹ ہو ...گیا۔ "کیا ہوا تھا جی اسے... کون سے وارڈ میں ہے؟"

"دل کے وارڈ میں ہے۔" ٹیڈی نے کہا۔ "اس کی گاڑی کو دل ...کا دورہ پڑا تھا۔"

"اوہ... رب خیر کرے۔" دوسرے ڈرائیور نے بدحواسی میں ...گاڑی کو ریورس کیا اور ٹیڈی کی بات پر غور نہ کر سکا۔

ہمارے لینڈ لارڈ نے گلا پھاڑ کے ہنسنا شروع کیا۔ "او واہ جی واہ... کس طرح دوڑ گیا اے پاگل دا پتر... گڈی نوں دل دا دورہ!" اس نے پھر کھانے پر حملہ کیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس ہنگامے میں سادھو رام کی موجودگی نے کوئی مسئلہ پیدا نہیں کیا۔ وہ دوسرے کمرے میں چپ چاپ بندھا پڑا رہا۔ بن بلایا مہمان یعنی ہمارا لینڈ لارڈ جانے لگا تو اس نے شہلا کے سر پہ ہاتھ پھیر کر باقاعدہ دعا دی اور سر سے ٹوپی اتاری۔ اس میں نوٹ بھرے ہوئے تھے۔ اس نے گن کر اکیاون روپے نکالے اور شہلا کو پکڑا دیے۔

"لے لے پتر... او بھئی شادی کوئی بار بار ہوندی اے۔ سانوں وی اک وار ہی ملے سن۔" وہ بولا۔ پھر اس نے باقی نوٹوں کے ساتھ ٹوپی کو احتیاط سے سر پہ جمایا اور باہر نکل گیا۔ اس کی ایک معمولی سی جذباتی حرکت نے ہم سب کو خاموش کر دیا تھا۔ اکیاون روپے نہیں اس کا جذبہ انمول تھا۔ اس کی وضعداری انمول تھی اور خلوص کی سادگی انمول تھی۔ وہ باہر جا کے پھر اندر آیا۔

"اور میاں جی۔" اس نے مجھے مخاطب کیا۔ "تو کدھر لے گیا تھا میری گڈی کو... بیڑہ غرق کر کے لایا... مگر یہ حساب فیر کدی کراں گے... اج تے خوشی دا موقع اے۔" وہ پھر پلٹا اور اپنی گاڑی رسید ھالے گیا۔ مجھے یہ سوچ کر پھر ہنسی آئی کہ اگر دوسرا ٹیکسی ڈرائیور میو اسپتال پہنچا اور دل کے وارڈ میں ہمارے لینڈ لارڈ کو تلاش کرتا پھرا تو مایوس ہو کے لوٹے گا اور سمجھ جائے گا کہ اسے بیوقوف بنایا گیا تھا۔ پیشہ ورانہ مخاصمت اپنی جگہ۔ تھا وہ بھی دل کا اچھا آدمی۔ مگر واپسی پہ اس کی اور ہمارے لینڈ لارڈ کی جنگ دلچسپ ہوگی۔

اس رات کوئی سونے کے موڈ میں نہ تھا۔ رات گیارہ بجے شہلا نے کافی بنائی جو اتنی سرور آور تھی کہ آسودگی اور راحت کا احساس میرے رگ و پے میں اترنے لگا۔ وقت بہت ناقابلِ اعتبار تھا۔ آج اس نے سب کو ملا دیا تھا اور سب کچھ دے دیا تھا۔ ایک رابعہ کی کمی کا احساس سب کو تھا لیکن عمداً کسی نے اس کا نام نہیں لیا تھا۔ وہ ہماری طرح خوش ہو سکتی تو ہم اسے بھی لے آتے مگر اب دل کی تسلی کے لیے یہ خیال غنیمت تھا کہ وہ محفوظ ہے۔ جدا ہیں آج اگر ہم تو کل ہم ہوں گے۔ یہ چند روزہ جدائی تو کوئی بات نہیں۔ یہ کس نے کہا تھا؟ یہ مجھے فوزیہ نے لکھا تھا۔ وقت کی راہیں بدل گئی تھیں اور منزلیں بدل گئی تھیں۔ وقت ہر گھڑی ہر لمحہ آدمی پہ حاوی ہے۔ وقت آدمی کی تقدیر ہے۔ ناقابلِ فہم، غیر یقینی، خیال کی گرفت میں نہ آنے والا۔

ہم نے محسن اور شہلا کو مشورہ دیا تھا کہ وہ ایک دو دن کے لیے کسی ہوٹل میں کمرا لے لیں کیونکہ یہاں سادھو رام کی موجودگی سب سے بڑا فتنہ تھی۔ ایک کمرے کو ہم حوالات کے طور پر استعمال کر رہے تھے اور وہاں کسی کا رات کو جاگتے رہنا ضروری تھا خواہ یہ کام باری باری کرنا پڑے۔ اس کے علاوہ ہم پانچ افراد تھے۔ ہمارا سامان تھا اور کمرے زیادہ بڑے نہیں تھے لیکن شہلا اور محسن نے تنگی میں گزارا کرنے کو ترجیح دی۔ شہلا تو کسی دوسرے گھر میں جانے کے لیے بھی تیار نہیں تھی مگر میں نے اسے باتوں سے قائل کر لیا۔

"یہ بھی کوئی گھر ہے۔" میں نے کہا۔ "تمہارے لیے ہم ایسا گھر لیں گے جسے تم واقعی گھر بنا سکو۔ اس گھر میں جس میں ہم سب آرام سے رہ سکیں، اسے تم اپنی مرضی سے سجانا۔ سارا سامان خود خریدنا۔ فرنیچر، پردے، برتن، وہ تمہارا اور محسن کا گھر ہوگا۔ ایم آر ایس کا ہیڈ کوارٹر نہیں ہوگا۔ اسے ہم سب ہر خطرے سے اور ہر آفت سے محفوظ رکھیں گے۔ جب ہم وہاں آئیں گے تو اپنے ساتھ کوئی مسئلہ نہیں لائیں گے۔ وہاں ہم پیار لے کر آئیں گے۔ خوشی لے کر آئیں گے۔"

"جیسے کہ بھائی اپنی بہن کے گھر جاتے ہیں تو خالی ہاتھ نہیں جاتے۔" استاد ٹیڈی نے کہا۔

"ہاں! اور ہم سکھ چین، خوشی اور آرام کے لیے وہاں آئیں گے۔" میں نے کہا۔ "ہماری ذمے داری اب بہت بڑھ گئی ہے۔ پہلے بھی ہم ایک دوسرے کے محافظ تھے مگر اب محسن کو تمہارے لیے اور تم کو محسن کے لیے جینا ہے اور ہمیں تمہارے گھر کی حفاظت بھی کرنی ہے۔ ہم تمہارے خطرات اور تمہارے مصائب کا بار اٹھا سکتے ہیں۔ یہ نہیں کر سکتے..."

"کیا نہیں کر سکتے۔" محسن نے میری بات کاٹ دی۔ "تم یہ سمجھتے ہو کہ اب میں گھر میں بیٹھ جاؤں گا تو تمہارا خیال غلط ہے۔ میری زندگی کی ذمے داری تم سب نے بانٹ لی ہے تو پھر مجھے کس بات

کا غم۔ مجھے تم ایم آر ایس سے خارج نہیں کر سکتے۔"

"چپ کر کے سو جاؤ، ایم آر ایس کے بچو۔" غالب نے آنکھیں کھول کر کہا اور تب ہمیں احساس ہوا کہ وہ جہاں بیٹھا تھا، وہیں لڑھک کر سو چکا ہے۔ استاد ٹیڈی کچھ کہنے والا تھا کہ میں نے اُسے منع کر دیا۔ وہ رات ہم نے باری باری جاگتے اور پہرا دیتے گزاری۔ صبح شہلا نے پھر ایک سگھڑ اور امورِ خانہ داری میں ماہر بیوی ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے سب کے لیے بہترین ناشتا تیار کیا۔ ہم نے اس دن کے کام تقسیم کر لیے۔ استاد ٹیڈی نے سادھو رام کے سونے کو ٹھکانے لگانے کی ذمے داری قبول کی۔ جتنا سونا خود استاد ٹیڈی کے پُراسرار صندوق میں تھا اسے وہ پہلے ہی صحن میں دفن کر چکا تھا۔ اس مختصر سے غریبانہ گھر میں وہ سونا بہت محفوظ تھا اور ایسے وقت میں ہمارے کام آسکتا تھا جب ہمارے وسائل باقی نہ رہیں۔

"یہ ہمارے مستقبل کی ضروریات کے لیے ایک ضمانت رہے گا۔" میں نے کہا۔ "اگر کبھی ہمیں اچانک بھاگنا پڑا تب بھی بعد میں ہم ہی اس خزانے کو نکالیں گے۔ ہماری جگہ کوئی بھی آئے، اسے مدفون خزانے کا سراغ بھی نہیں ملے گا۔"

"اور اگر ہم نہ آسکے؟" غالب نے کہا۔

"کب تک نہیں آئیں گے؟" میں نے کہا۔ "اور اگر ایک نہ آیا تو دوسرا آئے گا، تیسرا آئے گا۔"

"یہ خطرہ تو بہرحال رہے گا کہ اس کچے صحن میں کوئی بھی نئی عمارت کے لیے بنیادیں کھودے تو سونا نکال لے۔"

"بنیادوں کی حد تک کوئی خطرہ نہیں۔" ٹیڈی نے کہا۔ "میں نے اُسے چار فٹ کی گہرائی میں دفن کیا ہے۔"

"کسی نے ہینڈ پمپ لگایا یا کنواں کھودا تو..."

"اچھا تم بیٹھ جاؤ یہاں ڈنڈا لے کر۔" ٹیڈی نے بھنّا کے کہا۔ "جو بنیادیں کھودے گا یا کنواں کھودے گا وہ پہلے تمہاری قبر کھودے گا۔"

"تمہارا خزانہ ہے تم بیٹھ جاؤ اس پر ناگ بن کر۔ اب تک بیٹھے ہی تھے۔" غالب نے آگ بگولا ہو کے کہا۔

میں نے اُن کی لڑائی فوراً بند کرا دی۔ "جو ہمارے مقدر میں ہوگا وہی ہوگا۔ ابھی تو نیک محمد تم جاؤ، یہ سونے کے زیورات کسی کو دے آؤ۔ ان سے بھی پچپن ساٹھ ہزار ضرور ملیں گے۔ پھر آج رات کو اسی صحن میں دوسری جگہ انڈین کرنسی کو گاڑ دو۔ اس کی بھی جب ضرورت پڑے گی تب ہی کام آئے گی۔ ہوسکتا ہے ہمیں زنجیر کے دوسرے کنارے تک پہنچنے کے لیے ہندوستان سے گزرنا پڑے اور مشرقی پاکستان تک جانا پڑے۔ وہاں بھی انڈین کرنسی چل جاتی ہے۔"

"میرے لیے کیا حکم ہے سردار؟" محسن نے غیر موجود مونچھوں پر تاؤ دے کر کہا۔

"تم کوئی اچھا سا مگر محفوظ گھر دیکھو۔" میں نے کہا۔ "شہلا کو ساتھ رکھو۔ اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل۔"

"ناقص العقل۔" محسن نے کہا۔

"تم دونوں بیس ہزار روپے لے جاؤ۔" میں نے کہا۔ "آدھی رقم سے مکان کا ایڈوانس دو۔ آدھی سے ضرورت کا سامان خریدو۔ بیوی کو شاپنگ کراؤ۔ اس کی پسند سے سب چیزیں لو اور اس گھر میں پہنچ کے شام تک یا رات تک واپس آجاؤ۔ گھومو پھرو۔ میں آدھی رقم لے کر جاتا ہوں اور کوئی گاڑی دیکھتا ہوں۔ اس کے کاغذات وغیرہ مکمل کراتا ہوں... اور مرزا غالب..."

"غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں!" وہ مُنہ بنا کے بولا۔ "ہم تو میاں یہاں سو رہے ہیں لمبی تان کے۔"

"پھر اُٹھ قامت۔" استاد ٹیڈی نے کہا۔ "اگر غیرت والے ہو تو..." اور فوراً باہر نکل گیا ورنہ غالب اس کے پیچھے لپکا تھا۔

"ٹھیک ہے چچا غالب۔" میں نے کہا۔

"یار یہ کیا بکواس لگا رکھی ہے کل سے تم نے... میں چچا ہوں تمہارا؟" غالب نے دھرنا مار کے بیٹھتے ہوئے کہا۔ وہ ٹیڈی کے خلاف موثر جوابی کارروائی نہ کر سکنے کے باعث جھلایا ہوا تھا۔

"اچھا تایا غالب۔ تم آرام کرو۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "تمہیں رات کو جاگنا ہوتا ہے۔ گھر پر بھی کسی کو سادھو رام کی حفاظت کے لیے رہنا تو تھا۔ بس ذرا محتاط اور چوکس رہنا۔"

"یہ نہ ہو کہ واپسی پر معاملہ الٹا ملے۔" محسن نے اُسے چھیڑنے کے لیے کہا۔ "تم بندھے پڑے ہو اور سادھو رام..."

"جاؤ بابا جاؤ! کیوں فقیروں سے دل لگی کر کے بددعا لیتے ہو۔" غالب نے ہاتھ جوڑ کے کہا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ ہم سب اُسے چھیڑنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ آدھے گھنٹے کے اندر اندر ہم سب اپنے اپنے راستوں پر نکل چکے تھے۔ میں نے محسن اور شہلا کو ایک ساتھ رکشا میں روانہ ہوتے دیکھا۔ انھوں نے پلٹ کر ہاتھ ہلایا اور میں ان کے مسرت سے دمکتے چہروں کو دیکھتا رہا۔ شہلا کے رنگ روپ میں صبحِ بہار کی تازگی اتر آئی تھی اور وہ ایک دوسرے کو پالینے کی خوشی کے احساس سے سرشار تھے۔ ان کی خوشی کو قائم و دائم رکھنا خدایا! میں نے چلتے چلتے دعا کی۔ اگر ضرورت ہو تو میرے مقدر کی خوشیاں بھی ان کے دامن میں ڈال دینا۔ میں تو ابھی اس خوشی سے بہت دور ہوں اور اپنی محرومی کے دُکھ سے سمجھوتا کر کے بھی جی سکتا ہوں۔

گاڑی خریدتے ہوئے مجھے اچانک رابعہ کا خیال آیا۔ میں اس سے پہلے تین شوروم دیکھ چکا تھا۔ چوتھے شوروم میں مجھے سرخ رنگ کی ایک فاکس ویگن نظر آئی۔ ایک لمحے کے لیے میری نظر کو میرے تصور نے فریب دیا اور مجھے یوں لگا جیسے یہ وہی

گاڑی ہے جس میں رابعہ پہلی بار میرے پاس آئی تھی۔ نیلے آسمان کے رنگ کی ساری باندھے جس پر زرد پھول ستاروں کی طرح جگمگا رہے تھے اور جس میں اس کا چہرہ ماہتاب کی طرح روشن نظر آتا تھا۔ اسی گاڑی میں ایک رات میں اور رابعہ شہر کی رات کی تنہائی میں سرگرداں رہے تھے۔ وہ رات بھی ماضی کا قصہ بن گئی تھی اور یادوں میں زندہ تھی لیکن وہ گاڑی دوسرا جنم پا کے میرے سامنے آگئی تھی۔ رابعہ کو یہ گاڑی یاد تھی۔ اس کو دیکھ کر اُسے اور بہت کچھ یاد آسکتا تھا۔ اگر میں اس کے لیے ایک ویسی ہی ساری خرید کر لے جاؤں اور اسے کہوں کہ میرے ساتھ چلے۔ شاید آج کی رات پھر میں گزرے ہوئے وقت کی یادوں کو رابعہ کے رُوبرو کر سکوں۔

"آپ کو فوکس ویگن پسند ہے تو اس سے اچھی حالت میں نہیں ملے گی۔" ڈیلر نے میری محویت کو دیکھ کر کہا۔

"جی... ہاں... اس کی قیمت بتائیے۔ سودے بازی نہیں ہوگی۔ بس ایک اور بالکل آخری بات کیجیے۔" میں نے کہا۔

"دیکھیے جناب! یہ ایک خاتون وکیل کی گاڑی ہے۔" ڈیلر بولا۔

"کس خاتون وکیل کی؟" میرا دل ایک دم دھڑکا۔ لاہور میں کئی عورتیں وکالت کر رہی ہیں۔ میں نے خود کو سمجھایا۔

"مس رابعہ قاری ایڈووکیٹ۔" ڈیلر نے کہا۔ "ان کو سولہ ہزار کی آفر مل چکی ہے۔ سترہ میں آپ لے جائیں۔"

یکلخت مجھے یوں لگا جیسے میں خطرے کے حصار میں داخل ہوگیا ہوں۔ وہ ڈیلر بھی یقیناً ایک شکاری تھا یا کسی شکاری کا ایجنٹ تھا۔ یہ کوئی دھوکے کا جال تھا ورنہ یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ جو گاڑی بم کے دھماکے سے پُرزہ پُرزہ ہوگئی ہو وہ اپنی اصل صورت میں پھر نمودار ہو جائے اور اس کے حقوقِ ملکیت، رجسٹریشن نمبر وغیرہ سب وہی رہیں۔ میں نے اپنی بے نیازی کا پُراعتماد انداز برقرار رکھا اور گاڑی کو ہر طرف سے گھوم پھر کر دیکھنے کے بہانے چاروں طرف ایک نگاہ ڈالی کہ خدانخواستہ میرے آس پاس دشمن چھپے نظر آئیں تو میں جنگ کے لیے تیار ہو جاؤں۔

"اس کے کتنے اونر تھے پہلے؟" میں نے اپنی جانب کا دروازہ کھول کے اندر جھانکا۔ اندر سیٹ کور تک وہی تھے۔

"یہ فرسٹ اونر کار ہے صاحب۔" ڈیلر بولا۔

"مالک کیوں بیچ رہی ہیں؟" میں نے کہا۔

"انھوں نے جاپانی کار لے لی ہے۔ ٹویوٹا کورونا مارک وَن۔" ڈیلر بولا۔

"آئی سی۔ آپ ان سے واقف معلوم ہوتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "کہاں مل سکتی ہیں وہ؟"

"اُن سے مل کر آپ کو کیا لینا ہے؟" ڈیلر بولا۔ "گاڑی پسند کیجیے اور لے جائیے۔"

میں مسکرایا۔ "آپ تو کمیشن ایجنٹ ہیں۔ جس کی گاڑی ہے اُن سے ٹرانسفر لیٹر تو لینا ہی ہوگا۔"

"وہ ہمارے پاس ہے۔ اوپن لیٹر۔" وہ بولا۔ "ہم ان کو رقم ادا کر کے تمام کاغذات لے چکے ہیں۔ آپ کو ٹرانسفر کرا کے دیں گے، اپنی ذمے داری پر جناب۔"

"وہ میں کرا لوں گا۔" میں نے کہا اور اپنی نظر ہر طرف رکھی۔ شو روم کے آس پاس کوئی بھی نہیں تھا۔ "آپ مجھے کاغذات دکھا دیں۔"

ڈیلر اندر گیا اور کاغذات اُٹھا لایا۔ یہ اوریجنل کاغذات تھے۔ اسی گاڑی کے کاغذات جو رابعہ کے پاس تھی۔ مجھے شامتِ اعمال یہاں لے آئی تھی۔ میں سب سمجھ رہا تھا مگر مجبور تھا۔ میں اس گاڑی کو چھوڑ نہیں سکتا تھا۔

"آپ اس کا انجن نمبر اور چیسس نمبر چیک کر لیں۔" ڈیلر نے کہا۔

میں نے اناڑی پن کا مظاہرہ کیا اور انجن میں نمبر تلاش کرنے کے بہانے اس کے پُرزوں کو پہچاننے کی کوشش کرتا رہا۔ رابعہ کی گاڑی کے ایئر کلینر پر درمیان میں ایک ڈینٹ تھا۔ اس میں نیا کاربوریٹر ڈالا گیا تھا۔ اس کے کوائل پر سفید اسپرے پینٹ تھا۔ جو انجن میرے سامنے تھا اس میں یہ پہچان کی نشانیاں نہیں تھیں لیکن انجن پر نمبر وہی تھا۔ آخری چیز چیسس نمبر تھا۔

"چیسس کا نمبر فاکس ویگن میں پیچھے والی سیٹ کے نیچے ہوتا ہے صاحب۔" ڈیلر نے کہا۔ گاڑی کا دروازہ کھول کے ڈرائیور کی سیٹ کو آگے جھکایا اور پیچھے والی سیٹ اٹھائی۔ اندر روشنی کم تھی مگر میں نے جعلسازی کے نشانات دیکھ لیے۔ یہ کسی دوسری گاڑی کا چیسس تھا جسے رگڑ کر مٹانے کے بعد اسی جگہ نئے نمبر پنچ کیے گئے تھے۔ میرا ذہن بڑی تیزی سے کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دھماکے سے گاڑی کا چیسس تباہ ہوگیا تھا اور باڈی کے پرخچے اڑ گئے تھے۔ چیسس اور باڈی دوبارہ نہیں بنائے جاسکتے تھے۔ انجن پیچھے تھا۔ اس کو جزوی نقصان پہنچا۔ انجن کے باہر کے حصے یقیناً تباہ ہوگئے ہوں گے۔ وائرنگ، ڈسٹری بیوٹر کیپ اور کوائل۔ سیلف اور کاربوریٹر وغیرہ۔ لیکن درمیانی حصہ جس میں اسپارک پلگ لگتے ہیں اور نمبر ہوتا ہے محفوظ رہا ہوگا۔ کسی نے اسی حصے کے ساتھ باقی سب پُرزے ڈال لیے۔ باڈی کسی اور گاڑی کی تھی۔ اس کا اصل نمبر مٹا دیا گیا اور رابعہ کی گاڑی کا چیسس نمبر پنچ کر دیا گیا۔ کاغذات شاید گاڑی کو تباہ کرنے والوں نے پہلے ہی نکال لیے تھے۔ اب اسی نمبر اور نام سے دوسری گاڑی کھڑی کر دی گئی ہے۔ اس کی نمبر پلیٹ بھی نئی بنوا کے لگا دی گئی ہے اور اب چیکنگ ہو تب بھی کوئی نہیں کہہ سکتا کہ جعلسازی کہاں ہوئی ہے۔ چیکنگ

میں بھی دیکھنے والے صرف کاغذات دیکھتے ہیں۔ رجسٹریشن، اونر شپ سرٹیفکیٹ، انشورنس، ڈرائیونگ لائسنس، انجن نمبر کون دیکھتا ہے اور گاڑی میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو باہر نکال کے سیٹ کے نیچے جعلی اور اصلی نمبر کے فرق کو دیکھنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

لیکن جو سوال میرے ذہن میں تھا وہ کچھ اور تھا۔ یہ سب کارروائی کس نے کی تھی؟ کسی کباڑیے نے گاڑی کا ڈھانچہ اٹھا لیا اور کسی میکینک کو بیچ دیا۔ نہیں... میکینک کو جعلسازی کر کے ایک ختم ہو جانے والی کار کو پھر زندہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اور پھر کباڑیے نے کاغذات کہاں سے حاصل کیے۔ یہ کام تو اسی نے کیا جس نے کاغذات چرا لیے تھے۔

"پولیس صاحب! اسٹارٹ کروں گاڑی؟" ڈیلر نے میرے تذبذب کو دیکھ کر کہا۔

"کرو!" میں نے سر ہلایا۔

ڈیلر نے چابیاں میری طرف بڑھائیں "آپ ٹرائی لے لیں۔ چکر لگا آئیں۔"

"نہیں۔ تم چکر لگا کے دکھاؤ۔" میں نے کہا۔ میرے ذہن میں اگنیشن کے ساتھ ہی دھماکا ہونے کا خیال بھی تھا۔ اگر یہ ولاور اینڈ کمپنی کا ایجنٹ تھا اور یہ چکر انھوں نے چلایا تھا تو سب کچھ ہو سکتا تھا۔

"آپ ساتھ تو بیٹھیں گے۔" ڈیلر نے کہا۔ اس نے فرض کر لیا تھا کہ مجھے ڈرائیونگ نہیں آتی یا میں خریدنے سے پہلے کسی گاڑی کو ڈرائیو کرنے کا رسک لینے والوں میں نہیں ہوں۔ میرے انکار نے اُسے حیران کیا۔

"میں اکیلا گاڑی لے جاؤں اور چلا کے لے آؤں؟" وہ بولا۔ "ایسے آپ کو کیا پتا چلے گا صاحب!"

"پتا چل جائے گا۔" میں نے کہا۔ "گاڑی چلے گی تو چلتی ہوئی نظر آئے گی۔ چلتی کا نام گاڑی۔" میرا جواب سخت احمقانہ تھا لیکن میں ڈیلر کا ردِ عمل دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے حیرانی سے سر ہلایا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ بلا ارادہ میں چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے دروازہ بند کیا اور چابی نکال کر میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرایا۔ پھر اس نے اگنیشن سوئچ میں چابی لگائی۔ میں نے ہاتھ سے گاڑی کے کاغذات نیچے گرا دیے اور انھیں اٹھانے کے بہانے نیچے جھکا۔ اس طرح میں کم سے کم چھ گاڑیوں کے پیچھے ہو گیا۔ میں ابھی جھکا ہوا ہی تھا کہ میں نے انجن کے گرجنے کی آواز سُنی۔ میں نے بے یقینی میں چند سیکنڈ گزارے اور پھر آہستہ آہستہ سیدھا ہو گیا۔ گاڑی قطار سے نکل کر سڑک پر چلی گئی تھی۔ کوئی دھماکا نہ ہونے سے مجھے خفت سی محسوس ہو رہی تھی۔ میرے ذہن میں مار دھاڑ، قتل اور غارت گری سے بھری ہوئی فلموں کے مناظر تھے۔ جاسوسی ناولوں کے سین تھے اور وہ سب کچھ تھا جو افسانوی لگتا تھا مگر میرے ساتھ ہو چکا تھا۔ گاڑی میری نظروں کے سامنے سڑک پر جا رہی تھی اور میں اُسے بیوقوفوں کی طرح دیکھ رہا تھا۔ نہ جانے کیوں اب بھی مجھے کسی انہونی کے ہونے کی امید تھی۔ ممکن ہے گاڑی کے پہیے نکل جائیں یا اس کے بریک فیل ہو جائیں۔ لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ گاڑی جو میری نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی کسی راؤنڈ اباؤٹ سے لوٹی اور پھر میری آنکھوں کے سامنے سے مگر دوسری جانب کی سڑک پر دوڑتی ہوئی گزری۔ ڈیلر نے مجھے متوجہ کرنے کے لیے ہاتھ ہلایا اور سیدھا گزر گیا۔ چند منٹ بعد وہ دائیں طرف سے نمودار ہوا۔ اس نے گاڑی کو میرے سامنے فاتحانہ انداز میں یوں روکا جیسے وہ کسی تجرباتی خلائی پرواز کے بعد کامیاب لوٹا ہے۔ اُس نے چابی میرے ہاتھ پر رکھ دی۔

"اب کیا خیال ہے جناب؟" وہ بولا۔ "لے دن گاڑی ہے۔ اگر آپ میری مانیں..."

"میں نے تمھاری مان لی ہے۔" میں نے کہا اور جیب سے دس دس ہزار کی دو گڈیاں نکالیں۔ اس میں سے تین ہزار الگ کیے اور باقی اُسے تھما دیے۔ "گن کر اپنی تسلی کر لو اور پھر میرے ساتھ چلو۔"

"میں چلوں؟ کہاں صاحب۔" وہ رقم گنتے ہوئے بولا۔ "رسید تو میں ابھی دیتا ہوں۔"

"تم نے کہا تھا کہ رجسٹریشن آفس تک تمھاری ذمّے داری ہے۔" میں نے کہا۔ "وہاں کوئی گھپلا ہو گا تو کون ذمّے دار ہو گا؟"

"ذمّے داری تو ہم لیتے ہیں۔ لیکن میرا کمیشن..."

"تمھاری وکیل صاحبہ کو سولہ کی آفر ملی تھی۔ ان کو ساڑھے سولہ دو۔ باقی تمھارا کمیشن۔" میں نے کہا۔ "اور اب چلو..."

اس نے رقم اپنے آفس کی تجوری میں بند کی اور میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ مجھے وہ آدمی بالکل بے ضرر لگا۔ یہ اس کی اداکاری نہیں تھی۔ اسے شاید کچھ معلوم ہی نہیں تھا۔ اگر معلوم تھا تو صرف یہ کہ چیسس نمبر بدلا گیا ہے مگر یہ اس کے لیے پریشانی کی بات نہیں تھی۔ اُسے ٹرانسفر کی ساری کارروائی کسی ایجنٹ کو سو روپے دے کر مکمل کرانی تھا۔ چیکنگ کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ میں نے آدھے راستے میں گاڑی روک کر ریوالور نکال لیا۔

"یہ... یہ کیا ہے صاحب؟" اس کی زبان ریوالور دیکھ کر لڑکھڑانے لگی۔

"یہ گاڑی کس کی ہے؟" میں نے کہا۔ "تمھارے پاس کس طرح آئی...؟ سچ سچ بتا دو گے تو چھوڑ دوں گا، ورنہ تمھاری لاش گرا کے نکل جاؤں گا۔"

اس نے بہ آوازِ بلند کلمہ پڑھا۔ "دیکھیں صاحب! جس نے گاڑی دی تھی اس نے اتنا ہی بتایا تھا۔"

"وہ خاتون ایڈووکیٹ مر چکی ہے۔" میں نے کہا۔ "کاغذات ملی ہیں یا انجن بھی وہی ہے مگر باڈی وہ نہیں ہے۔ چیسس کا نمبر بدلا گیا ہے۔ مگر رنگ، نمبر پلیٹ، سیٹ کور سب وہی ہیں۔"

وہ بھونچکا رہ گیا۔ "آپ نے... آپ نے دیکھ لیا تھا کہ نمبر میں گڑبڑ ہے... قسم خدا کی..."

"قسم مت کھاؤ۔" میں نے ریوالور اس کی پسلیوں میں چبھو دیا۔ "نام بتاؤ اس کا جو یہ گاڑی لایا تھا... میں دس تک گنوں گا۔"

"یا میرے خدا... اب کدھر جاؤں..." وہ بلبلانے لگا... "الریح نے مروا دیا مجھے... صاحب میں اس کو نہیں جانتا... لیکن ایک اور شخص بھی اس کے ساتھ آیا تھا جو اس کو استاد پیڈرو کہہ رہا تھا۔"

"استاد پیڈرو..." میں بُری طرح چونکا۔ "تم کو اچھی طرح یاد ہے؟"

"بالکل صاحب... یہ نام ذرا عجیب لگا تھا مجھے... اس نام کی تو ایک انڈین فلم تھی۔" ڈیلر بولا۔ "اس میں شیخ مختار کے ساتھ بیگم پارہ تھی۔ اسی لیے مجھے یاد رہ گیا۔ انھوں نے کہا تھا کہ پندرہ سے اوپر جتنے ملیں میرے... لیکن انھوں نے کہا تھا کہ خریدار کو وہی بتانا ہے جو ہم کہیں اور جب کوئی اس قسم کا خریدار آئے... انھوں نے آپ کی تصویر دکھائی تھی صاحب... تو ہمیں بتا دینا۔"

"تم ان کو کیسے بتاتے؟" میں نے کہا۔ "وہ اپنا پتا یا فون نمبر کچھ دے گئے تھے؟ مگر پہلے استاد پیڈرو کا حلیہ بتاؤ؟"

ڈیلر نے جو حلیہ بتایا وہ بالکل ٹھیک تھا۔ "وہ ہر شام معلوم کرنے آتے ہیں... یا اُن کا فون آ جاتا ہے۔"

میرے اندیشے بے بنیاد نہیں تھے۔ شکاری جال پھیلا کے انتظار کر رہے تھے۔ شکار کا پھنس جانا کبھی یقینی نہیں ہوتا لیکن کامیاب شکاری کا صبر اور حوصلہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ بالآخر وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہے تھے۔ انھیں معلوم ہو چکا تھا کہ ہم پُرانی گاڑیاں خریدتے ہیں۔ انھیں بدلتے رہتے ہیں اور چھوڑ بھی دیتے ہیں مگر اس سے زیادہ اہم یہ بات تھی کہ وہ لال رنگ کی اس فاکس ویگن سے میری جذباتی وابستگی کو سمجھتے تھے۔ ان کا یہ خیال درست تھا کہ کبھی میں اس گاڑی کے سامنے سے گزروں گا تو میرے قدم خود ہی رُک جائیں گے۔ ڈیلر کو انھوں نے جو سمجھایا تھا اس میں کوئی بات غلط یا خطرے کی نہیں تھی کیونکہ کاغذات اصل تھے اور ان پر واحد اونر کا نام بھی وہی تھا جو اس نے بتایا تھا۔ اس سودے میں وہ دو ہزار بنا چکا تھا، جو چیسس نمبر کے فرق کو چھپانے اور خریدار کے بارے میں یہ اطلاع دینے کے بہت تھے کہ وہ تصویر والا ہی تھا۔ باقی کام استاد پیڈرو یا اس کے ساتھی کر سکتے تھے۔ وہ موٹر رجسٹریشن آفس سے معلوم کر سکتے تھے کہ گاڑی کس کے نام ٹرانسفر ہوئی ہے مگر اس میں غلط نام اور پتے کے اندراج کا امکان تھا۔ انھوں نے کچھ اور سوچا ہو گا۔ گاڑی کے صحیح آدمی کے ہاتھ فروخت ہونے کی اطلاع پاتے ہی وہ ایک طرف پورے شہر میں اپنے جاسوس چمچوں کو ہوشیار کر دیتے تو دوسری طرف پولیس کو اطلاع کر دیتے کہ ان کا مجرم بڑی شان سے اس نمبر کی لال فاکس ویگن میں گھوم رہا ہے۔ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر میں پکڑا جاتا یا مارا جاتا۔

"دو ہزار تم کو مبارک ہوں۔" میں نے کہا۔ "لیکن دو ہزار سے زیادہ زندگی ہے جو میں تمھیں بخش رہا ہوں، صرف ایک شرط پر... تم استاد پیڈرو کو کچھ نہیں بتاؤ گے۔"

"مگر وہ پوچھیں گے کہ گاڑی کہاں گئی۔"

"کہنا کہ اُسے منٹگمری کے چوہدری نعمت اللہ مالک بے مثال ٹیکسٹائل مل نے خریدا ہے۔" میں نے کہا۔ "کیا کہو گے؟"

ڈیلر نے لفظ بہ لفظ وہی دُہرا دیا جو میں نے کہا تھا۔

"شاباش! اگر تم نے ذرا بھی غلط بیانی کی تو مجھے معلوم ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔ "اور پھر تمھیں بھی معلوم ہو جائے گا کہ تم نے دو ہزار میں بیوی کو بیوہ اور بچوں کو یتیم کر لیا۔ استاد پیڈرو نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ گاڑی کسی اور کو نہیں بیچنی ہے۔"

"نہیں جی... یہ تو نہیں کہا تھا۔" ڈیلر نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔

"پھر تمھارے لیے خطرے کی کوئی بات نہیں۔" میں نے کہا۔ "بس یہ ہرگز مت کہنا کہ گاڑی اسی نے لی ہے جس کی تصویر تھی۔ اس کے علاوہ تم جو چاہو کہہ دو... کچھ بھی نام بتا دو اور جو حلیہ چاہو بیان کر دو۔ مجھے فرق نہیں پڑتا۔ مجھے منٹگمری، لائل پور یا ایبٹ آباد کا بتانا چاہو تو مجھے اعتراض نہیں لیکن میرا اصل حلیہ بتایا یا اس گفتگو کا حوالہ دیا جو اس وقت ہو رہی ہے تو پھر وہی ہو گا جو ابھی نہیں ہوا۔ تم شریف آدمی ہو۔ لالچ میں یہ بھول گئے تھے کہ یہ بڑے بدمعاشوں کی جنگ بھی ہو سکتی ہے۔ ہاتھی لڑتے ہیں تو حشرات الارض پس جاتے ہیں۔ تم اپنے دو ہزار رکھو اور خدا کا شکر بجا لاؤ کہ سچ بول کے بچ گئے۔"

"جھوٹ بول کر جناب..." وہ بولا۔

"جھوٹ تو اب بولو گے... ابھی تک نہیں بولا ہے۔" میں نے کہا اور اس کو دو ہزار روپے پکڑا دیے۔ "یہ میری طرف سے۔ میں بھی تم سے جو کام لے رہا ہوں اس کا معاوضہ ادا کر رہا ہوں۔

کام میری مرضی کے مطابق نہ ہوا تو صرف ایک چیز لوں گا۔ تمہاری جان... اب اتر جاؤ اور چل پڑو۔"

وہ نیچے اترا اور واپس چل پڑا۔ اس کی چال دیکھ کر مجھے ہنسی بھی آئی اور یہ یقین بھی آیا کہ وہ اپنی جان بچانے کے لیے جھوٹ ضرور بولے گا۔ وہ حد سے زیادہ دہشت زدہ تھا۔ وہ کبھی نہیں کہے گا کہ گاڑی وہی شخص لے گیا ہے جس کی تصویر دکھائی گئی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ استاد پیڈرو بھی اس کے سینے پر پستول رکھ دے اور اسے سچ بولنے پر مجبور کر دے۔ اسے فیصلہ اور انتخاب تو کرنا ہی پڑے گا کہ کس کے ہاتھوں مارا جائے؟ سمجھدار ہو گا تو دوسرے بدمعاش سے نمٹنے کا بندوبست پہلے سے کر کے گا۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے سوچا۔

اس گاڑی کو لے کر پھرنے میں خطرہ تھا مگر فوری نہیں۔ میں نے یہ انتیس ہزار روپے کا جوا کھیلا تھا۔ صرف اس امید پر کہ شاید اس گاڑی میں میرے ساتھ چل کے رابعہ کا ذہن اپنے ماضی کے مانوس راستوں کو اور آشنا لمحوں کو پہچان لے۔ یہ مقصد حاصل ہو جاتا تو میں سمجھتا کہ انتیس ہزار کی بازی میں نے جیت لی۔ رابعہ کی ایک پرانی محبت بھری مسکراہٹ پر ایسے انتیس ہزار کو میں انتیس ہزار بار قربان کر سکتا تھا۔ اگر میں اپنے مقصد میں ناکام رہا تو میں کیا کروں گا، یہ میں نے ابھی طے نہیں کیا تھا۔ شاید میں گاڑی کو ایک ٹائم بم کے ساتھ چوہدری دلاور کے دروازے پر چھوڑ آؤں گا اور دھماکا ہو گا تو وہ خود ہی میرے پیغام کو سمجھ لے گا۔ پھر شکل میں وہ کار ڈیلر پڑے گا جو مجھے سیلز مین لگتا تھا۔ استاد پیڈرو اسے جھوٹ بولنے کی سزا دے گا۔ اس نے خدا سے ٹھیک فریاد کی تھی کہ میں کدھر جاؤں۔ اب وہ سچ بھی نہ بولے اور جھوٹ بھی نہ بولے تو پھر کیا بولے۔ بہتر ہے کہ وہ کچھ نہ بولے اور اپنا بوریا بستر سمیٹ کر گول ہو جائے۔ کسی دوسرے شوروم میں چلا جائے لیکن کچھ عرصہ روپوش رہنے کے بعد۔

ہر گاڑی اپنی مخصوص پہچان رکھتی ہے اور جو اسے چلاتا ہے وہ گاڑی کی عادتوں کو جانتا ہے۔ گاڑی کی پک اپ کیسی ہے۔ بریک کس حد تک ٹائٹ ہیں اور کتنی رفتار پر گاڑی کم سے کم کتنے فاصلے پر روکی جا سکتی ہے۔ کلچ کو کتنا دبانا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہ انجن یا باڈی کے کس حصے سے کوئی مخصوص آواز آتی ہے، کیوں آتی ہے۔ جو گاڑی ایک ہی ہاتھ پر رہے اس کے مالک کے کان معمولی سی نئی آواز پر خود بخود کھڑے ہو جاتے ہیں۔ رابعہ کی گاڑی بھی اتنا عرصہ میرے پاس رہی تھی کہ میں اس کی چال پہچانتا تھا اور اس کے انجن کی آواز کو سمجھتا تھا۔ اس گاڑی کو چلاتے ہوئے مجھے یوں لگا جیسے یہ گاڑی دھوکے باز ہے۔ اس نے میک اپ سے رابعہ کی پرانی فاکس ویگن کی صورت بنا لی ہے لیکن جیسے کوئی ایکٹریس ماہر ترین میک اپ مین کے ہاتھوں رابعہ کی شکل و صورت اختیار کر کے، اسی کے لہجے میں بات کر کے اور اسی کے انداز و اطوار اپنا کے بھی رابعہ نہیں بن سکتی تھی، ایسے ہی یہ گاڑی ظاہری مشابہت سے مجھے دھوکا دینے میں ناکام تھی۔ تاہم یہ گاڑی اسی طرح اس کام آ سکتی تھی جس طرح کوئی ایکٹریس کسی رول میں اپنا کردار نبھاتی ہے۔ فلم بنانے والے اور دیکھنے والے سب ہی جانتے ہیں کہ یہی ایکٹریس جو دیہاتی لڑکی کا کردار کر رہی ہے، فلاں فلم میں کلب ڈانسر بنی تھی مگر دونوں فلموں کو یکساں دلچسپی سے دیکھنے والوں کے ذہن ظاہری حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے کہانی اور فلم کے تاثر کو قبول کرتے ہیں۔ مجھے امید تھی کہ رابعہ پر اس گم گشتہ رفیق اور یادگارِ عہدِ رفتہ کو پھر دیکھنے سے خوشگوار نتائج برآمد ہوں گے۔

ڈاکٹر لطیف کے گھر جاتے ہوئے مجھے استاد پیڈرو پر ہاتھ ڈالنے کے اس موقعے کے ضائع ہو جانے کا خیال بھی تھا۔ میں یہ بھی کر سکتا تھا کہ ابھی کار ڈیلر کو صرف پانچ ہزار کا بیعانہ ادا کرتا اور اس سے کہتا کہ باقی رقم میں شام چھ بجے ادا کروں گا۔ شام چھ بجے یا رات کو۔ اس کی اطلاع پاتے ہی استاد پیڈرو یا اس کا کوئی حکم کا غلام اپنی شکاری فوج کے ساتھ ضرور نمودار ہوتا۔ میں جان پر کھیل کر استاد پیڈرو کو اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش ضرور کر سکتا تھا مگر ایسی کوشش میں میری کامیابی کے امکانات بہت کم تھے۔ میرے ساتھ غالب اور محسن یا نیک محمد کے سوا کون جا سکتا تھا اور وہ دوستی میں جان کی بازی لگانے سے گھبرانے والے لوگ نہیں تھے مگر مقابلے میں کوئی بھی مارا جاتا تو مجھے پیڈرو کی گرفتاری مہنگی پڑتی۔ میں ان میں سے کسی کے کم ہونے کا رسک لے ہی نہیں سکتا تھا۔ محسن تو ایک نئی دلہن کے لیے مانگ کی افشاں تھا۔ ہاتھوں کی مہندی کا رنگ پھیکا پڑنے سے قبل ہی اس کو بیوگی عطا کرنے کا گناہ اتنا بڑا ہوتا کہ میں تمام عمر خود کو بدترین سزا دے کر بھی مطمئن نہ ہوتا۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پیڈرو کے ساتھ پولیس بھی محاصرہ کر لیتی اور ہم مقابلہ کیے بغیر گرفتار ہو جاتے۔ بے شک مجھے پیڈرو سے ہر قتل کا اعتراف جرم کرانا تھا جن میں سب سے پہلا قتل میرے باپ وزیر خان کا تھا اور اس سے پوچھنا تھا کہ وزیر خان کو اس نے مرنے کے بعد مدفن سے کیوں محروم کیا تھا اور پھر اس کی ہڈیوں کو زمین کے کس گمنام گوشے میں چھپایا تھا لیکن اپنے ساتھ دوسروں کی زندگی خطرے میں ڈال کر یہ کام کرنا ہرگز عقل مندی نہ کہلاتا۔ یار زندہ صحبت باقی۔ کبھی نہ کبھی میں شکاری بن کے اس طرح پیڈرو کو ضرور اسیر کروں گا کہ اس کی زبان خود اپنے ہر گناہ کا اور ہر جرم کا اقرار کرے گی اور اسے سارے قرضے چکانے ہوں گے۔ میرا یقین ابھی سلامت تھا کہ وہ دن ضرور آئے گا۔

ابھی پیڈرو کی گرفتاری سے زیادہ اہم رابعہ کی آزادی تھی۔ وہ فراموشی کے زنداں میں قیدِ تنہائی کاٹ رہی تھی جہاں نہ امید تھی نہ انتظار تھا۔ نہ خیالِ ماضی و حال تھا، نہ احساسِ ہجر و وصال تھا۔ دوستی نہ غم کا سوال تھا اور نہ اپنے آپ پر ملال تھا۔ اس کو پھر بیچ کے درمیان لانا تھا اور اس کے احساس کو زندہ کرنا تھا کہ ہمارے بیان، میرے اور اس کے درمیان کوئی نہیں۔ نہ وقت کے فاصلے مقام کے اور نہ احساس کے۔ جو نہ تھے، نہ ہوں گے۔

ڈاکٹر لطیف کے گھر جانے سے پہلے میں نے گاڑی کو لاء کالج کے سامنے کھڑی ہوئی قطاروں میں شامل کر دیا۔ اور خود پیدل انارکلی چلا گیا۔ میرے حلیے میں قدرتی تبدیلی اتنی زیادہ آ چکی تھی کہ میں خود کو بہت پُراعتماد محسوس کرتا تھا۔ خوف اب بھی تھا کہ کسی کی خوردبین نے مجھے غور سے دیکھا تو پہچان جائے گی مگر انارکلی کی گہما گہمی میں کسی کو کسی کی طرف دیکھنے کی فرصت نہ تھی۔ سب اپنے کام سے اور اپنے خیال میں گزرتے جاتے تھے اور جو چہرے نظر آتے تھے انھیں صرف آنکھ دیکھتی تھی۔ یہ عکس دماغ کے کمپیوٹر تک پہنچتا ہی نہیں تھا۔ انارکلی کی بھیڑ میں کھڑے ہو کر کسی شناسا صورت کو تلاش کرنا ایک الگ بات تھی اور انارکلی سے گزر جانا ایک مختلف عمل تھا۔ میں بھی کسی طرف دیکھے بغیر چلتا گیا۔ بانو بازار اور اس کے آس پاس ساریوں کی دکانیں چھان لینے کے بعد میں مایوسی کا شکار ہونے لگا تھا۔ میری پسند پر پورا اترنے والی ایسی ساری کہیں نہ تھی جس کی گہری نیلی زمین پر شوخ زرد رنگ کے چھوٹے پھول ہوں۔ ایسا گزشتہ بار بھی ہوا تھا اور ایک مرتبہ پھر آخری دکان پر مجھے ساری مل گئی۔ یہ بالکل ویسی ہی ساری تھی جیسی میں پہلے لے جا چکا تھا۔

"آپ تو پہلے بھی ایسی ساری تلاش کرتے ہوئے آئے تھے۔" دکاندار نے مجھے غور سے دیکھ کر کہا۔

"اچھا... میں... مجھے یاد نہیں تھا کہ یہی وہ دکان ہے..." میں نے بے وجہ نروس ہو کے کہا۔ اس نے یقیناً مجھے خبطی سمجھا ہو گا۔ جو ایک ہی عورت کے لیے دوسری بار ویسی ہی ساری لے جا رہا تھا یا ہر عورت کو ایک ہی قسم کی ساری پیش کرنے کے خبط کا شکار تھا۔

"ایسی چھ ساریاں بنی تھیں، یہ آخری ہے۔" وہ ساری کو پیک کرتے ہوئے مسکرایا۔

"گویا آئندہ... خیر... مسئلہ یہ ہے کہ مجھے ایک بلاؤز بھی سلوانا ہے۔" میں نے سر کھجا کے کہا۔

"بلاؤز کا کپڑا اسی میں شامل ہے۔" دکاندار نے مجھے سمجھایا۔ "ہم ٹیلرنگ بھی کرتے ہیں۔ آپ پیمائش لا دیں۔ کوئی دوسرا بلاؤز، کوئی قمیص ہو۔"

لاحول ولا قوۃ۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ یہ تو لمبا چکر ہے۔ اب مجھے گھر جانا ہو گا اور رابعہ کے سامان میں سے پیمائش کے لیے کچھ لا کر دینا پڑے گا۔ پھر یہ ٹیلرنگ بھی آناً فاناً تو نہیں ہو جائے گی۔ میں نے اپنی مشکل کا ذکر کیا تو دکاندار نے میری ناتجربہ کاری کو معاف کرتے ہوئے بتایا کہ بلاؤز ریڈی میڈ بھی مل جاتے ہیں بشرطیکہ رنگ میچ کر جائے۔ میرا یہ مسئلہ ایک اور دکاندار نے حل کیا جو اس معاملے میں مجھ سے زیادہ سمجھدار تھا۔ جب میں بلاؤز لے کر نکلا تو اس نے مجھے یاد دلایا کہ اس کے ساتھ ایک چیز اور ہوتی ہے جو پیٹی کوٹ کہلاتی ہے۔ اس نے میری گھبراہٹ پر مسکراتے ہوئے پیٹی کوٹ بھی نکالا اور میں نے دکان سے باہر آ کر اطمینان کا گہرا سانس لیا کہ بالآخر معرکہ سر کر لیا۔ حالانکہ اس سے پہلے میرا خیال صرف اصلی معرکے کی طرف تھا جو مجھے ابھی سر کرنا تھا۔

شام پانچ بجے میں گاڑی کو ڈاکٹر لطیف کی کوٹھی کے اندر لے گیا تو موش بھونکتا ہوا دوڑا۔ میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا کیونکہ اب میں محفوظ تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ فاکس ویگن کو کاٹ سکتا تھا مگر اس نے یہ حماقت نہیں کی اور واپس لوٹ گیا۔ السیشن نسل کے کتے قد میں اونچے اور صحت مند تو ہوتے ہی ہیں۔ موش کچھ زیادہ ہی بڑا تھا چنانچہ اس کا نام واقعی مضحکہ خیز لگتا تھا۔ اندر سے پھر وہی لڑکا نکلا اور اس نے موش کو عادتاً ڈانٹا۔ پھر وہ مجھے سرخ رنگ کی گاڑی سے نکلتا دیکھ کر حیران ہوا۔ اس نے گاڑی کو تعریفی نظروں سے دیکھا۔

"اگر کبھی میں نے گاڑی لی تو فاکس ویگن ہی لوں گا۔" اس نے مجھے مطلع کیا۔ "اور وہ بھی سرخ رنگ کی... بالکل ایسی ہی۔"

"بس تو پھر نیک کام میں دیر کیوں!" میں نے کہا۔ "یہی لے لو۔"

"ابھی... ابھی تو مشکل ہے۔" وہ سوچ کر بولا۔ "اور یہ تو آپ کی ہے۔"

"میری؟" میں نے کہا۔ "یہ تم سے کس نے کہہ دیا ———"

"وہ جو تمہارے گھر میں رابعہ آنٹی ہیں نا... یہ ان کی ہے۔"

"میں سمجھ گیا، آج ہی وہ مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ میرے پاس ایک لال رنگ کی فاکس ویگن تھی۔ نہ جانے کہاں گئی۔"

"اچھا؟ اور کیا کہہ رہی تھیں؟" میں نے دلچسپی سے کہا۔

"اور... اور پوچھ رہی تھیں کہ کیا آج سکندر صاحب آئیں گے۔ میں نے کہا کہ میں تو کسی سکندر کو نہیں جانتا۔ سوائے سکندرِ اعظم کے۔ وہ ہنسنے لگیں۔ میں حیران رہ گیا کیونکہ میں تو سمجھتا تھا کہ انھیں ہنسی آتی ہی نہیں۔" وہ بولا۔ "ہنستی ہوئی وہ بہت اچھی لگتی ہیں۔"

میں نے اپنے حوصلے کو دوچند محسوس کیا اور اندر گیا تو مجھے مسز لطیف نظر آئیں۔

"یہ بہت باتونی لڑکا ہے۔" انھوں نے میرے سلام کا جواب دینے کے بعد کہا۔ "بالکل باپ پر گیا ہے۔"

"جی... یہ بھی بہت اعتماد کے ساتھ بات کرتا ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ بتائیے رابعہ کیسی ہے؟"

"بہت بہتر۔ جب سے وہ یہاں آئی ہے میں نے پہلی بار خوش دیکھا ہے۔" وہ مسکرائیں۔ "اور اس خوشگوار تبدیلی کے ذمے دار تم ہو۔"

"میں آج ایک تجربہ کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب کہاں ہیں؟"

"وہ تو ابھی کلینک سے نہیں لوٹے۔ رابعہ سے ملنا ہے تو ان سے اجازت لینی ضروری نہیں۔" مسز لطیف نے کہا۔ "تجربہ کیا ہے؟"

"وہ... میں رابعہ کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔" میں نے کہا۔ "اس کے لیے میں کچھ کپڑے لایا تھا۔ ان کپڑوں سے اس کی کچھ یادیں وابستہ ہیں... اُسے بہت سی باتیں یاد آسکتی ہیں... اور میں اس کی گاڑی بھی لایا ہوں... جو اس کی نہیں ہے۔"

"تم کچھ کنفیوز ہو رہے ہو۔" مسز لطیف نے ہنس کر کہا۔ "جاؤ۔ اگر وہ جانا چاہے تو لے جاؤ... ہمارے ساتھ تو کہیں جاتی نہیں۔"

میں نے اوپر پہنچ کر دروازے پر دستک دی اور رابعہ کی آواز سُن کر اندر داخل ہو گیا۔

"سکندر صاحب!" وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی۔ "معلوم نہیں کیوں اس وقت مجھے آپ کا خیال آیا تھا۔"

"کیا تم میرا انتظار کر رہی تھیں رابعہ؟" میں نے دلی مسرت کو چھپا کے کہا۔

"انتظار؟ نہیں... میرا مطلب ہے ہاں..." وہ بولی۔ "آپ نے کہا تھا نا کہ میں پھر آؤں گا۔"

"ہاں... اور دیکھو میں آگیا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں ایک تحفہ بھی لایا ہوں تمھارے لیے۔"

اس کی مشتاق سوالیہ نظریں اُٹھیں اور میں نے ساری کو اس کے سامنے پھیلا دیا۔ "اسے پہچانتی ہو؟"

اس کا چہرہ کھل اُٹھا۔ "یہ... یہ تمھیں کہاں سے ملی... یہ تو... ہاں... میں اسے پہچانتی ہوں۔"

"یہ تمھاری ساری ہے نا؟" میں نے مسکرا کے کہا۔

"ہاں... مگر یہ تمھارے پاس... تم میری چیز مجھے ہی تحفے میں دینے کے لیے لائے ہو!" وہ بولی۔

"تمھیں یاد نہیں ہے رابعہ... یہ وہی ساری ہے مگر یہ میرے پاس محفوظ تھی۔ تم اسے میرے پاس بھول آئی تھیں۔" میں نے کہا۔

"اچھا اچھا... اسی لیے تو میں حیران تھی۔" وہ مطمئن ہو گئی۔

"میں چاہتا ہوں کہ تم یہ ساری باندھ لو۔" میں نے کہا۔ "میں تمھیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔"

"کہاں...؟" وہ بولی۔ "اچھا تم بیٹھو... میں تیار ہو جاؤں۔"

اس نے میرے جواب سے پہلے کہا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اس کا لہجہ اور اس کا چہرہ اب پہلے کی طرح جذبات سے عاری اور سپاٹ نہیں رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں زندگی کی امنگوں اور مسرتوں کے جاگتے خوابوں کا رنگ اتر آیا ہے اور اس کے رخسار دمکنے لگے ہیں۔ آرام اور علاج کے ساتھ صحیح دیکھ بھال نے اس کو صحت کی شادابی اور رعنائی تو عطا کر دی تھی لیکن وہ کچھ بُجھی بُجھی سی تھی۔ خوشی کے احساس کی روشنی پھیلی تو مجھے رابعہ کے قالب میں اپنی رابعہ دکھائی دینے لگی۔ میرے خیالوں کو امید کے پَر لگ گئے تھے۔ اور میں خود کو اس خلانورد کی طرح محسوس کر رہا تھا جو چاند کی سطح پر اترنے والا ہو... میرے خوابوں کی مسافت سیکڑوں صدیوں پر پھیلی ہوئی تھی لیکن بالآخر میرے تصور کو حقیقت کی منزل تک پہنچانے والا لمحہ آرہا تھا۔ میں اس لمحے کی سرگوشی سن سکتا تھا جو کامیابی کا نقیب تھا۔ یقینِ محکم عملِ پیہم محبت فاتحِ عالم... محبت فاتحِ عالم... اجی ہاں ہاں... محبت فاتحِ عالم... نیچے غالباً ٹی وی پر قوال بڑے زور شور سے گا رہے تھے... محبت فاتحِ عالم...

رابعہ یکلخت نمودار ہوئی۔ میں نے خود کو ایک زنداں میں دیکھا جہاں اس کے وجود نے پتھر کی دیواروں اور آہنی سلاخوں میں امیدوں کے گلشن کھلا دیے تھے۔ وفا کی خوشبو کا پہلا جھونکا... محبت کی چاندنی کی اوّلین کرن اور چاہت کا پہلا نغمہ بن کر وہ میرے احساس پر چھا گئی تھی۔ پھر وقت بدل گیا۔ میں نے اُسے ایک رات اپنے بہت قریب پایا۔ اس رات شہر کی سڑکوں کا رازداں اندھیرا ہم آوارگانِ کوئے تمنا کو کہاں کہاں لے گیا تھا۔ مال سے شملہ پہاڑی کی مہکتی خلوتوں تک اس شب کے دامن میں عہدِ وفا کے یادگار لمحے خوابیدہ تھے۔ اس رات بھی رابعہ کا یہی نیلے آسمان کا تاروں بھرا پیرہن تھا۔ پھر تیسری بار میں نے خواہشوں کی بے تابی سے مجبور ہو کے اسے کہا تھا کہ چلو رابعہ... آج پھر اسی مہرباں رات سے ملنے چلتے ہیں۔ ہم سختیِ آلام اور تلخیِ ایام سے بھاگ کر صرف ایک شب کے لیے اپنی یادوں کے سائے میں پناہ لیتے ہیں مگر اس رات وہ محوِ انتظار رہ گئی تھی اور شکاری مجھے اغوا کر کے لے گئے۔ یہ چوتھی بار تھی کہ میں نے یادِ ماضی کے خوب صورت جزیرے کی طرف لوٹ جانے کا اہتمام کیا تھا جہاں میرے اور رابعہ کے خوابوں کی حسین دنیا آباد تھی۔ مجھے دیوانہ کر دیا تھا، غمِ روزگار نے اور رابعہ دشتِ تنہائی میں بھٹک رہی تھی لیکن میں چاہتا تھا کہ ہم دونوں

ایک ساتھ ان منزلوں کے نشان تلاش کریں جو کشمکشِ حیات میں ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی تھیں۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟" رابعہ کے سوال نے مجھے چونکا دیا اور مجھے احساس ہوا کہ نہ جانے کتنی دیر سے میں اس پیکرِ رعنائی کے نظارے میں گم تھا جس کی پہلی جھلک نے مجھے دیوانہ کر دیا تھا۔ حیا سے اس کے عارض میں شفق کے اجالے کی روشنی اتر آئی تھی۔

"تمھیں دیکھ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اور جی چاہتا ہے تم اسی طرح کھڑی رہو اور تمھیں ایسے ہی دیکھتا رہوں... تمام عمر..."

وہ ہنس پڑی۔ "لیکن تم نے تو کہیں باہر چلنے کو کہا تھا۔"

"وہ... ہاں... آؤ چلتے ہیں۔" میں نے کہا اور اس کے ساتھ نیچے اتر آیا۔ وہ آگے تھی اور میں پیچھے تھا چنانچہ میری نظر نے ڈاکٹر لطیف کی آنکھوں میں کامیابی کی پیشگی موصول ہونے والی مبارک باد دیکھی اور ان کو دو انگلیوں سے کامیابی کا نشان بنا کے دکھایا۔ ان کی بیگم ہمارے نیچے پہنچنے کے بعد آئیں اور وہ رابعہ کو دیکھ کر حیران ہوئیں۔

"کدھر کے ارادے ہیں بھئی؟" ڈاکٹر لطیف نے خوش مزاجی سے پوچھا اور مجھ سے ہاتھ ملایا۔ "تیاری تو بڑے زوروں کی ہے۔"

"دیکھو جی نظر مت لگا دینا میری بچی کو۔" ان کی بیوی نے رابعہ کے ماتھے پر بوسہ دیا۔ "خدا تم دونوں کی خوشیوں کو سلامت رکھے۔"

اس دعا میں جتنی بے غرضی تھی اور جتنا خلوص تھا، جتنا پیار تھا اور جتنی ممتا تھی اس نے مجھے جذباتی کر دیا۔ صرف میری اپنی ماں ہی دل کی اتنی گہرائیوں سے یہ دعا مانگ سکتی تھی۔ مگر اس ماں کا میرے ذہن میں کوئی تصور نہ تھا۔ بزرگانہ شفقت کا ایک روپ میں نے فوزیہ کی ماں یعنی محسن کی مرحومہ والدہ کی محبت میں دیکھا تھا لیکن ایک وقت ایسا آیا تھا جب اُن کا دل بھی مجھ سے بدگمان ہوا تھا۔ تھوڑی سی شفقت مجھے بیگم رضوی نے بھی دی تھی مگر جب میں قانون کا مجرم بن گیا تو انھوں نے اپنے فرض شناس پولیس افسر شوہر کا ساتھ دیا اور مجھے فراموش کر دیا۔ یہ پہلی بار ہوا تھا کسی نے مجھ سے میرا ماضی اور حال نہیں پوچھا تھا۔ اس سے سروکار نہیں رکھا تھا کہ قانون کی نظر میں میری حیثیت کیا ہے اور رابعہ سے میرے تعلق کو شک کی نگاہ سے نہیں دیکھا تھا۔ وہ شریف انسانیت پر یقین رکھنے والے صاف دل لوگ تھے۔ خدا نے اُن کے ہاتھ میں شفا دی تھی لیکن وہ صرف جسم کے روگ دُور نہیں کرتے تھے، دلوں کے دکھ بھی بٹاتے تھے اور خوشیوں سے محروم ہو جانے والے تنہا انسانوں کی جدوجہد میں بھی ان کا ساتھ دیتے تھے۔ وہ صرف دوا سے نہیں اپنے پیار سے بھی اعجازِ مسیحائی دکھاتے تھے۔ ان میں ریاکاری تھی اور منافقت نہیں تھی۔ وہ انسانوں میں کوئی تفریق نہیں دیکھتے تھے۔ رابعہ ان کے لیے ایک مریضہ تھی جس کی صحت یابی ان کا مشن تھی۔ ان کے لیے حقیقی مسرت کا سرچشمہ یہی احساس تھا کہ وہ اپنے مشن میں کامیاب ہوں۔ ان کی کوشش سے ہمیں اپنی خوشی کی تعبیر مل جائے تو یہی کامیابی ان کا انعام تھی۔ وہ اس معاملے میں کوئی سروکار نہیں رکھتے تھے کہ دنیا مجھے کیا سمجھتی ہے یا کیا کہتی ہے۔ ان کی نظر نے مجھے پہچان لیا تھا اور ان کے لیے اتنا اطمینان کافی تھا۔ شاید وہ اپنے دوسرے مریضوں کے ساتھ بھی ایسے ہی حُسنِ سلوک سے کام لیتے تھے۔

"اب جاؤ بھئی..." ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "کیا روایتی انداز میں ہم سے اجازت ملنے کے انتظار میں کھڑے ہو۔"

میں شرمندہ ہو گیا۔ "آپ کی عنایات کے بعد کیا مجھے سعادت مندی کے اتنے مظاہرے کی اجازت بھی نہیں۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"تم تو ایسے رخصت ہو رہے ہو جیسے واپس آنے کا ارادہ ہی نہیں۔" بیگم لطیف نے کہا۔

"ہو سکتا ہے رابعہ واپس نہ آئے۔ یہ دونوں اپنے گھر چلے جائیں گے۔" ڈاکٹر لطیف نے بیوی کی طرف دیکھ کر کہا۔ "میں بھی یہی چاہتا ہوں۔"

"تم چاہتے ہو کہ یہ واپس نہ آئیں؟" بیگم لطیف نے خفگی سے کہا۔ "رابعہ کو نکالنا چاہتے ہو؟"

"نہیں۔ میرا مطلب کچھ اور تھا۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "میں تو چاہتا ہوں کہ ایک مریض کی حیثیت سے رابعہ ڈسچارج ہو جائے مگر بعد میں جب یہ آئیں گے تو اس طرح نہیں آئیں گے۔"

"اور جس طرح ہم آئیں گے اس سے آپ زیادہ خوش ہوں گی۔" میں نے کہا اور رابعہ کو لے کر باہر نکل گیا۔

رابعہ نے اپنی گاڑی کو دیکھا اور ٹھٹک کر رک گئی۔

میں نے اس کی آنکھوں میں الجھن دیکھی۔ "یہ... یہ وہی گاڑی ہے سکندر؟" رابعہ نے کہا۔

"ہاں! تمھیں شک کیوں ہے؟" میں نے دروازہ کھولا اور وہ چپ چاپ بیٹھ گئی۔

"کیا تم بھی مجھ سے جھوٹ بول رہے ہو؟" رابعہ نے اچانک کہا۔ "وہ گاڑی... وہ تو شاید... کیا ہوا تھا اُسے... وہ چوری ہو گئی تھی شاید... نہیں... آگ لگ گئی تھی اس میں..."

میں نے گاڑی کو اسٹارٹ کیا اور ریورس میں باہر لے گیا۔

رابعہ کی یادداشت جاگ رہی تھی۔ اس کے لاشعور کے دروازے وا ہونے لگے تھے اور یادوں کی دستک سے اس کا شعور بیدار ہو رہا تھا۔ وہ ونڈ اسکرین سے باہر خلا میں دیکھ رہی تھی۔

"تم بتاتے کیوں نہیں..." وہ اچانک میری طرف پلٹی۔ "کیا ہوا تھا میری گاڑی کو... یہ گاڑی میری نہیں ہے۔"

"یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟" میں نے کہا اور گلو کمپارٹمنٹ میں سے کاغذات نکال کے اُسے تھما دیے۔ "کیا یہ کاغذات ثابت نہیں کرتے کہ گاڑی تمہاری ہے۔"

اس نے کاغذات میرے ہاتھ سے لے کر دیکھے اور اس کی الجھن بڑھ گئی۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ پیشانی پر رکھ لیا... وہ سوچ کی لہروں کے ساتھ بہنے لگی تھی۔ سمندر کی موجوں کی طرح جو بہا کے لے جاتی ہیں اور اپنے مدّوجزر میں تہہ و بالا کرنے کے بعد پھر ساحل کی طرف اچھال دیتی ہیں۔

"یہ مال روڈ ہے نا؟" وہ باہر دیکھتے ہوئے بولی۔ "کیا تم شملہ پہاڑی کی طرف جا رہے ہو؟ یا باغ جناح میں۔"

"ابھی میں نے طے نہیں کیا تھا۔" میں نے انجان بن کے کہا۔ "تم کہاں جانا پسند کرو گی؟"

"وہیں... جہاں ایک بار میں اور تم گئے تھے۔" وہ بے خیالی میں بولی۔ "اس رات پورا چاند تھا۔"

میرا دل تیزی سے دھڑکا۔ "میں تم سے محبت کرتا ہوں رابعہ..."

"مجھے معلوم ہے۔" وہ بولی۔ "لیکن تم مجھے چھوڑ کر کیوں چلے گئے تھے۔" اس کے لہجے میں دُکھ تھا۔

صورتِ حال خلافِ توقع بہت تیزی سے معمول پر آنے لگی تھی۔ میں نے رابعہ کی طرف دیکھا۔ اس کے وجود میں بپا ہونے والے انقلاب نے اس کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ پرانی رابعہ نئی رابعہ پر حاوی آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں ڈرا کہ کہیں اس کش مکش کا انجام ہسٹریا نہ ہو۔

"میں تمہیں کہیں چھوڑ کر نہیں گیا تھا رابعہ۔" میں نے کہا۔ "میں محسن کے ساتھ گیا تھا... اس کے والد کا انتقال ہو گیا تھا نا۔"

"انکل شیروانی کا؟" وہ ایک دم بولی۔ یاد کا ایک اور دریچہ کھُل گیا تھا۔ "کب؟"

"ایک ہفتہ ہو گیا۔" میں نے کہا۔ "محسن اور شہلا کی شادی ہو گئی ہے۔"

یہ بہت بڑا شاک تھا اس نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا۔ "ان کی شادی ہو گئی... یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔" میں نے نارمل رہتے ہوئے کہا۔ "محسن مجبور تھا۔ وہ شہلا کو کہاں چھوڑتا... اُسے وہ ساتھ ہی لے آیا۔"

رابعہ نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ "یہ مجھے کیا ہو گیا ہے سکندر... مجھے یہ سب کیوں معلوم نہیں...؟"

"اب تو معلوم ہو گیا ہے نا..." میں نے کہا اور گاڑی کو باغِ جناح میں روک لیا۔ "آؤ اوپر چلیں۔"

"نہیں... نہیں سکندر... مجھے شہلا اور محسن کے گھر لے چلو۔ وہ کہاں رہتے ہیں؟" رابعہ نے میرا بازو تھام کے کہا۔

"ان کے گھر ہم کل چلیں گے۔" میں نے کہا۔ "انھوں نے کہا تھا کہ ہم سب کی دعوت کریں گے... میری تمہاری... استاد ٹیڈی اور مرزا غالب کی۔"

"یہ... استاد ٹیڈی... اور مرزا غالب..." وہ چلتے چلتے رک گئی۔ "یہ مجھے دیکھنے کیوں نہیں آئے سکندر... میں بیمار تھی اور اسپتال میں پڑی تھی۔"

"نازو بھی تو اسپتال میں پڑی ہے۔" میں نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا۔ "کیا تمہیں معلوم ہے؟"

"نازو..." رابعہ نے ایک چیخ ماری۔ "کیا ہوا ہے اُسے... اُسے... ہاں... اُسے گولی لگی تھی... کیسے لگی تھی اسے گولی؟"

"تمہیں یاد نہیں؟" میں پہاڑی پر سرسبز درختوں اور پھولوں سے گھرے ہوئے کنج کے درمیان لگی ہوئی بنچ پر بیٹھ گیا۔

رابعہ نے نفی میں سر ہلایا۔ اس کی آنکھیں گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی نظر آتی تھیں اور میں سمجھ رہا تھا کہ وہ گردوپیش سے بے خبر ہے۔ اس کا ذہن ماضی کے اُلجھے ہوئے راستوں سے نکلنے کی جدوجہد میں مصروف تھا۔ وہ بھول بھلیوں میں بھٹک رہی تھی مگر اس امید کے ساتھ کہ بالآخر وہ بند راستوں سے لوٹے گی تو کسی دوسرے راستے سے باہر جانے کی راہ ملے گی۔

"تمہیں گامے ماچھی کی جعلی خانقاہ سے نازو کے ساتھ اغوا کیا گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "وہ تمہیں ایک بہت بڑی سیاہ گاڑی میں ڈال کر لے گئے تھے۔"

"وہ کون؟" رابعہ نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔ "کون گاما ماچھی؟"

"وہ جو چوہدری دلاور کا ایجنٹ تھا... وہ مارا جا چکا ہے۔" میں نے کہا۔

رابعہ نے مایوسی سے سر ہلایا۔ "مجھے وہ... گاڑی تو یاد ہے لمبی سی کالے رنگ کی گاڑی تھی... مگر اور کچھ نہیں..."

"اچھا... آؤ میرے ساتھ چلو۔" میں نے مایوس ہونے سے پہلے ہر کوشش کر دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ "میں تمہیں وہاں لے چلتا ہوں۔"

رابعہ چپ چاپ کھڑی ہو گئی۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کا ذہن پھر پسپائی اختیار کر گیا ہے۔ وہ ایک وقت میں جتنا اپنی یادداشت کی گہرائی میں جا سکتی تھی، جا چکی تھی۔ اس سے زیادہ فی الحال ممکن نہیں تھا۔ وہ جدوجہد کرتے کرتے تھک گئی تھی اور اس کے اعصاب دُہری کش مکش کا دباؤ اس سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ شاید مجھے تھوڑا سا وقفہ دینے کی ضرورت تھی کہ جو کچھ اُسے یاد آیا ہے

ی کے تانے بانے میں اُلجھی ہے۔ اس کے لیے ایک جست میں حال اور ماضی کے درمیان حائل خلیج کو عبور کرنا محال تھا... وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ڈرتی ہوئی آگے بڑھتی تھی اور ٹھہر کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگتی تھی۔ پہچاننے کی کوشش کرتی کہ وہ کہاں ہے اور کس کے ساتھ ہے۔ اس نے اب تک کو پہچان لیا تھا۔ محسن اور شہلا، نازو اور استاد ٹیڈی اور مرزا غالب... یہ سارے نام اسے یاد آ گئے تھے مگر اس کے ذہن میں جو خوف بیٹھا ہوا تھا، وہ دشمنوں کو پہچاننے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔

گامے ماچھی کی جعلی خانقاہ کے سامنے سے گزرتے ہوئے بھی وہ خالی نظروں سے دونوں جانب دیکھتی رہی۔ اس کے چہرے پر خوف کے آثار ضرور عیاں ہوئے تھے مگر وہ خود اس خوف کی نوعیت کو سمجھنے سے قاصر تھی۔ مجھے اب مایوسی ہونے لگی تھی۔ واپسی پر میں نے ایک اور جوا کھیلا۔ میں رابعہ کو استاد ٹیڈی کی پرانی رہائش گاہ کی طرف لے گیا۔ کرشن نگر کے آخری حصّے میں اس گلی تک پہنچنے سے قبل ہی رابعہ کی حالت میں نمایاں تبدیلی آ گئی۔

"سکندر... ادھر مت جاؤ... اُدھر خطرہ ہے۔" وہ میرا بازو پکڑ کے بولی۔

"خطرہ؟ کس سے خطرہ ہے؟" میں نے انجان بن کے کہا۔

اسی وقت رابعہ کی نظر نے اس گیراج کو دیکھا جس کا ایک نوجوان مستری رابعہ کی کار میں دھماکے کے ساتھ ہی ہلاک ہو گیا تھا۔ رابعہ نے ایک چیخ ماری۔

"یہ... یہ وہی جگہ ہے۔" وہ ہکلانے لگی اور اس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔

میں نے گاڑی روک دی۔ "یہ کیا ہوا!" میں نے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے گاڑی خراب ہو گئی ہے۔ اچھا میں اس گاڑی کو دھکیل کر ایک طرف گلی میں کھڑی کرتا ہوں۔ تم جا کے اس گیراج سے کسی میکینک کو بلا لاؤ۔"

"نہیں..." رابعہ نے چلاّ کے کہا۔ "وہ اس کو بھی بم سے اڑا دیں گے... انھوں نے میری کار کو بھی اُڑا دیا تھا۔"

"یہ تم کس کی بات کر رہی ہو؟" میں نے حیرانی سے کہا۔ "کیا یہ تمہاری کار نہیں ہے... اسے کون بم سے اُڑائے گا بھلا!"

"وہی جو... جو میری اور تمہاری جان کے دشمن ہیں۔" رابعہ دیوانہ وار چلاّنے لگی۔ "دلاور اور اس کے ساتھی... مجھے بیوقوف مت بناؤ... یہ میری کار نہیں ہے... واپس چلو سکندر... یہ نہ ہو کوئی تمہیں دیکھ لے... تم ہٹو... گاڑی میں چلاؤں گی۔"

"کہاں جانا ہے اب؟" میں نے گاڑی سے اتر کے دوسری طرف جاتے ہوئے کہا۔ رابعہ میری جگہ آ گئی اور اس نے گاڑی کا اسٹارٹ کر کے میری طرف دیکھا۔ میں بے تعلق بیٹھا رہا۔ میں اس وقت بھی کچھ نہیں بولا جب اُس نے گاڑی واپس کی۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ اب وہ مجھے کہاں لے جاتی ہے؟

رابعہ ڈرائیونگ کرتے ہوئے بہت محتاط تھی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ کس توجہ اور انہماک کے ساتھ گردوپیش پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ وہ ہر سمت سے آنے والی گاڑیوں، ٹریفک کے قواعد سے بالاتر ریڑھیوں اور تانگوں، شور مچاتے رکشاؤں، فیل پیکر دو منزلہ بسوں، سائیکل سواروں اور پیدل چلنے والوں پر نظر رکھے ہوئے ہے اور اس بات سے پوری طرح باخبر ہے کہ میری نگاہ صرف اس پر ہے۔ وہ ذہنی طور پر پوری طرح حاضر تھی اور کوئی بھی اس کی گفتگو یا انداز و اطوار سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کر سکتا تھا کہ وہ ذہنی عدم توازن کا شکار ہے۔ یہ ذہنی عدم توازن سمجھا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ اس میں اگر کوئی تبدیلی آئی تھی تو یہ کہ اپنے ماضی کی سب دکھ دینے والی یادوں اور پُرآزار لمحوں کو وہ طاقِ نسیاں پر رکھ کر بھول گئی تھی۔ اگر وہ ایسا نہ کرتی تو یقیناً پاگل ہو جاتی لیکن کچھ عرصہ یادِ ماضی سے دامن چھڑا کے جینے سے اس کے عزم و یقین اور حوصلے کی تھکن دُور ہو گئی تھی اور آہستہ آہستہ ذہنی و جسمانی صحت کی بحالی کے ساتھ وہ پھر اس قابل ہو گئی تھی کہ سنگین حالات اور مصائب و آلام کا بار اُٹھا سکے اور میرے ساتھ قدم ملا کے چل سکے۔ اس کی مثال کسی ایسے بوجھ ڈھونے والے مزدور سے دی جا سکتی تھی جو اپنی جسمانی قوتِ برداشت سے زیادہ محنت کرتے کرتے بالآخر اتنا تھک جائے کہ کام کو بھول کر سو جائے اور جب تک سوتا رہے اسے یہ احساس ہی نہ ہو کہ ابھی اس کے لیے اپنے بارِ گراں سے نجات نہیں لیکن سو کر اٹھے تو پھر مشقت کے لیے تیار ہو۔ نیند جو احساس سے بیگانگی کا وقفہ ہوتی ہے، ذہنی و جسمانی قوت کے خرچ ہو جانے والے ذخیرے کو پھر بھر دیتی ہے۔

رابعہ بھی اپنے ماضی سے آنکھیں بند کیے، خود فراموشی اور احساس سے بیگانگی کا وقت گزار چکی تھی اور میرے آتے ہی آہستہ آہستہ اس کا ذہن پھر حال اور مستقبل کے مسائل کو سمجھنے کے لیے بیدار ہو رہا تھا۔ پہلے میری باتوں نے پھر اس ساری نے جو اب رابعہ کے وجود پر رنگِ گل اور پیرہنِ بہار کا عنوان بنی ہوئی تھی اور آخر میں سرخ رنگ کی اس فاکس ویگن نے اس کی خوابیدہ یادوں کو جھنجوڑ دیا تھا۔ وہ مجھے پہچان رہی تھی۔ پرانے راستوں کو پہچان رہی تھی اور اس وقت کو پہچان رہی تھی جو ان راستوں سے نسبت رکھتا تھا۔ اُسے وہ چہرے خدوخال کی تفصیل کے ساتھ یاد آ رہے تھے جو میری اور اس کی ذات کے حوالوں سے دوستی اور دشمنی کے

خانوں میں بٹے ہوئے تھے۔ اس کی سوچ میں ہر نقش ابھر رہا تھا جو خود فراموشی کے مختصر وقفے میں اس کی نظر سے اوجھل تھا۔ چہرے۔ مقامات۔ رشتے۔ خوف اور اندیشے۔ رنج و غم کے واسطے اور خوشیوں کے وسیلے۔ نفرتوں کے صلے اور چاہتوں کے سلسلے۔ خواہشوں اور ارمانوں کے روشن جذبوں کے رنگ اور ناامیدی کے تاریک سائے، یہ سب اس کے سامنے آتے جا رہے تھے اور اسے پکار رہے تھے۔ رابعہ ہم سب تمھارے وجود کا حصہ تھے اور ہیں... ہمیں جانو... پہچانو اور مانو۔

گاڑی ریلوے اسٹیشن سے علامہ اقبال روڈ کی طرف مڑی اور گڑھی شاہو کے مختصر سے بارونق بازار سے گزری۔ میں نے سوچا کہ اسے کچھ یاد دلاؤں۔ پھر یہ ارادہ ترک کر دیا اور اس کے ذہن کو اپنی مدد آپ کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا تاکہ وہ اپنی خود اعتمادی کے سہارے پر یادوں کی زنجیر تھامے چلتی جائے، جہاں تک بھی اسے گزرتے ہوئے وقت کی روشنی نظر آئے وہ خود ہر لمحے کی شناخت کرے اور احساس کی الجھی ہوئی ڈور کو سلجھاتی جائے۔ بالکل ٹھیک جگہ پر اور میری توقع کے عین مطابق اس نے گاڑی کو کراؤن سینما والی سڑک پر سیدھے ہاتھ کی طرف موڑ لیا۔ میری نظر بار بار رابعہ کی صورت پر جاتی تھی اور لوٹ آتی تھی۔ میں ایک عجیب سی بے چین کر دینے والی اور اعصاب شکن کیفیت سے دوچار تھا کیونکہ میں یہ نہیں جانتا تھا کہ اگلے لمحے کیا ہونے والا ہے۔ رابعہ کو ایک دم سب کچھ یاد آ جائے گا تو عالم زدہ یادوں کی یلغار سے دہشت زدہ ہو جائے گی یا اپنے خوف پر قابو پا لے گی۔ اپنے گھر کے بے نشاں آثار پر اس کا ردِ عمل کیا ہوگا؟ وہ چیخ مار کے بے ہوش ہو جائے گی یا دیوانہ وار گاڑی سے اتر کر بچپن سے جوانی تک ساتھ دینے والے مہربان گھر کے تصور سے لپٹ کر رونے لگے گی۔ وہ بالکل چپ تھی مگر اس کے جذباتی انتشار کا عکس اس کی صورت کے تغیر میں دکھائی دیتا تھا۔

رابعہ کے والدین کا گھر اور وہ گھر جہاں اس نے ہوش سنبھالا، آغازِ شباب کی امنگوں کو خوش آمدید کہا۔ برسوں میرے تصور سے خانۂ خیال کو آباد رکھا۔ وکالت کے کامیاب دور کا آغاز کیا۔ رسمِ دنیا نبھانے کے لیے ایک ایسے مرد کو شوہر مانا جو اس قابل ہی نہ تھا اور پھر رخصتی سے قبل ہی واپس دوشیزگی اختیار کی۔ مجھ سے ملی اور سب سے بچھڑی، ماں سے محروم ہوئی اور بالآخر بے گھر ہوئی۔ یہ سب فنا ہو جانے والے وقت کے عکس تھے جو اس کے ماضی کی یادوں سے پھر تصور میں جھلملائے اور وہ ساکت و صامت اس گھر کی جگہ ایک ملبے کے ڈھیر کو دیکھتی رہی جس کے گرد کھنچی ہوئی چار دیواری بھی زمانے کی دستبرد سے محفوظ نہ رہی تھی۔ کھنڈر کے جلے ہوئے دروازوں اور کھڑکیوں کی ہر چوکھٹ پہلے ہی غائب ہو چکی تھی۔ اب ضرورت مند اینٹیں نکال نکال کر لے جا رہے تھے۔ تھڑے بنانے کے لیے، منڈیر جوڑنے کے لیے، مسند وقفوں کے نیچے رکھنے اور کسی تخت یا چارپائی کے ٹوٹے پائے کی جگہ استعمال کرنے کے لیے جسے بھی دو چار یا پانچ دس اینٹوں کی ضرورت پڑتی تھی وہ اس لاوارث اور بے آسرا گھر کے ملبے سے یا اس کی چار دیواری سے نکالتے ہوئے نہیں شرماتا تھا۔

"سکندر..." رابعہ نے اچانک کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ معلوم نہیں میں یہاں کیوں آ گئی... یہاں تو اب کچھ بھی نہیں ہے۔"

"میرا بھی خیال ہے کہ ہمیں کہیں اور جانا چاہیے۔" میں نے جذبات کو قابو میں رکھتے ہوئے پُرسکون لہجے میں کہا۔ رابعہ کی یادداشت لوٹ رہی تھی اور وہ وقت کی زنجیر تھامے آگے بڑھ رہی تھی۔ جو درحقیقت پیچھے کا سفر تھا۔ وہ خود فراموشی کے اندھے کنویں سے نکلنے کی جدوجہد میں مصروف تھی اور اس کی آنکھیں اوپر کھلے آسمان کی وسعت میں روشنی دیکھنے لگیں۔ رابعہ نے پھر گاڑی اسٹارٹ کی اور واپس ہوئی۔ اتنے عرصے بعد کسی نے بھی رابعہ پر اور لال گاڑی پر توجہ نہیں دی۔ کوئی اس کھنڈر کے پرانے مکینوں کو یاد کرنے والا نہ تھا۔ سب زمانۂ حال میں جینے والے لوگ تھے جو گزر جانے والوں کو بھولنے میں دیر نہیں کرتے تھے، ورنہ رابعہ وہی بچی تھی جو اِن کی نظروں کے سامنے پیدا ہوئی۔ پلی اور بڑھی اور اسے پہچاننے والے سب پرانے لوگ ابھی ختم نہیں ہوئے تھے۔ رابعہ کی آنکھوں سے ایک قطرۂ اشک ٹپکا۔ یہ زندگی کی علامت تھی۔ احساس کو ٹھیس پہنچے، سوچ کے سمندر میں طوفان اٹھنے اور خیالوں کی برف کے پگھلنے کی علامت تھی۔ رابعہ جاگ رہی تھی اور اپنی پرانی دنیا کی جانب لوٹ رہی تھی۔ میرا مشن کامیابی سے ہمکنار ہونے لگا تھا مگر میرے لیے اس خوشی کے لمحات پہ قدغن لگانا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔

"تم مجھے بتاتے کیوں نہیں سکندر! مجھے کہاں جانا ہے؟" رابعہ نے اچانک کہا۔

"تمھیں میرے ساتھ جانا ہے۔" میں نے کہا۔ "اور مجھے تمھارے ساتھ جانا ہے۔ ہماری منزل الگ تو نہیں ہے۔"

رابعہ نے گاڑی کو نہر کے پل سے پہلے سیدھے ہاتھ کی طرف موڑا۔ وہ انکل رضوی کے گھر کی طرف جا رہی تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ اس میں میرے لیے کتنا خطرہ ہے مگر میں نے پچاس فیصد امید کا آسرا... مجھے دیکھنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ ان کی کوٹھی پر گارڈ متعین ہوئی تو وہ نئے محافظ ہوں گے اور اتنے مستعد کہاں ہوں گے کہ ہر گزرنے والی گاڑی میں سکندر بخت کی صورت تلاش کرتے ہوں۔ رضوی یا بچوں میں سے کوئی لال رنگ کی فاکس ویگن کو بھی پہچان [illegible] تھا۔ مجھے بھی اور رابعہ کو بھی مگر ان سے امید نہ تھی کہ وہ انکل [illegible] کی طرح قانون پرستی اور فرض شناسی کا مظاہرہ کریں۔ البتہ خود [illegible] رضوی سے مڈبھیڑ ہو جانے کی صورت میں بچنا محال تھا۔ ابھی [illegible] کوٹھی کے دروازے سے دور ہی تھے کہ رابعہ نے ایک دم بریک [illegible] کے گاڑی روک دی۔

"یہ... ادھر تو انکل رضوی مل سکتے ہیں۔" وہ گھبراہٹ میں بولی۔

"تم کیا منہ بند کیے بیٹھے ہو۔ مجھے روکتے بھی نہیں۔" اس نے بڑی [illegible] میں گاڑی کو واپس موڑنا چاہا مگر فاکس ویگن اپنے بڑے [illegible] کے باعث کم جگہ میں پورا چکر نہیں کاٹ سکتی۔ رابعہ کو سڑک [illegible] دوسرے کنارے سے جہاں میو گارڈن کی خاردار باڑھ تھی، کار [illegible] ریورس میں لینا پڑا۔ ہمارے پیچھے آنے والی ایک کار ذرا سی دیر [illegible] لیے رکنے پر مجبور ہوئی۔ فاکس ویگن جب آگے بڑھی تو میں نے [illegible] کار کے ڈرائیور کو دیکھا اور ایک لمحے کے لیے میرے دل کی دھڑکن رک گئی۔ وہ انکل رضوی کا ڈرائیور تھا جسے ہم نے سرونٹ کوارٹر سے بے دخل کیا تھا اور ترقی کا جھانسہ دے کر الیاس کو بنایا تھا کہ اس نے ہمارے جوتے تک پالش کیے تھے۔ رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا اور بانسوں والی سڑک پہ تاریکی زیادہ ہی محسوس ہوتی تھی۔ ایک بار ہم دونوں کی نظریں ملیں۔ پھر گاڑیاں ایک دوسرے کو کراس کر گئیں۔ میں نے سر گھما کے دیکھا تو انکل رضوی کی کار ٹھہری ہوئی تھی۔ اس کے پیچھے والے شیشے میں سے مجھے دو تین سر نظر آئے مگر فاصلہ بڑھ جانے کے باعث میں فیصلہ نہ کر سکا کہ اس وقت کار میں خود انکل رضوی تھے یا ان کی فیملی تھی۔ ڈرائیور نے یقیناً انھیں بتا دیا تھا کہ ابھی ابھی اتنے قریب سے گزرنے والی فاکس ویگن میں کون تھا۔ انکل رضوی ہوتے تو پلک جھپکتے میں باہر نکلتے اور فاکس ویگن کے ٹائروں پر فائر ضرور کرتے یا ڈرائیور سے کہتے کہ گاڑی کا تعاقب کرو۔ مگر کار چند سیکنڈ کے توقف سے پھر روانہ ہو چکی تھی۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ گاڑی میں بیگم رضوی اور بچے تھے۔ لیکن مجھے تھوڑی سی تشویش بھی لاحق ہو گئی۔ ہم نے اس جنت صورت ڈرائیور کے ساتھ کبھی اچھا سلوک نہیں کیا تھا بلکہ کسی حد تک اس سے دشمنی مول لے لی تھی۔ وہ یقیناً ایس ایس پی صاحب کو بتائے گا کہ مفرور ملزم سکندر بخت اور مسماۃ رابعہ قاری ایڈووکیٹ اپنی سرخ فاکس ویگن میں کوٹھی کے آس پاس مشتبہ حالت میں گھومتے ہوئے پائے گئے تھے۔

"تم نے ابھی تک لائٹ نہیں جلائی۔" میں نے کہا۔ "ویری گڈ... یہ اس میں ویری گڈ کی کون سی بات ہے؟" رابعہ نے کہا۔

"تمھیں یاد دلانا چاہیے تھا۔ خیریت ہوئی کہ..."

"اگر میں نے تمھیں یاد دلا دیا ہوتا تو خیریت ہرگز نہ رہتی۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "نمبر پلیٹ اندھیرے میں کسی سے نہیں پڑھی جاتی۔ روشنی ہوتی تو وہ مونچھ والا فوراً نمبر دیکھ لیتا!"

"کون مونچھ والا...؟" رابعہ نے حیرانی سے کہا۔

"انکل رضوی کا ڈرائیور... ابھی ابھی جو کار گزری ہے نا اُسے وہی چلا رہا تھا۔" میں نے کہا۔ "آنٹی پیچھے بیٹھی ہوئی تھیں۔"

"اوہ مائی گاڈ..." رابعہ نے ایک دم رفتار بڑھا دی... "انھوں نے ہمیں ضرور دیکھا ہوگا۔"

"ہاں! لیکن انھوں نے ہمیں روکنے کی کوشش نہیں کی۔" میں نے کہا۔ "خدا انھیں اس نیکی کا اجر دے۔"

"انھیں بہت دکھ ہوا ہوگا کہ ہم ان سے مل بھی نہیں سکے۔" رابعہ نے کہا۔ "اور یوں اجنبی ہو کے نکل گئے ہیں۔"

یہ ہماری کتابِ زندگی کا ایک اور باب تھا جو رابعہ کو یاد آ چکا تھا۔ میں اپنی کامیابی پہ بے حد مسرور تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے میں نے رابعہ کو ہار کر پھر جیت لیا ہے۔ میرے دماغ میں قوالی کے بول یوں گونج رہے تھے جیسے ریکارڈ گھس جانے سے سوئی ایک ہی جگہ اٹک گئی ہو۔ "محبت فاتحِ عالم... محبت فاتحِ عالم... اجی ہاں ہاں... محبت..."

"اب تو بتا دو کہ ہمیں کدھر جانا ہے؟" رابعہ نے بے بسی سے کہا۔

"تمھیں اچھی طرح معلوم ہے رابعہ..." میں نے کہا۔ "میری زندگی کے سفر میں ہر لمحہ ہر قدم تم میرے ساتھ رہی ہو... میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ تمھیں راستہ کہاں تک یاد ہے۔"

"تم مجھے آزما رہے ہو؟" وہ مسکرائی۔ "اچھا میں ایک کوشش اور کرتی ہوں..."

رابعہ نے گاڑی کو دائیں جانب موڑا اور نہر کے کنارے کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ راستے میں صرف ایک جگہ اس نے رفتار کم کی جہاں سڑک کے بیچ میں دو پولیس والے رائفل لیے کھڑے تھے۔ ابھی تو رات شروع ہوئی تھی۔ عموماً اس قسم کی چیکنگ پولیس والے نصف شب کے بعد شروع کرتے ہیں۔ ایک لمحے کے لیے خوف نے مجھے مغلوب کر لیا۔ شاید یہ ناکہ بندی آخر کس لیے؟ کیا اتنی سی دیر میں انکل رضوی نے پولیس کو خبردار کر دیا تھا کہ ایک لال رنگ کی فاکس ویگن کو اسی علاقے میں تلاش کریں جس میں مفرور اشتہاری مجرم سکندر بخت موجود ہے۔ میں رابعہ سے کہتے کہتے رک گیا کہ وہ

ایکسیلیٹر دبا کے گاڑی کو نکال لے جائے اور اس بات کی پروا نہ کرے کہ راستہ روکنے والے مارے جاتے ہیں یا اپنی جان بچاتے ہیں۔ پھر مجھے عقل نے لگام دی۔ پولیس والے مسلح تھے اور اگر وہ بچ جاتے تو بڑی آسانی سے ایک فائر کر کے ہماری گاڑی کو لنگڑا لولا کر دیتے۔ اس کے علاوہ پولیس کی جیپ سڑک سے ذرا ہٹ کے کھڑی ہوئی تھی اور اس میں کسی افسر کا ہونا یقینی تھا، کیونکہ جیپ کے سامنے والے حصے پہ وائرلیس کا انٹینا لہرا رہا تھا۔ وہ اپنے ریوالور سے ہمارے ٹائر چھلنی کر دیتا اور ہمارے پاس جو تھوڑا بہت چانس تھا کہ پہچانے نہ جائیں، وہ گرفتاری کے بعد ختم ہو جاتا۔ رابعہ نے میری طرف دیکھا اور بریک لگ گئے۔ ایک پولیس مین نے دائیں طرف آ کے اور دوسرے نے بائیں جانب سے ٹارچ کی روشنی اندر ڈالی۔ وہ بادلِ ناخواستہ ایک ضابطے کی کارروائی پوری کر رہے تھے۔

"کیا بات ہے بھئی...؟" میں نے متانت اور سکون کے ساتھ کہا۔

"کس کس کو بتائیں جی کہ کیا بات ہے؟" کانسٹیبل نے بیزاری سے کہا۔ "ایک ڈاکا پڑا ہے۔"

"جاؤ جی جاؤ..." دوسرے نے آل کلیئر کا سگنل دیا کیونکہ پیچھے دوسری کار آ گئی تھی۔ جب ہم سو گز دور نکل گئے تو میری جان میں جان آئی۔ اس وقت بھی جب ہماری کار ٹھہری ہوئی تھی، وائرلیس پہ انکل رضوی کا پیغام موصول ہو سکتا تھا اور میرا مشن جس کا مقصد رابعہ کی واپسی تھی، پسِ دیوارِ زنداں پہنچ کے پورا ہوتا جہاں سے پھر نکلنے کی امید رکھنا بھی محال تھا۔ نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم۔ جیتے جی کھوتی اد تھے آن کھلوتی۔ سارا عشق دھرا رہ جاتا۔ مادرِ وطن کے لیے جان کی بازی لگا دینے کے سارے منصوبے خاک میں مل جاتے۔

"اس وقت تو بال بال بچے۔" میں نے رابعہ کی طرف دیکھ کر کہا جو مجھے دیکھ رہی تھی۔

"تم کافی ڈر گئے تھے۔" وہ مسکرائی اور اسی وقت گاڑی نہر کی منڈیر پر چڑھ گئی۔ رابعہ نے ایک دم بریک نہ لگائے ہوتے تو دوسرے لمحے میں ہم فاکس ویگن کے ساتھ سوئمنگ کر رہے ہوتے۔

"تم سامنے دیکھ کر گاڑی چلاؤ۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ "فی الحال میں تم کو دیکھتا ہوں کیونکہ میں فارغ بیٹھا ہوں... تم مجھے بعد میں دیکھ لینا۔"

رابعہ ہنسی۔ اور مجھے اس ہنسی میں وہی پرانی رفاقتوں کی بے تکلف نغمگی محسوس ہوئی۔ پرانی اپنائیت کا بے ساختہ پن محسوس ہوا اور چاہت کے صادق جذبوں کی سرخوشی محسوس ہوئی۔ رابعہ نے کلچ دبایا اور گاڑی واپس نیچے اتر آئی۔ اس سڑک پر روشنی نہ ہونے کے برابر تھی اور فاکس ویگن کی ہیڈ لائٹس میں چھ والٹ کے بلب تھے چنانچہ ان کی روشنی بھی سڑک پر چند گز آگے تک ہی جا

"انکل رضوی کی کوٹھی کی طرف جاتے ہوئے تم رُک کیوں گئی تھیں؟" میں نے کہا۔

"یہی تو میں بھی سوچ رہی تھی... اور مجھے یاد نہیں آ رہا کہ بات کیا تھی... لیکن اُدھر کچھ خطرہ تھا۔" رابعہ نے کہا۔ "مجھے عین وقت پر خیال آیا کہ ہمیں اُدھر نہیں جانا چاہیے تھا... اگر ہمیں کوئی دیکھ لیتا تو اچھا نہ ہوتا۔"

"اور تم کو یہ بالکل یاد نہیں کہ وہاں ہم کیوں نہیں جا سکتے؟"

میں نے کہا۔ رابعہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔ میں نے اسے بہت سے واقعات یاد دلائے جو انکل رضوی کی کوٹھی میں قیام کے دوران پیش آئے تھے مگر اس کو صرف ایک بات یاد تھی کہ ایک رات ہم اس کوٹھی کے لان میں رات بھر شبنم سے بھیگی ہوئی چاندنی میں بیٹھے رہے تھے۔ اسے ہر اچھی بات یاد تھی۔ ہر ناخوشگوار یاد کو اس کے ذہن نے حافظے سے خارج کر دیا تھا تاہم اسے نامعلوم خطرات اور اندیشوں کے وجود کا احساس ہونے لگا تھا۔ میں باتیں کرتا رہا۔ اس کے ساتھ گزر جانے والا وقت حادثات و واقعات کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا لیکن میں نے نوٹ کیا کہ اس نے یادِ ماضی سے منسوب ہر خوشگوار تاثر کو قبول کر لیا تھا۔ جن باتوں سے اس کے ذہن کو صدمہ پہنچ سکتا تھا وہ اسے یاد ہی نہیں آتی تھیں۔ اس کو اپنے اغوا۔ دلاور اور ڈی سلوا سے تصادم۔ نواب خسرو جمشید کی کوٹھی میں پیش آنے والے واقعات، قصرِ جمشید کی آتش زدگی اور گامے ماچھی کے اڈے سے اپنے اغوا کے بعد کے واقعات بالکل یاد نہیں تھے۔ اس کی ذہنی کیفیت کا موازنہ کسی ایسے مریض سے کیا جا سکتا ہے جس نے حالات کے دباؤ اور اعصابی کشیدگی کے باعث خودکشی کی کوشش کی ہو اور جس کی حالت اب ڈاکٹروں کی کوشش سے خطرے سے باہر ہو مگر ڈاکٹر صرف انہی لوگوں کو ملنے کی اجازت دینے پر تیار ہوں جن سے ملاقات کا ردِ عمل ناخوشگوار نہ ہو اور انھیں مریض کے سامنے جانے کی اجازت نہ ملے جن سے اندیشہ ہو کہ ان کو دیکھ کر مریض نفرت یا غصے کے ردِ عمل کا شکار ہوگا اور یہ ممکن ہے کہ اس کے لیے یہ ذہنی صدمہ کسی پاگل پن یا جنون کے دورے کی شکل اختیار کر جائے۔ رابعہ بھی اپنی یادداشت سے فی الحال پُرمسرت یادوں کو منتخب کر رہی تھی۔ یہ ایک لاشعوری عمل تھا۔ وہ ماضی کی محفوظ گلیوں تک پہنچ گئی تھی۔ اس کے لیے فوری طور پہ قتل و خونریزی، تباہی و غارت گری اور جان لیوا خطرات کی یادوں سے رشتہ استوار کرنا ایک غیر محفوظ عمل تھا۔ اس کی ذہنی صحت کی مکمل بحالی تک یہ حفاظتی انتظام ضروری تھا تاہم مجھے یقین تھا کہ مکمل خود فراموشی کا دور ختم ہو چکا ہے تو رفتہ رفتہ اس کا ذہن تلخ حقائق کو بھی قبول کرنے لگے گا اور جب اس کا اعتماد بحال ہو جائے

وہ سب یاد آ جائے گا جو لاشعور سے بھی نیچے تحت الشعور کی گہرائی میں دفن ہو گیا ہے۔

میں دیکھ رہا تھا کہ وہ کدھر جا رہی ہے۔ آج کے لیے میری اتنی کامیابی ہی بہت تھی کہ اس نے مجھے محسن اور شہلا کو، انکل شیروانی اور انکل رضوی کو، غالب کو اور استاد ڈیڈی کو پہچان لیا تھا اور اس نے اپنے آدھے ماضی سے رشتہ جوڑ لیا تھا اور اس آدھے وقت سے اس کی ہر یاد مسرت کے احساس کی ضامن تھی۔ اس نے مجھے اور میری محبت کو قبول کر لیا تھا۔ ایک ازلی اور ابدی حقیقت کے طور پر محبت ابتدا سے تھی۔ اس ابتدا کے وقت کا... تعین وہ نہیں کر سکتی تھی۔ اسے صرف یہ خیال تھا کہ میرے علاوہ اس نے کسی کو چاہا نہ تھا اور نہ یہ ممکن تھا کہ مجھے کبھی فراموش کر سکے۔ اُسے بالکل احساس نہ رہا تھا کہ درمیان میں خود فراموشی کا ایک ایسا وقت بھی آیا تھا جب وہ مجھے بھی پہچاننے سے قاصر رہی تھی۔ اگر کسی بچے سے ہوش سنبھالنے کے بعد کسی دن اچانک یہ پوچھا جائے کہ تمھیں سر پر آسمان کی موجودگی کا احساس کب ہوا تھا تو وہ پریشان ہو جائے گا اور کہے گا کہ آسمان تو شروع سے ہے اور ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی اس دنیا کو بغیر آسمان کے تصور کر سکے۔ یہی حال رابعہ کا تھا۔ اسے یقین تھا کہ محبت سے اس کی زندگی نہ کبھی خالی تھی نہ ہو سکتی تھی۔ اگر میں اس سے کہتا کہ وہ دن یاد کرو جب تم پہلی بار مجھ سے ملنے کے لیے میری وکیل بن کر جیل میں ملاقات کے لیے آئی تھیں اور اس دن تمھارا لباس یہی تھا تو اُسے بالکل یاد نہ آتا اور میں اس کو بتاتا کہ وہی میری اور اس کی محبت کے آغاز کا پہلا لمحہ تھا جب میں نے اس کا یہ روپ دیکھا تھا تو وہ حیران ہوتی۔

اس نے سمن آباد میں میرے آبائی گھر میں گاڑی روک دی۔ گھر ویران، تاریک اور آسیب زدہ نظر آتا تھا۔ اس کے سب دروازے بند تھے اور کھڑکیاں بند تھیں۔ اس کے اُجڑے باغیچے میں پرانے درخت سرنگوں کھڑے تھے اور سناٹے میں جھینگر روتے محسوس ہوتے تھے۔ کسی دور افتادہ گوشے سے ایک مینڈک کے ٹرّانے کی آواز سنائی دے رہی تھی، ورنہ مکمل خاموشی تھی۔ میں رابعہ کو چھوڑ کر بہت پیچھے نکل گیا تھا۔ چند لمحوں میں میری آنکھوں نے اپنے بچپن کی یادوں کے اَن گنت زندہ عکس دیکھ لیے جو میری یادداشت میں محفوظ تھے۔ پھر مجھے وہ ریٹائرڈ سیشن جج یاد آیا جو اس گھر میں اکیلا رہ گیا تھا اور جس نے یہ مکان رابعہ کو دے کر مجھے میرا ماضی لوٹا دیا تھا مگر خود اپنا سب کچھ گنوا بیٹھا تھا۔ چشمِ تصور سے میں نے اپنے گزرے ہوئے وقت کو ان دیواروں میں محبوس دیکھا۔ ہر وقت مجھے پکار رہا تھا کہ بتاؤ کبیر خان... تم کب تک ہمیں تنہائی کی قید میں رکھو گے۔ آؤ اور وزیر خان کے وارث کی حیثیت سے اس گھر کے چراغ روشن کرو۔ دیواروں سے اداسیوں کے جالے نوچ کر پھینک دو اور ویرانی کو بے دخل کر دو۔ اس کی فضا میں خوشی کے نغمے اور مسرت بھرے قہقہے پھیلا دو۔ یہ وقت رابعہ کے لیے بانہیں پھیلائے کھڑا تھا کہ آؤ... تم رُک کیوں گئی ہو۔ تم تو اس گھر کی مالکن ہو۔ تمھیں تو اس گھر کو جنت بنانا ہے۔ اپنی محبت، توجہ اور پیار سے اس میں زندگی کے سارے شوخ رنگ بھرنے ہیں اور اس گھر کو وہ خوشی، خوب صورتی اور خوشحالی دینا ہے جو وزیر خان کا ارمان تھی۔ خواب تھی اور حسرت تھی اور اب اس کی روح کی خلش ہے جسے تم ہی دور کر سکتی ہو۔ اس کی بے کل روح تب ہی قرار پائے گی جب اس ویرانی کے جمود کو اس کا پوتا یا پوتی دنیا میں اپنی آمد کے اعلان سے توڑیں گے اور پھر اپنی معصوم ہنسی اور شریر قلقاریوں سے بھر دیں گے۔

"سکندر!" رابعہ نے میرے شانے پر سر رکھ کے کہا۔ "یہ گھر تو ہمارا ہے نا... یہاں آ کے تو میں نے کوئی غلطی نہیں کی۔"

میں نے اس کے سر کو پیار سے تھپکا۔ "یہ ہمارا ہی گھر ہے۔ لیکن آج اس کے دروازے بند ہیں۔ ایک دن یہ دروازے تم اپنے ہاتھوں سے کھولو گی۔ اس دن تمھارے ہاتھوں میں مہندی ہوگی اور تمھاری مانگ میں افشاں۔ اس گھر کے دروازے پر وزیر خان اپنی... بہو کا استقبال کرنے کے لیے خود موجود ہوگا۔ یہاں چراغاں ہوگا۔ سیج کے لیے پھولوں کی خوشبو ہوگی اور شادمانی کے نغمے ہوں گے اور جب تم لباسِ عروسی میں میرے ساتھ اس گھر میں قدم رکھو گی تو پھر یہ گھر ہمارا نہیں ہوگا۔ ہم اس گھر کے ہو جائیں گے... ہمیشہ کے لیے..."

میں نے رابعہ کی طرف دیکھا۔ چاندنی اس کے رُخ پر نثار ہو رہی تھی اور اس کی بند آنکھیں خواب کو حقیقت کی طرح دیکھ رہی تھیں۔ وہ تصورات کی دھنک کے جھولے میں پرواز کرتی جا رہی تھی اور خوشیوں کو آسمان کے تاروں کی طرح اپنی جھولی میں بھرتی جا رہی تھی۔ اس ماحول اور اس کے ساحر حسن کا طلسم بے خودی کا احساس بن کر چھا گیا اور اس وقت کا نقش دائمی ہو گیا۔ میں نے اپنی خوش بختی پر ناز کیا کہ میں اپنے گھر میں ہوں اور میرے ساتھ میری محبت ہے اور رابعہ ہے جس کے حسنِ بے مثال کی تابندگی سے کائنات روشن ہے اور میرے دل میں اجالا ہے۔ دوسرے لمحے یہ خواب ٹوٹ گیا جو حقیقت سے زیادہ حقیقی تھا۔ رابعہ نے سر اٹھا کے مجھے دیکھا اور آہستہ سے مسکرائی۔ چاندنی کچھ اور نکھر گئی۔ دل کچھ اور مچل گیا لیکن میں رابعہ کو دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں سے میں اس کے دل میں اتر گیا۔ "محبت فاتحِ عالم... محبت فاتحِ عالم... اجی ہاں ہاں... محبت فاتحِ عالم..." ہر طرف سے صدا آنے لگی۔

"چلو رابعہ..." میں نے چونک کر کہا۔ "میں تمھیں واپس لے چلتا ہوں... رات بہت ہو گئی ہے..."

"کیا تم رات سے ڈرتے نہیں سکندر۔" وہ بولی۔ "میں بہت ڈرتی ہوں... میں اکیلی رہ جاتی ہوں نا... مجھے اپنے ساتھ لے چلو یا میرے ساتھ چلو... ڈاکٹر لطیف کے گھر۔"

"میں وہاں نہیں رہ سکتا رابعہ۔" میں نے کہا۔ "اور تمھیں اپنے ساتھ بھی نہیں رکھ سکتا۔ کل میں پھر آؤں گا۔ پھر میں تمھیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ میں تمھیں محسن اور شہلا کے گھر لے چلوں گا اور پھر تم ان کے ساتھ ہی رہو گی۔"

"سچ کہہ رہے ہو؟" وہ بولی۔ "کھاؤ میری قسم۔"

"میں تمھاری اور تمھاری محبت کی قسم کھا کے کہتا ہوں کہ کل تمھیں ضرور لے جاؤں گا۔" میں نے اُسے یقین دلایا۔ "وعدہ کرو آج رات تم نہیں ڈرو گی۔ سکون سے سوتی رہو گی۔"

"اگر نیند نہ آئی تو میں تمھاری یاد کو ساتھ رکھوں گی۔ پھر مجھے ڈر نہیں لگے گا۔" وہ بولی۔ "اور نیند آئی تو خواب میں تمھیں ساتھ رکھوں گی... یہ کیسی عجیب بات ہے سکندر کہ یہاں مجھے بالکل ڈر محسوس نہیں ہوتا حالانکہ یہاں کتنی ویرانی ہے، اندھیرا ہے اور خاموشی ہے مگر ڈاکٹر لطیف کے گھر میں سب کے درمیان رہ کے بھی میں ڈرتی تھی... پریشان رہتی تھی۔"

"مجھے تو اب بھوک پریشان کر رہی ہے۔" میں نے رونی آواز میں کہا۔ "اگر میں نے آدھے گھنٹے کے اندر اندر کہیں بیٹھ کر چکن تکے نہ کھائے تو رات کو خواب میں مجھے مرغے ڈرائیں گے... کہ تمھارے لیے ہم جان سے گئے اور تم نے ہمارے تکے چکھے بھی نہیں۔"

رابعہ ہنس پڑی۔ "اگر تم کہتے کہ چائنیز کھانے چلتے ہیں تو میں انکار کر دیتی۔ میں خود چکن تکے کھانے کا ارادہ کر کے گھر سے نکلی تھی۔ اور بھوک مجھے اس وقت ہی لگ گئی تھی۔"

"اور اپنے ساتھ مجھے بھی بھوکا پیاسا لیے پھرتی رہیں...؟" میں نے مصنوعی غصّے سے کہا۔ "چلو ہٹو... اب گاڑی میں چلاؤں گا ورنہ تمھارا کیا ہے... لے جاؤ گی کہیں اور... ہمیں جانا ہے دار کباب۔"

رات کے گیارہ بجے میں نے بے خیالی میں گاڑی کو ڈاکٹر لطیف کی کوٹھی میں موڑا۔ میں رابعہ کے قریب اور اس کے ساتھ گزر رہی ہوئی شام کے نشے میں ڈوبا ہوا تھا کہ موش نے دہاڑ کر حملہ کیا۔ میں اچھل پڑا اور میں نے بے اختیار موش کو اُلّو کا پٹھا کہا۔ "ڈاکٹر لطیف بھی کمال کرتے ہیں۔ اس کا نام رکھ دیا موش یعنی چوہا۔ گدھے کے برابر کتا ہے۔ خرکار قسم کا نام رکھتے۔" میں نے کہا اور رابعہ ہنسی۔ گاڑی کی آواز پر ڈاکٹر لطیف باہر آئے اور انھوں نے موش کو بھگایا۔

"آپ ماہرِ نفسیات ہیں ڈاکٹر صاحب" میں نے نیچے اتر کر کہا۔ "آپ کے پاس آنے والے نفسیاتی مریض ہوتے ہیں۔ ان کا تو نروس بریک ڈاؤن ہو جاتا ہوگا۔ یہ کیا خطرناک چیز رکھ دی ہے آپ نے استقبالیہ پر..."

ڈاکٹر لطیف ہنسنے لگے۔ "اسے بھی وہ شوق ہے ہمارے ولی عہد کا... ویسے بہت بے ضرر چیز ہے۔"

"کون؟ آپ کا ولی عہد؟" میں نے کہا۔ "بالکل ہوگا مگر یہ جانور... اس کی تو آواز سے ہارٹ اٹیک ہو سکتا ہے... آپ ایسا کریں، پسج پم کا چوہا پال لیں۔ وہ واقعی بے ضرر ہوتا ہے۔ اسے موش کہنا ایسا ہی ہے جیسے بم کو ٹافی کہنا۔"

رابعہ پھر ہنسی اور ڈاکٹر لطیف کا چہرہ مسرت سے دمک اُٹھا۔ انھوں نے رابعہ کی اس خوشی کا اندازہ کر لیا جو ہنسی میں اس کے لبوں تک آئی تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے پہلے چاندی کے روپے کے کھوٹے یا اصلی سونے کا اندازہ اس کی کھنک سے کیا جاتا تھا۔ فرش پر بجنے والی خالص چاندی خود اپنی پہچان بتاتی تھی۔

"کیسی رہی تم لوگوں کی شام؟" ڈاکٹر لطیف نے انگریزی میں کہا۔

"بہت اچھی۔" میں نے رابعہ کی طرف دیکھا۔ "کیا آپ کو اچھی نہیں لگ رہی ہے؟" رابعہ شرما کے ہنسی اور اندر غائب ہو گئی۔

"میں سمجھ رہا تھا کہ تم کامیاب رہو گے۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "کتنی کامیابی حاصل ہوئی ہے؟"

"ساٹھ فیصد تو یقیناً ہوئی۔ اگر میں مغالطے سے کام نہ لوں۔" میں نے کہا۔ "کل وہ محسن اور شہلا کے گھر جانا چاہتی ہے... میرا خیال ہے وہاں رہ کے وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔"

"میں تمھارے یقین کی نفی نہیں کرتا... مگر کیا وہ وہاں محفوظ رہے گی؟"

"اگر مجھے ایک فیصد بھی شبہ ہوتا تو میں یہ رسک نہ لیتا۔ اس گھر سے محفوظ تر جگہ کا میرے ذہن میں تصور ہی نہیں لیکن یہاں رابعہ خود کو ایک کلینک میں محسوس کرتی ہو گی۔ بے شک آپ کا رویّہ اور یہ گھریلو ماحول ہرگز کلینک والا نہیں۔ یہ اس کے دماغ میں تو ہو سکتا ہے... جہاں وہ جانا چاہتی ہے وہ اپنے گھر کی طرح ہے... اپنے گھر لوٹ کر آنے کے بعد ہر مریض ذہنی طور پر خود کو صحت یاب محسوس کرتا ہے..." میں نے کہا۔

"میں تم سے سو فیصد اتفاق کرتا ہوں... جب اُسے اپنے والے ہوں گے اور وہ ماحول سے مطابقت پیدا کرے گی تو سارے ٹوٹے ہوئے رشتے قائم ہو جائیں گے مگر احساسِ تحفظ کی شرط ہے۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔

میں نے ان کو شب بخیر کہا اور گاڑی کو واپس لے گیا۔ بے اختیار میری نظر اوپر کے ایک روشن دریچے پر گئی۔ روشنی کے مستطیل فریم میں رابعہ کا پیکرِ حسن ایک عکسِ جمیل کی طرح نظر آ رہا تھا۔ اس نے سے ہاتھ اُٹھایا اور میں نے جواب میں ہاتھ ہلا کے دل پر رکھ لیا۔ وہ دہی تھی مگر اس کی چاہت کا احساس نیا تھا۔ عشق کی وارفتگی میں وصال کے بعد ہجر کی شب کی کسک میں بھی آزار تھی، وہ نئی تھی۔ میں اس کی مئے حسن کے نشے اور خمارِ میں گم تھا۔ میری نظر میں اس کا چہرہ تھا اور میرے کانوں میں کی آواز... مجھے گرد و پیش کی خبر ہی نہ تھی اور میں ذہن کے عمل کے تابع گاڑی کو ساٹھ ستر میل فی گھنٹا کی رفتار سے جا رہا تھا۔ مجھے بالکل پتا نہیں چلا کہ وہ کار کہاں سے میرے

رات کے ساڑھے گیارہ بجے سڑکیں ویران تھیں۔ شاید یہی وجہ ایک جگہ موڑ کاٹتے ہوئے میں نے رفتار کم کی تو عادت کے مطابق پیچھے دیکھا۔ ایک کار کی ہیڈ لائٹس کے سوا مجھے کچھ نظر نہیں آیا۔ وہ کار پیچھے تھی۔ چنانچہ میں نے انڈیکیٹر لائٹ نہیں دی اور مڑ گیا۔ پھر نے دیکھا تو وہ گاڑی اتنے ہی فاصلے پر مجھے اپنے پیچھے نظر آئی۔ نے رفتار کم کی اور بیس پچیس میل پر آ گیا۔ وہ گاڑی اس کے باوجود رہی۔ اس کا فاصلہ بھی کم نہیں ہوا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جو پہلے ساٹھ ستر میل فی گھنٹا کی رفتار سے میرا تعاقب کر رہی تھی اب کی رفتار بھی بیس پچیس میل کر لی گئی تھی ورنہ وہ چند منٹ میں اوور ٹیک کر جاتی۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ تصدیق کے لیے میں نے رفتار بڑھائی۔ میرے سامنے ایک سیدھی اور خالی سڑک تھی جس ستر اسّی میل فی گھنٹا کی رفتار ممکن تھی۔ مجھے اس سڑک پر ایک آگے جا کے پھر دائیں طرف مڑنا تھا لیکن میں سیدھا چلتا گیا۔ شک اس وقت یقین میں بدل گیا جب پیچھے آنے والی کار اتنے ہی فاصلے پر موجود رہی۔ اس کی رفتار بھی اسّی میل ہو گئی اور اس کار میں جو بھی تھا، وہ ماہر ڈرائیور تھا کہ دُور ہونے کے باوجود اپنی رفتار کو ضرورت کے مطابق کم زیادہ کر لیتا تھا لیکن درمیانی فاصلے میں فرق نہیں آتا تھا۔

میرے ذہن سے رابعہ کا خیال نکل گیا اور ایک رومانی شام کے پُرکیف خیالات کا بیڑا غرق ہو گیا۔ دشمن اچانک نمودار ہوا تھا اس کے ساتھ ہی خطرے کا احساس تمام خیالوں پر غالب آ گیا۔ میرا ذہن چوکنا اور مستعد ہو گیا تھا اور میرے جسم کا رُواں رُواں مقابلے کے لیے کھڑا ہو گیا تھا۔ فوری طور پر مجھے ایک خیال یہ آیا کہ تعاقب کرنے والے کون ہو سکتے ہیں؟ شکاری تھے تو کون سے شکاری؟ سب سے پرانے اور خطرناک شکاری چوہدری ولاور اینڈ کمپنی والے تھے۔ دوسرے شکاری قانون کے محافظ تھے جن کو ہر جگہ اور ہر وقت ایک اشتہاری مجرم سکندر بخت کی جستجو تھی۔ اب تیسری قسم کے دشمن سامنے آ چکے تھے جو میری ذات کے دشمن نہیں تھے، میرے ملک کے دشمن تھے لیکن ان کے عزائم کی راہ میں حائل ہو کے میں نے انھیں اپنا دشمن بنا لیا تھا۔ یہ کرنل جگجیت ناتھ سیوک اور سادھو رام جو دور سے پہچانے جانے والے شکاری تھے۔ سائیں بابا پر حملہ کروانے اور دلربا کے اڈّے کی تباہی کے بعد اگر یہ شکاری بھی میرے پیچھے لگ چکے ہوں تو عجیب نہیں۔ وہ انٹیلی جنس کے لوگ تھے اور ان کے مخبر و معاون ہمارے درمیان موجود تھے۔ ان کے لیے میرا سراغ لگانا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ یہ تیسری قسم کے شکاری اپنی خونریزی اور تباہ کاری کی صلاحیت کے اعتبار سے پہلے نمبر پر آتے تھے۔ ان کے لیے ایک فرد یا ایک گھر کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ یہ ایک بستی کو اپنے مذموم عزائم کی بھینٹ چڑھا سکتے تھے اور ان کا مقابلہ کرنا سب سے زیادہ مشکل تھا۔

دوسرا خیال مجھے یہ آیا کہ آخر تعاقب کرنے والے کب سے میرے پیچھے ہیں؟ میں تو رابعہ کے ساتھ دنیا و مافیہا سے غافل و بیگانہ تھا۔ کیا وہ ہر جگہ میرے پیچھے تھے لیکن بازاروں اور سڑکوں کی ٹریفک میں وہ نمایاں نہ ہوئے تھے۔ ان کا ارادہ میری جان لینے کا ہوتا تو وہ اسی وقت گولیاں برساتے ہوئے نکل جاتے جب میں نے اپنی گاڑی کی رفتار کم کی تھی لیکن وہ بڑی مستقل مزاجی سے میرے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ ان کا مقصد کچھ اور تھا۔ میں نے ایک موڑ کاٹا اور تقریباً دو فرلانگ تک نسبتاً چھوٹی سڑک پر چلنے کے بعد دوسری بڑی سڑک پر مڑ کے واپس ہو گیا۔ یہ دوسری سڑک پہلی سڑک کے متوازی تھی۔ مجھے اس کار ڈیلر کا خیال بھی آیا۔ کیا اس نے استاد پیڈرو کو بتا دیا تھا کہ گاڑی سکندر بخت لے گیا؟ رضاکارانہ طور پر نہ سہی اس نے گن پوائنٹ پر یہ اطلاع دے کر اپنی جان بچائی ہو گی۔ اگر ایسا ہی ہوا تو کل اس خبیث کی خیر نہیں۔ ابھی تو مجھے اپنی جان بچانے کے لیے کچھ کرنا تھا۔

میری نظر نے اچانک بائیں ہاتھ پر ایک کوٹھی دیکھی جس کے دو دروازے تھے۔ ایک اندر جانے کے لیے اور دوسرا باہر آنے کے لیے۔ گیٹ کھلا ہوا اور خاصا کشادہ تھا اور اس کے اوپر لائٹس تھیں چنانچہ راستہ صاف دکھائی دیتا تھا۔ گزرتے گزرتے میں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ اندر پورٹیکو میں کوئی گاڑی نہیں ہے اور گیٹ پر چوکیدار نہیں ہے۔ میں کوٹھی کو ذہن میں رکھتے ہوئے سیدھا گزر گیا۔ میرے ذہن میں ایک اسکیم آ رہی تھی لیکن اس پر عمل کرنے سے پہلے میں ہر قسم کے امکانات پر اچھی طرح غور کر لینا چاہتا تھا۔ میں نے چند لمبے گہرے سانس لیے اور گاڑی کی رفتار کم کر کے سکون سے بیٹھ گیا۔ تقریباً سو گز کے بعد ایک چوک سا آ گیا جس میں دائیں اور بائیں جانب دو گلیاں تھیں۔ بائیں طرف کے بارے میں میرے ذہن میں کوئی نقشہ نہیں تھا لیکن دائیں جانب مڑ جانے کے بعد مجھے پھر اسی بڑی سڑک پر پہنچ جانے کی امید تھی جس سے میں چند منٹ پہلے گزرا تھا۔ اس بات کو یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ میں نے ایک مستطیل میں سفر کیا جس کے دو متوازی ضلعے دو فرلانگ لمبی اور زیادہ چوڑی سڑکوں پر مشتمل تھے اور چوڑائی کے رُخ کے دونوں ضلعے تنگ گلیاں

تھیں جو سو گز یا اس سے کچھ کم لمبی ہوں گی۔

ایک بار پھر میں بڑی سڑک پر پہنچا تو موڑ کاٹتے ہوئے میں نے دوسری کار کو دیکھا۔ وہ پچاس ساٹھ گز پیچھے تھی اور تعاقب کرنے والے بڑی مستقل مزاجی کا ثبوت دے رہے تھے۔ میرا پورا چکر تقریباً پون میل بنتا تھا اور پیچھے آنے والے بیوقوف نہیں تھے۔ وہ یقیناً سمجھ چکے ہوں گے کہ مجھے تعاقب کا علم ہو گیا ہے اور میں نے جان بوجھ کر انھیں چکر دیا ہے۔ اب میں پھر اس راستے پر دوسری بار رواں تھا جس پر سے پانچ دس منٹ قبل گزرا تھا۔ میرا منصوبہ میرے ذہن میں مکمل ہو گیا تھا اور اس کے تمام خطرات کو سامنے رکھتے ہوئے بھی میں نے اس پر عمل کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میں نے اسپیڈو میٹر پر نگاہ ڈالی۔ میری رفتار تیس میل فی گھنٹا تھی۔ دو فرلانگ بعد میں دائیں طرف مڑا اور بائی لین میں سو گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد پھر دائیں طرف موڑ کاٹ کر بڑی سڑک پر آگیا۔ یہ اسی محدود علاقے میں میرا دوسرا چکر تھا جس کی حد بندی چار سڑکوں سے ہوتی تھی۔

وہ کوٹھی جس کے دو گیٹ کھلے ہوئے تھے اپنی مخصوص ساخت کی گیٹ لائٹس کے باعث مجھے دور ہی سے نظر آگئی تھی۔ میرے دشمن ابھی پیچھے تھے۔ بڑی سڑک پر آتے ہی میں نے ایکسیلریٹر کو دبایا اور فاکس ویگن جس کے انجن کی پک اپ کا مقابلہ بہت کم گاڑیاں کر سکتی ہیں اپنی قوت میں گرجا۔ گاڑی کسی چیتے کی طرح جست لگا کے بڑھی اور دس سیکنڈ سے بھی کم وقت میں اس کی رفتار اسی میل تک پہنچ گئی۔ اس سے پہلے کہ میرے پیچھے آنے والی کار پچھلا موڑ کاٹتی میں کوٹھی کے پہلے گیٹ میں داخل ہو چکا تھا۔ اندر جاتے ہوئے میں نے رفتار کو قابو میں رکھنے کے لیے بریک پر پاؤں کا پورا دباؤ ڈال دیا تھا۔ گاڑی کے پہیوں کی گردش رک گئی مگر گاڑی اپنے زور میں گھسٹتی ہوئی بڑھتی گئی۔ ٹائر کھردری زمین پر رگڑ کھا کر گھوم گئے اور گاڑی خود بخود نوّے درجے کے زاویے پر مڑ گئی۔ اتنی زیادہ رفتار پر اچانک بریک لگنے سے یہی ہوتا ہے۔ ڈرائیور پہلے سے تیار ہو اور ہوشیار ہو تو گاڑی کو گھوم جانے کے باوجود سنبھال لیتا ہے۔ ہموار سطح والی سڑک پر گاڑیاں اس حد تک بھی گھوم جاتی ہیں کہ ان کا رخ پلٹ جاتا ہے۔ اور سطح حد سے زیادہ چکنی ہو تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ گاڑی الٹ سکتی ہے یا کئی قلابازیاں کھا سکتی ہے۔

یہاں میری توقع کے مطابق ناہموار کنکروں کی نیم پختہ سڑک پر گاڑی نے تھوڑا سا ٹرن لیا تو میں نے بریک پر سے پاؤں ہٹا لیا اور گاڑی پھر آگے بڑھی۔ گیٹ کے اندر مجھے ایک نیم دائرہ سا نظر آیا۔ پہلے گیٹ سے شروع ہونے والا راستہ پورٹیکو سے نکلتا ہوا دوسرے گیٹ تک جا رہا تھا اور یہ نصف دائرہ کوٹھی کی چوڑائی تک پھیلا ہوا تھا۔ میں پورچ کے نیچے سے دوسرے گیٹ پر پہنچ کے میں نے گاڑی روک لی مگر انجن بند نہیں کیا۔ میرے حواس اب اس شکاری سے زیادہ بیدار تھے جو اندھیرے سنسان جنگل میں کسی مچان پر بیٹھا شیر کے قریب آنے کی ساری علامات نوٹ کر رہا ہو۔ میں نے اس یقین پر جوا کھیلا تھا کہ پیچھا کرنے والوں نے مجھے کوٹھی کے گیٹ میں غائب ہوتے نہیں دیکھا ہوگا اور وہ سڑک کو اچانک خالی پا کے حیران بھی ہوئے ہوں گے اور پریشان بھی کہ زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔ احتیاطاً میں نے گاڑی کی لائٹس بھی آف کر دی تھیں اور گاڑی کا سرخ رنگ رات کی سیاہی کا جزو بن گیا تھا۔ فاکس ویگن کے انجن نے کوٹھی کے اندر رہنے والوں کو اپنی آمد کی اطلاع اپنی آواز سے دے دی تھی لیکن ابھی تک کوئی باہر نہیں نکلا تھا۔ اس کا اندازہ مجھے یوں ہوا کہ پورچ کی لائٹ آن ہو گئی تھی۔ میں آواز پر کان لگائے بیٹھا رہا۔ چند سیکنڈ کے انتظار کا یہ وقفہ بہت مختصر ہونے کے باوجود انتہائی اعصاب شکن ثابت ہوا۔ جو کچھ میں کرنا چاہتا تھا اس میں میری کامیابی کا انحصار میرے اندازے کی درستگی پر تھا۔ ایک سیکنڈ کے فرق سے بھی میرا نشانہ خطا ہو سکتا تھا۔ میں ایک پاؤں سے کلچ دبائے اور دوسرا پاؤں ایکسیلریٹر پر رکھے اسی طرح بیٹھا تھا جیسے شکاری بندوق کے ٹرائیگر پر انگلی رکھے نشانہ لیے شکار کے اس جگہ تک پہنچنے کا انتظار کرتا ہے جہاں اس پر چلائی جانے والی گولی کا ہلاکت آفریں اثر یقینی ہو اور زیادہ سے زیادہ ہو۔ چند سیکنڈ کے بعد میں نے اس کار کی آواز کو بہت قریب سے سنا۔ اس کی ہیڈ لائٹس سے پہلے والے گیٹ کے سامنے کا کچھ حصہ روشن ہوا۔ پھر میں نے کار کو پہلے گیٹ کے سامنے سے گزرتے دیکھا۔ پہلے اور دوسرے گیٹ کا درمیانی فاصلہ مشکل سے تیس گز تھا۔

میرے دماغ کے کمپیوٹر نے از خود مجھے اطلاع دی کہ دوسرے گیٹ کے سامنے سے وہ گاڑی کتنی دیر بعد گزرے گی۔

بالکل ٹھیک وقت پر اسی خودکار ذہنی نظام سے مجھے گرین سگنل ملا اور میں نے اللہ کا نام لے کر کلچ پر سے پیر ہٹا لیا۔ ایکسیلریٹر پر دباؤ پڑتے ہی گاڑی اندھیرے میں سے یوں باہر نکلی جیسے گھات میں بیٹھا ہوا خونخوار درندہ اپنے شکار کو سامنے سے گزرتے دیکھ کر جھپٹتا ہے۔ عین اس وقت جب وہ کار دوسرے گیٹ کے سامنے تھی، فاکس ویگن نے پوری قوت کے ساتھ اس کی سائڈ میں ٹکر ماری۔ آگے فاکس ویگن کا انجن نہیں تھا۔ خالی ڈکی اور اس سے آگے بہت مضبوط بمپر تھا۔ بمپر دوسری کار کے اگلے دروازے پر لگا تو ایک خوفناک دھماکا ہوا۔ میں اس تصادم کے لیے تیار تھا چنانچہ میں نے سر اور سینے کو بچانے کی کوشش میں اسٹیئرنگ پر دونوں کہنیاں ٹکا دی تھیں اور کچھ جھک گیا تھا۔ پھر بھی تصادم کی قوت نے مجھے سیٹ سے اچھال دیا اور میں چھت سے ٹکرا کے پھر نیچے آیا۔ میرے کانوں نے شیشہ ٹوٹنے اور دھات کی چادر کے

ٹنے اور اپنے ہاتھوں پر اور چہرے پر سوئیوں بھن محسوس کی۔ یہ شیشے کے ذرات تھے جو اڑ کر میرے جسم کے صوں پر لگے تھے۔ اگر میں نے آنکھیں مضبوطی سے بند نہ رکھی ہوتیں شیشے میری آنکھوں میں اتر جاتے۔ ان کی نوکیلی تیز دھار آنکھ کے ے کو چیر دیتی اور میں ہمیشہ کے لیے اندھا ہو جاتا۔ اب مجھے ماتھے، ے اور بازوؤں پر آنے والی گہری خراشوں کی ٹیس کا احساس ہو تھا اور جو خون بہہ کر لبوں تک پہنچا تھا اس کا تلخ ذائقہ مجھے اپنی ان پر محسوس ہو رہا تھا۔

جب میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو نقشہ بدل چکا تھا۔ ری گاڑی کو فاکس ویگن نے غیر متوقع طور پر بائیں جانب سے ر اتنی قوت سے ٹکر ماری تھی کہ وہ ...... الٹ گئی تھی اور لابازیاں کھانے کے بعد سڑک کے دوسرے کنارے پر ایک اور ا کی دیوار سے جا ٹکرائی تھی۔ دیوار بہت زیادہ مضبوط نہیں تھی ٹوٹ گئی تھی اور اس کا ملبہ بھی الٹی ہوئی گاڑی پر گرا تھا۔

میری اپنی گاڑی کا سامنے کا حلیہ بگڑ گیا تھا۔ اس کا بونٹ ہو گیا تھا اور درمیان سے اوپر اٹھ گیا تھا۔ بمپر ٹوٹ کر الگ ہو تھا اور مڈ گارڈ چیتھڑا بن کے لٹک رہے تھے۔ ظاہر ہے ہیڈ لائٹس نام و نشان بھی باقی نہ رہا تھا۔ ڈکی کچھ اور دب جاتی تو پیٹرول ٹینک ا مگر فاکس ویگن میں بمپر کے بالکل پیچھے اور ڈکی میں سب سے فاضل ٹائر رکھا رہتا ہے جس میں ہوا ہوتی ہے۔ اس فاضل ٹائر جس میں ہوا کا دباؤ تیس پونڈ فی مربع انچ تھا دوسرے "نیومیٹک" کام کیا اور شاک کو کم کر دیا۔ اسٹپنی ٹیڑھی ہو گئی مگر پیٹرول ٹینک یا ورنہ گاڑی میں آگ لگ جانا یقینی تھا۔

تصادم کے پہلے دھماکے کے بعد کئی دھماکے تسلسل سے ہوئے دوسری گاڑی کے ہر بار الٹنے سے ایک دھماکا ہوا تھا۔ اس دیوار سے ٹکرانے کے بعد ایک دھماکا ہوا تھا اور جب شکستہ کی اینٹوں نے گاڑی کو سنگسار کیا تھا تو دھماکے ہوئے تھے۔ شور کی آواز رات کے سناٹے میں دور تک گئی تھی اور وہ ب جو اپنے اپنے گھروں کے اندر بستروں میں دبکے ہوئے تھے، کی میز پر تھے، ٹی وی دیکھ رہے تھے یا ڈرائنگ روم میں کے ساتھ گپ لڑا رہے تھے، چونک کر باہر آنے پر مجبور ئے تھے۔ ان میں سب سے آگے اسی کوٹھی کا مکین تھا جس کی حدود غیر قانونی طور پر داخل ہو کے میں نے یہ تخریبی کارروائی کی تھی۔ اب کے گیٹ سے باہر نکل چکا تھا اور پھر سڑک پر تھا۔

میری گاڑی نے روڈ کو بلاک کر رکھا تھا اور میں قریب آنے کی آوازیں سن رہا تھا۔ ہوش بحال ہوتے ہی میں نے چابی کی طرف بڑھایا۔ چابی اپنی جگہ پر موجود تھی اور سوئچ آن تھا۔ ڈائل ننھے ننھے سرخ دائرے روشن تھے۔ میں نے چابی گھمائی تو انجن نے اسٹارٹ ہونے میں دیر نہیں لگائی اور دونوں روشن نقطے غائب ہو گئے جس کا مطلب یہ تھا کہ آئل پریشر نارمل ہے اور ڈائنمو بھی چارجنگ کر رہا ہے۔ میں نے ایک بار پھر خدا کو یاد کر کے اس سے امداد مانگی اور گاڑی کو گیئر میں ڈال دیا۔ گاڑی آگے بڑھی اور میں نے اسٹیئرنگ گھمایا۔ گاڑی سڑک پر چل پڑی تو میں نے وہی اطمینان کی خوشی محسوس کی جو دشمن کا ایک مضبوط مورچہ کسی جانی نقصان کے بغیر سر کر لینے سے کسی کمانڈر کو ہو سکتی ہے۔ گاڑی کا نقصان کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ اس کی صرف صورت بگڑی تھی، کارکردگی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ گاڑی کے وہیل آؤٹ ہو جاتے۔ اس کا ایکسل ٹوٹ جاتا یا ٹیڑھا ہو جاتا۔ بال جوائنٹ یا ٹائی راڈ ناکارہ ہو جاتے۔ میں نے ایک بڑا خطرہ مول لیا تھا مگر اس کے دامن میں نہ جانے کتنے چھوٹے چھوٹے خطرات پوشیدہ تھے۔ گاڑی کے ٹوٹے پھوٹے مڈ گارڈ سے، بمپر کے لٹکتے ہوئے حصے اور دوسرے شکستہ حصوں سے بہت سی عجیب و غریب آوازیں نکل رہی تھیں مگر گاڑی چل رہی تھی۔

میں نے اپنے پیچھے بہت چیخ و پکار سنی۔ یہ دونوں طرف کی کوٹھیوں سے نکل آنے والے تھے جو دیکھ رہے تھے کہ تصادم کے بعد ایک گاڑی فرار ہو رہی ہے۔ انھیں بالکل معلوم نہیں تھا کہ حادثہ کیسے ہوا اور وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ یہ حادثہ نہیں ایک جنگی اقدام تھا۔ میں نے اپنی گاڑی کو ٹینک کی طرح استعمال کرتے ہوئے غنیم کی قوت پر کاری ضرب لگائی تھی اور اسے ختم کر دیا تھا۔ اندھیرے میں کوئی بھی گاڑی کا نمبر دیکھ نہیں سکتا تھا۔ ان میں سے کسی نے پتھر بھی پھینکا جو گاڑی کے پچھلے حصے پر لگا اور اتنی خطرناک صورت حال میں بھی میرے ہونٹوں پر ہنسی آگئی۔ بے بس لوگ اس سے زیادہ کر بھی کیا سکتے تھے۔ "شاباش شیر کی بچی۔" میں نے فاکس ویگن سے کہا اور خود ہی ہنسا۔ مجھے اپنی حالت کا بالکل خیال نہ تھا۔ صرف یہ احساس تھا کہ میں ایک نادیدہ دشمن کے عزائم کو خاک میں ملا چکا ہوں اور میں نے جان ہتھیلی پر رکھ کے جو بازی لگائی تھی وہ میں نے جیت لی ہے۔ وہ کون تھے اور کیا چاہتے تھے، یہ جاننا اتنا اہم نہیں تھا۔ وہ میرے خیر خواہ بہرحال نہیں تھے اور نیک عزائم ہرگز نہیں رکھتے تھے۔

ایک دھماکا سن کر میں نے گاڑی روکی اور پیچھے دیکھا۔ آواز بہت دور سے آئی تھی لیکن میرے کانوں نے سن لی تھی۔ یہ تباہ ہو جانے والی کار کے پیٹرول ٹینک کے پھٹنے کا دھماکا تھا۔ جہاں وہ گاڑی الٹی تھی وہاں اب ایک الاؤ روشن تھا اور شعلے بھڑک کر رقصِ اجل پیش کر رہے تھے۔ معلوم نہیں اس گاڑی میں کتنے آدمی تھے، کتنے زخمی ہوئے تھے اور کتنے مر گئے تھے۔ لوگ کسی کو

باہر نکالنے میں کامیاب ہوئے تھے یا نہیں؟ میں نے سوچا۔ خیال یہی کہتا تھا کہ ان میں سے کوئی نہیں بچا ہوگا۔ اس قسم کے حادثے میں کون سلامت رہ سکتا ہے۔ اگر کوئی فوراً ہلاک نہیں ہوتا تو ڈھانچے میں پھنسا رہ جاتا ہے جسے نکالنے کے لیے اکثر ڈھانچے کو کاٹنا بھی پڑتا ہے۔ مدد کے لیے آنے والوں کو اتنا وقت ہی کہاں ملا تھا کہ وہ کسی زخمی کو نکال سکتے۔ پٹرول ٹینک پھٹنے کا اندیشہ سب کو اپنی حفاظت پر مجبور کرتا ہے اور کسی کو قریب جانے کی ہمت نہیں پڑتی۔ کوئی جوشِ جذبات میں بہت آگے بڑھ گیا ہوگا تو اسے قضا نے ہی مجبور کیا ہوگا۔

میں نے پھر گاڑی آگے بڑھائی۔ معلوم نہیں یہ نئے شکاری تھے یا پرانے اور کیا چاہتے تھے؟ آدمی کے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ سارا کھیل تو تقدیر کا ہے۔ وہ دلاور اینڈ کمپنی یا ملک دشمن عناصر کے آلۂ کار تھے تو ان کو اس مشن سے ہاتھ دھونے پڑے تھے۔ اس کام کا معاوضہ لیتے وقت انھوں نے پورے عزم اور اعتماد کے ساتھ سوچا ہوگا کہ یہ کون سا مشکل کام ہے اور کام کے مقابلے میں معاوضے کی رقم ان کو اتنی بڑی محسوس ہوئی ہوگی کہ وہ موت کو بھول کر مستقبل کے منصوبے بنانے لگے ہوں گے جو دولت کے بغیر ہوائی قلعے تھے۔ اب وہ اپنے منصوبوں اور ان کی تکمیل کے خوابوں، امیدوں اور حوصلوں کے ساتھ راکھ ہو رہے تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے کاغذ کے نوٹ جل کر راکھ ہو جاتے ہیں ان کے کاغذی خیالوں کے محل ان کے وجود کے ساتھ جل کر فنا ہو رہے تھے۔

اب تک میں سیدھا چلتا جا رہا تھا اور ذہنی انتشار کی کیفیت میں یہ بھولا ہوا تھا کہ میں سڑک پر ہوں۔ نہ جانے کتنی گزر جانے والی گاڑیوں نے فاکس ویگن کے شکستہ ڈھانچے کو دیکھا ہوگا اور کیا سمجھا ہوگا۔ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ جائے واردات پر جمع ہونے والوں میں سے کوئی اپنی کار نکال کر میرے تعاقب میں روانہ ہو سکتا ہے اور کسی دشواری کے بغیر مجھے پکڑ بھی سکتا ہے۔ میرے لیے ضروری تھا کہ فوراً اس گاڑی سے نجات حاصل کر لوں۔ یہ رابعہ کی اصل گاڑی نہیں تھی لیکن کاغذات اس کو یہی ثابت کرتے تھے چنانچہ اس کار کا رابعہ کی یا ہماری رہائش گاہ کے قرب و جوار میں پایا جانا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اگر ممکن ہوتا تو میں اسے پل پر سے دریائے ملادی میں غرق کر دیتا مگر اس حال میں ملیرپل تک پہنچنا ہی ناممکن تھا۔ پھر میں گاڑی کو کہاں چھوڑوں؟ میں نے سوچنا شروع کیا۔ یہ ماڈل ٹاؤن کا علاقہ تھا جہاں رات کے وقت چھوٹی بڑی سڑکوں پر ایک جیسی ویرانی تھی۔ میں نے ابھی تک اپنے راستے کا تعین نہیں کیا تھا اور صرف یہ کوشش کرتا رہا تھا کہ جتنی جلد ممکن ہو خطرے کی حدود سے کہیں دور چلا جاؤں۔ اب میں اتنی دور آ چکا تھا کہ تعاقب میں آنے والے مجھے تلاش نہیں کر سکتے تھے۔ میں سوچے سمجھے بغیر چھوٹی چھوٹی سڑکوں پر دائیں بائیں چھا لیا تھا اور ماڈل ٹاؤن تک آگیا تھا۔

پھر میں نے ایک موڑ کو پہچان لیا۔ یہاں سے قصرِ جمشید زیادہ دور نہیں تھا۔ قصر بہت پہلے کھنڈر بن چکا تھا۔ اس کھنڈر کو چوہدری دلاور اینڈ کمپنی نے بھی استعمال کیا تھا اور جب اس خفیہ اڈے کی پوزیشن مشتبہ ہونے لگی تھی تو وہ اسے آگ لگا کے رہی سہی کسر پوری کر گئے تھے اور اس کھنڈر کے ملبے کو اپنے ماضی پر نوحہ خواں چھوڑ کر رخصت ہو گئے تھے۔ اب وہاں کوئی نہیں تھا اور مجھے اس وقت وہی ایک ایسی محفوظ جگہ نظر آئی جہاں میں اس کار کے ڈھانچے کو چھوڑ سکتا تھا اور جہاں یہ ڈھانچہ کسی کی توجہ کا مرکز نہیں بن سکتا تھا لیکن بعد میں اپنی تباہی کی داستان سنا کے چوہدری دلاور تک ہمارا پیغام ضرور پہنچا سکتا تھا کہ انھوں نے ہمارے لیے جو نیا جال پھیلایا تھا ہم اس میں گرفتار نہیں ہو سکے۔

قصرِ جمشید رات کے اندھیرے میں ایک پُرآسیب گوٹ لگتا تھا۔ اس کے ٹوٹے پھوٹے کھنڈر کی ویرانی میں قبرستان کا سکوت تھا اور موت کی ہولناکی سایہ فگن تھی۔ ایک بار پھر میرے دل کو دنیا کی بے ثباتی کے خیال نے درسِ عبرت دیا۔ اجاڑ باغ کے ایک گوشے میں قصرِ جمشید کے معمار اور مالک نواب خسرو جمشید کا ڈھانچہ اب تک موجود تھا اور شاید ان کی روح اپنی آنکھوں سے عہدِ رفتہ کی شان و شوکت۔ تزئین و آرائش اور حسن و زیبائش کے وہ گم شدہ آثار تلاش کرتی تھی جو دولت پر غرور کی دنیاوی علامت کا طرۂ امتیاز تھے۔ شاید وہ جھونپڑیاں اب بھی آباد تھیں جن میں اس قصرِ عالیشان کے دربان، غلام اور فراش رہتے تھے مگر محل اور محل والے افسانۂ فردا بن گئے تھے۔

گاڑی کو میں گھاس پھوس اور کوڑے کرکٹ پر سے گزارتا ہوا پچھلے حصّے میں لے گیا۔ اندھیرے میں ہیڈ لائٹس کے بغیر یہاں تک پہنچ جانا ہی تائیدِ ایزدی کی علامت تھا، ورنہ یہ ہو سکتا تھا کہ میں کسی دوسرے حادثے کا شکار ہو جاتا یا پکڑ لیا جاتا۔ گاڑی کی اور میری حالت دیکھ کر گشت کرنے والی پولیس میرے پیچھے لگ جاتی۔ میں ان سے بچ کر فرار نہیں ہو سکتا تھا۔ اونچے نیچے ناہموار راستے پہ گاڑی بہت شور کرنے لگی تھی اور جھٹکوں سے میرے جسم کا جوڑ جوڑ ہل رہا تھا۔ اب مجھے احساس ہونے لگا تھا کہ میں زخمی ہی نہیں اندرونی چوٹوں سے بھی خستہ حال ہوں اور میرا پورا وجود درد کا درماں مانگتا ہے۔ گاڑی کو روکنے کے بعد میں بڑی مشکل سے باہر نکلا۔ میٹھے میٹھے میری کمر، شانے اور ٹانگوں کے پٹھے اکڑ گئے تھے تاہم زمین پر کھڑا ہونے کے بعد میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ہڈیاں سلامت تھیں۔ میں نے کوشش سے بازو گھمائے اور اوپر نیچے کیے۔ ٹانگوں

ت دی اور چند قدم چلا۔ میری پیشانی پر، منہ پر اور ہاتھوں پر گہری
ثوں سے نکلنے والا خون جم چکا تھا۔ حرکت سے یہ زخم کھچنے لگے۔
تھوڑا سا گھوم پھر کے میں نے کھنڈر کے ایک حصّے کو منتخب
بس کی ایک دیوار اندر کی جانب گر جانے سے کھلا راستہ بن گیا
بیں نے فرش پر بکھری ہوئی اینٹوں کو اس طرح ہٹایا کہ گاڑی کے
پہیوں کے لیے گزرگاہ بن جائے۔ اس میں مجھے جزوی کامیابی
بی میرے لیے سارے ملبے کو صاف کرنا عملاً ناممکن تھا اور
ڑی کا اندر پہنچنا اب بھی دشوار نظر آتا تھا لیکن میں اس وقت
ھنہ کرنے سے کچھ کرنا بہتر سمجھتا تھا۔ میں پھر گاڑی میں بیٹھا اور
ے آہستہ آہستہ چلاتا ہوا پیچھے لے گیا۔ اندھیرے میں وہ صاف
ستہ مجھے نظر نہیں آ رہا تھا جو میں نے دو پہیوں کے لیے بنایا تھا۔
ں نے اپنی ڈرائیونگ کی صلاحیت سے زیادہ خدا کی مدد پر بھروسا
یا اور گاڑی کو تیزی سے چلاتا ہوا اپنے اندازے کے مطابق سیدھا
ے گیا۔

میرا اندازہ بہت زیادہ غلط نہیں ہوا۔ گاڑی اچھلتی جھٹکے
یتی اس ملبے پر چڑھ گئی اور آدھی سے زیادہ کمرے کی تین دیواروں
یں داخل ہو گئی۔ میں نے گاڑی کے فرش کے نیچے زبردست رگڑ
نی اور گاڑی کئی بار اوپر اُٹھ کے نیچے گری۔ اینٹوں کے ڈھیر نے درمیان
ے گاڑی کے فرش کو اُدھیڑ دیا تھا اور دونوں جانب کے مڈگارڈ
باہ کر دیے تھے۔ میں نے ایک آخری کوشش کی اور گاڑی کو فرسٹ
گیئر میں رکھتے ہوئے ریس دی۔ گاڑی آخری بار اُچھلی اور کسی ملبے
ے ڈھیر کو عبور کر کے اتری تو سامنے والی دیوار سے ٹکرا گئی۔ میرا دل
ذرا سی دیر کے لیے دہل گیا۔ اگر تصادم کی قوت زیادہ ہوتی تو دیوار
ھر پر آ گرتی۔ پھر بے سہارا چھت نیچے آتی جو اب تین دیواروں پر
کی ہوئی تھی۔ دو دیواریں اس کا بوجھ نہیں سہار سکتی تھیں۔ پھر وہ
دیواریں بھی چھت کے ساتھ زمین بوس ہو جاتیں اور میں اسی
فاکس ویگن کے تابوت میں دفن ہو جاتا۔

باہر نکل کے میں نے بہت سی گھاس پھوس اور خشک
لکڑیاں جمع کر کے گاڑی میں ڈالیں۔ کوڑے کرکٹ میں کاغذ
کے ٹکڑے بھی تھے۔ دیا سلائی دکھاتے ہی کاغذ نے اور پھر گھاس
نے آگ پکڑ لی۔ میں اس ملبے سے دور ہوتا گیا اور آگ کو پھیلتے دیکھتا
رہا۔ فضا میں اب چمڑے کے جلنے کی بُو بھی شامل ہو گئی تھی جس
کا مطلب یہ تھا کہ آگ نے سیٹوں کو جلانا شروع کر دیا ہے۔ میں
اندھیرے کی پناہ میں دروازے کی طرف چلنے لگا۔ ایک محفوظ
فاصلے پر رک کر میں نے چند منٹ انتظار کیا۔ پھر میرے کانوں
نے پٹرول ٹینک کے پھٹنے کا وہ دھماکا سُنا جو سب کچھ تباہ
کر دیتا تھا۔ آگ کا بگولا سا اُٹھا مگر اس کے ساتھ ہی عجیب سی

گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ اور میں سمجھ گیا کہ دھماکے نے باقی تین دیواروں کو اور چھت کو گرا دیا ہے۔ فضا میں گرد کا طوفان سا اُٹھا۔ ایک چھت کے گرتے ہی اس کے اوپر قائم دیواریں بے سہارا ہو گئیں۔ اوپر کی منزل کا ایک پورا حصّہ مسمار ہو گیا اور آگ کا شعلہ غائب ہو گیا۔ فاکس ویگن ملبے کے ایک بہت بڑے پہاڑ کے نیچے دفن ہو چکی تھی اور اس بات کا فوری طور پر کوئی امکان نہیں تھا کہ کوئی اس کو اپنے مدفن سے کھود نکالے گا۔ رابعہ کی سرخ فاکس ویگن کا یہ دوسرا جنم بھی تمام ہو چکا تھا۔

جب میں وہاں سے روانہ ہوا تو میں نے آس پاس کے کچھ لوگوں کو باہر نکل کے باتیں کرتے سُنا۔ وہ شور سن کر یہ سمجھے تھے کہ زلزلہ آ گیا ہے لیکن انھوں نے دیکھا کہ ایک پُرانا کھنڈر گر گیا ہے تو وہ مطمئن ہو کے اپنے اپنے محفوظ گھروں کی خواب گاہوں میں لوٹ گئے۔ میں کچھ دیر پیدل چلتا گیا۔ پھر نہ جانے کہاں سے ایک سائیکل سوار نمودار ہوا۔ وہ رات کو گشت کرنے والا چوکیدار تھا۔ میری حالت دیکھ کر وہ رُک گیا۔

"مجھے ایک گاڑی والا ٹکر مار کے بھاگ گیا بھائی۔" میں نے کہا۔ "خدا کے لیے مجھے کسی اسپتال تک پہنچا دو۔"

"اسپتال تک تو میں نہیں جا سکتا بابو۔" وہ مجھے غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "میری اسی علاقے میں گشت کی ڈیوٹی ہے۔ کتنی دور جانا ہے تم کو؟"

"باغبان پورہ سے آ گئے۔" میں نے مسکین صورت بنا کے اور کراہتے ہوئے کہا۔

"باغبان پورہ سے آ گئے؟ اس وقت؟" چوکیدار حیران ہو کے بولا۔ "اتنی دور جانے کے لیے تو سواری بھی ملنا مشکل ہے۔ تم کیا پیدل چل پڑے تھے؟"

"نہیں چاچا... سائیکل لے کر نکلا تھا۔" میں نے کہا۔ "اس کا بھی بیڑا غرق کر دیا کم بخت نے... اوپر سے کار گزار دی۔"

"چلو مٹی ڈالو سائیکل پر... شکر کرو جان بچی۔" وہ ہمدردی سے بولا۔ "تم نے نمبر نوٹ کیا تھا؟"

"نمبر کیسے نوٹ کرتا چاچا... ٹکر لگی تو میں ادھر جا کے گرا... دس گز دور..." میں نے کہا۔ "ہوش میں آنے سے پہلے تو وہ گاڑی لے کر بھاگ گیا۔ سائیکل کا چورا کر دیا... کباڑیا تول کر لے گا تو لے گا۔"

"پھر وہی سائیکل... او میاں اگر سائیکل بچ جاتی اور گاڑی تیرے اوپر سے گزر جاتی پھر کیا ہوتا۔ کباڑیا تجھے تول کر بھی نہ لیتا۔ عجیب ناشکرا آدمی ہے۔" چوکیدار خفا ہو گیا۔ "آخر آفت کیا تھی اس وقت نکلنے کی۔"

"چاچا جی فوت ہو گئے ہیں... ان کے گھر جا رہا تھا... ابھی ڈیوٹی سے آیا تو ماں نے بتایا۔" میں نے رونے کی اداکاری کی۔

"اتنی رات کو ڈیوٹی سے آیا تھا؟" چوکیدار نے اپنی جرح جاری رکھی۔

"ہاں... سینما میں گیٹ کیپر ہوں... آخری شو ختم ہوتا ہے تو چھٹی ہوتی ہے۔" میں نے کہا اور ہائے بلند کی۔ ادھیڑ عمر چوکیدار شاید رات کے وقت مشکوک حالت میں گھومنے والوں سے اسی طرح پوچھ گچھ کرتا تھا۔ میں اس علاقے میں اجنبی بھی تھا اور میری حالت یقیناً شکوک پیدا کرتی تھی تاہم میری اداکاری نے اسے میری مظلومیت کا قائل کر لیا اور وہ میری مدد پر تل گیا۔

"بیٹھ سکتا ہے اِدھر سائیکل پہ...؟" وہ کچھ دیر بعد بولا۔

"میں نے گھڑے جیسا سر ہلایا۔" بڑی مہربانی ہوگی۔ باغبانپورے لے..."

"میں باغبان پورے نہیں جا سکتا... میں تجھے ایک اور جگہ لے چلتا ہوں..." وہ بولا۔ "رب نے چاہا تو تیرا کام ہو جائے گا۔"

اپنی پرانی چرخ چوں کرتی سائیکل پہ وہ میرے بوجھ کو گھسیٹ کر تقریباً آدھے میل تک لے گیا اور پھر ایک کوٹھی کے عقبی حصے میں سرونٹ کوارٹر تک لے گیا۔ مجھے اپنی سائیکل پکڑوا کے اور فرار نہ ہونے کی تاکید کر کے اس نے دیوار پھاندی جو مشکل سے تین فٹ اونچی تھی۔ میں نے اس کو ایک کوارٹر کے دروازے پر دستک دیتے سُنا۔ کوارٹر کے روشندان میں لائٹ نے کسی کے بیدار ہونے کی خبر دی۔ میں سوچتا رہا کہ چاچا کو چاچی کے فوت ہونے کی کہانی سُنا کے اور اس کے ساتھ یہاں تک آ کے میں نے اپنا وقت تو ضائع نہیں کیا۔ لیکن مجھے کوئی نہ کوئی کہانی تو سنانا ہی تھی اور پھر اس جھوٹ کو نباہنا بھی تھا، ورنہ میری حالت تو ایسی ہو رہی تھی جیسے میں جوئے کے اڈّے سے ہار کے اور مار کھا کے یا دنگے فساد میں بہادری کے جوہر دکھا کے آ رہا تھا۔ چوکیدار کے مذاکرات نتیجہ خیز رہے اور وہ پانچ منٹ میں پھر دیوار پر نمودار ہوا۔

"لے بھئی تیرا کام بن گیا... یہ بھانجا ہے اپنا... تجھے چھوڑ آئے گا جہاں تو کہے گا۔" وہ بولا۔ "تو اسی جگہ انتظار کر... میں جاتا ہوں گشت پہ..."

میں دس منٹ تک وہیں کھڑا بھانجے کا انتظار کرتا رہا۔ پندرہ منٹ بعد جب میری تشویش بھی مایوسی میں ڈھلنے لگی تھی، ایک کوستے کی جانب سے گھوڑے کے ہنہنانے اور پھر اس کے سُموں کے سڑک پہ بجنے کی آواز آئی۔ وہ کارنر پلاٹ پہ بنی ہوئی کوٹھی تھی جس کا ایک دروازہ بڑی سڑک کی طرف میرے سامنے تھا تو دوسرا کہیں سائڈ روڈ کی جانب۔ تانگا اُدھر سے ہی نمودار ہوا جسے کوچبان چلاتا ہوا لا رہا تھا۔ اُس نے گھوڑے کی نکیل تھام رکھی تھی اور خود آگے آگے چل رہا تھا۔ اس آدھی رات کی ناوقت ڈیوٹی سے گھوڑے اور اس کے آقا دونوں کو یقیناً بیگار میں پکڑے جانے کا احساس تھا اور وہ دونوں ابھی تک سوئے ہوئے لگتے تھے تاہم گھوڑا اپنے مالک کا اور مالک اپنے ماموں کا فرمانبردار تھا۔

"معاف کرنا بھائی... تمھیں میں ہرگز تکلیف نہ دیتا... وہ تو تمھارے ماموں نے مجبور کر دیا..." میں نے کہا۔

"تم کو کیا مجبور کر دیا؟" تانگے والا بولا۔ "مجبور تو ہم کو کر دیا لیکن کیا کروں... ایک ہی ماما ہے... دو ہوتے تو اس وقت جگانے پر ایک کو گولی مار دیتا... سارا دن کے بعد رات کو بھی آرام نہ ملے تو بندے کی زندگی پہ لعنت..."

"اللہ تو تمھیں اس کا اجر دے گا ہی۔" میں نے تانگے میں بیٹھنے کے بعد کہا۔ "میں بھی کچھ نہ کچھ ضرور دوں گا۔" میں نے جیب میں سے سو کا ایک نوٹ نکالا اور آگے بڑھا دیا۔ تانگے کے لیمپ کی مدّھم روشنی میں اُس نے یقین کیا کہ نوٹ جعلی نہیں ہے اور پلک جھپکتے میں اس کی بیزاری اور خفگی کافور ہو گئی۔ اس نے نوٹ کو چوم کر جیب میں اُڑسا اور اپنا چابک لہرا کے گھوڑے کو رسید کیا... "چل اوئے نامراد... بجز الکاہل..." اس نے زور سے کہا۔ گھوڑے کے لیے یہ سلوک بالکل غیر متوقع تھا۔ وہ ہنہنایا، اچھلا اور رہوا ہو گیا۔ سو کے نوٹ نے تانگے والے کی بشاشت میں خاطر خواہ اضافہ کیا تھا۔

"میرا ماما آپ کا کیا لگتا ہے جی؟" وہ بولا۔ "کیا یار ہے وہ آپ کا...؟"

"ایک شریف آدمی دوسرے شریف آدمی کی مدد کرتا ہے تو وہ یار ہی سمجھا جا سکتا ہے۔" میں نے ایک فلسفیانہ جواب دیا۔

"شریف آدمی...؟" بھانجے نے طنز سے کہا۔ "اس کے کرتوت تو میری ماں سے پوچھتے... مر گئی بیچاری... تمام عمر وہ جوڑتی رہی اور یہ لے جاتا رہا۔ ایک مراثن کو دیتا رہا جو اس کو لارے دیتی رہی اور بھاگ گئی ایک کباڑیے کے ساتھ۔ اس نے کباڑیے کو تلاش کیا اور اس کا سر پھاڑ دیا۔ تین سال جیل میں کاٹے... پھر ایک بھنگن پہ مر مٹا..."

سو روپے کی آسامی لانے والے ماموں کو بھی نافرمان بھانجا رسوا کرنے پر تلا ہوا تھا حالانکہ وہ ماما جی کی لائف اسٹوری سے یہ اقتباسات پیش نہ کرتا تو میں اس کا زیادہ شکر گزار ہوتا کیونکہ میں سکون سے سوچنا چاہتا تھا مگر سفر ختم ہونے تک بھانجے نے میرا دل بہلانے کا شغل جاری رکھا یعنی اپنی بکواس جاری رکھی۔ ماما جی کی رنگین جوانی میں مراثن اور بھنگن کے ناکام رومانس کے بعد بھی کئی پردہ نشینوں کے نام آئے جو میں نے نہیں سُنے۔ "اب چوہدری بنے ہیں چوکیدار..." وہ بولا۔

"بس مجھے اسی جگہ اتار دو۔" میں نے کہا۔ "کسی دن ماما جی ملے تو اُن سے میں تمھاری بابت ضرور پوچھوں گا۔ تم بھی مجھے فرشتے نہیں لگتے۔ جیسے میں خود ایک گنہگار آدمی ہوں ویسے ہی سب ہیں۔ کیا ماما کیا بھانجا... کیا راجہ کیا پرجا..."

تانگے والا میری علمیت اور میری درویشانہ گفتگو سے دم بخود رہ گیا۔ دل میں وہ شرمندہ ضرور ہوگا کیونکہ اس نے مجھ سے نظر ملائے بغیر تانگا موڑا۔ گھوڑے کو بلا وجہ گالی دی اور چابک رسید کیا اور فرار ہو گیا۔ میں اُس وقت تک کھڑا رہا جب تک تانگے کے سائڈ لیمپ میری نظر سے اوجھل نہیں ہو گئے۔ پھر میں پیدل چلتا ہوا گلی کے نکڑ تک گیا اور گلی میں داخل ہو گیا۔ بند دروازے پر رُک کر میں نے چند سیکنڈ توقف کیا۔ دروازے کے پیچھے روشنی تھی اور وہ لوگ جاگ رہے تھے۔ نہ جانے کہاں سے رات کے تین گھنٹے بجنے کی آواز آئی۔ اسے رات نہیں صبح ہی کہا جا سکتا تھا۔ میں سارا دن اور تقریباً رات بھر غائب رہا تھا۔ شام کے بعد بھی وہ رات نو دس بجے تک انتظار کرتے رہے ہوں گے مگر اس کے بعد تشویش میں مبتلا ہوئے ہوں گے اور اب یقیناً پریشان ہوں گے۔ میرے دستک دیتے ہی اندر کھلبلی مچی... "کون ہے؟" محسن نے کہا اور میں نے درز میں سے جھانک کر دیکھا۔ تو وہ ریوالور لیے کھڑا ہوا تھا۔ شہلا اس کے پیچھے بلکہ اس کی پناہ لیے کھڑی تھی اور ان دونوں کے سوا کمرے میں کوئی بھی نہیں تھا۔

"پولیس..." میں نے بارعب اور بھاری آواز بنا کے کہا۔ "خبردار جو کسی نے فرار ہونے کی کوشش کی... تم محصور ہو گئے ہو۔" میں نے پھر درز میں سے اندر جھانکا۔ شہلا کی حالت غیر ہو گئی تھی۔ اس نے سر اٹھا کے محسن کے کان میں سرگوشی میں کچھ کہا۔ محسن کا اطمینان دیکھ کر مجھے تعجب ہوا۔ اس نے شہلا کے بازو پر تھپکی دی اور اسے حوصلہ رکھنے کو کہا۔ اسی وقت خواجہ نیک محمد نمودار ہوئے جو غالباً دوسرے کمرے میں یا دروازے کے باہر دفاعی مورچہ سنبھالے بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کی صورت دیکھ کر مجھے ہنسی آنے لگی۔ "دروازہ کھولتے ہو یا ہم توڑ دیں؟" میں نے دوبارہ دروازے پر دستک دینے کے بجائے لات ماری... معلوم نہیں میری آواز میں فرق پڑ گیا تھا یا محسن پہلے ہی سمجھ چکا تھا کہ یہ حرکت میری ہے۔ بچپن سے اب تک کی رفاقت اور دن رات کے ساتھ نے ہمیں ایک دوسرے کی اتنی پہچان کرا دی تھی کہ اب ہم ساری دنیا کو دھوکا دے سکتے تھے لیکن ایک دوسرے کو نہ چہرہ بدل کے فریب دے سکتے تھے اور نہ آواز بدل کے... اگر میں یہ کہوں کہ بند دروازے کے پیچھے سے بھی اس نے میری خوشبو سونگھ لی تھی تو شاید مبالغہ نہیں ہوگا۔

"آپ دروازہ توڑ دیں۔" محسن نے کہا۔ "بلکہ سر مار کے دیوار توڑ دیں... ہم دروازہ نہیں کھولیں گے۔"

"اچھا بھئی ہم پولیس نہیں ہیں... ایک بھوکے پیاسے... زخموں سے لہولہان یتیم اور لاوارث شخص ہیں... لاوارث اور یتیم ہیں۔"

"نہ یہ یتیم خانہ ہے نہ ہسپتال اور نہ قبرستان۔" محسن نے کہا۔ "یہاں شرفاء رہتے ہیں۔"

"شرفاء کی اولاد... جہاں سب یتیم رہتے ہیں وہ یتیم خانہ نہیں تو کیا ہے۔" میں نے چلّا کر کہا۔

"اس دلیل نے ہمیں قائل کیا۔" محسن بولا اور دروازہ کھول دیا۔ وہ دروازے سے لگا کھڑا تھا اور اتنی دیر میں اصل صورتِ حال سب پر واضح ہو چکی تھی چنانچہ شہلا مسکرا رہی تھی اور استاد ٹیڈی کی بتیسی دکھائی دے رہی تھی لیکن مجھے دیکھتے ہی اُن کی ساری شوخی کافور ہو گئی۔

"بھائی جان... یہ کیا ہوا ہے آپ کو؟" شہلا چلّائی۔

"سکندر بادشاہ... قسم مولا علی کی... ایک بار بتا دو تمھارا کس سے جھگڑا ہوا ہے؟" استاد ٹیڈی نے عادت کے مطابق اپنی ہانکی اور مجھے اس کی دو منٹ پہلے کی حالت کا تصور کر کے ہنسی آ گئی۔

"آخر یہ کیا حرکت ہے؟" محسن بولا۔ "بظاہر تو شدید مجروح اور قریب المرگ ہے مگر پھر بھی دانت نکال رہا ہے۔"

"آرام سے بیٹھ جاؤ ساتھیو..." میں نے چارپائی پر بیٹھ کے کہا۔ "کلیجہ تھام لو پہلے سنو پھر داستان میری۔"

"بھاڑ میں گئی داستان۔" شہلا لپک کر میرے پاس آئی۔ "پہلے کپڑے بدلیے... میں گرم پانی لاتی ہوں... زخم صاف کر کے دوا لگا دوں پھر آپ لیٹ جائیں۔"

"لیٹ جائیں گے... ہم لیٹ آئے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اس کی وجہ بھی تو بتا دیں۔" مگر شہلا نے میری ایک نہیں سُنی... محسن اور ٹیڈی کو اندازہ ہو گیا تھا کہ میری چوٹیں اور خراشیں معمولی ہیں ورنہ میں اپنے پیروں پر کھڑا بھی نہ ہو سکتا اور اس طرح بات بھی نہ کرتا۔ یہ صرف میں جانتا تھا کہ تھکن اور جسم کی چوٹوں کے درد... بھوک اور ایک خونریز معرکے نے مجھے ذہنی اور جسمانی طور پر کتنا بے حال کر دیا تھا لیکن میں دروازے پر یا اندر قدم رکھتے ہی گر پڑتا تو وہ سب بدحواس ہو جاتے۔ میں نے سخت جدوجہد کر کے اپنی بشاشت کو برقرار رکھا تھا اور انھیں اطمینان

دلانے میں کامیاب ہوگیا تھا کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ شہلا نے وہ کام کیا جو صرف ایک عورت کرسکتی ہے۔ اُس نے میری باتوں کو اور وضاحتوں کو غیر اہم سمجھتے ہوئے پہلے میرے آرام اور علاج کی طرف فوری توجہ دی۔ اس نے مجھے زبردستی پلنگ پر لٹا دیا اور مجھے لیٹتے ہی اتنا سکون ملا کہ میری آنکھیں بند ہونے لگیں اور راحت کا احساس میری رگ رگ میں سکون بن کے اترنے لگا۔

دس منٹ میں شہلا پانی گرم کرلائی... اُس نے ایک صاف کپڑا بھگو کے میرے جسم کی خراشوں پر جم جانے والے خون کو صاف کیا۔ درد کی ٹیس پھر اُٹھی اور گرم پانی زخم پر تیزاب کی طرح لگا مگر مجھے اس تکلیف میں بھی مسرت کا احساس ہوا۔ یہ خیال آیا کہ موت سے متصادم ہونے کے باوجود میں اس وقت زندہ ہوں اور اپنوں میں ہوں۔ باہر کی دنیا کے خطرات سے محفوظ ہوں اور اپنی ناکامیوں کے باوجود کامیاب ہوں۔ شہلا کے ہاتھوں میں بہن کا پیار تھا اور ماں کی ممتا تھی۔ یہ وہ ہاتھ تھے جو دوا کے ساتھ دعا بھی دیتے تھے اور دل کی گہرائیوں سے نکلنے والی دعا قبولیت کا شرف پا کے لوٹتی تھی تو پیغام شفا دیتی تھی۔ اس کے ہاتھوں کی ٹکور سے میرے وجود کا درد و کرب مٹ رہا تھا اور درد کھنچ کر نکلتا جا رہا تھا۔ وہ ایک نرس تھی... ڈاکٹر تھی اور ایک کمزور لڑکی ہونے کے باوجود اعجازِ مسیحائی کی ناقابلِ فہم قوت رکھتی تھی۔ اس نے میرے کپڑے بھی خود ہی بدلے اور اس کام کو ایک مقدس فرض کی طرح سرانجام دیا۔ یکلخت اس نے صورتِ حال کی سب ذمے داری قبول کرلی تھی۔ سب کی کمان سنبھال لی تھی اور اب میں دیکھ رہا تھا کہ اس کے شوہر سمیت سب اس کے حکم کے تابع ہوچکے ہیں۔ آدھے گھنٹے میں وہ زخم صاف کرکے خشک کرچکی تھی اور جہاں ضروری تھا وہاں اینٹی سیپٹک پاؤڈر چھڑک چکی تھی یا مرہم لگا چکی تھی۔ اس کے حکم پر ہی محسن نے دودھ گرم کیا تھا اور گلاس بھر لایا تھا... پھر ڈانٹ کھا کے وہ دودھ میں گلوکوز ملانے گیا اور تیسری مرتبہ سر کھجاتا ہوا گیا تو اسپرین کی گولیاں لے کر آیا۔ پھر شہلا نے مجھے سہارا دے کر اُٹھانے کے احکامات جاری کیے اور ٹیڈی آگے بڑھا ہی تھا کہ میں اُٹھ بیٹھا۔

”بہت ہوچکا میرا پوسٹ مارٹم...“ میں نے کہا... ”میں ہٹا کٹا ہوں۔“

”اور بہت بڑا اُلّو کا پٹھا ہوں... یہ بھی فرمایئے۔“ محسن نے کہا۔ ”قسم خدا کی اتنی خدمت اس نے کبھی میری نہیں کی... اور مجھے لگتا ہے کہ یہ تم دونوں کی بہن زیادہ ہوگی... میری بیوی تو پارٹ ٹائم رہے گی۔“

”بس... ہوگیا جل کے کوئلہ۔“ میں نے کہا۔ ”کل میں تیرا ایسا ہی حال کردوں گا... فکر مت کر۔“

”چلیں بھائی جان، یہ گولیاں کھا کے دودھ پئیں اور سو جائیں۔“ شہلا نے تنک کر کہا۔

”اور اگر میں یہ حکم نہ مانوں...؟“ میں نے ضدی بچّے کی طرح کہا۔

”تو میں... میں رو پڑوں گی۔“ شہلا نے عاجز آ کے کہا۔

”ویری گڈ! بالکل مت ماننا اس کی بات سکندر...“ محسن بولا۔ ”کل کو یہ بات بات پر مجھے بھی رونے کی دھمکی دے گی۔“

استاد ٹیڈی نے ریوالور نکال کے میری کنپٹی پر رکھ دیا۔ ”میں دس تک گنوں گا۔ اس وقت تک دودھ ختم ہوجانا چاہیے۔“

”اور کچھ بچ گیا تو...“ میں نے فوراً گولیاں مُنہ میں ڈال کر دودھ کا گلاس مُنہ سے لگا لیا۔

”تو میں گیارہ سے آگے گنتی شروع کردوں گا۔“ ٹیڈی نے ریوالور جیب میں رکھ کے کہا۔ میرے ساتھ شہلا بھی ہنس پڑی مگر اس نے دودھ ختم کرنے کے بعد بھی مجھے بولنے نہیں دیا... محسن اور ٹیڈی بھی میرے ساتھ پیش آنے والے واقعات جاننے کے لیے اتنے ہی بے چین تھے جتنے میں بتانے کے لیے تھا مگر شہلا کے آگے کسی کی نہیں چلی۔

”باتیں صبح بھی ہوجائیں گی... آپ فوراً سو جائیں۔“ وہ بولی۔

”نیک دل خاتون... اگر آپ غور فرمائیں تو آپ دیکھ سکتی ہیں کہ صبح ہو رہی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”رات گزر چکی تو ر کا تڑکا ہوا۔ ہوشیار اسکول کا لڑکا ہوا۔“

”بس اب چپ...“ شہلا نے کہا۔ ”چلو جی تم دونوں اُدھر یا پھر خاموشی سے یہاں لمبے ہوجاؤ۔“

”یہ شادی سے پہلے کتنی مسکین بنتی تھی... ہٹلر کی بچی...“ محسن نے زمین پر لیٹنے کی تیاری کی۔ ”اصل روپ اب سامنے آیا ہے۔“

”ایک سوال کی اجازت دو بی بی۔“ میں نے کہا۔ ”وہ قیدی کس حال میں ہے؟“

”اسے ہم نے زندہ رکھا ہے۔ وہ ابھی نہیں مرے گا۔“ شہلا نے کہا اور وہیں دوسری جانب دراز ہوگئی۔ استاد ٹیڈی نے خاموشی سے دوسرے کمرے کا رُخ کیا۔ آرام دہ بستر، گرم دودھ اور اسپرین نے میرے تھکے ہوئے ٹوٹے ہوئے اور شکستہ حال جسم کو اتنا آرام پہنچایا تھا کہ نیند سے میری آنکھیں خود ہی بند ہونے لگی تھیں۔ شہلا کے حکم نے میری ذہنی مزاحمت بھی ختم کردی ورنہ شاید میں جاگتا رہتا۔ چند منٹ میں مجھے اپنا ہوش نہ رہا۔

میری آنکھ کھلی تو دن کی روشنی میں سب سے پہلے میں نے شہلا کو دیکھا۔ شاید وہ اسی وقت میرے قریب آ کے کھڑی ہوئی تھی۔ میری حالت بہت بہتر تھی۔ جسم کا درد تقریباً ختم ہوچکا تھا اور ذہنی طور پر میں بالکل مستعد تھا۔

”کیسی طبیعت ہے بھائی جان؟“ شہلا نے مسکرا کے کہا۔

”میری ننّھی سی بہن، تیرے ہوتے ہوئے مجھے کیا ہوسکتا ہے۔“ میں نے پیار سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”میں بالکل ٹھیک ہوں مگر وہ تیرا میاں نظر نہیں آرہا ہے۔“

”وہ غالب بھائی کے ساتھ گئے ہیں... نئے گھر کو ٹھیک کرنے۔“ شہلا شرما کے بولی۔

”اچھا؟ تو ہم سب یہاں کیوں بیٹھے ہیں... بلکہ پڑے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”ہم بھی چلتے ہیں۔“

”ہم... ہم چلیں گے! پہلے آپ ناشتا تو کرلیں۔ وقت تو دوپہر کے کھانے کا بھی گزر چکا ہے۔“ شہلا بولی۔

”کیا بجا ہے؟“ میں نے گھڑی دیکھی۔ ”ساڑھے تین... تم نے ٹھیک کہا۔ مجھے کئی وقت کا ناشتا کرنا ہے۔“

”تم تو پورا اصطبل بیچ کے سو گئے تھے سکندر بادشاہ۔“ ٹیڈی نے نمودار ہو کے کہا۔

”اچھا ہوا اس اصطبل میں تم نہیں تھے۔“ میں نے کہا۔ ”اس صحافت کے بحرِ ظلمات کے گھوڑے کا کیا بنا؟“

”وہ پھر بچ گیا میرے ہاتھوں قتل ہونے سے۔“ ٹیڈی نے کہا۔ ”قسم مولا علی کی، اس کے اخبار میں اسی کے سوئم کا اشتہار آجاتا۔ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ تمہاری شکل ہرگز شہلا کا بھائی بننے کے لائق نہیں۔“

”پھر کس لائق ہے؟“ میں نے ہنس کر کہا۔

”کہتا تھا کہ تم ڈریکولا کے بھائی بن سکتے ہو۔“ ٹیڈی نے سلو... سے کہا۔ ”وہ خود ڈریکولا کی اولاد...“

”میرا مطلب تھا کہ اس کی اخبار کے ایڈیٹر سے جو جنگ ہوئی تھی اس کا انجام کیا ہوا؟“ میں نے کہا۔

”وہ نورا کشتی تھی۔“ ٹیڈی نے حقارت سے کہا۔ ”اگلے دن پھر دونوں عاشق معشوق بنے ہوئے تھے۔ غالب نے اس کو سائیں ... کے اڈے پر دھماکے کی رپورٹ دی اور فوٹو گراف کو ساتھ لے گیا۔ اس خبر نے تہلکہ مچا دیا۔“

”غالب نے اصل واقعات اور حالات کی طرف تو اشارہ نہیں کیا؟“ میں نے تشویش سے کہا۔ ”میرا مطلب ہے یہ تو نہیں لکھ مارا کہ وہاں جو عورت کرپاں والی بنی ہوئی تھی وہ کون تھی اور کیا کرتی تھی۔ کرنل جگن ناتھ، سیوک یا سادھو رام کا حوالہ تو نہیں دیدیا؟“

”یار سکندر بادشاہ! یہ غالب کمینہ ضرور ہے مگر بیوقوف

نہیں ہے۔" استاد ٹیڈی نے کہا۔

"وہ کمینہ بھی نہیں ہے استاد۔" میں نے کہا۔ "اس کمینی دنیا میں ہمارا واسطہ جن کمینوں سے پڑ رہا ہے ان کے مقابلے میں وہ ہیرا ہے جس کے بارے میں علامہ اقبال نے کہا ہے کہ پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر۔ وہ ایسا ہی دل رکھتا ہے جو خلوص کی ایک نظر سے پگھل جاتا ہے مگر تم جانتے ہو فطرت کے اعتبار سے وہ کتنا سخت جان ہے۔ گولی کیا توپ کا گولا اس سے ٹکرا کے پاش پاش ہو جائے۔"

"معلوم نہیں سکندر بادشاہ! کبھی کبھی تم عجیب باتیں کرنے لگتے ہو جو اپنی سمجھ میں نہیں آتیں۔" ٹیڈی نے مایوسی سے کہا۔

"خبر تو دوسرے اخبارات نے بھی دی ہوگی؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ خبر کہاں چھپائی جا سکتی تھی۔" ٹیڈی بولا۔ "سب نے ہی اپنے اپنے نمائندوں کی معرفت موصول ہونے والی خبر کو شائع کیا تھا۔ حقیقت کسی کو نہیں معلوم۔ کسی نے اُسے پُراسرار دھماکا قرار دیا ہے تو کسی نے صرف ایک بم کا دھماکا۔ ایک اخبار نے لکھا ہے کہ وہاں ڈاکوؤں کا ٹھکانہ تھا۔ دوسرے نے لکھا ہے کہ وہاں غیر قانونی طور پر آتش بازی کا سامان تیار ہوتا تھا۔ ایک نے حد کر دی۔ اس نے انکشاف کیا ہے کہ وقوعہ کی شب وہاں جوا ہو رہا تھا اور جوا کھیلنے والوں میں سے ایک شخص اپنا سب کچھ ہار جانے کے بعد دستی بم پھینک کر وہاں سے فرار ہو گیا۔ بم اس کے گھر پر تھا اور وہ ہارنے کے بعد مشتعل ہو کے گھر سے لایا تھا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ باقی سب نوسر باز ہیں۔ میرا خیال ہے سکندر بادشاہ کہ جان بوجھ کر اصل بات کو چھپایا گیا ہے۔"

"میرا خیال ہے استاد کہ تمہارا خیال ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "ان اخبار نویسوں کو پولیس اور ملٹری انٹیلی جنس والوں نے قریب کہاں پھٹکنے دیا ہوگا۔ انھیں وہاں سے اسلحے کی موجودگی کے یقینی سراغ ملے ہوں گے۔ اصل بات عام ہو جاتی تو تفتیش مشکل ہو جاتی۔ ہو سکتا ہے پولیس یا ملٹری کے ذرائع نے خود ہی پریس کی بریفنگ کی ہو اور انھیں مطمئن کر کے ٹال دیا ہو یا پھر دشمن کے ایجنٹوں نے یہ افواہیں پھیلائی ہوں۔ وہ بھی اسی علاقے میں موجود اور مصروفِ عمل ہوں گے۔ یہ جاننے کی کوشش کر رہے ہوں گے کہ اس تباہی کے پیچھے کسی کا ہاتھ تھا یا محض حادثے کے باعث ان کا ذخیرہ تباہ ہوا۔ ملٹری کی انٹیلی جنس کو تو سب معلوم ہو گیا ہوگا کہ وہاں کس قسم کا اور کتنا اسلحہ تھا۔ انھیں ہیلی کاپٹر کے ٹکڑے بھی ملے ہوں گے۔ اب یہ ایک سیاسی معاملہ بھی بن چکا ہے اور اس کی تحقیقات بہت اعلیٰ سطح پر ہو گی۔ مفادِ عامہ میں نہ سمجھا گیا تو کسی کو حقیقت کی خبر ہی نہیں ہونے دی جائے گی۔"

"پھر بھی، وہ لوگ تو خبردار ہو گئے ہوں گے سکندر بادشاہ جو یہ کام کرتے تھے۔"

"ہاں! وہ اپنے ٹھکانے بدل دیں گے۔" میں نے کہا۔ "لوگ بہرحال وہی رہیں گے۔ وہ اس کاروبار سے تائب نہیں ہو جائیں گے مگر اس حادثے یا واردات کے بعد وہ نئی حکمتِ عملی وضع کریں گے۔ بلکہ نئے افراد کا انتخاب کریں گے اور ہو سکتا ہے پرانے راستوں کو چھوڑ دیں۔ وہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ یہ کسی کی مخبری کا نتیجہ تو نہیں تھا اور اگر کسی نے مخبری کی تھی تو وہ کون تھا۔ وہ غدار اپنے درمیان کسی غدار کو تلاش کریں گے۔"

"کیا ان کا ذہن ہماری طرف نہیں جائے گا؟" ٹیڈی نے کہا۔

"ضرور جائے گا... لیکن ہم اس ڈر سے اپنا کام تو نہیں روک سکتے۔" میں نے کہا۔ "ایم آر ایس کا مشن تو ختم نہیں ہو سکتا... جب تک کہ ہمارے اور ملک کے دشمنوں کا پتا چلا کے ان کے ایک ایک ٹھکانے کو... سب ساتھیوں کو اور تمام وسائل کو بالکل ختم نہ کر دیا جائے۔ ہم نے ابھی تک کوشش کی ہے کہ یہ جنگ زیرِ زمین رہے لیکن کھلی جنگ کی نوبت آ گئی، تب بھی جنگ تو بہرحال جاری رہے گی۔"

"جنگ... جنگ... جب دیکھو جنگ۔" شہلا نے ناشتے کے ساتھ اندر آتے ہوئے کہا۔ "تم لوگ ڈھنگ کی کوئی بات نہیں کر سکتے... مل کر بیٹھو گے تو آپس میں لڑنے لگو گے۔ خواجہ صاحب اور غالب کی ٹھنی رہے گی۔ سکندرِ اعظم اور محسن خان لڑتے رہیں گے۔"

میں نے قہقہہ مارا۔ "چار دن ہوئے ہیں اس لڑکی کو گھر والی بنے ہمیں کیسے ڈانٹ رہی ہے جیسے ہم بچے ہیں۔"

"جب تک آدمی خود گھر والا نہ ہو، بچہ ہی رہتا ہے۔ ابھی کوئی ذمے داری کا بار نہیں ہے سر پر، اس لیے شتر بے مہار بنے پھرتے ہو۔" شہلا نے ہمیں مزید ڈانٹا۔ "محسن کو تو میں سیدھا کر دوں گی۔"

"وہ بے چارا تو پہلے ہی کتے کی دُم سے زیادہ سیدھا ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اوپر سے مل گئی ہے تم جیسی بیوی جو جلیبی سے زیادہ سیدھی ہے۔ رب نے ملائی جوڑی..."

استاد ٹیڈی نے سر کھجایا۔ "یار سکندر بادشاہ... کیا زمانہ آ گیا ہے۔ نئی دُلہنیں کیسی بے شرمی سے منہ پھاڑ کر اپنے گھر والے کا نام لیتی ہیں۔ ایمان سے ہماری اماں تو کہتی تھیں۔ اجی سنیے۔ یا نیک محمد کے ابا... حوالہ دینا ہوا تو یوں کہ اُن کو بتا دوں گی... یا وہ آئیں گے تو پوچھوں گی... نام لینے سے تو کہتے ہیں کہ نکاح تک ٹوٹ جاتا ہے۔"

"اور اوپر سے دھونس دیکھو۔ کہ میاں کو سیدھا کر دوں گی... [نک]ہ وہ سرتاج ہوتا ہے اور خداوندِ مجازی کا عہدہ رکھتا ہے۔"

[...]نے کہا۔ "مگر میاں نیک محمد زمانہ اُلٹا آ گیا ہے اور یہ سب قرب [قیام]ت کی نشانیاں ہیں۔ پہلے جورو کو پاؤں کی جوتی سمجھا جاتا تھا [اب] جورو کے غلام ان کی جوتیاں سیدھی کرتے ہیں۔ شوہر زن مرید ہو تو بیوی کر سکتی ہے ایسا دعویٰ۔" میں نے ایک ٹھنڈی [س]انس بھری۔

"قسم مولا علی کی! ہم تو زبان کھینچ لیں۔" استاد ٹیڈی نے کہا۔ "[اس]ی لیے تو اب تک کنوارے پھر رہے ہیں کہ لڑکیوں کی زبان تو [...]ے گز بھر کی۔ گھونگھٹ کیا، سر پر دوپٹا تک نہیں۔" شہلا ایکدم [ہ]نس پڑی۔

"شہلا بی بی۔" میں نے ناشتے پر حملہ کرتے ہوئے کہا۔ "کیا تم [ب]ھی اپنے میاں کو نظر بند کر دو گی کہ خبردار جو گندے بچوں کو منہ لگایا [او]ر آوارہ گردی کی تو ٹانگیں توڑ دوں گی۔ چراغ جلے گھر واپس نہ آئے [تو] زماق کر دوں گی... وغیرہ وغیرہ..."

ہنستے ہنستے شہلا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "یہ سب تو [ک]رنا ہی پڑے گا... اگر اس نے تمہارا ساتھ نہ دیا... شادی میں نے [اس] لیے نہیں کی ہے کہ وہ گھر بیٹھ جائے اور تمہاری جگہ اسے [...]یرا خیال رکھنے کی فکر ہو جائے۔"

"تم کو اپنے سہاگ کو داؤ پر لگاتے ڈر نہیں لگتا؟" میں [ن]ے کہا۔

"میں نے تو اپنی زندگی کو بھی داؤ پر لگا رکھا ہے۔" وہ بولی۔ "[...]اور میری زندگی کیا ہے؟ تم سب کی زندگی... مجھے معلوم ہے کہ [ا]س کی حفاظت مجھ سے بہتر طور پر تم کر سکتے ہو۔ یہاں رشتے اہم [...]نہیں کہ کون کس کا شوہر ہے اور کس کا بھائی ہے۔ وہ اتحاد زیادہ [اہ]م ہے جس کی بنیاد پر یہ رشتے قائم ہیں۔ کیا تم مجھے ایسا سمجھتے ہو [...]ں تمھیں کہیں بھی مقابلے کے لیے اکیلا جانے دوں گی کہ میرے [ش]وہر کو تو چھوڑ جاؤ... یا خود محسن میرے منع کرنے سے تمہارا ساتھ چھوڑ دے گا... ہم اگر اتنے کمینے اور خود غرض ہوتے تو اجنبی [ہ]ونے کے باوجود ایک خاندان نہ بناتے۔ میں دعوے سے کہہ [س]کتی ہوں کہ ہمارا خاندان اور خاندانوں سے زیادہ مضبوط ہے جو [...]ئی اور خونی رشتوں کے باعث اپنا وجود برقرار رکھنے پر [م]جبور ہیں۔"

شہلا کی باتیں میرے جذباتی رشتوں کی تقویت کا سامان [ف]راہم کر رہی تھیں تو اس کا تیار کیا ہوا ناشتا مجھے جسمانی قوت دے [ر]ہا تھا۔ یہ نہ دوپہر کے کھانے کا وقت تھا نہ رات کے کھانے [کا۔ ا]نجانے [...] مدار اور سگھڑ خاتونِ خانہ ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے سینڈوچ بنائے تھے اور کافی تیار کی تھی۔ دونوں چیزوں کا اہتمام اس نے میری بھوک کا اندازہ کرتے ہوئے کیا تھا۔ پھر بھی میں سب صاف کر گیا۔ وہ مسلسل مجھے تمیز سے کھانے اور آہستہ آہستہ کھانے کی تاکید کرتی رہی مگر میں نے ندیدوں کی طرح کم سے کم وقت میں سب کچھ پیٹ کے اندر پہنچانے کی کوشش کی اور پھر نہایت بدتمیزی سے اور مانگا۔ شہلا نے کہا کہ اب رات کو کھانا ملے گا۔ اس وقت تک صبر کرو۔ مجھے معلوم تھا وہ یہی کہے گی۔

میرے جسم کا درد برائے نام رہ گیا تھا اور خراشوں کی حالت بھی بہت بہتر تھی۔ میں اُٹھ کر دوسرے کمرے میں سادھو رام کو دیکھنے کے لیے گیا۔ بے شک وہ زندہ تھا لیکن اس کی حالت ابتر تھی۔ وہ بہت کمزور ہو گیا تھا اور برسوں کا بیمار لگتا تھا۔ اُسے ہم نے بستر پر مُنہ باندھ کے ڈال رکھا تھا اور اس طرح پڑے رہنے سے وہ مفلوج ہو رہا تھا۔ میں نے اطمینان سے سگریٹ سلگائی اور ایک کش لیا تو وہ مجھے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔

"سگریٹ پیو گے سادھو مہاراج۔" میں نے کہا اور اُس نے اقرار میں سر ہلایا۔ میں نے سگریٹ اس کے لبوں کی طرف بڑھائی۔ اس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے اور مُنہ میں کپڑا تھا۔ میں نے کپڑا نکالا تو اس کے ہونٹ سگریٹ کو گرفت میں لینے کے لیے ہلے۔ میں نے ایک بار سگریٹ آگے تک لے جا کے پیچھے ہٹا لی... اطمینان سے ایک اور کش لیا اور وِلن کے انداز میں دھواں اُس کے مُنہ پر چھوڑا۔ وہ کچھ نہیں بولا اور رحم طلب نظروں سے مجھے دیکھتا رہا۔ دوسری بار بھی میں نے یہی حرکت کی لیکن تیسری مرتبہ جلتی ہوئی سگریٹ میں نے اچانک اس کی گردن پر لگا دی اور دوسرے ہاتھ سے اس کا مُنہ دبا لیا۔ وہ تڑپا مگر اس کی چیخ حلق میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔ میرے ہاتھ نے سگریٹ کو اس کی جلد پر دبائے رکھا یہاں تک کہ سگریٹ بجھ گئی اور اس کی کھال میں ایک گہرا بدنما گڑھا نمودار ہو گیا۔ گوشت کے جلنے کی بُو جو چکن تکّوں اور کبابوں سے اٹھتی ہے تو بڑی اشتہا انگیز لگتی ہے۔ انسانی جسم سے اُٹھے تو کراہیت، ظلم اور بربریت کا احساس ہوتا ہے مگر اس وقت یہ بُو میرے اعصاب پر گراں نہیں گزری۔ اس نے میرے جذبۂ انتقام کو ایک وحشیانہ مسرت عطا کی۔ جو شخص میرے سامنے تھا، وہ میرا بدترین دشمن تھا۔ اگر وہ میرے باپ کا قاتل ہوتا تب بھی میں اس کے خلاف اتنے شدید نفرت کے جذبات میں مبتلا نہ ہوتا۔ میں اسے قانون کے حوالے کر دیتا یا خود انصاف کرتا تو اسے کم سے کم اذیت کے ساتھ موت کے حوالے کر دیتا مگر یہ میرے وطن کا دشمن تھا اور اس کے لیے سزائے موت بہت کم تھی۔ اسے زیادہ سے زیادہ عذاب کے ساتھ ہلاک کر کے بھی مجھے احساس رہتا کہ اس کو

جرم کی مناسبت سے بہت کم سزا ملی۔ اس نے جتنا اسلحہ دشمنوں تک پہنچایا تھا اس سے کتنے بے گناہ مارے گئے تھے۔ ملکی معیشت کو کتنا نقصان پہنچا تھا۔ دشمنوں کے ہاتھ کتنے مضبوط ہوئے تھے اور ملک کی سالمیت کو لاحق خطرات میں کتنا اضافہ ہوا تھا۔ اس سب کا اندازہ کرنا ناممکن تھا۔

جب میں نے سادھو رام کے منہ پر سے ہاتھ ہٹایا تو وہ تقریباً بے ہوش تھا اور آہستہ آہستہ لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ "آخر ... تم مجھے کب تک اس حال میں رکھو گے ...؟" وہ کراہ کے بولا۔

"یہ تو ہم بھی نہیں جانتے اور اگر جانتے تو تمھیں پھر بھی نہ بتاتے۔" میں نے کہا۔ "ہماری پوری کوشش ہوگی کہ تمھارے لیے موت سے زیادہ کربناک موت کا انتظار ہو۔ ابھی سے کیوں پریشان ہو... موت ابھی تم سے بہت دُور ہے۔ بس اس کی آرزو کرتے رہو اور دیکھتے رہو کہ موت کتنے بھیانک سوپ میں ایک ایک انچ، ایک ایک ثبوت تمھاری طرف بڑھ رہی ہے۔ تمھارے وجود کا رُواں رُواں مقروض ہے سادھو رام ... یہ لہو ہے تمھاری دولت کے عوض اپنی جان نذر کرنے والے معصوم بچوں کا۔ بوڑھوں کا اور عورتوں کا جو تمھارے جیسے لالچی شیطانوں کی لغزت بھری سیاست سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے۔ یہ لہو ہے ان اصولوں کا اور نظریات کا جن کی بقا کے لیے لاکھوں مسلمانوں نے ترکِ وطن کیا اور اپنے رشتے، جائدادیں۔ آبا و اجداد کے ترکے۔ ان کی یادگاریں اور ماضی کے ورثے سب قربان کر دیے تھے اور یہ لہو ہے ان کے اعتماد کا اور یقین کا جس پر وطن کی مٹی ناز کرتی تھی مگر جس میں تم جیسے مارِ آستیں بھی چھپے بیٹھے تھے جنھوں نے سب کو دھوکا دیا۔ تمھارا رُواں رُواں اس لہو کا قرض ادا کرے گا سادھو رام ... تمھارے جسم کا ریشہ ریشہ اپنی موت مرے گا۔ تمھارے ناپاک خون کا ہر قطرہ تمھارے وجود کے ناسور سے پیپ بن کے ٹپکے گا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ پہلے تمھارے ہاتھ مر جائیں جو طلبِ زر میں خونی قاتلوں کے سامنے پھیلائے گئے تھے۔ پھر تمھارے پیر مریں گے جو تم کو غداری اور وطن فروشی کے راستے پر لے گئے۔ پھر تمھاری آنکھیں مر جائیں گی جو ایک طرف زر و جواہر کے انبار سے حاصل ہونے والی دنیاوی خوشیوں کے خواب دیکھتی تھیں تو دوسری طرف اس ملک کی تباہی و بربادی کا نظارہ کرتی تھیں جسے تم نے کبھی صدقِ دل سے ایک علیحدہ نظریاتی مملکت تسلیم ہی نہیں کیا تھا۔ پھر تمھارے کان مر جائیں گے تم دلربا اور رنگین ناتھ جیسے سوداگروں کے سکوں کی کھنک تو سنتے تھے جو شرافت اور انسانیت کا ضمیر خریدتے پھرتے تھے مگر خود اپنے ضمیر کی آواز سننے سے قاصر تھے۔ پھر تمھارا دماغ مرے گا جو اصل مجرم ہے۔ جس نے تمھیں سادھو سے شیطان بنا دیا۔ تمھاری موت کی تو فلم بننا چاہیے، سلوموشن میں۔ ان کیمروں سے جو کلی کو کھل کر پھول بنتا اور ایک پتی کو کھلتا دکھا دیتے ہیں حالانکہ یہ اتنا سست رفتار عمل ہوتا ہے کہ آنکھ دیکھ ہی نہیں سکتی۔ پھر تمھاری موت کے ہر لمحے کی یہ تصویرِ عبرت تم جیسے ہر غدارِ وطن کو سزائے موت سنانے سے پہلے دکھانا چاہیے۔"

سادھو رام آہستہ آہستہ کراہ رہا تھا۔ وہ اتنا بے بس تھا کہ ہم سے رحم کی التجا تک نہیں کر سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا چیخنا چلّانا بھی بے کار ہے کیونکہ ہم اس کی ایک نہیں سنیں گے اور وہی کریں گے جو ہم پہلے سے طے کر چکے ہیں۔ پہلے اگر اس کے دل میں اُمید کی کوئی کرن ہوگی کہ شاید اس کا کوئی نجات دہندہ اسے اغوا کرنے والوں کا سراغ لگا لے اور اس کو چھڑا کر لے جائے تو اتنا وقت گزر جانے کے بعد یہ اُمید بھی دم توڑ چکی ہوگی۔ ہمارے اطمینان اور اعتماد کو دیکھتے ہوئے وہ اپنی شکست کو پوری طرح قبول کر چکا تھا۔ استاد ٹیڈی میرے پیچھے آ کھڑا ہوا تھا اور میری گفتگو سے خاصا متاثر نظر آتا تھا۔

"ہم نے تمھیں ایک پیش کش کی تھی۔" میں نے کہا۔ "اس پر غور کرنے کے لیے تمھیں کافی وقت ملا ہے۔ تم کسی نہ کسی نتیجے پر اب ضرور پہنچ گئے ہو گے؟"

"میں تمھیں کچھ نہیں بتا سکتا۔" وہ بولا اور اس کی آنکھوں سے کرب کے آنسو بہنے لگے۔

"تم بتانا نہیں چاہتے تو سمجھ لو کہ تمھارے لیے اپنی مرضی پر کاربند رہنا کل کے بعد ممکن نہیں رہے گا۔" میں نے کہا۔ "اور اگر واقعی تم کچھ نہیں بتا سکتے۔ کیونکہ تمھیں کچھ معلوم ہی نہیں تو تمھاری وفات سے قبل تمھارے دماغ کے ہر پُرزے کو کھول کر ہم خود دیکھ لیں گے۔"

"ابھی تو ہم نے تفتیش شروع ہی نہیں کی۔ تم نے ایم آر ایس کا تھانہ نہیں دیکھا۔" استاد ٹیڈی بولا۔

"تب تک یہ زخم تمھیں یاد دلاتا رہے گا کہ کل تک انتخاب تمھارے ہاتھ میں ہے۔" میں نے کہا۔ اس کے بعد میں نے کپڑا پھر اُس کے مُنہ میں ٹھونسا اور واپس ہو گیا۔

شہلا دوسرے کمرے میں تنہا کھڑی تھی اور دانتوں سے اپنا ہونٹ کاٹ رہی تھی۔ غالباً اس نے میری کارروائی دیکھی تھی اور سادھو رام کے ساتھ ہونے والی گفتگو بھی سُنی تھی۔ مزاج کے اعتبار سے شہلا بالکل مختلف تھی۔ نہ وہ رابعہ کی طرح مضبوط قوتِ ارادی کی مالک اور حوصلہ مند تھی اور نہ اس کو نادرہ کی طرح خطرات سے کھیلنے کی عادت تھی۔ [illegible] ہمارے ساتھ

زور گزارا تھا جس میں ہمارے ساتھ اس نے معرکہ آرائی میں شرکت کی تھی اور زندگی کی رزم گاہ میں ہمارے ساتھ موت کو نبرد آزما دیکھا تھا لیکن اس کے بعد بیشتر وقت اس نے انکل شیروانی کے گھر کی محفوظ چار دیواری میں گزارا تھا۔ وہ عام قسم کی لڑکی تھی جو اتنے دُکھ اُٹھا چکی تھی کہ اس کے اعصاب مزید صدمات برداشت کرنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ اس کے کمزور اور بزدل ہو جانے کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ پہلے کی طرح اب اس کی زندگی کا مقصد صرف اپنے لیے جینا نہیں رہا تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ اسے محسن کے لیے جینا ہے اور شاید اس کی آنکھیں مستقبل کو دیکھتی تھیں تو اسے یہ احساس بھی ہوتا تھا کہ اسے اپنے بچے کی ماں بن کے بھی بہت ساری ذمے داریاں پوری کرنی ہیں۔

"تم ڈر رہی ہو شہلا بی بی۔" میں نے ہنس کر اس کے سر کے بالوں کو چھیڑا۔

"مجھے اس آدمی سے ڈر لگتا ہے بھائی جان۔" وہ بولی۔

"وہ ایک مجبور اور بے بس قیدی ہے۔" میں نے کہا۔

"لیکن یہ گھر ہے، قید خانہ نہیں۔" شہلا نے کہا۔ "اور معلوم نہیں کیوں مجھے اس کا وجود ایک منحوس علامت کی طرح محسوس ہوتا ہے۔ اس کی موجودگی نے گھر کو آسیب زدہ کر دیا ہے۔ یہ احساس مجھے پہلے کبھی نہیں ہوا۔"

"چلو آج کا دن تھا... وہ بھی گزر گیا۔" میں نے کہا۔ "شام ہو گئی ہے۔ رات تک تم اپنے گھر پہنچ جاؤ گی اور وہ صرف تمھارا گھر ہوگا... قید خانہ نہیں۔"

"یہ نحوست زدہ شکل والا تو وہاں نہیں جائے گا نا؟" شہلا نے کہا۔

"ہرگز نہیں جائے گا... تم دوبارہ یہ شکل نہیں دیکھو گی...!" میں نے کہا۔

محسن اور غالب دس منٹ بعد آئے تو بڑی عجلت میں تھے کیونکہ غالب کو ڈیوٹی پر پہنچنا تھا۔ انھوں نے تمام اسباب سمیٹا اور ایک ریڑھے میں ڈال کر لے گئے۔ استاد ٹیڈی کا خزانہ دیکھنے میں سب سے نامعقول چیز لگتا تھا اور اس پرانے زنگ خوردہ صندوق کو دیکھنے والا کبھی اس کی اصل مالیت کا اندازہ نہیں کر سکتا تھا۔ سب سے زیادہ وزن اس لکڑی کے بکس کا تھا جس میں بارہ ٹائم بم رکھے ہوئے تھے۔ وقت کی سوئیوں کے ساتھ موت کا پیغام پہنچانے والے اور زندگی کے سفر کی آخری ساعتوں کو لمحہ لمحہ شمار کرنے والے۔ ابھی وہ چابی کے کھلونے سے زیادہ بے ضرر تھے مگر چابی دینے کے بعد ان کی ہلاکت خیزی وقت کا دوسرا نام بن جاتی تھی ... وقت ایک منٹ سے بارہ گھنٹے کے درمیان کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ جب تمام سامان اور اسلحہ وغیرہ رکھا جا چکا تو ریڑھے کے ساتھ محسن روانہ ہوا۔ میں شہلا اور غالب تانگے میں پیچھے رہے اور تانگے ریڑھے کی باہمی چپقلش شروع ہوئی تو دونوں کے پائلٹ مقابلے پر آ گئے۔ انھوں نے سڑکوں پر اندھا دھند گھوڑے دوڑانے شروع کر دیے جیسے لاہور نہیں بحرِ ظلمات ہے۔ جن کو اپنی جان عزیز تھی وہ بروقت راستہ دیتے گئے۔ لاہور کے رہنے والے اس قسم کے مقابلوں کے عادی ہیں اور زندہ دلی کا یہ عکس صرف تانگوں کی دوڑ تک محدود نہیں۔ میں نے بسنت پر سابقہ منٹو پارک اور اب اقبال پارک میں بڑے پتنگ بازی کے مقابلے دیکھے تھے جن میں محمود و ایاز یکساں جوش و خروش سے شریک ہوتے تھے اور کاروں کی قطاریں دیکھ کر اندازہ یہ ہوتا تھا کہ یہاں پتنگ بازی کا مقابلہ نہیں، سرکاری پارٹی کا جلسہ ہو رہا ہے۔ پھر میں نے پتنگ بازوں کو ہزاروں کی شرطیں ہارتے اور پتنگ کے ساتھ سو سو کے نوٹ لگا کر اُڑاتے دیکھا تھا اور اس قسم کے مقابلوں میں پبلک پتنگ بازوں کا اتنے ہی اشتیاق سے ساتھ دیتی تھی جتنے شوق سے اپنے اپنے حلقے کے سیاسی امیدواروں کا۔

ریڑھے اور تانگے کی دوڑ میں پہلے ریڑھا آگے رہا۔ پھر تانگا آگے نکل گیا اور تانگے بان نے گزرتے گزرتے مُنہ پر ہاتھ رکھ کے ریڑھے والے کی طرف دیکھا اور حلق سے عجیب سی آواز نکالی جو اپنے حریف کو غیرت سے ڈوب مرنے کا سگنل تھا۔ ریڑھے والے نے جواب دینے کے بجائے گھوڑے کو ایک دلچسپ گالی سے نوازا اور اس پر کوڑے برسانے لگا۔ نتیجہ یہ کہ اگلے چند منٹ میں ریڑھا آگے نکل گیا اور اب ریڑھے کے ڈرائیور نے حلق سے وہی صدا بلند کی اور اپنا رُخ تانگے والے کی طرف رکھتے ہوئے جوابی کارروائی کے طور پر قہقہہ مارا۔ "بس او ئے... پھوک نکل گئی۔ او ئے ایس ٹٹو نوں کباڑی کول لے جا... چھولے مل جان گے۔"

اب تانگے والے کی غیرت جاگی۔ اس نے اپنے گھوڑے پر ندامت کا غصہ اُتارا۔ "حرامخور... تینوں تے اج بجلی لاواں گا۔" اس نے گھوڑے کو چابک رسید کیے اور اسے بجلی بھی لگائی جو ایک نہایت غیر شریفانہ اور نامعقول حرکت تھی مگر نتائج خاطر خواہ برآمد ہوئے۔ ریڑھا ابھی دس گز آگے ہی تھا لیکن اس فاصلے کو کم کرتے کرتے پانچ منٹ گزر گئے۔ پھر ایک لخت گھوڑا آگے نکل گیا۔ تانگے والے کا جوشِ انتقام اُبل پڑا۔ اس نے مُنہ پر ہاتھ رکھ کے بڑھک ماری۔

"بس او ئے... ٹٹو دے پُتر..." اس نے ریڑھے والے کی طرف دیکھا اور ہانک لگائی۔ "او ئے ہُن تے معاف کر دے اپنے پیو نوں... جوان مرد بن تے آپ ایدی جگہ لے لے۔" یہ بہت

اشتعال انگیز بات تھی کہ ریڑھے والے کو اس کے گھوڑے کی ضعیفی کا طعنہ دیا جائے اور یہ بھی کہا جائے کہ وہ ضعیف جانور اس کا باپ ہے جس کے ساتھ وہ نہایت ناروا سلوک کر رہا ہے چنانچہ وہ خود ریڑھا کھینچے اور گھوڑے کو اپنی جگہ بٹھا دے۔ اس کے بعد بہت سخت مقابلہ ہوا جس میں ایسا وقت بھی آیا جب دونوں گھوڑے ایک رفتار سے جان کی بازی لگاتے رہے (مسافروں کی جان کی بازی) اور ریڑھا تانگا بہت کم چوڑی سڑک پر متوازی دوڑتے رہے۔ ایک بار دونوں کی باڈی مس ہوئی اور شہلا کا خوف سے بُرا حال ہو گیا۔ اس کو یقین تھا کہ دونوں کے پہیے ٹکرا کے نکل جائیں گے اور ایک ایک پہیے پر دوڑنے والے تانگے ریڑھے کے معزز مسافر گرا اور ان کا اسباب سڑک پر یوں بکھر جائیں گے جیسے منتشر ہو جانے والے جلسے میں پبلک کے جوتے ٹوپیاں۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ ایک طرف سے محسن اور دوسری طرف سے مرزا غالب دونوں کوچبانوں کو شہہ دے رہے تھے اور مقابلے میں شدت پیدا کرنے کے لیے آگے نکل جانے پر شاباش کا ہلّہ مچاتے تھے تو ہارنے پر غیرت کو للکارنے لگتے تھے۔ ایک ٹریفک کانسٹیبل نے اس ریس میں دخل درمعقولات کی واجبی سی کوشش کی اور پھر چھلانگ مار کے اپنی جان بچائی۔ وہ بھی لاہوریا تھا اور سمجھتا تھا کہ اس وقت قانون کوئی چیز نہیں۔ جو کچھ ہے فتح ہے یا شکست ہے۔

بالآخر میں نے مجبور ہو کے تانگے والے سے کہا "بھائی... خُدا کے واسطے ہماری خطا معاف کرو۔"

تانگے والا بھونچکا رہ گیا "کیوں شہنشاہو... کی ہویا جے؟"

"ہوا تو کچھ نہیں مگر ہو جائے گا۔ یہ لڑکی بیمار ہے۔ حادثہ ہوا' پھر تو سب ہی اللہ کو پیارے ہوں گے مگر یہ اس سے پہلے ہی مر جائے گی۔" میں نے کہا "میں مان لیتا ہوں کہ تم ریس جیت گئے۔"

تانگے والے کا دل ٹوٹ گیا۔ اسے ہم سے ایسے حوصلہ شکن رویّے کی امید نہیں تھی۔ اس وقت وہ آگے نکل چکا تھا اور اس کے عزائم بلند تھے۔ ہمارے مجبور کرنے پر اس نے گھوڑے کو بریک لگائے اور پلک جھپکتے میں ریڑھا آگے نکل گیا۔ ریڑھے والے نے اندازہ کر لیا تھا کہ تانگے والا مقابلے سے دستبردار ہو گیا ہے اور ریڑھے کو واک اوور مل گیا ہے۔

"ہا... اوئے مُک گیا تیرا ٹٹو۔" ریڑھے والے نے حلق سے قلقاریاں ماریں اور بہت ہاؤ ہو کی "ایس تے کی مقابلہ کرنا سی میرے شیر تیرڑ دا۔"

تانگے والے کا خفت سے بُرا حال ہو گیا "اوئے گھوڑا تے میرا وی شیر تر ہے... پر کی کراں... سواریاں..."

جو بات اس نے ہمارے بارے میں کہی وہ ہمارے لیے باعثِ شرم تھی۔ اس نے اپنے گھوڑے پر الزام نہیں آنے دیا اور صاف کہہ دیا کہ گھوڑا تو کبھی نہ ہارتا مگر سواریاں ہی ایسی ملی ہیں۔ اس نے جو لفظ استعمال کیا تھا اس سے ہم بزدل... بے غیرت... احمق اور نہایت گھٹیا درجے کی مخلوق ثابت ہوتے تھے۔ تاہم اس الزام کو قبول کرنا موت کو قبول کرنے سے بہتر تھا جب دونوں گھوڑے وقت کے معمولی سے فرق کے ساتھ آگے پیچھے رُکے تو دونوں کے ڈرائیور ایک ساتھ اترے اور چائے پینے چلے گئے۔ مقابلہ ختم ہو جانے کے بعد معاملہ بھی ختم اور دل صاف۔ دوستی بحال... یہ وہ چیز تھی جسے انگریزی میں اسپورٹس مین اسپرٹ کہا جاتا ہے۔ وہ دونوں ہم سے ناراض تھے اور چائے پینے کے لیے جانا عدم تعاون کی تحریک تھی جس میں دونوں حریف ایک ساتھ شریک تھے۔ مجبوراً ہم نے اپنا سامان خود ہی اتارا اور گھر کے اندر لے گئے۔

وہ دونوں دس منٹ بعد سگریٹ کے سُوٹے لگاتے ہوئے نمودار ہوئے تو میں نے ان کو سو سو کے نوٹ پیش کیے۔

"یہ تم دونوں کا انعام! مقابلہ زبردست رہا۔" میں نے کہا۔

"او جی مٹی پاؤ مقابلے تے..." تانگے والے نے کہا "اسی کوئی پیسہ لے کے تماشا دکھا رہے سی؟"

"سانوں پورے پیسے چاہیدے نے جناب... اپنا انعام اپنے کول رکھو۔" ریڑھے والے نے بے رُخی سے کہا۔ میں نے شرمندہ ہو کے سر کھجایا اور انھیں پچیس پچیس روپے دے دیے۔ ان کے جذبے نے مجھے متاثر کیا تھا۔ ان کے لیے پیسہ اور انعام غیر اہم تھا۔ مقابلہ تو لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ... کی روایت تھی اور میں نے ان کا لہو ٹھنڈا کر دیا تھا تو اس کی تلافی پیسہ نہیں کر سکتا تھا۔

گھر مزنگ کی ایک گلی میں تھا اور باہر سے اتنا اچھا نہیں لگتا تھا جتنا اندر سے اچھا تھا۔ اس میں چار کمرے تھے۔ باہر کے بڑے کمرے کو جو ڈیوڑھی سے ملحق تھا ڈرائنگ روم کا نام دیا جا سکتا تھا۔ یہ پرانی طرز کا مکان تھا اور اسے بنانے والوں نے باہر کی طرف مردان خانہ رکھا ہوگا۔ ڈیوڑھی کے بعد مختصر سا دالان آ جاتا تھا جو شاید بیس فٹ لمبا اور اتنا ہی چوڑا تھا۔ باقی تین کمرے دالان عبور کرنے کے بعد آتے تھے اور نسبتاً چھوٹے تھے۔ تینوں کمروں کے دروازے صحن میں ہی کھلتے تھے۔ ان کے درمیان کی دیواریں ہر کمرے کو بالکل جدا رکھتی تھیں۔ دائیں جانب ایک برآمدہ سا تھا اور بائیں طرف کے حصّے میں باورچی خانہ اور غسلخانہ تھا۔ باتھ روم کا وہ حصّہ جس میں باتھ نہیں کیا جاتا اوپر چھت پر تھا۔ جیسا کہ لاہور کی پرانی آبادی کے ہر گھر کے

باوجود مکان روشن اور نیا بنا ہوا لگتا تھا۔ اس کے اندرونی حصّے میں وسیع پیمانے پر مرمّت کی گئی تھی۔ دیواروں پر سارا پلستر نیا تھا اور رنگ نیا تھا۔ پرانی کھڑکیوں کی جگہ نئی بڑے شیشوں والی کھڑکیاں لگائی گئی تھیں۔ غالباً پلستر جھڑ چکا تھا اور پرانی کھڑکیوں کی لکڑی میں دیمک لگ گئی تھی۔ اب جو کھڑکیاں دروازے لگائے گئے تھے ان کے فریم لوہے کے تھے۔ گھر کی پرانی وائرنگ بھی بدل گئی تھی جو پچاس سال پہلے کی ہو گی۔ یہی وجہ تھی کہ باہر سے پرانا نظر آنے والا مکان اندر سے نیا بنا ہوا لگتا تھا۔ نئے پن کے اس تاثر کو نئے انداز کے فرنیچر اور نئی آرائش سے بھی بہت مدد ملی تھی۔ اس نئے گھر میں سب سے زیادہ شہلا خوش تھی۔ بالآخر اسے اپنی منزل اور اپنے خوابوں کی تعبیر مل گئی تھی۔ یہ اس کا گھر تھا جسے اس نے اپنی مرضی سے سجایا تھا۔ اس کے لیے تمام سامان اس نے اپنی مرضی کے مطابق خریدا تھا۔ وہ سامان جو انکل شیروانی کی بیگم نے شہلا کو جہیز میں دینے کے لیے جمع کیا تھا ابھی فوزیہ کے گھر میں رکھا تھا۔ بیگم شیروانی کو قدرت نے بہت کم مہلت عطا کی تھی۔ فوزیہ کے لیے انھوں نے تمام عمر جمع کیا تھا مگر اس کی شادی کے بعد جب شہلا ان کے پاس پہنچی تو وقت اتنا نہیں تھا کہ وہ اپنے ارمان نکال سکیں۔ وہ سمجھتی تھیں کہ شہلا کی پوزیشن کیا ہے۔ اس کا کوئی گھر نہیں تھا جہاں سے اس کی رخصتی ہوتی۔ اسے انکل شیروانی کے گھر سے رخصت ہو کے اسی گھر میں رہنا تھا۔ وہ ان کی بیٹی بھی تھی اور بہو بھی۔ بیگم شیروانی نے اندازہ کر لیا تھا کہ انھیں شہلا کی شادی ماں بن کے کرنا ہو گی اور پھر اسے بہو بنا کے گھر میں رکھنا ہو گا۔ دوسرے مرحلے کے آنے سے قبل ہی انھیں اجل نے آ لیا مگر پہلے مرحلے کی تیاری میں انھوں نے دیر نہیں کی تھی۔ وہ بہت کچھ بنا گئی تھیں اور جو کسر رہ گئی تھی' وہ انکل شیروانی نے یوں پوری کی تھی کہ اپنا سارا بینک بیلنس شہلا کے نام کر دیا تھا اور اسے بتا دیا تھا کہ یہ اس کو باپ سے ملنے والی رقم ہے جس سے وہ جہیز کا باقی سامان خود خریدے۔ یہ رقم بہت زیادہ نہیں تھی۔ شہلا کے کہنے کے مطابق تقریباً اسّی ہزار تھی۔ انکل شیروانی ایک وضعدار، خدا ترس اور دیانت دار افسر نہ ہوتے تو یہ رقم اسّی لاکھ ہوتی۔ وہ نقد رقم اتنی نہ چھوڑتے تب بھی پاکستان کے ہر بڑے شہر میں ایک کوٹھی ضرور چھوڑ جاتے۔ ان کے لاکھوں کے شیئرز مختلف منافع بخش کاروبار میں ہوتے یا محسن ایک فیکٹری کا مالک ضرور ہوتا لیکن انھوں نے ریٹائرمنٹ کے بعد سرکاری کوٹھی خالی کر دی تھی اور بیٹی داماد کے پاس زندگی کے آخری ایام گزار رہے تھے۔ اپنی پرانی گاڑی انھوں نے داماد کو دے دی تھی جو پروفیسر تھا اور اسے صرف فیملی کے ساتھ آنے جانے میں استعمال کر لیتا تھا۔ غالب، نیک محمد اور میں' ہم اس کے نالائق بھائی ثابت

ہوئے تھے جو اس کے لیے کچھ نہ کر پائے تھے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ہم کچھ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ہم میں سے ہر ایک کو شرمندگی کا احساس تھا اور اپنی ایک بہن کی خوشیوں کے لیے ہم سب کو بہت کچھ کرنا تھا۔

مرزا غالب نے چلتے چلتے شہلا کے سر پر پیار کیا "تیرے نصیب میں یہی بن مانس لکھا تھا بیٹا۔ اللہ کی رضا سمجھ کے اس یتیم للعارث کو قبول کر لینا اور خوش رہنا۔"

"خواجہ صاحب کے برادرانِ لاکو بن مانس کہہ کر تم پاگل کتے کی دُم کھینچ رہے ہو مرزا جی۔" میں نے کہا "وہ ہوتا تو تم کو بھی اللہ کی رضا سمجھ کے بہت کچھ قبول کرنا پڑتا' مثلاً ٹوٹی ہوئی ناک، سوجے ہوئے جبڑے اور غالب کا سرمہ۔"

"خیر ہم اسے بتا دیں گے۔" محسن نے کہا "سکندر نے بھی اسے پاگل کتا کہا ہے۔ ابھی تم جا ڈاپنے پاگل خانے ورنہ وہ ایڈیٹر پھر تمھیں کاٹنے کو دوڑے گا اور تم اسے کاٹو گے۔" شہلا کو بہت ہنسی آ رہی تھی۔ وہ ہنسنا چاہتی تھی چنانچہ اس کا چہرہ کھلا جا رہا تھا۔ جب میں نے واپسی کا ارادہ کیا تو اس نے مجھے روک لیا کہ کھانا کھا کے جانا۔ اس وقت کچھ پکانے کا سوال ہی نہ تھا۔ محسن مزنگ چوک تک گیا اور دارالماہی سے تلی ہوئی مچھلی لے آیا۔ میں نے محسن کو گزشتہ دن کے واقعات سنائے جس میں گاڑی کی خریداری سے تباہی تک سب کچھ آ گیا۔ وہ ہکّا بکّا بیٹھا رہا اور شہلا تو کھانا بھول گئی۔ اس کے لیے ایک دن کے یہ واقعات ایک پوری فلم کی اسٹوری سے زیادہ حیران کن اور سنسنی خیز تھے۔

"اگر رابعہ کو فائدہ نہ ہوتا تو میں یقیناً یہ کہتا کہ تو نے سولہ ہزار روپے غارت کر دیے۔" محسن بولا "مگر اس کی ذہنی کیفیت میں اتنی پیش رفت ہوئی ہے تو سولہ ہزار کچھ بھی نہیں۔ تجھے کل بھی سولہ ہزار خرچ کرنے کی اجازت ہے۔"

"مجھے یقین ہے کہ اس ہفتے کے ختم ہونے تک وہ پرانی رابعہ پھر ہمارے درمیان ہو گی۔" میں نے کہا۔

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔" محسن نے کہا "لیکن یار وہ کون لوگ تھے جو تیرے پیچھے لگ گئے تھے؟"

"شکاری۔" میں نے مختصراً جواب دیا "اس سے زیادہ میں کیا کہوں۔"

"یہ تو ویسی ہی بات ہے جو ایک تھانیدار نے چوری کی واردات میں بہت تحقیق و تفتیش کے بعد کہی تھی۔" محسن بولا۔ "کہ واردات میں چوروں کا ہاتھ معلوم ہوتا ہے۔ ارے بابا شکاری تو سب ہیں۔"

"میں اپنے جواب پر قائم ہوں۔ میں یہ نہیں دیکھ سکا کہ

وہ شکاری کس قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ پولیس سے، چوہدری دلاور اینڈ کمپنی سے یا سادھورام کے ساتھیوں سے۔ یہ کارروائی اندھیرے میں ہوئی تھی اور میں وہاں سے فوراً بھاگ کھڑا ہوا تھا۔"

"تو نے یہ بھی نہیں دیکھا تھا کہ وہ تیرے پیچھے کہاں سے لگے... کیسے لگے...؟"

"میں صرف ایک چیز دیکھ رہا تھا برادرم۔" میں نے کہا۔ "میں کچھ اور دیکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ جدھر دیکھتا ہوں، اُدھر تو ہی تو ہے والی کیفیت تھی۔ رابعہ کی تلاش میں میرا تعلق باقی دنیا سے کٹ گیا تھا۔"

محسن نے سر ہلایا اور میری دلیل کو تسلیم کیا۔ "پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انھوں نے گاڑی کا پتا کیسے چلالیا؟"

"ایک نظریہ تو یہ ہے کہ اس سیلز مین نے خود استاد پیڈرو کو مطلع کردیا اور انھوں نے شہر بھر میں اپنے کتے چھوڑ دیے جنھوں نے بالآخر ہمیں ڈھونڈ نکالا۔ اب وہ ہمارے پیچھے اس لیے لگے ہوئے تھے کہ ہمارا موجودہ ٹھکانا دیکھ لیں۔ یہ ہوسکتا ہے کہ اس شوروم کے سیلز مین کو سچ بولنا پڑا ہو۔ سامنے بندوق کی نال سے موت جھانک رہی ہو تو کوئی بہادر بننے کی بے وقوفی نہیں کرتا لیکن دوسرا نظریہ یہ بھی ہے کہ گاڑی کو وہاں کھڑا کرنے کے بعد اور سیلز مین کو تمام ہدایات دینے کے باوجود استاد پیڈرو نے اپنے انتظامات کو ناکافی سمجھا اور شوروم کے باہر کسی کی ڈیوٹی لگاتا رہا جس کا علم شوروم والوں کو بھی نہ ہو اور وہ شخص دیکھتا رہا کہ مکھی کب مکڑی کے جالے میں آتی ہے۔ یہ ایسا جوا تھا جس میں کامیابی کے امکانات دس فیصد بھی نہیں تھے کیونکہ شہر میں دسیوں شوروم ہیں جہاں سیکڑوں کاریں برائے فروخت کھڑی ہیں۔ یہ استاد پیڈرو کی نہیں چوہدری دلاور کی ذہانت کا کرشمہ تھا۔ اس نے کہا ہوگا کہ وہ سکندرِ اعظم کا گھوڑا، اسے فاکس ویگن پسند ہے اور لال رنگ کی فاکس ویگن تو اس کی جذباتی کمزوری ہوگی۔ جیسے مجنوں کو سگِ لیلیٰ سے بھی پیار تھا۔ ایسے ہی سکندر کوئی پرانی گاڑی تلاش کرنے نکلا تو ممکن ہے اِدھر آجائے اور پھنس جائے اور جناب محسن نعمان شیروانی... ہم جو کہ بیسویں صدی کے سب سے بڑے عاشق اور احمق ہیں، اس کی توقعات پر پورے اترے اور پھنس گئے۔ اس کو ہم اپنی شامتِ اعمال اور دلاور کی خوش قسمتی بھی کہہ سکتے ہیں۔"

"بشرطیکہ ہم پیچھا کرنے والوں کو دلاور کے نمائندے مان لیں۔" محسن بولا۔

"میری چھٹی حِس کہتی ہے کہ وہ اسی کے بھیجے ہوئے شکاری تھے۔" میں نے کہا۔ "ورنہ پولیس ہوتی تو ہمارے نقشِ قدم... میرا مطلب ہے نقشِ ٹائر پر کیوں چلتی رہتی؟ ہمیں گرفتار نہ کرلیتی۔"

"ہماری عقل مند پولیس بعض اوقات وہ نہیں کرتی جو اُسے کرنا چاہیے۔" محسن بولا

"بعض اوقات! پولیس کبھی وہ نہیں کرتی جو اسے کرنا چاہیے۔" میں نے کہا۔ "مگر رات کی بات مختلف تھی۔ اگر وہ وطن دشمن ہوتے تو اتنی دیر کبھی نہ لگاتے۔ وہ چند منٹ میں ہم پر بم پھینکتے یا ہمیں مشین گن سے بھونتے ہوئے نکل جاتے۔"

"یار یہ کیا ہے؟" محسن نے اچانک اخبار کا ایک صفحہ میرے سامنے کردیا جس میں وہ مچھلی لے کر آیا تھا۔ صفحہ تیل سے چکنا ہو رہا تھا اور کچھ پھٹ بھی گیا تھا مگر اس خبر کو پڑھا جاسکتا تھا جس پر محسن نے انگلی رکھی تھی۔ خبر کے ساتھ جو تصویر تھی اسے بھی میں نے فوراً شناخت کرلیا۔ میں نے اوپر دیکھا۔ یہ گزشتہ شام شائع ہونے والا ضمیمہ تھا۔

"یہ تو وہی سیلز مین ہے محسن۔" میں نے افسوس سے سر ہلایا "اس کا خون کس کے حساب میں لکھا جائے گا؟ ایک طرف میں اسے دھمکی دے آیا تھا تو دوسری طرف وہ تھے جو دھمکی بھی نہیں دیتے تھے لیکن معاف بھی نہیں کرتے تھے۔"

"اس نے یقیناً تیرے متعلق بتانے سے انکار کیا ہوگا۔" محسن نے کہا۔ "اور جھوٹ بولا ہوگا کہ گاڑی کوئی دوسرا شخص لے گیا ہے۔"

"اور ان کے اپنے ذرائع سے یا طاقت کے استعمال سے حقیقت سامنے آگئی ہوگی۔ سیلز مین کو اسی کی سزا ملی۔" میں نے کہا۔ "اب تو کوئی شک کی بات ہی نہیں رہی کہ پیچھا کرنے والے استاد پیڈرو کے آدمی تھے۔"

"آدمی ان میں کوئی نہیں... وہ قاتل ہیں یا غدّار ہیں، شیطان ہیں یا ضمیر فروش ہیں اور درندے ہیں۔ خونخوار شکاری درندے مگر آدمی نہیں ہیں۔" محسن نے کہا۔ "یہ کیسی فضول خبر ہے۔ چند نامعلوم افراد کی کاروں کے شوروم پر فائرنگ۔ ایک شخص ہلاک۔ شوروم کے مالک کا کہنا ہے کہ وہ گاڑی یا اس کا نمبر کچھ نہیں دیکھ سکا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ڈاکے کی نیت سے آئے تھے مگر باہر کھڑے ہوئے سیلز مین نے ان کی نیّت بھانپ لی اور شور مچایا جس پر وہ فرار ہونے پر مجبور ہوگئے... خوف و ہراس پھیلانے کے لیے انھوں نے گولیاں چلائیں، ان میں ایک سیلز مین کو لگ گئی۔ سب جھوٹ بکواس۔ وہ اطمینان سے آئے ہوں گے اور انھوں نے شوروم کے سیلز مین کو گردن سے دبوچ کر پوچھا ہوگا کہ وہ لال گاڑی کون لے گیا؟ اور اس نے کہا ہوگا کہ ننگر کے چوہدری شجاعت بخش تو انھوں نے ریوالور سیلز مین کے سر پر رکھ کر ایک گولی چلائی ہوگی جس سے اس کی پیشانی میں سوراخ ہوگیا ہوگا۔ پھر وہ مالک کو صحیح بیان دینے کی تاکید کرکے چلے گئے ہوں گے۔ مالک نے وہی بیان دیا جو جان بچانے کے لیے ضروری تھا کہ وہ نامعلوم افراد تھے۔ وہ اچھی طرح جانتا ہوگا کہ وہ کون تھے۔ اس نے انھیں آتے جاتے دیکھا ہوگا۔ ان کی گاڑی اور گاڑی کا نمبر سب اُسے معلوم ہے مگر وہ بوں حق کا بول بالا کرے۔ اسے زندہ رہنا ہے۔"

"میں اب چلتا ہوں یار! بہت دیر ہوگئی۔" میں نے کہا۔ "استاد بڈی اکیلا بیٹھا ہم سب کی جان کو رو رہا ہوگا۔"

"میں بھی چلتا ہوں۔" محسن نے اُٹھنے کی کوشش کی لیکن میں نے اسے سر دبا کے پھر بٹھا دیا۔

"خبردار جو باہر نکلنے کا سوچا۔" میں نے ڈانٹ کر کہا۔ "یہاں یا شہلا اکیلی رہے گی؟"

"یہ تم لوگ اچھا نہیں کررہے ہو... ایسے بالکل نہیں چلے گا۔" محسن نے برہمی سے کہا۔ "تم لوگ مجھے سچ مچ کا پالتو شوہر بنا کے گھر میں قید کرنا چاہتے ہو۔ اپنے سے الگ کررہے ہو۔"

"نہیں۔ جب تمھاری ضرورت ہوگی تو ہم کہیں گے کہ اُٹھ باندھ کمر کیا ڈرتا ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن آج کی رات تو کچھ بھی نہیں کرنا ہے۔ کوئی کام نہیں ہے۔ میں تیرے جذبات کی قدر کرتا ہوں مگر تو شہلا کے جذبات کی قدر کر۔ شب بخیر... صبح کسی وقت ہم بنوں آئیں گے۔" باہر نکل کر میں نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا اور گلی میں دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ مزنگ چوک سے مجھے ایک رکشا ملا جو درحقیقت ایک متحرک جھولا تھا اور آگے تو خیر چلتا ہی تھا مگر دائیں بائیں بھی ڈولتا تھا۔ تمام راستے مجھے اندیشہ رہا کہ اس کا کوئی حصہ یا تمام حصے کسی ایک طرف گر جائیں گے۔ پھر میں سڑک پر بیٹھا رہ جاؤں گا اور رکشا والا اپنی سیٹ پر براجمان اس حصے کے ساتھ نکل جائے گا جس میں دو پہیے اور انجن باقی بچے ہوں گے لیکن اللہ نے فضل کیا اور میں پورے کا پورا منزلِ مقصود تک پہنچا۔ دونوں گھروں کے درمیان چھ سات میل کا فاصلہ تھا مگر میٹر کے حساب سے چودہ میل ثابت ہوا۔ غالباً جھولا جھلانے کے چارجز الگ تھے۔ میں پرانے گھر کی گلی میں داخل ہوا تو مجھے بڑا عجیب سا لگا۔ ابھی میں جس گھر کو پیچھے چھوڑ آیا تھا وہ سچ مچ کا گھر تھا۔ جیتا جاگتا... محفوظ... خوشیوں سے معمور اور بارونق... اس گھر میں اب کچھ نہیں رہا تھا جہاں سادھورام قید تھا۔ سب کے چلے جانے کے بعد یہ واقعی ایم آر ایس کا تھانہ رہ گیا تھا اور ایک عارضی پناہ گاہ۔ دروازے کے سامنے مجھے اپنے لینڈ لارڈ کی ٹیکسی کھڑی ہوئی دکھائی دی۔ "آؤ بھتیجی سوہنیو۔" وہ مجھے دیکھتے ہی بولا۔ "ہم تو آئے تھے کہ پھر کچھ تر مال ملے گا مگر یہاں تو بندہ ہے نہ بستر۔"

"کیوں! ہمارے نیک محمد صاحب کو آپ بندوں میں شمار نہیں کرتے۔" میں نے کہا اور استاد ٹیڈی کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ خلافِ معمول کچھ اترا ہوا تھا۔

"بندہ تو اُدھر بھی ایک رکھا ہوا ہے تم نے۔" وہ بولا۔ "مگر ایسے... جیسے چوری کا مال ہو... کیا قصّہ ہے جی؟"

"قصّہ بڑا عجیب ہے جناب۔" میں نے سب کے ساتھ فرش پر بیٹھ کے کہا۔ "یہ بھارتی جاسوس ہے۔"

لینڈ لارڈ ایسے اُچھلا جیسے میں نے پیچھے سے آکر اس کے کان کے پاس پٹاخہ چلادیا ہو۔ "کو... کون... بھارتی جاسوس... یار، یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے... ابھی یہ تمھارا دوست کہتا تھا کہ اس کا دماغ خراب ہوگیا تھا اس لیے باندھ کر ڈالا ہوا ہے اور یہ تمھارے ماموں کا پتر ہے... تم کہتے ہو بھارتی جاسوس ہے۔"

"یہ واقعی بھارتی جاسوس ہے۔" میں نے کہا۔ "نیک محمد میری مرضی کے بغیر تم کو اصلیت نہیں بتا سکتا تھا۔"

"یا میرے مولا۔" لینڈ لارڈ نے سر ہلا کے فریاد کی۔ "یہ بھارتی جاسوس کدھر سے آگیا یہاں... او یار و! خدا کا کچھ خوف کرو... کیا بھارتی جاسوس بھی کوئی بٹیرا ہوتا ہے جو تمھارے ہاتھ لگ گیا۔"

"ایک تو ہمیں تمھارا نام معلوم نہیں... کچھ بتایا تو ہوگا تم نے...؟" میں نے کہا۔

"میرے تو بہت نام ہیں جی... ماں باپ نے کچھ رکھا تھا۔ یاروں نے کبھی کچھ کر دیا۔" وہ بولا۔ "کبھی کچھ... آج کل مولا جیٹ کہتے ہیں۔ یہ جیٹ چلاتا ہوں نا جو آپ کے دروازے پر کھڑا ہوا ہے۔ بیوی چن ماہی کہتی ہے۔"

"واہ واہ... سب سے اچھا یہی ہے... چن ماہی۔" میں نے کہا۔ "تو بھائی چن ماہی... ہم نے اس بھارتی جاسوس کو بڑی جدوجہد اور کوشش سے گرفتار کیا ہے...!" میں نے اور ٹیڈی نے بیک وقت ریوالور نکالے اور جیب میں ڈال لیے۔

"تم نے گرفتار کیا ہے... کون ہو آخر تم لوگ؟" چن ماہی کا رنگ اُڑ گیا۔ "پولیس والے یا فوجی؟"

"تم کچھ بھی سمجھ لو۔" میں نے کہا۔ "ہمارا کام یہی ہے اس لیے ہم خود کو چھپا کے رکھتے ہیں اور اپنے بارے میں اصلیت کسی کو نہیں بتلاتے۔ نہ اپنا صحیح نام اور نہ پتا۔ اگر ہم ایسا نہ کریں تو ہمارے ساتھ ہمارے گھر والوں کی زندگی بھی محفوظ نہ رہے۔"

"وہ... وہ تو ٹھیک ہے جناب عالی..." چن ماہی کا حلق خشک ہونے لگا تھا۔ "لیکن کسی کو معلوم ہوگیا تو میرا کیا بنے گا؟"

"کسی کو آخر کیسے معلوم ہوگا؟" میں نے اطمینان سے کہا۔ "ہم خود تو بتانے سے رہے۔ تمھاری زبان سے ہی کچھ نکلے گا تو بات پھیلے گی، ورنہ یہاں کسی کا بھی آنا جانا نہیں ہے۔ تمھارا مُنہ بند رہنا چاہیے۔"

"رب دی سوں... میں نے مرنا ہے جی مُنہ کھول کے۔" وہ بولا۔ "لیکن جنابِ عالی..."

"یہ کیا جنابِ عالی، جنابِ عالی شروع کر دی ہے تم نے.. اسے بھی ہم تمہارے کرائے دار ہیں اور اس کے علاوہ دوست ہیں۔" میں نے کہا۔ "اس حد تک ہم میں کوئی فرق نہیں کہ ہم بھی سچے پاکستانی ہیں اور تم بھی ہو۔ یہ جاسوس بھی خود کو پاکستانی ہی کہتا تھا اور تقسیم کے وقت ہجرت کر کے نہیں گیا تھا۔ یہاں کے لوگوں نے اس کے ساتھ محبت کا سلوک کیا اور اسے برابر کی عزت دی۔ کبھی اسے ہندو سمجھ کے اس سے تعصب نہیں برتا۔"

"یہ ہندو ہے؟" چن ماہی پھر اُچھلا۔ "کیا نام ہے اس کا؟"

"نام تم کو بتا دیتے ہیں۔ اس کا نام ہے سادھورام۔" میں نے کہا۔ "کام یہ خبیطا نوں والے کر رہا تھا۔ یہ پاکستان سے بھارت کی سرحد تک اسلحہ پہنچاتا تھا اور وہاں سے اسلحہ آگے جاتا تھا مشرقی پاکستان... جہاں ہمارے دشمن ملک کے اندر گڑبڑ پھیلانے میں مصروف ہیں اور بھائی کو بھائی سے الگ کر دینا چاہتے ہیں۔"

"توبہ رب دی!" چن ماہی نے دونوں گالوں پہ ہلکے ہلکے تھپڑ مارے۔ "ایسے ذلیل بندے کو آپ نے زندہ کیوں چھوڑا ہوا ہے بادشاہو! آپ تو مجھے اجازت دو کہ میں اس کی گچی مروڑ دوں۔"

"ابھی نہیں۔ بعد میں اپنی خواہش ضرور پوری کرنا۔" میں نے کہا۔ "پہلے ہمیں اس سے پوچھ گچھ کرنے دو۔ ہمیں اس سے ان سب کے نام پوچھنے ہیں جو یہاں اس کے مددگار تھے اور پھر ان کو بھی پکڑنا ہے... یہ کام بہت مشکل اور خطرناک ہے لیکن تم کو ڈرنے کی بالکل ضرورت نہیں۔"

"لو جی! ڈرتا کون کافر ہے۔" چن ماہی بولا۔ "ہم تو آپ کے ساتھ ہیں۔ یہ جان کب تک بچا کے رکھیں گے اور اگر مرنا ہو تو سب سے اچھی موت وہی ہے جی جو... جو شہادت کی موت ہو... وطن کے لیے نصیب ہو یا کسی نیک کام میں جان قربان کرتے ہوئے ملے۔ وہ کیا شعر ہے جی علامہ صاحب کا...؟"

"مسلماں کے لیے دنیا و دیں میں سرفرازی ہے۔" میں نے کہا۔ "دمرنے سے شہید اور زندہ رہ جانے سے غازی ہے۔"

"اللہ بھلا کرے آپ کا۔ میں نے کسی سے سُنا تھا۔" وہ خوش ہو کے بولا۔ "آپ کی بڑی مہربانی ہو گی اگر مجھے غازی یا شہید کر دو۔"

مجھے اس کی بات پہ ہنسی آئی مگر اس کی حُبّ الوطنی کے جذبات نے مجھے متاثر بھی کیا۔ "تم اس جہاد میں ہمارے ساتھ شریک ہو چکے ہو چن ماہی... اس گھر کو استعمال کرنے کی اجازت دے کر اور رازداری کی قسم کھا کر تم ہمارے ساتھی بن گئے ہو۔ بس تمہارا اتنا ہی کام ہے کہ کسی کو کچھ پتا نہ چلنے دو۔ یہی کہتے رہو کہ ہم تمہارے کرائے دار ہیں اور کوئی ہرج نہیں اگر اسے پاگل بتا دو۔ ہم میں سے کسی کا بھی رشتے دار کہہ دو۔"

"خدا نہ کرے ایسے ذلیل رشتے دار ہوں جی آپ کے۔" چن ماہی بولا۔ "مگر آپ بالکل فکر مت کریں۔ آپ کسی کے مُنہ سے کچھ سنو تو مجھے غدار کہہ کے گولی مار دینا۔"

"اوّل تو تمھیں نقصان ہو گا نہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن ہوا تو گورنمنٹ تمھیں اس کا معاوضہ دے گی... مثلاً یہ گھر..."

"توبہ توبہ... معاوضہ کس بات کا جی۔ اپنا پیارا پاکستان، اس گھر سے کم ہے کیا؟ ایسے ہزار گھر وطن پہ قربان۔" چن ماہی بولا۔ "اب آپ نے ساتھی بنا لیا ہے تو ساتھ دیں گے مردوں کی طرح۔ بولو تو اپنا یہ جیٹ طیارہ سیدھا بارڈر کے پار لے جاؤں۔"

"تمہارا جیٹ طیارہ ایک بار جنگ میں کام آ چکا ہے۔" میں نے کہا۔ "پھر ضرورت پڑے گی تو لے لیں گے۔ سارا خرچہ گورنمنٹ کا اور تم اگر باقاعدہ طور پہ اس مشن میں شامل ہونا چاہتے ہو تو بتاؤ... ہم تمہاری سفارش کریں گے۔ تمھیں تربیت دی جائے گی اور کچھ عرصہ تم ہمارے ساتھ کام کرو گے۔ جب تک تربیت جاری رہے گی تم کو وظیفہ ملے گا پانچ سو روپے ماہانہ علاوہ اخراجات۔"

چن ماہی کا مُنہ کھلا رہ گیا۔ "پانچ سو روپے... علاوہ اخراجات ...یعنی کھانا پینا... کپڑا سب مفت۔"

"ہاں... اور اگر تم نے تربیت کے سخت مراحل سے گزر کے خود کو اس کا اہل ثابت کر دیا تو چھ مہینے بعد ہم دوسری رپورٹ دیں گے کہ تم کو لیفٹیننٹ کا عہدہ دے دیا جائے۔" میں نے یوں کہا جیسے میں ملٹری انٹیلی جنس کا کوئی بہت بڑا اور با اختیار افسر ہوں۔

"لیفٹین... میں... میں لیفٹین...؟" چن ماہی ہکلانے لگا۔ "آپ مذاق تو نہیں کرتے جی... میں لیفٹین بن سکتا ہوں... پکا لیفٹین..."

"ہاں بھئی... مگر دیکھو... ہم لوگ وردی نہیں پہنتے۔" میں نے کہا۔ "نہ میں کسی کو بتاتا ہوں کہ میں کرنل ہوں اور نہ نیک محمد بتاتا ہے کہ یہ کیپٹن ہے۔ یہ سب خفیہ عہدے ہیں ایم آر ایس کے..."

چن ماہی کبھی میری صورت کو دیکھتا تھا تو کبھی نیک محمد کی۔ "ایم آر ایس... یہ کیا مطلب ہوا جی..."

"وہ میرے مُنہ سے نکل گیا۔" میں نے کہا۔ "تم کبھی نام بھی مت لینا اس کا... ملٹری انٹیلی جنس سروس بنتا ہے اس سے۔"

ان پڑھ چن ماہی یہ نوٹ نہ کر سکا کہ اس سے تو ایم آئی ایس بنتا ہے۔ وہ مسلسل انکشافات سے اور یہ سوچ سوچ کے پاگل ہو رہا تھا کہ ٹیکسی ڈرائیوری چھوڑ کے وہ صرف چھ ماہ میں لیفٹین بن سکتا ہے۔ اس نے مجھے کرنل مان لیا تھا اور استاد ٹیڈی کو کیپٹن

[...]ے ملک کے معاملے میں وہ بے حد جذباتی تھا اور اب صرف یہ دیکھنا [...]تھا کہ وہ راز کو کس حد تک راز رکھ سکتا ہے۔ پھر اسے اپنا ساتھی [...]نے میں کوئی نقصان نہیں تھا۔

"ایک بات بہت اچھی طرح سمجھ لو۔" میں نے کہا۔ "اس کام میں [...]ن کو ہتھیلی پہ رکھ کے پھرنا پڑتا ہے مگر اس سے زیادہ اہم مسئلہ رازداری کا [...]۔ ورنہ اِدھر بات مُنہ سے نکلی اُدھر دشمن کے کانوں تک پہنچ [...]تی ہے اور پھر ہر کامیابی کے بدلے ناکامی ملتی ہے۔ ہم نے تو اپنی [...]یوں کو بھی نہیں بتایا کہ ہم کیا کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ہم پولیس [...]ہیں اور ہمارا کام اسمگلروں کی نگرانی کرنا ہے۔ تم بھی اپنی بیوی [...]ے زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتے ہو کیونکہ اس کام میں بعض اوقات [...]ن رات باہر رہنا پڑتا ہے۔ آدمی پھنس جائے تو ہفتہ ہفتہ [...]ٹ کر نہیں آتا اور تقدیر ساتھ نہ دے تو کبھی لوٹ کر نہیں آتا۔ [...]یہ سب کر سکتے ہو؟"

"میں... میری خوش قسمتی ہو گی جناب... آپ میری سفارش [...]ر دیں اور مجھ سے قسم اٹھوا لیں۔ میری ماں کے سر کی قسم... بچوں [...]کی زندگی کی قسم... میں قرآن پہ ہاتھ رکھ کے وعدہ کر سکتا ہوں کہ [...]یسا آپ چاہیں گے ویسا ہی کروں گا۔ کبھی کسی کو کچھ نہیں بتاؤں [...]گا۔ اپنی زبان بند رکھوں گا۔ بس آپ سفارش کر دیں تو مجھے [...]لیفٹین بنا دیا جائے..."

"چن ماہی! وہ وقت ابھی دُور ہے۔" میں نے کہا۔ "تم کو [...]بھرتی کیا جا سکتا ہے مگر تم لیفٹین چھ مہینے سے پہلے نہیں بن سکتے۔ [...]ان چھ مہینوں میں ہم تمہاری کارکردگی پہ نظر رکھیں گے۔ تم سے ہر [...]کام لیں گے اور تم کو ہر طرح آزمائیں گے۔ اگر تم ہر آزمائش میں پورے [...]اترے تو کوئی وجہ نہیں کہ تم لیفٹیننٹ نہ بن جاؤ۔ کیا آج رات [...]تم دیکھو گے کہ ہم جاسوسوں سے کس طرح پوچھ گچھ کرتے ہیں؟ تمہارا [...]دل مضبوط ہے نا؟"

"چن ماہی کا دل فولاد بھی ہے اور شیشہ بھی... آپ دیکھ لو گے۔" وہ بڑے غرور سے بولا۔

"واہ! کیا بات کہی ہے تم نے۔" میں نے بے ساختہ کہا۔ "یہ تم نے تو بالکل علامہ اقبال کی طرح کہا ہے۔"

"او جی، ہم جاہل اَن پڑھ بندے علامہ اقبال کی جوتیوں کی خاک بھی نہیں۔" وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "کیا فرمایا ہے انھوں نے؟"

"ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم۔ رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن۔" میں نے کہا۔

"ذرا اردو میں بتاؤ جی۔" وہ سر کھجا کے بولا۔ "بڑی مشکل فارسی ہے۔"

"مطلب وہی ہے کہ مسلمان کا دل دوستوں کے لیے شیشہ ہے تو دشمنوں کے لیے فولاد۔" میں نے کہا۔ "تم نے بھی تو یہی کہا تھا۔ اب یہ بتاؤ کہ اس وقت تم کہیں سے ایک ٹب لا سکتے ہو؟"

"ٹب؟" وہ حیران رہ گیا۔ "ٹب تو نہیں... ڈرم لا سکتا ہوں۔"

"اچھا تو ڈرم لے آؤ... اور یاد رکھو... ہمارے پیشے میں صرف حکم کی تعمیل ہوتی ہے... سوال کیے بغیر۔" میں نے کہا۔

"ڈرم تو چھت کے اوپر پڑا ہے جی... میں ابھی اُتار لیتا ہوں۔" وہ بولا اور صحن کی دیوار پر چڑھ گیا۔

"سکندر بادشاہ! یہ کیا ڈراما کر رہے ہو؟" ٹیڈی نے موقع پاتے ہی کہا۔ "قسم مولا علی کی، مجھے تو لگتا ہے تم پر بھی رابعہ کی طرح کچھ... وہ ہو گیا ہے۔"

میں ہنسا۔ "ارے میاں خوجی... دیکھتے جاؤ... ہمارا یہ چن ماہی بھی ہیرا ہے حل کا... اس کی خدمات سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے چن ماہی کو اپنے ماضی کی پوری الف لیلے کی کہانی سنانا ضروری نہیں ہے۔ یہ تو پاگل ہو جائے گا سوچتے سوچتے کہ کس پر یقین کرے اور کس پر نہ کرے اور جب اسے معلوم ہو گا کہ ہمارے تین طرف شکاری ہیں تو وہ ڈر جائے گا کہ بیک وقت پولیس سے اور شہر کے بدمعاشوں سے بھی دشمنی اور ملک کے دشمنوں سے بھی جنگ۔ ابھی تو ہم جو کچھ کریں گے وہ جذبۂ حُبّ الوطنی میں ہمارا ساتھ دے گا۔ تم نے دیکھا لیفٹیننٹ بننے کی سن کر اس کا خوشی سے کیا حال ہوا تھا۔ وہ ہماری مدد کرے گا تو دل ہی دل میں فخر کرے گا کہ وہ وطن کی خدمت کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا رہا ہے۔ جو کوئی بہت زیادہ غلط بات بھی نہیں ہو گی کیونکہ پہلے جو میری دلاور کے ساتھ ذاتی دشمنی تھی وہ اب ذاتی معاملہ نہیں رہی۔ میں دلاور کو صرف اپنے باپ کے قاتل کی حیثیت نہیں دیتا۔ اس سے بڑھ کر وہ غدارِ وطن کی حیثیت سے سزا کا مستحق ہے۔ مجھے پہلے ایک وطن دشمن کو بے نقاب کرنا ہے اور پھر اس پر اپنے باپ کے قتل کی فردِ جرم عائد کرنا ہے اور تم بھی جانتے ہو کہ یہ سارا سلسلہ ایک ہی تھا۔ میرے والد کو کاروبار سے الگ کرنا۔ ان کو بلیک میل کر کے خاموش رہنے پر مجبور کرنا اور بالآخر ان کی جان لینا۔ یہ سب اسی لیے ہوا کہ میرے والد بھی دلاور کے کاروبار کی اصل نوعیت کو سمجھنے لگے تھے یا سمجھنا چاہتے تھے۔ دلاور نے اس ملک کے خلاف سازشی عناصر کا ساتھ دے کر پیسہ کمانا اسی وقت شروع کر دیا تھا اور آج تک وہ جو کچھ کر چکا ہے وہ سب وطن دشمنی ہے۔ اس میں وہ چند افراد کے خون کو قطعی اہمیت نہیں دیتا۔ میرے والد بھی اس کے عزائم کو ناکام بنا سکتے تھے چنانچہ دلاور نے انھیں ختم کر دیا۔ غالباً میر شرافت علی بھی اسی لیے مارا گیا کہ اس کو وزیر خان کی موت تک اصل حالات کا علم نہیں ہو سکا تھا۔

جیسے ہی دلاور کو اس سے خطرہ محسوس ہوا اس نے میر شرافت علی کو بھی ختم کر دیا۔ میں مزاحمت کر رہا ہوں تو میرا انجام تمھارے سامنے ہے۔ جس جس نے بھی اس کی مخالفت کی یا جس پر کبھی اسے شک ہوا کہ وہ خطرے کا سبب بن سکتا ہے' اسے دلاور نے ختم کر دیا۔ اب تو ہمارے اور اس کے درمیان کھلی جنگ ہے اور یہ جنگ اب صرف دلاور کے خلاف نہیں رہی' وطن دشمن ایجنٹوں تک پھیل گئی ہے اگرچہ چن ماہی بھی ہمارا ساتھ صرف اسی وجہ سے دے سکتا ہے تو اسے اپنے ذاتی مسائل اور معاملات بتانے سے کیا فائدہ۔"

"لیکن سکندر! کبھی اسے معلوم ہو گیا تو..." ٹیڈی متفکر ہو کے بولا۔

"کیسے معلوم ہو گا۔ وہ آرمی ہیڈ کوارٹر سے تو رابطہ قائم کرنے سے رہا۔" میں نے کہا۔ "وہ تو اب اپنی زبان سے ایک لفظ نہیں نکالے گا کیونکہ اس نے تم کو ایم آر ایس کا کیپٹن اور مجھے کرنل مان لیا ہے۔ میرا خیال ہے محسن کو میجر بنا دوں اور غالب کو... اسے بھی میجر تو بنانا ہی پڑے گا۔ ہماری آئندہ کی سب کارروائیاں منظم طریقے پر ایک ہی مقصد کی خاطر ہوں گی۔ پھر اسے شک کیسے ہو سکتا ہے۔ ابھی ہم سادھو رام کی زبان سے جو کچھ اگلوائیں گے اس سے ہماری باتوں کی تصدیق ہو جائے گی۔"

"لیکن یہ ڈرم... اس ڈرم کا تفتیش سے کیا تعلق؟" ٹیڈی نے کہا۔

"اگر بالٹی کا تفتیش سے تعلق ہو سکتا ہے تو ڈرم کا کیوں نہیں ہو سکتا کیپٹن۔" میں نے کہا۔ "تمھیں یاد ہے ڈی ایس پی سراج نے پہلے ہی دن مجھ سے کس طرح اقبال جرم کرایا تھا۔ مجھے ایک بالٹی سر کے اوپر ٹوپی کی طرح اڑھا کے اور ڈنڈے سے کوٹ کر... میں آج بھی اس کا تصور کرتا ہوں تو میرا سارا وجود لرزنے لگتا ہے۔"

"تم نے اس کا ذکر کیا تھا۔" ٹیڈی بولا۔ "مگر یہ چن ماہی اتنی دیر سے اوپر کیا کر رہا ہے۔"

اسی وقت چن ماہی کی آواز آئی۔ "او بھائی ذرا باہر نکلو... نیچے سے پکڑو... یا میں ڈرم کو نیچے گرا دوں؟"

"نہیں نہیں۔" میں نے صحن میں آ کے کہا۔ "نیچے گرا دو گے تو سارا محلہ پہلے ہی جاگ اٹھے گا۔"

"اتنی دیر سے کیا کر رہے تھے تم چن ماہی؟" استاد ٹیڈی نے سر اٹھا کے کہا۔

"ڈرم خالی کر رہا تھا۔" چن ماہی بولا۔ "اس میں ریت بھری ہوئی تھی۔ چھت پر پلستر کرایا تھا تو بچ گئی تھی۔"

میں نے اور ٹیڈی نے نیچے سے ڈرم کو تھاما اور صحن میں اتار لیا۔ یہ وہی پینتالیس گیلن والا تارکول کا ڈرم تھا لیکن اسے خاصا صاف کر لیا گیا تھا اور اندر کی دیواروں پر صرف تارکول کی سیاہی رہ گئی تھی۔ میرے کہنے پر ٹیڈی نے اسے دھویا اور اندر سادھو رام کے کمرے میں پہنچا دیا۔ پھر چن ماہی اور استاد ٹیڈی نے اس کو بھرنا شروع کیا۔ وہ بالٹی بھر کے پانی لاتے تھے اور ڈرم میں انڈیل دیتے تھے۔ سادھو رام اس کارروائی کو بڑے غور سے دیکھتا رہا اور یہ سمجھنے کی کوشش کرتا رہا کہ آخر میں کیا کرنا چاہتا ہوں۔ کیا اسے پانی میں غوطے دے کر اس سے کچھ اگلوانا چاہتا ہوں یا سردی کے موسم میں اس کو پانی میں ڈال کر ٹھنڈ سے ہلاک کرنے کے موڈ میں ہوں لیکن میرا پروگرام اس سے بالکل مختلف تھا۔

"تم نے کچھ سوچا سادھو رام؟" میں نے اس کے ہاتھ پیر کھول کے اسے آزاد کر دیا۔ "کہ تمھیں کیا کرنا ہے۔"

سادھو رام نے ہاتھوں پیروں کو حرکت دی اور کمر کو اوپر نیچے جھکایا۔ اس کی جسمانی حالت آج بہت بہتر تھی۔ "جو کچھ کرنا ہے تم کو کرنا ہے۔" وہ بولا۔ "تشدد کرنا ہے یا قتل کرنا ہے۔ قید کرنا ہے یا آزاد کرنا ہے۔ پیار کرنا ہے یا پاگل کرنا ہے۔"

"میں واقعی یہ سب کچھ کر سکتا ہوں۔ اس سے بہت زیادہ بھی کر سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "تم کو تو اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں کرنا ہے۔ صرف وہ نام اور پتے بتانے ہیں جو تمھارے دماغ میں محفوظ ہیں۔"

"میں کہہ چکا ہوں کہ میں کسی کو نہیں جانتا تھا۔ سوائے اُن کے جن سے تم مل چکے ہو۔" وہ بولا۔

"کرنل جگن ناتھ اس زنجیر کا اگلا سرا یا اگلی کڑی تھا۔" میں نے کہا۔ "دلربا درمیانی کڑی تھی۔ اس کے پیچھے والی کڑی تم تھے۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ تمھارے پیچھے اس زنجیر کی کون سی کڑی تھی۔ میں فرض کر لیتا ہوں کہ تم کرنل جگن ناتھ سے آگے کی کڑی کے بارے میں واقعی کچھ نہیں جانتے تھے۔ لیکن یہ ناممکن ہے کہ تمھیں پیچھے کی کڑی کا علم نہ ہو۔"

استاد ٹیڈی کے ساتھ اب چن ماہی بھی کمرے میں رک گیا تھا اور وہ دونوں بھی یہ گفتگو سن رہے تھے۔ آدھا ڈرم بھر جانے کے بعد میں نے انھیں ڈرم میں مزید پانی ڈالنے سے منع کر دیا تھا۔ چن ماہی کا جوش اور جذبہ، اشتیاق اور تجسس قابل دید تھا۔

"سادھو رام! تم زندہ رہ سکتے ہو۔" میں نے کہا۔ "اپنی حد تک میں وعدہ کر سکتا ہوں کہ تمھیں نکل جانے دوں۔ اس کے بعد تمھارے پرانے دوست تم کو زندہ نہ چھوڑیں تو میں ذمے دار نہیں۔ ان سے خود کو بچانا اور محفوظ رکھنا تمھارا اپنا کام ہو گا اور میں یہ بھی بتا دوں کہ تم کو میں نے کبھی دوبارہ دیکھ ل... تو چھوڑوں گا نہیں۔ لیکن

سکتے ہو یہ ملک کراچی سے گلگت تک پھیلا ہوا ہے۔ تم اجتماعی بارڈر کراس کر کے اپنے ہم مذہب لوگوں میں شامل ہو سکتے ہو اور نئے نام سے نئی زندگی کا آغاز کر سکتے ہو۔ تمھارے لیے پکڑے جانے کے امکانات کم ہوں گے اور نہ پکڑے جانے کے زیادہ۔ اس کا انحصار تمھاری عقل اور ذہانت پر ہے اور تم اس صلاحیت سے محروم نہیں ہو۔ تم خود کو کہاں چھپاتے ہو اور کیسے چھپتے ہو، یہ تمھارا گیم ہے۔ شکاری تمھارے پیچھے لگے رہیں گے مگر ہمیشہ نہیں۔ اگر تم سال بھر بھی گمنام رہنے میں کامیاب رہے تو پھر کبھی نہیں پکڑے جاؤ گے۔ لیکن..." میں نے ایک ڈرامائی وقفہ دیا۔ "لیکن تم نے ہم سے تعاون نہ کیا تو اس شب کی سحر نہ دیکھو گے۔ تمھاری لاش کل گدھ، کتے اور چیل کوے کھائیں گے۔"

"میں تمھیں سچ بتا رہا ہوں۔" وہ کانپتے ہوئے بولا۔ "میں کچھ نہیں جانتا۔"

"سادھو رام! یہ آخری موقع ہے۔" میں نے کہا۔ "تمھارے پاس اسلحہ کون لاتا تھا؟ کرنل جگن ناتھ یہاں سے اسلحہ سرحد کے پار تک کس کی مدد سے پہنچاتا تھا؟ کرنل جگن ناتھ بھارتی ایجنٹ تھا۔ تمھارے سیوک رام اور اس کے دونوں ساتھیوں کی طرح... کرنل جگن ناتھ تم کو صرف ادائیگی کرنے آتا تھا اور مال چیک کرتا تھا۔ وہ بھی مارا جا چکا ہے لیکن اس کے علاوہ بھی تم کچھ لوگوں کو جانتے ہو... مثلاً وہ کون ہیں جو ٹرک لے کر سائیں پاپڑ والے کی جعلی خانقاہ تک آتے تھے اور سارا اسلحہ لوڈ کر کے لے جاتے تھے۔ تم نے اُن کو دیکھا ہے؟"

"میں نے ان کو دیکھا ضرور تھا لیکن وہ اپنے بارے میں کچھ نہیں بتاتے تھے۔" سادھو رام بولا۔ "وہ کہتے تھے کہ تم کو رقم مل گئی۔ اب اپنے کام سے کام رکھو۔"

"تم نے اس ٹرک کا نمبر وغیرہ تو دیکھا ہو گا؟"

"نمبر ہمیشہ بدلا ہوا ہوتا تھا۔" سادھو رام بولا۔

"کیا ٹرک ہمیشہ وہی ہوتا تھا؟" میں نے کہا۔ "ڈرائیور اور اس کے ساتھی سب وہی ہوتے تھے؟"

سادھو رام نے اقرار میں سر ہلایا۔ "وہ سب بی ایس ایف کے لوگ تھے۔"

"گڈ! تم نے کچھ تو بتایا۔" میں نے کہا۔ "بی ایس ایف میں ان کے رینک کیا تھے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔"

"پھر تم کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ بی ایس ایف کے آدمی تھے؟" ملک نے کہا۔

"کرنل جگن ناتھ نے کہا تھا۔" سادھو رام بولا۔ "مگر اُس نے کسی کا نام نہیں بتایا تھا۔ وہ سب آپس میں بھی بات نہیں کرتے تھے اور بالکل خاموشی سے کام کر کے چلے جاتے تھے۔"

"وہ ٹرک کون سا تھا... کس کمپنی کا بنایا ہوا؟"

"بیڈ فورڈ کمپنی کا۔" سادھو رام بولا اور میرا ہاتھ بجلی کی طرح گھوم کر اس کے منہ پر پڑا۔ کمرہ اس کی آواز سے گونج گیا۔ "وہ انڈین ٹرک تھا۔ اشوک ٹاٹا کمپنی کا بنایا ہوا۔" میں نے کہا۔ "وہ ہیلی کاپٹر جس میں کرنل جگن ناتھ آتا تھا اس کا نمبر تو تم نے دیکھا ہو گا؟"

"وہ ایک ہی ہیلی کاپٹر میں نہیں آتا تھا۔" سادھو رام نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "ہر بار مختلف..."

میں نے اس کے دوسرے گال پر الٹا ہاتھ مارا۔ وہ نیچے گر گر گیا مگر میں نے اُسے پھر کھڑا کر دیا۔ "یہ دروازہ بند کر دو۔" میں نے ٹیڈی سے مخاطب ہو کے کہا۔ "ہاں تو سادھو رام! یاد کر کے بتاؤ کہ گزشتہ بار وہ جس ہیلی کاپٹر میں آیا تھا اس کا نمبر کیا تھا؟"

"مجھے... مجھے نہیں یاد..." سادھو رام نے لرزتے ہوئے کہا۔

"اس کا نمبر میں بتا سکتا ہوں۔" میں نے کہا اور نمبر دہرا دیا۔ "یہ ٹھیک ہے نا؟" سادھو رام نے اقرار میں سر ہلایا اور میں نے اس کے ایک اور چھانپڑ رسید کیا۔ "اگر یہ ٹھیک ہے تو پہلے کیوں کہا تھا کہ مجھے نمبر معلوم نہیں... خیر... وہ ہیلی کاپٹر بھی تمھاری دلربا کے ساتھ اڑ گیا۔ اب سوچنے کی بات نہیں... یہ بتاؤ کہ جو رقم تم کو کرنل جگن ناتھ دیتا تھا' وہ تم سے کون لینے آتا تھا؟"

"میں... میں اُسے نہیں جانتا۔" سادھو رام نے آستین سے وہ خون صاف کیا جو اس کی ناک سے بہنے لگا تھا۔

"تم اُسے جانتے ہو۔" میں نے اس کی ناک پر مکا مارا۔ "وہی شخص تم کو اسلحہ بھی پہنچاتا تھا۔ ممکن ہے وہ ایک آدمی نہ ہو' ایک گروہ ہو... تم بہرحال سب کو جانتے ہو گے۔ وہ تم سے حساب لیتے ہوں گے... تم صرف کمیشن ایجنٹ تھے... اور ہر کمیشن ایجنٹ دونوں پارٹیوں سے بخوبی واقف ہوتا ہے۔"

"میرے پاس چار آدمی آتے تھے... کبھی کوئی کبھی کوئی..." سادھو رام نے رو کے کہا۔ "مجھے کیا معلوم' وہ اپنا جو نام بتاتے تھے وہ صحیح ہوتا تھا یا غلط۔"

"تم غلط نام ہی بتا دو۔" میں نے کہا۔ "پہلے ان کے سرغنہ کا۔ پھر باقی افراد کا۔"

"سرغنہ... سرغنہ تو نمبر ون کہلاتا تھا۔" سادھو رام بولا۔ "وہ کبھی ساتھ نہیں آیا... وہ اس کا حوالہ دیتے تھے۔ باقی چار کے نام... لال دین... چوہدری بشیر... عبدالرزاق... اور کمال خاں تھے۔"

اس نے ہر نام بہت سوچ کے لیا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ یہ نام اس نے ابھی ابھی گھڑے تھے اور اسی لیے وہ سوچتے

پر مجبور ہوا تھا۔ اصل نام بتانے کے لیے اس کو سوچنا ہرگز نہ پڑتا۔ پھر جھوٹ اس کی صورت پر خوف بن کے پھیل گیا تھا۔ ہم سے پہلے وہ خود جانتا تھا کہ یہ سب ناقابلِ یقین ہوگا اور ہم اس کی بات نہیں مانیں گے۔

"اچھا..." میں نے کچھ دیر سوچ کے کہا۔ "یہ لوگ کس طرح آتے تھے؟ ٹرک میں یا کار میں؟"

"مال ٹرک میں لاتے تھے۔" سادھورام بولا۔ "پیسہ لینے کے لیے کار میں آتے تھے۔"

"اور ٹرک میں بھی وہی لوگ آتے تھے جو کار میں آتے تھے؟" میں نے کہا۔

"پیسہ وصول کرنے کے لیے ایک آدمی آتا تھا، ہر ہفتے۔"

"ٹرک اور کار کے نمبر کے بارے میں تم پھر وہی کہو گے کہ ہر بار بدلے ہوئے ہوتے تھے؟" میں نے کہا۔

سادھورام نے اقرار میں سر ہلایا۔ "کبھی وہ نمبر پلیٹ پر مٹی پھیر دیتے تھے یا اُسے ہٹا دیتے تھے۔"

"ٹرک کون سا ہوتا تھا؟"

"بیڈ فورڈ کا۔" سادھورام بولا۔

"اور کار..." میں نے کہا۔ "اس کا رنگ ماڈل... تمھارے پاس کار ہے اس لیے تم ضرور جانتے ہو گے؟"

"کار... فورڈ زیفر بھی لاتے تھے... اُنیس سو ساٹھ ماڈل۔" سادھورام بولا۔ "اس کا رنگ نیلا ہوتا تھا۔ دوسری اوپل ریکارڈ تھی۔ اسی سال کا ماڈل۔ رنگ اوپر کالا، نیچے سے سرخ۔"

"اب ذرا سوچ کے بتاؤ کہ یہ سلسلہ کب شروع ہوا تھا؟" میں نے کہا۔

"سوا سال پہلے... گزشتہ سال اگست کے مہینے سے۔" سادھورام بولا۔

"پہلا سودا کیسے ہوا تھا... وہ تم تک کیسے پہنچے تھے؟"

"دلربا کے ذریعے۔" سادھورام نے کہا۔

"اور اس پہلے سودے میں تمھارا کمیشن کتنا بنا تھا؟"

"سترہ ہزار روپے۔" سادھورام بولا۔ "سترّ ہزار دے گئے تھے۔"

"اس کے بعد؟" میں نے کہا۔ "کتنی بار آئے وہ لوگ؟"

"یہ سب... مجھے تفصیل سے تو یاد نہیں..." وہ بولا۔ "آئے ہوں گے دس بارہ مرتبہ۔"

میں نے اس کے مُنہ پر تھپیڑ مارا اور جب وہ گر گیا تو ٹھوکریں مار مار کے اس کا حال خراب کر دیا۔ "ابھی کہا تھا کہ ایک آدمی تم سے ہر ہفتے پیسے لینے آتا تھا۔ مال آیا سوا سال میں دس بارہ مرتبہ۔

پیسے لینے والے آتے رہے ہر ہفتے۔ میرا مقصد صرف یہ ثابت کرنا تھا کہ تم اب بھی جھوٹ بولنے کا حوصلہ رکھتے ہو۔" میں نے اسے پھر پیروں پہ کھڑا کر دیا اور دیوار سے لگا کے اس کے سینے پر اپنی ایک کہنی سے دباؤ ڈالنے لگا۔ "اب ایک بار پھر بتاؤ کہ وہ چار آدمی کون تھے؟ اُن کے کیا نام تھے؟"

"بتاتا ہوں... بتاتا ہوں..." سادھورام بلبلانے لگا۔ "ہائے میں مر گیا... میرا سانس رُک جائے گا۔" وہ چلاّنے لگا اور دیوانہ وار چیخنے لگا۔ میں اپنا سوال دُہراتا رہا۔ دوسری بار اس نے جو نام بتائے، وہ بالکل مختلف تھے۔ اُسے امید نہ تھی کہ ہر سوال پھر پوچھا جائے گا اور چونکہ اس نے جھوٹ بولا تھا اس لیے وہ ناموں کو غلط ملط کر گیا۔ اس نے بشیر خاں، چوہدری رزاق، کمال دین اور لال خان بتا دیے۔ میں نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ لمبے لمبے سانس لینے لگا۔

"تم نے سُنا کیپٹن۔" میں نے استاد ٹیڈی کو مخاطب کیا۔ "اس نے پہلے کیا نام لیے تھے۔"

"یس کرنل۔" استاد ٹیڈی بولا۔ "اس نے لال دین، کمال خان، چوہدری بشیر اور عبدالرزاق کہا تھا۔ کیوں لیفٹیننٹ؟"

چن ماہی بھونچکاّ رہ گیا۔ اسے ابھی سے لیفٹیننٹ کہہ کے مخاطب کیا گیا تھا۔ "یس سر۔" وہ فوراً سنبھل کر بولا۔ "یہی نام تھے۔"

"یہ جو کچھ کہتا رہا ہے وہ سب جھوٹ تھا۔" میں نے کہا۔ "میں نے اسے جو موقع دیا تھا، وہ اس نے گنوا دیا۔ اب تم اس کے ہاتھ پیر باندھو اور اسے ڈرم میں ڈال دو۔ اس کا مُنہ پانی سے باہر رہے۔ گلے میں رسّی باندھ کے پانی میں معلق کر دو اور رسّی کا سرا اپنے ہاتھ میں رکھو۔ اس طرح کہ یہ اُچھلے تو خود کو پھانسی دے۔ جھٹکے سے اس کی گردن کا منکا ٹوٹ جائے۔ ابھی یہ اُچھلے گا... بہت اُچھلے گا... شور بھی بہت کرے گا اس لیے اس کے مُنہ کو بند کر دو۔"

میں نے سادھورام کے ڈرم میں ڈالے جانے کی تمام کارروائی کی خود نگرانی کی اور چونکہ ڈرم نصف کے قریب بھرا ہوا تھا اس لیے سادھورام کے گھٹنے موڑ کر پیچھے کر دیے گئے اور اس کے دونوں ہاتھوں کو باندھ کر اسی رسّی سے پیر بھی باندھے گئے اور سادھورام کو پانی میں ڈالا گیا تو وہ گھٹنوں کے بل ڈرم میں کھڑا ہو گیا۔ اس کا مُنہ پانی کی سطح سے اوپر رکھنے کے لیے وہی رسّی جس سے سادھورام کے ہاتھ پیر باندھے ہوئے تھے اس کی گردن میں پھندا بنا کے ڈالی گئی اور پھر اس رسّی کا آخری سرا ڈرم کے کنارے پر سے گزار کے ہاتھ میں پکڑ لیا گیا۔ اب سادھورام انتہائی تکلیف دہ پوزیشن میں ڈرم کے اندر غرق ہو چکا تھا۔ نصف بھرے ہوئے ڈرم میں سادھورام کے ڈالے جانے سے پانی کی سطح بلند ہو گئی تھی اور پانی

ب کناروں سے تھوڑا ہی نیچے تھا۔

اگر سادھورام کے پاؤں گھٹنوں کے پاس سے کاٹ دیے جاتے اس کا قد چار فٹ سے بہت کم رہ جاتا۔ گھٹنوں کے بل کھڑا ہوا وہ ساڑھے تین فٹ کا ہی رہ گیا تھا اور سخت اذیت میں تھا ونکہ رسّی نے اس کو بُری طرح جکڑ رکھا تھا اور وہ ڈرم کی ایک طح کے ساتھ یوں لگا ہوا تھا کہ بالکل حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے گلے میں پڑے ہوئے پھندے نے اُسے پیچھے کھینچ رکھا تھا۔ نانچہ اس کا وجود ڈرم کے تین چوتھائی حصّے میں سما گیا تھا۔ وہ ت دہشت زدہ تھا اور یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اس کارروائی کا قصد کیا ہو سکتا ہے۔ خود استاد ٹیڈی اور چن ماہی سخت کنفیوژن انکار نظر آتے تھے۔

یہ ساری کارروائی مکمل ہو گئی تو میں دوسرے کمرے میں گیا اور بلی کا وہ راڈ ہیٹر اُٹھا لایا جو ہم غسل کا پانی گرم کرنے اور چائے، پانی بنانے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ ایک ہزار واٹ کا یہ ہیٹر جرمنی کا بنا ہوا تھا اور محسن خرید کر لایا تھا۔ اس کی دو الگ الگ شاخیں تھیں جن کی موٹائی پنسل کے برابر یا کچھ کم ہو گی۔ آخری حصّے میں یہ دونوں شاخیں ایک کوائل یا لچھے کی شکل میں ملی ہوئی تھیں اور گرم ہونے والا تار ان کھوکھلی پنسل نما شاخوں کے اندر تھا۔ یہ بہت عام چیز تھی جو کسی بھی بجلی کے سامان کی دکان سے تیس چالیس روپے میں مل جاتی تھی اور اس کی مجموعی لمبائی آٹھ انچ کے قریب تھی۔ اسے پانی سے بھری ہوئی کیتلی میں بھی لٹکایا جا سکتا تھا اور بالٹی میں بھی۔ اس کی تمام حرارت پانی کے اندر جذب ہوتی تھی چنانچہ پانی سے بھری ہوئی جو بالٹی چولہے پر ایک گھنٹے میں گرم ہوتی وہ اس ہیٹر سے دس منٹ میں اتنی گرم ہو جاتی تھی کہ پانی کھولنے لگتا تھا۔ ایک کیتلی پانی تو دو چار منٹ میں اُبل جاتا تھا۔

ڈرم میں کئی بالٹی پانی تھا چنانچہ اس کے درجۂ حرارت کو بائلنگ پوائنٹ تک پہنچانے کے لیے میرے اندازے کے مطابق تیس چالیس منٹ درکار تھے۔ راڈ ہیٹر کو دیکھتے ہی استاد ٹیڈی بھی سمجھ گیا کہ میں کیا کرنے والا ہوں اور سادھورام کی حالت بھی غیر ہونے لگی۔ اس نے دہشت زدہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے رحم کی التجا کی مگر میں نے سمجھ لیا تھا کہ سادھورام آسانی سے سب کچھ نہیں بتائے گا۔

"تم دیکھ رہے ہو نا سادھورام کہ میرا ارادہ کیا ہے؟" میں نے ہیٹر کو کھول کر پلگ پوائنٹ تک لے جاتے ہوئے کہا۔ "میں تمھارا سوپ بنانا چاہتا ہوں... افسوس یہ ہے کہ تمھارے بیوی بچے نہیں رہے ورنہ وہ تمھارا سوپ بنتا دیکھ کر محظوظ ہوتے۔ میں ان کو یہ سوپ پلاتا۔ کالی مرچ نمک اور کھٹا میٹھا مسالہ ڈال کے۔ اب

یہ سوپ پینے والا کوئی نہیں۔ بکرے کا گوشت عموماً ایک گھنٹے میں گل جاتا ہے۔ گائے بھینس کا گوشت زیادہ وقت لیتا ہے۔ تمھارا گوشت حرام ہے۔ سُوّر کے گوشت سے بھی زیادہ۔" میں نے راڈ ہیٹر کو پانی میں ڈال دیا۔

"ہیٹر آن کر دوں کرنل؟" چن ماہی نے بڑے اشتیاق سے کہا۔

"او کے لیفٹیننٹ۔" میں نے کہا۔ "دیکھو اس وقت ہمارے پاس کیسی نایاب ڈش ہے۔ افریقہ کے جنگلی قبائل جو آدم خور ہوتے ہیں اس ڈش کو بڑے چٹخارے لے کر کھاتے ہیں مگر مہذب دنیا میں سالم مرغ اور سالم دُنبہ روسٹ کر کے کھانے والے تو ملتے ہیں، سالم غدار کو ہضم کرنے والا کوئی نہیں... مجھے پھر ملال ہوتا ہے کہ ڈش ضائع ہو جائے گی۔"

"کیوں سر! کیا کتے بلیاں اسے نہیں کھا لیں گے؟" استاد ٹیڈی نے کہا۔

"نہیں کیپٹن۔ یہاں کے تو جانور بھی حُبّ الوطنی کا جذبہ یا حیوانی جبلت رکھتے ہیں۔" میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "ہر جانور کوئی ایسی چیز نہیں کھاتا جو اس کے لیے نقصان دہ ہو۔ ہاں اس جیسے دو چار ہمارے ہاتھ لگ جاتے تو ہم ان کی ضیافت کرتے اور آدھے سادھورام کا پلاؤ پکاتے تو آدھے سادھورام کا قورمہ۔ اب تو یہ گلنے کے بعد پانی میں ہی گھل جائے گا۔ اس کا حلیم بن جائے گا۔ ذرا دیکھو، پانی کا ٹمپریچر کیا ہے؟"

استاد ٹیڈی نے اُنگلی ڈال کے پانی کو دیکھا۔ "ابھی تو معمولی سا گرم ہوا ہے سر۔"

"اچھا کیپٹن، سادھورام کو اُبلنے دو۔" میں نے گھڑی دیکھی۔ "تم کافی بناؤ... چن ماہی اس کی رسّی ڈھیلی مت کرنا۔"

"نو سر!" چن ماہی نے فرض شناس ماتحت کی طرح کہا۔ "آپ فکر ہی نہ کریں۔"

میں دوسرے کمرے کی طرف جاتے جاتے رکا اور پلٹ کر سادھورام سے مخاطب ہوا۔ "اب تمھارے لیے مہلت بہت کم رہ گئی ہے سادھورام! آدھے گھنٹے میں پانی اتنا گرم ہو جائے گا کہ تمھارے جسم کو جلانے لگے گا۔ چالیس پینتالیس منٹ میں تم فل بوائل ہو جاؤ گے... مگر مرو گے نہیں... میں تم کو ہاف بوائل کر تا رہوں گا... صبح تک۔" میں نے سادھورام کو بے چینی سے سر ہلاتے دیکھا، آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ کہنے کی اجازت طلب کرتے محسوس کیا اور اس کی صورت پر موت کے خوف کا سایہ لرزاں دیکھا لیکن میں پروا کیے بغیر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

"مان گئے سکندر بادشاہ۔" استاد ٹیڈی بولا۔ "کیا آسان نسخہ ایجاد کیا ہے زبان کھلوانے کا... نہ کوئی مار پیٹ کی محنت مشقت،

نہ وقت کی بربادی... سالا ابھی سب کچھ بتائے گا۔"
"ضرورت ایجاد کا باپ ہے استاد۔" میں نے کہا۔"ایسے بہت سے طریقے ہمارے ہاتھ میں تھے لیکن اس سے پہلے کوئی ہمارے ہاتھ نہیں لگا تھا۔ جو ہاتھ لگے تھے وہ خود مر گئے یا مار دیے گئے۔ پہلی بار دشمن کا ایک اہم ٹیپ ہمیں ملا ہے۔ اس کو بجا کے پورا سننا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ سادھو رام ہاف بوائل ہونے کے بعد بجنے لگے گا۔"
"تم نے اچھا کیا جو شہلا کو ساتھ نہیں لائے۔" ٹیڈی بولا۔"لیکن محسن کیوں نہیں آیا؟"
"آج اپنے گھر میں ان کی پہلی رات ہے۔" میں نے کہا۔"پھر شہلا اکیلی نہ جاتی تو ڈرتی... یہاں کی کارروائی میں محسن کی موجودگی غیر ضروری تھی۔ میں اکیلا ہوتا تب بھی کافی تھا۔"
"یار سکندر بادشاہ! یہ تم کو ڈرم کا خیال کیسے آیا!" استاد ٹیڈی بولا۔"اگر اس وقت ڈرم نہ ملتا تو...؟"
"میں ڈرم کو بہت پہلے دیکھ چکا تھا استاد۔" میں نے ہنس کر کہا۔"ڈرم نہ ہوتا تو آج میں دیگ کا انتظام کر لیتا۔"
دوسرے کمرے میں چن ماہی نے سادھو رام کو مخاطب کر کے اپنے غم و غصے کا اظہار شروع کر دیا تھا۔ وہ سادھو رام کو غدار، نمک حرام... بے غیرت، کافر... وطن فروش وغیرہ کے علاوہ بھی بہت کچھ کہہ رہا تھا اور اس کے ہر جملے میں سادھو رام کی والدہ یا ہمشیرہ کا حوالہ مختلف انداز سے آتا تھا۔ وہ سادھو رام کو دہشت زدہ کرنے کے لیے بھی بہت کچھ کر رہا تھا اور اسے کے سامنے اگلے آدھے گھنٹے کی اذیت کا نقشہ بڑے مؤثر طریقے پر کھینچ رہا تھا۔ چن ماہی کے لیے اب ہمارے مشن کی نوعیت اور خود ہمارے بارے میں ایک فیصد شک کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ اس نے سادھو رام کی زبانی سب کچھ سن لیا تھا اور وہ بہت جوش میں تھا کہ آج رات وہ قومی سلامتی کے اتنے بڑے مشن میں ایک کرنل اور ایک کیپٹن کے ساتھ شریک ہونے کا اعزاز حاصل کر چکا ہے۔ وہ خود کو بے حد اہم اور ذمے دار محسوس کرنے میں حق بجانب تھا۔ اس کے آس پاس تمام ہم وطن اور اس کے تمام سابق ہم پیشہ سوئے پڑے تھے اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کے معمولی سے گھر میں کتنی اہم کارروائی ہو رہی ہے۔ اسی شہر میں ایک سے ایک جانباز بہادر پڑا تھا۔ نہ جانے کتنے اعلیٰ عہدوں والے افسر تھے اور دولت مند تھے مگر یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا۔ قدرت نے چن ماہی کو اس عظیم قومی خدمت کے لیے منتخب کیا تھا۔
میں نے اطمینان سے کافی ختم کی اور سگریٹ جلا کے اس کے لمبے لمبے کش لیتا رہا۔ مجھے رابعہ کا خیال بھی آیا اور اس گھر کا بھی جہاں محسن اور شہلا کم سے کم آج رات غم جہاں سے بے نیاز تھے۔ یہ ایک رات بھی بہت غنیمت ہے۔ کیا خبر کل صبح نکلے کس طرف سے آفتاب... خوب صورت اور مہرباں وقت جب اپنی گرفت میں ہو تو اس کے ہر لمحے سے مسرت کشید کر لینا چاہیے تاکہ گرانباری ایام میں اور حالات کی تشنہ کامی میں خمار شب ہی حسرتوں کے ساتھ ہو۔ نہ سہی وصل تو حسرت ہی سہی۔ وقت کا کیا بھروسا کہ کب پھر مہلت دے۔
"ہا ہا... اب بول تیری..." چن ماہی کی آواز نے مجھے خیالوں کی دنیا سے کھینچ لیا۔"اچھل... اور اچھل... ابھی تو تیرا جسم پھٹے گا۔ بوٹی بوٹی پھٹے گی۔ اندر تیرا دل جگر سب پھٹے گا۔ تیرا گوشت خون اور ہڈیاں سب صبح تک گل جائیں گی۔ نہیں گلیں گی تو میں کھانے کا سوڈا ڈالوں گا۔ اور پھر تیرا حلیم تیرے یاروں میں تقسیم ہوگا سرحد کے پار... اب تو گائے کو ماں کہنے والے اسے کھانے بھی لگے ہیں۔ اوئے تم بڑے... ہو... ماں کو کھا جاؤ... بس چلے تو بہن کو کھا جاؤ... باپ کو کھا جاؤ... بڑے مزے لے لے کر کھائیں گے تیرے یار تیرا حلیم... میں خود سرحد پار کر کے جاؤں گا اور تقسیم کروں گا۔ کون سا گاؤں ہے تیرا۔ خیر میں معلوم کر لوں گا... ہو سکا تو تیرے گاؤں والوں کو کھلاؤں گا۔ وہاں تیرے ماموں چاچے اور ان کے پتر بھی ہوں گے۔ ایسے مسالے ڈال کر لے جاؤں گا کہ وہ انگلیاں چاٹتے رہ جائیں گے۔"
جب میں پھر دوسرے کمرے میں گیا تو سادھو رام شدید عذاب میں مبتلا تھا۔ میں نے انگلی ڈبو کے پانی کا ٹمپریچر دیکھا۔ پانی اتنا گرم ہو چکا تھا کہ سخت سردی میں بھی اس سے نہانا مشکل تھا۔ یہ آہستہ آہستہ بڑھنے والی حرارت سادھو رام کے جسم نے بھی جذب کی تھی اور اس کا وجود اندر باہر سے اتنا ہی گرم ہو چکا تھا۔ کچھ بھاپ اٹھنے سے اور کچھ اندر کی گرمی کے خارج ہونے سے سادھو رام کا چہرہ پانی میں اور پسینے میں تر تھا... وہ نہایت بے ہنگم طریقے پر اچھل رہا تھا اور تڑپ رہا تھا۔ اس کے گھٹنے بار بار ڈرم کے فرش پر لگتے تھے اور وہ دیوانگی کی کیفیت میں کوشش کر رہا تھا کہ راڈ ہیٹر کو کھینچ لے اور اس کا تار الگ کر دے مگر چن ماہی نے رسی کو بڑی مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ سادھو رام کے ہاتھ پاؤں پیچھے بندھے ہوئے تھے چنانچہ وہ صرف اپنے منہ سے کوشش کر سکتا تھا مگر منہ میں بھی کپڑا تھا۔ لیکن کپڑا نہ ہوتا اور وہ کسی طرح اپنے دانتوں سے تار کاٹ دیتا تو کرنٹ پانی میں آ جاتا اور وہ فوراً ہلاک ہو جاتا۔ میں نے اس کے منہ سے کپڑا نکال دیا۔
سادھو رام نے بلبلا کے چیخ ماری۔"ہائے... ارے ظالم... ارے میں مر گیا... اف... ارے بھگوان کے لیے... تم کو تمہارے رسول اور خدا کا واسطہ... اسے بند کر دو... مجھے معاف کر دو... میں سب بتاتا ہوں۔"
میں نے سوئچ آف کر دیا۔ اس سے پانی کا درجۂ حرارت کم یں ہوا مگر سادھو رام کو ایک نفسیاتی قرار حاصل ہوا کہ پانی اس ے زیادہ گرم نہیں ہوگا۔"مجھے باہر نکالو... ہائے گرمی... رام رام... ب ے شریر میں اگنی بھر گئی ہے... ارے کوئی ہے... دوڑو... ردکرو... یہ مجھے قتل کر رہے ہیں۔" اس نے اچانک چیخنا شروع دیا۔ میں نے فوراً اس کا منہ بند کر دیا۔ اس نے گردن کو ادھر ادھر ل کے کپڑے سے بچنے کی بے سود کوشش کی۔ گلے میں پڑی ہوئی ی نے اسے بے بس کر رکھا تھا۔ یوں گردن ہلانے سے رسی گوشت ں گڑ گئی اور سادھو رام کی گردن کے چاروں طرف خراشیں آ گئیں ن سے خون رسنے لگا۔
باہر سے کسی نے دروازہ بجانا شروع کیا۔ یہ یقیناً سادھو رام ے چیخ پکار سے جاگ کر آنے والے ہمسائے تھے۔ میں نے ن ماہی کو اشارہ کیا کہ وہ صورت حال کو سنبھالے اور سادھو رام کے گلے کی رسی ٹیڈی کو تھما دی۔ پھر میں خود دوسرے کمرے میں جا کے چارپائی پر لیٹ گیا۔ میں نے بال بکھرا کے اور کپڑے بے ترتیب کر کے اچھلنا اور مچلنا شروع کیا۔"ہائے... اف مار ڈالا... قتل کر دیا..." میں نے چارپائی پر کسی غیر موجود مخلوق سے کشتی لڑتے ہوئے شور مچانا جاری رکھا۔"آہ... میں مر گیا... ارے کوئی آؤ... خدا کے لیے بچاؤ... یہ مار دے گا مجھے..."
دروازہ پھر بجا تو چن ماہی نے کنڈی کھولی... تین آدمی اندر آ گئے جو خاصے برہم نظر آتے تھے۔"یہ کیا ہو رہا ہے آدھی رات کو؟" ان میں سے ایک بزرگ نے خفگی سے کہا۔
"معاف کرنا چاچا جی..." چن ماہی بولا۔"یہ میرے سالے کا سالا ہے... گاؤں سے آیا ہے... اس پر پاگل پن کے دورے پڑتے ہیں... گاؤں کے مولوی صاحب نے کہا تھا کہ اس پر جن سوار ہے۔" میں نے اس وقفے میں اچھلنا کودنا قلابازیاں کھانا اور جن سے لڑنا جاری رکھا۔ میں اسے مکے مارتا رہا اور خود بھی گرتا رہا۔
"یہ تو... بڑی مشکل ہے..." بزرگوار نے کہا۔ ان کا غصہ ایک دم ہمدردی میں بدل گیا تھا۔
"ہاں جی... اب علاج کراؤں گا..." چن ماہی نے مظلوم شکل بنا کے کہا۔
"علاج کیا میاں... اس کو لے جاؤ کسی اچھے سے عامل کے پاس۔" بزرگ نے کہا۔"داتا صاحب کی خدمت میں حاضری دو۔"
"اسے پاگل خانے لے جاؤ جی۔" دوسرے سرپھرے اور باغی قسم کے جوان نے کہا۔"اس کا یہاں رہنا خطرناک ہے۔"
"نہیں بھائی... یہ خطرناک نہیں ہے... بے شک آپ قریب جا کے دیکھ لو... آپ سے کچھ نہیں کہے گا۔" چن ماہی بولا۔
بزرگوار آگے بڑھے اور انھوں نے میرے شانے پر تھپکی دی۔
"نوجوان... آیت الکرسی پڑھو۔"
"بابا جی... مجھے بچاؤ..." میں بزرگوار سے لپٹ گیا۔
"میں مر گیا... ہائے... بڑا بے رحم... قاتل... ہائے..."
بزرگوار نے بمشکل تمام خود کو چھڑایا۔ میں شور مچاتا رہا اور ان کے آگے ہاتھ جوڑتا رہا... باہر اتنی دیر میں کچھ اور لوگ بھی آ گئے تھے۔ بزرگوار نے کچھ پڑھ کے مجھ پر پھونک ماری۔ میں نے ان کو یہ عمل کرتے دیکھا تھا۔ چند سیکنڈ میں میرا شور و غوغا کم ہو گیا۔ پھر میں ساکت ہو گیا اور پلنگ پر آنکھیں بند کر کے پڑ گیا... بزرگوار اپنے عمل کی کامیابی سے یقیناً بہت خوش ہوئے ہوں گے۔
"اچھا میاں... ہم چلتے ہیں..." وہ بولے۔"خدا رحم کرے اس پر... دوبارہ دورہ پڑے تو ایک بار آیت الکرسی اور دو بار سورۃ فاتحہ پڑھ کے پھونک دینا... قرار آ جائے گا... اللہ کے کلام میں بڑی تاثیر ہے۔"
باغی خیالات رکھنے والا جوان کچھ نہ بول سکا کیونکہ باقی سب بزرگوار کے ہم خیال ہو گئے تھے اور ہمسائے ہونے کے ناتے چن ماہی کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کو تیار نہ تھے۔ سب کو چن ماہی سے ہمدردی تھی۔ چند منٹ میں وہ سب اپنے اپنے گھر لوٹ گئے تو چن ماہی نے کنڈی لگا دی۔
"مان گئے سوہنیو... میرا مطلب ہے کرنل صاحب!" وہ بولا۔
"دیکھو! آئندہ کبھی مجھے کرنل صاحب کہنے کی غلطی مت کرنا۔" میں نے کہا۔"تمھیں عادت پڑ گئی تو باہر بھی تمھارے منہ سے کرنل ہی نکلے گا... ہم پرانے ہو گئے ہیں اس لیے بھولتے نہیں۔ تم بالکل اسی طرح اپنے لہجے میں بات کرتے رہو تاکہ کسی کو شک ہی نہ ہو۔"
"اچھا مائی باپ... غلطی ہو گئی۔" چن ماہی نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔"اب ویسا ہی کروں گا جیسا آپ کہو گے۔"
"چن ماہی! تمھارے لیے یہ آزمائش کا زمانہ ہے... اگر تم غلطیاں کرتے رہے تو ہم تمھاری سفارش نہیں کر سکیں گے... اور تم کو بتائے بغیر غائب ہو جائیں گے۔" میں نے کہا۔"تم کبھی ہمیں تلاش نہ کر سکو گے لیکن کسی سے ہمارا ذکر بھی کرو گے تو ہمیں معلوم ہو جائے گا اور تمھیں بہت نقصان ہوگا۔ ہم بھیس بدل کر آنے والے جاسوسوں کو نہیں چھوڑتے تو تم کیا ہو۔"
چن ماہی کا رنگ اڑ گیا۔"آپ بالکل فکر نہ کریں جناب! میرا پکا وعدہ ہے کہ آپ لیفٹیننٹ بنائیں یا نہ بنائیں، میں جس

حد تک آپ کی خدمت کر سکا ضرور کروں گا اور پھر کبھی میری زبان سے ایک لفظ بھی نکلا تو آپ سے پہلے میں خود اپنے آپ کو شوٹ کروں گا۔"

یہ چن ماہی کی برین واشنگ تھی اور اس کے ذہن کو مکمل طور پر اپنے اختیار میں رکھنے کے لیے یہ ضروری بھی تھا کہ وہ ہمارے لیے کام کا آدمی ثابت ہو سکتا تھا اور اس سے ہمیں بہت سے فائدے حاصل ہونے کی امید تھی۔ ایک تو اس کا یہ گھر تھا جسے ہم استعمال کر رہے تھے۔ وہ ٹیکسی ڈرائیور بھی تھا اور شہر بھر میں گھوم پھر کے ہمارے لیے ہر قسم کی خبریں فراہم کرنے کا ذریعہ بن سکتا تھا۔ وہ خبریں جو کسی خبر رساں ایجنسی یا اسٹاف رپورٹر کے ذریعے مرزا غالب تک نہیں پہنچتی تھیں وہ چن ماہی اکٹھی کر سکتا تھا اور ہم اسے ٹیکسی کے ساتھ کہیں بھی بھیج سکتے تھے۔ مثلاً یہ ہو سکتا تھا کہ کبھی وہ ہمارے دشمنوں کو ٹیکسی میں بٹھالے۔ اس کے لیے وہ پہلے سے ان کے ٹھکانے کے قریب موجود ہو... اور اگر ٹیکسی میں بیٹھنے والے آپس میں گفتگو کریں تو وہ سن بھی سکتا تھا اور ریکارڈ بھی کر سکتا تھا۔ اس کی ٹیکسی میں ٹیپ ریکارڈر فٹ کرنا معمولی کام تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور کو عام طور پر لوگ اہمیت نہیں دیتے اور اس کی موجودگی کو رازداری کے لیے غیر اہم سمجھتے ہیں۔ وہ فرض کر لیتے ہیں کہ ٹیکسی ڈرائیور ایک غیر جانبدار فریق ہے جو دن بھر سب کی سنتا ہے مگر اپنے کام سے کام رکھتا ہے۔

میں نے دوسرے کمرے میں آ کے دیکھا تو گرم پانی میں پڑے رہنے سے سادھو رام کی حالت بہت ابتر ہو گئی تھی اور وہ تقریباً نیم بے ہوش تھا۔ میں نے اسے ذرا سی دیر کے لیے باہر نکالا۔ اس کے جسم پر ایک بالٹی بھر کے ٹھنڈا پانی انڈیلا اور اسے پھر ڈرم میں ڈال دیا۔ مجھے دوبارہ سوئچ آن کرتا دیکھ کر سادھو رام اچھلا۔ وہ دوبارہ اسی بھٹی میں جھونک دیا گیا تھا جس کی اذیت وہ آدھے گھنٹے تک برداشت کرتا رہا تھا۔ اب میں نے کسی قسم کے خوف کے بغیر اس کے منہ سے کپڑا نکال دیا۔

"تم کو شور مچانے کی اجازت ہے سادھو رام..." میں نے کہا۔ "جو تمہاری مدد کر سکتے تھے، وہ آ کے چلے گئے۔ اب وہ دوبارہ نہیں آئیں گے۔"

سادھو رام مجھے گالیاں بکنے لگا۔ میں مسکراتا رہا۔ بند کمرے سے اس کی آواز سنائی دیتی ہو گی لیکن اب اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ سادھو رام کی قوتِ مزاحمت میری توقع سے بڑھ کر ثابت ہوئی تھی۔ ابھی تک اس نے سچ نہیں بولا تھا حالانکہ وہ خود بھی سمجھتا تھا کہ اس کے لیے نجات کی کوئی صورت نہیں رہی اور پانی کے اُبلنے تک وہ ہوش کھو بیٹھے گا اور صبح تک اُبل اُبل کے بالآخر مر جائے گا۔ اس کے سامنے موت کا جو نقشہ کھینچا گیا تھا وہ غلط نہیں تھا اور سادھو رام جانتا تھا کہ یہ موت اتنی ہی خوفناک اور بھیانک ہو گی۔ مجھے اب یہ فکر ہونے لگی تھی کہ کچھ بتانے سے پہلے ہی سادھو رام کا دماغ الٹ گیا تو میری ساری کوشش رائیگاں جائے گی لیکن یقین کہتا تھا کہ دماغ مزاحمت کرے گا اور موت کو قبول کرنے کے بجائے شکست تسلیم کرنے کو ترجیح دے گا۔ سادھو رام کا گالیاں بکنا اور دیوانوں کی طرح چلاّنا بھی مکر تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہم اسے پاگل تسلیم کر لیں اور اپنی کوشش ترک کر دیں مگر میں تہیہ کر چکا تھا کہ خواہ سادھو رام پاگل ہو یا اُبل کے مر جائے میں کوشش جاری رکھوں گا۔

دس منٹ میں سادھو رام کا پاگل پن درست ہو گیا۔ وہ تقریباً اُبلتے پانی میں زور زور سے اُچھلنے کی کوشش کر رہا تھا مگر اس کے لیے جہنم کے اس عذاب سے نکلنا ناممکن تھا۔ اس کی کھال کا رنگ عجیب سا ہو گیا تھا اور اس نے اپنے گھٹنے یقیناً زخمی کر لیے ہوں گے۔ بالآخر اس کی دردناک چیخوں کا سلسلہ رُک گیا اور وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں کراہنے لگا۔ "میں سب... سب کچھ بتاؤں گا... میں بتاؤں گا... جو پوچھو گے... سب سچ..." اس نے گردن کو اِدھر اُدھر یوں مارنا شروع کیا کہ اس کا سر ڈرم کی چادر سے ٹکرانے لگا اور گردن کے گرد زخموں کے حلقے گہرے ہو گئے... میں نے اُسے باہر نکالنے کا حکم دیا۔ استاد ٹیڈی اور چن ماہی نے اسے کھینچ کر باہر نکالا اور فرش پر ڈال دیا۔ اس کے جسم پر ٹھنڈے پانی کی ایک اور بالٹی ڈالی گئی تو اسے ہوش آ گیا لیکن وہ اسی طرح پڑا رہا۔ ہاتھ پیروں کی رسّی کھول دینے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑا اور وہ بڑے مضحکہ خیز انداز میں مڑا ہوا لیٹا رہا اور کراہتا رہا۔ میں نے جھک کر اس کی کھال کو چھوا تو وہ چلاّیا... یوں جیسے میں نے انگلی نہیں اُسے انگارا چھوا دیا ہو۔ اس کی کھال کچی پڑ گئی تھی۔ اس پر سے سارے بال اتر گئے تھے اور آہستہ آہستہ وہ کھال آبلہ بننے لگی تھی۔

"بولو سادھو رام..." میں نے کہا۔ "تمہارے پاس اسلحہ لے کر کون آتا تھا؟ ان کے نام بتاؤ۔"

"وہ... وہ دو آدمی تھے..." سادھو رام نے بڑی مشکل سے کہا اور چپ ہو گیا۔

"شاباش... نام بتاؤ ان کے... نام پتے بتا دو گے تو تمہارا کام ختم... پھر تمہارا علاج کیا جائے گا... تمہیں آرام کا موقع ملے گا اور جب تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے تو تم کو جانے کی اجازت ہو گی..." میں نے کہا۔ "تم آزاد ہو جاؤ گے... نہیں بتاؤ گے تو ہم پھر تمہارا سوپ بنائیں گے...!" وہ مردے کی طرح لیٹا رہا تو میں نے اس کے بازو میں چٹکی بھری۔ وہ تڑپا اور چلاّیا مگر میں نے اسے نہیں چھوڑا۔ "بتاؤ اسلحہ کون لاتا تھا... تم سے پیسہ کون وصول کرتا تھا؟... بولو... بولو ورنہ مار ڈالوں گا۔"

"وہ... وہ چوہدری دلاور کے آدمی تھے۔" سادھو رام تڑپتے ہوئے بولا۔

میں نے بازو کا گوشت چھوڑ دیا۔ "کیا تم نے چوہدری دلاور کو دیکھا ہے...؟"

اس نے زور زور سے سر کو دائیں بائیں جنبش دی۔ "میں نے اس کا صرف نام سُنا تھا..."

"کیا تم کو اس کے کسی ٹھکانے کا علم ہے؟" میں نے کہا۔

"نہیں... میرا واسطہ صرف دو آدمیوں سے پڑتا تھا۔" سادھو رام بولا۔ "ان میں سے ایک استاد پیڈرو تھا..."

"اور دوسرا..." میں نے کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد کہا اور اس کی ران پر زور سے چٹکی نوچی۔

"دوسرا... دوسرا ایک سب انسپکٹر ہے... پرویز وکٹر..." وہ چلاّیا۔

"کیا یہ پرویز وکٹر کسی ڈی ایس پی سراج کا حوالہ دیتا تھا...؟" میں نے کہا۔

"ہاں... اس کا نام میں نے کئی بار سُنا... مگر میں نے اُسے دیکھا نہیں..." وہ بولا۔

"استاد پیڈرو کا حلیہ بتاؤ؟" میں نے کہا۔

سادھو رام نے اس کا جو حلیہ بتایا وہ بالکل ٹھیک تھا... اس حلیے کا دوسرا آدمی ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

"کیا استاد پیڈرو نے کبھی سکندر بخت... محسن یا رابعہ کا نام لیا؟" میں نے کہا۔

"سکندر بخت کا نام وہ اکثر لیتا تھا... کہتا تھا کہ اس کے باپ کو نہ مارتے تو بیٹا آسانی سے قابو میں آ جاتا... اور وہ کہتا تھا کہ سکندر بخت کے ٹکڑے اپنے کتوں کے سامنے نہ ڈالے تو پیڈرو نام نہیں۔" وہ بولا۔

"رابعہ یا محسن... استاد ٹیڈی یا شہلا کا کبھی نام نہیں لیا اس نے...؟"

"مجھے یاد نہیں... کبھی لیا ہو گا تو میں نے غور نہیں کیا تھا۔" سادھو رام بولا۔

"یہ استاد پیڈرو کہاں رہتا ہے؟" میں نے کہا۔ "اس کی گاڑی کا نمبر بتاؤ..."

"مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں رہتا ہے۔" سادھو رام بولا۔

"گرم پانی کی ایک پیالی میں دو چمچے نمک کے گھول کر لاؤ۔" میں نے ٹیڈی کو حکم دیا۔ ٹیڈی نے تعمیل کی۔

"ذرا دماغ پر زور دو۔" میں نے نمک ملا ہوا پانی سادھو رام کی گردن کے زخموں پر ٹپکا کے کہا۔ "اس کا کوئی پتا ٹھکانا ہے؟"

سادھو رام بلبلا کے تڑپا۔ اس کے گھٹنے جو اب تک مڑے ہوئے تھے سیدھے ہو گئے... "وہ... وہ کل آئے گا... پیسے لینے۔ جس دن جگن ناتھ مال لے جاتا تھا اس کے تیسرے دن وہ آتا تھا۔ یا پرویز وکٹر آتا تھا۔" سادھو رام نے روتے اور ہانپتے ہوئے کہا... اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا اور وہ نشے میں محسوس ہوتا تھا مگر یہ بیہوشی ناقابلِ برداشت جسمانی تکلیف کا نتیجہ تھی۔

"وہ اب نہیں آئیں گے... انھیں معلوم ہو چکا ہو گا کہ سائیں پاپڑ والے کا اڈا تباہ ہو چکا..." میں نے کہا۔ "ان کا دوسرا ٹھکانا بتاؤ۔"

"وہ... ایک ایمبولنس... نمبر ایل آر ڈیڈ... سیون زیرو سکس زیرو..." سادھو رام کراہا۔ "اس پر ریڈ کراس کا جعلی نشان ہے۔ اسلحہ اسی ایمبولنس میں آتا ہے۔ مائکرو بس ہے فاکس ویگن کی... اوپر گھومنے والی لائٹ ہے... اُسے کوئی نہیں روکتا جب وہ سائرن بجاتی ہوئی گزرتی ہے... اسے پرویز وکٹر کا بھائی چلاتا ہے... ماں کی بہن نرس کے لباس میں ساتھ رہتی ہے... سونیا وکٹر۔"

"ماشاء اللہ! پورا خاندان ہی غداری میں سند رکھتا ہے۔" میں نے دل ہی دل میں مجرموں کے حسنِ انتظام کو سراہا۔ واقعی جب کوئی ایمبولنس سائرن بجاتی گزرتی ہے تو سب لوگ سہم کر ایک طرف ہو جاتے ہیں اور راستے کھُلے چھوڑ دیتے ہیں جو زندگی کی نعمت سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ سائرن موت کی آواز بن کے ڈرانے لگتا ہے اور احساس دلاتا ہے کہ عین اس لمحے جب زندگی کی ساری گہما گہمی عروج پر ہے۔ بچے اسکولوں میں آنے والے دن کے مسائل سے نبرد آزما ہونے کا درس لے رہے ہیں۔ دفتروں میں قلم اور ٹائپ رائٹر چل رہے ہیں تو فیکٹریوں میں مشینیں اور دنیا بھر کی سڑکوں پر کاروانِ حیات رواں دواں ہے۔ بسوں اور چھکڑوں، ہوائی جہازوں اور بلٹ ٹرین میں لوگ مسکرا رہے ہیں، جامِ صحت پی رہے ہیں اور محبت کر رہے ہیں، تو ایک آدمی زندگی اور موت کی کش مکش سے دوچار ہے اور جب ایمبولنس گزر جاتی ہے تو وہ سوچتے ہیں کہ نہ جانے اس کش مکش میں جیت کس کی ہو گی اور پھر اپنی صحت اور زندگی کے احساس سے ان کا دل بھر جاتا ہے۔ وہ خدا کے شکر گزار ہوتے ہیں کہ اس وقت جو ایمبولنس گزری تھی اس میں وہ خود نہیں تھے اور ان کا اپنا پیارا کوئی نہیں تھا۔ ایمبولنس انسان اور موت کے درمیان جدّوجہد کی علامت ہے اور اس سے امیدِ زیست وابستہ ہے۔ کوئی بھی یہ تصور ہی نہیں کر سکتا کہ کسی ایمبولنس میں مریض اور اس کی زندگی کے لیے اپنی صلاحیت کے مطابق کوشش کرنے والے مسیحا کی جگہ موت کا سامان ہو سکتا ہے۔ جاں بہ لب مریض کی جگہ گولا بارود

انٹرول کے بھیس میں وطن کی آبرو کے سوداگر ہو سکتے ہیں۔ ایمبولنس کی آواز پر ٹریفک رک جاتی ہے اور کانسٹیبل راستہ صاف چھوڑ دیتا ہے۔ وہ ڈرائیور سے لائسنس نہیں مانگتا۔ کاغذات طلب نہیں کرتا اور رشوت نہیں لیتا۔ ناکا بندی کرنے والے محافظ پہریدار... سب ایک ایک لمحے کی اہمیت سمجھتے ہیں اور ایمبولنس تمام رکاوٹوں سے صاف گزر جاتی ہے۔

بے شک مجرموں نے بہت چالاک ہونے کا ثبوت دیا تھا اور بے حد ذہانت سے کام لیا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے خیال آیا کہ یہ بھی چوہدری دلاور کے شیطانی ذہن کی فطانت ہوگی۔ وہ ڈرامے کرنے کا ماہر تھا اور ایمبولنس بھی ایک چلتا پھرتا ڈراما تھی۔ اس کو ایک بھائی چلاتا تھا۔ بہن اس میں نرس کے فرائض سرانجام دیتی تھی اور پچھلے حصے میں رہتی تھی۔ بھائی اُسے سسٹر سونیا کہتا ہوگا تو بالکل ٹھیک کہتا ہوگا۔ وہ تینوں بھائی بہن اینگلو انڈین کرسچین ہیں، چنانچہ انگریزی فرفر بولتے ہوں گے۔ اگر کبھی کسی نے غلطی سے یا شک کی بنا پر ایمبولنس کو روکا ہوگا تو عقبی حصے سے سفید وردی والی نرس نے انگریزی میں شور مچا دیا ہوگا کہ خدا کے لیے یسوع مسیح سے ڈرو... ایک منٹ کی دیر بھی ہوگئی، تو تم بھی مارنے والوں میں شمار کیے جاؤ گے اور ممکن ہے درمیان میں اسٹریچر پر سفید چادر اوڑھے مریض کو لیٹا دیکھ کر دیکھنے والے دہل گئے ہوں۔ حالانکہ چادر کے نیچے رائفلیں ہوں گی اور سیٹ کے نیچے دستی بم۔

سادھو رام اب بے ہوش ہو چکا تھا اور استاد ٹیڈی کے ساتھ چن ماہی منتظر تھا کہ میں کچھ کہوں۔ بالآخر ٹیڈی نے ہمت کی "اب کیا کرنا ہے سر؟" وہ کھنکار کر بولا۔

"آں... کچھ نہیں... ابھی اسے چارپائی پر ڈال دو۔" میں نے کہا۔ "جب ہوش میں آئے گا تو دیکھیں گے۔"

چن ماہی اور استاد ٹیڈی نے سادھو رام کو ٹانگیں اور ہاتھ پکڑ کے اٹھایا اور بستر پر ڈال دیا۔ اس کی کھال نرم اور چکنی ہو رہی تھی۔ جیسے اس پر گوند مل دیا گیا ہو۔ اس کا رنگ بھی سفید پڑ گیا تھا اور سادھو رام کی شکل بہت ڈراؤنی لگتی تھی۔

"تم اب جاؤ چن ماہی۔" میں نے کہا۔ "یہ ٹیکسی چھوڑ جاؤ اور اگر صبح ٹیکسی سڑک پر کھڑی ہوئی نہ ملے تو گھبرانا نہیں... تمہیں گورنمنٹ کی طرف سے پورے دن کا کرایہ ملے گا۔" میں نے سو کا ایک نوٹ اس کی طرف بڑھایا۔

"نہیں جناب! میں کچھ نہیں لوں گا اس کام میں۔" وہ بولا۔

"رکھ لو۔" میں نے ڈانٹ کر کہا۔ "میں اپنی جیب سے کچھ نہیں دے رہا ہوں اور تم گورنمنٹ کے لیے کچھ کرو گے تو کیا گورنمنٹ تمہارے لیے کچھ نہیں کرے گی... تم کو ہم نے بیگار میں نہیں پکڑا ہے بس یہ خیال رکھنا کہ معاملہ ملکی سلامتی اور رازداری کا ہے۔ اگر تم نے اپنی بیوی سے ذکر کیا تو بہت بڑی بے وقوفی ہوگی۔"

"توبہ جی! عورت ذات کو راز کی بات بتانے کا مطلب ہے، بات کو لاؤڈ اسپیکر پر نشر کرنا۔" چن ماہی بولا۔

"رائٹ... بیوی تمہارے سر کی قسم کھائے یا بچوں کی جان کی... اس پر بھروسا نہیں کرنا ہے اور کوئی دوست کتنا ہی پیارا اور قابلِ اعتماد کیوں نہ ہو اسے بھی کچھ نہیں بتانا ہے... یہ کہ ہم کون ہیں اور کیا کرتے ہیں۔ لیفٹیننٹ بننے کی خوشی میں بے قابو مت ہو جانا، ورنہ پہنچ جاؤ گے جیل کے پیچھے... اور وہ عام جیل نہیں ہوگی۔ لاہور کے شاہی قلعے کے پیچھے جانے والے بہت کم اوپر آتے ہیں۔ ہاں اگر تم نے تربیت کے مرحلے طے کر لیے تو تمہاری سفارش میں خود کروں گا اور جب تم لیفٹیننٹ بن جاؤ گے تو سب کو پتا چل ہی جائے گا۔ سال بھر کی بات ہے مگر سال میں ایک دن کی غلطی تم کو ڈسکوالیفائی کرا دے گی۔ آخری دن بھی غلطی کی تو سب ختم۔"

وہ سر ہلا کے اور چابیاں دے کر نکل گیا تو میں نے استاد ٹیڈی کی طرف دیکھا۔ "میرا خیال ہے نیک محمد کہہ یا اور کچھ بتانے کی پوزیشن میں نہیں رہا... اب اسے ہوش نہیں آئے گا۔"

"تمہاری ہمت ہے سکندر بادشاہ کہ اس سے کچھ معلوم کر لیا۔" ٹیڈی بولا۔ "ورنہ یہ بتانے والا نہیں تھا۔"

"ہمارے لیے نئے راستے کھل گئے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہمیں اے ایس آئی پرویز وکرم کا پتا چلانا ہے۔ وہ اس ضمیر فروش ایس پی سراج کا لوکل ایجنٹ ہوگا۔ اب اس پورے نظام کی کچھ تصویر میرے سامنے ہے۔ چوہدری دلاور کے کسی ٹھکانے سے پرویز وکرم مال لے کر ایک ایمبولنس میں سادھو رام تک پہنچاتا ہوگا۔ سادھو رام کی بیوی دل کی مریضہ تھی چنانچہ مہینے میں ایک بار اس کے گھر کسی ایمبولنس کے آنے پر کوئی پریشان نہیں ہوتا ہوگا۔ سادھو رام یہی کہتا ہوگا کہ بیوی کو دورہ پڑا تھا اور اچانک اسپتال لے جانا پڑا تھا۔ اس کے گھر کے ملازم بھی یہی بات مشہور کرتے ہوں گے۔ سادھو رام کے گھر میں ان کی موجودگی کے اسباب بھی زیادہ واضح ہو گئے ہیں۔ وہ مال وصول کرتے ہوں گے اور یہ دیکھتے ہوں گے کہ ہر چیز آرڈر کے مطابق ہے۔ وہ سادھو رام پر بھی نظر رکھتے ہوں گے کہ کسی اور سے سودا نہ کرے۔ سادھو رام کا ایمان پیسہ تھا۔ کوئی کرنل جگن ناتھ سے زیادہ دینے والا مل جاتا تو سادھو رام پس و پیش نہ کرتا مگر اس کی نگرانی کرنے والے وہاں اسی لیے رکھے گئے تھے کہ سادھو رام کو بدعہدی نہ کرنے دیں اور پھر سادھو رام کے گھر سے وہ مال سیوک اور اس کے دونوں ساتھی دلربا کے اڈے تک

یعنی سائیں پاپڑ والے کی جعلی خانقاہ تک پہنچاتے ہوں گے۔"
"مگر تم نے مال کسی ٹرک میں آتے دیکھا تھا؟" ٹیڈی بولا۔
"ہاں۔ وہ ضرورت کے وقت ٹرک منگوا لیتے ہوں گے۔ ان کے پاس وائرلیس ہوگا یا ٹیلی فون۔" میں نے کہا۔ "پیغام ملتے ہی کہیں سے ٹرک آجاتا ہوگا۔"
"سکندر بادشاہ! ابھی تم نے اس سے کہا تھا کہ وہ انڈین ٹرک تھا... اشوک ٹاٹا کا۔"
"وہ میں نے اندھیرے میں تیر چلایا تھا جو نشانے پر لگا۔" میں نے کہا۔ "غالباً ایمبولنس کے دو پھیروں میں جتنا سامان سادھو رام کی حویلی میں جمع ہوتا ہوگا، وہ ایک ٹرک میں سائیں پاپڑ والے کے ڈلیرے پر پہنچا دیا جاتا ہوگا۔ وہاں سے دلربا اپنے کرنل جگن ناتھ کو سگنل دیتی ہوگی کہ ڈلیوری ہوگئی ہے۔"
"کیا... کیا ہوگیا ہے؟" استاد ٹیڈی نے گڑبڑا کے کہا۔ "ہر مہینے..."
میں بے اختیار ہنسا۔ "میرا مطلب تھا کہ وہ سامان وصول ہو جانے کی اطلاع دیتی ہوگی اور کرنل جگن ناتھ ادائیگی کرنے آجاتا ہوگا۔ مال دیکھتا ہوگا اور رقم دلربا کو دے جاتا ہوگا۔ اس کے بعد کسی وقت سرحد پار سے ٹرک آتا ہوگا اور یہ مال لوڈ کر کے لے جاتا ہوگا۔ سرحد پار کرنے میں ایک طرف سے تو کوئی دشواری نہیں۔ دوسری طرف ہمارے دشمنوں کے یار ایس پی سراج موجود ہیں۔ وہ اپنی وطن فروشی کی قیمت وصول کر کے ٹرک کو بحفاظت دوسری طرف پہنچاتے ہوں گے اور جب دوسری طرف سے مال مل جانے کی اطلاع دلربا کو ملتی ہوگی تو وہ اپنا کمیشن کاٹ کر سادھو رام کو ادائیگی کر دیتی ہوگی۔ سادھو رام اپنا کمیشن وضع کر کے باقی رقم پرویز وکٹر کو دیتا ہوگا جو اس رقم کو چوہدری دلاور تک پہنچاتا ہوگا۔ پرویز وکٹر کی فیملی بھی یا تو کمیشن لیتی ہوگی یا چوہدری دلاور کی ملازم ہوگی۔ اب ہم نقطۂ آغاز سے چلیں گے یعنی سب سے پہلے پرویز وکٹر کو تلاش کریں گے۔ پھر اس کے بھائی بہن تک پہنچیں گے۔ ان کی ایمبولنس کا سراغ لگائیں گے اور دیکھیں گے کہ اب وہ مال کہاں پہنچاتے ہیں۔"
"یہ تو بہت مشکل کام ہے سکندر بادشاہ۔" ٹیڈی بولا۔ "وہ بھائی بہن ہمیں قریب کہاں پھٹکنے دیں گے۔"
"ظاہر ہے یہ کام آسان ہوتا تو تم اکیلے بھی کر لیتے۔" میں نے کہا۔ "وکٹر فیملی تک پہنچنے کے دو ذریعے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہم چھپ کر اور بھیس بدل کر ان کے آگے پیچھے لگے رہیں اور دوسرا یہ کہ ان کے ساتھ شامل ہو جائیں۔ دونوں صورتوں میں خطرہ برابر ہے مگر تیسری صورت کوئی نہیں ہے۔ ہمیں ان کے ساتھ ساتھ یا ان کے پیچھے پیچھے چلنا پڑے گا تب ہی ہمیں ہر راستے کا اور ہر منزل کا سراغ ملے گا۔"
"ٹھیک ہے کرنل! جیسا تم چاہو گے ویسا ہی ہوگا۔" ٹیڈی نے کہا۔
"میرے چاہنے کی کیا بات ہے۔ میں تو چاہتا ہوں کہ آج ہی سب پتا چل جائے۔" میں نے کہا۔ "یہ تو میرا پروگرام ہے۔ باقی سب خدا کی مرضی اور تائید پر منحصر ہے۔ تقدیر ساتھ نہ دے تو تدبیر سے کیا ہوتا ہے۔"
"وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔" ٹیڈی نے بھی بڑی سنجیدگی سے نصف شعر پڑھا۔ "اور اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ وہ ساتھ نہ ہوتا تو ہم سب کیسے ملتے؟ اسی نے ہمیں ملایا کیونکہ وہ ہم سے کوئی بڑا اور نیک کام لینا چاہتا ہے اور اسی نے ہمیں حوصلہ دیا۔ اس نے مدد نہ کی ہوتی تو کیا اب تک ہم زندہ ہوتے۔ وہ آئندہ بھی حق کا ساتھ دے گا۔"
میں نے ٹیڈی کو گلے سے لگا لیا۔ "تمہارا یقین اور ایمان دیکھ کر مجھے سہارا ملتا ہے۔ تم ٹھیک کہتے ہو دوست۔"
ٹیڈی کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔ اس نے جو کچھ کہا تھا وہ اس کے دل کی آواز تھی۔ وہ کوئی بہت عالم فاضل شخص نہیں تھا کہ ایسی جذباتی تقریر کر سکتا لیکن یہ اس کے دلی جذبات تھے۔ خالص اور کھرے۔ جو خود بخود الفاظ میں ڈھل گئے۔
"اب اس کا سوچو سکندر بادشاہ... یہ کہیں مر نہ جائے۔" ٹیڈی نے کہا۔
"مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے استاد کہ یہ مرنے والا ہے۔" میں نے کہا۔ "چلو اس کو دنیا کے عذاب سے نجات دلا دیں۔ دنیا کو اس کی اور اسے دنیا کی ضرورت ہی نہیں رہی۔"
ہم دونوں نے مل کر سادھو رام کو اٹھایا اور باہر کھڑی ہوئی ٹیکسی کی ڈکی میں ڈال دیا۔ پھر میں پیچھے بیٹھا اور استاد ٹیڈی نے ڈرائیونگ شروع کی۔ ٹیکسی سڑک پر آئی اور میں نے ٹیڈی کو دریا کی سمت چلنے کو کہا۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ سادھو رام کو شہر سے باہر لے جا کر گولی مار دوں اور ہم اسے دفن کر آئیں مگر پھر میں نے سوچا کہ اتنی تکلیف کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اسے غرقِ دریا کرنے میں آسانی رہے گی۔ اس وقت رات کے دو بجے تھے اور سڑکوں پر ہو کا عالم تھا۔ جگہ جگہ ہمیں گشت کرنے والے چوکیدار ملے لیکن ٹیکسی کو کسی نے نہیں روکا۔ ٹیکسی نے شاہی قلعے کے پیچھے اور اقبال پارک کی درمیانی سڑک سے نکل کر شاہدرے جانے والی سڑک کا رُخ کیا۔ دس منٹ بعد ہم پُل پر پہنچے۔ وہاں پولیس تھی اور اگر خطرہ تھا تو اسی جگہ کہ وہ روک کر تلاشی نہ لیں مگر عین وقت پر پولیس چوکی والوں کا ایک ٹرک ڈرائیور سے جھگڑا شروع ہوگیا۔ میرے

...نے ڈرائیور نے پولیس کانسٹیبل کو تھپڑ مارا۔ کانسٹیبل کے ساتھی نے ...ل کے کندے سے ڈرائیور پر حملہ کیا اور اس کو بڑی بے رحمی سے ...شروع کیا۔ اندر سے دو اور پولیس والے نکلے اور ان تینوں نے ...ور کا حلیہ بگاڑ دیا مگر اتنی دیر میں پیچھے کھڑے ہوئے ٹرکوں کی قطار ...ے ڈرائیور اتر اتر کے آنے لگے۔ ان سب کے ہاتھوں میں سریے ...یا وھیل اسپنر تھے اور جیک کو گھمانے والے ہینڈل تھے۔ اپنی ...دری کے ایک رکن کے ساتھ پولیس کے ظلم کے خلاف وہ سب ...ہو گئے تھے اور اب پولیس کا مار کھانا یقینی تھا۔ یہ الگ بات ...کہ بعد میں پولیس کی بالادستی قائم رکھی جائے اور سب ...اوروں کو گرفتار کر کے الگ الگ تھانوں میں اس سرکشی کی سزا ...نا جائے۔
"ٹیکسی نکال لو استاد۔" میں نے ٹیڈی سے کہا۔ "موقع اچھا ...ہے۔"
"ہاں!" ٹیڈی چونکا۔ "میں ذرا پولیس کی پٹائی کا سین دیکھنے ...تا تھا..."
پولیس اور ٹرک ڈرائیوروں کی مارپیٹ کے باعث پُل پر ...ب طرف سے آنے والا ٹریفک جام ہو رہا تھا تو دوسری طرف ...ے ٹریفک رُک گیا تھا۔ ہماری ٹیکسی کے نکل آنے کے بعد صرف دو ...ریں اور پُل تک آئیں۔ کاریں زن سے آگے نکل گئیں۔ اب پُل ...کے آخری حصے میں کوئی نہیں تھا۔ ٹیڈی کی طرف سے آنے والی بسیں ...در ویگنیں بھی رات کو کم ہو جاتی ہیں مگر گوجرانوالہ سے اور گرد و نواح ...دیہات سے دودھ والوں کے ٹرک آنے شروع ہو گئے تھے۔ ...نصف سے زیادہ پُل عبور کرنے کے بعد میں نے ٹیڈی کے کندھے ...تھپکی دی۔
"یہاں روک لو استاد... اس طرح کہ ڈکی سائے میں رہے۔" ...ہنس کا۔ "خود بونٹ کھول کے کھڑے ہو جاؤ۔"
ٹیڈی نے گاڑی کنارے پر روکی اور گیئر کو نیوٹرل رکھا۔ تھوڑا سا دھکیلنے سے ڈکی ایک شہتیر کے سائے میں آگئی۔ ٹیڈی نے مجھے چابی دی اور خود بونٹ کھولنے چلا گیا۔ میں نے آس پاس کا جائزہ لیا اور فوراً ڈکی میں چابی لگا دی۔ اس کا پچھلا حصہ اُٹھ گیا۔ میں نے سادھو رام کو کھینچ کر نکالا اور کندھے پر ڈال لیا۔ اب اِدھر اُدھر دیکھنے کا وقت نہیں تھا۔ مجھے جو کچھ کرنا تھا کم سے کم وقت میں کرنا تھا۔ مخالف سمت سے کوئی گاڑی نمودار ہو جاتی تو ہیڈ لائٹس کی روشنی براہِ راست مجھ پر پڑتی۔ میں نے سادھو رام کو ایک عمودی شہتیر پر ٹکایا اور خود اوپر چڑھ کے دوسری جانب اتر گیا۔ ایک بار پھر اسے منہ کے بل ڈالا اور دوسرے شہتیر پر رکھ دیا۔ میں ایک ترچھے شہتیر پر بلاتردد جمائے کھڑا تھا اور دریائے راوی کا پانی میرے نیچے شاید سو فٹ کی گہرائی پر خاموشی سے بہتا جا رہا تھا۔ اگر میرا پیر پھسل جاتا یا توازن بگڑ جاتا تو سادھو رام وہیں لیٹا رہ جاتا اور میں نیچے دریا میں جا گرتا۔ میں اس جگہ جہاں پانی کی گہرائی سب سے زیادہ تھی لیکن اس سے میرے لیے کوئی پریشانی پیدا نہ ہوتی۔ استاد ٹیڈی فوراً ٹیکسی میں بیٹھ کے بھاگ جاتا اور میں تیر کر کنارے جا لگتا مگر سادھو رام بچ جاتا۔ اسے کوئی نہ کوئی اسپتال پہنچا دیتا جو میں ہرگز نہیں چاہتا تھا۔
میں نے ہاتھ بڑھا کے سادھو رام کو دھکا دیا اور دوسرے لمحے اس کے جسم کو اندھیرے میں ایک فولادی شہتیر سے ٹکرا کے اچھلتے اور پھر نیچے جاتے دیکھا۔ مجھے اس کے پانی میں گرنے کی آواز بالکل سنائی نہیں دی اور نہ میں نے اس کا انتظار کیا۔ میں فوراً اوپر چڑھا اور شہتیر پر سے سڑک پر کود گیا۔ ایک کار میرے قریب رُکی۔
"یہ تم کیا کر رہے تھے؟" کار سے اترنے والے ایک شخص نے کہا۔ وہ مجھے یوں گھور رہا تھا جیسے میں تخریب کار ہوں۔
"میں کوئی اچھا کام نہیں کر رہا تھا۔" میں نے انگریزی میں جواب دیا۔ "یہ ٹیکسی گھنٹا بھر سے خراب پڑی ہے اور یہاں کوئی باتھ روم نہیں ہے... میں کب تک برداشت کرتا۔ ادھر سے ٹریفک بند پڑی ہے۔"
وہ آدمی ہنس پڑا۔ "میں سمجھا تم... خیر... آئی ایم سوری۔"
وہ پھر کار میں بیٹھا اور کار روانہ ہوگئی۔
"تمہاری انگریزی کام آگئی سکندر بادشاہ۔" ٹیڈی نے فوراً بونٹ بند کیا اور اندر آ بیٹھا۔
"ہاں۔ انگریزی بڑے بڑے کام نکال دیتی ہے۔ انگریزی بولنے والا معتبر ہو جاتا ہے۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "انگریزی شرافت کی سند بن جاتی ہے۔"
"معلوم نہیں کون تھا... خواہ مخواہ اڑ گیا۔" ٹیڈی بولا۔
"اس کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی رک جاتا۔" میں نے کہا... "آدھی رات کے وقت کوئی پُل پر چڑھے تو شک یہی ہوتا ہے کہ کہیں پُل کو اُڑانا تو نہیں چاہتا... بم تو نہیں رکھ رہا ہے۔ گاڑی اب موڑ لو۔"
"سادھو رام کا کریا کرم تو ہوگیا۔" ٹیڈی نے گاڑی کو نصف دائرے میں موڑ لیا۔
"ہاں... ابھی وہ زندہ تھا۔ وقت ہوتا تو میں اس کے وجود سے راوی کے پانی کو گندہ نہ کرتا۔" میں نے کہا۔ "اسے زندہ گاڑ دیتا کسی ویرانے میں... یا جنگل میں پھینک آتا گولی مار کے۔"
ٹرک ڈرائیوروں اور پولیس کا جھگڑا ختم ہو چکا تھا مگر ایک پولیس والے نے ٹیکسی روک لی کیونکہ ٹیڈی کے پاس ٹول ٹیکس کی پرچی نہیں تھی۔ "جاتے وقت پرچی کیوں نہیں لی تھی؟" سنتری

غرّایا۔

" وہ جنابِ عالی! آپ کا اور ٹرک والوں کا جھگڑا چل رہا تھا۔" ٹیڈی نے معصومیت سے کہا اور پچاس کا نوٹ آگے بڑھا دیا۔ "پرچی یہیں کون دیتا۔۔۔ اب لے لیں آپ۔۔۔"

" چلو سنتری بادشاہ! یہ جرمانہ سمجھ کے رکھ لو۔" میں نے کہا اور سنتری نہایت ڈھٹائی سے مسکرایا۔ ٹیکسی کو آگے جانے کی اجازت مل گئی۔ صبح کے ساڑھے تین بجے ہم واپس پہنچے تو ہم نے ٹیکسی سڑک پر ہی روک دی اور باقی فاصلہ پیدل طے کیا۔ دروازے پر پہنچ کر میں نے غالب کو دیکھا۔ وہ چوکھٹ سے سر لگائے سو رہا تھا۔ ٹیڈی نے تالا کھولا اور پھر کنڈی مگر اسے خبر نہ ہوئی۔ جب دروازے کے پٹ کھلے تو وہ اندر کی جانب لڑھک گیا اور سر سہلاتا اٹھا۔

" لاحول ولا قوۃ! تم آدمی ہو کہ سانڈ۔" غالب نے ٹیڈی کو گھور کے کہا۔ "نہ آواز نہ دستک۔۔۔ گھسے چلے آئے ہو شریف لوگوں کے بے حد پرائیویٹ خواب میں۔ سر کے ساتھ اچھا بھلا خواب توڑ دیا اور وہ بھی دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا تھا۔"

" میں تو سمجھا تھا کوئی پاگل کتا آکے دروازے پر بیٹھ گیا ہے۔" ٹیڈی نے جواب میں غرّا کے کہا۔ "اچھا ہوا پتھر نہیں مارا۔"

" اور میاں غالب۔ یہ گلی میں بیٹھ کے اتنے پرائیویٹ خواب شریف لوگ دیکھتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"خواب میرے ہیں یا تمہارے۔" غالب نے تیوری چڑھا کے کہا۔ "میں گلی میں بیٹھ کے دیکھوں یا کلر ٹی وی کے انٹینا پر بیٹھ کر یا گرم توے پر بیٹھ کر۔"

" اچھا بھائی۔۔۔ ناراض کیوں ہوتے ہو۔" میں نے پلنگ پر بیٹھ کے کہا۔ "یہ تو بتا دو کہ خواب کس کا تھا؟"

" تھا خواب میں خیال کو ان سے معاملہ۔ جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا۔" غالب نے سرد آہ بھر کے کہا۔

" ان سے کیا مراد ہے۔ وہی جبڑے توڑ ٹانگ موڑ اور سر پھوڑ حسینہ۔" میں نے کہا۔ "کتنی بار پٹخ چکی تھی؟"

" تم تو بہت پہنچے ہوئے بزرگ ہو سکندر بادشاہ۔" غالب نے کہا۔ "بھلا تم کو کیسے معلوم ہوا؟"

" بلّی کو خواب میں چھیچھڑے ہی نظر آئیں گے۔" ٹیڈی نے کہا۔ "تم بھی خواب دیکھو گے تو اس سے مار کھانے کا۔"

" تمہارے باپ نے بھی کبھی محبت کی تھی کسی سے۔" غالب برہم ہو گیا۔ "تم کیا جانو پیار کی مار۔۔۔ اور پھر دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔ وہ بھی تو خواب میں مجھے ہی دیکھ رہی ہو گی۔ تم آکے دکھاؤ کبھی کسی کے خواب میں۔"

" بس بس۔۔۔ امن صلح آشتی۔" میں نے کہا۔ "یہ بتاؤ تم آج آفس میں کیوں نہیں پڑے رہے۔ کیا ایڈیٹر نے نکال دیا ہے؟"

" پہلے تم بتاؤ کہ اس وقت کون سی توپ چلا کے آ رہے ہو۔" غالب بولا۔ "کیا مورننگ واک کے لیے گئے تھے۔"

میں نے اسے بتایا کہ ہم نے سادھو رام کو پرلوک پہنچا دیا ہے اور اس نے عالمِ فانی سے کوچ کرنے سے قبل جو مفید معلومات فراہم کی تھیں وہ کیا ہیں۔ استاد ٹیڈی نے اتنی دیر میں ہمارے لیے کافی تیار کی۔ ہمارے ساتھ رہنے سے اس کے مزاج، عادات و اطوار اور ذوق میں نمایاں تبدیلی آئی تھی جو بے حد خوشگوار تھی۔ اس نے ذہنی طور پر ہمارے ساتھ مطابقت ہی نہیں کی تھی، ہماری سوچ کا انداز بھی اختیار کر لیا تھا۔ بنیادی وجہ یہ تھی کہ وہ ذہین تھا اور ایک اچھے خاندانی پس منظر کا مالک تھا۔ حالات نے اسے جس ماحول میں پھینک دیا تھا وہاں اس کی شخصیت پر عامیانہ پن اور گھٹیا معیارِ زندگی کی گرد جم گئی تھی جسے اس نے ہماری رفاقت سے دھو ڈالا تو اندر سے وہی پیارا اُجلا نیک محمد نکل آیا جو استاد ٹیڈی نہیں تھا۔ وہ اب ہم میں سے ایک تھا تو ہمارے ہی سلیقے میں ڈھل رہا تھا اور میں پیشن گوئی کر سکتا تھا کہ ایک دن اس میں، محسن میں اور مجھ میں ظاہر و باطن کا کوئی فرق نہیں رہے گا۔ وہ کپڑے ڈھنگ سے پہننے لگا تھا۔ گفتگو میں ترکی بہ ترکی جواب دیتا تھا۔ کافی پینے کا عادی ہو گیا تھا اور اپنے ماضی کو فراموش کر چکا تھا۔

" سادھو رام کے ساتھ تو تم نے ٹھیک کیا۔" غالب نے کافی پیتے سگریٹ کا دھواں پھیلاتے اور غور فرماتے ہوئے کہا۔ "لیکن میری صحافتی حس کہتی ہے کہ تم نے چن ماہی پر بہت زیادہ اعتماد کر لیا ہے۔ یہ ڈراما چلے گا نہیں۔"

" کیوں نہیں چلے گا۔۔۔ وہ بھروسے کا آدمی ہے۔" ٹیڈی نے کہا۔

" بالکل ہے۔۔۔ لیکن حد سے زیادہ جذباتی ہونا اس کی کمزوری ہے۔ ایسے لوگ بعض اوقات جوش میں حد سے بڑھ جاتے ہیں اور اپنے ساتھ دوسروں کو بھی مرواتے ہیں یا ان کے جذبات کی رو یکلخت منفی ہو جائے تو وہ اتنے ہی خطرناک دشمن بھی ہو جاتے ہیں جتنے اچھے دوست تھے۔ اعتدال پسندی سے ہی مستقل مزاجی آتی ہے۔"

" یہ تم نے بہت عقل مندی کی بات کہی ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن اب کیا ہو سکتا ہے؟"

" میرا مشورہ ہے کہ فی الحال ہم غائب ہو جائیں۔" غالب نے کہا۔ "یہ نہ ہو کہ کل چن ماہی کی کسی جذباتی حماقت کے باعث ہم اسی جگہ ایسے پکڑے جائیں کہ نکل ہی نہ سکیں۔"

" مگر وہ آدمی ہمارے کام آ سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

" ضرورت پڑنے پر کھوٹا سکہ بھی کام آ جاتا ہے مگر اسے جیب میں لیے پھرنے اور اس پر بھروسا کرنے کو عقل مندی نہیں کہا جا سکتا۔" غالب نے کہا۔ "یہ تم نے اچھا کیا کہ سادھو رام کو اس کے سامنے سپردِ آب نہیں کیا۔ اب اس کے لیے ایک رقعہ چھوڑ دو کہ ہم سادھو رام کے ساتھ ایک ٹاپ سیکرٹ مشن پر جا رہے ہیں اور مکان کو تالا لگا کے کھسک لو۔ جب بھی ضرورت پڑے گی اس سے رابطہ قائم کر لیں گے اور مکان کی چابی ہمارے ہی پاس ہو گی۔"

" چن ماہی اگر لیفٹیننٹ نہ بن سکا تو سخت مایوس ہو گا۔ اس کا دل ٹوٹ جائے گا۔" میں نے کہا۔

" اس کو لیفٹیننٹ بنا دینا سال بھر بعد۔ درمیان میں اس سے کام لیتے رہنا اور اسے وظیفہ بھی دینا مگر اس کے سامنے جانے کی اور اپنا نیا ٹھکانا بتانے کی ضرورت نہیں۔" غالب نے کہا۔ "اس عرصے میں پتا چل ہی جائے گا کہ وہ کس حد تک قابلِ اعتماد ہے۔"

" تیری بات میرے دل کو لگتی ہے غالب کے بھتیجے۔" میں نے کہا۔ "صبح ہونے سے پہلے ہم غائب ہو جاتے ہیں مگر غائب ہو کر جائیں گے کہاں؟"

" پائے گدا لنگ نیست۔۔۔ ملکِ خدا تنگ نیست۔۔۔" غالب نے کہا اور گدا کو جانتے بوجھتے گدھا کہتے ہوئے ٹیڈی کی طرف دیکھا۔

" سکندر بادشاہ! سنبھالو اس صحافی کی دُم کو۔ پہلے اس نے مجھے سانڈ کہا تھا اب گدھا کہہ دیا ہے۔" ٹیڈی بگڑنے لگا۔

" تم نے بھی مجھے پاگل کتا کہا تھا۔" غالب نے کہا۔ "اور تم تو بر جھوٹ بک رہے تھے، میں سچ کیوں نہ بولوں۔"

ایک بار پھر میں نے ان کے درمیان سیز فائر کر دیا۔ "چلو ہم فی الحال محسن میاں کی زوجہ کے سایۂ عاطفت میں چلے جاتے ہیں۔ پھر کوئی نیا ٹھکانا تلاش کریں گے۔"

نہ جانے کیوں اس وقت مجھے غالب کی بات میں دور اندیشی نظر آئی۔ چن ماہی پر اعتماد کا مظاہرہ ٹیڈی کو بھی پسند نہیں آیا تھا اور میں نے مذاق کی بات کو بہت آگے بڑھا دیا تھا۔ چن ماہی کی نیت کے خلوص پر شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ دماغ سے زیادہ دل کی بات پر عمل کرتا تھا۔ یہ اس کی فطرت تھی جو ایک دم نہیں بدل سکتی تھی۔ یہ ہو سکتا تھا کہ کچھ عرصے بعد وہ بھی سمجھ جائے کہ یہ دل کے معاملے نہیں ہیں اور دماغ کے فیصلوں کو ترجیح دینے لگے لیکن فوری طور پر اس کی جذباتی طبیعت میں اس کے نادان دوست ثابت ہونے کے امکانات نظر انداز نہیں کیے جا سکتے تھے۔ ہمارا یہاں اب بہت کم سامان رہ گیا تھا اور جو تھوڑا بہت بچا تھا وہ ٹیکسی میں لے جایا جا سکتا تھا۔ ٹیکسی کی چابی ہمارے ہاتھ میں تھی اور چن ماہی کی طرف سے کوئی اندیشہ نہ تھا کہ ٹیکسی نہ ملی تو وہ پریشان ہو جائے گا۔ پندرہ منٹ میں ہم نے اپنا اسباب اٹھا لیا اور گھر کے دروازے میں قفل ڈال دیا۔ غالب نے اپنی تحریر میں دروازے کی کنڈی میں ایک رقعہ لکھ کر پھنسا دیا۔ اس میں صرف ایک جملہ تھا: "ہم ایک خطرناک مشن پر تبلیغ کو جا رہے ہیں۔"

صبح کا ملگجا اجالا شہر پر اترنے لگا تھا جب ہم ٹیکسی میں ایم آر ایس کے اس ٹھکانے سے بھی رخصت ہوئے جسے ہم نے کچھ عرصے کے لیے بہت محفوظ فرض کر لیا تھا۔ سادھو رام کے یہاں آنے سے خطرے کا احساس خواہ مخواہ ساتھ آ گیا تھا اور مجھے کبھی کبھی خیال آتا تھا کہ کہیں دشمنوں کے ایجنٹ کتے ہماری بو سونگھتے ہوئے یہاں بھی نہ پہنچ جائیں۔ وہاں سے نکل کر میں نے خود کو کچھ ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ ایک عجیب سا اطمینان تھا کہ ہم بہت مناسب وقت پر وہاں سے نکل آئے۔

" میں نے ابھی تک تمہارے ایک سوال کا جواب نہیں دیا۔" غالب نے اونگھتے اونگھتے سر اٹھا کے کہا۔ "سوال بتاؤ۔"

" پہلے تم جواب بتاؤ۔" میں نے کہا۔ "میں سوال دوبارہ بنا لوں گا۔"

" میں جو آفس کی میز پر لمبی تان کے سونے کا عادی ہوں۔" غالب بولا۔ "اور اخبار کی آخری کاپی چلے جانے کے بعد ایڈیٹر کو شب بخیر تک نہیں کہتا۔ صبح سے پہلے اس در پہ کیوں آ پڑا تھا۔"

" ہاں، یہی میرا سوال تھا۔" میں نے کہا۔ "تمھیں ایڈیٹر نے باہر پھنکوا دیا ہوگا کہ رات کو دفتر میں کوڑا کرکٹ نہیں رہنا چاہیے۔"

"کبھی ایسا ہوا تو تم دیکھو گے کہ باہر کوڑے کے ڈھیر پر ایڈیٹر پڑا نظر آئے گا۔" غالب بولا۔ "مجھے تو ایک پیغام ملا تھا بلکہ میں یوں کہوں کہ میرے لیے کسی کا پیغام آیا تھا تو زیادہ رومانٹک بات ہوگی۔ اس نے مجھے الٹی میٹم دے دیا ہے۔"

"کس نے... نازو نے؟" میں نے کہا۔ "کیا کہا ہے کہ آدمی بن جاؤ ورنہ عاق کردوں گی۔"

"اس نے کہا ہے کہ شام چار بجے تک مجھے اسپتال سے لے جاؤ۔" غالب نے کہا۔ "ورنہ آدھے اسپتال کو تباہ کرکے نکل جاؤں گی اور پھر تم کو اخبار کے دفتر آکے تباہ کردوں گی۔ میں بہت سخت دہشت زدہ ہوں۔ اخبار کی تو کوئی بات نہیں، لوگ دوسرا پڑھ لیں گے لیکن غالب دوسرا کہاں سے آئے گا۔ بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا..."

"اور وہ جو تم کہتے تھے کہ غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں۔" میں نے کہا۔

"اس وقت تک مجھے نازو سے یعنی نازو کو مجھ سے... گویا کوئی وہ نہیں تھا... جو آپ کو رابعہ سے یا رابعہ کو آپ سے ہے۔ امید ہے آپ سمجھ رہے ہوں گے۔" غالب نے کہا۔

"یہ وَن وے ٹریفک ہے مرزا جی... آگ ایک طرف لگی ہوئی ہے۔ تم نے کبھی نازو کے منہ سے کچھ سنا؟" میں نے کہا۔

"جو سنا ہے وہی تو سنا رہا ہوں۔ اس سے بڑا ثبوت اور کیا چاہیے۔" وہ بولا۔ "بھئی اس نے صرف مجھے ہی پیغام کیوں بھیجا؟ یہ کیوں کہا کہ آکے مجھے لے جاؤ۔ آخر تم بھی تو بڑے ٹارزن بنے پھرتے ہو۔"

"لیکن مجھے وہ کس پتے پر پیغام بھیج سکتی تھی؟" میں نے کہا۔

"ایک تم ہی تو تھے جس کے بارے میں وہ جانتی ہوگی کہ اخبار کے دفتر میں مل جاؤ گے۔"

"گویا تم نہیں مانو گے۔" غالب نے جھنجلا کے کہا۔ "میرے چاند! وہ کہلوا سکتی تھی کہ ٹارزن اور رستم سے کہہ دینا مگر اس نے براہِ راست مجھ سے کہا کہ آکے لے جاؤ۔ غور کریں آپ 'مجھے آکر لے جاؤ' پر... یہ ہیروئن کی پکار ہے جو ظالم سماج کی قید میں ہے... ایسے میں ہیرو کیا کرتا ہے؟"

"پہلے تو ایک گانا گاتا ہے۔" میں نے کہا۔ "یا اُدھر ایک بند ہیروئن گاتی ہے اِدھر دوسرا بند ہیرو گاتا ہے... اور اس کے بعد جو کچھ ہوتا ہے وہ تمھارے بس کی بات نہیں۔ صرف فلموں میں ہو سکتا ہے۔"

بھاڑ میں جاؤ تم سب... میں کل اسے لینے جارہا ہوں۔"

غالب نے کہا۔ "آدھے اسپتال کو وہ تباہ کردے گی۔ باقی آدھے کو میں کردوں گا... پھر کون روکے گا ہمارا راستہ... ہم سیدھے چلے جائیں گے قطب شمالی کی طرف یا ٹانگانیکا۔"

"کیا اس کی حالت اب ایسی ہے کہ وہ سچ مچ کچھ کرسکے؟" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"وہ تقریباً صحت مند ہے لیکن اس لیے اسپتال میں کچھ دن اور رہنا چاہتی ہے کہ اسے لوٹ کر گھر جانا منظور نہیں۔" غالب نے کہا۔ "وہ سمجھتی ہے کہ گھر سے پھر نکلنا مشکل ہو جائے گا اور اسٹاف رپورٹر نے خبر دی ہے کہ مس نازو بفضلِ خدا فل آف ایکشن ہیں۔ وہ تو اکیلی بھی نکل آتی لیکن وہ جو اس کا بے حد چالاک بھائی ہے نا... وہ سب سمجھتا ہے اور اس نے بڑے سخت حفاظتی انتظامات کیے ہیں۔ اسپتال میں کمرے کے دروازے کے باہر ایک شخص بیٹھا رہتا ہے جو مسلح بھی ہوتا ہے اور سنا ہے سابق کمانڈو ہے۔ وہ نازو کو ہاتھ پیر توڑ کے مزید دو ماہ کے لیے لٹا سکتا ہے۔ اندر بھی یا تو شیخ خود موجود رہتا ہے، عموماً دن میں... رات کو اس کے ابا ہوتے ہیں۔ شیخ سے یوں نمٹنا مشکل ہے کہ وہ ہمیں فوراً پہچان جائے گا اور اس کے ابا کو ناک آؤٹ کرنا اس لیے مشکل ہے کہ وہ ایک شریف اور وضعدار آدمی ہیں... بزرگ ہیں۔"

"یہ سب اطلاعات اس پیغام کے ساتھ ملی تھیں؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"نہیں... وہ دراصل... پیغام ملنے کے بعد میں نے کچھ جاسوسی کی تھی۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہوکر۔" غالب نے سر کھجا کے خفت سے کہا۔

"فکر مت کرو دوست۔" میں نے مرزا کے کندھے پر ہاتھ مارا... "تم کو ایسے ملوا دیں گے جیسے اب خوابوں میں ملتے ہو۔"

ابھی سورج نکلا ہی تھا کہ ہم تینے گھر کے دروازے پر جا اترے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو استاد ٹیڑھی سویا پڑا تھا۔ وہ جاگ رہا ہوتا تو اتنی دیر خاموش نہ رہتا اور کسی نہ کسی بات پر اس کی غالب سے جھڑپ ضرور ہوتی۔ میں نے دستک دی تو محسن آنکھیں ملتا نکلا۔ اتنی صبح ہمارے آنے کی شہلا بھی نہیں سوچ سکتی تھی چنانچہ وہ بھی اپنے گھر والے کے پیچھے متفکر نظر آئی۔

"آخر کیا ... ی ہے۔" محسن نے کہا۔ "شرفا کیا ابھی تو مرغے بھی سوئے پڑے ہیں۔"

"ہم کیا کریں... علامہ صاحب نے فرمایا ہے کہ اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو۔" میں نے سامان اتارتے ہوئے کہا۔

"لیکن میں غریب نہیں ہوں۔" محسن بولا۔ "میں عجیب و غریب ہوں... وہ میرا سالا وہیں بھول آئے ہو کیا؟"

"نہیں... وہ پچھلی سیٹ پر مرا پڑا ہے۔" غالب نے کہا۔

لگتا ہوں اُسے۔" محسن نے کہا اور آگے بڑھ کے دروازہ کھولا۔ پھر ٹیڈی کے کان پر مُنہ رکھ کے سائرن کی طرح آواز نکالی۔ ٹیڈی ہڑبڑا کے اُٹھ بیٹھا۔

"یہ کیا حرکت ہے؟" اس نے کان میں اُنگلی ڈال کے ہلاتے ہوئے کہا۔

"یہ صورِ اسرافیل تھا مُردے۔" غالب نے کہا "اپنی قبر سے نکل آ۔"

اندر پہنچ جانے کے بعد ہم نے محسن کو اپنی ہجرت کے اغراض و مقاصد سے آگاہ کیا اور سادھورام سے تفتیش کے نتیجے میں حاصل ہونے والی معلومات کا خلاصہ پیش کیا۔ شہلا نے فوراً امورِ خانہ داری سنبھال لیے تھے اور ہمارے لیے چائے ناشتے کا انتظام کرنے میں لگ گئی تھی۔ اس نے سادھورام سے تفتیش اور اس کے انجام کے بارے میں کچھ نہیں سنا' ورنہ وہ خواہ مخواہ دہشت زدہ ہو جاتی۔

"تم لوگ وہ سب کچھ وہیں مدفون چھوڑ آئے؟" محسن بولا۔

"استاد ٹیڈی کا خزانہ اور وہ انڈین کرنسی۔"

"اتنا وقت نہیں تھا کہ اسے کھود کر ساتھ لاتے۔" میں نے کہا۔ "اور پھر ابھی اس کی ضرورت بھی کہاں ہے۔ جب ضرورت پڑے گی نکال لائیں گے۔ اسے ساتھ لیے پھرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔"

"لیکن ایک چیز ہے جسے بہر حال نکال کے لانا ہے۔" غالب نے کہا۔ "وہ زیادہ مشکل کام ہے۔"

میں ہنسا۔ "معاف کرنا دوست... میں اُسے بالکل ہی بھول گیا تھا۔"

"یہ کس چیز کا ذکر ہو رہا ہے؟" محسن بولا۔ میں نے اُسے نازو کے پیغام کے بارے میں بتایا۔

"یہ کام تو خطرناک ہے۔" محسن نے کہا۔

"وہ لڑکی بھی بہت خطرناک ہے۔" میں نے کہا۔ "اس نے جو کہا ہے وہ کر دکھائے گی۔ موجودہ حالات میں وہ ہمارے لیے بہت کارآمد ثابت ہو سکتی ہے۔ ہمیں ایک ایسی ٹیم کی ضرورت ہے جو سادھورام سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں کچھ کر سکے۔ رابعہ کے نکل جانے سے اور شہلا کے بیاہ رچا لینے سے ایم آر ایس کا زنانہ شعبہ خالی پڑا ہے۔ رابعہ کا کچھ پتا نہیں کہ وہ پھر کب ہمارا ساتھ دینے کے قابل ہوگی اور شہلا کو ہم ساتھ رکھنے کے خلاف ہیں۔ نازو ہی وہ لڑکی ہے جو کسی بھی خطرناک مشن پر ہمارے ساتھ جا سکتی ہے۔ نازو جیسی لڑکی ہر مرحلے میں کام آ سکتی ہے۔"

تم لوگ بہت خود غرض ہو کے سوچتے ہو۔" غالب نے کہا۔ "اسے صرف اس لیے لانا چاہتے ہو کہ وہ تمہارے لیے کارآمد ہے۔ اس لیے نہیں کہ وہ نازو ہے اور اس لیے نہیں کہ میں چاہتا ہوں۔"

"وہ ویسے بھی وہاں رُکنے والی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "اور جہاں تک اس کے کارآمد ہونے کا تعلق ہے تو مرزا جی' ہم سب ایک ہی کشتی کے مسافر ہیں اور سب پار اتر جائیں گے یا سب ڈوب جائیں گے۔ مگر وقت آنے پر ہاتھ پیر تو سب ہی چلائیں گے۔"

"اب تم نے طعنہ دے دیا ہے تو خواہ کچھ بھی ہو جائے... آج اُسے لے آئیں گے۔" محسن بولا۔

"لیکن کیسے؟ جہاں وہ قید ہے وہاں محاورے کے مطابق پرندہ پر نہیں مار سکتا۔" غالب نے کہا۔

"ہم پرندے نہیں ہیں۔" محسن بولا۔ "اور اگر کچھ مارنا ہی ہو تو ہم پر نہیں مارتے گولی مارتے ہیں۔"

"صبح صبح کس کو گولی مار رہے ہو۔" شہلا ناشتا لے کر اندر آئی۔

ناشتا کرتے ہوئے ہم نے نازو کو نکال لانے کا پلان اتفاق رائے سے منظور کیا۔ پھر ہم جو رات بھر کے تھکے ہوئے تھے سو گئے اور محسن ضروری انتظامات کرنے چلا گیا۔ فی الحال ہم نے ٹیکسی واپس کرنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ جب ہم سو کر اٹھے تو محسن واپس آ چکا تھا۔ اس نے بڑی مسرت کے ساتھ اعلان کیا کہ سب بندوبست ہو گیا ہے اور کھانے کے بعد ہم ٹھیک دو بجے روانہ ہوں گے تو انشاء اللہ ایک گھنٹے میں لوٹ آئیں گے۔ شہلا نے دوپہر کے کھانے میں بھی بڑا اہتمام کیا تھا۔

"لوگ کچھ بھی کہیں... شادی کے فائدے بہت ہیں سکندر بادشاہ..." مرزا غالب نے کہا۔

"ہاں۔ بشرطیکہ بیوی نازو جیسی نہ ہو۔" میں نے کہا۔ "کہ سال کے چھ مہینے آدمی ہسپتال کا کھانا کھائے۔"

"اور سال کے باقی چھ مہینے اس سے مار کھائے۔" استاد ٹیڈی نے تائید کی۔

"تم دونوں کو بولتے ہوئے شرم آنی چاہیے۔" غالب نے کہا۔ "ایک تو خیر سے ابھی لنڈورے ہی پھر رہے ہیں۔ دوسرے کو وہ پہچانتی ہی نہیں۔ میرا خیال ہے وہ جانتے بوجھتے ایسا کر رہی ہے یادداشت کھو جانے کا بہانہ ہے ورنہ وہ تو پیچھا چھڑانے کے لیے ڈراما کر رہی ہے۔"

زیادہ باتوں کا وقت نہیں تھا۔ میں نے محسن اور شہلا کو تیار ہو جانے کا سگنل دیا۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات چھٹے حصے میں ملاحظہ فرمائیں

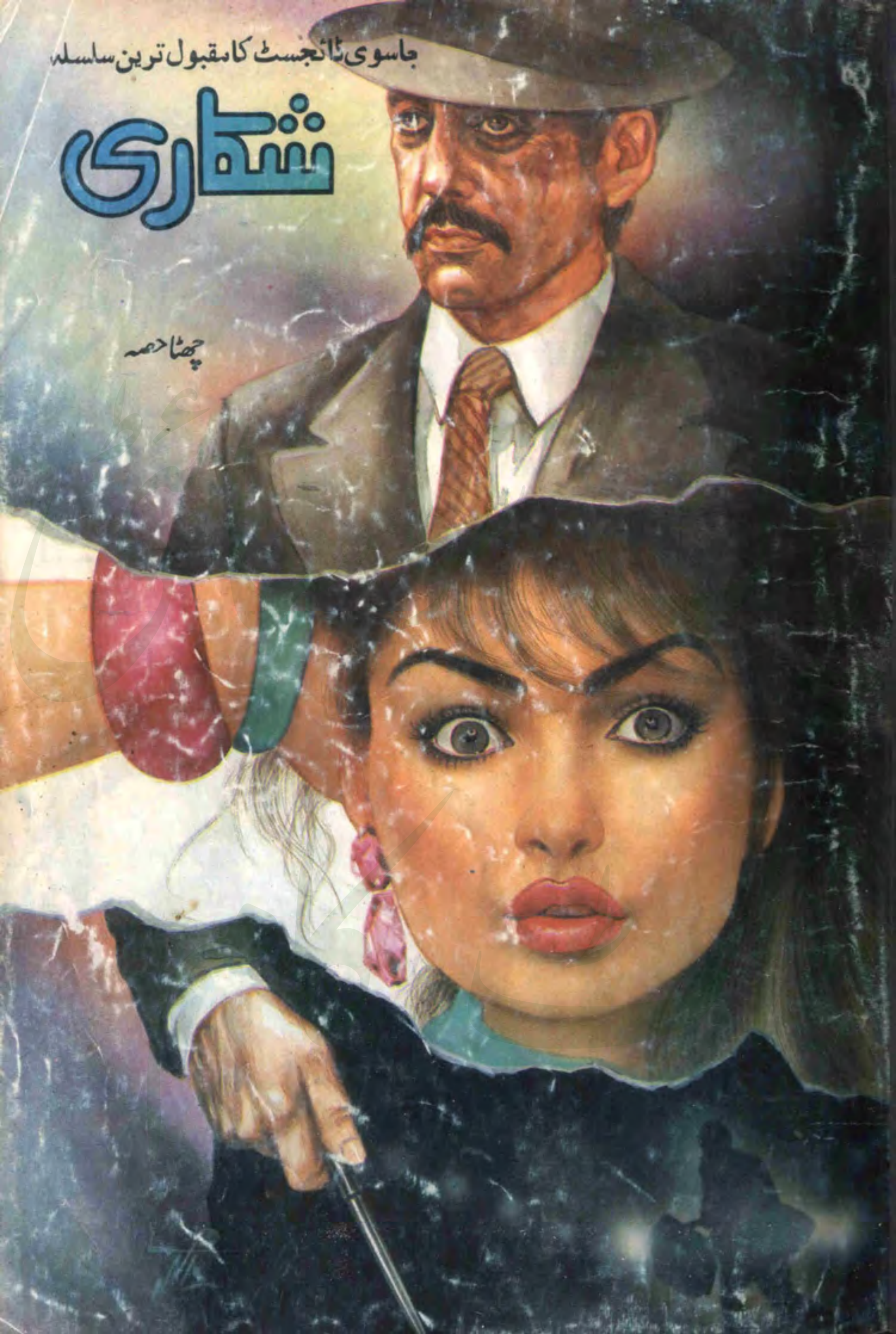
جاسوسی ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ
شکاری
چھٹا حصہ

معاشرے کے اُن ناسوروں کی رُوداد جو گوشت و پوست کے گزر کر صدیوں میں اُتر رہے تھے۔ ایک کفن بر دوش نوجوان کی کہانی جس کے شب و روز موت کی بستی میں گزر رہے

زندہ کرداروں پر مشتمل جاسوسی ڈائجسٹ کا نیا سلسلہ

نئی سوچ نیا رنگ نیا لہجہ نیا آہنگ

احمد اقبال کے شرربار و شبنم فشاں قلم سے

شہلا بہت مدت کے بعد ہمارے ساتھ کسی مہم میں شرکت کے لیے جا رہی تھی اور اگرچہ صحیح معنوں میں اسے مہم کا نام بھی نہیں دیا جا سکتا تھا کیونکہ نازو کو بہ رضا و رغبت اور صحیح سلامت اسپتال سے ہائی جیک کرانے میں مار دھاڑ اور قتل و خونریزی کا امکان نظر نہیں آتا تھا۔ جب شہلا نے نرس کا لباس پہنا تو سب سے زیادہ محسن کے دل پر اثر ہوا۔

”دل چاہتا ہے اسی وقت بیمار ہو کے یہیں لمبا لیٹ جاؤں“ اس نے نہایت رومانٹک آہ بھر کے کہا۔

”لیٹ جا۔ نرس صرف تیمارداری کر سکتی ہے“ میں نے کہا۔ ”علاج تو میں ہی کروں گا نا۔ اور میرا طریقۂ علاج ایسا ہے کہ آئندہ ہونے والے امراض بھی بھاگ جاتے ہیں۔ مریض کو میں نہیں بھاگنے دیتا۔“

”اچھے عیسیٰ ہو مریضوں کا خیال اچھا ہے۔“ غالب نے کہا۔ ”ارے بھائی مریض یہاں نہیں میو اسپتال میں چشم براہ ہے۔ ان میاں بیوی کا تو فرسٹ ایئر ہے۔ فرسٹ ایئر فول شوہر ایسی ہی باتیں کرتے ہیں اور بیویاں ان سے زیادہ احمق کہ خوش ہوتی ہیں۔ تم لوگ جاؤ ورنہ نکالے جاؤ گے۔“

چن ماہی کا جمبو جیٹ گلی کے رن وے پر لایا گیا تو ہائی جیکرز جن کی تعداد چار تھی فوراً اس میں سوار ہو گئے۔ میں ایک ڈاکٹر کے روپ میں اسپیشلسٹ لگتا تھا۔ میں نے شیو کرنا چھوڑ رکھا تھا چنانچہ میری داڑھی ایک مشت کے لگ بھگ ہو گئی تھی مگر جھاڑ جھنکاڑ نہیں تھی۔ نفاست سے تراشی ہوئی تھی اور اوپر سے بالوں کی بڑھی ہوئی قلموں سے مل جاتی تھی۔ محسن کے مشورے پر میں نے ہائیڈروجن پر اکسائڈ سے سیاہ رنگ کو سنہری مائل بھورا کر لیا تھا۔

میرے سر کے بال پہلے تو درویشوں جیسے ہو گئے تھے۔ پھر میں نے ایک ہیئر آرٹسٹ کے مشورے سے ان بالوں کو درمیان سے بنانا شروع کیا اور گُدی پر سے بڑھا لیا تھا۔ روانگی سے چند لمحے پہلے میں نے آنکھوں میں نیلے رنگ کے کنٹیکٹ لینسز لگائے تو بقول مرزا غالب کے میں ”ملعون فرنگی“ نظر آنے لگا۔ گاؤن اور گلے میں اسٹیتھسکوپ ڈال کر میرے لیے میو اسپتال کے سیکڑوں جونیئر اور سینئر ڈاکٹروں کی بھیڑ میں شامل ہو جانا کوئی مسئلہ نہیں تھا خصوصاً

اس حالت میں کہ ایک مکمل نرس مکمل ساز و سامان کے ساتھ ہمراہ ہو۔ غالب کو عمداً ٹیم سے ڈراپ کر دیا گیا تھا۔ اس کا ہر جگہ ہمارے ساتھ نظر آنا اور ہر جائے واردات پر پایا جانا دانش مندی کے تقاضوں کے خلاف تھا۔ وہ پس منظر میں رہتے ہوئے ہماری بہت زیادہ مدد کر سکتا تھا۔ اخباری دنیا سے پرانے تعلق کے باعث اس کے مراسم اور اثر و رسوخ کا دائرہ بہت وسیع تھا اور وہ ہر جگہ سے

نہیں لاسکتا تھا۔ غالب کو ہمراہ نہ لے جانے کی اصل وجہ یہی تھی مگر ٹیڈی نے کہا کہ وہ مجسم عاشق ہے اور نازو کو دیکھتے ہی اس کی عقل گھاس چرنے چلی گئی تو وہ اول فول بکنے لگے گا اور سب کا کونڈا کردے گا۔ غالب نے جواب میں کہا کہ عقل آخر بھینس سے بڑی چیز ہے۔ گھاس نہیں کھائے گی تو بھوسا کھائے گی مگر جس کے سر میں پہلے ہی عقل کی جگہ بھوسا بھرا ہوا ہو اس جانور کو خود گھاس کھانی چاہیے۔ ان کی لڑائی محسن نے ٹیکسی اسٹارٹ کرکے ختم کردی۔

میو اسپتال کے اندر پہنچ کر ٹیڈی نے محسن کی جگہ لے لی۔ اس نے مجھے ایمرجنسی کے گیٹ پر اتارا۔ پھر ٹیکسی کو واپس لے گیا اور اسی بلاک کے پیچھے شہلا کو اتار دیا۔ شہلا کے ہاتھ میں ٹرے تھی جس میں چند شیشیاں۔ ایک پیالی میں روئی اور تھرمامیٹر وغیرہ تھے۔ اس کی اور میری ملاقات ایمرجنسی وارڈ کے اندر یوں ہوئی کہ برآمدے کے پچھلے حصّے سے وہ نمودار ہوئی اور دوسری جانب سے میں اندر گیا۔ وہ دائیں جانب مڑی اور میں بائیں طرف مڑا۔ تقریباً ایک ہی جگہ ہم ساتھ ہوگئے۔ اس طرح کہ کسی کو احساس تک نہیں ہوسکا حالانکہ وہاں ایمرجنسی کیس آرہے تھے۔ ان کے ساتھ پولیس والے اور لواحقین جمع تھے۔ ڈاکٹرز نرسیں اور وارڈ بوائے سب کا اجتماع تھا لیکن سب کی مصروفیت اور انہماک کا یا افراتفری کا یہ عالم تھا کہ کسی کو کسی کی طرف دیکھنے کی نہ فرصت تھی اور نہ ضرورت۔ ماتحت نرس کی طرح شہلا مجھ سے دو قدم پیچھے رہی اور میں ڈاکٹروں کی سی شانِ بے نیازی سے کسی کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھے بغیر چلتا گیا۔ ہم تیسرے دروازے سے نکلے اور اسی طرح آرتھو پیڈک یعنی ہڈیوں کے وارڈ تک گئے۔ وہاں محسن گیٹ کے سامنے درخت کے نیچے گم صم کھڑا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ کسی مریض کے ساتھ آیا ہے جس کی حالت تشویش ناک ہے چنانچہ وہ لوٹ کر گھر بھی نہیں جاسکتا اور منتظر ہے کہ موقع ملے تو نظر بچا کے وارڈ کا ایک چکر لگالے۔ بائیں جانب کچھ فاصلے پر ٹیڈی اپنی خاکی بشرٹ اور پتلون کے ساتھ پی کیپ پہنے بالکل ٹیکسی ڈرائیوروں کے انداز میں بونٹ کا سہارا لیے موجود تھا اور کسی سواری کا انتظار کرتا نظر آتا تھا مگر وہ محسن کے اشارے کا منتظر تھا جب اسے ٹیکسی کو ٹھیک وارڈ کے دروازے کے سامنے سیڑھیوں تک لے جانا تھا۔

ہم نے سر کی خفیف سی جنبش سے ایک دوسرے کو سب ٹھیک ہے کا سگنل دیا۔ پھر میں شہلا کے ساتھ اس وارڈ میں سے گزرا جو جنرل وارڈ تھا۔ دو چار مریضوں کے پاس خواہ مخواہ رکا اور ان کے بیڈ سائڈ پر آویزاں چارٹ وغیرہ دیکھے۔ ایک مریض کو تسلی دی جو بہت شور کررہا تھا اور دوسرے کی شکایت سُنی جسے سب سے گلہ تھا۔ نرسوں سے ڈاکٹروں تک اور ناقص دواؤں سے خرابی تقدیر تک۔ اس وارڈ سے نکلتے ہی سیمی پرائیویٹ وارڈ شروع ہوگئے جہاں ایک کمرے میں دو مریض رکھے جاتے تھے۔ میں نے پورے اعتماد کے ساتھ سات نمبر کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوگیا۔ اس وقت کوئی ڈاکٹر پہلے سے موجود ہوتا تو میں اپنی ایک جھلک دکھاتا اور "سوری" کہہ کر دروازہ پھر بند کردیتا۔ دوسرا ڈاکٹر یہی سمجھتا کہ میں غلطی سے سات نمبر میں داخل ہونے والا تھا لیکن اندر نازو کے علاوہ صرف ایک عورت تھی جو غالباً کسی حادثے کا شکار ہوئی تھی۔ اس کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ پر پلاسٹر تھا اور یہ ٹانگ چھت سے معلق اسپرنگ والے ہینگر میں یوں رکھ دی گئی تھی کہ اسے خفیف سا جھٹکا بھی نہ لگے۔

نازو بستر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک لمحے کے لیے اس نے نرس اور ڈاکٹر کے آنے پر بے زاری کے ردِّعمل کا اظہار کیا۔ دوسرے لمحے میں اس نے شہلا کو پہچان لیا۔ اس کے لبوں پر ایک مسرت خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے مجھے غور سے دیکھا۔ کمرے کے باہر دروازے پر بیٹھے ہوئے پولیس کے اے ایس آئی نے ہم پر سرسری نگاہ ڈالی تھی اور پھر اخبار دیکھنے لگا تھا۔ اس کے لیے ایک ڈاکٹر کا کسی نرس کے ساتھ آنا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی اور یہ پوچھنا بھی ضروری نہیں تھا کہ ہم دو میں سے کس مریض کے چیک اپ کے لیے آئے ہیں۔ دوسری زخمی عورت نے آنکھیں کھول کے مجھے دیکھا اور کراہنے لگی۔

"ڈاکٹر صاحب۔ بڑی تکلیف ہے ٹانگ میں۔ کمر تختہ ہوگئی ہے۔ اوپر سے کوئی پوچھنے والا نہیں۔ گھنٹی دبا دبا کے میری انگلیاں درد کرنے لگتی ہیں۔ کوئی پانی پلانے بھی نہیں آتا۔" اس نے ایک ہی سانس میں ذاتی تکالیف اور مسائل کا رونا شروع کیا۔

"ابھی دیکھ لیتے ہیں آپ کو بی بی۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "اس مریض کو ڈسچارج کرنا ہے پہلے۔"

"مجھے تو ڈاکٹر صاحب سوئی لگادیں۔ کچھ آرام آجائے۔ رات بھر نیند نہیں آئی۔" وہ اسی طرح بولتی رہی لیکن میں نازو کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"کیا بات ہے مس نازیا؟" میں نے کہا۔ "تمھارے ساتھ کوئی محافظ نہیں ہے؟"

"بھائی جان ہیں۔" اس نے انگریزی میں جواب دیا۔ "سگریٹ پینے گئے تھے۔ آتے ہی ہوں گے۔" ابھی اس کا جملہ مکمل ہوا ہی تھا کہ شیخ اندر آگیا۔ میں نے فوراً شہلا کی طرف پلٹ کر ٹرے میں سے تھرمامیٹر اٹھالیا اور نازو کے منہ میں لگادیا۔ شیخ چپ چاپ ہمارے پیچھے کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے بلڈ پریشر چیک کرنے والا آلہ اٹھایا اور بیڈ سائڈ پر رکھ کر نازو سے آستین اوپر کرنے کو کہا۔

نازو نے منہ بناتے ہوئے آستین اوپر کرلی اور میں نے ماہر ڈاکٹر کی طرح اس کے بازو پر پٹی لپیٹ کر کس دی جو بلڈ پریشر چیک کرنے والے آلے سے منسلک تھی۔ پھر میں نے ربر کے غبارے کو ہاتھ سے دبا کے ہوا بھرنا شروع کی اور پارے کو اس آلے کی نالی میں چڑھتا دیکھتا رہا۔ ایک خاص بلندی تک پہنچ جانے کے بعد پارا نیچے آنے لگا اور میں نے ہوا کو تھوڑا تھوڑا کرکے نکالتے ہوئے نظر بلڈ پریشر کی ریڈنگ پر رکھی۔

"یو آر فائن مس نازلی۔" میں نے کہا۔ اس وقت میری آواز بھی اتنی بدل گئی تھی کہ شیخ اسی طرح بیٹھا رہا۔ اندیشہ شہلا کی طرف سے تھا مگر اس نے بڑی ہوشیاری سے اپنی پشت اکرام شیخ کی جانب رکھی۔

"یار، یہ تو میں آپ لوگوں سے پہلے بھی کہتی تھی۔" نازلی نے کہا۔

"آپ کے کہنے اور ہمارے کہنے میں فرق ہے۔" میں نے کہا۔ "فیصلہ کرنا ڈاکٹر کا کام ہوتا ہے۔ ابھی آپ کو کمزوری ہے۔ بلڈ پریشر ۷۰/۱۱۰ ہے جو ۸۰/۱۲۰ ہونا چاہیے۔ وزن کچھ بڑھالیجئے۔ سلم رہنے کے شوق میں ڈائٹنگ کا روگ پالنے سے انیمیا بڑھ جائے گا۔"

"میں تو بہت کھاتی ہوں ڈاکٹر صاحب۔" نازو نے کہا۔

"کیا کھاتی ہو؟ اَلّا بَلّا۔" شیخ نے پیچھے سے کہا۔ "یہ بھی بتادو۔ چھولے اور دہی بھلّے۔ قلفی فالودہ۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "بہت زیادہ پروٹین ہونے چاہئیں غذا میں۔ گوشت، انڈے، کلیجی۔ سیب کا جوس ایک گلاس ہر روز پی سکیں تو سب سے بہتر۔ مکمل ریسٹ۔ ویسے کسی چیز سے پرہیز نہیں۔"

"یعنی گول گپّے۔ آلو چھولے۔ دہی بھلّے کھاسکتی ہوں میں؟" نازو نے مسرت سے کہا۔

"ہاں۔ مگر دیکھیے، یہ خوراک نہیں ہے۔ زبان کا چٹخارا ہے۔" میں نے کہا۔ "دوائیں کیا ہیں؟" میں نے میز پر رکھی ہوئی دواؤں پر ایک نظر ڈالی اور پھر چارٹ پر۔ "ایمپی کلاکس بند کردیں۔ آٹرین کیپسول صبح شام۔ درد ہو تو نیاڈول لے لیں ورنہ نہیں۔ سرپکس ایک کردیں۔ صرف رات کو۔ آپ کے ساتھ کون ہے؟"

"بھائی ہیں میرے۔" نازو نے کہا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا اور اکرام شیخ کرسی سے اٹھ کر آگے آیا۔ اس نے اخلاقاً مجھ سے ہاتھ ملایا۔ یہ میرے لیے سب سے خطرناک لمحہ تھا۔ وہ مجھے شناخت کرلیتا تو مجھے اس کو ناک آؤٹ کرنا پڑتا۔ اس کارروائی پر دوسری عورت سائرن کی طرح چلّانے لگتی تو اسے بھی فوراً خاموش کرنا ضروری ہوجاتا لیکن اکرام شیخ نے میری صورت سے زیادہ میری بات پر توجہ دی۔ اس کے ذہن کے کسی گوشے میں بھی یہ شک نہیں تھا کہ میں کوئی جعلی ڈاکٹر ہوں ورنہ وہ بہت ذہین اور انتہائی تیز نظر رکھنے والا آدمی تھا۔

"آپ ان کو گھر لے جاسکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "آفس سے سلپ بنوالیں۔ ایمبولینس کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ٹیکسی میں بھی جاسکتی ہیں۔"

"میرے پاس ٹرانسپورٹ ہے۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "میں گھر فون کرکے والد صاحب کو بلالیتا ہوں۔"

میں نے فقط سر ہلایا اور دوسری عورت کی طرف متوجہ ہوگیا۔ شہلا نے یوں رُخ بدلا کہ وہ میری اوٹ میں رہی۔ اتنی دیر میں اکرام شیخ بھی باہر جانے کے لیے دروازے کا رُخ کرچکا تھا۔ میں نے واجبی سی دلچسپی کے ساتھ دوسرے کیس کو بھی دیکھا۔ شہلا نے نازو کو اٹھ کھڑے ہونے کا اشارہ کیا۔ شہلا میری ہدایات کے مطابق زخمی عورت کا بی پی چیک کرنے کے لیے اس کے بازو پر پٹی لپیٹ رہی تھی کہ میں نے دروازہ کھول کے سر نکالا۔

"انسپکٹر۔ یہ جو صاحب ابھی نکلے تھے۔ انسپکٹر اکرام شیخ۔" میں نے کہا۔ "ذرا اسے فوراً بلالاؤ۔ وہ ایمرجنسی میں گیا ہے ڈاکٹر اشرف کے پاس۔"

انسپکٹر بادلِ ناخواستہ اُٹھا اور پتلون کو اوپر کھینچ کر مخالف سمت میں چل پڑا۔ کاریڈور کے آخری حصّے میں کھڑے ہوئے محسن نے بجواب کپڑوں پر لیب اسسٹنٹ کا سفید کوٹ پہن چکا تھا ایک اسٹریچر کو دھکیل کر آگے لانا شروع کیا۔ ٹائمنگ ابھی تک بالکل ہمارے پلان کے مطابق جارہی تھی۔ محسن کو دروازے پر متعین پولیس والے کے ہٹتے ہی آگے آنا تھا۔ میں نے دروازہ بند کرکے نازو کو نکل جانے کا اشارا کیا۔ شہلا اسے آہستہ سے کہہ چکی تھی کہ انھی کپڑوں میں جانا ہے اور چادر ساتھ لے جانی ہے۔ میں دوبارہ اس زخمی عورت کا معائنہ کرنے لگا۔ اس کے سرہانے بہت سے ایکس رے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے ایک ایکس رے کو روشنی کے رُخ کرکے دیکھا۔ قدرتی طور پر عورت کی نظر بھی اِدھر ہی رہی اور اس نے نازو کو چادر بغل میں دبا کے چوروں کی طرح نکلتے نہیں دیکھا۔ مجھے معلوم تھا کہ باہر کیا ہوگا۔ نازو فوراً اسٹریچر پر لیٹ جائے گی اور شہلا اس پر چادر کو یوں پھیلا دے گی جیسے نیچے کوئی لاش ہے۔ جہاں زندگی اور موت کا کھیل دن رات جاری رہتا ہو اور ہر روز ایسے ہی درجنوں افراد رُخصت کیے جاتے ہوں وہاں اسپتال کا عملہ بالکل متوجہ نہیں ہوتا۔ ان کے لیے وہ زیادہ قابلِ توجہ ہوتے ہیں جن کے لیے زندگی کی جدّوجہد جاری ہو۔ صرف غیر متعلقہ افراد جو مریضوں کے لواحقین ہوتے ہیں، اس سفر کو خوف زدہ نظروں سے دیکھتے ہیں اور دل ہی دل میں دعا کرتے ہیں کہ ان کے عزیز یا دوست کی واپسی یوں نہ ہو۔ وہ بھی اسٹریچر دھکیلنے والوں کی طرف نہیں، اس کی طرف دیکھتے رہتے

ہیں جو امیدِ شفا لے کر آیا تھا مگر نہیں جانتا تھا کہ موت تو پہلے ہی سے یہاں اس کے انتظار میں ہے۔

میں نے عورت کو پھر تسلی دی۔ دروازے کو اندر سے کنڈی لگائی اور کھڑکی کے راستے باہر کود گیا۔ اس عورت کو پہلے تو سمجھ ہی نہ آئی ہو گی کہ ایک معتبر اور سنجیدہ صورت ڈاکٹر نے ایسی حرکت کیوں کی۔ اگر اسے دال میں کالا محسوس ہوا ہو گا تو اس نے گھنٹی کا بٹن دبا کر کسی کو پکارنا شروع کیا ہو گا۔ اس کے سوا وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ اس کے لیے تو بستر سے اُٹھنا بھی محال تھا۔ اسپتال کا عملہ اتنا مستعد نہیں تھا کہ گھنٹی سنتے ہی آجاتا اور دروازے پر بیٹھنے والا اے ایس آئی کہیں ایمر جنسی وارڈ میں شیخ کو تلاش کرتا پھر رہا تھا یا کسی ڈاکٹر اشرف کو پوچھ رہا ہو گا۔ اشرف نام کا ڈاکٹر مل گیا تو زیادہ مزے کی بات ہو گی۔ وہ کہے گا کہ ابھی اے ایس آئی اکرام شیخ آپ کے پاس آیا تھا۔ ڈاکٹر کہے گا کہ میں کسی اکرام شیخ کو نہیں جانتا تو وہ کہے گا کہ اچھا آپ چلیں سات نمبر میں پرائیویٹ میں۔ ڈاکٹر صاحب بلا رہے ہیں۔ ظاہر ہے ڈاکٹر مزید چراغ پا ہو گا کہ ایمر جنسی کا آرتھو پیڈک سے کیا تعلق اور یہاں سے میں وہاں کیسے جا سکتا ہوں۔ کون ہے وہ ڈاکٹر جو مجھے بلا رہا ہے۔ یہ سب سوچتے ہوئے میں نے کھڑکی سے دور ہو کے اینٹوں سے بنے ہوئے تین فٹ چوڑے راستے پر چلنا شروع کیا اور پھر سڑک کی طرف مڑ گیا۔ اسٹیتھسکوپ اب میرے ہاتھ میں تھا۔ بہت سے میڈیکل کے جونیئر طلباء نے مجھے بلا وجہ یا عادتاً سلام کیا۔ میں کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے گیٹ کی طرف سے باہر آیا اور نیلا گنبد تک چلتا گیا۔

دس منٹ تک بے مقصد کھڑے رہنے کے بعد مجھے تشویش ہونے لگی۔ دس منٹ میں ٹیکسی کو یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ اندیشوں نے مجھے گھیر لیا۔ کہیں شہلا اور محسن کا اس وقت تو اکرام شیخ سے آمنا سامنا نہیں ہو گیا جب وہ اسٹریچر کو دھکیلتے لے جا رہے تھے؟ محسن کے پہچانے جانے کے امکانات بھی اتنے ہی تھے جتنے شہلا کے۔ اکرام شیخ بے خیالی میں تو پاس سے گزر جاتا مگر کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا کہ اس کے ذہن میں کیا تھا۔ کہیں یہ نہ ہو کہ وہ مجھے یا شہلا کو پہچان کے بھی انجان بنا رہا ہو اور خاموشی سے باہر نکل گیا ہو۔ تاکہ ہماری گرفتاری کو یقینی بنانے کے لیے صحیح انتظام کر سکے۔

پندرہ منٹ بعد میری بے چینی بڑھ گئی اور میں ہر دس سیکنڈ کے بعد گھڑی دیکھنے لگا۔ ٹیکسی کو پانچ سات منٹ میں پہنچ جانا چاہیے تھا لیکن ٹیکسی دوسری گاڑیوں کی طرح ایک مشین تھی جس کے ان گنت پُرزے اسے حرکت اور قوت دیتے تھے۔ ان میں سے کوئی ایک فعال پُرزہ خراب ہو جائے یا ٹوٹ جائے تو اسے معمولی واقعہ کہا جا سکتا ہے۔ حادثہ یہ صرف ان کے لیے ہوتا جو ٹیکسی میں سوار تھے۔ ٹائر کا فلیٹ ہو جانا تو بہت عام سی بات تھی مگر وہ پہیہ بدلنے لگتے تو اس عمل میں دس منٹ لگ جاتے اور اتنی دیر میں تعاقب کرنے والے آجاتے۔ معاملہ منٹوں کا تھا گھنٹوں کا نہیں۔ دس منٹ سے کم وقت میں اے ایس آئی واپس لوٹ آیا ہو گا جسے میں نے دروازے کی پہریداری سے اُٹھا کے ایمر جنسی وارڈ میں خواری کے لیے بھیج دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اکرام شیخ بھی لوٹا ہو گا اور اندر سے دروازہ بند پانے کے بعد انھیں سمجھنے میں دیر نہیں لگی ہو گی کہ معاملہ کیا ہے۔ دروازہ توڑنا زیادہ مشکل نہ تھا۔ اکرام شیخ جو پچھلی طرف جا کر کھڑکی کے راستے کمرے میں پہنچا ہو گا اور وہاں اس موٹی عورت نے سب کچھ بتا دیا ہو گا جو ایک ٹانگ جھولے میں رکھے لیٹی ہوئی تھی۔ یہ تفتیش تو بعد میں ہو گی کہ وہ ڈاکٹر کون تھا اور وہ نرس کون تھی۔ اکرام شیخ فوراً سمجھ جائے گا اور اپنی بہن کو اغوا کر کے لے جانے والوں کو گولی مار دینے کے لیے دوڑے گا۔ وہ اے ایس آئی جسے دروازے پر پہرا دینے کے لیے بٹھایا گیا تھا مفت میں مارا گیا۔ اس کو فوراً معطل کر دیا جائے گا۔ کوئی یہ عذر قبول نہیں کرے گا کہ حکم دینے والا ڈاکٹر تھا یا کمشنر۔

بیس منٹ بعد میرے وسوسے یقین میں بدلنے لگے کہ محسن اور ٹیڈی کے ساتھ کوئی ایسی بات ہوئی ہے جس نے انھیں روک لیا یا پھر پلان بدل کے کسی اور سمت میں نکل جانے پر مجبور کر دیا۔ میں نے چند سیکنڈ تک سوچا اور پھر واپسی کا فیصلہ کر لیا۔ مجھے دیکھنا تھا کہ وہ نکل چکے ہیں یا اندر ہی پھنس گئے ہیں۔ دوسری صورت میں مجھے ان کی مدد کرنا تھی اور ہر طرح ان کو گرفتار ہونے سے بچانا تھا ورنہ ان پر بہت سے سنگین الزامات عائد ہو جاتے اور ایک طرف تو نئے نویلے میاں بیوی آج رات اپنے بیڈ روم کے بجائے حوالات میں بسر کرتے تو دوسری طرف نازو کو گھر لے جا کر سخت حفاظتی انتظامات کے ساتھ قید کر دیا جاتا۔ واپس جاتے ہوئے مجھے یہ خیال بھی آیا کہ اس بار نازو پکڑی گئی تو والدین اس کے پاگل پن کا روایتی علاج کریں گے یعنی اُسے فوراً بیاہ کر اپنے گھر سے اس بلا کو نکالنے میں ذرا بھی دیر نہیں کریں گے جس کی وجہ سے ان کی ناک کٹنے کا شدید خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔

ٹیکسی وہاں نہیں تھی جہاں میں نے اسے آخری بار دیکھا تھا۔ میں اندر کی سڑکوں سے واقف تھا۔ ٹیکسی اگر اس راستے سے نہیں آسکی تھی جدھر سے میں آیا تھا تو یہ ہو سکتا تھا کہ دوسری طرف کے راستے سے نکل گئی ہو۔ ابھی میں کینٹین کے پیچھے پہنچا ہی تھا کہ میں نے ٹیکسی کو زمین پر بیٹھا ہوا دیکھ لیا۔ اس کے دونوں پچھلے ٹائر برسٹ ہو کر فلیٹ ہو چکے تھے اور غالباً ٹیکسی بے قابو ہو کر ایک درخت کے تنے سے ٹکرا گئی تھی۔ ٹیکسی کے چاروں دروازے کھلے ہوئے تھے اور اندر کوئی نہیں تھا۔ باہر دس گز کے فاصلے پر کچھ لوگ ایک حلقہ بنائے کھڑے ہوئے تھے اور ٹیکسی کے پاس دو مسلح پولیس مین کھڑے سب کو دفع ہو جانے کی تلقین کر رہے تھے لیکن تجسس کے مارے ہوئے تماشا دیکھنے والے زیادہ مستقل مزاج تھے اور وہیں جمع تھے۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر میرا دل ڈوبنے لگا۔ نازو کو بحفاظت نکال لینے کا منصوبہ ناکام ہو گیا تھا اور مجھے معلوم نہیں تھا کہ حضرات و خواتین پر کیا بیتی۔

اگر میں اس مجمعِ عام میں پہنچ کر براہِ راست سوال کرتا کہ ع

جب قافلہ لٹا تو مسافر کہاں گئے ؟ تو ایک ڈاکٹر نظر آنے والے کے لیے بہت نامناسب بات ہوتی۔ براہِ راست پولیس سے بھی کچھ پوچھنے میں خطرہ تھا چنانچہ میں چند قدم کے فاصلے پر کھڑے ہوئے طلباء کے ایک گروپ کی طرف بڑھا۔ گروپ میں دو طالب علم، ایک خاصے دلکش نقوش والی نرس اور ایک واجبی صورت والی طالبہ شامل تھے۔

"یہ کیا ہوا ہے یہاں؟" میں نے آواز کو بارعب بنا کے انگریزی میں کہا اور اپنے پیچھے اشارا کیا۔

"فلمی ڈراما" ایک طالب علم نے ہنس کر کہا۔ "ڈز اٹ ڈز۔ مار دھاڑ بہت دلچسپ سین تھا۔"

"ایک مریضہ کو کچھ لوگ اغوا کر کے لے جا رہے تھے۔" دوسرے نے سنجیدگی سے کہا۔ "وہ اسپتال کے کپڑوں میں تھی پھر ایک پولیس کے آدمی نے ان کا راستہ روک لیا۔ وہ اسکوٹر پر آیا تھا۔" ان سب کے ہاتھوں میں کولڈ ڈرنک کی بوتلیں تھیں۔

"اور اس نے اسکوٹر کو بالکل ٹیکسی کے سامنے لٹا دیا تھا۔ ٹیکسی اس کے اوپر سے گزر جاتی۔" پہلے والے طالب علم نے کہا۔

"لیکن وہ بہت پُھرتیلا تھا۔ اسکوٹر کو بالکل ٹیکسی کے سامنے گرا کے وہ خود جمپ لگا گیا۔" دوسرے نے کہا۔ "ٹیکسی ڈرائیور نے اس کے باوجود ٹیکسی نکال کر لے جانے کی کوشش کی۔ اسکوٹر والے نے دو فائر کیے اور ٹائر پھاڑ دیے۔"

"وہ بھی پولیس والا تو نہیں لگتا تھا۔" نرس نے نیل پالش پر غور کرتے ہوئے کہا۔

"سب پولیس والے وردی میں نہیں ہوتے۔" خوبصورت نرس کے مقابلے میں کم توجہ پانے والی بد صورت طالبہ نے حقارت سے کہا۔

"چلو خیر۔ پکڑے گئے سب کہ نہیں؟" میں نے کہا۔ "اسپتالوں میں بھی اس قسم کی وارداتیں ہونے لگی ہیں۔"

"ابھی تو آپ نے ٹائٹل دیکھا ہے سر۔" پہلے والے طالب علم نے ہنس کر کہا۔ "اصل فلم تو بعد میں شروع ہوئی۔ ٹیکسی کے درخت سے ٹکراتے ہی... آپ کو کِک نہیں لگے گی؟"

"نو پلیز۔" میں نے کہا۔ "کیا وہ سب بھاگ گئے؟"

"ہاں... مگر اس وقت تو ہم نے یہاں کھڑے رہ کر دیکھا کہ ٹیکسی کے رُکتے ہی دروازہ خود بخود کھل گیا اور اندر سے ایک عورت باہر آ گری جس نے اسپتال کے مریضوں کے کپڑے پہن رکھے تھے۔" دوسرے طالب علم نے کہا۔ "ہم بھی سمجھے کہ وہ بے ہوش ہے۔ باہر گر کے بھی وہ پڑی رہی اور وہ پولیس افسر بالکل سر پر پہنچ گیا جس نے فائر کر کے ٹیکسی روک دی تھی۔ اس نے چلا کر کہا کہ خبردار جو کسی نے باہر آنے کی کوشش کی۔ ابھی وہ اتنا ہی بولا تھا کہ بے ہوش پڑی ہوئی عورت..."

"عورت نہیں۔ وہ بڑی خوبصورت لڑکی تھی۔" پہلے غیر سنجیدہ اور چھبیلے طالب علم نے کہا۔ "بالکل فلم اسٹار رانی۔"

"اس لڑکی نے ایک دم اچھل کر ٹیکسی پر فائر کرنے والے کو ناک آؤٹ کر دیا۔" دوسرے طالب علم نے مسکرا کے بات جاری رکھی۔ "اس نے ایک ہاتھ مار کے ریوالور گرا دیا اور دوسرا ہاتھ مار کے ریوالور والے کو۔"

"بالکل بجلی تھی بجلی۔" پہلا طالب علم بولا۔ "میں بال بال بچ گیا ورنہ وہاں لیٹا ہوتا۔" اس نے ہاتھ سے اشارا کیا۔ "میں کچھ ہیرو بننے کی سوچ رہا تھا مگر ہوا یہ کہ دو اچھے خاصے پہلوان ٹائپ مرد آگے بڑھے اور پلک جھپکتے میں غتربود ہو گئے! فلیٹ ہو گئے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے انجان بن کے کہا۔

"مارے گئے۔ ملیہ ہو گیا ان کا۔ اندر باہر سے۔" پہلا طالب علم ہنسا۔ "وہ لڑکی جوڈو کراٹے جانتی تھی۔ ایسے ہاتھ پیر چلائے اس نے کہ جو آگے بڑھا اس کا چورا ہو گیا۔ وہ اپنی مرضی سے اغوا ہو کے جا رہی تھی۔ بلکہ مجھے تو شک ہے کہ وہی اغوا کنندہ تھی۔"

"یہ تمھیں کیسے معلوم ہوا؟" میں نے مسکرا کے کہا۔

"اس لیے کہ سب کچھ تو اسی نے کیا تھا۔" پہلا لڑکا بولا۔ "مگر کیسے پڑی رہی اور تم سے زیادہ تندرست مرد جس کے ہاتھ میں ریوالور تھا اس کے دھوکے میں آگیا۔ چند سیکنڈ میں اس نے میزیں اُلٹ دیں۔ یہ انگریزی محاورہ ہے۔ پھر اس نے دخل در معقولات کرنے والوں کو فنا کیا اور ریوالور اُٹھا لیا۔ اس نے چلا کے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ یار نکل جاؤ۔ وہ بھی کم نہیں تھے۔ وہ ٹیکسی سے نکلے اور انھوں نے ڈاکٹر کیکٹس کو روک کر اس کی موٹر سائیکل چھین لی۔"

"کون ڈاکٹر کیکٹس؟" میرے مُنہ سے بلا ارادہ نکل گیا۔

"آپ ڈاکٹر کیکٹس کو نہیں جانتے؟" نرس نے بے حد اٹھلا کر حیرت کا اظہار کیا۔ "وہی اناٹومی والے۔ جن کے باغ میں کچھ بھی نہیں ہے سوائے ہر قسم کے کیکٹس کے۔"

"اچھا... وہ" میں نے کہا "پھر وہ لڑکی کدھر گئی؟"

"ابھی اس کی تلاش جاری ہے۔" پہلا طالب علم ہنسا۔ "اگر وہ پکڑی گئی تو میڈیکل بورڈ چیک اپ کرے گا کہ وہ لڑکی تھی، بھوت یا چھلاوہ۔ اُدھر اس کے دونوں ساتھی موٹر سائیکل لے کر بھاگ گئے اِدھر وہ فرار ہوگئی۔ کسی نے اس کا پیچھا نہیں کیا۔ خالی ہاتھ بھی وہ کم خطرناک نہیں تھی۔ ریوالور اٹھا لینے کے بعد تو وہی اس کے سامنے جا سکتا تھا جس کے ہاتھ میں توپ ہو۔"

ان کی گفتگو میں ابھی تک شہلا کا کوئی حوالہ نہیں آیا تھا۔ نازو نے ایک مرتبہ پھر اپنے بھائی کا راستہ روکنے کے لیے اس پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ شیخ بعد میں اس دن کو روئے گا جب اس کے گھر والوں نے نازو کو جوڈو کراٹے کی تربیت حاصل کرنے کی اجازت دی تھی، نازو نے دلیل دی ہوگی کہ اپنے دفاع کے لیے اپنے ہاتھ پیر استعمال کرنے کا فن سب کو آنا چاہیے۔ خصوصاً لڑکیوں کو جن کو کمزور سمجھ کے اس معاشرے میں غلط قسم کے لوگ راستہ بھی نہیں چلنے دیتے۔ اب یہ دفاع کا فن اپنے ہی گھر والوں کے لیے مصیبت بن گیا تھا۔ بڑے بھائی جو تھانیدار تھے مسلح ہونے کے باوجود پٹ گئے تھے محسن اور ٹیڈی بھی موٹر سائیکل پر نکل بھاگے تھے۔ ان کے ساتھ شہلا ہوتی تو اس گروپ کے چار افراد مجھے یہ بھی بتلاتے کہ موٹر سائیکل پر دونوں مردوں کے ساتھ ایک نرس بھی فٹ ہوگئی تھی۔ وہ اس واردات کے عینی شاید تھے اور اس وقت بھی یہیں کھڑے سردی کے موسم میں ٹھنڈا کوکا کولا پی رہے تھے جب یہ واردات ہوئی۔ ایک نرس دوسری نرس کو یوں فرار ہوتا دیکھتی تو چپ نہ رہتی مگر ان میں سے کسی نے شہلا کا ذکر تک نہیں کیا تھا۔ ان سے یہ پوچھنے میں کوئی عقلمندی نہیں تھی کہ کیا ان کے ساتھ ایک خوبصورت سی نرس نہیں تھی اور وہ مار دھاڑ کرنے والی حسینہ فرار ہو کے کس سمت گئی۔

میں نے باوقار طریقے پر "تھینکس" کہا اور کینٹین میں داخل ہوگیا۔ جب میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ مجھے بڑی عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اس کی متعدد وجوہ تھیں۔ انھیں میرا چہرہ اجنبی لگا ہوگا۔ میری دلچسپی انھیں عجیب لگی ہوگی اور ان کو میرا اس کینٹین میں جانا عجیب لگا ہوگا جو نچلے درجے کے یعنی پیرا میڈیکل اسٹاف کے لیے تھی۔ ڈاکٹرز کی کینٹین دوسری طرف تھی اور عموماً ڈاکٹر اپنے کمپلکس کے باعث بھی اس طرف آنا کسرِ شان سمجھتے تھے۔ میں نے سگریٹ کا ایک پیکٹ خریدا اور فوراً باہر نکل آیا لیکن واپسی کے بجائے میں دوسری طرف روانہ ہوگیا۔ صرف یہ ثابت کرنے کے لیے کہ جائے واردات اور کینٹین میرے راستے پر آگئے تھے، اس لیے میں رک گیا تھا۔ کینٹین کے پیچھے ایک بیرک تھی۔ بیرک کا چکر کاٹ کر میں پھر اسپتال کی مرکزی عمارت کی جانب ہو لیا۔ میرا ذہن سخت الجھن میں مبتلا تھا۔ میں یہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھا کہ ان حالات میں مجھے لوٹ جانا چاہیے یا نازو کو اور شہلا کو تلاش کرنا چاہیے آخر محسن اور ٹیڈی کے ساتھ شہلا کیوں نہیں تھی؟ اور اگر تھی تو وہ اس کو کیوں چھوڑ گئے۔ مجھے یہ بات ناممکن نظر آتی تھی کہ محسن جیسا عاشقِ زار شوہر اپنی دلہن چھوڑ کر بھاگ جائے۔ یا تو شہلا پہلے ہی الگ ہوگئی تھی یا حادثے کے بعد وہ کسی اور طرف نکل جانے میں کامیاب نہ ہی تھی اور محسن نے دیکھ لیا تھا کہ شہلا خطرے کی حدود سے دور جا چکی ہے۔

مرکزی عمارت میں وہی گہما گہمی اور آنے جانے والوں کا رش تھا۔ کہیں کوئی ہلچل نظر نہیں آتی تھی۔ اکرام شیخ کو شاید ایمرجنسی میں پہنچایا گیا ہوگا جہاں ابتدائی طبی امداد کے بعد وہ ہوش میں آگیا ہوگا اور اب وہ بھی اسپتال میں اسی طرح پھر رہا ہوگا جیسے جنگل میں زخم خوردہ شیر گھومتا ہے۔ اس نے پولیس بلالی تھی یا واردات کے بعد پولیس خود آپہنچی تھی۔ اگر اسے معلوم ہوا ہوگا کہ ٹیکسی میں سے نکلنے والے دو مرد تو ایک موٹر سائیکل چھین کر بھاگ گئے تھے مگر وہ لڑکی جس نے اچھے خاصے مردوں کو تہس نہس کر دیا تھا اندر کی طرف گئی تھی تو ممکن ہے وہ نازو کو تلاش کرے۔ مریضوں کے کپڑے پہن کر وہ گیٹ سے باہر نہیں نکل سکتی تھی لیکن نازو سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ گیٹ کیپر کو بھی لٹا دے۔ ایک دھان پان سی لڑکی کے سامنے آکر سب غلط فہمی میں مارے جاتے ہیں۔ آنکھیں اس کے چکا چوند پیدا کرنے والے حسن کا نظارہ کرتی رہ جاتی ہیں اور ذہن سوچ بھی نہیں سکتا کہ اتنی نازک کمزور اور دبلی پتلی سی لڑکی جو نقشِ چغتائی نظر آتی ہے آفت کی پرکالہ ہے۔ برقِ خرمن بار ہے اور آتشِ سوزاں ہے۔

میں محتاط طریقے پر اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا کہ میں نے ہلکی سی "شش" سنی۔ میرے قدم رک گئے اور میں نے پلٹ کر اس گوشے میں دیکھا جو ایک دیوار کے ستون اور زینے کے نچلے حصے میں تھا۔ وہاں شہلا دبکی کھڑی تھی۔

"تم... یہاں کیا کر رہی ہو بے وقوف؟" میں نے اس کی طرف پشت کر لی۔

"میں نازو کو تلاش کر رہی تھی۔" وہ بولی۔

"یہ کون سا طریقہ ہے تلاش کرنے کا کہ کونے میں گھسی ہوئی ہو؟" میں نے خفگی سے کہا۔ "تم کو نکل جانا چاہیے تھا۔"

"وہ... جیسے آپ گزرے اور میں نے دیکھ لیا۔ ایسے ہی میرا خیال تھا کہ کہیں نازو بھی مل جائے گی۔" وہ بولی۔ "میں اس سے پہلے تین بار جگہ بدل چکی تھی۔ آپ کے جانے کے بعد۔"

"مجھے سب معلوم ہو چکا ہے۔" میں نے کہا۔ "کہ محسن اور ٹیڈی بھاگ گئے۔ تم کو کسی نے نہیں دیکھا تھا؟"

"جب اکرام شیخ ہمارے پیچھے آیا تو ہم گھبرا گئے تھے۔ نازو نے کہا کہ میری فکر مت کرنا۔ جیسے موقع ملے وہ نکل جائے۔" شہلا نے کہا۔ "حادثہ ہوا تو وہ باہر گر گئی۔ دوسری طرف کا دروازہ خود ہی کھل گیا تھا۔ میں چپ چاپ نکل کر وہیں کھڑی ہوگئی تھی۔ میں نے نازو کو بھائی سے لڑتے دیکھا تھا۔ محسن کو میری فکر تھی لیکن میں نے اسے اشارہ کر دیا کہ نکل جائے۔ وہاں کچھ میڈیکل کے لڑکے ایک نرس کے ساتھ کھڑے تھے۔ ایک اور لڑکی بھی تھی۔ وہ یہی سمجھے کہ میں پہلے سے اس جگہ موجود تھی اور حادثے کا شکار ہوتے ہوتے رہ گئی۔ انھوں نے مجھے پیچھے گھسیٹ لیا تھا۔"

"میں ان سے مل چکا ہوں۔ انھوں نے ہی سب بتایا تھا مجھے۔"

"لوگ بھی یہی سمجھے کہ میں ادھر سے گزر رہی تھی۔ اِدھر نرسوں کی ایک کینٹین ہے۔" شہلا بولی۔ "میں اندر جا کے بیٹھ گئی تھی۔"

اچانک میری نگاہ نے اکرام شیخ کو دیکھ لیا۔ وہ لوگوں کی بھیڑ سے بچتا بچاتا میری طرف آرہا تھا اور اس کی نظر ہر چہرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ "شہلا۔ اب یہاں مت رکنا۔" میں نے کہا۔ "اکرام شیخ آرہا ہے۔ سیدھی گھر جانا یہاں سے۔" اتنی دیر میں اکرام شیخ بہت قریب آچکا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا اور میں نے جان لیا کہ اس کی نگاہ میری صورت کے اصل نقوش میں شناسائی کے آثار تلاش کر چکی ہے۔ ظاہری تبدیلی نے اسے وقتی طور پر دھوکا دیا تھا۔ غور سے دیکھتے ہی وہ مجھے پہچان گیا۔ میں ایک دم پلٹا اور بھاگا۔ میرے لیے سب سے بڑے اطمینان کی بات یہ تھی کہ شیخ کے پاس ریوالور نہیں ہے۔ اس کا ریوالور نازو لے جا چکی تھی۔ اس نے بھائی کو معمولی سے وار سے بے ہوش کیا تھا۔ چنانچہ ہوش میں آتے ہی اکرام شیخ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

مجھے فرار ہوتا دیکھ کر شیخ میرے پیچھے لپکا۔ میں نے برآمدے میں دوڑتے ہوئے ایک نرسنگ بوائے کو گرایا۔ دو نرسیں چیخ مار کر ہٹ گئیں ورنہ میں اس گاڑی کی طرح ان پر سے گزر جاتا جس کے بریک فیل ہوگئے ہوں۔ برآمدے میں بھگدڑ مچ گئی تھی۔ شیخ مسلسل میرے تعاقب میں تھا اور مجھے اپنے دائیں ہاتھ پر دروازے نظر آرہے تھے مگر میں رسک نہیں لے سکتا تھا کہ کسی کمرے میں محصور ہو جاؤں۔ دوسری طرف کھلا میدان سا تھا لیکن لمبی دوڑ میں میرا پکڑا جانا ممکن تھا کیونکہ شیخ اب شور بھی مچا رہا تھا۔ اس کی "پکڑو۔ پکڑو" سن کر ایک ساڑھے چھ فٹ قد کے گوریلے نے میری راہ میں مزاحم ہونے کی غلطی کی۔ اسے اپنے ڈیل ڈول پر ناز تھا۔ وہ بالکل میرے سامنے آگیا اور ہاتھ پھیلا کے کھڑا ہوگیا۔ اس کے قدم فرش پر مضبوطی سے جمے ہوئے تھے۔ میں ایک سیکنڈ کے لیے رک گیا اور اسے حملہ کرنے کا موقع دیا۔ اس نے اپنے بڑے بڑے ریچھ جیسے بازوؤں میں مجھے گھیرنے کے لیے جست لگائی اور میں نے ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا۔ وہ زد میں آگے آیا تو اسے دوسرے ہاتھ سے اوپر اٹھایا اور سر سے گزار کے پیچھے پھینک دیا۔ وہ فرش پر دھماکے سے گرا اور گلا پھاڑ کے چلایا۔ "ہائے رب جی!" میرے پیچھے دوڑنے والے دو چار جیالے اس رکاوٹ کے اچانک سامنے آجانے سے منہ کے بل گرے۔ سامنے والوں نے ہائے رب جی کی فریاد سن کر عبرت پکڑی اور مجھے راستہ دے دیا لیکن میں نے پلٹ کر دیکھا تو شیخ بدستور میرے تعاقب میں تھا۔

"سکندر۔ رک جاؤ۔ سکندر۔ ورنہ میں گولی مار دوں گا۔" وہ چیخ کر بولا۔ "تم بچ کر نہیں نکل سکتے سکندر بخت۔" اس کی دھمکی کا مجھ پر کیا اثر ہوتا لیکن اس کی چالاکی نے مجھے قائل کیا۔ میرا نام بار بار لے کر وہ گواہ پیدا کر رہا تھا کہ جس شخص کا وہ تعاقب کر رہا تھا وہ سکندر بخت تھا۔ کل کو وہ ثابت کر سکے گا کہ ڈاکٹر کے بھیس میں نازو کو اغوا کرنے والا سکندر بخت ہی تھا اور اسی نے اسپتال میں اتنی ہڑبونگ مچائی تھی۔ اس کے اور میرے درمیان مشکل سے بیس قدم کا فاصلہ ہوگا۔ میں نے برآمدے کی دیوار کے ساتھ ایک خالی اسٹریچر دیکھا اور رک کر اسے زور سے پیچھے دھکا دیا۔

"میرا ناں استاد پیڈرو ہے ڈڈو۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "چوہدری دلاور دا پتھا آں میں۔" یہ بات ان سب نے سنی جو اکرام شیخ کے ساتھ ہوگئے تھے۔ لوگ یہ نہیں سوچتے کہ بھاگنے والا مجرم ہے یا اپنی جان بچا کے بھاگ رہا ہے۔ وہ پکڑنے والے کا ساتھ دینے لگتے ہیں۔ اکرام شیخ نے اسٹریچر کو تیزی سے اپنی طرف آتے دیکھا اور اپنی اسپیڈ پر کنٹرول نہ کر سکا۔ وہ اسٹریچر سے ٹکرایا اور میں پلٹ کر بھاگا۔ میرے سامنے اوپر سے ایک لفٹ آکر رکی اور اس میں سے چار مرد عورتیں باہر آئے۔ دو آدمی آگے بڑھے ہی تھے کہ میں نے انھیں دھکا دیا اور وہ دور جا گرے۔ لفٹ مین نے منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے اسے گھسیٹ لیا۔ میں نے ایک بار پھر دہرایا کہ میں کون ہوں اور دھمکی دی کہ کسی نے لفٹ میں قدم رکھا تو مارا جائے گا۔ اس کے باوجود اکرام شیخ عین اس وقت اندر پہنچ گیا جب لفٹ کا دروازہ بند ہو رہا تھا اور میں اسے ساتویں فلور تک لے جانے کے لیے بٹن دبا چکا تھا۔

دروازہ بند ہونے سے قبل ہی میں نے اکرام شیخ کو دبوچ کر دیوار سے لگا دیا۔ "کیا چاہتے ہو تم آخر؟" میں نے غرا کے کہا۔ "مجھے گرفتار کرنا؟ ایسا نہ تمھاری زندگی میں ہوگا اور نہ میری زندگی میں۔"

"تم... تم مجھے صرف اتنا بتا دو کہ نازو کہاں ہے؟" اکرام شیخ

ہانپتے ہوئے بولا۔

"اسے میں نہیں لے گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "وہ محسن اور ٹیڈی کے ساتھ گئی تھی۔"

"لیکن اس گروہ کے سرغنہ تم ہو۔ یہ سارا پلان تمھارا تھا۔ تم اچھی طرح جانتے ہو۔"

"میں کمرے میں رہ گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "مجھے نہیں معلوم کہ باہر کیا ہوا۔ لوگوں نے نازو کو الگ فرار ہوتے دیکھا تھا۔"

لفٹ اوپر پہنچ چکی تھی۔ میں نے پھر گراؤنڈ کا بٹن دبا دیا۔ لفٹ رکی اور پھر نیچے چلنے لگی۔

"میں تم سے کچھ نہیں کہوں گا۔ اب میرا پولیس سے کوئی تعلق نہیں رہا۔" وہ بولا۔ "بس تم نازو کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔"

"میں نے ہمیشہ نازو کو یہی سمجھایا ہے کہ وہ گھر میں رہے۔" میں نے کہا۔ "اس سے کبھی نہیں کہا کہ ہمارا ساتھ دے۔ اگر وہ خود ہی گھر میں رہنا نہیں چاہتی تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔"

"سب قصور تمھارا ہے۔" اکرام شیخ نے چیخ کر کہا۔ "جب تک اس نے تمھیں نہیں دیکھا تھا وہ ایک شریف لڑکی تھی۔"

"وہ اب بھی ایک شریف اور معصوم لڑکی ہے۔" میں نے اکرام شیخ کا گلا دبوچ لیا۔ "اگر وہ ہمارے ساتھ رہے گی تو یہ مت سمجھو کہ وہ بدمعاشوں کے ساتھ رہے گی۔ ہم اس کی عزت کرتے ہیں۔ ہر عورت کی عزت کرتے ہیں جو کسی کی ماں ہوتی ہے یا بہن اور بیٹی ہوتی ہے۔ ہم اس کی عزت کی حفاظت کرنے کے اہل ہیں۔ اس بارے میں ہمیں کوئی شبہ نہیں۔" میں نے لفٹ کو پھر اوپر جانے کے لیے بٹن دبا دیا۔

"سکندر۔ میں تمھارا دوست تھا۔ اب بھی دوستی کا وہ پرانا رشتہ استوار ہو سکتا ہے۔" اکرام شیخ نے کہا۔

"رشتہ جو ٹوٹ جائے اس میں گرہ آجاتی ہے۔" میں نے کہا۔ "تمھاری اور میری دوستی مختلف حالات میں ہوئی تھی۔"

"حالات پھر بدل گئے ہیں۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "میں پھر تمھارے ساتھ ہوں۔" میں نے لفٹ کو اوپر ہی روک دیا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "ہماری فطرت ایک ہے مگر ہمارے جذبات کی نوعیت الگ ہے۔ تمھارے والد بھی ایک شریف، امن پسند اور قانون پرست شہری ہیں، تم انھی کے بیٹے ہو۔ تمھارے ساتھ وہ سب نہیں ہوا جو میرے ساتھ ہوا۔ ہوتا تو تم خود کو قانون کے حوالے کر دیتے اور اس کے فیصلے کو غلط ہونے کے باوجود قبول کر لیتے۔ جو کچھ میں کر چکا ہوں وہ تم کبھی نہ کرتے۔ میں ایک باغی ہوں۔ مجرم ہوں اور تمھارے قانون کی نظر میں چور، ڈاکو اور قاتل ہوں۔ صرف میں جانتا ہوں کہ میں کیا ہوں یا میرا خدا جانتا ہے۔

میرا ضمیر صاف ہے مگر اس ضمیر کو عدالت میں پیش نہیں کیا جا سکتا اور قانون کی نگاہ ضمیر کو نہیں دیکھ سکتی۔ میرے سامنے ایک مشن ہے جو میرے نزدیک جائز ہے اور بہت نیک ہے۔ اتنا اہم اور مقدس ہے کہ میں اس کو جہاد سے کم نہیں سمجھتا لیکن مجبوری یہ ہے کہ میں تم کو اس میں شریک نہیں کر سکتا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم بھی اس کو جہاد سمجھو گے مگر تمھارے اور میرے طریق کار میں بڑا فرق ہے۔ تم قانونی راستہ اختیار کرو گے۔ مجھے ڈر ہے کہ اس راستے کو اختیار کرنے سے شکست میری ہوگی کیونکہ دشمن بہت طاقت ور ہیں اور بہت با اثر ہیں۔ قانون کے لمبے ہاتھ ان کو چھو بھی نہیں سکتے۔ وہ چھپ جائیں گے یا فرار ہو جائیں گے۔ مجھے اپنے راستے سے ہٹا دیں گے اور میرے مشن کو ناکام بنا دیں گے کیونکہ ان کے ساتھی ہمارے اپنے بھی ہیں۔ ہماری صفوں میں غدار ہیں۔ ففتھ کالم کہلانے والے ہیں۔ اس لیے میں مجبور ہوں اکرام شیخ۔ شاید پھر کبھی ہم ملیں گے تو دوست ہوں گے۔"

وہ میری بات بڑے دھیان سے سن رہا تھا جب میں نے یکلخت اس کی کنپٹی پر مکا مارا اور وہ وہیں کھڑے کھڑے دیوار کے ساتھ سرکتا ہوا لفٹ کے فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ میں نے دروازہ کھولا اور زینے کی طرف چلنے لگا۔ زینے کے راستے کچھ لوگ شور مچاتے اوپر آ رہے تھے۔ میں نے ان سب کو اوپر آنے کا موقع دیا۔ چار جوان آدمی یکے بعد دیگرے بے خبری میں میرے ہاتھ لگے اور بلا مقابلہ لیٹ گئے۔ میں نے گاؤن اتار کے اسٹیتھسکوپ کے ساتھ پھینکا اور تیزی سے نیچے اترنے لگا۔

"وہ نیچے بھاگ گیا۔" میں نے چلا کر کہا اور اوپر آنے والے کچھ لوگ فوراً پلٹ گئے۔ انھوں نے فرض کر لیا کہ یہ آواز آگے جانے والے چار افراد میں سے کسی کی تھی۔ سیکنڈ فلور پر آ کے میں نے لفٹ کو بہت پیچھے چھوڑ دیا۔ اس فلور پر وارڈ تھے جہاں سے ملاقاتی نکالے جا رہے تھے۔ ملاقات کا وقت تو بہت پہلے ختم ہو چکا تھا مگر ڈھیٹ قسم کے لوگ اندھیرا ہونے تک براجمان تھے۔ مجھے ان سب کے درمیان مل کر نکلنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ وہ طویل برآمدے کے دوسرے کنارے والے زینے سے اتر رہے تھے۔ میں اسی ہجوم میں شامل رہا اور محفوظ رہا۔ مجھے اس اندھیرے نے بھی پناہ فراہم کی جو میو اسپتال کے زینے میں بلب نہ ہونے کے باعث پھیلا ہوا تھا۔ فیوز ہو جانے والے بلب کو بدلنے کی ضرورت پر کسی نے توجہ نہیں دی تھی اور بدانتظامی کا یہ بہت چھوٹا سا نمونہ تھا۔ اتنا چھوٹا کہ اس کی اہمیت ہی نہ تھی۔

پبلک کے اس ریلے نے مجھے باہر پہنچا دیا ورنہ ہر گیٹ

پر پولیس موجود تھی۔ یہ بے حسی اور عدم دلچسپی قومی مزاج کا ایک حصہ بن گئی تھی جس نے فرض شناسی میں مستعدی اور دیانت داری کے جذبے کو کھا لیا تھا۔ پولیس نے گیٹ پر ناکا بندی کر کے ضابطے کی کارروائی ضرور پوری کی تھی مگر اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا تھا۔ انھوں نے پہلے سے فرض کر لیا ہوگا کہ اتنے بڑے اسپتال میں ایک مجرم دو دن روپوش رہ سکتا ہے یا اس کے دس دروازوں میں سے جب چاہے نکل سکتا ہے۔ معلوم نہیں اس کی داڑھی اصلی تھی یا نقلی۔ وہ سوٹ پر سفید گاؤن پہن کر آیا ہوگا تو صرف سوٹ میں نکل جائے گا۔ چالاک مجرم تو برقع اوڑھ کر بھی نکل جاتے ہیں۔ چونکہ پولیس بہت زیادہ تردد کرنا نہیں چاہتی تھی اس لیے وہ بہت سے بہانوں کی آڑ لے سکتی تھی۔ دوسری بار نیلا گنبد پہنچ کر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر چائے پینے کے بعد میں نے سگریٹ جلائی اور اس عرصے میں شہلا کے اور نازو کے بارے میں سوچتا رہا۔ محسن اور ٹیڈی کی مجھے قطعی فکر نہیں تھی۔ وہ اب تک خیریت کے ساتھ گھر پہنچ چکے ہوں گے اور ہماری واپسی کے شدت سے منتظر ہوں گے۔ شہلا کے لیے بھی واپسی کے راستے کھلے ہوئے تھے۔ صرف نازو کے متعلق کچھ بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا۔ وہ راستے کی ہر رکاوٹ کو دور کرنا جانتی تھی اور دس مردوں کا حلقہ توڑ کر نکل سکتی تھی لیکن الجھن یہ تھی کہ نکل کر وہ کہاں جائے گی۔

اچانک مجھے ایک اور خیال آیا۔ نازو جسمانی طور پر بالکل فٹ تھی۔ اگر اسے گولی لگی تھی تو اس کا زخم سطحی تھا یا اسے صرف خراشیں آئی تھیں۔ وہ خود بھی تو اسپتال سے اسی طرح مار دھاڑ کر کے فرار ہو سکتی تھی۔ پھر اس نے غالب کو پیغام کیوں بھیجا تھا؟ وہ غالب سے پوچھ سکتی تھی کہ آج کل تم لوگوں کا ٹھکانا کہاں ہے۔ شاید وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ اب ہم اسے لینے آتے ہیں یا نہیں۔ ہم نے تو خود ہی اسے واپس اپنے گھر والوں کے سپرد کر دیا تھا۔ اس کا خیال ہوگا کہ ہم انکار کر دیں گے۔ اس نے غالب کو آزمایا۔ ہر عورت جانتی ہے کہ وہ کسی شہ زور مرد کی کمزوری بن سکتی ہے۔ وہ غالب کی نظر کا مفہوم سمجھ چکی تھی اور اس کے دل کی آواز سن چکی تھی۔ میری طرف سے مایوسی نے اس کو غالب کی طرف ملتفت کیا تھا۔ آہستہ آہستہ غالب نے اس کے خیالوں میں جگہ بنا لی تھی۔ آگ جو پہلے ایک طرف لگی تھی اب دونوں طرف تھی برابر لگی ہوئی۔ نازو نے غالب کو پیغام بھیجا کہ میرے لیے کچھ کر سکتے ہو تو آؤ اور مجھے لے جاؤ۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ جیت بالآخر کس کی ہوتی ہے۔ مصلحت کے تقاضوں کی یا وارفتگی عشق کی۔ عقل کی یا جنون کی۔

اب مجھے کوئی شبہ نہیں رہا تھا کہ نازو نے ہمیں کیوں بلایا تھا۔ میں یہ بھی سمجھ چکا تھا کہ اسپتال سے نکل کر وہ کہاں جائے گی۔ شہلا احمق تھی جو اسپتال میں اسے تلاش کرتی پھر رہی تھی۔ میں اٹھ کر کاؤنٹر تک گیا اور ٹیلی فون کرنے کی اجازت مانگی۔

"غالب سے بات کرنا ہے۔" میں نے آپریٹر کی آواز سن کر کہا۔

"غالب صاحب آئے تھے۔ واپس چلے گئے۔" آپریٹر نے کہا۔ "آپ کون صاحب ہیں؟"

"میں ان کا چچا ہوں۔ وہ کچھ بتا کے نہیں گئے؟" آپریٹر نے نفی میں جواب دیا۔

"وہ کسی خاتون کے ساتھ گئے ہیں؟" میں نے کہا۔ "دبلی پتلی نازک سی لڑکی کے ساتھ؟"

"جی... جی...!" آپریٹر نے حیرانی سے کہا۔ "کہہ کر گئے تھے کہ ابھی آتا ہوں۔ کوئی پیغام؟"

"پیغام؟" میں نے سوچ کر کہا۔ "ہاں... کہہ دینا... آئے ہے بیکسیٔ عشق پہ رونا غالب" اور فون رکھ دیا۔ بل ادا کر کے میں باہر نکلا اور رکشا میں بیٹھ گیا۔ رات کے آٹھ بجے میں شہلا اور محسن کے گھر پہنچا تو حسب توقع وہاں سب موجود تھے۔ شہلا کچھ دیر پہلے پہنچی تھی اور نازو اس کے بعد غالب کے ساتھ آئی تھی۔ اب ان کو میرا ہی انتظار تھا۔

"مجھے تو فکر ہونے لگی تھی آپ کی طرف سے۔" شہلا نے کہا۔ "میں تو اسی وقت نکل آئی تھی۔"

"میں ذرا مس نازو کے ڈرامے کا آخری سین کر رہا تھا۔" میں نے کہا۔ "خاصے لوگ بلاوجہ پٹے۔"

"ہم نے ایک شریف آدمی کو موٹر سائیکل سے اتار کے پھینک دیا تھا۔" محسن ہنسا۔ "اس کی موٹر سائیکل میوزیم کے سامنے کھڑی ہے۔"

"ہاں۔ وہ ڈاکٹر کیکٹس تھا۔" میں نے کہا۔ "وہ بھی آتا ہی ہوگا یہاں۔ ممکن ہے اس کے ساتھ اکرام شیخ بھی آ پہنچے۔"

"اسے کیا معلوم کہ اب ہم کہاں ہیں!" محسن نے کہا۔

"یہ نازو سے پوچھو۔ آخر کیا ضرورت تھی اس کو غالب کے نام ایس او ایس بھیجنے کی۔" میں نے برہمی سے کہا۔ "کیا یہ خود نکل کر نہیں آ سکتی تھی؟"

"نکل کر یہ کہاں جاتی؟ اس کو بھی ہمارے موجودہ ٹھکانے کا علم نہیں تھا۔" ٹیڈی نے کہا۔

"تم سب گدھے ہو۔" میں نے کہا۔ "اب نازو یہاں تک کیسے آ گئی؟ یہ غالب کے پاس پہنچی اور غالب اسے یہاں

ہے آیا۔ کیا ہم سب کو وہاں بلا کے ہنگامہ آرائی کا خطرہ مول لینے پر مجبور کرنا ضروری تھا۔ میں تو سمجھا تھا کہ نازو زخمی ہے اور جسمانی طور پر اُٹھنے کے بھی قابل نہیں۔ اس طرح تو یہ خود بھی نکل سکتی تھی۔ اکرام شیخ کو اس نے ناک آؤٹ کر دیا تو وہ تھانیدار جو دروازے پر بیٹھا تھا، کیا اسے ناک آؤٹ کرنا مشکل تھا۔ پھر جیسے یہ اب پہنچی غالب کے پاس اسی طرح پہنچ جاتی۔"

"یا بسمجھے معلوم تھا کہ تم شک کرو گے۔" نازو نے افسردگی سے کہا۔

"شک کی بات نہیں۔ تم نے بے وقوفی کی۔ خدانخواستہ ہم میں سے کوئی وہاں پھنس جاتا تو کیا ہوتا؟" میں نے کہا۔ میری بات دوسروں نے بھی سمجھ لی تھی اور سب کی سوالیہ نظریں اب نازو پر جمی ہوئی تھیں۔

"مجھے بے وقوف کہنے سے پہلے تم کو میری بات سُن لینی چاہیے تھی۔" نازو نے غصّے میں بل کھا کے کہا۔ "تم سے مجھے گلہ ہے سکندر کہ تم نے مجھے کبھی اعتماد کے قابل نہیں سمجھا حالانکہ میں نے ایک بار نہیں متعدد بار جان کی بازی لگا کے اپنے جذبات کی نیک نیتی کا اور خلوص کا یقین دلانے کی پوری کوشش کی ہے۔ کیا وہ بھی ڈراما تھا جب میں نے تمہاری جان لینے والی گولی کا راستہ روک لیا تھا؟ رابعہ سے پوچھنا کہ میں کس طرح اسے نکال کر لائی تھی، یہ ہے اس کا صلہ؟"

"آئی ایم سوری۔ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔" میں نے شرمندگی سے کہا۔ "میں نے تم کو بے وقوف ضرور کہا تھا، یہ نہیں کہا تھا کہ ہم تمہیں غیر سمجھتے ہیں۔ تمہارے جذبات کی قدر نہیں کرتے اور تم پر بھروسا نہیں کرتے۔"

"یار سکندرِ اعظم سے اب تم افلاطونِ اعظم بھی بن رہے ہو۔" نازو نے تلخی سے کہا۔ "بہت ناز ہے تم کو اپنی عقل پر لیکن اس عقل سے تم نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ سو فیصد غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں ایسا نہ کرتی تو کبھی تم تک نہ پہنچ پاتی۔ میرا بھائی بھی میری طرح ضدی اور انتہاپسند ہے۔ وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ جس طرح میں چھوٹے بڑے کا، خاندان کی عزت کا اور خون کے کسی رشتے کا لحاظ نہیں کرتی اسی طرح وہ بھی مجھے چھوٹی بہن کی حیثیت سے کوئی رعایت نہیں دے گا اور جان میری جائے یا اس کی، وہ مجھے تم تک نہیں پہنچنے دے گا۔ یہ اَنا اور خاندانی وقار کا مسئلہ بن گیا تھا۔ میرے والد بہت غیر جانبدار رہتے ہیں مگر یار وہ بھی کیا کریں کہ میں لڑکی ہوں۔ وہ دنیا سے نہیں کہہ سکتے کہ اولاد ناخلف اور باغی ہے۔ لڑکا ہوتا تو اسے نافرمان اور سرکش کہہ کر خود کو بچا لیتے یا عاق کر دیتے۔ لڑکی کے معاملے میں سارا الزام والدین پر آجاتا ہے کہ انھوں نے پرورش میں کوتاہی کی اور پھر بدنامی بھی انھی کو ملتی ہے۔ ماں تو مجھے رو رو کر کوستی تھی کہ ہمیں دنیا میں یوں رسوا کرنے سے تو بہتر تھا کہ تُو پیدا ہوتے ہی مر جاتی۔ وہ مجھے دھمکی بھی دیتی تھی کہ میں نے اپنی روش نہ بدلی تو کسی دن وہ کچھ کھا کے سو جائے گی۔ ان کی باتوں نے بھیّا کو بہت پریشان کر رکھا تھا اور انھوں نے مجھے صاف بتا دیا تھا کہ بحث کی قطعی گنجائش نہیں ہے۔ مجھے ویسے ہی رہنا ہو گا جیسے سب لڑکیاں اپنے ماں باپ کے اور پھر شوہروں کے گھر میں رہتی ہیں۔ لڑکے باہر کچھ بھی کرتے پھریں انھیں کوئی کچھ نہیں کہتا مگر لڑکیاں بہرحال لڑکیاں ہوتی ہیں۔ وہ کسی غیر شخص کی حمایت میں اُٹھ کھڑی ہوں اور گھر تک چھوڑ دیں تو لوگ اس کا مطلب کچھ اور نکالتے ہیں۔ کوئی نہیں مانتا کہ وہ حق اور انصاف کا پرچم بلند کرنے نکلی ہیں اور مظلوم کی حمایت میں جہاد کرتی پھر رہی ہیں۔"

"اور اس کے باوجود تمہارے خیالات میں تبدیلی نہیں آئی؟" محسن نے کہا۔

"خیالات تو آدمی کی فطرت کا عکس ہوتے ہیں۔" نازو نے کہا۔ "میں اپنی فطرت کے تقاضوں کو کیسے بدل دوں۔ جب میں شہلا کو دیکھتی ہوں اور رابعہ کو دیکھتی ہوں تو مجھے غیرت آتی ہے۔ یار آخر وہ بھی تو بے بس۔ ناقص العقل اور کمزور سمجھی جانے والی عورتیں ہیں۔ وہ کس طرح ساتھ نبھا رہی ہیں؟ میں اتنی خود غرض کیسے ہو جاؤں کہ صرف اپنی زندگی کی خوشیوں سے تعلق رکھوں اور باقی سب بھول جاؤں۔ میں اپنی آنکھیں بند کر سکتی ہوں، ذہن کی سوچ کے راستے بند نہیں کر سکتی۔ اکرام شیخ نے بھی مجبور ہو کے طے کر لیا تھا کہ وہ ہر قیمت پر میرا راستہ روکے گا۔ فلموں میں ڈائیلاگ ہوتا ہے نا کہ تم کو میری لاش پر سے گزر کے جانا ہو گا۔ کچھ ایسی ہی صورتِ حال تھی۔ وہ مجھے صاف بتا چکا تھا کہ سکندر بخت کا مظلوم اور برحق ہونا اپنی جگہ مگر والدین کی آبرو سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ میں اس کو سمجھتی ہوں چنانچہ میں نے اس کی نیت کو بھی سمجھ لیا۔ پھر یار بہت سوچ بچار کے بعد میں نے ایک منصوبہ بنایا۔ میں نے اسے قائل کرنے کے لیے اپنے خیالات میں رونما ہونے والے انقلاب کی باتیں شروع کر دیں۔ میں نے باتوں باتوں میں بھائی سے اپنے سابقہ رویّے پر ندامت کا اظہار کیا۔ یہ کہا کہ سکندر جیسے شخص کے لیے میرا جذباتی ہونا میری بے وقوفی تھی۔ وہ رابعہ کے علاوہ کسی کا نہیں ہو سکتا۔ میری بات پر اکرام شیخ نے سکندر کے خلاف الزامات اور اس کے جرائم کی تفصیل بتا کے مجھے سمجھایا کہ سکندر ایسی دلدل میں اتر چکا ہے جس میں سے وہ مر کے ہی نکلے گا۔ اس کے گرد دشمنوں کا حلقہ تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ وہ کہاں تک بھاگے گا اور کب تک چھپے گا۔ شکاری ہر سمت سے آگے بڑھتے جا رہے ہیں۔ چوہدری دلاور کے ساتھی۔ پولیس کی ہر سراغرساں ایجنسی اور اس کی گرفتاری پر ایک لاکھ کا انعام حاصل کرنے کے خواہشمند۔ سب اُسے تلاش کر رہے ہیں۔ آہستہ آہستہ میں نے سکندر بخت کے خلاف اپنی نفرت کے جذبات کو نمایاں کیا۔ یہ تبدیلی اگر فوراً آجاتی تو فیتا ڈ جاتا۔ مگر میں نے یہ ظاہر کیا جیسے اسپتال میں لیٹ کر اطمینان سے سوچنے کے بعد میں ایک منطقی نتیجے پر پہنچی ہوں۔ جو میرے منفی ردِ عمل کا نتیجہ ہے کہ اگر جان کا نذرانہ دے کر رشتوں کو ٹھکرا کر اور رسوائی مول لے کر بھی میں ایک شخص کے پتھر دل کو موم نہیں کر سکی تو شدید مایوسی نے مجھے نفرت پر مجبور کر دیا ہے۔"

ذرا سی دیر کے لیے وہ خاموش ہوئی۔ میں اور محسن اور شاید ہمارے ساتھ ٹیڈی اور شہلا بھی ایک ہی بات سوچ رہے تھے۔ کیا واقعی نازو نے بھائی سے جھوٹ بولا تھا اور حقیقت اس کے برعکس تھی، وہ اب تک مجھ سے محبت کرتی ہے؟ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں رابعہ کے علاوہ کسی کا نہیں ہو سکتا! یہ کیسا عشق ہے اور کیسی دیوانگی ہے کہ جس پتھر کے موم ہونے کا امکان ایک فیصد بھی نہ ہو وہ اسی پتھر کو پوجتی رہے اور اسی سے سر ٹکرا کے مر جانے کے عہد پر قائم ہو! غنیمت تھا کہ رابعہ سامنے نہ تھی ورنہ اس عشق کی انتہا شاید اسے بھی شرمسار کر دیتی اور حسد میں مبتلا کر دیتی۔ مجھ پر اور میری وفا پر کامل اعتماد رکھنے کے باوجود وہ اس خیال سے کیسے دامن چھڑاتی کہ مجھے کوئی اور بھی چاہتا ہے، کوئی اور بھی مجھے دل سے پیار کرتا ہے اور یہ وہ عشق ہے جو بے طلب ہے جو حقیقی ہے۔ عشقِ مجازی کی اگلی منزل ہے اور سودا کہیں، جنوں کہیں، وحشت کہیں اسے۔ مگر اس کا علاج کسی کے پاس نہیں۔ پیار میں کوئی بھی عورت کسی کی جذباتی شراکت بھی گوارا نہیں کر سکتی خواہ یہ شراکت یکطرفہ ہی ہو۔ میرے سامنے غالب تھا جو نازو کے عشق میں اسی منزل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ بے شک اب نازو بھی اس کی طرف ملتفت تھی مگر غالب کے احساس سے یہ بات فراموش نہیں ہو سکتی تھی کہ اس کی محبت نازو کے لیے ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ شاید یہ محبت نہیں نارسائی کی خیرات ہے۔ مجبوری ہے یا حالات کی ضرورت ہے۔ نازو محبت کے جس آسمان تک پہنچنا چاہتی تھی وہاں اس کے لیے جگہ نہ تھی۔ وہاں پہلے سے رابعہ اپنی محبت کا حصار کھینچ چکی تھی۔ نازو نے اس بلندی سے ذرا نیچے غالب کو پایا تھا اور اس کا سہارا لینا منظور کر لیا تھا کیونکہ وہ عرش سے فرش تک گرنے والی لڑکی نہیں تھی۔ تاہم اس کی نظر اب بھی اوپر تھی۔

"جب بھیّا کو یقین آنے لگا کہ میرے جذبات کا رُخ بدل گیا ہے۔" نازو نے کہا۔ "تو آہستہ آہستہ انھوں نے مجھے اپنا ہم خیال بنانا شروع کیا۔ وہ مجھے قائل کرنے لگے کہ سکندر بخت کا خود کو قانون کے حوالے کر دینا ہی سب سے بہتر ہے ورنہ اس کے معاملات خراب سے خراب تر ہوتے جائیں گے۔ میں نے ان سے اتفاق کیا۔ انھوں نے افسوس سے کہا کہ کاش اس کا سراغ مل سکتا تو میں خود اس سے بات کرتا اور اسے سمجھاتا کہ میں آج بھی اس کا دوست ہوں اور اس کی مدد کر سکتا ہوں۔ اچھے وکیل اس کے حالات کی مجبوریوں کو جواز بنا سکتے ہیں اور اعلیٰ عدالتوں میں سزا محض جرم دیکھ کر نہیں دی جاتی۔ عدالت مجرم کی ذہنی کیفیت اور اسے جرم کے ارتکاب تک لے جانے والے تمام عناصر پر غور کرتی ہے۔ بالآخر ایک دن میں نے غالب کا نام بتایا کہ شاید وہ سکندر بخت کے متعلق بتا سکے۔ بھیّا نے مایوسی کا اظہار کیا کہ وہ بہت چالاک صحافی ہے۔ نہ اسے قائل کیا جا سکتا ہے اور نہ مجبور۔ پھر میں نے بے شرم بن کے کہا کہ یہ کام میں کر سکتی ہوں۔ اگر میں اسے بلاؤں تو کچے دھاگے سے چلے آئیں گے سرکار بندھے۔"

"سرکار تو مگر بیٹھے رہے، جان کی بازی لگانے پہنچ گئے دوسرے۔" محسن نے کہا۔

"کچے دھاگے سے نہیں ان کو نائلون کی مضبوط رسّی سے باندھ کر لایا جا سکتا تھا۔" ٹیڈی بولا۔ "جیسے لوگ منڈی سے بکرا لاتے ہیں۔"

خفت اور شرمندگی سے غالب کا رنگ لال ہو گیا۔ وہ سخت بے عزتی محسوس کرتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھا۔ نازو اس کی طرف لپکی اور دروازے تک پہنچنے سے پہلے ہی اس کی راہ میں حائل ہو گئی۔

"کمال ہے یار! میں نے تو کچھ نہیں کہا تم سے۔" وہ ہاتھ پھیلا کے بولی۔ "تم جانتے ہو میں جھوٹ نہیں بولتی۔ مجھے معلوم تھا کہ تم آجاؤ گے لیکن میں یہ بھی جانتی تھی کہ تمہیں یہ لوگ نہیں آنے دیں گے۔"

"میں اپنے آپ سے بہت شرمندہ ہوں۔" غالب نے افسردگی سے کہا۔ "تمہاری نظر سے مجھے کوئی گلہ نہیں۔ ہم ہی میں تھی نہ کوئی بات... بس تم نے ہمارا نام استعمال کر لیا۔"

"غالب۔ میری طرف دیکھو۔" نازو نے کہا۔ "میری آنکھوں میں دیکھو یار۔ تمہیں کیا نظر آتا ہے۔ میری نظر میرے دل کا آئینہ ہے۔"

معلوم نہیں غالب نے اس کی آنکھوں میں کیا دیکھا جو ہم نہ دیکھ سکے مگر دوسرے لمحے میں سب کچھ بدل گیا۔ وہ پلٹا تو اس کی صورت پر مسکراہٹ تھی۔ یہ زبردستی کی مسکراہٹ نہیں تھی۔ اس مسکراہٹ میں جیتی جاگتی، سچی اور کھری خوشی کی ایک روشن کرن تھی اور اُمید کا سب سے دلکش رنگ تھا۔ اس میں احساس کی ندامت نہیں تھی، غرورِ عشق کی خود فراموشی تھی۔ نازو نے مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑا اور وہ سچ مچ کچے دھاگے سے بندھا چلا آیا۔

غالب کے بارے میں میرا خیال تھا کہ وہ کبھی کسی سے خفا نہیں ہوتا خصوصاً دوستوں کے مذاق سے لیکن آج ہماری بات نے اس کے جذبات مجروح کردیے تھے۔

"تم واقعی روٹھ کر جا رہے تھے یا صرف اداکاری کا نمونہ پیش کر رہے تھے؟" ٹیڈی نے کہا۔

"ہم آہ بھی بھرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام"۔ غالب نے آہ بھر کے کہا۔ "وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا۔ اب کیا اداکاری بھی نہ کروں!"

"ضرور کرو۔ بس محبت میں اداکاری مت کرنا"۔ شہلا نے اچانک کہا اور ذرا سی دیر کے لیے اس کی بات نے سب کو متحیر کردیا۔ اس کی بات سب پر چسپاں ہوگئی تھی۔ نازو ہنس پڑی۔

"اب آگیا تم لوگوں کی سمجھ شریف میں کہ غالب کو بلانے میں کیا مصلحت تھی؛ بھیا کو غالب کا انتظار تھا۔ تم لوگوں کا نہیں۔ اگر غالب آجاتا تو خاموشی سے اس کا پیچھا کیا جاتا یا پھر ایسا بندوبست ہوتا کہ کوئی پولیس مین سادہ کپڑوں میں ٹیکسی لے کر نمودار ہو جاتا اور غالب کے لیے مشکل پیدا ہو جاتی۔ ظاہر ہے میں غالب کو بتانے پر مجبور ہو جاتی کہ یہ چال ہے اور وہ مجھے جہاں چاہے لے جائے مگر سکندر بخت کے پاس نہ لے جائے۔ میں نے ایک جوا کھیلا تھا جو کامیاب رہا۔ غالب کے بجائے تم لوگ آپہنچے اور بھیا دھوکا کھا گئے۔ اگر تم لوگوں کے آنے کا ذرا بھی شک ہوتا تو اسپتال میں اور آس پاس پولیس کی نفری بھاری تعداد میں موجود رہتی۔ سادہ کپڑوں میں بھی اور مسلح بھی۔ غالب کو ایک صحافی اور بے ضرر سمجھتے ہوئے ایسا کوئی انتظام نہیں کیا گیا اور یہ مجھ پر چھوڑ دیا گیا کہ میں غالب کے ذریعے سکندر بخت کے موجودہ ٹھکانے کا پتا چلاؤں اور پھر بھیا کو مطلع کردوں۔ اب انھیں سخت رنج اور غصہ ہوگا کہ میں نے انھیں بے وقوف بنایا اور دھوکا دے کر نکل گئی۔ شاید یہ میرے لیے آخری چانس تھا۔ میں دوبارہ ان کے ہاتھ لگی تو کبھی زندہ نہ نکل سکوں گی۔ انھوں نے تو اس مرتبہ بھی فیصلہ کرلیا تھا کہ.... کہ بس اب وہی کیا جائے گا جو لڑکیوں کے معاملے میں آخری علاج سمجھا جاتا ہے۔"

"وہ کون سا علاج ہے؟" شہلا نے سادگی سے کہا۔

"ارے یار وہی جو تم نے کیا۔ شادی"۔ نازو نے بے تکلفی سے شہلا کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ ہم سب ہنس پڑے۔

"کون تھا وہ بدبخت جسے تمھاری غلامی میں دیا جا رہا تھا؟"

"معلوم نہیں کون تھا یار۔ میں کون سا گھونگھٹ نکال کے سر ہلا دیتی"۔ نازو نے کہا۔ "اگر زبردستی کی جاتی تو عین وقت پر اٹھ کھڑی ہوتی اور کہتی کہ اسے قبول کرنے والے پر لعنت۔ اسلام میں زبردستی سے منع کیا گیا ہے لیکن یہاں ہوتی ہے زبردستی اور لڑکی کی مجبوری کو اس کی فرمانبرداری سمجھا جاتا ہے۔ میں کردیتی سب کو...."

"دریں چہ شک"۔ غالب نے کہا۔ "یہ پہلا کیس ہوتا جو میں دلہن کے ہاتھوں دولھا کو حجلۂ عروسی سے گلی میں پھینکا جاتا اور اشتہار پر واپس کیسے لے جایا جاتا"۔ ہم سب کا ہنستے ہنستے برا حال ہوگیا۔

"یار تم اب جاؤ اپنے اخبار کے دفتر۔ مجھے شک ہے کہ وہ کسی نہ کسی کو وہاں بھیج چکے ہوں گے"۔ نازو نے کہا۔ "یہ لائن بھی لے لی گئی تھی۔ اب وہ خود اس پر چلیں گے۔ تم کو ادھر آنے کی بالکل ضرورت نہیں۔ کم سے کم ایک ہفتہ۔"

"ایک ہفتہ!" غالب نے مردہ آواز میں کہا۔ "ایک ہفتہ تم لوگ میری صورت دیکھے بغیر رہ سکو گے؟"

"صاف کیوں نہیں کہتے کہ اب ایک ہفتہ تم کسی کی صورت دیکھے بغیر نہیں رہ سکتے"۔ محسن ہنسا۔

"اب جاتے ہو کہ نہیں"۔ نازو نے ڈانٹ کر کہا۔ "یا پھر بائی ایئر گلی تک ارسال کردوں؟"

"جاتا ہوں بابا جاتا ہوں"۔ غالب نے پیچھے ہٹ کر کہا۔ "یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے کہ تمھاری بات نہ مانوں۔ لیکن اتنا تو بتادو کہ یوم حشر سے پہلے ملنا ہو تو۔ میرا کوئی ٹھکانا تو ہے نہیں۔"

"تو ہم خود رابطہ قائم کرلیں گے"۔ میں نے کہا۔ "تمھیں تلاش کرلیں گے۔ تم تو رات کو بھی آفس ٹیبل پر ہی ملو گے۔"

"اس کا.... کوئی گھر نہیں ہے؟" غالب کے جانے کے بعد نازو نے حیرانی سے کہا۔ "کیسی عجیب بات ہے یار!"

"ہاں۔ یہ مرد قلندر وہ ہے جس کے بارے میں کہا تھا علامہ اقبال مرحوم نے کہ۔ نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے"۔ میں نے کہا۔ "اس کا باپ ایک مشہور سرجن تھا اور یہ اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ وہ کناڈا گیا تھا کسی میڈیکل کانفرنس میں۔ واپسی پر جہاز کریش ہوگیا۔ غالب کے ماں باپ دونوں مارے گئے تھے مگر غالب اس سے پہلے ہی گھر چھوڑ چکا تھا۔"

"مگر.... مجھے تو کچھ اور بتایا تھا اس نے!" محسن چونکا۔

"ہاں۔ ڈاکٹر لطیف نے اصل بات مجھے بتائی ہے"۔ میں نے کہا۔ "وہ اس کے والد کے دوست تھے۔ باپ چاہتا تھا کہ بیٹا اس کی طرح نامور ڈاکٹر بنے۔ بیٹے میں صحافت کے اور شاعری کے فنکارانہ جراثیم پیدائشی طور پر موجود تھے اور مزاج میں درویشی تھی۔ یہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر مہاتما بدھ کی طرح گھر سے نکل گیا تھا۔ والدین کے انتقال کے بعد پلٹ کر گھر نہیں گیا۔ ڈاکٹر لطیف نے کہا کہ لاکھوں کی کوٹھی بند پڑی کھنڈر ہو رہی ہے۔ تمام ساز و سامان برباد ہو رہا ہے۔ .... یہ نہ ادھر جاتا ہے نہ اسے بیچتا ہے نہ کسی کو دیتا ہے۔ اس موضوع پر بات کرو تو خفا ہو جاتا ہے۔"

"گویا نفسیاتی کیس ہے"۔ نازو نے سوچ کر کہا۔

"ہاں.... یہی سمجھا جاسکتا ہے"۔ میں نے چونک کر کہا۔ "شدید احساس جرم اس کے لاشعور میں موجود ہے۔ اب وہ اپنے اس باپ کا وارث بنتے ہوئے خود کو مجرم محسوس کرتا ہے جس کی خواہش کو ٹھکرا کے وہ گھر سے رشتے توڑ آیا تھا۔ وہ کس دل سے اس گھر میں جائے۔ ڈاکٹر لطیف نے سمجھایا تھا کہ سب بیچ ڈالو اور رقم کسی رفاہی ادارے کو دے دو۔ کوئی ٹرسٹ بنا دو۔ کسی اسپتال میں وارڈ بنا دو۔ وہ کچھ بھی نہیں کرتا۔ اس میں شاید ہمت نہیں ہے۔ یہ سب اس کے باپ کی تمام عمر کی کمائی تھی۔ یہ اسے مل سکتی تھی مگر وہ خود اس سے دستبردار ہوگیا تھا۔ اب اس کا حق وراثت حاصل کرے تو مشکل اور پھر اسے بیچے تو مزید مشکل چنانچہ وہ کچھ بھی نہیں کرتا۔ اس نے خود کو پشیمانی اور پریشانی سے محفوظ رکھنے کے لیے سب کچھ بھلا دیا ہے۔"

"کیسی عجیب بات ہے سکندر بادشاہ!" ٹیڈی نے کہا۔ "کوٹھی کار اور بھرا ہوا گھر سب ہے مگر وہ کہتا ہے کہ اپنا کوئی ٹھکانا نہیں۔ آفس میں ٹیبل جوڑ کے سو جاتا ہے۔ تم کہتے ہو اس میں ہمت نہیں۔ ہم نے تو اس کا نشانہ دیکھا ہے۔ گولی سے موم بتی کا شعلہ گل کردیا تھا مگر موم بتی کھڑی رہی تھی اور ہمارے ساتھ جان کی بازی لگانے میں وہ کب پیچھے رہا۔"

"وہ ہمت کچھ اور ہے استاد۔ بڑے بڑے بہادر اور نڈر لوگ کسی نہ کسی جذباتی کمزوری کا شکار ہوتے ہیں"۔ میں نے کہا۔ "میں نے ایک بہت خطرناک مجرم کو دیکھا تھا۔ وہ نہ جانے کتنے قتل کرچکا تھا۔ خون بہتے دیکھ کر اسے کچھ نہیں ہوتا تھا۔ آنکھوں میں آنسو دیکھ کر وہ کانپنے لگتا تھا۔ وہ پکڑا بھی ایسے ہی گیا تھا۔ کہیں ڈاکا ڈالنے گیا تھا۔ عورت کو اس نے باتھ روم میں بند کردیا تھا۔ ایک بچہ سوتے سے اٹھ گیا۔ پانچ سات سال کا بچہ تھا وہ رونے لگا اور اس کے پیروں سے لپٹ گیا کہ میرے ڈیڈی کو مت مارو۔ اس کے ہاتھ پیر پھول گئے کیونکہ وہ خنجر کا ایک وار کرچکا تھا۔ اس نے بچے کو گود میں اٹھا لیا اور زخمی شخص کو خود اسپتال لے کر دوڑا۔ بچہ مسلسل روتا رہا کہ تم نے میرے ڈیڈی کو مار دیا اور وہ اسے چپ کراتا رہا کہ نہیں بیٹا۔ وہ ٹھیک ہو جائیں گے۔ اسپتال میں پولیس نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ بعد میں پھانسی ہوگئی اسے۔ جو کام پولیس اپنے وسائل کی طاقت سے نہیں کرسکتی تھی وہ ایک بچے کے آنسو کرگئے۔ غالب بھی اس گھر کے آسیب سے ڈرتا ہے۔"

"اس کا آسیب میں دور کردوں گی"۔ نازو نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں اپنے ساتھ لے جاؤں گی اسے اسی گھر میں۔"

"آمین۔ اور اس کے بعد تم دونوں باقی عمر ہنسی خوشی اسی گھر میں رہو گے"۔ میں نے کہا۔ "دودھوں نہاؤ گے پوتوں پھلو گے۔"

نازو کا رنگ ذرا سی دیر کے لیے لال پڑ گیا۔ اسے امید نہ تھی کہ میں اس کی بات کو یوں موڑ دوں گا۔ رات کے ساڑھے نو بجنے کو تھے۔ ٹیڈی بازار سے روٹی سالن لے کر آیا تو ہم سب نے پیٹ بھرا اور پڑ کے سو گئے۔ میں اور ٹیڈی ایک کمرے میں تھے ہمارے ساتھ والا بیڈ روم شہلا اور محسن کا تھا۔ نازو کو اس کے مقابل کا بیڈ روم دے دیا گیا۔ ٹیڈی بہت جلد گہری نیند میں خراٹے لینے لگا۔ اسے فکر تھی تو صرف یہ کہ جو ٹیکسی اسپتال میں رہ گئی تھی اس کی مدد سے پولیس مالک کا سراغ لگا لے گی اور اس سے ہمارے متعلق معلوم کرے گی تو وہ سب کچھ بک دے گا۔ جب اسے معلوم ہوگا کہ نہ ہم خفیہ پولیس کے آدمی تھے، نہ ملٹری انٹیلی جنس کے کرنل میجر بلکہ مفرور اشتہاری مجرم تھے تو وہ اپنی جان بچانے کے لیے پولیس سے تعاون کرے گا اور ہمارے بارے میں ہر بات تفصیل سے بتادے گا۔ ٹیڈی کو یہ ڈر تو نہیں تھا کہ پولیس ہمارا سراغ لگا لے گی مگر اس دولت کی فکر تھی جو ہم ٹیکسی ڈرائیور رحمٰن ماہی کے گھر میں مدفون چھوڑ آئے تھے۔ ایک صندوق سونے کا بھرا ہوا اور ایک انڈین کرنسی سے بھرا ہوا اس گھر کے آنگن میں دفن تھے اور انھیں فوری طور پر نکالنے کی کوئی صورت نہ رہی تھی۔ میں نے ٹیڈی کو تسلی دی کہ ابھی ہمیں اس پیسے کی ضرورت بھی نہیں۔ جب ضرورت پڑی تو دیکھا جائے گا۔

ٹیڈی نے محسوس کیا کہ میں اس کی باتوں میں دلچسپی نہیں لے رہا ہوں اور یہ سمجھا کہ میں تھکن کے باعث نیند سے مغلوب ہوں چنانچہ وہ منہ پھیر کے سو گیا مگر میں جاگتا رہا کیونکہ میں رابعہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ایک دن اس کے دیدار سے محرومی کی نذر ہو گیا تھا۔ کیا اس نے میرا انتظار کیا ہوگا؟ یقیناً کیا ہوگا اور کیا خبر وہ اس وقت تک جاگ رہی ہو اور میرے متعلق سوچ رہی ہو کہ آخر میں کیوں نہیں آیا۔ اس کے اور میرے درمیان احساس کی اجنبیت کے فاصلے تقریباً ختم ہوگئے تھے۔ ایک دن یا زیادہ سے زیادہ دو دن میں اس کی نظر کے علاوہ اس کا دل بھی مجھے پہچان لیتا۔ میں اسے اپنے ساتھ رکھتا اور ان تمام مقامات پر لے جاتا جہاں کبھی وہ میرے ساتھ تھی۔ اسے محسن اور شہلا کے گھر لاتا۔ اتنے مہرباں آشنا چہرے دیکھ کر وہ تنہائی کے اس جنگل سے نکل آتی جہاں اس کے ساتھ خوف اور بے یقینی کے ڈراؤنے سائے تھے اور خود شناسائی کے احساس سے محرومی کا اندھیرا تھا۔ وہ روشنی مانگتی تھی اور میں اسے روشنی کی طرف لے جا رہا تھا۔ وہ روشنی دیکھنے لگی تھی مگر آج میں نے اس کو پھر نا امید کیا۔ انتظار کے

بعد ناامیدی کتنی دل شکن ہوتی ہے۔

اس وقت نہ جانے کیوں دلِ ناصبور نے مجھے اتنا بے اختیار کیا کہ میں چپکے سے اُٹھا اور دروازہ کھول کے باہر آ گیا۔ گلی میں آدھے چاند کا اجالا تھا۔ رات کے گیارہ بجے لوگوں کی آمد و رفت بھی نہ تھی اور بیشتر گھروں کی تاریکی مکینوں کے بے خبر سونے کی خبر دیتی تھی۔ اتنی رات گئے ڈاکٹر لطیف کے گھر جانا اخلاق و آداب کے اصولوں کے خلاف تھا لیکن رابعہ کو ایک نظر دیکھنے کے لیے میں نے خود کو بدتمیز اور بدتہذیب کہلوانا منظور کیا۔ ابھی میں پچاس قدم ہی چلا تھا کہ مجھے اپنے پیچھے سے رکشا کی آواز آئی۔ وہ کسی سواری کو اتار کے خالی لوٹ رہا تھا مجھے یوں لگا جیسے تقدیر بھی میرا ساتھ دے رہی ہے۔ چند منٹ بعد میں رکشا میں سوار اپنی منزل کی سمت رواں تھا اور مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے رکشا اپنے انجن کی طاقت سے آگے نہیں بڑھ رہا ہے اور انجن کو پٹرول کی توانائی حرکت نہیں دے رہی ہے۔ یہ مقناطیسی کشش جیسی لیکن اس سے بہت زیادہ عظیم محبت کے جذبے کی کشش تھی۔ جو مجھے رابعہ کی طرف دھکیل رہی تھی اور میرے ساتھ رکشا بھی اسی سمت میں جا رہا تھا جدھر رابعہ تھی۔ میرا تصور مجھ سے بہت آگے محوِ پرواز تھا اور اس کے ہر روپ کی تصویریں یوں پیش کر رہا تھا جیسے سینما کے اسکرین پر سلائڈ پروجیکٹر ایک کے بعد ایک اشتہار دکھاتا جاتا ہے۔

گیارہ بج کر بیس منٹ پر ڈاکٹر لطیف کی کوٹھی کے دروازے پر اتر جانے کے بعد میں نے خود کو سخت احمق تصور کیا جسے اپنے آپ پر ذرا بھی اختیار نہ تھا۔ دل کے ہاتھوں یہ دیوانگی اب میری ذات سے بڑھ کر دوسروں کے لیے زحمت کا سبب ہونے لگی تھی۔ ڈاکٹر لطیف کی فراخدلی اور روشن خیالی کا صلہ یہ تو نہیں ہونا چاہیے کہ میں وقت بے وقت ان کے دروازے پر کھڑا نظر آؤں۔ ان کا یہی احسان کیا کم تھا کہ میرے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا اور رابعہ کا نام و نسب پوچھے بغیر اپنے گھر میں جگہ بھی دی اور علاج کے ساتھ وہ ماحول بھی فراہم کیا جو اس کے لیے نئی زندگی کا ضامن ہوا۔ دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا تو میرے جذبات پر عقل غالب آنے لگی اور میں تذبذب میں مبتلا ہو گیا کہ آگے بڑھوں یا لوٹ جاؤں۔ چند گھنٹوں کی ایک رات گزر ہی جائے گی۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ موش نے بڑی گھن گرج کے ساتھ گیٹ پر یلغار کی۔ میں گیٹ سے باہر تھا اس کے باوجود میں اچھل کے ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ غالباً یہ ڈاکٹر لطیف کی ظرافتِ طبع کا نتیجہ تھا کہ ایسے خاصے صحت مند بکرے سے بڑے کتے کا نام موش رکھ دیا گیا ورنہ لوگ ٹومی ٹائیگر قسم کے نام رکھتے ہیں۔ ناسمجھ جانور نہیں جانتا تھا کہ اسے چوہا کہہ کر بلایا جا رہا ہے ورنہ سخت سبکی محسوس کرتا۔

موش کے دہاڑنے کا فائدہ یہ ہوا کہ اندر ڈاکٹر لطیف کو میری آمد کی اطلاع مل گئی۔ ایسی کرخت اور رونگٹے کھڑے کر دینے والی آواز میں بھونکتا ہوا کتا کہاں اور وہ سریلی ڈنگ ڈانگ والی کال بیل کہاں جس کو صرف انگلی سے چھونا پڑتا ہے۔ اندر کے کمرے سے ڈاکٹر لطیف نے گیٹ لائٹ آن کی اور کھڑکی میں سے مجھے کھڑا دیکھا۔ اتنی دور سے انھوں نے مجھے پہچانا تو نہیں ہوگا مگر ایک آواز سے انھوں نے موش کو سچ مچ موش بنا دیا۔ وہ چوہے کی طرح دم دبا کے ایک طرف کھڑا ہو گیا تو میں گیٹ کھول کر اندر گیا اور موش کے عزائم سے ہوشیار پورے دفاعی انداز میں چلتا ہوا برآمدے تک پہنچا جہاں ڈاکٹر لطیف گاؤن کی جیب میں ہاتھ ڈالے کھڑے تھے۔

"آئی ایم سوری۔" میں نے ہاتھ ملا کے کہا۔ "اس وقت مجھے آنا تو نہیں چاہیے تھا۔ آپ سو رہے ہوں گے۔"

وہ ہنسنے لگے۔ "اس عمر میں نیند کی ضرورت بہت کم ہو جاتی ہے ینگ مین۔ میں ایک بجے تک ضرور جاگتا ہوں۔ کچھ کرتا رہتا ہوں۔ عموماً پڑھتا ہوں ورنہ خطوں کے جواب لکھتا ہوں۔ آؤ اندر آؤ۔" وہ آگے آگے چلنے لگے۔

"اتنے خط کسے لکھتے ہیں آپ؟" میں نے کہا۔

"لوگوں کو۔ جو مجھ سے مشورے مانگتے ہیں۔" وہ بولے۔ "اگر معمولی مسائل ہوں تو انھیں کلینک میں نہیں بلاتا۔ زیادہ تر مسائل تو محض لاعلمی یا وہم کی پیداوار ہوتے ہیں۔ مثلاً یہی نیند نہ آنے کا مرض۔ اب میری عمر کا آدمی دس گھنٹے کی گہری نیند مانگتا ہے تو اسے بیماری کوئی نہیں۔ یہ کم علمی کی بات ہے۔ اسے بتا دیتا ہوں کہ بھائی نیند نہ آئے تو کوئی کام کرو۔ یہ گولیاں وغیرہ کچھ نہیں کریں گی۔ نیند نہ آنے کے غم کو روگ مت بناؤ۔ جب نیند آئے سو جاؤ۔ نہ آئے تو کوئی بات نہیں۔ عورتیں زیادہ خوش قسمت ہوتی ہیں نیند کے معاملے میں مثلاً ہماری بیگم۔ تم نے اچھا کیا کہ اس وقت آ گئے۔ ہم اطمینان سے بات کر سکتے ہیں۔"

"میں زیادہ وقت نہیں لوں گا آپ کا۔" میں نے کہا۔

"لیکن میں تمھارا کافی وقت لوں گا۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "اس لیے پہلے میں کافی بنا لیتا ہوں۔ پیو گے نا؟"

"بڑے شوق سے۔" میں نے کہا اور ان کے ساتھ چل پڑا۔ کچن میں پہنچ کر انھوں نے مجھے ایک اسٹول پیش کیا اور خود الیکٹرک کیٹل میں پانی ڈالنے لگے۔

"میں تمھارا منتظر تھا۔" انھوں نے ٹیک لگا کے کہا۔ "مسئلہ ہے رابعہ کا۔"

میں ان کے رویے سے اندازہ تو کر ہی چکا تھا کہ وہ رابعہ کے بارے میں بات کریں گے۔ "کوئی... نیا مسئلہ ہے؟"

"مسئلہ تو نیا نہیں۔ ایک معمولی سی پیچیدگی پیدا ہو گئی ہے۔" وہ ہاتھ باندھ کے کھڑے ہو گئے۔ "میں بتا نہیں سکتا کہ ایسا کیوں ہوا۔ نفسیاتی اسباب کی تشخیص مشکل کام ہے۔ لیبارٹری ٹیسٹ اور مشینی آلات اس میں کام نہیں آتے۔ اب تم خود جانتے ہو کہ کل رات رابعہ کی پروگریس بہت اچھی تھی۔ میری توقعات سے کہیں زیادہ اور یہ سب تمھاری وجہ سے ممکن ہوا تھا۔ تم نے بڑی ذہانت کے ساتھ اس کو ہینڈل کیا۔ وہ بہت خوش تھی اور ظاہر ہے اس کو نارمل دیکھ کر میں خوش تھا مگر تمھارے چلے جانے کے بعد رات کو ہم سب سونے کے لیے لیٹ گئے تھے۔ معلوم نہیں کیا ہوا، اس نے چلانا شروع کیا...."

"ڈاکٹر صاحب۔ میں نروس ہو رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "یہ بتائیے وہ ٹھیک تو ہے نا؟"

"اوہ یس۔ وہ سو رہی ہے۔" ڈاکٹر لطیف نے اُبلتے پانی کو کافی پر ڈالا اور مگ میں چمچہ ہلانے لگے۔ "اس کی چیخ و پکار سن کر میں سب سے پہلے بھاگا کیونکہ میں جاگ رہا تھا۔ وہ کمرے سے نکل آئی تھی اور نیچے آ چکی تھی۔ میں نے اسے پکڑ لیا کیونکہ وہ باہر جانا چاہتی تھی۔ ایک بار تو اس نے خود کو چھڑا لیا مگر دوسری بار میں نے اسے قابو کر لیا۔ وہ مسلسل تمھیں آوازیں دے رہی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ انکل مجھے جانے دیں۔ چھوڑ دیں مجھے۔ میں نے کہا، کچھ بتاؤ تو سہی کہ کہاں جانا ہے۔ اس پر ہسٹریا کا سخت دورہ پڑا تھا۔ اس نے چیختے ہوئے کہا کہ سکندر زخمی ہے۔ اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ وہ مچلتی رہی اور خود کو چھڑانے کی جدوجہد کرتی رہی مگر سب سے غنیمت بات یہ تھی کہ وہ مسلسل تمھارے ساتھ پیش آنے والے حادثے کا ذکر کر رہی تھی۔ میں نے کہا کہ ہوش میں آؤ رابعہ۔ سکندر بالکل ٹھیک ہے لیکن وہ چلاتی رہی کہ آپ نہیں جانتے۔ آپ کو نہیں معلوم۔ اس کی گاڑی کو حادثہ پیش آ گیا ہے۔ وہ لال رنگ کی فاکس ویگن تباہ ہو گئی ہے۔"

میں کچھ دیر پتھر کا بت بنا بیٹھا رہا۔ "یہ رات کتنے بجے کی بات ہے ڈاکٹر صاحب؟"

"وقت... میرا خیال ہے ڈیڑھ یا دو بجے کی بات ہوگی۔" ڈاکٹر لطیف نے کافی کا مگ میری طرف بڑھایا۔

"پھر تو وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔" میں نے بے خیالی میں مگ پکڑ لیا۔

"کیا مطلب؟" ڈاکٹر لطیف نے مجھے غور سے دیکھا۔

"کل رات تقریباً اسی وقت میں ایک حادثے کا شکار ہوا تھا۔" میں نے کہا۔ "میں تو بچ گیا لیکن گاڑی مکمل طور پر تباہ ہو گئی۔ رابعہ نے خواب دیکھا تھا یا... کچھ اور بات تھی۔ آپ ڈاکٹر بھی ہیں اور ماہرِ نفسیات بھی۔ خود سمجھ سکتے ہیں۔"

"ہاں۔ اس جذباتی کیفیت کے مختلف نام ہیں۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "ای ایس پی۔ جذبات کی ہم آہنگی۔ خیالات کی فریکوئنسی کا ایک ہو جانا۔ ٹیلی پیتھی۔ مگر میڈیکل سائنس اس کی وضاحت نہیں کر سکتی کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ میرے اپنے پیشہ ورانہ تجربے میں یہ کوئی پہلا کیس نہیں ہے۔ ہر ڈاکٹر کا واسطہ کبھی نہ کبھی ایسے حالات سے پڑتا ہے اور عام لوگوں کے مشاہدے میں ایسے واقعات آتے رہتے ہیں جن کی منطقی توضیح ممکن نہیں۔ میں اس چکر میں پڑتا بھی نہیں کیونکہ میرا فیلڈ سائیکلوجی ہے پیراسائیکلوجی نہیں۔ رابعہ کی ذہنی کیفیت نے وقتی طور پر مجھے پریشان کر دیا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں یہ ردِ عمل کا ردِ عمل تو نہیں۔ یہ بھی ایک چکر ہوتا ہے۔ اب تم نے جو کچھ بتایا ہے وہ میری سمجھ میں آ رہا ہے اور مجھے اُمید ہے کہ تم کو زندہ اور صحیح سلامت دیکھ کر رابعہ کے ذہن پر خوشگوار اثر ہوگا۔ وہ پھر نارمل ہو جائے گی۔"

"کیا ابھی وہ نارمل نہیں ہے؟" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"نہیں۔ صبح تک میں نے اس کو بہت اسٹرانگ انجکشن دے کر سلائے رکھا تھا۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "عموماً چھ سے آٹھ گھنٹے تک سکون آور دواؤں کا اثر رہتا ہے لیکن ذہن زیادہ ڈسٹرب ہو تو تین چار گھنٹے میں ہی بے چینی شروع ہو جاتی ہے۔ میں نے دوبارہ انجکشن دیے۔ دوپہر کے بعد اس کو ہوش آنے لگا تو میں نے اسے سنبھلنے کا موقع دیا۔ شام کو اس نے کچھ کھایا اور مجھ سے بات کی تو مجھے اندازہ ہوا کہ گڑبڑ ہو گئی ہے۔ وہ تمھارے بارے میں ہی پوچھتی رہی کہ سکندر کا کیا حال ہے؟ کیا وہ زیادہ زخمی ہوا ہے۔ میں نے اسے بہت سمجھایا کہ سکندر کو کچھ بھی نہیں ہوا ہے اور وہ بالکل خیریت سے ہے مگر اس نے میری ایک نہیں مانی — کہنے لگی کہ انکل مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش مت کریں۔ مجھے سب معلوم ہے کہ اس کی گاڑی حادثے میں ختم ہو گئی ہے۔ خدا کے لیے مجھے بتا دیں کہ سکندر کون سے اسپتال میں ہے۔ میں اسے دیکھنا چاہتی ہوں۔ میں نے ہر ممکن طریقے سے اسے قائل کرنا چاہا لیکن وہ بضد رہی کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں اور اس کو اسپتال لے جانا نہیں چاہتا۔ رفتہ رفتہ اس کی کیفیت میں پھر جنون کے آثار عیاں ہونے لگے۔ وہ رونے لگی کہ سب نے مجھے قید میں ڈال رکھا ہے۔ میرا ہمدرد کوئی نہیں۔ کوئی نہیں بتاتا کہ سکندر زندہ ہے یا مر گیا ہے۔ مر گیا ہے تب بھی مجھے بتا دو تاکہ مجھے قرار آ جائے

یا میں بھی مر جاؤں۔ زندہ ہے تو مجھے ایک بار اس کی صورت دکھا دو۔ اسے میری ضرورت ہے۔ میں اسے بچالوں گی۔ بس ایک پاگل پن کا دورہ تھا جس میں ایک بے بنیاد خیال نے یقین کی شکل اختیار کرلی تھی۔ شام تک اس کا رونا دھونا زیادہ ہوگیا اور تم بھی نہیں آئے تو وہ چلانے لگی کہ دیکھا۔ سکندر ٹھیک ہوتا تو یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ وعدہ کرکے نہ آئے۔ بس میاں۔ جب اس کی حالت تمہارے نہ آنے سے بگڑنے لگی تو میں نے پھر وہی کیا جو میں کرسکتا تھا۔ میں نے اس کو زبردستی انجکشن دے دیا اور بے ہوش کردیا۔"

"سارا قصور میرا ہے لیکن میں کیا کرتا۔ میں خود پھنس گیا تھا۔" میں نے خالی مگ کو سنک میں رکھ دیا۔

"میں نے کوشش کی تھی کہ غالب کے ذریعے تم سے رابطہ قائم کروں۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "سات بجے تک تو وہ اخبار کے دفتر پہنچا نہیں تھا۔ ساڑھے آٹھ بجے پتا چلا کہ وہ ذرا سی دیر کے لیے آکر چلا گیا۔"

"کیا اب میں اس سے مل سکتا ہوں؟" میں نے کہا۔

"اگر مقصد دیکھنا ہے تو جاؤ دیکھ لو۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "لیکن بات کرنا چاہتے ہو تو ابھی مشکل ہے۔ وہ صبح تک سوتی رہے گی کیونکہ تمہارے آنے سے کچھ دیر پہلے ہی میں نے اس کو دوسرا انجکشن دیا تھا۔ یہ نیند نہیں ہے جس سے اس کو جگایا جاسکے۔ اگر اس نے آنکھیں کھولیں تب بھی اس کا ذہن تو بیدار نہیں ہوگا۔ تم صبح نو بجے آجاؤ تو یہ ہوسکتا ہے کہ میں رابعہ کو ذہنی و جسمانی طور پر اس ملاقات کے لیے تیار رکھوں اور وہ تم سے بات کرتے ہوئے اپنے ہوش و حواس میں ہو۔ یہ بہت ضروری ہے سکندر کہ وہ ایک حقیقت کو عقل و شعور کے ساتھ تسلیم کرے کہ تم زندہ اور بالکل صحیح سلامت ہو اور اسے یقین آئے کہ جو کچھ اس نے سوچا تھا وہ خواب تھا اور گزشتہ دن کے واقعات اسی خواب کا حصہ تھے۔ وہ پوری طرح ہوش میں نہیں ہوگی تو تمھیں سامنے پاکر بھی سمجھتی رہے گی کہ آنکھیں اسے دھوکا دے رہی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ تمھاری صحت اور سلامتی کا یقین رابعہ کی موجودہ ذہنی کیفیت کو ختم کرسکتا ہے۔ اس یقین کے بغیر شاید... دوائیں اور علاج، میری تسلی اور ہمدردی کے الفاظ اور ماحول کی موافقت۔ سب بے کار ہوں گے۔ وہ تم کو چھو کر تمھارے مادّی وجود کو تسلیم کرے گی تو اس کے ذہن میں بیٹھا ہوا خوف خود بخود دور ہوجائے گا۔ اس خوف سے رابعہ کو صرف تم نجات دلا سکتے ہو۔ صرف تم سکندر۔"

"میں صبح نو بجے آجاؤں گا ڈاکٹر انکل۔" میں نے کہا۔ "اس وقت آپ کو جو زحمت ہوئی۔۔"

"اوہ شٹ اپ۔ میں ایسی فضول رسمی گفتگو سے الرجک ہوں۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "تم نے اگر بہت اچھا کیا۔ رابعہ کا پرابلم ہے جس کو ہم دونوں مل کر حل کرسکتے ہیں۔ مجھے بھی تمھاری مدد چاہیے جو کام تم کرو گے وہ کوئی دوا نہیں کرے گی اور کوئی تیر شخص نہیں کرسکے گا خواہ وہ رابعہ کا کچھ بھی ہو۔ میرا مطلب ہے اگر اس کا بھائی ہوتا یا والدین ہوتے۔ تو ان سب کی نیک خواہشات اور دعائیں۔ محبت اور شفقت وہ کرشمہ نہیں دکھا سکتے تھے جو تم نے اس سے ملاقات کے بعد دکھایا تھا۔ صرف چوبیس گھنٹوں میں تم اس کو شفا کی منزل کے بہت قریب لے آئے تھے۔ تمھارا طریقہ مجھے پسند آیا تھا۔ بہت سائنٹفک اور عقلی و عملی طریقے تم نے اس کو سوچ کی راہوں پر ڈالا تھا اور آہستہ آہستہ سوچ کو یادوں سے منسلک کردیا تھا۔ تمھاری جگہ میں ہوتا تو یہی کرتا۔ تم ڈاکٹر نہیں ہو مگر تم نے ایک ڈاکٹر کی طرح سوچا۔ ایک چاہنے والے جذباتی نوجوان کی طرح نہیں۔ میں خاصے یقین کے ساتھ دعویٰ کرسکتا ہوں کہ کل وہ تم کو اپنی نظر سے دیکھ لے گی اور عقل سے پہچان لے گی تو پھر اس مقام پر آجائے گی جہاں تم اسے کل شام چھوڑ گئے تھے اور پھر آگے سفر کرے گی۔ بہت جلد تمھارے اور اس کے درمیان وقت کا خلاء باقی نہیں رہے گا اور وہ اسی طرح تمھارے ساتھ ہوگی جیسے پہلے تھی۔"

"مجھے بھی اس کا یقین ہے ڈاکٹر انکل۔ لیکن آپ نے جو کچھ رابعہ کے لیے کیا اس کے بغیر شاید رابعہ مجھے کبھی نہ ملتی۔ اگر ملتی تو اجنبی ہوکے۔ معلوم نہیں وہ کیسے زندہ رہتی اور اس کے بغیر میں کیسے زندہ رہتا۔ آپ کے احسان کا بدلہ میرے شکریے کے الفاظ نہیں ہوسکتے۔"

"کسی بھی ڈاکٹر کے لیے شکریے کے الفاظ میں خوشی نہیں، اس کی کامیابی ہی اسے خوشی دیتی ہے۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "وہ کسی ایک مریض کو زندگی اور صحت کی خوشی دیتا ہے تو محسوس کرتا ہے کہ اس کے نامۂ اعمال میں خدا نے ایک چھوٹی سی نیکی ضرور لکھ دی ہوگی۔ یہ نیکی ایک صدقۂ جاریہ کی طرح عاقبت تک ساتھ دیتی ہے۔ جب رابعہ ٹھیک ہوجائے گی اور میں تم دونوں کو خوش اور شاد و آباد دیکھوں گا تو یہ ایک دائمی مسرت ہوگی جو مجھے حاصل رہے گی۔ تمھاری زندگی کی ہر خوشی تمھاری کامیابی۔ تمھارے بچوں کی خوش حالی۔ جو کچھ بھی میں دیکھوں گا اس میں یہ خیال شامل ہوگا کہ خدا نے مجھے رابعہ کو صحت دینے کی توفیق عطا نہ کی ہوتی تو یہ سب کہاں ہوتا۔ ایسی نہ جانے کتنی خوشیاں ہی میری زندگی کا وہ اندوختہ ہیں جس پر میں فخر کرسکتا ہوں۔ یہ مال و دولت تو اسمگلر اور چور ڈاکو بھی کما لیتے ہیں لیکن وہ سب انھیں نہیں ملتا جو مجھے ملا۔ خیر۔۔ اب تم جاؤ ورنہ میں بولتا رہوں گا اور صبح ہوجائے گی۔" وہ ہنسے اور انھوں نے مجھ سے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ مجھے موش کی چیک پوسٹ سے بے خوف و خطر گزارنے کے لیے وہ گیٹ تک میرے ساتھ بھی رہے۔

واپسی پر سواری کا ملنا مشکل ہوگا' یہ بات مجھے یہاں آنے سے پہلے ہی معلوم تھی چنانچہ میں نے انتظار کیے بغیر مارچ شروع کیا۔ "چل چل رے نوجوان۔ او بچی تیری شان۔" مجھے ایک بہت پرانا فلمی گانا یاد آیا جو میں اور محسن ایسے ہی حوصلہ آزما مواقع پر گاتے تھے۔ عاشقِ صادق کی واپسی۔ ناکام و نامراد۔ دیدارِ یار تک نصیب نہ ہوا اور خیر سے بدھو گھر کو آئے مگر بھائی عشق میں تو یہی ہوتا ہے جوتیاں چٹخانے میں مجنوں کا ریکارڈ قائم ہے۔ جو صحرا میں نہ جانے کتنا پھرا۔ یہ کم غنیمت ہے کہ اس عہد کے عشق میں صحرا کے بجائے تارکول کی پختہ سڑک ہے۔ وہ خارِ مغیلاں اور نہ آبلہ پا ہونے کی آزمائش۔ زیادہ سے زیادہ سڑک پر بھونکنے والے کتے ہیں مگر کتوں سے کیا ڈرنا۔ کتے بھونکتے رہتے ہیں۔ قافلہ چلتا رہتا ہے۔ چنانچہ چل چل رے نوجوان۔ چھ سات میل ہی تو جانا ہے۔

میں خوش اور پُر امید تھا چنانچہ میرے ذہن کے اوٹ پٹانگ خیالات میں بھی مایوسی اور ملال نہیں تھا اور ڈاکٹر انکل سے ملنے کے بعد مجھے اس بات کی پروا نہیں رہی تھی کہ واپسی پر محسن یا ٹیڈی نے کھلی کھڑکی سے داخل ہوتے پکڑ لیا تو انھیں کیا جواب دوں گا۔ میں ان کو دنداں شکن جواب دینے کا حوصلہ رکھتا تھا۔ ابھی میں ایک میل بھی نہیں چلا تھا کہ مجھے مسافت کے طویل ہونے کا احساس کچھ شرمندہ کرنے لگا۔ پہلی حماقت تو میں نے گھر سے نکل کے کی تھی مگر اس سے کچھ فائدہ ہوگیا۔ یہ دوسری حماقت تھی کہ میں واپس چل پڑا۔ اگر ڈاکٹر لطیف سے کہہ دیتا کہ صبح تک ٹھہر جاتا ہوں تو کیا وہ انکار کرتے۔ وہ کہتے کہ میاں اپنا گھر ہے۔ جگہ کی کون سی کمی ہے۔ اب تو گھر پہنچتے پہنچتے مرغے اذانیں دینے لگیں گے اور ٹانگیں یوں ہوجائیں گی کہ بقول مرزا غالب چلتے ہیں بعدِ مرگ بھی میرے کفن میں پاؤں۔ اس کے بعد محسن کی ڈانٹ ڈپٹ۔ ناشتا اور پھر کوئے یار کی جانب مراجعت۔ تکلف میں تکلیف کے سوا کیا ہے۔

ایک جیپ میرے پیچھے سے نمودار ہوئی تو میں نے پلٹ کر دیکھا اور سڑک سے ذرا ہٹ کر چلنے لگا۔ جیپ میرے قریب پہنچ کر رک گئی۔ لاحول ولا قوۃ۔ اب یہ رات کو گشت کرنے والی پولیس سوال جواب کرے گی کہ جاتے ہو کس طرف کو، کہاں کا خیال ہے اور ان کی فضول بک بک کا ایک انجام تو یہ ہوسکتا تھا کہ وہ مجھے آوارہ گردی کے جرم میں پکڑ کر تھانے لے جائیں اور دوسرا یہ کہ میں ان کی فیس ادا کرکے شرافت کی سند حاصل کرلوں۔ وہ اپنے راستے جائیں اور میں اپنی راہ پکڑوں۔ یہ بڑی افسوس ناک بات تھی کہ سواری پچاس روپے خرچ کرکے بھی نہیں مل سکتی تھی مگر سفر ختم ہونے تک تین چار جگہ آوارہ گردی کے الزام سے بچنے میں ڈیڑھ دو سو روپے خرچ ہوسکتے تھے۔ راہِ عاشقی میں فرہاد یا مجنوں کو کسی کانسٹیبل نے بہرحال نہیں پکڑا تھا اور انھیں کسی کو رشوت نہیں دینا پڑی تھی۔

جیپ رکے ایک پھول والا افسر میری طرف بڑھا۔ "کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم کہاں جا رہے ہو اس وقت؟" اس کے لہجے میں تھانیداری کا رعب یا اکھڑ پن تو فطری تھا لیکن مجھے احساس ہوا کہ وہ اردو صاف نہیں بول سکتا۔ اس کی زبان کچھ اینٹھی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ جیسے کوئی انگریز روانی سے اردو بولے یا مدراس کا رہنے والا افریقی میں بات کرے۔

"بالکل۔ تمھیں اس کا قانونی اختیار حاصل ہے آفیسر۔" میں نے انگریزی میں جواب دیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کانونٹ زدہ نہیں ہے کوئی اینگلو انڈین ہے۔ "تم ڈاکٹر لطیف کو یقیناً جانتے ہوگے؟"

"کون ڈاکٹر لطیف؟" وہ یکلخت محتاط اور شائستہ ہوگیا۔

"وہ... جو پیچھے رہتے ہیں؟"

"بالکل وہی۔" میں نے پچاس روپے بچ جانے کے خیال سے خوش ہوکر کہا۔ "مجھے بڑی خوشی ہوئی.."

"شٹ اپ۔ تم ڈاکٹر لطیف نہیں ہو۔ میں ان کو پہچانتا ہوں۔" اس نے غرا کے کہا۔ "دھوکے باز..."

"پلیز آفیسر۔ میں نے ڈاکٹر لطیف ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔" میں نے بھی لہجہ سخت کرلیا۔ "میں ان کے گھر سے آرہا ہوں۔"

"کون ہو تم ان کے؟ مریض؟" وہ شرمندہ ہوئے بغیر بولا۔ "وہ تو پاگلوں کا علاج کرتے ہیں۔ کیا تم فرار ہوئے ہو؟"

"نہیں۔ میں کسی کو دیکھنے گیا تھا اور جسے میں دیکھنے گیا تھا وہ پاگل نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"تمھارا اپنا گھر کہاں ہے؟ ڈاکٹر لطیف کو چھوڑو۔" وہ بدتمیزی سے بولا۔ "نام کیا ہے تمھارا؟ اپنی شناخت کراسکتے ہو یا میں لے جاؤں..؟"

"ضرور لے جاؤ۔ ڈاکٹر لطیف کا گھر زیادہ دور نہیں ہے۔ وہ مجھے شناخت کرکے تمھیں مطمئن کرسکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"میں پاگل نہیں ہوں کہ آدھی رات کو انھیں جگاؤں۔ صرف یہ پوچھنے کے لیے کہ وہ تم کو پہچانتے ہیں یا نہیں۔ کسی شریف آدمی کے لیے خود کو شریف ثابت کرنا مشکل نہیں ہوتا۔" وہ بولا۔ "تم اپنا نام تک نہیں بتا رہے ہو۔" اب اس کے لہجے میں دھمکی بہت واضح تھی اور جیپ میں سے ایک رائفل بردار کانسٹیبل بھی اتر کے

افسر کے ساتھ آکھڑا ہوا تھا۔
میں نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر لطیف کا حوالہ دے کر میں نے اپنے لیے مشکل پیدا کر لی ہے۔ ڈاکٹر لطیف مجھے صرف اسی صورت میں پہچانتے جب میں اپنا نام سکندر بخت بتاتا اور اصل نام بتاتا تو اس بات کا امکان تھا کہ اے ایس آئی جو مجھے صورت سے نہیں پہچان سکا تھا نام سے فوراً پہچان جائے۔ پھر وہ مجھے ڈاکٹر لطیف کے پاس کبھی نہ لے جاتا۔ اتنے بڑے کارنامے کو عطیۂ قدرت جانتا اور مجھے زندہ یا مردہ افسرانِ بالا کی خدمت میں پیش کر کے سرخ رُو ہوتا۔ ترقی اور تعریفی سند پاتا اور انعام کا مستحق ٹھہرتا۔ اصل نام بتانے میں بہت خطرہ تھا چنانچہ میں نے ظاہری سکون کے ساتھ مسکراتے ہوئے کہا: "آئی ایم سوری... میں سلیم جوزف ہوں۔"
"تم۔ کرسچین ہو؟" اس کے لہجے میں رونما ہونے والی تبدیلی نے مجھے حوصلہ دیا۔ "کیا کرتے ہو؟"
"مشن ہائی اسکول میں سائنس پڑھاتا ہوں۔ ایم ایس سی بی ای ہوں۔" میں نے کہا۔ "اس لیے سیکنڈ ہیڈ ماسٹر بھی ہوں۔"
"کون سے مشن اسکول میں؟" وہ بولا۔ "یہاں لاہور میں؟"
"نہیں۔ راولپنڈی کے مشن اسکول میں۔" میں نے کہا۔ "راجہ بازار کے پاس فوارہ چوک کے قریب ہے۔"
"وہ مجھے معلوم ہے۔" اس کی دلچسپی اور ماتحت کانسٹیبل کی بیزاری بڑھ گئی۔ کانسٹیبل انگریزی میں ہونے والی گفتگو سے کوئی نتیجہ اخذ کرنے میں مصروف تھا کہ اچانک ملنے والا افسر کا یار ہے یا معاملہ کچھ اور ہے۔ "کب سے ہو تم وہاں۔ بہت سینیئر ہو گئے؟"
"ہاں۔ تقریباً سات سال سے ہوں۔" میں نے کہا۔ "مجھ سے پہلے میرے والد تھے۔"
"سات سال پہلے میں نے مشن اسکول راولپنڈی سے ہی میٹرک کیا تھا۔ مجھے تمہاری صورت دیکھی ہوئی نہیں لگتی۔" وہ بولا۔
میری ساری محنت جو میں نے اس اینگلو انڈین کا ہم مذہب بن کے رعایت حاصل کرنے کے لیے کی تھی ضائع ہونے لگی۔ میں نے جھوٹ کی گرتی ہوئی دیوار کو سہارا دینے کی جدوجہد میں کمی نہیں آنے دی۔ "وہاں اور بھی ٹیچر تھے اور اس وقت میں نیا تھا۔" میں نے کہا۔
"جو کچھ تم نے بتایا ہے اس کا کوئی ثبوت دے سکتے ہو؟" وہ بولا۔ "یہاں کس کے پاس ٹھہرے ہو؟"
میں نے ایک ایسے علاقے کا نام لیا جہاں بہت سے معزز کرسچین رہتے تھے اور اپنا ایک بھائی ایجاد کیا جو انجینئرنگ یونیورسٹی میں لیکچرار تھا لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ اس کا شک بڑھ رہا ہے۔ معلوم نہیں ایسا کیوں ہوا۔ وہ بہت کائیاں شخص تھا۔

غالباً اس نے تاڑ لیا کہ میں خود کو کرسچین ظاہر کر کے اسے بے وقوف بنا رہا ہوں اور اپنی جان چھڑانا چاہتا ہوں۔ ایک جھوٹ کو نبھانے کے لیے مجھے دوسرے جھوٹ کا سہارا لینا پڑا۔ پھر تیسرا جھوٹ بولنا پڑا۔ آہستہ آہستہ جھوٹ کا یہ جال میرے لیے وبال بننے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں خود اپنے جال میں گرفتار ہو رہا ہوں۔ کسی نہ کسی مرحلے پر میرا ایک جھوٹ ہر جھوٹ کا راز فاش کر دے گا۔ اس سے کہیں بہتر ہوتا کہ میں سو پچاس کا نذرانہ دے کر نکل جاتا لیکن خود کردہ را علاجے نیست۔ اے ایس آئی ابھی مجھے بخشنے پر آمادہ نظر نہ آتا تھا۔
"تم کو میرے ساتھ چلنا ہو گا۔" وہ بولا۔ "تم مجھے مطمئن نہیں کر سکے۔"
"تم میرے ساتھ چل کے میرے بھائی سے پوچھ سکتے ہو۔" میں نے کہا اور ذہنی طور پر مقابلے کے لیے تیار ہو گیا۔
"میں اس علاقے میں گشت پر ہوں۔ تمہارے ساتھ کیسے جا سکتا ہوں۔" وہ بولا۔ "لیکن تم اپنے بھائی کو تھانے بلوا سکتے ہو۔ اس کے گھر میں فون تو ہو گا؟"
"نہیں۔ فون تھا۔ زیادہ بل آنے کے بعد کٹ گیا۔" میں نے کہا۔ "بہت افسوس کی بات ہے کہ تم اپنے اسکول کے ایک ٹیچر..."
"شٹ اپ۔" اس نے ایک دم ریوالور نکال لیا۔ "تم وہاں ٹیچر نہیں ہو۔ اگر ہو تو مجھے بتاؤ۔ ہیڈ ماسٹر کون ہے وہاں اب سات سال پہلے کون تھا؟ دوسرے سب ٹیچرز کے نام بتاؤ جو تمہارے ساتھ تھے۔"
"اس ریوالور کے سامنے تو مجھے اپنا نام بھی یاد نہیں آئے گا انسپکٹر۔" میں نے ہاتھ اٹھا کے کہا۔ ابھی تک وہ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا ہوا تھا لیکن مجھے اس کا نام دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ ہم ایک اسٹریٹ لائٹ سے کافی فاصلے پر تھے اور قریب کے کھمبے پر کوئی بلب نہیں تھا۔ تھوڑی بہت روشنی صرف میرے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ وہ خود روشنی کی طرف پیٹھ کیے کھڑا تھا۔ نام کا چھوٹا سا بیج اس کی جرسی پر لگا ہوا تھا۔ نیلے پلاسٹک کی آدھے انچ سے بھی کم چوڑی اور تین انچ لمبی پٹی پر انگریزی کے سفید حروف بھی اندھیرے میں تھے۔ اس نے ریوالور ہلا کے مجھے جیپ کی طرف بڑھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے صورت پر مظلومیت دکھ اور بے بسی، احساسِ ذلت اور برہمی کے جذبات طاری کیے اور آہستہ سے ایک قدم جیپ کی طرف بڑھایا۔ دوسرے لمحے میں نے پیچھے کی طرف ٹانگ گھمائی اور میرے جوتے کی ایڑی سب انسپکٹر کی کلائی پر لگی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے کانسٹیبل کو کھینچ لیا اور اس کی گردن پکڑ کے جھٹکا دیا۔ وہ قلابازی کھا کے آگے گیا اور اس کی رائفل وہیں گر گئی۔ میں نے غوطہ مار کے رائفل اٹھائی

اور ڈنڈے کی طرح گھمائی۔ اس کا بٹ سب انسپکٹر کے شانے سے ذرا نیچے لگا۔ اگر وار اس کے سر پر پڑتا تو شاید اس کی کھوپڑی چٹخ جاتی۔ وہ بھی ریوالور سے محروم ہو چکا تھا مگر میں نے نہیں دیکھا تھا کہ میری لگ سے اُچھلنے والا ریوالور کدھر گیا تھا۔ رائفل کا بٹ پڑتے ہی وہ نیچے گرا اور اس نے چلّا کر جیپ میں بیٹھے ڈرائیور کو گالی دی: "شوٹ ہم۔ باسٹرڈ۔ گولی مار دو اس... کو۔" اس کی دوسری گالی میرے لیے تھی۔
پہلا کانسٹیبل اتنی دیر میں پھر اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے مجھ پر حملہ کرنے کی بے وقوفی کی۔ اس نے اپنے افسر کا حکم سنا تھا مگر یہ نہیں سمجھا تھا کہ حکم کسے دیا گیا ہے۔ وہ خود رائفل کے بغیر مجھے کیسے شوٹ کرتا۔ بدحواسی میں وہ میرے سامنے آ گیا۔ اسی وقت ڈرائیور نے نشانہ لے کر گولی چلائی۔ ڈرائیور بالکل مطمئن گاڑی کے انجن کو اسٹارٹ رکھے بیٹھا تھا اور اسے بالکل اُمید نہ تھی کہ انگریزی بولنے والوں میں اچانک خوف ناک جنگ چھڑ جائے گی۔ اس نے رائفل نکالنے میں کچھ دیر ضرور کی مگر وہ بدحواس نہیں ہوا۔ وہ اپنی جگہ پر بالکل محفوظ تھا اور اپنے افسر کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے مجھے آسانی سے گولی مار سکتا تھا۔ وہ کیسے جان سکتا تھا کہ اس کا اپنا ساتھی گولی کے راستے میں آ جائے گا۔ گولی مجھ پر حملہ کرنے والے کانسٹیبل کو لگی۔ تھری ناٹ تھری کی رائفل کے دھماکے سے اور کانسٹیبل کی چیخ سے رات کا سکون درہم برہم ہو گیا۔
صورتحال غیر متوقع طور پر انتہائی پُرخطر اور پریشان کن ہو گئی تھی۔ میرے لیے مقابلے سے تیز راہِ فرار ہو جانا ضروری تھا لیکن ایک خطرہ تو ڈرائیور کی طرف سے تھا کہ وہ رائفل کی دوسری گولی مجھے ضرور مار دے گا۔ میری وجہ سے اس کا ایک ساتھی قتل ہو چکا تھا اور یہ بات بھی اسے مشتعل کرنے کے لیے کافی تھی۔ دوسرا خطرہ سب انسپکٹر کی طرف سے تھا۔ اُس نے ضرور دیکھا ہو گا کہ ریوالور کس سمت میں گیا تھا۔ وہ ریوالور تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا تو مجھے کبھی فرار نہ ہونے دے گا۔ کانسٹیبل گولی لگنے کے بعد گر گیا تھا مگر اب اس کا اُٹھ رہا تھا کہ میں اس پر جا گرا۔ میرا گرنا میرے کام آیا۔ ڈرائیور نے اپنی رائفل سے جو دوسری گولی چلائی تھی وہ میرے سر کے اوپر سے گزر کے نہ جانے کدھر گئی۔ پھر میں نے سب انسپکٹر کو اٹھا لیا اور ڈھال بنا لیا۔ اُس کے دونوں بازو کمر کے پیچھے لاک کر کے میں نے اسے سامنے رکھا اور چلّا کر کہا: "چلاؤ... چلاؤ گولی... ماردو اپنے اس کتے کو بھی۔"
ڈرائیور نے اتنی دیر میں نشانہ لے لیا تھا مگر یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ نشانہ کون بنے گا۔ سب انسپکٹر نے خود کو چھڑانے کی بہت کوشش کی لیکن میں اُسے دھکیلتا ہوا آگے لے گیا۔ بے چارا ڈرائیور

جیپ سے باہر کھڑا ہوا اپنے افسر کی بے بسی کا نظارہ کرتا رہ گیا اور خود بھی بے بس ہو گیا۔ پولیس میں ریوالور صرف افسروں کو ملتے تھے چنانچہ گشت کرنے والی پارٹی کے باقی دو ارکان کے پاس وہی گوروں کے وقت کی رائفلیں تھیں۔ نیچے اترنے والے کانسٹیبل کی رائفل میدانِ کارزار میں اُس کے قریب لیٹی ہوئی تھی۔ ڈرائیونگ کرنے والے کانسٹیبل نے اپنی رائفل پیچھے کہیں رکھی ہو گی۔ ضرورت پڑتے ہی وہ بھی جنگ میں کود گیا تھا لیکن اس کی بہادری نے اپنی ہی شکست کا سامان کیا تھا۔ ایک خالی ہاتھ شخص تین مسلح افراد پر غالب آ چکا تھا اور یہ ان سب کے لیے ڈوب مرنے کا مقام تھا۔
"رائفل پھینک کر دور ہٹ جاؤ۔" میں نے ڈرائیور کو حکم دیا۔ "ورنہ تمہارے افسر..."
"اس بدمعاش کی بات مانی تو میں تم کو گولی مار دوں گا۔" سب انسپکٹر نے چلّا کر کہا۔ "شوٹ کر دو اسے بے وقوف..."
رائفل لے کر جیپ کے ساتھ کھڑے ہوئے ڈرائیور کی عقل خبط ہو گئی۔ وہ بھی پولیس کی وردی میں تھا اور اتنے کم فاصلے سے یقیناً تیسرا فائر کرتا تو اپنے ایک افسر کے قتل کا مجرم ہوتا لیکن افسر حکم دے رہا تھا کہ گولی چلاؤ۔ افسر خودکشی کرنا چاہتا تھا یا پاگل ہو چکا تھا لیکن وہ پاگل نہیں تھا چنانچہ اس نے رائفل کی ہلاکت خیزی کا تیسرا تجربہ نہیں کیا۔ اُسی وقت سب انسپکٹر نے ثابت کیا کہ اُس کا حکم غلط نہیں تھا کیونکہ میں نے خود کو فضا میں بلند ہوتے محسوس کیا۔ پھر میں سخت زمین پر گرا۔ ایک پل میں مجھ پر یہ حقیقت عیاں ہو گئی کہ سب انسپکٹر بھی جوڈو کراٹے کے داؤ پیچ جانتا ہے اور اس نے میرے ہاتھوں گرفتاری پر بے بسی کا مظاہرہ صرف اس لیے کیا تھا کہ وہ مناسب موقعے کے انتظار میں تھا۔
"اِدھر لاؤ رائفل، سُور کے بچے۔" میں نے سب انسپکٹر کی آواز سُنی اور ایک قلابازی کھا کے اٹھا۔ تیسری گولی جو سب انسپکٹر نے چلائی تھی اُس جگہ زمین میں گھُس گئی جہاں ایک سیکنڈ پہلے میں کھڑا تھا۔ میں نے دونوں دشمنوں کو مساوی فاصلے پر دیکھا اور کانسٹیبل کا انتخاب کیا۔ پھر میں ایک جھٹکے سے اوپر اُٹھا اور میری فلائنگ کک نے کانسٹیبل کو سب انسپکٹر پر گرا دیا۔ حیران ہونے کی باری اب سب انسپکٹر کی تھی کیونکہ جو وار میں نے کیا تھا وہ کوئی ماہرِ فن ہی کر سکتا تھا۔ اپنی طرف سے اُس نے بہت چالاکی سے کام لیا تھا اور وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جواب میں نہلے پہ دہلا ملے گا۔ یہ ہم سب کی فطری کمزوری ہوتی ہے کہ ہم خود کو سیر سمجھتے ہیں تو یہ توقع نہیں رکھتے کہ سوا سیر سے

پالا پڑ جائے گا۔ اس ایک لمحے میں جب ماتحت اور افسر ایک ساتھ گرے تھے۔ افسر کو یقین آ گیا ہوگا کہ میں کوئی بہت ہی عیار اور مکار مجرم ہوں جس نے پہلے اپنی شستہ انگریزی سے اور اپنے جھوٹ سے کام نکالنا چاہا تھا لیکن اس میں ناکامی ہوئی تو میں بے خوف و خطر تین مسلح پولیس والوں سے بھڑ گیا۔ شاید لاہور میں اس کا واسطہ ایسے کسی بدمعاش سے نہیں پڑا ہوگا جو اتنا مہذب اور اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی ہو۔ اتنا اچھا اداکار بھی اور جوڈو کراٹے کا ماہر بھی۔

کانسٹیبل تو سینے پر پڑنے والی کک کے بعد اٹھ ہی نہ سکا۔ اس کے وفات پانے کا بالکل امکان نہیں تھا اور وہ اتنا کمزور بھی نظر نہیں آتا تھا کہ ایک کک سے بے ہوش ہو جائے۔ غالباً اس نے دانش مندی اسی میں جانی کہ چپ چاپ لیٹ جائے اور خود کو مزید پٹائی سے بھی بچائے، ایک اور قتل کے الزام سے بھی اور افسر کی حکم عدولی کی سزا سے بھی۔ افسر کو میں نے اٹھتے ہی جالیا مگر وہ بہت پھرتیلا تھا۔ اس نے غوطہ مار کر میرا وار خالی کر دیا اور میں اس کے اوپر سے گزر کر گرا تو وہ بڑی پھرتی سے میرے اوپر سوار ہو گیا۔ میں نے اس کا ہاتھ بلند ہوتے دیکھا وہ بڑا مہلک وار تھا جسے دشمن کو یقینی طور پر ختم کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ عام نمائشی مقابلوں میں یا معمولی لڑائی جھگڑوں میں اس کا استعمال کوئی نہیں کرتا۔ جوڈو اور کراٹے کا فن بنیادی طور پر دفاعی کھیل ہے۔ چنانچہ اس میں جارحانہ نیت کو غیر اخلاقی تصور کیا جاتا ہے اور نقصان پہنچانے والے داؤ پیچ استعمال کرنے کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے مگر جہاں معاملہ زندگی یا موت کا ہو وہاں اخلاقیات کا سبق بے معنی ہو جاتا ہے۔ سب انسپکٹر بھی جو کچھ کر رہا تھا موجودہ حالات میں جائز تھا۔ میں نے فوراً اپنا دفاع کیا اور اس طرح اچھل کر کروٹ لی کہ دوسرے لمحے میں سب انسپکٹر نیچے تھا اور میں اوپر۔ مقابلے کو زیادہ دیر تک جاری رکھنے کی گنجائش نہیں تھی کیونکہ ادھر ادھر کی کوٹھیوں میں فائرنگ کے تین دھماکوں سے ہلچل مچ گئی تھی۔ میں نے سب انسپکٹر پر تابڑ توڑ حملے کیے اور ذرا سی دیر میں وہ بے حس و حرکت ہو گیا۔ دو طرف سے چوکیداروں نے یا گھر کے ملازموں نے شور مچا رکھا تھا لیکن وہ قریب نہیں آ رہے تھے۔ جنگ میں پولیس ایک فریق تھی اور وہ ریفری بھی نہیں بننا چاہتے تھے۔ ایک گھر سے کسی نے چلا کے پوچھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ دوسری طرف سے کسی نے کہا کہ یار پولیس کو بلاؤ۔ پھر نہ جانے کون زندہ دل تھا جو اس صورتِ حال سے بھی لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس نے ہنس کر کہا کہ ہاں یار، مزید پولیس کو بلاؤ۔ یہ پولیس تو کم ہے۔

میں نے بڑی عجلت میں اے ایس آئی کو اٹھا کے جیپ میں ڈالا اور جیپ میں ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ جیپ کا انجن ابھی تک چل رہا تھا۔ اُسے گیئر میں ڈالتے ہی میں نے ایکسیلریٹر دبا دیا۔ جیپ ایک دم بھاگی۔ اُسی وقت نہ جانے کدھر سے ریوالور کی ایک گولی آئی اور جیپ کے پیچھے لگے ہوئے دس لیٹر پٹرول کے جیری کین میں لگی۔ رات کی خاموشی میں فائر کی آواز سے میں نے اندازہ کر لیا کہ گولی اعشاریہ چار پانچ کے سروس ریوالور سے چلائی گئی تھی جو ملٹری آفیسر کے پاس ہو سکتا تھا، یا پھر پولیس اور رینجرز وغیرہ کے پاس۔ ان میں سے کسی نے مجھے فرار ہوتے دیکھا تھا اور فرض شناسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے روکنے کی کوشش کی تھی۔ اُسے جزوی طور پر کامیابی ہوئی۔ گولی ٹائر یا پٹرول ٹینک میں لگتی تو میں اتر کر بھاگنے پر مجبور ہو جاتا۔ جیری کین میں سوراخ ہوتے ہی پیٹرول نے آگ پکڑ لی تھی اور جیپ کے پچھلے حصے میں شعلے بھڑکنے لگے تھے۔ بہنے والا پٹرول جیپ کے کینوس پر بھی گر رہا تھا اور سڑک پر بھی پھیلتا جا رہا تھا لیکن اس کے خالی ہونے تک پوری جیپ کا آگ کی لپیٹ میں آ جانا یقینی تھا مگر جیری کین اچانک پھٹ گیا۔ دھماکا کسی دستی بم کی طرح تھا۔ میں نے جیپ کو ایک دم پورا ایکسیلریٹر دے کر آگے بڑھا دیا۔ ایک سیکنڈ کے وقفے سے میں نے پلٹ کر دیکھا تو جیری کین کے جلتے ہوئے ٹکڑے فضا سے زمین کی جانب پرواز کرتے نظر آئے۔ کچھ چراغ سے سڑک پر بھی روشن تھے لیکن جیپ کے پیچھے اب کینوس کا تھوڑا سا حصہ جلتا رہ گیا تھا۔ جیری کین کی آگ جیپ کی تیز رفتاری کے باعث پیچھے رہ گئی تھی اور جہاں پہلے جیری کین تھا وہاں اُس کا ایک ٹکڑا کلیمپ میں اٹکا رہ گیا تھا۔

جیپ کو روک کر میں نیچے اُترا۔ اگر میرے پاس خنجر ہوتا تو میں پیچھے والے حصے کا کینوس کاٹ دیتا۔ لیکن اب مجھے وہ سب ہُک کھولنے پڑے جن سے جیپ کا اوپر والا حصہ بندھا ہوا تھا۔ کینوس کے ٹاپ والی جیپ میں شفاف پلاسٹک کی کھڑکیاں سی بنی ہوئی تھیں۔ کینوس کے مقابلے میں پلاسٹک پر آگ نے فوراً اثر کیا اور ہر دو سائڈ پر بھی آگ پھیل گئی۔ میں نے اپنے حواس برقرار رکھے۔ آگ ابھی پیٹرول لائن اور پیٹرول ٹینک سے بہت دُور تھی۔ لیکن اندیشہ تھا کہ جلتا ہوا کینوس اگر سیٹوں پر گرا تو [illegible] یقیناً تباہ ہو جائے گی۔ میں نے کچھ ہُک کھولے، کچھ کھینچ کر اور جھٹکا دے کر توڑے اور باقی کینوس کو ان سوراخوں میں ہاتھ ڈال [illegible] سے اتارا جو کھڑکیوں کی جگہ نمودار ہو گئے تھے۔ وہاں جلا ہوا پلاسٹک اب بھی اتنا گرم تھا کہ میری ہتھیلیوں سے چپک گیا مگر میں اپنی دیوانہ وار کوشش سے کینوس کی فولڈنگ باڈی کو جیپ سے علیحدہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ کینوس کو سڑک پر ڈال کر میں نے پھر ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ میں گرفتاری سے بچ گیا تھا۔ فائرنگ سے بچ گیا تھا۔ سب انسپکٹر کے جوڈو کراٹے کے داؤ پیچ سے بچ گیا تھا اور آخری وقت میں آگ لگا دینے والی گولی کی تباہ کاری سے بھی بچ گیا تھا۔ یہ سب بمشکل پندرہ منٹ میں ہو گیا تھا۔ پندرہ منٹ پہلے میں بہت اچھے موڈ میں ڈاکٹر لطیف کے گھر سے نکلا تھا۔ پندرہ منٹ بعد میں ایک جیپ لے کر فرار ہو رہا تھا۔ جیپ میں ایک اے ایس آئی پڑا ہوا تھا۔ اس کے باقی دو ساتھیوں میں سے ایک کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ زندہ ہوگا۔ دوسرے کے بارے میں مجھے بالکل معلوم نہیں تھا کہ اپنے ساتھی کی چلائی ہوئی گولی اس کے جسم میں کہاں لگی تھی۔ ان دونوں کی رائفلیں بھی وہیں پڑی رہ گئی تھیں اور جائے واردات کے قریب ہی اے ایس آئی کے ریوالور کا مل جانا بھی یقینی تھا۔ صبح ہونے سے قبل ہی وہاں مزید پولیس پہنچ جائے گی اور اس سنگین واردات کی تفتیش شروع ہو گی جس میں بدمعاش ایک پولیس والے کو مجروح یا مقتول کر گئے تھے، ایک کو بے ہوش چھوڑ گئے تھے اور ان کے افسر کو جیپ سمیت اغوا کر کے لے گئے تھے۔

کھلی جیپ کو میں نے دو میل آگے ایک اسکول کے احاطے میں روکا۔ اسکول اُجڑا پڑا تھا اور سارے کلاس روم تاریک تھے۔ اس گیٹ پر کوئی چوکیدار نہ تھا جس سے میں جیپ کو اندر لے گیا تھا۔ اندر داخل ہونے سے قبل ہی میں نے ہیڈ لائٹس آف کر دی تھیں اور انجن بھی بند کر دیا تھا۔ جیپ اپنی رفتار میں خاموشی سے اندر گئی۔ میں نے اُسے موڑ کر دیوار کے متوازی کھڑا کر دیا۔ جہاں ایک طرف قدِ آدم جھاڑی پھیلی ہوئی تھی۔ اب میں نے زیادہ اطمینان کے ساتھ جیپ کی تلاشی لی۔ اس کے ڈیش بورڈ کے خانے میں کاغذات تھے۔ سائڈ کی پاکٹ سے مجھے ایک ٹارچ ملی۔ میں نے ٹارچ کو روشن کیا اور پیچھے بے ہوش پڑے ہوئے اے ایس آئی کے چہرے پر روشنی ڈالی۔ پھر روشنی کا مختصر سا دائرہ آگے بڑھایا اور ایک لمحے کے لیے میری نظر بھی منجمد ہو گئی۔ جرسی پر لگی ہوئی نام کی تختی کے حروف سے "پرویز وکٹر" کا نام بہت واضح پڑھا جا رہا تھا۔

میں سیدھا ہو کے بیٹھ گیا اور اپنے سامنے پھیلے ہوئے رات کے اندھیرے کو گھورنے لگا۔ یہ ایک نئی مصیبت تھی جس سے چھٹکارا حاصل کرنا مشکل تھا۔ مجھے افسوس ہوا کہ پرویز وکٹر کا نام پہلے میرے ذہن میں کیوں نہیں آیا۔ لاہور کی پولیس میں آخر کتنے اینگلو انڈین سب انسپکٹر ہوں گے۔ مشکل سے دو چار۔ قدرت نے مجھے حادثاتی طور پر اپنے ایک ایسے دشمن کے روبرو کر دیا تھا۔ جس کی مجھے تلاش تھی۔ سادھو رام کے لبوں سے یہ نام اگلوانے کے لیے مجھے اس پر سخت تشدد کرنا پڑا تھا لیکن اس سے حاصل ہونے والی معلومات نے ہمارے لیے وہ راستے کھول دیے تھے جو دلربا، کرنل جگن ناتھ اور سیوک رام کے بعد سادھو رام کی موت پر بند ہو گئے تھے۔ سائیں پاپڑ والے کا اڈا تباہ ہو گیا تھا اور دشمن کے جتنے ایجنٹ اس اڈے سے منسوب تھے، مارے جا چکے تھے یہاں تک کہ سادھو رام کی بیوی بھی نہ رہی تھی۔ ایسے وقت میں سادھو رام نے پرویز وکٹر، اس کے بھائی اور اس کی بہن سونیا وکٹر کے نام بتا کے ہماری جدوجہد کو نئی سمت عطا کر دی تھی۔ اب پرویز وکٹر کسی جستجو کے بغیر ہی مجھے مل گیا تھا اور میں بجا طور پر کہہ سکتا تھا کہ تقدیر مجھے اس سے ملوانے کے لیے سوتے سے اٹھا کے لائی تھی۔ رابعہ کا شوق دیدار تو بہانہ بن گیا۔ اُسے دیکھنا تو نصیب نہ ہوا۔ نصیب نے راہ چلتے نیا گل کھلا دیا۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ میں پرویز وکٹر کا کیا کروں۔ کوئی دوسرا سب انسپکٹر ہوتا تو میں اسی جگہ جیپ چھوڑ کر بھاگ جاتا لیکن پرویز وکٹر کا معاملہ مختلف تھا۔ ہم نے ابھی تک کوئی لائحہ عمل طے نہیں کیا تھا کہ پرویز وکٹر اور اس کی نرس سسٹر سونیا کا سراغ لگانے کے بعد ہم کیا کریں گے۔ اب اچانک فیصلے کا وقت آ گیا اور میرا ذہن اُلجھن کا شکار ہو گیا۔ میں اُسے شہلا کے گھر نہیں لے جانا چاہتا تھا۔ دوسری جگہ چن ماہی والا گھر تھا جس کی چابیاں ابھی تک ہمارے پاس تھیں۔ یہ ہو سکتا تھا کہ میں اور محسن اس کو اسی ایم آر ایس کے تھانے میں لے جائیں جہاں سادھو رام سے تفتیش کی گئی تھی اور پرویز وکٹر سے بھی پولیس کے انداز میں سب کچھ پوچھ لیں مگر میرا دل اس سے مطمئن نہیں تھا۔ تشدد کے سامنے سادھو رام نہ ٹھہر سکا تھا مگر یہ ممکن تھا کہ پرویز وکٹر مر کے بھی کچھ نہ بتائے۔ اگر وہ کچھ بتائے بغیر مر گیا تو ہمیں فائدے کے بجائے نقصان ہوگا۔ پولیس تو یہی کہے گی کہ چور ڈاکو اے ایس آئی پرویز وکٹر کو مقابلے کے بعد اُٹھا کے لے گئے مگر کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جو پرویز وکٹر کے اغوا کا مطلب کچھ اور نکالیں گے۔ وہ یہی سوچنے پر مجبور ہوں گے کہ سائیں پاپڑ والے کا اڈا تباہ کرنے والوں نے ہی پرویز وکٹر کو اٹھایا ہے اور اب وہ اس سے مزید معلومات

حاصل کریں گے اور ظاہر ہے اس کے بعد اگلا وار کریں گے۔ نہیں، دشمن اتنے بے وقوف نہیں ہیں۔ وہ فوراً حفاظتی تدابیر اختیار کریں گے۔ وہ ٹھکانے بدل دیں گے، جو پرویز وکٹر کے علم میں ہوں گے کہ بفرضِ محال وہ کچھ بتانے پر مجبور ہو جائے تب بھی نقصان نہ ہو اور پرویز وکٹر کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچنے والوں کو مایوسی کے سوا کچھ نہ ملے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ سونیا کو غائب کر دیں، ہمیشہ کے لیے یا وقتی طور پر۔ پرویز وکٹر کے دوسرے بھائی کو بھی ختم کر دیں اور اُس ایمبولینس کو بھی جسے وہ چلاتا تھا۔ دشمن کے ایجنٹ تو فقط مہرے ہوتے ہیں، ایک چال غلط ہو جائے تو مہرے ہٹ جاتے ہیں۔ ان کے مارے جانے سے اوپر والوں کو فرق نہیں پڑتا، جن کے ہاتھ مہروں کو آگے بڑھاتے ہیں۔ وہ نئے مہرے منتخب کر لیتے ہیں۔ راستے بدل دیتے ہیں اور پہلے کے سب سُراغ مٹا دیتے ہیں۔

مَیں نہیں چاہتا تھا کہ دشمن ہوشیار ہو جائے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ پرویز وکٹر کو کھلا چھوڑ دیا جائے۔ ہم خاموشی سے اس کا تعاقب کریں اور اس کی نقل و حرکت پر نظر رکھیں۔ یہ اسی صورت میں ممکن تھا جب پرویز وکٹر کو کچھ نہ ہو۔ وہ یہی سمجھے کہ اس کا واسطہ کسی خطرناک مجرم سے پڑ گیا تھا۔ اُس نے مجھے بالکل نہیں پہچانا تھا اور میرا موجودہ حلیہ اتنا بدلا ہوا تھا کہ اس واردات میں میرا نام آنے کا بہت کم امکان تھا۔ پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟ پرویز وکٹر کو اسی جگہ چھوڑ کر بھاگ جانا چاہیے، یا اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنا چاہیے اور پھر اس سے معذرت کر کے اُسے گھر چھوڑ آنا چاہیے اور اس بہانے پرویز وکٹر کے گھر اور اس کی بہن سونیا کو دیکھ لینا چاہیے؟ نہیں، پرویز وکٹر ہوش میں آنے کے بعد مجھے معاف نہیں کرے گا۔ بات صرف مار پیٹ کی نہیں رہی تھی۔ فائرنگ سے ایک کانسٹیبل زخمی ضرور ہوا تھا۔ مَیں نے فرائض کی انجام دہی میں مداخلت کی تھی۔ سرکاری اہلکاروں کو مارا تھا اور اُن کی جیپ پر قبضہ کیا تھا۔ اُن سے اسلحہ چھینا تھا۔ میرے جرائم ناقابلِ معافی تھے۔ مَیں نے جھوٹ بول کر خود کو کرسچین اور مشن ہائی اسکول کا ٹیچر ظاہر کیا تھا۔ اپنے ایک بھائی کو انجینئرنگ یونیورسٹی کا لیکچرار بتایا تھا۔ ان سب معاملات کی تحقیق و تفتیش کے بغیر وہ مجھے کہاں چھوڑے گا۔

فیصلہ کرنے کی کوشش میں میرا ذہن اُلجھتا جا رہا تھا۔ مَیں نے بہتر سمجھا کہ اس سارے معاملے کو ایم آر ایس کے دیگر ارکان سے صلاح مشورے پر اُٹھا رکھوں۔ یہ فیصلہ سب سے بہتر فیصلہ تھا جس نے میرے ذہن کو کچھ ہلکا کر دیا۔ ان حالات میں وہی لوگ صحیح انداز سے سوچ سکتے تھے جو اس واردات میں ملوث نہیں تھے۔ میرا دماغ سوچنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

مَیں نے جیپ کو پھر اسٹارٹ کرنے سے پہلے پرویز وکٹر کی طرف دیکھا۔ بظاہر وہ بے ہوش تھا لیکن مجھے شک ہوا کہ وہ مکر کر رہا ہے۔ اس جیسے چالاک شخص سے کچھ بعید نہ تھا کہ بے خبری میں مجھ پر پیچھے سے حملہ کر دے۔ ابھی اس کا موقع نہیں تھا۔ وہ اُٹھنے کی کوشش بھی کرتا تو مَیں اُسے اُٹھنے نہ دیتا لیکن ڈرائیونگ کرتے ہوئے میری توجہ بٹ جاتی۔ مَیں آگے اپنے راستے پر نظر رکھنے کی کوشش بھی کرتا اور پیچھے قیدی پر بھی تو پرویز وکٹر فائدہ اٹھا لیتا۔ مَیں نے اسے ہلا جلا کے دیکھا اور پھر مطمئن ہو کر جیب سے سگریٹ نکالی۔ سگریٹ جلاتے وقت بھی مَیں محتاط تھا۔ ایک کش لے کر مَیں نے جلتی ہوئی تیلی بجھائی اور باہر پھینکنے کا ارادہ کیا لیکن ایک دم پلٹ کر اس کا دہکتا ہوا سرا پرویز وکٹر کی ناک پر رکھ دیا۔ وہ ایک دم حرکت میں آیا اور اُس کا ہاتھ بے اختیار ناک پر گیا۔ اُس نے محسوس کیا کہ ڈراما نہیں چلا تو اُٹھ کر پیچھے سے میرے گلے میں بازو ڈالنے کی کوشش کی۔ سگریٹ پھینک کر مَیں نیچے جھک گیا۔ اس کا ہاتھ میرے شانے پر لگا اور مَیں نے اُس کی گالی سنی۔ مَیں نے پیچھے گھوم کر اس کے سر پر مکا مارا۔ وہ جیپ کی سائڈ سے ٹکرایا۔ اس کے سر میں جیپ کی باڈی کے فریم سے خاصی چوٹ آئی ہو گی۔ کیوں کہ وہ پھر اُٹھنے کی کوشش میں ناکام رہا۔ مَیں نے اس کے سر کو بالوں سے پکڑ کر اٹھایا اور پھر جیپ کی سیٹ کے فریم پر مارا۔ اس کے حلق سے کوئی آواز نہیں نکلی تو مَیں نے بال چھوڑ دیے۔ سر جیپ کے فرش پر گرا لیکن وہ ساکت رہا۔

دس منٹ بعد مَیں نے جیپ کو شہلا کے گھر کے دروازے پر روکا تو اندر سے کلاک کے تین گھنٹے سنائی دیے۔ مَیں اُسی کھڑکی سے اندر گیا، جس سے نکل کے فرار ہوا تھا۔ اندھیرے میں مجھے ایک جگنو سا چمکتا نظر آیا۔ یہ مرزا غالب تھے۔ جو میرے بستر پر آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔

"تم ... تم اندر کیسے آئے؟" مَیں نے خفت سے سر کھجا کے کہا۔

"جیسے تم باہر گئے تھے" غالب نے کہا۔ "کہو ملاقات ہوئی؟"

"ہاں، اس کے سوا بہت سے ملے۔ ایک میرے ساتھ بھی آئے ہیں" مَیں نے کہا۔ "لیکن تم یہاں کیوں آئے ہو؟ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، تم کو ادھر قدم رنجہ نہ فرمانے کی سختی سے تاکید کی گئی تھی۔"

"سختی سے تاکید تو بہت سی باتوں کی سب کو کی گئی ہے، مثلاً نماز پڑھنے کی اور ممنوعہ لٹریچر نہ پڑھنے کی" غالب نے اپنے دفاع میں نیا فلسفہ پیش کیا۔ "جب کوئی اور کسی کی نہیں سنتا تو ہم کیوں سُنیں۔ بس ہم نے قدم رنجہ فرما دیا۔"

"یہ کیا ٹرٹر لگا رکھی ہے۔ شرفاء کا سونا حرام ہے۔" ٹیڈی نے لحاف سے مُنہ نکال کے کہا۔ "یہ سالا صحافی پھر آ مرا یہاں۔"

"یار شرفاء، ایسی باتوں کا وقت نہیں ہے۔" مَیں نے کہا۔ "مَیں ذرا چہل قدمی کے لیے گیا تھا۔ واپسی پر ایک مہمان ساتھ ہو لیا۔ اب سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا کیا کروں۔ تم ذرا فوراً محسن خان شیروانی کو خواب گاہ سے برآمد کرو کہ ایم آر ایس کا ہنگامی اجلاس ہے مگر نازو کو سونے دو۔"

واجبی سے ہنگامے کے بعد ہنگامی اجلاس شروع ہوا۔ مَیں نے ٹیلی گرام کے الفاظ میں اپنے جرائم کی تفصیل پیش کی جو سب کے سو جانے کے بعد مجھ سے سرزد ہوئے تھے۔ کیوں کہ تقدیر میں یہی لکھا تھا۔

"تقدیر کے گھوڑے! آخر کیا تکلیف تھی کہ سوتے سوتے تو جھک مارنے نکل گیا۔" محسن نے کہا۔

"تکلیف تو پرانی ہے دوستو! تم جانتے ہو سب۔" مَیں نے عاجزی سے کہا۔ "یہ بھی تو دیکھو کہ مَیں کیا چیز اٹھا لایا ہوں۔"

"اور اب اُسے گلی میں ڈال رکھا ہے،" غالب نے کہا۔ "تاکہ لوگ اُسے دیکھ لیں اور وہ ہم لوگوں کو اور ہمارے ٹھکانے کو دیکھ لے۔"

"اس کو مَیں اندر لے آتا ہوں۔ ابھی تو اس کے اندر اور باہر اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔" مَیں نے کہا۔ "پھر بھی احتیاط ضروری ہے۔"

مَیں نے اور محسن نے پرویز وکٹر کو بڑی پھرتی سے کھڑکی کے راستے اندر ڈالا۔ پھر اس کے ہاتھ پیر باندھے۔ منہ بند کیا اور آخر میں آنکھوں پر بھی پٹی باندھ کر باتھ روم میں ڈال آئے۔

"یہ جیپ کس کی ہے؟" مرزا غالب نے کہا۔

"سرکار کی اور کس کی۔" مَیں نے کہا۔ "کاغذات تو نہیں دیکھے مَیں نے مگر ..."

"مگر کیا۔ تم نے نمبر بھی نہیں دیکھا،" مرزا غالب نے میز پر مکا مارا۔ "بلکہ جیپ تک نہیں دیکھی۔ دیکھی ہوتی تو سمجھ لیتے کہ ابھی تک سرکار نے ہماری پولیس کو جو جدید ترین گاڑیاں دی ہیں وہ کن ماڈل کی ملٹری ماڈل جیپ ہیں۔ ان کی نمبر پلیٹ پر ویسٹ پاکستان پولیس لکھا ہوا ہے۔ یہ نئی جیپ ہے۔ پرائیویٹ نمبر ہے اس کا۔ جاؤ اور کاغذات نکال کے لاؤ۔ اور میاں محسن، اپنی جورو سے کہو کہ شرفاء کے لیے شرافت سے اٹھ کے کافی بنائے۔"

"شرافت کی اولاد۔ تیرے باپ کی نوکر نہیں ہے وہ۔" ٹیڈی نے آنکھیں نکال کر کہا۔ "خبردار جو اُسے جگایا۔"

"مگر مَیں تو جاگ رہی ہوں،" شہلا نے دروازے سے جھانک کر کہا۔ "کافی بن رہی ہے بھائی جان۔" جب مَیں کاغذات لینے جا رہا تھا تو بھائی جان یعنی خواجہ نیک محمد پر سب ہنس رہے تھے۔ چند منٹ بعد مَیں واپس آیا تو ٹیڈی اور غالب ایک ہی سگریٹ سے باری باری کش لگا رہے تھے۔ وہ بالکل بچوں کی طرح لڑتے تھے، ایک منٹ کے بعد وہ لڑائی کی وجہ بھی بھول جاتے تھے۔

"یہ تو اپنے پرویز وکٹر صاحب کی جیپ ہے جنابِ عالی۔" مَیں نے کاغذات کو روشنی میں دیکھ کر کہا۔

"تو اس میں پرویز وکٹر کے گھر کا پتا بھی ہو گا جنابِ عالی۔" محسن نے کہا۔ پتا واقعی تھا اور سب نے باری باری دیکھا۔

"یہ کیا ضروری ہے کہ پتا دُرست ہو یا رہائشی پتا ہو۔" غالب نے آخری کش کے بعد سگریٹ باہر پھینک دی۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟ ابھی اس میں دو سوٹوں کا دم تھا۔" ٹیڈی نے کہا۔

"اچھا تو باہر جاؤ اور دو سوٹے لگا لو۔" غالب نے کہا۔ "عادت تو پڑی ہوئی ہے ٹوٹے چن کر پینے کی۔"

"اگر تُو نے پہلے ہی کاغذات دیکھ لیے ہوتے تو اُسے یہاں لانے کے بجائے اس پتے پر لے جاتا۔" محسن نے مجھ سے کہا۔ "معلوم ہو جاتا کہ پتا اصلی ہے یا نقلی۔"

"مَیں وہاں نہیں جانا چاہتا۔" مَیں نے کہا۔ "اب یہ کام کسی اور کو کرنا ہو گا۔ مجھے سونیا وکٹر نہ دیکھے اور اس کا دوسرا بھائی بھی نہ دیکھے تو اچھا ہے ورنہ تینوں نے میری صورت دیکھ لی تو سمجھ جائیں گے کہ جس نے مار پیٹ کی تھی وہی مجرم اتنی دیدہ دلیری سے گھر تک آ گیا تھا۔"

"اس سے کیا فرق پڑے گا۔" مرزا غالب نے کہا۔ "خرابی کے اسباب تو آپ پہلے ہی بہت کر آئے ہیں۔ آخر تمہیں ڈاکٹر لطیف کا نام لینے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ بھی خواہ مخواہ پریشان ہوں گے اب۔"

"وہ ... بس غلطی ہو گئی ... بلکہ غلطی بن گئی۔" مَیں نے کہا۔ "مگر انھیں پریشانی کیوں ہو گی۔ وہ صاف انکار کر دیں گے۔"

"یار، عقل سے کام لو۔ پرویز وکٹر صرف نام سے تصدیق نہیں کرے گا۔" غالب نے جھنجلا کے کہا۔ "نام پر تو اُسے پہلے ہی غلط ہونے کا شک تھا۔ وہ حُلیہ بتائے گا کہ اس قسم کے ایک

شخص نے آپ کا نام لیا تھا۔ وہ آپ کو کیسے جانتا ہے اور ڈاکٹر لطیف بتا دیں گے کہ وہ رابعہ کو دیکھنے آیا تھا۔ نام اگر نہ بتایا تب بھی کہیں گے کہ ایک خاتون مریض سے ملنے والا تھا۔ پرویز دکٹر پہلے کچھ نہیں کہے گا کہ وہ کیوں پوچھ رہا تھا۔ بعد میں سب بتائے گا اور . . . ہو سکتا ہے رابعہ سے ملے؟"

"رابعہ سے . . . ڈاکٹر لطیف اس کی اجازت نہیں دیں گے۔" میں نے ڈوبتے دل کے ساتھ کہا۔

"اس وقت نہ دیں۔ بعد میں وہ کورٹ سے آرڈر لے آئے گا کہ رابعہ سے اس ملزم کے بارے میں پوچھنا ہے۔ ڈاکٹر لطیف کورٹ کے احکامات کو نہیں ٹال سکتے۔ پرویز دکٹر کے لیے یہ بہت سنگین معاملہ ہوگا۔ خدانخواستہ وہ کانسٹیبل مر گیا تو قتل کا کیس ضرور بنے گا اس میں رابعہ کو شاملِ تفتیش کرنا ضروری ہو جائے گا۔"

"یہ تو بڑی خرابی ہوگی۔" میں نے پریشانی سے کہا۔ "وہ رابعہ کو تنگ کرے گا۔ رابعہ کچھ بتانے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔"

"ہاں۔ لیکن اس کو عدالت میں حاضر ہونا پڑے گا۔" غالب نے کہا۔ "ڈاکٹر لطیف کی رائے کو مسترد بھی کیا جا سکتا ہے اور رابعہ کا کیس میڈیکل بورڈ کی رائے کے لیے بھیجا جا سکتا ہے جو حتمی فیصلہ کرے گا کہ کیا واقعی اس کی یادداشت متاثر ہوئی ہے۔ سوچو ذرا اس کے نتائج کتنے غلط نکل سکتے ہیں۔ استغاثہ اصرار کر سکتا ہے کہ مقدمے کی اس اہم ترین گواہ کو میو اسپتال کے نفسیاتی وارڈ میں منتقل کیا جائے جہاں شفایاب ہونے تک اسے زیرِ نگرانی رکھا جا سکے یعنی وہ پولیس کے پہرے میں رہے۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ ڈاکٹر لطیف کے کمرے سے اس کو فرار کا موقع مل جائے گا۔ کہاں ڈاکٹر لطیف کے گھر کا ماحول اور کہاں پولیس کے ساتھ نفسیاتی وارڈ کی فضا۔"

"میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔" میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں اسے ابھی لے آتا ہوں۔"

"بیٹھو۔ ایک حماقت کے بعد دوسری حماقت کرو گے تو ہمارے لیے بھی کچھ کرنے کی گنجائش نہیں چھوڑو گے۔" غالب نے مجھے ہاتھ کھینچ کر پھر بٹھا دیا۔ "وہاں اب شہلا کو جانے دو۔ وہ ڈاکٹر لطیف کو سمجھا دے گی کہ تمہارے ساتھ واپسی پر پولیس کا جھگڑا ہوا تھا اور تم نے حوالے کے طور پر ان کا نام لیا تھا مگر اب کوئی پوچھے تو وہ انکار کر دیں۔ وہ کہہ سکتے ہیں کہ میرا نام تو دروازے کی نیم پلیٹ پر لکھا ہوا ہے۔ ہر شخص جو ادھر سے گزرتا ہے دیکھ سکتا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ رابعہ کے حق میں بہتری کی خاطر وہ جھوٹ بولنا قبول کر لیں گے۔"

"لیکن انھوں نے صبح نو بجے بُلایا تھا مجھے اور میرا جانا بے حد ضروری ہے۔" میں نے کہا۔

"تم فی الحال اُدھر نہیں جا سکتے۔ جاؤ گے تو پکڑے جاؤ گے۔" غالب نے کہا۔ "پرویز دکٹر سے کچھ بعید نہیں کہ وہ ڈاکٹر لطیف کی بات پر بھی اعتبار نہ کرے اور باہر سادہ کپڑوں میں پولیس آنے جانے والوں کو دیکھتی رہے۔"

"یار خدا کے لیے یہ بحث ابھی چھوڑ دو۔ پہلے پرویز دکٹر کو یہاں سے لے جاؤ۔" محسن بولا۔ "صبح ہونے والی ہے۔"

"چلو میں اور تم چلتے ہیں۔" غالب نے محسن سے کہا۔ "اس پتے پر سونیا دکٹر یا اس کا بھائی ملے تو اچھا ہے۔ میں کہوں گا کہ ہم رات کی ڈیوٹی کر کے لوٹ رہے تھے۔ یہ جیپ کھڑی دیکھی۔ اس میں یہ آدمی پڑا تھا۔ آدھا اندر آدھا باہر۔ ہم اسے یہاں لے آئے کیوں کہ کاغذات میں یہی پتا تھا۔"

"وہ پوچھیں گے کہ تھانے میں کیوں نہیں لے گئے تھے؟" محسن بولا۔

"سیدھی صاف بات کہ ہم نیکی کر کے مصیبت میں پڑنا نہیں چاہتے تھے۔" غالب بولا۔ "یہ آپ کا آدمی ہے تو اسے سنبھالو اور جو آپ کا دل چاہے کرو۔ ہم جاتے ہیں۔ تھانے کچہری سے ہمیں معاف رکھو۔"

"تمھارے ساتھ میں چلتا ہوں۔" ٹیڈی بولا۔ "محسن کو شہلا کے ساتھ جانے دو۔ یہ بھی صبح ہونے سے پہلے ہی ڈاکٹر لطیف کے گھر پہنچ جائیں تو اچھا ہے۔"

غالب اور ٹیڈی اتفاقِ رائے سے پرویز دکٹر کو اٹھا کر لے گئے۔ صبح چار بجے ان کی جیپ گلی سے نکل چکی تھی اور میرا خیال تھا کہ آدھے پونے گھنٹے میں وہ پرویز دکٹر کا پتا تلاش کر لیں گے۔ مجھے یہ ڈر ضرور تھا کہ کہیں پرویز دکٹر کا بھائی اور سونیا انھیں زبردستی نہ روک لیں مگر مجھے غالب کی عقل اور معاملہ فہمی پر بھی بھروسا تھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح جان بچا کے اپنے ساتھ ٹیڈی کو بھی نکال لائے گا۔ انھیں پرویز دکٹر کو گھر والوں کے حوالے کرنے سے پہلے اس کے ہاتھ پیر بھی کھولنے تھے اور منہ پر بندھی ہوئی پٹی بھی کھولنا تھی۔ خدا کرے کہ راستے میں پرویز دکٹر کو ہوش نہ آئے ورنہ غالب اور ٹیڈی مشکل میں پڑ جائیں گے۔ میں نے دل ہی دل میں دعا مانگی۔ پرویز دکٹر سخت مشتعل ہوگا اور آسانی سے مطمئن نہیں ہوگا تاہم غالب کا وہ کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ گر تھانے بھی جانا پڑا تو غالب کے لیے یہ ثابت کرنا مشکل نہ ہوگا کہ آدھی رات کے بعد تک وہ اخبار کے دفتر میں تھا اور ٹیڈی اس کے ساتھ تھا۔

"اگر ڈاکٹر لطیف نے جھوٹ بولنے سے انکار کر دیا تو کیا ہوگا سکندر؟" محسن نے تشویش سے پوچھا۔

"بہت بُرا ہوگا۔ رابعہ پھنس جائے گی اور اُسے نکالنا بھی آسان نہیں ہوگا۔" میں نے کہا۔ "میرے سارے پرانے کیس نکل آئیں گے . . ."

"مگر اُسے نکالنا بھی تو نقصان دہ ہوگا۔" محسن بولا۔ "وہ اسی گھر میں رہے گی تو ٹھیک ہوگی۔"

"ڈاکٹر لطیف نے تو کہا تھا کہ وہ مجھے زندہ سلامت دیکھے گی تو ٹھیک ہوگی۔" میں نے کہا۔ "اب صبح نو بجے میں نہ گیا تو بہت زیادہ خرابی نہ ہو جائے محسن۔ وہ رابعہ کو ذہنی طور پر مجھ سے ملنے کے لیے تیار کریں گے۔ میں نہ پہنچا تو وہ سمجھے گی کہ ڈاکٹر لطیف بھی جھوٹ بول رہے تھے۔ ایسے کیس میں مریض کا ڈاکٹر پر سے اعتماد اُٹھ جائے تو سارا علاج بے مصرف ہو جاتا ہے۔ مجھے جانا چاہیے محسن اور میں جاؤں گا۔"

"سکندر، تیری عقل پر جذبات غالب آ رہے ہیں۔ وہاں جانے سے بہتر ہے کہ تو سیدھا تھانے جا کر خود کو قانون کے حوالے کر دے، کم از کم پولیس کے سر تو تیری گرفتاری کا سہرا نہ بندھے۔" محسن نے خفگی سے کہا۔ "کیا تو اندازہ نہیں کر سکتا کہ تیری گرفتاری سے کتنے لوگوں کا مفاد وابستہ ہے۔ اس بار وہ تجھے چالان، ضمانت اور سماعت پر پیشی کے انتظار میں قید رکھنے کا رسک نہیں لیں گے۔ میں شرط لگا کے . . . میرا مطلب ہے کہ مجھے ایک فی صد بھی شبہ نہیں کہ وہ تجھے مار دیں گے، خود پولیس کے ہاتھوں مروا دیں گے۔ ایسے جھوٹے پولیس مقابلوں میں خطرناک مجرم اور ڈاکو اکثر مارے جاتے ہیں۔ پولیس اپنی فائلیں بند کرتی ہے اور عدالت میں زیرِ سماعت مقدمات ختم کرتی ہے۔ ثبوت، شہادت، جرح اور اپیل کے چکر ختم کرتی ہے۔ تیرے ساتھ بھی یہی ہوگا۔ کہا جائے گا کہ تُو نے پولیس پر فائر کر کے بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ تیرے کسی ساتھی نے تجھے ایک ریوالور پہنچا دیا تھا۔ سب شکاری یہی چاہتے ہیں کہ ایک بار تُو زیرِ دام آ جائے تو سارے جھگڑے جو تیرے دم سے ہیں، ختم کر دیے جائیں گے۔ تو خود سوچ۔ اس سے کس کس کا بھلا ہوگا۔ نقصان ہوگا تو صرف ایم آر ایس کا۔ شکاری تو تیری زندگی کی قیمت دس لاکھ تک لگا سکتے ہیں اور دس لاکھ ایک آدمی کو قتل کرنے کا اتنا زیادہ معاوضہ ہے کہ کوئی بھی اس کام کے لیے تیار ہو سکتا ہے، خواہ بعد میں پھانسی ہو جائے۔ نقصان ہوگا ہمارا۔ کیا ہماری دوستی کی قیمت دس لاکھ ہے؟ رابعہ کی قیمت دس لاکھ ہے؟ ایم آر ایس کا مشن دس لاکھ میں ختم کیا جا سکتا ہے؟ مگر دس لاکھ یا دس کروڑ میں بھی شکاری تجھے شکار کرنے میں کامیاب رہے تو مرنے والا صرف سکندر بخت نہیں ہوگا۔ پھر رابعہ بھی مر جائے گی۔ محسن اور شہلا بھی مر جائیں گے۔ غالب اور نیک محمد بھی جی کے کیا کریں گے۔ یہ شکست ہم یوں قبول نہیں کر سکتے۔ اس سے تو کہیں بہتر ہوتا کہ تو ابتدا میں دلاور سے سودا کر لیتا۔"

میں نے دیکھا تو شہلا دروازے کی دہلیز سے لگی رو رہی تھی۔

"خدا کے لیے بس کرو، چُپ ہو جاؤ۔" وہ چلّائی۔

"اگر صبح نو بجے میں رابعہ سے ملنے نہ پہنچا محسن، تو اُسے ہمیشہ کے لیے کھو دوں گا۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ دیوانگی کی سرحد عبور کر کے اتنی دُور نکل جائے گی جہاں سے میرے لیے اس کو واپس لانا بالکل ناممکن ہو جائے گا۔"

"میں ایک بات کہوں سکندر۔" محسن نے تھوڑے سے تذبذب کے بعد کہا۔ "فرض کر ایسا وقت آیا کہ تجھے رابعہ کی محبت اور اپنے فرض میں سے ایک کا انتخاب کرنا پڑا، تو تیرا فیصلہ کیا ہوگا؟ تو رابعہ کو چھوڑے گا یا اس مشن کو جس کا مقصد وطن کی سرزمین کو غداروں اور اس کی آبرو کا سودا کرنے والوں سے پاک کرنا ہے۔ اس مشن میں ہم سب ایک طرف ہیں۔ ہم صرف تیری وجہ سے اپنے مشن کو ختم نہیں کریں گے۔ جب تک یہ وزیر خان کے قتل کا انتقام لینے کا مسئلہ تھا یہ تیرا ذاتی مسئلہ تھا لیکن اب یہ کسی کا بھی ذاتی مسئلہ نہیں ہے۔ ہم سب اس مشن میں برابر کے شریک ہیں اور کوئی بھی مشن محض ایک فرد کی کمی سے ختم نہیں ہوتا۔ مشن کسی فرد کا نام نہیں ہوتا۔ یہ ایک جذبہ ہوتا ہے۔ مقصد ہوتا ہے اور تحریک ہوتی ہے۔ افراد اُسے ایک مشعل کی طرح لے کر چلتے ہیں اور آگے بڑھتے جاتے ہیں۔ ایک ہاتھ کٹ کر گرتا ہے تو اس مشعل کو روشن رکھنے والے دوسرے ہاتھ اٹھ جاتے ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کل میں یا تو۔ نیک محمد یا غالب نہ رہیں۔ لیکن ہماری جگہ کوئی ضرور لے گا۔ اس کا نام کچھ بھی ہو مگر ہماری جگہ خالی نہیں ہوگی۔ اس مشن کو اسی جذبے اور لگن کے ساتھ تکمیل تک پہنچانے والے کبھی کم نہ ہوں گے۔"

میں پتھر کے بُت کی طرح بیٹھا ہوا دیوار کو دیکھتا رہا۔ محسن نے یکلخت سچ کو یُوں میرے رُو برُو کر دیا تھا کہ میں اس سے نظر چُرا ہی نہیں سکتا تھا۔ اس حقیقت کو تسلیم کیے بنا چارہ ہی نہ تھا کہ آزمائش کا دوراہا اس سفر کے کسی بھی مرحلے میں کسی بھی وقت آ سکتا ہے۔ جب مجھے یا خود محسن کو ایک راستے کا انتخاب کرنا پڑے گا۔ ایک وہ راستہ جو اپنی ذات کے تحفظ اور اپنی خوشیوں کی بقا کا راستہ ہوگا، ایک اپنے لیے مرنے جینے کا راستہ۔ خود غرض زندگی کا راستہ، جس میں دل اتنا تنگ ہو جائے کہ وہ کسی اور کے لیے اپنی ایک سانس بھی وقف کرنا منظور نہ کرے۔ نہ دوستی کے نام پر، نہ انسانیت کے نام پر، نہ رشتوں کے نام پر اور نہ اعلیٰ و ارفع مقاصد کے نام پر۔ دوسرا راستہ قربانی کا راستہ ہوگا۔ جس پر چلنے کے لیے اپنی ذات کو فراموش کرنا پڑے گا۔ اپنی خوشیوں کو قربان کرنا ہوگا اور اپنے جذبات کا گلا گھونٹنا ہوگا۔ یہ ادائے فرض کا راستہ ہوگا۔ حب الوطنی، انسانیت کی آبرو، صداقت کی روشنی، رشتوں کی بقا، سب کچھ دوسرے راستے سے منسوب ہوگا۔

"اگر... اگر یہی انتخاب تجھے کرنا پڑا محسن..." میں نے چھیڑ کے لہجے میں کہا۔

"میں تو بہت پہلے طے کر چکا ہوں۔" محسن بولا۔ "مجھے اب کسی فیصلے کا مرحلہ درپیش نہیں۔ فیصلہ تو میں نے اسی دن کر لیا تھا جب میں ولایت سے تیرے ساتھ یہاں پہنچا تھا۔ میرے والدین اور میری بہن سب میری خوشیوں سے اپنی اُمیدوں کا دامن باندھے میرا انتظار کرتے رہے تھے مگر میں تو لوٹ کر ہی نہیں آیا۔ نگری نگری پھرا، مسافر گھر کا رستہ بھول گیا۔ انتظار کرنے والے انتظار کرتے کرتے رخصت ہو گئے۔ میں واپس پہنچ کے بھی ان سے اتنا ہی دور رہا، جتنا ولایت میں تھا۔ میں نے تیرا ساتھ دیا تھا۔ میرے لیے بہت آسان تھا کہ میں اپنے گھر میں سارے غموں سے محفوظ رہتا۔ والدین کی محبت اور شفقت پاتا۔ ان کے ارمان پورے کرتا۔ وہ میری شادی بڑی دھوم دھام سے کرتے۔ مرنے سے پہلے میرے لیے کسی اعلیٰ ملازمت کا بندوبست کر جاتے یا مجھے بزنس لائن پر لگا جاتے۔ میں کسی بیوروکریٹ یا بزنس مین کی طرح بے فکری اور عیاشی کی زندگی گزارتا اور بس۔ کبھی یاد کر لیتا کہ ہاں ایک یار تھا اپنا سکندر۔ نہ تجھے کوئی گلہ ہوتا مجھ سے، نہ مجھے اپنی خود غرضی پر شرمندگی ہوتی۔ مگر سکندر! اس وقت میں نے اپنا گھر، اپنے رشتے اور اپنا مستقبل سب قربان کر دیا تھا تو آج مجھے کون سی آزمائش میں مشکل ہو گی۔ میں بہت پختہ ہو چکا ہوں۔ اب مجھے انتخاب کرنا پڑا تو شاید میں سوچوں گا بھی نہیں۔ میں وہی راہ اختیار کروں گا جو پہلے کی تھی۔ میں پھر اپنے رشتے اور اپنا گھر، اپنا مستقبل اور اپنی خوشیاں سب قربان کرنے کا حوصلہ رکھتا ہوں۔ تو آج اس آزمائش سے دوچار ہے۔ اِس سے پہلے تُو نے صرف دولت کو چھوڑا ہے۔ آج شاید تجھے جذبات کے رشتوں کو چھوڑنا پڑے۔ رابعہ کو چھوڑنا پڑے۔ اپنے مستقبل کے خوابوں کو اور خوشیوں کو چھوڑنا پڑے۔"

"میں سب چھوڑ دوں گا محسن۔" میں نے اچانک کہا۔ "میری آنکھیں شاید بند تھیں۔ تُو نے یہ اچھا کیا کہ میری آنکھیں کھول دیں اور مجھے آئینہ دکھا دیا۔ مجھے اس میں اپنی صورت دیکھ کر شرم آنے لگی ہے۔ میں بہت نیچے گر کر سوچ رہا تھا۔ حیوانی سطح پر جہاں ایک مرد کے لیے صرف ایک عورت اہم رہ جاتی ہے اور اس کا حصول۔ کیا میں اندھا ہو گیا تھا کہ میں نے تیرے نقشِ قدم بھی نہیں دیکھے، حالانکہ یہ ساری مسافت تُو نے میرے ساتھ اور میرے سامنے طے کی تھی۔ آخر میرا راستہ جدا کیسے ہو سکتا ہے۔ مجھے انھی نقوشِ قدم پر چلنا ہے جو تُو نے بنائے ہیں۔ میں رابعہ کو خدا پر چھوڑتا ہوں۔ اگر وہ چاہے گا تو ایک دن رابعہ بھی ٹھیک ہو جائے گی اور مجھے وہ سب مل جائے گا جس کی آج مجھے آرزو ہے مگر اس آرزو پر میں اپنے مشن سے روگردانی کروں تو مجھ پر لعنت۔ میں ایسا سوچ کر بھی شرمندہ ہوں۔"

"میں جانتا ہوں کہ وقت آتا تو سکندر بخت وہی کرتا جو تم نے کیا۔ میں سکندر بخت کو جانتا ہوں۔" محسن بولا۔ "بس میں نے تیرا راستہ صاف کیا ہے، جس پر جذباتی اُلجھنوں کی وجہ سے تذبذب اور شکوک کے کانٹے پھیل گئے تھے۔ خدا ہم سب کو ساتھ رکھے اور ہماری اُمیدوں کے چراغ نہ بجھنے دے لیکن کوئی اکیلا رہ جائے اور اندھیرے میں گھر جائے تب بھی اُسے اپنے مشن کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔"

پھر خاموشی کا ایک مختصر وقفہ آیا جس میں شہلا، محسن اور میں اپنے اپنے خیالوں اور اندیشوں اور اُمیدوں کے ساتھ تنہا رہ گئے۔ یہ وقفہ بڑے کرب اور عذاب کا تھا جس میں ہم سب نے سچ کے زہر کی تلخی کو آبِ حیات سمجھ کر قبول کیا۔ یہ دل شکستگی کا وقفہ تھا جس میں عقل نے سارے آبگینے توڑ ڈالے۔ میں نے رابعہ کا تصور کرنا چاہا اور نہ کر سکا۔ سارے عکس مٹ گئے تھے اور گڈمڈ ہونے لگے تھے پھر اس کے سارے روپ بکھر گئے اور میں نے اُسے ایک دل شکن روپ میں دیکھا۔ وہ ایک پاگل خانے میں بند تھی۔ وہ مجھے پہچانتی ہی نہیں تھی۔ "اگر اس دن تم آ جاتے سکندر بخت!" میرے کانوں میں ڈاکٹر لطیف کی آواز آئی۔ "تو آج یہ یہاں نہ ہوتی۔ اس حال میں نہ ہوتی۔" میں نے رابعہ کو ملتجی نظروں سے دیکھا۔ "تم مجھے لینے ضرور آؤ گے۔ مجھے اکیلا چھوڑ کر نہیں جاؤ گے۔ میں بھی تو کل تک شریکِ سفر تھی۔ آج میری مجبوری کو تم بھی نہیں سمجھو گے تو پھر کون سمجھے گا۔ سفر جاری رہتا ہے۔ سفر کو جاری رہنا چاہیے۔ جو تھک کے بیٹھ گیا اُسے منزل سے کیا... میں کیسے رک سکتا ہوں رابعہ۔

دروازہ کھلا اور غالب کے ساتھ ٹیڈی نمودار ہوا۔ "تم لوگ ابھی بیٹھے ہو؟ اسی طرح جیسے ہم چھوڑ گئے تھے۔ ہم تو اپنا کام کر آئے۔" ٹیڈی نے مسرت سے اعلان کیا۔ "سونیا سے بھی مل آئے۔"

"اُس نے کچھ خاطر مدارت نہیں کی؟" محسن نے کہا۔ "جان بخشی کیسے ہوئی؟"

"اپنے خواجہ صاحب تو سونیا کو دیکھتے ہی سب بھول گئے تھے کہ کیا کہنا ہے اور کیا کرنا ہے۔" غالب نے کہا۔ "پھر اُس کا دوسرا بھائی نکل آیا سلیم وکٹر۔ بہن تو رونے دھونے لگی وہ ہمارے پیچھے پڑ گیا تھا خبیث۔ ہم نے مختصراً وہی کہا جو سوچ کر گئے تھے۔ وہ ہمیں روکنے پر پر آمادہ تھا۔ مجھے اتفاق سے موقع مل گیا۔ اُسے دھکا دیا، باہر سے کنڈی لگائی اور جوتیاں بغل میں دبا کے بھاگے۔" وہ قہقہہ مار کے ہنسا۔

"گویا سلیم وکٹر ہی وہ شخص ہے جو ایک طرف دلاور سے رابطہ رکھتا تھا۔" میں نے کہا۔ "اس سے مال لیتا تھا اور اپنی نرس بہن مونیا کے ساتھ ایمبولینس میں ڈال کر سادھورام کو پہنچاتا تھا۔"

"ہاں اور پھر یہی سلیم وکٹر سادھورام سے پیسہ وصول کرنے جاتا تھا اور رقم دلاور کو پہنچاتا تھا۔" غالب نے کہا۔ "دوسرا بھائی پرویز وکٹر، پولیس میں ہونے کی وجہ سے براہِ راست سراج ڈی ایس پی سے رابطہ رکھتا تھا۔ وہ مال کو لاہور سے کرماں والی تک پہنچانے میں مدد کرتا ہوگا۔ ممکن ہے ایمبولینس کے ساتھ جیپ میں چلتا ہو تاکہ راستے میں کسی جگہ ایمبولینس کو روکنے کی ہمت کوئی نہ کرے۔ آگے بارڈر کراس کرانے میں ڈی ایس پی سراج ساتھ دیتا تھا۔"

"وکٹر فیملی کو اس کاروبار میں کلیدی حیثیت حاصل ہے۔" میں نے کہا۔ "ان سے ہمیں دونوں طرف کی معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔"

"ہاں، بشرطیکہ ہمارا ایک جاسوس ان کے درمیان ہو۔" غالب نے کہا۔ "بظاہر جہاں وہ رہتے ہیں وہاں کسی کو بھی ان پر شک نہیں ہوگا کہ وہ کس قسم کے کاروبار میں ملوث ہیں۔ محلے والے ہمیں کچھ بھی نہیں بتا سکیں گے۔ سب یہی کہیں گے کہ تینوں بہت شریف اور بے ضرر لوگ ہیں۔ بہن کسی اسپتال میں نرس ہے۔ ہر روز نرس کی وردی پہن کر نکلتی ہو گی تو سب دیکھتے ہوں گے۔ ممکن ہے ایمبولینس اُسے لانے لے جانے کے لیے آتی ہو۔ محلے میں انھوں نے بہت اچھی گڈول بنا رکھی ہو گی۔ نرس کا پیشہ بہت معتبر اور محترم شمار ہوتا ہے۔ اگر دوسرا بھائی ایمبولینس ڈرائیور ہے تو یہ بھی اچھی بات ہے۔ محنت کرتا ہے اور نیک کام کرتا ہے۔ تیسرا پولیس میں اے ایس آئی ہے۔ وہ اگر بدنام ہوا تو یہ کون سی انوکھی بات ہو گی۔ سارا محکمہ ایک جیسی شہرت رکھتا ہے۔ اس میں اچھے بھی بُرے ہی سمجھے جاتے ہیں۔ تاہم اے ایس آئی پرویز وکٹر کے بارے میں مجھے یقین ہے کہ وہ ایماندار اور فرض شناس مشہور ہوگا۔ پاس پڑوس کے لوگوں کی رائے اہمیت نہیں رکھتی۔ ممکن ہے آدھے اس کی شرافت کے قائل ہوں اور باقی آدھے اسے بھی ڈھونگ سمجھتے ہوں۔ ان کا رہن سہن اچھا ہوا تو اسے پولیس مین بھائی کی آمدنی سے منسوب کیا جاتا ہوگا۔ ایک نرس اور ڈرائیور کی آمدنی ہی کیا ہے۔ لیکن افسرانِ بالا اور پرویز وکٹر کے ساتھیوں سے پوچھا جائے تو وہ اس نوجوان اے ایس آئی کے بارے میں انھی خیالات کا اظہار کریں گے جیسے خیالات سابق اے ایس آئی اکرم شیخ کے بارے میں پائے جاتے تھے۔ زیادہ تر تو گالیاں ہی دیتے ہوں گے کہ سالا نہ خود کھاتا ہے اور نہ ہمیں کھانے دیتا ہے۔"

"پرویز وکٹر کو کیا ضرورت ہے رشوت کی۔" محسن بولا۔ "دوسرے راستے سے اس کی آمدنی کی کوئی حد نہیں۔ اس آمدنی کے مقابلے میں رشوت کی کمائی تو ایسے ہے جیسے ندی کے سامنے نالا... ایمان داری اور فرض شناسی کی شہرت تو ایک ڈھال ہے جو اسے محفوظ رکھ سکتی ہے۔ انکل رضوی جیسے افسرانِ بالا اس کی بہت عزت اور قدر کرتے ہوں گے۔"

"سوال یہ ہے کہ اتنی آمدنی کے باوجود وہ موہنی روڈ کے اس پرانے اور چھوٹے سے مکان میں کیوں رہتے ہیں۔ کیا یہ بھی ایک ڈھونگ ہے؟" غالب نے کہا۔ "وہ دُہری زندگی گزار رہے ہیں۔ دیکھنے میں فرشتے، کرتوتوں میں شیطان۔ ظاہر میں غریب اور درحقیقت دولت مند۔ وہ شام کو پائے جاتے ہوں گے فائیو اسٹار ہوٹلوں میں جہاں اُن کے محلے کا کوئی آدمی انھیں دیکھ ہی نہیں سکتا۔"

"دوستو! وہ اندر سے کیا ہیں اور باہر سے کیا ہیں۔ اس پر بحث اور قیاس آرائی کا کیا فائدہ۔" غالب نے کہا۔ "ہمیں تو اصلیت معلوم کرنی ہے اور اس کا وہی ایک طریقہ ہے کہ ہم اِن پر چوبیس گھنٹے نگاہ رکھیں۔ ان کے روز و شب کا ہر لمحہ ہماری نظر میں ہو۔ ہم ان کی گفتگو کا ایک ایک لفظ سنیں تاکہ ہمیں ان کے پروگرام کا قبل از وقت پتا چل سکے۔"

"یہ ناممکن ہے۔ وہ اپنے سائے سے بھی محتاط ہوں گے۔" محسن بولا۔ "اور کسی نے ایک دن بھی اُن کا تعاقب کیا تو انھیں معلوم ہو جائے گا۔"

"تعاقب سے مسئلہ حل بھی نہیں ہوگا۔" میں نے کہا۔ "مزید مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ کوئی اندر ان کے ساتھ ہوگا تو کام بنے گا۔"

"میں کوشش کرتا ہوں۔" محسن نے کہا۔ "ابھی تک انھوں نے مجھے نہیں دیکھا۔ دستک دے کر کہوں گا کہ حضرات و خواتین، کیا آپ مجھ بے گھر کو اپنے سایۂ عاطفت میں جگہ دینا پسند کریں گے۔ یقین کیجیے میں شریف آدمی ہوں جیسا کہ میں آپ کو نظر آتا ہوں۔"

"اُن کے گھر میں کسی کا رہنا عملاً ناممکن ہے۔" غالب نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اپنے خطرناک کاروبار کی وجہ سے وہ کسی پر اعتبار نہیں کر سکتے۔ اُن کے گھر میں گھسنا تو درکنار، ان سے تعلقات بڑھانا بھی آسان نہیں ہوگا۔"

"جو کچھ میرے ذہن میں ہے وہ مشکل ضرور ہے مگر ناممکن نہیں ہے اور یہ تو کسی کام میں ہاتھ ڈالنے کے بعد ہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کو مشکل قرار دیا جائے یا ناممکن سمجھ کر چھوڑ دیا جائے۔ مشکلات پر قابو پایا جا سکتا ہے اس کے لیے جتنی لگن اور محنت درکار ہے، اتنی ہی عقل اور ذہانت سے کام لینے کی بھی شرط ہے۔ مزید یہ کہ دشمنوں کے درمیان رہنا اور محفوظ رہنا حوصلے کی بات ہے اور عقل کے گھوڑے ہر طرف دوڑانے کے بعد

انھوں نے جھوٹ نہیں بولا تھا؟ رابعہ کا یقین پختہ ہو جائے گا کہ سب اُس سے جھوٹ بولتے رہے ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ سکندر اس دنیا میں ہوتا تو وعدہ کر کے نہ پہنچتا۔ اس کی راہ میں ندیاں اور پہاڑ، سمندروں کے طوفان اور زلزلے حائل ہوتے تب بھی وہ آتا۔ میرا نہ پہنچنا رابعہ کے لیے سب سے بڑا ثبوت بن جائے گا کہ وہ یقین کے فریب کا شکار نہیں ہے۔ ڈاکٹر لطیف نے ابھی تک جو اُمید کی کرن روشن رکھی تھی وہ گم ہو جائے گی اور رابعہ ایک بار پھر اس اندھے خلا میں گر جائے گی جہاں سے اس کے لیے تنہائی کا جہنم شروع ہوتا ہے۔ پھر وہاں سے واپسی کسی کے اعجازِ مسیحائی اور دستِ امکاں میں نہ ہو گی۔ کتنی کوشش اور خواہش کے ساتھ مَیں اُسے ایک بار خود فراموشی کی آخری سرحد سے واپس لے آیا تھا۔ اس سرحد کے پار دیوانگی کا صحرائے بے کنار تھا جس میں کسی یاد کا سایہ بھی نہ تھا اور محرومیوں کی کڑی دھوپ تھی۔ کتنی اُمید تھی مجھے کہ بہت جلد مَیں اس کے ماضی، حال اور مستقبل کے ٹوٹے ہوئے رشتوں کو وقت کی ایک ہی زنجیر سے منسلک کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ رابعہ تو اس اندھے کی طرح تھی۔ جسے مَیں نے انسانوں کی دوڑتی بھاگتی، کچل دینے والی، مار دینے والی مشینی سواریوں کے ہجوم سے نکال کر سڑک پار کرانے کا عزم کیا تھا مگر اب سڑک کے درمیان مَیں نے اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا کہ وہ راہ گم کردہ جدھر چاہے جائے۔ حالات کی اس مجبوری کے سامنے مَیں بھی بے بس تھا۔ رابعہ کو مجھ سے ایسے اندازِ تغافل کی اُمید نہ ہو گی لیکن حالات نے میرے لیے ایک کے سوا سارے راستے بند کر دیے تھے۔ مجھے مجبور کر دیا تھا کہ مَیں محبت کو بھول جاؤں اور اپنا فرض یاد رکھوں۔

"تم کو بہت دُکھ ہے سکندر کہ تم رابعہ کو لا سکتے تھے مگر نہ لا سکے۔" نازو نے کہا۔

مَیں نے چونک کر نازو کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں پیر سمیٹے گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکائے اپنے پیر کے ناخن تراش رہی تھی۔ اس کی نظریں مجھ پر نہیں تھیں لیکن اس کے دل میں میرا خیال تھا۔ مجھے دکھی دیکھ کر وہ دکھی تھی۔ "ہاں... نہیں... اس میں میرا کیا قصور ہے۔"

"اُسے مَیں تمھارے لیے لے آؤں گی۔" وہ مجھ سے نظریں ملائے بغیر بولی۔ "تم اپنے دل کو دکھی مت کرو۔"

اس کی بات نے مجھے شرمندہ کر دیا۔ ایک بار پہلے بھی وہ جان پر کھیل کر رابعہ کو بچا لائی تھی۔ اُسے اغوا کر کے کرماں والی لے جانے والے بہت طاقت ور اور خطرناک مرد تھے۔ اگر وہ چاہتی تو اکیلی فرار ہو کر آ سکتی تھی، اس پر کوئی الزام نہ آتا۔ کوئی بھی اُسے محبت کی رقابت میں خود غرض ہو جانے کا مجرم قرار نہ دیتا۔ لیکن اُس نے رابعہ کو فراموش نہیں کیا۔ اس پاگل لڑکی کی محبت بالکل بے غرض تھی۔ اُسے مجھ سے محبت تھی مگر یہ بالکل بے طلب اور یک طرفہ محبت تھی۔ اُسے بالکل پروا نہیں تھی کہ محبت کے جواب میں اُس کو مجھ سے محبت کیوں نہیں ملتی۔ وہ رابعہ سے بالکل حسد نہیں کرتی تھی اور مَیں نے دنیا میں اتنی بے لوث محبت کو صرف اُن کے دل میں دیکھا تھا جو خدا کو، سچائی کو اور ظاہر کی حقیقت کو پانے کے لیے اپنے وجود کو یوں فراموش کر دیتے تھے کہ بے وجود ہو جاتے تھے۔ اُن کی ذات کی خواہشات بے وجود ہو جاتی تھیں اور ان کے ساتھ دوسروں کا رویّہ، دُکھ سُکھ، رنج و راحت اپنا جسم اور جذبات بے معنی ہو جاتے تھے لیکن نازو ایک جوان عورت تھی جس کا دل طوفانی خواہشات کا گہوارہ ہوتا ہے۔ اور اس کی عمر کی لڑکیاں دل کے ہاتھوں اس حد تک مجبور ہو جاتی تھیں کہ سوچنے سمجھنے کے قابل ہی نہیں رہتی تھیں مگر یہ دنیا سے نرالی لڑکی تھی۔ جس کے پاگل پن کے انداز میں بھی ضبطِ نفس تھا، ڈسپلن تھا اور خود اختیاری تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ مانگنے سے سب کچھ نہیں ملتا مگر آرزو تو جرم نہیں، خواب تو جرم نہیں اور آزارِ محرومی کی خلش تو جرم نہیں۔ اس کی محبت یہ تھی کہ وہ محبت کرنے کا مجھے حق دے۔ مجھے اپنی خواہشات کا اسیر نہ کرے بلکہ میری خوشی کو اپنی سب خوشیوں پر مقدم رکھے اور اس کی خوشی یہی تھی کہ مجھے کوئی دُکھ نہ ہو۔ نہ وہ اپنے اس لازوال اور ناقابلِ تسخیر جذبۂ عشق کو دنیا سے چھپاتی تھی اور نہ اس سے مغلوب ہوتی تھی۔ اُس نے بہت پہلے تسلیم کر لیا تھا کہ وہ مجھے حاصل نہیں کر سکتی اور مَیں رابعہ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا، چنانچہ اب اُس نے کسی عام عورت کی طرح میرے اور رابعہ کے درمیان حائل ہونے کی، رابعہ کو اپنی راہ سے ہٹانے کی، خود کو الگ کرنے کی بالکل کوشش نہیں کی تھی۔ اُس نے اپنی خوشیوں کو میرے لیے وقف کر دیا تھا، جسم و جان کی ساری توانائیوں کے ساتھ۔ مَیں ایک ضدی بچّے کی طرح تھا جو اَڑ گیا ہو کہ وہ ایک کھلونے کے سوا دنیا کی کوئی چیز قبول نہیں کرے گا۔ اگر وہ مٹّی کا کھلونا ہے تب بھی اُس کو وہی کھلونا چاہیے۔ اس کے سامنے کوئی آسمان کے تارے بھی ڈال دے، چاندی کے ٹکڑے پھیلا دے اور قوسِ قزح کی کرنیں بکھیر دے تب بھی وہ خوش نہ ہو۔ اب نازو نے رابعہ کو میری خوشی جان لیا تھا تو اُسے سنبھال کے رکھنا اور اُسے بالآخر میرے حوالے کرنے کو اس نے اپنا فرض جان لیا تھا۔

لیکن اس کے ساتھ ہی وہ عقل و ہوش سے بے گانہ نہیں ہوئی تھی اور اُس نے تارک الدنیا ہو کے رہبانیت اختیار نہیں کی تھی۔ اُسے زندگی کے تقاضوں کا احساس تھا اور خود کو ان خوشیوں

سے محروم رکھنا نہیں چاہتی تھی جو قدرت نے عطا کی تھیں۔ اس نے اپنے آس پاس بسنے والوں سے آنکھیں بند نہیں کی تھیں چنانچہ وہ غالب کی چاہت کو اُس کی آنکھوں میں پڑھ سکتی تھی اور اس کے دل کی دھڑکن بھی سن سکتی تھی۔ بالکل اُسی طرح جیسے وہ اپنے استاد ڈیڈی کے برادرانہ جذبات کے خلوص کو سمجھ سکتی تھی۔

اور اس معاملے میں نازو کا رویّہ بالکل سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اُس نے کبھی غالب کی دل شکنی نہیں کی تھی اور اس کے ڈھکے چھپے اظہارِ عشق کا بُرا بھی نہیں مانا تھا۔ کسی حد تک اُس نے غالب کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ زبان سے کچھ کہے بغیر اُس نے غالب کو سمجھا دیا تھا کہ ایک محبت میری رُوح کی ہے جو سکندر کے لیے وقف ہے لیکن تم چاہو تو نازو سے محبت کر سکتے ہو۔ اس نے یہ نہیں کہا تھا کہ غالب میرا خیال چھوڑ دو کیوں کہ مَیں سکندر کی ہو چکی ہوں اور اب کسی کو یہ حق نہیں دے سکتی کہ وہ مجھ سے محبت کرے۔ اُس کی شخصیت کے یہ دونوں پہلو بالکل جُدا تھے اور ان میں کوئی کش مکش نہیں تھی۔ مَیں پیشین گوئی کر سکتا تھا کہ وہ غالب کی محبت کا جواب نفرت سے نہیں دے گی۔ اگر اس سے شادی کر سکے گی تو بہت اچھی بیوی بھی ثابت ہو گی جسے اپنے شوہر، اپنے گھر اور اپنے بچّوں کے لیے جان بھی دینا پڑے تو دریغ نہ کرے۔ وہ غالب سے وفادار رہے گی اور اُسے اتنی ہی محبت دے گی جتنی کوئی بھی شوہر پرست بیوی دے سکتی ہے لیکن اُس کے دل میں جہاں میری محبت کا چراغ روشن ہے وہ گوشہ صرف میرے خیال سے آباد رہے گا۔ غالب یا کوئی اور چاہے کہ اس خیال کی روشنی کو بُجھا دے تو یہ ناممکن ہو گا۔

"کیا سوچ رہے ہو اتنی دیر سے؟" نازو نے اچانک کہا۔

مَیں چونک پڑا۔ "کچھ نہیں... کوئی ایسی بات نہیں۔" مَیں نے کہا: "محسن اور شہلا کو بہت دیر ہو گئی۔"

"ہاں... دو گھنٹے ہونے کو ہیں۔" نازو نے کہا۔ "تم لوگوں نے میرے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے؟"

"تمھارے بارے میں...؟" مَیں نے حیران ہو کے کہا۔ "اپنے فیصلے تم خود کرتی ہو بی بی۔ کس کی مجال ہے جو دخل دے سکے۔"

"مَیں مذاق نہیں کر رہی ہوں۔" وہ بولی۔ "تم کوئی کام لینا چاہتے تھے مجھ سے۔"

"کام تو ہے... لیکن نازو... مَیں پھر کہتا ہوں کہ گھر لوٹ جاؤ۔" مَیں نے کہا۔ "والدین کے گھر کے باہر پناہ بڑی مشکل سے ملتی ہے۔"

"مَیں کس سے پناہ مانگ رہی ہوں؟" وہ خفا ہو کے بولی۔ "اور کیا یہاں مَیں تم سب کی پناہ میں نہیں ہوں۔ مَیں بہت مطمئن ہوں۔"

"مگر تمھارے ماں باپ اور تمھارا بھائی... وہ مطمئن نہیں ہیں۔" مَیں نے کہا۔ "وہ سمجھتے ہوں گے کہ تم صرف ان کی رسوائی کا سبب بن رہی ہو۔ انھیں دُکھ دے رہی ہو۔ تمھاری عمر کی لڑکیاں..."

"میری عمر کی لڑکیاں تو غلط راستے پر بھی نکل جاتی ہیں۔" وہ تند لہجے میں بولی۔ "مجھے یہ اعتماد تو ہے کہ مَیں نے غلط قدم ابھی تک نہیں اٹھایا۔ میرا کردار بے داغ ہے اور میرے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں۔ مَیں خود کو اتنا ہی محفوظ سمجھتی ہوں جتنا اپنے گھر میں تھی، اور یہ سب تو نیّت کے کھیل ہیں ورنہ سخت پردہ دار کہلانے والی لڑکیاں کیا نہیں کرتیں۔ کہاں نہیں جاتیں۔ ان کے اپنے خاندان میں انھیں کزن مل جاتے ہیں ورنہ محلوں میں کوٹھیوں کی دیواریں پھاندنے والے بھی مل جاتے ہیں۔ وہ اسکول اور کالج جانے کے لیے کتابیں لے کر اور برقعے اوڑھ کر نکلتی ہیں تو شالامار اور مقبرۂ جہانگیر پہنچتی ہیں کیا تم یہ سب نہیں جانتے؟ کون نہیں جانتا۔ کچھ لوگ اپنا بھرم رکھتے ہیں اور اسے پردہ کہتے ہیں۔ مَیں جو کچھ کر رہی ہوں، سب کے سامنے کر رہی ہوں اور غلط نہیں کر رہی ہوں۔ عزّت و ذلّت اور رسوائی یا نیک نامی کی سند دینے والے اکثر وہی ہیں جو چوری چھپے غیر اخلاقی اور غیر قانونی کام کرتے ہیں۔ جھوٹ بولتے ہیں۔ غیبت کرتے ہیں۔ امانت میں خیانت کرتے ہیں۔ حقوقِ ہمسائیگی اور حقوق العباد کی پروا نہیں کرتے۔ جہاں ڈر نہ ہو وہاں غیر قانونی کام سے بھی نہیں چوکتے۔ کتنے ہیں ایسے جن کو موقع ملے اور پھر بھی وہ رشوت نہ لیں، سفارش قبول نہ کریں، کسی لالچ یا دباؤ میں نہ آئیں۔ پورے لاہور میں ہے کوئی ایسا جو رات کو ویران سڑک پر ٹریفک سگنل کی لائٹ سُرخ دیکھے اور رک جائے۔ وہ سب کسی نہ کسی طور مجرم ہیں جو دوسروں پر فردِ جرم عائد کرتے ہیں۔ مَیں اُن سے نہیں ڈرتی۔ ایک دن میرے والدین کو اور میرے بھائی کو یقین آ جائے گا کہ مَیں نے بغاوت نہیں کی تھی وہی کیا تھا جسے جائز اور سچ مانا تھا۔ ہمّت نہ ہو تو آدمی نتائج کی سوچ کے ڈر جاتا ہے۔ مَیں نتائج کی پروا نہیں کرتی کیوں کہ مَیں جانتی ہوں، نتائج غلط نہیں ہو سکتے۔"

مَیں دم بخود رہ گیا۔ معاشرتی اقدار کے پیمانے سے اس کے خیالات یقیناً سرکش اور باغیانہ تھے مگر اس بات سے انکار ناممکن تھا کہ وہ سچ کہنے کا حوصلہ رکھتی ہے اور اس کی بات کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ "تم اپنے گھر سے بالکل قطع تعلق کر لو گی۔"

"اس حد تک کہ مَیں اپنے گھر میں نہیں رہوں گی، مَیں اُن سے رابطہ رکھوں گی۔" وہ بولی۔ "تاکہ انھیں یقین رہے کہ مَیں زندہ ہوں۔"

"وہ خود تمھارے بغیر صرف اس یقین پر زندہ رہ سکیں گے کہ تم زندہ ہو۔" میں نے کہا۔ "اور کچھ نہیں سوچیں گے۔ کہ تم کہاں ہو اور کس حال میں ہو۔ لڑکی تو ایک پل کے لیے نظر سے اوجھل ہو تو ماں باپ دس اندیشوں اور وسوسوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔"

"ایک تو میرے ماں باپ جانتے ہیں کہ میں کس قسم کی لڑکی ہوں۔" وہ بولی۔ "پھر وہ دوسری قسم کے ماں باپ ہیں۔ ماں کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی کیوں کہ وہ صرف ماں ہے لیکن میرے والد اور میرے بھائی مجھ سے مختلف نہیں ہیں۔ انھیں مجھ پر اعتماد ہے۔"

"اور مجھ پر۔۔۔؟" میں نے کہا۔

"اعتماد تو تم پر بھی ہے۔" نازو نے کہا۔ "وہ تمھارے جرائم کی نوعیت کو بھی سمجھتے ہیں۔ انھیں بالکل شک نہیں کہ تم ایک مضبوط کردار کے مالک اور شریف آدمی ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ جو کچھ تم نے کیا وہ غلط تھا۔ ان کے لیے ہر غیر قانونی کام غلط ہے، خواہ وہ شریف آدمی کرے یا بدمعاش۔ تاہم انھیں میری طرف سے کوئی خطرہ نہیں ہوگا کہ میں غلط لوگوں کے درمیان ہوں۔ میرا بھائی اور میرا باپ مل کر میری ماں کو بھی سمجھا لیں گے کہ میرے لیے دعا کرے اور میری بحفاظت واپسی کا انتظار کرے۔"

"ٹھیک ہے نازو۔ میرا کام تمھیں سمجھانا تھا لیکن تم خود سمجھ دار ہو۔" میں نے کہا۔ "ہم سب کوشش کریں گے کہ تمھیں ایک دن پھر والدین کے گھر پہنچا دیں، بالکل سلامتی اور حفاظت کے ساتھ۔ اسی حالت میں جیسے تم گھر سے نکلی تھیں۔ ہم اس بارِ امانت کو اٹھا لیں گے۔ حالانکہ اس سے ہماری ذمے داریوں میں اضافہ ہوگا مگر ہم سب جانتے ہیں کہ کسی رشتے کی عدم موجودگی میں سب سے مضبوط رشتہ انسانیت کا ہوتا ہے جس نے ہمیں ایک خاندان بنا دیا ہے اور دُکھ سُکھ میں ساتھ دینے کا حوصلہ عطا کیا ہے۔"

"حوصلہ تم میرا بھی آزما چکے ہو۔ یہ بتاؤ میں کس طرح تمھارے کام آسکتی ہوں؟" وہ بولی۔

"بتاؤں گا۔ سب کے سامنے بتاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "وہ کام ایسا ہے جو بہت مشکل اور خطرناک ہے۔ جب میں نے اس کام کے بارے میں سوچا تھا تو مجھے خیال آیا تھا کہ تمھارے سوا یہ کام کوئی نہیں کر سکتا۔ میرا اب بھی یہی خیال ہے لیکن فیصلہ میں نہیں کروں گا۔ سب کا متفق ہونا ضروری ہے تاکہ کل کو خدانخواستہ ۔۔۔ کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے۔۔۔ تو الزام صرف مجھ پر نہ آئے۔"

"میں تمھیں کبھی الزام نہیں دوں گی۔" وہ بولی۔ "مجھے بتلنے میں کیا حرج ہے؟"

"نہیں بات سب کے سامنے ہوگی۔" میں نے کہا۔ "وہ لوگ آتے ہی ہوں گے۔ میرا خیال ہے کہ میں باہر جا کر ڈاکٹر لطیف کے گھر فون کروں۔ آخر اتنی دیر کیوں کی انھوں نے؟" نازو نے سر ہلایا اور میں باہر نکل گیا۔

ایک دکان پر میں نے پبلک ٹیلی فون کی تختی لگی دیکھی۔ وہ ایک جنرل اسٹور تھا جس پر گاہکوں کا ہجوم تھا۔ کئی بار چلانے کے بعد میں دکان کے مالک پر یہ واضح کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ مجھے آٹے دال کا بھاؤ نہیں معلوم کرنا بلکہ فون کرنا ہے۔ اس نے ہاتھ ہلا کے مجھے اس کی اجازت دی اور میں نے یادداشت کی مدد سے ڈاکٹر لطیف کا نمبر ڈائل کیا۔ گھنٹی چار مرتبہ بجی، پھر اُن کی بیگم نے ریسیور اٹھا لیا۔

"آنٹی، میں سکندر بول رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "وہ محسن۔۔۔ اور شہلا آپ کی طرف آئے تھے؟"

"یہاں۔۔۔ نہیں تو۔۔۔ میں نے نہیں دیکھا۔" وہ بولیں۔ "تم خود کیوں نہیں آئے آخر۔۔۔؟"

"تھی کچھ ایسی مجبوری کہ مجھے اپنی جگہ محسن اور اس کی بیوی کو بھیجنا پڑا۔" میں نے کہا۔

"تم بھی کمال کرتے ہو۔ ڈاکٹر صاحب بہت ناراض تھے۔" وہ بولیں۔ "کہ اس لڑکے نے بہت غلط حرکت کی ہے۔ اگر وہ آ نہیں سکتا تھا تو اُس نے آنے کا وعدہ کیوں کیا تھا۔ اب رابعہ پر اس کا غلط اثر ہوا تو کون ذمے دار ہوگا۔"

"کیا وہ موجود ہیں؟ میں خود انھیں بتا دیتا ہوں کہ میں کیوں نہیں آسکا۔" میں نے کہا۔

"اُن کے کلینک میں کوئی بیٹھا ہے۔ وہ چلا جائے تو میں بات کروں۔" انھوں نے کہا۔ "ہو سکتا ہے محسن بھی وہاں ہی بیٹھا ہو۔"

"آپ فون انھیں دے دیں۔" میں نے کہا۔ "کلینک میں بھی تو فون ہوگا۔"

"ہے۔۔۔ لیکن۔۔۔ میرا خیال ہے چوہدری دلاور کے سامنے وہ بات نہیں کریں گے۔"

"چوہدری دلاور؟" میرے ذہن کو ایک زبردست جھٹکا لگا۔ "کون چوہدری دلاور؟ وہ ایم ڈبلیو ڈی والا؟"

لائن یکلخت کٹ گئی۔ میں ریسیور ہاتھ میں لیے کھڑا رہ گیا جس میں اب لائن کے بزی ہونے کی ٹون آرہی تھی۔ پھر دکان دار نے ریسیور مجھ سے لے لیا اور ایک خاتون کے لیے نمبر ملانے لگا۔

یکلخت کسی نامعلوم خطرے کے احساس نے میری پریشانی کو تشویش میں بدل دیا۔ ڈاکٹر لطیف کی بیگم نے بہت کچھ بتا دیا تھا لیکن اس سے کہیں زیادہ چھپا لیا تھا اور میرے ذہن کو ان گنت پُر خطر اور زہریلے خیالوں کے سرسراتے، کلبلاتے اور پھنکارتے سانپوں سے بھرے جنگل میں بھٹکتا چھوڑ دیا تھا۔ ان میں ایک سوال اژدہے کی طرح سر اٹھاتا تھا اور مجھے ڈراتا تھا۔ چوہدری دلاور کا ڈاکٹر لطیف کے گھر میں کیا کام؟ اس کا ایک منطقی جواب کوئی بھی دے سکتا تھا کہ ڈاکٹر کے گھر کے دروازے تو سب ہی کے لیے کھلے رہتے ہیں۔ اگر وہاں رابعہ جا سکتی ہے تو چوہدری دلاور کیوں نہیں جا سکتا۔ لیکن ڈاکٹر لطیف ایک نیورو فزیشن تھے جو ہر مرض کا علاج نہیں کرتے تھے۔ وہ نفسیاتی امراض کے معالج تھے اور میرے لیے یہ فرض کرنا مشکل تھا کہ چوہدری دلاور کوئی نفسیاتی یا ذہنی مریض ہوگا۔ جب سے میرا اور اس کا رابطہ ہوا تھا میں نے اس کی شخصیت کے مختلف روپ دیکھے تھے۔ ابتداً میں وہ میرے والد کا ایک پارٹنر بن کے سامنے آیا تھا۔ اس نے میرے ساتھ ایک شفیق سرپرست کا رویہ اختیار کیا تھا۔ پھر مجھے پتا چلا تھا کہ وہی میرے باپ کا قاتل ہے اور میں نے اسے اپنے دشمن کی حیثیت سے شناخت کیا تھا۔ میں نے اس کی فراخدلی دیکھی تھی جب اس نے مجھے کاروبار سے علیحدگی اختیار کرنے کی پیش کش کی تھی اور میرے سامنے دو متبادل راستے رکھے تھے۔ میں یکمشت رقم لوں اور بھول جاؤں کہ میں ایم ڈبلیو ڈی کمپلیکس کے بانی مقتول وزیر خان کا جائز قانونی وارث ہوں۔ دوسرا یہ کہ بہت معقول معاوضے پر اس کاروبار میں خاموش تماشائی کی حیثیت سے شریک رہوں۔ اپنے ضمیر کا ماہانہ معاوضہ طے کر لوں اور اس کے مذموم کاروبار میں ایک ایجنٹ بن کے دولت مندی کے اس کبھی خشک نہ ہونے والے سرچشمے کو رواں دواں رکھوں۔ میں نے دونوں راستے اختیار نہیں کیے تھے اور اصولوں کی جنگ میں کود گیا تھا۔ پھر میں نے دلاور کو ایک شکاری کے روپ میں دیکھا تھا اور اس کے ذہن کی عیاری، معاملہ فہمی، دور اندیشی، حالات کے نشیب و فراز سے متاثر ہوئے بغیر پُرسکون رہنے کی صلاحیت اور شاطرانہ فطانت کا اعتراف کیا تھا۔ اس کا پیشہ اخلاقی اور قانونی اعتبار سے مجرمانہ تھا لیکن اس کاروبار نے تمام داؤ پیچ اور جوڑ توڑ، خطرات سے نمٹنے کے طریقے، راستوں کی رکاوٹوں کو صاف کرنے کے گُر، خود کو محفوظ رکھتے ہوئے نیچے سے اوپر تک تمام دشمنوں سے مقابلے کا حوصلہ اور ابتدا سے انتہا تک تمام مرحلوں سے بخیر و عافیت گزر جانے کی صلاحیت۔ یہ سب چوہدری دلاور کے دماغ کا ہی کام تھا۔ اس راستے کو غلط کہا جا سکتا تھا جس پر وہ چل رہا تھا مگر اس کے قدم کسی تذبذب کے بغیر آگے بڑھتے تھے تو اس کی وجہ یہی تھی کہ ذہنی طور پر وہ شکوک و شبہات اور اندیشوں کے جال میں گرفتار نہیں ہوتا تھا۔ اس کی سوچ بالکل واضح رہتی تھی۔ اس کا یقین و اعتماد اور اس کی قوتِ فیصلہ و قوتِ عمل سب قابلِ رشک تھے تو صرف اس لیے کہ اس کو خدا نے بہترین دماغ عطا کیا تھا۔ یہ اس کی بدبختی تھی کہ اس دماغ کی توانائی کا رُخ اس نے تخریب کی جانب موڑ دیا۔ چوہدری دلاور کبھی وہ ذہنی یا نفسیاتی مریض نہیں ہو سکتا تھا جو ڈاکٹر لطیف سے رجوع کرنے پر مجبور رہو۔ اس کے شعور میں کوئی اُلجھن اور کوئی پیچیدگی نہیں تھی۔ دنیا کے تین ہزار مذاہب پر راسخ اعتقاد رکھنے والے دل اور دماغ کی یکسوئی کے ساتھ اپنے عقائد کو مصائب سے نجات اور روح کے سکون کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ ان کے یقین میں صرف جذبات کی نہیں عقل کی بھی تائید شامل ہوتی ہے۔ پھر بھی ایک مذہب کا ماننے والا یہ کہے کہ دوسرے مذاہب کی تعلیمات اور نظریات کو ماننے والے نفسیاتی مریض ہیں تو یہ غلط ہوگا۔ ذہن ایک مجرم بھی ہو سکتا ہے اور سراغرساں بھی۔ دنیا میں تعمیری قوت اور تخریبی عناصر کے درمیان ازل سے جو برابر کی جنگ چل رہی ہے وہ ابد تک جاری رہے گی۔

گھر میں داخل ہونے سے قبل مجھے ایک فضول سا خیال یہ بھی آیا کہ کیا ڈاکٹر لطیف اور دلاور کے درمیان کوئی کاروباری تعلق بھی ہو سکتا ہے۔ اس کاروبار میں قانون کے محافظ اس کے ساتھ تھے۔ جعلی پیر اس کے ساتھ تھے جن کی روحانی قوت کے سامنے سادہ دل مرید سر جھکا دیتے تھے۔ سابق نواب خسرو جمشید کا ولی عہد ان کے ساتھ تھا تو پھر ایک ڈاکٹر بھی اس کا ساتھی بن سکتا ہے مگر اس خیال پر مجھے خود ہی شرم آئی۔ بے شک میں نے انسانیت کش ڈاکٹر بھی دیکھے تھے جو پیسے کی خاطر اپنے پیشے کی آبرو بیچتے تھے مگر ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں تھی اور ڈاکٹر لطیف تو ان لوگوں میں سے تھے جو انسان کے روپ میں فرشتہ ہوتے ہیں۔ [illegible] اپنا ایمان بیچتے ہیں تو شیطان ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر لطیف کو [illegible] نیک کے چوہدری دلاور نہ خرید سکتے ہیں۔ نہ اپنی طاقت سے سرنگوں کر سکتے ہیں اور نہ اپنے مقصد سے ہٹا سکتے ہیں۔ وہ مقصد ہے دکھی انسانوں کے جسم و جاں کی شفا اور ان کی روح کے ناسوروں کے لیے دوا کرنا۔ انھوں نے اپنا تمام وقت، ساری توانائی، سب صلاحیت اور خدا کی دی ہوئی استطاعت کے ساتھ اپنے آپ کو بھی اسی مقصد کے لیے وقف کر دیا ہے۔ انھیں مال و زر سے کیا۔ نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا

ہے۔ کہاں دلاور کا پیشہ کہاں ڈاکٹر لطیف کا پیشہ۔ چہ نسبت خاک را بہ عالمِ پاک (معلوم نہیں ان کے بارے میں اتنا گھٹیا خیال میرے ذہن میں آیا کیوں)۔ شاید اس لیے کہ سانپ کا ڈسا رسی سے بھی ڈرتا ہے۔ مجھے تو رسی بھی پھانسی کا پھندا نظر آتی تھی۔ میں سانپ اور رسی دونوں سے ڈرنے لگا تھا۔ حسبِ عادت غالب سویا ہوا تھا۔ اندر قدم رکھتے ہی میری متفکر صورت اور پریشان حالی نے استاد ٹیڈی اور نازو کو مضطرب کر دیا۔ "کیا ہوا سکندر بادشاہ۔ کیا خبر لائے ہو؟" ٹیڈی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے میرا چہرہ اوپر اٹھایا۔ "شکل پر ابھی سے بارہ بج گئے ہیں۔"

"خبر اچھی نہیں ہے استاد۔" میں نے ماتھے پر ہاتھ پھیر کر کہا اور بیڈ پر نیم دراز ہو گیا۔ "محسن اور شہلا تو وہاں پہنچے ہی نہیں۔"

"کہاں؟ ڈاکٹر لطیف کے گھر؟"

"ہاں۔ گئے تو وہیں تھے۔" نازو نے کہا۔ "کچھ سمجھ میں نہیں آئی بات۔"

"اس سے بھی زیادہ تشویش کی بات یہ ہے کہ چوہدری دلاور اس وقت ڈاکٹر لطیف کے گھر میں ہے۔" میں نے کہا۔

"کیا؟" استاد ٹیڈی یوں اچھلا جیسے میں نے اس کے سر پر پٹاخہ پھوڑ دیا ہو۔ "چوہدری دلاور۔ کیا کہہ رہے ہو سکندر بادشاہ۔"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ وہ ڈاکٹر لطیف کے کلینک میں موجود ہے اور محسن یا شہلا کی کوئی خبر نہیں کہ وہ اندر رہیں یا نہیں ہیں۔"

"تمھیں کیسے معلوم ہوا؟" نازو نے کہا۔

"میں نے فون کیا تھا۔" میں نے کہا۔ "خود ڈاکٹر لطیف کی بیگم نے مجھے یہ بات بتائی ہے۔"

"وہ جانتی ہیں دلاور کو؟" ٹیڈی نے کہا۔

"ہاں۔ ان کی بات سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا۔" میں نے کہا۔ "یہ میں کیسے پوچھ سکتا تھا کہ دلاور وہاں کیوں آیا ہے۔"

"تیرا کیا خیال ہے؟"

"میرا کوئی خیال نہیں۔" میں نے بے خیالی میں کہا۔ "اس کے ہزاروں اسباب ہو سکتے ہیں۔ میں یہ فرض نہیں کر سکتا کہ چوہدری دلاور خود اپنے کیس میں طبی مشورے کے لیے گیا ہو گا۔ نہ وہ پہلے نفسیاتی مریض تھا اور نہ اب ہو سکتا ہے۔ اس کے اعصاب فولاد کے بنے ہوئے ہیں۔"

"ہو سکتا ہے کہ اسے بھی اپنے خاندان کے کسی فرد کے سلسلے میں مشورہ لینا ہو۔" نازو نے کہا۔

"ہاں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اس عرصے میں دلاور کی بیوی کے اعصاب مسلسل دباؤ اور کشیدگی کے باعث جواب دے گئے ہوں۔ وہ میرے خیال کے مطابق ایک عام قسم کی گھریلو عورت ہے۔" استاد ٹیڈی نے کہا۔ "ورنہ وہ کہیں تو دلاور کے ساتھ نظر آتی اور دلاور کی معرکہ آرائی میں برابر کی شریک ہوتی مگر اس کا تو نام بھی سننے میں نہیں آیا۔ ہم نے شاید صرف ایک بار اسے دیکھا ہے۔ جب ہم ایک لاش کا تحفہ لے کر دلاور کے گھر گئے تھے۔"

"تمھارا خیال درست ہو سکتا ہے۔" نازو نے اس کی تائید کی۔ "دلاور کتنا بھی پُرسکون رہتا ہو اور باہر کے معاملات کو گھر سے دور رکھنے کی بھی کوشش کرتا ہو مگر یہ ناممکن ہے کہ اس قسم کے حالات سے گھر کی فضا متاثر نہ ہو۔ بیوی جاہل ہو یا بہت پڑھی لکھی، اپنے شوہر کی صورت دیکھ کر اس کی ذہنی پریشانی اور اس کے مسائل کا اندازہ کرنے کی قدرتی اور فطری صلاحیت رکھتی ہے۔ کچھ عرصہ شوہر اپنی اداکاری سے سب خیریت ہے کا ڈراما چلا سکتے ہیں مگر پھر چھوٹی چھوٹی باتیں سب راز کھولنے لگتی ہیں۔"

"ایسے بول رہی ہے جیسے تجھے بڑا تجربہ ہے۔" ٹیڈی نے کہا۔

"واہ۔ تجربہ ہی سب کچھ ہے کیا۔ مشاہدہ کچھ نہیں۔" نازو نے ٹیڈی کے طنز کا فوراً موثر جواب دیا۔ "آدمی بہت کچھ سنتا ہے۔ پڑھتا ہے۔"

"آدمی کی بات اور ہے۔ تو ابھی عورت بھی نہیں، لڑکی ہے۔"

"مجھے صرف لڑکی سمجھنے والے غلط فہمی میں مارے جاتے ہیں۔" نازو نے غرور آمیز برہمی سے کہا۔ "کیا میں نے غلط کہا تھا سکندر؟"

"اسے کیا معلوم۔ اس کی ابھی تک ایک بھی بیوی نہیں۔"

"اچھا شہلا آئے تو اس سے پوچھ لینا۔" نازو نے چڑ کر کہا۔ اسے چڑانا ہی استاد ٹیڈی کا مقصد تھا۔

"وہ اپنے میاں کے ساتھ بھاگ گئی۔" ٹیڈی نے کہا۔ "ناک کٹوا دی ہماری۔"

ایسے سنگین حالات میں بھی یہ بات سن کر مجھے ہنسی آ گئی۔

"خدا کا شکر ہے کہ شکل سیدھی ہوئی۔" ٹیڈی بولا۔ "پریشانی اپنی جگہ مگر رونے سے کیا ہو گا۔ عقل بھی کام نہیں کرے گی۔"

"یہ تم نے ٹھیک کہا استاد۔" میں نے کہا۔ "اس وقت عقل کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹنا چاہیے مگر سوال یہ ہے کہ اب ہم کیا کریں؟"

"محسن اور شہلا کی واپسی کا انتظار۔" ٹیڈی بولا۔

"انتظار آخر کب تک۔ ڈھائی گھنٹے میں وہ دو بار جا کے آ سکتے تھے۔ چھ سات میل کا فاصلہ طے کرنے کے لیے آدھا گھنٹا۔" میں نے کہا۔

"بشرطیکہ باہر نکلتے ہی سواری مل جائے۔ وہ پیدل تھے۔" ٹیڈی نے کہا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھے مطمئن اور پُرسکون رکھنے کے لیے اس قسم کے دلائل کا سہارا لے رہا ہے۔ اس کی یہ مخلصانہ کوشش میرے ذہن کو انتشار سے بچانے کے لیے تھی مگر بے سود تھی۔ ہر لمحہ میرے اندیشوں کو یقین میں بدل رہا تھا اور محسن کی واپسی میں جتنی دیر ہو رہی تھی اتنا ہی میرا یہ احساس شدت اختیار کر رہا تھا کہ مجھے ہاتھ پر ہاتھ رکھے نہیں بیٹھے رہنا چاہیے۔ مجھے کچھ کرنا چاہیے۔ اپنے لیے۔ رابعہ کے لیے۔ محسن اور شہلا کے لیے۔ مگر کیا، اس کیا کا ابھی تک میرے ذہن میں کوئی جواب نہ تھا۔

"آخر ہم کب تک صرف سوچتے رہیں گے؟" میں نے کہا۔ "کہ یہ ہوا ہو گا اور وہ ہوا ہو گا۔ خود ہم کچھ نہیں کریں گے۔"

"کریں گے کیوں نہیں سکندر بادشاہ۔" استاد ٹیڈی نے کہا۔ "قسم مولا علی کی، ہم سے جو بھی بن پڑا کریں گے۔"

"مگر کب... سوچو ذرا استاد کہ تین گھنٹے ہونے کو ہیں۔"

"ابھی ہوئے تو نہیں ہیں۔" استاد ٹیڈی نے نازو کی طرف دیکھا۔ "بس تھوڑی دیر اور دیکھ لیتے ہیں۔ پندرہ منٹ بعد تین گھنٹے پورے ہو جائیں گے۔"

"مجھے بتاؤ کہ تین گھنٹے بعد ہم کیا کریں گے۔" میں نے طنز اور مایوسی کے ساتھ کہا۔ "بھنگیوں کی توپ لے کر طبلِ جنگ بجاتے ہوئے کوچ کریں گے اور کشتوں کے پشتے لگا دیں گے؟"

"تین گھنٹے بعد میں جاؤں گی۔ صرف میں۔" نازو نے یکلخت کہا۔ "مجھے کوئی وہاں نہیں پہچانتا۔ جو میرا راستہ روکے گا، میں اس کی ہڈی پسلی ایک کر دوں گی۔ محسن اور شہلا اندر رہے تو انھیں بھی نکال لاؤں گی ورنہ رابعہ کو اٹھا لاؤں گی۔ وہ اچھی ہے یا بُری، رہے گی یہاں۔"

"تم نے تو فرض کر لیا ہے کہ تمھارا راستہ روکنے والا کوئی نہیں ہو گا اور ہوا تو خالی ہاتھ ہو گا۔" میں نے کہا۔ "چوہدری دلاور تو سوتے وقت بھی مسلح رہتا ہے اور خواب میں بھی اسلحہ ساتھ لے کر پھرتا ہے۔ تم اس کی ہڈی پسلی کیا ایک کرو گی، وہ تمھاری پسلیوں کے اندر دل کو چھلنی کر دے گا۔"

"تم نے خواہ مخواہ فرض کر لیا ہے کہ چوہدری دلاور کا ڈاکٹر لطیف کے گھر جانا ہمارے معاملات سے کوئی تعلق رکھتا ہے۔" نازو نے خفگی سے کہا۔

"امکانات کو نظر انداز مت کرو نازو۔" میں نے کہا۔ "ذرا سوچو کہ رابعہ کتنے دن سے وہاں ہے۔ ڈاکٹر لطیف کوئی غیر معروف شخصیت نہیں ہیں اور ان کے حلقۂ احباب میں، مریضوں میں، ملنے جلنے والوں میں نہ جانے کتنے وکیل بھی ہوں گے۔ سب وکیل رابعہ کو پہچانتے ہیں۔ سو فیصد نہ سہی۔ تو نوّے فیصد ہوں گے۔ وہ بھی بہت شہرت یافتہ وکیل تھی۔ اس کی وجہِ شہرت کا ایک سبب تو یہی تھا کہ خواتین وکلاء کی تعداد محدود ہے۔ گنتی کی چند عورتیں پریکٹس کرتی تھیں اور ہائی کورٹ کی ایڈووکیٹ خواتین تو دو چار ہی تھیں۔ پھر رابعہ کی ذہانت اور اس کی وہ صورت جو ایک بار دیکھنے والا آسانی سے بھلا نہیں سکتا۔ بعد کے واقعات نے اسے مزید شہرت دی۔ اب اگر کسی وکیل نے اُسے ڈاکٹر لطیف کے گھر میں دیکھ لیا ہو گا تو فوراً پہچان لیا ہو گا اور ایک وکیل سے یہ بات بار ایسوسی ایشن کے تمام ارکان تک پہنچ سکتی ہے۔ چوہدری دلاور کے بھی وکیل ہیں۔"

"تمھارا مطلب ہے کہ... چوہدری دلاور وہاں رابعہ کی وجہ سے گیا ہو گا؟" استاد ٹیڈی نے تشویش سے کہا۔

"اگر ایسا ہوا تو ڈاکٹر لطیف خواہ مخواہ مصیبت میں مبتلا ہو جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "دلاور ان کے لیے خطرہ بن جائے گا۔"

"میرا اندازہ ہے کہ دلاور وہاں رابعہ کی وجہ سے نہیں گیا۔" نازو نے سوچ کر کہا۔ "وہ بہت چالاک اور عیار آدمی ہے۔ اگر اسے معلوم ہو جاتا کہ رابعہ اس گھر میں موجود ہے تو وہ اپنے شکاری باہر بٹھا دیتا۔ اس یقین کے ساتھ کہ جہاں رابعہ ہو گی وہاں تم ضرور جاؤ گے۔ یہ تو کوئی احمق ہی کر سکتا ہے کہ منہ اٹھا کے اندر گھس جائے اور رابعہ کو یا ڈاکٹر لطیف کو ڈرانے دھمکانے لگے کہ سکندر کا پتا بتاؤ۔"

نازو کی بات اتنی مدلل تھی کہ میں فوراً قائل ہو گیا۔ اس سے مجھے کچھ سکون ملا۔ پھر بھی ایک بے نام سی بے کلی اور خلش باقی رہی جس کا علاج کوئی نہ تھا۔ نازو نے اور ٹیڈی نے سوچے سمجھے بغیر تین گھنٹے گزر جانے کے بعد کچھ نہ کچھ کرنے کا اعلان تو کر دیا تھا جس میں صرف پندرہ منٹ باقی رہ گئے تھے۔ یہ خود ان پر واضح نہیں تھا کہ اسی وقت سے کاؤنٹ ڈاؤن شروع کر دیا گیا تو زیرو آور پر کیا ہو گا۔ پندرہ منٹ کے بعد دس منٹ۔ پانچ منٹ۔ چار... تین۔ دو۔ ایک۔ پھر سیکنڈ۔ ساٹھ پچاس... دس... نو آٹھ سات... چھ... پانچ چار۔ تین دو۔ ایک۔ زیرو۔ زیرو کے بعد؟ زیرو کے بعد تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ صرف زیرو ہوتا ہے۔ زیرو لامحدود ہے۔ خلا کی طرح۔ حیات بعد از موت کی طرح... دشتِ امکاں کی طرح...

ابھی پانچ منٹ ہی گزرے تھے کہ دروازے کی کنڈی بجی اور بیک وقت ہم سب اُچھل پڑے جو اپنے اپنے خیالات کے ڈراؤنے جنگل میں الگ الگ بھٹک رہے تھے۔ میں نے ٹیڈی کو دوسرے کمرے میں روپوش ہونے کا اور نازو کو ٹھہرنے کا اشارہ کیا۔ احتیاط کے ان تقاضوں پر عمل کرنا اب ہماری عادت سی ہو گئی تھی۔ خدانخواستہ اندر آنے والا کوئی اجنبی یا شکاری ہوتا تو ہمیں بالکل تیار پاتا۔ سامنے میں آتا اور مجھے ٹیڈی کا تحفظ حاصل ہوتا جو سامنے نہیں تھا۔ نازو ایک طرح کی کمانڈو فورس تھی جو ہنگامی صورتِ حالات میں غیر متوقع طور پر حملہ کرنے کی

اہل تھی اور یقینی ناکامی کو کامیابی میں بدل سکتی تھی۔ اس وقت ہم سب محسن اور شہلا کی واپسی کے انتظار میں تھے لیکن ایک غلط بات یہ ہوگئی تھی کہ ڈاکٹر لطیف کے گھر میں چوہدری دلاور پہنچ گیا تھا۔ اس کے بعد کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ وہ رابعہ کا پتا چلا سکتا تھا مگر یہ بھی عین ممکن تھا کہ اسے محسن اور شہلا نظر آجائیں اور وہ ان کا خاموشی سے پیچھا کرتا ہوا یہاں تک آ پہنچے۔ یا ان پر کسی طرح اپنے شکاری کتوں کی مدد سے قابو پالے اور انھیں زبردستی یہاں تک لے آئے۔ محسن اور شہلا سے دباؤ کے سامنے آسانی سے سر جھکانے کی مجھے توقع نہیں تھی لیکن شادی کا بندھن ان کے درمیان ایک ایسی کمزوری بن گیا تھا جس سے شکاری فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ خدانخواستہ یہ میرے ساتھ ہوتا کہ مجھے محسن کی جان خطرے میں نظر آتی تو میں شہلا کے سہاگ کو بچانے کے لیے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوتا۔ باقی سب کا بھی یہی تھا کہ محسن اور شہلا کی ازدواجی زندگی جس کا ابھی آغاز ہی ہوا تھا سب کو عزیز تھی۔ خود محسن یا شہلا کو اس کمزوری سے مبرا کیسے سمجھا جا سکتا تھا جو میاں بیوی تھے۔ بیوی کو بچانے کے لیے محسن اور شوہر کی زندگی کے لیے شہلا اگر ہمیں گرفتار کرانے کی شرط بھی منظور کر لیتے تو ہم شکوہ نہ کرتے۔ ہر آدمی بالآخر خود اپنی ہی کسی کمزوری کے جال میں گرفتار ہوتا ہے اور اس کی کمزوری ایک ناگزیر مجبوری بن جاتی ہے۔

رات بھر جاگنے والا غالب اب سو رہا تھا۔ میں نے اسے سونے دیا اور دروازے کے قریب کھڑا دوسری دستک کا منتظر رہا اور باہر کھڑے ہوئے محسن اور شہلا یہ بات جانتے تھے چنانچہ محسن نے اپنی آواز میں کہا کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ تب میں نے دروازہ کھول دیا۔ وہ دونوں میاں بیوی شاید باہمی صلاح مشورے سے طے کر آئے تھے کہ انھیں بہت زیادہ مایوس اور پریشان نہیں دکھائی دینا چاہیے چنانچہ اندر آتے ہی محسن نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"سکندرِ اعظم کیوں رو رہا ہے؟" محسن بولا۔ "اور کسے رو رہا ہے؟"

میں نے دروازہ بند کر دیا اور پلٹ کر محسن کی طرف دیکھا۔ "تم دونوں ڈاکٹر لطیف کے گھر نہیں گئے۔ پھر واپسی میں اتنی دیر کیوں کی؟"

"تجھے کیسے معلوم ہوا؟" محسن ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"وہاں چوہدری دلاور پہنچا ہوا تھا نا؟" میں نے کہا۔

"تجھے کیسے معلوم؟" محسن نے اسی لہجے میں کہا۔

"فون کیا تھا میں نے؟" میں نے جھنجلا کر کہا۔ "بیگم لطیف سے بات ہوئی تھی۔"

"وہ یار... بڑی عجیب سی بات ہوگئی۔" محسن کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔ "سچی بات ہے کہ پہلے تو میں گھبرا گیا تھا کہ اس وقت چوہدری دلاور کا یہاں کیا کام۔"

"تو نے کیا اسے باہر ہی دیکھ لیا تھا؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ اس وقت میں اور شہلا اندر پہنچ چکے تھے۔" محسن بولا۔ "بس قسمت اچھی تھی کہ ڈاکٹر لطیف کو صبح صبح ایئرپورٹ جانا پڑا کسی دوست کو چھوڑنے کے لیے۔ وہ اس وقت تک لوٹ کر نہیں آئے تھے لیکن کہہ گئے تھے کہ سکندر آئے تو اسے روک لینا اور رابعہ سے ملوا دینا۔"

"اس کا مطلب ہے وہ رابعہ سے کہہ چلے تھے کہ میں آؤں گا۔" میں نے سخت دل شکستہ لہجے میں کہا۔

"ہاں یار... انھیں صبح ساڑھے چھ بجے ہی جانا پڑ گیا۔ اس وقت ٹیکسی ملتی نہیں چنانچہ دوست نے انھیں فون کر دیا اور وہ گاڑی لے کر نکل گئے۔ رابعہ جاگ رہی تھی۔ اس نے باتیں شروع کر دیں اور ڈاکٹر لطیف نے اس کا مورال اپ کرنے کے لیے بتا دیا کہ سکندر نو بجے تمھیں لینے آئے گا بے وقوف لڑکی پھر تو مانو گی کہ اسے کچھ نہیں ہوا۔ وہ سب تمھارے دماغ کا فتور تھا۔ یہ باتیں مجھے بیگم لطیف نے بتائیں۔"

"اور... رابعہ پر کیا اثر ہوا تھا؟" میں نے کہا۔

"ظاہر ہے کہ اچھا اثر ہوا تھا۔" محسن بولا۔ "یوں لگتا تھا جیسے وہ سوتے سوتے اچانک بیدار ہوگئی ہو۔ نہ جانے کیوں اس نے ڈاکٹر لطیف کی بات کو جھوٹ نہیں کہا۔ جیسے کہ وہ پہلے کہتی تھی اور ان کی تردید بھی نہیں کی۔ وہ کچھ مضطرب اور بے چین نظر آنے لگی اور ڈاکٹر لطیف کے جانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں بند ہوگئی۔ آٹھ بجے بیگم لطیف نے اسے دیکھا... تو وہ بالکل تیار تھی۔ میک اپ وغیرہ سے فارغ ہوگئی تھی اور اس نے وہی"

"محسن...!" شہلا نے اسے گھور کے تنبیہ کی۔

"اس نے وہی ساڑی باندھی تھی۔ نیلی۔ جس پر زرد پھول ہیں؟" میں نے کہا۔

"ہاں... مجھے بہت افسوس ہے یار..." محسن نے کہا۔ "اسے یقیناً بہت مایوسی ہوئی ہوگی۔"

"مایوسی تو پہلے بھی ہوتی رہی ہے۔ لیکن اب کے نظر آتے ہیں کچھ آثار جدا۔ نہ جانے یہ مایوسی کیا گل کھلائے۔" میں نے زخمی دل کی تڑپ کو الفاظ دے کر کہا۔ "کون جانے وہ پھر کتنی دور نکل جائے۔ اتنے قریب آ کے...!"

"قسمت اچھی تھی کہ جس رخ پر میں بیٹھا تھا اس کے بالکل سامنے بہت بڑی کھڑکی تھی۔" محسن بولا۔ "پٹ بند تھے مگر پردے ہٹے ہوئے تھے اور میں شیشے سے باہر دیکھ سکتا تھا۔ میں نے اچانک ایک گاڑی کو اندر آتے دیکھ لیا اور ونڈ اسکرین کے پیچھے

مجھے چوہدری دلاور کی صورت نظر آگئی۔ چند سیکنڈ کے لیے تو میں منجمد ہوگیا تھا اور میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا تھا کہ اس کا آنا کسی بڑی مصیبت کا پیش خیمہ ہے اور ہم محصور ہو چکے ہیں۔ پھر میں نے بیگم لطیف سے پوچھا کہ یہ شخص کون ہے اور انھوں نے سر گھما کے گاڑی کو دیکھا تو لاعلمی کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ وہ ڈاکٹر لطیف کے سب مریضوں سے واقف نہیں ہیں۔ میں نے ان کو بتایا کہ یہ چوہدری دلاور ہے جو ایک بہت خطرناک آدمی ہے۔ میری حالت کے تغیر نے ان کو پہلے ہی حیران کر رکھا تھا۔ میری بات نے انھیں مزید حیران کیا۔ میں نے کہا کہ زیادہ لمبی بات کا وقت نہیں۔ یہ رابعہ کا ایک خاندانی دشمن ہے۔ اس کے والد کی موت۔ پھر والدہ کی موت اور اس کے گھر کی تباہی میں بہت حد تک اسی شخص کا ہاتھ تھا چنانچہ آپ اسے رابعہ کی یہاں موجودگی کا بالکل پتا نہ چلنے دیں اور نہ ہمارے یہاں آنے کا۔ ورنہ وہ چالاک آدمی ہے۔ یہ نتیجہ اخذ نہ کر لے کہ ہم رابعہ کی وجہ سے ہی یہاں آتے ہیں۔ نوکر نے دلاور کو ڈرائنگ روم میں نہیں بلایا بلکہ کلینک میں پہنچا دیا۔"

"اس وقت رابعہ کہاں تھی؟" میں نے کہا۔

"رابعہ اوپر اپنے کمرے میں تھی اور تیرا انتظار کر رہی تھی۔" محسن نے کہا۔

"تجھے اس سے مل لینا چاہیے تھا۔" میں نے کہا۔ "یہ ہو سکتا تھا کہ وہ تجھے اور شہلا کو پہچان جاتی اور اگر تم میرے نہ آنے کی وجہ بتاتے تو مان بھی جاتی۔"

"میں نے یہی کیا تھا یار۔" محسن بولا۔

"مگر میں نے کہا تھا۔ خود تمھاری عقل میں نہیں آئی تھی یہ بات۔" شہلا بولی۔

"اچھا بابا۔ اب روایتی بیویوں کی طرح ہر جگہ شوہر کو احمق اور خود کو عقلِ کل مت ثابت کرتی پھرو۔" محسن نے جھنجلا کے کہا۔ "جب ہم ایک ساتھ اور ایک ہی مشن پر گئے تھے تو یہ ٹیم ورک تھا۔ ایک بات کا کریڈٹ میں لوں اور دوسری کا تم تو کیا فائدہ دونوں کا۔"

"تم بھی شوہروں کی طرح زبردستی اپنی مت منواؤ۔ عقل کی ایک بات میں نے کی تھی تو مان لو کہ بیویاں بھی بالکل ناقص العقل نہیں ہوتیں۔" شہلا بولی۔

"مجھے بتاؤ کہ رابعہ سے مل کے کیا ہوا؟" میں نے تیز لہجے میں کہا۔

"رابعہ سے ملنا اچھا ہوا۔" محسن بولا۔ "وہ پہلے تو شش و پنج میں پڑ گئی۔ کہنے ... دونوں سے ملاقات ہو چکی ہے لیکن یاد نہیں آتا کہ کہاں۔ میں نے کہا کہ سکندر کے ساتھ اکثر ملاقات ہوتی تھی۔ وہ کہنے لگی کہ سکندر آنے ہی والا ہے۔ عجیب سی اجنبیت تھی ہمارے لیے مگر تمھارا نام لیتے ہوئے اس کا لہجہ اور اس کا رویہ بالکل بدل گیا تھا۔"

"میں تو اس کی صورت دیکھتی رہ گئی تھی۔ اس کے سارے جذبات کی روشنی اس کے چہرے پر پھیل گئی تھی۔" شہلا نے کہا۔

"اسی وقت میں نے بتایا کہ سکندر نہیں آسکے گا اور میرے الفاظ کا ردِعمل اتنا شدید ہوا کہ میں تو ڈر گیا تھا۔" محسن بولا۔ "اس کی صورت ایک دم بجھ گئی۔ بالکل اسی طرح جیسے لائٹ کے ساتھ ہی ٹی وی کا زندہ متحرک تصویروں والا اور روشن اسکرین بے جان اور تاریک ہو جائے۔ پھر میں نے اسے سمجھایا کہ موقع ملتے ہی سکندر آئے گا مگر اس نے نہیں مانی۔ وہ اسی طرح سر ہلاتی رہی کہ نہیں۔ سب مجھے بے وقوف بنانے آتے ہیں۔ مجھ سے جھوٹ بولتے ہیں۔ وہ اب کیسے آسکتا ہے۔"

"کوشش میں نے بھی کی تھی کہ اسے تمھارے بخیر و عافیت ہونے کا یقین دلا سکوں لیکن اس کے ذہن کے سارے دروازے جو صبح سے تمھارے انتظار میں کھلے ہوئے تھے یکلخت بند ہو گئے تھے۔" شہلا نے کہا۔

فیض کی ایک نظم صدائے بازگشت بن گئی۔

ڈھل گئی رات بکھرنے لگا تاروں کا غبار
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہگزار
اجنبی خاک نے دھندلا دیے قدموں کے سراغ
گل کرو شمعیں بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا۔

مگر میں آؤں گا۔ ایک دن ان بے خواب پلکوں کی چلمن اُٹھا کے میں تمھاری آنکھوں میں جھانک کر کہوں گا کہ دیکھو رابعہ، میں وہی سکندر ہوں۔ میں تمھارا بھولا ہوا خواب ہوں۔ یادوں کا نقشِ رہگزر ہوں۔ میں اس وقت کا حصہ ہوں جو تمھارا اور میرا تھا اور کسی جگنو کی طرح تمھاری مٹھی سے نکل کر اڑ گیا تھا۔ میں ان گنت فروزاں لمحوں کے جگنو سمیٹ کر تمھاری مانگ میں افشاں کے ستارے سجانے لوٹ آیا ہوں اور تب تم دیکھو گی کہ میری آنکھوں میں تمھاری تصویر ہے اور مجھے پہچانو گی اور کون ہو سکتا ہے جو تمھاری تصویر لگا ہوں میں سجائے ہجر کی صدیوں کا سفر کرے اور اس نقش کو مٹنے نہ دے مگر میرے آنے تک انتظار کرنا۔ اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو مگر ان کواڑوں کے پیچھے اُمید اور انتظار کا سورج روشن رکھو۔

"تم میری بات نہیں سن رہے تھے۔" محسن نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"ہاں...!" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "نہیں... میں سب سن رہا تھا۔"

محسن نے میرے جھوٹ کو معاف کرتے ہو سچ مان لیا۔ "میں نے رابعہ سے کہا کہ اس وقت چوہدری دلاور یہاں بیٹھا ہوا ہے۔ تم خود ہی سوچو کہ سکندر کیسے آتا۔ چوہدری دلاور کے نام پر وہ کچھ خوف زدہ نظر آنے لگی تھی لیکن پھر وہ ہنس پڑی اور کہنے لگی کہ تم سمجھتے ہو میں پاگل ہوں۔ یہاں چوہدری دلاور کا کیا کام؟ میں نے کہا کہ تم چاہو تو دیکھ لو۔ نیچے اس کی گاڑی کھڑی ہے یا نہیں۔ اس نے نیچے جھانکا اور بولی کہ جھوٹ کی بھی حد ہوتی ہے۔ یہ اس کی گاڑی نہیں ہے۔"

"تو کیا وہ گاڑی دلاور کی نہیں تھی؟" میں نے کہا۔

"گاڑی اسی کی تھی۔" محسن بولا۔ "مگر وہ پہلے والی گاڑی نہیں تھی۔ اس نے اتنے عرصے میں گاڑی بدل لی ہے۔ میں نے بھی براہِ راست اس کو ونڈ اسکرین کے پیچھے دیکھ لیا تھا ورنہ گاڑی دیکھ کر تو میں بھی کچھ نہ سمجھتا۔ یہ میری بھول تھی یا بدقسمتی۔ دلاور نے گاڑی نہ بدلی ہوتی تو شاید رابعہ کے حق میں اچھا ہوتا اس کے ذہن میں پرانی گاڑی تھی اور اسے یقیناً یاد تھا کہ چوہدری دلاور تمہارا دشمن تھا۔ کیوں دشمن تھا' یہ بات ممکن ہے اسے پوری تفصیل کے ساتھ یاد نہ ہو۔ رابعہ کے ذہن میں پرانی گاڑی کا تصور تھا۔ نئی گاڑی دیکھتے ہی اس کا میری بات پر سے اعتبار بالکل اٹھ گیا۔ وہ ایک دم بگڑ گئی اور چلانے لگی۔ مجھ پر اور شہلا پر خفا ہونے لگی کہ تم دونوں جھوٹے اور دھوکے باز ہو۔ سازشی ہو اور پتا نہیں کون ہو۔ نکل جاؤ یہاں سے۔ میں تمھیں نہیں جانتی۔ میری اور شہلا کی سب منت سماجت رائگاں گئی۔ اس نے ہماری ایک نہیں سنی۔ اس وقت یہ ہو سکتا تھا کہ میں رابعہ کو نیچے لے جاتا اور کسی طرح اس کو موقع فراہم کرتا کہ وہ دلاور کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے مگر ایک تو گاڑی والی بات غلط ہو گئی۔ پھر اس کی آواز پر بیگم لطیف آ گئیں۔ انھوں نے پریشان ہو کر ہم دونوں کو کمرے سے باہر بلا لیا۔ وہ ڈر رہی تھیں کہ کہیں رابعہ پر ہسٹریا کا شدید دورہ نہ پڑ جائے۔ ڈاکٹر لطیف بھی آنے ہی والے تھے۔ ان کا موڈ ایک دم بگڑ جاتا کہ سکندر کیوں نہیں آیا اور رابعہ سے ہم نے کیا کہہ دیا ہے کہ ان کے تمام کیے کرائے پر پانی پھیر دیا۔ ہم رابعہ کو چھوڑ کر پھر نیچے ڈرائنگ روم میں آ گئے اور بیگم لطیف نے کسی طرح رابعہ کو خاموش کر لیا۔"

"یہ تو بہت برا ہوا محسن۔ بہت ہی برا ہوا۔" میں نے کہا۔

"برا تو ہوا لیکن سب برا نہیں ہوا۔" محسن بولا۔ "کچھ اچھا بھی ہوا۔"

"اس میں کون سا پہلو نکلتا ہے اچھائی کا؟" میں نے طنز سے کہا۔

"ایک بات ہمارے خلاف گئی تو ایک حق میں بھی رہی۔" محسن نے کہا۔ "ہم نیچے آ کر بیٹھے ہی تھے کہ فون کی گھنٹی بجی اور مجھے ریسیور اٹھانا پڑا۔ میں نے صرف ہیلو ہی کہا تھا کہ دوسری طرف سے کوئی پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولا۔ "میں سب انسپکٹر ... بول رہا ہوں۔ مجھے ڈاکٹر لطیف سے بات کرنا ہے۔"

میں ایک دم محتاط ہو گیا۔ "بول رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اور ذرا نرمی سے اور آہستہ بات کرو۔ میں بہرا نہیں ہوں۔"

اس لہجے اور رویے نے اسے احساس دلایا کہ وہ کسی عام آدمی سے نہیں ایک بہت بڑے ڈاکٹر سے مخاطب ہے۔ "آئی ایم سوری ڈاکٹر۔ کل رات آپ کے گھر کے قریب کچھ بدمعاشوں نے مجھے مارا۔ میں گشت پر تھا۔ دو سپاہیوں کے ساتھ کہ مجھے ایک مشتبہ شخص نظر آیا۔ میں نے اسے روکا۔ پہلے تو اس نے آپ کا نام لیا۔"

"خود اس نے اپنا کیا نام بتایا تھا؟" میں نے کہا۔

"غالباً... سلیم جوزف۔" وہ بولا۔ "اس نے کہا تھا کہ آپ اسے جانتے ہیں اور وہ اپنے کسی عزیز کو دیکھنے گیا تھا جو آپ کے گھر میں زیرِ علاج ہے۔"

"میں اس نام کے کسی شخص کو نہیں جانتا۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "اور انسپکٹر! یہ میرا گھر ہے' اسپتال نہیں۔ یہاں میں کسی کو زیرِ علاج نہیں رکھتا۔"

"لیکن اس نے آپ کا نام لیا تھا سر۔ آخر کیوں؟" وہ بولا۔

"اگر اس سڑک سے گزرنے والے ڈاکو میرا نام دیکھ جائیں اور بعد میں کہیں کہ ہم ڈاکٹر لطیف کے بھائی ہیں تو کیا اس سے وہ ڈاکو میرے بھائی بند ہو جائیں گے انسپکٹر۔ تم کو عقل سے کام لینا چاہیے۔ یہاں عموماً دروازوں پر نیم پلیٹ نظر آتی ہے۔" میں نے خفگی سے کہا۔

"میں معافی چاہتا ہوں سر۔" وہ بولا۔ "مجھے معلوم تھا وہ جھوٹا آدمی ہے کیونکہ بعد میں بھی اس نے اپنے بارے میں بہت غلط بیانی کی تھی۔ سوری فار ... ٹربل۔" اس نے فون بند کر دیا اور میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ایک بہت خطرناک مرحلہ حسنِ اتفاق سے دو منٹ میں بڑی آسانی سے گزر گیا تھا۔ اس وقت بیگم لطیف یا موجود ہوتیں یا خود ڈاکٹر لطیف ہوتے تو معاملہ گڑبڑ ہو جاتا۔ ہمارے لیے ان کو سمجھانا بھی مشکل ہوتا اور انھیں جھوٹ بولنے پر راضی

کرنا بھی۔ میں یہی سوچ کر پریشان تھا کہ ڈاکٹر لطیف نہ مانتے تو کیا ہوگا۔ وہ کرنا خدا کا کچھ ایسا ہوا کہ فون ریسیو بھی کیا تو کس نے؟ خود میں نے۔ جس کا میں تصور تک نہیں کر سکتا تھا مگر بعض اوقات تقدیر بڑے عجیب انتظامات کرتی ہے اور ہونے والی بات ہو کے رہتی ہے۔ اس میں ایک سیکنڈ کے وقت کا فرق نہیں پڑتا۔ جتنی دیر میں بیگم لطیف اوپر سے آئیں' ڈاکٹر لطیف لوٹ آئے اور گاڑی پورچ میں کھڑی کر کے وہ پہلے ڈرائنگ روم میں آئے۔ وہاں ہم کو دیکھ کر مایوس ہوئے۔ ہم نے بتا دیا کہ ناگزیر وجوہ کی بنا پر سکندر نہیں آیا۔

"ناگزیر وجوہ؟" وہ ایک دم بگڑ گئے۔ "کیا آسمان ٹوٹ پڑا تھا یا قیامت آ گئی تھی۔ اتنا سمجھا دیا تھا اس گدھے کو میں نے کہ تمہارا آنا بے حد ضروری ہے۔ نہیں آ سکتا تھا تو بتا دیتا۔ میں رابعہ کو تیار نہ کرتا۔ اس سے بات ہی نہ کرتا کہ سکندر نو بجے آئے گا۔ پہلے وہ ایک فریبِ خیالی کا شکار تھی۔ اب اسے یقین ہو گا کہ جھوٹ ہم سب بولتے تھے۔ ہم اس کے لیے بالکل قابلِ اعتبار نہیں رہے کیونکہ ہم اس کے سچ کی نفی کرتے تھے اور ایک حقیقت کو جھٹلاتے تھے کہ سکندر خیر و عافیت اور زندہ سلامت ہے۔ اب تو خود سکندر کے لیے سامنے آ کر اپنے وجود کو حقیقی ثابت کرنا مشکل ہو گا۔ وہ سمجھے گی کہ پہلے بھی اس کی نظر کو دھوکا ہوا تھا اور وہ نظر کے فریب میں آ گئی تھی۔ دوسری بار اس کا ذہن پوری مزاحمت کرے گا۔ ناگزیر وجوہ۔ مائی فٹ! رات کے دو بجے تک وہ یہاں تھا۔ بے وقوف آدمی یہاں رک جاتا۔ خواہ مخواہ گیا۔ اب پیغام بھیج دیا کہ وہ تشریف نہیں لا سکتے۔ چند گھنٹوں میں ان کے لیے ناگزیر وجوہ پیدا ہو گئیں۔" وہ اتنے برہم تھے کہ درمیان میں بول کر انھیں کچھ سمجھانے کی کوشش کرنا ہی بے سود تھا۔ جب وہ خاموش ہوئے تو میں نے آہستہ سے کہا کہ رات کو واپس جاتے ہوئے سکندر کو ایک معمولی سا حادثہ پیش آ گیا تھا۔ اس کا ردِ عمل دیکھنے والا تھا۔ ڈاکٹر لطیف کا سارا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا اور وہ ایک دم پریشان نظر آنے لگے۔

"ایکسیڈنٹ؟ کس چیز سے... اور وہ ہے کہاں؟" انھوں نے کہا۔

"اسپتال میں نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "اسے ایک جیپ ٹکر مار کے نکل گئی تھی۔ وہ اس کا نمبر وغیرہ کچھ نہیں دیکھ سکا تھا۔ خیریت یہ گزری کہ وہ کنارے پر تھا چنانچہ اس کا مونڈھا جیپ کی سائڈ سے لگا اور وہ گر گیا۔ دو چار دن میں چلنے پھرنے کے قابل ہو جائے گا۔ فریکچر یا کوئی گہرا زخم نہیں ہے۔"

انھوں نے افسوس سے سر ہلایا۔ "یہ سب بدقسمتی کی بات ہے۔ دو چار دن بعد اس کے آنے سے رابعہ کو کیا فائدہ ہوگا۔ وہ نقصان تو ہو گیا۔ اب نہ جانے کب تک رابعہ اس خود فراموشی کی کیفیت کا شکار رہے گی۔ میں تو بہت خوش اور پرامید تھا اس کی پیش رفت دیکھ کر۔ لیکن وہ آخری سیڑھی سے پھسل کر پھر نیچے گر جائے گی۔ معلوم نہیں دوبارہ اوپر دیکھے گی بھی یا نہیں۔ پھر اپنے آپ کو پانے کی خواہش بھی باقی رہے گی یا نہیں۔"

"یہ سب قدرت کے کھیل ہیں ڈاکٹر لطیف۔" میں نے کہا۔ "ہم سب اپنی طرف سے اچھا کرتے ہیں مگر برا ہو جاتا ہے۔ اب رات کو سکندر یہاں آنے کی حماقت نہ کرتا تو کچھ نہ ہوتا۔ مگر اس نے مجھے بتایا ہے کہ آپ اس کے آنے پر خوش تھے اور آپ کا خیال تھا کہ اس نے ٹھیک کیا۔ آیندہ بھی ہم سب اور آپ مل کر رابعہ کے لیے کوشش کرتے رہیں گے۔ امید کا دامن تو ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔"

"ہاں... اب اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ یہی امید تو آدمی کے لیے زندہ رہنے کی جدوجہد کا سبب بنتی ہے۔" وہ بولے۔ "اللہ مالک ہے رابعہ کا بھی۔ جو اس کے مقدر میں ہے وہ تو اسی کو بھگتنا ہے۔" وہ جانے والے تھے کہ میں نے انھیں روک لیا۔

"ڈاکٹر صاحب' آپ کے کلینک میں ایک شخص بیٹھا ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔ چوہدری دلاور۔ کیا بات ہے؟" وہ رک کر بولے۔

"آپ اسے کیسے جانتے ہیں؟" میں نے کہا۔ جو ایک احمقانہ سوال تھا۔

"اسے تو بہت سے لوگ جانتے ہیں۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"میرا مطلب تھا کہ کیا وہ آپ کا مریض ہے؟"

"نہیں۔ اس کی بیوی کچھ عرصے سے میرے پاس زیرِ علاج ہے۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "بیماری وہی ہے۔ ذہنی اور اعصابی کشیدگی۔ صحیح سبب وہ بتاتا نہیں۔ غلط بیانی کرتا ہے۔ میں نے اسے سمجھا دیا تھا کہ اس طرح میں کچھ نہیں کر سکوں گا۔ وکیل اور ڈاکٹر کو حقائق کا علم ہونا چاہیے۔ ورنہ کیس بگڑ جاتا ہے۔ دوائیں اس وقت تک بے اثر رہیں گی جب تک بیماری کے اسباب دور نہیں ہوں گے۔ بھئی ایک سیدھی سی بات ہے۔ تمہارا گلا اگر کھٹائی کھانے سے خراب ہے تو پہلے گھر سے یہ اچار چٹنی وغیرہ ہٹاؤ۔ کھٹائی کھانا چھوڑو۔ مگر یہ عجیب آدمی ہے۔ کہنے لگا کہ اسباب تو میں دور نہیں کر سکتا۔ اسے دور بھیج دیتا ہوں۔ جہاں اسباب نہ ہوں۔ اب دیکھتا ہوں کہ کیا بتانے آیا ہے۔"

اس وقت تک بیگم لطیف نیچے آ گئی تھیں۔ میں نے مناسب سمجھا کہ دلاور کے بارے میں خود کچھ نہ کہوں۔

"میں نے بیگم لطیف سے کہہ دیا تھا۔۔" شہلا بولی۔

"ہاں ہاں۔ میں سن رہا تھا" محسن بولا۔ "اور اسی لیے میں نے آگے بات نہیں کی۔ اجازت لی اور چل پڑا۔"

"فی الحال رابعہ کے لیے ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔" میں نے ایک تلخ حقیقت کو دل پر پتھر رکھ کے تسلیم کیا۔ "اور صرف رابعہ ہی ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔"

"اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا" استاد ٹیڈی نے فوراً کہا۔

"تمھارے مقدر میں صرف دُکھ ہیں۔ محبت کی بات تم کیوں کرتے ہو" محسن نے کہا۔

یہ استاد ٹیڈی کی دُکھتی رگ تھی۔ وہ تلملا کے رہ گیا۔

"تمھارے آنے سے پہلے میں اور نازو ایک بات کر رہے تھے جس کا تعلق ایم آر ایس کے اگلے مشن سے ہے۔" میں نے کہا "اس میں نازو کا مرکزی کردار ہے۔"

"ایک فلسفیانہ نکتہ ذہن میں آیا ہے۔" محسن نے کہا۔ "کہ آدمی کی تمام جدّ و جہد میں مرکزی کردار پیٹ کا ہے جو اس وقت خالی ہے۔"

"اور پیٹ کا تعلق براہِ راست دماغ سے ہے۔" استاد ٹیڈی نے کہا۔

"تم پھر بولے۔ تمھارے پاس ہے دماغ!" محسن نے کہا۔

"ابھی دیکھ لیتے ہیں۔" استاد ٹیڈی ایک دم اُٹھا "پہلے تمھارا سر توڑ کر دیکھتے ہیں کہ اس میں کیا ہے۔ ذرا ہتھوڑی لانا میری بہن۔"

"خبردار زوجہ محترمہ۔ آپ کو ہمارے سرِ عزیز کی قسم جو آپ نے اس کو توڑنے کا بندوبست کیا۔" محسن نے کہا۔

"میں جاتی ہوں کھانے کا انتظام کرنے۔" شہلا ہنسنے لگی۔ "ورنہ تم دونوں ایک دوسرے کو کھا جاؤ گے۔"

"میں مسلمان ہوں۔ لحمِ خنزیر نہیں کھاتا۔" ٹیڈی نے فوراً وار کیا۔

"سنا تم نے۔۔ کیا کہا گیا ہے تمھارے سرتاج کو۔" محسن چلّایا "اسی وقت عاق کر دو اس بھائی کو ورنہ سوچ لو تم کیا کہلاؤ گی۔"

محسن اور نازو نے نامعقولیت کی اس محفل سے اٹھ جانا ہی بہتر سمجھا۔ سالے بہنوئی کی جنگ جس طرح شروع ہوئی تھی اسی طرح ختم بھی ہو گئی اور وقت گزارنے کے لیے انھوں نے ایک عجیب کھیل شروع کیا جس میں رشتوں کے الٹ پھیر کو سمجھ کے صحیح جواب نکالنا پڑتا تھا۔

"اب فرض کرو کہ تمھاری ممیا ساس کے پوتے سے میری سمدھن کے نواسے کا نکاح ہو جاتا ہے۔" محسن نے کہا۔ "تو تم میرے کیا ہوئے؟"

"نہ تمھاری سمدھن ہے نہ میری ممیا ساس۔ دوسرا سوال کرو۔"

"سوال ہے فرض کرنے کا۔" محسن بولا۔ "میں نے فرض کیا تھا کہ تمھارے پاس عقل ہے۔ بھلا پوتے کا نواسے سے نکاح ہو سکتا ہے، بے عقل شخص۔ دونوں مذکر ہوں گے تو میرا تمھارا رشتہ ہی ختم ہو جائے گا۔ یہ سوال [illegible]" غالب کھانے کے وقت بھی سوتا رہا۔ کھانے کے بعد میں نے اپنی تجویز پیش کی۔

"میرا خیال ہے کہ نازو کو وکٹر فیملی کے گھر میں پہنچا دیا جائے۔" میں نے کہا۔ "یہ کام نازو بہت اچھی طرح کر سکتی ہے۔"

"بلّے کے گلے میں گھنٹا کون کون باندھے گا۔" محسن بولا۔ "ان کو اندر چھوڑنے کون جائے گا اور جو جائے گا وہ واپس کیسے آئے گا؟"

"وہ خود اسے باہر پھینک دیں گے۔" ٹیڈی بولا۔ "اسٹریچر پر آ جائے گا۔"

"یارو! یہ مذاق کی بات نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "میں نے سب سوچ لیا ہے کہ یہ سب کیسے ہوگا۔ نازو اس گھر کے اندر ایک ملازمہ بن کے رہ سکتی ہے۔ خود اندر پہنچ سکتی ہے۔ یہ بہت سخت۔ خطرناک اور مشکل کام ہے مگر میں نازو پر پورا بھروسا کرتا ہوں۔ کرنے کو یہ کام شہلا بھی کر سکتی تھی لیکن وہ ایک کام نہیں کر سکتی۔ وہ خالی ہاتھ اپنی حفاظت نہیں کر سکتی۔"

"اور جو میری گھر والی کر سکتی ہے وہ نازو نہیں کر سکتی۔" محسن نے کہا۔ "خادمہ کو کھانا پکانا پڑتا ہے۔ جھاڑو دینا پڑتی ہے اور برتن مانجھنے پڑتے ہیں۔"

"خواہ مخواہ میرے خلاف غلط پروپیگنڈا مت کرو۔" نازو نے کہا۔ "تم سے کس نے کہا ہے کہ میں یہ کام نہیں کر سکتی؟"

"میں نے تو بی بی تمھیں جب بھی دیکھا قتلِ عام کرتے دیکھا۔ اسے اُٹھایا، اسے پٹخا۔ اس کی ٹانگ توڑی، اس کی بتیسی باہر کی۔" محسن بولا۔ "اب اس وقت جو ماحضر تناول فرمایا ہے سب حرام خوروں نے۔ مثلاً یہ جو زردہ تھا۔۔"

"وہ تو نازو نے ہی پکایا تھا۔" شہلا بولی۔ "ورنہ اتنی جلدی کا سب کیسے ہوتا؟"

"کیا؟ یعنی کہ۔۔ خیر۔" محسن نے گڑبڑا کے کہا۔ "آپ کچھ فرما رہے تھے؟"

"جی۔ میں عرض کر رہا تھا کہ نازو اس گھر میں خادمہ کی حیثیت سے داخل ہو جائے تو یہ بہت بڑی کامیابی ہوگی۔" میں نے ہنسی پر قابو پا کے۔ "یہ کام ایک اچھی ایکٹریس کے لیے مشکل نہیں اور نازو غالباً۔۔۔"

"غالباً۔۔ تمھارا مطلب ہے غالب کی وہ۔۔۔ خیر آگے کہو۔" محسن نے کہا۔

"پہلے میں تمھاری گرامر ٹھیک کر دوں۔" نازو جھینپ کر اٹھی۔ محسن فرار ہونے کے لیے اٹھا پھر دونوں بیٹھ گئے۔

"نازو بہترین ایکٹریس ہے۔ جب میں فلم بناؤں گا تو اسے ہیروئن لوں گا اور غالب کو ہیرو۔" محسن نے کہا۔ "مگر برادرانِ اسلام سوال یہ ہے کہ ایک اچھی خادمہ کو جو اچھی اداکارہ بھی ہے، وکٹر فیملی قبول کرے گی؟ انھیں ضرورت ہے خادمہ کی؟"

"ضرورت تو سب کو ہوتی ہے۔ اس کی شدت کا احساس دلایا جا سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اور اگر ملازمت کی امیدوار اپنی مظلومیت کا رونا روئے۔ ہاتھ پیر جوڑے اور منت سماجت کرے کہ لاوارث ہوں۔ رہنے کا ٹھکانہ نہیں ہے۔ بس رہنے کو جگہ دے دو اور دو وقت کی روٹی۔ تو بعض اوقات آدمی کا دل پسیج جاتا ہے۔"

"ان کے دل ایسے نہیں ہو سکتے۔" ٹیڈی بولا۔ "وہ سنگدل لوگ ہیں اور ایسے کام کرتے ہیں کہ آسانی سے اعتبار نہیں کر سکتے۔"

"مشکل مرحلہ یہی ہے۔ اندر داخل ہونے کا۔" میں نے کہا۔ "اور انھیں اعتبار پر مجبور کرنے کا۔ فرض کرو نازو پر انھیں رحم آ جاتا ہے اور وہ سوچتے ہیں کہ ایک نوکرانی مل رہی ہے۔"

"اور وہ بھی اتنی خوبصورت۔" شہلا بولی۔

"اونہوں۔ اس کا تو حلیہ بگاڑنا پڑے گا۔" میں نے شرماتی ہوئی نازو کو دیکھا۔ "اس رنگ روپ پر بدصورتی کا پردہ ڈالنا پڑے گا۔ یہ بھی محنت طلب کام ہے مگر ناممکن نہیں کہ ہم نازو کو ایک سیاہ فام، بدصورت اور عمر رسیدہ عورت بنا دیں۔ پھر یہ وکٹر برادران کی بُری نظر سے تو محفوظ ہو جائے گی۔ آج کل گھریلو ملازم ملتے ہیں تو لوگ انھیں گھر میں جگہ دیتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ مردوں کے لیے تو ویسے ہی گنجائش نہیں ہوتی کیونکہ گھروں میں بہو بیٹیاں ہوتی ہیں۔ لڑکے بھی ملتے ہیں تو گھروں سے بھاگے ہوئے اور اُٹھائی گیرے قسم کے۔ جوان عورت کو عموماً گھر والیاں نہیں رکھتیں"

"کہ کہیں صورتِ حال الٹی نہ ہو جائے۔" محسن بولا۔ "سب شوہر میری طرح شریف اور نیک نفس تو نہیں ہوتے نا۔ بعد میں پتا چلے کہ اب خادمہ کو مالکن کا اور مالکن کو خادمہ کا مقام حاصل ہو گیا ہے۔ تختہ اُلٹ گیا ہے۔"

"چنانچہ ادھیڑ عمر کی عورتیں سب سے موزوں خادمہ ثابت ہوتی ہیں اور پسند کی جاتی ہیں۔" میں نے کہا۔ "زیادہ بوڑھی۔ سے بھی لوگ ڈرتے ہیں کہ دس روگ ساتھ لائیں گی اور دو دن خدمت کریں گی تو چار دن کرائیں گی۔ میں سمجھتا ہوں نازو کی کامیابی کے چانس ففٹی ففٹی ہیں۔ کوشش کر لینے میں کوئی ہرج نہیں۔ فرض کرو نازو کسی طرح ان کی گھریلو خادمہ بن گئی۔ تو دو چار دن آزمائش کے ہوں گے۔ وہ لوگ اس پر چوبیس گھنٹے نظر رکھیں گے۔ صبح سے رات تک اور رات سے صبح تک۔ کام بہت سخت ہے نازو تمھیں دن بھر محنت کرنا ہوگی۔ پہننے کو میلے کچیلے کپڑے ہوں گے اور سونے کو کسی کوٹھری میں جھلنگا چارپائی یا فرش پر بستر۔ کر لوگی یہ سب؟"

"تم جانتے ہو کہ میں اس سے کہیں زیادہ قوتِ برداشت کا مظاہرہ کر چکی ہوں۔" نازو نے کہا۔

"اگر تم نے انھیں مطمئن کر دیا۔" میں نے کہا۔ "تو میرا خیال ہے کہ تمھارا کام ایک مہینے میں ہی ختم ہو جانا چاہیے۔ دو چار دن یا ایک ہفتے بعد جب انھیں تمھارے بے ضرر ہونے کا یقین آ جائے گا تو تمھیں کچھ آزادی مل جائے گی۔ میرا مطلب ہے ان کی نگرانی کچھ کم ہو جائے گی۔ اس عرصے میں تم گھر کے اندر آنے جانے والوں کا جائزہ لو گی۔ ہر گوشے کو دیکھو گی۔ بظاہر بالکل بے نیاز نظر آؤ گی مگر تمھارے کان بھی کھلے رہیں گے اور تمھاری آنکھیں بھی سب کچھ دیکھتی رہیں گی۔ تم خود کو بالکل جاہل ظاہر کرو گی۔ تمھیں اپنے لیے ایک بیک گراؤنڈ بھی بنانا ہوگا کہ تم پہلے کہاں تھیں اور اس حال تک کیسے پہنچیں۔ تمھاری کہانی ہم سب مل کر تیار کریں گے۔ اس میں کوئی سقم نہیں ہوگا اور کوئی بات ناقابلِ یقین نہیں ہوگی اور اس کی تصدیق کوئی بھی آسانی سے نہیں کر سکے گا۔ یہ کہانی تم کو انتہائی ستم رسیدہ اور مردم گزیدہ عورت ثابت کرے گی جس کے باپ نے، شوہر نے یہاں تک کہ بیٹوں نے اس کا استحصال کیا اور اسے دنیا کی ٹھوکریں کھانے کے لیے تنہا چھوڑ دیا۔ ایسی زندہ کہانیاں بھی ملتی ہیں جن سے ہم راستے کاٹ کے اور نظر بچا کے گزر جاتے ہیں۔ ہر دستِ طلب دراز کرنے والے محتاج و گدا کو پیشہ ور بھکنگا کہہ کر حقارت سے اس کا ہاتھ جھٹک دیتے ہیں۔ سرِ راہ گزر پڑے ہوئے معذور یا بیمار پر طنز و استہزا کا جملہ پھینک کر اپنی راہ لیتے ہیں کہ مانگنے والے بھی کیسے کیسے ڈرامے رچاتے ہیں۔ بے شک اکثریت خیرات کی مستحق نہیں ہوتی مگر سو میں سے پانچ نہ سہی تو ایک کی کہانی دقت کی بے وفائی۔ عاقبت نااندیشی۔ اپنوں کے کرم اور غیروں کے ستم کی منہ بولتی داستانِ عبرت ہوتی ہے جسے سننے کی نہ کسی کو ضرورت ہوتی ہے نہ فرصت۔"

"یہ ٹھیک کہتا ہے تو۔" محسن نے کہا۔ "فلمی دنیا میں تو ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو اپنے وقت میں فلم کی کامیابی کی ضمانت سمجھے جاتے تھے۔ منہ مانگے معاوضے لیتے تھے اور دولت کو ہاتھ کے میل سے زیادہ بے وقعت جانتے تھے۔ پھر چشمِ فلک نے دیکھا کہ وہ کاسۂ گدائی لیے پھرتے تھے اور کوئی پوچھتا نہ تھا۔ رئیس زادے فقیر

ہوئے۔ عیاشی طبع کے باعث صنعتکار دیوالیہ ہوگئے۔ لوگ آخری دمڑی تک جوئے میں ہار گئے یا پھر لالچی اولاد نے ان کا سب کچھ چھین لیا۔ دنیا میں یہ ہوتا ہی رہتا ہے۔"

ہاں۔ مگر نازو کو یقین دلانا ہے کہ ایسا ہی کچھ اس کے ساتھ بھی ہوا تھا۔" میں نے کہا۔" اور دکھ بھری فلمی نو ایسی دردناک کہانی سنانی ہے جو پتھر کو بھی پگھلا دے۔ اس کے علاوہ نازو کا میک اپ بھی ایسا ہونا چاہیے کہ ہم بھی اسے نہ پہچان سکیں۔"

"میک اپ کرتے کرتے میں بھی اب اتنا ماہر ہوگیا ہوں کہ تیرا میک اپ کر دوں تو تجھے آدمی بنا دوں۔" محسن بولا۔

"اچھا فرض کرو یہ سب ہوگیا۔" استاد ٹیڈی نے کہا۔" یعنی نازو صحیح میک اپ میں ایک بہت رقت انگیز کہانی سنا کے وکٹر فیلی کے گھر کی خادمہ بننے میں کامیاب رہی تو کیا ہوگا؟"

"ایک ہفتہ تو کچھ بھی نہیں ہوگا۔" میں نے کہا۔" نازو اپنی پوزیشن مستحکم کرے گی۔ اس کے بعد بھی ہم اس سے رابطہ قائم نہیں کریں گے۔ وہ خود جب بھی مناسب سمجھے گی اور جیسے بھی چاہے گی ہم سے رابطہ قائم کرے گی اور ظاہر ہے نازو یہ کام اس وقت کرے گی جب اس کی اپنی پوزیشن کو خطرہ لاحق نہیں رہے گا۔ یہ سب سے اہم پہلو ہے۔ پہلے اپنے قدم مضبوطی سے جمانا اور تمام شکوک و شبہات دور کرنا۔ جلدی میں کام بگڑ سکتا ہے۔ جتنی نازو کی پوزیشن اچھی ہوگی وہ اتنی ہی آزادی اور بے خوفی سے کام کر سکے گی۔ وہ لوگ ایک بار مطمئن ہو جائیں گے تو اس پر عائد بہت سی پابندیاں نرم کر دیں گے مثلاً یہ کہ گھر کے کس حصے میں جانا ہے، کس طرف نہیں جانا ہے۔ کس کے سامنے اور کس وقت آنا ہے اور کب نہیں آنا ہے۔ نازو کے خود کو بے ضرر ثابت کرنے کی شرط ہے۔ پھر وہ خود بے پروا ہو جائیں گے۔ یہ ایک فطری چیز ہے کہ ہم پہلے بہت محتاط رہتے ہیں لیکن مطمئن ہونے کے بعد ہمارا ذہن ایزی ہو جاتا ہے۔ اس سنتری کی طرح جو مسلسل نگرانی پر مامور ہو اور جب اسے بالآخر بتایا جائے کہ اب وہ آرام کر سکتا ہے تو وہ بیٹھے اور سو جائے۔ ان سب کا دوسرا ردِعمل بے فکری کا ہوگا۔ وہ ایک مظلوم اور لاوارث بڑھیا کو یکسر نظر انداز کر دیں گے اور ان کے ذہن میں یہ خیال تک نہیں آئے گا کہ یہ بڑھیا آفت کی پڑیا ثابت ہو سکتی ہے چنانچہ اس کے سامنے کھل کر بات نہیں کرنا چاہیے یا اسے باورچی خانے تک نقل و حرکت کی اجازت دینا چاہیے اور بس۔"

"میں نے ایک انگریزی ناول پڑھا تھا۔" محسن بولا۔" اس میں ہوٹلوں کے ویٹرز نے ایک خفیہ بین الاقوامی تنظیم بنا رکھی تھی اور وہ ملکوں کے راز ادھر سے ادھر کرتے تھے۔ جن ہوٹلوں میں وہ کام کرتے تھے وہاں ہر ملک کے سربراہ، وزرا اور سفیر، تجارتی اور فوجی وفد سب ہی آتے تھے۔ کانفرنس کرتے تھے اور یہ بہرے آزاد تھے کہ ان کی ساری گفتگو سن سکیں۔ انھیں بار بار کمروں میں بلایا جاتا تھا۔ وہ کانفرنس ہال میں موجود رہتے تھے لیکن کوئی ان کا نوٹس ہی نہیں لیتا تھا کہ یہ تو ویٹرز ہیں۔ ہوٹل کے ادنیٰ ترین ملازم۔ ان کے ہونے یا نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ چنانچہ غیر محتاط قسم کے لوگ اسی ذہنی رویے کے باعث وہ باتیں بھی کہہ جاتے تھے جو بقول کسے۔ دیواروں کے کان بھی سن لیں تو بہت کچھ ہو جاتا ہے۔"

"رائٹ۔ نازو اسی کمزوری سے فائدہ اٹھائے گی۔" میں نے کہا۔" بعد میں ہم اسے سب کچھ فراہم کر دیں گے۔ اسلحہ۔ ریموٹ مائک جس سے ہم اپنے ریڈیو کے ایف ایم بینڈ پر پیغام وصول کر سکیں۔ کوئی فون نمبر بھی استعمال ہو سکتا ہے۔ کوڈ میں خفیہ پیغام رسانی کا طریقہ بھی وضع ہو سکتا ہے۔ نازو سب کچھ لکھ کر ڈاک سے بھی بھیج سکتی ہے۔ اندر کے حالات کا اندازہ اندر پہنچنے کے بعد ہوگا اور سارے فیصلے نازو کو خود کرنے ہوں گے۔ اپنے رسک پر۔"

"اور سکندر بادشاہ! اگر انھوں نے اس کو پہچان لیا۔" استاد ٹیڈی بولا۔" اس کا میک اپ اتار دیا اور اصلیت معلوم کر لی پھر؟"

کچھ دیر کے لیے ہم سب خاموش ہوگئے۔ استاد ٹیڈی کی "پھر" کا کوئی جواب نہیں تھا۔ ایک جواب کے سوا جو انگریزی میں مشہور ہے۔ جاسوس کا کوئی دوست نہیں ہوتا۔ نازو پکڑی گئی اور اس کی رہائی کی کوشش بھی ناکامی کا شکار ہوئی تو اس کی مدد کون کر سکے گا۔ سوائے خدا کے۔ وہ اعترافِ جرم پر بھی مجبور کر دی جائے گی اور اگلوانے والے اس سے سب اگلوا لیں گے۔ ہمیں معلوم تک نہ ہوگا کہ پہلے ہفتے میں اس پر کیا بیتی۔ میری نظر میں بہت سے لرزہ خیز مناظر آئے۔ شاید اس وقت جب نازو کو شکاری دشمنوں کے حصار میں پہنچا کے ہم مطمئن ہوں گے کہ بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیا اور رات کو چین سے سو رہے ہوں گے نازو کسی عقوبت خانے میں تشدد کا عذاب جھیل رہی ہوگی۔ وہ زندگی کا عذاب بھگت رہی ہوگی اور بے بس ہوگی۔ ایک نوجوان عورت کے ساتھ بے ضمیر شیطان کیا نہیں کر سکتے۔ عزت آبرو کی بات تو الگ رہی موت بھی بہت آسان ہے۔ موت سے پہلے کا عذاب جھیلنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ خود میں نے سادھو رام سے کس طرح ہر بات پوچھی تھی۔ راوی کے ٹھنڈے پانی میں پہنچ کے تو اس کے مردہ جسم کو بھی بہت قرار ملا ہوگا۔

"اب چپ کیوں ہوگئے؟" استاد ٹیڈی کی آواز آئی۔

"میں اس لیے چپ ہوں استاد کہ اس سوال کا جواب کوئی نہیں دے سکتا اور اگر کوئی جواب ہے تو نازو کو معلوم ہے۔ ہم سب خود کو بچائیں گے، نازو کو نہیں بچا سکیں گے۔ اس حقیقت کا اعتراف آج اور ابھی سب کے سامنے کر لینا چاہیے۔ نازو اس مشن میں تنہا ہوگی۔ ہمارے ساتھ اس کی تقدیر ہوگی۔ یا پھر اس کی ذہانت اور جرأت۔ وہ سمجھ لینا چاہیے کہ اندر جانا شاید آسان ہو۔ وہ خود دروازے کھول دیں اور پھر ہمیشہ کے لیے بند کر دیں۔ واپسی اپنے اختیار کی بات ہی نہ رہے۔"

"ایسی صورت میں کیا تم نازو کو موت کے منہ میں دھکیلنے کی قرارداد پاس نہیں کر رہے ہو؟" استاد ٹیڈی نے ناراض ہو کے کہا۔

"یہ قرارداد نہیں ہے، چیلنج ہے۔" میں نے کہا۔" نازو پر کسی قسم کا دباؤ نہیں۔ اگر کوئی اسے مجبور کرے یا اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھائے تو مجرم۔ وہ اپنے فیصلے میں بالکل آزاد ہے۔ زندگی میں ایسے مشکل مقام سب کے لیے آتے ہیں جب یہ جوا کھیلنا پڑتا ہے۔ مثلاً اس وقت جب ڈاکٹر کسی مریض کے لواحقین کو بتا دیتے ہیں کہ آپریشن کی کامیابی اور ناکامی کے امکانات برابر ہیں اور کسی کو یہ فیصلہ ضرور کرنا پڑتا ہے کہ آپریشن ضروری ہے ورنہ یہ ففٹی ففٹی کا چانس بھی نہیں رہے گا۔ فیصلہ کرنے والا باپ بھی ہو سکتا ہے اور بیٹا بھی مگر کیا ڈاکٹر اس فیصلے میں اس کی مدد کر سکتا ہے؟ نازو انکار کر دے تو یہ اس کا حق ہے۔"

"اس کا یہ حق میں استعمال کرتا ہوں۔" استاد ٹیڈی نے کہا۔" وہ نہیں جائے گی۔"

"میں ضرور جاؤں گی۔" نازو نے قطعی لہجے میں کہا۔" تم بھائی بن کے سوچ رہے ہو۔ یہاں سب نے رشتوں کو نظر انداز کیا ہے۔ محسن نے بھی اور سکندر نے بھی۔ اس معاملے میں تمھاری بھی نہیں چلے گی بھیا۔"

"نازو! یہ خودکشی بھی ہو سکتی ہے۔" ٹیڈی نے مایوسی سے کہا۔

"خودکشی بھی بعض اوقات ناگزیر ہوتی ہے۔ وہ موت یقیناً حرام ہے جو کسی ذاتی مسئلے سے فرار کی خاطر خودکشی سے ملے مگر اس موت کو کیا کہتے ہیں جو سپاہی کو محاذ پر نصیب ہوتی ہے۔ اس محاذ پر جہاں سے زندہ واپسی کے ایک فیصد امکانات بھی نہیں ہوتے اور جانے والے جانتے ہیں کہ وہ لوٹ کر نہیں آئیں گے۔ کیا وہ شہادت کی ابدی زندگی نہیں سمجھی جاتی۔ فرق صرف مقصد کا ہے۔ جنگِ عظیم دوم میں جاپانی فوجوں کے پاس "سوئی سائڈ بٹالین" تھی جس کے دستے آگے بڑھ کر موت کو گلے لگاتے تھے مگر دشمن کا راستہ روک دیتے تھے۔ یہ خودکشی کرنے والے دستے ان جیالوں پر مشتمل ہوتے تھے جو دستی بم لے کر ٹینک کے سامنے لیٹ جاتے اور لوہے کے اس ہاتھی کی پیش قدمی روک کر اپنی جان دیتے ہوئے یہ سمجھتے تھے کہ انھوں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ ان کا گوشت، خون، ہڈیاں سب پس کر مٹی میں مل جاتے تھے۔ نہ ان کا مزار بنتا تھا نہ مدفن، نہ انھیں بہادری کے بے مثل کارنامے پر میڈل پس از مرگ دیا جاتا تھا اور نہ ان کے لیے کوئی قومی دن منایا جاتا تھا۔ غالباً ایسے ہی وہ بھی تھے جو اپنے جسم کے ساتھ بم باندھ کر ہوائی جہاز سے کود پڑے تھے اور دنیا کے سب سے بڑے بحری جہاز "پرنس آف ویلز" کی چمنی لے اندر اتر گئے تھے۔ اس جہاز کو تباہ کرنے کی اور کوئی صورت نہیں تھی۔ ایک آدمی نے اس فولادی قلعے کے دو ٹکڑے کر دیے۔ ایک ہزار یا ایک لاکھ آدمی اپنی ساری طاقت صرف کر کے اس جہاز کو یوں توڑ سکتے تھے جیسے ایک انگلی سے ماچس کی تیلی ٹوٹ جاتی ہے۔ کیا وہ خودکشی تھی؟ خودکشی کو جاپانی اپنے پرانے عقیدے کے مطابق کارِ ثواب سمجھتے ہیں۔ اسے "ہاراکاری" کہا جاتا ہے۔ ہم اپنے عقیدے کی کسوٹی پر "ہاراکاری" کو حرام موت کہہ سکتے ہیں لیکن جو کچھ "سوئی سائڈ بٹالین" نے کیا وہ جرأت کے اعلیٰ ترین کارنامے تھے۔ ان کی طرح کوئی ہم میں سے جان دے تو شہید کا مرتبہ پاتا ہے اور بہادری کے اعلیٰ ترین اعزاز کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ پھر میرا وہاں جانا خودکشی کیسے ہوا؟ میں جان کو ایک ہتھیلی پر لیے پھرتی ہوں۔ دل کو دوسری ہتھیلی پر۔ یہ دونوں چیزیں بے مصرف سہی مگر کسی کے کام آ جائیں تو مجھے زندگی سے اور کچھ نہیں لینا۔"

میں بہت دیر تک دم بخود بیٹھا رہا اور سوچتا رہا کہ کیا دنیا میں نازو جیسی دوسری لڑکی کہیں ہوگی؟ حسن و نزاکت میں یکتا۔ حوصلے اور جرأت میں بے مثل۔ ذہانت اور جذبوں کی صداقت میں کھری۔ اتنا وہ پہلے کبھی نہیں بولی تھی۔ آج اس نے سب کو بولنے کے قابل نہیں چھوڑا۔ اس کی سوچ کا انداز اتنا مثبت تھا کہ منفی رجحانات رکھنے والے معاشرے کی تمام اقدار کی نفی کرتا تھا۔ معلوم نہیں یہ لڑکی یہاں کیوں پیدا ہوگئی۔ اسے فلسطین میں ہونا چاہیے تھا اور ہر اس دور میں پیدا ہونا چاہیے تھا جب حق و صداقت اور انصاف کے خلاف آواز اٹھائی گئی۔ اس کے حقیقت شناس ذہن کے دلائل چٹانوں سے زیادہ مضبوط تھے جو گہرے سمندروں میں قدم جمائے کھڑی ہوں اور کوہ شکن لہروں اور قیامت خیز طوفانوں پر خندہ زن ہوں۔

"میں نے اپنی بات کہہ دی نازو۔" میں نے ہی خاموشی کے اس سکوت کو توڑا جس میں ذہنی طور پر ہم سب ایک ہی طرح نازو کو خراجِ عقیدت پیش کر رہے تھے۔" تم نے اپنے عزم کا اظہار کر دیا لیکن پھر بھی کل تک سوچ لو۔"

"کل... کل کس نے دیکھی ہے!" وہ مسکرائی۔" پھر آج کا کام کل پر کیوں چھوڑیں۔ میں اس سوچ کی قائل ہی نہیں جو ارادوں

کومتزلزل کرنے لگے۔ دیمک کی طرح حوصلے کو چاٹنے لگے اور اندیشوں کا جال پھیلا گئے۔ میں نے ایک بار سوچ لیا اور فیصلہ کر لیا تو دوسری بار کیا سوچنا۔ کیا تم نے پہلے بھی مجھے اسی نظریۂ حیات پر عمل کرتے نہیں دیکھا۔ میں پچھتانے اور افسوس کرنے کی قائل ہی نہیں رہی۔ فیصلہ کر لیا تو کر لیا۔ غلط ہوا تو کیا ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ جان ہی جائے گی نا۔ کتنی بار جائے گی؟"

استاد ٹیڈی نے بڑی عقیدت اور شفقت کے ساتھ اپنی چھوٹی بہن کے ماتھے پر بوسہ دیا "مجھے تجھ پر کتنا فخر ہے نازو۔ خدا نے سب کچھ لے کر ایک بہن دی اور تلافی کر دی۔ کاش اتنی ہی جرأت اور بے خوفی مجھ میں بھی ہوتی۔ افسوس کہ تو اپنے بھائی پر فخر نہیں کر سکتی۔ وہ ایک بزدل آدمی ہے۔ صرف زبانی باتوں سے بہادری کی ڈینگ مارنے والا۔ مولا علی کی قسم کھا کے کچھ نہ کرنے والا گناہگار۔ جس کے اتنے بڑے وجود میں چیونٹی کے دل کے برابر ہمت نہیں۔ جو موت سے ڈرتا ہے۔"

"میں بھی سخت شرمندہ ہوں نازو" میں نے یکلخت سنجیدہ ہو جانے والی صورتِ حال کو ختم کرنے کے لیے آواز میں مصنوعی رقت پیدا کی "میں بھی موت سے نہیں ڈرتا توپ سے نہیں ڈرتا۔ یہاں تک کہ بھوت سے نہیں ڈرتا مگر میں موش سے ڈرتا ہوں۔ جانتی ہو موش کیا ہوتا ہے؟"

نازو کو سب کے ساتھ ہنسی آئی "تم چوہے سے ڈرتے ہو"

"مجھے پتا تھا تم یہی سمجھو گی" میں نے رونی شکل بنا کے کہا "وہ چوہا نہیں ڈاکٹر لطیف کا کتا ہے۔ گدھے کے سائز کا۔ جب وہ بھونکتا ہے تو بھونچال آجاتا ہے میرے پیٹ میں۔ کاٹے گا تو پتا نہیں کیا ہوگا۔"

ایک دم سب کا موڈ ٹھیک ہو گیا۔ سب ضرورت سے زیادہ جذباتی اور سیریس ہو رہے تھے اور میں یہ کامیڈی پیش نہ کرتا تو فضا بہت دیر تک بوجھل اور ناقابلِ برداشت حد تک افسردہ رہتی۔

"ابھی سب فیصلے کر لو" نازو نے پھر سب کو متوجہ کیا۔ "میرا اپنا خیال ہے کہ دیر سے کچھ حاصل نہیں۔ مجھے فوراً روانہ ہو جانا چاہیے۔ مسٹر میک اَپ مین! تم اپنا کام کتنی دیر میں ختم کر سکتے ہو؟"

"کون سا کام؟" محسن بولا "تمہاری صورت بگاڑنے کا؟ وہ میں غالب سے اجازت بلکہ باقاعدہ این او سی لیے بغیر نہیں کر سکتا۔" یہ اس کی بدقسمتی کہ وہ اپنا محلِ وقوع بھول گیا۔ وہ نازو کے بہت قریب بیٹھا ہوا تھا۔ اچانک اس نے خود کو قلابازی کھا کے اڑتا ہوا پایا۔ نازو نے اتنی پھرتی سے اسے اٹھایا تھا کہ خود میں حیران رہ گیا۔ یہ اس کے دُبلے پتلے جسم کے لوچ کا کمال تھا کہ وہ خود کمان ہو جاتی تھی مگر اس کے ہاتھ میں خم میں...
محسن نے ہائے کے ساتھ تقریباً شملا کے سامنے لینڈ کیا...
اسے چوٹ نہیں آئی تھی مگر اس نے دیدے گھما لیے اور...

"الوداع اے حور۔ اب تجھ سے جنت میں ملیں گے"
بولا "میرا بدلہ ضرور لینا کسی سے بھی لے لینا"

"اُٹھ کے بیٹھو سیدھے" شملا نے اُسے ڈانٹا مگر ہنسی بھی آئی۔ محسن اس کے اور میرے درمیان بیٹھ گیا اور پھر گھورنے لگا جو اس تماشے پر بہت خوش تھا۔

"سالے۔ نازو سے کس کو رستگاری ہے۔ آج ہم کل تو باری ہے" محسن نے خفت مٹانے کے لیے کہا۔

"تم نے میرے سوال کا جواب ابھی تک نہیں دیا" نازو...

"جواب اس کا یہ ہے اے قاتل حسینہ کہ میں فقط حکم کا... ہوں۔ اجازت ہو تو شام تک تجھے پری سے چڑیل بنا دوں... غالب تک ڈر کے چیخ مارے اور ایسا بھاگے کہ پھر ہاتھ نہ...
محسن بولا۔

"بس تو میں آج ہی رات کو نکل جاؤں گی" نازو نے فی...
آج رات؟" استاد ٹیڈی نے کہا "نازو تم بہت جلدی کر رہی ہو"

"دیر کی گنجائش کہاں ہے بھیا" نازو بولی "ہم فرصت اور اطمینان کے لیے وقت نکالیں گے تو اتنی دیر میں اسلحے کی... کھیپ نکل جائے گی۔ ایک کھیپ کتنے گھر تباہ کرے گی کتنے... اور رشتوں کا وجود مٹائے گی، تخریب کاروں کو کتنی جانوں کا نذ... لینے کی طاقت دے گی"

"اگر یہ بات ہے تو پھر میں بھی ساتھ چلوں گا" ٹیڈی نے...

"تمہارا وہاں کیا کام؟" نازو نے اور میں نے تقریباً ایک ساتھ کہا۔

"وہی جو تیرا کام ہے لڑکی" ٹیڈی بولا۔

"وہ کام تم نہیں کر سکتے" نازو نے اسے سمجھانے کی کوشش...

"میں تجھے بھی اس گھر میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا" ٹیڈی کی آ...
گیا "ہو سکتا ہے کہ وہ مجھے بھی ملازم رکھ لیں"

میں نے نفی میں سر ہلایا "تم نازو کا چانس بھی خراب کر... استاد اور وہ فوراً کھٹک جائیں گے" میں نے کہا۔

"میری طرف سے بے فکر رہو" نازو بولی "میں جان لینا بھی جانتی ہوں اور جان دینا بھی... میں اپنی حفاظت کر سکتی... تم کو یہاں بہت سے دوسرے کام ہوں گے"

"اچھا میں ہر روز تیری خبر لینے آؤں گا" ٹیڈی نے بادل... کہا اور گردن جھکالی۔

"خبر تو وہ تمہاری ایسی لیں گے کہ تم خود خبر بن جاؤ گے"
محسن نے کہا۔

"یار محسن، مجھے ایک خیال آیا ہے ٹیڈی کی بات پر" میں نے کہا "جس سے ہم نازو کے ساتھ رابطہ رکھ سکتے ہیں۔ اگر اپنے استاد ٹیڈی بھی اس گھر کے قریب چیک پوسٹ قائم کر لیں"

"کیسی چیک پوسٹ؟" محسن بولا "وہاں کوئی گھر...؟"

"گھر نہیں... گھر میں رہ کے ہر وقت دروازے پر نگاہ نہیں رکھی جا سکتی مگر فرض کرو کوئی دکان ہو۔ ریڑھی ہو" میں نے کہا۔

"یہ ٹھیک ہے استاد۔ اگر تم وہاں مونگ پھلی کی ریڑھی لے کر کھڑے ہو جاؤ۔ بہت آسان کام ہے۔ منافع اپنی جگہ اور بہانہ معقول۔ تم سب آتے جاتے لوگوں پر نظر رکھنے کے ساتھ ان کی تصویریں تک اتار سکتے ہو۔ گاڑیوں کے نمبر نوٹ کر سکتے ہو۔ اور بعد میں نازو کے اور تمہارے درمیان کوئی مواصلاتی رابطہ بھی قائم ہو سکتا ہے۔ تم درمیانی رابطہ بن سکتے ہو۔ رات بارہ بجے تک وہاں پٹرومیکس لیمپ لے کر کھڑے رہنا کوئی ایسی بات نہیں ہوگی جس پر کوئی شک کر سکے۔ دن میں بھی اگر نازو کو موقع ملے گا تو تم وہیں موجود ہو گے۔ رات کے بارہ بجے کے بعد تم ہمیں دن بھر کی رپورٹ دے سکتے ہو"

"یہ کام تو میں کر سکتا ہوں۔ مان گئے سکندر بادشاہ" ٹیڈی نے خوش ہو کے کہا۔

"سارا دن کھڑا رہنا پڑے گا اور رات بارہ بجے تک سردی میں مونگ پھلی بیچنا ہوگی۔ ٹانگیں ٹیڑھی ہو جائیں گی" محسن نے اس کا حوصلہ کم کرنے کی کوشش کی "آواز لگاتے لگاتے آواز بیٹھ جائے گی"

"یہ ایک مہینے کا مشن ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ" میں نے کہا "اس عرصے میں ہمیں جو کچھ معلوم ہونا ہے معلوم ہو جائے گا۔ اگر نہ ہوا تو پھر وہاں وقت ضائع کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا"

"میری شکل مونگ پھلی بیچنے والے کی طرح بنا دو محسن بھائی" ٹیڈی بولا۔

"تمہاری شکل پہلے ہی مونگ پھلی جیسی ہے"
محسن نے کہا "ذرا مجھے ایک سریلی صدا لگا کے تو دکھاؤ کہ مونگ پھلی بیچو گے کیسے، ٹریلر پیش کرو"

ٹیڈی نے کھنکار کے گلا صاف کیا اور ایک ہاتھ کان پر رکھ۔ پہلی صدا نہایت بے سُری نکلی۔ سب کا ہنستے ہنستے بُرا حال ہو گیا۔ دوسری کوشش اس سے بھی بدتر رہی۔ ٹیڈی کا منہ لال ہو گیا تھا۔

"تم مونگ پھلی تک نہیں بیچ سکتے سالے" محسن بولا۔

"میں تمہیں بیچ سکتا ہوں مونگ پھلی کی جگہ" ٹیڈی نے بھنا کے کہا "اس کے لیے گانا ضروری نہیں۔ مونگ پھلی والے ہاتھ میں گھنٹی رکھتے ہیں"

"تم گلے میں گھنٹی باندھ لینا۔ بیل کی طرح سر ہلاتے رہنا اور یہ ڈڈو جیسی آواز نکالتے رہنا" محسن بولا "تماشا دیکھنے والے جمع ہو جائیں گے تو دو چار مونگ پھلی بھی لے لیں گے"

ان کی جنگ بڑی مشکل سے ختم ہوئی۔ اصولی طور پر سب نے میری دونوں تجاویز سے اتفاق کر لیا تھا۔ اب تفصیلات طے ہونا باقی تھیں اور ہمیں بعد کا لائحہ عمل طے کرنا تھا مگر اس کے لیے بہت وقت تھا۔ شام ہونے لگی تھی جب محسن نے لات مار کے غالب کو اُٹھایا۔ پھر محسن ضرورت کا کچھ سامان لینے چلا گیا اور میں نے غالب کے پوری طرح جاگنے کے بعد اسے اپنی تمام گفتگو کا خلاصہ سنایا اور صبح سے اب تک پیش آنے والے تمام واقعات بتائے۔ وہ شام کے پانچ بجے لنچ کرتے ہوئے گھوڑے کی طرح سر ہلاتا رہا اور ہوں ہاں کرتا رہا۔ کئی بار مجھے شک ہوا کہ وہ اب بھی سو رہا ہے اور میری بات سن ہی نہیں رہا ہے مگر وہ پورے ہوش و حواس میں تھا۔ بعد میں میرے ساتھ کافی پیتے ہوئے بہت سے مفید مشورے دیے جو سب غیر سنجیدگی سے دیے گئے تھے چنانچہ احمقانہ تھے۔ شام سات بجے وہ اپنے اخبار کے دفتر چلا گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ نازو کے مشن اور استاد ٹیڈی کے رول پر غور کر رہا ہے اور اس کا ذہن خاموشی سے اس منصوبے کے مثبت اور منفی پہلوؤں کا تجزیہ کر رہا ہے۔ غالب کی یہی خوبی تھی۔ وہ کبھی اندازہ نہیں ہونے دیتا تھا کہ اس کے ذہن میں کیا کھچڑی پک رہی ہے۔ وہ کسی کمپیوٹر کی طرح چپ چاپ جمع تفریق ضرب تقسیم کرتا رہتا تھا اور اس وقت بولتا تھا جب وہ کسی ایک نتیجے پر پہنچ جاتا تھا اور پھر سب کو لاجواب کر دیتا تھا۔ وہ بہت سطحی نظر آنے والا شخص بہت گہرائی رکھتا تھا اور اسے سادہ لوح سمجھنے والے اس کی عیاری سے مار کھا جاتے تھے۔ جیسے نازو کو کمزور اور لڑکی سمجھنے والے اس سے مار کھا جاتے تھے۔

مجھے اطمینان اس بات کا تھا کہ غالب نے ہمارے کسی خیال کو مسترد نہیں کیا اور ہمارے منصوبے سے اتفاق کیا — اب یہ ہو سکتا تھا کہ وہ بہتر تجاویز پیش کر دے اور زیادہ مؤثر لائحہ عمل مرتب کرنے میں مدد دے یا خود بھی عملی طور پر شرکت کا راستہ نکال لے۔ وہ کام کرتے ہوئے بھی سوچتا رہے گا اور غیر شعوری طور پر منصوبے کا ہر پہلو سے جائزہ لیتا رہے گا۔ اس کے ساتھ ایک مشکل تھی کہ وہ شب بیدار لوگوں میں سے تھا۔ رات کو جاگتا

تھا اور دن کو اسے ضرورت کے تحت سونا پڑتا تھا چنانچہ وہ دن میں ہمارے ساتھ ہر روز جانے سے قاصر تھا۔ اس کا ایک فائدہ بھی تھا کہ رات کے وقت ہم کہیں بھی ہوں اس سے رابطہ قائم کر سکتے تھے۔ اسے پیغام دے سکتے تھے اور اس سے مدد بھی مانگ سکتے تھے۔ یہ اپنا غریب وطن پاکستان تھا جہاں ہر فرد اور ہر گھر کو ٹیلی فون جیسی بنیادی سہولت حاصل کرنے کے لیے بھی دس دس سال انتظار میں گزارنے پڑتے تھے چنانچہ اب تک ہم نے جتنے گھر لیے تھے اور جتنے ٹھکانے بدلے تھے سب ٹیلی فون سے محروم تھے ورنہ رابطہ رکھنا کوئی مشکل کام نہیں ہوتا۔ پھر یہاں پبلک کال آفس کی آسانی بھی بڑے شہروں میں محدود پیمانے پر حاصل تھی۔ پی سی او کچھ دکانوں میں تھے اور ان سے اسی وقت فائدہ اُٹھایا جا سکتا تھا جب دکان کھلی ہوئی ہو۔ کہاں وہ لندن کا شہر جہاں ٹیکسی میں بھی فون دستیاب تھا اور گھر میں تو اتنا ہی ضروری سمجھا جاتا تھا جتنا پانی کا نل یا بجلی کی لائن ۔۔ ان حالات میں یہ ضروری تھا کہ ہم اپنے درمیان غیر قانونی مواصلاتی رابطہ قائم کریں یعنی وہی وائرلیس مائکروفون رکھیں جن سے ہماری آواز ریڈیو کے ایف ایم بینڈ پر سُنی جا سکے اور ہم تین چار افراد ایک ہی فریکوئنسی پر پیغام دے سکیں یا فریکوئنسی الگ الگ ہو تو ہم سب کے علم میں ہو مگر اور کسی کو معلوم نہ ہو۔

اس طریقے میں بہت سی خرابیاں تھیں۔ ایک تو یہ کہ رابطے کے لیے دو طرفہ نظام ضروری تھا۔ ہر شخص کے پاس بیٹری کے سیل سے چلنے والا ایف ایم بینڈ کا ریڈیو ہو اور مائکروفون ہو۔ چھوٹے سے چھوٹا ریڈیو بھی سگریٹ کے پیکٹ سے بڑا تھا اور اس میں استعمال ہونے والے دو پین ٹارچ سیل چار دن سے زیادہ ساتھ نہیں دیتے تھے۔ مسلسل استعمال کی صورت میں شاید دو ہی دن میں جواب دے جاتے اور وقفے وقفے سے مختصر وقت کے لیے استعمال کیا جائے تب بھی ان کی لائف ایک ہفتے سے زائد نہ تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ ہر ہفتے نئے سیل ڈالنے کا مسئلہ جو ہر جگہ اور ہر وقت نہیں ملتے ۔ یہی صورت حال ریموٹ مائکروفون کی تھی ۔ ان دونوں چیزوں کو ساتھ رکھنا' اس طرح کہ کسی کو پتا نہ چلے' عملاً ناممکن تھا۔ یہ چیزیں نظر میں آ سکتی تھیں اور تلاشی میں فوراً برآمد کی جا سکتی تھیں۔ یہاں وہ بٹن کی جگہ استعمال ہونے والے طاقت ور مائکروفون کہیں دستیاب نہ تھے جو انگریزی جاسوسی ناولوں میں مجرم اور پرائیویٹ سراغرساں سب بے باکانہ استعمال کرتے تھے اور آلہ سماعت جیسے ٹرانسمیٹر بھی نایاب تھے جن کی آواز سو پچاس میل کے دائرے میں سُنی جاتی ہو اور جو دھوپ سے چارج ہونے والی یا جوہری قوت والی بیٹری سے مسلسل استعمال کے قابل رہتے ہوں۔ اگر ہم مقامی مارکیٹ سے ایف ایم اور ریڈیو یا واکی ٹاکی حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتے تو ان کی رینج زیادہ سے زیادہ پچاس کلومیٹر ہوتی یعنی گویا پینتیس میل بلکہ اس سے بھی کم تھی۔ اس سے شہر کے اندر رہتے ہوئے رابطہ رکھا جا سکتا تھا مگر پینتیس میل سے زیادہ دور نکل جانے کے بعد رابطے کی کوئی صورت نہ تھی۔

ہمارے لیے حالات کی عدم موافقت ہی سب سے بڑی مشکل تھی۔ پرائیویٹ سراغرساں کا تصور یہاں جاسوسی اور جرم کی کہانیوں میں بھی غیر حقیقی لگتا تھا۔ پولیس کا تصور یکسر مختلف تھا۔ نہ وہ برطانوی پولیس کی طرح عوام کے دوست اور مددگار سمجھے جاتے تھے اور نہ امریکن پولیس کی طرح مستعد اور فرض شناس۔ حقیقت یہ تھی کہ بیشتر ترقی یافتہ ممالک میں پولیس کا کردار وہی تھا جو اسے زبردستی ہونا چاہیے۔ یہاں صورتِ حال اس کے بالکل برعکس تھی۔ پولیس کا امیج بہت خراب تھا۔ پبلک ان کو اپنا دشمن اور ساری خرابیوں کا ذمے دار سمجھتی تھی۔ جو اگر مستعد تھے تو صرف رشوت لینے اور فرض کی ادائیگی سے اتنا بھی واسطہ نہیں رکھتے تھے جتنا تنخواہ کی آمدنی سے۔ ان کے لیے اصل آمدنی کے ذرائع ہی اصل ذرائع بنے ہوئے تھے جن میں شریف لوگوں کو بے وجہ تنگ کرنا یا گرفتار کرنا اور معاوضے لے کر چھوڑنا۔ چوروں ڈاکوؤں سے اشتراک۔ جوئے اور نشے کے اڈوں کی سرپرستی۔ غنڈوں بدمعاشوں کے ذریعے بھتہ وصول کرنا اور ایسے ہی رفاہِ عامہ کے کام شامل تھے۔ بے شک سب ایسے نہیں تھے مگر اس کا کیا علاج کہ رسوا سب ایک سے تھے۔

خود پبلک کی صورتِ حال مختلف نہ تھی۔ قانون کا احترام اگر کوئی کرتا تھا تو سزا کے خوف سے۔ اس لیے نہیں کہ یہ ہر شہری کا فرض ہوتا ہے۔ جہاں دیکھنے والا کوئی نہ ہو وہاں سب موقع سے فائدہ اٹھا لیتے تھے اور بیشتر صورتوں میں رشوت کو برا وہی کہتے تھے جن کو رشوت کہیں سے نہیں ملتی تھی۔ ایسے باکردار لوگ عنقا ہوتے جا رہے تھے جو مایا جال میں گرفتار نہ ہوں اور دولت سامنے ہو مگر وہ خوفِ خدا کے باعث نہ لیں۔ لوگ اپنی اخلاقی اور قانونی ذمے داریوں سے بھاگتے تھے۔ پڑوس کے گھر میں ڈاکا پڑ جائے تو اپنے گھر میں تالا ڈال کے بھاگ جاتے تھے تاکہ کہہ سکیں کہ وہ تو واردات کے وقت موجود ہی نہیں تھے۔ سڑک پر حادثہ ہو جائے تو نظر بچا کے فرار ہو جاتے تھے کہ گواہی نہ دینی پڑے۔ رشتوں ناتوں اور ذات برادری کے چکروں میں وہ فیصلے کرتے تھے جو درست ہو بلکہ ذاتی مفادات اور مصلحت کے تحت اپنی کو پیش رکھتے تھے۔

ایسے حالات میں ہم چند افراد کا اتحاد اور ایک گروہ کی حیثیت سے دلاور اینڈ کمپنی کے خلاف صف آرا ہونا بہت بڑی بات تھی۔ یہ کوئی پی ایل او یا بلیک ستمبر جیسی تنظیم نہیں تھی جس کے وسائل لامحدود ہوں اور جس کے ساتھ ہمدردی رکھنے والوں کی تعداد لامحدود ہو۔ یا جسے عالمی سطح پر سیاسی حمایت بھی حاصل ہو۔ یہ تو کچھ سر پھرے سرفروش اور سرخ رُو افراد تھے جن کو اعتماد تھا خدا کی ذات پر اور اس کی مدد پر۔ جو تکیہ کرتے تھے اپنے نام و عمل کی قوت اور نیت کے خلوص پر اور کام لیتے تھے اپنے زورِ بازو سے۔ بقول علامہ اقبال۔ اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے ہم تو اپنے وسائل بھی خود پیدا کرتے تھے اور اپنے راستے بھی خود نکالتے تھے اور انجام کی پروا کبھی نہیں کرتے تھے۔ یہی ہماری اب تک کی کامیابیوں کا راز تھا۔

رات کو نازو کے جانے کا معاملہ صبح پر ملتوی کر دیا گیا کیونکہ محسن کو میک اپ کا سامان لے کر واپس آنے میں دیر ہو گئی تھی۔ پھر یہ بھی فیصلہ ہوا کہ اگلے دن استاد ٹیڈی پہلے اپنا مورچہ قائم کرے اور نازو بعد میں پہنچے۔ استاد ٹیڈی کو اگلے دن بہت سی شاپنگ کرنا تھی۔ ایک عدد ریڑھی خریدنا تھی۔ اس پر ڈھیر کرنے کے لیے مونگ پھلیاں۔ مونگ پھلیاں بھوننے کا چولہا کر چھائریت اور متعلقہ سامان ۔ ترازو اور باٹ۔ لفافے اور پٹرومیکس لیمپ۔ ان چیزوں کی خریداری تو مشکل نہ تھی مگر اس میں کم سے کم دو گھنٹے صرف ہونے یقینی تھے چنانچہ نازو کی روانگی صبح بھی مشکل نظر آتی تھی۔ دوپہر کے بعد وہ جا سکتی تھی اور محسن کے پاس اس کا میک اپ کرنے کے لیے بہت وقت تھا۔ میں نے رات کو ٹیڈی کے ساتھ جا کر اس گھر کا اور گلی کا جائزہ لیا جہاں وکٹر فیملی کا قیام تھا۔ وہ عام قسم کے بہت سے گھروں سے ملا ہوا ایک گھر تھا جس کا ایک ہی دروازہ گلی میں کھلتا تھا۔ اِدھر اُدھر کرائے کا مکان تلاش کرنے کے بہانے ہم بہت پھرے مگر وہاں کوئی مکان تھا بھی نہیں۔ میں نے ٹیڈی کی ریڑھی کے لیے ایک جگہ کا انتخاب کیا اور ہم لوگ رات دس بجے تک لوٹ آئے۔ خلافِ توقع ہم نے غالب کو موجود پایا۔ شہلا اسے کسی بات پر چھیڑ رہی تھی لیکن وہ ٹال رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ ہماری واپسی کے انتظار میں مبتلا تھا۔ اسے ہم سے کچھ کہنا تھا چنانچہ وہ کوئی بہانہ کر کے جلد لوٹ آیا تھا لیکن ہم گھر سے غائب تھے۔ نازو کی موجودگی میں وہ اتنا نروس نہیں ہوتا تھا اور ہم سب کے چھیڑنے پر ڈھیٹ بن جاتا تھا لیکن اس وقت وہ کوفت کا شکار تھا۔

"آج کیا پھر ایڈیٹر سے باکسنگ ہو گئی؟" میں نے کہا "اس وقت تمہارا یہاں نظر آنا چہ معنی دارد؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "ہم صحافی ایک امن پسند قوم ہیں۔"

"مگر تم صحافی نہیں، کسی صحافی کی بھٹکی ہوئی بدروح ہو۔" استاد ٹیڈی نے کہا۔

"ہاں ۔۔ اور مجھے بھٹکانے والے تم سب ہو۔" غالب نے افسوس سے سر ہلا کے کہا۔ "اب میں صحافی بہت کم رہ گیا ہوں۔ تقریباً تیس فیصد۔ باقی تیس فیصد جیمز بونڈ قسم کی چیز بن گیا ہوں۔"

"اور باقی چالیس فیصد کا کیا حساب ہے؟" میں نے بات کو سمجھتے ہوئے کہا۔

"وہ دل کا حساب ہے۔" غالب نے کہا۔ "مطلب یہ کہ میرے دل میں ہے اور میں خود نہیں سمجھتا تو تمھیں کیا سمجھاؤں۔ یہ بتاؤ' تشریف آوری کہاں سے ہو رہی ہے؟"

"میں اور استاد اس مشن پر گئے تھے جسے فوجی اصطلاح میں 'ریکونی سینس' کہا جاتا ہے۔" میں نے کہا۔

"آپ یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ ہم دشمن کے علاقے کا جائزہ لینے گئے تھے۔" غالب نے کہا۔ "اور وہ دولھامیاں؟"

"وہ نہیں آیا ابھی تک؟" میں نے کہا۔ "بہت نوفر ہو گیا ہے شادی کے بعد سے۔ شہلا نے ڈھیل بہت دے رکھی ہے لیکن اس سوال کا جواب تو بیچ میں ہی رہ گیا۔ تم کیسے بھاگ آئے؟"

"بس یار۔ چھٹی کر دی میں نے اخبار کی۔" غالب نے کہا۔

"کیا مطلب؟ استعفا دے دیا؟" میں نے کہا۔

"یا انھوں نے لات مار کے نکال دیا؟" استاد ٹیڈی بولا۔

"ایک مہینے کے لیے کچھ بھی سمجھ لو۔" غالب نے کہا۔ "میں نے تو مانگی تھی چھٹی کہ شادی ہے۔"

"شادی؟ کس کی شادی؟" نازو بولی اور ہنسنے لگی۔

"میری۔" غالب نے اسے غور سے دیکھ کر کہا اور نازو کی ہنسی کافور ہو گئی۔ "اور معلوم ہے اس کے بعد کیا ہوا؟ ایڈیٹر نے بہت شور مچایا کہ اخبار کیا میرا باپ نکالے گا۔ میں نے کہا کہ اخبار گیا بھاڑ میں۔ کیا تمھارے اخبار کی خاطر میں کنوارا مر جاؤں تو اس نے ایک فائل نکالی اور میرے سامنے رکھ دی۔ یہ دیکھو' جب ستمبر ۶۵ء کی جنگ چل رہی تھی تو تم نے ایک مہینے کی چھٹی کی تھی۔ یہ دوسری شادی تم نے کی دو سال بعد نومبر ۶۷ء میں۔ تیسری درخواست میں پھر شادی کے بہانے تم ایک ماہ غیر حاضر رہے۔ جولائی ۶۸ء میں۔ اور اب دو سال بھی نہیں ہوئے ۔۔ کہ پھر شادی۔ بے وقوف سمجھتے ہو مجھے' الو بناتے ہو۔ میں نے کہا آپ کو خدا نے جو بنا دیا سو بنا دیا میرے سمجھنے سے کیا ہوتا ہے لیکن آپ کو یہ بات سمجھ لینا چاہیے کہ از روئے شرع مجھے چار شادیاں کرنے کی اجازت ہے اور

میں اپنا یہ شرعی حق حاصل کرنے کے لیے تمہارے سر دھڑ کی بازی لگا دوں گا۔ کہنے لگا اچھا میں خود جا کر دیکھوں گا کہ اسٹاک میں تین بیویاں ہیں یا نہیں اور چوتھی کو اس تباہی سے بچانے کے لیے راست اقدام کروں گا۔ میں نے کہا کہ چوتھی سے آپ ضرور ملیں۔ آپ کی طبیعت صاف ہو جائے گی۔ ہاضمہ درست ہو جائے گا۔ چال ٹھیک ہو جائے گی اور عقل و نظر کا فتور بھی دور ہو جائے گا مگر پہلے والی تین سے آپ نہیں مل سکتے۔ پہلی تو عقد سے پہلے ٹمبکٹو بھاگ گئی تھی۔ دوسری کو میں عقد کے بعد ہنولولو میں چھوڑ کر بھاگ آیا۔ تیسری بارات راستہ بھٹک گئی تھی اور غلط جگہ پہنچی جہاں کوئی عرس شریف ہو رہا تھا۔ جب دلہن کے گھر پہنچے تو اس کا نکاح قاضی سے ہو چکا تھا۔"

سب کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔ نازو پہلے تو شرم سے لال ہو گئی تھی کیونکہ سب اس کی طرف دیکھنے لگے تھے مگر.... پھر وہ بھی سمجھ گئی اور اس کے لیے ہنسی کو ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔ غالب بالکل سنجیدہ رہا۔

"تم لوگ بلاوجہ خبطی مشہور نہیں ہوتے۔" ٹیڈی بولا۔

"ہم جینئس لوگ ہوتے ہیں۔ جن کو آدھا پاگل سمجھنے والے پورے پاگل ہوتے ہیں۔"

"مگر ایک مہینے کی چھٹی کی کیا ضرورت تھی؟" میں نے کہا۔ "تم وہیں رہو تو اچھا ہے۔ سب کے لیے رابطے کی ایک جگہ ہے۔"

"تم ذرا میرے ساتھ چلو۔" غالب بولا۔ "مجھے تم سے ایک.... نہیں، دو باتیں کرنا ہیں۔"

"ایسی کون سی بات ہے جو یہاں سب کے سامنے نہیں ہو سکتی۔" میں نے کہا۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی اور محسن اندر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سوٹ کیس تھا جو اس نے نیچے رکھ دیا اور حیرانی سے غالب کو دیکھنے لگا۔

"ایک بات کی جا سکتی ہے سب کے سامنے۔" غالب سوچ کے بولا۔ "لیکن دوسری بات... بہتر ہو گا کہ تم سنو۔ اس کا تعلق سب سے نہیں ہے۔"

محسن کے ہاتھ ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ اس نے دونوں ہاتھ آپس میں رگڑ کر پھونک ماری اور سب کی صورت دیکھ کر بیٹھ گیا۔ "کوئی گمبھیر مسئلہ ہے؟" وہ بولا۔

"ایک مسئلہ واقعی گمبھیر ہے۔" غالب بولا۔ "جس کی وجہ سے مجھے فوراً آنا پڑا۔ اور یہ فیصلہ بھی کرنا پڑا کہ فی الحال میں آفس نہ جاؤں۔"

"کوئی خطرے کی بات ہے؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ آج جب میں آفس پہنچا تو مجھے اپنی میز پر ایک لفافہ ملا۔ اس پر صرف میرا نام تھا۔" غالب بولا۔ "کسی کو معلوم نہ تھا کہ وہ لفافہ وہاں کس نے پہنچایا۔ وہ ڈیسک نیچے ہے جہاں پبلک اپنے مراسلے، بیانات، اعلانات اور پریس ریلیز وغیرہ دے جاتی ہے۔ سب وہاں ڈھیر ہوتے رہتے ہیں اور پھر متعلقہ لوگوں تک پہنچا دیے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے اس میں زیادہ تر فضول ردی ہوتی ہے۔ نام کی تنظیموں کے بیانات اور ذاتی قسم کے خطوط یا بے مقصد اعلانات۔ انھی میں یہ لفافہ بھی ہو گا۔ ڈیسک پر بیٹھنے والے کو بالکل معلوم نہیں تھا کہ وہ کون لایا تھا۔ میرے نام ذاتی قسم کے خط بھی آتے ہی رہتے ہیں مثلاً تقریبات کے دعوت نامے ہوتے ہیں جو ایسے ہی سادے لفافوں پر نام لکھ کر پہنچا دیے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس لفافے کو دیکھ کر میں نہ حیران ہوا تھا نہ پریشان لیکن میں نے اسے کھول کر پڑھا تو مجھ پر چودہ طبق روشن ہو گئے۔ ممکن ہے پندرہ سولہ طبق ہوں۔ مجھے گننے کا ہوش نہیں تھا۔"

"اور وہ ہوش ربا خط کس کا تھا۔ اور اب کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

"خط میرے پاس ہے۔" غالب نے کہا۔ "اور چوہدری دلاور کی طرف سے آیا ہے۔"

یکلخت سب کو سانپ سونگھ گیا۔ کچھ دیر تو کسی کے ذہن نے اس سنگین حقیقت کو تسلیم ہی نہیں کیا اور اسے بھی غالب کی ظرافت کا نمونہ سمجھا۔ پھر غالب کی صورت دیکھ کر آہستہ آہستہ سب پر عیاں ہونے لگا کہ یہ مذاق کی بات نہیں ہے۔ اس نے جیب میں سے ایک لمبا سا لفافہ نکالا اور میری طرف بڑھا دیا۔ "تم اس تحریر کو پہچان سکتے ہو؟" وہ بولا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "اگر یہ دلاور کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے تو اس نے تحریر کو بدل کے لکھا ہے۔ یہ کوئی خط شناس ہی بتا سکتا ہے۔"

"خط نکالو۔ خط کہاں ہے؟" محسن نے مضطرب لہجے میں کہا۔ "لفافے پر تو تمہارے نام کے سوا کوئی خطرناک بات نہیں۔"

"پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ خط لے کر تم سیدھے ادھر آئے تھے؟" میں نے کہا۔ "ایڈیٹر کو بتا کے آئے تھے کہ کہاں جا رہے ہو؟"

"ہاں۔ میں نے شادی کی درخواست خط پڑھ لینے کے بعد ہی دی تھی۔" غالب بولا۔ "جھگڑا تو ہوا مگر میں طے کر چکا تھا۔ میں نے کہہ دیا کہ میں جا رہا ہوں اپنے گھر اور خبردار جو تم بارات میں آئے۔ وہ بے وقوفوں کی طرح بیٹھا رہ گیا۔ دراصل اس سے پہلے بھی جب میں نے چھٹی لی تو بات مذاق میں ٹل گئی۔ اخبار کے دفتر میں کام زیادہ ہوتا ہے اور عملہ کم۔ باری باری سب لوگ ہفتے کے مختلف دنوں میں ایک چھٹی کر کے کام چلاتے ہیں۔ کوئی دو دن بھی نہ آئے تو شیڈول بگڑ جاتا ہے۔ ایک ہفتے کی رخصت بھی مشکل ہوتی ہے کیونکہ کام دوسروں پر پڑ جاتا ہے۔ ایک مہینے کی چھٹی صرف شادی کے لیے ملتی ہے چنانچہ سب یہی لکھ دیتے ہیں اور اخبار کا جو مالک ہے وہ مجبور ہو جاتا ہے۔ ایڈیٹر سب جانتا تھا اور اتفاق سے ایک 'سب ایڈیٹر' پہلے ہی چھٹی پر تھا چنانچہ اس نے گڑبڑ ڈالی اور مجھے جھگڑا کر کے نکلنا پڑا۔ آفس میں تو میرا پتا نا پتا لکھا ہوا ہے جہاں مدت سے کسی کا آنا نہیں ہوا۔ ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ سب باہر مل لیتے ہیں اور اپنا گھر بار ایسا تھا بھی کہاں کہ کسی کی میزبانی کریں یا کوئی وہاں مہمان ہو۔ اب ہو سکتا ہے کہ کل پرسوں ایڈیٹر خود اُدھر دوڑ لگائے مجھے کسی صورت واپس لے جانے کے لیے۔"

"تمہارے پاس تو فلیٹ تھا۔" میں نے کہا۔ "مقبرہ ٹائپ۔"

"ہاں۔ اب وہاں کوئی اور دفن ہو گا۔" غالب بولا ـــــ "جو بے سروسامانی تھی اس سے لینڈ لارڈ کو کرائے کا عشرِ عشیر بھی وصول نہیں ہوا ہو گا۔"

"وہی۔ چند تصویر بتاں، چند حسینوں کے خطوط؟" محسن بولا۔

"نہیں۔ ایک میلا پاجامہ۔ ایک پتلون۔ دو قمیصیں، پرانی چپل اور چارپائی مع فقیرانہ بستر کے۔" غالب بولا۔ "کرایہ تو میں نے چھ مہینے پہلے بھی نہیں دیا تھا۔ اس کے لیے دس لاکھ یا تو ہوں۔ وہ تالا توڑ کے قبضہ لے چکا ہو گا۔"

"میں نے پوچھا تھا کہ آپ نے خط لے کر آفس سے سیدھے ادھر تشریف لانے کی حماقت کیوں کی؟" میں نے کہا۔

"ویسے تو حماقت آدمی شوقیہ کرتا ہے۔" غالب بولا۔ "مگر اس وقت حماقت مجھے بہت مہنگی پڑتی۔ میں نیچے والی منزل پر گیا۔ وہاں ایک سب ایڈیٹر کا کمرہ ہے۔ وہ رازدار قسم کا آدمی ہے۔ میں نے اسے کہا کہ باہر بہت خطرناک قسم کے سود خور بندوقیں اور توپیں لیے کھڑے ہیں۔ میں نہ سود دے سکتا ہوں نہ اصل چنانچہ وہ مجھے لے جائیں گے اور معلوم نہیں کس طرح سود وصول کریں گے۔ بہرحال... وہ کوئی اخلاقی طرزِ عمل اختیار نہیں کریں گے اس لیے میں پچھلی طرف سے نکل کر فرار ہونا چاہتا ہوں۔ اس نے دروازہ بند کر کے میری حالت پر افسوس کیا اور پوچھا کہ آخر میں نے ایسی حماقت کیوں کی۔ سود خوروں سے قرضہ لینا آسان ہے مگر ان سے جان چھڑانا مشکل۔ میں نے اسے ایک دردناک کہانی سنائی کہ کیا کرتا۔ بہن کی ڈولی اُٹھانا تھی۔ خاصے فلمی ڈائلاگ تھے۔ نتیجہ یہ کہ اس نے میری مدد کی۔ دفتر میں رسی تو کوئی نہیں تھی مگر ٹیلی فون کے پرانے تار ایک جگہ پڑے تھے۔ وہ سب سے لمبا ٹکڑا لے آیا اور میں نے اس ٹکڑے کو کھڑکی کے باہر والے ہینڈل سے باندھ دیا۔ ٹیلی فون کا دُہرا تار بہت سخت اور مضبوط ہوتا ہے۔ خطرہ یہ تھا کہ گانٹھ کھل جائے گی چنانچہ اس مددگار نے بھی ایک سرا تھامے رکھا اور میں پھسلتا ہوا نیچے اتر گیا۔ رات کا وقت تھا اس لیے دیکھا کسی نے نہیں۔ پیچھے جو احاطہ ہے اس میں کاغذ کی کترن کے انبار پڑے رہتے ہیں جو وقتاً فوقتاً روئی کی گانٹھوں کی طرح باندھ کر اور دبا دبا کے ٹرک پر لاد دیے جاتے ہیں۔ ان کترنوں کو خریدنے والا اخبار کے ایڈیٹر سے بہت زیادہ مالدار ہے۔"

"مختصر بات کرو۔ دلاور کے خط میں کیا لکھا ہے؟" میں نے بھنا کر کہا۔

"اس میں کوئی ایسی بات نہیں۔" غالب نے مجھے تسلی دی۔ "ساری پریشانی کی بات یہ ہے کہ وہ خط میرے پاس کیوں آیا؟ میں تو آج بال بال بچ گیا۔ یقیناً صدر دروازے پر چوہدری دلاور کا کوئی شکاری کتا کھڑا ہوا ہو گا اس وقت بھی۔ اس نے مجھے اندر جاتے دیکھا ہو گا اور یہ اطمینان بھی کر لیا ہو گا کہ عمارت میں داخل ہونے اور باہر آنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے۔ پیچھے سے نکلنے میں بھی ان کاغذ کی کترنوں نے بچا لیا ورنہ میں دل کی طرح ٹوٹ جاتا۔ ہزار ٹکڑے ہوتے کہ کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا۔ مگر میں گرا اس انبار پر جو روئی کے پہاڑ کی طرح تھا۔"

"کیا تار چھوٹ گیا تھا؟" نازو نے گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکا کے سوال کیا۔

"اس کا اندازہ تو مجھے لٹک جانے کے بعد ہوا۔" غالب بولا۔ "تار تھا کوئی بیس فٹ لمبا۔ چوتھی منزل تھی اڑتالیس فٹ بلند۔ بس اچانک میں نے ہاتھ نیچے بڑھا کے تار کو گرفت میں لینا چاہا تو مٹھی میں رات کا اندھیرا آیا اور میں نے چوبیس فٹ بغیر پیراشوٹ کے پرواز کی۔ کمزور دل کا ہوتا تو نیچے لینڈ کرتا صرف یہ فانی جسم۔ روح وہیں سے اوپر چلی جاتی۔ اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں دیوار پر گروں گا، فرش پر یا اس فولادی بازوؤں والی مشین پر جو کاغذ کی کترنوں کو پریس کر کے گانٹھوں کی شکل میں باندھتی ہے۔"

"غالب بھائی۔" شہلا نے اچانک کہا۔ "اس وقت جب آپ گر رہے تھے۔ چند سیکنڈ میں آپ کو کس کا خیال آیا تھا؟ سچ بتائیے گا۔"

غالب نے سانس روک کر نازو کی طرف دیکھا جو نظر جھکائے پیر کے ایک ناخن کو کھرچ رہی تھی اور خاموشی کے اس مختصر ترین وقفے میں غالب کا جواب سب نے سنا اور سمجھا، دیکھا اور جانا پھر اس نے ایک گہری سانس لی اور مسکرایا۔ "جیسے عدالت فیصلہ محفوظ رکھتی ہے، ایسے ہی میں جواب محفوظ رکھتا ہوں۔" وہ بولا۔ "زندگی میں پہلی بار میں نے موت کو اتنے قریب پایا تھا مگر نیچے گرتے ہی میں نرم کاغذوں کے ڈھیر میں دھنس گیا تو میں بہت دیر تک آنکھیں

بند کیے پڑا رہا۔ اس وقت وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ چوکیدار وہاں ہوتا ہی نہیں۔ پھر میں نے کہا تھینک یو گاڈ۔ پہلی زندگی ہی کا مجھ پر بہت بڑا احسان تھا۔ یہ دوسری زندگی مجھ گناہگار پر تیری خاص عنایت ہے کیونکہ اب مجھے جینے کی ضرورت کا احساس پہلے سے زیادہ ہو رہا تھا جب آدمی صرف اپنے لیے جیے یا بے مقصد جیے تو اس کے جینے یا نہ جینے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

غالب نے وہ سب کچھ کہہ دیا تھا جو اسے کہنا تھا۔ کچھ کہے بغیر ناز و پر واضح کر دیا تھا کہ اپنی پہلی زندگی کے آخری لمحوں میں مجھے تمھارا خیال آیا تھا اور اب دوسری زندگی کی مجھے اس لیے ضرورت تھی کہ میں تمھارے لیے جی سکوں اور تمھیں مقصد بنا سکوں۔ کسی نے کسی سے کچھ بھی نہیں کہا۔ غالب نے دلاور کا خط نکالا اور اونچی آواز میں پڑھنے لگا۔

"اس خط کے ذریعے میں سکندر بخت کو ایک پیش کش کرتا ہوں جس کے ساتھ میرے تمام اختلافات کی بنیاد ایم ڈبلیو ڈی کمپلیکس تھا۔ وہ اس کا قانونی وارث ہے اور میں اس کا یہ حق تسلیم کرتے ہوئے یہ کارخانہ اور اس کے تمام اثاثے اس کی ملکیت میں دینے کو تیار ہوں۔ اس سلسلے میں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ تمام قانونی کارروائی میں سکندر بخت کا ذاتی طور پر حاضر رہنا ضروری نہیں ہوگا۔ اس کے کسی بھی قانونی اٹارنی کو قبضہ دیا جا سکتا ہے۔"

"دلاور نے ایک ٹیلی فون نمبر بھی دیا ہے۔" غالب نے پڑھنا چھوڑ کے کہا۔ "اس نمبر پر اس سے مزید بات کی جا سکتی ہے۔"

"کیا خط میں صرف اتنا ہی تھا؟" محسن بولا۔

"نہیں۔ یہ پہلا پوائنٹ تھا۔" غالب بولا۔ "تمھارا اس کے متعلق کیا خیال ہے؟"

"خیال تو سب کا ایک ہی ہوگا۔" میں نے کہا۔ "یہ چوہدری دلاور کی ایک احمقانہ چال ہے۔ شاید اسے معلوم ہو گیا ہے کہ اب مسئلہ حق وراثت حاصل کرنے یا انتقام لینے کا نہیں رہا۔ یہ ایک طرح کی رشوت ہے۔"

"رائٹ۔ یہ رشوت ہے۔" غالب نے کہا۔ "ہمیں اپنے اصل مقصد سے ہٹانے کے لیے اور ایم آر ایس کے مشن کو ختم کرنے کی سازش ہے۔"

"دوسری بات یہ ہو سکتی ہے کہ ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس میں اب اسلحہ سازی ختم کر دی گئی ہوگی۔ خطرے کے پیش نظر اسلحہ ساز مشینیں اور آلات کسی دوسری جگہ منتقل کر دیے گئے ہوں گے۔ دلاور کا خصوصی عملہ بھی نکل گیا ہوگا اور اب شاید پھر وہاں صرف زرعی مشینری کے پرزے بننے لگے ہوں گے جو... کے زمانے میں بنتے تھے۔ ان کے منافع کی چوہدری دلاور کو... نہیں رہی۔ اسے کافی وقت ملا ہے۔ اس عرصے میں اپنے ناجائز کاروبار سے اس کی آمدنی میں بے حساب اضافہ ہوا۔ اس کے مقابلے میں زرعی مشینری کے پرزوں کا منافع کیا حیثیت رکھتا ہے۔ اس منافع کو برقرار رکھنے اور کاروبار کو پھیلانے کے لیے اس نے کوئی محفوظ جگہ منتخب کر لی جہاں مکمل رازداری کے ساتھ زیادہ پیداوار ممکن ہو۔ زیادہ آرڈر پورے کیے جائیں اور اس وقت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تجوریاں بھر لی جائیں۔ مشرقی پاکستان میں علیحدگی کا رجحان بڑھ رہا ہے اور وہاں تخریب کار زیادہ سرگرم عمل ہو رہے ہیں۔ ان کی پشت پناہی کرنے والے انڈین ایجنٹ بھی زیادہ فعال ہیں۔ انھوں نے اپنا جال زیادہ منظم طریقے پر پھیلا دیا ہوگا اور ... ہے وہی اب چوہدری دلاور کے مشیر ہوں جنھوں نے اسے سمجھایا ہو کہ لعنت بھیجو اس جھگڑے پر جو ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس کی وجہ سے شروع ہوا۔ اپنی آرڈیننس فیکٹری کسی نئی اور خفیہ جگہ پر قائم کرو۔ بہتر مشینری لگاؤ اور زیادہ مال فراہم کرو۔ یہ پرانا کارخانہ اس شرپسند سکندر بخت کے حوالے کرو۔ ان کے نقطۂ نظر سے تو وہ شرپسند ہی ہوا نا۔ تاکہ دنیا دیکھ لے کہ وہاں کچھ بھی نہیں۔ چوہدری دلاور کی پوزیشن کلیئر ہو جائے اور اسے کوئی خطرہ نہ رہے۔ بلکہ اس کی شرافت کی دھاک بیٹھ جائے۔"

"میں اس خیال سے سو فیصد اتفاق کرتا ہوں۔" محسن بولا۔

"میں بھی۔ کیونکہ آگے جو کچھ ہے وہ اس کی تائید کرتا ہے!" غالب نے کہا۔ "ملاحظہ ہو پیراگراف نمبر دو۔"

"سکندر کے والد کو کاروبار سے بے دخل کرنے کا ذمے دار میر شرافت علی تھا تاہم اس سے جتنی ذہنی اذیت سکندر بخت کو ملی اور جتنا مالی نقصان ہوا میں اس کی تلافی کرنے کے لیے بھی تیار ہوں اور یہ سکندر بخت پر چھوڑتا ہوں کہ وہ کتنا ہرجانہ طلب کرتا ہے۔ کسی عدالتی کارروائی کے بغیر یہ رقم میں اسے اپنے حساب سے دینے کو تیار ہوں۔ اس سلسلے میں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ میر شرافت علی کو قتل کرنے والا استاد پیڈرو تھا جس نے یہ قتل میرے ایما پر نہیں، ڈی سلوا کے کہنے پر کیا تھا۔ ڈی سلوا اب دنیا میں موجود نہیں ورنہ اس کی تصدیق کرتا لیکن استاد پیڈرو کو سکندر بخت کے حوالے کیا جا سکتا ہے اور وہ چاہے تو اس سے وزیر خان کے قتل کا انتقام خود لے سکتا ہے۔ استاد پیڈرو ہی یہ بھی بتا سکتا ہے کہ وزیر خان کو اب کہاں دفن کیا گیا ہے۔ سکندر بخت کو اس کے بعد مجھ سے کوئی گلہ نہیں رہنا چاہیے۔"

"یکلخت اتنی نیکی!" میں نے ہنس کر کہا۔ "ساری غلطیوں کا اعتراف کرنا اور تمام گناہوں کا کفارہ ادا کرنے پر رضامندی۔ کیا واقعی دلاور کی فطرت میں یہ انقلاب آ گیا ہے؟"

"یہ تو کوئی غیر معمولی بات نہیں۔" محسن نے کہا۔ "بہت سے لوگ زندگی کے کسی مرحلے میں یا کسی حادثے کے باعث اچانک گمراہی کے راستے سے ہٹ کر صراط مستقیم پر آ گئے۔ متقی اور پرہیزگار بن گئے اور گناہ کی زندگی چھوڑ دی۔ لیکن چوہدری دلاور شیطان ہے۔ شیطان ڈھونگ تو رچا سکتا ہے مگر تائب نہیں ہو سکتا۔"

"ہاں۔ یہ بھی ڈراما ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ شروع سے ڈرامائی انداز میں ہر بات کہنے کا عادی رہا ہے۔ اس مرتبہ ڈرامے کی پیش کش کا انداز مختلف ہے۔ ظاہر یہ کیا جا رہا ہے کہ اس کے اور پیڈرو کے درمیان اختلافات پیدا ہو چکے ہیں۔ کاروباری رقابت یا پیڈرو کی سرکشی کے باعث وہ پیڈرو کا دشمن ہو گیا ہے اور اب اسے میرے ہاتھوں ختم کرانا چاہتا ہے۔ دلاور کو یقین ہوگا کہ ہم اس کا یہی مطلب نکالیں گے جب کہ حقیقت اس کے برعکس ہوگی۔"

"اس کا مقصد بھی وہی ہے۔ تجھے اصل مقصد سے ہٹانا۔" محسن نے کہا۔ "اور ذاتی انتقام کے چکر میں ڈالنا۔ تو ایم آر ایس کے مشن کو بھول کر استاد پیڈرو کے پیچھے پڑ جائے اور اس سے پہلے تو وزیر خان کے موجودہ مدفن کے بارے میں معلوم کرے اور پھر اسے قتل کرنے کی سوچے۔ اس چکر میں پیڈرو تو ہاتھ آئے گا نہیں۔ تو پیڈرو کے ہاتھ پڑ جائے گا۔"

"وزیر خان کے لیے ایک مدفن کیا اور دوسرا کیا۔" میں نے ایک سرد آہ بھر کے کہا۔ "زمین کی مٹی سب ایک ہے اور ایک ہی طرح آدمی کو کھاتی ہے۔ مجھے خدا نے موقع دیا کہ ایک بار اس کی قبر کے سرہانے کھڑا ہو کے اس کی مغفرت کے لیے دعا کر سکوں۔ وہ میں نے کر لی۔ اب پھر خدا نے توفیق دی تو اس کی دوسری ابدی آرام گاہ تک بھی جا پہنچوں گا۔ اس کے ظلم کے حساب اور اس کی سزا کو میں نے خدا پر چھوڑا کہ وہ چاہے تو اسی دنیا کے نظام انصاف کو حرکت میں لائے اور اسے عبرتناک انجام سے دوچار کرے اور چاہے تو یوم حساب پر اس کا فیصلہ کرے۔ میرا مقصد اب اس سے ارفع و اعلیٰ ہے۔ وہ ایک جذباتی دور تھا جس میں ذاتی انتقام کی خواہش نے مجھے دیوانہ کر رکھا تھا۔ اب میں نے صبر کر لیا ہے اور دنیا کے تجربات نے مجھے بہت کچھ سکھا دیا ہے مثلاً یہ کہ میرے غم میرے مصائب و مسائل اور میری زندگی کے دکھ ہی سب سے زیادہ نہیں۔ ہم سب کی ایک ہی کہانی ہے۔ واقعات مختلف ہیں لیکن مظلوم ہم سب ہیں۔ آج میں سمجھتا ہوں کہ پہلے میں ایک شخص کے خلاف جنگ لڑ رہا تھا اور وہ تھا وزیر خان کا قاتل۔ اب میں اپنے وطن کی خاطر جہاد میں شریک ہوں۔ دو افراد شرط لگا کے تاش کھیلتے ہیں۔ ایک شخص قومی کرکٹ ٹیم میں کھیلتا ہے۔ دونوں کے معیار کا نہیں، مقصد اور جذبے کا فرق بھی زمین آسمان کا فرق ہے۔ ایک کا مقصد ذاتی فتح اور جیت ہے۔ دوسرے کے لیے پورے ملک کی نمائندگی کا اعزاز ہے اور وطن کی عزت کا سوال ہے۔"

"اس بیان سے ہم سب کے جذبات کی ترجمانی ہوتی ہے۔" محسن نے سر ہلا کے کہا۔ "کیوں استاد؟"

"مجھے اپنے ساتھ مت شامل کرو۔" ٹیڈی نے صاف انکار کر دیا۔ "میں تو اس خبیث استاد پیڈرو کو کبھی معاف نہ کرتا۔ چوہدری دلاور سے کہو کہ پہلے اسے ہمارے حوالے کرے پھر آگے بات کریں گے۔"

"استاد۔ یہ سب دھوکا ہے۔" میں نے کہا۔ "ایک مقصد کے تحت استاد پیڈرو کو قاتل بنا کے پیش کیا جا رہا ہے۔ ممکن ہے اصل قاتل وہ نہ ہو۔ ہم نہیں جانتے کہ دلاور کے ذہن میں کیا ہے مگر وہ کچی گولیاں نہیں کھیلا ہے کہ پیڈرو کو آسانی سے تمھارے حوالے کر دے۔ وہ پیڈرو کو اس کیچوے کی طرح استعمال کرنا چاہتا ہے جسے کھانے کے لیے آنے والی مچھلی کانٹے میں پھنس جاتی ہے۔ تم اس جال کو نہیں دیکھ رہے ہو مگر جال ہے۔ تمھیں اس کی طرف لانے کی ترغیب دی جا رہی ہے —— ورنہ تصدیق کرنا ہو تو یہ خط عبدالودود منظر ایڈووکیٹ کو بھیج دو۔ وہ دلاور سے ملے اور پوچھے کہ کیا یہ خط اسی نے لکھا ہے اور یہ بات دو گواہوں کی موجودگی میں پوچھے۔ وہ صاف انکار کر دے گا۔ یہ اس کی ہینڈ رائٹنگ تک نہیں ہوگی۔"

"اب آخری پیراگراف۔" غالب نے کہا۔

"اگر تمام معاملات کا تصفیہ ہو جاتا ہے تو اس بات کی کوشش کی جا سکتی ہے کہ سکندر بخت کے خلاف مقدمات ختم ہو جائیں۔ ابھی تک اس کے خلاف شرافت علی کے قتل کا مقدمہ سب سے سنگین تھا مگر شیدے اور عبدل کے مرنے کے بعد اس مقدمے میں جان نہیں رہی۔ بے شک اس کے خلاف پولیس نے قتل کے اور بھی مقدمات بنا رکھے ہیں مگر ان کا عینی گواہ کوئی نہیں اور صفائی کے گواہ فراہم کیے جا سکتے ہیں۔ سکندر کے خلاف

گاڑیاں چھیننے پر جو ڈکیتی کے مقدمات درج ہیں وہ کمزور ثابت ہوں گے کیونکہ سکندر ایک تعلیم یافتہ اور باحیثیت آدمی ہے اور نفسیاتی مریض بھی نہیں ہے۔ ان وارداتوں کے عینی گواہ بھی نہیں اور ہوتے تو منحرف ہو جاتے۔ تاہم قانون کے اس عمل سے گزرنے کے لیے سکندر کو خود عدالت میں حاضر ہونا پڑے گا اور خود کو قانون کے سپرد کرنا ہو گا کیونکہ اس کی ضمانت غیر حاضری کے باعث منسوخ ہو چکی ہے۔ نئے سرے سے ضمانت ہونے تک یا پھر مقدمات کا فیصلہ ہونے تک اسے جیل میں رہنا ہو گا۔ اسے جیل کے اندر بی کلاس اور اضافی مراعات ملیں گی اور اس بات کی ضمانت میں دے سکتا ہوں کہ وہ بہت جلد باعزت طور پر رہا ہو جائے گا۔"

"الّو کا پٹھا۔" میں نے کہا۔ "سمجھتا ہے میں مرعوب ہو جاؤں گا کہ دلاور مقدمات قائم کرا سکتا ہے تو ختم کرانے کی طاقت بھی رکھتا ہے۔ میں ایک بار جیل گیا تو وہاں سے میری لاش ہی باہر نکلے گی۔"

"کیا واقعی وہ ہمیں اتنا کم عقل سمجھتا ہے؟" محسن نے سوچ کر کہا۔ "اور کیا اسے معلوم نہیں کہ ہمارے پاس ایک وکیل تو ہر وقت ہے۔ دوسرا عبدالودود منظر ہے۔ اگر ہم ذاتی عقل سے محروم ہوتے تب بھی ان سے ضرور مشورہ کرتے۔" میں نے کہا۔

"اور اسے یہ معاملات طے کرنے ہی تھے تو غالب کو خط لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔" محسن بولا۔ "عبدالودود منظر سے ملتا اور سارے مقدمات ختم کرانے کی بات کر لیتا۔ یہ کوئی اور چکر ہے سکندر، جسے ہم ابھی تک سمجھ نہیں سکے۔"

"چکر کچھ بھی ہو۔" غالب بولا۔ "باعثِ تشویش یہ بات ہے کہ اسے میرے اور تمھارے تعلق کا علم ہے۔ وہ میرے ذریعے تم تک پہنچنا چاہتا تھا۔ آج میں نے اس کی کوشش ناکام بنا دی مگر کل وہ پھر کوشش کر سکتا ہے۔"

"یہ تمھارے لیے خطرناک ہو گا اور ہمارے لیے نقصان دہ۔" میں نے کہا۔ "ابھی ہم تمھارے تعلقات سے اور تمھاری پوزیشن سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ تم آزادانہ گھومتے ہو اور کوئی آسانی سے تم پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ تم ہمیں وہ معلومات فراہم کر سکتے ہو جو ہم خود حاصل نہیں کر سکتے کیونکہ تم ایک اخبار میں ہو۔ اگر اخبار چھوڑ دو گے تو تمھاری یہ پوزیشن نہیں رہے گی۔"

"اسی لیے میں نے فی الحال ایک مہینے کی چھٹی لی ہے اور چھپ کر بھاگ آیا ہوں تاکہ وہ کسی طرح بھی یہاں نہ پہنچ سکیں۔"

غالب نے کہا۔ "یہاں آتے ہوئے میں موت۔ جلالی کے گھر گیا تھا۔ وہی میک اپ مین۔"

"مجھے یاد ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ خود نازو کا میک اپ کرے گا۔" غالب نے کہا۔ "دو ہزار لے گا۔"

"کیا ضرورت تھی اس کی۔ میں بھی یہ کام کر لیتا ہوں۔" محسن

"کام کرنے اور مہارت سے کام کرنے میں فرق ہے۔" غالب بولا۔ "جہاں ہم نازو کو بھیج رہے ہیں وہاں حفاظتی اقدامات میں ایک فیصد فرق کا رسک نہیں لیا جا سکتا۔ دس ہزار میں یہ رسک نہیں رہتا۔ اس کے علاوہ وہ میرا بھی میک اپ کرے گا۔"

"تمھارا؟" میں اور محسن ایک ساتھ بولے۔ پھر میں نے کہا۔ "تم کیا بنو گے؟"

"یہ بڑا مشکل سوال ہے۔ بچپن میں بھی بہت سے لوگ مجھ سے کرتے تھے۔" غالب نے کہا۔ "پہلے میں بیشتر بچوں کی طرح کہتا تھا کہ پائلٹ۔ جہاز اڑانے کے خیال میں سب بچوں کے لیے سنسنی خیزی کا سب سامان ہے۔ میرا باپ کہتا تھا کہ بیٹا بہت بڑا ڈاکٹر بنے گا۔ ماں کی خواہش تھی کہ میں بڑا آدمی بنوں۔ بڑے آدمی کا اس کے ذہن میں کوئی تصور واضح نہیں تھا۔ غالباً وہ سب مشہور لوگوں کو بڑا آدمی سمجھتی تھی خواہ وہ مولانا محمد علی جوہر ہوں یا گرو... میں کیا بنا؟ یہ سب کے سامنے ہے۔"

"تم بے وقوف بنے دنیا کے ہاتھوں۔" ٹیڈی نے کہا۔

"اور دل کے ہاتھوں۔" محسن نے اضافہ کیا۔

"چنانچہ اب میں مونگ پھلی بیچنے والا بنوں گا۔" غالب نے اعلان کیا۔ "جو کام استاد ٹیڈی کے سپرد کیا جا رہا تھا، وہ میں کروں گا۔"

"کیوں؟ تم سمجھتے ہو میں وہ کام نہیں کر سکتا؟" استاد ٹیڈی نے بھڑک کر کہا۔ "یہ فیصلہ تم نے اکیلے کیسے کر لیا؟"

"اس لیے کہ اکیلا میں سمجھتا ہوں کہ تم اس کام کے لیے قطعی نااہل ہو بلکہ کسی بھی کام کے لیے نااہل ترین شخص ہو۔" غالب نے اشتعال انگیزی کی پوری کوشش کی۔ "تم کو ہم نے استاد کہہ کہہ کے سر چڑھا دیا ہے ورنہ تم کو ابھی سو سال میری شاگردی میں جوتیاں سیدھی کرنا سیکھنا چاہیے۔"

"اور تم... تم کیا ہو۔" ٹیڈی آپے سے باہر ہو گیا۔ "افلاطون بنے پھرتے ہو۔ مرزا غالب کا نام بدنام کرتے ہو۔ خبریں بنانے کا نہیں تم کو قبریں بنانے کا پیشہ اختیار کرنا چاہیے۔" وہ غالب کی طرف لپکا۔

غالب ایک دم ہنس پڑا اور اس نے ٹیڈی کو گلے لگا لیا۔

"یار خفا کیوں ہوتے ہو۔ ہم تو مذاق کر کے دل خوش کرتے ہیں اپنا ورنہ ہم کیا اور تمھاری... میرا مطلب ہے ہماری اوقات کیا۔ بات یہ ہے کہ ہمیں تمھاری جان بہت عزیز ہے اس لیے یہ خطرہ میں اپنے سر لیتا ہوں۔ مریں تو ہم مریں۔"

"ضرور مرو۔" ٹیڈی نے خود کو چھڑا لیا۔ "مگر مجھے بے وقوف مت بناؤ۔"

"اچھا تو آرام سے بیٹھ کے میری بات سنو۔" غالب نے کہا۔ "اصل بات یہ ہے کہ..."

"اصل بات تو میں سمجھتا ہوں برخوردار۔ تم بچے ہو ابھی ہمارے سامنے۔" محسن نے غیر موجود داڑھی پر ہاتھ پھیر کے بزرگانہ لہجے میں کہا۔ "ہم بھی جوانی میں گزرے ہیں اسی دور سے۔ صحرا کی خاک چھاننا، جوئے شیر لانا یا مونگ پھلی بیچنا سب ایک ہی سلسلہ ہے۔ تجھے وہاں بیٹھ کے جوتے بھی گانٹھنے پڑتے تو گانٹھتا۔"

"بھئی، ہم تو جا رہے ہیں۔ نیند آ رہی ہے۔" نازو اٹھ کھڑی ہوئی۔ "تم لوگ باتیں زیادہ کرتے ہو فیصلے کم کرتے ہو۔ صبح بتا دینا مجھے۔"

"تم کو جو بتانا تھا، وہ بتا دیا۔" محسن بدستور شرارت پر آمادہ رہا۔ "اب تمھیں خوابِ ناز مبارک۔ جاگتے رہیں اُلّو۔ تم بھی جاؤ زوجہ۔ ایسے اونگھنے سے کیا فائدہ۔" اس نے شہلا کو ہلا کے کہا۔

وہ دونوں احتجاجاً واک آؤٹ کر گئیں۔

"اب ٹھیک ہے۔" غالب بولا۔ "کھل کے بات ہو سکتی ہے یارو، بات یہ ہے کہ میں ایک تیر سے دو بلکہ تین چار شکار کرنا چاہتا ہوں۔ پہلی مشکل تو یہ تھی ٹیڈی کے لیے کہ وہاں گلی کے دوسرے موڑ پر ایک پرانا مونگ پھلی والا ہے جو شاید کسی تھانیدار کا سالا ہے کہ کسی کو گلی میں مونگ پھلی نہیں بیچنے دیتا۔ اس کی اجارہ داری کئی سال سے قائم ہے۔ میں نے اوپر بات کی اور کہا کہ ایس ایس پی رضوی صاحب کا ایک آدمی دوسری طرف مونگ پھلی کی ریڑھی لگائے گا۔ اس سے کوئی چھیڑ چھاڑ نہ کرے اور بھتا نہ مانگے۔ اب رضوی صاحب سے بھلا کون تصدیق کر سکتا ہے کہ آدمی ان کا ہے یا نہیں۔ دوسری بات یہ کہ میں نے دفتر سے ایک دوست کو فون کیا تھا۔ دوست کیا، ایک ایسا شخص ہے جسے میں نے جیل جانے سے بچا لیا تھا۔ ایک ڈی ایس پی اس کا دشمن ہو گیا تھا۔ اس نے ڈی ایس پی کو چھ مہینے کا بل بھیج دیا تھا۔ ان کے گھر سے کبھی ٹی وی، کبھی ٹیپ ریکارڈر اور کبھی فریج آ جاتا تھا مرمت کے لیے۔ اس کی اب بھی ہال روڈ پر دکان ہے۔ اس سے میں نے کہا تھا کہ جاسوسی کے لیے کچھ آلات چاہئیں۔ واکی ٹاکی۔ چھوٹے سے چھوٹے مائکروفون۔ پاکٹ ریسیور... اس نے کہا سب مل جائے گا۔ یہاں نہ ملا تو کراچی سے لازماً ملے گا۔ وہاں اس کے بھائی کی وکٹوریہ روڈ پر دکان ہے۔"

"جب میرا پلان سنتے ہوئے تم سوچ میں گم تھے تو میں سمجھ گیا تھا کہ تمھارا ذہن مصروفِ عمل ہو چکا ہے۔" میں نے خوش ہو کر کہا۔ "دو تین گھنٹے میں کافی کام کر لیا تم نے۔"

"اخبار والے ہیں بھیا۔ بال کی کھال نکال سکتے ہیں اور کھال کے جوتے بنا سکتے ہیں اور جوتے چٹخاتے عمر گزار دیتے ہیں۔" غالب نے کہا۔ "ایک ہاکر نے مجھے مونگ پھلی والے کے بارے میں بتایا۔ شک تو مجھے تھا کہ گڑبڑ ہو گی۔ پولیس کو بھتا دیے بغیر اور غنڈہ ٹیکس دیے بغیر کوئی ریڑھی تک نہیں لگا سکتا۔ اسٹیشن پر قلی بھی ٹھیکیدار کی مرضی کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس کام میں ہماری ضروریات کیا ہوں گی چنانچہ میں نے فون پر ہی ہال روڈ والے دوست سے بات کی۔ واپسی میں موسلے جی کو پکڑا۔ اس بار وہ اکڑ گیا تھا مگر میں نے نقد سودا کیا۔ میں نے ریڑھی پر صبح کے وقت اخبار فروشی کا بندوبست بھی کیا ہے۔ رات بارہ بجے میں آ جاؤں گا۔ صبح چھ بجے سے ٹیڈی وہاں اخبار بیچے گا، شام چھ بجے تک۔ اس میں کسی کو برا نہیں ماننا چاہیے۔ اگر شام چھ سے رات کے بارہ بجے تک ہم بھی اس کے قریب رہیں۔ وہ کوئی بات ہم سے کرے اور ہم اس سے کہہ لیں۔ یہاں تو ایک چنڈال چوکڑی ہے جو بات کا بتنگڑ بناتی ہے۔ وہ باتیں صیغۂ راز میں رہیں گی اور اس پر کچھ تو اثر ہو گا۔ یہ دیکھ کر کہ اس کے عشق نے ایم اے پاس کامیاب صحافی کو مونگ پھلی بیچنے پر مجبور کر دیا۔"

"میں تو سمجھ گیا تھا بیٹے۔" محسن نے دانت نکال کے کہا۔ "کیا ماڈرن الیکٹرونک عشق ہے جس میں وائرلیس پر حالِ دلِ زار کہا جائے۔"

"کل نازو کامیاب رہی تو امید ہے کہ کامیابی کے نئے راستے کھل جائیں گے مگر ایک ہفتہ ہمیں بھی ملے گا۔" میں نے کہا۔ "اس ایک ہفتے میں اور کچھ کام بھی ہو جائیں تو اچھا ہے۔ ایک تو یہ کہ ہم اپنا سب نقد سرمایہ ایک جگہ کر لیں۔ چن ماہی کے گھر سے انڈین کرنسی لے آئیں۔ استاد ٹیڈی کا سونا بیچ دیں۔ دس ہزار تو صبح موسلے جی لے گا۔ الیکٹرونک مواصلاتی رابطے کا ساز و سامان بھی سستا نہیں ملے گا۔ شاید پھر کوئی گاڑی بھی لینی پڑے، اس کے علاوہ اسلحے کی پوزیشن کا صحیح اندازہ کرنا ہے۔"

رات کے ایک بجے ہم بھی سو گئے۔ اس وقت تک ہم نے اتفاقِ رائے سے چوہدری دلاور کے خط کو نظرانداز کر دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ہم دیکھنا چاہتے تھے کہ اس چال کی ناکامی کے بعد وہ کیا قدم اٹھاتا ہے۔ غالب نے غائب ہو کے بہت عقلمندی کی تھی ورنہ ہمارا یہ ٹھکانا بھی شکاری تاڑ جاتے اور اس مرتبہ وہ

عجلت میں کوئی کام نہ کرتے۔ ہمیں اس وقت پتا چلتا جب ایک دھماکا "ایم آر ایس" کے وجود کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیتا۔

صبح میں خلافِ معمول دیر تک سوتا رہ گیا۔ ٹیڈی تو سونے کے معاملے میں تھا ہی بدنام۔ اُٹھایا نہ جاتا تو دوپہر تک نہ اُٹھتا۔ اکیلا محسن بستر پر آلتی پالتی مارے بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ گھڑی میں صبح کے آٹھ بجے تھے۔

"عیش کرو بھائی۔ جب تک مقدر میں ہے" محسن سرد آہ بھر کے بولا "ہم بھی کبھی آٹھ بجے سو کر اُٹھتے تھے۔"

"اب کون روکتا ہے تجھے۔ نام بتا مجھے اس کا؟" میں نے کہا

"نام اس کا کچھ بھی ہو۔ شہلا، رابعہ یا نازو" محسن بولا "لیکن کہلاتی وہ بیوی ہے۔ عجیب مشکل ہے کہ شادی نہ کرو تو رونا اور شادی کر لو تو مزید رونا۔"

"اس وقت رونے کے اسباب پر روشنی ڈالیے" میں نے کہا اور سگریٹ جلالی۔ محسن نے چوری چوری باہر دیکھا اور ایک سگریٹ مانگی۔

"دیکھ نا یار۔ کل سگریٹ کی پوری ڈبیا چرمر کر کے باہر پھینک دی کہتی ہے خبردار جو آئندہ منہ سے دھواں نکلا" محسن نے کش لگاتے ہوئے کہا "میں نے کہا کہ نیک بخت دھواں کہیں سے تو نکلے گا۔ ناک منہ سے نہ نکلا تو دل سے اُٹھے گا۔ رات کو ہم سوئے تھے تہجد کے وقت۔ صبح فجر کے لیے اٹھا دیا کہ نماز پڑھو۔ نماز تو پڑھ لی میں نے مگر اس کے بعد بیڈ ٹی مانگی تو جواب ملا کہ بُری عادت ہے۔ بس اب ناشتا کرو گے تو چائے ملے گی۔ اگر خالی پیٹ کچھ پینا ہے تو دودھ پیو یا جوس پی لو۔ ہم صبح دم بلیک کافی پینے والے دودھ پئیں گے۔ ناشتا ملے گا سب کے ساتھ۔ روؤں نہیں تو کیا کروں۔"

"غالب اُٹھ گیا ہو تو بس منگوا لے ناشتا۔ اور دیکھ اتنا زن مرید مت بن" میں نے کہا "بیوی کو ذرا دبا کے رکھ۔ ناشتے پر ڈانٹنا بلاوجہ۔ چائے ٹھنڈی کیوں ہے۔ انڈا ہاف فرائی کیوں ہے۔ شوہروں کے پاس رُعب جھاڑنے کے بہت بہانے ہوتے ہیں۔ اس نے سگریٹ پینے کو منع کیا ہے۔ تو بیڑی شروع کر دے۔ بیڑی سے منع کرے تو حقہ۔ اپنے ساتھ لے کر پھر حقے کو۔ حقے پر پابندی ہو تو دھمکی دے کہ اب آخر کیا پیوں۔ شراب، چرس یا گانجا ـــــ ٹھیک ہو جائے گی۔"

"اچھی صلاح دے رہے ہیں سکندر بھائی" شہلا نے دروازے میں نمودار ہو کے کہا۔ اس نے محسن کے ہاتھ سے سگریٹ چھین لی اور کھڑکی سے باہر پھینک دی۔

"تم فکر مت کرو" محسن نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔ "یہ بھی تو کرے گا شادی۔ میں بھی اسے الٹی صلاح دوں گا۔ خدا کے لیے اب تو ناشتا لا دو۔ مردے تک اُٹھ گئے ہیں۔" اس نے ٹیڈی کی طرف دیکھا جو اُٹھ بیٹھا تھا۔

"غالب بھائی بھی آجائیں" شہلا مسکرائی۔

"اس کا کچھ بھروسا نہیں۔ دوپہر تک بھی نہ آئے" محسن بولا "مجھ سے کہہ گیا تھا۔"

غالب دس بجے آیا تو اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ میک اپ مین موسلے بھائی بھی تھا۔ وہ ٹیکسی میں سو رہا تھا اور غالب نے دروازہ کھلوانے کے بعد اسے بیدار کیا تو وہ سخت حیران ہوا۔

"ہم سو گیا تھا؟" وہ سر کھجا کے مشکوک لہجے میں بولا۔

"کیا رات بھر جاگتے رہے تھے؟" غالب نے کہا اور لے اندر لے آیا۔

"نیند ایسے نئیں آتا۔ گولی کھاتا تو سوتا" موسلے بھائی نے باری باری ہم سب کی صورتوں کا جائزہ لیا۔ نازو اور شہلا کے چہرے اس نے پہلی بار دیکھے تھے مگر مجھے دیکھ کر وہ پہچان گیا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کے اسے مصافحے پر مجبور کیا۔

"رات کو تم نے بھول سے دو گولیاں کھالی ہوں گی" غالب نے کہا۔

"ہم دو ہی کھاتا ہے بابا۔۔ مگر یہ ہو سکتا ہے کہ ہم نے پھر دو گولی کھالیا ہو۔ بھول ہو جاتا ہے" وہ بولا۔ اس کی آواز میں غنودگی تھی اور آنکھیں بوجھل تھیں۔ وہ ہمیں مجرموں کے ایک ناپسندیدہ گروہ کی حیثیت سے دیکھ رہا تھا جو صورت بدل بدل کے حقیقی زندگی میں ڈرامے کرتے رہتے ہیں۔ بلیک کافی کی ایک پیالی پی کر وہ مستعد ہو گیا۔

"اب تم اپنا کام شروع کر دو" غالب نے کہا "کام میں تم کو بتا چکا ہوں۔ کام اچھا ہو گا تو ہزار زیادہ دوں گا۔ فرق ہوا تو ایک پیسہ نہیں دوں گا۔ بلکہ جو تمھاری جیب میں ہے وہ بھی لے لوں گا۔"

"پیسہ پہلے۔ کام بعد میں" موسلے بھائی نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔

میں نے اسے دس ہزار نقد دیے جو اس نے حفاظت کے ساتھ اندر کی جیب میں رکھ لیے۔ محسن نے وہ سوٹ کیس اس کے سامنے رکھ دیا جو وہ گزشتہ رات لے کر آیا تھا۔ موسلے بھائی نے اسے کھول کر دیکھا اور تمام اسباب کا بغور جائزہ لینے کے بعد مطمئن ہو کے سر ہلایا مگر جب محسن نے نازو کو ہاتھ پکڑ کے آگے کیا تو وہ حیران ہوا۔

"اس لڑکی کو چڑیل بنا دو" محسن نے کہا۔

"اللہ ہم کو معافی دے۔ ہم اچھا صورت کو بگاڑتا! ٹی وی پر ہم صورت کو خوبصورت بناتا مگر تم ہم سے یہ گناہ کراتا۔"

"زیادہ باتیں مت کرو" غالب نے خفگی سے کہا "گناہ ثواب کے فلسفے کو ہم زیادہ سمجھتے ہیں۔ گناہ تم نے جیب میں رکھ لیا ہے۔ ثواب تم کو اپنے کام سے ملے گا۔ کتنا وقت لگے گا اس کام میں؟"

"تین گھنٹا" موسلے بھائی نے قطعی لہجے میں کہا۔

"اچھا تم اپنا کام کرو" غالب نے کہا "میں آتا ہوں دو گھنٹے میں۔"

محسن کو وہیں چھوڑ کر غالب نے مجھے اور ٹیڈی کو ساتھ لیا اور ہم اسی ٹیکسی میں روانہ ہو گئے۔ ہمارا نقد سرمایہ اب تیس ہزار سے بھی کم رہ گیا تھا۔ اس میں سے پانچ ہزار دے کر ہم نے ٹیڈی کو راستے میں اتار دیا۔ اسے ایک ریڑھی خرید نا تھی اور مونگ پھلی بیچنے کا سارا ہی سامان لینا تھا۔ پھر اس سامان کو اپنے اڈے تک پہنچانا تھا اور اس کام کے لیے ٹیڈی کے پاس پورا دن تھا۔ غالب نے اسے بتا دیا تھا کہ شام تک وہ پہنچ جائے گا۔ ٹیکسی کو ہم نے بیڈن روڈ کے پاس چھوڑ دیا اور بیڈن روڈ سے پیدل گزرے۔ راستے میں وہ آفس بھی آیا جس کے باہر "میرو ز پرائیڈ کمپنی" کا سائن بورڈ اب تک اسی طرح موجود تھا لیکن اوپر جانے والے زینے کی گرل میں تالا پڑا ہوا تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ آفس میں اب کوئی نہیں۔ شاید وہ سب رُخصت کر دیے گئے تھے جو پہلے کاروبار کے دفتری امور کو سنبھالتے تھے۔ زرعی مشینری کے پُرزوں کے آرڈر لیتے تھے۔ سپلائی کرتے تھے اور امپورٹ ایکسپورٹ کی کاغذی کارروائی کا حساب رکھتے تھے۔ اس فیکٹری میں انسانوں کا پیٹ بھرنے والی مشینوں کو رواں رکھنے والے پُرزوں کے بجائے سینوں میں گولیاں اتارنے والا اسلحہ بننے لگا اور زندگی کے بجائے موت کا سامنا ہونے لگا تو کسی دفتر کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ آرڈر دینے والے اور لینے والے براہِ راست بات کرتے تھے اور گفتگو تک کا نہ ریکارڈ چھوڑتے تھے اور نہ گواہ۔ ان کا لین دین سب ناجائز اور غیر قانونی تھا۔ اس میں حساب کتاب بھی ان کا اپنا تھا۔ اس کے داؤ پیچ، کیش بک اور لیجر سب وہ خود تھے۔ اُنھیں امپورٹ ایکسپورٹ کے لائسنس کی ضرورت نہیں تھی کہ سرکاری اداروں سے خط و کتابت کریں اور سیلز ٹیکس یا انکم ٹیکس ادا کرنے کا سوال ہی نہ تھا چنانچہ فائلوں کا اور عملے کا وجود بے مصرف ہو گیا تھا اور حسابِ دوستاں دردل کی طرح اب حسابِ دشمناں دردل کے اصولوں پر عمل ہو رہا تھا۔ مجھے وہ وقت یاد آیا جب پہلی بار میں نے اس دفتر میں قدم رکھا تھا اور میری ملاقات ڈی سلوا سے ہوئی تھی۔ اس وقت سے اب تک گردشِ حالات نے کیا رنگ دکھائے تھے۔ ڈی سلوا رزقِ خاک ہو چکا تھا اور میں اس ادارے کا مالک ہونے کے باوجود یہاں سے گزرتے ہوئے بھی خوفزدہ تھا کہ پہچان نہ لیا جاؤں ــــ زریر خان کے پرانے وفادار اور نمک خوار جو اس کے لیے ایک خاندان کی طرح تھے بکھر گئے تھے۔ غالب سمجھتا تھا کہ اس وقت میرے جذبات و احساسات کیا ہوں گے۔ وہ خود بھی وقت کی انھی تبدیلیوں کے بارے میں سوچ رہا ہو گا جس کا شکار سب ہوئے۔ ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے۔ وقت گھات میں بیٹھا ہوا بے رحم اور اندھا شکاری ہے جو بے خبری میں وار کرتا ہے اور سارے خوابوں کے طلسم توڑ دیتا ہے۔ اُمیدوں کے نقش مٹا دیتا ہے اور منصوبوں کو خاک میں ملا دیتا ہے اور شہنشاہ کو گدا اور غلام کو سلطنت کا مالک بنا دیتا ہے۔

ہم اپنے خیالات میں محو دائیں طرف مڑ گئے پھر صوبہ خان ٹیلرز کی دکان کے سامنے سے گھوم کر بیڈن روڈ پر داخل ہوئے۔ شروع کے حصے میں وہ دکان بھی نہیں تھی جہاں سے ایک بار میں نے کلاک میکنیزم والے ٹرانسسٹر ریڈیو لیے تھے جو درحقیقت ٹائم بم تھے۔ معلوم نہیں وہ شخص کیا ہوا؟ اپنے ہی کسی ٹائم بم کے دھوکا دینے سے مارا گیا۔ دھوکا بم نہیں دیتا، ٹائم دیتا ہے۔ وقت پر گرفت کا دعوٰی غلط ہو جاتا ہے اور تیس منٹ کا وقت انتیس منٹ میں گزر جاتا ہے۔ گھڑی کی سوئیوں کو متحرک رکھنے والی گراریاں تیز چلنے لگتی ہیں تو تیس منٹ کا سفر پچیس منٹ میں پورا کر لیتی ہیں اور پانچ منٹ کے وقت کو خطرے کی حدود سے دور پہنچنے کے لیے بہت کافی سمجھنے والے ایک دنیا سے دوسری دنیا میں پہنچ جاتے ہیں۔ بعض اوقات تیس منٹ پورے ہوتے ہی فرشتۂ اجل وقت کو روک لیتا ہے کیونکہ اس کے حساب سے وقت پورا نہیں ہوتا اور جب ٹائم بم لگانے والوں کو یقین آجاتا ہے کہ اس کے نظام میں کوئی خرابی واقع ہو گئی ہے تو وہ اسے چیک کرنے آتے ہیں اور یہی ان کے لیے زندگی کا آخری لمحہ ہوتا ہے جب ہاتھ لگتے ہی بم پھٹ جاتا ہے کیونکہ فرشتۂ اجل کے ہاتھوں میں رُکا ہوا وقت آزاد ہو جاتا ہے۔

غالب کے ساتھ میں ایک بہت بڑی دکان میں داخل ہوا تو میرے خیالات کی رَو ٹوٹ گئی۔ وہ دکان ہر قسم کے بجلی کے سامان سے بھری ہوئی اور بہت سجی ہوئی تھی۔ نئے سیلز مین ہماری طرف بڑھے لیکن غالب ہاتھ ہلا کے سیدھا گزر گیا۔ آخری حصے میں ایک شیشے کا دروازہ تھا جس کے وسط میں سرخ رنگ سے "پرائیویٹ" لکھا ہوا تھا۔ اندر مختصر سے کیبن نما کمرے میں ایک میز کے پیچھے گھومنے والی کرسی پر ایک نوجوان آدمی بیٹھا تھا۔ اس نے غالب کا پُرتپاک خیر مقدم کیا اور ہم اس کے مقابل کی دیوار کے ساتھ لگے

ہوئے صوفے پر بیٹھ گئے۔ خاطر تواضع کے ساتھ باتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ باغی ذہن رکھنے والا نوجوان' غالب کی مدد کے باعث ایک ڈی ایس پی کے عتاب سے بچ گیا تھا مگر اس کی روش تبدیل نہیں ہوئی تھی۔ اس نے کہا کہ پولیس ہی نہیں دوسرے حرام کھانے والوں سے تو میں دگنی اجرت وصول کرتا ہوں۔ مفت کام کرنا ہو گا یا رعایت دینا ہو گی تو کسی غریب یا مستحق آدمی کو دوں گا یا کسی دوست کا کام ہو گا تو کروں گا۔ پھر ان بدمعاشوں سے کمی پوری کروں گا۔ غالب نے اسے یقین دلایا کہ اس ملک میں رہ کر بھی اس کے خیالات نہ بدلے تو انشاء اللہ ایک دن اس کا کاروبار بھی سے چوپٹ ہو جائے گا اور وہ خود بھی اپنی اصولی اور نظریاتی جنگ کے باعث عزت نہیں پائے گا بلکہ بستہ 'ب' کے مجرمان میں شامل کیا جائے گا۔ غالب کہاں کہاں اس کی مدد کرے گا۔ اس نقار خانے میں جہاں بدمعاشی کا نقارہ بج رہا ہے' کون سنتا ہے صدائے درویش۔

پھر غالب نے مطلب کی بات کی کیونکہ اس نوجوان کے خیالات کو بدلنا مشکل تھا۔ بالآخر وقت اسے صحیح سبق پڑھا دے گا۔ وہ سمجھ جائے گا کہ غلط کیا ہے اور صحیح کیا اور پھر دنیا میں کامیاب رہے گا۔ اس نے ہمارے مطالبات پر غور کیا اور ضرورت کی نوعیت کو سمجھنے کے بعد کچھ پریشان نظر آنے لگا۔

"بات یہ ہے غالب صاحب کہ ملنے کو دنیا کے بازار میں سب کچھ ملتا ہے مگر آپ آ گئے ہیں میری دکان پر۔" وہ بولا "میں کوئی ناجائز چیز نہ رکھتا ہوں نہ بیچتا ہوں۔ لیکن میں آپ کو "سوری" کہہ کے بھی رخصت نہیں کر سکتا کیونکہ آپ ایک ضرورت لے کر میرے پاس آئے ہیں۔"

"مسئلہ کیا ہے۔ یہ کام ہو سکتا ہے یا نہیں ہو سکتا؟" غالب بولا۔

"میں نے انکار نہیں کیا۔" وہ بولا "مجھے یہ سب سامان منگوا کے دینا پڑے گا۔ میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ یہاں کون کیا بیچ رہا ہے اور کس دام بیچ رہا ہے۔"

"چلو تم ان کا پتا بتا دو۔" غالب نے کہا۔

"وہ آپ کو اتنی آسانی سے یہ چیزیں نہیں دیں گے۔" وہ بولا۔ "جتنی آسانی سے پرچون کی دکان سے دال مل جاتی ہے۔ کسی کو کیا معلوم کہ آپ کون ہیں۔ پولیس یا سی آئی ڈی کے آدمی یا ملٹری انٹیلی جنس والے۔ یہ چیزیں بہت خطرناک مقاصد میں استعمال ہوتی ہیں۔ کسی کا راز لینے کے لیے۔ اب راز کسی فرد یا خاندان کا ہو تو اسے بلیک میل کیا جا سکتا ہے اور حکومت کا ہو تو اس سے وطن فروش قسم کے لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں۔"

"ایک اور استعمال کے امکانات پر غور کرو۔" غالب نے کہا۔ "کہ اس سے وطن دشمن عناصر کی سرگرمیوں کا پتا چلایا جا سکتا ہے اور ان کی نگرانی کی جا سکتی ہے۔ انھیں ارتکاب جرم کے وقت یا معقول ثبوت اور شہادت جمع کر لینے کے بعد گرفتار کیا جا سکتا ہے۔"

"آئی سی۔" اس نے مجھے پہلی بار غور سے دیکھا کیونکہ اب تک میں خاموش ہی رہا تھا اور عملاً اس موضوع پر صرف غالب نے بات کی تھی۔ "آپ لوگوں کا مقصد یہی ہو گا۔ میں یہ فرض نہیں کر سکتا کہ آپ لوگ کسی طرح بھی غیر اخلاقی یا غیر قانونی کام کر سکتے ہیں۔"

"کیوں فرض نہیں کر سکتے۔ صرف ہماری شریفانہ صورت دیکھ کر؟" غالب بولا۔

"نہیں۔ ہر شخص کی ایک چھٹی حس ایسے ہی موقع پر اس کی صحیح رہنمائی کرتی ہے اور اس پر بھروسا کیا جا سکتا ہے۔" وہ بولا۔

"وہ تمھاری مرضی۔ تم حواس خمسہ پر بھروسا کرو یا چھٹی حس پر۔ کام ہونا چاہیے۔ کاروبار میں لگی لپٹی نہیں رکھنی چاہیے۔" غالب نے کہا "صاف بات کرو۔"

"جی۔ اور صاف بات یہ ہے کہ میں آپ کو سب کچھ لا دیتا ہوں۔ دوسروں سے لے کر آؤں گا۔" وہ بولا "آپ یہیں تشریف رکھیے۔ اگر آپ گئے تو وہ بہت چکر دیں گے۔ کبھی ایک جگہ بلائیں گے کبھی دوسری جگہ۔ آج کل پرسوں پر ٹالیں گے اور اس عرصے میں آپ کے بے ضرر ہونے کی تصدیق بھی کر لیں گے اور آپ کی فرمائش کا اندازہ بھی۔ قیمت وہ ضرورت کی وصول کرتے ہیں' چیز کی نہیں۔ میں ان کے لیے بے ضرر ہوں۔ ابھی مال لے آؤں گا اور زیادہ پیسے بھی نہیں دوں گا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہر چیز وہ مجھے قیمت خرید پر یا معمولی منافع پر دے دیں گے۔ جی نہیں۔ اسمگلر اتنے خطرات مول لے کر جو چیز لاتا ہے وہ معمولی منافع کمانے کے لیے نہیں لاتا۔"

"قیمت کوئی مسئلہ نہیں۔" غالب نے کہا "تم جاؤ۔ ہم یہاں تشریف رکھتے ہیں۔" اس نے مجھ سے لے کر اس کے سامنے بیس ہزار رکھ دیے۔

"اب ایسا بھی نہیں۔" وہ بیس ہزار اٹھاتے ہوئے بولا۔ "یہ بھی میں احتیاطاً زیادہ لے جا رہا ہوں۔ کچھ لوگ زیادہ خبیث ہوتے ہیں۔ وہ آپس میں بھی لحاظ کے قائل نہیں ہوتے۔ بعض اوقات پوری مارکیٹ میں ایک ہی پیس ہو تو وہ چڑھ جاتا ہے آسمان پر۔ جو قیمت مانگے دینا پڑتی ہے۔"

ہم نے اسے ایک سیلز مین کے ساتھ باہر جاتے دیکھا لیکن اندر شیشے کے دروازے کے پیچھے بیٹھ کر ان کے درمیان ہونے والی گفتگو نہ سن سکے۔

"کیا ہم یہاں بیٹھ کے ہر بات کر سکتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"یہ سوال ایسا ہی ہے جیسے مذبح خانے میں بھینس کسی دوسری بھینس سے پوچھے کہ یہاں چھری کا کوئی ڈر تو نہیں۔" غالب بولا۔

"تمھارا مطلب ہے' یہاں دیواروں کے واقعی کان ہوں گے؟" میں نے کہا "جو سب سن کر ریکارڈ کر لیں گے اور تمھارا دوست بعد میں سب جان لے گا؟"

"کیا یہ ناممکن ہے؟" غالب بولا "وہ آدمی تو ایسا نہیں ہے۔ اسے کوئی ضرورت بھی نہیں ہے اتنا اہتمام کرنے کی۔ تم کہو کیا کہنا ہے۔ وہ کم سے کم ہماری باتیں سن کے ہمیں بلیک میل نہیں کرے گا اور افشائے راز بھی نہیں کرے گا۔"

"تمھارا کیا خیال ہے' وہ خط لکھنے والا احمق تھا؟" میں نے کہا۔

"اس کی جگہ تم ہوتے۔" غالب سوچ کر بولا "تو یہ خط لکھنے کے بعد کیا امید رکھتے۔ فرض کر لو کہ تمھاری جگہ وہ ہوتا۔"

"میں کوئی امید نہ رکھتا۔" میں نے کہا۔

"میں رات کو اسی مسئلے پر غور فرماتا رہا۔" غالب نے کہا۔ "وہ پورا خط ایک جال ہے۔ مگر اس میں ایک سچائی چھپی ہوئی ہے۔ اس خط کو پڑھنے کے بعد تم نے کچھ نتائج اخذ کیے تھے۔ لکھنے والے کو یقین تھا کہ تمھارا ذہن اس کے علاوہ کچھ نہیں سوچے گا اور یہی نتائج اخذ کرے گا۔ تم نے بہت کچھ فرض کر لیا ہے' مثلاً یہ کہ فیکٹری تمھارے حوالے کرنے کی وجہ کیا ہے۔ تمھارے خیال میں وجہ یہ ہے کہ دلاور نے اسلحہ سازی کہیں اور شروع کر دی ہے۔ دلاور جانتا تھا کہ اس خط کو پڑھنے کے بعد تم یہی سمجھو گے اور پھر تصدیق کرو گے۔ اگر تصدیق کے لیے خود جاؤ گے تو وہ تمھارے استقبال کے لیے موجود ہو گا اور تمھیں اپنے اندازوں کے غلط ہونے کی قیمت ادا کرنا ہو گی۔ سب کچھ وہاں بالکل ویسا ہی ہو گا جیسا پہلے تھا۔"

"کیا تمھارا خیال غلط نہیں ہو سکتا؟" میں نے غور کرتے ہوئے کہا۔

"ہر بات' ہر خیال اور نظریہ دونوں پہلو رکھتا ہے۔" غالب بولا "وہ تجربات کی کسوٹی پر اور مشاہدے کے بعد درست ثابت ہو جائے گا یا غلط ہو گا' اس حقیقت کو میں نے کبھی فراموش نہیں کیا تھا۔ اگر ہم یہ مان لیتے ہیں کہ اسلحہ سازی اب کسی دوسرے محفوظ اور خفیہ مقام پر ہو رہی ہے تو کیا ہو گا؟ ہم ایم ڈبلیو ڈی کمپلیکس کی طرف سے بے نیاز ہو جائیں گے۔ اس بات کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ تم یا تمھارا کوئی قانونی اتھارٹی اس کا قبضہ لینے جائے۔ جاتا تو جھک مار کے لوٹ آتا۔ دلاور کہتا کہ میاں ہوش کے ناخن لو۔ مقدمہ عدالت میں ہے۔ میں ایسا خط لکھنے کی حماقت اور جسارت کر سکتا ہوں؟ چنانچہ وہی ہوتا کہ ہم اپنے خیال پر قائم رہتے اور ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس ہماری نظر کرم سے محفوظ ہو جاتا۔ ہم بے وقوف اس نئے مقام کی جستجو میں لگ جاتے جہاں دلاور نے اسلحہ سازی کی مشینری منتقل کی ہو گی اور اس سراب کے پیچھے اپنا وقت بھی ضائع کرتے اور توانائی بھی۔"

"تم نے مجھے الجھا دیا ہے مرزا غالب کے بھتیجے۔" میں نے کہا۔ "کیونکہ تمھارے دونوں خیال منطقی اور قائل کرنے والے ہیں۔ سچ یہ بھی ہو سکتا ہے اور وہ بھی مگر سچ دو نہیں ہو سکتے۔"

"سچ ایک ہے اور اس کو دریافت کرنا پڑے گا۔" غالب نے کہا۔ "دلاور کے خط نے ہمارے سامنے ایک چیلنج رکھ دیا ہے۔"

"اگر یہ بات ہے تو ہم اس چیلنج کو قبول کرتے ہیں۔" میں نے کہا "ہم خود جا کے دیکھ لیں گے کہ ایم ڈبلیو ڈی کمپلیکس میں اب کیا ہو رہا ہے۔"

اسی وقت دکان کا مالک لوٹ آیا۔ اس کے ہاتھ میں گتے کا ایک ڈبا تھا۔ "کچھ تو مل گیا۔" وہ اندر آ کے بولا۔ "کچھ میرا آدمی لے کر آئے گا۔" اس نے ڈبا میز پر رکھا اور فون گھمانے لگا۔ اس نے چھ جگہ فون کیا اور پھر آرام سے بیٹھ کر ڈبا کھولنے لگا۔ پہلی چیز جو اس نے برآمد کی وہ دیکھنے میں مختصر ترین آلۂ سماعت کی طرح تھی۔ ایک دھاگے جیسے باریک تار کے ساتھ ایک سرے پر ننھا سا سفید موتی لگا ہوا تھا۔ دوسری طرف دو انچ چوڑا اور تین انچ لمبا سفید رنگ کا پلاسٹک پیس تھا جس کی موٹائی چار یا پانچ ملی میٹر سے زیادہ نہیں تھی۔

"یہ وہ چیز ہے جس سے بہرے اور اونچا سننے والے عام لوگوں کی طرح سن سکتے ہیں۔" وہ بولا اور اس نے ہر طرف سے بند ڈبیا پر ایک ننھے سے ابھار کو دبا دیا۔ ابھار کے نیچے سرخ روشنی جھلملانے لگی "اب یہ آن ہو گیا ہے۔ جس کا دل چاہے اسے ٹیسٹ کر لے۔ یہ آلۂ سماعت کے سوا کچھ نہیں ہے۔"

غالب نے کان میں انگلی ڈال کے ہلائی۔ "غالباً یہ چیز اس فہرست میں شامل نہیں تھی۔ اس کی ضرورت تو شاید اسی سال کی عمر میں پڑے گی۔"

وہ مسکرایا۔ "یہ آپ کی مطلوبہ چیز ہے مگر بہت محفوظ۔ اب آپ غور سے دیکھیے۔ میں اس ننھے سے بٹن کو پھر دباتا ہوں۔ لائٹ آف ہو گئی؟ مگر اب پھر غور فرمائیے۔ میں اسی بٹن کو پھر دباتا ہوں۔ لائٹ آ گئی۔ یہ اب بھی آلۂ سماعت ہے مگر یہ دیکھیے میں نے اسی بٹن کو ایک بار پھر دبایا۔ لائٹ آف نہیں ہوئی بلکہ کچھ تیز ہو گئی ہے۔ اب یہ ایک واکی ٹاکی ہے۔ کان میں لگا ہوا مائک بہت زیادہ حساس اور پاورفل ہے اور تین فٹ کے دائرے

کی سرگوشی بھی کیچ کر لیتا ہے۔ یہ باریک تار اس کا انٹینا ہے اور یہ نیچے کا دوسرا حصہ ٹرانسمیٹر' جسے جیب میں ڈالا جاسکتا ہے یہاں تک کہ بالوں میں چھپایا جاسکتا ہے۔ بشرطیکہ بال لمبے اور بڑے ہوں۔ بالوں میں سے نکل کے یہ دھاگے جیسا تار کان تک پہنچ جائے گا۔ اس کی آواز سو میٹر دور دوسرے یونٹ میں سنی جاسکتی ہے دونوں کی فریکوئنسی ایک ہے لیکن "پری سیٹ" ہے یعنی آپ چاہیں تو اسے بدل نہیں سکتے۔" اس نے ڈبے میں سے دوسرا ویسا ہی آلۂ سماعت نکال کے ہمیں دکھایا اور اپنی نگاہ شیشے کے دروازے کے باہر رکھی

"یہ خاصی کارآمد چیز ہے۔" غالب نے کہا۔

"اب آپ اس کا طریقۂ استعمال سمجھ لیں۔" وہ بولا۔ "اس بٹن کو پھر دبانے سے یہ نظام آف ہوگیا۔ لائٹ بجھ گئی ہے۔ اسے دوبارہ آن کرنے کے لیے یہی عمل دُہرانا پڑے گا۔ پہلی بار میں آلۂ سماعت آن۔ دوسری بار میں آف۔ تیسری بار میں پھر آلۂ سماعت آن۔ چوتھی بار دبانے سے لائٹ زیادہ تیز ہوگی مگر لائٹ ہر جگہ نہیں دیکھی جاسکتی۔ فرض کریں' یہ آپ نے بالوں میں چھپا رکھا ہے۔ آپ اپنا سر کھجانے کے بہانے اسے آن یا آف کرسکتے ہیں۔ واکی ٹاکی بنانے کے لیے اس بٹن کو چار مرتبہ دبایئے۔ پانچویں دفعہ میں آف۔ خدانخواستہ یہ کسی کے علم میں آجائے تو اسے خاک بھی پتا نہیں چلے گا۔ ایک بار میں یہ آن ہوگا تو صرف آلۂ سماعت ہوگا۔ وہ اسے آف کرکے دیکھ لے۔ دوبارہ آن کرے گا تب بھی یہ آلۂ سماعت ہی ہوگا۔ شک کی بات ہی نہیں۔ چوتھی بار میں یہ سو گز دور تک پیغام رسانی کا ذریعہ ہے۔ جب یہ چار مرتبہ دبایا جائے گا تو سو گز کے دائرے میں دوسرا یونٹ کان میں سگنل دے گا۔ دوسرا شخص اپنے یونٹ کے بٹن کو چار مرتبہ دبا کے بات کرسکے گا اور سن بھی سکے گا۔ کان میں لگا ہوا موتی کنڈنسر مائک بھی ہے اور ہیڈ فون بھی۔"

میں اس چیز کی افادیت کا قائل ہوگیا۔ جب اس نے بڑے بالوں کی بات کی تھی تو قدرتی طور پر میرے ذہن میں نازو کا خیال آیا تھا مگر ابھی یہ محض ایک خیال تھا۔ کوئی فیصلہ نہیں تھا کہ وہ اسے ضرور استعمال کرے گی۔ آغاز ہی سے اس کا ایک الیکٹرونک آلے کے ساتھ جانا شبہات کو جنم دے سکتا تھا۔ ہمارے مقابل بے وقوف لوگ نہیں تھے جو گردوپیش سے بے خبر ہوں۔ شاید ہم سے پہلے کو وہ جانتے ہوں گے کہ بازار میں کیا کچھ دستیاب ہے اور استعمال بھی کرچکے ہوں گے۔ یہ کوئی نادر ایجاد یا دنیا میں اپنی نوعیت کی واحد چیز نہیں تھی۔ اس کی قیمت سن کر غالب بھی متاثر ہوا۔ باہمی رابطے کی یہ جوڑی آٹھ ہزار میں ملی تھی اور اس کی افادیت سو میٹر تک محدود تھی۔ اس کے بعد مجھے دوسری چیز کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ یہ سگریٹ کے پیکٹ سے ذرا بڑا واکی ٹاکی تھا اور اس سے ایک فٹ لمبا انٹینا کھینچ کر باہر نکالا جاسکتا تھا۔ اس قسم کے دو پیس چار ہزار میں ملتے ... بالیف ایم ٹرانسمیٹر ریسیور تھے جو بیٹری سیل سے چلتے تھے اور ان کی رینج ایک کلو میٹر تھی۔ ظاہر ہے یہ چھپا کے استعمال کرنے کی چیز تھی اور ان کا طریقۂ استعمال ہم جانتے تھے۔

"اس کی رینج انٹینا بڑھانے سے تین کلو میٹر تک ہو جاتی ہے۔" غالب کے دوست نے کہا۔ "مثلاً گھروں کے اوپر لگے ہوئے ریڈیو یا ٹی وی کے ایریل سے مدد لی جائے تو تین کلو میٹر تک آواز پہنچ ... تین کلو میٹر کے فاصلے سے سگنل ریسیو کرنا ممکن ہے۔ اس کا ... مسلسل استعمال کیا جائے تو پانچ گھنٹے کام دے گا۔"

"اس پر مجھے یاد آیا۔" میں نے کہا۔ "اس دوسرے یونٹ کے اندر بھی تو سیل ہوگا۔ آلۂ سماعت ٹائپ..."

"ہاں۔ اس میں مائکرو سلیکون سیل ہے۔" وہ بولا۔ "یہ چیز اتنی عام تو نہیں ہے مگر مل جاتی ہے تلاش کرنے سے۔ ڈیڑھ سو کا ایک سیل ملے گا جو کافی چلے گا۔ استعمال پر منحصر ہے۔ ایک سو اسّی منٹ کی لائف ہے اس کی چنانچہ آپ حساب رکھیں کہ ... منٹ استعمال ہوا۔ ٹارچ لائٹ سیل آہستہ آہستہ کمزور پڑتا ہے اور سگنل بھی کمزور ہو جاتا ہے۔ سلیکون سیل ایک دم جواب دے جائے گا۔ دراصل اس یونٹ کو کم سے کم ایک خاص مقدار میں کرنٹ چاہیے اس کا لیول گرے گا تو فنکشن ختم ہو جائے گا۔ آپ ان دونوں چیزوں کو ٹیسٹ کریں گے؟"

"نہیں۔ آپ کا کہا کافی ہے۔" غالب نے کہا اور اس کے دکان دار دوست نے دو چھوٹے اور دو بڑے واکی ٹاکی پھر ڈبے میں بند کر دیے۔ وہ صابن کی بارہ ٹکیوں والا ڈبا تھا جس کو کھولنے سے صابن کی مخصوص مہک آتی تھی۔ اس میں سب چیزیں پلاسٹک کی تھیلی میں ڈال کر رکھی گئی تھیں۔ ہمیں گھر سے نکلے ہوئے سوا گھنٹا ہوگیا تھا۔ غالب نے بے چینی سے کلائی کی گھڑی دیکھی۔ اسی وقت دکان کا وہ سیلز مین بھی آگیا جو مالک کے ساتھ گیا تھا۔ وہ خاموشی سے اندر آیا اور اس نے چمڑے کی جیکٹ کے اندر سے سگریٹ کا ایک پیکٹ نکال کے میز پر رکھ دیا۔ "دو ہزار اور دینے ہیں۔" وہ بولا۔

"کم نہیں کیے اس یہودی نے؟" دکان کا مالک بولا۔

"کہہ رہا تھا' بارہ کے دس لے رہا ہوں اور کیا کم کروں —"

"غالب صاحب' میرا اندازہ کچھ غلط ہوگیا۔" دکان دار نے کچھ خفت سے کہا۔ "لیکن ساری بات ضرورت کی ہے اور مال شاذ ہے اتفاق سے چنانچہ سب فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ دو چار ہفتے میں اس سے آدھی قیمت دینا پڑتی۔ اسے دو ہزار اور دے دیں۔"

سیلز مین دو ہزار لے کر چلا گیا تو اس نے "تھری کیسل" برانڈ سگریٹ کا پیکٹ کھولا۔ اندر سے ایک کلائی کی گھڑی نکلی اور ایک عجیب سی چیز جس کی لمبائی دو انچ تھی۔ چوڑائی آدھے انچ سے کچھ زیادہ اور موٹائی وہی چار یا پانچ ملی میٹر۔ اس کے دونوں کنارے گول تھے۔ ایک سطح بالکل صاف اور چکنی تھی۔ دوسری طرف انگلی کے ناخن کے برابر کھلے حصے پر جالی تھی۔ جالی کا اور اس چیز کا رنگ چمکدار سیاہ تھا۔

"یہ بہت نایاب... اور خطرناک چیزیں ہیں۔" دکان دار بولا۔ "یہ کلائی کی گھڑی نہیں' ایف ایم مائکروفون ہے۔ گھڑی کی چابی پول تو وقت بتانے والی سوئیوں کے لیے ہے' اس کو تھوڑا سا باہر کھینچ لیں تو وقت ملایا جاسکتا ہے۔ ہر گھڑی میں ایسے ہی ہوتا ہے لیکن اب دیکھیے۔ میں منٹ کی سوئی کو ایک پورا چکر دیتا ہوں۔ وقت ایک گھنٹا آگے بڑھ گیا۔ اب اسے واپس لاتا ہوں۔ وقت پھر وہی ہوگیا۔ اب چابی کو تھوڑا سا اور باہر کھینچ لیں۔ سیکنڈ کی سوئی رک گئی ہے۔ یہ اشارہ ہے کہ آپ کی گھڑی کا مائکروفون کام کرنے لگا ہے۔ سوئی کو گھمائیں گے تو فریکوئنسی بدلے گی۔ جیسے ریڈیو کی سوئی سے بدلتی ہے۔ اس ریموٹ مائکروفون میں یہ فائدہ ہے کہ آپ کو ایک ہی فریکوئنسی پر پیغام دینے کی مجبوری نہیں۔ آپ جب چاہیں فریکوئنسی بدل لیں۔ اٹھاسی میگا ہرٹز سے ایک سو آٹھ میگا ہرٹز کے درمیان کہیں بھی رکھ لیں۔ اس کی رینج بہت زیادہ ہے۔ میرا مطلب ہے' اس کے سائز کے مقابلے میں۔ کسی گاڑی کے ریڈیو کا انٹینا پورا اونچا کرلیا جائے تو ریڈیو ٹیون کرنے سے اس مائکروفون کا سگنل کسی جگہ بالکل صاف سنائی دے گا۔ تقریباً ایک میل کے دائرے میں۔ ایک کلو میٹر کچھ کم ہوتا ہے ایک میل سے۔ انٹینا کم سے کم تین فٹ اونچا ہونا چاہیے گاڑی کے ریڈیو کا۔ چھت کے اوپر ہوگا تو آواز زیادہ صاف ہوگی مگر رینج وہی رہے گی۔ اس کلائی کی گھڑی کی سب سے بڑی خوبی اس کا سیل ہے جو تھرمو الیکٹرک سیل ہے۔ جیسے کوئلے یا تیل کو جلا کے بجلی پیدا کرتے ہیں' اسی طرح اس سیل میں جسم کی حرارت سے کرنٹ پیدا ہوتا ہے۔ گھڑی ہاتھ پر بندھی رہے تو اس کی پشت حرارت جذب کرتی ہے اور سیل اس حرارت کو کرنٹ میں تبدیل کرتا ہے۔ سیل کی لائف مقرر نہیں۔ نہ چلے تو دو دن نہ چلے اور ٹھیک کام کرتا رہے تو دو سال گزار دے۔ طریقۂ استعمال سمجھ لیا ہے آپ نے۔ ایک بار پھر دیکھ لیں۔"

"ہم اتنے کوڑھ مغز نہیں ہیں۔" غالب مسکرایا۔ "ایک بار میں بات سمجھ بھی لیتے ہیں اور سمجھا بھی دیتے ہیں۔ یہ واقعی بہت قابلِ قدر اور کارآمد چیز ہے۔"

"ہے بھی تو آٹھ ہزار کی جناب۔" غالب کا دوست خوش ہوکے بولا۔ "یہ جو کالی سی چیز ہے' یہ سیدھا سادا مائکروفون ہے۔ اس کی فریکوئنسی پری سیٹ ہے۔ یعنی آپ بدل نہیں سکتے۔ اسے آپ ایک الیکٹرونک کان سمجھ لیں۔ یہ مقناطیسی ہے اور کسی بھی لوہے کی سطح پر چپک جاتا ہے۔ آس پاس کچھ بھی ہو' یہ ہر آواز کو نشر کرتا رہتا ہے اور اس کی آواز بھی ایف ایم بینڈ ریڈیو پر سنی جاسکتی ہے مگر وہی سو میٹر کے دائرے میں۔ اسے ارتھ ہونا چاہیے۔ ارتھ ہوتے ہی یہ خود بخود آن ہو جاتا ہے۔ مثلاً آپ اسے گاڑی کی باڈی سے لگا دیں تو یہ کام شروع کردے گا۔ الگ کریں گے تو آف ہو جائے گا۔ گھر کے اندر پانی کے نلکے سے چپکا دیں۔ کسی کیل سے لگا دیں جو دیوار میں پیوست ہو۔ لکڑی میں نہ لگی ہوئی ہو۔"

"زبردست! مان گئے تمھیں دوست۔" غالب نے جذباتی ہوکے کہا۔ "تم نے میری جو مدد کی ہے' وہ درحقیقت ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ میں تم کو زیادہ تفصیل نہیں بتا سکتا۔ مگر اس وقت تم نے اپنے وطن اور ملک کے کچھ دشمنوں کے عزائم ناکام بنانے کے مقدس فرض کو پورا کر دیا ہے۔ جس حد تک تم کرسکتے تھے۔"

"میں نے تو آپ کی مدد کی تھی۔ اگر یہ میرے وطن کی خدمت ہے تو غالب صاحب' آپ یہ پیسہ لے جایئے۔" وہ بولا۔ "میں سپاہی نہیں ہوں لیکن اس وطن کی خاطر لڑنے والوں کے لیے کچھ کرسکوں تو میری خوش قسمتی۔"

"پیسہ غیر اہم ہے۔ قربانی اور ایثار کا جذبہ ہے تو سب ہے۔ تم نے وقت پر ایک مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں مدد کی' یہی تمھارا جہاد ہے۔" غالب نے اٹھتے ہوئے اس سے ہاتھ ملایا۔ "ایک دن میں خود تمھیں یہ بتلانے آؤں گا کہ تم نے جو کچھ کیا تھا وہ بیس ہزار کیا' بیس لاکھ یا بیس کروڑ سے زیادہ قابلِ قدر تھا۔"

"مجھے امید ہے' اس دن یہ بھی آپ کے ساتھ آئیں گے۔" وہ مجھ سے ہاتھ ملا کے بولا۔ "آج تو یہ بالکل نہیں بولے۔"

"امید ہے' تم بھی راز کو راز رکھتے ہوئے چُپ رہو گے۔ کسی سے ہمارے آنے کی بات نہیں کرو گے۔" غالب بولا۔ "تمھارا وہ سیلز مین قابلِ اعتبار ہے؟"

"وہ میرا چھوٹا بھائی ہے۔" وہ بولا۔ "اس میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں۔ آپ بھروسا رکھیں اور پھر ضرورت پڑے تو مجھے کسی بھی وقت یاد کرلیں۔ میں اپنا کارڈ دیتا ہوں۔ گھر یا دکان پر کسی جگہ فون کردیں۔"

ہم کارڈ لے کر دکان سے نکل آئے۔ ہم نے دو گھنٹے میں واپس پہنچنے کو کہا تھا اور دو گھنٹے ہوگئے تھے۔

"تیرے دوست نے تو کمال کر دیا یار۔" میں نے کہا۔ "میں واقعی خود کو سکندرِ اعظم سمجھنے لگا ہوں جس نے دنیا فتح کرلی ہو۔"

"وہ تم کو ملٹری کا کوئی کرنل جنرل سمجھتا رہا۔" غالب ہنسا۔ "اور

اسی لیے تمھارے بارے میں اس نے زیادہ تجسس کا مظاہرہ نہیں کیا۔ آدمی سمجھ دار ہے۔ یہ جانتا ہے کہ کمانڈوز کے آپریشن کتنے ٹاپ سیکرٹ ہوتے ہیں۔"

"مجھے اس کی حب الوطنی، دوست داری اور اصول پرستی بھی پسند آئی۔" میں نے کہا۔

ہماری خوش قسمتی تھی کہ اسی جگہ سے ایک رکشا والے نے کسی قسم کی شرائط عائد کیے بغیر ہمیں بٹھالیا اور بیس منٹ بعد ہم گھر میں داخل ہوئے تو ہمارا استقبال چالیس سال سے زائد عمر کی ایک بدصورت بڑھیا نے کیا جس کے چہرے پر عمر رفتہ کی تحریر جھرّیوں کی شکل میں نظر آتی تھی۔ اس کے سر کے بالوں میں سفیدی غالب آنے لگی تھی اور یہ بال خشک، اُلجھے ہوئے اور کھُردرے تھے۔ اس کے میلے اور بدوضع دانتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ پان بہت کھاتی ہے اور پھر دنداسہ بہت استعمال کرتی ہے۔ اس کا رنگ سیاہی مائل گندمی تھا اور سوسی کے پرانے میلے شلوار قمیص کے ساتھ پھٹے ہوئے دوپٹے سے اس کی غربت عیاں تھی۔ جسمانی طور پر بھی وہ بہت نحیف ولاغر تھی۔ میں اور غالب کچھ دیر سکتے کے عالم میں کھڑے رہے۔ ہمارے لیے نازو کی اس ہیئت کذائی پر ہنسنا بھی مشکل تھا اور رونا بھی۔

"بہت صدمہ پہنچا ہے دل کو؟" شہلا نے غالب کو چھیڑا۔

"صدمہ تو مجھے بھی پہنچا ہے۔" میں نے کہا۔ "کیا صورت تھی، جسے کیا کر دیا مگر صدمے سے زیادہ مجھے اس ہمت پر رشک آتا ہے۔ یہ کسی اور کے بس کی بات نہیں تھی۔"

"ابھی تو کچھ نہیں کیا میں نے۔" نازو ہنسی۔ "اتنی تعریف مت کرو کہ مجھے غرور ہو جائے۔ حد سے زیادہ خوداعتمادی بھی نقصان پہنچاتی ہے۔"

"اس میں کوئی مبالغے کی بات نہیں نازو۔" محسن نے کہا۔ "میری بیوی سے پوچھو۔ ایمانداری سے بتائے کہ یہ کام وہ کرسکتی تھی۔"

"میں جھوٹ کیوں بولوں۔" شہلا نے کہا۔ "میں واقعی اتنی ہمت نہیں رکھتی۔ لیکن رابعہ باجی شاید..."

"نہیں... وہ بھی سیدھی دشمن کے قلعے میں داخل نہ ہوتی۔" میں نے کہا۔ "خود میں اسے نہ جانے دیتا۔ نازو کی طرح وہ اپنا دفاع نہیں کرسکتی۔"

"باباتم لوگ اپنا مسخری چھوڑو۔" موسلے جی نے کہا جس کی طرف ہم نے ابھی تک توجہ نہیں دی تھی۔ اس نے تین گھنٹے کہے تھے مگر اپنا کام دو گھنٹے میں ختم کرلیا تھا چنانچہ آدھے گھنٹے سے وہ ہمارے انتظار میں، شہلا کے بیان کے مطابق ایک پیکٹ سگریٹ کا، دو گلاس پانی اور تین کپ چائے پی چکا تھا۔

"چھوڑ دی۔ بالکل چھوڑ دی آج سے۔" غالب نے کہا۔ "اپنا بُوتھا پیشِ خدمت ہے۔ اس کو بگاڑ کے اپنے جیسا بنا دیجیے۔" وہ موسلے بھائی کے سامنے دھرنا مار کے بیٹھ گیا۔ موسلے جی ایک فنکار تھا مگر اس کے فن کی قدر نہیں تھی یا دنیا کو اتنی ضرورت نہیں تھی جتنی موٹر مکینک کی چنانچہ وہ عمر کے اس حصّے میں فرسٹریشن کا شکار رہتا تھا۔ اسے ٹی وی سے لگا بندھا معاوضہ ملتا تھا جو زندگی کی جائز ضروریات کی کفالت بھی نہیں کرسکتا تھا۔ ناجائز اور منہ زور خواہشات کی تکمیل کے لیے اس نے ناجائز راستے اختیار کر لیے تھے لیکن اس سے موسلے جی کے اندر چھپا ہوا فنکار شرمسار رہتا تھا اور خود کو مجرم محسوس کرتا تھا۔ ہم سب اس کے ہاتھوں کی ہنرمندی کو مصروفِ عمل دیکھتے رہے۔ اس نے دیکھتے ہی دیکھتے غالب کا چہرہ بدل دیا۔ غالب پر اسے اتنی محنت نہیں کرنا پڑی جتنی نازو پر ہوئی تھی۔ چنانچہ وہ آدھے گھنٹے میں فارغ ہو گیا۔

"ابھی تم میرے کو چھوڑ کر آؤ۔" وہ بولا۔

"تم ٹیکسی میں آئے تھے۔" میں نے کہا۔ "ٹیکسی لو اور چلے جاؤ..."

"نہیں یار۔ ہم اتنے بے مروت نہیں ہیں۔" غالب نے کہا۔ "لاؤ بھئی شہلا، موسلے بھائی کے لیے گرما گرم دودھ ملائی والی چائے لاؤ۔۔۔ اور ہمارے لیے بھی۔" اس نے موسلے جی سے نظر بچا کے مجھے آنکھ ماری اور یہ اشارہ شہلا نے بھی دیکھ کر مخالفت کا ارادہ ترک کر دیا ورنہ یہ چائے کا کوئی وقت نہیں تھا۔

"استاد، تم ذرا جا کے موسلے بھائی کے لیے ایک فرسٹ کلاس ٹیکسی لاؤ۔" غالب نے کہا۔ "جتنی دیر میں ٹیکسی آئے گی یہ چائے پی لیں گے اور اگر وہ فوراً آجائے تو اس سے دو چار منٹ انتظار کا کہنا۔" ٹیڈی نے میری نظر کا اشارہ نہ دیکھا ہوتا تو وہ غالب کے اس تحکمانہ انداز پر احتجاج ضرور کرتا مگر اس نے دیکھا کہ یہ چکر کچھ اور ہے تو وہ خاموشی سے چلا گیا۔ شہلا نے چائے پانچ منٹ میں حاضر کر دی۔ پانی پہلے سے ابل رہا تھا چنانچہ اسے دیر نہیں لگی۔

"یار یہ کیا حرام خوری ہے۔" غالب نے ایک کپ کو اندر سے ملاحظہ فرما کے کہا۔ "کپ کو ٹھیک طرح صاف تو کرنا تھا۔" پھر وہ اسی طرح کپ کو اندر لے گیا اور گرم پانی سے دھو کے لایا۔ سب سے پہلے اس نے موسلے جی کو چائے بنا کے دی۔ پھر اطمینان سے بلکہ کاہلی سے سلو موشن میں ہم سب کو چائے بنا کے دینے لگا۔

استاد ٹیڈی ہمارے چائے ختم کرنے تک ٹیکسی لے کر نہیں لوٹا تھا۔ شاید اسے ٹیکسی دستیاب نہیں ہوئی تھی۔ لاہور میں نہ جانے کیوں رکشا تعداد میں بڑھتے جارہے تھے اور ٹیکسیاں کم ہو رہی تھیں۔ موسلے بھائی اب واپس جانے کے لیے بے چین تھا کیونکہ اس کے ٹی وی اسٹیشن جانے کا وقت ہو رہا تھا۔ پندرہ بیس منٹ بعد جھلاتے ہوئے استاد ٹیڈی نے واپس آکے اعلان کیا کہ شاہی سواری آگئی ہے مگر موسلے جی اس وقت تک سو چکا تھا۔

"موسلے بھائی! اے موسلے بھائی۔" غالب نے اس کو ہلاتے ہوئے چلا کر کہا۔ "تم ادھر سونے کو آیا تھا کیا؟ تم کو نہیں معلوم کہ جو سوتا ہے وہ کھوتا ہے۔" مگر اس پر خاک بھی اثر نہیں ہوا۔

"آتے ہوئے بھی تم ٹیکسی میں سو گیا تھا۔"

"اس کو کیوں ڈانٹتے ہو۔ حرکت تو یہ تمھاری ہے۔" میں نے کہا۔

"توبہ توبہ ـــــــ" غالب دونوں کانوں کو ہاتھ لگا کے بولا۔ "میں نے تو بس خواب آور گولیاں ملائی تھیں اس کی چائے میں۔ سویا یہ خود ہے۔ اگر نہ سوتا تو مجھے اس کو ناک آؤٹ کرنا پڑتا مگر گڑ سے مرنے والے کو زہر دینے کا گناہ میں نہیں کرتا۔"

"شک تو مجھے پہلے ہی ہو گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "تصدیق اب ہو گئی۔"

"چلو اب یہ مال ڈھونے میں میری مدد کرو۔" غالب بولا۔ "میں اس کو گھر کے دروازے تک تو چھوڑ آؤں۔ پہلے آنکھ کھلی تھی تو موسلے بھائی نے خود کو یہاں پایا تھا۔ اب آنکھ کھلے گی تو واپس وہیں ہو گا جہاں سے چلا تھا۔"

"سمجھے گا کہ خواب تھا جو بھی ہم نے دیکھا، جو بھی سُنا افسانہ تھا۔"

"اس کو سمجھنا پڑے گا۔" غالب بولا۔ "ورنہ میں اس کو سمجھا دوں گا۔ یہ ضروری تھا کہ موسلے بھائی کو اس گھر کے راستے کا علم نہ ہو۔ اس سے کچھ بعید نہیں کہ کل شراب کے لیے پیسے نہ ہوں تو پھر آجائے۔ اب کہاں جائے گا۔"

"تمھارے دفتر بھی تو پہنچ سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"وہاں میں اس کو پہچاننے سے بھی انکار کر دوں گا۔" غالب بولا۔ "شہر میں یہ ہمیں تلاش کر نہیں سکتا اور اتفاق سے مل جانے کا رسک ایک فی ہزار بھی نہیں۔ اتنا رسک تو ہم شوقیہ بھی لیتے ہیں۔" باہر سے ٹیکسی والے نے ہارن دیا اور ہڑبڑ مچایا تو میں اور غالب سوئے ہوئے موسلے جی کو اُٹھا کر لے گئے اور ٹیکسی میں پیچھے کی سیٹ پر لٹا دیا۔

"اتنی دیر کیا اسے قتل کرنے میں لگی؟" ڈرائیور نے موسلے بھائی کو غور سے دیکھ کر کہا۔ "یہ بندہ ہے کہ لاش؟"

"بندہ ہے مگر سویا ہوا۔" غالب نے کہا۔ "بیمار تھا اس لیے ڈاکٹر نے نیند کا انجکشن دیا ہے۔" وہ آگے بیٹھ گیا اور ٹیکسی روانہ ہو گئی۔

"سچ کہا تھا غالب نے۔" میں نے کہا۔ "وہ تیس فیصد صحافی، تیس فیصد جیمز بونڈ ایجنٹ زیرو زیرو سیون اور چالیس فیصد مجنوں ہو گیا ہے۔ صحافی تو برائے نام ہی رہ گیا نا۔"

اندر آنے کے بعد میں نے الیکٹرونک نوادرات کی نمائش کی جسے خواتین نے بھی دلچسپی سے دیکھا۔ میں نے طریقۂ استعمال اچھی طرح سمجھانے کے بعد کلائی کی گھڑی نازو کے ہاتھ پر کہنی سے بھی اوپر باندھ دی۔ وہ بہت ہی نازک سی لڑکی تھی چنانچہ اس کا بازو میری کلائی کے برابر یا کچھ زیادہ تھا۔ جب اس نے آستین اٹھائی تو کہنی تک سیاہی مائل گندمی رنگ کے ختم ہوتے ہی جلد کا سنہرا رنگ شروع ہو گیا جو یوں لگتا تھا جیسے سائے کے ساتھ ہی دھوپ کی روشن لکیر۔ سایہ محدود تھا اور آگے سب دھوپ تھی۔ اس کے چہرے اور گردن کے نیچے تک اور پیروں پر ٹخنے سے اوپر تک سائے کی عملداری تھی جسے دیکھ کر کوئی اجنبی، دھوپ کے اجالے کا تصور ہی نہیں کرسکتا تھا۔

"ہر بار اس کو استعمال کرنے کے لیے تمھیں آستین چڑھانا ہو گی۔" میں نے کہا۔ "اور شاید گھڑی کھولنا بھی پڑے۔ مگر یہ احتیاط بہتر ہے۔ ان کو تمھارے ہاتھ پر کلائی کی گھڑی نظر نہ آئے۔"

"میں اسے آن کیوں نہ رکھوں؟" نازو بولی۔

"چوبیس گھنٹے آن رکھو گی؟" میں نے کہا۔ "اس کی بیٹری ایک دن بھی ساتھ نہیں دے گی۔ اسے تو ضرورت کے وقت استعمال کرنا ہے۔ کم سے کم الفاظ میں پیغام دینا ہے اور بس۔"

"کس کے لیے پیغام دینا ہے؟" محسن نے کہا۔

"تمھارے لیے اب کسی کا پیغام نہیں آئے گا۔" میں نے کہا۔ "اس لیے تم چپ رہو۔ لمبی گفتگو کرو گی تو یہ اندیشہ بھی رہے گا کہ کوئی سُن نہ لے۔"

"ہائے اللہ۔ کسی نے سُن لیا تو؟ کوئی آگیا تو؟" محسن نے لڑکیوں کی طرح کہا اور ایک دم دور بھاگ گیا۔ "تم اسے کیا سمجھا رہے ہو۔ لمبی گفتگو کرے گا وہ۔ چھ سے بارہ والا۔ دیوانِ غالب اور کلیاتِ میر سُنائے گا اور صبح تک بیٹری خلاص۔"

"تم بولنے دو اسے۔" میں نے نازو سے کہا۔ "تم اپنا کام سمجھتی ہو اور حالات کے مطابق خود احتیاط برت سکتی ہو۔ یہ دوسرا مقناطیسی مائک ہے۔ اسے بھی موقع دیکھ کر استعمال کرنا۔ اگر تم نے ان کا اعتماد حاصل کر لیا تو ممکن ہے تمھیں کہیں آنے جانے پر کوئی نہ ٹوکے۔ باہر کا کام ہم پر چھوڑ دو۔ ہم تمھاری نگرانی اور حفاظت بھی کریں گے اور تمھارے ہر پیغام کو ریسیو بھی کریں گے۔"

غالب ایک گھنٹے میں لوٹ آیا تو ہم سب نے کھانا کھایا جو ایک رسمی کارروائی تھی۔ کھانے کو کسی کا جی نہ چاہتا تھا۔ سب کے دل پر خوف کا ایک بوجھ سا تھا کہ سوچا تو ہم نے بھی تھا ہی ہے

مگر ایسا نہ ہو کہ لینے کے دینے پڑ جائیں۔ اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے۔ نازو میک اَپ اور اچھی اداکاری کے باوجود پکڑی جائے۔ وہ اتنے محتاط ہوں کہ کسی اجنبی کو اندر گھسنے ہی نہ دیں۔ یا بعد میں کسی موقع پر نازو کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیں۔ سارے خطرات نازو کے لیے تھے جیسے ہم سب مل کر خطرے کی بھٹی میں جھونک رہے تھے۔ جانتے بوجھتے دشمنوں کے حصار کی طرف دھکیل رہے تھے۔ جو کچھ اس کے ساتھ ہو سکتا تھا' اس کا تصوّر کرتے ہوئے بھی دل کانپتا تھا اور ہم خود کو مجرم محسوس کرتے ہوئے نظریں چار نہیں کر پاتے تھے۔ دو بار میں نے نازو سے کہا کہ ابھی وقت ہے اور وہ چاہے تو قدم آگے بڑھانے سے پہلے رک جائے۔ یہی بات دو بار محسن اور غالب دُہراتے رہے مگر وہ سب کا مذاق اڑاتی رہی اور سب پر ہنستی رہی کہ ڈر مجھے چاہیے مگر خوف سے تم سب کا بُرا حال ہے۔

شام کے چھ بجے میں نے اور غالب نے نازو کو ساتھ لیا اور ہم نے ایک خطرناک ترین مشن کے لیے روانگی اختیار کی۔ شہلا رونے کے قریب تھی مگر محسن نے اسے اندر سے جا کر ڈانٹا ڈپٹا تو وہ چپ کھڑی رہی۔ ہم نے جانتے بوجھتے تانگے میں سفر کیا۔ آدھے راستے میں مجھے خیال آیا کہ ہم نے سب کچھ لے لیا مگر ایف ایم بینڈ کا ریڈیو نہیں لیا۔ اس کے بغیر نازو کے ارسال کردہ پیغامات سنے ہی نہیں جا سکتے تھے۔

"یہ ایسی ہی حماقت ہے جیسے کوئی گھوڑا لینے جائے تو نعلیں لے کر لوٹ آئے اور گھوڑا بھول آئے۔" غالب نے کہا۔ نازو ہنس پڑی۔ زبردستی۔

"گھوڑا اب لے لیتے ہیں۔ خریدتے ہوئے جائیں گے۔" میں نے کہا۔

"ہیں جی؟ راہ میں گھوڑا خریدو گے؟" تانگے والا ایک دم چونکا۔ "خیر سے کیسا گھوڑا چاہیے۔ جنگی جان والا۔ جیسا یہ گھوڑا ہے۔ ایسا ہی لینا ہے تو آپ یہ لے لو۔ میں دوسرا پکڑ لوں گا۔"

"کہاں سے پکڑ لو گے؟ چڑیا گھر میں تو گھوڑا ہے نہیں۔" غالب نے کہا۔

"اس کے علاوہ ہم جس گھوڑے کی بات کر رہے تھے وہ بیٹری سیل سے چلتا ہے۔" میں نے کہا۔

"اچھا اچھا۔ کھلونا لینا ہے۔" تانگے والے نے دانت نکال کے کہا۔

ایف ایم بینڈ والا ریڈیو کہیں نہ تھا۔ سب میں وہی میڈیم ویو یا شارٹ ویو بینڈ تھے جو عام گھروں میں استعمال ہوتے ہیں۔ بجوراً مجھے کار ریڈیو لینا پڑا۔ یہ پھر وہی گھوڑے کے بغیر نعلیں لینے والی بات تھی۔ کار نہیں تھی مگر کار ریڈیو تھا۔ اس کے لیے کار بیٹری کی ضرورت تھی۔ وہ بھی ہم نے راستے ہی میں خریدی اور تانگے والے کو مطمئن کیا کہ اسے ڈبل راستے کا ڈبل کرایہ ضرور ادا کیا جائے گا۔ سب سے پہلے غالب اتر گیا۔ اس جگہ جہاں سے چند قدم کے فاصلے پر مونگ پھلی کی ریڑھی تھی۔ پھر نازو نے بھی وہیں اترنے کا فیصلہ کیا اور میں نے اسے خدا حافظ کہتے ہوئے اس کے کندھے پر پیار سے تھپکی دی۔ "بیسٹ آف لک۔" میں نے کہا۔ نازو نے مسکرا کے دو انگلیوں سے وی کا نشان بنایا اور تانگا آگے چل پڑا۔

یکلخت میرے دل کو اداسی نے اور مایوسی نے جکڑ لیا۔ میں نے تانگے والے کو بیس روپے دیے اور خود اُتر کے چند قدم واپس گیا۔ نازو کو اب بھی واپس بلایا جا سکتا تھا۔ ابھی کوئی نقصان نہیں ہوا تھا۔ کل جب نقصان ہو جائے گا تو الزام صرف مجھ پر آئے گا جس نے یہ اسکیم پیش کی تھی۔ جس نے اوّل تا آخر اس کے ہر مرحلے میں نازو کی جان کو داؤ پر لگائے رکھا تھا اور اب وہ میری خواہش پر موت کے مشن پر گئی تھی۔ میں نے چاہا کہ اسے چلا کے واپس بلاؤں۔ مگر آواز میرے حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔ نازو بہت آگے جا چکی تھی۔ اس کی بحفاظت واپسی کے لیے اب صرف دعا کی جا سکتی تھی۔ غالب کی جیب میں بھرا ہوا ریوالور تھا۔ نازو کو بھی ریوالور فراہم کیا جا سکتا تھا۔ وہ خالی ہاتھ بھی مقابلہ کر سکتی تھی مگر جہاں وہ گئی تھی اور جن لوگوں سے اس کا واسطہ پڑنے والا تھا وہ بہت بے رحم' بے ضمیر اور خطرناک تھے۔ ان سے نازو کو صرف خدا کی ذات ہی محفوظ رکھ سکتی تھی۔

گلی کے موڑ پر غالب نے مونگ پھلی کی ریڑھی پر پوزیشن سنبھال لی تھی۔ میں نے آلۂ سماعت کو کان میں لگا لیا۔ ایسا ہی دوسرا یونٹ غالب کے پاس تھا جو سو میٹر سے کم فاصلے پر تھا چنانچہ ہم آپس میں گفتگو کر سکتے تھے۔ میں نے غالب سے پہلے رابطہ قائم کیا۔

"ابھی کچھ نہیں ہوا۔" غالب کی آواز میرے کان میں گونجی۔ "وہ دروازے پر کھڑی ہوئی ہے۔"

"میں سخت پشیمانی اور احساسِ جرم میں مبتلا ہوں۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" غالب نے کہا۔ "ہم سب کی کیفیت ایک سی ہے۔ میں نے تو دل کو پہلے ہی قائل کر لیا ہے کہ اب نازو سے اس دنیا میں ملاقات کی فقط اُمید رکھی جا سکتی ہے۔ اگر وہ اور میں بہت خوش قسمت رہے تو پھر ملیں گے ورنہ اس کی یاد میرے ساتھ ہو گی۔ دمِ آخر تک۔"

"ایسی مایوسی کی باتیں کیوں کرتے ہو؟" میں نے تقریباً رو کر کہا۔ "تم بھی تو رابعہ کو کھو چکے ہو۔ پھر پا لو گے تو تمھاری قسمت کی خوبی اور خدا کی مہربانی۔" غالب بولا۔ "میں اور تم ایک ہی کشتی کے مسافر ہیں۔"

"خدا کے لیے بتاؤ نازو کیا کر رہی ہے؟"

"کسی نے دروازہ کھولا ہے۔ ایک عورت ہے۔" غالب نے کہا۔ "نازو اس سے کچھ کہہ رہی ہے۔"

"کیا کہہ رہی ہے؟" میں نے بے تابی سے کہا۔

"مونگ پھلی دینا ایک پاؤ۔" کسی کی آواز آئی۔ "فٹافٹ۔"

"ابھی لو سرکار۔" غالب نے اچانک آ جانے والے گاہک سے کہا اور اس غلط وقت پر گاہک کا آنا مجھے سخت گراں گزرا۔ اپنے سوال کے جواب پر مجھے بالکل ہنسی نہیں آئی۔ میں غالب کو مونگ پھلی دیتے دیکھتا رہا۔

"اب... نازو ہاتھ جوڑ رہی ہے۔" غالب بولا۔ "عورت نے ایک بار دروازہ بند کر دیا تھا مگر وہ کھڑی رہی تھی... وہ اس عورت کے پاؤں پڑ رہی ہے۔ میرا خیال ہے اداکاری اچھی ہے۔ عورت رُک کر نازو کی بات سننے پر مجبور ہو گئی ہے۔ یہ وکٹر براوران کی بہن سونیا تو نہیں ہو سکتی۔ اس کی کتنی عمر ہے؟"

"میں نے اسے نہیں دیکھا ہے۔ مگر ظاہر ہے نرس جوان ہی ہو گی۔" میں نے کہا۔

"نرس کے بوڑھی ہونے پر کوئی پابندی نہیں۔" غالب بولا۔ "یہ کچھ عمر رسیدہ عورت ہے۔ ہاں۔ اب ایک جوان عورت بھی آ گئی ہے۔ افسوس یہ ہے کہ میں گفتگو نہیں سن سکتا حالانکہ نازو کی گھڑی کا ٹرانسمیٹر آن ہو گا۔ یہ سب تمھاری وجہ سے ہوا۔ ورنہ دن میں ہی ریڈیو اور بیٹری بھی خرید لیتے تو اب تک ریڑھی پر فٹ ہو جاتے... خیر... لو بھائی سکندر۔ دروازہ کھلا اور بند ہو گیا۔ نازو اندر پہنچ گئی ہے۔"

آدمی نے چاند پر قدم رکھ دیا ہے۔ یہ خبر ابھی نئی تھی۔ غالب کی بات سن کر مجھے یوں لگا جیسے وہ نازو کے ایک دوسری دنیا میں پہنچ جانے کا اعلان کر رہا ہے۔ چاند کی اجنبی دنیا کے پُراسرار سفر پر روانہ ہونے والوں کو اپنی روانگی کے بعد واپسی کا کتنا یقین تھا؟ سائنس کی تمام تحقیق اور نتائج کی قبل از وقت معلومات پر دسترس کے باوجود وہ اس ایک لمحے پر مکمل اختیار کی ضمانت نہیں رکھتے تھے جو فنا کا لمحہ ہوتا ہے۔ کہیں آنکھ سے اوجھل رہ جانے والی ایک مشینی غلطی یا کمپیوٹر کے برق رفتار ذہن سے سرزد ہو جانے والی حساب کی فروگزاشت اسی لمحے کے وجود کو تسلیم کراتی تھی۔ کروڑوں چھوٹے بڑے کل پرزوں کے سرکٹ میں رونما ہو جانے والی خرابی لاکھوں سائنس دانوں اور انجینئروں کی آنکھ نہیں دیکھ پاتی۔ کون جانے نازو کو اس سفر پر روانہ کرنے سے قبل احتیاط اور انتظام کے سارے تقاضے پورے کرنے کے باوجود ہم سے کس مرحلے میں کون سی کوتاہی سرزد ہو گئی ہو جو اب اس کے لیے واپسی کو ناممکن بنا دے مگر اب ہم اسے واپس نہیں لا سکتے تھے۔ وہ اس سیارے پر اتر چکی تھی جہاں ایک وحشی' درندہ صفت اور انسان دشمن مخلوق کی حکومت قائم تھی اور وہ اپنی حدودِ مملکت میں کسی کی داخل اندازی کو ناقابلِ معافی جرم تصور کرتی تھی۔

آدھا گھنٹا مکمل خاموشی میں گزر گیا جس میں ہر دس سیکنڈ بعد میں غالب سے ایک ہی بات پوچھتا تھا۔ "کوئی خبر؟" اور غالب ایک ہی جواب دیتا تھا۔ "کچھ نہیں۔" انتظار کی کوفت آہستہ آہستہ جھنجلاہٹ میں بدلنے لگی تھی۔ اعصابی کشیدگی کا شکار غالب بھی تھا مگر وہ مجھ سے زیادہ مضبوط اعصاب کا مالک تھا یا پھر کچھ ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ وہ مجھ سے یہی کہتا رہا کہ ہم نازو کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ پھر پریشان ہونے سے کیا حاصل۔ میں دُہرے عذاب میں مبتلا تھا۔ ایک طرف رابعہ تھی جس کے لیے میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ جب مجھے موقع ملا تھا تو میں نے گنوا دیا تھا۔ ایک مجبوری نے میرے قدم پکڑ لیے تھے اور اب مجھے بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کس حال میں ہے۔

جہاں میں کھڑا ہوا تھا' وہیں ایک میڈیکل اسٹور تھا اور مالک کسی کو فون کر رہا تھا۔ میں اسے دیکھتا رہا اور جب اس نے ریسیور رکھا تو میں دکان میں داخل ہو گیا۔ وہ عجیب آدم بیزار شخص تھا لیکن میں نے کہا کہ مجھے ایک ڈاکٹر کو فون کرنا ہے اور ایک مریض کی خیریت دریافت کرنی ہے تو وہ مان گیا۔ ریسیور خود ڈاکٹر لطیف نے اٹھایا۔

"ڈاکٹر لطیف۔" میں نے کہا۔ "میں سکندر بول رہا ہوں۔"

"سکندر... ہاں بھئی۔" انھوں نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔ "کیا حال ہے؟"

"حال تو مجھے رابعہ کا معلوم کرنا تھا۔" میں نے کہا۔

"ٹیلی فون پر؟ کیا تم اس وقت بھی نہیں آ سکتے؟"

"میں کیوں نہیں آ سکا تھا' اس کی وجہ تو آپ کو معلوم ہو گئی ہو گی۔" میں نے شرمندہ ہو کر کہا۔ "مجبوری ایسی تھی۔"

"مجبور ہم سب ہیں۔ مختار کوئی نہیں۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "مگر کبھی دوسروں کی مجبوری پر اپنی مجبوری کو قربان کرنا پڑتا ہے۔ خواہ اس سے کتنا ہی نقصان کیوں نہ ہو۔ چھوٹی چھوٹی مجبوریوں کے عذر..."

"وہ چھوٹی مجبوری نہیں تھی انکل۔" میں نے کہا۔

"لیکن اس سے کتنی بڑی خرابی پیدا ہو گی۔" ڈاکٹر لطیف نے برہمی سے کہا۔ "تم کو تو ابھی اس کا اندازہ بھی نہیں ہے؟"

"خدانخواستہ... رابعہ کو... وہ ٹھیک تو ہے نا؟" میں نے

ڈوبتے دل کے ساتھ کہا۔ "کیا میں آجاؤں۔؟"
"بہتر ہوگا کہ تم آجاؤ۔ فون پر میں کیا بتاؤں۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔
"آپ بتادیں۔ میں سب کچھ سننے کا حوصلہ رکھتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اگر وہ مجھے دنیا میں اکیلا چھوڑ جائے تب بھی میں یہ صدمہ جھیل کے جی لوں گا۔"
"مرنے والے کے لیے صبر آجاتا ہے۔ اس دنیا میں بچھڑ جانے والے پر آدمی رو کر نہیں بیٹھ سکتا۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "اس کی واپسی کی آس تڑپاتی رہتی ہے۔"
"واپسی۔ یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" میں نے کہا۔
"ہاں۔ آج تمھارے نہ آنے کا ردِ عمل بہت شدید ہوا تھا۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "اس نے میری ایک نہیں مانی۔ یہی کہتی رہی کہ تم سب جھوٹ بولتے ہو اور مجھے بے وقوف بناتے ہو۔ وہ سارا دن روتی رہی۔ اس کے بعد معلوم نہیں کیا ہوا شام کو وہ اپنے کمرے میں نہیں تھی۔"
"کیا! کمرے میں نہیں تھی؟" میں نے چلا کر کہا۔ "پھر کہاں تھی؟"
"کہیں بھی نہیں تھی۔ تمھاری آنٹی نے مجھے بتایا کہ رابعہ نے ان سے کچھ کہا تھا۔ یہی کہ سکندر ضرور کسی اسپتال میں زخمی پڑا ہوا ہے۔ اس کی گاڑی کو حادثہ پیش آیا تھا۔ میں خود اسپتالوں میں دیکھوں گی۔ ایمر جنسی میں یا پھر آرتھو پیڈک میں معلوم نہیں۔ وہ کس حال میں ہوگا۔ میں یہاں آرام سے بیٹھی ہوں اور کوئی مجھے بتاتا بھی نہیں۔"
"آپ کا مطلب ہے وہ اسپتال میں جا سکتی ہے؟" میں نے اسی لہجے میں کہا۔ "او مائی گاڈ۔ وہ کہاں کہاں جائے گی۔ کس طرح جائے گی؟ اس پاگل پن میں پیدل پھرے گی۔"
"وہ تو خالی ہاتھ نکل گئی ہے۔ اس کا پرس تک یہیں پڑا ہوا ہے۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔
"ڈاکٹر لطیف! کیا آپ نہیں سمجھتے کہ وہ... وہ ذہنی طور پر معذور ہے اور کوئی بھی اس کی معذوری سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔" میں نے مشتعل ہو کے کہا۔ "وہ غلط افراد کے ہاتھوں میں جا سکتی ہے! کوئی بھی اس سے کہہ دے کہ چلو میں تم کو بتاتا ہوں سکندر کہاں ہے تو وہ اس کے ساتھ ہولے گی۔"
"میں یہ سب تم سے بہتر سمجھتا ہوں۔ تم اس وقت جذباتی ہو کر یہ بھول رہے ہو کہ میں نے تم سے زیادہ دنیا دیکھی ہے اور میرا تجربہ تم سے زیادہ ہے۔ میں ایک ڈاکٹر بھی ہوں۔ مجھے تم سے زیادہ معلوم ہے کہ رابعہ کی ذہنی کیفیت کیا ہے اور اس کیفیت میں اس کا رویہ اور ردِ عمل کیا ہو سکتا ہے لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ صرف ٹیلی فون پر چیخنے چلانے سے کچھ نہیں ہوتا۔"
"آئی ایم سوری۔ مجھے بتائیے میں کیا کروں... آپ نے کچھ کیا ہے ابھی تک؟ یہ کتنی دیر پہلے کی بات ہے؟" میں نے کہا۔
"غالباً دو سے تین گھنٹے ہوئے ہیں اس کو نکلے ہوئے۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "تین گھنٹے پہلے وہ موجود تھی۔ اب دو گھنٹے سے غائب ہے۔ میں نے فون کیے ہیں۔ اسپتالوں میں ڈاکٹر مجھے جانتے ہیں لیکن میں سب کو یہ بات نہیں بتا سکتا۔ ایمر جنسی اور آرتھو پیڈک وارڈ تو ہر اسپتال میں ہوتے ہیں، کیا معلوم وہ پہلے کہاں پہنچے گی لیکن میں نے میو اسپتال۔ گنگا رام ہوسپٹل۔ البرٹ وکٹر اور گلاب سنگھ جیسوٹ دیوی اسپتال کے علاوہ کچھ مشہور اور بڑے پرائیویٹ اسپتالوں میں بھی بات کی ہے۔ یہ کہا ہے کہ کوئی عورت سکندر نام کے کسی شخص کو پوچھتی ہوئی آئے تو اسے روک لیا جائے، اگر تم آسکتے ہو تو آجاؤ۔ ہم چل کر دیکھ لیتے ہیں۔"
"میں آتا ہوں۔ آدھے گھنٹے میں۔" میں نے ڈوبتے دل کے ساتھ کہا اور ریسیور رکھ دیا۔ دکان دار کو... پیسے دیے اور باہر آگیا۔ میرا ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔ میرے لیے یہ تصور کرنا مشکل تھا کہ رابعہ اس وقت کس سڑک پر اور کس سمت میں رواں ہوگی۔
وہ ہر ایک سے پوچھتی پھرے گی کہ تم نے سکندر کو تو نہیں دیکھا؟ تم نہیں جانتے میرے سکندر کو؟ غزالاں تم تو واقف ہو کہ مجنوں کے مرنے کی۔ دیوانہ مر گیا آخر تو ویرانے پہ کیا گزری۔ کہیں نہ کہیں رابعہ کو پہچان لیا جائے گا۔ کوئی اس سے پوچھ بیٹھے گا کہ تم وہی رابعہ قاری ایڈووکیٹ ہو نا؟ وہ اقرار کرے گی۔ اور تم اس سکندر بخت کو تلاش کر رہی ہو نا؟ وہ پھر اقرار کرے گی کہ ہاں میں اسی سکندر بخت کو تلاش کر رہی ہوں جو میرا محبوب ہے۔ میری تمنا ہے اور جستجو ہے لیکن دنیا کسی رابعہ کے محبوب سکندر کو نہیں جانتی۔ ایک مفرور اور مطلوب مجرم سکندر بخت کو جانتی ہے۔ ایمر جنسی وارڈ میں ہر جگہ پولیس ضرور موجود ہوتی ہے۔ وہ اس نام کو بھولے نہیں ہوں گے یہ ایک لاکھ روپے کے نوٹ کا نام ہے۔ یہ سکندر بخت کو گرفتار کرانے والے کا انعام ہے۔ میں ڈاکٹر لطیف کے ساتھ کسی اسپتال میں رابعہ کو تلاش کرتا پھروں گا۔ وہ مجھے دوسرے اسپتال میں پوچھتی پھرے گی۔ ایک اسپتال سے دوسرے اسپتال۔ پیدل۔ جسمانی تھکن کے احساس سے بے نیاز۔ بھوک پیاس سے بے پروا۔ رات کے اندھیرے سے بے خوف۔ اندھیرے میں گھومنے والے بھوکے ہوسناک بھیڑیوں کے وجود سے بے خبر۔ اس شہر کی سڑکوں پر وہ رات بھر چلتی رہے گی اور میں رات بھر اس کی تلاش میں سرگرداں رہوں گا مگر کہیں کسی راستے پر میرا اس کو یا اس کا مجھے دیکھ لینا مشکل ہوگا۔ عملاً ناممکن۔ اس کا چانس ایک لاکھ کے مقابلے میں ایک کا بھی نہیں۔ خصوصاً اندھیری سڑکوں پر۔ اور کون جانے اس شب کی سحر ہونے تک کون کہاں پہنچے۔ وہ اور میں الگ الگ پکڑے جائیں اور شکاری ہمیں ایک دوسرے سے بہت

دور، کبھی نہ ملنے کے لیے پسِ دیوارِ زنداں پہنچادیں۔ مگر اب مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ رابعہ کے علاوہ میں سب کچھ بھلا بیٹھا تھا۔ انجام کچھ بھی ہو، مجھے اس کو تلاش کرنا ہوگا۔
"غالب۔" میں نے اپنی جگہ پہنچ کے وائرلیس پر کہا۔ "میں جا رہا ہوں۔"
"یار، وہ نازو کا پہلا پیغام ملا ہے ابھی ابھی...!"
"غالب! رابعہ پاگل پن میں ڈاکٹر لطیف کے گھر سے نکل گئی ہے اور اسپتالوں میں مجھے ڈھونڈتی پھر رہی ہے۔" میں نے کہا۔
"نازو نے مجھے بتایا ہے کہ...!"
"اگر وہ بھٹکتی رہی تو مشکل میں گرفتار ہو جائے گی۔" میں نے پھر اس کی بات کاٹ دی۔ "میں ڈاکٹر لطیف کے ساتھ جا رہا ہوں۔ اسے تلاش کرنے۔"
"تم بھی پاگل ہو گئے ہو کیا؟" غالب نے برہمی سے کہا۔ "رابعہ ہی سب کچھ نہیں ہے، نازو بھی ہے۔"
"میرے لیے رابعہ ہی سب کچھ ہے۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "اس کے بغیر میں خود بھی کچھ نہیں ہوں۔ میں جا رہا ہوں۔"
"ایم آر ایس کا یہ مشن تمھارے ذہن کی پیداوار تھا۔" غالب نے مشتعل ہو کے کہا۔ "اب تم یہ سننے کے روادار بھی نہیں کہ نازو نے کیا کہا ہے۔ اس کو تم نے ہی بھیجا تھا اس جہنم میں...!" وہ بولتا رہا مگر میں نے نہیں سنا۔ سڑک کے دوسرے کنارے پر میں نے ایک رکشے کو سواریاں اتارتے دیکھا۔ میں ادھر ادھر دیکھے بغیر رکشا پکڑنے کے لیے سڑک عبور کرنے لگا۔ بائیں طرف سے آنے والی ایک تیز رفتار گاڑی کے ڈرائیور نے پوری قوت سے بریک لگائے۔ گاڑی کے پہیے جام ہو گئے اور پھر سڑک سے رگڑ کھا کے چیختے ہوئے، گاڑی کے بھاری وجود کو اپنی ہی قوت میں گھسیٹتے ہوئے اور اپنے پیچھے ایک سیاہ لکیر چھوڑتے ہوئے بڑھتے گئے۔ میں نے گاڑی کی چندھیا دینے والی روشنی کو یوں دیکھا جیسے شکار ہونے والا کمزور جانور شکاری چیتے کی انگارا آنکھوں کو روبرو دیکھتا ہے اور مفلوج ہو جاتا ہے۔ گاڑی نے ٹکر مارنے کے بعد مجھے اوپر اچھال دیا۔ میں فضا میں تھوڑا سا بلند ہوا۔ درد کی شدید لہر نے میری ٹانگیں بے کار کر دی تھیں چنانچہ میں نیچے آیا تو پیروں پر نہ اتر سکا۔ میں تار کول کی پکی سڑک پر پتھر کی طرح گرا۔ مجھے یقین تھا کہ اب اپنی کم ہوتی ہوئی رفتار کے باوجود وہی گاڑی کچھ اور آگے آ کے میرے جسم پر سے گزرے گی مگر ایسا نہیں ہوا۔ ایک لمحے کے لیے میں نے ان گنت روشنیاں دیکھیں۔ ستاروں کی روشنی۔ سڑک پر رواں دواں گاڑیوں کی روشنی۔ بجلی کے کھمبوں کی روشنی۔ پھر روشنی کے دائرے سے بن گئے اور گھومنے لگے۔ مدھم پڑنے لگے۔ میرے کانوں نے آوازوں کا شور سنا جو رفتہ رفتہ معدوم ہو گیا۔
آنکھ کھلی۔ تھوڑی سی کھلیں تو میرے سامنے روشنی میں سائے سے تیرنے لگے۔ مکھیوں کی بھنبھناہٹ جیسی آوازیں میرے کان سے ٹکرائیں۔ میں نے پلکیں جھپکا کے دیکھا۔ سائے واضح ہو گئے۔ وہ سب انسانی ہیولے تھے۔ ان کے لب ہل رہے تھے اور الفاظ کہیں کہیں سے سنائی دینے لگے تھے۔
"کس طرح... دیکھیے... دماغ پر چوٹ... عارضی اثرات۔"
"خطرے کی بات...!"
"نہیں... دماغ کے اندر جھلی میں... جھٹکا لگتا ہے تو دماغ ہل جاتا ہے... اور اس سے بے ہوشی... وقتی اثر... بالکل وقتی۔ آٹھ سے بارہ گھنٹے میں ہوش آنا چاہیے۔"
"اور نہ آیا تو؟" اب میں نے بالکل واضح طور پر ایک عورت کی آواز سنی۔
"خدا پر بھروسا رکھیں۔ آخر ہم ڈاکٹر ہیں۔ کچھ علم اور کچھ تجربہ رکھتے ہیں اور ہمارے لیے یہ پہلا کیس نہیں ہے۔"
"کیا کسی طرح بھی ذہن متاثر ہوگا؟" وہی عورت بولی۔
"ابھی تو آثار نہیں ہیں۔" مرد نے کہا۔ "سب رسپانس نارمل ہیں۔"
"میرا مطلب تھا یادداشت۔" عورت نے کہا۔
"اس کا پتا تو ہوش میں آنے کے بعد چلے گا۔" وہ یقیناً کوئی ڈاکٹر تھا۔
اتنی دیر میں میری آنکھیں بھی سایوں کو شناخت کرنے لگی تھیں۔ اجالے کے رخ مجھے رابعہ کا چہرہ دکھائی دینے لگا تھا۔ میں نے آہستہ سے سر گھمایا اور دوسری طرف دیکھا۔ ڈاکٹر پلٹ کر جا رہا تھا۔ اس نے ایک دروازہ کھولا اور غائب ہو گیا۔ بند کمرے کی تنہائی میں میرے ساتھ صرف رابعہ رہ گئی۔ میں نے اس کمرے کو، اپنے بستر کو اور لائٹس کو دیکھا۔ میری ناک نے دواؤں کی مخصوص بو کو محسوس کیا اور ایک دم مجھے یاد آگیا کہ میرے ساتھ کیا ہوا تھا۔ اب میں کسی اسپتال میں تھا مگر رابعہ! کیا اس کار سے ایکسیڈنٹ کے بعد رابعہ مجھے یہاں لائی تھی؟
"رابعہ!" میں نے اس کی طرف دیکھ کر آہستہ سے کہا۔
"سکندر!" رابعہ نے فرطِ مسرت سے چیخ ماری اور بیڈ پر بیٹھ کر میرے ہاتھ کو مضبوطی سے اپنے دونوں ہاتھوں کی گرفت میں لے لیا۔ "خدا کا شکر ہے۔" وہ میرے ہاتھ کو اپنی آنکھوں سے لگا کے رونے لگی۔ اس کے گرم آنسو میرے ہاتھ کو جلانے لگے۔ "یہ خدا کا احسان ہے مجھ پر... اس نے دعا سن لی میری... تم نے مجھے پہچان لیا۔"
"رو کیوں رہی ہو؟" میں نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہیں کی۔ "میں تو نہیں رو رہا تھا۔ جب تم میرے ساتھ تھیں اور میں تمھیں تلاش کر رہا تھا۔ تم تو مجھے چھوڑ گئی تھیں۔"

"میں خود ہی آگئی۔ انھوں نے مجھے روک رکھا تھا۔ قید کر رکھا تھا اور وہ مجھ سے جھوٹ بولتے تھے۔" رابعہ نے روتے روتے کہا۔ "وہ مجھے آنے دیتے تو میں بہت پہلے تم کو تلاش کر لیتی۔ مجھے معلوم تھا کہ تم زخمی ہو۔ کسی حادثے کا شکار ہوئے ہو لیکن ڈاکٹر لطیف مجھ سے غلط بیانی کرتے رہے۔ کہتے رہے کہ تم کو کچھ بھی نہیں ہوا... میرا دل جھوٹ نہیں بولتا تھا۔ میں جانتی تھی کہ وعدہ کرنے کے باوجود تم کیوں نہیں آئے تھے۔"

"لیکن تم... تم یہاں کیسے آگئیں؟" میں نے کہا۔ "یہاں مجھے کون لے کر آیا تھا؟"

"یہ سب تو مجھے معلوم نہیں۔ لیکن میں تم کو تلاش کرتی پھر رہی تھی ہر اسپتال میں... اور یہاں پہنچی تو میں نے تمھیں پا لیا۔ میری محبت نے مجھے یہ راستہ دکھایا اور یہاں لے آئی۔ اب تم فکر نہ کرو۔ میں یہاں ہوں۔ تم بہت جلد اچھے ہو جاؤ گے۔ بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

"اور تم... تم ٹھیک ہو؟" میں بھونچکا رہ گیا۔ یہ محبت کی معجزہ نمائی تھی جس نے وقت کے ہر لمحے کا اور سارے راستوں کا تعین کیا تھا۔ اسی محبت نے سب سے پہلے رابعہ کو خبر دی تھی کہ سکندر کی گاڑی ایک حادثے میں تباہ ہوئی ہے۔ اسے رات کے دو بجے جگا کے یہ خبر سنائی تھی۔ اگر اس رات ڈاکٹر لطیف نے رابعہ کا راستہ نہ روکا ہوتا تو شاید وہ ٹھیک اس جگہ پہنچ جاتی جہاں میں تھا۔ محبت کا یہ قطب نما جذبۂ دل کی قوت پر راہنمائی کرتا تھا۔ اس نے بالآخر رابعہ کو رہائی دلائی اور اسے وہاں پہنچا دیا جہاں میں سچ مچ ایک حادثے کا شکار ہو کے اسپتال کے بستر پہ لیٹا تھا اور کسی کو معلوم نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں۔ خود غالب کو اس حادثے کی خبر نہیں تھی جو مجھ سے سو میٹر کے فاصلے پر موجود تھا لیکن اس وقت قدرت نے راستوں کو وقت کے لمحوں سے ملانے کا نیا اہتمام کیا۔ اس نے مجھے فون کرنے بھیجا اور یوں مجھے نیم دیوانگی کی کیفیت میں حادثے سے دوچار کیا۔ ٹھیک وقت پر پسِ پردہ رہنے والے تقدیر کے ہاتھ نے مجھے اس اسپتال میں پہنچایا اور عین اسی وقت رابعہ کی تلاش اور اس کی قیدِ تنہائی اور دیوانگی تمام ہوئی۔ اس نے مجھے زخمی پایا اور یکلخت اس کے دماغ نے دل کی بات مان لی۔ یہ تسلیم کر لیا کہ سچ وہی تھا جو دل کہتا تھا۔ وہ حقیقت تھی اس کا تصور نہیں تھا اور فریبِ خیال نہیں تھا جیسا کہ ڈاکٹر لطیف نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ اس کے دل اور دماغ کے درمیان جاری رہنے والی کشمکش باقی نہ رہی۔ اس نے دیکھ لیا کہ میں واقعی زخمی ہوں لیکن میری حالت تشویشناک نہیں ہے۔ میں شدید زخمی نہیں ہوں۔

اسپتال کے کسی ڈاکٹر نے یقیناً اسے میرے ساتھ ہی دیکھا ہوگا۔ اسی لمحے وہ رابعہ کو میری حالت کے بارے میں تفصیل سے بتا رہا تھا۔

"تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔" میں نے کہا۔

"میں نے بتایا نا، مجھے بھلا کیا ہوا تھا جو تمھیں میرے بارے میں اتنی تشویش ہے؟"

"یہ اسپتال کون سا ہے؟" میں نے کہا۔

"البرٹ وکٹر اسپتال۔" وہ بولی۔ "اس سے پہلے میں میو اسپتال میں دیکھ چکی تھی اور گنگا رام اسپتال ہو آئی تھی۔"

"تم میرا نام پوچھتی پھر رہی تھیں؟" میں نے پریشان ہو کے کہا۔ مجھے ڈاکٹر لطیف کی بات یاد آگئی تھی کہ انھوں نے سب اسپتالوں کو میرا نام لے کر کچھ پوچھنے والی عورت کو روکنے کی ہدایت کر دی ہے۔ ان میں البرٹ وکٹر اسپتال بھی شامل تھا۔

"کیا میں اتنی احمق ہوں؟" رابعہ نے مسکرا کے کہا۔ "میں خود تمھیں دیکھتی پھر رہی تھی۔"

"تم واقعی احمق ہو۔" میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ "ان دو اسپتالوں میں کتنے وارڈ ہیں۔ کتنا پھرنا پڑا ہوگا تمھیں۔"

"زیادہ نہیں۔ میو اسپتال میں ایمرجنسی اور ہڈیوں کے وارڈ دیکھے کیونکہ میرا خیال تھا کہ ممکن ہے حادثے میں تمھاری ہڈیاں ٹوٹ گئی ہوں۔" وہ بولی۔

"کسی نے روکا نہیں تمھیں؟" میں نے کہا۔

"روکتا کیوں؟" وہ حیران ہو کے بولی۔ "ملاقات کا وقت تھا۔ سب ہی آجا رہے تھے۔"

"اور یہ سب فاصلہ تم نے پیدل ہی طے کیا؟"

"ہاں... مگر یہ فاصلہ ہی کتنا ہے۔" وہ بولی۔ "میں ڈاکٹر لطیف کے گھر سے نکلتے ہوئے اپنا پرس لینا بھول گئی تھی۔"

یہ فاصلہ کم نہیں تھا۔ رابعہ نے میلوں کی مسافت طے کی تھی لیکن اسے احساس نہیں ہوا تھا۔ خوشی مجھے اس بات کی تھی کہ اس حادثے کو بہانہ بنا کے قدرت نے اسے پھر مجھ سے ملا دیا ورنہ میں بھی وہی سمجھ رہا تھا جو دنیا کا خیال تھا کہ اب شاید وہ لوٹ کر نہ آسکے۔

"رابعہ! میں یہاں لیٹا نہیں رہ سکتا۔" میں نے کہا۔ "کیا کسی نے بھی یہاں میرا نام نہیں پوچھا۔ یہ تو پرائیویٹ کمرہ ہے۔"

"ہاں تم کو وہی گاڑی والا لایا تھا۔ جس کی کار سے تمھاری ٹکر ہوئی تھی۔ اس نے بتایا کہ تم دیوانہ وار سڑک پار کرنے کے لیے بھاگے تھے۔" رابعہ نے کہا۔ "نیک دل آدمی تھا۔ پانچ ہزار یہاں بھی جمع کرا گیا تھا۔ اور تمھارے تکیے کے نیچے بھی دس ہزار چھوڑ گیا۔ اس نے تمھارا نام فرخ لکھوایا تھا۔"

میں نے تکیہ اُٹھا کے دیکھا۔ اس کے نیچے واقعی دس ہزار موجود تھے۔ وہ آدمی نیک تھا یا نہیں، پیسے والا ضرور تھا اور پیسے کا صحیح استعمال بھی جانتا تھا۔ اس نے خود کو پولیس کیس سے بچانے کے لیے پیسہ فراخدلی سے استعمال کیا تھا۔ شاید اس نے کہا ہوگا کہ یہ میرا چھوٹا بھائی ہے جس کو سڑک پر کوئی شخص گاڑی سے ٹکر مار کے بھاگ گیا۔

"آخر وہ تھا کون؟" میں نے کہا۔ "اور پھر گیا کہاں؟"

"مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں گیا۔ جب میں نے تمھیں دیکھا تو میں رک گئی اور ڈاکٹر مجھ سے ہی بات کرتا رہا۔" رابعہ نے کہا۔ "کوئی پولیس آفیسر تھا۔ رضوی..."

میں ایک دم اٹھ بیٹھا۔ رضوی؟ ایس ایس پی رضوی؟ کیا انھوں نے مجھے پہچانا نہیں تھا؟ کیا رابعہ کو یاد نہیں کہ رضوی نام کا پولیس افسر کون ہوگا؟

"رابعہ! سوچ کے بتاؤ وہ ایس ایس پی تو نہیں تھا؟" میں نے کہا۔

"تمھارا مطلب ہے انکل ضامن رضوی تو نہیں تھے؟" رابعہ مسکرائی۔ "یہ تو تمھارے سوچنے کی بات ہے۔ وہ ہوتے تو کیا تمھیں یوں چھوڑ جاتے اور اُن کے پاس شاید بنک میں پندرہ ہزار ہوں گے تو اپنی تنخواہ میں سے بچائے ہوئے ہوں گے۔ وہ پندرہ ہزار جیب میں نہیں لیے پھرتے۔ ان کے پاس حرام کی کمائی نہیں ہوتی کہ اس طرح پھینک کر بھاگ جاتے۔"

"کیا تم نے اس پولیس افسر کو دیکھا تھا؟"

"نہیں... وہ اسی وقت گیا تھا جب میں پہنچی تھی۔" وہ بولی۔ "میرے آنے سے چند ہی منٹ پہلے۔ لیکن جو کچھ مجھے ڈاکٹر نے بتایا، اس سے میں نے اندازہ کر لیا کہ وہ انسپکٹر کے عہدے کا کوئی افسر تھا اور اس نے حادثے کی ذمے داری سے بچنے کے لیے یہ سب کچھ کیا ہوگا۔"

"وہ مجھے ٹکر مار کے بھاگ بھی سکتا تھا۔" میں نے کہا۔

"یقیناً کوئی ایسی بات ہوگی کہ وہ رُکنے پر مجبور ہوا۔" رابعہ بولی۔ "وہاں ٹریفک زیادہ ہوگا۔ مجمع لگ گیا ہوگا۔ وہ ہوشیار آدمی تھا اور خود پولیس میں تھا اس لیے پریشان نہیں ہوا۔ فوراً تمھیں اپنی گاڑی میں ڈال کے چل پڑا۔ لوگ اس کی شرافت اور احساسِ ذمے داری سے متاثر ہوئے ہوں گے اور مطمئن ہو کے منتشر ہو گئے ہوں گے یا ممکن ہے اس کے ساتھ بھی دو زیادہ جوشیلے اور ہر معاملے میں آگے رہنے والے ہمدرد قسم کے لوگ بیٹھ گئے ہوں۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔" میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ "وہ اپنی چالاکی اور حاضر دماغی سے بچ گیا لیکن میرا خیال ہے کہ اس کی بدحواسی کی وجہ سے میں بچ گیا۔ یہاں آ کے اس نے بڑی مستعدی اور انسان دوستی کا مظاہرہ کیا ہوگا۔ فوراً ایمرجنسی وارڈ میں ایمرجنسی پھیلا دی ہوگی کہ سب کو چھوڑو... پہلے اس زخمی کو دیکھو۔ ساتھ آنے والے بعد میں متاثر ہوئے ہوں گے اور جب وہ پندرہ ہزار دے کر اور مجھے داخل کرا کے گیا ہوگا تو شاید اس پولیس انسپکٹر کی نیت پر شک کرنے والے شرمندہ اور مطمئن ہو کے پہلے ہی جا چکے ہوں گے۔"

"تم چاہو تو ڈاکٹر سے بات کر لو۔" رابعہ نے ایک نوجوان کو اندر آتے دیکھ کر کہا۔ نوجوان صرف اسٹیتھسکوپ کی وجہ سے ڈاکٹر نظر آتا تھا، ورنہ حلیے سے وہ نئی نسل کا نمائندہ تھا۔

"ہیلو!" وہ خوش دلی سے مسکرایا۔ "لُکنگ فائن۔"

"خدا کا شکر ہے ڈاکٹر صاحب... آئی فیل فِٹ۔" میں نے کہا۔

ڈاکٹر نے نفی میں سر ہلایا۔ "اگر تم چاہتے ہو کہ میں تم کو فِٹ قرار دے کر ڈسچارج کر دوں تو یہ مشکل ہے۔ تم ٹھیک نہیں.. بلکہ بہتر ہو... اس حد تک کہ ہوش میں آگئے ہو لیکن تم کو کم سے کم مزید دو دن یہاں رہنا ہوگا۔"

"کسی وجہ کے بغیر...؟"

"وجہ کو ہم سمجھتے ہیں۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "ہوش کا یہ وقفہ عارضی بھی ہو سکتا ہے۔ تم کو انڈر آبزرویشن رکھنا ضروری ہے۔ میں ذاتی طور پہ پہلے بھی مطمئن تھا کہ بے ہوشی کا اثر عارضی ہے لیکن اولڈ مین مجھ سے متفق نہیں تھا۔"

"کون اولڈ مین؟" میں نے کہا۔

"ہمارے سینئر ڈاکٹر۔ ایسوسی ایٹ پروفیسر آف نیورو سرجری جن کے پاس دس ڈگریاں ہیں مگر سب آؤٹ آف ڈیٹ۔"

"کیا ڈگری بھی آؤٹ آف ڈیٹ ہو جاتی ہے فیشن کی طرح؟"

"آف کورس... علم میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ تحقیق دن رات جاری ہے اور دنیا بھر کے دوا ساز ادارے ریسرچ پر زیادہ سے زیادہ رقم صرف کر رہے ہیں۔" ڈاکٹر نے ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اس سے پرانے نظریات بدل گئے ہیں۔ بعض نظریات اُلٹ گئے ہیں۔ میں اسپرین کی مثال دیتا ہوں۔ پہلے کہا گیا کہ اس سے دل پہ بُرا اثر پڑتا ہے۔ اب ثابت ہوا ہے کہ اسپرین دل کے دورے سے بچاتی ہے۔ یہ سب ریسرچ کا نتیجہ ہے مگر یہ پرانی ڈگریاں رکھنے والے محض نام کے دام وصول کر رہے ہیں۔ بڑی بڑی فیس لے کر اور بڑے بڑے عہدے سنبھال کر مطمئن ہیں۔ یہ طب اور میڈیسن میں نئے رجحانات سے ناواقف ہیں اور نئی معلومات سے استفادہ کرنے کے لیے پڑھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ حالانکہ ایک ڈاکٹر کی معلومات بالکل وقت کے ساتھ رہنی چاہئیں۔ اسے نئی دواؤں کے بارے میں، نئے امراض کے بارے میں اور امراض کے نئے اسباب کے بارے میں سب معلوم ہونا چاہیے۔ اس کے لیے محنت کرنی پڑتی ہے۔ پڑھنے کے لیے وقت نکالنا پڑتا ہے اور ان لوگوں کے پاس وقت نہیں ہے۔ یہ چوبیس گھنٹے پیسہ کما رہے ہیں۔ دو گھنٹے ایک پرائیویٹ کلینک میں تو دو گھنٹے دوسرے میں۔ ہر جگہ ڈگریوں سے متاثر ہونے

والے مریض منتظر ملتے ہیں۔ لوگوں کے یقین کا یہ حال ہے کہ وہ دس دس دن بعد کی ڈیٹ لینا قبول کرتے ہیں مگر ہم جیسے نوجوان ڈاکٹروں سے مشورہ کرنا پسند نہیں کرتے۔ اُن کے خیال میں ہم ناتجربہ کار، غیر ذمے دار اور احمق ہیں۔ حالانکہ ہم لوگ آج کے دَور کی مکمل معلومات رکھتے ہیں۔ ہم میں زیادہ انرجی ہے اور زیادہ جذبہ ہے۔ ہم ترقی کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے محنت کر رہے ہیں۔ ہم ان بوڑھے ڈاکٹروں کی بھی سنتے ہیں اور ان کے تجربے کو نظرانداز نہیں کرتے مگر اپنے جدید ترین ذخیرۂ معلومات سے زیادہ فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ جو ان بوڑھوں کے پاس نہیں ہے۔"

"تم ان سینیئر ڈاکٹروں سے بہت خفا ہو۔" مَیں نے ہنس کر کہا۔

"مَیں ہی نہیں... یہ ہم سب نئی نسل کے ڈاکٹروں کا المیہ ہے۔" نوجوان ڈاکٹر نے کہا۔ "یہ سینیئر ہمیں اپرنٹس سمجھتے ہیں۔ جیسے ہم ابھی زیرِتعلیم ہیں اور ہماری ڈگری بھی بوگس ہے۔ انھوں نے اپنے ناموں سے اور ڈگریوں کی قطار سے ایک امیج بنا رکھا ہے اور اپنی اجارہ داری قائم کر رکھی ہے۔ مَیں یہ نہیں کہتا کہ سب سینیئر ڈاکٹر ایک سے ہوتے ہیں۔ کچھ یقیناً اپنی نالج کو اپڈیٹ رکھنے کے لیے وہ سب لٹریچر پڑھتے ہوں گے جو دواساز کمپنیوں کی معرفت ان تک پہنچتا رہتا ہے اور جس سے نئے نظریات و رجحانات اور نئی دواؤں کے بارے میں مفصل معلومات مل جاتی ہیں۔ مگر اکثریت اس کی زحمت نہیں کرتی۔ کیا ضرورت ہے انھیں جبکہ عزت، شہرت اور دولت اس کے بغیر ہی حاصل ہے۔ مَیں شرط لگا سکتا ہوں کہ ان میں سے کچھ بڈھے طوطے پرانا پڑھا ہوا بھی بھول گئے ہوں گے اور ان کے پاس تجربہ ہی تجربہ ہے۔ علم نہیں ہے یا ہے تو اس کی افادیت مشتبہ ہے۔ آج ان کا پھر امتحان لیا جائے تو یہ فیل ہو جائیں۔"

مجھے بے اختیار ہنسی آئی۔ "کیا یہ مبالغہ نہیں ہے؟"

"نہیں۔ مَیں ایک مثال دیتا ہوں۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "اگر تم بُرا نہ مانو۔ اور آپ بھی خاتون... تو مَیں ایک سگریٹ پی لوں۔"

"ضرور پییں۔" مَیں نے حیران ہو کے کہا۔ "بلکہ اجازت ہے تو مجھے بھی دے دیں۔"

"اجازت ہوتی تو نہیں اسپتالوں میں۔" رابعہ نے دبے دبے لہجے میں کہا۔

"سب فضول باتیں ہیں... قواعد و ضوابط... ریڈ ٹیپ۔" وہ سگریٹ کیس نکال کے بولا۔ "ٹھیک ہے بھئی آپریشن تھیٹر میں پابندی ہونی چاہیے۔ جنرل وارڈ میں ٹھیک ہے کہ دوسرے بھی ہوتے ہیں وہاں جو اس کی بُو سے الرجک ہوں۔ اسٹور میں یا آفس میں بھی پابندی ٹھیک ہے۔ لیکن یہ ایک پرائیویٹ کمرہ ہے۔ یہاں ڈاکٹر اور مریض دونوں سگریٹ پیتے ہیں تو کسی کو نقصان نہیں ہو سکتا۔ دُھواں اس کمرے میں رہے گا اور اس کھڑکی سے باہر نکل جائے گا۔

ہاں تمھاری صحت کے لیے سگریٹ یا اس کا دُھواں مُضر ہوتا تو میں خود تمھیں یہ حرکت نہ کرنے دیتا۔" اُس نے بیک وقت دو سگریٹ جلائے اور ایک کش لگانے کے بعد ایک سگریٹ مجھے تھما دیا۔ مجھے وہ نوجوان اور بے تکلف ڈاکٹر اچھا لگا۔

"دراصل میں بہت تھک گیا تھا۔" وہ بولا۔ "اس لیے دیر تک رک گیا ہوں۔ اولڈ مین صرف ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ ہے۔ اس کا صرف یہ کام ہے کہ دن میں دو چکر لگائے اور دیکھے کہ سب ٹھیک ہے یا نہیں؟ ڈاکٹر ایک ٹانگ پر کھڑے ہیں یا نہیں؟ نرسیں دوڑی بھاگی پھر رہی ہیں یا نہیں؟ کہیں وہ آپس میں زیادہ رومانٹک تو نہیں ہو رہے ہیں۔"

اب رابعہ کو بھی ہنسی آئی۔ "کیا اُن کا رومانٹک ہونا جرم ہے؟"

"ان کا رومانٹک ہونا سخت جرم ہے۔ اُن کو ہر وقت ڈاکٹر اور نرس رہنا چاہیے۔ یہ بھول جانا چاہیے کہ وہ مرد و عورت ہیں۔" ڈاکٹر نے اسی لہجے میں کہا۔ "قواعد و ضوابط یہاں بھی ظالم سماج سے کم نہیں حالانکہ مَیں سمجھتا ہوں کہ اگر ایک ڈاکٹر کسی نرس کو پسند کرتا ہے یا نرس کسی ڈاکٹر کو چاہتی ہے تو وہ ایک اچھی ٹیم بنتے ہیں۔ اس نرس کو کسی ایسے ڈاکٹر کے ساتھ لگا دو جس کی صورت سے وہ چڑتی ہو اور ڈاکٹر کو اس نرس کے ساتھ نتھی کر دو جس کو دیکھ کر اُسے وحشت ہوتی ہو۔ تو کیا وہ ایک دوسرے سے تعاون کر سکیں گے، نو سر... وہ زبردستی ڈیوٹی تو دیں گے مگر انتہائی بددلی کے ساتھ۔ ایک دوسرے کو چاہنے والے نرس اور ڈاکٹر ایک شفٹ کے ساتھ کو ایک خوشگوار ساتھ سمجھتے ہوئے کوشش کریں گے کہ ان کا ساتھ قائم رہے۔ چنانچہ وہ مستعد رہیں گے اور کسی کوتاہی کے مرتکب نہیں ہوں گے۔ یہاں ایسا ہوا ہے کہ کسی ڈاکٹر نے کسی ایک نرس کے ساتھ شفٹ پر اصرار کیا اور دو چار مرتبہ ایسا ہوا تو بن جائے گا افسانہ اور اولڈ مین کے کانوں تک بات پہنچے گی تو وہ فوراً فلمی ہدایت کار کی طرح کہے گا... کٹ... اور رومانٹک سین وہیں ختم۔ اگلے دن ایک بیزار ٹیم بنا دی جائے گی۔ ایک دوسرے سے بیزار، مریضوں سے بیزار... قواعد و ضوابط سے بیزار۔ یو سی مسٹر فرخ۔ یہ پورا معاشرہ ایک انقلاب مانگتا ہے۔ جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو۔ علامہ اقبال کے کہنے کے مطابق۔"

مَیں ہی نہیں، ڈاکٹر کی گفتگو سے رابعہ بھی متاثر ہوئی تھی اور معلوم نہیں کیا بات تھی کہ وہ میرے کمرے میں دم لینے رکا تھا اور اس نے اتنی بے تکلفی سے اظہارِ خیال کیا تھا جیسے ہم پرانے شناسا ہیں اور ہم خیال ہیں۔

"تم سے مل کر خوشی ہوئی۔ ورنہ عموماً لوگ ڈاکٹر، وکیل اور گورکن وغیرہ سے مل کر خوش نہیں ہوتے۔" مَیں نے کہا۔

وہ ہنسا۔ "مَیں کوشش کرتا ہوں کہ مریض اور ڈاکٹر کے درمیان قربت اور ذاتی تعلق پیدا کروں۔ عموماً ان کے درمیان فاصلہ رہتا ہے۔ مریض خود کو بے بس اور ڈاکٹر کے رحم و کرم پر سمجھتا ہے اور ڈاکٹر کے لیے وہ ایک نمبر ہوتا ہے۔ وہ مریض کو نام سے نہیں، بیڈ نمبر سے پکارتے ہیں۔ چھ نمبر کی کیا پوزیشن ہے۔ دس نمبر کو ڈرپ لگا دو۔ بارہ نمبر کے ساتھ کون ہے اس سے کہو خون کا بندوبست کرے۔ یہ نمبر دی رہتے ہیں۔ اس پر مریض بدلتے رہتے ہیں۔ سال میں دس بیس یا چالیس پچاس بار چھ نمبر آئیں گے اور چلے جائیں گے۔ اس سے مریض کو بھی احساس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر اس کے مقابلے میں ایک بہت بڑی اور عظیم طاقت ہے جس کی خوشنودی میں شفا بھی ہے اور زندگی بھی۔ جو ہمارے بنیادی عقائد کے خلاف بھی ہے مگر اس سے مریض اور ڈاکٹر میں دوستانہ اعتماد کی فضا پیدا ہو ہی نہیں سکتی اور مریض کھل کر بات نہیں کرتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ مریض پریشانی میں بہت سی فضول باتیں بھی کرتا ہے مگر بعض اوقات اس کی باتوں سے ہی ڈاکٹر بہت کچھ سمجھ لیتا ہے۔ مَیں اسی لیے زیادہ بولتا ہوں۔ اولڈ مین بہت ریزرو رہتا ہے اور مجھے سنجیدہ رہنے کی تلقین کرتا رہتا ہے۔"

"آپ نے ابھی تک خود کو متعارف نہیں کرایا۔" رابعہ بولی۔

"اور یہ جو مَیں اتنی دیر سے بول رہا ہوں۔ کیا یہ تعارف نہیں ہے؟" ڈاکٹر نے کہا۔ "آپ کا مطلب غالباً نام سے ہے۔ تو میرا نام ڈاکٹر فرخ ہے۔"

"فرخ؟" مَیں نے چونک کر رابعہ کی طرف دیکھا۔

"چونکیے نہیں۔" ڈاکٹر مسکرایا۔ "مجھے معلوم ہے کہ آپ کے شوہر کا نام بھی فرخ ہے۔ مگر دنیا فلمی اتفاقات سے بھری پڑی ہے۔"

رابعہ کا رنگ ذرا سی دیر کے لیے گلابی ہوا مگر یہاں ڈاکٹر کی بات سننے والا میرے سوا کوئی نہ تھا چنانچہ وہ چپ رہی۔

"اس پر مجھے یاد آیا۔" مَیں نے کہا۔ "کہ اسپتال والوں کو میرا نام کس نے بتایا تھا؟"

"اس نے جو تمھیں داخل کرانے آیا تھا۔" وہ بولا۔

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ ایک پولیس انسپکٹر تھا... رضوی۔" مَیں نے کہا۔

"تمھیں کس سے معلوم ہوا ہے؟" وہ بولا۔

"ان سے۔" مَیں نے رابعہ کی طرف اشارہ کیا۔

"ان سے!" وہ ہنسا۔ "یہ بھی خوب ہے... ہمارے یہاں میاں بیوی کتنے تکلف سے کام لیتے ہیں۔ بیویاں بھی نام لینے کے بجائے کہتی ہیں، ان کا یہ خیال ہے، وہ یہ کہہ رہے تھے۔ ایسے بجائے کہو کہ میری بیوی سے معلوم ہوا ہے۔ بیوی کو بیوی کہنا کون سا غیراخلاقی فعل ہے یا گناہ ہے... خوامخواہ کا ایک کمپلیکس ہے۔"

"آل رائٹ... میری بیوی نے بتایا تھا مجھے۔" مَیں نے مسکرا کے کہا۔

"مَیں نے بھی سُنا تھا۔" رابعہ نے جلدی سے کہا۔

"مگر مَیں نے اُسے دیکھا تھا۔" ڈاکٹر اطمینان سے بولا۔ "وہ ایک عیار اور جھوٹا آدمی تھا... مجھے اس کے انسپکٹر ہونے پر بھی شک تھا۔"

"کیوں؟" مَیں اس انکشاف پر حیران ہوا۔ "کیا وہ وردی میں نہیں تھا؟"

"نہیں۔ اُس نے کہا کہ مَیں انسپکٹر رضوی ہوں اور یہ میرا بھائی ہے فرخ رضوی۔" ڈاکٹر بولا۔ "کوئی اسے گاڑی سے ٹکر مار کے بھاگ گیا تھا... اسے فوراً دیکھیں۔"

"بالکل ٹھیک اندازہ تھا تمھارا..." مَیں نے کہا۔ "اسی بدمعاش نے تو ٹکر ماری تھی مجھے۔ پھر خود ہی یہاں لایا اور چھوڑ کر بھاگ گیا۔"

ڈاکٹر نے اقرار میں سر ہلایا اور سگریٹ کے آخری ٹکڑے کو کھڑکی سے باہر اچھال دیا۔ پھر کھڑکی کی طرف لپکا۔ "مائی گڈنس، ابھی باہر سے اولڈ مین گزر رہا ہوتا تو دھماکا ہوتا۔ اگر سگریٹ اس کے سامنے بھی جا گرتی۔ وہ بارود کا بنا ہوا ہے۔"

رابعہ اس کی بات پر ہنسی۔ "آپ اسے اولڈ مین کہتے ہیں۔ وہ آپ کو کس نام سے پکارتا ہے؟"

"ینگ فول۔" ڈاکٹر فرخ نے پھر کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "مَیں بات کر رہا تھا اس انسپکٹر کی جو جعلی تھا۔ جب وہ تم کو لے کر آیا تو مَیں ڈیوٹی پر تھا۔ ہم مریض کو اٹینڈ کرتے ہیں۔ اسے لے کر آنے والے کے بارے میں تفتیش نہیں کرتے۔ یہ کام پولیس کرتی ہے۔ غالباً اسی لیے وہ فوراً انسپکٹر بن گیا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ پُراعتماد آدمی تھا۔ اس نے بغیر مانگے پانچ ہزار جمع کرا دیے۔"

"دس ہزار وہ میرے پاس بھی چھوڑ گیا تھا۔" مَیں نے کہا۔

"باسٹرڈ! رشوت دے کر نکل گیا۔" ڈاکٹر فرخ نے کہا۔ "تاہم مَیں نے اُسے دیکھا تھا۔"

"تم اس کا کچھ حلیہ وغیرہ بتا سکتے ہو؟" مَیں نے کہا۔

"ہاں... وہ ڈارک براؤن سوٹ میں تھا۔ تیس پینتیس سال عمر ہو گی۔ قد درمیانہ اور جسم قدرے بھاری۔" ڈاکٹر بولا۔ "یہ بہت عام حلیہ ہے۔ میرا مطلب ہے اس کی شخصیت کا کوئی بہت نمایاں پہلو نہیں تھا۔"

"کیا کسی نے اس کی گاڑی نہیں دیکھی؟"

"مشکل ہے..." اس نے کہا۔ "گاڑیاں تو سب پارکنگ لاٹ میں کھڑی کرتے ہیں۔ یہاں وارڈ کے سامنے وہ ایک منٹ کے لیے رکا ہو گا۔ صرف اتنی دیر جتنی دیر میں تم کو اتارا جا سکے۔"

"اس کے ساتھ کوئی اور بھی تھا؟" مَیں نے کہا۔

"تھا تو سامنے نہیں آیا... وہی آگے آگے تھا تمام معاملات میں اور ضرورت سے زیادہ شور کر رہا تھا۔" ڈاکٹر فرخ نے کہا۔ "خود

کو اصلی انسپکٹر ثابت کرنے کے لیے... میری اس سے جھڑپ بھی ہوئی تھی، بکم طرفہ۔ میں نے اس کو ڈانٹ کر کہا کہ یہ اسپتال ہے تھانہ نہیں... اگر تم ڈی ایس پی کیا ڈی آئی جی ہو تب بھی اپنی آواز سے مجھ پر رعب مت جھاڑو اور عملے کو ہراساں مت کرو، ورنہ میں ایک منٹ میں تم کو باہر پھینک دوں گا... بقلم خود۔"

"بقلم خود؟" میں نے ہنس کر کہا۔ "کیا تم ایسا کر سکتے تھے؟"

"میں ایک بار ایسا کر چکا ہوں۔" ڈاکٹر فرخ نے کہا۔ "بعد میں وہ انسپکٹر معطل ہو گیا تھا... یو سی... میرے ساتھ جو لوگ کام کرتے ہیں وہ ہمیشہ میرے دوست ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ میرا رویہ اُن کے ساتھ دوستانہ رہتا ہے۔ ڈونٹ مائنڈ اِٹ لیڈی۔ نرسوں کے ساتھ یہ رویہ کچھ عاشقانہ ہو جاتا ہے۔ اس کے بہت سے فائدے ہیں مگر صرف پیشہ ورانہ... ان سب نے میرے حق میں گواہی دی کہ انسپکٹر نے مجھے گالیاں دی تھیں اور تھپڑ مارا تھا۔ جب کہ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔"

"پھر کیا ہوا تھا؟" رابعہ نے ہنستے ہنستے کہا۔

"وہی... اس نے مجھے ترڑی دی۔ میں نے کہا کہ اُٹھا کے باہر پھینک دوں گا... وہ تھا ڈھائی من کا۔ کہنے لگا کہ ہمت ہے تو پھینک کر دکھاؤ۔ میں نے اس کی خواہش پوری کر دی۔ وہ برآمدے کی سیڑھیوں پر جا کے گرا اور لڑھک کر نیچے جا لیٹا۔ میری ٹیم کے ارکان اُسے اسٹریچر پر ڈال کے اُٹھا لائے اور وارڈ میں لے گئے۔" وہ بولا۔

"تم دیکھنے میں تو نارمل نہیں لگتے۔" میں نے کہا اور بے ساختہ ہنسا۔

"دیکھنے میں تو میں ڈاکٹر بھی نہیں لگتا۔" وہ بولا۔ "میں پہلوان بننا چاہتا تھا لیکن اکھاڑوں میں کشتی کم تھی، بدمعاشی زیادہ... پھر میں نے باکسر بننے کی کوشش کی اور اس کا ثبوت میری ناک ہے۔" اس نے ربر کی محسوس ہونے والی ناک کو دونوں طرف موڑ کر کہا۔ "مجھے بچپن سے خواہش تھی کہ کسی سے مار نہ کھاؤں لیکن میں ذرا کمزور تھا چنانچہ سب سے پٹتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں نے جسمانی طاقت کو کارآمد بنانے کے ہر فن میں ٹانگ اڑائی لیکن بالآخر وہی جوڈو کراٹے کا فن کام آیا جس میں میرا جسمانی طور پر بہت صحت مند ہونا ضروری نہیں تھا۔ بس پھرتی کی ضرورت تھی۔ چار سال تک یعنی ایم بی بی ایس کے آخری چار سالوں میں سخت پڑھائی کے ساتھ میں نے اس فن میں مہارت حاصل کرنے کے لیے بھی سخت محنت کی۔ حالانکہ اس زمانے میں محنت سے زیادہ وقت نکالنے کا مسئلہ ہوتا ہے۔ یہاں پر بلیک بیلٹ وغیرہ تو ایسے ہی مل جاتی ہے۔ بس میں خود مطمئن ہو گیا کہ اب مجھ سے زیادہ صحت مند چار آدمی مل کے بھی میری پٹائی نہیں کر سکتے۔ میرے بچپن کا کمپلیکس کام آ گیا۔ احساسِ کمتری میں مبتلا افراد اکثر کسی غیر معمولی صلاحیت کا مظاہرہ کر کے دنیا کو حیران کر دیتے ہیں... یہی میں نے بھی کیا۔"

"یو آر اے ونڈر فل مین۔" میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ اس جعلی انسپکٹر کا نام بھی رضوی نہیں ہو گا۔"

ڈاکٹر فرخ ہنسا۔ "مجھے تو یہ بھی معلوم ہے کہ تمہارا نام بھی فرخ نہیں سکندر بخت ہے۔"

ایک لمحے کے لیے میرے دل کی دھڑکن رُک گئی۔ میرا اوپر کا سانس اوپر رہ گیا اور نیچے کا نیچے۔ میں پلکیں جھپکانا بھی بھول گیا اور میں نے ڈاکٹر فرخ کی طرف دیکھا جو اتنا بڑا دھماکا کر کے بھی اسی طرح پُرسکون بیٹھا تھا۔ خود رابعہ کا رنگ اُڑ گیا تھا اور وہ ساکت و صامت بیٹھی تھی۔

"یہ... یہ کس نے بتایا تمھیں؟" میں نے بالآخر خود کو سنبھالا۔

"ڈاکٹر لطیف نے۔ وہ ایک زمانے میں میرے استاد تھے اور میں آج بھی ان کا احترام کرتا ہوں۔" ڈاکٹر فرخ نے کہا۔ "تم دونوں پریشان کیوں ہو گئے؟"

"پریشان... نہیں... اس میں پریشانی کی کون سی بات ہے میں خود تمھیں بتانے والا تھا کہ..."

"غلط۔ تم چاہتے تھے کہ تمہارا اصلی نام کسی کو معلوم نہ ہو۔" ڈاکٹر فرخ نے کہا۔ "تم فرخ بنے ہوئے تھے اور فرخ ہی رہنا چاہتے تھے۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو!" میں نے ایک واجبی سی کوشش کی۔

"مائی ڈیئر سر! تم تو بے ہوش تھے۔" وہ بولا۔ "لیکن تمہاری وائف تو ہوش میں تھی۔ اس نے ایک بار بھی تردید نہیں کی کہ میرے شوہر کا نام غلط لکھ دیا گیا ہے۔ اور اتنی دیر سے تم باتیں کر رہے ہو۔ تم نے بھی نہیں کہا کہ تمہارا نام فرخ نہیں ہے۔ میں نے جانتے بوجھتے اپنا نام فرخ بتایا تھا۔ صرف تمہارا ردِعمل دیکھنے کے لیے۔ تم چونکے تھے اور میرے کہنے پر تم نے اسے ایک فلمی اتفاق مان لیا تھا۔ یعنی تسلیم کر لیا تھا کہ تمہارا نام بھی فرخ ہے۔ اس سے تصدیق ہو گئی تھی کہ تم اپنی شناخت چھپانا چاہتے ہو... آخر کیوں؟"

"تم بہت چالاک آدمی ہو ڈاکٹر۔" میں نے برہمی سے کہا۔

"اس دنیا میں بے وقوف آدمی کے لیے جگہ نہیں رہی اب۔" وہ بولا۔ "چالاک لوگ کامیاب ہیں اور ان کا مقابلہ کرنے والے اصول پرست، وضعدار اور ضمیر شناس۔ آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی پر عمل کرنے والے احمق ملتے جاتے ہیں اور ہر جگہ ناکام رہتے ہیں۔ امید ہے میری صاف گوئی کا تم بُرا نہیں مانو گے... میں منافقت کا قائل نہیں... میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں تو بہت سیدھا سادا... بے ضرر اور شریف آدمی ہوں۔"

"میں کسی حد تک اسی فلسفے کی افادیت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوں۔" میں نے کہا۔ "اس لیے میں انکار نہیں کروں گا کہ میں اپنی شناخت چھپا رہا تھا... کیوں چھپا رہا تھا؟ اس کے اسباب

پرائیویٹ ہیں۔"

"پولیس پرائیویٹ اسباب کی دلیل نہیں مانتی۔"

"کیا مطلب! پولیس کا اس معاملے سے کیا تعلق ہے؟" میں نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پا کے کہا۔

"حادثہ پولیس کیس ہوتا ہے لیکن ابھی تک اس کی رپورٹ پولیس کو نہیں دی گئی ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "تمہاری بیوی نے ایک بار بھی نہیں کہا کہ اس جعلی انسپکٹر کے خلاف رپورٹ کرنی چاہیے۔"

"کیا یہ تمہارا فرض نہیں تھا؟" میں نے کہا۔

"تھا۔ مگر مجھے اندازہ ہوا کہ خود ڈاکٹر لطیف یہ نہیں چاہتے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "انھوں نے مجھ سے تمہارے متعلق نہیں پوچھا تھا اور نہ کچھ کہا تھا۔ اُن کا فون آیا تھا کہ کیا رابعہ قاری نام کی کوئی عورت کسی سکندر بخت کو پوچھتی اسپتال پہنچی ہے۔ میں نے کہا کہ یہ رابعہ قاری کون ہے؟ وہی ایڈووکیٹ؟ تو ڈاکٹر لطیف نے کہا کہ ہاں، اگر وہ آئے تو اس کو روک لینا۔ شی اِز ناٹ نارمل۔ لیکن مجھے اس کی طرف سے بہت تشویش ہے۔ میں نے کہا کہ آپ فکر نہ کریں۔ اس فون کے آنے کے پندرہ منٹ بعد تم کو لایا گیا۔ اور تمھیں لانے والا تمہارا نام فرخ لکھوا کے بھاگ گیا۔ آدھے گھنٹے بعد تمہاری بیوی پہنچی۔ اور حسبِ توقع اس نے پوچھا کہ یہاں کوئی سکندر بخت تو نہیں ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ رابعہ قاری ایڈووکیٹ ہیں؟ انھوں نے تسلیم کیا تو میں ان کو مختلف وارڈز میں لے گیا۔ تمہارے کمرے میں پہنچتے ہی ان کے ردِعمل سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ نارمل نہیں ہیں۔ ان کو شاید یاد بھی نہ ہو۔ انھوں نے میری موجودگی کی پروا کیے بغیر چیخ ماری تھی اور تمہارا نام لیا تھا۔ اور ان کا رویہ بالکل ویسا ہی تھا جیسا کہ ایک محبت کرنے والی بیوی کا ہونا چاہیے۔ میں نے ڈاکٹر لطیف کو اطلاع دے دی کہ رابعہ یہاں ہے اور بالکل خیریت سے ہے۔ اور وہ سکندر بخت کے پاس ہے۔ ایک گھنٹے بعد وہ آ پہنچے تھے اور انھوں نے سامنے آئے بغیر رابعہ کا کیس ڈسکس کیا تھا۔"

"صرف رابعہ کا؟" میں نے کہا اور رابعہ کی طرف دیکھا۔

"صرف رابعہ کا۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "انھوں نے کہا کہ رابعہ کو یہاں رہنے دو جب تک سکندر یہاں ہے۔ اس سے فائدہ ہوا ہے۔ شی اِز نارمل ناؤ۔ پھر وہ چلے گئے تھے۔"

"جانے سے پہلے انھوں نے یہ نہیں بتایا تھا کہ رابعہ میری بیوی نہیں ہے؟" میں نے اطمینان کا سانس لے کر کہا۔

"بیوی نہیں ہے؟" ڈاکٹر نے بوکھلا کے کہا۔ "اوہ نو... پھر کون ہے؟ خیر میرا یہ سوال بھی غلط ہے... بیوی نہ سہی... ان کا ایک جذباتی تعلق ہے آپ سے جو بہت گہرا ہے۔ اور واضح ہے۔ تم نے دیکھا کہ ایک ڈاکٹر جب کسی مریض سے دوستانہ طرزِ عمل اختیار کرتا ہے تو اس سے باتوں باتوں میں وہ سب معلوم کر سکتا ہے جو براہِ راست تفتیش سے معلوم نہیں ہو سکتا۔ مریض ایک دم محتاط ہو جاتا ہے اور کچھوے کی طرح اپنی ذات کے خول میں سمٹ جاتا ہے۔ بہر حال تمھیں مجھ سے کوئی خطرہ محسوس نہیں کرنا چاہیے۔"

"خطرہ... خطرہ کیوں محسوس کروں گا میں؟" میں نے کہا لیکن مجھے یہ احساس ہوا کہ اس بہت ذہین ڈاکٹر سے حقیقت نہیں چھپائی جا سکتی اور اگر میں نے دفاعی کھیل نہ کھیلا تو وہ میرا سارا کھیل چوپٹ کر دے گا۔

"وہی آدمی اپنی شناخت چھپاتا ہے جسے اپنی اصلیت ظاہر کرنے میں خطرہ محسوس ہو۔" ڈاکٹر بولا۔ "تم کہتے ہو کہ اس کے پرائیویٹ اسباب ہیں... میں مان لیتا ہوں۔ صرف اس لیے کہ میں ڈاکٹر ہوں سراغرساں نہیں ہوں ورنہ اسباب بھی معلوم کر لیتا... مس رابعہ! آپ ابھی تو یہیں ہیں کیونکہ یہ دو دن یہاں ہیں۔ ہو سکتا ہے، کل صبح ڈاکٹر لطیف آئیں۔ میری باتوں سے پریشان ہونے کی قطعی ضرورت نہیں مسٹر سکندر بخت۔ میں وہ آدمی ہوں کہ اگر تم مجھ پر بھروسا کرنا چاہو تو فائدے میں رہو گے۔ تم اگر کسی کو قتل کر آئے ہو یا جیل سے بھاگے ہو تب بھی مجھے بے خوف ہو کے بتا سکتے ہو۔ کم سے کم میری زبان سے ایک لفظ کسی اور تک نہیں پہنچے گا۔ میرے لیے ہر مریض پہلے ایک آدمی ہے۔ پھر مریض اور اس کے بعد وہ کچھ بھی ہو۔ وِش یو بیسٹ آف لک۔" وہ ایک دم اُٹھا۔

"ڈاکٹر..." میں نے کہا۔ "جانے سے پہلے اپنا اصل نام بھی بتاؤ۔"

"اِٹ اِز ڈاکٹر حکیم۔" وہ مسکرایا۔ "ویری فنی نیم فار اے ڈاکٹر۔"

"ڈاکٹر اور حکیم۔" میں نے اس کے چلے جانے کے بہت دیر بعد کہا۔ "کیا یہ آدمی بھی اپنے نام کی طرح عجیب نہیں تھا؟"

"مجھے وہ عجیب نہیں خطرناک لگا۔" رابعہ نے ڈرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "وہ بہت کچھ جانتا ہے۔"

"اس نے کہا ہے کہ وہ قابلِ اعتماد بھی ہے۔" میں نے اُسے تسلی دی۔

"ہم اس طرح ہر ایک کے کہنے پر اعتماد کا مظاہرہ نہیں کر سکتے۔"

"رابعہ! کیا تمھیں یاد ہے کہ تم ڈاکٹر لطیف کے گھر میں کیوں تھیں؟" میں نے کہا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "تم اور غالب وہاں آتے تھے، تم بتاؤ؟"

"اچھا اس سے پہلے کیا ہوا تھا؟" میں نے کہا۔

"کب کیا ہوا تھا؟"

"جب میں تم سے ملا تھا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا..." میں نے کہا۔ "دلاور نے جو کچھ کیا۔ تم کو محسن اور شعلہ... استاد شیدی یاد ہیں؟"

"یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟" رابعہ نے پریشانی سے کہا۔ "کل

تم پوچھو گے کہ میرا نام بتاؤ... یہ پوچھو گے کہ مجھے اپنا نام یاد ہے۔ اپنے والدین کا نام یاد ہے؟"

میں یہ سوال بہت پہلے کرنا چاہتا تھا لیکن ڈاکٹر حکیم کی موجودگی میں مجھے صرف رابعہ کے رویئے پر غور کرنے کا موقع ملا تھا۔ اس سے میں اتنا تو سمجھ گیا تھا کہ وہ نارمل ہو گئی ہے۔ اب مجھے کوئی شک نہیں رہا کہ اس کی یادداشت بھی بحال ہو چکی ہے۔ میرے ساتھ پیش آنے والے ایک حادثے کے بعد اس کا مجھ سے ملنا اس کی شفا کا بہانہ بن گیا تھا... یہ سب تقدیر کے کھیل تھے۔ قدرت نے اُسے جس طرح پہلے ملایا تھا اسی طرح پھر ملا دیا تھا، ورنہ وہ مجھے کھو بیٹھی تھی اور میں اس سے مایوس تھا۔ میرا حادثے میں زخمی ہونا بھی اچھا ہی ہوا۔ نہ میں زخمی ہو کے یہاں پہنچتا، نہ رابعہ کو نظر آتا۔ وہ نہ جانے کہاں کہاں مجھے تلاش کرتی پھرتی اور بالآخر نہ جانے کہاں پہنچتی۔

مجھے اس وقت یہ خیال بھی آیا کہ میں رابعہ سے ان واقعات کے بارے میں سوال کروں جن کے نتیجے میں اس کی یادداشت متاثر ہوئی تھی مگر میں نے اس تلخ حقیقت کے حوالے سے گریز کیا۔ پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسد۔ میں ڈرا کہ کہیں اس بات کے ذکر سے رابعہ کے ذہن پر خود فراموشی یا پاگل پن کے اس دورے کا اثر پھر نہ ہو جائے۔

"دیکھو رابعہ! یہ میری خوش قسمتی ہے کہ ابھی تک کسی نے مجھے پہچانا نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن میں یہاں دو دن نہیں رک سکتا۔ میں ایک انتہائی اہم کام کو ادھورا چھوڑ آیا تھا... مجھے یہاں سے جانا ہے... ابھی اور اسی وقت۔"

"تم مجھے چھوڑ کر نہیں جاؤ گے!" وہ سہم کر بولی۔ "میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔"

"ضرور چلو لیکن مجھے یہ بتاؤ کہ یہاں سے نکلیں گے کیسے؟" میں نے کہا۔ "ڈاکٹر حکیم بہت چالاک آدمی ہے۔ اسے دھوکا دینا بہت مشکل ہوگا۔"

"تم ہی کچھ سوچو۔" رابعہ نے کہا۔

"ایک طریقہ تو یہ ہے کہ میں اسے رازدار بنا لوں۔ وہ آدمی اچھا ہے اور اس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ لیکن عقل کہتی ہے کہ اتنی جلدی کسی پر بھروسا کر لینا خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔ ہمارے حالات ایسے ہیں کہ اچھی طرح جانے اور پرکھے بغیر ہمیں کسی کو بھی دوست اور مددگار نہیں بنانا چاہیے۔ دوسرا طریقہ مشکل اور خطرناک تو ہے مگر..."

"مگر کیا؟" رابعہ نے مجھے سوچ میں دیکھ کر کہا۔

"سوچتا ہوں کہ وہ سچ مچ جوڈو کراٹے کا ماہر ہوا اور مجھ پر بھاری پڑا تو کیا ہوگا؟" میں نے کہا۔ "دشمن کو کمزور سمجھنے کی غلطی نہیں کرنا چاہیے۔"

"تم اسے زبردستی مغلوب کرنے کی سوچ رہے ہو؟" رابعہ نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔ "اسپتال میں مار دھاڑ کرو گے؟"

"اگر اور کوئی ترکیب کارگر نہ ہوئی تو پھر یہی ایک راستہ رہ جائے گا۔" میں نے کہا۔ "میرا یہاں رکنا ناممکن ہے۔ اب تک میری عدم موجودگی سے نہ جانے کتنا نقصان ہو چکا ہوگا۔ غالب تو پریشان ہی مشتعل تھا کہ میں نازو کو مصیبت میں پھنسا کے جا رہا ہوں۔"

"نازو مصیبت میں ہے... تمہاری وجہ سے؟" رابعہ چونکی۔

"ہاں، میری وجہ سے۔ وہ میری ہی تجویز تھی جس پر عمل کیا تھا اس نے۔" میں نے کہا۔ "محسن اور شہلا الگ پریشان ہوں گے کہ میں کچھ بتلائے بغیر اور مشن کو ایسے نازک مرحلے میں چھوڑ کے کہاں غائب ہو گیا۔"

"یہ تم کس مشن کی بات کر رہے ہو؟" رابعہ پریشان ہو کر بولی۔

"دیکھو رابعہ! بہت سی باتیں ہیں جو میں تم کو یہاں اور اس وقت نہیں بتا سکتا۔" میں نے کہا۔ "جب تم گھر چلو گی تو محسن بتا دے گا۔ یا اس کی بیوی سے اپنی غیر حاضری کے سارے واقعات سن لینا۔"

"سکندر، تم مجھے پاگل کر دو گے۔" رابعہ نے کہا۔ "میں کب غیر حاضر تھی اور یہ محسن کی بیوی کون ہے؟"

"میری بات غور سے سنو۔" میں نے اُسے اپنے قریب بٹھا لیا۔ "تم کو آخری بات کیا یاد ہے؟"

"مجھے؟... مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ مجھے اور شہلا کو کچھ لوگ اغوا کر کے لے گئے تھے..." وہ بولی۔

"ہاں... اور تم کو وہاں سے نازو نے نکالا تھا۔" میں نے کہا۔

"یہ بھی مجھے یاد ہے۔ مگر اس کے بعد کیا ہوا تھا؟ کیا نازو نے مجھے ڈاکٹر لطیف کے گھر پہنچا دیا تھا؟" رابعہ نے کہا۔

"ابھی تم یہی سمجھ لو کہ تب سے تم ڈاکٹر لطیف کے گھر میں تھیں۔" میں نے کہا۔ "اور تمہاری یادداشت کھو گئی تھی۔"

"میری یادداشت کھو گئی تھی؟" وہ دہشت زدہ ہو گئی۔

"ہاں۔ اس حد تک کہ تم مجھے بھی پہچاننے سے قاصر تھیں۔" میں نے کہا۔ "تمہاری یہ غیر حاضری ذہنی تھی۔ تم ہمارے ساتھ پیش آنے والے بہت سے واقعات سے بے خبر ہو۔ ان کا خلاصہ بھی پیش کرنا چاہوں تو گھنٹوں لگ جائیں گے۔ اب تم ٹھیک ہو تو تمہیں درمیانی مدت میں اپنے ساتھ ہونے والی کوئی بات یاد نہیں۔ تمہارا علاج ڈاکٹر لطیف کر رہے تھے۔ جب تم وہاں زیر علاج تھیں تو محسن کے والد کا انتقال ہو گیا۔"

"انکل شیروانی کا؟" رابعہ کی صورت پر افسردگی چھا گئی۔

"ہاں۔ اور جب محسن گیا تو شہلا سے شادی کر کے اسے اپنے ساتھ لے آیا۔" میں نے کہا۔ "شہلا کو وہاں چھوڑنا مشکل تھا۔ اس کے علاوہ مرحوم انکل شیروانی کی وصیت یہی تھی۔ سوئم کے بعد فوزیہ کے گھر سے شہلا کی رخصتی ہوئی اور وہ دونوں اچانک میاں بیوی کی حیثیت سے آ پہنچے۔ ہم تو خود بھی دم بخود رہ گئے تھے۔"

"اور مجھے یقین کرنا مشکل ہو رہا ہے کہ شہلا اب محسن کی بیوی بن گئی ہے۔ کہاں ہیں وہ دونوں؟" رابعہ نے اشتیاق اور مسرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ کہا۔

"ہم انہی کے گھر میں ہیں۔" میں نے کہا۔ "میں اور استاد ٹیڈی اور مرزا غالب۔ ہم سب نے ایک پلان بنایا تھا۔ ملاور اینڈ کمپنی کے خلاف۔ اور نازو کو آگے رکھا تھا۔ غالب اس کے ساتھ تھا اور میں غالب کے ساتھ لیکن اس کے بعد اچانک میرے ساتھ حادثہ پیش آ گیا اور میں غالب کو بتائے بغیر یہاں آ لیٹا۔ میری مدد کے بغیر غالب بھی نازو کی مدد نہیں کر سکتا اور ہمارے پورے مشن کا بیڑا غرق ہو سکتا ہے۔ ابھی زیادہ دیر تو نہیں ہوئی۔ لیکن بارہ گھنٹے بھی بہت ہوتے ہیں... خدانخواستہ نازو کو کچھ ہوا تو میں تمام عمر خود اپنی نظر میں مجرم ہو جاؤں گا۔ میں کبھی خود کو معاف نہ کر سکوں گا۔ میں اس کے احسانات کے بوجھ تلے پہلے ہی اتنا دبا ہوا ہوں کہ ایک بار نہیں تین بار جنم لوں تو اس کا قرض ادا کر سکوں گا۔ اس ایک زندگی میں تو یہ قرض اتر نہیں سکتا۔"

"لوگ سات جنم کی بات تو محاورتاً کرتے ہیں۔ یہ تین جنم کی کیا بات ہوئی؟" رابعہ بولی۔

"اس کا، دو بار میری زندگی کو اپنی جان کی بازی لگا کے بچانے کا قرض ہے۔" میں نے کہا۔ "دونوں مرتبہ وہ زخمی ہوئی اور مر بھی سکتی تھی۔ تیسری بار وہ جان پر کھیل کر تمہیں بچا لائی۔ تم بھی میری زندگی ہو۔ اس لیے نازو کے احسانات کا قرض اتارنے کے لیے مجھے کم سے کم تین بار مر کے جینا ہوگا۔ پھر بھی شاید سود رہ جائے کیونکہ وہ جذبہ میں کہاں سے لاؤں گا جس نے نازو کو اپنے ہی بھائی کے مقابل کھڑا کر دیا تھا۔" میں نے کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ ہم پہلے سے نکل جائیں۔ میں تم کو شہلا کے پاس چھوڑ دوں گا۔ وہاں تم اطمینان سے سارے واقعات اور پورے مشن کی تفصیلات سن لینا... اور وہیں یہ بھی بتا دینا کہ نازو تم کو کس طرح نکالنے میں کامیاب ہوئی تھی۔"

"یہ ڈاکٹر لطیف کون ہیں؟... میرا مطلب ہے میں وہاں کیوں تھی؟ کیا وہ نازو کو جانتے تھے؟" رابعہ نے کہا۔

"نہیں۔ وہ غالب کے والد کے دوست تھے... بہت زبردست آدمی ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ان کے گھر کے سوا کوئی جگہ ایسی نہیں تھی جہاں تمہیں رکھا جا سکتا۔ خصوصاً اس حال میں کہ تمہیں کچھ بھی یاد نہیں تھا۔ اب انھوں نے ڈاکٹر حکیم سے کہا ہے کہ رابعہ کو کہیں نہ جانے دیا جائے تو یہ ڈاکٹر تمہیں نکلنے دے گا اور نہ مجھے۔" میں نے کہا۔ "مجھے وہ کم سے کم دو دن اور یہاں رکھنے پر مُصر ہے۔ ویسے بھی وہ کچھ تجسس میں مبتلا ہو گیا ہے کہ میں نے اپنی شناخت بدلنے کی ضرورت کیوں محسوس کی۔"

"تمہارا کیا خیال ہے کہ اس نے باہر پہرا بٹھا رکھا ہوگا؟"

"پہرا بٹھانا تو مشکل ہے۔" میں نے کہا۔ "ممکن ہے اس نے چوکیدار کو ہدایت کر رکھی ہو۔ تم ذرا باہر کا ایک راؤنڈ لگاؤ... یہ دیکھو کہ فرار کے کتنے راستے ہیں۔ خود باہر جانے کی کوشش کرو۔"

رابعہ نے اقرار میں سر ہلایا اور دروازہ کھول کے باہر نکل گئی۔ اس نے دروازہ دوبارہ بند کر دیا تو میں اس کمرے میں اکیلا رہ گیا۔ میں نے کھڑکی تک جا کے دیکھا۔ اس میں فلائی پروف جالی تھی۔ میں نے جالی پر ہاتھ پھیر کے دیکھا۔ اُسے ایک چھری سے بھی کاٹا جا سکتا تھا اور مُکا مار کے پھاڑا بھی جا سکتا تھا مگر کھڑکی کے بالکل سامنے ایک گارڈن لائٹ تھی۔ اس کے نیچے بنچ پر دو مریض بیٹھے تھے۔ مختصر سے لان میں ایسی چھ بنچیں تین طرف لگی ہوئی تھیں اور اُن سب پر مریض کھلی ہوا کا لطف اٹھا رہے تھے۔ سردی کا زمانہ گزر چکا تھا اور شام بڑی خوشگوار ہوتی تھی۔ لان کے دوسرے کنارے پر ایک کیمسٹ کی دکان تھی اور اس طرف سے کھڑکی توڑ کے نکلنا رات کے بارہ بجے سے پہلے ناممکن نہ سہی مشکل ضرور تھا۔ یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ میں شور مچانے یا راہ میں حائل ہونے والے ہر شخص کو ناک آؤٹ کرتا جاؤں اور باہر نکلتے ہی کسی رکشا کو پکڑ لوں۔ میں رابعہ کو بھی اپنے ساتھ لے جا سکتا تھا مگر اس کے بعد رابعہ بڑی مشکل میں پڑ جاتی۔ وہ اپنے محسن ڈاکٹر لطیف کے سامنے بھی نہ جا پاتی۔ ڈاکٹر حکیم ان کو پوری رپورٹ دے دیتا کہ وہ کس طرح سکندر کے ساتھ فرار ہو گئی تھی۔

دروازہ کھلا تو میں نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ رابعہ لوٹ آئی تھی۔ اس کا چہرہ مایوسی کی تصویر بنا ہوا تھا۔

"کیا ہوا؟" میں نے کہا۔ "پکڑ لیا کسی نے؟"

"ہاں... اسے اتفاق کہو یا کچھ اور... کوریڈور میں ہی سامنے سے ڈاکٹر حکیم آ رہا تھا۔ کہنے لگا کہ خیریت؟ کدھر کا ارادہ ہے؟ میں نے کہا کہ ایسے ہی کمرے میں گھبرا گئی تھی۔ وہ میرے ساتھ ہو لیا کہ چلیے کچھ دیر باغ میں ٹہلتے ہیں۔ میں بھی فارغ ہوں اس وقت۔ مجھے مجبوراً جانا پڑا۔ دس منٹ تک زبردستی اس کے ساتھ ٹہلتی رہی۔ عجیب آدمی ہے وہ بھی۔ یہاں کتنا بول رہا تھا۔ اب بالکل چپ۔ دو بار بولا تو یہ کہ مس رابعہ کچھ بات کیجیے۔

تنگ آ کے میں نے کہا کہ کیا موسم پر بات کروں۔ اور لوٹ آئی۔"

"کوئی بات نہیں۔ اتفاق ایک بار ہو سکتا ہے۔ دو بار ہو سکتا ہے مگر بار بار نہیں ہو سکتا۔" میں نے کہا۔ "پھر جاؤ... اور اگر وہ دوبارہ ملے تو اس کو جھاڑ دینا۔ کہہ دینا کہ میں تنہائی چاہتی ہوں۔ آپ خواہ مخواہ بے تکلف ہونے کی کوشش نہ کریں۔ لڑکیوں کے پاس شمعِ حسن کے پروانوں کی حوصلہ شکنی کے بہت بہانے ہوتے ہیں۔"

"اسے مت شامل کرو میرے پروانوں میں۔" رابعہ نے خفگی سے کہا۔

"ایک شمع روشن ہو تو پروانے کتنے آ جاتے ہیں مرنے والے۔ انھیں کوئی روک سکتا ہے بھلا؟" میں نے اُسے چھیڑنے کے لیے کہا اور وہ ناراضگی میں باہر نکل گئی۔

آدھے گھنٹے میں مجھے معلوم ہو گیا کہ ڈاکٹر حکیم کا سامنے سے نمودار ہو جانا کوئی اتفاق نہیں تھا۔ دوسری مرتبہ بھی وہ رابعہ کو بالکل اسی جگہ ملا اور پھر رابعہ کے ساتھ ہو گیا۔ رابعہ نے اسے پہلے شرافت سے کہا کہ وہ کچھ دیر اکیلی رہنا چاہتی ہے مگر اس نے کہا کہ یہ عمر اکیلی رہنے کی نہیں ہوتی اور آپ جیسی خاتون کو کیا ضرورت ہے اکیلی رہنے کی۔ رابعہ نے اُسے بے تکلفی سے باز رہنے کے لیے زیادہ سخت الفاظ میں کہا تو وہ سنجیدہ ہو گیا کہ مس رابعہ... میں ایک ڈاکٹر ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ تنہائی آپ کی ذہنی صحت کے لیے نقصان دہ ہے۔ تنہائی میں ذہن کو خیالات پریشان کرتے ہیں اور آدمی ڈپریشن کا شکار ہو سکتا ہے۔ ان حالات میں کہ مجھے ڈاکٹر لطیف نے آپ کا خیال رکھنے کو کہا ہے، میں کسی صورت آپ کو تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔ میرے مجبور کرنے پر رابعہ تیسری بار نکلی اور چند قدم چل کے لوٹ آئی۔ اس نے ڈاکٹر حکیم کو کسی جن کی طرح نمودار ہوتے دیکھ لیا تھا۔

"یہ معاملہ بے حد مشکوک ہو گیا ہے۔" میں نے رابعہ کی رونی صورت دیکھ کر کہا۔ "آخر اُسے کیسے علم ہو جاتا ہے کہ تم کمرے سے نکلی ہو... اور حد یہ ہے کہ وہ ملتا بھی اسی جگہ ہے۔ کیا وہ دروازے پر نظر رکھے کھڑا رہتا ہے کہ اُدھر سے تم چلے اور ہم اِدھر سے... اور ملاقات پھر اسی جگہ۔"

"کیسے دیکھتا رہتا ہے؟" رابعہ نے چڑ کے کہا۔ "کہاں سے دیکھتا رہتا ہے۔ سامنے تو سیدھا کوریڈور ہے اور اس کے دونوں جانب مریضوں کے کمرے ہیں۔ آخر میں وہ لاؤنج سا ہے جہاں رات کی ڈیوٹی پر مامور اسٹاف موجود رہتا ہے۔ ایک ٹیبل نرس کی ہے جس پر دو نرسیں اس وقت بھی بیٹھی ہوں گی۔ ایک بنچ ہے جس پر دو آیا ٹائپ عورتیں بیٹھی ہیں اور ایک طرف ڈاکٹر کا کمرہ ہے۔"

"کس ڈاکٹر کا؟" میں نے کہا۔

"جس کی بھی ڈیوٹی ہو۔" رابعہ نے کہا۔ "اس کا دروازہ کھلا ہے اور وہاں دوسرا ڈاکٹر موجود ہے۔ ایک لیڈی ڈاکٹر بھی ہے۔ اگر دروازے سے باہر نکل کے دیکھو تو تمھیں بائیں جانب بالکل سامنے دیکھنے سے نرس کی ٹیبل بھی نظر آئے گی اور لیڈی ڈاکٹر بھی۔ دائیں طرف بھی ایک کمرہ ہے جو غالباً اسٹور ہے۔ دوائیں وغیرہ ہیں اور سامانِ ضرورت ہے۔ بائیں جانب باہر جانے کا راستہ ہے۔"

"اور ڈاکٹر حکیم کس طرف سے آتا ہے؟"

"دائیں جانب سے۔ جدھر اسٹور ہے۔" رابعہ نے کہا۔ "کیا وہ اسٹور میں صرف ہماری نگرانی کے لیے موجود ہے؟ ایک ڈاکٹر اگر بلاوجہ اسٹور میں رہے گا تو کتنی دیر۔ کیا وہ ہماری چوکیداری پر مامور ہے؟ ہم قیدی ہیں؟ فرض کرو میں زبردستی باہر جانا چاہوں تو کیا وہ روک سکتا ہے مجھے؟"

"میرا خیال ہے ایک ڈاکٹر کے اختیارات کو اسپتال میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔" میں نے کہا۔ "وہ خود بھی آسانی سے تم پر قابو پا لے گا اور پھر کسی ایسی جگہ رکھ دے گا جہاں میں بھی نہ جا سکوں گا۔ یہاں کمرے بہت ہیں اور میں ہر کمرے میں جھانک کر کیسے دیکھ سکتا ہوں۔"

"سب سے بڑی بات یہ ہے سکندر کہ اس کو معلوم کیسے ہوتا ہے؟"

"یہی ہے غور طلب مسئلہ۔" میں نے کہا۔ "کیا تم چوتھی بار..."

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" رابعہ نے برہمی سے کہا۔ "میرا جھگڑا ہو جائے گا اس سے... ہنگامہ کر دوں گی میں۔"

"نہیں نہیں... ایسے نہیں۔" میں نے اُسے تسلی دی۔ "جوش سے نہیں، ہوش سے کام لو... اور مجھے ذرا سوچنے دو۔"

میں نے کمرے کی دیواروں کا جائزہ لیا۔ کسی دیوار کے کان نہیں تھے۔ پلاسٹر اور رنگ و روغن پرانا تھا۔ اگر اس کے نیچے کوئی خفیہ مائکروفون ہوتا تو مجھے بال برابر لکیر دیکھ کے بھی اندازہ ہو جاتا کہ کسی نے مہارت سے کچھ چھپایا ہے۔ مگر دو دن پہلے بھی کون میرے یہاں آنے کی پیش گوئی کر سکتا تھا۔ میرا یہاں آنا ایک حادثے کا نتیجہ تھا چنانچہ اس قسم کے انتظامات نہ پہلے سے کیے جا سکتے تھے اور نہ میری موجودگی میں ممکن تھے۔ میں نے لائٹس کو دیکھا۔ پنکھے پر غور کیا جس کے درمیان میں ایک گول چمکیلا سا دائرہ ہوتا ہے اُسے دبا کر کھولا جا سکتا ہے۔ تاکہ پنکھے میں گریس ڈالی جا سکے۔ میں نے اس کو انگلی سے بجایا اور پھر کھول کر دیکھا۔ اس کے نیچے تازہ بھری ہوئی گریس تھی۔ میں نے بستر کے نیچے اور بیڈ سائیڈ ٹیبل کی درازوں میں دیکھا۔ کہیں کچھ بھی نہیں تھا۔ میں مایوس ہونے لگا تھا کہ مجھے دروازے کا خیال آیا۔ میں نے اس کے ہینڈل کو گھمایا اور رابعہ کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ اس نے میرے ہاتھ کے اشارے کو سمجھتے ہوئے باہر جھانکا اور سر فوراً اندر کر لیا۔ میں نے دروازہ بند کر دیا۔

"کیا وہ پھر سامنے آ گیا تھا؟" میں نے کہا اور رابعہ نے اقرار میں سر ہلایا۔ میں بستر پر لیٹ گیا اور ڈاکٹر کے اندر آنے کا انتظار کرنے لگا لیکن وہ اندر نہیں آیا۔ وہ دروازے کے قریب تک آیا اور پھر لوٹ گیا۔ میں نے مکمل خاموشی میں اس کے قدموں کی چاپ سنی اور رابعہ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ آخر اس کے یوں آنے اور چلے جانے کا مقصد؟ وہ کون ہے؟ کس کے لیے یہ سب کچھ کر رہا ہے؟ کسی سوال کا یقینی جواب نہیں تھا مگر مجھے اسی طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھے بے بس و لاچار نہیں لیٹے رہنا تھا۔

میں نے گھٹنوں پر جھک کر ڈور لاک کا معائنہ کیا اور بڑی آسانی سے میں نے وہ باریک سا تار دریافت کر لیا جو دروازے کے گول گھومنے والے ہینڈل کے قفل سے نکل کر دروازے کی ایک جھری کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا مگر اس پر وہی پینٹ کر دیا گیا تھا جو دروازے پر تھا، چنانچہ بہت غور سے دیکھے بغیر اس تار پر کسی کی نظر پڑنے کا بالکل امکان نہیں تھا۔ میں نے تار کے اوپر انگلی پھیری اور میری انگلی پر کریم کلر کی لکیر سی بن گئی۔ باقی دروازے کا رنگ خشک تھا مگر تار پر نیا رنگ تھا۔ میں نے اُسے سونگھا۔ اس میں پینٹ یا اینمل کی بُو نہیں تھی۔ یہ خشک پاؤڈر کلر تھا جو بڑی صفائی سے تار کے اوپر پھیلا دیا گیا تھا۔ میں نے رابعہ کو تار کی طرف متوجہ کیا اور اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اس نے سر ہلایا اور واضح کیا کہ وہ سمجھ گئی ہے۔ میں نے انگلی سے زمین پر لکھا۔ "باتیں کرو۔"

"میں اب نہیں جاؤں گی۔" رابعہ نے زور سے کہا۔ "تم سمجھتے کیوں نہیں آخر۔ اِدھر میں باہر نکلتی ہوں اُدھر وہ آ پہنچتا ہے۔"

"اچھا اسی سے کہہ دو کہ مجھے کیا چاہیے۔" میں نے کہا۔

"یہ پش بٹن آخر کس لیے ہے۔" رابعہ نے کہا۔ "تم سگریٹ، چائے، کافی سب منگوا سکتے ہو۔"

"لیکن تم جانتی ہو... وہ چیز تمھارے سوا کوئی نہیں لا سکتا۔"

"پھر اس ڈاکٹر کو بلا کر کہہ دو۔" رابعہ نے کہا۔ "وہ لا دے گا۔"

"ڈاکٹر مجھے اسپتال میں شراب لا کے دے گا؟ تمھارا دماغ خراب ہے۔" میں نے کانوں کو ہاتھ لگا کے توبہ کی... مگر یہ سب ضروری تھا۔

"کل جو ملی تھی... سب پی گئے۔ اب میں کیسے باہر جاؤں۔ بس میں سو رہی ہوں۔" رابعہ نے کہا۔ "تم بھی سو جاؤ۔"

"اچھا بھئی، تمھاری مرضی۔" میں نے کہا اور لائٹ آف کر دی۔

"دو دن کی قید اور ہے... کاٹ لیں گے..." لیکن اس تمام عرصے میں جو کچھ میں کرتا رہا وہ سب رابعہ بڑی دلچسپی سے دیکھتی رہی۔ میں نے میز پر سے پھل کاٹنے والی چھری اٹھائی اور اس کی دھار کو آہستہ سے تار پر پھیر دیا۔ پتلا سا تار دو حصوں میں تقسیم ہو گیا مگر اپنی جگہ پر رہا۔ اس کے بعد ہم نے پندرہ منٹ خاموشی میں گزارے۔ ایک بار پھر کوئی آہستہ آہستہ چلتا ہوا عین دروازے تک آیا۔ چند سیکنڈ رکا اور مطمئن ہو کے لوٹ گیا۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ رات کے سوا گیارہ بجے تھے۔

"اب تیار ہو جاؤ۔" میں نے رابعہ سے سرگوشی میں کہا۔ "ہماری آواز اب کوئی نہیں سُن رہا ہے۔"

"پھر بھی وہ ہمیں سامنے سے گزرتا دیکھے گا۔"

"اس کا باپ بھی کچھ نہیں دیکھ سکتا۔" میں نے کہا اور چھری سے کھڑکی کی فلائی پروف جالی کاٹ دی۔ "اگر دروازے میں نصب مائکروفون کام کر رہا ہوتا تو یہ آواز بھی یقیناً ڈاکٹر حکیم کے کان سن لیتے۔ اب باہر پارک میں کوئی بھی نہیں تھا۔ اوائل مارچ کی خنکی کے باعث سب لیٹے اپنے کمروں میں جا چکے تھے اور کھڑکیاں بند کر چکے تھے۔ صرف کیمسٹ کی دکان کھلی ہوئی تھی لیکن وہ بھی کہیں اندر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے پہلے رابعہ کو باہر اتارا۔ پھر بستر کی چادر اپنے جسم پر اس طرح لپیٹ لی کہ میرا اسپتال کا لباس تقریباً چھپ گیا۔

"اب تم اطمینان سے باہر جاؤ۔" میں نے کہا۔ "اور کسی رکشا کو روکو۔ جب رکشا گیٹ پر آ جائے تو اندر آ کے مجھے اپنی صورت دکھا دینا۔ میں گیٹ پر نظر رکھوں گا۔ تم واپس جا کے رکشا میں بیٹھ جانا اور میرا انتظار کرنا۔ رکشا والے سے کہنا کہ مزنگ جانا ہے۔"

رابعہ آہستہ آہستہ آگے بڑھی۔ میں نے اسے پورے اعتماد کے ساتھ گیٹ سے باہر جاتے دیکھا۔ وہ اسپتال کے کپڑوں میں نہیں تھی چنانچہ چوکیدار نے اسے نہیں روکا۔ وہ عملے کی رکن بھی ہو سکتی تھی اور کسی پرائیویٹ وارڈ کے مریض کے ساتھ رہنے والی گھر کی کوئی عورت بھی۔ میں اس اندھیرے کمرے میں کھڑکی بند کیے شیشوں کے پیچھے کھڑا گیٹ کو دیکھتا رہا۔ رابعہ دس منٹ بعد اندر آئی اور اس نے کیمسٹ کی دکان سے کچھ خریدا۔ پھر وہ واپس چلی گئی... میں کھڑکی سے باہر اترا اور گیٹ کی سمت بڑھا۔ چوکیدار نے چادر کے نیچے سے اسپتال کے دھاری والے کپڑے کا پاجامہ پہچان لیا۔

"کون ہو تم... اے بھائی صاحب... رک جاؤ۔" وہ میری طرف بڑھا اور میں رک گیا۔ چوکیدار میرے قریب آ گیا۔ "اپنی صورت تو دکھاؤ۔" وہ بولا۔ صورت کے ساتھ ہی میں نے اُسے ایک معمولی سے داؤ کا تماشا بھی دکھایا۔ اس کی گردن پر اور کنپٹی پر میرے دو ہاتھ لگے۔ وہ لان پر گر گیا۔ میں گیٹ کی طرف بھاگا۔ کیمسٹ چلانے

لگا: "پکڑو... پکڑو۔"

اس کی آواز پر اسپتال کے اندر شاید کوئی متوجہ ہوا ہو تو ہوا ہو۔ باہر جہاں رکشا میں رابعہ میری منتظر تھی اس کی آواز انجن کے شور میں دب گئی۔ وہی رکشا کا شور جس سے ہمیشہ میرے اعصاب متاثر ہونے لگتے تھے، اس وقت میرے لیے باعثِ سکون ثابت ہوا۔ میرے پہنچتے ہی رکشا چل پڑا اور اس وقت میں نے پلٹ کر دیکھا تو مجھے گیٹ لائٹ کی روشنی میں ڈاکٹر حکیم کا چہرہ نظر آیا۔ وہ رکشا کے پیچھے بھاگا۔ "اے رکشا۔" اس نے چیخ کر کہا مگر رکشا والا اپنی دھن میں چلتا گیا۔ اُسے کیسے شک ہو سکتا تھا کہ کوئی اسے پکار رہا ہے۔ اگر رکشا خالی ہوتا تو اس آواز پر ضرور رک جاتا۔ ڈاکٹر کی یہ حرکت مجھے مضحکہ خیز لگی۔ وہ رکشا کے پیچھے خود کیسے دوڑ سکتا تھا۔ میں نے دوبارہ پلٹ کر دیکھا تو اس کا ہاتھ جیب سے باہر آ چکا تھا۔ میرے ایک ہاتھ نے رابعہ کو گردن سے پکڑ کے جھکا دیا۔ میں خود بھی جھک گیا تھا جب فائر کی آواز آئی۔ اگر اس کا نشانہ صحیح ہوتا تو گولی رکشا والے کو بھی لگ سکتی تھی جس کا سر پیچھے بیٹھنے والی سواریوں کے درمیان نظر آتا ہے۔ اب یا تو اس کا نشانہ حد سے زیادہ درست تھا کہ نہ میں نشانہ بنا اور نہ رابعہ بنی اور گولی سیدھی گزر گئی۔ اگر اس نے رکشا روکنے کے لیے ڈرائیور کے سر کا نشانہ لیا تھا تو اسے قسمت نے بچایا۔ رکشا متحرک تھا اور اس کی رفتار بھی زیادہ تھی۔ سڑک ناہموار تھی۔ چنانچہ جھٹکوں سے ہم بھی اُچھل رہے تھے۔ غالباً یہی سب عوامل تھے جو ہمارے اور رکشا والے کے بچ جانے کا سبب بنے۔ ڈاکٹر نے تین فائر کیے تھے مگر ہر فائر کے بعد دوسرا فائر ہونے تک درمیانی فاصلہ پہلے سے زیادہ بڑھ چکا تھا۔ جب رکشا نے موڑ کاٹا تو میں نے اپنے محفوظ ہونے کا یقین کیا اور اطمینان کا سانس لے کر سر اٹھایا۔ رکشا والا اس سارے خونی ڈرامے سے بالکل بے خبر تھا اور اسے بالکل اندازہ نہ تھا کہ گولیاں اس پر چلائی جا رہی ہیں۔ اُسے تو اچانک گولی لگ جاتی تو پتا چلتا کہ بغیر کسی وجہ کے موت نے اُسے آلیا ہے۔

"یہ تو ہم بُرے پھنسے تھے۔" میں نے رابعہ سے کہا۔

"مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا ہے کہ وہ ڈاکٹر جو اتنے دوستانہ لہجے میں بات کر رہا تھا اور ہمارا اعتماد حاصل کر چکا تھا، ہمارا دشمن تھا۔" رابعہ بولی۔

"میں بھی اس سے متاثر ہو گیا تھا۔" میں نے کہا۔

"اچھا ہی ہوا کہ تم نے اُسے رازدار اور مددگار نہیں بنایا۔" رابعہ بولی۔

"بس خدا نے بچا لیا۔ میں جلدی میں فیصلہ کر لیتا کہ اس سے مدد لینی چاہیے تو ساری باتیں آگے پہنچ جاتیں۔ وہ بہت چالاک تھا اور بہت خطرناک بھی۔"

"تمہارے خیال میں وہ چوہدری دلاور کا ایجنٹ تھا؟"

"مجھے اس بارے میں کوئی شبہ نہیں۔" میں نے کہا۔ "اور کوئی حفاظتی انتظام نہیں کر سکتا جو اس نے کیا۔ وہ کسی کمرے میں بیٹھا ساری گفتگو سُن رہا تھا۔ ہر آواز اس تک پہنچ رہی تھی۔ تم پہلے دروازہ کھولتی تھیں، اسے معلوم ہو جاتا تھا۔ اگر میں کھڑکی کھولتا تو یہ آواز بھی اس تک پہنچتی اور وہ فوراً آ جاتا۔ باتوں باتوں میں وہ ہم پر واضح کر چکا تھا کہ اسے جوڑ توڑ کرانے میں مہارت ہے۔ مجھے تو اس کے ڈاکٹر ہونے پر بھی شک ہے۔"

"اسے اپنی ناکامی پر جھنجلاہٹ بھی ہوگی اور پریشانی بھی۔ ہم اس کی ساری چالاکی اور مستعدی کے باوجود صاف نکل گئے۔" رابعہ نے کہا۔ "اسے خبر ہو جاتی تو وہ گاڑی لے کر ہمارے تعاقب میں آتا۔"

"ہاں۔ وہ کیمسٹ کے ہنگامے پر باہر نکلا ہوگا۔" میں نے کہا۔ "کیمسٹ نے بھی اس لیے شور مچایا کہ وہ چوکیدار کو ناک آؤٹ ہوتے دیکھ چکا تھا۔ ڈاکٹر نے باہر نکل کے کیمسٹ سے پوچھا ہوگا کہ بات کیا ہے اور جتنی دیر میں صورتِ حال اس پر واضح ہوتی ہم دور نکل آئے تھے۔ اگر اس وقت وہ گاڑی کی طرف لپکتا تو اسے رکشا نظر تک نہ آتا۔ مگر اس سے زیادہ اطمینان کی بات تو یہ ہے کہ میں نے تم سے کمرے میں بہت سی باتیں کی تھیں پر نہیں بتایا تھا کہ نازو کون ہے اور اس کا مشن کیا ہے۔ میں نے شملا اور محسن کی شادی کا ذکر تو کیا تھا مگر ان کے گھر کا پتا نہیں بتایا تھا۔ اس تمام گفتگو کو ریکارڈ کیا ہوگا تب بھی اس سے کچھ پتا نہیں چلے گا۔"

"چوہدری دلاور تو بہت برافروختہ ہوگا۔"

"ہاں۔ اس مرتبہ انتظام بہت پکا تھا۔" میں نے کہا۔ "اب ناکامی کی ساری ذمے داری ڈاکٹر حکیم پر جائے گی۔ حالانکہ قصور اس کا نہیں ہے۔ وہ تو پوری طرح مستعد تھا۔ ہر آہٹ پر نکل آتا تھا مگر رکشا کدھر جا رہا ہے؟"

"مزنگ اکھیا سی۔ مزنگ ول جا ریا اے۔" رکشا والے نے کہا۔

"مزنگ؟ او نئیں یار۔" میں نے کہا۔ "مزنگ جا کے کی لینا جے۔ میرا کیہڑا ماما رہندا اے اوتھے۔ میں نے جانا اے داتا دربار۔ پہلاں اوتھے حاضری دے کے گھر جاواں گا۔"

رکشا والے نے مجھے گھور کر دیکھا اور میں نے رابعہ کو گھور کے دیکھا جیسے ساری غلطی اس کی ہے۔ داتا صاحب کے نام پر وہ بول نہ سکا ورنہ کہیں اور جانا ہوتا تو وہ احتجاج کرتا۔ میں نے

رکشا کو داتا صاحب کے دربار والی گلی میں چھوڑا اور مزار پر فاتحہ خوانی کرنے گیا۔ آج میں ایک نئے شکاری کے جال میں پھنس گیا تھا اور بال بال بچا تھا۔ جب ہم پھر سڑک پر آئے تو میں بہت اطمینان محسوس کر رہا تھا۔ دوسرے رکشا نے ہمیں آدھے گھنٹے میں گھر پہنچا دیا۔ گھر پہنچنے تک میرے دل کی بے قراری میرے اعصاب کو شکست دینے لگی تھی۔ ایک معمولی سے حادثے نے مجھے کہاں پہنچا دیا تھا۔ میری عدم موجودگی نے نازو کو کہاں پہنچا دیا ہوگا۔ یہ سوچ کر میرا دل بیٹھنے لگتا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ میرے کچھ بتائے بغیر غائب ہو جانے سے باقی سب کی ذہنی کیفیت کیا ہوگی۔ میرے ساتھ پیش آنے والا حادثہ عقل کے ہاتھ سے جذبات کا دامن چھوٹ جانے کا نتیجہ تھا۔ رابعہ کے گھر سے نکل جانے کی خبر نے مجھے دیوانہ کر دیا تھا اور میں نہ کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل رہا تھا اور نہ کچھ دیکھنے سننے کے۔ لیکن اسی جذباتی دیوانگی کا نام زندگی تھا۔ اس دیوانگی کے مختلف انداز تھے۔ رابعہ سے عشق اس کا ایک نام تھا۔ ورنہ ہم سب جو کچھ کرتے تھے، جس طرح جیتے تھے اور جیسے مرنے کا سامان کرتے تھے اس میں سب کچھ ہی دیوانگی سمجھا جا سکتا تھا۔

رکشا رک گیا تو میرے خیالات کی رو بھی رک گئی، اور میں یوں گھر کی طرف بڑھا جیسے گھر سے فرار ہو جانے والا ناخلف بیٹا دُنیا کے دھکے کھا کر شرمسار اور خوفزدہ۔ دوبارہ گھر آتا ہے...

دروازے پر دستک دیتے ہوئے میں نے رابعہ کی طرف دیکھا۔ فرطِ جذبات سے اس کی حالت بھی غیر تھی اور یہی کیفیت اپنی انتہا کو پہنچ کر قوتِ برداشت سے بڑھ جاتی تو ہسٹریا کا دورہ بن جاتی۔ جذباتی دباؤ سے وہ بھی شدید اعصابی تناؤ میں مبتلا تھی۔

دروازہ شملا نے کھولا۔ اس نے پہلے مجھے دیکھا پھر اندھیرے سے رابعہ اس کے سامنے آئی اور شملا نے ایک چیخ ماری۔

"رابعہ باجی۔" وہ ایک دم رابعہ سے لپٹ گئی۔ اس کی چیخ نے گھر کے اندر محسن کو بوکھلا دیا۔ وہ نہ جانے کیا گرا کے یا خود کسی چیز پر گر کے دوڑا اور لنگڑاتا ہوا نمودار ہوا۔

"کیا ہوا؟ قیامت آ گئی کیا؟" وہ شملا کو ڈانٹ رہا تھا۔ مگر ہمیں دیکھتے ہی وہ لنگڑانا بھی بھول گیا۔

"آ گئے ہو خیر سے گھر کو لوٹ کے بدھو میاں۔" محسن نے ناخلف اولاد کے سخت گیر باپ کی طرح کہا۔

"اکیلا نہیں آیا... کچھ لے کر بھی آیا ہوں۔" میں نے شملا کی طرف اشارہ کیا جو رابعہ سے گلے لگ کر رو رہی تھی اور رابعہ اسے بالکل بڑی بہن کی طرح تسلی دے رہی تھی۔ پچکار رہی تھی۔ محسن نے پہلے رابعہ کو اور پھر مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ میں نے آہستہ سے اقرار میں گردن ہلائی کیونکہ اس کی نظروں کا سوال میں نے سمجھ لیا تھا۔ اس نے پوچھا تھا کہ کیا رابعہ نارمل ہو گئی ہے؟ اس کی یادداشت بحال ہو گئی ہے؟

"یہ بچھڑے ہوئے اندر جا کے بھی رو دھو سکتے ہیں۔" محسن نے کہا۔

"یار محسن!" میں نے کہا۔ "میں تو بعد میں بتاؤں گا کہ کہاں گیا تھا اور اس وقت کہاں سے آ رہا ہوں۔ پہلے تو بتا کہ نازو کا کیا حال ہے؟"

محسن نے دونوں ہاتھ اٹھا دیے۔ "اللہ اس کی مغفرت کرے، اچھی خاصی لڑکی تھی مگر تجھے کیا۔ بیوہ تو ہوا غالب۔"

"تو ایسے نہیں بتائے گا۔" میں نے کہا اور محسن اندر کی طرف دوڑا۔ رابعہ اور شملا روتے روتے ہنس پڑیں۔

"شروع ہو گئی دھما چوکڑی اور خرمستی۔" شملا نے کہا۔

میں نے محسن کو ٹانگ اڑا کے گرایا اور اس کے اوپر چڑھ بیٹھا۔ "میں تین تک گنوں گا۔"

"کیوں! آگے گنتی نہیں آتی کیا؟" محسن بولا۔ "اتنے کم وقت میں بھلا میں کیسے بتا سکتا ہوں کہ نازو خیریت سے ہے۔"

میں نے اسے چھوڑ دیا اور بیڈ پر بیٹھ گیا۔ "اس کی طرف سے کوئی پیغام ملا؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ غالب کا رابطہ قائم ہے۔" محسن بولا۔ "آج صبح سے شام چھ بجے تک ٹیڈی نے ڈیوٹی دی تھی۔ چھ سے بارہ پھر غالب گیا تھا۔ آتا ہی ہوگا۔ بہت مفید معلومات حاصل ہوئی ہیں نازو سے۔"

"وہ لڑکی بھی کمال ہے۔ جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔"

"تجھے تعریف کرنا ہے تو رابعہ کی کر۔" محسن نے مجھے ڈانٹا۔ "خود میں اب شملا کے سوا کسی کی تعریف نہیں کرتا۔ کر ہی نہیں سکتا بچارا۔" وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "جھوٹ بولنے پر مجبور ہوتا ہے بیوی سے کہ کوئی تم سا حسین نہیں زمانے میں۔"

"میں تو ایک سچ بولنے پر مجبور ہوں۔" میں نے کہا۔ "کہ کچھ کھانے کو نہ ملا تو میں فوت ہو جاؤں گا۔ گناہ تیرے سر کیونکہ میں تیرا مہمان ہوں۔"

"کنیز۔" محسن نے تالی بجا کے کہا۔ "دو مہمانوں کے لیے شاہی دسترخوان بچھایا جائے۔ چولھے پر دس تولے دال مسور ہمراہ ایک گیلن پانی کے اچھی طرح جوش دے کر ایک ماشہ گھی کے ہمراہ رکھی جائے اور اگر بھوسی ٹکڑے والا گزشتہ ہفتے کی روٹیاں نہ لے گیا ہو تو وہ بھی معزز مہمانوں کے لیے حاضر کی جائیں۔" وہ دونوں نہایت زور شور سے باتیں کرنے میں مصروف تھیں۔ موضوع تھا شادی سے پہلے اور شادی کے بعد۔ مجبوراً محسن کو چلّانا پڑا۔

"لیڈیز! آپ کچن میں جا کے ایک دوسرے کا دماغ چاٹیں، یہاں بے حد اہم مردانہ گفتگو ہو رہی ہے۔"

"سُن لیا سن لیا۔" شملا نے بھی چلّا کے کہا۔ "ابھی فرصت نہیں ہے ہمیں۔ ہم بھی بے حد مصروف ہیں۔"

"توہم کیا تمھارا سر کھائیں جس میں مغز تک نہیں۔" محسن نے چلّا کر کہا۔

"جو ملے کھالو۔ کچن میں جاکے پکالو یا بازار سے جاکے لے آؤ۔" شہلا نے سُنی اَن سُنی کرکے کہا۔ "ابھی تنور کھلے ہوں گے۔"

"دیکھا تو نے ان بیسویں صدی کی بیویوں کا رویّہ؟" محسن نے خفّت سے کہا۔ "اس سے تو اچھا ہوتا کہ میں کسی تنّور والے کی بیٹی سے شادی کرلیتا۔ اس وقت سسرِ محترم گرماگرم روٹیاں خود لگاکے دیتے۔"

"چل یار جانے دے۔ تیرے مقدر میں شوہر بن کے یہی بے عزتی لکھی تھی۔" میں نے کہا۔ "ان کو باتیں کرنے دے۔ ہم بازار سے لے آتے ہیں۔"

ہم نکلے ہی تھے کہ ہمیں سامنے سے ٹیڈی اور غالب آتے دکھائی دیے۔ ہمارے سامنے آکے دونوں یوں رک گئے جیسے متحارب فوجیں ایک دوسرے کے مقابل صف آرا ہوتی ہیں۔

"آگئے تم مجنوں کے جانشیں۔ ملی وہ لیلے یا محض جھک ماری۔" غالب نے طنز سے کہا۔

"دونوں کام کیے۔ جھک بھی ماری ہم نے اور لیلے کو بھی لے آئے۔" میں نے دانت نکال کے کہا۔

"کیا مطلب؟ رابعہ کو لے آئے؟" ٹیڈی نے بے یقینی سے کہا۔

"یقین نہیں تو گھر میں جاکے دیکھ لو۔" میں نے کہا۔ "ورنہ ہمارے ساتھ چلو۔ ہم ماحضر تناول فرمانے جارہے ہیں۔"

"مجھے میری بیوی نے مع مہمان کے گھر سے نکال دیا ہے دوستو۔ میں جارہا ہوں کہیں سے نان نفقے کا بندوبست کرنے۔" محسن نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ تم بھی ساتھ چلو۔ کہیں بیٹھ کے دعوتِ ولیمہ کھا لو میری۔"

"اور وہ گھر میں انتظار کریں گی ہمارا۔" میں نے کہا۔

"بیویوں کا کام انتظار کرنا ہے۔" محسن بولا۔ "خود جب باتیں کرتے کرتے تھک جائیں گی تو پکائیں گی اور کھالیں گی۔"

"یہ ٹھیک ہے۔ ہم بھی کہیں بیٹھ کے بات کرتے ہیں۔" میں نے کہا اور ہم واپس چل پڑے۔ میں نے مختصر الفاظ میں وہ سب واقعات سنائے جو کسی کے علم میں نہ تھے۔ میرے حادثے میں زخمی ہونے سے اسپتال پہنچنے اور وہاں سے فرار ہونے تک جو کچھ میرے ساتھ پیش آیا تھا وہ میں نے سب بتادیا اور چلتے چلتے ہم ریلوے اسٹیشن جانے والی سڑک پر پہنچ گئے۔ وہاں بہت سے ہوٹل کھلے ہوئے تھے۔ ہم ایک نسبتاً صاف ستھرے ریسٹورنٹ میں بیٹھ گئے۔ کھانے کا آرڈر میں نے دیا۔ پھر غالب نے مجھے نازو کے بارے میں رپورٹ دی۔

"اس کو ڈاکٹر فیملی نے مجبور ہو کے گھر میں جگہ دے دی... بھائی بہن تو بالکل تیار نہیں تھے مگر اسی گھر میں ان کی ماں بھی رہ کر جسے اپنی اولاد کے اصل کرتوت معلوم نہیں۔" غالب نے کہا۔

"اس روز رات کو... اس کا پہلا پیغام کیا تھا؟" محسن نے

"بہت مختصر۔ اس نے مورس کوڈ میں 'او کے' کہا تھا۔" غالب نے کہا۔ "اندر پہنچنے کے تقریباً نصف گھنٹے کے بعد ملنے والے پیغام نے میری ساری تشویش دور کردی تھی۔ اس وقت مجھے تم سے زیادہ تم پر غصّہ تھا کہ سب چھوڑ چھاڑ کے چل پڑے۔ نازو کی طرف سے اطمینان ہوا تو میں مونگ پھلی کی ریڑھی چھوڑ کے وہاں تک گیا جہاں تم کھڑے ہوئے تھے مگر تم غائب تھے۔ میں لوٹ آیا، تمھیں ایک سو ایک گالیاں دے کر۔"

"گالیوں کی کوئی بات نہیں۔ دوست دیں تو دعا کی طرح لگتی ہیں، دشمن دیں تو پتھر کی طرح۔" میں نے کہا۔ "مونگ پھلی کا بزنس کیسا رہا؟"

"بہت فائدہ مند... ایک بوری پر کوئی دو سو بچے... پوری بوری دو دن میں ختم ہو گئی۔" غالب بولا۔ "صحافت سے تو اچھا ہے۔"

"اس کے بعد نازو سے رابطہ قائم ہوا؟" میں نے کہا۔ "کوئی کام کی بات معلوم ہوئی ڈاکٹر فیملی کے بارے میں؟"

"ہاں۔ اندر داخل ہونے کے بعد ڈاکٹر برادران کو مطمئن کرنا اصل مسئلہ تھا۔" غالب بولا۔ "نازو نے رات کے گیارہ بج کے چار منٹ پر دوسرا پیغام دیا۔ یہ کہا کہ ابھی جانا مت۔ وہ نہ کہتی تب بھی میں ٹھیک بارہ بجے دکان نہ بڑھاتا۔ میں شرماتے ہوئے اقرار کرتا ہوں کہ میں سخت مضطرب اور بے چین تھا۔"

"ماشاءاللہ سے بہت شرمیلا بچّہ ہے۔" محسن نے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔

"تم ہوتے میری جگہ تو تمھارے لیے بھی بہت مشکل ہو جاتا نازو کو اس طرح چھوڑ کے جانا۔" غالب نے کہا۔ "پہلا دن... بلکہ پہلی رات تھی۔ ایک ڈر سا تھا کہ کہیں بعد میں کوئی غیر متوقع بات نہ ہو جائے۔ خیر میں ساڑھے بارہ بجے تک انتظار کرتا رہا اور یہ آدھا گھنٹا اتنا لمبا ہو گیا...؟"

"طولِ شبِ فراق کی طرح۔" محسن نے کہا۔ "مختصر بات کرو۔"

ویٹر نے ہمارے درمیان ڈنر سجانا شروع کیا۔ میں نے اس سے ہر اچھی چیز لے آنے کو کہا تھا۔ اس کے نزدیک مرغی سے زیادہ اعلیٰ وارفع خوراک نہیں تھی چنانچہ ہر چیز میں مرغی تھی۔ چاول میں مرغی مگر اسے چکن بریانی کہنا مشکل تھا۔ قورمے میں مرغی جسے مرغ قورمہ قرار دیا گیا تھا۔

"جی تو نصف شب کے بعد آپ کے اور ان کے درمیان کیا راز و نیاز ہوئے؟" میں نے کہا۔ "آپ سنسر کرکے سنا سکتے ہیں۔"

"اس نے ساڑھے بارہ بجے سگنل دیا۔ گویا میرے کان میں ایکزٹ کی سرگوشی کی۔" غالب بولا۔ "میں نے فوراً اپنے یونٹ کو آن کر لیا۔ اس نے کہا کہ پہلا مرحلہ تو سر ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر فیملی کو ایک خادمہ کی ضرورت تھی۔ وہ سب دن بھر باہر رہتے ہیں اور بعض اوقات رات کو بھی گھر نہیں آتے، ماں گٹھیا کی مریض ہے۔ اسی مجبوری نے نازو کا گھر کے اندر قیام آسان بنادیا۔ ڈاکٹر برادران اور ان کی بہن تو مخالف تھے کہ کسی اجنبی کو گھر میں جگہ دی جائے مگر نازو کی آہ و زاری نے ان کی ماں کو متاثر کرلیا تھا۔ نازو کا کہنا ہے کہ اسے خود اپنی اداکاری پر حیرت ہوئی تھی۔ سلیم ڈاکٹر اور یوسف ڈاکٹر کو مطمئن کرنا بہت مشکل تھا۔ وہ پوچھتے رہے کہ پہلے کہاں تھیں اور اب کیا گھر گھر سوال کرتی پھر رہی ہو۔ آگے پیچھے کوئی نہیں ہے تو کیوں نہیں ہے۔ نازو نے سارے سوالات کے ایسے جواب دیے کہ وہ مطمئن ہوئے یا نہیں مگر اُن کی ماں پر رقت طاری ہوگئی۔ اس نے فیصلہ کرلیا کہ اس مظلوم عورت کو گھر میں جگہ دینے میں کوئی ہرج نہیں۔ لڑکے اس بات پر تو راضی ہوگئے کہ ایک خادمہ کی حیثیت سے وہ دن بھر گھر میں رہے، کام کاج اور ان کی ماں کی خدمت کرے لیکن رات کو اپنے گھر جائے۔ نازو نے شور مچایا کہ گھر ہوتا اور گھر والا ہوتا تو میں آتی ہی کیوں۔ قصہ مختصر، ماں کی وجہ سے وہ مجبور ہوگئے اور نازو کو کچن کے ساتھ ایک اسٹور خالی کرکے اپنا بستر بچھانے کی اجازت دے دی گئی... اور یار اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سب اسی کا حوصلہ تھا۔ اسٹور میں موش کی پوری فیملی تھی۔"

"کون موش؟ وہ ڈاکٹر لطیف کا خونی دربان۔"

"ہاں۔ اس کے بھائی بند اسٹور میں آباد تھے۔ جسے دیکھ کر تمھاری گھگی بندھ جاتی تھی۔" غالب نے کہا۔

"اس سے کچھ زیادہ ہی ہوتا تھا۔ اسے عموماً واپسی پر پتلون بدلتے پایا گیا۔" محسن نے کہا۔

"میں شرط لگا سکتا ہوں کہ تم دونوں کی زوجگان کو کمرے میں ایک چوہا نظر آجائے تو وہ چیخ ماریں گی اور بیہوش ہو جائیں گی۔"

"چوہے اور چھپکلی کو دیکھ کر چیخ مارنا خواتین کا پیدائشی حق ہے۔" میں نے احتجاج کیا۔ "اور بیہوش ہونا ان کی ایک ادا۔"

"خیر تو اپنی بہادر جورو کی داستانِ شجاعت جاری رکھو۔ چوہے سے کیا، وہ تو تجھ سے بھی نہیں ڈرتی۔" محسن نے کہا۔

"اُلٹا یہ اس سے چوہے کی طرح ڈرتا ہے۔" ٹیڈی نے لقمہ دیا۔

"ہاں ہاں... چوہا ہوں میں..." غالب نے بھنّا کے کہا۔ "اُلّو کا پٹھا تو نہیں ہوں... یک بک لگا رکھی ہے اپنی۔"

"معاف کرنا یار۔ پیچ سے تمھاری دل شکنی ہوئی۔" میں نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔

"اس نے پہلی رات تو جیسے تیسے کاٹ دی۔" غالب کچھ دیر بعد بولا۔ "دوسرے دن اس نے چوہوں کے خلاف جہاد کا آغاز کیا اور چھ چوہے تو میدانِ جنگ میں کام آئے۔ باقی بھاگ گئے... پہلی رات اس نے مفصل رپورٹ دی۔"

محسن پھر ہنس پڑا۔ "کیا ستم ہے۔ ہجر و فراق کے مارے ہوئے الم نصیب ایسے نہ ہوں گے۔ اُدھر محبوب کو چوہے نہیں سونے دیتے۔ اِدھر شاعر مونگ پھلی بیچ رہا ہے۔ کتنا غیر شاعرانہ تصور ہے عشق کا۔"

"اور کتنا غیر فلمی منظر ہے۔" میں نے کہا۔ "کسی کامیڈی فلم میں بھی ایسا آئیڈیا پیش نہیں کیا گیا۔"

"زندگی ایک ٹریجڈی ہے۔" غالب نے متانت سے کہا۔ "اس کا اُردو شاعری اور فلموں سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ دل بہلانے کی چیزیں ہیں۔ خیر تو اس رات مجھے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر فیملی عیش کر رہی ہے۔ ان کا گھر دیکھنے میں باہر سے جتنا غریبانہ نظر آتا تھا، اندر سے اتنا ہی شاہانہ ہے۔ دولت کی فراوانی کے آثار اندر قدم رکھتے ہی نظر آجاتے ہیں۔ بیڈ روم ایئرکنڈیشنڈ ہیں۔ اور تیسرا بڑا کمرہ ڈرائنگ روم ہے۔ ایئرکنڈیشنڈ وہ بھی ہے۔ لیکن نازو نے بتایا کہ محلّے والے تو اُن سے ملتے جلتے نہیں۔ ان کو بُرا بھی نہیں سمجھتے۔ وہ خود بھی الگ تھلگ رہتے ہیں۔ کچھ لوگ محلّے میں ایسے ہیں جو اُن کو اپنے برابر کا نہیں سمجھتے۔ وہ کم ہیں اس لیے نہیں، اس لیے کہ وہ بھنگی تھے اور مشہور ہے کہ ان کی ماں اسی شہر لاہور کی گلیوں میں جھاڑو دیتی پھرتی تھی۔"

"میرے خیال میں وہ زیادہ قابلِ عزت کام تھا۔" میں نے کہا۔ "محنت کیسی بھی ہو اور کسی بھی پیشے میں ہو بُری نہیں سمجھی جاسکتی۔"

"ہاں۔ اس کے مقابلے میں جو اولاد کر رہی ہے وہ انتہائی مذموم اور قابلِ نفرت ہے۔" محسن بولا۔ "مگر دنیا کی نظر میں فتور ہے۔"

"دنیا کی عقل میں بھی فتور ہے۔ بہت سے حرام کی کمائی سے دولت مند ہو جانے والے معزز ہیں اور ہر ہاتھ انھیں سلام کرنے کے لیے اُٹھتا ہے۔ راج مزدور اور بڑھئی، مزدور اور بس ڈرائیور... ویٹر اور چوکیدار سب گھٹیا کام کرنے والے سمجھے جاتے ہیں اور معاشرے میں کوئی مقام نہیں رکھتے۔ پیسہ عزت کا معیار بن گیا ہے۔"

"جو اس وقت صرف میرے پاس ہے۔ اس لیے تم سب مجھے سرکار کے مخاطب کرو۔" میں نے جیب سے دس ہزار کی گڈی نکالی جو میں اسپتال سے فرار ہوتے وقت تکیے کے نیچے سے نکال لایا تھا۔ "تم سب سوالی ہو اس وقت۔" میں نے کھانے کا بل ادا کر دیا جو صرف ساٹھ روپے بنا تھا۔ کسی فرسٹ کلاس ہوٹل میں یہ بل ایک سو ساٹھ سے بھی زیادہ ہوتا۔

"نازو کا خیال ہے کہ وہ ڈرائنگ روم ہی وہ جگہ ہے جہاں ان وطن فروشوں کی ملاقاتیں اور اجلاس ہوتے ہوں گے۔ چنانچہ وہ

مقناطیسی مائکروفون کل ہی نصب کر دیا جائے گا۔"
"کل کیوں؟" میں نے کہا۔
"اس لیے کہ کل ایک اجلاس متوقع ہے۔" غالب نے کہا۔
"اس کے آگے میں سناؤں گا۔" ٹیڈی نے کہا۔ "کیونکہ باقی باتیں اس نے مجھ سے دن میں کی تھیں۔ آج دن میں۔ صبح آٹھ بجے وہ مائکرو بس آئی تھی۔ اس کا نمبر میں نے نوٹ کر لیا تھا۔ سوا آٹھ بجے سونیا البرٹ وکٹر اسپتال چلی گئی۔"
"کیا وہ واقعی وہاں کام کرتی ہے؟" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔
"اس میں کوئی شک نہیں۔ وہاں وہ نرس ہے اور بہت نیک نام ہے۔ کسی کو بھی معلوم نہیں کہ فارغ وقت میں وہ کیا کرتی ہے۔" غالب نے کہا۔
"فاکس ویگن کی اس مائکرو بس کو سونیا کا ایک بھائی چلاتا ہے اور وہ بھی البرٹ وکٹر اسپتال میں ہے۔" ٹیڈی نے کہا۔
"میرا ایک نظریہ درست ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر میں اس کا ذکر بعد میں کروں گا۔ پہلے تم اپنی بات بتاؤ۔"
"دونوں بہن بھائی چلے گئے۔ معلوم نہیں وہ صبح منہ اندھیرے ہی ویگن لینے نکل گیا تھا یا رات کو ڈیوٹی پر تھا۔" ٹیڈی نے کہا۔ "اگر اس نے رات بھر ڈیوٹی دی ہوتی تو اُسے صبح اسٹاف کو لینے نہ بھیجا جاتا۔ یا تو وہ مائکرو بس کسی دوسری جگہ کھڑی رہتی ہے یا سلیم وکٹر ذرا پہلے نکل جاتا ہے۔ سونیا تیسرے پہر لوٹ آئی تھی۔ اس کا انسپکٹر بھائی بھی صبح گیا تھا اور تیسرے پہر تک وہ بھی آگیا تھا۔ ان دونوں کے آنے تک نازو کو بہت کچھ معلوم ہو گیا۔ مثلاً اس نے ایک اہم بات یہ معلوم کی کہ گھر میں ایک تہ خانہ ہے جس کا راستہ ڈرائنگ روم سے نیچے جاتا ہے۔ بظاہر وہ بند دروازہ باتھ روم کا لگتا ہے جو ڈرائنگ روم سے اٹیچ ہے۔ مگر اس دروازے کو مقفل رکھا جاتا ہے۔"
"نازو نے اتنی جلدی کیسے معلوم کر لیا؟"
"وہ ڈرائنگ روم کی جھاڑ پونچھ میں لگی ہوئی تھی کہ پولیس انسپکٹر آگیا۔ اس نے دیکھا ہی نہیں کہ بائیں جانب ایک گوشے میں نازو بھی موجود ہے۔ وہ حصہ کچھ تاریک بھی تھا۔ ساری وال لائٹس جلائی جائیں تو ظاہر ہے بہت روشن ہو جاتا ہے مگر دن میں دروازے کھڑکیاں بند رہتے ہیں اور پردے پڑے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے ادھر کوئی جاتا ہی نہیں۔ نازو نے انسپکٹر کو اندر آتے دیکھا تو وہ ایک صوفے کے پیچھے دبک گئی۔ انسپکٹر سیدھا گیا اور دروازے کو چابی لگا کے کھولا۔ نازو نے چند سیکنڈ بعد قریب جا کے سُنا تو اس کے بھاری قدموں کی آواز سنائی دی۔ جو کم ہوتی گئی۔ نازو نے دروازہ کھول کر نہیں دیکھا کہ کوئی الارم وغیرہ نہ ہو۔ مگر اس نے اندازہ کر لیا کہ وہ نیچے اتر گیا ہے۔ حالانکہ دروازہ کھلا تھا تو اُسے باتھ روم ہی نظر آیا تھا۔ انسپکٹر صاحب کے واپس آنے سے پہلے ہی وہ ڈرائنگ روم سے نکل آئی اور مصروف ہو گئی۔ تاہم اس نے دو بار سونیا کی اور اس کے بھائی کی گفتگو سنی۔ وہ اکیلے تھے اور کسی سے وائرلیس پر مخاطب تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کل رات کچھ لوگ آئیں گے۔"
"وہ کون لوگ ہوں گے؟" میں نے کہا۔
"اس کا اندازہ نازو نہیں کر سکی۔" غالب نے کہا۔ "نازو کی ہم سے جتنی گفتگو ہوئی — یعنی مجھ سے اور اپنے اُستاد سے — وہ کچھ ٹیلی پرنٹر کے پیغامات تھے۔ وقفے وقفے سے دس منٹ اسے جب بھی ملے، اُس نے رابطہ قائم کر لیا۔ کسی نے اُس پولیس انسپکٹر پرویز وکٹر کو فون کیا تھا۔ اس کی گفتگو میں چند نام واضح طور پر لیے گئے مثلاً جگن ناتھ، سیوک رام کے اور اس معاملے میں غالباً کوئی اختلاف رائے تھا یا وہ اپنی اور ان کی حکمتِ عملی کے غلط نتائج پر بحث کر رہے تھے کہ بات لمبی ہو گئی اور انسپکٹر پرویز وکٹر کی آواز غیر ارادی طور پر بلند ہو گئی۔ نازو بہت قریب نہیں جا سکتی تھی۔ انسپکٹر آہستہ بول رہا تھا لیکن غصے میں آ جاتا تو احتیاط کے تقاضے بھول جاتا تھا۔ اس وقت نازو نے آپ سب لوگوں سے زیادہ عقل مند ہونے کا ثبوت دیا۔"
"اگر تم اُس کے مجنوں ہو تو تمھیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ ایک ناقص العقل عورت کو ہم سب سے افضل قرار دو۔" محسن نے احتجاج کیا۔ "میں سب مردوں کی طرف سے احتجاج کرتا ہوں۔"
"میں اپنی بات پر قائم ہوں۔" غالب اَڑ گیا۔ "نہیں مانتے تو مت مانو۔ میں بھی اس وقت تک کچھ نہیں بتاؤں گا جب تک اپنی بات نہیں منوا لوں گا۔"
"تم کہو کہ وہ آپ سب سے زیادہ خوب صورت ہے تو ہم مان لیں گے۔ یہ بھی مان لیں گے کہ وہ مار دھاڑ میں ہم سے زیادہ نڈر ہے۔" محسن نے مصالحت کا ایک فارمولا پیش کیا۔
"اُونہوں — وہ تم سب سے زیادہ عقل مند ہے۔" غالب نے کہا۔
"اچھا بابا — ہم سے ہی نہیں تم سے بھی۔ سارے جہان سے زیادہ عقل مند ہے وہ افلاطون کی بچی۔" محسن نے جھنجلا کر کہا۔ "آگے بکو۔"
"اُس نے مجھے پیغام دیا کہ میں اپنے ایف ایم بینڈ کے کو ٹیون کر کے اُن کی گفتگو سُن لوں۔" غالب نے فاتحانہ انداز میں دانت نکال کر کہا۔ "وہ سمجھ گئی تھی کہ یہ وائرلیس سیٹ بھی ویسا ہی ہے جیسا ہمارے پاس واکی ٹاکی ہے۔ یہ رینج کم زیادہ ہو سکتی ہے مگر ہوگا تو وہی ایف ایم بینڈ۔ سُوئی کو اِدھر اُدھر گھما کر دیکھنے سے کہیں نہ کہیں ان کی آواز پکڑی جا سکتی تھی۔ میں نے یہی کیا اور ایک جگہ اُن کی آواز صاف سُن لی۔ دوسری طرف سے معلوم نہیں کون بات کر رہا تھا اور ان کے درمیان جھگڑا یہ تھا کہ سیوک رام اور جگن ناتھ کے ٹولے کو کس کی غلطی نے ختم کیا۔ سائیں بابا پر پڑنے والے ڈاکے اور کرپال والی کا سُراغ کس کی غلطی سے ملا؟ ظاہر ہے وہ ایک دوسرے کو الزام دے رہے تھے۔"
"اُن کی گفتگو میں چوہدری دلاور کا نام نہیں آیا؟" میں نے پوچھا۔
"نہیں۔ نہ اُس کا، نہ اُستاد پیڈرو یا نواب خسرو جمشید کا۔" غالب نے کہا۔ "لیکن سراج کا نام آیا تھا۔ پرویز وکٹر نے کہا کہ سراج کو بہت شرمندگی اُٹھانی پڑی۔ وہ بہت خفا تھا کہ وعدے کے مطابق مال کیوں نہیں پہنچا۔ جب میں نے اسے بتلایا کہ یہاں معاملہ چوپٹ ہو گیا ہے تو اُس کو پریشانی لاحق ہو گئی۔ اس نے کہا کہ یہ راز کیسے فاش ہو گیا؟ کیا سراغ رساں اداروں کو مخبری ہو گئی؟ پرویز وکٹر نے جواب میں جو کچھ کہا، وہ اہم ہے۔ اس نے کہا کہ ثبوت تو کوئی نہیں لیکن میں نے جب ایم ڈی سے بات کی تو وہ بھی میرا ہم خیال ثابت ہوا کہ یہ سکندرِ اعظم کی فوج کا کارنامہ معلوم ہوتا ہے جو سمجھتے ہیں کہ وہ دُنیا فتح کر لیں گے۔ اس گفتگو میں ایم ڈی کا لفظ کس کے لیے استعمال ہوا۔ یہ سوچنے کی بات ہے۔ ایم ڈی کا مطلب ہوتا ہے مینجنگ ڈائریکٹر۔ یہ چوہدری دلاور کا حوالہ بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ وہ بہرحال ایم ڈبلیو ڈی کمپلیکس کا مینجنگ ڈائریکٹر ہے۔ یہ کسی اور کا نام بھی ہو سکتا ہے لیکن سکندرِ اعظم کی فوج کا حوالہ بالکل واضح ہے۔ اس بارے میں شک کی گنجائش ہی نہیں کہ وہ ہماری بات کر رہے تھے اور انھیں یقین ہے کہ اس تباہ کاری کے ذمے دار ہم ہیں۔ ایم آر ایس والے۔"
"کیا انھیں بھی یہ نام معلوم ہے؟" میں نے کہا۔
"غالباً نہیں۔ ورنہ وہ ایم آر ایس ہی کہتے۔ وہ ہمارا ذکر بڑے تحقیر آمیز انداز میں کر رہے تھے۔" غالب نے کہا۔ "جیسے ہم کوئی ناقابلِ فہم، ناممکن اور بعید از امکان و قیاس کام کر رہے ہیں اور ہمارے عزائم شیخ چلی کے منصوبوں سے زیادہ خیالی اور ناقابلِ عمل ہیں۔ ان کی گفتگو دس منٹ تک میں نے سُنی۔ بات کل پر ختم ہوئی۔ پرویز وکٹر نے کہا کہ اچھا اب جو طے کرنا ہے کل رات کر لیں گے۔ تم وقت پر پہنچ جانا۔ اُس نے کہا کہ میری فکر مت کرو۔ باوان آر سنگھ سے کہنا کہ دیر نہ کرے اور آر ڈیپ کو سمجھا دینا کہ اس نے اُلٹی سیدھی بات کی تو میں اسے گولی مار دوں گا۔ ایم ڈی وہ نہیں ہے۔"
"آر ڈیپ — یہ بھلا کیا نام ہوا؟" میں نے کہا۔
"اور باوان آر سنگھ؟" غالب مسکرایا۔ "ظاہر ہے یہ نام نہیں تھے، کوڈ تھے۔ کل میں ان ناموں پر غور کر رہا تھا لیکن میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ خیر ناموں سے ہمیں کیا۔ یہ تو معلوم ہو گیا نا، کہ ڈاکٹر فیملی کے گھر میں اُن کی میٹنگ ہے۔"
"ہمارے پاس بارہ ٹائم بم ہیں۔" محسن نے کہا۔
غالب نے اور میں نے ایک ساتھ نفی میں سر ہلایا۔ "ابھی اُن کے استعمال کا وقت نہیں آیا۔ کل رات کی میٹنگ میں کون آتا ہے ایک تو یہ دیکھنا ہے اور میٹنگ کے بعد اگر الگ الگ اُن کا تعاقب کیا جا سکے تو یہ بھی کرنا ہے۔ نازو نے ڈرائنگ روم میں وہ مقناطیسی مائکروفون صحیح جگہ پر لگا دیا تو مونگ پھلی کی ریڈیو پر ہم پوری میٹنگ کی رُوداد سُن سکیں گے۔ ممکن ہوا تو ریکارڈ بھی کر لیں گے تاکہ بعد میں ایم آر ایس کی میٹنگ میں اس پر ڈسکس کیا جا سکے۔"
"دُوسری اہم بات ہے تہ خانے کی دریافت۔" غالب بولا۔ "اگر میٹنگ تہ خانے میں ہوئی تو ہمیں کچھ بھی پتا نہیں چلے گا۔ نازو وہاں نہیں پہنچ سکتی کہ اپنا مقناطیسی مائکروفون نصب کر آئے۔"
"اُسے چانس مل بھی سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "فرض کرو کہ وہ چائے لے کر جاتی ہے۔"
"وہ اتنے غیر محتاط نہیں ہوں گے۔" غالب نے نفی میں سر ہلایا۔ "اگر چائے کی ضرورت محسوس ہو گی تو نازو سے منگوائیں گے اور خود لے جائیں گے۔ وہ اس خفیہ جگہ تک نازو کو کبھی نہیں پہنچنے دیں گے۔ مگر مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ تہ خانہ ایک گودام ہے اور وہاں سے وہ مائکرو بس بھر کے لے جاتے تھے۔ وہاں شاید میٹنگ کی جگہ نہ ہو۔ وہ اپنے ڈرائنگ روم کے دروازے بند کرنے کے بعد خود کو محفوظ سمجھیں گے۔ وہ کسی خفیہ مائکروفون کی موجودگی کا شبہ کیسے کر سکتے ہیں اور انھیں شک ہو تب بھی اسے تلاش کرنا آسان نہیں ہو گا۔"
"اور کچھ چاہیے صاحب؟" ویٹر نے ہم سے یوں پُوچھا جیسے یہ میز خالی کرنے کا نوٹس ہو۔ یہ کارروائی قطعی غیر ضروری تھی کیونکہ دوسری بیشتر میزیں خالی پڑی تھیں۔
"ہاں دوست — چاہیے تو بہت کچھ۔" غالب نے ایک سرد آہ بھر کے اس کی طرف دیکھا۔ "تاج و تخت، حکومت و اقتدار۔ مگر فی الحال تم ہمارے لیے صرف چائے لے آؤ۔ باقی پھر کبھی سہی۔"

بیرے کی صورت دیکھ کر مجھے بے اختیار ہنسی آئی۔ اُس نے فرض کیا ہوگا کہ غالب نشے میں ہے چنانچہ وہ جھینپ کر مسکرایا اور لوٹ گیا۔

"خدا کا شکر ہے کہ نازو کو کسی کٹھن آزمائش سے نہیں گزرنا پڑا۔" میں نے کہا۔ "یہ مرحلہ جو بہت مشکل نظر آتا تھا، خلافِ توقع بہت آسان ثابت ہوا۔"

"مجھے تو یقین تھا کہ ہم اتفاقِ رائے سے نازو کو عذابِ جہنم میں دھکیل رہے ہیں۔ وہ حد سے زیادہ چالاک اور بے رحم لوگ ہیں۔ وہ اتنی آسانی سے اس پر اعتبار کہاں کریں گے اور گھر میں تو ہرگز نہیں گھسنے دیں گے۔ مگر یہ ایک نفسیاتی مسئلہ ہے کہ بڑے مجرم بہت احتیاط کرتے ہیں۔ ہر طرح سے مکمل منصوبہ بندی کرتے ہیں اور حفاظتی انتظامات میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے لیکن کوئی بہت چھوٹی سی غلطی کر جاتے ہیں جس کا خود انھیں بھی پتا نہیں چلتا یا احساس نہیں ہوتا اور اس چھوٹی سی غلطی کا بہت بڑا خمیازہ ناکامی کی صورت میں سامنے آتا ہے تو پھر پچھتانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔"

"اس کی ماں کی مدد تائیدِ ایزدی ثابت ہوئی۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔ یہ بھی ایک وجہ ہے۔ وہ گٹھیا کی مریض ہے۔ زیادہ چل پھر نہیں سکتی۔ اس نے غنیمت سمجھا ہوگا کہ گھر بیٹھے ایک قابلِ اعتماد خادمہ مل گئی۔ ورنہ آج کل بھروسے کے قابل نوکر کہاں ملتے ہیں۔ اسی کی وجہ سے تینوں بھائی بس چپ ہو گئے لیکن سب سے بڑی کامیابی کی وجہ خود نازو کی اداکاری ہے۔ اس نے اپنے مظلوم، بے سہارا اور بے ضرر ہونے کا یقین دلا دیا۔"

"پرویز وکٹر پولیس میں ہے۔ اس کی لائن ایس پی سراج سے ملی ہوئی ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن دوسری طرف سونیا اور سلیم وکٹر کا کردار زیادہ اہم ہے۔ غالباً سلیم وکٹر ہی نے ڈاکٹر حکیم بن کے ہمیں ٹریپ کر لیا تھا۔ وہ ڈاکٹر وغیرہ کچھ نہیں ہوگا۔"

"ڈاکٹر حکیم؟" ٹیڈی اور غالب نے کہا۔ میں نے ان کو پھر بتایا کہ میں اور رابعہ کس طرح فرار ہوئے تھے۔

"سوال یہ ہے کہ اس ڈاکٹر حکیم کو یہ سب کچھ کرنے کے لیے کس نے کہا ہوگا؟" غالب بولا۔

"اُس نے تو ظاہر کیا تھا کہ وہ کچھ نہیں جانتا۔" میں نے کہا۔ "سوائے اس کے کہ میرا نام فرخ نہیں، سکندر بخت ہے اور میں اپنی شناخت کو کسی نہ کسی وجہ سے چھپانے پر مجبور ہوں۔"

"لیکن وہ سب کچھ جانتا تھا۔" غالب بولا۔ "تمھیں محصور رکھنے کے لیے کسی اسپتال میں یہ انتظام کر لینا آسان نہیں تھا۔"

"وہ ڈاکٹر نہیں تھا۔ اتنا تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں لیکن وہ کوئی بہت ہوشیار اور ذہین آدمی تھا۔" میں نے کہا۔ "اس کی باتوں نے مجھے اور رابعہ دونوں کو متاثر کیا تھا۔ لیکن یہ اس شکاری کا جال تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہم اعتماد میں مارے جائیں۔ اس پر بھروسا کرتے ہوئے فرار کی کوشش نہ کریں اور خود کو محفوظ سمجھیں۔ وہ تو قسمت کہ مجھے اس کے ہر وقت باخبر رہنے کا راز معلوم ہو گیا اور وہ دھوکے میں مارا گیا۔ ورنہ خود سوچو کہ ایک ڈاکٹر کیا اسپتال میں ریوالور لے کر پھرتا ہے۔"

"سوال یہ ہے کہ کسی نے اُسے چیک کیوں نہیں کیا؟"

"اسپتال سب کے لیے کھلا رہتا ہے۔" میں نے کہا۔ "مریض، اُس کی تیمارداری کرنے والے۔ اُن کی خیریت دریافت کرنے کے لیے آنے والے۔ وقت بے وقت پہنچنے والے مریض۔ اِن سب کو چیک کرنا مشکل ہوتا ہے۔ بڑے اسپتالوں میں تو ایک شفٹ کا عملہ دوسری شفٹ کے عملے سے بے خبر رہتا ہے۔ کتنے ڈاکٹر ہیں اور کتنی نرسیں۔ یہ سب کسی کو یاد نہیں رہتا۔ اگر عملے میں کوئی نیا ڈاکٹر شامل ہو جائے تو فوراً سب کو معلوم نہیں ہو جاتا۔ میں شرط لگاتا ہوں کہ اس وقت میں یا محسن ایک گاؤن قسم کا سفید کوٹ پہن لیں اور ہاتھ میں اسٹیتھسکوپ لے کر کسی بھی اسپتال میں پہنچ جائیں تو کوئی ہماری طرف نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھے گا۔ سب ایک جیسے حلیے میں اور اپنے اپنے کام میں مصروف ہوتے ہیں، کسی کے ذہن میں آ ہی نہیں سکتا کہ کوئی جعلی ڈاکٹر یا نرس بھی اُن کے درمیان موجود ہے۔ ہم آپریشن تھیٹر کے اندر تک ہو آئیں گے اور کوئی سوال نہیں کرے گا کہ تم کون ہو۔ اس کے لیے تھوڑا سا اعتماد چاہیے اور ایک معقول قسم کی شخصیت۔ یہی سلیم وکٹر نے کیا۔ رابعہ بھی سب ڈاکٹروں کو نہیں جانتی۔ مختلف وقت پر مختلف ڈاکٹر آتے رہے۔ اُس نے مان لیا کہ یہ بھی ڈاکٹر ہے۔ ڈاکٹر نہ ہوتا تو کیس کے بارے میں کیسے جانتا اور اندر آتا ہی کیوں؟ جب اُس نے اولڈ مین کا تذکرہ ایسے کیا کہ میں بھی شک نہ کر سکا۔ شک تو ایک بیج کی طرح ہوتا ہے۔ اگر وہ ایک بار پھوٹ جائے تو پھر بڑھتا ہی جاتا ہے مگر دماغ میں بیج ہی نہ ہو تو شک کا پودا کیسے سر اٹھائے گا۔ آخری کام اس نے یہ کیا کہ ڈاکٹر لطیف کا حوالہ دے دیا۔۔۔ اور یہی وہ کڑی ہے جس سے دوسری کڑی ملتی ہے۔"

"تمھارا مطلب ہے ڈاکٹر لطیف بھی.....؟" غالب بولا۔

"لاحول ولا قوۃ۔ ایسی احمقانہ بات کر کے تم یہ کیوں ثابت کر رہے ہو کہ تم غلطی سے صحافت کے پیشے میں چلے آئے ورنہ تم تھے مونگ پھلی بیچنے کے قابل۔" میں نے کہا۔ "رابعہ جب ڈاکٹر لطیف کے گھر میں تھی تو دلاور وہاں اپنی بیوی کے نفسیاتی کیس کے سلسلے میں مشورہ کرنے گیا تھا۔"

"کیا وہ پاگل ہو گئی ہے؟" ٹیڈی بولا۔

"نفسیاتی کیس تھوڑے بہت سب ہوتے ہیں۔ ہم بھی ہیں۔" میں نے کہا۔ "جو اعصابی دباؤ یا پریشانی کے باعث نروس بریک ڈاؤن کا شکار ہوتے ہیں، وہ دوسرے درجے کے مریض سمجھے جا سکتے ہیں۔ پاگل پن کے تو کئی درجے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ دلاور وہاں جاتا تھا اور شاید کسی موقع پر اس کی نظر رابعہ پر پڑ گئی۔ اس نے ڈاکٹر لطیف سے پوچھا ہو تو مجھے معلوم نہیں لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ اُس نے رابعہ سے بات کی ہو اور میرے متعلق پوچھا ہو مگر اس زمانے میں رابعہ کو خود اپنی خبر نہ تھی۔ وہ دلاور کو میرے بارے میں کیا بتاتی۔ دلاور نے اسے ایکٹنگ سمجھا ہوگا تو شاید ڈاکٹر لطیف سے پوچھا ہوگا اور اُسے یہ جان کر مایوسی ہوئی ہوگی کہ رابعہ کو تو کچھ بھی یاد نہیں۔ تاہم اس نے رابعہ پر نظر رکھی اور ایک دن اسے اچانک معلوم ہوا کہ رابعہ گھر سے نکل گئی ہے اور ڈاکٹر لطیف نے ہر اسپتال میں فون کیا ہے۔ دلاور نے بھی تمام اسپتالوں سے پوچھا اور بہت جلد رابعہ کا پتا لگانے میں کامیاب ہو گیا۔ اُسے اپنی محنت کا انعام توقع سے زیادہ ملا، یعنی رابعہ کے ساتھ میں بھی مل گیا۔ اس نے فوراً سلیم وکٹر کو میری حفاظت پر مامور کر دیا اور اُس کو حفاظتی انتظامات کی ہر سہولت فراہم کر دی۔"

"سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس نے پولیس کو اطلاع کیوں نہیں دی اور خود سامنے کیوں نہیں آیا؟" محسن بولا۔

"تمھیں اُس کا وہ خط یاد نہیں جو غالب کی معرفت ملا تھا۔ اس میں دلاور نے مذاکرات کی پیشکش کی تھی۔" میں نے کہا۔ "یہ کہنا مشکل ہے کہ اسے مہلت ملتی تو وہ اب کیا کرتا۔ میں بے ہوش تھا اور ایسی حالت میں نہ مجھے پولیس لے جا سکتی تھی اور نہ دلاور مجھ سے بات کر سکتا تھا۔ ہوش میں آتے ہی ایک گھنٹے کے اندر اندر میں فرار ہو گیا۔ اگر اتنی دیر میں اس جعلی ڈاکٹر سلیم وکٹر نے دلاور کو مطلع کیا ہوگا تو دلاور نے کہا ہوگا کہ جلدی کی کوئی بات نہیں۔ صبح دیکھیں گے اور تم اس پر نظر رکھو۔"

"اب وہ دلاور کو کیا جواب دے گا کہ اس نے کیا نظر رکھی تھی۔" محسن ہنس کر بولا۔

"تو کیا جواب دے گا گھر جا کے اپنی جورو کو کہ آدھی رات کو منہ اٹھا کے کہاں نکل گیا تھا؟" میں نے کہا۔ "ہم تو ہیں آزاد لوگ۔"

"آزاد نہیں، گمراہ لوگ۔ میں کہہ دوں گا یہی لوگ مجھے بہکا کے بلکہ ہائی جیک کر کے لے گئے تھے۔" محسن بولا۔ "اور رہتے دار تو وہ خود ہے نافرمان۔ اس نے کھانا پکانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ خود ہی کہا تھا کہ بازار سے لے آؤ۔"

"پھر بھی اب چلنا چاہیے۔" میں نے کہا۔ "کافی سرال چکی اٹھے۔ وہ دونوں پریشان ہوں گی۔"

"خاک پریشان ہوں گی۔ انھیں باتوں میں ہوش ہی کہاں ہوگا کہ کتنی دیر سے شوہر غائب ہے۔" غالب بولا۔

واپسی پر ہم نے اگلے دن کا پروگرام مرتب کیا۔ اس کارروائی میں ہم سب کو شریک رہنا تھا۔ غالب اپنی مونگ پھلی کی ریڑھی پر وکٹر فیملی کے گھر میں ہونے والی کارروائی سنے گا اور آگے نشر کرے گا۔ سو میٹر کے فاصلے پر دونوں جانب میں اور ٹیڈی ٹم اکی ٹاکی لیے موجود رہیں گے۔ گلی میں جانے والی ہر گاڑی کا رنگ، ماڈل اور نمبر وغیرہ سب ایک دوسرے کو بتائیں گے۔ غالب اپنی ریڑھی پر ٹیپ ریکارڈر کا اضافی بندوبست رکھے گا۔ تاکہ وکٹر فیملی کے گھر میں جو گفتگو ہو اس کا ہر لفظ سنا جا سکے۔ ہم سب مسلح ہوں گے اور ہر قسم کی ہنگامی صورتِ حالات کے لیے تیار ہو کے جائیں گے۔ میں اور محسن اپنے پرانے طریق کار کے مطابق دو گاڑیاں حاصل کریں گے۔ گاڑی خریدنے، بیچنے اور بدلنے میں رسک تھا۔ اتفاقِ رائے سے ہم نے طے کیا کہ اپنی ضرورت کے لیے ہم گاڑی کسی سے بھی لے لیں گے۔ اور شرافت سے ایک بار استعمال کرنے کے بعد مالک کو پہنچا دیں گے۔ اسے سمجھا دیں گے کہ وہ پولیس کے چکر سے بچے اور چوبیس گھنٹے کے اندر اندر اسے گاڑی بالکل اسی حالت میں کہیں مل جائے گی۔ نہ سمجھا تو خود پولیس سے چھڑاتا پھرے گا لیکن اس طرح ہمیں کچھ خرچ نہیں کرنا پڑے گا۔ گاڑیوں کی کوئی کمی نہیں ہوگی اور ہم کسی بھی گاڑی کی وجہ سے پہچانے نہیں جائیں گے۔

رات کا ایک بجنے والا تھا جب ہم نے ڈرتے ڈرتے دروازے پر دستک دی۔ کوئی جواب نہ آنے پر میں نے دروازے کو زیادہ قوت سے بجانا چاہا تو دروازہ اندر ہو گیا۔ میں نے حیران ہو کے اُسے پیچھے دھکیلا۔

"یہ کیا۔ دروازہ اس وقت سے کھلا پڑا تھا۔" محسن بولا۔

"اپنی باتوں میں اِتنا بھی ہوش نہیں کہ دروازہ اندر سے بند کر لیں۔" میں نے کہا اور اندر سب سے پہلے داخل ہوا۔ باقی سب مجھ سے صرف ایک قدم پیچھے تھے لیکن گھر کے اندر غیر معمولی خاموشی کا احساس ہم سب کو ایک ساتھ ہوا۔

"کیا سو گئی ہیں دونوں؟" غالب نے کہا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم کتنی دیر میں واپس آ گئے ہیں، زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ گھنٹے میں۔"

"اور میری بہن تو ۔ ایسی قسم کی ہے۔ اس کے صبح تک سونے کا کوئی اِمکان نہیں" محسن بولا "وہ صبح تک تشویش میں مبتلا جاگتی اور رُوتی رہتی۔"

"میں عموماً بارہ بجے کے بعد ہی چلتا تھا ۔۔۔ اور تقریباً اسی وقت گھر پہنچتا تھا تو ہم سب اسی وقت کھانا کھاتے تھے۔" غالب بولا۔ گڑبڑ کا احساس سب کو ہو رہا تھا لیکن دل کی بات زبان پر لانے کی ہمت کسی میں نہ تھی۔

"شہلا ....." سب سے پہلے محسن نے آواز دی۔

"رابعہ ....." میں نے بھی اِتنی اونچی آواز میں کہا کہ وہ گھر کے کسی بھی کمرے میں ہوتی تو سُن لیتی۔ پھر ایک ساتھ ہم نے تینوں کمروں میں اور باتھ رُوم میں دیکھا۔ وہ دونوں کہیں بھی نہیں تھیں۔

"میں اُوپر دیکھتا ہوں ۔۔" استاد ٹیڈی نے بوکھلاہٹ میں کہا۔

"چھت پہ ! اِس وقت چھت پہ کیا کام ان کا ؟" غالب بولا لیکن اِتنی دیر میں ٹیڈی اُوپر پہنچ چکا تھا۔

"اوپر بھی نہیں ہیں وہ" ٹیڈی گھبرا کے واپس بھاگا تو زینے سے گرتے گرتے بچا۔ ہم سب خوف اور پریشانی میں اپنی اپنی جگہ منجمد ہو گئے۔ شکوک و شبہات کی گنجائش ہی نہ تھی۔ وہ اپنی مرضی سے اتنی رات گئے کہیں جانے والی نہیں تھیں۔ انھیں کوئی لے گیا تھا۔ غالب بیڈ پہ بیٹھ گیا۔ ٹیڈی دیوار سے ٹیک لگا کر دوسری دیوار کو گھورنے لگا۔ میں نے اُس جگہ کو دیکھا، جہاں وہ بیٹھی تھیں۔ یوں جیسے برسوں کی بچھڑی ہوئی سگی بہنیں۔ دلوں کی ایک جیسی بے قراری اور محبت کی ایک جیسی تڑپ کے ساتھ، جذبوں کی ساری خوبصورتی ان کی حسین صورتوں پہ یوں جھلک رہی تھی جیسے شفاف سطحِ آب پہ چاندنی۔ اب وہ جگہ سنسان پڑی تھی۔

"ان کو اغوا کر لیا گیا سکندر" محسن نے بہت دیر بعد کھوکھلے لہجے میں کہا۔ کسی نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ یہ کوئی سوال نہیں تھا اور تھا تو اس کا جواب کوئی نہیں دے سکتا تھا۔ یہ وہ بے رحم حقیقت تھی جو خود اپنا وجود تسلیم کراتی تھی۔ کسی کو کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ انھیں دلاور اینڈ کمپنی کے شکاری اٹھا لے گئے تھے۔ ایک بار تو رابعہ کو نازو اپنی جان پہ کھیل کے نکال لائی تھی مگر نازو وہ بجلی تھی جو طوفان سے ٹکرا سکتی تھی۔ وہ چنگاری تھی جو شعلوں سے اُلجھ سکتی تھی اور وہ موجِ نسیم تھی جو بادِ سموم کو پلٹ سکتی تھی۔ کیا اب رابعہ بھی شہلا کے لیے کچھ کر سکے گی ؟ نازو پہلے دشمنوں کے حصار میں تھی اور کسی دشواری کے بغیر اس نے حصار کو عبور کر لیا تھا۔ مجھے اب اس کی کامیابی بھی ایک جنگی چال نظر آنے لگی۔ دشمن نے اسے بھی کامیابی کا ... دیا تھا۔ وہ ہمیں اس کامیابی پہ خوش ہوتا دیکھنے کے لیے بیٹھے ... ہماری شکست پہ خندہ زنی کے لیے۔

"وہ یہاں تک کیسے پہنچ گئے یار" غالب نے کہا ... سب چونک پڑے "وہ بہت چالاک شکاری ہیں۔ ہم وقتی کامیابی ... سے خوش فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے" میں نے کہا "انھوں نے ... سے یہاں تک ہمارا پیچھا کیا ہو گا۔"

"کیا تم نے ..... دیکھا تھا ؟" غالب بولا۔

"ہاں ..... دیکھا تو تھا ..... اور ہم براہِ راست آئے ... تھے" میں نے کہا "ہم نے رکشا والے سے مزنگ چلنے کو کہا تھا ... میں پروگرام بدل دیا تھا۔ داتا دربار میں رُکے تھے اور وہاں سے ... رکشا میں یہاں تک آئے تھے ..... کہیں بھی مجھے اپنے تعاقب ... کوئی نظر نہیں آیا تھا۔"

"وہ اتنے بے وقوف تو نہیں ہیں کہ پیچھے آتے تو اس طرح ... کہ پتا چل جائے" اُستاد ٹیڈی نے برہمی سے کہا "بڑا تیر مارا تھا ... نے اُن کی آنکھوں میں دھول جھونک کر۔ وہ سب دیکھ رہے ... سب جانتے تھے۔"

میں نے اقرار میں سر ہلایا اور مجرم کی طرح سب کی طرف دیکھا "میں نے وہی کیا تھا جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔ میری جگہ تم ... تم میں سے کوئی بھی ہوتا تو یہی کرتا ..... یہ ناممکن تھا کہ میں ... پڑا رہتا اور کچھ نہ کرتا۔"

"تمھیں کوئی الزام نہیں دے رہا ہے" غالب نے کہا۔

"ظاہر ہے اُن کا کوئی آدمی باہر بھی موجود تھا۔ کسی گاڑی ... یا موٹر سائیکل پر جس نے رکشا کا نمبر دیکھ لیا ..... اور پھر بہت فاصلے سے تعاقب کیا۔ غالباً اس نے داتا دربار پہنچ کر رکشا والے سے پوچھ لیا ہو گا کہ ہم کدھر گئے اور اُس نے بتا دیا ہو گا۔ ہم نے اس کا کام آسان کر دیا" میں نے کہا "اگر ہم ایک رکشا چھوڑ کے فوراً دوسرا رکشا لیتے تو شاید وہ تعاقب جاری نہ رکھ پاتا۔ مگر ہم ایسا کرتے تو رکشا والا شک میں پڑ جاتا۔"

"کیا تجھے یقین ہے کہ ایسا ہی ہوا تھا ؟" محسن بولا۔

"میرا دل تو نہیں مانتا۔ میں اِمکان کی بات کر رہا ہوں" میں نے کہا "اصل بات کچھ اور ہو گی ۔۔۔ یا تو اُن کو پہلے سے ہمارے ٹھکانے کا عِلم ہو چکا تھا لیکن وہ کسی وجہ سے خاموش تھے۔"

"وجہ کچھ نہیں۔ وہ تینوں کو ایک ساتھ پکڑنے کے لیے مناسب موقع کا انتظار کر رہے تھے" غالب نے کہا "اب تک وہ نازو کا میک اَپ بھی اُتار چکے ہوں گے اور اس کے سب پیغام رسانی کے خفیہ آلات ضبط کر چکے ہوں گے۔"

"اب ہمیں کیا کرنا چاہیے ؟" استاد ٹیڈی نے کہا اور ہم سب نے اس کو یوں دیکھا کہ وہ شرمندہ ہو گیا۔ اس کا سوال احمقانہ تھا۔ ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔

"یہ مذاق ہمیں بہت مہنگا پڑا" محسن نے کہا۔

"کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر ہم باہر نہ گئے ہوتے تو وہ ہمیں بھی ساتھ ہی لے جاتے ؟" میں نے کہا۔

غالب نے نفی میں سر ہلایا "وہ ہمیں لے جانا چاہتے تو ہماری واپسی کا اِنتظار کر سکتے تھے۔ ہم اسی طرح پکڑے جاتے جیسے چوہے دان میں چوہا گرفتار ہوتا ہے۔ وہ ہمیں ہینڈز اَپ کراتے اور ریوڑ کی طرح ہانک کر لے جاتے۔"

"کہاں لے جاتے ؟" میں نے کہا۔

"ہاں ۔۔ یہ سوچنے کی بات ہے" غالب نے کہا "میرا خیال کہتا ہے کہ وہیں جہاں نازو ہے۔ وہ شہلا اور رابعہ کو بھی وہیں لے گئے ہوں گے۔"

"میرا دل بھی یہی کہتا ہے" میں نے کہا۔

"یہ ہو سکتا ہے" محسن نے کہا اور ٹیڈی نے فقط تائید میں سر ہلایا۔

"اگر سب یہی سمجھتے ہیں ..... تو پھر دیر کیسی ؟" میں نے کہا۔

"تمھارا مطلب ہے ہم اس اسلحہ خانے پر حملہ کر دیں اور اپنے یرغمالی چھڑا کے لے آئیں ؟" محسن بولا "مر جائیں یا مار آئیں ؟"

"کیا ہم ایسا نہیں کر سکتے ؟" میں نے کہا۔

"یہ سراسر خودکشی ہو گی۔ ہمیں اُن کے پیغام کا انتظار کرنا ہو گا۔ وہ ہم سے کوئی سودا کریں گے۔ کوئی بات منوائیں گے۔"

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ ہم سب یوں اچھل پڑے جیسے کوئی بغیر بتائے اندر آ گیا ہے۔ حالانکہ یہ دستک بیرونی دروازے پر ہوئی تھی۔ ٹیڈی قریب تھا چنانچہ وہ سب سے پہلے دروازے تک جا پہنچا۔ ہم سب جو اس کے ساتھ بیٹھے تھے، رُک گئے۔

"ٹھہر جاؤ اُستاد" میں نے چلّا کے کہا اور جیب سے ریوالور نکال کے دروازے کی اوٹ میں ہو گیا "تم سب ہٹ جاؤ پیچھے۔" مگر اتنی دیر میں ٹیڈی نیچے جھکا۔ میں نے اُسے نیچے سے کچھ اُٹھاتے دیکھا۔

"یہ ..... یہ کوئی کاغذ ہے" ٹیڈی چلّایا اور اُس نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر دروازہ باہر سے بند تھا۔ میں نے ٹیڈی کے ہاتھ سے وہ کاغذ چھین لیا۔

"وہ دروازے کو باہر سے کنڈی لگا گیا ہے" ٹیڈی نے مشتعل ہو کے ایک ایسی گالی دی جو وہ بھول چکا تھا۔ غالب اور محسن میرے قریب ہو کے اس کاغذ کی تحریر کو پڑھنے لگے اس پر لکھا تھا۔

"سکندر !
میں نے تمھیں پہلے بھی پیغام بھیجا تھا۔ آخر تم مجھ سے بات کیوں نہیں کرتے ؟
دلاور"

"بس۔ صرف ایک سطر" محسن نے مایوسی سے کہا۔

"جو کچھ اسے لکھنا تھا وہ پہلے ہی لکھ کر بھیج چکا تھا" میں نے کہا "اب تو اُس نے صرف یہ کہا ہے کہ تم بات کرنے پر مجبور ہو۔ اب تم انکار نہیں کرو گے ۔۔۔ اور اس نے ٹھیک کہا ہے میں جاؤں گا۔"

"سکندر بادشاہ ۔۔ کہاں جاؤ گے تم ؟" ٹیڈی نے خوف زدہ ہو کے کہا۔

"اس نے ایک ٹیلی فون نمبر دیا تھا" میں نے کہا "وہ خود بتا دے گا کہ مجھے کہاں خود کو پیش کرنا ہے۔"

"ہم بھی تمھارے ساتھ چلیں گے" ٹیڈی بولا۔

"اُس نے تو مجھے بلایا تھا" میں نے خالی خالی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا "یہ مرضی ہے اس کی کہ وہ میرے ساتھ کسی اور کو آنے کی اجازت دے یا نہ دے۔"

"تم ..... تم شاید واپس نہ آ سکو ۔۔" محسن بولا۔

"ہاں ..... لیکن وہ تینوں آ جائیں گی" میں نے کہا "وہ ہم میں سے کسی کو بھی بلاتے تو وہ جاتا۔ کیا تم انکار کر سکتے تھے محسن ؟ اور تم غالب ؟ کیا یہ ممکن تھا کہ تم نہ جاتے ۔ تم استاد ؟" اُن میں سے کسی نے مجھ سے نظر نہیں ملائی۔ اُن میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں تھا۔ پھر اُن کا فیصلہ مختلف کیسے ہو سکتا تھا۔

"عجلت میں فیصلہ مت کرو" غالب نے کہا "اس وقت کسی کا دماغ کام نہیں کر رہا ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ ہمیں صبح تک سوچ سمجھ کے کوئی لائحہ عمل مرتب کرنا ہو گا۔ ہونے والی بات تو ہو چکی لیکن کیا یہ ہماری شکست ہو گئی ؟ جنگ ختم ہو گئی، صرف اِتنی سی بات پر کہ وہ دو لڑکیوں کو اٹھا کر لے گئے۔"

"یہ اتنی سی بات ہے غالب کے بچے" اُستاد ٹیڈی چلّایا۔

"سنو دوستو ! وہ سب ہماری محبت تھیں۔ مگر کیا ہماری محبت ہماری کمزوری ثابت ہو گی ؟" غالب نے کہا "وہ ہمارا حوصلہ تھیں مگر کیا اُن کے بغیر ہمارا عزم کچھ نہیں۔ ہمارا مشن آخر کیا تھا۔ سب کا نقصان، سب کے اندیشے ۔۔۔ اور سب کے خطرات برابر ہیں۔ کیا اس نقصان پر ہم اپنے مشن کو قربان کر دیں گے ۔۔۔ ہمارا مشن ایک عورت کا حصول تھا ؟ صرف اس کے ساتھ گزاری جانے والی ازدواجی زندگی کی خوشیاں ہمارا مقصدِ حیات تھیں تو ہم نے اِتنا وقت کیوں ضائع کیا ؟ ہم یہاں تک کیوں آئے ؟"

اس کی بات نے ہم سب کو پھر احساس دِلا دیا کہ وقتی

صدمے نے ہم سب کو کسی حد تک متاثر کیا تھا۔ اب سونے کا کوئی سوال نہ تھا۔ یہ سوچنے کا بھی کوئی فائدہ نہ تھا کہ وہ رالعہ، شہلا، یا نازو کے ساتھ کیا کر سکتے تھے اور کیا کریں گے۔ پیغام نے ہماری سوچ کو بھٹکنے نہیں دیا تھا۔ اب یہ توقع تھی کہ وہ میرا یا میرے جواب کا انتظار کریں گے اور اگر میں نے انکار نہ کیا تو اُن کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی جائے گی۔ بے شک اب وہ اس پوزیشن میں تھے کہ انھیں ہمارے سامنے یا ہمیں ان کے سامنے لے جا کر ہر بات منوا سکتے تھے یا اگلوا سکتے تھے مگر آج کی رات ہم آزاد تھے۔ وہ ہمیں جان بوجھ کر چھوڑ گئے تھے کہ ہم صبح تک کوئی فیصلہ کر سکیں۔"

"تم لوگ ڈرائنگ روم میں چلو۔" محسن نے کہا۔ "میں سب کے لیے کافی بنا کے لاتا ہوں۔"

"میں دروازے کو چیک کر لوں۔" میں نے کہا۔ "کہیں دروازے تک آ کے پیغام چھوڑنے اور ہمیں قید کر جانے والا وہی آلات یہاں نصب نہ کر گیا ہو جو ہم نے دکٹر فیملی کے گھر میں پہنچائے تھے۔ ہماری جوتی اور ہمارا ہی سر والا کیس نہ ہو۔"

"لیکن ..... دروازہ تو باہر سے بند ہے۔" ٹیڈی نے کچھ تاخیر سے کہا، کیونکہ وہ بھی اپنے خیالوں میں گم تھا۔ اس وقت تک وہ دروازہ کھولنے کی کوشش کر چکا تھا۔ میں بھی بھولا ہوا تھا کہ دروازہ نہیں کھولا جا سکتا مگر مجھے اس وقت بڑی حیرانی ہوئی جب دروازہ کھل گیا۔ میں نے کسی کے فرار ہوتے قدموں کی صدا پر بڑی پھرتی سے اپنا ریوالور نکالا اور باہر آ گیا۔ فرار ہونے والے کو میں نے تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر دیکھا۔ وہ سرتاپا سیاہ لباس میں تھا اور آخری کونے کی اسٹریٹ لائٹ کے قریب پہنچ کر اُس نے پلٹ کر دیکھا۔ تب بھی میں اس کی صورت نہ دیکھ سکا کیونکہ اس کے چہرے پر بھی چادر کا پلّو تھا جس میں سے صرف اس کی آنکھیں نظر آتی تھیں۔ میں نے ریوالور اُٹھایا اور نیچے کر لیا۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا لیکن وہ حرکت میں تھا اور یہ ہو سکتا تھا کہ نشانہ خطا جائے۔ محلّہ تو سارا جاگ اُٹھے مگر میرے ہاتھ کچھ نہ آئے۔ میں نے اُس کے پیچھے دوڑ لگانے کا سوچا مگر پھر خود ہی اس ارادے کو ترک کر دیا۔ اُسے پچاس گز آگے ہونے کا فائدہ حاصل تھا اور وہ تھا بھی بہت تیز رفتار۔ ذرا سی دیر میں وہ میری نگاہ سے اوجھل ہو گیا۔ پھر کسی جیپ کا انجن غُرّایا۔ اور جیپ کی ایک جھلک مجھے اس وقت دکھائی دی جب جیپ گلی کے سامنے سڑک پر سے گزری۔ گلی کے آخری حصّے کے بعد سڑک پر کوئی اُسے واپس لے جانے کے لیے تیار کھڑا ہوا تھا۔

"کچھ ملا؟" غالب نے میرے قریب آ کے کہا۔ "یہ ٹیڈی تو کہہ رہا تھا کہ دروازہ باہر سے بند ہے؟"

"تو کیا میں جھوٹ بول رہا تھا؟" ٹیڈی نے چڑ کر ہو کے کہا۔

"جھوٹ نہیں تھا تو کیا سچ تھا؟" غالب نے بھی اُلٹا میں کہا۔ "سکندر کے پاس جادو تو نہیں ہے کہ اس نے خود کہ سے لگی ہوئی کنڈی کھول لی۔"

"کوئی باہر موجود تھا۔" میں نے دروازہ بند کرتے ہوئے سب کو مطلع کیا۔ "جس نے کنڈی لگائی تھی، وہ دروازے سے لگا کھڑا رہا اور ہماری گفتگو سنتا رہا تھا۔"

"تم قیاس آرائی کر رہے ہو....."

"نہیں ـــــ جب میں نے دروازہ کھولا تو وہ بھاگا۔" ... نے کہا۔ "میں نے خود اُسے بھاگتے دیکھا ـــــ ایک جیپ اُسے لے گئی ہے۔"

"تم نے دیکھ لیا تھا اُسے؟ کون تھا وہ؟" محسن بولا۔

"گولی کیوں نہیں مار دی اُسے ـــــ" ٹیڈی نے کہا۔

"یار! اُس نے کالی چادر لپیٹ رکھی تھی۔ بہت دور نکل گیا تھا وہ۔" میں نے کہا۔ "گولی تو مار دیتا مگر اس کے بعد کیا ہر لوگ باہر نکل آتے کہ یہ کیا تھا ـــــ اُسے گولی لگتی یا نہ لگتی ہم تو میں پولیس کا چکر پڑ جاتا۔"

ایک بات پر ہم سب کا اتفاقِ رائے تھا کہ یہ جگہ اب چوہدری دلاور کی نظروں سے محفوظ نہیں اور تحفظ کا احساس محض ہماری خوش فہمی تھی۔ بظاہر یوں لگتا تھا کہ اس شہر کے کسی گوشے میں ہمارے لیے مستقل پناہ نہیں۔ دلاور ہزار آنکھوں والا ہزار پایہ ہے جو ہر جگہ دیکھ سکتا ہے اور ہر جگہ پہنچ سکتا ہے اور اس سے کہیں مفر نہیں۔ آئندہ ہمارا ٹھکانہ کہاں ہو گا؟ یہ مسئلہ خارج از بحث تھا اور زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا تھا، جہاں سینگ سمائیں ـــــ جہاں تقدیر لے جائے۔

یہ غالب تھا جس نے ایک سوال پھر اٹھایا کہ وہ شہلا اور رالعہ کو کہاں لے گئے ہوں گے۔ "غالباً وہیں جہاں نازو ہے۔" ہم سب نے کہا ـــــ یہ ہم پہلے بھی کہہ چکے تھے۔

"وہ انھیں کسی دوسری جگہ بھی لے جا سکتے ہیں۔" غالب نے کہا۔

"ہاں ـــــ انتخاب رالعہ یا شہلا کے ہاتھ میں نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"اور کون سی جگہ ہو سکتی ہے؟" غالب بولا۔ "کیا وہ انھیں اپنے گھر لے جائیں گے ـــــ نہیں ـــــ وہاں ان کی اپنی فیملی ہے۔ وہ جو کچھ باہر کرتے ہیں، اُس کا تعلق اُن کی فیملی سے نہیں ہوتا اور اس کا اثر ان کے گھر پر نہیں پڑتا۔"

"اُن کے پاس جگہ کی کمی نہیں۔ اُن کے وسائل محدود نہیں اور ان کے سارے خفیہ ٹھکانے ہمارے علم میں نہیں۔" میں نے کہا۔

"میں ایک مختلف زاویے سے دیکھ رہا ہوں۔" غالب نے کہا۔ "میں نے بھی ان کے گھر اور خاندان کی بات کی تھی جو اُن کے غیر قانونی اور غیر اخلاقی کاروبار کے اثرات سے محفوظ ہیں۔ لیکن کیا ہمارے گھر اور خاندان اُن کی بدمعاشی اور جارحیت سے محفوظ ہیں؟ ایسا پہلے بھی ہوا ہے۔ وہ رالعہ اور نازو کو اٹھا کے لے گئے تھے۔ لیکن اس وقت وہ ہمارے ساتھ ایک محاذ پہ آگئے تھیں۔ آج انھوں نے ہمارے گھر میں گھس کر کارروائی کی ہے۔ وہ محسن کی بیوی کو اُٹھا لے گئے ہیں۔ محسن کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ دلاور کی بیوی کو اٹھا لائے۔"

میں نے غالب کے استدلال پر محسن کی طرف دیکھا۔ پھر محسن نے میری طرف دیکھا۔ ہم دونوں کی نظر کا سوال ایک ہی تھا۔ کیا غالب ٹھیک نہیں کہتا؟ ـــــ جنگ میں اخلاقی اصولوں کی پاسداری دونوں فریق کرتے ہیں یا پھر کوئی بھی نہیں کرتا۔ پہل کرنے والے ہم نہیں تھے مگر ہمارے لیے ایسی ہی جوابی کارروائی کا جواز یقیناً پیدا ہو گیا تھا۔

"یہ بھی سوچو سکندرِ اعظم کہ رشتوں کی آبرو کا پیمانہ صرف نکاح نامہ نہیں ہوتا، جو محسن کے پاس ہے اور تمھارے پاس یا میرے پاس نہیں ہے۔ رالعہ تمھاری بیوی نہیں۔ نازو میری کچھ نہیں مگر کیا وہ ہماری عزّت نہیں ہیں؟ ـــ ہم اُن کی عزّت کے اتنے ہی رکھوالے ہیں، جتنا دلاور اپنی بیوی کی عزّت کا رکھوالا ہے۔ یہاں قانون اور اخلاق میں ذمّے داری کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔" غالب نے کہا۔

"میں تمھارے خیال سے اختلاف نہیں کر سکتا۔" میں نے کہا۔

"اختلاف محسن بھی نہیں کر سکتا۔" غالب نے کہا۔ "اگر ہم اپنے عقیدے کو دیکھیں تو اس میں آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت یا جان کے بدلے جان لینے کا تصوّر ہے۔ ہمیں یہ حکم نہیں کہ کوئی تمھارے ایک گال پہ طمانچہ مارے تو تم دوسرا گال بھی اس کے سامنے کر دو۔ جہاں تک ہمارے ساتھ ہونے والی زیادتی کا تعلق ہے تو سوال قانونی رشتے کا نہیں.......... ایک دشمن ہم سے وہ چیز چھین کر لے گیا جو ہمیں بہت عزیز تھی۔ ہماری آنکھ اور ہمارے دانت سے بھی زیادہ اور وہ ہمارا دشمن تھا۔ اس سے ہماری جنگ ہے ـــــ کھلی جنگ۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہمیں دلاور نے ہی مجبور کیا ہے کہ ہم اُسی کے سکّوں میں اس کو ادائیگی کریں۔" محسن بولا۔

"اب یہ ہمارا مفروضہ ہے کہ وہ رالعہ اور شہلا کو بھی نازو کے ساتھ قید کر کے لے گئے ہوں گے۔ اس مفروضے کی بنیاد کوئی نہیں۔ ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ دکٹر فیملی کے اسلحہ خانے پر حملہ کر کے سب کو چھڑا لانا بھی ناممکن ہے۔ لیکن ایک کام ہم کر سکتے ہیں۔ سو فی صد یقین کے ساتھ جس میں ناکامی کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔" غالب نے کہا۔ "ہم نے چوہدری دلاور کا گھر دیکھا ہے۔ اس کے علاوہ اپنے دشمنوں میں سے ہم نے ایس پی سراج کا گھر دیکھا ہے۔ سکندر کو چوہدری حشمت کا گھر معلوم ہے جو پولیس میں انسپکٹر یا سب انسپکٹر ہے۔ ڈی سلوا جس کوٹھی میں تھا وہ اب خالی پڑی ہو گی۔ لیکن وہ بھی ایک ٹارگٹ ہے۔ کیا یہ چار ٹارگٹ کافی نہیں؟"

"ٹارگٹ کس مقصد کے لیے؟" میں نے کہا۔

"ہمارے پاس بارہ ٹائم بم ہیں۔" غالب نے کہا۔ "ہم ان میں سے چار استعمال کر سکتے ہیں ـــــ ایک ایک گھنٹے کے وقفے سے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایک بم کے پھٹنے سے شاید شکاری خوف زدہ نہ ہوں۔ دوسرا دھماکا ان کے حوصلے پست کر دے گا۔ تیسرے دھماکے سے پہلے اگر چوہدری دلاور کو بتا دیا جائے کہ وہ اس مہلت سے فائدہ اٹھا لے، ورنہ نہ اس کا گھر رہے گا نہ خاندان۔ تو مجھے امید ہے ہم اس سے ہر بات منوانے کی پوزیشن میں ہوں گے۔"

غالب کی تجویز نے ہم سب کو دم بخود کر دیا۔ یہ خطرناک جنگ کی ابتدا تھی مگر جنگ تو ہوتی ہی خطرناک ہے۔ اِس حکمتِ عملی سے دلاور کو ایک فیصلہ کُن جنگ میں شکست ہو سکتی تھی۔ اس سے مطلوبہ نتائج حاصل ہو سکتے تھے اور ہم ثابت کر سکتے تھے کہ "ایم آر ایس" ایک نام ہی نہیں، ایک طاقت بھی ہے۔ ایک ایسی طاقت جس سے ٹکرانا آسان نہیں رہا۔ اگر یہ پلان کامیاب رہا تو شکاری پہلی بار ہماری قوت کے مظاہرے سے خوف زدہ ہوں گے۔ انھیں یقین کرنا پڑے گا کہ ہم بھی شکاری ہیں، جو اُن کو اسی طرح شکار کر سکتے ہیں جیسے اب تک وہ سب کو شکار کرتے رہے ہیں ـــــ اُن کو جو بے گناہ مارے گئے ـــ جو ہمارے مقابلے کے لیے خریدے گئے اور جان گنوا بیٹھے۔ سائیں یا پیر والے سے سیوک رام اور وکٹر فیملی تک، سب اسی ہوسِ زر کے شکار تھے۔ چوہدری دلاور نے اپنے پیسے سے ڈی سلوا کو، استاد پیڈرو اور خسرو جمشید کو، ڈی ایس پی سراج کو اور اُن سب کو شکار کیا جو ضمیر کو قابلِ فروخت سمجھتے ہیں۔ اس کی عیاری اور سفاکی نے وزیر خان کو اور میر شرافت علی کو شکار کیا۔ رالعہ، اس کی ماں اور دوسرے اَن گنت لوگ اس کی بربریت کا شکار رہے۔ لیکن خود دلاور سے اُوپر عالمی سیاست کے شکاری تھے جو اسی پیسے کی قوت سے سرحدیں بدل رہے تھے۔ دِلوں میں تفرقے

پیدا کر رہے تھے۔ گھر اور بستیاں اُجاڑ رہے تھے اور اسلحہ خرید کر ان انسانوں کے ہاتھوں میں تھما رہے تھے جو قاتل نہیں تھے مگر ان کے دِلوں میں نفرت کا بیج بو دیا گیا تھا۔ چنانچہ وہ عصبیت کا شکار ہو کے اپنے ہم وطنوں کا شکار کر رہے تھے۔ خون کی ہولی کھیل رہے تھے اور انسانیت کی قدروں کو پامال کر رہے تھے شکاری سب تھے اور شکار بھی سب تھے ــــ نیچے سے اُوپر تک مشرقی پاکستان میں علیحدگی پسندی کی تحریک چلانے والوں سے لے کر اس تحریک کی نشو و نما کرنے والوں تک ــــ

"اب کیا رہ گیا ہے سوچنے کو؟" غالب نے کہا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے کہا۔ "ہمیں کیا کرنا ہو گا؟"

"ابھی صبح ہونے میں دیر ہے کم سے کم چار گھنٹے ہیں جس میں ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں۔" غالب نے کہا۔ "وہ ٹائم بم کبھی کسی نے دیکھے؟ مطلب یہ کہ ان کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اگر انھیں اِستعمال کرنا ہو تو کیسے کیا جائے گا؟"

"اب تک کوشش تو نہیں کی۔ مگر ٹائم بم کا میکینزم کوئی کمپیوٹر کا سرکٹ نہیں ہوتا۔" محسن بولا۔ "کلاک ورک ہوتا ہے۔ ابھی سمجھ لیتے ہیں۔" وہ اٹھا اور باہر نکل گیا۔ جب وہ لوٹا تو اس کے ہاتھ میں ایک ٹائم بم تھا جو اس نے ٹیڈی کی طرف اچھال دیا۔

"لو اُستاد پکڑو۔ کیچ ــــ" محسن نے کہا۔ استاد ٹیڈی کے حلق سے ایک عجیب سی آواز نکلی اور اس کی حالت خندق میں بیٹھے ہوئے شخص سے بدتر ہو گئی جس کے سر پہ بم آ گیا ہو۔ نہ وہ اٹھ کر بھاگ سکتا تھا اور نہ کیچ سکتا تھا۔ کیچ وہ خاک کرتا۔ اس نے نہایت مضحکہ خیز انداز میں اِدھر اُدھر ہاتھ چلائے جیسے ناک پر بیٹھنے والی مکھی کو اُڑا کر بھگا رہا ہو اور پھر آخری وقت میں لڑھک گیا۔ اس کے منہ سے نکلنے والی مضحکہ خیز آوازیں سُن سُن کر ہم سب کا ہنستے ہنستے بُرا حال ہو گیا۔ ہماری ہنسی اس وقت قابو سے باہر ہو گئی جب ٹائم پیس کے برابر بم اُس کی گود میں گرا اور اس نے زور سے کلمہ پڑھا جیسے بم پھٹ گیا تو اُسے اس کی مہلت بھی نہ ملے گی۔

جب کچھ بھی نہ ہوا اور اُس نے ہمیں ہنستے دیکھا تو وہ ایک دم اٹھا ــــ "تیری تو ایسی کی تیسی۔" وہ محسن کے پیچھے دوڑا۔ "ارے استاد ــ کیا گناہ ہے آخر میرا۔ کیچ خود تم نے نہیں کیا اور مارتے ہو مجھے۔" محسن نے چھلانگ مار کر اپنی جان بچائی۔

"لو..... بچا لیے پر بم پھینک دیا اور کہتا ہے میرا گناہ کیا ہے۔" غالب بولا۔

"بم پھٹ جاتا تو بچارا دُنیا سے کنوارا جاتا۔" میں نے کہا۔

"بڑی خود غرضی کی بات ہے کہ خود تو شادی کر لی اور ٹیڈی پر بم گرا دیا۔"

اُستاد ٹیڈی کا خوف پہلے شدید اشتعال میں تبدیل ہو گیا تھا۔ ہماری ہنسی نے غصّے کو خجالت میں بدل دیا۔ وہ بیٹھ گیا۔ "یار ایسا جان لیوا مذاق نہیں کرنا چاہیے۔" وہ بولا۔

"ابے کوڑھ مغز ــــ عقل کے دشمن۔" محسن نے کہا۔ "بم والا ہوتا تو یہ دوسرے آرام سے بیٹھے رہتے ــــ اور میں پھینکتا۔ قسم خُدا کی میرے لیے تو ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ سالا اتنا احمق ہے۔"

"اُستاد..... بم میں ایک تو ہوتا ہے فیوز۔" غالب نے اسے سمجھانے کے لیے کہا۔ "جب تک فیوز نہ لگایا جائے۔ بم اتنا ہی رہتا ہے۔ جیسا کوئی کھلونا ــــ اس کے علاوہ یہ تو خاص سسٹم کا، اُس میں ٹائم سیٹ کرنا ضروری ہے۔ جیسے الارم ٹائم سیٹ کیے بغیر نہیں بجتا۔ ایسے ہی یہ ٹائم بم بھی سیٹ کیے ہوئے ٹائم پھٹتا ہے۔" اتنی دیر میں محسن نے ٹائم بم کو اُلٹ پلٹ کر سے دیکھ لیا تھا۔ اس نے اپنی رائے کا اظہار غالب سے کیا اور غالب نے اس سے اتفاق کیا۔ پھر انھوں نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی لیکن میں نے کہا کہ میں اپنی ناقص عقل کو اس دام سے دُور رکھ کے خوش ہوں۔ اللہ آپ دونوں کی مغفرت کرے۔ اگر سمجھنے میں کوئی غلطی ہو جائے ــــ تجربے کی گنجائش بھی نہیں تھی چنانچہ انھوں نے بم کو ایک طرف رکھ دیا اور آدھے گھنٹے میں ہم نے اپنا پلان بنا لیا۔

اس کا پہلا مرحلہ دو ٹیموں کی تشکیل سے شروع ہوا۔ ایک ٹیم میں میرے ساتھ غالب رہا۔ دوسری ٹیم میں سالے بہنوئی کو شامل کیا گیا۔ اِس تنبیہ کے ساتھ کہ وہ بم ایک دوسرے کو نہ لگائیں۔ پروگرام کے مُطابق انھیں ڈی سلوا کی خالی کوٹھی میں پہلا بم رکھنا تھا اور اس کا وقت اتفاقِ رائے سے دس بجے رکھا گیا تھا۔ چونکہ ٹائم بم میں زیادہ سے زیادہ بارہ گھنٹے کی گنجائش ہوتی ہے۔ اس لیے ضروری تھا کہ آخری بم کا وقت دو بجے ہو۔ دُوسرا بم بھی انھی کو ایس پی سراج کے گھر میں لگانا تھا اور اس کا وقت گیارہ بجے کا تھا۔ باقی دو بم میرے اور غالب کے پاس تھے۔ تیسرے بم کے لیے بارہ بجے کا وقت اور حشمت خان کا گھر منتخب کیا گیا تھا اور آخری بم چوہدری دلاور کے گھر کے لیے تھا۔ دلاور کو دو گھنٹے کی مہلت دی گئی تھی تاکہ وہ فیصلہ بھی کر سکے اور اُس پر عمل درآمد کے انتظامات ہماری مرضی کے مطابق ممکن ہوں۔

اس وقت رات کے یا صبح کے تین بجے تھے۔ اندھیرے کو دیکھتے ہوئے اسے رات ہی سمجھا جا سکتا تھا مگر اصُولاً یہ دن کی صبح کا آغاز تھا اور اس آغاز کو بھی تین گھنٹے بیت چکے تھے ــــ حشمت خان کا گھر ایک سمت میں تھا تو دلاور کا دوسری سمت میں اور ہم واپس پہنچتے تو ایک تکون کے تین اضلاع کی مسافت طے کرتے ــ مجموعی فاصلہ پندرہ میل سے کم نہ ہوتا۔ چنانچہ پہلا مسئلہ ٹرانسپورٹ کا تھا۔ محسن اور ٹیڈی کی ٹیم پر بھی واضح کر دیا گیا تھا کہ انھیں ذرائع نقل و حمل خود تلاش کرنے ہیں یا پیدا کرنے ہیں۔

ہم دو فرلانگ تک پیدل چلتے رہے لیکن اتنی دیر میں ہمارے قریب سے ایک چوکیدار سائیکل پہ گزر رہا۔ ایک کتا چار ٹانگوں پر اور ایک پولیس مین دو ٹانگوں پر گزرے اور دُور دھرلے جانے والا ایک رِیڑھا گزرا جس میں دو ٹانگوں والا جانور چار ٹانگوں والے کو نہار منہ گالیاں دے رہا تھا۔ ہماری مایوسی اور دل شکستگی کو مرزا غالب نے حسنِ تدبیر سے نئی اُمید اور تازہ حوصلہ دے کر جدّ و جہد کے جوش اور ولولے میں بدل دیا تھا۔ ہم محسوس کرنے لگے تھے کہ ہاری ہوئی بازی جیتی جا سکتی ہے۔

اچانک غالب نے مجھے کہنی ماری اور سڑک پر گِر گیا۔ میں نے پیچھے سے آنے والی گاڑی کی ہیڈ لائٹ دیکھ لی تھی۔ میں نے سڑک کے درمیان میں آ کے زور زور سے ہاتھ ہلانا شروع کیا۔ قریب آ کے کار رُک گئی۔ ان کے لیے رُکے بنا چارہ بھی نہ تھا کیونکہ غالب آدھی سڑک پر لمبا پڑا ہوا تھا۔ باقی راستہ میں نے روک رکھا تھا۔ عورت اور مرد دونوں جوان تھے لیکن عورت خوف زدہ ہو گئی تھی۔

"میں نے..... تم سے کہا تھا....." وہ بولی۔ "گاڑی مت روکو۔"

"شٹ اپ۔" مرد نے کہا اور پھر مجھ سے مخاطب ہُوا۔ "کیا بات ہے؟"

"یہ میرا ساتھی..... چلتے چلتے لیٹ گیا۔" میں نے کہا۔ "غالباً اس پر دل کا دورہ پڑا ہے۔ بڑی مہربانی ہو گی..... اگر آپ اِسے اسپتال....."

"اُف..... بھئی ہم ایئرپورٹ جا رہے ہیں۔" مرد بولا۔ "میرا سالا آ رہا ہے۔ اسپتال گئے تو دیر ہو جائے گی۔ ہم ایئرپورٹ پہنچیں گے اور وہ گھر پہنچ جائے گا۔"

"وہ گھر پہنچ تو جائے گا صاحب..... یہ تو اللہ میاں کے پاس پہنچ جائے گا۔" میں نے کہا۔ مرد مجبور ہو گیا اور اُس نے پچھلا دروازہ کھول دیا۔ پلک جھپکتے میں مُردہ زندہ ہو گیا اور ہم دونوں تقریباً ایک ساتھ پچھلی سیٹ پہ قابض ہو گئے۔ مرد کا ہاتھ گلوو کمپارٹمنٹ کی طرف بڑھا ہی تھا کہ میں نے ریوالور نکال لیا۔ عورت نے ایک چیخ ماری۔

"واٹ اِز دِس ــ تم ڈرامہ کر رہے تھے؟" مرد بولا۔

"یس..... ہم ایسے ڈرامے کرتے رہتے ہیں۔" میں نے انگریزی میں جواب دیا۔ "اور خواہش یہی رکھتے ہیں کہ انجام ٹریجک نہ ہو۔ سب لوگ آخر میں ہنسی خوشی اپنے اپنے گھر جائیں اور اس واقعے کو بھول جائیں۔"

"یہ زیادہ سے زیادہ بیس منٹ کی ڈرائیو ہے۔" غالب نے کہا۔ "جہاں ہم جانا چاہتے ہیں وہاں پہنچا دو۔ اس کے بعد گڈ بائی اینڈ گڈ لک ــــ ہمیں صرف لفٹ چاہیے۔"

"جو تم خوشی سے کبھی نہ دیتے۔" میں نے کہا۔ "اور اگر ہمیں اس وقت ٹرانسپورٹ ملنے کی اُمید ہوتی تو ہم تمھارا راستہ کبھی نہ روکتے۔"

بیس منٹ سے بھی کم وقت میں اس نے ہمیں مغل پورہ روڈ پر گھاس منڈی کے پاس اتار دیا۔ راستے میں کسی نے کوئی بات نہیں کی تھی ــــ عورت نے ایک بار پھر مرد کو یاد دِلانا چاہا تھا کہ وہ احمق ہے اور اگر اس نے گاڑی نہ رُکنے کا مشورہ قبول کر لیا ہوتا۔ مرد نے پھر اس کو شٹ اپ کہا تھا اور وہ شٹ اپ ہو گئی تھی۔

"تھینک یُو..... اور بہت معذرت۔" میں نے اترنے کے بعد کہا۔ "آدمی کبھی کبھی مجبوری میں وہ کام کرتا ہے جو اسے نہیں کرنے چاہئیں۔ مثلاً شادی۔"

"اگر تم ڈاکا ڈالنے جا رہے ہو تو خدا کے لیے میری گاڑی کا نمبر بھول جاؤ۔" مرد بولا اور گاڑی نکال لے گیا۔ عورت اُس وقت بھی دم بخود بیٹھی تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ہم نے صرف لفٹ لی ہے۔ اس کی جان نہیں لی ہے۔ زیورات نہیں لیے ــــ ہینڈ بیگ نہیں لیا۔

آگے کا راستہ ایک تنگ سی سڑک سے گزرتا تھا، جو ایک فرلانگ کے بعد دو حصّوں میں بٹ جاتی تھی۔ ایک گلی کا رُخ تھوڑا سا دائیں طرف گھومتی تھی تو دوسری تھوڑا بائیں طرف۔ یادداشت نے میرا ساتھ دیا اور میں نے اُلٹے ہاتھ کی طرف مڑنے کا فیصلہ کیا۔ بہت جلد میں نے اس جگہ کو شناخت کر لیا جہاں ایک رات میں رابعہ کو سخت ترین عذاب کی قید سے نجات دلا کے پہنچا تھا تو مجھے پولیس نے گرفتار کر لیا تھا۔ کیونکہ میرے جسم پر نام کو بھی لباس نہیں تھا۔ وہ گھڑ سوار پولیس تھی جو مجھے اپنے ساتھ تھانے لے گئی تھی۔ جہاں سے انکل ایس ایس پی رضوی کو فون کرتے ہی مجھے وی آئی پی کا درجہ حاصل ہو گیا تھا۔ اسی رات میں نے حشمت خان کا گھر دریافت کیا تھا۔ بات بہت پُرانی تھی اور میں کچھ بھول رہا تھا۔ اگر ہم چاہتے تو کسی سے بھی پتا پُوچھ سکتے تھے مگر ایک تو اُس وقت پتا بتلانے والا دُور دُور تک کوئی نہیں تھا

اور ہوتا تو بھی حشمت خان کا پتا پوچھ کے ہم اپنی حیثیت مشتبہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اگر پروگرام پر عمل کرتے ہوئے ہم بارہ بجے حشمت خان کے گھر کو اُڑاتے تو ایک چشم دید گواہ سامنے آجاتا اور بتاتا کہ ہاں..... رات کے نہیں... صبح کے ساڑھے تین چار بجے تھے جب دو اس قسم کے آدمی حشمت خان کا پتا پوچھتے پھر رہے تھے۔ ایک جگہ رُک کر میں نے تھوڑا سا غور کیا اور ذہن کے نہاں خانوں میں رکھی ہوئی یادوں کی کتاب پر سے وقت کی گرد جھاڑی۔ آہستہ آہستہ میرے ذہن میں ایک تصویر اُبھری غالب نے مجھے ہلایا۔

"یہ کیا گلی کے بیچ میں گیان دھیان شروع کر دیا۔ ابھی آجائے گا کوئی چوکیدار تو گلے پڑ جائے گا۔" غالب نے کہا۔

"گیان یہ حاصل ہوا ہے ہیں مُورکھ، کہ جہاں ہم پہنچ چکے ہیں وہی ہماری منزل ہے۔" میں نے کہا۔ "اپنے سامنے دیکھ..... وہ جو سُرخ رنگ کی کھڑکیوں کی قطار ہے، وہی حشمت خان کا گھر ہے۔" میں نے کہا۔

غالب نے میری انگلی کے اشارے پر دیکھا۔ "یہ تیسرا گھر؟"

میں نے اقرار میں سر ہلایا اور ہم نے تصدیق کے لیے قریب جا کے دیکھا۔ دروازے پر لکڑی کی میلی سی تختی پر "حشمت خان" اے ایس آئی لکھا تھا۔ اس کے دونوں جانب دو منزلہ مکان تھے۔ ایک نظر میں ہمیں یہ اندازہ ہو گیا کہ ہمارا کام کتنا مشکل ہو گیا ہے۔

"دونوں طرف سے چھت پر اترنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔" غالب نے کہا۔

"شاید پیچھے کی طرف کوئی ایسا گھر ہو جس کی چھت بالکل حشمت خان کے گھر کی چھت سے ملتی ہو۔" میں نے کہا۔

"اس کا کیا فائدہ کہ پہلے ہم ایک چھت پر چڑھنے کا خطرہ مول لیں اور پھر دوسری پر اتریں۔" غالب نے کہا۔ "براہِ راست اسی پر نہ چڑھ جائیں۔"

"کیسے چڑھ جائیں بندر کے بچے۔" میں نے کہا۔ "مجھے تو اُڑنا بھی نہیں آتا اور خدا نے تمھیں عقل دی ہوتی تو ایک سیڑھی یا رسّی لے آتے۔"

"میلی کوپٹر ہوتا تو سب سے اچھا رہتا۔" غالب نے جھنجلا کے کہا۔ "تم اِدھر آؤ۔ ذرا دیوار کے ساتھ لگ جاؤ۔ میں تمھارے سرِ عزیز پہ قدم رکھ کے اُوپر والے چھجے تک پہنچتا ہوں۔ وہاں سے چھت کی منڈیر تک پھر یہی طریقہ کام آئے گا۔"

مجھے اندازہ تو تھا کہ کھڑکی کے اُوپر والا چھجا کافی مضبوط ہے اور زیادہ اُونچا بھی نہیں ہے۔ زمین سے اُس کی بلندی آٹھ فٹ کے قریب تھی۔ لیکن غالب روشن دان کے چھجے کی بات کر رہا تھا۔

جو بارہ فٹ اوپر تھا۔ میں نے اسے سہارا دیا اور دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں ملا کے کھڑا ہو گیا۔ اس نے دونوں میں پیر رکھا اور میرے کندھے پر چڑھ گیا لیکن چھجا اب بھی ایک فٹ دُور تھا۔ میں نے دونوں ہاتھ سر سے اُوپر اٹھائے۔

"دونوں ہتھیلیوں پر ایک ایک پیر رکھو۔" میں نے کہا۔ "میں تم کو اور اُوپر اٹھاتا ہوں۔"

غالب نے سر ہلایا اور میرے ہاتھوں پر چڑھ گیا۔ اس کا وزن میری توقع سے زیادہ ثابت ہُوا۔ لیکن میں نے جسم کی ساری توانائی صَرف کر کے ہاتھوں کو اُوپر کیا۔ آہستہ آہستہ غالب کو اُوپر اٹھایا۔ "شاباش ٹارزن، تھوڑا سا اور..... بس تھوڑا اور ہاں....." ایک دم میرے ہاتھوں پر سے وزن غائب ہو گیا۔ میں نے لمبی سانس کھینچی اور غالب کو روشن دان کے چھجے پر پیر جمائے چھت کی منڈیر کو پکڑتے دیکھا۔ روشن دان کا چھجا لکڑی کا تھا اور اس پر زیادہ وزن نہیں ڈالا جا سکتا تھا۔ غالب نے نہ جانے ہاتھ سے کیا اشارہ کیا اور چھت پر اُتر کے غائب ہو گیا۔ میں گلی میں اکیلا کھڑا رہ گیا۔ اِتنی دیر میں نہ گلی سے کوئی چوکیدار گزرا تھا نہ کوئی دُوسرا شخص۔ لیکن کوئی کسی بھی وقت آسکتا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور سامنے والے گھر کے دروازے میں جا کھڑا ہو گیا، جو دونوں دیواروں کے درمیان کچھ گہرائی میں تھا۔

غالب شاید یہ چاہتا تھا کہ میں گلی کی نگرانی کروں۔ اس کا کام وہ اکیلا کر سکتا تھا۔ ہم دونوں کے اُوپر جانے اور ایک ساتھ نیچے اترنے سے کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ کیونکہ وہ کام ایک ہی آدمی کا تھا۔ میں اُس الماری جیسے خلا میں دروازے سے چپک کر سانس روکے کھڑا ہوا تھا کہ نہ جانے کدھر سے ایک کُتّا نمودار ہو گیا۔ اس نے میرے قریب آ کے مجھے سُونگھنا شروع کر دیا۔ میرے جسم میں سردی کی لہریں دوڑنے لگی۔ کُتّا میرے بُوٹ چاٹنے لگا۔ دُنیا کی آفات میں اگر مجھے کسی چیز سے خوف آتا ہے تو وہ کُتّا ہے، جس پر پطرس نے اِنتہائی حقیقت پسندانہ مضمون لکھا ہے۔ میں نے دل ہی دل میں اس خطرناک چیز سے اپنے ناکردہ گُناہوں کی مُعافی مانگی اور اس سے ٹل جانے کو کہا لیکن وہ بے تکلفی پر آمادہ تھا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ جب آدمی خوف زدہ ہوتا ہے تو اس کے جسم میں سردی کی لہر دوڑنے اور اس کے بدن کا رُواں رُواں کھڑا ہونے کا سبب وہ ایڈرنالین ہوتی ہے جو ایسے وقت میں خود بخود خون میں شامل ہو جاتی ہے۔ اور کُتّے اُس کی بُو سے الرجک ہوتے ہیں چنانچہ عام مشاہدے کی بات ہے کہ کُتّا اُس پر غُرّاتا ہے جو اس کے قریب سے ڈرتا ہُوا گزرے یا خوف کے باعث رُک کر کانپنے لگے ۔۔۔ لیکن جو بے خوفی سے گزر جائے، کُتّا اس کی طرف نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھتا، اور اس سے ڈرتا بھی ہے۔ اس بات کے سچ ہونے کا ثبوت مجھے پھر ملا۔ کُتّے نے غرّانا شروع کیا اور اس کے عزائم جارحانہ ہو گئے۔ میرے لیے کچھ کرنا ضروری ہو گیا۔ میں جاگ نہیں سکتا تھا۔ چیخ نہیں مار سکتا تھا، یہاں تک کہ اُسے شُو شُو کر کے دھتکار تک نہیں سکتا تھا..... میں نے وہ کیا جس کی مجھے خود سے بالکل اُمید نہ تھی۔ میرا ایک پاؤں بجلی کی طرح حرکت میں آیا اور بُوٹ کی ٹھوکر کُتّے کے سر پر لگی۔ وہ چلّاتا ہوا بھاگا..... میں نے اطمینان کا سانس بھی نہ لیا تھا کہ نئی مُصیبت نازل ہو گئی ۔۔۔ اگر وہ کُتّے کا بچہ نہ آتا تو میں دبکا کھڑا رہتا اور چوکیدار سیدھا گزر جاتا مگر کُتّے پر ہونے والے تشدد اور اس کی فریاد و فغاں نے چوکیدار کو ہوشیار کر دیا..... وہ ایک دم لٹھ لے کر سامنے آگیا۔

"کون.... ؟" اُس نے چلّا کر پوچھنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے اُسے دبوچ لیا۔ اس کے حلق سے آواز تک نہ نکل سکی اور وہ میری گرفت میں بے بس ہو گیا۔ میری جگہ غالب ہوتا تو اس سے نہ نمٹ پاتا کیونکہ وہ صحت مند اور جوان عمر کا پٹھان تھا۔ اُسے خاموش رکھنے کے لیے میں نے اس کے کان کے پیچھے کُہنی ماری۔ وہ بے سُدھ ہو کے میرے ہاتھوں میں جھول گیا۔ میں نے اسے وہیں لِٹا دیا اور بے چینی سے غالب کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ سب سے زیادہ خوف مجھے حشمت خان کے گھر میں کسی کے جاگ اٹھنے کا تھا۔ غالب مسلح تھا اور خدانخواستہ حشمت خان مقابلے پر آجاتا اور بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے چور کو خود پکڑنے کی کوشش کرتا یا اس پر گولی چلاتا تو خود مارا جاتا۔ یہ ہم میں سے کوئی بھی نہیں چاہتا تھا۔ ہم نے تو یہ طے کیا تھا کہ مقررہ وقت سے آدھا گھنٹا پہلے حشمت خان کے گھر فون کر کے گھر والوں کو نکل جانے کو کہیں گے۔ انھیں صاف بتا دیں گے کہ گھر میں بم رکھا ہوا ہے جو ٹھیک آدھے گھنٹے بعد پھٹ جائے گا۔ بم کو تلاش کرنے میں وقت ضائع نہ کیا جائے۔ بم ایسی جگہ ہے جہاں سے خود بم ڈسپوزل اسکواڈ والے بھی اسے برآمد نہیں کر سکتے۔

غالب بیس منٹ بعد نمودار ہوا اور اس نے اُوپر سے ہی ہاتھ ہلایا جس سے میں نے اندازہ کیا کہ وہ اپنے مشن میں کامیاب رہا۔ اوپر جانے کی نسبت نیچے اترنے کا عمل بہت آسان تھا۔ غالب منڈیر سے لٹکا تو اس کے پاؤں کھڑکی کے چھجے تک پہنچ گئے۔ وہاں سے وہ لٹک کر گلی میں پہنچ گیا اور ہم کوئی بات کیے بغیر چل دیے۔

"سب ٹھیک ہو گیا نا۔" میں نے گلی سے نکل جانے کے بعد کہا۔

"اوپر کپڑے سکھانے والی الگنی تھی۔" غالب بولا۔ "میں نے رسّی کھول لی اور بم کو اس میں باندھ کر آتش دان کی چمنی سے نیچے پہنچا دیا۔"

"یہ نہ ہو کہ بم نیچے آتش دان میں رکھا ہوا نظر آجائے۔"

"میں نے اُسے آٹھ فٹ نیچے اتارا تھا۔" غالب بولا۔ "اور رسّی کو چمنی کے ساتھ باندھ دیا تھا۔ بم دیوار کے بیچ میں ہے۔"

"چمنی میں سے دُھواں نیچے نہ گرا ہو۔"

"یار کچھ نہیں ہوا....." غالب نے جھلّا کے کہا۔ "بے وقوف نظر ضرور آتا ہوں میں، لیکن ہوں نہیں..... آتش دان میں آگ کبھی نہیں جلائی گئی۔ پُرانے مکانوں میں بنائے ضرور جاتے تھے۔ اب نمائشی رہ گئے ہیں ۔۔۔ گھروں میں بجلی اور گیس کے ہیٹر استعمال ہوتے ہیں۔"

"نیچے ایک کُتّے کی وجہ سے چوکیدار آگیا تھا۔" میں نے کہا۔ "اُسے مجبوراً ناک آؤٹ کرنا پڑا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ہوش میں آجائے گا۔"

"اب درپیش ہے اصل مرحلہ۔" غالب نے کہا۔ "شیر کے کچھار میں بلکہ شیر کے منہ میں بم رکھنا ہے۔"

"چار بج رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "پانچ یا زیادہ سے زیادہ ساڑھے پانچ بجے تک ہمیں وہاں سے نکل جانا ہو گا۔"

سڑک پر پہنچنے کے بعد پھر ٹرانسپورٹ کا مسئلہ پیدا ہوا مگر تقدیر مدد پر آمادہ نظر آتی تھی..... نہ جانے کیسے ایک رکشا نمودار ہو گیا اور ہمارے اِشارے پر رُک بھی گیا۔ ہم نے عرضِ مدّعا کیا۔

"دھندا کرنے نہیں نکلا ہوں میاں جی ۔۔۔" وہ بولا۔ "اپنے پڑوسی کو اسپتال لے گیا تھا..... اس کی بیوی کو۔"

"چلو کچھ دھندا بھی کر لو۔" میں نے کہا۔ "جو مانگو گے دیں گے۔ آج بڑا مُبارک دن ہے تمھارے لیے..... ثواب تو کما ہی چکے ہماری مدد کر دو گے تو ثواب کے ساتھ پچاس روپے بھی کما لو گے۔ سارا خرچ نکل آئے گا۔"

"واپسی میں اپنی گھر والی کے لیے حلوہ پُوری لیتے جانا۔" غالب نے اُسے آمادہ پا کے بیٹھتے ہوئے کہا۔ پچاس روپے سے اِنکار کرنا اس کے لیے مشکل تھا۔ رکشا نِکالنے کے بعد رات تو خراب ہو ہی چکی تھی..... مگر نیکی واقعی کام آئی تھی۔ ہم نے بھی خدا کا شکر ادا کیا کہ پھر کسی کے ساتھ زبردستی نہیں کرنا پڑی۔ رکشا والے کو بھی اس کی نیکی نے بچا لیا تھا۔ اُس نے حقوقِ ہمسائیگی کا خیال کیا تھا خدا نے ہمارے وسیلے سے اُس کو انعام پہنچا دیا۔ ورنہ یہی رکشا والا دن میں ملتا تو شاید اتنی آسانی سے نہ مانتا اور ہم بزورِ بازو منواتے

اس نے راستے میں ہمیں بتایا کہ اس کا پڑوسی ایک کلرک ہے جس کو ہر سالانہ انکریمنٹ کے ساتھ ایک بچّے کا خرچ بڑھانے کا شوق ہے۔ پچیس روپے ماہانہ میں بھلا ایک بچّہ پلتا ہے۔ مہنگائی الگ بڑھتی جارہی ہے۔ نتیجہ یہ کہ کلرک دن بدن زیادہ غریب ہوتا جارہا ہے۔ بعد میں اُس نے انکشاف کیا کہ وہ خود بھی کلرک تھا تو یہی مسئلہ تھا۔ اب اللہ کا فضل ہے — سب کا خرچ پُورا ہوتا ہے۔ زیادہ کی ضرورت ہو تو زیادہ محنت کرنے سے مل جاتا ہے۔ لگی بندھی تنخواہ کا مسئلہ نہیں ہے۔

ہم اس فلاسفر رکشا والے کی گفتگو سے متاثر ہوئے جو ابھی کلرکی اور کثرتِ اولاد کے مُعاشرتی اسباب پر مزید اظہارِ خیال کرتا، اگر ہماری منزل نہ آجاتی — وہ پچاس کا نوٹ لے کر اور ہاتھ ملا کے رخصت ہوا تو ہم نے دلاور کی کوٹھی کا رُخ کیا۔ اس کوٹھی کا نقشہ میرا دیکھا بھالا تھا۔ عقبی حصّے میں ایک دروازہ تھا جس سے داخل ہو کے ہم نے لان میں طاقو کی لاش دفن کی تھی۔ کسی دشواری کے بغیر ہم اسی راستے سے گزر کے اندر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ میں نے ایک کونے سے جھانک کر دیکھا تو مجھے چوکیدار دروازے پر مستعد کھڑا نظر آیا۔ اُس کے ہاتھ میں بندوق نہیں تھی لیکن اُس کی پتلون کی سائڈ پر ہولسٹر میں ریوالور صاف دکھائی دے رہا تھا۔

"تم اپنا کام کرو—" میں نے کہا۔ "میں چوکیدار پر نظر رکھتا ہوں —"

"یہاں تو سارے کھڑکی دروازے بند ہیں۔" غالب نے کہا۔

"دوسری طرف جاؤ۔ شاید کچن میں کوئی نہ ہو۔" میں نے کہا۔ غالب نے سر ہلایا اور اندھیرے میں غائب ہو گیا... چند منٹ میں وہ پھر آ گیا۔

"کچن کے دروازے بھی بند ہیں۔ مجھے شیشہ توڑنا پڑے گا، کسی کھڑکی کا۔" غالب نے کہا۔

"پھر تو سامنے سے جاؤ۔ ڈرائنگ رُوم ہی ایسی جگہ ہے جہاں کوئی نہیں ہوگا۔" میں نے کہا۔ "میں چوکیدار کو اِدھر بلاتا ہوں۔"

غالب دُوسری بار غائب ہو گیا۔ میں نے ایک پتھر اٹھایا اور سامنے والی دیوار پر مارا۔ چوکیدار ایک دم چونکا اور آواز کی سمت میں آیا۔ ریوالور اُس نے فوراً نکال لیا تھا۔ میں دیوار کے موڑ پر دیوار کے ساتھ سانس روکے کھڑا رہا۔ جیسے ہی وہ میرے سامنے سے گزرا، میں نے اس کو پیچھے سے دبوچا اور سَر پر ریوالور کا دستہ مار کر بے ہوش کر دیا۔ وہ دلاور کا چوکیدار تھا اور گلی کے چوکیدار کی طرح نہیں تھا۔ اُسے ذرا بھی مُہلت ملتی تو وہ مقابلہ کرتا اور میں اُسے قابو نہ کر پاتا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ وہ سابق کمانڈو ہو۔ میں نے تو اُسے اپنی صُورت تک نہیں دیکھنے دی تھی۔ چوکیدار کی طرف سے مطمئن ہو کے میں سامنے والے حصّے کی جانب گیا۔ غالب مجھے کہیں دکھائی نہ دیا۔ میں نے باہر ٹھہر کر اس کا انتظار کرنا مناسب سمجھا تا کہ خُدانخواستہ اندر کوئی گڑبڑ ہو جائے، دلاور نے اندرونِ خانہ بھی الارم سسٹم لگا رکھا ہو یا کسی آہٹ پر وہ جاگ جائے تو غالب پکڑا نہ جا سکے اور میں اس کی کوئی مدد کر سکوں۔

غالب ایک کھڑکی کے راستے اندر داخل ہوا تھا۔ میں نے ایک کھڑکی کا ٹوٹا ہوا شیشہ دیکھ لیا اور جب اس کے پٹ کو دھکیلا تو کھڑکی بھی کھُل گئی — غالب اندر نہ جانے کہاں تھا۔ وہ نڈر اور جری آدمی تھا جو صُورت سے چُغد نظر آتا تھا۔ مگر یہ اسی کی ذہانت کا کمال تھا کہ ہم ایک مؤثر جوابی کارروائی کا منصوبہ بنانے میں کامیاب رہے تھے۔ اب وہ دشمن کے قلعے میں اِنتہائی بے خوفی سے گھُس گیا تھا اور اکیلا ہی ساری کارروائی کر رہا تھا۔ مجھے بالکل شبہ نہیں تھا کہ دلاور اپنے تکیے کے نیچے بھرا ہوا ریوالور رکھ کر سوتا ہوگا — اگر وہ جاگ اٹھتا اور کسی کو گھر کے اندر دیکھ لیتا تو سوال کیے بغیر گولی مار دیتا۔ وہ ایسا آدمی تھا کہ چور یا ڈاکو بھی آئیں تو انھیں مار کے گاڑ دیتا۔ اور پولیس کو ضابطے کی کارروائی پُوری کرنے کی خاطر بھی رپورٹ نہ دیتا۔ خود غالب بھی کم نہ تھا۔ وہ دیکھتا کہ دلاور کا ہاتھ ریوالور کی طرف بڑھ رہا ہے تو وہ اس ہاتھ کو ہی اُڑا دیتا۔

اُسے اندر گئے ہُوئے دس منٹ ہو گئے تھے۔ میں کچھ بے چین ہونے لگا تھا۔ اچانک گھر کے اندر سے سائرن کی آواز سُنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی غالب دوڑتا ہوا نمودار ہوا — اندر سے کسی نے چلّا کر کہا۔ "کون ہے —؟" یہ دلاور کی آواز تھی — "چوکیدار.... چوکیدار...."

غالب نے باہر چھلانگ لگائی۔ ہم ایک ساتھ بھاگے۔ یک لخت باہر کوٹھی کے اُوپر ہر طرف رات کو دن کر دینے والی سرچ لائٹس جل اٹھیں۔ اندر سے کسی نے ایک فائر کیا مگر ہم اس وقت تک عقبی دیوار پھاند چکے تھے۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھے بغیر اور کوئی سوال کیے بغیر ہم بے تحاشا بھاگے — دلاور کی کوٹھی پر تو جیسے قیامت آگئی تھی.... سائرن اب بند ہو گیا تھا۔ مگر دلاور کی آواز صاف سُنائی دے رہی تھی۔ وہ چوکیدار کو گالیاں دے رہا تھا اور گھر کے دوسرے نوکروں کو حکم دے رہا تھا کہ ہر طرف دیکھیں اور جو نظر آئے اُسے بلا تامّل گولی سے اُڑا دیں۔

جب ہم مڑ کے تو دلاور کی کوٹھی بہت پیچھے رہ گئی تھی۔

"یہ.... یہ تم نے کیا کیا؟" میں نے پھُولی ہوئی سانس کو قابو میں لا کے کہا۔

"کچھ نہیں یار— میں نے سوچا کہ چوری کا کیس بنا دُوں۔" غالب نے سر کھُجا کے ہانپتے ہوئے کہا۔

"گویا تم نے تجوری کو ہاتھ لگایا تھا؟"

"ہاں — ہے تو تمھارے باپ کا مال.... آنکھیں کیوں دکھاتے ہو؟" غالب نے کہا۔ "کچھ مال ہاتھ لگ جاتا تو اچھا تھا۔"

"اور تمھیں چار سو چالیس دولت کا کرنٹ لگ جاتا تو مزید اچھا ہوتا—" میں نے کہا۔ "تجوری کیا کھُلی پڑی تھی؟"

"نہیں.... میں نمبر ملا رہا تھا—" غالب بولا۔ "یہ فن میں نے ایک ماہر نقب زن سے سیکھا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ کان تیز ہونے چاہئیں — اندر کی گراریاں صحیح نمبر پر کلک کرتی ہیں۔ تجربہ کامیاب رہا تھا۔ اس کی تجوری کے قفل کا نمبر کیا ہے؟ مرڈر— تین سو دو— مگر اس کے علاوہ بھی کوئی چکّر تھا کہ تجوری کا دروازہ کھُلتے ہی سائرن چلّانے لگا۔"

"یہ بتاؤ، جس کام کے لیے گئے تھے، اس کا کیا بنا؟"

"وہ تو میں نے دو منٹ میں کر لیا تھا۔" غالب بولا۔ "اندر ایک بڑا سا گملا ہے۔ اس میں اِن ڈور پلانٹ ہے۔ میں نے بم کو گملے کے پیچھے کونے میں رکھ دیا ہے — وہاں کسی کو نظر آنے کا سوال ہی نہیں۔"

صبح کے سوا پانچ بجے تھے۔ آدھا میل چلنے کے بعد ہم ایک رکشا پکڑنے میں کامیاب ہو گئے اور طے شدہ وقت سے دس منٹ پہلے ہی گھر پہنچے تو ہمارا خیال تھا کہ محسن اور ٹیڈی ابھی نہیں لَوٹے ہوں گے مگر وہ کافی پی رہے تھے۔ ہم نے ایک دُوسرے کو اپنی اپنی کامیابی کی رُوداد سُنائی اور مبارک باد دی۔ اس میں سات بج گئے۔ محسن نے ناشتا تیار کیا، جو میں نے زبردستی کھایا تاکہ کسی کو میری پریشانی کا اِحساس نہ ہو — حقیقت یہ ہے کہ میں بہت بڑا جوا کھیلنے جا رہا تھا۔ میرے مقابل دلاور جیسا شکاری تھا، جو آسانی سے ہتھیار نہیں ڈالتا تھا۔ اس سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ ہماری چال کا کوئی توڑ نکال لے اور ہم خود اپنے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس جائیں۔ ناکامی کی سزا صرف میرے لیے ہی نہیں تھی۔ مجھ سے زیادہ رالعہ اور شہلا کے لیے ہو سکتی تھی۔ ٹیڈی میرے ساتھ ہی نکلا اور میں نے سب کی گڈ لک کے ساتھ سب کو گڈ بائی کہا۔

ٹیڈی نے اپنی ریڑھی پر پڑا ہوا اخبارات کا بنڈل پھیلا کر اطمینان سے اپنا مواصلاتی رابطہ بحال کیا — پندرہ منٹ بعد اس نے مجھے دو انگلیوں سے 'وی' کا نشان بنا کے سگنل دیا۔ اس کا مطلب تھا کہ نازو خیریت سے ہے اور شہلا اور رالعہ کو یہاں نہیں لایا گیا۔ یہ میرے لیے خاصی اِطمینان بخش خبر تھی۔ ٹھیک آٹھ بجے میں شاہدرہ جانے کے لیے رکشا میں بیٹھ گیا — ساڑھے آٹھ بجے میں اطمینان کے ساتھ ایم ڈبلیو ڈی کمپلیکس کے دروازے پر اُترا۔ فیکٹری میں کام شروع ہو چکا تھا مگر دلاور ابھی نہیں پہنچا تھا۔ اس کے اتنی جلدی آنے کا کوئی سوال ہی نہ تھا، مگر میں اس سے پہلے پہنچ جانا چاہتا تھا۔ گیٹ کیپر نے مجھے نہیں پہچانا — وہ کوئی نیا آدمی تھا۔

"کیا کام ہے آپ کو چوہدری صاحب سے؟" وہ بولا۔

"کام کے بچّے۔" میں نے غُرّا کے کہا۔ "جو کام مجھے چوہدری صاحب سے ہوگا، وہ میں تمھیں بتاؤں گا۔ میں اُن کے آفس میں بیٹھوں گا اور اُن کے گھر فون کروں گا کہ میں پہنچ گیا ہوں۔"

"یس.... یس سر۔" وہ گھبرا گیا اور اس نے چوکیدار سے کہا کہ میرے لیے دروازہ کھول دے — وہ مجھے چوہدری دلاور کے کمرے تک لے جانا چاہتا تھا مگر میں نے اُسے جھڑک دیا اور کہا کہ مجھے راستہ معلوم ہے۔ میں نے اس کے کمرے میں پی، اے کے ساتھ بھی یہی رویّہ برقرار رکھا، اور اُس کا فون اپنی طرف کر لیا۔ پھر میں نے وہ نمبر ملایا جو مجھے دلاور کی طرف سے ملا تھا — بیس سیکنڈ بعد کسی نے ریسیور اُٹھا لیا۔

"ہیلو.... میں سِکندر بخت بول رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "مجھے چوہدری دلاور کا پیغام مِلا تھا۔ میں اُن سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

اُس کے پی، اے نے پلک جھپکتے میں دراز سے ریوالور نِکال لیا۔

"اسے توپ کے دہانے کا رُخ اپنی طرف کر لو۔" میں نے اس سے پہلے اپنا ریوالور نکال لیا۔ پی اے کا ہاتھ رک گیا — موٹاپے کے باعث وہ میری طرح پھُرتیلا نہیں تھا۔

"کہاں سے بول رہے ہیں آپ؟" ٹیلی فون پر دوسری جانب سے کسی کی زنانہ آواز میں سوال کیا گیا۔

"اپنے مُنہ سے۔" میں نے کہا۔ "لیکن یہ تمھاری آواز کو کیا ہو گیا ہے چوہدری دلاور، صرف آواز زنانہ ہوئی ہے یا خصلت..."

"جس ٹیلی فون پر آپ بات کر رہے ہیں، وہ کہاں ہے؟" سوال اس بار سوچ سمجھ کے کیا گیا تھا۔

"ایک میز پر۔" میں نے کہا۔ "مگر دلاور... یہ تمھاری جِنس بدلنے کا واقعہ کب پیش آیا؟"

"کمال کرتے ہیں آپ۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔ "میں چوہدری صاحب کی سیکریٹری ہوں۔ آپ کا پیغام پہنچا دوں گی لیکن آپ سے ملنے کے لیے وہ کہاں تشریف لائیں۔"

"کچھ لانے کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔ "بس خود اپنے آفس آجائیں جہاں میں پہلے سے موجود ہوں اور اگر ان کے پی اے نے اتنی دیر میں مجھے مقتول نہ بنایا تو میں انھیں منتظر ملوں گا۔ ورنہ پھر عرصۂ محشر میں ملیں گے۔" فون بند ہوگیا۔ میں نے دانت نکال کے پی اے کی طرف دیکھا۔ "اب تم شوق سے مجھے گولی ماردو۔" میں نے کہا اور ریوالور واپس جیب میں رکھ لیا۔ پی اے خون آشام نظروں سے مجھے گھور رہا تھا مگر الجھن کے آثار اس کی صورت سے عیاں تھے۔ وہ حیران اور پریشان تھا کہ جو شخص ایک مفرور مجرم۔ قاتل اور دہشت گرد قسم کی چیز تھا اور چوہدری دلاور کا دشمن نمبر ون تھا، وہ اتنے سکون و اعتماد کے ساتھ اپنے پیروں سے چل کر یہاں کیسے آپہنچا اور چوہدری دلاور نے اسے طلب کیا تھا تو ظاہر ہے قتل کرنے کے لیے نہیں کیا تھا۔ پھر دو متحارب دشمنوں کے درمیان اس ملاقات کا کیا مقصد ہوسکتا ہے۔ کیا وہ دونوں سیز فائر کے مذاکرات میز پر آمنے سامنے بیٹھ کر کریں گے؟ اور کیا اس کا یہ مطلب بھی نکالا جاسکتا ہے کہ چوہدری دلاور نے مجھے برابر کا حریف مان لیا ہے؟ یہ تسلیم کرلیا ہے کہ جنگ یکطرفہ نہیں اور نقصانات کو دیکھتے ہوئے وہ اپنے رویے میں لچک پیدا کرنے پر مجبور ہوگئے ہیں؟ یہ ایسا ہی تھا جیسے برسرِ اقتدار حکومت کسی باغی گوریلا لیڈر کے سامنے اتنی بے بس ہو جائے کہ اسے ہر قسم کے تحفظات فراہم کرکے بات چیت کے لیے مدعو کرے۔

"ایسے کب تک گھورتے رہو گے مجھے؟" میں نے کہا۔ "میں واقعی زندہ سکندر بخت ہوں، اس کی روح نہیں ہوں۔ شاید تمھیں حیرت ہے کہ میں کیسے زندہ ہوں؟"

"مجھے افسوس ہے کہ تم اب تک کیوں زندہ ہو۔" پی اے نے کہا۔

"جب چور، ڈاکو، اسمگلر اور وطن فروش زندہ ہیں، شیطان صفت انسان زندہ ہیں۔ خوشامدی چمچے اور الو کے پٹھے زندہ ہیں۔" میں نے مسکرا کے کہا۔ "یہاں تک کہ سور کے بچے اور کتے کے پلّے زندہ ہیں تو پھر میں کیسے مرسکتا ہوں۔۔۔ فانوس بن کے جس کی حفاظت ہوا کرے۔ وہ شمع کیوں بجھے جسے روشن خدا کرے۔ کیسا شعر ہے؟"

وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ سارے استعارے میں نے کس کے لیے استعمال کیے ہیں مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا، ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ پی اے نے ریسیور اٹھایا اور میری طرف بڑھا دیا۔

"ہاں بھئی، اپنے سکندر صاحب۔ اچھا کیا تم نے کہ ہماری بات مان لی۔" چوہدری دلاور کی آواز آئی۔ "مگر یار یہ تم دفتر کیوں چلے گئے؟"

"جہنم میں شاید میری اور تمھاری ملاقات نہ ہوتی۔۔۔"

وہ ہنسا۔ "ابھی تک مسخری کی عادت نہیں گئی تمھاری۔ میں تم سے ملنے کے لیے آدھے گھنٹے میں آرہا ہوں۔ مگر ایک بار تو بتاؤ۔ کیا تمھیں کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا۔ فرض کرو اس سے پہلے ہی پولیس آپہنچے؟"

"چوہدری صاحب! کیا دشمن کو کمزور سمجھنے والے کو عقلمند مانا جاسکتا ہے؟"

"نہیں۔ کمزور آدمی بھلا دشمنی کا حوصلہ کہاں رکھتا ہے؟" وہ بولا۔

"پھر کیا تم نے مجھے کمزور اور احمق سمجھا تھا کہ یہ سوال کیا؟" میں نے کہا۔ "خطرہ تو ایک احساس کا نام ہے۔ آدمی سڑک پر چلتے ہوئے ڈرے کہ کہیں وہ حادثے کا شکار نہ ہو جائے۔ بند کمرے میں ڈرے کہ کہیں چھت اس پر نہ آگرے۔ موت سے ڈرے۔ موت کا ایک دن معیّن ہے۔ اور اس کے بارے میں نہ تم جانتے ہو نہ میں کہ آج کا دن کس کی موت کے لیے معیّن ہے۔ خطرہ تو تمھارے لیے بھی ہے اور ہر طرف ہے۔ مگر تم اس کے احساس سے دُور رہنا چاہتے ہو۔ یقین نہیں کرنا چاہتے کہ میری طرح تم بھی غیر محفوظ ہو۔ مگر کیا حقیقت کو تسلیم نہ کرنے سے حقیقت بدل جاتی ہے یا اس کا وجود باقی نہیں رہتا۔"

"کیا تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟ میرا مطلب ہے ڈرا رہے ہو؟"

"نہیں۔ میں تمھیں سمجھا رہا ہوں کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ تم مجھ سے ملنے آسکتے ہو۔" میں نے کہا۔

"تمھارے لہجے اور تمھاری باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ تم اپنی حفاظت کا انتظام پہلے سے کرکے آئے ہو۔"

"کیا مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا؟" میں نے کہا۔ جواب میں وہ صرف ہنسا اور اس نے فون بند کردیا۔ میں سمجھ گیا کہ اس نے مجھ سے بالواسطہ رابطے کے لیے کسی اور کا فون نمبر استعمال کیا تھا۔ اگر میں خود ہی فون کرتا تو پہلے یہ بتاتا کہ میں سکندر بخت ہوں تو مجھ سے پوچھا جاتا کہ میں کون ہوں اور غلط نام بتاتا تو دوسرا سوال یہ ہوتا کہ مجھے کس سے بات کرنا ہے۔ وہ فون نمبر کسی ایسے شخص کا ہوگا جس کی ظاہری حیثیت عام لوگوں کی نظر میں بہت معتبر اور شبہے سے بالاتر ہوگی لیکن وہ درمیان کا آدمی ہوگا۔ اس طویل زنجیر کی ایک کڑی جس کا ایک سرا دلاور تھا تو دوسرا مشرقی پاکستان کا کوئی دہشت پسند ٹولہ جو علیحدگی کے جذبات کو ہوا دینے کے لیے صوبے کے طول و عرض میں تخریب کاری میں مصروف تھا۔ مجھ سے کسی عورت نے بات کی تھی جس کا لب و لہجہ ہرگز سیکریٹری والا نہیں تھا۔ وہ کسی کی بیوی یا گھر کی کوئی عورت تھی۔ اگر وہ بھی صفِ مجرماں میں شامل نہیں تھی تو اس کو اتنا ہی بتایا گیا ہوگا کہ سکندر بخت نام کا کوئی شخص کبھی چوہدری دلاور سے بات کرنا چاہے تو دلاور کو فلاں نمبر پر

پیغام دے دیا جائے۔ درمیان میں نمبروں کا سلسلہ دراز بھی ہوسکتا تھا لیکن یہ احتیاط اتنی زیادہ اہم اور ضروری نہیں تھی۔ نمبر مجھے یاد تھا اور میں کسی بھی وقت معلوم کرسکتا تھا کہ یہ کس کے گھر کا نمبر ہے۔

"چوہدری صاحب تم سے ملنے آرہے ہیں۔" پی اے نے بے یقینی کے ساتھ کہا۔ "یا تم بھی مجھے یکطرفہ ڈائیلاگ سنا کے بے وقوف بنا رہے تھے۔"

"اللہ نے تم کو دلاور کا پی اے بنا دیا۔ تم کو بے وقوف بنا کے وقت ضائع کون کرے گا۔" میں نے کہا اور ریوالور پھر جیب میں رکھ لیا۔

"میں تم کو اتنا بے وقوف نہیں سمجھتا۔"

"کتنا؟ اپنے برابر یا اپنے باس کے برابر؟" میں نے کہا۔

"میری بات مت کرو۔ تم سے میری کوئی ذاتی دشمنی نہیں۔" پی اے نے کہا۔ وہ دلاور ہی کا ہم عمر لیکن نسبتاً عیار نظر آنے والا آدمی تھا جس سے میری بارہا ملاقات ہوچکی تھی مگر ہم نے کبھی اس طرح گفتگو نہیں کی تھی مگر اب ظاہر یہ ہوتا تھا کہ اس کو بھی میرے تمام معاملات اور حالات کا علم ہوچکا ہے۔

"تم کو کچھ کہنا ہے تو بلا تمہید کہہ ڈالو۔" میں نے کہا۔

"تم مجھے اچھا آدمی نہیں سمجھتے۔" وہ بولا۔ "ٹھیک ہے میں اچھا آدمی نہیں ہوں۔ بننا چاہتا تھا مگر بن نہیں سکا۔ اب بننا بھی چاہوں تو بن نہیں سکتا۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ میں مطمئن ہوں اور دنیا کی پروا نہیں کرتا کیونکہ مجھے دوسرے بھی زیادہ مختلف نہیں لگتے مجھے پیسے کی ضرورت تھی اور پیسہ مجھے ضرورت سے زیادہ ہی مل رہا ہے۔"

"تمھارے نامۂ اعمال میں تو اندراج کی جگہ نہیں بچی ہوگی۔ اصل مع سود تمھارا زادِ آخرت دلاور کے بنک بیلنس سے زیادہ ہے یا کم؟" میں نے کہا۔

"یہ پیسہ میرے کام نہیں آرہا ہے۔ اس سے میرے بیوی بچوں کو معاشرے میں عزت ملی ہے۔ آسائش کی زندگی ملی ہے۔ وہ خاصے بڑے گھر میں رہتے ہیں۔ ہمارے پاس ایک کار ہے اور ہم بیمار ہوں تو بہترین علاج کرسکتے ہیں۔ ان کو نہیں معلوم کہ یہ پیسہ صرف پی اے کی تنخواہ نہیں ہوتا۔ وہ تو سمجھتے ہیں کہ میرا سیٹھ بہت سخی اور فراخدل ہے اور میری خدمات کا بہت صلہ دیتا ہے۔ اتنا کہ کہیں اور مل ہی نہیں سکتا۔ میرے کام کچھ نہیں آتا۔ میں دل کا مریض ہوں۔ ہائی بلڈ پریشر سے دل بڑھ گیا ہے اور یہ مرض قابلِ علاج نہیں۔ ذیابیطس کے ساتھ مل کر یہ مرض جان لیوا ہو جاتا ہے۔ میں کچھ کھا ہی نہیں سکتا۔ نہ نمکین نہ میٹھا۔ اس عمر میں لباس بھی کیا پہنوں۔ یار دوست بھی تھے نہیں۔ سگریٹ، شراب حرام ہی نہیں ممنوع ہیں۔ چنانچہ پیسہ دوسروں کی ضرورت ہے جسے میں پورا کرنے پر مجبور ہوں۔ اس پیسے نے میرے ایک بیٹے کو ڈاکٹر بنانے اور بیٹی کو عزت سے رخصت کرنے میں میری مدد کی۔ دوسرے بیٹے کو ریڈیو شاپ قائم کرنے میں مدد دی۔ میں اس پیسے کے بغیر کچھ نہ ہوتا۔ میری اولاد اپنے پیروں پر اس طرح نہ کھڑی ہوتی۔ چنانچہ میں اس پیسے کی خاطر سارے گناہ اپنے کھاتے میں ڈال رہا ہوں اور ساری خوشیاں ان کو دے رہا ہوں۔ وہ گنہگار نہیں ہیں کیونکہ وہ اس پیسے کو جائز اور حق حلال کی کمائی سمجھ کے خرچ کرتے ہیں۔ اگر ان کو اس بات کا یقین نہیں ہوتا تو وہ میری دل سے کبھی عزت نہ کرتے۔ میں گناہ سمجھ کے پیسہ کماتا ہوں اور جہنمی ہوں لیکن جس سے پیسہ ملتا ہے اس کا وفادار بھی ہوں۔ تم اچھے آدمی ہو۔ میں جانتا ہوں لیکن تم میرے مالک کے دشمن ہو۔ اس لیے تم مجھ سے بھی نفرت کرتے ہو۔ یہ نفرت میں نے ہمیشہ محسوس کی ہے۔ مگر تم نے کبھی انسانوں کی مجبوری کو محسوس نہیں کیا۔ تم یہ سمجھ ہی نہیں سکے کہ نیکی کے راستے سے آدمی جب چاہے بدی کے راستے پر چلنے لگے مگر جس راستے پر میں ہوں اسے چھوڑنا میرے لیے ناممکن ہے۔ آج میں تم کو یہ سب اسی لیے بتا رہا ہوں کہ تم مجھے اپنا دشمن مت سمجھو۔"

"لیکن تم میرے دوست بھی نہیں ہوسکتے۔" میں نے اس بھاری بھرکم اور مجبور و معذور شخص کو افسوس سے دیکھا۔

"دوست کیسے ہوسکتا ہوں۔" وہ بولا۔ "اگر ابھی چوہدری صاحب آکے مجھے حکم دیں کہ تمھیں شوٹ کردوں تو میں ان کا حکم مانوں گا۔"

"تم نے تو ان کا حکم ملنے سے پہلے ہی ریوالور نکال لیا تھا۔ کوشش ضرور کی تھی۔" میں نے طنز سے کہا۔

"میں اپنی حفاظت کے خیال سے غافل نہیں رہ سکتا۔ خصوصاً اسے دیکھ کر جو مجھے بھی اپنا دشمن سمجھتا ہو۔ میرا یہ ردِ عمل فطری تھا۔" وہ بولا۔ "اس کے علاوہ مجھے حکم تھا کہ تم کبھی اندر نظر آؤ تو تمھیں گولی ماردوں۔"

"پھر تم نے ماری کیوں نہیں؟" میں نے حیرانی سے کہا۔ "اب ماردو۔"

"تمھاری بات سننے کے بعد یہ ضروری نہیں رہا۔" وہ بولا۔ "تم جوان آدمی ہو، پڑھے لکھے ہو۔ بے شک دلاور نے تم سے تمھارا حق چھینا مگر بازوؤں میں دم ہو تو آدمی نئی دنیا آباد کرلیتا ہے۔ تم یہاں موت کو گلے لگانے کیوں آگئے ہو؟"

"تم مجھے مشورہ دے رہے ہو کہ میں بھاگ جاؤں؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ تم ہر طرف سے محصور ہو۔ کیا یہ بات تم نہیں جانتے؟" وہ بولا۔ "آج میں پہلی بار غداری کا مرتکب ہو رہا ہوں۔ غالباً یہ کمزوری اس بات کا اشارہ ہے کہ میرا وقت قریب ہے اور قدرت مجھے نیکی کمانے کا ایک موقع دینا چاہتی ہے۔ سنا ہے بعض اوقات نامۂ اعمال کی ایک نیکی سارے گناہوں کی سیاہی دھو ڈالتی ہے۔"

تمھارے بارے میں سب کو ایک جیسے احکامات ملے ہوئے ہیں۔ اب تم جانا بھی چاہو تو جا نہیں سکو گے۔"

"پھر تم یہ مشورہ مجھے ہی کیوں دے رہے ہو؟" میں نے کہا۔

"تم جانا چاہو تو میں تمھاری مدد کر سکتا ہوں۔" وہ آہستہ سے بولا۔ "مجھے ہینڈز اپ کراؤ۔ میرا ریوالور لے لو۔" اس نے ریوالور نکال کے میرے سامنے رکھ دیا۔ "پھر مجھے دھکیلتے ہوئے ڈھال بنا کے آگے لے جاؤ۔ میں سب کو منع کر دوں گا کہ گولی نہ چلائیں۔ ورنہ میں مارا جاؤں گا۔ سڑک تک مجھے ایسے ہی لے جاؤ۔ پھر ناک آؤٹ کرو اور بھاگ جاؤ۔ آگے اللہ بیلی۔"

ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا! مجھے اس بے بس آدمی پر ترس آیا، جو اب عمر کی آخری منزل پر پہنچ کے عذابِ آخرت کے خوف کا شکار ہوا تھا۔ یہ احساس اس کو بہت دیر سے ہوا تھا لیکن وہ پھر بھی پُرامید تھا کہ ایک نیکی کما لے گا تو اس کا عذاب شاید کم ہو جائے گا۔ افسوس کی بات یہ تھی کہ اس کو یہ موقع فراہم کرنا میرے لیے ممکن نہ تھا۔ بہت بدبخت تھا وہ شخص جس نے بہت کمایا اور سب گنوا دیا۔

"میرا دل تمھاری طرف سے صاف ہوا۔" میں نے کہا۔ "مگر میں یہاں دلاور سے خود ملنے آیا ہوں۔ اپنی مرضی سے اور اپنے پیروں پر چل کر اور اپنے تمام معاملات اور مسائل کو ذہن میں رکھتے ہوئے۔ تم نے کہا ہے کہ آگے اللہ بیلی۔ آگے پیچھے ہر جگہ اللہ بیلی نہ ہوتا تو میں کہاں ہوتا؟ تم بالکل فکر مت کرو۔ اس نے مجھے عقل کی طاقت ضرور دی ہے۔ مجھے اس پر پورا بھروسا ہے۔ دلاور چاہے گا بھی تو میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔"

اس نے مایوسی اور دکھ سے سر ہلایا۔ "تم نوجوان ٹھوکر کھائے بنا سنبھلتے ہی نہیں۔ دوسروں سے کچھ نہیں سیکھتے جو ٹھوکریں کھا چکے ہیں۔"

"اپنے تجربات کے بغیر اپنی زندگی ایسی ہی ہے جیسے چابی کے کھلونے کی زندگی۔" میں نے کہا۔ "میں دوسروں کی عقل کی چابی سے نہیں اپنی مرضی سے چلنا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ مجھ میں اور کھلونے میں کچھ فرق رہے۔"

"تمھاری مرضی۔ مگر یوں نہ بیٹھو میرے سامنے۔" وہ بولا۔ "کم سے کم ریوالور نکال لو۔ دلاور آتا ہی ہو گا۔"

میں نے اس کی یہ خواہش پوری کرنے میں کوئی مضائقہ نہ سمجھا، حالانکہ اس وقت میری نگاہ کو ایک تصویر نے متوجہ کر لیا تھا۔ یہ تصویر ڈاکٹر حکیم کی تھی۔ اس کے ساتھ ہی خبر تھی کہ البرٹ وکٹر اسپتال کا ایک ملازم کل اُس وقت ایک تیز رفتار گاڑی کی ٹکر سے شدید زخمی ہو کے انتقال کر گیا جب وہ ڈیوٹی پر حاضر ہونے کے لیے جا رہا تھا۔ متوفی کے بارے میں اسپتال کے ذرائع نے بتایا کہ وہ جعلی اسناد پیش کر کے ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن سینئر ڈاکٹر اس پر اپنے شک کا اظہار کر چکے تھے۔ اس کو ملازم ہوئے ابھی ایک مہینہ ہی ہوا تھا اور اسپتال میں اس کے لواحقین اور اس کے رہائشی پتے کا کوئی ریکارڈ بھی نہیں ہے۔ لاش کو پولیس نے معائنے کے بعد میو اسپتال پہنچا دیا تھا لیکن رات گئے تک اس کا کوئی وارث اسپتال نہیں پہنچا تھا۔ پولیس نامعلوم گاڑی کا سراغ لگانے کی کوشش کر رہی ہے۔ مزید انکشافات کی توقع ہے۔

خبر پڑھ کر میرا دماغ چکرا گیا۔ تصویر اسی شخص کی تھی جس سے میں اور رابعہ اسپتال میں ملے تھے۔ جو انتہائی پُراسرار طریقے پر سائے کی طرح ہمارے ساتھ لگا ہوا تھا اور جس نے اپنی ناکامی پر مشتعل ہو کے ہم پر گولی چلانے سے بھی دریغ نہیں کیا تھا اور اس بات کا خیال بھی نہیں رکھا تھا کہ اسپتال کے کسی ڈاکٹر کا مسلح ہو کے آنا اور یوں فائرنگ کرنا ہی اس کی حیثیت کو مشتبہ بنا دیتا ہے۔ بلاشبہ اس کو ناکامی کی سزا دی گئی تھی اور سزا دینے والے بھی وہی شکاری تھے جن کے جال کو ہم نے کاٹ دیا تھا۔

لیکن زیادہ چونکا دینے والی بات یہ تھی کہ خبر میں حادثے کا وقت دوپہر کے قریب بتایا گیا تھا۔ دوپہر کے بعد تو لاش مردہ خانے پہنچ چکی تھی مگر ہم نے اس شخص کو رات کے وقت زندہ دیکھا تھا۔ پھر کیا اس کی روح مردہ خانے سے اٹھ کر وہ فرض پورا کرنے آگئی تھی جو زندگی میں پورا نہ ہوا تھا۔ نہ مجھے اپنی عقل اور بصارت پر شبہ تھا اور نہ رابعہ انکار کر سکتی تھی کہ تصویر اسی شخص کی نہیں ہے۔

دن میں مرنے والا رات کو ہمیں زندہ نظر آیا تو یقیناً اس خبر میں کوئی گھپلا تھا۔

پہلی بات تو میں نے یہ دریافت کی کہ خبر کسی اسٹاف رپورٹر نے نہیں دی تھی بلکہ پریس ریلیز تھی۔ ایک حادثے کے بارے میں اخباری نمائندوں کا ذریعۂ اطلاعات تھانہ ہوتا ہے یا اسپتال اور خبر اسٹاف رپورٹر کے حوالے سے شائع کی جاتی ہے۔ حادثہ بڑا ہو مثلاً ریل یا بس کا تو خبر رساں ایجنسی کا حوالہ ہوتا ہے مگر کوئی اسپتال کسی مرنے والے کے بارے میں پریس ریلیز جاری نہیں کرتا۔ حادثات میں زخمی ہونے والے میو اسپتال ہی جا کے مرتے ہیں مگر ان کی موت پر میو اسپتال کی جانب سے کوئی پریس ریلیز نہیں جاری ہوتی کہ فلاں فلاں مقام سے حادثے کے اتنے زخمی لائے گئے تھے اور ان میں سے اتنے جانبر نہ ہو سکے۔ یہ خبر ان کی طرف سے دی گئی تھی اور دلاور نے اپنے خصوصی ذرائع استعمال کر کے شائع کروا دی تھی۔

"میں ایک اور فون کر لوں؟" میں نے کہا اور پی اے کی مرضی کے مطابق ریوالور کو انتہائی جارحانہ انداز میں اس کی جانب رکھا۔

"کر لو۔ مگر خیال رکھنا کہ دلاور آتا ہی ہو گا۔" وہ بولا۔

میں نے سر ہلایا اور ڈائریکٹری سے البرٹ وکٹر اسپتال کا نمبر تلاش کر کے ملایا۔

"ہیلو۔" کسی نے سخت بیزار لہجے میں کہا۔

"مجھے اس خبر کے بارے میں..."

"ارے بابا... ہم تو صبح سے دس بار بتا چکے ہیں کہ خبر غلط ہے۔ کوئی ڈاکٹر حکیم وکیم ہمارا ملازم نہیں تھا۔" بیزار شخص چلانے لگا۔ "او ہم نے یہ پریس ریلیز دی ہے۔ اب سارا دن سارا شہر ہم سے پوچھتا رہے گا۔ ہم کیا کریں..."

"آپ اس کی تردید جاری کر دیں۔" میں نے اس کی بیزاری کو جائز تسلیم کرتے ہوئے ہمدردی سے کہا۔

"کر دیا بابا کر دیا۔ مگر وہ تو کل چھپے گی... آج کیا ہو گا۔ فون پر جواب دے دے کر ہم تو پاگل ہو جائیں گے۔" وہ بولا۔

"پاگل ہوں آپ کے دشمن... آپ ریسیور نیچے رکھ دیں۔"

"پھر اسپتال فون کرنے والے ضرورت مند پاگل ہو جائیں گے۔" وہ میرے ہمدردانہ لہجے سے متاثر ہوا تھا۔

"پھر آپ صبرِ جمیل سے کام لیں۔ کوئی سکون بخش دوا کھائیں یا پھر چھٹی کر کے گھر چلے جائیں۔" میں نے کہا اور لائن کاٹ دی۔ پی اے مجھے غور سے دیکھتا رہا۔

"یہ کیا بات ہوئی؟" وہ بولا۔

"بات تو ابھی میری سمجھ میں نہیں آئی... تمھیں کیا سمجھاؤں۔" میں نے ایک سرد آہ بھر کے کہا۔ "مردہ زندہ ہو گیا۔" میں نے تصویر پر انگلی رکھ کر کہا۔ "یہ شخص دوپہر کو فوت ہوا۔ شام سے پہلے اٹھ کھڑا ہوا اور مردہ خانے سے فرار ہو گیا۔"

"چوہدری دلاور سے میں نے اکثر سنا ہے کہ تم جوکر ہو۔" پی اے بولا۔

خبر میں ایک گھپلا اور بھی تھا۔ میرا زخمی ہو کے البرٹ وکٹر اسپتال پہنچنا بھی حادثہ تھا۔ مجھے وہاں پہنچانے والا ایک پولیس افسر تھا۔ حادثے کے کیس تو میو اسپتال جاتے ہیں۔ پھر وہ مجھے البرٹ وکٹر اسپتال کیوں لے گیا تھا، غالباً قانونی الجھن سے بچنے کے لیے۔ میری چوٹیں معمولی نوعیت کی تھیں۔ اس نے اسپتال کے کسی ڈاکٹر سے سازباز کی یا پھر کوئی دوسری کہانی بیان کی۔ کوئی ایسی کہانی جس پر یقین کرتے ہوئے البرٹ اسپتال والے مجھے داخل کر لیں۔ پندرہ ہزار وہ میرے لیے چھوڑ گیا تھا۔ شاید دس پندرہ کسی کے ہاتھ پر بھی رکھ دیے ہوں۔ البرٹ وکٹر بڑا نیک نام اسپتال تھا مگر ایک گندی مچھلی کس تالاب میں نہیں ہوتی۔ اچھے لوگوں کے درمیان کوئی پیسے کا لالچی بھی بیٹھا ہے جو اس نیک نامی پر بٹا لگاتے ہوئے شرمندہ نہیں ہوتا۔

آخری ناقابلِ فہم بات یہ تھی کہ میرا البرٹ وکٹر اسپتال پہنچنا اگر اتفاق تھا تو یہ جعلی ڈاکٹر حکیم وہاں کیسے پہنچ گیا۔ کیا وہ شخص جس کی گاڑی کو میں نے ٹکر ماری تھی اور جس نے خود کو پولیس انسپکٹر رضوی ظاہر کیا تھا، وہ بھی ایک شکاری تھا یا اسی نے دلاور کو مطلع کیا تھا کہ لو آپ اپنے دام میں صیاد آگیا۔ سکندر رضا کارانہ طور پر میری گاڑی کے سامنے آمرا اور میں نے اس کو فلاں جگہ جمع کرا دیا ہے۔ آگے آپ سنبھال لیں۔ دلاور فوراً حرکت میں آگیا اور اس نے ایک قابلِ اعتماد آدمی کو حفاظتی انتظامات کے ساتھ اسپتال میں بھیج دیا مگر وہ آدمی اعتماد کے معیار پر پورا نہیں اترا چنانچہ عالمِ بالا کو ارسال کر دیا گیا اور اس کی وفات تو رات کو ہوئی مگر حادثے میں دوپہر کا وقت بتا دیا گیا۔ دلاور نے جلدی میں غلطی یہ کی کہ پریس ریلیز کو اسپتال سے منسوب کر دیا، ورنہ اس جعلی ڈاکٹر حکیم کو ناکامی اور نااہلی پر گاڑی سے مروانے کے بعد یہ بہتر ہوتا کہ اس کی لاش پولیس کے حوالے کر دی جاتی اور دلاور اپنے ذاتی تعلقات اور پیسے کی مدد سے پولیس کی خدمات حاصل کرتا۔ وہ حادثے کا بہت اچھا انتظام کر لیتے۔ مثلاً جائے واردات کو بدل دیتے۔ یہ کہتے کہ متوفی ریلوے لائن پر جا لیٹا تھا چنانچہ تیز گام کے نیچے اس کے تین ٹکڑے ہو گئے۔ پولیس اس کی لاش کو ناقابلِ شناخت بنا سکتی تھی۔ اور لاوارث قرار دے کر مردہ خانے میں پھنکوا سکتی تھی۔ میڈیکل کے طالب علموں کو تجربات کے لیے مردے بیچنے والا ٹھیکیدار بھی کچھ کما لیتا اور متوفی کے اجزائے ترکیبی منتشر ہو جاتے۔ زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب۔ موت کیا ہے انہی اجزا کا پریشاں ہونا۔

مگر یہ ان کے نقائص ظاہر کرتے تھے کہ یہ سب کچھ دلاور نے نہیں کیا ہو گا۔ کسی نے اُسے بہت گھبراہٹ میں ٹھکانے لگایا اور پھر اپنی عقل پر بھروسا کرتے ہوئے خبر دینے کی غلطی کی۔ یار زندہ صحبت باقی۔ دلاور کی طرف سے غلطی کرنے والے کو بھی انعام ملے گا۔ خبر نے ایک اور وضاحت بھی کر دی تھی کہ مجھے اسپتال میں نظربند ہی کیوں رکھا گیا تھا۔ اگر میرے محافظ اور نگراں خود شکاری تھے تو انھوں نے مجھے شکار کیوں نہیں کیا۔ صرف اسیر رکھنا کیوں کافی سمجھا۔ دراصل دلاور مجھ سے ملنا چاہتا تھا۔ پہلی بار اس کی دعوت کو میں نے چال سمجھ کے مسترد کر دیا تھا۔ دوسری بار وہ مجھے اس اسپتال سے لے جانا چاہتا تھا اور میرے ہوش میں آنے کا منتظر تھا مگر اس کی یہ خواہش بھی پوری نہ ہو سکی۔ مجبوراً اس نے وہ چال چلی جس میں کامیابی یقینی تھی۔ شہلا اور رابعہ کو یرغمال بنا کے وہ مجھے بلانے میں کامیاب رہا تھا۔

میں نے میو اسپتال فون کرنے کا سوچا اور اپنے ارادے کو ملتوی کر دیا۔ ان کا جواب اس کے سوا کچھ نہ ہوتا کہ یہاں کسی ڈاکٹر حکیم کی لاش نہیں لائی گئی جو کسی کار کے حادثے میں زخمی ہوا ہو۔ میں پولیس سے پوچھتا تو وہ سب سے زیادہ لاعلم بن جاتے۔ اخبار والوں سے پتا کرتا تو پریس ریلیز کا مسودہ ہی نہ ملتا یہ نہ معلوم ہوتا کہ پریس ریلیز کون

دے گیا تھا خبر کس نے کاتب تک پہنچائی اور اشاعت میں شامل ہو گئی۔ اخبار کے دفتر میں رات کے وقت کاتبوں کی ایک ٹیم سر اٹھائے بغیر کام کرتی ہے اور کتابت کے لیے ان میں خبریں برابر تقسیم ہوتی رہتی ہیں۔ بعد میں کوئی نہیں بتا سکتا کہ کون سی خبر کس نے دی تھی اور کس کاتب کو دی تھی۔

خبر میں میری دلچسپی ایک قدرتی بات تھی لیکن اس کے بعد میں ذہنی طور پر خبر کا تجزیہ کرنے لگا اور پی اے کی طرف سے غافل ہو گیا۔ ریوالور میری گرفت میں ضرور تھا مگر اپنی حفاظت کے لیے نہیں۔ پی اے چاہتا تھا کہ میں اس پوز میں بیٹھوں۔ اگر وہ چاہتا تو کسی بھی وقت مجھ سے ہتھیار رکھوا لیتا لیکن اس کی باتیں سننے کے بعد میں نے مان لیا تھا کہ وہ میرا دشمن نہیں تھا۔ ویسے بھی وہ گھومنے والی کرسی پر اطمینان سے سر پیچھے لٹکائے بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے دوبارہ اس کی طرف توجہ کی تب بھی وہ اسی طرح خاموش تھا اور بے حس و حرکت نگاہیں چھت پر لگائے بیٹھا تھا لیکن اچانک مجھے اس کی حالت پہلے سے مختلف لگی۔ میں نے غور سے دیکھا تو مجھے اس کی آنکھوں کی پتلیاں ساکت نظر آئیں۔ میں ایک دم اٹھا اور میز کا چکر لگا کے اس کے پاس پہنچا۔

"شفاعت صاحب!" میں نے کہا۔ اور اس کا شانہ ہلایا۔ وہ تھوڑا سا ہلا اور بائیں طرف جھک گیا۔ میرے لیے شک کی کوئی گنجائش نہ رہی۔ وہ مر چکا تھا۔ پانچ دس منٹ پہلے وہ زندہ تھا۔ میں یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ میں نے سوچ بچار میں کتنا وقت صرف کر دیا تھا لیکن اتنا یقین سے کہہ سکتا تھا کہ اس وقفے میں کوئی بھی نہ کمرے میں داخل ہوا تھا اور نہ کھڑکی میں نظر آیا تھا۔ اس کی موت کے طبعی ہونے میں شبہ نہ ہونے کے باوجود میرے دل میں ایک خلش پیدا ہو گئی۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ ابھی چند منٹ پہلے اس نے اپنی گنہگار زندگی پر میرے سامنے اپنی مجبوری کا اعتراف کیا تھا اور یہ بتایا تھا کہ اس کی طرف سے میرا دل صاف ہو جانا چاہیے۔ کیا یہ سب قدرت کا انتظام تھا؟ فرشتۂ اجل کی روانگی سے پہلے گناہ گار اور خطاکار آدمی پر اپنا غفور الرحیم ہونا ثابت کرنے کے لیے اس نے ایک شخص کو چند منٹ دیے کہ وہ اپنے ضمیر کا بوجھ ہلکا کر لے! مگر اسے یہ ثابت کرنے کی کیا ضرورت جسے ثبوت درکار ہی نہیں۔ پھر کیا یہ اتفاق تھا کہ اعترافِ جرم و ندامت کے فوراً بعد دل نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔

میں ابھی حیرت اور خوف، دکھ اور بے یقینی کے احساس سے دم بخود کھڑا سوچ ہی رہا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ فوراً کسی کو آواز دے کر بلانا چاہیے یا دروازہ بند کر کے بھاگ جانا چاہیے کیونکہ یہ حادثہ میرے خلاف ایک جرم بھی بنایا جا سکتا تھا کہ اسی وقت مجھے اپنے سامنے کھلے دروازے میں چوہدری دلاور نظر آیا۔

وہ اطمینان سے چلتا ہوا میری طرف دوستانہ انداز میں مصافحے کے لیے آیا۔

"لو بھئی اپنے سکندر صاحب! ہم نے بلوا ہی لیا آپ کو۔" دلاور نے خوشدلی سے کہا۔ بلوا لیا کہہ کے اس نے بہت کچھ کہہ دیا تھا۔ یہ کہ تم تو کبھی نہ آتے۔ مگر دیکھو کہ تم کتنے مجبور ہو کر آئے۔ یہ کچھ ویسی ہی ملاقات تھی جیسی دوسری جنگِ عظیم کے بعد شہنشاہ ہیرو ہیٹو اور اتحادی فوجوں کے سپریم کمانڈر کے درمیان ہوئی تھی۔ چڑھتے سورج کی سرزمین کا وہ شہنشاہ جس کی طرف رعایا نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھتی تھی نظر جھکا کے اعترافِ شکست کی دستاویز پر دستخط کرنے آیا تھا۔ نہ آنا اس کے اختیار کی بات نہیں تھی۔

"یہ... یہ اسے کیا ہوا؟" چوہدری دلاور نے میری خاموشی اور میری صورت کے تاثرات کو دیکھ کر کہا۔

"اسے اللہ نے بلوا لیا۔" میں نے کہا۔ "یہ بھی میری طرح مجبور ہو گیا تھا غالباً۔"

"اچھا... گویا یہ مر گیا۔" چوہدری دلاور نے جذبات سے عاری اور سپاٹ لہجے میں کہا۔ اس کا ردِ عمل اتنا سرسری تھا کہ میرا پارہ چڑھنے لگا۔ وہ یوں پوچھ رہا تھا جیسے ذکر کسی آدمی کا نہیں پالتو کتے کا تھا۔ کتا پالنے والے بھی اس سے اتنے مانوس ہوتے ہیں کہ اس کے مرنے پر رنجیدہ ہو جاتے ہیں۔

"چند منٹ پہلے تک یہ ایک جیتا جاگتا انسان تھا۔ میری اور تمہاری طرح۔" میں نے برہمی سے کہا۔ "اور یہ تمہارا پی اے تھا۔ تم ایسے بات کر رہے ہو جیسے..."

"ارے بھئی تم کیوں خفا ہو۔" دلاور بولا۔ "موت سے کس کو رستگاری ہے۔ یہی شعر ہے نا۔ ہم کچھ اَن پڑھ بندے ہیں۔ غلط شعر پڑھیں تو آپ اس پر بھی خفا ہو جاؤ۔ اب مرنا تو سب کو ہے جی۔ بندہ بشر کیا اور جانور کیا۔ درخت اور یہ سب دنیا کا دھندا کاٹھ کباڑ۔ سب ختم ہو جانا ہے۔"

"تمہارے نزدیک اس آدمی میں اور کاٹھ کباڑ میں کوئی فرق نہیں؟ اور کیا یہ اب یہاں ایسے ہی پڑا رہے گا؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ اٹھوا دیتے ہیں اسے۔" دلاور نے بے نیازی سے کہا۔

"چوہدری صاحب! زندہ انسانوں کی تو کوئی اہمیت ہے نہیں آپ کے نزدیک۔ مرنے والے کا بھی لحاظ نہیں؟ آخر یہ نمک خوار تھا آپ کا۔ اس کے وارثوں کو اطلاع دینا۔ تجہیز و تکفین میں شریک ہونا۔ یہ سب آپ کی اخلاقی ذمے داری ہے۔"

"ہاں یار ہے۔ میری اخلاقی ذمے داری کے لیے تم کیوں پریشان ہو آخر۔ یہ تمہارا نمک خوار تو نہیں تھا۔" چوہدری دلاور نے کہا۔ "سب کچھ ہو جائے گا۔ میں بھی پہنچ جاؤں گا نماز کے وقت۔ یہ کام دوسروں کو کرنے دو۔ تم آؤ میرے ساتھ۔ ہم اتنی دیر

میں اپنے کام کی بات کر لیں۔ آخر تم اس سے ملنے تو نہیں آئے تھے۔"

"کمال ہے چوہدری صاحب۔" میں نے با دلِ ناخواستہ اور سخت خراب موڈ میں دلاور کے ساتھ جاتے ہوئے کہا۔ "تم نے ابھی تک یہ بھی نہیں پوچھا کہ یہ آخر کیسے مر گیا۔ صرف میں تھا اس کے پاس۔"

"مجھے معلوم ہے۔" دلاور نے دروازہ کھول کے اسی بے حسی کے ساتھ کہا۔ "پوچھنا کیا اپنے سکندر صاحب۔ بندے کا دل دغا دے گیا۔ سب ہی جانتے ہیں کہ اس کا دل حد سے بڑھ گیا تھا مگر شاید تم نہ سمجھو۔"

"کیوں؟ کیا دل نہیں ہے میرے پاس؟" میں نے مشتعل ہو کے کہا۔

"یہ مطلب نہیں تھا میرا۔" دلاور نے بیٹھتے ہوئے مجھے اپنے مقابل بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ "دل تو ہے تمہارے پاس مگر جوان ہے اور تم اس سے کام بھی کہاں لیتے ہو۔ دماغ سے ہی سارے کام نکالتے ہو۔ کبھی کبھی زندگی اور موت کا توازن ایک بال پر قائم ہوتا ہے۔ ریت کے ایک ذرے پر چٹان رکی رہتی ہے۔ ہم نے دسویں جماعت کے جغرافیے میں پڑھا تھا کہ میلوں لمبے گلیشیر جو سال میں چند انچ سرکتے ہیں آواز کی لہروں سے۔ اونچا بولنے یا ایک چھینک مارنے سے پھسل جاتے ہیں اور پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ یہ بندہ بھی بس ایسے ہی زندگی کے دھاگے سے لٹکا ہوا تھا۔ دھاگا مکڑی کے جالے کی طرح ہو گیا تھا کہ ایک سانس میں ٹوٹ جائے۔"

"تم یہ فلسفہ مجھے کیا سمجھانے کے لیے بول رہے ہو؟" میں نے اسے غور سے دیکھا کیونکہ اس کے لبوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ تھی جو کچھ کہتی محسوس ہوتی تھی۔

"یہی کہ مجھے اس کی اچانک موت کا سبب معلوم ہے۔" چوہدری دلاور نے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ "تم دیکھو گے؟"

"اب دیکھنے کو کیا رہا ہے؟" میں چونکا۔

"وہی اس بندے کی موت کا سبب۔" چوہدری دلاور بولا اور اس کا ایک ہاتھ جیب میں گیا۔ میرا ردِ عمل فوری اور فطری تھا۔ میں اس بات سے اور کیا مطلب نکالتا کہ وہ مجھے موت کا سبب بتانا نہیں، دکھانا چاہتا ہے۔ ریوالور ایک دم میرے ہاتھ میں آ گیا لیکن اس کا دلاور پر خاک بھی اثر نہیں ہوا۔ وہ اسی طرح بیٹھا رہا یوں جیسے میرے ہاتھ میں اصلی نہیں، نقلی ریوالور ہو۔ اس شخص کی اداکارانہ صلاحیت کا میں ہمیشہ سے معترف تھا۔ وہ اپنے ردِ عمل کو بھی کنٹرول کر لیتا تھا۔ اپنی صورت سے وہ خوف یا پریشانی اور گھبراہٹ کا کبھی اظہار نہیں ہونے دیتا تھا اور اپنے لہجے سے یا صرف مسکراہٹ سے وہ بات کہہ جاتا تھا جو زبان نہیں کہتی تھی۔ اس نے جیب میں سے ایک سفید کاغذ نکالا جس کو چار مرتبہ تہ کیا گیا تھا۔ پورا کھل جانے پر وہ فل اسکیپ سائز کی شیٹ بن گیا جسے اس نے دونوں ہاتھوں میں پکڑ کے میرے سامنے پھیلا دیا۔ میرے دماغ کو ایک زبردست جھٹکا لگا۔ اس پر مارکر سے موٹے واضح حروف میں صرف ایک جملہ لکھا ہوا تھا۔ "غدار کے لیے سزائے موت۔"

وہ سارا فلسفہ جو دلاور نے بگھارا تھا ایک دم میری سمجھ میں آ گیا۔ میں سمجھ گیا کہ اس کا پی اے کس طرح اچانک آواز نکالے بغیر مر گیا تھا۔ اسے کسی نے گولی نہیں ماری تھی۔ زہر نہیں دیا تھا اور کسی نے اس کا گلا نہیں گھونٹا تھا مگر اس کی موت طبعی نہیں تھی۔ یہ قتل تھا جو دلاور نے کیا تھا۔ اس نے میری اور اپنے پی اے کی تمام گفتگو سن لی تھی یا اس کا کچھ حصہ سن لیا تھا جس سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ پی اے نمک حرام ہو گیا ہے۔ اس کا شاطر ذہن عملی زندگی میں کئی مرتبہ ڈرامے کر چکا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ ڈرامائی تاثر سے ذہن کو مرعوب کرنے کا ماہر ہے اور خود میرے ساتھ اس نے کئی ایسے ڈرامے کیے تھے جن کا نقش میرے ذہن پر قائم تھا۔ وہ سیدھی سی صاف بات کو بھرپور انداز میں یوں پیش کرتا تھا جیسے ایک کامیاب ہدایت کار کسی کہانی کے خیال کو ڈرامے کی صورت میں اسٹیج پر پیش کرتا ہے اور اپنی پیش کش کے کمال سے ناظرین کو ہنسانے رلانے اور ان کے جذبات کا رخ اپنی مرضی کے مطابق موڑنے میں کامیاب رہتا ہے۔ جب اس نے کہا تھا کہ ریت کے ایک ذرے پر چٹان رکی رہتی ہے تو وہ اپنے پی اے کی بات کر رہا تھا جس کا ناتواں دل خفیف سا صدمہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے قتل کا الزام اپنے سر لیے بغیر اسے مار دیا۔ نہ جانے کس وقت وہ ذرا سی دیر کے لیے کھلے دروازے کے سامنے آیا تو اس کے دونوں ہاتھوں میں یہی تحریر تھی جسے شفاعت پی اے نے پڑھا اور وہ ایک دم سمجھ گیا کہ دلاور نے اس کی تمام گفتگو سن لی ہے۔ دہشت کا صدمہ اس کے دل کو لے بیٹھا۔ وہ سزائے موت کا فیصلہ دیکھ کر مر گیا۔ غالب نے تو ایک شاعرانہ بات کی تھی کہ مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالب۔ مگر یہاں میرے لیے یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ ابھی ابھی میری نظروں کے سامنے ایک انسان کو ایک سطر سے قتل کیا گیا تھا۔ کیا چند حروف پر مشتمل ایک سطر کو آلۂ قتل سمجھا جا سکتا ہے؟ دنیا کا کوئی قانون اسے قتل قرار دے سکتا تھا! کوئی ہوشمند آدمی میری بات مان سکتا تھا کہ دلاور قاتل ہے۔ وہ غضب کا شکاری تھا۔ اس کی نظر اس کی عقل سے زیادہ تیز تھی۔ اس نے کچھ نہیں کیا تھا۔ صرف ریت کا وہ ذرہ ہٹا دیا تھا جس پر چٹان رکی ہوئی تھی اور اب وہ مجھے موت کا سبب دکھا رہا تھا۔ کسی خوف یا شرمندگی کے بغیر۔ اسے بالکل ڈر نہیں تھا کہ میں کیا سمجھتا ہوں۔ میں کہتا تو وہ کاغذ کی شیٹ میرے حوالے کر دیتا کہ لو جہاں چاہو لے جاؤ۔ پولیس کے پاس جاؤ یا اخبار والوں کے پاس یا اسے چوک میں چسپاں کر دو اور چاہو تو اس کے نیچے یہ بھی لکھ دو کہ اس جملے سے چوہدری دلاور نے

اپنے پی اے کو قتل کر دیا۔ یکلخت میرے دماغ کا فیوز اُڑ گیا مگر ایک بار پھر دلاور نے اپنے ٹھنڈے دماغ سے مجھے شکست دی۔ اس نے میری صورت سے میرے ردِ عمل کا اندازہ کر لیا تھا۔ عین اس وقت جب میں ریوالور نکال چکا تھا اور طے کر چکا تھا کہ اب اس حرامزادے کو قتل کر کے ہی دم لوں گا اُس نے میرے ہاتھ پر پیپر ویٹ کھینچ مارا۔

اس کا نشانہ بھی خطا نہیں گیا۔ میری کلائی پر سخت چوٹ آئی اور ریوالور پھینک کر میں نے اپنا ہاتھ جھٹکا جس میں درد کی شدید لہر اُٹھی تھی۔ دلاور نے ایک فون نمبر گھمایا۔

"ریوالور اُٹھا کے جیب میں رکھ لو۔" وہ آہستہ سے بولا اور پھر فون پر مخاطب ہوا۔" دیکھو بھئی! یہ شفاعت بے چارے کا ہارٹ فیل ہو گیا ہے۔ ابھی ابھی... نہیں... اب کیا فائدہ ڈاکٹر ایمبولنس کا... ہاں... وہ تو میں نے باہر نکل کے دیکھ لیا... نہ جانے کتنی دیر سے مرا پڑا تھا... ہاں... تم تیکنیکی میں تھی کرا دو۔ سب اس کے جنازے میں شریک ہوں گے۔ اور دیکھو میت کے ساتھ تم خود جانا... تدفین کا وقت شام تک رکھنا تاکہ میں بھی پہنچ جاؤں۔ میری طرف سے تعزیت کرنا... ہاں بھئی صدمے کی بات تو ہے... یہ دیکھو کہ اس کے واجبات کتنے تھے... خیر جتنے بھی ہوں تم سب ملا کے ایک لاکھ کر لو... ہاں... باقی میری طرف سے ڈال دینا مگر یہ ایک لاکھ مرحوم کے خاندان کو آج ہی دینے ہیں۔ میں خود آؤں گا تو دے دوں گا... اور سنو بھئی... یہاں ایک مہمان بیٹھے ہیں میرے ورنہ میں ابھی یہ سارا کام خود کراتا۔ بہت اہم اپائنٹمنٹ ہے جو کینسل نہیں ہو سکتی۔ تم ذرا کافی وغیرہ کے لیے کسی سے کہہ دو... ہاں... شفاعت بے چارہ خود کر لیتا تھا سب کچھ..." اس نے ریسیور رکھ دیا۔

میں نے ایک گہری سانس لی اور اپنے جذبات کی آتش فشانی پر قابو پا لیا۔ آدمی اپنے دوستوں سے ہی نہیں دشمنوں سے بھی بہت کچھ سیکھتا ہے۔ دشمن اس کی کمزوریوں سے فائدہ اُٹھاتے ہیں تو ایک طرح سے اُسے موقع فراہم کرتے ہیں کہ ان کمزوریوں سے نجات پا لے۔ دلاور کی بات ایک طعنہ بن گئی تھی کہ میں دل سے کہاں دماغ سے ہی سارے کام لیتا ہوں۔ کم سے کم ایسا سمجھتا ضرور ہوں مگر کیا واقعی ایسا ہے؟ ابھی ابھی میرے دماغ پر دل اس طرح غالب آ گیا تھا کہ میں اندھا ہو گیا تھا۔ اندھا نہ ہوتا تو ضرور دیکھ لیتا کہ دلاور کو قتل کر کے میں خود کس راستے سے زندہ باہر جاتا اور پھر ان سب کے مشن کا کیا بنتا جنھوں نے عقل و ہوش سے کام لیتے ہوئے مجھے یہاں بھیجا تھا۔ رابعہ اور شہلا کا کیا ہوتا؟

میں نے ریوالور جیب میں ڈال لیا اور پی اے کی موت کو بھول گیا۔ دلاور ایک سفاک اور شیطان صفت آدمی تھا اور جذباتی بے حسی کا یہ مظاہرہ اس کی فطرت میں شامل تھا۔ مجھے مقصد سے کام رکھنا چاہیے۔

"میں تمھارا مہمان نہیں ہوں دلاور..." میں نے کہا۔ "... سے آتا تو ضرور ایسا سمجھتا لیکن جیسا کہ تم نے کہا کہ تم نے مجھے ... ہے۔"

"یعنی تم کافی کیا پانی تک نہیں پیو گے میرے ہاتھ ..." دلاور ہنسا۔" تمھاری مرضی بھئی... ہم تو اتنی وضعداری کے پابند نہیں ہیں۔ تم مجھے اغوا کر لیتے تب بھی تمھارے پاس جا کر میں سب سے پہلے کافی مانگتا۔"

"سب سے پہلے یہ بتاؤ کہ رابعہ اور شہلا کہاں ہیں؟" میں نے ... "کہاں رکھا ہے تم نے انھیں؟"

"وہ جہاں بھی ہیں خیریت سے ہیں۔ مجھے معلوم تو نہیں لیکن تمھاری یقین دہانی کے لیے کہہ سکتا ہوں۔" وہ بولا۔

"کیا وہ نازو کے ساتھ ہیں؟" میں نے کہا۔

"نازو؟ یہ کون ہے اپنے سکندر صاحب...؟" دلاور ... "وہی لڑکی تو نہیں جو بڑی مار دھاڑ کرتی ہے۔ اس سب انسپکٹر کی بہن... کیا نام ہے اس کا... ہاں... اکرام شیخ۔ بیچارے کو جس وجہ سے استعفا دینا پڑا۔"

"میرا سوال اکرام شیخ کے بارے میں نہیں تھا۔" میں نے ...

"وہ تمھارا گہرا دوست تھا... اور اپنے سکندر صاحب ... میں ایسا ہونا تو نہیں چاہیے۔" دلاور بولا۔" دوست کی عزت ... عزت...!"

"تم جیسے مرتے شیطان کے منہ سے عزت کا لفظ اچھا نہیں لگتا۔" میں نے بھڑک کر کہا۔" اس کی ہی نہیں... ہر پرائی بہو بیٹی کی عزت میری عزت ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔" وہ متاثر ہوئے بغیر بولا۔" مگر دنیا ... اس لیے بکواس کرتی ہے... میں بھی کہتا ہوں کہ تم سے... چھوڑو... بس جو بھی ہوا اس سے کسی کا بھلا نہیں ہوا... اگر ... ہوا تو میں کہہ نہیں سکتا لیکن ماں باپ تو کسی کو منہ دکھانے کے نہیں رہے۔ اب یہ بھی ایسی بات ہے سکندر جو تم بیس تیس ... بعد سمجھتے۔ بشرطیکہ تمھاری بھی جوان بیٹی ہوتی مگر کچھ سمجھنے کے ... زندگی کے سارے تجربات سے گزرنے کی مہلت سب کو نہیں ..."

"اگر تم سمجھتے ہو کہ اس دھمکی سے میں..."

"دھمکی کوئی نہیں۔" دلاور نے ہاتھ اُٹھا کے کہا۔" یہ سب فضول باتیں ہیں۔ تم کچھ کرو گے تو مجھے بتا کے نہیں کرو گے ورنہ میں بھی کرتا رہا ہوں۔ تم نے نازو کے بارے میں سوال کیا ... اس کے بارے میں جو کچھ مجھے معلوم تھا وہ تمھیں بتا دیا۔"

"وہ خود کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

دلاور نے دونوں ہاتھ پھیلا کے لاعلمی کا اظہار کیا۔" اگر تم کو نہیں معلوم تو پھر میں کیسے بتاؤں... بھائی نہیں جانتا... ماں باپ نہیں جانتے... پولیس نہیں جانتی اور تم نہیں جانتے... تو پھر اللہ ہی جانتا ہے کہ وہ کہاں ہے۔"

ایک شخص کافی لے کر اندر آیا۔" وہ... سر... پولیس کو اطلاع دی ہے جی آپ نے؟"

"اس کی ضرورت نہیں... تم وہی کرو جو میں نے کہا ہے..." دلاور نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔" لاش اُٹھا لی ہے؟"

"یس سر جی... چوکیدار کی چارپائی پہ لٹا دیا ہے۔" وہ بولا۔

"اچھا... پھر تم اس کی جگہ بیٹھو۔" دلاور نے کہا۔" اور اس بات کا خیال رکھو کہ اندر کوئی نہ آنے پائے... ٹیلی فون کال بھی نہیں..."

"جی سر جی..." کافی لانے والے نے کہا۔ ایک نظر مجھے دیکھا اور لوٹ گیا۔ میں دلاور کی کسی بات کو جھوٹ یا سچ کیسے سمجھتا جب کہ وہ حد درجہ عیار شخص اس بات پر قادر تھا کہ سچ کو جھوٹ بنائے اور جھوٹ کو سچ... نازو کے متعلق اس کے اظہارِ لاعلمی سے بھی کوئی نتیجہ اخذ کرنا مشکل تھا اور نازو کے گھر والوں کی حالت کے متعلق اس کے بیان پر اعتبار کرنا بھی۔

"تم اچھی طرح جانتے ہو دلاور..." میں نے اس کی کافی قبول کرتے ہوئے کہا۔" تمھارے پہلے دعوت نامے کو میں نے مسترد کر دیا تھا۔ تمھاری پیش کش اگر سنجیدہ اور مخلصانہ ہوتی تب بھی میں تم سے ملنے نہ آتا۔ مجھے تم سے کوئی سودا منظور ہی نہیں خواہ اس میں فائدہ ہی فائدہ ہو۔ میں اس فائدے پر لعنت بھیج سکتا ہوں جو تم سے حاصل ہو۔ اس کے مقابلے میں جان کا زیاں بھی قبول ہو گا مجھے..."

"واہ اپنے سکندر صاحب!" دلاور مسکرایا۔" بڑی تیاری سے آئے ہو۔ اچھا بول رہے ہو... پڑھے لکھے بندے ہو نا... ڈائیلاگ مجھے پسند آئے۔"

"اب یا تو بتا دو کہ مجھے کیوں بلایا تھا یا مجھے جانے دو۔" میں نے اُسے گالی دینے کی خواہش کو اور غصے کی شدید لہر کو دبا کے کہا۔

"میں نے تو اپنے خط میں سب لکھ دیا تھا۔" وہ بولا۔" کوئی نئی بات نہیں ہے۔" اور اطمینان سے کافی پینے لگا۔ اس کا کنٹرول اپنی حرکات و سکنات پر اور چہرے کے تاثرات پر ہی نہیں لہجے اور آواز پر بھی حیرت انگیز تھا۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ آدمی نہیں مشین ہے۔ کوئی آٹومیٹک نظام اس کی ساری شخصیت کو ایک خاص تاثر کی سطح پر رکھتا ہے۔ جیسے تھرمو اسٹیٹ بجلی کی استری اور اوون یا واٹر ہیٹر کے درجۂ حرارت کو نہ کم ہونے دیتا ہے اور نہ زیادہ بلکہ وہیں رکھتا ہے جہاں اسے سیٹ کر دیا جائے اسی طرح وہ اپنے ہر ردِ عمل کو ضرورت کے مطابق سیٹ کر کے مطمئن ہو جاتا ہے۔ پھر نہ وہ مشتعل ہو گا نہ مایوس۔ نہ حیران ہو گا نہ پریشان۔ اس کی آواز بھی ایک ہی لیول پر رہے گی۔ نہ اوپر جائے گی نہ نیچی ہو گی۔ لہجے میں بھی جذبات کو قطعی دخل نہ ہو گا اور اس کا چہرہ بند ٹی وی اسکرین کی طرح کوئی عکس پیش نہیں کرے گا۔ بالکل بلینک رہے گا۔ شاید اسمگلر دلاور کی شخصیت اس سے بہت مختلف ہو گی۔ وہ اپنے ردِ عمل کے نظام کو دوسرے لیول پہ لے آتا ہو گا۔ بے رحم سفاک اور غصہ ور... طوفانی مزاج والا چیخنے دہاڑنے والا۔

"میں چاہتا تھا کہ یہ جھگڑا ختم ہو جائے۔" وہ پھر بولا تو میں چونکا۔

"جھگڑا تو ایسے ختم نہیں ہو سکتا۔" میں نے کہا۔ میں کہنا چاہتا تھا کہ اب میرے اور تمھارے درمیان نہیں، یہ جنگ غیر ذاتی ہونے کے بعد حق و باطل کی قوتوں کے درمیان ہو رہی ہے۔ یہ نیکی، بدی... جائز و ناجائز... دوست اور دشمن کی شناخت کی جنگ ہے۔ ہم دشمنوں کو پہچان گئے ہیں اور اب ایک طرف وطن پرست ہیں تو دوسری طرف وطن فروش۔ میں ان کا نمائندہ نہیں ہوں کہ تم سے صلح کے مذاکرات کر سکوں۔ جھگڑا تو تمھارے ناپاک وجود کے ساتھ ہی ختم ہو گا، ورنہ نہیں ہو گا۔ لیکن یہ سب میں نے مصلحت کے خلاف سمجھتے ہوئے نہیں کہا۔

"پھر کیسے ختم ہو سکتا ہے؟" دلاور نے اسی سپاٹ آواز میں کہا مگر یہی وہ بات تھی جس کا جواب حاصل کرنے کے لیے اس نے مجھے زبردستی بلایا تھا۔

"کیا تم نہیں جانتے؟" میں نے بھی گول مول بات کی۔

"جانتا تو ہوں؟" وہ سوچتے ہوئے بولا۔" تم کو وزیر خان پر ہونے والے ظلم کی شکایت ہے۔ میں تمھارے جذبات کو سمجھتا ہوں۔ تم کو یقین دلا دیا گیا ہے کہ اصل مجرم میں ہوں۔ میں اس سے انکار نہیں کرتا کہ میں نے وزیر خان کی مدد نہیں کی۔ تمھیں حالات سے بے خبر رکھا اور... مدد کی تو میر شرافت علی کی جس نے سب کچھ کیا۔ پلان اسی کا تھا۔ عمل کرنے کے جرم میں ایک شریک میں بھی تھا۔ لیکن اس وقت تک پلان میں وزیر خان کو یکسر خارج کر دینا شامل نہیں تھا۔ میر شرافت علی نے مجھے قائل کیا کہ اس کے بغیر چارہ نہیں۔ وزیر خان کو وہ بہت پہلے سے جانتا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ حد درجہ اصول پرست اور ضدی آدمی ہے۔ میں نے نہ تائید کی اور نہ تردید... پھر جو کچھ کیا اس نے کیا۔ میں خاموش رہا جو ایک طرح سے حمایت تھی۔ ظاہر ہے کہ میں کھل کر مخالفت کرتا تو وہ ایسا نہ کرتا۔ مگر میں وزیر خان سے ناواقف تھا۔ اور میر شرافت علی نے جو بھی کیا اس کے نتیجے کا اندازہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ غالباً وہ خود بھی اندازوں کی غلطی کا

نسکا رہوا۔ اس کا خیال تھا کہ تم نوجوان ہو۔ ہر نوجوان کی طرح دولت مند بننے کی آرزو رکھتے ہو۔ چار سال ولایت میں رہنے کے بعد تمہارے خیالات کی پرواز بلند ہو گی۔ تم اصول پرستی وغیرہ کے چکر میں نہیں پڑو گے اور عام نوجوانوں کی طرح نو عیش و نو آؤٹ کیش۔۔ کے اصول پر عمل کرتے ہو گے۔ اگر تم نے تھوڑی بہت مزاحمت کی تو حالات کی سختی بہت جلد تمہیں راہِ راست پر لے آئی گی۔ خیر۔۔ ایسا نہیں ہوا اور میری رضامندی کے بغیر اس نے وزیر خان کو قتل کرا دیا۔۔ اگر وہ مجھ سے براہِ راست کہتا کہ اس نے یہ فیصلہ کیا ہے اور اس پر فوراً عمل بھی کرا رہا ہے تو میں اس کی ضرور مخالفت کرتا۔"

"یہ سب مجھے بتانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں صرف سن رہا ہوں۔ اس پر یقین نہیں کر رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "جب مجھے کچھ کرنا ہوگا تو اپنی تفتیش کے نتائج کو سامنے رکھ کے کروں گا۔ میرے نظامِ انصاف کا تمہارے خیالات اور اس فضول بکواس سے کوئی تعلق نہیں۔"

"سیدھی صاف بات ہے سکندر کہ تم انتقام صرف مجھ سے لینا چاہو تو یہ ناممکن ہے۔" دلاور نے کہا۔ "میں نے اپنی حد تک اپنے جرم کا اعتراف کر لیا ہے مگر اس سے یہ نتیجہ مت نکالنا کہ میں تلوار تمہارے ہاتھ میں دے کر سر جھکا رہا ہوں۔۔۔ کہ اُڑا دو میری گردن۔۔۔ نہیں۔۔۔ مجھے اپنی گردن بچانا آتی ہے۔ ایک تو خود اپنی نظر میں ساری سزا کا مستحق اکیلا میں ہوں۔ دوسرے یہ کہ ایک نہیں دس قتل کر کے بھی کوئی بہ رضا و رغبت پھانسی کے تختے پر نہیں چڑھتا۔ تمہارے دو مسئلے تھے۔ ایک حقِ وراثت کا اور دوسرا اپنے باپ کے قاتل کو سزائے موت دینے کا۔ میں اس شخص کو تمہارے حوالے کر سکتا ہوں جس کے ہاتھ براہِ راست وزیر خان کے خون میں رنگے ہوئے ہیں۔"

"تمہاری مراد استاد پیڈرو سے ہے تو جس دن وہ میری گرفت میں آئے گا اس دن حقیقت کا اعتراف خود اس کی زبان کرے گی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پھر حقیقت وہ نہ رہے جو تم بیان کر رہے ہو بلکہ اس کے برعکس ثابت ہو جائے۔" میں نے کہا۔ "تم اور استاد پیڈرو میری نظر میں ایک ہی جیسے مجرم ہو۔"

"استاد پیڈرو تم کو یہ بھی بتا سکتا ہے کہ اس نے تمہارے والد کو کہاں دفن کیا تھا۔" دلاور نے یوں کہا جیسے میری بات اس نے سُنی ہی نہیں۔

"وہ بتلائے یا نہ بتائے، مجھے کیا فرق پڑتا ہے یا وزیر خان کو کیا فرق پڑتا ہے۔" میں نے کہا۔ "مٹی خود آدمی کو بلاتی ہے۔ خدا کی مرضی ہو گی کہ وہ اپنے موجودہ مدفن سے صورِ اسرافیل پر اُٹھے۔ مٹی تو مٹی میں مل گئی۔ اسے اب نہ لوحِ مزار کی ضرورت ہے نہ میرا ارادہ اس کے لیے کوئی عالیشان مقبرہ تعمیر کرنے کا ہے۔ اس کی نشانی میں خود ہوں۔"

اگر اسے کوئی مایوسی ہوئی تھی تو اس کا اظہار دلاور نے صورت سے نہیں ہونے دیا۔ "تم نہیں جانتے اپنے سکندر صاحب کہ آج تم صرف میری وجہ سے زندہ ہو۔"

میں نے ایک قہقہہ لگایا۔ "کیا تم خدائی کے دعویدار ہو گئے ہو چوہدری دلاور؟ زندگی اور موت پہ اپنے اختیار کا دعویٰ تو فرعون اور نمرود نے بھی کیا تھا۔"

"میں کچھ اور بتانا چاہتا تھا تمہیں۔" پہلی بار دلاور کے لہجے میں تھوڑی سی جھنجلاہٹ آئی۔ "الفاظ کو توڑ مروڑ کے تمہیں فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔ یہ حقیقت ہے کہ استاد پیڈرو کی لگام میرے ہاتھ میں نہ ہوتی تو وہ کب کا تمہیں ٹھکانے لگا چکا ہوتا۔ تمہارے قتل پر سب سے زیادہ خوش ہونے والا وہی ہوگا۔ یہ اس کی بے چینی ہے مگر اس کو میں نے ہمیشہ روکا۔ اُسے روکنے کے لیے صرف منع کافی نہ ہوتے۔ میں نے اُسے ہمیشہ واضح دھمکی دی کہ جس دن اس نے تم کو قتل کرنے کی حماقت کی وہ اس کی زندگی کا بھی آخری دن ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ تم ابھی تک زندہ بھی ہو۔"

"میں اس لیے زندہ ہوں چوہدری صاحب کہ خدا کی یہی مرضی ہے۔" میں نے کہا۔

"تم دیکھنا چاہتے ہو کہ پیڈرو کس حد تک تمہارے خون کا پیاسا ہے؟" دلاور نے کہا۔ "میں اسے یہاں بلا کے صرف اشارہ کر دوں۔۔۔ خیر چھوڑو۔۔۔ میں نے تم کو یہاں دشمنی بڑھانے یا لڑنے جھگڑنے کے لیے نہیں بلایا۔"

"جب تم اتنے طاقتور ہو تو صلح کے مذاکرات کیوں کرنا چاہتے ہو؟" میں نے کہا۔

"اس لیے کہ نقصان مجھے بھی ہو رہا ہے۔" دلاور نے کہا۔ "یہ میرے اندازوں کی غلطی تھی جس کے باعث ایک معاملہ اتنا لمبا تنازعہ بنا۔ بے شک اس وقت تم میرا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے جب یہاں پہنچے تھے۔ لیکن اس کے بعد تم کو حالات موافق ملے۔ تم اکیلے تھے اور مرنے سے نہیں ڈرتے تھے۔ میں بیوی بچوں والا تمہاری طرح جنون کا شکار نہیں ہو سکتا تھا۔ میرا کاروبار ہی نہیں۔۔۔ گھر بھی اس جنگ سے متاثر ہوا۔"

"مجھے معلوم ہے کہ تمہاری بیوی کے اعصاب پر بُرا اثر پڑا ہے۔ مگر یہ بھی تو ہو سکتا ہے چوہدری دلاور کہ گھر کے اندر تم اچھے شوہر ثابت ہوئے ہو۔ تمہارے رویے کی وجہ سے اس کی یہ حالت ہوئی ہو۔ یا اس کی اعصابی کمزوری کا یہ مرض موروثی ہو۔" میں نے کہا۔ "لیکن جو کچھ رابعہ کے ساتھ ہوا۔۔۔"

"ہاں۔ اسباب تو رابعہ کے پاگل پن کے بھی وہی ہو سکتے ہیں مگر تمہارے ساتھ صرف رابعہ ہے۔ میرے ساتھ بچے بھی ہیں۔ ان کو ایک ماں کی توجہ اور محبت کی ضرورت ہے۔ تم نے فوزیہ کو رابعہ پر قربان کر دیا۔ اب رابعہ نہ ہو تب بھی تم جی لو گے۔ بالآخر کوئی متبادل تلاش کر لو گے۔ میں بھی دوسری بیوی تو لا سکتا ہوں لیکن وہ بچوں کی ماں نہیں ہو گی۔۔۔ اور ان سب باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے تم سے تمہاری شرائط پر سودا کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں مرحوم وزیر خان کی تمام جائداد منقولہ اور غیر منقولہ کہتے ہیں شاید اسے تمہیں منتقل کرنے کو تیار ہوں۔"

"اس میں ایک چیز اور شامل کر لو۔ وزیر خان کی زندگی۔" میں نے کہا۔

"اس کے علاوہ۔۔۔" دلاور نے ایک ہاتھ کے اشارے سے میری بات کو فضول سمجھتے ہوئے ٹال دیا۔ "تم حسابات آڈٹ کرا کے وہ سب منافع بھی لے سکتے ہو جو وزیر خان کو نہیں ملا۔"

"لیکن اس کو تو سب منافع ملتا رہا تھا۔ آخری وقت تک۔" میں نے طنزیہ اور تلخ لہجے میں کہا۔ "اس کے دستخط موجود ہیں۔ تمام حسابات، کیش بُک، لیجر اور دوسری سب دستاویزات پر۔"

"ہاں۔ مگر اس کے باوجود وہ رقم میں تمہارے حوالے کر دوں گا۔ تم میرے ساتھ ایم ڈبلیو ڈی کمپلیکس کے ایک قانونی مالک بن جاؤ گے۔ تمام معاملات میں میرا اور تمہارا برابر کا دخل ہوگا۔ مطلب یہ کہ تم سلیپنگ پارٹنر نہیں کہلاؤ گے۔" وہ بولا۔

"ٹھیک ہے۔ یہ معاملات میں اپنے قانونی مشیر اور اٹارنی، ایڈووکیٹ عبدالودود منظر پر چھوڑتا ہوں۔" میں نے کہا۔

دلاور نے نفی میں سر ہلایا۔ "اگر تمہارے لیگل اٹارنی سے معاملات طے کرنے ہوتے تو میں تمہیں کیوں بلاتا۔"

"لیکن اس میں کوئی بات غیر قانونی نہیں۔ منظر کو مکمل اختیارات حاصل ہیں کہ وہ میری طرف سے جو چاہے کرے۔" میں نے کہا۔

"یہ قانونی اختیارات کی بات نہیں۔" وہ بولا۔ "میں تحفظ کی ضمانت چاہتا ہوں۔ ورنہ مجھ سے بڑا احمق کوئی نہیں ہوگا کہ تمہیں وارث تسلیم کرتے ہوئے سب کچھ تو عبدالودود منظر صاحب کے سپرد کر دوں اور تم بدستور میرے خلاف گوریلا جنگ جاری رکھو۔ تمہیں تو وہ سب مل جائے جو تمہارے باپ کا تھا مگر مجھے سکون نہ ملے۔"

"یہ تحفظ تمہیں کیسے حاصل ہو سکتا ہے چوہدری جی؟" میں نے کہا۔

"اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ تم خود کو قانون کے حوالے کر دو۔" دلاور نے کہا۔ "ہر کیس میں تمہاری ضمانت کرانے کی ذمے داری میری۔۔۔ ثبوت شہادت پیش نہ کرنے کی ذمے داری میری۔ گواہوں کو منحرف کرنے کی ذمے داری میری۔ تم کسی سزا کے بغیر چھوٹ جاؤ گے لیکن قانونی کارروائی ضابطے کے مطابق ہوتی ہے۔ تمام مقدمات کا فیصلہ ہونے میں کم سے کم سال لگے گا۔ یہ عرصہ تم جیل میں نہیں گزارو گے مگر پابندِ ضمانت رہ کر گزارو گے اور چونکہ ضامن میں بنوں گا، اس لیے میری حفاظت میں گزارو گے تاکہ تمہارے کسی غلط فیصلے سے میری دی ہوئی ضمانت ضبط نہ ہو۔"

میں نے دل ہی دل میں دلاور کے منصوبے کی خوب صورتی کو سراہا۔ اگر وہ نیک نیتی کے ساتھ ویسا ہی کرتا جیسا وعدہ کر رہا تھا تب بھی ایک سال کے لیے میں اپنے مقصد سے کٹ جاتا۔ دلاور کے محافظ سائے کی طرح میرے ساتھ رہتے اور ضمانت پر رہائی بھی نظر بندی ہوتی۔ میں کسی کوٹھی میں رہتا تو محافظ باہر پہرا دیتے۔ گاڑی میں نکلتا تو محافظ ساتھ ہوتے یا پیچھا کرتے۔ ایک سال میں تو میرا مشن چوپٹ ہو جاتا اور اسی ایک سال میں دلاور اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کر لیتا۔ مجھے یوں لگا جیسے یہ سارا پلان اوپر سے دیا گیا ہے۔ ان کی طرف سے جو دلاور کے بھی آقا تھے۔ جو اس سے اسلحہ خرید رہے تھے اور اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے اسے آگے مشرقی پاکستان کے تخریب کاروں اور علیحدگی پسندوں تک پہنچا رہے تھے۔ نقصان دلاور کو نہیں اُن کو ہو رہا تھا اور وہ ہر قیمت پر میری رخنہ اندازی کو ختم کرانا چاہتے تھے۔ انھوں نے ہی دلاور پر دباؤ ڈالا ہوگا کہ اپنا جھگڑا ختم کرو تاکہ ہمارا راستہ صاف ہو۔ جو دینا دلانا ہے ہم سے لو اور اس کو ذاتی نہیں سیاسی مسئلہ سمجھ کے بات کرو۔

"بے شک تم ضمانت پر رہائی کے عرصے میں نقل و حرکت کے لیے آزاد ہو گے اور جسے چاہو گے ساتھ رکھ سکو گے۔ تمہاری عزت اتنی ہی ہوگی جتنی میری ہے۔ تم ایک پارٹنر کی حیثیت سے آفس میں بیٹھ کر کام کرو گے اور فیصلے کرو گے۔ رابعہ بھی اگر اپنی لیگل فرم کے معاملات ٹھیک کرنا چاہے تو اپنی گڈوِل بحال کر سکتی ہے۔ اور ظاہر ہے اس نئے شادی شدہ جوڑے کو۔۔۔ محسن اور شہلا کو ازدواجی زندگی کا یہ پہلا سال۔۔۔ جو ہنی مون سمجھا جا سکتا ہے۔۔۔ سکون کے ساتھ گزارنے کے وہ مواقع ملیں گے جو اَب حاصل نہیں۔"

"تمہاری باتیں دلچسپ ہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ بتاؤ اور کیا ہوگا؟"

"اور یہ ہوگا۔۔۔ کہ غالب پہلے کی طرح ایک صحافی بن کے کام کرتا رہے گا۔ ایک بار تو وہ ہماری آنکھوں میں دُھول جھونک کر فرار ہو گیا تھا مگر وہ کب تک مفرور رہ سکتا ہے۔ نازو اپنے گھر لوٹ جائے گی۔ مجھے اطلاع ملی ہے کہ وہ صحافی اس میں خاصی دلچسپی لے رہا ہے۔ تم سب نے جوڑے اچھے بنائے ہیں۔ پھر اس احمق کو ابھی تک لاوارث کیوں چھوڑ رکھا ہے جو خواہ مخواہ تمہارا دُم چھلا بنا ہوا ہے؟ استاد ٹیڈی کو۔۔۔ خیر یہ مذاق کی بات تھی۔ اصل بات تھی میری پیشکش کی۔"

"چوہدری صاحب! آپ کی ہوشیش کش کے پیچھے آپ کی ضمانت

کو دخل ہے؟" میں نے کہا۔ "مثلاً یہ کہ میں خود کو گرفتاری کے لیے پیش کردوں تو باقی سب آپ کے ہاتھ میں ہوگا۔ میری ضمانت پر رہائی۔ ثبوتِ شہادت میں ردّوبدل اور گواہوں کا منحرف ہونا۔ اس بات کی ضمانت کون دے گا کہ تم یہ سب ضرور کردو گے۔ اگر میں نے خود کو گرفتاری کے لیے قانون کے حوالے کردیا اور تم اطمینان سے بیٹھے گئے تو میں تمھارا کیا بگاڑ لوں گا۔ کس طرح تم کو مجبور کروں گا کہ تم مجھ سے کیے ہوئے وعدے پورے کرو۔ تم تو کہہ رہے ہو کہ میری زبان پر اعتبار کرتے ہوئے تختۂ دار تک پہنچنے کا چیک دے دو۔ میرے بارے میں تمھارے خیالات کا یہ تضاد کیسا ہے۔ ایک طرف تم مجھے برابر کا حریف مانتے ہو۔ یہ کہتے ہو کہ میرے بارے میں تمھارے اندازے غلط ہوئے اور اب تمھیں بھی نقصان ہو رہا ہے۔ دوسری طرف تم مجھ سے اس قسم کی حماقت کی توقع رکھتے ہو؟"

"یہ حماقت نہیں سکندر! تمھاری مجبوری ہے۔" دلاور بولا۔ "تم کو میری زبان پر اعتبار کرنا ہی ہوگا اور کوئی صورت نہیں ہے اس مسئلے کو حل کرنے کی۔ تم کو یہ فیصلہ آج اور ابھی کرنا ہے۔"

"یعنی ایک جانی دشمن سے زندگی کی ضمانت قبول کرنے کا۔ چھری اگر خربوزے کو ضمانت دے۔ بھیڑیا اگر بھیڑ کو محافظت کا یقین دلائے تو کیا یہ عملی طور پر ممکن ہے؟" میں نے کہا۔

"فیصلہ تم کو کرنا ہے اپنے سکندر صاحب! مجھے نہیں۔" دلاور بولا۔

"اور اگر میں کہوں کہ ایسا احمقانہ فیصلہ کرانے کے لیے تمھارا مجھ کو بلانا ہی سب سے بڑی حماقت تھی؟"

"تم جو چاہو کہو۔ مگر یہ حماقت بھی تم کو ہی مہنگی پڑے گی۔ فیصلہ کیے بغیر تم کیسے جاؤ گے۔" دلاور مسکرایا اور اس کی صورت کا تاثر تھوڑا سا بدلا۔ "تم بھول رہے ہو کہ رابعہ اور شہلا میرے پاس ہیں۔"

"پھر کیا ہوا؟ تم نے خود ہی تو بتایا تھا کہ وہ محفوظ ہیں... اگر یہ بات سچ نہیں ہوتی تو پھر باقی باتیں کیسے سچ ہوں گی۔" میں نے کہا۔

"وہ محفوظ ہیں۔ تمھارے فیصلے کی ضمانت پر۔" دلاور نے کہا۔

"میں تمھاری ہر پیشکش مسترد کرتا ہوں... یہی ہے میرا فیصلہ۔" میں نے کہا۔

"ایک بار پھر سوچ لو۔ تم اس پوزیشن میں نہیں ہو۔" چوہدری دلاور نے کہا اور اس کی صورت پر خشونت، بے رحمی اور سختی کے جذبات کا تھوڑا سا تاریک سایہ پھیل گیا۔

"ایسا تم سمجھتے ہو دلاور۔" میں نے کہا۔ "تمھارے سارے اندازے پہلے بھی غلط ہو چکے ہیں۔ دوبارہ سوچنے کا میں قائل ہی نہیں۔"

"تم اپنے ساتھ ایک ریوالور لائے ہو۔" دلاور آگے جھک کر بولا۔ "ابھی تم نے مجھے میرا ریوالور استعمال کرنے سے روک دیا تھا اور بہت خوش ہوئے تھے... تم سمجھے تھے میں ڈر گیا... ہے نا یہی بات؟"

"میں ایسا نہیں سمجھا تھا۔" میں نے کہا۔ "تمھارا یہ اندازہ بھی غلط ہوا۔ مجھے معلوم ہے کہ تم بالکل محفوظ ہو اور میں غیر محفوظ ہوں۔ ... میں ریوالور نکالنے کی حماقت نہیں کروں گا۔ اس سے پہلے کہ ... نشانہ لوں شاید ہر طرف سے دس بندوقوں کی نالیں نکل آئیں گی ... آنے سے پہلے میں نے ایک پرانی کہاوت کو ذہن میں رکھا تھا ... اپنی مرضی سے ہوتا ہے مگر واپسی دوسرے کی مرضی کی بات ہوتی ہے۔"

"تم جانا چاہو، تو جا سکتے ہو۔" دلاور بولا مگر اس کے ... مجھ پر واضح کردیا کہ یہ ناممکن ہے۔

"میرا کام اتنا آسان ہوتا تو میں ضرور چلا جاتا۔ تم کو ... کر کے ڈھال بناتا اور ظاہر ہے پھر میرا راستہ کوئی نہ روکتا ..." کہا اور اپنی جیب سے اچانک ریوالور نکال کے میز پر ...

خاموشی کا ایک مختصر سا وقفہ آیا جس میں دلاور کی ... مجھے گھورتی رہیں اور میں ظاہری بے نیازی سے مسکرانے کی ... کوشش کرتا رہا تاکہ دلاور میرے اطمینان سے میری بے خوفی کا ... قائل ہو جائے لیکن حقیقت یہ ہے کہ خوفزدہ میں بھی تھا ... طرف سے میں نے اور ایم آر ایس کی کابینہ نے جو پلان بنایا تھا ... میں کوئی سقم نظر نہیں آتا تھا لیکن یہ دھوکا تو سب کو ہوتا ہے ... یا قاتل سے لے کر ترقیاتی منصوبے بنانے والوں تک سب ... ہیں کہ انھوں نے اچھی طرح غور و خوض کرنے کے بعد ناکامی کا ... امکان نہیں چھوڑا مگر عمل درآمد کا وقت آتا ہے تو بہت سے ... ایسے پیدا ہو جاتے ہیں جو ان کی نظر میں نہ تھے اور جو منصوبے ... چوپٹ کر دیتے ہیں۔ میرے سامنے بھی کوئی عام آدمی نہیں تھا ... شخص تھا جو اپنے حیرت انگیز شیطانی ذہن سے انہونی کو ہونی ... دکھا دیتا تھا۔ اسے ہمارے حالات کی خبر رہتی تو لہٰ ماشٹے تک ... نازو کے متعلق اس کا اظہارِ لاعلمی اس کی چال بھی ہو سکتا تھا ... میں اس بات کو خارج از امکان نہیں سمجھتا تھا کہ اسے ہمارے ... دھماکا خیز پروگرام کی خبر بھی مل چکی ہو اور وہ اچانک قہقہہ مار ... چاروں ٹائم بم میرے سامنے رکھ دے کہ اپنے سکندر صاحب ... کیا خیال ہے۔ تاہم میں اسے پیش منظر تسلیم کرنے پر رضامند نہیں ... اور قبل از وقت مایوسی کو گناہ سمجھتا تھا۔

"آخر تم کیا سوچ کے یہاں آ گئے تھے؟" دلاور نے بالآخر کہا۔ "یہ کہ میں تم سے وہی بات کروں گا جو میں نے خط میں لکھی تھی۔ تم نے مان لی تو بہت اچھا، ورنہ تمھیں کافی پلا کے ہاتھ ... لگا اور کہوں گا تھینک یو..."

"جو تمھیں نہ جانتا ہو دلاور! وہ یہ سوچ سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "تم تو اتنے عرصے میں کھل کر میرے سامنے آ گئے ہو۔ جب آدمی کسی آدم خور شیر کی کچھار میں جاتا ہے تو اظہارِ خیر سگالی کے ... نہیں جاتا۔ میں نے اپنا فیصلہ تم کو بتا دیا۔ اب ایک فیصلہ تم ... ہے اور اس فیصلے کے لیے میں تم کو آدھا گھنٹا دوں گا۔ اس وقت ساڑھے نو بجے ہیں۔ بلکہ پانچ منٹ باقی ہیں۔"

"دس بجے کیا ہوگا... قیامت آ جائے گی؟" دلاور نے طنز سے کہا۔

"تمھیں اپنے سابق دستِ راست ڈی سلوا کے گھر کا فون نمبر یاد ہے؟" میں نے کہا۔ "یا تم مرتے ہی دوستوں کو اسی طرح جلا دیتے ہو جیسے طوائف کنگال عاشقوں کو فراموش کر دیتی ہے۔"

"کیا اس فون نمبر پر ڈی سلوا کی روح مجھے میرے سوال کا جواب دے گی؟" دلاور نے کہا۔

"اس کی کوٹھی میں آج کل کون رہتا ہے؟" میں نے کہا۔ "اس کا جانشین؟" میں نے کہا۔ "اس سے میری ملاقات تو ہو چکی ہے لیکن اس وقت مجھے نام یاد نہیں آ رہا ہے۔ دس بجے اسے تم سے وفاداری کا وہ انعام ملے گا جس کے بارے میں وہ سوچ بھی نہیں سکتا۔ وہ دیکھنے میں بے حد شریف اور مہذب آدمی تھا چنانچہ ڈی سلوا سے زیادہ خطرناک تھا۔ ڈی سلوا اپنے رویے سے صاف بتا دیتا تھا کہ میں بدمعاش ہوں۔ مجھ سے بچ کر رہنا۔ اس نے منیجر کی بدمعاشی پر شرافت اور تہذیب کا پردہ تھا..."

"اسے بیچ میں کیوں لائے ہو؟" دلاور نے میری بات کاٹ دی مگر وہ اپنی تشویش کو نہ چھپا سکا۔

"اسے میں نہیں اپنے چوہدری دلاور صاحب!" میں نے کہا۔ "آپ بیچ میں لائے ہیں۔ اس کو میں نے تو جنرل منیجر مقرر نہیں کیا تھا۔ اگر تم صرف پانچ منٹ پہلے بھی بتا دو گے یعنی نو بج کر پچپن منٹ تک کہ رابعہ اور شہلا کہاں ہیں تو اس کے گھر میں جو بھی ہوگا، باہر نکل کے اپنی جان بچا لے گا۔ گھر بہرحال تباہ ہو جائے گا۔"

"ویری گڈ! تمھارا پائلٹ ٹھیک دس بجے اس گھر پہ ایٹم بم گرانے کے لیے ٹیک آف کر جائے گا۔" دلاور نے طنز آمیز مسخرے کے ساتھ کہا۔

"آدمی کسی ٹائم بم سے مرے یا ایٹم بم سے، اس کے لیے موت تو زندگی سے محرومی کا نام ہے۔" میں نے کہا۔ "میں نہیں چاہتا کہ بے گناہ مارے جائیں مگر اس کا فیصلہ بھی تمھیں کرنا ہے۔ اس کوٹھی میں ایک ٹائم بم رکھا ہوا ہے جو ٹھیک دس بجے پھٹ جائے گا۔ ویسے تو یہ خبر تمھیں ذرا دیر سے ملے گی لیکن میری وزارتِ اطلاعات نے تمھاری سہولت کے لیے خبر فوراً پہنچانے کا معقول انتظام کیا ہے۔ ٹھیک پونے دس بجے تمھیں ایک فون کال موصول ہوگی۔ تم کو ایک ٹیلی فون نمبر بتلایا جائے گا۔ کیا تم کو معلوم ہے کہ اس کوٹھی کے آگے پیچھے یا دائیں بائیں کون لوگ رہتے ہیں اور ان کا فون نمبر کیا ہے؟"

"میرا ان سے کوئی تعلق نہیں۔"

"خیر کوئی بات نہیں۔ شریف لوگوں کا اپنے ہمسایوں سے تعلق ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ "ٹیلی فون نمبر تمھیں بتا دیا جائے گا دس بج کر پانچ منٹ پر تم فون کر لینا۔ آس پاس رہنے والے تم کو یقیناً یہ خوش خبری دے سکیں گے کہ اس کوٹھی میں کیا ہوا۔"

دلاور نے ایک دم ٹیلی فون اٹھا لیا۔ اس نے انکوائری کا نمبر ڈائل کیا اور منتظر رہا کہ کوئی جواب دے مگر ٹیلی فون والے کسی پر اتنے مہربان ہوں کہ فوراً جواب دے دیں تو اسے اتفاق ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ ایسا ہی اتفاق دلاور کے ساتھ ہوا۔ اسے آدھا منٹ بھی انتظار نہیں کرنا پڑا ہوگا مگر وہ آپریٹر پر برس پڑا۔ "سوتے رہتے ہو تم لوگ... آدھے گھنٹے سے ریسیور پکڑے بیٹھا ہوں کہ کوئی بولے۔" اس نے پھاڑ کھانے والے انداز میں کہا۔ "مجھے فوراً بم ڈسپوزل اسکواڈ کا نمبر بتاؤ... ایک بم پھٹنے والا ہے... پھٹ گیا تو میں... اچھا۔" اس نے ایک کاغذ پر نمبر لکھا اور لائن کاٹ دی۔ پھر وہ بم ڈسپوزل والوں کا نمبر گھمانے لگا۔

میں نے مایوسی اور افسوس کے ساتھ سر ہلایا۔ "اتنا وقت اب کہاں رہا ہے چوہدری دلاور صاحب! ان کو پہنچنے میں بھی پندرہ منٹ تو لگ جائیں گے۔ اور بم ایسی جگہ رکھا ہوا ہے کہ انھیں تلاش کرنے کے لیے پورا دن چاہیے۔"

"ہیلو! دیکھو میں ایم ڈبلیو ڈی کمپلیکس کا مالک بول رہا ہوں۔ چوہدری دلاور... ایک پتا لکھو اور فوراً پہنچو۔ معلوم ہوا ہے کہ کسی نے اس کوٹھی میں ٹائم بم فٹ کر دیا ہے جو دس بجے پھٹ جائے گا... کیا؟... پہلے کیسے بتاتا پاگل کے بچے جبکہ خود مجھے یہ بات ابھی ایک منٹ پہلے معلوم ہوئی ہے۔" اس نے ریسیور کو دھڑ سے دے مارا۔

"اچھا ہوا کہ آپ نے مختصر بات کی۔" میں نے کہا۔ "بم ڈسپوزل والے عقل مند تو ہوتے ہیں کہ مقررہ وقت تک بم نہ تلاش کر سکیں تو اپنی جان بچانے کا بندوبست ضرور کر لیتے ہیں مگر تم ان کو خبردار کر دیتے تو اچھا تھا۔"

"اپنا اچھا بُرا میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔" وہ غرایا جس سے مجھے بخوبی اندازہ ہو گیا کہ وہ تھوڑا بہت پریشان ضرور ہے۔ اس نے میری بات کو جھوٹ سمجھ کے نظر انداز نہیں کیا تھا۔

"کاش ایسا ہوتا چوہدری دلاور۔" میں نے سر ہلا کے کہا۔ "تمھارے اس فون میں اسپیکر سسٹم تو ہے۔ ذرا بٹن دبا دو کہ کال آئے تو گفتگو میں بھی سن سکوں؟" میری بات ختم ہونے سے قبل ہی گھنٹی بجی اور دلاور نے ایک دم ریسیور کی طرف ہاتھ بڑھایا پھر اس نے ہاتھ کھینچ لیا اور ایک بٹن دبا دیا۔

"ہیلو!" چوہدری دلاور نے دور سے ہی ریسیور اٹھائے بغیر کہا۔

"اپنے چوہدری دلاور صاحب؟" میں نے غالب کی آواز سنی۔ "ایک فون نمبر لکھ لیں۔ جہنم رسید ہونے سے قبل تمھارا نائب، شیطان ڈی سلوا جس کوٹھی میں رہتا تھا، یہ اس کوٹھی کے مقابل سڑک کے پار والے جنرل اسٹور کا نمبر ہے۔"

"تم... کون ہو تم؟" دلاور نے ایک احمقانہ سوال کیا۔

"میں فرشتۂ اجل کا نمائندۂ خصوصی۔" غالب نے قہقہہ مارا۔ "ٹھیک دس بج کر پانچ منٹ پر اس اسٹور سے آپ کو فون پر کارآمد معلومات حاصل ہوں گی۔"

دلاور نے کاغذ کے پیڈ پر نمبر لکھا۔ "تم سمجھتے ہو کہ میں اس طرح ہراساں ہو جاؤں گا تو تم غلطی پر ہو۔"

"اللہ اس کی غلطی معاف کرے جو غلطی پر ہو۔" غالب بولا۔ "ایک بات کا خیال رکھنا اپنے چوہدری دلاور صاحب۔ آپ کے پاس ہمارا ایک مہمان بیٹھا ہے۔ اس کو ایک ڈبل چائے، ڈبل ملائی والی پلانا نہ بھولیں اور خود تقویتِ قلب کے لیے خمیرہ گاؤ زبان عنبری جواہر والا چھ ماشہ...۔"

دلاور نے اُسے ایک گالی دی جو ناقابلِ اشاعت ہے اور گھڑی کی طرف دیکھا۔ دس بجنے میں دس منٹ رہ گئے تھے۔ اس نے ایک اور نمبر ملایا۔

"سنو! میں دلاور بول رہا ہوں۔" اس نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔ "وہاں کوئی آیا ہے۔ فائر بریگیڈ والے یا سرکاری گاڑی میں...۔"

"نہیں چوہدری صاحب! ابھی تو میں اور چھوٹو ہی ہیں... آپ بالکل فکر مت کریں... ہم کسی کو اندر نہیں گھسنے دیں گے...۔"

"فکر کے بچے۔ فوراً باہر نکل جاؤ۔" دلاور نے کہا۔ "اندر کسی نے بم رکھ دیا ہے۔"

"بم۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں چوہدری صاحب؟ ہم نے تو کسی کو بھی آتے جاتے نہیں دیکھا۔" وہ بولا۔

"اس وقت تم مرے پڑے تھے۔ اور دوبارہ مر جاؤ گے اگر میری بات نہ مانی۔" دلاور نے ریسیور کو دوسری بار غصے میں کریڈل پر مارا۔ اسے نروس دیکھ کر مجھے زندگی میں پہلی بار دلی مسرت حاصل ہو رہی تھی۔

"ایک تو چھوٹو ہے وہاں؟" میں نے ہمدردانہ لہجہ بنا کے کہا۔ "دوسرا کون ہے۔ جو دس منٹ بعد نہیں ہوگا۔ موٹو یا ملبوبہ؟"

"اپنی بکواس بند کرو...۔" دلاور نے دہاڑ کر کہا۔

"تم بتا دو کہ رابعہ اور شہلا کہاں ہیں تو میں بتا سکتا ہوں کہ بم کہاں ہے۔" میں نے کہا۔ "چھوٹو، موٹو یا ملبو میں سے کوئی بھی اس کا فیوز نکال سکتا ہے۔"

میری بات جھوٹ تھی۔ وہاں بم فٹ کرنے والے تو ٹیڈی اور محسن تھے۔ میں نے حشمت خان اور دلاور کے گھر میں بم رکھا تھا۔ زیادہ صحیح بات یہ تھی کہ وہاں بم رکھنے کے لیے میں غالب کے ساتھ گیا تھا۔ بم خود غالب نے رکھا تھا اور میں نے کسی سے پوچھا تک نہیں تھا کہ اس نے بم کہاں رکھا ہے۔ غالب نے یہ ضرور بتا دیا تھا کہ ایک جگہ بم کو اس نے چمنی میں لٹکا دیا ہے اور

دوسری جگہ ایک گملے کے پیچھے رکھا ہے لیکن کون سی چمنی اور کس گملے کے پیچھے، یہ اس کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا۔

دلاور بڑے شش و پنج میں مبتلا تھا اور اس کے اضطراب میں میرے اعتماد سے اضافہ ہو رہا تھا۔ ریوالور میرے سامنے میز پر میرے ہاتھ کی دسترس میں تھا اور اس سے پہلے دلاور کوئی غلط حرکت کرتا، میں ریوالور اُٹھا سکتا تھا۔ وہ فضا جس میں ہم کچھ دیر پہلے گفتگو کر رہے تھے ایک دم بدل گئی تھی۔ پہلے اپنی بالادستی کے احساس سے مطمئن اور پُراعتماد تھا اور میں اپنے انتظامات کے خیال سے۔ میرے آدھے گھنٹے کے نوٹس کے ساتھ گویا اعلانِ جنگ ہو گیا تھا اور اب ہم متحارب فوجوں کے کمانڈروں کی طرح آمنے سامنے موجود اپنے حریف کی قوت کا صحیح اندازہ اور اس کی جنگی حکمتِ عملی کا جائزہ لینے اور دونوں طرح کے نتائج پر غور کرنے میں مصروف تھے۔ ہم میں سے کوئی ایک دوسرے پر گولی چلانے میں پہل کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ اگر ایک طرف سے چلائی گئی تو دوسری جانب سے بھی فوراً جواب ملے گا۔ اتنے کم فاصلے سے کسی کا نشانہ خطا ہونے کا سوال ہی نہ تھا، چنانچہ یہ حرکت صریح خودکشی کے مترادف تھی۔

دلاور کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی آدھے گھنٹے کی مہلت، کھوکھلی دھمکی اور اس کے بعد آنے والی فون کال کو ڈرامے کا حصہ سمجھتا مگر یہ بھی سوچتا کہ خدانخواستہ دھمکی ٹھیک آدھے گھنٹے بعد صحیح ہو گئی تو کیا ہوگا؟ وقت اس کی قوتِ فیصلہ کو متاثر کر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بم ڈسپوزل والوں کے پاس پہنچنے اور بم کو تلاش کر کے ناکارہ بنانے کے لیے وقت ہی نہیں ہے۔ اب دس بجنے میں پانچ منٹ رہ گئے تھے۔ میری دی ہوئی مہلت تمام ہو رہی تھی اور وہ میری صورت کو گھورنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا لیکن میری صورت سے وہ جھوٹ سچ کا اندازہ کرنے سے قاصر تھا۔ یہی چیز اس کو جھنجلاہٹ اور کوفت میں مبتلا کر رہی تھی۔

دوسری طرف میں پورے اعتماد کے باوجود دل کے ایک گوشے سے اس خوف کو نہیں نکال سکتا تھا کہ ہمارے انتظامات میں کوئی خامی عین وقت پر ہماری ناکامی نہ بن جائے۔ یہ تو سارا کھیل ہی وقت کا تھا۔ اگر ٹائم بم کا کلاک ٹھیک نہ ہوا۔ اسے سیٹ کرتے ہوئے محسن کچھ بھول گیا ہو جس سے مشینی رکاوٹ پیدا ہوئی ہو یا بم فٹ ہی نہ ہوا ہو۔ خراب تو ہر گھڑی ہو سکتی ہے۔ کلاک کی مشینری کو تو تیل وغیرہ دینا پڑ جاتا ہے۔ اندر گرد بھی چلی جاتی ہے۔

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو دلاور کے ساتھ میں بھی اُچھل پڑا۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ اعصابی کشیدگی کا شکار میں ہی نہیں، دلاور بھی ہے۔ اس شخص کو میں نے کبھی پریشان ہوتے یا رونا ہوتے نہ دیکھا تھا۔ آج اس کی ساری اداکاری دھری رہ گئی تھی۔ وہ اپنے جذبات کو چھپانے میں ناکام تھا۔ اس نے جھپٹ کر ریسیور اٹھا لیا۔

"بہت افسوس ہے اپنے چوہدری صاحب۔" اس بار آواز محسن کی تھی جو دلاور کے لہجے کی بہتر طور پر نقل اتار رہا تھا۔ "فیصلے میں بہت دیر کی آپ نے... شاید آپ نے فیصلے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی...۔"

"کون ہو تم سُوّر کے بچے...۔" دلاور کے مُنہ سے گالیاں یوں نکلیں جیسے پریشر کُکر سے بھاپ نکلتی ہے۔

"فرشتۂ اجل کا نمائندۂ خصوصی۔" محسن ہنسا۔ "اگر تمہاری قوتِ فیصلہ یہی رہی تو آج دوپہر تک تم مجھے دیکھو گے... زندگی میں پہلی اور آخری بار۔ لیکن اس سے پہلے گیارہ بجے تمہارا ایک اور خانہ خراب ہوگا۔ ہمارے مہمان کی زندگی کا مالک ویسے تو خدا ہے مگر ہم نے پوری کوشش کی ہے کہ وہ تمہارے شر سے محفوظ رہے۔"

"میں ان دھمکیوں میں آنے والا نہیں ہوں۔" دلاور چلایا۔

"دھمکی تو بے وقوف دیتے ہیں دلاور۔" محسن بولا۔ "تم سکندر بخت کو ہاتھ لگا کے دیکھو۔ تمہیں اندازہ ہوگا کہ وہ تمہارے دفتر میں اتنا ہی محفوظ ہے جتنا اپنے گھر میں تھا۔ اب تم اس کی حفاظت کرو گے۔ اس کی بحفاظت واپسی پر بہت کچھ منحصر ہے۔ وقت ہو گیا آ رہا ہے۔ وقت کا پہلا سبق تم کو یہ ہے کہ جو کچھ سکندر بخت نے کہا تھا غلط نہیں تھا۔ اس کے بعد بھی جو کچھ وہ کہے گا وہی ہوگا۔ وہ بڑا پہنچا ہوا شخص ہے۔" فون کی لائن کٹ گئی اور دلاور نے بڑی عجلت میں وہ نمبر ملایا جو اُسے غالب نے دیا تھا اور اس کے سامنے کاغذ کے پیڈ پر لکھا ہوا تھا۔

"تم تو واقعی نام کے دلاور نکلے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "آج تو دلاوری کا بھرم رکھنا بھی تمہارے لیے مشکل ہو رہا ہے... جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔ میں تمہیں مزید آدھے گھنٹے کی مہلت دیتا ہوں۔"

"بھونکو مت کتے...۔" دلاور نے چیخ کر کہا۔

دروازہ ایک دم کھلا۔ "آپ... آپ نے آواز دی سر...۔"

"گیٹ آؤٹ...۔" دلاور نے اندر آنے والے کو ایک زبردست گالی دی۔ "میں نے کیا کہا تھا... اندر کیسے آئے تم...۔"

"سوری... سوری سر...۔" اندر آنے والا بڑی گھبراہٹ میں فرار ہوا مگر جاتے جاتے وہ اپنی والدہ اور ہمشیرہ کے بارے میں بہت کچھ سن گیا۔

"ہاں جی؟" ٹیلی فون کے ریسیور اور اسپیکر میں کسی نے کہا۔ پس منظر میں ریکارڈنگ کی آواز کے ساتھ مختلف لوگوں کی باتیں کرنے کا شور بھی سنائی دیا۔ دلاور نے نظر گھڑی پر رکھی اور نمبر دُہرایا۔

"ہاں جی... یہی نمبر ہے۔" جواب ملا۔ "بات کرو نا فٹ...۔"

"بھئی یہ تمہارے سامنے سڑک کے دوسرے کنارے پر کیا ہوا ہے؟" دلاور نے آواز کو سخت جدوجہد کے بعد نارمل رکھا۔ "ایک کوٹھی ہے...؟"

"بس جی مت پوچھو کیا ہوا ہے...۔" آواز آئی۔ "اور کوٹھی ہے کہاں جی۔ بھئی... اب تو مٹی دھول ہے اور دھواں ہے... آپ کون ہو؟"

"میں... ڈی ایس پی...۔"

"تو ڈی ایس پی صاحب! آپ مہربانی کرو۔" جواب دینے والا سخت گھبرایا ہوا لگتا تھا۔ "کسی کو بھیجو اِدھر... ایسا بم مارا ہے جی کسی نے کہ بہت کچھ اُڑا کے رکھ دیا ہے... اوئے بچامے، دیکھ کوئی گاہک دوڑ نہ جائے پیسے دیے بغیر... معاف کرنا جی، بڑی افراتفری ہے۔ میں تو خود بھی نیچے گر گیا تھا۔ سارے شیشے ٹوٹ گئے۔ گلاس برتن نیچے پڑے ہیں۔ کچھ گاہک بھی پڑے ہیں مگر انھیں ہوا کچھ نہیں ہے۔ ڈر کی وجہ سے میزوں کے نیچے گھس گئے ہیں۔ اوئے بچامے... بند کرا یہ گانا بجانا... ایتھے قیامت آگئی اے تے ایہہ پیا گاتے سُنداسے...۔"

دلاور نے ریسیور کو نیچے رکھا اور چند سیکنڈ تک اس کی نظریں خلا میں معلق رہیں۔ پھر آہستہ آہستہ اس نے میری طرف دیکھا۔ "تم کو اس کی بہت بڑی قیمت ادا کرنا پڑے گی سکندر۔" اس نے سرد اور سفاک لہجے میں کہا۔

"صرف تیس منٹ اور میں تمہارے پاس دلاور۔" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "اس وقت کو دھمکیوں میں ضائع مت کرو... ایسا نہ ہو کہ تمہارے لیے دوسری اطلاع زیادہ اندوہناک ہو۔ میں صرف رابعہ اور شہلا کا پتا ہی تو پوچھ رہا ہوں۔"

"اب وہ تم کو اگلے جہان میں ملیں گی۔" دلاور نے کہا اور میں نے اس کی صورت کو دیکھا جو غیظ و غضب سے مسخ ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا اور نتھنے پھول گئے تھے۔ گال اندر دب جانے سے جبڑے کچھ نمایاں ہو گئے تھے اور اس کی کنپٹی پر ایک رگ پھڑک رہی تھی۔

"تم ان کو قتل کرانے سے زیادہ کیا کر سکتے ہو۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "مجھے تو اس وقت بھی یقین نہیں کہ وہ زندہ ہوں گی۔ یہاں آنے سے قبل ہی میں ذہنی طور پر اس کے لیے تیار تھا کہ شاید اس دنیا میں ہماری پھر ملاقات نہیں ہوگی۔"

"تم موت کو کھیل سمجھتے ہو نا... اس لیے کہ موت ابھی تم نے دیکھی نہیں۔" دلاور نے زہریلے سانپ کی طرح پھنکار کے کہا۔

"یہ تو سارا کھیل ہی موت کا تھا دلاور! مگر ہم جانتے تھے کہ موت صرف ایک بار آتی ہے۔" میں نے کہا۔ "جو بات

تم نہیں جانتے وہ بہت جلد جان لوگے۔ ٹھیک گیارہ بجے تم پھر کسی کو فون کرو گے تو تمھیں اندازہ ہو جائے گا کہ فرشتۂ اجل کا نمائندہ خصوصی غلط نہیں کہتا تھا شاید آج ہی تم اُسے دیکھو...“

” اس سے پہلے تم بہت کچھ دیکھو گے سکندر۔“ دلاور نے کہا اور فون اٹھا لیا۔ اس نے ایک نمبر ڈائل کیا لیکن فون کے اسپیکر کو بند کر دیا تاکہ میں ان کی گفتگو نہ سن سکوں۔

” گاڑی باہر لاؤ ؟“ وہ بولا...؛ ہاں ... پانچ منٹ میں... چھ منٹ ہوئے تو میں تمھاری کھال کے جوتے بنوا کے تمھاری ماں کو بھیج دوں گا۔“ وہ غصے میں پاگل ہو رہا تھا۔” اور سنو... رابعہ اور شہلا۔“

یہ آخری بات اس نے مجھے چونکانے اور میری توجہ اپنی طرف کرنے کے لیے کہی تھی ورنہ اسے جو حکم دینا تھا وہ دے چکا تھا۔ رابعہ اور شہلا کا نام سنتے ہی میں نے بے اختیار دلاور کی طرف دیکھا اور اس ایک لمحے میں اپنی حفاظت کے خیال سے غافل ہو گیا۔ دلاور نے ریسیور میرے منہ پہ کھینچ مارا۔ فون اگر میز کے ایک کونے پہ ہوتا تو شاید بل کھائے ہوئے اسپرنگ جیسے تار کی قوت اُسے آگے بڑھنے سے روک لیتی مگر فون دلاور کے بالکل سامنے اور میز کے وسط میں تھا۔ میز کی تین فٹ سے کچھ کم چوڑائی ہم دونوں کے درمیان حائل تھی اور کریڈل سے الگ ہونے کے بعد ریسیور دونوں طرف برابر فاصلے پہ چار فٹ تک تو جا ہی سکتا تھا۔ یہ دلاور کی زبردست چال تھی کہ اس نے میرے ذہن میں غفلت کے ایک لمحے کو پیدا کیا اور جب وہ لمحہ اسے حاصل ہوا تو اس نے اپنی جگہ سے ہلے بغیر اور مجھے کوئی موقع دیے بغیر میرے دفاع کی صلاحیت ختم کر دی۔ ریسیور کسی پتھر کی طرح میرے منہ پہ لگا اور میں سنبھل نہ سکا۔ میرا سر ایک جھٹکے سے پیچھے ہوا۔ دلاور نے ریسیور پھینکتے ہی جست لگائی تھی۔ میرا ہاتھ میز کی خالی سطح پر پڑا۔ ریوالور اس وقت تک دلاور کے قبضے میں پہنچ چکا تھا۔ اس درد کو بھول کر جو میری ناک اور جبڑے کی ہڈی میں یوں اٹھا تھا جیسے ہڈی ٹوٹ گئی ہو، میں کرسی سے لڑھک گیا۔ ریوالور سے نکلنے والی گولی میرے پیچھے کی دیوار سے ٹکرا کے نیچے گری یا اس میں پیوست ہو گئی... یہ میں نے نہیں دیکھا۔

” باہر آ جاؤ سکندرِ اعظم۔“ میں نے دلاور کی آواز سنی جو میرا مذاق اُڑا رہی تھی۔” تم اتنے پھرتیلے نہیں ہو کہ گولی کو ڈاج کر سکو اور نہ میرا نشانہ اتنا کچا ہے۔ میں نے گولی تم پر چلائی ہی نہیں تھی۔“ وہ کمینگی سے ہنسا اور نیچے جھکا۔ میں نے اس کے ریوالور کو میز کی سطح کے نیچے، اپنے سر سے دو فٹ دُور دیکھا۔” اٹھو !“ اس نے ریوالور ہلا کے مجھے حقارت سے حکم دیا۔” گولی تو میں تم کو یہاں بھی مار سکتا ہوں مگر اتنی آسان موت تمھارے مقدر میں نہیں ہے۔“

میں آہستہ آہستہ اٹھا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ میری ناک سے خون قطرہ قطرہ ٹپک رہا تھا اور درد کی ٹیس سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ چوٹ میرے لبوں کے کنارے پر بھی لگی تھی، اوپر والا لب کٹ گیا تھا اور کسی مسوڑھے سے رسنے والے خون کا نمکین ذائقہ مجھے اپنی زبان پر محسوس ہو رہا تھا۔ دلاور نے ریسیور کو اٹھا کے پھر کریڈل پہ اپنے سامنے رکھ دیا تھا اور اب میری طرف دیکھ کے یوں مسکرا رہا تھا کہ یہ مسکراہٹ کسی گالی سے زیادہ اشتعال انگیز لگتی تھی۔

” تم نے تیس منٹ میں سے پانچ منٹ ضائع کر دیے۔“ میں نے ناک کے خون کو آستین سے صاف کیا۔ ” اس بار تم جب چاہو مجھے گولی مار سکتے ہو مگر خود کو اس تباہی سے نہیں بچا سکتے جو تمھارے اور تمھارے خاندان کا نصیب ہو جائے گی، تمھارے غلط فیصلے کے باعث۔“

” صرف اپنی فکر کرو...“ اس نے مجھے ایک گندی گالی دی۔ ” اس جنگ میں عورتوں کو گھسیٹنے میں تم نے پہل کی تھی۔ رابعہ اور اس کی ماں کے ساتھ جو کچھ کیا تھا اس کی سزا یہ تھی کہ تم نے میرے ایک دوست کی بیوی کو اغوا کر لیا جو محسن کی بیوی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے تمھاری ایک بیوی جو تمھارے بچوں کی ماں ہے اور جو تمھاری عزت بھی ہے... تمھیں یاد کرنا چاہیے کہ گیارہ بجے...“

” گیارہ بجے کچھ نہیں ہوگا۔“ وہ دیوانوں کی طرح چلایا اور مجھ پہ حملہ آور ہوا۔ اس کی دیوانگی مجھے ایک ایسی مسرت دے رہی تھی جس کا تجربہ مجھے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ آج وہ بہت کمزور پڑ گیا تھا۔ اس کا سارا اعتماد، اطمینان اور غرور اب اعترافِ شکست میں ڈھل رہا تھا۔ اداکاری سے خود کو بیوقوف ثابت کرنے کا، زبان سے خود کو ناقابلِ تسخیر ظاہر کرنے کا اور عیاری سے خود کو شیطان سے زیادہ فطین تسلیم کرانے کا حوصلہ جواب دے چکا تھا۔ اس کا سیلف کنٹرول ختم ہو رہا تھا۔ مجھ پر حملہ کرنا اس کی ذہنی ابتری کی دلیل تھی۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ میں اس سے کو خالی ہاتھوں سے لپٹا سکتا ہوں۔ اسے شاید عام آدمی کی طرح ڈھنگ سے مکا مارنا بھی نہیں آتا تھا اور میں نے بیک لینے کی کوشش بھی نہیں کی تھی مگر جو دھکا اس نے مجھے دیا، میری کسی سند یافتہ کراٹیکا سے کم نہ تھی۔

میں نے سر جھکایا اور نیچے سے اس کے پیٹ میں... وہ اوپر اچھلا تو میں نے گھٹنا اٹھایا اور پھر دایاں ہاتھ گردن کے پاس اسے الٹ دیا۔ یہی ہاتھ میں زیادہ قوت سے مارتا تو گردن کی ہڈی کسی دیا سلائی کی طرح ٹوٹ جاتی لیکن میں ایسا کر دیتا تو خود بھی مارا جاتا اور میرا مشن ادھورا رہ جاتا۔ بہت کچھ...

...کے خواب بھی شامل تھے۔ دلاور رہ جاتا جن میں میرا اور رابعہ کے خواب بھی... بیک وقت تین طرف سے تین مسلح افراد نمودار ہوئے۔ ان سب کے ہاتھوں میں مشین گن تھی۔ جو تھا جو سب سے پہلے اندر آیا تھا پیڈرو تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چمڑے کا ہنٹر تھا۔ وہ بالکل فلمی ولن کی طرح پیر پھیلائے اور ہاتھ کمر پر رکھے کھڑا تھا۔

” اس حرامزادے کے ہاتھ باندھ دو۔“ پیڈرو نے کہا۔ اندر آنے والے تین افراد میں سے دو نے مشین گن رکھ دی لیکن تیسرا بھی دس فٹ کے فاصلے پر مشین گن کا رخ میرے سینے کی جانب کیے اور ایک انگلی ٹرائیگر پہ رکھ کے کھڑا رہا۔ وہ مجھے صورت سے ذہنی طور پر پسماندہ اور کچھ جنونی لگتا تھا۔ ایک ایسا شخص جو کسی کے حکم یا اشارے کے بغیر بھی گولی چلا سکتا تھا۔ کسی وجہ کے بغیر میرے جسم کو چھلنی کر سکتا تھا اور میرے بدن کے ہر سوراخ سے اُبلنے والے لہو کے دھارے کو دیکھ کر خوشی سے قہقہے لگا سکتا تھا۔ دیوانے کو اپنے کسی فعل کے منطقی جواز کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ خود بھی نہیں جانتا کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے کیوں کر رہا ہے۔ سب اس کی ذہنی رو پر منحصر ہے۔ وہ چاہے تو سرِ بازار اپنے کپڑے پھاڑ کر اتار پھینکے یا کسی دوسرے قریب سے گزرنے والے کے گریبان پہ ہاتھ ڈال دے۔ ایسے دیوانے کے ہاتھ میں مشین گن دیکھ کر میرا خوفزدہ ہو جانا ایک قدرتی امر تھا۔ میں اپنی جگہ منجمد ہو گیا اور اس کی طرف دیکھ کر دوستانہ طریقے پہ مسکرایا۔

دلاور فوراً کھڑا ہو گیا تھا۔ جیسے ہسٹریا کے دورے سے مغلوب ہو جانے والی عورت کو ہوش میں لانے کے لیے ایک تھپڑ کافی ہوتا ہے، ایسے ہی میرے ہاتھوں زیر زبر ہونے کے بعد دلاور کی عقل ٹھکانے آ گئی تھی۔ اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ میرے مقابلے اپنی جذباتی کمزوری کا تماشا کر کے اس نے اپنا امیج خراب کر لیا ہے۔ وہ اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا اور پرانے دلاور کی شخصیت کا نقاب پھر اوڑھنے کی فکر میں تھا جو میرے ہاتھوں نے ذرا دیر کے لیے اتار دی تھی۔

وہ دونوں ایک رسی لے کر لوٹے جو مشین گن پیچھے رکھ گئے تھے۔ میں نے رضاکارانہ طور پر ہاتھ پیچھے کر دیے۔

” میں تم کو اتنا بے وقوف نہیں سمجھتا تھا دلاور۔“ میں نے بڑی تکلیف سے کہا۔ میری ناک سے رسنے والا خون بند ہو گیا تھا مگر اندر جمنے والے خون کے باعث میرے لیے ناک سے سانس لینا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ دونوں رسی لانے والے بڑے انہماک سے میرے ہاتھوں کے گرد رسی لپیٹنے میں مصروف تھے۔” ایک ثبوت دے چکا ہوں تمہیں۔ اس کے باوجود تم سمجھتے ہو کہ گیارہ بجے کچھ نہیں ہوگا۔ ذرا گھڑی کی طرف دیکھو۔“

دلاور نے گھڑی کی طرف نہیں دیکھا۔ پیڈرو نے بھی اس کی ضرورت محسوس نہیں کی لیکن وہ شخص جس کے بارے میں میرا خیال تھا کہ ذہنی طور پر پسماندہ ہے میری چال میں آ گیا۔ وال کلاک اس کے پیچھے تھا۔ اس کی گردن بے اختیار گھوم گئی۔ میں نے دایاں پیر ایک دم پیچھے کی جانب اٹھایا۔ میرے ہاتھ باندھنے والوں میں سے ایک بلبلا کے دہرا ہوا۔ میں نے غوطہ مارا اور مشین گن والے کے پیروں میں جا پڑا۔ اس نے خطرے کا احساس ہوتے ہی ٹرائیگر پر انگلی کا دباؤ بڑھا دیا۔ مشین گن کا ایک راؤنڈ ختم ہو گیا۔ میرے جوتے کی ایڑی کا شکار ہونے والا سیدھا ہوا ہی تھا کہ کئی گولیاں اس کے جسم سے گزر گئیں۔ دوسرا جو بدستور میرے ہاتھوں کے گرد رسی لپیٹ رہا تھا میرے ساتھ کھنچا چلا آیا۔ میں تو فرش پر اوندھا ہو گیا مگر وہ مزاحمت کے باعث سیدھا رہا اور مجھے اپنی جانب کھینچنے کی کوشش میں مارا گیا۔ ان دونوں کے حلق سے ایک جیسی بھیانک چیخ نکلی۔ رسی سے آزاد ہوتے ہی میرے ہاتھوں نے مشین گن والے کی پنڈلیوں کو عین ٹخنے کے اوپر سے گرفت میں لے لیا جہاں ان کی موٹائی کم سے کم تھی۔ ایک جھٹکے سے وہ اس پل کی طرح گرا جس کو سہارا دینے والے ستون ڈائنا مائیٹ کے دھماکے سے غائب ہو جائیں۔ پیڈرو اور دلاور صورتِ حالات کی اس غیر متوقع تبدیلی کے لیے بالکل تیار نہیں تھے۔ مشین گن کے فائر کی آواز سے وہ غیر شعوری طور پر پیچھے ہٹے اور مجھ سے چند قدم دُور ہو گئے۔ مشین گن والا نیچے گرا تو اس کا سر سیمنٹ کے فرش پر لگا اور ضرب کی شدت نے اسے بے سُدھ کر دیا۔

میرا ہاتھ ایک دم اس مشین گن کی طرف بڑھا جس کے راؤنڈ نے دو افراد کو ایک سیکنڈ میں موت سے ہمکنار کر دیا تھا لیکن اس میں اب کوئی راؤنڈ نہیں تھا، اسے دوبارہ لوڈ کرنے کے لیے اضافی راؤنڈ کہاں سے آتے۔ مجھے افسوس ہوا کہ میں نے اپنے پیچھے رکھی ہوئی دو میں سے ایک مشین گن اُٹھانے کا نہیں سوچا۔ اسی وقت میں نے پیڈرو کو جست لگا کے اپنے قریب سے گزرتے دیکھا۔ میں نے خالی مشین گن کو ڈنڈے کی طرح گھمایا۔ اس کا بٹ پیڈرو کی پنڈلی پہ بالکل سامنے پڑا۔ ہڈی پر لگنے والی ضرب کی شدت دُہرے تصادم کے باعث دگنی ہو گئی۔ ایک طرف سے وہ آگے بڑھ رہا تھا اور میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کی رفتار کیا ہو گی مگر دوسری طرف سے گن کا بٹ کم سے کم دس گنا رفتار سے آیا۔ نتیجے میں وہ چیخ مار کے منہ کے بل گرا اور میں خالی مشین گن پھینک کر ایک دم اٹھا۔

دلاور نے دیکھ لیا تھا اور سمجھ لیا تھا کہ اگلے لمحے کیا ہونے والا ہے۔ مسلح افواج کے دو ارکان خاک و خون میں غلطاں پڑے تھے۔ تیسرے کو دن میں تارے نظر آ گئے تھے یا اُسے زمین آسمان ابھی تک گھومتے محسوس ہو رہے تھے کہ وہ فرش پر بیٹھا سر کو زور زور سے جھٹک

رہا تھا۔ مسلح افواج کا کمانڈر انچیف بھی زمین بوس ہوگیا تو چوہدری دلاور کو اپنی حفاظت کے لیے خود کچھ کرنے کا خیال آیا۔ مگر اس خیال کے آنے اور میرے مشین گن تک پہنچنے میں سیکنڈ کے سویں یا ہزارویں حصے کا فرق رہ گیا جس کی وجہ سے مشین گن پر پہلے میں گرا۔ پھر دلاور میرے اوپر گرا اور میں نے ایک کروٹ لے کر اُسے دُور پھینک دیا۔ سیدھا کھڑا ہوتے ہی میں نے دوسری مشین گن پر ایک پاؤں رکھ دیا اور اپنے ہاتھ کی مشین گن کا رُخ دلاور کی جانب کر دیا۔ تب میں نے دیکھا کہ دلاور کے پیچھے کچھ تماشائی بھی ہیں جو فائرنگ شور ہنگامے اور چیخ پکار پر کام چھوڑ کر دوڑے تھے۔ مشین گن کا رُخ اپنی جانب دیکھ کر وہ پھر بھاگے۔

"رک جاؤ سب۔" میں نے چیخ کر کہا۔ وہ سب یوں رک گئے جیسے بجلی سے چلنے والے کھلونے لائٹ جاتے ہی ساکت رہ جائیں۔ میری سانس پھولی ہوئی تھی مگر میری ذہنی و جسمانی صلاحیت آزمائش کے مرحلے سے گزر کر دو چند ہو گئی تھی۔ "دلاور... گیٹ بند کرا دو... نہ کوئی باہر جائے گا نہ اندر آئے گا اور نہ فون کرے گا۔ کم اُن' حکم دو ان اُلو کے پٹھوں کو ورنہ اس مشین گن کا راؤنڈ میں ان پر چلا دوں گا۔ دوسری مشین گن پھر بھی میرے پاس ہوگی۔"

"جاؤ!" دلاور نے زخمی شیر کی طرح دہاڑ کر کہا۔ "سنا نہیں تم نے کہ کیا کرنا ہے... اور کیا نہیں کرنا ہے۔"

"نہیں۔ یہ سب جو کمرے میں آچکے ہیں یہیں رہیں گے۔" میں نے کہا۔ "تم فون پر حکم دو گے۔ یہ سب یرغمالی ہیں۔ تمھاری یا کسی اور کی دلاوری کی قیمت یہ اپنی جان دے کر ادا کریں گے۔ کوئی سالا خود کو ضرورت سے زیادہ چالاک اور حد سے زیادہ نمک خوار ثابت نہ کرے ورنہ ان سب کی موت کا ذمے دار وہی ہوگا۔ اندر کی خبر باہر نہیں جائے گی۔ اشارے کنائے یا کوڈ میں۔ کوئی پرچی لکھ کر یا کسی آنے والے فون کے جواب میں غلط بات کہی گئی تو میں ان سب کو بھون دوں گا۔ ان کی بیویاں یتیم اور بچے بیوہ... میرا مطلب ہے... خیر مطلب تم سب لوگ سمجھ گئے ہو۔"

دلاور آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور اس نے فون اُٹھانے کی کوشش کی۔ ایک مشین گن ہاتھ میں سنبھالے اور دوسری کو پیر سے گھسیٹتا میں میز تک پہنچا۔ دلاور نے وہی نمبر ڈائل کیے تھے کہ میں نے ایک ہاتھ مارا اور فون دیوار سے ٹکرا کر ٹوٹ گیا۔

"میں نے فون استعمال کرنے سے منع کیا تھا۔" میں نے کہا۔ "انٹرکام استعمال کرو... باہر کی دنیا سے تمھارا کوئی رابطہ نہیں ہونا چاہیے۔"

چوہدری دلاور کی صورت بگڑ گئی۔ اس کی یہ چال بھی ناکام رہی تھی۔ وہ میرے سامنے فون کرتا اور وہی دہراتا جو میں نے کہا تھا مگر سننے والا شاید ایس پی سراج ہوتا۔ نواب خسرو جمشید ہوتا یا اس کا کوئی مددگار ہوتا جو فوراً سمجھ جاتا کہ معاملہ گڑبڑ ہے... نے نہیں دیکھا تھا کہ وہ کیا نمبر ڈائل کر رہا ہے اور یہ نمبر باہر کا ہے یا اندر کا۔

"چوکیدار سے کہو باہر تالا ڈال دے۔" میں نے کہا... آئے اسے یہی کہے کہ فیکٹری بند کر دی گئی ہے۔ سب لوگ... کے جنازے میں گئے ہیں... ٹیلی فون ایکسچینج کے آپریٹر... یہاں آ جائے۔" دلاور نے انٹرکام کا بٹن دبائے رکھا اور... زبان سے نکلنے والا ہر لفظ ایک حکم بن کے جاری ہوتا گیا۔ "گھڑی کی طرف دیکھو چوہدری دلاور۔" میں نے کہا۔ "اگر... سے بے جاتے تو میں کیسے ثابت کرتا کہ گیارہ بجے... نے کہا تھا۔ اب دس بجکر چالیس منٹ ہوئے ہیں۔ ٹھیک پونے گیارہ بجے تم کو فرشتۂ اجل کے نمائندۂ خصوصی کی ٹیلی... آئے گی جو میں ریسیو کروں گا... لیکن سنو گے تم بھی... تم..."

کمرے میں موجود سات افراد نے حیرانی سے ایک... کی طرف دیکھا۔ فرشتۂ اجل کے روپ میں تو خود میں ان کے سامنے موجود تھا۔ پھر یہ نمائندۂ خصوصی کون ہوگا جو ٹیلی فون... گا؟ ایسا کبھی دیکھا نہ سنا کہ حضرت عزرائیل نے کسی کی جان... کرنے سے پہلے اسے فون پر مطلع کیا ہو کہ حضرت میں حاضر...

"ایک قدم پیچھے ہو کر دیوار کے ساتھ لگ جاؤ۔"... کہا۔ "اور اپنے ہاتھ اوپر اٹھا لو۔" ان سب نے بڑی فرمانبرداری سے تعمیل کی۔ سوائے پیڈرو کے جو وہیں بیٹھا رہا اور کراہتا...

کال ٹھیک پونے گیارہ بجے آئی۔ میں نے بٹن دبا... فون کا اسپیکر آن کر دیا۔ "ہاں بھئی کس سے بات کرو گے..." نے اپنی زبان میں کہا۔

"یہاں دلاور کون ہے؟" غالب کی آواز آئی۔

"کوئی بھی نہیں۔" میں نے کہا۔ "سب بزدل ہیں۔... کی طرح دبکے کھڑے ہیں۔ ان میں اپنے چوہدری صاحب... ہیں جو مشین گن کے سامنے بید مجنوں کی طرح کانپ رہے ہیں۔"

غالب یقیناً سمجھ گیا ہوگا کہ دال میں کچھ کالا ہے... کالا تھا مگر اب پھر سفید ہے ورنہ دلاور مشین گن کی زد میں... آگیا؟

"اپنے چوہدری صاحب! آپ بم ڈسپوزل اسکواڈ... ایک ٹیلی فون اور کریں۔" غالب بولا۔ "ان سے کہیں کہ ا... سراج کے گھر میں کسی نے ٹائم بم رکھ دیا ہے جو ٹھیک گیارہ... پھٹ جائے گا..."

"سراج... سراج کے گھر میں..." دلاور ہکلایا۔

"یہ تو واقعی مجنوں کی طرح کانپ رہا ہے۔ اس کی... کانپ رہی ہے۔" غالب نے قہقہہ مارا۔ "اس سے کہو کہ اپنا... یہ مرزا پھویا رکھ لے یا حاجی لق لق..."

"وہ... اس گھر میں... اس کی بوڑھی ماں بھی رہتی ہے۔ تم اس کو بھی نہیں بخشو گے۔" دلاور نے اس بے عزتی پر خون کے گھونٹ پی کر کہا۔

"جب بم ہیروشیما پر گرا تھا تو اس نے کسی کی ماں بہن کا خیال نہیں کیا تھا۔ بم رشتوں کو نہیں پہچانتا۔ شریف اور بدمعاش میں فرق نہیں دیکھتا۔ امن کے حامی بھی جنگ میں کام آتے ہیں۔ چوہدری دلاور... رابعہ کی ماں کا... یا سکندر کے باپ کا کس نے لحاظ کیا تھا؟ اور بھی بہت سے نام یاد ہوں گے تم کو جو اتنے ہی بے گناہ تھے جتنی ایس پی سراج کی ماں ہے۔" غالب نے کہا۔ "اس بار تو شاید بم ڈسپوزل اسکواڈ والے تمھاری بات سنیں گے ہی نہیں۔ تم کتنی بار کہاں کہاں دوڑاؤ گے ان کو اور ہر جگہ وہ دس منٹ میں پہنچ بھی نہیں سکتے۔ ایک بم کا سراغ لگانے کے لیے بھی تو وقت چاہیے۔"

"میں... میں اس کے... سراج کے گھر فون کر دوں؟"

"تمھارا باپ ہے وہ سور کا بچہ...؟" میں نے گرج کر کہا۔ "اور جب ایک بار میں نے کہہ دیا ہے کہ نہ کوئی فون کال جائے گی اور نہ آئے گی... آئے گی تو میں ریسیو کروں گا۔"

"ایک فون کال کی اجازت دے دینا ان کو یار۔" غالب نے کہا۔ "یہ ایس پی سراج کی کوٹھی سے متصل دوسری کوٹھی کا فون نمبر ہے۔ گیارہ بجکر پانچ منٹ پر... یعنی اب سے دس منٹ بعد... ان کو دوسری خوش خبری ملے گی... نمبر لکھو..."

میں نے دلاور کو اشارہ کیا۔ اس نے مجبوراً نمبر لکھا۔ پھر لائن کٹ گئی۔ دلاور کی حالت کا تغیر اب قابلِ دید تھا۔

"سنو! میں بات کرنا چاہتا ہوں تم سے۔" وہ لبوں پر زبان پھیر کے بولا۔ "علیحدگی میں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "اب کوئی فائدہ نہیں۔ تم نے اس مہلت سے فائدہ اُٹھانے کے بجائے سچ مچ دلاور بننے کی کوشش کی اور اپنا ایک ساتھی گنوا دیا۔ اس کی ماں کے خونِ ناحق کے ذمے دار بھی تم ہو... تم نے پھر فیصلے میں دیر کی۔ ثبوت دیا کہ تم کتنے احمق ہو کہ دشمن کو کمزور سمجھتے ہو۔ میں نے تم کو آتے ہی بتا دیا تھا کہ میں اپنی حفاظت کا پورا بندوبست کر کے آیا ہوں۔ صرف تم اپنے دفاع سے غافل تھے۔"

"میں تم کو... بتا دوں گا... کہ وہ کہاں ہیں۔" وہ بولا۔

"بتا دینا۔" میں نے بے نیازی سے کہا۔ "گیارہ بجکر پانچ منٹ سے پہلے تمہیں آدھے گھنٹے کی مہلت ملے گی۔ بلکہ پچیس منٹ کی۔ اگر تم نے ساڑھے گیارہ بجے تک ان کا صحیح پتا ٹھکانا بتا دیا اور ہمارے پاس اتنا وقت ہوا کہ ہم ان کو بحفاظت نکال سکیں تو ہم تمھیں بھی بتا دیں گے کہ بم کہاں ہے... اگر تمھیں وقت ملا تو تم بھی وہی کر سکو گے جو ہم کریں گے۔ تم اپنے یار ایس پی اور اس کی ماں کے لیے تو کچھ نہیں کر سکے۔ مگر اس کے بعد جس کی باری ہے، شاید اُسے بچا سکو۔ یہ سب تمھارے تعاون پر منحصر ہے۔ یاد رکھو ہم اس وقت تک کچھ نہیں بتائیں گے جب تک ہمیں یقین نہیں آجائے گا کہ اب وہ بھی محفوظ ہیں اور ہم بھی۔ تیسرا نشانہ کون ہے، یہ میں ابھی نہیں بتا رہا ہوں مگر یہ چوتھا نشانہ تمھارا اپنا گھر ہوگا۔ تمھارے اپنے بیوی بچے تمھاری وجہ سے مریں گے۔"

دلاور اب میری ہر بات پر یقین کرنے کے لیے تیار تھا۔ اس کی مضبوط شخصیت سومنات کے بت کی طرح بکھر چکی تھی اور وہ پٹے ہوئے مہرے کی طرح انہی کی نظروں کے سامنے ذلت و رسوائی برداشت کر رہا تھا جو اس کے نام کی دہشت سے لرزہ براندام رہتے تھے۔ یہ شکست وقتی تھی مگر مکمل تھی۔ وقتی اس لیے کہ تمام وطن فروشوں کا اور ان کے اڈوں کا پتا چلنے تک دلاور کا زندہ رہنا ضروری تھا۔

"چلو دلاور، اپنے یار سراج کی خیریت معلوم کر لو۔" میں نے گھڑی کی طرف دیکھا جس میں گیارہ بجکر پانچ منٹ ہو رہے تھے۔

"نمبر تم ملا دو..." دلاور نے ٹوٹے ہوئے فون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے زہریلے لہجے میں کہا۔

"انٹرکام پر کسی سے کہو کہ ایک فون نکال کر یہاں لے آئے۔" میں نے کہا۔ "تمھارے پی اے کی لائن بھی یہی ہے۔ اسے کہو اپنا فون پلگ سے نکال کر یہاں لگا دے۔"

وہ شخص جو کافی لے کر آیا تھا اور جسے حکم دیا گیا تھا کہ مرحوم پی اے کی جگہ جا بیٹھے، اس وقت دیوار کے ساتھ دونوں ہاتھ اٹھائے کھڑا تھا۔ اس نے اجازت طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"جاؤ لیکن اپنی زندگی کو وفاداری کے غیر معمولی مظاہرے سے خطرے میں مت ڈالنا۔" میں نے کہا۔ "چوہدری صاحب تمھیں تو پی اے بنا دیں گے مگر یہ جو باقی چھ بے گناہ کھڑے ہیں ان کی جان لے کر ایک عہدہ حاصل کرنا تم کو بہت مہنگا پڑے گا۔"

"یہ سب میرے ساتھی ہیں سر۔" وہ مسکینی سے بولا۔

"اس کے علاوہ... وہ شاخ ہی نہ رہے جس پہ آشیانہ تھا۔" میں نے کہا۔ "تو فکرِ آشیاں بندی سے کیا حاصل۔ ان کے ساتھ چوہدری صاحب بھی گئے تو تم کس کے پی اے بنو گے۔"

غالباً یہ دوسرا نکتہ اسے قائل کرنے میں زیادہ اہم کردار ادا کر گیا اور وہ چند منٹ میں فون کو پلگ سے نکال لایا۔ ٹیلیفون کی لائن بجلی کے تاروں کی طرح فٹ کی گئی تھی۔ جیسا کہ عموماً دفاتر اور بڑے اداروں میں ہوتا ہے۔ اور ایک بورڈ میں ٹیلی فون لائن کے تین کنکشن تھے۔ اس نے صحیح ساکٹ میں پلگ لگایا اور

بے حد سعادت مندی سے پھر اسی صف میں جا کھڑا ہوا جہاں دوسرے چھ افراد زندگی سے بیزار کھڑے تھے۔ وہ تماشا دیکھنے آئے تھے اور خود تماشا بن گئے تھے۔

دلاور نے جس بے دلی کے ساتھ نمبر ڈائل کیا اس سے یہ بات واضح ہو جاتی تھی کہ یقین تو اُسے پہلے ہی آچکا ہے اور اب دوسری بری خبر کی تصدیق سے احساس کے عذاب میں اضافہ ہی ہوگا۔ اس دوسرے فون کے ساتھ ایمپلی فائر اسپیکر نہیں تھا۔ مجھے افسوس ہوا کہ میں نے ٹیلی فون کو بلاوجہ چھاپڑ مارا تھا۔ میں دلاور کو چھاپڑ مار کے فون استعمال کرنے سے روک سکتا تھا۔ اس ٹیلی فون کے ٹوٹ جانے کا نقصان یہ ہوا کہ میں دلاور کی گفتگو یکطرفہ ہی سن سکا۔

"کون۔ دیکھیں جی میں دلاور بول رہا ہوں۔" چوہدری دلاور نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ "آپ کے ساتھ والی کوٹھی میں ایک ایس پی صاحب رہتے ہیں۔ جی ؟ ہاں جی... جی... پوری کوٹھی تباہ ہو گئی... کوئی زندہ بچا ؟ آپ کو معلوم ہے ایس پی صاحب کی والدہ اندر تھیں۔ اور خود ایس پی صاحب... نہیں معلوم..." اس نے ریسیور رکھ دیا۔

"اب بھی تم یہ سمجھتے ہو کہ میں بے وقوفوں کی طرح منہ اٹھا کے یہاں چلا آیا تھا تو تم سے بڑا بے وقوف کوئی نہیں۔" میں نے کہا۔ "اب میں اکیلا نہیں ہوں دلاور... اور کمزور بھی نہیں ہوں۔ میں اسی وزیر خان کا بیٹا ہوں جس کو تم نے بے بسی اور ذلت کی موت مار دیا اور اپنے شکاری کتے پیچھے لگا کے مجھے انگلستان سے یہاں بلوالیا۔ آج میں ایک طاقت ہوں دلاور... میرا نام انصاف کی طاقت ہے۔ تم اپنی دولت اور بدمعاشی کی طاقت کے غرور میں انصاف کی بات کرنے والوں کو کیا سمجھتے تھے؟ خیالی دنیا میں رہنے والے احمق... مگر یہی احمق آج تم سے تسلیم کرا چکے ہیں کہ انصاف ایک سچائی ہے جسے ختم کرنا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا سورج کی دھوپ کو کالا کرنا۔ تم دیکھ رہے ہو کہ انصاف آج بھی ملتا ہے اور اگر ملتا نہیں تو حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس وقت کا تصور کرو جب تمھاری جگہ میں اسی طرح خوف اور دہشت میں مبتلا... ڈرا ہوا اور سہما ہوا کھڑا تھا۔ تمھاری طاقت اور دبدبے کے ڈرامے سے مرعوب اور خود کو تمھارے رحم و کرم پر سمجھنے والا۔ آج صورتِ حال اس کے برعکس ہے۔ انگریزی محاورے کے مطابق میزیں اُلٹ گئی ہیں۔ اب تم میرے جوتوں میں کھڑے ہو۔ یہ بھی انگریزی محاورہ ہے۔ اس کا اندازہ تم کو ہو چکا تھا اسی لیے تم مجھے انصاف کی خیرات دینا چاہتے تھے مگر قانونی حق دینے کی بات کرنا چاہتے تھے۔ یہ بات تم نے بہت دیر سے کی۔ اپنے فیصلوں کی طرح۔ اب مجھے تم سے کچھ مانگنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں خود سب کچھ حاصل کر سکتا ہوں۔"

ایک نظر میں نے ان سب کو دیکھا جو کھڑے ہو... نہیں تھکے تھے لیکن ہاتھ اوپر رکھنا ان کے لیے مشکل ثابت... سب سے زیادہ ابتر حالت پیڈرو کی تھی۔ پنڈلی کے ٹوٹ... سے وہ شدید تکلیف میں تھا اور کھڑا تک نہیں ہو سکتا تھا... ساری باتیں اس نے بھی سُنی تھیں اور دلاور کی طرح وہ بھی... ہی اندر اپنی بے بسی پر پیچ و تاب کھا رہا تھا اور اپنی حم... رہا تھا کہ اس نے تین افراد کی طاقت پر جو مشین گنوں سے... بہت زیادہ بھروسا کر لیا۔ یہ ان کا قصور نہیں تھا۔ ایک... تین مشین گنوں کے سامنے کتنا بے بس ہوتا ہے اس کا... اندازہ تھا۔ وہ کس طرح فرض کر لیتے کہ تقدیریں دھوکا دے... ورنہ وہ اپنی جیب میں ایک ایک ریوالور تو ضرور لاتے۔

"استاد پیڈرو!" میں نے تفریحِ طبع کے لیے تھوڑا سا... ضروری سمجھا۔ "بہت بے ادب ہو گئے ہو تم۔ تمھارے آقا... نعمت، تمھارے اَن داتا اور باس کھڑے ہیں۔ اور تم بیٹھے... کھڑے ہو جاؤ۔"

"میری ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔" وہ بولا۔ معذ... کو سمجھتے ہوئے یا دلاور کے اشارے پر اس نے کتے کی طرح... اور غرّانا بند کر رکھا تھا اور شرافت سے بات کر رہا تھا۔ اس... لہجہ بھی مجھے اجنبی لگا۔

"کون سی ٹانگ ؟" میں نے افسوس سے سر ہلایا۔

"یہ ٹانگ۔" اس نے خون کے گھونٹ پی کر بائیں... کی طرف اشارہ کیا۔

"غلطی تمھاری تھی... تمھیں کیا ضرورت تھی ٹانگ اڑا... کی۔" میں نے محاورے کا عملی استعمال کیا۔ "خیر کوئی بات نہیں... اور احترام کرنے والے تو ایک ٹانگ پر کھڑے رہتے ہیں... کھڑے ہو جاؤ۔"

پیڈرو مجھے یوں دیکھتا رہا کہ اس کی آنکھوں کے پیچھے... ہوئی خون کی پیاس کو میں نے محسوس کیا۔ جیسے راکھ میں دبی ہو... چنگاری کی حرارت محسوس کی جاسکتی ہے۔ مگر وہ اسی طرح بیٹھا...

"کیا تم چاہتے ہو کہ میں تمھاری دوسری ٹانگ بھی توڑ دوں... پھر تمھیں پنکھے سے اسی طرح لٹکا دوں جیسے قصائی ذبح کیے ہو... بکرے کی کھال اتارنے کے لیے اس کی ٹانگیں توڑ کر کام کرتے... میں نے کہا۔ "تم نے دیکھا تو ہوگا یہ منظر... یہ رسّی دیکھو جو تم نے... منگوائی تھی... میرے ہاتھوں کے لیے... اب میرے ہاتھوں... کمال دیکھنا۔ دس منٹ اُلٹے لٹکو گے تو تمھارے حلق سے آواز... بھی ذبح ہونے والے بکرے کی طرح نکلیں گی۔"

دیوار کے ساتھ ساتھ قطار میں کھڑے ہوئے سات اف... میں سے ایک بے اختیار ہنس پڑا۔ اب انھیں اپنی طرف...

...بے قدری ہو گئی تھی۔ میں نے ان کو کئی بار بے گناہ کہا تھا، چنانچہ اب انھیں یہ ڈر نہیں رہا تھا کہ میں ان کو بھی انتقام کی خاطر مار سکتا ہوں۔ میں نے دیکھا کہ ہنسنے والا وہی تھا جس کی مشین گن سے ساتھی کے دو ساتھی ہلاک ہوئے تھے اور جس سے میں نے پہلی مشین گن چھینی تھی۔ وہ واقعی ذہنی طور پر پسماندہ تھا۔ اُسے پاگل نہیں کہا جا سکتا تھا۔ آدمی جب انتہائی احمق ہونے کی حد سے بھی آگے نکل جائے اور جسمی عمر کے مقابلے میں اس کے دماغ کی عمر پیچھے رہ جائے تو یہی ہوتا ہے۔ پیڈرو نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔

"تم سب لوگ بیٹھ جاؤ۔" میں نے کہا۔ "مگر ایک شرط ہے جب میں اشارہ کروں تو تم لوگ تالیاں بجاؤ گے۔"

وہ سب بیٹھ گئے اور میں آگے بڑھا۔

"تالیاں۔" میں نے پیڈرو کے قریب پہنچ کر مشین گن اٹھائی۔ بیٹھے ہوئے لوگوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر مجبوراً تالیاں بجانے لگے۔ دلاور اب بھی میری زد میں تھا۔

"جب میں مشین گن سے استاد پیڈرو کی ٹانگ پر ضرب لگاؤں گا تو پھر تالیاں۔" میں نے کہا۔ پیڈرو چلّایا تو پھر تالیاں...

پیڈرو نے دیوار کا سہارا لیا اور ایک دم کھڑا ہو گیا۔ اس کی ایک ٹانگ زمین پر تھی اور دوسری ہوا میں معلق تھی۔

"تالیاں۔" میں نے کہا۔ "استاد پیڈرو اپنے پیروں پر کھڑے ہو گئے... بلکہ پیر پر کھڑے ہو گئے۔"

دلاور اور پیڈرو کے ماتحت اور ملازم۔ ان کے اشاروں کے غلام اور ان کے ٹکڑوں پر پلنے والے پھر تالیاں بجانے لگے۔ چشمِ فلک نے یہ تماشا پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔

"ویری گڈ۔ ذرا ایک قدم آگے آجاؤ استاد۔" میں نے کہا۔ "سہارا ہمیشہ انسانوں کا لینا چاہیے۔ دیواروں کا نہیں... شاباش... بچپن میں تم نے بھی ایک ٹانگ پر وہ کھیل تو کھیلا ہوگا... لنگڑی پالا۔"

استاد پیڈرو ایک ٹانگ پر اُچھل کر آگے آیا تو اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ اس کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ کی اذیت ناقابلِ برداشت تھی۔ وہ گرا تو اس کی وہ ٹانگ اس کے جسم کے وزن کے نیچے آگئی۔ وہ بُری طرح بلبلایا۔

"عورتوں کی طرح ڈھکوسلے مت کرو۔" میں نے گرج کر کہا۔ "کھڑے ہو جاؤ فوراً۔"

"میں کھڑا نہیں ہو سکتا سُور کے بچے... کتے..." پیڈرو کے ضبط کا حوصلہ جواب دے گیا۔ "مار دے گولی مجھے... تیری..." اس نے مجھے مزید غلیظ ترین گالیاں دیں۔ عام حالات میں ایسی گالیوں کا مجھ پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ میں یہی سمجھتا کہ گندے منہ سے گندگی نکل رہی ہے تو قصور منہ کا نہیں۔ اُس منہ سے پھول کیسے جھڑ سکتے ہیں۔

گٹر میں پھول کیسے مہک سکتے ہیں۔ لیکن اس وقت میں نے آگے بڑھ کے پیڈرو کے منہ پر کِک ماری۔ وہ لڑھک گیا۔ میں نے اس کو ٹھوکریں مار مار کے بے حال کر دیا۔ کئی ٹھوکریں اس کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ پر لگیں اور اس کی چیخوں نے تماشا دیکھنے والوں کا رنگ فق کر دیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے پیڈرو کی حالتِ زار دیکھتے رہے بالآخر پیڈرو کی آواز بند ہو گئی اور وہ بے حس ہو گیا۔ درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا۔ اب اُسے ٹھوکریں مارنا کسی پتھر کو ٹھوکر مارنے کی طرح بے مقصد تھا۔

"تالیاں ایک بار پھر..." میں نے کہا اور یہ محسوس کیا کہ پیڈرو کو مارتے وقت میں دشمنی اور انتقام کے بے رحم جذبات سے کس حد تک مغلوب ہو چکا تھا۔ شاید میرے لاشعور میں دبا ہوا ایک خیال میرے شعور پر غالب آگیا تھا کہ یہی میرے باپ کا قاتل ہے۔ بہت بے دلی سے چند افراد نے تالیاں بجا کے ظاہر کیا کہ وہ حکم عدولی نہیں کر رہے ہیں۔

"چوہدری دلاور..." میں نے کہا۔ "سوا گیارہ بجے ہیں... کیا تم ان دونوں کو ساڑھے گیارہ بجے تک یہاں بلا سکتے ہو؟"

"یہاں ؟" دلاور چونکا۔ "میں تم کو وہاں پہنچا دوں..."

"جو میں کہوں گا وہ ہوگا..." میں نے کہا۔ "تمھاری مرضی نہیں چلے گی۔"

"لیکن صرف پندرہ منٹ میں۔" وہ بولا۔ "کم سے کم آدھا گھنٹہ تو دو۔" پیڈرو ایک بار کراہا۔ وہ ہوش میں آنے لگا تھا۔

"میں تم کو پون گھنٹا دے سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "مگر اس کے بعد یہ ممکن نہیں رہے گا کہ تم تیسرے بم کو نہ پھٹنے دو۔"

"تیسرا بم... وہ کہاں ہے... ؟" دلاور کے حلق میں آواز پھنس گئی۔

"یہ تمھیں ٹیلی فون پر بتایا جائے گا۔" میں نے کہا۔ "جب رابعہ اور شہلا یہاں آجائیں گی اور ہم سب بحفاظت نکل جائیں گے تو تمھیں یہ بتا دیا جائے گا کہ تیسرا بم کہاں ہے۔"

"ٹھیک ہے... لیکن اس کے لیے مجھے ایک فون کرنا ہوگا۔" دلاور بولا۔

"کرو لیکن ذرا سوچ سمجھ کے... چوتھا بم تمھارے گھر کے اندر ہے۔" میں نے کہا۔

دلاور نے ایک نمبر ڈائل کیا جو میں نے ذہن میں نوٹ کر لیا۔

"جمشید! ان دونوں کو یہاں بھجوا دو۔" دلاور نے مختصراً کہا۔ "کم سے کم وقت میں۔" اور ریسیور رکھ دیا۔ دلاور کسی کا نام لیے بغیر بھی یہ حکم دے سکتا تھا مگر وہ حواس باختہ تھا۔ اس نے خود ہی مجھے نواب خسرو جمشید کا ٹیلی فون نمبر بتا دیا مگر اسے احساس نہ ہوا۔ اس نمبر سے خسرو جمشید کا سراغ لگایا جاسکتا تھا۔ اسی وقت پیڈرو کراہتا ہوا اُٹھ بیٹھا۔

"تمھارے کہنے کے مطابق رابعہ اور شہلا کو یہاں پہنچنے میں پندرہ منٹ سے زیادہ ہی صرف ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "اس وقت کو ضائع کرنا ٹھیک نہیں چوہدری جی۔۔۔ اپنے استاد پیڈرو کو ایک کاغذ قلم فراہم کیجیے۔"

دلاور نے میز پر سے پیڈ اور بال پوائنٹ پین اٹھایا اور آہستہ آہستہ پیڈرو کی طرف بڑھا۔ پیڈرو کے قریب جا کر وہ تھوڑا سا جھکا اور اسی ایک لمحے میں جب دلاور میرے اور پیڈرو کے درمیان حائل تھا، پیڈرو کا ہاتھ حرکت میں آیا اور اس نے جیب سے ریوالور نکال کے مجھ پر فائر جھونک دیا۔ میں اس کے لیے بالکل تیار نہ تھا۔ میرا تو خیال یہ تھا کہ دلاور اور پیڈرو اپنے ساتھ کوئی ریوالور نہیں لائے تھے۔ دلاور تو ریوالور اپنی دراز میں رکھتا تھا مگر پیڈرو کا ریوالور عادت کے مطابق اس کے پاس تھا۔

میرا خیال ہے کہ پیڈرو نے گھبراہٹ اور عجلت میں نشانہ لیا تھا۔ اسی لیے گولی میرے کان کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ دلاور ایک دم گر گیا۔ اس نے مجھے پیڈرو کے مقابل نہیں کیا تھا۔ پیڈرو کو میرے سامنے چھوڑ دیا تھا اور اپنی جان بچائی تھی۔ یہ اس نے اچھا ہی کیا کیونکہ جواب میں ایک لمحے کا توقف کیے بغیر میں نے مشین گن کا برسٹ مارا مگر اس بات کا خاص خیال رکھا کہ گولی پیڈرو کو نہ لگے۔ کوئی گولی اس کے ہاتھ پر لگی اور ریوالور اس کی گرفت سے نکل کر دُور جا گرا۔ پیڈرو تکلیف سے چلایا۔ اس کا ہاتھ لہولہان ہو گیا تھا۔ دلاور نے اور کمرے میں موجود دوسرے لوگوں نے خوف و دہشت سے گولیوں کے ان نشانات کو دیکھا جو پیڈرو کے پیچھے والی دیوار پر نمودار ہو گئے تھے۔ یہ سوراخ اس کے جسم میں بھی ہو سکتے تھے مگر وہ بال بال بچ گیا تھا۔

"اب قلم اٹھاؤ اور لکھو۔" میں نے تیسری مشین گن اٹھا کے کہا۔

"کیا لکھوں؟ اور کیسے لکھوں؟" پیڈرو نے اپنا خون آلود ہاتھ اٹھایا اور میں نے دیکھا کہ گولی سے اس کی درمیان والی انگلی اڑ گئی تھی۔ زخم سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ اس کی حالت واقعی بہت خراب تھی۔

"یہ لو۔۔۔" میں نے اپنی جیب میں سے رومال نکال کے دلاور کی طرف پھینک دیا۔ "اس کو پٹی باندھ دو۔ اس کے بعد تم منشی کے فرائض سنبھال لو۔۔۔ یعنی جو کچھ پیڈرو بتائے وہ لکھتے جاؤ۔ تم نے کہا تھا کہ میرے والد کا اصل قاتل پیڈرو ہے اور پیڈرو ہی بتا سکتا ہے کہ وزیر خان کا مدفن اب کہاں ہے؟"

پیڈرو نے چونک کر سر اٹھایا۔ "یہ تم نے کہا تھا؟" اس نے ہر میں بجھے ہوئے لہجے اور خونخوار نظروں کے ساتھ دلاور سے کہا۔

"سمجھنے کی کوشش کرو بے وقوف۔" دلاور نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں۔ دلاور کو سمجھنے کی کوشش کرو۔" میں نے کہا۔ "اتنا عرصہ ساتھ رہنے کے باوجود ابھی تک تم اسے سمجھے نہیں ہو۔ اس نے مجھ سے ایک سودا کرنا چاہا اور سودے میں تم بھی شامل تھے۔ تمھیں میرے حوالے کیا جا رہا تھا کہ میں تم سے وزیر خان اور۔۔۔ کے قتل کا انتقام لے لوں اور تم سے یہ بھی معلوم کروں کہ وزیر۔۔۔ کو اس کی قبر سے نکال کر تم نے کہاں دفن کیا تھا۔"

پیڈرو نے دوسرے ہاتھ سے دلاور کو دھکا دیا۔ "۔۔۔ سچ ہے؟ تم مجھے قربانی کے بکرے کی طرح بیچ رہے تھے۔۔۔" ۔۔۔ نے ایک گالی دی۔

"ڈرامامت کرو تم دونوں۔" میں نے کہا۔ "میں جانتا ہوں تم دونوں مل کر کیا ناٹک کرتے رہے ہو۔ جو کچھ دلاور نے کہا وہ تمھیں معلوم تھا۔ تم دونوں نے ہی مل کر اس ون ایکٹ پلے کے مکالمے تیار کیے ہوں گے اور منظر نامہ لکھا ہو گا۔ اب جو میں کہہ رہا ہوں وہ لکھو۔ سب سے پہلے یہ لکھو کہ تم نے وزیر خان اور شرافت علی کو کیسے قتل کیا تھا۔"

"وزیر خان کو میں نے قتل نہیں کیا تھا۔" پیڈرو چلایا۔

"گویا میر شرافت علی کو تم نے قتل کیا تھا؟" میں نے کہا۔ "پہلے مجھے بتاؤ کہ یہ قتل تم نے کیسے کیا تھا؟۔۔۔ دلاور لکھتا جائے گا۔"

"اس سے کیا فائدہ ہو گا تمھیں؟" پیڈرو بولا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے کہا۔ "عدالت میں اس کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہو گی اور ویسے بھی عدالت میں میرا حاضر ہونا ناممکن ہے۔ اس کے بعد یہ لکھو کہ وزیر خان کو تم نے کہاں دفن کیا ہے۔۔۔ غلط بیانی کے ذمے دار۔۔۔"

پیڈرو نے اس ہاتھ کو دیکھا جس پر دلاور نے بڑی صفائی اور مہارت سے پٹی لپیٹی تھی مگر اس کے باوجود خون رس رہا تھا اور وہ سخت تکلیف میں تھا۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے لٹکتی ہوئی ٹانگ کو پکڑ رکھا تھا۔

"تم مجھے گولی مار سکتے ہو مگر مجھ سے یہ تحریر نہیں لکھوا سکتے۔" وہ بولا۔

"میں تم سے سب کچھ کرا سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے اور تم کرو گے ایک دن۔ ابھی وقت کم ہے اس لیے میں اصرار نہیں کرتا۔ تم کو جانا تو میرے ساتھ ہی ہے۔"

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو کمرے میں موجود ہر شخص تقریباً اچھل پڑا۔ میں ایک قدم پیچھے ہٹا اور میں نے ریسیور اٹھا لیا۔

"ہیلو۔۔۔" میں نے کہا۔

"سکندر۔۔۔" محسن کی آواز آئی۔ "کچھ بات بنی؟"

"تم تیار رہو۔" میں نے کہا اور فون رکھ دیا۔ یہ سب ۔۔۔ شدہ کوڈ تھے۔ میری بات کا مطلب یہ تھا کہ وہ فوراً روانہ ہو جائیں اور ایم ڈبلیو ڈی کمپلیکس کے باہر کسی گاڑی میں میرا انتظار کریں۔ گاڑی ان کے پاس نہیں تھی۔ ان کو حاصل کرنا تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ کسی صورت میں پونے بارہ بجے سے پہلے نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اس کا دوسرا مطلب یہ تھا کہ اب حشمت خان کے گھر کو بھی دھماکے سے اُڑنے سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔

ہم نے یہ بھی طے کر لیا تھا کہ غالب اور محسن کس وقت فون کریں گے اور کامیابی یا ناکامی کی صورت میں ان کا لائحہ عمل کیا ہو گا۔ بیڈی اس وقت مونگ پھلی اور اخبار بیچنے کی ڈیوٹی پر تھا اور مجھے یہ اطمینان ضرور حاصل تھا کہ نازو خیریت سے ہے۔ اس کا راز فاش نہیں ہوا اور وہاں سب کچھ پروگرام کے مطابق چل رہا ہے۔ یہ بات دلاور نہیں جانتا تھا مگر مجھے معلوم تھا کہ دھماکے سے قبل سراج کی ماں کو خود غالب اور محسن نے اس گھر سے نکال لیا ہو گا۔ خواہ انھیں بڑی بی کو زبردستی اُٹھا کے لے جانا پڑا ہو۔ ہم اپنی جنگ میں عورتوں بچوں کو نشانہ بنانا اخلاقی بزدلی سمجھتے تھے اور اگر وقت آ جاتا تو دلاور کے بیوی بچوں کو بھی خود دلاور کی زبانی گھر میں بم کی موجودگی کی اطلاع مل جاتی۔ حشمت خان کے بیوی بچوں کو بھی کوئی خطرہ نہیں تھا۔ انھیں دس منٹ پہلے بھی گھر سے نکالا جا سکتا تھا۔

فون کی گھنٹی پھر بجی۔ یہ فون غیر متوقع تھا۔ فیکٹری کے اندر پانچ لائنوں کا ایکسچینج تھا جو بند کر دیا گیا تھا مگر دلاور کے پاس ایک ڈائریکٹ لائن تھی۔ میں نے سوچنے میں وقت ضائع کیے بغیر ریسیور اُٹھا کے کہا۔ "ہیلو!"

"بھئی آج یہ کیا ہو رہا ہے؟" میرے کانوں نے ایک جانی پہچانی آواز بہت عرصے کے بعد سُنی۔ "یہ نامعقول چوکیدار ہمیں روکتا ہے کہتا ہے فیکٹری میں چھٹی ہے۔ اور اس کی خود سری دیکھو۔ ہماری نہیں مانتا کہ ابھی ہمیں چوہدری صاحب نے خود فون کر کے بلایا تھا۔"

"نواب خسرو جمشید۔" میں نے کہا اور ریسیور دلاور کو تھما دیا۔

"ہاں۔ کیا بات ہے جمشید؟" دلاور نے کہا۔ "ہاں ہاں۔۔۔ میں سمجھ گیا مگر تم نہیں سمجھے۔ تم ذرا فون چوکیدار کو دو۔۔۔ بیلا دوست۔" پھر چند سیکنڈ کا وقفہ آیا جس کے بعد دلاور نے چوکیدار کو حکم دیا کہ وہ نواب خسرو جمشید کو اندر آنے دے۔ "دونوں خواتین کے ساتھ۔" ان آخری الفاظ کا مجھ پر الیکٹرک شاک کی طرح اثر ہوا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا اور میری نظر دروازے پر جم گئی۔

دو منٹ بعد ایک گاڑی اندر آئی۔ اس کے چاروں دروازے بالترتیب کھلے اور بند ہوئے پھر میں نے رابعہ اور شہلا کو دیکھا۔ وہ سب سے آگے کمرے میں آئی تھیں۔ اندر کا نقشہ دیکھ کر ان کے قدم رُکے مگر سب سے زیادہ خسرو جمشید کو صدمہ پہنچا۔ وہ اپنی پرانی وضع میں تھا۔ سیاہ شیروانی۔ اونچے کلف لگے شملے والی دستار اور گھیر والی سفید شلوار۔ اس کی مونچھیں بھی پہلے کی طرح گھنی اور لمبی تھیں اور صحت مند کلین شیو، چہرے کا رنگ بھی سرخ و سفید تھا۔ اس کا ہاتھ جیب کی طرف بڑھا اور رک گیا۔ رابعہ اور شہلا کی صورت سے پریشانی عیاں تھی جو ایک قدرتی بات تھی اور وہ کچھ تھکی ہوئی بھی لگتی تھیں مگر اس کے علاوہ مجھے ان کی ظاہری حالت میں کوئی بات تشویشناک نہیں لگی۔

"تم دونوں اِدھر آ جاؤ۔" میں نے کہا۔ "اور آپ نواب صاحب قبلہ۔۔۔ اِدھر تشریف لے آئیے۔ اس صف میں بیٹھ جائیے۔ باادب، باملاحظہ، ہوشیار۔"

نواب خسرو جمشید کے ذہن نے بالآخر اس حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا کہ ان کا سپر مین باس دلاور اور استاد کہلانے والا پیڈرو مشین گن کے سامنے بے بس ہیں تو وہ کیا کر سکتے ہیں جو محض نواب ہیں۔ وہ وہیں بیٹھ گیا جہاں دیوار کے ساتھ پہلا آدمی ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔

"پہلے تو مجھے یہ بتاؤ کہ تم اصلی ہو یا نقلی؟" میں نے کہا۔

"ہم اصلی بھی ہیں اور نقلی بھی۔" خسرو جمشید بولا۔ "جس کی شناخت ہو وہ پہچان لے۔"

میں نے رابعہ اور شہلا کی طرف دیکھا۔ "تم ٹھیک ہو نا؟"

انھوں نے ایک ساتھ اقرار میں سر ہلایا۔

"تمھارے ساتھ کوئی زیادتی تو نہیں کی کسی نے؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ بس ہمیں باندھ کر رکھا گیا تھا۔" رابعہ نے کہا۔۔۔ وہ یقیناً مجھ سے اور بھی بہت کچھ پوچھنا چاہتی ہو گی مگر یہاں اس کا موقع نہیں تھا۔

"ٹھیک ہے چوہدری دلاور۔" میں نے کہا۔ "اب تم سب انسپکٹر حشمت خان کو فون کر دو۔ بم اس کے گھر کے ایک کمرے کی چمنی میں معلق ہے۔ اسے نکالنے اور ناکارہ بنانے کا وقت نہیں ہے، اس لیے گھر والے فوراً باہر نکل جائیں۔"

"حشمت خان!" چوہدری دلاور کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ "وہ تو خود بھی گھر پر ہو گا۔" وہ فون کی طرف لپکا۔

"گویا تم کو اس کی ڈیوٹی کا شیڈول بھی معلوم ہے۔" میں نے کہا۔

دلاور نے بڑی گھبراہٹ میں نمبر ملایا۔ "حشمت! میں دلاور بول رہا ہوں۔ سنو اسی وقت گھر سے نکل جاؤ۔۔۔ پاگل کے بچے تمھارے گھر میں ایک ٹائم بم رکھا ہوا ہے جو سات منٹ بعد پھٹ جائے گا۔۔۔ تمھارے باپ سکندر بخت نے رکھا ہے۔ سراج کے گھر میں پھٹ چکا ہے اور اس سے پہلے گلوب سینما والی کوٹھی میں۔ ہاں ہاں میں تصدیق کر چکا ہوں۔۔۔ دیر کرو گے تو مارے جاؤ گے۔۔۔" اس نے ریسیور رکھ دیا۔ اس وقت تک نواب خسرو جمشید کی صورت

پر بارہ بج چکے تھے۔

"اب ہم چلتے ہیں،" میں نے دلاور سے کہا "تمھارے بیوی بچّوں کی سلامتی کا دارومدار تمھارے رویّے پر ہے۔ اگر ہمارا راستہ نہ روکا گیا اور کسی نے ہمارا پیچھا نہ کیا تو ہم دس منٹ بعد تم کو بتا دیں گے کہ ہم کہاں ہے۔ تم کو بہت وقت ملے گا ہم کو ناکارہ بنانے کے لیے لیکن ہمیں شک ہوا کہ تم نے کوئی چکّر چلایا ہے تو ہم فون نہیں کریں گے۔ ایک گھنٹے بعد تم دنیا میں اکیلے رہ جاؤ گے...

ہم نواب خسرو جمشید کی گاڑی میں جائیں گے... رابعہ تم استاد پیڈرو کا ریوالور اٹھا لو۔" میں نے ایک کونے کی طرف اشارہ کیا "اور شہلا کے ساتھ جا کے گاڑی میں بیٹھو۔ تم ڈرائیور کے پیچھے رہو گی اس کے سر کا نشانہ لے کر بیٹھو گی۔ شہلا درمیان میں ہو گی... پھر میں اور آگے دوسری سیٹ پر پیڈرو ہو گا۔"

"میں نہیں جاؤں گا۔" پیڈرو چلّایا۔ اس کی آواز میں احتجاج تھا فریاد تھی کہ مجھے دشمنوں کے حوالے مت کرو... خوف تھا اور بے بسی تھی۔

"تم سے کسی نے پوچھا نہیں ہے کہ چلو گے یا نہیں۔" میں نے کہا۔ اتنی دیر میں رابعہ نے ریوالور اٹھایا اور شہلا کو ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔

"دلاور! تم چپ کھڑے ہو۔" پیڈرو نے چیخ کر کہا مگر اس کی آواز صدا بہ صحرا ثابت ہوئی۔ دلاور دوسری طرف دیکھتا رہا۔

"سوّر کے بچّے... حرام زادے... یہی صلہ ہے میری نیکی کا۔ جو میں نے تیرے ساتھ کی...؟" پیڈرو پھر چلّایا۔

"نیکی!" میں نے قہقہہ مارا۔ "اوّل تو وہ نیکی نہیں تھی۔ کسی چور ڈاکو کی مدد نیکی نہیں کہلاتی۔ اس کے علاوہ یہ تو تمھاری بے وقوفی تھی کہ تم نے نیکی کر کے کچھ کیا تو کس کے لیے... سانپ کو دودھ پلاؤ گے تو کیا وہ ڈسنا چھوڑ دے گا۔ اور اسے صلہ دینا ہو تب بھی اس وقت وہ خود مجبور ہے۔ وہ تمھیں جواب تک تو دے نہیں سکتا۔"

"نہیں... تم مجھے نہیں لے جا سکتے... دلاور... مجھے بھی تو نے چھوڑ دیا؟ ان سب کی طرح جو... تیرے زر خرید تھے۔" پیڈرو اب پاگل ہونے کے قریب تھا۔ اس صورتِ حال نے مجھے چکرا دیا۔ کیا واقعی یہ ڈراما نہیں تھا؟... دلاور سچ مچ اپنے دستِ راست سے محرومی کے فیصلے کو قبول کر چکا تھا۔ کیا دلاور کو ڈر نہیں کہ وہ ہماری تحویل میں ہو گا تو سارے راز کھول دے گا۔

"تم اگر نہ جانا چاہو تو تمھیں کون لے جا سکتا ہے۔" دلاور نے اچانک بے حد پُرسکون اور جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔

"کیا؟... تو مجھے... تو چاہتا ہے کہ میں...؟ دلاور، میں ایسا نہیں کر سکتا۔" انتہائے خوف سے پیڈرو کی آنکھیں پھیل گئیں اور اس کا رنگ لاش کی طرح سفید پڑ گیا۔

"بزدل! کیا تم نے سوچا نہیں تھا کہ یہ وقت بھی آ سکتا ہے" دلاور نے نفرت اور حقارت سے کہا۔ "تم سے پہلے بھی لوگوں کے سارے راستے بند ہو گئے تھے تو انھوں نے آخری راستہ اختیار کیا۔ مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی کہ تم ان معمولی حیثیت کے لوگوں سے کم ہمت ہونے کا ثبوت دو گے۔ یہ تمھاری لاش لے جا سکتے ہیں، تم کو کیسے لے جا سکتے ہیں۔"

"نہیں۔" پیڈرو پاگلوں کی طرح چیخنے لگا۔ "میں زندہ رہنا چاہتا ہوں... میں مرنا نہیں چاہتا۔ میں ان کے ساتھ مل جاؤں گا۔ انھیں وہ سب بتا دوں گا جو مجھے معلوم ہے۔ ان سے اپنی زندگی کا سودا کر لوں گا۔ میں خودکشی نہیں کروں گا دلاور۔" دلاور کا چہرہ تاریک ہو گیا۔

یکلخت ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔ دلاور بے بس تھا۔ پیڈرو کو نہ جانے دیتا مگر وہ جانتا تھا کہ پیڈرو جو آج تک ہمّت کی آزمائش سے کامراں گزرا تھا۔ زندگی اور موت کے کھیل سے بے خوف گزر رہا تھا اور وفاداری کے ہر امتحان سے کامیاب نکلا تھا آج بھی اس کی توقعات پر پورا اترے گا اور اتنی ہی آسانی سے جان سے گزر جائے گا مگر عین وقت پر دلاور کے سامنے پیڈرو کی شخصیت کا وہ روپ سامنے آ گیا جو اس نے آج تک نہ دیکھا تھا۔ یقیناً اس کے دانتوں کے کسی خلا میں کوئی زہر قاتل تھا جس کو دلاور نے آخری راستہ قرار دیا تھا۔ اس نے پیڈرو کو بتا دیا تھا کہ میں تمھاری مدد نہیں کر سکتا اور اب تمھیں مر جانا چاہیے۔ اس سے پہلے اگر پیڈرو کے لیے جان کے طلب گار مرحلے آئے تھے تو اس میں زندگی کے بھی پچاس فیصد امکانات تھے۔ تھے تو چالیس فیصد تھے یا تیس فیصد تھے مگر آج یہ امکانات گھٹ کر صفر فیصد رہ گئے تھے تو پیڈرو کا حوصلہ جواب دے گیا تھا۔ جانتا تھا کہ میرے ساتھ جانا جلّاد کے ساتھ پھانسی کے تختے کی طرف جانے سے بھی بدتر ہے۔

"اٹھو پیڈرو!" میں نے کہا۔ "شاید تم مجھے دلاور سے زیادہ فراخ دل پاؤ... شاید میں تمھیں معاف کر دوں۔ تمھارے پاس مجھے دینے کے لیے کوئی ایسی چیز ہو جس کے بدلے تم مجھ سے زندگی کا سودا کر سکو۔"

پیڈرو نے دیوار کا سہارا لیا اور کھڑا ہو گیا۔ میں ایک دم پلٹ گیا اور الٹے پاؤں دروازے کی طرف بڑھا۔ آہستہ آہستہ پیڈرو میرے پیچھے چلتا گیا۔ اس وقت تک رابعہ اور شہلا گاڑی کی پچھلی نشست پر بیٹھ چکی تھیں اور نواب خسرو جمشید کا ہمشکل ڈرائیور جو خود نواب بھی ہو سکتا تھا بالکل منجمد بیٹھا نظر آ رہا تھا۔ یقیناً اس کے سر کے پیچھے رابعہ کا ریوالور تھا۔

"شاباش... آگے آؤ..." میں نے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ پیڈرو ایک ٹانگ پر اچھلتا کراہتا آگے بڑھا۔ وہ اس وقت ایک خوف ناک پاگل نظر آ رہا تھا۔ دروازے تک پہنچ کے اس نے دلاور کی طرف دیکھا۔

"لعنت تم پر... تم سب پر..." پیڈرو چلّایا اور میں پیچھے ہٹتے ہٹتے گاڑی کے دروازے تک پہنچ گیا۔ پھر وہ ہوا جس کے لیے میں ذہنی طور پر بالکل تیار نہیں تھا۔ پیڈرو ایک دم کمرے کے اندر گرا اور دیوار کی اوٹ میں ہو گیا۔ کسی نے دروازے کو دھڑ سے بند کر دیا۔ میرے ہاتھ نے مشین گن کا ٹریگر دبا دیا۔ دروازے میں سوراخ ہی سوراخ ہو گئے مگر اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوا۔ اندر رہ جانے والے جانتے تھے کہ کیا ہونے والا ہے۔ وہ سب دروازے کے سامنے سے ہٹ گئے تھے۔

یکلخت مجھے احساس ہوا کہ میں خالی ہاتھ دشمنوں کے قلعے میں کھڑا رہ گیا ہوں۔ کسی طرف سے آنے والی کوئی بھی گولی میرے جسم میں اتر سکتی تھی۔ یہ بات دشمن بھی جانتے تھے کہ مشین گن کی ہلاکت خیزی ختم ہوئی۔ اب جو کچھ تھا وہ ریوالور تھا جو رابعہ کے ہاتھ میں تھا مگر ریوالور تو دلاور کی دراز میں بھی تھا۔ اس کے پی اے کی دراز میں بھی ہو گا۔ نہ جانے کس کس کے پاس ہو گا۔ یہ تو وہ اسلحہ خانہ تھا جہاں سب کچھ بن رہا تھا اور ہزاروں میل دور پہنچانے کے لیے ذخیرہ کیا جا رہا تھا۔ اس اسلحے سے بھرے ہوئے قلعے میں ایک ریوالور ایسے ہی تھا جیسے ریوالور کے مقابلے میں غلیل۔ میں ایک دم دوڑ کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ میں نے دلاور کو چلاتے سنا۔

"چلو... گاڑی چلاؤ۔" میں نے چلا کر کہا۔

نواب خسرو جمشید کے نقشِ ثانی نے سر گھمایا اور مسکرا کے مجھے دیکھا۔

"میں صرف تین تک گنوں گی۔" رابعہ نے پیچھے سے ریوالور کی نال اس کی گردن پر رکھ دی۔ "ایک... دو..." مگر میرے ہاتھ اس سے پہلے ہی حرکت میں آ چکے تھے۔ میں نے نواب خسرو جمشید یا اس کے بھیس والے ڈرائیور کے سر پر مشین گن کا دستہ مارا... وہ گرنے لگا تو میں نے دروازہ کھول دیا اور وہ باہر لڑھک گیا۔

اس کمرے میں جہاں دلاور، پیڈرو اور دوسرے سات افراد بند تھے نہ جانے کیا کارروائی ہو رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اتنی دیر میں دلاور نے گیٹ کیپر کو فون یقیناً کر دیا ہو گا کہ دروازہ نہ کھولے۔ مجھ سے ایک غلطی یہ ہوئی تھی کہ میں نے فون دوبارہ لگوا کے روانگی سے قبل ناقابلِ استعمال نہیں بنایا تھا۔ اب دلاور فیکٹری کے اندر اور باہر ہر جگہ سب کو ہمارا راستہ روکنے کے احکامات جاری کر رہا ہو گا۔ پولیس کو بتا رہا ہو گا کہ مطلوبہ مجرم کہاں ہیں۔ غصّے اور انتقام کی آگ اسے جلا رہی ہو گی۔ پولیس کے پہنچنے کی مجھے فکر نہیں تھی۔ ان کو قریب ترین پولیس اسٹیشن سے سو گز دور بھی جانا ہو تو وہ آدھا گھنٹا ضرور لیتے ہیں مگر اندر کے دشمنوں کا ہوشیار ہو جانا اور ہمارا ان کے نرغے میں آ جانا انتہائی سنگین صورتِ حال پیدا کر سکتا تھا۔

پہلا فائر کسی نے اس وقت کیا جب میں گاڑی اسٹارٹ کر چکا تھا۔ میں نے گاڑی کو نصف دائرے میں یوٹرن دیا تو ایک منڈیر سی آ گئی جس کے بعد پھولوں کی ایک فٹ چوڑی اور آخر تک پھیلی ہوئی کیاری تھی۔ گاڑی اس سے ٹکرا کے اچھلی اور منڈیر کو توڑتی ہوئی پھولوں پر سے گزر گئی۔ اگر یہ نواب خسرو جمشید کی مرسیڈیز نہ ہوتی تو شاید اس رکاوٹ کو عبور نہ کر پاتی۔ کیاری کی کچی زمین بہت نرم تھی لیکن طاقتور انجن کی قوت نے پہیّوں کو دھنسنے نہیں دیا۔ پھر بیک وقت دو فائر ہوئے جن میں سے ایک سامنے والے حصّے میں بونٹ پر لگا۔ میں نے اپنے سامنے چھوٹے چھوٹے گملے دیکھے۔ مرسیڈیز ان کو چورا کرتی گزری تو لان آ گیا۔ جس میں مالی نے پانی دے رکھا تھا۔ میں نے رفتار ایک دم بڑھائی تو گاڑی گھوم گئی مگر پھر ایک جست میں لان کو عبور کر گئی۔

رابعہ نے پیچھے سے فائر کیا اور میں نے ایک بیرک سے دوڑ کر باہر آنے والے پہلے شخص کو گرتے دیکھا۔ رابعہ کا نشانہ بہت اچھا نہیں تھا مگر اس شخص کی قضا آ چکی تھی کہ گولی خود اس کی طرف چلی گئی۔ دوسرا شخص بائیں جانب سے مشین گن کے ساتھ نمودار ہوا۔ رابعہ نے پھر فائر کیا مگر اس سے قبل ہی میں نے گاڑی کا رُخ سیدھا اس کی جانب کر دیا تھا۔ اس نے دس گز کے فاصلے سے مرسیڈیز کو یوں دیکھا جیسے کھلے میدان میں آدمی سر پر آ جانے والے بمبار طیارے کو دیکھتا ہے۔ مرسیڈیز کی رفتار اتنی زیادہ تھی کہ وہ مشین گن پھینک کر بھاگا۔ اس کے دونوں ہاتھ اوپر اٹھے رہ گئے ــــ پھر کسی خون آشام درندے کی طرح مرسیڈیز نے اسے روند دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ گاڑی میرے کنٹرول سے باہر ہو چکی ہے۔ پیچھے سے رابعہ اور شہلا مسلسل چیخ رہی تھیں مگر میں اندھا اور بہرا ہو چکا تھا۔ فیکٹری کے گیٹ کو بھی میں نے اس وقت دیکھا جب درمیانی فاصلہ پچاس گز بھی نہیں رہا تھا۔ میں نے سر کو جھکا کے اسٹیئرنگ کو مضبوطی سے تھام لیا۔ دوسرے لمحے ایک خوفناک دھماکا ہوا۔ میں نے خود کو اوپر اٹھتا اور پھر ایک جھٹکے سے نیچے آتا محسوس کیا۔ گاڑی دروازے کو توڑ کر باہر نکل آئی تھی۔ دونوں فولادی گیٹ اکھڑ گئے تھے۔ ان میں سے ایک مرسیڈیز کے پچھلے حصّے پر گرا۔ میرے کانوں نے مشین گن کے مسلسل فائر سنے لیکن میں نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ گاڑی میرے قابو میں آ چکی تھی اور ابھی تک رواں تھی۔ آگے بڑھ رہی تھی۔ میں زندہ تھا۔ رابعہ اور شہلا زندہ تھیں اور ہم ہر لمحہ موت سے دور ہوتے جا رہے تھے۔

بن روڈ تک کا راستہ شاید دو سو گز تھا لیکن اس وقت یہ فاصلہ زندگی کی سرحد کا سفر بن گیا جو حدِ افق سے بھی دُور لگتی تھی۔ نہ مجھے اپنا ہوش تھا۔ نہ یہ خیال تھا کہ رابعہ اور شہلا کس حال میں ہیں۔ گاڑی کو میں کیا دیکھتا کہ اس کا حشر کیا ہوا۔

"سکندر!" رابعہ نے ایک دم میرا کندھا ہلا کے اور میرے کان میں چیخ کر کہا۔ "گاڑی روکو... وہ دیکھو محسن اور غالب دوسری گاڑی لیے کھڑے ہیں۔"

"سکندر بھائی۔" شہلا چلّائی۔ "اس گاڑی سے دھواں اٹھ رہا ہے۔"

میں نے جسم کی تمام قوت بریک دبانے میں صرف کر دی۔ گاڑی کے پہیے جام ہو گئے۔ نیم پختہ سڑک پر ٹائر زبردست رگڑ کے ساتھ بڑھتے گئے۔ پھر جیسے زلزلہ گزر گیا۔ کائنات جو تہ و بالا ہو رہی تھی ساکت ہو گئی۔ سمندروں کا طوفانی مد و جزر ختم ہو گیا اور شورِ قیامت تھم گیا۔ میں نے محسن اور غالب کو دوڑ کر آتے دیکھا... میں اپنا سر اسٹیئرنگ پر رکھے سوچ رہا تھا کہ میں کتنا تھک گیا ہوں۔ مجھ میں حرکت کی ہمت بھی نہ رہی تھی۔ اسی وقت دروازہ کھلا اور محسن نے مجھے کھینچ لیا۔ وہ مجھے کندھے پر ڈال کے دوڑنے لگا۔ چند سیکنڈ میں اس نے مجھے کندھے پر سے اتار کے سیدھا دوسری گاڑی کے کھلے دروازے میں پھینکا۔ دروازہ بند ہوا اور گاڑی چل پڑی تو میں نے دیکھا کہ میرے ساتھ پچھلی سیٹ پر رابعہ اور شہلا بھی ہیں۔ وہ دونوں زخمی تھیں اور بے ہوش تھیں۔

میں خود بھی ہوش میں نہیں تھا مگر دھماکا ہوا تو میں نے پلٹ کر دیکھا۔ مرسیڈیز کی جگہ ایک الاؤ بھڑک رہا تھا۔ اس میں پٹرول ٹینک کے پھٹتے ہی آگ لگ گئی تھی۔ میرے کانوں میں ابھی تک مشین گن کے فائروں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ اس آدمی کی چیخ گونج رہی تھی جسے میں نے روند ڈالا تھا۔ مرسیڈیز اس کے لہو گوشت اور ہڈیوں کو پیستی ہوئی اور سڑک پر پھیلاتی ہوئی گزر گئی تھی۔ میں وہ دھماکا سُن رہا تھا، جو بند فولادی گیٹ کے ٹوٹنے سے ہوا تھا۔ وہ سب پیچھے رہ گیا تھا مگر ہنوز میرے تصور کے ساتھ تھا۔ میرے خیال میں زندہ تھا۔ ایک آسیب بن گیا تھا۔ گاڑی سیدھی جا رہی تھی۔ دوسری بہت سی گاڑیوں کو پیچھے چھوڑتی۔ اسے محسن چلا رہا تھا۔ آہستہ آہستہ میں زندگی کے یقین کی طرف لوٹنے لگا۔ پھر ہوش میں آنے لگا اور بالآخر سب کچھ دیکھنے، سننے اور سمجھنے لگا۔

"یہ... یہ دونوں زخمی ہیں۔" میں نے غالب کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا جو اگلی سیٹ پر مطمئن بیٹھا تھا۔

"اور خود تم کیا ہو۔ ذرا آئینے میں دیکھو۔" غالب نے بیک ویو مرر کا رخ میرے مقابل کر دیا۔ میں اپنا چہرہ دیکھ کر ڈر گیا۔ اس پر خون ہی خون تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اب تک کسی [illegible] تکلیف مجھے محسوس کیوں نہیں ہوئی تھی۔ گاڑی اب لاہور کی حدود میں داخل ہو چکی تھی۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں غالب؟" میں نے کہا۔

"ہم وہاں جاتے ہیں جہاں تقدیر ہمیں لے جاتی ہے۔ پھر ایک گھر لیا ہے بے گھر ہونے کو۔" غالب نے کہا۔

"تم بہت وقت پر پہنچے۔" میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ اور رابعہ اور شہلا کو دیکھا۔ ان کے چہروں پر خراشیں بالکل ویسی ہی جیسے میرے چہرے پر تھیں۔ یہ گاڑی کے ریزہ ریزہ ہو جانے والے شیشے سے آئی تھیں اور اگر میں نے سر نہ جھکایا ہوتا تو شاید اندھا ہو جاتا۔

"تم نے بہت دیر کی۔" غالب بولا۔ "ہم تو مایوس ہو کر کچھ کرنے والے تھے۔ تخت یا تختہ۔"

"کم سے کم فون پر تو بتا دینا تھا کہ تمہیں مدد کی ضرورت ہے۔" محسن بولا۔

"محسن!" میں نے اچانک چلّا کے کہا۔ "فون... دلاور کو فون کرنا ہے۔ صرف پندرہ منٹ رہ گئے ہیں۔"

"تو نے اسے بتایا نہیں؟" محسن نے ایک دم پلٹ کر کہا۔ میں نے نفی میں سر ہلایا اور محسن نے گاڑی کو ایک پٹرول پمپ پر موڑ لیا۔ جتنی دیر میں اس کا ٹینک فل ہوا محسن کیشئر کے پاس جا کے لوٹ آیا۔ اس نے رقم ادا کی اور گاڑی نکال لے گیا کیونکہ پٹرول ڈالنے والا پیچھے کی سیٹ پر بے ہوش اور زخمی پڑی ہوئی دو عورتوں کو اور ایک مرد کو انتہائی شکوک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"بات ہو گئی؟" میں نے کہا اور محسن نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

"میں نے دلاور کے گھر اور دفتر دونوں جگہ فون کر دیا تھا۔" محسن نے کہا۔ "وہ خود تو ملا نہیں۔ شاید راستے میں ہو گا۔ اس کی بیوی کو بتا دیا۔"

"اس نے یقین بھی کیا؟" میں نے پریشانی سے کہا۔

"کیا ہی ہو گا۔ وہ ایک دم چیخنے چلّانے لگی تھی۔" محسن بولا۔

"وہ اعصابی مریض ہے۔ پاگل نہ ہو گئی ہو۔" میں نے کہا۔ "دلاور کے بچے مارے جائیں گے اگر اس نے کچھ نہ کیا۔"

"خطرہ ہو تو جانور بھی بچوں کو محفوظ مقام پر منتقل کر دیتا ہے۔ وہ پاگل ہے تو کیا... ایک ماں بھی ہے۔" محسن نے کہا مگر اس کے جواب سے میری تشفی نہیں ہوئی۔ خدا کرے دلاور وقت سے پہلے گھر پہنچ جائے اور اس کی بیوی ہی ٹیلی فون پر ملنے والے پیغام کے بارے میں بتا دے۔

"ایس پی سراج اور حشمت خان کے گھر میں کیا ہوا؟" میں نے کہا۔

"دھماکا۔" غالب بولا۔ "صرف حشمت خان کے مارے جانے کی اطلاع ہے۔ باقی سب بچ گئے۔ گھر تباہ ہو گئے۔"

"اس پٹرول پمپ والے نے گاڑی کا نمبر نوٹ کر لیا ہو گا؟" محسن نے اچانک کہا۔ گاڑی جو مال روڈ پر دوڑ رہی تھی موڑ کاٹ کے ایک کوٹھی میں داخل ہوئی اور پورچ میں رک گئی۔ وہ خاصی پرانی اور ویران کوٹھی تھی۔ "تم سب نکلو۔" محسن نے کہا۔ "تم اور غالب دونوں..... لڑکیوں کو اٹھا کے اندر لے جاؤ۔ میں گاڑی کو کہیں چھوڑ کے آتا ہوں۔"

غالب آگے سے اترا اور میں پیچھے سے ایک طرف۔ ہم نے پیچھے کے دونوں دروازے کھولے۔ رابعہ کو دوسری طرف غالب نے کھینچ لیا اور شہلا کو میں نے۔ پھر ہم نے لات مار کے دروازے بند کیے اور محسن گاڑی کو ریورس گیئر میں لے گیا۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ وہ فورڈ کار تھی۔ چھ سلنڈر والی ساٹھ کے ماڈل کی زیفر... کسی سے چھینی ہوئی۔

"میاں کھڑے کیوں ہو... اندر چلو۔" غالب بولا۔ "اپنا ہی گھر سمجھو اسے۔"

"اپنا گھر۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "ایسے کہہ رہے ہو جیسے تمہارے باپ کا گھر ہو۔ آگے چلو۔"

"ہاں... یہ میرے باپ کا ہی گھر ہے۔" غالب نے کہا۔ "یہاں میں پیدا ہوا تھا۔" اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ "اس کا مالک میرا باپ تھا۔"

اس حالت میں بھی غالب کی بات نے میرے ذہن کو جھنجھوڑ دیا۔ مجھے وہ سب یاد آگیا جو ڈاکٹر لطیف نے بتایا تھا۔ غالب ایک کمرے میں داخل ہو گیا۔ "تم... تم نے تو یہ گھر چھوڑ دیا تھا۔" میں نے کہا اور شہلا کو ایک پرانے بیڈ پر لٹا دیا جس پر صاف اور نئی چادر تھی۔ غالب نے رابعہ کو اسی بیڈ پر شہلا کے ساتھ لٹا دیا۔

"ہاں، میں نے بن باس لے لیا تھا۔ مہاتما بدھ کی طرح۔ میں اپنے محل سے نکل گیا تھا۔" غالب اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا۔ "گھر ہو یا محل... سب دیواروں کے حصار ہوتے ہیں۔ دیواریں تو جیل کی بھی ہوتی ہیں۔ فرق صرف تعلق کا ہے۔ پیار کرنے والی دیواریں نہ ہوں تو اس کو گھر نہیں سمجھا جا سکتا۔ ان دیواروں کو مجھ سے اور مجھے ان دیواروں سے کوئی پیار تھا ہی نہیں تو میں ان کے درمیان کیسے رہتا۔"

"پھر اب اس زنداں میں کیوں لوٹ آئے ہو...؟" میں نے طنز سے کہا۔

"اب یہ گھر ہے۔ پیار ہے یہاں۔" غالب نے کہا۔ "تم اور رابعہ، محسن اور شہلا... ہم سب پیار ہو۔ پیار تم سے ہے اور تم پیار سے ہو۔"

"اور نازو... وہ کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"وہ میں ہوں۔" غالب ہنسا۔ "مجھے تم جو چاہو سمجھو۔ محسن آ جائے تو کسی ڈاکٹر کو بلائیں۔"

"کیا ان کی حالت زیادہ تشویشناک ہے؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ ہوش میں تو یہ آ جائیں گی۔" غالب بولا۔ "مگر ان کو کچھ سکون آور ادویات کی اور کچھ مرہم پٹی کی ضرورت تو ہو گی۔"

"تم وہاں سے سب سامان نکال لائے ہو؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ صرف اپنی جان سلامت لے آئے ہیں۔" غالب بولا۔ "یہ بھی کیا کم غنیمت ہے؟ ہم وہاں کیسے رہ سکتے تھے۔ نقد رقم اب ختم ہو رہی ہے۔"

"ویسے تو میرے پاس دس ہزار ہیں۔" میں نے کہا۔ "مگر اپنے استاد ٹیڈی کا مدفون خزانہ بھی تو محفوظ پڑا ہے۔"

"ہاں سب کسی دن نکال کے لانا ہی پڑے گا۔" غالب بولا۔ اسی وقت باہر ایک رکشا آ کے رکا۔ میں نے باہر نکل کر دیکھا تو محسن ایک ڈاکٹر کے ساتھ اتر کے اندر آ رہا تھا۔ ڈاکٹر بہت عجیب چیز تھا۔ اور اپنے مضحکہ خیز لباس سے کسی سرکس کا جوکر لگتا تھا۔ محسن نے بعد میں بتایا کہ وہ تیس سال تک ایک سرکاری اسپتال میں کمپاؤنڈر رہا اور اب نجی پریکٹس کرتا ہے۔ اس نے ڈریسنگ بڑی مہارت سے کی اور دونوں لڑکیوں کو دو دو انجکشن بھی لگائے۔ ایک نسلے ٹی ایس" کا اور دوسرا سکون آور۔ یہی سلوک وہ میرے ساتھ کرنا چاہتا تھا، مگر میں نے کہا کہ سکون آور انجکشن وہ کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھے۔ اس نے محسن سے دو سو روپے لیے اور سلام کر کے رخصت ہو گیا۔ اس نے زخموں کی نوعیت اور ان کے اسباب کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا کیونکہ سو روپے محض زبان بند رکھنے کے لیے تھے اور میرے خیال میں رازداری کی یہ فیس بہت کم تھی۔ مستند ڈاکٹر ہوتا تو یہی کام ہزار لے کر بھی نہ کرتا۔

اُجڑی ہوئی کوٹھی کے صرف دو کمرے قابلِ رہائش بنائے گئے تھے۔ اس حد تک کہ بستر جھاڑ کر بچھا دیے گئے تھے ورنہ فرش پر برسوں کی دھول اسی طرح موجود تھی۔ چھت میں پرندوں کے گھونسلے قائم تھے اور دیواروں کے گوشوں میں مکڑیوں کے جالے تنے ہوئے تھے۔ دوسرے کمروں میں کیا تھا، یہ دیکھنے کی ابھی نہ ضرورت تھی اور نہ فرصت۔ ان دو کمروں کے علاوہ کچن اور باتھ روم کو بھی استعمال کے قابل بنا لیا گیا تھا مگر مردانہ ہاتھوں کے لیے صفائی کا عمل مشکل کام تھا۔ پوری کوٹھی کی جھاڑ پونچھ اور صفائی رابعہ اور شہلا کے لیے بھی مہینہ بھر کی مشقت تھی۔ محسن نے اسی کچن میں چائے بنائی اور ثابت کیا کہ چولہا اب بھی جلتا ہے۔ تاہم پانی کی موٹر کے بارے میں اس نے افسوس سے مجھے مطلع کیا

کہ جام ہوگئی ہے اور جو پانی اوپر والے ٹینک میں تھا وہ برسوں میں بخارات بن کے اُڑ گیا ہے۔ جو انڈر گراؤنڈ ٹینک میں ہے، وہ گندہ ہے اور ٹینک کی صفائی کیے بغیر اس کو بھی استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم باہر باغ کے ایک نل سے براہِ راست کارپوریشن کا تازہ اور صحت بخش پانی حاصل ہوتا ہے۔ ٹونٹی جام ہو چکی تھی مگر اسے پلاس کی مدد سے کھول لیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ عقبی حصے میں ایک ہینڈ پمپ بھی تھا جس کا واشر سوکھ چکا تھا۔ غالباً تیل دینے کے بعد وہ بھی پانی اُگلنے لگا۔

"ہم ابھی تو سامنے کے حصے سے داخل ہونے پر مجبور تھے مگر آئندہ ہماری آمد و رفت عقبی حصے سے ہوگی۔" محسن نے کہا۔ "کسی کو بھی معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ کئی سال تک غیر آباد رہنے والی کوٹھی میں کوئی آگیا ہے۔"

"کوئی کا کیا مطلب ہے؟" غالب نے ڈانٹ کر کہا۔ "صاحبِ خانہ تشریف لے آئے ہیں۔ ہم کوئی ایرے غیرے نتھو خیرے نہیں، کوٹھی والے ہیں۔"

"ہم نے اندر کے دو کمروں کا انتخاب کیا ہے۔" محسن نے اس کی بات سُنے بغیر اپنی بات جاری رکھی۔ "بیرونی کمروں کے کھڑکی دروازے بند رہیں گے۔ آج ہم ایسا انتظام بھی کر لیں گے کہ رات کو لائٹ جلے تو روشنی باہر نہ جائے۔ جب تک نازو کا مشن مکمل نہیں ہو جاتا، ہم اسی طرح چھپ کر رہیں گے۔ حتی الامکان دن میں باہر نکلنے سے گریز کریں گے اور ناگزیر ہوا تو پیچھے سے جائیں گے۔"

"میری ایک بہت اچھی تجویز کو محسن نے ویٹو کر دیا۔ صرف اس لیے کہ وہ میرے ذہن میں آئی تھی۔" غالب نے شکایت کی۔ "میرا مشورہ تھا کہ ہم خانہ بدوش یا فقیروں کا کنبہ بن جائیں اور یوں رہیں جیسے ویران کوٹھیوں میں ناجائز قابضین رہتے ہیں۔"

"اور اس تجویز کو محسن نے مسترد کر دیا؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔ "میں اس کے ویٹو کو ویٹو کرتا ہوں۔ یہ تو چھپ کر رہنے اور آزاد رہتے ہوئے پھرنے کے لیے مناسب ترین طریقہ ہے۔ ہم خانہ بدوشوں کا قبیلہ بن سکتے ہیں کیونکہ ہم واقعی بے گھر لوگ ہیں۔"

کافی پیتے ہوئے میں نے محسن اور غالب کو دلاور سے ملاقات کا احوال سنایا۔ رابعہ اور شہلا سوتی رہیں۔ دوپہر کے کھانے کا وقت ہوا تو غالب نے ناشتے کو دُہرایا یعنی سلائس، آملیٹ اور چائے پیش کی۔ پیٹ بھرنے کے لیے سب غنیمت تھا کیونکہ اس وقت کوئی بھی باہر جانا نہیں چاہتا تھا۔ پھر میں نے نازو کی خیریت معلوم کی۔

"نازو اپنی ڈیوٹی پر ہے۔" محسن بولا۔ "اور موٹو گیلی والا اپنی ڈیوٹی دے رہا ہے۔"

"آج رات وہاں جو خفیہ میٹنگ ہونے والی ہے اس سے بہت کچھ معلوم ہوگا۔" غالب نے کہا۔ "ہم سب آس پاس ہوں گے اور اندر ہونے والی گفتگو سنیں گے۔ یہ بھی دیکھیں گے کہ وہاں کون کون آتا ہے اور..."

میرا جملہ ادھورا رہ گیا۔ قدموں کی آہٹ پر میں نے پلٹ کر دیکھا تو مجھے تین آدمی نظر آئے۔ ان کے ہاتھ میں رائفلیں تھیں۔ انھوں نے چہروں پر ڈھاٹے باندھ رکھے تھے۔

تینوں نے پہلے نو واردوں کو اور پھر ایک دوسرے کو ہم سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ان حالات میں سب سے پہلے یہ خیال آتا ایک فطری امر تھا کہ یہ تینوں بھی تنکاری میں جو ہمارے تعاقب میں تھے یا کسی طرح ہمارا سراغ لگا کے یہاں تک آ پہنچے تھے۔ لیکن یہ خیال ایک بے بنیاد اندیشے سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔ کسی نے پیچھا کیا ہوتا تو ہمارے ساتھ ہی یہاں قدم رنجہ فرماتا۔ رونمائی کے لیے اتنی دیر انتظار نہ کرتا۔ میں یہ بھی خاصے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ فیکٹری سے دلاور یا اس کے کسی پالتو کتے کا ہماری بو سونگھتے ہوئے یہاں تک آنا محال بلکہ ناممکن تھا۔ ہم جس گاڑی میں فیکٹری کا گیٹ توڑ کے نکلے تھے وہ نواب خسرو جمشید کی تھی مگر وہ گاڑی جل کر کوئلہ ہو چکی تھی۔ باقی سفر ہم نے دوسری گاڑی میں جلیبی سے زیادہ سیدھے راستے پر کیا تھا اور محسن اس گاڑی کو بھی بہت دور چھوڑ آیا تھا چنانچہ اس دعوے میں مبالغہ نہ تھا کہ اب کوئی کتا ہماری بو بھی نہیں پا سکتا تھا۔

"وہ... محسن... کیا یہ تیرے سسرالی رشتے دار ہیں؟" غالب نے سب سے پہلے محسن کو ٹھوکا دیا۔

"پتا نہیں یار..." محسن چونکا۔ "ہو بھی سکتے ہیں۔ نئی نئی شادی ہے نا... ابھی سب کو نہیں پہچانتا میں۔"

"ایک کی صورت میرے پرنانا کے سلسلے سے ملتی ہے۔" میں نے کہا۔ "مرحوم نے ایسی ہی بندوق سے خودکشی فرمائی تھی۔"

"بکواس بند کرو اپنی۔" ان میں سے ایک نے گرج کے کہا۔ "ٹھیک ٹھیک بتاؤ کہ تم کون ہو؟"

غالب نے ایک سرد آہ بھری۔ "پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے؟"

"یہ خود کون ہیں یار؟" محسن بولا۔ "بالکل اصلی ڈاکو لگتے ہیں۔"

"حالانکہ یہ سب میک اپ کا کمال ہے۔" میں نے سر ہلایا۔ "غالباً کسی فلم کی شوٹنگ ہو رہی ہے۔"

"ہم اصلی ڈاکو ہیں۔" دوسرا نقاب پوش چلّایا۔ میرے الزام سے اس کی انا سخت مجروح ہوئی تھی۔

"میرے پرنانا کا سالا بھی اصلی ڈاکو تھا۔" میں نے خوش ہو کے کہا۔ "ایسی ہی بندوق لے کر دن دن کرتا پھرتا تھا... انیسویں صدی میں یہی رائفل چلتی تھی۔"

"اگر تم لوگ ڈاکو ہو تو یہ توپ کیوں اٹھائے پھرتے ہو؟" محسن نے کہا۔ "ریوالور لے لو... ایسا..." اس نے بڑی پھرتی سے اپنا ریوالور نکال کے سامنے کر دیا۔

"ایسا..." فوراً غالب نے اور میں نے بھی ایک آواز ہو کے کہا اور اپنے ریوالور نکال کے دکھائے۔ ہمارے غیر سنجیدہ رویے نے انھیں پریشان کر دیا تھا۔ بلاشبہ وہ حلیے سے ڈاکو ہی لگتے تھے۔ عام آدمی کی انھیں دیکھ کر گھگی بندھ جاتی مگر ہم بہت بڑے ڈاکوؤں سے لڑ رہے تھے اور اس لڑائی میں جدید ترین اسلحہ یہاں تک کہ دستی بم اور ٹائم بم تک استعمال کر رہے تھے۔ وہ ڈاکو تھے ملک کی آزادی اور سلامتی پر ڈاکا ڈالنے والے۔ عدل و انصاف کے مقدس ایوانوں پر ڈاکا ڈالنے والے۔ انسانیت اور شرافت کی آبرو پر ڈاکا ڈالنے والے اور انسانوں کی زندگی کے حق، محبت کے رشتوں اور ماؤں بہنوں کی عزت پر ڈاکا ڈالنے والے۔ ان کے مقابلے میں یہ ڈاکو طفلِ مکتب بھی نہیں تھے جو صرف مال و زر چھینتے تھے۔ ان کی یہ از کار رفتہ رائفلیں بھی پولیس کے ناتواں ہاتھوں سے چھینی ہوئی لگتی تھیں۔

"گولی چلانے کا اب کوئی فائدہ نہیں۔" محسن نے انھیں سمجھایا۔ "تم بھی تین ہو اور ہم بھی تین۔"

"لیکن ہمارا چوتھا ساتھی آنے والا ہے۔" غالب نے کہا۔

"اور اگر تمھارا کوئی چوتھا ساتھی نہیں ہے تو سمجھ لو کہ تم گھاٹے میں ہو کیونکہ ہمارا چوتھا ساتھی تم کو باہر سے ہی ہینڈز اَپ کرائے گا۔" میں نے کہا۔

"تم تینوں اس کے نشانے کی زد میں ہو گے مگر وہ خود تمھارے سامنے نہیں ہوگا کہ تم اسے نشانہ بنا سکو۔" محسن نے کہا۔

"اس لیے بہتر ہوگا کہ تم یہ رائفلیں رکھ دو اور آرام سے بیٹھ کر بتاؤ کہ تم لوگ کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟" غالب نے کہا۔

"یہاں کیوں آئے ہو اور زندہ واپس جانا کیوں نہیں چاہتے؟" میں نے کہا۔

ڈاکوؤں کا حوصلہ جواب دے گیا۔ ہمارے پُرسکون انداز اور اعتماد نے ان کے جارحانہ عزائم کو پہلے ہی شکست دے دی تھی۔ جب ہم نے مسلسل بولنا شروع کیا اور ان کو جواب کی مہلت دیے بغیر قوالوں کی طرح یکے بعد دیگرے بول سے بول ملانے لگے تو ان کو اندازہ ہوا کہ وہ کسی مشکل میں پڑ گئے ہیں اور مقابلہ عام لوگوں سے نہیں ہے۔ پنجابی فلموں نے تو پبلک کے دل میں ڈاکوؤں کی دہشت بٹھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی اور ہم شریف آدمی ہوتے تو اخلاقاً ہی اصلی ڈاکو دیکھ کر تھر تھر کانپنے لگتے یا بے ہوش ہو جاتے مگر ہمارا ردِ عمل الٹا ہوا تھا کہ ہم نے زیادہ بے خوفی سے زیادہ مہلک ہتھیار نکال لیے تھے۔ تاہم انھیں بھی اپنے ڈاکو ہونے کی لاج رکھنا تھی۔

"ہم ان کھلونوں سے نہیں ڈرتے۔" ان میں سے ایک نے گرج کر کہا۔ لیکن یہ گرج بھی اتنی بادلوں کی تھی جو برستے نہیں۔

"اوئے موت ساڈے لئی کھیڈ اے۔" دوسرے نے بالکل فلمی ولن کی طرح دہاڑ کر کہا مگر یہ دہاڑ بھی چڑیا گھر کے شیر کی دہاڑ تھی جو زکام میں مبتلا ہو۔

"ٹھہر جا اوئے! پہلے انہاں دی وی سن لئی اے۔" تیسرے نے نسبتاً پُرسکون لہجے میں حکم دیا اور اپنے زیادہ سمجھدار ہونے کا ثبوت دینے کے ساتھ ساتھ اس نے باقی دو جوشیلے ساتھیوں کی آبرو بھی رکھ لی۔ باقی دو نے تھوڑا سا احتجاج کیا مگر پھر اپنے سردار کے فیصلے کو قبول کرتے ہوئے رائفلیں رکھ کر بیٹھ گئے۔ یہ بہادری، مصلحت اندیشی اور سرداری کا ڈراما خاصا کامیاب رہا۔ ہم نے بھی اخلاق اور مروت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ریوالور واپس جیب میں ڈال لیے۔

"اب بتاؤ تم کون ہو؟" سرداری کا عہدہ سنبھالنے والے نے کہا۔

"ہم یہاں رہتے ہیں۔" غالب نے بے حد اختصار سے کام لیا۔

"جھوٹ مت بولو۔" سردار نے کہا۔ "یہاں ہم رہتے ہیں۔"

"ایک نیام میں دو تلواریں اور ایک ملک میں دو بادشاہ نہیں رہ سکتے تو پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک ہی گھر کی چھت کے نیچے ہم بھی رہیں اور تم بھی رہو۔" میں نے کہا۔

"ہم نے تمھیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔" ایک ماتحت ڈاکو نے کہا۔

"ہم نے بھی تمھیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔" غالب نے دانت نکال کے کہا۔

"تم یہاں کیسے رہ سکتے ہو۔" دوسرے نائب ڈاکو نے مشتعل ہو کے کہا۔ "تمھارے باپ کا گھر ہے۔"

"اگر میں کہوں کہ ہاں تو؟" غالب نے کہا۔

"پھر یہ ہمارے بھی باپ کا گھر ہے۔" سردار نے تنگ آ کے کہا۔

"کیا؟ تم تینوں ایک ہی شخص کو باپ مان رہے ہو؟" غالب نے انھیں مزید مشتعل کرنے کے لیے کہا۔ "میرے باپ نے تو ایک ہی شادی کی تھی لیکن مجھے کیا اگر اس کے تعلقات دوسری عورتوں سے بھی تھے۔"

"اوئے... زبان سنبھال کے..." اس مرتبہ سردار کا خون جوش میں آگیا۔ حملہ ان کی والدہ کے کردار پر ہو رہا تھا۔ غالب نے زبان سے نکل جانے والی بات کے مفہوم کو بدل دیا تھا۔

سردار کا اُٹھنا ہی اس کے لیٹنے کا سبب بنا۔ جب تک وہ رائفل لے کر میرے سامنے کھڑے تھے میں نے اپنے جارحانہ عزائم کو خوف کی معصوم اداکاری سے چھپا رکھا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کسی طرف سے بھی گولی چلے۔ خصوصاً ہمارے نو وارد مہمانوں کی رائفل سے وہ دھماکا ہو جو ہر طرف سُنا جائے اور آس پاس رہنے والے یہ دیکھنے آ جائیں کہ اس ویران اور آسیب زدہ کوٹھی

میں کسی بھوت کا قتل ہوا ہے یا کوئی پُراسرار واردات ہوئی ہے۔ اس طرح ہماری یہاں موجودگی کا راز فاش ہو جاتا۔ سردار نے تو محض اداکاری سے یہ ظاہر کرنا چاہا تھا کہ گالی سُننا اس کی قوتِ برداشت سے باہر ہے۔ ابھی وہ رائفل کی طرف ہاتھ بڑھا کے کھڑا بھی نہیں ہوا تھا کہ میں نے اُسے جا لیا۔ وہ مجھ سے زیادہ پھرتیلا نہیں تھا لیکن میں تھوڑی سی مہلت چاہتا تھا۔ جب وہ بیٹھ گئے تھے تو مجھے مہلت ملنے کا یقین ہو گیا تھا۔

میری لات پڑتے ہی سردار اُچھل کر پیچھے گیا۔ میں نے اُسے نیچے سے اٹھا کے پوری قوت سے دیوار پر مارا۔ وہ لڑکھڑایا اور دیوار کے ساتھ سرکتا ہوا زمین پر بیٹھ کر جھومنے لگا۔ میرے حرکت میں آتے ہی غالب اور محسن نے بھی ریوالور دوبارہ نکال لیے تھے اور باقی دونوں ڈاکو اُٹھتے ہی پھر بیٹھ گئے تھے۔ میں نے ان تینوں کی رائفلیں لے کر دیوار کے سہارے ایک کونے میں کھڑی کر دیں۔

"کب سے قابض ہو تم لوگ اس گھر پر؟" میں نے ان کے سر پر کھڑے ہو کر کہا۔ "تمھیں معلوم ہے یہ کس کا گھر ہے؟"

"یہ مجسٹریٹ صاحب ہیں۔" محسن نے باادب لہجے میں میری طرف اشارہ کیا۔ "کوٹھی ان کے دوست کی ہے۔" اس نے غالب کی طرف دیکھا۔

"چار سال سے میں لندن میں تھا۔" غالب نے آگے آ کے کہا۔ "تم نے کیا سمجھا تھا کہ یہ لاوارث زمین ہے؟ اور لاوارث ہو تب بھی یہ حق کس نے دیا ہے تم کو کہ اس کے وارث بن بیٹھو؟"

ان تینوں کی حالت غیر ہو گئی۔ وہ اپنے ڈاکو ہونے کا پہلے ہی اعتراف کر چکے تھے۔ ان کا دوسرا جرم غاصبانہ قبضہ بن گیا۔ نہ جانے کب سے وہ اس ویران کوٹھی میں اپنا اڈا جمائے بیٹھے تھے اور کئی سال سے بند پڑی ہوئی کوٹھی کی طرف سے بہت مطمئن تھے کہ اس میں خطرے کی کوئی بات نہیں۔ یہاں نہ کبھی پولیس آئے گی اور نہ کوئی حقِ ملکیت کا دعویدار آئے گا۔ اگر کوئی دور کے رشتے سے حقِ وراثت رکھنے والا زندہ ہوتا تو اب تک لاکھوں کی اس جائداد کو حاصل کرنے کی کوشش نہ کرتا۔ بے شک کوٹھی کھنڈر ہو رہی تھی اور اس کا سازوسامان غارت ہو چکا تھا مگر صرف یہ زمین ہی کئی لاکھ مالیت کی تھی جس پر کوئی بھی سرمایہ کاری کرتا تو عالی شان عمارت کھڑی کر سکتا تھا۔ پرانے آثار کو مٹا کے اس کی جگہ کوئی کمرشل کمپلیکس یا کئی منزلہ رہائشی اسکیم بنا سکتا تھا۔

"صاحب! غلطی ہو گئی ہم سے۔" سب سے پہلے سردار نے ہاتھ جوڑ کے عاجزی و انکساری کا ڈراما شروع کیا۔

"ہر غلطی کی سزا تو بھگتنا ہی پڑتی ہے۔" میں نے بالکل کسی مجسٹریٹ کی طرح کہا۔ "قانون کسی کو معاف نہیں کرتا۔"

"جناب! ہمیں معلوم نہیں تھا۔" اب دوسرے نے بھی اپنی غلطی ڈاکو والی اداکاری کو خیرباد کہا اور منت سماجت پر اتر آیا۔

"کیا معلوم نہیں تھا؟" میں نے ڈانٹ کر کہا۔ "یہ بات تو بچہ بھی جانتا ہے کہ پرائی چیز پرائی ہوتی ہے۔ کیا ایسے کوئی بھی گھر میں مُنہ اُٹھا کے گھس سکتا ہے؟ اور اس پر یہ دیدہ دلیری ہمیں دھمکا رہے تھے۔ یہ سینہ زوری کہ اس کو اپنے باپ کا گھر رہے تھے۔ حالانکہ یہ اِس کے والد کا مکان ہے۔ وہ بہت بڑے ڈاکٹر تھے اور ہوائی حادثے میں میاں بیوی دونوں ہلاک ہو گئے تھے۔ یہ باہر زیرِ تعلیم تھا اس لیے گھر نہیں آ سکا تو اس کا مطلب ہوا کہ گھر اس کا نہیں رہا؟"

"گھر تو مالک کا ہی ہوتا ہے سرکار۔" ڈاکوؤں کے سردار نے گڑگڑا کے کہا۔ "ہم سے بڑی بھول ہوئی۔"

"کیوں بھئی! کیا خیال ہے؟" میں نے بڑی متانت سے غالب کی طرف دیکھا۔ "چھوڑ دیں ان کو؟"

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔" غالب نے شکایتی لہجے میں کہا۔ "دیکھ تو لوں کہ گھر میں کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔"

"ہاں۔ یہ چور تو گھر کا سارا سامان بھی بیچ کر کھا گئے ہوں گے۔" محسن نے تائید کی۔ "فی الحال تو ان کو پولیس کی تحویل میں دے دیا جائے، وہ خود سب اُگلوا لیں گے کہ یہاں سے کیا کچھ نکالا تھا۔"

انھوں نے قسمیں کھانا شروع کر دیں کہ اس ایک کمرے کے سوا انھوں نے کسی دوسرے کمرے میں کبھی قدم نہیں رکھا۔ یہاں بھی وہ ہفتے میں یا دس دن میں ایک بار آتے تھے... سب ایک ساتھ بول رہے تھے اور ہاتھ پیر جوڑ رہے تھے۔ ان کا شور جاری ہی تھا کہ رابعہ نمودار ہوئی اور اس نے ڈرامے کو دیکھ کر ٹھٹکی۔ وہ اب بہت پُرسکون تھی۔ سکون بخش دوا کا اثر قبل از وقت ختم ہو گیا تھا چنانچہ وہ کچھ غنودگی کی کیفیت کا شکار تھی اور اس کی آنکھیں اب بھی سوئی سوئی لگتی تھیں۔

"آپ ہماری سفارش کریں بیگم صاحبہ۔" ڈاکوؤں کے سردار نے بڑی چالاکی سے کام لیتے ہوئے عورت کے دل کی نرمی اور فطری رحمدلی سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ "آئندہ ادھر کا رخ کریں تو ہماری توبہ..."

"آئندہ کی آئندہ دیکھی جائے گی۔" محسن نے کہا۔ "ابھی تو پچھلا حساب دو کہ کہاں کہاں ہاتھ مارتے رہے۔ کتنی وارداتیں کی ہیں اب تک... قتل کتنے کیے ہیں۔" پھر وہ رابعہ کو ان کے بارے میں بتاتا رہا۔

"میرا خیال ہے میں ساتھ والی کوٹھی سے فون کر کے پولیس کو بلوا لیتا ہوں۔" غالب نے کہا۔

"ایک منٹ ٹھہرو... مجھے یہ چور اُچکے لگتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ڈاکو اتنے بزدل نہیں ہوتے۔ بہت سے ڈاکو میرے سامنے

آ چکے ہیں مگر ان میں سے کوئی بھی نہ اتنا احمق تھا نہ اتنا بودا۔ یہ پولیس کی مار کیا برداشت کریں گے۔"

"مجھے بھی یہ ڈاکو نظر نہیں آتے۔" رابعہ نے کہا۔ اس کی بات نے مجھے حیران کیا۔ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ کوئی میرے خیال کی تائید کرے اور یہ ڈاکو موقعے سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے خود کو معمولی قسم کی وارداتوں کا مجرم تسلیم کریں۔ میں جانتے بوجھتے اپنی کوتاہ بینی اور کم عقلی کا ثبوت دینا چاہتا تھا۔ وہ سچ مچ کے ڈاکو تھے لیکن ہم اُن کو پولیس کے حوالے کرنے کے چکر میں نہیں پڑ سکتے تھے۔ اس سے پہلے تو پولیس ہمیں دھر لیتی۔ دوسری طرف یہ بھی ضروری تھا کہ وہ اتنے خوفزدہ ہو کر فرار ہوں کہ دوبارہ ادھر کا رُخ کرنے کا نہ سوچیں۔

"صورت پر مت جائیے۔" میں نے رابعہ سے مخاطب ہو کے کہا۔ "یہ آپ کو دیکھ کر مسکین بن رہے ہیں۔ آپ جا کر دیکھیے، اگر خانساماں آ گیا ہو تو کافی بنوائیے۔"

"خانساماں ذرا دیر سے آئے گا۔" محسن بولا۔ "میں اپنی وائف سے کہتا ہوں۔" وہ رابعہ کو اپنے ساتھ لے گیا۔

ڈاکوؤں کے دل میں اب ذرا بھی شک و شبہ نہ رہا کہ گھر کے اصل مالک اپنی فیملی کے ساتھ لوٹ آئے ہیں اور ان کی بدقسمتی کی انتہا یہ ہے کہ مالک کا ایک دوست مجسٹریٹ ہے۔ دوسرے نہ جانے کیا ہوں گے۔ پولیس کے نام سے ان کی حالت غیر ہونے لگی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ گرفتاری کے بعد ان کا پولیس کے ہاتھوں کیا حشر ہوگا اور اگر انھیں سارے جرائم کی سزا ملی تو ان کی زندگی کے کتنے ہی سال جیل میں کٹ جائیں گے۔ ان کے بارے میں میرا ایک اندازہ کسی حد تک درست تھا کہ وہ بہت خطرناک قسم کے ڈاکو نہیں تھے۔ ان کا کوئی باقاعدہ گروہ بھی نہیں تھا۔ غالباً انھوں نے حال ہی میں یہ دھندا شروع کیا تھا۔ اس سے پہلے وہ چوری چکاری کی وارداتیں کرتے رہے ہوں گے۔ آپس میں مل گئے تو رائفلیں لے کر گھومنے لگے اور خود کو ڈاکو کہنے لگے۔ ان میں بڑی واردات کا حوصلہ نہیں تھا تو قتل وہ کیا کرتے۔ تاہم میرا خیال غلط بھی ہو سکتا تھا۔ اصولاً انھیں قانون کے مطابق سزا ملنا چاہیے تھی لیکن ہم قانون کی نظر میں ان سے بڑے مجرم تھے۔ اپنے حالات کے باعث ہم ان کے ساتھ وہ سلوک نہیں کر سکتے تھے جس کے وہ مستحق تھے۔

"وہ ٹیلی فون والا آیا تھا۔" محسن نے دوسرے کمرے سے نمودار ہو کے کہا۔ "اُس نے کہا ہے کہ دو ہزار دیں تو کل ہی فون بحال ہو جائے گا۔" اس نے مجھے آنکھ ماری۔ رابعہ اس کے ساتھ پھر آ گئی۔

"اتنے برسوں کے بعد بحالی کا کیا سوال... وہ نئی لائن دیں گے۔" میں نے کہا۔ "تم فکر مت کرو... میں کل ایس پی ضامن رضوی سے بات کر کے دیکھتا ہوں۔ وہ ٹیلی فون کے محکمے کے کسی اعلیٰ افسر سے کہہ دیں گے تو کام ہو جائے گا۔ رشوت مانگنے آئے کوئی تو اُسے گردن سے پکڑ کر میرے پاس لے آؤ۔"

"ضامن رضوی تو اب ایس ایس پی ہیں۔" محسن بولا۔ اس نے ہمیشہ کی طرح میرے ذہن کی سوچ کو سمجھ لیا تھا اور اب ہماری ساری گفتگو بے مقصد ہونے کے باوجود ایک ہی مقصد کے حصول کے لیے تھی۔ ڈاکوؤں نے ایس ایس پی کا نام سُنا اور سہم کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ شامتِ اعمال ان کو کہاں لے آئی تھی۔

"بھئی ختم کریں یہ سلسلہ۔" رابعہ نے سچ مچ کی بیگم صاحبہ کے ناز نخرے کے ساتھ کہا۔ "کیا آتے ہی عدالت لگا لی۔ ہمارے لیے تو پہلے ہی کم مسائل نہیں ہیں۔ اتنے عرصے بعد گھر آئے ہیں تو یہ نئی مصیبت۔"

"یہ کوئی مصیبت نہیں۔ میں ان کو پولیس لاک اپ بھجوا دیتا ہوں؟" میں نے کہا۔

"تو اب پولیس بھی آئے گی؟" رابعہ نے تنک کر کہا۔ "میں کہتی ہوں دفع کریں انھیں۔"

"آپ سمجھنے کی کوشش کریں، یہ مجرم ہیں۔" میں نے کہا۔

"ہوں گے... لیکن کیا سب کو پکڑنے کے ذمے دار آپ ہی رہ گئے ہیں۔ ابھی سارا گھر ٹھیک کرنا ہے۔ فرنیچر آنے والا ہے۔ ہزار کام چھوڑ کے آپ اس کام میں لگ گئے۔" رابعہ نے کہا۔

"اچھا آپ اندر چلیں۔" میں نے کہا۔ "میں دیکھتا ہوں کہ ان بدبختوں کا قصور قابلِ معافی ہے یا نہیں۔"

رابعہ اندر چلی گئی تو میں نے ان کے سردار کو اشارہ کیا۔ "میں چاہتا ہوں کہ تم یہاں اپنے تمام کرتوت اُگل دو۔" میں نے کہا۔ "جو کچھ اب تک کیا ہے سب سچ سچ بتا دو۔ پھر میں سوچوں گا کہ کیا تم کو شرافت سے زندگی گزارنے اور اپنی اصلاح کا ایک موقع دیا جائے یا نہیں۔"

"آپ ہمارے مائی باپ ہیں حضور۔" سردار نے ہاتھ جوڑ کے کہنا شروع کیا۔ "بس ایک بار ہمیں معاف کر دیں۔ ہم قسم کھا لیں گے آپ کے سامنے... آئندہ چوری ڈاکا سب چھوڑ دیں گے... محنت مزدوری کریں گے اور پھر کبھی برائی کی طرف نہیں آئیں گے۔"

ڈاکوؤں کے اس خودساختہ سردار نے مجھے دنیا کا سب سے احمق مجسٹریٹ مان لیا تھا۔ اسی یقین کے باعث وہ مجھے قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ انھیں راہِ راست پر چلنے کا موقع فراہم کیا گیا تو وہ واقعی شرافت کی زندگی اختیار کر لیں گے۔ یہ عملاً ناممکن تھا... وہ جس راستے پر چل رہے تھے اس میں واپسی ممکن ہوتی تو وہ بہت پہلے لوٹ گئے ہوتے۔ اب تو وہ بہت آگے جا چکے تھے۔ اتنا آگے کہ وہ وقت ان کی نظر سے اوجھل ہو چکا تھا جب ان کے قدم غلط راستے پر اُٹھے تھے۔ میں اُن کو چھوڑنے پر مجبور تھا مگر میں اپنا بھرم رکھنا چاہتا تھا اور اس ڈرامے کو حقیقی بنانے کے لیے ضروری تھا کہ میں انھیں آسانی سے نہ جانے دوں اور بالآخر انھیں "فرار" ہونے دوں۔

اندر ایک اسٹور روم ایسا تھا جس کو باہر سے مقفل کیا جا سکتا تھا مگر اس کی کھڑکی کے عام شیشے ٹوٹ چکے تھے۔ اس کے باہر کی طرف نہ لوہے کی سلاخیں تھیں اور نہ گرل تھی چنانچہ دونوں پٹوں کو ملا کر ان پر تختے ٹھونک دیے گئے تھے اور کیلیں جڑ دی گئی تھیں۔ کیلوں کو بھی زنگ لگ گیا تھا اور کوئی بھی معمولی سی کوشش سے اور تھوڑا سا زور لگا کے تختوں کو نکال سکتا تھا اور پٹ کھول سکتا تھا۔

" ان میں سے ایک کو اندر لاؤ۔" میں نے اندر جاتے ہوئے محسن کو حکم دیا۔ "باقی دو کو باندھ کر رکھو۔"

" باندھنے کے لیے تو کچھ نہیں ہے۔" غالب نے کہا۔ "آپ فکر نہ کریں۔ میں انھیں ہلنے نہیں دوں گا۔"

میں نے سر ہلایا۔ "کوئی ہلنے کی کوشش بھی کرے تو بلا تامل گولی مار دینا۔" میں نے کہا۔ "اچھا ایسا کرو، ایک کو اندر لے آؤ اور دو کو مرغا بنا دو... اس سردار کی اولاد کو پہلے لاؤ۔"

" چل بھئی۔" غالب نے اس تھانیدار کی طرح کہا جو ملزم کو حوالات سے نکال کر ڈرائینگ روم کی سیر کرانے کے موڈ میں ہو۔ "تو چل مجسٹریٹ صاحب کے ساتھ۔ اور تم دونوں کیا دیکھ رہے ہو کان پکڑ لو۔"

دونوں ڈاکوؤں نے احساسِ ذلت سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ یوں جیسے کہہ رہے ہوں کہ حضرت پہلے آپ۔

" بن جاؤ مرغا۔" میں نے گرج کر کہا۔ "کسی غلط فہمی میں مت رہنا۔ میں سب کو گولی مار کے یہیں گاڑ دوں گا۔ کوئی پوچھنے والا نہیں ہوگا مجھ سے۔"

وہ دونوں بڑی پھرتی سے اٹھے اور مرغا بن گئے۔ میں نے اسٹور کی ایک پرانی گرد سے اٹی ہوئی کرسی پر بیٹھ کے ریوالور ہاتھ میں رکھا اور سردار صاحب کو طلب کیا۔ محسن نے اسے یوں پیش کیا جیسے وہ ایس ایچ او کا کمرہ ہو۔

" تو خود کو ڈاکوؤں کا سردار کہتے ہو تم؟" میں نے ریوالور سے اشارہ کیا۔ "اس کونے میں کان پکڑ لو اور پھر بتاؤ اپنے کارنامے۔"

" مرغے کی اولاد۔" محسن نے اس کے ایک جھانپڑ مارا۔ "سنا نہیں مجسٹریٹ صاحب نے کیا حکم دیا ہے۔" ڈاکو کو میرے ہاتھ میں ریوالور صاف نظر آ رہا تھا اور وہ میرے خالی ہاتھوں سے بھی خاصا پٹ چکا تھا چنانچہ اس نے بخش دیے جانے کی امید میں یہ ذلت بھی قبول کر لی اور مرغا بن گیا۔

" یہ بتاؤ کہ کب سے چوری ڈاکے شروع کیے تھے۔" میں نے کہا۔ "زیادہ لمبی بات مت کرنا اور کوئی دردناک اسٹوری مت سنانا کہ تم کو حالات نے ڈاکو بننے پر مجبور کر دیا۔ تم زمانے کے ستائے ہوئے ہو اور جو کچھ کر رہے ہو وہ ایک انتقامی ردِعمل ہے۔ ایسی بکواس پر میں نے کبھی یقین نہیں کیا۔ ہر آدمی اپنے ہر فعل میں خود مختار ہے۔ وہ نہ چاہے تو کوئی اسے مجرم نہیں بنا سکتا۔ سیدھی طرح یہ بتاؤ کہ پہلی چوری کب کی تھی۔ کہاں کہاں واردات کر چکے ہو۔ کس کس کے ساتھ رہے ہو اور اس لائن میں آنے کے بعد کسی بے گناہ کو مارا ہے؟"

اس نے ایک بے سروپا داستان شروع کی جس سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ اب تک اس نے معمولی نوعیت کی چوریاں کی ہیں۔ راہ چلتے لوگوں کو بھی لوٹا ہے۔ گھروں میں گھس کے نقدی اور زیور بھی لوٹے ہیں لیکن کسی کی جان کبھی نہیں لی۔ کسی عورت پر ہاتھ نہیں اٹھایا اور کسی غریب آدمی سے کچھ نہیں چھینا۔ اس کا نشانہ حرام کا مال جمع کرنے والے ہی رہے ہیں۔ وہ چالاک آدمی تھا۔ اس طرح وہ اپنی مجرمانہ زندگی کو ایک اخلاقی جواز بھی فراہم کر رہا تھا اور اپنے جرائم کی سنگینی کو کم کرنے میں مصروف تھا۔ میں نے آدھے گھنٹے تک اس کی سنی۔ پھر اسے باہر نکال دیا۔

" اب اسے لے جاؤ۔ اس کا منہ بند رکھنا۔" میں نے کہا۔ "اس کے دوسرے بہادر ساتھی کو لے آؤ... اس سے بھی جھوٹ سچ پوچھ لیں۔" میں نے دیکھا کہ میری بات پر ڈاکو کا رنگ زرد پڑ گیا۔ اس نے سمجھ لیا کہ اب اس کا جھوٹ پکڑ لیا جائے گا۔ ایک ہی واردات میں ملوث ملزمان سے الگ الگ بیانات لے کر تضاد بیانی یا تضاد کے فرق کا پتا چلانا آسان ہو جاتا ہے۔ محسن ریوالور اس کی کمر سے لگا کے اسے دھکیلتا ہوا لے گیا۔ اس کی جگہ دوسرا مرغا آ گیا۔ حسبِ توقع اس کا بیان مختلف واقعات پر مبنی تھا۔ تیسرے کی باری آئی تو اس نے کچھ اور کہانی سنائی۔

میں نے انھیں ایک ساتھ طلب کیا اور صف بستہ کر دیا۔ "مجھے افسوس ہے کہ تم نے رعایت حاصل کرنے کا موقع گنوا دیا۔" میں نے ان کے مقابل کھڑے ہو کے کہا۔ "تم سب نے جھوٹ بولا... اگر سچ ہوتا تو سب ایک ہی بات کہتے۔"

وہ خود بھی جانتے تھے کہ انھوں نے غلط بیانی کی تھی اور تین افراد کے الگ الگ بیان دینے سے ان کے سچ کا راز فاش ہو گیا تھا۔ ایک دوسرے کے سامنے تو جو ایک کہتا تھا دوسرا اس کی تائید کر دیتا تھا۔

" اب میں تمھیں پولیس کے حوالے کرنے پر مجبور ہوں۔" میں نے کہا۔ "تم سب کے بیانات میں نے ٹیپ کر لیے تھے... احتیاطاً۔ پولیس وہ ٹیپ بجا کر سن لے گی تو تمھیں بجائے گی اور پھر وہ جانیں اور تم جانو... میرا نام تو اس کیس میں آئے گا نہیں۔ میں پولیس کو ہدایت کر دوں گا کہ دوسرے سب معاملات میں تمھارا چالان الگ الگ پیش کرے۔ اگر وہ ضروری سمجھیں گے تو تمھیں ہیروئن یا ناجائز اسلحے کے کیس میں بھی لے آئیں گے۔ اسلحہ تمھارے پاس ہے۔ ہیروئن ان کے پاس ہوتی ہے۔"

" پولیس پر بہت اعتماد ہے تمھیں؟" ڈاکوؤں کے سردار نے مایوس ہو جانے کے بعد بہتر یہی سمجھا کہ اب وہ اپنی جرأتِ رندانہ کا مظاہرہ کرے۔ "مجسٹریٹ صاحب، وہ تو ہمارے بیلپنگ پارٹنرز ہیں۔"

" ہیلپنگ پارٹنرز؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔ "ویری گڈ! اس سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ تم پڑھے لکھے بھی ہو۔ سمجھتے ہو کہ اس اصطلاح کا مطلب کیا ہے؟"

" ہاں۔ جو کچھ نہ کرے مگر حصہ پورا وصول کرے۔" سردار نے اپنے ساتھیوں کی طرف فخر سے دیکھا۔ "یہ دونوں ان پڑھ ہیں مگر میں گریجویٹ ہوں۔ اسی لیے سردار ہوں ان کا۔"

" ماشاء اللہ! تعلیم سے خوب فائدہ اٹھایا تم نے۔" میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے تم ان دونوں سے زیادہ سخت سزا کے مستحق ہو جس نے زیادہ سمجھ بوجھ رکھنے کے باوجود یہ راہ اختیار کی اور دوسروں کو بھی اس پر چلایا۔ میں پولیس سے تمھارے ساتھ امتیازی سلوک کو کہوں گا۔"

" میں بتا چکا ہوں کہ وہ ہمارے ہی ساتھی ہیں۔ سب حصے دار ہیں۔ ہم ان سے مل بانٹ کر کھائے بغیر کچھ نہیں کرتے۔" وہ بولا۔ "تم جو چاہو کہو مگر وہ ہمیں حوالات میں بڑے آرام سے رکھیں گے۔ ہماری خاطر تواضع مہمانوں کی طرح کریں گے۔ اور ہماری ضمانت بھی کرا لیں گے۔"

" ضمانت کے لیے تم کو میرے ہی سامنے لایا جائے گا نا۔" میں نے کہا۔ "میں دیکھوں گا کہ تمھارا ضامن کون بنتا ہے۔ خود ضامن کو ایک ضامن کی ضرورت پڑ جائے گی۔ تم بھول رہے ہو کہ میں عام آدمی نہیں ہوں، ایک مجسٹریٹ ہوں۔ اگر میں تفتیش سے مطمئن نہ ہوا تو تھانے کے پورے عملے کا ٹرانسفر کرا دوں گا۔ اچھا ہوا کہ میں نے رحم کھا کے تم کو چھوڑنے کی غلطی نہیں کی۔ تم راہِ راست پر آنے والے نہیں تھے۔ جاؤ بھئی، پولیس کو فون کر دو۔" میں نے محسن کی طرف دیکھ کر کہا، جو ریوالور ہاتھ میں لیے کھڑا ہوا تھا۔

وہ پلٹا ہی تھا کہ ان تینوں نے ایک ساتھ مجھ پر حملہ کیا...

" سیدھے ہو جاؤ۔" محسن نے چلا کر کہا۔ "ورنہ شوٹ کر دوں گا۔"

" نہیں۔ گولی مت ضائع کرو۔" میں نے اپنا ریوالور جیب میں رکھ کر کہا۔ "پہلے میں ان کو سمجھا دوں کہ مجسٹریٹ کی مار پولیس سے کتنی زیادہ سخت ہوتی ہے۔"

دس منٹ بعد وہ تینوں لیٹے پڑے ہوئے تھے اور اس قابل نہیں رہے تھے کہ پیروں پر کھڑے بھی رہ سکیں۔ سردار کا دایاں ہاتھ کلائی پر سے ٹوٹ گیا تھا۔ دوسرے کے دو دانت کم ہو گئے تھے اور وہ قمیص کے دامن سے خون صاف کرتے ہوئے بری طرح کراہ رہا تھا۔ تیسرے کی شاید ایک پسلی ٹوٹ گئی تھی کہ اسے سانس لینے میں دقت ہو رہی تھی اور ہر سانس کے ساتھ اس کی صورت پر کرب نمایاں ہو جاتا تھا۔ چھوٹی موٹی چوٹوں کا کوئی حساب نہ تھا۔ میں نے تینوں کو ایک ساتھ بہت بری طرح رگیدا تھا۔ انھیں اٹھا اٹھا کے دیوار پر مارا تھا۔ دھوبی پٹخا دیا تھا۔ ٹھوکریں ماری تھیں اور لاتے مار مار کے ان کے چہرے بگاڑ دیے تھے۔ وہ انتہائی دہشت زدہ ہو گئے تھے اور شاید پچھتا رہے تھے کہ انھوں نے سچ نہ بول کر رہائی کا موقع گنوا دیا۔

" پولیس کے آنے تک اسے ہی اپنی جیل سمجھو۔" میں نے دروازے کو باہر سے بند کر دیا۔ پھر میں اور محسن دروازے سے کان لگا کے کھڑے ہو گئے۔ اندر سے کچھ دیر کراہنے اور ہائے ہائے کرنے کی آوازیں آتی رہیں۔ پھر آہستہ آہستہ وہ ایک دوسرے سے کچھ کہنے لگے۔ غالباً بات ایک دوسرے کو الزام دینے سے شروع ہوئی تھی کہ بہت جلد تلخ کلامی کی نوبت آ گئی مگر سردار جی نے انھیں ٹھنڈا کیا۔

" احمقو... الو کے پٹھو... خدا نے ایک موقع دیا ہے نکلنے کا تو لے آپس میں لڑ کر گنوا رہے ہو۔" وہ بولا۔ "اس کھڑکی سے راستہ بناؤ اور نکل جاؤ۔"

" اور باہر نکلتے ہی انھوں نے گولی مار دی تو؟" ایک کراہ کے بولا۔

" یہ جوا تو کھیلنا ہی پڑے گا۔ کچھ نہ کیا تو ذرا سی دیر میں پولیس آ جائے گی اور سب کو لے جائے گی۔" سردار نے کہا۔ "اور اس بار اگلا پچھلا سارا حساب برابر کرے گی۔ ہائے رب جی... کلائی توڑ دی ظالم نے۔"

" پولیس تو پہلے بھی لے جاتی رہی ہے ہیں۔"

" پہلے کی بات بھول جاؤ۔" سردار بولا۔ "وہ خرگوش اور ہرن تھے جن کا ہم شکار کرتے رہے۔ اس بار شیر کی کچھار میں پھنس گئے ہیں اور شیر بھی آدم خور۔"

" اسی لیے تو کہتے ہیں... ہائے..." تیسرا بولا۔ "کہ سو دن چور کے تو ایک کوتوال کا... یا میرے مولا... لگتا ہے پسلی ملی میں اتر گئی ہے۔"

" وہ کوتوال بھی بڑا خبیث ہے۔" سردار نے کہا۔

" بڑے مردم شناس لوگ ہیں۔" محسن نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ "کیسی صحیح رائے دی ہے تیرے بارے میں۔"

" وہ مونچھوں والا گیدڑ تو ریوالور لے کر شیر ہو رہا تھا۔" دوسرا بولا۔

" سچ فرمایا آپ نے۔" میں نے خوش ہو کے محسن کے کان میں کہا۔ "تیری ذات پر بھی بڑا جامع تبصرہ کیا ہے۔"

ہم نے تختے اکھاڑنے اور لکڑیوں کے ٹوٹنے کی دبی دبی آوازیں سن کر درز میں سے جھانکا۔ وہ کھڑکی کھولنے کی جدوجہد کر رہے تھے۔ زور آزمائی صرف وہ کر سکتا تھا جس کے دانت ٹوٹے تھے۔ ٹوٹی ہوئی کلائی اور شکستہ پسلی والے صرف اللہ کو یاد کر رہے تھے۔

" ہمارے بینک کا کیا ہوگا استاد... ہائے..." ٹوٹی پسلی والا بولا۔

" بھاڑ میں گیا بینک۔" سردار نے کہا۔ "یہاں سے نکل گئے تو

سارے نیک ہمارے ہیں۔"

"کسے معلوم تھا کہ سال بھر میں جتنا جمع کیا تھا سب یہیں رہ جائے گا۔" دوسرے نے دردناک لہجے میں کہا۔

"ایک لاکھ کم تو نہیں ہوتے استاد!" کھڑکی سے کشتی لڑانے والے نے مُنہ وبا کے کبوتر کی طرح غرغوں کی۔

"اچھا تو جاؤ کھود کے نکال لو۔" استاد نے برہمی سے کہا۔ "اپنے اُسی ملمے مجسٹریٹ سے کہنا کہ جناب دوسرے کمرے میں ہم نے چوری کا مال گاڑ رکھا ہے۔ اجازت ہو تو لے جائیں۔"

میں نے اور محسن نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ایک لاکھ کی لاٹری نکلنے پر ہاتھ ملا کے ایک دوسرے کو مبارکباد دی۔

"پاگل دے پُتر... وہ مجسٹریٹ تو ہمیں ایسا اندر کرائے گا کہ شاید باہر آنے ہی نہیں دے گا۔" سردار نے کہا۔ "تینوں رائفلیں بھی تو لے لی ہیں اس نے اور وہ سب پولیس کی ہیں۔"

"ہم نے ان کا کرایہ دیا تھا۔ ہمیشہ دیتے آئے ہیں۔"

"مگر کیا پولیس والے مانیں گے؟" سردار خفا ہو کے بولا... "جب بات ان پر آئے گی تو وہ ہم کو پکڑ لیں گے کہ ہم نے یہ اسلحہ مال خانے سے چوری کیا تھا۔ میں تو کہتا ہوں خدا کا شکر ادا کرو کہ یہ بے وقوفی ہو گئی ان سے کہ انھوں نے کھڑکی کی طرف دھیان نہیں دیا اور یہ بھی قسمت کی بات ہے کہ کھڑکی میں سلاخیں نہیں ہیں۔ لعنت بھیجو سب پر اور نکلنے کی کرو۔ یہ بڑے خطرناک لوگ ہیں۔ دوبارہ ہماری پرچھائیں بھی دیکھی تو چھوڑیں گے نہیں۔ اس بار مرغا بنایا تھا۔ اگلی بار مرغی بنائیں گے اور پھر کہیں گے کہ انڈا بھی دو... ورنہ ماریں گے۔"

"مگر استاد جی! ایک لاکھ..."

"ایک لاکھ کے بچے... یہاں سے بچ کر نکل گئے تو ایسے کئی لاکھ بنانے کا موقع ملے گا۔" سردار نے تسلی دینے کے انداز میں کہا۔ "بھول جا اس نقصان کو... فائدہ دیکھ کہ جیل جانے سے بچ گئے۔ ایک بڑا ہاتھ ماریں گے اگلی بار تو لاکھ پورے کر لیں گے۔"

جب وہ کھڑکی کھول کے اپنی دانست میں کامیابی سے فرار ہو گئے تو میں نے دروازہ کھول کر کھڑکی سے جھانکا وہ تینوں ایک دوسرے کو سہارا دیتے گرتے پڑتے بدحواسی کے عالم میں پیچھے دیکھتے بھاگے جا رہے تھے۔ میرا ڈراما کامیاب رہا تھا۔ اب ان کی واپسی کا کوئی امکان نہ تھا۔ وہ ہمارے لیے اسی گھر میں کسی جگہ ایک لاکھ روپے مدفون بھی چھوڑ گئے تھے مگر اس کے باوجود مجھے افسوس ہو رہا تھا۔

"کاش ہم ان کو پولیس کے حوالے کر سکتے۔" محسن نے کہا۔

"کاش صرف اتنا ہی کر سکتا میں کہ انھیں سامنے کھڑا کر کے گولی مار دیتا، اور ان کی لاشیں یہاں گاڑ دیتا۔" میں نے کہا۔ "اس سزا کے مستحق تو تھے یہ لوگ۔"

"ہاں ہم نے ایسے خطرناک مجرموں کو مزید جرائم کرنے کے لیے کھلا چھوڑ دیا۔" محسن بولا۔ "مجرم ہم بھی ہو گئے۔ قانوناً بھی اور اخلاقاً بھی۔"

"یہ آئندہ جو کچھ کریں گے اس کا گناہ ہمارے سر بھی آئے گا۔" میں نے کہا۔ "یہ ہماری خود غرضی تھی یا مجبوری کہ ہم نے انھیں نکل جانے دیا۔ یہ جانتے ہوئے کہ وہ آئندہ بھی چوریاں کریں گے اور ڈاکے ڈالیں گے۔ ان کی اصلاح کی کوئی صورت نہیں تھی۔"

"بس اتنا احساسِ پشیمانی بہت ہے۔" غالب نے آ کے میرے کندھے پر تھپکی دی۔ "خدا تو جانتا ہے نیتوں کا حال۔ ہم مجبور تھے تو یہ ہمارے ذاتی مفاد کی مجبوری نہیں تھی۔ ہم ایک عظیم تر مقصد کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ یہ فرد اور معاشرے کی پرانی بحث ہے کہ کیا اجتماعی فائدے کی خاطر فرد کے حقوق کو قربان کر دینا چاہیے۔ فرد بھی اہم ہے کیونکہ افراد کے ملنے سے ہی معاشرہ وجود میں آتا ہے مگر بعض اوقات انتخاب میں آزمائش کا مرحلہ آ جاتا ہے۔ ایک ہی وقت میں تم اپنے وقت اور اپنی توانائی کو کہاں کہاں صرف کر سکتے ہو۔"

"یہ فلسفہ مجھے مطمئن نہیں کر سکتا۔" محسن بولا۔ "اور میں سمجھتا ہوں کہ آدمی کچھ بھی کرے اس کے غلط یا صحیح ہونے کا جواز بھی خود پیدا کر لیتا ہے۔"

"نہیں، ایسا نہیں ہے۔" غالب بولا۔ "فرض کرو تمھارے پاس دس منٹ ہوں اور تمھیں معلوم ہو جائے کہ دشمن نے دو جگہ ٹائم بم فٹ کر رکھے ہیں، ایک تمھارے دوست کے گھر میں جو پانچ منٹ کے فاصلے پر ہے اور دوسرا کسی پُل یا پاور ہاؤس... اسکول یا اسپتال میں۔ اگر تم اپنے دوست کو خبردار کرنے گئے تو دوسرا بم پھٹ جائے گا جس سے اجتماعی نقصان ہو گا۔ وہاں پانچ منٹ کی تاخیر سے پہنچنا ممکن ہی نہیں۔ تم کدھر جاؤ گے؟ کسے بچاؤ گے... اگر یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم اپنے دوست کے گھر کو بچا سکتے تھے تم نے ان کو مر جانے دیا تو یہ صحیح فیصلہ ہو گا۔"

"اس مثال کا موجودہ حالات سے کیا تعلق؟" محسن بولا۔

"تم بڑے دشمن سے نمٹ رہے ہو۔ جو معاشرے کے نہیں ملک کی تباہی کے درپے ہے۔" غالب بولا۔ "یہ چور ڈاکو ایک محدود دائرے میں غیر قانونی سرگرمیوں سے چند افراد کو نقصان پہنچا رہے ہیں گے۔ اگر تم ان کو سزا دینے یا دلوانے کے چکر میں پڑ جاتے تو دلاور اینڈ کمپنی کا کچھ نہ کر پاتے۔ وہ اس ملک کے عوام کو ان کی آزادی کو اور ان کی حب الوطنی کو بیچ رہے ہیں۔ وہ بڑے ڈاکو ہیں۔ تم نے ایک منطقی طور پر درست فیصلہ کیا۔ چلو اب اندر چلو۔"

غالب نے بڑے غیر جذباتی انداز میں ہمارے اس فعل کو ایک

اخلاقی سند عطا کر دی تھی۔ اس طرح سوچنے پر خود ہماری نظر میں ہمارا جرم کوئی جرم نہیں رہا۔ اندر اب شہلا بھی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ ان دونوں کی ظاہری حالت پُرسکون تھی مگر وہ جاننا چاہتی تھیں کہ ہم دلاور اینڈ کمپنی کے جال کو توڑ کر یہاں تک بحفاظت پہنچنے میں کیسے کامیاب ہوئے۔ میں نے انھیں مختصراً وہ سب بتا دیا جو میں نے کیا تھا۔ ہمارا منصوبہ کامیاب رہا تھا اور ہم نے بیک وقت دو کارنامے سرانجام دیے تھے۔ ایک طرف دشمن پر اپنی بھرپور قوت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے زبردست نقصان پہنچایا تھا۔ دوسری طرف انھیں اتنا مجبور اور بے بس کر دیا تھا کہ وہ شہلا اور رابعہ کو گزند نہیں پہنچا سکے تھے۔ دلاور کی یہ شکست انتہائی سبق آموز تھی۔ رابعہ اور شہلا کو اٹھاتے وقت اس کے ذہن میں صرف ہماری کمزوری کا خیال تھا اور اپنی شہ زوری کا۔ اس نے فرض کر لیا تھا کہ رابعہ اور شہلا کی وجہ سے ہم کو دست وبستہ اس کی خدمت میں حاضر ہونا پڑے گا اور اس کی ہر شرط کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا پڑے گا مگر ایسا نہیں ہوا۔ اس کی وقتی کامیابی نے اسے بہت بڑی ناکامی سے دوچار کر دیا تھا۔ ڈی سلوا جس کوٹھی میں رہتا تھا وہاں اب بھی اس کا کوئی آدمی رہتا تھا اور میرے اندازے کے مطابق وہ جگہ ان کے ایک ٹھکانے کے طور پر استعمال ہو رہی تھی۔ وہاں رہنے والے بھی اگر مارے گئے تھے تو مجھے ان کی موت کا ملال نہیں تھا لیکن وہ اڈا بہرحال تباہ ہو گیا تھا۔ خود کو فرعون سمجھنے والے ایس پی کی کوٹھی کو بم سے اڑا دینا بھی ایسا کارنامہ تھا جس پر ہم بجا طور پر فخر کر سکتے تھے۔ ہمیں اندازہ تھا کہ جتنا دلاور اس تباہی و بربادی پر دل شکستہ و مشتعل تھا، اتنا ہی سراج بھی غصے سے پاگل ہو رہا ہو گا۔ اصلی یا نقلی نواب خسرو جمشید کی ذلت بھی ان کے لیے بہت بڑی سزا تھی اور حشمت خان اگر مارا گیا تھا تو گویا ایک شیطان کم ہو گیا تھا۔ اطمینان کی بات یہ تھی کہ حشمت خان کے گھر سے عورتیں اور بچے نکل گئے تھے اور ایس پی سراج کی ماں کو نکال لیا گیا تھا۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد اپنے مقصد میں کامیاب ہو کے ہم دشمن کے قلعے سے یوں نکل آئے تھے کہ وہ ہماری گرد کو بھی نہ پا سکے تھے۔ نہ جانے کتنے عرصے تک مسلسل کوشش کے بعد وہ ہمارا سراغ لگانے میں کامیاب ہوئے تھے کہ ہم پھر روپوش ہو گئے۔ اب کوئی شبہ نہیں رہا تھا کہ دلاور نے ڈاکٹر لطیف کے گھر میں رابعہ کو دیکھنے کے بعد ہی ہمارے پیچھے اپنے شکاری کتے لگا دیے تھے۔

رابعہ اور شہلا نے ہمیں بتایا کہ ان کو کس طرح اغوا کیا گیا تھا۔

"تم دونوں تو کھانا لینے نکلے تھے۔" رابعہ نے کہا۔

"ہاں، مگر پھر ہم کھانا کھانے بیٹھ گئے۔" محسن نے اعتراف کیا۔

"اور تمھیں بالکل خیال نہیں آیا کہ گھر پر بیویاں بھوکی بیٹھی ہیں۔" شہلا نے خفگی سے کہا۔

"بیویاں؟" محسن نے میری طرف دیکھا۔ "یار کیا یہ جمع کا صیغہ درست ہے؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "چوری چھپے کسی اور سے بھی نکاح کر لیا ہے تو بتا دے۔ شہلا کو پتا چل گیا ہے۔"

"میری اکلوتی بیوی جانتی ہے کہ میں دوسری بار یہ حماقت کرنے کا اہل نہیں ہوں۔" محسن بولا۔

"پھر کیا میرا حوالہ دیا ہے تیری اکلوتی بیوی نے؟" میں نے سر کھجایا۔

"پتا نہیں۔ یہاں جو دو عورتیں ہیں ان میں ایک تو یقیناً بیوی ہے جس کا شوہر میں ہوں۔" محسن نے غور سے رابعہ کو دیکھا جس کا رنگ لال ہو رہا تھا۔

"دیکھا تم نے باجی۔" شہلا نے ہنسی کو خفگی میں چھپائے رکھا۔ "کیسی بات پکڑتے ہیں اور پھر شروع کر دیتے ہیں اپنی بیت بازی۔"

"ایک گھنٹے تک تم لوگ نہیں آئے تو ہمیں تشویش ہونا لازمی تھی۔" رابعہ نے بہتر سمجھا کہ موضوع بدل دے۔ "دستک ہوئی تو ہم نے یہی سمجھا کہ خیر سے بدھو گھر کو آئے۔"

"اس وقت کسی اور کے آنے کی امید بھی نہیں تھی۔"

"گاہک اور موت کا کوئی وقت مقرر نہیں۔" محسن نے فلسفیانہ لہجے میں کہا۔

"گاہک سے کیا مطلب ہے؟" شہلا نے آنکھیں نکالیں۔

"تمھاری اور ہماری جان کے گاہک ایک ہی ہیں۔" محسن نے فوراً اپنا دفاع کیا۔ "اور وہی موت کے نامہ بر بھی ہیں۔"

"اتفاق سے میں کمرے میں تھی۔ شہلا نے دروازہ کھولا اور انھوں نے اندر آتے ہی اسے دبوچ لیا۔" رابعہ نے اپنی بات جاری رکھی۔ "میں نے اندر سے ہی پوچھا کہ کون ہے اور شہلا کا جواب نہیں ملا تو خود دیکھنے گئی۔ وہ اندر آ کے زینے کی طرف لپک کر کھڑے ہو گئے تھے۔"

"انھوں نے تمھیں بھی دبوچ لیا۔ شاباش ہے تم دونوں کو۔" غالب نے کہا۔ "نہ ہوئی وہ شیر کی بچی ورنہ اکیلی دونوں کو دبوچ لیتی۔ میرا خیال ہے کہ تم دونوں کو زبان کے علاوہ ہاتھ پیر چلانا بھی سیکھ لینا چاہیے۔"

"گویا زبان درازی کے ساتھ دست درازی بھی آنا چاہیے معزز خواتین کو۔" محسن نے تائید کی۔ "اب نازو آئے تو اس کی شاگردی قبول کر لو۔"

"سوچ لو۔ سب سے زیادہ خطرہ بھی اُسے ہی لاحق رہے گا جو سب سے قریب ہو گا۔" شہلا ہنسی۔

"توبہ کرو توبہ۔" محسن کانوں کو ہاتھ لگا کے بولا۔ "کس کو ڈرا رہی ہو نیک بخت... اپنے مجازی خدا کو..."

"سب قربِ قیامت کی نشانیاں ہیں برادرِ عزیز۔" میں نے آہ بھر کے کہا۔ "برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر۔"

"اب تم لوگ باتیں ہی کرتے رہو گے۔" رابعہ نے کہا۔ "شام ہو رہی ہے۔ تم کو نازو اور ٹیڈی کی طرف جانا ہے۔"

"کمر باندھے ہوئے چلنے کو یہاں سب یار بیٹھے ہیں۔" غالب بولا۔ "کیوں یارو؟"

"بیٹھے کیا ہیں، کھڑے ہیں۔" میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "مگر بقولِ شاعر تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے۔"

"مطلب یہ کہ ٹھکانا تو وہ بھی تھا جہاں سے تم بتا ٹھکانا بتائے بغیر نکل گئی تھیں۔" محسن بولا۔ "ہر بار ایک بیوی کے لیے ایک جنگِ عظیم نہیں چھیڑی جا سکتی۔"

"اس سے تو آسان ہے کہ آدمی وہ کرے..." میں نے تائید کی۔

"عقدِ ثانی؟" غالب نے کہا۔

"نہیں یار... صبرِ جمیل۔" محسن بولا۔ "تم دونوں کو تو فکر ہے ہی نہیں... رات حوالات میں گزرے یا فٹ پاتھ پر... تم کیا جانو طولِ شبِ فراق کو۔"

"اچھا اچھا... اب جاؤ۔" شہلا نے کچھ شرما کے اور ڈانٹ کے کہا۔ "ہم اب یہیں ملیں گے۔"

"یہ لو میرا نعم البدل۔ میرا مطلب ہے میری عدم موجودگی میں یہ توپ تمہاری محافظ ہوگی۔" محسن نے ریوالور شہلا کو تھما دیا۔ "بس گولا چلاتے وقت دیکھ لینا کہ سامنے کون ہے۔ میں تو پہلے ہی مر چکا ہوں... تم پر۔"

"تم بھی یہ اضافی اسلحہ رکھ لو۔" میں نے اپنا ریوالور رابعہ کے حوالے کیا۔ "اگر تیرِ مژگاں اور خنجرِ ابرو ناکافی ہوں تو یہ داغ دینا، مگر یہ خیال تم بھی رکھنا کہ نشانہ کسی کا دل ہے۔ باقی وہی جو محسن نے کہا۔"

وہ دونوں واک آؤٹ کر گئیں۔

ہم نے اپنے اسلحہ خانے سے دو نسبتاً جدید ریوالور نکالے، ان میں سے ایک پر سائلینسر بھی تھا۔ آج کی رات قتل و خونریزی کا امکان تو نہیں تھا لیکن احتیاط کے تقاضے نظر انداز نہیں کیے جا سکتے تھے۔ اچھی بات یہ تھی کہ فرنیچر کے سوا پرانے گھر کا تقریباً سب سامان یہاں منتقل کر لیا گیا تھا۔ اسلحہ خانے میں جو کچھ تھا دوسروں سے چھینا ہوا تھا اور آج تک ہر مشکل وقت میں ہمارے کام آیا تھا۔ ریوالور نسبتاً آسان حاصل رہے تھے ورنہ ہمارے ملکی قوانین کے تحت لائسنس بھی بڑی سفارشوں سے حاصل ہوتا تھا اور اس کے بعد اگر ریوالور ملتا تھا تو اس کی ایک ایک گولی کا حساب رکھنا پڑتا تھا۔ اب تک کی معرکہ آرائی میں سب سے اہم کردار وہ چار ٹائم بم ادا کر گئے تھے جو ہماری خواہش اور منصوبہ بندی کے مطابق ایک ایک گھنٹے کے فرق سے پھٹ گئے تھے۔ چوتھا بم پھٹنے سے پہلے شکاری چوکڑی بھول گئے تھے۔ سب سے بڑے شکاری نے یقین کر لیا تھا کہ چوتھے بم پر اس کے خاندان کی زندگی اور ان کے مستقبل کا انحصار ہے اور وہ ہماری زندگی اور ہمارے مستقبل کا سودا کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

جب ہم گھر سے روانہ ہوئے تو ہم نے خواتین کو سختی سے تلقین کی کہ وہ دروازے بند کر کے قلعہ بند ہو جائیں اور ہمارے لیے بھی اس وقت دروازے کھولیں جب ان کو یقین آ جائے کہ ہم ہی آئے ہیں۔ ہمارے ساتھ کوئی ہمیں یہاں تک لانے والا نہیں ہے۔"

"ہدایت نمبر ایک۔" محسن نے کہا۔ "اسے تم حکم سمجھو اپنے مجازی خدا کا۔ ریوالور کو میرے خیال کی طرح دل سے جدا نہ کرنا۔"

"ہدایت نمبر دو..." میں نے کہا۔ "دروازہ کھولنا ہی پڑ جائے تو اس طرح مت کھولنا جیسے پہلے کھولا تھا۔ شہلا دروازے تک جائے تو تم کسی محفوظ مقام پر چھپ کر دیکھتی رہنا اور ریوالور تیار رکھنا۔ اس میں سات گولیاں ہیں اور تم کو سات خون معاف، ایک بس شہلا کا نشانہ مت لینا۔"

"اگر بھوت اور جنات یا خبیث ارواح تم کو اسی طرح نکالنا چاہیں جیسے ہم نے ان تین ڈاکوؤں کو نکالا تھا تو چیخ مار کے بے ہوش ہو جانا۔ یہ کام تو خواتین کے لیے مشکل نہیں ہوتا مگر بھوت اور ارواحِ خبیثہ کے لیے لخلخہ لانا مشکل ہو جائے گا۔" غالب بولا۔ "وہ لخلخہ لینے جائیں گے تو ان شاء اللہ لوٹ کر نہیں آئیں گے... یہ ہدایت نمبر تین ہے۔"

"بھوتوں سے پہلے آپ لوگ جو آ جائیں گے۔" رابعہ نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔

"وہ تو ان کی صورت دیکھتے ہی بھاگ گئے ہوں گے۔" شہلا کی آواز پیچھے سے سنائی دی۔ ہم تینوں اپنے بدلے ہوئے حلیوں کے باعث اصلی صورت میں تو نہیں تھے لیکن مقامِ افسوس یہ تھا کہ جتنی محنت موسیٰ بھائی نے ہمارا حلیہ بدلنے میں کی تھی وہ رائیگاں گئی تھی۔ کم سے کم میری موجودہ صورت کو شکاری دیکھ چکے تھے۔ رات کا اندھیرا جو آہستہ آہستہ شام پر غالب آ رہا تھا ہمیں تھوڑا سا تحفظ فراہم کر رہا تھا۔ وقت ہوتا تو ہم ایک بار پھر چہرہ بدل لیتے کیونکہ وہ جگہ بھی شکارگاہ تھی جہاں نازو انتہائی جرأت مندی کا ثبوت دیتے ہوئے اکیلی پہنچ گئی تھی۔ اس جگہ سے بہت قریب ٹیڈی ایک خطرناک مشن کی نگرانی کر رہا تھا۔

"میاں سکندرِ اعظم۔" غالب نے کچھ دور آ جانے کے بعد کہا۔ "ہم کوئی بے وقوفی تو نہیں کر رہے ہیں؟"

"بے وقوفی تو ہم اکثر کرتے ہیں۔ وضاحت فرمایئے کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"میرا مطلب تھا کہ ہمارے ساتھ... آگے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے... والی بات نہ ہو جائے..." غالب بولا۔ "وہاں پہنچیں اور معلوم ہو کہ شکاری پہلے سے استقبال کے لیے موجود ہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ ایسا ہوتا تو ٹیڈی گرفتار ہو جاتا۔" میں نے کہا۔

"اور نازو کو بھی مہلت نہ ملتی۔"

"یہ مہلت بھی تو ایک جال ہو سکتی ہے۔" غالب نے کہا۔ "کیا یہ ناممکن ہے کہ انھوں نے نازو کو بھی شناخت کر لیا ہو۔ جانتے بوجھتے اس کو گھر میں گھسنے دیا ہو۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ آخر اس کا مقصد کیا ہے۔"

"ناممکن تو کچھ بھی نہیں ہوتا مرزا جی... مگر..."

"مگر کیا تم نے فرض کر لیا تھا کہ شکاری ڈاکٹر لطیف کے گھر میں رابعہ کو دیکھ کے ہمارے پیچھے لگ گئے تھے۔" غالب بولا۔ "کیا ثبوت ہے کہ ایسا ہی ہوا تھا؟"

"تمہاری ناقص عقل کیا کہتی ہے آخر؟" محسن نے کہا۔

"کیا یہ بعید از قیاس ہے کہ انھوں نے نازو کو پہچان کے اس پر نظر رکھی ہو؟" غالب نے کہا۔ "اس طرح کہ خود نازو کو خبر نہ ہو۔ انھوں نے اس کے پھیلائے ہوئے جال کا ہر پھندا دیکھ لیا مگر خاموش رہے۔ میں اور ٹیڈی صبح شام ڈیوٹی بدلتے رہے اور بزعمِ خود بڑی کامیابی سے اپنی سراغ رسانی کا اڈا چلاتے رہے۔ وہ ہمارا تعاقب کرتے ہوئے ہمارے اڈے تک آ پہنچے۔"

"فرض کرو ایسا ہی ہوا تھا۔" میں نے کہا۔ "پھر اب کیا کریں... یہیں سے واپس لوٹ جائیں؟ نازو اور ٹیڈی کو چھوڑ دیں؟"

"یہ کون اُلو کا پٹھا کہہ رہا ہے۔" غالب نے چڑ کے کہا۔ "خود کو بہت زیادہ عقلمند سمجھنے والا جھک مارتا ہے۔ تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ دلاور کتنا چالاک اور عیار آدمی ہے۔"

"ہماری صورتیں بدلی ہوئی ہیں۔" محسن بولا۔

"سکندر تو چوہدری دلاور سے مل آیا ہے۔ اور اس کا چہرہ دلاور بھول نہیں سکتا۔" غالب نے کہا۔ "ہماری شکل کا بھی بھروسا نہیں۔ وہ سب کی اصلیت جان چکے ہوں... کہ یا جوج ماجوج اور منکر نکیر تو ساتھ ساتھ ہی ملیں گے جہاں بھی ملیں گے۔ میرا مطلب تھا کہ ہمیں الگ الگ رہنا چاہیے۔ یہ نہ ہو کہ وہ مونگ پھلی... ریوڑھی اور حلوہ جیسا ضمنی کو ایک ہی بار سمیٹ کر اندر لے جائیں اور نازو کے سامنے پیش کر دیں کہ لیجیے خاتون... یہی ہیں نا وہ جو خود کو شکاری کہتے اور سمجھتے تھے۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم ریوڑھی سے دُور رہیں گے۔" محسن بولا۔

"لیکن ٹیڈی کو اپنی تشریف آوری کی اطلاع دے دیں گے۔" میں نے کہا۔ "تاکہ وہ پریشان نہ ہو۔ جب تک اس کی طرف سے آل کلیئر کا سگنل نہیں ملے گا ہم قریب نہیں جائیں گے۔"

ٹیڈی اپنی جگہ موجود تھا۔ یہ ہم نے دُور سے ہی دیکھ لیا۔ ہم نے تین مختلف سمتوں میں پوزیشن سنبھالی۔ میں گلی کے دوسرے کنارے پر رہا۔ غالب اور محسن میں سے ایک کو میرے ساتھ رہنا تھا۔ محسن نے میرا ساتھ دینا پسند کیا۔ گلی کے اس کنارے پر ایک کیفے نما فٹ پاتھ تھا۔ چائے والے نے چولھا اور دوسرے آلات و اسباب چائے سازی اپنے اطراف میں پھیلا رکھے تھے اور فٹ پاتھ کو پبلک کے لیے یوں بند کیا تھا کہ چوڑائی کے رُخ دونوں جانب دو لکڑی کے تختوں کی بنچیں لگا دی تھیں۔ فٹ پاتھ پر آنے والوں کو سڑک سے نیچے اتر کے چائے خانے کی حدود سے باہر رہنا پڑتا تھا۔ کوئی بھی راہگیر فٹ پاتھ پر چلنے کا قانونی حق ان سب سے طلب نہیں کر سکتا تھا جو بنچوں پر اکڑوں یا آلتی پالتی مار کے بیٹھے تھے اور چائے نوش کرتے تھے، گپ لگاتے تھے اور کیفے سرِ راہ کی رونق بڑھاتے تھے۔ محسن نے بھی اسی چائے خانے سے رجوع کیا اور جم کر بیٹھ گیا۔ وہاں ایک کپ چائے پینے والا اگر دو گھنٹے بھی بیٹھا رہے تو کیفے کے مالک ذرا معترض نہیں ہوتے تھے۔ اس وقت صرف دو ہی افراد تشریف فرما تھے وہاں چنانچہ محسن شریکِ محفل ہو گیا اور نہ جانے کس فضول مسئلے پر بحث میں الجھ گیا۔ اس کی نظر مجھ پر رہی۔ میں نے ٹیڈی کو وائرلیس پر سگنل دیا تو فوراً اس کی طرف سے جواب آیا۔ "آ گئے ہو اپنے سکندر بادشاہ!" وہ بولا۔ "مجھے تو سخت تشویش لاحق ہو رہی تھی۔"

"کیوں استاد! ڈر کس کا تھا تمھیں؟" میں نے کہا۔

"ڈر تو قسم مولا علی کی کسی کا نہیں..." وہ بولا۔ "سب سے اکیلا بھی نمٹ لیتا ہوں۔"

"سب کون؟" میں نے کہا۔

"ارے وہی سب بدمعاش۔ دلاور آخر میں پہنچا ہے۔" ٹیڈی نے کہا۔ "اس سے پہلے ایک گاڑی میں دو آدمی آئے تھے مگر میں انھیں دیکھ نہیں سکا۔ انھوں نے پردے ڈال رکھے تھے پچھلی سیٹ پر۔"

"نازو کی طرف سے کوئی اطلاع ملی؟"

"ابھی تک تو کچھ نہیں۔" ٹیڈی بولا۔ "تم بتاؤ شہلا اور رابعہ کی کوئی خبر..."

"ہم انھیں لے آئے ہیں۔" میں نے کہا۔ "خراش تک نہیں آئی دونوں کو۔ تفصیلات اس وقت نہیں بتا سکتا۔"

"شکر ہے میرے رب کا۔" ٹیڈی بولا۔ "تشویش اسی بات کی تھی کہ سارا دن گزر گیا تھا اور تمہاری طرف سے کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ سارے دن میں آدھا خون تو خشک ہو گیا ہوگا میرا۔"

"باقی آدھا خشک مت ہونے دینا استاد۔" میں نے کہا۔ "ہم سب تمہاری حفاظت کر رہے ہیں۔"

"وہ مرزا غالب کا بھتیجا کہاں ہے؟ اس نے چارج نہیں لیا مجھ سے۔"

"وہ تمہارے بہت قریب کہیں موجود ہے۔" میں نے کہا۔ "میں گلی کے دوسرے کنارے پر تمہارے بہنوئی کے ساتھ مورچہ بند ہوں۔ ہم سب مسلح ہیں اور اگر ضرورت پڑی تو دونوں طرف سے راستے بند کر دیں گے۔ خدانخواستہ انھوں نے نازو کو اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کی تو پھر کھلی جنگ ہوگی۔"

"نازو کا آخری پیغام مغرب سے ذرا دیر پہلے ملا تھا۔" ٹیڈی بولا۔ "اس نے کہہ دیا تھا کہ اب وہ دُور رہے گی۔ اس نے وہ مقفل

مائکروفون صحیح جگہ پر فٹ کردیا ہے جہاں ان سب کے جمع ہونے کی امید ہے۔ ان کی سب گفتگو براہِ راست سنائی دے گی۔ تم بھی سنو گے یار۔"

"تم نے ٹیپ ریکارڈر بھی سیٹ کرلیا ہے نا؟"

"ہاں۔ لیکن ابھی تک تو بالکل خاموشی ہے۔" ٹیڈی نے کہا۔

"وہ تینوں بہن بھائی گھر میں ہیں؟"

"ہاں۔ پرویز وکٹر اور اس کی بہن موجود ہیں۔" ٹیڈی بولا۔ "اب وہ تین نہیں دو رہ گئے ہیں۔"

"میں بھول گیا تھا کہ سلیم وکٹر مارا جاچکا ہے۔" میں نے کہا۔ "تم نے خبر دیکھی ہوگی۔"

"دیکھی تھی... تصویر بھی دیکھی تھی۔ کیا۔ اسپتال میں وہی ڈاکٹر بنا ہوا تھا، اور اسی نے تم پر فائر کیے تھے؟" ٹیڈی بولا۔

"ہاں استاد۔ دلاور نے اسے ایک بہت اہم ذمے داری سونپی تھی۔ اسے صرف یہ کرنا تھا کہ رابعہ اور میں اسپتال سے نہ نکل سکیں، اس کے لیے بہت اچھا انتظام کردیا گیا تھا۔ مگر وہ ناکام رہا۔ اس ناکامی کی سزا یہی ہوسکتی تھی۔" میں نے کہا۔

"تمھارا مطلب ہے... یہ حادثہ نہیں تھا... قتل تھا؟"

"ہمارے ساتھ اتنا عرصہ ہوگیا تمھیں استاد مگر تم ابھی تک بہت سیدھے ہو کہ ان لوگوں کو نہیں سمجھے۔" میں نے کہا۔ "یہ انسانوں کو استعمال کرنے والے لوگ ہیں۔ صرف اپنے فائدے کے لیے نقصان ہوجانے تو یہ آدمی کی ایک بھی غلطی کو معاف نہیں کرتے۔"

"حالانکہ انسان خطا کا پتلا ہے۔" استاد ٹیڈی نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

"غلطی مشین سے بھی ہوجاتی ہے۔ روبوٹ اور کمپیوٹر سے بھی ہوسکتی ہے تو آدمی کیا ہے۔" میں نے کہا۔ "کیا سلیم وکٹر کی لاش گھر آئی تھی؟"

"نہیں... میں نے صبح خبر پڑھی..."

"تم نے ایک بات پر غور نہیں کیا ہوگا۔ خبر کسی نے براہِ راست اخبارات کو دی تھی۔" میں نے کہا۔

"تمھیں کیسے معلوم ہوا؟"

"جرائم اور حادثات کی خبریں عموماً تھانوں سے جمع کی جاتی ہیں یا پھر عدالتوں سے۔" میں نے کہا۔ "حادثات کی خبریں اسپتالوں سے ملتی ہیں یا پھر اتفاق سے کوئی رپورٹر جائے حادثہ پر موجود ہو تو خود دیکھ لیتا ہے۔ ورنہ شہر کے کسی حصے میں حادثہ آٹھ نو بجے بھی پیش آئے تو اخبار والوں کو اگلے دن ہی پتا چلتا ہے اور خبر اس سے اگلے دن آتی ہے۔ نہ کوئی تھانہ کسی اخبار والے کو اطلاع دیتا ہے، نہ اسپتال... مگر یہ خبر اسپتال سے منسوب کی گئی تھی۔ اسپتال والوں نے اسے جھوٹ قرار دیا۔ میں نے معلوم کیا تھا۔"

"اس کی لاش تو گھر بھی نہیں پہنچی۔ میں سارا دن منتظر رہا۔ سونیا کو پرویز وکٹر دن کے ایک بجے گھر لے آیا تھا۔ وہ بہت دور رہی تھی۔ لیکن اس ایمبولینس سے لاش کوئی نہیں آتاری گئی۔" ٹیڈی نے کہا۔ "کیا انھوں نے لاش کو غائب کردیا ہوگا؟"

"ابھی کچھ دیر میں حقیقت سامنے آجائے گی۔" میں نے کہا۔ "میرے دو نظریات ہیں۔ ایک یہ کہ حادثہ ہوا ہی نہیں۔ سلیم وکٹر کو گولی مار کے کہیں گاڑ دیا گیا۔ لیکن اس کے امکانات کم ہیں۔ یہ لوگ پرویز وکٹر اور سونیا کو اپنا دشمن نہیں بنائیں گے۔ انھیں اس فیملی کی خدمات کی ضرورت ہے۔ یہ بھائی بہن ملک و قوم اور دوسروں کے لیے جیسے بھی ہوں، آپس میں کوئی بیر نہیں رکھتے۔ اگر ان کے درمیان محبت نہ ہوتی تو اس عمر کو پہنچنے تک وہ الگ ہوجاتے اور اپنا کام کو یوں مل کر نہ کرتے۔ ان کے مزاج طبیعت اور عادات میں فرق ہوتا تو یہ اتفاق کیسے ہوتا ان میں... یہ تو ایسا کام ہے کہ ایک کی سوچ بھی مختلف ہوتی تو وہ باقی دو کو بھی کچھ نہ کرنے دیتا۔ لیکن یہ سالہا سال سے ایک ہیں اور یہ بات سب کو معلوم ہوگی۔ اگر وہ سلیم وکٹر کو قتل کریں گے تو باقی دو باغی ہوجائیں گے۔ یہ سوچیں گے کہ کل یہی ہمارے ساتھ نہ ہو۔ مشتعل ہونے کے بعد وہ سب کچھ کرسکتے ہیں۔ ان کو سب معلوم ہے اور جسے سب معلوم ہو اس سے ڈرنا پڑتا ہے۔ یہی ان تین بہن بھائیوں کی طاقت ہے کہ کسی ایک کو نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ اب یا تو دلاور اینڈ کمپنی سب کو ختم کرے ورنہ سب کو برداشت کرے سب کو ختم کیا تو کام رُک جائے گا۔ یہ پرانے بھروسے کے قابل اور تجربہ کار لوگ ہیں۔ فوراً ایسے لوگ نہیں مل سکتے جو ان تینوں کی جگہ لے لیں۔"

"تمھاری باتیں اپنے پلّے نہیں پڑیں سکندر بادشاہ۔ تم ایک طرف کہتے ہو کہ سلیم وکٹر کو اس کی غلطی کی وجہ سے قتل کردیا گیا، دوسری طرف اپنے کہنے کی تردید کرتے ہو۔" استاد ٹیڈی بولا۔ "سیدھی بات کرو۔"

"بات ٹیڑھی ہے کیونکہ یہ لوگ ٹیڑھے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور دھوکا دینے کے ماہر ہیں۔ انھوں نے خبر دے کر ہمیں مطلع کیا ہے کہ سلیم وکٹر کو قتل کردیا گیا۔ وہ اسپتال میں بوگس ڈاکٹر بن کے پہنچا تھا۔ اسپتال والوں کی جان چھوٹ گئی اور وہ بھی مطمئن ہوگئے کہ خس کم جہاں پاک۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس ثابت ہوگی۔ سلیم وکٹر سو فیصد زندہ ہوگا۔ بس اسے منظر سے ہٹا دیا گیا ہے کیونکہ وہ بہت نمایاں ہوگیا تھا... یہ آوازیں..."

"ہاں... میں بھی سن رہا ہوں۔" استاد ٹیڈی بولا۔ "شاید وہ لوگ میٹنگ کے لیے آگئے ہیں... اب کچھ مت بولنا کیونکہ میں ٹیپ ریکارڈر کو آن کررہا ہوں۔"

میرے کانوں میں بیک وقت بہت سے لوگوں کے بولنے کی آواز آنے لگی تھی۔ یوں جیسے کرکٹ میچ کی کمنٹری کے پس منظر میں لوگوں کا شور... آہستہ آہستہ آوازیں بلند اور صاف ہونے لگیں۔ پھر کوئی دروازہ کھلا اور یکلخت میرے لیے آوازوں نے ایک واضح شکل اختیار کرلی۔ سب سے نمایاں آواز نازو کی تھی۔

"خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔" وہ بڑی مظلومیت کے ساتھ فریاد کررہی تھی۔ اس نے اپنی آواز بدلی تھی مگر میں اسے لہجے سے شناخت کرسکتا تھا۔ "میں ایک غریب لاوارث عورت ہوں۔"

"چپ کھڑی رہ ادھر۔" یہ آواز دلاور کی تھی۔ "کس نے بھیجا تھا یہاں تجھے... بول..."

"میں تو خود ہی آگئی تھی جی۔" نازو نے روتے ہوئے کہا۔ "بی بی جی نے رحم کھا کے رکھ لیا مجھے۔"

طمانچے کی آواز بالکل صاف سنائی دی۔ "خود ہی آگئی تھی۔" دلاور نے اس کے الفاظ دہرا کے کہا۔ "بکواس کرتی ہے اُلّو کی پٹھی۔"

نازو نے سخت واویلا کیا۔ "ہائے ہائے میں مرگئی... ارے ظالمو... غریب بڑھیا پر ہاتھ اٹھاتے ہو۔ ایسے کوئی تمھارے جیسا جوان بیٹا ہوتا میرا تو تم سے نمٹ لیتا... گالیاں دیتے ہو مجھے۔ اللہ کے عذاب سے ڈرو۔"

"اداکارہ اچھی ہے بڑھیا۔" اس بار خسرو جمشید کی آواز میں نے پہچان لی۔

"دیکھ مائی... جھوٹ نہیں چلے گا۔" دلاور نے بدلے ہوئے یا کچھ نرمی سے کہا۔ "تو نہیں جانتی ہم کون ہیں۔"

"کیا ضرورت ہے مجھے جاننے کی۔" نازو نے دھاڑیں مار مارکے رونا شروع کیا۔ "میں تو اس گھر کی نوکرانی ہوں۔ گھر سمجھ کے رہتی تھی اس گھر کو بھی... تم کہاں سے آگئے... خدا غارت کرے نصیبں۔ بس میں جارہی ہوں جی... عزت سے ملازمت کی روٹی ملتی تھی... کسی نے کبھی کچھ نہیں کہا مجھ سے۔ چھوٹی بی بی اور بڑی بی بی... سب نے بڑا اچھا سلوک کیا میرے ساتھ... مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ اس گھر کے مہمان اتنے کمینے ہوں گے... اچھے مہمان ہیں یہ کہ گھر کے نوکروں کو مارتے ہیں اور مالک چپ رہتے ہیں۔"

"اُدھر کہاں جارہی ہے؟" دلاور کے چمچے پیڈرو نے گرج کر کہا۔

"جارہی ہوں جہاں مقدر لے جائے۔ یہاں اب نہیں رہ سکتی میں۔" نازو نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ "ہٹ جا میرے راستے سے کمینے۔"

نازو کے ایک اور جھاپڑ مارا گیا اور غالباً پیڈرو نے مارا ہوگا۔ نازو نے ایک دل گداز چیخ ماری۔ "ارے کوئی بچاؤ... یہ مسٹنڈے مار ڈالیں گے مجھے... کسی کو رحم نہیں آتا ایک عورت پر... خدا نے بے آسرا کردیا مجھے... ورنہ میرے بھی دو جوان بیٹے تھے۔"

"پھر کہاں گئے وہ؟" پیڈرو تلخی سے ہنسا۔ "ماں کو چھوڑ کر بھاگ کیوں گئے ہم؟"

"اللہ نے اٹھا لیا انھیں۔" نازو نے روتے دھوتے کہا۔ "چھوٹا تو لڑکے پن ہی میں چلا گیا۔ بڑا جنگ سے نہیں لوٹا... بالکل اس کے جیسا تھا یہی صورت شکل یہی قد کاٹھ... ایسی ہی آواز بھی تھی اس کی۔ سچ بتا تو وہی تو نہیں ہے؟"

"تیرا دماغ خراب ہے بڑھیا۔" دلاور نے کہا اور میں سمجھ گیا کہ نازو نے اس کو جذباتی کمزوری میں مبتلا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کی جرأت اور بے باکی کا میں پہلے ہی قائل تھا۔ ذہانت اور اداکاری کی صلاحیت کا معترف تھا۔ جوڈو کراٹے میں اس کی مہارت کو تسلیم کرتا تھا جس سے فائدہ اُٹھا کے اس نے بڑے بڑے شہ زور مردوں کو چت کیا تھا۔ اس کے حسنِ بے مثال کا جادو سر چڑھ کے بولتا تھا۔ اس ہمہ صفت اور مجموعۂ حسن و خوبی کی شخصیت پر میں پوری ایک کتاب رقم کرتا تو الفاظ کم پڑتے۔ اگر میں مصوّر ہوتا تو مجھے رنگ ناکافی ہوتے جو اس پیکرِ جمال کے عکس کو اتار سکیں اور میں شاعر ہوتا تو اس کے وجود کی رعنائی پر نہ جانے کتنے دیوان لکھ دیتا... محبت ایک الگ جذبہ تھا جس کا مرکز صرف رابعہ کی ذات تھی اور میرے خیال کی دنیا اسی کے تصور سے آباد رہتی تھی مگر نازو کے بارے میں میرے حقیقی جذبات یہی تھے کہ شاید اس حسین لڑکی کو خدا نے اپنے ہاتھوں سے ایک بار تخلیق کرکے شاہکار کی طرح بنایا اور پھر بے مثل کردیا۔ شاہکار تو ایک ہی بار تخلیق ہوتے ہیں۔ اگر محبت کرنا اپنے اختیار کی بات ہوتی تو میں ہزار بار اس سے محبت کرتا۔

اس وقت وہ انتہائی ہمت اور حاضر دماغی کے ساتھ بہترین اداکاری کا مظاہرہ کررہی تھی اور دلاور کو اپنے بیٹے کی طرح بنا کے اس نے زبردست چال چلی تھی۔ دلاور کا لہجہ کمزور پڑگیا تھا۔ مضبوط سے مضبوط نظر آنے والے مرد کے گرد بھی ایک جذباتی فصیل موجود رہتی ہے جو کہیں نہ کہیں سے کمزور پڑجاتی ہے۔ نازو نے اس کمزور حصے کا پتا چلانے کے لیے اندھیرے میں ایک پتھر پھینکا تھا اور جہاں یہ پتھر لگا تھا وہاں سے گونج آئی تھی جو ٹھوس حصار کے پیچھے خلا کا پتا دیتی تھی۔

"میں کتنے سالوں سے اس کی واپسی کا انتظار کررہی ہوں مجھے یقین ہے کہ وہ زندہ ہوگا۔" نازو نے دیوانوں کی طرح کہا۔ "کیا تو میرا بیٹا نہیں ہے... ہے تو مجھے پہچانتا کیوں نہیں ہے آخر...؟"

"لاحول ولاقوۃ... ابے اماں مجھے معاف کر۔" دلاور نے پریشان ہوکر کہا۔ "میں تیرا بیٹا نہیں ہوں۔"

"ٹھیک کہتا ہے تو... وہ تو بڑا رحمدل تھا کسی کو تکلیف میں دیکھ ہی نہیں سکتا تھا۔" نازو نے اسی لہجے میں کہا۔ "کسی کا دل نہیں دکھایا تھا اس نے۔ سب کی عزت کرتا جاتا تھا... ہر بوڑھی عورت اس کی ماں تھی جب وہ گیا تھا تو میں نے کہا تھا کہ بہادر... یہ اس کا نام تھا۔ بہادر تو نام کا بہادر نہیں ہے۔ بہادری کمزور پہ ہاتھ اٹھانے میں نہیں ہے۔ خبردار جو کسی عورت پر کسی بچے پر... بوڑھے یا بیمار پہ ہاتھ اٹھایا۔"

"بند کر اپنی بکواس۔" پیڈرو نے پھر اس کے ہاتھ مارا۔ "بھونکتی

جا رہی ہے کتیا کی طرح ۔" نازو مار کھا کے بھی مشتعل نہیں ہو رہی تھی۔
"پیڈرو۔" دلاور نے تنبیہ کے انداز میں کہا۔" یہ ایسے ہی بتا دے گی۔ مار مت اسے۔"
" استاد یہ بہت مکار لگتی ہے مجھے۔" پیڈرو نے کہا۔
" پیڈرو... یہ کئی دن سے ہمارے گھر میں ہے۔" یہ آواز سن کے میں چونک پڑا کیونکہ یہ سلیم وکٹر کی آواز تھی۔ وہ سلیم وکٹر جو البرٹ وکٹر اسپتال میں مجھ سے "ڈاکٹر حکیم" بن کے ملا تھا اور اخباری اطلاع کے مطابق حادثے میں ہلاک ہو چکا تھا۔
" ہم نے اس پر مسلسل نظر رکھی ہے۔" پرویز وکٹر بولا۔" ہمیں ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی۔"
" تم دونوں ہر وقت گھر میں نہیں رہتے۔" پیڈرو نے برہمی سے کہا۔
" میں نے سارا دن گھر میں رہ کے بھی دیکھا ہے۔" یہ آواز سونیا کی تھی۔
" ہم نے اپنی ماں کو بھی سمجھا دیا تھا کہ یہ کوئی مشتبہ حرکت کرتی نظر آئے تو ہمیں بتانا۔" سلیم وکٹر بولا۔" اس عرصے میں نہ یہ کہیں گئی اور نہ کوئی اس سے ملنے کے لیے آیا۔"
" تم سب بلاوجہ اس کی طرف داری کر رہے ہو۔" پیڈرو بولا۔ " مجھے صرف دس منٹ دو۔ میں اسے الٹا لٹکا کے سارا سچ اگلوا لیتا ہوں۔"
" میرا بھی خیال ہے کہ اس کا یہ ظاہری روپ میک اپ کا نتیجہ ہے اور اصل چہرہ مختلف ہوگا۔" نواب خسرو جمشید کی آواز پہلی بار آئی۔
" میک اپ کیا میں کھال اتار کے دیکھ لوں گا۔" پیڈرو نے غالباً نازو پر ہاتھ ڈالا تھا کہ اس نے چیخ ماری۔
" پیڈرو!" اس مرتبہ دلاور کے لہجے میں برہمی نمایاں تھی۔ " کیا کہا تھا ابھی میں نے... خبردار جو اسے پھر ہاتھ لگایا۔"
میں یہ سب کچھ ایک ریڈیو ڈرامے کی طرح سن رہا تھا جس میں مرکزی کردار ادا کرنے والوں کے ڈائیلاگ مکمل اور واضح صوتی اثرات کے ساتھ سنائی دیتے تھے۔ میں اس جگہ سے زیادہ دور بھی نہیں تھا جہاں حقیقی زندگی کا یہ پُر اسرار ڈراما کھیلا جا رہا تھا لیکن چشم تصور سے میں خود کو اسی جگہ محسوس کر سکتا تھا۔ سارے کردار میرے دیکھے بھالے تھے اور میں ان کی صورت کے ہر تاثر کو اور ان کی تمام حرکات و سکنات کو بھی دیکھ سکتا تھا۔ یہ ایک بالکل غیر متوقع صورتِ حال تھی۔ ہم میں سے کسی نے یہ نہیں سوچا تھا کہ اس وقت جب نازو کی پوزیشن وکٹر فیملی کے گھر میں محفوظ ہو چکی ہے، اس کے خلاف نئے سرے سے انکوائری شروع ہو جائے گی لیکن ایسا ہونا عین ممکن تھا۔ نازو کو اس گھر کے اندر جگہ دلوانے میں تینوں بہن بھائیوں سے زیادہ ان کی بوڑھی ماں کی خواہش اور ضرورت کا دخل تھا۔ دلاور، پیڈرو اور خسرو جمشید مختلف لوگ تھے۔ زیادہ خطرناک اور شک کرنے والے۔ وہ سفاک اور بے رحم شکاری نازو کو یوں گھیر چکے تھے جیسے معصوم ہرنی کو خونی بھیڑیوں کا غول ہر سمت سے نرغے میں کر لے۔
کسی نے دروازے پر دستک دی تو مجھے اندازہ ہوا کہ میں کسی حد تک اعصابی کشیدگی میں مبتلا ہوں۔
" کون ہے؟" پیڈرو نے کہا۔ اس کے لہجے سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ دلاور کی بات سے کتنا مشتعل ہوا ہے۔
" تمہارا باپ۔" جواب ملا۔ آواز بند دروازے کے پیچھے سے آئی تھی لیکن میں نے پہچان لی۔ یہ ایس پی سراج تھا۔ دروازہ نہ جانے کس نے کھولا۔
" میں نے تم سے پہلے بھی کہا ہے کہ میرے باپ کی بات نہ کیا کرو۔" پیڈرو نے سخت برہمی سے کہا۔
" آئندہ تم بھی اس لہجے میں بات کرنے کی بھول مت کرنا۔" ایس پی سراج نے خطرناک آواز بنا کے کہا۔
" گلا چھوڑو میرا..." پیڈرو کی گھٹی گھٹی آواز آئی۔
" سراج! یہ کیا کر رہے ہو تم۔" دلاور نے کہا۔" چھوڑو اسے۔"
" اس دو ٹکے کے بدمعاش کو سمجھا دو کہ یہ اپنی اوقات نہ بھولے اور یہ نہ بھولے کہ میں ایس پی ہوں۔" سراج نے کہا۔" اگر کسی نے تم کو اس کا باپ کہلانا قبول نہیں کیا تو یہ میرا قصور نہیں ہے۔"
" لیکن تمہیں بھی وہ بات نہیں کرنا چاہیے جو میں برداشت نہیں کر سکتا۔" پیڈرو نے پھنکارتے ہوئے کہا۔
" کانے کو کانا کہو تو وہ بھی برداشت نہیں کرتا جس کی دونوں آنکھیں ٹھیک ہوں وہ نوٹس ہی نہیں لیتا۔" سراج بولا۔" یہ تمہاری ایک آنکھ کا قصور ہے... میرا نہیں..."
" بہت ہو گئی سراج۔" دلاور نے غرا کے کہا۔" تم نے آتے ہی فساد پھیلا دیا۔ یہاں تم ایس پی نہیں ہو... یہ بات بھی سمجھ لو تم بھی ہم میں سے ایک ہو۔ ہم تمہیں سیلوٹ نہیں کر سکتے... نہ تم ہمارے افسر ہو اور نہ یہ تھانہ ہے۔"
" چلو بات ختم ہوئی۔" نواب خسرو جمشید سب سے کم بولنے والا آدمی تھا۔ اس نے بروقت مداخلت کی۔
" یہ عورت کون ہے؟" سراج نے چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد کہا اور میں نے تصور کیا کہ وہ مظلوم بن کر روتی ہوئی اور کانپتی ہوئی نازو کو گہری نظر سے گھور رہا ہوگا۔
" یہ اس گھر کی نئی ملازمہ ہے..." پیڈرو نے طنزیہ لہجے میں کہا۔" خود کو لاوارث اور مظلوم کہتی ہے۔ اس سے زیادہ اپنا اتا پتا کچھ نہیں بتا سکتی کہ اس کے دو بیٹے تھے جو مر گئے اور اب اس کا آگے پیچھے کوئی نہیں۔"
" اس طرح کسی بھی اجنبی پر اعتبار کر لینا حماقت ہے۔" سراج بولا۔" یہی میں نے بھی کہا تھا۔" پیڈرو بولا۔" مگر سلیم کے گھر میں سب اس کو بھروسے کے قابل سمجھتے ہیں۔ سب مطمئن ہیں کہ یہ بے ضرر ہے۔ بلکہ ہمارے چوہدری صاحب کو اس مکار عورت نے اپنی اداکاری سے موم کر لیا ہے۔"
" یہ میں کیا سن رہا ہوں دلاور... کیا تم کسی تفتیش کے بغیر ہی مطمئن ہو جاؤ گے؟" سراج بولا۔
" آخر کیا تفتیش کرو گے تم؟" دلاور نے کہا۔ جھنجلاہٹ اس کے لہجے سے عیاں تھی۔ صاف محسوس ہوتا تھا کہ جو کچھ دوسرے چاہتے ہیں، وہ اسے منظور نہیں مگر وہ سب کو روکنے سے بھی قاصر تھا۔
" ایس پی صاحب! میں کہتا ہوں کیا یہ اداکاری نہیں ہو سکتی؟ اس کا رونا دھونا اور مکر کرنا۔" پیڈرو کا حوصلہ بڑھ گیا۔" کیا اس کی صورت پر میک اپ کا جھوٹا نقاب نہیں ہو سکتا؟ لیکن ہمارے چوہدری صاحب کا دل بہت نرم ہے نا۔ اس بات سے پگھل گیا ہے کہ اس کے ایک بیٹے کو بس نے کچل دیا تھا اور دوسرا بالکل ہمارے چوہدری صاحب جیسا تھا۔" وہ قہقہہ مار کے ہنسا۔" انہی کی شکل و صورت رکھنے والا۔ آواز بھی ایسی ہی تھی اس کی۔ اور کمال یہ ہے کہ اس کا نام بہادر تھا۔ دلاور اور بہادر میں کیا فرق ہے۔ وہ جنگ میں لاپتا ہو گیا تھا۔ اس نے پوچھ لیا کہ تم وہی تو نہیں ہو اور چوہدری صاحب جذبات کی رو میں بہہ گئے۔"
ذرا سی دیر میں صورتِ حال بدل گئی تھی۔ جب سراج آیا تھا تو اس نے پیڈرو کا گلا دبوچ لیا تھا اور اسے دلاور نے چھڑایا تھا۔ دو منٹ بعد وہ سراج کی حمایت میں اور دلاور کی مخالفت میں بول رہا تھا۔ دلاور یقیناً اندر ہی اندر کھول رہا ہو گا کہ پیڈرو اس وقت صورتِ حال سے ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے۔
" فضول بات مت کرو۔" دلاور نے غرا کے کہا۔" میں جذبات سے نہیں عقل سے سوچنے والا آدمی ہوں۔"
" پھر تم تفتیش کی مخالفت کیوں کرتے ہو؟"
" تفتیش کرو مگر دیکھو کہ یہ ایک بوڑھی اور کمزور عورت ہے۔" دلاور نے کمزور سا دفاع کیا۔" جسمانی تشدد سے کیا فائدہ؟"
سراج نے قہقہہ مارا۔" تمہارا مطلب ہے کہ ہم سوال کریں۔ یہ جواب دے اور ہم مان لیں۔ کیا اس طرح کوئی سچ بولتا ہے؟"
" اصل بات وہی ہے سراج۔" نواب خسرو جمشید نے کہا۔" اس عورت نے دلاور سے پوچھا تھا کہ تم میرے گمشدہ بیٹے تو نہیں ہو؟ اب یہ اتفاق ہے یا اس عورت کی چالاکی کہ اس نے جو نام بتایا وہ دلاور نہیں تھا، بہادر تھا... اور دلاور کے ایک بھائی کا نام بہادر تھا جو بچپن میں ہی گم ہو گیا تھا۔"
اس بات نے جتنا مجھے حیران کیا تھا اتنا ہی دوسروں کو بھی کیا ہوگا کیونکہ اس کے بعد خاموشی کا ایک مختصر سا وقفہ آیا۔ پھر سراج کی آواز آئی۔
" کیا یہ ٹھیک ہے اپنے چوہدری دلاور صاحب؟"
" یہ ٹھیک ہے۔" دلاور نے سپاٹ لہجے میں کہا۔
" تم نے پہلے کبھی بتایا نہیں۔" سراج بولا۔
" یہ میری پرائیویٹ لائف ہے۔ تم سے میرا صرف کاروباری رشتہ ہے۔" دلاور ایک دم بھڑک گیا۔" ضروری نہیں کہ میں اپنے خاندانی معاملات اور خاندانی تاریخ پر بھی تم سے بات کروں۔"
" یہ تم نے ہی خسرو جمشید کو بتایا ہوگا؟"
" میں دلاور کو بہت پہلے سے جانتا ہوں۔" خسرو جمشید نے اطمینان سے کہا۔" اور میں یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ اس کی ماں بھی۔"
" جمشید!" دلاور نے دہاڑ کر کہا۔" بند کرو اپنی بکواس۔"
" میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔ ایک سبب بتا رہا ہوں تمہارے تذبذب کا اور تمہاری نفسیاتی کمزوری کا۔" خسرو جمشید نے متاثر ہوئے بغیر کہا۔" کیا یہ سچ نہیں ہے کہ اس صدمے سے تمہاری ماں کا ذہنی توازن بگڑ گیا تھا۔ اگر میرے ساتھ ہوتا تو شاید میرا ردِعمل بھی مختلف نہ ہوتا..."
" میں... میں مانتا ہوں کہ اس صدمے نے میری ماں کی جان تک لے لی تھی اور اس کے بعد میں دنیا میں اکیلا رہ گیا تھا۔ ایک سال کے وقفے سے میرا بھائی گیا اور پھر میری ماں گئی۔" دلاور نے ہارے ہوئے لہجے میں کہا۔" اور بالآخر باپ بھی گیا۔ کیونکہ اس نے دوسری شادی کر لی تھی... وہ میرا باپ نہیں رہا تھا۔ آخر میں میرا گھر بھی گیا کیونکہ وہ میرا گھر نہیں رہا تھا... بس جمشید... خود میں نے سب بتا دیا ہے کہ تم میری ذات کو بے نقاب کرنے کا اعزاز حاصل نہ کر سکو۔ کوئی دھماکا کرنے کی سنسنی خیز خوشی نہ ملے تمہیں۔ تم مجھے جذباتی طور پر بلیک میل نہ کر سکو۔ کوئی گندہ انڈا آج تک مجھے بلیک میل نہیں کر سکا۔ جس نے یہ کوشش کی وہ زندہ نہ رہا۔" اس کی آواز آہستہ آہستہ بلند ہوتی چلی گئی تھی۔
" آئی ایم سوری دلاور... میرا یہ مطلب نہیں تھا۔"
" میں تمہیں بھی سمجھتا ہوں اور تمہارے مطلب کو بھی..." دلاور نے اس کی بات کاٹ دی۔" تم نے سمجھا تھا دلاور کمزور پڑ گیا ہے، اس موقع سے فائدہ اٹھاؤ۔ ذلیل کرو دلاور کو اس بہانے۔ مگر ایسا نہیں ہوگا جمشید... تم اس عورت کے ساتھ جو چاہو کرو... ایس پی صاحب آ گئے ہیں اب تو... یہ تفتیش کے ماہر ہیں... اگر میری ماں ہوتی... میری اصلی ماں... تب بھی میں یہ اذیت جھیل جاتا لیکن ڈرو اس وقت سے جمشید... تم پیڈرو... اور تم سراج... جب وقت ہماری جگہ بدل دے گا۔ تم خود کو وہاں پاؤ گے جہاں اس وقت میں ہوں اور میں تمہاری جگہ لوں گا۔ تم بھی آدمی ہو۔ پتھر کی دیوار یا بجلی کے کھمبے نہیں ہو۔ تمہاری جذباتی کمزوری کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں تو ظاہر ہوگی۔" وہ یکلخت چپ ہو گیا۔
میرا خون خشک ہونے لگا۔ اپنے وطن کی سرزمین پر قدم

رکھتے ہی میں نے ایک رات تھانے میں سراج کے ہاتھوں جو ذہنی و جسمانی اذیت برداشت کی تھی اس کے تصور سے آج بھی میری روح کانپتی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے خوف کے بچھو کا ڈنک میرے دل میں اتر گیا ہے اور تکلیف سے میرا وجود مفلوج ہونے لگا ہے۔ کیا وہ سب کچھ نازو کے ساتھ ہوگا؟ سراج اپنے اسی غیر انسانی طریقے پر نازو سے تفتیش کرے گا اور... نہیں... اس سے آگے سوچنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ میرا ذہن سوچ کے اس خلا سے ایک جست میں آگے نکل جاتا تھا اور قطعی فیصلے پر پہنچ جاتا تھا۔ اگر سراج نے نازو پر تشدد کے شیطانی اور ننگِ انسانیت طریقے آزمائے تو میں انتظار نہیں کروں گا۔ میں غالب اور محسن اور ٹیڈی کے ساتھ اندر پہنچ جاؤں گا۔ پھر جو ہو سو ہو۔ غنیمت تھا کہ یہ ساری گفتگو ابھی ٹیڈی سن رہا تھا یا میں۔ غالب اور محسن کو گفتگو کا ٹیپ بعد میں سُننا تھا۔

"یار سکندر بادشاہ..." استاد ٹیڈی کی آواز آئی "قسم مولا علی کی اگر ان لوگوں نے..."

"بالکل ٹھیک ہے استاد... میں بھی یہی فیصلہ کر چکا تھا۔" میں نے کہا۔

"کیا فیصلہ کر چکے تھے؟" میری بات نے ٹیڈی کو حیران کیا۔

"جو تم کر چکے ہو۔ ہم وکٹر فیملی کے گھر پر دھاوا بول دیں گے اور نازو کو نکال لائیں گے۔" میں نے کہا۔

"ہمارے پاس صرف ریوالور ہیں... مگر کوئی بات نہیں۔" وہ بولا۔

"اللہ مسبّب الاسباب ہے۔" میں نے کہا۔ اس سے زیادہ کچھ کہنے کی مجھے مہلت نہ ملی۔

"میرا خیال ہے کہ فضول اختلافات اور بے مقصد باتوں میں ہم نے بہت وقت ضائع کر دیا ہے۔" سراج نے کہا۔ "تم سب کو معلوم ہوگا کہ آج کسی نے میرے گھر کو بم سے اُڑا دیا۔ خدا کا شکر ہے میری ماں بچ گئی۔"

"حشمت خان بھی مارا گیا۔" دلاور بولا۔ "اور گلوب سینما والا گھر بھی تباہ ہوگیا۔"

"لیکن تمہارا گھر بچ گیا۔" سراج نے طنزیہ اور تلخ لہجے میں کہا۔

"میرے اختیار میں کچھ نہیں تھا۔" دلاور نے احتجاج کیا۔ "میں نے جو قدم بھی اُٹھایا تھا اس میں تم سب کا مشورہ شامل تھا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ پیڈرو نے بھی دیکھا۔ خسرو جمشید نے بھی دیکھا۔ کیا میری جگہ یہ لوگ کچھ کر سکتے تھے؟"

"تم یہ سب کچھ کس کے سامنے کہہ رہے ہو؟" پیڈرو بولا۔ "اس عورت کے سامنے جس کے بارے میں تم کچھ نہیں جانتے کہ یہ دوست ہے یا دشمن۔"

"یہ ابھی معلوم ہو جائے گا۔" ایس پی نے کہا۔ "سلیم تم گھر میں سے ایک رسی لاؤ۔ تھوڑا سا تیل اور پسی ہوئی لال مرچیں اور پیڈرو اس کے کپڑے اتار دو۔" نازو نے ایک چیخ ماری۔

"میں زخمی ہوں۔" پیڈرو بولا۔

"اچھا پرویز... یہ کام تم کر سکتے ہو۔" سراج نے خباثت سے کہا۔ "جب رسی آ جائے تو اس کو اُلٹا لٹکا دو۔ پیر باندھ کر۔ دونوں ہاتھ بھی پیچھے کمر کی طرف کر کے باندھ دو اور منہ میں کپڑا ٹھونس دو۔"

"ماں جی... ماں جی! مجھے بچاؤ۔" نازو نے چیخنا شروع کیا۔ "مجھے ان شیطانوں سے بچاؤ۔"

"بس... حوصلہ جواب دے گیا ابھی سے۔" سراج شیطانی انداز میں ہنسا۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔

"کون ہے؟" سراج نے غرا کے کہا۔

"دروازہ کھولو... یہ کیا ہو رہا ہے اندر؟" کسی عورت نے دروازہ پیٹتے ہوئے کہا۔ نازو نے اور زور سے چلانا شروع کیا۔

"سلیم... اپنی ماں سے کہو واپس چلی جائے۔" سراج نے کہا۔

"دروازہ کھولو نہیں تو میں دروازہ توڑ دوں گی۔" سلیم کی ماں کی آواز آئی جو دروازہ بند ہونے کی وجہ سے کچھ دبی دبی محسوس ہوتی تھی۔ "کھولو دروازہ نہیں تو میں سارا محلہ اکٹھا کر لوں گی۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس عورت کی مداخلت نے نازو کو بچا لیا تھا۔ ان میں سے کسی نے مجبوراً کنڈی کھولی۔

"آخر کیا ہو رہا ہے یہاں۔" اسی عورت کی آواز اب بلند ہوئی۔ "کیوں چیخ رہی تھی نوراں؟"

"ماں جی...... مجھے بچا لو... مجھے نکال لو یہاں سے۔" نازو نے چلانا شروع کیا۔ "یہ ظالم شیطان مجھے بے عزت کرنا چاہتے تھے..."

"کیا... کیا تم سب پاگل ہو گئے ہو؟" بوڑھی عورت چلائی۔ "تم بھی سلیم... اور تم پرویز... یہ بوڑھی عورت ہے۔"

"تم کو کچھ معلوم نہیں ممی۔" سلیم بولا۔ "تم اندر جاؤ۔"

"لیکن نوراں کو یہیں چھوڑ جاؤ۔" سراج نے کہا۔

"اپنا ہاتھ پیچھے کر کمینے... کون ہے تو میرے گھر میں مجھ پر حکم چلانے والا اور نوراں پر ہاتھ ڈالنے والا۔" وہ چلا کے بولی۔

"ممی... اندر جاؤ ورنہ..." پرویز نے زیادہ سخت لہجے میں کہا۔

"ورنہ کیا؟... بول... مجھے بھی بے عزت کرے گا..." وہ دیوانہ وار چیخنے لگی۔ "بے غیرت... بے حیا... کون ہیں یہ تیرے یار... میں نے کبھی نہیں پوچھا کہ تم لوگ اندر گھس کے اور دروازہ بند کر کے کیا کرتے ہو۔ مگر آج تم میرے گھر کا نمک کھانے والی غریب بے سہارا اور مظلوم عورت کی عزت پر ہاتھ ڈالنا چاہتے ہو؟ خداوند یسوع مسیح کی قسم... میں اپنی جان دے دوں گی ایسا اپنے گھر میں نہیں ہونے دوں گی... رو مت نوراں..." میں دیکھتی ہوں میرا راستہ کون روکتا ہے..."

میرے ساتھ... اس کے چند منٹ بعد دروازے کے بند ہونے کی آواز آئی۔

"یہ جو کچھ بھی ہوا..." دلاور نے بہت دیر بعد کہا۔ "اچھا نہیں ہوا۔ آج جو کچھ ہو رہا ہے غلط ہو رہا ہے۔"

"ہم اس عورت سے بعد میں نمٹ لیں گے۔" سراج نے کہا۔

"یہ خیال تم کو بہت دیر سے آیا ایس پی صاحب۔" دلاور نے طنز سے کہا۔ "جب ساری خرابی ہو چکی۔ تم لوگ یہ کبھی نہیں بھول سکتے کہ تمہیں پولیس افسری کا رعب دن کے چوبیس گھنٹے ہر جگہ اور ہر شخص پر جھاڑنا ہے خواہ اس کی ضرورت ہو یا نہ ہو۔"

یہیں سے ان کے درمیان ایک گرما گرم بحث کا آغاز ہوا۔ دلاور اور ایس پی سب سے زیادہ طاقتور لوگ تھے۔ ثانوی حیثیت پیڈرو اور خسرو جمشید کی تھی۔ حیثیت کا یہ تعین کسی چارٹر یا بائی لاز کے تحت نہیں ہوا تھا بلکہ بلحاظِ اہمیت وقت کے ساتھ ساتھ کوئی بڑا ہو گیا تھا اور حکم دینے لگا تھا تو دوسرے اس کا حکم ماننے لگے تھے۔ دلاور سب سے زیادہ دولت مند، عیار اور ذہین، بااثر اور سفاک تھا۔ اس نے سرغنہ کا درجہ حاصل کر لیا۔ اس کے کاروبار سے سب کا کاروبار چلتا تھا اور اس نے ناجائز کاروبار کو ایک جائز تحفظ رکھنے والا نام دے رکھا تھا۔ ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس نہ ہوتا تو شاید مٹی سے سونا بنانے کا یہ کاروبار شروع ہی نہ ہوتا۔ سراج اس کاروبار کا محافظ تھا اور اپنے تمام قانونی اختیارات کے ساتھ اس غیر قانونی دھندے کو چلانے والوں پر آنچ نہیں آنے دیتا تھا۔ چنانچہ وہ خود کو دلاور سے کم نہیں سمجھتا تھا۔ ایک دولت کی اس گاڑی کا ڈرائیور تھا تو دوسرا گارڈ... پیڈرو خود کو انجن سمجھتا تھا جو گاڑی کو کھینچتا تھا اور یہ سوچنے میں حق بجانب تھا کہ اس کے بغیر گاڑی نہیں چل سکتی مگر یہ بھی جانتا تھا کہ انجن خود نہیں چلتا۔ وہ ہر وقت ڈرائیور کے ہاتھوں کے کنٹرول میں رہتا ہے۔ وہ اسے جہاں چاہے روک دے اور اگر چاہے تو پٹڑی سے بھی اتار دے... چنانچہ اہم ہونے کے باوجود اپنا غیر اہم ہونا اسے بہت کھلتا تھا۔ خسرو جمشید نے آج مجھے چونکا دیا تھا۔ وہ دلاور کے کاروبار میں برابر کا شریک معلوم ہوتا تھا اور غالباً یہ برابری اس کاروبار میں سرمائے کی برابری کے باعث تھی۔ مجھے یہ اندازہ بھی ہوا کہ چوہدری دلاور اور خسرو جمشید بہت پرانے ساتھی ہیں۔ وہ بچپن کے دوست یا کلاس فیلو وغیرہ ہوتے تو نواب خسرو جمشید اس کا حوالہ ضرور دیتا۔ لیکن اس نے صرف بتایا تھا کہ وہ دلاور کو بہت پہلے سے جانتا ہے۔ کیا وہ پہلے بھی کسی غیر قانونی کاروبار میں شریک رہے تھے؟ میں نے سوچا۔ کسی وجہ سے ان کو وہ دھندا ختم کرنا پڑا لیکن دلاور نے نیا دھندا شروع کیا تو جمشید پھر شامل ہو گیا۔ وہ زبردستی بھی شامل ہو سکتا تھا کیونکہ وہ دلاور کے بہت سے پرانے معاملات سے واقف تھا، جن پر اب پردہ پڑا ہوا تھا۔ وہ دلاور کو بلیک میل کرنے کی پوزیشن میں تھا چنانچہ دلاور نے اسے بھی ایک ورکنگ پارٹنر بنا لیا تھا تاہم کنٹرول بدستور دلاور کے ہاتھ میں تھا اور خسرو جمشید بھی اپنی حیثیت کو دلاور سے کمتر تسلیم کر کے خوش نہیں تھا۔ وکٹر فیملی چار بڑوں کے بعد آتی تھی۔ وہ محض کارکن تھے لیکن عام کارکن نہیں تھے۔ ڈی سلوا اور گاما بھی جو مارے جا چکے تھے، وہ بھی ایسے ہی کارکن تھے جو بہت اہم اور قابلِ اعتماد سمجھے جاتے تھے۔ اس کے بعد سیکڑوں تھے جو خریدے جا سکتے تھے۔ ختم کیے جا سکتے تھے۔ بدلے جا سکتے تھے اور ضائع ہو جائیں تو بھلائے جا سکتے تھے۔ اہمیت کے اعتبار سے اس شکاری ٹولے میں سب سے اوپر دلاور تھا... پھر سراج... اس کے بعد خسرو جمشید اور آخر میں استاد پیڈرو... وکٹر فیملی کے تین افراد اس کے بعد تھے۔

آج وہ سب بے حد مشتعل تھے۔ رابعہ اور شہلا کو یرغمال رکھ کر مجھے بلانے کی اسکیم ان سب نے مل کر بنائی تھی اور اس کا مقصد میرے عزائم کا اندازہ کرنا اور مجھے منہ مانگی قیمت دے کر راہ سے گمراہ کرنا تھا مگر یہ کوشش ناکام رہی تھی اور اس کے نقصانات بہت زیادہ ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی نے سوچا تک نہ ہوگا کہ میں یوں بے خوف و خطر ان کے ناقابلِ شکست حصار میں داخل ہو جاؤں گا اور پھر اتنی آسانی سے دندناتا ہوا نکل جاؤں گا۔ ان کی ساری طاقت مجھے نہ روک سکے گی اور ان کی فتح ایسی ذلت آمیز شکست میں تبدیل ہو جائے گی۔ وہ سب ایک دوسرے کو الزام دیتے تھے حالانکہ نقصان کے ذمے دار سب ایک جیسے تھے۔ دلاور پر سب کی برہمی یوں تھی کہ اس کا گھر بچ گیا تھا۔ اس نے پانچ منٹ پہلے بم کو ڈھونڈ نکالا تھا اور گھر سے دُور ایک کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیا تھا۔ اس کے پھٹنے سے ایک ٹیلی فون کا کھمبا گر گیا تھا اور ایک گھر کی بیرونی دیوار کا کچھ حصہ، لیکن کسی کو معلوم نہ ہو سکا تھا کہ یہ بم وہاں کس نے رکھا تھا اور کیوں رکھا تھا۔ سراج کی کوٹھی کا نصف حصہ تو کھنڈر بن گیا تھا۔ باقی نصف میں بھی دراڑیں پڑ گئی تھیں اور اس کے کہنے کے مطابق سامان کے ساتھ ہونے والے نقصان کی مالیت چار لاکھ سے اوپر تھی۔ ڈی سلوا کی کوٹھی کسی کی ذاتی ملکیت نہیں رہی تھی۔ ڈی سلوا کا کوئی وارث ہوتا تو اس کا مالک بنتا مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دنیا میں وہ اکیلا تھا۔ اس کوٹھی میں دو ملازم مارے گئے تھے۔ کسی کو ان کی زندگی کے ضائع ہونے کا رنج نہیں تھا۔ گفتگو کے دوران میں انھوں نے بار بار مال کے ضائع ہونے پر افسوس کا اظہار کیا تاہم یہ واضح نہ ہو سکا کہ وہ مال کیا تھا۔ اگر وہاں بھی اسلحے کا گودام ہوتا تو ایک ٹائم بم سے چین ری ایکشن شروع ہو جاتا یعنی ایک سے دوسرا بم پھٹتا۔ گولا بارود میں آگ لگتی اور وہ دھماکا ارد گرد کے سارے علاقے کو ہلا دیتا۔ پاس پڑوس کے گھر اور دکانیں تباہ کر دیتا اور وہ صرف ایک دھماکا نہ ہوتا۔ دھماکوں کا سلسلہ ہوتا۔

حشمت خاں موجود ہی نہ تھا کہ اپنے نقصان کو روتا کسی سے اس کا تذکرہ کیا بھی تو سرسری انداز میں۔ اتفاق رائے سے انھوں نے سراج کے نقصان کو سب سے زیادہ اور ذاتی تسلیم کیا اور اسے تسلی دی کہ چار پانچ لاکھ کا ازالہ بہت جلد کر دیا جائے گا۔ فی الحال وہ کسی کمالے کے مکان میں منتقل ہو جائے یا دوسرا مکان خرید لے۔

"مکان تو میں خرید لوں گا۔" سراج نے کہا۔ "لیکن میرے محکمے میں اور پبلک کے سامنے میری پوزیشن بہت خراب ہوگی۔ کل سارے اخباروں میں آجائے گا کہ ایس پی کے گھر میں بم کا دھماکا۔"

"یہ تو حشمت خان کے بارے میں بھی آئے گا۔"

"حشمت خاں گیا جہنم میں۔ اسے اب خدا کے سوا کس کو مُنہ دکھانا ہے۔" سراج عالم اشتعال میں بولا۔

"خدا کو مُنہ دکھانے کے قابل وہ پہلے ہی نہیں تھا۔" خسرو جمشید بولا۔

"تم ان اخبار والوں کو نہیں جانتے۔" سراج بولا۔ "یہ بال کی کھال نکالتے ہیں اور کڑی سے کڑی ملاتے ہیں۔ مفروضات پر سنسنی خیز سرخیاں لگاتے ہیں اور نام کماتے ہیں۔ یہ معلوم کرلیں گے کہ میری پوسٹنگ کہاں ہے اور پھر کوئی تعیش ایسا شوشہ چھوڑے گا کہ خود تو گرفت میں آئے گا نہیں مگر پبلک پر واضح کردے گا کہ یہ بارڈر پر اسمگلنگ کرنے والوں کی کارروائی ہوسکتی ہے اور ممکن ہے یہ سودے بازی میں اختلاف پر رنجش کا نتیجہ ہو۔ وہ اس کو حشمت خاں کے گھر کی تباہی سے اور حشمت خاں کی ہلاکت سے ملائیں گے اور پھر کوئی اسٹوری بنالیں گے کہ وہ انسپکٹر پولیس اور میں ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے تھے۔ مل کر کوئی غلط کام کرتے تھے اور غلط کام کا انجام تو غلط ہونا ہی تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔"

"جھوٹ لکھنے پر تم ان کے خلاف کارروائی کر سکتے ہو؟" پیڈرو بولا۔

"عدالتی کارروائی کیا آسان کام ہے؟" سراج تلخی سے بولا۔ "اور پھر ان اخبار والوں کے خلاف... یہ تو لکھ دیتے ہیں، مبیّنہ طور پر... یا پھر... کہا جاتا ہے... اب کس نے کہا اور انھوں نے کس سے سنا۔ معتبر ذرائع کیا تھے... یہ سب گول مول ہوتا ہے... ان کے جھوٹ کو کبھی جھوٹ ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ الٹا آدمی دلدل میں اتر جاتا ہے۔ وہ گڑے مردے اکھاڑنے پر آجاتے ہیں۔ سب مل کر محاذ قائم کرلیں تو افسرانِ بالا تک پریشان ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ یہی بہتر سمجھتے ہیں کہ جھوٹ کو سچ مان کے جان چھڑائی جائے۔ جس کے خلاف طوفان کھڑا کیا گیا ہے اسے ٹرانسفر یا وقتی طور پر معطل کردیا جائے۔ بیان دے دیا جائے کہ تحقیقات کی جارہی ہیں۔ اس طرح معاملہ دب جاتا ہے اور چند دن میں سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔ لیکن پریشانی تو ہوتی ہے نا۔"

"تم اپنا دوسرا گھر خفیہ رکھنا۔" خسرو جمشید نے مشورہ دیا۔

"مجھے تو اندیشہ ہے کہ اب ہم کچھ بھی خفیہ نہیں رکھ سکیں گے۔" سراج نے کہا۔ "آخر یہ سب کچھ کیسے ہوا۔ کرماں والی کے اڈے کو ہم نے کتنا محفوظ سمجھ رکھا تھا۔ وہ کیسے تباہ ہوگیا۔ سیوک رام، کرنل جگن ناتھ سب کیسے مارے گئے؟"

"میں سمجھتا ہوں وہ بھی ایسی ہی غلطی تھی۔" خسرو جمشید بولا۔ "اس وقت رابعہ نام کی اس ایڈووکیٹ کو اور اس لڑکی نازلی کو اغوا کیا گیا تھا۔"

"کون نازلی... وہ انسپکٹر شیخ کی بہن؟" سراج بولا۔

"ہاں۔ اب تو خیر وہ استعفیٰ دے کر غائب ہوگیا ہے۔" خسرو جمشید نے کہا۔ "مگر سکندر بخت کا وہ انتقامی ردِ عمل بھی ایک غلط اقدام کا نتیجہ تھا۔ بہتر ہوگا اگر ہم عورتوں کو بیچ میں نہ لائیں۔ وہ رابعہ کو دیوانگی کی حد تک چاہتا ہے اور اس کی خاطر ساری دنیا کو تباہ کر سکتا ہے۔ خواہ دنیا کے ساتھ وہ خود بھی تباہ ہو جائے۔"

"یہ ٹھیک ہے۔" پیڈرو بولا۔ "آج وہ جان ہتھیلی پر رکھ کر وہاں گھس آیا تھا جہاں سے وہ واپسی کی امید نہیں رکھ سکتا تھا مگر دیکھو وہ کتنی تباہی پھیلا کے دونوں لڑکیوں کو لے گیا۔"

"یہ ٹائم بم تو ویسے ہی ہیں... بلکہ وہی ہیں..."

"ہاں۔ اس نے سائیں پاپڑ والے کے مزار سے پورا باکس اٹھا لیا ہوگا اور باکس میں بارہ بم تھے۔" دلاور نے کہا۔ "آٹھ اب بھی اس کے پاس ہونے چاہئیں۔"

"ضرور ہوں گے۔ شاید اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوگا۔" پیڈرو بولا۔ "جو اس نے کرماں والی کے اڈے سے اٹھایا ہوگا۔"

"اگر ہم نے رابعہ کو اغوا نہ کیا ہوتا تو وہ سیوک رام تک نہ پہنچتا۔ سیوک رام کے ذریعے ہی اسے کرماں والی کا ٹھکانہ پتا چلا۔ اس نے سب تباہ کر دیا۔" پیڈرو نے کہا۔ "گاما ماچھی بھی اسی با... مارا گیا تھا۔"

"سیوک رام اور جگن ناتھ کو اس نے دشمن کا ایجنٹ کہہ کے مار دیا اور ان کے اسلحے کے ذخیرے کو بھی تباہ کر دیا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اسے ہم پر بھی شبہ ہے؟" سراج نے کہا۔ "اور اس کے ساتھی یہ جانتے ہیں کہ سیوک رام اور جگن ناتھ کو اسلحہ کون فراہم کرتا ہے؟"

"میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔" دلاور بولا۔ "ممکن ہے سیوک رام نے اسے بتا دیا ہو۔ تشدد سے ہی انھوں نے کرماں والی کا پتا معلوم کیا ہوگا۔ اب یہ ہو سکتا ہے کہ اس نے صرف رابعہ کے بارے میں پوچھا ہو کہ وہ کہاں ہے اور سیوک رام اسے وہاں لے جانے پر مجبور ہوگیا ہو۔ سیوک رام اپنی بیوی کو ختم کر گیا تھا وہ کچھ نہ بتا سکے۔ ایسے شخص سے یہ امید کم ہی ہے کہ اس نے ہمارے بارے میں کچھ اگلا ہو۔ اس کو یہ ڈر بھی ہوگا کہ راز افشا ہو جانے کے بعد وہ زندہ نہ رہ سکے گا۔ مگر سیوک رام کا کوئی سراغ نہیں ملا...

... کی لاش مل جاتی تو معلوم ہو جاتا کہ وہ تشدد سے ہلاک ہوا تھا یا اس نے خودکشی کرلی تھی۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ بھاگ گیا ہو۔" سراج بولا۔

"ہاں۔ اس کا امکان زیادہ ہے۔" دلاور نے تسلیم کیا۔ "میرا خیال یہ ہے کہ جب وہ سکندر کے ہتھے چڑھا تو سکندر نے اس سے رابعہ کے بارے میں پوچھا۔ وہ رابعہ کے بارے میں بتانے پر مجبور ہوگیا اور سکندر کو سائیں پاپڑ والے کے مزار تک لے گیا۔ تاہم وہ جانتا تھا کہ وہاں پہنچنے کے بعد سکندر کو اور بھی بہت کچھ معلوم ہو جائے گا۔ جانے سے پہلے اس نے جان بچا کے نکل جانے کا انتظام کرلیا۔ بیوی کو ساتھ لے کر فرار ہونا مشکل ہوتا۔ اسے وہ ہمیشہ کی نیند سلا گیا اور جب سکندر کو رابعہ ملی تو درمیان میں کسی وقت سیوک رام کو فرار ہونے کا موقع مل گیا۔ وہ سرحد پار چلا گیا ہوگا۔ سکندر بخت اور اس کے ساتھیوں نے تہ خانہ وغیرہ بعد میں دیکھا ہوگا مگر اس وقت تک سیوک رام نکل گیا تھا چنانچہ اسے ہمارے بارے میں معلومات فراہم کرنے والا کوئی نہیں رہا تھا۔"

"میں تمھارے خیال سے اتفاق نہیں کر سکتا دلاور۔ میرا خیال ہے کہ سیوک رام نے سب بتا دیا ہوگا۔ وہ انھی کے ہاتھوں مارا گیا اور انھوں نے لاش کہیں پھینک دی۔" سراج بولا۔

"اگر اس کو اتنا معلوم ہوتا تو کیا وہ یہاں نہ پہنچ جاتا؟" دلاور نے کہا۔ "مجھ سے گفتگو کے دوران میں بھی اس کی باتوں سے یہ اندازہ بالکل نہیں ہوتا تھا کہ اسے اسلحے کے کاروبار کی نوعیت معلوم ہے۔ بے شک وہ بہت ذہین اور چالاک ایکٹر ہے۔ مجھ سے تو وہ منشیات کی بات ہی کرتا رہا۔"

"گویا اب تک اُسے علم نہیں کہ ہم منشیات فروش نہیں ہیں۔" نواب خسرو جمشید نے کہا۔ "یہ بات عقل تسلیم نہیں کرتی دلاور۔"

"میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں کہ اداکاری کو سمجھ نہ سکوں۔" دلاور نے کہا۔ "اور میں نے اپنی عقل کے مطابق اپنا خیال ظاہر کیا ہے۔ تمھارا اس سے متفق ہونا ضروری نہیں۔ تم نے اسپتال میں اس کا رویہ دیکھا تھا؟ وہ صرف رابعہ کے لیے متفکر تھا اور رابعہ کو لے کر نکل گیا۔ ہمارے سب حفاظتی انتظامات بہت خفیہ تھے۔ اسے کیسے معلوم ہوگیا کہ دروازے کے ہینڈل میں مائکروفون چھپایا گیا ہے؟"

"کیا تم مجھ پر الزام لگا رہے ہو؟" سلیم نے برہمی سے کہا۔

"چور کی طرح داڑھی کے تنکے پر ہاتھ مت ڈالو۔" دلاور بولا۔ "میں نے ایسی کوئی بات نہیں کہی۔ اس نے اپنی ذہانت سے سب معلوم کیا اور تمھاری آنکھوں میں دھول جھونک کر نکل گیا... ڈاکٹر جیفسن کے گھر میں آخر کیا ہوا تھا۔ وہ صرف رابعہ کی خاطر جاتا تھا۔ اس کے عشق نے اسے پاگل کر رکھا تھا۔ رابعہ کا مسئلہ ہو تو وہ خود کو بھول جاتا ہے۔ ابھی تک وہ جہاں بھی ہتھیلی پر سر رکھ کے گیا ہے، رابعہ کے لیے گیا ہے۔ اگر اس کو شبہ ہوتا کہ اس کارخانے میں اسلحہ

بن رہا ہے تو وہ چار ٹائم بم لگا کے کارخانہ اُڑا چکا ہوتا۔ اس نے ابھی تک براہِ راست کارخانے پر حملہ نہیں کیا۔ آخر کیوں؟ اگر وہ جانتا ہے کہ اسلحے کی ترسیل اسی جگہ سے ہوتی ہے تو اس جگہ کو وہ کیوں چھوڑے ہوئے ہے؟ اِدھر اُدھر کیوں جھک مارتا پھر رہا ہے۔"

"تمھاری اس بات میں وزن ہے۔" سراج نے کہا۔

ان کی بات خاصی اطمینان بخش اور حوصلہ افزا تھی۔ وہ ابھی تک ہمارے عزائم کا صحیح اندازہ نہیں کر پائے تھے اور ہمارے حق میں یہی بہتر تھا کہ وہ ہمیں اپنی تباہی کا ذمے دار نہ سمجھیں۔ ان کی عقل میں یہ نہ آئے کہ ہم اُن کے ملک دشمن ساتھیوں سے اور ان کے ناجائز کاروبار کی اصل نوعیت سے واقف ہو چکے ہیں۔ ہم نے ابھی تک انھیں اپنے بارے میں غلط تاثر دینے کی جو کوشش کی تھی وہ کامیاب رہی تھی۔ دلاور اینڈ کمپنی کا خیال اب بھی یہی تھا کہ میں اپنے باپ کے قاتلوں کا دشمن ہوں۔ اس کو زبوں حالی اور کسمپرسی کے عالم میں زندہ درگور رکھنے والوں کا دشمن ہوں، اس کی تمام عمر کی محنت کی کمائی پر غاصبانہ قبضہ کرنے والوں کا دشمن ہوں اور ان سب کا دشمن ہوں جنھوں نے مجھے مصائب کی دلدل میں گرفتار کر کے بلیک میل کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی اور مجھے میرے حق سے محروم رکھنے کے لیے اپنے ترکش کا ہر تیر آزمایا۔ ان کے یقین کے مطابق میں جو کچھ کر رہا تھا اپنے ذاتی دشمنوں کے علاوہ منشیات کے اسمگلروں کے خلاف تھا۔

ان کی گفتگو سے میں نے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا کہ وہ اسلحے کے ذخائر کی تباہی اور اپنے ایجنٹوں کی موت پر سخت تشویش میں مبتلا ہیں کہ یہ خفیہ پولیس کی کارروائی تھی یا ملٹری انٹیلی جنس کی۔ دلاور نے اس خیال کا اظہار بھی کیا کہ ملک میں پی ایل او کی طرز پر کوئی ایسا سرفروشوں کا گروہ برسرِ پیکار نہ ہو جسے اپنے ذرائع سے وطن کی سرزمین پر غداروں کی موجودگی کا پتا چل گیا ہو مگر دلاور کے خیال کو اکثریت نے مسترد کر دیا۔ سب نے یہی کہا کہ یہاں کسی زیرِ زمین مزاحمتی گروپ، گوریلا تنظیم یا جانبازوں کی تنظیم کے اس حد تک فعال ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور ابھی تک اس قوم میں اتحاد، یقینِ محکم اور تنظیم کے اصولوں پر عمل کرنے کی صلاحیت صرف تقریروں تک محدود ہے یا ان زرّیں اقوال کا تذکرہ صرف کتابوں میں ملتا ہے۔ یہاں یہ ناممکن ہے کہ کوئی تنظیم بنے جو پی ایل او کی طرح قوت رکھتی ہو، مؤثر ہو اور باعمل ہو۔ وہ فرمودۂ اقبال سے بے خبر تھے کہ۔ ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی۔ ایم آر ایس کے نام سے سرفروشوں کی ایک بہت چھوٹی سی تنظیم وجود میں آچکی تھی مگر چھوٹی ہونے کے باوجود اس تنظیم کے پاس یقینِ محکم اور اتحاد کی وہ طاقت تھی کہ اس کے عزائم بہت بڑے تھے اور ان کے حوصلے ہمالہ کی بلند ترین چوٹی سے بھی بلند تر اور ناقابل

شکست تھے۔ انھیں کہاں علم تھا کہ ستاروں پر کمند ڈالنے والے جوانوں کے ساتھ اس سرزمین پر رابعہ اور نازو جیسی مادرِ وطن کی قابلِ فخر بیٹیاں بھی ہیں جو اپنے جسم کے ہر قطرۂ خون سے اس مٹی کے ہر ذرّے کو سرخرو کرنے کا حوصلہ رکھتی ہیں۔

میں کھڑے کھڑے تھک گیا تھا۔ میں نے دُور سے محسن کو اشارہ کیا اور وہ چائے کے چنڈو خانے کی محفل سے اُٹھ گیا۔ معلوم نہیں اس نے حاضرین و ناظرین با تمکین سے کس اخلاقی مسئلے پر اشتعال انگیز بحث شروع کر رکھی تھی کہ وہ آیا تو لال پیلا ہو رہا تھا۔

"اچھا ہوا کہ تو نے بلا لیا۔" وہ بولا۔ "ورنہ ایک آدھ میرے ہاتھوں جنتی ہو جاتا یا وہ سب مل کر میرا آملیٹ بنا دیتے۔"

"جھگڑا کس بات کا تھا؟" میں نے کہا۔

"ارے یار! میں یوگنڈا کا ذکر کر رہا تھا کہ وہاں کے گینڈے صورت میں شتر مرغ سے ملتے ہیں کہ ایک شخص کہنے لگا تم بکتے ہو۔ میں سات سال افریقہ میں رہ چکا ہوں۔ میں نے کہا کہ تم بکتے ہو۔ تم نے شتر مرغ تو کیا مرغ تک نہیں دیکھا ہوگا۔ ذرا بتاؤ، دنیا میں کتنی قسم کے مرغے ہوتے ہیں۔ وہ ایسا خبیث تھا کہ واقعی قطب شمالی سے قطب جنوبی تک ہر قسم کے مرغوں کی اقسام گنانے لگا۔ میں نے کہا، سب سے اچھا کون سا ہوتا ہے۔ بس یہیں وہ مار کھا گیا۔ اس نے کوئی مشکل سا نام لیا اور میں نے کہا غلط۔ سب سے اچھا ہوتا ہے فلاں ہوٹل کا مرغ مسلّم... بس اسی بات پہ ہاتھا ہوتے ہوتے رہ گئی۔"

ہاتھا؟ یا ہاتھا پائی...؟" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

نہیں... صرف ہاتھا... پائی میں پاٹے چلانے پڑتے۔" وہ بولا۔

"اچھا اب تم یہاں میری جگہ لو۔" میں نے کہا۔ "میں تھک گیا ہوں اور چائے خانے کی رونق بڑھانے جاتا ہوں۔"

ولاور اینڈ کمپنی کی گفتگو لمبی ہوتی گئی اور بیچ میں ایسے بہت سے مرحلے آئے جب ذراسی بات پر اختلافِ رائے سے نوبت تلخ کلامی تک اور گالی گلوچ تک پہنچی مگر پھر کسی نہ کسی نے جوش کو چھوڑ کر ہوش سے کام لیا اور بات کو اس حد تک نہیں بگڑنے دیا جہاں بات بنائے نہ بنتی۔ وہ سب ایک ایسے کاروبار میں شریک تھے جو غیر قانونی اور غیر اخلاقی تو تھا ہی خود ان کے لیے ندامت اور احساسِ جرم کی خلش کو جگائے رکھتا تھا۔ وہ اس کا اعتراف اپنے آپ سے بھی نہیں کرتے تھے مگر ان کے مادی وجود کے اندر احساس کی ایک کرن زندہ تھی جس پر تاریکی غالب آ ہی نہیں سکتی تھی۔ یہ آدمی کا ضمیر تھا جو کبھی کسی قاتل کے ہاتھوں نہیں مرتا۔ جو بے وجود ہونے کے باوجود سخت جان ہوتا ہے اور سسک سسک کر بھی زندہ رہتا ہے۔ یہ لاشعور کی گہرائیوں میں دفن رہنے والا خیال ان کو اندر ہی اندر کچوکے دیتا رہتا ہے کہ وہ دوست نہیں ہیں شریکِ جرم ہیں اور دنیا کے سامنے ظاہر ہے وہ معزز اور معتبر مگر یہاں ایک دوسرے کے سامنے سب مجرم ہیں۔ ان کے درمیان خلوص اعتماد کی فضا میں پروان چڑھنے والا رشتہ تھا ہی نہیں بلکہ شکوک اور عدم اعتماد کے ساتھ مجبوری کا تعلق تھا۔ ان حالات میں چائے خانہ ہی ایک مناسب ٹھکانا لگتا تھا۔

چائے خانے کے مالک نے کئی بار مجھ سے مختلف موضوعات پر تبادلۂ خیال کی بے سود کوشش کی۔ وہ نیلو کی نئی فلم کے رقص کی تباہ کاری سے سیلاب یا زلزلے کی تباہ کاری تک ہر مسئلے پر مفید معلومات فراہم کر سکتا تھا اور یہ بھی بتا سکتا تھا کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے یا نہیں ہو رہا ہے، سب قربِ قیامت کی نشانیاں ہیں۔ اس جگہ آنے جانے والے عام لوگ تھے جو ایک کپ چائے پیتے تھے تو دل کے بہلانے کو باتیں کرتے تھے۔ یہ تنہائی کے احساس کو مٹانے [illegible] اور وقت گزارنے کا سستا نسخہ تھا۔ کچھ وہاں [illegible] آنے والے لوگ تھے جو اُسے اپنا اڈا سمجھتے تھے۔ اڈا اگر اعلیٰ قسم کا ہو تو کلب کہلاتا ہے یا کافی ہاؤس۔ کبھی کبھار کے آنے والوں کو بھی اس روڈ سائڈ کلب میں اجنبی سمجھ کے نظر انداز نہیں کیا جاتا تھا۔ سب بہت جلد بے تکلف ہو جاتے تھے اور پھر جس کا جو چاہے کہے۔ سب کی سُنے اور اپنی سنائے۔

لیکن میں یہاں گیان دھیان میں مگن سادھو یا خبطی الحواس کی طرح چپ بیٹھا تھا۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ میرے سر کے بالوں میں ایک خفیہ ریسیور چھپا ہوا ہے جس میں سے نکلنے والا مکڑی کے جالے جیسا باریک تار میرے کان میں گھس گیا ہے اور میں سوگز دور ایک گھر کے بند دروازوں کے پیچھے ہونے والی گفتگو کا ایک ایک لفظ صاف سُن رہا ہوں۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ جو آوازیں میں سُن رہا ہوں، وہ اس ملک اور اس قوم کے محبِ وطن افراد کے لیے کتنی اہمیت رکھتی ہیں۔ اگر یہ آوازیں سب سن سکتے تو شاید اس گھر کو جلا کے راکھ کر دیتے اور وطن فروشوں کے اس ٹولے کی تکا بوٹی کر دیتے مگر جو کچھ ہم کرنا چاہتے تھے وہ اشتعال انگیزی کی کارروائی نہیں تھی۔ ہمیں سب سن کر تمام معلومات کی مدد سے ایک مؤثر لائحہ عمل تیار کرنا تھا تاکہ ہم ہر گوشے میں چھپے ہوئے وطن کے ہر دشمن کا قلع قمع کر سکیں۔

"میری سوہنی سرکار۔" چائے خانے کا مالک بالآخر میری پُراسرار محویت اور خاموشی سے تنگ آگیا۔ "آپ چائے کی پیالی پیٹ میں ڈالتے جا رہے ہو۔"

"اس پیٹ کے دوزخ میں آدمی تمام عمر ایندھن ڈالتا رہتا ہے لیکن اس کی آگ کبھی ٹھنڈی نہیں ہوتی۔" میں نے کسی فلسفی کی طرح فرمایا۔

چائے والا بے حد متاثر ہوا۔ "آپ تو مجھے پہنچے ہوئے لگتے ہو جی!"

"تجھے کیا معلوم کون کہاں پہنچا ہوا ہے۔" میں نے اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔ "کوئی شیخوپورہ بھی نہیں پہنچا... کوئی ولایت پہنچا۔"

"سبحان اللہ میری سوہنی سرکار۔" فرطِ عقیدت سے اس کا بُرا حال ہو گیا۔ "جو ولایت کے مرتبے تک پہنچے، ولی ہوئے۔ آپ کو بھی ولایت حاصل ہے جی؟"

"ہم ولایت تک پہنچ کے لوٹ آئے۔" میں نے قلندرانہ شان سے کہا۔ سارا فرق اس لفظ کے مطلب کا تھا کہ میں کچھ کہہ رہا تھا مگر وہ کچھ اور سمجھ رہا تھا۔ میں تو چاہتا تھا کہ کسی طرح وہ چپ ہو جائے۔

"آپ ہم پر بھی نظرِ کرم کریں تو ہم خود اس فٹ پاتھ سے اُٹھ جائیں۔" وہ میرے سامنے ایک اور چائے کا کپ رکھ کے بولا... "ورنہ کسی روز کارپوریشن والے ایسا اٹھائیں گے کہ پھر بیٹھنے نہ دیں گے۔ دعا کریں کہ یہاں سے اُٹھ کے کسی ہوٹل میں کاروبار جمائیں۔"

"اللہ تجھے اُٹھائے بچّہ۔" میں نے کہا۔ "تیرے کاروبار کو منجمد کرے۔"

"آمین۔" وہ سمجھے بغیر بڑی عقیدت سے بولا۔ "ایک بات بتائیں۔"

"چوپ۔" میں نے اُنگلی ہونٹوں پر رکھ کر سرگوشی میں کہا۔ "ہم کچھ سُن رہے ہیں۔"

وہ دم بخود رہ گیا۔ "کیا سُن رہے ہو میری سوہنی سرکار؟ ادھر تو بس شور ہی شور ہے۔"

"ہم جو کچھ سُن سکتے ہیں وہ کوئی نہیں سن سکتا بدبخت..." میں نے کہا جو بالکل غلط نہیں تھا۔ چائے والا خاموش ہونے پر مجبور ہو گیا۔

دلاور اینڈ کمپنی والے اب اپنے نئے انتظامات پر بحث کر رہے تھے۔ سائیں پاپڑ والے کی جعلی درگاہ اور کرماں والی کے اڈّے کا خاتمہ ہو گیا تھا اور وہ سب لوگ بھی مارے جا چکے تھے جو اس سے تعلق رکھتے تھے لیکن اس سے نہ تخریب کاروں اور علیحدگی پسندوں کے عزائم کو شکست ہوئی تھی اور نہ ان کے غدّار دوستوں کا خاتمہ ہوا تھا۔ انھوں نے دوسرے افراد اور دوسرے ٹھکانے تلاش کر لیے تھے۔ اگر ہم سیوک رام اور جگن ناتھ کے علاوہ ان کے دوسرے افراد اور غلاموں کو جہنم رسید نہ کرتے تب بھی یہ ایسا کاروبار نہیں تھا جو غیر معینہ مدت تک ایک ہی جگہ چلتا رہے اور انہی لوگوں کے ہاتھوں چلتا رہے۔ شکوک سے بچنے کے لیے بھی لوگ اور ٹھکانے، اِدھر سے اُدھر کرتے رہنا ضروری ہو جاتا ہے۔

جو کچھ میں سُن رہا تھا وہ استاد ٹیڈی کے پاس ریکارڈ بھی ہو رہا تھا۔ اس کے پاس وافر مقدار میں کیسٹ تھے لیکن میں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا کہ یہ ایک مشینی نظام تھا جو اصلاتی طور پر کسی معمولی سے نقص سے ختم ہو سکتا تھا۔ ٹیپ ریکارڈر میں فنی خرابی پیدا ہو سکتی تھی چنانچہ میرے لیے گفتگو کے ہر لفظ کو اپنے ذہن میں محفوظ رکھنا ضروری تھا۔ عین اس وقت جب ان کی میٹنگ کا اصل مقصد پورا ہو چکا تھا اور وہ چائے پیتے ہوئے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے تھے، میں نے ایک کار کو گلی کے آخری حصے سے کچھ دُور رُکتے دیکھا۔ یہ ایک مرسیڈیز تھی اور تقریباً ویسی ہی تھی جیسی خسرو جمشید کے پاس تھی اور جسے ہم ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس سے نکلنے کی کوشش میں تباہ کر چکے تھے۔ اس کا رنگ اور ماڈل سب کچھ وہی تھا مگر جس چیز نے مجھے متوجہ کیا وہ اس کا رجسٹریشن نمبر تھا۔ خسرو جمشید کی جل کر کوئلہ ہو جانے والی مرسیڈیز کا نمبر ہی ایسا تھا کہ آسانی سے ذہن نشین ہو جاتا تھا اور اس دوسری کار پر مجھے پھر وہی نمبر نظر آ رہا تھا۔ یہ کچھ ایسا ہی تھا جیسے کوئی مردہ جسے سپردِ خاک کر دیا گیا ہو پھر سرِ راہ انہی کپڑوں میں نظر آ جائے جو وہ عموماً اپنی زندگی میں پہنتا تھا۔

ابھی میں اس مردے کے زندہ ہونے پر حیران ہی تھا کہ میں نے سڑک کے کنارے لگے ہوئے بجلی کے کھمبے کی روشنی کو براہِ راست ڈرائیور پر پڑتے دیکھا اور چائے کا آٹھواں کپ میرے ہاتھ سے گرتے گرتے رہ گیا۔ میں ایک دم اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"یہ لو چائے کے پیسے..." میں نے دس کا نوٹ نکال کے کہا۔

"توبہ جی توبہ۔" وہ کانوں کو ہاتھ لگا کے بولا۔ "آپ تو بس میرے حق میں دعا کریں۔"

"دعا کس چیز کے لیے؟"

"اللہ ایک بیٹا دے اس سال۔" وہ بولا۔ "چھ سال میں گھر والی نے چھ لڑکیاں پیدا کر دی ہیں۔"

"لڑکیاں اللہ کی رحمت ہوتی ہیں بچّہ۔" میں نے کہا۔

"مجھے بڑھاپے کا ایک سہارا بھی چاہیے میری سوہنی سرکار۔"

"ہم اولادِ نرینہ کے لیے دعا نہیں دیتے۔" میں نے کہا۔ "اولاد جوان ہو کے نافرمان اور سرکش ہو تو باپ کی سفید داڑھی پکڑتی ہے اور اس کا مُنہ کالا کرتی ہے۔ ساری بد دعائیں پھر ہم پر آتی ہیں۔"

"اچھا تو خوشحالی کی دعا دیں۔" وہ بولا۔

"کتنی خوشحالی چاہیے؟" میں نے کہا۔ "لکھ پتی بننے کی دعا چاہیے تو فیس ہزار روپے۔ کروڑ پتی بننے کی دعا دس ہزار میں۔"

"فیس؟ اوئے بدمعاش... فراڈیے..." اس نے میرے ہاتھ سے دس کا نوٹ چھین لیا اور چھ روپے میرے ہاتھ پر رکھ دیے۔ "چل کھسک اِدھر سے... بڑا پہنچا ہوا بنتا تھا... یہ نہ ہو تھانے پہنچ جائے۔"

"ہم وہاں بھی پہنچ چکے ہیں بچّہ۔" میں نے چلتے چلتے کہا۔ "اب اللہ تجھے بھی پہنچائے۔ اور تجھے مزید چھ بیٹیاں دے۔" پھر میں نے وہاں سے دوڑ لگائی۔ وہ اُٹھا اور پھر بیٹھ گیا۔ اس کا ارادہ مجھ پر ایک کفگیر مارنے کا تھا مگر ہاتھ کچھ غلط گھوم گیا اور نشانہ ایک "تابت" بنا۔

پھر وہ آپس میں اُلجھ گئے۔ چائے والا معافیاں مانگ رہا تھا اور گاہک مجروح کلائی کو ملتے ہوئے بیٹھ چکا تھا۔

کار کے قریب پہنچنے کے بعد میں نے خود کو ایک سائڈ پہ رکھا تاکہ ڈرائیور مجھے بیک ویو مرر میں نہ دیکھ سکے۔ نیچے بیٹھ کر میں نے ماچس کی ایک تیلی سے ٹیوب کا والو دبایا۔ ہوا بڑی آواز کے ساتھ نکلی اور ڈرائیور ایک دم اچھل پڑا۔ وہ کسی نامعقول کی شرارت اور دیدہ دلیری پہ مشتعل تھا، جو ڈرائیور کی موجودگی میں ٹائر کو فلیٹ کرنے پر آمادہ تھا۔ وہ ایک دروازے سے باہر آیا اور میں دوسری طرف سے گھوم کر سامنے چلا گیا۔ نواب خسرو جمشید کے ہم شکل شوفر نے زیرِ لب ایک گالی دی۔ "کون تھا؟" وہ پچھلی سائڈ کے بائیں ہاتھ والے ٹائر کو دیکھ کر بولا۔ اس نے لات مار کر ہوا کا پریشر دیکھا جو بالکل ٹھیک تھا۔ ذرا سی ہوا کم ہونے سے پریشر میں کیا فرق پڑ سکتا تھا مگر ہوا نکلنے کی آواز اس نے خود سُنی تھی جو پیچھے سے آئی تھی۔ اِدھر اُدھر دیکھنے پر اُسے کوئی بھی نظر نہ آیا جس پر وہ شک کرسکتا۔ اس نے آواز کو اپنا وہم سمجھا اور پھر اپنی جگہ پر جا بیٹھا۔ میں اتنی دیر میں سر جھکائے پیچھے کی طرف لوٹ آیا۔ بیٹھے بیٹھے میں نے پھر تیلی کی مدد سے ٹیوب کے والو کو دبایا۔ اس مرتبہ آواز پہلے سے بھی زیادہ دیر تک سنائی دی۔

نواب خسرو جمشید کا ہم شکل شوفر دوسری بار بڑے یقین کے ساتھ ریوالور ہاتھ میں لے کر باہر آیا۔ میں دبک کر کار کے نیچے گھس گیا اور کسی آواز کے بغیر سرکتا ہوا دوسری طرف جا نکلا۔ وہ پیچھے آیا اور کچھ دیر سیدھا کھڑا رہا۔ پھر میں نے نیچے سے ہی اس کے قدموں کو آگے بڑھتا دیکھا۔ اس نے کار کے گرد ایک چکر پورا کیا اور کسی کو نہ پا کے حیران ہوا۔ میری توقع کے عین مطابق اس نے سر جھکایا اور نیچے جھانکنا چاہا۔ میرے ہاتھوں نے صحیح وقت پر اس کی گردن دبوچ لی۔ اپنی اونچے شملے والی پگڑی اس نے پہلے ہی اتار کے ایک ہاتھ میں تھام لی تھی ورنہ اتنا جھکنے سے وہ زمین پر گرتی۔ اس طرح وہ ایک ہاتھ کو استعمال کرنے کے قابل نہ رہا۔ میرے سامنے اس کے بال آئے۔ میں نے اسے ایک ہاتھ سے بال پکڑ کے کھینچا تو وہ نیچے گرا اور اس کا سر سائڈ سے ٹکرایا۔ پھر میں نے دونوں ہاتھ سے اس کی گردن دبا کے اسے کار کے نیچے کھینچ لیا۔ ریوالور وہ استعمال کر ہی نہیں پایا تھا۔ میں نے اس کا سر اوپر اٹھا کے کار کے فرش پر مارا۔ اس سے ایسی آواز پیدا ہوئی جیسے کوئی خالی ڈرم پہ لات مارے۔ دوسری بار بھی میں نے ایسا ہی کیا اور وہ آواز نکالے بغیر بے سُدھ ہوگیا۔

میں نے چند منٹ تک انتظار کیا کہ اگر اِدھر اُدھر سے کسی نے دیکھا ہوگا تو آجائے گا اور پھر اس سے بھی نمٹنا ہوگا مگر یہ ساری کارروائی ایک منٹ میں ختم ہوگئی تھی۔ کسی نے ڈرائیور کو کار کے گرد چکر لگاتے دیکھا ہوگا تو اسے کوئی بات غیر معمولی نظر نہ آئی ہوگی۔

اس نے دوسرے لمحے میں ڈرائیور کو غیر موجود پایا ہوگا تو فور… ہوگا کہ وہ اندر جا بیٹھا ہے۔ کار کے نیچے تیس سیکنڈ میں ہو… والی جنگ بالکل یکطرفہ رہی۔ اسے مزاحمت کا موقع ہی نہ… میں نے اُسے ناک آؤٹ کر دیا۔

اگلا مرحلہ زیادہ دشوار ثابت ہوا۔ جب میں نے… ہوئے نواب خسرو جمشید کے نقشِ ثانی کو بے لباس کیا… قدرت میں آگیا۔ مرسیڈیز جیسی عالی شان کار کے نیچے ایک… ایسا بھی آیا جب ایک حمام والا محاورہ درست ثابت… پھر میں نے وہ خلعتِ فاخرہ زیبِ تن فرمائی جو دوسرے… جسم پر تھی مگر اب نہیں تھی۔ میں نے اپنا لباس اسے پہنانا… نہیں سمجھا۔

باہر طلوع ہونے کے بعد میں نے اپنی دستار بند… وہ پگڑی جس پہ میں نے ہاتھ ڈالا تھا نیچے سے اٹھا کے جما… اپنے سر پہ جمالی۔ فرق اب صرف مونچھوں کا تھا لیکن یہ فرق… بیس کا تھا۔ خود میں نے حلیہ بدلنے کے لیے اپنی مونچھوں کی… پہ کافی وقت صرف کیا تھا مگر اس نقلی نواب کی مونچھیں… آدھا انچ کے قریب زیادہ باہر نکلی ہوئی تھیں اور کچھ نوکیلی تھیں۔ رات کے اندھیرے میں صورت کے فرق کا فوراً… مشکل تھا اور میں اب ایک ادھ کھلی میں سر دیے بیٹھا تھا چنانچہ… سے ڈرنا بے کار تھا۔

موقع پاتے ہی میں نے ڈکی کھول کر نقلی نواب کو نیچے نکالا اور ڈکی میں ڈال دیا۔ زیادہ ڈر مجھے اصلی نواب خسرو جمشید… طرف سے تھا۔ ان کی میٹنگ ختم ہو رہی تھی اور وہ کسی بھی… ہو سکتا تھا۔ ان دونوں نے ایک جیسی شکل و شباہت سے… چلا رکھا تھا وہ بالآخر آج ختم ہوگیا۔ صاف ظاہر تھا کہ اصلی… خسرو جمشید اعلیٰ سطحی اجلاس میں بہ نفسِ نفیس تشریف… کی ہدایات کے مطابق شوفر ٹھیک وقت پر اسے لے جانے کے لیے گاڑی لے کر حاضر ہوگیا تھا۔ اگلی سیٹ پر بیٹھ کر میں نے… تھوڑا سا آگے بڑھا کر لیمپ پوسٹ سے دور اندھیرے میں… پھر پیچھے اتر کے ڈکی میں پڑے ہوئے نقلی نواب کو تاروں سے… تار ڈکی میں پڑے ہوئے تھے۔ محسن دُور سے سب کچھ دیکھ رہا… وہ آہستہ آہستہ قریب آگیا۔

"یہ کیا کر رہا ہے تو؟" وہ بولا۔ "یہ ہمارے پروگرام میں ش… نہیں تھا۔"

"پروگرام میں تو ہمارے بہت کچھ شامل نہیں تھا۔" میں… کسی عظیم فلسفی کی طرح کہا۔ "مثلاً میرا مسماۃ رابعہ وکیلن سے عشق کرنا… تیرا شہلا سے عقد فرمانا۔ وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے… یہی منظور تھا، منظورِ نظر کہ میں نواب بنوں اور تو حسد کرے… لگ رہا ہوں میں؟"

"ایسا کہ نواب خسرو جمشید تیری نظر اتار دیں گے۔" محسن جل کر بولا۔ "ممکن ہے نظر کے ساتھ کھال بھی اتار لیں۔ اور بھُس بھر کے یہ ہمیں ارسال کر دیں۔"

"بھُس مت بھرنا۔" میں نے وصیت کے انداز میں رقت طاری کر کے کہا۔ "میری کھال کے طبلے بنوا لینا۔ اور رابعہ کو دے دینا اور اگر وہ بھی عاشقی کی روایات پر عمل کرتے ہوئے میرا ساتھ دینے کے لیے دنیا سے عالمِ بالا کی سمت کوچ کر جائے تو ہر سال شہیدانِ الفت کا عرس کرنا۔ لنگر اور قوالی والا۔ قوالی میں سنگت کے لیے یہی طبلے رکھنا اور قوالی خود گانا۔"

"دلاور چوہدری قوال اور ہمنوا زیادہ بہتر قوالی کریں گے۔" محسن بولا۔ "طبلہ سراج بجالے گا۔ اس نے ایک رات تھانے میں تجھے بھی طبلے کی طرح بہت اچھا بجایا تھا۔"

"مذاق کی بات چھوڑ... وہ آنے والے ہیں۔" میں نے کہا۔ "آج میں نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیا۔ پانی ڈکی میں ہے۔ بالکل اصل حالت میں... جیسا دنیا میں آیا تھا... اور دودھ آنے والا ہے۔ یہ میرے کپڑے لے جا۔" میں نے بنڈل اسے تھما دیا۔

"یہ لے جا کر تیری نشانی کے طور پر رابعہ کو دے دوں؟" محسن نے سمجھ لیا کہ وہ میرا ارادہ بدل نہیں سکے گا۔

"ہاں... میری آخری نشانی۔"

"اور اسٹوری کیا سناؤں؟" محسن بولا۔ "کہ کپڑوں کے اندر کا ولی کدھر گیا۔"

"کوئی اچھی سی دل پر اثر کرنے والی اسٹوری سنا دینا۔ مثلاً یہ کہ ہم چڑیا گھر کے شیر کو دیکھ رہے تھے۔ شیر نے کہا کہ ایسے کیا دیکھتا ہے اندر آ پھر میں تجھے دیکھوں۔ مرحوم جذباتی ہو کے اندر چلے گئے۔ اب شیر کے اندر ہیں اور ہضم ہو رہے ہیں۔ کپڑے شیر کو فٹ نہیں تھے اس لیے بچ گئے۔ بہت امپریس ہوگی۔"

"میں دوڑ کر یہ کپڑے غالب کو دے آتا ہوں۔" محسن بولا۔ "اسے بتلا دوں کہ ہم ذرا گھومنے جا رہے ہیں اور کچھ دیر سے آئیں گے۔ میں تجھے اکیلا نہیں جانے دوں گا۔"

"بے وقوفی مت کر... بیوی کو بیوہ میں تبدیل مت کر۔"

"بکواس مت کر۔" وہ بولا۔ "میں آتا ہوں... میرے آنے تک جانا نہیں۔"

اس کے جانے اور آنے میں دس منٹ صرف ہونے یقینی تھے۔ اِدھر جو آوازیں میرے کان سن رہے تھے ان سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ سب ایک دوسرے سے رخصت ہونے کی اجازت طلب کر رہے ہیں۔ کام کی ساری باتیں میں نے سُن لی تھیں اور مجھے یقین تھا کہ ٹیپ پر ریکارڈ بھی ہوگئی ہیں۔ یہ سب سُن کر میں ان کے عزائم سمجھ چکا تھا جو انتہائی خطرناک تھے۔ اگر ان کے عزائم [illegible] کامیاب ہو جاتے تو یہ ملک دو ٹکڑے ہو جاتا اور ملک میں ایسی خانہ جنگی کی صورت پیدا ہو جاتی جس میں لاکھوں محبانِ وطن کا پاک لہو بے آبرو ہو کے مٹی میں مل جاتا۔ ان غداروں کو سزائے موت دینے کے لیے یہی جرم کافی تھا کہ انھوں نے ایسا سوچا مگر ابھی ہمیں ان کے پورے منصوبے کو طشت از بام کرنا تھا اور ان کے ہر شریکِ جرم تک پہنچنا تھا۔ ابھی سے انھیں مار کے ہم راستوں کا سراغ گم نہیں کرنا چاہتے تھے۔

رخصت ہونے والوں میں سب سے پہلے ایس پی سراج گیا۔ اس وقت رات کے دس بج رہے تھے۔ وہ گلی کے دوسرے حصے سے نکل گیا۔ ورنہ اس طرف سے جاتا تو میں اُسے ضرور دیکھتا۔ اس کے جانے کے بعد پیڈرو نے دلاور اور جمشید کے سامنے اسے گالیاں دیں کہ بڑا ایس پی بنا پھرتا ہے۔ کسی دن یہ کر دوں گا اور وہ کر دوں گا۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ پیڈرو اور سراج کے درمیان کبھی نہیں بنی اور وہ ساتھ ہونے کے باوجود ایک دوسرے کی جان کے دشمن ہیں۔ ساتھ دینے کی مجبوری نہ ہوتی تو وہ ایک دوسرے کو کتے کی موت مار دیتے۔ دلاور نے پھر اُسے سمجھایا کہ وہ بہت کام کا آدمی ہے۔ ایس پی اور ڈی آئی جی کے عہدے کی بات نہیں۔ پولیس میں ایسے بہت ہی کم ہوتے ہیں جو پیسے کے لالچ میں اندھے ہو جائیں۔ فرائض اور ذمے داریوں کو بھول جائیں اور دشمنوں کا آلۂ کار بننا تک قبول کر لیں۔ اسے ناراض کرنا کاروبار کے راستے بند کرنے کے مترادف ہوگا۔ پھر دوسرا آدمی ملے نہ ملے جو اسی طرح سارے راستے کھُلے رکھے۔ خسرو جمشید نے اس کی تائید کی اور پیڈرو کو جذباتی نہ ہونے کی تلقین کی۔

دلاور اور خسرو جمشید ایک ساتھ نکلے اور مخالف سمتوں میں روانہ ہوگئے۔ اس کا اندازہ میں نے ان کے الوداعی کلمات سے کیا۔ پھر پیڈرو نے روانگی اختیار کی اور چلتے چلتے سونیا سے نہ جانے کیا کہا کہ اس نے برہمی سے کہا۔ "بکواس نہ کرو۔" اور پیڈرو قہقہہ مار کے ہنسا۔ سونیا کی برہمی مجھے ایک ادائے محبوبی لگی۔ معلوم نہیں اُن کے درمیان تعلق کی نوعیت کیا تھی لیکن یہ بات عجیب سی تھی یا مجھے عجیب لگی کہ اس گھر میں سونیا کے دونوں بھائی بھی موجود تھے اور پیڈرو نے ان کے سامنے کوئی قابلِ اعتراض بات کی تھی۔ ممکن ہے وہ سامنے نہ ہوں۔ میں نے سوچا۔ میں صرف آوازیں سُن رہا ہوں۔ کچھ دیکھ نہیں رہا ہوں۔ پیڈرو بھی چلا گیا اور میں نے قدرے تشویش میں مبتلا ہو کے محسن کو تلاش کیا جو دس منٹ میں آسانی سے واپس لوٹ کر آسکتا تھا لیکن اس کا کہیں پتا نہ تھا۔ نواب خسرو جمشید کسی بھی لمحے گلی کے نکڑ سے نمودار ہو سکتا تھا اور اب محسن کے لیے اتنا وقت نہیں رہا تھا کہ وہ ڈکی میں چھپ سکے۔

غالباً آخری چند سیکنڈ باقی تھے جب میں نے اپنا پروگرام بدل دیا۔ ذہن میں آنے والا یہ فوری خیال بالکل آوازِ غیب کی طرح تھا جس نے واضح الفاظ میں کہا کہ سکندر! تم نے سوچے سمجھے

بغیر بہت عجلت میں فیصلہ کیا تھا۔ ابھی وقت تمھاری گرفت میں ہے... بدل دو اس فیصلے کو... یہ نہ ہو آتنی بڑی کامیابی تمھارے غلط فیصلے سے ناکامی میں بدل جائے اور قصور وار صرف تم کہلاؤ کیونکہ تم نے کسی کو بتلائے بغیر اور کسی سے مشورہ کیے بغیر وہ کیا جو تمھارے دماغ میں آیا۔ یہ شاید وہ آواز تھی جس کو میں اپنی چھٹی حس سے تعبیر کرسکتا تھا۔ یہ تائید یزدی تھی۔ وہ قوت تھی جس کا نادیدہ ہاتھ ہمیشہ مجھے تحفظ فراہم کرتا آیا تھا اور جس نے مجھے سوچ کے صحیح راستے پر گامزن رکھا تھا۔

میں نے چابی گھمائی اور گاڑی کو ایک دم گیئر میں ڈال دیا۔ کسی چیتے کی طرح طاقتور اور خوب صورت مرسیڈیز نے ایک جست لی اور اس کی رفتار سات سیکنڈ میں ساٹھ میل پر پہنچ گئی۔ میں نے کھڑکی سے سر نکال کے پیچھے دیکھا کیونکہ بیک ویو مرر میں سے اندھیرے کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ خسرو جمشید ابھی تک سڑک پر نہیں پہنچا تھا۔ اب میں اس سے کئی گز دُور تھا چنانچہ وہ آبھی جاتا تو اتنے فاصلے پر جانے والی کار کو پہچان نہ پاتا۔ اس کی نظر گلی اور سڑک کے سنگم پر ادھر اُدھر گئی ہوگی کہ شوفر نے کار کہاں کھڑی کی ہے۔ یہ خیال اس کے ذہن میں آنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا کہ صرف دس سیکنڈ پہلے وہ کار یہاں موجود تھی مگر اب نہیں ہے۔

خود کو محفوظ پا کے میں نے رفتار کم کی اور اب میرے دماغ کی منفی رو نے مجھے اندیشوں اور خطرات کے امکانات کا تناسب سمجھانا شروع کیا۔ اگر محسن آجاتا اور ڈکی میں لیٹ جاتا تو کیا ہوتا۔ وہ میری کوئی مدد نہ کر پاتا۔ سب سے پہلے تو یہ ہوسکتا تھا کہ خسرو جمشید اصل اور نقل کے فرق کو پہلی نظر میں تاڑ جاتا۔ اس کے شوفر کی اور میری مونچھوں میں تو اتنا فرق نہیں تھا مگر ہمارے چہرے بالکل مختلف تھے۔ اگر خسرو جمشید اندھیرے میں صورت پر غور نہ بھی کرتا تو جیسے ہی وہ اندر بیٹھنے کے لیے دروازہ کھولتا اور اندر چھت کی لائٹ جلتی وہ میری صورت دیکھ لیتا۔ اس کی نگاہ کے دھوکا کھانے کا امکان بہت کم تھا۔ میں نے اسے کبھی چشمہ لگاتے نہیں دیکھا تھا چنانچہ یہ فرض کرنا غلط تھا کہ اس کی نظر کمزور ہوگی۔ اگر یہ بھی نہ ہوتا تو سب سے خطرناک مرحلہ آتا۔ وہ مجھ سے کہتا کہ چلو۔ اور میں احمقوں کی طرح سوچتا کہ کہاں چلوں۔

یہ سب سے بڑی غلطی میرا راز فاش کر دیتی۔ اصلی شوفر تو جانتا تھا کہ خسرو جمشید کو کہاں لے جانا ہے۔ میں اس سے تو پوچھ نہیں سکتا تھا کہ نواب صاحب کہاں تشریف لے جائیے گا۔ پھر کس سے پوچھتا میں؟ میں نے ناک آؤٹ ہو جانے والے شوفر سے نواب جمشید کے گھر کا پتا معلوم کرلیا ہوتا تو کام شاید چل جاتا۔ اس کے بعد بھی مجھے وقت ملا تھا جب میں گلوز کمپارٹمنٹ میں کاغذات دیکھ سکتا تھا۔ رجسٹریشن بُک میں کوئی نام اور پتا ضرور مل جاتا۔ لیکن یہ سب کچھ کیے بغیر میں نے شوفر کی جگہ سنبھال لی تھی اور

بال بال بچ گیا تھا، ورنہ پیچھے بیٹھنے والا خسرو جمشید میری گُدی پر ریوالور رکھ دیتا اور کہتا کہ بہروپیے! کون ہو تم... اور نواب شوفر کہاں ہیں جو اس گاڑی میں بیٹھے ہوئے تھے۔

میں نے گاڑی کو دوسری مرتبہ دائیں طرف موڑا اور شکر ادا کیا کہ جلد بازی میں ایک بے وقوفی کرنے سے بچ گیا ورنہ ایجنٹ کمپنی کو معلوم ہو جاتا کہ جس وقت اُن کا انتہائی خفیہ اجلاس ہو رہا تھا اس وقت ایم آر ایس کے جاسوس باہر پھیلائے ان کی زبان سے نکلنے والے ہر لفظ کو گرفتار کر رہے تھے۔ ان کا یہ شک یقین میں بدل جاتا کہ ہمیں ان کے اصل ارادوں اور ان کے مذموم عزائم کا اچھی طرح علم ہے۔ اب تک ان کے ٹھکانے اور ایجنٹ ہمارے ہی ہاتھوں تباہ و برباد ہوئے ہیں۔ اپنا سارا پروگرام بدل دیتے، سارے اڈے تبدیل کر دیتے اور سب منسوخ کر دیتے جو انھوں نے وکٹر فیصل کے گھر میں میٹنگ میں طے کیا تھا۔ اس کے بعد ان کی نقل و حرکت پر نظر رکھنا اور سُراغ سے ان کے سراغ دیکھنا اتنا ہی ناممکن ہو جاتا جتنا ہوا کے جانے والے جھونکے کا تعاقب کرنا۔

ظاہر ہے اس کے بعد اگر خسرو جمشید مجھے ختم نہ کرتا تو میرے لیے اصلی اور نقلی دونوں نوابوں کو ختم کرنا ضروری ہو جاتا۔ میں ان کو قید رکھتا یا ان کی لاشیں تک غائب کر دیتا، ہر صورت میں ان کی پُراسرار گمشدگی سے شکاری ایک ہی نتیجہ اخذ کرتے کہ عین ان کے پالیسی ساز اجلاس کے بعد ایک اہم شریکِ جلسہ کا اس طرح غائب ہونا خطرے کا سائرن ہے۔ ان کو کسی نے اغوا کیا ہوگا اور پھر ان کے جسم سے جان کو قطرہ قطرہ کشید کرنے والوں نے ان کے دماغ سے بھی وہ سب معلومات حاصل کرلی ہوں گی جو اہم تھیں تفتیش کے تو ایک سو ایک طریقے ایسے ہیں جن کا آدمی کو یوں بولنے پر مجبور کر دیتا ہے جیسے چابی والے گراموفون ریکارڈ کو سوئی کی چبھن آواز نکالنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ وہ اپنے منصوبے کو از سرِ نو مرتب کرتے اور سب کچھ بدل ڈالتے۔

یہ مسئلہ اب بھی تھا کہ اس شوفر نواب کا کیا کیا جائے جو کی ڈکی میں بند تھا لیکن زیادہ سنگین نہیں۔ اسے سب کے سامنے کر بہتر طریقے پر حل کیا جا سکتا تھا۔ میں اس عالی شان کار کو تنگ گلی سے گزار کر گولڈن مونگ پھلی اینڈ نیوز پیپر ایجنسی کی طرف لے گیا جہاں اب مرزا غالب مونگ پھلی بیچ رہے تھے۔ یہ کوئی عام کار نہیں تھی جو کسی کو متوجہ نہ کرتی۔ اس کو چوری کی آسان تھا، رکھنا عملاً ناممکن تھا۔ آدمی کسی کی مرغی تو چُرا سکتا ہے اور ہضم بھی کر سکتا ہے، چڑیا گھر کا ہاتھی نہیں چُرا سکتا اور چُرا لے تو چھپا کے نہیں رکھ سکتا۔ مجھے معلوم تھا کہ بہت جلد پولیس کو اس کار کی چوری کے بارے میں سب کچھ بتا دیا جائے گا اور وہ آسانی سے کسی بھی سڑک پر اس گاڑی کو دیکھیں گے تو پکڑ

جائیں گے کیونکہ ایسی کاریں لاہور میں دو درجن سے زائد نہیں ہو سکتی تھیں۔ میں نے کار کو دو گھروں کے درمیان خالی پڑے ہوئے پلاٹ پر کھڑا کیا ہی تھا کہ میرے کانوں میں پھر آوازیں آنے لگیں۔ میں ڈرائیونگ کرتا ہوا سو میٹر کی رینج سے دور ہو گیا تھا۔ اب میں مونگ پھلی کے اسٹیشن سے قریب تھا چنانچہ میرے ریسیور نے کام شروع کر دیا تھا۔

"سب تمھارا قصور ہے ممی..." پرویز یا سلیم وکٹر میں سے کسی نے کہا۔ ان دونوں بھائیوں کی آوازیں بھی ایک تھیں جیسے ان کے کرتوت ایک تھے۔

"آخر کیا ضرورت تھی تم کو..."

"تو تھانیدار ہے کیا۔" ان کی ماں نے چیخ کر کہا۔ "کہ مجھ سے اس لہجے میں سوال کر رہا ہے... ارے یہ گھر میرا ہے... تیرے ان مشٹنڈے دوستوں کا نہیں۔ آخر کیا سمجھ کے اس نے ایسی حرکت کی تھی... میں اس کا مُنہ نوچ لیتی۔"

"اس نے کوئی غلط حرکت نہیں کی تھی۔"

"اور کیا ہوتی ہے غلط حرکت؟" وہ اسی لہجے میں بولی۔ "وہ اس مظلوم عورت کو مارتا؟ کپڑوں کے ساتھ عزت اتار لیتا؟ کھال کھینچ لیتا تب یہ زیادتی کہلاتی؟ میں کہتی ہوں تم کو شرم نہیں آئی اس وقت جب وہ ہمارے گھر کا نمک کھانے والی ایک غریب عورت پر ظلم کر رہا تھا تم کیوں نہیں بولے... کیوں منع نہیں کیا اس کمینے کو..."

"تم ان باتوں کو نہیں جانتیں ممی۔" سونیا نے نسبتاً نرم لہجے میں کہا۔ "اس سے پوچھنا ضروری تھا۔"

"کیا پوچھنا ضروری تھا۔ کیا تم نے دیکھا نہیں تھا کہ وہ بے چاری کتنی ستم رسیدہ تھی۔" ان کی ماں بولی۔

"ہم نے یہ اسی کے مُنہ سے سُنا تھا۔" سونیا کا بھائی بولا۔

"تو کیا وہ جھوٹ بول رہی تھی؟" ماں نے چمک کر کہا۔

"ممی! کیا ثبوت ہے کہ سچ ہی بول رہی تھی وہ؟" سلیم بولا۔

"سچ کو کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہوتی احمق کتنے دن رہی تھی وہ اس گھر میں۔ صبح سے شام تک جو کچھ کرتی تھی سب کے سامنے کرتی تھی۔ سب کی خدمت کی اس نے... میرے تو پاؤں دبانے۔ میری دوا کا اور خوراک کا خیال رکھا۔ جو تم سب نہیں کر سکے تھے وہ اس نے کیا..."

"ہم نوکر نہیں تھے۔" پرویز نے دبے دبے لہجے میں کہا۔

"ہاں! تم میری اپنی اولاد تھے... تم کو کرنی چاہیے تھی میری خدمت مگر تم تو میرا دو دن کا آرام نہ دیکھ سکے۔" ان کی ماں نے رونا شروع کیا۔ "ارے بے وقوفو... میں نے اسے اچھی طرح پرکھ لیا تھا... جانتے بوجھتے میں نے زیور کھلا چھوڑا۔ اِدھر اُدھر رکھ دیا مگر اس نے ہر چیز اٹھا کے مجھے لادی۔ میں نے ہزاروں روپے... دس ہزار کی پوری گڈی دروازے کے پاس گرا دی۔ یوں

جیسے تم سے باہر جاتے ہوئے گر گئی ہو۔ وہ چاہتی تو رکھ لیتی لیکن اس نے کبھی ایک پیسہ اِدھر سے اُدھر نہیں کیا۔ میں دیکھنا چاہتی تھی کہ وہ چور تو نہیں ہے۔ وہ زمانے کی ستائی ہوئی عورت تھی، جیسے تم نے یہاں بھی نہ ٹکنے دیا۔ خدا معلوم اب کہاں گئی ہوگی۔ اس کی بد دعا نہ لگ جائے ہمارے گھر کو۔"

یہ میرے لیے نئی اور بڑی اچھی اطلاع تھی کہ نازو موقع پاتے ہی اس گھر سے نکلنے میں کامیاب ہوئی۔ اس کا مشن اس کی ہمت اور ذہانت کے باعث بحُسن و خوبی پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اس نے وہ سب کچھ کر لیا جس کے لیے ہم نے... میں نے... اسے ایک ایسے جہنم میں دھکیل دیا تھا جہاں زہریلے ناگ اور ڈنک مارنے والے بچھو سے زیادہ ہلاکت آفریں انسان رہتے تھے اور جہاں سے اس کی واپسی قطعی غیر یقینی تھی۔ ایک بار پھر میں نے تسلیم کیا کہ صرف نازو ہی یہ کارنامہ سر انجام دے سکتی تھی۔ دعوے تو سب ہی کر لیتے ہیں کہ وہ آسمان پر تیر مار سکتے ہیں مگر وقت آتا ہے تو ان سے کمان بھی نہیں اٹھائی جاتی۔ میں خود اپنے بارے میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہی کام میرے سپرد کیا جاتا تو میں سارے خطرات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اتنی آسانی سے تیار ہو جاتا اور اگر جانا پڑتا تو ہر مرحلہ اتنی خوبی سے سر کرنے کے بعد اتنی صفائی سے نکل بھی آتا۔ یہ نازو کی اداکاری کا کمال تھا کہ ماں اپنی اولاد کو احمق اور بے وقوف کہہ رہی تھی۔ نازو کو ایک ستم رسیدہ اور مظلوم عورت تسلیم کر چکی تھی۔ اس کے دکھ پر دکھی تھی۔ اس کی خدمت گزاری، وفا شعاری اور ایمانداری کے گن گا رہی تھی اور اس کے ساتھ ہونے والے سلوک پر برہم تھی۔ نازو نے کمال کیا تھا کہ کسی کو اپنے بارے میں شک میں مبتلا ہی نہیں ہونے دیا تھا۔ ایک وقت کچھ دیر پہلے ایسا آگیا تھا جب میں سمجھ رہا تھا کہ مار دھاڑ کیے بغیر وہ نکل نہ سکے گی اور میں یہ بھی طے کر چکا تھا کہ ایم آر ایس کی پوری قوت کے ساتھ اس کو نکال لانے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دوں گا۔ بلاشبہ نازو کسی کے ہاتھ آنے سے پہلے ایک دو کے ہاتھ پیر توڑنے کی پوری طرح اہل تھی مگر وہاں دو سے زیادہ افراد تھے جو مسلح بھی تھے۔ اس سے پہلے کہ ہم نازو کی مدد کو پہنچتے کوئی بھی شکاری صرف ایک گولی چلا کے نازو کا اور اس کے مشن کا خاتمہ کر دیتا۔ نازو نے ثابت کر دیا کہ وہ آسانی سے جذبات کی تندی کا شکار ہو جانے والی لڑکی نہیں ہے۔ اس نے انتہائی ضبط سے کام لیتے ہوئے جوابی کارروائی سے گریز کیا اور جب موقع پایا تو ایک لمحہ ضائع کیے بغیر یوں نکل گئی جیسے چھلنی سے پانی نکل جاتا ہے۔

میں نے وائرلیس کا بٹن دبا کے مرزا غالب سے رابطہ قائم کیا۔ وہ لہک لہک کر گا رہے تھے۔ "کھاؤ جو میری مونگ پھلی... کھل جائے تمھارے دل کی کلی۔ خوشبو سے مہکے گلی گلی۔ بادام سے اور پستے سے بھلی۔"

"بس مرزا بس... شاعری کو مبالغے نے ڈبویا..." میں نے کہا "تم کو یہ مونگ پھلی ڈبو دے گی۔"

"تم کیا شاہِ جنات کے ساتھ ڈوب مرے تھے بھوت کے بچے؟" مرزا غالب نے خفگی سے کہا "محسن اور اس کا سالا دونوں جھک مارتے پھر رہے تھے۔"

"ویری گڈ۔ وہ اسی قابل ہیں کہ جھک ماریں۔" میں نے کہا "اور کیا مار سکے وہ... تم نے سنا کہ نازو بھاگ گئی۔"

"پرانی خبر ہے... مگر دالمنج ہو کر سب کے ساتھ نہیں بھاگی... ٹیڈی کے ساتھ بھاگی ہے۔" غالب نے کہا۔ غالب کی قدر تو اس کے مرنے کے بعد ہوگی۔"

"تمہارے کیس میں مرنے کے بعد بھی مشکل ہے۔" میں نے کہا "یہ بتاؤ کہ محسن خاں کہاں پائے جاتے ہیں؟"

"تمہاری تلاش میں گلی گلی بھٹک رہا ہے... ابھی آجائے گا رپورٹ دینے کہ ابھی تک سکندر کے نہ فنگر پرنٹ ملے ہیں نہ فٹ پرنٹ۔" غالب بولا۔

"یار وہ ایک چیز اٹھا لی میں نے سڑک پر سے... بس ایسے ہی دل چاہا تھا۔" میں نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے مگر آپ بھول رہے ہیں کچھ۔" غالب بولا "آپ نے ایک نہیں دو چیزیں اٹھائی ہیں۔ ایک نواب کا چربہ اور دوسری نواب کی کار۔ آخر اس ایڈونچر کی کیا ضرورت تھی۔ قبض ہو جاتا اگر شرافت سے لوٹ آتے؟"

"یہ تو میں نے نہیں سوچا تھا۔ بہت سے کام سوچنے سے نہیں ہوتے مثلاً نکاح کے وقت فوراً کہنا پڑتا ہے کہ قبول کیا۔ سوچنے بیٹھ جائے آدمی تو قاضی سے کہے کہ آپ بتائیے پہلے آپ نے قبول کیا؟" میں نے کہا "محسن آئے تو اس سے کہو کہ گھر جائے۔ تم بھی نیب سے سدھارو۔ میں وہ تحفۂ درویش لے کر حاضر ہوتا ہوں... اس کا کیا کرنا ہے۔ یہ سوچ کر کریں گے۔"

"میں ابھی نہیں جا سکتا۔ آج تو سیل ہو رہی۔ ٹیڈی چیلنج دے گیا ہے۔" غالب نے کہا "میں بارہ بجے ہی دکان بڑھاؤں گا۔"

"یہ بتاؤ وہ سب ٹھیک ریکارڈ ہو گیا ہے؟"

"ہو گیا ہوگا... جب سنیں گے تو پتا چلے گا۔" غالب نے کہا اور پھیرے کاری شروع کی "کھاؤ جو میری مونگ پھلی...!" غالباً اس کے گاہک آ رہے تھے۔ میں نے سیٹ آف کرنے سے پہلے قافیہ ملا کے کہا "بھوبن مانگے موت ملی۔" اور گاڑی کو واپس لے گیا... میری آخری بات صرف غالب کے کانوں نے سنی ہوگی مگر وہ فی البدیہہ کچھ عرض کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ ان دنوں مونگ پھلی بیچنے کا مقابلہ زوروں پر تھا اور غالب کے ساتھ ٹیڈی کی ٹھنی ہوئی تھی۔ گزشتہ دن ہی ان کی جنگ ہوتے ہوتے رہ گئی تھی۔

وہاں سے روانہ ہونے کے بعد میں نے سیدھا گھر کا رُخ کیا۔ میں اس کار کو کم سے کم وقت اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا لیکن اس کو اپنے پاس رکھنا ضروری تھا۔ وہ ہمیں بہت سی مفید معلو[مات] فراہم کر سکتا تھا۔ اس کے انجام کے بارے میں مجھے کوئی شبہ [نہیں تھا] ہم اسے واپس کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ بہتر [یہی] تھا کہ وہ غائب ہو جائے۔ بالکل اسی طرح جیسے گدھے کے سینگ غائب ہوئے ہوں گے۔ گدھا تھا اصل نواب اور [اس] کے سینگ تھے یہ ہشکل شوفر صاحب جو ڈبل کا رول بڑی [کامیابی] سے ادا کرتے آئے تھے مگر دنیا سے سنگل ہی جانے والے تھے۔

کار اتنی شاندار تھی کہ مجھے خسرو جمشید پر رشک آیا [اور] اس سے حسد محسوس ہونے لگا۔ یہ جائز دولت کی خرید تھی یا [نا جائز] کی مگر شاہانہ سفر کے تمام تکلفات سے مزین ایسی کار کی ملکیت [پر] آدمی فخر کرے تو جائز... شاید کسی دن خدا مجھے بھی اس قابل [بنائے] میں نے سوچا۔ اگر وہ سب جو میرا حق تھا مجھے مل جاتا اور [میں] دشواری کے بغیر رابعہ قاری جیسی کامیاب ایڈووکیٹ سے شادی میں کامیاب ہو جاتا تو ہم ایسی دو کاریں رکھ سکتے تھے۔ اے آرزو کہ خاک شدہ!!... ابھی تو عشق بھی آشفتہ سر ہے اور ہے سودائے خام... نہ جانے کب تک اس گردشِ ایام [کے] درمیان... بے ساماں... ہم ہی ہوں گے بے نشاں... سا[تھ] گے اپنی ہی تنہائیوں کے کارواں... اپنے اپنے نوحہ خواں۔

معلوم نہیں کیسے میرا ذہن ایسے وقت میں بھٹک گیا جب مجھے انتہائی مستعد رہنے کی ضرورت تھی۔ میں نے اس ٹریفک پولیس کے سارجنٹ کو اس وقت دیکھا جب وہ مجھے روکنے کے لیے سامنے آ چکا تھا۔ اس کی ساڑھے سات ہارس پاور ٹرائمف موٹر سائیکل نہ جانے کہاں سے میرے پیچھے لگی تھی۔ اب وہ آگے آگے چلتے ہوئے ایک ہاتھ سے مجھے رُکنے کا اشارہ [کر رہا] تھا۔ قدرتی طور پر جو خیال سب سے پہلے میرے ذہن میں آیا وہ [یہ تھا کہ] خسرو جمشید نے چوری ہونے والی مرسیڈیز کا ماڈل رنگ اور [نمبر] مشتہر کرا دیا تھا اور پولیس نے اپنے وائرلیس کے نظام پر سب [کو] اطلاع دے دی تھی کہ اس قسم کی کار پر نظر رکھی جائے۔ یہ سارجنٹ میری شامتِ اعمال بن کے کہیں کھڑا تھا کہ اِدھر اعلان نشر ہوا [اور] میں اس کے سامنے سے گزرا۔

اب نجات کی ایک صورت تو یہ ہو سکتی تھی کہ میں [رکنے] کے بجائے رفتار بڑھاؤں اور بھاگ جاؤں مگر اس کے پاس انتہائی خطرناک قسم کی موٹر سائیکل تھی۔ وہ میرا تعاقب کر کے بھی مجھے پکڑ سکتا تھا۔ یہ کار نہ ہر تنگ گلی سے گزاری جا سکتی تھی اور نہ [ہر جگہ] موڑی جا سکتی تھی۔ اس کے برخلاف موٹر سائیکل شکاری کتے کی [طرح] تھی جو برق رفتاری کے ساتھ جست لگائے۔ ایک دم ملٹے [اور] گھوم کر سامنے آ جائے اور فرار کے راستے ہی نہ چھوڑے۔ دو[سرا] طریقہ یہ تھا کہ میں اسے ٹکر مار کے بھاگ جاؤں۔ یہ بھی مشکل تھا۔

سارجنٹ مسلح تھا۔ وہ گرتے گرتے بھی کار کا ٹائر برسٹ کر سکتا تھا۔ میں نے بہتر یہی سمجھا کہ اپنے اعتماد کا مظاہرہ کروں اور اگر مقابلہ ہو تو آتشیں اسلحے کا نہ ہو۔ خالی ہاتھوں کی طاقت کا ہو۔

"یس؟" میں نے کار روک کے سر نکالا۔

"نیچے اترو یس کے بچے۔" وہ موٹر سائیکل ایک کنارے پر ٹکا کے بولا۔

"میں یس کا بچہ ہوں تو تم کون ہو؟" میں نے نیچے اتر کے کہا "نو کے بچے؟"

"بکواس بند کرو..." وہ ریوالور نکال کے بولا "یہ تمہارے باپ کی گاڑی ہے؟"

"نہیں۔" میں نے تسلیم کیا "یہ تمہارے باپ کی گاڑی ہے۔"

اتنی اشتعال انگیزی کو برداشت کرنا اس کے لیے ممکن نہ تھا۔ اس نے ریوالور اٹھایا اور دستہ میرے سر پر مارنا چاہا۔ لیکن اس کا ہاتھ نیچے بھی نہیں آیا تھا کہ میرا ہاتھ اٹھا اور ضرب اتنی شدید ہوگئی کہ ریوالور اچھل کے نیچے گرا اس کے ہاتھ کی ہڈی کلائی کے اوپر سے ٹوٹ گئی۔ میں نے کم سے کم وقت میں وہاں سے نکل جانے کے لیے اس کو سنبھلنے کا موقع نہیں دیا میرے ہاتھوں نے اس کو اپنی طرف کھینچا اور جب وہ تیزی سے آگے آیا تو میں نکل گیا۔ اس کا سر بڑی آواز کے ساتھ گاڑی سے ٹکرایا۔ کوئی دوسری کار ہوتی تو اس کی چادر اندر دب جاتی لیکن مرسیڈیز کی باڈی بہت مضبوط تھی۔ سارجنٹ کے حلق سے ایک بار "حق" کی آواز نکلی۔ پھر وہ وہیں گر گیا۔ میں نے اُسے اٹھا کے گاڑی کے اندر ڈال دیا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ اس دو منٹ میں سنسان سڑک پر سے ایک گاڑی بھی نہیں گزری اور کسی نے بھلا مجھے نہیں دیکھا، ورنہ اس واردات کا چشم دید گواہ بن جاتا۔

میرے ذہن نے تیزی سے سوچنا شروع کیا۔ سارجنٹ یقیناً گاڑی دیکھ کر میرے پیچھے آیا تھا اور سمجھ گیا تھا کہ یہ چوری کی ہے ورنہ اتنی عظیم الشان کار کے مالک سے تو ایس پی کو بھی ایسے لہجے میں بات کرنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ میں اپنے ٹھکانے سے اب بھی دو میل دور تھا۔ خود کو محفوظ رکھنے کے لیے میں نے ایک بار پھر حلیہ بدلنے کے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ میں خود بھی گاڑی کے اندر گیا اور اندر ہی رہتے ہوئے میں نے نقلی نواب کا لباس بھی بدل ڈالا۔ سارجنٹ کی وردی میرے جسم پر فٹ آئی۔ وردی کے ساتھ ہی اس کے تمام کاغذات اور اس کی جیب میں پڑی ہوئی حرام کی دولت بھی میری تحویل میں آ گئی۔ سارجنٹ کی موٹر سائیکل سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی تھی اور ابھی تک میں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ اس کو وہیں چھوڑوں گا یا ساتھ لے جاؤں گا۔ میں نے سارجنٹ کے بارے میں بھی طے نہیں کیا تھا کہ اسے کہاں [غائب] کروں گا۔ اس نے تو محض شامتِ اعمال کے باعث میرا راستہ روکنے کی غلطی کی تھی اور جو کچھ اس نے کیا وہ اس کا فرض تھا۔ نہ وہ مجھے پہچان پایا تھا اور نہ میرا ارادہ اسے اس سے زیادہ سزا دینے کا تھا جتنی وہ پا چکا تھا۔ گڑبڑ اس وقت ہوئی جب میں نے اسے بھی ڈکی میں ڈال کر کچھ دور لے جانے کا فیصلہ کیا۔ میں نے سوچا تھا کہ سارجنٹ کو موٹر سائیکل سے ایک ڈیڑھ میل دور بالکل مختلف سمت میں کسی جگہ سڑک کے کنارے ڈال دوں گا جہاں سے کوئی اسے اٹھا لے گا ورنہ وہ خود ہی ہوش میں آنے کے بعد چل پڑے گا۔ خسرو جمشید کے شوفر کی وردی اسے پہنانے کا خیال بھی مجھے ضرور آیا تھا لیکن اس طرح دو الگ الگ وارداتوں کا سلسلہ آپس میں مل جاتا۔ میں نے بہتر یہی سمجھا کہ سارجنٹ کو بھی ڈکی میں ڈال دوں۔ پھر ایک جگہ اسے چھوڑ دوں اور گاڑی کو دوسری جگہ۔ کہیں سے ایک اور گاڑی لاؤں۔ نقلی نواب کو اس گاڑی میں شفٹ کروں اور گھر پہنچ جانے کے بعد دوسری گاڑی کو بھی دور کھڑا کر آؤں۔

ڈکی کھول کر دیکھنے پر مجھے نواب خسرو جمشید کے شوفر کی گردن کچھ عجیب طرح سے مڑی ہوئی اور اکڑی ہوئی دکھائی دی۔ زندگی میں تو خسرو جمشید کی گردن اکڑی ہی رہتی تھی مگر بے ہوشی کی کیفیت میں یہ پوزیشن ذرا مشکل لگتی تھی۔ میں نے اُسے ہاتھ لگا کے دیکھا تو اس کا جسم بھی اکڑا ہوا تھا۔ اس کے بعد تصدیق کی ضرورت نہیں رہی۔ وہ مر چکا تھا اور اسے مرے ہوئے بھی کافی دیر ہو گئی تھی۔ غالباً وہ اسی وقت مر گیا تھا جب میں نے اُسے ناک آؤٹ کیا تھا۔ اس کا اتنی جلدی مر جانا میری سمجھ میں نہ آیا۔ اگر وہ سر کی کسی اندرونی چوٹ سے مرتا تو فوراً نہ مرتا۔ ایک شبہ دور کرنے کے لیے میں نے ڈکی میں سر ڈال کے اس کا منہ سونگھا۔ اس کے منہ سے کڑوے باداموں جیسی بُو آ رہی تھی۔ ایسا پہلے بھی ہو چکا تھا۔ گزشتہ روز بھی ایسا ہی ہو سکتا تھا۔ دلاور نے پیڈرو سے کہا تھا کہ گرفتار ہو کے ہمارے ساتھ جانے سے بہتر ہے کہ وہ قیدِ حیات سے نجات پا لے مگر اس کو ہمت نہ پڑی تھی۔ خسرو جمشید کا یہ وفادار شوفر جو اس کے ڈبل کا رول بڑی کامیابی سے کرتا تھا، پیڈرو سے زیادہ بہادر ثابت ہوا۔ اس نے وہی کیا جو ایسے حالات میں کرنا تھا۔ ولاورا اینڈ کمپنی کے ہر معتمدِ خاص کو اس کے لیے تیار رہنا پڑتا تھا۔ اس نے دانتوں کے کسی خلا میں دبے ہوئے دنیا کے خطرناک ترین زہر سائنائڈ سے بھرے کیپسول کو توڑ دیا تھا اور چند سیکنڈ کے اندر اندر مر گیا تھا۔ غالباً ڈکی کے اندر پہنچتے ہی اُسے ہوش آ گیا تھا مگر ہوش آتے ہی اس نے دیکھ لیا تھا کہ وہ قید میں ہے اور اس قید سے رہائی کی کوئی صورت نہیں۔ وہ پُرانا آدمی تھا اور اچھی طرح سمجھتا تھا کہ اس کو قید کرنے والے کون ہیں اور اس کے ساتھ کیا سلوک کر سکتے ہیں۔ اس نے فوراً فیصلہ کیا اور اس پر عملدرآمد میں بھی دیر نہیں لگائی۔

اس صورتِ حالات نے مجھے اپنا پروگرام بدلنے پر مجبور کر

دیا۔ مجھے اپنی کوشش کے رائیگاں جانے اور وقت کے ضائع ہونے کا احساس ہونے لگا۔ محسن اور غالب تو اب مجھے نخشیں گے نہیں۔ انھوں نے کہا تھا کہ آخر اس ایڈونچر کی کیا ضرورت تھی۔ نقلی نواب کے مرنے سے میرا یہ کارنامہ واقعی بے مصرف ایڈونچر ہو گیا تھا۔ نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم۔ خواہ مخواہ گاڑی چوری کی۔ نقلی نواب کو اغوا کرنے کا خطرہ مول لیا اور مزید خرابی کہ ایک ٹریفک سارجنٹ کو مار کے گاڑی میں ڈال لیا۔ یک نہ شد دو شد۔ اب دوسرا مسئلہ سارجنٹ کی گاڑی کا بھی پیدا ہو گیا تھا۔

سوچنے کے لیے وقت نہیں تھا۔ میں نے سارجنٹ کو کھینچ کر باہر نکالا اور سڑک سے دور لے گیا۔ اس وقت رات کے گیارہ بج چکے تھے، چنانچہ ہر طرف ویرانی کا راج تھا۔ کسی نے مجھے یہ کارروائی کرتے نہیں دیکھا۔ میں واپس آ کے گاڑی میں بیٹھا اور گاڑی کو بھگا لے گیا۔ تقریباً ایک میل سیدھا جانے میں میرے پانچ منٹ صرف ہوئے۔ میری نظر کسی مناسب مقام کی جستجو میں تھی۔ اچانک مجھے سڑک کے کنارے ایک گیراج سا نظر آیا۔ گیراج لکڑی کا مختصر سا کیبن تھا جس کے سامنے تین چار پرانی اور زنگ خوردہ کاروں کے ڈھانچے کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے گاڑی کو ان کے درمیان میں فٹ کیا۔ نقلی نواب کے کپڑے ڈکی میں ڈالے اور پٹرول ٹینک کھولا۔ ڈکی میں ایک پائپ نہ ہوتا تو پٹرول نکالنا خاصا مشکل ہو جاتا مگر کاروں والے عموماً چھوٹا سا پائپ کا ٹکڑا اس لیے رکھتے ہیں کہ ضرورت پڑنے پر تھوڑا بہت پٹرول نکالا جا سکے۔ کاربوریٹر کی صفائی کا مسئلہ ہو یا بریک لائن دھونے کا، تھوڑا بہت پٹرول میکینک بھی کھینچ کر نکال لیتے ہیں۔ میں نے پائپ کا ایک سرا ٹینک میں ڈالا اور دوسرے سرے کو منہ سے لگا کے پٹرول کو سانس کے ساتھ کھینچا۔ تھوڑا سا پٹرول میرے منہ میں گیا۔ میں نے فوراً نلکی کو نیچے کر دیا اور پٹرول خسرو جمشید کے شوفر کے کپڑوں پر گرنے لگا۔ میں نے منہ کے پٹرول کو باہر تھوکا مگر پھر بھی میرا حلق کڑوا رہا اور پٹرول سے میرے ہونٹ کے کنارے جلنے لگے۔ میری زبان سُن ہو گئی اور اس کی بُو سے مجھے متلی سی ہونے لگی۔ جب کپڑے پٹرول میں اچھی طرح تر ہو گئے تو میں نے ڈکی بند کی اور کپڑے گاڑی کی اگلی اور پچھلی سیٹوں پر پھیلا کے لائٹر سے آگ دکھا دی۔ شعلے بھڑکتے ہی میں وہاں سے بھاگا۔

سڑک پر دس منٹ پیدل چلنے کے بعد مجھے اپنے پیچھے سے ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹس کا اجالا محسوس ہوا۔ میں نے گاڑی کے قریب آنے کا انتظار کیا اور پھر سڑک کے بیچ میں آ کے اُسے روک لیا۔ گاڑی کو ایک عورت چلا رہی تھی۔ وہ بُری طرح نروس ہو گئی۔ اگر آخری وقت میں چھلانگ لگا کے میں ایک طرف نہ ہو جاتا تو کار یقیناً مجھے کچل دیتی۔

"کیا... کیا بات ہے؟" عورت نے خوفزدہ لہجے میں سوال

کیا۔

"کیا تم نشے میں ڈرائیونگ کر رہی تھیں؟" میں نے سارجنٹ کے لہجے میں سوال کیا۔ "لائسنس ہے تمہارے پاس..."

"سب کچھ ہے۔" وہ چلائی۔ "لیکن اس وقت مجھے جانے دو... مجھے ہسپتال پہنچنا ہے... میری بیٹی کی حالت خراب..."

"آئی ایم سوری۔" میں نے کہا۔ "آپ ادھر ہی جا رہی ہیں... مجھے آگے ڈراپ کر دیں۔"

عورت نے سر ہلایا اور دروازہ کھول دیا۔ "بیٹھو..." بولی اور ابھی میں بیٹھا بھی نہ تھا کہ اس نے گاڑی چلا دی۔

"کیا ہوا ہے آپ کی بیٹی کو خاتون؟" میں نے دروازہ بند کر کے کہا۔

"اس کو... کوئی معجزہ ہی بچا سکتا ہے۔" وہ دُکھ اور ... سے بولی۔ "آج ایک سال ہونے کو آیا۔ اس کے گردے ناکارہ ہو گئے تھے۔ وہ مشین کے سہارے زندہ تھی۔ ہفتے میں دو تین مرتبہ ... سیس ہوتی تھی مگر اب وہ بھی ممکن نہیں۔ ایک گردہ ... جاتا تو ڈاکٹر کوشش کر سکتے تھے لیکن ابھی تک مجھے کامیابی نہ ہوئی۔ اب اس کا مر جانا ہی بہتر ہے۔ اس سے زیادہ میں اس کی تکلیف نہیں دیکھ سکتی۔" وہ چالیس پینتالیس سال کی عورت تھی مگر کچھ اس کی جسمانی ساخت ایسی تھی اور کچھ اس نے خود کو ... کے رکھا تھا چنانچہ وہ تیس برس کی نظر آتی تھی۔ اس کا لباس فیشن ایبل تھا اور اس کے انداز و اطوار میں بھی اچھے بیک گراؤنڈ کی جھلک ملتی تھی۔ وہ بہت ہمت والی بھی تھی کہ اتنی رات ... اکیلی گاڑی لے کر چل پڑی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اس کے ساتھ کوئی مرد کیوں نہیں۔

"آپ اکیلی جا رہی ہیں؟" میں نے کہا۔

"میں اکیلی ہی ہوں... ایک بیٹی تھی... جب وہ مر جائے گی تو میں بھی مر جاؤں گی... صرف اسی کے لیے زندہ تھی میں... ایک امید تھی کہ شاید میری کوشش اور دعائیں اسے بچا لیں... اپنے لیے جی کر مجھے کیا کرنا تھا... میں خود کو شوٹ کر لوں گی۔" ... نے سیٹ کی سائڈ پر رکھا ہوا ریوالور اٹھا کے مجھے دکھایا۔ میں ... رہ گیا۔ وہ اگر چاہتی تو ریوالور دکھا کے رُکے بغیر نکل جاتی گر... نے میرے لیے گاڑی روک لی تھی۔

"آپ... یہ کیا کہہ رہی ہیں۔" میں نے کہا۔ "اتنی مایوس ہیں آپ... کہ خودکشی کی سوچتی ہیں... یہ جانتے ہوئے بھی کہ ایسا کرنا غلط ہے... اخلاقی اور قانونی طور پر جرم ہے۔"

"کوئی مجھے زندہ رہنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔" وہ بولی۔

"میں کر سکتا ہوں۔" میں نے اچانک کہا۔ "آپ کا مسئلہ صرف ایک گردے کا ہے نا... میں یہ مسئلہ حل کر دوں گا۔"

"میں اب تک کچھ نہیں کر سکی... تو تم کیا کرو گے؟"

"میں بھی کوشش کروں گا۔" میں نے کہا۔ "میں اکیلا نہیں ہوں۔ میرے بہت سے ساتھی ہیں۔ ممکن ہے ان میں سے کسی کا ایک گردہ آپ کی بیٹی کے لیے موزوں ثابت ہو۔ آپ نے خود..."

"میرا اپنا گردہ میچ کر گیا تھا۔" وہ میری بات کا مطلب سمجھ کے بولی۔ "مگر قسمت کے لکھے کو کوئی نہیں بدل سکتا... جس دن آپریشن ہونا تھا اس دن بجلی فیل ہو گئی۔ اسپتال والوں نے اپنا جنریٹر چلایا۔ وہ خراب ہو گیا... گردہ ضائع ہو گیا۔"

"گاڑی یہاں روک لیں۔" میں نے موٹر سائیکل کو دیکھ کر کہا۔ "اور مجھے بتائیں کہ آپ سے پھر کہاں اور کیسے رابطہ قائم کروں؟"

"کیا پولیس میں اتنے ہمدرد اور نیک دل لوگ ہوتے ہیں؟" وہ میری وردی کو دیکھ کر بے یقینی سے بولی۔

"اچھے برے لوگ ہر جگہ ہوتے ہیں۔ ان کا تعلق کسی محکمے، کسی شہر یا صوبے اور کسی ملک سے نہیں ہوتا۔" میں نے کہا۔ "بہتر ہوگا اگر آپ اسی وقت میرے ساتھ چلیں۔ سب سے پہلے میں ہوں۔ پھر میرے گھر کے لوگ ہیں۔ کسی نہ کسی کا گردہ ضرور میچ کرے گا... نہیں کرے گا تو ہم اپنے دوستوں سے رابطہ قائم کریں گے۔ ہمارے دوست بھی ایسے ہی ہیں جیسے ہم ہیں۔"

"تم خوش قسمت ہو۔ اگر کوئی میرا بھی دوست ہوتا تو میری مدد کر سکتا تھا۔" وہ اب تک نہیں روئی تھی مگر ہمدردی کے دو بول سنتے ہی رونے لگی۔

"کم آن... خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔" میں نے اسے تسلی دی۔

"بہت مشکل ہے اب۔" وہ بولی۔ "اگر میرا شوہر زندہ ہوتا... تو کیا ایسا ہو سکتا تھا... اس کے مرتے ہی سب ساتھ چھوڑ گئے۔"

"کون تھا آپ کا شوہر؟" میں نے کہا۔ "کب انتقال ہوا ان کا؟"

"انتقال ہوئے کئی سال ہو گئے۔" وہ بولی۔ "وہ کوئی اچھا آدمی نہیں تھا... کم سے کم اس دنیا کی نظر میں... تم نے بھی شاید اس کا نام سنا ہوگا... بہرام دادا کے نام سے مشہور تھا وہ..."

میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ بہرام دادا کا ذکر استاد نیازی نے کیا تھا مگر میرے لیے یقین کرنا مشکل تھا کہ آدھی رات کو ... سے ایک سنسان سڑک پر ملنے والی یہ عورت بہرام دادا کی بیوہ ہو سکتی ہے۔ میں پھر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ میں نے اطمینان سے اس کا ریوالور اٹھا لیا۔

"میں بہرام دادا کو اچھی طرح جانتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اگر تم جھوٹ نہیں بول رہی ہو..."

"مجھے کیا ضرورت ہے جھوٹ بولنے کی۔" وہ بولی۔ "اسے پولیس سے زیادہ کون جانتا تھا۔ تم ہی تو اس کے قاتل تھے۔ میں پہچانتی ہوں تمہیں..." اس نے یکلخت جھپٹ کر ریوالور میرے ہاتھ سے چھین لیا۔ یہ حیرت کا ایک لمحہ تھا جس نے مجھے اس کی طرف سے غافل کر دیا تھا۔ میں یہ امید بھی نہیں رکھتا تھا کہ اس جیسی دُبلی پتلی، مغموم اور مضمحل عورت ایک توانا مرد کے ہاتھوں سے ریوالور چھیننے کی کوشش بھی کر سکتی ہے مگر وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہو چکی تھی اور اب ریوالور کی نال کا رُخ میری طرف تھا۔ مجھے وہ اپنے شوہر کا قاتل سمجھتی تھی اور اس کی آنکھوں میں انتقام کی پیاس کے ساتھ خون اُتر آیا تھا۔

"دماغ خراب ہے تمہارا۔" میں نے پلک جھپکتے میں اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ مارا مگر پھر بھی مجھے سیکنڈ کے ہزارویں حصے کی تاخیر کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ گولی میرے بائیں شانے کے گوشت کو اُدھیڑتی ہوئی، بند کھڑکی کا شیشہ توڑتی ہوئی نکل گئی۔ اگر اس وقت جب اُس نے ریوالور اٹھایا تھا، میں نے دیکھ لیا ہوتا کہ اس کا سیفٹی کیچ ہٹا ہوا ہے تو یہ نوبت نہ آتی۔ سیفٹی کیچ سے گولی کے اتفاقیہ چل جانے کا خطرہ بھی باقی نہ رہتا۔ میں نے سیدھے ہاتھ سے اس کی کلائی تھام کے جھٹکا دیا تو ریوالور نیچے گر گیا۔

"ہاں، ہاں میں پاگل ہوں۔" اُس نے ہسٹریائی میں چلانا شروع کیا۔ "پہلے تم نے میرے شوہر کو قتل کر کے مجھے زندہ درگور کیا..."

"ہوش میں آؤ... میں نے اُسے قتل نہیں کیا تھا۔" میں نے اُسے جھنجوڑا۔

"تم نہ سہی... وہ تم جیسا ہی تھا۔ پولیس کی وردی نے اور اس کے ریوالور نے یہ اختیار دے دیا تھا اسے کہ وہ جسے چاہے قانون کے نام پر اپنی گولی کا نشانہ بنا دے۔" وہ دیوانہ وار چیخنے لگی۔ "آج تم آ گئے ہو میرے ہمدرد بن کے... جھوٹے... فریبی... دغاباز... کیا بچا ہے اب میرے پاس جو مجھ سے چھینو گے۔" اُس نے ایک وحشیانہ قوت کے ساتھ مجھ سے لڑنا جاری رکھا۔ اپنی کلائی کو میری گرفت سے چھڑانا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ وہ اپنی جگہ بیٹھی بل کھاتی رہی۔ اس نے میرے ہاتھ پر دانت جما کے کاٹنا چاہا اور دوسرے ہاتھ سے میرا منہ نوچنے کی کوشش کی۔ مجبوراً مجھے اس کے ایک تھپڑ رسید کرنا پڑا۔ میں نے زیادہ قوت صرف نہیں کی تھی مگر ایک محدود سی جگہ میں ہونے والی کش مکش سے نقصان زیادہ ہوا۔ اس کا سر اسٹیئرنگ پر لگا۔ وہ آخری بار چلائی اور بے ہوش ہو گئی۔ میں نے اُسے دوسری سیٹ پر کر دیا اسی وقت ایک کار سامنے سے نمودار ہو گئی اور عین میرے قریب آ کے ٹھہر گئی۔ "کیا ہو رہا ہے یہ..." کار میں سے اترنے والے باکسر ٹائپ شخص نے بڑے خطرناک ارادے سے ہماری کار کا دروازہ کھولا۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھے باہر گھسیٹتا، میں خود باہر آ گیا۔

"تمہارے خیال میں یہاں کیا ہو رہا تھا؟ کسی فلم کی شوٹنگ؟" میں نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔

"کیوں چیخ رہی تھی یہ عورت... بولو۔" وہ غرّایا۔ قد میں وہ مجھ سے چار انچ زیادہ ہی تھا اور اسے یقیناً اپنی قوتِ بازو پر بہت

ناز تھا۔

"دیکھو مسٹر! میں تمھیں شرافت سے جانے کے لیے دس سیکنڈ دیتا ہوں۔"

"شرافت کی ایسی تیسی۔" وہ ایک قدم آگے بڑھا۔ "تم جیسے شریفوں سے ڈرنے والا نہیں ہوں میں۔۔۔ اس وردی سے بھی نہیں ڈرتا میں۔۔۔ تم جیسے دس سارجنٹ میرے باپ کو سیلوٹ کرتے ہیں۔ یوں۔"

"مگر ان دس میں تم نے مجھے شامل سمجھ رکھا ہے تو یہ تمھاری بھول ہے۔" میں نے کہا۔ "دفع ہو جاؤ یہاں سے ورنہ میں تم کو بھی گرفتار کر لوں گا۔"

"مجھے گرفتار کرو گے؟" وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ "کس جرم میں؟"

"فرائض کی ادائیگی سے روکنا جرم ہے۔ میٹر ریڈر سے پولیس انسپکٹر تک سب سرکاری ملازم ہیں تمھارے باپ کے نہیں۔" میں نے کہا۔

"اور وردی پہن کر اکیلی عورت پر دست درازی کرنا تمھارے سرکاری فرائض میں شامل ہے؟" اس نے میرے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔

میں اس سے اُلجھنا نہیں چاہتا تھا تو اس کے متعدد اسباب تھے۔ میں نقلی سارجنٹ تھا اور مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر اصلی سارجنٹ کی موٹر سائیکل کھڑی ہوئی تھی۔ اصلی سارجنٹ کسی بھی لمحے ہوش میں آ جاتا تو بہت سنگین مسائل پیدا کر دیتا۔ وردی نہ سہی اس کے جسم پر بنیان اور انڈر ویئر بہر حال تھے چنانچہ وہ سڑک تک پہنچتا تو مجھے فوراً شناخت کر لیتا اور مجھ پر ایک درجن مقدمات قائم ہو جاتے۔ ایک مرسیڈیز کی چوری۔۔۔ سارجنٹ پر قاتلانہ حملہ۔ اس کی وردی پہن کر دھوکا دینا۔ گاڑی کو آگ لگا کے تباہ کرنا (اس میں سے جلی ہوئی لاش برآمد ہونے کے بعد) ایک قتل۔۔۔ چوری اور قتل کے جرائم کو چھپانے کی کوشش۔ ایک عورت پر بدنیتی کے ساتھ دست درازی اور ایک "شریف شہری" سے مار پیٹ جو عورت کی مدد کرنا چاہتا تھا۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔۔۔ یہ کون دیکھتا کہ میں نے ایک مصیبت سے نجات پانے کے لیے دوسری مصیبت مول لی تھی۔ سلسلہ نہ جانے کہاں تک دراز ہوتا۔

میری وجہ سے اس عورت کو بھی اسپتال پہنچنے میں دیر ہو رہی تھی جس کی بیٹی کی حالت نازک تھی۔ میں اس کی مدد کرنا چاہتا تھا مگر مدد کا جذبہ اس کے حق میں برائی کا سبب بن رہا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے شک تھا کہ دخل در معقولات کرنے والا جوان ہوش میں نہیں ہے۔ وہ کچھ پیے ہوئے تھا اور اگر میں اپنی جان چھڑا کے نکل جاتا تو معلوم نہیں وہ بہرام دادا کی بیوہ کے ساتھ کیا بدسلوکی کرتا، وہ پریشانی کی وجہ سے نروس بریک ڈاؤن کا شکار تھی۔ اب اس کے لیے یک نہ شد دو شد والا مسئلہ ہو گیا تھا۔ پہلے میں نے اس سے زبردستی لفٹ لی تھی اور ابھی وہ مجھ سے گو مگو میں ہی کامیاب نہیں ہوئی تھی کہ ایک اور بدمعاش نے فساد کھڑا کر دیا۔

ان سب باتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے میں نے فوری مؤثر جوابی کارروائی کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے ایک مُکّا پوری قوت سے اس کے مُنہ پر مارا۔ وہ اس حد تک ہوش میں ضرور تھا کہ اس نے خود کو بچانے کی کوشش کی اور مُکّا اس کے شانے پر لگا جو شدید نہیں تھی مگر وہ ایک دم پیچھے گر گیا اور چلّانے لگا۔ بچاؤ۔ میں نے ایک پیر سے اس پر دباؤ ڈالا۔

"بھونکنا بند کرو کتّے۔۔۔ اور بھاگ جاؤ۔" میں نے کہا۔

وہ اس طرح چیخنے لگا جیسے روڈ رولر کے نیچے آ گیا ہو یا مگر نہ منہ میں۔ یہ سب نشے کا اثر تھا۔ نشہ ہرن ہوا تھا تو بہادری کے جوہر دکھانے کا جذبہ بھی خلاص ہو گیا تھا اور اس نے معلوم نہیں سارے زمانے کو مدد کے لیے اکٹھا کرنے کا پروگرام بنا لیا تھا۔

"مرڈر۔۔۔ ارے کوئی دوڑو۔۔۔ مدد کرو۔۔۔" اس نے لاؤڈ اسپیکر کی طرح آواز نکالی۔ مجھے یقین تھا کہ لتنے شور سے سونے والے تو کیا مردے تک جاگ جائیں گے۔ ابھی میں اسے چھوڑ کر فرار ہونے کی سوچ ہی رہا تھا کہ بہرام دادا کی بیوہ کار لے کر وہاں سے نکل گئی۔ نہ جانے کس وقت اُسے ہوش آ گیا تھا اور اس نے موقع پاتے ہی پھر ڈرائیونگ سیٹ پر آ کے چابی گھما دی۔ انجن کے اسٹارٹ ہوتے ہی اس نے گاڑی بڑھا دی۔ میں بے بسی سے چند قدم اس کے پیچھے دوڑا مگر یہ ایک اضطراری حرکت تھی۔ میں اس کار کو چھو بھی نہ سکا اور بے بسی سے اس کی ٹیل لائٹ اندھیرے میں ڈوبتے دیکھتا رہا۔ مجھے بہت افسوس تھا کہ میں نیک نیتی رکھنے کے باوجود اس عورت کے کام نہ آ سکا جو استاد ڈیڈی ایک بہت بڑے محسن کی بیوہ تھی اور مصیبت میں تھی۔ میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ میرا غالب محسن یا ڈیڈی کا شہلا، نازو یا رابعہ میں سے ایک کا گردہ اس کی بیٹی کی جان بچا سکے گا۔ میں عبدالودود سے کہہ سکتا تھا اور وہ اپنی وکیل برادری تک یہ اپیل پہنچا سکتا تھا۔ مرزا غالب کے اپنے روابط تھے۔ وہ صحافی برادری کے ذریعے بات کو عوام و خواص کے ہر حلقے تک پہنچا سکتا تھا اور اس بڑے پیمانے پر کوشش کے نتائج خاطر خواہ برآمد ہونے لازمی تھے۔ غالباً بہرام دادا کی بیوہ کو نہ کسی نے مشورہ دیا تھا اور نہ ہی اسے خیال آیا تھا کہ وہ اخبارات میں اپیل شائع کرائے۔

"اب کیا دیکھ رہے ہو۔" میرے پیچھے وہ خبیث قہقہہ لگا کے ہنسا جو ایک منٹ پہلے زمین پر گرا ہوا واویلا کر رہا تھا۔ "وہ گئی۔۔۔ پھُر سے۔۔۔ اُڑ گئی۔"

بالکل غیر ارادی طور پر میرے مُنہ سے گالی نکلی۔ "ابھی نکالتا ہوں تیری ساری اکڑ فوں۔۔۔" میں نے اُسے دبوچ کر ایک دم اوپر اُٹھا لیا۔ وہ پھر چلّانے لگا۔ "مرڈر۔۔۔ ہیلپ۔۔۔" مگر میں نے پروا نہیں کی۔ میں نے اُسے پنکھے کی طرح گھمایا اور نیچے پھینک دیا۔

میں نے دوسری طرف دیکھا ہی نہیں جدھر سے سارجنٹ بنیان اور انڈر ویئر میں دوڑتا چلا آ رہا تھا۔

"ٹھہرو۔۔۔ کون بدمعاش ہے۔۔۔ تمھاری تو۔۔۔" وہ کسی آتش فشاں کی طرح گالیوں کا لاوا اُگل رہا تھا۔ اس نے وردی دیکھ کر مجھے یقیناً شناخت کر لیا تھا۔ اس کا ریوالور تو میں نے چھین لیا تھا مگر یہ دیکھ کر میری سٹی گم ہو گئی کہ وہ دوسرا ریوالور لہراتا آ رہا تھا اور سخت قاتل موڈ میں تھا۔

میں ایک دم بھاگا اور اس جوان کی گاڑی میں جا بیٹھا جو زمین پر ایسے تڑپ رہا تھا جیسے آخری وقت قریب ہو۔ اس نے ہیرو بننے کے چکر میں گاڑی کا گیٹ کھلا چھوڑ دیا تھا اور انجن بھی بند نہیں کیا تھا۔ چنانچہ مجھے گاڑی میں بیٹھ کر فرار ہونے میں دیر نہیں لگی۔ میری نیت کا اندازہ بے وردی سارجنٹ نے بھی کر لیا تھا۔ اس نے نشانہ لیے بغیر فائر کیا۔ گولی کار کی باڈی پر نہ جانے کہاں لگی۔ میں نے صرف فائر کی آواز سُنی اور پھر ٹین کی چادر سے گولی کے ٹکرانے کی آواز۔ میرے کانوں نے کار کے مالک کی فریاد و فغاں بھی سُنی۔ وہ عالم نزع کو بھول کر اور تڑپنا چھوڑ کر میرے پیچھے دوڑا تھا۔ "اوئے۔۔۔ اوئے میری گاڑی۔۔۔ اوئے تیری۔۔۔"

مگر میں اتنی دیر میں کار کے ایکسیلیٹر کو فرش سے لگا چکا تھا۔ گاڑی ابھی تھی کہ اس نے زیادتی پر احتجاج کرتے ہوئے ایک چھلانگ لگائی اور پھر ہوا ہو گئی۔ دوسرا فائر مس ہو گیا مگر تیسرا پیچھے والے ونڈ اسکرین پر لگا۔ اس کا شیشہ بکھر گیا اور شیشے کے ذرات اندر تک آ گئے۔

سارجنٹ اپنی موٹر سائیکل سے دُور تھا۔ اُسے فوراً پلٹ کر سڑک کے دوسرے کنارے تک پہنچنے اور موٹر سائیکل کو اسٹارٹ کرنے میں دو تین منٹ تو لگ جاتے۔ اس کے بعد بھی وہ میرا پیچھا کرتا تو اس مضحکہ خیز حلیے میں موٹر سائیکل کو کہاں تک دوڑاتا۔۔۔ مجھے اس کے غصے اور بے بسی دونوں کا احساس تھا۔ احتیاطاً میں نے سیدھی سڑک پکڑنے کے بجائے دوسری متوازی سڑکوں پر دائیں بائیں کئی موڑ کاٹے اور جب یہ محسوس کیا کہ کوئی مجھ تک نہیں پہنچ سکتا تو میں نے کار کو ایک کوٹھی کے دروازے پر روک دیا۔ اب میں جلد از جلد گھر پہنچنا چاہتا تھا۔ نقلی نواب جمشید کو ہائی جیک کرنے سے حاصل کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ یکے بعد دیگرے تاخیر کے اسباب پیدا ہوتے گئے تھے اور اب مجھے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ میرے لواحقین کتنے پریشان ہوں گے۔ وہ صرف اتنا جانتے تھے کہ میں نقلی خسرو جمشید بن کے اسی گاڑی میں نکلا تھا۔ پھر میں اصلی خسرو جمشید کے گھر پہنچا، تھانے یا عدم آباد؟ اس کے بارے میں وہ صرف قیاس آرائی کر سکتے تھے۔ تاہم میری یہ مہم جوئی بالکل بے مصرف نہیں رہی تھی۔ ایک تو مجھ پر یہ راز منکشف ہوا تھا اور وہ میرے اصلی نواب خسرو جمشید کون ہے۔ نقل باقی نہ رہی تھی چنانچہ آئندہ کسی کنفیوژن کا امکان نہ تھا۔ دوسری اہم بات بہرام دادا کی بیوہ سے ملاقات تھی۔ میں اس کی گاڑی کا نمبر نہیں نوٹ کر سکا تھا۔ اس کا نام اور پتا نہیں پوچھ سکا تھا لیکن اس سے سیوا اسپتال میں دوبارہ ملا جا سکتا تھا۔ وہاں مجھے اس لڑکی کو تلاش کرنا تھا جس کے دونوں گردے ناکارہ ہو چکے تھے اور جو مشین کے سہارے زندگی کے آخری ایام ایک موہوم سی امید کے سہارے کاٹ رہی تھی کہ شاید قدرت اُسے زندہ رکھنا چاہے تو کسی دردمند یا ضرورت مند کو بھیج دے جو ایک انسانی زندگی بچانے کا ثواب کمانے کے لیے اپنے ایک گردے سے محرومی قبول کر لے یا مالی مشکلات سے نجات پانے کے لیے اپنا ایک گردہ فروخت کر دے۔ پچاس ہزار یا ایک لاکھ میں زندگی کا یہ سودا کر لے۔ اس میں بھی کوئی معیوب یا غیر اخلاقی بات نہیں ہو گی۔ جو شخص گردہ بیچتا ہے وہ اپنا ضمیر تو نہیں بیچتا۔ باہمی رضامندی سے دو حاجت مند زندہ رہنے کے مواقع حاصل کرتے ہیں اور یہ معاہدہ دو خاندانوں کی خوشیوں کا ضامن ہوتا ہے۔

ابھی میں نے ایک فرلانگ کا فاصلہ پیدل طے کیا ہو گا کہ پیچھے سے ایک موٹر سائیکل سوار آیا۔ میں نے اس کی طرف پلٹ کر دیکھا تو وہ خود ہی رک گیا۔ وہ ائیرپورٹ سیکیورٹی کا آدمی تھا اور نصف شب کے بعد کی ڈیوٹی ختم کر کے لوٹا تھا۔ اُس نے وردی کے فرق کے باوجود مجھے بھی اپنا ہم پیشہ سمجھا اور گھر تک لفٹ دینے کے بعد ہاتھ ملا کے رخصت ہوا۔ عمداً میں ایک ایسی کوٹھی کے سامنے رک گیا تھا جہاں صرف پورچ میں روشنی تھی اور گیٹ کھلا پڑا تھا۔ میں چند قدم اندر تک گیا اور پھر لوٹ آیا۔ مرزا غالب کا آبائی گھر تقریباً سو قدم کے فاصلے پر اس سے متصل اور متوازی چلنے والی سڑک پر تھا۔

باہر سے کوٹھی کی ویرانی سالہا سال پرانی لگتی تھی اور ایک نظر ڈال کے گزر جانے والا سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ برسوں بعد بالآخر بوسیدہ دیواروں والے اس کھنڈر نے اپنے وارث کو بلا لیا ہے۔ میں جھاڑ جھنکاڑ والے میدان سے گزرا جو کبھی لان ہو گا۔ اس کے سرسبز تختوں کے گرد رنگین پھولوں کا حاشیہ ہو گا اور اس کی ہریالی نگاہوں کو تازگی بخشتی ہو گی۔ اب وہاں خشک نوکیلی گھاس تھی۔ کانٹے دار جھاڑیاں تھیں اور خودرو پودوں کے درمیان گرگٹ کی نسل کے زمین میں رہنے والے جانوروں نے بل بنا رکھے تھے۔۔۔ برآمدے کے عقبی حصے کے ایک دروازے کے سوا باقی سب دروازے اور کھڑکیاں جن کا رُخ سامنے کی طرف تھا حسبِ سابق بند پڑے تھے۔

میں گھوم کر پیچھے گیا تو مجھے ایک کھڑکی کے پردوں سے چھن کر نکلنے والا اجالا گرد آلود شیشوں پر نظر آیا۔ اندر وہ سب تھے۔ میں کان دروازے سے لگا کر ان کی گفتگو سننا چاہتا تھا مگر ابھی میں

جھکا ہی تھا کہ کسی نے بہت جما کے لات رسید کی اور میں دروازے سے گزر کے سیدھا ان کے درمیان پہنچا۔ محسن باہر میرے انتظار میں تھا اور اس نے تو مجھے اندر آتا دیکھ لیا تھا مگر میں اُسے نہ دیکھ پایا تھا چنانچہ وہ دبے پاؤں میرے پیچھے آگیا تھا۔ حملہ اتنا غیر متوقع تھا کہ میرے قدم اکھڑ گئے۔ کچھ پھرتی مرزا غالب نے بھی دکھائی اور میں تیر کی طرح اندر گیا تو انھوں نے فوراً ٹانگ اڑا دی۔ نتیجہ یہ کہ میں مُنھ کے بل وہیں گرا جہاں وہ سب میرے آس پاس حلقہ سا بنائے بیٹھے تھے۔

"السلامُ علیکم حضرات و خواتین!" میں نے اُٹھنے کے بعد چوٹیں سہلاتے ہوئے خفت سے دانت نکال کے کہا۔ "میں کچھ جلدی تو نہیں آگیا؟"

"جی نہیں..." محسن نے اندر آنے کے بعد کہا۔ "یہی وقت دیا تھا آپ نے... جلدی تو ہم آگئے تھے... گدھے تو ہم ہیں۔"

"دریں چہ شک۔" میں نے کہا۔ "ابھی جو دولتی آپ نے جھاڑی اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔"

"قسم مولا علی کی سکندر بادشاہ... تم نے ہم سب کو تفتیش میں مبتلا کر دیا تھا۔" استاد ٹیڈی نے سنجیدگی سے کہا۔

"تفتیش نہیں، ابوجہل کے چچے... تشویش..." مرزا غالب نے کہا۔ محسن بھی نہیں ہنسا تھا مگر رابعہ، شہلا اور نازو کے ہنسنے سے ان کے غصّے کا ڈراما فلاپ ہو گیا۔ ٹیڈی نے جواب میں غالب کو مرزا جاہل کہا۔

"کیا مصیبت ہے یار۔" محسن نے جھلا کر کہا۔ "کیا طے کیا تھا ابھی کہ سب سیریس رہیں گے... کچھ سزا دیں گے اسے... میں نے تو لات مار دی... ایک ایک ہاتھ تمھیں بھی مارنا تھا۔"

"مجھے اندازہ ہے آپ سب کے دلی جذبات کا۔" میں نے کہا۔ "کچھ ایسے ہی جذبات میرے بھی ہیں لیکن پہلے آپ لوگ میری دُکھ بھری کہانی سن لیں... اگر سب آٹھ آٹھ آنسو نہ رونے لگیں تو میرا ذمہ۔ ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا۔ میں اتنی دیر تک جھک نہیں مارتا رہا۔"

"اتنی دیر تک پھر آپ کیا مارتے رہے مسٹر تیس مار خاں؟" محسن بولا۔

"بھئی ایک تو ہم نے نقلی نواب مارا۔" میں نے سوچ کر کہا۔ "پھر ایک عدد ٹریفک سارجنٹ کو تھوڑا سا مارا... اتنا کہ وہ اپنا سر نہ اُٹھا سکے۔ ایک نامعلوم شخص کو بلاوجہ مارا۔ اس کا دل چاہتا تھا پٹنے کو۔ ہمیں اس کی کار بھی چھیننا پڑی۔ اس سے پہلے ہم ایک بہت اعلیٰ قسم کی کار پھونک چکے تھے۔ پھر ایک نیک دل خاتون سے ہم نے زبردستی لفٹ لی۔ اس پہ یاد آیا کہ ہم نے خاتون کے ایک چھانپڑ بھی مارا تھا۔"

"نیک دل خاتون کی عمر، رنگ روپ، ناک نقشہ؟" محسن

بولا۔ "یہ سوال مس رابعہ کی طرف سے کیا جا رہا ہے۔"

"اہم بات یہ ہے کہ نیک دل خاتون ہمارے ایک ... کی بیوہ تھی۔" میں نے کہا۔ "ہم سب کو اس کا ایک قرض چکانا ..."

"ویری گڈ... اور چھانپڑ گویا... اس قرض کی پہلی قسط کے طور پہ مارا تھا آپ نے۔" غالب بولا۔

"مرزا جی! اپنی زرد صحافت مت چلاؤ یہاں... آپ نے میرا پورا بیان سُنا نہیں اور ایک سنسنی خیز سرخی لگا دی۔" ... کہا۔ "جو کچھ میں نے فرمایا ہے اس کی تفصیلات بہت جلد پیش ... گی۔ پہلے میری اچھی طرح خاطر تواضع کی جائے... ویسے نہیں جیسے آپ لوگ چاہتے ہیں... بلکہ جیسے میں چاہتا ہوں... کیسے سنگدل لوگ ہیں یہاں کہ اسے مارتے ہیں جو پہلے ہی مر رہا ... کسی پر... یہ نہیں پوچھتے کہ کیا چاہتے ہو اور کیسے چاہتے ہو۔"

"سیدھی طرح بتاؤ کیا چاہیے۔" رابعہ نے مصنوعی غصّہ ... مجھے ڈانٹا۔ کیونکہ شہلا کھی کھی کرنے لگی تھی۔

"ایک روٹی کا سوال ہے مائی۔" میں نے فقیر کی طرح ... لگائی۔ "دو وقت کا بھوکا ہوں... اللہ تیرے دل کی مراد پوری کرے... تیرا سہاگ سلامت رکھے... میرے چھوٹے چھوٹے یتیم بہن بھائی ہیں۔" میں نے دردناک لہجے میں کہا اور ایک ہاتھ محسن کے سر پہ رکھا اور دوسرا غالب کے سر پہ۔

"بابا جی!" محسن نے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ "آپ تینوں میں سے جس کو چاہیں بہن بنا لیں۔ بس مجھے بھائی نہ بنائیں ... بہنوئی کو بھائی کہنا گناہ ہے۔"

"چلو باجی! یہ لوگ تو شروع ہو گئے۔" شہلا نے کہا اور رابعہ کے ساتھ کچن کی طرف چلی گئی۔ وہاں صرف نازو رہ گئی جو ابھی تک اپنے اسی میک اپ میں تھی۔ پھٹے پرانے کپڑوں میں ایک بدشکل اور خستہ حال بڑھیا بنی ہوئی۔

"خدا کے لیے اب تو حلیہ بدل لو اپنا۔" میں نے کہا۔ "مرزا ... تو غالب کے دل کا ہی کچھ خیال کر لو۔"

"ہاں، کتنے پاپڑ بیلے ہیں اس نے۔" محسن نے تائید کی۔

"نہیں... کتنی مونگ پھلیاں بیچی ہیں اس نے۔" میں نے ...

"مونگ پھلیاں تو میں نے زیادہ بیچی ہیں۔" ٹیڈی بولا۔

"غلط! تم کیا مجھ سے اچھے سیلزمین ہو؟" غالب نے کہا۔

"ہاں... میری آواز میں تاثیر تھی۔" استاد ٹیڈی نے کہا۔ "لوگ اس پہ کھنچے چلے آتے تھے۔" "میری اس بات کا تو جواب ہی ... کہ مونگ پھلی سونے کی ڈلی۔"

"یہ چوری ہے..." مرزا غالب نے کہا۔ "یہ محکمۂ زراعت ... کا نعرہ ہے جو ہر قصبے، دیہات کی دیوار پہ لکھا نظر آتا ہے۔ شرم آنی چاہیے تمھیں۔"

"چور تم بھی ہو... ایک شعر نہیں پورا شاعر چُرا لیا تم نے ...

ٹیڈی نے مشتعل ہو کے کہا۔ "مرزا غالب کو قیامت کے دن کیسے ... دکھاؤ گے۔"

"شاعری میری اپنی تھی۔" مرزا غالب نے میز پہ مُکا مارا۔ "اور مونگ پھلی کی شان میں ایسا قصیدہ لکھ کر تو دکھائے کوئی... یہی میری کامیابی کا راز تھا... میری سیل ہمیشہ زیادہ رہی۔"

"دو سیر مونگ پھلیاں تم خود چَر جاتے تھے۔ اس کو سیل میں شامل کرتے ہو..." ٹیڈی نے چراغ پا ہو کے کہا۔

"تم بھی اس سے زیادہ اپنی پی آر بڑھانے کے لیے بانٹ دیتے تھے۔" مرزا غالب نے چلّا کر کہا۔ "اور تم بارہ گھنٹے دُکانداری کرتے تھے۔"

"صبح سے دوپہر تک لوگ اخبار خریدتے ہیں۔ مونگ پھلی نہیں۔ تم کو سینما کے دو شو ملتے تھے۔" ٹیڈی نے بھی چلّا کے کہا۔ "لوگ رات کو ہی مونگ پھلی کھاتے ہیں... کبھی شفٹ بدل کے دیکھتے۔"

"دیکھ لیتے اشام کے دونوں شو خالی جاتے۔" مرزا غالب نے مزید اشتعال انگیزی کی۔ "لوگ تو تمھاری صورت دیکھ کر بھاگ جاتے تھے۔ وہ سینما بھی چھوڑ دیتے۔"

"ہاں! اور بس تمھارا گانا سن کے لوٹ جاتے۔" ٹیڈی نے جل بھن کے کہا۔ "بالکل زہرہ بائی انبالے والی کی طرح گاتے تھے۔ کھائے جو میری مونگ پھلی۔" اس نے مضحکہ خیز زنانہ آواز بنا کے نقل اتاری۔ میں اور محسن تو اس مونگ پھلی کی پہلی جنگ سے بہت خوش تھے اور لطف اندوز بھی ہو رہے تھے مگر رابعہ اور شہلا کے اندر آتے ہی امن بحال ہو گیا۔ انھوں نے نازو سے کہا کہ وہ تصفیہ کرا دے اور نازو اٹھی ہی تھی کہ غالب اور ٹیڈی نے ہاتھ ملا لیا۔

"بخدا سیلزمین تو آپ ہیں... میں تو آپ کی خاکِ پا۔" غالب نے کہا۔

"نہیں دوست اب مجھے شرمندہ مت کرو... تم نے بہت زیادہ مونگ پھلی بیچی۔" ٹیڈی بولا۔ "تم استاد میں شاگرد۔"

"نہیں تم استاد میں شاگرد۔" غالب بولا۔

"اُونہوں... تم..." ٹیڈی نے اصرار کیا اور نازو جو اب تک دُور ایک چارپائی پہ لیٹی ہوئی تھی اُٹھ کر ان کے درمیان آ بیٹھی۔

"اب کوئی نام لے مونگ پھلی کا۔" نازو نے کہا۔ "کسی کا لحاظ نہیں کروں گی میں۔" غالب اور ٹیڈی نے ڈھٹائی سے ہنسنا شروع کیا۔

"یار، وہ کس محسن کی بیوہ کا ذکر تھا۔" محسن بولا۔ "ہمارا کون مُحسن فوت ہوا ہے؟"

"اس کے انتقال کو زمانہ ہوا۔" میں نے کہا اور کھانے پہ ہاتھ

صاف کرنے لگا۔ "احسان اس نے استاد ٹیڈی پہ کیا تھا لیکن ہم سب دوست ہیں تو اس احسان کا قرض بھی ہم سب پہ ہے۔ خدا نے ہمیں موقع فراہم کیا ہے کہ ہم اب یہ قرض اتار دیں۔"

میں نے نقلی خسرو جمشید کے اغوا سے بات شروع کی اور مختصراً اپنی اور بہرام دادا کی بیوہ سے ملاقات تک سب کچھ بتا دیا۔ میری توقع کے مطابق استاد ٹیڈی پہ سب سے زیادہ اثر ہوا۔

"تمھیں یقین ہے کہ وہ عورت جھوٹ نہیں بول رہی تھی؟" وہ بولا۔

"نہیں استاد! جھوٹ بول کے اُسے کیا ملتا۔"

"مگر اپنے سکندر بادشاہ... جہاں تک مجھے معلوم ہے۔" ٹیڈی نے بے چینی سے ٹہلتے ہوئے کہا۔ "بہرام دادا کی بیوی ہی کوئی نہیں تھی... تم بیٹی کی بات کرتے ہو۔"

"بہرام دادا سے تمھاری ملاقات کا زمانہ بہت مختصر تھا۔ اس نے تمھاری مدد کی تھی... تم کو اپنا رازدار نہیں بنایا تھا۔" میں نے کہا۔ "ممکن ہے وہ کسی کو بھی اپنے بیوی بچوں کے بارے میں نہ بتاتا ہو... ان کو محفوظ رکھنے کے لیے کسی کے سامنے ان کا ذکر تک نہ کرتا ہو۔"

"اگر یہ سچ ہے تو ہمیں فوراً اس سے ملنا چاہیے۔" محسن نے کہا۔ "اس عورت کی مدد کرنا چاہیے۔"

"زندگی اور موت تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن ہم کوشش ضرور کر سکتے ہیں۔ نہ جانے خدا نے یہ نیکی کی توفیق کس کے مقدر میں لکھی ہو۔ کس کا ایک گردہ میچ کر جائے اور اس کی بیٹی کی زندگی بچا لے۔"

"کیا ایک گردے کے ساتھ آدمی بالکل صحت مند رہتا ہے؟" ٹیڈی نے کہا۔ "اور زندہ رہتا ہے؟"

"ہاں استاد... یہ قدرت کا حیرت انگیز نظام ہے۔" میں نے کہا۔ "جیسے ایک آنکھ مل جائے تو اندھا دنیا کو اسی طرح دیکھ سکتا ہے جیسے دو آنکھوں والے، اسی طرح ایک گردے اور ایک پھیپھڑے کے ساتھ آدمی بالکل نارمل رہتا ہے۔"

"پھر تو سب سے پہلے میں اپنا گردہ دوں گا..." ٹیڈی بولا... "یہ میرا حق ہے کہ اپنا قرض سب سے پہلے میں ادا کروں۔"

"تمھارے جذبات قابلِ قدر ہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن یہ مسئلہ جذباتی نہیں ہے۔ میڈیکل سائنس کا ہے۔ کسی بھی شخص کے کوئی بھی گردہ نہیں لگایا جا سکتا۔ پہلے بہت سے ٹیسٹ ہوتے ہیں۔ عموماً ماں باپ یا بھائی بہن کے گردے موزوں ثابت ہوتے ہیں اور جسم انھیں قبول کر لیتا ہے لیکن غیروں کے گردے بھی میچ کر جاتے ہیں۔"

"تم عجیب آدمی ہو کہ اس کا نام پتا نہیں پوچھا۔"

"میں نے بتایا نا کہ وہ ایک دم بھاگ گئی۔" میں نے کہا۔

"اب تو ہم صبح ہی میو اسپتال جا کے معلوم کریں گے۔"

"یہ کام مجھ پر چھوڑ دو۔" مرزا غالب نے کہا۔ "میں اپنے اخبار کے دفتر اور دوسرے صحافی دوستوں سے کہوں گا۔ وہ ایک گھنٹے میں پتا چلالیں گے اور اگر بدقسمتی سے ہم میں سے کوئی بھی اس ثواب کا اہل نہ ہوا تو پھر پبلک سے اپیل بھی وہی لوگ شائع کرا دیں گے۔"

"ہم منہ مانگا معاوضہ ادا کریں گے۔" ٹیڈی بولا۔ "خدا کا شکر ہے کہ وہ پندرہ سیر سونا ابھی تک محفوظ رہا... شاید اسی دن کے لیے..."

"مجھے ایسا لگتا تھا کہ اس عورت کے مالی حالات بھی ٹھیک نہیں ہیں... ورنہ یہ کام وہ خود بھی کرسکتی تھی۔" میں نے کہا۔ "اخبار میں اشتہار دے کر کسی کو معقول معاوضے کی پیشکش کرتی۔"

"مگر تم نے کہا ہے کہ وہ گاڑی میں تھی۔ خود چلا رہی تھی۔" محسن بولا۔

"ہاں، گاڑی تو چلا رہی تھی۔" میں نے کہا۔ "لیکن ایک تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ گاڑی اسی کی تھی۔ دوسری بات یہ کہ گاڑی کوئی بہت زیادہ قیمت کی نہیں تھی... معمولی سی پرانی گاڑی تھی۔"

"ایک گردہ جسے ہم کوئی اہمیت نہیں دیتے۔" غالب نے تلخی سے کہا۔ "وہ ایک گاڑی سے زیادہ مہنگا ہوتا ہے۔ اہمیت گاڑی کو ملتی ہے۔"

"جب تک زندگی کی گاڑی چلتی رہے ہم یہی رویہ رکھتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "پھر ایک دن اچانک ہم پر عیاں ہوتا ہے کہ جسم کی مشینری کا ایک معمولی سا پرزہ بھی کتنا گراں قیمت ہے۔ بعض اوقات کروڑوں، اربوں روپے میں زندگی کی چند سانسوں کے لیے یہ سامان مستعار بھی نہیں ملتا۔"

"میرا خیال ہے میں ابھی چلا جاؤں۔" ٹیڈی اچانک بولا۔

"ابھی جا کے کیا کرو گے؟" میں نے کہا۔ "کوئی تمھیں وارڈ میں نہیں جانے دے گا اور تم سارے اسپتال میں بھٹکتے پھرو گے اور اسی میں صبح ہو جائے گی۔ یہی کام غالب صبح آسانی سے کرلے گا۔"

"لیکن صبح تک... اُسے کچھ ہو نہ جائے۔" ٹیڈی بولا۔

"خدا پر بھروسا رکھو۔" میں نے کہا۔ "اُس نے ہی ایسے اسباب پیدا کیے کہ میں بہرام دادا کی بیوہ سے ملا اور اس کے حالات سے واقفیت ہوئی۔ ظاہر ہے اس میں خدا کی مرضی اور مصلحت شامل تھی۔ وہ ہمیں اتنی مہلت بھی دے گا کہ ہم ایک نیکی کما سکیں۔ میرا دل کہتا ہے اگر خدا کو یہ منظور نہ ہوتا کہ وہ لڑکی زندہ رہے تو یہ اتفاقیہ ملاقات بھی نہ ہوتی۔ یہ کوئی ایسا مرض نہیں جو مہلت ہی نہ دے۔ اس میں مریض کی ظاہری حالت کئی بار اتنی بگڑ جاتی ہے کہ زندگی کی امید نہیں رہتی مگر وہ پھر سنبھل جاتا ہے۔"

"اس کے علاوہ..." غالب بولا۔ "سارے ٹیسٹ صبح ہی ہوتے ہیں... اس وقت ہم سب جا کے کہیں کہ ہمارا گردہ لے لو تب بھی ڈاکٹروں کا جواب یہی ہوگا کہ صبح آئیے۔ یہ بہت مشکل اور پیچیدہ قسم کے ٹیسٹ ہوتے ہیں۔ سارے ٹیسٹ ہو جانے کے بعد ہی ڈاکٹر کوئی حتمی فیصلہ کرتے ہیں۔ گردہ دینے والے کو ایک مقررہ تاریخ پر طلب کرتے ہیں اور پھر آپریشن وغیرہ ہوتے ہیں۔"

ٹیڈی خاموش ہوگیا لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ اس اطلاع نے جذباتی طور پر اسے کتنا مضطرب کر دیا ہے۔

"تم یہ بتاؤ استاد کہ وہ سب ریکارڈ ہو گیا؟" میں نے موضوع بدلنے کے لیے کہا۔

"ہاں، کیا تم سن نہیں رہے تھے؟" غالب بولا۔

"میں نے اور تم نے تو سن لیا تھا۔" میں نے کہا۔ "باقی سب نے تو کچھ نہیں سنا۔"

"نازو کا یہ کارنامہ ہم سب کے لیے باعث فخر ہے..." محسن بولا۔ "ٹیپ تو میں نے نہیں سُنے مگر ٹیڈی نے جو کچھ بتایا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دلاور اینڈ کمپنی کے عزائم کتنے خطرناک ہیں..."

"لیکن اب خدا کی مدد شاملِ حال رہی تو ہم ان کے عزائم خاک میں ملا دیں گے۔" میں نے کہا۔ "نازو کی بے مثال ہمت کے باعث ہی ہمارے لیے یہ معلومات حاصل کرنا ممکن ہوا... ورنہ ہم سب اندھیرے میں رہتے اور دشمن کے ایجنٹ اپنا کام کر رہے ہوتے۔ زیادہ خوشی مجھے اس بات کی ہے کہ نازو محفوظ رہی... اسے کچھ ہو جاتا تو..."

"مجھے کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ اسی یقین نے میری حفاظت کی۔" نازو بولی۔

"ایک وقت ایسا آیا تھا جب تمھارے یقین کو شکست ہو سکتی تھی۔ اس وقت جب ایس پی سراج تمھاری اصلیت جاننے کے لیے پولیس کے مخصوص حربے استعمال کرنے پر تُل گیا تھا۔" میں نے کہا۔

"اس وقت میں گھبرا جاتی تو سارا معاملہ چوپٹ ہو جاتا۔"

"تمھاری اداکاری بہت لاجواب تھی۔" میں نے کہا۔

"سراج کسی اداکاری سے متاثر ہونے والا آدمی نہیں تھا۔ وہ تو خدا نے کسی کی سُن لی اور وکٹر کی ماں آگئی۔" نازو بولی۔

"کس کی سن لی؟" شہلا بولی۔ "میری اور رابعہ کی سُنی ہوگی۔"

"ممکن ہے غالب کی سُنی ہو۔" میں نے کہا۔ "دل سے جو دعا نکلتی ہے اثر رکھتی ہے... مگر حقیقت یہ ہے کہ اس وقت میں بھی ایک خطرناک فیصلہ کر چکا تھا۔"

"تم نے کیا فیصلہ کیا تھا استاد؟" نازو مسکرائی۔

"بس سر دھڑ کی بازی لگانے کا۔" میں نے کہا۔ "یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ شیطان تمھارے ساتھ کوئی زیادتی کرتے اور ہم سب کن کے بھی کچھ نہ کرتے۔"

"قسم مولا علی کی... سوچا میں نے بھی یہی تھا۔" استاد ٹیڈی نے کہا۔ "اگر وہ کمینہ پیڈرو اپنے باپ سراج کے حکم پر عمل کرتا تو اس سے پہلے میں اندر گھس جاتا... اس کے بعد تخت یا تختہ۔"

"تم نے اکیلے ہی چڑھائی کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا استاد؟" میں نے کہا۔

"ہاں! پہلے تو مجھے اتنا تاؤ آ رہا تھا کہ دل چاہتا تھا دروازہ توڑ کے اندر گھس جاؤں اور سالوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں۔" ٹیڈی بولا۔

"کافی رنفیٹں لے جانی پڑتیں تمھیں۔" غالب نے کہا۔ "اور استاد یہ بھی ہوسکتا تھا کہ وہ کمینے تم کو انہی اینٹوں سے انارکلی کی طرح دیوار میں زندہ چُن دیتے۔"

"اسی لیے میں نے برداشت سے کام لیا۔" استاد ٹیڈی سادگی سے بولا۔ "میں نے سوچا کہ سب کے ساتھ حملہ کرنا چاہیے۔ بس اسی وقت اُن کی اماں نے معاملات کو بگڑنے سے بچا لیا۔"

"اُس وقت بڑھیا کا آنا واقعی تائیدِ ایزدی ثابت ہوا۔" نازو نے ٹیڈی کی بات پہ مسکرا کر کہا۔ "ورنہ معلوم نہیں کیا ہوتا... کوئی قریب آنے کی ہمت کرتا تو مارا جاتا۔ اس کے بعد اگر ریوالور میرے ہاتھ لگ جاتا تو شاید بچ کر نکل آنے کی کوئی صورت پیدا ہو جاتی۔ میں سب کو شوٹ تو کر نہیں سکتی تھی۔ اگر دلاور یا سراج میں سے کوئی پکڑا جاتا تو اسے ڈھال بنا کے نکلنے کی کوشش کامیاب ہو سکتی تھی۔"

"یہ کامیابی بھی ناکامی ہی ہوتی۔ ہمارا راز فاش ہو جاتا اور تمھاری محنت رائیگاں جاتی۔" میں نے کہا۔ "خیر جو ہوا اچھا ہوا... اب تو آگے کی سوچنا چاہیے۔"

"آگے کی صبح سوچیں گے۔" محسن نے مُنہ پھاڑ کے جماہی لی۔ "معلوم ہے رات کا ڈیڑھ بج رہا ہے۔"

"خدا کا شکر ہے کل مونگ پھلی بیچنے نہیں جانا ہے۔" استاد ٹیڈی نے کہا۔ "نیند تو مجھے بھی آ رہی تھی پہلے... لیکن اب بہرام دادا کی بیوہ کے خیال سے پریشانی ہو رہی ہے۔"

"تمھاری پریشانی سے اس کی پریشانی دُور نہیں ہوگی۔" محسن نے اُسے سمجھایا۔ "ہم سب کو عملی طور پر جو کچھ بھی کرنا ہے وہ کریں گے مگر اس وقت کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

ہماری عدم موجودگی میں رابعہ اور شہلا نے بہت کام کیا تھا۔ انھوں نے تیسرا کمرہ بھی جھاڑ پونچھ کے رہائش کے قابل بنا لیا تھا۔ اس کو پہلے گیسٹ بیڈ روم کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ صفائی کے باوجود ویرانہ وقت اس کمرے کی فضا میں موجود تھا۔ کئی سال پرانے بیڈ کو جھاڑنے سے گرد ہٹ گئی تھی لیکن اس کا اُڑا ہوا رنگ اور داغ دھبے باقی تھے۔ یہی حال پردوں کا تھا جو لٹکے لٹکے بوسیدہ ہو گئے تھے۔ فرش پر سے تنکے اور دوسرا کوڑا کرکٹ ہٹا دیا گیا تھا لیکن قالین پر اتنی گرد جم گئی تھی کہ اُسے اٹھا کر باہر لے جائے بغیر صاف نہیں کیا جا سکتا تھا۔ دیواروں پر جہاں تک رابعہ یا شہلا کا ہاتھ پہنچتا تھا، وہاں تک جھاڑو سے مکڑی کے جالے وغیرہ ہٹا دیے گئے تھے مگر اوپر کے گوشوں میں اور چھت کے ساتھ ساتھ اب بھی جالے دکھائی دیتے تھے۔ اگر بجلی کی روشنی ہوتی تو شاید اس ماحول کا آسیب کچھ کم محسوس ہوتا لیکن موم بتی کی مدھم روشنی سے ویرانی کا تاثر ختم نہیں ہوتا تھا۔ یہ گیسٹ بیڈ روم شہلا اور محسن کے حوالے کر دیا گیا۔ دوسرا کمرہ کھانے کا کمرہ تھا۔ اس کی بہت قدیم وضع کی میز کرسیاں ہٹانے کے بعد اتنی جگہ نکل آئی تھی کہ میں، غالب اور ٹیڈی فرش پر دراز ہو جائیں۔ ہم نے تکیوں کی جگہ وہ کشن استعمال کیے جو ڈرائنگ روم کے صوفوں پر رکھے ہوئے تھے۔

"بالکل ایسا لگتا ہے جیسے یہاں بھی قالین ہے..." میں نے کہا۔

"یہ قالین ہی ہے اور بہت اعلیٰ قسم کا۔" غالب نے کہا۔ "جس پر آپ لیٹے ہیں۔"

"اچھا؟" میں نے سر کھجایا۔ "اس کا رنگ کیسا تھا؟"

"مجھے یاد نہیں۔" غالب نے خفت سے کہا۔ "مٹی کئی سال سے پڑ رہی ہے۔"

"ہاں، اب مٹی زیادہ ہے قالین کم۔" میں نے کہا۔ "پہلے مٹی اس قالین پر پڑتی رہی۔ اب ہم مٹی میں پڑے ہیں۔ تم مصر ہو کہ ہم قالین پر لیٹے ہوئے ہیں... چلو مان لیتے ہیں۔"

"ایک ویکیوم کلینر سے سارے قالین صاف ہو جائیں گے..." غالب نے کہا۔ "جب گرد ہٹے گی تو پھر دیکھنا قالین کا اصلی رنگ۔"

"خدا کا شکر ہے چوہے نہیں ہیں۔" ٹیڈی بولا۔ "ورنہ یہیں سونا مشکل ہو جاتا... ابے تیری..." وہ ایک دم چلایا اور اُچھل کر بیٹھ گیا۔ ہم دونوں کا ہنستے ہنستے بُرا حال ہو گیا۔ ٹیڈی کی بات ابھی ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ ایک موٹا تازہ چوہا دروازے سے اندر آگیا۔

"سالا کہیں چھُپ کر انتظار ہی کر رہا تھا۔" ٹیڈی نے کہا اور اس پر جوتا پھینکا۔ اس کے بعد بڑی بھگدڑ مچی۔ چوہا ڈرائنگ روم میں چلا گیا جہاں رابعہ اور نازو آمنے سامنے کے بڑے صوفوں پر دراز تھیں۔ انھوں نے چیخ ماری اور صوفے پر کھڑی ہو گئیں۔ میں، غالب اور ٹیڈی چوہے کے پیچھے لگ گئے۔ ہم نے باری باری نشانہ لے کر جوتوں کے میزائل چلائے مگر چوہا ہر بار بچ گیا۔ وہ کبھی ایک صوفے کے پیچھے چلا جاتا تھا کبھی دوسرے کے پیچھے۔ چنانچہ کبھی نازو چیخ مار کے دوسرے صوفے پر رابعہ کے ساتھ

جا کھڑی ہوتی تھی تو کبھی رابعہ اور وہ ایک ساتھ تیسرے صوفے پر چھلانگ مارتی تھیں۔ ہماری ہنسی سے ان کو مزید خفّت کا سامنا تھا۔ ان دونوں کی جرأت مندی اور بے خوفی اچھے خاصے مردوں کو شرمندہ کردیتی تھی۔ رابعہ نے دشمنوں کا مقابلہ بڑی ہمت سے کیا تھا۔ اسے قید میں شدید ترین جسمانی اذیت دی گئی تھی اور ابھی گزشتہ دنوں وہ گولیوں کی بوچھار میں میرے ساتھ ایم ڈبلیو ڈی کمپلیکس سے باہر نکلی تھی اور اس گاڑی سے وہ جوابی فائرنگ کرتی رہی تھی۔ دوسری نازو تھی۔ مجسّم قیامت... مار دھاڑ سے بھرپور اور قتل و خونریزی کو کھیل سمجھنے والی جو تن تنہا دشمن کے قلعے میں داخل ہوگئی تھی اور بحفاظت لوٹ آئی تھی۔ یہاں ایک چوہا دیکھ کر دونوں حواس باختہ تھیں اور یہی سب سے بڑا لطیفہ تھا۔

ہمارے شور اور قہقہوں نے محسن کو بھی بیڈ روم سے کھینچ نکالا۔ اس کی زوجہ پہلے تو آنکھیں ملتی اندر آگئی۔ پھر اُسے ہنگامے کا سبب نظر آگیا۔ اس نے بھی ایک دلخراش چیخ ماری اور اس صوفے پر چڑھ گئی جہاں دو بہادر خواتین پہلے ہی لرزہ براندام تھیں۔ محسن ہمارے ساتھ شکار میں لگ گیا اور چوہا جس کے لیے فرار کے سارے راستے بند کردیے گئے تھے، بالآخر محسن خان کے ہاتھوں ہلاک ہوا۔ چند جوتے کھانے اور مسلسل دوڑنے سے وہ نیم جان پہلے ہی ہو رہا تھا۔ محسن خان نے ایک بانس اُٹھا رکھا تھا جس پر جھاڑو اس طرح باندھی گئی تھی جیسے رائفل پر سنگین لگائی جاتی ہے۔ اس سے دن میں جالے صاف کیے گئے تھے۔ اب محسن نے طویل فاصلے پر مار کرنے والے اس ہتھیار سے چوہے پر وار کیے اور اسے مار دیا۔

اس کے بعد مزید ہڑبونگ مچی کیونکہ ابھی خواتین نے سکون کا سانس بھی نہیں لیا تھا کہ محسن نے چوہے کو دم سے پکڑ کے اٹھالیا۔

"یار سکندر! تو نے غور کیا۔ اس میں اور میرے سالے میں کوئی فرق نہیں ہے۔ دیکھنے میں ویسا ہی ہٹا کٹا الّو کا پٹھا مگر اتنا ڈرپوک۔" وہ بولا۔

"اتفاق دیکھو کہ نظر بھی ٹیڈی کو آیا تھا۔" غالب نے لقمہ دیا۔

"آیا ہوگا بڑے بھائی سے ملنے۔" محسن بولا۔ "وہ بھی مارا جائے گا کسی دن اسی طرح میرے ہاتھوں... سالا چوہا۔"

"محسن... یہ کیا بدتمیزی ہے۔" شہلا چلّائی کیونکہ ٹیڈی کسی پریشر ککر کی طرح پھٹنے والا تھا۔

"یہ بدتمیزی نہیں چوہا ہے... یہ لو..." اس نے چوہے کو شہلا کی طرف اچھال دیا۔ وہ چیخ مار کے بھاگی۔

"یہ چوہا نہیں چھچھوندر ہے۔" اب اُسے غالب نے اُٹھالیا اور اس کو ناک کے قریب لا کے سونگھا۔

"کیا اس کے سر میں چنبیلی کا تیل ہے؟" میں نے کہا۔

"یہی دیکھ رہا تھا... ذرا تم دیکھنا..." اس نے چوہا نازو کی طرف پھینکا۔

نازو ایک صوفے سے دوسرے پہ کود گئی۔ "میں بتاؤں گی تم کو..." وہ چلّا کے بولی۔ اب چوہا میرے قریب تھا۔ ... نے لُسے اٹھایا تو رابعہ کی حالت غیر ہوگئی۔ میں آگے بڑھا۔

"دیکھو سکندر... خبردار... باہر لے جاؤ اسے۔" وہ ... ہٹتے ہوئے چلّائی۔ "دُور کرو... دفع کرو اسے۔"

"کیوں... اچھا بھلا آدھا سیر گوشت ہے۔" میں ... "پلاؤ پکے گا زبردست... یا قورمہ... موش مسلّم کھایا ہے کبھی..."

اب پوزیشن یہ تھی کہ جیسے ہی میں آگے بڑھتا تھا خواتین ... دوسری جانب دوڑ جاتی تھیں۔ ان کا احتجاج اور ان کی ... فغاں سب کو بے حد محظوظ کررہی تھی اور ہم سب کے ... ہنستے آنسو نکل آئے تھے۔ جب ٹیڈی نے وہ ... جھاڑو مار کے چوہا نیچے گرایا اور اُٹھا کے باہر پھینکا تو یہ تماشا ختم ہوا۔ ہم پھر لیٹے تو بہت دیر تک ہماری ہنسی نہیں تھمی۔ کافی دیر بعد جب ہم نے پھر سونے کا موڈ بنایا تو رابعہ اور نازو ... رونی صورت بنائے دروازے میں نمودار ہوئیں۔

"اب کیا ہوگیا... کیا وہ میرا سالا آگیا؟" غالب اُٹھ ...

"نہیں یار... میرا سالا ہوگا..." میں نے کہا۔

"ہم بات نہیں کرتے تم سے۔" رابعہ نے کہا۔

"دونوں ایک جیسے بدتمیز ہو..." نازو بولی۔ "بھائی نیک ... ذرا تم اِدھر آؤ۔"

"آہا ہا... بھائی نیک محمد۔" غالب نے نقل اتاری۔ "... شرافت اور شائستگی آگئی ہے لہجے میں۔"

"ہمیں ڈر لگ رہا ہے۔" میں نے بھی نقل اتاری۔ "بھائی نیک محمد آپ اِدھر ہمارے کمرے میں سو جائیں... یہی بات ہے نا...؟"

بات یہی تھی چنانچہ ان دونوں کو مزید شرمندگی اُٹھانا پڑتی لیکن ٹیڈی نے انھیں بچالیا اور خود ہی ان کے ساتھ چل پڑا۔ وہ بھی ہم سے جان چھڑانا چاہتا تھا اور اسے موقع مل رہا تھا کہ ایک شریف اور بہادر بھائی کا رول ادا کرے۔ ہم بہت ... تک اُسے ہوٹ کرتے رہے مگر وہ دوسرے کمرے میں جا کر صوفوں کے درمیان خالی جگہ پر لیٹ گیا تھا۔ رابعہ اور نازو اس کے دائیں بائیں صوفے کے اوپر تھیں اور وہ نیچے قالین پر تھا۔ ابھی آدھا گھنٹہ بھی نہیں گزرا تھا کہ استاد ٹیڈی کا شور و غوغا سنائی دیا۔ میں اور غالب فوراً اُٹھ بیٹھے۔

"خدا خیر کرے اب کوئی بھوت آگیا ہے کیا..." غالب بولا۔

"یہ بھی ہو سکتا ہے... ان کا قبیلہ آباد ہے یہاں..." میں نے کہا۔

"یار اِدھر آؤ..." ٹیڈی نے کہا۔ اس کے بلانے سے پہلے ہی ہم کھڑے ہو چکے تھے۔ دوسرے کمرے میں عجیب منظر تھا۔ رابعہ اور نازو تو سکون سے سوئی پڑی تھیں جو خاصی حیرت کی بات تھی۔ اتنے ہنگامے سے اتنی خوفزدہ ہونے کے بعد وہ کتنی جلدی مطمئن ہوگئی تھیں کہ اب ڈر کی کوئی بات نہیں رہی کیونکہ ان کے درمیان ایک محافظ موجود ہے۔ خوف کا احساس بھی نفسیاتی تھا اور تحفظ کا بھی... استاد ٹیڈی قالین کے اوپر ایسے ہاتھ مار رہے تھے جیسے عینک لگانے والا عینک تلاش کررہا ہو۔

"مرزا جی! تم کو کچھ یاد ہے؟" ٹیڈی نے کہا۔ "اس کونے میں کیا تھا؟"

"اس کونے میں...؟" غالب نے ایک صوفے کے آخری حصے کے نیچے دیکھا۔

"ہاں... ابھی سوتے میں میرا پیر اِدھر گیا تو ایسا لگا جیسے فرش ہلا ہو..." ٹیڈی نے کہا۔ "تم بھی دیکھو، قالین کے نیچے تختہ ہے۔"

"ہوں... ہے تو سہی..." میں نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر تختے کے اُبھرے ہوئے کنارے تلاش کیے۔

"یہاں ایک تجوری رکھی ہوئی تھی۔" غالب نے کہا۔ "لیکن لکڑی کا تختہ کہاں سے آگیا۔ تجوری تو گن میٹل کی بنی ہوئی تھی۔ اس پر بم بھی اثر نہ کرتا۔ اس کی سطح فرش کے برابر تھی۔ یکے بعد دیگرے تین چابیاں لگا کے اُسے کھولا جاسکتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے ایک بار ڈیڈی نے اُسے میری موجودگی میں کھولا تھا۔ انھوں نے قالین ہٹایا تو مجھے اس کونے میں ٹائل والے موزیک ڈیزائن کی جگہ ایک سیاہ مربع دیکھ کر حیرانی ہوئی تھی کیونکہ اس سے پہلے اگر کبھی وہاں سے قالین ہٹایا گیا تھا تو مجھے کچھ نظر نہیں آیا تھا... پورا فرش ایک جیسا ہی تھا۔ میری حیرانی دیکھ کر ڈیڈی نے دو فٹ لمبا اور چوڑا کینوس کا ٹکڑا اس سیاہ سطح پر پھیلا دیا اور سارا فرش پھر ایک جیسا ہوگیا۔ اس کینوس کے ٹکڑے پر وہی ڈیزائن اسی رنگ میں پینٹ کیا گیا تھا اور اس کے نیچے کوئی چپکنے والی چیز تھی۔ قالین ہٹانے پر بھی ایک نظر میں کوئی بھی محسوس نہیں کر سکتا تھا کہ ایک کونے میں ٹائل نہیں ہیں۔ دوبارہ کینوس ہٹانے کے بعد انھوں نے ہاتھ سے ایک چابی لی اور مجھے دکھائی تو اس پر مجھے سات کا ہندسہ نظر آیا۔ انھوں نے چابی کو درمیان میں رکھ کے ذرا سا دبایا تو ایک جگہ چابی فٹ ہوگئی۔ بالکل اسی طرح جیسے کار کے ڈور لاک کی چابی اپنی جگہ بناتی ہے۔ اس چابی نے سوراخ تلاش کرلیا تھا اور اندر گھس گئی تھی۔ اسے ایک بار گھمانے کے بعد ڈیڈی نے دوسری چابی لی۔ اس پر آٹھ نمبر لکھا ہوا تھا۔ دوسری چابی کو انھوں نے بالکل دائیں جانب رکھا اور اسی طرح دبایا تو وہ بھی لگ گئی۔ اسے گھمانے سے پہلے والی چابی نکل آئی۔ ڈیڈی نے مجھے بتایا کہ جب تک دوسری چابی نہیں لگائی جائے گی پہلی چابی اندر پھنسی رہے گی۔ یہی دوسری چابی کے ساتھ ہوا۔ اسے نکالنے کے لیے تیسری چابی بائیں جانب لگانا پڑتی تھی اور تیسری چابی پر چھ کا ہندسہ لکھا ہوا تھا۔"

"سات سو چھیاسی۔" میں نے کہا۔ "گویا بسم اللہ۔"

"ہاں... بسم اللہ کے اعداد پورے ہوتے ہی ہموار سطح پر ایک ہینڈل سا اُبھر آیا۔ اسے ڈیڈی نے ایک بار سیدھے ہاتھ کی طرف گھمایا اور پھر اُلٹے ہاتھ کی طرف۔ اس سے تیسری چابی نکل آئی اور تجوری کا دروازہ اندر کی طرف کھل گیا... وہ بہت بھاری دروازہ تھا۔ بعد میں ڈیڈی نے مجھ سے کہا کہ اسے اوپر کھینچ کر بند کردوں تو میں اسے ہلا بھی نہ سکا لیکن اتنا وزنی دروازہ کھلتے ہوئے نیچے گرا نہیں تھا بلکہ آہستہ آہستہ نیچے گیا تھا۔ اندر نہ جانے اسپرنگ اور لیور کا کیا مشینی نظام تھا جو اسے سنبھالے رکھتا تھا۔"

"ایسی نادرِ روزگار تجوری تمھارے ڈیڈی نے کہاں سے بنوائی تھی؟"

"وہ لندن کی کسی سیکورٹی فرم کے مالک کو جانتے تھے۔ اسے برٹش گورنمنٹ نے ریزرو بینک آف انڈیا کے اسٹرانگ روم کے قفل کا انتظام بدلنے کے لیے دہلی بلایا تھا۔ معلوم نہیں کون اُسے دہلی کی جامع مسجد لے گیا اور وہاں اس نے سیڑھیوں پر بیٹھ کے بارہ مسالے والی گھسیٹے خاں کی حلیم کھالی۔ اس بارود کی حلیم نے نازک مزاج انگریز کے پیٹ کا وہی حشر کیا جو نادر شاہ نے دلّی کا کیا تھا۔ اس کا علاج میرے ڈیڈی نے کیا جو اس زمانے میں وہاں تھے۔ بعد میں وہ لندن گئے تو اسی کے مہمان ہوئے۔ وہ انھیں ہر ایک سے ملواتا تھا تو یہ واقعہ ضرور سناتا تھا کہ دہلی میں اس نے گن پاؤڈر والا حلوا کھالیا تھا تو اس ڈاکٹر نے مجھے پھٹنے نہیں دیا تھا۔ وہ گلہ بھی کرتا تھا کہ انڈین پولیس سخت حرامخور ہے۔ انھوں نے وہ آتش گیر حلوا بیچنے والے کو پکڑا تو تھا مگر پھر چھوڑ دیا کہ حلوے میں ذرا نمک کم تھا اور کوئی خطرناک بات نہیں تھی۔"

مجھے اور غالب کو اس بیان پر بڑی ہنسی آئی۔ مرچ بالکل نہ کھانے والے انگریز کے لیے تو وہ تیز سرخ مرچوں والا دھواں دھار حلیم واقعی بارود سے کم آگ لگانے والا نہ تھا۔ پولیس نے انگریز حاکم کا حال پتلا دیکھ کر مجبوراً حلیم فروش کو پکڑا ہوگا اور اس کی حلیم کی دیگ نوش فرمانے کے بعد چھوڑ دیا ہوگا۔ ظاہر ہے اسی سے ان کو نمک کی کمی کا پتا چلا تھا۔

"یہ تجوری کسی جوہری نے بنوائی تھی؟" غالب بولا۔ "اس جوہری کو ڈاکو اٹھا کے لے گئے اور اس کی بیوی سے سہاگ کی اتنی قیمت طلب کی کہ آدھی دکان خالی ہوگئی۔ میاں چھوٹ کر آیا تو اطلاع ملی کہ بیٹے کو قبائلی اٹھا کر لے گئے ہیں۔ وہ باغیوں کی سرکوبی کی مہم پر گیا تھا اور اسے رزمک کی چھاؤنی میں سیکنڈ لیفٹیننٹ کی حیثیت سے رپورٹ کیے دو ہفتے بھی نہیں ہوئے تھے۔ باقی آدھی دکان اس عورت نے اپنی ممتا پر قربان کی۔ ظاہر ہے اس کے بعد وہ خود ہی بچی تھی اور جوہری اسے تجوری میں رکھ کے کیا کرتا۔ وہ تجوری

ہی لے جا سکا اور بنانے والے نے اسے میرے والد کو گفٹ کر دیا۔ ڈیڈی بہت پریشان ہوئے کہ اس تحفے کا کیا کریں! انکار کریں تو بدتہذیب کہلائیں اور قبول کریں تو اسے سوٹ کیس میں ڈال کر کیسے لے جائیں۔ وہ ایک سوٹ کیس میں سامانِ سفر ڈال کے پھرنے کے عادی تھے۔ میزبان ان کی پریشانی کو بھانپ گیا اور انھیں تسلی دی کہ یہ تحفہ ان کے دروازے تک پہنچانا اور اسے نصب کرانا بھی اسی کی اخلاقی وضعداری ہے۔ بعد میں یہ تجوری واقعی کام آئی۔"

"کیا ڈیڈی تم کو رکھتے تھے اس میں؟" میں نے کہا۔

"نہیں! وہ کچھ بہت قیمتی ہیرے جواہرات اور خاندانی قسم کے زیورات میری والدہ کو مل گئے۔" غالب بولا۔

"کہاں سے مل گئے... سڑک پر پڑے ہوئے..." ٹیڈی بولا۔

"وہ تم ملے تھے اپنے باپ کو..." غالب نے کہا۔ "واضح ہو کہ میری نانی کسی والیٔ ریاست کی چھٹی یا ساتویں بیگم تھیں... اور روایات شاہد ہیں کہ حسن و جمال میں ثانی نہیں رکھتی تھیں لیکن یہ کوئی قابلِ ذکر بات نہیں۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ حضور نواب کی نگاہِ انتخاب کی کسوٹی پر کیسے پوری اترتیں۔ وہ تو عقد ہی اسی سے فرماتے تھے جو چندے آفتاب و چندے ماہتاب ہو۔ نانی مرحومہ میں جو خوبی سب سے بڑھ کر تھی وہ ان کی سیاسی ذہانت تھی۔ انھوں نے محل میں قدم رنجہ فرماتے ہی دو کام کیے۔ ایک تو نواب صاحب کی عقل کو گھاس چرنے کے لیے بھیج دیا اور بقول کسے 'نواب صاحب پر اُلو کی لکڑی پھیر دی۔ وہ حکم کے غلام ہو گئے کہ نانی نے کہا کہ کان پکڑ لو تو وہ مرغا ہی نہیں بنے اذانیں بھی دینے لگے۔ انھوں نے کہا ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر میرے لیے شعر کہو تو انھوں نے پوری مثنوی زہرِ عشق پڑھ ڈالی۔ اس مرحلے پر نانی جی نے دوسرا کارنامہ سرانجام دیا اور اپنی ہر سوکن کی چھٹی کر دی۔ نواب صاحب نے سب کا اجلاسِ عام طلب کیا۔ جیسا کہ حقے داروں کا ہوتا ہے۔ وہ بھی نواب صاحب کی شیدا ہوا کرتی تھیں اور اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے نواب صاحب نے کہا کہ میں آپ ساتوں کو مجموعی طور پر اکیس بار طلاق دیتا ہوں۔ بحساب تین طلاق فی کس۔ نانا جان کی رحلت کے بعد ایک دن خود نانی کو بھی فوت ہونا پڑا۔ موت سے کس کو رستگاری ہے۔ بعد مرنے کے جو گھر سے سامان نکلا اس میں سیر سوا سیر موتی۔ کوئی ڈیڑھ پاؤ ہیرے۔ ڈھائی چھٹانک زمرد، الماس اور نیلم اور ساڑھے سات سیر سونے اور چاندی کے ظروف کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ ہائے یہ مفلسی کی موت! یہ سب کاٹھ کباڑ میری والدہ کو زبردستی تھمایا گیا کہ تم ہی ان کی واحد وارث ہو۔ چاندی کے برتن ان کے چہلم سے قبل ہی چوری ہو گئے تھے۔ سونا انھوں نے بیچ کر رقم بنک میں ڈال دی اور پھر اسی سے

یہ کوٹھی تعمیر ہوئی۔ ہیرے جواہرات تھے جو اس تجوری میں رہتے تھے۔ میرے والد بڑے قلندر تھے۔ دنیاوی مال و زر، شہرت اور عزت کی نہ انھیں کمی تھی اور نہ پروا۔ پھر بھی نہ جانے کیوں وہ ان ہیرے جواہرات کو محفوظ کیے بیٹھے تھے اور کبھی کبھی ان کو دیکھ کر خوش ہو لیتے تھے۔ اس کے سوا ان پتھروں کا مصرف بھی کیا تھا۔"

"ممکن ہے تمھاری والدہ کو اپنی والدہ کی نشانیاں عزیز ہوں۔"

"مشکل ہے۔ ایسا ہوتا تو وہ سونا بھی پڑا رہتا۔" غالب بولا۔ "وہ سب زیور نہیں تھا۔ سونے کا ایک پیالہ تھا جس سے وہ پانی پیتی تھیں... نانی جان۔ ایک وضو کا لوٹا تھا۔ ثواب تو کوثر کے وضو کا ہی ملتا ہوگا مگر خوشی زیادہ ملتی ہوگی۔ اللہ انھیں اس غرور اور اسراف پر معاف کرے۔ سونے کی ایک رحل تھی جس پر قرآن رکھ کر وہ تلاوت کرتی تھیں۔ قرآن بھی ایک نادر نسخہ تھا جس کے حروف طلائی تھے۔ قرآن گھر میں رہ گیا تھا۔ باقی سب اماں نے بیچ دیا تھا۔ انھیں چاندی کے برتنوں کے چوری ہونے کا بھی صدمہ نہیں تھا۔ قصہ مختصر وہ ہیرے جواہرات، زمرد، الماس اور نیلم اسی تجوری میں بند تھے اور میری آخری اطلاعات کے مطابق بیچے نہیں گئے تھے۔ میرے والدین پر ایسا وقت آنے کا کوئی امکان نہ تھا جب وہ ضرورت کے لیے ان کو فروخت کرتے۔ بعد میں جیسا کہ تم جانتے ہو، وہ ہوائی حادثے میں مارے گئے اور میں ناخلف لوٹ کر گھر نہیں آیا۔"

"کمال ہے! ان کی مالیت تو کئی لاکھ بنتی ہو گی۔" میں نے کہا۔

"لاکھ نہیں۔ کروڑ کا لفظ استعمال کرو۔" غالب بولا۔

"اور اس کے باوجود تم نے ان کی خبر نہیں لی؟" ٹیڈی بولا۔

"میرے لیے سب پتھر تھے۔ میں خود پتھر ہو چکا تھا۔ یہ دیواریں پتھر کی تھیں اور اس میں سارے جذبے پتھر تھے۔ میرا احساس پتھر تھا۔ دنیا کے لوگوں کی نظریں پتھر ہو گئی تھیں۔ ان چمکیلے لال، نیلے، سبز پتھروں میں میرے لیے کوئی کشش نہیں تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے کبھی خیال آیا بھی تو اس گھر کی ویرانی کا... آج تم نے پوچھا تو سب یاد آیا... ورنہ شاید اب بھی میں بھولا ہی رہتا۔" غالب نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ اب یہاں کچھ بھی نہیں ہوگا۔"

"قالین ہٹا کے دیکھتے ہیں۔" ٹیڈی نے کہا۔

قالین بڑی دشواری سے ہٹایا گیا۔ اس کا کونا اسی صوفے کے نیچے دبا ہوا تھا جس پر رابعہ سو رہی تھی۔ میں نے اسے ایک طرف سے اٹھانے کی کوشش کی۔ رابعہ کا اپنا وزن ہوتا تو میں محسوس بھی نہ کرتا مگر وکٹورین طرز کا صوفہ نہ جانے کس لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ غالب نے اور میں نے اسے مل کر زمین سے تین انچ اوپر اٹھایا تو ٹیڈی نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر قالین کھینچ لیا۔ ہم نے صوفہ آہستہ سے پھر نیچے رکھ دیا۔ رابعہ کو خبر تک نہ ہوئی۔ قالین کے ہٹتے ہی تین فٹ لمبا اور تین فٹ چوڑا لکڑی کا تختہ سامنے

آگیا۔ اسے فرش کے خلا پر ایسے ہی رکھ دیا گیا تھا۔ خلا تجوری کے نکال لینے سے پیدا ہوا تھا۔

"بڑی فراغت سے کام کیا چوروں نے۔" غالب تلخی سے ہنسا۔ "جس تحفے کو وصول کرنے کے بعد والدِ ماجد پریشان ہو گئے تھے کہ اسے اٹھا کر کیسے لے جاؤں۔ حالانکہ وہ جائز اور قانونی طور پر اسے لا سکتے تھے اور اتنی استطاعت بھی رکھتے تھے کہ ہوائی جہاز سے لانا چاہیں تو لے آئیں خواہ کرایہ اتنا بن جائے کہ پھر اصل مالک یعنی جوہری والا کیس ہو جائے، اسے چور اطمینان سے نکال لے گئے۔"

"اور وہ کیا کرتے! بسم اللہ کی چابی ان کے پاس تھی نہیں۔ نہ ہتھوڑی نہ ہتھوڑا۔ نہ تیشۂ فرہاد اور نہ کھل جا سم سم کا جادو... تجوری کو کھولنا یا توڑنا ناممکن تھا۔ بم بھی اگر ایٹم بم ہوتا تو کام کرتا مگر پھر ہیرے جواہرات اور وہ خود بھی مشتِ غبار رہ جاتے۔ انھوں نے آسان کام کیا کہ تجوری کو فرش سے نکال لیا۔ پھر کہیں ویلڈنگ ٹارچ سے اسے کاٹ دیا ہوگا۔ ممکن ہے تجوری بھی بیچ دی ہو۔ دس ہزار میں بھی سستی تھی۔" غالب بولا۔

"پھر اب یہ دیکھو کہ تختہ رکھنے میں کیا مصلحت تھی۔" میں نے کہا۔

خالی جگہ دو فٹ سے کچھ زیادہ لمبی اور چوڑی تھی۔ گہرائی تین فٹ کے قریب تھی۔ تجوری کے چاروں طرف سے اور نیچے سے سارا سیمنٹ توڑے بغیر تجوری نہیں نکالی جا سکتی تھی لیکن جو گڑھا ہمیں نظر آرہا تھا اس کے کنارے ہموار تھے اور فرش سیدھا تھا۔

"اسے بعد میں دوبارہ بنایا گیا ہے۔" غالب نے جھک کر اس کا معائنہ کرنے کے بعد کہا۔

"اندر کچھ ہے۔" ٹیڈی نے کنارے سے سر لگا کے گڑھے کے نسبتاً تاریک حصے میں دیکھا اور اندر اترنے لگا۔

"دیکھنا استاد! چکر نہ ہو اس میں کوئی۔" میں نے کہا۔

"کیسا چکر؟" ٹیڈی نے اپنا پاؤں باہر کھینچ لیا۔

"کوئی شیطانی چکر۔ تم اترو اور غائب ہو جاؤ... نیچے دو سو فٹ گہرا کنواں ہو۔" میں نے کہا۔ "یا ڈاکوؤں کا خزانہ ہو اور اس پر سیاہ ناگ پھن پھیلائے بیٹھا ہو۔"

ٹیڈی سمجھ گیا کہ میں اسے ڈرانے کے لیے ایسا کہہ رہا ہوں۔ پھر بھی وہ محتاط رہا۔ "یہ تو کوئی صندوق ہے۔" وہ ٹین کی آواز سن کر بولا۔ مزید تصدیق کے لیے اس نے سیاہ ٹین کی چادر پر پاؤں مارے۔

"استاد! کیا غضب کرتے ہو۔" میں نے کہا۔ "اپنے مال کی حفاظت کے خیال سے کوئی غافل نہیں ہوتا۔ کوئی بم نہ ہو اس میں جو لاتیں مارنے سے پھٹ جائے اور تمھارے ساتھ ہماری عاقبت بھی خراب ہو۔"

"بار سکندر بادشاہ، کیسی دل توڑنے والی باتیں کرتے ہو! ہمارے ساتھ تمھاری عاقبت خراب ہو رہی ہے؟" ٹیڈی بُرا مان کے بولا۔

"جو تم کر رہے ہو یہ خودکشی ہے... یا ہو سکتی ہے۔" میں نے فوراً وضاحت کی۔ "اس کو حرام موت ہی سمجھا جاتا ہے۔ اس سے کیا عاقبت سنور جائے گی۔ خیر تم اللہ کا نام لے کر نکالو اس پنڈورا کے باکس کو۔"

"کس کا صندوق ہے یہ؟" ٹیڈی نے سر اٹھا کے مجھے دیکھا۔ "تم کو کسی کا نام لکھا ہوا نظر آرہا ہے اس پر؟"

"یہ غالب کی نانی کا نام تھا۔" میں نے کہا۔ "وہ خود پنڈورا کا باکس تھیں جسے نواب صاحب غلطی سے کھول بیٹھے تھے... اب سمجھے؟"

ٹیڈی کم تعلیم یافتہ ہونے کے باعث ہماری اس قسم کی گفتگو سمجھ نہیں پاتا تھا اور جھینپ کر چپ ہو جانے میں ہی بہتری سمجھتا تھا۔ اس نے تھوڑی سی کوشش کی اور ٹین کا وہ صندوق نکال لیا جو زیادہ پرانا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس پر چمکدار کالا اینمل تھا جو گرد پڑنے سے کچھ دھندلا گیا تھا اور اسی لیے فوراً نظر نہیں آیا تھا۔ اس میں معمولی سا قفل تھا جسے ٹیڈی نے ہاتھوں کے زور سے توڑنے کی ناکام کوشش کی۔

"اسے دوسرے کمرے میں لے چلو۔" غالب نے کہا۔ "ہاں، یہاں شور ہوگا تو ان کے خوابِ ناز میں خلل پڑے گا۔" غالب ہنسا۔ "اللہ یہ عورت ذات بھی... ایک معمّا ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا... اب کیسی غافل سو رہی ہیں۔"

"بس یہ احساس ہے کہ ہمارے استاد ٹیڈی عرف ٹارزن آف لاہور ان کے درمیان ان کی حفاظت کے لیے موجود ہیں۔" میں نے کہا۔

"چنانچہ اب چوہا تو خیر آہی نہیں سکتا۔ چور ڈاکو اور بھوت بھی دُور رہیں گے۔" غالب بولا۔

"کچھ سوچ کے ہی بھروسا کیا ہوگا انھوں نے مجھ پر!" ٹیڈی بولا۔

"معاملہ جذبات کا ہو تو خواتین سوچنے سے قاصر رہتی ہیں استاد اور ثبوت دیکھنا ہو تو ابھی انھیں جگا کے بتا دو کہ میں جا رہا ہوں... مجال ہے جو یہ پھر سو سکیں۔ ویسے تو تم جا ہی رہے ہو۔" غالب نے کہا۔

ایک پیچ کس کی مدد سے تالا کھٹ سے ٹوٹ کر کھل گیا۔ میں نے ڈھکنا اٹھایا اور بھونچکا رہ گیا۔ اس میں صرف فائلیں تھیں اور کاغذات تھے۔ نہ جانے کیوں میں یہ توقع رکھتا تھا کہ باکس میں سے ہیرے جواہرات نہ سہی، مالِ غنیمت ضرور برآمد ہوگا۔ کچھ ایسی ہی مایوسی کی کیفیت غالب اور ٹیڈی کی صورت سے عیاں تھی۔

"وہ بدمعاش جو یہاں غاصبانہ طور پر قابض تھے۔" غالب بولا۔ "وہ چور ڈاکو تھے۔ انھوں نے کہا بھی تھا کہ ان کا مال یہاں دفن ہے۔"

"یہ تو وہ مال نہیں ہوسکتا۔" میں نے سر ہلایا۔ "جس کی وہ بات کر رہے تھے... مگر یہ کاغذات کیسے ہیں؟"

غالب نے ایک فائل اُٹھا کے گرد جھاڑی اور اس کے چند صفحے پلٹے۔ پھر اس کی دلچسپی بڑھ گئی۔ اس نے باقی صفحات پر سرسری نگاہ ڈالی۔ "یہ تو کوٹھی کی ملکیت وغیرہ کے کاغذات ہیں۔ سیل ڈیڈ... لیز، میوٹیشن۔"

میں نے دوسری فائل اٹھائی۔ "اس میں پراپرٹی ٹیکس کے بل ہیں۔ کارپوریشن کے واجبات کی ادائیگی کی رسیدیں ہیں۔ اور یہ کئی سال کے بل ہیں جو ادا نہیں ہوئے۔ کسی نے سب چُن کر اکٹھے کر دیے ہیں۔"

غالب نے تیسری فائل اُٹھالی۔ "یہ ڈیڈی کے انکم ٹیکس کا حساب ہے۔" ٹیڈی نے ایک بڑا سا لفافہ اُٹھایا اور اُلٹ دیا۔ اس میں چیک بکس تھیں۔ سب جزوی طور پر استعمال شدہ... مختلف بنکوں کی مختلف برانچوں کے یہ اکاؤنٹ غالب کے والد یا والدہ کے نام پر تھے۔ پھر دو چیک بکس غالب کے نام کی برآمد ہوئیں۔

"معلوم نہیں کس اکاؤنٹ میں کتنا پیسہ ہے؟" وہ بولا۔

"جتنا بھی ہو... مگر ان کاغذات سے تمھیں اپنا قانونی حقِ وراثت حاصل کرنے میں مدد ملے گی۔" میں نے کہا۔

"قانونی حقِ وراثت!" غالب نے تلخی سے کہا۔ "تمھیں مل گیا؟"

"میری بات چھوڑو... تمھارے حق پر ڈاکا ڈالنے والا کوئی میر شرافت علی یا چوہدری دلاور نہیں تھا۔" میں نے کہا۔ "تمھیں سب ملے گا۔"

"کون جیتا ہے تری زُلف کے سر ہونے تک۔" وہ بولا۔

"کیا تصور میں تم نازو سے مخاطب ہو؟" میں نے کہا۔

ٹیڈی نے اُچھل کر کہا۔ "یار سکندر بادشاہ۔" اور میں نے بھی باکس میں دیکھا۔ کاغذات ختم ہوگئے تھے اور نیچے سے اچانک وہ دولت نکل آئی تھی جس کی امید اور جس کا خیال بھی دل سے محو ہو چکا تھا۔ مایوسی خلافِ توقع ہوئی تھی لیکن اس کے بعد یکلخت خیال کے حقیقت میں ڈھل جانے سے جتنی حیرانی ہوئی تھی وہ ناقابلِ بیان تھی۔ صندوق کے نچلے حصے میں نوٹوں کی گڈیاں تہ در تہ جمی ہوئی تھیں اور یہ سب ملے جلے پرانے نوٹ تھے۔

"کیا یہ ایک لاکھ کی رقم ہے؟" غالب نے نوٹوں کو ایک نظر دیکھ کر کہا۔

"ایسے اندازہ نہیں ہوسکتا، گن لیتے ہیں۔" استاد ٹیڈی نے کہا۔ "یہ کون سا قارون کا خزانہ ہے۔"

"تم نے کبھی غور کیا۔" میں نے کہا۔ "ہم سب پیسے کی ضرورت اور اس کی اہمیت کے زیادہ سے زیادہ قائل ہوتے جا رہے ہیں حالانکہ ہم سب پیسے کو اپنا مقصدِ حیات نہیں سمجھتے تھے۔ ہم میں سے کسی نے پیسے کے بارے میں سوچا تک نہیں تھا کہ یہ آئے گا اور کہاں سے آئے گا۔ نہ ہم اس کو طاقت کا ذریعہ سمجھتے تھے نہ شرافت کا معیار... میرا باپ ایک صنعت کار تھا اور میں جب لندن میں تھا تو میری سب ضروریات پوری ہوتی تھیں۔ مجھے کبھی خیال تک نہ آتا تھا کہ واپسی پر کیا ہوگا۔ یہ سب تو گویا پہلے سے طے شدہ تھا کہ میں اسی کاروبار کو سنبھالوں گا اور ترقی دوں گا۔ میں نے کبھی حساب نہیں لگایا تھا کہ میرے اثاثے کتنے ہوں گے اور میں کتنا کماؤں گا۔ کما کے کہاں لگاؤں گا۔ کہاں خرچ کروں گا۔ ایک عجیب سی بے نیازی اور شانِ استغنا تھی۔ کہ پیسہ ہمارا مزید آتا رہے گا۔ سب ضروریات اب تک پوری ہوئی ہیں تو آئندہ بھی ہوں گی۔ ضروریات کا بھی کوئی محدود تصور نہ تھا۔ نہ ایک سے دو اور دو سے چار کارخانے بنانے کا کوئی منصوبہ تھا اور نہ یہ احساس کہ کل اگر یہ کارخانہ بھی نہ رہا تو کیا ہوگا۔ بُرائی فطرت میں ہی نہ تھی۔ چنانچہ عیش و عشرت کے بارے میں تو سوچتے نہیں تھے۔ ایسے بھی نہ تھے کہ دنیا میں نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا۔ پُل بنا، چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا کے مقولے پر عمل کرتے۔ یہ میرے لیے اپنا کوئی وجود ہی نہ رکھتا تھا۔ بس میں تھا... میری ذات اور اس کی مصروفیات۔ محسن کے لیے بھی مستقبل محفوظ تھا وہ بڑے باپ کا بیٹا تھا۔"

"خود میں نے عملاً پیسے کو ہاتھ کا مَیل سمجھا۔" غالب بولا۔ "تم دیکھ لو کہ وہ ہیرے جواہرات نہ جانے کتنے لاکھ کے تھے جو میرے تھے مگر اب مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ کون سے گیا یا نہیں۔ جواہرات کے خزانوں کی خاطر قتل و خونریزی ہوتی ہے۔ اسمگلنگ کا جال پھیلایا جاتا ہے۔ اس پر فلمیں بنتی ہیں اور ہزاروں کہانیاں لکھی جاتی ہیں۔ وہ ہیرے جواہرات کسی غریب آدمی کو سڑک پر پڑے مل جاتے تو شاید اس کا ہارٹ فیل ہو جاتا۔ یا اسے پولیس مار ڈالتی کہ کس کا خزانہ لُوٹا تھا مگر وہ نہ بتا پاتا۔ مجھے آج بھی معلوم نہیں کہ میرے باپ کے اور میرے اکاؤنٹ میں کتنا پیسہ ہوگا۔ میں نہیں جانتا کہ اس جگہ کی قیمت کتنے لاکھ ہے جس پر ہم فقیروں کی طرح ڈیرا ڈالے پڑے ہیں۔ میرا مشن صحافت تھا۔ پیسہ کمانا میرا مشن نہ تھا مگر اب دیکھو کہ صرف ایک لاکھ..."

"ایک لاکھ چوالیس ہزار۔" استاد ٹیڈی نے تصحیح کی جو نوٹ گن کر فارغ ہوگئے تھے۔ "ایک لاکھ چوالیس ہزار کی میرے نزدیک بھی کوئی اہمیت نہ ہوتی اگر میں اپنے باپ کے کاروبار کو سنبھالتا میں بھی سنار ہوتا مگر بہت بڑا۔ میں اس کے کاروبار کو بہت ترقی دیتا اور مٹی میں ہاتھ ڈالتا تو سونا بنا لیتا۔ مگر دیکھو کہ پندرہ سیر سونا میں کس دن کے لیے اٹھائے پھرتا رہا تھا... میرا کیا تھا؟"

"خود رابعہ کتنی مطمئن اور خوشحال تھی۔ اس کا مشن بھی پیسہ نہیں تھا۔ وہ ترقی کرتی۔ مزید شہرت پاتی۔ اس کی فرم کی آمدنی لاکھوں میں تھی اور اس کی کوٹھی بہت بڑی تھی۔ ممکن تھا کہ کسی دن وہ ہائی کورٹ کی جج بن جاتی مگر آج اس کے پاس بھی کچھ نہیں۔" میں نے کہا۔

"اور حالات کی ستم ظریفی دیکھو کہ ہمارے مقابل وہ ہیں جن کا دھرم ایمان سب پیسہ ہے۔" غالب بولا۔ "جو صرف پیسے کو مقصدِ حیات جانتے ہیں خواہ وہ جائز ذرائع سے آتا ہو یا ناجائز طریقے سے... جو پیسے کی خاطر خود کو، اپنی عزتِ نفس کو، اپنے ضمیر کو اور اپنے وطن کو سب کو بیچ دیتے ہیں۔ کیا تضاد ہے یہ بھی۔ ایک طرف ہم جیسے ہیں جو بہت دولت مند گھروں میں پیدا ہوئے۔ سونے کا چمچہ مُنہ میں لے کر۔ اور ہم طبعاً بھی قلندر تھے کہ پیسے کی اہمیت کو تسلیم نہیں کرتے تھے ورنہ وہ بھی ہیں جو لاکھ سے کروڑ بنالیں تو کروڑ سے ارب اور ارب سے کھرب بنانے کی فکر کرتے کرتے مرجاتے ہیں۔"

"ہمارا واسطہ پڑ رہا ہے ان چوروں سے۔ ڈاکوؤں سے۔" میں نے کہا۔ "یہ لوگ غریب اور احساسِ محرومی کے مارے ہوئے تھے۔ ان کے لیے سب کچھ پیسہ تھا جس کی خاطر انھوں نے مذہب اخلاق اور قانون کے دائروں سے نکل کر سب کے حقوق غصب کیے... مجرم کہلائے اور معاشرے کا ناسور قرار پائے لیکن ان کو پیسہ ملا تو عزت نہ ملی۔ پیسے کو خرچ کرنے کی آزادی نہ ملی۔ جن کے یہ ایک لاکھ چوالیس ہزار ہیں ان کی حیثیت ہمارے مقابلے میں کیا ہے؟ مگر ہم بھی ان سے مختلف نہیں ... چوری کا مال چُراتے ہیں۔ ڈاکوؤں کے مال پر ڈاکا ڈالتے ہیں۔ چھوٹے چور سے بڑے چور تک سب کی دشمنی کے سوا کچھ نہیں پاتے۔ جو کام ہم کر رہے ہیں وہ کتنا بڑا ہے مگر کیا ہمیں کوئی قومی ہیرو مانتا ہے۔ ہمیں کوئی بہادری یا حُبّ الوطنی کا میڈل ملے گا؟"

"اتنا اداس اور قنوطی ہونے کی کیا ضرورت ہے۔" غالب نے میرے کندھے پر ہاتھ مار کے کہا۔ "کامیابی کی جو لگن... شوق کی جو انتہا... عزم و ہمت کا کبھی ختم نہ ہونے والا جذبہ اور رفاقت کا جو اعتماد ہمیں حاصل ہے وہ کس کو ملتا ہے۔"

"نیکی کرنے کی توفیق بھی خدا جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔" ٹیڈی نے کہا۔ "ہر ایک کے نصیب میں یہ خوشی نہیں ہوتی۔"

"بڑا نام کمانے کے لیے تو سب ہی جدّوجہد کرتے ہیں... بڑا کام کر دکھانے اور نیک مقصد میں کامیابی کی خوشی کو ہی اپنا انعام سمجھ کر خدا کا شکر ادا کرنے والے بہت کم ملتے ہیں۔"

"یہ بھی تو ہوسکتا تھا کہ ہم سب مل کر ڈاکوؤں کا ایک گروہ بنالیتے یا اسمگلروں کا۔" غالب نے کہا۔

"اور کچھ بھی نہ کرتے تو دلاور کے ساتھی بن جاتے۔ اس کی دشمنی میں تو سب نے نقصان اُٹھایا۔ فائدہ دیکھتے تو اس کی ہر پیشکش سے دولت حاصل کر سکتے تھے۔" ٹیڈی بولا۔ "یہ کتنی بڑی بات ہے کہ ابھی تک وہ ہم میں سے کسی کو بھی اپنے ارادے سے ایک انچ نہیں ہلا سکے۔"

"یہ تو ہے۔" میں نے تسلیم کیا۔ "ابھی تک کسی کی استقامت میں سرِمُو فرق نہیں آیا ہے۔ اتنی سختی جھیلنے اور اتنے مصائب برداشت کرنے کے باوجود سب کا حوصلہ پہلے سے زیادہ ہے۔" میں نے کہا "کتنے لوگ ہیں جو آرام و آسائش... بلکہ عیش و عشرت کی زندگی کو چھوڑ کے اس راہِ پُرخطر کے عذاب و اذیت کو قبول کر سکے۔ ہماری جگہ دلاور اینڈ کمپنی کا کوئی بھی آدمی ہوتا تو اس کا ایمان سلامت نہ رہتا۔ وہ سب قابلِ فروخت ہیں۔ میں شرط لگا کے کہہ سکتا ہوں کہ یہ بیس لاکھ ہوتے تو ہم پیڈرو کو خرید سکتے تھے۔ وہ دلاور سے وفاداری پر لعنت بھیج کر خود اپنے ہاتھوں سے اس کو قتل کر دیتا۔ بیس لاکھ میں خسرو جمشید بھی الگ ہو جاتا... رہ جاتا سراج... وہ بیس لاکھ میں سب کو بند کرا دیتا یا ختم کرا دیتا اور اپنی ایس پی کی نوکری سے بھی فائدہ اٹھاتا رہتا... ان سب کو احساس ہے کہ وہ ایک جرم میں شریک ہیں... کسی نیک کام میں نہیں۔ یہ بات وہ سب سمجھتے ہوں گے کہ کوئی کسی وقت بھی خود کو بچانے کے لیے دوسروں کی گردن پھنسا سکتا ہے۔ وہاں سب اپنی ذات کا تحفّظ اور اپنا فائدہ پہلے دیکھتے ہیں۔"

"اگر ہماری سوچ بھی ایسی ہی ہوتی تو سب سے پہلے تم الگ ہو جاتے کیونکہ سب سے زیادہ فائدہ تمھارا ہی تھا۔" غالب بولا۔ "پچاس لاکھ کی آفر اب کتنی بڑھ چکی ہے وہ تمھارا کاروبار تک تمھارے حوالے کرنے کو تیار ہے۔ تمھارے اور مرحوم وزیر خان کے سارے نقصانات کی تلافی کرنے کی بات کرتا ہے۔ تم اُن کی مانتے تو رابعہ کے ساتھ لندن میں سکونت اختیار کر لیتے اور انہی کے کاروبار کو چلاتے رہتے۔ محسن کو کیا پڑی تھی۔ ماں باپ اور بھائی بہن کا ساتھ چھوڑ کے تمھارے ساتھ خوار ہونے کی۔"

میں نے کہا۔ "یہی تو فرق ہے جو بالآخر ان کی شکست کا سبب بنے گا۔ ہم سب خود کو نہیں ایک دوسرے کو بچا رہے ہیں۔ ان سب کو بچا رہے ہیں جو اس سرزمین پر جان اور مال اور عزت آبرو کے تحفّظ کے ساتھ رہتے ہیں اور نہیں جانتے کہ ان کے درمیان ہی وہ غدّار ہیں جو پیسے کے لیے ان کے یقین کو فروخت کر رہے ہیں۔ ہمیں اپنی جان کی پروا نہیں۔ اُن کو صرف اپنی جان پیاری ہے۔ ایم آر ایس کے اتحاد کا مقصد ان کے اتحاد کے مقصد سے اتنا ہی دُور ہے جتنا آسمان اس زمین سے ـــــ اگر ہم اپنی دنیا میں والدین کے بنائے ہوئے

پر کامیابی اور خوشحالی کا سفر جاری رکھتے تو پھر ایک دوسرے سے کیسے ملتے اور ایم آر ایس کا وجود کہاں ہوتا۔"

"آج ہم فخر سے کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے شیخ چلی کی طرح صرف خیالی پرواز نہیں کی... ہوا میں تیر نہیں چلائے۔" غالب نے کہا: "صرف سوچا ہی نہیں، عمل بھی کیا ہے۔ ہمارے کریڈٹ پر بہت سی فتوحات ہیں۔ ہم نے دشمنوں کو جتنا نقصان پہنچایا ہے اس سے زیادہ نقصان ان کے عزائم کو پہنچایا ہے۔ ان کے مقاصد کو ناکام بنانے کے لیے پیش قدمی کی ہے اور ان کے حوصلوں کو پست کیا ہے۔"

میں نے کہا: "اب تو انھیں اچھی طرح معلوم ہو گیا ہے کہ ان کے مقابل بھی ایک قوت ہے جو اُن کی راہ میں دیوار بن گئی ہے اور یہ دیوار گرائی نہیں جا سکتی۔ ہر نیا دن اس کی مضبوطی میں اضافہ کر رہا ہے اور ایک دن آئے گا جب یہ دیوار ہمالیہ پہاڑ سے بھی زیادہ بلند اور ناقابلِ تسخیر ہو جائے گی۔"

"اس سے ٹکرانے والے خود پاش پاش ہو جائیں گے۔۔" غالب بولا۔

"پھر ہم خود ایک دوسرے کو بہادری کا تمغہ دیں گے۔" ٹیڈی بولا۔ "کیوں سکندر بادشاہ؟"

"ایک میڈل تو ابھی لو..." محسن نے دروازہ کھول کے کوئی چیز پھینکتے ہوئے کہا۔ "تک تک لگا رکھی ہے کب سے۔"

اس نے جو چپل پھینکی تھی وہ میری کمر پر لگی۔ "آہ... کیسا چھپ کر بیٹھ کر وار کیا ہے۔" میں نے واویلا کیا مگر محسن اندر غائب ہو چکا تھا۔

"شرفاء کی عزت اب باہر بھی محفوظ نہیں رہی۔" غالب نے افسوس سے سر ہلایا۔ ٹیڈی نے قہقہہ مارا۔

"شرفاء کے بچے! ساری رات نیند حرام کی۔" محسن نے پھر دروازہ کھول کے دوسری چپل ماری جو نشانہ چوک جانے سے ٹیڈی کو لگی۔

"یہ سالا بہت دانت نکال رہا ہے۔" محسن کی آواز آئی۔ ٹیڈی کی ہنسی رک گئی۔ اس نے مشتعل ہو کے اپنی چپل کو محسن کی طرف فائر کیا مگر محسن پھر دروازے کے پیچھے غائب ہو گیا۔

"صبر کرو استاد۔" غالب قہقہہ مار کے بولا۔ "مقدر میں یہی تھا کہ بہن کا رشتہ بھی دو اور پھر جوتے بھی کھاؤ۔"

"او بدبخت! فقیروں کو مت مار... مارنا ہے تو کسی کا حق مار۔" میں نے کہا۔

"نہیں تو باہر آ... پھر دیکھ فقیر کیا کرتے ہیں۔" ٹیڈی نے چلا کے کہا۔

"ایسی کی تیسی فقیروں کی۔" محسن نے اندر ہی سے جواب دیا۔ "ہم کسی بادشاہ سے نہیں ڈرتے... خواہ سکندرِ اعظم آ جائے۔"

وہ اپنے قلعہ بند ہونے کا فائدہ اُٹھا رہا تھا مگر شامتِ اعمال اس وقت شہلا باہر آ گئی کیونکہ صبح ہونے لگی تھی۔ میں اور ٹیڈی ایک ساتھ اُٹھ کر دوڑے۔ محسن فوراً چارپائی کے نیچے گھس گیا۔ چارپائی کے نیچے ایک گھمسان کی جنگ ہوئی۔ محسن اکیلا ہم دونوں کا مقابلہ کیسے کر سکتا تھا۔ اس نے اُٹھ کر بھاگنے کی کوشش میں چارپائی اُلٹ دی مگر پکڑا گیا۔ ہم باہر نکلے تو رابعہ دروازے میں کھڑی غالب سے پوچھ رہی تھی۔

"کیا کوئی چوہا اور نکل آیا ہے؟" خوفزدہ نازو اس کے پیچھے تھی۔

"ہاں! یہ چوہا ابھی ابھی پلنگ کے نیچے سے نکالا ہے۔" میں نے کہا اور محسن کو بیچ میں پھینک دیا۔

"بہت شکریہ آپ حضرات کا۔" محسن نے اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے دانت نکال کے کہا۔ "یہاں تک اُٹھا کر لانے کی زحمت کی۔" پھر اس کی نظر نوٹوں کے ڈھیر پر گئی۔ "یہ کیا ہے؟"

"ہاتھ کا میل۔" میں نے ہاتھ جھاڑ کے کہا۔ "غالب کے ہاتھ کا... مجھے رشوت میں دے رہا تھا۔"

"تم لوگ کسی بات کا سیدھا جواب نہیں دے سکتے۔" شہلا بولی۔

"ہم سیدھے سادے لوگ ہمیشہ سیدھی بات کرتے ہیں۔ اس میں بھی کوئی غلط بیانی نہیں شہلا بی بی۔" میں نے کہا۔ "یہ سب غالب کا ہے۔"

"تجھے کیوں رشوت میں دے رہا تھا؟" محسن نے دلچسپی سے کہا۔

"کہتا تھا کہ میرا ایک کام کرا دو... سفارش کی کہتا تھا..." میں نے نازو کی طرف دیکھا۔

"اچھا...؟ کام کیا تھا؟" محسن نے بھی نازو کو دیکھا۔ اس کا رنگ لال ہونے لگا۔

"بہت مشکل کام تھا یار... جان جوکھوں کا۔"

"میں سمجھ گیا... کہتا ہو گا کہ میری طرف سے اظہارِ محبت کرا دو۔" محسن نے سر ہلایا۔ "اسے سمجھاؤ کہ یہ خیال چھوڑ دے۔ ایٹمی میزائل کا ڈنڈے سے کیا عشق... ڈنڈا بھی تھانیدار کا نہیں... بے چارہ مولا بخش۔"

"مولا بخش تمام عمر اس کی جوتیاں سیدھی کرے گا۔" غالب نے دانت نکال کے کہا۔

"اور اسے ہمیشہ پاؤں کی جوتی سمجھے گا۔" محسن نے کہا۔ "اس کے لیے ایک محل بنائے گا سپنوں کا۔"

"اور اسے محل میں اپنی امنی کنیز بنا کے رکھے گا۔" محسن بولا۔ جب ہم سب نے ہنسنا شروع کیا تو وہ سب واک آؤٹ کر چکی تھیں۔

"بس ایک دفعہ ان کی زبان چل پڑے تو رُکنے کا نام نہیں لیتی۔" کچن سے رابعہ کی آواز آئی۔ "بدنام ہم ہیں۔"

"فوراً پٹڑی سے اتر جاتے ہیں۔" شہلا نے خفگی سے تائید کی۔

جب ناشتا شروع ہوا تو ہم نے اپنی شب بیداری کے اسباب پر روشنی ڈالی۔ غالب کی بات اور ہمارے انکشافات نے خاصی سنسنی پھیلائی۔

"کیا وہ چور اپنا مال لینے کے لیے واپس آئیں گے؟" محسن بولا۔

میں نے کہا: "اگر تجوری بھی انھوں نے نکالی ہو گی تو انھیں لاکھ ڈیڑھ لاکھ کی کیا پروا۔"

غالب نے کہا: "مجھے وہ ایسے نہیں لگتے تھے کہ تجوری کا پتا چلا لیں اور اُٹھا لے جائیں۔ اس کو کھود کر نکالنا بھی اتنا ہی مشکل تھا جتنا اُسے یہاں سے کہیں منتقل کرنا اور پھر کسی سے کھلوانا... عام ویلڈنگ کرنے والے اسے نہیں کاٹ سکتے تھے۔ وہ گن میٹل کی بنی ہوئی تھی۔"

"تمھارا مطلب ہے تجوری پہلے ہی کوئی لے گیا تھا! زیادہ بڑا اور ہنرمند چور؟"

غالب بولا: "ہاں، اور ممکن ہے یہ کام کسی گھر کے بھیدی نے کیا ہو۔"

"کیا مطلب؟" ٹیڈی نے کہا

غالب نے کہا: "میرے والد اپنے دوست احباب پر بہت بھروسا کرتے تھے۔ ان کے سب دوست پرانے اور قابلِ اعتماد تھے۔ ڈاکٹر لطیف اس کی ایک مثال ہیں۔ وہ سب کو تجوری کے متعلق بتاتے تھے۔"

"مگر ڈاکٹر لطیف جیسے لوگ تو یہ کام کرنے سے رہے۔"

"نہ جانے کس کس کو یہ بات معلوم تھی۔" غالب نے کہا۔ "ان کے انتقال کے بعد میں تو آیا نہیں۔ معلوم نہیں کس نے موقع سے فائدہ اُٹھا لیا۔"

"تمھیں کیوں یقین ہے کہ یہ کام اپنوں کا ہو گا؟" میں نے کہا

"یہ کام وہی کر سکتا تھا جو پورے اعتماد کے ساتھ یہاں آ کے رہ سکتا ہو۔" غالب بولا۔ "جسے دوسرے سب لوگ جانتے پہچانتے ہوں اور گھر کا محافظ سمجھتے ہوں۔ کوئی اجنبی تجوری نکالتا تو سب دیکھتے۔ اُسے لوڈ کرنے کے لیے کرین منگوانا پڑا ہو گا اور اسے ٹرک میں لے جایا گیا ہو گا۔ ورنہ دس بیس مزدوروں نے یہ کام کیا ہو گا۔ ظاہر ہے یہ رات کی خاموشی میں ہونے والا ایسا کام نہیں تھا کہ آس پاس والوں کو خبر تک نہ ہوئی ہو۔ میں ایک مفروضے کو بنیاد بناتا ہوں کہ جب میرے والدین کے ساتھ حادثہ پیش آیا تو سب تعزیت کرنے والے یہاں پہنچے۔ ہمارے کچھ رشتے دار بھی تھے جن کو میرے والدین مُنہ نہیں لگاتے تھے۔ اس لیے نہیں کہ وہ غریب تھے۔ ایک زمانہ تھا کہ میرے والد معمولی ڈاکٹر تھے اور وہ سب دولت مند شمار ہوتے تھے۔ میرے والد نے سخت حالات کا مقابلہ کیا تھا اور اُس وقت سب رشتے دار غیر بنے رہے تھے۔ بعد میں میرے والد کی کامیابی کا دور شروع ہوا تو وہ سب دوڑے۔"

"اپنی اپنی نااہل، بدتمیز اور بدصورت لڑکیوں کے رشتے لے کر۔" محسن بولا۔

"بالکل یہی ہوا۔" غالب بولا۔ "مگر میرے والد نے اپنی مرضی سے شادی کر لی۔ ایک متوسط گھرانے میں... اپنے ایک میٹرک کے زمانے کے کلاس فیلو کی لڑکی سے جو ہیڈ کلرک تھا۔ تم کہہ سکتے ہو کہ یہ لَو میرج تھی۔"

"ایک اچھی روایت قائم کی تھی انھوں نے... اسے قائم رکھو۔" میں نے کہا۔

"اس کے بعد انھوں نے یعنی ٹھکرائے ہوئے رشتے داروں نے ہمارے خاندان کے خلاف قوت اور [illegible] میرے والد نے کوئی نوٹس نہیں لیا اور معاشرتی مقاطعہ کرنے والوں سے الگ ہو کے اپنے مخلص دوستوں کے رشتوں کو استوار کر لیا۔ ان کو کسی کی کمی محسوس نہیں ہوئی۔" غالب نے کہا۔ "میرا قیاس یہ ہے کہ جب ان کا انتقال ہوا تو میری عدم موجودگی میں کوئی خون کے رشتے کا دعویدار آ پہنچا ہو گا۔ ایک دو تو فرسٹ کزن تھے۔ چچازاد یا ماموں زاد قسم کے۔ اصولاً وہ میرے بھی چاچے، مامے تھے۔ کسی چاچے مامے نے فوراً میزبانی کے فرائض سنبھال لیے اور گھر پر کنٹرول حاصل کر لیا۔ سوگ ختم ہو گیا اور کوئی آنے جانے والا نہ رہا... میرا انتظار بھی نہ رہا۔ تو اس نے صورتِ حال سے فائدہ اُٹھانے کی سوچی۔ ممکن ہے وہ سال چھ ماہ یہاں رہا ہو۔"

"تم نے ڈاکٹر لطیف سے پوچھا ہو گا؟"

"میں نے پوچھا تھا۔" غالب نے کہا۔ "اور ان کے جواب پر ہی میرے قیاس کی بنیاد ہے۔ انھوں نے کہا تھا کہ ہاں! کوئی تھا تو سہی جو سب سے مل کر ٹسوے بہا رہا تھا۔ سب اُسی کو تسلی دیتے تھے اور اُسی سے تعزیت کرتے تھے۔ اندر باہر سب انتظام اُسی کے ہاتھ میں تھا۔ سوئم پر بھی وہی منتظم تھا اور چہلم پر بھی... خود ڈاکٹر لطیف کو اس کا نام یاد نہیں تھا۔ جو حلیہ انھوں نے بتایا وہ کسی بھی ادھیڑ عمر کے آدمی کا ہو سکتا تھا لیکن وہ نام بتا دیتے تب بھی میں کیا سمجھتا۔ میں آج بھی کسی کو نہیں پہچان سکتا۔ نہ ان کو میری خبر ہے نہ مجھے ان کی۔ مطلب یہ کہ یوں مرحوم کا نام لیوا بن کے کوئی یہاں مقیم رہا اور جب اِدھر اُدھر کے لوگوں نے اسی کو وارث تسلیم کر لیا اور اس کی موجودگی کے عادی ہو گئے تو اس نے اپنا کام بے خوف و خطر کیا۔ اسے یہ ڈر نہیں تھا کہ کوئی رد کرے گا۔ میرے نہ ہونے سے وہ سیاہ و سفید کا مالک تھا۔ اس نے عقلمندی سے کام لیا کہ سب کچھ ویسے ہی چھوڑ دیا۔ یہ [illegible]

گھر کا سازوسامان... بس وہی ایک چیز لے گیا جو قصرِ بکنگھم سے زیادہ قیمت کی تھی۔ ممکن ہے اب وہ بڑی شان و شوکت کے ساتھ کسی عالی شان محل میں رہتا ہو اور اس کا شمار صنعت کاروں میں ہو۔"

"ایک اور چوہدری دلاور۔" میں نے کہا۔ "اس کو بھی ڈائری میں لکھ لو۔ ہمیں ایک دن اس تجوری چور کو بھی پکڑنا ہے۔ ہم اسے تلاش کریں گے مگر بعد میں..."

"کیا تم نے میری قیاس آرائی کو اتنا درست تسلیم کر لیا ہے۔" غالب ہنسنے لگا۔ "ہو سکتا ہے اس افسانے میں حقیقت کا ایک فیصد بھی نہ ہو۔"

"یہ فیصد کا فرق ہی افسانے کو حقیقت سے جدا کرتا ہے۔" محسن بولا۔ "اور مجھے یہ فرق دکھائی نہیں دیتا... بالکل ایسا ہی ہوا ہو گا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تجوری چور تو فی الحال محفوظ ہیں مگر ہم خود کو ان چوروں سے محفوظ تصور نہیں کر سکتے جن کا مال ہمارے قبضے میں آ گیا ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ اپنا مال لینے تو آئیں گے۔"

"اور ایسے وقت میں آئیں گے، جب ہم موجود نہ ہوں گے۔" غالب نے کہا۔ "صرف محترم خواتین ہوں گی۔"

"اور اب وہ تیر و تفنگ اور بم بارود نہیں لائیں گے۔ اپنے ساتھ نصف درجن حسن پرست چوہے لے آئیں گے۔" میں نے کہا۔

"اوئی اللہ... چھ چوہے..." محسن نے زنانہ آواز بنا کے چیخ ماری۔ رابعہ اور نازو کا خفت سے بُرا حال ہو گیا کیونکہ ہم سب کا ہنستے ہنستے بُرا حال ہو رہا تھا۔

"چھ چوہے اور چھ چھپکلیاں۔" غالب بولا۔ "یہ اسلحہ خواتین کی ایک فوج کو شکست دینے کے لیے کافی ہے۔" مگر ابھی اس کا جملہ پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ نازو بجلی کی طرح اٹھی۔ دوسرے لمحے میں مرزا غالب اُڑتے نظر آئے۔ ٹیڈی نے بچنے کی بڑی کوشش کی مگر غالب اس کے اوپر گرا۔ وہ دونوں ہی اُلجھ گئے۔ میں اور محسن فوراً دُور ہو گئے تھے، چنانچہ بچی تھی ویسے ہی بیٹھ گئی۔ باری اب خواتین کے جیتنے کی تھی۔

"کیا ہوا بھئی! بڑے بڑے سورما چت پڑے ہیں۔" رابعہ بولی۔

"اور بڑے بڑے سکندر بھاگ رہے ہیں۔" شہلا بولی۔ "چھپ رہے ہیں۔"

"بالکل چوہوں کی طرح۔" رابعہ نے کہا۔

"اور ایک چھپکلی جیسی لڑکی کے سامنے نہیں آ رہے ہیں۔" شہلا بولی۔

جب امن و امان بحال ہوا تو سنگین مسائل پر سنجیدگی سے غور کیا گیا۔ رقم کے بارے میں طے کیا گیا کہ اسے فوری ضرورت پر خرچ کرنا مناسب ہو گا۔ چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کا پروگرام ہمیں معلوم ہو چکا تھا مگر اس کا پہلا مرحلہ تین دن بعد آتا تھا۔ جہاں سے ہم پھر ان کے پیچھے لگ سکتے تھے۔ ٹیپ سننے کے بعد سب کے لیے نئی حکمتِ عملی کا نقشہ سامنے آ گیا تھا اور سب ہی سمجھ رہے تھے کہ اب ہمارا پروگرام کیا ہو گا۔ ان تین دنوں میں ہمیں بھی بہت سے کام نمٹانے تھے۔

"سب سے پہلے تو بہرام دادا کی بیٹی کے لیے کچھ کرنا ہے۔" ٹیڈی نے کہا۔ "ہم کو اب تک اسپتال پہنچ جانا چاہیے تھا۔"

"میں اور تم اسپتال جا رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اس کے لیے ذرا محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ ایک طرف مجھے پولیس تلاش کر رہی ہو گی۔"

"تم اس سارجنٹ کی وردی کو تو اتار دو۔" رابعہ نے کہا۔ "خواہ مخواہ ڈر لگتا ہے کہ ابھی کسی کا چالان کر دو گے۔"

"ایک دن چالان تو تمہارا ہو گا بی بی۔" میں نے کہا۔ "بغیر وردی کے بھی کریں گے ہم... مگر تمہاری خواہش کے احترام میں یہ لباس بدل دیتے ہیں حالانکہ بہت جچ رہا تھا یہ لباس ہم پر۔"

"تقریباً ایسی ہی وہ ڈیڈی کی وردی تھی۔" رابعہ نے کہا۔

"اس میں آدمی خود کو زیادہ بااختیار محسوس کرتا ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر اس لباس میں باہر جانے کا مطلب ہے... ٹریفک پولیس کو پیچھے لگانا... میں اتنا احمق نہیں ہوں آپ لوگوں کی اطلاع کے لیے..."

"ہماری رائے کسی اطلاع سے نہیں بدل سکتی۔" محسن بولا۔ "آپ نے کل جو حماقتوں کا ورلڈ شو پیش کیا..."

"یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم آج بہرام دادا کی بیوہ کے لیے کچھ کرنے کے قابل ہو گئے۔" میں نے احتجاج کیا۔ "اگر اسے حماقت کہا جائے تو اس میں بھی خدا کی مصلحت تھی۔"

"اس کا اثر دلاور اینڈ کمپنی کے پلان پر بھی پڑ سکتا ہے۔" محسن نے کہا۔ "کل ہی نازو وہاں سے غائب ہوئی... کل ہی خسرو جمشید ثانی مارا گیا۔"

"ان دونوں واقعات کے درمیان کوئی تعلق ثابت نہیں ہوتا۔"

"ہو بھی سکتا ہے۔" محسن بضد رہا۔ "وہ کوئی رسک بہرحال نہیں لیں گے۔"

"رسک ہم بھی نہیں لیں گے۔" میں نے کہا۔

"تم اسپتال جا کے رسک لے رہے ہو۔" غالب بولا۔ "تم کو کم از کم چوبیس گھنٹے سڑک پر نظر نہیں آنا چاہیے۔"

"لیکن بہرام دادا کی بیوہ کو صرف میں پہچانتا ہوں۔"

"اسے پہچاننا ضروری نہیں۔" غالب نے کہا۔ "اگر اس کی بیٹی مل جائے گی تو ان کا پتا بھی مل جائے گا۔ اسپتال میں ہمیشہ پولیس موجود رہتی ہے۔ اور تم ایک بار میو اسپتال میں خاصی ہنگامہ آرائی کر چکے ہو۔"

"ٹھیک ہے میں نہیں جاتا۔" میں نے کہا۔

"لیکن میں تو جاؤں گا۔" ٹیڈی بولا۔

"تم بھی مت جاؤ..." غالب نے کہا۔ "یہ کام صرف شہلا کو کرنے دو۔"

"اکیلی شہلا کو؟" رابعہ نے کہا۔

"اکیلی کا کیا مطلب... اسے کیا وہاں توپ چلانی ہے۔" غالب بولا۔ "اور نازو کا مشن تو خیر ایسا تھا کہ یہ بی بی دکین اور تم کچھ کر ہی نہیں سکتی تھیں۔"

"یہ تسلیم کرتے شرم آتی ہے کہ تم بھی کچھ نہیں کر سکتے تھے۔" رابعہ بولی۔

"ہاں ہاں، میں اور شہلا کا میاں... ہم دونوں صرف مار کھا سکتے ہیں۔ کسی کو خالی ہاتھوں سے مار نہیں سکتے... تمہارے سکندرِ اعظم کی طرح۔" غالب نے بھنا کر کہا۔ "عقل کی بات کوئی سنتا نہیں... فوراً کاٹ شروع ہو جاتی ہے۔ شہلا سب سے کم مشہور اور مطلوب ہے۔ اسے رابعہ اور نازو کی طرح کسی سے خطرہ نہیں۔ یہ جائے برقع اوڑھ کر اور اطمینان سے پھرے۔ ہر وارڈ میں کسی سے بھی بات کرے۔ اسے کوئی نہیں پہچانتا۔ یہ اس لڑکی سے کوئی بھی رشتہ جوڑ سکتی ہے۔ بہرام دادا کی رشتے کی کچھ بن جائے اور سیدھی اس لڑکی سے جا کے بات کرے۔ خاموشی سے اس کو یا اس کی ماں کو سمجھا دے کہ وہ کس کی طرف سے آئی ہے۔ وہ میرا حوالہ دے یا استاد ٹیڈی کا مگر انھیں قائل کر لے کہ وہ رازداری سے کام لیں... ہماری اصلیت جاننے کے چکر میں نہ پڑیں اور خدا نے چاہا تو ہم سب کچھ ٹھیک کر لیں گے۔ ایک بار رابطہ قائم ہو گیا تو پھر کوئی مسئلہ نہیں رہے گا۔"

غالب کی بات بہت معقول تھی چنانچہ اس سے اتفاق نہ کرنے کا سوال ہی نہ تھا۔ شہلا نے اسی وقت روانگی کی تیاری شروع کر دی۔ مسئلہ ایک برقعے کے حصول کا بھی تھا مگر شہلا نے کہا کہ وہ انارکلی سے خرید لے گی اور امید ہے دوپہر کے کھانے کے وقت تک لوٹ آئے گی۔ ٹیڈی کچھ مضطرب اور مایوس تھا کہ اسے بہرام دادا کی فیملی کے لیے کچھ کرنے کا موقع نہیں مل رہا لیکن ہم نے اسے تسلی دی کہ پہلا کام تو اس لڑکی کو بچانے کا ہے۔ اس کے بعد ساری زندگی پڑی ہے۔ ٹیڈی جس طرح چاہے اپنے احسان کا قرض مع سود ادا کرے۔"

"وہ سونا تو اب نکال ہی لینا چاہیے۔" ٹیڈی نے کہا۔

"ابھی سے کیوں نکال لیں۔ جب ضرورت پڑے گی نکال لیں گے۔" میں نے کہا۔ "وہاں وہ سونا بہت محفوظ ہے۔"

میں اور محسن سڑک تک شہلا کے ساتھ گئے اور اسے ٹیکسی میں بٹھا کے لوٹ آئے۔ ہم نے اسے دس ہزار روپے دے دیے تھے کہ اگر اسپتال میں بہرام دادا کی بیٹی ضرورت مند ہو تو اُسے دے آئے۔ واپسی پر ہم نے اخبارات خریدے۔ ان میں گزشتہ دنوں کی دہشت گردی کے خلاف بہت سے بیانات اور اداریے تھے جن میں سارا غم و غصہ انتظامیہ پر اتارا گیا تھا۔ صاف نظر آتا تھا کہ یہ بیانات چھپوائے گئے ہیں کیونکہ ہماری تمام کارروائی کا نشانہ دلاور کے علاوہ پولیس کے دو افسر بنے تھے۔ ان میں سے ایک انسپکٹر حشمت خان تو مارا گیا تھا لیکن ایس پی سراج کا گھر تباہ ہوا تھا۔ تازہ خبریں ایک نامعلوم شخص کے قتل اور ایک ٹریفک سارجنٹ پر قاتلانہ حملے کی تھیں۔ نامعلوم شخص کے متعلق بتایا گیا تھا کہ اس کی لاش ایک جلی ہوئی گاڑی سے دریافت ہوئی تھی اور ناقابلِ شناخت ہو چکی تھی۔ اس بات کا ذکر نہیں تھا کہ گاڑی کس کی تھی اور کہاں سے ملی تھی۔ اس گیراج کا بھی کوئی حوالہ نہیں تھا جہاں میں نے مرسیڈیز کو چھوڑا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس کے ساتھ کھڑی ہوئی دو زیرِ مرمت کاریں بھی ضرور تباہ ہوئی ہوں گی مگر خبر میں اس کا تذکرہ نہیں تھا۔ پولیس شاید اس گیراج کے مالک کو پکڑ کر لے گئی ہو گی یہ پوچھنے کے لیے کہ وہ مرسیڈیز وہاں کیسے پہنچی... کیسے اس میں آگ لگی؟ اسے وہاں چھوڑ کر جانے والے کون تھے اور اس نے کچھ نہیں دیکھا تو کیوں نہیں دیکھا؟ باقی دو گاڑیوں کے مالکوں نے بھی اپنے نقصان کے لیے اسی کو ذمے دار ٹھہرایا ہو گا اور پولیس نے کاروں کے مالکوں کو مطمئن کرنے کے لیے گیراج والے کو اٹھا لیا ہو گا۔ اس کی واجبی سی مرمت کی ہو گی اور پھر اسے معاف کر دیا ہو گا۔ معاف کرنے کا نذرانہ لے کر۔ پولیس کو بھی معلوم ہو گا کہ وہ مجرم نہیں ہے اور اگر سچ مچ تفتیش کرنی پڑی تو وہ کبھی کچھ معلوم نہیں کر سکیں گے لیکن خبر میں یہ سب نہیں تھا۔ ٹریفک سارجنٹ نے بھی واقعات کو اپنی مرضی کے مطابق پیش کیا تھا۔ اس کے بیان کے مطابق حملہ آور دو تھے۔ ان میں سے ایک گاڑی لے کر بھاگ گیا اور دوسرا پکڑا گیا۔ اس نے دوسری کار کے مالک کو پکڑ لیا تھا جو وہاں موجود ہونے کا قصوروار تھا... وہ نشے میں تھا اور اس کا یہ جرم کافی تھا۔ پولیس نے اس سے سارے نقصانات کی تلافی کر لی ہو گی۔ سارجنٹ نے اپنی عزت بچا لی تھی اور یہ بالکل نہیں کہا تھا کہ فرار ہونے والا مجرم اس کی وردی اتروا کے بھاگ گیا تھا۔ دوبارہ اس وردی میں نمودار ہوا تھا اور پھر بھاگ گیا تھا۔ اس قسم کی کارکردگی پر اسے بہت شرمندگی اٹھانی پڑتی۔ جو پکڑا گیا تھا بہرحال پیسے والا تھا۔ نئی وردی بنوانے کے لیے پیسے دے گیا ہو گا۔

ہم واپس پہنچے تو غالب اور نازو مختلف کمروں میں پھر رہے تھے۔ غالب اپنے بچپن سے فرار ہونے تک کے واقعات بڑی تفصیل سے بیان کر رہا تھا اور نازو بڑی دلچسپی سے سُن رہی تھی۔ چنانچہ غالب نے عمرِ رفتہ کی کتاب کا ہر ورق اس کے سامنے کھول کر رکھ دیا تھا۔

"میرا خیال ہے غالب بالآخر نازو کو امپریس کرنے میں کامیاب ہوگیا ہے۔" محسن نے ان دونوں کے انہماک کو دیکھ کر کہا۔

"تم سب مرد ایک جیسے شکاری ہو۔" رابعہ نے کہا۔ "لفظوں کے جال بُنتے ہو۔ سبز باغ اور سنہرے خواب دکھاتے ہو۔ عورت بچ کر کہاں جاسکتی ہے۔"

"یہ عورت تو اپنے گھر جاسکتی ہے۔" محسن بولا۔ "اس کا اپنا گھر ہے۔"

"کون سا گھر؟ عورت کا اپنا گھر ہوتا ہے۔" رابعہ بے خیالی میں بولی۔

"یہ زنانہ فلسفہ مت جھاڑو ہمیں اداس کرنے کے لیے کہ اسے تو ایک دن بابل کا انگنا چھوڑ کے آنا پڑتا ہے۔" محسن بولا۔ "ہم سب ہی اسی طرح اپنے اپنے دل میں حسرتِ تعمیر لیے پھر رہے ہیں۔ میرا کون سا گھر ہے؟ استاد ٹیڈی کا گھر کہاں ہے؟ باپ کا گھر نہ اسے ملا نہ سکندر کو۔ لیکن اسے تم نے خرید لیا۔ اُس ویرانے میں اور اِس ویرانے میں کیا فرق ہے؟ بقولِ شاعر۔ آباد کرتے آخر ویرانے آدمی ہیں۔ جب سکندر دواع ہو کے تمہارے گھر جائے گا... تو کیا وہ اس کا گھر نہیں کہلائے گا کیونکہ مالک تو تم ہو۔"

"میرا مطلب یہ نہیں تھا۔" رابعہ نے شرمندگی سے کہا۔

اندر سے غالب کا ایک نعرہ سنائی دیا۔ نازو ہنستی ہوئی برآمد ہوئی اور رابعہ کو اپنے ساتھ لے گئی۔ "چلو باجی کچھ دوپہر کے کھانے کا کریں۔" وہ بولی۔ جاتے جاتے اس نے پلٹ کر دیکھا۔ غالب رونی شکل بنائے لنگڑاتا ہوا نمودار ہوا تو وہ پھر ہنسی۔ میں نے اور محسن نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"یار مرزا... خیریت تو ہے نا...؟" میں نے ہمدردی سے کہا۔

"خاک خیریت ہے۔" مرزا فرش پر آلتی پالتی مار کے بیٹھ گیا۔ "اُلّو کی پٹھی کے ہاتھ پیر ہی قابو میں نہیں ہیں۔"

"تمہاری بھی تو زبان قابو میں نہیں ہے دوست۔"

"او یار تو زبان کا جواب زبان سے دے۔" مرزا غالب نے غصے سے کہا۔ "آخر کون سی بڑی بات کہہ دی تھی میں نے۔ یہی کہا تھا کہ وہ دن کب آئے گا جب تمہارے رُخِ روشن کی چاندنی سے میرے گھر میں اجالا ہوگا۔ میرے دل میں پھول کھلیں گے۔"

"ڈائیلاگ تو اچھا تھا۔" میں نے سر ہلا کے کہا۔

"خاصی رومانٹک اور جذباتی بات تھی۔" محسن نے میری تائید کی۔

"بس اسی پر اُٹھا کے پھینک دیا۔" غالب نے نقشِ فریادی

بن کے کہا۔

"تم چھوڑو مرزا... یہ عشق تمہارے بس کا نہیں۔" میں نے کہا۔ "لنگڑے لُولے ہو جاؤ گے شادی ہونے تک۔ دُولھا بن کے پہیوں پر جاتا اچھا نہیں لگتا۔"

"اور وھیل چیئر پہ بیٹھ کر کیسا لگتا ہے؟" محسن بولا۔

"یہی تو مجبوری ہے دوستو۔" غالب نے آہ بھر کے کہا۔ "اپنی خُو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں۔"

"سوچ لو ابھی سے یہ حال ہے۔ بعد میں کیا ہوگا؟" م
"جب تم اس کے حکم کے غلام بنو گے، سارا دن فٹ بال کھیلے گے...

"سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے۔" غالب بولا۔ اس نے آج پہلی بار اظہارِ عشق کیا تھا۔ اعترافِ جرم کیا تھا اور سزا کا طلبگار تھا۔ اس کا مرض لاعلاج ہو چکا تھا۔

"یار یہ نازو کیا اب ایسے ہی پھرے گی؟" غالب بولا۔ "... بنی ہوئی۔"

"یہ پوچھو کہ چاند بدلی سے کب باہر آئے گا۔" میں نے
"تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب موسلے بھائی آئے گا۔ وہی ... کو پھر پری بنائے گا۔"

"اور موسلے بھائی کب آئے گا؟" محسن بولا۔ "جب ہم لائیں گے۔"

"اور تم اُسے کب لاؤ گے؟" غالب نے کہا۔

"ہم اُسے جب چاہیں گے اُٹھا لائیں گے۔" محسن نے کہا۔

"اب تو اُٹھا کے ہی لانا پڑے گا... اپنی خوشی سے وہ ... بھی نہیں آیا تھا......" غالب بولا۔ "صورت دیکھتے ہی ... جائے گا۔"

"ہمیں ایک خانہ بدوش قبیلہ بن کے سفر کرنا ہے۔" میں نے کہا۔ "پھر کیا ضرورت ہے نازو کا میک اپ اتارنے کی۔ ہم سب کو ایسا ہی بن جانا چاہیے۔"

"ہمیں خانہ بدوشوں کے دیگر اسباب کی ضرورت بھی ہوگی۔ چار گدھے اور کم سے کم دو خیمے۔ سفر میں کھانا پکانے کا سامان۔ ... بہت برتن اور زمین پر بچھا کے سونے کے لیے کچھ بستر وغیرہ۔" محسن بولا۔ "اس کے علاوہ صورت خانہ بدوشوں جیسی بنا لینے کے بعد ویسا ہی لباس بھی درکار ہوگا۔ یہ سب کہاں سے آئے گا؟"

"بازار میں کیا نہیں ملتا... ابھی تو کھانے میں دیر ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم چلتے ہیں اور سب خرید لاتے ہیں۔ شام تک ... بدل جائے تو اچھا ہے۔ پھر یہ طے کریں گے کہ کس کو کیا کرنا ہے کدھر جانا ہے۔"

"اب ہم سب ایک ہی قافلے کی صورت میں نہیں ... سکتے۔" غالب نے بھی بالآخر اپنے لب کھولے۔ "دو حصّوں میں تقسیم ... بنے گا۔ ایک ٹیم دوسری ٹیم سے رابطہ ضرور رکھے گی۔ لیکن دونوں الگ رہیں گے۔"

"یہاں کون ٹھہرے گا؟" ٹیڈی سوتے سوتے اُٹھ بیٹھا۔

"کوئی نہیں۔" میں نے کہا۔ "یہاں کوئی کام نہیں ہوگا۔"

"کام تو ہے لیکن تم اسے کام نہیں سمجھتے۔" ٹیڈی نے شکایتی لہجے میں کہا۔ "بہرام دادا کی بیٹی کا کیا بنے گا؟"

"اس کے لیے ہمیں جو کچھ کرنا ہوگا جانے سے پہلے ہی کر لیں گے۔ اس کے بعد آپریشن کرنا ہمارا کام نہیں ہے۔ آپریشن کی کامیابی کے لیے ہم دعا کے سوا کیا کر سکتے ہیں۔ دعا کے لیے ہمارا یہاں موجود ہونا ضروری نہیں۔" میں نے کہا۔

"ہم ان عورتوں کو بھی ساتھ رکھیں گے؟"

"ظاہر ہے! یہاں کس کا میکہ ہے۔" میں نے کہا۔ "ان کی مدد کی ضرورت بھی تو پڑ سکتی ہے۔ ایک ٹیم میں نازو ہوگی تو دوسری میں رابعہ۔ یہ بھی ضروری ہے کہ میں اور نازو الگ ہوں۔ خالی ہاتھوں سے لڑنا پڑے تو دونوں ٹیموں میں مقابلے کی صلاحیت برابر ہو۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تم اور رابعہ... میں اور نازو..." غالب نے خوش ہو کے کہا۔ "خوب گزرے گی..."

"مجبوری ہے ورنہ تمہاری جان کی بازی نہ لگاتے۔" میں نے کہا۔ "اسے لڑنے بھڑنے کا موقع نہ ملا تو وہ ساری مشقِ ستم تمہاری جانِ ناتواں پر کرے گی اور وہاں تمہیں بچانے والا بھی کوئی نہیں ہوگا۔"

"ارے تو کون کافر بچنا چاہتا ہے۔ مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی۔" غالب بولا۔

"بس تو پھر کیا غم ہوگا۔" محسن بولا۔ "شوق سے مرو۔"

"ان میاں بیوی کا کیا ہوگا۔ کیا ہم ظالم سماج کی طرح ان کو جدا کر دیں گے؟" غالب بولا۔

"میرا خیال ہے شہلا ہمارے ساتھ نہیں جاسکتی۔" میں نے کہا اور محسن کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

محسن نے اقرار میں سر ہلایا۔ "وہ نہیں جاسکتی۔"

"مگر کیوں نہیں جاسکتی۔" ٹیڈی نے کہا۔

"تم نہیں سمجھو گے بیٹے! ابھی بچے ہو۔" محسن نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کے کہا۔ "وہ امید سے ہے۔" اس نے شرماتے ہوئے اعتراف کیا۔

"اچھا؟" غالب اور ٹیڈی ایک ساتھ اُچھلے۔ "تو یہ بات ہے؟ ہمیں بتایا تک نہیں۔" غالب نے محسن کے ایک مُکّا رسید کیا۔ "مبارک ہو بھئی۔"

"یہ تو اتنی تازہ خبر ہے کہ آج کے اخبار میں بھی نہیں۔" محسن ... "مجھے بھی رات کو ہی اطلاع ملی تھی۔ اور میرا خیال تھا کہ کسی کو معلوم نہیں۔"

"... سکندر کو کیا فرشتے بتا گئے؟" غالب بولا۔

"تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "مجھے امید تھی۔"

"تم بھی امید سے تھے؟" غالب بولا۔

"ہاں بھئی! ایک اندازہ تھا کہ جب محسن نے شادی کی ہے تو پھر وہ سب کچھ تو ہوگا جو شادی کے بعد ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ "دنیا امید پر قائم ہے۔"

"پھر تو واقعی شہلا نہیں جاسکتی۔ اور ظاہر ہے پھر بچے کا باپ بھی نہیں جاسکتا۔" غالب نے کہا۔

"باپ ضرور جائے گا۔ کسی کا باپ نہیں روک سکتا اسے۔" محسن بولا۔

"لیکن یہاں بھی تو کسی کو شہلا کی خبرگیری کے لیے رہنا چاہیے۔" میں نے کہا۔

"ہم اسے کسی کے پاس چھوڑ سکتے ہیں۔" محسن بولا۔ "مثلاً منظر کے گھر میں۔ اس کی بیوی بہت تجربہ کار ہے۔"

"فائن! اس سے بہتر کوئی صورت نہیں ہوسکتی تھی۔" میں نے کہا۔ "تو اب دونوں ٹیموں کی تشکیل ہوگئی۔ میرے اور رابعہ کے ساتھ استاد ٹیڈی۔ غالب اور نازو کے ساتھ محسن۔ اس سے بہتر ٹیم نہیں بن سکتی۔ غالب اور نازو کی جوڑی تو اچھی ہے..."

"اتنی ہی اچھی ہے جتنی تمہاری اور رابعہ کی جوڑی۔" محسن بولا۔

"ہاں اتنی ہی اچھی ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن ضروری ہے کہ دونوں کے ساتھ ظالم سماج کا نمائندہ موجود رہے۔ ویسے تو ماشاءاللہ سب ہوش مند، فرض شناس اور باضمیر ہیں مگر احتیاط اچھی چیز ہے۔ نازو کے اور میرے الگ رہنے کے اسباب وہ نہ ہوتے جو میں نے بیان کیے تو میں خود تجویز کرتا کہ رابعہ اور غالب ایک ساتھ ہوں۔"

"یہ انتخاب بہتر کارکردگی کا ضامن ہوگا۔" محسن نے کہا۔ "کام میں دل لگے اور دل کی تقویت کا سامان ساتھ ہو تو کام بھی کام نہیں رہتا۔ ایک رومانٹک ایڈونچر بن جاتا ہے۔"

لیکن نازو اور غالب کے ساتھ ٹیڈی کو رکھا گیا تو یہ ایڈونچر بھی خانہ جنگی کی صورت اختیار کرے گا۔ نازو اور غالب میں تو ما چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد۔ والا معاملہ ہے مگر ٹیڈی اور غالب بھی لڑیں گے اور تینوں آپس میں اُلجھنے والے ہوں گے تو سلجھائے گا کون۔ میں اور رابعہ امن پسند لوگ ہیں۔"

"ٹھنڈے خون والے جانور مثلاً مگرمچھ اور اگر مچھ۔" غالب نے کہا۔

"تمہارے ساتھ محسن ہی ٹھیک رہے گا۔" میں نے کہا۔ "ہم استاد ٹیڈی کے اچھے پارٹنر ہوں گے۔"

ہم دونوں ٹیموں کے فرائض اور تقسیمِ کار کی بحث میں ایسے اُلجھے کہ دوپہر کے کھانے کا وقت آگیا۔ شہلا نے اس سے پہلے ہی لوٹ آنے کو کہا تھا لیکن میرا خیال تھا کہ یہ کام اتنا آسان بھی نہیں

کہ وہ جائے اور اسپتال کو ہاتھ لگا کے لوٹ آئے۔ رابعہ اور نازو نے لنچ کا اعلان کیا تو دو بج چکے تھے۔ شہلا کا انتظار بے سود تھا۔ محسن نے بھی مجھ سے اتفاق کیا کہ وہ چار بجے سے پہلے نہیں آ سکتی چنانچہ ہم سب دسترخوان پر بیٹھ گئے۔ مینو دیکھ کر ہم سب کو حیرانی ہوئی۔ دو گھنٹے سے بھی کم وقت میں دو لڑکیوں نے بہت کچھ بنا لیا تھا۔ قورمے کے ساتھ آلو کے کٹلٹ تھے۔ بریانی تھی۔ سلاد، اچار اور کھیر دیکھ کر مجھ پر رقت طاری ہونے لگی۔ یہ انتہائی گھریلو قسم کا مینو تھا جو دربدری میں نہ جانے کب سے خواب و خیال تھا۔ عام طور پہ بازار کا کھانا چلتا تھا۔ تنوری روٹیاں اور وہی آلو قیمہ، آلو گوشت۔

"بیٹھے کیوں ہو... کیا صرف دیکھ کر پیٹ بھر جائے گا؟" رابعہ ہنسی۔

"کچھ یقین نہیں آرہا ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ سب کیسے کر لیا تم لوگوں نے؟"

"ہم کیا نہیں کر سکتے۔" نازو نے غالب کی طرف دیکھ کر کہا۔

"اب تک تو ہاتھ پیر چلاتے اور توڑتے ہی دیکھا تھا..." غالب بولا۔ "یہ معلوم نہیں تھا کہ ہانڈی میں چمچہ بھی چلا لیتی ہو۔"

"اور یہ خاتون ایڈووکیٹ! انھیں قانونی دفعات کے حوالوں کے علاوہ کھانے پکانے میں بھی شُد بُد ہے۔" میں نے کہا۔ "غالباً قورمہ انھوں نے بنایا ہوگا۔"

"غلط... قورمہ نازو نے تیار کیا ہے۔" رابعہ مسکرائی... "میں نے بریانی پکائی... خوب اندازہ ہے آپ کا۔"

"پھر کٹلٹ نازو نے بنائے ہوں گے۔" غالب نے کہا۔ "میرے کٹلٹ بناتی رہتی ہیں نا۔"

"یہ بھی غلط۔" رابعہ پھر ہنسی۔ "نازو نے کھیر بنائی ہے۔"

"کھیر پکائی جتن سے اور خرمہ دیا جلا۔" میں نے کہا۔

"آیا کتا کھا گیا۔" محسن نے غالب کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"تو بیٹھا ڈھول بجا۔" میں نے امیر خسرو کا دوہا مکمل کرتے ہوئے نازو کو مخاطب کیا۔ "ڈھول بجنی ڈھول جاتی، ڈھول سپاہیا۔"

"ڈھول تو یہ ساری عمر بجائیں گی۔" محسن بولا۔ "کھانا کھائیے۔ پھر نہ جانے سفر میں ریت پھانکنا پڑے اور گھاس چرنا پڑے۔"

میں نے کھانے پر حملہ کرتے ہوئے کہا۔ ٹیڈی اور غالب مجھ سے پہلے ہی ٹوٹ پڑے تھے اور خواتین کی ایک نہیں سن رہے تھے جو صبر کی تلقین میں وقت ضائع کر رہی تھیں۔ بالکل گھر گرہستی والی بی بیوں کی طرح انھوں نے ہلکی پھلکی... وہ خود کھانے سے ... شہلا کا انتظار کریں گے۔

غالب اور ٹیڈی نے اتنا کھا لیا تھا کہ انھیں کھینچ کر اٹھانا پڑا... وہ اٹھے اور مشکل سے بستر تک پہنچے اور لیٹ گئے۔

"اب تو سانس لینا بھی مشکل ہو رہا ہے۔" استاد ٹیڈی کی...

"غالباً معدے میں جگہ نہیں رہی تو کھانا پھیپھڑوں ... گیا۔ دل و جگر میں سما گیا۔" غالب نے کہا۔

"یہ تمھارا آخری طعام تو نہیں تھا؟" میں نے کہا۔

"اب لیٹ کر کلمہ پڑھتے رہو۔" محسن بولا۔ "ہم جا رہے ہیں ... ہماری واپسی تک فوت مت ہونا۔"

ان دونوں پر غنودگی طاری تھی۔ میں اور محسن گھر سے نکلے تو وہ خراٹے لے رہے تھے۔ نہایت مضحکہ خیز طریقے ... لگتا تھا کہ غالب ایک مصرع پڑھتا ہے اور ٹیڈی خراٹوں کا ... مصرع پڑھ کے جواب دیتا ہے۔ ہم دونوں نے جیب میں پانچ ہزار روپے رکھ لیے تھے۔ باقی ایک لاکھ چوبیس ہزار کی رقم ... نے سیو فیق میں اچھی طرح لپیٹ کر اندر گرا اور ٹوائلٹ ٹینک ... ڈال دی تھی جس میں پانی اوپر تک بھرا ہوا تھا لیکن نہ جانے ... پرانا تھا۔ ہم نے اتفاقِ رائے سے موسیٰ بھائی کی خدمات حاصل کرنے کو غیر ضروری قرار دیا۔ خانہ بدوش صحرائی قبیلے کے افراد کا بھیس بدلنا کوئی مشکل کام نہیں تھا جو ہم خود نہ کر سکتے۔

چوک رنگ محل کی ایک دکان تک پہنچنے کے لیے ... نے راہ چلتے لوگوں سے اور کچھ دکانداروں سے رہنمائی حاصل کی۔ رنگ محل کی اس دکان کے ماتھے پہ بڑا جاندار سائن بورڈ آویزاں تھا۔ "حشر تھیٹر سپلائی کمپنی" کا نام اسٹیج ڈرامے کے اس عظیم مصنف اور فنکار کے نام سے منسوب تھا جسے دنیا آغا حشر کے نام سے ہمیشہ یاد رکھے گی۔ تاہم سائن بورڈ پر مصوری کے سارے نمونے ویسے ہی تھے جیسے عموماً ٹرک اور بس کی باڈی پر نظر آتے ہیں۔ ایک طرف خوفناک مونچھوں والا پہلوان ٹائپ شخص مغل بادشاہوں کی وضع قطع بنائے کھڑا ہوا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ نے کندھے پر گرز کو تھام رکھا تھا تو دوسرے ہاتھ سے وہ مغلِ اعظم کی طرح گلاب کا پھول سونگھ رہا تھا۔ میرے ذہن میں کسی شہنشاہِ ہند کا تصور نہ آیا جو اتنا بے ڈھنگا ہو اور بہ یک وقت گرز اور پھول اٹھا کے تصویر بنوا تا ہو۔ دوسری طرف نور جہاں یا ملکہ ممتاز محل قسم کی ... خاتون تھیں۔ لباسِ شاہانہ میں بے لباسی کا اشتہار۔ ملکہ عالیہ کی ایک آنکھ چھوٹی تھی اور دوسری بڑی۔ کسی نے شرارت میں ان کے لبوں پہ مار کر سے دو سیاہ لکیریں بنا دی تھیں جو باقاعدہ ترشی ہوئی مونچھیں نظر آتی تھیں۔

مالک دکان آغا حشر کا قدرداں ہی نہیں ہیرو کار تھا ... کا اٹھنا بیٹھنا بات کرنا سب ڈراماٹی تھا۔ اس نے ... اپنا مشورہ شامل کیا اور بہت تفصیل سے سمجھایا کہ صحیح ... نظر آنے کے لیے ہمیں کس قسم کا حلیہ بنانا ہوگا۔ اس کے پاس ... پرانی البم تھی جس میں مختلف اسٹیج ڈراموں کے فوٹوگراف تھے۔ ... نے متعدد ڈراموں کے بارے میں بتایا کہ وہ کس میں کیا بنا تھا۔

... ہیرو، ولن، ہیرو کے باپ، ہیروئن کے باپ اور کامیڈین یہاں ... زنانہ رول تک کیے تھے۔ اور بقولِ خود ہر کردار ... ایمرجنسی میں ... کی اداکاری کی دھاک بٹھا دی تھی۔ بُرا ہو بائیسکوپ کا جس ... اپنی اداکاری ... تھیٹر کا بیڑا غرق کیا۔ اس نے ہمیں خانہ بدوش قبیلے کے مرد اور عورت کے بھیس میں بہت سی تصویریں دکھانے کے بعد اپنی ... سے سامان نکالا اور مفصل ہدایات کے ساتھ ہمارے حوالے ... اس کی فضول بکواس ہم نے مروت اور اخلاق میں سُنی... وہ ... دل شکستہ آرٹسٹ تھا جس کے لاکھوں قدرداں ختم ہو چکے ... بامِ شہرت سے گمنامی کے اندھیرے میں گم ہو جانے والے ... کوئی پوچھنے بھی نہیں آتا تھا۔ حد تو یہ تھی کہ جب وہ کسی کو ... دور کے متعلق کچھ بتاتا تھا تو کم ظرف اور بدتمیز لونڈے ... تھے۔ کالجوں میں ڈرامیٹک کلب بنا کے پھکڑپن کا مظاہرہ ... والے یہ لونڈے خود کو ڈراما آرٹسٹ کہتے تھے اور اُسے بہت افسوس تھا کہ یہی لوگ بعد میں ٹی وی ڈراموں کے لیے منتخب ہو جاتے تھے۔ فن کہیں نہیں مگر فنکار سب ہیں۔ اس نے زمانے کے چلن پر آخری تبصرہ کیا۔

ہم ایک خاصا بڑا بنڈل لے کر اور اس ماضی کے عظیم فنکار سے مصلحے کی سعادت حاصل کر کے دکان سے رخصت ہوئے تو کچھ افسردہ تھے۔ زمانے کی قدرناشناسی کا نظارہ بہت عبرتناک تھا۔ وہ بھی زمانہ ہوگا، جب ہزاروں افراد اس غضب کے فنکار کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے، اس سے ایک بار ہاتھ ملانے کے لیے اور اس سے ملاقات کے لیے دن رات آگے پیچھے پھرتے ہوں گے۔ ایکٹرسوں سے لے کر تماش بینوں تک ہر طبقے کی ایک سے ایک حسین لڑکی اس پر فریفتہ ہوگی اور اس کے قرب کی خواہش میں بے قرار مگر وقت ساتھ چھوڑ گیا تو سب ساتھ چھوڑ گئے۔ اب ثقافت کے نام لیوا بھی اس سے کترا کے گزر جاتے ہیں۔ شاید وہ ہر ایک کو اسی طرح اپنے ماضی کی داستان سنا کے دل کا غبار نکالتا ہوگا اور بتاتا ہوگا کہ یادگارِ زمانہ ہیں ہم لوگ... گر زمانے کی روش تو یہ ہے کہ جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو۔ ان فنکاروں کو تو آثارِ قدیمہ والے بھی اپنی تحویل میں نہیں لیتے۔

"اس آدمی نے مجھے شرمندہ کیا۔" محسن بولا۔ "موسیٰ بھائی تھا ... نمبر کا بدمعاش۔ ہم بھی اس سے بدمعاشی کے دھندوں میں ... لیتے تھے اور پیسہ اس کے منہ پر مارتے تھے۔ یہ فنکار تھا اس ... میں فن شناس سمجھا اور فن کے اسرار و رموز سمجھاتا رہا۔ اگر اسے معلوم ہو جاتا کہ ہم اس کے پیشے سے دُور کا تعلق بھی نہیں رکھتے ... دھوکا دے رہے ہیں تو اسے کتنا دُکھ ہوتا۔"

"دکھ تو آدمی کا مقدر ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر اسے اتنا ہی ... ہوتا ہے فن کی بے قدری دیکھ کر تو وہ اس پیشے کو خیرباد کیوں ... دیتا؟ اصل بات یہ ہے کہ مجبوری سب کچھ کراتی ہے۔

وہ جانتا ہے کہ سب میک اپ سے بھیس بدلنے والے ڈراما آرٹسٹ نہیں ہوتے۔"

"پھر اُس نے ہم سے یہ سب باتیں کر کے کیا پایا؟"

"کچھ نہیں... تم بھول رہے ہو کہ وہ ایکٹر تھا۔ ایکٹر ہمیشہ ایکٹر رہتا ہے خواہ اسے اسٹیج اور اسکرین کی دنیا بھول جائے۔" میں نے کہا۔ "وہ اچھی طرح سمجھتا ہوگا کہ اب میک اپ سے کوئی بھیس بدل سکتا ہے تو دنیا کو دھوکا دینے کے لیے، روپوش ہونے کے لیے۔ چور ڈاکو اور جرائم پیشہ لوگ زیادہ ہیں۔ اسٹیج آرٹسٹ بہت کم۔ اس نے ہم سے کوئی سوال نہیں کیا کہ ہم کس ڈراما سوسائٹی یا کس کالج کے ڈرامیٹک کلب سے تعلق رکھتے ہیں۔ عموماً پرانے کلب اپنا سامان رکھتے ہیں اور ہماری طرح اناڑی پن کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ اُس نے تو ڈرامے کا نام تک نہیں پوچھا۔ ہم سچ مچ اسٹیج ڈراما کرنے والے ہوتے تو کیا اُسے مدعو نہ کرتے؟ مگر وہ پرانے وقتوں کے کچھ نہ جاننے والے اور کچھ نہ سمجھنے والے سادہ لوح بوڑھے کا کردار ادا کرتا رہا اور بلاشبہ اس نے اپنی اداکاری سے مجھے متاثر کر لیا۔ میں شرط لگاتا ہوں کہ اگر اس کے پاس ڈاکو جائیں اور صاف کہیں کہ وہ کس مقصد کے لیے بھیس بدلنا چاہتے ہیں تو وہ بہرا بن جائے گا۔ یہ ظاہر کرے گا کہ اس نے کچھ سنا ہی نہیں۔ اشاروں میں بات کرے گا اور جو وہ مانگیں گے دے دے گا۔"

"اس کا فائدہ؟"

"وہ محفوظ رہتا ہے۔" میں نے کہا۔ "جو لوگ دھوکا دہی کے لیے اس سے بھیس بدلنے کا سامان لے جاتے ہیں انھیں وہ ایک مظلوم اور قابلِ رحم شخص لگتا ہے۔ کبھی کوئی پکڑا جاتا ہوگا تو اس کا نام نہیں لیتا ہوگا کہ خواہ مخواہ پولیس اس بڈھے کو بھی گھسیٹے گی۔ بفرضِ محال اس کو پولیس اعانتِ جرم میں دھر لے تو وہ ایک مخبوط الحواس اور دل شکستہ بوڑھے کی اداکاری سے اپنی مظلومیت کا تاثر قائم کرنے میں کامیاب رہے گا اور چھوڑ دیا جائے گا۔ یہ بھی موسیٰ بھائی ہے لیکن بے خطر۔"

"میں نہیں مانتا کہ یہ اداکاری تھی۔" محسن بولا۔

"دیکھ یار! اس نے پیسہ کتنا لیا ہم سے۔" میں نے کہا۔ "کیا یہ سامان سات ہزار کا ہے؟ ڈراما آرٹسٹ ہوتے تو یہ ان سے سات سو مانگتا اور اگر سات ہزار مانگتا تو کیا وہ اتنی آسانی سے دے دیتے۔ چھ عدد نقلی وِگ، داڑھی مونچھیں، اور چھوٹا موٹا دوسرا سامان۔ یہ تین چار سو کا ہوگا۔ سات سو کے بجائے اس نے ہم سے سات ہزار وصول کر لیے۔ ایک پیسہ کم نہ کرنے کا مطلب بالکل صاف تھا کہ میاں یہ سامان کی نہیں، ضرورت کی قیمت ہے۔ معلوم نہیں تم کیا کرو گے۔ مجھے اپنا رسک بھی تو کَوَر کرنا ہے۔ ممکن ہے تم ڈاکا ڈالو، لاکھوں لوٹ لو۔ پھر سات ہزار مجھے کیوں نہیں دیتے؟"

"ہم چھوڑ کے بھی تو جا سکتے تھے۔"

"مشکل تھا۔ اسے ہم نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ دکان کتنی مشکل سے تلاش کی تھی ہم نے۔" میں نے کہا۔ "مشکل انہی کو پیش آتی ہے جن کا ڈرامے سے دور کا بھی تعلق نہ ہو۔ وہ جانتا تھا کہ ہم سات ہزار دے سکتے ہیں۔ ایسی دُکانیں گلی گلی تو ہیں نہیں۔ ہم کہاں جاتے۔ اور جانے لگتے تو وہ ایک شوشہ چھوڑ دیتا کہ میاں ہوشیار رہنا۔ لوگ پہلے پولیس کو بلا کے تصدیق بھی کر لیتے ہیں کہ یہ ڈراما کہاں ہو رہا ہے۔ بجے تم لوگ ڈراما آرٹسٹ تو لگتے نہیں۔"

"میں قائل ہونے لگا ہوں تیری بات سے۔" محسن بولا۔ "اس کا یہ بھی مطلب نکالا جا سکتا ہے کہ آئندہ کے لیے یہ دروازہ کھلا ہوا ہے۔ بڈھے کو پیسے سے غرض ہے۔ اس کے بعد اسٹیج پر ڈراما کرو یا دنیا کے سامنے۔ اس کی کوئی ذمّے داری نہیں۔"

"ظاہر ہے! سات ہزار کی اس نے کون سی رسید دی ہے۔" میں نے کہا۔

"اور سامان سے تو یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ہم نے اس سے لیا تھا۔" محسن بولا۔ "چلو ٹھیک ہے۔ ہم بھی ایک مستقل مزدور تمند ہیں۔ پھر لیں گے اگر خدا لایا۔"

"اب وہ سامان چاہیے جو کسی دکان پر نہیں ملتا۔" میں نے کہا۔

"ہمیں کچھ گدھے چاہئیں۔"

"ان کی کیا کمی! ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔" محسن نے کہا۔

"وہ ایک کہاں ملے گا۔" میں نے کہا۔ "غالباً کسی کمہار یا دھوبی سے پوچھنا پڑے گا۔ معلوم نہیں آجکل کیا بھاؤ چل رہا ہے۔"

محسن قہقہہ مار کے ہنسا۔ "کیا دلچسپ تجربہ ہے یہ بھی۔ کبھی سوچ سکتے تھے ہم کہ ایک دن گدھے خریدنے پڑیں گے۔۔۔ ایسی بہت سی چیزیں ہیں جو آدمی کبھی نہیں خریدتا۔ مثلاً کشکول ہم فقیروں کے ہاتھ میں دیکھتے ہی رہتے ہیں مگر کوئی پوچھے کہ یہ کہاں بنتے ہیں اور کہاں ملتے ہیں تو جتنے خیرات دینے والے ہیں ان میں سے ایک بھی نہ بتا سکے۔"

"میرا خیال ہے کہ شہر سے باہر چلتے ہیں۔ ملتان روڈ کی طرف۔ میں نے اکثر خانہ بدوشوں کے خیمے دیکھے ہیں وہاں۔" میں نے کہا۔ "گدھے کیا اُن سے خانہ بدوشی کا تمام اسباب مل جائے گا۔"

ایک ٹیکسی نے ہمیں ملتان روڈ پہنچا دیا۔ ڈرائیور نے دو بار پلٹ کر پوچھا کہ ہمیں ملتان روڈ پر کہاں جانا ہے اور ہر بار ہم نے وہی جواب دیا کہ سیدھے چلتے جاؤ۔

"او جی ملتان جانا ہے تے صاف دسّو نا۔" وہ چڑ کر بولا۔ "میں نئیں جا سکدا۔۔۔ کوئی بس پھڑ لو۔"

"ایہہ وی ٹھیک اے۔" میں نے کہا۔ "اسی بس پھڑ لیتے آں۔"

ٹیکسی والے نے اس جواب کا مزید بُرا منایا اور وہیں ٹیکسی کھڑی کر دی۔ ہم نے بہت شرافت سے کرایہ بمطابق میٹر ادا کیا اور وہ ہمیں ویران سڑک پر چھوڑ کے واپس ہو گیا۔ وہ طے نہیں کر سکا کہ ہم بیوقوف ہیں یا بہت چالاک۔ جب ٹیکسی نظر سے اوجھل ہو گئی تو ... ایک طرف اشارہ کیا۔ سڑک سے کچھ فاصلے پر چند خیمے نظر آ رہے تھے۔ ایک اونٹ اپنی بلندی کے باعث صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے دامن میں چرنے والے گدھے بھی ہو سکتے تھے ... گھوڑے بھی۔ باقی چوپائے بھیڑ بکریاں تھے یا خانہ بدوشوں کے بیوی بچے۔

تقریباً آدھے میل کا فاصلہ ہم نے ہل چلی ہوئی زمین کھیتوں کی منڈیر پر طے کیا۔ گرد اور دھوپ نے ہمارے رنگ روپ کو خاصا متاثر کیا اور جب ہم خیموں تک پہنچے تو ... لباس کا رہ گیا تھا جیسے تو من تو شدم تو مُن شدی والا ... وہاں کُل سات خیمے تھے اور اتنے ہی گدھے کے سائز کے گھوڑے جو نہایت کاہلی سے کھڑے تھے۔ چار جوانی میں بوڑھی ہو جانے والی عورتیں میلے کچیلے ڈھیلے ڈھالے مگر رنگ برنگے کپڑے پہنے ... پیر پاؤں پسارے ایک دوسرے کے سروں سے جوئیں تلاش کر رہی تھیں۔ یہ ان کی ہابی سمجھی جا سکتی تھی۔ بچے بھی زمین کی تپش سے بے نیاز لوٹیں لگانے میں مصروف تھے۔ بھیڑ بکریاں ... تھے اور ان کے ساتھ مل کر زمین کو کھاد فراہم کر رہے تھے۔ ایک ... نے بھونکنا شروع کیا تو انھیں کسی اجنبی کی موجودگی کے ... سب سے پہلے بچے آئے اور انھوں نے انتہائی پیشہ ورانہ انداز میں کورس شروع کیا۔ "ایک چار آنے دے دے بابو۔۔۔ بھوک لگی ہے۔" وہ ہمارے پیچھے چلنے لگے اور مختلف درد بھری اپیلیں کرتے رہے۔ "میرے چھوٹے چھوٹے بھائی بہن ہیں۔ ماں اندھی ہے۔ باپ معذور ہے۔" اگر ہمارے پاس اتنی ہی چونیاں ہوتیں جتنے بچے تھے تو ہم ... کورس کو بند کر سکتے تھے۔ ایک روپے کا نوٹ دیتے تو وہ آپس میں چھینا جھپٹی میں پھاڑ دیتے اور لٹتے تو ایک کے نوٹ بھی ہمارے ... نہیں تھے۔ چنانچہ ہم نے ان کو جھڑکا لیکن وہ بالکل متاثر نہ ہوئے۔

پھر کسی خیمے سے ایک تیلا سا بانس نما شخص نکلا جس کی مونچھیں اسٹیل وُول کی بنی ہوئی لگتی تھیں۔ اس کے لمبے بال کندھوں تک پہنچتے تھے اور تقریباً سفید تھے۔ وہ صرف دھوتی باندھے ہوئے تھا اور ننگے پاؤں نکلا تھا لیکن اس کے گلے میں ... جیولری تھی۔ نیلے پیلے لال رنگ کے موتیوں کی مالائیں۔ کانوں میں پیتل کی بالیاں اور ہاتھ میں کونڈی والا موٹا ڈنڈا جو بھنگ گھوٹنے کے کام آتا ہو گا لیکن اس سے وہ ہمارا سر توڑنا چاہتا تو توڑ سکتا تھا۔ ہم اُسے دیکھ کر مسکرائے۔

"کیا یہ قبیلے کا سردار ہو گا؟" محسن نے سوچ کر کہا۔

"سخی داتا کچھ دینے آیا ہے۔" وہ شخص آسمان کی طرف منہ اُٹھا کے بولا۔ اُس کی آواز کی گھن گرج نے مجھے متاثر کیا۔

"یہ تو یار فقیروں کا ڈیرا ہے۔" محسن بولا۔

"پھر کیا ہوا۔۔۔ یہ خانہ بدوش فقیر ہوں گے۔" میں نے کہا۔ پھر ہم نے سلام کر کے اس بڈھے کو مخاطب کیا۔ "بابا! ہم کچھ دینے بھی آئے ہیں اور لینے بھی۔"

"فقیر دعا دے گا بچہ! اللہ تجھے زمین پر حاکم بنائے گا۔"

"حاکم کیا مطلب؟ سی ایس ایس؟" محسن بولا۔ "ڈپٹی کمشنر وغیرہ۔۔۔"

"یار کام کی بات کرنے دو۔" میں نے کہا۔ "بابا! ہمیں کچھ گدھے چاہئیں۔۔۔ جیسے یہ ہیں۔"

بڈھے کا موڈ آف ہو گیا۔ "مذاق کرتے ہو ہم سے۔" وہ گرج کر بولا۔ "شہر میں کم ہیں گدھے؟"

"صحیح کہا آپ نے۔۔۔ بہت گدھے ہیں مگر ہم یہ خریدنا چاہتے تھے۔" میں نے کہا۔ "یہ سب۔۔۔ مطلب یہ کہ آپ کی بستی۔۔۔"

بڈھے نے مجھے مشتبہ نظروں سے دیکھا۔ غالباً میں صحیح الفاظ میں عرض مدعا نہیں کر سکا تھا۔ محسن نے بروقت میری مدد کی۔

"بابا جی! آپ کے یہ دو خیمے بہت پرانے ہو گئے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "ہم چاہتے تھے کہ ان کی جگہ آپ کو نئے دلوا دیں۔"

"اللہ اجر دے گا آپ کو۔" بڈھا ایک دم خوش ہو گیا۔

"اب ہمارے پاس اتنا وقت تو ہے نہیں کہ ہم نئے خیمے دیں اور پھر ان کو بدلیں۔" محسن بولا۔ "یہ بتاؤ نئے خیمے کتنے میں آتے ہیں؟"

"دو خیمے۔۔۔ چھ سو۔۔۔ سات۔۔۔ نہیں آٹھ سو۔" لالچ نے اس کے لیے فوری فیصلہ کرنا مشکل بنا دیا تھا۔

"ٹھیک ہے۔۔۔ یہ لو آٹھ سو۔" محسن نے جیب میں سے نوٹ نکالے۔ "یہ خیمے اکھاڑ کے ہمارے حوالے کرو۔"

بڈھا پھر پریشان ہو گیا۔ وہ کبھی خیموں کی طرف دیکھتا تھا تو کبھی نوٹوں کی طرف۔ "ابھی؟۔۔۔ دیکھو بابو۔۔۔ ایک تو میں اپنا خیمہ دے سکتا ہوں اسی وقت۔۔۔ دوسرا۔۔۔ وہ۔۔۔ پیچھے والا۔۔۔ وہ میری بہن کا ہے۔۔۔ باقی مرد دھندے پر گئے ہوئے ہیں۔۔۔ شام کو۔۔۔ بلکہ رات کو آئیں گے۔۔۔ اور پتا نہیں سودا کریں گے یا نہیں۔۔۔"

میں سمجھ گیا۔ بڈھا اپنا اور اپنی بہن کا فائدہ چاہتا تھا۔ "اچھی بات ہمارے لیے یہ تھی کہ وہ دونوں خیمے جو بڈھا بیچنے پر آمادہ تھا، خستہ ضرور تھے مگر باقی سب کے مقابلے میں نئے ہی لگتے تھے۔ میں نے محسن کو آنکھ ماری اور اس نے نوٹ بڈھے کو تھما دیے جس نے ان کو بڑے ندیدے پن سے دھوتی میں اُڑس لیا۔ پھر وہ دوسری طرف مُنہ کر کے گلا پھاڑنے لگا۔ اس کی زبان ہماری سمجھ میں نہیں آئی لیکن اس کی بات کا اثر ہم نے فوراً دیکھا۔ تقریباً ہر خیمے سے ایک عورت نے نکل کر چلّانا شروع کیا۔ بڈھے نے جواب میں بہت کچھ کہا جو غیر شریفانہ اور خواتین سے گفتگو کا اشتعال انگیز طریقہ تھا مگر خواتین ترکی بہ ترکی جواب دے رہی تھیں۔ اُن کو بڈھے کی گالیوں پر نہیں اس بات پر اعتراض تھا کہ اس نے کمینے پن کا مظاہرہ کیا اور اپنے دونوں خیمے بیچ دیے۔ انھوں نے بڈھے کو تقریباً ہم وزن گالیاں دیں اور پھر مایوس ہو کر اندر چلی گئیں۔ فروخت ہو جانے والے دونوں خیموں کو اکھاڑنے کا کام فوراً شروع ہو گیا۔ ان کی بستی میں ایسا سنسنی خیز واقعہ پہلے کبھی پیش نہیں آیا تھا چنانچہ بچے بھی دم بخود تھے۔

"اب ایک سودا اور کرنا ہے۔" محسن نے کھنکار کے کہا۔

"بولو بولو۔۔۔ اور کیا چاہیے۔۔۔ یہ مٹکے۔۔۔ یہ مالا۔۔۔ چمٹا ہے اور کشکول ہے۔" بڈھا بولا۔

"نہیں! یہ سب آپ کو مبارک ہو۔۔۔ یہ گدھے۔۔۔"

"یہ گھوڑے ہیں بابو۔۔۔" اس نے تصحیح کی۔

"اچھا! اتنے پورٹیبل۔۔۔ میرا مطلب ہے بالکل گھوڑے کا خلاصہ لگتے ہیں۔" محسن نے ایک کامیاب شوروم کے مالک کی طرح کہا جو کسی کی پرانی گاڑی لیتے وقت اس میں صرف خامیوں کا شمار کرتا ہے اور مالک شرمندہ ہوتا ہے کہ اب تک جس چیز کو وہ فخر سے گاڑی سمجھ کے استعمال کرتا رہا وہ تو گدھا گاڑی سے بھی زیادہ گئی گزری چیز تھی۔

"خیر یہ گھوڑے ہیں تو گھوڑے سہی۔۔۔ چار نول دو۔" محسن بولا۔ نوٹ محسن کے ہاتھ میں تھے۔ چنانچہ بڈھا دانت پیس کر گالی نہ دے سکا اور دانت نکالنے پر مجبور ہو گیا۔ "یہ چار سو کا ایک ہو گا۔"

"چلو اس کا بھی سودا ہوا۔" محسن نے سولہ نوٹ گنے۔ بڈھے کی طرف بڑھائے اور پھر اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ "یہ ریڑھا بھی تمھارا ہے؟"

"ہاں جی۔۔۔ لینا ہے؟ آٹھ سو ہوں گے۔" بڈھے نے نوٹوں کی طرف پھر ہاتھ بڑھایا۔

"یہ ہو گئے چوبیس۔۔۔ ٹھیک ہے۔" محسن بولا۔ "کچھ کپڑے۔۔۔ جیسے ان عورتوں نے پہن رکھے ہیں۔"

"یہ۔۔۔ یہ کپڑے۔۔۔" بڈھا بھونچکا رہ گیا۔ "پھر یہ کیا پہنیں گی؟"

"ان کو تم نئے کپڑے لا کر دے سکتے ہو۔" میں نے کہا۔ "دراصل ہم تھیٹر والے لوگ ہیں۔ ہمیں ایک فلم کے لیے یہ سب سامان درکار ہے۔ ہمارے پاس یہ تین ہزار روپے ہیں۔ ہمیں خانہ بدوشوں کی زندگی دکھانے کے لیے یہ سامان چاہیے۔"

"فلم کے لیے۔۔۔" بڈھا بولا۔ "ایک بار پہلے بھی فلم والے آئے تھے اور ہم سب کو لے گئے تھے۔ سب کو دس دس روپے ملے تھے۔"

"ہم بھی لے جائیں گے اور پچاس پچاس دیں گے۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے جی۔۔۔ سب مل جائے گا آپ کو۔" وہ بولا۔

"ہاں!" میں نے کہا۔ "آدھا گھنٹہ گھنٹہ ہم انتظار کر لیں گے۔"

تقریباً پون گھنٹے میں وہ سب سامان ریڑھے پر لاد دیا گیا جو ہم نے مانگا تھا۔ اگر اس بڈھے نے ہماری مدد نہ کی ہوتی تو ہم ریڑھے کو ڈرائیو کرکے نہیں لے جاسکتے تھے۔ خصوصاً اس صورت میں کہ تین فاضل گھوڑے بھی ساتھ ہوں۔ اس نے دو گھوڑوں کو بڑی مہارت سے آگے جوتا اور دو کو پیچھے باندھ دیا۔ ہم سامان کے اوپر بیٹھے اور وہ شہر کی مختلف سڑکوں سے گزار کے شام پانچ بجے تک ہمیں گھر کے قریب پہنچانے میں کامیاب ہوگیا۔ خیریت گزری کہ راستے میں کوئی حادثہ نہیں ہوا اور کوئی ٹریفک سارجنٹ ملا بھی تو متوجہ نہیں ہوا۔ ہماری جیب میں تو اتنے پیسے بھی نہیں تھے کہ اس سے گلوخلاصی کی فیس ادا کرسکتے۔ ابھی ہم اپنے گھر سے آدھا میل کے فاصلے پر تھے کہ مجھے ایک کھلا میدان سا نظر آیا۔ میں نے اس جگہ کو مناسب سمجھتے ہوئے گھوڑا گاڑی روک لی۔ ڈرائیور سے کہا کہ ہماری فلم کا سیٹ اسی جگہ لگایا جائے گا۔ وہ اگر چاہے تو ایک ہفتے بعد اپنے قبیلے کو لے کر صبح نو بجے تک یہاں پہنچ جائے۔ اس نے اپنی فقیرانہ بولی اب ترک کر دی تھی اور ہم سے عام فہم زبان میں اور سیدھے صاف لہجے میں بات کر رہا تھا۔

جب وہ چلا گیا تو میں نے دو گھوڑوں کی باگ ڈور سنبھالنے کی کوشش کی اور اس تجربے میں ناکام رہا۔ وہ اشاروں کی زبان سمجھنے والے جانور تھے اور میرے اشارے ان کو کنفیوز کر رہے تھے چنانچہ ایک چلتا تھا تو دوسرا رک جاتا تھا۔ ایک دائیں طرف جانے کے لیے مڑنے لگتا تو دوسرا بائیں سمت چلنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس طرح گاڑی نہیں چل سکتی تھی چنانچہ میں نے اتر کے ان دونوں کی لگام تھامی اور آگے آگے پیدل چلنا شروع کیا۔ محسن پیچھے رہا اور باقی دو گھوڑوں کو ہنکاتا رہا۔ چھ بجے ہم اس خانہ بدوشی کے جملہ اسباب کے ساتھ کوٹھی کے ویران احاطے میں داخل ہوئے تو مجھے بہرام دادا کی بیوی کی گاڑی نظر آئی۔ "یہ کون آگیا سکندر؟" محسن نے گھبرا کے کہا۔

"فکر کی بات نہیں۔" میں نے کہا۔ "تو ان گھوڑوں کو یہاں باندھ دے۔ ان کے چرنے کو گھاس کافی ہے۔ ریڑھا پیچھے کی طرف لے جانا۔ سامان اسی پر رہے۔"

"یہ سب تو کرلوں گا، میں..."

"بہرام دادا کی بیوی آئی ہے۔" میں نے کہا۔ "شاید شہلا کو چھوڑنے اور ہمارا ٹھکانا دیکھنے آئی ہوگی۔"

اندر پہنچنے کے بعد میں نے بہرام دادا کی بیوہ کو ایک پرانی کرسی پر بیٹھے دیکھا۔ اس کے سامنے ٹیڈی پریشان اور نازو چپ بیٹھی تھی۔ غالب اور ٹیڈی کچھ فاصلے پر متفکر کھڑے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ عورت چونکی۔ اس نے ابھی تک لباس نہیں بدلا تھا مگر میرے جسم پر سارجنٹ کی وردی نہیں تھی۔

میں نے اسے سلام کیا اور اس کی بیٹی کی خیریت پوچھی۔

"وہ ویسی ہی ہے۔" وہ بولی۔ "کل رات بیماری کے دورے کے بعد اس کی حالت سنبھل گئی تھی۔"

"شہلا پولیس کی تحویل میں ہے۔" غالب نے کہا۔

"پولیس کی تحویل میں؟" میں نے اور محسن نے بیک وقت کہا۔

"بے چاری لڑکی۔" بہرام دادا کی بیوہ نے افسوس سے کہا۔ "آئی تو تھی جولی کی جان بچانے کے مشن پر... میری بیٹی کا نام جولیٹ مگر ہم جولی کہتے ہیں۔ مجھے بہت دکھ ہے کہ اسے گرفتار کرلیا گیا۔"

"لیکن کس جرم میں؟" میں نے کہا۔ "کیسے گرفتار کرلیا؟"

"جرم اس نے تو کوئی نہیں کیا تھا؟" غالب بولا۔ "شہلا ہمارے ساتھ تھی... مجرموں کی ساتھی تھی۔"

محسن ابھی تک اس غیر متوقع صدمے سے سُن کھڑا تھا۔

"یہ پولیس کو کیسے معلوم ہوا...؟"

"غلطی میری بھی تھی۔" جولی کی ماں سر جھکا کے بولی۔ "خدا مجھے معاف کرے۔ لیکن تم نے مجھے رات کو روکا نہ ہوتا تو میں تو شاید یہ سب نہ ہوتا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ تم کون ہو۔ تم تو ایک سارجنٹ کی وردی پہن کر میری گاڑی کے سامنے آگئے تھے۔ اور تم نے مجھے بتایا ہی نہیں تھا کہ تم..." وہ چپ ہوگئی۔

"تم نے موقع ہی کب دیا تھا... کیا ضرورت تھی تمہیں فرار ہونے کی؟" میں نے برہمی سے کہا۔

"دیکھو! وہ میری غلطی نہیں تھی۔ میں بہت پریشان تھی۔ وہاں تم نے اس شرابی سے مار پیٹ شروع کردی تھی۔" وہ بولی۔ "میں اس جھگڑے میں نہیں پڑسکتی تھی۔ مجھے پہلے ہی دیر ہو رہی تھی۔ میں نروس بریک ڈاؤن کا بہت جلد شکار ہو جاتی ہوں۔ جولی کی بیماری نے میرا حوصلہ چھین لیا ہے اور میری قوت برداشت ختم کردی ہے۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ پولیس والا مجھے تھانے لے جائے گا اور وہاں جو سوال جواب ہوں گے ان کا مجھے اندازہ تھا۔ وہ مجھے بلا وجہ بٹھائے رکھتے... ذلیل کرتے اور پھر پیسہ مانگتے جو آجکل ویسے ہی میرے پاس نہیں ہے۔ جو تھا وہ پہلے ہی بیماری میں لگ گیا اور میرے پاس زیادہ تھا بھی نہیں۔ جولی کا باپ جتنا چھوڑ کر مرا تھا اس میں سے ہم کئی سال سے خرچ کرتے آ رہے تھے۔ اس میں تو قارون کا خزانہ بھی پورا نہ ہوتا۔ کمانے والا کوئی نہیں تھا۔ میں سروس کرسکتی تھی۔ پڑھا سکتی تھی۔ اسٹینوگرافر بننے کے لیے میں نے ٹائپ اور شارٹ ہینڈ سیکھی تھی اور اسپیڈ بھی بنالی تھی لیکن میں کیا کروں کہ ہر جگہ بہرام دادا کا حوالہ میری راہ میں حائل ہو جاتا تھا۔ مجھے نوکری اس لیے نہیں ملتی تھی کہ میں ایک بدنام شخص کی بیوی رہی تھی۔ میں خود بدنام نہیں تھی۔ کوئی بھی مجھ سے نہیں پوچھتا تھا کہ تم کس کی بیٹی ہو۔ میری شرافت کی بہرام دادا قسم کھاتا تھا۔ اس سے شادی کرکے گویا میں نے خاندانی شرافت بیچ دی تھی۔ سب فرض کرلیتے تھے کہ میرے یار آشنا وہی ڈاکو بدمعاش ہوں گے جو جرم دلوانے کے ساتھی تھے اور یہ ساتھی اب بھی آتے جاتے رہیں گے تو بڑی خرابی ہوگی۔ کوئی یہ نہیں سوچتا تھا کہ وہ ساتھی اگر ساتھ نبھانے تو میں یہ چار چھ سو کی نوکری کیوں ڈھونڈتی پھرتی... خیر معاف کرنا میں کیا کہنا چاہتی تھی اور کدھر نکل گئی۔"

"تم اب فکر مت کرو۔" استاد ٹیڈی نے اچانک انتہائی جذباتی لہجے میں یوں کہا کہ ہم بھی چونک پڑے۔ "تمہاری مشکلات کے دن پورے ہوگئے۔ اب تمہیں کسی بات کی پریشانی نہیں ہوگی۔ ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔"

"ہاں! ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔" میں نے کہا۔ "خدا نے چاہا تو جولی بھی ٹھیک ہوجائے گی اور دوسرے مسائل بھی حل ہوجائیں گے۔ تم یہ بتاؤ کہ شہلا تک پولیس کیسے پہنچ گئی؟"

"میں وہی بتانے والی تھی۔" جولی کی ماں بولی۔ "تم جس شرابی سے الجھ پڑے تھے..."

"وہ شرابی مجھ سے الجھا تھا۔" میں نے کہا۔

"ہاں، یہی مطلب تھا میرا۔" وہ معذرت آمیز لہجے میں بولی۔ "اس نے میری گاڑی کا نمبر نوٹ کرلیا تھا۔ اور میں سمجھتی ہوں۔ اس نے مجھے کوئی بدقماش عورت سمجھا ہوگا۔ میرا حلیہ بھی تو ایسا ہی رہتا ہے لیکن یہ لباس تو میں شروع سے پہنتی آئی ہوں۔ میں کرسچین ہوں اور اسکرٹ بچپن سے پہنا میں نے۔ بال میں نے ہمیشہ کٹوائے۔ بہرام دادا نے تو کبھی نہیں ٹوکا مجھے۔ اب تو میں میک اپ نہیں کرتی، پہلے کرتی تھی۔ اس نے کبھی نہیں کہا کیتھی۔ کیتھرین میرا نام ہے مگر سب کیتھی کہتے ہیں۔ اس نے کسی بات پر مجبور نہیں کیا مجھے۔ ہی واز اے گریٹ مین۔ دنیا کے لیے وہ مس فٹ تھا۔ اسے کسی نے نہیں سمجھا اور اسی لیے وہ سیدھے راستے سے ہٹ گیا باغی ہوگیا۔ اس نے مجھ سے محبت کی اور شادی کی۔ میرے باپ کی دولت کو لات ماردی مگر مجھ سے نہیں کہا کہ اپنا مذہب بھی چھوڑ دو۔ میں نے اسے بتادیا تھا کہ میں بس کٹر رومن کیتھولک ہوں۔ اس نے کہا کہ کیا فرق پڑتا ہے۔ ہم تو بس میاں بیوی ہیں۔ تمہارا اور ہمارا خدا تو وہی رہے گا اور حضرت عیسیٰ کے بارے میں ہمارا عقیدہ بھی ہے کہ ان کو آسمان پر اٹھا لیا گیا۔ گھر میں ہمارا اپنا اپنا مذہب دوسرے کے لیے کوئی پریشانی تو پیدا نہیں کرسکتا۔ کوئی مذہب پریشانی پیدا کرنے اور نفرت پھیلانے یا نفاق سکھانے کے لیے آیا ہی نہیں۔ ہمارا گھر تو عام سا گھر اور مسائل بھی وہی ہیں جو کسی بھی گھر کے مسائل ہوسکتے ہیں۔ تم ہاؤس وائف ہو۔ اپنے فرائض کو سمجھتی ہو تو کافی ہے۔ بیوی وفادار اور با اخلاق ہونا چاہیے۔ یہ ہر مذہب کی تعلیم ہے۔ میں اتوار کو چرچ چلی جاتی۔ میں بدبخت جیسے کو بھی مسجد نہیں جاتا تو مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ تم میرے ساتھ عید کرلینا اور میں تمہارے ساتھ کرسمس میں شریک رہوں گا۔ آئی ایم سوری۔ میں پھر بھول گئی کہ تم نے کیا پوچھا تھا۔ میں اس آدمی کی بات کر رہی تھی جب مجھے غلط قسم کی عورت سمجھ کے رکا تھا۔ غلط آدمی وہ خود تھا۔ اس نے سمجھا ہوگا کہ مجھے پولیس نے آوارہ گردی میں دھر لیا ہے۔ یا شاید خود یہ پولیس والا... خیر... اسے مایوسی ہوئی اور اس نے مار کھائی۔ نمبر اس نے بہرحال دیکھ لیا تھا اور جب دوسرا آدمی جو انڈرویر پہنے دوڑتا ہوا آیا تھا اور جس کے متعلق مجھے بعد میں پتا چلا کہ وہ اصلی پولیس سارجنٹ تھا۔ تم نے اسے مار کے اس کی وردی کیوں چھینی تھی؟"

"اس سوال کا جواب میں پھر کبھی دوں گا۔" میں نے کہا۔

"خیر وہ اصلی سارجنٹ تو وہیں رہ گیا تھا اور تم اس شرابی کی گاڑی لے کر بھاگ گئے تھے۔" کیتھرین نے کہا۔ "اسی سے ساری گڑبڑ پھیلی۔ وہ ایک اسمگلر کا لڑکا تھا۔ باپ سے زیادہ بدکردار لیکن با اثر۔ اس وقت تو وہ پولیس کے ساتھ چلا گیا مگر آدھے گھنٹے میں باپ آپہنچا۔ یہ باتیں مجھے اسپتال میں آج معلوم ہوئیں۔ وہ بیٹے کو لے گیا اور پولیس کو اس کی گاڑی چوری ہونے کی رپورٹ لکھنا پڑی۔ اخبار میں جو خبر ہے وہ فضول اور نامکمل ہے۔ اس میں نہ کسی کا نام ہے اور نہ کار کی چوری کا ذکر۔ یہ سب پولیس والوں کی چال تھی۔ انھوں نے میری کار کا نمبر لے کر معلوم کرلیا گاڑی کس کی ہے اور پھر میرے گھر پہنچے۔ ان کا خیال تھا کہ تم میرے ساتھی ہو۔ تم میرے ساتھ کار میں بیٹھے تھے اور میری خاطر تم نے ایک شخص کو مارا بھی تھا چنانچہ میں ان کو تمہارے بارے میں بتا سکوں گی۔ صبح گیارہ بجے وہ اسپتال آپہنچے۔ میں جانتی تھی کہ انکار کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ میری نہیں مانیں گے کہ میں تمہیں نہیں جانتی اور تم سے چند منٹ پہلے ہی ملی تھی۔ تمہارا نام تک نہیں جانتی اور تم کو پہچانتی بھی نہیں۔ وہ یقیناً مجھے تھانے لے جا کر اقرار کرانے کے وہ سب طریقے آزماتے جن سے میں اچھی طرح واقف ہوں۔ معاملہ بہت سنگین تھا۔ ان کے ایک افسر کی سخت بے عزتی ہوئی تھی۔ تم نے اسے مارا اور اس کے کپڑے اتار کے اسے اندھیری جھاڑیوں میں پھینک گئے۔ پھر آئے اور اس کی نظروں کے سامنے دوسری واردات کرکے بھاگ گئے۔ اس کی ایک گولی نہیں لگی تمہیں۔ وہ اپنی ناکامی پر سخت مشتعل تھا۔ اگر وہ مجھے تفتیش کے لیے لے جاتے تو اپنی ناکامی کا سارا غصہ مجھ پر اتارتے۔ اور خواہ وہ مجھے مار مار کے ختم کردیتے مگر مجھ سے تمہارا نام پتا معلوم کرنے میں ناکام رہتے۔ جو بات مجھے معلوم ہی نہیں تھی وہ میں ان کو کیسے بتاتی۔ میرا سچ ہی میری جان لے لیتا۔ یہ سب سوچ کے میں نے اسپتال کے ایک ... سے بات کی۔ وہ بہت نیک دل آدمی ہے۔ نیک دل آدمی سوائے خدا کے کسی سے نہیں ڈرتا اور اپنے ضمیر کو زندہ رکھتا ہے۔

مسلمان ہے اور اگر تنگ نظر ہوتا تو شروع سے میرے ساتھ بے غرض ہمدردانہ رویہ نہ رکھتا۔ وہ ایسا آدمی تھا جس کی مدد نے مجھے بہت سہارا دیا۔ اس نے میری ساری بات سُنی اور سمجھی۔ یہ میری بیوقوفی ہے یا کمزوری کہ جب کوئی مجھ سے ہمدردی کرتا ہے تو میں ایسا دُکھڑا رونے بیٹھ جاتی ہوں۔ مسلسل صدمات اور آزمائشوں نے مجھے کمزور کر دیا ہے۔ زیادہ لوگ تو دکھوں کے زخم دینے والے ملتے ہیں۔ اسی لیے ایسا ہوتا ہے کہ کبھی کوئی میرے غم کو سمجھتا ہے تو میں اپنا ہر دکھ اور ہر زخم اسے دکھانے لگتی ہوں۔ اس ڈاکٹر کو میں نے بتایا کہ ایک پولیس والا مجھے اپنے ساتھ تھانے لے جانا چاہتا ہے۔ میں نے ڈاکٹر کو بتا دیا کہ میرے ساتھ کیا حادثہ ہوا تھا اور اب مجھے کیا ڈر ہے۔ اس نے میری بات سمجھ لی اور پولیس والے کو وارڈ سے نکال دیا مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ ذرا سی دیر میں وہ سارجنٹ خود آ پہنچا۔ وہ دو پولیس والوں کے ساتھ مجھے وارڈ میں گھس گئے اور میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال کے لے جانے کی نیت رکھتا تھا مگر وارڈ میں اس کو میرے بجائے ڈاکٹر سے بات کرنا پڑی۔ ڈاکٹر نے مجھے وارڈ میں ڈیوٹی آفیسر کے کمرے میں بٹھا دیا تھا اور کہا تھا کہ جب تک پولیس نہ چلی جائے میں باہر نہ آؤں ورنہ صورتِ حال بگڑ جائے گی۔ وہ زبردستی یہاں آیا تو تمہیں گھسیٹ کر لے جائے گا۔ مجھ سے مار پیٹ ہوگی اور معاملہ اتنا بڑھ جائے گا کہ ڈاکٹر ہڑتال کر دیں گے۔ اخبارات طوفان کھڑا کر دیں گے لیکن اس سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ میں اس کمرے میں بیٹھی سنتی رہی۔ تھانیدار بہت گرم ہوا مگر ڈاکٹر نے تحمل سے بات کی اور کہا کہ جولی کی ماں کل دوپہر کے بعد آئی تھی اور پوری رات یہاں رہی کیونکہ اس کی بیٹی جولی کی حالت اچانک بگڑ گئی تھی۔ ہم نے اُسے فون کر کے بلوایا تھا۔ وہ یہ بات ماننے پر تیار نہیں تھا اور جانتا تھا کہ ڈاکٹر مجھے بچانے کے لیے جھوٹ بول رہا ہے۔ جب اس نے شور کیا تو ڈاکٹر نے کہا کہ تھانیدار صاحب یہ وارڈ ہے۔ یہاں آہستہ بات کرو ورنہ یہاں سے نکل جاؤ۔ اس نے ڈاکٹر کو بھی دھمکی دی کہ تم مجرم کو چھپا رہے ہو اور یہ بھی جرم ہے۔ ڈاکٹر نے سینئر ڈاکٹر کو طلب کر لیا اور ذرا سی دیر میں علاقہ ایس پی کا فون آ گیا۔ انسپکٹر کو واپس جانا پڑا۔ ایک ڈاکٹر اور ایک سینئر سرجن کو خود ایس پی جھوٹا نہیں کہہ سکتا تھا تاہم انسپکٹر اپنے یقین کی وجہ سے ٹلا نہیں۔ اس نے ساتھ آنے والوں کو وارڈ کے دونوں جانب باہر کھڑا کر دیا کہ وہ آنے جانے والوں پر نظر رکھیں۔ کیتھرین باہر نکلے تو اس کا تعاقب کریں اور کوئی جولی سے ملنے آئے تو اس سے بھی پوچھ گچھ کریں۔ یہ جاننے کے بعد کہ میں کون ہوں وہ اپنی کامیابی کے بارے میں بہت پُرامید تھا۔ اس نے مجھ سے صاف کہا تھا کہ وہ بدمعاش بھی تیرے شوہر کا یار کوئی ڈاکو تھا جو اب تیرا یار ہے۔ تو اسے چھپا رہی ہے اور یہ ڈاکٹر تجھے بچا رہا ہے مگر میں کسی کے روکے رُکنے والا نہیں ہوں۔ تمھیں ... ہی دم لوں گا۔ ابھی وہ وہیں موجود تھا کہ شہلا آ گئی اور ... یا جولی کو پہچانتی نہیں تھی اس لیے وہ لوگوں سے پوچھ ... پہنچی تھی۔ اس کی اطلاع فوراً انسپکٹر کو مل گئی۔ ایک ... نے بتایا کہ ابھی ابھی ایک عورت جولی کی خیریت ... آئی ہے مگر عجیب بات یہ ہے کہ نہ اسے جولی کا نام ... نہ اس کا بیڈ نمبر اور وارڈ۔ وہ عورت برقعے میں ہے ... وضع کا ہے مگر عورت جوان، خوب صورت اور فیشن ... وہ بہت خوش ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ عورت تمھاری ... اور تم نے خود آنے کے بجائے اسے بھیجا ہے تاکہ تشویش ... ہو تو پتا چل جائے۔ وہ وارڈ کے باہر مستعد کھڑا رہا اور ... شہلا نکلی اس نے آگے بڑھ کے راستہ روک لیا۔ شہلا ایک ... اندر بیٹھی رہی تھی اور میں نے بھی اس سے بات کی تھی ... نے مجھے تمھارے متعلق بتایا۔ تم سب کے متعلق...“

”ہمارے متعلق کیا بتایا اس نے؟“ محسن بولا۔

”کوئی ایسی ویسی بات نہیں۔“ کیتھرین بولی۔ ”اس نے ... کہ رات کو انسپکٹر کی وردی میں میرا بھائی تھا اور اس نے جو ... تھا مجبوری میں کیا تھا۔ مجبوری کی نوعیت اس نے نہیں بتائی ... نے یہ بھی کہا کہ میرے تین بھائی ہیں اور میں شادی شدہ ہوں ... نے یہ بھی بتایا کہ دو بھائیوں کی بہت جلد شادی ہو جائے ... ان کی نسبت طے پا چکی ہے لیکن میں نے نام پوچھے تو ... کسی کا بھی نام بتانے سے انکار کر دیا۔ یہ بھی نہیں بتایا کہ وہ ... کہاں رہتی ہے۔ ماں باپ کون ہیں اور شوہر کیا کرتا ہے ... لگی کہ آنٹی! بس آپ کا کام ہو جائے گا۔ آپ اور کچھ نہ پوچھیں ... کسی کو کچھ نہ بتائیں۔ ہم خود آپ سے رابطہ رکھیں گے۔ اس ... آپ کا پتا درکار ہے۔ میں نے اسے پتا بتا دیا مگر اس کی ... نے مجھے الجھن میں ڈال دیا۔ اس کا رویہ بے حد پُراسرار ... کوئی انسان نیک کام کرنا چاہے تو اسے اتنی رازداری برتنا ... نہیں ہوتی۔ بے شک کچھ لوگ گمنام رہ کے نیکی کرتے ہیں ... اپنی تشہیر سے گریز کرتے ہیں لیکن کسی نہ کسی کو تو معلوم ہوتا ہے ... کہ وہ کون ہیں۔ وہ مجھے تو سب کچھ بتا سکتی تھی اور کہہ سکتی تھی ... ہم لوگ پبلسٹی نہیں چاہتے مگر میں نے محسوس کیا کہ وہ خوف زدہ ... اپنی شناخت نہ کرانے کا مقصد وہ نہیں ہے جو میں سمجھ رہی ... وہ اپنے بارے میں کچھ بتاتے ہوئے ڈرتی ہے۔ کل تمھارا ... بھی عجیب تھا اور تمھارے بارے میں معلوم ہونے والی ... مزید شک میں ڈال رہی تھیں۔ تاہم میں نے شہلا سے ... کی۔ خدا نے اسے رحمت کا فرشتہ بنا کے بھیجا تھا کہ ... کی جان بچ جائے۔ اب وہ کچھ بھی ہوں۔ اس کے بھائی ... ڈاکو ہوں تو مجھے کیا۔ اتنی بڑی نیکی کے بعد نہ ان سب ...

... بخشش ضرور قبول کرے گا۔ دنیا کا قاعدہ مختلف ہے۔ ... ایک بہت بڑی نیکی سے بھی ایک بہت چھوٹے جرم ... کی معافی نہیں ملتی جب تک کہ قانون اسے بری نہ کرے۔ میں ... نے مطاہرے سے گریز کیا، یہ نہیں رحمت کا ... کر نہ چلا جائے اور پھر میں تمام عمر جولی کی قبر پر ... کہ میں نے نیکی کے جذبے کا خون اپنے شک سے ... اور جولی مر گئی۔ بہرام دادا کی بیوی نے اچھائی برائی سب دیکھی ... اس کو معلوم تھا کہ سب اچھے نظر آنے والے اچھے نہیں ... اور جن کو بُرا سمجھا جاتا ہے وہ بعض اوقات اچھوں سے ... ہوتے ہیں۔ عذاب اور ثواب، نیکی اور بدی اس دنیا کا ... نہیں، خدا کا حساب ہے جسے صرف وہی جانتا ہے۔ میں ... مطمئن اور اتنی خوش تھی کہ جب شہلا چلی گئی تو میں رو پڑی ... میں نے جولی سے کہا کہ ہم بہت خوش نصیب ہیں بیٹی کہ ... دعا خدا نے قبول کر لی اور ہماری مایوسی کو امیدیں بدل ... ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ مجھے شہلا کے گرفتار ہونے کا ... ملا۔ وہ اچانک پولیس کے ہاتھ پڑنے سے گھبرا گئی تھی اور ... نے جو جواب دیے اس سے انسپکٹر کا شک بھی یقین میں ... گیا۔ وہ شہلا کو اپنے تھانے لے گیا۔ میں بہت پریشان ہوئی کہ ... اس کے بھائیوں کو کیسے اطلاع دوں اور اسے کیسے بچاؤں ... کے بغیر میری امید کا چراغ بھی روشن نہیں رہ سکتا تھا... میں ... پھر ڈاکٹر سے بات کی تو اس نے کہا کہ کیتھرین! میں نے ہمیشہ ... مدد کی ہے کیونکہ تم مصیبت زدہ ہو لیکن وہ عورت ... خود جانتی تک نہیں ہو اور جو پولیس کے خیال میں کسی ... مجرموں کے گروہ سے تعلق رکھتی ہے اُسے میں کس طرح ... سکتا ہوں اور میں بچانے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتا۔ ... نے کہا کہ وہ مجرموں کے کسی گروہ کی عورت نہیں تو وہ بولا کہ ... گناہ ہوگی تو خود ہی چھوٹ جائے گی۔ مایوس ہو کے میں نے اپنے ... کچھ پرانے دوستوں سے رابطہ قائم کیا جو وکیل تھے اور جب ... بہرام دادا زندہ رہا وہ اس کے مقدمات کی پیروی کے لیے ... فیس وصول کرتے رہے تھے۔ ان سب پر میں اعتماد ... کر سکتی تھی کیونکہ میں ان کی فطرت سے واقف تھی۔ بعد ... مجھے ان کی خدمات کی ضرورت پڑی تھی نہ ان کو مجھ سے ... کی۔ کاروباری تعلق تھا نا۔ پھر بھی میں نے کوشش ... خدا کا شکر ہے کہ کسی حد تک کامیاب رہی۔ ایک ... تجربہ کار سینئر وکیل نے کہا کہ وہ میرے ساتھ تھانے ... جا رہا ہے۔ وہ مجھے اسپتال سے اپنے ساتھ لے گیا اور اس ... میں تھانے والے بھی شرافت سے بات ...

”... کتنی دیر بعد تھانے پہنچی تھیں؟“ میں نے کہا۔

”تقریباً ایک گھنٹے بعد۔ وہ لوگ شہلا کو ڈرا دھمکا رہے تھے کہ وہ اس شخص کا نام بتائے جس نے اسے بھیجا تھا اور جو گزشتہ رات ٹریفک سارجنٹ کی وردی اتار کے خود پہنے پھر رہا تھا۔“ کیتھرین نے کہا۔ ”لیکن شہلا کی رٹ وہی تھی کہ نہ اسے کسی نے بھیجا ہے اور نہ وہ کسی ایسے شخص کو جانتی ہے۔ اس کے پاس دو باتوں کا جواب البتہ نہیں تھا۔ ایک یہ کہ جس لڑکی کو وہ نہ جانتی تھی نہ پہچانتی تھی اس سے ملنے کیوں گئی تھی؟ دوسری یہ کہ اس کا گھر کہاں ہے۔ وہ شہلا کی یہ بات ماننے پر تیار نہ تھے کہ نہ اس کا کوئی عزیز رشتے دار ہے اور نہ گھر، چنانچہ وہ اسے سخت دہشت زدہ کر رہے تھے کہ انھیں سب اگلوانا آتا ہے اور ان کے پاس ایسے طریقے بھی ہیں کہ وہ صرف پانچ منٹ میں سب بک دے گی۔“

”کیا انھوں نے شہلا کو مارا تھا؟“ محسن خلا میں دیکھتے ہوئے بولا۔

”ایک آدھ تھپڑ تو مارا ہی تھا۔ نشان اس کے گالوں پر نظر آ رہے تھے اور وہ رو بھی رہی تھی۔“ کیتھرین بولی۔ ”لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوا تھا۔ وہ ایس ایچ او کے کمرے میں تھی جہاں وہ ٹریفک سارجنٹ بھی موجود تھا۔ اور بہت گندی گالیاں بک رہا تھا۔ بار بار کہہ رہا تھا کہ اسے میرے حوالے کر دو۔ میں اسے بتلاؤں گا کہ اس کے خصم نے تو صرف میری وردی اتاری تھی، میں عزت کیسے اتارتا ہوں اور کھال کیسے اتارتا ہوں۔ اگر ہم نہ پہنچتے تو وہ سب کچھ کرتے۔ ان کی اس قسم کی تفتیش آدھی رات کے بعد شروع ہوتی ہے۔ شہلا کے ساتھ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ اس کا کوئی والی وارث بھی تھانے نہیں پہنچا تھا اور وہ ہر قسم کے تشدد کا نشانہ بن سکتی تھی۔ وہ بہت ڈری ہوئی تھی۔ پہلی بار تھانے جا کے تو مرد بھی وحشت زدہ ہو جاتے ہیں اور وہاں ایک سے ایک سفاک دل والا قانون کا نام لے کر سب کچھ کرنے کا مجاز ہے۔ اس وقت بھی شہلا کے سامنے ایک کونے میں انھوں نے کسی چور کے کپڑے اتار کے اسے لمبا لٹا رکھا تھا۔ اس کے مُنہ میں کپڑا ٹھونس کر دو کانسٹیبل قسم کے قصائی اس کو دبائے بیٹھے تھے اور تیسرا چمڑے کی پٹی سے اس کو بُری طرح مار رہا تھا مگر وہ نہ چیخ سکتا تھا اور نہ ان کے چنگل سے رہائی پا سکتا تھا۔ وہ ہر وار پر وہیں کرب سے بل کھاتا تھا...“

”شٹ اپ...“ محسن چلایا۔ ”مت سناؤ یہ سب مجھے اور یہ بتاؤ کہ تم نے وہاں جا کے کیا کیا؟“

”تم اس کے شوہر ہو نا۔“ کیتھرین بولی۔ ”آئی ایم سوری۔ لیکن بات یہ ہے کہ میں پہلے، جب میرا شوہر زندہ تھا، تھانے جاتی ہی رہتی تھی۔ مار بھی بہت کھائی تھی میں نے اس لیے اب میں ڈرتی نہیں۔ پھر وہ وکیل تھا میرے ساتھ۔ اس کو دیکھتے ہی سب سیدھے ہو گئے۔ اس چور کو اندر لے گئے اور تھانیدار نے مجھے

دیکھ کر بُرا سا منہ تو بنایا مگر کچھ بولا نہیں۔ وکیل نے کہا کہ اس لڑکی کو اسپتال سے کس جرم میں گرفتار کر کے لائے ہو۔ تھانیدار نے کہا کہ اس کا ایک خطرناک گروہ سے تعلق ثابت ہوتا ہے اور ہم ابھی کچھ بتانے کے پابند نہیں۔ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر اسے مجسٹریٹ کے سامنے پیش کر دیں گے اور اس کا ریمانڈ لے لیں گے۔ وکیل نے سمجھداری سے کام لیا اور کہا کہ ٹھیک ہے۔ لیکن اسے چند منٹ شہلا سے اکیلے میں بات کرنے کی اجازت دی جائے تو ممکن ہے اس سے فائدہ ہو۔ اس وقت تک شہلا نے اپنا نام نہیں بتایا تھا۔ تھانیدار ہنسنے لگا اور بولا کہ اچھا تو شہلا ہے اس کا نام۔ آپ اس کے شوہر کا نام بھی بتا دیں۔ یہ بھی بتا دیں کہ اس کے بھائی کون ہیں اور گھر کہاں ہے۔ وکیل نے کہا کہ سب بتا دیا جائے گا لیکن پہلے اسے شہلا سے بات کرنے کا موقع دیا جائے۔ تھانیدار اس چکر میں آگیا کہ شاید اب وہ اصل مجرم تک یعنی تم تک پہنچ سکے گا۔ میں نے موقع پاتے ہی شہلا سے تم لوگوں کا پتا پوچھا۔ وہ بہت پریشان تھی کہ کیا کرے۔ بہرحال میں نے اس کو تسلی دی اور اس وکیل نے بھی کہا کہ تم میری بیٹی کی طرح ہو اور میں نہیں چاہتا کہ تمہارے ساتھ کوئی زیادتی ہو۔ اس شہر میں تم کسی کو تو جانتی ہوگی۔ مجھے بتاؤ تاکہ میں اس سے مل لوں۔ اس نے پہلے ایک ایس پی کا نام لیا...۔"

"ایس ایس پی... ضامن رضوی؟" محسن نے چونک کر کہا۔

"ہاں، وکیل ان کو فون کرتے گیا مگر وہ نہ آفس میں ملے نہ گھر پر — تاہم اس نے پیغام دے دیا۔" کیتھرین بولی۔

"اوہ مائی گاڈ۔" محسن بولا۔ "کیسی بے وقوف لڑکی ہے۔"

"اس نے ٹھیک کیا۔" غالب بولا۔ "وہ اسی طرح محفوظ رہے گی۔"

"لیکن ہم تو محفوظ نہیں رہیں گے۔" محسن بولا۔

"تمہارا کیا خیال ہے شہلا ان کو ہمارا پتا بتا دے گی۔" "وہ کبھی ایسا نہیں کرے گی۔" میں نے کہا۔ "فائدہ صرف یہ ہوگا کہ اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کر پائے گا۔"

"ایس ایس پی صاحب اس کی رہائی کے احکامات کبھی صادر نہیں فرمادیں گے۔" محسن نے تلخی سے کہا۔

"مجھے معلوم ہے وہ شہلا کو زیرِ حراست رکھنے کے احکامات دیں گے۔" میں نے کہا۔ "مگر حراست میں رہ کے بھی شہلا محفوظ ہوگی۔"

"یہ تمہارا خیال ہے۔ جسمانی تشدد وہ چاہے نہ کریں تفتیش کے نفسیاتی دباؤ والے طریقوں کا استعمال ضرور کریں گے۔" محسن بولا۔

"تم لوگ میری بات تو سن لو... کی عدم موجودگی میں مجھے پھر موقع ملا۔ میں نے اس سے کہا کہ دیکھو! تم میرے ... امید بن کے آئی تھیں، کیا اب میں ناامید ہو جاؤں؟ یہاں سے واپس چلی جاؤں اور جولی کو یہ بتا دوں کہ جو ... سکتے تھے وہ اب کچھ نہیں کر سکتے۔ وہ کتنی مایوس ہوگی ... بولی کہ میں صرف آپ کو بتا سکتی ہوں۔ اس وکیل پر بھروسہ ... کر سکتی۔ یہ لوگ قانون پرستی کے چکر میں پڑ گئے تو ہم کہیں ... رہیں گے۔ میں نے کہا کہ خداوند یسوع مسیح کی قسم... کیتھرین ... کوئی کاٹ سکتا ہے مگر اس زبان سے وہ بات نہیں سن سکتے ... کو میں راز رکھنا چاہوں۔ پھر شہلا نے مجھے یہ پتا سمجھایا اور ... وقت ضائع کیے بغیر یہاں آگئی۔"

"وہ وکیل کہاں گیا؟" میں نے کہا۔

"وہ اپنے آفس چلا گیا۔" کیتھرین بولی۔ "میں نے اس سے ... کہ کل اگر ضمانت داخل کرنے کی ضرورت پیش آئی تو میں اسے ... کر دوں گی کہ وہ عدالت میں آجائے۔ لیکن وہ کہتا تھا کہ اگر ... ٹھیک کہتی ہے اور ایس ایس پی ضامن رضوی واقعی اس ... انکل ہیں تو پولیس کا باپ بھی اس کو باعزت طور پر چھوڑ ..."

"تم نے اسے اور کچھ تو نہیں بتایا؟"

"میں بہرام دادا کی بیوی ہوں۔" وہ بڑے فخر اور غرور سے ... "میں اس کے قابل نہ ہوتی تو وہ مجھ سے شادی نہ کرتا اور اس ... میں اپنے قابل نہ سمجھتی تو اس پر تھوک دیتی۔ لیکن میں نے اس ... باپ کی دولت پر تھوک دیا۔ وہ مر گیا... مٹی ہو گیا مگر میں ... کی وفادار ہوں۔ میں شادی کر سکتی تھی۔ مجھ سے شادی کے خواہش ... بھی بہت تھے آئی واز ویری بیوٹی فل۔"

"آج بھی آپ کسی سے کم نہیں ہیں۔" محسن بولا۔

"شٹ اپ بولڈے... تم آج مذاق کر سکتے ہو مجھ ..."

"اوہ نو! میں مذاق نہیں کر رہا تھا آنٹی۔" محسن خفت سے بولا۔

"اس وقت جو لوگ میرے آگے پیچھے پھرتے تھے ... سب کو میں نے دھتکار دیا تھا۔" وہ بولی۔ "پھر وہ میرے ... بن گئے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں زندگی کی آخری سانس تک بہرام دادا کی ہو رہوں گی۔ وہ نہ سہی اس کی چھوڑی ہوئی نشانی ... اس کی یادیں تو ہیں۔ وہ سب گِدھ تھے۔ لالچی اور مردار خور ... کو یقین تھا کہ بہرام دادا کے پاس کروڑوں ہوں گے۔ نقد ... سونا چاندی، ہیرے جواہرات۔ اس نے عمر بھر میں جتنا کمایا ... وہ سب ہوگا۔ شاید اس سے زیادہ ہی ہوگا۔ وہ سب کا ... تھا۔ کچھ لوگ سردار بننے کے لیے ہی پیدا ہوتے ہیں اور ان ... ہوتے کوئی دوسرا سردار بن ہی نہیں سکتا۔ وہ میرا حصہ رکھتا ... خریزی مجاوے کے مطابق۔ اور کیوں نہ رکھتا۔ وہ تھا بھی ... میں اس کو فرشتہ ثابت نہیں کر رہی ہوں، کیونکہ وہ میرا شوہر تھا ... تھیک ہے وہ ڈاکو تھا مگر وہ خود کو ڈاکو مانتا تھا۔ کھلم کھلا ... ڈالتا تھا۔ دن دہاڑے لوٹتا تھا اور ان کو جو درحقیقت زیادہ ... ڈاکو تھے مگر سفید پوش تھے۔ اسمگلر، کسٹم کے بدعنوان افسر اور رشوت ... خور پولیس والے۔ ذخیرہ اندوز اور ٹھیکیدار جو ریت کی دیواریں کھڑی ... کرتے تھے اور سیمنٹ کے ٹینڈر دُگنے دام پر بھرتے تھے۔ ... بڑے عزت دار اور اعلیٰ عہدوں والے... جو کہیں صدارت ... کرتے تھے کہیں مہمانِ خصوصی ہوتے تھے۔ کوئی نہیں پوچھتا تھا ... ان کے پاس یہ دولت کہاں سے آئی جس میں سے وہ عطیات ... دیتے ہیں۔ ان کی چمکتی دمکتی کاروں کا ماڈل ہر سال کیسے بدلتا ہے۔ ... ان کی کتنی کوٹھیاں ہیں۔ کتنے ناموں سے کتنے اکاؤنٹ ہیں اور ... ان میں کتنا پیسہ ہے۔ اور کیا ان کی ساری عمر کی تنخواہ کا ٹوٹل ان ... کی ایک کوٹھی کی قیمت خرید کے برابر بھی ہوتا ہے؟ وہ سب ... بھی ڈاکو تھے۔ بزدل۔ قانون کے ڈر سے تھر تھر کانپنے والے۔ ... اپنی کرپشن کے چھاپوں سے خوف زدہ رہنے والے۔ سات پردوں ... میں چھپ کر سرکار کے خزانے پر یا پبلک کی جیب پر ڈاکا ... ڈالنے والے۔ بہرام دادا ان سے زیادہ بڑا آدمی تھا۔ اس کا ظاہر ... اور باطن ایک تھا۔ اس میں منافقت نہیں تھی۔ اس نے لوٹ ... میں بہت مال کمایا مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اس نے سب ... میں برابر بانٹا۔ اور جو اپنا حصہ بنا اس میں سے بہت کم بچایا۔ وہ ... مال بچا بھی کہاں ہے۔ وہ رابن ہڈ مشہور نہیں ہوا مگر وہ تھا رابن ... ہڈ ہی۔ تم کیا جانو۔ کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ اس کی مدد سے کتنی ... غریب لڑکیوں کو جہیز ملا۔ کتنی بیواؤں کو سر چھپانے کے لیے ایک ... چھت کا سایہ ملا۔ کتنے بچوں کے تعلیمی اخراجات پورے ہوئے۔ ... کمال تو یہ ہے کہ وہ لوگ بھی اسے نہیں جانتے جن کے لیے اس ... نے سب کچھ کیا۔ وہ کہتا تھا کیتھی! ہمارے مذہب کی یہی تعلیم ... ہے کہ دو تو یوں دو کہ ایک ہاتھ دے مگر دوسرے ہاتھ کو خبر نہ ... ہو۔ وہ بہت زیادہ نہیں جیا۔ صرف چوالیس سال اس کی عمر تھی ... جب وہ مر گیا تھا مگر کچھ لوگ سو سال جی کے بھی کچھ نہیں کرتے۔ ... پیدا ہوتے ہیں بڑے ہو کر اپنے ہی جیسے دوسرے انسان کو پیدا ... کرنے میں اور خود ختم ہو جاتے ہیں۔ اپنے پیچھے کوئی داستان ... نہیں چھوڑتے۔ کوئی ایسا کام نہیں کرتے کہ انہیں زمانہ یاد کرے۔ ... ٹیپو سلطان کی بات کہتا تھا کہ گیدڑ کی سو سال کی زندگی سے ... شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے۔ اور اس نے یہ ثابت کر دکھایا ... کہ اس کے دشمن اسے نہ مار سکے۔ ایک دوست نے اس سے ... جان لی اور اس نے دے دی۔ خیر میں تم کو اس کی سوانح حیات ... سنا کے تمہارا وقت برباد نہیں کروں گی۔"

"ہم اس بہادر انسان کے بارے میں تم سے سب باتیں ... سنیں گے اور یہ سمجھیں گے کہ ہم نے وقت کا بہترین استعمال کیا۔" ... میں نے کہا۔ "بڑے انسانوں کی زندگی کے تجربات چھوٹے انسانوں ... کے راستوں کو روشنی دیتے ہیں۔ تم اس روشنی کو ہمارے لیے بھی ... بچا کے رکھو۔ ہمیں اس کی ضرورت ہوگی لیکن اس وقت شہلا کو بھی ہماری اتنی ہی ضرورت ہے جتنی جولی کو۔"

"یو آر رائٹ بوائے۔ تم اب کیا کرو گے؟" وہ بولی۔

"ہم اب کیا کریں گے؟" محسن نے زیر لب کہا۔ یہ کوئی سوال نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا، جو الفاظ میں ڈھل گیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا اور اس کی سوچ لبوں تک آگئی تھی۔

"ہم پولیس اسٹیشن نہیں جا سکتے۔" میں نے کہا۔ یہ بھی جواب نہیں تھا محض اظہارِ حقیقت تھا۔ "اب تک انکل ضامن رضوی وہاں پہنچ چکے ہوں گے۔"

"انکل... وہ تمہارے بھی انکل ہیں؟" کیتھرین نے حیران ہو کے کہا۔ "پھر کس کا ڈر ہے ینگ مین؟" اس نے اپنے بالوں کو انگلیوں سے سنوار کے پیچھے کیا اور ایک اسٹول پر بیٹھ گئی۔ اس کے سیٹ کیے ہوئے بال ہلکے براؤن رنگ کے تھے اور اس کے شانوں تک پہنچتے تھے۔ وہ کسی حد تک دُبلی پتلی اور اسمارٹ عورت تھی۔ اچھا میک اپ مین اسے بیس سال کی حسین و جمیل لڑکی بنا سکتا تھا۔ جسم سے زیادہ اس کا حوصلہ جوان تھا۔ تھکن یا اداسی کا اظہار ہوتا تھا تو صرف اس کی آنکھوں سے۔ ان کا رنگ بھی براؤن تھا مگر وہ کچھ خلا میں دیکھتی ہوئی اور کھوئی کھوئی سی لگتی تھیں۔

"وہ ہم سب کے انکل ہیں لیکن... میں اُن کو بُرا نہیں کہہ سکتا۔ وہ مثالی قسم کے انسان ہیں۔ اصول پرست اور فرض شناس۔ وہ ادائے فرض پر جذبات کے سارے رشتے قربان کر دینے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور ہم سب اسی لیے ان کے سامنے جانے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔"

"کیوں! واٹ ہیو یو ڈن؟" وہ بولی۔ "کیوں ڈرتے ہو تم لوگ؟"

"یہ بھی بہت لمبی کہانی ہے۔" میں نے کہا۔ "جب فرصت ہوگی تو ہم پہلے تم سے بہرام دادا کی زندگی کی کہانی سنیں گے اور پھر تمہیں اپنی کہانی سنائیں گے۔ ابھی صرف اتنا سمجھ لو کہ ان کی نظر میں اور قانون کی نظر میں ہم مجرم ہیں۔ یہ ہم جانتے ہیں یا ہمارا خدا جانتا ہے کہ مجرم کون ہے۔ حالات کی شہادت اور اتفاقات و حادثات نے ہمیں مجرم بنا دیا ہے۔ شہلا کو مجرموں کے ایک گروہ کا ساتھی سمجھا جا سکتا ہے مگر وہ خود مجرم نہیں ہے۔ تم یہ بات بہتر طور پر سمجھ سکتی ہو۔ مجرم بہرام دادا تھا مگر سزا تم کو اور جولی کو آج تک مل رہی ہے۔ تم نے کوئی جرم نہیں کیا تھا نا... پھر ایسا کیوں ہے؟ مگر ایسا ہی ہوتا آیا ہے اور آج کل بھی ہو رہا ہے۔"

"تو شہلا کے بھائی نہیں ہو تم؟"

"بھائی ہونے کا مطلب اگر یہ ہو کہ ہم سب نے ایک ہی ماں کے پیٹ سے جنم لیا یا ہمارا باپ ایک ہی تھا تو جواب ہوگا نہیں۔ مطلب اگر رشتے کی جذباتی گہرائی ہے اور اس کا تقدس

ہے تو شہلا ہم تینوں کی بہن ہے۔" میں نے غالب اور ٹیڈی کے کندھوں پر دونوں ہاتھ پھیلا کے کہا۔" اور ہم سب بھی آپس میں بھائی ہیں۔ صرف سُکھ کے ساتھی نہیں۔ دُکھ بھی برابر بانٹ رہے ہیں، اسی لیے سب مجرم بنے ہوئے ہیں۔ یہ ایک خاندان ہے۔ الزام بھی ہم سب لیتے ہیں۔ انعام بھی ہم سب پاتے ہیں۔ گھر ہوگا تو سب کا گھر ہوگا۔ ورنہ ہم سب بے گھر ہیں۔"

"میں یقین نہیں کرسکتی کہ رشتے اتنے پائیدار اور حقیقی بھی ہوسکتے ہیں۔" وہ رشک سے ہم سب کو دیکھتے ہوئے بولی۔

"میرا خیال ہے کہ ہمیں شہلا کی نہیں اپنی فکر کرنی چاہیے۔" محسن نے کہا۔" یہ نہ ہو کہ انکل کی فوج ہمیں محصور کرلے اور راستے بند ہوجائیں۔"

"مجھے یقین ہے کہ شہلا اتنی کمزور ثابت نہیں ہوگی۔" میں نے کہا۔

"وہ اتنی کمزور نہیں تھی۔" محسن بولا۔"جب تک وہ صرف میری بیوی تھی۔ اب وہ ایک ماں بن رہی ہے۔ اس کی سوچ بدل سکتی ہے۔"

"محسن ٹھیک کہہ رہا ہے۔" رابعہ نے کہا۔" اگر انکل رضوی نہ پہنچے اور پولیس نے اس پر تشدد کرنے کی کوشش کی تو وہ اپنے آپ کو نہیں، اپنے بچے کو بچائے گی۔ ماتما کا جذبہ تو عورت کی سب سے بڑی کمزوری بن جاتا ہے۔"

"میں ایسا نہیں سمجھتا۔ شہلا اپنی ماتا پر ہم سب کو، ہمارے مستقبل کو اور ہمارے مشن کو قربان نہیں کرے گی۔" میں نے کہا۔" وہ مرجائے گی۔"

"مگر اسے مرنا نہیں چاہیے۔" رابعہ چلائی۔" ہم اتنا بڑا گناہ نہیں کرسکتے سکندر! اس سے تو بہتر ہے کہ ہم خود کو پولیس کے حوالے کردیں۔"

"کیا تم پاگل ہوگئی ہو!" محسن بولا۔" وہ نہیں مرے گی۔ اور یہ سب ہم پہلے ہی طے کرچکے ہیں کہ ایک فرد ایک مشن نہیں ہے۔ ہم میں سے کوئی بھی... میں تم... سکندر یا شہلا... کسی کی خاطر بھی خودکشی نہیں کی جاسکتی۔"

"تم سب کیا کہہ رہے ہو! واٹ مشن؟" کیتھرین نے کہا۔

"کیا تم کو ہر بات بتانی ضروری ہے۔" محسن سخت لہجے میں بولا۔" تم یہاں موجود ہو... یہ کافی ہے۔ ہم تم پر اعتماد کرتے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم ہم میں سے ہو۔ تم سے چوبیس گھنٹے پہلے صورت آشنائی تک نہیں تھی۔ تمہارے کریڈٹ پر بہرام دادا کا قرض ہے ورنہ..."

"اس نے کبھی کسی پر قرض نہیں چھوڑا تھا۔" کیتھرین نے اس کی بات کاٹ دی۔" اور چھوڑا تھا تو میں معاف کرتی ہوں۔ یو آر فری۔"

"ہم جو کچھ کرنا چاہتے ہیں اس کا تعلق اس سے نہیں... ہم کررہے ہیں۔" محسن نے کہا۔" ہمیں اپنا فیصلہ خود کرنے دو..."

"تم سب کیا خاک فیصلہ کرو گے۔" غالب بولا۔" میں... کہتا ہوں پولیس اسٹیشن یا اخبار کے کسی بااثر آدمی کے... کچھ نہیں ہونے دیں گے اور شہلا آجائے گی۔"

"اس کے پیچھے پولیس بھی آجائے گی۔"

"وہ بعد کی بات ہے۔ ہم ایسا بندوبست کریں گے... ہم تک پہنچنے میں کامیاب ہو لیکن پولیس کو کچھ نہ... ان کو ڈاج کرسکتی ہے ورنہ ہم خود شہلا کو پولیس سے چھین..." غالب بولا۔" آپ اب گھر جائیں۔ اپنے ساتھ استاد ٹیڈی کو... جائیں۔ یہ اصل نام نہیں ہے اس کا... ماں باپ نے نیک... رکھا تھا۔ دنیا نے استاد ٹیڈی کردیا۔ آپ اس پر اتنا ہی اعتماد... سکتی ہیں جتنا بہرام دادا پر کرسکتی تھیں۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو... یو ایڈیٹ..."

"میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں خاتون..." غالب بولا... آپ اپنا بیٹا سمجھ لیں۔ بیٹے بعض اوقات توقعات پر پورے نہ... اترتے۔ اسی لیے میں نے بہرام دادا کی مثال دی تھی۔ صرف... کی بات ہوگی تو آپ دیکھیں گی کہ میں نے غلط نہیں کہا تھا... میں سے کوئی آپ کے اشارے پر جان نہیں دے گا... یہ دے گا..."

"کیسی عجیب باتیں کرتے ہو تم لوگ... میں کیوں کسی کی جان لوں گی۔" کیتھرین بولی۔" بہرحال میں اس کو ساتھ لے جاتی ہوں۔"

"یہ آپ کا گھر دیکھ لے گا۔ اس کے بعد اگر ضرورت ہوئی تو ہم میں سے کوئی بھی آپ کے ساتھ رہنے کو تیار ہوگا... بشرطیکہ آپ خود کو تنہا یا غیر محفوظ سمجھتی ہوں..."

"غیر محفوظ۔" کیتھرین تلخی سے ہنسی۔" میرا خدا میرا محافظ ہے جس دن وہ ہاتھ کھینچ لے گا اس دن میں خود بھی اپنی حفاظت نہیں کرسکوں گی۔ میرے شوہر نے مجھے زندہ رہنا سکھا دیا تھا۔ یہ بھی سمجھا دیا تھا کہ ہمارے لیے زندگی فنا و بقا کی ایک مسلسل جنگ ہے۔ جنگ میں سب جیتنا چاہتے ہیں۔ ہارنے والا میدان سے نکل جاتا ہے۔ اس لیے کبھی کبھی دوسروں سے جینے کا حق چھین کر بھی زندہ رہنا پڑتا ہے۔ میں نے اس ریوالور سے چھ آدمی مارے ہیں اب تک..." اس نے پلک جھپکتے میں بلاؤز سے ایک زنانہ آٹومیٹک ریوالور نکال لیا۔ یہ وہ ریوالور نہیں تھا جو... نے کار میں دیکھا تھا۔

اس کے ریوالور نے کسی کو خوفزدہ نہیں کیا تھا۔ وہ چند لمحے اسے اُلٹ پلٹ کر دیکھتی رہی۔ پھر اس نے ریوالور واپس رکھ لیا۔" میں اس وقت تک کسی کو نہیں مارتی جب تک خود میری زندگی یا میری عزت خطرے میں نہ پڑے۔ اپنے شوہر کو...

…گھر کو... خود کو اور ایک بار جولی کو بچانے کے لیے میں نے... دشمنوں کو گولی ماردی جو بہت آگے آگئے تھے اور... انہیں واپسی کی اجازت نہیں دی جاسکتی تھی۔ آج بھی بہت... کرسکتی ہوں... اور ایک بات بتاؤں... میں نے ایک... کبھی دو گولیاں ضائع نہیں کی ہیں۔ صرف ایک گولی سے... نے یہاں سوراخ کیا تھا۔" اس نے اپنی پیشانی کے وسط... پستول کی نال سے چھو کر کہا۔" اس سر کے سوراخ سے ان کے... شیطانی ارادے ان کی ناپاک روح کے ساتھ نکل گئے... ان کی لاشیں نکال کے دیکھنا چاہو تو میں بتاسکتی ہوں کہ وہ... میں گلے۔ ان کے ڈھانچے دیکھنا۔ سب کے سروں میں ایک ہی جگہ پر ایک ہی سوراخ ملے گا۔"

"ہم بہت امپریس ہوئے۔" غالب بولا۔" اب آپ جائیں اور کل تک اس ڈاکٹر کے ساتھ مل کر کوئی ایسا بندوبست کریں کہ ہم سب کے سارے ٹیسٹ ہوجائیں۔ باری باری... اور جب ایک کے بارے میں قطعی رپورٹ مل جائے کہ وہ جولی کے لیے کچھ نہیں کرسکتا تو دوسرے کو لے جائیں۔ یا وہ ڈاکٹر انتظام کرسکے تو ایک ہی دن میں سب کے ٹیسٹ مختلف ہسپتالوں میں کرلیے جائیں۔ شرط صرف ایک ہے۔ مکمل رازداری اور سب کی بحفاظت واپسی... خدانخواستہ سب ناکام رہے تو پھر دوسرا بندوبست ہم کریں گے۔ اس ہفتے کے آخر تک جولی کا گردہ بدل دیا جائے گا اور ایک کامیاب آپریشن کے بعد وہ صحت مند زندگی کی طرف لوٹے گی۔"

"کاش یہ سب اتنا آسان ہوتا۔" وہ اُٹھتے ہوئے بولی۔" تم نے تو ایک جملے میں بات ختم کردی۔ اس ایک مسئلے کے ساتھ دس دوسرے مسئلے ہیں۔"

"ہم سب کی طرف سے یقین رکھیے کہ آپ کے لیے کوئی مسئلہ نہیں رہا۔" میں نے کہا۔" زمین پر جو کچھ انسان کے اختیار میں ہے وہ ہمارے اختیار سے باہر نہیں ہے۔ ایک بار نہیں دو بار بھی گردوں کی ضرورت پڑے گی تو ہم حاصل کرلیں گے۔ یہاں کے ڈاکٹر بندوبست نہ کرسکے تو ہم جولی کو امریکا تک بھیج دیں گے۔"

"تم کیا سمجھ رہے ہو... میں... کیا ہے میرے پاس..."

"ہمارے پاس کیا ہے، صرف اپنا یقین۔" میں نے کہا۔" آپ کو اب کچھ بھی نہیں کرنا ہے۔ بالکل کچھ نہیں... صرف دعا کرنا ہے کیونکہ ماں آپ ہیں اور یہ وہ چیز ہے جو سب سے زیادہ اعجازِ مسیحائی رکھتی ہے لیکن کرۂ ارض پر صرف ایک جگہ ملتی ہے... آپ کے دل میں۔"

"گاڈ بلیس یو... گاڈ بلیس آل آف یو۔" اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا اور اپنے سینے پر ایک انگلی سے صلیب بنائی۔" اب سب کچھ خدا پر اور تم پر چھوڑتی ہوں... خدا پر اور تم پر چھوڑتی ہوں..." وہ دروازے کی طرف بڑھی۔ ٹیڈی اس کے ساتھ باہر نکل گیا۔ چند منٹ بعد اس کی گاڑی کے روانہ ہونے کی آواز آئی۔

"میں باہر کسی پبلک کال آفس سے بات کروں گا۔" غالب بولا۔

"میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔" میں نے کہا۔

پبلک کال آفس کی تلاش میں ہمیں ایک میل اور جانا پڑا۔ وہ ایک ریسٹورنٹ تھا جہاں ٹیلی فون کاؤنٹر پر رکھا ہوا تھا۔ مالک اتنے قریب بیٹھا تھا کہ ہماری گفتگو سن سکتا تھا۔ غالب نے نہ جانے کس کا نمبر ملایا۔

"ہیلو... یار میں غالب ہوں... ہاں... ارے نہیں بھائی! مرتے ہیں غیرت مند لوگ... ہم بہت ڈھیٹ چیز ہیں... یار ابھی دنیا سے بول رہا ہوں... دیکھو ایک کام ہے... ٹاپ سیکرٹ... تمہارے اور میرے درمیان رہے گی بات۔ ایک نمبر لکھو... ہاں... ایس ایچ او سے بات کرو... ایک لڑکی ہے شہلا... بکواس نہیں کرو، ورنہ فون پر مکا ماروں گا... وہ میرے دوست کی بیوی ہے۔ بہن کی طرح ہے میرے لیے... اسے پولیس نے میو ہسپتال سے اٹھالیا ہے۔ ہاں آج... وجہ کوئی نہیں۔ بس اٹھا لیا... ذرا ان کو ایک ڈوز دے دو... کہہ دو کہ اسے کچھ نہیں ہونا چاہیے... اور اگر اس نے ایف آئی کا کاٹ دی ہو تو معلوم نا دفعہ کیا لگائی ہے... وہ سالے کچھ بھی لگا سکتے ہیں... یار میں نہیں جاسکتا اسی لیے تو تم سے کہہ رہا ہوں... نہیں میں فون بھی نہیں کرسکتا۔ میں دس منٹ بعد پھر تم سے ہی پوچھوں گا۔... اور دیکھو... مرزا غالب نے کوئی فون نہیں کیا تمہیں... یہ بات اچھی طرح بٹھا لو اپنی کھوپڑی میں، ورنہ میں آج رات ہی تمہاری کھوپڑی اتار کے لے آؤں گا..." وہ قہقہہ مار کے ہنسا اور فون بند کردیا۔

ہم نے وہیں بیٹھ کے ایک کپ چائے کا پیا اور اس دوران میں کیتھرین اور اس کے شوہر کے بارے میں بات کرتے رہے۔ وہ شوہر کے بارے میں بات کرتی تھی تو بے حد جذباتی ہوجاتی تھی وہ کسی شریف آدمی کی بیوی نہیں تھی لیکن اس کی محبت سو فیصد وہی تھی جو مشرق کی کوئی بھی شوہر پرست بیوی کرتی ہے۔ شاید اس سے زیادہ ہی تھی۔ اس میں آج بھی کمی نہیں تھی جبکہ بہرام دادا صرف ایک نام رہ گیا تھا۔ اس کی شدت اور وارفتگی کا انداز وہی تھا۔ مصائب نے اس کو ہر طرف سے گھیر لیا تھا لیکن وہ بڑی حوصلہ مندی سے مقابلہ کررہی تھی۔ اس کے کردار کی مضبوطی اور اس کی بے خوفی قابلِ تعریف تھی۔ بے شک حالات کے دباؤ نے اس کے اعصاب پر بڑا اثر ڈالا اور اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ بہت بولتی تھی۔ بولتے ہوئے موضوع سے ہٹ جاتی تھی اور گھوم پھر کر اپنے شوہر کے ذکر پر آجاتی تھی لیکن وہ اکیلی عورت جینے کا اپنا

اندازرکھتی تھی۔

دس منٹ سے پہلے ہی غالب نے دوبارہ اپنے دوست کو فون کیا: ہاں... کیا ہوا... خود ایس ایس پی صاحب موجود ہیں وہاں... نہیں یار... تو کیوں ڈرتا ہے۔ ابے صحافی ہے تو! گھسیارا نہیں... اگر تم نے فون کر کے کسی ڈاکو کے یا قاتل کے بارے میں بھی پوچھا ہوتا تو یہ کوئی جرم نہ ہوتا... ہاں... ہم سے بات کرنا چاہتے ہیں... اچھا... ہاں... ٹھیک ہے دوست... ہم بات کر لیتے ہیں... تھینک یو نہیں کہوں گا میں... سالے تم ہمارے کام نہیں کرو گے تو اور کون کرے گا۔ تمھاری برادری سے خارج تو نہیں ہو گئے ہم... سمجھ لو ایک انڈر گراؤنڈ صحافتی مشن پر ہوں میں۔ جب باہر آؤں گا تو ایسی اسٹوری کے ساتھ جو ایٹمی دھماکا کرے گی۔ نیچے سے اوپر تک سب کو ہلا دے گی... دیکھ لینا بھائی... تم بھی یہاں ہو اور ہم بھی ہیں... سب سامنے آجائے گا۔" اس نے فون بند کر دیا۔

"کیا ایس ایس پی صاحب براہِ راست مذاکرات پر بضد ہیں؟" میں نے کہا۔ "کوئی فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں اس صورتِ حال سے...؟"

"معلوم نہیں وہ کیا چاہتے ہیں۔" غالب بولا۔ "بات کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ وہ صرف پولیس افسر ہی نہیں، شریف النفس آدمی بھی ہیں۔ اس بچارے کے پیچھے پڑ گئے تھے! مجھے معلوم ہے تم کس کے کہنے پر فون کر رہے ہو۔ تم سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہو اور اس کا نام مجھے کبھی نہیں بتاؤ گے لیکن تم اُسے ایک پیغام دے سکتے ہو تو ضرور دو کہ مجھ سے بات کریں۔" ہم یہ گفتگو کاؤنٹر سے ذرا ہٹ کر کر رہے تھے۔

"اس میں کوئی چال تو نہیں ہو سکتی؟" میں نے کہا۔

"چال کیا ہو گی۔" غالب بولا۔ "تمھارا خیال ہے کہ وہ کال کو ٹریس کر لیں گے تو برادرِ عزیز یہ... یہ ولایت نہیں ہے۔ ابھی تو ان کو یہ بھی علم نہیں کہ میں نے کہاں سے فون کیا تھا، ورنہ وہ ایکس چینج سے کہہ دیتے... یہاں ایک نہیں دس ایکس چینج ہیں... یہ ہو سکتا ہے کہ ہم دوبارہ کال کریں تو وہ کسی انجینئر سے کہیں اور وہ اپنے طور پر کسی طرح اس فون نمبر کا پتا چلا لے جہاں سے ہم بات کر رہے تھے۔ پر بڑا لمبا عمل ہے۔ انکل رضوی کو تھانے میں ایک فون پر ہم سے گفتگو جاری رکھنی ہو گی اور اس وقفے میں دوسرے فون سے کال ٹریس کرنے کی کارروائی کی جائے۔ دوسرا فون تھانے میں تو ہو گا نہیں۔ یہاں ابھی تک ایک تھانے کو ایک سے زیادہ فون دینے کا رواج نہیں بلکہ زیادہ تر تھانے بغیر فون کے ہیں۔ دوسرا فون قریب ہوا تو شاید کوئی معلوم کر آسکے کہ فلاں نمبر سے بات ہو رہی تھی۔ ٹیلی فون کا عملہ بھی کوئی اتنا مستعد اور فرض شناس تو ہوتا نہیں کہ ایک منٹ میں بتا دے۔ پانچ دس منٹ کسی کو آتے جاتے میں لگ جائیں گے۔ پھر اگر پولیس کو فوراً روانہ کیا گیا تو انھیں یہاں پہنچنے کے لیے آدھا گھنٹا چاہیے۔ برطانیہ، امریکا میں تو قریب کار پیغام ملنے کے بعد تین منٹ میں پہنچ جاتی ہے... ہم اطمینان سے آدھا گھنٹا گفتگو کر کے جا سکتے ہیں۔"

"بہتر ہو گا کہ اب ہم دوسری جگہ سے بات کریں۔"

"نہیں! وقت ضائع ہو گا۔" غالب بولا۔ "میں کرتا ہوں بات۔"

غالب نے دوبارہ کاؤنٹر پر جا کے فون گھمایا تو مالک نہیں تھا۔ اس کے کچن میں کوئی خانہ جنگی کی واردات ہو گئی تھی جس میں ہاتھ پیر یا سر کم ٹوٹے تھے، برتن اتنے شہید ہوئے۔ آواز آئی تھی کہ لگتا تھا فی الحال معزز گاہکوں کو سلور کے گلاس میں چائے پیش کی جا سکے گی۔

"مجھے ایس ایس پی صاحب سے بات کرنی ہے۔" غالب نے اعتماد سے کہا۔ اور چند سیکنڈ تک انتظار کرنے کے بعد بولا: "السلام علیکم سر... میں غالب بول رہا ہوں۔ جی... ایک منٹ۔" اس نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھا اور سرگوشی میں مجھ سے مخاطب ہوا۔ "پوچھ رہے ہیں کہ سکندر بات کرتے ہوئے بھی ڈرتا ہے۔"

میں نے ریسیور لے لیا۔ "السلام علیکم انکل۔" میں نے کہا۔

"میں تو سمجھا تھا کہ تم بھی سر ہی کہو گے۔" ضامن رضوی صاحب کی آواز میں طنز تھا اور کچھ دبا دبا دکھ بھی تھا۔ "کیا حال ہے؟"

"آپ کو معلوم ہو گا انکل... بس جی رہے ہیں... بلکہ دلدل... جینے کی کوشش کر رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "آنٹی ٹھیک ہیں؟"

"ہاں... ٹھیک ہیں سب۔" وہ بولے۔ "رابعہ کیسی ہے؟"

"اگر میں کہوں گا کہ آپ کی دعا سے اچھی ہے تو آپ سمجھیں گے میں طعنہ دے رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"اس لڑکی نے مجھے بتایا کہ اس نے شادی کر لی ہے محسن سے۔" انکل رضوی بولے۔ "شیروانی زندہ ہوتا تو میں گلہ کرتا۔ فوزیہ سے پوچھوں گا کہ کیا بچپن سے اب تک انکل کہنے میں کوئی جھوٹ لاحق تھی کہ ادھر باپ مرا اُدھر نہ کوئی انکل رہا نہ کوئی رشتے کا لحاظ۔ خیر یہ بتاؤ تم نے بھی رابعہ سے...؟"

"نہیں انکل... محسن اور شہلا کو... بلکہ انکل شیروانی کو وقت نہیں ملا... ورنہ یہ ہو سکتا تھا کہ آپ کی دعائیں شامل نہ ہوتیں۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا... رابعہ کو آپ رخصت کریں گے۔"

"ابے پاگل ہوا ہے۔" غالب میرے کان میں بولا۔ "یہ بلف کر رہے ہیں۔ ایس ایس پی صاحب ایسے نہیں ہیں کہ تھانے میں بیٹھ کر تجھ سے اس قسم کی پرائیویٹ گفتگو کریں۔ تیرے جذبات سے فائدہ اٹھا رہے ہیں وہ..."

"یہ تم کہہ رہے ہو اس لیے مان لیتا ہوں۔" انکل رضوی نے دکھی لہجے میں کہا۔ "ورنہ آثار تو ایسے نہیں ہیں۔ سب کچھ بگڑ گیا ہو جائے۔"

"میں معذرت چاہتا ہوں انکل۔" میں نے کہا۔ "میں ابھی پانچ منٹ میں پھر فون کرتا ہوں آپ کو... کچھ تسلی سی ہو رہی ہے۔" میں نے فون کا ریسیور رکھ دیا۔ غالب کی بات نے مجھے قائل کر لیا تھا۔ وہ اس وقت آفیشل ڈیوٹی پر تھے لیکن ان کی گفتگو سراسر ان آفیشل تھی جو ان کے کردار کے خلاف امر تھا کیا ان کے لہجے میں دکھی ہونے کا احساس بھی ان کی اداکاری تھا؟ میں نے باہر نکل کے سوچا۔ نہ جانے کیوں میرے دل نے یہ بات نہیں مانی کہ وہ مجھے دکھی ہونے کا تاثر صرف دھوکا دینے کے لیے دے رہے تھے۔ وہ واقعی دکھی تھے اور کوشش کر رہے تھے کہ ان کا دکھ ظاہر نہ ہو۔ خدا نے غالباً ان کو دو دل دیے تھے۔ ایک بے حد شریف آدمی کا جو ہمارے حالات سے پریشان تھا۔ دوسرا ایک ذمے دار پولیس افسر کا جو کسی رشتے کو قانون سے زیادہ اہم تسلیم نہیں کرتا تھا اور اس وقت یہ دونوں دل باہم مصروفِ پیکار تھے۔ بے شک پولیس افسر کا دل غالب تھا مگر انکل رضوی کا مظلوم دل بھی دبے دبے لہجے میں فریاد کناں تھا۔

اتفاق سے باہر نکلتے ہی مجھے ایک خالی رکشا گزرتا نظر آیا اور میں نے چلا کے اُسے روک لیا۔ ہم نے مخالف سمت میں دو میل کا فاصلہ دس منٹ میں طے کیا۔ پھر مجھے ایک پرائیویٹ کلینک نظر آیا۔ میں نے رکشا کو روک لیا اور غالب کے ساتھ اندر ہو گیا۔ ریسپشن پر ایک اسمارٹ سی لڑکی بیٹھی تھی۔ وہاں ہمیں دو فون نظر آئے۔ ایک پر لکھا ہوا تھا: "صرف ڈاکٹرز کے لیے" اور دوسرے کے سامنے "وزیٹرس اور مریضوں کے لیے" کی تختی رکھی ہوئی تھی۔ میں نے کسی تذبذب کے بغیر دوسرا فون اٹھا لیا۔ لڑکی نے گھور کے ہم دونوں کو دیکھا مگر پھر کسی کال کو اٹینڈ کرنے لگی۔

"مجھے ایس ایس پی صاحب سے بات کرنی ہے۔" میں نے نمبر ملا کے کہا۔

"آپ کا نام؟" اس اکھڑ لہجے میں مجھے ڈانٹنے والا ایس ایچ او ہی ہو سکتا تھا۔

"ایس ایس پی صاحب کو معلوم ہے۔" میں نے بھی اسے ڈانٹا۔

"ہاں بھئی سکندر! مسئلہ شہلا کا ہے۔" انھوں نے قطعی بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تمھاری وجہ سے یہ بے قصور پکڑی گئی۔"

"آپ لوگ تو عموماً بے قصور انسانوں کو پکڑتے رہتے ہیں۔ بس میری مراد ہے آپ کے محکمے کے تھانیداری رکھنے والے لوگ۔" میں نے کہا۔

"میں تم سے پولیس کے محکمے کی خرابیوں اور ان کی اصلاح کے موضوع پر بحث کرنا نہیں چاہتا۔" وہ بولے۔ "مختصر بات کرو۔ شہلا کی رہائی چاہتے ہو یا نہیں؟" غالب کا تجزیہ بالکل درست تھا... اب وہ صرف ایس ایس پی رہ گئے تھے کیونکہ ان کی چال ناکام ہو گئی تھی۔ گفتگو اسی طرح چلتی رہتی تو وہ آدھے گھنٹے سے زیادہ دیر تک "گپ شپ" کرتے رہتے۔ میں ان کے مہربان اور دوستانہ لہجے سے متاثر ہو کے باتوں میں الجھ جاتا۔ پھر مطلب کی بات بھی اتنی لمبی ہو جاتی کہ کال ٹریس کرنے کی سست رفتار کارروائی بھی مکمل ہو جاتی اور ہم وہیں دھر لیے جاتے۔ اب وہ سمجھ گئے تھے کہ میں اس جگہ سے کھسک گیا ہوں جہاں پہلے تھا۔

"شہلا کو آپ کسی جرم کے بغیر قید میں رکھنا چاہیں تو میں آپ کو کیسے روک سکتا ہوں سر۔" میں نے طنز سے کہا۔ "آپ کا حکم تو قانون سے بڑھ کر ہے۔"

"میں معمول کی قانونی کارروائی میں مداخلت نہیں کروں گا۔"

"وہ تو آپ کر چکے۔" میں نے ان کی بات کاٹ دی... "پولیس نے ایک عورت کو ہسپتال کے وارڈ میں گھس کر پکڑا۔ ہسپتال کا سارا عملہ اور وارڈ کے سب مریض گواہ ہیں کہ اس عورت نے کوئی جرم نہیں کیا تھا... کیا آپ نے اس غیر قانونی کام کرنے والے سے باز پرس کی؟ اس سے پوچھا کہ اس عورت کو کیوں گرفتار کیا گیا ہے...؟"

"ایسا ہوتا ہے... مجرموں کے گروہ کا ایک آدمی بھی ہاتھ آجائے تو ہم اس سے گروہ کا سراغ لگانے میں مدد لیتے ہیں..."

"کیا آپ بھی اس طریقِ تفتیش کے قائل ہیں؟" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "کہ ڈاکو ہاتھ نہ آئیں تو اس کے بیوی بچوں کو اٹھا لو، ماں باپ کو اٹھا لو۔"

"میں نے اس کا حکم نہیں دیا تھا۔"

"کیا شہلا کے خلاف کسی تھانے میں کوئی رپورٹ درج ہے؟" میں نے کہا۔ "کبھی کوئی ایسا ثبوت یا گواہ ملا ہے جس سے پتا چلا ہو کہ وہ کسی واردات میں شریک تھی یا اس نے مجرموں کی مدد کی تھی؟ میں سمجھتا ہوں وہ اتنی ہی بے قصور ہے جتنی... آپ سمجھ لیں کہ شیروانی صاحب کی بیٹی اور محسن کی بہن فوزیہ... جو سیالکوٹ میں ہے۔ پکڑنا چاہیں تو آپ اسے بھی پکڑ لیں کہ محسن کی بہن ہے اور اس سے محسن کا پتا پوچھا جا سکتا ہے مگر کسی مجرم سے رشتہ کوئی جرم تو نہیں ہوتا ایس ایس پی صاحب... باقی آپ کی مرضی ہے۔ اس کے خلاف کسی بھی جرم میں ایف آئی آر کاٹ دیں۔ اسے تو پھنسانے کے ہزار بہانے ہوں گے آپ کے ضابطۂ فوجداری میں۔"

"شٹ اپ! تم میری بے عزتی کر رہے ہو۔" انکل رضوی نے کہا۔ "میں نے کبھی ایسا نہیں کیا۔"

"مگر آپ کے یہ ماتحت ضرور کریں گے۔" میں نے کہا۔ "کیا آپ نہیں جانتے کہ شہلا اس تمام عرصے میں کہاں رہی تھی۔ وہ اسلام آباد میں تھی۔ انکل شیروانی کی بیگم اور خود انکل شیروانی کی زندگی کے آخری لمحات میں اسی نے دن رات ایک کر کے تیمارداری کی تھی... اور

ان کی موت کے بعد وہ فوزیہ کے پاس سیالکوٹ چلی گئی تھی۔ یہاں آئے ہوئے تو اسے جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے اور پولیس نے اُسے گرفتار کر لیا۔"

"تم نے اسے اپنا آلۂ کار بنایا تھا۔" انکل رضوی نے کہا۔

"کیا یہ ثابت ہو گیا ہے... شہلا نے اس کا اعتراف کر لیا ہے؟" میں نے کہا۔ "اور اگر ہم نے آلۂ کار بنایا تھا تو کس جرم کا ارتکاب کرنے کے لیے؟ یقیناً پولیس کی کارکردگی قابلِ تعریف ہے کہ ابھی مجرموں کے ایک گروہ نے جس کا انھیں نام و نشان تک معلوم نہیں، کوئی واردات کرنے کا پروگرام بنایا تھا اور ایک لڑکی کو کسی خاص مقصد سے ایک بسترِ مرگ پر لیٹی ہوئی لڑکی کے پاس بھیجا تھا۔ انھوں نے موقعے پر پہنچ کر لڑکی کو پکڑ لیا اور یوں قبل از وقت کارروائی سے مجرموں کے عزائم کو خاک میں ملا دیا... ونڈرفل۔"

"مجھے یہ اختیارات حاصل نہیں ہیں کہ میں شہلا کو رہا کرنے کا حکم دے دوں۔" انھوں نے کہا۔ "ایس ایچ او کا خیال ہے کہ اس لڑکی سے تمھارا پتا معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اخفائے جرم بھی تو جرم ہوتا ہے۔"

"آپ شوق سے اس کو حراست میں رکھیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن ایک تو یہ بات نہ بھولیں کہ وہ خود مجرم نہیں ہے۔ اس کا شوہر آپ کی تعریف میں تو مجرم ہوگا ورنہ وہ بھی مجرم نہیں ہے۔ دوسری بات یہ کہ وہ انکل شیردانی کی بہو ہے اور مرتے وقت تک ان کی صرف یہی خواہش تھی کہ شہلا سکھی رہے۔ تیسری بات یہ کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ اس پہ ذہنی یا جسمانی تشدد کیا گیا تو ہو سکتا ہے..."

"ایسا کچھ نہیں ہوگا۔" انکل رضوی نے کہا۔ "میں اس کو اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔ صرف اس لیے کہ تفتیش میرے سامنے ہو یا میں خود کروں۔ اس کو ریمانڈ پر تھانے میں یا جوڈیشل ریمانڈ پر جیل نہ بھیجا جائے۔ تم جانتے ہو وہاں کا ماحول کیسا ہوتا ہے۔ لیکن میری ایک شرط ہے۔ نازلی کو واپس کر دو۔ اُسے گھر اپنے گھر جائے۔ اس کے والدین کی حالت بہت خراب ہے اور اس کا بھائی پاگل ہو رہا ہے۔ وہ میرے گھر میں بھی آزاد نہیں ہوگی۔"

"میں یہ پیغام اُسے دے دوں گا۔" میں نے کہا۔ "اس بات کی ضمانت نہیں دے سکتا کہ وہ اس شرط کو قبول بھی کر لے گی۔ وہ خود پاگل لڑکی ہے جو ہم پاگلوں کے ساتھ ہے۔ ہم ایسا نہیں چاہتے تھے مگر اس نے ہماری کبھی نہیں مانی۔ اگر وہ لوٹ کر نہ گئی تو..."

"تو میں لوٹ جاؤں گا۔" وہ بولے۔ "میں شہلا کے معاملے میں بالکل دخل نہیں دوں گا۔ مجھے اپنا دل پتھر کرنا پڑے گا۔ ایک ایس ایس پی شہر کے ہر تھانے کے کیس میں دخل نہیں دیتا۔ میں نے نازو کی فیملی کے خیال سے ایک پیش کش کی تھی۔ اگر اسے شہلا کا خیال ہوگا تو وہ اتنا ضرور کرے گی... یہ کوئی بہت مشکل یا ناممکن بات نہیں۔ لیکن وہ اپنی ضد پر قائم رہتی ہے تو پھر مجھے بھی اپنے آپ پر جبر کرنا پڑے گا۔ یہ نہ قانون کے خلاف ہوگا نہ میرے ضمیر کے خلاف۔ ایک جذباتی الجھن ہوگی مگر اس کی کوئی بات نہیں۔ گھلے گی تو شہلا۔" انھوں نے ایک دم لائن کاٹ دی۔ آخری بات کہتے ہوئے وہ بے حد مشتعل تھے اور میں تصور کر سکتا تھا کہ انھیں کتنا غصہ تھا۔ میری باتوں نے انھیں مشکل میں ڈال دیا تھا اور وہ یک طرفہ فیصلہ کرنے کے قابل نہ رہے تھے۔

"یہ آپ لوگ کس قسم کی باتیں کر رہے تھے؟" کسی نے پیچھے آ کے کہا اور میں چونک کر پلٹا۔

"کیا یہ غیر مہذب اور غیر شائستہ گفتگو تھی؟" میں نے کہا۔

"یہ فون صرف مریضوں کے لیے اور انھیں دیکھنے کے لیے آنے والوں کی خاطر لگایا گیا ہے۔" وہ بولا۔ صورت اور حلیے سے وہ ڈاکٹر نہیں لگتا تھا۔ شاید وہ مالک یا مینیجر تھا۔

"ہم کسی مریض کو دیکھ لیتے ہیں۔" غالب بولا۔ "اس کے بعد فون کا استعمال ناجائز نہیں سمجھا جائے گا۔ ویسے میں ایک صحافی ہوں۔" اس نے اپنا پریس کا کارڈ نکالا۔ "میں نے ایمرجنسی میں فون استعمال کر لیا تو کوئی جرم نہیں کیا اور کیا ہے تو تم مجھے گرفتار کرا دو۔ یہ ایک وکیل ہیں جو ایک ایس ایس پی سے بات کر رہے تھے۔"

"اور ہم اس فون کو زحمت نہ دیتے اگر آس پاس کوئی پبلک کال آفس مل جاتا۔" میں نے دس کا نوٹ کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ "معلوم نہیں لوکل کال کے کتنے یونٹ چارج ہوں گے۔"

"ایک لوکل کال اگر آدھا گھنٹا جاری رہے یا سارا دن چلتی رہے تب بھی پچاس پیسے ہی بنتے ہیں۔" غالب نے دس کا نوٹ اُٹھا لیا اور کاؤنٹر پہ ایک اٹھنی رکھ دی۔ اعتراض کرنے والا بے بسی سے ہمیں باہر جاتا دیکھتا رہ گیا۔ اس نے ہم پر رعب جھاڑنے کی بلاوجہ کوشش کی تھی۔ پریس کارڈ اور وکیل کا نام سُن کر وہ خود مرعوب ہو گیا تھا۔ اس نے اٹھنی اٹھا کے ہمارے پیچھے پھینکی جو فرش پہ کھنک سے گری مگر ہم نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ پھر کاؤنٹر پہ بیٹھی ہوئی اسمارٹ لڑکی کے ہنسنے کی آواز آئی جو چاندی کے سکوں کی جھنکار کی طرح تو نہیں تھی مگر یہ لگتا تھا جیسے بہت سی اٹھنیاں فرش پر بکھر گئی ہوں۔

"اب کیا ہوگا؟ ایس ایس پی صاحب نے تو شرط عائد کر دی ہے مگر دوسری طرف نازو ہے۔" میں نے کہا۔

"نازو واپس چلی جائے گی۔" غالب نے کہا۔

"وہ کبھی نہیں جائے گی۔" میں نے کہا۔ "میں جانتا ہوں اس کی فطرت کو۔"

"تم اس کی فطرت کو جانتے ہو۔ میں نازو کو جانتا ہوں۔ لگا لو شرط۔"

شرط تو ہم نے نہیں لگائی لیکن لگائی ہوتی تو غالب جیت جاتا۔ نازو نے رابعہ کے ساتھ ہماری پوری بات بڑے سکون سے سنی اور میں اس کی صورت کے تاثرات کو غور سے دیکھتا رہا۔ غالب نے اسے وہ سب بتا دیا جو انکل رضوی نے کہا تھا۔ رابعہ کی شکل رونے والی ہو گئی مگر نازو مسکرائی اور پھر ہنسنے لگی۔

"پھر میں چلتی ہوں۔" وہ بولی۔ "شہلا کی آزادی کے لیے شرط یہی ہے تو مجھے منظور ہے۔"

خاموشی کا ایک اُداس اور بوجھل لمحہ آیا۔ نازو کو یوں بھی واپس جانا ہی چاہیے تھا۔ اس کے والدین کی حالت ابتر تھی اور بھائی اسے ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔ پھر بھی نہ جانے کیوں یہ سب ہمارے لیے انتہائی غیر متوقع تھا۔ ہم نہیں سوچ سکتے تھے کہ وہ یوں اچانک ہمارا ساتھ چھوڑنے پر مجبور ہو جائے گی۔ وہ ہماری قوت تھی، ہمارا سہارا تھی۔ آہستہ آہستہ سب کی ضرورت بن چکی تھی۔ اس کے بغیر ہم سب جیسے ادھورے رہ جاتے تھے۔ ہمارے حوصلے، ہمارے ولولے اور ہماری امیدیں۔ سب میں وہ برابر کی شریک تھی۔ ایم آر ایس کا مشن اس کی شرکت کے بغیر لاحاصل محسوس ہوتا تھا۔ بے شک وہ ایک لڑکی تھی اور ہم سب اکثر کہتے تھے، دوسروں کو قائل کرنے کے لیے دلیل دیتے تھے کہ مشن میں کسی ایک فرد کی عدم موجودگی سے پیش قدمی نہیں رک سکتی لیکن آج وقت آیا تھا تو سب کو مایوسی کے احساس اور ناامیدی کے اندیشوں نے گھیر لیا تھا۔

"تم مجبور نہیں ہو۔" محسن نے بہت دیر بعد کہا۔ "شہلا کی وجہ سے خود کو پابند مت سمجھو۔ وہ آ جائے گی۔ اس پہ کوئی جرم ثابت نہیں ہوگا اور وہ... پولیس والے اسے کیسے رکھ سکتے ہیں... منظر اس کی ضمانت کرا لے گا۔"

"اسے تھانے میں ایک رات بھی نہیں رہنا چاہیے۔" نازو بولی۔ "اچھا ہے اگر اسے انکل رضوی لے جائیں۔ وہاں اس کی دیکھ بھال بھی ہوگی۔ اور وہ محفوظ بھی رہے گی۔"

"میرا مطلب تھا کہ تم کو اپنے والدین کی وجہ سے جانا چاہیے۔" محسن نے کہا۔ "ہم تو پہلے بھی کہتے تھے کہ تمھارا گھر لوٹ جانا بہتر ہوگا۔ اب اکرام شیخ بھی تو ایک ہی بھائی ہے تمھارا۔ اس نے تمھاری وجہ سے نوکری چھوڑ دی اور یقیناً اسے بھی بہت صدمہ ہے۔"

محسن کی بات بے ربط تھی۔ وہ خواہ مخواہ دلائل دے رہا تھا۔ اس کے ذہن میں ایک کش مکش تھی جس نے اس کی سوچ کو الجھا دیا تھا۔ وہ شہلا کی طرف سے بالکل بے فکر نہیں ہو سکتا تھا، خواہ وہ رضوی صاحب کے گھر میں رہے۔ شہلا کے لیے وہ بھی تو گواہی تھی۔ اور ہم یہ نہیں جانتے تھے کہ پھر کب اس سے ملاقات ہوگی۔ ہوگی یا نہیں ہوگی۔ وہ تو ہمارے ساتھ ہی جا رہی تھی۔ ہم نے سوچا تو تھا کہ اس کا نہ جانا بہتر ہوگا مگر اس بات کا یقین کسی کو نہیں تھا کہ وہ مانے گی۔ وہ صاف کہہ دیتی کہ اب جو بھی ہوگا وہ سب کے ساتھ ہوگا۔ میں اکیلی پیچھے رہ کے اپنے وسوسوں کے آسیب میں مبتلا ہو جاؤں گی۔ اکیلی انتظار کاٹوں گی۔ کب تک؟ جب تک تم سب واپس نہ آ جاؤ۔ کیا تم لوگ بتا سکتے ہو کہ تم کس دن، کس وقت واپس آؤ گے... کون سی فلائٹ سے؟ کس ٹرین سے؟

"تم سب لوگ اتنے مایوس کیوں ہو... رونی شکل کیوں بنائی ہے تم لوگوں نے؟" نازو ہنسی۔ "کیا یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ اس سفر کے کسی مرحلے میں ہمارا ساتھ چھوٹ جاتا؟ ابھی تو میں لوٹ کر گھر جا رہی ہوں۔ کیا یہ بالکل بعید از امکان تھا کہ مجھے کسی دشمن کے ریوالور کی ایک گولی ختم کر دیتی اور تم کو میرا نشان تک نہ ملتا؟ یہ تو کسی کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ کیا اس سے مشن ختم ہو جائے گا۔ تم تو کہتے تھے کہ آخری آدمی بھی لڑے گا۔ اپنی زندگی کی آخری سانس تک..."

"وہ مختلف بات ہوتی..." میں نے بمشکل تمام کہا۔

"کیا یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ میرا ارادہ کمزور پڑ جاتا۔ میں ویسے ہی ڈر جاتی اور تمھارا ساتھ چھوڑ جاتی؟" نازو بولی۔ "اس وقت واپس چلی جاتی جب تم مجھے واپس جانے کے لیے مجبور کرتے تھے؟ یہ تو بہت اچھا ہے کہ میں ایک ساتھ دو کام کر رہی ہوں، اپنے گھر واپس جا رہی ہوں اور شہلا کو بھی ایک گھر میں پہنچا رہی ہوں۔ تم لوگ جاؤ... تمھیں اور ہمسفر ملیں گے۔ تمھارا ساتھ دینے والے بہت ہوں گے۔"

"تم نے ٹھیک کہا۔ ہم کو تو خوش ہونا چاہیے کہ بالآخر تم گھر جا رہی ہو... اپنے ماں باپ کے پاس۔" میں نے کہا۔ "ہم سب بے گھر لوگ تھے۔ کسی کے بھی ماں باپ نہیں تھے۔ ہم اگر واپس نہ بھی آئے تو کسی کے لیے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

"تم واپس آؤ گے... کامیاب آؤ گے۔ اور اس وقت شہلا تمھارا انتظار اکیلی نہیں کرے گی..." نازو ہنسی۔ وہ اپنی اعصابی کشیدگی اور جذباتی دباؤ کو کم کرنے کے لیے زبردستی ہنس رہی تھی۔

"معلوم نہیں ایسا ہوگا یا نہیں ہوگا۔ ممکن ہے وہ اس قیدِ تنہائی میں گھٹ گھٹ کر اور ہمارے لیے پریشانی میں روتے روتے حوصلہ ہار جائے اور ہم واپس نہ آ سکیں۔ جانا تو ہمارے اختیار کی بات ہے، واپس آنا تقدیر کی یاوری کے بغیر ممکن نہیں۔" محسن بولا۔ "ہو سکتا ہے وہ بیوہ اور اس کا بچہ یتیم رہ جائیں۔"

"تو پاگل ہو رہا ہے محسن!" میں نے برہمی سے کہا۔ "اتنا ہی خیال ہے بیوی بچے کا تو جا... تو بھی انکل رضوی کے پاؤں پکڑ لے... تجھے بھی معافی اور پناہ مل جائے گی۔"

محسن نے سر کو جھٹکا۔ "معاف کرنا یار... پتا نہیں مجھے اچانک کیا ہو گیا تھا۔"

میں اب جا رہی ہوں... ہو سکے تو جب بھی موقع ملے مجھے فون کر دینا۔" نازو بولی۔

"تمہارے والدین فون کٹوا دیں گے۔" غالب بولا۔

"خط ڈال دینا... بس خیریت کا..." نازو نے براہِ راست غالب سے کہا۔

"صرف خیریت کی اطلاع کو میں خط نہیں سمجھتا۔" غالب بولا۔ "میں سادہ پوسٹ کارڈ پر اپنے آٹو گراف ارسال کرتا رہوں گا۔ مضمون تم خود لکھ لینا کہ میں یہاں خیریت سے ہوں اور آپ کی خیریت خداوند کریم سے نیک مطلوب ہے۔"

"اچھا بابا جو تمہارا دل چاہے لکھ دینا۔" نازو نے کہا۔

غالب کا چہرہ کھل اٹھا۔ "جو دل چاہے... مگر دل کی بات تم تک کوئی پہنچنے دے گا۔ میرا تو خیال ہے کہ جیسے ہی تم واپس پہنچو گی، والدین خدا کا شکر بجالائیں گے جس نے ان کی عزت آبرو رکھی۔ اب تک تو وہ کسی بہانے تمہاری عدم موجودگی پر جھوٹ کا پردہ ڈالتے رہے ہوں گے۔"

"ہاں! انھوں نے سب سے کہا ہو گا کہ میں خالہ کے پاس کراچی میں ہوں۔"

"مگر اب وہ تمہارے ساتھ جھٹ منگنی پٹ بیاہ کی بات کریں گے اور تمہاری ایک نہیں سنیں گے۔" غالب بولا۔ "شادی کی زنجیر سے باندھ کر کسی کے حوالے کریں گے کہ چاند سی بنو اب تیرے حوالے۔"

"پاگل ہوئے ہو۔ زبردستی کون کسی کو میرے سر منڈھ سکتا ہے۔ میں نہیں ڈرتی کسی زنجیر سے اور زنجیر تو میں یوں توڑ سکتی ہوں۔" وہ چٹکی بجا کے بولی۔

"پھر بھی کب تک..."

"جب تک تم واپس نہیں آ جاؤ گے... میرا مطلب ہے تم سب..." وہ بولی۔

"دوسروں کی بات نہیں کرتا۔ میں ضرور آؤں گا... وعدہ۔" غالب نے کہا۔

نازو کے چہرے پر حیا کا رنگ گل کھلانے لگا۔ 'وعدہ' اس نے بڑی بے تکلفی کے ساتھ سب سے ہاتھ ملایا۔ جب اس نے رابعہ سے ہاتھ ملایا تو رابعہ رونے لگی۔ اس نے نازو کو گلے لگا لیا اور اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔ نازو مسکراتی رہی، اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ روئے گی نہیں۔ غالب سے ہاتھ ملاتے ہوئے اس نے چند سیکنڈ کے لیے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھوں میں رہنے دیا۔ اور میں نے دیکھا کہ غالب نے اس کے ہاتھ پر اپنا دوسرا ہاتھ رکھ دیا۔ تھوڑا سا اٹھایا اور پھر چھوڑ دیا۔ اس چند سیکنڈ کے وقفے میں ان کے درمیان سارے قول و قرار ہو گئے۔ غالب نے وہ سب کہہ دیا جو وہ ... خاموشی میں کہہ سکتا تھا۔ اور نازو نے شاید پہلی بار اسے مایوس نہیں کیا۔ جواب نازو کی آنکھوں نے دیا اور اس کا عکس غالب کی صورت پر نظر آیا۔ پھر وہ دروازے سے نکل گئی۔ اس نے ایک بار بھی پلٹ کر نہیں دیکھا۔ ہم سب وہیں کھڑے رہ گئے۔ چپ چاپ اور سوگوار اور دل شکستہ۔ اس گھر کی ویرانی میں اچانک شہ ... کی اداس شام اتر آئی۔

پھر باہر کوئی کار آ کے رکی۔ ہم سب چونکے۔

میں نے کہا۔ "یہ تو کیتھرین آنٹی کی کار معلوم ہوتی ہے... وہ ... واپس کیوں آ گئی؟"

"سب لوگ اندر۔" میں نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور ... دروازے کے ساتھ پوزیشن لے کر کھڑا ہو گیا۔ غالب، رابعہ اور ... ساتھ والے کمرے میں غائب ہو گئے۔ مجھے ایک خیال ... کر دیا تھا۔ ایک ڈاکٹر کی حمایت نے جولی کی ماں کو بچا لیا تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ باہر پولیس اس کے خلاف کوئی انتقامی کارروائی کرنے پر آ جائے۔ وہ کینہ پرور لوگ بہرام دادا کا نام بھولے نہیں تھے۔ اور اس کی بیوہ آج پھر انہیں چوٹ دے گئی تھی۔ ... اکیلی عورت کے خلاف جھوٹے الزامات کا سلسلہ دراز کر ... تھے۔ اس پر بدکاری کا الزام عائد کرنے کے لیے نام نہاد شرفا کی طرف سے درخواست حاصل کر سکتے تھے۔ یہ کہہ سکتے تھے کہ اس کے گھر میں اب بھی جرائم پیشہ افراد کا آنا جانا ہے۔ وہ جوئے کا اڈا چلاتی ہے۔ کسی اسمگلر کی آلۂ کار ہے... وغیرہ وغیرہ۔ بے بنیاد ثبوت اور جھوٹے گواہوں کی بنیاد پر ان کے لیے شریف آدمی کا جینا اجیرن کرنا کوئی مشکل نہیں ہو گا۔ بے گناہی تو عدالت میں سو بار پیشی کے بعد ایک مرتبہ ثابت ہوتی ہے۔ اس سے قبل ... جھوٹے مقدمات درج کرنے سے پولیس کو روکنے کے لیے کوئی قانون کام نہیں آتا۔

لیکن استاد ٹیڈی اندر آیا تو ہمارے اندیشے مٹ گئے۔ اس کے ساتھ کیتھرین بھی آئی تھی۔ اندر آنے کے بعد ٹیڈی نے حیرت سے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر میں سامنے آ گیا۔

"میں تو ڈر گیا تھا کہ ... سب کہاں چلے گئے۔"

"ہم بھی ڈر گئے تھے کہ تم ... چھوڑنے گئے تھے تو اسے اپنے ساتھ واپس کیوں لے آئے۔" رابعہ نے اندر سے آ کے کہا۔

"کیا آپ اس کو چھوڑنے آئی ہیں؟" محسن بولا۔ "اسے سڑک پر چھوڑ دینا تھا۔ یہ سیدھا اپنے تھان پر آ جاتا۔"

"میں... میں آج رات یہاں رہوں گی..." کیتھرین نے ... "... یو ڈونٹ مائنڈ... مجھے ڈر تھا کہ کہیں رات کو پھر پریشان کرنے نہ آ جائے کوئی..."

"ہم آپ کو خوش آمدید کہیں گے۔" میں نے کہا۔

"ویسے میں پولیس سے کبھی نہیں ڈرتی... پچھلے چند سال سے انھوں نے مجھے پریشان کرنا چھوڑ دیا تھا۔" کیتھرین بیٹھ گئی۔ "لیکن اس وقت میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔ میں خواہ مخواہ کے جھگڑوں میں نہیں پڑ سکتی۔"

"یہ بھی آپ کا گھر ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن..."

"لیکن کیا؟ فکر مت کرو... میں تم پر زیادہ عرصہ بار نہیں بنوں گی۔" وہ بولی۔

"آپ ہمیشہ ہمارے ساتھ رہیں تو ہمیں خوشی ہو گی۔" میں نے ذرا وضاحت کی۔ "اس گھر میں ہمارا قیام چند دن سے زیادہ نہیں۔ پھر ہمیں جانا ہے۔ ہم جولی کے لیے کچھ کیے بغیر نہیں جائیں گے۔"

"ابھی میں نے ڈاکٹر سے بات کی تھی۔" کیتھرین نے کہا۔ "اس نے کہا ہے کہ کل تم سب کے ٹیسٹ ہو سکتے ہیں۔ کیا واقعی تم لوگ میری جولی کے لیے یہ سب کرو گے... ایک اجنبی کے لیے... میں کیسے شکریہ ادا کروں تمہارا۔"

"اس کی ابھی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔ "الفاظ صرف شرمندہ کرتے ہیں۔ کبھی وقت پڑا تو ہم بھی ضرورت مند بن کے کہیں گے کہ آنٹی! اب تم ہماری مدد کرو... ممکن ہے ایسے ہی تم بھی کسی اجنبی کے لیے کچھ کر سکو۔"

"مجھے اس لڑکے نے بتایا ہے کہ یہ میرے شوہر کو جانتا تھا اور یہ کہ اس کے پاس اس کی کوئی امانت پڑی ہے۔" وہ بولی۔

"یہ ٹھیک کہتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اب آپ اسی سے باقی تفصیلات بھی سن لیں۔ اتنی دیر میں ہمیں کچھ کام کرنے ہیں۔"

رابعہ ان کے لیے چائے بنانے چلی گئی۔ میں محسن اور غالب باہر آ گئے۔ ہم نے خانہ بدوشی کے پروگرام پر تفصیل سے بحث کی۔ ابھی تک ہمارے پلان میں کہیں خامی نہیں تھی۔ ... اینڈ کمپنی کے پروگرام کے مطابق اسلحے کی اگلی کھیپ کے چار دن بعد روانگی طے تھی۔ انھیں یہ اسلحہ بیل گاڑیوں پر بھوسے کے ڈھیر میں چھپا کے لے جانا تھا۔ بھوسے سے لدی ہوئی بیل گاڑیاں عموماً رات کو سڑکوں پر رواں نظر آتی ہیں جن پر بھوسا یوں باندھ کر لادا جاتا ہے کہ بیل گاڑی کے اوپر دس فٹ تک اور اس کی حدود سے دائیں اور بائیں جانب پانچ پانچ فٹ تک بھوسے کا پہاڑ سا بن جاتا ہے مگر بھوسے کا وزن نہیں ہوتا چنانچہ بیل اسے آسانی سے کھینچتے رہتے ہیں۔ سڑک پر دور سے بسوں اور گاڑیوں کی ہیڈ لائٹ پڑتی ہے تو بھوسے کی سنہری چمک سے ... سڑک پر کوئی روشن دیوار سی دکھائی دیتی ہے لیکن اوورٹیک کرنے والی گاڑیاں تھوڑی سی جگہ میں سے گزر جاتی ہیں۔ بیل گاڑی کے پچھلے حصے میں ایک لالٹین جھولتی رہتی ہے اور بھوسے ... گاڑی والا سوتا نظر آتا ہے۔ تجربہ کار بیل بالکل ... نان اسٹاپ سفر کرتے ہیں۔

اس ڈھیر کے اندر یقیناً خاصی مقدار میں اسلحہ چھپانے کی گنجائش تھی اور چھ بیل گاڑیوں کا ایک قافلہ اتنا ہی اسلحہ لے جا سکتا تھا جتنا ایک ٹرک میں لے جانا ممکن ہوتا ہے مگر بھوسے کی گاڑیوں پر کسی کو شک ہونے کا سوال ہی نہیں تھا۔ ان کو چلانے والے بھی دیہاتی نظر آتے ہوں تو انھیں اسلحے کا اسمگلر، غدار یا دشمن کا ایجنٹ کون سمجھ سکتا ہے۔ ہم ان کے پہلے پڑاؤ تک ان سے پہلے پہنچ سکتے تھے اور سڑک کے کچھ فاصلے پر اپنے خیمے گاڑ کے انتظار کر ... ہم عقبی حصے کے برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ رابعہ آئی اور ہمیں بھی چائے کے کپ تھما کے لوٹ گئی۔ "کیا استاد ٹیڈی کی فلم ابھی چل رہی ہے؟" میں نے کہا۔

رابعہ نے اقرار میں سر ہلایا۔ "ابھی تو انٹرول ہوا ہے۔"

"اس نے ابھی تک نازو کے بارے میں سوال نہیں کیا؟"

"کیا تھا..." رابعہ بولی۔ "میں نے بتا دیا... رونے کے قریب ہو گیا تھا۔"

"اس سے کہنا کہ ہمارے بارے میں کچھ نہ بتائے۔" محسن بولا۔ "ہم خود رات کو ایک ساتھ بیٹھیں گے تو بات ہو جائے گی۔"

"تم لوگ یہاں بیٹھے ہو! جا کے پتا کیوں نہیں کرتے کہ نازو اپنے گھر پہنچی یا نہیں۔ اور انکل رضوی بھی شہلا کو لے گئے یا نہیں؟" رابعہ نے اندر جاتے ہوئے کہا۔ "میں اب رات کے کھانے کی تیاری کرتی ہوں۔"

"ہم بھی جاتے ہیں چائے پی کر۔" میں نے کہا۔ "ویسے انکل رضوی وعدہ کر کے مکرنے والے نہیں ہیں۔ شہلا کے حق میں اچھا ہی ہوا۔ آنٹی اس کا خیال رکھ سکتی ہیں۔ اس کی مدد بھی کر سکتی ہیں۔"

"کیسی مدد؟"

"یہی! اگر وہ ہم سے بات کرنا چاہے۔ ہم فون کریں کبھی تو وہ بات کرا دیں۔ اس کو خط یا پیغام ارسال کریں تو انکل رضوی کا سنسر دھرا رہ جائے اور خط کا جواب بھی آ جائے۔" میں نے کہا۔ "وہ عورت ہیں بہرحال۔"

ہم تینوں میں سے غالب اور محسن ٹیلی فون کرنے گئے۔ میں نے گھر پر ٹھہر جانا مناسب سمجھا۔ ٹیڈی ابھی تک باتوں میں مصروف تھا۔ میں رابعہ کے پاس کچن میں جا بیٹھا۔ وہ موم بتی کی مدھم روشنی میں گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھے بیٹھی تھی... "کوئی خواب دیکھ رہی ہو؟" میں نے کہا۔

"نہیں! خواب دیکھنے چھوڑ دیے ہیں میں نے۔" وہ بولی۔

"ایک ... کہ زوجہ محترمہ سخت بھوک لگی ہے۔ تم گرما گرم پراٹھے اتارو۔ میں یہیں بیٹھ کے کھاؤں گا۔" میں نے کہا۔

"ایسا زنانہ رومانی ناولوں میں ہوتا ہے۔" رابعہ مسکرائی۔ "اس وقت تم کہو گے کہ چلو آج چائنیز میں چلتے ہیں... یا حکم دو گے کہ ویٹر... خانساماں سے کہو آج ہم ناشتے میں پراٹھے کھائیں۔"

ڈائننگ ٹیبل پر اخبار پڑھتے پڑھتے تم دو چار نوالے کھا کے کافی پی لوگے اور اُٹھ جاؤ گے۔"

"یہ تو بڑا عبرتناک نقشہ کھینچ کے رکھ دیا تم نے۔" میں نے کہا۔"بے شک اگر میں سکندر بدبخت نہ ہوتا صرف سکندر بخت ہوتا تو آج صنعت کاروں کی صف میں شامل ہوتا۔ جو دن رات کاروباری مسائل میں اُلجھے رہتے ہیں اور پراٹھے نہیں کھا سکتے کیونکہ ہضم نہیں کر سکتے اور ان کا کلسٹرول بڑھ جاتا ہے۔ خیر... کیا یہ ممکن ہے کہ کل جو نہیں ہو سکتا وہ ابھی ہو جائے؟"

"یہ ہو سکتا ہے۔" وہ ہنسی۔

"ابھی وہ سب آجائیں گے، میرے سالے۔" میں نے کہا۔"کتے کی طرح ان کی ناک خوشبو سونگھ لے گی۔"

"اور آتے ہی میرے پیچھے پڑ جائیں گے کہ پراٹھے پکا پکا کے کھلا رہی ہو۔" رابعہ ہنسی۔

اور ایسا ہی ہوا۔ سب سے پہلے تو ٹیڈی وارد ہوا۔ اُس نے آتے ہی نعرہ لگایا۔"آہاہا... پراٹھے!" اور میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ کیتھرین دروازے میں کھڑی مسکراتی رہی۔ میں اور ٹیڈی چھینا جھپٹی کرتے رہے اور اتنے گرم پراٹھے کھاتے رہے کہ دونوں کے منہ جل گئے۔ ابھی ہمارا مقابلہ جاری ہی تھا کہ محسن اور غالب آگئے۔

"ارے یار دیکھو ذرا بدمعاشی۔" محسن چلایا۔"ہمیں کیسے بہانہ کر کے گھر سے نکال دیا اور یہاں ہو رہی ہے دعوت؟"

"کس کی دعوت؟" غالب بولا۔"میاں یہ تو عشق ہے کھلا عشق اور حد ہے بے شرمی کی۔"

"یہ طفیلی تو میاں مجنوں کی وجہ سے کھا رہا ہے۔ ورنہ اسے کون پوچھتا۔" محسن نے کہا۔"یار اپنی بھی گھر والی تھی... سو فیصد شرعی..."

"صبر کر یار! آجائے گی وہ... سیف ڈیپازٹ والٹ میں رکھی ہے۔" غالب نے کہا۔"اپنی بھی کسی دن نکل آئے گی ظالم سماج کی دیواریں گرا کے۔"

"مگر یہ تو ظالم سماج کے سامنے پراٹھے کھاتے جا رہے ہیں..."

"بک بک بند کرو۔ یہاں بیٹھو اور کھانا شروع کر دو۔" میں نے کہا۔"ورنہ میں نے منع کر دیا رابعہ کو تو سوکھی روٹی ملے گی۔"

"ملے خشک روٹی جو آزاد رہ کر۔ تو وہ ہے غلامی کے حلوے سے بہتر۔" غالب بولا۔"مگر میں غلام ابن غلام غلام..." وہ محسن کا ہاتھ پکڑ کے بیٹھ گیا۔

"تم لوگ کیا خبر لینے گئے تھے۔ کیا خبر لائے؟" میں نے کہا۔

"پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔" غالب بولا۔"نازو اپنے گھر میں ہے۔ اس کے باپ نے کم اور بھائی نے ہمیں زیادہ گالیاں دیں۔ مگر میں گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا۔"

"شہلا کو انکل رضوی اسی وقت لے گئے تھے۔" ...

"جب وہ تھانے گئے تھے تو اسی ارادے سے گئے تھے... ہوشیار آدمی ہیں۔ تم سے ایک سودا بھی کر لیا۔ اگر نازو... تب بھی وہ شہلا کو بہر حال لے جاتے۔"

"کیا ان کی بیگم نے بتایا ہے یہ سب کچھ؟"

"اور کیا انکل بتاتے۔" محسن بولا۔"میں نے شہلا سے ... بات کی تھی۔"

"وہ رو رہی تھی؟"

"رو تو میں بھی رہا تھا۔" محسن نے معصومیت سے کہا "مگر..."

"رونے سے اور عشق میں بے باک ہو گئے۔" غالب نے لقمہ دیا۔

"ہاں! آنٹی نے بہت تسلی دی اور کہا کہ دن میں جب ایس ایس پی صاحب دفتر میں ہوتے ہیں تو میں فون کر ... میں نے کہا کہ جان ہتھیلی پر رکھ کے دیواریں پھاند جاؤں ... آجاؤں تو؟ وہ ہنسنے لگیں اور بولیں کہ دیوار پر اب خاردار تار ہیں... بہت اونچے۔ اندر دو خونخوار قسم کے کتے بھی پال لیے گئے ہیں۔ تاروں سے کپڑے پھٹ جائیں گے۔ کتوں سے ... خود پھٹ جاؤں گا، اس لیے ایسا نہ کرنا۔"

کھانے کے بعد ہم سب بیٹھے تو ایک بار پھر ہماری روانگی کے پلان کی بات شروع ہوئی۔ میں نے کیتھرین کے ساتھ الگ بیٹھ کے اسے اپنی سرگزشت کا خلاصہ سنایا۔ وہ دم بخود بیٹھی رہی۔ محسن اور غالب کا تعارف ختم ہوتے ہوتے ایک گھنٹا گزر گیا۔ پھر میں نے اُسے رابعہ، شہلا اور نازو کے متعلق بتایا۔

"مجھے یقین نہیں آتا کہ تم سب اتنے باہمت اور اتنے مخلص... اتنے اچھے دوست ہو۔" کیتھرین کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔"آج مجھے اپنا شوہر یاد آرہا ہے۔ وہ ہوتا تو تمہارے لیے کوئی پرابلم نہ ہوتی۔ کچھ نہ کچھ میں بھی کروں گی۔ میرے بھی وسیع رابطے تھے۔ میں بہرام دادا کے ساتھ رہتی تھی۔ اس کے ہر راز میں شریک تھی۔"

"آپ...؟ آپ ہمارے ساتھ چلیں گی؟"

"ساتھ نہ گئی تب بھی ساتھ دوں گی... تم نہیں جانتے، میں کیا کر سکتی ہوں۔" وہ بولی۔"وقت بتائے گا کہ میں اب بھی وہ ہوں جو بہرام دادا کی نصف بہتر تھی۔"

ابھی اس کی بات جاری تھی کہ باہر سے آہٹ سنائی دی۔ پھر ایک رائفل کی نال شیشہ توڑ کے اندر آئی۔ میں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ اُدھر سے بھی دو نالیں ہم سب کا نشانہ لیے ہوئے تھیں۔

ہم سب ایک ہی وقت میں ایک ہی چھت کے نیچے جمع تھے اور کوئی دشمن ایسے وقت میں آپہنچا تھا جب ہم اپنے دفاع کی طرف سے غافل تھے۔ ہم سب نے ... نظروں ہی نظروں میں ایک دوسرے سے سوال کیا کہ یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں مگر جو میری ذہنی کیفیت تھی وہی سب کی تھی۔ یقین کے ساتھ میں بھی نہیں بتا سکتا تھا کہ یہ کون سے شکاری ہیں۔ دلاور ... کے شکاری جو صفِ دشمناں میں سب سے اوّل تھے۔ پولیس یا وہ چند جو ہم سے پہلے اس گھر پر قابض تھے اور بڑی دیدہ دلیری سے اسے اپنے باپ کا گھر سمجھ کر یہاں مالِ غنیمت لاتے تھے، چھپاتے تھے اور جمع رکھتے تھے۔

ایک قدرتی ردِ عمل یہ ہوا تھا کہ ہم سب نے ریوالور نکال لیے تھے مگر ہمارے مقابل صرف دیواریں تھیں اور ہم ان کو دیکھ نہیں سکتے تھے جو ہمیں گھیر چکے تھے اور اپنا نشانہ بنائے منتظر تھے کہ ہم خود ہی اپنی اس کمزور پوزیشن کو سمجھتے ہوئے ہتھیار ڈال دیں۔ یہ سب لوٹا ہوا اور چھینا ہوا اسلحہ تھا۔

میں نے ایک نظر سب کا جائزہ لیا اور اچانک امید کی ایک کرن نے مجھے مایوسی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے سے نکال لیا۔ مجھے غالب نظر نہ آیا۔ عین اسی وقت جب ان نادیدہ حملہ آوروں کی بندوقوں نے سر نکالا تھا یا چند لمحے قبل وہ دوسرے کمرے میں غائب ہو چکا تھا۔ یہ بہت ضروری تھا کہ اب اسے لوٹ کر نہ آنے دیا جائے اور اس خطرے سے خبردار کر دیا جائے جس میں ہم گرفتار ہو چکے تھے۔

"کون ہو تم لوگ؟" محسن نے پُراعتماد اور مضبوط لہجے میں کہا۔

"معلوم ہو جائے گا۔" باہر سے جواب آیا۔ آواز اجنبی تھی اور بے حسی کا آئینہ دار تھا۔"بہت جلد معلوم ہو جائے گا۔ یہ ہتھیار ... دو اور سب پلٹ کر دیوار کی طرف منہ کر لو۔ اپنے دونوں ہاتھوں کو سر سے اوپر اُٹھا کے دیوار پر رکھو اور ایسے ہی کھڑے رہو۔"

"تم سمجھتے ہو کہ ہم اتنے بزدل اور کم ہمت ہیں۔" میں نے ... کر کہا۔"ہم موت سے نہیں ڈرتے۔ تم اگر مرد ہو تو سامنے آؤ۔"

میری بات کا کوئی مقصد نہ تھا، سوائے غالب کو خبردار کرنے کے۔ ایسے وقت میں کسی کو اپنی جرأت مندی سے متاثر کرنا یا دعوتِ مبارزت دینا ایک مضحکہ خیز حرکت ہی تھی چنانچہ سب نے مجھے حیرانی سے دیکھا لیکن میں جانتا تھا کہ اس طرح شور مچانے سے فائدہ ہو سکتا ہے۔

"اپنی بکواس بند کرو۔" اسی آواز نے کہا۔"ہم یہاں تم سے لڑنے نہیں آئے ہیں۔ اپنی مردانگی اپنے پاس رکھو اور وہی کرو جو کہا جائے۔"

"ورنہ کتے کی موت مارے جاؤ گے۔" یہ دوسری آواز کسی اُجڈ اور ... شخص کی تھی۔"... بہادری..." اس نے ایک فحش بات کی۔

"تم چپ رہو۔" پہلے شخص نے اپنے ساتھی سے اتنی ہی بے حسی کے ساتھ کہا۔"کیا تمہیں بتایا نہیں گیا تھا کہ فضول بات کوئی نہیں ہوگی اور تم وہی کرو گے جو میں کہوں گا۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔" دوسرا شخص کتے کی طرح آہستہ سے غرایا۔

"میں تم کو دس سیکنڈ دوں گا کہ اپنے ہتھیار نیچے پھینک دو۔ اُدھر دروازے کی طرف۔" پہلا شخص جو روبوٹ کی طرح بولتا تھا اور اس گروہ کی قیادت کا دعویدار تھا، مجھے زیادہ خطرناک لگا مگر اس کے ساتھ ہی مجھے اس کا مشینی لہجہ بھی مصنوعی لگا۔ وہ آواز بدل کے بات کر رہا تھا۔ اب وہ گنتی شمار کر رہا تھا اور میرے کان ہر سیکنڈ کے گزرنے کی آواز سُن رہے تھے۔ جب وہ سات پر پہنچا تو میں نے ریوالور نیچے کر کے دروازے کی طرف اچھال دیا۔ محسن اور استاد ٹیڈی مجھ سے پہلے ہی جھک کر سیدھے ہو چکے تھے۔

"تمہارا ایک ساتھی کم ہے۔" گروپ لیڈر نے کہا۔

"کون کم ہے؟" میں نے بیک وقت محسن اور ٹیڈی کی طرف دیکھ کر اپنی حیرانی کا اظہار کیا۔

"تم خود جانتے ہو کہ کون کم ہے۔ اسے کہو کہ سامنے آجائے ورنہ اندر آنے کے بعد ہم سب سے پہلے اس کی ساری چالاکی نکال دیں گے۔"

"اگر کوئی ملے تو تم کو اختیار ہے کہ اس کے ساتھ جو سلوک چاہو کرو۔" میں نے کہا۔

"ویسے بھی تم کو ہم سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے۔" محسن نے سر ہلایا۔

"اچھا اب ان عورتوں سے کہو کہ یہ بھی وہی کریں جو تم نے کیا۔" گروپ لیڈر بولا۔"ہم جانتے ہیں کہ یہ بھی مسلح ہیں۔"

"یہ... یہ کیا ہو رہا ہے۔" جولی کی ماں نے اچانک ہسٹریائی سے مغلوب لہجے میں کہا۔ اس کی آواز میں لکنت تھی اور وہ بُری طرح کانپ رہی تھی۔

"ہمت سے کام لو... پلیز..." میں نے کہا۔ مجھے شک ہونے لگا تھا کہ وہ محض خوف کا ڈراما کر رہی ہے۔ وہ ایسی عورت نہیں تھی کہ صرف بندوق کی نال کا رُخ اپنی طرف دیکھ کر دہشت زدہ ہو جائے۔ اس کی عمر کا بڑا حصہ بہرام دادا کے شانہ بہ شانہ دادِ شجاعت دیتے گزرا تھا۔ وہ تسلیم کر چکی تھی کہ کس طرح وہ چھ افراد کو گولی کا نشانہ بنا چکی ہے جو اُسے کمزور عورت سمجھنے کی غلطی کر بیٹھے تھے۔ میرا اندازہ درست تھا۔ وہ میری بات ختم ہونے سے قبل ہی تھوڑا سا ہلی اور پھر بے جان لاش کی طرح فرش پر ڈھیر ہو گئی۔

"یہ عورت دل کی مریض ہے۔" میں نے کہا۔

"کوئی بات نہیں... اسے مر جانے دو۔" باہر سے جواب ملا۔

"ہوسکتا ہے کہ یہ مکر کر رہی ہو... تم یہ بتاؤ کہ چوتھی عورت کہاں ہے؟"

"چوتھی عورت؟" میں نے تعجب سے دُہرایا۔ اس کی بات سے پتا چلتا تھا کہ وہ کسی کو پہچان نہیں سکتا ورنہ وہ نام لے کر پوچھتا کہ فلاں کدھر ہے۔"

"ہاں! یہاں چار مرد اور چار عورتیں ہوں گی۔" وہ بولا۔ "ہمیں یہی بتایا گیا تھا۔" رابعہ اور شہلا نے بھی ایک ایک ریوالور آگے کھسکا دیا۔

"بتلانے والوں کو غلط فہمی..."

"ایک عورت اور ایک مرد اگر دوسرے کمرے میں ہیں تو اُن سے کہو کہ سامنے آجائیں ورنہ ان کا حشر بُرا ہوگا۔" وہ بولا۔

"تم ان کا کیا حشر بُرا کرو گے۔" محسن نے اچانک قہقہہ مارا۔ "وہ میاں بیوی باہر گئے ہوئے ہیں۔ تم محسن اور شہلا کو پوچھ رہے ہو، نا؟"

میں ایک بار پھر محسن کے اور اپنے خیالات کی یکسانیت اور سوچ کی ہم آہنگی کا قائل ہوا۔ کچھ لوگ اسے ذہن کی اس برقی رو کی فریکوئنسی کا ایک ہونا کہتے ہیں جو انسان کی کھوپڑی میں دماغ کے فعل کو متحرک کرتی ہے۔ محسن نے بھی سمجھ لیا تھا کہ ہمیں محصور کرنے والے صرف ہماری تعداد سے واقف ہیں۔ وہ کسی کو صورت سے شناخت نہیں کرسکتے۔

"شہلا امید سے ہے۔ محسن اسے ڈاکٹر کے پاس لے گیا تھا۔" میں نے کہا۔

"کس ڈاکٹر کے پاس؟" وہ بولا۔

"غالباً ڈاکٹر لطیف کے پاس۔" میں نے روانی سے کہا۔

"یہ بھی ہوسکتا ہے کہ محسن نے وہاں جانے کا خطرہ مول نہ لیا ہو... شہر میں سیکڑوں ڈاکٹر ہیں جو اس کو نہیں پہچانتے۔"

"وہ کسی لیڈی ڈاکٹر کے پاس گیا ہے۔" رابعہ نے آہستہ سے کہا مگر یوں کہ باہر والے بھی سن لیں۔

"تم سب مل کر ایک جھوٹ کو سچ بنا رہے ہو۔" باہر والا بولا۔ "ہم نے صبح سے اپنے آدمی یہاں لگا رکھے تھے۔ انھوں نے کسی کو باہر جاتے نہیں دیکھا۔"

وہ خود کو احمق ثابت کر رہا تھا۔ صبح کے بجائے وہ دوپہر کہتا تب بھی غلط ہوتا لیکن وہ کہہ سکتا تھا کہ ہم بہت دیر سے دیکھ رہے تھے۔ میرا حوصلہ کچھ اور بڑھ گیا۔ ایک احمق آدمی زیادہ خطرناک دشمن ثابت نہیں ہوسکتا اور اپنی حماقت کے باعث اس سے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ خود ہی کوئی ایسی غلطی کرے گا جس سے ہم فائدہ اُٹھالیں گے۔

"اچھا وہ اندر ہیں تو آکے انھیں بھی پکڑ لو۔" ٹیڈی نے جھنجلا کے کہا۔

"اپنا منہ دیوار کی طرف کرو اور ہاتھ اٹھا کے کھڑے ہوجاؤ۔"

اس نے حکم دیا۔ ہم چند لمحے تذبذب کی کیفیت کا اظہار کرتے رہے۔ جب اس نے پھر دس سیکنڈ کی وارننگ دی اور گننا شروع کیا تو ہم پلٹے اور مردہ قدموں سے چلتے ہوئے دیوار سے جا لگے۔ ہمارے رویّے سے بے بسی، مایوسی اور اشتعال کا اظہار ہونا ضروری تھا۔ صرف جولی کی ماں فرش پر بے حس و حرکت پڑی رہ گئی۔ مکمل خاموشی کا مختصر وقفہ بھی اس حالت میں بہت طویل محسوس ہوا۔ میرے کانوں نے بھاری قدموں کی آہٹ سنی۔

"ان سب کی تلاشی لو۔" گروپ لیڈر بولا۔ "اس بات کا خیال رکھنا کہ سکندر بخت جوڈو کراٹے جانتا ہے۔ اگر اس نے تم کو قابو کرلیا..... تو میں تمھیں بچا نہیں سکوں گا۔ زیادہ سے زیادہ میں اس کو گولی مار دوں گا۔ گولی تم کو بھی لگ جائے تو میں ذمہ دار نہیں۔"

"بس بس! میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں۔" وہی ایک شخص جھنجلا کے بولا۔

"پھر کتنے بے وقوف ہو؟" محسن نے نیم سنجیدہ لہجے میں کہا۔ جواب میں اس کی گالی کے ساتھ ہی محسن کو تھپڑ مارنے کی آواز سنائی دی۔ محسن کا سر دیوار سے ٹکرایا۔

"اپنا کام کر..." گروپ لیڈر نے بھی اس کو ایک گالی دے کر کہا لیکن گالی دیتے وقت بھی اس کی آواز بلند نہیں ہوئی۔ وہ اسی مشینی لہجے میں بولتا رہا۔ "اسی لیے سب نے مجھ سے کہا تھا کہ میں کسی اور کو ساتھ لے جاؤں۔ تجھ میں برداشت نہیں ہے۔"

میں اپنی باری کا منتظر رہا اور تلاشی لینے والے کو مشتعل کرنے کا کوئی موثر طریقہ سوچتا رہا۔ اگر کسی طرح اس کو مجبور کیا جاسکتا کہ وہ غصے میں بے قابو ہو جائے اور اپنا کام کرنے کے بجائے مجھ سے الجھ جائے۔ اچانک میرے کانوں نے ٹیڈی کے کراہنے کی آواز سنی۔ سر گھما کے دیکھنے پر مجھے ٹیڈی نیچے گرا ہوا نظر آیا۔ دو افراد اُسے گھسیٹ کر لے گئے۔ میں نے شہلا اور رابعہ کا دہشت سے سفید پڑ جانے والا چہرہ دیکھا اور یہ بھی کہ ہمارے پیچھے دو افراد مشین گن لیے بہت مستعد کھڑے ہیں۔ ان سب نے سر سے پیر تک سیاہ لباس پہن رکھے تھے۔ سیاہ پتلونوں کے پائنچے انھوں نے سیاہ بوٹوں کی سیاہ جرابوں کے اندر کر لیے تھے۔ اوپر سب نے ایک جیسی کالی قمیص پہن لی تھی اور اپنی صورت کو چھپانے کے لیے انھوں نے نائلون کی کالی جرابیں الٹی کر کے سر کی طرف سے چڑھائی تھیں۔ بڑے سائز کی جراب میں چھپ جانے کی بہت گنجائش ہوتی ہے اس کے باوجود پیر کی جراب کو سر پر چڑھانے کے لیے انھیں جراب کے ساتھ زبردستی کرنا پڑی ہوگی۔ اس طرح جراب گردن تک آگئی تھی اور بہت زیادہ کھنچ جانے سے جھلی کی طرح ہوگئی تھی چنانچہ وہ اس کے اندر سے دیکھ سکتے تھے مگر باہر سے ان سب کے چہرے مضحکہ خیز ہوگئے تھے۔ ان کے ناک کان اس جھلی میں سے ابھرے ہوئے محسوس ہوتے تھے لیکن گردن سے اوپر ان کے سر اور چہرے ایک جیسے لگتے تھے۔ قدرے لمبوترے اور اوپر سے گول۔ سپاٹ اور بے شناخت۔ سب کے سروں پر وسط میں ایک چھوٹا سا گنبد نما ابھار بھی تھا۔ یہ جراب کا آخری حصہ تھا جو پورا پھیلا نہیں تھا اور سر کی ہموار سطح کے ساتھ چپک کر برابر نہیں ہوا تھا۔ اس قسم کے نقاب میرے لیے نئے نہیں تھے۔ میں نے لندن میں قیام کے عرصے میں سرمنڈے گوروں کو اسی کم خرچ آسان حاصل نقاب سے صورت چھپا کر ایشیائی اور افریقی باشندوں پر حملہ کرتے اور فرار ہوتے دیکھا تھا۔ کوئی ان کو پہچان نہ سکتا تھا۔ جھلی جیسے نقاب میں ان کے بالوں کے انداز، ان کی رنگت اور صورت کے خدوخال سب چھپ جاتے تھے۔ یہی طریقہ وہاں ڈکیتی کی چند وارداتوں میں بھی استعمال ہوا تھا مگر وہ جہاں اور تھا۔ وہاں کی پولیس اس روپوشی کے باوجود اکثر مجرموں کو ڈھونڈ نکالتی تھی۔

ٹیڈی کو تلاشی لینے والے نے ناک آؤٹ کیا تھا۔ اس کو انھوں نے تھوڑا سا پیچھے لے جا کر ڈال دیا اور محسن کی تلاشی لینے لگے۔ اس بار میں انھیں دیکھتا رہا۔ ایک نے اوپر سے نیچے تک محسن کے کپڑوں پر ہاتھ مارا۔ اور ٹخنوں تک لباس کو یوں ٹٹولا کہ کہیں کوئی سگریٹ لائٹر بھی ہوتا تو اس کے ہاتھ محسوس کر لیتے۔ دوسرے نے محسن کے سر پر ریوالور کا دستہ مارا اور محسن کوئی آواز کیے بغیر لڑکھڑا کے نیچے گر گیا۔ مجھے اس کے بارے میں کوئی شبہ نہ تھا کہ وہ سچ مچ بے ہوش ہوا ہے۔ مارنے والے نے بڑی قوت کے ساتھ وار کیا تھا۔ تاہم وہ صرف ضرب کی شدت کو کافی سمجھتا تھا۔ اسے یہ علم نہیں تھا کہ صحیح جگہ پر خفیف سی ضرب کا اثر بھی وہی ہوتا ہے جو غلط جگہ پر شدید ضرب کا بلکہ بعض اوقات سخت ترین ضرب سے بھی خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہوتے۔

جب وہ میرے پاس آیا تو میں نے ایک گہری سانس لے کر جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ مجھے اپنے دفاع میں کامیابی کے لیے جو کچھ کرنا تھا اس کا انحصار میرے صحیح ذہنی اور جسمانی ردِعمل پر تھا۔ تلاشی کا عمل پورا ہوا تو میں سر پر چوٹ کھانے کے لیے تیار تھا۔ اگر میں گردن اکڑا لیتا تو چوٹ زیادہ سخت پڑتی اور میں خود کو بچانے کے لیے سر جھکاتا تو وہ ایک کی جگہ دو مرتبہ وار کرتا۔ اور دوسری بار جھنجلاہٹ میں زیادہ طاقت سے مارتا۔ میں نے ضرب کو سر کی خفیف سی جنبش کے ساتھ جھیلنے کی کوشش کی مگر پھر بھی ذرا دیر کے لیے میری آنکھوں کے سامنے تارے سے ناچ گئے اور دیوار میرے سامنے لہرا کے غائب ہوگئی۔ میں نے کھڑے رہنے کی ناکام کوشش کی۔ زمین تو میرے قدموں کے نیچے سے جیسے غائب ہوچکی تھی۔ میں گرتے ہوئے دیوار سے ٹکرایا۔

نیم بے ہوشی کا یہ وقفہ بہت مختصر تھا لیکن اس نے مجھے کچھ کرنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا میرے کانوں میں سائیں سائیں ہو رہی تھی۔ پھر بھی میں مختلف آوازیں سن کر ان کا مطلب سمجھنے کے قابل تھا۔

"کیا سب کا ڈھیر لگاتے جاؤ گے۔" روبوٹ بولا۔ "جاؤ پہلے ان کو ٹرک میں ڈال دو۔"

"باہر سے ان دونوں کو بھی بلالو۔"

"نہیں... ایک ٹرک میں ہے۔ ایک کا باہر رہنا بھی ضروری ہے۔ کہیں وہ دونوں میاں بیوی نہ آجائیں۔"

"ایک کو ایک اٹھا کے ٹرک تک نہیں لے جاسکتا..."

"تو دونوں مل کے لے جاؤ۔"

"پھر تم یہاں اکیلے رہ جاؤ گے؟"

"میری فکر مت کرو۔ تمھارا کیا خیال ہے کہ میں دو عورتوں سے نہیں نمٹ سکتا۔" روبوٹ نے کہا۔ "آخر تم بار بار یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ یہاں تم میرے حکم کی تعمیل کے لیے آئے ہو۔ مجھ سے بحث کے لیے نہیں۔ لیڈر میں ہوں۔"

"لیڈر... اونہہ..." تمسخر اور حقارت آمیز لہجہ اور مجبوری۔

میں نے ایک آنکھ کھول کر دیکھنا چاہا لیکن میں غلط رُخ پر گرا تھا۔ میں دونوں آنکھیں کھول کر دیکھتا تب بھی مجھے اپنے مقابل دیوار ہی نظر آتی۔ پیچھے دیکھنے کے لیے میرا سر کو گھمانا ضروری تھا لیکن میں ذرا بھی حرکت کرتا تو وہ ہوشیار ہو جاتے۔ چنانچہ میں اسی طرح لیٹا رہا۔ ایک وقت ایسا آیا جب میرے اندازے کے مطابق کمرے میں صرف روبوٹ تھا۔ باقی دونوں محسن کو اٹھا کے باہر لے گئے تھے۔ آخر کیتھرین اس موقع سے فائدہ کیوں نہیں اُٹھاتی؟ میں نے سوچا۔ اس کے پاس ریوالور بھی ہے۔ وہ اس ایک آدمی کو شوٹ کرسکتی ہے۔ غالب کیوں دبکا ہوا ہے! اس وقت وہ بھی روبوٹ سے ہتھیار رکھوا لے تو باقی دو کو بھی اندر لوٹ کر آتے ہی ہینڈز اپ کرایا جاسکتا ـــــ یہ وقت گزر جائے گا تو وہ غالب کو بھی ڈھونڈ نکالیں گے۔ وہ چھلاوا تو ہے نہیں کہ نظر سے اوجھل ہو جائے۔ غالب اور کیتھرین نے پھر بھی نہیں کیا اور دوسرے چکر میں وہ ٹیڈی کو لے گئے۔ پانچ منٹ میں وہ پھر آئے۔ ان میں سے ایک نے میرے دونوں ہاتھوں کے نیچے بغل میں ہاتھ دے کر اٹھایا۔ دوسرے نے ٹانگوں کو پکڑ کے۔

ٹرک عام قسم کا مال بردار ٹرک نہیں تھا۔ یہ ہیوی ڈیوٹی ٹرک تھا جس کے پیچھے لمبا سا ٹریلر تھا۔ اس کے اوپر فولادی چادروں سے بنا ہوا بیس فٹ لمبا دس فٹ چوڑا اور دس فٹ اونچا باکس کنٹینر رکھا ہوا تھا۔ یہ اسٹینڈرڈ سائز کے کنٹینر ایسے ساز و سامان کی نقل و حرکت میں استعمال ہوتے ہیں جس کے بارش یا دھوپ میں خراب ہونے کا اندیشہ ہو اور جس کو زیادہ حفاظت کے ساتھ پہنچانا مقصود ہو۔ بیرونِ ملک سے اس قسم کے کنٹینر بحری جہازوں پر کرین سے اُٹھا کے

جاتے ہیں اور مال بردار جہاز جب بندرگاہ پر پہنچتے ہیں تو انھیں کرین جہاز پر سے اُٹھا کے اسی طرح ٹرک کے ٹریلر پر رکھ دیتی ہے جو اُن کو سڑک کے راستے اندرونِ ملک پہنچا دیتے ہیں۔ بظاہر ہے یہ باکس انتہائی مضبوط ہوتے ہیں اور اس طرح مقفل کیے جا سکتے ہیں کہ کسی بھی جگہ کوئی انھیں آسانی سے نہ کھول سکے۔

دیو ہیکل باکس کی سائڈ کا ایک دروازہ نیچے گرا ہوا تھا۔ اس دروازے کو بند کرنا مقصود ہو تو اوپر اٹھا کے برابر کر دیتے ہیں اور ایک اِنچ موٹی لوہے کی سلاخ کو کھسکا کر کئی سوراخوں میں سے گزارنے کے بعد تین چار جگہ ایسے قفل سے روک دیتے ہیں کہ باکس تقریباً سیل ہو جاتا ہے۔ تالے بھی عام تالے نہیں ہوتے۔ ان سب کو توڑے بغیر سلاخ ایک سوت نہیں ہلتی اور جب تک پوری سلاخ دروازے کے سامنے سے نہ ہٹ جائے پٹ نیچے نہیں گرتا۔ مجھے بھی اس کھلے دروازے سے اندر پھینک دیا گیا۔ کچھ کرنے کی خواہش کو میں نے بڑی مشکل سے دبا رکھا تھا۔ صرف اس امید میں کہ غالب اور کیتھرین کے ذہن میں جو بھی پروگرام ہے وہ میری جلد بازی کے باعث ڈسٹرب نہ ہو۔

فرش پر گرنے سے مجھے چوٹ تو آئی مگر میں برداشت کر گیا اور جہاں گرا تھا، وہیں پڑا رہا۔ مجھے یہ خیال بھی تھا کہ اس کمرے سے بڑے باکس کے اندر بھی کوئی شکاری ضرور ہوگا۔ وہ پوری تیاری کے ساتھ آئے تھے تو اتنے کم اندیش اور غیر محتاط کیسے ہو سکتے تھے کہ پہلے سب کو گرفتار کریں اور پھر نکل جانے کا موقع فراہم کر دیں۔ میں سر اٹھا کے محسن یا ٹیڈی کو آواز دینا چاہتا تھا اور یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کہیں وہ بھی میری طرح بے ہوش بنے تو نہیں پڑے ہیں مگر میں اسی نادیدہ محافظ کے ڈر سے نہیں بولا جو میرے خیال کے مطابق اندر موجود تھا۔ غالباً یہی احتیاط محسن اور ٹیڈی بھی کر رہے تھے۔ اب تک جو صورت حال سامنے آئی تھی اس کے مطابق کم سے کم سات شکاری اس مہم کے لیے بھیجے گئے تھے۔ چار اندر آئے تھے۔ ایک ٹرک ڈرائیور اور ایک وہ جو باہر نظر رکھے ہوئے تھا۔ کنٹینر کے اندر والا ملا کے سات۔ ان کی تعداد زیادہ بھی ہو سکتی تھی۔ لیکن اتنی بھی نہیں کہ معلوم ہو دشمن کے قلعے کو سر کرنے کے لیے فوج کشی مطلوب تھی۔

پہلا فائر ہوا تو میں اچھل پڑا۔ آواز اندر سے آئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی کوئی بڑے بے ہنگم طریقے پر چلایا اور میں نے آواز پہچان لی۔ یہ وہی اُجڈ اور اکھڑ شخص تھا جسے گروپ لیڈر یعنی مشینی لہجے میں بات کرنے والا روبوٹ بار بار فہمائش کرتا تھا۔ پھر دوسرا فائر ہوا اور دوسرے شخص نے چیخ کے کہا۔ "میں ان دونوں کو گولی مار دوں گا۔" اس کے ساتھ ہی رابعہ کے چلانے کی آواز نے مجھے احتیاط کے سب تقاضے نظر انداز کرنے پر مجبور کر دیا۔

"محسن... ٹیڈی..." میں نے سر اٹھا کے کہا۔ کیے بعد دیگرے

دو گولیاں میرے سر کے اوپر دائیں بائیں سے گزر گئیں۔ اس فولادی ہال میں فائر کی آواز نے بڑی گونج پیدا کی۔ گولیاں ایک تاریک گوشے سے چلائی گئی تھیں جہاں میرے اندازے کے مطابق کوئی ریوالور لیے دبکا کھڑا تھا۔ میں نے سر کو ایک لمحے کے لیے نیچے کیا اور دوسرے لمحے بجلی کی طرح اُٹھتے ہوئے باہر کود گیا۔ اندر کھڑا ہوا محافظ اس ایک لمحے میں تھوڑا سا مطمئن اور غافل ہو گیا تھا کہ میں اتنی جلدی دوبارہ سر اُٹھانے کی جرأت نہیں کروں گا۔

میں زمین پر گرا اور ایک دم پلٹ کر ٹرک کے بھاری بھرکم اور بڑے بڑے پہیوں کے درمیان کی جگہ میں گھس گیا۔ میرا محافظ شاید دوڑ کر دروازے تک آیا تھا۔ جتنا وقت مجھے باہر گرنے میں لگا تھا اتنا ہی اسے پھر مجھے زد پر لینے میں صرف ہوا تھا کیونکہ جیسے ہی میں نے پلٹا کھایا کیے بعد دیگرے دو فائر ہوئے۔ ایک سیکنڈ کے سوویں یا ہزارویں حصے کے فرق نے مجھے نشانہ بننے سے بچا لیا اور گولیاں وہاں زمین میں پیوست ہو گئیں جہاں میں گرا تھا۔ میرے کانوں میں رابعہ کے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ مجھے اپنے خالی ہاتھ ہونے کا افسوس ہوا، ورنہ وہ دونوں بدمعاش جو رابعہ کو ڈھال بنائے لا رہے تھے میرے سامنے تھے۔

اس وقت مجھے خیال آیا کہ اس ٹرک کے نیچے بھی میں محفوظ ہوں اور جیسے ہی اندر سے فائرنگ کرنے والا بتائے گا کہ ایک قیدی نکل کر ٹرک کے نیچے چھپ گیا ہے، باقی شکاری مجھے ہر طرف سے فائرنگ کر کے مار ڈالیں گے یا بہ آسانی نکال لیں گے۔ میرے پاس ایک ریوالور ہوتا تو میں اس محفوظ مورچے سے فائدہ اُٹھا سکتا تھا۔ رابعہ اور شہلا کے زخمی ہونے کا خیال کرتا تو ان پر گولی نہ چلاتا مگر اس ٹرک کے اگلے ٹائر برسٹ کر دیتا یا ڈیزل ٹینک میں سوراخ کر دیتا اور ان کے فرار کو ناممکن کر دیتا۔ ٹرک کے ٹائر اتنے بھاری اور موٹے تھے کہ عام کیل سے ان کا کچھ بھی نہ بگڑتا۔ میرے پاس خنجر بھی ہوتا تو بے کار تھا۔ ہر پہیے میں ڈبل ٹائر ہونے کے باعث ایک دو ٹائروں کے فلیٹ ہونے سے فرق بھی نہ پڑتا۔ چنانچہ میں نے فوری طور پر نکل بھاگنے کا فیصلہ کیا۔ آزاد رہ کر میں بہت کچھ کر سکتا تھا۔ اور آزادی کے لیے مقابلے کا امکان نہیں تھا، فرار کے راستے ابھی کھلے ہوئے تھے۔

میں ٹرک کے عقبی حصے کے نیچے سے نکلنے کے لیے بڑھا ہی تھا کہ ٹرک کے اندر سے محافظ نے چلّا کے کہا۔ "ایک سُور کا بچہ بھاگ گیا۔"

"کیسے بھاگ گیا...؟" باہر سے کوئی گالی دے کر اور چیخ کر بولا۔ "تو کیا سو گیا تھا۔ بے ہوش آدمی پر نظر نہیں رکھ سکا۔"

"وہ بے ہوش نہیں تھا... تم دونوں اُلو کے پٹھے اور بیوقوف ہو جو ایسا سمجھتے تھے۔" وہ اوپر سے بولا۔ "دیکھو اسے، وہ نیچے گھسا تھا۔"

تُو نے پاؤں میں مہندی لگا رکھی تھی۔" نیچے سے دوسرے نے اُسے زیادہ گندی گالی دے کر کہا۔

"میں نیچے اترتا تو تیرے یہ دونوں باپ بھی بھاگ جاتے۔" اوپر والے نے گالی کا جواب گالی سے دیا۔ "ان دونوں کو اندر ڈالو اور اسے نکالو۔"

رابعہ کی خاموشی ظاہر کرتی تھی کہ وہ بھی بے ہوش ہو گئی ہے یا کر دی گئی ہے۔ چند سیکنڈ کے اس وقفے میں جو ٹرک کے فولادی ڈھانچے کی پناہ میں گزرا، مجھے یہ بھی سوجھی تھی کہ میں کسی بھی قریب آنے والے کو ٹانگ پکڑ کے اندر گھسیٹ لوں اور اس سے ریوالور چھین لوں مگر اس میں کامیابی کے امکانات بہت کم اور خطرات بہت زیادہ تھے۔ یہ ضروری تھا کہ آنے والا اتنا قریب آ جائے کہ میرے دونوں ہاتھوں کی دسترس میں ہو۔ پھر یہ بھی ضروری تھا کہ میرے ہاتھ اس کے ٹخنوں سے اوپر کے حصوں کو صحیح طرح گرفت میں لے سکیں اور آخری بات یہ ضروری تھی کہ میں اسے اتنی قوت کے ساتھ جھٹکا دے سکوں کہ وہ سر کے بل گرے اور سیدھا اندر کھنچا چلا آئے۔ ٹرک کے نیچے میری نقل و حرکت کی صلاحیت بہت محدود تھی۔ ہر طرف کیل کانٹے تھے اور میں سیدھا بیٹھ بھی نہ سکتا تھا۔ ایسی حالت میں میری کوشش کا انجام ناکامی ہوتا تو بعد کے نتائج زیادہ بھیانک نکلتے چنانچہ میں نے زیادہ سے زیادہ دُور جانے کا فیصلہ ٹھیک ہی کیا تھا۔

ابھی غالب اندر تھا اور ایک شکاری بھی باہر نہیں آیا تھا جو غالباً وہی روبوٹ گروپ لیڈر تھا۔ ابھی تک انھوں نے ایک دوسرے کو نام سے مخاطب کرنے کی غلطی نہیں کی تھی اور صرف مشینی لہجے میں بولنے والا ہی آواز بدل کے بات نہیں کر رہا تھا، باقی سب بھی اصل آواز میں گفتگو نہیں کر رہے تھے۔ انھیں اپنی شناخت کو چھپانے کے لیے مفصل اور واضح ہدایات دی گئی تھیں جن پر وہ پوری طرح عمل پیرا تھے مگر اُن کے طرزِ عمل نے بہت سے راز کھول دیے تھے۔ ایک تو یہ کہ وہ اجنبی تھے اور ہم میں سے کسی کو پہچانتے نہیں تھے۔ اس سے یہ نتیجہ بھی نکالا جا سکتا تھا کہ وہ نئے شکاری تھے یا انھیں اس مہم پر بھیجنے والوں نے ایسے افراد کا انتخاب کیا تھا جو پیشہ ور بدمعاش نہیں تھے۔ مقصد اس کے سوا کیا ہو سکتا تھا کہ وہ پکڑے جائیں تو پولیس کے پاس ان کا کوئی ریکارڈ نہ ہو اور وہ کسی کا نام نہ بتا سکیں۔ نہ دلاور اینڈ کمپنی کے کسی رکن کا اور نہ ہمارا... انھیں یہ بھی معلوم نہ ہو کہ ہمیں کس لیے اٹھوایا جا رہا تھا۔ اس بار شکاری محتاط تھے۔ ان میں سے کوئی شہر کے کسی نئے بدمعاش کے پاس پہنچا ہوگا اور اس کے سامنے ایک لاکھ روپے رکھے ہوں گے کہ سوال جواب کوئی نہیں۔ فلاں جگہ اتنے لوگ ہیں۔ انھیں جیسے چاہو اُٹھا لاؤ اور فلاں جگہ پہنچا دو۔ پہنچا دیا تو دو لاکھ یا تین لاکھ اور ملیں گے۔ نہ لا سکے اور پکڑے

گئے تو تمھاری قسمت۔ تم سے ایک لاکھ کوئی واپس نہیں مانگے گا لیکن بچانے کے لیے بھی کوئی سامنے نہیں آئے گا۔ تم خود بتاتے رہنا کہ تم نے جو کچھ کرنے کا سوچا تھا اس کا مقصد کیا تھا، پولیس کے سامنے ذمے دار ہمیں ٹھہرانا بے کار ہوگا کیونکہ تم ہمارا نام پتا ٹھکانا کچھ جانتے ہی نہیں اور پولیس یہ عُذر قبول نہیں کرتی کہ تم کوئی جرم کسی کے کہنے پر کر رہے تھے۔ خصوصاً ایسی صورت میں جب مجرم فرضی نام لیں۔ اس نئے بدمعاش کے لیے ایک لاکھ بہت تھے اور یہ اس کے لیے خود کو بڑا بدمعاش ثابت کرنے کا چیلنج تھا۔ حقیقی معنوں میں بڑا بدمعاش بننے کے کیریئر کے آغاز کا پہلا سنہرا موقع... ایک لاکھ کا جُوا... ہار گئے تو وہی جیل جو اس کیریئر کی ٹریننگ اکیڈمی ہے اور چھوٹے بدمعاش کو بڑا بدمعاش بننے کے لیے وہاں سے پاس آؤٹ کرنا ہی پڑتا ہے۔ نہ پکڑے گئے تو مزید تین لاکھ۔ کیریئر کا پہلا بڑا منافع بخش ٹھیکہ جس سے گڈوِل قائم ہو گی اور مستقبل میں شہرت اور کامیابی کے نئے راستے کھل جائیں گے۔ اس نئے بدمعاش نے چانس سے فائدہ اٹھانے کے لیے یارانِ کہن سے مشاورت کی اور چند حوصلہ مند ساتھیوں کو گروپ بنانے اور اسے گروپ لیڈر تسلیم کرنے کی ضرورت اور افادیت کا قائل کر لیا۔ یہی وجہ تھی کہ ان میں ابھی ڈسپلن کا فقدان تھا اور پرانے تجربہ کار لوگوں کی طرح منصوبہ بندی کرنے اور سکون کے ساتھ منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی صلاحیت کی کمی تھی۔

یہ سب وہ خیالات تھے جو اُن حملہ آوروں کے آنے کے بعد سے اب تک کے رویے کو دیکھتے ہوئے میرے ذہن میں آئے تھے۔ اس تمام عرصے میں جب میں مصروفِ عمل تھا، میرا ذہن اپنے طور پر حقائق کو جمع کرنے اور نتائج اخذ کرنے میں مصروف تھا۔ ٹرک کے نیچے سے نکلتے وقت بھی میں نے مجموعی صورتِ حال کو فراموش نہیں کیا تھا اور احتیاط ہر لمحہ مجھے ملحوظ رہی تھی چنانچہ آگے سے نکلنے کے بجائے میں نے پیچھے کا راستہ منتخب کیا تھا۔ آگے میری معلومات کے مطابق ایک ڈرائیور موجود تھا اور میں یہ فرض نہیں کر سکتا تھا کہ وہ مسلح نہیں ہوگا۔ اگر میں سامنے سے نکلتا تو کیتھرین کی گاڑی سامنے تھی اور میں ایک جست میں اس گاڑی کے پیچھے پہنچ جاتا لیکن یہ ناممکن تھا کہ میں اس گاڑی کو اسٹارٹ کر کے نکل جاتا۔ الٹا یہ ہو سکتا تھا کہ وہ گاڑی تباہ ہو جاتی جس کی طرف ابھی ان کا دھیان نہیں گیا تھا۔

میں پیچھے والے دونوں ٹائروں کے بیچ میں سے نکلا تو اندر سے رابعہ کو لانے والے ٹرک کے دونوں طرف نیچے جھکے ریوالور نکالے ایک ہی بات کو بار بار دُہرا رہے تھے۔ "تم چھپ کر نہیں رہ سکتے۔ بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتے۔ خیریت چاہتے ہو تو باہر آ جاؤ۔" ان باتوں کے ساتھ ساتھ وہ گالیاں

رہے تھے۔ رابعہ کو غالباً وہ اندر پھینک چکے تھے۔ میں پیچھے بھی زیادہ دیر چھپا نہیں رہ سکتا تھا۔ بالآخر ان میں سے کوئی چکر لگاتا ہوا پیچھے بھی آ سکتا تھا۔ وہ فائر کرنے سے گریز کر رہے تھے کیونکہ انھیں گولی کے کسی ٹائر میں لگ جانے کا ڈر تھا۔ نقصان زیادہ بھی ہو سکتا تھا اگر گولی سے ڈیزل یا آئل ٹینک میں سوراخ ہو جاتا، بریک لائن یا فیول لائن کٹ جاتی۔

اچانک میری نظر نے لوہے کی اس سیڑھی کو دیکھا جو ٹرک کی باڈی کے پچھلے حصّے کے ساتھ بنی ہوئی تھی۔ اس ٹریلر میں اوپر سامان نہیں رکھا جاتا کیونکہ اوپر کی سطح بالکل ہموار تھی اور اس کے کناروں پر کسی قسم کی روک بھی نہیں تھی۔ سیڑھی لگانے کا بظاہر کوئی مقصد نہیں تھا سوائے اس کے کہ کبھی کبھار اوپر سے صفائی مقصود ہو تو چڑھا جا سکے۔ میں نے سیڑھی کو اپنی ہنگامی ضرورت کے لیے تائیدِ ایزدی جانا اور اوپر چڑھ گیا۔ کنٹینر کی چھت زمین سے پندرہ فٹ تو یقیناً اونچی تھی۔ اس کے اوپر چھ فٹ کا آدمی کھڑا رہ کے کیسے چھپا رہ سکتا تھا چنانچہ میں بالکل وسط میں لیٹ گیا اور سرکتا ہوا آگے بڑھا۔

" وہ نیچے نہیں ہے..." کسی نے چلّا کے کہا۔

" اور کہاں جا سکتا ہے۔ نیچے ہی ہوگا... آنکھیں کھول کے دیکھو۔"

" تیری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں... جب وہ بھاگا تھا..." دوسرے نے مشتعل ہو کے گالی دیتے ہوئے کہا۔" وہ کسی اور طرف نکل گیا اور تجھے پتا نہیں چلا... ابھی اپنے باپ کو جواب دینا۔"

" کیا شور ہے یہ ؟" مشینی لہجے والا روبوٹ اندر سے برآمد ہوتے ہوئے بولا۔" کون نکل گیا ؟" باقی نے اس کو صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہوئے ایک دوسرے پر الزام تراشی کا سلسلہ جاری رکھا۔ جس محافظ کی غفلت نے مجھے فرار کا موقع فراہم کیا تھا وہ زیادہ قصوروار سمجھا جا رہا تھا حالانکہ جس طرح میں جان ہتھیلی پر رکھ کے کودا تھا اس کو میری بے وقوفی یا خوش قسمتی کچھ بھی سمجھا جا سکتا تھا۔ اس محافظ کی جگہ کوئی دوسرا یا خود گروپ لیڈر بھی ہوتا تو صورتِ حال مختلف نہ ہوتی۔ اب الزام کے جواب میں الزام لگا کے وہ سب خود کو بچانے میں لگے ہوئے تھے اور مجھے بھولے ہوئے تھے۔ میں نے آہٹ کیے بغیر آگے کھسک کر کنارے سے سر نکالا اور نیچے جھانکا۔ گروپ لیڈر ان سب کو ایک جیسی گالیاں دے رہا تھا۔ ایک معمولی سے حادثے نے ان کو بدحواس اور پریشان کر رکھا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ آخر غالب اور کیتھرین کا کیا بنا۔ وہ ابھی تک باہر نہیں آئے تھے۔

ان کا ایک ساتھی غالباً مارا جا چکا تھا۔ اس کی چیخ سے تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ گولی کا نشانہ بن گیا تھا اور گولی یا غالب چلا سکتا تھا یا پھر کیتھرین چلا سکتی تھی۔ دوسری گولی کا نشانہ آخر کون بنا تھا؟ دل کے وسوسے کہتے تھے کہ انہی دونوں میں سے ایک اپنی جرأت مندی کا خمیازہ بھگتتا۔ دوسرا فائر بھی انھوں نے کیا ہوگا اور دشمن اس کا نشانہ ہوتا تو مجھے ایک آدمی کم نظر آتا یا زخمی نظر دکھائی دیتا۔ اگر وہ دونوں اندر تھے تو کیا ان میں سے ایک مر چکا تھا۔ کون مر چکا تھا؟ کیتھرین نے اچانک اُٹھ کر ایک کو نشانہ بنا لیا تھا اور دوسرے کا نشانہ بن گئی تھی۔ یا غالب ایک کو مار کے باہر آنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ پہلی صورت زیادہ امکانی تھی... کیونکہ کیتھرین اتنی دیر تک ساکت و صامت نہیں پڑی رہ سکتی تھی۔ اس سے امید بھی بندھتی تھی کہ غالب محفوظ ہے اور شاید ہوش مندی سے کام لیتے ہوئے سامنے آنے سے گریز کر رہا ہے۔ وہ عین وقت پر نمودار ہو کے ان کے پروگرام کا ملبہ کر دے گا لیکن اس سے ناامیدی کا جو احساس پیدا ہوتا تھا، وہ زیادہ دل شکن اور پُرآزار تھا۔ کیتھرین کو مرنا نہیں چاہیے۔ اگر وہ مر گئی تو پھر جولی بھی مر جائے گی۔ ایسے وقت میں جب زندگی سے مایوس جولی کے لیے جینے کے اسباب پیدا ہو گئے تھے اور دستِ غیب نے اس کے لیے حیاتِ نو کے فرمان پر مُہرِ تصدیق ثبت کر دی تھی، جولی کا بے آسرا ہو جانا ہی اس کی موت تھا... نہیں... قدرت اس کے ساتھ اتنا سنگین مذاق نہیں کر سکتی۔

" تم سب گدھے ہو۔" گروپ لیڈر نے کہا۔" وہ بھوت یا چھلاوا نہیں تھا آدمی تھا۔ اب اس بحث سے کیا فائدہ کہ وہ کس کی غلطی سے نکلا وہ یہیں ہوگا۔ تلاش کرو اسے... دوسری گاڑی میں دیکھو۔ اس گھاس میں دیکھو۔ یہ گدھے گھوڑے کیسے کھڑے ہیں یہاں... ریڑھا کیوں موجود ہے؟"

" میرے لیے کیا حکم ہے؟" آگے سے آواز آئی اور میں نے پہلی بار ڈرائیور کی موجودگی کا یقین کیا ورنہ اب تک وہ ایک مفروضہ تھا۔

" تم کچھ مت کرو... ہاتھ پہ ہاتھ رکھے تماشا دیکھتے رہو۔ مونچھوں کو تاؤ دیتے رہو۔" گروپ لیڈر نے کہا۔ آہستہ آہستہ وہ بھی نروس ہونے لگا تھا اور اس کا مصنوعی سیلف کنٹرول ختم ہوتا نظر آ رہا تھا۔

" خود تم نے ہی کہا تھا کہ تمھارا کام بالکل تیار رہنا ہے تاکہ روانگی میں ایک سیکنڈ کی دیر نہ ہو۔" ڈرائیور خفگی سے بولا۔

" اچھا اس ٹرک کو آگے بڑھا دو۔ وہ نیچے ہوگا تو مرے گا یا نکلے گا۔"

ابھی تک میں طے نہیں کر پایا تھا کہ میں کس طرح ان بدمعاشوں کی بدمعاشی ختم کروں۔ وہ مسلح تھے اور تعداد میں زیادہ ہونے کے علاوہ پھیلے ہوئے تھے۔ اگر وہ ایک ہی جگہ ہوتے تو میں اوپر سے چھلانگ لگا دیتا۔ ایک کو گرتے گرتے گرا دیتا اور باقی کو سنبھلنے سے پہلے بے دست و پا کر دیتا۔ چند سیکنڈ کی جنگ میں کود کر دشمن کی قوت کو ختم کرنے کا خطرہ بھی مول لیا جا سکتا تھا لیکن اسی صورت میں کہ کامیابی کے امکانات واضح نظر آتے ہوں۔ ٹرک اسٹارٹ ہوا تو میں نے سوچا کہ اب مجھے اوپر ہی قیام کرنا چاہیے اور یہ دیکھنا چاہیے کہ آخر یہ ٹریلر کہاں جاتا ہے۔

جو بات ابھی تک میری عقل میں نہ آ سکی تھی وہ یہی تھی کہ آخر کس عقل مند نے ان لوگوں کو یہ ٹرک استعمال کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ اس کی رفتار ایک حد سے زیادہ نہیں بڑھائی جا سکتی تھی۔ اسے تنگ راستوں اور تمام سڑکوں پر سے نہیں گزارا جا سکتا تھا۔ چند سڑکیں ہیوی ٹریفک کے لیے ممنوعہ علاقہ تھیں۔ کچھ ایسے پُل بھی تھے جن پر سے ایک مخصوص سائز اور وزن سے زیادہ کی گاڑیاں گزارنا منع تھا۔ اس چلتے پھرتے پہاڑ کو چھپانا مشکل تھا لیکن اس کا سراغ لگانا اور تعاقب کرنا بہت آسان تھا۔ اس کی جگہ کوئی بھی عام تیز رفتار ٹرک یا ویگن ہوتی تو زیادہ کارآمد ثابت ہوتی۔ یہ صرف آٹھ افراد کی منتقلی کا مسئلہ تھا۔ اس میں دو کاریں بھی استعمال کی جا سکتی تھیں۔ پھر یہ کنٹینر کس لیے جس میں سینٹرل جیل کے سارے قیدی ایک ہی پھیرے میں منتقل کیے جا سکتے تھے۔

ٹرک آگے بڑھا تو میں نے اپنی پوزیشن بدلی اور میری نگاہ نے ایک ربر کی نلکی دیکھی جو کنٹینر کی سپاٹ چھت میں ایک روشندان ٹائپ سوراخ میں سے اندر چلی گئی تھی۔ یہ روشندان اس قسم کا تھا کہ چھت پر پڑنے والی بارش یا دھوپ کا اندر گزر نہ تھا لیکن ہوا کی راہ میں رکاوٹ نہیں تھی۔ اس قسم کے روشندان اور بھی تھے اور ان کا مقصد یہی معلوم ہوتا تھا کہ کبھی اس ہال جیسے کنٹینر میں مویشی لے جانے پڑیں تو انھیں تازہ ہوا ملتی رہے۔ یا بفرضِ محال اندر انسان ہوں تو زندہ رہیں۔

میں نے نلکی کو کھینچنا چاہا مگر وہ چھت کی سطح کے نیچے کہیں مضبوطی سے لگی ہوئی تھی۔ اس کا دوسرا سرا مجھے ٹریلر کے آگے ٹرک کو چلانے والے حصّے میں ڈرائیور کیبن کے اوپر تک جاتا نظر آیا۔ کیبن کے اوپر مختصر سا جنگلا لگا ہوا تھا۔ اور اس پر دوسرے فاضل ٹائر کے علاوہ بھی کچھ سامان پڑا ہوا تھا۔ نلکی وہیں لپیٹے ہوئے ایک سلنڈر سے ملتی تھی۔ یہ بات کچھ عجیب سی تھی۔ میں نے کسی بھی ٹرک بس یا ویگن پر اس قسم کا کوئی نظام پہلے نہیں دیکھا تھا اور اس کی ضرورت بھی مشکوک تھی۔ ہر فاضل نظر آنے والا پُرزہ بھی اگر گاڑی کے لیے ضروری ہو تو وہ ایسی جگہ نصب نہیں کیا جا سکتا۔ یہ آگ بجھانے والا آلہ بھی نہیں تھا جو ہمیشہ اندر ڈرائیور کی دسترس میں رکھا جاتا ہے۔

سلنڈر کا رنگ بھی زرد اور سُرخ تھا اور اس پر سفید دائرہ بنا ہوا تھا۔ میں نے قریب سے دیکھا تو اس پر مجھے سفیدی کے نیچے بھی سیاہی کی جھلک نظر آئی۔ اس پر خطرے کا نشان تھا۔ جس کو سفید پینٹ کے نیچے چھپانے کی کوشش کی گئی تھی مگر ایک کاسۂ سر کے ساتھ دو ہڈیاں کراس کی صورت میں نظر آ جاتی تھیں۔

قدرتی طور پر مجھے خیال آیا کہ اس میں پہلے کوئی زہریلی گیس تھی۔ مگر زہریلی گیس کے سلنڈر کو کسی دوسری بے ضرر گیس کے لیے استعمال کرنے کی وجہ کوئی نہیں ہو سکتی اور ایسی کون سی گیس ہے جو کسی گاڑی میں یوں رکھی جائے۔ اس میں اب بھی وہی زہریلی گیس ہوگی۔ اس خیال نے مجھے پریشان کر دیا۔ اس کا مقصد یہی ہوگا کہ کسی بھی وقت زہریلی گیس کے سلنڈر کو کھولا جائے تو گیس فولادی کنٹینر میں داخل ہونے لگے۔ کوئی بھی گیس جو ہوا سے بھاری ہوگی، وہ نلکی کے راستے نیچے اتر جائے گی اور سانس لینے والوں کے پھیپھڑوں میں پہنچ جائے گی اور وہ کنٹینر ایک گیس چیمبر بن جائے گا۔ کسی قسم کی مزاحمت کا سوال ہی پیدا نہ ہوگا اور زہریلی گیس سونگھنے والے بے ہوش ہو جائیں گے یا مر جائیں گے۔

اس تصور نے ہی مجھے لرزا دیا کہ میرا اور میرے ساتھ پوری ایم آر ایس کا کیا انجام ہو سکتا تھا۔ میں نے ایک بات قبل از وقت دریافت کر لی تھی۔ اب اس موت کے سامان کو غیر مؤثر بنانا ضروری تھا۔ پہلے میں نے نلکی کو کھینچ کر سلنڈر سے جدا کرنے کا سوچا لیکن اس طرح تو جو بھی سلنڈر کا والو کھولنے آتا اُسے فوراً معلوم ہو جاتا کہ ٹیوب الگ ہے اور وہ اُسے پھر جوڑ دیتا۔ میں نے آہٹ کیے بغیر اوپر کے سامان میں کوئی ایسی چیز تلاش کی جس سے ربر کی نلکی کاٹی جا سکے لیکن وہاں ایسی کوئی بھی چیز نہ تھی۔ میں مایوس ہونے لگا تھا کہ مجھے جنگلے کا کنارا دکھائی دیا۔ ربر پائپ کو اس کے اوپر رگڑنے سے کام بننے کی امید تھی۔ میں نے پائپ کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کے جنگلے پر دبایا اور اس طرح رگڑا کہ کیبن میں بیٹھے ہوئے ڈرائیور کو حرکت کا ارتعاش بھی محسوس نہ ہو۔ کند نظر آنے والا کنارہ خلافِ توقع بہت جلد پائپ کو اُدھیڑنے میں کامیاب رہا۔ پائپ کا ربر بھی نرم تھا۔ دو منٹ میں ربر اتنا کٹ گیا کہ میں نے دونوں طرف سے اسے انگلیوں میں دبا کے کھینچا اور پائپ کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ میں نے ان کو وہیں ساتھ ساتھ چھوڑ دیا۔ اب اوپر آ کے سلنڈر کی چابی گھمانے والا ایک نظر میں دیکھ ہی نہیں سکتا تھا کہ گیس لائن درمیان میں سے منقطع ہے۔ گیس فضا میں منتشر ہو جائے گی اور انھیں اس وقت پتا چلے گا جب سلنڈر خالی ہو چکا ہوگا۔

دریں اثنا وہ مجھے ہر طرف تلاش کرنے والے ناکامی کا اعتراف کر چکے تھے۔ تاہم روبوٹ یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھا کہ میں پلک جھپکنے میں غائب ہو گیا۔

" اندر باہر سب جگہ تم لوگ موجود تھے۔" وہ بولا۔" تم نے صرف اس کو باہر چھلانگ لگاتے اور ٹرک کے نیچے گھستے دیکھا تھا۔ نیچے سے وہ نکلا نہیں تو پھر کہاں گیا؟"

" اوپر۔" ایک بے وقوف نظر آنے والے نے اچانک

وہ بات کہہ دی کہ وہ سب چونکے۔ میں فوراً پیچھے نہ ہٹ جاتا تو وہ سب مجھے دیکھ لیتے جن کے سر خود بخود اوپر اٹھ گئے تھے۔

"یہ ٹھیک ہے... اوپر دیکھو۔" روبوٹ بولا۔ "باقی سب ذرا ہٹ کر گھیرا ڈال لو۔"

اس کی بات نے مجھے نروس کر دیا۔ اب میرے لیے نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن والی پوزیشن تھی۔ تین میں سے دو ٹریلر کے ایک جانب کھڑے ہو گئے۔ روبوٹ دوسری طرف رہا۔ اور چوتھے نے نیچے سے اوپر چڑھنا شروع کیا۔ میں نے ایک کنارے پر ہو کے ادھر دیکھا جہاں سے ایک مسلح شخص نمودار ہونے والا تھا۔ دوسری نظر نیچے ڈالی جہاں روبوٹ ٹریلر سے تقریباً دس فٹ کے فاصلے پر قدم جمائے کھڑا تھا اور پھر جسم کو تول کر جست لگا دی۔

گروپ لیڈر کی نگاہ اوپر ہوتی تو شاید وہ ہٹ جاتا مگر وہ پہلے اوپر جانے والے ساتھی کی طرف متوجہ تھا۔ جب اس نے مجھے دیکھا تو اتنا وقت بھی نہ رہا تھا کہ وہ سنبھل پاتا یا ریوالور کام میں لاتا۔ میں اس کے ساتھ ہی گرا۔ اس نے چلا کر کسی کو آواز دی اور مجھے دھکیلنا چاہا مگر موت کے روبرو میری تمام ذہنی اور جسمانی صلاحیت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا۔ مجھے اسی مشینی لہجے میں بولنے والے کو زمین بوس کرنے اور اس کے ہاتھ سے ریوالور چھیننے میں تیس سیکنڈ بھی نہیں لگے۔ اس کی آواز نے سب سے پہلے ڈرائیور کو متوجہ کیا تھا مگر وہ خاصی بلندی پر کیبن میں فٹ تھا۔ یہی پوزیشن اس شخص کی تھی جو اب کنٹینر کی چھت پر نظر ڈال رہا تھا اور سب سے اوپر والی سیڑھی پر کھڑا ہوا تھا۔ وہ اوپر ہوتا تو مجھے براہ راست نشانہ بنا لیتا۔ اسے اور ڈرائیور کو نیچے اترنے میں کچھ وقت لگا اتنا ہی وقت دوسری طرف کھڑے ہوئے دو افراد کو گھوم کر آنے میں لگا۔ مگر یہی مختصر ترین مہلت میرے لیے زندگی کی ضمانت بن گئی۔ میں پھر ٹرک کے نیچے گھس گیا۔ جہاں سے پہلا فائر میں نے ڈرائیور پر کیا۔

ڈرائیور اپنی جگہ پر گھوم گیا۔ گولی نے اس کے سینے پر زخم کھول دیا تھا۔ وہ منہ پھاڑ کے چلایا اور نیچے گر گیا لیکن اس کے بعد مجھے مہلت نہ ملی۔ باقی تین نے ٹائروں کے پیچھے رہتے ہوئے اپنے ریوالوروں کا رخ میری طرف کر دیا۔

"باہر نکل آؤ۔ اپنا ریوالور وہیں چھوڑ دو۔" روبوٹ نے کہا۔ "مجھے بہت افسوس ہے کہ میں تم کو شوٹ نہیں کر سکتا، ورنہ اب تک اس ریوالور کی ہر گولی تمہارے جسم میں اتر گئی ہوتی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں تمہارے ہاتھوں مرنا قبول کر لوں گا مگر تم کو نہیں ماروں گا۔"

میں نے مقابلہ بے سود سمجھا۔ کھلی جگہ پر میں ان تینوں سے نمٹ سکتا تھا مگر یہاں مقابلہ آتشیں اسلحے کا تھا اور میں تین طرف سے گھرا ہوا تھا۔ میری مایوسی کی دوسری وجہ غالب اور کیتھرین کا خیال تھا۔ ابھی تک مجھے امید تھی کہ غالب کچھ نہ کچھ ضرور کرے گا لیکن آہستہ آہستہ میرا یقین پختہ ہوتا جا رہا تھا کہ وہ اس قابل ہی نہیں۔ وہ زخمی پڑا ہے اور شکاری جانتے ہیں کہ وہ خود ہی مر جائے گا۔ شاید اب تک مر چکا ہوگا۔ پھر کیتھرین رہ جاتی تھی۔ وہ بھی بہت کچھ کر سکتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس کی بے ہوشی ڈراما ہے مگر یہ خیال بھی غلط ثابت ہو رہا تھا۔ اس کی بہادری کی ساری داستانیں، جرأت مندی اور بے خوفی کے سارے دعوے اور عزم و حوصلے میں بہرام دادا جیسے مرد سے کم نہ ہونے کی باتیں وقت آنے پر جھوٹی ہو گئی تھیں۔ تھی وہ عام عورت بلکہ عام عورت کے مقابلے میں زیادہ کمزور۔ رابعہ نے حواس برقرار رکھے تھے لیکن وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ شاید بعد میں اس سے بھی ریوالور لے لیا گیا ہوگا اور اس کی بے ہوشی کو ابدی نیند میں بدل دیا گیا ہوگا۔ اب میرا ذہن قائل ہو رہا تھا کہ پہلا فائر غالب نے کیا اور اس اجڈ آدمی کو ختم کر دیا جو سب سے زیادہ جارحانہ رویہ رکھتا تھا۔ پھر کسی نے جواب میں گولی چلائی اور غالب کو مار دیا۔ فائر دو ہی ہوئے تھے۔ ایک سے دشمنوں کے ایک ساتھی کا مارا جانا ثابت ہوتا تھا۔ دوسرے فائر سے غالب اور کیتھرین میں سے ایک مارا گیا تھا تو یہ فرض کرنا مشکل تھا کہ ایک گولی چلا کے دشمنوں نے بے ہوش پڑی ہوئی کیتھرین کو ختم کیا تھا اور غالب ابھی تک چھپا بیٹھا تھا۔ میرے ذہن میں ایک جگہ ایسی تھی جہاں غالب چھپ سکتا تھا۔ دوسرے کمرے میں قالین کے نیچے ایک گوشے کا فرش دیکھنے میں برابر لگتا تھا لیکن وہاں تختے کو ہٹانے سے وہ خلا نمودار ہو جاتا تھا جس میں سے غالب کے باپ کی تجوری نکال لی گئی تھی۔ غالب اگر اس خالی جگہ میں بیٹھ کر تختہ برابر کر لیتا تو اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا مگر وہ ایسا آدمی تو تھا نہیں کہ جان بچانے کے لیے وہاں چھپا ہو۔ اگر وہ زندہ ہوتا تو اب تک ضرور نکل آتا۔ اس کے لیے دشمنوں کو اندر سے ہی نشانہ بنانے کے بہترین مواقع تھے۔

یہ وہ حوصلہ شکن خیالات تھے جن کی وجہ سے میں وقتی طور پر اپنی شکست تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا۔ مجھے یہ اندیشہ بھی تھا کہ یہ کرائے کے لوگ ہیں اور انھوں نے مجھے بھی قتل کر دیا تو باقی لوگوں کو یہ بہر حال لے جائیں گے اور اپنے آقاؤں کے سامنے بیان داغ دیں گے کہ ان میں سے دو بڑے سورما بنتے تھے چنانچہ مقابلہ کرتے ہوئے مارے گئے۔ باقی حاضر ہیں۔ ان کا اپنا بھی ایک آدمی کم ہوگا تو کسی ثبوت کی ضرورت باقی نہیں رہے گی کہ مقابلہ واقعی ہوا تھا۔ میں 'ہمہ یاراں دوزخ ہمہ یاراں بہشت' کے اصول پر بھی یقین رکھتا تھا اور یہ بھی محسوس کرتا تھا کہ اسیری میں غالب اور ٹیڈی کے ساتھ میرا ہونا ضروری ہے۔ ایک اور ایک گیارہ تو مزید ایک ملانے سے ایک سو گیارہ۔

میں شرافت سے باہر نکلا اور اس فولادی قید خانے میں چڑھ گیا جس میں محسن اور ٹیڈی کے ساتھ صرف رابعہ پڑی ہوئی تھی۔ مجھے خوشی ہوئی کہ شہلا کا گرفتار ہو جانا ایک بہت نیک فال ثابت ہوا۔ اس سے وہ خود انکل ضامن رضوی کے گھر میں محفوظ ہو گئی اور اسی کی وجہ سے نازو بھی بچ گئی۔ شہلا نہ پکڑی جاتی تو اس وقت قیدیوں میں تین حضرات کے ساتھ تین خواتین بھی ہوتیں۔ شہلا کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ مار دھاڑ اور اٹھا پٹخ برداشت کر سکتی۔ اسے بھی ٹریلر میں رابعہ کی طرح پھینکا جاتا تو خطرناک ہوتا اور اسے ناقابل تلافی نقصان بھی ہو سکتا تھا۔ وہ دونوں ہمارے لیے کچھ نہیں کر سکتی تھیں۔ ان کو کبھی معلوم بھی نہ ہوگا کہ ہم پہ کیا بیتی اور نہ جانے کب تک وہ ہمارا انتظار کریں گی۔ کوئی پیغام ملے۔ کوئی واپسی کی نوید ہو۔ کہیں سے خیریت کی اطلاع آئے۔ وہ کب تک آس لگائے بیٹھی رہیں گی؟ آس بڑی سخت جان چیز ہے کہ مصائب اور آلام کے پہاڑ ٹوٹیں، ناامیدی کا کوہ گراں آ پڑے اور سخت ترین آزمائش کی چکی پیس ڈالے مگر آس ٹوٹتی نہیں، مرتی نہیں... دم آخر تک امید کی ایک کرن ساتھ رہتی ہے کہ پھر کوئی آیا دل زار۔

"اب کھڑے منہ کیا دیکھ رہے ہو۔" روبوٹ نے کہا۔ "جاؤ اس بڑھیا کو بھی لے آؤ۔ دیکھتے نہیں فائرنگ کی آواز دوسروں نے بھی سن لی ہے۔ کسی نے پولیس کو فون کر دیا تو ہم یہیں دھر لیے جائیں گے۔"

"گاڑی اب کون چلائے گا؟" ایک ماتحت نے کہا جو کافی خوف زدہ محسوس ہوتا تھا۔

"گاڑی کوئی بھی چلا سکتا ہے۔ ان لاشوں کا کیا کرنا ہے؟" دوسرے نے زیادہ پریشانی سے کہا۔

"ظاہر ہے ان کو ہم چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔" گروپ لیڈر بولا۔ "دونوں کو یہیں ڈال دو۔"

ان کی گفتگو نے میری رہی سہی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ اگر وہ کیتھرین کو لا رہے تھے تو شک کی کوئی بات نہیں رہی تھی کہ غالب مارا گیا اور اس خیال نے ہی میرے دل میں خنجر اتار دیا۔ وہ مرد قلندر... یاروں کا یار... باضمیر اور اصول پرست انسان اور اپنی ذات سے بے پروا اور بے نیاز۔ راہ و رسم عاشقی میں وضعدار اور دولت دل کو دولت جہاں کے مقابل ہیچ سمجھنے والا۔ لاکھوں کروڑوں کی وراثت ترک کر کے آزادی کی جلاوطنی اختیار کرنے والا۔ نگری نگری پھرا مسافر گھر کا رستہ بھول گیا۔ اور جب گھر لوٹا تو بس پل بھر آرام کیا اور عدم کی راہ لی۔ اس کے دکھ کا سارا درد میری آنکھوں میں اتر آیا۔ اشک بن کے ٹپکا اور پھر بھی دل میں رہا۔

یکے بعد دیگرے دو خون آلود لاشیں اندر آئیں۔ ان میں سے ایک کے سینے سے اور دوسرے کے سر سے لہو اب بھی ٹپک رہا تھا۔ اب میرے سامنے پانچ بے حس و حرکت جسم پڑے تھے۔ ان میں زندہ اور مردہ کی تفریق صرف میں کر سکتا تھا جو گھٹنوں پر سر رکھے بے بسی سے سب کچھ دیکھتے رہنے پر مجبور تھا۔ ایک لاش محسن پر یوں گری تھی کہ اس کا آدھا اوپر کا دھڑ محسن کی ٹانگوں پر تھا چنانچہ اس کے سینے سے نکلنے والا خون محسن کو بھی تر کرنے لگا تھا۔ دوسری لاش رابعہ کے پاس گری تھی اور اس کا خون رابعہ کے دامن تک پہنچ رہا تھا۔ وہ سب آڑے ترچھے پڑے ہوئے تھے۔ دوست اور دشمن سب ایک دوسرے کے ساتھ تھے۔

جب کیتھرین کو اندر پھینکا گیا تو وہ بھی محسن کے اوپر والی لاش پر گری۔ محسن ایک مردہ اور ایک زندہ جسم کے بار سے دب گیا۔ مردہ جسم دشمن کا تھا اور زندہ دشمن کا نہیں تھا لیکن یہ سب میرے اپنے احساس کی تفریق تھی۔ وہ خود ان سب خیالوں سے بیگانہ تھے۔ امید اب بھی میرا ساتھ چھوڑنے پر آمادہ نہ تھی۔ ایک امید یہ تھی کہ شاید پاس پڑوس کے لوگوں میں سے کوئی فون کر چکا ہو اور پولیس آ جائے۔ بے شک پولیس بھی ہماری دوست نہیں تھی اور ہم ایک کی قید سے رہائی پاتے تو دوسرے کی قید میں پہنچ جاتے لیکن ترجیح کے اعتبار سے دیکھا جاتا تو پولیس کی قید آسان اور بہتر تھی۔ پولیس کے جال سے نکلنے کی امید کی جا سکتی تھی مگر ان سے نہیں جو ہمیں لے جا رہے تھے۔ ایک امید یہ بھی تھی کہ شاید اب بھی غالب آ جائے... مگر غالب کہاں کہ آ جائے یہ لاش بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہے۔

دروازہ دھڑ سے بند ہوا تو کنٹینر کے اندر اندھیرا چھا گیا جس میں کچھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ انھوں نے باہر سے لوہے کی سلاخ کو بولٹ کیا اور تالے ڈال دیے۔ میں آوازیں سنتا رہا اور تصور کی مدد سے سب دیکھتا رہا۔ چند منٹ بعد ٹرک کا انجن گرجا اور ٹریلر آہستہ سے آگے بڑھا۔ باہر سے آنے والی دوسری آوازیں معدوم ہو گئیں۔

"سکندر..." میں نے کیتھرین کی آواز سنی۔

میں اچھل پڑا۔ "تم... آنٹی کیتھرین... تم ٹھیک ہو؟"

"او یس... مجھے کچھ نہیں ہوا۔" وہ آہستہ سے بولی اور میں نے اس کا ہاتھ اپنے کندھے پر محسوس کیا۔ "یو او کے؟"

"ہاں۔ مجھے شرم آتی ہے یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ میں ٹھیک ہوں مگر میں تمہاری طرف سے بہت متفکر تھا۔" میں نے کہا۔

"میں بے ہوش نہیں تھی۔ میں انتظار کر رہی تھی کہ موقع ملے... مگر کیا کروں... وہ میرے سر پر کھڑے تھے۔ میں زیادہ سے زیادہ ایک کو مار سکتی تھی۔ پھر وہ مجھے مار دیتے اور میرا ریوالور چھین لیتے۔" وہ بولی۔

"کیا مطلب؟" ریوالور اب بھی تمہارے پاس ہے؟" میں

نے کہا۔

"ہاں... انھوں نے اسی وجہ سے مجھے نظرانداز کیا... اور اہمیت نہیں دی کہ عورت ہے اور اتنی بزدل عورت کے پاس کیا ہوگا۔" وہ بولی۔

"ان کا ایک آدمی تو مارا گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "جس کی لاش یہاں پڑی ہوئی ہے۔ اسے تم نے نہیں مارا تھا تو غالب نے مارا ہوگا۔"

"غالب؟ کیا وہ یہاں نہیں ہے؟" کیتھرین حیران ہو کے بولی۔

"نہیں... وہ اندر ہی تھا۔ دوسرے کمرے میں چھپ گیا تھا۔" میں نے کہا۔

"مجھے نہیں معلوم۔" کیتھرین نے کہا۔

"تم نے دو فائر تو سُنے ہوں گے؟" میں نے کہا۔

"ہاں... سُنے تھے۔" کیتھرین بولی۔

"کس نے چلائی تھیں وہ گولیاں؟" میں نے کہا۔

"مجھے کیا معلوم... میں نے دیکھا نہیں... صرف سُنا تھا۔ میں نے باہر سے بھی فائرنگ کی آواز سُنی تھی۔" وہ بولی۔ "کیا تم فائرنگ نہیں کر رہے تھے؟"

"میں نے بھی فائرنگ کی تھی... لیکن اندر نہیں... آخر ان کے آدمی کو کسی نے تو مارا ہوگا۔ محسن اور ٹیڈی تو پہلے ہی ناک آؤٹ ہو گئے تھے... اس کے بعد کسی نے جواب میں گولی چلائی تھی۔" میں نے کہا۔

"میں کیا بتاؤں... اصل بات وہی ہے کہ میں نے کچھ دیکھا نہیں تھا۔"

"بہرحال... مجھے یقین ہے کہ غالب مارا جا چکا ہے۔" میں نے کہا۔

"اوہ نو..." اس نے اندھیرے میں اپنے سینے پر انگلی سے صلیب بنائی۔ آہستہ آہستہ میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے لگی تھیں۔

"تم وہ ریوالور مجھے دے دو۔" میں نے کہا۔

"نہیں... میرے پاس شاید بچ جائے۔" وہ بولی۔

"میری تلاشی لی جا چکی ہے... تمھاری اب لی جائے گی۔" میں نے کہا۔

"کہاں لی جائے گی؟" وہ ریوالور مجھے دے کر بولی۔

"جہاں بھی ہمیں لے جایا جائے گا۔" میں نے کہا۔ "ابھی تو ہم سفر میں ہیں۔ دیکھو یہ ٹرک کب اور کہاں رُکتا ہے؟"

"یہ کون لوگ ہیں سکندر؟ دلاور کے شکاری؟" وہ بولی۔

"غالباً! یقین کے ساتھ تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" میں نے کہا۔ "مگر اور کون ہو سکتا ہے... خدا کا شکر ہے نازو اور شہلا بچ گئیں... لیکن آنٹی... اب جولی کا کیا ہوگا؟"

"کیا ہوگا؟ زیادہ سے زیادہ وہ مر جائے گی۔" وہ کھوئے لہجے میں بولی۔

"ایسا مت کہو... اُس کو زندہ رہنا چاہیے۔" میں نے کہا۔

"بہت کچھ ہونا چاہیے ینگ مین... لیکن وہ سب نہیں ہوتا۔" کیتھرین نے کہا۔ "میں کوئی فلاسفر نہیں ہوں مگر زندگی کے تجربات کا فلسفہ میں نے پڑھا ہے۔ میری زندگی ہوائی جہاز کا آرام دہ شاہانہ سفر نہیں تھی جس میں انسان ہوا پر تیرتا جاتا ہے۔ آنکھیں بند کر کے کوئی خواب دیکھتا ہے یا آنکھیں کھول کر اوپر کے آسمان یا نیچے بادلوں کے خوب صورت رنگ دیکھتا ہے اور منزل آ جاتی ہے۔ نہیں... یہ سمندروں کا سفر تھا۔ طوفانی لہروں، غضب ناک ہواؤں اور خطرناک چٹانوں کے ساتھ جاری رہنے والی جدوجہد کا سفر۔ میں نے زندگی اور موت کی آنکھ مچولی میں بارہا دستِ اَجل کو رگِ جاں سے بھی قریب تر پایا اور پھر میرے محافظ ہاتھ نے مجھے بچا لیا۔ جولی بھی ایسی ہی جدوجہد کر رہی ہے وہ بچانے والا ہاتھ اس کے ساتھ بھی ہے۔ اب میں سمجھنے لگی ہوں کہ ایسی حالت میں وہ آج تک کیوں زندہ رہی۔ خدا کو اسے زندہ رکھنا منظور تھا۔ ایک وقت تھا جب میں اس کی موت کے خیال سے بہت ڈرتی تھی۔ سوچتی تھی کہ وہ مر گئی تو میں بھی مر جاؤں گی۔ اس کا غم اور اس کی تکلیف میرے لیے بہت عذاب تھے مگر آہستہ آہستہ میں نے یہ عذاب برداشت کرنا سیکھا۔ میں سمجھتی تھی کہ جولی کو میرے سہارے کی ضرورت ہے۔ میری موجودگی اور میرا قرب اسے حوصلہ دیتا ہے۔ میری باتوں سے اس کو امید ملتی ہے۔ پھر میں نے جینے کی خوشی کو مطلق اور پُرامید نظر آنے کی جدوجہد شروع کی تاکہ میں جولی کے لیے وہ سب کچھ کر سکوں جو میں کرنا چاہتی تھی اور کر سکتی تھی۔ میں نے ایک حقیقت کو تسلیم کر لیا کہ میری کوشش اور ڈاکٹروں کی جدوجہد جولی کو زندہ رکھنے کی ایک خواہش کا نام ہے۔ ورنہ خدا کو نامنظور ہو تو میرے چاہنے اور ڈاکٹروں کے چاہنے سے کیا ہوگا... کچھ بھی نہیں۔ اور اگر اس کی زندگی باقی ہوگی تو خود بخود سب ٹھیک ہو جائے گا۔ دوا اثر کرے گی۔ جسم ساتھ دے گا اور کوئی معجزہ بھی رونما ہو جائے گا۔ معجزہ کیا ہے۔ کوئی بھی ایسی بات جو آدمی کے وہم و گمان میں نہ آ سکتی ہو۔ جب تم لوگ ملے تو میں نے فوراً اسے ایک معجزہ تسلیم کر لیا۔ میں ہر امید کو سہارا بنا لیتی ہوں۔ امید غلط ہو جائے تو دل سخت ہوتا جاتا ہے۔ میں بھی بہت پہلے جولی کی طرف سے دل کو پتھر کر چکی ہوں کہ وہ زندہ نہیں رہے گی۔ میں ہر روز کہتی تھی کہ وہ آج مر جائے گی۔ پھر وہ دن گزر جاتا تھا لیکن میرے لیے ہر آنے والا دن پُرامید ہو جاتا تھا۔ میں نے ذہنی طور پہ اس حقیقت سے سمجھوتا کر لیا ہے کہ جولی کا مر جانا غیر متوقع نہیں اس کا زندہ رہنا غیر متوقع ہوگا۔ وہ پھر مجھے مل گئی تو یہ خداوند یسوع مسیح کی مجھ گنہگار پر خصوصی عنایت ہوگی۔" وہ یکلخت چپ ہو گئی۔

"انکل ضامن رضوی بہت اچھے آدمی ہیں۔" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ "اگر شہلا انھیں جولی کے بارے میں بتائے گی تو وہ ضرور کچھ کریں گے۔ اس کے علاوہ نازو بھی ہے۔ غالب نے بھی اپنے کچھ ہم پیشہ دوستوں سے کہا تھا۔ تمھارے لیے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔"

"کیا تم نوٹ کر رہے ہو کہ ہم کدھر جا رہے ہیں؟" وہ بولی۔

"میں نے کوشش کی تھی۔ پہلے دائیں طرف... پھر دائیں طرف... اس کے بعد بائیں جانب... پھر دائیں طرف... اب دائیں بائیں سب خلط ملط ہو گیا ہے۔ کچھ یاد نہیں... اس کے علاوہ صرف موڑ سے کیا پتا چلتا ہے۔ ایک سڑک پر دائیں جانب دس جگہ موڑ آ سکتے ہیں۔"

"میں نے ایک ایسی ہی صورتِ حال کسی فلم میں دیکھی تھی۔" وہ کہنے لگی۔ "ہیرو گھڑی دیکھتا رہتا ہے کہ کتنے منٹ بعد موڑ کس طرف آیا تھا۔ اس نے رفتار کا اندازہ کر لیا۔"

"میرے دماغ میں کوئی اسپیڈو میٹر نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "مزید یہ کہ میں ہیرو نہیں ہوں اور یہ فلم نہیں ہے۔"

"تم بہت افسردہ اور دل شکستہ ہو..."

"میں غالب کی موت کے خیال سے افسردہ ہوں۔" میں نے کہا۔ "جان تو میرے چکر میں نہ جانے کس کس نے دی۔ سب میرے خیر خواہ تھے اور اسی لیے جان سے بھی گئے لیکن ایسا بے غرض دوست اُن میں کوئی نہ تھا۔ وہ شاید کبھی اپنے لیے جیا ہی نہیں۔ اس کی زندگی ایک مشن رہی۔ صحافت کا پیشہ بھی اس نے اپنے مشن کی خاطر اختیار کیا تھا۔ اس نے کس مقصد کے لیے جان دی، کون جان سکے گا۔ اسے کوئی تمغہ کوئی میڈل اور کوئی ایوارڈ کبھی نہیں دیا جائے گا۔ ان ہزاروں گمنام مجاہدوں کی طرح جو وطن کی آبرو پر قربان ہو گئے۔ اس کو رونے والا بھی کوئی نہیں۔"

کیتھرین خاموش رہی۔ میں بھی چپ رہا۔ ٹرک ایک ہی رفتار سے چلتا رہا۔ اس کی مسلسل گھوں گھوں ایک نوحۂ ماتم بن گئی اور چشمِ تصور سے میں نے وہ گھر دیکھا جہاں غالب اکیلا رہ گیا تھا۔ جو اس گھر کا وارث تھا مگر پولیس شاید اسے لاوارث قرار دے گی۔ اس کی موت کے قصے عاریہ بندوبست بھی کریں گے کہ مرنے والے کی شناخت نہ ہو اور ایک صحافی کی موت کا چرچا ہی نہ ہو۔

ٹرک کی رفتار کم ہونے لگی تو میں نے کیتھرین سے کہا۔ "غالباً پہلا اسٹاپ آ رہا ہے۔"

"پہلا اسٹاپ... کیا اس کے بعد بھی سفر جاری رہے گا! تم کو کیا معلوم۔" وہ بولی۔

"ہم اس باکس میں تو نہیں رہیں گے نا۔" میں نے کہا۔ "یہاں سے کہیں منتقل کیے جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "یا یہ ٹریلر بھی آ گے جائے گا اور ہم بھی۔ ایسے ٹریلر کراچی تک یا بیرونِ ملک سامان لے جاتے ہیں۔ بحری جہازوں پر لوڈ کر دیے جاتے ہیں۔"

"سمندر پار... اوہ نو... میں جولی کو چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی۔"

"تم نے ابھی کہا تھا کہ بہت کچھ ہونا چاہیے مگر وہ سب ہوتا نہیں۔" میں نے کہا۔ "تم نے سفر کی بات کی تھی تو میں نے بھی بتا دیا کہ سفرِ زندگی کی آخری منزل تک جاری رہتا ہے۔"

ٹرک رُک گیا اور کیتھرین فوراً اسی طرح لیٹ گئی جیسے پہلے لیٹی ہوئی تھی۔ باتوں میں مجھے بھی اس سلنڈر کا خیال نہیں رہا تھا جس کے پائپ کو میں نے کاٹ دیا تھا۔ کیا انھوں نے گیس کھولی ہوگی؟ میرے اندازے کے مطابق ہم نے بیس منٹ سے آدھے گھنٹے کے درمیان سفر کیا تھا۔ اگر انھیں استعمال نہ کرنا ہوتا تو وہ زہریلی گیس کو اندر پہنچانے کا اہتمام ہی کیوں کرتے۔ اس کے بعد کب موقع آنے گا اور ممکن ہے وہ زہریلی گیس صرف اس لیے ہو کہ ہم سب بے ہوش ہو جائیں۔ ٹرک کو بڑی سڑکوں پہ سے گزرنا تھا۔ اگر ہم ہوش میں رہتے تو اندر سے چادر بجا کے راہ چلتے لوگوں کو متوجہ کر لیتے۔ یہ بات میرے دل کو لگی کہ وہ صرف ہمیں خاموش رکھنا چاہتے تھے۔ مارنا مقصود ہوتا تو وہیں مار دیتے زندہ یہاں کیوں لاتے۔ میں نے باہر سے راڈ کے ہلائے جانے اور ہُک میں سے نکلنے کی آواز سُنی۔ اس کا شور کنٹینر کے اندر بہت زیادہ سنائی دیا اور میں نے بھی لیٹ جانے کا فیصلہ کیا۔

میرا فیصلہ کسی یقین کی بنیاد پر نہ تھا لیکن سوچنے اور کسی منطقی نتیجے پر پہنچنے کے لیے وقت ہی نہیں تھا۔ اگر میں نے غلط کیا تھا تو غلطی کا نتیجہ بھی سامنے آ جائے گا۔ غلط یہ بھی ہو سکتا تھا کہ میں ہوش میں بیٹھا ہوا ملتا اور ایک غلطی مجھے بہرحال کرنا تھی۔ ٹاس کے وقت کچھ تو مانگنا ہی پڑتا ہے۔

دروازہ بڑی آواز کے ساتھ گرا اور میں نے آنکھیں کھول کر پھر بند کر لیں۔ باہر اندھیرا تھا اور کنٹینر کے اندر باہر سے ٹیوب لائٹس اور بلبوں کی روشنی پہنچ رہی تھی۔ میرے کان آوازیں سُننے کے لیے مستعد تھے لیکن ابھی تک وہی آوازیں تھیں جو میں نے اس معرکہ آرائی میں سُنی تھیں اور اُن کے قدموں کی چاپ تھی۔ پھر خاموشی کا مختصر وقفہ آیا۔ یکلخت سب چپ ہو گئے تھے۔ دو منٹ بعد کوئی اندر آیا۔ اس کے پیچھے پیچھے دوسرے لوگ بھی آئے۔ میں نے اپنی پوزیشن ایسی رکھی تھی کہ میں سر یا گردن گھمائے بغیر ایک آنکھ کھول کر بھی آنے جانے والوں کو دیکھ سکوں چنانچہ میں نے چوہدری دلاور کو سب سے پہلے دیکھا۔ اس کے پیچھے وہی چار افراد تھے جو ہمیں لے کر آئے تھے۔ مشینی لہجے میں بولنے والا گروپ لیڈر دلاور کے ساتھ ساتھ ٹارچ لے کر چل رہا تھا۔

"آخر باقی لوگ کہاں ہیں؟" دلاور کی آواز میں ناگواری تھی۔

"یہی ہیں سب جو مجھے ملے۔"

"میں نے کیا بتایا تھا تمھیں؟" دلاور بولا۔

"آپ نے تو سات کہے تھے چوہدری صاحب۔ چار مرد اور تین عورتیں مگر..."

"مگر تم لائے ہو تین مردوں اور دو عورتوں کو... یہی میں پوچھ رہا ہوں کہ باقی دو کہاں ہیں؟" دلاور نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"وہاں جتنے تھے سب کو میں لے آیا ہوں۔ کسی کو چھوڑ کر آنے میں کیا ملنا تھا مجھے۔" گروپ لیڈر نے کہا۔ "میں نے تو پوری کوشش کی تھی کہ سب کو زندہ لے آؤں۔"

"مگر دو مارے گئے...؟"

"میرے دو آدمی مارے گئے۔ اس لیے کہ میں ان کو روکتا رہا۔" وہ اونچے مشینی لہجے سے دوسرا دلاور لگتا تھا اور بعض اوقات گمان گزرتا تھا کہ وہ دلاور کی نقل اتار رہا ہے مگر یہ اس کا اپنا انداز نہ ہوتا تو دلاور کے سامنے وہ اصل لہجے میں بات کرتا۔ یہ بات دلاور بھی جانتا ہوگا چنانچہ وہ لہجے کا بُرا نہیں منا رہا تھا۔

"مجھے ان کے مرنے کا یقیناً افسوس ہے لیکن تم نے معاہدہ پورا نہیں کیا۔" دلاور بولا۔ "تم کو سات آدمی لانے تھے۔"

"وہاں پانچ ہی آدمی تھے تو میں کیا کرتا چوہدری صاحب!"

"تمھارا مطلب ہے میں نے تم کو غلط اطلاع دی تھی۔"

دلاور کا موڈ آف ہونے لگا۔ "جھوٹ بولا تھا تم سے؟"

"میں نے ایسا کب کہا ہے۔ ہمارے پہنچنے سے پہلے وہاں سات ہی ہوں گے۔ چار مرد اور تین عورتیں۔" وہ بولا۔ "لیکن ایک مرد اور ایک عورت کہیں چلے گئے تھے۔ وہ دونوں میاں بیوی تھے۔ ان کا نام محسن اور شہلا تھا۔ اور ان کے ساتھیوں نے کہا کہ وہ ڈاکٹر کے پاس گئے ہیں۔ اس نے کہا کہ ڈاکٹر لطیف کے پاس مگر عورت کہنے لگی کہ نہیں وہ کسی لیڈی ڈاکٹر کے پاس گئے ہوں گے..."

"دیکھو لڑکے... کیا نام ہے تمھارا... پتنگا۔"

"آپ جانتے ہیں کہ میرا نام پروانہ ہے... استاد پروانہ۔" گروپ لیڈر نے مشتعل ہو کے کہا کیونکہ اس کے کسی ساتھی نے ہنسنے کی کوشش کی تھی۔

"ہاں بھئی پروانہ... وہ ایک ہی چیز ہوتی ہے پتنگا اور پروانہ۔" دلاور نے اسی لہجے میں کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ تمھارا اصل نام کیا ہے۔ بلکہ یہ بھی جانتا ہوں کہ تمھاری اصلیت کیا ہے۔ اور کس کے استاد ہو لیکن تم شاید نہیں جانتے کہ میرا نام کیا ہے۔ بعض اوقات نام سے کچھ بھی پتا نہیں چلتا۔ کچھ لوگ نام کی پبلسٹی سے استاد بنتے ہیں اور پبلسٹی وہ خود کرتے ہیں۔ کچھ لوگ گمنام رہتے ہیں مگر وہ استادوں کے استاد ہوتے ہیں۔ یقیناً ... شہر میں تمھارے نام کا ڈنکا گلی گلی بج رہا ہوگا اور میرا نام بہت کم لوگوں نے سنا ہوگا۔ لیکن تم اپنی غلط فہمی دور کر لو تو اچھا ہے کہ تم میرے بچپانے ہو..."

"میں سمجھا نہیں کہ آپ کیوں بگڑ رہے ہیں!" پروانہ بولا۔

"جب میں نے تم کو بلایا تھا مسٹر پروانہ۔" دلاور نے اپنے مخصوص کاٹ رکھنے والے سرد سفاک لہجے میں کہا۔ "تو میں نے تمھارے آبا و اجداد کا شجرۂ نسب تک معلوم کر لیا تھا۔ میں بتا سکتا ہوں کہ تمھارا باپ کون تھا۔ تمھارا گھر کہاں ہے۔ تم کس کس کے ساتھ رہتے ہو۔ گھر میں کتنے بھائی بہن ہیں۔ کتنی بہنوں کی شادی ہوئی ہے اور کس کے ساتھ۔ کتنی شادی کے قابل ہیں۔ پھر یہ کہ باہر تم نے کیا کارنامے سرانجام دیے اور کس کس کے شاگرد رہے۔ استادی کے مرتبے پر فائز ہونے سے پہلے۔"

"آپ کو مجھے مرعوب کر کے کیا فائدہ ہوگا۔" پروانہ نے ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "یا مجھے میرے ساتھیوں کے سامنے بے عزت کر کے کیا ملے گا؟ میں جانتا ہوں کہ آپ کچھ نہیں جانتے۔"

"استادِ محترم! آپ کے والد پرانے شاہ عالمی کے ایک تنور پر کام کرتے تھے۔" دلاور بولا۔ "سات سال روٹیاں لگاتے رہے اور پھر ایک دن خود تنور میں گر گئے۔ کہا گیا کہ ان کو گرمی سے چکر آگیا تھا مگر یہ دوسرا چکر تھا۔ بعد میں تم پیدا ہوئے۔ جب تنور کے مالک نے تمھاری ماں سے شادی کر لی۔ تمھاری ایک بہن کامونکے منڈی کے ایک ڈرائیور کی بیوی ہے۔ دو گھر میں بیٹھی جوان ہو رہی ہیں۔"

"بکواس بند کرو اپنی..." پروانہ چیخ کر بولا۔

"میاں پروانہ صاحب! جامے سے باہر ہونے کی کیا ضرورت ہے۔" دلاور نے ہنس کر کہا جس کے سامنے استاد پروانہ واقعی طفلِ مکتب تھا۔ "تم نے کہا تھا کہ میں کچھ نہیں جانتا تو میں بتا رہا تھا کہ مجھے کیا کچھ معلوم ہے۔ اگر غلط کہا ہو تو کہو۔ تمھارے یہ ساتھی تمھاری پرائیویٹ لائف کے بارے میں کچھ اور سمجھتے تھے۔ مثلاً یہ کہ تم مہاراجہ پٹیالہ کی اولاد ہو۔ تو اپنا ریکارڈ درست کر لیں۔ اب تمھارا استادی شاگردی کا معاملہ کچھ ایسا ہے کہ تم مختلف لوگوں کے ساتھ رہے ہو۔ چار مرتبہ جیل میں۔ وہاں سے نکلے تو ماشاءاللہ خاصی ترقی کی۔ ایک زمانے میں تم استاد پیڈرو کے لونڈے تھے۔ تم کو یاد ہے؟" جس انداز سے اس نے استاد پروانہ کو پیڈرو کا لونڈا کہا تھا وہ انتہائی تحقیر و تذلیل کا انداز تھا اور ممکن تھا کہ پروانہ کسی اور جگہ چوہدری دلاور پر حملہ کر دیتا مگر یہاں وہ خود کو مجبور سمجھتا تھا۔

"استاد پیڈرو کی..." پروانہ نے اپنے غصے کا رُخ پیڈرو کی طرف موڑ دیا اور اُسے ایک بہت بڑی گالی دی۔

"ابھی تم ان سے ملو گے تو یہ بات ان سے خود ہی کہہ دینا۔ میرے منہ سے اچھی نہیں لگے گی۔" دلاور ہنسا۔ "استاد پیڈرو نے ہی تمھارا انتخاب کیا تھا اور تمھارا تاریخ جغرافیہ بتایا تھا۔ تم کو یہ بتانا ضروری ہے کہ استاد پیڈرو میرا ایک کتا ہے۔ میرے اشارے پر چلنے والا دُم ہلانے والا۔ بھونکنے والا اور کاٹنے والا... اور ایسے بہت سے کتے پال رکھے ہیں میں نے جن کے سامنے تم ایک پلے ہو۔ اس لیے اپنی ہوشیاری اپنے پاس رکھو۔"

دلاور زبردست ڈرامے باز تھا اور مکالموں کی ادائیگی میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ میرا اس سے بار بار سابقہ پڑ چکا تھا۔ چنانچہ میں جانتا تھا کہ وہ صرف زبان سے ہی نہیں اپنی شخصیت سے اور بعض اوقات ڈرامائی صورتِ حال پیدا کر کے کس طرح اپنے حریف پر چھا جاتا ہے۔ اس کے ذہن کو گمراہ یا مفلوج کر دیتا ہے یا سوچ کے غلط راستے پر ڈال دیتا ہے اور پھر اپنے مقصد میں کامیابی کے امکانات کو یقینی بنا لیتا ہے۔ استاد پروانہ کیا چیز تھا کہ متاثر نہ ہوتا۔

"میں نے کون سی غلط بات کہی ہے چوہدری صاحب!" پروانہ بولا لیکن اب اس کا لہجہ جارحانہ نہیں معذرت خواہانہ ہو گیا تھا۔

"کون سی بات صحیح کی ہے تم نے؟" دلاور نے ایک دم گرج کے کہا۔ "پروانے کی اولاد، میں خاک کر دوں گا تمھیں... کون سے میاں بیوی کی بات کر رہے تھے تم؟"

"میں نے نام بتایا ہے اُن کا... محسن اور شہلا۔"

"اُلو کے پٹھے... یہ ہے تمھارا والدِ ثانی محسن۔" دلاور نے کہا۔ "اس کی بیوی کہاں ہے؟ اور یہ تم کسے اٹھا لائے ہو، اپنی ماں کو... کون ہے یہ عورت؟"

"چوہدری صاحب! میں کسی کو پہچانتا نہیں تھا اور آپ نے مجھے نہ کسی کا فوٹو دکھایا تھا اور نہ نام بتایا تھا۔" پروانہ نے احتجاج کیا۔

"میں ہر بات تم کو نہیں بتا سکتا تھا... اس لیے کہ تم احمق ہو... اصل افراد میں سے تین کم ہیں۔ دو عورتیں اور ایک مرد۔ ایک تو وہی عورت ہے جو محسن کی بیوی ہے... شہلا۔" دلاور نے کہا۔

"نام تو میں نے ٹھیک ہی بتایا تھا آپ کو... اور مجھے انہی سے معلوم ہوا تھا۔" پروانہ بولا۔

"کیا ضرورت تھی کسی سے اس کا نام یا کام پوچھنے کی؟ میں نے تم سے کہا تھا کہ فضول باتیں بالکل نہ کرنا... جتنے آدمی چاہو لے جاؤ مگر سب کی زبان کو لگام دے کے رکھو اور اُن سے کہو کہ اپنا کام کریں۔ یہ کام کیا ہے تم نے؟ سات میں سے چار کو لائے ہو۔ باقی تین کو چھوڑ آئے ہو یا اپنے پیچھے لگا لائے ہو۔"

"ہمارے پیچھے کوئی نہیں آیا۔"

"تمھیں کیا معلوم کہ تمھارا واسطہ تم جیسے نام کے استادوں سے نہیں تھا۔ یہ آدمی نہیں بھوت ہیں۔ تمھیں کیا، مجھے نظر نہیں آتے مگر آ جاتے ہیں سر پر۔ جو رہ گئے ہیں وہ نہ میرا پیچھا چھوڑیں گے اور نہ تمھارا۔ میری تو کوئی بات نہیں۔ مجھے اُن سے نمٹنا آتا ہے۔ تم اپنی خیر مناؤ۔" دلاور نے کہا اور اس کی رائے سن کر میں خوش ہوا۔ اس نے ہمیں جن بھوت کہا تھا۔ کیڑے مکوڑے نہیں کہا تھا۔ شیخی نہیں بگھاری تھی کہ وہ ہمیں حشرات الارض کی طرح مسل دے گا۔ یہ تسلیم کیا تھا کہ ہم بھی کسی سے کم نہیں۔ دلاور جیسے شخص سے اتنی عزت و احترام حاصل کرنا ایک دن کا کام نہیں تھا۔ اس کی رائے بدلنے میں بہت وقت لگا تھا۔ جان اور مال کا بڑا زیاں ہوا تھا اور پُرخطر آزمائش کے ہزار جان لیوا مرحلے سر کرنے پڑے تھے۔

"آپ ہماری فکر مت کریں جی۔ ہم بھی دیکھ لیں گے وہ کتنے بڑے جن بھوت ہیں۔ بڑے بڑے عمل سیکھے ہیں ہم نے بھی جن اتارنے کے۔" پروانہ ابھی چھوٹا بدمعاش بلکہ شہدا تھا چنانچہ اس کی اکڑفوں زیادہ تھی۔ انگریزی محاورے کے مطابق خالی برتن زیادہ شور کرتے ہیں۔ ایسا ہی پروانہ کر رہا تھا تو یہ اس کا قصور نہیں تھا۔ "آپ ہمیں فارغ کر دیں۔"

"تم فارغ ہوئے... جاؤ۔" دلاور جیسے بجلی کی سی بولا۔

"جائیں... میرا مطلب ہے جانا تو ہے..." پروانہ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد بولا۔

"تم شاید معاوضے کے انتظار میں ہو؟ برخوردار... مجھے یہ سمجھاؤ کہ میں تم کو کام کا معاوضہ دوں یا کام بگاڑنے پر تم سے جرمانہ وصول کروں۔ سات میں سے تم چار بندے لائے ہو... یہ پانچواں میری طرف سے تحفہ رکھ لو... یہ میرے کام کی نہیں۔" دلاور نے یقیناً گیتھرین کی طرف اشارہ کیا ہوگا۔

"چوہدری صاحب! آپ نے پچاس ہزار فی کس کہا تھا..." پروانہ نے غصے کو خلافِ مصلحت سمجھتے ہوئے ضبط سے کام لیا۔ "چار آدمی تو آئے نا... ان کے دو لاکھ نکالیں... اور یہ جو دو مر گئے..."

"اللہ ان کی مغفرت کرے اور لواحقین کو صبرِ جمیل عطا کرے۔" دلاور نے کہا۔ "تجہیز و تکفین کے لیے کچھ چاہیے تو لے لو۔"

"آپ حد سے بڑھ رہے ہیں چوہدری صاحب... میرے دو آدمی جان سے گئے۔" پروانہ مشتعل ہونے لگا۔

"یہ تو میں نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ کوئی مارا گیا یا پکڑا گیا تو رسک صرف تمھارا ہے۔" دلاور نے بے رخی سے کہا۔ "تم آٹھ نہیں آٹھ سو کی نفری لے کر جاتے۔ ان میں سے صرف تم بچ کر آتے تب بھی مجھے کیا... جو یہ کام کرتے ہیں وہ مرتے بھی ہیں۔ مرنے سے ڈرتے تو ماں کے گھٹنے سے لگ کر بیٹھتے۔ باہر نہ نکلتے... بہرحال میں انہی کی وجہ سے دو لاکھ دوں گا... لیکن تمھیں نہیں دوں گا۔ ان کے گھر والوں کو ایک ایک لاکھ پہنچ جائیں گے،

بیٹوں کی جوانی کی قیمت۔"

" دو لاکھ میں لوں گا چوہدری صاحب... با چار آدمی میں لایا ہوں۔" پروانہ چیخ کر بولا۔" معاہدہ میں نے کیا تھا۔"

" تمہارا معاہدہ ابھی پورا نہیں ہوا استاد... باقی دو آدمی بھی لے آؤ اور یہ فالتو مال لے جاؤ۔" دلاور نیم سنجیدگی سے بولا۔" معاہدے میں جو وقت دیا گیا تھا وہ ایک گھنٹے بعد ختم ہو جائے گا۔"

" مجھے نام پتا بتاؤ وہ کون لوگ ہیں۔" پروانہ اب آپے سے باہر ہو رہا تھا۔

" ہاں ہاں نام نوٹ کرو..." دلاور بولا" ایک ہے مرزا غالب' وہ صحافی ہے اور اس کا پتا کوئی نہیں۔ وہ جس اخبار میں تھا وہاں سے اس کو برطرف کیا جا چکا ہے۔ تاہم وہ گھر اسی کا تھا جہاں تم کو بھیجا گیا تھا۔ اس کا باپ بہت مشہور ڈاکٹر تھا جو یہ کوٹھی اس کے لیے چھوڑ گیا تھا۔ دوسرا نام ہے شہلا کا جو تمہیں ملے گی ایس ایس پی ضامن رضوی کے گھر میں۔ میری تازہ ترین اطلاعات یہی ہیں... تمہارے لیے ایس ایس پی کے گھر میں گھس کر اُسے اُٹھالانا کیا مشکل ہے۔ آخر ایسے ہی تو استاد پروانہ نہیں کہلاتے تیسرا نام ہے ایک لڑکی نازلی کا جو نازو کہلاتی ہے... ایک سابق سب انسپکٹر پولیس اکرام شیخ کی بہن ہے۔ اس کا باپ ریٹائرڈ سول جج تھا۔ لڑکی تم سب کو دو منٹ میں لنگڑا، لولا، اپاہج اور معذور کر سکتی ہے۔ اس کے سامنے بھول کر بھی خالی ہاتھ جانے کی غلطی مت کرنا، ورنہ سب کے جیبس تک ٹیڑھے ہو جائیں گے۔ تمام عمر کوئی چیز صحیح کام نہیں کرے گی... نہ بریک نہ گیئر نہ کلچ۔"

" یہ تم اب بتا رہے ہو مجھے... تمہاری..." پروانہ نے غضبناک لہجے میں ایک گالی دے کر کہا۔" پیسہ ہضم کرنا چاہتے ہو ہمارا... بے ایمان کتے... میں تم کو چھوڑوں گا نہیں... سور کے بچے..."

" اوئے پروانے..." غالباً باہر سے استاد پیڈرو کی آواز آئی۔" چل باہر... بہت دیر ہو رہی ہے... اور تم سب بھی آجاؤ... میں تم سب کو انعام دیتا ہوں۔ ایسا کہ دوسرے یاد رکھیں گے۔"

" دوسرے... دوسرے کون ؟" پروانہ ہکلایا۔

" تمہیں رونے والے... اور کون..." پیڈرو ہنسا" اور وہ جو کل تمہارے جنازے میں شریک ہوں گے۔"

اس کے بعد بہت ہنگامہ ہوا۔ بیک وقت گالی گلوچ کا شور اُٹھا اور مار پیٹ بھی ہوئی مگر ایک گولی نے سب ختم کر دیا۔ میں نے بالکل غیر ارادی طور پر آنکھ کھول کے دیکھا تو استاد پروانہ تڑپ رہا تھا۔ وہ جتنا بڑا بدمعاش بن سکتا تھا بن چکا تھا۔ اپنی دانست میں استاد مگر درحقیقت ایک غلط راستے پر چل وہ اونٹ جس نے بڑے بڑے بدمعاش دیکھے ہی نہیں تھے۔ وہ اونٹ جس نے پہاڑ نہ دیکھا ہو اور گرد کی مخلوق کو دیکھ کر یہی سمجھتا رہتا ہے کہ اس سے بڑا کوئی نہیں۔ دلاور نے اس سے ایک کام لیا تھا۔ معلوم نہیں کتنا پیسہ دکھایا تھا اور پروانہ نہیں سمجھ سکا تھا کہ یہ اس کی زندگی کی قیمت ہے۔ دلاور نے اس سے پہلے نہ جانے کس کس کو اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے اسی طرح استعمال کیا جیسے وہ کاغذ کے نوٹ یا ریوالور کی گولی استعمال کرتا تھا۔ دونوں صرف ہونے والی چیزوں کی طرح پروانے جیسے لوگ بھی اس کے لیے قابلِ صرف اشیا سے زیادہ اہم نہیں تھے۔

پروانے کے انجام نے باقی سب کو گھٹنے ٹیک کر ہاتھ جوڑنے، زمین پر ناک رگڑ کر رحم کی بھیک مانگنے اور زندگی کی خیرات کے لیے گڑگڑانے پر مجبور کر دیا تھا مگر زندگی کا یہ عملی سبق انھوں نے بہت دیر سے سیکھا تھا۔ شیر کی خوں آشامی کا اندازہ کرنے کے لیے کوئی آدم خور شیر کے سامنے چلا جائے تو اُسے یہ تجربہ بہت مہنگا اور بہت بے مصرف محسوس ہوتا ہے مگر اس وقت جب وہ شیر کی جان لیوا گرفت میں آجاتا ہے اور کسی کو نہیں بتا سکتا کہ یہ تجربہ کیسا رہا۔ چوہدری دلاور نے کچھ سرپھروں کو پیسے کے جال میں گرفتار کر کے موت کے مشن پر روانہ کیا تھا اور جو مر گئے تھے وہ اچھے رہے تھے کہ رسوا نہ ہوئے۔ مجبور نہ ہوئے اور انھوں نے صرف موت کا عذاب جھیلا۔ موت ان کا بھی مقدر ہوئی جو بچ کر آئے اور خود کو کامیاب و کامران جان کر فتح مندی کی جھوٹی تسلی دیتے رہے۔ وہ خود اپنی نظر میں رسوا ہوئے اور ذلت کا عذاب انھوں نے اضافی جھیلا، پشیمانی اور بے بسی کے احساس اور اپنی احمقانہ جدوجہد کے رائیگاں جانے کا صدمہ الگ برداشت کیا اور پھر پہنچے وہیں یہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔ ان جیسے پہلے بھی یوں ہی مرے کہ ان کو رونے والے بھی پچھتاتے رہے کہ کاش وہ ہم سب کی طرح جیتا تو مزید جی لیتا۔

جب یہ شور و فغاں ختم ہوا۔ جلاد انھیں لے گئے جن کو سزائے موت دی گئی تھی اور وہاں تین زندہ اور تین مردہ مرد اور دو عورتیں پڑی رہ گئیں تو دلاور نے کہا" ان سب لاشوں کا... اور باقی سب کا بھی انتظام تم خود کرو گے۔"

پیڈرو نے کہا" وہ میں کر لوں گا۔ مگر باقی کا کیا بنے گا ؟"

" ان کا بعد میں سوچیں گے۔" دلاور بولا" ان سب کو اندر لے آؤ۔"

مجھے اسی طرح پڑے پڑے آدھے گھنٹے سے زیادہ ہونے والا تھا۔ مجھے کیتھرین کے بارے میں تو علم تھا کہ وہ میری طرح سب سن رہی ہے اور شاید دیکھ بھی رہی ہو مگر رابعہ کی طرف سے میں پریشان تھا کہ کہیں ہوش میں آ کے کوئی غلط حرکت نہ کر بیٹھے۔ اپنے ذہنی انتشار اور اعصابی بحران سے نکلے

...ہوا تھا۔ محسن اور ٹیڈی کے بارے میں مجھے شک تھا کہ وہ ...دیر تک بے ہوش نہیں رہ سکتے۔ غالباً وہ بھی مکر کر رہے تھے۔ پندرہ منٹ بعد مجھے اٹھا لیا گیا۔ مجھے اٹھانے والا ...ہی شخص تھا جس نے مجھے کندھے پر ڈال لیا۔ میرا سر اور ...پیچھے تھے اور ٹانگیں آگے تھیں۔ اس وقت بھی میں ایسی ...پوزیشن میں تھا کہ اس شخص کو ختم کر دوں لیکن میں پروانے کا ...انجام دیکھ چکا تھا۔ اس کے ساتھی بھی پیڈرو جلاد کے سپرد ...کیے گئے تھے اور وہ مسلح ہونے کے باوجود دم نہ مار سکے تھے ...اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ سب خود کو دشمن کے قلعے میں بے بس ...محسوس کرتے تھے ورنہ ان کی جنگ باہر ہوتی تو وہ بھی مرنے ...مارنے پر اتر آتے۔ ان حالات کے پیشِ نظر میرا کوئی بہادری کا ...مظاہرہ قبل از وقت خودکشی کے مترادف ہوتا۔ اس سے بہتر ...تھا کہ میں انتظار کروں اور دیکھوں کہ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔

میں نے آنکھیں کھول کے گرد و پیش کا جائزہ لیا تو مجھے ...ایک گودام قسم کا شیڈ نظر آیا۔ شبہ تو مجھے پہلے بھی تھا کہ یہ جگہ ...شاہدرہ میں واقع ایم ڈبلیو ڈی کمپلیکس ہو سکتی ہے۔ دلاور کی موجودگی ...اور نگرانی کے انداز سے اس شبہے کو تقویت ملی تھی۔ جو شخص مجھے ...اٹھا کر لے جا رہا تھا، وہ بھی اپنی ڈانگری سے کوئی ورکر ہی لگتا ...تھا اور قد و قامت سے قابلِ رشک صحت کا مالک نظر آتا تھا۔ ...اس نے مجھے بیرک کی لمبائی کے رُخ والی دیوار سے متصل کمرے ...میں پہنچا دیا۔ اس مختصر مسافت کو طے کرتے ہوئے مجھے بیرک ...کا ایک سائڈ کا تفصیلی جائزہ لینے کا موقع ملا۔ بیرک کی مجموعی ...لمبائی اور چوڑائی اتنی تھی کہ اس میں آگے پیچھے یا ساتھ ساتھ اس ...کے دو ہیوی ڈیوٹی ٹریلر کھڑے کیے جا سکتے تھے۔ چھت ...کی بلندی بھی ٹریلر کی اونچائی سے دگنی ضرور تھی۔ بیرک میں چاروں طرف ...ٹیوب لائٹس نصب تھیں اور درمیان میں چھت سے آویزاں ...ٹیوب لائٹس کی دہری قطار تھی۔ ٹرک کے سوا مجھے بیرک میں اور ...کچھ نظر نہ آیا۔ سوائے چند لکڑی کے بڑے بڑے بکسوں کے جو ...دیوار کے ساتھ ساتھ رکھے ہوئے تھے۔

جس کمرے میں مجھے پہنچایا گیا وہ کچھ آفس قسم کا تھا۔ مجھے ...قالین پر ڈال دیا گیا۔ میں بے حس و حرکت پڑا رہا اور میں نے ...آنکھیں کھولنے کی حماقت بھی نہیں کی۔ یہاں تیز روشنی تھی ...مجھے یقین تھا کہ یہاں دلاور ضرور ہوگا۔ اس کی پوری کابینہ بھی ...ہو سکتی تھی۔ وہ سب ہمیں بغور ملاحظہ فرما رہے ہوں گے۔ ...خیال کی تصدیق فوراً ہی ہو گئی۔

" یہ سب لوگ ابھی تک بے ہوش کیوں ہیں ؟" دلاور نے کہا۔

" کیا گیس کھولی تھی ؟" پیڈرو بولا۔

" گیس کا اثر ہی ہوگا۔" کسی نے جواب دیا۔

" گیس کا اثر بھی اتنی دیر میں ختم ہو جانا چاہیے۔" دلاور نے کہا" خیر تم ڈاکٹر کو بلا دو۔"

" فون کروں جی ؟"

" خود جاؤ گاڑی لے کر۔" دلاور نے بدمزگی سے کہا مگر یہ سب اس خبیث کی اداکاری تھی۔ اچانک اس نے میری گردن پر جلتی ہوئی سگریٹ لگا دی۔ میں اچھل پڑا اور قدرتی طور پر میرا ہاتھ گردن کی طرف گیا۔ یہ جسم کا طبعی ردِ عمل یا ریفلکس ایکشن تھا۔ اس نے مجھے تاثر یہ دیا تھا کہ وہ مجھے بے ہوش تسلیم کر چکا ہے اور ڈاکٹر کو بلوانے کی بات کرتے کرتے وہ دبے پاؤں میرے پاس آ گیا تھا۔ اس نے میری بے ہوشی کو ٹیسٹ کرنے کے لیے ٹھیک چال چلی تھی۔ اس کی جگہ میں ہوتا تو یہی کرتا۔

" معاف کرنا اپنے سکندر صاحب۔" وہ مسکرایا۔" ہم ہیں تو آپ کے مقابلے میں اَن پڑھ اور بے وقوف لیکن تھوڑا سا زندگی کا تجربہ حاصل ہوا ہے۔ وہ بھی آپ کی جوتیوں کے طفیل... آپ کی خدمت کر کے..."

" تمہیں تو اب بولنا بھی آگیا ہے۔" میں نے خفت کو چھپا کے اُٹھتے ہوئے کہا۔

" ابھی کہاں جی... ابھی تو صرف سُنتے آئے ہیں۔" وہ ذومعنی الفاظ کا سہارا لیتے ہوئے بولا" ہم بولیں گے تو آپ کو اچھا نہیں لگے گا۔" اس نے مجھ سے بات کرتے کرتے اچانک جھک کر وہی سگریٹ محسن کے کان کی لَو سے چھوا دی۔ نتیجہ میری توقع کے مطابق نکلا۔ اس نے کان پر ہاتھ مارا۔

" لاحول ولاقوۃ۔" وہ چلّا کے بولا اور پھر اُٹھ بیٹھا۔ اس نے میری طرف اور دلاور کی طرف دیکھا اور ٹیڈی کو ہلانے لگا" اٹھو بھئی اپنے خواجہ صاحب۔"

" ورنہ یوں اُٹھائے جاؤ گے جیسے مردے اٹھائے جاتے ہیں۔" دلاور بولا۔

ایک ایک کر کے سب کھڑے ہو گئے جو ابھی تک اپنی بے ہوشی کو ایک دوسرے سے بھی چھپائے ہوئے تھے۔ ان میں رابعہ بھی تھی۔ وہ خوفزدہ ضرور تھی مگر ہسٹریا کا شکار نہیں تھی۔ سب ایک قطار میں کھڑے ہوئے تھے۔ ہمارے پیچھے سپاٹ دیوار تھی جو تقریباً پندرہ فٹ لمبی تھی۔ اس کمرے کی چوڑائی دس فٹ ہو گی۔ اس کی چھت کے نیچے پلائی ووڈ کی چھت تھی جو مشکل سے آٹھ فٹ اونچی تھی۔ ایئر کنڈیشنر کی مؤثر کارکردگی برقرار رکھنے کے لیے دیواروں پر بھی پلائی ووڈ کی تہ بڑی خوب صورتی سے لگائی گئی تھی اور اس پر بہت عمدہ وارنش تھا۔ دیواروں پر چھت سے فرش تک پہنچنے والے پردے تھے چنانچہ کسی دیوار میں کوئی کھڑکی تھی تو نظر نہیں آ رہی تھی۔ میرے مقابل ایک میز تھی جس کے پیچھے ایک گھومنے والی کرسی رکھی ہوئی تھی۔

دلاور ہم سے چند قدم کے فاصلے پر ہاتھ ...

کھڑا ہوا بڑی عیاری سے مسکرا رہا تھا۔ اس کے پیچھے کمرے کے دونوں گوشوں میں دو آدمی مشین گن لیے کھڑے تھے۔ تیسرا ہمارے قریب دروازے میں موجود تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ ان کے مقابلے میں میرا ریوالور کس حد تک کارآمد ہوگا۔

"ہر بات کی ایک انتہا ہوتی ہے سکندر۔" دلاور نے کہا۔

"ہاں۔ ظلم اور ناانصافی بھی ایک انتہا کو پہنچ کے خود اپنی سزا بن جاتی ہے۔" میں نے کہا۔

"میں نے۔۔۔ یا تم کہہ سکتے ہو کہ تقدیر نے۔" وہ میری بات کو سُنی اَن سُنی کر گیا۔ "تم کو متعدد مواقع فراہم کیے، جب تم اپنی یہ احمقانہ جنگ ختم کر سکتے تھے۔ تم اسے احمقانہ تسلیم نہیں کرو گے۔ یہ میرا خیال ہے اور تم اس سے اتفاق کرو یا نہ کرو، مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم اس کو معرکۂ حق و باطل کہو۔ اصولوں کی جنگ کہو یا وطن کے لیے جہاد۔۔۔ حقیقت وہی رہتی ہے کہ تم نے کچھ پایا نہیں۔ جو کچھ تمہارا تھا وہ بھی تم نے ٹھکرا دیا اور اس کے علاوہ دوسروں کا بھی بہت نقصان کیا۔ اس میں شک نہیں کہ تم لوگوں کو متاثر کرنے کا فن جانتے ہو چنانچہ تم کو کچھ لوگوں کی اس حد تک حمایت حاصل رہی کہ وہ تمہارے لیے ہر قسم کی قربانی دیتے رہے۔ جوانی میں جذبات ایسے ہی ہوتے ہیں، سیلاب کے دھارے کی طرح۔ اس کا جدھر رُخ موڑ دیا جائے اُدھر بہنے لگتا ہے۔ دو چار لڑکے اور دو چار لڑکیاں۔۔۔ یہ ہے تمہاری کُل طاقت جس کو تم نے ایم آر ایس کا مضحکہ خیز نام دے رکھا ہے۔"

"تمہاری انٹیلی جنس سروس کی فراہم کردہ معلومات قابلِ تعریف ہیں۔" میں نے کہا۔

"ڈھول کا پول تو کھُل ہی جاتا ہے ایک دن۔" دلاور نے گھوم کر جاتے ہوئے اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "تم نے کچھ عرصہ مجھے دھوکے میں مبتلا رکھا اور یہ ظاہر کرنے میں کامیاب بھی رہے کہ میرے کاروبار کی اصل حقیقت کا تمھیں علم نہیں ہے۔ میری حد تک یہ دھوکا چل سکتا تھا لیکن سائیں بابڑے والے کے مزار اور موضع کرماں والی پہنچ کے تم حد سے بڑھ گئے۔ کیا تم اب بھی انکار کرو گے کہ تم نے اس جگہ کو تباہ کیا؟"

"نہیں۔۔۔" میں نے سوچے سمجھے بغیر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔ "یہ کوئی قابلِ شرم بات نہیں، کوئی اخلاقی یا قانونی جرم نہیں اور کوئی گناہ نہیں کہ میں اس کا اعتراف تم جیسے شیطان کے سامنے کرتے ہوئے ڈروں۔ یہ ٹھیک ہے کہ تمہارے اس فریب کے اڈے کو میں نے ختم کیا تھا۔ انہی چند سرپھرے سرفروشوں کی مدد سے جو ایم آر ایس کے نام کو مضحکہ خیز تسلیم کرتے ہیں۔ اس کے مشن کو مقدس سمجھتے ہیں۔ اپنی زندگی سے بھی زیادہ۔"

"ویری گڈ۔۔۔ اپنے سکندرِ اعظم صاحب۔" دلاور نے طنزیہ اور تمسخر والے انداز میں تین بار تالی بجا کے کہا۔ "افسوس ہے کہ یہ

"ڈائیلاگ حب الوطنی پر مبنی ہوئی کسی فلم میں اداکار محمد علی نہیں کیے ورنہ لوگ بہت تالیاں پیٹتے۔ خصوصاً صف اوّل کے لوگ۔ سیوک رام اور اس کی بیوی کو اور کرنل جگن ناتھ کو تم نے قتل کیا تھا؟"

"ہاں۔ اور ہمیں اس کارنامے پر فخر ہے۔" میں نے کہا۔ باقی سب اس لیے چُپ کھڑے رہے کہ ان کے جذبات کی ترجمانی میں کر رہا تھا۔

"کیا تم سمجھتے تھے کہ چند افراد ایک حکومت کی مشنری کو تباہ کر سکتے ہیں؟ تم اتنے کم عقل تو نہیں تھے۔ تم سب۔۔۔" دلاور بولا۔ "بس مجھ سے دشمنی میں اپنے ساتھ میرا نقصان کر کے خوش فہمی کا شکار ہو گئے تھے۔ تم نے سمجھ لیا کہ ایک ملک سے جو رقبے اور فوجی قوت کے اعتبار سے اس ملک سے پانچ گُنا بڑا ہے، تم پانچ آدمی اور ڈھائی عورتیں ٹکر لے سکتے ہو۔ سوچو ذرا یہ کیسی تسیخ چلّی کی کہانی ہے۔ انڈین آرمی۔۔۔ کمانڈوز اور ملٹری انٹیلی جنس کے وسائل، ان کی تنظیم۔۔۔ طاقت اور وسعت کا چند افراد سے کیا مقابلہ جن کے پاس اپنا پستول تک نہ ہو۔ جو راہ چلتے لوگوں سے کاریں چھین کر کام چلاتے ہوں اور اِدھر اُدھر سے ریوالور چھین کر اسلحہ حاصل کرتے ہوں۔۔۔ یہ چور اُچکوں کی غیر مسلح فوج کہاں اور انڈین آرمی کہاں۔"

"چوہدری دلاور! تاریخ کا سبق کچھ اور بھی ہے۔" میں نے تنگ آ کے کہا۔ "یہ دنیا صرف طاقت رکھنے والوں نے نہیں بنائی ہے۔ آج جو کچھ ہے تعلیم اور تہذیب کی ترقی۔ علم کی روشنی اور سائنس کا ارتقا۔۔۔ یہ سب ان کی بدولت ہے جو جسمانی طور پر بہت کمزور لوگ تھے۔ وہ نہ جنرل تھے نہ پہلوان اور نہ باکسر۔۔۔ نہ جوڈو کراٹے کے ماہر اور نہ سُپرمین۔ حضرت عیسیٰؑ کو مصلوب کرنے والے کتنے زیادہ اور کتنے طاقتور تھے۔ امام حسینؓ کے مقابل یزید کا لشکر تھا مگر کیا وہ جیت گئے اور آج فتح مند کون ہے؟ سقراط کو زہر کا پیالہ دینے والے اور گلیلو پر کُفر کے فتوے صادر کرنے والے کیوں کامران نہ ہوئے۔ اس لیے کہ عیسیٰؑ یا محمدؐ۔ سقراط، حسینؓ یا گلیلو کسی فرد کا نہیں، ایک سچائی کا نام تھا اور سچائی ناقابلِ شکست رہتی ہے، خواہ سچ بولنے والے کتنے ہی کم ہوں۔ اور کیوں نہ ہو۔ عرب کے ریگزاروں سے اُٹھنے والی ایک آواز آج دنیا کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ایک ارب انسانوں کی آواز ہے۔ اس آواز کو دبانے والے ہزار یا دس ہزار تھے۔ ایک لاکھ تھے۔ ان کو بھی بہت گھمنڈ تھا اپنی طاقت کا۔"

"تمہارے ساتھ یہی ایک خرابی ہے۔" دلاور کا موڈ آف ہو گیا۔ "کہ تم سے آج کی بات کی جائے تو تم گزرے ہوئے کل کی تاریخ پڑھانے لگتے ہو یا آنے والے کل سے ڈرانے لگتے ہو۔ میں دنیا کی بات کرتا ہوں تو تم آخرت کی۔ میں تم کو بتانا چاہتا

ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ یہ سب باتیں دیر سے معلوم ہوئیں، ورنہ میں خود تم کو تھوڑا تھوڑا کر کے قتل آہستہ آہستہ مارتا۔ نہ جانے کیوں پہلے میں تم کو ڈھیل دیتا رہا۔ ے باپ کے ساتھ تھوڑی سی زیادتی ہوگئی تھی جس کی وجہ میں نے تمہاری جوانی پر رحم کھایا۔ کسی حد تک تمہارے نقصانات کی تلافی کی کوشش بھی کی تو تمہارے جذبات کے تق فشاں کو سرد کرنے کی بھی۔ اس کا خمیازہ میرے ساتھ دوسروں بھی بھگتا۔ تم نے کرماں والی کے اڈے سے بارہ ٹائم بم چوری لیے۔"

"چوری نہیں کیے۔۔۔ چھینے۔۔۔" میں نے کہا۔

"ان میں سے چار کو تم نے مجھ پر اور میرے دوستوں پر استعمال یا۔" وہ بولا۔

"تم کو ہماری شرافت کا قائل ہو جانا چاہیے کہ ہم نے اس لک میں ایس پی سراج کی والدہ کو، حشمت خان کی فیملی کو اور تمہارے گھر کو بخش دیا کیونکہ ہم جنگ میں عورتوں، بچوں کو مارنے کے قائل نہیں تھے۔ تم نے جو کچھ رابعہ اور شہلا کے ساتھ کیا اس اذکر کرتے تمھیں شرم آتی ہے؟"

"ٹھیک ہے۔۔۔ تم فرشتے ہو اور میں شیطان ہوں۔" وہ بولا۔ "تم نے اس ملک کے قانون کے تحت ہی اتنے جرائم کیے ہیں تم کو دس دس بار پھانسی ہو سکتی ہے مگر اب تمہاری سزا کا اختیار انھوں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے جو اس ملک کے قانون کے پابند نہیں۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ تم سب کو زندہ سلامت ان کے حوالے کر دوں۔ وہ تم سے سیوک رام اور کرنل جگن ناتھ کے علاوہ ان کے دوسرے ساتھیوں کے خون کا حساب لیں گے اور یہ بھی پوچھیں گے کہ تمہارے ساتھی اور مددگار کون ہیں۔ وہ دیکھیں گے تمہارے ہاتھ کتنے لمبے ہیں۔ تم نے میری انٹیلی جنس سروس کی فراہم کردہ معلومات کی تعریف کی تھی۔ یہ سب میں نے نہیں، انھوں نے خود معلوم کیا اور مجھے بتایا۔ کیا یہی وہ بڑھیا تھی جو فیملی کے گھر میں بھیس بدل کے ملازم رہی تھی؟" اس نے کیتھرین کی طرف اشارہ کیا۔

"نہیں۔" میں نے کہا مگر اسی وقت کیتھرین نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ دلاور مسکرایا۔ "بیک وقت ہاں اور نہیں؟ خیر جھوٹ سچ کا پتا وہ خود چلا لیں گے۔ میں تو تم کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تمہارا سارا ڈراما انھوں نے بہت دلچسپی سے دیکھا۔۔۔ بس تمہارے استاد ٹیڈی وہاں مونگ پھلی بیچتے تھے۔ اس کے ساتھ وہ جانباز صحافی تھا جو ابھی غائب ہے مگر کب تک غائب رہے گا۔"

یہ غالب کے غائب ہونے کی بُری خبر نہیں تھی، اس کے زندہ ہونے کی خوشخبری تھی۔ میرا دل ایک دم خوشی سے لبریز ہو

گیا اور میں نے ان آنسوؤں کو بڑی مشکل سے روکا جو میری دلی مسرت کا سرچشمہ بن کے آنکھوں سے رواں ہونے پر بضد تھے۔ اس وقت میرے رونے کو میری خوشی کی انتہا کون مانتا۔ اسے میری بزدلی اور کم ہمتی سے تعبیر کیا جاتا۔

"انھوں نے بعد میں سب کچھ دریافت کر لیا۔" دلاور بتاتا رہا۔ "ان کے پاس سگنل ڈیٹکٹر تھے۔ تمہارے ٹرانسمیٹر کی ڈائریکشن سے انھوں نے تمہارا سراغ لگایا۔ پھر وکٹر فیملی کے گھر میں سے سب کچھ برآمد کر لیا۔ بس یہ بڑھیا وہاں سے نکل گئی تھی۔۔۔ وہ ایک سسٹم کے مطابق کام کرتے ہیں۔ ان کی تربیت اور ان کا تجربہ اسی فیلڈ میں ہے۔ غالب بھی آتا ہی ہوگا۔ شہلا کو انھوں نے چھوڑ دیا ہے کیونکہ عملاً وہ تم لوگوں کی تخریبی سرگرمیوں میں تمہارے ساتھ نہیں رہی تھی۔ اور وہ ہے بھی بالکل بے ضرر لڑکی۔۔۔ نازو بھی ماں باپ کے گھر میں محفوظ رہے گی۔ اس کے بھائی نے یقین دلا دیا ہے کہ اسے گھر میں زنجیروں سے باندھ کے رکھنا پڑا تو رکھا جائے گا۔۔۔ باقی سب لوگوں کو بہت جلد آگے روانہ کر دیا جائے گا۔"

دلاور کی باتوں نے مجھے صورتِ حال کی سنگینی کا احساس دلایا۔ وہ جھوٹ بولنے اور اُسے سچ بنا کے پیش کرنے کا ماہر تھا لیکن اس وقت جو کچھ اس نے کہا، غلط نہیں لگتا تھا۔ وہ خود کچھ پریشان سا تھا۔ غالباً اس کو اپنا کارندہ بنانے والوں نے اس کی نااہلی کے باعث ہونے والے نقصانات پر اظہارِ تشویش کیا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ فوری طور پر ان کو مطمئن نہ کیا گیا تو اس کا کاروبار ہی نہیں، خود اس کا وجود اور اس کے خاندان کا اور ساتھیوں کا وجود بھی خطرے میں پڑ جائے گا۔ اسے اندازہ تھا کہ ہمیں گرفتار کر کے دشمنوں کے حوالے کرنے سے وہ محفوظ ہو سکتا ہے اور کہہ سکتا ہے کہ یہ ہیں آپ کے مجرم، اب آپ ان کے ساتھ جو سلوک چاہیں کریں۔

دلاور کے اشارے پر ہم سب کو باری باری باہر لے جایا گیا۔ کمرے کے مخالف کونوں میں دونوں مسلح افراد مشین گن لیے موجود رہے اور ان کی نظر ایک پل کے لیے بھی ہم پر سے نہیں ہٹی تھی بلکہ میں نے تو ان کو پلک جھپکاتے بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ بالکل منجمد اور بے حد مستعد تھے۔ مشین گن کی موت اگلنے والی نال کا رُخ ایک ہی جگہ رہا تھا اور ان کی انگلی کو ٹریگر پر دیکھ کر دہشت اس لیے محسوس ہوتی تھی کہ کہیں وہ اس اعصابی کشیدگی کے باعث غیر ارادی طور پر دباؤ نہ بڑھا دیں اور اس سے پہلے کہ ان کو غلطی کا احساس ہو، ہم میں سے کسی کا جسم چھلنی بن جائے۔ ان کو واضح حکم تھا کہ کوئی بھی خطرے کی بات دیکھیں یا ہم سے کوئی خطرہ محسوس کریں تو فائر کھول دیں۔ ان کے عزائم کا اظہار ان کے چہروں کی بے حسی اور ان کی آنکھوں کی سفّاک چمک سے ہوتا تھا۔۔۔

بھی مجھے انسان سے زیادہ مشینی روبوٹ لگے جو اپنی مرضی سے کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی قوتِ فیصلہ اور قوتِ عمل ریموٹ کنٹرول کے ذریعے دلاور کے اختیار میں تھی۔ دلاور ایک اشارہ کرتا اور وہ حرکت میں آجاتے۔ مشین گن رکھ دیتے۔ بیٹھ جاتے۔ لیٹ جاتے یا کھڑے ہو کر پھر مشین گن اٹھا لیتے اور یہ دیکھے بغیر کہ سامنے دیوار ہے یا ان ہی جیسے آدمی قطار میں کھڑے ہیں، وہ گولیوں کی بوچھار کر دیتے۔ یہی سب کچھ سمجھتے ہوئے ہم میں سے کسی نے بھی بہادر بننے کی بالکل بے وقوفی نہیں کی۔

جب میری باری آئی تو میں نے کسی بہادر جنگی قیدی کی طرح مارچ شروع کیا۔ ایک شخص میرے پیچھے تھا اور دو کچھ فاصلے سے دائیں بائیں چل رہے تھے۔ ویسے تو وہاں ہر آدمی دشمنِ جاں تھا اور مجھے قاتل موڈ میں نظر آتا تھا لیکن اس بار محافظوں کے انداز میں ملٹری ڈسپلن کی جھلک صاف نظر آتی تھی۔ ہمیں لانے والے یقیناً احمقوں کا ایک گروہ تھے جو اپنی تعداد اور طاقت کے بل پر ہمیں گرفتار تو کر لائے تھے لیکن بہت بڑی قیمت دے کر۔ ان میں نظم و ضبط کا فقدان تھا اور وہ کسی منصوبے کی پیش بندی کیے بغیر آپہنچے تھے۔ خود دلاور احتیاط پسند اور ہوشیار آدمی تھا مگر وہ بھی کام لیتا تھا پریڈ نہیں کراتا تھا۔ یہ تجربہ اس اعتبار سے جدا تھا کہ دلاور ان پر حکم نہیں چلا رہا تھا۔ وہ دلاور کے سامنے اس کے غلاموں کی طرح با ادب، با ملاحظہ ہوشیار نہیں کھڑے تھے اور بظاہر صرف ادائے فرض میں مصروف تھے۔ انھیں کسی سے سروکار نہیں تھا کہ وہ کون ہے، کیا کہہ رہا ہے یا کر رہا ہے اور کیوں کر رہا ہے۔ ان کو حکم تھا کہ جو لوگ وہاں لائے جائیں، انھیں کہیں نہ جانے دیں۔ حتی الامکان زندہ اور اسیر رکھیں۔ یہ ناممکن ہو جائے تو شوٹ کر دیں لیکن فرار نہ ہونے دیں۔ ورنہ یہ ان کا جرم سمجھا جائے گا۔

یہی وجہ تھی کہ جو کمرے میں موجود تھے وہ ایک لفظ نہیں بولے تھے۔ وہ اب بھی خاموش تھے اور ایک تو مشین گن کے ساتھ میرے ہر قدم کو شمار کرتا پیچھے آرہا تھا لیکن دائیں بائیں چلنے والے فرشتے خالی ہاتھ تھے۔ ان کے ساتھ چند قدم چل کے مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ بھی دلاور کے آدمی نہیں تھے۔ وہ پیشہ ور قسم کے کمانڈوز تھے جو خالی ہاتھوں سے لڑنے کا فن جانتے تھے۔ مجھے ان کے ہاتھوں کی ساخت اور مخصوص حرکات سے اندازہ ہو گیا کہ اگر میں نے سیدھا بھاگنے کی کوشش کی تو وہ جوڈو کراٹے کا کون سا داؤ آزمائیں گے۔ کسی ایک پر حملہ کیا تو کیا کریں گے، قلابازی کھائی تو ان کا ردِ عمل کیا ہو گا اور پیچھے والے محافظ پر حملہ کر کے اس سے مشین [illegible] کوشش کی تو وہ میری کوشش کو کیسے ناکام بنائیں گے۔ میں خود بھی اس فن کو......
چنانچہ اپنے ذہن سے سوچنے کے باوجود میرا اندازہ

غلط نہیں تھا۔ انھیں پہلے سے بتا دیا گیا تھا کہ قیدیوں میں ایک مرد اور ایک عورت مومن ہیں۔ جو مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی۔

دوبارہ بیرک سے گزرتے ہوئے میں شک میں ... یہ ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس کا حصہ ہے یا کوئی اور ... میں نے اس فیکٹری کو پوری طرح نہیں دیکھا تھا جس کی بنیاد ... والد نے رکھی تھی، جس کو میرے والد نے ورکشاپ سے ... بنانے میں دن رات ایک کر دیے تھے اور جو قانونی طور پر ... بھی ملکیت تھی۔ اس کا کچھ حصہ میں نے بہت پہلے دیکھا تھا ... یہ ہو سکتا تھا کہ اندر سے عمارت میں تبدیلی کر دی گئی ہو ... میرے کانوں میں باہر سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی ... جی ٹی روڈ سے زیادہ فاصلہ نہیں تھا اور اس سڑک پر چوبیس گھنٹے ٹریفک رواں رہتی تھی جس کا شور صاف سنائی دیتا ... باہر کا سناٹا مجھے بہت اجنبی لگتا تھا۔

چلتے چلتے میں نے دیوار کے ساتھ رکھے ہوئے ہر کمرے کے باکس کو غور سے دیکھا۔ یہ سب پانچ فٹ اونچے اور چوڑے باکس تھے جو بڑی صفائی سے موٹے تختے جوڑ کر بنائے گئے تھے۔ ... کہیں نظر نہ آتا تھا اور ان کے کناروں پر اینگل آئرن تھا جس سے کناروں کے ٹوٹنے یا جدا ہونے کا کوئی امکان نہیں رہا تھا۔ ایک طرح رندہ پھیرنے کے بعد لکڑی پالش کی گئی تھی جو اور چمک رہی تھی ... یہ باکس کس طرف سے کھلتے تھے، یہ اندازہ کرنا مشکل تھا۔

دائیں جانب چلنے والا اچانک رک گیا۔ دوسری طرف والے نے ہاتھ اٹھا کے میرے سامنے ایک بیریئر سا بنا دیا جس کا مطلب یہ تھا کہ رک جاؤ۔ میں رک گیا۔ دائیں طرف چلنے والے نے ایک باکس کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے اسے آنکھیں نکال کے دیکھا۔ "کیا مطلب ہے آخر تمھارا؟"

اس نے ہاتھ سے زیادہ واضح اشارہ دیا کہ مجھے اندر داخل ہو جانا چاہیے۔

"میں اس... ڈربے میں گھس جاؤں؟" میں نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ "کیا مرغا ہوں... اور تم رہ سکتے ہو اس میں..."

لیکن میری بات کے ختم ہونے سے پہلے ہی وہ دونوں حرکت میں آگئے۔ ان کو اندازہ تھا کہ برضا و رغبت اور ہنسی خوشی کوئی بھی ایسے حکم کی تعمیل نہیں کرے گا۔ ایک سیکنڈ بعد میں اندر تھا، میرا سر سامنے والے تختے سے ٹکرایا اور اندر گونج سی پیدا ہوئی۔ میرے سنبھل کر اٹھنے سے پہلے وہ تختہ برابر ہو گیا جو ایک طرف پڑا تھا لیکن میں نے اسے غور سے نہیں دیکھا تھا۔ انھوں نے تختہ برابر کیا۔ اس کے کناروں پر اینگل آئرن رکھے اور اس میں پیچ کسنے لگے۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ وہ باکس تھا، ہمارے لیے

... تھے اور ایم آر ایس کے باقی معزز ارکان انھی ڈبوں میں بند ... جن کے پاس سے میں گزر کے آیا تھا۔ سب ڈبوں کی ساخت ... تھی کہ اس کی ایک سائڈ کا کھلا حصہ قبضوں کی مدد سے ... تھا اور یہ حصہ کھولنے پر نیچے گر کر فرش سے مل جاتا تھا۔ ... دوبارہ اٹھا کر بند کرنے کے لیے پانچ فٹ لمبا اینگل آئرن کام آتا ... ڈبے کے باقی تین کناروں پر اینگل آئرن پہلے سے نصب ... اور شاید ہر کنارے کو ملانے والا اینگل آئرن دوسرے کنارے ... اینگل آئرن کے ساتھ ویلڈ کر دیا گیا تھا۔ صرف اوپر کی ایک ... سائڈ ایسی تھی جس کا اینگل آئرن پیچ کھلنے سے جدا ہو جاتا ... تو وہ سائڈ دروازے کی طرح کھل جاتی تھی۔

یہ بڑا مضبوط اور تکلیف دہ انتظام تھا۔ میرے ساتھ ... نے والے تو گونگے بہرے بن گئے تھے۔ ان کو ضرور بات کرنے کی ممانعت ہو گی تاکہ میں لہجے سے یہ اندازہ بھی نہ کر سکوں کہ وہ کس علاقے اور کس خطے کے رہنے والے ہیں۔ وہ پاکستانی بہرحال نہیں ... اور میں ان کو مدراس، حیدرآباد دکن یا جنوبی ہندوستان کے علاقے کا رہنے والا فرض کر سکتا تھا۔ وہ اپنی تربیت اور ہدایات کے اصولوں پر سختی سے عمل کر رہے تھے۔ ایک منٹ میں انھوں نے اینگل آئرن میں اسکریو ٹائٹ کر دیے اور مجھے سیل بند کر دیا۔ ... سکریو ڈرائیور اور اسکریو ان کے پاس جیب میں تھے یا ڈبے کے پاس ہی کہیں موجود تھے، یہ میں نہ دیکھ سکا تھا۔

پانچ فٹ کی چوڑائی اور اونچائی ایسی تھی کہ میں نہ سیدھا کھڑا ہو سکتا تھا اور نہ پیر پھیلا کے لیٹ سکتا تھا۔ مجھے معلوم تھا اگر اس پنجرے میں مجھے دس پندرہ دن رکھا گیا تو میری کیا حالت ہو جائے گی۔ قید میں سب سے زیادہ اذیت ناک احساس تنہائی کا ہوتا ہے چنانچہ نظر بندی بھی صرف اس لیے گراں جاتی ہے کہ آدمی کا مونس دیواروں کے سوا کوئی نہیں رہتا۔ ... چلنے پھرنے اور کھانے پینے کی آزادی ہوتی ہے اور بعض اوقات لوگوں کو اپنے ہی گھر میں بھی نظر بند کیا جاتا ہے مگر اس وقت اپنا گھر بھی بیگانہ لگتا ہے جب گھر کے دروازے خود صاحبِ خانہ کو باہر نہ جانے دیں اور اس کو ساری دنیا سے الگ کر دیں۔ ... آدمی اپنے آپ سے باتیں کرے تو دیوانہ نظر آتا ہے اور کہلاتا ہے۔ مسلسل خاموشی اعصاب کو شکست دینے لگتی ہے اور نظر بندی فی الحقیقت زباں بندی بھی بن جاتی ہے۔

یہاں قید تنہائی کے علاوہ بھی بہت سے عذاب تھے۔ ... نقل و حرکت کی جگہ انتہائی محدود تھی اور سب سے ... اپنے جانور ہونے کا احساس تھا۔ اشرف المخلوقات کو اس ... میں ڈال دیا گیا تھا جس میں شاید گدھا بھی نہ سماتا... تاہم ... اپنی مرضی کا زنداں نہیں منتخب کر سکتے اور وہاں پسندیدہ ... کا تقاضا بھی نہیں کر سکتے۔ کسی عالمی انسانی منشور میں اسیروں

کو یہ حق نہیں دیا گیا۔ انگریز تو کہتے ہیں کہ خیرات مانگنے والے بھی اختیار کا حق نہیں رکھتے۔ انھیں وہی قبول کرنا پڑتا ہے جو خیرات دینے والے دیں۔

خود کو اس فلسفے سے قائل کرنے کے بعد میں ایک دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھ گیا۔ میری جیب میں سے سگریٹ تک نکال لی گئی تھی لیکن سگریٹ ہوتی تو اس ڈبے کی پچیس مکعب فٹ ہوا کو دھوئیں سے آلودہ کرنا ممکن نہ ہوتا۔ میں نے اندر کی سطح پر ہاتھ پھیر کر دیکھا اور کونوں میں انگلی پھیر کے دیکھا، مجھے کوئی درز یا سوراخ محسوس نہیں ہوا۔ تاہم باکس ایئر ٹائٹ نہیں تھا اور مجھے امید تھی کہ جتنی آکسیجن میں خرچ کروں گا اتنی باہر سے آتی رہے گی اور جو کاربن ڈائی آکسائڈ ... وہ اوپر سے باہر نکلتی رہے گی۔ کاربن ڈائی آکسائڈ ہوا سے تو غالباً ہلکی ہوتی ہے، میں نے سوچا۔

پرائمری اسکول کے زمانے سے میں یہ پڑھتا چلا آرہا تھا کہ تمام جانداروں کو جن میں پودے بھی شامل ہیں، زندہ رہنے کے لیے تازہ ہوا کے علاوہ دھوپ، پانی اور خوراک کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ اگر میں سکندر بخت نہیں ٹماٹر کا پودا ہوتا تب بھی ان چار چیزوں کے بغیر مر جاتا اور ابھی تک میں یہ دریافت کر چکا تھا کہ تازہ ہوا تو حسبِ ضرورت ملتی رہے گی۔ دھوپ کا گزر بعید از قیاس تھا مگر خوراک اور پانی کی فراہمی بھی مشکوک تھی۔ اللہ پتھر کے کیڑے کو بھی رزق پہنچاتا ہے تو باکس میں بند سکندر بخت کے لیے بھی کچھ کرے گا۔ خود سکندر بخت کیا کرے گا اگر اسے اپنے موجودہ بیڈ روم کو ہی باتھ روم کے طور پر استعمال کرنا پڑا؟

میرے پاس کیتھرین کی حاضر دماغی کے باعث ایک ریوالور محفوظ رہ گیا تھا۔ دشمن، چور، ڈاکو یا قاتل خواہ کتنی ہی باریک بینی سے کام لیتے ہوئے احتیاط اور حفظِ ماتقدم کے سارے تقاضے پورے کریں مگر کہیں نہ کہیں غیر ارادی طور پر بھول چوک کر جاتے ہیں۔ حد سے زیادہ مستعد ذہن ننانوے فیصد درست چلتا ہے مگر ایک فیصد خطا بھی نہ کرے تو آدمی خطا کا پتلا کیسے کہلائے۔ ہمارے مقتول شکاری بھی کیتھرین کی بے ہوشی کے ڈرامے کی طرف متوجہ ہو گئے تھے چنانچہ ان کے ذہن میں صرف کیتھرین کی بزدلی کا احساس رہ گیا تھا اور یہ خیال محو ہو گیا تھا کہ ان کو اس حد درجہ کمزور عورت کی تلاشی لینے کی رسمی کارروائی تو کرنا ہی چاہیے۔ اس کے بعد وہ ریوالور میں نے بے کریت عقل مندی کا ثبوت دیا تھا مگر اب میں حیران تھا کہ اس عقل مندی کا کیا کروں۔ ریوالور میرے لیے اتنا ہی بے کار تھا جتنا خالی ہاتھوں سے لڑنے کا فن... میں ان دیواروں کو شوٹ نہیں کر سکتا تھا جو ہر طرف پانچ فٹ کے بعد سامنے آجاتی تھیں۔ اس محدود وسعت میں بہت سے کام ناممکن تھے۔ میں چہل قدمی نہیں فرما سکتا

زیادہ سے زیادہ رکوع کی حالت میں دو قدم جا سکتا تھا۔ سیدھا کھڑا ہو کے انگڑائی نہیں لے سکتا تھا اور ڈنڈ نہیں پیل سکتا تھا مگر بہت سے ایسے طریقے بھی تھے جن سے میں ہاتھوں پیروں کو حرکت دے کر ان کی کارکردگی کا معیار برقرار رکھ سکتا تھا۔ میرے لیے بیٹھ کر گردن اور کمر کی ورزش کرنا بھی ممکن تھا۔

یہ سب خیالات قبل از وقت تھے۔ ابھی میں نہیں جانتا تھا کہ مجھے اس ڈبے میں کتنا عرصہ رہنا ہوگا۔ رکھنے والے مجھے اسی حالت میں ایک سال بھی رکھتے تو مجھے کوئی معجزہ ہی بچاتا۔ وہ مجھے چند گھنٹوں کے بعد تفتیش کے لیے زیادہ دیر پُر عذاب جگہ طلب کر لیتے یا کچھ پوچھے بغیر عالمِ بالا کو ارسال کرنے کا فیصلہ کر لیتے تو ان کی مرضی۔ میں نے اطمینان سے بیٹھ کر صورتِ حال میں امید کا پہلو تلاش کرنا شروع کیا۔ ریوالور میرا بہت بڑا سہارا تھا۔ فرض کرو ایسا ہو جائے کہ کوئی شخص مجھے دانہ پانی ڈالنے آئے اور میں اس کو دبوچ لوں۔ میں نے سوچا اور پھر نفی میں سر ہلایا۔ اگر کوئی آئے گا تو اکیلا نہیں آئے گا۔ باہر دوسرا قاتل موجود رہے گا کہ اِدھر میں ڈبے سے گردن نکالوں اُدھر وہ میرا قصہ پاک کر دے۔ ایک قفل ہوتا یا ایک کُنڈی ہوتی تو میں گولی سے اُڑا دیتا لیکن پانچ فٹ لمبے اینگل آئرن کا ایک گولی سے کیا بگڑے گا جو کئی جگہ سے اسکریو لگا کے جوڑا گیا ہو۔ اور گولی چلاتے ہی سب بھاگے چلے آئیں گے۔ ڈبے سے باہر نکلنے کے بعد کون سی آزادی مل جائے گی۔ آگے کئی بند دروازے ہوں گے اور راستہ روکنے والے محافظ ہوں گے۔ چنانچہ سکندر بادشاہ! تم کو دوسروں کے مقابلے میں اس ریوالور کے باعث صرف ایک فائدہ ہو سکتا ہے کہ تم قید کی سختی نہ جھیل سکو تو خودکشی کر کے حرام کی موت مر جاؤ۔

لاحول ولاقوۃ! میں نے کہا۔ ایسے مایوس کن خیالات کا آخر کیا مطلب ہے؟ مجھے کچھ تو شرم آنا چاہیے۔ میرے ساتھ محسن بھی بند ہے اور وہ زیادہ ذہنی اذیت میں مبتلا ہوگا کیونکہ اس کو بیوی یاد آ رہی ہوگی اور اس بچے کا خیال ہوگا جس کا باپ شاید اسے کبھی نہ دیکھ سکے۔ میرے ساتھ رابعہ ہے اور کیتھرین ہے۔ ڈاٹر فُل وومن۔ اس کی بیٹی بسترِ مرگ پر ہے مگر وہ زندگی سے مایوس نہیں ہے اور اس کا خدا کے اعجازِ مسیحائی پر اعتقاد کم نہیں ہوا ہے۔ مزید یہ کہ مردہ بھی زندہ ہو گیا ہے یعنی مرزا غالب جن کو میں مرحوم سمجھ کے رو بھی چکا تھا بفضلِ خدا ابھی تک دشمن کے ہاتھ نہیں لگے ہیں۔ وہ اُلو کا پٹھا آخر کہاں گیا اور چھپ کر کیا کرتا رہا۔ ہمارے آنے کے بعد نکلا ہوگا تو اس کا فائدہ؟ پھر بھی اللہ سے دعا ہے کہ اس کو عقل اور ہمت دے کہ وہ ایم آر آئی ایس کے منشور پر عمل کرتے ہوئے جہاد جاری رکھے۔ ہمارا سراغ لگائے پھر ہمیں ایسے نکال لے جائے جیسے اسمگلر کسٹم والوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر ممنوعہ سامان نکال لے جاتے ہیں۔

افسوس یہ کہ نازو نے میکے جانے کے لیے بہت غلط وقت کا انتخاب کیا۔ اس نے کیا انتخاب کیا شہلا کی مجبوری نے مروا دیا۔ وہ باہر ہوتی تو اس سے امید رکھی جا سکتی تھی کہ وہ دشمنوں کے دانت کھٹے کر دے یا توڑ دے۔

کسی نے دروازہ کھولنے کا عمل شروع کیا اور میں نے اپنا ریوالور تیار کر لیا مگر جیب سے نکالا نہیں۔ پانچ منٹ میں بولٹ کھل گئے اور دروازہ ہٹا تو مجھے منکر نکیر میں سے ایک نظر آیا۔ ان دونوں کا ابھی تک مجھے نام تو معلوم تھا نہیں جو مجھے اس ڈبے تک لانے اور اندر پہنچانے کے ذمہ دار تھے۔ وہ پھر سامنے آئے تو مجھے منکر نکیر کا ہی خیال آیا۔ شاید اس لیے بھی کہ میں ایک تابوت میں تھا۔ دوسرا باہر کھڑا رہا۔ تو ذرا چہرہ "تشنۂ مضراب ہے ساز" کی عملی تفسیر بنا ہوا۔ وہ مار دھاڑ کے لیے کچھ بے چین نظر آتا تھا اور میری بے عملی سے مایوس تھا۔

"السلام علیکم حضرت!" میں نے خوشدلی سے کہا۔ "کیسے آئے؟" گیٹ کھولنے والے نے ایک کاغذ میں لپٹا ہوا بنڈل اندر رکھا۔ پھر موم کاغذ کا بنا ہوا پانی کا گلاس بھی احتیاط کے ساتھ ایک طرف رکھا۔

"دیکھیے! صبح ناشتے میں دو انڈے ہاف فرائی... ایک کافی... توس دو عدد براؤن کیے ہوئے..." میں نے کہا مگر گیٹ اوپر اُٹھا چکا تھا اور اس کے نٹ بولٹ کس رہا تھا۔ "عجیب بداخلاقی کا دَور ہے" میں نے کہا۔ "یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں۔ واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں" میں نے ذرا پر غور فرماتے ہوئے مرزا غالب کی زبان میں شکوہ کیا۔ ابھی مجھے بھوک نہیں تھی مگر میں نے سب کچھ پیٹ میں انڈیل لیا اس خیال سے کہ کہیں مجھے بھوک ہڑتال پر سمجھ کے وہ اس من و سلویٰ کو بھی نہ لے جائیں۔ پانی میں نے نہیں پیا کیونکہ پھر سارے پانی کے جسم سے اخراج کا مسئلہ پیدا ہو جاتا۔

میری عقل ابھی تک کام کر رہی تھی چنانچہ میں نے جارحیت سے گریز کیا تھا۔ ایک امید قائم تھی کہ شاید قدرت کوئی ایسا موقع فراہم کر دے جب ایک ریوالور سے جنگ کا پانسا پلٹتے دیر نہ لگے۔ مارنے کو میں منکر نکیرین کو ٹھنڈا کر سکتا تھا مگر باہر مشین گن والے بھی تھے جو سب کی طرح قتل و خونریزی کے لیے بہانہ چاہتے تھے۔ ابھی تک ہم میں سے کسی نے یہ بہانہ پیدا نہیں کیا تھا، چنانچہ ہم سب بقیدِ حیات اور اپنے اپنے ڈربوں میں بخیر و عافیت موجود تھے۔

جب کرنے کو کچھ نہیں، سوچنا بے کار ہے۔ نہ کوئی سننے والا نہ کہنے والا تو وقت کاٹنے کے لیے سو جانا ہی بہتر ہے۔ میں نے طے کیا۔ سونے سے جسم کی توانائی بحال ہوتی ہے اور ذہن آرام پانے کے بعد بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ میں تختے کے فرش پر پاؤں سکوڑے سے سمیٹ کر لیٹا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اپنی دراز قامتی میرے لیے کبھی باعثِ پریشانی یا پشیمانی نہ تھی۔ میں اس بلند قامت پر ناز کرتا تھا مگر آج مجھے خیال آیا کہ پستہ قد بھی کبھی کبھی فائدے میں رہتے ہیں۔ اگر میں پانچ فٹ قد کا ہوتا تو اطمینان کے سوتا اور باکس کے اندر مزے سے ٹہلتا۔

مجھے معلوم نہیں میں کتنی دیر سویا تھا اور سو چکا تھا یا ابھی سونے کی کوشش کر رہا تھا کہ میرے کانوں نے دستک سُنی اور میں ایک دم اُٹھ بیٹھا۔ یہ دستک میرے ڈربے کے صدر دروازے پر نہیں ہوئی تھی۔ اس کی آواز مجھے اپنے پیچھے سے سنائی دے رہی تھی۔ کھٹ کھٹ... کھٹا کھٹ... کھٹا کھٹ... کھٹا کھٹا کٹ کٹ... میں وقتی خوشی سے اچھل پڑا۔ یہ مورس کوڈ کا سگنل تھا۔ ایک پرانی یاد نے پھر دل کا دریچہ کھولا۔ میں نے غور سے سُنا۔ از کجا می آید ایں آوازِ دوست!

آوازِ دوست پڑوس میں سے سنائی دے رہی تھی جیسے میرے پنجرے کے ساتھ ہی محسن تھا۔ دوسرے پنجرے میں قیام پذیر تھے۔ معلوم نہیں اس نے کیسے جانا کہ میں اس کا ہمسایہ ہوں۔ غالباً اس نے قسمت آزمائی کی لیکن قسمت نے ساتھ دیا۔ میں نے اس کے پیغام کو صاف سمجھ لیا۔ اس نے صرف میرا نام لیا تھا۔ سکندر... میں نے فوراً پیچھے کی دیوار پر انگلی بجا کے جواب دیا... یس...

مورس کوڈ ایک عظیم ایجاد ہے۔ اسے ٹیلیگراف آفس میں تار دینے والے نہیں سمجھتے۔ شاید تار ارسال کرنے والے بھی اسے مسلسل استعمال کرنے سے اتنے بیزار ہو جاتے ہیں کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا پسند کرتے ہیں یا یوں ہی شغلاً دو چار ہاتھ اِدھر اُدھر مار کے ڈیوٹی پوری کرتے ہیں۔ تار نہ پہنچنے یا غلط پہنچنے کی یہی وجہ ہو سکتی ہے۔ ورنہ نقطوں اور لکیروں کی یہ زبان ایک عالمی زبان ہے جسے اہلِ زبان بھی استعمال کر سکتے ہیں اور بے زبان بھی... ہنگامی حالات میں اس سے پیغام ارسال کرنے کے لیے کسی بھی سطح کو کسی بھی چیز سے بجا کے کام چلایا جا سکتا ہے۔ محسن نے نقطے کے لیے انگلی آہستہ سے ماری تھی اور لکیر کے لیے ذرا زور سے اور دبا کے۔ یہی میں نے بھی کیا۔ کسی ٹرانسمیٹر، وائرلیس، لفافے یا کبوتر کے بغیر ہمارے درمیان مواصلاتی رابطہ قائم ہو گیا۔

"کیا حال ہے... شیر لوہے کے جال میں ہے؟" محسن بولا۔

"میں خواہش کر رہا تھا کہ میرا قد چار فٹ گیارہ انچ ہوتا۔" میں نے کہا۔

"ہم یہاں کب تک رہیں گے آخر؟"

"یہ تو باوا آدم کو بھی علم نہ تھا کہ وہ جنت میں کتنا عرصہ رہ پائے گا۔" میں نے کہا۔

"تو نے ضرور غور و خوض فرمایا ہوگا۔ کافی فرصت تھی... کہ ہمارا انجام کیا ہوگا۔"

"میں کچھ استراحت فرماتا رہا۔" میں نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔ "لیکن آپ کے سوال کا جواب دینے کے لیے غور کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ آپ نے یہ احمقانہ سوال بھی غور فرمائے بغیر کیا ہے۔"

"یار مختصر بات کر... انگلیاں تھک جائیں گی۔" محسن بولا۔

"یار میرے پاس ایک ریوالور ہے۔" میں نے کہا۔

"تو سیریس نہیں ہے اُلو کے پٹھے۔"

"کیا میں ایک گولی چلا کے ثبوت پیش کروں؟" میں نے کہا۔ "اپنا سر سامنے رکھ اس تختے کے درمیان میں۔ ریوالور مجھے آنٹی نے دیا ہے۔"

"کیتھرین نے؟"

"ہاں... وہ تلاشی سے بچ گئی تھی۔"

"معلوم نہیں یہ اچھی بات ہے یا بے کار بات ہے۔" محسن بولا۔ "اس کے استعمال کی نوبت آئے گی یا نہیں۔"

"رابعہ اور کیتھرین کا کیا حال ہے؟"

"معلوم نہیں... ان کو جو بنگلا الاٹ کیا گیا ہے وہ دور ہے۔ میرے دوسرے پڑوسی خواجہ صاحب ہیں۔"

"وہ زندہ تو ہیں؟"

"ہاں۔ میں نے پہلے اُدھر پیغام دے دیا تھا۔ اس نے جواب میں چلا کے کہا کہ کون ہے بھائی... اندر آ جاؤ..." محسن بولا۔ "پھر میں نے دوسری طرف کوشش کی۔"

"تجھ پر کیا وحی نازل ہوئی تھی کہ دوسرے بنگلوں میں کون ہے؟"

"جب مجھے یہاں ٹھہرایا گیا تھا تو ظاہر ہے اس فائیو اسٹار ہوٹل کے باقی کمرے دوسرے مہمانوں کے لیے بُک تھے۔" محسن بولا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ صرف ہمیں رکھنے کے لیے اتنا تکلف کیوں کیا گیا۔" میں نے کہا۔ "باکس بنوانے ضروری نہیں تھے۔ ہمیں ایک ہی کمرے میں بھی بند کیا جا سکتا تھا۔"

"پہلی بات تو یہ کہ باکس ہمارے لیے نہیں بنے۔ اس میں سامان جاتا ہے۔" محسن نے جواب دیا۔ "ایکسپورٹ کیا جاتا ہے۔ سب کے تختوں پر ایک ہی پتا لکھا ہوا تھا۔"

"کیا لکھا ہوا تھا؟"

"نام تو میں... یاد نہیں رکھ سکا..." محسن نے جواب دیا۔ "بہت مشکل اور لمبا نام تھا۔ کاربن ٹیٹرا کلورائیڈ قسم کا... پتا بھی کچھ ایسا ہی تھا۔"

"یعنی تو نے دیکھا اور میں نے نہیں دیکھا... ایک ہی بات ہے۔"

"نہیں یار... ملک کا نام مجھے یاد ہے... بلکہ شہر کا بھی۔"

محسن بولا۔" اس پر تو سٹرک کا نام، ٹیلیکس نمبر، کیبل ایڈریس اور فون وغیرہ سب ہی لکھا گیا تھا۔ اسٹینسل سے حروف پینٹ کیے گئے تھے۔ وہ سب میں کیسے یاد رکھتا۔ شہر کا نام تھا" ایلڈو میٹ سٹی۔"

"کیا... ایلڈو میٹ؟" میں نے کہا۔" تو نے ٹھیک سے دیکھا تھا۔"

" ہاں یار... یہی نام تھا... ایل ڈی او ایم اے ٹی۔"

" یہ کیسے ہو سکتا ہے...!"

" مجھے بھی معلوم ہے کہ یہ ایک دوا کا نام ہے۔" محسن نے کہا۔

" ہاں۔ اور یہ بلڈ پریشر کی دوا ہے۔ بہت عام۔" میں نے کہا۔

" اور اسی لیے مجھے یہ نام یاد رہ گیا۔" محسن نے جواب دیا۔

"کہ خود میرے والد یہ دوا استعمال کرتے تھے۔"

" ملک کا نام کیا تھا؟"

" یہ مت کہنا کہ میری عقل گھاس کھا گئی ہے۔ یا میری دور کی نظر خلاص ہو گئی ہے۔" محسن بولا۔" ملک کا نام تھا... دس بی دانیا..."

" دس بی دانیا؟" میں ہونق سا رہ گیا۔

" ہاں دس بی دانیا۔" محسن بولا

" اس کا مطلب تو ہے... خدا حافظ..."

" میں نے اور تو نے فلم پردیسی ایک ساتھ دیکھی تھی۔" محسن بولا۔" لندن میں بھی کچھ دن یہ لفظ چلا تھا۔"

" یہ روسی زبان کا لفظ ہے۔" میں اب محسن کی بات سمجھنے لگا تھا۔" فلم میں ایک گانا تھا۔ پھر ملیں گے جانے والے یار دس بی دانیا۔"

" ہاں۔ اچھا گانا تھا مگر وہ دوسرا گانا زیادہ اچھا تھا۔ نادریم تنا دے رے نا۔" محسن بولا۔" لتا کی آواز میں۔"

" لاحول ولا قوۃ... موسیقی ہمارا موضوع نہیں ہے۔" میں نے کہا۔" تیری بات سے تو میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ پتا بھی بوگس ہوگا۔ ٹیلیکس نمبر... کیبل ایڈریس... فون نمبر... سب غلط ہوگا۔"

" اتفاق سے میں آپ سے اتفاق کرنے پر مجبور ہوں۔"

" اور یہ سب مال جاتا کہاں ہوگا؟" میں نے کہا۔

" جہاں اسے نہیں جانا چاہیے۔" محسن بولا۔" لیکن میرا خیال ہے کہ یہاں سے کراچی جاتا ہوگا۔ وہاں بندرگاہ سے کسی بحری جہاز پر لادا جاتا ہوگا۔ اب جیسا کہ تو جانتا ہے۔ بندرگاہ تو پورا شہر ہوتا ہے جس کا سر پیر نہیں ہوتا۔ ہر روز نہ جانے کتنے مال بردار جہاز آتے ہیں اور جاتے ہیں۔ نہ جانے کتنی گودیاں ہیں اور کتنے گودام۔ سیکڑوں ایسے اور اس سے چھوٹے بڑے باکس اور کنٹینر۔"

" ہاں... کنٹینر۔" محسن بولا۔" جس میں ہم لائے گئے تھے۔"

" کنٹینر میں کتنے باکس آسکتے ہیں؟" میں نے کہا۔

" سولہ... ایسے ہی باکس..." محسن نے ہونہار طالب علم کی طرح فوراً جواب دیا۔" وہاں اس قسم کے کنٹینر بھی روزانہ اتارے چڑھائے جاتے ہیں۔ ہزاروں مزدور اور بندرگاہ کے عملے کے ہزاروں افراد دن رات یہ کام کرتے ہیں۔ کون غور کرتا ہے کہ پیٹی، پارسل، باکس یا کنٹینر پر کیا پتا لکھا ہوا ہے۔ مال جانا ہے، چلا جائے گا۔ چڑھانے والے خود بحری جہاز پر لوڈ کرا سکتے ہیں۔ کلیئرنگ فارورڈنگ ایجنٹ اور ان کے ایجنٹ۔ سب مل کے کسی بھی چیز کو جہاز تک پہنچا سکتے ہیں یا بندرگاہ سے نکال سکتے ہیں اور جہاں تک مجھے یقین ہے سب لوگ دنیا کے ممالک اور تمام شہروں کے نام نہیں جانتے۔ کیا تو بتا سکتا ہے کہ آج اقوام متحدہ کے رکن کتنے ممالک ہیں اور ان سب ممالک کی بندرگاہوں کے نام کیا ہیں۔"

" نہیں... یہ جواب تو کمپیوٹر بھی نہیں دے سکتا ہے کیونکہ آئے دن کوئی پنڈ دادن خاں جتنا ملک خود مختاری حاصل کر لیتا ہے اور چند جزائر پر مشتمل مملکت بن جاتی ہے۔" میں نے کہا۔

" رائٹ... اسی کم علمی کو دنیا کا زیادہ علم رکھنے والوں نے استعمال کیا۔" محسن بولا۔" عام مزدور تو پڑھ بھی نہیں سکتا۔ اس کو بندرگاہ کے اندر کوئی ایجنٹ کہے گا کہ یہ فلاں جہاز کا مال ہے۔ ایجنٹ کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ مثلاً دشمن کا ایجنٹ... جہاز بھی انہی کا ہوگا۔"

" یہ تو بہت خطرناک کام ہے۔"

" ہاں۔ مگر کرنے والے کر رہے ہیں۔" محسن بولا۔" خطرے سے کھیلنے کا ہی معاوضہ پا رہے ہیں۔ اوّل تو وہ اپنے مال کے سوا کسی کے مال پر نظر ڈالتے نہیں۔ سب اپنا مال پہچانتے ہیں اور اسی کو تلاش کرتے ہیں۔ کوئی دیکھے تو سوچتا نہیں کہ یہ شہر اور یہ ملک کہاں ہوں گے۔ ٹانگانیکا... ہنڈیورا... وغیرہ وغیرہ یہ بھی تو شہر ہی ہیں۔"

" تیری نظر... تحقیق اور استدلال سے ہم مرعوب اور خوش ہوئے۔"

" صرف خوش ہونے سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ ہم فوت بھی تو ہو سکتے ہیں۔"

" اگر فوت نہ ہوئے تو یہ معلومات کارآمد ہوں گی۔" میں نے کہا۔

" فوت تو ہونا پڑے گا۔"

" یار ہو سکتا ہے غالب دھاوا بول دے۔" میں نے کہا۔

[illegible]

" ... تو باتیں تصدیق طلب ہیں۔" محسن بولا۔" ممکن ہے وہ بھی آئے ہوں اور ہماری طرح آرام کر رہے ہوں... اس کے علاوہ غالب صرف بول سکتا ہے، دھاوا نہیں بول سکتا۔"

"اس کو فلمی ہیرو کی طرح چانس ملنا چاہیے

...پنٹوں کے پیشتے لگاتا ہے۔"

" مجھے کیتھرین کا بہت افسوس ہے۔ اس کے لیے دہرا عذاب ہے۔"

" ایک امید یہ بھی ہے کہ شاید اسے چھوڑ دیا جائے۔" میں نے کہا۔

" یہ لوگ بے گناہ کو بخش دینا ضروری نہیں سمجھتے۔"

" کیا تجھے اپنی زوجہ یاد آرہی ہے؟" میں نے کہا۔

" ہاں۔ اور مجھے ہچکیاں بھی آرہی ہیں۔ یقیناً وہ مجھے یاد کر رہی ہے۔"

" مجھے بھی رابعہ یاد آرہی ہے۔ ممکن ہے اب اسے ہچکیاں آنے لگی ہوں۔" میں نے کہا۔

" میری انگلیوں کی پوریں درد کرنے لگی ہیں... اس لیے وقفہ۔"

" یار یہ باتھ روم کی ضرورت ناگزیر ہوتی جارہی ہے۔"

ابھی ہمارے مواصلاتی رابطے کو منقطع ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ میں نے رابعہ کے چلانے کی آواز سنی۔ میں تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔

" کہاں لے جارہے ہو تم مجھے... بتاتے کیوں نہیں؟" اس کی بات کا بھی کسی نے جواب نہیں دیا اور رابعہ کی آواز آہستہ آہستہ دور ہو گئی۔ اس کے چلانے کا مقصد یہی ہو سکتا تھا کہ ہم کہیں آس پاس موجود ہوں تو خبردار ہو جائیں۔ ہمیں یہاں قید کرنے والے ایک ایک کر کے لائے تھے چنانچہ ایک کو دوسرے کی خبر نہ تھی کہ وہ کہاں ہے۔ صرف محسن نے عقل کے گھوڑے دوڑا کر مجھ سے رابطہ قائم کر لیا تھا اور یہ بھی معلوم کر لیا تھا کہ دوسری طرف استاد ٹیڈی ہے۔ میں نے استاد ٹیڈی کی آواز بھی سنی۔

"بے غیرت... بزدل انسانوں... عورتوں پر ظلم کو بہادری سمجھتے ہو۔" اس کے مشتعل ہونے اور ایسی باتیں کہنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا مگر اس کے دلی جذبات عقل کے تابع نہیں تھے۔ وہ اپنے غصے اور بے بسی کا اظہار اسی طرح کر سکتا تھا۔ میں اور محسن چپ بیٹھے رہے۔ ایک دوسرے سے ہم کیا کہتے... نہیں جانتا تھا نہ محسن کہ ہمارے ساتھ کیا ہونے والا ہے اور رابعہ کے ساتھ بھی کیا ہو سکتا ہے۔ ہم جنگی قیدی تھے اور افراد یا اقوام کے اخلاقی معاہدے یا جنیوا کنونشن کے اصول ہمیشہ کاغذی پیرہن رکھتے ہیں۔ ان پر حقیقی عمل درآمد وہ بھی نہیں کرتے جو حقوق انسانیت کے عالمی منشور بناتے ہیں۔ ہم جن لوگوں کے رحم و کرم پر تھے وہ ہمارے بارے میں ایسی بہت سی معلومات حاصل کر چکے تھے جو ہمارے خیال کے مطابق صرف ہم تک محدود تھیں لیکن ابھی ان کو اور بھی بہت کچھ پوچھنا تھا۔ پوچھ گچھ کے پرانے طریقے مجھ پر آزمائے جا چکے تھے اور رابعہ کے لیے بھی نئے نہ تھے۔ پہلے ایک وکیل کی حیثیت سے اس نے پولیس کے طریق کار کا مشاہدہ

کیا تھا اور بعد میں میرے ساتھ رہ کے وہ تشدد کا عملی مفہوم بھی سمجھ چکی تھی۔ مورس کوڈ کی ٹک ٹک کے بغیر زبانِ خاموشی میں محسن مجھ سے ہمکلام رہا۔

" یار... یہ تو بہت برا ہوا..."

" ہم نے اچھا چاہا ہی کب تھا... اچھائی برائی سب ہمارے اور ان کے اندازِ نظر کا فرق ہے۔"

" اب وہ رابعہ پر تشدد کریں گے۔"

" ہم ان کو نہیں روک سکتے... پھر یہ سوچنے سے کیا حاصل ... رابعہ کے ساتھ اس کا اور ہمارا خدا ہے۔"

اسی وقت کیتھرین نے شور مچانا شروع کیا۔" واٹ از دِس... چھوڑ دو مجھے... تم اس لڑکی کو کہاں لے گئے تھے... کیوں چلا رہی تھی وہ... دیکھو... اس کی جگہ مجھے مارنا چاہو تو مجھے اعتراض نہیں... مگر اس کو جانے دو... اس پر ظلم مت کرو۔"

بے وقوف عورت... کس سے سودا کرنا چاہتی ہے اور کیا مانگ رہی ہے۔ میں نے سوچا۔ پتھر کی دیواروں پر اثر ہو سکتا ہے لیکن ان کے کانوں پر نہیں۔ اس کی جگہ رابعہ ہوتی تو وہ بھی شور مچاتی کہ مجھے مار ڈالو مگر اس عورت کو کچھ مت کہو... اس کی لڑکی بہت بیمار ہے... وہ مر جائے گی۔

باہر سے کسی نے پھر باکس کو کھولنا شروع کیا۔ چند منٹ کے بعد مجھے منکر نکیر نظر آئے۔ ایک نے مجھے انگوٹھے سے باہر آنے کا سگنل دیا۔ میں جھک کر رکوع کی حالت میں باہر نکلا اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔ میں نے پھر انہی لوگوں کو دیکھا جو ولادر کے ساتھ آفس میں مشین گن لیے کھڑے تھے۔ میں نے محسن اور ٹیڈی کو بھی دیکھا جو اپنے اپنے پنجروں سے جانوروں کی طرح نکل آئے تھے اور اپنے احساسِ خودداری کو بلند رکھنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ آپس میں کوئی بات کیے بغیر ہم ان کے ساتھ چل پڑے۔ جتنی ضروری باتیں تھیں وہ ہم پہلے ہی کر چکے تھے۔ اب ان کے سامنے اپنی بے نیازی کا انداز برقرار رکھا جا سکتا تھا۔ ٹیڈی ڈربے میں شور مچا رہا تھا۔ اب خوفزدہ ہو کے خاموش ہو گیا تھا۔

اس بار ہمیں بیرک سے باہر لے جایا گیا اور تب میں نے دیکھا کہ وہ جگہ شاید وہ میں ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کیبلیکس کے اندر نہیں تھی۔ وہ تنہا بیرک صنعتی علاقے میں کھڑی تھی۔ اس کے گردونواح میں دوسری فیکٹریاں تھیں اور دور دور تک ایسی بہت سی عمارتیں اور کارخانوں کی چمنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ یہ کوٹ لکھپت کا علاقہ لگتا تھا۔ ہر کارخانے میں رات کی شفٹ میں کام نہیں ہو رہا تھا چنانچہ تاریکی میں ویرانی کا تاثر گہرا ہو گیا تھا۔ باہر ایک کار کھڑی ہوئی تھی اور دوسرا لائٹ ویٹ ٹرک تھا۔ ہم تینوں کو ٹرک میں سوار ہونے کا حکم دیا گیا اور آمنے سامنے لگی ہوئی دو بینچوں پہ ہم یوں بیٹھے کہ آخری حصے میں ہیں

مقابل محسن تھا۔ محسن کے ساتھ استاد ٹیڈی اور پھر وہ گوریلا جو مشین گن پر سے انگلی نہیں ہٹاتا تھا۔ دوسرا گن مین میرے ساتھ تھا اور اس کی مشین گن کا رُخ مخالف سمت میں محسن اور ٹیڈی کی طرف تھا۔ وہ دونوں شروع میں رہے جن کے بارے میں مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ جوڈو کراٹے کے ماہر ہیں۔ ہمارے بیٹھ جانے کے بعد بھی ٹرک نہ ہلا۔ پھر ایک وردی والا شخص نمودار ہوا جس کے ہاتھ میں تھرمس تھا۔ اس نے تھرمس میں سے کافی انڈیلی اور کپ میری طرف بڑھایا۔ "یہ پی لو۔"

"یکلخت تم لوگوں اتنے مہربان اور مہمان نواز ہو گئے ہو؟" میں نے کہا۔ "اس میں کیا راز ہے؟"

"پی لو ورنہ پچھتاؤ گے... لمبا سفر ہے۔" وہ بولا اور اس نے دوسرا مگ بھر کے محسن کو دیا۔ تیسرا ٹیڈی کو دینے کے بعد اس نے چوتھا اپنے لیے بھرا اور بولا۔ "تم کو شک ہے کہ اس میں زہر ہوگا۔ پھر وہ ہنسا۔" اگر تمھیں مارنا ہی مقصود ہوتا تو یہاں تک کیوں لاتے۔"

وہ باہر کھڑا رہا اور کافی کی چسکیاں لیتا رہا۔ اس نے کافی کے ساتھ دو گولیاں بھی نگل لیں اور ہم سے بھی پوچھا کہ کسی کو اسپرین کی ضرورت تو نہیں ہے۔ مجھے ضرورت تھی۔ میرے بعد محسن نے بھی مانگ لی۔ ہمارا شک اب دُور ہو چکا تھا۔ کافی کی مہک ویسے بھی بہت پُرکشش تھی۔ ہم نے مگ خالی کر دیے تو اسی شخص نے ہمیں سگریٹ دیے۔ وہ انہی لوگوں کا ساتھی تھا اور جو کچھ کر رہا تھا اپنی مرضی سے نہیں کر رہا تھا مگر وہ بداخلاق یا بدزبان نہیں تھا۔ سگریٹ کے پیکیٹ میں سے میں نے اپنے اور محسن کے لیے دو سگریٹ نکالے اور اس کو پیکیٹ واپس کرتے ہوئے ماچس طلب کی۔ اس نے ماچس دیتے ہوئے کہا کہ پیکیٹ رکھ لو۔

"تھینک یو۔" محسن بولا۔ "تم نے کوئی نیکی تو کی... کون ہو تم؟"

"میں حکم کا غلام ہوں۔" وہ ہنسا اور خالی مگ لے گیا۔

"اب چلنا ہے کہ نہیں؟" آگے سے کسی نے پوچھا اور ٹرک ڈرائیور نے انجن اسٹارٹ کیا۔ ایک دفعہ۔ دو دفعہ۔ تین دفعہ... میں نے اور محسن نے سگریٹ کے کش لیتے ہوئے ایک دوسرے کو مسکرا کر دیکھا۔

"یہ تو کچھ بھی نہیں استاد۔" محسن نے اچانک ٹیڈی سے کہا۔ "ابھی تم دیکھنا یہ کیا زبردست مہمان نوازی کا ثبوت دیتے ہیں۔ شاندار دعوت ہوگی... پلاؤ... قورمہ..."

"کیوں۔ سسرال جا رہے ہیں کیا تمھارے؟" ٹیڈی جل کے بولا۔

"اونہوں۔ جب کسی کی سزائے موت کے فیصلے پر عمل درآمد کا وقت آجائے تو اسے پسند اور خواہش کے مطابق کھانا دیا جاتا ہے۔" محسن بولا۔

"آخری طعام۔" میں نے تائید میں سر ہلایا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرا سر کچھ زیادہ ہل گیا تھا۔ میں نے بہت کم حرکت دی تھی لیکن سر ڈھلک کر کافی آگے آگیا تھا اور پھر اسے واپس اٹھانے کے لیے مجھے تھوڑا سا زور لگانا پڑا تھا۔ یہ بڑی عجیب کیفیت تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میری پرانی گردن پر بہت بڑا بوجھ رکھ دیا گیا تھا جسے سنبھالنا میرے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ میں نے محسن کی طرف دیکھا تو وہ سگریٹ کو گھور رہا تھا۔

"اس سگریٹ میں... کچھ تھا سکندر۔" وہ بولا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا تو میرا سر پھر ڈھلنے لگا... "کافی میں..."

"کافی تو اس نے بھی پی تھی۔" محسن بولا۔

"اُس نے دو گالیاں بھی... کھالی تھیں..." میں نے کہا۔ "اس پر اثر نہیں ہوا... وہ اسپرین نہیں ہوگی... اسپرین... اس نے صرف ہمیں دی۔" میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ ٹرک کا ڈرائیور آگے انجن کے ساتھ کچھ کر رہا تھا اور بڑبڑا رہا تھا لیکن میرا خیال تھا کہ وہ جانتے بوجھتے دیر کر رہا تھا۔ وہ لوگ نہیں چاہتے تھے کہ جس راستے سے ہمیں لے جایا جائے وہ ہم یاد رکھیں۔ ایک مقصد یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ہم شور کرنے کے قابل نہ رہیں۔ چند منٹ کے اندر اندر میں نے اس صورتِ حال کو قبول کر لیا۔ ٹیڈی سو گیا تھا اور محسن اونگھ رہا تھا۔ جب ٹرک اسٹارٹ ہوا تو میں ایک جھٹکے سے نیچے گر گیا۔

دوبارہ ہوش آنے پر میں نے خود کو ایک تہ خانے میں پایا۔ اس کی دیواروں کے بالکل اوپر والے حصے میں چھت کے قریب دو روشندان تھے جن میں سے آسمان دکھائی دیتا تھا۔ اس سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ہم زمین کی سطح سے کتنا نیچے ہیں۔ جیسے جیسے حواس بحال ہوئے، میں گرد و پیش کا جائزہ بہتر طور پر لینے کے قابل ہو گیا۔ یہ سیمنٹ کے پلاستر کے رنگ والا خاصا بڑا کمرہ تھا۔ تقریباً اٹھارہ فٹ لمبا اور پندرہ فٹ چوڑا۔ میں اس کے فرش پر لیٹا ہوا تھا۔ میرے قریب ہی محسن اور ٹیڈی پڑے تھے۔ کمرے کی چھت سے ایک بلب معلق تھا مگر اس کی روشنی کو دیواریں جذب کر رہی تھیں۔ اس کی صرف ایک ہی دیوار میں دروازہ تھا اور یہ دیوار ہم سے بہت دُور تھی۔ ہم اس دروازے تک پہنچ بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ ہم سب کا بایاں ہاتھ ایک زنجیر سے منسلک تھا اور زنجیر دیوار میں پیوست تھی۔ میں نے محسن کو آوازیں دیں۔ وہ ہوں... ہاں کر کے اور کروٹ لے کر پھر سو گیا۔ ٹیڈی پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

میں ابھی سوچ رہا تھا کہ آخر اس قید خانے میں منتقلی کا مقصد کیا ہے اور یہ لوگ ہم سے کیا چاہتے ہیں؟ شاید پہلا مقصد تو یہی ہوگا کہ جب تک ان کے منصوبے کے مطابق مال کی

...ب نہ نکل جائے ہمیں نکلنے ہی نہ دیا جائے۔ دکٹر فیملی کے ...ہیں ہونے والی میٹنگ میں جو کچھ طے ہوا تھا ہمیں معلوم ...یا تھا اور یہ بات وہ جان گئے تھے۔ اب یا تو وہ اپنا پروگرام ...تے جو زیادہ مشکل کام تھا۔ ایک سرے سے دوسرے سرے ...ان کے سارے ایجنٹ مال کو وصول کرنے اور آگے پہنچانے ...نظامات کر چکے ہوں گے۔ یہ سب انتظامات درہم برہم ہو ...تے اور سب کچھ نئے سرے سے کرنے میں تاخیر کا پہلو آجاتا۔ ...وں نے آسان یہی سمجھا کہ ہمیں روک لیا جائے۔

دروازہ کھلنے کی آواز پر میں چونکا۔ آہستہ آہستہ پولیس کی ...ردی میں ملبوس دو افراد میرے قریب آئے۔ ان میں سے ...ک کو میں پہچانتا تھا۔ وہ ایس پی سراج تھا۔ دوسرا کوئی نیا ...سپکٹر تھا۔ مجھے اب کوئی شک نہیں رہا کہ ہمارے ساتھ کیا ...لوک ہونے والا ہے۔ سراج میرے قریب آکے رُک گیا۔ پھر ...س نے مجھے بوٹ کی ٹھوکر ماری۔

"دیکھو اپنی حالت کو سکندرِ اعظم۔" وہ خباثت سے بولا۔ ...تم ایک چوہے سے زیادہ بے بس اور قابلِ رحم ہو۔ ایک بار ...میرے جال سے نکل گئے تھے اور جتنا عرصہ بچتے رہے یہ سمجھتے ...رہے کہ تم ناقابلِ تسخیر ہو۔ تقدیر تم کو ڈھیل دیتی گئی اور تم اسے ...اپنی تدبیر کا کمال سمجھتے رہے۔ یہ سمجھتے رہے کہ تم بہت ذہین اور بہت ...جرأت مند ہو۔ بیک وقت افلاطون بھی ہو اور ٹارزن بھی۔ تمھارے ...کارنامے سُن سُن کر میرا خون کھولتا تھا۔ اس خیال سے کہ یہ سب ...کچھ میری وجہ سے ہوا۔ اسے میری بے وقوفی کہہ لو یا کمزوری... ...کہ جب تم میری مٹھی میں تھے تو میں نے تم کو نکل جانے دیا۔ ...کاش مجھے علم ہوتا کہ تم بعد میں اتنا اچھلو گے۔ اتنا اتراؤ گے ...اور اتنی خرابی کا باعث بنو گے۔ اتنا نقصان کرو گے... تو اس ...رات ہی میں تمھاری لاش کے ٹکڑے شہر کے دس کوڑے خانوں ...میں پھنکوا دیتا... کون... پکڑ سکتا تھا مجھے... بہت ہوتا تو تھوڑی ...سی تحقیقات ہوتی اور بس... اتنی خرابی اس لیے پیدا ہوئی کہ میں ...نے تم کو قتل نہیں کیا تھا۔"

"مجھے قتل کرنا اس رات تمھارے اختیار کی بات تھی... بے ضمیر، غدار اور بے غیرت شیطان۔" میں نے کہا۔ "اور نہ آج ...ہے..."

وہ غصے سے پاگل ہو گیا اس نے چیخ کر مجھے ایک سے ...بڑھ کر غلیظ گالی دی اور اس کے ماتحت انسپکٹر نے اس کو نہ روکا ہوتا ...تو اسی پاگل پن میں وہ مجھے لاتوں سے مار مار کے ختم کر دیتا۔ "میں ...تیری زبان کاٹ لوں گا کتے کی اولاد... تیرا یہ سر توڑ کے وہ سب ...کچھ نکال لوں گا۔ تیری ہڈیاں کتوں کے سامنے ڈال دوں گا... ...تیرا دماغ سے ساری سرکشی... ساری خوش فہمی اور ساری مردانگی ...نکلوا لوں گا جیسے..." اس نے منہ سے مغلظات اگلتے ہوئے کہا۔

"سر... پلیز سر۔" ماتحت انسپکٹر نے اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کے ایک طرف کھینچ لیا۔ "یہ آپ کیا کر رہے ہیں... ہوش میں آئیں سر..."

"چھوڑ دو مجھے سندر..." وہ خود کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے چلّایا۔ "میں اس... کو بتاتا ہوں... اس کی تو..."

"نہیں سر! ہم اور آپ مشکل میں پڑ جائیں گے..." انسپکٹر نے کہا جو اپنے نام سے ہندو ہی لگتا تھا۔ ایک اور وطن فروش۔ اس مٹی سے اُگنے والی فصل سے پیٹ بھرنے والا۔ اس زمین کے اوپر کی ہوا سے وہ آکسیجن کھینچنے والا جو اس کے جسم کے ہر خلیے اور خون کے ہر قطرے تک پہنچتی تھی۔ اور اسی زمین کے آسمان سے دھوپ لینے والا۔ اس زمین پر بسنے والوں سے رشتوں کے سہارے پاکر زندگی کے مشکل مرحلوں سے گزرنے والا۔ میں نے نفرت اور حقارت سے ان دونوں کی طرف دیکھ کر سوچا اور تھوکا۔ میرے تھوک میں میرا لہو تھا جس کا نمکین ذائقہ مجھے اپنی زبان پر محسوس ہوتا تھا۔ اب یہ انسپکٹر سندر۔ احسان فراموش اور کمینہ۔ دشمن کا ففتھ کالم تھا۔ اندر سے دوستی کا فریب دینے والا اور دشمن کے ساتھ مل کر پیٹھ میں خنجر گھونپنے والا۔ اس ملک نے ان دونوں کو کیا نہیں دیا؟ بچپن سے جوانی تک زندہ رہنے کے لیے سازگار حالات... تعلیم... ترقی کے مواقع۔ ملازمت۔ قانون کے مقدس نام کی حفاظت کے لیے یہ وردی۔ یہ عہدہ۔ لوگوں کے جان و مال اور عزت آبرو کے تحفظ کی ذمے داری اور ان دونوں نے ان تمام مراعات کا کیا بدلہ دیا۔ ان احسانات کے بدلے میں اسی ملک کے ساتھ کیا کیا؟ ایک ہندو تھا اور اس کا جرم قانونی طور پر مسلمان کے جرم سے کم سنگین نہ تھا مگر مسلمان میری نظر میں زیادہ بڑا مجرم تھا جس نے خدا و رسولؐ کے ماننے والوں کے اعتماد کو دھوکا دیا۔ اس نے وہی کیا جو ایک کافر کر سکتا تھا لیکن مسلمانوں جیسا نام رکھ کر۔ ان کے ہم مذہب کی حیثیت سے وہ دُہرا مجرم تھا۔ اس کو اسلام کے نام پر حاصل ہونے والے ایک ملک کی حفاظت ایک مسلمان کی حیثیت سے بھی کرنا تھی اور ایک پولیس افسر کی حیثیت سے بھی۔

یہ سب خیالات میرے ذہن میں اس مختصر وقفے میں آئے جو میں نے ایس پی سراج کی وحشیانہ مار پیٹ کے بعد سنبھلنے میں صرف کیا۔ ٹھوکروں سے میری کھال متعدد مقامات پر سے پھٹ گئی تھی اور میری پسلیوں پر پڑنے والی ہر ضرب اتنی شدید تھی کہ میرے لیے سانس لینا بھی آسان نہ رہا تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے میری پسلیاں ٹوٹ کر اندر گھس گئی ہیں۔ میرا سر گھوم رہا تھا اور میرا اوپر والا ہونٹ کٹ گیا تھا۔ محسن اور ٹیڈی بھی میری طرح بے بس تھے۔ چنانچہ وہ مجھے عقل سے کام لینے کی تلقین کرنے کے سوا میرے لیے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ وہ براہِ راست

سراج کے عتاب کا نشانہ نہیں بنے تھے چنانچہ محفوظ رہے تھے۔

ٹیڈی نے کہا۔ "سکندر بادشاہ... چپ رہو... کیا فائدہ بولنے سے..."

محسن بولا۔ "یار! چھوڑ ایسی باتیں... ہم ابھی کچھ نہیں کرسکتے..."

انسپکٹر سندر نے بھی سراج کے غصے کی آگ کو دبا دیا تھا۔ سراج نے مجھے آستین سے خون صاف کرتے دیکھا۔ "تم آئندہ بھی کچھ نہیں کرسکو گے..."

"اور تو غلام ابنِ غلام۔" میں نے حقارت کے زہر سے بجھے لہجے میں کہا۔ "شیطان کے غلام۔ ہوسِ زر کے غلام۔ وطن دشمنوں کے غلام۔ تو خود کیا کرسکتا ہے؟ تجھ میں ہمت ہے، اپنے آقاؤں کی مرضی کے خلاف کچھ کرنے کی؟ کتا اپنی مرضی سے دُم تو ہلا سکتا ہے۔ تو اپنی مرضی سے سانس بھی نہیں لے سکتا۔ بدبخت ہے وہ ماں جس نے تجھے جنا۔ تیری ماں کے پیروں کے نیچے بھی جنت تھی۔ ہر ماں کے پیروں کے نیچے وہی جنت ملتی ہے۔ یہ وطن جو ہم سب کی جنت ہے۔ اس کی مٹی کو تو نے بیچ دیا تو ماں کے پیروں کے نیچے ملنے والی جنت کو بیچ دیا۔"

معلوم نہیں کیوں سراج کا اشتعال ذرا سی دیر کے لیے ایک کرب بن کے اس کے چہرے پر نمودار ہوا۔ اس کے اندر سے اذیت کی ایک لہر یوں اٹھی جیسے دل کے دورے کی پہلی جان لیوا، وجود کو کاٹ دینے والی، احساس کے زخموں میں کرچیاں بن کے پھیل جانے والی اور درد کی انتہا تک پہنچ کے ٹوٹ جانے والی تڑپ۔ پل بھر کے لیے ایس پی کے قالب میں دفن اور پولیس کی وردی کے کفن میں لپٹی ہوئی اس آدمی کی بے جان اور بے حس لاش میں حرکت پیدا ہوئی جو کسی ماں کا بیٹا تھا۔ یکلخت اس نے محسوس کیا کہ وہ خود اپنے لیے نہیں اپنی ماں کے لیے باعثِ رسوائی ہے اور اس کے چہرے پر انفعال کا سایہ اس طرح آیا اور گزر گیا جیسے پیاسے سوکھے، سپاٹ صحرا پر سے ابرِ رواں کا سایہ گزر جائے۔

لیکن اس ایک لمحے نے سراج کے آتش فشاں سے اُبلنے والے لاوے کو روک دیا۔ وہ انسپکٹر سندر سے مخاطب ہوا۔

"سندر داس... میں... باہر ہوں..." وہ پلٹ کے بولا۔ "تم کو اس سے جو پوچھنا ہے پوچھ لو۔" اور تیزی سے باہر نکل گیا۔
اس تماش بین کی طرح جس کو جوان بیٹے نے کسی طوائف کے کوٹھے کی سیڑھیاں اترتے دیکھ لیا ہو۔ دروازے تک جا کے وہ لوٹا اور اندر جھانک کر بولا۔ "میں ایک سگریٹ پی رہا ہوں۔ اندر میری طبیعت کچھ گھبرا رہی تھی۔" یہ بات کہتے ہوئے اس نے میری طرف نہیں دیکھا۔

"آپ فکر نہ کریں سر۔" سندر داس نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

"اگر سیدھی انگلیوں سے گھی نہ نکلے تو پھر مجھے بتا..." بولا اور دروازے سے غائب ہوگیا۔

میرا وار کارگر رہا تھا۔ میں نے اس کے ضمیر پر نشتر چلا دیا تھا۔ یہ ضمیر پہلے ایک ناسور ہوگا مگر اب سرطان کا آزار رکھنے والا تھا۔ ناقابلِ علاج اور قاتل۔ اس نے سب کو مار دیا تھا۔ اس سراج کو جو ایک بہادر ماں کا بیٹا تھا۔ وہ نیک دل ماں اس بیٹے پر فخر کرتی تھی اور اس کی راستی کی قائل تھی۔ اس کی فرض شناسی کی قائل تھی اور اس کی محبت کی قائل تھی۔ وہ آج کے اس ایس پی سراج کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھی جسے ہم جانتے تھے یا دلاور اور کرنل جگن ناتھ جیسے شکاری جانتے تھے۔ اگر اس ماں کو اپنے بیٹے کا یہ اصل چہرہ دیکھنا پڑتا تو وہ ایک آہ کر کے اس کا دل ٹوٹ جاتا۔ مگر دل شکستگی کا اگلا لمحہ اس کے لیے دکھ، ندامت اور احساسِ جرم سے نجات کا لمحہ بن جاتا۔ وہ ... جاتی اور شاید یومِ حشر اسے اپنا بیٹا بھی تسلیم نہ کرتی۔ ضمیر کے اس سرطان نے پولیس کے اس افسر کو مار دیا تھا جس نے ... کا آغاز کرتے ہوئے فرض کی ادائیگی کے لیے جان تک دینے کا حلف اُٹھایا ہوگا۔ ضمیر کے سرطان نے ایک آدمی کو مار دیا تھا جو برائی کو برائی سمجھتا ہے تو قبول نہیں کرتا۔ میں نے اس ضمیر کے سرطان میں زہر کا انجکشن گھونپ دیا تھا۔ وہ مجھ سے کیسے نظر ملا کے بات کرتا۔

"مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارے لیے کچھ نہیں کرسکتا۔" سندر داس کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ "غدار... پہلے تم نے کسی کے لیے کچھ کیا ہے۔ تم کو اس ملک کے رہنے والوں نے فراخدلی کا ثبوت دیتے ہوئے عزت سے جینے کا حق دیا تھا... یہاں تک کہ تم کو اسی وطن کے قانون کا رکھوالا بنانا تک منظور کرلیا تھا۔"

"فار گاڈ سیک! میری بات سنو۔" وہ آہستہ سے بولا۔ "ایسی باتوں میں وقت ضائع مت کرو۔ ٹھیک ہے میں ہندو ہوں۔ کافر ہوں اور ملحد ہوں۔ مگر میں غدار اور وطن فروش نہیں ہوں۔ تم مانو یا نہ مانو اس سے مجھے فرق نہیں پڑتا۔ سارا زمانہ میری وفاداری پر شک کرتا ہے کیونکہ میں ہندو ہوں۔ رام اور رحیم کا یہ فرق مذہبی عقائد کا فرق ہے۔ تم نماز پڑھتے ہو، میں پوجا کرتا ہوں۔ اس کا میرے فرض سے کیا تعلق۔ یہاں تو کرسچین بھی ہیں اور تم دیکھ لو، تمہارے ہم مذہب سراج جیسے بھی ہیں..."

میں نے اور محسن نے ایک دوسرے کی طرف بے یقینی سے دیکھا۔ پھر میں نے کہا۔ "یہ بھی انٹیلی جنس والوں کا حربہ ہے... ہمدرد بن کے جانا اور اعتماد حاصل کر کے..."

"... تک پہنچا دینا۔"

"تم پھر وقت ضائع کر رہے ہو۔" وہ پریشانی سے بولا۔ "وہ اندر آ جائے گا تو میں بات بھی نہیں کرسکوں گا۔ میں اس ... بحث نہیں کرسکتا۔ دلائل نہیں دے سکتا اور ثبوت نہیں ... کہ میں بھی اتنا ہی پاکستانی ہوں جتنے تم ہو۔ تم پڑھے لکھے، ... خیال آدمی ہو۔ محض اس لیے مجھ سے نفرت مت کرو کہ ... نام سندر داس ہے۔ ایک نہ ایک دن تم قائل ہو جاؤ گے ... میں غدار تھا اور نہ کسی غدار کا ساتھی۔ میں بڑی مشکل سے ... کے ساتھ یہاں تک پہنچا ہوں۔ اس کا اعتماد حاصل ... کے لیے مجھے بڑی محنت کرنا پڑی تھی۔ اب بھی وہ ... سو فیصد قابلِ اعتماد نہیں سمجھتا مگر وہ مجبور ہے۔ مجھے اس ... ساتھ ضامن رضوی صاحب نے رکھا ہے۔"

مجھے اب بھی اس پر یقین نہیں آیا۔ "تم ضامن رضوی کا ... استعمال کر رہے ہو۔"

"اوکے... میں بتا چکا ہوں کہ یقین کرنا نہ کرنا تمہارا کام ..." سندر داس کا موڈ آف ہوگیا۔ "تم کچھ بھی کہہ سکتے ہو یا فرض ... سکتے ہو لیکن میری ایک درخواست ہے کہ سراج کے سامنے ... گفتگو کا حوالہ بالکل مت دینا، ورنہ میرا کام خراب ہو جائے گا۔"

"کیا کام... کیا تم اور وہ ایک ہی کام نہیں کرتے؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ بظاہر ہمارا ایک ہی کام ہے۔" سندر داس بولا۔ "ہم ... پولیس میں ہیں اور ہمارے فرائض کی نوعیت مختلف نہیں۔ ... ایک بات تمہاری معلومات میں اضافے کے لیے۔ ایس پی ... کی نقل و حرکت پر نظر رکھی جا رہی ہے۔ اس کے خلاف ... گمنام شکایات موصول ہوئی تھیں۔ محکمہ جاتی قوانین و ضوابط ... مطابق گمنام خطوط پر ایکشن نہیں لیا جاتا لیکن اس کی بھی ایک ... ہے۔ جب کچھ شکایات مع ثبوت آئیں تو ایس ایس پی ... ضامن رضوی نے مجھے اس کے ساتھ پوسٹ کردیا۔"

"کیا وہ جانتا ہے کہ تم کو اس کی نگرانی پر مامور کیا گیا ہے؟"

"غالباً نہیں۔ میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔" سندر داس ... "وہ ہر وقت اور ہر جگہ مجھے ساتھ نہیں رکھتا۔ اس ... یہ بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ اسے شک ہوگیا ہے۔ یہ بھی ہو ... ہے کہ پولیس میں یہ بات دوسرے لوگ بھی جانتے ہوں۔ ... اس کا امکان کم ہے۔ کیونکہ تمام شکایات ذاتی طور پر ضامن ... صاحب کے نام ان کے گھر کے پتے پر ارسال کی گئی تھیں ... انہوں نے مجھے بتا دیا تھا کہ ان شکایات کا علم کسی کو بھی ... مگر اس امکان کو مسترد نہیں کیا جا سکتا کہ شکایت بھیجنے ... نے کسی دوسرے اعلیٰ پولیس افسر کو بھی خطوط لکھے ہوں۔ ... ایک ہی شخص ہے۔"

"اور اس کی شکایات کی نوعیت کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"مجھے نہیں معلوم۔" سندر داس نے سر ہلایا۔ "رضوی صاحب نے مجھے تفصیل سے آگاہ نہیں کیا۔ انھوں نے صرف یہ کہا کہ میں ایس پی سراج کے ساتھ ڈیوٹی دوں۔ اس کی کوئی بات مشکوک یا مشتبہ نظر آئے تو اس کی رپورٹ ذاتی طور پر صرف رضوی صاحب کو دوں اور کسی کو بھی معلوم نہ ہونے دوں کہ سراج کے خلاف شکایات ملی ہیں۔"

"پھر تم مجھے کیوں بتا رہے ہو؟" میں نے کہا۔

"انھوں نے تمہارا ذکر کیا تھا۔" وہ متذبذب لہجے میں بولا۔

"کس حوالے سے؟" میں نے کہا۔

"میں بتا نہیں سکتا۔" وہ بولا۔ "مگر جب میری پوسٹنگ کا پتا میرے ایک پرانے ساتھی کو چلا تو اس نے مجھ سے ملاقات کی اور کہا کہ میں تمہارا خاص طور پر خیال رکھوں۔"

میں اس پُراسرار انکشافات کرنے والے انسپکٹر سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا مگر مشکل وہی تھی کہ نہ اس کے لیے وقت تھا اور نہ یہ جگہ ایسی تھی کہ میں مفصل گفتگو کرسکتا۔ میں جرح کرنے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھا۔ وہ پولیس کی وردی میں ایک بااختیار افسر تھا اور میں ایک قیدی۔ معلوم نہیں ضامن رضوی صاحب نے اس سے میرے بارے میں کیا کہا تھا۔ صرف میرے بارے میں کہا تھا یا رابعہ، محسن اور شہلا کے بارے میں بھی کہا تھا۔ ان کے لیے ہم سب مجرم بھی تھے اور دوسرے رشتے سے ان کے مرحوم دوستوں کی نشانی بھی۔ وہ ایک پولیس افسر کی حیثیت سے ہم سب کو مجرم سمجھنے اور ہماری گرفتاری کے لیے ہر ممکن کوشش کرنے پر مجبور تھے لیکن یہ نہیں سمجھا جا سکتا تھا کہ وہ اس میں کوئی خوشی محسوس کرتے ہوں گے یا ان کے دل میں ہمارے لیے نیک اور ہمدردانہ جذبات نہیں رہے ہوں گے۔ ایک انسان کی حیثیت سے وہ یقیناً ہمارے لیے اداس ہوتے ہوں گے کہ ہم سے پہلا سا تعلق نہ رہا اور وقت نے ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ رکھنے کے بجائے ایک دوسرے کے مقابل لا کھڑا کیا۔ انسپکٹر سندر داس سے انھوں نے میرا ذکر کس طرح کیا تھا؟ کیا وہ جانتے تھے کہ میرا اور سراج کا آمنا سامنا ہوسکتا ہے؟ ہاں! یہ ان کو یقیناً معلوم ہوگا۔ پھر انھوں نے کیا کہا ہوگا؟ یہ کہ سکندر بخت یا محسن میں سے کوئی نظر آئے تو ان کی حفاظت کرنا؟ یا انھیں گرفتار کرلینا؟ نہیں... اگر وہ گرفتاری کی بات کہتے تو سندر داس مجھ سے بات ہی کیوں کرتا۔ مجھے گرفتار کرلیتا اور سیدھا رضوی صاحب کے سامنے لے جا کر پیش کر دیتا۔ پھر جو کچھ پوچھنا ہوتا وہ خود پوچھ لیتے۔ یا ان کو اطلاع کر دیتا کہ سکندر بخت اور اس کے ساتھی مل گئے ہیں۔ باقی سب ان پر چھوڑ دیتا کہ وہ گرفتاری کا بندوبست کرتے ہیں یا خود آتے ہیں۔ سندر داس نے دوستانہ رویہ رکھا تھا۔ یہ بڑی حوصلہ افزا بات تھی۔

لیکن اس تاثر کے فریب میں آنے کا انجام غلط بھی ہو سکتا تھا۔
" وہ کون دوست تھا تمھارا ؟" میں نے محسن کی آواز سنی۔
" جس نے ہمارا خاص خیال رکھنے کو کہا تھا۔"
" ہمارا ؟" سندرداس نے اُسے گھور کر دیکھا۔ "تم کون ہو؟ میں تم کو نہیں جانتا۔ کیا تم بھی اس کے ساتھ ہو ؟"
" نہیں۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "تم یہ سوال میری طرف سے سمجھو۔"
" مجھ سے اکرام شیخ نے کہا تھا۔" وہ بولا۔ " وہ پہلے پولیس میں سب انسپکٹر تھا۔ بڑا اچھا اور نیک نام افسر تھا مگر ایسے افسروں کا چلنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ وہ بھی استعفا دے گیا۔ اکرام شیخ نے بھی ایک ہی نام لیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ سکندر بخت کے بارے میں کچھ معلوم ہو تو فوراً مجھے بتانا۔ اس نے اور کچھ نہیں بتایا تھا۔"
" کیا تم اس کو اطلاع دے چکے ہو ؟" میں نے کہا۔
" ابھی تو نہیں۔ لیکن بتا دوں گا۔" سندرداس بولا۔
" کیا تم نے ایس پی سراج کے بارے میں کوئی رپورٹ بھیجی ہے؟"
" ہاں لیکن اس میں کوئی خاص بات نہیں۔" وہ مایوسی سے بولا۔ "خاص بات مجھے معلوم ہی نہیں ہوئی۔ میں ایک انسپکٹر ہوں اور وہ ایس پی ہے۔ میرے جیسے نہ جانے کتنے انسپکٹر اس کے ماتحت ہیں۔ وہ جسے چاہتا ہے ساتھ رکھتا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ ویسے تو ہم سب بارڈر ایریا کی نگرانی کرتے ہیں لیکن بارڈر بہت طویل ہے اور ہم سب ایک جگہ نہیں رہ سکتے۔ دن رات ڈیوٹی بدلتی ہے تو کوئی کسی طرف جاتا ہے کوئی کسی طرف۔ سراج کی مرضی ہوتی ہے کہ جسے چاہے اپنی جیپ میں ساتھ لے جائے۔ مجھے وہ کبھی نہیں لے جاتا بلکہ ہمیشہ اس کا اُلٹ ہوتا ہے۔ یعنی وہ مشرق کی طرف جاتا ہے تو میری ڈیوٹی مغرب میں ہوتی ہے۔ کئی میل دُور۔ وہ رات کو جاتا ہے تو میں دن میں بھیج دیا جاتا ہوں۔ اور وہ دن میں جائے تو میری ڈیوٹی رات کو لگ جاتی ہے۔"
" اچھا سندرداس! دیکھو تم کو ہم سے بہت مفید معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور تم سراج کی نقل و حرکت اور اس کی مشتبہ سرگرمیوں کے بارے میں ایس پی ضامن رضوی صاحب کو مستقل رپورٹیں بھیج سکتے ہو۔ ایسی رپورٹیں جو ناقابلِ یقین مگر درست ہوں گی۔ اور اگر تم اس مشن پر کوئی بہت بڑا کارنامہ سرانجام دینے میں کامیاب رہے تو تمھارا ڈی ایس پی بن جانا یقینی ہے۔ عین ممکن ہے تم کو خصوصی ترقی دے کر ایس پی بنا دیا جائے۔ ہم آج سب جانتے ہیں جو تم نہیں جانتے۔"
" ہم کون ؟" وہ محسن اور ٹیڈی کی طرف دیکھ کے بولا۔
" تم کو بعد میں معلوم ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔ "میرے کچھ ساتھی بھی ہیں جو میری وجہ سے مشکل میں گرفتار ہیں۔ ہم سب پر یہ آفت کیوں آئی، اس کا جواب بھی تمھاری رپورٹوں سے ملے گا لیکن یہ سب ہم اس وقت بتائیں گے جب ہمیں یقین ہو جائے گا کہ تم ڈراما نہیں کر رہے ہو۔"
" ڈراما ؟ کیسا ڈراما ؟" وہ حیران ہو کے بولا۔
" ہمارے ساتھ ہونے کا۔" میں نے کہا۔ "میں نہیں جانتا کہ تم سندرداس ہو۔ خدا بخش ہو یا پیٹر جون۔ میں آنکھ بند کر کے نہیں مان سکتا کہ تم پولیس انسپکٹر ہو اور یہ وردی اصلی ہے۔ ضامن رضوی اور اکرام شیخ کے حوالے تو سراج بھی دے سکتا ہے اور کچھ اس سے بھی بڑے شکاری۔"
" شکاری... تم کیسی عجیب باتیں کرتے ہو۔" سندرداس بولا۔
" ناراض ہونے کی بات نہیں۔" میں نے کہا۔ "سچ کبھی چھپا نہیں رہتا اور جھوٹ بھی ایک نہ ایک دن کھل جاتا ہے۔ جس دن مجھے یقین آ گیا کہ تم نے سب سچ کہا تھا اس وقت تم میرے دوست بن گئے۔ ابھی تم بھی شکاری ہو اور یہ بھی کہ میں بھی شکاری ہوں۔ ہم ایک ہی شکارگاہ میں ہیں۔ ایک دوسرے سے اوجھل مگر ایک دوسرے کے تعاقب میں سرگرداں۔ ہم ایک دوسرے کو شکار کرنے کے لیے جال بچھاتے پھر رہے ہیں اور دوسروں کے پھیلائے ہوئے جال سے بچنے کے لیے کوشاں ہیں۔ ابھی فیصلہ ہونا ہے کہ کون شکاری تھا اور کون شکار۔ اس کا فیصلہ وقت کرے گا یا تقدیر کرے گی۔"
" مختصر بات کرو... وہ آنے والا ہوگا۔" سندرداس نے بے چینی سے باہر کی طرف دیکھا اور پھر کلائی کی گھڑی کو۔
" میں تمھارا دوست بن کے تمھارے لیے بہت کچھ کر سکوں گا مگر یہ سب اس وقت ہوگا جب تم ثابت کر دو گے کہ تم میرے دشمن نہیں ہو۔ غداروں میں سے ایک نہیں ہو اور خود بھی شکاری نہیں ہو۔ ابھی تو مجھے تم سے صرف ایک بات کہنا تھی... تم میرے بارے میں کسی کو اطلاع نہیں دو گے۔ نہ اپنے ایس ایس پی کو... نہ اکرام شیخ کو... یہی پہلا ثبوت ہوگا۔"
سندرداس نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں ایسا نہیں کر سکتا... جب میں تم سے مل چکا تو یہ بات چھپی نہیں رہ سکتی... سراج جانتا ہے..."
" سراج کبھی ضامن رضوی کو نہیں بتائے گا کہ میں یہاں ہوں اور تم نے ضامن رضوی کو رپورٹ دی کہ سکندر بخت مل گیا ہے تو ان کے آنے سے پہلے ہی تمھاری رپورٹ غلط ہو جائے گی۔ خود تمھیں پتا نہیں ہوگا کہ میں کہاں ہوں تو تم ان کو کیا بتاؤ گے۔ تم دس جگہ مجھے دیکھو گے تب بھی کچھ نہیں ہوگا۔ تمھاری رپورٹ غلط ہوگی اور بالآخر تم ناقابلِ اعتبار ہو جاؤ گے۔" میں نے کہا۔
" اب جو بھی ہو۔" سندرداس بولا۔ "اکرام شیخ کو تو میں نے خط بھیج ہی دیا ہے۔ ایک آدمی لاہور جا رہا تھا۔ وہ ذاتی طور پر لے گیا۔"

افسوس سندرداس! تقدیر نے ہم دونوں سے ایک اچھا موقع چھین لیا۔" میں نے مایوسی سے کہا۔ "اب نہ تم کچھ کر سکو گے نہ ہم... اکرام شیخ یہ بات ایس ایس پی ضامن رضوی کو بتا دے گا اور..."
دروازے کو لات مار کے ایس پی سراج اندر آیا۔ "بہت مل گیا تم کو سندر... کچھ معلوم ہوا۔" وہ اب پہلے کی طرح خود تھا۔
" کچھ معلوم نہیں ہوا سر۔" سندرداس نے کہا۔ "اس کی تو ایک ہی رٹ ہے کہ مجھے نہیں معلوم۔"
" اور اس کے ساتھیوں سے پوچھا ؟" وہ میرے سر پر آ کھڑا ہوا۔ "اور کے بچّے بھی تیس مار خاں اور رُستم خاں ہیں۔ رستم خاں کے یہ ہیں سب۔" اُس نے حسبِ ضرورت گالیاں فٹ کر کے ہر جملے کو ہمارے لیے شایانِ شان بنایا۔
سندرداس نے افسوس زدہ اور شکایتی انداز میں میری طرف دیکھا۔ جس نے محسن کو اپنا ساتھی نہ بتا کے پہلا جھوٹ بولا تھا۔ اعتماد کی بنیادیں پختہ ہونے سے پہلے ہی ہلانے کا الزام وہ مجھے دے سکتا تھا۔ میں اسے نہیں کیونکہ ابھی تک مجھے اس کے کسی جھوٹ کے جھوٹ ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ملا تھا۔
" کسی سے کوئی کام کی بات معلوم نہیں ہوئی سر۔" سندرداس نے کہا۔
" تم کو صرف ایک بات پوچھنی تھی سندر۔" سراج نے اُن سے کہا اور مجھے معلوم تھا کہ تم نہیں پوچھ سکو گے۔ تم گپ شپ کر رہے تھے۔"
" جی ؟ یہ گپ شپ نہیں تھی۔" سندرداس چوکنا ہو گیا۔ سراج کے ذہن میں یہ شک پیدا ہونا ایک قدرتی امر تھا کہ کہیں وہ چھپ کر تو اس کی باتیں نہیں سنتا رہا تھا۔ اس نے اپنی بات بند نہیں ہونے دی تھی مگر ایسے مقامات پر کسی خفیہ مائکروفون کی موجودگی کے امکانات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔
" اور اتنی دیر تم کیا جھک مارتے رہے۔ تم ایک نالائق اور نکمّے شخص ہو۔" سراج نے برہم ہو کے کہا۔ "معلوم نہیں کس اُلّو نے تمھاری سفارش کی تھی کہ تمھیں..."
" میں پہلے بھی تردید کر چکا ہوں کہ میں کسی کی سفارش سے یہاں بھرتی نہیں ہوا تھا۔" سندر نے اس کی بات کاٹ دی۔ "آپ نالائق اور احمق سمجھتے ہیں تو یہ آپ کی رائے ہے سر۔ میں اس کی تردید نہیں کروں گا لیکن آپ جب بھی مجھے سفارشی کہیں گے تو میں تردید ضرور کروں گا۔ یہ میرے لیے زیادہ ناقابلِ برداشت گالی ہوگی۔ آپ تصدیق کر سکتے ہیں کہ میں میرٹ پر سلیکٹ ہوا تھا..."
" خاک میرٹ پر... تم اپنے اقلیتی کوٹے پر آئے ہو گے۔"
سراج کا چہرہ بگڑ گیا۔ "مجھے تمھاری یہ خودسری اور بحث کی عادت بالکل پسند نہیں ہے اور میں اسے ان ڈسپلن سمجھتا ہوں۔ تم کو مجھ سے اچھی رپورٹ لینا ہے تو خود کو اچھا ثابت کرنا ہوگا انسپکٹر..."
" یس سر! میں خوشامد کر کے آپ کو مجبور نہیں کروں گا کہ میرے بارے میں جھوٹی رپورٹ دیں۔" سندرداس نے مؤدّبانہ لہجے میں کہا مگر یہ سراج کی بات کے جواب میں ایک اور طنزیہ اور معنی خیز بیان تھا۔
" مجھے یہ بتاؤ کہ تم کیا پوچھتے رہے ؟" سراج نے جھنجلا کے کہا۔ "تم نے ابھی کہا تھا کہ کوئی کام کی بات معلوم نہیں ہوئی۔ اور کیا کام کی باتیں معلوم کرنا تھیں تم کو؟ میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ تم کو یہاں اکیلا چھوڑنا میری غلطی تھی اور تم بھروسے کے قابل نہیں ہو۔"
" یہ میری بدقسمتی ہے سر..." سندرداس نے جذبات سے عاری اور سپاٹ لہجے میں کہا۔ ان کے یہ اختلافات اور باہمی کشیدگی کو ظاہر کرنے والا رویّہ ثابت کرتا تھا کہ سندرداس نے کوئی غلط بیانی نہیں کی تھی مگر میرا فریب خوردہ ذہن اتنی جلدی اعتبار کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ مجھے ایک شک کی خلش اس وقت بھی ہوشیار کر رہی تھی کہ کہیں یہ گفتگو بھی ڈرامے کے ریہرسل کیے ہوئے ڈائیلاگ پر مشتمل نہ ہو۔ میں جانتا تھا کہ ولادر کتنا بڑا ڈراما آرٹسٹ ہے۔ اس کی پوری شخصیت ایک ڈراما تھی۔ وہ خود بہترین اداکار تھا اور کسی بھی صورتِ حال کو ناقابلِ یقین حد تک ڈرامائی بنا سکتا تھا۔ پھر اس ڈرامائی صورتِ حال کو حقیقت میں ڈھال سکتا تھا اور اپنے فائدے کے لیے استعمال کر سکتا تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ سراج اور انسپکٹر سندرداس کو خود اسی نے یہ ڈائیلاگ رٹائے ہوں تاکہ سراج اور انسپکٹر سندرداس کی چپقلش کھل کر سامنے آ جائے اور میں انسپکٹر سندرداس پر یقین کرتے ہوئے اسے رازداری کا اہل سمجھ لوں۔ میرا ذہن شک کی بیماری میں مبتلا تھا تو اس کے اسباب تھے۔ میں بقول مرزا غالب "ڈرتا ہوں آدمی سے کہ مردم گزیدہ ہوں" اس بیماری سے شفا میں چاہتا بھی نہیں تھا۔ ہر بات پر شک کرنے سے میری احتیاط پسندی کی عادت راسخ ہوتی جا رہی تھی۔ ہر بات کو سُن کر اور ہر چہرے کو دیکھ کر اعتبار کر لینے کی عادت مجھے نقصان پہنچا سکتی تھی۔ چنانچہ میں نے سراج کی اور سندرداس کی رنجش آمیز گفتگو سے کچھ غلط امیدیں وابستہ کرنے سے گریز کیا۔
سراج کی ایک اور لات پڑی تو میں بے اختیار چلایا کیونکہ ضرب میرے پیٹ میں آئی تھی۔ میں وہیں پیٹ پکڑ کے لوٹنے لگا۔ مجھے ایسا لگتا تھا کہ میرے جگر یا گردے اس چوٹ سے متاثر ہوئے ہیں۔ سراج نے میرے ایک اور لات ماری۔ "مر جاؤ

... کل کے مرتے آج مر جاؤ۔" وہ گالی دے کر بولا۔" میری جوتی کو بھی پروا نہیں۔"

" سر... پلیز خیال رکھیں..." سندر بولا۔

" شٹ اپ۔" سراج نے دہاڑ کر کہا۔" تنگ آ چکا ہوں میں تم سے... تم خود کو کیا سمجھتے ہو آخر... میرے افسر ہو تم یا میرے باپ ہو؟ خبردار جو آئندہ مجھے ٹوکا..."

" میں آپ کی بھلائی کے لیے..."

" نہیں چاہیے مجھے تمھاری بھلائی۔" سراج نے اسی لہجے میں کہا۔" اپنی بھلائی کو اپنے پاس رکھو... اور یہ کبھی مت بھولو کہ میں تم سے بہت بڑا افسر ہوں۔ میں تم کو خوش رکھنے کا پابند نہیں ہوں... میری نوکری... میرا مستقبل تمھارے ہاتھ میں نہیں ہے... لیکن میں تمھارا بیڑا غرق کر سکتا ہوں۔ میری رپورٹ تمھارے کیریئر کو تباہ کر دے گی۔ نوکری کے... روٹی کے اور زندگی کے لالے پڑ جائیں گے تم کو۔"

" آپ مجھے لکھ کر حکم دیں کہ میں سروس کے قابل نہیں تو میں ابھی اپنا استعفا لکھ کر آپ کو دے دوں گا۔" سندر داس نے سرکشی سے کہا۔" لیکن آپ سمجھتے ہیں کہ آپ مجھے نوکری سے نکلوا دیں گے تو یہ آپ کی بھول ہے سر... مجھے بھی بچانے والے ہیں... میں آپ کا ذاتی ملازم نہیں ہوں اور یہ وردی وہ نہیں ہے جیسی آپ نے اپنے شوفر کو بنوا کے دی ہوگی۔ یہ سرکاری وردی ہے سر... آپ دیکھیں گے کہ میری نوکری رہے گی۔ مجھے کھانے کو روٹی بھی ملتی رہے گی۔ اور موت سے پہلے میری زندگی کی حفاظت بھگوان کریں گے۔"

سراج غصے سے لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ شاید اس کے کسی ماتحت نے کبھی یوں کھل کر اس سے بات نہ کی ہوگی۔ عین ممکن تھا کہ وہ پھر ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتا لیکن نہ جانے اس نے سندر داس کی آنکھوں میں کیا دیکھا کہ وہ ایک قدم آگے بڑھا اور رک گیا۔ کچھ دیر اپنے ہونٹ کاٹتا رہا اور اسے خون آشام نظروں سے گھورتا رہا۔ پھر وہ میری طرف پلٹ گیا۔

" سکندرِ اعظم کے نطفے... میں صرف ایک بار پوچھوں گا اس کے بعد بھی جواب نہ ملا تو میں دوسرے طریقے اختیار کروں گا جن سے تم اچھی طرح واقف ہو۔" وہ طنزیہ اور تلخ لہجے میں بولا۔ " سیدھی طرح بتا دو کہ نازو کہاں ہے؟"

" میری آخری اطلاعات کے مطابق نازو اپنے گھر میں تھی۔" میں نے کہا۔

" اس کے بعد کہاں گئی؟"... نے مجھے گھما کے لات ماری...

میں لڑھک گیا۔" ایس ایس پی ضامن رضوی صاحب نے کہا تھا کہ نازو کو گھر بھیج دیا جائے تو شہلا کو وہ اپنے گھر لے جائیں گے۔ اور ان کا پیغام ملنے کے بعد ہم نے ایسا ہی کیا تھا۔ شہلا کو پولیس اسٹیشن سے اپنے گھر لے گئے تھے اور ہم نے نازو کے گھر سے پوچھا تھا تو معلوم ہوا تھا کہ وہ گھر پہنچ چکی ہے۔"

" اتنی دیر سے تم یہی کہے جا رہے ہو۔" سندر نے اچانک ... دیا۔" ارے بھائی! یہ سب تو ہمیں پہلے سے معلوم ہے... کہ بعد میں وہ کہاں گئی ہے؟"

" مجھے نہیں معلوم۔" میں نے اس انکشاف پر بھی ... حیرت کو چھپا لیا۔

" پھر وہی ' مجھے نہیں معلوم '۔" سندر نے آگے بڑھ کر ... گلا دبوچ لیا اور میرے منہ پر کئی زوردار تھپڑ رسید کیے۔" تم کو سب معلوم ہے۔ تمھاری ہدایت پر وہ واپس گئی تھی مگر تم نے اس کو سمجھا دیا تھا کہ جب شہلا کو ایس ایس پی صاحب ... تو تم گھر سے مار پیٹ کر کے نکل آنا۔ کہاں بلایا تھا تم نے اُسے؟"

سندر داس نے مجھے بہت کچھ بتا دیا تھا۔ جو ہم میں سے کسی کے علم میں نہیں تھا۔ نازو کا پھر نکل جانا اس کی فطرت کے تقاضوں سے ہم آہنگ تھا۔ وہ قید میں رہنے والی لڑکی تھی ہی نہیں۔ ماں باپ اور بھائی اُسے زنجیروں سے باندھ کر رکھنے کی بات کر سکتے تھے۔ اور شاید وقتی طور پر اسے باندھ بھی سکتے تھے لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔ اسے ہمیشہ بند کمروں میں اور مقفل دروازوں کے پیچھے نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ جس لڑکی کو رشتوں کا پروا ہی نہ ہو اس کی راہ میں کون حائل ہو سکتا ہے۔ یہ بات تو مجھے پہلے ہی سمجھ لینا چاہیے تھی کہ وہ جتنی آسانی سے جانے کے لیے تیار ہو گئی تھی، اتنی ہی آسانی سے وہ واپس آنے کا فیصلہ بھی کر چکی ہو گی۔ اس کا مقصد شہلا کو تحفظ فراہم کرنا تھا۔ اس نے ایس ایس پی صاحب کی عائد کردہ شرط قبول کر لی تھی اور ایک بار شرط پوری بھی کر دی تھی۔ اس نے یہ شرط قبول نہیں کی تھی کہ اس کے بعد وہ تمام عمر گھر سے نہیں نکلے گی۔ نہ رضوی صاحب نے یہ ضمانت طلب کی تھی کہ بعد میں بھی نازو کو گھر میں ہی رہنا ہوگا ورنہ جس دن وہ دوبارہ نکلی اسی دن شہلا کو پھر پولیس کی تحویل میں دے دیا جائے گا۔ میں جانتا تھا کہ وہ ایسا نہیں کر سکتے... شہلا کو پولیس کے پاس کبھی نہ چھوڑتے۔ خواہ نازو واپس جاتی یا نہ جاتی۔ سوال یہ تھا کہ نازو والدین کے گھر سے کب نکلی اور نکل کے کدھر گئی؟

" بولو... تم نے اس سے کہاں آنے کو کہا تھا؟" سندر نے میری گردن کو جھنجوڑا۔

" میں نے اُسے کہیں بھی آنے کو نہیں کہا تھا۔" میں نے کراہ کے کہا۔" وہ آتی تو وہیں آتی جہاں سے ہمیں پکڑا گیا تھا۔"

" تمھارا ایک اور ساتھی بھی تھا، صحافی مرزا غالب۔" سندر نے میری گردن چھوڑ دی۔" وہ کہاں ہے؟"

" وہ اپنے گھر میں مر گیا تھا۔" میں نے ... کسی کی ... گھٹنے ...

" یہ جھوٹ ہے۔" سراج نے میرے سر پر مکا مارا۔" وہ اندر نہیں تھا۔ وہ اندر ہوتا تو جل کے مر جاتا اور ہمیں اس کی جلی ہوئی لاش ملتی۔ یا وہ جان بچانے کے لیے باہر نکلتا تو ہمارے ہاتھ لگتا..."

" پھر وہ غائب ہو گیا ہو گا... بھوت بن کے۔" میں نے سخت تکلیف کے باوجود کہا۔ میرے لیے یہ بہت بڑی خوشخبری تھی کہ غالب نہ صرف یہ کہ بچ گیا تھا بلکہ وہ کسی کے ہاتھ بھی نہیں آیا تھا۔ ہم سب کے لیے یہ بھی ایک خبر تھی کہ بعد میں اس کوٹھی کو آگ لگا دی گئی تھی۔ وہ غالب کے باپ کا گھر تھا۔ جو غالب کی وجہ سے جل کے خاک ہوا۔ اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے۔

" مجھے معلوم تھا کہ یہ حرامزادہ آسانی سے نہیں بتائے گا..." سراج اُٹھ کھڑا ہوا۔

" تم کو بتانا تو پڑے گا۔" سندر نے کہا۔" اچھا ہوتا اگر تم ہمیں بتا دیتے اور زیادہ سختی سے بچ جاتے۔"

" کیا تم کو معلوم ہے سکندر کہ اس وقت رابعہ اور وہ عورت جو اپنا نام کیتھرین بتاتی ہے۔" سراج بولا۔" کہاں ہیں؟"

" وہ ایسے ہی خصوصی رہائشی انتظامات اور تم لوگوں کی مہمان نوازی سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہی ہوں گی۔" میں نے کہا۔

" نہیں... اس وقت وہ آرام سے ہیں۔" سراج نے کہا۔" ان دونوں کو ایک بیڈ دے دیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ باتھ بھی ہے۔ انھیں کھانا بھی اچھا دیا گیا تھا لیکن انھوں نے کھایا نہیں... خیر... کب تک نہیں کھائیں گی۔ جب ہم ان کو تمھارے متعلق بتائیں گے کہ تم بہت آرام سے ہو۔ تو وہ کھا لیں گی۔ مگر اس کے بعد وہ آرام سے نہیں رہیں گی۔" وہ کمینگی سے ہنسا۔" یہ سب کچھ باری باری ہو گا۔ ابھی تم آرام سے نہیں ہو۔ اور آج یا کل رات وہ اپنی آنکھوں سے تفتیش ہوتے دیکھیں گی ——— جیسے آپریشن تھیٹر کے باہر سے کوئی اپنے کسی عزیز کا انتہائی جان لیوا اور تکلیف دہ آپریشن ہوتا دیکھے۔ تم سمجھ سکتے ہو کہ کوئی ماں اپنے بیٹے یا بہن اپنے بھائی کے جسم پر نشتر چلتے... اس کا خون بہتے اور اس کے کھلے پیٹ سینے یا سر کو نہیں دیکھ سکتی اور جہاں معاملہ محبوب کا ہو..." اس نے ایک شیطانی قہقہہ مارا۔" تو بھلا کون لڑکی اپنے محبوب کی اذیت برداشت کر سکتی ہے۔ فرض کرو کہ تم الٹے لٹکے ہوئے ہو۔ لہولہان ہو اور تڑپ رہے ہو... بالکل بے لباس۔"

... نے مضبوط لہجے میں کہا۔" میں تو خیر ایسی باتوں سے ڈرنے والا نہیں ہوں مگر تم دیکھو گے کہ رابعہ تمھاری توقع سے زیادہ قوتِ برداشت رکھتی ہے... تمھیں مایوسی ہوگی۔"

" چلو پھر کیا ہو گا۔" سراج بولا۔" یہ تو پہلا مرحلہ ہو گا مگر اس کے بعد بساط الٹ جائے گی... نہیں... شاید میں غلط محاورہ استعمال کر گیا۔"

" محاورہ غلط نہیں تھا۔ تمھارے منہ سے سچ نکل گیا۔" میں نے کہا۔" خدا نے چاہا تو واقعی بساط الٹ جائے گی۔"

" یہ لفظوں کا ہیر پھیر ہے۔" سراج بولا۔" اصل بات یہ ہے کہ اس کے بعد نقشہ بدل جائے گا۔ جو تماشا تھے وہ تماشائی ہوں گے۔ اور جو تماشائی تھے وہ تماشا ہوں گے۔ تمھاری قوتِ برداشت کتنی ہے؟"

" تم کو اندازہ ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔

" مجھے تو ہے... تم کو پہلی بار ہو گا۔" وہ بولا۔" میں نے تمھاری پاکستان تشریف آوری پر تمھارا خیر مقدم کیا تھا۔ اس رات تمھاری قوتِ برداشت دیکھ لی تھی میں نے۔ یہ مسئلہ ذرا زیادہ ہی سنگین ہے۔ کیا تم اپنی جگہ رابعہ کو تصور کر سکتے ہو۔ اسی حالت میں جیسا کہ میں نے بیان کیا تھا۔ سر کے بل معلق۔ اس طرح تم نے پہلے کبھی اسے نہ دیکھا ہو گا۔ جیسے وہاں ہم سب دیکھیں گے اور یہ تو کہنے کی بات ہی نہیں کہ جتنا ایک مرد کے ساتھ ہو سکتا ہے اس کا دس گنا ایک عورت کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ مرد کے مقابلے میں عورت کا جسم... ایک خوب صورت جوان عورت کا نازک جسم، اذیت میں کس طرح رقص کرتا ہے۔ کیسے بل کھا کے تڑپتا ہے اور کتنے دلچسپ تجربات کی آماجگاہ بنتا ہے، اس پر تم غور کرو تو تمھیں نازو اور مرزا غالب کے بارے میں بتا دینا بہت آسان لگے گا۔"

وہ حرامزادہ میرے جذبات پر گندے الفاظ کے گھناؤنے نشتر چلا رہا تھا۔ وہ مجھے زیادہ سے زیادہ ذہنی اذیت دے کر میرے اعصاب کو شکست دینا چاہتا تھا لیکن میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اس دباؤ کو برداشت کروں گا۔ وہ بولتا رہا۔ اس نے بے شرمی اور بے حیائی کی انتہا کر دی۔ وہ حد درجہ فحش زبان میں بتاتا رہا کہ رابعہ کے ساتھ کیا ہو گا۔ محسن کی حالت بھی غیر تھی اور ان باتوں پر اس نے بھی کسی ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا تو یہ اس کی ہوشمندی تھی۔ اس شیطان کو جواب میں گالیاں دینا یا اس پر چیخنا چلانا بے سود تھا۔ ٹیڈی نسبتاً کم ہمت آدمی تھا۔ اس نے سراج کو برابر کی گالیاں دیں۔ اس کی ماں اور بہن کو بیچ میں گھسیٹ لایا اور ہمارے منع کرنے کے باوجود چلاتا رہا کہ ان کے ساتھ بھی ایسا ہی نہ ہوا تو یہ کر دوں گا اور وہ کر دوں گا۔ سراج کے لیے اس کا یہ ردِ عمل کچھ تسکین کا باعث بنا کیونکہ ہم نے اسے مایوس کیا تھا۔ وہ زیادہ مزے لے کر گندی شیطانی باتیں کرتا رہا۔

رہا کہ شہلا اس کے ہاتھ نہ لگی ورنہ زیادہ مزہ آتا۔ ایک ٹکٹ میں دو مزے۔ ایک ہی جگہ ڈبل پروگرام چلتا۔ جس کا جدھر دل چاہے دیکھے۔

بالآخر وہ دفع ہوا اور ہم سب کچھ دیر زمین پر سر رکھے پڑے رہے۔ اگر ہمیں سو سو دُرّے مارے جاتے تو وہ ہماری حالت نہ ہوتی جو اس کی باتوں سے ہوئی تھی۔ بے حیائی کی یہ باتیں ہم نے سُن تو لی تھیں مگر اب ہم میں اتنی ہمت نہ تھی کہ ایک دوسرے سے نظر ملا سکیں۔ ہم سب شرم سے پانی پانی ہو رہے تھے۔ سب ایک ہی بات سوچ رہے تھے اور ڈر رہے تھے۔ اگر سچ مچ ایسا ہوا تو کیا ہو گا۔ اور خود کو سمجھا رہے تھے کہ ایسا نہیں ہو گا۔ ٹیڈی رو رہا تھا۔ اس کا نروس بریک ڈاؤن ہو چکا تھا۔ گالیاں دینے اور چیخنے چلانے کے بعد وہ اپنی بے بسی کے احساس سے مار کھا گیا تھا۔ حقیقت نے اپنا وجود تسلیم کرا لیا تھا کہ جو سب کچھ کر سکتے ہیں وہ آج آزاد ہیں اور طاقتور ہیں اور ہم صرف امید کا سہارا لے سکتے ہیں۔ خود کو فریب دینے کے لیے اور ناقابلِ تصور حالات کا حقیقی روپ دیکھنے کا حوصلہ پیدا کرنے کے لیے... دنیا میں ناممکن کچھ بھی نہیں۔ وہ بھی ہو سکتا ہے جو سراج نے کہا تھا۔

"استاد..." بالآخر میں نے سر اٹھا کے کہا۔ "تم تو بہت بزدل نکلے یار۔"

"قسم مولا علی کی سکندر بادشاہ۔" وہ روتے روتے بولا۔ "اس کُتّے کی زبان تک میرے ہاتھ نہیں پہنچ سکتے تھے۔ ورنہ میں اس کا حلق تک چیر کے رکھ دیتا۔ میں تو اتنا مجبور تھا کہ خود اپنے کان نہیں بند کر سکتا تھا۔ جن میں وہ حرامزادہ اتنی گندگی ڈال گیا۔"

"گندے الفاظ جس مُنہ سے نکلتے ہیں وہ مُنہ گندا ہوتا ہے یہ بات تو مجھے بچپن میں بتائی گئی تھی۔" میں نے کہا۔ "سُننے والے پر گندگی نہیں آتی۔"

"کیا واقعی نازو پھر اپنے گھر سے نکل گئی؟" محسن اچانک بولا۔

"وہ کچھ بھی کر سکتی ہے۔" میں نے کہا۔ "اور جب وہ گئی تھی تو... تجھے یاد ہے، وہ فوراً چل پڑی تھی... اس نے کسی قسم کے تذبذب کا اظہار نہیں کیا تھا... بالکل سوچا نہیں تھا۔"

"ہاں... غالباً وہ طے کر چکی تھی کہ اسے کیا کرنا ہے۔" محسن بولا۔ "اسے جانا تھا اور جانے کی شرط پوری کرتے ہی پھر آ جانا تھا۔"

"لیکن وہ آئی بھی نہیں۔" میں نے کہا۔

"یہ میرے لیے بھی پریشانی کی بات ہے۔" محسن بولا۔ "اسے تو معلوم تھا کہ ہم وہیں ہیں۔ وہ کسی اور جگہ نہیں جا سکتی تھی۔"

"پھر کیا ہوا آخر؟"

میں نے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا۔ "ہونے کو کیا نہیں ہو سکتا... حادثہ..."

"اونہوں۔ حادثہ پیش آتا تو بالآخر اس کے والدین کو جا... کو اور انکل رضوی کو خبر مل جاتی۔ ان کو بھی معلوم ہو جاتا۔" محسن بولا۔ "ان لوگوں نے پہلے سارے اسپتال چھان مارے ہوں گے میرا مطلب ہے نازو کو تلاش کرنے والوں نے۔"

"کیا یہ سندر داس... واقعی اکرام شیخ کا دوست ہو گا؟"

"ہو بھی سکتا ہے۔ ابھی تک میں طے نہیں کر سکا کہ وہ کس حد تک سچ بول رہا تھا۔" محسن نے کہا۔ "میرا دماغ ستر فیصد ووٹ اس کے حق میں دیتا ہے تو دل تیس فیصد خلاف بھی ہے۔"

"غالباً یہی تناسب میرا ہے۔" میں نے کہا۔ "سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا انکل رضوی نے اسے صرف میرے بارے میں بتایا؟ تیرے اور شہلا کے بارے میں کچھ نہیں کہا؟"

"یہ ہے ذرا عجیب سی بات۔" محسن بولا۔ "کہ وہ مجھے اور ٹیڈی کو نہیں پہچان سکا۔"

"حالانکہ اس نے غالب اور نازو کی بات کی تھی۔" میں نے کہا۔ "اُس کو یہ نام معلوم تھے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ باقی سب کے نام وہ نہ جانتا ہو۔"

"میرا خیال ہے کہ وہ صرف نام جانتا ہے۔ پہچانتا کسی کو نہیں۔" محسن بولا۔

"یہ ٹھیک ہے۔ سراج تو اُسے دُور دُور رکھتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ وہ اس کی راہ میں کہیں حائل نہ ہو۔" میں نے کہا۔

"پھر وہ اس کو تفتیش کے لیے اپنے ساتھ کیوں لایا؟" محسن نے ایک منطقی سوال کیا۔ "وہ اپنے کسی قابلِ اعتماد انسپکٹر کو بھی تو لا سکتا تھا۔ جس سے افشائے راز کا بالکل ڈر نہ ہوتا۔"

"اس کی باتوں نے مجھے بڑی الجھن میں ڈال دیا ہے۔" میں نے کہا۔ "آخر انکل رضوی نے میرے بارے میں اس سے کیا بات کی تھی؟ میری باتیں بتائی ہوں گی کہ یہ سکندر ایک مفرور مجرم ہے اور بہت خطرناک ہے۔ اگر تم کو نظر آئے تو فوراً گرفتار کر لینا یا گولی مار دینا۔ اور اگر کچھ نہ کر سکو تو مجھے اطلاع دینا۔ میں سارا انتظام کر دوں گا... نہیں محسن! انھوں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ انھوں نے کہا ہے کہ تم سکندر بخت کی حفاظت کرو گے کیونکہ وہ سراج کے ہاتھ پڑ سکتا ہے۔ سندر داس کو سراج کے خلاف شکایت کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔ حقیقت کیا ہے یہ تو انکل رضوی بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ سندر داس کو ثبوت حاصل کرنے ہیں تاکہ وہ سراج پر ہاتھ ڈال سکے۔ غالباً انہی شکایات کے باعث انکل رضوی کو معلوم ہوا ہو گا کہ ہم کس چکر میں ہیں اور کس کے خلاف لڑ رہے ہیں، جو بات ہم نے ان کو نہیں بتائی تھی وہ کسی نے انھیں خطوط میں بتا دی۔ کچھ باتیں انھیں پہلے سے معلوم تھیں، انکل رضوی نے دو اور دو کو جوڑ کر جواب نکالا تو چار آیا۔ غالباً اب وہ ہمارے مشن کو سمجھتے ہیں اور اس مشن کو راز رکھنا چاہتے ہیں۔ خود کو ملوث کیے بغیر بالواسطہ طور پر وہ ہماری حفاظت کے انتظامات بھی کر رہے ہیں۔"

"اگر ایسا ہے تو بڑی خوشی کی بات ہے کہ وہ ہمارے دشمن نہیں رہے۔" محسن بولا۔ "جب وہ شہلا کو لے گئے تھے تو مجھے شک ہوا تھا کہ یہ مہربانی بے سبب نہیں۔"

"وہ بے حد ذہین آدمی ہیں۔ انھوں نے تسلیم کر لیا ہو گا کہ قانون کے دائرے میں رہ کے کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ ہم مجبور تھے یہ راستہ اختیار کرنے پر۔ قانون کی تمام قوت ان کے ہاتھ میں تھی۔ انھوں نے ولاور اینڈ کمپنی کا کیا بگاڑ لیا؟ آج تک ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس پر چھاپا تو مار نہیں سکے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ولاور اینڈ کمپنی سے تصادم کا کوئی فائدہ نہیں۔ اُلٹا ہو گا یہ کہ یہ سب لوگ جن کے ہاتھ بہت لمبے اور خزانے بہت بھرے ہوئے ہیں، انکل کو اپنے راستے سے ہٹا دیں گے۔ ان کی پوسٹنگ کسی دوسرے شہر میں کرا دیں گے۔ اتنی دور جہاں بیٹھ کے وہ کچھ نہ کر سکیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انھیں ترقی دے کر ہیڈ آفس میں بٹھا دیا جائے۔ انتظامی امور کی دیکھ بھال کے لیے۔ جو اختیارات ایک شہر کا ایس ایس پی رکھتا ہے وہ ہیڈ کوارٹر کا ڈپٹی آئی جی بھی نہیں رکھتا۔ پھر وہ ہمیں تحفظ فراہم کر سکتے تھے اور نہ ہماری مدد کے لیے کسی سندر داس کو بھیج سکتے تھے۔"

"تیرا خیال دل کو لگتا ہے۔" محسن بولا۔ "انکل رضوی کو اب حقیقی صورتِ حال کا پتا چل گیا ہے۔ انھوں نے ہمارے سارے چھوٹے موٹے جرائم کو اسی لیے نظر انداز کر دیا ہو گا کہ یہ سب کچھ ہم نے شوقیہ نہیں کیا تھا بلکہ ایک مقصد کے حصول کی خاطر کیا تھا۔ وہ مقصد بہت بڑا ہے اور دشمن سے جنگ کی حیثیت رکھتا ہے۔ میدانِ جنگ میں سپاہی اپنی بندوق کا بے دریغ استعمال کرتا ہے۔ دشمنوں کا قتلِ عام کرتا ہے مگر اسے پھر بھی جہاد کہا جاتا ہے۔ وہ ایک پوری بٹالین کا صفایا کر دے، دشمنوں کا ایک مورچا اڑا دے یا پھر کسی بستی کو تباہ کر دے جہاں دشمن کا اسلحہ خانہ ہو۔ تو اس سے باز پرس نہیں ہوتی۔ اسے تمغہ ملتا ہے۔ یہ بہادری اور جرأت کے کارنامے کہلاتے ہیں۔ انکل رضوی نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے کہ ہم ایک بہت خطرناک دشمن کے خلاف جنگ لڑ رہے ہیں۔ اور یہ ایسا دشمن ہے جس سے وہ نہیں لڑ سکتے، فوج نہیں لڑ سکتی۔ پولیس نہیں لڑ سکتی اور عوام نہیں لڑ سکتے۔ یہ سب کی نظروں سے دور پسِ پردہ لڑی جانے والی جنگ ہے۔ اگر انھوں نے ہمارے بارے میں ملنے والی ساری خبروں پر غور کیا ہو گا تو اس نتیجے پر پہنچے ہوں گے کہ ہم جس پاگل پن میں مبتلا ہیں وہ عقل کی ایسی بات ہے جو کسی کی سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ انھوں نے اخبارات کی خبروں کو دیکھا ہو گا۔ گاما ماچھی کے تباہ ہو جانے والے اڈّے کے بارے میں تفتیشی رپورٹ دیکھی ہو گی۔ پھر انھیں کرماں والی اور سائیں پاپڑ والے کے اسلحہ خانے، وہاں سے حاصل ہونے والے ہیلی کوپٹر کے ٹکڑے۔ اسلحے کے نمونے اور ماہرین کی رپورٹ ملی ہو گی۔ انھیں حشمت خان، سراج اور ڈی سلوا کی پرانی کوٹھیوں میں پھٹنے والے ٹائم بموں کی تفصیلی رپورٹ مل گئی ہو گی۔ ممکن ہے کہ حشمت خان کو وہ نہ جانتے ہوں مگر سراج کے خلاف تو پہلے ہی ان کو شکایات مل رہی تھیں۔ وہ ڈی سلوا کے نام سے بھی واقف تھے اور اس کوٹھی میں بھی اسلحہ تھا..."

"یار، یہ سراج کے خلاف شکایات کون ارسال کرتا رہا؟"

"اسی کا کوئی دشمن۔" میں نے کہا۔

"ساتھی بھی ہو سکتا ہے۔" محسن بولا۔ "ایسا ساتھی جو مالِ حرام کی غلط تقسیم یا کسی کے غلط رویّے کے باعث ان کے خلاف ہو گیا ہو۔"

"یا جس کو بالآخر ضمیر کی خلش نے مجبور کر دیا ہو۔" میں نے کہا۔

"ہاں... یہ بھی ایک امکان ہے۔" محسن بولا۔

"سکندر بادشاہ۔" ٹیڈی نے اچانک کہا۔ "مجھے معاف کر دو۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ "کس بات پر... یہ کیا ہے خواجہ صاحب؟"

"وہ خط میں نے ڈالے تھے۔" ٹیڈی نے کہا۔ "تم سے پوچھے بغیر..."

اگر اس تہ خانے میں بم پھٹ جاتا تو ہم اتنے حیران نہ ہوتے جتنے ٹیڈی کے لبوں سے نکلنے والے ایک جملے سے ہوئے۔ کچھ دیر ہم دم بخود بیٹھے ٹیڈی کو دیکھتے رہے۔

"تم نے! تم نے ایس ایس پی ضامن رضوی کو خطوط ارسال کیے تھے؟" میں نے بہت دیر بعد کہا۔

"ہاں، سکندر بادشاہ۔" ٹیڈی سر جھکا کے بولا۔ "میں بہت بے وقوف ہوں۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن پتا نہیں کیوں جس دن مجھے یہ خیال آیا اس دن کے بعد مجھ پر آسیب ہو گیا۔ اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے یہی خیال رہنے لگا کہ مجھے تمھارے انکل رضوی کو سارے حالات سے باخبر رکھنا چاہیے۔ وہ کب تک یقین نہ کریں گے۔ بالآخر ان کو سوچنا پڑے گا۔ وہ بڑے افسر ہیں۔ تفتیش کریں گے تو سچ سامنے آ جائے گا۔"

میں نے اور محسن نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ بے وقوف اور بزدل نظر آنے والے استاد ٹیڈی نے ایک ایسا کام کیا تھا جو ہم افلاطون نہ کر سکے تھے۔ اس کی بے وقوفی یہ تھی کہ وہ اب بھی شرمندہ تھا جبکہ اس کی وجہ سے ہماری پوزیشن صاف ہو گئی تھی۔ انکل رضوی کا ہم پر اعتماد بحال ہو گیا تھا اور ان کی نظر سچ کو دیکھنے لگی تھی۔

"میں نے تم سے اس لیے تذکرہ نہیں کیا تھا" وہ اب بھی اپنی صفائی پیش کر رہا تھا "کہ تم مجھے روک دو گے۔ اور نہ جانے میرے اندر کون سی آواز تھی جو کہتی تھی کہ نیک محمد... یہ نیکی کر... یہ نیکی ہے۔ ایسا ضرور کر... پھر میں نے تم سب سے چھپ چھپ کے خط لکھنے شروع کیے... میں وہ سب لکھتا گیا جو میرے نزدیک سچ تھا۔ جو کچھ ہم نے کیا تھا جو ہمیں معلوم تھا۔ میں نے کسی کا نام نہیں لکھا مگر واقعات سب لکھ دیے وہ سب لکھ دیا جو ہم جانتے تھے۔ اور پھر یہ خطوط مختلف مقامات سے پوسٹ کرتا رہا۔ میں پولیس کو کچھ نہیں بتانا چاہتا تھا۔ یہ میں نے خطوں میں بھی لکھ دیا تھا۔ اور اسی لیے میں نے سارے خط ان کے گھر کے پتے پر بھیجے تھے۔"

میرے کان ٹیڈی کی آواز سن رہے تھے۔ یہ آوازِ غیب تھی جس نے ٹیڈی سے کہا تھا کہ اٹھا قلم اور لکھ... اس سچی آواز کی طرح جس نے ایک اُمّی رسولؐ سے کہا تھا کہ پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے تجھے پیدا کیا۔ اور اب وہ آواز مجھ سے مخاطب تھی کہ دیکھو! تم صراطِ مستقیم پر تھے۔ اس لیے ہم نے تمھاری حفاظت کی اور تم کو ہدایت دی، عقل دی اور بصیرت دی کہ تم اپنے نفع نقصان کو سمجھ لو۔ اور تم کو روشنی دی اور رفاقت دی۔ حوصلہ دیا اور وہ سب کچھ دیا جو تم نے چاہا۔ تمھارے مانگنے سے پہلے تم کو دیا۔ تم کو دنیا نے معتوب جانا۔ تمھارے نام پر ہر تقصیر لکھی اور تم کو سارے رشتوں سے محروم کیا مگر کیا ہم نے تمھارے لیے دلوں میں محبت کم کی؟ ہم نے تم کو زیادہ مخلص اور سچے رشتے دیے اور وہ محبت دی جو ہم اپنے خاص بندوں کو دیا کرتے ہیں (پس تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے)

میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ میری ساری طاقت تُو ہے میرے معبود... میں نے عاجزی سے اعتراف کیا۔ یہ سب سچ تھا۔ استاد ٹیڈی نے سچ کو سب پر افشا کر دیا تھا۔ انکل رضوی کو قائل کر لیا تھا اور ان کو پھر ہمارا معاون و مددگار بنا دیا تھا۔ سندر داس کی باتوں کا ثبوت مل گیا تھا کہ اسے ضامن رضوی نے بھیجا تھا اور اکرام شیخ نے اسے بطورِ خاص میرا خیال رکھنے کی ہدایت کی تھی۔ یہ سب تائیدِ ایزدی تھی کہ اس نے ایک غیر مسلم کو ذریعہ بنایا اور اپنی قدرتِ کاملہ کا ایک اور ثبوت فراہم کیا حالانکہ اس قادرِ مطلق کے اختیار میں سب کچھ ہونے کا یقین، ایمان ہے اور اس پر کوئی شک کرنے والا نہیں۔

"... اور میں نے یہ اس لیے کیا کہ میری ہینڈ رائٹنگ رضوی صاحب بالکل نہیں پہچان سکتے۔ میں وہ خط سیاہی اور کاغذ بدل کے لکھتا تھا۔ اور کبھی ایک جگہ سے ڈالتا تھا تو کبھی دوسری جگہ سے۔" ٹیڈی کا اعترافِ جرم جاری تھا۔

استاد! تم کس بات پر شرمندہ ہو؟" میں نے کہا۔ "شرمندہ

تو میں ہوں کہ کچھ کر نہیں سکتا، ورنہ اس وقت اُٹھ کر تمھارا منہ چوم لیتا اور تمھارے ہاتھوں کو بوسہ دیتا۔ تم نے تو وہ کام کیا ہے جو سکندر سے نہ ہوا۔ یہ سب تمھاری کوشش کا نتیجہ ہے کہ ہم میں ایک بہت بڑی اور خوشگوار تبدیلی آئی ہے۔ ایس ایس پی ضامن رضوی اب ہمارے ساتھ ہیں اور ہمیں ان سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ سب کچھ سنبھال لیں گے۔ خدا نے چاہا تو ان کی تائید بھی حاصل ہو گی۔ وہ پولیس کو ہمارے تعاقب سے ہٹا سکتے ہیں۔ ہمارے کیس داخلِ دفتر کرا سکتے ہیں۔ عدالتی کیس تو وہی ایک ہے۔ میر شرافت علی کے قتل کا... اور اس میں اب جان کہاں رہی ہے۔ قاتل نے مرتے وقت اقرارِ جرم کر لیا تھا۔ جس دن بھی ہم عدالت میں پیش ہوں گے سماعت کی رسمی کارروائی کے بعد باعزت طور پر بری ہو جائیں گے۔"

"تم نے بہت بڑا کام کیا ہے استاد... تم واقعی استاد ہو۔" محسن نے کہا۔ "مجھے شہلا کی طرف سے اطمینان حاصل ہو گیا ہے۔ اور اب تو مجھے لگتا ہے کہ اکرام شیخ بھی سندر داس کے پیچھے پیچھے ہو گا۔ انکل رضوی نے اسے ضرور سمجھا دیا ہو گا کہ حقیقت کیا ہے۔ وہ مستعفی ہو چکا ہے۔ وہ ہمارا ساتھ دے سکتا ہے۔"

"تو نے بالکل ٹھیک کہا۔" میں نے مسرت سے کہا۔ "یہ بھی ممکن ہے کہ نازو نے اپنی پوزیشن کلیئر کر دی ہو۔ اکرام شیخ بھی بہت ذہین آدمی ہے۔ اس نے اور انکل رضوی نے مل کر نازو کے والدین کو قائل کر لیا ہو گا کہ وہ نازو کی طرف سے بے فکر رہیں... نہ وہ غلط قسم کی لڑکی ہے اور نہ غلط راستے پر چل رہی ہے۔ جو کچھ وہ کر رہی ہے وہی اس کو کرنا چاہیے۔"

"تو۔ کہنا یہ چاہتا ہے کہ نازو اس بار سب کی رضامندی سے فرار ہوئی ہے اور یہ فرار نہیں ہے۔" محسن بولا۔

"اگر میرے مفروضات غلط نہ ہوئے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نازو اس بار اپنے بھائی کے ساتھ نکلی ہو۔ ایسی صورت میں کسی کو کیا اعتراض ہو گا۔"

"مگر وہ نکل کر جائے گی کہاں؟" محسن نے پرانا سوال دہرایا۔ "وہ گھر جہاں ہم تھے جل کے خاک ہوا۔ غالب نہ جانے کدھر گیا۔ انھیں معلوم نہیں کہ ہم کدھر گئے۔ دلاور اینڈ کمپنی نے تو اپنا سارا پلان بدل دیا۔ وہ ہم تک کیسے پہنچ سکتے ہیں۔ یہ لوگ ہمیں نہ جانے کہاں لے جائیں گے۔ تلاش کرنے والے بھٹکتے رہ جائیں گے مگر کبھی ہمارا سراغ نہ پائیں گے۔"

"انسپکٹر سندر داس ان کو بتا چکا ہے۔"

"صرف یہ کہ ہم کہاں ہیں۔ کل کے بارے میں وہ خود بھی نہیں جانتا۔ کیونکہ سراج اسے ہمارے ساتھ نہیں رکھے گا۔" محسن نے کہا۔

"سندر داس نے بتایا تو ہے کہ اکرام شیخ کو مطلع کر کے بھیجا تھا

نے کسی کو خط دے کے بھیجا تھا۔ کسی کے ہاتھ بھیجا جانے والا لیٹر اب تک پہنچ چکا ہو گا۔ خط ڈاک سے جاتا تو دیر ہو سکتی تھی۔ خط گم بھی ہو سکتا تھا۔" میں نے کہا۔

"یہ تو ٹھیک ہے... مگر سکندر... اگر ایسا ہوا کہ نازو اور اکرام شیخ ایک ساتھ نکل کھڑے ہوئے ہوں... ... جیسا کہ تیرا خیال ہے۔ تو وہ خط لے جانے والا خط کسے دے گا؟" محسن بولا۔ "یہ بڑی عجیب اور افسوسناک صورتِ حال ہو گی کہ اِدھر ہمارے موجودہ پتے کی اطلاع لے جانے والا نامہ بر وہاں جائے، اُدھر پتا چلے کہ مکتوب الیہ تو گھر سے نکل کے نہ جانے کدھر گئے۔ گھر والے کیا بتائیں گے کہ اکرام شیخ کہاں گیا۔ اکرام شیخ اپنی بہن نازو کے ساتھ پہنچے گا اس گھر میں جہاں نازو ہمیں بخیر و عافیت چھوڑ کر گئی تھی۔ وہاں اسے ایک پرانی حویلی کا جلا ہوا ڈھانچہ ملے گا... لوگ شاید بتا دیں کہ آگ لگی تھی تو دو لاشیں شاید ملی تھیں مگر اور نہ کوئی زندہ نکلا نہ مُردہ۔ شاید اندر ہی جل کے راکھ ہو گئے یا ملبے میں دب کر کوئلہ ہو گئے۔ پھر نازو اور اس کا سابق سب انسپکٹر بھائی کیا کریں گے۔ وہ کس سے پوچھیں گے غالب کا پتا... میرا اور تیرا پتا۔"

"لیکن... جب انھیں کسی کا پتا نہ ملا تو وہ کہاں جائیں گے؟ ظاہر ہے واپس گھر..." میں نے کہا۔ "اور گھر پہنچنے پر انھیں سندر داس کا مکتوب مل جائے گا۔"

"ہاں۔ بشرطیکہ وہ لوٹ کر گھر گئے۔" محسن بولا۔ "وہ دونوں قدم آگے بڑھا کے پیچھے ہٹنے والے نہیں ہیں۔ اکرام شیخ کو جانتا ہی ہے تو... اگر اب اس کو احساس ہو گا کہ اس نے غلطی کی تھی۔ تو تلافی کے لیے وہ سر دھڑ کی بازی لگا دے گا اور ہمارا سراغ لگانے چل پڑے گا۔ اس کی رہنمائی کرے گی نازو... وہ بھی ضدی اور جنونی لڑکی ہے۔ عجیب فلمی اتفاقات اور حادثات سے بھرپور کیس ہے۔"

محسن نے ایک سرد آہ بھری۔ "بس دعا کرو وہ خط اُسے مل جائے۔"

"صرف خط کا ملنا ہی کافی نہیں۔" میں نے کہا۔ "وہ خط پڑھ کے فوراً روانہ ہو جائیں۔ اور ہمارے یہاں سے ہٹائے جانے سے قبل آ جائیں۔ اگر وہ دیر سے آئے تو یہاں کون ملے گا۔ ممکن ہے سندر داس ملے مگر وہ بھی کیا بتائے گا کہ اسیرانِ خستہ جاں کو شکاری کدھر لے گئے۔"

"سندر داس ہمارے انکل رضوی کو بھی تو مطلع کرے گا...؟" محسن نے کہا۔ "اور ان کو یہ بھی بتائے گا کہ اس نے سکندر کو کہاں اور کس حال میں دیکھا تھا۔ پھر وہ سراج سے پوچھیں گے۔ سراج کو بتانا پڑے گا۔"

"ایسا ہو سکتا تھا لیکن یار میں نے تو خود ہی سندر داس کو تیرے سامنے منع کر دیا تھا کہ انکل رضوی کو کچھ نہ لکھے۔" میں نے مایوسی سے کہا۔

"یہ تو نے بہت غلط کیا۔"

"مجھے کیا معلوم تھا اس وقت کہ سندر داس واقعی سچ بول رہا ہے۔ میں اس پر کیسے اعتبار کر لیتا ایک دم۔" میں نے کہا۔

"اب کہہ دیں گے اس سے کہ ایس ایس پی صاحب کو سب لکھ دے۔ وہ سب باتیں جو ہم سے ہوئیں۔ ہمارے بارے میں۔ سراج کے بارے میں۔" محسن بولا۔

"اگر موقع ملا تو کہہ دیں گے۔ مگر اس کے بعد بھی کون سی ضمانت ہے کہ انکل رضوی فوراً ایکشن لیں گے۔" میں نے کہا۔ "وہ سراج سے پوچھ ضرور سکتے ہیں لیکن سراج انکار کر دے تو اس طرح نہیں پوچھ سکتے جیسے سراج ہم سے پوچھے گا۔ ایس ایس پی صاحب سراج کو الٹا لٹکا کے مترڈ ڈگری کے طریقے سے اعتراف نہیں کرا سکتے کہ اس نے ہمیں کہاں چھپایا ہے۔ کہاں بھیجا ہے یا کس کے ہاتھ بیچا ہے۔ قتل کیا ہے تو کہاں گاڑا ہے۔ وغیرہ وغیرہ... زیادہ سے زیادہ کسی ایس پی کو معطل کیا جا سکتا ہے۔ وہ بھی کسی سنگین جرم کا ثبوت ملنے پر۔ صرف ایک انسپکٹر کا کہہ دینا کافی نہیں ہو گا۔ سراج صاف مکر جائے گا کہ کبھی وہ دوبارہ سکندر بخت سے ملا ہے۔ وہ انسپکٹر پر دشمنی کی نیت سے جھوٹ بولنے کا الزام عائد کر سکتا ہے۔ نہ ثبوت نہ گواہ۔ ایک الزام ماتحت نے افسر پر لگایا۔ دوسرا افسر نے ماتحت پر۔ وزن کس کے الزام میں ہو گا۔ ظاہر ہے افسر کی افسری چلے گی اور مارا جائے گا سندر داس۔"

"تو بہت حوصلہ شکن باتیں کر رہا ہے۔" محسن بولا۔ "قنوطی ہو رہا ہے۔"

"میں حقیقت کو خواب کے روپ میں نہیں دیکھنا چاہتا۔" میں نے کہا۔ "خواہش اگر جنون بن جائے تو آدمی پاگل کہلاتا ہے۔ سراب کے پیچھے دوڑنے لگتا ہے۔"

دروازہ کھلا تو ہم خاموش ہو گئے۔ ایک ساتھ چار افراد اندر آ گئے۔ ان میں دو وہی مشین گن والے تھے جو ہمیں اس بیرک کے آفس میں دلاور کے ساتھ ملے تھے۔ باقی دو وہی خاموش رہ کر خالی ہاتھوں سے لڑنے والے تھے جو ہمارے ساتھ آئے تھے۔ اور جنھوں نے ہمیں پنجروں میں بند کیا تھا۔ ان کے پیچھے ایس پی سراج آیا۔

"تم لوگوں نے کوئی فیصلہ کیا؟" وہ میرے سامنے کمر پر ہاتھ رکھ کر اور پیر پھیلا کے کھڑا ہو گیا۔ بالکل فلمی ولن کی طرح۔

"فیصلہ تم کو کرنا ہے۔ تم نے بہت بڑے دعوے کیے تھے" میں نے کہا۔

"میں آخری بار پوچھ رہا ہوں۔" وہ بولا۔ "نازو اور غالب کہاں ہیں؟"

"ہمارا جواب اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ ہم نہیں جانتے۔" میں

کہا: "اگر ہمیں معلوم ہوتا تب بھی نہ بتاتے۔"

"ٹھیک ہے۔" سراج بولا: "ان سب کو اوپر لے آؤ۔"

دونوں خالی ہاتھ آنے والوں نے اپنی اپنی جیب سے رومال سے بڑے کپڑے نکالے۔ ایک نے میرے پیچھے آکے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔ دوسرے نے محسن کے پیچھے بیٹھ کر یہی عمل شروع کر دیا تھا۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہ دیکھ سکا۔ چند منٹ کے بعد میری ہتھکڑی کھول دی گئی۔ انہی میں سے کسی نے مجھے جھٹکا دے کر پیروں پر کھڑا کیا اور پھر آگے دھکیلا۔ میں لڑکھڑا کے گرتے گرتے بچا۔ مجھے ہانکنے والے اسی طرح دھکے دے دے کر مجھے آگے بڑھنے پر مجبور کرتے گئے۔ تہ خانے کی سیڑھیوں پر میں دو مرتبہ منہ کے بل گرا۔ میں نے ٹیڈی کی آواز سنی۔ وہ ان سب کو گالیاں دے رہا تھا۔

"خدا تم سب کو اندھا کرے۔ تمہاری آنکھوں میں کیڑے پڑیں۔" مجھے بے ساختہ ہنسی آنے لگی تھی مگر میں نے روک لی۔ بات مذاق کی نہیں تھی لیکن مجھے ایک پرانی بات یاد آگئی۔ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء یا اس کے بعد ایک زمانہ ایسا بھی آیا تھا جب انگریز افواج غالب آچکی تھیں اور ہندوستانی چونکہ متحد نہ تھے اس لیے شکست کھا گئے تھے۔ بطور لطیفے کے یہی بات سنائی جاتی تھی کہ اس زمانے میں بڑی بوڑھیاں انگریزوں کو بددعائیں اور کوسنے دیتی تھیں تو کہتی تھیں کہ اللہ کرے موئے فرنگیوں کی توپوں میں کیڑے پڑیں۔ ٹیڈی بھی کچھ کرنے سے قاصر تھا تو بددعا پر اکتفا کر رہا تھا۔

میں سراج کے حکم کی تعمیل میں دائیں بائیں مڑتا گیا۔ ظاہر ہے یہ حکم صرف میرے لیے نہیں تھا۔ محسن اور ٹیڈی بھی اس کا حکم مانتے جا رہے تھے اور ہم سب ایک ساتھ کسی نامعلوم مقام کی جانب رواں تھے۔ مجھے اپنے اندیشے درست ہوتے نظر آ رہے تھے۔ اب کوئی آیا بھی تو یہاں کون ملے گا۔ نہ نازو اور نہ غالب۔ نہ ایس آئی اکرام شیخ اور نہ ایس ایس پی ضامن رضوی ہی وہاں پہنچ سکیں گے جہاں ہمیں اب لے جایا جا رہا تھا۔ اس کے بعد بھی ہماری منزل کہاں تھی۔ یہ خود ہم نہیں جانتے تھے۔ شاید سراج اور سندر داس بھی نہیں جانتے تھے کہ ہمیں کس کے حوالے کرنا ہے اور کہاں پہنچانا ہے۔ سفر کے کتنے مرحلے ہیں اور کتنے ہمسفر ہیں۔ ہم شکاری تھے۔ یہ دعویٰ باطل ہوا۔ دلاور اور سراج بھی شکاری تھے۔ وہ کسی حد تک کامیاب ہوئے انھوں نے ہمیں جن کے حوالے کیا وہ سب سے بڑے شکاری تھے۔ یہ ثابت ہو گیا۔

دہاتھوں نے مجھے ایک دم اٹھایا اور اچھال دیا۔ میں کسی ٹرک یا بس کے فرش پر گرا۔ میرے ساتھ ہی محسن اور ٹیڈی بھی اندر آئے۔ میں نے سندر داس کی آواز سنی: "اب کیا حکم ہے سر؟"

"تم اب ڈیوٹی پر جاؤ۔" سراج نے کہا۔

"لیکن کل رات کی شفٹ میں ڈیوٹی دے چکا ہوں۔" اس نے احتجاج کیا۔

"ہم یہاں روٹین اور شیڈول کو فالو نہیں کر سکتے۔ بارڈر کو کھلا نہیں چھوڑا جا سکتا۔" سراج نے گرج کر کہا: "ایک آدمی بیمار ہے تو اس کی جگہ کیا میں ڈیوٹی دوں۔ دِس از این آرڈر... تم کو ڈبل ڈیوٹی دینا ہے۔ یہ کوئی ناانصافی یا ظلم نہیں ہے۔ تمہاری جگہ بھی لوگ ڈیوٹی دے چکے ہیں۔"

"یس سر!" سندر داس نے مردہ لہجے میں کہا۔

"اوکے... تم جا سکتے ہو... اور یاد رکھو کہ آج رات پھر تم کو اپنے معمول کے مطابق شفٹ کرنا ہے۔" سراج بولا۔

"آئی نو سر!" سندر نے کہا: "ڈیوٹی از ڈیوٹی... آرڈر از آرڈر..."

ٹرک دس منٹ بعد روانہ ہوا اور تقریباً ایک گھنٹا چلتا رہا۔ میں اِدھر اُدھر کی آوازوں سے بالکل اندازہ نہ کر سکا کہ ہم کہاں سے گزر رہے ہیں۔ ہر طرف خاموشی تھی اور ہچکولے یہ ظاہر کرتے تھے کہ ہم پختہ سڑک پر نہیں تھے۔ وہ کچی سڑک بھی نہیں تھی۔ ناہموار زمین تھی۔ ایک گھنٹے کے بعد ٹرک رکا تو ہمیں اتار لیا گیا۔ ہم مختلف راستوں سے گزارے گئے۔ پھر ہمیں رکنے کا حکم دیا گیا اور کسی نے میری آنکھوں پر سے پٹی اتار لی۔ اس وقت مجھے پتا چلا کہ محسن اور ٹیڈی میرے ساتھ نہیں ہیں۔ جہاں میں کھڑا ہوا تھا وہ پندرہ فٹ لمبا اور اتنا ہی چوڑا کمرہ تھا جس میں کراس بار اور چھت سے آویزاں لوہے کے حلقے تھے۔ بالکل ویسے ہی جیسے ورزش کرنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ یہ کوئی چھوٹا سا جمنازیم لگتا تھا۔ لیکن میں سمجھ گیا کہ یہ عقوبت خانہ ہے جہاں مجھ سے پوچھا جائے گا کہ نازو کہاں ہے اور غالب کہاں ہے۔ لیکن اس بار پوچھنے کا انداز مختلف ہوگا۔

اس بات کا یقین مجھے رابعہ کو دیکھ کر بھی آیا جو شیشے کے ایک بند دروازے کے پیچھے کرسی پر بندھی بیٹھی تھی۔ وہ کچھ کہنے کے لیے چلا رہی تھی مگر اس کی آواز میرے کانوں تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ پھر دروازے کے پیچھے بالکل اندھیرا ہو گیا اور اس مختصر سے کمرے میں سرچ لائٹ روشن ہو گئی۔ اب رابعہ وہ سب کچھ دیکھ سکتی تھی جو میرے ساتھ ہونے والا تھا۔ لیکن میں اس کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اچانک ایک اسپیکر آن ہو گیا اور میں نے رابعہ کے چیخنے کی آواز سنی۔ "رابعہ!" میں چلایا: "تم ٹھیک ہو؟"

"ہاں سکندر!" اس نے چلا کے کہا: "دیکھو ان کو بتا دو کہ نازو کہاں ہے۔"

یہ بڑا بے رحم انتظام تھا۔ ہم ایک دوسرے کی فریاد و فغاں سب سن بھی سکتے تھے۔

رابعہ کی آواز نے میری ذہنی اذیت میں اضافہ کیا۔ ایک طرف جسمانی عذاب کا خیال باعثِ اذیت تھا دوسری طرف رابعہ کی موجودگی کا احساس۔ ایسے میں رابعہ کا یہ کہنا میں نازو کے بارے میں کچھ نہ چھپاؤں اور سب بتا دوں میرے لیے حیرانی اور دکھ کی بات تھی۔ حیرانی مجھے یوں تھی کہ مجھے نازو کے متعلق کیا معلوم تھا جو رابعہ جانتی تھی اور سب جانتے تھے میرے پاس بتانے کو تھا ہی کیا جو میں کچھ چھپاتا اور ان حالات میں کچھ چھپانا ممکن بھی نہیں تھا۔ اگر میں سچ بولتا تو صرف یہی کہتا کہ نازو گھر گئی تھی لیکن وہاں سے نکل کے کہاں گئی؟ یہ کسی کو نہیں معلوم اور غالب اس کھنڈر کی آگ میں جل کر بھی نہیں مرا اور وہاں ملا بھی نہیں تو خدا کے سوا کون جانتا ہے کہ وہ کہاں ہوگا۔ تو یہ جواب انھیں ہرگز مطمئن نہ کرتا۔ چنانچہ یہ تو طے تھا اور میں نے ذہنی طور پر خود کو اس کے لیے تیار بھی کر لیا تھا کہ وہ جسمانی تشدد کا کوئی بھی طریقہ جس حد تک آزمانا چاہیں گے ضرور آزمائیں گے۔ وہ مجھ سے ایک واضح جواب کی امید رکھتے تھے کہ فلاں فلاں جگہ جا کے دیکھو۔ یا فلاں دن فلاں وقت پر نازو اور غالب فلاں جگہ آئیں گے مگر میرا یہ جھوٹ بھی آسانی سے نہ چلتا۔ وقتی طور پر میری جان عذاب سے بچ جاتی مگر پھر بھی سب کچھ رابعہ کے یا محسن کے ساتھ ہوتا اور اگر وہ بھی جھوٹ بولتے کہ غالب اور نازو کہاں اور کس وقت مل سکتے ہیں تو ظاہر ہے کہ ان کے اور میرے جھوٹ میں فرق ہوتا اور ہمارے سچ کی قلعی کھل جاتی۔ دشمنوں کو معلوم ہو جاتا کہ ہم نے تشدد کی اذیت سے بچنے اور مہلت حاصل کرنے کی فضول سی کوشش کی تھی۔

دکھ مجھے رابعہ کی اس بات پر ہوا کہ اس نے ایک غلط بات کی تھی۔ اگر مجھے نازو کے بارے میں علم ہوتا کہ وہ کہاں ہوگی تب بھی کیا میں اُسے پکڑوا دیتا۔ میں پوری کوشش کرتا کہ آخری سانس تک مجھ پر جو گزرتی ہے گزر جائے لیکن میری زبان میرے ارادوں کی شکست کا اعتراف نہ کرے۔ غالب اور نازو میں میرے لیے اس اعتبار سے کوئی فرق نہ تھا کہ دونوں میرے ساتھی تھے اور خیر و شر کی اس جنگ میں میرے ساتھ برابر کے شریک تھے۔ انھیں بچانے کی ہر ممکن کوشش کرنا اور دشمنوں کے ہاتھوں ان تک نہ پہنچنے دینا میرا ہی نہیں ہم سب کا مشترکہ مقصد تھا جو اس وقت قید میں تھے۔ پھر رابعہ نے یہ کیوں کہا کہ نازو کے بارے میں بتا دو؟ کیا وہ ایک حسد سے مغلوب ہو جانے والی عورت ہو گئی تھی یا جذبات کی یک طرفہ یلغار میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو جانے والی۔ جواب ایک ہی آرزو کی پکار بن گئی تھی کہ چاہے دنیا رہے نہ رہے، وہ رہے جو میری محبت کی زندگی ہے۔ کیا محبت اسی خود غرضی کو کہتے ہیں؟

سرچ لائٹ چھت کے ایک گوشے میں نصب تھی اور اس کی روشنی ٹارچ کی روشنی کی طرح ایک لکیر کی صورت میں اندھیرے سے گزر کر فرش تک محدود سے دائرے میں پڑ رہی تھی اور جہاں وہ دائرہ تھا وہیں فرش پر ایک کرسی رکھی ہوئی تھی۔ یہ کوئی عام استعمال کی کرسی نہیں تھی۔ یہ فولادی کرسی سیاہ رنگ کی تھی اور اس ماحول میں بالکل الیکٹرک چیئر کی طرح لگ رہی تھی جو امریکا اور یورپ میں سزائے موت دینے کے لیے استعمال کی جاتی رہی ہے۔ اس کی ایک وجہ وہ چمڑے کے تسمے تھے جو کرسی کے بازوؤں پر اور پشت پر نظر آرہے تھے اور جن سے کرسی پر بیٹھنے والے کو یوں پر کسا جا سکتا تھا کہ وہ جنبش تک نہ کر پائے۔ الیکٹرک چیئر پر بٹھائے جانے والوں کو بھی برقی رو چھوڑنے سے پہلے اسی طرح باندھا جاتا تھا۔ کرسی کے فولادی پائے سیمنٹ کے فرش میں نصب تھے۔ چنانچہ کرسی کو ہلانے کا بھی کوئی سوال نہ تھا۔

مجھے سزائے موت نہیں ہوئی تھی۔ یہ میرے لیے موت سے بدتر عقوبت کا اہتمام تھا اور ایذارسانی کے ذریعے اعترافِ جرم کرانے یا زبان کھلوانے کے اس طریقے کو ساری دنیا میں سب سے آسان اور مؤثر سمجھ کے استعمال کیا جاتا تھا۔ جو اس کٹھن مرحلے کو جھیل جاتا تھا، وہ گویا جہنم کے دوسرے زیادہ اذیتناک طبقے کے لیے کوالیفائی کر لیتا تھا۔ جہنم کے اگر سات طبقے ہیں اور ہر طبقے کا عذاب شدید تر ہے تو دنیا میں انسانوں نے بھی عقوبت کے درجے بنا رکھے ہیں اور جو قوتِ برداشت کے ایک مرحلے سے گزر جاتا ہے، وہ اذیت اور تشدد کے سخت ترین مرحلے میں داخل ہو جاتا ہے۔ کسی نہ کسی مرحلے میں ہر شخص شکست قبول کر لیتا ہے۔ اگر کوئی فتح مند گزرتا ہے تو وہی جو بالآخر جاں سے گزر جاتا ہے۔ سراغرسانی اور تفتیشی اداروں کے ماہرین نے آدمی کے ذہن کے ہر نہاں خانے سے سچ کا آخری قطرہ تک نچوڑ لینے کے فن کو ایک ناقابلِ تصور حد تک بھیانک اور لرزہ خیز عمل بنا دیا ہے۔ اب تشدد کرنے والی مشینوں کے استعمال کو وہ بھی جائز سمجھتے ہیں جو آزادی، ضمیر اور اخلاقی اقدار اور مہذب معاشرے کی بات کرتے ہیں۔ جو انجمن انسدادِ بے رحمی حیوانات بناتے ہیں مگر حیوانِ ناطق اور اشرف المخلوقات کے ساتھ انسانیت سوز مظالم کو اپنی سیاست میں روا رکھتے ہیں۔

مجھے معلوم تھا کہ سب سے پہلے مجھے ہی اس کرسی پر باندھ کر یوں بٹھا دیا جائے گا کہ وہ سرچ لائٹ براہِ راست میری آنکھوں پر پڑتی رہے اور جب اس روشنی کا عذاب میری آنکھوں کے لیے اور میرے اعصاب کے لیے برداشت سے باہر ہونے لگے گا تو سوالات کا سلسلہ شروع ہوگا۔ جن لوگوں نے روشنی کو صرف چاندنی، ٹیوب لائٹ اور مرکری لیمپ، فانوسوں اور دلکش ڈیزائن والی وال لائٹس، نیون سائن، جلتے بجھتے آرائشی بلبوں، نگینوں

روشنی کے فواروں، کینڈل لائٹ ڈنر اور خواب گاہوں میں دیکھا ہے، ان کے لیے روشنی صرف خوب صورتی ہے۔ اندھیروں کو مٹا دینے والی قوت ہے اور نائٹ لائف کے ہنگامۂ ناؤ نوش اور جشن طرب کو جاری رکھنے کی ضمانت ہے مگر جو پولیس کے تھرڈ ڈگری طریقۂ تفتیش سے گزرے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہی روشنی کتنی سفاک اور بے رحم حقیقت ہے۔ عام آدمی کو اگر براہِ راست آنکھوں پہ پڑنے والی دس ہزار واٹ لائٹ کی بیم میں بٹھا دیا جائے تو پہلے اس کا نروس بریک ڈاؤن ہوگا۔ پھر وہ پاگل ہونے لگے گا۔ پھر چیختا چلاتا اس اذیت کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو جائے گا یا ہمیشہ کے لیے اندھا ہو جائے گا۔ یہ کتنا بہت آسان ہے کہ آنکھیں بند کرنے کے بعد روشنی نہیں رہتی مگر یہ اتنی کمزور روشنی نہیں ہوتی۔ یہ بند آنکھوں کے پپوٹوں کو چیرتی ہوئی اندر اتر جاتی ہے اور اس کی چبھن آنکھوں میں پیوست ہونے والی سوئیوں کی طرح محسوس ہوتی ہے۔

جس دروازے سے مجھے اندر لایا گیا تھا وہ ایک بار پھر کھلا اور وہ دونوں پھر نمودار ہوئے جو زبان رکھتے تھے مگر گونگے تھے۔ ان کے تیور ہر وقت جارحانہ رہتے تھے اور وہ اتنے چوکنے نظر آتے تھے جیسے ان کے مقابل آدمی نہیں آدم خور شیر ہو۔ ان کی صورت کے نقوش میں بھی عجیب آدم بیزار بے حسی اور دل آزار سختی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میں ان کو ایک ہاتھ رسید کرنے کا ارادہ بھی کرتا تو وہ دونوں مجھے دو ہاتھ مار کے لٹا دیتے۔ قد میں وہ مجھ سے کم تھے لیکن ان کے جسم فولادی اور تباہ کن قوت سے بھرے ہوئے لگتے تھے۔

ان میں سے ایک نے انگلی سے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ یہ کوئی مشکل اور ناقابلِ فہم اشارہ نہیں تھا مگر میں کھڑا رہا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ اب وہ زبان سے کیا حکم دیتا ہے مگر ان کے منہ میں تو جیسے زبان تھی ہی نہیں۔ انھیں اچھی طرح سمجھا دیا گیا تھا کہ ان کا واسطہ لاتوں کے بھوت سے ہے جنھیں باتوں کی ضرورت نہیں۔ دوسرے نے مجھے بڑی پھرتی سے گھوم کر لات ماری اور میں ایک دم آگے گیا تو دوسرے نے سنبھال لیا اور کرسی پر گرا دیا۔ مشینی انداز میں انھوں نے میرے ہاتھوں کو کرسی کے بازوؤں پر کس دیا۔ پیروں کو نیچے کرسی کے پایوں سے باندھ دیا اور ایک بیلٹ درمیان سے میرے پیٹ پر سے گزار کے پیچھے ہک کر دیا۔ ریوالور اب بھی میری جیب میں تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ کہیں مناسب موقع کے انتظار میں، میں نے کچھ کرنے کے سارے مواقع ضائع تو نہیں کر دیے ہیں۔

جب میرے سر کو پیچھے ہیڈ ریسٹ پر رکھ کے ایک بیلٹ میری پیشانی پر کسی گئی تو میں تقریباً منجمد ہو گیا۔ سرچ لائٹ ابھی میری آنکھوں پر نہیں پڑ رہی تھی۔ مجھے باندھ کر بے بس کر دینے والے اپنا کام کر کے رخصت ہوئے تو سرچ لائٹ کی اس کا زاویہ بدلا اور اچانک میرے سامنے سورج آ گیا۔ اس خیرہ کن روشنی کے سوا میری نگاہ سے ہر چیز اوجھل ہو گئی۔ مجھے اس کی چندھیا دینے والی روشنی کے ساتھ ہی تپش بھی محسوس ہوئی جو میرے وجود میں ہر مسام کے راستے اتر رہی تھی لیکن میں اپنے سر کو ایک سوت اِدھر سے اُدھر نہیں کر سکتا تھا کہ اس روشنی کی یلغار سے بچ سکوں۔ میں نے آنکھیں بند کر کے دیکھا مگر اس سے روشنی کی شدت میں برائے نام کمی آئی۔ میری پلکوں پر اس روشنی کا سیلاب اُمڈ آیا اور اس کا دباؤ آنکھوں میں درد بن کے پھیلنے لگا۔ وقت گزرنے لگا۔

رابعہ کی آواز اب میرے کانوں تک نہیں پہنچ رہی تھی اور میں ایک کمرے کی تنہائی میں اس روشنی میں یوں قید تھا جیسے وہ روشنی اپنا ایک مادی وجود رکھتی ہے۔ وہ روشنی میرے گرد ایک چمکیلے اور ٹھوس مادے کی طرح جمع ہو کے جم گئی تھی اور اس میں میرا جسم اس طرح نظر آتا تھا جیسے شفاف شیشے کے پیپر ویٹ میں رنگین پھول مقید دکھائی دیتے ہیں۔

"رابعہ!" میں نے چلا کے آواز دی۔ میرا مقصد اپنی تنہائی کے احساس کو شکست دینا تھا۔ "رابعہ... حوصلہ مت ہارنا... میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

میری بات کا جواب دیواروں کی خاموشی نے بھی نہیں دیا۔ مجھ پر واضح کر دیا گیا تھا کہ میرے اور رابعہ کے درمیان رابطہ ہے لیکن کنٹرول ان کا ہے۔ ان کی مرضی ہے کہ وہ جو چاہیں دکھائیں اور جو چاہیں سنائیں۔ رابعہ کو میری حالت دکھائیں اور مجھے اس کی آہ و بکا سنائیں۔ وقت ایک بارِ گراں بن گیا تھا۔

"رابعہ..." میں پھر چلایا۔ "مجھے اور تم کو ایک ہی بار مرنا ہے لیکن مرنے سے پہلے یہ شرمندگی نہ ہو کہ ہم ہار گئے۔ ہم دوستی کے نام کو رسوا کر گئے۔"

خاموشی... سناٹا... اکیلے پن کا آسیب اور اذیت۔ "تم سن رہی ہو نا... جب ہمیں کچھ معلوم ہی نہیں تو یہ ہم سے کیا پوچھیں گے۔" میں نے زیادہ اونچی آواز میں کہا۔ وقت مجھے شکست دینے لگا۔

"جواب دو مجھے رابعہ۔" سکوت کا ایک وقفہ۔

"رابعہ... میں تم سے محبت کرتا ہوں... تم جانتی ہو... سارا زمانہ جانتا ہے اور ساری خدائی جانتی ہے۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "زندگی کی آخری سانس تک... دل کی آخری دھڑکن تک میں یہ اقرار کرتا رہوں گا۔"

نہ جانے کون میرے تصور میں قہقہہ مار کے ہنسا۔ اس کی بے آواز ہنسی میرا تمسخر اڑا رہی تھی۔ یہ وقت تھا یا میری تقدیر تھی جو مجھ پر خندہ زن تھی۔ "تمہارے اعصاب جواب دے رہے ہیں سکندر بخت... تم پاگل ہو رہے ہو۔"

"یہ روشنی بجھا دو... ہٹا دو اس روشنی کو میرے سامنے سے۔" میں نے چیخ کر کہا اور خود کو آزاد کرنے کی بے سود کوشش کرنے لگا۔ "سنو... تم جو بھی ہو... دلاور... سؤر کے بچے... کمینے...... یہ لائٹ آف کر دو ورنہ میں تجھے قتل کر دوں گا... بیڈ رو... استاد کی اولاد... میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا... خسرو جمشید... نواب کے نطفے... تیری تو..."

روشنی پسے ہوئے شیشے کی طرح میری آنکھوں کو کھرچ رہی تھی۔ درد بن کے میرے دماغ کو مفلوج کر رہی تھی اور میرے جسم میں آگ بھر رہی تھی۔ میں پاگلوں کی طرح زور لگا رہا تھا اور دیوانہ وار جدوجہد کر رہا تھا لیکن اس روشنی سے مفر نہ تھا۔ میں اس روشنی میں ایسے پھنس گیا تھا جیسے گاڑھے سیمنٹ میں تنکا پھنس جائے اور وقت کے ساتھ ساتھ سیمنٹ سخت ہوتا جائے تو تنکے کے پر بھی ٹوٹ کر منجمد ہونے لگیں۔ میں چیخ رہا تھا اور چوہدری دلاور سمیت ان سب کو گالیاں دے رہا تھا جو میری اس حالت کا تماشا کہیں چھپ کر دیکھ رہے تھے یا میرے قریب ہی خاموش کھڑے تھے۔ بالآخر بے ہوشی مجھ پر سکون کا وقفہ بن کے نازل ہوئی۔

دوبارہ ہوش آیا تو میں پسینے میں تر تھا۔ وقت کا احساس تو پہلے ہی فنا ہو گیا تھا۔ اب مجھے بالکل معلوم نہ تھا کہ باہر کی دنیا میں دن ہے یا رات اور میں بے ہوشی سے پھر ہوش کی دنیا میں کتنی دیر کے بعد لوٹا ہوں۔ مجھے سخت نقاہت محسوس ہو رہی تھی۔ میری سانس بھی تیز تھی۔ تاہم وہ روشنی خاموش تھی جس نے مجھے بے بس کر رکھ دیا تھا۔

"تم کچھ سوچ رہے ہو سکندر بخت!" ایک اجنبی آواز نے اس اندھی خاموشی کو چیر دیا۔ میں اچھل پڑا... صرف محاورتاً ورنہ اچھلنا تو درکنار میں اپنی جگہ پر ہل بھی نہیں سکتا تھا۔

"کیا تم سوچ رہے ہو کہ تعاون کرنا تمہارے حق میں بہتر ہوگا؟" آواز نے کہا۔ وہ انگریزی میں بات کر رہا تھا مگر اس کا لہجہ بالکل صاف نہیں تھا۔ میں خاصے اعتماد سے انگریزی کے مرہٹی، گجراتی، بنگالی اور پنجابی یا مدراسی لہجے کو شناخت کر سکتا ہوں۔ مجھے مخاطب کرنے والا جنوبی ہندوستان سے تعلق رکھتا تھا۔ تامل، تیلگو یا ملیالم بولنے والوں کے خطے کا تلفظ سب سے جدا ہے۔

"میں جاننا چاہتا ہوں کہ تم کون ہو۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

"تم کو صرف جواب دینے ہیں۔ سوال ہم کریں گے۔" وہ بولا۔ "تم جواب میں کچھ بھی کہہ سکتے ہو۔ اس کے غلط یا صحیح ہونے کا پتا ہم خود چلا لیں گے۔"

"تم کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"

"ہم ترتیب وار سوالات کریں گے۔" یہ دوسری آواز تھی۔ غالباً کوئی بنگالی۔

"سکندر بخت، تمہارا دوسرا نام کیا ہے؟"

"مجھے بچپن میں کبیر خان بھی کہتے تھے۔ میرے والدین اور دوست۔"

"تم اپنا والد کسے سمجھتے ہو؟"

"صرف وزیر خان کو۔"

"مگر تمہیں معلوم ہے کہ وزیر خان نے صرف تمہاری پرورش کی تھی، ورنہ تم جنوبی ہندوستان کی ایک ریاست کے ولی عہد ہو۔"

"میں اس فضول بات کو نہیں مانتا... پیدائش کے وقت میں نے جس ماں کی گود میں آنکھ کھولی وہ وزیر خان کی بیوی تھی۔ اور جس شخص نے میرے کان میں اذان دی وہ وزیر خان تھا۔" میں نے کہا۔

"اس سے حقیقت تو نہیں بدلتی۔" مدراسی بولا۔

"اگر تم چاہو تو آج بھی اپنی ریاست میں لوٹ کر جا سکتے ہو۔" بنگالی نے کہا۔

"ہندوستان میں اب کون سی ریاست رہ گئی ہے۔"

"مگر ریاستوں کے انضمام کے وقت جو کچھ حکمرانوں کو ملا وہ تمہیں مل سکتا ہے۔" بنگالی نے کہا۔

"مجھے اس کی قطعی آرزو نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"ویری ویل... کیا تم وزیر خان کے وارث کی حیثیت سے اس کے کاروبار اور اثاثوں کو اپنی تحویل میں لینا پسند کرو گے؟" مدراسی بولا۔

"میں اس رشوت کو پہلے ہی ٹھکرا چکا ہوں۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔"

"مگر اسی حقِ وراثت کے لیے تم نے اپنے والد کے پارٹنر میر شرافت علی کو قتل کر دیا تھا۔"

"وہ ایک جھوٹا الزام تھا۔ مجھے اس قتل میں ملوث کیا گیا تھا۔"

"لیکن ابھی تک کسی عدالت نے تمہیں بے گناہ قرار نہیں دیا۔" بنگالی بولا۔

"میں جانتا ہوں کہ میں بے گناہ ہوں۔"

"صرف تمہارا جاننا کافی نہیں سکندر بخت... یہ قانونی معاملہ ہے۔" مدراسی نے کہا۔

"تم اپنے والد کا قاتل کسے سمجھتے ہو؟" بنگالی بولا۔

"کئی افراد کو... بہت سے لوگوں نے مل کر ان کے خلاف سازش کی تھی۔"

"میر شرافت علی کو تم نے قتل نہیں کیا تو پھر کس نے کیا تھا؟" مدراسی بولا۔

"اس کے دل میں خنجر اتارنے والا ہاتھ استاد پیڈرو کا تھا لیکن اس کے ہاتھ میں خنجر تھمانے والا چوہدری دلاور تھا۔" میں نے کہا۔

"تم نے ان دونوں سے قتل کا انتقام لینے کا ارادہ کیوں چھوڑ دیا؟"

"میرا انصاف خدا کرے گا۔" میں نے کہا جو ایک گول مول جواب تھا۔

"تم پرویز خان کے قتل کے اسباب کب واضح ہوئے تھے اور تمھارے خیال میں یہ اسباب کیا تھے؟" بنگالی نے پوچھا۔

"چوہدری دلاور کے ٹولے کا ناجائز کاروبار۔" میں نے کہا۔

"تم اس ناجائز کاروبار کے بارے میں کیا جانتے ہو؟"

"وہ اسلحہ بناتا اور اسمگل کرتا ہے۔" میں نے بے خوفی سے کہا۔

"اور یہ اسلحہ کہاں جاتا ہے؟"

"مشرقی بنگال کے تخریب کاروں اور علیحدگی پسندوں کو۔" یہ سب ایسے حقائق تھے جن کا اعتراف نہ کرنے سے مجھے کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا تھا۔

"گویا تم ہی سائیں پاپڑ والے کی خانقاہ کو تباہ کرنے کے ذمے دار ہو؟"

"وہ خانقاہ نہیں... تمھارا اسلحہ خانہ تھا۔" میں نے کہا۔

"تم سیوک رام... کرماں والی اور کرنل جگن ناتھ کے قتل کا اعتراف کرتے ہو؟" مدراسی نے کہا۔

"ہاں، وہ جاسوس اور غدار تھے اور اپنی زمین پر مجھے یہ حق حاصل ہے کہ میں ایسے لوگوں کے ناپاک وجود کو ختم کر دوں۔ مجھے موقع ملے تو میں تم کو بھی زندہ نہ چھوڑوں۔" میں نے کہا۔

"تم نے بہت سے اسلحے پر قبضہ بھی کر لیا تھا۔" بنگالی نے کہا۔

"ہاں... ہمیں اس کی ضرورت تھی۔"

"ہم کون؟ تمھارے ساتھی؟" بنگالی نے کہا۔

"کیا تم ان ساتھیوں کے نام گنوا سکتے ہو؟" مدراسی نے کہا۔

"تم سب کے نام جانتے ہو۔ پھر مجھ سے کیوں پوچھتے ہو؟"

"میں سوال دہراتا ہوں۔ کیا تم ان کے نام گنوا سکتے ہو؟"

"میں اپنی زبان سے کسی کا نام نہیں لوں گا۔"

مدراسی نے ایک ایک کر کے سب نام لیے۔ "تم سب نے تنظیم آزادیِ فلسطین، آئرش لبریشن آرمی کی طرز پر ایک دہشت گرد تنظیم ایم آر ایس کے نام سے بنائی تھی۔ یہ ایک مضحکہ خیز حرکت تھی۔"

"تم ایسا کہہ سکتے ہو۔"

"اگر تم کو آزاد کر دیا جائے تو کیا تم کوئی سمجھوتا قبول کرو گے؟"

"اور اگر قبول کرو گے تو اس کی شرائط کیا ہوں گی؟"

"تم نے ابھی ہماری تنظیم کو مضحکہ خیز قرار دیا تھا۔ اب اسی کے ایک نمائندے سے مصالحت کی پیش کش میں تم اتنے سنجیدہ ہو؟" میں نے کہا۔

"یہ ہو سکتا ہے کہ تم اور رابعہ لندن چلے جاؤ... محسن اور شہلا بھی تمھارے ساتھ رہیں تو کوئی حرج نہیں۔ تم کو رہائش اور معقول ملازمت کے ساتھ برطانوی شہریت مل جائے گی۔" بنگالی نے کہا۔ "پھر باقی سب لوگ اپنی پرانی زندگی کی طرف لوٹ جائیں گے استاد ٹیڈی، غالب اور نازو۔"

"میں ان شرائط کو مسترد کرتا ہوں۔"

"تمھیں ایسا ہی کرنا ہوگا۔" مدراسی بولا۔

"ہم سب کو باری باری رضامند کر لیں گے۔" بنگالی نے کہا۔

"پرویز وکرم کے گھر سے تمھیں کیا معلومات حاصل ہوئی تھیں؟ تم نے ایک بڑھیا کو وہاں جاسوسی کے لیے بھیجا تھا... وہ بڑھیا کون تھی؟" مدراسی نے کہا۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"کیا وہ رابعہ تھی؟" مدراسی نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

"وہ شہلا تھی۔" میں نے یہ سوچ کر کہا کہ سب سے زیادہ محفوظ وہی تھی۔ میں نے وہ سب کچھ بتا دیا جو ہمیں نازو کو وکرم فیملی کے گھر میں بھیج کر معلوم ہوا تھا۔ اس معلومات کی اب کوئی اہمیت نہیں رہی تھی۔ وہ لوگ اپنا پلان بدل چکے تھے اور میرے سچ بولنے سے وہ یقین کر سکتے تھے کہ جاسوس بن کے اندر پہنچنے والی عورت شہلا ہی تھی، نازو نہیں تھی۔

"نہیں، وہ رابعہ بھی نہیں تھی اور شہلا بھی نہیں تھی... تم جھوٹ بول رہے ہو۔" مدراسی بولا۔

"یہ تمھاری مرضی ہے کہ جسے چاہو جھوٹ مانو اور جسے چاہو سچ۔"

"تمھاری اس نام نہاد دہشت گرد تنظیم کے اغراض و مقاصد کیا ہیں۔ یہ تنظیم کب سے قائم ہے؟" مدراسی بولا۔

"مجھے یاد نہیں پڑتا کہ ہم نے اس کا نام کب ایم آر ایس رکھا تھا۔" میں نے کہا۔ "اغراض و مقاصد تمھیں معلوم ہیں۔"

"ایم آر ایس سے پہلے یہ تنظیم کیا تھی؟"

"وطن کے ناموس کی خاطر اور اس کی سرحدوں کی حفاظت کے لیے جان کی بازی لگانے والے چند دوست جو سرزمینِ پاکستان سے غداروں اور وطن فروشوں کا خاتمہ کرنے کا عہد کر چکے تھے۔" میں نے کہا۔

"اور اب اس کی قوت کیا ہے؟"

"وہی اتحاد، یقین محکم اور تنظیم کے اصول۔ خلوص نیت۔ خدا پر بھروسا اور سرفروشی کا جذبہ۔" میں نے کہا۔

"اس جملے میں صرف خوب صورت الفاظ ہیں... میں مادی قوت کی بات کر رہا تھا۔" مدراسی نے کہا۔ "تمھاری اس تنظیم کے حروف 'ایم آر ایس' سے کیا بنتا ہے۔"

اگر میں سچ بولتا تو یہ جواب نہایت مضحکہ خیز ہوتا کیونکہ ایم آر ایس سے کوئی تنظیم ہی نہ تھی۔ یہ تو درحقیقت ہمارے ایک جذبے کا نام تھا۔ ایک عہد اور ایک مشن کا نام تھا جس میں سب برابر کے شریک تھے مگر مذاق میں ہم نے محسن، رابعہ اور سکندر کے ناموں کے ابتدائی حروف لے کر ایک نام گھڑ لیا تھا جو پی ایل او کی طرح بہت بھاری بھرکم اور متاثر کرنے والا لگتا تھا۔ اس کے ابتدائی ارکان ہم تھے۔ سب سے پہلے شکاری مجھے گھیر کر لائے تھے۔ محسن میرے ساتھ تھا اور پہلی مدد رابعہ نے کی تھی۔ اس کے بعد ہمارا ساتھ دینے والے استاد ٹیڈی... شہلا... نازو اور غالب کسی طرح بھی ہم سے کم اہم نہ تھے مگر وہ نام زبان پر ایسا چڑھا تھا کہ ہم اپنی اجتماعی قوت کو ایم آر ایس کہنے لگے تھے۔ یہ بالکل ایسی ہی بات تھی جیسے عظیم موجد اور سائنس داں رانجن کو جب اپنی دریافت کردہ پُراسرار شعاعوں کا کوئی نام نہ سوجھا تو اس نے انھیں ایکس رے کہنا شروع کر دیا جو آج تک ایسے ہی چل رہا ہے۔ اب ایک سنگین صورتِ حال میں اس سوال کا جواب دینا مشکل ہو گیا۔

مدراسی نے کہا "کیا تم نے سوال نہیں سنا؟"

میں نے کہا "ایم آر ایس کا مطلب ہوتا ہے۔ مدر لینڈ ریفارم سوسائٹی۔"

مدراسی نے کہا "ریفارم؟ گویا تم جو کچھ کر رہے ہو، یہ اصلاح ہے؟"

"ہاں سارو، میں تم اسے تنظیم اصلاحِ وطن کہہ سکتے ہو۔"

مدراسی بولا "تم نے اصلاح کا کون سا کام کیا ہے؟"

میں نے کہا "اصلاح کے لیے ہی سب کچھ ہے۔ سب سے پہلے دشمنوں کی اصلاح۔ ان کے دماغ کی اصلاح۔ نیت کی اصلاح پھر وطن پرستوں کی نگاہ کی اصلاح جو دشمنوں کو نہیں پہچانتی۔ ان کے جذبۂ ایمان و اتحاد کی اصلاح۔"

"ایم آر ایس کا صدر دفتر کہاں ہے؟" مدراسی نے میری دلیل سے قائل ہو کے کہا۔

میں نے کہا "جہاں ہم سب ہوں وہی صدر دفتر ہے۔"

"ہم سب سے تمھاری مراد ہائی کمان سے ہے؟" مدراسی بولا۔

میں نے کہا "ہائی کمان؟"

مدراسی بولا "ہاں... تم اور محسن... غالب اور ٹیڈی... رابعہ، شہلا اور نازو۔ یہ سات افراد ایم آر ایس کو کنٹرول کرتے تھے؟"

"تھے کا کیا مطلب؟"

مدراسی بولا "مطلب یہ کہ اب تم سات نہیں رہے اور تم خود اب کچھ بھی نہیں ہو۔ تم ایم آر ایس کو کیسے کنٹرول کرو گے جبکہ تم خود ہمارے کنٹرول میں ہو۔"

میں نے کہا "ایم آر ایس افراد کا نام نہیں ہے۔ یہ ایک قوت کا... ایک جذبے کا اور ایک تحریک کا نام ہے۔ اس میں ہم سات کیا ہیں۔ تم دیکھو گے کہ اس میں ملک کے سات کروڑ عوام شامل ہیں۔"

"سوائے ہم غداروں کے۔" بنگالی بہت دیر بعد غصے سے بولا۔ "تم یہی کہو گے۔"

"تم سچ کو خود قبول نہیں کر رہے ہو۔ سچ تم پر غالب ہے اور تم اس کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو۔" میں نے کہا۔

"سات کروڑ عوام میں سے تمھارے ساتھ عملاً کتنے لوگ شامل تھے۔" مدراسی نے کہا۔ "جو تمھاری تخریبی کارروائیوں میں تمھارا ساتھ دیتے تھے۔"

"میں تمھارا مطلب نہیں سمجھا۔"

"ایم آر ایس کے ارکان کی مجموعی تعداد کیا ہے؟"

"سات کروڑ۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"ایم آر ایس کی باقاعدہ رکنیت حاصل کرنے والے کتنے ہیں؟ ان کے صوبائی ڈویژن اور ڈسٹرکٹ... اور شہر کی سطح پر کون سربراہ ہیں؟ کس کس شہر میں تمھارے دفاتر ہیں اور کہاں واقع ہیں۔ ان کے اجلاس کب ہوتے ہیں۔ انھیں کون بریف کرتا ہے تربیت کون دیتا ہے؟"

"یہ کیا فضول بکواس ہے۔" میں نے کہا۔

"تم کو ابھی ایک سوالنامہ دیا جائے گا۔" مدراسی متاثر ہوئے بغیر بولا۔

"اور اس میں یہی سوالات ہوں گے...؟"

"اس میں اور بھی بہت کچھ پوچھا جائے گا... نام پتے... سب کی کارگزاری... یہ کہ کس کے پاس کتنا اسلحہ ہے اور کس قسم کا اسلحہ ہے۔ یہ اسلحہ کس طرح حاصل کیا گیا۔ کس کس نے ایم آر ایس کو سرمایہ فراہم کیا... کیا تمھاری تنظیم کو غیر سرکاری طور پر حکومت کی فوجی یا نیم فوجی تنظیموں کا تعاون حاصل ہے اور یہ کہ مشرقی بنگال اور بھارت میں تمھارے کتنے تربیت یافتہ ایجنٹ کہاں کہاں پھیلے ہوئے ہیں ان سب کے نام اور ٹھکانے..."

"تم غلط سمجھ رہے ہو۔" میں نے بوکھلا کے کہا۔ "تنظیم میں وہی سات آٹھ افراد شامل ہیں جن کو تم نے خود ہائی کمان سمجھ لیا ہے۔ بے شک، ہمیں بہت سے دوسرے لوگوں کا تعاون بھی حاصل رہا اور اکثر غیر متعلقہ افراد نے ہماری مدد کی ہے... مگر وہ ایم آر ایس کے نام سے بھی واقف نہ تھے۔"

"تم سمجھتے ہو کہ ہم اس بے سروپا بات پر یقین کر لیں گے تو یہ تمھاری بھول ہے۔" مدراسی نے کہا۔ "ایم آر ایس ایک تنظیم ہے اور تمھارے اپنے کہنے کے مطابق یہ صوبائی یا مقامی تنظیم نہیں ہے۔ ایک قومی تنظیم ہے جسے ملک کی سات کروڑ آبادی کا تعاون حاصل ہے۔ غالباً تمھاری مراد مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان میں اپنے حامیوں سے ہوگی۔"

بنگالی ہنسنے لگا۔ "تم سمجھتا ہے اِدھر سب تمھارا ساتھی لوگ ہے؟ تم سب پاکستان کا آبادی میں سات کروڑ کو اپنے ساتھ مانتا... تم بے وقوف ہے۔ اِدھر سب ایسا بات بولتا۔ امارا بنگلہ دیش میں سب تمھارا دشمن ہے۔" بنگالی نے نہ جانے کیوں انگریزی بولتے بولتے اُردو کی ٹانگ توڑنا شروع کر دی۔ اس غدار کی زبان سے یہ کوئی نئی اور انوکھی بات نہیں تھی۔ علیحدگی پسندی کے رجحانات رکھنے والے ایسی ہی باتیں کر رہے تھے اور ان کے سستے جذباتی نعرے مشرقی پاکستان کے سیدھے سادے مسلمانوں کو گمراہ کر رہے تھے۔ یہ وہی مسلمان تھے جنھوں نے تقسیم کے وقت مسلمانوں کے علیحدہ وطن کی خاطر خون کی قربانی دینے سے بھی دریغ نہیں کیا تھا۔ آج یہ کیسے ممکن تھا کہ وہی مسلمان اپنے مغربی حصے کے بھائیوں سے الگ وطن کا مطالبہ کرنے لگتے۔ انھیں غلط اعداد و شمار سے... سیاسی چالبازیوں سے اور بے بنیاد مگر مسلسل پروپیگنڈے سے یہ تاثر دیا جا رہا تھا کہ ان کا استحصال ہو رہا ہے۔ سنہرے ریشے کی سرزمین کی تمام آمدنی کو مغربی حصے کی خوشحالی پر صرف کیا جا رہا ہے اور ان کے حصے میں بھوک اور سیلاب کی تباہ کاری۔ فاقہ کشی اور بے روزگاری کے سوا کچھ نہیں آ رہا ہے۔

چھ نکاتی پروگرام کو ایک منظم سازش کے تحت بنگال کے عوام کا نعرہ بنایا جا رہا تھا حالانکہ ان سچے پاکستانیوں کے دل سے وہی پاکستان زندہ باد کی صدا نکلتی تھی مگر یہ عالمی سیاست کے شعبدہ گروں کا کمال تھا کہ وہ اسی آواز کو بدل کے نکال رہے تھے۔

"میں مکرجی... آئی مین یہ جو کچھ اِنھوں نے کہا۔" مدراسی نے غیر ارادی طور پر منہ سے نکل جانے والے نام پر خفت سے کہا۔ "سوال یہ نہیں کہ پاکستان کے دونوں حصوں کی مجموعی آبادی میں سے سات کروڑ تمھارے ساتھ ہیں یا آٹھ کروڑ۔ میرا مقصد تھا کہ تم پہلے مغربی پاکستان کے بارے میں بتاؤ۔ یہاں تمھاری تنظیم کہاں تک پھیلی ہوئی ہے۔ پشاور سے کراچی تک تمھارے کتنے ایجنٹ ہیں؟"

"کیا تم پاگل ہو گئے ہو۔" میں نے کہا۔ "اس تنظیم میں جو کچھ ہیں ہم ہیں اور کوئی نہیں۔"

"جیسا کہ میں نے پہلے کہا، ہم ایسی مضحکہ خیز بات پر یقین نہیں کر سکتے، ایم آر ایس صرف سات ارکان پر مشتمل ہے۔" مدراسی بولا، جو اپنے لہجے اور اعتماد کے باعث تفتیشی ٹیم کا سربراہ لگتا تھا۔ "چار مرد اور تین عورتیں مل کر کوئی دہشت گرد تنظیم نہیں بنتے۔ تمھاری پُشت پناہی یقیناً کسی کا سرمایہ کر رہا ہوگا۔ کوئی سیاسی جماعت تمھارے پیچھے ہوگی جو تم کو اسلحہ اور وسائل فراہم کرتی ہوگی۔ تمھاری عملی مدد کرنے والے ہر جگہ ہوں گے جو سامنے آئے بغیر تمھارے لیے بہت کچھ کرتے ہوں گے۔ ہم نے دنیا بھر کی دہشت پسند تنظیموں کی نظریاتی اساس... طریقِ کار اور کارکردگی۔ نیچے سے اوپر تک کے تنظیمی ڈھانچے کی ساخت... عوامی سطح پر اس کے فعال ہونے کے اسباب اور عالمی سطح پر ان کے روابط کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ مجھے پہلے یہاں تمھاری تنظیم کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کر کے ایک تفصیلی رپورٹ مرتب کرنا ہے۔ اس کے بعد یہ دیکھا جائے گا کہ بھارت میں اور مشرقی بنگال میں تمھاری پوزیشن کیا ہے۔"

میں نے محسوس کیا کہ مدراسی کی سوچ غلط نہیں لیکن ہمارے معاملے میں وہ ایم آر ایس کا موازنہ پی ایل او کے تنظیمی ڈھانچے، روابط اور وسائل سے کر رہا تھا تو اس کے اسباب تھے۔ یہاں ہم نے انھیں بہت نقصان پہنچایا تھا جو غداروں سے مل کر ملک کے دو ٹکڑے کرنے کی سازش میں شریک ہو گئے تھے اور پیسے کی خاطر بک گئے تھے۔ مشرقی بنگال میں بھی حب الوطن عوام کے ہاتھوں علیحدگی پسندوں کو اور ان کے حامیوں کو برابر نقصان ہو رہا تھا۔ چنانچہ مدراسی نے فرض کر لیا تھا کہ ہمارا ان سے رابطہ ہے اور ہم ملک گیر سطح پر منظم ہو کے مزاحمت کی تحریک چلا رہے ہیں۔

"ابھی میں تم کو ایک سوال نامہ دوں گا۔" مدراسی نے کہا، "تمھارے پاس پوری رات ہوگی۔ ایسا ہی سوال نامہ تمھارے تمام ساتھیوں کو الگ الگ دیا جائے گا۔ اس سوالنامے کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں ساٹھ سوال ہیں جن کے جواب بہت مختصر ہیں۔ ہاں یا نہیں۔ دوسرے حصے میں تمھیں سوچ کر وہ سب لکھنا ہوگا جو تم جانتے ہو۔"

"دیکھو... تم شدید غلط فہمی کا شکار ہو..."

"آج کی رات سوچو اور آرام کرو۔" وہ میری بات کاٹ کے بولا۔ "کل صبح دس بجے تک تم جوابات تحریر کر دوگے۔"

"میرے پاس نہ کچھ بتانے کو ہے اور نہ لکھنے کو۔" میں نے چلّا کر کہا مگر وہ اسپیکر بند ہو گیا تھا جس کے ذریعے میں ان کی آواز سُن رہا تھا۔ کمرے میں ایک مدھم سی روشنی کچھ تیز ہوئی اور پھر وہی دونوں اندر آ گئے جنھوں نے مجھے کرسی کے ساتھ باندھا تھا۔ انھوں نے مجھے کھولا اور کھڑا کر دیا۔ میں تھوڑا سا لڑکھڑایا کیونکہ اتنی دیر تک بندھے رہنے کے بعد میرے ہاتھوں اور پیروں کے رگ پٹھے اکڑ گئے تھے۔ انھوں نے مجھے دھکیلا تو میں چل پڑا۔ بے اختیار میری نگاہ اس شیشے کے دروازے کے پیچھے گئی جہاں میں نے رابعہ کو دیکھا تھا۔ تھوڑی سی روشنی وہاں پہنچ رہی تھی لیکن وہاں اب کوئی نہیں تھا۔ میرے دونوں محافظ مجھے اس عذاب گاہ سے نکال کے ایک خواب گاہ میں لے گئے۔

خواب گاہ سات فٹ لمبے چوڑے اور اونچے کمرے یا کوٹھری کا نام تھا جس کی چاروں دیواریں ایک جیسی سپاٹ اور مضبوط تھیں۔ دیواروں پر رسماً چونے کی کوچی پھیر دی گئی تھی تاکہ پلستر کا سیاہ رنگ ے روشن ہو جائے۔ اوپر چھت بھی ایک دیوار ہی محسوس ہوتی تھی جو میرے اور آزادی کے درمیان حائل تھی۔ جو میری زمین کو آسمان سے جدا کرتی تھی اور مجھے محبوس ہونے کا احساس دلاتی تھی۔ میرا ذہن اُسے چھت نہیں مانتا تھا۔ گھروں کی چھت بہت بلند اور بہت مہربان ہوتی ہے۔ آدمی گھر کی دیواروں کو چھو سکتا ہے مگر چھت کو آسمان کے نیچے ایک اور سائبان کی پناہ کے طور پر دیکھ سکتا ہے یا محسوس کر سکتا ہے۔ اس چھت کو میں اپنے ہاتھوں سے چھو سکتا تھا اور اس کی سختی کو اور بے رحمی کو محسوس کر سکتا تھا۔ دیواروں کے اوپر والے ایک جوڑ پر ٹیوب لائٹ کی تیز روشنی تھی جس کے تار پیچھے والے روشندان سے گزر کے باہر جا رہے تھے۔ روشندان کی لمبائی دو فٹ اور چوڑائی آٹھ انچ کے قریب تھی۔ ٹیوب لائٹ اس کی چوڑائی کو دو حصوں میں تقسیم کرتی تھی اور لمبائی کے رُخ پورے روشندان پر پھیلی ہوئی تھی۔ دو فٹ کی ٹیوب لائٹ کا اُجالا اس کمرے کے لیے کافی تھا۔

روشندان میں کوئی سلاخ یا جالی نہیں تھی۔ اس کے سامنے ٹیوب لائٹ کی رکاوٹ ضرور تھی، اگر میں اسے توڑ دیتا تب بھی آٹھ انچ کی چوڑائی سے نہیں گزر سکتا تھا۔ روشندان سے ہی مجھے اندازہ ہوا کہ دیواریں چھ انچ موٹی ہیں۔ میرے پاس ایک کیل بھی ہوتی تو میں چنائی سے ایک اینٹ الگ کر دیتا اور رات بھر میں دیوار کے شگاف سے نکل جاتا لیکن میرا سارا اثاثہ ایک ریوالور تھا جسے میں باہر نکالنے سے گریز کرتا آیا تھا اور منتظر تھا کہ اس کے استعمال کا مناسب وقت آئے۔ شاید وہ وقت کبھی نہیں آئے گا اور جب آئے گا تو ریوالور مجھ سے چھینا جا چکا ہوگا۔ میں نے مایوسی کی کیفیت میں سوچا۔ فرش پر ایک بستر بچھا ہوا تھا۔ بستر صاف اور آرام دہ تھا۔ اس کے تکیے پر ایک قلم اور ایک کاپی رکھی ہوئی تھی ــــ کاپی بتیس صفحات والی تھی جو شاید چار آنے میں ملتی تھی۔ اسے کھول کر دیکھے بغیر میں نے جان لیا کہ یہی وہ سوالنامہ ہے جس کے جواب مجھے صبح دس بجے تک تحریر کرنے ہوں گے۔ اگر میں نے جوابات نہ دیے تو کیا ہوگا؟ غلط جوابات دیے تو کیا ہوگا اور بالفرضِ محال سب کے صحیح جوابات لکھ دیے تو کیا ہوگا؟ یہ اضافی سوالات میرے ذہن میں تھے مگر ان کا کوئی جواب میرے پاس نہیں تھا۔

بستر پر بیٹھ کے میں نے چشمِ تصور سے رابعہ کو اور پھر محسن کو دیکھا جو شاید ایسے ہی ڈربوں میں بستر پر بیٹھے سوالنامے کو گھور رہے ہوں گے اور ان کا خون کھول رہا ہوگا لیکن بے بس آدمی کا خون کھولتا ہے تو جلتا ہے۔ وہ بھی اسی مشکل کا شکار ہوں گے کہ کیا کریں۔ قلم توڑ دیں۔ سوالنامے کو پھاڑ دیں یا جوابات پر غور کریں۔ جو سوالات میرے ذہن میں تھے وہی ان کے ذہن میں انتشار پیدا کر رہے ہوں گے۔ آزمائش کے مرحلے سب کے لیے ایک سے تھے۔

اچانک دروازے کے قفل نے باہر سے کسی کے آنے کی خبر دی۔ پھر درِ زنداں کھلا اور ایس پی سراج اندر آ گیا۔ اس کے لبوں پر وہی کمینے پن کی مسکراہٹ تھی جو اس کی فطرت کی خباثت کو ظاہر کرتی تھی۔ پیچھے ایک ملازم ٹائپ آدمی تھا جس نے ٹرے اٹھا رکھی تھی۔ ٹرے میں میرے لیے کھانا لایا گیا تھا۔ اس کے اشارے پر ملازم نے ٹرے نیچے رکھ دی۔

"اسے لے جاؤ۔" میں نے کہا۔ "مجھے بھوک نہیں ہے۔ ویسے بھی میں کسی دشمن کا نمک نہیں کھا سکتا۔"

سراج نے قہقہہ مارا۔ "وہ کیا فرما گئے ہیں اپنے علامہ صاحب کہ اس رزق سے موت اچھی جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی۔ مائی ڈیئر طائر لاہوتی، جو مل رہا ہے کھا لو۔ کیا معلوم یہ تمھارا آخری طعام ہو۔ پیٹ خالی ہے تو دماغ بھی خالی رہتا ہے اور تم کو دماغ کا بہت استعمال کرنا ہے۔"

میں نے ٹرے پر نظر ڈالی۔ اس میں روٹی کے ساتھ چاول تھے۔ بُھنا ہوا گوشت تھا اور تھوڑا سا حلوا تھا۔ میں نے سراج کے سامنے ایک ڈینگ تو ماری تھی مگر حقیقت کو جھٹلانا ناممکن تھا۔ بھوک آدمی کی سب سے بڑی دشمن ہے یا اس کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ بھوک نے آدم کو جنت سے نکلوایا۔ بھوک نے معاشی جدّوجہد کو جنم دیا۔ غلامی بھی معاشی جدّوجہد ہے۔ عصمت فروشی بھی اور چوری ڈکیتی بھی۔ بھوک نے ہی انسان کو یہ تسلیم کرنے پر مجبور کیا کہ اس میں اور ایک حیوان میں کوئی فرق نہیں۔ آخر میں کب تک نہیں کھاؤں گا۔ میں نے سوچا۔ فاقہ کشی کا مجھے کوئی تجربہ نہ تھا۔ میں نے تو کبھی شوقیہ بھی بھوک ہڑتال نہیں کی تھی۔ ذہن اب میرے جذبات پر عقل کا دباؤ ڈال رہا تھا اور وہ دلائل دے رہا تھا جن کی نفی نہیں کی جا سکتی تھی۔ نہ جانے اس قید میں کب تک رہنا پڑے۔ جسم بھی اذیت اسی وقت برداشت کر سکتا ہے جب اس میں قوت ہو۔ سختی جھیلنے اور مظالم برداشت کرنے کے لیے مجھے توانائی چاہیے۔ ناتوانی میں تو حوصلہ بھی جواب دے جاتا ہے۔ پھر دشمن کے نمک کا کیا سوال۔ نمک حرام تو یہ شیطانی ٹولہ تھا۔ میں اپنے وطن کی مٹی سے اُگنے والی گندم کی روٹی پر حق رکھتا ہوں۔ اسے میں خود کیوں اپنے لیے شجرِ ممنوعہ بناؤں۔ یہ سب کچھ حرام ہونا چاہیے ان کے لیے جو وطن فروش ہیں۔ ان کو واقعی حق نہیں پہنچتا کہ اس وطن کی کسی بھی نعمت کو اپنا کہیں۔

"ڈرو مت۔" سراج طنزیہ لہجے میں بولا۔ "اس میں زہر نہیں ہے۔"

"اگر تمھارے بس کی بات ہوتی تو تم مجھے صرف زہر ہی کھانے کو دیتے۔" میں نے کہا۔ "میں بے بس ہوں، تم بھی بے بس ہو کہ مجھے مار نہیں سکتے۔"

"مار دینا تو بہت آسان کام ہے۔ مارنا اور مرنے نہ دینا، یہ ذرا مشکل پڑتا ہے۔" وہ بولا۔ "میں تمھیں مار دیتا تو تمھاری جان دنیا کے سارے بکھیڑوں سے چھوٹ جاتی۔ یہ مختلف لوگ ہیں۔ یہ اتنی آسانی سے جان نہیں چھوڑیں گے۔ تم نے یہ سوالنامہ دیکھا؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "اگر تم کچھ کرنا ہی چاہتے ہو تو ایک کام کرو۔"

"کیسا کام؟" وہ حیران ہو کے بولا۔

"میں ڈنر کے بعد سو جاتا ہوں۔ تم یہ سوالنامہ پڑھ کے مناسب جوابات لکھ دو۔" میں نے کہا۔ "سوالات مرتّب کرنے میں تم نے ضرور مدد کی ہوگی۔ زیادہ تر معلومات ایسی ہوں گی کہ تم میری جگہ جواب دے سکتے ہو۔"

"ماشاء اللہ طبیعت کی ظرافت ابھی باقی ہے۔" وہ بولا۔ "ابھی کچھ ہوا نہیں نا۔ کل رات مزاج پوچھیں گے اور دیکھیں گے، زبان سے پھول جھڑتے ہیں یا کانٹے۔ ٹرے میں یہ تھرماس کافی کا ہے۔ سگریٹ میں ابھی بھجواتا ہوں، جو شخص برتن اُٹھانے آئے گا وہی سگریٹ بھی لائے گا۔ اور کسی چیز کی ضرورت پڑے تو دروازہ بجا دینا۔ باہر دو مسلّح محافظ تمھاری خدمت کے لیے ہی کھڑے کیے گئے ہیں۔"

"کیا میں انھیں قتل کر کے فرار ہو جاؤں؟" میں نے کہا۔

"کوشش کر کے دیکھ لو۔" سراج جاتے جاتے بولا۔ "تمھاری جگہ میں ہوتا تو میں بھی کوشش ضرور کرتا۔ دوسرا راستہ روشندان کا بھی ہے تم سمٹ کر بلّی کے برابر ہو جاؤ تو اِدھر سے نکل سکتے ہو۔"

جب وہ چلا گیا تو مجھے یہ جان کے بہت افسوس ہوا اور بہت شرم آئی کہ میں کھانے کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا ہوں۔ کوئی بات نہیں۔ میں نے ٹرے کو اپنی طرف کھسکاتے ہوئے کہا۔ جیسے نیند سُولی پر بھی آجاتی ہے، ایسے ہی بھوک شاید قبر میں بھی لگتی ہوگی۔ آدمی بہت کمزور، بے بس اور مجبور ہے۔ خطا کا پُتلا ہے اور وہ ہے، پانی کا بُلبلا وغیرہ۔ اس قسم کے دلائل ختم ہونے سے پہلے کھانا ختم ہو گیا اور میں نے کافی کا تھرماس خالی کرتے ہوئے ریوالور استعمال کرنے کے امکانات کا جائزہ لیا۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ جب وہ ملازم برتن اٹھانے کے لیے اندر آئے تو میں اسے زد پر رکھ لوں اور کہوں کہ راستہ چھوڑ دو ورنہ میں اسے گولی مار دوں گا... نہیں...... وہ کہے گا کہ مار دو۔ ایک ملازم کی جان بے قیمت ہوتی ہے اور ایک آقا کی مرضی پر دس غلام قربان کرنے کی روایت پرانی ہے۔ تجویز نمبر دو... کیا یہ ہو سکتا ہے کہ میں اس ملازم کی ٹھکائی لگاؤں اور جب وہ واویلا کرے تو خود بھی اس کے ساتھ شور مچاؤں۔ فوراً کوئی مسلّح محافظ مشین گن کے ساتھ اندر آجائے اور میں اسے گولی مار کے اس کی مشین گن پر قبضہ کر لوں... تو... وہ اکیلا نہیں آئے گا۔ ایک اندر آئے گا تو دوسرا پیچھے موجود رہے گا اور وہ دونوں بہرحال اتنے احمق نہیں ہوں گے کہ مجھے مشین گن پر اتنی آسانی سے قبضہ کرنے دیں۔ انھیں یہ بتا دیا گیا ہوگا کہ میں کیا کر سکتے ہیں اور انھیں ہر مشکل صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے واضح ہدایات دے دی گئی ہوں گی۔

ملازم اندر آیا اور ٹرے اُٹھانے لگا تو میں نے اُسے ڈانٹ کر کہا۔ "کیا تم سگریٹ لانا بھول گئے ہو؟"

اس نے معذرت خواہانہ نظروں سے میری طرف دیکھا اور جیب میں سے سگریٹ کا پیکٹ اور ماچس نکال کے مجھے پکڑا دیں۔

"یہ کیا ہے؟ گولڈ لیف؟" میں نے کہا۔ "میں تھری کاسل پیتا ہوں۔" ملازم نے میری فضول بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

"سنو، کیا تم مجھے یہاں سے فرار ہونے میں مدد دے سکتے ہو؟" میں نے سرگوشی میں کہا۔ "میں تم کو پانچ روپے انعام دوں گا۔"

ملازم نے بدحواسی میں اِدھر اُدھر دیکھا۔

"چلو چھوڑو، یہ بتاؤ کہ تم باہر کھڑے ہوئے دونوں محافظوں کو گولی مار سکتے ہو؟" میں نے کہا۔ "ریوالور میں فراہم کر دوں گا۔"

ملازم نے پھر ٹرے کو اٹھانا چاہا جس کو میں نے پکڑ رکھا تھا۔

"اچھا میرے ماموں کو پیغام تو پہنچا سکتے ہو کہ میں یہاں قید ہوں۔" میں نے کہا۔ "وہ مال روڈ سے بھنگیوں کی توپ لے کر آجائے گا اور ایک گولا چلائے گا تو سب کو بدر روح بنا دے گا۔ وہ بہت بہادر ہے... دلاور سے بھی زیادہ..."

باہر سے ایک محافظ نے میری توقع کے مطابق اندر جھانک کر یہ دیکھا کہ برتن اٹھانے والا اتنی دیر سے کیا کر رہا ہے۔

میں نے ملازم کے ایک جھانپڑ مارا۔ "اتنی دیر سے میں اکیلا ہی بولتا جا رہا ہوں... منہ میں زبان نہیں ہے یا ماں نے بولنا نہیں سکھایا؟"

ملازم چلّانے لگا "ہائے مر گیا جی... اللہ میری توبہ۔" اور میں نے اسے گردن سے دبوچ لیا۔ ایک بار پھر وہی ہوا جس کی مجھے امید تھی۔ مشین گن والا محافظ اندر آگیا۔ اس کے بالکل پیچھے دو قدم سے دوسرے محافظ نے بھی اپنی مشین گن کا رُخ میری طرف کر دیا۔ ملازم ٹرے اٹھا کے بھاگا۔

"سب سالے گونگے ہیں یہاں۔" میں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا اور سگریٹ جلا لی۔ دونوں محافظ لوٹ گئے اور دروازہ باہر سے مقفّل ہو گیا۔

تو گویا فرار ہونے کے امکانات صفر فیصد۔ میں نے اس تجربے سے حاصل ہونے والے نتائج کی روشنی میں سوچا... کہیں سے غیبی امداد پہنچنے کے امکانات صفر فیصد... بہادری سے مقابلہ کر کے نکل جانے کے امکانات صفر فیصد... مجموعہ صفر فیصد... ان حالات میں سوالنامے کا مطالعہ کرنے کے سوا کیا

سکتا تھا۔ میں نے اسے کھول کر دیکھا۔ اس کے پہلے حصّے کے سوالات چھ صفحات پر پھیلے ہوئے تھے۔ دوسرے حصّے کے دس سوالات ساتویں صفحے پر درج تھے اور باقی پچیس صفحات سادہ چھوڑ دیے گئے تھے کہ میں جتنا زورِ قلم صرف کرنا چاہوں کر دوں۔ میں بہت لائق طالب علم تھا اور سالانہ امتحانات میں پرچا حل کرتے ہوئے زیادہ سے زیادہ صفحات کالے کرنے کی پوری کوشش کرتا تھا۔ جہاں دوسرے ایک امتحانی کاپی سے کام چلا لیتے تھے، وہاں میں دو یا تین کاپیاں بھرتا تھا اور بہت خوش ہوتا تھا کہ دوسروں سے دوگنا یا تین گُنا قابل ہوں مگر مجھ سے زیادہ لائق لڑکے ایک امتحانی کاپی بھر کے زیادہ نمبر لے جاتے تھے۔

آج پھر ایک امتحان درپیش تھا۔ کاش مجھے معلوم ہو سکتا کہ دوسرے کیا کر رہے ہیں۔ ان کا ذہنی ردِّعمل کیا ہے۔ اگر میں ان سے مشورہ کر سکتا تو ہم مشترک لائحہ عمل اختیار کر سکتے تھے لیکن دشمن نے یہی تو چال چلی تھی۔ ہمارے جوابات سے جھوٹ سچ الگ ہو جائے گا۔ ویسے مجھے پوری امید تھی کہ ممن اور رابعہ بھی وہی کریں گے جو میں کروں گا... میں کیا کروں گا۔ یہ میں نے ابھی طے نہیں کیا تھا۔ کیتھرین بیچاری کی معلومات تو نہ ہونے کے برابر تھیں اور اس کے لیے سوالنامہ شاید عبرانی زبان میں ہوتا تب بھی اتنا ہی ناقابلِ فہم ہوتا۔ وہ اردو بول لیتی تھی مگر لکھ پڑھ نہیں سکتی تھی۔

حصّہ اوّل کے سوالات تاریخ کا حصّہ تھے اور میرے لندن میں قیام کے زمانے سے شروع ہوتے تھے۔ لندن میں مجھے وزیر خان کے خطوط ملتے تھے؟ کیا خطوط میں اس نے دلاور کا ذکر کیا تھا؟ کبھی بتایا تھا کہ دلاور کون ہے؟ پیڈرو کون ہے اور میر شرافت علی کون ہے؟ اس نے کاروبار سے اپنی علیحدگی کا ذکر کیا تھا؟ کبھی یہ بتایا تھا کہ اس کے کاروبار پر غاصبانہ قبضہ ہو چکا ہے؟ کبھی یہ لکھا تھا کہ اب وہاں ناجائز کاروبار ہوتا ہے؟ پھر سوالات پاکستان میں قیام کے بعد کے حالات سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں وہ سب کچھ پوچھا گیا تھا جو ہم کر چکے تھے۔ ان کے جواب ہاں یا نہیں میں دیے جا سکتے تھے۔

دوسرے حصّے کے سوالات زیادہ مشکل تھے اور کچھ یوں تھے کہ:

1 :- ایم آر ایس کے اغراض و مقاصد کیا ہیں؟

2 :- ایم آر ایس کے ارکان کی مجموعی تعداد کیا ہے؟ ان میں کتنے عہدیدار ہیں اور ان کے فرائض کیا ہیں؟ کس صوبے میں کتنی شاخیں ہیں؟ بڑے بڑے شہروں میں ان کے ٹھکانے کہاں ہیں اور ان کو ہدایات کون جاری کرتا ہے؟

3 :- ایم آر ایس کی عسکری قوّت کیا ہے؟ اسے کتنے سابقہ فوجیوں کا اور کمانڈوز کا تعاون حاصل ہے؟ انھیں خدمات کا کیا معاوضہ دیا جاتا ہے اور یہ لوگ کیا خدمت سرانجام دیتے ہیں؟

4 :- ایم آر ایس کے مالی وسائل کیا ہیں؟ مجموعی اثاثے کتنے ہیں اور کہاں کہاں پھیلے ہوئے ہیں۔

5 :- ایم آر ایس کے پاس اسلحہ کتنا ہے اور کہاں سے آتا ہے؟

6 :- ایم آر ایس کا رابطہ ملک کی کس سیاسی جماعت سے ہے اور کس کس جماعت نے ایم آر ایس کو حمایت کی پیش کش کی ہے؟

7 :- بلاواسطہ یا بالواسطہ طور پر ایم آر ایس کو کس سُپر پاور کی پشت پناہی حاصل ہے؟

8 :- ایم آر ایس نے اب تک تخریب کاری کی کتنی وارداتیں کی ہیں اور ان میں کتنا مالی یا جانی نقصان کیا ہے یا اٹھایا ہے؟

9 :- بھارت اور مشرقی بنگال کے کن افراد... تنظیموں... سیاسی جماعتوں یا اداروں سے ایم آر ایس کو سیاسی اور نظریاتی بنیادوں پر تعاون حاصل ہے؟

10 :- کیا ایم آر ایس اپنی تخریبی کارروائیوں کا سلسلہ روک کے اور ملکی معاملات سے خود کو علیحدہ رکھنے کے سوال پر مذاکرات کے حق میں ہے یا مصالحت کا کوئی فارمولا پیش کر سکتی ہے؟

یہ سوالات پڑھ کے میری عجیب حالت ہوئی۔ ایک طرف میرے اندر غصّے کا آتش فشاں پھٹنے کے قریب ہو گیا۔ یہ حرامزادے ہمیں تخریب کار کہتے تھے۔ ہماری مجاہدانہ سرگرمیوں کو اپنی وطن دشمن حرکتوں کی طرح پیسے کی ہوس کا نتیجہ سمجھتے تھے۔ یہ سمجھتے تھے کہ ہمیں ملک میں انتشار پھیلانے والے پیسہ اور اسلحہ دیتے ہیں۔ ہم امریکا یا روس کے ایجنٹ ہیں۔ آخری سوال کا مفہوم بھی واضح تھا کہ بتاؤ کتنا پیسہ چاہیے۔ کس ملک کی شہریت اور عیش و عشرت کے کیا لوازمات درکار ہیں۔ مذاکرات... مصالحت کا فارمولا... اُلّو کے پٹھے... شیطان کے چیلے۔ خود تو بِک چکے اب مجھے خریدنا چاہتے ہیں۔ غصّے کے ساتھ مجھے ہنسی بھی آگئی کہ وہ خوف اور دہشت کے باعث رائی کو پہاڑ کی شکل میں دیکھ رہے تھے۔ ہم گنتی کے چند افراد... خالی ہاتھ... بے آسرا اور پریشان حال... ہمارا موازنہ وہ بہت بڑے پیمانے پر ملکی اور بین الاقوامی سطح کی تنظیموں سے کر رہے تھے۔ کہاں راجا بھوج اور کہاں گنگو تیلی۔ گنگو تیلی ہم تھے مگر ان کی نظر اور عقل ہمیں راجا بھوج سمجھ رہی تھی۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے محاذِ جنگ پر کوئی کسی کے ہاتھ میں لوٹا بھی دیکھے تو بم سمجھ کے دور بھاگ جائے... سارا اثر ایک نفسیاتی فضا کا ہوتا ہے۔ کتّے سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسد... ان کو ہماری سرگرمیوں نے ایم آر ایس فوبیا میں مبتلا کر دیا تھا۔ یہ سب سوالات ان کے ذہن

میں بیٹھے ہوئے اندیشوں کی پیداوار تھے اور اُن کے تصور کا فریب تھے لیکن میرے لیے تشویش کی بات [illegible] جواب کیا ہوں گے۔ جہاں سوال ہی غلط ہوں وہاں جوابات کے درست ہونے کا کیا سوال... ہم کیسے بتائیں گے کہ ہمارا کس سیاسی جماعت سے رابطہ ہے۔ ہم کس سیاست داں کے آلۂ کار ہیں اور کس کے اشارے پر یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔ روس اور امریکا میں سے کون ہمیں شہ دے رہا ہے۔ لاحول ولاقوۃ۔ یہ تو ایک خالص ذاتی سطح کی جدّوجہد ہے جس سے نہ کسی کا مفاد وابستہ ہے اور نہ غرض۔ نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا۔ کہاں کی مدد اور کیسی مدد۔ ابھی تک تو کوئی ایم آر ایس کا نام تک نہیں جانتا۔ کیا دے گا کوئی ہمیں اور کیوں دے گا۔ ابھی تک نہ اثاثے ہیں نہ وسائل۔ ملا خاک بھی نہیں۔ جو اپنا تھا وہ بھی گنوا دیا ہے اور ایک جان ہے سو وہ بھی داؤ پر لگی ہوئی ہے۔

مگر کیا یہ سب کچھ وہ مانیں گے جنھوں نے سوال نامہ مرتّب کیا ہے۔ وہ تو کہیں گے کہ جواب دو... مفصّل جواب دو۔ اعداد و شمار دو... نام پتے دو... اور ہمارے انکار سے کام نہیں چلے گا۔ میں نے سوال نامہ رکھ دیا اور ایک سگریٹ سے دوسری سگریٹ جلاتے لگا۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ ہم کس مشکل میں پھنس گئے ہیں۔ گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل... وہ ہر صورت میں تشدّد کریں گے اور تشدّد کی ہر صورت میرے تصور میں تھی خصوصاً وہ سب جو رابعہ کے ساتھ ہو سکتا تھا۔ اس کو غیر شریفانہ، غیر اخلاقی یا غیر انسانی کہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ دشمن سے اور کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ وہ جو کچھ کرتے ہیں اس کے لیے دشمنی کا جواز رکھتے ہیں۔

کونے میں ایک سرسراہٹ کی آواز نے مجھے پلٹ کر دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ اس کونے میں فرش کے ساتھ ایک انچ سے کچھ زیادہ قطر کا سوراخ تھا جس میں لوہے کا پائپ فٹ تھا۔ اگر رات کے وقت میں دروازہ بجا کے سنتری کے سامنے اسکول کے بچّوں کی طرح ایک انگلی کھڑی کرتا تو وہ مجھے اس سوراخ سے رجوع کرنے کو کہتا۔ سرسراہٹ سے یوں لگتا تھا جیسے کوئی چوہا اندر آنے کی کوشش میں مصروف ہے لیکن اسی وقت ایک تنکا اندر سرکا۔ تنکے کے آخر میں کاغذ کی ایک گولی چپکی ہوئی تھی۔ میں لپک کے گیا اور تنکے کو اندر کھینچ لیا۔ یہ تنکا نہیں لوہے کا تار تھا۔ کسی سائیکل کی پرانی اسپوک۔ اس پر جو کاغذ کی گولی تھی اسے میں نے احتیاط سے کھولا۔ اس پر پنسل سے لکھا ہوا تھا۔ "مجھے بتاؤ میں تمھارے لیے کیا کر سکتا ہوں۔ سندر۔"

"سندر!" میں نے زمین پر لیٹ کر نالی کے سوراخ میں سرگوشی کی۔ "تم میری آواز سن سکتے ہو۔"

"ہاں..." سندر کی آواز لوہے کے پائپ میں سے براہِ راست میرے کان میں پہنچی۔ "ذرا آہستہ بات کرنا۔"

"کیا تم ہمیں یہاں سے نکال نہیں سکتے؟" میں نے کہا۔

"نہیں... پہرا بہت سخت ہے۔ میں اکیلا سب سے مقابلہ نہیں کر سکتا۔ میں تو ڈیوٹی سے بھاگ کر آیا ہوں۔" سندرداس بولا۔ "سراج نے مجھے دو میل دُور مخالف سمت میں بھیج دیا تھا۔"

"کیا ہم بارڈر پر ہیں؟" میں نے کہا۔

"تم بارڈر کے قریب ہو۔" وہ بولا۔ "کھیم کرن کا قصبہ یہاں سے نزدیک ہے۔ تقریباً سات میل کے فاصلے پر۔"

"تو کیا اب ہمیں بارڈر کے پار اسمگل کیا جائے گا؟"

"ہاں... تم کو انڈین انٹیلی جنس کے حوالے کر دیا گیا ہے لیکن وہ تم کو زمینی راستے سے نہیں لے جائیں گے۔" سندرداس بولا۔

"پھر کیا ہوائی جہاز سے لے جائیں گے؟"

"مجھے اتنا ہی معلوم ہو سکا ہے کہ تم کو سمندر کے راستے مال بردار جہاز میں لے جایا جائے گا۔" سندر نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ پہلے ہمیں کراچی لے جایا جائے گا؟"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ اور غالباً انہی صندوقوں میں۔" سندر نے کہا۔

"آئی سی!" میں نے کہا۔ مجھے محسن کی بات یاد آگئی تھی۔ اُس نے بتایا تھا کہ صندوقوں پر 'ایلڈ ویسٹ سٹی' اور ملک کا نام 'دبئی' لکھا ہوا تھا جو ایک مہمل اور گمراہ کن بات تھی۔ "سندر! کیا تم یہ بات کسی ایسے شخص کو بتا سکتے ہو جو ہماری مدد کر سکے۔ مثلاً اکرام شیخ کو یا ایس پی ضامن رضوی کو... یا غالب کو اور نازو کو... اگر وہ پہلے سے کراچی میں موجود ہوں تو شاید کچھ کر سکیں۔"

"میں کوشش کروں گا۔"

"اگر انھیں اس جگہ کی بابت صحیح معلوم ہو جائے اور تم ان کو لوکیشن بتا سکو کہ ہم کہاں ہیں تو بتا دینا۔" میں نے کہا۔

"میں... کوشش کروں گا۔" وہ بولا۔ "دراصل یہاں سے میرا جانا تو ناممکن ہے۔ ڈاک کا نظام بھی نہیں ہے۔ لاہور یہاں سے بائیس میل دُور ہے لیکن جہاں ہم پڑے ہیں وہ غیر آباد علاقہ ہے کوئی ٹرانسپورٹ نہیں ملتی۔ میں خود موٹر سائیکل لے کر جاؤں تو تین چار گھنٹے سے پہلے نہیں آ سکتا اور میری غیر حاضری کا سراج کو فوراً علم ہو جائے گا۔ ادھر سے کوئی بس گزرتی بھی نہیں کہ میں خط دے دوں۔ لاہور سے ہمارا رابطہ وائرلیس پر ہے لیکن وائرلیس بھی سراج کے پاس ہے۔ پھر بھی میں کوشش کروں گا۔"

"اچھا۔" میں نے مایوسی سے کہا۔ "اگر تم اپنی کوشش میں کامیاب ہو جاؤ تو ہمارے دوستوں کو صرف یہ بتانا کہ ہم خیریت سے ہیں۔ ورنہ وہ پریشان رہیں گے۔ اگر معلوم ہو سکے تو مجھے ان کے بارے میں مطلع کرنا۔ خصوصاً غالب اور نازو کے بارے میں اور ہاں... اگر ایس پی ضامن رضوی صاحب سے بات ہو تو ان سے پوچھنا کہ کیتھرین کی لڑکی جولی کا کیا ہوا۔ اس کے گرگے بدلے نے تھے۔ اگر یہ آپریشن اب تک نہ ہوا ہو تو ایس پی صاحب سے کہنا کہ اپنا سارا اثر و رسوخ استعمال کر کے یہ کام ضرور کرا دیں۔ ویسے مجھے یقین ہے کہ شہلا انھیں یاد دلاتی رہے گی... اور غالب نے بھی کچھ نہ کچھ ضرور کیا ہو گا۔ اس نے اپنے اخبار نویس ساتھیوں کے ذریعے کا یقین دلایا تھا۔ بس جولی کی خیریت معلوم ہو جائے۔"

"میں... کوشش کروں گا۔" سندر نے اسی لہجے میں کہا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ یہ سب کچھ نہیں کر سکتا تھا مگر وہ انکار سے بھی گریز کر رہا تھا اور دعوے سے بھی۔ پھر بھی اس کے الفاظ مجھے امید کی روشنی دیتے تھے اور اس سے رابطہ قائم ہو جانے کے بعد میں محسوس کرنے لگا تھا کہ میرا رابطہ ساری دنیا سے بحال ہو گیا ہے۔ ابھی تک دنیا کو خبر نہ تھی کہ رابعہ اور محسن، ہیڈی اور کیتھرین کہاں ہیں لیکن اب انھیں پتا چل جائے گا کہ ہم یہاں ہیں۔ کوئی نہ کوئی ضرور کچھ کرے گا۔

"مجھے اب ڈیوٹی پر واپس پہنچنا ہے۔"

"اچھا سندر۔" میں نے کہا۔ "تم پھر کب آؤ گے؟"

"میں کیا بتاؤں... جب بھی موقع ملا... یہ بہت خطرناک کام ہے اور میرے لیے بہت زیادہ رِسکی ہے۔" وہ بولا۔

"تم ایس پی صاحب کو اپنی رپورٹ کیسے بھیجتے ہو آخر؟"

"ایسے ہی... جب بھی موقع مل جائے یا کوئی وسیلہ ہاتھ آ جائے۔" وہ بولا۔

"کیا تمھیں معلوم ہے کہ رابعہ اور محسن کدھر ہیں؟"

"ہاں... لیکن میں ادھر نہیں جا سکتا۔ ادھر روشنی ہے اور میں محافظوں کی نظر میں آ جاؤں گا۔" وہ بولا۔ "آخری کمرہ کیتھرین کا ہے، وہاں جا سکتا ہوں۔"

"تم مجھے کوئی ایسی چیز لا کر نہیں دے سکتے جس سے میں دیوار توڑ سکوں۔" میں نے کہا۔ "کوئی چھینی یا ہتھوڑی... چاقو..."

"اس سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔" وہ بولا۔ "اگر تم رات بھر کوشش کر کے دیوار کی چند اینٹیں نکالنے میں کامیاب رہے اور محافظوں کو بھی پتا نہ چلا... تو باہر آ کے کہاں جاؤ گے... اور کیسے جاؤ گے؟"

"آخر تم بھی تو یہاں پہنچے ہو۔"

"مجھے گارڈ پہچانتا ہے۔ اس نے کوئی سوال کیے بغیر میرے لیے دروازہ کھول دیا تھا اور میں نیچے اتر آیا تھا۔" وہ بولا۔ "اگر میں خاموشی سے لوٹ گیا تو کسی کو معلوم نہیں ہو گا کہ میں اندر آیا تھا... گارڈ بلاوجہ کسی سے میرا ذکر نہیں کرے گا۔ مگر تم گیٹ تک بھی نہ پہنچ پاؤ گے۔"

"اور اگر تم گیٹ تک نہ پہنچ پائے؟" میں نے کہا۔

"تو کل سویرے صبح میری پیشی سراج کے سامنے ہو گی اور مجھے اس جرم کی سزا ملے گی۔ ممکن ہے میری پیٹی اتر جائے۔ یا مجھے معطّل کر دیا جائے... لائن حاضر کر دیا جائے۔ یا میرے خلاف انضباطی کارروائی ہو تو میری تنزلی ہو جائے۔ میرے کندھے پر دو ہی اسٹار رہ جائیں۔" سندرداس بولا۔

"گیٹ کتنی دُور ہے؟"

"سو گز کے فاصلے پر۔" وہ بولا۔ "یہ جگہ زیرِ زمین ہے۔ سو گز لمبی سرنگ ایک کمرے میں کھلتی ہے۔ باہر سے صرف یہی ایک کمرہ نظر آتا ہے اور اس پر لکھا ہوا ہے: سب اسٹیشن واپڈا۔ اس کے چاروں طرف خاردار تاروں کی باڑھ ہے جس میں کرنٹ رہتا ہے۔ تاروں کی بلندی دس فٹ ہے اور ان کو عبور کرنا بہت مشکل ہے۔ دروازے پر مسلح محافظ کھڑا رہتا ہے جو واپڈا کا ملازم نظر آتا ہے اور اس پر کوئی شک نہیں کر سکتا۔ وہ تم کو دیکھتے ہی گولی مار دے گا۔ اس کے علاوہ تم اکیلے نکل بھی گئے تو تمھارے دوسرے ساتھیوں کا کیا ہو گا۔ ان کی تو شامت آ جائے گی۔ تم سب ایک ساتھ تو فرار ہو نہیں سکتے... میرا مشورہ ہے کہ ایسی کوشش بھی نہ کرنا۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے زیادہ مایوس ہو کے کہا۔ "چلو تم ایک کام تو کرو... میں ایک ریوالور باہر پھینک رہا ہوں۔"

"ریوالور... تمھارے پاس...؟"

"ہاں... تفصیل ابھی نہیں بتا سکتا کہ ریوالور میرے پاس کہاں سے آیا۔ میرا خیال ہے کہ ریوالور کیتھرین کے پاس ہی رہے تو اچھا ہے۔ میں نے اس سے لیا تھا کہ کام آئے گا... مگر اب مجھے ڈر ہے کہ میرے پاس سے برآمد ہو جائے گا۔ اس کے پاس محفوظ رہنے کا چانس زیادہ ہے۔"

"ٹھیک ہے... لیکن ریوالور کیسے پھینکو گے؟"

"روشندان میں سے۔" میں نے کہا۔ "یہ بہت اونچا ہے ٹیوب لائٹ ہے لیکن میرا ہاتھ نیچے کے خلانے تک پہنچ جاتا ہے۔"

"پھینک دو... میں کیچ کر لوں گا۔" وہ بولا۔

میں فرش سے اٹھا ہی تھا کہ دروازہ ایک دم کھلا۔

"لاؤ... پستول مجھے دے دو۔" سراج نے اندر آتے ہی ہاتھ پھیلا دیا اور آہستہ آہستہ میرے قریب آنے لگا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں ریوالور تھا جس کے ٹریگر پر رکھی ہوئی انگلی ذرا سے دباؤ کی منتظر تھی۔ میں بے وقوفوں کی طرح کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ ابھی تو میں نے اپنا ریوالور باہر پھینکنے کے لیے نکالا تک نہ تھا کہ وہ آ پہنچا۔ وہ یقیناً کہیں دُور بیٹھا ہوا ہماری ساری گفتگو سن رہا تھا۔ میں اور سندر بہت اونچی آواز میں نہیں بول رہے تھے مگر کہیں چھپا ہوا کوئی مائیکروفون اتنا حسّاس تھا کہ ہماری سرگوشی بھی کیچ کر رہا تھا۔ دیواریں بالکل سپاٹ تھیں لیکن ان کے کان کہیں نہ کہیں ضرور تھے۔

"کم آن..." سراج نے کہا۔ "معلوم نہیں اب تک

بے وقوفی سے یہ ریوالور تمہارے پاس رہا... میں معلوم کرلوں گا... لیکن تم کسی خوش فہمی میں مبتلا نہ رہو تو اچھا ہے۔ ریوالور کیا تمہارے پاس توپ بھی ہوتی تو بے کار تھی۔"

میں نے اندر اُڑسا ہوا ریوالور نکالا اور سراج کے ہاتھ پر رکھ دیا کیونکہ اس کے بالکل پیچھے آنے والا گونگا کمانڈو انتہائی جارحانہ انداز میں آگے بڑھنے لگا تھا۔ "یہ لو... خودکشی میں کام آئے گا۔"

"اس حرامزادے سُندر سے تو میں نمٹ لوں گا۔" سراج نے ریوالور کو جیب میں ڈال لیا: دھوبی کا کتا... نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔"

"تم اپنی بات کر رہے ہو تو میں اس رائے سے اتفاق کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"مسٹر جوکر... بہتر ہوگا اگر تم آرام سے سو جاؤ یا ان سوالات پر غور کرو جن کا تمہیں جواب دینا ہے۔ کتنا وقت ضائع کر دیا ہے تم نے۔" سراج ناگواری سے بولا اور پلٹ گیا۔ اس کے ساتھ آنے والا وہیں کھڑا رہا ——— وہ چند منٹ کے لیے باہر گیا اور پھر لوٹ آیا۔

"تم سندر سے ملنا یقیناً پسند کرو گے۔" وہ خباثت سے مسکرایا۔ اس کے اشارے پر گونگے کمانڈو نے مجھے ہاتھ پکڑ کے گھما دیا اور دروازے کی جانب روانہ کر دیا۔ دروازے کے باہر اس کا دوسرا ساتھی موجود تھا۔ بالکل مشینی انداز میں وہ میرے دائیں بائیں ہوگئے لیکن اس وقت مجھے ان کا نہیں سندر کا خیال تھا۔ کیا سراج کے کتوں نے اُسے پکڑ لیا ہوگا۔ بے چارہ نیکی کرنے آیا تھا بدی گلے پڑ گئی۔ اپنی وفاداری اور حب الوطنی ثابت کرنے کے لیے اس نے بڑی محنت کی تھی اور بالآخر سندھو ہونے کے باوجود یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا کہ وہ کسی بھی مسلمان سے کم پاکستانی نہیں۔ اس نے ضامن رضوی جیسے افسر کا اعتماد حاصل کر لیا تھا تو یہ اس کی کامیابی کی سند تھی۔ سراج اس کے ساتھ کیا سلوک کرے گا، یہ بات تو یقینی تھی کہ وہ معطل ہوگا۔ وہ ڈیوٹی چھوڑ کر بھاگ آیا تھا۔ رضوی صاحب بعد میں اُسے بچا لیں گے۔ وہ بتا دے گا کہ اس نے یہ رسک کیوں لیا تھا مگر اُسے دوبارہ سراج کے ساتھ پوسٹ کرنا مشکل ہو جائے گا۔ سراج پہلے ہی اس سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا اور سندر نے اس کو بہت معقول جواز فراہم کر دیا تھا کہ وہ اسے انتہائی خراب رپورٹ کے ساتھ واپس کر دے۔ سندر انکار نہیں کر سکے گا کہ وہ ڈیوٹی چھوڑ کے مجرمانہ غفلت کا مرتکب ہوا تھا۔ اس نے دو گھنٹے تک بارڈر کو کھلا چھوڑ دیا تھا۔ آخر کیوں؟ کیا اس نے کسی اسمگلر سے بھتا لے کر وعدہ کیا تھا کہ جب اس کا مال گزرے گا تو ٹوکنے والا کوئی نہیں ہوگا؟ سندر پر سارے الزامات عائد کیے جا سکیں گے اور وہ کسی کا جواب نہ دے سکے گا۔

میں ایک سرنگ نما راہداری میں چل رہا تھا۔ چھت میرے سر سے اتنی ہی اونچائی پر تھی جتنی کمرے کی چھت تھی۔ یہ زیرِزمین عمارت تھی۔ اس کی دیواروں اور چھتوں کو اونچا رکھنے کے لیے زیادہ گہرائی تک کھدائی کرنا مشکل کام تھا چنانچہ سات فٹ کی بلندی کافی سمجھی گئی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ یہاں حبس نہیں تھا اور گرمی نہیں تھی۔ کہیں نہ کہیں سے ایگزاسٹ فین کے ذریعے ہوا باہر کھینچی جا رہی تھی اور دوسری طرف سے تازہ ہوا اندر پہنچ رہی تھی۔ راہداری کے دونوں طرف دروازے تھے۔ سراج نے ایک دروازے کو دھکیلا اور اس کے پیچھے میں بھی کمرے میں داخل ہوگیا۔ رابعہ کو دیکھ کر میں ٹھٹکا۔ وہ فرش پر بچھے ہوئے بستر پر گھٹنے سمیٹے اور ٹھوڑی گھٹنوں پر رکھے بیٹھی تھی۔ یہ بالکل ویسا ہی کمرہ تھا جیسا مجھے دیا گیا تھا۔ محسن اور ٹیڈی دائیں جانب کی دیوار سے چپکے کھڑے تھے۔ مجھے بھی اس صف میں شامل کر دیا گیا۔

"کیا بات ہے؟ کہاں ہے وہ...؟" اس نے ایک گالی دے کر کہا۔

"وہ... دوسرے کمرے میں..." اندر آجانے والا ایک شخص بولا۔

"کیا تم نے اُسے مار دیا ہے؟" سراج نے کہا۔

"نہیں... زندہ ہے... مگر مرنے والا ہے..."

"تو میرا مُنہ کیا دیکھ رہے ہو... اُسے مرنے سے پہلے لاؤ" سراج نے گرج کر کہا۔ دو آدمی باہر نکل گئے۔ میں نے رابعہ کی طرف دیکھا اس کا چہرہ لاش کی طرح سفید پڑ گیا تھا اور نظریں دیوار پر منجمد ہوگئی تھیں۔

سراج کے حکم پر باہر جانے والے چند منٹ میں لوٹ کر آئے تو انھوں نے دونوں ہاتھ اور دونوں ٹانگیں پکڑ کے سندر داس کو اُٹھا رکھا تھا۔ وہ بے ہوش تھا اس کا سر نیچے لٹکا ہوا پیچھے کی طرف جھول رہا تھا اور اس کے کپڑے خون سے تر تھے۔ خون اس کے جسم سے مسلسل بہہ رہا تھا اور فرش پر گرتا جا رہا تھا۔ انھوں نے سندر داس کو کمرے کے فرش پر ایسے پھینک دیا جیسے وہ مر چکا ہو اور اس کے لیے درد کے احساس کا کوئی مفہوم نہ ہو۔ بے شک ہوش سے بیگانگی نے اسے جسمانی اذیت کے احساس سے بھی بیگانہ کر دیا تھا لیکن ہم بہرحال احساس رکھتے تھے۔ ہم تو مُردوں کو بھی اتنے احترام اور شائستگی کے ساتھ اُٹھاتے ہیں کہ ان کو خفیف سا جھٹکا بھی نہ لگے۔ زخمی اور قریبِ مرگ کے ساتھ اس قسم کا رویہ دشمن سپاہی کے ساتھ میدانِ جنگ میں بھی کوئی روا نہیں رکھ سکتا۔ سندر داس کی تکلیف کا آزار ہم سب نے اپنے دل میں محسوس کیا۔

سندر داس کو تین گولیاں لگی تھیں۔ ایک زخم سینے پر تھا، دوسرا پیٹ سے ذرا نیچے اور تیسرا بائیں ران پر۔ خون تینوں جگہ سے بہہ کر فرش کو داغدار کرتا جا رہا تھا اور میں اس شخص کو دیکھ کر احساسِ جرم و ندامت کا شکار تھا۔ جس نے ہماری خاطر چوری چھپے دو میل کا فاصلہ طے کیا تھا اور دشمنوں کے ہمارے گزرنے کا خطرہ مول لے کر خود کو اس اعتماد کا اہل ثابت کرنا چاہا تھا جو رضوی صاحب نے اس پر کیا تھا۔

"تم لوگ جذبات میں اندھے ہو جاتے ہو۔" سراج نے کہنا شروع کیا۔ "فائر کھول دیا سوچے سمجھے بغیر۔ ایک گولی کافی تھی۔ میں اس کو زندہ گرفتار کرنا چاہتا تھا۔ اس کے مُنہ سے سُننا چاہتا تھا کہ اس نے کیا کہا تھا اور کیا سُنا تھا۔ میں اس سے سب اگلوا لیتا۔ اس کا یہ جرم ہی کافی تھا کہ یہ بارڈر پر اپنی ڈیوٹی چھوڑ کر یہاں آیا تھا۔ اب میں کس سے معلوم کروں کہ یہ کیوں آیا تھا۔ یہ لوگ کون ہیں گے؟" اس نے ہم سب کی طرف اشارہ کیا۔

"جب تم نے سب کچھ اپنے کانوں سے سن لیا ہے تو پھر کس بات کا۔" میں نے کہا۔ "سندر تمھیں وہی بتاتا... جو یہ بتا سکے گا۔"

"تم اپنی بکواس بند رکھو۔" سراج دہاڑا۔ "مجھے معلوم ہے یہ کون تھا۔ یہ تمہارے انکل ایس ایس پی کا ایجنٹ تھا۔ میری نگرانی پر مامور کیا گیا تھا۔ تمہارا ہمدرد تھا اور تمہاری مدد کرنا چاہتا تھا۔"

"شیطانوں کے درمیان بھی انسان ہوتے ہیں جن کا مذہب انسانیت ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اور تم جیسے لوگ جو پیسے کو خدا مانتے ہیں ان سے ہمیشہ خوفزدہ رہتے ہیں۔ تم کو اب اس الزام کا ڈر ہے جو تم پر آئے گا۔ رضوی صاحب یہی سمجھیں گے کہ تم نے جان بوجھ کے اسے مروا دیا۔ تم اس سے جان چھڑانا چاہتے تھے۔"

"لیکن اسے میں نے تو نہیں مارا۔" سراج نفرت اور حقارت سے مسکرایا۔ "یہ بارڈر پر ڈیوٹی دیتے ہوئے اسمگلروں کی گولیوں کا نشانہ بن گیا۔ یہ کوئی غیر معمولی واردات نہیں۔ ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ افسوس مجھے یہ ہے کہ سندر داس کی موت بہادر اور فرض شناس آدمی کی موت کہلائے گی۔ میں اسے زندہ گرفتار کرتا تو اس پر مجرمانہ غفلت، اسمگلروں سے ساز باز، رشوت لے کر ان کے لیے راستہ کھلا رکھنے اور جرم میں برابر کا شریک ہونے کے الزامات عائد کرتا... ثابت کرتا اور اسے جیل پہنچاتا۔"

سندر داس کے بے حس و حرکت جسم میں اچانک حرکت ہوئی۔ اس نے آنکھیں کھول کے اِدھر اُدھر دیکھا اور اس کی نظریں مجھ پر ٹھہر گئیں۔ میں دوسروں کی پروا کیے بغیر آگے بڑھا اور گھٹنوں کے بل اس کے پاس بیٹھ گیا۔ میں نے اس کا سر دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔

"پا... پا... پانی..." اُس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "کیا مرنے والے کو ایک گھونٹ پانی بھی نہیں دو گے؟"

میں نے پلٹ کر سراج کی طرف دیکھا۔

"کاش میرے اختیار میں ہوتا کہ میں اس کے لیے موت کے عذاب کو زیادہ سخت اور لمبا کر سکتا۔" سراج نے قہقہہ مارا۔ ایک سفاک شیطانی قہقہہ... جو انسانیت کا نوحہ تھا اور ضمیر کی بے حسی کا آئینہ دار تھا۔

رابعہ ایک دم اُٹھی۔ اس کے کھانے کے برتن ابھی تک اُٹھائے نہیں گئے تھے کیونکہ اس نے کھانے کو چھُوا بھی نہیں تھا۔ اس نے ٹرے میں رکھا ہوا پانی کا گلاس اُٹھایا اور سندر کے پاس گھٹنوں کے بل جھک کر بیٹھ گئی۔ ایک طرف سے میں نے سندر کو سہارا دے کر اوپر اُٹھایا اور دوسری جانب سے رابعہ نے گلاس کو اس کے لبوں سے لگانے کی کوشش کی۔ میں ذرا سی دیر کے لیے سراج کی طرف سے غافل ہوگیا کیونکہ سندر مجھ سے کچھ کہہ رہا تھا۔ "میں... میں نے کہا... کہا تھا... کہ کوشش..."

اسی وقت سراج نے آگے بڑھ کر گلاس کو کِک ماری۔ گلاس رابعہ کے ہاتھ سے نکل کر اُڑتا ہوا گیا اور چھت سے ٹکرا کے پاش پاش ہوگیا۔ رابعہ نے ایک چیخ ماری۔ کیونکہ چوٹ اس کی کلائی پر بھی آئی تھی۔ پھر وہ وحشیانہ دیوانگی کے ساتھ اُٹھی اور سراج پر حملہ آور ہوئی۔

"ذلیل... شیطان... کتے..." اس نے پاگل پن کی بھری ہوئی قوت کے ساتھ سراج کا مُنہ نوچ لیا۔ سراج کے لیے اتنا شدید ردِعمل بالکل غیر متوقع ثابت ہوا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا رابعہ کے ہاتھوں نے جو کسی خونخوار شیرنی کے پنجوں سے زیادہ بے رحم ہو گئے تھے سراج کے چہرے پر خراشیں ڈال دیں۔ اس نے خود کو بچانے کے لیے ہاتھوں سے چہرہ چھُپانا چاہا اور ایک بار رابعہ کو دھکیلا مگر وہ پھر اس سے یوں ٹکرائی جیسے کسی اسپرنگ کی طاقت نے اُسے کھینچ لیا ہو۔ سراج کی گردن کا گوشت اُدھڑ گیا۔ میں نے اس کی جلد پر خون کی سُرخ لکیروں کو نمایاں ہوتے دیکھا۔

"چھوڑ مجھے پاگل کُتیا..." اُس نے چیخ کر گالی دی اور اپنا گھٹنا اُٹھا کے رابعہ کے پیٹ میں مارا۔ رابعہ بلبلا کے دُہری ہوئی تو اُس نے دوسرا گھٹنا اس کے مُنہ پر مارا اور وہ دُور جا گری۔ محسن اور ٹیڈی مجھ سے پہلے آگے بڑھے تھے لیکن ان کی راہ میں وہ دونوں گونگے کمانڈوز حائل ہو گئے تھے جو ہر وقت مستعد رہتے تھے۔ انھوں نے بڑی پھُرتی سے دونوں کو پھر دیوار کے ساتھ لگا دیا تھا اور وہیں دبوچ کر اتنا بے بس کر دیا تھا کہ وہ سانس بھی بڑی مشکل سے لے رہے تھے۔ میری آنکھوں نے ایک سیکنڈ میں دونوں طرف دیکھ لیا تھا۔ رابعہ کو حملہ کرتے بھی اور محسن کے ساتھ ٹیڈی کو پسپا ہوتے بھی۔ دوسرے سیکنڈ میں میرے دماغ کا فیوز اُڑ گیا۔ میرے وجود میں غصہ یوں بھر گیا جیسے پریشر ککر میں بھاپ اتنی بھر جائے کہ سارے حفاظتی نظام کی موجودگی بھی اُسے پھٹنے سے

نہ بچا سکے۔ میں نے ایک جست میں سراج کو جا لیا۔ اس نے رابعہ کو دُور پھینکا ہی تھا کہ میں نے اُسے اُٹھا کے دیوار پر دے مارا۔ وہ نیچے گرا تو میں اس کے اوپر گرا۔ میں نے مشین گن کے برسٹ کی آواز سُنی اور رابعہ کی چیخ بھی لیکن اس وقت میں جنون کی اس منزل سے آگے تھا جہاں عقل کی رسائی ممکن ہی نہ تھی۔ میں سراج کو اسی شیشے کے گلاس کی طرح ٹکڑے ٹکڑے کر دینا چاہتا تھا جس کو سراج نے ٹھوکر مار کے گرا دیا تھا۔ میں اس کو قتل کر دیتا اور خود سراج نے بھی میری آنکھوں میں اپنی موت دیکھ لی تھی۔ مقابلہ کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ میرے تابڑ توڑ مکوں نے اس کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ میں نے اُسے آٹے کی طرح گوندھ ڈالا تھا اور یوں رگڑ ڈالا تھا جیسے سِل پر مسالے کو بٹے سے پیسا جاتا ہے۔ مجھے ایک منٹ اور ملتا تو میں اس کا ریشہ ریشہ، بوٹی بوٹی الگ کر دیتا اور ان سب کے سامنے سراج ایس پی کے بجائے ٹوٹی پھوٹی ہڈیوں، خون اور گوشت کا کراہیت انگیز، قابلِ نفرت اور بے ہنگم ڈھیر پڑا رہ جاتا۔

اچانک دو مضبوط ہاتھوں نے مجھے کھینچ لیا۔ میں نے مداخلت کرنے والوں سے بھی لڑنے کی کوشش کی اور ان میں سے ایک قلابازی کھا کے دُور جا گرا لیکن دوسرے نے مجھے مفلوج کر دیا۔ اس کے بجلی کی طرح چلنے والے ہاتھ میرے بازوؤں پر یوں پڑے کہ ہڈی ٹوٹنے سے رہ گئی مگر میرے بازو بے جان ہو گئے۔ اس نے گھوم کر لات ماری جو میری ران پر پڑی اور میں کٹے ہوئے درخت کی طرح گرا۔ دوسرا اتنی دیر میں مجھے سنبھالنے آ گیا اور اس نے مجھے دونوں ہاتھوں میں گھما کے نیچے دے مارا... میں پھر اُٹھا تو میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا اجالا گڈمڈ ہو رہا تھا اور میرے پیروں کے نیچے زمین جھولا بن گئی تھی۔ ان دونوں نے مجھے بازوؤں میں جکڑ لیا۔

میں نے سر کو جھٹک کر دیکھا اور منظر میری نظروں کے سامنے صاف ہونے لگا۔ ٹیڈی اور محسن کو ایک مشین گن نے روک رکھا تھا۔ دوسرا مشین گن والا دروازے میں جما کھڑا تھا اور اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں تھا۔ اگر اندر والے ایک ایک کر کے ختم ہو جاتے تو آخر میں وہ ایک برسٹ مار کے ہمیں بھی ختم کر دیتا لیکن اس سے پہلے وہ ہمارے لیے فرار کا راستہ کھلا نہ چھوڑتا۔ اس ملازم نے جو میرے لیے کھانا لایا تھا، سراج کو سہارا دے کر اپنے پیروں پر کھڑا کیا۔ سراج زخمی تھا اور بری طرح کراہ رہا تھا۔ مجھے افسوس ہوا کہ میں نے اتنی مہلت ملنے کے باوجود اس کی ناپاک زندگی کا خاتمہ نہیں کیا۔ میں اس کو مکے تھپیڑ مارتا رہا اور پھینکتا پٹختا رہا۔ وجہ یہی تھی کہ میں ٹھنڈے دماغ کے ساتھ نہیں لڑ رہا تھا، ورنہ میں صرف ایک ہاتھ مارتا اور اس کی گردن توڑ دیتا۔ وہ میری توقع سے زیادہ سخت جان ثابت ہوا تھا اور اگرچہ اس کی حالت غیر ہو رہی تھی مگر وہ ہوش میں تھا۔ شاید اُس کی ہڈیاں بھی ڈھیٹ تھیں کہ ٹوٹی نہیں تھیں اور وہ سیدھا کھڑا رہنے کے قابل تھا۔ سندر مر گیا تھا لیکن کوئی اس کی طالبِ انصاف لاش کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ سب کی نگاہ سراج پر تھی جو آہستہ آہستہ میری طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں قاتلانہ چمک تھی اور وہ ریوالور نکال کر اس کی ساری گولیاں میرے جسم میں اتار دینے کی نیت کے ساتھ آگے آ رہا تھا۔ اس کی بہت بے عزتی ہوئی تھی۔ اس کی حاکمیت کا غرور ایک عورت نے توڑ دیا تھا۔ پھر اس کی افسری کی فرعونیت کو ذلت آمیز شکست ہوئی تھی اور اس جرم کی وہ مجھے زیادہ سے زیادہ سزا دینا چاہتا تھا۔ مجھے دونوں گونگے کمانڈوز نے یوں جکڑ لیا تھا کہ میں جنبش تک نہیں کر سکتا تھا۔

وہ مجھ سے دو قدم دُور تھا جب دروازے میں کھڑے ہوئے محافظ نے اُسے مخاطب کیا۔ "ریوالور جیب میں رکھ لو ایس پی صاحب۔" میں نے چونک کر اُسے دیکھا۔ اس کی آواز میں نے پہلے بھی سُنی تھی۔ یہ وہی مدراسی تھا جو مجھ سے تفتیش کرتا رہا تھا۔ اس کی سپاٹ آواز میں سختی نہیں تھی لیکن تحکمانہ بے حسی کا ایسا انداز تھا جس نے سراج کو اس کی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا۔

"میں اس کو قتل کیے بغیر نہیں چھوڑوں گا۔" سراج نے زخم خوردہ سانپ کی طرح پھنکار کے کہا۔ "اس کا خون پی جاؤں گا۔"

"یو وِل ڈو نو سچ تھنگ۔" مدراسی نے اسی جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔ "ریوالور کا استعمال کرنے کی تمھیں اجازت نہیں۔"

"اجازت۔" سراج پھٹ پڑا۔ "تم اجازت کی بات کرتے ہو مجھ سے... کون ہو آخر تم... میرے افسر یا میرے باپ... تم بھول رہے ہو کہ تم کہاں کھڑے ہو۔"

"میرا کام تم کو خبردار کرنا تھا۔" مدراسی نے بھی انگریزی میں کہا۔ "میں وہ نہیں ہونے دوں گا جو تم چاہتے ہو۔ ایٹ اِز نوٹ... میں پھر دُہراتا ہوں... ریوالور جیب میں رکھ لو۔"

سراج کے پندار پر یہ ایک اور تازیانہ تھا۔ اس نے ریوالور جیب میں رکھتے ہوئے مدراسی کو زیرِ لب گالی دی مگر وہ برف یا پتھر کا آدمی تھا جو کسی طرح بھی جذبات سے متاثر نہیں ہوتا تھا نہ وہ مشتعل ہو سکتا تھا۔ نہ ادائے فرض کے معاملے میں اس لکیر سے ایک سُوت اِدھر اُدھر ہوتا تھا، جو اوپر والوں نے اس کے مشن کا راستہ قرار دی تھی۔

"تم... کتے کے کمینے پِلّے۔" سراج نے شعلہ فشاں نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کا تھپڑ میرے مُنہ پر بڑی آواز کے ساتھ پڑا۔

میں اب ہوش میں تھا۔ میرا گال تھپڑ کی ضرب سے لال ... دکھنے لگا تھا مگر میں مسکراتا رہا۔

"میں تم کو ایسی سزا دوں گا... تم کو بھی اور تمھاری اس ... بھی... کہ تمھاری ساری بہادری پیشاب بن کے نکل جائے..." اس نے میرے مُنہ پر دوسرا تھپڑ مارا۔ اس نے ایک بار ... شروع کی کہ وہ میرے سامنے رابعہ کا کیا حشر کرے ... رابعہ کی نظروں کے سامنے میرے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔ اس کے ساتھ وہ میرے پیٹ میں گھونسے مارتا گیا۔ میں ان گونگے ... کے شکنجے میں تھا اور ان کی گرفت اتنی سخت تھی کہ ... میں میری ساری مہارت دھری رہ گئی تھی۔ ہر ضرب ... میرے پیٹ کے اندر درد کا بگولا سا اُٹھتا تھا اور میں کرب سے ... کر کراہتا تھا۔ اس کی وحشت بڑھتی جا رہی تھی... ... ظاہر تھا کہ سراج کے لیے گولی چلانے کے سوا مجھ پر ... ستم کی اجازت لینا ضروری نہیں تھا۔ وہ مجھے ہر طرح ... کرنے... میرے ساتھ ہر غیر انسانی سلوک کرنے۔ میری ... ادھیڑنے اور مجھے زیادہ سے زیادہ ذہنی و جسمانی اذیت ... دینے کے لیے آزاد تھا۔ شرط صرف ایک تھی کہ میری جان ... اور یہی سب سے سخت شرط تھی۔ میرے لیے بھی اور ... کے لیے بھی۔ مجھے ذہنی اذیت دینے کے لیے میری ... سب سے بڑی کمزوری رابعہ اس کے ہاتھ میں تھی۔ میں نے آہستہ ... اس تلخ حقیقت کا زہر قبول کر لیا تھا کہ ہم سب کچھ نہیں ... سکتے۔ ہماری آنکھوں کو وہ سب دیکھنا ہو گا جس کا تصور ہی ... کو آزار میں مبتلا کرتا ہے۔ ہمارے کانوں کو گندے الفاظ ... رشتوں کی آبرو لُوٹے جانے کا مکروہ شور سُننا ہو گا اور ہمارے ... دل کو وہ سب برداشت کرنا ہو گا جو پتھر کا سینہ شق کر دے۔

"تم مجھ سے معافی مانگ لو گے تو بڑی اذیت اور ... سے بچ جاؤ گے سکندر۔" سراج نے میرے بال پکڑ ... میرا سر اٹھایا۔

اس وقت میں نے وہی کیا جو میرا بہترین جواب ہو سکتا ... میں نے اس کے مُنہ پر تھوک دیا اور مسکرانے لگا لیکن ... اس حرکت نے سراج کو پاگل کر دیا۔ وہ مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ ... اس نے میرے کپڑے پھاڑ دیے اور ان کا تار تار میرے جسم ... سے جدا کر دیا۔ رابعہ نے ایک چیخ ماری لیکن اس کا کسی پر اثر ... کمرے میں موجود ہر شخص جیسے اندھا گونگا اور بہرا ہو گیا ... سوائے سراج کے جس کی زبان سے اس کے وجود کی ساری ... غلاظت گالیاں بن کے بہہ رہی تھی۔ ٹیڈی اور محسن نے نظر ... جھکا لی تھی اور رابعہ نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا تھا۔ سراج نے میری بیلٹ کھینچ لی تھی۔ تڑاپ کی آواز کے ساتھ ... چمڑے کی بیلٹ میرے جسم پر پڑی۔ شدید تکلیف کے ... میں نے مسکرانا جاری رکھا۔ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ جب تک ہوش رہے گا میں مسکراتا رہوں گا۔ یہ مسکراہٹ اس کی گالیوں سے زیادہ تذلیل کرنے والی تھی۔ میں اگر اسے برابر کا جواب دیتا تب بھی وہ اتنا مشتعل نہ ہوتا جتنا میری اس مسکراہٹ نے کیا۔ یہ مسکراہٹ اسی روشنی کی طرح بے رحم تھی جس کو بجھانا میرے اختیار میں نہ تھا اور جس کا عذاب میری برداشت سے باہر تھا۔ وہ مجھے تو قتل نہیں کر سکتا تھا لیکن اب وہ میری اس طعنہ دیتی ہوئی، تمسخر اڑاتی ہوئی، چیلنج دیتی ہوئی، تحقیر کرتی ہوئی، اس کی بزدلی اور میری جرأت، اس کی بے بسی اور میری ہمت، اس کی کامیابی میں ناکامی اور میری سرفرازی کا اعلان کرتی ہوئی مسکراہٹ کو قتل کر دینا چاہتا تھا۔ اس کے ہاتھ مشینی انداز میں بیلٹ کو لہرا کر پوری قوت سے میرے جسم پر مارتے رہے کسی نے اسے نہیں روکا۔ ہر بار جب بیلٹ کسی کوڑے کی طرح میرے بدن پر لگتی تھی تو میری کھال پر ایک نیلگوں سیاہ لکیر سی بنا جاتی تھی۔ آہستہ آہستہ یہ لکیریں گہری اور جنگل کی اُلجھی ہوئی پگڈنڈیوں کی طرح ہوتی جا رہی تھیں۔ کہیں کہیں کھال کے پھٹنے سے خون رسنے لگا تھا لیکن ابھی تک میں ہوش و حواس کے ساتھ اپنے لبوں کی مسکراہٹ کو برقرار رکھنے میں کامیاب تھا۔ اس دیے کی طرح جسے کوئی راہ گم کردہ مسافر طوفان سے بچائے رکھنے کے لیے جسم و جان کی ساری توانائی صرف کر دے۔ رابعہ تو اسی وقت بے ہوش ہو گئی تھی، جب میرے جسم پر چمڑے کی بیلٹ کا پہلا نقش ابھرا تھا۔ ٹیڈی پھٹی پھٹی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہا تھا اور بُری طرح کانپ رہا تھا۔ اس کے لبوں پر آیت الکرسی تھی جو وہ بلند آواز میں پڑھ رہا تھا۔ میرا حوصلہ بڑھانے کے لیے یا اپنے دل کی تقویت کے لیے۔ اس کا رنگ لاش کی طرح سفید ہو گیا تھا۔ محسن خلا میں دیکھ رہا تھا اور بالکل بُت بنا کھڑا تھا۔ اس کی پلکیں تک نہیں جھپکتی محسوس ہوتی تھیں۔

بالآخر میں کامران ہوا۔ خدا نے مجھے اتنا حوصلہ دیا۔ اتنی استقامت دی اور اتنی قوتِ برداشت دی کہ میں شدید ترین اذیت کو جھیل گیا۔ میرے جسم کو انگاروں کی زبان چاٹ رہی تھی اور ہر آتشیں زخم میں کانٹے اُگ آئے تھے لیکن میں نے دانتوں کو مضبوطی سے ایک دوسرے پر جما رکھا تھا اور میرے لبوں پر سراج کے لیے ایک ناقابلِ برداشت گالی بن جانے والی مسکراہٹ زندہ تھی۔ یہ مسکراہٹ اس وقت تک رہی جب تک میں ہوش میں رہا۔ پھر اچانک احساس فنا ہو گیا اور میرا وجود گھُپ اندھیرے میں ڈوب گیا۔ درد حد سے گزرا تو دوا ہو گیا۔

میں نے دوبارہ آنکھ کھولی تو اپنے کمرے میں تھا۔ ایک شخص جو ڈاکٹر کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا تھا، میرے اوپر جھکا ہوا تھا۔

"زخم مندمل ہونے میں دو ہفتے تو لگیں گے۔" وہ بولا۔

"دو ہفتے... نہیں ڈاکٹر... زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ۔" یہ آواز سراج کی تھی۔ وہ کچھ پریشان تھا... اور خوف زدہ تھا۔

میں نے آنکھیں پھر بند کرلیں۔

"میں علاج کرسکتا ہوں... جادو نہیں کرسکتا..." ڈاکٹر نے کہا۔ "تاہم خطرے کی اس وقت بھی کوئی بات نہیں۔ میں نے اینٹی بایوٹک انجکشن دیے ہیں اس لیے کوئی پیچیدگی پیدا ہی نہیں ہوگی۔ مرہم اور پاؤڈر لگاتے رہو۔"

"لیکن اس کو جانا تھا۔"

"جائے... چلنے پھرنے سے کس نے روکا ہے۔" ڈاکٹر بولا۔ "تھوڑی سی جسمانی توانائی بحال ہو جائے تو یہ خود ہی اٹھ کھڑا ہوگا۔"

"کل سے چوبیس گھنٹے ہو چکے ہیں۔" سراج بولا۔

"چوبیس گھنٹے میں یہی ہو سکتا تھا۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "گلوکوز کی دو بوتلیں اور دے دی جائیں گی۔"

"کیا تم کسی کو زبردستی ڈرپ لگا سکتے ہو ڈاکٹر؟" میں نے اچانک کہا۔

ڈاکٹر چونک پڑا۔ "تم... تم ٹھیک ہو... ویری فائن..."

"تم زبردستی مرہم تھوپ سکتے ہو؟ پاؤڈر چھڑک سکتے ہو؟" میں نے اسی لہجے میں کہا۔ "میں تمہارے علاج معالجے پر لعنت بھیجتا ہوں... کوئی میرے قریب تو آکے دیکھے۔"

"کیا تم اچھا ہونا نہیں چاہتے؟" ڈاکٹر نے نرمی سے کہا۔

"اچھا ہو جاؤں آخر کس لیے... دوبارہ کھال اُدھیڑنے کے لیے؟" میں نے تلخی سے کہا۔ "نہیں... میں چاہتا ہوں کہ سراج مجھے اسی حالت میں پیش کرنے پر مجبور ہو... اُسے جواب دہی کرنا پڑے کہ یہ سب کیوں ہوا۔ ایک ایس پی کو بھی اندازہ ہو کہ با اختیار ہونے کے باوجود وہ اپنے آقاؤں کا زرخرید غلام ہے اور کتنا بے اختیار ہے۔"

"ہم تمہیں انجکشن دے کر سیڈیشن میں رکھ سکتے ہیں... مطلب یہ کہ سلائے رکھ سکتے ہیں۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "تم کوئی پرابلم نہیں بنو گے اور ہم گلوکوز دیتے رہیں گے۔"

"تم اگر واقعی ڈاکٹر ہو تو مجھے دُکھ ہے کہ تم نے بھی اپنے پیشے کے تقدس کو ان بے ضمیر شیطانوں کے ہاتھ بیچ دیا۔" میں نے کہا۔

"میں کون سا غلط کام کر رہا ہوں۔" ڈاکٹر نے عیاری سے کہا۔ "اگر میں کسی کی جان لوں تو یہ غلط ہوگا۔ میں تمہاری صحت کی بحالی کے لیے کوشش کر رہا ہوں تو یہی میرا اور ہر ڈاکٹر کا پیشہ ہے... اور فرض ہے۔ اگر کسی مریض کا رویہ عدم تعاون کا ہو، کوئی ہسٹریا، جنون یا پاگل پن میں اپنا اور ہمارا دشمن ہو جائے تو ہم اور کیا کر سکتے ہیں۔ ہم اسے زنجیروں سے نہیں جکڑتے لیں

سُلا دیتے ہیں۔ اس قابل نہیں چھوڑتے کہ وہ حرکت بھی کرسکے۔"

"تم فکر مت کرو ڈاکٹر..." سراج نے ڈاکٹر کے کندھے پر تھپکی دی۔ "میں مسٹر سکندر بخت کی طرف سے ضمانت دیتا ہوں کہ یہ وہی کریں گے جو ہم چاہیں گے۔ اگر یہ کتے کی دم کی طرح سیدھے نہیں ہوں گے تو ہم انھیں سیدھا کرنے کے لیے ایک چیز استعمال کریں گے جس کا نام ہے رابعہ..."

میں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ سراج ہنسا اور ڈاکٹر کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔ کاش اس مشکل وقت میں مجھے رابعہ کی یاد ہوتی، خود رابعہ نہ ہوتی۔ میں نے سوچا۔ میں اکیلا ہوتا تو اس کے تصور کے ساتھ زندگی کی ہر سختی جھیل جاتا۔ جیل کے طلب گار ہر مرحلے سے گزر جاتا... لیکن اب میں کیا کروں۔

تقریباً دو گھنٹے بعد جب میں اپنی ہی سوچوں سے نڈھال تھا، ایک شخص کمرے میں آگیا جسے میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ میرا ہی ہم عمر تھا یا مجھ سے پانچ سات سال بڑا تھا مگر اچھی صحت کے باعث کم عمر لگتا تھا۔ وہ صورت سے تعلیم یافتہ اور مہذب نظر آتا تھا اور اُسے ہینڈسم کہا جا سکتا تھا۔ اس کے چہرے کے نقوش میں وہ سختی نہیں تھی جو یہاں سب کے چہروں پہ محسوس ہوتی تھی اور مجھے یوں لگتا تھا جیسے میرے اردگرد خونی بھیڑیے جمع ہوں۔ اس نو وارد کی شخصیت میں ایک متاثر کرنے والی دلکشی تھی۔ اس کے گھنے چمکیلے سیاہ بال۔ نازک سنہرے فریم کی عینک۔ تازہ کلین شیو چہرہ اور اس کی دوستانہ مسکراہٹ اس تاثر میں خوشگوار اضافہ کرتے تھے۔ وہ کریم کلر کے بہترین سلے ہوئے سفاری سوٹ کے ساتھ اعلیٰ درجے کے جوتے پہنے ہوئے تھا۔

اس نے قریب آکے مجھ سے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ "ہیلو مسٹر سکندر بخت... کیا حال ہے؟"

میں نے ہاتھ نہ بڑھانے کا سوچا اور پھر اپنی جانب سے بداخلاقی کی ابتدا کو درست نہ سمجھتے ہوئے ہاتھ ملا لیا۔ "میری حالت کے بارے میں مجھ سے بہتر دوسرے جانتے ہیں۔ جو اس کے ذمے دار ہیں۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم کون ہو؟"

وہ ابھی کھڑا ہوا تھا۔ فرش پر بچھے ہوئے بستر پر بیٹھنے کے لیے مشکل بھی تھا اور شاید اس نے مناسب بھی نہیں سمجھا۔ "ویل... اگر تم چاہو تو مجھے اپنا دوست سمجھ سکتے ہو۔" اس نے ہاتھ پیچھے باندھ کر کہا۔

"دوست، ایک ایسے شخص کو جسے میں نے زندگی میں پہلی بار دیکھا ہو اور وہ بھی اپنے بدترین دشمنوں کے درمیان۔"

اس نے سر ہلایا۔ "میں غلط لفظ استعمال کرگیا۔ کہنا مجھے یہ تھا کہ میں ایک ایسا شخص ہوں... جو تمہارے کام آسکتا ہے۔ تمہاری بہتری کے لیے کچھ کرسکتا ہے۔"

"مثلاً یہ کہ تم مجھے اور میرے ساتھیوں کو باعزت طور پر یہاں سے نکال کے کہیں بھی پہنچا سکتے ہو۔" میں نے طنز سے کہا۔

باہر کھڑا ہوا محافظ اس کے لیے ایک اسٹول رکھنے آیا اور واپس چلا گیا۔ وہ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر بیٹھ گیا۔ اس نے جیب سے سگریٹ کیس نکالا۔ لبوں میں دو سگریٹیں دبا کے سلگائیں اور ان میں سے ایک میرے لبوں سے لگا دی۔ یہ اعتماد قائم کرنے کا اور دوستانہ فضا پیدا کرنے کا ایک اچھا طریقہ تھا۔ میں نے اندازہ کیا کہ وہ ماہر نفسیات ہوگا۔ تفتیشی اداروں میں ایسے افراد مؤثر کردار ادا کرتے ہیں جہاں پولیس کے مروجہ طریقے ناکام ہوں۔ جرم کرنے والے یا زیر تفتیش افراد بہت ذہین، ہوشیار اور مضبوط قوت ارادی کے مالک ہوں تو جسمانی تشدد سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ پھر ان کے ذہن تک رسائی حاصل کرنا اور انھیں ذہنی طور پر مطیع کرنا ضروری ہو جاتا ہے اور یہ کام وہی کرسکتے ہیں جو انسانوں کو اس طرح سمجھتے ہوں جیسے بیس پچیس سال کا عملی تجربہ رکھنے والا ماہر مکینک موٹر کے ہر کل پرزے کو سمجھتا ہے۔

"مسٹر سکندر بخت!" وہ خاموشی کے طویل وقفے کے بعد بولا۔ "تم جب سے پاکستان آئے ہو..."

"میں خود آیا نہیں، لایا گیا تھا۔" میں نے کہا۔

اس نے سر ہلایا۔ "تب سے تم اپنی مشکلات میں مسلسل اضافہ کر رہے ہو اور تمہارا یہ طرز عمل ہر روز زیادہ سے زیادہ انتقامی ہوتا جا رہا ہے۔ انتقام لینا انسان اور حیوان کی قدر مشترک ہے۔ مگر تم اپنے آپ کو انتقام کا نشانہ بنا رہے ہو اور خود کو اذیت دینا ایک منفی رجحان..."

"میں اس فضول بکواس سے تمہاری قابلیت کا تعین، تمہاری اہلیت کا اندازہ کر رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "سیدھی طرح بات کیوں نہیں کرتے کہ مجھ سے کیا چاہتے ہو۔"

اس کی مسکراہٹ کا رنگ ذرا سی دیر کے لیے پھیکا پڑا۔ "رائٹ... کل تمھیں ایک سوالنامہ دیا گیا تھا... کیا تم نے اسے دیکھا؟"

"میں نے اُسے پڑھ لیا۔" میں نے کہا۔

"اور پھر کیا فیصلہ کیا؟" وہ بولا۔

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ میرے ساتھیوں نے کیا فیصلہ کیا؟" میں نے کہا۔

"پہلے اپنا اندازہ بتاؤ، انھوں نے کیا کہا ہوگا؟" وہ نرمی سے بولا۔

"میرا اندازہ ہے کہ انھوں نے سوالنامے کو پھاڑ پھینکا ہوگا۔"

وہ معنی خیز طریقے پر مسکرایا۔ "آئی ایم سوری... میں سمجھتا ہوں تمہارے درمیان وہ انڈر اسٹینڈنگ نہیں ہے۔ وہ ذہنی ہم آہنگی ابھی پیدا نہیں ہوئی ہے کہ تم ایک دوسرے کی مائنڈ ریڈنگ کرسکو۔ دراصل یہ انڈر اسٹینڈنگ پرانے دوستوں میں طویل رفاقت کے بعد یا گہری جذباتی وابستگی سے پیدا ہوتی ہے۔ بشرطیکہ دوستی اور وابستگی بے غرض ہو۔ بقائے باہمی کے لیے ہو اور اس کا مقصد مسرت کا حصول ہو۔ تمہاری ان ساتھیوں کے ساتھ وابستگی ایک مشن کے لیے ہے۔ گویا کاروباری ہے۔"

میں نے دلچسپی سے اُسے دیکھا... الو کا پٹھا... ماہر نفسیات کی دم۔ حالات کا پتا نہیں اور آگیا تحلیل نفسی کے لیے۔ کتابی علم بگھارنے۔ قصور اس کا نہیں تھا۔ اس کے نظریات کی بنیاد وہی معلومات تھیں جو اسے فراہم کی گئی تھیں۔ اسے صرف یہ بتایا گیا تھا کہ ایم آر ایس کیا ہے۔ اس کے نزدیک یہ دہشت گردوں کا ایک ٹولہ تھا اور جیسے ہمارے دشمن صرف پیسے کی خاطر سب کچھ کر رہے تھے ایسے ہی شاید ہم نے بھی پیسے کے عوض اپنی جان کو گروی رکھ دیا ہے۔ بالفاظ دیگر ہم کرائے کے گوریلے ہیں۔

تاہم میں نے اس کی تھیوری کو مسترد نہیں کیا اور یہ ظاہر نہیں کیا کہ وہ کتنا سطحی علم اور کتنی نامکمل معلومات رکھتا ہے۔ میرے حق میں یہی بہتر تھا کہ میرے ذہن میں جھانکنے کی خواہش لے کر آنے والے کی آنکھوں پر غلط نمبر کی عینک ہی لگی رہے تاکہ وہ غلط دیکھے اور غلط سمجھے۔ میں اس کو صحیح معلومات فراہم کر دیتا اور اس کا زاویۂ نگاہ درست کر دیتا تو گویا اس کی مدد کرتا۔

"تمہارے اندازے کے برعکس انھوں نے سوالنامے کے جوابات تحریر کر دیے ہیں۔" وہ میری مایوسی سے مطمئن ہو کے بولا۔

"اچھا۔" میں نے افسوس زدہ لہجے میں کہا۔ "پھر تو مجھے بھی ان کی توقعات کو غلط ثابت کرنا چاہیے۔ انھوں نے سمجھا ہوگا کہ میں جواب لکھ دوں گا چنانچہ انھوں نے بھی لکھ دیے۔ ایسی کی تیسی ان سب کی۔" میں نے سرہانے رکھی ہوئی کاپی اُٹھا کے پُرزہ پُرزہ کر دی۔

وہ میری اس حرکت پر بالکل حیران یا مشتعل نہیں ہوا بلکہ ایسے بیٹھا رہا جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ "کوئی کام دو طرح سے کیا جا سکتا ہے۔ خوش اسلوبی سے اور کسی خرابی یا دشواری کے بغیر... وہی کام اپنے لیے مشکلات پیدا کر کے اور بڑی خرابی کے بعد کرنے والے کو عقلمند نہیں سمجھا جا سکتا۔ یہ لوگ جو تم کو یہاں لائے ہیں تمہارے دشمن ہیں۔ ان سے رحم یا رعایت کی توقع خود فریبی ہوگی لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ تم اپنی اس پوزیشن کو تسلیم کرتے ہوئے مزاحمت چھوڑ دو اور وہ سب بتا دو، جو تم سے پوچھا جا رہا ہے تو تم بہت سے عذابوں سے محفوظ رہ سکتے ہو۔ مجھے تم کو یقین دلانے کے لیے بھیجا گیا ہے کہ تم ان سے تعاون کرو گے تو وہ دوبارہ نہیں ہوگا... جو گزشتہ شب ہوا۔"

"یقین دہانی کرانے والا کون ہے؟" میں نے کہا۔

"وہ ذمے دار لوگ ہیں۔ انھوں نے سراج کو بھی سرزنش

کی ہے۔ وہ ذرا اجڈ اور بارودی مزاج رکھنے والا آدمی ہے۔ اس کے خلاف پہلے بھی بے رحمی کی شکایات ہیں۔ میں سمجھتا ہوں' وہ نارمل نہیں ہے تو اس کی وجہ ہے' یہ اس کے بچپن کے حالات کی سختی... احساسِ محرومی اور کمتری کا ردِعمل ہے۔ یوسی' اس کا باپ نہیں تھا۔ میرا مطلب ہے اس کے باپ کا نام نہیں تھا۔''

"بغیر نام کے تو کوئی شخص نہیں ہوتا... یہ کہو کہ اس کے اصل باپ کا نام اس کی دستاویزات میں کہیں ولدیت کو ظاہر نہیں کرتا۔" میں نے کہا۔

"بالکل ٹھیک۔" اس نے انگلی اٹھا کے تعریفی انداز میں کہا۔ "اس کی ماں کے ساتھ بہت ظلم ہوا۔ جس شخص نے اس سے شادی کی' وہ اس کو بدچلن سمجھتا تھا جبکہ وہ خود بدچلن تھا۔ اس نے شادی کے بعد اپنی بیوی کو گناہ کی زندگی گزارنے پر مجبور کیا۔ یہاں تک کہ ایک دن وہ عورت اپنے بچے کے ساتھ اس کے گھر سے فرار ہوگئی۔ بعد میں بھی وہ زمانے کے ہاتھوں میں بہت خوار ہوئی۔ یہ سب سراج کے ذہن میں' اس کے لاشعور میں ہے۔ وہ سارا زہر جو اس کی ماں نے پیا' نفرت کا زہر تھا۔ یہ زہر اس کے خون میں بھی شامل ہوا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اب وہ دنیا کو ان سارے مظالم کی سزا دے کر ایک تسکین حاصل کرتا ہے جو دنیا نے اس پر کیے تھے۔ ایک سینئر اور ذمے دار افسر میں زیادہ تحمل' بُردباری اور قوتِ برداشت ہونا چاہیے۔ مثلاً کل اسے اتنا مشتعل ہونے اور ایسی دیوانگی کا مظاہرہ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کی جگہ دوسرا ایس پی ہوتا تو سندر کو گرفتار کر لیتا مگر تم سے کچھ نہ کہتا۔ ظاہر ہے کہ تم نے کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ یہ مار پیٹ بے مقصد تھی۔ اسے معلوم تھا کہ تم کو تھوڑی سی مہلت آرام سے سوچنے کے لیے دی گئی ہے۔ اس نے اشتعال میں کام خراب کر دیا۔ اس پر تو لازم تھا کہ تم نے اس پر تھوکا تھا تب بھی برداشت سے کام لیتا اور رومال سے منہ صاف کر لیتا... خیر... یہ سب میں نے اس لیے بتایا کہ تم سراج کی مجبوری کو سمجھ سکو اور یہ بھی سمجھ لو کہ آئندہ وہ تمھارے سامنے نہیں آئے گا۔''

میں حیران تھا کہ وہ سراج کے بارے میں اتنا کچھ جانتا ہے۔ اس نے وہ سب دیکھا یا سنا ہے جو گزشتہ شب ہوا لیکن وہ ہمارے بارے میں معلومات نہیں رکھتا کہ میں اور محسن بچپن سے یک جان دو قالب ہیں اور رابعہ کا مجھ سے وہی رشتہ ہے جو روح کا جسم سے ہوتا ہے۔ کیا وہ تجاہلِ عارفانہ سے کام لے رہا تھا اور جانتے بوجھتے ظاہر کر رہا تھا کہ وہ کچھ نہیں جانتا؟

"میں اس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ تمھیں آزادی دلا سکوں لیکن میں اتنا ضرور کر سکتا ہوں کہ تمھارے لیے آسانیاں پیدا کر دوں۔ یہاں تمھارا قیام عارضی ہے۔ میں اور چند دوسرے لوگ یہ ذمے داری کو قبول کر چکے ہیں کہ تمھارے بارے میں اور ایم آر ایس کے بارے میں بنیادی معلومات حاصل کریں۔ یہ معلومات غلط ہیں یا صحیح۔ اس کی تصدیق ہم نہیں کریں گے۔ جو کچھ بتا دو گے ہم درست تسلیم کرتے ہوئے ریکارڈ میں شامل کر لیں گے۔ آگے وہ جانیں جن کا یہ کام ہے۔ ہم تمھارے مکمل بائیو ڈیٹا سمیت یہ سب انفارمیشن آگے پاس کر دیں گے اور تمھیں بھی ان کے حوالے کر دیں گے۔ ہم صرف عارضی طور پر تمھارے کسٹوڈین ہیں۔ ذاتی سطح پر ہمارے اور تمھارے درمیان کوئی دشمنی نہیں ہے۔ تم وہ کر رہے ہو جسے تم صحیح سمجھتے ہو۔ ہم وہ کر رہے ہیں جو ہمارے نزدیک صحیح ہے۔ فرق صرف پوزیشن کا ہے۔ اس وقت تم قید ہو اور قید کرنے والے ہم ہیں۔ کل یہ پوزیشن الٹ بھی سکتی ہے لیکن میری خواہش ہے کہ تم ہمارے لیے مشکل پیدا مت کرو۔ سوالنامے کے جواب میں کچھ بھی لکھ دو۔ جھوٹ سچ۔ ہمیں اس سے کیا۔ ہم تو کہیں گے کہ جناب' یہ ہیں آپ کے قیدی اور یہ ہے انفارمیشن جو ان سے ملی ہے۔ اس کے بعد ہمارا کام ختم۔"

اس وقت تک مجھے یقین آ چکا تھا کہ جسے میں ماہر نفسیات سمجھا تھا' وہ ایک بہت عیار اور خطرناک آدمی ہے۔ وہ خود کو جو کچھ ظاہر کر رہا تھا' درحقیقت اس سے بالکل مختلف تھا۔ میرا اندازہ غلط ہو گیا تھا۔ دوسرا اندازہ میں نے یہ لگایا کہ وہ اس انٹیلی جنس کی ٹیم کا سربراہ ہوگا جو ہماری گرفتاری اور ایم آر ایس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے خصوصی طور پر تشکیل دی گئی ہوگی۔ اس ٹیم میں جاسوس اور سراغرساں' تفتیش کے ماہر' نفسیات اور پیشہ ور قاتل سب شامل تھے لیکن اس کی نگرانی کرنے والا انٹیلی جنس کا بہت اچھی شہرت اور بہترین ریکارڈ رکھنے والا کوئی بہت اعلیٰ افسر ہوگا۔ کرنل جگن ناتھ سے بھی اوپر کے رینک کا کوئی بریگیڈیئر یا میجر جنرل۔ اعزازی عہدے والا یا سویلین نظر آنے والا۔ وہ مجھے بتا رہا تھا کہ اس کا کام ہمیں معلومات کے ساتھ دوسروں کے حوالے کرنے کا ہے۔ یہ دوسرے کون ہیں؟ مشرقی بنگال میں بغاوت کی منظم سازش کرنے والے یا ان کے مددگار بھارتی؟ دوسرے الفاظ میں وہ خود کو ایک پاکستانی ظاہر کر رہا تھا۔ سراج اور دلاور کا ساتھی بتا رہا تھا جبکہ وہ خود ہی دوسری طرف کا آدمی تھا جو ہمیں لے جانے کے لیے آیا تھا۔ جو سراج اور دلاور کا بھی باس تھا۔ ان سے کام لیتا تھا اور ان غداروں کو وطن فروشی کے راستے دکھاتا تھا۔ طریقے بتاتا تھا اور اس کے معاوضے طے کراتا تھا۔ وہ مشرقی بنگال میں ہونے والے سیاسی ڈرامے میں برابر کا شریک تھا مگر اس نے مغربی پاکستان کے سیکٹر کی ذمے داری سنبھال رکھی تھی۔ اس جیسے نہ جانے کتنے اس محاذ پر مختلف جگہ اپنی اپنی ذمے داریاں پوری کر رہے تھے۔

میں خود مختار تھے۔

"میری بات کو سمجھو اور مانو۔" اس نے اندر کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ویسی ہی دوسری ٹائپ شدہ کاپی نکالی جیسی میں پھاڑ چکا تھا۔ "میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم آرام سے رہو گے۔ سفر میں تم کو ہر سہولت رہے گی اور تمھارے ساتھیوں کو بھی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سب کو اکٹھا کر دیا جائے کیونکہ باقی سب تو جوابات دے ہی چکے ہیں۔ تم بھی جوابات لکھ دو تو تمھاری یہ قیدِ تنہائی ختم ہو جائے گی۔ سب کو ایک کوٹھی میں شفٹ کر دیا جائے گا جہاں تم گھومنے پھرنے کے لیے آزاد رہو گے۔ اندر ہی گھوم پھر سکو گے۔ باہر کی دنیا سے تمھارا رابطہ ممکن نہ ہوگا کہ ان حالات میں اس کی اجازت کیسے دی جا سکتی ہے۔ ایک میڈیکل اسپیشلسٹ تم کو دیکھنے آتا ہے۔ اس نے امید ظاہر کی ہے کہ ایک ہفتے میں تم بالکل فٹ ہو جاؤ گے۔ اس وقت بھی تم چل پھر سکتے ہو' اٹھ بیٹھ سکتے ہو۔ تم کچھ بھی منگوا سکتے ہو۔"

"مثلاً دستی بم... دور مار توپ... ایٹم بم..."

وہ ہنسا۔ "میں نے سنا تھا کہ تمھارا سینس آف ہیومر سخت حالات میں بھی ختم نہیں ہوتا... خیر... کیا اب میں امید کروں کہ تم یہ سوالنامہ بھر دو گے؟ یہ سمجھ لو کہ جتنی جلدی یہ کام کرو گے اتنی ہی جلدی یہاں سے نکل کے پُرتکلف رہائش گاہ میں منتقل ہو جاؤ گے اور اپنے ساتھیوں سے جا ملو گے۔ کوشش کرو کہ تمھارے جوابات درست ہوں کیونکہ باقی سب کے جوابات سے موازنہ ہوگا اور بہت زیادہ فرق ہوا تو..." وہ بات ادھوری چھوڑ کے کھڑا ہو گیا۔

"کیا تم بتا سکتے ہو کہ میرے باقی ساتھی کیسے ہیں؟" میں نے بے اختیار ہو کے پوچھ لیا حالانکہ میں جانتا تھا کہ وہ اس کا جو بھی جواب دے گا' وہ غلط ہوگا۔

"ٹھیک ہیں... رابعہ اور کنیز کو ہم نے ایک جگہ کر دیا ہے۔ ان کو کچھ مراعات حاصل ہیں... عورت ہونے کی وجہ سے۔" وہ بولا۔ "کیا تم رابعہ سے ملنا چاہو گے؟"

یہ سوال اتنا غیر متوقع تھا کہ میں اٹھ بیٹھا۔ "کیا یہ ممکن ہے؟"

"میں کوشش کر سکتا ہوں کہ تم چند منٹ کے لیے مل لو... بے شک کوئی تمھارے قریب موجود ہوگا۔ کسی پرائیویسی کی امید مت رکھنا۔" وہ بولا۔ "اس کے علاوہ... تمھاری گفتگو کو سننا چاہیے... ذاتی باتیں... یہ بہت غلط ہوگا اگر تم نے اس سے دوسرے سے پوچھا کہ اس نے کیا لکھا اور کیوں لکھا... اور اس کے ساتھ کیا ہوا۔ تم کوئی پلان نہیں بناؤ گے اور ایک دوسرے کو کسی قسم کی ہدایات نہیں دو گے۔ کیا ان شرائط کو تسلیم کرتے ہوئے تم کو ملنا قبول ہوگا؟"

میں نے اقرار میں گردن ہلائی۔ "میں صرف اسے دیکھوں گا... صرف تسلی دوں گا۔ اس کے آنسو پونچھ دوں گا۔ دیٹ از آل... لیکن تم کہو گے تو میں یہ بھی نہیں کروں گا۔ بالکل نہیں بولوں گا... تم ایک بار اسے لانے کا وعدہ کرو تو میں سب وعدے کر سکتا ہوں۔"

اس نے سر ہلایا اور باہر چلا گیا... اندر ہی اندر میں اس شخص کے دوغلے پن... اس کی اداکاری... اس کی پُرفریب باتوں اور اس کے شاطر ذہن کی بدمعاشی پر کھول رہا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے اس نے ظاہر کیا تھا کہ وہ میرے اور رابعہ کے جذباتی تعلق سے بے خبر ہے۔ اس نے ہماری وابستگی کو کاروباری قرار دیا تھا۔ اب وہ رابعہ کو میری جذباتی کمزوری بنا کے استعمال کر رہا تھا۔ وہ پہلے مبہم اور غیر واضح الفاظ میں دوسروں کے حوالے سے بات کرتا تھا۔ اب وہ کھل کر 'ہم' پر آ گیا تھا۔

دروازہ اب بھی کھلا ہوا تھا۔ میں اٹھ کر دروازے تک گیا۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ میری جسمانی اذیت بہت کم ہو چکی تھی۔ یہ درد کے احساس کو مٹانے والی کسی زود اثر دوا کا اثر تھا۔ میرے زخموں پر بھی کوئی ایسا ہی مرہم لگایا گیا تھا۔ زخم بالکل سطحی تھے چنانچہ کسی علاج کے بغیر بھی ٹھیک ہو جاتے۔ اینٹی بایوٹک انجکشن کے بعد انفیکشن کا خطرہ بھی نہیں رہا تھا۔

دروازے کے باہر کسی محافظ کو نہ پا کے مجھے تعجب ہوا لیکن بہت جلد میں نے سمجھ لیا کہ یہ دوسری چال ہے۔ شکاری وہی ہیں مگر جال وہ نہیں ہے۔ اب انھوں نے دام ہمرنگِ زمیں پھیلایا ہے جو نظر نہیں آتا لیکن جیسے ہی میں نے غلط قدم اٹھایا' میں نئی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤں گا۔ میں واپس آ گیا۔ دل کو رابعہ کے آنے کا سُن کر ضبط و سکون کا یارا ہی نہ رہا تھا اور صبر و قرار ساتھ چھوڑ گئے تھے... وہ آئے گی... کیا وہ آئے گی...؟ نہیں... وہ مجھے امید کا فریب دے گیا ہے۔ رابعہ کے خیال میں الجھا گیا ہے۔ وہ ابھی کچھ دیر میں آ کے کہے گا کہ سوری' بھئی سکندر بخت... وہ کہتے ہیں کہ پہلے تم سوالنامے کے جوابات دے دو تو انھیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا اگر تم ایک ساتھ اس کمرے میں بھی رہو۔

میں نے اسٹول کو روشندان کے قریب کیا اور باہر جھانکا۔ میرے سامنے مشکل سے پانچ فٹ کے فاصلے پر دوسری دیوار تھی اور ایک ایسا ہی روشندان تھا۔ اس میں بھی ٹیوب لائٹ لمبائی کے رُخ فٹ تھی لیکن میں ٹیوب لائٹ کو پیچھے سے دیکھ رہا تھا۔ پہلی عجیب بات مجھے یہ لگی کہ اس میں چوک کی طرف سے دو نہیں تین تار نکلے ہوئے تھے۔ اس میں سے دو تو واضح طور پر بجلی کے تار تھے لیکن تیسرا نسبتاً پتلا تار تھا۔ تقریباً ویسا ہی جیسا کہ ہینڈ سیٹ اور ٹیلی فون کے درمیان ہوتا ہے۔ یا جو ڈیک اور اسپیکر کے درمیان نظر آتا ہے۔ آواز کی لہروں کو برقی

مقناطیسی لہروں کی صورت میں اِدھر سے اُدھر آنے جانے کی راہ فراہم کرنے والا۔ میں نے فوراً اپنے روشندان کی ٹیوب لائٹ کے پیچھے ہاتھ مار کے دیکھا۔ اس میں بھی تین تار تھے۔۔۔ دو آپس میں بل کھا کے لپٹے ہوئے تار بجلی کے تھے۔ تیسرا پتلا اور چکنی سطح والا نرم تار تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس چکنی سطح کے نیچے دو الگ الگ تار ہیں اور ٹیوب لائٹ کے اندر ہی کسی جگہ ایک مائکروفون فٹ ہے۔

ٹیوب لائٹ کوئی پیچیدہ چیز نہیں ہوتی۔ چوک۔ اسٹارٹر اور ٹیوب۔۔۔ اس کے یہی تین اجزاء ہیں۔ چوتھی چیز وہ ٹین کا فریم ہوتی ہے جس میں ٹیوب فٹ کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ ہے تو اس کا تعلق ٹیوب لائٹ سے نہیں۔ میں نے ہاتھ گھماتے ہوئے سوچا اور بہت جلد اس چیز کو دریافت کر لیا۔ یہ بھی ایک اسٹارٹر تھا۔ ایک ٹیوب لائٹ میں دو اسٹارٹر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ دوسرا اسٹارٹر دیکھنے میں اسٹارٹر لگتا ہے لیکن اس کے اندر مائکروفون ہے۔ یہ بات سمجھ لینے کے بعد میں نے دونوں کی ساخت پر غور کیا۔ فرق بہت نمایاں تھا۔ ایک اسٹارٹر کے اوپر والے حصے میں بہت باریک جالی سی تھی۔ اسٹارٹر نکال لینے سے جلتی ہوئی ٹیوب لائٹ روشن رہتی ہے۔ فرق اس وقت پڑتا ہے جب اسے بجھایا جائے۔ بغیر اسٹارٹر کے ٹیوب پھر روشن نہیں ہوگی۔

میں نے اطمینان سے دونوں کی جگہ بدل دی۔ اسٹارٹر کی جگہ مائکروفون لگاتے وقت معمولی سا اسپارک ہوا اور تار جلنے کی مخصوص بو آئی۔ دو سو بیس وولٹ پر مائکروفون کا جل جانا قدرتی بات تھی لیکن میں نے مائکروفون کی جگہ اسٹارٹر لگایا تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ گزشتہ روز اسی مائکروفون کے ذریعے وہ سب گفتگو سراج نے سن لی تھی جو میرے اور سندر کے درمیان ہوئی تھی۔ وقتی طور پر میں نے اس نظام کو ناکارہ کر دیا تھا۔ مجھے یہ خوش فہمی نہیں تھی کہ انھیں پتا نہیں چلے گا۔ وہ دیکھتے ہی سمجھ جائیں گے کہ یہ حرکت میں نے کی ہوگی مگر اب مجھے رابعہ سے بات کرنے کا موقع ملا تو ہماری گفتگو کوئی نہ سن پائے گا۔ ایک نظر دیکھنے سے وہ فرق محسوس نہ کر پائیں گے اور جتنی دیر میں وہ چیکنگ کر کے دیکھیں گے کہ خرابی کہاں ہے آتنی دیر میں رابعہ سے بہت سی باتیں ہو جائیں گی۔

یہ کارروائی دو منٹ سے بھی کم وقت میں مکمل ہو گئی تھی۔ باہر کوئی نہ تھا لیکن یہ خطرہ بہرحال تھا کہ کوئی اچانک آ جائے۔ میں اترنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ میں نے رابعہ کی آواز سنی۔۔۔ اور گرتے گرتے بچا۔

"سکندر۔۔۔ یہ کیا کر رہے ہو؟" وہ خوفزدہ سرگوشی میں بولی۔

"کچھ نہیں۔" میں نے نیچے اترتے ہی اسٹول کھینچ کر روشندان سے دور کر دیا۔ "بیٹھو اور سناؤ کیا حال کیا ہے۔ بہت قیامت ٹل رہی ہو اس وقت۔ معلوم ہوتا ہے تمھیں خواب میں دیکھ رہا ہوں۔"

"سکندر، یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" وہ میرے اور قریب آ گئی۔ اتنا قریب کہ میں اس کے بالوں کی خوشبو کو سونگھ سکتا تھا اور اس کی آنکھوں میں اتر آنے والے موتیوں کو چُن سکتا تھا۔

"رونے سے کیا یہ سب نہیں ہوگا؟" میں نے کہا۔ "ہمت اور امید رکھو، خدا نے سندر داس کو ایک وسیلہ بنا کے بھیجا تھا وہ بہتری کی کوئی اور صورت بھی پیدا کرے گا۔ لیکن ذہنی طور پر تیار رہو کہ جنگی قیدیوں کے ساتھ کہیں بھی جینوا کنونشن کے معاہدے کے مطابق عمل نہیں ہوتا۔ نازیوں نے جو کچھ جرمنی کے کسی کیمپ میں کیا تھا وہ دوسروں نے بھی اپنے جنگی قیدیوں کے کیمپ میں کیا ہے اور یہی ہمارے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔"

"مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے سکندر۔۔۔ یہ بہت بے رحم اور شیطان لوگ ہیں۔۔۔ میں کیا بتاؤں کہ کیسی باتیں کرتے ہیں۔" وہ نظر جھکا کے بولی۔

"وقت کم ہے اس لیے جو میں کہہ رہا ہوں، وہ سن لو۔ اکرام ضامن رضوی اب ہمارے ساتھ ہیں۔ انسپکٹر سندر داس کو انھوں نے ہی سراج کے پیچھے لگایا تھا۔" میں نے کہا۔

"وہ بے چارہ تو مارا گیا۔" رابعہ کا چہرہ پھر آنسوؤں میں ڈوبا۔

"ہاں، لیکن اس نے مرنے سے پہلے اکرام شیخ کو کوئی خط بھیج دیا تھا کسی کے ہاتھ۔۔۔" میں نے کہا۔

رابعہ کا چہرہ پھر امید سے روشن ہو گیا۔ "سچ؟"

"ہاں۔۔۔ اور خبر یہ بھی ہے کہ اکرام شیخ اور نازو ایک ساتھ نکل کھڑے ہوئے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ممکن ہے غالب بھی ان کے ساتھ ہو۔"

"کیا یہ بات سب کو معلوم ہے؟"

"نہیں۔۔۔ لیکن موقع ملے تو بتا دینا۔۔۔ کہ نا امید نہ ہوں۔ بے شک ان کو خط ملنے اور ہمارا پتا معلوم کرنے۔۔۔ یہاں تک پہنچنے اور کچھ کرنے میں وقت لگے گا اور یہ ہو سکتا ہے کہ اتنی دیر میں ہم کہیں اور پہنچ جائیں۔۔۔ پھر بھی یہ ناممکن تو نہیں کہ وہ ہمارا سراغ لگا لیں۔ وہ تینوں ماشاءاللہ بہت ہوشیار ہیں۔ اب مجھے باہر گڑبڑ لگتی ہے۔ جلدی سے یہ بتاؤ کہ تم نے سوالنامے کے جوابات لکھے ہیں یا نہیں۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ سب نے لکھ دیے ہیں۔"

"یہ جھوٹ انھوں نے مجھ سے بھی بولا تھا۔" رابعہ نے کہا۔

"یہ۔۔۔ یہ کمینہ پن ہوا ہے۔" کسی نے باہر کی طرف سے روشندان میں نمودار ہو کے کہا۔ مجھے اس کی غصے سے چمکتی آنکھیں نظر آئیں۔

"کیا ہوا بھائی۔۔۔ خدانخواستہ تمھاری ہمشیرہ محترمہ۔۔۔"

"شٹ اپ۔۔۔ ایک لفظ آگے کہا تو۔۔۔" اس الیکٹریشن انجینئر نے کہا جو مائکروفون اور اسٹارٹر کی بدلی ہوئی جگہ دیکھ چکا تھا اور اب اپنی جیب میں سے دوسرا مائکروفون نکال کے صحیح جگہ پر لگا رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں مزید کچھ ارشاد فرماتا دروازے کی طرف سے ایک محافظ نمودار ہوا اور تقریباً ہم سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

"اس طرح کیوں گھور رہے ہو سالے صاحب؟" میں نے کہا۔ "غلط حرکت تم کرنے پر آمادہ ہو کر میاں بیوی کے درمیان کھڑے ہو۔ چلو ڈیڑھ انچ پیچھے ہٹو۔"

محافظ مجھے اسی طرح گھورتا رہا لیکن رابعہ میری بات پر مسکرائی۔

"ہاں تو زوجۂ محترمہ۔۔۔" میں نے کہا۔ "عرض میں یہ کر رہا تھا کہ ہم اپنے پروگرام کے مطابق نومولود۔۔۔"

"یہ کیا ہے جی۔۔۔ آپ سوالنامے کی بات کر رہے تھے؟" انجینئر نے مجھے ڈانٹا۔ "اعمال نامے کی نہیں۔"

"ہاں۔۔۔ یاد آیا۔۔۔ تو طے ہم نے یہ کیا ہے کہ اس سوالنامے کے مفصل جواب دیں اور سب کچھ سچ لکھ دیں۔ صاف بتا دیں کہ جب امریکی سفیر نے ہمیں طلب کیا تھا اور ایک کروڑ ڈالر دیے تھے۔۔۔ خیر یہ سب تو تم نے بھی لکھا ہی ہوگا۔"

"تم نے رعایت کا غلط استعمال کیا مسٹر سکندر بخت۔" وہی شخص مجھے دروازے میں نظر آیا جو رابعہ کو لانے کا وعدہ کر کے گیا تھا۔

"میں بالکل نجی باتیں کر رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اگر اس پر بھی تم کو اعتراض ہے تو میں خاموش ہو جاتا ہوں۔ وقتِ ملاقات ختم ہونے تک میں رابعہ کو دیکھنے کے سوا کچھ نہیں کروں گا۔ وہ بھی بُری نظر سے نہیں۔"

"اس لڑکی کو لے جاؤ۔" وہ مجھ پر دھیان دیے بغیر بولا۔ محافظ فوراً حرکت میں آیا اور اس نے رابعہ کو بازو سے پکڑ کے کھینچ لیا۔

"خدا حافظ۔" میں نے ہاتھ ہلا کے کہا۔ "اب میدانِ حشر میں ہی ملیں گے۔۔۔ پریشان مت ہونا۔۔۔ میں خود تلاش کر لوں گا انھیں۔۔۔"

دروازے میں کھڑا ہوا شخص اندر آ گیا۔ "یہ حیرت کی بات ہے کہ تم ان حالات میں بھی ہنسنے ہنسانے کی صلاحیت سے محروم نہیں ہوئے۔"

"سب کی طرح میں بھی روتا ہوا دنیا میں آیا تھا۔" میں نے فلسفی کی طرح کہا۔ "ہنسنے کی یہ مہلت بہت غنیمت ہے، پھر آگے پھر رونا ہے۔"

اس نے پھر سر ہلایا اور اسٹول اٹھا کے نکل گیا۔ وہ سر ہلا کے بہت کچھ کہہ جاتا تھا۔ بعض اوقات یہ انکار بھی نہیں ہوتا تھا اور اقرار بھی نہیں۔ اس کا مطلب کچھ نہیں ہوتا تھا اور کچھ بھی نکالا جا سکتا تھا۔ وہ حد درجہ ٹھنڈے مزاج کا آدمی تھا۔ بالکل برف کا بنا ہوا۔ جذبات سے عاری اور ظاہر سے باطن کی خبر نہ دینے والا۔ انٹیلی جنس سروس میں وہ اسی لیے کامیاب تھا کہ وہ گرگٹ تھا۔ اس کی شخصیت کے رنگ بدلتے رہتے تھے اور وہ ہر جگہ وقت کی ضرورت کے سانچے میں ڈھل سکتا تھا۔ اس کا اصل روپ کیموفلاج ہو جاتا تھا اور کبھی نظر نہیں آتا تھا۔

میں تھک گیا تھا اور میرے زخموں کی ٹیسیں پھر بیدار ہو رہی تھیں۔ مسکن اور دردکش دوا کا عارضی اثر کم ہونے لگا تھا۔ میں بستر پر بیٹھ گیا اور سوالنامے کو بہ آوازِ بلند پڑھنے لگا۔ پھر میں بہت دیر لیٹا رہا اور جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھتا رہا۔ انسپکٹر سندر مر گیا تھا اور مجھے اس بہادر، شریف اور محبِ وطن انسان کی موت کا بہت دکھ تھا۔ مرتے مرتے وہ ہمارے لیے ناامیدی کے اندھیرے میں امید کا ایک چراغ روشن کر گیا تھا۔ شاید اس کا پیغام اکرام شیخ تک پہنچ جائے۔ پھر شاید اکرام شیخ یہاں تک پہنچ جائے۔ ایس ایس پی ضامن رضوی کی سپاہ یہاں تک پہنچ جائے اور دشمن کے اس زیرِ زمین قلعے کو فتح کر لے۔ ہم نیچے بیٹھے گولیاں اور گولے چلنے کی آوازیں سن سن کے خوش ہوتے رہیں، یہاں تک کہ انکل رضوی کے ساتھ نازو۔۔۔ غالب اور اکرام شیخ نمودار ہوں اور انکل کہیں۔۔۔

"تم پہلے سے بہت بہتر ہو۔" ڈاکٹر نے دروازے میں نمودار ہو کے کہا۔ "میں تم کو کچھ گولیاں دے جاتا ہوں۔"

"تھری ناٹ تھری کی؟" میں نے کہا۔ "اس کے لیے رائفل بھی تو چاہیے۔"

"گڈ جوک۔۔۔ ویری گڈ جوک۔" ڈاکٹر نے ایسی بُری شکل بنا کے کہا کہ مجھے اپنا بچپن یاد آیا جب ملیریا کے علاج کے لیے کونین مکسچر پلایا جاتا تھا۔

"یہ گولیاں درد اور تکلیف میں چھ گھنٹے آرام دیتی ہیں۔" وہ خشک لہجے میں بولا۔ "کھانا کھا کے یہ دو گولیاں کھا لینا۔ اس سے نیند آ جائے گی۔"

"میں ان کا عادی ہوں۔۔۔ چار سے کم نہیں کھاتا۔" میں نے کہا۔ ڈاکٹر نے بے یقینی سے مجھے دیکھا اور میری سنجیدگی کو دیکھتے ہوئے اس نے آٹھ گولیاں میرے ہاتھ پر رکھ دیں۔

"ان میں سے چار رات کے کھانے کے بعد۔" وہ بولا۔ "سب اکٹھی کھا کے مرنے کی کوشش مت کرنا۔۔۔ تم مرو گے نہیں۔۔۔ ذرا لمبے سو جاؤ گے۔" پھر اس نے مجھے ایک اینٹی بایوٹک انجکشن لگایا اور رخصت ہو گیا۔ اس کو حیرت کے ساتھ خوشی بھی تھی کہ میری صحت یابی کی رفتار اتنی تیز ہے۔ میں نے ساری

خواب آور گولیاں اپنے بستر کے نیچے رکھ دیں اور سوالوں کے جواب لکھنے لگا۔ درمیان میں وہی ملازم میرے لیے لنچ لے کر آیا اور میں نے اس سے انتہائی اوٹ پٹانگ اور پریشان کن سوالات کیے۔ دوپہر سو کر گزارنے کے بعد میں شام کو اٹھا تو میں نے پھر کاپی کے صفحے بھرنے شروع کیے۔ حصہ اول کے جوابات میں نے یوں دیے کہ جہاں مجھے ہاں لکھنا تھا وہاں نہیں لکھا اور جہاں جواب نہیں تھا وہاں میں نے ہاں لکھا۔

حصہ دوم کے جوابات زیادہ دلچسپ تھے۔ میں نے ایک کے بعد ایک صفحہ بھرنا شروع کیا۔ رات تک میں نے دس صفحات پُر کر دیے تھے۔ رات کا کھانا کھاتے ہی میں لیٹ گیا اور نہ جانے کب تک سگریٹ پھونکتا رہا۔ میزبان بہت مہربان تھا اور میری ہر فرمائش پوری ہو رہی تھی۔ سگریٹ کے علاوہ مجھے ہر بار طلب کرنے پر کافی بھی ملی۔ رات کو میں وقفے وقفے سے سوتا جاگتا رہا۔ جب نیند آتی تھی تو میرے لاشعور کا خوف مجھے خواب میں ڈراؤنے مناظر دکھاتا تھا۔ سراج کی ہر دھمکی کا نقش زندہ ہو جاتا تھا اور میں اُٹھ بیٹھتا تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے یہ کمرہ نہیں میری قبر ہے اور صورِ اسرافیل کی صدا سے پہلے میں اس قبر سے نہ نکل سکوں گا۔

خدا خدا کر کے صبح ہوئی اور میں نے کاپی کے باقی صفحے بھی پُر کر دیے۔ یہ سب بالکل بے معنی باتیں تھیں۔ مثلاً میں نے لکھا تھا کہ ایم آر ایس کی تنظیم کے اغراض و مقاصد بہت وسیع ہیں۔ دنیا کی تمام بدصورت لڑکیوں کے لیے عاشقانِ صادق فراہم کرنا اور ان کی شادی ایسے لڑکوں سے کرنا جو چندے آفتاب چندے ماہتاب قسم کی حوریں چراغ لے کر ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ شالیمار باغ کو اسی طرح کے ٹوبہ پر منتقل کرنا۔ یہ معلوم کرنا کہ پہلے انڈا پیدا ہوا تھا یا مرغی... باقی سوالوں کے جواب میں کچھ یوں لکھا تھا کہ ایم آر ایس ملک گیر بلکہ بین الاقوامی تنظیم ہے۔ ہر صوبے میں اس کی شاخ کا سربراہ گورنر ہوتا ہے اور ڈویژن کا کمشنر۔ ان کا اجلاس ہر چودھویں رات کو چاند نکلنے کے بعد زیرِ زمین ہوتا ہے۔ ممبران کی کل تعداد اتنی ہی ہے جتنی پولیس کی نفری۔ بیرونی امداد کا یہ حال ہے کہ ایک بار امریکی سفیر نے طلب کیا تھا اور ایک کروڑ ڈالر دیے تھے کہ جاؤ کشمیر خرید لو مگر واپسی میں جیب کٹ گئی۔ روسی سفیر کو میں نے دو درجن ایٹم بم... تین درجن میزائل۔ چار درجن سپر سانک طیارے اور پانچ درجن جدید ترین ٹینک کے علاوہ بھی بہت کچھ فراہم کرنے کا حکم دیا تھا اور امید ہے کہ وہ سارا سامان بہت جلد ڈلیور کر دے گا۔ سیاسی پارٹی جس نے ایم آر ایس سے رابطہ قائم کیا تھا ٹی پارٹی کہلاتی ہے... وغیرہ وغیرہ... ہر سوال کے جواب میں ایک کہانی تھی، جس کا کوئی سر پیر نہ تھا۔

صبح دس بجے وہ پھر آیا جو خود کو میرا خیر خواہ کہتا تھا۔

میری حالت بہت بہتر تھی۔ معلوم نہیں وہ کون سا جادو اثر مرہم تھا جو میرے جسم پر ملا گیا تھا تو بدن کا درد غائب ہو گیا تھا اور صرف داغ رہ گئے تھے۔ دراصل وہ زخم جلد کی خراشوں سے زیادہ نہ تھے اور اگرچہ نیل بہت نمایاں نظر آتے تھے لیکن تکلیف نہیں رہے تھے۔ درد مٹانے والی دوائیں کھانے اور صرف آرام کرنے سے میری جسمانی حالت تقریباً نارمل ہو گئی تھی۔

"افسوس یہ ہے کہ میں تمہارے لیے کوئی اچھی خبر نہیں لایا۔" وہ ٹہلتے ہوئے بولا۔

"اگر وہ خبر سنانا بے حد ضروری ہے اور تم سنائے بغیر رہ نہیں سکتے تو میری فکر مت کرو۔" میں نے کہا۔ "میں نے اتنی بُری دیکھی ہے اور اتنی بُری خبریں سُنی ہیں کہ میرا دل پتھر ہو گیا ہے۔"

"تمہارے ساتھ جو عورت پکڑی گئی تھی۔" وہ بولا۔ "تفتیش سے معلوم ہوا کہ وہ ایک مصیبت زدہ بیوہ ہے... اتفاقیہ تم سے ملی تھی۔"

"تم کیتھرین کی بات کر رہے ہو؟"

"ہاں۔ اس نے بتایا کہ تم لوگوں نے اس کی مدد کا وعدہ کیا تھا۔" وہ بولا۔ "اس کی ایک بیٹی ہسپتال میں داخل تھی اور اسے ایک گردے کی ضرورت تھی۔ تم سب نے مل کر کوشش کی اور اس کا انتظام ہو گیا۔"

"یہ تو اچھی خبر ہے۔" میں نے کہا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "تمہارا صحافی دوست... کیا نام ہے اس کا؟"

"مرزا غالب۔"

"کہاں ہے وہ آج کل؟" وہ بولا۔

"مجھے نہیں معلوم۔" میں نے کہا۔

"تم مجھے بتا سکتے ہو... ورنہ یہ بہت سفاک اور بے رحم لوگ ہیں۔ تم سے نہیں پوچھ سکے مگر کسی نہ کسی سے معلوم کر لیں گے۔" وہ بولا۔ "ضروری نہیں کہ سب کی قوتِ برداشت اتنی ہی ہو۔"

"تم خود کو بہت شریف اور رحمدل ثابت کر رہے ہو۔" میں نے جھنجلا کے کہا۔ "اور یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہو کہ تم ہمارے ہی خواہ ہو... تم بھی یہ نہیں سمجھتے کہ جو بات کسی کو معلوم ہی نہ ہو وہ اسے بدترین عذاب دے کر بھی نہیں پوچھی جا سکتی۔ میں مانتا ہوں کہ تشدد کے جدید طریقوں کے مقابلے میں انسان کی قوتِ برداشت واقعی کچھ نہیں لیکن ایسی صورت میں انجام کار تشدد کرنے والوں کی محنت رائگاں جاتی ہے۔ اپنا وقت اور توانائی کسی کو ذہنی و جسمانی اذیت دینے میں صرف کرنے اور بعض اوقات جان لے کر بھی کچھ نہ پانے کے بعد لوگ سچ کو تسلیم کر لیتے ہیں۔"

"یہ تو ٹھیک ہے... مگر یہ میرے اور تمہارے جیسے نہیں ہوتے کہ ان کو کسی احساسِ پشیمانی سے پریشانی ہو یا ضمیر کی خلش سے۔" وہ ٹہلتے ہوئے بولا۔ "آدمی مر جائے تو ان کو اتنا صدمہ بھی نہیں ہوتا جتنا کارپوریشن کے اس ملازم کو جو لاوارث آوارہ کتے مارتا پھرتا ہے۔ یہ آدمی کو بھی کتے کی طرح پھینکا دیتے ہیں اور بھول جاتے ہیں۔ اور دوسرے کے ساتھ..."

"میں ایسی باتوں سے دہشت زدہ نہیں ہوتا۔" میں نے دانت نکال کے کہا۔ "تم مجھے وہ بُری خبر سنانا نہیں چاہتے تو نہ سناؤ... یہ مت سمجھنا کہ میں سخت سسپنس کا شکار ہوں۔"

"سوری۔" میں دوسری باتوں میں اُلجھ گیا۔" وہ بولا۔ "تمہارے صحافی دوست کی اپیل پر دوسرے اخبارات میں کام کرنے والوں نے بھی اپیل کی اور ریلیف میں سے بہت سے لوگ آئے لیکن اتفاق سے شہلا کا گردہ میچ کر گیا اور وہ بضد تھی کہ جولی کے لیے کسی اور کا نہ لیا جائے۔ ڈاکٹروں نے اُسے بہت سمجھایا تھا کہ اس حالت میں وہ رسک نہ لے۔ وہ ماں بننے والی ہے لیکن وہ مانی... اور..."

میرا دل ڈوبنے لگا۔ "کیا... کیا شہلا کو کچھ ہو گیا ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "شہلا کو نہیں..."

"تو کیا... اس کے بچے کو..." میں نے اُٹھ کے اس کا گریبان تھام لیا۔ "بتاتے کیوں نہیں؟"

اس نے خود کو چھڑانے کی بالکل کوشش نہیں کی۔ وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھتا رہا۔ "ابھی ابھی تم نے کہا تھا کہ تم ہر بُری خبر سُن سکتے ہو گویا تم خود کو فریب دے رہے تھے۔"

میں نے اُسے چھوڑ دیا۔ ایک گہری سانس لی اور بستر پر گر پڑا۔

"شہلا کے بچے کو بھی کچھ نہیں ہوا۔" اس نے اپنے کپڑوں کی شکنوں کو درست کرتے ہوئے کہا۔ "بس شہلا کی قربانی... یا اس کے جذبۂ ایثار سے جولی کو فائدہ نہیں ہوا... وہ مر گئی۔"

"اوہ مائی گاڈ..." میں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

"جولی کی کنڈیشن ایسی نہیں رہی تھی کہ اتنا بڑا آپریشن کیا جاتا۔" اس نے افسوس زدہ لہجے میں کہا۔ "لیکن ڈاکٹرز کے پاس بھی چوائس نہیں تھا۔ وہ رسک نہ لیتے تب بھی جولی مر جاتی۔ اس کا ففٹی ففٹی چانس بہرحال تھا اور انھوں نے گردہ بدلنے کا فیصلہ کیا تھا تو زندگی کے ففٹی پرسنٹ چانس پر۔ لیکن قضا و قدر کا فیصلہ دوسرے ففٹی پرسنٹ چانس کے لیے ہو چکا تھا۔ اسے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔"

"کیا یہ بات اس کی ماں کو بتا دی گئی ہے... تم سب کے سب شیطان ہو... اسے تو تم سب سے پہلے بتانے گئے ہو گے۔"

میں نے کہا۔

"دشمن سے رعایت کی امید مت رکھو۔" وہ بولا۔ "میں نے تم کو کل سمجھایا تھا۔ میں خود شاید یہ نہ کرتا مگر ہوا یہی... اب وہ تمہارے سامنے ایک شرط رکھیں گے۔ تم سب کے سامنے۔"

"کیسی شرط؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔

"یہی کہ... اگر تم غالب اور نازو کے بارے میں بتا دو اور ان کے سارے سوالات کے صحیح جوابات دے دو تو کیتھرین کو اسپتال بھیجا جا سکتا ہے۔"

"کیا؟" میں نے چلا کے کہا۔ "کیتھرین..."

"ہاں۔ اس خبر کا اس پر غیر متوقع اثر ہوا۔ وہ بے ہوش ہو گئی اور ابھی تک بے ہوش ہے۔" وہ بولا۔ "لیکن اس کو اسپتال پہنچا دیا جائے تو وہ بچ جائے گی۔"

"ان لوگوں کے نامۂ اعمال میں ایسی ہزاروں نیکیاں درج ہیں۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "بہتر ہو گا اگر کیتھرین کے قتل کی نیکی بھی کما لیں۔"

"اس کی موت ایک صدمے کا نتیجہ..."

"نہیں... اس کی موت جانتے بوجھتے طبی امداد کی فراہمی کو روکنے کا نتیجہ ہو گی۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "کسی کی خوراک روک دی جائے تو وہ بھی مر جائے گا۔ ہوا روک دی جائے تو وہ بھی مر جائے گا۔ قانون اسے طبعی موت نہیں سمجھتا۔ پھر مریض کی دوا روک دی جائے اور اس کا علاج روک دیا جائے تو کیا یہ قتل نہیں ہے؟ مجھے الفاظ کے چکر میں مت ڈالو۔ نیت کا حال خدا بہتر جانتا ہے لیکن بندے بھی اندھے نہیں ہیں۔"

وہ خاموشی سے ٹہلتا رہا۔ "تم کو شہلا کی زیادہ فکر کرنا چاہیے۔ کیونکہ جولی کے مرنے کے بعد کیتھرین کا زندہ رہنا بے مقصد تھا۔"

"اس کا فیصلہ تم کیسے کر سکتے ہو۔ وہ کسی عظیم تر مقصد کے لیے بھی زندہ رہ سکتی تھی۔" میں نے کہا۔ "موت تو زندگی کی ایسی حقیقت ہے جس کو ماں باپ بھی تسلیم کرتے ہیں خواہ ان کا سب سے بڑا... ہونہار اور کماؤ بیٹا مر جائے۔ انھیں دوسرے بچوں کے لیے زندہ رہنا پڑتا ہے۔ ماں باپ مر جائیں تو آدمی بہن بھائی اور بیوی بچوں کی خاطر زندہ رہتا ہے۔"

"لیکن کیتھرین کا تو کسی سے کوئی رشتہ نہیں۔"

"رشتے جذبات سے ہوتے ہیں اور جذباتی وابستگی کے لیے خونی رشتے ہی نہیں ہوتے۔ خلوص اور محبت کے رشتے بھی ہوتے ہیں۔ خیر یہ بات تم نہیں سمجھو گے... یہ بتاؤ شہلا کا کیا ذکر تھا؟" میں نے کہا۔

وہ رُک گیا۔ "میں نے بتایا نا کہ اس نے ڈاکٹروں کی مرضی کی پروا نہ کرتے ہوئے خود کو پیش کیا... ایک جذباتی... حرکت۔"

"تم اسے حماقت کہنا چاہتے تھے نا؟" میں نے تلخی سے کہا۔

" نیک دل رضا کار بہت تھے۔ ان کی پیشکش بھی انسانیت کی اعلیٰ ترین مثال تھی۔ شہلا کے پاس تو تعلق کی ایک وجہ تھی۔ یہ اجنبی لوگ تھے جن کا جولی سے دور کا تعلق بھی نہ تھا۔ اپنوں کے لیے تو سبھی کچھ کرتے ہیں۔ کمال ان کا ہے جو غیروں کے لیے کرتے ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ جو کچھ ہوا دیر سے ہوا۔ یہ چھ مہینے پہلے ہوتا تو جولی بھی بچ جاتی اور شہلا کے لیے یہ ایثار کوئی خطرہ پیدا نہ کرتا... اب اس کی اپنی زندگی خطرے میں ہے۔"

خطرہ کس حد تک ہے؟" میں نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔

" مجھے نہیں معلوم۔" وہ بولا۔" اطلاع صرف اتنی تھی کہ شہلا کی حالت بھی ٹھیک نہیں اور اس کو کسی پرائیویٹ اسپتال کے انتہائی نگہداشت کے یونٹ میں رکھا گیا ہے۔ ایس ایس پی صاحب کا پیسہ اور اثر و رسوخ اسے بچا لے گا۔"

اس نے آخری جملے میں جو طنز کیا تھا اسے میں نے نظر انداز کر دیا کیونکہ یہ وقت ضامن رضوی صاحب کے کردار کے دفاع کرنے کا نہیں تھا۔" یقیناً تم نے محسن کو اذیت دینے کے لیے یہ خبر ضرور سنائی ہوگی اور بہت مبالغہ آرائی کے ساتھ... میں دلاور کو جانتا ہوں... اس نے ایسا نقشہ کھینچا ہوگا کہ شہلا تو بسترِ مرگ پر ہے اور ہر سانس کے ساتھ تمہارا نام لے رہی ہے۔ ڈاکٹروں نے صاف کہا ہے کہ اس کی زندگی کی امید صرف ایک صورت میں ہے کہ محسن کو فوراً بلا لیا جائے۔ تم جا سکتے ہو اگر غالب اور نازو کا پتا بتا دو۔ ان کے ملتے ہی تم کو اسپتال پہنچا دیا جائے گا۔ تمہاری بیوی اور تمہارا بچہ دونوں بچ سکتے ہیں۔"

" کم سے کم میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔"

" تم اور وہ کیا الگ ہو؟" میں نے برہمی سے کہا۔" تم سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہو۔ دلاور کے ڈرامے بھی میں نے دیکھے ہیں اور یہ ڈراما بھی دیکھ رہا ہوں جو تم کر رہے ہو لیکن میں ایسی باتوں سے متاثر ہونے والا نہیں ہوں اور میں محسن کے بارے میں بھی یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ تم اس کے سامنے فرض اور محبت کی آزمائش کے لیے یہ دردناک فلمی سچوایشن رکھو گے تو وہ بھی متاثر نہیں ہوگا۔ وہ کہے گا کہ شہلا کو اگر خدا بچانا چاہے گا تو بچا لے گا۔ اسے منظور نہیں ہوگا تو میرے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ موت ہمارے لیے کوئی حوصلہ آزما یا حوصلہ شکن چیز نہیں جس کا خوف ہمارے ارادے بدل دے۔ ہماری عقل کو مفلوج کر دے یا ہمیں اطاعت پر مجبور کر دے۔ جس کو مرنا ہے وہ اپنے وقت پر مرے گا اور ویسے ہی مرے گا جیسے دستِ قدرت نے اس کے لیے مرنا لکھا ہے۔ اس تقدیر کو نہ ہم بدل سکتے ہیں نہ کوئی اور بدل سکتا ہے۔ ہم میں سے کوئی بھی مر سکتا ہے لیکن تمہاری کوشش سے نہیں، خدا کے حکم سے... اور خدا کے حکم کے سامنے ہم ہر وقت راضی برضا ہیں۔"

" اچھا بول لیتے ہو تم... مجھ سے دلاور نے کہا تھا۔ تمہارا... اور میں نے کہا تھا کہ وہ سب بولنے والے ہی نہیں، زبان سے نکلنے والے ہر لفظ پر عمل کرنے والے بھی ہیں... تم سب کے کردار میں سختی بھی ہے اور لچک بھی... جیسے کہ کسی فولادی سپرنگ میں ہوتی ہے۔ وہ مڑتی جاتی ہے اور ایک جگہ پہنچ کے لوٹ جاتی ہے۔ اسے موڑنے والا دوسرا نہیں کر سکتا... خیر... تم ابھی تک میری پوزیشن کو نہیں سمجھے۔ اتنے کم وقت میں سمجھ بھی نہیں سکتے میری۔ کچھ مجبوریاں ہیں لیکن میں کچھ اختیارات بھی رکھتا ہوں۔"

" محدود اور مشروط اختیارات۔" میں نے کہا۔" مثلاً تم مجھ سے مطلوبہ معلومات حاصل کرنے کے لیے کوئی بھی وعدہ کر سکتے ہو۔ یہ کہ محسن کو شہلا کے پاس پہنچا دیا جائے گا۔ کیتھرین کو اسپتال منتقل کر دیا جائے گا۔ یا یہ کہ سب کو چھوڑ دیا جائے گا۔ غلط ہے۔ ان وعدوں کی ضمانت کوئی نہیں۔ تم دس جھوٹ بول سکتے ہو اور زیادہ مہارت سے بول سکتے ہو...!"

" تم نے وہ سوالنامہ بھرا؟" اس نے اچانک میری بات کاٹ دی۔

" ہاں... باقی سب نے مجبوری کے سامنے سر جھکا دیا تو میں کیسے انکار کر سکتا ہوں۔" میں نے کہا اور کاپی اس کی طرف بڑھا دی۔ اس نے کاپی کو کھول کر ایک نظر دیکھا اور اس کے چہرے پر کامیابی کی طمانیت آمیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ کاپی بند کر کے اس نے سر ہلایا۔ جو اور بہت کچھ کہنے کے مترادف تھا... تھینک یو... ختم ہو گئی ساری اکڑفوں؟ یہ تو ہونا ہی تھا وغیرہ وغیرہ۔ پھر وہ باہر نکل گیا۔ میں اس کے جانے کے بعد اس خیال سے ہنس بھی نہ سکا کہ جوابات پڑھنے کے بعد اس کی حالت کیا ہوگی جب اس پر واضح ہوگا کہ وہ صرف بے وقوف بنا ہے اور میرے ساتھ مغز ماری کی ہے تو اس نے جھک ماری ہے۔

مجھے جولی کی موت کا سخت صدمہ تھا۔ کتنی امیدوں کے ساتھ ہم نے اس کارِ خیر کے لیے مل کر جدوجہد کی تھی۔ اس یقین کے ساتھ کہ ہم سب کی مشترکہ کوشش جولی کو موت کے منہ سے کھینچ کر واپس زندگی کی طرف لے آئے گی۔ یہ کوئی ناممکن کام بھی نہیں تھا۔ بس اس کے لیے وقت نہیں رہا تھا۔ ہم اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ قدرت نے جولی کو جتنی فرصتِ عمر دی تھی وہ تمام ہو رہی ہے جس کے بعد ساری دنیا کے ماہر ترین سرجن کوئی اعجازِ مسیحائی نہیں دکھا سکتے۔

مجھے شہلا کی طرف سے زیادہ تشویش تھی۔ اس نے بے وقوفی ضرور کی تھی مگر اس بے وقوفی پر اس کو شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ بھی وہی عشق تھا جو بے خطر آتشِ نمرود میں کود پڑتا ہے، کسی سود و زیاں کا خیال کیے بغیر۔ اپنی ذات سے بے نیاز... میں کوئی مفتی نہیں تھا اور دین کا بہت کم علم رکھتا تھا مگر میری نظر میں شہید کا کوئی مقام تھا تو بہت بلند تھا۔ شہید وہ ہو جو کسی نیک مقصد کے لیے جدوجہد کرتے ہوئے جان دے۔ تو شہلا مرنے کے بعد شہادت کا مقصد حاصل کر لیتی لیکن میں چاہتا تھا کہ وہ زندہ رہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر جولی بھی زندہ رہتی اور شہلا ایک طویل عمر تک اس خوشی کی دولت سے سرفراز رہتی جو اسے ایک زندگی بچا کے حاصل ہوئی تھی۔ ایسا نہ ہو سکا تھا تو اب ہم سب کی خوشی کے لیے شہلا کا زندہ رہنا اور اس کے بچے کا وقتِ مقررہ پر جنم لینا ضروری تھا۔ مجھے وہ وقت یاد تھا جب میرے اور ٹیڈی کے درمیان جنگ ہوئی تھی کہ چچا کی حیثیت سے پہلا حق میرا ہوگا یا ماموں کی حیثیت سے اس کا۔ اب کیا کسی کو کچھ نہ ملے گا؟ سوائے رنج و احساسِ زیاں، اور پشیمانی و پریشانی کے؟ کیا خدا ہم سب کی دعائیں مسترد کر دے گا۔ دل سے نکلنے والی دعائیں اثر ہوتی ہے تو پھر یہ دعائیں کیسے قبول نہ ہوں گی جو دل کی گہرائی سے خلوص اور صدق کے ساتھ نکلی ہیں۔ میرا حوصلہ انتہائی پست ہو گیا تھا۔ یہ بہت بڑی شکست تھی۔ بے بسی کی انتہا اور کیا ہوگی کہ ہم دشمن کی قید میں ہیں۔ ایسی جگہ میں جہاں تائیدِ غیبی کے بغیر کسی کی رسائی ممکن ہی نہیں۔ جولی مر گئی ہے۔ شہلا انتہائی نگہداشت کے یونٹ میں ہے۔ غالب اور نازو کا پتا نہیں۔ کیتھرین کو بیٹی کی موت نے ہوش سے بیگانگی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ ہمارا ایک مددگار سندر تھا جو مارا جا چکا ہے اور ہم اب غیر ملکی ایجنٹوں کی تحویل میں ہیں جو ہمیں اغوا کر کے لے جا رہے ہیں۔ ہر طرف سے ناامیدی کی یلغار ہے۔ امید کا ایک تنکا اس سیلابِ یاس میں کیسے سہارا دے سکے گا۔

میرے جوابات کا ردِعمل بہت جلد ظاہر ہوا... آدھے گھنٹے سے کم وقت میں وہ پھر آ گیا۔

" تمہارے جوابات بہت پُرلطف تھے۔" وہ بولا۔" ہم سب ہنستے ہنستے بُرا حال ہو گیا۔" لیکن یہ بات کہتے ہوئے اس کے لیے چہرے کے ناگوار اثرات اور لہجے کی تلخی کو چھپانا مشکل ہو گیا۔

" اور اب شاید میرا بُرا حال ہوگا۔" میں نے کہا۔

" تم نے ایسا کیوں کیا؟" وہ فکرمندی سے بولا۔" میں نہیں سمجھتا تھا کہ... تم اتنے... عاقبت نااندیش ہو... تم سوچ سکتے ہو... وہیں ہوا اور حالات تمہارے سامنے ہیں... خیر... مجھے افسوس رہے گا کہ میں تمہاری مدد نہ کر سکا۔"

اس کی بات ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ وہ دونوں اندر آ گئے جن کا نام معلوم نہ ہونے کے باعث میں انھیں گونگے کمانڈوز کہتا تھا۔ ان میں سے ایک نے مجھے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں کھڑا ہو گیا۔ دوسرے نے مجھے چلنے کا اشارہ دیا۔ میں چل پڑا۔ وہ میرے دائیں بائیں اس طرح چلنے لگے کہ ان کی آنکھیں، ان کے ہاتھ اور ان کا ذہن پوری طرح چوکس تھے۔ یہ ناممکن تھا کہ میں اس زیرِ زمین قید خانے سے نکل کے فرار ہو سکوں مگر وہ اپنا فرض سمجھتے تھے کہ تیار رہیں اور اگر میرا ایک قدم بھی غلط پڑے تو دماغ درست کر دیں۔ ایک بار پھر مجھے اسی جمنازیم میں لایا گیا جہاں میں نے ایک رات کا عذاب مسکراتے ہوئے جھیل لیا تھا مگر اب مجھ میں مسکرانے کا حوصلہ نہ تھا۔

اس بار مجھے فولادی کرسی میں جکڑ کر نہیں بٹھایا گیا۔ کمرے میں تین کرسیاں پڑی تھیں جن میں سے مجھے بیچ والی کرسی ملی۔ تقریباً میرے ساتھ ہی سراج اندر آیا۔ اس کی وہی زہر آلود، پُر خباثت شیطانی مسکراہٹ اس کے چہرے پر چسپاں تھی جو اس کا ٹریڈ مارک بن گئی تھی لیکن وہ مجھ سے کچھ کہے بغیر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ دوسری جانب وہ آ گیا جو میرے ہمدرد اور بہی خواہ کا رول ادا کرنے میں ناکام رہا تھا۔

" تم نے تو ہماری تفریح کا بڑا اچھا انتظام کیا تھا۔" سراج نے کچھ دیر بعد کہا۔" سوالوں کے جواب میں لطائف و ظرائف لکھ مارے۔ اب کچھ تفریح کا بندوبست ہماری طرف سے ہوا ہے۔"

" ہم تم کو ایک فلم دکھا رہے ہیں۔" دوسرا شخص بولا۔" یہ فلم ہم رابعہ کو بھی دکھا چکے ہیں۔"

سراج ہنسا۔" اور یقین کرو اس نے بڑا انجوائے کیا۔ تم بھی کرو گے۔"

میں خاموشی سے ایک شخص کو فلم کی نمائش کا انتظام کرتے دیکھتا رہا۔ اس نے مجھ سے آٹھ دس فٹ کے فاصلے پر ایک آہنی بار سے پردہ لٹکایا اور اسے کھول دیا۔ یہ چار ضرب چھ فٹ کا پردہ سفید کینوس یا زین کے کپڑے کا بنا ہوا تھا اور ایک ڈنڈے پر لپٹا ہوا تھا۔ پھر وہ پیچھے گیا اور اس نے اپنے پروجیکٹر کو ہمارے سروں سے تھوڑا سا اوپر رکھنے کے لیے پہلے ایک سنیٹر ٹیبل رکھی اور اس کے اوپر ویسی ہی کرسی رکھی جیسی میرے بیٹھنے کے کام آ رہی تھی۔ اس کرسی پر اپنا پروجیکٹر رکھنے کے بعد اس نے پلگ کو پچھلی دیوار میں لگایا اور لائٹ کو پردے پر فوکس کرنے کے لیے میز کو آگے پیچھے گھسیٹتا رہا۔ بالآخر ایک سلائیڈ پردے پر نمودار ہوا جسے آپریٹر نے بالکل ٹھیک فاصلے پر فوکس کیا تھا چنانچہ عکس بہت واضح تھا۔ میرے ذہن کو ایک الیکٹرک شاک لگا کیونکہ سلائیڈ میں ایک عورت کو دکھایا گیا تھا۔

اور یہ عورت رابعہ تھی، اسے لباس کے بغیر دیکھ کر مجھے اتنا صدمہ نہ ہوتا جتنا اسے انتہائی بے شرمی سے مسکراتا دیکھ کے ہوا۔ وہ نہایت بے باکی سے کیمرے کی طرف دیکھ رہی تھی چنانچہ مجھے اپنی طرف دیکھتی محسوس ہوتی تھی اور میرے لیے اس سے آنکھیں چار کرنا مشکل تھا۔ یہ عکس غائب ہو گیا اور اس کی جگہ دی

عورت دوسرے زیادہ شرمناک پوز میں نمودار ہوئی۔ میرے لیے یقین کرنا مشکل تھا کہ وہ رابعہ ہوسکتی ہے مگر اس میں شک کی کوئی بات نہیں تھی ..... رابعہ دشمن کے قبضے میں تھی اور اس کے جسم کو خوراک یا لباس سے محروم رکھنا اور اسے جبر سے کسی بھی ننگِ انسانیت فعل پر مجبور کرنا ان لوگوں کے اختیار میں تھا۔ ناقابلِ یقین وہ جذبات تھے جو رابعہ کی صورت پر عیاں تھے۔ میں تصور نہیں کرسکتا تھا کہ رابعہ اس طرح مسکراتے ہوئے۔ اتنی بے حیائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اور اتنی خوشی سے ایسی تصاویر اتروا سکتی ہے۔ اس کے چہرے سے جبر کا بالکل پتا نہیں چلتا تھا اور اگرچہ یہ ساکت تصاویر تھیں لیکن میں فرض کرسکتا تھا کہ آگے فلم میں بھی مرکزی کردار رابعہ کا ہی ہوگا۔ میرا دماغ خالی ہو رہا تھا اور میں گم صم بیٹھا تھا۔ آخر یہ سب کیسے ہوا۔ اگر وہ خوابیدہ ہوتی تو میں سمجھتا کہ وہ بے ہوش ہے۔ اس کی آنکھیں بند ہوتیں تو میں سمجھتا کہ اسے کچھ خبر نہیں ... لیکن وہ تو پوری طرح ہوش و حواس میں تھی۔ میرا ذہن اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی جدوجہد کر رہا تھا کہ آخر یہ کیسے ممکن ہوا۔

میں نے ابتدائی دو تین تصاویر کے بعد کچھ نہیں دیکھا۔ میری نظریں اسکرین پر رہیں اور اس پر عکس بدلتے رہے لیکن میں سوچتا رہا۔

جواب تلاش کیے بغیر میرے دماغ کا پُرسکون ہونا مشکل تھا۔ یہ جواب بہت جلد مل گیا۔ غالباً رابعہ کو شراب پلادی گئی تھی یا اسی قسم کی کوئی نشہ آور چیز دے دی گئی تھی جس سے وہ نیک و بد کی تمیز کھو بیٹھی تھی۔ یا اُسے ہپناٹائز کیا گیا تھا اور اس کے ذہن کو ناکارہ بنانے کے بعد اس طرح اپنے قابو میں کرلیا گیا تھا کہ وہ ہر حکم کی تعمیل کرتی رہی تھی۔ اُٹھ جاؤ... بیٹھ جاؤ... مسکراؤ... ادھر دیکھو... کہنا نہیں مانوں گی تو ہم سکندر کے ساتھ پھر وہی سلوک کریں گے۔ اس کے لاشعور میں ایک خوف تھا جس نے اُسے مجبور کیا ہوگا... یہ وضاحت منطقی ضرور تھی مگر پھر بھی اطمینان بخش نہیں تھی۔ میرے دل میں ایک نوکِ خار تھی جو مسلسل باعثِ آزار تھی اور مجھے احساس دلاتی تھی کہ یہ توضیح غلط ہے۔ یہ اصل بات نہیں ہے۔ میں نے ایک جواز بنالیا ہے۔ ایک سبب ایجاد کرلیا ہے۔ صرف خود کو مطمئن کرنے کے لیے رابعہ کے رویے کو قابلِ فہم بنالیا ہے۔

"تم کو تصویریں پسند آئیں؟" سراج نے میری حالت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔

"ان تصویروں سے تم کس کو بلیک میل کرو گے؟" میں نے کہا۔ "مجھے یا رابعہ کو اور ہمارے تمام دوست احباب کو کیا فرق نہیں پڑے گا اگر تم اس البم کو شائع کرا کے سارے شہر میں مفت بانٹ دو۔"

"یہ تو کچھ نہیں۔" سراج نے قہقہہ مار کے کہا۔ "ہر فلم سے پہلے سینما ہال میں سلائیڈ دکھائے جاتے ہیں نا... اس کے بعد فلم شروع ہوتی ہے۔"

میں نے اپنے دائیں بائیں دیکھا۔ وہ خبیث گونگے تو اپنے ہاتھوں کو بڑے جارحانہ انداز میں بازوؤں پر رکھے مدد کے لیے تیار کھڑے تھے۔ ان کے پیچھے دیوار کے ساتھ لگے ہوئے تین قاتل موجود تھے جن کے ہاتھوں میں آتشیں اسلحہ تھا۔ دو کے پاس ریوالور تھے اور تیسرے کے پاس مشین گن تھی۔

"پریشان ہونے کی بات نہیں۔" میرے بائیں ہاتھ پر بیٹھا ہوا شخص آہستہ سے بولا۔ "اس فلم کا رابعہ سے کوئی تعلق نہیں۔"

"اس پیشگی اطلاع کا شکریہ۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "اب اپنا یہ کھیل بند کرو کہ تم میرے بہی خواہ اور ہمدرد ہو یا دوسروں کے مقابلے میں کوئی شریف اور مہذب آدمی ہو۔ میرا خیال ہے تم زیادہ نمک حرام ہو۔"

اسی وقت فلم شروع ہوگئی۔ معلوم نہیں وہ کون لڑکی تھی۔ منظر اسی جگہ کا تھا جہاں میں بیٹھا ہوا تھا اور وہ لڑکی فرش پر گم صم بیٹھی ہوئی تھی۔ سراج نے کمنٹری کرتے ہوئے بتایا کہ یہ لڑکی ایک کالج میں لیکچرار ہے اور اس نے ہمارے لیے کام کیا تھا لیکن بعد میں جب اس کے پاس کافی پیسہ جمع ہوگیا تو یہ غائب ہوگئی۔ ہم نے اسے تلاش کرلیا۔ اسے دوبارہ کام پر لگا دیا گیا اور پھر چھ مہینے تک یہ ٹھیک رہی۔ پھر اس کی آنکھ کسی کیپٹن میجر سے لڑ گئی اور اس پر حب الوطنی کا دورہ پڑا۔ اس کے ضمیر میں فرض شناسی کے جراثیم داخل ہوگئے اور اس نے اپنے یار سے مل کر ایسا چکر چلایا کہ ہمارے بہت سے آدمی پکڑے گئے۔ کئی جگہ کامیاب چھاپے پڑنے سے لاکھوں کا نقصان ہوا اور وہ راستے بند ہوگئے جن پر ہمارا مال جاتا تھا۔ نئے راستے اور نئے آدمی تلاش کرنے میں بہت پریشانی اٹھانا پڑی۔ پھر اس نے سارے جرائم کا اعتراف کرلیا۔

یہ فلم اس لڑکی سے اعترافِ جرم حاصل کرنے کی لرزہ خیز کہانی تھی۔ اس پر روایتی طریقے کے مطابق تشدد کیا گیا تھا۔ اس کے نازک جسم پر کوڑے برسائے گئے تھے اور جلتے ہوئے سگریٹ لگائے گئے تھے۔ اس کی لرزہ خیز چیخوں کی آواز پروجیکٹر سے منسلک اسپیکرز پر مسلسل سنائی دیتی رہی۔ ان کو کسی ماہر کیمرہ مین کی خدمات بھی حاصل ہوں گی ورنہ یہ مناظر اتنی بے رحم تفصیلات کے ساتھ دکھایا نہ جاسکتا۔ میری آنکھیں اس اجنبی لڑکی پر ہونے والے ظلم کو دیکھ رہی تھیں مگر میرے تصور میں رابعہ تھی۔ وہ چند ساکت عکس تھے جو میں نے فلم سے پہلے دیکھے تھے۔ اگر شکاری یہ چاہتے تھے کہ اس فلم کو دیکھتے ہوئے میں چشمِ تصور سے اس بدبخت اور مظلوم لڑکی کی جگہ رابعہ کو دیکھوں تو وہ اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب رہے تھے۔

میں نے دل کو کسی طرح سے قائل کیا۔ میں نے فرض کیا کہ یہ سب حقیقت نہیں ہے، یہ لڑکی کوئی پیشہ ور ایکسٹرا گرل یا کوئی معمولی سی اداکارہ ہوگی جسے بھاری معاوضہ دے کر اس قسم کی شوٹنگ کے لیے رضامند کرلیا گیا ہوگا۔ اگر کوئی لڑکی تن کی عریانی قبول کرلے تو باقی کام ہدایت کار اور کیمرہ مین کرلیتے ہیں کس سین کو کس زاویے سے لیا جائے کس طرح پیش کیا جائے کہ اس کا تاثر حقیقی اور زیادہ دل گداز لگے اور کس طرح کیمرے کی آنکھ سے منظر کو یوں فلمایا جائے کہ دیکھنے والے کو سب اپنے سامنے ہوتا ہوا محسوس ہو۔ بلاشبہ غیر ملکی فلموں میں تشدد کے مناظر اتنا عام ہوتے ہیں اور وہاں ایکٹر بھی پیسہ لے کر سب کچھ کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں مگر اب مغرب کی ہر مہذب بے راہ روی ہمارے معاشرے میں بھی سرایت کرنے لگی ہے اور پیسہ تو سب کچھ بن گیا ہی آیا ہے۔ کیا عورت کی شرم و حیا اور کیا اس کی آبرو۔

اس خیال نے مجھے قائل کرلیا کہ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں وہ صرف ایک فلم ہے۔ یہ اداکارہ یا فاحشہ آج بھی کہیں موجود ہوگی اور اس کے بعد بھی نہ جانے کتنی فلموں میں بے حیائی کے مظاہرے کرچکی ہوگی۔ یہ اداکاری ہرگز نہیں تھی۔ اداکاری کا شمار فنونِ لطیفہ میں ہوتا ہے۔ اس لڑکی پر جو تشدد کیا جا رہا تھا وہ غیر حقیقی تھا اور وہ اس طرح چیخ چلا رہی تھی اور یوں تڑپ رہی تھی جیسے سچ مچ اس کے لیے یہ اذیت ناقابلِ برداشت ہے۔ میرے خیال کے مطابق یہ چیخ و پکار بھی صوتی تاثرات دینے والوں کا کارنامہ تھی جن کے پاس ہر قسم کی آوازیں بھرنے کے لیے ریکارڈ ہوتے ہیں۔

ان سب دلائل کے باوجود میرے ذہن سے وہ نقش نہ مٹتا تھا جو رابعہ کی ناقابلِ بیان حد تک شرمناک تصاویر دیکھ کر ابھرا تھا اور میرے لیے یہ اذیت انتہائی باعثِ ملال بھی تھی نہ جانے اس قسم کی تصویر کشی کے لیے ان بے رحموں نے رابعہ پر کیا مشقِ ستم کی ہوگی۔ شاید خود اسے بھی یہ تصاویر دکھائی گئی ہوں اور اس وقت وہ ہوش میں ہوگی تو اس کے دل پر کیا بیتی ہوگی۔ محسن اور ٹیڈی نے بھی رابعہ کو اس حال میں دیکھا ہوگا۔ اُف میرے خدا... کہیں ایسا نہ ہو کہ اس ذلت اور رسوائی کے احساس سے نجات پانے کے لیے رابعہ خودکشی کرلے۔ ہر لڑکی اگر حساس ہوگی تو اپنی یہ نمائش دیکھنے کے لیے اور دیکھنے والوں کی نظروں کا سامنا کرنے کے لیے زندہ رہنا پسند نہیں کرے گی۔ محسن اور ٹیڈی نے سمجھ لیا ہوگا کہ رابعہ کو مجبور کیا گیا ہوگا اور مجبور کرنے کے بہت سے طریقے ہیں۔ خدا کے لیے حوصلہ مت ہارنا رابعہ... تم ہم سب کی نظروں میں فرشتوں کی طرح معصوم رہو گی۔ یہ سب تو جنگ میں ہوتا ہی ہے۔ دشمن کوئی رعایت نہیں کرتا اور کسی ظلم کو غیر اخلاقی، غیر انسانی یا ناجائز نہیں سمجھتا۔

اچانک فلم کا منظر بدل گیا۔ آخری سین وہ تھا جب بے ہوش ہو جانے والی لڑکی کو دو آدمی اٹھا کر لے گئے تھے۔ یہ دونوں اس وقت میرے دائیں بائیں تیار کھڑے ہوئے تھے۔ نہ جانے کیوں میرا یقین متزلزل ہونے لگا کہ یہ فلم تھی جس کے سارے مناظر غیر حقیقی تھے۔ جس طرح وہ لڑکی لے جائی گئی تھی، وہ منظر حقیقی تھا۔ اتنی اچھی اداکاری اس لڑکی نے کیسے کی؟ اگر وہ واقعی ایسی اداکاری کرسکتی تو یقیناً فلمی دنیا میں صفِ اوّل کی اداکارہ شمار ہوتی کیونکہ جہاں تک ظاہری حسن و شباب کا تعلق تھا وہ بہت سی نامور اداکاراؤں کے مقابلے میں ہزار درجہ بہتر تھی پھر اس کے چہرے پر پیشہ ور، خصوصاً اس قسم کے رسوائی کردار کرنے والی 'اداکارہ والی' کوئی بات نہیں تھی۔ اگر وہ پیسے کی خاطر اس قسم کی فلمیں بنوانے والی ہوتی تو اس کی صورت پر پھٹکار برستی اور اس کے انداز و اطوار میں اس کے سارے گناہ آلود ماضی کی جھلک ہوتی لیکن وہ تو عام سی لڑکی تھی۔

ایک اور بات یہ تھی کہ اس لڑکی سے جتنے سوال جواب کیے جا رہے تھے، وہ بھی میں نے سُنے تھے۔ سوال کرنے والے سامنے نہیں تھے مگر ان کی آواز کو میں نے شناخت کرلیا تھا۔ ایک آواز استاد بیدرد کی تھی اور دوسری ایس پی سراج کی۔ میرا دل لرزنے اور کانپنے لگا۔ اگلے منظر میں وہ لڑکی اس کمرے میں تھی جس میں مجھے رکھا گیا تھا اور شاید وہ سب کمرے ایک جیسے تھے جن میں ہم سب اسیر تھے۔ اس کے ساتھ ہی دونوں گونگے کمانڈوز تھے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس فلم میں بھی ان کا کردار خاموش تھا۔ وہ ایک لفظ نہیں بولے تھے۔ وہ تعمیلِ حکم کرتے تھے یا کراتے تھے۔ کمرے میں لڑکی کے ساتھ وہی دونوں موجود تھے اور معلوم نہیں کیا کرنے والے تھے کہ لڑکی حد درجہ سہمی ہوئی تھی۔ اب مجھے یقین آنے لگا کہ یہ اداکاری نہیں۔ وہ لڑکی کوئی ایکٹریس نہیں تھی۔ جو کچھ اس پر بیتی تھی حقیقت تھی اور میں اس ظلم کو کھلی آنکھوں سے دیکھنے پر مجبور تھا۔

سراج کے کمرے میں آتے ہی لڑکی نے چیخ ماری۔ سراج کے ہاتھ میں ایک ڈبا تھا۔ جب کیمرے نے سامنے سے فوکس کیا تو مجھے پتا چلا کہ یہ ڈبا ایک چوبے دان تھا۔ اس کا سامنے کا کھل جانے والا حصہ تاروں کی جالی کا بنا ہوا تھا۔ کیمرے نے اس کو بہت قریب سے دکھایا تو مجھے اس میں چھوٹے چھوٹے چوہے اُچھلتے اور انتہائی اضطراب کے عالم میں جالی سے سر ٹکراتے دکھائی دیے۔ میں سمجھ گیا کہ اب کیا ہوگا۔ اس کا مجھے تجربہ نہیں تھا لیکن میں نے سنا تھا کہ پولیس کے پاس یہ بھی تشدد کا ایک مؤثر اور کامیاب طریقہ ہے اور اس طریقے کو استعمال کرنے کے بعد عام طور پر سچ کو چھپانے کا حوصلہ نہیں رہتا۔ یہ سب چوہے بھوکے رکھے گئے تھے اور گوشت خور تھے۔ عورت تو خیر چوہا

یا کاکروچ دیکھ کر ہی دہشت زدہ ہو جاتی ہے۔ مرد بھی ان چوہوں کی آدم خوری اور خون آشامی سے پناہ مانگنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ مجھے وہ وقت یاد آیا جب غالب کے آبائی گھر میں ایک چوہے کے آجانے سے نازو جیسی بہادر لڑکی اور رابعہ جیسی باہمت لڑکی کا کیا حال ہوا تھا۔

ان دونوں گونگے کمانڈوز نے لڑکی کو بے بس کر دیا اور سراج نے اپنے شیطانی قہقہوں کے ساتھ اسے چوہوں سے ڈرانا شروع کیا۔

گونگے کمانڈوز نے لڑکی کے ہاتھ پیچھے باندھے اور اسے چھوڑ دیا۔ وہ بُری طرح اچھلنے لگی۔ چوہے اس کے سارے جسم پر دوڑ رہے تھے مگر ان کے لیے باہر نکلنے کے سارے راستے بند کر دیے گئے تھے۔ وہ جسم سے چپکے ہوئے کپڑوں کے اندر قید تھے............ لڑکی کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے چنانچہ

وہ پاگلوں کی طرح دانتوں سے رسّی کی گرہ کھولنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کے دانت صرف آستینوں کی گرہ تک پہنچے لیکن وہ انھیں بھی نہ کھول سکی۔ قمیص کے نچلے حصّے اور شلوار کے پائنچوں تک اس کے دانتوں کی رسائی ہی نہ تھی۔ اس نے فرش پر جھک کر دُہرا ہو کے اِدھر سے اُدھر تڑپ کر گرتے ہوئے قلابازی کھا کے لوٹتے ہوئے ان موذی اور وحشی چوہوں سے نجات پانے کی بے سود کوشش جاری رکھی۔ سراج مسلسل ایک ہی سوال دُہرا رہا تھا اور لڑکی کچھ نہیں سُن رہی تھی۔ وہ پوری قوت سے چیخ رہی تھی۔ اس کے حلق سے "خدا کے لیے... رسول ؐ کے لیے... مجھے نہیں معلوم... میں نے کچھ نہیں کیا... مجھے چھوڑ دو..." کے جملے نکلتے تھے۔ پھر وہ ایسے چیخ مارتی تھی جیسے اسے ذبح کر دیا گیا ہو۔ وہ اپنی ماں کو آوازیں دے رہی تھی۔ خدا کو پکار رہی تھی۔ ان سب کی منّت سماجت کر رہی تھی لیکن اُس کی آواز بہری دیواروں سے ٹکرا کے رُک رہی تھی۔

"بند کرو... بند کرو یہ سب۔" میں نے اچانک چیخ کر کہا اور کسی دیوانے کی طرح میرے ذہن میں یہ سب کچھ تباہ و برباد کر دینے کا خیال آیا۔ پروجیکٹر، سینما کا پردہ۔ میرے ارد گرد موجود درندے۔ جلاد صفت شکاری۔ یہ عقوبت گاہ۔

میں ان سب کو نیست و نابود کر دینا چاہتا تھا لیکن وہ پہلے سے ہوشیار تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ فلم کا اثر کیا ہوگا۔ مضبوط سے مضبوط اعصاب والے کے لیے بھی یہ سب دیکھنا ناممکن تھا۔ میرے اُٹھنے سے پہلے دو مضبوط ہاتھوں نے مجھے پھر بٹھا دیا۔ سراج میرے دائیں جانب تھا۔ اس نے اپنی کرسی کو کچھ دور کر لیا۔ بائیں طرف بیٹھا ہوا شخص بھی آگے کھسک گیا۔ اور وہ دونوں گونگے کمانڈوز میرے دائیں بائیں آگئے۔ انھوں نے مجھے ایک دم اُٹھایا اور گھسیٹ کر اس کرسی تک لے گئے

جو لوہے کی بنی ہوئی تھی اور سیمنٹ کے فرش میں نصب تھی۔ میں نے بہت ہاتھ پیر چلائے اور ان کو لاتیں مارنے میں کامیاب بھی ہوا مگر وہ پروفیشنل لوگ تھے۔ مجھ سے بہت زیادہ تنومند تھے اور مار کھانا بھی جانتے تھے۔ اگر وہ چاہتے تو بندوق کا ایک کُندا مار کے مجھے ناک آؤٹ کر دیتے۔ خود گونگے کمانڈوز کے لیے میری مزاحمت کو ختم کرنا مشکل نہ تھا مگر وہ مجھے فلم دکھانے کے لیے ہوش میں رکھنا چاہتے تھے۔

مجھے اس فولادی کرسی پر چمڑے کی پیٹیوں سے باندھ دیا گیا تو سراج اور اس کا دوسرا ساتھی اپنی کرسی پھر میرے قریب لے آئے۔ سینما کا اسکرین نئے زاویے پر لٹکایا گیا اور اسی مناسبت سے پروجیکٹر کو شفٹ کیا گیا۔ میں نے ان کو بہت گالیاں دیں اور قتل کر کے ٹکڑے کتوں کو ڈالنے کی دھمکیاں دیں۔ وہ صرف مسکراتے رہے۔ وہ یہی چاہتے تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ بالآخر میری قوّتِ برداشت ختم ہو جائے گی اور میرے اعصاب جواب دے جائیں گے۔ ابتدا میں رابعہ کی تصاویر دکھانے کا مقصد بھی یہی تھا کہ جب میں فلم دیکھوں تو مجھے اس اجنبی لڑکی کی جگہ رابعہ دکھائی دے۔

"ابھی تم نے کچھ نہیں دیکھا۔" سراج بولا۔ "ابھی تو آدھی فلم ہوئی ہے... باقی آدھی بھی دیکھو۔"

"میں کچھ نہیں دیکھوں گا۔" میں نے کہا اور آنکھیں بند کرلیں لیکن اسی وقت میرے جسم کو سچ مچ کا الیکٹرک شاک لگا۔ میں تڑپ کر اُچھلا مگر اپنے بندھنوں میں کسمسا کے رہ گیا۔ میرے لب خشک ہو گئے اور سارے جسم پر پسینہ آگیا۔ میرا دل چلتے چلتے رُکا اور پھر چلنے لگا لیکن اب اس کی دھڑکن بہت تیز تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ دل میرے سینے کے زنداں کی دیوار کو توڑ دے گا۔ یہ کرسی واقعی الیکٹرک چیئر تھی۔ انھوں نے اس میں ذرا سی دیر کے لیے کرنٹ چھوڑا تھا اور بند کر دیا تھا۔

"پانی... پانی..." میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔

سراج نے قہقہہ لگایا۔ "فلم کے بعد پانی ملے گا... فلم نہیں دیکھو گے تو صرف الیکٹرک شاک ملیں گے۔"

"میں... میں یہ سب نہیں دیکھ سکتا..." میں نے کہا۔

بجلی ایک بار پھر چمکی اور اس بار یہ چمک مجھے اندھیرے میں چمکنے والی آسمانی بجلی کی طرح لگی۔ میرے دماغ میں جھکڑ چلنے لگے اور اندھیرے اجالے کی آنکھ مچولی شروع ہو گئی۔ میرا سارا جسم سُن ہو گیا اور اس میں سے آگ نکلنے لگی۔ پسینہ اب پانی کی طرح بہہ رہا تھا اور میرے حلق میں کانٹے بھر گئے تھے۔ اب میں چیخ بھی نہیں سکتا تھا اور پانی بھی نہیں مانگ سکتا تھا۔

"فلم دیکھو۔" سراج نے مجھے حکم دیا۔ "اگر تم پوری فلم خاموشی سے نہیں دیکھو گے تو ہم رابعہ کو بھی

لے آئیں گے اور باقی فلم وہ بھی تمھارے ساتھ بیٹھ کر دیکھے گی۔" وہ شخص بولا جس کا مجھے ابھی تک نام معلوم نہیں تھا لیکن وہ میرے خیال میں اس مشن کا سربراہ تھا جس کا مقصد ہمیں گرفتار کر کے لانا اور ہم سے تمام معلومات حاصل کرنا تھا۔

"ہم یہ بھی کر سکتے ہیں کہ تمھارے پپوٹے کاٹ دیں... تم پلک ہی نہ جھپکا سکو گے تو آنکھیں کیسے بند کرو گے۔ تمھاری آنکھیں ساری زندگی کھُلی رہیں گی۔ مرنے کے بعد بھی کھلی رہیں گی...... اور تم جانتے ہو اگر پلک ایک منٹ بھی نہ جھپکے تو آنکھ پر کیا گزرتی ہے۔"

میں لمبے لمبے سانس لینے لگا اور فلم دیکھنے لگا۔ فلم کے باقی مناظر شرافت اور انسانیت کی لاش کی بے حرمتی کے مناظر تھے۔

مجموعی طور پر اس فلم کی لمبائی کیا تھی، اس کا مجھے کوئی اندازہ نہ ہو سکا۔ میرے لیے وہ وقفہ صدیوں کے عذاب پر محیط تھا۔ اس الیکٹرک کرسی پر دو مرتبہ معمولی جھٹکے کھانے سے میری جو حالت ہوئی تھی، اس کے بعد مجھ میں آنکھیں بند کرنے کا حوصلہ نہ رہا تھا۔ وہ سب کچھ کر سکتے تھے۔ میں نے تشدد کے واقعات کا تذکرہ کتابوں اور رسالوں میں پڑھا تھا۔ مجرموں کے ناخن کھینچنے، دانت توڑنے اور پپوٹے کاٹنے کے واقعات نازیوں سے بھی منسوب تھے۔ دہشت پسندوں اور تفتیش کرنے والوں سے بھی یہ سب میرے ساتھ بھی ہو سکتا تھا اور رابعہ کے ساتھ بھی۔

فلم کے آخری منظر میں لڑکی مر گئی تو میں نے یوں محسوس کیا، جیسے میرے سینے سے بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا ہو۔ خدا نے بالآخر اس کو عذاب سے نجات دی۔ اس کے ساتھ کیا ہوا، یہ سب بیان کرنا بھی ناممکن ہے اور اس کا ذکر سننا بھی۔ مگر میں نے تو یہ سب دیکھا تھا اور خوف میری روح کے اندر تک سما گیا تھا کہ یہی سب کچھ رابعہ کے ساتھ ہوگا اور میں دیکھوں گا۔ دیکھنے پر مجبور کر دیا جاؤں گا۔ میری عقل اور میرے جذبات۔ میرا دل اور دماغ سب ایک ہی بات کہنے لگے تھے۔ چھوڑ دو سکندر رحمت! یہ سب کچھ چھوڑ دو جو تم کرتے رہے ہو۔ صرف رابعہ کو بچا لو۔ بھول جاؤ ایم آر ایس کو۔ اپنے مشن کو... دلاور کو... اپنے باپ کے ساتھ ہونے والے ظلم کو... اس وطن کو بیچنے والے بہت طاقتور ہیں۔ تم نے دیکھا کہ انھوں نے رابعہ کے ساتھ کیا کیا۔ رابعہ کے ساتھ؟ نہیں... ابھی رابعہ کے ساتھ کچھ نہیں ہوا۔ ہوا کیسے نہیں۔ کیا تم نے اس کی تصاویر نہیں دیکھیں... وہ دیکھو... اس لڑکی کی لاش کو ایک ٹرک میں ڈالا جا رہا ہے... ٹرک اب روانہ ہو گیا ہے۔ اس جگہ کو تم پہچانتے ہو نا... یہ لاہور کی ایک سڑک ہے۔ سا پیر مال کا حصہ... دیکھو انھوں نے لڑکی کی آبرو سوختہ... شکستہ اور زخم خوردہ لاش کو سڑک پر پھینک دیا ہے... اور اب دیکھو... وہ ٹرک واپس آ رہا ہے۔ ٹرک اس لاش کے اوپر سے گزر گیا ہے... ہا ہا ہا... ٹرک دوبارہ ریورس گیئر میں آیا... ہا ہا ہا... پھر لاش کے اوپر سے گزرا۔ اب اسے کون پہچانے گا۔ یہ کس کی بیٹی تھی۔ کس کی بہن تھی۔ کس سے پیار کرتی تھی۔ کون تھا جس نے اسے خوابوں میں بسا رکھا تھا۔ یہ کس گھر کے آنگن کو اپنے وجود کی مہکار دینا چاہتی تھی۔ کس گلشن میں پھول کھِلا سکتی تھی۔ اب یہ ایک لاوارث ناقابلِ شناخت لاش ہے۔ حشرات الارض کا رزق... اس کے لیے کوئی مدفن نہیں... کوئی لوحِ مزار نہیں... کوئی اشکبار آنکھ نہیں۔ اس کی روح تا ابد زمین اور آسمان کے درمیان چلّاتی رہے گی۔ ہے کہاں روزِ مکافات اے خدائے دارو گیر!! ہا ہا ہا... روزِ مکافات... ہا ہا ہا...

قہقہے سراج کے تھے مگر ایک وقت آیا جب میں نے محسوس کیا کہ میں بھی اس کے ساتھ ہنس رہا ہوں۔ اسی طرح قہقہے لگا رہا ہوں۔

"لے جاؤ اسے... اور وہیں ڈال دو۔" سراج بولا۔

"ڈاکٹر کو بلاؤ۔" دوسرا شخص بولا۔ "اس کے دماغ پر یہ اثر عارضی ہوگا... آدمی مستقل مزاج ہے۔"

وہ دونوں مجھے گھسیٹ کر لے گئے۔ میں راستے میں ان کو ماں بہن کی گالیاں دیتا رہا۔ ہنستا رہا اور روتا رہا۔ انھوں نے کمرے کا دروازہ کھولا اور مجھے اندر پھینک دیا۔ میں فرش پر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ ان سب مکروہ آوازوں کا شور... اس لڑکی کی جگر خراش چیخیں، سراج کی بھیانک ہنسی... سب ختم ہو گئے۔ ذہن سے سارے بے آبرو نقش محو ہو گئے۔ مجھے احساس سے پناہ مل گئی۔ جب میں پھر ہوش میں آیا تو میرا سر بھاری ہو رہا تھا۔ میں اسی زنداں کے اندھیرے میں تھا اور تنہا تھا۔ میرے قریب اسٹول پر وہی شخص بیٹھا تھا جس کو میں نے سوالنامے کے جوابات پیش کیے تھے۔ کاپی اس کے ہاتھ میں تھی۔ "ہیلو۔" وہ خوشدلی سے بولا۔ "میں تمھارے جوابات دیکھ رہا تھا۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کاپی کے صفحات پلٹتا رہا۔

"دیکھو... مجھے یہ بتا دو کہ تم کون ہو؟" میں نے لجاجت سے کہا۔

"تمھارا مطلب ہے میرا نام..." وہ بے نیازی سے بولا۔ "نام سے کیا فرق پڑے گا تم کو... فرض کرو میرا نام ایکس ہے۔ یہ نام جاسوسی ناولوں اور کہانیوں میں بہت مقبول ہے۔ تم مجھے مسٹر ایکس کہہ سکتے ہو۔"

"مسٹر ایکس... کچھ سمجھنے کی کوشش کرو۔" میں نے کہا۔ "اگر میں کچھ بتا سکتا تو ضرور بتا دیتا۔ ایم آر ایس ویسی تنظیم نہیں ہے جیسی پی ایل او... یا پھر آئی ایل آر۔ اس میں صرف ہم لوگ

ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ کچھ سوالات کے میں نے عمداً غلط جواب دیے تھے۔"

"کوئی بات نہیں۔" وہ بولا۔ "یہ لو دوسری کاپی۔ شام تک اس میں صحیح جوابات لکھ دو... جس حد تک لکھ سکتے ہو۔ ورنہ کل ایک اور فلم کی شوٹنگ ہوگی۔ فلم ویسی ہی ہوگی جیسی تم نے کل دیکھی تھی مگر اس کی ہیروئن رابعہ ہوگی۔"

"تم نے یہ دھمکی کل ہی مجھے فلم دکھا کے دے دی تھی۔" میں نے سوالنامہ لیتے ہوئے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ "کاش وہ مجبوریاں میری اپنی ہوتیں..."

"جو کسی طرح بھی مجبور نہیں، وہ ایک خدا کی ذات ہے۔" وہ بولا۔

"تم خدا کی بات کیوں کرتے ہو۔ تم اس کے وجود کے قائل ہوتے تو تمہارے دل میں اس کا خوف بھی ہوتا... جو کچھ تم کرتے ہو یا کر سکتے ہو اس پہ تو شاید خود شیطان بھی شرمسار ہو۔"

"ہر شخص اپنے اعمال کی سزا اگر خود کاٹتا ہے تو کوئی انوکھی یا غلط بات نہیں۔" وہ بولا۔ "مگر جو کچھ رابعہ کے ساتھ ہوا... یا ہو سکتا ہے اس میں رابعہ کی کوئی خطا نہیں۔ اس کے ذمے دار تم ہو... تم اسے بچا بھی سکتے ہو... نہ بچانا چاہو تو ایک بار پھر اس سوالنامے کو غلط بھر کے دیکھو۔"

"میرے پاس تمہیں بتانے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ یقین کرو سچ اتنا ہی ہے جتنا تم پہلے سے جانتے ہو۔" میں نے کہا۔ "تم کو میرے جوابات مطمئن نہیں کریں گے۔ تم یہ سمجھتے رہو گے کہ میں حقائق کو چھپا رہا ہوں۔ کسی دوسرے شہر میں یا ملک میں ہماری کوئی شاخ نہیں۔ ہمارا کوئی حمایتی تک نہیں۔ تم تصدیق کر سکتے ہو کہ کسی بھی سیاسی جماعت نے ہم سے رابطہ قائم نہیں کیا۔ کوئی ہمیں جانتا ہی نہیں تو رابطہ کیسے قائم کرے گا۔"

"میرا خیال ہے ایسے جوابات سے بات نہیں بنے گی۔" وہ بولا۔

"تو پھر یہ لے جاؤ۔" میں نے سوالنامہ اسے واپس کر دیا۔ "ویسے بھی میں تم کو کسی وعدے کا پابند نہیں کر سکتا تھا۔ یہ تو ایسی بات ہے کہ میرے پاس اپنے سچ کو ثابت کرنے کا کوئی ذریعہ ہی نہیں۔ سچ اگر ایکس رے میں ظاہر ہو سکتا یا کسی لیبارٹری ٹیسٹ سے معلوم کیا جا سکتا تو ہم سب کے لیے کوئی پریشانی کی بات ہی نہ ہوتی مگر اب بات یقین کی ہے۔ ہم سے تم لاکھ بار پوچھو۔ کسی بھی طرح پوچھو... جواب وہی رہے گا۔"

"یہ مسئلہ تو ہے۔" وہ ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ "اور افسوس کی بات میرے لیے یہ ہے کہ اس سلسلے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کی جا سکتی۔"

"دشمن کی کون مدد کرتا ہے۔ آخر تم میرے دشمن ہو اور میں تمہارا دشمن ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں تو تم پر اعتبار بھی نہیں کر سکتا کہ تمہاری کسی بھی ضمانت کی کوئی حیثیت ہے۔ تم اگر کہو کہ سکندر بخت، یہ لو خنجر اور اپنا گلا کاٹ لو۔ اس کے بعد باقی سب کو چھوڑ دیا جائے گا... تو یہ حرام موت ہوگی۔ میرے جان دینے کے بعد بھی تم باقی سب کے ساتھ وہی کرو گے جو تمہارا دل چاہے گا۔ مجھ سے کیے ہوئے وعدے اور میری قربانی کا خیال تک نہیں آئے گا۔ تم کہو گے کہ وہ تو بے وقوف تھا کہ ہم نے کہا اور اس نے مان لیا۔ خس کم جہاں پاک۔ اور بات صرف میری نہیں۔ تم کسی کے سامنے بھی یہ شرط رکھو گے تو وہ دوسروں کے لیے اپنی جان دینے کو تیار ہو جائے گا۔ جسے تم بے وقوفی سمجھ سکتے ہو وہ ہم سب کے لیے خلوص اور وفاداری کے جذبات کا نام ہے۔"

"میں ایسی کوئی شرط عائد نہیں کر رہا ہوں۔"

"ہاں... تمہاری شرط اس سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔" میں نے کہا۔ "تم سچ جاننا چاہتے ہو اور ہمارے سچ کو سچ نہیں مان سکتے پھر ٹھیک ہے جو تمہارا دل چاہے کرو۔"

"گویا تم نے آخری فیصلہ کر لیا ہے کہ کسی بھی سوال کا جواب نہیں دو گے۔" وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

"میرے فیصلے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں جواب دوں یا نہ دوں، تمہارے لیے ایک ہی بات ہے۔ تم ہمیں جیسے جی چاہے مار ڈالو۔ تھوڑا تھوڑا کر کے قتل کرو... بے آبرو کر کے مارو... ہمارے جسم سے قطرہ قطرہ خون کشید کر دو یا ہمیں پُرزہ پُرزہ کرو... جو ہم نہیں جانتے وہ کیسے بتا سکتے ہیں۔ تم تو ہماری لاشیں بھنبھوڑتے ہوئے بھی پشیمان نہیں ہو گے۔ دعا کا کیا سوال ہمیں گالی ہی دو گے کہ حرام زادے ضدی تھے۔ جان دے دی مگر بتایا کچھ نہیں۔ ہمارا وقت بھی برباد کیا اور توانائی بھی ضائع کی۔" میں نے کہا۔

وہ کچھ متاثر معلوم ہوتا تھا۔ اس نے پھر سر ہلایا مگر اس سے کچھ پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ قائل ہو گیا ہے یا کچھ اور فیصلہ کر چکا ہے۔ جب وہ دروازے کے قریب تھا تو اس نے پلٹ کر دیکھا۔

میں نے کہا۔ "تم یہ تو بتا سکتے ہو کہ کیتھرین کی حالت اب کیسی ہے؟"

"کوئی خاص فرق نہیں... ڈاکٹر نے کہا تھا کہ مینٹل شاک کی یہ کیفیت عارضی ہوگی تو چوبیس گھنٹے میں معلوم ہو جائے گا۔ چوبیس گھنٹے تو گزر گئے۔ اب یہ ہے کہ اسے کسی نیورو سرجری کے وارڈ میں کسی ماہر کی زیرِ نگرانی رکھا جائے تو وہ ہوش میں آ سکتی ہے مگر وقت کا تعین مشکل ہے۔ ہفتہ دس دن بھی لگ سکتے ہیں... مہینہ بھر بھی۔"

"اور اگر وہ اسی طرح پڑی رہی تو...؟"

اس نے فقط کندھے ہلا کے لاعلمی کا اور مایوسی کا اظہار کیا۔ "یہ تو پھر جو خدا کی مرضی۔ جب تک زندگی ہوگی جیے گی اسی طرح..." وہ پھر جانے کو تھا کہ میں نے اُسے روک لیا۔

"شہلا کی کوئی خبر ہے...؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا اور باہر چلا گیا۔ مجھے احساس ہوا کہ میرا سوال احمقانہ تھا۔ بھلا انہیں کیا پڑی ہے کہ وہ شہلا کی خیریت معلوم کرتے پھریں۔ اُن کی بلا سے کل کی مرتی آج مر جائے۔ اس کے جانے کے بعد میں بہت دیر تک سر کو دونوں ہاتھوں میں تھامے بیٹھا رہا۔ میری عقل تجھ سے مدد اور رہنمائی مانگتی ہے میرے پروردگار۔ میں نے دل کی آواز میں کہا۔ میں کیا کروں۔ اگر اس مصیبت سے نجات کی کوئی صورت ممکن نہیں تو ہمارے لیے موت کو آسان کر دے۔ شہلا اور محسن کے لیے۔ کیتھرین کے لیے۔ میرے اور رابعہ کے لیے۔ ہمیں موت سے پہلے کے عذاب سے محفوظ رکھ۔

میں نے وہ سارا دن یوں گزارا جیسے سزائے موت پانے والا قیدی زندگی کا آخری دن بسر کرتا ہے۔ میں پاگلوں کی طرح اندر مختصر سے دائرے میں چلتا رہا یہاں تک کہ میری ٹانگیں جواب دے گئیں۔ ڈاکٹر دوبارہ آیا اور مجھے چیک کر کے چلا گیا۔ اس نے مجھے فِٹ قرار دیا۔ میں نے اس کو بہت گالیاں دیں... اسے قصاب، جلاد اور شیطان کہا۔ میرا ذہنی توازن پھر بگڑنے لگا تھا۔ میں دروازہ کوٹتا رہا اور رابعہ اور محسن کو آوازیں دیتا رہا۔ پھر دلاور اور سراج کو گالیاں دیتا رہا۔ ان کی منت سماجت کرتا رہا یہ جانتے ہوئے بھی کہ میری آواز کسی کے کانوں تک پہنچ رہی ہے تب بھی بے اثر ہے۔

میں نے سارا دن کھانا نہیں کھایا اور جو کھانا آیا تھا وہ ملازم کے مُنہ پہ پھینک دیا۔ رات آئی تو مجھے ان گولیوں کا خیال آیا جو میں نے ڈاکٹر سے لی تھیں۔ وہ آٹھ گولیاں میرے بستر کے نیچے موجود تھیں۔ میں نے آٹھوں گولیاں ہتھیلی پہ رکھیں اور چبا کے کھا گیا۔ ان کا ذائقہ بہت خراب تھا مگر میں نے مزے لے لے کر سب کو حلق سے اتار لیا۔ اور نیند، بے ہوشی یا موت کا انتظار کرنے لگا۔

میری آنکھیں نیم غنودگی سے بوجھل ہو رہی تھیں جب میں نے کسی عورت کے چیخنے کی آواز سُنی۔ وہ یوں چلا رہی تھی جیسے وحشی اور بھوکے بھیڑیے ہر طرف سے اس کی بوٹیاں نوچنے کے لیے اس پر یلغار کر رہے ہوں۔ "خدا کے لیے... چھوڑ دو مجھے... مجھے جانے دو... سکندر... مجھے بچاؤ... سکندر... سکندر..." وہ اسی طرح چیخ رہی تھی جیسے وہ لڑکی جسے میں نے ایک فلم میں بڑی بے آبروئی اور بڑے عذاب کے ساتھ مرتے دیکھا تھا۔ مجھے وہ بات بھی یاد تھی کہ یہ سب کچھ رابعہ کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ آواز رابعہ کی ہے۔ میں نے نیم خوابیدہ ذہن کو بیدار کیا اور غور سے سُننے کی کوشش کی۔ شک کی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ رابعہ تھی... رابعہ نہ ہوتی تو مجھے کیوں پکارتی۔ لیکن اس وقت تک میرے حواس پہ نیند غالب آنے لگی تھی۔

دوسری بار میں نے پھر وہی درد و کرب میں ڈوبی ہوئی فریاد سُنی۔ یہ رابعہ کے سوا کسی کی آواز نہیں ہو سکتی تھی۔

"یا اللہ... اللہ میری توبہ..." وہ شدید تکلیف میں دہشت سے چیخ رہی تھی۔ "چھوڑ دو... مجھے چھوڑ دو... خدا کے لیے..."

"رابعہ..." میں نے دیوانہ وار چلّا کے کہا اور بند دروازے پہ مکّے مارنے لگا، پوری قوّت کے ساتھ۔ جیسے اپنے خالی ہاتھوں کی قوّت سے میں دروازے کو توڑ ڈالوں گا۔

"اللہ... اُف اللہ... آہ... قسم خُدا کی... قسم رسولؐ کی... مجھے نہیں معلوم..." اس کی مسلسل چیخوں سے میرا دماغ پھٹنے لگا۔ "ارے ظالمو... مجھے مار ڈالو... میرا گلا کاٹ دو... گولی مار دو مجھے... لیکن مجھے ایسا عذاب مت دو... یا خُدا... ہائے میں کیا کروں... کدھر جاؤں... سکندر... مجھے بچاؤ سکندر... سکندر... سکندر..."

"رابعہ..." میں نے دروازے پر پاگلوں کی طرح یلغار کی۔ "رابعہ... میں آ رہا ہوں... میں ان سب کا خون پی جاؤں گا... دلاور... سراج... رابعہ کو چھوڑ دو... اسے کچھ نہیں معلوم... اسے عذاب مت دو..." میں نے دروازے پہ لاتیں اور مکّے برسانا جاری رکھا۔ میرے ہاتھ زخمی ہو گئے۔ میرا دماغ رابعہ کی مدد کی پکار سے مفلوج ہو رہا تھا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ میں ان پتھر کی دیواروں سے گزر کے رابعہ تک پہنچ سکوں لیکن میں چلّا چلّا کے کہہ رہا تھا کہ میں آ رہا ہوں اور مسلسل اس بند دروازے سے ٹکرا رہا تھا۔ مجھے یہ بھی پتا نہ تھا کہ رابعہ اس تہ خانے میں کدھر ہے۔ کتنے بند دروازے اور کتنی سنگ و خشت کی دیواریں میرے اور اس کے درمیان حائل ہیں۔ میں تو اس کے جسم پر گزرنے والا سارا عذاب جھیل رہا تھا۔ اس کی ہر صدا پہ میرے دل میں درد کا آتشیں نشتر پیوست ہو جاتا تھا اور ایک ناقابلِ برداشت کرب بن کے میرے وجود کو نگلنے لگتا تھا۔ میرے احساس کو سُن کرنے لگتا تھا۔ وہ مسلسل چیخ رہی تھی اور اس کی ہر چیخ ایک تڑپ تھی۔ میری آنکھیں اسے دیکھ رہی تھیں کہ وہ بھوکے بھیڑیوں کے نرغے میں ہے جو اس کے بدن پر اپنے سفّاک پنجوں اور اپنے خونی دانتوں کی درندگی آزما رہے تھے۔ اس کے زخمی لہولہان جسم پہ اپنے شیطانی ہاتھوں کے لمبے لمبے ناخنوں سے حیوانیت کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ اسے ہوس پرست، سفّاک اور خون آشام جانور بھنبھوڑ رہے تھے۔ ہر طرف سے نوچ رہے تھے۔ کاٹ رہے تھے۔ اس کے گرد جمع ہو کے دہشت اور بربریت کا ننگا رقص کر رہے تھے۔ عورت کی مجبوری سے فائدہ اُٹھا کر اس کی عصمت اور عفت

اور معصومیت کی دھجیاں اُڑا رہے تھے۔ اور وہ چلّا رہی تھی۔ خُدا کو مدد کے لیے پکار رہی تھی۔ مجھے بُلا رہی تھی۔ موت مانگ رہی تھی۔

میں نے چیخ چیخ کر دلاور کو اور سراج کو ایک سے ایک گندی گالی دی اور اپنا سر دروازے سے ٹکرانے لگا۔ رابعہ کی آواز میرے دل کو یوں پارہ پارہ کر رہی تھی کہ ہر قطرۂ خوں درد و کرب کا سمندر بن کے اُبلنے لگا تھا لیکن پھر بھی وہ دُکھ بھری' بے بس پکارتی ہوئی آواز کئی ہزار نوکیلے دندانوں والی آری کی طرح میرے جگر کو کاٹتی جا رہی تھی۔

بالآخر دروازہ کسی نے باہر سے کھولا۔ میں ایک وحشی قوت کے ساتھ باہر نکلا اور اس جال میں اُلجھ گیا جو شکاری پہلے سے پھیلائے کھڑے تھے۔ یہ نائلون کی مضبوط ڈوریوں سے بنا ہوا جال تھا جو عین درِ زنداں کے مقابل رکھا گیا تھا کہ میں اپنے پاگل پن میں نکلوں تو مجھے قابو کرنے کے لیے کسی کو ایک انگلی بھی نہ ہلانا پڑے۔ وہ میری ذہنی کیفیت کا اندازہ کر سکتے تھے اور یہ بھی سمجھتے تھے کہ جو بھی میرے سامنے آئے گا مارا جائے گا خواہ اس کے ہاتھ میں مشین گن ہی کیوں نہ ہو۔

جال ایک دم میرے گرد لپٹ گیا۔ میں نے ہر طرف ہاتھ پیر چلائے اور اس جال کی ڈوریوں کو ہاتھوں سے توڑنے کی اور دانتوں سے کاٹنے کی دیوانہ وار کوشش کی مگر میری ساری جدوجہد تلوار سے ہوا کو کاٹنے یا سمندر کے ٹکڑے کرنے کی احمقانہ کوشش کے سوا کچھ نہ تھی۔ جال سمٹتا گیا اور میں چیختے چیختے سچ مچ پاگل ہو گیا۔ میں اس وقت اپنی حالت دیکھنے سے قاصر تھا۔ لیکن میری سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ میرے حلق سے بے ربط اور بے معنی آوازیں نکل رہی تھیں۔ میں کبھی رابعہ کو پکارتا تھا کبھی دلاور اور سراج کو' پیڈرو کو اور خسرو جمشید کو گالیاں دینے لگتا تھا۔ میں نے ان سب کی ماں بہن کو ایک کر دیا تھا۔ میں اُنھیں مضحکہ خیز دھمکیاں دے رہا تھا اور جال میں یوں تڑپ رہا تھا جیسے جنگل میں پکڑا جانے والا خونخوار چیتا۔ مجھے بے بس کرنے والے وہی دونوں خاموش رہنے والے تھے جو صرف حکم کے غلام تھے اور اسی طرح کام کرتے تھے جیسے مشینی نظام والا روبوٹ کسی آپریٹر کے اشارے پر چلتا ہے۔ ان کے ذاتی جذبات و احساسات کا سرے سے وجود نہ تھا۔ وہ بے پناہ قوت کے مالک تھے اور جسمانی اعتبار سے دیوزاد تھے۔ ان کو خصوصی تربیت کے ذریعے ہر صورت حال سے نمٹنا سکھا دیا گیا تھا چنانچہ وہ خالی ہاتھوں سے لڑ سکتے تھے۔ یا قتل کر سکتے تھے۔ ابھی تک انھوں نے اسلحہ استعمال نہیں کیا تھا مگر میرا بہت پہلے سے خیال تھا کہ وہ ریوالور سے اسٹین گن تک سب کچھ چلاتے ہوں گے اور ممکن ہے ہر قسم کی گاڑی ڈرائیو کر سکتے ہوں اور جہاز اُڑا سکتے ہوں۔ وہ محض اعلیٰ تربیت یافتہ اور ہر کام کی صلاحیت رکھنے والے ملازم تھے جن کو اطاعت گزاری اور وفاداری کے سوا کچھ نہ آتا تھا۔

وہ مجھے جال میں گرفتار کر کے گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔ میں نے خود کو پھر اسی جمنازیم جیسے عقوبت خانے میں پایا۔ میرا خیال تھا کہ رابعہ اسی عذاب گاہ میں ہوگی مگر وہاں صرف دلاور تھا جو بڑے طنزیہ اور معنی خیز انداز میں مسکرا رہا تھا۔ میں ابھی تک جدوجہد میں مصروف تھا۔ میں نے اپنے ہاتھوں اور پیروں کو زخمی کر لیا تھا' اپنے کپڑے پھاڑ لیے تھے اور اپنے بال نوچ ڈالے تھے۔ میرے بازوؤں سے' میرے ماتھے سے اور چہرے سے رسنے والے خون کی لکیریں میری حالت کو مزید مضحکہ خیز بنا رہی تھیں۔ مجھے اب رابعہ کی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ شاید وہ بے ہوش پڑی ہوگی۔ شاید وہ مر گئی ہوگی۔ میں نے سہم کر سوچا۔

سراج اندر آیا اور دلاور کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ اب وہ دونوں میری دیوانگی اور میری بے چارگی کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ میری سعیٔ رائیگاں پر خندہ زن تھے۔ وہ اپنی فاتح قوت کے غرور کا مقابلہ میری شکست کی ذلّت سے اور میری مجبوری سے کر رہے تھے۔

"بھئی سراج صاحب! یہ اپنے سکندرِ اعظم ہیں۔ ایم آر ایس کے چیئرمین۔" دلاور نے اپنے غیر جذباتی لہجے میں کہا۔

سراج نے قہقہہ مارا۔ "چوہے دان کے اندر چوہا۔"

"ایسا تو مت کہو یار... یہ ماشاءاللہ سے بڑے جیالے اور شُورما ہیں۔" دلاور بولا۔ "جوڈو کراٹے جانتے ہیں۔ میرے تمھارے جیسے دس کو چت کر سکتے ہیں۔ دیوار کو یوں گرا سکتے ہیں۔" وہ چٹکی بجا کے بولا۔

سراج نے آگے بڑھ کر میرے بال پکڑ لیے۔ "یہ تو بہت پتلی ڈوریاں ہیں۔ دیواریں گرا سکتے ہو تو ان کو کیوں نہیں توڑ سکتے... تم تو نرشیر ہو اور یہ جال تو خرگوش پکڑنے کے کام آتا ہے۔"

"سراج... ایس پی صاحب... خدا کے لیے۔" میں نے ہاتھ جوڑ کے کہا اور گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔

"اب خدا یاد آیا۔" سراج نے میرے سر کے بالوں کو مٹھی میں لے کر اتنی قوت سے جھٹکے دیے کہ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "کیا یہ خدا کا حکم تھا کہ ایم آر ایس بناؤ۔"

"اور اپنے سکندر صاحب! یہ تو بڑی بزدلی دکھا رہے ہو۔ آپ جیسے عزت والے کبھی ہم جیسے کمینوں کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہیں؟" دلاور نے طنز سے کہا اور پیچھے ہاتھ باندھ کے ٹہلنے لگا۔ "آپ تو خیر سے مجاہد ہو۔ جان و مال اور عزت و آبرو سب قربان کرنے کا حوصلہ رکھتے ہو... وہ کیا فرمایا ہے اپنے علامہ صاحب نے کہ مر گئے تو شہید اور زندہ رہے تو غازی شعر و شاعری کی بات ہے' اس لیے صحیح یاد نہیں مگر کچھ ایسا ہی ہے اس میں' آپ سمجھ گئے ہوں گے۔"

"سراج! تمھیں اپنی ماں کی قسم۔" میں نے کہا۔ "رابعہ کو چھوڑ دو۔"

سراج نے میرے سر پہ لات ماری۔ "اچھا سلوک کیا تھا تم نے میری ماں کے ساتھ۔ اس نے ایک رات تم کو مہمان رکھا اور پھر تم نے اسی کے گھر کو بم سے اُڑا دیا۔"

"لیکن اس کو تو کچھ نہیں ہوا تھا۔ ہم نے اُسے نکال لیا تھا۔"

"کیا اس سے تمھارے جرم کی سنگینی کم ہو جاتی ہے؟" سراج نے دوسری لات میرے بازو پر ماری۔ "تم کسی عورت کو گھر سے نکال کے گھر کو آگ لگا دو۔ بم سے تباہ کر دو... اور پھر کہو کہ عورت کی زندگی تو بچا لی۔ یہ پوچھو اس عورت سے کہ اس کے دل پر کیا گزری۔ اس کے دل میں تمھارے لیے شکر گزاری کے جذبات ہیں یا نفرت کے؟ وہ گھر میرے باپ کا تھا... میری ماں کے شوہر کا۔ اس گھر میں جو کچھ تھا' اس سے میری ماں کی تمام زندگی منسوب تھی۔ اس کی یادوں کا سارا خزانہ لوٹ لیا تھا تم نے... اس کو بے گھر کر دیا تھا۔"

"جانے دو سراج۔" دلاور بولا۔ "ان سے ناتجربہ کاری اور جوانی کے جوش میں بہت غلطیاں ہوئی ہیں۔ ہمارا تو نقصان کیا سو کیا' اپنا بھی خوب بیڑا غرق کیا انھوں نے... واہ بھئی' واہ اپنے سکندر صاحب... پڑھ لکھ کے بھی آپ ہم سے زیادہ بے وقوف رہے۔ کیا بہادری ہے کہ دشمن کے سر پہ ڈنڈا مارا تو اپنے پاؤں پہ کلہاڑی مار لی۔"

"میں تم کو آخری موقع دے رہا ہوں۔" سراج نے سو فیصد ایس پی کے لہجے میں کہا۔ "بہت لحاظ کر لیا میں نے۔ اس کمینے سندر نے تم کو بہت گمراہ کیا۔ تم یہ سمجھنے لگے کہ بس اب تمھارے حمایتی اور مددگار پہنچنے ہی والے ہیں۔" اس نے حقارت سے ایک گندی گالی دی۔ "یہاں اُن کے فرشتے بھی پَر نہیں مار سکتے۔ نہ تمھارے وہ انکل رضوی ایس ایس پی بہادر... نہ وہ ایس آئی اکرام... بے غیرت شخص۔ اس کی بہن فاحشہ ہے۔ راتوں کو گھر سے باہر رہتی ہے۔ جوان مردوں کے ساتھ جہاں چاہتی ہے' راتیں گزارتی ہے۔ کیا میں نہیں جانتا۔ دنیا نہیں جانتی کہ تم لوگ کچھ بھی نہیں ہو۔ صرف آوارہ مزاج' مغرب زدہ اخلاقی اقدار کے ماننے والے... مادر پدر آزاد لڑکے اور لڑکیاں وہاں بھی مشترکہ خاندان بنا کے رہتے ہیں۔ شادی کو غیر اہم سمجھتے ہیں۔ معاشرتی' اخلاقی اور مذہبی زنجیروں کو توڑ کے سمجھتے ہیں کہ انھوں نے انفرادی آزادی حاصل کر لی۔ ان کے لیے خاندان کچھ نہیں اور خاندانی ذمّے داریاں بھی کچھ نہیں۔"

"تم بکتے ہو۔" میرا خون کھنچ کر سر میں آ گیا۔

"نہیں... میں جانتا ہوں تم نے چار سال لندن میں گزار کے یہی سیکھا اور اب وہی سب کچھ یہاں کر رہے ہو۔" سراج نے کہا۔ "تم سب جوائنٹ فیملی سسٹم پر رہتے ہو... کیسا نکاح اور کیسی شرعی قیود۔ تم حیوانی سطح پر رشتے قائم کرتے ہو... میں جانتا ہوں کہ یورپ میں بھی یہ انتہائی گرے ہوئے' معاشرے کے ٹھکرائے ہوئے' بے ضمیر اور بے کردار افراد کا شیوہ ہے۔ ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں۔ وہاں ننگوں کے کلب بھی ہیں اور ان کے ممبر لباس کو انسان کے لیے غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ لباسِ فطرت تو برہنگی ہے۔ خدا آدمی کو دنیا میں جس طرح بھیجتا ہے اسے ویسے ہی رہنا چاہیے۔ تمام ذی روح رہتے ہیں۔ انسان بھی جانور ہے۔ اگر تعلق رکھتا ہے تو کیا ہوا۔ تم نے بھی شاید یہاں خود ایم آر ایس کے نام پر وہی کلب بنا رکھا ہے اور یہ جو ڈھونگ رچایا ہے تم نے کہ تم محبِ وطن ہو' یہ سب اپنے کرتوتوں کا پردہ ہے۔ رابعہ تمھاری ہی نہیں محسن' غالب اور ٹیڈی کی بھی..."

"سُؤر کے بچے... خبیث... کُتے۔" میں نے غصّے میں پاگل ہو کے چیخنا شروع کیا۔ "ایک بار مجھے چھوڑ کے دیکھ... پھر میں تجھے بتاؤں کہ ماں اور بہن میں کیا فرق ہوتا ہے۔ بیوی' محبوبہ اور داشتہ میں کیا فرق ہوتا ہے۔"

"ہوتا ہے' مگر تم نے سب کو ایک کر دیا ہے۔" سراج نے کمینگی سے کہا۔ "تم سب کے سامنے مُنہ پر کسی کو بہن کہتے ہو کسی کو بھابی۔ مگر ہیں وہ سب تمھارے لیے صرف عورتیں..."

میں اسے چیخ چیخ کر گندی گالیاں دینے لگا۔ دلاور مسکراتا رہا' میں جال میں پھنسا ہوا تھا اور وہ مجھ سے زیادہ دُور نہیں تھے مگر بالکل محفوظ تھے۔ پھر میری آواز بیٹھ گئی۔ میرے لیے سانس لینا مشکل ہو گیا اور سراج پھر بولنے لگا۔ اس نے نازو' شہلا اور رابعہ کے بارے میں اور زیادہ غلیظ باتیں شروع کر دیں۔ میں تھک گیا تھا۔ اگر میرے اعصاب پہلے کی طرح مضبوط ہوتے تو میرا ردِّ عمل یہ نہ ہوتا۔ میں ساری بکواس سُن کر بھی پُرسکون رہتا اور سمجھتا کہ کُتا بھونک رہا ہے تو اس میں بُرا ماننے کی کون سی بات ہے۔ بھونکنا کُتے کی فطرت بھی ہے اور عادت بھی۔ کبھی کبھی وہ کاٹ لے' تب بھی کوئی ایسی بات نہیں مگر اس وقت میں اپنے آپ پر قابو رکھنے میں ناکام تھا۔ ذرا سی بات سے میرے اعصاب کے تار جھنجھنا اُٹھتے تھے۔ جب یہ بات میری سمجھ میں آ گئی کہ سراج کی ہرزہ سرائی کا مقصد صرف مجھے ذہنی اذیت پہنچانا اور میرے اعصاب کو زیادہ کمزور کرنا ہے تاکہ میری مزاحمت کی قوت کم سے کم ہو جائے تو میں خاموش پڑا سب سنتا رہا۔ کیا یہ لوگ دوسروں کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کر رہے ہوں گے؟ رابعہ پر ہونے والے

تشدد کو تو میں نے دل کی آنکھ سے دیکھا تھا اور خود بھی جھیلا تھا مگر مجھے محسن اور ٹیڈی یا کیتھرین کی کوئی خبر نہ تھی۔ کیا ان پر بھی ایسے ہی جسم اور ذہن کو شکست دینے والے حربے آزمائے گئے ہوں گے؟ جواب اثبات میں آیا۔ یہ لوگ کسی کو بھی رعایت دینے والے نہیں تھے۔ مایوسی کی انتہا کو پہنچنے کے بعد میں بے حد قنوطی ہو گیا تھا۔ مجھے اب کوئی امید نہیں رہی تھی کہ اس مصیبت سے ہمیں چھٹکارا مل سکتا ہے۔ میں سب کچھ بتانے کو تیار تھا لیکن مشکل یہ تھی کہ جو کچھ میں بتا سکتا تھا، وہ اس سے کہیں زیادہ پوچھ رہے تھے۔ میرے پاس اگر سونے کا ایک سکہ تھا جسے میں چھپا سکتا تھا تو وہ مجھ سے سونے کی کان کا پتا معلوم کرنا چاہتے تھے جو میرے فرشتے بھی نہیں بتا سکتے تھے۔ میں ان کی ہر شرط قبول کرنے کو تیار تھا۔ میں ایم آر ایس سے دستبرداری قبول کر سکتا تھا۔ اپنے مشن سے تائب ہونے پر تیار ہو سکتا تھا۔ انھوں نے ذہنی اور جسمانی طور پر مجھے ہی نہیں میرے حوصلے کو بھی ختم کر دیا تھا۔ مجھے احساس دلا دیا تھا کہ میری ساری جدوجہد بے مقصد اور احمقانہ تھی۔ میں گوشت پوست کا بنا ہوا انسان تھا۔ کوئی پتھر یا فولاد کا مجسمہ نہیں تھا کہ مجھ پر کسی چیز کا اثر نہ ہوتا اور میں سپرمین نہیں تھا کہ ساری عمر ہر قسم کا تشدد جھیلتا رہتا اور پھر بھی اپنی بات پر اڑا رہتا۔ یہ کسی کے لیے بھی ممکن نہیں تھا لیکن انتخاب ہمارے ہاتھ میں نہیں تھا کہ ہم کچھ کر سکتے اور پہلے جو ہوا اس کو بھول کر ندامت کا اظہار کرتے اور آئندہ کے لیے وہ راستہ اختیار کر لیتے جو ہمیں دکھایا جاتا۔ دشمنوں سے نجات مشروط تھی اور ان کی شرائط کو ناممکنات میں شامل سمجھا جا سکتا تھا۔ ٹریجیڈی یہ ہے کہ فلموں، قصے کہانیوں اور تصورات کی دنیا میں ہیرو ناقابلِ شکست ہوتا ہے۔ وہ تنہا سارے دشمنوں کو، زمانے بھر کو، سماجی اور معاشرتی اقدار کو یہاں تک کہ قانون کو شکست دے سکتا ہے۔ فوجوں سے لڑ جاتا ہے اور سب پر غالب آتا ہے۔ عملی زندگی میں ایک آدمی کا بدمعاشوں۔ اسمگلروں۔ پولیس یا مسلح افراد کی طاقت سے مقابلے کا سوال ہی نہیں۔ وہ مارا جاتا ہے اور کبھی ہیرو نہیں بن سکتا۔ چنانچہ معاشرے میں برائی بڑھتی جا رہی ہے۔ زبردست کی حکومت قائم ہو رہی ہے۔ لاقانونیت کا رجحان پھیل رہا ہے اور اصول پرستی، فرض شناسی اور قانون یا حق کی باتیں کرنے والے احمقوں کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔

میں نے اپنا سر زمین پر رکھ دیا تھا۔ اس جال کے اندر میں واقعی خود کو چوہے سے زیادہ حقیر، کمزور اور بے بس محسوس کر رہا تھا۔ جب میں نے خاموشی پر غور کیا تو سر اٹھا کے دیکھا۔ کمرے میں اب کوئی بھی نہیں تھا۔ مجھے جال میں باندھ کر لانے والے شکاری تک رخصت ہو چکے تھے۔ میں جال سمیت ادھر سے ادھر لڑھکنے کے لیے آزاد تھا لیکن اس کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ اس ہال کے سارے دروازے بند تھے۔ اوپر ایک لائٹ جل رہی تھی اور یہ وہی بے رحم لائٹ تھی جو تیز ہو جاتی تھی تو آنکھوں میں زبردستی گھستی تھی۔ اسے کسی ریگولیٹر سے تیز یا مدھم کیا جاتا تھا۔

کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز پر میں نے سر گھما کے دیکھا، شکاری اب محسن کو دوسرے جال میں گرفتار کر لائے تھے۔ انھوں نے محسن کو گھسیٹ کر میرے قریب ڈال دیا اور لوٹ گئے۔ محسن کے گرد بھی جال یوں لپٹا ہوا تھا کہ وہ ایک گٹھڑی بن گیا تھا۔

"محسن!" میں نے بمشکل تمام کہا۔ "تو ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں..." وہ کراہ کے بولا۔ "انھوں نے مجھے مرنے نہیں دیا۔"

"ایک نہ ایک دن تو یہ ہونا ہی تھا۔ ہم حالات کی موافقت یا اتفاق سے بچتے رہے تھے اور جو کچھ ہم نے کیا تھا اس سے خوش فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے کہ ہم ان کو ختم کر دیں گے۔"

"حالانکہ ایسا سوچنا بھی بے وقوفی تھا۔ یہ ایک طاقت ہیں۔ ان کے پیچھے غیر ملکی ہاتھ ہیں۔ ان کے پاس اسلحہ ہے، وسائل ہیں اور فوجی قوت ہے۔" محسن بولا۔

"اب پچھتانے سے کیا فائدہ۔" میں نے کہا۔ "یہ بتا کہ ہم ان کی غلط فہمی کیسے رفع کریں؟ کیسے یقین دلائیں ان کو کہ ہم ہی ایم آر ایس ہیں۔ ہم کوئی قومی یا عالمی دہشت گرد یا حریت پسند تنظیم نہیں ہیں۔ ہمیں کسی قسم کی سیاسی حمایت حاصل نہیں ہے۔ ہماری پشت پر کوئی سپر پاور نہیں ہے۔"

"اس کا یقین تو انھیں ہمارے مر جانے کے بعد بھی نہیں آئے گا۔" محسن بولا۔ "لیکن موت ابھی کہاں۔"

"کیا انھوں نے تجھے... بہت تشدد کیا تجھ پر؟"

"تجھ پر تشدد نہیں ہوا کیا؟" محسن نے کہا۔ "میں اور تو اور ہم سب ان کے لیے برابر ہیں۔ سب کے ساتھ ایک سا سلوک ہو رہا ہے۔ اس میں شک کی کون سی بات ہے۔"

میں محسن کی حالت دیکھ سکتا تھا۔ جال کے اندر سے بھی اس کے پھٹے کپڑے... چوٹوں کے نشانات... بدن کے نیل اور لہو کے داغ دکھائی دیتے تھے۔

"محسن... انھوں نے رابعہ کو..." میں نے کہا۔

"دل کو پتھر کر لے سکندر... رابعہ سب سے زیادہ عذاب جھیلے گی کیونکہ وہ عورت ہے اور ہم سب کی کمزوری ہے۔ جذبات کے رشتے سب سے بڑی کمزوری ہوتے ہیں... انہی سے آدمی کا استحصال ہوتا ہے۔" محسن بولا۔

"کیا تجھ کو معلوم ہے کہ... کہ شہلا...؟"

"ہاں، شہلا مر گئی۔" محسن نے سکوت سے کہا۔

"مر گئی...؟"

"ہاں... کیا تجھے نہیں معلوم؟" محسن تلخی سے بولا۔

"مجھے صرف اتنا بتایا تھا... کہ اس نے ایک گردہ جولی کے لیے دینے کی غلطی کی تھی۔" میں نے بمشکل تمام کہا۔

"غلطی؟ غلطی کیسی... اس نے تو بہت اچھا کیا کہ اپنے بے مقصد... آسان اور ثواب کی موت قبول کی۔" محسن ہنسنے لگا۔ میری طرح اس کا ذہنی توازن بھی خاصا متاثر ہوا تھا۔

"اس کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا..."

"اسے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔ ورنہ ایک دن وہ بھی یہاں پہنچتی... آج نہ سہی تو کل... ایک ہفتے یا ایک مہینے بعد..." محسن بولا۔ "یا اس وقت جب اس کے وجود سے جنم لینے والے بچے کے دنیا میں وارد ہونے کے دن قریب ہوتے۔ ابھی تو وہ وقت بہت دور تھا... وہ یہ سب عذاب کیسے برداشت کرتی سکندر... اور وہ بچہ... اس نے تو کوئی قصور نہیں کیا تھا مگر اس کو بھی سزا ملتی... اب وہ ماں کے ساتھ مر گیا... اچھا ہوا... میں نے اس کی صورت صرف تصور میں دیکھی... وہ میری گود میں نہیں کھیلا... اسے بھول جانا آسان ہو گا... شہلا نے بھی صرف خواب دیکھے تھے۔ ابھی اس کی مامتا کے سوتے نہیں پھوٹے تھے۔ وہ اسے اپنی کوکھ میں چھپا کے ان بے رحم درندوں کی دسترس سے دور چلی گئی۔ زمین میں چھپ گئی... اس نے بہت اچھا کیا سکندر۔ بے شک وہ جولی کی جان نہ بچا سکی... لیکن اس نے نیت کا ثواب حاصل کر لیا... نیکی کما لی... اس کی بخشش ہو گئی۔ وہ تو اس معصوم کے طفیل بھی بخشی جاتی جس کو اس نے اپنے وجود میں سنبھال کر رکھا تھا کہ وہ زندگی خدا کی امانت تھی اور شہلا نے باعزت طور پر اسی کو لوٹا دی... یہاں بے عزت ہو کے مرتے سے اسے کیا ملتا۔" وہ اب زار و قطار رو رہا تھا۔ میں رحم کھانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ یہ اطلاع کہ شہلا بھی مر گئی میرے دل کے زخم پر تازہ دہکتے انگارے کی طرح تھی جس کی اذیت کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

"میری شہلا مجھے چھوڑ گئی سکندر۔ وہ میرے بچے کی ماں نہ بن سکی۔" محسن نے روتے ہوئے کہا۔ "اب میں زندہ رہنا نہیں چاہتا۔ کچھ بھی کرنا نہیں چاہتا۔ نہ اپنے لیے نہ تیرے لیے نہ ایم آر ایس کے لیے۔"

مایوسی... مایوسی... مایوسی... ہر سمت ناامیدی کا گھٹا ٹوپ اندھیرا... زندگی کی مجبوریاں... زندہ رہنے کا عذاب۔ نجات کا سراب۔

"کیا جولی بھی مر گئی ہے محسن؟"

"ہاں۔ مجھے کیتھرین نے بتایا تھا۔" محسن بولا۔

"اور کیتھرین پھر بھی زندہ ہے۔"

"میں اور تو بھی زندہ ہیں۔" محسن نے کہا۔ "زندہ نہ رہنا بھی ہمارے بس میں نہیں تو پھر کیا کریں... کیسے مریں؟"

"کیا ہم ایک دوسرے کے جال کی ڈوریاں نہیں کھول سکتے؟"

"معلوم نہیں۔ مگر اس سے کیا فائدہ؟" محسن بولا۔ "وہ ہمیں پھر باندھ جائیں گے۔"

"ہم کوشش تو کر سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"کوشش کی ضرورت کیا ہے۔ جال کاٹ دیا تب بھی یہاں سے نکل تو نہیں سکتے۔" محسن نے کہا۔

میں نے محسن کی بات نہ مانتے ہوئے لڑھکنا شروع کیا اور اس کے قریب چلا گیا۔ میرے مجبور کرنے پر محسن نے ہر طرف سے میرے جال کو دیکھا اور مایوسی سے سر ہلایا۔ پھر میں نے اُسے چاروں طرف سے دیکھا تب مجھے یقین آیا کہ اس جال کے کسی پھندے کو کاٹنا یا کھولنا ممکن نہیں۔ اس کا کوئی کنارا نہیں تھا۔ کسی جگہ ڈور کا کونا نہیں تھا اور سب پھندے ایک سے کسے ہوئے لگتے تھے۔ ڈوری کو دانت سے کاٹنے کی کوشش میں میرے دانت درد کرنے لگے مگر ڈوری پر اثر نہ ہوا۔

"آخر ایسے کب تک چلے گا محسن؟" میں نے کہا۔ "کب تک یہاں رکھیں گے یہ لوگ ہمیں؟"

"یہی سوال میں تجھ سے کرتا ہوں۔ مجھے تو جواب نہیں معلوم۔ تجھے معلوم ہے تو بتا دے۔" محسن بولا۔

سراج اور دلاور ایک بار پھر اندر آئے۔

"ہاں بھئی، اپنے سکندر بخت صاحب! خوب گپ شپ رہی پھر یاروں میں؟" دلاور نے اپنے مخصوص لب و لہجے میں کہا۔ "آج شہلا کی تدفین ہے... اور جولی کی بھی۔" سراج نے خباثت سے مسکرا کے کہا۔ "ہم نے ایک آدمی بھیجا تو ہے کہ فلم بنا لے یا کم سے کم تصویریں لے آئے۔"

"ایک فلم آپ نے ضرور دیکھی ہو گی یہاں... اپنے سکندر صاحب! ابھی کچھ دن پہلے کی بات ہے۔" دلاور نے لبوں پر زبان پھیر کے آنکھ ماری۔ "وہاں ولایت میں آپ نے مووی کی بہت فلمیں دیکھی ہوں گی مگر کیا وہ ایسی تھیں؟"

"اور وہ فلم تجربہ حاصل کرنے کے لیے بنائی گئی تھی۔" سراج نے کہا۔ "تجربہ ہی آدمی کے کام آتا ہے۔ اب جو فلم ہم آج بنائیں گے، ابھی تھوڑی دیر میں... وہ بہت بہتر ہو گی... ہر لحاظ سے۔"

"اور آپ یہ سمجھ لیں جناب عالی۔" دلاور نے کہا۔ "کہ جہاں اس وقت ہم ہیں، یہ اسٹوڈیو ہے... اپنے سراج صاحب بڑے اچھے ڈائریکٹر ہیں۔ انھوں نے سارا انتظام کیا ہے۔ لائٹ مین۔ کیمرا مین... ایکٹر جو ہر سین میں الگ ہوں گے۔"

"ایک ہی ہیروئن کے ساتھ۔" سراج نے قہقہہ مارا۔

"ہم کوشش کریں گے کہ انجام ویسا نہ ہو۔" دلاور مسکرایا۔

"وہ جو لڑکی تھی، وہ ہماری ناتجربہ کاری کے باعث مر گئی تھی۔ انشاء اللہ اب ایسی غلطی نہیں ہو گی۔ اور ہیروئن خود اپنی فلم کا ہر شاٹ دیکھے گی۔ اس کی کاپیاں سارے پاکستان میں نمائش کے لیے بھیجی جائیں گی۔ خاص طور پر تمھارے ایس ایس پی صاحب کو۔"

"نازو کے گھر والوں کو۔" سراج بولا" اور وہ جو محسن کی بہن ہے نا... تمھاری پرانی داشتہ... اس کے شوہر کو۔"

ایک بار پھر میرے ضبط کا پیمانہ چھلک گیا۔ میں چلّانے لگا اور انھیں گالیاں بکنے لگا۔"تم سب کتے ہو... شیطان ہو... رابعہ کے ساتھ تم کچھ بھی کر کے دیکھ لو... وہ تم کو کچھ نہیں بتا سکے گی... اس کو کچھ معلوم ہی نہیں۔"

"تم تو جانتے ہو... شوٹنگ کے دوران میں جب مناسب سمجھو بتا دینا... ورنہ فلم تو پوری بنے گی۔" سراج بولا۔ ابھی وہ بات کر ہی رہا تھا کہ دو افراد بڑے بڑے کیمروں کو دھکیلتے ہوئے اندر لائے، یہ فلموں کی شوٹنگ میں استعمال ہونے والے کیمرے تھے جو تختوں پر نصب اسٹینڈ کے اوپر رکھے ہوئے تھے۔ تختوں کے نیچے بال رولر تھے۔ چنانچہ انھیں کسی بھی سمت میں گھمایا اور چلایا جا سکتا تھا۔ پھر دو آدمی بھاری بھرکم سرچ لائٹس اٹھا کے لائے۔ انھوں نے لوہے کے اسٹینڈ والی لائٹس کو آمنے سامنے رکھ دیا اور ان کے پلگ لگا کے روشنی کے سیلاب کا رُخ متعین کرنے لگے۔ کیمروں نے بھی ایک پلیٹ فارم کو فوکس کیا جو لکڑی کا بنا ہوا تھا اور زمین سے ایک فٹ اونچا تھا... اس کی لمبائی چوڑائی دس فٹ سے زیادہ تھی۔ پلیٹ فارم کمرے کے دوسرے کنارے پر اور ہم سے پندرہ فٹ دور تھا۔ مجھے خیال آیا کہ جتنا زیر زمین جیسا کمرہ پہلے اتنا بڑا نہیں تھا۔ غور سے دیکھنے پر مجھے معلوم ہو گیا کہ درمیان کی دیوار ہٹا لی گئی ہے۔ یہ دیوار لوہے کی سمٹ جانے والی گرل تھی جس کے سامنے پہلے پردے پڑے ہوئے تھے۔ دو حصوں کے ایک ہو جانے سے کمرے کی مجموعی لمبائی چوبیس پچیس فٹ ہو گئی تھی مگر چوڑائی اتنی ہی رہی تھی۔ جو کچھ وہاں ہونے والا تھا اس کا تصور کرنے سے ہی میرا جسم سرد پڑنے لگتا تھا اور میرا دل ڈوبنے لگتا تھا۔

"محسن!" میں نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

"کیا بات ہے۔ تو ڈر رہا ہے؟"

"ہاں یار... یہ لوگ ایسا نہیں کر سکتے۔" میں نے کہا۔

"کیوں نہیں کر سکتے... یہ سب کچھ کر سکتے ہیں۔" محسن بولا۔ ان سے کہہ ایسا نہ کریں... جتنا ظلم کرنا ہے مجھ پر کر لیں۔"

"یہ میرا کہنا ماننے والے لوگ نہیں ہیں... ورنہ رابعہ کی جگہ ہی نہیں تیری جگہ بھی میں خود کو پیش کر دیتا۔" محسن دکھی لہجے میں بولا۔ "نہ تیری اور کیتھرین کی جگہ بھی میں خود پر سارا ظلم برداشت کر لیتا۔ لیکن یہاں سودا کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ سودا وہ کر سکتے ہیں جو کچھ دے سکتے ہوں۔ ہمارے پاس کیا ہے دینے کو؟"

"ہاں، جو کچھ یہ مانگ رہے ہیں... وہ تو نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

اچانک رابعہ کی آواز پھر سنائی دی۔ "چھوڑ دو... خدا کے لیے... مجھے معاف کر دو... اللہ... یا اللہ... اللہ... ہائے... ہائے میں مر گئی... سکندر..."

"میرے کانوں میں سیسہ ڈال دے محسن..." میں نے اپنے ہاتھوں کی دونوں انگلیاں کانوں میں ٹھونس کر کہا مگر رابعہ کے چیخنے کی آواز اسی طرح سنائی دیتی رہی۔ "میں پاگل ہو جاؤں گا محسن۔"

"کاش، میں بھی ہو جاؤں۔" محسن بولا۔ "دیوانگی میں احساس کا یہ عذاب تو نہیں ہو گا۔ میں خود بھی پاگل ہو جانا چاہتا ہوں تاکہ دکھ سکھ، دوسروں کے رنج و غم سب سے نجات مل جائے۔ کوئی فکر نہ رہے۔ کوئی خیال پریشان نہ کرے۔ نہ آج کی پروا ہو نہ کل کی... نہ زندگی کا حصار ہو نہ موت کی تمنائے لاحاصل۔"

"میں بہت بے غیرت ہوں محسن۔" میں نے کہا۔ "مجھے موت بھی نہیں آتی۔ کاش مرنا میرے اختیار کی بات ہوتی۔ میں سانس روک لیتا اور پھر نہ لیتا۔ میں اپنے دل کی دھڑکن کو روک لیتا۔"

"میں بھی یہی سوچتا ہوں کہ ابھی تک میرا ہارٹ فیل کیوں نہیں ہوا جب میں نے سُنا کہ شہلا مر گئی ہے... میرا بچہ مر گیا ہے میرا اور اس کے سارے خواب مٹی میں مل گئے ہیں تو صدمے سے میری حرکتِ قلب بند کیوں نہیں ہوئی۔ آخر وہ بھی تو ہوتے ہیں جو بہت معمولی سے جذباتی دباؤ پر ہارٹ فیل ہونے سے مر جاتے ہیں۔" محسن پھر رونے لگا۔ اس کے اعصاب بھی جواب دے چکے تھے۔ وقت ہمیں کہاں لے آیا تھا کہ ہماری ساری شوخی اور ظرافت کافور ہو گئی تھی۔ عزم و حوصلہ ساتھ چھوڑ گیا تھا۔ امید کے آسرے باقی نہ رہے تھے۔ خود پر، آنے والے دن پر، اور دنیا کی ہر چیز پر سے اعتبار اٹھ گیا تھا۔ ہم اب زندگی کی نہیں موت کی بات کرتے تھے۔ تقدیر ہمیں دیارِ غیر سے... سات سمندر پار ولایت سے اپنے وطن لائی تھی۔ اس کے ساتھ ہی آزمائش اور ابتلا کا دَور شروع ہوا تھا۔ عارضی اور وقتی کامیابیوں کے فریب نے ہمیں خوش فہمی میں مبتلا کر دیا تھا اور انجام یہ ہوا تھا کہ اپنا سب کچھ گنوا دینے کے بعد ہم موت سے بدتر عذاب جھیل رہے تھے اور ایک بہت پُراذیت دنیاوی جہنم میں جھونک دیے گئے تھے۔

وہ دونوں گونگے کمانڈوز پھر نمودار ہوئے اور انھوں نے مجھے اور محسن کو گھسیٹ کر کمرے کی دوسری دیوار سے لگا دیا۔ دیوار کے نچلے حصے میں وہ دو کنڈے پہلے ہی لگا چکے تھے۔ انھوں نے جال کو اس کنڈے میں یوں پھنسا دیا کہ ہمارے لیے نہ کھڑا رہنا ممکن رہا نہ بیٹھنا۔ ہم نیچے ہوتے تو ہمارے پیر زمین پر ٹک جاتے تھے لیکن باقی دھڑ اوپر رہتا تھا۔ کھڑے ہونے کی جال میں گنجائش نہ تھی۔ کنڈے سے منسلک ہو جانے کے بعد ہمارے لیے دائیں بائیں گھومنا بھی ممکن نہ رہا۔ معلوم نہیں، اب ان کے شیطانی دماغ میں کیا تھا۔ وہ صرف ہمیں دہشت زدہ کر رہے تھے یا سچ مچ کوئی بھیانک کھیل کھیلنا چاہتے تھے۔

جب وہ رابعہ کو گھسیٹتے ہوئے اندر لائے تو میرے جسم کا رُواں رُواں کانپنے لگا۔ وہ چوبیس فٹ دُور مخالف دیوار کے ایک در سے آئے تھے۔ رابعہ ان کے ہاتھوں کی گرفت میں مچل رہی تھی اور ہاتھ پیر چلا رہی تھی۔ اس کے جسم پر وہی لباس تھا جو اس نے اسیری کے وقت پہن رکھا تھا۔ اس کو اندر لانے والے بھی وہی دونوں گونگے کمانڈوز تھے اور ان کی فولادی گرفت میں رابعہ اسی طرح تھی جیسے باز کے پنجوں میں ایک ناتواں فاختہ۔ رابعہ اب چلّا نہیں رہی تھی کیونکہ اس کے مُنہ پر ٹیپ لگا دیا گیا تھا۔ دو اِنچ چوڑے میڈیکل ٹیپ نے اس کے ہونٹوں کو ملا کے بند کر دیا تھا۔

"سُنو!" میں نے چیخ کر کہا۔ "خُدا کے غضب سے ڈرو۔ اس عورت کو مار ڈالو مگر اس پر یہ ظلم مت کرو۔"

"آنکھیں بند کر لے سکندر۔" محسن نے مشورہ دیا۔ جو ان حالات میں سب سے اچھا مشورہ تھا۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ وقت تھم گیا۔ میری چشمِ تصور ... ... جو زیادہ لرزہ خیز تھا۔ میں نے گھبرا کے آنکھیں کھول دیں۔ رابعہ اب اسٹیج کے درمیان پڑی ہوئی تھی۔ سراج اور دلاور اس پلیٹ فارم کے دائیں اور بائیں جانب آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ سراج کے اشارے پر باری باری دونوں سرچ لائٹس آن ہوئیں... دو کیمرا مین اور دو لائٹ مین اسی وقت آ گئے تھے جب میں کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر کے فرض کیے بیٹھا تھا کہ اب ڈرنے کی کوئی بات نہیں رہی۔

سب سے آخر میں پیڈرو آیا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور پلیٹ فارم پر چڑھ گیا۔ وہ آپس میں باتیں بھی کر رہے تھے لیکن میں اتنی دور سے الفاظ کا صحیح مطلب سمجھنے سے قاصر تھا۔ پھر پیڈرو نے ایک قہقہہ لگایا اور نیچے جُھکا۔ اس نے ایک انتہائی شرمناک حرکت کی اور پھر میری طرف دیکھنے لگا۔ رابعہ نے لاتیں چلائیں، تب مجھے پتا چلا کہ اس کے دونوں ہاتھ اور دونوں پیر رسیّوں سے باندھ دیے گئے ہیں۔ چاروں رسیّوں کے کنارے پلیٹ فارم کے چاروں کونوں پر بندھے ہوئے تھے چنانچہ وہ حرکت تو کر سکتی تھی مگر اس شکنجے سے نکل نہیں سکتی تھی۔ پیڈرو کے ہاتھ میں سُلگتی ہوئی سگریٹ تھی۔ وہ نیچے جھکا اور اس نے وہ سگریٹ رابعہ کے جسم پر رکھ دی۔ وہ بُری طرح تڑپی۔ پھر میں چلّایا۔ میں پیڈرو کو گالیاں دینے لگا۔ اس کے سوا میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ وہ میری طرف بالکل متوجہ نہیں ہوا۔

سراج آہستہ آہستہ چلتا ہوا میرے قریب آیا۔ اس نے کہا۔ "ابھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ تم مجھے وہ سب بتا سکتے ہو۔"

"میں کچھ نہیں بتا سکتا... معلوم ہوتا تو اب ضرور بتا دیتا۔" میں نے دہاڑیں مار مار کے روتے ہوئے کہا۔ "تم کو اللہ رسول کا واسطہ... رابعہ کو چھوڑ دو... اس کے ساتھ ایسا مت کرو۔"

"یہ سب تو تمھاری ضد کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ ہمیں بہرحال معلوم کرنا ہے کہ پاکستان بھر میں تمھارے ایجنٹ کہاں ہیں۔ کون ہیں اور کیا پلان رکھتے ہیں۔" سراج بولا۔ اس پر میرے رونے کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ جیسے آیا تھا ویسے ہی لوٹ گیا۔

ایک گھنٹے بعد جو شاید ایک پورے دن سے بھی زیادہ طویل عذاب رکھتا تھا، قدرت نے میری مدد کی۔ میں پاگل ہو گیا۔ لیکن پاگل ہونے سے پہلے میں نے رابعہ کے ساتھ وہ سب کچھ ہوتے دیکھا جو اس سے پہلے ایک فلم میں کسی نامعلوم لڑکی کے ساتھ ہوتے دیکھا تھا۔ وہ فلم تھی، یہ حقیقت... وہ لڑکی مظلوم ضرور تھی مگر اس کے ساتھ میری کوئی جذباتی وابستگی نہیں تھی۔ میں نے یہ بھی سمجھ لیا تھا کہ وہ کوئی پیشہ ور لڑکی ہو گی۔ یہاں میرے سامنے رابعہ تھی۔ ایک کلی سے زیادہ معصوم اور پھول سے زیادہ نازک۔ اس کے آس پاس وہ انسان تھے جن سے شیطان شرمائے۔ ان کی سفاکی سے درندے پناہ مانگتے اور حیوان توبہ کرتے۔ ان میں سب سے نمایاں کردار پیڈرو کا تھا لیکن اس کا ساتھ دونوں گونگے کمانڈوز نے بھی دیا ——— انھوں نے مجھ پر ایک ظلم یہ بھی کیا تھا کہ رابعہ کے ہونٹوں کو آزاد کر دیا تھا۔ اس کی دل کو خون کر دینے والی چیخوں سے میرے لیے کہیں مفر نہ تھا۔ جو کچھ رابعہ کے ساتھ ہوا وہ... پولیس بدترین اخلاقی مجرموں کے ساتھ بھی نہیں کرتی ——— سراج نے ہدایات دیں اور باقی لوگوں نے جس طرح رابعہ کے جسم کو نوچا کھسوٹا .... جلایا کاٹا اور بربریت کا نشانہ بنایا، اس کا الفاظ میں بیان ممکن ہی نہیں... سراج کئی بار میرے پاس یہ پوچھنے کے لیے آیا کہ اب میرا کیا خیال ہے۔ میں اس وقت تک پاگل ہو چکا تھا۔ میں جال سمیت اُچھل رہا تھا اور چیختے چیختے میرا گلا بیٹھ گیا تھا۔ میرے لبوں سے کف جاری تھا اور میرے لیے سانس لینا بھی دشوار ہو رہا تھا۔ معلوم نہیں میں نے اس سے کیا کہا۔ میں رو پا بیٹھا۔ میں نے اس کی منت سماجت کی۔ اسے سب کے واسطے دیے۔ دھمکیاں اور گالیاں دیں مگر وہ سب پتھر کے آدمی تھے۔ رابعہ ان کے جور و ستم کی انتہا سے گزر کے بار بار بے ہوش ہوئی۔ انھوں نے اس کے خوب صورت بال جلا دیے اور میں نے بالوں کے جلنے سے اُٹھنے والی بُو کو اپنے حواس پر یلغار کرتے محسوس کیا۔ ... میں ہنسنے لگا۔

"محسن! یہ سب تُو نہیں دیکھ رہا ہوگا؟" میں نے بیٹھی ہوئی آواز میں کہا۔ "میرا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ پتا نہیں، مجھے کیا نظر آرہا تھا۔ عجیب آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں رابعہ کو دیکھ رہا تھا۔ حالانکہ وہ یہاں ہے ہی نہیں... وہ تو انکل رضوی کے گھر میں ہے۔"

"یہ رابعہ نہیں ہے سکندر۔" محسن نے کہا۔ وہ بھی پاگل ہو چکا تھا۔ میں نے پھر ہنسنا شروع کیا۔ رابعہ پھر چلّانے لگی۔ مگر اب وہ مر رہی تھی۔ اس کی آواز میں نزع کا کرب آگیا تھا۔

اس وقت مجھے اپنا ہوش نہیں تھا۔ محسن نے مجھے بعد میں بتایا کہ میں نے اپنے کپڑے پھاڑ لیے تھے اور چیختے چیختے ایک وقت ایسا آیا تھا جب میرے حلق سے آواز نکلنا بھی بند ہوگئی تھی۔ یہ بات یقینی تھی کہ میں آزاد ہوتا تو کچھ نہ کچھ ضرور کر بیٹھتا۔ میں انھیں قتل نہ کر پاتا تو خود کو نقصان پہنچاتا۔ میرے ہاتھ میں کوئی چیز آجاتی میں اپنی جان لینے کے لیے استعمال کرتا اور کچھ بھی نہ ملتا تو دیوار سے سر ٹکرا کے مر جاتا۔ جب مجھے ایک دہشت انگیز اور انسانیت سوز مظالم کی فلم دکھائی گئی تھی تو میں نے سوچا بھی تھا کہ یہ سب رابعہ کے ساتھ بھی ہوسکتا ہے لیکن یہ ایک خیال تھا۔ خیال سے حقیقت تک یقین کے ہزار مرحلے تھے اور میں نے پہلے ہی مرحلے میں اپنے خیال کو مسترد کردیا تھا۔ یہ دلیل میرے کام آئی تھی کہ فلم کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ سب کیمرا ورک تھا اور کسی پیشہ ور اداکارہ یا فاحشہ کی خدمات مُنہ مانگی قیمت دے کر حاصل کرنے کے بعد یہ شوٹنگ کی گئی تھی۔ چنانچہ رابعہ کے ساتھ ایسا نہیں ہوسکتا۔

یہ انسانی فطرت ہے کہ اسے جینے کے لیے مادّی سہاروں کے ساتھ ذہنی اور روحانی اطمینان اور اعتماد کے سہاروں کی ضرورت بھی پڑتی ہے۔ ہر روز سڑکوں پر پیش آنے والے بدترین حادثات کی دردناک تفصیلات پڑھ کے اور تصویریں دیکھ کے بھی وہ خوفزدہ نہیں ہوتا اور یہ نہیں مانتا کہ وہ خود بھی ایسی ہی خبر بن سکتا ہے... اگر یہ خوف غالب آجائے تو وہ پاگل ہوجائے۔ گھر سے نکلنا چھوڑ دے۔ زینے پر اترنا چڑھنا چھوڑ دے کہ اس پر سے بھی پیر پھسل جائے تو گردن ٹوٹ جاتی ہے۔ بجلی کی چیزوں کو ہاتھ نہ لگائے کہ برقی جھٹکے سے بہت لوگ مرتے ہیں لیکن جینے کی خواہش آدمی کو اس خوف سے دور رکھتی ہے اور اس کے یقین کو متزلزل نہیں ہونے دیتی کہ وہ کسی حادثے کا شکار نہیں ہوگا۔ یہی کیفیت میری بھی تھی۔ میں نے مان لیا تھا کہ رابعہ کے ساتھ کچھ نہیں ہوگا اور یہ لوگ صرف مجھے ڈرا رہے ہیں لیکن وہ خیال جس پر میں یقین کرتے ہوئے ڈرتا تھا سچ بن کے سامنے آیا تو خوف اور صدمے کی شدت نے میرے ذہن کو پھر تحفظ فراہم کیا۔ میں ہوش سے بیگانہ ہوگیا اور احساس کے عذاب سے بچنے کے لیے میں اس خیال کی پناہ میں چلا گیا کہ وہ رابعہ نہیں تھی۔

جب وہ رابعہ کی لاش اٹھا کے لے جا رہے تھے تو میں زور زور سے قہقہے لگا رہا تھا۔ سراج اور دلاور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے میرے قریب آکے رک گئے۔

"کیا یہ سچ مچ پاگل ہوگیا ہے؟" سراج نے مجھے غور سے دیکھ کر کہا۔

"لگتا تو ایسا ہی ہے۔" دلاور بولا۔

"میں پاگل ہوں۔" میں نے قہقہہ مارا۔ "پاگل تم دونوں ہو... مجھے بے وقوف بنا رہے تھے۔ کیا میں سمجھتا نہیں کہ یہ سب ڈراما تھا۔"

"یہ ڈراما نہیں تھا۔" سراج نے کہا۔ "تمھاری ضد کی وجہ سے رابعہ کو..."

"وہ رابعہ نہیں تھی..." میں نے ایک گالی دے کر کہا۔ "میں اندھا نہیں ہوں کہ رابعہ کو بھی نہ پہچان سکوں۔"

"پھر وہ کون تھی... اپنے سکندر صاحب۔" دلاور مسکرایا۔

"وہ تیری ماں تھی الّو کے پٹھے۔" میں نے ہنس کر کہا... "پوچھ لو محسن سے... کیوں محسن... وہ سراج کی ماں تھی نا؟"

"تو ٹھیک کہتا ہے سکندر... وہ رابعہ نہیں تھی۔" [illegible] نے میری تائید کی۔

"وہ بے وقوف لڑکی مر گئی بالآخر۔" سراج نے کہا۔ "کیا ملا اس کو ضد سے؟"

"کیا تم اس کی لاش دیکھو گے؟" دلاور بولا۔

"لاش..." میں نے زور زور سے ہنسنا شروع کیا۔ میرے قہقہے بلند سے بلند تر ہوتے گئے۔ "میں تمھاری لاش دیکھنا پسند کروں گا... میں اپنی لاش دیکھنا پسند کروں گا... اپنے چوہدری صاحب... میں مر گیا ہوں... رابعہ کو بتا دینا... اس سے کہنا کہ میری لاش کو نیلا کفن دے۔ گہرا نیلا جس پر زرد پھول ہوں۔ اس کی ایک ساری ہے ایسی ہی... اسی میں لپیٹ دینا مجھے۔ رابعہ، شہلا اور جولی سے کہنا کہ میرے لیے تاج محل بنوائیں۔ شہلا کے بچے کا نام سکندر بخت رکھنا۔"

میں نے محسن کو دھاڑیں مار مار کے روتے سُنا اور اسے حیرت سے دیکھتا رہا۔ "تجھے کیا ہوا شیروانی کے بچے... اچکن کی اولاد... تیرے کون سے بیوی بچے مر گئے ہیں جو تو رو رہا ہے۔"

میں اسی طرح شور کرتا رہا اور جال کے اندر پاگل جانور کی طرح اچھلتا رہا۔ قہقہے لگاتا رہا۔ دلاور اور سراج چلے گئے۔ محسن چلّا چلّا کے مجھ سے کچھ کہتا رہا لیکن میں نے اس کی ایک نہیں سُنی۔ پھر وہی دونوں گونگے کمانڈوز نمودار ہوئے اور مجھے لے گئے۔ جیسے ہی انھوں نے مجھے اپنے کمرے میں لے جا کر آزاد کیا، میں مقید پاگل کتے کی طرح نکلا اور ان دونوں سے چمٹ گیا۔ وہ اس کے لیے پہلے سے تیار تھے۔ ایک نے مجھے آڑے ہاتھوں لیا اور پیچھے کی طرف پھینک دیا۔ میں پھر اُٹھا اور ان سے یوں لڑنے لگا

جیسے وہ میرے جانی دشمن ہیں اور میں نے ان کو نہ مارا تو وہ مجھے مار دیں گے۔ میرے ہاتھ پیر بجلی کی طرح چل رہے تھے اور دیوانگی نے مجھے غیر معمولی قوت عطا کر دی تھی۔ میں نے ایک کو اتنی پھرتی اور مہارت سے فلائنگ کِک ماری کہ وہ دیوار سے ٹکرایا اور کسی دیر کے لیے بے سُدھ ہوگیا مگر اتنی دیر میں دوسرا مجھ پر پڑا۔ اس نے مجھے اُٹھنے ہی نہ دیا اور بال پکڑ کے میرا سر فرش پر مارنے لگا۔ میں نے چیختے چلّاتے ہوئے اس سے مقابلہ جاری رکھا اور اس وقت تک لڑتا رہا جب تک کہ میرا وجود مکمل تاریکی میں نہیں ڈوب گیا۔

مجھے معلوم نہیں بے ہوشی کا یہ وقفہ کتنا طویل تھا۔ درمیان میں ہوش کے مختصر وقفے یوں آتے رہے جیسے صحرائے بے کنار کے بے نشاں سفر میں نخلستان۔ میرے کانوں نے کچھ آوازیں سُنیں جو سمجھی نہیں تھیں اور اندھیرے میں سایوں کی طرح لرزتے ہوئے چہرے بھی [illegible] میں جن سے میرا ان سے رابطہ نہ ہوسکا۔ پھر ایک رات میں نے رابعہ کو دیکھا۔ وہ سر تا پا سفید لباس میں تھی جو بالکل کفن کی طرح تھا۔ میرے پاس بیٹھ کر اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا جو برف کی طرح سرد تھا۔

"یہ تمھیں کیا ہوگیا ہے، سکندر؟" وہ بولی۔

"مجھے کیا ہوسکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے تو قبر کی تنگی کا عذاب بھی نہیں ہے۔ مجھے اپنی قبر بہت کشادہ محسوس ہوتی ہے۔"

"یہ تمھاری قبر نہیں ہے۔"

"اچھا! تو کیا یہ تمھاری قبر ہے؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔ "انھوں نے مجھے بھی تمھارے ساتھ ہی دفن کردیا ہوگا۔ عاشقی کی روایات کچھ ایسی ہی ہیں۔ غالباً لیلیٰ مجنوں کا مدفن بھی ایک تھا اور رومیو جولیٹ کا بھی۔"

"خدا کے لیے سمجھنے کی کوشش کرو۔ یہ تمھارا کمرہ ہے۔" وہ بولی۔

"قبر بھی ایک کمرہ ہی ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔

"سکندر! تم زندہ ہو، میں بھی زندہ ہوں۔" رابعہ نے مجھ پر جھک کر کہا۔

"یہ حیات بعد از موت ہے۔ ہماری دوسری ابدی زندگی۔" میں نے اس کی تائید میں سر ہلایا۔

"نہیں سکندر! یہ وہی دنیا ہے۔" رابعہ کی آنکھوں سے ایک قطرہ اشک میری پیشانی پر ٹپکا۔

"کون سی دنیا... وہ جس میں میرے باپ کے قاتل تھے، دلاور اور سراج تھے، وطن دشمن اور انسانیت فروش شیطان۔ ہماری اور تمھاری خوشیوں کے دشمن۔" میں نے کہا۔

"ہاں ہاں... وہی دنیا..."

"یہ کیسے ہوسکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "وہاں ہم نہیں مل سکتے۔ سکندر تمھارے بغیر میں اس دنیا میں کیسے رہ سکتا تھا۔ اب کوئی ڈر نہیں..."

"سکندر! میں زندہ ہوں... تم نے غلط دیکھا تھا۔ وہ سب تمھاری نظر کا دھوکا تھا۔" رابعہ نے کہا۔

"دھوکے میں نے بہت کھائے تھے رابعہ... لیکن اب ہم وہاں ہیں جہاں کوئی ہمیں دھوکا نہیں دے سکتا۔" میں نے کہا۔

"تم سمجھ رہے ہو کہ میں مر چکی ہوں؟" رابعہ نے کہا۔ "دیکھو... اچھی طرح دیکھو، میں زندہ ہوں... وہ میں نہیں تھی... جسے... تم نے مرتے دیکھا تھا... وہ سب ڈراما تھا... شوٹنگ تھی... جیسے فلموں کے مناظر کی شوٹنگ ہوتی ہے... دیکھنے والوں کو سب بالکل حقیقی لگتا ہے... محسن نے تم کو سمجھانے کی بہت کوشش کی تھی... وہ سب سمجھ گیا تھا کہ جس لڑکی... پہ... ظلم کیا گیا تھا... وہ میں نہیں تھی... وہ ایک ایکٹریس تھی... میری اور اس کی صورت میں تھوڑی سی مشابہت ہے... باقی مشابہت میک اپ سے پیدا کی گئی تھی۔ اسے میرے کپڑے پہنا دیے گئے تھے... تم بہت دُور سے دیکھ رہے تھے اور تمھارا دماغ کام نہیں کر رہا تھا... تم نے سمجھ لیا کہ وہ میں ہی ہوں... یہ سب تم کو دہشت زدہ کرنے کے لیے تھا... وہ ایکٹریس بھی زندہ ہے۔ اس کے ساتھ کچھ بھی نہیں ہوا تھا... وہ سب کیمرا ٹرک تھی... وہ چیخوں کی آواز بھی اس کی نہیں تھی... میری بھی نہیں تھی۔ وہ ریکارڈ تھا۔ ٹیپ کی ہوئی آوازیں تم کو سنوائی جارہی تھیں۔ اس کے ساتھ نہ کسی قسم کی زیادتی ہوئی نہ اس پر تشدد ہوا، نہ مارپیٹ کی گئی لیکن ایسا تو فلموں میں دکھلایا ہی جاتا ہے۔ یہ کون سی غیر معمولی یا مشکل بات ہے۔ اس شوٹنگ کا بندوبست دلاور نے کیا تھا۔ تم جانتے ہو کہ وہ ایسے ڈرامے پہلے بھی کرتا رہا ہے... یہ اسی کے شیطانی ذہن کی سازش تھی۔ اس ایکٹریس کو خراش تک نہیں آئی۔ وہ کوئی ایکٹریس بھی نہیں، شاہی محلّے کی ایک طوائف کی بیٹی ہے۔ ایسی ہی گندی فلموں میں کام کرتی ہے اور اس کو ذرا شرم نہیں آتی۔ میں نے بعد میں اس کی اور دلاور کی ساری گفتگو سُنی تھی۔ اُسے پچاس ہزار روپے دیے گئے تھے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا... جہاں میرا کمرہ ہے اس کے پیچھے ہی وہ لوگ باتیں کر رہے تھے اور مجھے ان کی گفتگو روشندان سے سنائی دے رہی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ فلم بنانے والوں کا مقصد کیا ہے۔ اس کے خیال میں مقصد مختلف کیسے ہوسکتا تھا۔ پہلے بھی اس نے ایسی ہی فلموں کے لیے کام کیا تھا۔ دلاور اس کی اداکاری کی تعریف کر رہا تھا۔ وہ پوچھ رہی تھی کہ وہ کون تھا جو درمیان میں چلّا رہا تھا اور گالیاں بک رہا تھا... دلاور نے اُسے بتایا کہ فلم کی سچویشن ہی ایسی ہے۔ ایسی فلموں میں کہانی تو برائے نام ہوتی ہے۔ دلاور نے کہا کہ فلم میں یہ سب کچھ ایک ایسے شخص کی نظر [illegible] ہوا تھا جو لڑکی کو چاہتا تھا اور اس سے شادی کرنے

تھا۔ چنانچہ اس کا یہ رول بالکل حسبِ حال تھا۔ اس کی چیخ پکار، گالی گلوچ اور احتجاج ایک فطری امر تھا... وہ مطمئن ہو گئی تھی۔ دراصل وہ تم کو نہیں دیکھ سکتی تھی کیونکہ اس کے سامنے دو سرچ لائٹس تھیں اور تم روشنی کے پیچھے بہت دُور تھے۔ وہ سمجھتی رہی کہ جیسے اس کی آوازیں اصلی نہیں بلکہ پہلے سے ٹیپ کی ہوئی تھیں اور وہ ان آوازوں کے مطابق تاثرات دے رہی تھی، ایسے ہی تمھلا ہنگامہ بھی صوتی اثرات کا نتیجہ تھا... اب آیا تمھاری سمجھ میں؟ مجھے چھُو کر ہاتھ لگا کے دیکھ لو... میں زندہ ہوں اور حقیقی رابعہ ہوں... مجھے کچھ بھی نہیں ہوا ہے... تم بھی بالکل ٹھیک ہو اور میں تمھارے پاس ہوں۔"

بے شک اس کی باتوں کو میرے ذہن نے قبول کیا تھا اور میں کچھ پُرسکوت ہو کے سنتا رہا تھا لیکن بے یقینی کے اثرات باقی تھے۔ میں یوں محسوس کرتا تھا جیسے میرے دماغ کے اندر مکمل تاریکی تھی مگر اب نامعلوم سمت سے روشنی اندر آ رہی ہے۔ یہ روشنی بہت کم تھی۔ میں واضح طور پر کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن میں خود کو اندھے خلا کی قید میں محسوس نہیں کرتا تھا۔ میں خود کو دیکھ سکتا تھا اور ہر طرف تجسس کی نظر ڈال سکتا تھا اور اب وقت اور مقام کا تعین کرنا چاہتا تھا... میں کون ہوں؟ زندہ یا مُردہ... اور کہاں ہوں؟ عالمِ خاک و باد میں یا عالمِ ارواح میں... رابعہ کی کچھ باتیں میری سمجھ میں آ رہی تھیں اور کچھ نہیں۔ جیسے دسویں جماعت تک سائنس پڑھنے والے طالب علم کو زمین کی کشش اور اس کے دائرے سے نکلنے والے راکٹ کی رفتار کا اصول تو سمجھ میں آئے مگر خلا میں اس کے مدار اور حرکت کے سائنسی فارمولے اور ایروناٹکس کی فنّی اصطلاحات محض کنفیوژن پیدا کریں۔ میں اُسے پلکیں جھپکائے بغیر دیکھتا رہا۔ وہ اور بھی بہت کچھ کہتی رہی جو میری سمجھ میں نہیں آیا۔

پھر وہی دونوں نمودار ہوئے۔ میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا: "آ گئے... ملک الموت..." میں نے انگلی اُٹھا کے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں پھر آؤں گی۔" رابعہ کھڑی ہو گئی۔

"یہ جہنم کے فرشتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ تم کو نہیں آنے دیں گے۔"

"نہیں سکندر! یہ میرے اور تمھارے جیسے انسان ہیں..." رابعہ نے کہا۔

یہ بڑی عجیب صورتِ حال تھی۔ ایک وقت تھا جب رابعہ کا ذہنی توازن برقرار نہیں رہا تھا۔ اس کے دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ میں مر چکا ہوں اور میں نے سخت کوشش کے بعد اس کو قائل کیا تھا کہ یہ غلط ہے۔ فریبِ خیال ہے اور حقیقت سے دُور کا بھی واسطہ نہیں... اب معاملہ اس کے برعکس تھا۔ رابعہ مجھے یقین دلا رہی تھی کہ میں زندہ ہوں اور وہ بھی زندہ ہے مگر میرا ذہن اس خیال سے نجات پانے میں ناکام تھا کہ ہم دونوں مر چکے ہیں۔ اس کے جانے کے بعد بھی میرا ذہن بے سروپا خیالات کی یلغار میں رہا۔ یہ سب بے ربط خیالات تھے۔ بے سمت بھٹکنے والے اور کسی وجہ کے بغیر آنے جانے والے میرے دماغ میں ساری عمرِ گزشتہ کی یادیں وقت اور مقام کی ترتیب سے محفوظ تھیں۔ بالکل کسی ماڈرن سُپر اسٹور میں قاعدے اور سلیقے سے رکھے ہوئے سامان کی طرح... ایک زلزلے نے سب کچھ تہ و بالا کر دیا تھا۔ سب خلط ملط ہو گیا تھا۔ ترتیب بگڑ گئی تھی اور اب ایک ڈھیر تھا جس میں ہاتھ مارنے سے کبھی کچھ مل جاتا تھا، کبھی کچھ لیکن یہ مشکل تھا کہ ضرورت کی کوئی چیز تلاش کی جائے تو آسانی سے ہاتھ سیدھا وہیں جائے جہاں وہ چیز موجود ہو۔ مجھے تمام واقعات، چہرے اور مقام اس طرح یاد آتے تھے جیسے سینما اسکرین پر ایک سلائیڈ آئے اور دوسری جائے لیکن ایک اختتام کا دوسرے سے کوئی تعلق نہ ہو۔ مجھے بہت سے لوگ یاد آئے جو مر چکے تھے اور انہی کے ساتھ جولی یاد آئی۔ شہلا یاد آئی اور آخر میں رابعہ... مگر رابعہ کہتی تھی کہ وہ زندہ ہے۔ پھر کیا یہ ممکن ہے کہ شہلا بھی زندہ ہو؟ جولی بھی زندہ ہو؟ میں سوچنے لگا۔ میرے ذہن کا خلا کبھی کباڑی کی دکان بن کے بھر جاتا تھا تو کبھی ایسے رہ جاتا تھا جیسے لوٹی ہوئی دکان... مجھے اتنا ہوش ضرور تھا کہ کچھ لوگ میرے سامنے بار بار آتے ہیں۔ ان میں سے دو میرے لیے کھانا لائے تھے۔ ایک ڈاکٹر تھا جو صبح شام آتا تھا۔ دو بار میں نے اس پر حملہ کیا مگر اس کے ساتھ آنے والوں نے مجھے بے بس کر دیا اور وہ مجھے انجکشن لگا کے چلا گیا۔

پھر ایک بار آنکھیں کھول کر دیکھنے پر مجھے محسن دکھائی دیا۔ میں اُٹھ بیٹھا۔ "محسن! یار! یہ کیا چکر ہے؟"

محسن کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔ "کیا چکر ہے؟"

"یہ خواب ہے یا حقیقت؟" میں نے کہا۔

"تو مجھے خواب میں نہیں دیکھ رہا ہے۔" محسن بولا۔

"عجیب بات ہے... رابعہ کو بھی میں نے خواب میں دیکھا تھا۔" میں نے کہا۔ "اور وہ مجھے یقین دلا رہی تھی کہ اسے کچھ نہیں ہوا۔"

"وہ بھی خواب نہیں تھا۔ وہ خود تیرے پاس آئی تھی اور یہ ٹھیک ہے کہ اُسے کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔" محسن بولا۔ "اور کیا کہتی تھی وہ؟"

میں نے سوچ سوچ کر یادداشت کی مدد سے وہ سب بتایا جو مجھ سے رابعہ نے کہا تھا۔ محسن مسکراتا رہا۔ پھر اس نے بھی وہی کہا جو رابعہ نے بتایا تھا۔

"تو صحیح کہہ رہا ہے۔" میں نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ "وہ سب ڈھونگ تھا... دلاور کا ڈراما تھا... فلم کی شوٹنگ تھی۔"

"ہاں یار... وہ شاید تجھے فلم بھی دکھاتے۔" محسن نے خوش ہو کے کہا۔ "مگر وہ شوٹنگ انھیں مہنگی پڑی... تیرا دماغ اُلٹ گیا تھا۔ خدا کا شکر ہے اس کا اثر زیادہ دیر نہیں رہا۔ انھوں نے رابعہ کو بھی اسی لیے بھیجا تھا اور مجھے بھی اسی لیے لایا گیا ہے کہ ہم مل کے تجھے یقین دلا سکتے ہیں اور سمجھا سکتے ہیں کہ رابعہ پر کوئی تشدد نہیں ہوا اور اس کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہیں کی گئی۔ ہم سے مدد لینے پر مجبور تھے۔ یہ دلاور اور سراج کا آئیڈیا تھا۔ وہ عینک والا جو سب کا چیف ہے یا مشن کا نگراں ہے، اس خیال سے متفق نہیں تھا۔ اس نے کہا تھا کہ ایک فلم دکھانا کافی ہے۔ اس نے بادلِ ناخواستہ ایک ایسے منظر کی شوٹنگ کی اجازت دی تھی جس میں کسی کو رابعہ بنا کے پیش کیا جائے۔ جب وہ ایک عورت کو لے آئے جو رابعہ کی ہم شکل تھی اور یہ مشکل رول کرنے پر تیار تھی تو اس نے بھی یہ تجربہ کرنے پر رضامندی ظاہر کر دی۔ بعد میں وہ دلاور اور سراج پر بہت بگڑا کہ انھوں نے انتہا پسندی سے کام لیا اور اگر سکندر کا ذہنی توازن ٹھیک نہ ہوا تو ان کے حق میں بھی ٹھیک نہ ہو گا... وہ کہتے تھے کہ ایک سکندر کے نہ ہونے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ تفتیش دوسروں سے بھی کی جا سکتی ہے... مگر وہ کہتا تھا کہ مجھے آگے بھی جواب دینا ہے۔"

"یہ سب باتیں تو نے کیسے سُن لیں؟" میں نے کہا۔

"میں نے کچھ نہیں سُنا۔" محسن بولا۔ "رابعہ کو جس کمرے میں رکھا گیا ہے اس کا روشندان باہر کی طرف دوسرے کمرے میں کھلتا ہے۔ وہاں اُن کا آفس ہے یا وہ کمرہ اس عینک والے کا ہے۔ اس کا نام کسی کو بھی نہیں معلوم لیکن میرا خیال ہے کہ وہ انڈین آرمی انٹیلی جنس کا کوئی اعلیٰ افسر ہے۔"

"میں نے اس سے نام پوچھا تھا تو اس نے کہا تھا کہ اسے مسٹر ایکس سمجھا جا سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "جیسا کہ عموماً چیف کا نام ہوتا ہے۔"

"وہی مسٹر ایکس اس بات کا ذمّے دار ہے کہ ہمیں بحفاظت دہلی لے جائے اور اعلیٰ حکام کے سپرد کر دے۔ کچھ معلومات حاصل کرنا ضروری تھیں۔" محسن نے کہا۔ "تاکہ وہ تصدیق کر لیں کہ ہم میں سے کوئی ان کے حربوں سے زیر نہیں ہوا۔"

"اب ان کا کیا خیال ہے؟" میں نے کہا۔ "وہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں اس سے زیادہ کچھ معلوم ہی نہیں یا ہم کچھ بتا نہیں رہے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ اب ہمارے متعلق ان کی رائے کیا ہے۔" محسن نے کہا۔ "یہ سب کچھ مجھے رابعہ سے معلوم ہوا ہے۔ وہ روشندان سے کان لگا کے باتیں سُنتی رہتی تھی۔ اگر دوسری طرف آفس نہیں تو پھر مسٹر ایکس کا کمرہ ہے۔"

جیسے شیطان کے بارے میں مشہور ہے کہ اس کا نام لیا اور وہ حاضر، ایسے ہی مسٹر ایکس اندر آ گیا۔ وہ سوٹ میں تھا۔ کریم کلر کے سوٹ کے نیچے اس نے ڈارک براؤن شرٹ پہن رکھی تھی اور کریم کلر کی ٹائی بڑی نفاست سے باندھ رکھی تھی۔

"ہیلو۔" اس نے بہ یک وقت مجھے اور محسن کو مخاطب کیا اور مسکرایا۔ میں اپنے اسی بستر پر تھا جو فرش پر بچھا رہتا تھا اور محسن اسی پر میرے قریب بیٹھا ہوا تھا۔ مسٹر ایکس کے بیٹھنے کی کوئی جگہ نہ تھی اور وہ نیچے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ اوّل تو یہ اس کی شان کے خلاف تھا کہ ایک دشمن، مجرم کے ساتھ فرش نشیں ہو۔ دوسرے اس کو اپنے سوٹ کی استری کے خراب ہونے کا ڈر تھا۔

"میں... افسوس کا اظہار کرنے آیا تھا۔" اس نے عادت کے مطابق کمرے میں ٹہلنا شروع کیا۔

"کس بات پر؟" میں نے کہا۔

"جو کچھ بھی ہوا۔" وہ بے نیازی سے بولا۔ "اس میں میری مرضی بہرحال شامل نہیں تھی۔"

"تمھاری مرضی کیا تھی؟" محسن نے طنز سے کہا۔

"کچھ نہیں... سوری... میں صرف حکم کی تعمیل کرتا ہوں۔" وہ بولا۔ "اور اپنی مرضی سے کچھ بھی نہیں کر سکتا۔"

وہ اکیلا نہیں آیا تھا۔ اس کے پیچھے سائے کی طرح ایک محافظ نمودار ہو گیا تھا، جو اب دروازے سے ذرا آگے مشین گن تانے کھڑا تھا اور اپنے جارحانہ انداز سے ہر لمحہ دھمکی دیتا معلوم ہوتا تھا کہ خبردار جو مجھے غافل سمجھتے ہوئے کوئی غلط حرکت کی۔ خود مسٹر ایکس بھی اپنی حفاظت کے خیال سے کبھی غافل نہیں رہتا تھا۔ اس وقت بھی میں دیکھ رہا تھا کہ اس کی پتلون کی ایک جیب میں سروس ریوالور ہے جو حجم میں بڑا ہونے کی وجہ سے کوٹ کے اوپر بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔

میں نے محسن کے یوں انگلی چبھوئی کہ وہ نہ دیکھ سکے۔ "میں کچھ کرنے والا ہوں۔" میں نے آہستہ سے فرانسیسی میں کہا۔

مسٹر ایکس چونکا۔ "تم نے کچھ کہا مجھ سے؟"

"ہاں۔" میں نے کہا۔ "تم کتے کے بچے ہو۔"

وہ متاثر نہیں ہوا اور مجھے شک کی نظروں سے دیکھتا رہا۔ "تم نے کچھ اور کہا تھا، فرانسیسی میں۔"

"تم فرنچ جانتے ہو؟" میں نے مجرمانہ اعتراف ... اختیار کر لیا۔

"فرنچ تو بہت سے لوگ جانتے ہیں۔" وہ بولا۔ "تم کوئی اور زبان بول کے دیکھو مثلاً روسی، بنگالی، عربی، پشتو، جرمن یا ڈچ۔"

"گویا سات زبانیں جانتے ہو تم... انگریزی ... ۔" محسن نے تعریفی انداز میں کہا۔ "مادری زبان الگ۔"

"تم نے کہا تھا... میں... چاہتا ہوں..." وہ بدستور مجھے گھورتا رہا۔ "کیا چاہتے ہو؟"

"میں مرنا چاہتا ہوں... یہی کہا تھا میں نے۔" میں نے کہا۔

خلافِ توقع وہ مطمئن ہو گیا اور اس کے اطمینان سے مجھے اطمینان حاصل ہوا کیونکہ جو میں نے کہا تھا، وہ محسن نے سُن اور سمجھ لیا تھا۔

"... تو میں کہہ رہا تھا کہ یہ سب میری مرضی کے خلاف ہوا۔" وہ پھر ٹہلنے لگا۔ محسن میرے سرہانے بائیں جانب بیٹھا تھا...... وہ دائیں طرف مختصر سی جگہ میں ہاتھ پیچھے باندھے ایک دیوار تک جاتا تھا، پھر پلٹ کر دوسری دیوار تک۔ اس طرح ایک راؤنڈ میں دو مواقع ایسے آتے تھے جب وہ میرے اور مشین گن کے درمیان آجاتا تھا۔

"تمہارا دل رکھنے کے لیے ہم مان لیتے ہیں کہ ایسا ہی ہے۔" محسن نے کہا۔ "تم ہمارے سچ پر اعتبار نہ کرو تو تمہاری مرضی اور جھوٹ کو سچ منوانا چاہو تو تمہیں اختیار ہے۔"

"میں پولیس کا طریقۂ کار اختیار کرنے کو ایسا ہی سمجھتا ہوں۔ جیسے گدھے گھوڑے کو ایک لاٹھی سے ہانکنا..." وہ بولا۔ "ہر آدمی ایک الگ یونٹ ہے... اپنی ذات کے خول میں بند۔ اس کی شخصیت اور مزاج یا طبیعت... ذہنی ردِعمل کا نام ہے اور... ذہنی ردِعمل میں بہت کچھ آجاتا ہے۔ فرق کے ہزاروں اسباب نکلتے ہیں۔ سب کو ڈنڈے سے تسخیر نہیں کیا جا سکتا۔ اور کچھ بہرحال ناقابلِ تسخیر رہتے ہیں۔ میں ان کے اصرار سے مجبور ہو گیا تھا... میں یہ بتانے آیا تھا کہ شاید تم سے یہ میری آخری ملاقات ہو... آرڈر آگئے ہیں کہ تمہیں بھیج دیا جائے۔ میں نے اعتراف کر لیا ہے کہ میں تم سے کچھ معلوم کرنے میں ناکام رہا۔"

"تمہاری اس ناکامی کو تمہاری نااہلی نہیں سمجھا جائے گا؟" محسن بولا۔ وہ مسٹر ایکس کو باتوں میں لگائے رکھنا چاہتا تھا، کیونکہ اس نے میری نیت کو سمجھ لیا تھا اور وہ دیکھ بھی رہا تھا کہ میں موقع تلاش کر رہا ہوں۔

"اوہ نو... میرے وسائل بہت محدود تھے۔" وہ بولا... "اگلے مرحلے میں جو لوگ تم سے پوچھ گچھ کریں گے، وہ ایکسپرٹ لوگ ہوں گے۔ تفتیش کا فن ایک سائنس ہے اور وہ سائنسداں ہیں... بہت سائنٹیفک طریقے پر کام کرنے والے لوگ... وہ یقیناً نتائج حاصل کرتے ہیں۔ ان کی ایک لیبارٹری ہوتی ہے اور وہاں آدمی کو اسی طرح ٹیسٹ کیا جاتا ہے جیسے... تم نے اکثر دیکھا ہوگا کہ میڈیکل سائنس کی ریسرچ میں سفید چوہے بہت استعمال ہوتے ہیں... گنی پگ... وہاں تمہارے دماغ کے ایک ایک نیجے اور ہر خیال کا تجزیہ کرنے والی جدید ترین مشینیں ہیں۔ تم کچھ بتاؤ یا نہ بتاؤ، وہ تمہارے ذہن کو پڑھ لیں گے۔ بہت سی دوائیں ہیں جو آدمی کے دماغ پر براہِ راست اثر انداز ہوتی ہیں۔ اس کو بزدل یا بہادر بنا سکتی ہیں۔ اس کی مزاحمت یا سرکشی کو ختم کر سکتی ہیں اور اسے مکمل طور پر مطیع و فرماں بردار کر سکتی ہیں... اس کے ردِعمل اور ہر ذہنی کیفیت کا تجزیہ..."

میرا خیال ہے کہ وہ ایک عام انسانی کمزوری کا شکار ہوا۔ ایسا اکثر ہوتا ہے کہ ہم کسی کے سامنے کوئی انوکھی یا حیرت انگیز بات کرتے ہیں اور یہ محسوس کرتے ہیں کہ سننے والا ہمارے انکشافات سے حیران بھی ہے اور دلچسپی بھی رکھتا ہے تو ہم زیادہ گہرائی میں جا کے اور زیادہ تفصیل کے ساتھ اسے اپنی معلومات سے امپریس کرتے ہیں۔ یہی مسٹر ایکس کے ساتھ ہوا۔ وہ ہمیں یہ باتیں بتانے میں ضرورت سے زیادہ ہی منہمک ہو گیا۔

میں اپنی جسمانی استعداد کا اندازہ کر رہا تھا۔ مسٹر ایکس کے بارے میں مجھے کوئی خوش فہمی نہیں تھی۔ وہ کمانڈو ز کے ایک مشن کا لیڈر تھا تو ظاہر ہے اپنی صلاحیت کے اعتبار سے خود کو بہت پہلے اس کا اہل ثابت کر چکا تھا۔ اس کا اپنی ذات پر یہ اعتماد اسی اہلیت کی بنیاد پر تھا۔ چنانچہ میرے لیے ناکامی اور کامیابی کے امکانات کو برابر سمجھنا بھی مشکل تھا۔ زیادہ امکان میری ناکامی کا تھا مگر جس شخص کے پاس ہارنے کو کچھ نہ ہو، وہ جُوا کھیل سکتا ہے۔ جسے موت یقینی اور ذریعۂ نجات محسوس ہوتی ہو، اس کے لیے مرنے سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں رہتی۔ میں یہ بھی سمجھتا تھا کہ ان لوگوں کے لیے میری زندگی زیادہ اہم ہے۔ مارنا چاہتے تو ان کا ہاتھ پکڑنے والا کوئی نہیں تھا لیکن یہ حکم کی تعمیل کرنے والے لوگ مجھے زندہ رکھنے پر مجبور تھے۔ ابھی تک تفتیش کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا تھا اور 'گنی پگ' یعنی ہم کو اب لیبارٹری میں سائنسدانوں کے حوالے کرنا ضروری تھا۔ ابھی یہ کہا جا سکتا تھا کہ مسٹر ایکس نے روایتی طریقے پر تفتیش کی تھی چنانچہ مشن ناکام نہیں سمجھا جا سکتا مگر ہم مارے جاتے تو مشن کہاں رہتا۔ مسٹر ایکس کے لیے جواب دہی مشکل ہو جاتی کہ وہ ہماری حفاظت کیوں نہیں کر سکا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ صرف ہم ہی سے بنیادی نوعیت کی معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔ ہمارے سوا کوئی ذریعہ نہیں۔ کیا وہ ہماری اہمیت کو نہیں سمجھتا تھا؟

مسٹر ایکس ہماری جسمانی اور ذہنی صحت کا ذمے دار تھا اور اس نے ابھی تک اپنی ذمے داری پوری کرنے میں کسی قسم کی نادانی کا ثبوت نہیں دیا تھا۔ اسے احساس تھا کہ ایک مرحلے پر دلاور اور سراج کے اصرار کے سامنے جھک جانا اس کی غلطی تھی۔ میری حالت یقیناً ایسی ہو گئی تھی کہ میں جسمانی طور پر زندہ رہتا لیکن میری ذہنی موت واقع ہو جاتی۔ میرا دماغ ان سائنسدانوں کے لیے بیکار ہو جاتا جو اپنے سائنٹیفک طریقوں سے ہر خلیے کے ہر خیال کو پڑھنا چاہتے تھے اور مسٹر ایکس کو اس کوتاہی اور غیر ذمے دارانہ رویے کی بہت بڑی قیمت ادا کرنا پڑتی۔ اس کے شاندار سروس ریکارڈ پر سیاہی پھر جاتی۔

ان سب عوامل کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے میں نے کوئی غلط فیصلہ نہیں کیا تھا۔ مجھے ایک فائدہ یہ حاصل تھا کہ مسٹر ایکس کے نزدیک میں سو فیصد فٹ نہیں تھا۔ اس کو ملنے والی رپورٹس کے مطابق میں ذہنی اذیت سے بریک ڈاؤن کا شکار تھا۔ سادہ الفاظ میں یہ کہ میں عارضی طور پر پاگل ہو چکا تھا۔ اصل صورت اب اس کے برعکس تھی۔ پہلے رابعہ کا ملنا مجھے دیوانگی سے ہوش کی دنیا میں لانے کا سبب بنا تھا اور وہ جذباتی وجوہ کی بنا پر پچاس فیصد سے زیادہ کامیاب رہی تھی۔ اس سے ملاقات کے بعد میں کچھ بے یقینی کا شکار ضرور رہا تھا مگر میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بحال ہو گئی تھی۔ محسن نے اس بے یقینی کی کیفیت کو بھی ختم کر دیا تو میرا ذہن پھر جدّوجہد کے لیے مستعد ہو گیا۔ عام حالات میں میری ذہنی اور جسمانی صحت کی بحالی کا یہ عمل اتنا تیز نہ ہوتا۔ گھر میں یا اسپتال میں لیٹا ہوا مریض اس وقت تک نہیں اٹھتا جب تک معالج اور تیمار دار نہ چاہیں اور وہ خود ضرورت محسوس نہ کرے لیکن صحرا کے سفر میں کسی آبلہ پا کے لیے بھوک پیاس یا تھکن کے علاوہ بخار میں بھی ریت پر لیٹ جانا ممکن نہیں ہوتا۔ وہ گر پڑے تب بھی اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور اس کی ہمت کا فاضل ذخیرہ جو قدرت نے ہر ذی روح کے جسم میں ہنگامی صورتِ حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے رکھا ہے اسے جدّوجہد جاری رکھنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

مسٹر ایکس ابھی اپنے تفتیش کرنے والے سائنسدانوں کی مہارت اور ان کی استعداد کے متعلق معلومات بہم پہنچانے میں مصروف تھا کہ میں نے فیصلہ کر لیا۔ بزرگوں نے کہا ہے کہ حرکت میں برکت ہے۔ بے حرکت پڑے رہ کر سب کچھ جھیلنے سے بہتر ہے کہ میں جان کی بازی لگا دوں۔ مر گیا تو سمجھوں گا کہ موت ایسے ہی لکھی تھی اور فرشتۂ اجل کو بھی حکم تھا کہ سکندر بخت کی روح فلاں جگہ فلاں وقت قبض کرے۔ بچ گیا اور ناکام رہا تو زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا؟ یہی کہ مجھے زنجیروں میں جکڑ دیا جائے گا یا کسی فولادی پنجرے میں بند کر دیا جائے گا۔

میں نے بہت ناپ تول کر کے جست لگائی۔ میں نے ہر لمحے کو شمار کیا۔ مسٹر ایکس کی نقل و حرکت پر نظر رکھی۔ اس کا ایک ایک قدم گِنا اور بالآخر میرے دماغ کے کمپیوٹر نے اس لمحے کا اعلان کر دیا جب مجھے کچھ کرنا تھا۔ یہ فیصلہ پہلے ہی ہو چکا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ چنانچہ میں نے دیکھا کہ مسٹر ایکس بات کرتے کرتے ایک سیکنڈ سے بھی بہت کم وقت کے لیے رُکا۔

وہی لمحہ تھا جب مسٹر ایکس نے مجھے مشین گن سے تحفظ فراہم کیا۔ میں بگولے کی طرح اٹھا۔ ایک لات مار کے میں نے محسن کو فرش پر گرا دیا اور اپنی قوت میں اُڑتا ہوا گیا۔ مسٹر ایکس نے کچھ نہیں دیکھا۔ اس کی نظر اپنی طرف ہونے سے پہلے میں اس سے ٹکرا چکا تھا۔ اس کا ہاتھ اپنی جیب کی طرف گیا تھا لیکن ریوالور نکالنے کے لیے نہیں۔ وہ غالباً سگریٹ نکالنا چاہتا تھا۔ میرے چھ فٹ قد اور ایک سو ساٹھ پونڈ وزن نے مسٹر ایکس کے قدم اکھاڑ دیے۔ میں نے محسن کی طرف نہیں دیکھا اور مشین گن کے بارے میں نہیں سوچا۔ میں نے صرف ایک شکاری کو زیر کرنے پر ساری توجہ مرکوز کر دی تھی۔

گرنے کے بعد مسٹر ایکس نے صورتِ حال کو سمجھ لیا اور وہ فوراً پوری طرح متحرک اور فعال ہو گیا۔ اس نے دونوں پیروں کو فرش پر جما کے مجھے ایک جھٹکے سے جھٹکنے کی کوشش کی لیکن میں عملی تجربہ رکھنے کے باعث اس جھٹکے کے لیے تیار تھا۔ اس کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی یہی کرتا۔ میں نے جسم کی لچک سے فائدہ اٹھایا اور اسے اپنے اوپر سے گزار کے دوبارہ نیچے دے مارا۔ پھر میں نے اس کے شانے پر کھڑی ہتھیلی سے ضرب لگائی اور وہ ذرا سی دیر کے لیے مفلوج ہو گیا۔

اسی وقت میں نے مشین گن کے برسٹ کی آواز سُنی مگر میں نے اپنی توجہ میں کمی نہیں آنے دی۔ کوئی گولی مجھے لگتی تو خود پتا چل جاتا۔ اگر محسن اس کا شکار ہوا تو یہ اس کا مقدر، میں اسے بچا نہیں سکتا تھا۔ بس میرے ذہن میں یہ خیال ضرور آیا کہ محسن بھی محفوظ ہے ورنہ میں اس کی آواز ضرور سنتا۔

مسٹر ایکس کے لیے سوٹ ایک جال بن گیا۔ وہ جوڈو کراٹے کا ایکسپرٹ ہوگا مگر اس لباس میں مسٹر ایکس کی حرکت بڑی محدود ہو کے رہ گئی تھی۔ اس کے مقابلے میں میرا لباس ڈھیلا ڈھالا تھا۔ مجھے قید رکھنے والوں نے علاج کی غرض سے مجھے ایک دھاری دار سوتی پاجامہ اور ویسی ہی شرٹ ٹائپ قمیص دے دی تھی۔ عموماً اسپتالوں کے مریض اسی لباس میں نظر آتے ہیں۔ یہ لباس مجھے نقل و حرکت کی پوری آزادی عطا کرتا تھا۔

...ایکس کا دایاں بازو مفلوج ہوتے ہی میں نے بڑی پھرتی سے جیب میں ہاتھ ڈالا اور اس کا ریوالور نکالنے میں کامیاب ہو گیا مگر میں اسے قبضے میں نہ رکھ سکا۔ مسٹر ایکس نے دوسرے ہاتھ کی کہنی میرے سینے پر ماری۔ میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ تاہم میں نے اس لمحے پر اپنی گرفت برقرار رکھی جو فیصلہ کن تھا۔ اس کے بعد کوئی دوسرا موقع عطا کرنے والا لمحہ نہیں تھا چنانچہ میں اس لمحے کو گنوا ہی نہیں سکتا تھا۔

مشین گن والا ایک برسٹ مار کے الگ ہو گیا تھا۔ میں نے اوپر نیچے ہوتے ہوئے دیکھا تھا کہ محسن بھی اس سے ٹکرا گیا ہے۔ بعد میں غالباً اس نے مشین گن کا بٹ مار کے محسن کو ناک آؤٹ کر دیا تھا جو اب فرش پر بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔ مشین گن کا برسٹ بھی اس نے بڑی احتیاط سے مجھے اور مسٹر ایکس کو بچاتے ہوئے مارا تھا۔ میں نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ تمام گولیاں دیوار میں پیوست ہوئی ہیں۔ اب وہ میری اور مسٹر ایکس کی جدوجہد دیکھ رہا تھا لیکن کچھ کرنے سے قاصر تھا۔

مسٹر ایکس نے مجھے اپنے سے جدا کر کے اٹھتے ہوئے اپنے گھٹنے سے وار کیا اور مجھے دیوار کی طرف اچھالا۔ وہ ابھی اٹھا ہی تھا کہ میں نے پیر دیوار پر مارے اور اسپرنگ کی طرح اس کی طرف آیا۔ سر کے بل گیا اور پلٹ کر دونوں پیر پوری قوت سے اس کے منہ پر جما دیے۔ وہ نیچے گرا تو اس کا سر بڑی آواز کے ساتھ فرش پر لگا۔ اسی وقت مشین گن نے پھر گولیاں اگلیں اور میں نے اپنے کانوں میں سائیں سائیں ہوتی محسوس کی۔ گولیاں یقیناً میرے اوپر سے میرے کانوں کو چھوتی ہوئی گزری تھیں۔ سنتری نے چلا کے مجھ سے کچھ کہا اور یہی غلطی کی۔ وہ مجھے فائرنگ سے دہشت زدہ نہیں کر سکا تھا۔ اب اس نے خود آگے بڑھ کے مجھے بھی محسن کی طرح ناک آؤٹ کرنا چاہا۔ وہ مسٹر ایکس کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ میری اور اس کی جنگ میں کوئی فریق حاوی نہیں ہے لیکن یہ کسی بھی لمحے ہو سکتا تھا کہ میں مسٹر ایکس پر غالب آ جاؤں یا میرے ہاتھ میں ریوالور آ جائے۔ اس نے ٹھیک ہی سوچا تھا کہ قریب آ کے موقع دیکھے اور پھر میرے سر پر مشین گن کا بٹ مارے۔

لیکن اسے خبر نہ تھی کہ محسن جو وقتی طور پر بے ہوش ہوا تھا، ہوش میں آ چکا ہے۔ اسے بھی غیبی قوت نے جھنجوڑا ہو گا کہ اٹھ یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے۔ یہ بے ہوش رہنے کا وقت نہیں ہے اور لاشعور کی دستک نے محسن کو بہت جلد بیدار کر دیا تھا۔ جیسے ہی سنتری آگے بڑھا وہ اس کے پیروں سے لپٹ گیا اور سنتری منہ کے بل گرا تو مشین گن چھوٹ کر میرے اور مسٹر ایکس کے قریب آئی۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ اپنے ہاتھ بڑھائے تھے اور میرے اندازے کے مطابق مشین گن میرے مقابلے میں مسٹر ایکس کے زیادہ قریب تھی لیکن ہوا یہ کہ فرش پر اوندھا گرنے والے محافظ نے بھی اس کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اسے کھینچنا چاہا مگر اسے محسن نے کھینچ لیا اور یوں مشین گن مسٹر ایکس کی دسترس سے چند انچ دور چلی گئی اور میرے ہاتھ میں آ گئی۔

پوری طرح اپنی مضبوط گرفت میں لیے بغیر میں نے مشین گن کو گھمایا۔ اس کا بٹ مسٹر ایکس کے منہ پر لگا اور اس نے بلبلا کے مجھے گالی دی۔ میں نے اس کے سامنے والے دانتوں کو غائب پایا۔ اس کے ہونٹوں سے خون بہہ نکلا تھا لیکن وہ اسی بے جگری سے لڑ رہا تھا۔ اس نے اچانک ریوالور اٹھا لیا جو اس کے نیچے آ گیا تھا۔ اتنے قریب سے وہ فائر نہیں کر سکتا تھا اس نے ریوالور محافظ کی طرف پھینک دیا۔

"پکڑو اسے... شوٹ ہم... یو ایڈیٹ...!" وہ چلایا۔

اسی وقت میں نے مشین گن کا بٹ مسٹر ایکس کے سر پر مارا۔ جب ریوالور کے فائر کی آواز آئی تو میں بے اختیار فرش پر گرا۔ میرے کانوں نے ایک چیخ بھی سنی لیکن یہ محسن کی چیخ نہیں تھی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو ریوالور محسن کے ہاتھ میں تھا اور محافظ، جو کچھ دیر پہلے مشین گن لیے کھڑا تھا۔ خود کو بے حد محفوظ اور دوسروں کو اپنی انگلی کے اشارے کا نشانہ سمجھے ہوئے تھا، فرش پر عجیب طرح سے لوٹ رہا تھا۔ وہ ٹانگیں چلا رہا تھا اور تقریباً ایک دائرے میں گھوم رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ گردن پر تھے اور خون اس کی انگلیوں سے پھوٹ رہا تھا۔ محسن کی چلائی ہوئی گولی اس کے نرخرے میں سے گزر گئی تھی۔ وہ اب بہت بھیانک آوازیں بھی نکال رہا تھا اور چند لمحوں کا مہمان تھا۔

اس جنگ کی خبر مشین گن کے پہلے ہی راؤنڈ نے سب کو پہنچا دی تھی لیکن نہ جانے کس وقت محسن نے دروازہ اندر سے بند کر دیا تھا۔ اب باہر جمع ہونے والے دروازے کو توڑنے کی سر توڑ کوشش کر رہے تھے۔ میں سراج کے دھاڑنے اور اونچی آواز میں گالیاں بکنے کا شور بھی سن رہا تھا۔ مسٹر ایکس لمبا لیٹا ہوا تھا اور اس کے سانس لینے کی رفتار بہت کم تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ واقعی بے ہوش ہے۔

مشین گن اٹھاتے ہی میں نے محسن کی طرف ہاتھ بڑھا لیا۔ اس نے محافظ کے جسم پر سے اتارا ہوا راؤنڈ میری طرف اچھال دیا۔

"دروازے کے ساتھ... ادھر سے۔" میں نے محسن کو اشارہ کیا اور محسن میری راہ سے ہٹ گیا۔ باہر سے ٹکریں مارنے والے دروازے کی مضبوطی پر برہم تھے۔ انھوں نے خود ہی اسے مضبوط بنایا تھا لیکن ان کا مقصد یہ تھا کہ جو اسیر ہو وہ اسے نہ کھول سکے۔ اب خود صیاد کے لیے اسیر تک رسائی مشکل ہو گئی تھی۔ یقیناً ان کو اس غلطی کا احساس بھی ہوا ہو گا جو انھوں نے دروازے کے اندر کنڈی لگا کے کی تھی لیکن یہ ہماری عادت ہے کہ ہم دروازے کو اندر اور باہر سے ایک جیسا محفوظ بناتے ہیں۔ لوہے کی موٹی سی سلاخ کو محسن نے ایک ہاتھ مار کے کھسکا دیا تھا اور سلاخ دو آہنی کنڈوں سے گزر گئی تھی۔

باہر سراج مسلسل چیخ رہا تھا "مارا گیا نا آخر افلاطون کی اولاد... ہم کو اُلّو کا پٹھا سمجھتا تھا۔" اس نے مسٹر ایکس کے لیے ایک زبردست گالی کے ساتھ کہا۔ "ہم بھی چھوٹے بچے کے ایس پی نہیں بنے... بہت عرصہ..." اس نے خود اپنی ذات کے لیے خاصے نامناسب الفاظ استعمال کیے۔ "اور اندر وہ کتے کا بچہ... مشین گن لیے کھڑا کیا کر رہا تھا... اب لایا ہے کلہاڑی۔" اس نے کسی کو گالی دی۔

میں نے مشین گن سے نشانہ لے کر ایک برسٹ مارا... دروازے میں کئی سوراخ ہو گئے اور باہر دو تین افراد ایک ساتھ چیخنے لگے۔ میں نے محسن کو اشارہ کیا کہ کنڈی کھول دے۔ اس کا یہی بہترین موقع تھا۔ جیسے ہی دروازہ کھلا میں باہر کی طرف لپکا۔ پہلے برسٹ نے تین آدمی گرا دیے تھے جو دروازہ توڑنے کے لیے اپنے جسم سے دھکا لگا رہے تھے۔ ان میں وہ دونوں گونگے کمانڈوز بھی شامل تھے جو آج تک فرشتۂ اجل کی طرح مسلط رہے تھے۔ ان کو مرتا دیکھ کے مجھے ایک وحشیانہ سی خوشی ہوئی۔ باقی سب ایک دم پیچھے ہٹے تھے۔ خود سراج بھاگ رہا تھا کہ میں نے مشین گن کا رُخ اس کی طرف کر دیا۔ ریوالور اس کے ہاتھ میں تھا مگر وہ منجمد ہو گیا۔

"تم اسی طرح اسی جگہ کھڑے رہو گے۔" میں نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا "محسن باہر جائے گا... صرف محسن..."

"مگر وہ کیسے... کیسے باہر جائے گا۔" سراج نے کہا۔ "راستے میں..."

"وہ اپنے ساتھ مسٹر ایکس کو لے جائے گا۔" میں نے کہا۔ "راستہ خود مسٹر ایکس بتائیں گے۔ ان کے حکم سے سارے محافظ راستہ دیں گے... اور سارے بند دروازے کھلیں گے... باقی سب سے کہو کر غائب ہو جائیں۔ تم اکیلے اس راہداری میں کھڑے رہو گے۔ اگر کوئی تمھاری مدد کے لیے آئے گا تو خود بھی جان سے جائے گا اور تمھیں بھی مروائے گا۔"

"تم اپنی زندگی سے کھیل رہے ہو۔" سراج نے کہا۔

"بکواس بند کرو۔" میں نے کہا۔ "یا تم چاہتے ہو کہ میں وہی گنتی والا کھیل شروع کروں... دس تک گنوں اور اس کے بعد بھی تم..."

"آل رائٹ... سب لوگ اندر جاؤ۔" اس نے بادل ناخواستہ حکم دیا اور وہ چاروں اِدھر اُدھر کے کمروں میں گم ہو گئے جو راہداری میں سراج کے ساتھ کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے مشین گن سے سراج کو اشارہ کیا۔

"اب تم اندر آ جاؤ... آگے آؤ... اور آگے..." میں نے ایک ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ میں اسے نظر میں رکھنا چاہتا تھا لیکن یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ دروازے سے گزرے تو میرے بہت نزدیک ہو۔ سراج تعمیل پر مجبور تھا۔ وہ آہستہ آہستہ دروازے تک آیا۔ اس وقت تک میں چند قدم پیچھے ہٹ چکا تھا اور اس کے گزرنے کے لیے دروازہ خالی تھا۔

"یہ تو مر گیا ہے۔" سراج نے نیچے پڑے ہوئے مسٹر ایکس کی طرف دیکھ کے کہا۔

"اس کے مرنے سے تم یتیم نہیں ہوئے۔" میں نے کہا۔ "دوسرا باپ مل جائے گا تمھیں... تم اپنی فکر کرو۔"

اگر سراج کا مقصد میری توجہ ہٹانا تھا تو وہ اپنے مقصد میں ناکام رہا۔ یہ ایک بچکانہ حرکت تھی۔ کوئی معمولی سمجھ بوجھ رکھنے والا بھی اس طرح دھوکا نہیں کھا سکتا تھا۔ میں نے اُسے حکم دیا کہ وہ اپنا منہ دیوار کی طرف کرے اور ہاتھوں کو سر کے اوپر رکھ کے کھڑا ہو جائے۔ تھانے میں ایک معمولی سپاہی کسی بھی چور اُچکے یا جیب کترے کے ساتھ یہی سلوک کرتا ہے اور صفِ مجرماں میں ان شرفا کو بھی شامل کر دیا جاتا ہے جو آوارہ گردی یا مشتبہ انداز میں پھرنے کے الزام میں پکڑ کر لائے جاتے ہیں۔ پولیس کی کچھ دفعات کا معاشی خوشحالی سے براہِ راست تعلق ہے۔ اندیشۂ نقصِ امن کی دفعہ کسی بھی دو افراد یا دو گروہوں پر لگائی جا سکتی ہے جو بہ آوازِ بلند بات کر رہے ہوں تو کہا جا سکتا ہے کہ وہاں خون خرابا ہونے ہی والا تھا۔ کوئی تفریح کی غرض سے ٹہل رہا ہے یا کسی کا پتا تلاش کر رہا ہے تو اس پر آوارہ گردی کا لیبل آسانی سے لگ جاتا ہے... اور مشتبہ نظر آنا تو دیکھنے والے کی نظر پر ہے۔ جیسے حُسن دیکھنے والے کی نظر میں ہوتا ہے ایسے ہی کسی سو فیصد شریف اور امن پسند معزز شہری کو پولیس کی نظر مشتبہ یا آوارہ گرد کی حیثیت سے دیکھتی ہے تو صرف اس لیے کہ یہی لوگ رہائی کا منہ مانگا معاوضہ ادا کر کے جاتے ہیں۔ جانے سے پہلے ان کو تھانے کے رعب اور دبدبے کا احساس دلانے کے لیے چند چھتر مارے جاتے ہیں یا لاتیں گھونسے تو اس کی ضرورت اور اہمیت بھی تھانے والے ہی جانتے ہیں۔

مگر آج معمولی کانسٹیبل نہیں، ایک ایس پی کے ساتھ وہ سلوک ہو رہا تھا جو عام حالات میں ہمارے ساتھ ہوتا۔ مجھے وہ سب یاد تھا جو سراج نے روزِ اوّل میرے ساتھ کیا تھا اور اب کیا تھا۔ میری دلی آرزو تھی کہ میں انگریزی محاورے کے مطابق... اس کو اسی کے سکوں میں ادائیگی کروں، ایک بار اسے بھی بتاؤں کہ بات صرف وقت کی ہے جو بدلتا رہتا ہے۔ کل وہ اوپر تھا، آج نیچے آ کے دیکھے اور سمجھے کہ ظلم کیا ہوتا ہے۔ زبان سے میں کیسے بتا سکتا تھا کہ مجھ پر کیا بیتی تھی۔ جو جسمانی اور ذہنی اذیت میں جھیل چکا تھا، اس کو بیان کرنے کے لیے دنیا کی تمام زبانوں کے الفاظ ناکافی تھے اور اسے ضابطۂ تحریر میں لانے کے لیے عمرِ خضر بھی ناکافی تھی لیکن صرف ایک رات کا عملی سبق اس بے ضمیر شیطان کی آنکھیں کھول سکتا تھا۔

"مجھے افسوس رہے گا سراج کہ تم میرے ہاتھ آئے تو ایسے وقت میں جب میں تم سے اپنا حساب برابر نہیں کر سکتا۔" میں نے کہا۔ "تم نے اور دلاور نے بڑے زبردست شیطانی ڈرامے کیے۔ تم خود کو بہت اچھا ڈائریکٹر پروڈیوسر سمجھتے ہو گے۔ میں تمہاری خوش فہمی دور کر دیتا کہ تم سے بڑے ہدایت کار اور ڈرامے باز تو ہم ہیں... میں تو ہر عذاب اور ہر اذیت جھیل گیا۔ اور کیا تم دعویٰ کر سکتے ہو کہ قوتِ برداشت میں سکندر بخت تم سے زیادہ نہیں؟ اس کا پتا چل جاتا۔ اور کسی دن ضرور چلے گا جب معاملہ اُلٹا ہو گا۔ اب تک ہم تماشا تھے اور تم تماشا کرنے والے بھی اور تماشائی بھی... کسی دن تم تماشا بنو گے... تمہارے لیے وہ ایک دلچسپ تجربہ ہو گا اور سبق بھی جو تم کبھی نہ بھولو گے۔"

"آج تمہیں روکنے والا کون ہے؟" سراج نے زہرخند کے ساتھ کہا۔

"وقت۔" میں نے کہا۔ "ابھی اتنی ہی مہلت ہے کہ میں دوسرے زیادہ اہم کام ختم کروں۔ تاہم میرا وعدہ ہے کہ ایک رات تم بھی ایم آر ایس کے تھانے میں گزارو گے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک رات میں نے تمہارے تھانے میں گزاری تھی اور سراج، ایک فلم کی شوٹنگ میں بھی کروں گا جسے تم میری طرح دیکھو گے۔ مجھے تو پہلے سے معلوم نہیں تھا کہ میرے ساتھ کیا ہو گا... مگر میں نے تم کو بتا دیا ہے۔ اب تم انتظار کا عذاب بھی جھیلو۔ خوف کے آسیب سے بھی ڈرتے رہو۔ حادثے میں مر جانا آسان ہوتا ہے۔ سزائے موت پانے والے قیدی کے لیے پھانسی کے دن تک جینا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ سارا ذہنی اور جسمانی عذاب اور اذیت جو مجھے ملی، تم بھی پاؤ گے مگر خوف اور انتظار کا کرب تمہیں اضافی ملے گا۔ اسے تم اپنے اعمال کا سود سمجھ لو جو حرام ہوتا ہے لیکن حرام کھانے والوں کو، حرام کاری کرنے والوں کو اور تم جیسے حرامزادوں کے لیے جائز ہے... محسن... ایس پی صاحب کو ننگا کر دے اور ان کے کپڑے اتار دے۔"

"تم ایسا نہیں کر سکتے۔" سراج پھٹ پڑا۔

"اس وقت ہم سب کچھ کر سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اس سے زیادہ بھی کر سکتے ہیں۔ تم اتنے کم عقل تو نہیں ہو کہ صورتِ حال کو سمجھ نہ سکو۔"

"میں... اس کا بدلہ لوں گا۔" سراج نے دانت پیس کر کہا۔

محسن نے اس کے ایک چھانپڑ دیا۔ سراج کا منہ دیوار سے لگا اور اس نے ہاتھ سے ناک کو چھو کر دیکھا تو مجھے اندازہ ہوا کہ اس کی ناک سے خون بہنے لگا ہے۔

"بدلہ تم کو نہیں، ہم کو لینا ہے۔" محسن نے کہا۔ "تم تو سب کچھ کر چکے۔ جوابی کارروائی ہمیں کرنا ہے۔ یہ باری کا کھیل ہے اور تمہاری باری گزر گئی۔" اس نے سراج کی جامہ تلاشی جاری رکھی اور اس کی جیب میں سے ریوالور کے علاوہ شناختی کارڈ۔ نقد رقم جو بعد میں نو ہزار سات سو روپے بنی۔ اور کچھ کاغذات بھی نکال لیے۔

"اب تم اپنے کپڑے شرافت سے میرے حوالے کرو گے یا میں زبردستی کروں؟" محسن نے کہا۔

سخت اشتعال کے عالم میں سراج نے اپنی بشرٹ اور پتلون اتار کے زمین پر دے ماری۔ "تم نے اسے اتروا کے بہت بڑا جرم کیا ہے۔"

محسن نے اس کے ایک لات ماری۔ "کیا یہ جرم اس وردی کو پہن کر اسمگلنگ کرنے سے بھی بڑا ہے؟ غداری اور وطن فروشی سے بھی زیادہ سنگین ہے۔"

"سچ تو یہ ہے کہ تم اس لباس کے کبھی اہل نہ تھے۔" میں نے کہا۔ "تمہارے جسم پر تو وہ چار خانے والی وردی ہونا چاہیے جو سی کلاس کے قیدیوں کو ملتی ہے... یہ لباس تو وطن کے قانون کی بالادستی رکھنے والوں اور ملک کو اندر اور باہر کے دشمنوں سے بچانے والوں کو دیا جاتا ہے۔"

"اب اُلٹے لیٹ جاؤ۔" محسن نے حکم دیا۔

احساسِ ذلت سے سراج کا چہرہ مسخ ہو گیا تھا۔ لیکن وہ تعمیل نہ کرتا تو کیا کرتا۔ اس کی نظر بار بار دروازے کی طرف جاتی تھی، شاید اسے امید تھی کہ کمرے سے باہر دوسرے لوگ کچھ نہ کچھ ضرور کریں گے مگر ابھی تک ہر طرف خاموشی تھی۔ وہ گالیاں بکتا ہوا اُلٹا لیٹ گیا۔ میری نظر دروازے سے باہر بھی دیکھ رہی تھی اور میں بے ہوش پڑے ہوئے مسٹر ایکس کی طرف سے بھی غافل نہیں تھا۔

...سکتا تھا کہ وہ چالاک اور عیار آدمی مکر کر رہا ہو اور آنکھیں بند ...ہماری ساری باتیں سن رہا ہو اور موقع کی جستجو میں ہو، ...وہ پھر صورتِ حال کو قابو میں کر سکے۔ میں نے اس کو دو ...بار ٹھوکریں مار کے دیکھا اور اس کی جیب میں سے سگریٹ ...لی۔ اسی کے لائیٹر سے جلائی اور پھر اس کے جسم سے لگا کے ...مگر وہ غیر متحرک رہا۔ اس وقت جب میں یہ کارروائی کر رہا ...مجھے احساس ہوا تھا کہ اس کا سانس رکا ہوا ہے... مجھے ...ہوا کہ سراج کی بات درست ہی نہ ثابت ہو جائے۔ دس ...ٹ بعد میں نے پھر دیکھا تو مجھے پھر سانس رُکی ہوئی لگی اور میرا ...یقین میں بدلنے لگا کہ وہ مر چکا ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ دو ...منٹ تک سانس روک کے رکھنا کوئی مشکل کام نہیں لیکن ...منٹ بہت ہوتے ہیں۔ اگر میں نبض دیکھتا تو مجھے مشین گن ...رنت چھوڑنا پڑتی۔ مشین گن اگر ایک ہاتھ میں ہو تو بے کار ...اُسے چلانے کے لیے دونوں ہاتھوں سے تھامنا پڑتا ہے۔ ...نچہ میں نے نبض دیکھنے کا خطرہ مول نہیں لیا تھا کہ کہیں میں ...ن دیکھنے بیٹھوں اور مُردہ زندہ ہو جائے۔ جب محسن اپنی ...روائی میں مصروف تھا، تب بھی میری نظر مسلسل مسٹر ایکس کا ...زہ لیتی رہی تھی اور میں یہ ماننے پر مجبور ہو گیا تھا کہ مسٹر ایکس ...خودکشی کر لی ہے یا وہ کسی ضربِ کاری سے ہلاک ہو گیا ہے۔ ...یجنٹ اپنے دانتوں کے خلا میں پوٹاشیم سائنائڈ جیسا کوئی ...زہر رکھتے ہیں اور جہاں فرار کے سب راستے بند ہوں، وہاں ...زہر کی مدد سے اپنا خاتمہ کر لیتے ہیں۔ وہ دشمن کی قید میں جا کے ...شن کا عذاب جھیلنے سے بچ جاتے ہیں اور اس اندیشے سے ...ہیں وہ تشدد کی تاب نہ لاتے ہوئے سارے راز افشا نہ کر ...دانتوں کے خلا میں چھپے ہوئے اس زہر کے کیپسول کو ایک ...طریقے سے دانتوں کے بیچ میں لا کر چبانا کافی ہوتا ہے۔ چند ...نڈ میں زہر اپنا کام کر جاتا ہے اور ہر حکومت کے جاسوس جو ...شن پر دشمن کے علاقے میں بھیجے جاتے ہیں، اُن پر واضح ...ہے کہ گرفتاری کی صورت میں انھیں اپنی مدد آپ کرنا ...یہ بات بہت مشہور ہے کہ جاسوس کا دوست کوئی نہیں ...اپنے نہ پرائے۔ پرائے تو خیر دشمن ہوتے ہیں مگر اپنے ...سے صاف انکار کر دیتے ہیں چنانچہ وہ جان آسانی ...پسند کرتے ہیں۔

...جب تڑ تڑ کی آواز آئی تو میں چونکا۔ اور یہ دیکھ کر مجھے ...ہوئی اور ہنسی بھی آئی کہ محسن نے سراج کے ساتھ بہت ...سلوک کیا ہے۔ اس نے اپنا جوتا اتار کے سراج کی ...شروع کر دی تھی لیکن سراج اب خاموش تھا۔

"افسوس کہ میرے پاس وہ تیرہ نمبر کا روایتی چھتر نہیں جو تھانوں میں شرفا کی عزت افزائی کے لیے رکھا جاتا ہے۔ میرے جوتے کا نمبر دس ہے۔" محسن نے کہا۔

"محسن! وقت ضائع مت کر۔" میں نے کہا۔ "یار زندہ، صحبت باقی۔ ہم یہ کام تسلی سے اور دل جمعی سے کریں گے۔"

"میں نے تو افتتاح کیا ہے۔" محسن بولا۔ "دس جوتے صرف آغاز کے طور پر مارے ہیں... باقی اقساط آئندہ۔"

"اِدھر آ کے دیکھ، یہ دشمن کتا مر گیا ہے... مجھے تو ایسا ہی لگتا ہے۔"

محسن نے سراج کو چھوڑ کے جوتا پہنا اور میرے پاس لیٹے ہوئے مسٹر ایکس کا معائنہ کرنے لگا۔

"یہ تو واقعی مر چکا ہے۔" محسن نے بھی سانس پر غور کیا۔

میں نے اشارے سے نبض اور دل کی دھڑکن دیکھنے کو کہا۔ محسن نے اس کی کلائی تھامی اور جانتے بوجھتے غلط جگہ پر انگلی رکھ کے نبض دیکھنے لگا۔ یہ ضروری نہیں کہ نبض کے چلنے کا پتا صرف انگوٹھے کے نیچے کلائی پر انگلی رکھ کر ہو۔ غور سے دیکھا جائے تو نبض کی جگہ متحرک نظر آتی ہے۔ بے شک، یہ حرکت بہت خفیف ہوتی ہے مگر جلد پر ایک جگہ پھڑکتی دکھائی دیتی ہے۔ اور محسن نے اسی کو دیکھ کے مجھے آنکھ ماری جس کا مطلب واضح طور پر یہ تھا کہ مسٹر ایکس فوت نہیں ہوئے ہیں۔ یقیناً وہ وقفے وقفے سے سانس لیتا رہا تھا اور میں نوٹ نہیں کر سکا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ یوگا کا ماہر ہو، جن کے بارے میں ناقابلِ یقین باتیں مشہور تھیں کہ وہ سانس کو مسلسل گھنٹوں روکے رکھتے ہیں۔ یوگی ایسے بھی ہیں جو قبروں میں دفن رہ کے اگلے دن زندہ برآمد ہوتے ہیں۔ کم عقل اور اندھی عقیدت رکھنے والے تو ہفتوں اور مہینوں کا ذکر کرتے ہیں کہ فلاں یوگی بابا چھ مہینے بعد قبر سے نکلے... مگر وہ سب مبالغہ اور بکواس ہوتی ہے۔ تاہم طویل وقفے کے لیے سانس روکنے کی مشق یوگا میں شامل ہے۔

"نبض بھی رُکی ہوئی ہے۔" محسن نے مایوسی بھرے لہجے میں کہا۔

"یہ تو بہت بُرا ہوا۔" میں نے بھی افسوس سے کہا۔ "یہ آدمی کام کا تھا، ہمیں بہت کچھ بتا سکتا تھا۔"

"اچھا ہوتا اگر یہ زندہ رہتا۔" محسن اُٹھ کھڑا ہوا۔ یہ ساری گفتگو مسٹر ایکس کو سنانے کے لیے تھی تاکہ اسے ہمارے بے وقوف بننے کا یقین آ جائے۔ "خیر اب آگے کی سوچ... ہمیں یہاں سے نکلنے کے لیے کیا کرنا ہے؟"

"ہمیں تو باہر نکلنے کے راستے بھی معلوم نہیں۔" میں نے کہا۔

"راستے تو مل جائیں گے لیکن پہلے رابعہ، ٹیڈی اور کیتھرین کو ساتھ لینا ہے۔ یہ معلوم کرنا ہے کہ وہ کہاں قید ہیں۔ ہمیں ہر کمرے میں جا کے دیکھنا ہوگا۔ باہر والے کوریڈور میں دونوں طرف آٹھ دروازے ہیں۔ چار ایک طرف اور چار دوسری طرف۔ نواں دروازہ بالکل سامنے ہے جو شاید باہر جانے کے لیے ہوگا۔ باہر کیا ہے؟ یہ باہر جا کے دیکھیں گے۔ پہلے تو ہر کمرے کے سامنے سے گزرنے کا مرحلہ ہے۔ نہ معلوم کس کمرے میں سے کوئی توپ چلا دے۔ پھر رابعہ کیتھرین اور ٹیڈی کو نکال کر ساتھ لے جانا بھی آسان نہیں ہوگا۔ سراج ہمارے قبضے میں ہے تو ہمارے بھی تین آدمی ان کے پاس ہیں۔ ان کی زندگی کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔"

"معلوم نہیں یہاں کل کتنے آدمی تھے۔" محسن بولا۔

"تین مارے گئے... دو یہاں ہیں۔" میں نے کہا۔ "دلاور اور پیڈرو بھی یہیں تھے۔ اب کسی کی آواز نہیں آ رہی ہے۔ باہر نکل کے دیکھتے ہیں۔"

"ہر کمرے کے سامنے سے گزرنے کا اور ہر کمرے کے اندر جانے کا خطرہ تو مول لینا ہی پڑے گا۔" محسن بولا۔

"تو ایس پی صاحب کی وردی پہن لے۔" میں نے آہستہ سے محسن کے کان میں کہا۔

محسن نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"یہ لوگ پہچانتے ہیں اور دھوکا نہیں کھائیں گے کہ تو سراج ہے۔" میں نے اس کے کان میں کہا۔ "مگر ہم باہر نکل گئے تو اس وردی سے کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور اٹھائیں گے۔"

محسن نے میری بات مان لی اور اپنے کپڑے اتار کے ایس پی سراج کی پوری وردی چڑھا لی۔ سراج خونی نظروں سے ہمیں گھورتا رہا۔ میں نے محسن کو دروازے کی طرف بڑھنے کا اشارہ کیا۔ محسن نے مسٹر ایکس اور سراج کی طرف اور پھر میری طرف دیکھا۔ اس کی نظر کا سوال واضح تھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ کیا ہم ان دونوں خطرناک دشمنوں کو اسی جگہ ایسے ہی چھوڑ جائیں گے۔ میں نے سر ہلایا اور اسے پھر دروازے کی طرف چلنے کا اشارہ کیا۔ میں اور وہ ایک ساتھ دروازے سے نکلے اور اپنے پیچھے دروازہ بند کر دیا۔ میں نے وہیں کھڑے رہ کر باری باری دونوں پیروں پر اچھلنا شروع کیا۔ محسن نے میری تقلید کی۔ زمین پر ہمارے پیروں کے پڑنے سے ایسی آواز پیدا ہوتی تھی جیسے ہم دونوں بھاگ رہے ہوں۔ رفتہ رفتہ میں نے اس آواز کو کم کیا۔ یہ تاثر دینے کے لیے کہ ہم دور چلے گئے ہیں۔ پھر ہم دروازے کے دونوں جانب پوزیشن لے کر کھڑے ہو گئے۔

ہماری اس حرکت کے نتائج خاطر خواہ نکلے۔ سب سے پہلے تو کمرے کے اندر سے سراج کے گالی دینے کی اور چیخنے چلانے کی آواز سنائی دی۔ پھر ہم نے مسٹر ایکس کی آواز سنی۔ وہ سراج کو ڈانٹ رہا تھا کہ اس طرح شور نہ کرے۔ ہم ان کے منتظر تھے کہ کوریڈور کے تین دروازے کھلے اور ان میں سے تین آدمی نکلے۔ دو کے ہاتھ میں ریوالور تھے اور تیسرے نے مشین گن اٹھا رکھی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتے میں نے مشین گن کا راؤنڈ چلا دیا اور وہ تینوں وہیں گر گئے۔ مارے جانے والے بھی یہی سمجھے تھے کہ ہم راہداری میں دوڑتے ہوئے دروازے کی طرف گئے ہیں اور وہ ہمیں پیچھے سے شوٹ کر دینے کا ارادہ رکھتے تھے مگر اندازے کی غلطی ان کی موت کا سبب بن گئی۔

میں نے محسن کو واپس کمرے کے اندر کھینچ لیا کیونکہ اب مزید مسلح افراد کا باہر نکل آنا یقینی تھا۔ اندر سراج اور مسٹر ایکس ایک ساتھ کھڑے ہوئے تھے۔ وہ ہمیں دیکھ کر بری طرح چونکے۔ فائرنگ کی آواز سے انھوں نے بھی فرض کر لیا تھا کہ ہم فرار ہوتے ہوئے مارے گئے۔

"مردہ زندہ ہو گیا۔" میں نے مسٹر ایکس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"کیا تم بھی اسی شان سے باہر جانا پسند کرو گے؟" محسن بولا۔

"مجھے کوئی کمپلیکس نہیں ہے۔" مسٹر ایکس نے متانت سے کہا۔ "تم میرے کپڑے پہننا چاہتے ہو تو لے لو۔ کپڑوں کا میری شخصیت سے یا میری عزت اور ذلت سے کوئی تعلق نہیں۔ کپڑے ہوں یا نہ ہوں، میں وہی رہوں گا... جو میں ہوں۔ میں ان کی پروا بھی نہیں کرتا جو میرا تماشا دیکھیں گے اور مجھ پر ہنسیں گے کیونکہ وہ دشمن ہیں۔"

اس کی باتوں نے سراج کے دل کو یقیناً تسلّی دی ہوگی۔ وہ بولا۔ "یہ ایسی ہی بات ہے جیسے تم میری وردی پہن کے ایس پی نہیں ہوئے۔ اور چوروں نے میری وردی اتار لی تو میرا عہدہ ختم نہیں ہوا۔ میں اب بھی ایس پی ہوں اور ایسی وردیاں مجھے بہت ملیں گی۔"

مشین گن کے راؤنڈ ختم ہو گئے تھے لیکن اب ہمارے ہاتھ میں دو ریوالور آ گئے تھے۔ ایک سراج کا اور دوسرا مسٹر ایکس کا۔ میں نے مشین گن کو ناکارہ بنا کے پھینک دیا۔

"چلیے جناب ایس پی صاحب۔" میں نے کہا۔ "اور مسٹر ایکس۔"

اس نے مسکراتے ہوئے انکار میں سر ہلایا۔ "تم مجھے شوٹ کر سکتے ہو مگر مجھے تعمیلِ حکم پر مجبور نہیں کر سکتے۔"

میں نے اس کی پُراعتماد مسکراہٹ اور اس کے لہجے پر غور کیا تو مجھے یقین آنے لگا کہ وہ ایسا ہی کرے گا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ میں اُسے ناک آؤٹ کر دوں۔ ایسی صورت میں اُسے اٹھا کے جانا پڑتا۔ میں اُسے دھکے دے کر باہر لے جانے کی کوشش کرتا (تو وہ) مزاحمت کرتا اور اگر باہر چلا بھی جاتا تو وہ نہ کرتا جو ہم چاہتے۔ وہ کسی کو حکم نہ دیتا کہ ہماری مدد کریں۔ اپنی جان بچانے کے (لیے بھ)ی کو تعمیلِ حکم پر مجبور نہ کرتا۔ وہ بالکل مختلف آدمی تھا۔ سراج (اور دلا)ور جیسے لوگوں سے الگ۔ وہ جان کی بازی لگانے آیا تھا (ا)سے جان کی پروا نہیں تھی۔ یہ ہو سکتا تھا کہ وہ الٹا سب سے (ک)ہ ہماری بات نہ مانیں اور مقابلہ کریں۔ ایسے آدمی سے کچھ بھی (اگلوانا) عملاً ناممکن تھا اور یہاں ہمارے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ (ا)س سے زبردستی کچھ اگلواتے۔

اگر میں تذبذب سے کام لیتا تو اس سے میری کمزوری ظاہر (ہوت)ا۔ میں نے فوراً فیصلہ کر لیا۔ "مسٹر ایکس! دس سیکنڈ میں تم (اپنے) فیصلے پر نظرِ ثانی کر سکتے ہو۔ ہمیں باہر نکالنے میں مدد کرو گے یا (مو)ت قبول کرو گے۔"

"فیصلہ میں کر چکا ہوں۔ اور میں کبھی دو فیصلے نہیں کرتا۔" وہ (بولا۔) "اگر میں زندگی کو اتنا اہم سمجھتا تو اس مشن کی کمان سنبھالنے (کا) فیصلہ نہ کرتا اور میرا یہی کردار ان کی نظر میں بھی تھا جنھوں نے (مجھے) یہ اہم ذمے داری سونپی تھی۔ تمھارے نقطۂ نظر سے میں دشمن (ہوں)۔ کافر ہوں یا جہنمی ہوں۔ غدار اور شیطان ہوں لیکن سرحد (کے) اس پار میں بھارت کا جیالا سپوت ہوں۔ میں محبِ وطن (ہو)ں۔ غازی ہوں اور مر جانے کے بعد سورگ باشی کہلاؤں گا۔ اعلیٰ (تر)ین اعزاز کا مستحق سمجھا جاؤں گا۔ شکست قبول کر لینے اور زندہ (رہ)نے کے لیے دشمن سے رحم کی بھیک مانگنے یا اس سے سمجھوتا (ک)رنے کی صورت میں میرے لیے کچھ نہیں۔ میں اِدھر دشمن تو (اُدھ)ر غدار۔ اِدھر کافر تو اُدھر بے دین۔ اِدھر جہنم تو اُدھر نرگ کا (ا)گنی۔ ذلت اور رسوائی دونوں طرف... میں تمھارے ہاتھوں (مرن)ے کو ترجیح دوں گا۔"

"آل رائٹ۔ میں تمھیں وعدے کے مطابق دس سیکنڈ (دے) رہا ہوں جس میں تم سوچ سکتے ہو کہ یہ ڈراما بہتر ہے یا حقیقت (بہتر) ہے۔" میں نے کہا اور ایک ایک سیکنڈ کو گن کر شمار کرنے (لگا۔ ...) ہوتے دس سیکنڈ گزر گئے اور اس شخص کے اطمینان اور اعتماد (میں کمی) نہیں آئی۔ جب میں نے اس کے سر میں گولی ماری تب بھی (وہ مسک)را رہا تھا لیکن اس کی اچانک موت نے سراج پر (...) طاری کر دی۔

"اب تمھاری باری ہے۔" میں نے ریوالور کا رُخ بدلا۔ "تم کیا (چاہتے) ہو؟"

"میں... میں... تم کیا چاہتے ہو؟" سراج نے ہکلا کے کہا۔

"اب تم آزادی سے سارے فیصلے کر سکتے ہو۔" میں نے کہا۔ "یہی ایک شخص تھا جو تم پر حکم چلاتا تھا۔ تمھارے لیے ہم سب کو زندہ سلامت یہاں سے نکالنا کوئی مشکل کام نہیں۔"

"اتنا آسان بھی نہیں... لیکن میں کوشش کر سکتا ہوں۔" سراج نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"تمھارا مطلب ہے چوہدری دلاور یا پیڈرو تمھاری راہ میں حائل ہو سکتے ہیں؟" میں نے کہا۔

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "کیا تم وعدہ کر سکتے ہو کہ اس کے بعد مجھے مارو گے نہیں؟" اس نے مسٹر ایکس کی لاش پر نظر ڈالی۔

"اگر تم ہمارے وعدے پر اعتبار کر سکتے ہو تو وعدہ کرنے میں کیا ہرج ہے۔" میں نے کہا۔ "میں وعدہ کرتا ہوں۔"

سراج کی پوزیشن بہت عجیب ہو گئی تھی۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ ہم نے مسٹر ایکس کے ساتھ کیا کیا۔ لیکن وہ مسٹر ایکس کی طرح بہادر نہیں تھا۔ مسٹر ایکس اب اپنوں کے لیے غدار نہیں رہا تھا لیکن سراج بدستور غدار تھا اور مرنے کے بعد بھی رہتا۔ وہ مرنے سے ڈرتا تھا۔ ہم سے زندگی کی ضمانت مانگنا ایک ایسی ہی احمقانہ حرکت تھی جو اس سے موت کے خوف میں سرزد ہوئی۔ جب جنگ جاری ہو تو دشمن سے وعدہ لینا اور پھر وعدے پر قائم رہنے کی امید رکھنا دونوں بے وقوفی کی دلیل ہیں۔

"میں تمھارے ساتھ چلوں گا... لیکن اس طرح نہیں۔" وہ بولا۔

"تم محسن کے کپڑے پہن سکتے ہو۔" میں نے کہا۔

انتہائی مجبوری کے عالم میں اس نے محسن کے اتارے ہوئے کپڑے پہنے۔ اس کی حالت قابلِ رحم تھی۔ وہ ایک ایسا شخص تھا جو خود اپنی نظر سے گر گیا تھا۔ اس کی بہادری کے دعوے موت کو سامنے پا کے نقش برآب ثابت ہو گئے تھے۔ وہ بہت بھونکتا تھا۔ گالیاں دیتا تھا اور ظلم کرتا تھا مگر اس وقت جب فریقِ ثانی بے بس اور انتہائی مجبور ہوتا تھا۔ اس وقت جب وہ خود کو محفوظ سمجھتا تھا اور بااختیار سمجھتا تھا۔ صورتِ حال کے پلٹتے ہی اس کی اصلیت ظاہر ہو گئی تھی۔

باہر آتے ہی اس کی نگاہ نے دروازے پر پڑی ہوئی تینوں لاشوں کو دیکھا۔ پھر آگے تین مختلف دروازوں پر اسے تین اور آدمی پڑے نظر آئے اور اس کی صورت پر مایوسی اور ناامیدی کا تاریک سایہ اور گہرا ہو گیا۔

"میں تمھارے ساتھ ایک قدم پیچھے ہوں۔" میں نے کہا۔ "پہلے ایک دروازے پر دستک دو... جو اندر ہو اُسے باہر آنے کا حکم دو اور پھر خود ایک قدم پیچھے ہٹ جاؤ۔"

"اندر اب کون ہوگا۔" وہ تلخی سے بولا اور آگے چلتا گیا۔ میں نے پہلے دروازے پر گرے ہوئے محافظ کی اسٹین گن اٹھا لی۔

اسے اُٹھانے کا خیال سراج کے دل میں بھی آیا تھا مگر اس نے مجھے ایک قدم پیچھے پایا تو اپنا ارادہ بدل دیا۔ اسٹین گن لوڈ تھی چنانچہ میں نے ریوالور جیب میں ڈال لیا۔ محسن ہمارے ساتھ نہیں نکلا تھا، وہ اسی کمرے کے دروازے میں ریوالور لیے کھڑا رہا تھا جس میں مسٹر ایکس کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ یہ ایک دُہرا حفاظتی انتظام تھا۔ میں سراج کے پیچھے لگا ہوا تھا اور محسن نسبتاً محفوظ مقام سے میری حفاظت کر رہا تھا۔ سراج نے دروازے پر دستک دی۔ لیکن اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ اس نے دروازے کا ہینڈل گھمایا تو دروازہ کھُل گیا۔

"اندر کوئی نہیں ہے۔" وہ بولا۔

"تم پیچھے ہٹ جاؤ۔" میں نے کہا "میں دیکھوں گا... اور یہ مت بھولنا کہ تم دوسرے ریوالور کی زد میں ہو۔" میں نے محسن کی جانب اشارہ کیا۔

کمرے میں واقعی کوئی نہیں تھا۔ یہ ویسا ہی کمرہ تھا جیسے کمرے میں مجھے رکھا گیا تھا۔ تاہم یہ رابعہ کا کمرہ نہیں تھا... وہ دائیں جانب تھا۔ چنانچہ یہ محسن یا ٹیڈی میں سے کسی ایک کا کمرہ ہو سکتا تھا۔ اندر کی فضا خود بتاتی تھی کہ یہاں بھی کوئی اسیر تھا۔ کھانے کے برتن جن میں تھوڑا بہت کھایا ہوا کھانا موجود تھا۔ چائے کا کپ، ایک خالی گلاس اور فرش پہ بچھے ہوئے بستر کی شکن آلود چادر۔

"تم آگے چلو۔" میں نے باہر آ کے کہا۔ دوسری جانب وہ کمرہ تھا جس میں رابعہ کو رکھا گیا تھا مگر وہ بھی خالی تھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو مجھے سراج کے لبوں پہ ایک ایسی مسکراہٹ نظر آئی جو میرا مذاق اُڑا رہی تھی۔ میں نے اس مسکراہٹ سے مشتعل ہو کے اس پر حملہ کر دیا۔

"کہاں گئے یہ لوگ؟" میں نے چیخ کر کہا اور اسٹین گن کے بٹ سے سراج کے شانوں پر اور اس کی پسلیوں پر وار کیے۔

"میں... میں تو تمہارے ساتھ تھا..." وہ نیچے گر گیا اور بُری طرح کراہنے لگا۔

"کیا انھیں دلاور اور پیڈرو لے گئے ہیں؟" میں نے کہا۔

"مجھے نہیں معلوم۔" وہ دُہرا ہو کے بولا۔

"معلوم ہے... تم کو سب معلوم ہے۔" میں نے کہا اور اس کو پے در پے ٹھوکریں ماریں۔ وہ ہر ٹھوکر پر لُڑھکتا گیا اور ہائے ہائے کرتا گیا۔

"خدا کی قسم... میں... مجھے معلوم نہیں..."

"اب خدا کی قسم کھاتے ہو۔" میں نے اسے اور لاتیں ماریں۔ "تکتے... جب میں خدا کا نام لیتا تھا تو کیا کہتا تھا... میری کسی قسم پہ اعتبار کیا تھا؟ اپنے الفاظ یاد کر..." میں نے اُسے ایک گالی دی۔

محسن نے بھی سب سُنا تھا۔ وہ میرے قریب آ کے بولا "اس کو مارنے سے کیا ملے گا سکندر... اندر سارے کمرے دیکھ لیتے ہیں۔ ممکن ہے وہ باقی سب کو لے کر نکل گئے ہوں۔"

میں نے محسن کے ساتھ مل کر دوسرے کمروں میں جھانکا۔ سارے کمرے خالی تھے۔ رابعہ، کیتھرین اور استاد ٹیڈی کا کہیں پتہ نہ تھا، غالباً حالات کا رُخ بدلتا دیکھ کے دلاور اور پیڈرو نے وہاں رُکنے کا خطرہ مول نہیں لیا اور فوراً وہاں سے نکل گئے۔ انھوں نے محسوس کیا ہو گا کہ تمام حفاظتی انتظامات کے باوجود نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے تو اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی جُزوی شکست مکمل شکست بن جائے۔ ہم سب کو چھُڑا لیں اور ان کو قید کر لیں۔ ہماری دسترس سے باہر کسی نامعلوم مقام پر پہنچ جانے کے بعد وہ اپنا دباؤ برقرار رکھ سکتے تھے کیونکہ رابعہ، کیتھرین اور ٹیڈی ان کے قبضے میں تھے۔ اپنے ان ساتھیوں کی سلامتی کو داؤ پہ لگا کے ہم کچھ نہیں کر سکتے... یہ بات شکاری اچھی طرح سمجھتے تھے۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب یہاں کچھ بھی نہیں تھا تو یہ آدمی کس کی حفاظت کے لیے موجود تھے۔" میں نے کہا۔

"یہ غالباً سراج اور مسٹر ایکس کو نکال کر لانے کے لیے پیچھے چھوڑ دیے گئے ہوں گے۔" محسن نے کہا۔

میں نے تائید میں سر ہلایا۔ "تو یہاں ٹھہر... میں دیکھتا ہوں کہ اس آخری دروازے کے پیچھے کیا ہے۔"

"ایسے مت جا سکندر..." محسن نے کہا "کیا معلوم دروازے کے پیچھے وہ نیا جال بچھائے بیٹھے ہوں اور تو سیدھا ان کے ہاتھوں میں پہنچ جائے... یا موت کے مُنہ میں پہنچ جائے۔"

مجھے ایک دم ہوش آ گیا۔ "تو ٹھیک کہتا ہے... ہو سکتا ہے کہ وہ دروازے کو ٹریپ کر گئے ہوں... اس کے ساتھ کوئی بم وغیرہ لگا گئے ہوں... کہ ادھر ہم دروازہ کھولیں اُدھر دھماکا ہو اور سب ختم..." میں نے کہا۔

"ایس پی صاحب کو ضرور معلوم ہو گا۔" محسن نے سراج کی طرف دیکھا جو اب اُٹھ بیٹھا تھا مگر اس کی حالت غیر ہوئی تھی۔

"مجھے... مجھے نہیں معلوم..." وہ چلّانے لگا۔

"چلّاؤ مت۔" محسن نے اس کے سر پر لات ماری۔ "اس دروازے سے ہم گزرتے تو ہلاک ہو جاتے۔ ایسا انتظام مشکل نہیں تھا مگر کیا ایسا انتظام کرنے والوں کو تمہارا خیال نہیں ہو گا؟ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ اس میں سے ہم نہ گزرتے۔ تم اور مسٹر ایکس تب ہمیں قتل کرنے کے بعد یا پھر قیدی بنانے کے بعد۔ کیا بھی مارے جاتے؟ نہیں، ایس پی صاحب... شکاری جانتے ہیں کہ ایس پی صاحب کو بچ کر نکلنا آتا ہے۔"

"دروازے میں کچھ بھی نہیں ہے۔ صرف قفل ہے۔" سراج نے اپنی چوٹوں کو سہلاتے ہوئے کراہ کر کہا۔

پہلے مجھے صرف شبہ تھا اور میرے ذہن میں یہ خیال احتیاط ہی میں انتہا پسندی کے باعث آیا تھا لیکن سراج کے رویّے نے خیال کو یقین بنانے میں مدد دی۔ میں نے کہا "اچھا یہ قفل ہے اسے کھولو۔"

"میں... میں کیسے کھولوں..." سراج بولا "میرے پاس کون سی چابی ہے۔"

میں نے کہا "اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا۔ ایس پی صاحب کہتے ہیں کہ میں تالا کیسے کھولوں... ساری عمر چوروں ڈاکوؤں کے ساتھ رہے۔ ان سے تالے کھولنے کے گُر سیکھتے رہے اور ان کی بند زبانیں کھلواتے رہے۔ دعویٰ یہ تھا کہ جن کے سامنے پتھر بولتے ہیں اور جو کچھ انھوں نے کیا وہ ہماری اٹل پیر پڑے ہوئے قفل کھولنے کے لیے کیا۔ اب کہتے ہیں دروازے کا قفل بغیر چابی کے کیسے کھولوں؟" میں نے بڑی پھُرتی سے آگے بڑھ کے اسے لات ماری۔ وہ دروازے سے ٹکرایا اور کچھ دیر لمبا لیٹا رہا۔

"چابی اس کے ہاتھ میں دے محسن۔" میں نے دو مُردہ پڑے ہوئے شکاریوں میں سے ایک کا ریوالور سراج کی طرف پھینکا... "توڑ دو اس تالے کو ایس پی بہادر... لیکن اپنا اور ریوالور کا رُخ دوسری طرف رکھنا... مجھے ذرا بھی شک ہوا کہ تم پلٹ کر دیکھنا چاہتے ہو تو میں تم کو چھلنی کر دوں گا۔"

سراج اُٹھا تو اس کا رنگ زرد تھا۔ "تم تو... خود بھی تو یہ کام کر سکتے ہو..."

"وقت مت ضائع کرو... ہم یہ کام تمھیں سونپ رہے ہیں۔" محسن بولا۔

سراج نے ریوالور اُٹھایا۔ میری ہدایت کے مطابق اس نے ریوالور اٹھاتے وقت بھی اپنا چہرہ دروازے کی طرف رکھا۔ میں نے دیکھا کہ اس کا ہاتھ کانپ رہا ہے۔ وہ چند سیکنڈ تذبذب کے عالم میں کھڑا رہا۔ پھر اس نے جھک کر ریوالور فرش پر رکھ دیا۔

"میں... میرا خیال ہے... کہ تم ٹھیک کہتے ہو..." وہ آہستہ سے بولا۔

"ہم کبھی غلط نہیں کہتے تھے۔ اس کا اعتراف ایک دن تم بھی کرو گے۔" میں نے محسن کی طرف دیکھا۔ بروقت ذہن میں آ جانے والے ایک خیال نے ہمیں بچا لیا تھا تو اسے ہم اپنی ذہانت اور عقلمندی بھی کہہ سکتے تھے اور خوش قسمتی بھی لیکن یہ آوازِ غیب تھی اور تائیدِ ایزدی کے سوا اسے کچھ نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔

"گویا تم مان رہے ہو کہ دروازے کے قفل میں موت کا جال ہے؟ تم پہلے بھی یہ جانتے تھے مگر خاموش رہے۔ تم کو یقیناً بہت مایوسی ہوئی ہو گی۔ تمھاری ساری امیدیں اس ڈیتھ ٹریپ سے وابستہ ہوں گی۔" محسن بولا۔

ایس پی آگے بڑھا۔ اس نے ڈور لاک کو اُلٹا گھمایا اور چند سیکنڈ خاموش رہا۔ "دلاور... میں سراج ہوں... تم سُن رہے ہو نا؟"

"کیا بات ہے اپنے ایس پی صاحب۔" مخصوص لہجے میں دلاور کی آواز سنائی دی۔ کسی بہت چھوٹے سے اسپیکر میں سے نکلنے والی آواز اصل آواز سے بہت مختلف تھی مگر انداز اور لہجہ دلاور کا تھا۔ ہمیشہ کی طرح پُرسکون۔ جذبات سے عاری ٹھہرا ہوا... دبے دبے طنز اور تمسخر کا انداز لیے ہوئے۔

"میں باہر آنا چاہتا ہوں۔" سراج نے کہا۔

"اچھا؟ اندر بہت گرمی ہے کیا؟" دلاور بولا۔

"فضول باتیں مت کرو..."

"لو جی آپ ہم پہ ناراض ہو... ہم تو آپ کے بھلے کی کہتے ہیں۔ کیا کرو گے آخر باہر آ کے... باہر وہی کمینی دنیا ہے جس نے آج تک تمہارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ اب دوسری دنیا میں ملیں گے اپنے سراج صاحب کیونکہ یہاں سے تو ہم جا رہے ہیں۔" دلاور بولا۔

"کہاں جا رہے ہو مجھے چھوڑ کے؟" سراج نروس ہو گیا۔

"اب تمھاری اور ہماری منزل جدا ہے۔ پھر تم کو بتانے سے کیا فائدہ کہ ہم کس راستے پہ جا رہے ہیں۔" دلاور ہنسا۔

"میرے احسانات کا اور میری دوستی کا یہ بدلہ دے رہے ہو مجھے... تم ایسا نہیں کر سکتے دلاور..." سراج نے برہمی سے کہا۔

"کیوں نہیں کر سکتے بھئی؟" دلاور بولا "کیا تم ہمیں روک سکتے ہو؟ اور یہ دوستی اور احسان کی بات تم پہلے بھی کرتے تھے۔ میں نے کتنی بار سمجھایا تھا تم کو کہ ہم سب ایک کاروبار کر رہے ہیں... وہ کاروبار بھی شرافت کا نہیں تھا۔ نقد سودا تھا جس میں نہ کوئی دوستی کا سوال تھا، نہ کسی کے احسان کا۔ نہ نیکی کا، نہ مروت کا... تمہارے بعد یہی کام کوئی اور کرے گا۔ ضرورت مند دنیا کے بازار میں بہت ہیں جو تمھاری طرح برائے فروخت ہیں۔ اپنے ضمیر، شرافت، فرض اور انسانیت کے ساتھ... جیسے مکان برائے فروخت ہو تو تمام آسائشوں کے ساتھ زیادہ قیمت ملتی ہے ایسے ہی آدمی کی خدمات کا معاوضہ ادا کیا جاتا ہے تو یہ دیکھ کر کہ وہ کیا کر سکتا ہے اور کتنا اچھا کر سکتا ہے کون زیادہ سہولتیں اور آسانیاں فراہم کر سکتا ہے۔ تم بھی بُرے

نہیں تھے مگر اب ہمیں ایک ڈی آئی جی مل رہا ہے... اسی معاوضے پر... "

" دلاور... کچھ سمجھنے کی کوشش کرو۔" سراج نے اچانک خود کو سنبھال لیا۔ " وہ لوگ تہ خانے میں اُتر گئے ہیں۔"

" تہ خانے میں اُتر گئے ہیں! کیسے؟" دلاور کے لہجے میں تشویش آگئی۔ "ضرور تم نے اُنھیں راستہ بتایا ہوگا نمک حرام۔"

" گالی مت دو... میری جگہ تم ہوتے... تو تم بھی بتاتے۔" سراج نے کہا۔

" اتنی سی دیر میں بول گئے ایس پی بہادر۔" دلاور نے طنز بھرے لہجے میں کہا۔ "شاید انھوں نے صرف گولی مارنے کی دھمکی دی ہوگی اور تمہارا دم نکل گیا ہوگا۔ آخر وہ بھی تو تھا جس نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ جان دے سکتا ہے مگر حکم کے آگے سر نہیں جھکا سکتا۔ اور اُس نے ایسا ہی کر کے دکھایا۔"

" ٹھیک ہے... میں اتنا بہادر نہیں ہوں۔" سراج نے خفت سے کہا۔ "کیا تم اس کی جگہ ہوتے تو اتنی آسانی سے موت قبول کر لیتے؟ کہنا بہت آسان ہے چوہدری دلاور مگر نہایت مشکل کام ہے... یہ جو تم نے کروڑوں کمائے ہیں کس کے لیے ہیں؟ اتنا خطرہ اور اتنی بدنامی مول لے کر آدمی دولت جمع کرتا ہے، زندگی کا لطف اُٹھانے کے لیے... اس لیے نہیں کہ ایک گولی کھائے اور مر جائے... عیش کریں وہ جنھوں نے انگلی تک نہ ہلائی ہو... جن کو گھر بیٹھے قارون کا خزانہ مل جائے... نہیں دلاور... میں ابھی مرنا پسند نہیں کروں گا... جب دولت ہاتھ میں ہو تو دنیا زیادہ... بہت زیادہ خوب صورت لگتی ہے۔"

" اپنے ایس پی صاحب!" دلاور ہنسا۔ "کیا موت کو قبول کرنا یا نہ کرنا اپنے اختیار کی بات ہے؟ مثلاً تم اس وقت جینا تو چاہتے ہو لیکن کیا اپنی مرضی سے جی سکتے ہو؟ وہ راستے تو سب بند ہیں جو زندگی کی طرف جاتے ہیں۔"

" ایسا مت سوچو دلاور... جب کوئی راستہ نہ رہے تب بھی بنانے والے راستہ بنا لیتے ہیں۔" سراج نے خطرناک لہجے میں کہا۔ "میں ابھی زندہ ہوں... میرے جیتے جی یہ دغا بازی نہیں چلے گی۔ ایسی کی تیسی تمہارے اس ڈی آئی جی کی اور تمہاری... تمہارے سارے راستے تو میری نظر میں ہیں، کیا وہ ڈی آئی جی تمھیں میری نظر سے چھپا سکتا ہے؟ خود چھپ کے رہ سکتا ہے؟ یہ میں ہی تھا جس کے ساتھ تم نے ہر راستے پر خود کو محفوظ سمجھا اور دونوں ہاتھوں سے مال سمیٹا۔" سراج نے مشتعل ہو کے کہا۔

" کیا تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟" دلاور بولا۔

" ہاں ہاں... کھلی دھمکی دے رہا ہوں... مجھے یہاں چھوڑ کے جاؤ اور پھر دیکھو کہ میں کیا کرتا ہوں... تمھاری سات پشتوں کو عبرت حاصل ہوگی... تم نے کیا آسا[illegible] سمجھ لیا ہے... سراج سے پیچھا چھڑا[illegible] میں تو موت کا فرشتہ ہوں... جب [illegible] آخری سانس قبض نہیں کر لوں گا چھوڑوں گا نہیں... [illegible] مجھے..."

سراج نے اُسے ایک زبردست گالی دی۔

" ٹھیک ہے اپنے ایس پی صاحب... پھر ہم بھی دیکھتے ہیں کہ کون کس کی جان قبض کرتا ہے۔" دلاور نے کہا۔

ان کی یہ لڑائی ایک نیا تجربہ تھی۔ اگر سچ مچ ان کے درمیان کاروباری رقابت کی خلیج آگئی تھی اور دلاور اینڈ کمپنی نے سراج کو سرطان زدہ عضو کی طرح کاٹ کے الگ کر دینے کا فیصلہ کر لیا تھا تو اس صورتِ حالات سے ہم فائدہ اُٹھا سکتے تھے۔ معلوم نہیں دلاور نے یہ فیصلہ کیوں کیا تھا۔ ممکن ہے سراج سے کچھ غلطیاں سرزد ہوئی ہوں یا وہ ان کی توقعات پر پورا نہ اُترا ہو۔ دلاور جیسے لوگ اپنی مرضی سے راستوں کے پہرے دار خریدتے ہیں اور پھر بے خوف ہو کے سفر کرتے ہیں۔ وہ ہر محافظ کی جیب میں مال ڈالتے جاتے ہیں لیکن اسی طرح جیسے کوئی کتے کو ہڈی ڈالتا ہے۔ ہڈی ڈالنے والا کتے سے وفاداری کی توقع تو رکھتا ہی ہے، اسے اپنی اوقات بھی یاد دلاتا رہتا ہے۔ یہ بتاتا رہتا ہے کہ وہ ہڈی پر پلنے والا کتا ہے اور کتے کو کتا ہی رہنا چاہیے۔ ایس پی سراج شاید کتا بن کے رہنا پسند نہیں کرتا ہوگا۔ وہ ایک خود سر، بدمزاج اور مغرور آدمی تھا۔ وہ خود کو دلاور اینڈ کمپنی میں اوپر والوں کے برابر سمجھتا ہوگا۔ شاید اسی لیے انھوں نے سراج کو ہٹا کے دوسرے آدمی کو لانے کا بندوبست کر لیا تھا۔ انھیں سراج سے پیچھا چھڑانے کا بہترین موقع ہاتھ آیا تھا، وہ اس سے فائدہ کیوں نہ اُٹھاتے۔

لیکن یہ بھی ہو سکتا تھا کہ سراج پر سندر لال کی نگرانی کا علم دوسروں کو بھی ہو گیا ہو۔ سراج اب مشتبہ افراد میں شامل تھا اور اس کی نگرانی کی جا رہی تھی۔ ایسے پولیس افسر کا تعاون حاصل کرنے والے بھی خود کو سو فیصد محفوظ نہیں سمجھ سکتے تھے۔ جیسا کہ وہ اب تک سمجھتے آئے تھے۔ سراج کی پوزیشن وہ نہیں رہی تھی جو پہلے تھی۔ اس سے پہلے کہ سراج کی وجہ سے ان پر کوئی مصیبت نازل ہوتی انھوں نے سراج کا متبادل تلاش کر لیا۔ ایک ایسا آدمی ڈھونڈ لیا جو برائے فروخت تھا اور زیادہ کارآمد تھا۔ ان لوگوں کے ہاتھ بہت لمبے تھے اور انھیں پیسے کی طاقت بھی حاصل تھی۔ معلوم نہیں وہ کون ڈی آئی جی تھا جس نے ہوس زر میں ان لوگوں کا کٹ پتلا بننا منظور کر لیا تھا۔ دولت کی خاطر اپنے عہدے کی آبرو اور وطن کی عزت کا سودا کر لیا تھا۔ یہ افسوس کی بات ضرور تھی مگر اچنبھے کی نہیں۔ میر جعفر اور صادق ہماری تاریخ کے ہر دور میں رہے ہیں۔ ان کے نام بدلے گئے مگر ان سب کا کردار ایک ہی رہا۔ کچھ لوگ آج ہمارے سامنے بے نقاب ہو چکے تھے لیکن بہت سے چہرے ابھی ہمارے سامنے نہیں آئے تھے۔

سراج اب گالیاں بک رہا تھا کیونکہ دلاور نے سلسلۂ گفتگو منقطع کر دیا تھا۔ وہ مائکروفون یقیناً ڈور لاک میں تھا اور وہ اسپیکر بھی جس کے ذریعے دلاور اور سراج کی دو طرفہ گفتگو جاری تھی۔ ہم یہ تو سمجھ رہے تھے کہ دلاور اور سراج کے درمیان ٹھن گئی ہے مگر ابھی تک یہ اندازہ نہیں کر پائے تھے کہ دلاور کہاں سے بات کر رہا تھا۔ وہ اسی عمارت کے کسی حصے میں تھا یا کسی دوسری جگہ سے بول رہا تھا۔ اور وہ جگہ کتنی دُور تھی۔ بظاہر وہ سراج کو ہمارے ساتھ زیرِ زمین تہ خانوں میں مرنے کے لیے چھوڑ گئے تھے اور اگر ان تہ خانوں سے باہر جانے کا راستہ ہوتا تو دلاور یہ نہ پوچھتا کہ کیا اپنی مرضی سے جی سکتے ہو اور یہ چیلنج نہ دیتا کہ دیکھیں اب کون کس کی جان قبض کرتا ہے۔ ان کی گفتگو سے ہی ہم پر تہ خانوں کی موجودگی کا راز افشا ہوا تھا۔ ان تہ خانوں میں کیا تھا؟ یہ ابھی ہم نہیں جانتے تھے۔

" اب تم کیا کرو گے سراج؟" میں نے کہا۔ جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے۔"

" میں سب کی ہوا نکال دوں گا۔" سراج نے پلٹ کر کہا۔ "میری دشمنی ان کو بہت مہنگی پڑے گی... بہت مہنگی..."

" ہاں... بشرطیکہ تم دشمنی کرنے کے لیے ان کی دنیا میں پہنچ سکے۔" محسن نے ہنس کر کہا۔ "ابھی تو تم ہمارے ساتھ ہو۔"

" اور تمہاری پوزیشن دھوبی کے کتے سے بھی بدتر ہے۔" میں نے کہا۔ "نہ دوست تمہارے رہے نہ دشمن... تمہارے لیے اندر اور باہر ذِلّت ہے اور وہ بھی عزت کی موت نہیں۔"

" دیکھو... یہ ٹھیک ہے کہ تم میرے دشمن ہو... میں نے تم سے رعایت نہیں کی... تم کو جس حد تک ذلیل کر سکتا تھا کیا... تمہارے عذاب کو سخت سے سخت بنایا اور... مجھے اختیار ہوتا تو میں تم کو کتے کی موت مارتا۔" سراج نے کہا۔ "اگر تم کو موقع ملے تو تم بھی کمی نہیں کرو گے۔"

" یہ وعدہ تو ہم کر چکے ہیں۔"

" ہاں، مگر تمھاری اور میری مجبوری ایک ہی ہے۔" سراج بولا۔ "اور وہ ہے جینے کی مجبوری... دوستی اور دشمنی کے رشتے سب زندگی سے مشروط ہیں۔ زندہ رہو گے تو اپنا وعدہ پورا کرو گے۔ باہر نکل گئے تو کوئی تیر مارو گے۔ نہ نکلے تو یہیں مر جاؤ گے۔ میں تم کو باہر نکال کے لے جا سکتا ہوں۔"

" کس شرط پر؟" میں نے کہا۔

" شرط یہی ہے کہ باہر نکلنے کے بعد تم مجھے ایک موقع دو گے۔" سراج بولا۔ "میں تم کو جینے کا ایک موقع دوں گا۔ اس کے بدلے میں تم مجھے جینے کا ایک موقع دو گے۔ ہم اپنے اپنے راستوں پر چلے جائیں گے۔ ہم دوست نہیں ہوں گے... دشمن ہی رہیں گے مگر دشمنی اس کے بعد شروع ہوگی۔ ہمارے راستے وہی ہیں اور منزل وہی ہے۔ منزل تک پہنچنے کا مقصد الگ ہے۔ ہم انہی راستوں پر پھر ملیں گے۔ تب تک کے لیے تم کو میری اور مجھ کو تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ میں تم کو باہر پہنچا دوں گا۔ بس تم وعدہ کرو کہ تم میری پیٹھ میں گولی نہیں مارو گے... مجھے جانے دو گے... یہ وعدہ میں کسی دشمن سے نہیں، وزیر خان کے بیٹے سکندر بخت سے چاہتا ہوں۔"

" جب میں نے تمہاری ماں کا نام لے کر تمہاری منت کی تھی تو تم نے کیا جواب دیا تھا؟" میں نے کہا۔

" جو کچھ پہلے ہوا، میں اس سے انکار نہیں کر رہا ہوں... اور نہ تم سے رحم کی درخواست کر رہا ہوں اور نہ تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا رہا ہوں۔ وقت ضائع مت کرو... مرنا ہے تو آسان راستہ اختیار کرو... پہلے مجھے گولی مارو اور پھر خود کو مار لو... ایسے بھوکے پیاسے تڑپ تڑپ کر مرنے سے کیا فائدہ... یہاں کوئی نہیں آئے گا... کم سے کم ایک ہفتے تک... تم ان ویران کمروں میں چیختے پھرو... دیواروں سے سر ٹکراؤ یا دروازے سے۔ باہر نکلنا تمہارے لیے ناممکن ہے۔ اگر زندہ رہنا ہے تو مجھ سے اپنے باپ کے خون کی قسم کھا کے وعدہ کرو کہ میں نے تمھیں باہر نکال لیا تو تم یہ اسٹین گن مجھ پر نہیں چلاؤ گے اور مجھے قید کر کے بھی نہیں لے جاؤ گے... تم مجھے اتنی مہلت دو گے کہ میں تمہاری نظروں سے اوجھل ہو جاؤں... کم سے کم ایک گھنٹے تک تم میرے پیچھے نہیں آؤ گے۔ تم اگر مخالف سمت میں جانا چاہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" وہ اب زیادہ بے خوفی سے اور زیادہ اعتماد سے بات کر رہا تھا۔

" ٹھیک ہے ایس پی صاحب!" میں نے کہا۔ "مجھے یہ شرط منظور ہے۔ میں اپنے والد مرحوم وزیر خان کے خونِ ناحق کی قسم کھا کے کہتا ہوں کہ اس تہ خانے سے نکلنے پر تم کو زندہ رہنے کا ایک موقع دوں گا۔ ایک مجبوری کے تحت میں تم سے اشتراک کر رہا ہوں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہوگا کہ ہم دشمن نہیں رہے... میرے باپ کو قتل کرنے والوں میں تم بھی ہو... یہ میری اور تمہاری ذاتی دشمنی ہے۔ میں اپنا انتقام خدا پر بھی چھوڑ سکتا ہوں لیکن تم کو وطن دشمنی کے جرم پر معاف نہیں کر سکتا۔"

" اچھا...؟" وہ عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھتا رہا۔ "تم ذاتی عداوت کے جذبات کو بھول سکتے ہو؟ کیسے...؟"

"میں اس کے جواب میں تم کو ایک مشہور واقعہ سناؤں گا۔" میں نے کہا۔ "جو شاید تم نے سُنا ہو۔ ایک یہودی کو حضرت علیؓ نے میدانِ جنگ میں زیر کر لیا جب آپ خنجر سے اس کے سر کو تن سے جدا کرنے والے تھے تو اس نے آپؓ کے مُنہ پر تھوک دیا۔ آپؓ نے خنجر کے وار کو روک لیا اور اُسے بخش دیا۔ یہ فرماتے ہوئے کہ پہلے میرے اور تیرے درمیان راہِ خدا میں جنگ تھی۔ اب میں نے تجھے قتل کیا تو سمجھا جائے گا کہ میں نے ذاتی توہین کا بدلہ لیا... تو ایس پی سراج صاحب... خدا اور اس کے رسولؐ نے عفو و درگزر کو سب سے بہتر انتقام قرار دیا ہے۔ وہ وقت گزر گیا جب میں جذبات کی رو میں بہہ کر ان سب کا خون پی جانا چاہتا تھا جو میرے باپ کے قاتل تھے، اس کے قتل میں شریک تھے یا اس کے ذمے دار تھے۔ اب یہ جنگ وہی ہے جو حق و باطل کی جنگ سمجھی جا سکتی ہے۔ تم میرے وطن... میرے عقیدے۔ میرے کروڑوں ہم وطن مسلمانوں کی نظریاتی اساس کے دشمن ہو تو میں تمہارا دشمن ہوں اور تم میرے نزدیک واجب القتل ہو۔"

"اور اگر... اگر میں تائب ہونا چاہوں... ؟" وہ خلا میں گھورتے ہوئے بولا۔

"تم... تم تائب ہو کے کیا کرو گے اب ؟" میں نے چونک کر کہا۔

"کیوں... کیا توبہ کے دروازے بند بھی ہوتے ہیں؟" وہ بولا۔

"نہیں... مجھے... مجھے نہیں معلوم... کہ تمہاری نیّت کیا ہے... اور جو کچھ تم کہہ رہے ہو... یا کرنا چاہتے ہو اس کے پس منظر میں کیا ہے۔ یاد رکھو مرتے وقت کی توبہ قبول نہیں ہوتی۔ اگر تم خوف اور مجبوری میں توبہ کرنے کی سوچ رہے ہو تو بے کار ہے... لیکن فیصلہ کرنے والا میں نہیں، وقت ہے۔ یہاں اس موضوع پر بات کرنے کا کیا فائدہ... ہم تمہاری کسی بات پر اعتبار کرنے والے نہیں۔ آئندہ جو کچھ ہوگا، وہ دُور کی بات ہے۔ ابھی تو ہمارے درمیان ایک وقتی معاہدہ ہوا ہے۔ تم ہمیں باہر لے چلو... ہم تم کو جانے دیں گے۔ آئندہ کبھی سامنے آئیں گے تو دوست ہوں گے یا دشمن، اس کی بات کرنا ابھی بے کار ہے۔" میں نے کہا۔

اس نے سر ہلایا اور واپس چل پڑا۔ میں نے محسن کی طرف دیکھا۔ اس کے لبوں پر بھی ایک پُر امید مسکراہٹ تھی۔ کیا ایسا ہوگا کہ سراج تائب ہو جائے گا بجا آدمی ٹھوکر کھا کے ہی سنبھلتا ہے۔ اور صبح کا بھولا شام کو گھر آ جائے تو اُسے بھولا بھی نہیں کہتے۔ دیر سے ہی سہی اگر اب بھی اسے احساس ہو جائے کہ جس راستے پر وہ چل رہا تھا، وہ غلط تھا تو بلاشبہ وہ آئندہ زندگی کے لیے صراطِ مستقیم کا انتخاب کر سکتا ہے۔ وہ سابقہ غلطیوں کی تلافی کر سکتا ہے۔ معافی مانگ سکتا ہے۔ باقی عمر نیکیاں کما کے وہ گناہ اور ثواب کے حساب کو برابر کرنے کی کوشش کر سکتا ہے۔ اب تک وہ فرض سے بے گانہ تھا وہ اپنے فرض کو پہچان لے تو ہمارے لیے بہت کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔ چور اگر پرہیزگار ہو جائے اور کوتوال بن جائے تو سب چور پکڑے جا سکتے ہیں کیونکہ وہ سب کو پہچانتا ہے اور سب کے ٹھکانے جانتا ہے۔ ایک ایس پی اگر راتوں رات انتقامی ردِ عمل کا شکار ہو جائے تو ہمیں وہ سب معلومات فراہم کر سکتا ہے جو ہمارے لیے مشعلِ راہ ہوں، وہ اندر کے سب لوگوں کو پہچانتا تھا۔ سب خفیہ راستوں سے واقف تھا۔ اس سے دغا کی امید نہ تھی جن کا وہ سب سے بڑا معاون تھا۔ اب وہ ان کی دشمنی مول لینے کی پوزیشن میں تھا۔ اس نے بہت دولت کما لی تھی مگر اتنی دولت کمانے کے بعد اس پر واضح ہوا تھا کہ وہ دھوبی کا کتّا ہے۔ نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔ اسے مزید دولت کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ ایماندار اور فرض شناس بن کے اپنی ذات پر آنے والے شک کے سائے سے بھی بچ سکتا تھا۔ افسرانِ بالا کی نظر میں نیک نام ہو سکتا تھا۔ یہ ثابت کر سکتا تھا کہ اس کے خلاف الزامات بے بنیاد تھے۔ وہ اپنے ضمیر کی تسکین کا سامان بھی حاصل کر سکتا تھا۔ میرے خیال میں سراج کے لیے یہ گھاٹے کا سودا نہیں تھا اور اگر وہ سچ مچ ہمارا ساتھ دینے پر تیار ہو جاتا تو میں اس کے سارے قصور معاف کر سکتا تھا۔ وہ سب زیادتیاں بھول سکتا تھا جو اس نے میرے ساتھ کی تھیں۔ اس کے پیچھے چلتے ہوئے جو کچھ میں سوچ رہا تھا، شاید وہی محسن بھی سوچ رہا تھا۔ یہ صورتِ حالات بھی ایک بہت بڑے انقلاب کی علامت تھی۔ دلاور اینڈ کمپنی نے سراج کو مرنے کے لیے چھوڑ دیا تھا اور اس کے مرنے سے پہلے کسی اور کو سراج کی جگہ دے دی تھی تو یہ بہت بڑی غلطی تھی۔ مگر دشمن اگر ایسی غلطیاں نہ کرے تو ثابت کیسے ہو کہ اس کا مالک دمولا، راہبر اور رہنما، مشیر و معاون شیطان تھا۔

سراج آخری کمرے کے دروازے سے گزر گیا۔ اس کمرے میں مجھے رکھا گیا تھا۔ آگے راہداری بند تھی اور مجھے اپنے سامنے ایک سپاٹ دیوار نظر آ رہی تھی۔

"کیا تم اس دیوار کو توڑ سکتے ہو؟" سراج نے کہا۔ "یہ کوئی بہت مضبوط دیوار نہیں ہے۔ ایک اینٹ کی کھڑی چنائی ہے۔"

"اس دیوار کے پیچھے کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"اس کے پیچھے ایک کچی پہاڑی ہے۔ ریت کنکر پتھر کی دیوار ہے۔" وہ بولا۔ "اس سے یہ دیوار ملی ہوئی ہے مگر بیچ میں تھوڑا بہت خلا ضرور ہوگا۔ یہ عمارت کا آخری حصہ ہے۔ باقی عمارت آرسی سی چھت کے نیچے ہے اور اس کے اوپر مٹی ہے اور جھاڑیاں ہیں۔ باہر سے یہ عمارت نظر نہیں آتی لیکن میں نے نقشہ دیکھا تھا تو اس دیوار سے ملی ہوئی پہاڑی تھی۔ اگر تم دیوار کے اوپر والے حصے کی اینٹیں نکالو تو اینٹوں کے ساتھ ہی ریت اور کنکر اندر گریں گے۔ ایک شگاف ہو جائے تو مزید اینٹیں نکالنا مشکل نہیں ہوگا۔ تین بائی تین کا راستہ بنانے کے بعد اوپر کی جانب سے زمین کھودنا پڑے گی۔ بھربھری مٹی ہے۔ خود ہی شگاف سے اندر گرتی جائے گی۔ میرا خیال ہے تین چار فٹ کھدائی کے بعد ہم باہر ہوں گے۔"

"اور اگر اوپر بیس پچیس یا تیس چالیس فٹ تک پہاڑی ہوئی۔ بھربھری کنکر پتھر والی مٹی نہ ہوئی۔ کوئی چٹان آ گئی تو؟" میں نے کہا۔

"بلندی کے بارے میں تو مجھے معلوم ہے کہ اس کنارے پر پہاڑی کی اونچائی زیادہ نہیں ہے کیونکہ یہ پہاڑی کا کنارا ہے۔ درمیان میں سے اس کی اونچائی چالیس پچاس فٹ ہوگی مگر یہاں نہیں... تاہم میرا اندازہ ہے کہ پانچ فٹ سے زیادہ مٹی نہیں ہوگی۔ یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ بیچ میں چٹان ہوگی یا نہیں کیونکہ میں نے پہاڑی کو صرف اوپر سے دیکھا تھا۔" سراج نے کہا۔

"کیوں دیکھا تھا؟" محسن نے کہا۔ "تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ تمہیں ایک دن اسی طرح قید ہو جانے کا ڈر تھا۔"

"میں نے اور دلاور نے اس زیرِ زمین عمارت کا ہر طرف سے جائزہ لیا تھا۔ یہ دیکھا تھا کہ کوئی اندر پہنچ سکتا ہے تو کس طرف سے۔ اور اندر سے باہر نکلنا چاہے تو کیسے نکلے گا۔ اس وقت دلاور نے تھوڑی سی تشویش کا اظہار کیا تھا کہ ادھر سے دیوار کا اوپر والا کنارا پہاڑی کے نیچے آ گیا ہے اور پہاڑی کچی ہے۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ ادھر تھوڑا سا سیمنٹ اور کنکریٹ بچھا دینا چاہیے۔ مگر بعد میں اس موضوع پر بات نہیں ہوئی اور دلاور بھی بھول گیا۔" سراج نے کہا۔

"ٹھیک ہے... ہم کوشش ضرور کریں گے۔" میں نے کہا۔ "مگر ہمارے پاس کھودنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔"

"اس عمارت میں سب کچھ ہوگا سکندر۔" محسن بولا۔ "وہ یہاں رہتے تھے۔ ہم سب نے وہ جگہ بھی دیکھی ہے۔"

"وہ... اس کا راستہ ادھر سے نہیں ہے۔" سراج نے بیچ میں بات شروع کر دی۔ "باہر والا دروازہ کھل سکتا تو ہم آگے جا کے اوپر پہنچ سکتے تھے۔ وہاں سب مل سکتا تھا مگر دروازے کو کھولا نہیں جا سکتا اور یہ سب کمرے خالی ہیں۔"

"چلو ہم اسٹین گن کا استعمال کریں گے۔" میں نے کہا۔ "کام کی بنیاد تم کرو گے۔ تم میرے کندھوں پر چڑھ کے اوپر والے حصے کی اینٹیں نکالو گے۔ تمہارے پاس خالی اسٹین گن ہوگی۔ بھری ہوئی اسٹین گن لے کر محسن کھڑا رہے گا۔ پھر میری جگہ تم لو گے اور محسن تمہارے کندھوں پر چڑھ کے باقی کام کرے گا۔ بھری ہوئی اسٹین گن میرے ہاتھ میں رہے گی۔"

"اپنے اطمینان کے لیے تم کچھ بھی کرو... مجھے اعتراض نہیں لیکن دیر مت کرو۔" سراج بولا۔ "ایسا نہ ہو، وہ لوگ نکل جائیں۔"

"کہاں؟ وہ نکل کے کہاں جائیں گے؟" میں نے کہا۔

"ایسے کیا بتاؤں۔ ان کے کئی ٹھکانے ہیں۔" وہ بولا۔

"تم نے تہ خانوں کا ذکر بھی کیا تھا۔" محسن بولا۔

"تہ خانوں کے چکّر میں پڑو گے تو وہ تمہارے ساتھیوں سمیت غائب ہو جائیں گے اور پھر تم کو نہ جانے کب تک بھٹکنا پڑے گا۔" وہ بولا۔

"تم یہ تو بتا سکتے ہو کہ ان تہ خانوں میں کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"ہاں... اسلحہ ہے۔" وہ بولا۔ "فیصلہ کر لو کہ تہ خانے دیکھو گے یا باہر نکل کے دلاور کا راستہ روکو گے۔"

"کیا ہم ان کا راستہ روک سکتے ہیں؟" محسن بولا۔ "میرا خیال ہے کہ براہِ راست مقابلہ مشکل ہوگا۔ اور شاید سودمند بھی نہ ہو۔ ہم ان کے تعاقب میں بھی جا سکتے ہیں... تمہیں تو اُن کے سارے ٹھکانے معلوم ہیں۔"

"لیکن... میں تم کو ہر ٹھکانے تک کیسے لے جا سکتا ہوں۔ باہر نکلنے کے بعد میرے اور تمہارے راستے الگ ہوں گے۔" سراج نے کہا۔

"میرا اور تمہارا راستہ ایک ہی ہوگا ایس پی صاحب... تم خود مجھے اپنے ساتھ لے کر جاؤ گے... تم جانتے ہو، وہ کہاں جائیں گے۔" محسن نے کہا۔

"تم... تم نے ابھی وعدہ کیا تھا۔" سراج نے خوف اور مایوسی کے ساتھ کہا۔ "کیا تمہاری کوئی بھی قسم اعتبار کے قابل نہیں۔"

"قسم میں نے نہیں کھائی تھی سراج... سکندر اپنے وعدے پر قائم رہے گا۔" محسن بولا۔ "وہ تمہارے پیچھے نہیں جائے گا لیکن میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔ میں نے تم سے کوئی وعدہ نہیں کیا اور کوئی قسم نہیں کھائی۔"

سراج کو احساس ہوا کہ وہ خود اپنے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس گیا ہے۔ سراج سے غیر ارادی طور پر ایک چُوک ہو گئی تھی۔ اس نے میرے وعدے کو ایک اجتماعی وعدہ سمجھ لیا تھا اور یہ فرض کر لیا تھا کہ میں نے قسم کھائی ہے تو اس کا پابند محسن بھی ہوگا۔ اس نے ضروری نہیں سمجھا تھا کہ محسن سے بھی حلف اٹھوائے۔ باہر نکلنے کا راستہ معلوم ہو چکا تھا اور وہ ہمیں روک نہیں سکتا تھا لیکن باہر جانے کے بعد قسم کا پابند صرف میں تھا۔ میں نے اپنے باپ کے خونِ ناحق کی قسم کھائی تھی

اور یہ ہرگز نہیں کہا تھا کہ محسن یا میرا کوئی ساتھی بھی سراج کے تعاقب میں نہیں جائے گا۔

"محسن ٹھیک کہہ رہا ہے سراج! یاد کرو تمھارے الفاظ کیا تھے۔" میں نے کہا۔ "تم نے کہا تھا کہ میں وزیر خان کے بیٹے سکندر بخت سے وعدہ چاہتا ہوں اور وعدہ صرف میں نے کیا تھا۔ میں نے ایک بار بھی ہم کا لفظ استعمال نہیں کیا تھا۔ میری قسم کا پابند محسن نہیں ہے۔"

"تم دھوکے سے ابتدا کر رہے ہو۔" سراج بگڑ گیا۔

"اوّل تو یہ دھوکا ہے نہیں۔ یہ تمھاری غلط فہمی تھی۔" میں نے کہا۔ "اس کے بعد یہ مان لیا جائے کہ تم سے دھوکا ہوا تو اس میں بھی کوئی بُری بات نہیں کیونکہ جنگ میں سب جائز ہے۔ تم خود ہمیں دھوکا دیتے آئے ہو۔ تم حکومت کو دھوکا دے رہے ہو۔ اس ملک کے رہنے والوں کو دھوکا دے رہے ہو اور ان کے اعتماد کو دھوکا دے رہے ہو۔ جو سب کو دھوکے دے رہا ہو اس کے ساتھ دھوکا کیوں نہ کیا جائے۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا..."

"میں... میں نے سوچا تھا کہ تمھاری مدد کروں گا... تمھارا ساتھ دوں گا۔"

"مجھے اس پر اعتبار نہیں تھا۔ تمھارا ایسا کہنا بھی دھوکا ہو سکتا تھا۔" محسن نے کہا۔ "اور اسی لیے میں طے کر چکا تھا کہ اگر تم نے مجھ سے قسم کھانے کو کہا تو میں انکار کر دوں گا۔ یہ بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ تم ہمارا ساتھ دینے کی کیوں سوچ رہے تھے؟ اس لیے کہ اب تک تم جن کا ساتھ دیتے آئے تھے انھوں نے تمھارا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ اب تم ان کے پاس جاؤ گے تو وہ تم کو دھتکار دیں گے۔ ان سے دشمنی کرو گے تو کس برتے پر... تم ان کی طاقت کو جانتے ہو... وہ تمھیں عہدے سے ہٹوا سکتے ہیں۔ گرفتار کروا سکتے ہیں، یہاں تک کہ مروا سکتے ہیں۔ تم ہمارا ساتھ دینے پر اس لیے تیار ہوئے تھے کہ اب تم نے انھیں اپنا دشمن مان لیا ہے اور ان کے خلاف تم کو ہماری مدد کی ضرورت تھی۔ تم ذاتی انتقام کے لیے ہمیں استعمال کرنا چاہتے تھے۔ ہم تو پہلے ہی ان کو نیست و نابود کرنے پر کمربستہ ہیں۔ یہی تمھاری خواہش بھی ہے۔ چنانچہ تم ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتے تھے۔ ایک طرف نیکی کما کے افسرانِ بالا کا یہ شبہ دُور کر دو کہ تم ملک دشمن عناصر سے ملے ہوئے تھے اور دوسری طرف دغا دینے والوں کو عبرت ناک سبق دو... یہ ثابت ہو جائے کہ تم تو بہت ہی ایماندار اور فرض شناس افسر ہو اور تمھاری نشاندہی پر یہ ملک دشمن افراد کی طاقت کا شیرازہ بکھر گیا۔ جو مالِ حرام تم نے اب تک کما لیا ہے وہ کوئی نہ دیکھے اور تم نیک نامی بھی کما لو۔"

میں حیرت سے محسن کو دیکھتا رہا۔ اس نے سراج کی نیت کا بالکل صحیح تجزیہ کیا تھا اور اس نے وہی سمجھا تھا جو میں نے سمجھا تھا۔ اس نے سراج کو آئینہ دکھا دیا تھا اور سراج میں ہمت نہ تھی کہ نظر اُٹھا سکے۔ اس نے پھر مزید بحث نہیں کی اور خاموشی سے ہمارے ساتھ تعاون کرنے لگا۔ اس کے بیان کے مطابق ہمیں دیوار کے اوپر والے حصے کی اینٹیں نکال کر راستہ بنانے میں کچھ زیادہ دشواری نہ ہوئی۔ باہر اندر کی طرف گرنے والی بھر بھری مٹی ایک ڈھیر کی شکل میں کمرے میں جمع ہو گئی تھی۔

"ہم پہلے تہ خانے دیکھیں گے... بلکہ... یوں سمجھو کہ میں تہ خانہ دیکھوں گا۔" محسن کچھ دیر بعد بولا۔ "سکندر باہر جائے گا اور باہر ہی ہمارا انتظار کرے گا۔"

"نہیں، میں بھی تہ خانے میں ساتھ جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "اپنی قسم کے مطابق میں نے باہر نکلنے کے بعد سراج کے پیچھے نہ جانے کا عہد کیا تھا۔ یہ وعدہ اندر کے لیے نہیں تھا۔ پہلے ہم تہ خانے دیکھ آئیں۔ پھر باہر جانے کے بارے میں سوچیں گے۔"

سراج کو اگر اپنی زندگی سے اتنا پیار نہ ہوتا تو وہ اتنا بزدل نہ ہوتا اور اتنی آسانی سے ہماری بات نہ مانتا۔ تیر اس کی کمان سے نکل چکا تھا مگر زندہ رہنے کی مجبوری اب بھی اس کے ساتھ تھی۔ وہ واپس چل پڑا۔

"میں کچھ بھول گیا۔" سراج نے اچانک ایک ہاتھ ماتھے پر رکھ لیا۔

"کیا بھول گئے؟" میں نے کہا۔

"وہی... تہ خانے کا راستہ..." سراج نے کہا۔ "دراصل میں ایک ہی بار نیچے گیا تھا... اور اس وقت دلاور آگے تھا۔ میں نے دھیان نہیں دیا تھا۔"

"کیا دلاور نے دھیان دینے سے منع کر دیا تھا؟" میں نے طنز سے کہا۔ "تم ہو صحیح نمک خوار، مطیع و فرماں بردار، حکم کے غلام۔ تم نے کہا کہ اچھا جی مائی باپ! اگر آپ نہیں چاہتے تو ہم دھیان نہیں دیتے۔"

"میں... میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔" سراج نے باری باری مجھے اور محسن کو دیکھا... وہ اپنی بات کا ردِ عمل دیکھنا چاہتا تھا۔

"خوب، آپ کسی اور کے بارے میں سوچ رہے تھے۔" محسن نے کہا۔ "غالباً اپنی محبوبہ یا منگیتر کے بارے میں کہ آپ کی وفات حسرت آیات کے بعد وہ کس کے پاس جائے گی۔ بہتر ہو گا اگر آپ پھر ہی سوچیں۔"

"تم لوگ سمجھتے کیوں نہیں۔" سراج نے کہا۔ "تہ خانے میں بہت دیر لگ جائے گی۔ اس کا راستہ تلاش کرنا پڑے گا اور پھر نیچے جانے آنے میں مزید وقت لگے گا۔ ایسا نہ ہو کہ اتنی دیر میں کوئی اوپر آ کے وہ راستہ دیکھ لے... جو ہم نے بنا لیا ہے۔"

صاف ظاہر تھا کہ سراج ہمیں تہ خانے میں لے جانے سے گریز کر رہا ہے۔ اس نے پہلے راستہ بھول جانے کا بہانہ کیا۔ پھر تاخیر کے نتائج سے ڈرایا۔ سراج کو اس تھپڑ کی بالکل توقع نہ تھی جو میں نے ایک دم اس کے مُنہ پہ اُلٹے ہاتھ سے رسید کیا۔

"یہ چکمہ مت دو ہمیں سراج۔" میں نے کہا۔ "انتخاب اس وقت تمھارے ہاتھ میں نہیں ہے۔ تہ خانے کا راستہ ہم تم سے ہی پوچھ لیں گے اور مرتے دم تک تم انکار پر قائم رہے تو خود دریافت کر لیں گے۔"

"ہمیں اب کوئی جلدی نہیں ہے۔" محسن نے تائید میں سر ہلایا۔

سراج کا ایک ہونٹ کٹ گیا تھا۔ اس نے آستین سے لب صاف کیے۔ "تم یہ بھی نہیں سوچتے کہ اتنی دیر میں وہ بہت دُور نکل جائیں گے... رابعہ کے ساتھ..."

"یہ ہم بعد میں پوچھیں گے کہ وہ رابعہ کو کہاں لے گئے ہیں اور تم ہی ہماری رہنمائی اس ٹھکانے تک بھی کرو گے۔ فی الحال خیریت چاہتے ہو تو تہ خانے کی طرف چلو۔" میں نے کہا۔ "رابعہ کا اللہ مالک ہے؟"

"میں... میں ایسا نہیں کر سکتا..." سراج نے رحم طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "تم اس ذخیرے کو تباہ کر دو گے... اور وہ اس کا ذمے دار مجھے سمجھیں گے... اور اس کی سزا بہت سخت دیں گے۔"

"کیا تم پاگل ہو۔" میں نے کہا۔ "وہ تم کو ہمارے ساتھ مرنے کے لیے چھوڑ گئے...... وہ تم کو مردہ سمجھ کے بھول چکے ہیں۔ تم اب ان کے ساتھ نہیں ہو... تمھاری جگہ کسی اور کو دے دی گئی ہے۔ اس سے بڑی سزا اور کیا ہو گی؟"

"کیا تم نہیں جانتے کہ سزائے موت بہت کم سزا ہوتی ہے۔ یہ سزا صرف ایک آدمی کو ملتی ہے اور موت کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہے۔ جب اُسے سخت ترین سزا دینی ہو تو مرنے نہیں دیا جاتا۔ مجھے بتاؤ، کیا ایسا وقت نہیں آیا تھا جب تم نے موت کی آرزو کی تھی۔ اس لیے کہ موت اس عذاب کے مقابلے میں بہت کم تھی جو تم جھیل رہے تھے؟ موت تمھاری نجات کا ذریعہ بن سکتی تھی۔"

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ دلاور اینڈ کمپنی نے اگر سراج کو الگ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا تو یہ واقعی ان کی مہربانی تھی کہ وہ سراج کے لیے سزائے موت کا انتظام کر کے چلے گئے تھے۔ سراج کا وجود ان کے لیے بے مصرف ہو گیا تھا۔ ابھی تک اس کی وجہ سے نقصان نہیں ہوا تھا مگر اس نقصان سے بچنے کے لیے انھوں نے پہلے ہی بندوبست کر لیا تھا۔ اگر اس کی بے وقوفی یا غداری کا ثبوت مل جاتا یا بھی پتا چل جاتا کہ سراج نے جانتے بوجھتے ان کو نقصان پہنچانے والوں کا ساتھ دیا تھا تو یقیناً اس کی سزا زیادہ سخت ہوتی۔ اس کی موت زیادہ سخت ہوتی۔ مرتا تو آدمی ایک ہی بار ہے مگر اس کے لیے ذہنی اور جسمانی اذیت کو طول دیا جا سکتا ہے۔ اسے تھوڑا تھوڑا کر کے قتل کیا جا سکتا ہے۔ ایک ہفتے یا ایک مہینے یا ایک سال تک موت کے کرب میں معلق رکھا جا سکتا ہے۔ اور اس عرصے میں وہ دیکھ سکتا ہے کہ اس کی غلطی کی سزا وہ بھی پا رہے ہیں جن سے وہ محبت کرتا تھا۔ جن کے لیے وہ نوکِ خار کی چُبھن بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

"میں سمجھ گیا سراج..." میں نے کہا۔ "لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ جب آدمی چوروں کا ساتھ دیتا ہے تو اُسے ذہن میں رکھنا چاہیے کہ وہ پکڑا گیا تو خواہ اُسے پہلی واردات کے مالِ غنیمت میں سے پھوٹی کوڑی نہ ملے، اسے ان سب کے برابر سزا ملے گی جو پہلے سے وارداتیں کر رہے تھے مگر ان کی خوش قسمتی تھی کہ پکڑے نہیں گئے تھے۔ پہلی بار ساتھ دینے والا بدقسمت بھی ہو سکتا ہے کہ ان کے ساتھ تمام سابقہ جرائم کی سزا پائے اور ہاتھ کچھ نہ آئے... قتل کرنے والا اگر خنجر اُٹھانے سے پہلے یا گولی چلانے سے پہلے اس شخص کے بارے میں سوچ لے جو موت کے اندھے کنوئیں میں پھانسی کے پھندے سے لٹکا ہوا اکیلا تڑپ رہا ہوا اور فرشتۂ اجل کے سوا اس کی مدد کوئی نہ کر سکتا ہو... تو شاید وہ ہاتھ روک لے... مگر ایسا نہیں ہوتا اور اسی لیے آئے دن ورثا، بیوی بچے اور بوڑھے ماں باپ... آخری ملاقات کے لیے لائے جاتے ہیں اور پھر صبح دم طلوعِ آفتاب سے قبل اس کی لاش لینے جیل کے دروازے پر جمع ہوتے ہیں... تم نے وہ سب کچھ دیکھا جو میرے اور محسن کے ساتھ ہوا۔ مگر اس وقت تم کو ایک لمحے کے لیے بھی یہ خیال نہیں آیا کہ یہی سب کچھ تمھارے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ اگر تمھیں یہ ڈر ہوتا تو کیا تم وہ سب کرتے جو تم نے کیا تھا۔"

"اب تم بھی ان کے لیے دشمن ہو... تمھاری پوزیشن ابھی تک وہ نہیں جو ہماری ہے... لیکن ہو جائے گی... تم اس سے بچ نہیں سکتے۔" محسن نے کہا۔ "ہم نے تو اپنا عذاب کاٹ لیا۔ یہ ہمارے لیے غیر متوقع تھا اس لیے ہم ڈرے نہیں تھے۔ یہی عذاب تم کو درپیش ہے اور تم اس لیے خوفزدہ ہو کہ تم نے ہمیں عذاب میں دیکھا ہے۔"

"یوں سمجھو کہ تم نے ایک شخص کو پھانسی پاتے دیکھا تھا اور اس وقت تم جیلر تھے یا جلاد تھے۔" میں نے کہا۔ "اب اس نادیدہ ہستی کی قوت نے جو انسانوں کی تقدیر کے فیصلے لکھتی ہے، خود تم کو تختۂ دار پر لا کھڑا کیا ہے۔ مگر کیا تم نوشتۂ تقدیر کو بدل سکتے ہو؟" میں نے کہا۔

"تم لوگ... تم لوگ مجھے بچا سکتے ہو۔" وہ یکلخت ہاتھ جوڑ کے کھڑا ہو گیا۔ "مجھے تہ خانے تک جانے پر مجبور نہ کرو۔ مجھے معاف کر دو۔ جو کچھ میں نے تمہارے ساتھ کیا، میں اپنی غلطی مانتا ہوں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "صرف ہاتھ جوڑنے سے کسی غلطی کی تلافی نہیں ہوتی... تم تو قانون کو سمجھتے ہو... اس پر عمل کراتے ہو۔ اگر تم کسی چور کو یا ڈاکو اور قاتل کو ارتکابِ جرم کے وقت گرفتار کر لو تو کیا اس کو ہاتھ جوڑنے پر معاف کر دو گے؟ جسے تم اپنی غلطی کہہ رہے ہو وہ غلطی نہیں تھی، سنگین ترین جرم تھا۔ غداری سے بڑا جرم ملک کے قانون کے تحت اور کیا ہو گا ایس پی صاحب؟"

"تاہم تمہاری مدد کی جا سکتی ہے۔" محسن بولا۔ "قانون میں ایک رشق وعدہ معاف گواہ کے لیے خصوصی رعایت کی ہوتی ہے۔ وہ باقی مجرموں کے خلاف ٹھوس شہادت دے اور انھیں کیفرِ کردار تک پہنچانے میں قانون کا معاون ہو تو اس کی سزا بہت کم یا بالکل ختم بھی ہو جاتی ہے۔ تم تو جانتے ہو کہ ملک کا قانون ان پر ہاتھ نہیں ڈال سکا۔ کیونکہ اس قانون کے ہاتھ مضبوط کرنے والے تھی تھے مگر تم نے قانون کے ہاتھ کاٹ دیے تھے۔ اب قانون ہم ہیں۔ قانون وہ ہے جو ہم چاہتے ہیں۔ ہم خود مدعی ہیں، خود منصف اور خود سزا پر عمل درآمد کرنے والے۔ اب یہ پی پی سی یا ضابطۂ فوجداری پاکستان کی کسی دفعہ کے تحت چلایا جانے والا مقدمہ نہیں ہو گا۔ یہ ایم آر ایس کے وضع کردہ قانونِ انصاف کے مطابق چلے گا اور تم یہ کر سکتے ہو کہ وعدہ معاف گواہ کی طرح اصل مجرموں کے خلاف ایم آر ایس کی عدالت میں بیان دو، گواہی دو اور ثبوت پیش کرو۔"

میں نے تعریفی نظروں سے محسن کی طرف دیکھا۔ اس نے بہت واضح الفاظ میں سراج کے سامنے ایک متبادل راستہ رکھ دیا تھا۔ سراج خلا میں گھور رہا تھا۔ اس کا ذہن کسی فیصلے پر پہنچنے سے قاصر تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ محفوظ وہ کسی طرح بھی نہیں۔ اگر اس نے ہماری بات نہ مانی تو ہم اسے بخشنے والے نہیں۔ اگر اس نے ہمارا ساتھ دیا تو دلاور اینڈ کمپنی اسے بخشنے والی نہیں۔ آگے کنواں، پیچھے کھائی۔ وہ نہ آگے جا سکتا تھا نہ پیچھے۔

"تم جانتے ہو، ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"اگر تم نے فوراً فیصلہ نہ کیا تو پھر ہم کوئی فیصلہ کریں گے۔" محسن بولا۔

سراج نے آہستہ سے سر ہلایا اور آگے بڑھا۔ بظاہر وہاں ایسی کوئی علامت نہیں تھی جس سے ہم کچھ اندازہ کر سکتے۔ محسن نے بتایا تھا کہ رابعہ کے کمرے میں جو روشندان ہے اس کے ساتھ ہی مسٹر ایکس کا کمرہ ہے یا کوئی آفس ہے جہاں ہونے والی گفتگو رابعہ کو سنائی دیتی تھی۔ اب سراج اسی کمرے میں کھڑا ہوا تھا اور روشندان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اچانک اس نے دیوار کو کھرچنا شروع کیا۔ دیوار کا رنگ اکھڑنے لگا۔ سراج نے عین روشندان کے نیچے سے رنگ اتارنا شروع کیا اور رنگ کے بڑے بڑے نیلے اور چتے ٹکڑے نیچے گرنے لگے۔ اس رنگ کے نیچے بھی مختلف رنگ نہیں تھا مگر رنگ کی اوپر والی تہ پھیکی پڑ گئی تھی چنانچہ نیچے سے نمایاں ہونے والا رنگ نیا اور گہرا محسوس ہوتا تھا۔

سراج نے تین فٹ کی چوڑائی اور چھ فٹ کی لمبائی کا رنگ اتار دیا۔ اب یہ مستطیل ٹکڑا باقی دیواروں سے الگ نظر آنے لگا۔ اگر ہم خوردبین یا محدب عدسہ لے کر اس عمارت کی ایک ایک دیوار کو دیکھتے پھرتے، تب بھی ہمیں اس جگہ کا پتا نہ چلتا۔ اس کمرے میں رہ کر بھی ہم کبھی اندازہ نہیں کر سکتے تھے کہ ایک دیوار کسی بھی طرح دوسری دیوار سے مختلف ہے۔ اوپر کا رنگ بالکل ہموار اور ایک جیسا تھا۔ دلاور اینڈ کمپنی کی چالاکی پر میری عقل دنگ رہ گئی۔ اگر وہ اپنا ایک مہرہ نہ گنواتے تو شاید اس محاذ پر اُن کو بازی مات نہ ہوتی۔

"یہ ہے نیچے جانے کا راستہ۔" سراج نے کہا۔ اس کی آواز اور لہجے میں شکست اور مایوسی کا عنصر بہت نمایاں تھا۔ "میں نے تمہارے لیے یہ راستہ کھول دیا ہے مگر اپنے لیے کوئی راستہ کھلا نہیں چھوڑا۔"

"اس کا احساس تمھیں آج ہوا ہے۔" میں نے کہا۔ "واپسی کے راستے تو تم نے بہت پہلے بند کر دیے تھے۔ آج تو اچانک تمہارے سامنے دیوار آ گئی ہے۔"

"اس دیوار کے پیچھے ایک کمرہ ہے۔" وہ بولا۔ "پہلے یہاں ایک دروازہ تھا۔ پھر اس کی جگہ دو انچ موٹی دیوار اٹھا دی گئی اور اس پر رنگ کر دیا گیا... اسے تم لات مار کے گرا سکتے ہو۔ چنائی کچی ہے۔"

لات کے بجائے میں نے اس پر اسٹین گن کا دستہ مارا۔ اس کی بہت سی پتلی پتلی اینٹوں کے دوسری جانب گرتے ہی دیوار میں خاصا بڑا شگاف پیدا ہو گیا۔ پھر محسن نے اوپر والا حصہ بھی گرا دیا۔ مجھے اب اپنے مقابل وہ کمرہ نظر آ رہا تھا جس میں وہ سب جمع ہوتے تھے۔ اس میں دو بیڈ لگے ہوئے تھے۔ ایک میز تھی جس کے گرد چھ کرسیاں رکھی گئی تھیں۔ یہ میز کھانے کے لیے بھی استعمال ہو سکتی تھی اور گول میز کانفرنس کے لیے بھی۔ اور دونوں مقاصد کے لیے استعمال بھی ہوتی تھی۔ ایک دیوار کے ساتھ لکڑی کی الماری رکھی ہوئی تھی اور اس کے دونوں پٹ کھلے ہوئے تھے۔ الماری میں کچھ کراکری تھی اور چائے وغیرہ بنانے کا سامان تھا۔ اسی الماری کے قریب کونے میں مٹی کے تیل کا چولہا تھا جس پر سیاہ ہو جانے والی المونیم کی پتیلی رکھی ہوئی تھی۔ دوسرے گوشے میں چھوٹا سا فریج تھا۔

پہلے میں دیوار کے ملبے پر سے گزرا اور دوسری جانب ریوالور لے کر کھڑا ہو گیا۔ پھر سراج اندر آیا اور آخر میں محسن۔ میں نے زیادہ تفصیل سے کمرے کا جائزہ لیا لیکن وہاں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ سوائے ایک بات کے، ایک بیڈ کے سرہانے میز پر مختلف رنگ کے چند تار لٹک رہے تھے۔ یہاں ان کا مواصلاتی نظام تھا جس سے وہ ہماری گفتگو سنتے تھے۔ شاید ریکارڈ بھی کرتے تھے۔ ہم سے بات کرتے تھے اور باہر والوں سے رابطہ رکھتے تھے۔ جاتے وقت وہ سارے آلات وغیرہ لے گئے تھے اور منقطع تار چھوڑ گئے تھے۔ کمرے کی اونچائی اتنی ہی تھی جتنی ہمارے کمروں کی تھی۔ لیکن یہ کمرہ رقبے میں دُگنا تھا۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ رابعہ کو یہاں ہونے والی گفتگو کیوں سنائی دیتی تھی۔ دو انچ کی کچی دیوار آوازوں کو مؤثر طور پر نہیں روک سکتی تھی مگر یہ خامی دلاور اینڈ کمپنی کے علم میں نہیں تھی۔

"اس کمرے میں مجھے کوئی دوسرا دروازہ نظر نہیں آ رہا ہے۔" میں نے کہا۔

"دروازہ اس الماری کے پیچھے ہے۔" سراج نے کہا۔

"محسن کے ساتھ مل کے اسے ہٹاؤ۔" میں نے کہا۔ "بلکہ بہتر ہو گا اگر تم اکیلے ہی کوشش کرو۔"

"ہاں الماری زیادہ بھاری تو نہیں لگتی۔" محسن نے کہا۔ "پہلے برتن نکال کے نیچے رکھ دو گے تو کام زیادہ آسان ہو جائے گا۔"

سراج نے بڑی مجروح نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "تم اب بھی شک کرتے ہو کہ میں دھوکا کر سکتا ہوں۔"

"میں سانپ اور بچھو پر بھروسا کرنے کا رسک لینے کو عقلمندی نہیں سمجھتا۔" میں نے کہا۔ "خواہ وہ میری قید میں ہی کیوں نہ ہو۔"

سراج نے غصے میں برتن نکال کے باہر پھینک دیے۔ کپ اور پیالے اور پلیٹیں فرش پر گر کے ٹوٹ گئے۔ چمچے بکھر گئے۔ چائے کی پتی اور چینی کی شیشیاں پاش پاش ہو گئیں۔ پھر سراج نے خالی الماری کو دھکا دیا اور لکڑی کی الماری بڑی آواز کے ساتھ فرش پر گری۔ مجھے اس آواز سے فرش کے نیچے خلا کی موجودگی کا احساس ہوا۔ الماری کی جگہ اب ایک دروازہ نمودار ہو گیا تھا۔

"اب اگر تم کہو گے کہ اس کا قفل بھی کھول دو تو میں نہیں کھول سکوں گا۔" سراج نے اپنی ذلت کے احساس کو دبانے کے لیے تھوڑی سی خفگی کا مظاہرہ کیا تھا۔

میں نے جواب دینے کے بجائے ایک دم ریوالور اٹھا کے فائر کیا۔ آواز زیادہ نہیں تھی مگر اس کمرے کی محدود جگہ میں زیادہ سنائی دی۔ سراج بری طرح چونکا اور بے اختیار ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ گولی اس کے سامنے سے گزری تھی۔ میں نے تالے کا نشانہ لیا تھا لیکن گولی سراج کے پیٹ سے چند انچ دور رہ گئی تھی۔

میں نے دوسرا فائر کیا تو تالے کے انجر پنجر ڈھیلے ہو گئے۔

"اب دروازہ کھل جائے گا... آگے چلو..." محسن نے کہا۔ سراج پلٹا اور اس نے دروازے کو لات ماری۔ دونوں پٹ اندر کی طرف کھلے اور میں نے اپنے سامنے ایک تاریک خلا دیکھا۔

"نیچے روشنی کا کیا بندوبست ہے؟" میں نے کہا۔

"اور اسی سوال سے دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس عمارت میں بجلی کہاں سے آتی ہے؟" محسن نے کہا۔

"بجلی واپڈا والے فراہم کرتے ہیں۔" وہ بولا۔ "لیکن ان کا اپنا انتظام بھی ہے۔ نیچے جنریٹر ہے جو بجلی کے جاتے ہی ٹرپ ہو جاتا ہے۔ یعنی خود چل پڑتا ہے۔"

"وضاحت کا شکریہ... ویسے میں ٹرپ کا مطلب سمجھ گیا تھا۔" میں نے کہا اور محسن سے مخاطب ہوا۔ "انسپکٹر سندر نے مجھے بتایا تھا کہ اوپر صرف ایک کمرہ ہے جس پر واپڈا سب اسٹیشن کا بورڈ لگا ہوا ہے اور آس پاس خاردار تاریں ہیں۔ خود واپڈا والوں کو اپنے اس سب اسٹیشن کا پتا نہیں ہو گا۔"

سراج نے دروازے سے نیچے قدم رکھا اور کوئی سوئچ دبایا۔ اس سے اندر روشنی پھیل گئی۔ سراج کے پیچھے چلتے ہوئے ہم نیچے اترنے لگے۔ کُل بارہ زینے تھے اور ہر زینہ شاید آٹھ انچ بلند تھا چنانچہ تہ خانہ آٹھ فٹ کی گہرائی میں تھا۔ زینہ ختم ہوتے ہی مجھے ایک نیم تاریک ہال نظر آیا۔ میرے اندازے کے مطابق یہ ہال پوری اوپر والی عمارت کے نیچے پھیلا ہوا تھا۔ اس کی لمبائی بھی پچاس فٹ تھی اور چوڑائی بھی پچاس فٹ... یہ صحیح پیمائش نہیں تھی۔ مجھے چھت کے نیچے تو سیمنٹ اور کنکریٹ کے ستون دکھائی دے رہے تھے۔ انہی ستونوں نے اوپر کے سارے اسٹرکچر کا وزن سنبھال رکھا تھا۔ ہر قطار میں تین پلر تھے اور ایسی تین قطاروں کے ہر پلر کے درمیان کا فاصلہ دونوں جانب سے بارہ فٹ کے قریب لگتا تھا چنانچہ ہال اتنا ہی لمبا اور چوڑا ہو سکتا تھا۔

جنریٹر نیچے والے دروازے کے قریب ہی نصب تھا۔ وہیں اوپر مجھے ایک سوئچ بورڈ نظر آیا۔ میں نے اس کے بٹن دبائے تو ہال کے ہر ستون پر نصب بلب روشن ہوتا گیا۔ ہال کی دیواروں پر سیمنٹ کے پلاسٹر کا رنگ تھا مگر ہر ستون پر دو سو واٹ کا بلب سرچ لائٹ کی صورت میں یوں لگایا گیا تھا کہ سب کی

روشنی مختلف سمت میں جاتی تھی اور ہال کے ہر گوشے کو روشن کر دیتی تھی۔ اس روشنی میں مجھے نیچے سے اوپر تک ویسے ہی باکس نظر آنے جیسے ہم نے گامے ماچھی کے اڈے پر اور پھر سائیں پاپڑ والے کے مزار کے نیچے دیکھے تھے۔ انھیں کھول کر دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اب تک ہم نے جو اسلحہ پکڑا تھا اور تباہ کیا تھا وہ ایک ہی جیسا تھا۔ کچھ غیر ملکی ساخت کا مگر بیشتر ایم ڈبلیو ڈی کمپلیکس کا تیار کیا ہوا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ دلاور اینڈ کمپنی اور اس جیسے وطن کے غداروں کی فیکٹریوں کا بنا ہوا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ اب ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس میں پھر زرعی مشینری کے پُرزے بن رہے ہوں کیونکہ اس کا نام پریس، پبلک اور پولیس سب کے لیے ناآشنا نہیں رہا تھا۔ وہ اسلحہ ساز مشینری کسی دوسری جگہ لے گئے ہوں گے۔ اس خیال کا اظہار محسن پہلے بھی کر چکا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ صرف ایک نہیں تخریب کاری کی کئی فیکٹریاں چل رہی ہوں۔

محسن کی نظر بھی لکڑی کے تابوت نما صندوقوں کا جائزہ لے رہی تھی۔ شاید وہ بھی سوچ رہا تھا کہ ان میں کتنے دستی بم ہوں گے۔ کتنے ٹائم بم اور کتنی مشین گنیں۔ کتنے ریوالور اور کتنے کارتوس۔ ڈائنا مائیٹ اور بارودی سرنگیں۔ یہ سب تباہ کن اسباب کتنے لوگوں کی جان لیتا۔ کتنے بے گناہوں کا خون بہاتا۔ کتنے بچوں کو یتیم کرتا۔ کتنی عورتوں کو بیوہ کرتا۔ اس سے کتنے پُل اُڑائے جاتے۔ کتنے بجلی گھر تباہ کیے جاتے اور کتنی سرکاری تنصیبات کو نقصان پہنچایا جاتا۔

سب سے پہلے وہ آواز میں نے سُنی۔ ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت کے فرق سے محسن نے چونک کر اوپر دیکھا اور میں نے سراج کے لبوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ پھیلتی محسوس کی۔

"کیا یہ ہیلی کاپٹر یہاں آ رہا ہے؟" میں نے اسٹین گن کا رخ سراج کی طرف کر لیا۔

سراج نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اسی طرح مسکراتا رہا اور اس کی یہ مسکراہٹ مجھے اپنا تمسخر اُڑاتی محسوس ہوئی۔

"کون آیا ہے اس ہیلی کاپٹر میں؟" میں نے چیخ کر کہا اور اسٹین گن کا دستہ گھما کے سراج کے سر پہ مارا۔ وہ اُچھل کے ایک طرف ہو گیا مگر اپنے کندھے کو ضرب سے نہ بچا سکا۔

"اس میں تمھارا باپ آیا ہے... وزیر خان... سیدھا جہنم سے۔" سراج نے تکلیف کے باوجود مسکراتا جاری رکھا...!" اور وہ تم کو ساتھ ہی لے کر جائے گا اپنے بہادر سپوت کو۔"

"وہ صرف مجھے نہیں، تمھیں بھی لے جائے گا سراج۔" میں نے کہا۔ اس کی اشتعال انگیز باتوں پر یہ جواب بہت ناکافی تھا مگر میرا ذہن فوری طور پہ دوسری طرف چلا گیا تھا۔ اب میں نے بھی سمجھ لیا تھا کہ سراج کے اس رویے کا مطلب کیا ہے اور محسن نے بھی۔ ہیلی کاپٹر میں یقیناً وہ آئے تھے جو ہمارے دشمن تھے۔ سراج کے ساتھی تھے۔ اس اسلحے کے خریدار آئے تھے یا اس ذخیرے کو منتقل کرنے والے۔

"ہمیں کچھ کرنا ہو گا محسن۔" میں نے کہا۔

"وقت بہت کم ہے... ہم یہ سارا ذخیرہ تباہ نہیں کر سکیں گے۔" محسن بولا۔

"کیوں محسن! ان صندوقوں میں دیکھو... ان میں ٹائم بم بھی ہوں گے... ہمیں پندرہ منٹ تو لیں گے۔" میں نے کہا۔

"پندرہ منٹ میں ایک یا دو ٹائم بم فٹ کیے جا سکتے ہیں۔" محسن نے مایوسی سے کہا۔ "ان میں فیوز لگانا... ٹائم سیٹ کرنا اور انھیں صحیح جگہ پر رکھنا۔"

"چل دو ہی سہی... کچھ تو ہو گا..." میں نے کہا۔

"دو ٹائم بم سارے اسلحے کے ذخیرے کو نہیں اُڑا سکتے... سارا یہ اسٹرکچر بھی آر سی سی کا ہے۔ ایک دو بلر گر جائیں گے... یا چھت کا کوتا ٹوٹ جائے گا۔" محسن بولا۔

"تم اب کچھ نہیں کر سکتے... صرف مر سکتے ہو... مجھے بھی مار سکتے ہو مگر خود کو کسی طرح نہیں بچا سکتے۔" سراج نے وہی شیطانی قہقہہ مارا۔ میں ایک دم اس پر ٹوٹ پڑا۔ محسن نے جلدی جلدی باکس کھول کر دیکھنے شروع کیے۔

"کُتے... تیرا منہ پہلے بند کر دوں..." میں نے اس پر پے در پے وار کیے۔ وہ سر پر پڑنے والی پہلی چوٹ پر ہی چکرا کے گرا اور بے ہوش ہو گیا۔

"دیکھ محسن! میں اس کمینے کو گھسیٹ کر اوپر لے جاتا ہوں اور اس راستے سے باہر نکلنے کی کوشش کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔ ہیلی کاپٹر کی آواز اب بہت صاف سنائی دے رہی تھی اور یوں لگتا تھا کہ وہ ہمارے سر پر پہنچ چکا ہے۔

"نہیں سکندر... باہر مت جانا۔" محسن چلایا۔ "ہو سکے تو ان کا راستہ روکنے کی کوشش کرنا۔ وہ سامنے والے دروازے سے اندر آئیں گے... جس کو ٹریپ کیا گیا تھا۔"

"نہیں محسن! ادھر سے اندر آنے کے بعد نیچے پہنچنے کا واحد راستہ یہ دیوار تھی۔" میں نے سراج کو اٹھا لیا اور کندھے پر ڈال لیا۔ "اس تہ خانے تک آنے کا دوسرا راستہ بھی ہو گا۔ تو اس دروازے پر ایک ٹائم بم لگا دے۔ وقتی طور پہ ان کی پیش رفت رک جائے گی۔ تجھے وقت مل جائے گا۔ اگر مجھے موقع ملا تو میں ہیلی کاپٹر کو نہیں اترنے دوں گا۔"

میں سراج کے وزن کے ساتھ اوپر چڑھنے لگا... یہ کام

آسان نہیں تھا چنانچہ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ سیڑھیاں صرف بارہ تھیں کمرے سے گزر کے میں راہداری میں دوڑتا ہوا پہنچا۔ ہیلی کاپٹر کا شور اب بہت بلند ہو گیا تھا۔ میں نے سراج کو مٹی اور پتھر کے اس ڈھیر پہ پھینک دیا جو دیوار سے ملی ہوئی کچی پہاڑی کھود کر راستہ بناتے ہوئے اندر گرنے سے جمع ہو گیا تھا۔ پھر میں اس ڈھیر پہ چڑھا۔ بھربھری مٹی پہ قدم جما کے اوپر جاتے ہوئے کئی بار میرا پیر پھسلا اور میرے کپڑے پھٹنے کے علاوہ میرے بازوؤں پہ خراشیں آئیں مگر چند فٹ کی وہ بلندی میں نے ایک جنونی کیفیت میں طے کر لی۔ نیچے محسن کیا کر سکتا ہے اور کیا کرے گا؟ یہ میں نے اس پہ چھوڑ دیا تھا۔ میرے سامنے وہ تھا جو مجھے کرنا تھا۔

ایک بات میرے ذہن نے قبول کر لی تھی کہ اس صورتِ حال میں ہمارا بچ نکلنا ناممکن نہیں تو محال ہو گا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ ہم سراج کو وہیں چھوڑتے تو اپنی جان بچا کے اس راستے سے فرار ہو جاتے جس کا ابھی دشمن کو علم نہیں تھا لیکن ہم یوں نکل جاتے تو یہ جرم محاذِ جنگ پہ مورچا چھوڑ کر فرار ہو جانے کے جرم سے بھی زیادہ سنگین ہوتا۔ دشمن وہ سب اسلحہ لے جاتا جو وہاں موجود تھا اور اس اسلحے سے جتنی تباہی ہوتی۔ جتنی انسانی جانوں کا زیاں ہوتا اور وطن فروشوں کے مذموم مقاصد کی تکمیل کا جتنا سامان ہوتا اس کے ذمے دار صرف ہم ہوتے۔ ہم اتنا بڑا جرم کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ ایسا سوچنے سے پہلے جان دینا ہمارے لیے بہت آسان ہوتا۔

میں نے اوپر ایک پتھر کی اوٹ سے سر نکال کے دیکھا تو مجھے ہیلی کاپٹر مشکل سے پچاس گز دُور اور فضا میں چالیس پچاس فٹ کی بلندی پہ نظر آیا۔ اس کی بلندی آہستہ آہستہ کم ہو رہی تھی اور ہیلی کاپٹر تقریباً اسی جگہ اتر رہا تھا جہاں اسلحہ خانے کی چھت تھی۔ کچھ دیکھنے یا سوچنے سمجھنے کا وقت ہی نہیں تھا۔ میں نے ایکدم سامنے آ کے پوزیشن لی اور اسٹین گن کا رُخ اوپر ہیلی کاپٹر کی طرف رکھتے ہوئے پورا راؤنڈ خالی کر دیا۔ یہ چند سیکنڈ کا کام تھا۔ پھر میں نے غوطہ مارا اور اس کچی مٹی کی ڈھلوان پر گر گیا جو کسی سرنگ کی طرح اندر آتی تھی۔ میں پھسلتا لڑھکتا سراج کے اوپر گرا۔

باہر ایک خوفناک دھماکا ہوا۔ میں اُٹھ کے پھر باہر کی جانب لپکا۔ میرا دل کامیابی کی خوشی سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ ہیلی کاپٹر یقیناً گر گیا تھا۔ لیکن میں دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کی تباہی کس حد تک مکمل رہی۔ جو نظارہ میں نے باہر نکل کے دیکھا اس نے میرے جسم کے روئیں روئیں میں مسرت کی سنسنی بھر دی۔ ہیلی کاپٹر ایک آگ کا الاؤ بن گیا تھا۔ اس کے بہت سے چھوٹے ٹکڑے دُور تک پھیلے ہوئے جل رہے تھے۔

ایک بڑے الاؤ کے گرد یہ چھوٹے چھوٹے الاؤ میرے لیے خوشی کا چراغاں تھے۔ ابھی تک مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ہیلی کاپٹر کے عملے اور دوسرے افراد کی تعداد کیا تھی اور ان میں سے کتنے مارے گئے۔ پہلے میری فائرنگ اور پھر ہیلی کاپٹر کے گرنے سے کسی کا زندہ بچ جانا مشکل ہی نظر آتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ آگ اب مختلف گھاس اور جھاڑیوں تک پھیل چکی ہے۔ میں نے غور سے ہر طرف دیکھا لیکن نہ مجھے کسی کے چیخنے چلانے یا کراہنے کی آواز سنائی دی یا کوئی نہ کوئی حرکت کرتا دکھائی دیا۔ پھر اچانک وہ بُو میری ناک تک پہنچی جو دنیا کی سب سے زیادہ قابلِ نفرت اور کراہیت انگیز بُو سمجھی جا سکتی ہے۔ اس بُو میں اور سیخ پر کبابوں کے بھونے جانے کی خوشبو میں کوئی فرق نہیں ہوتا مگر جہاں آدمی خود جانتا ہو کر بُو انسانی گوشت کے جلنے کی ہے وہاں احساس کا ردِّ عمل قطعی مختلف اور شدید ہوتا ہے۔ معلوم نہیں وہ اس بُو کو کیسے گوارا کر لیتے ہیں جو اپنے عقیدے کے مطابق مرنے والے کو خود جلاتے ہیں اور اس کے عمل کر راکھ ہونے تک تماشائی بنے کھڑے رہتے ہیں۔ شاید وہ اس کے عادی ہوتے ہیں۔ انسان کے ذہن کی تربیت جس نہج پر ہو وہی اس کی فطرتِ ثانیہ بن جاتی ہے۔ آدم خور قبائل کے درمیان پرورش پانے والے بچّے کے لیے مردے کے گوشت کو بھون کر کھا جانا کوئی جذباتی مسئلہ نہیں ہو گا خواہ مرنے والا اس کا بھائی ہی کیوں نہ ہو۔

میرے ذہن کو ایک جھٹکا لگا اور میں نے متلی سی محسوس کی۔ میں نے خالی اسٹین گن کو وہیں پھینکا اور پھر نیچے بھاگا۔ سراج ابھی تک بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ میں اس کے اوپر سے عجیب لگا گیا۔ دوڑتا ہوا راہداری سے اور پھر کمرے سے گزرا۔ نیچے پہنچا تو محسن نے ہال کے آخری حصے سے چلّا کے مجھے مبارکباد دی۔

"تُو اب ماہر شکاری ہو گیا ہے۔ کوّے مارنا چھوڑ کے ہیلی کاپٹر گرانے لگا ہے۔" وہ بولا اور تاروں سے کسی چیز کا کنکشن ملانے میں مصروف رہا۔

"تجھے کیسے معلوم ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"دھماکے سے" محسن نے دو تاروں کو دانت سے کاٹ کے چھیلا۔

"وہ تو میرے گرنے سے بھی ہو سکتا تھا۔" میں نے کہا۔

"اب ایک دھماکا میں کروں گا۔ دیکھتے ہیں کس کا دھماکا بڑا رہا۔" محسن نے کہا۔ "میں تو گھبرا گیا تھا پہلے... پھر میں نے دو باکس درمیان میں رکھے اور ان دونوں میں ایک ایک ٹائم بم فکس کر دیا۔" وہ اچانک تار چھوڑ کے دوڑا۔

"کیا دونوں بم پھٹنے والے ہیں؟" میں نے اس کی بدحواسی کو سمجھ کے کہا۔

"خیال نہ آتا تو دو منٹ میں ہم دونوں اللہ کو پیارے ہو جاتے۔" محسن نے ایک باکس کھول کے کچھ کیا اور پھر دوسرے باکس کی طرف لپکا جو دوسرے ستون کے قریب تھا۔

"یہ تو مرنے کے بعد معلوم ہوتا کہ اللہ کو پیارے ہوتے یا اللہ کے نزدیک معتوب ہوتے۔" میں نے کہا۔ "اصولاً یہ ہماری اجتماعی خودکشی کا کیس بن جاتا اور خودکشی حرام موت ہوتی ہے۔"

"اللہ نے ہی حرام موت سے بچایا۔" محسن بولا۔

"تُو بھی عجیب چیز ہے۔ دو منٹ باقی رہ گئے تھے اور آپ کتنے اطمینان سے تار چھیلنے میں اور مبارک باد دینے میں مصروف تھے۔"

"وہ... دراصل یار... تیرے آنے سے پہلے میں نے سمجھ لیا تھا کہ اب بچ کے باہر نکلنے کا کوئی امکان نہیں رہا۔" محسن بولا۔ "ذہن میں وہی خیال تھا۔"

"یہ تار کہاں سے ملے تجھے؟" میں نے کہا۔

"یہیں سے۔" اس نے اِدھر اُدھر ہاتھ گھما کے کہا۔ "دیکھتا نہیں، اب تو تین، صرف دو لائٹیں جل رہی ہیں۔"

"تُو نے ان کے تار کاٹ لیے؟"

"کاٹنے کو کیا تھا۔ بس کھینچ کر توڑ لیے۔" محسن بولا اور چھیلے ہوئے تار کو ایک ڈائنامائیٹ سے جوڑنے لگا۔

"تجھے کرنٹ نہیں لگا؟ تو شاک پروف مخلوق ہے کیا؟" میں نے کہا۔

"حاضرین میں سب سے احمق مخلوق۔" محسن بولا۔ "تُو نے سائنس پڑھی ہوتی تو ایسا سوال نہ کرتا۔ اگر ایک وقت میں ایک ننگے تار کو بھی پکڑ لیا جائے اور آدمی کہیں سے ارتھ نہ ہو تو کرنٹ کیوں لگے گا۔ میں لکڑی کے صندوق پہ چڑھ کے تار کھینچتا رہا۔ ایک وقت میں ایک تار کھینچا تاکہ تار شارٹ ہونے سے فیوز نہ اُڑ جائے۔"

"اور اب کیا سائنسی کارنامہ سرانجام دے رہا ہے تو؟"

"میں نے کچھ ایسا بندوبست کیا ہے۔" محسن نے ایک اور تار کے ٹکڑے کو دانت سے کاٹا۔ "کہ جب ہم باہر جائیں تو وہ تار جو میں نے چار صندوقوں کو جوڑنے کے لیے استعمال کیے ہیں... یہ دیکھ... پہلا باکس پہلے ستون کے پاس ہے۔ اس میں ڈائنامائیٹ ہیں۔ دوسرے میں بارودی سرنگیں ہیں جو زمین کے نیچے دبائی جاتی ہیں اور کوئی ان پہ سے مرسیڈیز میں گزرے یا دو ٹانگوں پہ، دھماکے سے اُڑتا ہے اور سیدھا اوپر پہنچتا ہے... اللہ میاں کے پاس۔ اس تیسرے باکس میں دستی بم ہیں۔ ان تینوں کے درمیان برقی تاروں کا سلسلہ ہے۔ اور یہ تار میں نے اس جنریٹر سے ملائے ہیں۔"

"گویا اسے اڑانا ہو تو پہلے جنریٹر چلانا پڑے گا۔" میں نے کہا۔ "اور جنریٹر نہ چلا تو کچھ نہیں ہو گا۔ پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہو گا۔"

"دیکھ میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں مگر پلاؤ زردے، قورمے کی بات نہیں سُن سکتا۔" محسن بولا۔ "تجھے معلوم ہے کب سے فاقہ چل رہا ہے۔ سوائے جوتوں لاتوں اور کوڑوں کے کچھ نہیں کھایا۔ سوئیٹ ڈش میں گالیاں ملی ہیں۔ تیری باتوں سے میرے پیٹ میں وہ چوہے پھر دوڑنے لگے ہیں جو دوڑتے دوڑتے تھک کر بے ہوش ہو گئے تھے۔"

"تیرا کتنا کام باقی ہے اب؟" میں نے کہا۔ "ممکن ہے فریج میں کچھ کھانے کو مل جائے۔ چائے کے برتن تو اس سالے ایس پی نے سب غصّے میں توڑ ڈالے ورنہ میں اس سے خانساماں کا کام بھی لیتا۔"

"وہ ہے کہاں؟" محسن نے جھک کر تاروں کو تیسرے باکس میں کسی چیز سے ملایا۔

"باہر کوڑے کے ڈھیر پہ مردہ کتّے کی طرح پڑا ہے۔"

"بہت بڑا شیطان ہے یہ بھی۔ کیسے کیسے رنگ بدلے اس گرگٹ کی اولاد نے۔ پہلے تائب ہونے کی بات کی۔ پھر خوف زدہ کرنا چاہا۔ اور آخر میں ہیلی کاپٹر کی آواز سنتے ہی آ گیا اپنی اصلیت پر۔" محسن بولا۔

"یار محسن! کیا اُسے معلوم تھا کہ ہیلی کاپٹر آنے والا ہے؟" میں نے کہا۔

"یقیناً معلوم تھا... وہ وقت پورا کر رہا تھا۔" محسن بولا۔

"پھر تو یار، وہ بھی ڈراما تھا۔" میں نے کہا۔ "وہ سب گفتگو جو دلاور کے اور سراج کے درمیان ہوئی تھی۔ غالباً دلاور کو معلوم ہو گیا تھا کہ ہم غالب آ گئے ہیں۔ انھوں نے جو بات کی، اس کا اصل مطلب کچھ اور نکلتا ہو گا۔"

"اصل مطلب ہم سراج میں سے... بلکہ نچوڑ لیں گے۔" محسن بولا۔

"ٹائم بم میں اب کتنا وقت رکھا ہے؟" میں نے کہا۔

"پندرہ منٹ آگے بڑھا دیا ہے۔" محسن بولا۔ "تو وقت باتوں میں مت گزار، جا کے دیکھ اگر فریج میں کچھ پڑا ہے تو لے آ۔"

میں پھر اوپر گیا۔ فریج میں ٹھنڈا پانی تھا اور ڈبل روٹی کے کچھ پیس تھے۔ کچھ انڈے تھے اور مکھن تھا جو جما ہوا تھا۔ میں یہ اسباب جھولی میں ڈال کے اور پانی کی بوتل لے کر اوپر گیا۔ ہم نے چار چار پیس یوں کھائے کہ دانتوں سے مکھن کاٹتے تھے اور پھر سلائس... اس کے بعد ایک گھونٹ پانی پیتے تھے۔

"کافی بہت اچھی ہے۔" محسن نے پانی کا گھونٹ پی کر کہا۔

"جی... امپورٹڈ تھی۔ اور میں نے بڑی محنت سے بنائی تھی۔" میں نے کہا۔

"انڈے بھی تو فرائی کیے تھے آپ نے۔" محسن بولا۔

"جی... دو ہاف فرائی... دو ہاف بوائل۔" میں نے اس کی خدمت میں چار سالم انڈے پیش کیے۔ "نوش فرمایئے۔"

"ایسا نہ ہو کہ میں انڈا توڑ کے منہ میں ڈالوں اور کوئی چوزہ حلق سے اتر جائے لیکن شاید خالص اور کچی حالت میں چوزہ بھی پروٹین فراہم کرے گا۔ ویسے ہر انڈا مستقبل کا چوزہ ہے ہر انڈے سے مرغ اور مرغیوں کے ایک خاندان کا شجرۂ نسب شروع ہوتا ہے۔ مگر ہم یہ شجرۂ نسب کھا جاتے ہیں۔" محسن بولا۔

"بلکہ پی جاتے ہیں۔" میں نے کچا انڈا توڑ کے حلق میں انڈیل لیا۔ اس وقت مسئلہ ذائقے کا نہیں توانائی کا تھا۔ یہ مکھن اور انڈے ہمارے جسم کی گاڑی کے لیے آئندہ بارہ گھنٹے کا ایندھن تھے۔

"تو نے ایس پی صاحب کی سگریٹیں بھی چرائی تھیں۔" محسن بولا۔ "وہ ہوش میں آتے ہی تجھے گرفتار کر لیں گے۔"

"یہ سب مالِ غنیمت ہے جو مسلمانوں پر حلال ہے اور مجاہدین میں برابر تقسیم ہوتا ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "مگر یار... بارود خانے میں سگریٹ جلا لوں۔"

"جلا لے یار... کیا ہوگا... زیادہ سے زیادہ مرنا۔" محسن بولا۔

میں نے نیچے بیٹھ کے اور جھک کر زمین سے لگتے ہوئے دو سگریٹ منہ میں دبائے اور ماچس کی ایک تیلی سے جلائے۔ ان میں سے ایک میں نے محسن کو دیا۔ "کش لیتے وقت خیال رکھیے گا کہ یہ آپ کی آخری سانس ثابت نہ ہو۔ آپ بارود کے ڈھیر پر تشریف فرما ہیں۔" میں نے کہا۔

"میرا کام ختم ہو گیا۔" محسن نیچے اتر آیا۔ "اب اپنی سائنسی مہارت اور اعلیٰ کارکردگی پہ ایک تقریباً اپنی تعریف میں کرتا ہوں۔" وہ کش لے کر بولا۔ اور دروازے کی طرف چلنے لگا۔ "جیسا کہ تجھے معلوم ہے، یہ انکشاف ایس پی صاحب نے فرمایا تھا... کہ جیسے ہی بجلی جائے جنریٹر ٹرپ ہو جاتا ہے یعنی خود بخود چل پڑتا ہے۔"

"وضاحت کا شکریہ۔" ویسے میں ٹرپ ہونے کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ یہ وہی الفاظ تھے جو محسن نے سراج سے کہے تھے۔

"جب ہم باہر جائیں گے تو بجلی چلی جائے گی۔" محسن اوپر آ کے بولا۔ "اور جنریٹر ٹرپ ہو جائے گا۔"

"بجلی کو آپ کیسے بھیجیں گے؟" میں نے کہا۔

"اُف... ابوجہل..." محسن نے سر پہ ہاتھ مارا۔ "بچپن سے دیکھتا آیا ہے کہ کوئی چیز شارٹ ہو تو فیوز اُڑ جاتا ہے۔ فیوز کا اُڑنا اور بجلی کا بند ہونا ایک ہی بات ہے۔"

"آدمی کا اُڑنا اور آدمی کا بند ہونا ایک ہی بات نہیں ہے۔" سُنی ہی نہیں تھی۔ سُنی تھی تو اُس کا جواب دینا فضول سمجھا تھا۔ وہ زیادہ اہم کام میں مصروف تھا۔ اُس نے سب سے آخری بلب کو نکالا۔ اس پر ایک چونی رکھی اور بلب کو پھر فٹ کر دیا۔ یہی حرکت اس نے باہر آ کے کی۔ وہ بلب اس راہداری کا آخری بلب تھا اور تقریباً ملبے پر پڑے ہوئے سراج کے سر پہ تھا۔ چونکہ چھت ہر جگہ وہی آٹھ فٹ اونچی تھی اس لیے ہاتھ اٹھا کے بلب نکالنا اور فٹ کرنا مشکل کام نہیں تھا۔

میں نے بلاوجہ اُس کو چڑانے کے لیے کہا مگر محسن نے میری بات

"یہ چونیاں کہاں سے ملیں تجھے۔" میں نے کہا۔

"ان کی جیبوں سے کچھ ریزگاری نکالی تھی میں نے۔" اس نے لاشوں کی طرف اشارہ کیا جو اب اکڑ چکی تھیں۔ ان کا جو خون فرش پر بہا تھا، وہ بھی جم کر سیاہ ہو گیا تھا۔ "اللہ مجھے مُردوں کی جیب کاٹنے پر معاف کرے۔ ویسے میں نے ایک روپیہ ان کی جیب میں رکھ دیا تھا۔ ایک کا نوٹ۔"

"پھر تو کوئی گناہ نہیں ہوا غالباً۔ مُردے سے ریزگاری لینا تو کوئی بڑی بات نہیں۔ ہم اگر چاہیں تو ان کی جیب سے سب کچھ نکال سکتے ہیں لیکن یہ ہمارے دشمن نہیں ہیں۔ یہ تو شاید ہمارا نام تک نہ جانتے ہوں۔ یہ فقط دشمن کے آلۂ کار تھے۔ ان کا حکم ماننے پر مجبور تھے۔" میں نے کہا۔

"سراج کی جیب سے نکلی ہوئی رقم کافی ہے۔" محسن بولا۔ "مگر اس کی جیب سے جو دستاویزات برآمد ہوئی ہیں، وہ زیادہ دلچسپ اور اہم ہیں۔ مجھے سرسری طور پر دیکھنے کا موقع ملا تھا۔"

"کیا تھا اس میں؟" میں نے کہا۔

"ایک تصویرِ بتاں ایک حسینوں کے خطوط۔" محسن بولا۔

"اُف بدبخت، بدذوق۔ سارے صیغے جمع کے استعمال کر ڈالے... شاعر کی روح کو سخت تکلیف ہوگی۔" میں نے کہا۔

"تکلیف تجھے ہو رہی ہے... کیا تو شاعر کی روح ہے؟" محسن بولا۔ "اس میں سب کچھ واحد تھا۔ ایک تصویر... ایک خط... ایک پتا... وہ لڑکی سراج کی منگیتر ہے۔ جتنی خوب صورت لڑکی ہے اتنا ہی خوب صورت نام ہے۔ غزالہ نسیم... تحریر اس سے زیادہ خوب صورت ہے... معلوم نہیں ایسی لڑکی ایسے کمینے آدمی کے پلے کیوں باندھی جا رہی ہے۔"

"کمینہ اور شیطان وہ ہمارے نقطۂ نظر سے ہے۔" میں نے کہا۔ "لڑکی کے والدین تو اکڑتے پھرتے ہوں گے کہ ہونے والا داماد ایس پی ہے... بات بات پر سب کو بند کرا دینے کی دھمکی دیتے

ہوں گے۔"

"تو غلط سمت میں غور کرنے نکل گیا۔" محسن بولا۔"یہ لڑکی ہمارے کام آسکتی ہے۔"

"وہ کیسے؟" میں نے ایک احمقانہ سوال کیا۔

"جیسے رابعہ ان کے کام آئی۔" محسن نے کسی تذبذب کے بغیر کہا۔

میں کچھ دیر کے لیے ہکا بکا رہ گیا۔"غزالہ نسیم... کیا ہم اُسے اُٹھا کے لائیں گے؟ اس پر تشدد کریں گے؟"

"اگر سراج نے ہمیں مجبور کیا... تو یہ بھی ہوگا۔ جنگ تو جنگ ہے۔ اس کی لپیٹ میں سب آجاتے ہیں۔ جولی اور شہلا کا قصور کیا تھا کہ وہ اس جنگ کی بھینٹ چڑھا دی گئیں۔" محسن یکلخت اداس ہوگیا اور اس کے لہجے میں نفرت کا اور انتقام کی آرزو کا زہر اتر آیا۔ مجھے اپنی بات یاد آئی۔ میں نے بھی سراج سے کہا تھا کہ تم کو تمہارے ہی سکوں میں ادائیگی کی جائے گی۔ میں نے وعدہ کیا تھا کہ ایک دن ایسا ضرور ہوگا... لیکن کیا ایسا ضروری ہوگا۔ خدا کرے کہ نہ ہو... شاید ہم غزالہ نسیم نام کی اس معصوم اور بے گناہ لڑکی کے ساتھ وہ سب کچھ نہ کرسکیں جو سراج اور دلاور کرنے کے اہل ہیں۔ ہم کتنے بھی گر جائیں، انسان سے شیطان نہیں بن سکتے اور دلاور یا سراج جیسے کتنے بھی اعلیٰ مقام پر کیوں نہ ہوں ان کے لیے انسانیت کے معیار کو چھونا مشکل ہے۔

ہم اب سراج کو اُٹھا کے باہر لے جانے کی سوچ ہی رہے تھے کہ ایک آواز نے ہم دونوں کو چوکنا کر دیا۔

"پھر؟ دوسرا ہیلی کاپٹر۔" محسن بولا۔

میں نے ایک دم سراج کو اُٹھا لیا۔"اسلحہ بھی تو بہت تھا۔ ایک ہی ہیلی کاپٹر میں کیسے جا سکتا تھا۔"

"تو باہر نکل۔" محسن نے کہا۔"میں آتا ہوں... جتنا دُور جا سکے چلے جانا... اور میری فکر مت کرنا۔"

"تو کیا کرنا چاہتا ہے؟ میرے ساتھ کیوں نہیں نکلتا؟" میں نے چلّا کر کہا۔

"پاگل مت بن۔" محسن بولا۔"مجھے یہ سوئچ آن کرنا ہے جس سے اوپر والا بلب روشن ہوگا۔ اس کے اوپر چھتری رکھنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ تار شارٹ ہو جائیں۔ اندر والے بلب پر تو یہ بندوبست اس لیے کیا تھا کہ یہاں سوئچ خراب ہو یا کسی وجہ سے تار شارٹ نہ ہوں تو میں اندر جا کے لائٹ جلا سکوں۔ اسپارک ہوتے ہی مین فیوز اُڑ جائے گا اور بجلی بند ہوتے ہی نیچے جنریٹر اسٹارٹ ہوگا۔ میں نے جنریٹر کی لائن کے کنکشن کو تینوں صندوقوں میں ڈائنا مائٹ سے جوڑ دیا ہے۔ جنریٹر کے اسٹارٹ ہوتے ہی ہر باکس سے بجلی کا شعلہ اُٹھے گا جو ڈائنا مائیٹ کو اُڑا دے گا۔ باقی سب چین ری ایکشن ہوگا۔ یعنی ایک ڈائنا مائٹ کے پھٹنے سے دوسرے بھی پھٹ جائیں گے۔ بارودی سرنگ اور دستی بموں میں بھی ایسا ہی ہوگا۔ صرف ٹائم بم والے باکس میں دھماکا ایک وقت پر ہوگا۔ تقریباً اب سے پندرہ منٹ بعد۔ باہر میں نے دو ٹائم بم اس گیٹ پر لگائے ہیں جو ہال کے آخر میں ہے۔ تو نے ٹھیک کہا تھا۔ وہ سیدھا تہ خانے میں پہنچنے کا راستہ ہے اور گیٹ کی لمبائی چوڑائی دیکھنے کے بعد میں سمجھ گیا تھا کہ اس راستے سے چھوٹی گاڑیاں سیدھی اندر لائی جاتی ہوں گی۔ شاید یہ کوئی سلوپ ہوگا۔ کوئی آہستہ آہستہ نشیب میں اترنے والا راستہ جو ایک فرلانگ یا سو گز دُور سے شروع ہو کے تہ خانے پر ختم ہوتا ہوگا۔ ٹائم بم گیٹ کو اتنا نقصان ضرور پہنچا دیں گے کہ فولادی گیٹ ٹوٹ کر راستہ روک دے یا ٹیڑھا ہو جانے تو کھلنے کے قابل نہ رہے۔"

"ویری گڈ... مگر اب تیرا رکنا کیوں ضروری ہے۔ بٹن دبا کے نکلنے کی فکر کر۔" میں نے کہا۔

"ابھی نہیں۔" محسن بولا۔"تو سراج کے ساتھ بھاگ جا۔ میں اس وقت بٹن دباؤں گا جب ہیلی کاپٹر اُتر جائے گا۔ یہ پوری عمارت گر جائے گی اور ملبے کے ڈھیر میں ہیلی کاپٹر کے پُرزے بھی دفن ہو جائیں گے۔"

"تو خود بھی تو غیر محفوظ ہوگا محسن۔" میں نے کہا۔

"اللہ مالک ہے۔ میں بٹن دباتے ہی اسی راستے سے بھاگنے کی کوشش کروں گا۔" محسن نے کہا۔"دھماکا تو بٹن دباتے ہی ہو جائے گا اس لیے ممکن ہے یہ چھت بھی بیٹھ جائے اور... یہ راستہ بند ہو جائے۔ مگر تو جا... خدا نے چاہا تو ہم پھر ملیں گے۔" وہ ہنسا۔"اس دنیا میں نہیں تو اُس دنیا میں... ویسے بھی اب جینے کی تمنا مر چکی ہے۔ شہلا کے ساتھ ہی..."

"یہ تو کیسی باتیں کر رہا ہے..."

"جا سکندر... نکل جا... ہیلی کاپٹر اُتر رہا ہے۔" محسن نے کہا اور بلب روشن کرنے والے سوئچ کے قریب جا کھڑا ہوا۔

میں سراج کو لے کر بیس پچیس قدم ہی بھاگا تھا کہ دھماکا ہوا۔ دھماکے نے میرے قدم اکھاڑ دیے اور میں مُنہ کے بل گرا۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات ساتویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں

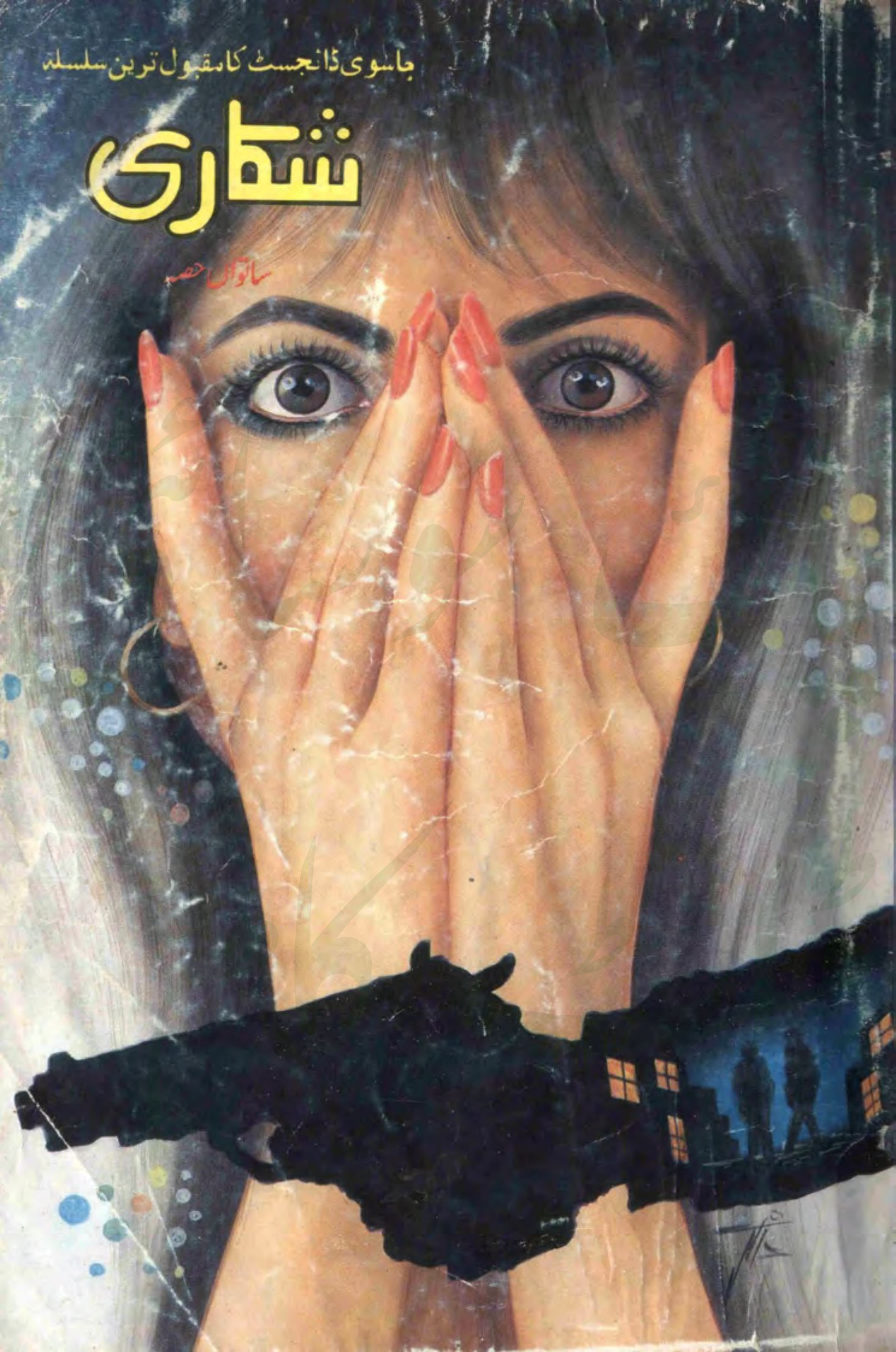
جاسوسی ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ
شکاری
ساتواں حصہ

نشانہ

مُعاشرے کے اُن ناسوروں کی رُوداد جو گوشت و پوست سے گزر کر انسانی ہڈیوں میں اتر رہے تھے۔ ایک کفن بردوش نوجوان کی کہانی جس کے شب و روز موت کی بستی میں گزر رہے تھے۔ جلتے دن سلگتی راتیں۔ آس و یاس خوف و ہراس۔ شیریں خواب تلخ حقیقتیں

زندہ کرداروں پر مشتمل جاسوسی ڈائجسٹ کا منفرد سلسلہ

نئی سوچ - نیا رنگ - نیا لہجہ - نیا ڈھنگ

احمد اقبال کے شرربار و شبنم فشاں قلم سے

وہ ایک دھماکا نہیں تھا بلکہ ایک کے بعد ایک ہونے والے کئی دھماکے تھے جو درمیانی وقفہ انتہائی مختصر ہونے کے باعث ایک طویل گونج دار دھماکے کی طرح سُنائی دیے تھے۔ اس کی وجہ مجھ پر واضح تھی۔ پہلے دھماکے تین الیکٹرک اسپارک سے ہوئے تھے جب محسن نے ٹن ڈبا کے باہر کی لائٹ جلائی ہوگی تو بلب نہیں جلا ہوگا۔ اُس پر رکھی ہوئی جوتی نے فیوز اُڑا دیا ہوگا۔ فیوز کے اُڑتے ہی جنریٹر اسٹارٹ ہوا ہوگا اور اس سے ملے ہوئے تاروں سے ان تین تابوتوں میں بجلی کا شعلہ لپکا ہوگا جن میں ڈائنامائیٹ، بارودی سُرنگیں اور ٹائم بم بھرے ہوئے تھے۔ اس تمام بارودی ڈھیر کے اڑتے ہی عمارت کا ڈھانچہ بھی ایک دھماکے سے گرا ہوگا۔ اس وقت تک ہیلی کاپٹر بھی اُتر چکا تھا۔ چنانچہ جیسے ہی، محاورے کے مُطابق.... اس کے قدموں کے نیچے سے زمین نکلی، ہیلی کاپٹر بھی ملبے میں دفن ہوا اور اسی دھماکے میں اس کی موت کا دھماکا بھی شامل ہوگیا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ دونوں ٹائم بم جو محسن نے نیچے والے فولادی گیٹ میں نصب کیے تھے، صحیح وقت پر پھٹے تھے یا نہیں۔ پندرہ منٹ تو ہوگئے تھے چنانچہ ہوسکتا ہے کہ وہ بھی اس دھماکے میں شریک ہوں لیکن ان کے نہ پھٹنے سے اب کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ کنکریٹ کے اس زمیں دوز اسٹرکچر کے گرتے ہی وہ فولادی گیٹ بھی گر گیا ہوگا اور نہیں گرا ہوگا تو اس کے شکستہ ڈھانچے کی لاش ملبے میں دفن ہوگئی۔ کبھی اس ملبے کو کھودا گیا تو اس میں سے ایک ہیلی کاپٹر کا ڈھانچہ بھی برآمد ہوگا اور دیکھنے والے حیران ہوں گے یا برہم ہوں گے تو صرف ایک دشمن ملک کی کارروائی پر۔ ان کی اس جسارت پر کہ انھوں نے اپنا ہیلی کاپٹر یہاں بھیج دیا۔ یہ علاقہ عین سرحد پر تھا مگر پھر بھی یہ سرحدی حدود کی خلاف ورزی تھی۔ دیکھنے والے اسلحے کے اس ذخیرے پر بھی تحقیق کریں گے جو ملبے سے نکلے گا اور پھر ایک رپورٹ مرتب کی جائے گی جو حکومت کی مشینری کے اعلیٰ ماہرین کے جائزے پر مشتمل ہوگی۔

اس رپورٹ میں یقیناً بڑی باریک بینی سے کام لیا جائے گا اور ہیلی کاپٹر کے اجزا کے مطالعے سے حاصل کردہ معلومات کو یکجا کر کے بتایا جائے گا کہ ہیلی کاپٹر کتنا بڑا تھا، کس ساخت اور ماڈل کا تھا اور اس میں کتنے افراد تھے۔ اس کے کریش ہو جانے کے بعد کیا ہوا۔ عملے پر کیا بیتی اور باقی افراد کس طرح ہلاک

ہوئے۔ نیچے اندازاً کتنے ڈائنامائیٹ تھے، کتنے ٹائم بم اور کتنی بارودی سُرنگیں۔ ان سب کی مجموعی تباہ کُن قوت کیا تھی اور اس نے اسٹرکچر کو کتنا نقصان پہنچایا۔ (یہ بھی بتایا جائے گا کہ اسٹرکچر کی مضبوطی کا کیا معیار تھا۔ بی ایس ایس کے مطابق اس میں

سیمنٹ اور کنکریٹ کی قوت۔ کتنے ہزار راؤنڈ فی منٹ برسانے والی) پھر رائفلوں، مشین گنوں اور ریوالوروں کی تعداد بتائی جائے گی۔ تباہ شدہ اتنے اور صحیح حالت میں ملنے والے اتنے۔ پھر ساخت وغیرہ کا ذکر ہو گا۔ ان کے راؤنڈ شمار کیے جائیں گے۔ لاشیں گنی جائیں گی اور ہر لاش کی پوسٹ مارٹم رپورٹ ہو گی۔

لیکن اس مفصل رپورٹ میں کہیں ایک سطر بھی اُن کے بارے میں نہیں ہو گی جو اسی چھت کے نیچے اپنی ذات کے جہنم میں روز و شب کے ہر لمحے کا عذاب جھیلتے رہے۔ جو تہی دست اور بے آسرا اور بے نوا تھے اور اُن کی ساری طاقت ان کا عزم تھا۔ ان کا خلوص تھا اور ان کا ناقابلِ تسخیر جذبہ تھا۔ وطن کی پاسبانی کا جذبہ، وفا کی راہ میں نذرانۂ جاں کو بہت کم سمجھنے کا جذبہ۔ غداروں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کا جذبہ۔ پوچھنے والے اُن سے پوچھتے تھے کہ تمہارے ساتھ کون سی سپر پاور ہے؟ کون سی سیاسی جماعت ہے؟ تمہاری عسکری قوت کیا ہے؟ اور وہ مردانِ حق... سر فروش اور جنونی لوگوں کا ٹولہ ایسی باتوں کا جواب نہیں دے سکتا تھا چنانچہ اُن کے جسم پر ستم کا ہر تیر آزمایا گیا اور تشدد کا ہر سامان استعمال کیا گیا۔ ان کو ذہنی اذیت کے ناقابلِ تصور عذاب میں زندہ رہنے پر مجبور کیا گیا۔ اس رپورٹ میں کہیں نہیں لکھا جائے گا کہ وہاں ایک عقوبت خانہ بھی تھا۔ کوئی ان لاشوں کو شمار کرتے وقت یہ نہیں لکھے گا کہ ان میں سے کس نے کیا ظلم کیا تھا۔ ان کی پوسٹ مارٹم رپورٹ میں یہ درج نہیں ہو گا کہ وہ کون ننگے کمانڈوز کس قسم کے ننگِ انسانیت اور ظالمانہ احکامات کی تعمیل کرتے تھے اور کراتے تھے۔ مجھ پر اور محسن اور رابعہ پر جو بیتی، اس کی کسی کو خبر نہیں ہو گی۔ کاش یہ ممکن ہوتا کہ وہ ماہرین اس فلم کو دیکھ سکتے اور اس فلمی سین کی شوٹنگ دیکھ سکتے جو میں نے دیکھی تھی اور وہ بھی انھی حالات میں دیکھتے جن سے میں گزر رہا تھا۔ پھر اُن کی رپورٹ مکمل ہوتی۔ اس میں صرف اعداد و شمار نہ ہوتے۔ حقائق کی وہ تصویریں ہوتیں جسے دیکھنے والی ہر آنکھ سے خون کے آنسو ٹپکتے۔

ستم تو یہ تھا کہ اگر ان رپورٹ مرتب کرنے والوں کو ہماری موجودگی کا ثبوت مل جائے گا تو وہ لکھیں گے کہ یہاں کچھ مفرور مجرم بھی روپوش تھے۔ ان میں سکندر بخت بھی تھا جو متعدد مقدمات میں پولیس کو مطلوب تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ جان بچا کے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ ہم جس وطن کی خاطر جان کی بازی لگائے ہوئے تھے اسی وطن کے قانون نے ہمیں مجرم بنا رکھا تھا۔ ہماری قربانی... ہماری مشکلات اور ہماری جد و جہد کی کوئی قدر کرنے والا نہ تھا۔ کوئی یہ بھی نہیں سمجھ سکتا تھا کہ ہم کتنا بڑا کام کر رہے تھے اور کتنی مضحکہ خیز بے سر و سامانی کے ساتھ۔ خیر... کبھی تاریخ لکھی گئی تو شاید اس کا ایک سنہرا باب ہمارے نام سے منسوب ہو۔ ہر چند کہ آج تک ایسا نہیں ہوا۔ تاریخ سب سے زیادہ مظلوم ہے کہ اسے لکھنے والوں نے اپنے مفادات کے تحت مرتب کیا یا اپنے جذباتی نقطۂ نظر سے سمجھ کے لکھا۔

یہ سب خیالات ان چند منٹوں میں میرے ذہن سے گزرے جو میں نے منہ کے بل مٹی میں پڑے ہوئے گزارے۔ اتنا سوچنے کے لیے وقت نہیں تھا۔ یہ ایسے ہی تھا جیسے کوئی متعدد بار کی پڑھی ہوئی کتاب دیکھے تو صرف ایک خیال کی طرح کتاب کا موضوع ذہن میں آ جائے یا کسی مشہور فلم کا نام سُنے تو اُسے پوری فلم کی کہانی یاد آ جائے اور اس فلم کی ہر نمایاں بات یاد آ جائے۔ خیالات پرانے تھے اور یہ میری سوچ میں جمع ہو جانے والی گرد تھی۔ جو بیٹھ گئی تھی مگر ایک پتھر پڑنے سے یہ مٹی اُڑی تو یہ ایک بگولا بن گیا۔ بالآخر ہم اس جہنم سے نکل آئے تھے اور ہم نے اس جہنم ارضی کو نیست و نابود بھی کر دیا تھا مگر ابھی نہ جانے ایسے کتنے جہنم ہمارے انتظار میں تھے اور ہماری راہ میں تھے۔

صبح ہونے والی تھی۔ میں اٹھا تو میں نے آنکھوں سے اور چہرے سے گرد صاف کی اور پھر گرد اور دھوئیں کے اس بادل کو دیکھا جو بہت بلند ہو چکا تھا۔ میرے کانوں میں ابھی تک سیٹیاں سی بج رہی تھیں اور مجھے زمین اپنے قدموں کے نیچے ابھی تک لرزتی محسوس ہوتی تھی۔ جس دھماکے نے دور ہونے کے باوجود مجھے اُچھال دیا تھا، اس نے محسن کا کیا حال کیا ہو گا؟ یہ سوچتے ہوئے بھی میں ڈرتا تھا۔ ابھی تک اس کا کہیں پتا نہ تھا مگر میں خود کو قائل کر رہا تھا کہ وہ نکل آئے گا۔ اسے اتنے میں کچھ وقت تو لگے گا۔ میری نظریں اُسے تلاش کر رہی تھیں اور میرے کانوں میں محسن کے آخری الفاظ گونج رہے تھے۔ اس نے بات مذاق میں کی تھی... اس دنیا میں نہ سہی اگلے جہان میں ملیں گے۔ مگر بعض اوقات زبان سے مذاق میں نکلنے والی بات تقدیر کا بے رحم مذاق بن جاتی ہے... اور وہ تو زندہ رہنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ نہیں... وہ اتنا کم ہمت نہیں ہے۔ اس نے یہ ضرور کہا تھا کہ شہلا کے مر جانے کے بعد جینے کی تمنا کسے ہے؛ مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ وہ مرنا چاہتا تھا۔

"محسن..." میں نے آواز میں اپنے جذبات کی ساری فریاد کو شامل کر کے اسے پکارا۔ اتنی قوت سے کہ وہ زیرِ زمین بھی ہوتا تو میری آواز سن لیتا۔ میں نے گلے کی ساری طاقت کے ساتھ اُسے آواز دی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس دیوانگی کا جواب کون دے گا... ویرانے میں میری صدائیں گم ہو جائیں گی، جیسے صحرا کی پیاسی ریت میں بارش کا ایک قطرہ... چنانچہ جواب میرے بہت قریب سے آیا تو میں یوں اُچھل پڑا جیسے کوئی لعنت دوسرا اژدہا کا میرے پیچھے پڑ گیا ہو۔

"اتنا کیوں چلّا رہا ہے بھائی...؟" محسن نے کہا اور میں ایک دم پلٹا۔

"یہ... یہ تو... تو ٹھیک ہے نا...؟" میں اس کی طرف دوڑا اور اس سے لپٹ گیا۔

"ابے بھوت... کیوں چمٹ گیا مجھ سے...؟" محسن ہنسنے لگا۔ "کیا تو جانتا نہیں کہ میں... میں نہیں ہوں... میں محسن کا بھوت ہوں... محسن تو مارا گیا۔"

"میں سخت پریشان ہو گیا تھا یار..." میں نے محسن کو چھوڑتے ہوئے کہا۔ "میں بہت ڈر گیا تھا۔"

محسن نے میرے کندھے پر ہاتھ مارا۔ "ابے ایسے مرنے والے ہوتے، تو بہت پہلے مر جاتے... بہت ڈھیٹ چیز ہیں ہم..."

"یہ سب اللہ کا فضل و کرم ہے محسن..." میں نے کہا۔ "ذرا تو خود سوچ کہ جس حال میں ہم یہاں تھے۔ ابھی دو دن کیا، دو گھنٹے پہلے بھی ہم اس پوزیشن میں تھے کہ کوئی بڑا کارنامہ سر انجام دینے کا خیال بھی دل میں لاتے؟"

"مصیبت پہلے بھی آئی تھی۔" محسن بولا۔ "اور مصیبت سے ہم نکلے بھی تھے لیکن اب کے نظر آتے تھے کچھ آثار جُدا... امید تک ساتھ چھوڑ گئی تھی۔"

"چل اب یہاں سے نکلنے کی فکر کر..." میں نے کہا۔ "تو زخمی ہے۔"

محسن ہنسا۔ "اتنا زخمی تو تو بھی ہے... یہ تو خراشیں آئی ہیں جب میں بٹن دبا کے بھاگا تو پتا نہیں کیا ہوا... مجھے ایسا لگا جیسے بم کے ساتھ ہی میں بھی اُڑ گیا ہوں... کسی جن کے نظر نہ آنے والے بہت طاقتور ہاتھ نے مجھے اٹھا کے باہر پھینک دیا۔"

"میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا لیکن میں دور تھا۔" میں نے کہا۔

"میں تو بس زندگی تھی کہ بچ گیا۔" محسن بولا۔ "اگر میرا رُخ اس دیوار کے شگاف کی طرف نہ ہوتا تو میں چھت سے ٹکراتا یا دیوار سے اور میرا سر پھٹ جاتا... میرا رُخ باہر کی جانب تھا۔ چنانچہ میں اس شگاف سے باہر جا پڑا۔ اسی سے یہ خراشیں آئی ہیں۔ کنکر پتھر لگے تھے۔ سخت چٹان ہوتی تو شاید زیادہ چوٹ آتی... جیسے ہی میں باہر گرا، وہ دیوار منہدم ہو گئی اور شگاف بند ہو گیا۔ میں وہیں رُک گیا ورنہ پھسلتا ہوا واپس جاتا اور اندر ہی دفن ہو جاتا۔ مجھے تو اٹھنے کا ہوش بھی نہیں تھا اور کافی دیر تک مجھے کچھ نظر نہیں آیا۔ اتنی مٹی تھی کہ میری ناک، حلق اور آنکھوں میں بھر گئی اور مجھے سانس لینا دشوار ہو گیا۔ پھر بارود کی بو تھی لیکن خدا کا شکر ہے کہ دھواں نہیں تھا۔ دھواں بعد میں اٹھا، جب میں خود اٹھ چکا تھا۔ ہوش آنے سے پہلے تو مجھے خیال آیا تھا کہ دنیا سے اٹھ چکا مگر جب زندہ ہونے کا یقین آیا تو میں اٹھ کے بھاگا... دل پر ایک دہشت سوار تھی کہ ابھی دوسرا دھماکا ہوا تو نہ جانے کدھر جا کے گروں گا۔ اپنی حالت کا جائزہ بھی میں نے بعد میں لیا۔ ایس پی صاحب خیریت سے ہیں نا؟"

"ہاں... ابھی سو کے نہیں اٹھے۔" میں نے پلٹ کر کہا اور اُس طرف اشارہ کیا جہاں سراج بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ "اُدھر لیٹے ہوئے ہیں۔"

محسن کی صورت پر بارہ بج گئے۔ "کہاں؟"

نظر میری بھی اس خالی جگہ پر ٹھہر گئی تھی جہاں ابھی چند منٹ پہلے سراج بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ "مردود... وہ بھاگ گیا محسن۔" میں نے کہا۔ "مکر کیے پڑا تھا۔ اُسے موقع مل گیا۔"

"کوئی بات نہیں..." محسن نے میرے کندھے پر تھپکی دی۔ "جائے گا کہاں... ہمارے سامنے سے تو گزرا نہیں۔ گیا ہو گا تو ادھر ہی گیا ہو گا۔ تو تھوڑا سا دائیں طرف جا، میں اِدھر بائیں طرف رہتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے... اتنی سی دیر میں وہ بہت دور نہیں جا سکتا۔ اس کی حالت بھی ایسی نہیں ہے کہ وہ چیتے کی طرح دوڑ سکے۔ ایک میل کے اندر ہی ہو گا ابھی۔"

"زیادہ دور مت جانا۔" محسن نے کہا۔ "یہ نہ ہو کہ ہم ہی بچھڑ جائیں اور باقی وقت ایک دوسرے کو ہی تلاش کرتے رہیں۔"

ہم دونوں ساتھ ساتھ روانہ ہوئے۔ ہم دونوں کے پاس اب دو دو ریوالور تھے۔ جو ہم نے سراج سے، ہسٹر ایکس سے اور دو محافظوں سے حاصل کیے تھے... ایک ایک ہم نے ہاتھ میں رکھا اور اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے چلتے گئے۔ میری نظر زمین پر تھی کہ کہیں کوئی نقشِ قدم یا سراج کے گزرنے کی کوئی نشانی دکھائی دے تو ہم اپنی سمت کا تعین کر سکیں مگر وہاں جھاڑیاں تھیں اور بھربھری زمین تھی جس میں نصف سے زیادہ کنکروں کی آمیزش تھی۔ اس پر نقشِ پا کا ثبت ہونا مشکل تھا۔ سورج

نکل آنے کے بعد راستہ صاف نظر آنے لگا تھا۔

"شیطان سے زیادہ مکار آدمی ہے یہ سراج بھی۔" محسن بولا۔

"ہاں — خبیث نے کس طرح مجھے قسم دے کر پابند کیا تھا۔" میں نے کہا۔ "یہ تو اچھا ہوا کہ خود اس نے اپنی طرف سے بدعہدی کی اور اب میں قسم نباہنے کا پابند نہیں رہا۔"

"ورنہ کیا تو سچ مچ اس کو جانے دیتا؟"

"ہاں — قسم تو قسم ہی ہوتی ہے یار — آدمی دنیا کو دھوکا دے سکتا ہے لیکن اپنے ضمیر کو دھوکا نہیں دے سکتا۔" میں نے کہا۔

"کیا ہو گیا ہے تجھے — ابے یہ جنگ ہے کوئی امن کا زمانہ نہیں ہے.... کم سے کم ہمارے لیے — جنگ چل رہی ہو تو یہ سارے ادب آداب — اصول اور شرافت کے قاعدے ضابطے نہیں چلتے۔"

"میں مانتا ہوں —" میں نے کہا۔ "مگر اس وقت میرا یہی خیال تھا کہ سراج کو اپنی طرف سے ایک موقع ضرور دوں گا — ممکن ہے باہر آ کے میرا بھی خیال بدل جاتا — لیکن سب سے بڑی عقل مندی کا ثبوت تو اس نے دیا تھا — تو قسم سے بچ گیا تھا اس لیے مجھے اطمینان تھا۔"

"یہ بھی اچھا ہوا کہ ہم نے جو ملا، پیٹ میں ڈال لیا تھا۔" محسن نے کہا۔ "ورنہ اس وقت چلنے کی طاقت بھی نہ ہوتی۔"

"سراج کا ملنا بہت ضروری ہے۔" میں نے تشویش سے کہا۔ "ورنہ ہم کدھر جائیں گے — ان سب کا سراغ سراج ہی سے مل سکتا ہے۔"

میری مراد رابعہ کیتھرین اور شیلڈی سے تھی اور محسن نے یہ بات سمجھ لی — اس نے سر ہلایا اور اچانک اس کی صورت پر دکھ کا تاریک سایہ پھیل گیا۔ میں نے اس کے وجود کو ڈسنے والے خیال کے کرب کو دیکھا — ایک لمحے کی کسک محسن کی آنکھوں تک آئی مگر اس نے درد کو اشک نہیں بننے دیا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ شہلا کی یاد تھی — جو اس کی محبوبہ تھی — اس کی بیوی تھی اور اس کے ہونے والے بچے کی ماں تھی۔ اس بچے کی جس نے محسن کے خیالوں میں ہی زندگی پائی اور حقیقت کی دنیا میں قدم رکھنے سے پہلے ہی دم توڑ دیا۔ میں محسن سے تسلی اور ہمدردی کے الفاظ کہنا چاہتا تھا لیکن نہ جانے کیوں مجھے الفاظ ہی نہیں سوجھے — میں سوچتا رہا کہ محسن سے کیا کہوں۔ کہنے کے لیے کچھ بھی تو نہیں — الفاظ ہیں تو وہ بس الفاظ ہیں — الفاظ کیا کر سکتے ہیں — کون سا دکھ دور کر سکتے ہیں۔ کس نقصان کی تلافی کر سکتے ہیں۔ کس درد کا درماں بن سکتے ہیں — کیسے زخم بھر سکتے ہیں — یہ سب تو خدا کرے گا اور وقت کرے گا جو سب سے بڑا مسیحا ہے۔ چنانچہ میں چپ رہا۔ کچھ بھی نہ بول سکا — پھر میں نے دیکھا تو محسن مسکرا رہا تھا۔

"اب یہاں سے میں تھوڑا سا دائیں طرف جاتا ہوں۔" محسن نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ کے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی لیکن ہر طرف وہی قدِ آدم جھاڑیاں تھیں اور جنگل تھا جو اب گھنا ہوتا جا رہا تھا — اس زرخیز مٹی والے علاقے میں نیم ریگستانی علاقے کا وجود میرے لیے باعثِ حیرت تھا۔ لیکن وہ بہت چھوٹا سا قطعۂ زمین تھا۔ اب جہاں سے ہم گزر رہے تھے، وہاں سونا اگلنے والی مٹی تھی۔ ہر طرف سبزہ اُگ رہا تھا اور بقولِ غالب سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی — بن گیا سطحِ آب پر کاہی۔ شیشم، دریک اور پیپل کے درخت زیادہ نظر آنے لگے تھے۔ جس سے فضا میں صبحِ بہار کی لطافت اور خوشبو آ گئی تھی — درختوں پر بسیرا کرنے والے پرندے اب تلاشِ رزق کے لیے پر تول رہے تھے اور ان کی چہکار ہر سمت سے سنائی دیتی تھی — آبادی کے نشان ہنوز مفقود تھے ورنہ مجھے زمین پر پگڈنڈیاں نظر آ جاتیں۔ پگڈنڈی قرب و جوار میں انسانی آبادی کی علامت ہوتی ہے۔ یہ بتاتی ہے کہ عین اسی جگہ سے لوگ گزرتے ہیں۔ اکا دکا آدمی ہل چلانے والے — بازار جانے والے — کھیتوں میں محنت کرنے والوں کے لیے کھانا لے جانے والی جفاکش بیویاں۔ کنوؤں سے پانی بھر کر لانے والی مٹیاریں — نہ جانے کتنی صدیوں تک آدمی کے قدم زمین کو ایک ہی جگہ سے روندتے جاتے ہیں اور تب آہستہ آہستہ ناہموار کچی زمین پر ایک راستے کے نقوش ابھرنے لگتے ہیں۔ شہر میں محکمۂ تعمیرات والے منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ نقشے بنواتے ہیں — سروے ہوتا ہے۔ ٹینڈر طلب کیے جاتے ہیں اور مجموعی اخراجات کا حساب لگایا جاتا ہے کہ اس میں سے کتنا سڑک کی تعمیر پر صرف ہو گا اور کتنا کس کس کی جیب میں جائے گا — اسے منافع، نذرانہ — کمیشن یا رشوت، کچھ بھی سمجھا جا سکتا ہے جو سڑک بنانے والے مل بانٹ کے کھاتے ہیں — گاؤں میں ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ بس آدمی چلتے جاتے ہیں۔ ان کے پیر مخصوص قدموں کے نشان دیکھ کر ایک ہی راستے پر اٹھتے رہتے ہیں — باپ کے بعد بیٹا — پھر اس کی اولاد — سب اس پر چلتے ہیں اور یہ انسانی قدم خود بخود ایک سڑک بنا دیتے ہیں۔ کسی سروے — بلیو پرنٹ اور ٹینڈر کے بغیر — اور پھر یہ راستے شاہراہوں کی طرح گاؤں کو گاؤں سے اور گھر کو گھر سے ملاتے ہیں اور کبھی مسافروں کو بھٹکنے نہیں دیتے مگر یہاں مجھے ایسے آثار بالکل دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

"حیرت کی بات ہے محسن، کہ اتنا بڑا دھماکا کسی نے نہیں سنا۔" میں نے کہا۔

"سنا ہو گا تو آنے والوں کو وقت لگے گا۔" محسن بولا۔ "کون جانے یہاں سے آبادی کتنے کوس پر ہے — میرا خیال ہے ادھر ہو گی — مخالف سمت میں — جدھر سے ہم آئے ہیں — دھماکا یقیناً تین چار میل تک تو ضرور سنا گیا ہو گا۔"

"صبح صبح کا وقت تھا — آٹھ دس میل تک آواز پہنچی ہو گی۔" میں نے کہا۔

"میں اس طرف پینتالیس ڈگری پر جاتا ہوں — تو دوسری طرف پینتالیس ڈگری کے زاویے پر تلاش کر۔" محسن نے کہا۔ "لیکن منہ اٹھا کے چلتے نہیں جانا ہے — ایک میل کے بعد پھر پینتالیس درجے مڑ کر چلنا شروع کریں گے تو ایک جگہ مل جائیں گے — تقریباً ڈیڑھ میل کے فاصلے پر۔"

"یہ حساب کا فارمولا ہے بھائی — غلط نہ ہو جائے۔" میں نے کہا۔ "میں نکل جاؤں کالاشاہ کاکو کی طرف اور تو جا پہنچے، چیچہ کی ملیاں...."

آہستہ آہستہ ہم دونوں کے درمیان فاصلہ بڑھنے لگا۔ میں نے محسن کے غائب ہونے سے پہلے اس کی طرف ہاتھ اٹھا کے انگلیوں سے وی کا نشان بنایا — وی فار وکٹری — اس نے جواب میں مجھے مٹھی بند کر کے مکا دکھایا جو اتحاد کی علامت تھا اور طاقت کا مظہر تھا — یہ مکا پاکستان کے پہلے وزیرِ اعظم مرحوم لیاقت علی خان نے ایک جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے دکھایا تھا اور تب سے بہت شہرت حاصل کر گیا تھا — مجھے اس وقت محسن کا یہ اشارہ بہت حوصلہ افزا لگا۔ یہ اتفاق میں برکت ہے کا سمبل تھا۔ مل کر رہو اور متحد رہو تو یہی سب سے بڑی قوت ہے۔

محسن درختوں میں غائب ہو گیا تو میں نے زیادہ انہماک کے ساتھ زمین کے آثار پر غور کرنا شروع کیا۔ ہمارے ملک کے ریگستانی اور پہاڑی علاقوں میں جہاں عام طور پر جغرافیائی حالات کسی سراغ کو باقی نہیں رہنے دیتے۔ تجربہ کار کھوجی قدموں کے نشان دیکھ لیتے ہیں یا وہ نشانیاں تلاش کر لیتے ہیں جن سے معلوم ہو جاتا ہے کہ کوئی شخص کدھر گیا ہے — ان کی آنکھیں انتہائی باریک بیں اور تیز ہوتی ہیں کہ گھاس کی ایک پتی بھی مڑی ہوئی یا ٹوٹی ہوئی دکھائی دے تو وہ چوکتے نہیں اور بیشتر صورتوں میں ان کی تلاش کامیاب ثابت ہوتی ہے۔ ضروری نہیں کہ ہر بار وہ کسی مجرم کو ہی تلاش کریں۔ بعض اوقات کوئی معذور گھوڑا یا منحرف ہو جانے والا اونٹ بھی ڈھونڈنا پڑتا ہے تو وہ ڈھونڈ نکالتے ہیں — ان کی نظر صرف سُموں کے نشان ہی نہیں دیکھتی — جانور نے جہاں گھاس پر منہ مارا ہو یا درختوں سے پتے توڑے ہوں، یہ کھوجی اسے بھی نوٹ کر لیتے ہیں۔ اس وقت میرے ساتھ ایسا ہی کوئی کھوجی ہوتا تو مجھے سیدھا سراج کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیتا۔

تاہم میں سراغ رسانی کے فن میں اپنی نااہلی کے خیال سے مایوس نہیں ہوا۔ میں نے زمین کا مشاہدہ جاری رکھا۔ ایک جگہ مجھے پگڈنڈی دکھائی دی، جو دائیں سے بائیں جا رہی تھی مگر میں نے اس پر چلنے کا خیال چھوڑ دیا۔ ایک تو اس لیے کہ مجھے محسن کی ہدایات کے مطابق ناک کی سیدھ میں اور پینتالیس ڈگری پر چلنا تھا اور میں پگڈنڈی پر ہو لیتا تو محسن سے نہ مل پاتا۔ دوسری وجہ میرا ذاتی خیال تھی کہ سراج چالاک آدمی ہے — وہ عام اور آسان راستے سے دور رہے گا۔ وہ دشوار گزار راستہ اختیار کرے گا، جہاں کسی سے ملنے کا امکان کم سے کم ہو۔

ایک جگہ میرے قدم خود بخود رک گئے اور میں ارشمیدس کی طرح — "پالیا.... پالیا...." چلاتے چلاتے رک گیا — گھاس پر خون تھا — میں نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس داغ کو غور سے دیکھا تو مجھے مایوسی ہوئی — یہ بہت پرانا خون تھا جو خشک ہو چکا تھا۔ کچھ آگے جا کے مجھے یہی خون پھر نظر آیا۔ چوتھی جگہ یہ خون گھاس پر پپڑی بن کے منجمد ہو گیا تھا اور میں نے اس پپڑی کو اٹھایا تو یہ سرخ رنگ کا پاپڑ ٹوٹ گیا۔ میرے لیے یہ طے کرنا مشکل تھا کہ خون آدمی کا ہے یا جانور کا مگر اتنا میں وثوق سے کہہ سکتا تھا کہ خون بہت پرانا تھا — وہیں میری ناک نے تعفن بھی محسوس کیا اور کچھ آگے جانے پر میں نے ایک لاش دیکھی — مگر وہ لاش کتے کے سائز کے کسی جانور کی تھی۔ وہ لومڑی بھی ہو سکتی تھی اور گیدڑ بھی ہو سکتا تھا۔ یہ اسی کا خون تھا۔ جانور اب ہڈیوں کا پنجر رہ گیا تھا۔ اس کا سارا گوشت حشرات الارض اور مردار خور جانور کھا چکے تھے۔

"لاحول ولا قوۃ —" میں نے زور سے کہا اور ناک پر رومال رکھ لیا۔

"باہر کس پر لاحول بھیجتا ہے —" میرے پیچھے سے کسی نے خوفناک آواز میں کہا۔ "شیطان تو تیرے اندر ہے — بھوت کے بچے...."

میں اچھل پڑا — بے اختیار میرا ہاتھ ریوالور پر گیا — لیکن وہ کوئی ملنگ تھا... پچاس ساٹھ سال کا یا اس سے بھی

زیادہ عمر کا۔۔۔ اس کی صحت اب بھی اچھی تھی۔ اس نے عجیب مضحکہ خیز حلیہ بنا رکھا تھا۔۔۔ ملنگ سے زیادہ وہ جوکر لگتا تھا۔۔۔ اس کی دھوتی پہلے ضرور نارنجی رہی ہوگی مگر اب اس پہ داغ ہی داغ تھے۔۔۔ گرد و غبار اور میل نے دھوتی کو ہزار رنگ دے دیے تھے۔ مزید یہ کہ کثرتِ استعمال سے دھوتی ایئر کنڈیشنڈ ہوگئی تھی اور اس میں ہر طرف تازہ ہوا کے آنے اور جانے کے لیے چھوٹے بڑے متعدد سوراخ ہو چکے تھے۔۔۔ دھوتی پہ اس نے بے حد میلا کچیلا' پھٹا ہوا اور لال رنگ کا کوٹ پہن رکھا تھا۔ بقول ضمیر جعفری یہ لنڈا کا کوٹ تھا تو۔۔۔ کسی مرے ہوئے گورے کی یادگار ہے یہ۔۔۔ گورے کے بعد اس کو ہمارے وطن کے کسی غریب کالے نے پہنا تھا اور جب اس کے لیے بھی بے مصرف ہوگیا تو شاید اس نے کسی کو خیرات کر دیا تھا۔۔۔ اب یہ ملنگ اسے بڑی شان سے پہنے کھڑا تھا۔ اس کے سر پہ جو فلیٹ ہیٹ تھا' اسے ملنگ نے کھینچ کھینچ کر کانوں تک بڑھا دیا تھا اور اس کے درمیانی حصے میں ملنگ کا سر۔۔۔ کسی گیند کی طرح نظر آتا تھا۔ باقی چیزوں کی طرح یہ فلیٹ ہیٹ بھی تاریخی حیثیت رکھتا تھا جس کے نیچے سے ملنگ کے لمبے مگر الجھے ہوئے سفید بال نکلے ہوئے تھے۔۔۔ سر کے بال اس کی جھاڑ جھنکاڑ داڑھی میں یوں مل گئے تھے... کہ من تو شدم تو من شدی کا منظر تھا۔۔۔ پتا نہیں چلتا تھا کہ داڑھی کہاں ختم ہوئی اور جٹائیں کہاں شروع ہوئیں۔ اس کے ہاتھ میں ایک بہت موٹا ڈنڈا تھا جسے اصطلاحاً "گھوٹنا" کہا جاتا ہے اور جو کونڈی کے لیے بہت ضروری ہوتا ہے..... اکیلی........ کونڈی بھنگ نہیں گھوٹ سکتی جو ہمارے ملنگوں کا فیورٹ ڈرنک ہے۔ ملنگ نے گلے میں چھوٹے بڑے رنگین منکوں کی جو مالائیں پہن رکھی تھیں' اُن کا وزن دو سیر تو ضرور ہوگا۔۔۔ یہ فریبی ملنگ۔۔۔ مجذوب اور سیریا تو نیم پاگل ہوتے ہیں اور کمزور عقیدے کے لوگ ان کی بے سروپا باتوں سے اپنی اپنی عقل اور ضرورت کے مطابق مفہوم اخذ کر کے انھیں معرفت کی باتیں سمجھ لیتے ہیں۔۔۔ یا یہ بہت چالاک لوگ ہوتے ہیں اور جانتے بوجھتے ہوئے بھی ایسا حلیہ بناتے ہیں کہ عام آدمی دیکھ کر مرعوب تو نہیں ہوتا' کچھ خوف زدہ ہو جاتا ہے۔۔۔ یہی خوف ان کے دل میں عقیدت پیدا کرتا ہے۔ اگر یہ ملنگ اپنے گلے میں ایک بے ضرر سانپ ڈال لیتا تو نہ جانے کتنے لوگ اس کے پیر چھوتے۔

"کیا کہا۔۔۔؟" میں نے ریوالور کا رُخ اس کی طرف کر دیا۔ "میں بھوت کا بچہ ہوں۔۔۔ کارٹون کی اولاد؟"

ملنگ کی گھگی بندھ گئی۔ "ارے... ارے بابا... غلطی ہوگئی فقیروں سے۔۔۔ جانے دے ہمیں نامُراد۔۔۔ اور تو بھی نامُراد جا۔۔۔ اس دُنیا سے جا' یا یہاں سے جا..."

"میں جاؤں۔۔۔؟" میں نے گرج کے کہا۔ "پہلے میں تجھے تو بھیج دوں نامُراد کے بچے۔۔۔ بیٹھ۔۔۔ چل بیٹھ نیچے۔"

"ہم تو ہیں مٹی کے کیڑے۔۔۔ مٹی ہمارا اوڑھنا بچھونا ہے۔ ہم مٹی میں مل جائیں گے۔۔۔" وہ بھد سے نیچے بیٹھ گیا۔ "مگر تو مٹی میں سونا کھوج رہا ہے۔۔۔ تیرے من میں لوہ مایا ہے۔۔۔ تیری نظر خزانے تلاش کر رہی ہے۔"

"اپنا ریکارڈ بند کر دو ملنگ مہاراج' ورنہ مارتے مارتے پلنگ بنا دوں گا..."

"کیا بنا دے گا۔۔۔ پلنگ... یعنی چارپائی۔۔۔ نادان ہم پہلے ہی چوپائے ہیں۔" وہ بولا۔

"میں پتنگ بنانے کی بات کر رہا تھا۔" میں نے کہا۔ "ویسا ہی ہلکا پھلکا کر کے اڑا دوں گا۔۔۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"ہم اپنے سوہنے محبوب کو تلاش کر رہے ہیں' بھوت کے بچے۔"

"پھر.... پھر بھوت کا بچہ کہا۔" میں نے اس کے ایک جھانپڑ رسید کرنا چاہا مگر وہ بڑی پھرتی سے لیٹ گیا۔ "سیدھی طرح جواب دے.... بدمعاش۔۔۔ کون ہے تو؟"

"فقیر پہ ہاتھ اٹھائے گا تو اللہ تجھے اٹھائے گا بھوت کے بچے۔" ملنگ نے اٹھ کر کہا۔ "ابھی موقع ہے.. جو مانگنا ہے مانگ لے۔"

"میں ایک سوال کا جواب مانگ رہا ہوں۔" میں نے تنگ آ کر اسے بھوت کا بچہ کہنے پہ معاف کر دیا۔ "تم نے کسی آدمی کو ادھر سے گزرتے دیکھا ہے؟"

"کیا تو آدمی نہیں ہے۔۔۔ ہمیں پتا تھا تو مان جائے گا کہ تو بھوت کا بچہ ہے۔" اس نے ایک خوفناک قہقہہ لگایا۔

اب مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔۔۔ میں نے اس کے ایک لات رسید کی۔۔۔ وہ گرا اور پھر اٹھ کے بیٹھ گیا۔۔۔ لات اس کے صحیح نہیں پڑی تھی۔

"میرے علاوہ کسی اور کو دیکھا ہے؟" میں نے کہا۔

اس نے اپنا فلیٹ ہیٹ جھاڑ کر سر پہ رکھا اور کھینچ کر کھوپڑی پہ فٹ کر لیا۔ "ہم نے تو بہت کچھ گزرتے دیکھا ہے وقت کو۔۔۔ بادشاہوں کے جاہ و جلال کو۔۔۔ فرنگی کے دورِ استبداد کو۔۔۔ دل پہ قیامت کو۔۔۔ شاہِ جنات کو۔"

میں اس کے منہ سے یہ الفاظ سن کے چونکا۔ اچانک اس نے عالمانہ قسم کی گفتگو شروع کر دی تھی۔۔۔ کسی جاہل آدمی کے لیے یہ مجذوب کی بڑ ہو سکتی تھی مگر میرے لیے یہ بہت بامعنی اور کسی حد تک شاعرانہ گفتگو تھی۔

"ہم تو تجھے بھی گزرتا دیکھیں گے۔ بھوت کے بچے۔" وہ بولتا گیا۔

میں نے اُس کی داڑھی پکڑ لی۔ "سچ بتاؤ' تم کون ہو؟ مجھے تو تم دشمن کے ایجنٹ لگتے ہو۔"

"ارے بابا۔۔۔ کیوں ہماری اکلوتی داڑھی کا دشمن ہوا ہے۔ چھوڑ اسے۔۔۔ پکڑنا ہے تو کچھ اور پکڑ لے۔۔۔ یہ عصا پکڑ لے' ہمارا ہاتھ پکڑ لے۔" وہ شور مچانے لگا۔

"میں اس وقت تک نہیں چھوڑوں گا' جب تک حقیقت معلوم نہیں کر لوں گا۔" میں نے کہا۔ "تو اس اڈے کے آس پاس گھوم رہا تھا۔۔۔ تیرا یہ بھیس فقیروں والا ہے مگر تو فقیر نہیں ہے۔"

"بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب.... تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں۔۔۔ سمجھا بھوت کے بچے۔" اس نے اپنی اصل آواز میں کہا اور میں نے غالب کی آواز پہچانی تو انتہائے حیرت سے منجمد ہو گیا۔

"ارے بھائی! اب تو داڑھی چھوڑ دو ہماری امپورٹڈ داڑھی کا ناس کر دیا جھٹکوں سے۔۔۔" غالب بولا۔

"غالب۔۔۔ مرزا غالب۔" میں نے چیخ کر کہا۔۔۔ پھر میں اس سے لپٹ گیا۔ اس نے مجھے دھائیں مکے مارے اور میں نے اُسے۔ محبت اور خوشی میں ہم ایک دوسرے کو جتنی گالیاں دے سکتے تھے' دے چکے تو میں نے آنکھوں میں خود بخود آ جانے والے آنسو صاف کیے۔

"تو زندہ ہے۔۔۔ مجھے پتا تھا' تو نہیں مر سکتا بھوت کے بچے!" میں نے مرزا غالب سے کہا۔ "تو غائب ہو گیا تھا بھوت کے بچے۔۔۔ مگر تو یہاں کیسے پہنچا؟"

"جیسے تو پہنچا۔" غالب نے اپنے گندے کوٹ کی جیب میں سے سگریٹ نکالی اور وہیں بیٹھ گیا۔ "آدمی کو اس کی تقدیر کہیں بھی لے جا سکتی ہے۔۔۔ کوئے یار سے' سُوئے دار تک۔"

"وہ تو ہے۔۔۔ مگر یہ جگہ کیسے معلوم ہوئی تجھے۔ تو اکیلا آیا ہے۔۔۔ باقی سب کہاں ہیں؟ نازو کیسی ہے؟" میں نے ایک سانس میں کہا۔

"چھری تلے دم لے۔" غالب نے دو سگریٹیں جلائیں اور ایک مجھے دے دی۔ "یہاں تو میں اکیلا ہی پہنچا ہوں۔ ایک حضرت ہیں انسپکٹر سندر داس..."

"ہیں نہیں یار.... تھے۔" میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ "کیا اُس کا پیغام مل گیا تھا؟"

"اس پیغام کے بغیر تمھارا پتا ٹھکانا کیسے ملتا؟" غالب نے کہا۔

"پھر تم نے اتنی دیر کیوں کی؟" میں نے کہا۔

"دیر کہاں کی میرے عزیز۔۔۔ تمھارے بارے میں اطلاع ملی تھی نازو کو۔۔۔ بلکہ اس کے برادرِ کلاں مسمی اکرام شیخ کو... وہ پہنچے سیدھے ایس ایس پی صاحب کے پاس۔۔۔ واضح ہو کہ خدا نے ان کے دل میں نیکی ڈالی اور ان کو صراطِ مستقیم پہ چلنے کی توفیق عطا کی۔ انھوں نے حقائق کو سمجھا اور اکرام شیخ کو نہ جانے کیا مشورہ دیا کہ وہ اپنی ہمشیرہ صاحبہ... محترمہ نازلی بیگم صاحبہ..."

"نازو کافی ہے۔۔۔ تو اپنی محبوبہ کا نام لے رہا ہے' نانی مرحوم کا نہیں۔" میں نے کہا۔

"بجا ارشاد۔۔۔ اکرام شیخ نے نازو سے مشورہ کیا اور ظاہر ہے' وہ تو ہے شاہِ جنات کی بیٹی۔" غالب بولا۔

"مگر تو کہاں مل گیا اسے؟" میں نے کہا۔ "تیرے بارے میں تو عام اطلاع یہ تھی کہ اپنے آبائی گھر میں مدفون ہے۔"

"یہ اطلاع خود میں نے دی تھی۔" غالب بولا۔ "اور سب سے پہلے نازو کو دی تھی۔۔۔ تمھارے نکلتے ہی میں بھی رفو چکر ہو گیا تھا۔ بال بال بچا ورنہ وہیں جل مرتا۔۔۔ میں نے اندازہ لگایا کہ ان حالات میں میرا مرحوم نہ ہونا ایک معجزہ ہی تھا۔ میں اندر دبکا ہوا تھا کہ مناسب وقت پہ دخل در معقولات کروں گا اور دشمنوں کو تہس نہس کر دوں گا مگر اسی میں وقت نکل گیا۔ مجھے سخت ملال تھا کہ تم لوگ کیا سمجھتے ہوگے۔۔۔ باہر نکل کے دیکھا تو تم میں سے کسی کا پتا نہ تھا۔۔۔ پھر میں کیا کرتا۔۔۔ میں عبدالودود منظر کے گھر چلا گیا۔ اس کے ایک درجن پورے ہو گئے۔"

"ایک درجن کیا پورے ہو گئے؟" میں نے کہا۔

"بچے اور کیا...." غالب نے کش لے کر جواب دیا۔ "دس تو پہلے ہی تھے۔ اس بار۔۔۔ بقول منظر کے۔۔۔ بیوی نے ایڈوانس بکنگ کر رکھی تھی۔ آئندہ سال کی چھٹی مانگی ہے اس نے۔ خیر اس کے یتیم خانے میں میرے لیے بھی جگہ نکل آئی۔۔۔ وہاں سے میں نے پہلے تو اُن کو فون کیا۔" اس نے شرمانے کی بھونڈی اداکاری کی۔

"اچھا۔۔۔ اور انھوں نے کیا کہا؟" میں نے ہنس کر کہا۔

"انھوں نے کہا.... مگر تجھے کیوں بتاؤں کہ میں نے کیا نہیں کہا اور اس نے کیا نہیں کہا۔۔۔ یہ ہماری پرائیویٹ باتیں ہیں۔"

غالب بولا۔ "آخر میں اُس نے کہا کہ جہاں ہو، وہیں رہو۔"

"مطلب یہ کہ اپنی اوقات میں رہو ـــــ خبردار، جو آگے بڑھے۔" بابے تکلف ہونے کی کوشش کی۔" میں نے کہا۔

"ایسی غلطی میں کر سکتا ہوں؟ مجھے اپنی ہڈیاں عزیز ہیں۔" غالب نے کہا۔ "اس کا مطلب تھا کہ منظر کے گھر میں رہو۔ تم لوگ یعنی اغوا شدہ حضرات و خواتین کو موقع ملا تو تم کسی نہ کسی جگہ سے رابطہ ضرور قائم کرو گے اور ایسی جگہ انکل رضوی کا گھر تھا' نازو کا گھر یا پھر عبدالودود منظر کا گھر۔ اُسے یقین تھا کہ تم خود فون نہ کر سکے تو کسی کو نمبر دے دو گے ـــ یہ ضروری ہے کہ ہم پیغام موصول کرنے کے لیے موجود ہوں۔ فون تو نہیں ملا لیکن انسپکٹر سندر داس کا ایک خط ضرور مل گیا جس میں خاصی مفید معلومات تھیں اور اس خط نے ہماری بڑی رہنمائی کی ـــ وہ کیسے مارا گیا یار ـــ ؟"

"یہ بڑی لمبی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "فرصت میں بتاؤں گا۔ یہ سمجھ لے کہ اسے سراج نے گولی مار دی۔ وہ مجھ سے ملنے آیا تھا۔"

غالب کچھ دیر چُپ رہا۔ "تھا تو وہ کافر ـــ مگر اس کے لیے مغفرت کی دُعا جائز ہوگی، آگے جو اُس غفور الرحیم کی مرضی۔"

"تُو نے بتایا نہیں کہ نازو اور اکرام شیخ کہاں ہیں؟"

"وہ بھی میرے ساتھ ہی تھے، اب کراچی میں ہیں۔" غالب نے کہا۔

"کراچی میں؟ کراچی کیا لینے گئے ہیں؟" میں نے کہا۔

"تمھیں لینے۔" غالب نے کہا۔ "پتا یہ چلا تھا کہ تم کو کسی کارگو شپ پر مال کے ساتھ کہیں بھیجا جائے گا، تم ایکسپورٹ آئیٹم ہو۔"

"وہاں ہزاروں جہاز، لاکھوں ٹن مال اُتارتے چڑھاتے ہیں۔ وہ کیا سارے جہازوں کی جامہ تلاشی لیں گے؟" میں نے کہا۔

"نہیں، سُندر داس نے لکھا تھا کہ جو کریٹ وہاں پہنچیں گے اُن پر نام پتا غلط ہے۔" غالب بولا۔ "بڑی احمقانہ حرکت تھی یہ دلاور اینڈ کمپنی کی ـــ کریٹ پر شہر کا نام تھا "ایڈ ومیٹ سٹی۔"

"اور ملک کا نام تھا دِس بی دا انیا۔ رائٹ؟" میں نے کہا۔

"رائٹ، وہ دونوں یہی دیکھیں گے۔" غالب نے کہا۔ "میں نے تو اس بت طناز کے بھائی سے کہا تھا کہ میری نظر بہت تیز ہے، میں اور نازو چلے جاتے ہیں کراچی اور قسم بھی کھائی تھی کہ ہم صرف کریٹ دیکھیں گے لیکن وہ اڑ گیا کہ نظر ہی نہیں تم خود بھی بت تیز ہو اور میری بہن تم سے بھی تیز ہے۔ میں تمھاری سلامتی اسی میں سمجھتا ہوں کہ تمھیں الگ ارسال کر دوں تاکہ تم سالم رہو ـــ پس لمے یار جانی۔" غالب نے ایک سرد آہ بھر کے کہا۔ "یہ فقیر اِدھر آگیا، صحرا کی خاک چھاننے۔"

"تُو نے کمال کا میک اَپ کیا اور خوب آواز بنائی یار ـــ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔" میں نے کہا۔ "تُو کب سے موجود ہے یہاں...؟"

"میں رات کو یہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا تھا گرد و نواح کے کچھ دیہاتیوں نے مجھے بتایا تھا کہ ادھر ایک پہاڑی سی ہے، وہاں کبھی کبھی جہاز اُترتے ہیں، بس میں سمجھ گیا کہ یہی ہے میری منزلِ مقصود، ورنہ یہاں کوئی ائرپورٹ تو ہے نہیں۔ رات بھر میں اِدھر اُدھر سے جائزہ لیتا رہا مگر مجھے سوائے ایک کمرے کے کچھ نظر نہیں آیا۔ اس کے باہر ایک نیلے رنگ کا چھوٹا سا بورڈ لگا ہُوا تھا، جس پر لکھا ہُوا تھا 'واپڈا' اور کچھ بھی نہیں، یہ کوئی گرڈ اسٹیشن تو تھا نہیں، بس ایک کمرا تھا۔ میں نے غور کیا کہ کیا یہ سب اسٹیشن ہو سکتا ہے اور اس نتیجے پر پہنچا کہ نہیں ہو سکتا۔"

"کیوں نہیں ہو سکتا دوست؟" میں نے سر کھجا کے کہا۔

"نادان دوست! سب اسٹیشن وہاں بنائے جاتے ہیں، جہاں لوڈ زیادہ ہو۔" غالب بولا۔ "ڈسٹری بیوشن گرڈ یو سمجھ لے بجلی کا، وہاں سے ہائی وولٹیج کے تار نکلتے ہیں اور صاف نظر آتے ہیں۔ ان کے باہر عموماً لال رنگ کی ایک پلیٹ لگا دی جاتی ہے اس پر ہمیشہ مجھے وہی ایک تصویر نظر آتی ہے، تیرے جدِ امجد کے سر کی پلائی کی۔ نیچے لکھا ہوتا ہے خطرہ گیارہ ہزار وولٹ یا تینتیس ہزار وولٹ، لیکن اس کمرے میں پول سے بجلی کے دو معمولی تار جا رہے تھے۔ مزید یہ کہ سب اسٹیشن اتنا چھوٹا بھی نہیں ہوتا۔"

"مرزا غالب! کاش واپڈا والے اپنا محکمہ تجھے بخش دیں آخر اتنی موٹی باتیں ان کی عقل میں کیوں نہیں آئیں؟" میں نے کہا۔

"آئی ہوں گی تو چلی گئی ہوں گی۔" غالب بولا۔ "جب ہاتھ میں نوٹ آ جاتے ہیں تو آدمی صرف نوٹ دیکھتا ہے۔ ملک اور قوم کا مفاد نہیں دیکھتا، یہ نہیں دیکھتا کہ دال میں کیا کالا ہے اور کیوں کالا ہے۔ جب میں نے تصدیق کر لی کہ یہ سب اسٹیشن نہیں اور جو سنتری باہر کھڑا ہُوا ہے، وہ بھی واپڈا کا ملازم نہیں...."

"یہ تصدیق کیسے ہوئی؟"

"میں نے سنتری کے پاس جا کر پوچھا تھا کہ بابا! کیا واپڈا میں نوکری ملے گی؟" غالب بولا۔ "وہ کہنے لگا کہ دفع ہو جاؤ، ورنہ گولی مار دوں گا۔ اس سے تصدیق ہو گئی، سچ مچ واپڈا کا ملازم ہوتا تو اتنا بُرا نہ مانتا' رشوت مانگتا یا دُعا۔ میں نے کہا بچہ، ہم تیری نوکری تو نہیں لے رہے ہیں، گولی مارنا ہے تو واپڈا کو مار اور خلقِ خدا کی دُعا لے' وہ ذرا مشتعل ہُوا اور آگے بڑھا تو میں نے اُلٹ دیا اور ٹھنڈا کر دیا۔"

"کیسے؟ خالی ہاتھوں سے... نازو کی شاگردی کر لی ہے کیا؟"

"آہ! ایسی دل دکھانے والی باتیں مت کر، وہ جفا کار حسینہ مجھے اپنی شاگردی میں قبول کرے تو میں تین تین بار ایجاب و قبول کروں۔ سنتری کو میں نے طمنچے سے ٹھنڈا کیا۔" غالب نے کوٹ میں ہاتھ ڈالا اور بغل میں سے سائیلنسر والا پستول برآمد کیا۔ "وہ دھوکے میں مارا گیا، اُسے کیسے خیال آسکتا تھا کہ آج کل کے ملنگ بھی گُدڑی میں طمنچے رکھتے ہیں۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا اندر جانے کی کہ فائرنگ کی آواز آئی اور میں دُور بھاگ گیا۔ وہ مشین گن کے فائر تھے۔ دُور سے ہی میں نے تین گاڑیاں روانہ ہوتے دیکھیں۔"

"کتنی دُور سے؟ نمبر وغیرہ دیکھا؟"

"نہیں، میں قریب ہوتا تب بھی نمبر نہ دیکھ سکتا اور دیکھ لیتا تو کیا فرق پڑتا، وہ اصلی نمبر تو نہیں ہوں گے نا۔ تینوں گاڑیاں ایک ہی سمت گئی تھیں، میں پیچھے دوڑتا تو کیسے دوڑتا۔ رات کا وقت تھا، اندھیرے میں ویسے بھی راستہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ تاہم میں اُسی طرف گیا تھا اور اب واپس آ رہا تھا کہ یہ دھماکا سُنا۔" غالب بولا۔

"وہ رابعہ، کیتھرین اور ٹیڈی کو لے گئے یار۔" میں نے کہا۔ "سراج کو ہم نے قابو میں کر لیا تھا۔"

"وہ دھماکا تم نے کیا تھا، کیا تھا یہاں؟"

"وہی جو سائیں بابا پرڈو والے کے اڈّے پر تھا۔" میں نے کہا۔ "افسوس یہ ہے کہ خبیث سراج بھاگ گیا۔ بس چند سیکنڈ کے لیے نظر چُوکی تھی کہ وہ نکل گیا۔ سُوّر کا بچہ مکر کیے بے ہوش پڑا تھا۔ میں اور محسن اُسے ہی تلاش کرنے نکلے تھے۔"

"محسن؟ کہاں ہے محسن؟" غالب ایک دم اُٹھ کھڑا ہُوا۔

"وہ مجھے کوس رہا ہوگا۔" میں نے کہا۔ "اُس نے مجھے سخت ہدایات دی تھیں کہ میں پینتالیس ڈگری پر ایک میل چلوں پھر بائیں جانب اُسی زاویے پر اتنا ہی سفر کروں تو جہاں سے ہم چلے تھے' وہاں سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر پھر مل جائیں گے۔ وہ تو پہنچ چکا ہوگا۔"

"مشکل ہے، تم دونوں کی فطرت ایک ہے۔ جب تم صراطِ مستقیم سے بھٹک گئے اور گپ لگانے بیٹھ گئے تو وہ بھی کہیں بھٹک گیا ہوگا۔" غالب نے کہا۔ "چلو اب ہم دونوں اُسے تلاش کرتے ہیں، اندازاً سمت بتاؤ۔"

میں نے اندازے سے سمت کا تعین کیا اور ہم دونوں روانہ ہوگئے۔ سُورج اب کافی بُلند ہوگیا تھا۔ میں نے اور غالب نے پہلے اُسے بُلند آواز سے پُکارنے کا سوچا اور پھر یہ ارادہ ترک کر دیا۔ ڈر یہ تھا کہ کہیں محسن سے پہلے، ہماری پُکار سراج کے کانوں تک نہ پہنچ جائے اور وہ جواب گولی سے نہ دے۔ ہم نے اُسے غیر مسلح کر دیا تھا مگر اس کا کوئی بھروسا نہیں تھا کہ باہر بھی کہیں توپ چُھپا رکھی ہو۔ دُن سے گولا داغ دے۔ گولا نہ سہی سیر بھر کا پتھر کھینچ مارے۔ اُس کے جنگل میں پائے جانے کے خاصے امکانات تھے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ ہماری نظر سے چُھپنے کے لیے درخت پر چڑھ جائے اور پتّوں میں چُھپ کر بیٹھ جائے۔ اُوپر سے سیر بھر کا پتھر وہ سیدھا ہمارے سر پر مار سکتا تھا اور ہمارے دل کی طرح ہمارے سر بھی بہت نازک تھے۔

تقریباً پون گھنٹے تک ہم اندازے غلط کرتے رہے اور اِدھر سے اُدھر بھٹکتے رہے لیکن محسن کو نہ ملنا تھا' نہ ملا۔ اب بھی میرے ذہن میں سمت کا تھوڑا سا حساب تھا کیونکہ سورج ابھی تک مشرق میں ہی تھا۔ کنفیوژن سے بچنے کے لیے میں نے ایک کھجور کے درخت کو نشانی بنا لیا تھا، جو صُبح ٹھیک اسی سمت میں تھا، جدھر سے سورج طلوع ہُوا تھا اور یہ درخت اپنی قسم کا ایک ہی درخت تھا۔

"میاں سکندرِ اعظم! مجھے تو یہ دشتِ طلسمات لگتا ہے۔" مرزا غالب نے بالآخر کہا۔ "آخر محسن ابھی تک نظر کیوں نہیں آیا۔ ذرا میری طرف دیکھنا، کیا میں نظر آ رہا ہُوں؟"

"بالکل صاف، پوری داڑھی کی جھاڑی سمیت...!"

"خدا کا شکر ہے، تم بھی نظر آ رہے ہو مجھے، ہم ابھی تک گُم نہیں ہوئے ہیں۔" غالب بولا۔ "غالباً اس لیے کہ کولھو کے بیل کی طرح ایک دائرے میں پھر رہے ہیں مگر یہ سمجھ رہے ہیں کہ بہت سفر کیا۔"

"ناک کی سیدھ میں چلنے والا سیدھے راستے سے نہیں بھٹک سکتا۔"

"تیری ناک ٹیڑھی ہے میرے ہمسفر... میرے راہنما۔" غالب نے کہا۔ "معلوم نہیں کس کی ضربِ کلیم سے ہوئی مگر اسی کی وجہ سے ہم جھک مار رہے ہیں اور ہنوز وہیں ہیں جہاں سے چلے تھے۔"

"غلط۔ وہ جگہ کم سے کم دس قدم دُور ہے۔" میں نے اشارہ کر کے بتایا مگر اس کے ساتھ ہی میری آواز بند ہو گئی اور میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میں نے غالب کو روک لیا۔

"غور سے سُنو مرزا جی!" میں نے لبوں پر اُنگلی رکھ کے سرگوشی کی۔

غالب نے سر ہلایا۔ "سُنا، میں نے بھی سُنا۔"

"کیا سُنا؟" میں نے آہستہ سے پوچھا۔

"جو تُو نے نہیں سُنا، میرے دل نے اُسے پُکارا تھا۔" غالب بولا۔

"کاش میں آپ کے جھانپڑ رسید کر سکتا۔ جھانپڑ کی آواز آپ صاف سُنتے۔" میں نے کہا اور غالب کو ہاتھ سے پکڑ کے پیچھے کھینچ لیا۔ ہم دونوں ایک درخت کی اوٹ میں ہو گئے پھر میں نے درخت پر غور کیا اور مجھے درخت کے تنے سے ملی ہوئی شاخوں تک پہنچنا آسان نظر آیا۔ میں نے غالب کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اُوپر چڑھ گیا۔ زمین سے تقریباً بارہ چودہ فٹ اُوپر جا کے دیکھنے پر مجھے کچھ نظر نہیں آیا تو مجھے فریبِ سماعت کا یقین آنے لگا۔ غالب نیچے کھڑا مجھے گھُور رہا تھا کیونکہ اُس کے کانوں نے واقعی کچھ نہیں سُنا تھا۔ اُس نے ہاتھ کے اشارے سے پوچھا کہ کیا ہے اور میں نے اشاروں کی زبان

میں اُسے صبر کرنے کو کہا۔ اس وقت مجھے ایک لطیفہ یاد آ رہا تھا اور اگر میں نیچے اُترتا تو شاید وہی لطیفہ غالب مجھے شرمندہ کرنے کے لیے سُناتا۔ کسی پاگل خانے میں ایک پاگل بہت دیر سے زمین پر پڑا دیوار سے کان لگائے کچھ سُن رہا تھا۔ ایک ڈاکٹر نے آتے جاتے کئی بار دیکھا اور بالآخر پاگل کے قریب بیٹھ کر خود بھی کچھ سُننے کی کوشش کرنے لگا مگر اُسے کچھ بھی سُنائی نہیں دیا تو اُس نے پاگل سے کہا کہ کیا بات ہے میاں، مجھے تو کچھ سُنائی نہیں دیتا۔ پاگل نے ڈاکٹر کو افسوس ناک اور قابلِ رحم نظروں سے دیکھ کر کہا کہ پاگل کے بچے! جب پانچ گھنٹے سے مجھے کچھ سُنائی نہیں دیا تو تجھے پانچ منٹ میں کیا سُنائی دے گا، چل بھاگ یہاں سے۔

ابھی مجھے یہ لطیفہ یاد آیا ہی تھا کہ فریبِ سماعت کا شُبہ دُور ہو گیا۔ میں نے دائیں جانب سے کسی کے قدموں کی آہٹ سُنی۔ وہ بہت احتیاط کے ساتھ دبے پاؤں آ رہا تھا۔ میں نے نظر جما کے دیکھا اور ایک دم سراج میرے سامنے آ گیا۔ بے ہوش محسن اُس کے کندھے پر لٹک رہا تھا اور سراج ہاتھ میں محسن کا ریوالور لیے اِدھر ہی آ رہا تھا۔

"غالب!" میں نے شاخ سے بندر کی طرح نیچے لٹک کر کہا۔ "شکاری آ گیا۔ اس کمینے نے محسن کو شکار کیا ہے۔ اسے اِدھر متوجہ کرا اور پیڑ کے نیچے لے آ، مگر آواز مت نکالنا، اُس کے ہاتھ میں ریوالور ہے۔"

غالب نے سر ہلایا اور میں پھر اُوپر پہنچ گیا۔ میں اُوپر سے غالب کو خاموش سگنل دیتا رہا۔ سراج بہت محتاط تھا لیکن وہ بہت تھکا ہُوا بھی تھا۔ وہ چلتے ہوئے لڑکھڑا آتا تھا، رُک کر ہانپتا تھا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگتا تھا۔ غالباً اُسے بھی راستے کی جُستجو تھی یا کسی آبادی کی تلاش تھی۔ ٹھیک وقت پر غالب نے اپنے موٹے منکوں کی مالا کو ہاتھ میں لے کر ہلانا شروع کیا۔ منکے کڑکڑائے اور سراج ٹھٹک گیا۔

"کون ہے؟" سراج نے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ کہا مگر غالب درخت کی اوٹ میں چُھپ گیا تھا۔ سراج چند سیکنڈ بہت چوکنا کھڑا رہا پھر اُس کی صُورت پر حیرانی کے آثار نمودار ہوئے کیونکہ اس جنگل میں یہ آواز اسے عجیب لگی تھی۔ تجسس اُسے درخت کے نیچے لے آیا۔ اُس نے محسن کو نیچے ڈال دیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

"ریٹل اسنیک!" اُس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ سوال بالکل ٹھیک تھا۔ اس قسم کی آواز جنگل میں ایک سانپ کے چلنے سے پیدا ہوتی ہے، جس کی ٹھریاں کڑکڑاتی ہیں لیکن وہ سانپ ہمارے جنگلوں میں نہیں پایا جاتا۔

ریوالور اُس کے ہاتھ میں ہی تھا جب میں اُس پر بم کی طرح گرا۔ قدرتی طور پر میں نے گرتے ہوئے ریوالور کا خیال رکھا اور میرا ایک ہاتھ اُس کی کلائی پر یوں لگا کہ ریوالور دُور جا گرا۔ سراج میرے وزن کے نیچے دب گیا۔ میں نے اُس کی گردن دبوچ لی۔

"دل تو چاہتا ہے کہ تجھے کُتے کی موت مار دوں۔" میں نے اُس کے مُنہ پر طمانچے مارتے ہوئے کہا۔ ہر طمانچے پر اُس کا مُنہ کبھی دائیں طرف پھر جاتا تھا، کبھی بائیں طرف اور میری انگلیوں کے نشان اُس کے گالوں پر بن جاتے تھے۔ وہ ہر طمانچے پر کراہتا تھا۔

"دل کی بات مان لے بچہ۔" غالب نے سامنے آ کے اپنی موٹے منکوں والی مالا بجانا شروع کی۔ "مگر یہ کُتا تو نہیں ہے، یہ تو کُتے کا بچہ ہے۔" اُس نے سراج کا ریوالور اُٹھا لیا۔

میں نے سراج کو چھوڑ دیا۔ "تُو سمجھا ہو گا کہ چکما دے کر نکل گیا لیکن تقدیر ساتھ چھوڑ دے تو سارے راستے ایک ہی طرف لے جاتے ہیں۔"

"اور ہاتھ میں توپ بھی ہو تو اُس کا گولا پلٹ کے لگتا ہے بچے۔" غالب نے ریوالور کو لہرا کے کہا۔ "یہ دیکھ، اب اس کا رُخ کدھر ہو گیا ہے۔"

اب سراج سمجھ گیا تھا کہ وہ ریٹل اسنیک کون تھا۔ وہ غالب کو گھور رہا تھا اور اُسے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا مگر جسے میری نگاہ نہ پہچان سکی تھی اُسے سراج کیسے پہچان سکتا تھا۔ میں محسن کی طرف متوجہ ہو گیا۔ غالباً سراج نے اُسے بے خبری میں وار کر کے ناک آؤٹ کر دیا تھا۔ میں نے اُسے آواز دی اور اُس کے گال تھپکے لیکن محسن کی آنکھیں بند رہیں۔ اس وقت اندر ہی اندر میں غصے کی بھڑکی ہوئی آگ میں جل رہا تھا لیکن بہت مجبور تھا۔ میں سراج کو مارتا تو وہ مر جاتا۔ جو معلومات ہمیں اُس سے حاصل ہو سکتی تھیں، کسی اور سے نہیں ہو سکتی تھیں۔ انہی کی مدد سے ہم رابعہ، کیتھرین اور ٹیڈی تک پہنچ سکتے تھے چنانچہ سراج کا زندہ رہنا بے حد ضروری تھا۔

"یار، کچھ سمت کا اندازہ ہے؟" میں نے غالب سے کہا۔ "تم نے تو اس علاقے کا سروے کیا تھا، کوئی آبادی ہے قریب میں؟"

"قریب تو نہیں، چار پانچ میل چلنا پڑے گا۔" غالب بولا۔

"پہلے ہم آبادی تک جانے والے راستے تک پہنچ جائیں، وہاں سے ٹیکسی مل جائے تو اس بارِ گناہ کو اُٹھا کے چلنے سے بچ جائیں گے۔" اُس نے سراج کی طرف اشارہ کیا۔

"ٹیکسی؟ گھاس کھا گیا ہے کیا؟"

"مقامی آبادی آمد و رفت اور نقل و حمل کے لیے بیل گاڑی سے استفادہ کرتی ہے۔ شہر میں یہی کام ٹیکسی سے لیا جاتا ہے۔ پس بیل گاڑی لوکل ٹیکسی ہے۔" غالب بولا۔ "ممکن ہے سُپر ڈیلکس سروس یعنی ریڑھا یا تانگا بھی مل جائے مگر کیا ہم پبلک میں جا سکتے ہیں؟"

"محسن کی حالت ٹھیک نہیں ہے، ہمیں جانا ہی پڑے گا۔" میں نے کہا۔ "تو اُسے اُٹھا لے اور آگے چل، میں ایس۔ پی صاحب کو مارچ کراتا ہوں۔" اور نیچے جُھک کر سراج کو پیروں پر کھڑا کر دیا۔

"ایس۔ پی صاحب کا مُنہ بند کر دے۔" میں نے کہا۔ "اور ہاتھ پیر باندھ دے، جو قمیص انھوں نے پہن رکھی ہے، وہ محسن کی ہے، اسی کو پھاڑ کے استعمال کر۔"

سراج اب تقدیر سے بھی مایوس ہو چکا تھا جس نے اُسے دوبارہ ہم جیسے دشمنوں کی قید میں پہنچا دیا۔ اُس نے بالکل مزاحمت نہیں کی۔ غالب نے قمیص کا کچھ حصّہ اُس کے مُنہ میں ٹھونس دیا اور باقی سے اُس کے ہاتھ کمر کے پیچھے کس کر باندھ دیے پھر غالب نے محسن کو کندھے پر ڈالا اور میں نے سراج کو دھکیل کر روانہ کر دیا۔ میرے ہاتھ میں اُسی کی پتلون سے نکالی ہوئی چمڑے کی بیلٹ تھی۔

تقریباً دو میل کا یہ راستہ بہت کٹھن ثابت ہُوا۔ غالب نے اور میں نے باری باری محسن کو اُٹھایا۔ یہ عام حالات میں بھی مشکل کام تھا کیونکہ محسن کا وزن بھی میرے برابر ہی یعنی ایک سو ساٹھ پونڈ تھا۔ اب تو مدت سے ہم نے وزن نہیں کرایا تھا۔ جب تک ہم لندن میں تھے تو ایک دوسرے کو موٹا اور گول گپا کہتے تھے۔ ذرا سی بے احتیاطی سے ہمارا وزن بڑھنے لگتا تھا اور وزن کو حد میں رکھنے کے لیے ہم اکٹھے دوڑ لگاتے تھے اور ورزش کرتے تھے پھر کبھی ایسا زمانہ آتا تھا کہ ورزش چُھٹ جاتی تھی اور خوب پارٹیاں ہوتی تھیں۔ آئس کریم اور کیک کھانے کے مقابلے شروع ہو جاتے تھے تو وزن پھر بڑھنے لگتا تھا۔ یہاں آئس کریم، کیک کے مقابلے تو تھے نہیں۔ دلاور اینڈ کمپنی سے مقابلہ تھا اور ورزش سے زیادہ دوڑ دھوپ تھی چنانچہ پہلے کے مقابلے میں دونوں کا وزن کم ہُوا تھا پھر بھی یہ وزن اتنا کم نہیں تھا کہ ہمیں نقش فریادی سمجھا جاتا۔

جنگل کے ناہموار راستے پر محسن کو اُٹھا کے ایک فرلانگ کا فاصلہ طے کرتے کرتے ہم ہانپنے لگتے تھے۔ غالب اور میں ڈیوٹی بدل رہے تھے۔ ایک محسن کو لے کر چلتا تھا اور دوسرا سراج کو جنگی قیدی کی طرح دھکیلتا۔ اُسے حسبِ توفیق ذلیل کرتا اور وہ خاموش احتجاج کرتا یا پلٹ کر دیکھتا تو بیلٹ سے اُس کی کھال اُدھیڑتا۔ اس کام میں ہمارے لیے ایک انتقامی تسکین کا سامان تھا۔ راستے میں ہم ایک جگہ دس پندرہ منٹ کے لیے رُکے اور ایک سگریٹ پی۔ اس کے سوا پینے کو کچھ تھا بھی نہیں۔

"آہا! کتنا لُطف ہے اس تصور میں کہ جب یہ سفر ختم ہو گا تو ہمیں گرما گرم کافی ملے گی، سینڈوچ ہوں گے، کلب سینڈوچ۔" غالب نے آنکھیں بند کر کے کہا۔ "اور تھری کاسل کے سگریٹ ہوں گے۔"

"اور ہمارے لیے ایک چمکتی دمکتی مرسیڈیز تیار کھڑی ہو گی۔"

میں نے بھی اُس کے تصور میں ساتھ دیا۔ "ایئر کنڈیشنڈ اور ہوا بلکہ تیرنے والی۔"

"جس کی پچھلی نشست پر رابعہ اور نازو بیٹھی ہوں گی۔" غالب بولا۔ "رابعہ نے گہرے آسمانی رنگ کی ساڑی باندھ رکھی ہو گی، جس پر زرد پھول یوں کِھلے ہوں گے جیسے آسمان پر ستارے۔" میں نے کہا۔

"اور نازو نے سراہتے سفید ریشم کی شلوار قمیص پہن رکھی ہو گی اور اُس کے گلابی چہرے کے گرد سفید شیفون کے دوپٹے کا ہالہ ہو گا اور اُس نے بالوں میں موتیے کے پھول لگا رکھے ہوں گے اور اُس کے لبوں پر دُھوپ سے اُجلی مُسکراہٹ ہو گی اور وہ حیا سے نظریں جُھکا کے اور مُسکرا کے کہے گی۔۔۔"

"اُلو کے پٹھے! اُٹھ اور آگے چل۔" میں نے کہا۔

"بس، ذرا سی جُھوٹی خوشی بھی نہیں دیکھی گئی۔ اچھے دوست ہو۔" غالب نے آنکھیں کھول کے سرد آہ بھری۔ "بڑا مزہ آ رہا تھا۔"

"مزہ تو آئے گا ابھی۔" میں اُٹھ کھڑا ہُوا۔ سراج ہم دونوں کو عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"کاش تم بھی تصور میں کوئی ایسا ہی حسین خواب دیکھ سکتے۔" میں نے سراج کو اُٹھنے کا اشارہ کیا۔ "مگر تمھارے تصور میں تو وہی بھوکے بھیڑیے آتے ہوں گے۔ دلاور اور پیڈرو۔۔۔ تمھارے غیر ملکی آقا۔ تم تو بس بند دقیں اور ہم ہی دیکھتے ہو گے، یا پھانسی کا پھندا، ذلت کی موت، بے آبروئی اور رسوائی۔"

"ایسا مت کہہ یار، یہ بھی غزالہ نسیم کو یاد کر رہا ہو گا۔" غالب بولا۔

سراج ایک دم تڑپ کر پلٹا۔ اُس کی نظروں میں دُکھ کے ساتھ خوف تھا۔

"پریشان کیوں ہو ایس۔ پی صاحب۔" میں نے اُس کے ایک بیلٹ رسید کی۔ "اُسے بھی تم سے بہت جلد ملوانے کے لیے لائیں گے۔"

سراج نے پھر پلٹ کر دیکھا اور میں نے ایک اور بیلٹ ماری۔ اُس کی پیٹھ پر کئی نیل نظر آنے لگے تھے۔

"تم کو یاد ہو گا کہ میں نے ایک وعدہ کیا تھا تم کو تمھارے ہی سکّے میں ادائیگی کا۔" میں نے کہا۔ "اب وقت آ گیا ہے۔ بہت جلد تم وہ سب دیکھو گے، جو ہم نے دیکھا کیونکہ تم نے دکھایا تھا اور ہم وہی کریں گے جو ہم نے تم سے سیکھا۔ مثلاً ایک فلم تم نے دکھائی تھی اور پھر ایک فلم کی شوٹنگ کا اہتمام کیا تھا۔ مجھے تو معلوم ہو گیا کہ وہ لڑکی رابعہ نہیں تھی مگر ہم تم کو کیمرا ٹرک سے پریشان نہیں کریں گے۔ ہماری فلم میں اصلی ہیروئن ہو گی، مس غزالہ نسیم، تم بہت قریب سے سب دیکھو گے، جو میں نے دیکھا تھا۔"

سراج نے پھر سر گھمایا اور پھر بیلٹ شڑاپ سے اُس کی کمر پر لگی۔ "وقت بڑا بے رحم اُستاد ہے سراج۔" میں نے کہا۔ "یہ طوائف سے بھی زیادہ بے وفا ہے اور تم سے زیادہ دغا باز۔ دیکھو، اس نے کس طرح تمھارا ساتھ چھوڑ دیا۔ آج وقت ہمارے ساتھ ہے۔ اب تاریخ اپنے آپ کو دُہرائے گی، واقعات وہی ہوں گے، بس تمھاری جگہ ہم ہوں گے اور ہماری جگہ تم کو لینا پڑے گی۔ جب وقت ہمارا نہیں تھا، تو انتخاب ہمارے ہاتھ میں نہیں تھا، آج انتخاب تمھارے ہاتھ میں نہیں ہے۔"

"اپنے سکندر بخت صاحب!" غالب نے دلاور کا لہجہ بنا کے کہا۔ "یہ تو ہم شاید کسی آبادی کے قریب پہنچ رہے ہیں۔ میرے کانوں

میں گھنٹیاں سی بج رہی ہیں اور یہ نازو کی آواز نہیں، بیلوں کے گلے میں پڑی ہوئی گھنٹی لگتی ہے۔"

غالب کے بعد مَیں نے بھی یہ موسیقی سُنی اور اس کے ساتھ ہی مجھے بیل گاڑی کی چرخ چوں سُنائی دی پھر بیل گاڑی کے پائلٹ نے اپنے بیلوں سے خطاب کیا، جو چند بے معنی الفاظ پر اور کچھ پیار بھری گالیوں پر مشتمل تھا۔

"آ آ ہا... آ ود... ٹخ ٹخ... اوئے سُور دے چرخے، تینوں بے جان بو چڑ... چل چل... او تیری تے..."

"مرزا غالب!" مَیں نے محسن کو نیچے رکھ کے کہا "مَیں جاتا ہُوں اس ٹیکسی میں اور گاؤں سے کچھ کھانے پینے کو لاتا ہُوں۔"

"اور ہم... ہم یہاں سُوکھتے رہیں۔" غالب نے کہا۔

"مجبوری ہے مرزا۔" مَیں نے کہا "تم اس خلعتِ فاخرہ میں گئے تو گاؤں میں مجمع لگ جائے گا۔ مرد و زن تم سے تعویذ کے اور دُعاؤں کے طالب ہوں گے۔ د تمھاری قدم بوسی کے خواہش مند تمھارا جلوس نکال دیں گے۔ بہت زیادہ عقیدت کا مظاہرہ کیا تو ممکن ہے تمھارا مزار شریف بنا دیں تاکہ تمھاری ذاتِ بابرکات کے فیوض اسی آبادی تک محدود رہیں اور ہمیشہ رہیں۔ سراج کو بھی تم ہی اسیر رکھ سکتے ہو۔"

"آخر محسن کو لے جانے میں کیا ہرج ہے؟"

"اس کی وردی تو دیکھو دوست، یہ ایس۔ پی ہے۔ اوّل تو ایس پی بے ہوش نہیں ہوتا اور ہو تب بھی بیل گاڑی میں بہرحال سفر نہیں کرسکتا۔" میں نے کہا "میرے ذہن میں ایک بہت شاندار پلان ہے، بس تم ایک گھنٹا انتظار کرلو، اس کے بعد دیکھنا۔"

"اگر آنکھیں اس وقت تک دیکھنے کے قابل رہیں۔" غالب بولا۔

مَیں درختوں اور جھاڑیوں کی اوٹ سے نکلا اور بیل گاڑی کے پیچھے دوڑا، جو اتنی دیر میں سو گز آگے جا چکی تھی۔ یہ کچا راستہ اسی قسم کی سواریوں کے لیے تھا۔ مجھے زمین پر ٹائروں کے جو نشانات نظر آئے، وہ سائیکلوں کے ٹائر تھے۔ اس سے بڑی ٹائروں والی گاڑی شاید اِدھر سے کبھی نہیں گزری تھی، ورنہ کیچڑ کے خشک ہو جانے کے بعد جو نقوش قائم رہ گئے تھے، ان میں موٹر سائیکل کے ٹائروں کے پرنٹ تو نظر آتے۔ راستہ مشکل سے چھ فٹ چوڑا تھا اور اس کے دوسری طرف کھیت تھے۔

"بھیا... لے بھوا...!" میں نے دوڑتے ہوئے ہانک لگائی۔

گاڑی والا ہونّق کار کھڑا رہ گیا۔ وہ جس راستے سے گزر کے آیا تھا، اس پر ابھی چند منٹ پہلے کچھ بھی نہیں تھا۔ میں اچانک نمودار ہُوا تھا، بالکل اس طرح، جیسے آسمان سے ٹپکا ہُوں یا زمین سے اُگا ہُوں۔ مزید ستم یہ کہ میں پتلون والا شہری بابو تھا۔ گاڑی بان بیس بائیس سال کا لڑکا تھا۔

"قبلۂ محترم! اگر بارِ خاطر نہ ہو تو اس بندۂ حقیر، فقیر پُر تقصیر کو قریب ترین آبادی تک رسائی حاصل کرنے کے کارِ خیر میں..." مَیں نے کہا۔

وہ خوف زدہ ہو کے میری صورت دیکھنے لگا۔

"اُردو نہیں سمجھتے؟" میں نے انگریزی میں کہا "مجھے گاؤں تک پہنچا دو، جہاں تم جا رہے ہو۔"

گاڑی والے نے سر ہلایا "مینوں تے سمجھ نئیں لگدی۔"

"اچھا اچھا، پہلاں دسناں سی یار کہ پنجابی دے سوا ہور کچھ نئیں آوندا۔" مَیں چھلانگ مار کے بیل گاڑی میں بیٹھ گیا "ہُن چل۔ مینوں وی لے چل نال وے، باؤ سوہنی گڈی والیا۔"

وہ ہنس پڑا "تم فلموں میں کام کرتے ہو؟"

"اب کروں گا۔" میں نے کہا "تم مجھے اپنے گاؤں لے چلو، میں راستہ بھول گیا تھا، رات بھر بھوت میرا پیچھا کرتے رہے ہیں۔ اس جنگل میں شیر کم ہیں، بھوت زیادہ ہیں۔"

"شیر؟" گاڑی والا ہنسنے لگا "شیر کدھر سے آگیا؟"

"پتا نہیں، غیر ملکی ہوگا۔" میں نے کہا "ٹورسٹ شیر یا ممکن ہے عمل ہو۔ ایک ہی فیملی ہے دونوں کی، خیر یہ بتاؤ گاؤں کتنی دور ہے اور اس کا نام کیا ہے؟"

"گاؤں تو وہ سامنے ہے۔" لڑکا بولا "وہ مسجد کا مینار نظر نہیں آرہا ہے؟ نام ہے چوریلوالہ۔"

"کیا یہ بوریلوالہ کا بھائی ہے؟" مَیں نے کہا۔ لڑکا پھر ہنسنے لگا۔ وہ سادہ لوح اور اچھا آدمی تھا۔ اُس نے مجھے بہت مفید معلومات فراہم کرنے میں بخل سے کام نہیں لیا۔ گاؤں میں ڈھائی تین سو گھر تھے۔ ایک ڈاک خانہ بھی تھا اور پولیس چوکی بھی۔ پٹواری اور نمبردار کے بارے میں اُس کی رائے اتنی ہی خراب تھی جتنی پولیس چوکی کے تھانے دار کے بارے میں۔ گاؤں میں بجلی بھی تھی اور ایک تصویروں والا ڈبا پہلے چوپال میں لگایا گیا تھا پھر نمبردار اپنے گھر لے گیا اور اب اُس کی بیٹھک میں صرف خاص خاص لوگ ہی جا سکتے ہیں۔ ان میں اسکول ماسٹر بھی شامل ہے، جو دس سال سے بچوں کو پڑھانے کی ناکام کوشش کر رہا ہے۔ بچوں کے والدین تعلیم کے مقابلے میں دوسرے مسائل کو زیادہ اہم سمجھتے ہیں، مثلاً بھیڑ بکریاں چرانا، گائے بھینسوں کی دیکھ بھال، کھیتوں میں چھوٹے موٹے کام کرنا، وغیرہ وغیرہ۔ وہ خود بہرحال چوتھی پاس تھا۔

مجھے اُس نے گاؤں کی مال روڈ پر اُتار دیا۔ وہ مُصر تھا کہ میں اس کے ساتھ چلوں اور اُس کے چاچے کو سمجھاؤں کہ وہ اُسے اعلیٰ تعلیم کے لیے قصور بھیج دے۔ جہاں وہ پانچویں کلاس سے شروع کرے گا تو صرف پانچ سال میں میٹرک کرلے گا۔

"تمھارے گھر تو میں بعد میں آؤں گا۔" میں نے کہا "تم یہ بتاؤ کہ تمھارے چاچے سے کیوں بات کرنا ضروری ہے، باپ سے کیوں نہیں؟"

"اس لیے کہ باپ تو ہے ہی نہیں۔" وہ بولا "اس کے مرنے کے بعد چھوٹے بھائی نے رواج کے مطابق گھر کی عزت پر چادر ڈالی تھی۔"

"معاف کرنا دوست، یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔" مَیں نے کہا۔

"بہو کو ہم گھر کی عزت کہتے ہیں ناجی۔ گھر والا مر جائے تو اسی گھر کا دوسرا مرد اسے بیوی بنا لیتا ہے، عزت باہر نہیں جاتی۔" وہ بولا "میرے باپ کے چھوٹے بھائی نے بھابی سے شادی کرلی تھی، یعنی میری ماں سے۔ اب ماں تو تیار ہے کہ مجھے قصور بھیج دیا جائے، ماسے کے پاس۔"

"تو تمھارے چاچے کو کیا اعتراض ہے؟" میں نے کہا۔

"وہ میری شادی کرنا چاہتا ہے۔" وہ بولا "اُس کی پہلی بیوی بڑی.... ہے۔" اُس نے اپنی چھوٹی سوتیلی والدہ کے لیے ایک ایسا لفظ استعمال کیا، جو اُس نے کئی بار اپنے ایک بیل کے لیے استعمال کیا تھا۔ "وہ مجھے اپنی چھوٹی بہن کے ساتھ باندھنا چاہتی ہے۔"

"کیا وہ تم کو پسند نہیں؟" مَیں نے کہا۔

"آپ دیکھنا اُس کو، پسند کیے تو لے جانا۔ گاؤں میں سب اُس کے نام پر کانوں کو ہاتھ لگاتے ہیں۔" وہ بولا "اور جناب، سچ بات تو یہ ہے کہ وہ سارے گاؤں کی بیوی بھی بن چکی ہے۔ میں اُس سے بیاہ کردں، قتل کرکے پھانسی نہ چڑھ جاؤں۔"

"اچھا اچھا، مَیں تمھارے چاچے کو سمجھاؤں گا اور وہ نہ سمجھا تو اس کا دماغ درست کردوں گا۔" مَیں نے کہا "ایک دو دن میں یہاں ایس پی صاحب دورے پر آنے والے ہیں۔"

"ایس پی؟ وہ کیا ہوتا ہے؟"

"پولیس کا سب سے بڑا افسر۔" مَیں نے کہا۔

"تھانیدار سے بھی بڑا؟" وہ بولا۔

"ہاں، تھانیدار تو اُس کے گھر میں جھاڑو دیتے ہیں اور برتن دھوتے ہیں۔" میں نے کہا "وہ سارے تھانیداروں کا تھانیدار ہوتا ہے۔"

"بس جی تو آپ چاچے کو دس چھتر لگوا دیں۔" وہ خوش ہو کے بولا۔ "وہ افسر آپ کی مانتا ہے؟"

"دوست ہے میرا، مانے گا کیوں نہیں۔" میں نے کہا "لیکن یار، تم بھی میرا ایک کام کرو۔ پہلے تو یہ بتاؤ کہ تھانے میں کون کون ہے؟"

"تھانے میں؟" وہ بولا "ایک تو وہ کانا حوالدار ہے فتح خان، اُس کے ساتھ دو سپاہی ہیں۔ ایک تو کُوما ہے۔"

"تمھارا مطلب ہے قیوم؟" میں نے کہا۔

"ہاں جی، کمہار کا لڑکا اور دوسرا شہر سے آیا ہے سونا خاں، ان کے سامنے کوئی دم نہیں مار سکتا۔ روز گُڑ کھاتے ہیں، پانچ سیر دودھ ہر روز لے جانا پڑتا ہے اُن کے لیے۔ جسے چاہتے ہیں پکڑ کے لے جاتے ہیں اور گنجا کرکے واپس بھیج دیتے ہیں۔" وہ بولا۔

"گنجا کرکے! کیا اُن میں کوئی نائی بھی ہے؟" مَیں نے کہا۔

"ہاں جی، وہ سونا خاں نائی کا بیٹا ہے، وہی اُسترا پھیرتا ہے۔ کل بالو ترکھان کو پکڑ کے لے گئے تھے۔ اُس نے نمبردار کی بیٹھک کے لیے جو منجی بنائی تھی اُس کی لکڑی سے بُرادہ جھڑنے لگا تھا۔ آج وہ آئے گا، سو چھتر کھا کے اور سر منڈوا کے... نمبردار نے سو چھتر مارنے کے لیے کہا تھا۔"

"اچھا! یہ سب تو ہوتا آیا ہے عزیزم اور ہوتا رہے گا۔ اکیلا چنا بھاڑ کو نہیں پھوڑ سکتا۔ ہر گاؤں اور شہر کے تھانے میں پولیس کے ہاتھوں غریب اور لاوارث مگر بے گناہ لوگوں کی ٹھُکائی ہوتی رہے گی اور ظالم نمبردار قسم کے لوگ ان کو سو چھتر بھی پڑواتے رہیں گے اور سو پیاز بھی کھلاتے رہیں گے مگر تمھارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ مَیں پولیس کی اصلاح کے لیے نہیں آیا، ان سے اب اللہ ہی سمجھے، تم میرا ایک کام کرو، سیدھے تھانے جاؤ۔"

"تھانے جاؤں؟" لڑکے نے خوف زدہ ہو کے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اُس کے سر پر تازہ کٹی ہوئی لان کی گھاس جیسے بال اُگ رہے تھے۔ غالباً اُسے تھانے سے آئے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔

"فکر مت کرو، دوبارہ تمھاری ٹنڈ کوئی نہیں کرے گا۔" مَیں نے کہا "تم اُس کانے حوالدار سے کہنا کہ مجھے ایس۔ پی صاحب کا پی اے ملا تھا۔ کیا کہو گے؟"

"ایس۔ پی صاحب کا پی۔ اے ملا تھا۔" وہ بولا۔

"شاباش۔ اور کہنا کہ وہ کسی ملزم کی تلاش میں اِدھر آئے ہیں اور ہو سکتا ہے تھانے میں بھی پہنچ جائیں۔" مَیں نے کہا "پر یہ مت بتانا کہ پی۔ اے صاحب بیل گاڑی میں آئے تھے میرے ساتھ، کہنا کہ سڑک پر ملے تھے۔"

"اچھا جی۔ میں کہہ دوں گا کہ سڑک پر ملے تھے۔" وہ بولا۔

"کیا نام ہے تمھارا؟" مَیں نے کہا "اگر تم سے ملنا ہو تو...؟"

"فضلو... میرے چاچا کا نام ہے ہاشو... وہ خود کو حشمت اللہ کہنے لگا ہے اب..." وہ خوش ہو کے بولا۔

میں نے اُسے دس کا ایک نوٹ دیا "یہ اپنا انعام رکھو اور دیکھو، جو کام میں نے کہا ہے، وہ ویسے ہی ہونا چاہیے، بھولنا مت، میں ایس پی کا پی۔ اے ہُوں۔"

"ایس پی کا پی اے۔" اس نے دس کا نوٹ دھوتی میں اُڑس کر کہا۔

گاؤں کی مال روڈ پر چار پانچ دُکانیں بالکل اُسی معیار کی تھیں جیسی کہ ہونی چاہئیں۔ وہ سب سپر اسٹور اور ڈیپارٹمنٹل اسٹور تھے یعنی وہاں ہر چیز ملتی تھی، مثلاً انسانوں کی خوراک بھی اور مویشیوں کی بھی۔ بھینس باندھنے کی زنجیر بھی اور سگریٹ بھی، تاہم گاؤں اس سے بڑا تھا جتنا مجھے مسٹر فضلو نے بتایا تھا۔ اس میں گھروں کی تعداد پانچ سو کے لگ بھگ ضرور ہوگی۔ میں نے ایک چائے خانہ بھی دریافت کیا۔ وہاں وہی اُبلتا ہُوا گاڑھا شیرہ تھا جس میں دُودھ وافر تھا اور چائے کی پتّی رسماً ڈالی گئی تھی تاہم اُسے پی کر بھی مَیں اتنا ہی خوش ہُوا جتنا لاہور میں شیزان کی چائے پی کر ہوتا پھر میں سوچنے لگا کہ اس مشروب کو غالب اور محسن

تک کیسے لے جاؤں کہ یہ ٹھنڈا نہ ہو مگر اللہ بڑا کارساز ہے۔ ابھی میں چائے پی کر فارغ ہی ہُوا تھا کہ مَیں نے پولیس فورس کو دیکھا۔ اُن میں کانا حوالدار بھی شامل تھا۔ دونوں ماتحت ایک نوجوان کی گردن میں رسّی ڈالے اُسے بیل کی طرح کھینچتے ہوئے لے جا رہے تھے۔ نوجوان کے گھنے بال دیکھ کر مجھے افسوس ہُوا۔ بہت جلد وہ ان بالوں سے محروم ہونے والا تھا۔ حوالدار جسے مقامی تھانیدار کے مکمل اختیارات حاصل تھے اور جو تھانیدار کہلاتا بھی تھا، ایک ڈنڈا لیے پیچھے چل رہا تھا وقتاً فوقتاً وہ مجرم کے ایک ڈنڈا رسید کرتا تھا اور ایک ایسی گالی دیتا تھا، جو مَیں نے پہلے نہیں سنی تھی۔ سب سے پیچھے ایک شخص ریڑھی دھکیلتا آ رہا تھا۔ ریڑھی پر کھلونے، پلاسٹک کا سامان اور نہ جانے کیا کچھ تھا مگر اس میں مجھے ایک الارم کلاک، ایک جوڑی نئے جوتے، ایک تھرماس اور ایک سلائی مشین بھی نظر آئے۔ مَیں اُن کے پیچھے چل پڑا۔ باقی لوگوں میں اتنی جُرأت نہیں تھی۔

”یہ کیا چکر ہے؟“ میں نے اس شخص سے کہا، جو ریڑھی لے جا رہا تھا۔

”کون ہے یہ؟“ میں نے ملزم کی طرف اشارہ کیا۔

”چور ہے جی“ ریڑھی دھکیلنے والے نے مجھے اُوپر سے نیچے تک دیکھ کر کہا۔ اگر میں اس گاؤں کا رہنے والا ہوتا اور پتلون میں نہ ہوتا تو وہ مجھے جھڑک دیتا۔ ”یہ سب چوری کا مال ہے۔“

”یہ تھرماس بھی؟“ میں نے کہا۔

”ہاں جی، پتا نہیں کس کس کے گھر سے اُٹھاتا رہا۔ گلی میں پھر کے کھلونے بیچتا تھا اور جہاں داؤ لگتا تھا وہاں سے کچھ غائب کر لیتا تھا۔“

کانا تھانیدار اور اُس کے ماتحت شاید بیس قدم آگے تھے۔ انھوں نے یہ گفتگو نہیں سنی، ورنہ وہ مجھ سے دخل در معقولات کا سبب ضرور پوچھتے۔

”تم کون ہو، چور کے ساتھی؟“ میں نے کہا۔

”لعنت بھیجو جی ایسے کام پر۔“ وہ بولا۔ ”میں تھانے کا چوکیدار ہوں اور تھانیدار صاحب کا خاص آدمی۔“

”ویری گڈ۔“ میں نے کہا۔ ”پھر تو تم میرا ایک کام کر سکتے ہو۔ یہ لو سو روپے، خاموشی سے جیب میں رکھ لو۔“

تھانیدار کے آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی نے سو کا نوٹ ایسے غائب کیا جیسے شعبدہ باز لوہے کا گولا غائب کرتے ہیں ”کیا کام ہے؟“

”یہ تھرماس تمھارے لیے بے کار ہے۔“ میں نے کہا۔ ”چوری کے مال میں اسے مت شامل کرو۔“

اُس نے ریڑھی پر سے تھرماس اُٹھایا اور مجھے پکڑا دیا۔ ”یہ لو جی مگر اب کھسک لو، تھانیدار صاحب نے دیکھ لیا تو سو جھتر ماریں گے۔“

میں فوراً واپس ہو گیا۔ بیس روپے کا تھرماس اس وقت سو میں بھی مہنگا نہیں تھا۔ میں نے اُس میں چائے بھروائی، بسکٹ لیے اور گاؤں کا ایک چکر کاٹ کے واپس ہُوا۔ میں نے گاؤں کا ڈاک خانہ دیکھا، جہاں فردِ واحد ایک کرسی پر حقہ پیتے پیتے سو گیا تھا۔ میں نے ایک دھوتی بھی خریدی لیکن ایک کرتا مجھے نہ مل سکا۔ جب میں دوسری طرف سے واپس آ رہا تھا تو مجھے پھر فضلو ملا۔ وہ تھانے جا رہا تھا۔ اُس نے میری فرمائش پر پھر دُہرایا کہ اُسے کیا کہنا ہے۔ اس کے باوجود مجھے ڈر رہا کہ کہیں وہ اُلٹا نہ کہہ دے کہ مجھے پی۔ اے صاحب کے ایس ایچ او ملے تھے۔ گاؤں کے دوسری طرف مجھے ایک جلا ہُوا گھر بھی نظر آیا، جو خرابی پڑا تھا۔ اس کے بارے میں مجھے بعد میں معلوم ہُوا کہ پٹواری کی شکایت پر تھانیدار کے حکم سے اسے آگ لگا دی گئی تھی۔

جب میں پھر غالب اور محسن کے پاس پہنچا تو دو گھنٹے کے انتظار نے اُن کی حالت خراب کر دی تھی۔

”معاف کرنا یار، کچھ دیر ہو گئی مجھے۔“ میں نے کہا۔

غالب ایک درخت کے نیچے سبز گھاس پر محسن کے ساتھ لیٹا ہُوا تھا۔ اُس نے میری طرف ایک آنکھ کھول کے دیکھا۔ ”اب معافی مت مانگ، دُعائے مغفرت مانگ، ہم سب فوت ہو چکے ہیں۔“

محسن آنکھیں کھول کے مُسکرایا تو میری آدھی کوفت اور تھکن دُور ہو گئی ——— میں اُس کے پاس بیٹھ گیا۔ ”کیا حال ہے اب تیرا؟“

”ٹھیک ہے۔“ محسن نے کہا۔ ”سر میں بہت سخت درد ہے۔“

”فکر مت کر، میں گرما گرم چائے لایا ہُوں۔ اسپرین کی گولیاں بھی مل گئیں لیکن یہ تھرماس نہ ملتا تو کچھ نہ ہوتا۔“ مَیں نے کہا۔

غالب اُٹھ کے بیٹھ گیا۔ ”گاؤں والے بھی اب ماڈرن ہو گئے ہیں۔ چائے، تھرماس اور اسپرین... نصف صدی قبل کسی گاؤں کے رہنے والے ان الفاظ کا مطلب نہیں جانتے تھے۔ کیا نام ہے اس گاؤں کا...؟“

”چوریوالہ!“ میں نے کہا۔ ”برادرِ من بوریوالہ... وہ کہاں ہے، سابق ایس پی؟“

”اِدھر، حوالات میں۔“ غالب نے بڑے اشتیاق سے تھرماس کھولا، بسکٹ کے ڈبّے کھولے اور پہلے محسن کو چائے دی۔ میں نے دوسری طرف جا کے دیکھا تو غالب نے سراج کو درخت کے ساتھ باندھ دیا تھا۔ اُس نے اپنی تمام رنگین منکوں والی مالائیں اُس کے گرد لپیٹ رکھی تھیں۔

”میں فارغ تھا، سوچا تھوڑی سی نیند کر لی جائے۔“ غالب نے کہا۔ ”مگر ڈر تھا کہ ایس پی صاحب چوری نہ ہو جائیں۔ جب محسن ہوش میں آ گیا تو میں نے سراج کو باندھ دیا۔ کتنی خوبصورتی سے باندھا ہے۔“

”کافی طاقت صرف ہوئی تیری۔“ میں نے کہا۔ ”بہت اچھا سجایا ہے قربانی کے اس بکرے کو، اُوپر نیچے تک لال، نیلے، پیلے موتیوں کی لڑیاں نظر کو بہت بھلی لگتی ہیں۔ تم لوگ کھا پی لو تو اسے بھی کچھ ڈال دینا ورنہ مر جائے گا۔“

”کیا موضع چوریوالہ بہت دُور ہے؟“ غالب بولا۔

”نہیں، مَیں تو خواہ مخواہ ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔“ مَیں نے کہا۔ ”واپسی پر پیدل آنے میں پندرہ بیس منٹ لگے ہوں گے۔“

”لیکن ہم سب پیدل نہیں جا سکتے۔“ غالب بولا۔

”مجبوری ہے۔“ مَیں نے کہا۔ ”میرے پلان کے مطابق ہمارے لیے اس وقت گاؤں میں داخل ہونا مناسب نہیں۔ ہم رات کو اندھیرا پھیلنے کے بعد جائیں گے۔ مَیں سارے راستے اور ٹھکانے دیکھ آیا ہُوں۔“

”مگر رات تک یہاں کیا کریں گے؟“ غالب نے احتجاج کیا۔

”آرام۔“ مَیں نے کہا۔ ”یہ جگہ راستے سے بہت ہٹ کر ہے۔ اُوپر پیڑوں کا سایہ ہے، نیچے سبزہ، رات تک ہم سب کی حالت بہت بہتر ہو جائے گی۔“

”مگر اس وقت جانے میں کیا قباحت ہے۔“ غالب نے میری ہر دلیل کو مسترد کر دیا۔

”بے وقوف آدمی، اپنا حلیہ دیکھ۔ سراج کی وردی محسن نے پہن رکھی ہے۔ کوئی ایس پی گاؤں میں اس طرح پہنچتا ہے، پھر سراج کو ہم ایسے نہیں لے جا سکتے، اسے چھپا کے لے جانا پڑے گا۔“ میں نے خفگی سے کہا۔ ”اور تم نے تو ابھی میرا پلان بھی نہیں سُنا۔“

”اچھا سُن لیتے ہیں۔“ غالب نے محسن سے کپ لے لیا۔ وہ بڑی بے تابی سے اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا کیونکہ تھرماس کا ایک ہی مگ تھا۔ چائے کا پہلا گھونٹ لیتے ہی اُس کی زبان جل گئی اور صورت ایسی ہو گئی جیسے غلطی سے وہ ٹنکچر آیوڈین پی گیا ہو۔ ”یہ چائے ہے؟“

”ہاں یہ چائے ہے۔“ مَیں نے آستین چڑھا کے کہا۔ ”تیرا تو باپ بھی مانے گا بھوت کے بچے... اگر یہ چائے نہیں ہے تو پھر کافی ہے۔“

محسن آنکھیں بند کیے اور ایک ہاتھ سر پر رکھے لیٹا رہا اور میری بات سُنتا رہا۔ مَیں نے ان کو فضلو سے ملاقات سے لے کر کانے تھانیدار کے افسر بکارِ خاص سے چوری کا مال خریدنے تک کا احوال تفصیل سے سُنایا لیکن اپنی آواز اتنی کم رکھی کہ سراج کے کانوں تک نہ پہنچے پھر بھی بیچ بیچ میں کبھی غالب زور سے قہقہہ مارتا تھا تو کبھی میں۔ آہستہ آہستہ محسن کی حالت بھی بہتر ہونے لگی اور وہ بھی اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ سراج کو چائے اور بسکٹ دینے کے بعد پھر اسی طرح باندھ دیا گیا اور ہم نے سر جوڑ کر اپنے پلان کو ڈسکس کیا۔ اُن دونوں نے ہاتھ ملا کے مجھے ایسا شاندار پلان بنانے پر مبارکباد دی اور بڑی فراخدلی سے اعتراف کیا کہ میں ایم۔ آر۔ ایس کی سربراہی کے لیے موزوں ترین شخص ہُوں۔ غالب نے یہ بھی اعتراف کیا کہ یہ بات وہ اُوپری دل سے کہہ رہے ہیں اور اخلاقاً جھُوٹ بول رہے ہیں۔

رات کا اندھیرا پھیلنے میں ابھی کم سے کم چھ گھنٹے باقی تھے۔ ہم نے اتفاقِ رائے سے دو دو گھنٹے سراج کی نگرانی کرنے کی ڈیوٹی دینے کا فیصلہ کیا اور اس طرح چار چار گھنٹے سونے کی مہلت نکال لی۔

سُورج تقریباً سات بجے غروب ہُوا۔ ہم سب کئی دن کے تھکے ہوئے تھے اور ذہنی طور پر بھی اتنے ہی خستہ حال تھے جتنے جسمانی طور پر شکستہ حال تھے چنانچہ مجھے اور محسن کو نیند تو آئی مگر ٹوٹ ٹوٹ کر۔ وہ پُرسکون اور بے خواب نیند ان حالات میں یہاں کیسے آ سکتی تھی جبکہ ہر طرف خطرے کا آسیب مسلّط تھا۔ ذہن میں ہر لحظہ رابعہ کی یاد تھی اور ان سب کا خیال تھا جن کی سلامتی ہمیں خود اپنی زندگی سے زیادہ عزیز تھی۔ دو بار میری پلک جھپکی تو یادوں کے بھیانک عفریت جو ماضی کا قصّہ بن گئے تھے، اپنی قبروں سے نکل آئے اور اُن کے مکروہ ڈھانچے مجھے خواب میں ڈرانے لگے۔ ”ہم پھر آئیں گے سکندر بخت... ہم تمھارے تعاقب میں ہیں۔“ وہ شیطانی قہقہے لگانے لگے۔ ”لو، یہ فلم دیکھو، بڑی اچھی فلم ہے، اس میں رابعہ بھی ہے۔“ دونوں بار میں گھبرا کے اُٹھ بیٹھا اور محسن میرے ساتھ اُٹھا، نیند میں وہ بھی پریشان ہو رہا تھا۔ ہم ایک دوسرے کو تسلّی دے کر پھر لیٹ گئے۔ نیند نہ سہی، جسم کے لیے آرام ضروری تھا۔ ہم نے سراج کو بھی باندھ کر پیڑ کے ساتھ کھڑا رکھنے کے بجائے زمین پر لمبا لٹا دیا تھا اور اُس کے جسم سے لپٹی ہوئی ایک مالا کو درخت سے باندھے رکھا تھا تاکہ وہ دُور نہ جا سکے۔ وہ بھی تھکن اور پٹائی سے بے حال تھا مگر ہمارے مقابلے میں وہ واقعی گھوڑے بیچ کر سویا۔ اُس کے خراٹے سُن کر مجھے تعجب ہُوا تھا۔ محسن نے تو خیال ظاہر کیا تھا کہ وہ ایکٹنگ کر رہا ہو گا، مگر مَیں نے اُس کے کان میں کبوتر کا پَر گھما کے دیکھا، اُس نے حرکت بھی نہیں کی، جس سے اندازہ ہُوا کہ وہ بے ہوشی کی نیند سو رہا تھا۔ کھانے کے لیے وہی بسکٹ کے ڈبّے تھے، جو ہم چھوڑ گئے تھے اور چائے تھی، جو دوپہر کو ہی ختم ہو گئی تھی۔ تاہم اس آرام کے وقفے نے ہماری جسمانی توانائی کو بحال کر دیا۔

سات بجے ہم نے سراج کو لات مار کے جگایا۔ ”اُٹھ مُردے! یہ تیرے باپ کی جاگیر نہیں ہے، جس پر پیر پھیلا کے سو رہا ہے۔“ مَیں نے کہا۔

”تیرے لیے تو قبر کی دو گز جگہ بھی مشکل سے نکلے گی، تیری لاش کو کتّے ہضم کریں گے۔“ محسن بولا۔ ”ذرا سوچ کہ صورِ اسرافیل پر شرفا تو اپنی قبروں سے اُٹھیں گے، تُو کہاں سے نکلے گا؟“

”بے حد غور طلب نکتہ ہے۔“ غالب نے آخری سگریٹ جلاتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ ”ممکن ہے ایسے بدبختوں کو عرصۂ محشر میں بھی قدم نہ رکھنے دیا جائے، سیدھا جہنم کے سب سے غلیظ طبقے میں پہنچا دیا جائے۔“

”چلو یار، کُوچ کرو۔“ میں نے کہا۔ ”گاؤں تک پہنچتے پہنچتے اندھیرا گہرا ہو جائے گا، بھوک بھی لگ رہی ہے اب تو... “

ہم سب ایک ساتھ روانہ نہیں ہوئے، سراج کو ہم نے سب سے پیچھے رکھا اور اُس کے ساتھ غالب رہا۔ میں اور محسن آگے تھے۔ ہم راستہ صاف دیکھتے تھے تو اُنھیں اشارہ کرتے تھے اور وہ

ہمارا ساتھ دینے لگتے تھے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ہمیں کوئی بھی گاؤں میں وارد ہوتا دیکھے۔ پورے بیس منٹ کا راستہ چالیس منٹ میں طے ہُوا اور ہم تقریباً آٹھ بجے اس جلے ہوئے مکان میں داخل ہوئے جس کے بام و در ابھی تک سیاہ تھے اور آدمی کے ہاتھوں آدمی کی خانہ بربادی پر نوحہ خوانی کر رہے تھے۔ اُس کا ایک کمرا جلنے سے صاف تھا کیونکہ اس کی چھت نہیں گری تھی مگر وہاں بھی فرش پر مٹی اور گھاس کے علاوہ چھت میں بسیرا کرنے والے پرندوں کی غلاظت کا بستر بچھا ہُوا تھا۔ کچھ حضرات و خواتین نے اُسے خلوت کی جگہ پاکے بطور بیت الخلا بھی استعمال کیا تھا اگر محبت کرنے والوں نے اسے ملنے کی جگہ بھی بنایا ہو تو تعجب نہیں کیونکہ یہ گھر گاؤں سے باہر تھا۔

"آخر پٹواری نے اس گھر کو کیوں آگ لگائی؟ کون بدقسمت تھا وہ، جسے یہ سزا ملی اور وہ اپنے گھر کی آگ میں جل مرا یا کہیں بے گھر پھر رہا ہے؟" محسن نے افسوس سے سر ہلایا۔

"ان سوالات کا یہ کوئی وقت نہیں۔" میں نے اُسے ڈانٹا۔ "ڈیٹ شیٹ کے حساب سے جب انگلش کا پرچا ہو تو حساب کے سوال پوچھنے کا مقصد؟ بہرحال، ہم کل جواب دیں گے۔"

"کوئی ویرانی سی ویرانی ہے۔" غالب نے اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد کہا۔ "دشت کو دیکھ کے گھر یاد آ گیا، اپنا گھر بھی ایسا ہی رو سیاہ ہے۔ اُسے دلاور نام کے ایک پٹواری کے حکم پر جلایا گیا تھا۔"

"گھر تو رابعہ کا بھی جلایا گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "مگر جلے دل جلو ابھی اپنی گم گشتہ جنتوں کو یاد کر کے کیوں دل آزردہ ہوتے ہو؟ ہم ایک دن پھر لوٹ کر انہی جنتوں کو آباد کرنے جائیں گے، جہاں سے ہمیں شیطان نے نکلوایا۔ ابھی تو میں گاؤں جا رہا ہُوں۔ موم بتی، سگریٹ، ماچس، کھانے پینے کا سامان لاتا ہُوں اور چائے بنانے کا سامان بھی لاؤں گا۔ مرزا غالب تم یہ قلندرانہ لباس اُتار دو اور یہ دھوتی باندھو، جو میں دن میں لایا تھا اور میرے ساتھ چلو۔ محسن، تُو ذرا ایس پی صاحب سے کمرے کی صفائی کروالے۔"

غالب نے وہ لنگی باندھی اور اوپر صرف بنیان رہنے دیا۔ یہ وضع قطع مقامی لوگوں کے لیے زیادہ قابلِ قبول تھی۔ ہم نے گاؤں کی مال روڈ کی طرف جاتے ہوئے ایک کنواں دریافت کیا جو ہماری جائے قیام سے چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ ہم اس کے رہٹ کو بیل کی طرح چلا سکتے تھے اور تازہ پانی سے غسل فرما کے تازہ دم ہو سکتے تھے۔ اس خیال نے ہمیں بہت خوش کیا۔ میں یہ بھی غور کرتا گیا کہ موضع چوریوالہ میں ٹیلی فون کی لائن تو نہیں ہے۔ ٹیلی فون کا کھمبا تک مجھے دکھائی نہ دیا۔ رات کے وقت بیشتر گھروں میں چراغ جل رہے تھے مگر گاؤں میں بجلی تھی چنانچہ کچھ گھروں میں بلب بھی روشن تھے۔ مال روڈ پہ ایک قطار میں چھ سات بلب ٹمٹما رہے تھے۔ سردیاں گزر چکی تھیں چنانچہ دکانیں ابھی کھلی ہوئی تھیں اور چائے خانے کے باہر تو خاصی رونق تھی۔ چارپائیوں پر لوگ دھوتیاں سمیٹ کر اور حقے لے کر فراغت سے بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے اِدھر جانے سے گریز کیا۔ پہلی ہی دکان سے ہمیں پُورا چائے کے ایک ایک آنے والے پیکٹ ملے۔ لال شکر ملی جس کو دکاندار نے بہترین کھانڈ قرار دیا۔ ہم نے دہیں سے سگریٹ خریدے اور تھری کاسل کے نام پر دکاندار دنگ رہ گیا۔ اس کے خیال میں یہ ولایتی سگریٹ تھے یا پھر گوروں کے زمانے میں بنتے تھے۔ مقامی آبادی کا برانڈ تھا بگلا مارکہ سگریٹ یعنی کنگ اسٹارک۔ اعلیٰ ترین سگریٹ دلز کے سمجھے جاتے تھے، جس کا صرف ایک پیکٹ دستیاب تھا۔ باقی ہم کو وہی بگلا مارکہ لینے پڑے جسے غالب نے 'کھنگ اسٹوک' قرار دیا۔ کھنگ چونکہ پنجابی میں کھانسی کو کہتے ہیں اس لیے یہ نام بہت مناسب تھا۔ اس سگریٹ کا دھواں سینے میں جا کے گھونسے کی طرح لگتا تھا تو بے اختیار کھانسی آتی تھی۔ وہاں صابن بھی تھا مگر مسئلہ ایک برتن نے پیدا کیا۔ گاؤں میں صرف مٹی کے برتنوں کی دکان تھی اور چونکہ ہم نے کافی شاپنگ کی تھی اس لیے نیک دل دکاندار نے ہمیں کمہار کا گھر بھی انگلی کے اشارے سے دکھا دیا۔ پھر اُس نے ہم سے وہ سوال کیا جس کے انتظار میں ہم بہت دیر سے تھے۔

"تم اس گاؤں کے تو نہیں لگتے۔" وہ بولا۔ "کہاں سے آئے ہو؟"

"شہر سے۔" میں نے گول مول جواب دیا۔

"شہر سے؟ قصور سے کہ لاہور سے؟" وہ بولا۔

"دونوں جگہ سے۔" میں نے کہا۔ "لاہور سے چلے تھے اب قصور سے آئے ہیں۔ دراصل ایس پی صاحب کے ساتھ خوار ہو رہے تھے۔"

"کس کے ساتھ؟" وہ چونکا۔

"پولیس کے بادشاہ کے ساتھ۔" میں نے کہا۔ "انھوں نے ایک دھوکے باز کو پکڑنا تھا... وہ کبھی اِدھر بھاگ جاتا تھا، کبھی اُدھر... آج پھنس گیا۔"

"اچھا اچھا... وہ اپنا فضلو بھی کہتا پھر رہا تھا۔" دکان دار بولا۔ "کہ کوئی بہت بڑے پولیس کے افسر آنے والے ہیں۔ تھانیدار اُسے پکڑ کے نمبردار کے پاس لے گیا تھا۔ وہاں اس نے سب کے سامنے کہا کہ اُسے کوئی ملا تھا۔ پتا نہیں کون۔ اس نے بتایا کہ تھانے والے ہوشیار رہیں... کانا... میرا مطلب ہے تھانیدار صاحب کی تو پتلون ڈھیلی ہو رہی ہے۔ اور اس کے ساتھ جو منکر نکیر ہیں نا... ان کی حالت زیادہ خراب ہے۔ آج رات بھر تھانے کی صفائی ہوگی۔"

"اس اطلاع سے مجھے دلی مسرت ہوئی۔" میں انہی کے ساتھ ہوں اور وہ گاؤں کے باہر موجود ہیں۔"

"گاؤں کے باہر؟" دکان دار اُچھلا۔ "اتنے بڑے افسر اور گاؤں کے باہر... نمبردار کی حویلی کے ہوتے ہوئے..."

"چاچا... بس یہیں رُک جاؤ۔" میں نے کہا۔ "افسر کا حکم ہے کہ کسی کو خبر نہیں ہونا چاہیے۔ بہت سخت اور ایمان دار افسر ہے... کسی بھی نمبردار، تحصیلدار، تھانیدار کے گھر کی روٹی بھی نہیں کھاتا... مگر غریب آدمی کے گھر چلا جاتا ہے۔ تمھاری زبان سے ایک لفظ نہیں نکلنا چاہیے کل تک ورنہ سمجھ لو کہ سب سے پہلے تم ہی پکڑے جاؤ گے... ابھی تک تمھارے سوا یہ بات کوئی نہیں جانتا۔"

"میں... میری توبہ... میرے باپ کی توبہ..." وہ بولا۔ "آپ یہ پیسے بھی رکھیں... میں غریب اور بڈھا آدمی ہوں۔"

"چاچا... میں نے کہا نا کہ افسر سخت ہے۔ ایک پیسے کی رشوت نہیں لیتا، اس لیے قیمت تو تم کو لینا پڑے گی۔" میں نے کہا۔ "لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ تم ایک رات کے لیے کچھ سامان دے دو۔"

"حکم کرو مائی باپ... کیا سامان چاہیے... گھر خالی کر دوں، آپ اِدھر آ جائیں... میں اپنے سسر کے گھر..."

"فضول باتیں مت کرو۔" میں نے کہا۔ "افسر اپنی آمد کو خفیہ رکھنا چاہتا ہے اور تم کہتے ہو یہاں آ جاؤ... کر سکتے ہو تو اتنا کرو کہ ایک پتیلی لا دو... دو تین چائے کے پیالے۔"

بڈھے دکان دار کے لیے یہ بڑی خوش قسمتی کی بات تھی کہ اُسے اتنے بڑے افسر کی خدمت اور رازداری کا موقع مل رہا تھا۔ اس نے سب چیزیں ہمیں لا دیں اور سارا سامان ایک پوٹلی میں باندھ دیا۔ میں نے اس کے برتنوں کے لیے سو کا نوٹ بطور زرِ ضمانت رکھوانا چاہا تو وہ ہاتھ جوڑنے لگا۔ میں نے نوٹ رکھ لیا۔ "بس اب آج رات کسی سے بات مت کرنا۔" میں نے کہا۔ "کوئی ہمارے بارے میں پوچھے تو کہہ دینا کہ مسافر تھے۔"

"کسی سے کوئی شکایت ہو تو بتاؤ۔" غالب نے کہا۔ "ہم صاحب سے سفارش کر سکتے ہیں۔"

"شکایت... شکایت تو ہے جی... پر کسی اور سے کیا کہیں، جب اپنی ہی اولاد کمینی ہو۔" وہ بولا۔ "میرا جوان لڑکا ہے جی... تین بچوں کا باپ۔ ایک رنڈی کے پیچھے لگ کر برباد ہو رہا ہے۔"

"کون ہے وہ رنڈی؟" میں نے رعب سے کہا۔

"وہ جی... ہاشو کی سالی... کیا کہیں جناب کہ ماں کتنی شریف اور اس کی بیٹی کیسی بدمعاش... تیس سال کی ہو گئی اور ابھی تک کسی نے قبول نہیں کیا اسے... کرے گا بھی کون۔" وہ بولا۔

مجھے یاد آیا کہ اسی عورت کا ذکر فضلو نے کیا تھا کہ اس کا چاچا ہاشو زبردستی اسے اپنی سالی کے ساتھ باندھنا چاہتا ہے، جو بقول فضلو کے سارے گاؤں کی جورو بن چکی ہے۔ اور فضلو اس سے شادی پر خودکشی کو ترجیح دیتا تھا۔ یہ مسئلہ ایک نہیں تھا مگر اس کا حل ایک ہی ہو سکتا تھا۔

"فکر مت کرو۔" میں نے کہا۔ "صبح سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تمھارا بیٹا اس رنڈی سے اس طرح الگ ہو جائے گا جیسے جوتی پاؤں سے الگ ہوتی ہے۔"

"یہ... یہ ہوئی نا بات جنابِ عالی... سارا کمال ہی جوتی کا ہے... بس اس کو چار چھتر پڑ جائیں کرارے۔" وہ بولا۔

"کیسے... اس رنڈی کو..." میں نے کہا۔

"نہیں جی... میرے پتر کو..." وہ بولا۔ "اور چھتر پڑیں سب کے سامنے... اس کی بیوی بھی ہو... میری بہو کے سامنے... دل خوش ہو جائے سب کا۔"

"سب کا دل خوش کر دیں گے چاچا... السّلام علیکم..." میں نے کہا۔

جب ہم واپس آ رہے تھے تو مرزا غالب نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ یہاں ہر مرض کی دوا چھتر ہے۔ جمہوریت اور شخصی آزادی، انصاف اور قانون... انسانی نفسیات پر چھتر کاری کے منفی اثرات یہ سب یہاں کوئی نہیں جانتا... چور کا علاج چھتر... آوارہ پن کا علاج چھتر... عشق کا علاج چھتر... جن بھوت کا علاج چھتر۔ جو پٹواری... مولوی صاحب یا نمبردار کی نہ مانے اس کا علاج چھتر۔

ہماری عدم موجودگی میں محسن نے ایس پی سے جھاڑو دلوائی تھی۔ جھاڑو بھی سراج نے خود ہی درختوں سے پتلی پتلی شاخیں توڑ کے بنائی تھی اور پھر پتوں سے ہی رگڑ رگڑ کے فرش کو صاف کیا تھا۔ وہ دو بار محسن سے پٹا بھی تھا۔ ہم نے موم بتی روشن کی تو چھت پر چمگادڑوں نے احتجاجاً اُڑنا اور چیخنا شروع کیا۔ وہ کچھ دیر کمرے میں چکر لگا کے باہر نکل گئیں تو محسن نے سارا سامان دیکھا اور ہماری ساری روداد سُنی۔ اس عرصے میں غالب نے پتھروں کا چولھا بنوایا اور سراج کو باہر سے خشک لکڑیاں جمع کرنے لے گیا۔ اب ہم اپنی مرضی کے مطابق چائے تیار کرنے کی پوزیشن میں تھے لیکن میں نے تجویز پیش کی کہ پہلے ہمیں نہا لینا چاہیے۔

کنوئیں پہ سراج کو بیل کی جگہ باندھ دیا گیا۔ اس کے مقدر میں خدا نے جتنی ذلت لکھی تھی وہ اس کو بہرحال اٹھانا تھی۔ باری

باری ہم نے بھی اس کے ساتھ زور لگایا اور ایک ایک کر کے نہاتے گئے۔ پانی بہت صاف اور ٹھنڈا تھا۔ لائف بوائے کا گاؤں میں ملنا کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ یہ یونیورسل قسم کا باتھ سوپ تھا جو شاید ماؤنٹ ایورسٹ پر بھی مل جاتا۔ اس سے نہا دھو کے پاک ہوتے ہی ہم نے خود کو ایک نئی دنیا کا نیا انسان محسوس کیا جس کے جسم میں نئی طاقت تھی اور جس کا عزم و حوصلہ نیا تھا۔ سراج کو ہم نے مُنہ بھی نہیں دھونے دیا کیونکہ صبح اس کو مفرور ملزم کی طرح پیش کرنے کے لیے اس کا حُلیہ بھی خراب ہونا ضروری تھا۔ ہم نے چولھا جلا کے چائے بنائی اور بسکٹ کھاتے ہوئے مسلسل چائے پیتے رہے۔ ولز کے سگریٹ برابر تقسیم کیے گئے۔ دسویں سگریٹ کو پہلے سلگایا گیا اور اس کے سُوٹے سب نے لیے۔ سراج کو بھی بسکٹ اور چائے دی گئی اور پھر باندھ کر دوسرے کمرے میں ڈال دیا گیا جس کی چھت نہیں تھی۔ اس کے مُنہ میں کپڑا نہیں ٹھونسا گیا تھا۔ یہاں اس کو شور مچانے کی اجازت تھی مگر وہ بالکل گُم سُم پڑا رہا۔ اس سے بندھی ہوئی ایک ڈوری ہمارے ہاتھ میں رہی لیکن پھر بھی ہم نے اس پر نظر رکھی۔ وہ ایسا آدمی تھا کہ مالا کی ڈوری کسی پتھر سے باندھ کے نکل جاتا اور ہم ساری رات ڈور تھامے اس یقین کے ساتھ بیٹھے رہتے کہ وہ موجود ہے۔

دس گیارہ بجے چاند نکلا تو ہم زمین پر ایک دوسرے کے متوازی لیٹے سگریٹیں پھونک رہے تھے کھانس رہے تھے اور سب ایک ہی بات سوچ رہے تھے۔ سب کے ذہن میں رابعہ کیتھرین اور استاد ٹیڈی کا خیال تھا۔

اچانک محسن نے پوچھا "یار غالب! تو نے بھی شعلا کو روکا تھا؟"

غالب نے اسے سر گھما کے دیکھا "کس بات سے؟ میں نے اسے شادی کے وقت روکا تھا کہ کس کو قبول کر رہی ہے... میرا مطلب ہے روکتا اگر..."

"بکواس مت کر۔" محسن گرم ہو گیا "سیدھی طرح بتا..."

"کیا بات ہے یار... تو بہت سیریس ہو رہا ہے۔" غالب بولا۔

"میں نے جو پوچھا ہے وہ بتا... تو نے بھی منع کیا تھا اسے؟"

"کس بات سے یار... تو جانتا ہے وہ انکل رضوی کے گھر میں تھی۔" غالب بولا۔

"انھوں نے بھی اُسے روکا تھا... کہ جولی کے لیے گردے کا عطیہ نہ دے؟"

"تو پاگل ہو گیا ہے کیا؟" غالب اُٹھ بیٹھا "شعلا نے کب عطیہ دیا تھا جولی کے لیے؟"

"پھر کس نے دیا تھا؟" میں نے اسے غور سے دیکھا۔

"ایک حافظ جی تھے۔ اخبار میں اپیل چھپی تھی تو ان کی بیٹی آ گئی تھی اور لوگ بھی بہت آئے تھے مگر گردہ اسی حافظ جی کی بیٹی کا لگا۔ انھوں نے کسی طرح بھی ایک پیسہ نہیں لیا... نہ معاوضہ، نہ نذرانہ، نہ تحفہ..." غالب بولا۔

"غالب... کیا کہہ رہا ہے تو..." میں نے اس لہجے میں کہا کہ غالب پریشان ہو کے بیٹھ گیا۔ اس نے میری اور محسن کی صورت پر برستی ہوئی وحشت کو دیکھا۔

"اس میں... ایسی کون سی انہونی بات ہے یارو؟" وہ بولا۔

"پھر کیا ہوا تھا شعلا کو..." محسن نے چلّا کے کہا "اس کی طبیعت اچانک اتنی خراب کیسے ہو گئی تھی۔ کون جھوٹ بول رہا ہے مجھ سے... زمانہ کہ تو..."

"یار میں کیوں جھوٹ بولوں گا... اس کی طبیعت... خراب تو خیر ہوئی تھی مگر اس میں بھی کوئی غیر معمولی بات نہیں... انکل رضوی سے بہتر اس کا خیال رکھنے والا کون تھا... اور پھر آنٹی تجربے کار ہیں۔ باقاعدہ میڈیکل چیک اپ کے لیے وہ ایک گائناک اسپیشلسٹ کے پاس جاتی تھی... آنٹی کی کوئی کزن وغیرہ ہے۔"

"پھر وہ مر کیسے گئی... کیسے مر گئی وہ..." محسن نے اس کا گریبان پکڑ لیا اور اسے دیوانہ وار جھنجوڑنے لگا۔

غالب نے محسن کو دھکا دیا "سکندر... یہ پاگل ہو رہا ہے، پیچ پچ... کہتا ہے شعلا مر گئی... کیوں کرتا ہے یہ ایسی باتیں۔"

"تو... تو کیا... وہ زندہ ہے۔" میرے حلق سے آواز بڑی مشکل سے نکلی اور جو آواز نکلی وہ مجھے اپنی نہیں لگی۔

"تم مذاق تو نہیں کر رہے ہو... تمھاری صورت بتاتی ہے کہ تم سیریس ہو... کیا کسی نے تم سے کہا تھا کہ وہ مر گئی ہے؟" غالب نے باری باری مجھے اور محسن کو دیکھا جو اب بُت کی طرح ساکت بیٹھے تھے "میں سمجھ گیا... یہ ان خبیث لوگوں نے کہا ہوگا۔ تم کو اذیت دینے کے لیے... ہے نا یہی بات..."

میں نے احمقانہ اور مجرمانہ ندامت سے سر ہلایا۔

"اُلو کے پٹھو... مجھ سے اب تک پوچھا بھی نہیں..." غالب چلّانے لگا "انھوں نے کہا اور تم نے مان لیا...؟ میں قابلِ اعتبار نہیں تھا تمھارے لیے؟"

"یار... وہ دراصل..." میں نے کہا۔

"کیا دراصل...... اصل بات یہ ہے کہ دونوں کے دماغ میں بھوسا بھرا ہے اور کچھ نہیں... سارے زمانے کی باتیں کر لیں۔ صبح سے رات ہو گئی... کہاں کہاں جھک مار آئے۔ شعلا کا نام تک نہیں آیا کسی کی زبان پر۔" غالب ہم پر بری طرح برسنے لگا۔

"ہم اس بُری خبر پر اعتبار کر چکے تھے۔" میں نے کہا "ہم میں سے کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس موضوع کو چھیڑتا... میں

محسن کے خیال سے چُپ تھا۔ محسن ظاہر کر رہا تھا کہ وہ کتنا صبر کرنے والا دل رکھتا ہے۔"

"کیا وہ... وہ زندہ ہے غالب... دیکھ جھوٹ مت بول مجھ سے... میں نے دل کو پتھر کر لیا تھا۔ سینے پر صبر کی چٹان رکھ لی تھی۔ مجھے ایسے جھوٹ کی ضرورت نہیں ہے جو کوئی مجھے تسلّی دینے کے لیے بولے۔" محسن نے غالب کا بازو تھام لیا۔ وہ بُری طرح کانپ رہا تھا۔

"محسن! وہ بالکل ٹھیک ہے میرے یار... شعلا بالکل ٹھیک ہے... تو بتا میں کس کی قسم کھاؤں۔" غالب نے اس کے چہرے پر پیار سے تھپکی دی۔

"تو نے... تو نے خود دیکھا تھا؟ کب دیکھا تھا؟" محسن بولا۔

"یہاں آنے سے، دو دن پہلے..." غالب بولا "دیکھا تو نہیں تھا... فون پر بات ہوئی تھی... اس وقت نازو بھی تھی وہاں... اور میں نے جب نمبر ملایا تھا تو ریسیور آنٹی نے اُٹھایا تھا۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ کھانے کی چور ہے... تم ہی سمجھاؤ اسے، کل رات دودھ کا آدھا گلاس پیا، آدھا واش بیسن میں ڈال دیا۔ صبح مجھے پتا چل گیا... یہ کیا احمقانہ حرکت ہے... میاں تو ہمارے بھی گھر سے دُور رہتے تھے۔ چوروں ڈاکوؤں کے پیچھے مارے مارے پھرتے تھے مگر ہم اپنا خیال رکھتے تھے۔ اس طرح کھانا پینا چھوڑنے سے اپنی صحت تو خراب ہوگی۔ پھر بچے کی صحت کیسے اچھی ہوگی۔ میں نے کہا تھا کہ آنٹی آپ مجھے کیا کہہ رہی ہیں۔ ایس ایس پی صاحب سے کہیں۔ دو ہاتھ لگائیں... تیر کی طرح سیدھی ہو جائے گی۔ میں نے بھی اُسے ڈانٹا تھا کہ کھاؤ... اتنا کھاؤ کہ ہیضہ ہو جائے۔ بھوک مرنے سے کھا کھا کے مرنا بہتر ہے۔"

محسن ایک دم ہاتھوں میں مُنہ چھپا کے رونے لگا۔ میں نے اس کا سر اپنے کندھے پر رکھ لیا "مت رو محسن... وہ سب جھوٹ تھا... ڈراؤنا خواب تھا..."

"میری شعلا زندہ ہے سکندر... میرا بچہ بھی زندہ ہے۔" محسن اب پھوٹ پھوٹ کے رو رہا تھا لیکن یہ خوشی کے آنسو تھے۔ جسے اس نے اپنے ذہن سے فراموش کر دیا تھا اور تصوّر میں ایک بھولی بسری یاد بنا لیا تھا، وہ پھر حقیقت بن کے اس کی دنیا میں آ گئی تھی۔ یہ اتنی بڑی خوشی تھی کہ اس کا پاگل ہو جانا بھی ممکن تھا۔ میں نے اُسے رونے دیا۔ یہ جانے بغیر کہ میں خود بھی رو رہا ہوں، صرف غالب تھا جو بے وقوفوں کی طرح ہم دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ اور بڑبڑا رہا تھا "لاحول ولا قوۃ... اچھا عشق ہے یہ... تو بہ محبت ہے۔ کسی نے کہا کہ وہ مر گئی اور دل نے مان لیا... سب ڈراما ہے... سچا عشق ایسا نہیں ہوتا... کوئی لاکھ کہتا مگر دل نہ مانتا... یہ تو محبت کا دعویٰ کرنے والے کے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہے... کل کوئی کہہ دے گا کہ وہ بھاگ گئی کسی کے ساتھ... یا اس نے نکاح ختم کرانے کا کیس کر دیا ہے... مان لوگے؟"

"بس یار... اب اور شرمندہ مت کر..." میں نے کہا۔ "اسے مبارکباد دے کہ اس کی محبت اسے پھر مل گئی۔"

"ہونہہ... محبت..." غالب بولا "یہ کہہ کہ یقین پھر مل گیا۔ بہت کچّا اور بودا... ناقابلِ اعتبار یقین ہے یہ بھی... پھر اُٹھ جائے گا کسی کی بات پر۔"

"مرزا جی! انھوں نے بات ہی اس طرح کی تھی۔" میں نے کہا "تم ہوتے تو تم بھی مان جاتے۔ انھوں نے کہا کہ جولی کا آپریشن کامیاب نہیں ہو سکا۔"

"ایسی کی تیسی ایسا کہنے والوں کی... جولی بالکل ٹھیک ہے... بالکل صحت مند ہے اور اس کا آپریشن ایک سو ایک فیصد کامیاب تھا۔" غالب نے کہا "ڈاکٹر بھی اس کی صحت یابی کی رفتار پر حیران تھے۔ اس نے بڑی تیزی سے ریکوَر کیا۔ ایک دو ہفتے میں وہ چلنے پھرنے لگے گی۔ یہ سب انکل رضوی نے خود اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ صبح شام اسے دیکھنے جاتے تھے۔ سارے ڈاکٹر اٹین شن رہتے تھے۔ نرس ہر وقت موجود... اسپیشل وارڈ میں تو پہلے ہی منتقل کر دیا گیا تھا۔ اور وہ تو ایسا کیس تھا کہ نہ جانے کتنے رضا کار تھے۔ سب بضد تھے کہ ہم سے گردہ لے لو۔ اسے دیکھنے کے لیے تو نہ جانے کتنے لوگ ہر روز آتے تھے... اسکولوں کے بچّے اپنے ساتھ گلدستے لاتے تھے۔ چرچ کی طرف سے الگ گلدستے پہنچتے تھے۔ ٹیلی فون تو سارا دن آتے تھے۔ اخبارات میں اس کی تصاویر بھی چھپتی رہی تھیں۔ سب اپنے یار تھے جو برابر کام کر رہے تھے۔"

"آج مجھے بہت عرصے بعد... نہ جانے کتنی صدیوں کے بعد... اتنی بڑی خوشی ملی ہے۔" میں نے کہا "اتنی بڑی کہ میرے دل میں اس کے لیے جگہ تنگ لگتی ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے سرکاری کوارٹر رکھنے والے چپراسی کو قارون کا خزانہ مل جائے، جس کی کُنجیاں ہی سات اونٹوں پر لادی جاتی تھیں۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا سکندر..." محسن نے بالآخر خود کو سنبھال کے اپنے آنسو خشک کیے "کہ کیتھرین بھی ٹھیک ہوگی۔ ہم سے تو انھوں نے کہا تھا کہ اسے بیٹی کے مرنے کی خبر دی گئی تھی تو وہ بے ہوش ہو گئی تھی اور اس کی حالت بہت تشویشناک بتائی تھی۔"

"کیتھرین کی بات اور ہے۔ بیٹی کی موت کی خبر سے اُسے

کچھ بھی ہو سکتا تھا۔" میں نے کہا۔

"میرا دل اب بھی نہیں مانتا۔" محسن نے کہا۔

"آپ کا دل انتہائی فضول... کمزور اور جاہل ہے۔" غالب نے کہا۔ "اب اس پر اعتبار کیوں کرتے ہو۔"

"وہ ہمت والی عورت تھی یار۔" محسن بولا۔ "صدمہ تو ہوا ہوگا اُسے مگر اتنا نہیں۔ جب شہلا کی اور جولی کی بات غلط ہوگئی تو یہ بات بھی غلط ہوگی کہ وہ بے ہوش پڑی تھی... اگر وہ بے ہوش تھی۔ اور اس کی حالت اتنی ہی خراب تھی تو وہ جاتے وقت اُسے کیوں لے گئے؟"

"ماشاء اللہ، بڑے منطقی دلائل سُوجھ رہے ہیں اب۔" غالب نے طنز کیا۔

"ظاہر ہے یار... جب دماغ کو غلط لائن پر ڈال دیا گیا تھا تو سوچ کیسے صحیح رہتی۔" محسن نے کہا۔ "تو بہت بول رہا ہے بیٹے... وہاں ہماری جگہ ہوتا تو ہم پوچھتے... سارا ردیف قافیہ تنگ ہو جاتا۔"

"ہاں یار... اب ذرا فرصت ہے... بتاؤ تمھارے ساتھ انھوں نے کیا سلوک کیا۔" غالب بولا۔ "ویسا ہی جیسا بادشاہ، بادشاہوں کے ساتھ کرتے ہیں... یا ویسا جو اکثر بادشاہوں کے ساتھ نہیں کرتے؟"

"انھوں نے ہمارے ساتھ وہی سلوک کیا جو ہم ان کے ساتھ کرتے۔ اگر وہ ہمارے قبضے میں ہوتے۔" میں نے کہا اور پھر غالب کو مختصراً وہ سب بتانے لگا جو ہم پر بیتی تھی۔ غالب نے درمیان میں کئی بار ان کو گالیاں دیں اور اُبلتا رہا کہ قسم فلاں کی۔ فلاں کے ساتھ یہ نہ کیا تو غالب نام نہیں۔

رات کے آخری پہر میں جب ہمارے سگریٹ بھی ختم ہو گئے اور ہماری باتیں بھی ختم ہوگئیں تو ہم نے سونے کی ناکام کوشش کی۔ صرف غالب اپنی کوشش میں کامیاب ہوا۔ میں اور محسن صبح کا اجالا پھیلنے تک شہلا، رابعہ اور جولی کی باتیں کرتے رہے۔ محسن اب بہت خوش تھا۔ خود میں محسوس کرتا تھا کہ میری دنیا میں امید کا نیا تابناک سورج طلوع ہوا ہے جس نے مایوسی کے اندھیرے کو یوں دھو ڈالا ہے جیسے بارش گرد آلود آسمان کو دھو ڈالتی ہے۔ صبح کے آثار نمودار ہونے لگے تو مجھے خیال آیا کہ کچھ کرنا چاہیے۔ میں نے محسن سے کہا اور محسن نے اتفاق کیا۔ ہم دونوں کنوئیں تک گئے۔ محسن نے اپنی ایس پی کی میلی وردی اتاری اور میں نے رہٹ چلایا۔ اسی لائف بوائے صابن سے محسن نے وردی کو اچھی طرح دھو کے صاف کیا۔ اتنی دیر میں اجالا کافی پھیل گیا تھا چنانچہ ہم نے باری باری غسل کیا اور لوٹ آئے۔ جب ہم چائے بنانے کی تیاری کر رہے تھے تو غالب اٹھا۔ مجھے چولھا جلاتے اور محسن کو دُھلے ہوئے کپڑے پھیلاتے دیکھ کر وہ بہت ہنسا۔

"کیا وقت آگیا ہے۔" وہ اُٹھتے ہوئے بولا۔ "جو سکندرِ اعظم بنے پھرتے تھے وہ چولھا پھونک رہے ہیں۔ تقدیر نے تن کے کپڑے تک اتروا لیے ہیں۔"

"یہ نہیں دیکھتا شاعر کی دُم کہ تقدیر نے ایس پی کی وردی بھی پہنا دی ہے۔" محسن نے شرما کے کہا۔

"مت سن اس کی شاعری۔" میں نے محسن سے کہا۔ "یہاں سب اپنے ہیں اور اپنوں میں شرم کیسی۔"

غالب اس کے بعد کنوئیں پر گیا اور میں نے غسل میں اس کی مدد کی۔ جب ہم واپس آئے تو محسن چائے بنا چکا تھا۔ ہم نے دہکتے ہوئے کوئلے اسی پتیلی میں ڈالے جس میں چائے بنائی گئی تھی اور ایس پی کی وردی کو فرش پر بچھا کے اور ہاتھ سے برابر کرتے ہوئے پتیلی گھس کر استری کی۔ پتیلی کا پیندا اتنا گرم ہوگیا تھا کہ نتائج سو فیصد نہیں تو ستّر فیصد ہماری توقع کے مطابق نکلے۔ دُھلنے اور استری ہونے کے بعد وردی بالکل ایسی ہوگئی تھی کہ دورے پر جانے والے ایس پی کے شایانِ شان ہو۔ ایک میلی کچیلی اور شکن آلود وردی کا امپریشن اتنا اچھا نہ پڑتا۔ اس ایجاد شدہ، استری سے وردی خشک بھی ہوگئی تھی ورنہ ہمیں دھوپ کے نکلنے کا انتظار کرنا پڑتا اور اُسے دو تین گھنٹے تک پھیلائے رکھنا پڑتا۔ سراج کی جیب میں سے ایک کنگھی بھی نکلی تھی جو اس وقت کام آئی۔ میرے اور غالب کے کپڑے اتنے صاف نہیں تھے لیکن ہمارا کردار بھی اتنا اہم نہیں تھا۔ میں ایس پی صاحب کا پی اے تھا، اور غالب ان کا چپراسی۔

نو بجے کے قریب ہم اس جلے ہوئے گھر سے اپنے قیدی کو لے کر روانہ ہوئے۔ سراج اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ ہم کیا کرنے والے ہیں مگر وہ ہمیں روک نہیں سکتا تھا۔ ہم نے اس کا مُنہ پھر بند کر دیا تھا تاکہ وہ بول ہی نہ سکے۔ گاؤں کی حدود شروع ہوتے ہی ہمیں متعدد افراد نے دیکھا جو ہل لے کر کھیتوں کی طرف جا رہے تھے اور بڑے ادب سے سلام کیا۔ فضلو کی کارکردگی کا اندازہ میں نے گزشتہ شب ہی کر لیا تھا۔ اس نے ایس پی کی آمد کی خبر متعلقہ افراد تک پہنچا دی تھی اور اب تک غیر متعلقہ افراد کو بھی معلوم ہو چکا تھا کہ پولیس کا کتنا بڑا افسر گاؤں میں آنے والا ہے۔

پولیس چوکی تلاش کرنے میں ہمیں کسی قسم کی دشواری پیش نہیں آئی۔ یہ دو کمروں پر مشتمل کچی عمارت تھی جو انسپکشن کے لیے تیار تھی۔ کانے حوالدار نے راتوں رات اس پر سفیدی پھیری تھی۔ ظاہر ہے اس نے مقامی آبادی کو بیگار میں پکڑا ہوگا۔ باہر بھی چونے کی سفید لکیریں پڑی ہوئی تھیں اور اندر بھی ہر چیز چمک رہی تھی۔ یہ کسی تھانے تک ہی محدود نہیں، ہر دفتر اور ادارے میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ جب کوئی بڑا افسر یا وزیر معائنے کے لیے تشریف لاتا ہے تو تمام معاملات درست ملتے ہیں اور حالات مثالی ہو جاتے ہیں۔ عملہ مستعد، با اخلاق اور فرض شناس نظر آتا ہے۔ ہر کام قاعدے ضابطے کے مطابق۔ صفائی کا معیار بہترین۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ عام دنوں میں کیا ہوتا ہے۔ اگر سارا سال کارکردگی کا ایسا ہی معیار رہے تو پبلک کو کسی سے شکایت نہ رہے اور خواہش کرنے کو کچھ نہ رہے مگر یہ ایک رسم ہے جو اسی طرح سب لوگ نباہتے ہیں۔

ہماری تشریف آوری کی خبر ہم سے بہت پہلے پہنچ گئی تھی۔ غالباً کانے تھانیدار نے گاؤں کے چاروں طرف اپنے مخبر کھڑے کر دیے تھے کہ ایس پی صاحب جدھر سے بھی نمودار ہوں اُسے دوڑ کر اطلاع دی جائے۔ وہ بہ نفسِ نفیس ہمارے استقبال کے لیے موجود تھا۔ اس کی وردی سے جوتے تک سب بے داغ تھے اور اپنی ایک آنکھ پر اس نے سیاہ چشمے کا پردہ ڈال رکھا تھا۔ اُس نے چلّا کر ہمیں سیلوٹ کیا۔ اس کے ساتھ ہی دونوں سپاہی اٹین شن ہوئے اور انھوں نے بھی ایڑیاں بجا کے سیلوٹ جھاڑا۔ یہ گویا گارڈ آف آنر تھا۔ کانا حوالدار بظاہر بہت پُر اعتماد نظر آرہا تھا مگر مجھے معلوم تھا کہ وردی میں اس کی ٹانگیں کانپ رہی ہوں گی۔ کسی ایس پی کا ایک چھوٹے سے گاؤں کی پولیس چوکی پر اچانک چھاپا مارنا قیامت کے آنے سے کم نہیں ہوتا۔

محسن نے ایک شانِ استغنا کے ساتھ سر ہلا کے سیلوٹ کا جواب دیا اور کہا۔ "دیکھو بھئی... ہم نے یہ خطرناک مجرم پکڑا ہے... یہ بہت بڑا دھوکے باز ہے... اور جعلساز ہے..."

"شکل سے ہی ایک نمبر فراڈ لگ رہا ہے جنابِ عالی۔" کانے حوالدار نے کہا اور اس کے ماتحت عملے نے تائید میں سر ہلایا۔

محسن اس کرسی پر بیٹھ گیا جو واحد میز کے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ "اس کو حوالات میں ڈالو۔" اس نے دوسرے کمرے کی طرف نگاہ ڈالتے ہوئے کہا جو باقاعدہ حوالات تھا۔ اس میں لوہے کی سلاخوں والا دروازہ تھا جس میں قفل بھی پڑا ہوا تھا۔

کانے حوالدار نے گرج کر اپنے ایک ماتحت کو حکم دیا۔ "او بے سعدنے... اس بدمعاش کو ڈک دے... تفتیش کرنا ہے جنابِ عالی؟"

اس کا مطلب واضح تھا۔ تفتیش کے نام پر پولیس صرف تشدد کرتی ہے۔ کانا حوالدار افسر کو خوش کرنے اور اپنی فرض شناسی ثابت کرنے کے لیے فوراً تیرہ نمبر چھتّر کا استعمال شروع کرنا چاہتا تھا۔

"ابھی نہیں..." محسن نے ہاتھ اُٹھا کے کہا اور اپنی کیپ اتار کے میز پر ڈال دی۔ "بس اس کا مُنہ بند رکھنا... مجھے شور اچھا نہیں لگتا۔"

سراج کا مُنہ تو پہلے ہی بند تھا۔ جب اسے نہایت ذلّت کے ساتھ دھکّے دے کر حوالات میں پھینکا گیا تو مجھے دلی مسرّت حاصل ہوئی۔ وہ اس تھانے کا حاکم تھا مگر اس کے ماتحت اسی کے ساتھ مجرموں جیسا سلوک کر رہے تھے۔ اندر ہی اندر اس کا خون کھول رہا ہوگا لیکن وہ بے بس تھا۔

"بہت کمینہ ہے یہ..." محسن نے کہا۔ "نہ جانے کتنے لوگوں کو لوٹ چکا ہے۔ کہیں تحصیلدار بن کے جاتا ہے۔ کہیں نہر کے محکمے کا افسر بن جاتا ہے۔ ایک گاؤں کے لوگوں سے دس ہزار وصول کر لیے تھے کہ نہر کا پانی بند ہی نہیں ہوگا... آج کل ایس پی بنا پھر رہا تھا۔"

"ایس پی؟" کانا حوالدار اُچھلا۔ "اس کی یہ مجال..." وہ کسی مجبوری کے باعث جیم کی آواز نکالنے سے قاصر تھا۔ "زوتے مار مار کے..."

"بھئی، دیکھو..." محسن نے اس کی بات کاٹ دی۔ "یہ ہمارے ماتحت ہیں... ہمارے ساتھ خوار ہو رہے تھے... ارے بھئی، تم کھڑے کیوں ہو۔" محسن نے مجھے مخاطب کیا۔ "بیٹھ جاؤ نا... تم بھی دروازے کے باہر بیٹھو... میری اجازت کے بغیر کسی کو اندر مت آنے دینا... اور مجمع مت لگانا..."

"جی سرکار..." غالب بولا اور باہر چلا گیا جہاں اس کو بھی تشریف رکھنے کے لیے ایک کرسی دی گئی۔ میں بھی دوسری کرسی پر بیٹھ گیا جو میز کے دائیں جانب پڑی تھی۔ تیسری کرسی بائیں طرف تھی۔ سامنے کوئی کرسی نہیں رکھی گئی تھی۔ یہ سب کرسیاں کسی کے گھر سے منگوائی گئی تھیں کیونکہ اس قسم کا فرنیچر تو شہر کے تھانوں میں بھی نظر نہیں آتا... ایک بنچ کمرے کی دیوار کے ساتھ ڈال دی گئی تھی جو ملاقاتیوں کے لیے تھی۔ ان کو افسرِ اعلیٰ کے بہت قریب آنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی تھی۔ حاکم اور محکوم کے درمیان یہ فرق بھی نہ رہے تو خطرناک قسم کی اسلامی مساوات آجاتی ہے اور جمہوریت آجاتی ہے جو حاکموں کو حاکم نہیں رہنے دیتی۔ چنانچہ جو نظام گوری چمڑی والے انگریز نے کالی رعایا کو خود سے دُور رکھنے کے لیے قائم کیا تھا، وہ اپنی قابلِ مذمت روایات کے ساتھ آزاد نوکر شاہی نے اپنا لیا تھا۔

"ہاں بھئی... کیسا چل رہا ہے یہاں کا نظام؟" محسن نے سر کے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ آنکھیں ملیں اور کچھ اطمینان سے۔ بیٹھ

گیا۔ مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ وہ بہت تھکا ہوا ہے۔

"نظام بہترین چل رہا ہے زناب... بہترین۔" کاتے حوالدار نے کہا۔ اور اپنے ایک نائب کو کچھ اشارہ کیا جو میں نے دیکھا۔ ماتحت فوراً دبے پاؤں نکل گیا۔

"وارداتوں کا کیا حال ہے؟" محسن نے کہا۔

"اللہ کی مہربانی سے سب ٹھیک ہے... چوری ڈکیتی کچھ نہیں... بس کبھی کبھی آپس کے چھوٹے موٹے زگڑے (جھگڑے) ہوزاتے ہیں... تو زناب عالی وہ میں زو تے... میرا مطلب ہے صلح صفائی کرا دیتا ہوں۔" حوالدار نے مفصل رپورٹ دینا شروع کی۔ "زگڑے بھی دہی ہوتے ہیں۔ کسی کے ڈنگر کسی کے کھیت میں چلے گئے... آخر زانور ہے زناب عالی... گھروں میں لڑائی ہوزاتی ہے... جہاں دو برتن ہوتے ہیں وہ ٹکراتے ہیں تو بزتے ہیں... پرچے کاٹنے سے کیا فائدہ۔"

"یہاں گنجے بہت نظر آئے مجھے۔" محسن نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

حوالدار پر بجلی گر پڑی۔ "زی..." اس کے حلق سے عجیب سی آواز نکلی۔

"گنجے... بہت سے لوگوں کی ٹنڈ نظر آئی مجھے..." محسن نے کہا۔

"وہ... دراصل... گرمی بہت پڑتی ہے تو زناب یہاں کے لوگ سر منڈوا دیتے ہیں تاکہ سر کو ٹھنڈی ہوا لگے مغز ٹھنڈا رہے۔"

"مجھے رپورٹ ملی تھی کہ ٹنڈ تم کراتے ہو۔" محسن نے اسی لہجے میں حوالدار کی طرف دیکھے بغیر کہا اور اپنے جوتوں کے تسمے کھولنے لگا۔

حوالدار پر اب آسمان ٹوٹ پڑا۔ "میں... یہ آپ کیا فرماتے ہیں زناب عالی... میری کیا مزال... کسی نے زوٹی رپورٹ دی ہے... بہت سے کمینے لوگ میرے خلاف ہیں... میں انصاف سے کام لیتا ہوں اس لیے... میرا تو یہی فرض ہے... کسی میں فرق نہ رکھوں... یہاں پٹواری اور نمبوار... زمیندار... یہ چاہتے ہیں کہ میں ان کا ساتھ دوں... وہ زس کو کہیں زوتے ماروں غریب مزارع۔"

"یہ تم سے نمبوار اور پٹواری کہتے ہیں؟" محسن نے کہا۔ "یعنی مطالبہ کرتے ہیں کہ کسی بے گناہ کو ان کے کہنے پر تھانے بلا کے جوتے مارے جائیں؟ میں ملنا چاہتا ہوں ان سے... اس کا مطلب تو یہ ہے کہ وہ پولیس کے کام میں دخل دیتے ہیں۔ میرے ایک ماتحت کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔"

"یہ بات... یہ بات نہیں زناب عالی۔" حوالدار کی حالت اس وقت کے خیال سے غیر ہونے لگی جب ایس پی یہ بات نمبوار اور پٹواری کے سامنے کہے گا کہ تم میرے ماتحت سے غلط کام کراتے ہو۔ "آپ تو افسر ہیں... کبھی کبھی آتے ہیں... یہاں ہم دن رات ان کے ساتھ ہیں... ان کی نظر دیکھتے ہیں... وہ زبان سے کچھ نہیں کہتے۔"

"ہاں... یہ تو ہے... دریا میں رہ کے مگر مچھ سے بیر نہیں رکھا جا سکتا... لیکن میرے پاس کچھ درخواستیں آئی تھیں۔" محسن بولا۔

"کس کی زناب...؟" حوالدار کا رنگ پھر اڑ گیا۔

"میں بلاؤں گا ان سب کو آج۔" محسن نے کہا۔

"ایک تو سرِدہ فضل الرحمٰن عرف فضلو کا کیس ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں بھئی... مجھے یاد ہے... ایک عورت کے بارے میں بہت سی شکایات ملی تھیں۔ کوئی حشمت اللہ ہے یہاں۔ اس کی بیوی کی بہن ہے۔" محسن نے افسرانہ شان بے نیازی سے کہا۔

"وہ... گلابو..." حوالدار بولا۔ "بڑی حرافہ ہے... زی... مگر آپ کچھ کھا پی لیں پہلے۔"

"ہاں بھئی... چائے اگر مل جائے تو..." محسن نے دونوں ٹانگیں میز پر پھیلا کے کہا اور جیب میں سے دس کا نوٹ نکالا۔ "یہ ایک پیکٹ تھری کاسل کا۔"

"کس چیز کا زناب عالی؟" حوالدار دم بخود رہ گیا۔ یہ نام اس نے پہلی بار سنا تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ افسر بسکٹوں کا پیکٹ مانگ رہا ہے یا بندوق کی گولیوں کا۔

"سگریٹ چاہئیں... میرے سگریٹ رات کو ختم ہو گئے تھے۔" محسن بولا۔

"تو حکم کریں زناب..." وہ ایک الماری کی طرف لپکا۔ اس میں سے کیپسٹن کے سگریٹوں کا پورا کارٹن نکالا جو اس نے یقیناً شہر سے بطورِ خاص منگوایا ہوگا یا کسی نمبردار قسم کی چیز نے تحفے میں بھیجا ہوگا۔

"تھانے میں سگریٹ؟" محسن نے ناگواری سے کہا۔

"وہ سر... آپ کے لیے نمبردار صاحب نے خاص طور پر بھیجے تھے... اور انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ آج رات کا کھانا..."

"شٹ اپ..." محسن نے کہا۔ "یہ لو دس روپے... اس میں سے دس پیکٹ لے دو... بلکہ یہ دس روپے اور رکھو... کارٹن میرے حوالے کرو۔"

"زناب عالی... وہ پیسے نہیں لیں گے..." حوالدار نے مری مری آواز میں کہا۔

"مگر تم دو گے... ابھی اپنے پاس رکھو... جب میں انھیں بلاؤں تو میرے سامنے دینا۔ میں دیکھتا ہوں وہ کیسے انکار کرتے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "اور ہاں شام کے کھانے کے لیے ان سے منع کر دو۔ میں کسی کے گھر دعوت میں نہیں جاتا۔ کوئی تحفہ قبول نہیں کرتا اور ہر چیز کی نقد قیمت ادا کرتا ہوں۔ جو افسر پہلے آئے ہوں گے ان کی بات اور تھی۔ مجھے ان جیسا نہ سمجھا جائے۔ یہ بات ان سب کو معلوم ہو جانا چاہیے جو مجھ سے ملنے آئیں۔ اگر کسی نے مجھے کسی بھی بہانے کچھ پیش کیا... تو تم معطل..."

"زی... زی... زناب عالی..." حوالدار کا خون خشک ہونے لگا مگر خیریت گزری کہ اسی وقت چائے آ گئی۔ حسبِ توقع چائے کے ساتھ بہت کچھ تھا۔ میں نے حوالدار کو آنکھ سے باہر چلنے کا اشارہ کیا۔

"جب افسر لوگ چائے پیتے ہیں تو کسی کی موجودگی پسند نہیں کرتے تم ہمارے لیے چائے ناشتا یہیں لے آؤ۔" میں نے کہا۔

"بہت اچھا زناب... غلطی ہو گئی تھی مجھ سے۔" وہ اندر جانے لگا۔

"بے وقوف... ابھی نہیں... پہلے صاحب کو فارغ ہونے دو۔" میں نے کہا۔

میری اس کوشش کا فائدہ یہ ہوا کہ محسن نے اطمینان سے پیٹ بھر کے کھایا۔ دیہات کے خالص مکھن کا بھرا ہوا دو لگا تھا۔ پراٹھے تھے حلوا تھا۔ اُبلے ہوئے انڈے تھے اور چائے تھی۔ ڈراما صحیح پیش کرنے کے لیے ہمیں آدھا گھنٹا انتظار کرنا پڑا۔ مگر اس کے بعد کھانے کا سامان باہر آیا تو میں نے اور غالب نے سب کے سامنے ڈٹ کر کھایا۔ ہم ماتحت اور 'نچلے' لوگ تھے چنانچہ ہمارا اپنے افسر کی طرح ہونا ضروری نہیں تھا۔ ہمیں افسرِ اعلیٰ کی طرف سے ایک ایک پیکٹ سگریٹ کا بھی مرحمت فرمایا گیا۔ ہم نے سگریٹ بھی باہر پی۔ افسر کے سامنے یہ حرکت بھی گستاخی سمجھی جاتی۔

اصل ڈراما ایک گھنٹے کے بعد شروع ہوا۔ اس وقت تک گاؤں میں پولیس کے افسرِ اعلیٰ کی آمد کی خبر پھیل چکی تھی اور کچھ لوگ تھانے کے آس پاس بھی پہنچے تھے مگر ان کو کالے حوالدار نے دبکا لگا کے بھگا دیا۔ اُسے اندیشہ تھا کہ یہ شرپسند اس کا کیریر خراب کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ کیونکہ ان میں بیشتر گنجے تھے اور سر پر چیلنج دینے کے انداز میں ہاتھ پھیر رہے تھے۔ گاؤں کے دی آئی پی بھی شرفِ نیاز حاصل کرنے کا پیغام ارسال کر چکے تھے لیکن ان کو انتظار کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔

"حوالدار..." محسن نے ناشتے کے بعد ایک دم اپنا رویہ بدلا اور ایس پی بن گیا۔ "اس لڑکے فضل الرحمٰن کو حاضر کرو۔"

حوالدار نے کہا۔ "زی زناب۔" اور سونا خان کو سمن دے کر روانہ کر دیا۔

"کل یہاں کوئی چور پکڑا گیا تھا؟" محسن نے کہا۔

"چور... نہیں... کوئی چور نہیں پکڑا گیا یہاں تو۔"

"بکومت۔" محسن نے گرج کر کہا۔ "کوئی پلاسٹک کے کھلونے بیچنے والا تھا... گلیوں میں پھرتا تھا اور چوریاں کرتا تھا۔"

"وہ... زی ہاں... مگر وہ بے قصور تھا۔"

"چنانچہ تم نے چھوڑ دیا۔ تفتیش بھی ایک دن میں مکمل ہو گئی۔ حیالان بھی نہیں کاٹا تم نے لیکن فیصلہ کر دیا۔ کیا تم نے یہاں عدالت کے اختیارات بھی سنبھال رکھے ہیں... بولو... جواب دو۔"

"زناب... زنابِ عالی... اس کے پاس..." حوالدار کی زبان لڑکھڑانے لگی۔

"اس کے بارے میں چشم دید گواہوں کا بیان کچھ اور ہے۔" محسن نے کہا۔

"کون... چشم دید گواہ... کیا بیان ہے سر...؟"

"یہ کہ تم نے اس کے گلے میں رسی باندھ رکھی تھی اور اُسے بیل کی طرح گھسیٹتے ہوئے لے جا رہے تھے۔" محسن نے کہا۔ "اس کی ریڑھی پر مالِ مسروقہ تھا جس میں ایک سلائی مشین... ایک گھڑی اور ایک تھرماس تھے۔"

"یہ... یہ غلط ہے زنابِ عالی۔" حوالدار نے دبے دبے لہجے میں کہا۔

محسن نے میز پر ہاتھ مارا۔ "پی اے۔" اس نے مجھے آواز دی۔ "اندر آؤ۔"

میں اندر جا کے اٹین شن ہو گیا۔

"تم نے کل ایک چور کو حوالدار کی تحویل میں دیکھا تھا۔ حوالدار کو بتاؤ کہ اس کے پاس کیا تھا۔" محسن نے کہا۔

میں نے وہی بتایا جو حقیقت پر مبنی تھا۔ سو روپے... میں تھرماس کی خرید و فروخت کا معاملہ حوالدار کے علم میں بھی نہیں تھا۔ تاہم وہ کسی الزام کی نفی کرنے سے قاصر تھا۔ اس کی زبان گنگ ہو گئی۔

"حوالدار... تمھاری خاموشی اقرارِ جرم کے مترادف ہے۔" محسن نے سخت لہجے میں کہا۔ "یا تو تم نے کسی بے گناہ کو پکڑا تھا یا پھر وہ چور تھا تو تم نے رشوت لے کر اُسے چھوڑ دیا۔ مالِ مسروقہ کو ضبط کر کے بیچا۔ دونوں جرم بہت سنگین ہیں... نہ تم کو مال ضبط کرنے کا اختیار تھا اور نہ بیچنے کا۔ تم کو مشیر نامہ بنانا چاہیے تھا۔ وہ چور کہاں ہے۔ اگر وہ بھاگ گیا ہے تو میں تم کو معطل کر سکتا ہوں۔ ابھی... اسی وقت..."

"زنابِ عالی۔" حوالدار نے ہاتھ جوڑ کے گڑگڑانا شروع کیا۔ "غلطی ہو گئی... پہلی بار سمجھ کے معاف کر دیں... وہ لڑکا ایک

غریب مزارع کا ہے... باپ بہت شریف اور فرماں بردار تھا۔ اسے بھی گمراہ کیا۔"

"گویا اس کا قصور یہ تھا کہ اس نے باپ کو مزارع کی حیثیت سے کام نہیں کرنے دیا۔ بڑھاپے میں ذلت اُٹھانے سے روک دیا اور خود بھی غلامی قبول نہیں کی... آزادی سے روزی کمانے کا سوچا... کس کا مزارع تھا وہ؟" محسن بولا۔

"نمبردار صاحب کا۔" حوالدار بولا۔

"ٹھیک ہے... جب نمبردار آئے تو اس لڑکے کو بھی میرے سامنے پیش کرنا، اس کی رپورٹ کے ساتھ۔" محسن بولا۔

"وہ... وہ تو زناب... اُنہی کے احاطے میں کھڑی ہوئی تھی... کل ہی اُسے آگ لگا دی گئی تھی۔" حوالدار بولا۔

"اوہ مائی گاڈ... یہاں تو لاقانونیت کا راج ہے۔ غنڈہ گردی ہے اور تم کہتے ہو سب ٹھیک ہے۔" محسن نے برہمی سے کہا۔

"سر... وہ فضلو آگیا ہے۔" ایک سپاہی نے سیلوٹ مار کے کہا۔

"ٹھیک ہے... اُسے اندر بھیج دو... باقی سب باہر جاؤ۔" محسن نے کہا۔ "تم ٹھہرو۔" وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

فضلو ڈرتا ہوا اندر آیا۔ مجھے دیکھ کر اس کا حوصلہ بحال ہوا۔ وہ سلام کر کے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

"بہلیں سب معلوم ہو گیا فضلو۔" محسن نے کہا۔ "تمہارا وہ چاچا... کیا نام ہے اس کا؟"

"حشمت اللہ عرف ہاشو سر۔" میں نے مستعد پی اے کی طرح کہا۔

"ہاں... وہ بھی آیا ہے؟" محسن نے پوچھا۔

فضلو نے اقرار میں سر ہلایا۔ "آیا ہے سر... مگر اس نے راستے میں مجھے دو تھپڑ مارے اور کہا کہ ایس پی تو چلا جائے گا۔ دیکھ بعد میں تیرا کیا حشر کرتا ہوں میں... اور ٹنڈ کرانے کی دھمکی دی ہے۔"

"اُسے بلاؤ اندر۔" محسن نے کہا۔ "حوالدار کو بھی بلاؤ۔"

حشمت اللہ عرف ہاشو صورت سے کمینہ نظر آنے والا ہٹا کٹا آدمی تھا۔ غالباً اسے حوالدار نے بریف کر دیا تھا کہ وہ ہاتھ جوڑ کر اندر آیا اور ایک دم شروع ہو گیا۔ "مائی باپ... یہ لڑکا فضلو تو سالے گاؤں کے لیے مصیبت ہے... ہم سب پریشان ہیں اس سے... ایک نمبر کا جھوٹا ہے...۔"

محسن اُٹھ کر ٹہلتا ہوا اس کے قریب گیا تو وہ کانپنے لگا اور اس کی زبان لڑکھڑانے لگی۔ محسن کا زناٹے دار تھپڑ اس کے منہ پر پڑا تو وہ نیچے گر گیا۔ میں نے فضلو کی طرف دیکھا اور مسکرایا۔ میں نے اُسے آنکھ بھی ماری کہ آگے دیکھو کیا ہوتا ہے۔ ہاشو نے اب محسن کے پیر پکڑ لیے تھے مگر اس کا اشارہ بھی حوالدار نے کیا تھا۔

"سیدھا کھڑا کرو اسے حوالدار۔" محسن نے گرج کر کہا۔

حوالدار نے اُسے سر کے بال پکڑ کے کھینچا اور اٹین شن کر دیا۔

"ہاشو! میں تم کو اسی جگہ پھانسی دے دوں تو مجھے پوچھنے والا کوئی نہیں... گولی مار سکتا ہوں میں تم کو۔" محسن نے اچانک ریوالور نکالا اور پھر رکھ لیا۔ "تم ایک نمبر کے جھوٹے اور ناقابلِ اعتبار آدمی ہو۔ میں لمبی بات نہیں کرتا... میرا حکم سُن لو... اور حوالدار... میں ایک ہفتے بعد کسی کو بھیجوں گا... یہ معلوم کرنے کے لیے کہ میرے احکامات پر عمل ہوا یا نہیں۔"

"بالکل... بالکل ہوگا زناب عالی... کیسے نہیں ہوگا۔" حوالدار پر کپکپی طاری تھی لیکن وہ اپنی خودی کو رعایا کے سامنے بلند رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"فضلو کو کل ہی پڑھنے کے لیے قصور بھیج دو۔" محسن نے کہا۔

"سُنا کہ نہیں۔" حوالدار نے ہاشو کی گدی پہ ایک زبردست جھانپڑا مارا۔

"کل کیوں مائی باپ... آج ہی بھیج دوں گا۔" ہاشو چلانے لگا۔

"اپنی آواز بند رکھو۔" محسن نے گرج کر کہا۔ "تم اس کی شادی کی بالکل فکر نہیں کرو گے۔ وہ جہاں چاہے گا اور جب چاہے گا اپنی مرضی کے مطابق شادی کرے گا۔ کوئی زبردستی نہیں چلے گی۔ میں نے اس کو اپنا پتا اور اپنا ٹیلی فون نمبر دے دیا ہے کہ کوئی اُسے پریشان کرے تو مجھ سے شکایت کرے پھر میں ایک ایک کی کھال میں بھس بھر دوں گا۔"

"جیسا حکم مائی باپ..." ہاشو لرزتے ہوئے بولا۔

"تم نے یہاں آتے ہوئے اُسے مارا تھا۔" محسن نے کہا۔ "معافی مانگو اس سے۔"

ہاشو کی سانس رُک گئی اور آنکھیں پتھرانے لگیں۔ افسر سے مار کھانا اتنی بڑی ذلت نہیں تھی جتنی کہ چھوٹے سے معافی مانگنا۔ محسن نے اس کے تذبذب کو دیکھتے ہوئے دوسرا تھپڑ رسید کیا... اور اپنا حکم دُہرایا۔

"مجھے... مجھے معاف... کر دے... فضلو..." ہاشو نے زار و قطار روتے ہوئے کہا۔

"فضلو نہیں... بیٹا کہو... آئندہ ہمیشہ اسے بیٹا کہو گے پھر کبھی تمہارے غلط رویے کی شکایت ملی تو شہر منگواؤں گا۔" محسن نے کہا۔

"معاف کر دے مجھے بیٹا۔" ہاشو بولا۔

"اب دفع ہو جاؤ..." محسن نے کہا۔ اس کے جانے کے بعد محسن نے فضلو سے ہاتھ ملایا اور اُسے پانچ سو روپے دیے۔

"یہ تمہاری تعلیمی ضروریات کے لیے... جاؤ..." محسن نے کہا۔ فضلو کی آنکھوں میں جذبۂ احسان مندی سے آنسو آنے لگے تھے۔

"اللہ آپ کو ترقی دے... عزت دے سر..." وہ بولا اور باہر نکل گیا۔

اگلا کیس بھی خاصا دلچسپ تماشا رہا۔ پہلے اس بڑے دکاندار کے بیٹے کو طلب کیا گیا جو گلابو کے چکر میں پڑ کر بیوی بچوں کو بھول رہا تھا۔ وہ تیس سال کا کلین شیو اور لمبی لمبی مونچھوں والا جوان تھا اور گاؤں میں یقیناً بدمعاشی سے سر اُٹھا کے چلتا ہوگا۔ یہاں بھی وہ کچھ اکڑ میں تھا کیونکہ ابھی تک اس کو اپنے خلاف الزامات کی نوعیت کا علم نہیں تھا۔

"کیسے یاد فرمایا ہمیں حضور نے۔" وہ بولا۔ اور ہاتھ باندھ کے کھڑا ہو گیا۔

محسن نے اُسے کرسی پر بیٹھے بیٹھے نظر جما کے دیکھا۔ "حوالدار... اسے سیدھا کھڑا ہونا سکھاؤ۔" اس نے سگریٹ کا کش لے کر کہا۔

حوالدار اب اپنی عزت و نوکری بچانے کے لیے ایس پی صاحب کو زیادہ سے زیادہ خوش کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے ایک مُکا مارا۔ "ہاتھ پیچھے کر سور دے پتر... ایسے کھڑا ہے جیسے تو ہمارا افسر ہے... ابھی ساری بدمعاشی بھی نکل جائے گی... بڑے بڑوں کی پھونک نکل جاتی ہے یہاں...۔"

وہ سیدھا کھڑا ہو گیا... اُس نے ظاہر کیا کہ مُکے کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا اور وہ ایسے مُکوں کی پروا بھی نہیں کرتا۔

"اچھا تو یہ بدمعاش ہے؟" محسن نے کہا۔ "حوالدار... یہاں کوئی باربر ہے... میرا مطلب ہے حجام... نائی...۔"

"ہے زناب عالی... آپ نے شیو بنوانا ہے؟"

"نہیں... اس بدمعاش کی ٹنڈ کراؤ پہلے۔" محسن بولا۔ حوالدار کا چہرہ کھِل اُٹھا۔ اس کے دل کی مراد بر آئی تھی۔ افسر نے وہی کیا تھا جو وہ خود کرتا تھا۔ اُسے یقین آنے لگا تھا کہ اب اس کا لوگوں کی ٹنڈ کرانے کا جُرم سنگین شمار نہیں ہوگا۔ ملزم نے کچھ شور مچایا کہ اس کا جرم بتایا جائے مگر اس کی کسی نے نہیں سُنی... حوالدار نے اُسے بزورِ بازو مرغا بنایا۔ خود چھتر لے کر اس کے سر پہ کھڑا رہا اور اس کے ماتحت سونا خان نے بقلم خود ملزم کو مونڈ دیا۔ اس کام میں وہ خاصا تجربہ رکھتا تھا اور حوالدار صاحب کے حکم پر شاید گاؤں کی نصف باقی آبادی کے سر صاف کر چکا تھا۔ گھنے لمبے بالوں کے نیچے سے کدو جیسا سر نکالنے کے بعد سونا خان نے صفائی کے خیال سے ایک ایک بال چُنا اور فرش پہ کپڑا مارا۔

"اس کی مونچھیں کیوں چھوڑ دیں؟" محسن نے کہا۔

ملزم کی ساری اکڑفوں ختم ہو گئی تھی۔ اس نے ہاتھ جوڑنا اور گڑگڑانا شروع کیا لیکن اس کی ایک نہ سُنی گئی۔ سونا خان نے اس کی پلی ہوئی مونچھیں ایک منٹ میں غائب کر دیں۔ سر منڈوانے کے مقابلے میں کسی جوان کے لیے مونچھیں مُنڈوانا بہت زیادہ بے عزتی اور بے غیرتی کے مظاہرے کی بات تھی۔ شاید اب وہ سوچ رہا تھا کہ اس کا مُنہ کالا کیا جائے گا اور پھر اسے شاہی سواری پر یعنی کمہار کے گدھے پر دُم کی جانب مُنہ کر کے بٹھایا جائے گا اور گاؤں کی گلیوں میں پھرایا جائے گا۔

"ہاں بھئی... اب بتاؤ تم کیا کرتے ہو... بدمعاشی کے علاوہ؟" محسن نے ایک اور سگریٹ جلاتے ہوئے کہا۔

"حضور، ہم شریف آدمی ہیں... غلط کہا ہے کسی نے...۔"

"تمہاری بیوی ہے... بچے ہیں۔" محسن نے اس کی بات کاٹ دی۔

"ہیں حضورِ والا... چار بچے ہیں...۔"

"اور اس کے باوجود بدمعاشی کرتے ہو؟" محسن نے کڑک کر کہا۔ "کیا لگتی ہے گلابو تمہاری... کیوں ملتے ہو اس سے...۔"

"میں... خدا کی قسم حضور... میں کسی گلابو کو نہیں جانتا... یہ جھوٹا الزام ہے مجھ پہ...۔" وہ چلانے لگا۔

"چلاؤ مت۔" محسن نے میز پر مُکا مارا۔ "حوالدار... گلابو کو بلاؤ... ہاشو کی سالی کو۔"

اس دوسرے جملے سے حوالدار پہ اور گلابو کے عاشق پہ واضح ہوا کہ ایس پی صاحب سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں۔ ایک آدمی اسی وقت گلابو کو لانے کے لیے بھیج دیا گیا۔

"گلابو کے آنے تک تم اُدھر کان پکڑو۔" محسن نے کونے کی طرف اشارہ کیا۔ ایک شادی شدہ شخص کو راہِ راست پر لانے اور ایک فاحشہ کے چنگل سے چھڑانے کے لیے مؤثر کارروائی ضروری تھی۔ حوالدار نے اُسے گردن سے دبوچا اور کونے میں پھینک دیا جہاں وہ رضاکارانہ طور پر مُرغا بن گیا۔

"حوالدار... اس گاؤں کی مشرقی سمت میں آخری مکان کس کا ہے؟" محسن نے کہا۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں آگ لگ گئی تھی۔"

"آگ... زی ہاں زناب... صحیح فرمایا آپ نے... اس میں آگ ہی لگی تھی۔" حوالدار نے سنبھل کے کہا۔

"کیسے لگی تھی؟ کس کے حکم سے...؟"

"یس زناب عالی... بزلی گری آسمان سے۔" حوالدار نے کہا۔

"اللہ کے حکم سے۔"

"اور وہ جو اس میں رہتے تھے... وہ کون تھے... اب کہاں ہیں؟"

"وہ... ایک بڈھا تھا زناب... تب بزلی گری تو... وہ گھر میں نہیں تھا" حوالدار نے کہا "اس لیے بچ گیا... بڑا مغرور ہو گیا تھا کیونکہ اس کا ایک بیٹا دبئی چلا گیا تھا۔ وہاں سے وہ باپ کو بہت پیسہ بھیج رہا تھا... اس نے پکا مکان بنوا لیا تھا۔"

"جو ایک گستاخی تھی۔ پٹواری کا مزارع اور پکا مکان بنا کے رہنے لگے؟ یہ تو صاف بغاوت کرنے والی بات ہے۔ کل تک جوتیاں اُٹھانے والے اور جوتیاں سیدھی کرنے والے برابری کا دعویٰ کرتے ہیں... سر اُٹھا کے چلتے ہیں اور دوسروں کو بھی کہتے ہیں کہ خدا کے آگے سر جھکاؤ... کسی اور کے آگے نہیں۔ رزق دینے والا خدا ہے... زمیندار نہیں... یہی جرم تھا نا اس کا؟ جس کی سزا اُسے یہ دی گئی کہ اس کا گھر جلوا دیا گیا؟" محسن کی آواز آہستہ آہستہ تیز ہو گئی۔ "تم نے کیا کیا؟"

"میں... میں... میں..." حوالدار ہکلانے لگا۔

"کیا بکرے کی طرح مَیں مَیں کر رہے ہو... میں پوچھتا ہوں تم نے پرچہ کاٹا پٹواری کے خلاف؟" محسن نے میز پر ہاتھ مارا۔

حوالدار اُچھل پڑا... "خود ہی کاٹ دیتا... زناب عالی کوئی تو مدعی ہونا چاہیے... وہ سامنے ہی نہیں آیا... شکایت لکھوانے آتا تو میں ضرور لکھتا۔"

"اب کہاں ہے وہ...؟" محسن نے کہا۔

"اپنے بیٹے کے پاس..." حوالدار بولا۔

"گویا ان ظالموں کے ڈر سے جلا وطن ہو گیا؟ اپنا گھر اور گاؤں چھوڑ گیا... اور تم انصاف کے ٹھیکیدار بن کے دیکھتے رہے؟" محسن نے گرجتے ہوئے کہا۔ "مجھے دیر سے رپورٹ ملی ورنہ میں دیکھتا حوالدار کہ وہ پٹواری اس مکان کو نئے سرے سے تعمیر کراتا۔ اپنے خرچ سے بنواتا اور تم کو میں اس مکان کا چوکیدار بنا دیتا کہ اس کی ایک اینٹ بھی نکلی تو تم پولیس سے نکالے جاؤ گے... مگر اب خدا کا شکر ادا کرو کہ تم بچ گئے ہو۔ مدعی ہی کوئی نہیں اس کیس میں تو انصاف کیسے دلایا جائے۔"

تھانے پر ایسی اُفتاد کبھی نہ پڑی ہو گی۔ افسر پہلے بھی گزرے ہوں گے تو دعوتیں کھا کے یا زمینداروں کی میزبانی کا لطف اُٹھا کے، نذرانے لے کر اور شکار کھیل کر رخصت ہوئے ہوں گے۔ یہاں تو آج تھانے میں بھونچال آیا ہوا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ سارے کیس آج ہی نمٹا دیے جائیں گے۔ جس پر بھی ظلم ہوا ہے اس کی داد رسی ہو گی اور ظالم کا وہیں فیصلہ ہو گا... اتنا بڑا افسر تھا۔ اس کے سامنے کس کو دم مارنے کی مجال تھی۔ ایک حوالدار اگر سزا دینے کا اختیار رکھتا تھا تو اس افسر کے اختیارات کی انتہا کوئی نہیں ہو سکتی۔ دونوں سپاہی بار بار گاؤں دوڑتے تھے اور کسی فریادی کو لے آتے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ اب تک سارے گاؤں میں تہلکہ مچ گیا ہو گا کہ ایک زبردست فرض شناس، انصاف پرور حاکم آیا ہے جو کسی کی نہیں سنتا اور ایک پیسہ نہیں لیتا۔ نمبردار کے گھر کی روٹی تک کھانے سے انکار کر دیا۔ بچہ سقہ کو ایک دن کی بادشاہت ملی تھی تو اس نے چمڑے کے سکے چلا دیے تھے۔ ہم بھی چمڑے کے سکے چلا رہے تھے۔ جو بہت عرصہ نہ چلیں گے۔ کچھ دن چرچا رہے گا کہ ایک صحیح پولیس افسر آیا تھا۔ لوگ اس کے انعام و اکرام اور اس کے انصاف اور اس کے فیصلوں کو یاد رکھیں گے اور دعائیں دیں گے۔ کچھ عرصے بعد سب وہی ہو گا۔ صدیوں کے ظلم اور بدعنوانی، اختیارات سے تجاوز اور قانون کے غلط استعمال کی روایات کی بنیادیں بہت گہری تھیں، انھیں ایک دن میں نہیں بدلا جا سکتا تھا مگر خود میں بہت لطف لے رہا تھا کہ ایک دن کے لیے ہی سہی ہم نے نمونہ تو پیش کیا کہ پولیس کو کیا ہونا چاہیے۔ قانون تو کمزور کی حفاظت کے لیے بنا تھا لیکن پھر پیسے نے قانون کو بھی خرید لیا اور جو طاقتور تھے وہ زیادہ طاقتور ہو گئے۔ غریب کا دشمن قانون بھی ہو گیا۔ اب سوائے یومِ حشر کے انصاف پر اعتقاد رکھنے کے سوا وہ کرے بھی تو کیا کرے۔

ایک سپاہی نے گلابو کے آنے کی اطلاع دی۔ میں نے اُسے دیکھا تو مجھے یقین آیا کہ عورت کو صرف مجبوری طوائف نہیں بناتی۔ اس الزام میں بھی سو فیصد صداقت نہیں ہے کہ اسے مرد طوائف بناتا ہے۔ کبھی کبھی وہ شوقیہ بھی طوائف بنتی ہے۔ شہر کی طوائف کو میں نے ہر رنگ میں دیکھا تھا۔ دیہات کی طوائف کو دیکھنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ وہ واقعی اٹھائیس تیس سال کی عورت تھی۔ قدرے فربہی کی طرف مائل۔ اس کے رخساروں پر صحت مندی کی چمک تھی اور اس نے کپڑے بھی ریشمی پہن رکھے تھے۔ اس کی آنکھوں کا سُرمہ پلکوں کے سائے سے باہر تک پھیلا ہوا تھا اور اس نے چہرے کے داغوں کو چھپانے کے لیے پاؤڈر کو کریم میں ملا کے یوں لیپ رکھا تھا جیسے دیہاتی دیوار کو کیچڑ سے لیپ پوت کے برابر کرتے ہیں۔ جب وہ میرے پاس آئی تو اس کے وجود سے بہت تیز اور گھٹیا سینٹ کی مہک آئی۔ یہ سب فحش نہیں تھا۔ فحش اس کی مسکراہٹ تھی۔ یہی مسکراہٹ خود اشتہار دیتی تھی کہ وہ عورت نہیں طوائف ہے۔ برائے فروخت ہے۔

"بڑے صاحب نے بلایا ہے مجھے۔" وہ پازیب چھنکا کے بولا۔

"ہاں" مگر تیرے نخرے دیکھنے کے لیے نہیں۔" میں نے اس کے پیچھے پیچھے سے کہا "یہاں ٹھہر ابھی۔ میں پہلے اطلاع کر دوں۔"

لیکن وہ بڑی بے باک عورت تھی۔ وہ ہنسی اور میرے پیچھے پیچھے اندر چلی آئی۔ وہ مجھے بالکل لفٹ دینے پر تیار نہیں تھی اور اسے یقیناً یہ خوش فہمی تھی کہ اسے بڑے افسر کی دل بستگی کا سامان فراہم کرنا ہے۔ اندر قدم رکھتے ہی اس نے اپنے ایک پرستار کو صاف ستھرے سر کے ساتھ کونے میں مرغا بنا دیکھا تو وہ ٹھٹکی۔

"سلام صاحب جی۔" گلابو نے ایک ادا سے مسکرا کے کہا اور کرسی پر بیٹھنے کی نیت سے آگے بڑھی۔ "کیا حکم ہے ہمارے لیے؟"

"اُلو کی پٹھی۔" میں نے اس کا بازو تھام لیا۔ "کھڑی ہو جا یہاں۔" گلابو کا رنگ اُڑ گیا۔ پہلی بار اسے احساس ہوا کہ معاملہ کچھ اور ہے۔ "یہ گلابو ہے سر۔" میں نے کہا۔ "اسے روکا تھا میں نے مگر یہ پیچھے چلی آئی... بہت بدتمیز عورت ہے۔"

محسن نے سر ہلایا اور مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ افسری کی اداکاری میں واقعی کمال دکھا رہا تھا۔ اس کی نظر گلابو پر جمی رہی۔

"گھر والا کہاں ہے تیرا؟ وہ ساتھ کیوں نہیں آیا؟" محسن نے کہا۔

"جی... گھر والا؟" گلابو نے گھبرا کے کہا۔ "شادی نہیں ہوئی۔"

"تو باپ کو ساتھ لانا تھا۔ بھائی کو ساتھ لانا تھا۔" محسن نے کہا۔

"میرا کوئی نہیں سرکار۔"

"رہتی کہاں ہے؟ کس کے ساتھ رہتی ہے؟"

"اپنا گھر ہے سرکار... باپ کا چھوڑا ہوا... اسی میں رہتی ہوں۔" وہ بولی۔

"ورکرتی کیا ہے؟ کھاتی کہاں سے ہے؟"

"بس سرکار... دال دلیہ مل جاتا ہے... آپ کی دعا سے۔" وہ مسکرائی۔

"میری دعا سے یا ان اُلو کے پٹھوں سے۔" محسن نے گرج کر کہا اور کونے میں مرغا بنے ہوئے شخص کی طرف اشارہ کیا۔ "کیا لگتا ہے یہ تیرا؟"

"کچھ... ک... کچھ نہیں... کچھ نہیں سرکار۔" وہ کانپنے لگی۔

"پھر کیوں بلاتی ہے اسے؟ کیوں ملتی ہے اس سے؟" محسن نے کہا۔ "کیا تجھے معلوم نہیں کہ اس کی بیوی ہے... بچے ہیں... ان کا حق تو مار لیتی ہے فاحشہ... گاؤں تیری وجہ سے بدنام ہے۔"

"قسم آپ کی سرکار... میں نہیں بلاتی اسے... یہ تو میرے پیچھے پڑا ہوا ہے... جان نہیں چھوڑتا میری۔" وہ رونے لگی۔ "اس کے بیوی بچوں کا تو مجھے بھی خیال ہے۔"

"اچھا... سچ کہہ رہی ہے؟" محسن نے نرمی سے کہا۔ "حوالدار... اس کے باپ کو اور اس کی بیوی کو حاضر کرو۔"

انھیں بھی شاید گلابو کے ساتھ ہی بلایا گیا تھا مگر وہ بعد میں پہنچے تھے اور باہر کھڑے ہوئے تھے۔ اس دکاندار نے اندر آ کے مجھے پہچانا اور بڑے ادب سے مجھے بھی سلام کیا۔ پھر اس کی نظر اپنے فرزندِ ارجمند پر گئی جو ایک کونے میں بانگ دے رہے تھے۔ ان کا گھٹا ہوا سر دیکھ کر وہ مسکرایا۔

"بیٹھو چاچا۔" میں نے بینچ کی طرف اشارہ کیا۔ "اپنی بہو کو بھی بٹھاؤ... اور صاحب کو بتاؤ کیا شکایت ہے تمھیں گلابو سے؟"

بڈھا تو خاموش رہا۔ مرغے کی بیوی نے رونا پیٹنا اور دُہائی دینا شروع کیا۔ اس نے گلابو کو اپنی زنانہ لغت میں گالیاں دیں اور کوسا۔ اپنے اکلوتے شوہرِ نامدار کو بُرا بھلا کہا اور درخواست کی کہ اس کا دماغ درست فرمایا جائے۔ محسن سب کچھ افسرانہ التفات کے ساتھ سنتا رہا۔

"دماغ درست ہو جائے گا۔ فکر مت کرو... آج کے بعد یہ گلابو کا نام بھی لے تو حوالدار کو بتانا۔" محسن نے کہا۔ "حوالدار..."

"یس زناب عالی۔"

"چھتر ہے تمہارے پاس؟" محسن نے کہا۔

"کیا چیز سر... کون سا چھتر..." حوالدار ایکدم انجان بن گیا۔

"تیرہ نمبر کا چھتر... دماغ کیسے درست کرتے ہو آخر تم... حوالدار ہو گئے ابھی تک چھتر کا مطلب پوچھتے ہو۔" محسن نے کہا۔ اس کے بعد حوالدار کے لیے گنجائش نہ رہی کہ وہ اصلی تے وڈا چھتر پیش کرے۔

"اس مرغے کو اُلٹا لٹا دو۔" محسن نے حکم دیا۔ حوالدار نے تعمیل کی، مرغے نے بہت واویلا مچایا اور بہت ہاتھ جوڑے۔ ابھی تک اس کا خیال تھا کہ چھتر سروس خود حوالدار کرے گا۔

"اس عورت... کیا نام ہے اس کا... گلابو۔" محسن نے چٹکی بجا کے کہا۔ "یہ چھتر اسی کو دو... اور اس سے کہو کہ یہ واقعی اسے نہیں بلاتی بلکہ اس سے پیچھا چھڑانا چاہتی ہے۔ تو اس کے گن کر چالیس چھتر لگائے۔"

مرغا ایک دم کھڑا ہو گیا۔ "ایہہ نئیں ہو سکدا... عورت ذات مینوں جتی مارے... نئیں سرکار... تسی چالیس نئیں مینوں سو چھتر مار لو..."

"بکواس بند کرو اس کی حوالدار۔" محسن نے آواز بلند کیے بغیر کہا۔

"چل اوئے تیری..." حوالدار نے پھر اُسے لٹانا چاہا مگر اس نے حوالدار کو ایک طرف دھکیل دیا۔ اس کے لیے یہ انتہائی ذلت کی بات تھی کہ ایک عورت جو طوائف تھی... بدنام تھی اور کوئی عزت نہ رکھتی تھی، اسے جوتی سے مارے اور وہ بھی سب کے سامنے۔ اس کے باپ کے سامنے اور اس کی بیوی کے سامنے۔ عورت تو مرد کے سامنے نظر نہیں اُٹھا سکتی۔ مرد زیادہ سے زیادہ یہ حق بڑی

بہن کو اور ماں کو دیتا ہے کہ وہ اس کو ڈانٹ ڈپٹ دے اور ایک آدھ تھپڑ بھی غصے میں مار دے۔ لیکن بیوی تو خود پاؤں کی جوتی ہے۔ گاؤں میں تو مرد حاکم ہے اور عورت کا درجہ کنیز کا بھی نہیں۔

"میں لے نئیں ہون دیاں گا وڈیا تھانیدارا۔" مرشے نے عین فلمی ولن کی طرح بڑک ماری... وہ مقابلے پر آمادہ تھا اور بلاشبہ اتنا تومند تھا کہ میرے سوا جملہ حاضرین کو فرداً فرداً پیٹ سکتا تھا۔ خود حوالدار اس کے جارحانہ عزائم کو دیکھتے ہوئے ڈر گیا تھا اور جب اس نے وڈے تے اصلی تھانیدار کو للکار دیا تو حوالدار کی سٹی گم ہو گئی۔ وہ شخص مرنے مارنے پر آمادہ تھا اور حوالدار کو اندازہ نہیں تھا کہ اس صورتِ حال سے ایس پی کیسے نمٹے گا۔ اگر وہ حوالدار کو حکم دیتا کہ اس بدمعاش کو پکڑ لو تو حوالدار یقیناً مار کھاتا۔ اس کا اندازہ محسن نے بھی کر لیا تھا چنانچہ اس نے ریوالور نکال کر میری طرف دیکھا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں تم کو حکم دیتا ہوں کہ اُلٹے لیٹ جاؤ۔" محسن نے کہا۔

"اوئے توں گولی مار دے مینوں۔" وہ سینے پر ہاتھ مار کے بولا۔ اس کے باپ نے اور بیوی نے چلانا شروع کیا کہ اس بے وقوف کا قصور معاف کر دیا جائے۔ گلابو لرزنے لگی۔

"سب پیچھے ہٹ جاؤ۔" میں نے کہا۔ "بیچ میں کوئی نہ آئے۔" پھر میں آگے بڑھا اور اس سے پہلے کہ مرغا سنبھلتا، میں نے اسے اُٹھایا اور گھما کے نیچے دے مارا۔ وہ تڑپ کر اُٹھا۔ میں نے اُسے مسلسل ٹھوکریں ماریں اور وہ کئی بار دیوار سے لگا۔ ذرا سی دیر میں اُسے اپنی طاقت کے بے مصرف ہونے کا اندازہ ہو گیا۔ میں نے اُسے دو منٹ میں اُلٹا لٹا دیا اور ایسے دبا لیا کہ وہ حرکت تک نہیں کر سکتا تھا۔

"چلو... اپنا کام کرو..." محسن نے گلابو کو یوں اشارہ کیا جیسے کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوئی۔ گلابو ہاتھ جوڑنے لگی۔

"ایسا مت کریں سرکار... کسی اور کو حکم دیں..."

"اگر تو نے حکم نہ مانا تو اس کی جگہ لینا پڑے گی۔" محسن نے سگریٹ جلاتے ہوئے دھواں اوپر چھوڑا۔ "بول، تیار ہے؟"

گلابو کے لیے حوالدار سے چھتر لینے کے سوا چارہ نہ رہا۔ گلابو کے اس پرستار کو بالکل اندازہ نہ ہوا کہ یہ سب اس کے باپ کی فرمائش پر ہو رہا ہے مگر افسوسناک بات یہ بھی تھی کہ خود بڈھے دکاندار نے یہ بات سنجیدگی سے نہیں کی تھی۔ اُسے یہ بات کرتے وقت بالکل امید نہیں تھی کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے اور اب وہ پشیمان بھی تھا اور پریشان بھی۔ خود اس کی بہو جو کچھ دیر پہلے رو رو کر گلابو کو کوس رہی تھی اور اپنے مجازی خدا کے دماغ کی اصلاح کا مطالبہ کر رہی تھی، اب دم بخود بیٹھی تھی۔ تھانے کا وہی ماحول تھا جو شاید پھانسی گھر میں مجرم کو زبردستی تختۂ دار تک پہنچاتے وقت نظر آتا ہوگا۔ گلابو ابھی تک کشمکش و پریشانی میں تھی۔ حوالدار نے اُسے دھکا دیا۔

"اب بھول ذرا سارا نخرا... کنجری... تیرے سارے یار آئیں گے ابھی تو..."

مجھے یہ دھمکی پسند آئی۔ اس میں گلابو کے لیے معاشی اور سماجی بحران اور مستقبل کے بارے میں شدید خطرات کی دھمکی تھی۔ بلاشبہ اگر وہ اپنے سارے پرستاروں کی تاجپوشی کرتی تو پھر گاؤں میں کیسے رہتی۔ گلابو کا دم خشک ہو گیا، اس نے نیچے پڑے ہوئے شخص کے ایک چھتر مارا۔

"ایسے نہیں... ذان لگا ذرا... جتنا مال کھایا ہے اس کا، اتنا ہی زور لگا کے مار۔" حوالدار نے کہا۔ نتیجہ یہ کہ باقی انتالیس چھتر گلابو نے ایمانداری سے پوری قوت صرف کر کے مارے اور اس کے پرستار نے ہر چھتر پر اُسے غلیظ گالیاں دیں۔ جب یہ سزا پوری ہو گئی تو میں نے اُسے پیروں پر کھڑا کر دیا۔

"ابھی تمہارا دماغ درست نہیں ہوا۔" محسن نے کہا۔ "حوالدار، اسے بند کرو حوالات میں۔ رات کو سارے گاؤں کو جمع کرو۔ تماشا پھر ہوگا۔ اب چھتر اس کی بیوی مارے گی۔"

وہ ایک دم زمین پر گر گیا۔ "خدا کے لیے مجھے معاف کر دیں... میری توبہ ہمیشہ کے لیے توبہ۔ میں اس کنجری کا نام بھی لوں تو میری کھال کھینچ لینا۔ مجھے اور ذلیل مت کرو۔ ابھی کسی نے نہیں دیکھا۔ میں خودکشی کر لوں گا۔ اگر سب کو معلوم ہوا..."

"اچھا... نہیں معلوم ہوگا۔" محسن نے نرمی اور رحمدلی کا مظاہرہ کیا۔ "اُٹھو اور سیدھے کھڑے ہو کے اپنے باپ کو، وہ تمہاری ضمانت دے۔ یہ کہ تم آئندہ کوئی غلط حرکت نہیں کرو گے۔ بیوی بچوں کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کرو گے اور یہ بدمعاشی بھی چھوڑ دو گے۔ چھوٹے سے گاؤں میں بدمعاشی بہت آسان ہوتی ہے مگر تم نے انجام دیکھا اپنا... یہ میرا آخری دورہ نہیں ہے۔ میں پھر آؤں گا۔ کسی بھی دن آ جاؤں گا۔ ایک ہفتے یا ایک مہینے بعد... اور مجھے معلوم ہوا کہ تمہارا رنگ نہیں بدلا۔ تو پھر دیکھنا میں تم کو کیسے بھٹی چڑھاتا ہوں۔ رنگ پکا ہو تو اسے کاٹنے کے لیے دوسرے طریقے اختیار کرنا پڑتے ہیں۔"

جب اس نے باپ کے سر پر ہاتھ رکھ کے وعدہ کر لیا اور باپ بھی اس کی نیک چلنی کا ضامن بن گیا تو اُسے جانے کی اجازت دے دی گئی اور ان سب کو جو وہاں موجود تھے سمجھا دیا گیا کہ اس کمرے میں پیش آنے والے واقعات کا ذکر وہ باہر کسی سے نہیں کریں گے۔ اب دوپہر ہو چکی تھی اور سارے گاؤں کو اطلاع مل

چکی تھی کہ تھانے میں کتنا انصاف ہو رہا ہے۔ باہر مجمع لگ رہا تھا اور علاقے کے کچھ معزز لوگ بھی باہر غالب کے پاس کھڑے تھے۔ ان میں پٹواری بھی تھا اور نمبردار بھی مگر غالب نے ان کو روک رکھا تھا کہ بڑے صاحب ایک کیس سے نمٹ لیں تو وہ جا سکتے ہیں۔ جب گلابو کا پرستار اپنے باپ اور بیوی کے ساتھ نکل گیا تو گلابو بھی جانے لگی۔ محسن نے اُسے روک لیا۔

"تم وہاں بینچ پر بیٹھو۔" محسن نے کہا۔ "نمبردار صاحب اور پٹواری کو اندر آنے دو۔" وہ مجھ سے مخاطب ہوا اور میں چق ہٹا کر باہر گیا اور ان دونوں کو لے آیا۔ ان کے پیچھے ایک اور شخص آیا... وہ اسکول ماسٹر تھا۔ پھر ڈاک بابو نے بھی اجازت چاہی۔ میں نے سب کو آنے دیا۔ محسن نے ان سب سے اُٹھ کر ہاتھ ملایا اور سب کو تشریف رکھنے کے لیے کہا۔ ڈاک بابو اور ماسٹر کو جگہ نہ ہونے کے باعث مجبوراً گلابو کے ساتھ بینچ پر بیٹھنا پڑا۔ میں کھڑا رہا۔ ادھر اُدھر کی رسمی باتوں کے بعد، خوشامد اور چاپلوسی کے بعد اور افسر کا موڈ دیکھنے کے بعد نمبردار نے محسن کو دعوت دی۔

"آپ سے پہلے بھی دو بار افسر آئے۔ ہمیشہ غریب خانے کو عزت بخشی۔" وہ بولا۔ "آپ کیا ہمیں اس قابل بھی نہیں سمجھتے؟"

"نمبردار صاحب... یہ میرا اصول ہے کہ ڈیوٹی پر نہ میں کسی کے گھر میں قیام کرتا ہوں اور نہ کسی کی دعوت قبول کرتا ہوں۔" محسن بولا۔ "پھر کبھی حاضر ہو جاؤں گا۔"

"جناب، ہم افسر سمجھ کے نہیں... مہمان سمجھ کے درخواست کر رہے ہیں، یہ شہر نہیں ہے کہ کوئی آئے کوئی جائے کسی کو غرض نہیں۔ یہاں ہر آنے والا گاؤں کا مہمان ہے۔" نمبردار نے اپنی لچھے دار باتیں جاری رکھیں۔ میرا دل چاہا، اس سے پوچھوں کہ گزشتہ ایک سال میں کتنے اجنبی گاؤں سے گزرے اور ان میں سے کتنوں کی دعوت اس کی حویلی میں ہوئی۔ مہمان نوازی کی وہ تابندہ روایات اب داستانِ پارینہ ہو گئی ہیں۔ اب تو مسجدیں بھی مقفل رہتی ہیں جہاں پہلے مسافر بلاامتیاز ٹھہر جاتے تھے اور ہر گھر سے ان کے لیے کھانا بھی آ جاتا تھا۔

"جب میں مہمان بن کے آؤں گا تو سیدھا آپ کے دروازے پر دستک دوں گا کیونکہ سب سے پہلا حق آپ کا ہے۔ آپ نے ہی سب سے پہلے کہا ہے۔" محسن بولا۔ "فی الحال میں آپ لوگوں سے ایک مسئلے کو حل کرنے میں مدد چاہتا ہوں۔ آپ لوگ اس علاقے کے بااثر اور معزز لوگ ہیں۔ آپ سب چاہیں تو یہ مسئلہ ختم ہو سکتا ہے۔"

"آپ حکم دیں جناب۔" پٹواری بولا۔ "مسئلہ کیا ہے۔"

"مسئلہ یہ ہے۔" محسن نے بینچ پر بیٹھی ہوئی گلابو کی طرف اشارہ کیا۔

سب کی نظر ایک ساتھ گلابو پر گئی۔ پھر سب کو سانپ سونگھ گیا۔ ان کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ ایک ایس پی ان سب کو آزمائش میں ڈال دے گا۔ وہ سب نظریں چُراتے رہے۔

"جہاں تک مجھے موصول ہونے والی شکایات سے پتا چلا ہے۔" محسن نے کچھ دیر بعد کہنا شروع کیا۔ "یہ عورت آپ لوگوں کے گاؤں کو بدنام کر رہی ہے؟"

"یہ تو ہے جناب... اسے گاؤں سے نکال دیتے ہیں۔" نمبردار کھنکارا۔

"نہیں نمبردار صاحب۔ پھر یہ دوسرے گاؤں میں چلی جائے گی اور اسے بدنام کرے گی۔ ہر گاؤں کی اپنی عزت ہوتی ہے۔ کیا کبھی آپ ایسا کرتے ہیں کہ اپنے دروازے کی غلاظت اٹھا کے اپنے پڑوسی کے دروازے پر ڈال دیں۔ کیا حکم ہے ہمارے دین کا ہمسائے کے حقوق کے بارے میں؟ پڑوسی کا گاؤں بھی تو ہمسایہ گاؤں ہے۔ اس کے علاوہ یہ سوال ایک عورت کے مستقبل کا بھی ہے۔ مجھے اس فلسفے پر تقریر نہیں کرنا ہے کہ عورت کو طوائف کون بناتا ہے۔ میں صرف ایک سوال کروں گا کہ کیا آدمی کو موقع ملے تو اسے نیکی نہیں کرنا چاہیے؟ بھٹکے ہوئے کو راستہ دکھاتا ہو تو کیا اس کا ہاتھ نہیں تھامنا چاہیے... گرے ہوئے کو اُٹھانا نہیں چاہیے۔ آپ لوگوں کے گاؤں میں کوئی ہے، جو اس عورت کو اپنی ذمے داری سمجھ کے قبول کر سکے؟"

طویل خاموشی کا ایک وقفہ آیا۔ محسن اپنے سوال کے جواب کا انتظار کرتا رہا۔ گلابو پلک جھپکائے بغیر محسن کو دیکھتی رہی۔ اس نے کبھی نہ سُنا تھا نہ دیکھا تھا۔ شاید ان میں سے کسی نے بھی سنا اور دیکھا نہیں تھا کہ پولیس ایسی بھی ہوتی ہے یا ہو سکتی ہے۔ پولیس معاشرے کی اخلاقی ذمے داریاں بھی سمجھ سکتی ہے اور سمجھا سکتی ہے۔ مسائل کو حل بھی کر سکتی ہے۔ اب تک تو پولیس صرف مسائل پیدا کرتی آئی تھی۔ دن بدن پولیس کی وجہ سے لوگوں کے مسائل میں اضافہ ہو رہا تھا مگر یہ عجیب افسر تھا کہ حقوقِ ہمسائیگی کی بات کرتا تھا۔ سماجی ذمے داریوں کی بات کرتا تھا۔ طوائف کے مستقبل کی بات کرتا تھا۔

"ایک شخص ہے تو سہی۔" بالآخر اس خاموشی کو ماسٹر کی آواز نے توڑا۔

"کون ماسٹر صاحب؟" ڈاک بابو نے کہا۔

"وہی میراثی... جو اس سے کئی بار شادی کو کہہ چکا ہے۔" ماسٹر نے کہا۔

"بے شک... وہ شادی کر لے گا۔" نمبردار نے تائید کی۔

"شادی تو کر لے گا... نبھائے گا بھی؟" محسن نے کہا۔ "ازدواجی زندگی کی ذمے داریاں سنبھال لے گا؟ اخلاق و کردار کیسا ہے اس کا؟"

"اب اس کے اخلاق و کردار کو کیا دیکھنا جناب۔" پٹواری بولا۔

"یہ کون سی شریف زادی ہے؟"

"یہی تو اصل بات ہے پٹواری صاحب!" محسن نے اُسے ٹوک دیا۔ "ہر شخص اس عورت کے ساتھ نباہ نہیں کر سکتا۔ اس کا دل بڑا ہونا چاہیے۔ اس کی نظر میں وسعت ہونا چاہیے... کہ وہ اس عورت کے ماضی کو فراموش کر دے۔ کبھی اس کا طعنہ نہ دے اور اسے شریف زادی سمجھتے ہوئے قبول کرے۔ غلطی سب کرتے ہیں مگر کیا غلطی کو معاف بھی سب کر سکتے ہیں؟ سچے دل سے؟ دنیا کو دکھانے کے لیے نہیں... نیک نیّتی کے ساتھ۔"

"وہ... اچھا آدمی ہے جناب!" ماسٹر بولا۔ "اس سے محبت کرتا تھا اور اب بھی کرتا ہے... مگر وہ میراثی ہے... اور اس کا رنگ کالا ہے۔ اس لیے یہ عورت اُسے ٹھکراتی رہی۔ وہ اب گانے بجانے کا کام نہیں کرتا۔ اس کے باپ دادا میراثی تھے اس لیے وہ بھی میراثی کہلاتا ہے۔"

"باپ دادا کے میراثی ہونے سے کسی کی میراث ذلت نہیں ہو سکتی اور شرافت بھی کسی کو ورثے میں نہیں ملتی۔ اسلام نے تو گورے کو کالے کے اور عربی کو عجمی کے برابر رکھا تھا۔ حضورؐ کا آخری خطبہ کیا تھا۔ انھوں نے رنگ۔ نسل اور ذات کی بنیاد پر فضیلت کے دعوے کو مسترد کر دیا تھا۔" محسن بولا۔ "یہ ایک جاہل عورت ہے۔ آپ لوگ اس کو سمجھا سکتے ہیں کہ سب سے بڑی دولت تو محبّت ہے... یہ نہ ہو کہ وقت گزر جائے تو وہ بھی اسے نفرت کی نظر سے دیکھنے لگے جو آج دل میں محبّت رکھتا ہے۔ اس سے کہو کہ اس میراثی سے شادی کرے۔"

"میں... میں کروں گی سرکار... میں ضرور کروں گی۔" گلابو ایکدم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کا ہسٹریا اشکوں کا سیلاب بن گیا۔ "میں جاہل ہی نہیں اندھی بھی تھی۔ آپ نے میری آنکھیں کھول دیں۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ اس کی بیوی بن کے ایسے ہی رہوں گی جیسے سب بیویاں رہتی ہیں۔ کسی کو مجھ سے شکایت نہیں ہوگی۔ یہ سب لوگ دیکھیں گے کہ میں بھی عورت ہوں۔"

"ویری گڈ!" محسن نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ "آپ سب نے سُنا یہ تائب ہو رہی ہے۔"

"جزاک اللہ... آپ تو جنّتی ہیں ایس پی صاحب۔" نمبردار بولا۔

"میں بہت گنہگار ہوں نمبردار صاحب... توبہ کرتا ہوں ہر وقت خدا سے۔" محسن نے کہا۔ "اب آپ لوگ آج رات اس کی شادی کا بندوبست کریں۔ دعوت وہیں ہوگی اور ہم سب شریک ہوں گے۔ میری طرف سے یہ رکھیے۔" اس نے جیب میں سے ایک ہزار روپے نکالے اور میز پر ڈال دیے۔ "شادی کے انتظام کے لیے۔"

"انتظام ہو جائے گا سرکار۔" نمبردار نے احتجاج کیا۔

"پھر بھی... یہ میری طرف سے... دولہا دلہن کے لیے۔" محسن نے کہا۔ "رکھ لیں ورنہ میں نہیں آؤں گا۔" نمبردار نے بادل ناخواستہ رقم اُٹھالی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ کتنے شرمسار تھے۔ ان کی نظر میں اس پولیس افسر کے لیے حقیقی عزت اور عقیدت کے جذبات تھے... یہ انتہائی جذباتی منظر تھا۔

اچانک گلابو اُٹھی اور دوڑتی ہوئی محسن کی طرف بڑھی۔ اس نے نیچے گر کر محسن کے قدم پکڑنا چاہے۔ محسن نے اُسے اُٹھالیا۔ "جاؤ میری بہن... خدا تمھیں صحیح راستے پر چلنے کی توفیق دے اور تمھارا گھر آباد رکھے۔"

"آپ فرشتہ ہیں... فرشتہ ہیں سرکار..." وہ بولی اور ہچکیاں لینے لگی۔ معزّزین دم بخود کھڑے رہے۔ ایک ایس پی ایک طوائف کو بہن کہہ رہا تھا۔ اس کا گھر آباد کر رہا تھا۔ اُسے دعا دے رہا تھا۔ دھمکی نہیں... وہ رشوت بھی نہیں لے رہا تھا۔ اپنی جیب سے شادی کا خرچ دے رہا تھا۔ اس نے نمبردار کی ذاتی دعوت مسترد کر دی تھی مگر ایک میراثی اور ایک طوائف کی تقریبِ خانہ آبادی کی دعوت میں آنے پر تیار تھا۔ ایسا پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ کیا آئندہ کبھی ایسا ہوگا؟ ہوگا تو کب ہوگا؟ جس دن ہوگا کیا اس دن یہی دنیا جنّت نہیں کہلائے گی؟

جب سارے لوگ نکل گئے تو محسن نے پٹواری کو روک لیا۔ "آپ سے کچھ مشورہ کرنا تھا مجھے۔" محسن نے اخلاق کے ساتھ کہا۔

"ہم تو غلام ہیں سرکار کے۔" پٹواری پھر بیٹھ گیا۔

"پٹواری صاحب!" محسن نے کہا۔ "اس گاؤں کے باہر ایک جلا ہوا گھر ہے۔"

پٹواری کا رنگ فق ہو گیا۔ "ہاں جی ہے... بالکل ہے۔"

"کس کا گھر تھا وہ؟" محسن نے میز پر انگلیوں سے گھوڑے دوڑاتے ہوئے بہت شرافت سے کہا۔

"تھا جی ایک بدبخت کا۔" پٹواری سرد آہ بھر کے بولا۔ "اللہ تعالےٰ کا قہر نازل ہوا۔ آسمان سے بجلی گری۔"

"وہ بجلی آپ تو نہیں تھے؟" محسن بولا۔ "اللہ نے خدانخواستہ آپ کو قہر بنا کے تو نازل نہیں کر رکھا ہے یہاں۔"

"مجھے... نہیں سرکار... میں تو سب کا خادم ہوں... سب کی بھلائی کے لیے دن رات کوشش کرتا ہوں۔" پٹواری نے جھوٹ کو نباہنے کی کوشش کی۔

"پھر کہاں گیا وہ شخص، جس کے گھر کو بجلی نے جلا کے خاک کر دیا؟"

"اس نے کہاں بچنا تھا جی۔" پٹواری بولا۔ "کچھ نہیں بچا گھر میں۔"

"پٹواری صاحب!" محسن نے یکلخت لہجہ بدل دیا۔ "اس کے لڑکے نے مجھے براہِ راست باہر سے خط بھیجا تھا۔ باپ تو ان پڑھ تھا اس لیے کچھ نہ لکھ سکا مگر لڑکے نے سب واقعات لکھے تھے۔

شرم آنا چاہیے آپ کو پٹواری صاحب۔ اگلی بار میرے آنے سے پہلے اس گھر کو بالکل ویسا ہی ہونا چاہیے جیسا پہلے تھا۔ بہت مال کھینچا ہے آپ نے۔ مجھے سب معلوم ہے... اس میں سے تھوڑا سا لگا لیے۔"

"لیکن... حضور... میرا کیا قصور... میرے خلاف کوئی شکایت کسی نے نہیں لکھائی... کوئی پرچا نہیں کاٹا گیا..."

"اچھا... تو آپ قانون چھانٹ رہے ہیں... اپنے ہوشیار ہونے کا ثبوت دے رہے ہیں۔" محسن کھڑا ہو گیا۔ "بہت بہتر۔ ایف آئی آر بھی درج ہو جائے گی... حوالدار..."

"جی... جی... جنابِ عالی..." حوالدار چونک پڑا۔

"مجھے شکایت ملی ہے کہ گاؤں سے کچھ لوگ ناجائز اسلحہ سرحد پار بھیجتے ہیں اور ان کی مدد گاؤں کا پٹواری کرتا ہے۔" محسن نے کہا۔ "بعد میں خانہ تلاشی کے وارنٹ آئیں گے تو اسلحہ بھی برآمد ہو جائے گا۔ فی الحال میں پٹواری صاحب کو ساتھ لے جاؤں گا۔ ان کا کیس سی آئی اے کے سپرد کیا جائے گا۔"

پٹواری چلّانے لگا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں... سرکار، یہ تو سراسر ظلم ہے۔"

"اور جو کچھ تم نے کیا تھا، وہ کیا تھا؟ وہ ظلم نہیں تھا؟" محسن نے گرج کے کہا۔ "بک بک کرنے کی ضرورت نہیں میرے سامنے۔ کل گاؤں میں کھلی کچہری ہوگی۔ اس میں بھی تمھارے خلاف سب کی شکایات سُنی جائیں گی۔"

"سرکار... مجھے معاف کر دیں... میری توبہ... میں نیا مکان کھڑا کر دوں گا۔" پٹواری گڑگڑانے لگا۔

"ایک مہینے میں۔" محسن نے کہا۔ "میں درمیان میں بھی چکّر لگا کے دیکھ سکتا ہوں کہ کتنا کام ہوا۔ میں نہ آ سکا تو کوئی تمھاری خبر لینے ضرور آئے گا... جاؤ دیکھو... نمبردار صاحب چلے گئے؟"

"ابھی باہر موجود ہیں جنابِ عالی... پٹواری صاحب کا انتظار فرما رہے ہیں۔" حوالدار نے کہا۔

"اچھا تو انھیں ایک منٹ کے لیے اندر بھیج دو۔" محسن بولا۔

"حکم بندہ پرور۔" نمبردار نے اندر آ کے کہا۔

"نمبردار صاحب! کل ایک غریب آدمی کو غلطی سے پکڑ لیا گیا کہ وہ چور ہے۔" محسن بولا۔ "ساری غلطی اس حوالدار کی ہے۔ اسے میں نے سرزنش کر دی ہے۔ وہ شخص ریڑھی پر پلاسٹک کے کھلونے بیچتا تھا۔ معلوم نہیں کس نے اس پر یہ جھوٹا الزام عائد کیا۔ اور پھر رات کو اس کی ریڑھی کو آگ لگا دی۔ آپ کی حویلی کے احاطے میں لے جا کر۔"

"میری حویلی کے احاطے میں؟" نمبردار نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔

"جی ہاں... ظاہر ہے آپ کو بدنام کرنے کے لیے۔" محسن نے کہا اور جیب میں سے پانچ سو روپے نکالے۔ "یہ میری طرف سے اس کو دے دیں۔ ممکن ہے وہ مجھ سے قبول نہ کرے... اور اُسے ریڑھی لگانے دیں۔ میں اُسے آپ کی حفاظت میں چھوڑتا ہوں۔ حوالدار! اگر تم نے پھر ایسی زیادتی کی تو جیل میں سڑا دوں گا۔"

"جیسا آپ کا حکم بندہ پرور۔" نمبردار پھر کھنکارا۔ "لیکن یہ رقم تو اپنے پاس رکھیے... زیادہ شرمندہ نہ کریں... تھوڑی سی نیکی ہم بھی کما لیں۔"

محسن نے ہاتھ ملایا اور ان کو رخصت کر دیا۔ اس نے کسی ماہر سیاست داں کی طرح ہر چال چلی تھی۔ ہر شخص کے ساتھ ویسا ہی سلوک کیا تھا جس کا وہ مستحق تھا۔ اسی لہجے میں بات کی تھی جیسے ضروری تھی اور تمام معاملات کو انتہائی خوش اسلوبی سے نمٹا دیا تھا۔ وہ ایس پی تو نہیں تھا مگر اس سے بہتر ایس پی کی مثال نہیں دی جا سکتی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ غیر شعوری طور پر وہ ایس ایس پی انکل ضامن رضوی کے انداز میں سارے معاملات طے کر رہا تھا۔ اس کا لب و لہجہ بھی کسی حد تک انکل رضوی کے جیسا تھا۔ اور یہ ایک غیر شعوری حرکت تھی۔ ذہنی طور پر وہ رضوی صاحب سے متاثر تھا اور خود میں بھی۔ ہمارے لیے وہ ایک مثالی انسان اور مثالی قسم کے پولیس افسر تھے۔ یہ حالات ہوتے تو شاید ان کا رویّہ بھی ایسا ہی ہوتا۔ کسی کو شک نہیں ہوا تھا کہ وہ جعلی ایس پی ہے۔ گاؤں کے رہنے والے کیا جانیں کہ ان کے علاقے کا ایس پی کون ہے۔ ایس پی بدلتے رہتے ہیں اور نمبردار کے کہنے کے مطابق صرف دو بار ایس پی یہاں آئے تھے۔ اگلی بار کون کس وقت آئے گا، یہ کتنا غیر یقینی تھا۔

ایس پی کی آمد کا شوشہ پہلے سے چھوڑنے کا فائدہ یہ ہوا تھا کہ تھانیدار کے اختیارات رکھنے والا کانا حوالدار اپنے عملے سمیت ہمارے شاہانہ استقبال کے لیے تیار تھا۔ اس کے لیے ناممکن تھا کہ وہ تصدیق کر سکتا تھا۔ نہ لیس کیا گاؤں میں بھی ٹیلی فون نہیں تھا۔ اگر وہ دس بیس میل جاتا اور کہیں سے ٹیلی فون کر کے معلوم کرتا تو اُسے کچھ معلوم نہ ہوتا۔ اوّل تو شہر کی لائن ہی نہ ملتی۔ پھر پولیس ہیڈکوارٹر میں وہ کس سے پوچھتا کہ کون سا ایس پی اچانک آ رہا ہے۔ ایس پی اچانک کہیں بھی چھاپا مارنے کا اختیار رکھتے ہیں۔ اتنی ہمّت تو کسی ایک یا دو پھول والے باقاعدہ تھانیدار کو نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ ایس پی کا نام پوچھ سکے اور اس سے شناختی کارڈ طلب کر سکے۔ پھر جتنے کیس محسن نے صبح سے سہ پہر تک نمٹائے، ان سے بھی ثابت ہوا کہ وہ ایس پی ہے جسے ہر بات کا علم ہے۔ جتنی شکایات اسے ملی تھیں، ان سب پر اس نے ایکشن لیا۔ کہیں بہت سخت تو کہیں معمولی۔ مگر اس نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ ایک حاکم کو رعایا کے حال سے کتنا باخبر ہونا چاہیے۔ کتنا عادل ہونا چاہیے اور کتنا مہربان ہونا چاہیے۔

"ہاں بھئی حوالدار... اور کوئی کیس ہے؟" محسن بولا۔

حوالدار کی صبح سے پریڈ ہو رہی تھی اور اتنی سخت ڈیوٹی شاید اس نے کسی افسر کے ساتھ نہیں کی تھی۔ وہ اور اس کے ماتحت مسلسل گاؤں میں دوڑ لگا رہے تھے اور اٹین شن کھڑے تھے۔ کھانے کا وقت گزر چکا تھا لیکن ابھی تک افسر نے کھانے کا نام ہی نہیں لیا تھا تو وہ کیسے بولتا۔ ہماری پوزیشن یہ تھی کہ ہم نے دس بجے کے قریب جو اعلیٰ مکھن اور دیسی گھی کے پراٹھے کھائے تھے، وہ ابھی تک ہضم نہیں ہوئے تھے۔ ہم شہری لوگ تھے۔ چیزوں کو دیکھ بھال کے، چھان پھٹک کے مقررہ مقداریں اور ایک وقت پر کھانے والے۔ یہ خالص غذا محنت کرنے والوں کو راس آتی تھی، جو ہل چلا کے اُسے آسانی سے ہضم بھی کر لیتے تھے۔

"اور تو کوئی کیس نہیں سرزی۔" حوالدار بولا۔

"تم نے کھانا کھا لیا ہے؟" محسن نے بے نیازی سے کہا۔

"نہیں زناب عالی... میرا خیال ہے کہ آپ بھی کھا لیں۔"

"نہیں... تم کھا لو۔" محسن بولا۔ "اور یہ بتاؤ، یہاں کوئی تنور ہے جہاں سے روٹی سالن مل سکے۔"

حوالدار نے افسوس کے ساتھ نفی میں گردن ہلائی۔ "سب کے اپنے اپنے گھروں میں تنور ہیں۔"

"اچھا چلو... ایک چکر گاؤں کا لگاتے ہیں۔" محسن اُٹھ کھڑا ہوا۔ "کہیں چائے پی لیں گے... چائے تو ملتی ہے نا۔"

حوالدار کا منہ لٹک گیا۔ پہلے وہ بھی افسروں کے ساتھ عیش کرتا ہوگا۔ ان کے لیے پلاؤ زردہ اور بھنے ہوئے مرغ آتے ہوں گے تو حوالدار بھی دعوت میں شریک رہتا ہوگا۔ اس افسر نے صبح سے بھوکا کھڑا کر رکھا تھا اور اب خالی پیٹ گاؤں میں گھمانے پر مُصر تھا۔ لیکن حوالدار انکار کیسے کرتا۔ اس نے اپنی سپاہ کو اٹین شن کیا اور ہمارے پیچھے چلنے لگا۔ تھانے کے باہر اب بھی پندرہ بیس افراد جمع تھے۔ ان سب نے محسن کو ڈرتے ڈرتے سلام کیا۔ محسن ان کے پاس چند منٹ کے لیے رکا اور رسماً پوچھا کہ کسی کو پولیس سے کوئی شکایت تو نہیں ہے۔ ان میں مجھے چار گنجے نظر آ رہے تھے۔ دو تازہ اور دو پرانے لیکن وہ بولے نہیں۔ غالباً ہمارے پیچھے سے حوالدار نے اُن کو آنکھیں دکھا کے خاموش کر دیا تھا۔

گاؤں میں واقعی اس پولیس افسر کے انصاف اور رعایا پروری کے قصے پھیل چکے تھے اور لوگ ہر جگہ ہمیں انتہائی عقیدت اور احترام کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔ مجھے اس احترام میں خوف بالکل نظر نہ آیا۔ کچھ بزرگ قسم کے لوگوں نے آگے بڑھ کے محسن سے ہاتھ بھی ملایا اور اسے طویل عمر کی، ترقی کی اور صحت کی دعائیں دی۔ یہ سچے دل سے نکلنے والی دعائیں تھیں۔ دعا دینے والے نہیں جانتے تھے کہ وہ ایس پی اصلی ہے یا نقلی۔ انھوں نے تو انصاف اور سچائی کا ایک روپ دیکھا تھا۔ مظلوموں کے حق میں اُٹھنے والی ایک آواز سنی تھی۔ حق بات کو تسلیم کرنے والے کو دیکھا تھا۔ اور یہ سب انھوں نے پہلے نہیں دیکھا تھا چنانچہ وہ اپنے جذبات کے اظہار میں برحق تھے۔ ہم یوں پھر رہے تھے، جیسے واقعی ہم اس علاقے کے بادشاہ ہیں۔ میرا دل بار بار کہتا تھا کہ کاش ایسا ہوتا۔ یہ پانچ سو گھروں کی چھوٹی سی آبادی ہماری حکومت ہوتی۔ ہم اسی کو ایک یوٹوپیا بنا سکتے۔ وہ مثالی فلاحی ریاست جس کا تصور اسلام نے پیش کیا تھا اور جس کی ایک مثال حضرت عمرؓ کے دورِ حکومت میں نظر آئی تھی۔ جب گلی میں ایک کتا بھی بھوکا سوتا تو خلیفہ خود کو مجرم سمجھتا تھا۔ جب خلیفہ اور غلام باری باری اونٹ پر سواری کرتے تھے۔ شہنشاہوں کے سفیر طاقت اور دبدبے میں خود کے ہمسر خلیفہ کو اپنی عبا میں ٹانکے لگاتے ہوئے پاتے تھے۔ جو رعایا کے سامنے ہر فعل کے لیے جوابدہ تھا مگر جس کی سخت گیری اور گرفت سے وہ سب تھر تھر کانپتے تھے جن کے دل پاک نہ تھے یا جن کی نیت میں فتور تھا۔ ہماری یہ ایک دن کی بادشاہت خود ہمیں یاد رہے گی اور لوگ بھی یاد رکھیں گے۔

اچانک ایک ضعیف اور کمر خمیدہ شخص نے ہمارا راستہ روک لیا۔ اس کی عمر ستر سال سے زائد ضرور ہوگی۔ "السّلام علیکم بیٹیا۔" اس نے محسن سے ہاتھ ملا کے کہا۔ "میں گاؤں کی مسجد کا پیش امام ہوں۔"

محسن کے بعد ہم سب نے اس سے مصافحہ کیا۔ "تم ہی وہ ایس پی ہو نا... جس کو سارا گاؤں دعائیں دے رہا ہے... میرا لڑکا بھی پولیس میں تھا۔"

"اچھا مولانا صاحب۔" محسن نے کہا۔ "اب کہاں ہے؟"

"سوہنے رب کے پاس۔" وہ انگلی اوپر اُٹھا کے بولا۔ "اس کی رضا یہی تھی۔ ورنہ وہ بھی آج ایس پی ہوتا... بالکل تمھارے جیسا گبرو جوان تھا۔"

"کیا نام تھا اس کا مولانا صاحب؟" محسن نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

"کرم علی... ایس آئی کرم علی۔" پیش امام نے کہا۔ "دس سال ہو گئے اب تو... اللہ نے صبر دیا۔ ایک ہی اولاد تھی میری۔"

"مجھے بہت افسوس ہے... کیسے انتقال ہوا تھا اس کا؟" محسن نے کہا۔

"ڈاکو آ گئے تھے گاؤں میں۔" پیش امام نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "وہ اکیلا نکل گیا... میں نے روکا کہ بیٹیا اکیلا مت جا... وہ بولا کہ بابا... اکیلا کہاں۔ میرا رب میرے ساتھ ہے... یہ اس کی ڈیوٹی نہیں تھی، وہ تو چھٹی آیا ہوا تھا۔ ڈیڑھ سال ہوا تھا شادی کو... پُتّر ایس پی... اِدھر اس کا جنازہ اُٹھا... اُدھر اس کے بیٹا ہوا... اب دس سال کا ہے میرا پوتا... اس کو پولیس میں بھرتی کرانا ہے۔"

"ضرور کرائیے... لیکن ابھی تو وہ چھوٹا ہے۔" محسن نے کہا۔

"ہاں پُتّر... جب بڑا ہو جائے گا تب۔" وہ بولا۔ "میں نے تو اُسی دن اپنی بہو سے کہا تھا کہ نیک بخت... رو مت... اللہ نے امتحان لیا ہے ہمارے صبر کا... بیٹا لیا ہے تو پوتا دیا ہے۔ وہ سب انسپکٹر تھا تو یہ اس سے بھی بڑا افسر بنے گا... باپ سے آگے جائے گا۔"

"ضرور جائے گا مولانا صاحب... اگر آپ کی دعائیں شامل حال رہیں اور خدا نے چاہا تو وہ ایس پی کیا آئی جی بنے گا۔" محسن نے اس جذباتی بوڑھے کو تسلی دی۔ اس کی بات نے ہم سب کو افسردہ کر دیا تھا۔ جب ہم نے اجازت مانگی تو وہ اَڑ گیا۔

"میں اتنی دیر سے آخر کس لیے کھڑا ہوا تھا۔" وہ بولا۔ "میں تو خود آتا مگر میں ایک سب انسپکٹر کا باپ ہوں... جو شہید ہو چکا ہے۔ میں نے سوچا کہ تم کو چل کر میرے پاس آنا چاہیے... اور دیکھو تم آ گئے۔ اب میرے گھر سے کچھ کھائے بغیر نہیں جا سکتے۔ چائے لسی پیو، پھر جاؤ۔" اس نے ہمیں حکم دیتے ہوئے کہا۔ پیش امام کچھ عمر کے باعث اور کچھ اپنی زندگی کے اس المناک حادثے کی وجہ سے تھوڑا سا خبطی ہو گیا تھا۔

"چائے لسی تو ہم نہیں پئیں گے مولانا صاحب۔" محسن نے کہا۔

"پیو گے کیسے نہیں..." وہ گرم ہونے لگا۔

"میرا مطلب تھا کہ ہمیں بھوک لگی ہے۔ روٹی مل جائے گی...؟" محسن نے کہا۔

"اوئے پُتّر ایس پی... روٹی کیوں نہیں ملے گی۔ گھر میں روٹی نہیں ملے گی تو پھر کہاں ملے گی۔" وہ محسن کو بازو پکڑ کے کھینچنے لگا۔ میں نے حوالدار کی طرف دیکھا۔ اس کی صورت پر بارہ بج گئے تھے۔

"یہ بڈھا تو پاگل ہے زناب۔" وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "تب سے اس کا بیٹا مرا ہے..."

"تم کو شرم نہیں آتی۔" میں نے اونچی آواز میں کہا۔ "جس کے پیچھے نماز پڑھتے ہو، اسے پاگل کہتے ہو... ساری زندگی جھک مار کے تم حوالدار رہے۔ اس کا بیٹا دس سال پہلے ایس آئی تھا... اور وہ شہید بیٹا تھا۔"

"غلطی ہو گئی سرزی۔" حوالدار نے حلق کی تلخی کو تھوک سے نگل لیا کیونکہ محسن نے بھی اُسے خون آشام نظروں سے گھورا تھا۔

پیش امام کا کچا گھر مسجد سے متصل دو نیم تاریک کمروں پر مشتمل تھا۔ ایک میں ہم کو بٹھایا گیا۔ فرش پر پھوڑی (چٹائی) پڑی ہوئی تھی۔ ہم نے ہاتھ دھو کر بسم اللہ پڑھی اور کھانے لگے۔ اندر سے پیش امام کی بہو گرم گرم روٹیاں ارسال کرتی رہی۔ اس کے ساتھ گڑ تھا۔ دیسی گھی تھا اور پیاز تھی۔ حوالدار کے حلق میں نوالہ پھنس رہا تھا۔ اس کو دن بھر کے فاقے کے بعد سوکھی روٹی اور پیاز کھانا پڑ رہی تھی۔ اس کی مجبوری قابلِ دید تھی۔ افسر کو وہ دل ہی دل میں ہزار گالیاں دے رہا ہوگا کہ کیسے کیسے کمینے لوگ ایس پی ہو گئے ہیں جن میں کوئی بات افسروں والی ہے ہی نہیں۔ مگر وہ سب کا ساتھ بھی دے رہا تھا۔ معلوم نہیں، یہ ماحول کی جذباتی فضا کا اثر تھا۔ یا چلنے سے ہمیں بھوک لگی تھی کہ ہم نے اس کھانے میں جتنا مزہ پایا، وہ آج بھی یاد ہے۔

ہمارے واپس ہونے تک پورے گاؤں کے ہر فرد کی زبان پر یہ بات تھی کہ ایس پی نے پیش امام کے گھر میں زمین پر بیٹھ کے سوکھی روٹی گڑ اور پیاز کے ساتھ کھائی۔ اسی شہرت کا نتیجہ تھا کہ رات کو ہم گلابو اور میراثی کے نکاح کی تقریب میں پہنچے تو وہاں گاؤں کا بچہ بچہ موجود تھا۔ عورتیں محسن کو ایسے دیکھ رہی تھیں جیسے وہ آدمی نہیں، فرشتہ ہے جو ابھی پر لگا کے اُڑ جائے گا۔ ہر شخص اس سے ہاتھ ملانے کا مشتاق تھا کیونکہ ان کے دلوں سے ڈر نکل گیا تھا اور اس کی جگہ عزت و احترام کے جذبات نے لے لی تھی۔ وہ محسن سے ہاتھ ملا کے بھی خوشی محسوس کرتے تھے۔ جتنی دعائیں محسن نے اس ایک دن میں لیں، اتنی شاید ہم سب نے ساری عمر میں اکٹھی نہیں لی ہوں گی۔ شادی کی دعوت کا سارا انتظام نمبردار نے کیا تھا۔

پٹواری اور دوسرے معززین بھی اب اپنے نمبر بنانے میں پیش پیش تھے اور غالباً یہ گاؤں کی تاریخی شادی تھی۔ عام حالات میں یہ معززین کسی میراثی اور ایک بدنام عورت کی شادی کا دعوت نامہ لے کر آنے والے کو بھی بے عزت کر کے بھگا دیتے۔ شادی میں ایک بار پھر حاکم و محکوم کی تفریق رکھی گئی تھی۔ ایس پی کے لیے اور معززین کے لیے الگ بیٹھنے کا انتظام ہو رہا تھا مگر میں نے خاموشی سے نمبردار کو سمجھا دیا کہ وہ ایسا نہ کرے۔ ایس پی عام لوگوں میں بیٹھ جائے گا تو اُسے مایوسی ہوگی۔

ہم رات آٹھ بجے لوٹ آئے۔ مجھے کوئی شک نہیں تھا کہ یہ شادی کامیاب رہے گی۔ اس کی ذمے داری گاؤں کے بڑوں نے لی تھی اور خود گلابو نے جو وعدہ کیا تھا، وہ جھوٹا نہیں تھا۔ اس کے دل کا سچ خود الفاظ میں ڈھل کے زبان تک آ گیا تھا اور گلابو کا لہجہ اس کی نیت کی صداقت کا گواہ ہو گیا تھا۔ میراثی بہت خوش تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اسے خدا ایک وقت اتنی بہت سی خوشیاں عطا کر دے گا۔ اسے اپنی محبت مل جائے گی۔ شادی کے انتظامات خود بخود ہو جائیں گے۔ اس کی شادی میں نمبردار، پٹواری اور گاؤں والے ہی نہیں، ایک ایس پی بہ نفسِ نفیس شریک ہوگا جو اسے سلامی میں پانچ سو روپے دے جائے گا۔

"آج تو تم نے کمال کر دیا محسن۔" میں نے واپسی میں فرانسیسی بولنا شروع کی۔ "تیری جگہ میں اس منصب کو اتنی خوش اسلوبی سے نہیں

نبلا سکتا تھا۔"

"معلوم نہیں کیوں اس دھوکا دہی اور جعلسازی میں بھی مجھے سچی خوشی مل رہی ہے۔" محسن نے بھی فرانسیسی میں جواب دیا۔ "اس وردی کے بغیر میں ایک دن میں اتنی نیکی نہیں کما سکتا تھا۔"

"چلو، ہمارا مقصد تو پورا ہوا۔ جب ہم چلے جائیں گے تو سب یاد کریں گے... کچھ دن سب ٹھیک رہے گا۔" میں نے کہا۔

"ہم کسی طرح انکل رضوی سے کہیں گے کہ وہ بعد میں اپنے کسی ماتحت کو ایک دن کے لیے بھیج دیں۔" محسن بولا۔ "جو تصدیق کر جائے کہ فضلو کو تعلیم کے لیے بھیجا گیا یا نہیں۔ گلا بو کا چلن کیسا ہے۔ اس کا سابقہ پرستار راہِ راست پر ہے یا نہیں۔ پٹواری نے اس گھر کو پھر بنا لیا ہے یا نہیں جسے اس نے آگ لگوائی تھی اور نمبردار نے اس نوجوان کو ریڑھی لگا دی ہے یا نہیں۔"

"میرا بھی خیال ہے کہ یہ بندوبست مشکل نہیں۔" میں نے کہا۔

"یہ لوگ بعد میں تصدیق تو نہیں کریں گے... ہمارے متعلق۔" محسن بولا۔

"اگر ہم سب کو لوٹ کر لے جاتے۔ فراڈ کرتے۔ زبردستی نذرانے لیتے اور رشوت سے جیبیں بھرتے تو شاید یہ لوگ معلوم کرتے کہ وہ ڈاکو تو نہیں تھے۔" میں نے کہا۔ "اب تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم کچھ دے کر ہی جا رہے ہیں... لے کر جا رہے ہیں تو صرف دعائیں۔"

"اب اصل کام رات کا ہے جس کے لیے ہم نے تھانہ حاصل کیا تھا اور تھانیداری قائم کی تھی۔" محسن نے کہا۔

ہاں... اب سراج سے تفتیش کرنا ہے۔" میں نے کہا۔ "میں نے اس سے ایک وعدہ کیا تھا۔ اس وعدے کو پورا کرنے کے لیے حالات خود بخود سازگار ہو گئے ہیں۔"

حوالدار ہماری گفتگو سے بوکھلایا ہوا تھا۔ اگر انگریزی ہوتی تو وہ ایک آدھ لفظ یا جملہ ضرور سمجھ لیتا۔ مگر یہ زبان تو اس کے لیے خیالی زبان تھی۔ وہ پریشان بھی تھا کہ کہیں یہ گفتگو اس کے خلاف تو نہیں ہے۔ ایس پی نے سارے گاؤں کے کیس نمٹا دیے تھے۔ مگر اس کا کیس باقی تھا۔ وہ خود جانتا تھا کہ اس نے کتنے غلط کام کیے ہیں چنانچہ اس کے دل کا چور اسے ڈرا رہا تھا کہ یہ افسر بہت باخبر ہے۔ اسے لوگوں کے ذاتی معاملات تک کا علم ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اسے اپنے عملے کے کرتوتوں کی خبر نہ ہو۔

تھانے پہنچنے کے بعد محسن نے کہا۔ "بھئی حوالدار... تم بہت تھک گئے ہو گے۔ اس لیے اب تم آرام کرو۔"

"اور... آپ... زناب عالی۔" حوالدار نے سکھ کا سانس لیا۔

"مجھے تو ابھی اس بدمعاش سے تفتیش کرنا ہے۔" محسن نے کرسی پر گر کے کہا۔ "تم ایسا کرو کہ تھانے کے باہر چارپائیاں ڈال لو۔"

"ہماری مدد کی ضرورت نہیں پڑے گی سرزی۔" حوالدار بولا۔

"میرا خیال ہے کہ نہیں پڑے گی۔" محسن بولا۔ "پڑے گی تو بلا لیں گے۔ تم آج اندر سے چارپائیاں نکال کے باہر لے جاؤ۔"

"چارپائی کی کوئی بات نہیں زناب عالی۔" وہ بولا۔ "آپ کو بھی آرام کرنا ہوگا اس لیے میں نے بستر لگوا دیے ہیں۔"

"پھر... تم لوگ کیا کرو گے؟" محسن بولا۔

"ہم بھی منگوا لیں گے کچھ گاؤں سے۔" حوالدار بولا۔ پھر اس نے اپنے ماتحتوں کے ساتھ گارڈ آف آنر پیش کیا اور رخصت ہو گیا۔ تخلیہ ہوتے ہی سارے دن کی اداکاری کی تکان اتارنے کے لیے ہم نے آدھا گھنٹا لیٹ کر سگریٹیں پینے اور سارے دن کے واقعات پر ہنستے گزارا۔ پھر ہم حوالات میں پہنچے جہاں سراج گٹھری بنا پڑا ہوا تھا۔ محسن نے اس کے منہ میں ٹھنسا ہوا کپڑا نکال دیا۔

"اب تم گلا پھاڑ کے چلا سکتے ہو اور مدد کے لیے پکار سکتے ہو۔ باہر تمہارے اپنے قبیلے کے لوگ ہیں۔ ان پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ وہ تفتیش کے شور میں زیادہ سکون سے سوتے ہوں گے۔" میں نے کہا۔

"اگر ان کو معلوم ہو جاتا... کہ تم دھوکے باز ہو۔" سراج نے لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے کہا۔

"ہم تم سے بڑے دھوکے باز تو نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔ "اگر ہم نے دھوکا دیا تو ایک چھوٹے سے گاؤں کو۔ تم تو پورے ملک کو اور ملک کے عوام کو دھوکا دے رہے ہو۔"

"اور انہیں معلوم بھی کیسے ہو سکتا تھا۔" محسن بولا۔

سراج ہنسا۔ "معلوم ہو سکتا تھا۔ میں ان کو بتا سکتا تھا۔"

"افسوس یہ کہ تمہیں کوئی موقع نہیں ملا۔" غالب نے کہا۔

"تم لوگوں کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ اور پھر میرا۔" سراج نے اسی لہجے میں کہا۔ "کہ اس وقت تم میری جگہ حوالات میں بندھے ہوئے نہیں پڑے ہو۔ تم سارا دن بادشاہت کرتے رہے اور نشۂ اقتدار میں بھول گئے کہ شامتِ اعمال تمہارے کتنے قریب آ گئی تھی۔ مجھے موقع ملا تھا جب میں یہ راز فاش کر سکتا تھا۔"

"کب موقع ملا تھا۔" میں نے متاثر ہوئے بغیر کہا۔

"جب ایک احمق میرے لیے کھانا لایا تھا۔" سراج بولا۔ "اس نے تو میرے ہاتھ بھی کھول دیے تھے اور جب میں کھانا کھا رہا تھا تو وہ بندوق تانے کھڑا ہوا تھا۔ میں نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ حالانکہ میں چاہتا تو اسے سب بتا سکتا تھا۔ صرف اتنا ہی کہہ دیتا کہ ذرا ایس پی صاحب سے ان کا شناختی کارڈ تو مانگ لو۔ وہ نہ سہی... نمبردار تو تمہارا ماتحت نہیں تھا۔ وہ شک میں پڑ جاتا تو تم سے یہ مطالبہ ضرور کر بیٹھتا۔ جب میں کھانا کھا رہا تھا تو تمہارے دربار میں ہی معززین بیٹھے ہوئے تھے۔"

میں نے اور محسن نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ کیا واقعی ہم سے اتنی بڑی بھول ہو گئی تھی۔

"تم کو کھانا کس نے دیا تھا، میرا مطلب ہے کس کی اجازت سے دیا گیا تھا؟" میں نے کہا۔

"مجھے نہیں معلوم۔ تم تو مجھے بھول گئے تھے لیکن وہ نہیں بھولے تھے کہ ان کی تحویل میں ایک حوالاتی بھی ہے۔" سراج بولا۔

"پھر تم نے ان سے وہ کیوں نہیں کہا جو تم کہہ سکتے تھے۔" محسن بولا۔

"میں نے اس میں کوئی فائدہ نہیں دیکھا۔" سراج نے کہا۔ "تم جو کچھ کر رہے تھے اچھا ہی کر رہے تھے۔ اس میں میرا کوئی نقصان نہیں تھا۔ وہ سب مجھے اچھا لگا اور میں نے دخل در معقولات نہیں کیا۔"

"لیکن تم جانتے تھے کہ... تمہیں نقصان ہوگا۔" میں نے کہا۔

"کیا نقصان ہوگا؟" وہ خلا میں دیکھنے لگا۔ "جتنا نقصان ہونا تھا ہو چکا۔ میں نوکری سے غیر حاضر ہوں۔ اور میرے دوبارہ حاضر ہونے کا امکان بھی نہیں۔ مجھے معطل کیا جا چکا ہوگا۔ یہ وردی تمہیں مبارک ہو۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں رہی۔ اب تم صرف میری جان لے سکتے ہو۔"

"تم جانتے ہو کہ تمہارے لیے جان دینا اتنا آسان بھی نہیں ہوگا جتنا تم سمجھ رہے ہو۔" محسن بولا۔

"میں جانتا ہوں۔ تم مجھے بدترین اذیت دینے کے لیے کتنے بے تاب ہو۔" سراج بولا۔ "تمہیں پہلی بار موقع ملا ہے۔"

"ہاں... جب تم کو پہلی بار موقع ملا تھا تو تم نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔" میں نے کہا۔ "مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا۔ آج تم میرے مہمان ہو۔ ایک بالٹی میں نے رکھی ہوئی دیکھ لی تھی ورنہ میں خاص طور پر منگواتا۔"

"تم اپنا شوق پورا کر سکتے ہو۔" وہ بولا۔ "اگر صرف معلومات حاصل کرنے کی بات ہے تو میں ویسے ہی سب کچھ بتانے کو تیار ہوں۔ میں تم کو وہاں لے جا سکتا ہوں جہاں رابعہ، کیتھرین اور تمہارے دوست ٹیڈی مل سکتے ہیں۔"

"ہم اب تم پر اتنی آسانی سے اعتبار نہیں کریں گے سراج۔ ایک موقع تم کو پہلے بھی دیا گیا تھا۔" میں نے کہا۔

"وہ موقع تقدیر نے دیا تھا۔ لیکن میں اس سے فائدہ نہ اٹھا سکا۔ تقدیر بار بار موقعے فراہم نہیں کرتی۔ اور اب تو میرا اعتقاد نہ تقدیر پر رہا ہے نہ تدبیر پر... وقت ہی ساتھ چھوڑ گیا ہے ورنہ میں دوسری بار گرفتار کیوں ہوتا۔" سراج بولا۔

"یہ سب ہم نہیں جانتے۔ یہ تمہاری ریاکاری بھی ہو سکتی ہے۔"

"میں تمہارے لیے کارآمد ثابت ہو سکتا ہوں۔" سراج بولا۔

"نہیں، ہم اپنی مدد آپ کر سکتے ہیں۔ ہم نہ تمہاری رہنمائی پر بھروسا کر سکتے ہیں اور نہ تمہاری نیک نیتی پر۔" میں نے کہا۔ "ہم تمہیں ساتھ رکھیں گے۔"

"تمہارے علاوہ مجھے کوئی ساتھ رکھنے کے لیے تیار بھی نہیں ہوگا۔" وہ بولا۔ "تم جانتے ہو کہ دلاور بھی مجھے چھوڑ چکا ہے۔ مجھے ایک موقع اور دو... میں تمہارا ساتھ دوں گا۔ پھر غلطی کروں تو جو سزا چاہے دینا۔"

"پہلے یہ بتاؤ کہ رابعہ، کیتھرین اور ٹیڈی کو کہاں لے جایا گیا ہے؟" میں نے کہا۔

"انہیں کراچی لے جانے کا پروگرام تھا۔" وہ بولا۔

"کیسے؟ یہ تو ہمیں بھی معلوم ہے کہ ان کو کریٹ میں بند کر کے کراچی پہنچایا جائے گا۔" میں نے کہا۔ "یہ کریٹ کراچی تک کیسے جائیں گے۔"

"سڑک کے ذریعے۔ سامان لے جانے والے ٹریلرز میں۔" وہ بولا۔

"اور یہ ٹریلر کہاں سے روانہ ہوں گے؟" محسن بولا۔

"یہ مجھے نہیں معلوم۔" وہ بولا۔ "دلاور... یہ باتیں مجھے نہیں بتاتا تھا۔"

"مگر تم ہمیں بتاؤ گے۔" میں نے کہا۔

تھانے میں تفتیش کا سب اسباب مہیا تھا۔ پہلے ایک گھنٹے میں غالب نے اور میں نے تفتیش کی۔ ہمارا سوال ایک ہی تھا کہ ٹریلرز کہاں سے روانہ ہوں گے اور کب روانہ ہوں گے۔ میں نے اس کے جسم سے لباس الگ کر دیا اور غالب کی مدد سے اس کو کھڑکی کی سلاخوں کے ساتھ باندھ دیا۔ پھر میں نے چمڑے کی بیلٹ اٹھالی۔ اس کی آواز بند رکھنے کے لیے ہم نے اس کے منہ میں پھر کپڑا ٹھونس دیا۔ بیلٹ کے ہر وار پر وہ بل کھاتا رہا اور تڑپتا رہا۔ آہستہ آہستہ اس کے سارے جسم پر نیل کے سانپ سے نمودار ہو گئے۔ جب میں تھک گیا تو میں نے اسے ایک موقع دیا۔ لیکن وہ ایک ہی بات پر اڑا رہا۔ مجھے نہیں معلوم... محسن نے اور غالب نے مزید ایک گھنٹا محنت کی مگر اس سے کچھ نہ اگلوا سکے۔ وہ نیم بے ہوش تھا اور اس کے جسم کی کھال جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھی۔

بالآخر میں نے محسن سے کہا کہ وہ بالٹی اٹھا لائے۔ میں نے اسے کرسی پر بٹھا کے مضبوطی سے باندھ دیا اور بالٹی اس کے سر پر الٹی کر کے رکھ دی۔ اس کا منہ گردن تک بالٹی میں غائب ہو گیا۔ محسن دوسرے کمرے سے باہر گیا اور درخت کی دو شاخیں توڑ لایا۔ ان کے پتے صاف کرنے کے بعد وہ ایک انچ سے زیادہ

موٹے اور تقریباً تین فٹ لمبے لچکدار ڈنڈے ہمارے ہاتھ میں رہ گئے۔ سراج کی آنکھیں بالٹی اوڑھانے سے پہلے دہشت سے باہر آ رہی تھیں۔ جب بالٹی پر میں نے پہلا ڈنڈا مارا تو سراج کرب سے بل کھانے لگا۔ دوسری طرف سے محسن نے بالٹی پہ وار کیا۔ اس کی اذیت میں نے محسوس کی کیونکہ میں اس بھیانک تجربے سے گزر چکا تھا۔ رفتہ رفتہ میرا جنون بڑھنے لگا۔ میں نے پوری قوت سے بالٹی پہ ڈنڈے مارنا شروع کیے۔

"سراج..." میں نے قہقہہ لگا کے کہا۔ "کیسا لگتا ہے اندر؟۔ میں نے اپنا ایک وعدہ پورا کیا۔ یہ طریقۂ تفتیش میں نے تم سے ہی سیکھا تھا۔"

"سکندر!" محسن نے اچانک میرا ہاتھ روک لیا۔ "یہ آواز کیسی ہے؟"

میں نے کان لگا کے سُنا۔ یہ کوئی گاڑی تھی... غالباً جیپ... جو قریب آ رہی تھی۔ ابھی تک تو میں نے اس گاؤں کے راستے پر موٹر کے ٹائر کا ایک بھی نشان نہیں دیکھا تھا۔ پھر یہ وطن کے تین بجے جیپ کہاں سے آ گئی؟

باہر گھپ اندھیرا تھا لیکن میں دور سے آنے والی گاڑی کی ہیڈ لائٹس کو روشنی کی دو متحرک اور متوازی لکیروں کی طرح آگے بڑھتا دیکھ سکتا تھا۔ ناہموار زمین کے ہچکولوں سے روشنی اوپر نیچے ہوتی تھی تو اس کی زد میں آنے والے جنگل کے درختوں کا ساکت وجود کبھی تنے کی حد تک نظر آتا تھا تو کبھی سرسبز شاخوں میں اُجالا اندر تک پیوست ہو جاتا تھا۔ پتّوں کے درمیان آشیانوں کی محفوظ خواب گاہوں میں پرندے یوں خوفزدہ ہو کے چلّاتے تھے، جیسے صبح کے بعد شفق کے نرم اُجالے سے نکلنے والا سورج آج یک لخت آدھی رات کو سوا نیزے پر آ گیا ہے۔

"حوالدار—" میں نے چلّا کے کہا۔ وہ مجھ سے پچاس گز کے فاصلے پر منجمد کھڑا ہوا تھا۔

"زناب عالی—" وہ اچھلا اور پلٹ کر دوڑا۔

"کون آیا ہے اس وقت؟" میں نے کہا۔

"کوئی زیپ میں آیا ہے زناب۔"

"یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔" میں نے جھنجلا کے کہا۔ "کہ کوئی زیپ میں آیا ہے مگر یہ کون ہے؟ یہاں کس کے پاس ہے جیپ؟"

"زیپ تو کسی کے پاس نہیں ہے— مگر آپ تو زانتے ہیں کہ آج کل چور ڈاکو بھی گھوڑوں پر نہیں آتے۔" وہ بولا۔ "پچھلے سال زب ڈاکا پڑا تھا تو زناب، اپنے نمبردار صاحب کی بیٹی کی شادی تھی... جتنے مہمان تھے کہ اِدھر اُدھر کے پنڈ سے دو سو بندے اور زنانیاں حویلی میں اور باہر خیموں میں ٹھہرے ہوئے تھے اور زناب، یہ عورتیں— اللہ ان کو عقل دے... خوب گہنے پہن کر آئی تھیں— شو مارنے کے لیے— ڈاکوؤں کو سب معلوم تھا۔ چوڑیاں اور کڑے— ہار بُندے— ناک کی لونگ تک نہیں چھوڑی انھوں نے— کئی سیر سونا لے گئے۔" جیپ اب گاؤں کی طرف جا چکی تھی۔

"اچھا— اور کسی نے... میرا مطلب ہے، اتنے لوگ تھے پھر بھی ڈاکو نکل گئے۔"

"مقابلہ تو کیا تھا زناب— گاؤں کے زیالوں نے۔" وہ بولا۔ "ایک ڈاکو زخمی ہوا تو اسے اس کے ہی ساتھی ٹھنڈا کر گئے— گاؤں کے دو زوان مر گئے— شادی کیا ہوئی تھی— سب کی بربادی ہو گئی۔"

"تمھارا مطلب ہے رخصتی نہیں ہو سکی؟" میں نے تازہ ہوا میں سانس لی۔

"لوزی.... وہ سب کچھ تو ہوا— پر زناب اپنا نمبردار تو برباد ہو گیا نا—" حوالدار بولا۔ "سب اس کے مہمان تھے۔ اس نے سب کا نقصان پورا کیا— ایک مربع زمین بیچی۔ پورا سال سب نے مل کر نمبردار کا نقصان برابر کیا، تب اس غریب کو زمین واپس ملی۔"

"سب نے مل کر۔ تمھارا مطلب ہے گاؤں کے لوگوں نے؟" میں نے کہا۔ "ان کا کیا قصور تھا— اور کیا زمیندار کے پاس وہی ایک مربع زمین تھی؟"

"نہیں زناب عالی— تھی تو دس مربعے... مگر نقصان تو اس اکیلے کا ہوا تھا۔" حوالدار نے کہا۔ "اور مہمان تھے وہ پنڈ کے... سب نے مل کر یہ نقصان تو پورا کرنا ہی تھا۔"

"بہت خوب— مہمان پنڈ کے اور نقصان نمبردار کا۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "تم دس مربعے والے کو غریب کہتے ہو؟ نو تو باقی تھے اس کے— کیا وہ کم تھے اس کو کہ گاؤں والوں کو سال بھر محکومی کا ٹیکس دے کر نقصان پورا کرنا پڑا— امیر کے خزانے سے مٹھی بھر اشرفیاں نکل جائیں تو رعیت اپنا پیٹ کاٹ کر دے— اور غریب کا گھر لُٹ جائے تو...؟"

"غریب کا گھر... اس میں کیا ہوتا ہے زناب عالی... زو کوئی لُوٹے؟" حوالدار میری جذباتی موشگافی پر دم بخود رہ گیا۔

"کیا آج بھی کوئی شادی ہے؟" میں نے لاجواب ہو کے کہا۔

"ابھی تو نہیں.... ابھی دو ہفتے ہیں۔" وہ سوچ کر بولا۔ "یہ ڈاکو نہیں ہوں گے سرزی— کسی کے مہمان آئے ہوں گے۔ یا کوئی بیمار ہو گا تو شہر سے ڈاکٹر کو لایا ہو گا— آپ فکر مت کریں۔ بندہ اِدھر ڈیوٹی پر موزود ہے۔"

"اور دوسری طرف؟" میں نے کہا۔

"اُدھر بھی گارڈ ہے۔" اس نے مجھے مطلع کیا۔ "تھانے کے تینوں جانب اس کے ماتحت عملے کا کوئی نہ کوئی فرد چارپائی ڈالے لیٹا ہوا

میں نے سر ہلا کے اطمینان کا اظہار کیا اور اندر لوٹ گیا۔ جتنی دیر میں باہر کھڑا رہا تھا، میں نے محسوس کیا تھا کہ اندر ہونے والا تفتیش کا شور جتنا بند کمرے میں سنائی دیتا تھا، اتنا باہر نہیں پہنچتا تھا۔

غالب نے غالباً اس تفتیش کے دوران اپنی موجودگی کو مزید ضروری نہیں سمجھا تھا اور وہ حوالات کے باہر پڑی ہوئی ایک لمبی میز پر دراز ہو کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو چکا تھا۔ محسن اکیلا ہی سراج کی فولادی ٹوپی کو بجا رہا تھا اور اس کام میں بڑے ذوق و شوق کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ اندر سراج کی حالت کیا ہو گی— بات پُرانی تھی مگر اس کی اذیت کا احساس تازہ لگتا تھا۔ سراج کی قوتِ برداشت جواب دے چکی تھی— وہ اب چیخ رہا تھا اور اُچھل رہا تھا— کرب سے بلبلا رہا تھا— خدا اور رسولؐ کے واسطے دے رہا تھا۔

"مجھے معاف کر دو... میں... مر جاؤں گا... مجھے بخش دو— مجھے کچھ معلوم نہیں— خدا کی قسم...۔" الفاظ اس کے حلق سے کراہ بن کے نکل رہے تھے۔

میں نے اس کے سر سے بالٹی ہٹا دی۔ "کیوں بھئی اپنے ایس پی صاحب!" میں نے سراج کے لہجے اور آواز میں کہا۔ "کیسے ہیں مزاجِ عالی؟"

"سکندر.... میں.... میں نے بہت ظلم کیا تھا۔" وہ ہاتھ جوڑنے لگا مگر اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ وہ خود ایسے لرز رہا تھا جیسے اسے سخت جاڑا لگ رہا ہو— وہ بُری طرح کانپ رہا تھا۔

"ظلم نہیں بھئی— یہ تفتیش ہے... تمھارا ہی طریقہ ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھ پر تمھارا بہت قرض ہے— سب ایک رات میں تو ادا نہیں ہو گا۔ پھر بھی جتنا ممکن ہوا ضرور لوٹائیں گے۔ ابھی بہت رات باقی ہے۔"

تفتیش کا یہ عمل یقیناً صبح تک جاری رہتا لیکن اچانک گاؤں کی طرف سے گولیاں چلنے کی آوازیں آئیں— پہلے ایک فائر ہوا اور کسی عورت نے ہذیانی انداز میں چلّانا شروع کیا— رات کی خاموشی کے باعث اس کے رونے پیٹنے کی آواز صاف سُنائی دے رہی تھی۔ میں اور محسن ایک ساتھ اٹھے اور باہر آ گئے۔

"غالباً یہ ڈاکو ہیں۔" میں نے تشویش سے کہا۔ "مجھے ابھی حوالدار نے بتایا تھا کہ کبھی کبھار وہ اِدھر بھی چکّر لگانے آ جاتے ہیں کسی خاص موقع پر، مثلاً کسی شادی پر، جب انھیں عورتوں کے زیورات ہاتھ لگتے ہیں۔"

"اگر یہ ڈاکو ہیں تو ہمیں کیا۔" محسن نے کہا۔ "ہم ان کو روک نہیں سکتے اور نہ انھیں مار کے بھگا سکتے ہیں۔"

"ایس پی صاحب۔" میں نے کہا۔ "آپ سوچ لیں— ایک زمانے میں آپ نے کارہائے نمایاں سرانجام دے کر اس گاؤں میں جو عزت کمائی تھی، وہ خاک میں مل جائے گی۔"

"عزت کا خاک میں مل جانا بہتر ہے۔" محسن نے فرمایا۔ "خود ہمارے خاک میں ملنے سے۔"

"مگر یار— یہ گاؤں والوں پر بڑا ظلم ہے— ہم اتنے بے حس ہو جائیں کہ جانتے بوجھتے کچھ نہ کریں۔" میں نے کہا۔ "ظلم ہم پر ہو یا ہمارے کسی ہم وطن پر— ہم اے ایم آر ایس کے منشور میں شامل سمجھتے ہیں کہ اس کے خلاف ڈٹ جائیں۔"

"آپ ایم آر ایس کو پنگا تحریک بنا رہے ہیں سکندرِ اعظم صاحب!" محسن نے کہا۔ "ہمارا ایک مقصد اور ایک مشن ہے، اس سے ہٹ کر ہم نے ہر جگہ پنگا لینا شروع کیا تو حاصل کچھ بھی نہیں ہو گا— سوائے وفاتِ حسرت آیات کے— بے شک سارے جہان کا درد ہمارے جگر میں ہے مگر اس کی دوا ہمارے پاس نہیں ہے۔"

"ہمارے پاس تو خود اپنے درد کی دوا نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"اسی لیے تو کہتا ہوں کہ کان اور آنکھیں بند کر لے۔" محسن بولا۔ "ظالم ہر جگہ ہیں اور شیطان بھی ہر جگہ ہیں.... لیکن ہم خدائی فوجدار نہیں ہیں۔"

ایک فائر اور ہوا۔ "حوالدار—" میں نے چلّا کے کہا مگر اس کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ ابھی چند منٹ پہلے وہ پوری طرح جاگ رہا تھا، چنانچہ اس کا فوراً مدہوشی کی اتنی گہری نیند میں گم ہو جانا میرے لیے ناقابلِ فہم تھا۔

"حوالدار مکر کر رہا ہے۔" میں نے کہا۔ "اتنی چیخ و پکار ہو رہی ہے مگر کیسے مُردہ بنا پڑا ہے— سالے کو ڈر ہے کہ کہیں اسے گاؤں کی طرف جانے کا [illegible]"

"یہ بہترین پالیسی ہے۔" محسن بولا۔ "ہر جگہ یہ لوگ ڈاکوؤں کا سامنا کرنے سے گریز کرتے ہیں اور ہر مرتبہ ان کے پاس کوئی نہ کوئی عذرِ لنگ ہوتا ہے— ناکافی اسلحے کا— بہت کم نفری کا— ٹرانسپورٹ کی سہولت نہ ہونے کا یا پھر قطعی لاعلمی کا— یہ جانتے بوجھتے انجان بن جاتے ہیں۔"

"ڈاکوؤں سے ان کی ملی بھگت ہوتی ہے۔ سب طے شدہ پروگرام کے مطابق اور اتفاقِ رائے سے ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ کب آئیں گے، کدھر سے آئیں گے— کس کے گھر جائیں گے اور کیا لے جائیں گے؟ یہ سب معلومات پولیس کے پاس پہلے سے ہوتی ہیں— صرف اس لیے کہ ڈاکو ان کا حصہ دیتے وقت ڈنڈی نہ ماریں— میں ذرا حوالدار کو خوابِ خرگوش سے جگا دوں۔"

حوالدار لمبی تان کے سو رہا تھا مگر اس کی آنکھوں کی خفیف سی حرکت چغلی کھاتی تھی کہ وہ جاگ بھی رہا ہے۔ ہماری باتیں بھی سُن رہا ہے اور غالباً نیم وا آنکھوں سے دیکھ بھی رہا ہے کہ ہم کیا کرتے ہیں۔

"حوالدار ۔" محسن نے قریب پہنچ کر اور کڑک کر کہا۔ پھر اس سے قبل کہ حوالدار ہڑبڑا کے اٹھنے کی اداکاری کرتا محسن نے اُس کی چارپائی الٹ دی۔

"وہ..... آہ... بسنوی ۔" حوالدار بدحواسی کے عالم میں کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھا۔

"گھوڑے بیچ کے سوتے ہو گدھے کے بچے" محسن نے گرج کر کہا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے ؟" محسن نے گاؤں کی طرف اشارہ کیا۔

"کیا ہو رہا ہے زناب عالی ۔" حوالدار نے معصومیت سے مظلوم لہجے میں کہا۔ اس کی بدقسمتی کہ اسی وقت مسلسل تین فائر ہوئے۔

"تمھارے باپ آئے ہیں غالباً" محسن نے کہا "تمھاری آنکھیں تو کھل گئی ہیں لیکن کان شاید ابھی تک بند ہیں" اس کا ہاتھ گھوما اور ایک زناٹے دار تھپڑ حوالدار کے گال پر پڑا۔ اس کے کانوں میں یقیناً سائیں سائیں ہونے لگی ہوگی۔ وہ لڑکھڑا کے گرا اور پھر فوراً کھڑا ہو گیا۔ گالیاں تو اس نے افسرانِ اعلیٰ اور عوام و خواص سب سے ہی بہت کھائی ہوں گی مگر ایسا تھپڑ کھانے کا شاید یہ پہلا اتفاق تھا۔ مشکل یہ تھی کہ افسر بہت بڑا تھا اور جسمانی طور پر بھی بہت زیادہ طاقت ور تھا۔ اس کے برعکس حوالدار کمزور ہی نہیں، بے ضمیر اور بزدل بھی تھا۔ چنانچہ اس میں خودی ایک فیصد بھی نہیں تھی ۔۔۔ پھر یہ کہ تھپڑ کھانے کا یہ ذلت آمیز واقعہ ایک پرائیویٹ واقعہ تھا یعنی کسی کے سامنے پیش نہیں آیا تھا۔ وہ فوراً ہاتھ جوڑ کر گڑگڑانے لگا ۔۔۔ گاؤں میں اب پھر خاموشی چھا گئی تھی یہ بھی عجیب بات تھی۔

"معاف کر دیں زناب ۔۔ بندہ بشر ہوں ۔۔۔ نیند آگئی تھی۔"

"بکواس ۔۔ تم مکر کر رہے تھے، تاکہ تم کو جانا نہ پڑے" محسن نے ڈانٹ کر کہا "جاؤ اور دوڑتے ہوئے آؤ ۔۔۔ دیکھو گاؤں میں کیا ہو رہا ہے ؟"

"زناب ... میرے بیوی بچے ہیں ... بچے تو یتیم خانے چلے زائیں گے ۔۔۔ بیوی کون سے خانے میں زائے گی ۔۔ ڈاکو شریف آدمی نہیں ہوتے ذرا لحاظ نہیں کرتے زناب عالی ۔۔۔ میں بالکل مر زاؤں گا ۔۔ مجھے خودکشی پر مزبور نہ کریں۔" وہ تھر تھر کانپنے لگا۔

ڈاکو غالباً اپنا کام کر کے جا چکے تھے ۔۔ جسے لٹنا تھا وہ لٹ چکا تھا اور اب باقی لوگ اسے تسلی دے رہے تھے یا صبر کی تلقین کر رہے تھے۔ ممکن ہے کچھ بے وقوف اسے پولیس سے رجوع کرنے اور رپورٹ لکھوانے کا مشورہ بھی دے رہے ہوں۔

"تم کو کس اُلّو کے پٹھے نے پولیس میں بھرتی ہونے کا مشورہ دیا تھا ؟" محسن نے افسرانہ غصّے میں دہاڑ کر کہا۔ میری ایک نظر گاؤں کی طرف تھی تو دوسری تھانے کی طرف۔

"میری زورو نے زناب ۔" وہ منمنانے لگا "وہ چاہتی تھی کہ میں فٹافٹ مر زاؤں ۔۔ کسی پولیس مقابلے میں ہلاک ہو زاؤں ۔۔۔ ڈاکوؤں کے ہاتھوں مارا زاؤں ۔۔ کبھی کہتی ہے ہلال بنو ۔۔ کبھی کہتی ہے ٹریفک پولیس میں چلے زاؤ۔ ہر طرف گاڑیاں ہی گاڑیاں ہوں گی، خوب پیسہ ملے گا ۔۔ کمینی ذات عورت کی ۔۔۔ زانتی ہے کہ کوئی نہ کوئی گاڑی مجھ پر چڑھ زائے گی ۔۔۔ رشوت مانگتی ہے یا... میری وفات...۔"

"آخر کیوں ؟" مجھے اس کی بات اور حالت پر ہنسی آنے لگی۔

"بس زی ۔۔۔ اس نے شادی سے پہلے ایک یار بنا لیا تھا، وہ لولا ۔ ایک لونڈا تھا.... نہ کام کا نہ کاز کا.... دشمن اناز کا۔ شہر کے فلمیں دیکھتا تھا ۔۔۔ گاؤں میں آ کے عاشقی کی پریکٹس کرتا تھا اس کے چکر میں پڑ گئی تھی ۔۔ باپ نے مجھ سے شادی کر دی ۔۔ مگر وہ اسے بھولی نہیں ہے۔ چاہتی ہے کہ میں مر زاؤں تو اسے مزے لے یار کے ساتھ زانے کا ۔۔ ابھی تو ڈرتی ہے کہ میں اُسے قتل کر دوں گا۔"

"ایسی عورت کو تم چھوڑ کیوں نہیں دیتے ؟" میں نے کہا۔

"چھوڑ دوں ؟ خود اپنی مرضی سے.... نہیں زی اسے زانے دوں اپنے یار کے پاس ؟" حوالدار دم بخود ہو گیا۔ اس موضوع پر مزید گفتگو اس لیے جاری نہ رہ سکی کہ مجھے گاؤں کی جانب سے دو سائے سے لپکتے دکھائی دیے۔

"ایس پی صاحب.... دُہائی ہے سرکار" ایک نے چلّا کر ہانپتے ہوئے کہا۔

"ہماری مدد کریں مائی باپ" دوسرا بولا۔ قریب آ کر وہ لوگ نیچے گر گئے ۔۔۔ یہ بالکل قدموں میں سر رکھنے کا انداز تھا۔

"لاحول ولا قوۃ ۔" محسن نے پیچھے ہٹ کر کہا "یہ کیا بے ہودگی ہے.... سیدھے کھڑے ہو کے بات کرو۔"

وہ دونوں کھڑے ہو گئے ۔۔۔ ان میں سے ایک جوان آدمی تھا اور دوسرا بوڑھا۔

"شرم نہیں آتی تم لوگوں کو.... مسلمان ہو اور جانتے ہو کہ خدا کے سوا کسی کو سجدہ جائز نہیں ۔" محسن نے انھیں ڈانٹنا شروع کیا۔ "جو کہنا ہے انسانوں کی طرح کہو ۔۔ پیر پکڑنے یا ہاتھ جوڑنے کی کیا ضرورت ہے ۔ مصیبت میں پولیس سے مدد مانگنا تمھارا حق ہے اور تمھاری مدد کرنا ہمارا فرض ہے۔"

"وہ... سر جی ..." نوجوان نے خود کو سنبھال کے کہنا شروع کیا۔ "خرکار آ گئے تھے گاؤں میں...."

"خرکار یا ڈاکو ؟" میں نے کہا۔

"وہ ڈاکو نہیں تھے مائی باپ...." بڈھے نے کہا "وہ کچھ بھی لے کر نہیں گئے ۔۔ کسی گھر کو نہیں لوٹا انھوں نے.... پانچ جوانوں کو پکڑ کر لاری میں ڈال لیا اور بھاگ گئے ۔۔۔ ان کی مائیں تو پاگل ہو گئی ہیں، دو بے ہوش پڑی ہیں ۔۔۔ دو کو باندھ کے ڈال دیا ہے ۔۔۔"

اپنے کپڑے پھاڑ رہی تھیں۔"

"لیکن تمھیں کیسے معلوم کہ وہ خرکار تھے ؟" محسن نے کہا۔

"اور کوئی پانچ جوان لڑکوں کا کیا کرے گا مائی باپ ؟" بڈھے نے کہا "بس اب وہ ان کو لے کے کسی بے گار کیمپ میں لے جائیں گے ۔ کھانے کو کچھ نہیں دیں گے، ماریں گے اور جانوروں کی طرح کام لیں گے۔" وہ ایک دم دہاڑیں مار مار کے رونے لگا "ان میں میرا بیٹا بھی ہے... اس کا چھوٹا بھائی...."

اب تو جوان نے بھی بھائی کو یاد کر کے رونا شروع کر دیا۔ اب تک وہ حوصلے سے کام لے رہے تھے یا پولیس افسر کے سامنے ضبط سے کام لینے پر مجبور تھے کہ کہیں وہ شور شرابے پر خفا نہ ہو جائیں۔

"دیکھو... عقل سے کام لو ۔۔۔ حوصلہ رکھو۔" محسن نے کہا "مجھے اطمینان سے ساری بات بتاؤ ۔۔۔ خرکار اس طرح نہیں آتے ۔۔ وہ ڈاکے مار کر جوان آدمی اپنے ساتھ نہیں لے جاتے ۔۔ تم نے دیکھا تھا ان کو...؟"

"دیکھا تھا مائی باپ۔" بڈھا سسکیاں لیتے ہوئے بولا۔

"کتنے آدمی تھے وہ ؟"

"صرف دو ۔۔ مگر ان کے ہاتھوں میں پستول تھے مائی باپ۔ اور انھوں نے گولی سے ایک لڑکے کو زخمی بھی کر دیا تھا ۔۔۔ وہ اُن کے قبضے سے نکل بھاگا تھا ۔۔۔ گولی اس کی ٹانگ میں لگی تھی لیکن وہ پھر بھی بھاگ گیا ۔۔۔ رات کا وقت تھا اس لیے نشانہ چوک گیا ۔۔۔ اللہ نے زندگی بچالی ۔۔۔ باقی پانچ کو انھوں نے لاری میں ڈال لیا ۔ ان میں سے ایک لاری کا ڈرائیور تھا.... دوسرا پیچھے بیٹھا تھا اس نے لڑکوں سے کہا کہ خبردار جو کوئی ہلا۔ سب اُلٹے پڑے رہو۔ کسی نے سر بھی اٹھایا تو گولی مار دوں گا۔" بڈھے نے بتایا۔

"اور تم سب دیکھتے رہے۔" محسن نے برہمی سے کہا "خیر چھوڑو، یہ بتاؤ کہ انھوں نے کس کس کو پکڑا.... اور کہاں سے ؟"

"وہ جی، ایک کو انھوں نے کھیتوں سے پکڑا ۔۔۔ وہ پانی لگا رہا تھا" بڈھے نے بتانا شروع کیا "اسے ساتھ لے کر وہ گاؤں میں آ گئے، اسی لڑکے سے انھوں نے پوچھا کہ کس گھر میں کون جوان لڑکا ہے ۔۔۔ اور اس کا نام کیا ہے ۔۔۔ پھر انھوں نے ہر دروازے پر دستک دے کر ہر لڑکے کو نام لے کر بلایا اور باہر کھینچ لیا ۔۔۔ دھکے دے کر ساتھ لے گئے اور لاری میں ڈال لیا۔"

"انھوں نے کچھ کہا نہیں.... کہ آخر وہ کیا چاہتے ہیں ؟" محسن نے کنفیوز ہو کے پوچھا "گھر والوں سے کوئی بات نہیں کی ؟"

"انھوں نے یہ کہا تھا مائی باپ کہ فکر کی بات نہیں.... ہمیں چار پانچ جوان اور صحت مند لڑکے چاہئیں۔" بڈھا بولا "شور مچانے اور کسی کو بتانے کی ضرورت نہیں ۔۔۔ لڑکے صبح تک آ جائیں گے.... لیکن مائی باپ... وہ جھوٹ بول رہے تھے۔ ماں باپ شور کیسے نہ مچاتے ؟ انھوں نے دوبارہ فائر کی.... ڈرانے کے لیے ۔۔۔ ایک لڑکا بہادر تھا سب جانتے ہیں اُسے کہ وہ ہاتھ سے سانپ کو پکڑ لیتا ہے اور پیچ پیچ کر مار دیتا ہے ۔۔۔ ایک بار اس نے کلہاڑی سے بھیڑیے کی گردن الگ کر دی تھی جو اس پر حملہ کرنے والا تھا ۔۔۔ وہ چلتی لاری سے کود گیا اور بھاگ کر آ گیا ۔۔۔ گولی اس کی پنڈلی میں لگی تھی لیکن اللہ نے ہڈی بچالی اور اسی لیے وہ دوڑتا رہا، چونکہ جنگل تھا اس لیے درختوں کی آڑ میں رہا ورنہ وہ اور گولیاں چلاتے۔ خرکاروں کو نکل جانے کی جلدی بھی تھی۔"

"بابا جی.... میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ وہ خرکار نہیں تھے" میں نے کہا "اگر انھوں نے یہ کہا تھا کہ لڑکے صبح تک واپس آ جائیں گے تو مجھے پوری امید ہے کہ وہ آ جائیں گے ۔۔۔ اصل بات کچھ اور ہے... تم ذرا ان کا حلیہ بتاؤ۔"

بڈھے نے نفی میں سر ہلایا "میں تو کچھ نہیں دیکھ سکا انھوں نے دروازہ بجایا تو میرا بیٹا گیا تھا کنڈی کھولنے ۔۔۔ وہ اسے گھسیٹ کر لے گئے... وہ چلّایا تو میں دوڑا... مگر لاری نکل گئی تھی ۔۔۔ میں نے اسے جگایا اور باہر گیا۔ اس وقت تک گاؤں کے چھ لڑکے اغوا ہو چکے تھے۔"

"وہ پولیس والے تو نہیں تھے ۔۔ ؟" محسن نے پوچھا۔

بڈھے نے نفی میں سر ہلایا "وردی تو کسی نے بھی نہیں پہن رکھی تھی۔"

"کسی دُوسرے گاؤں کے دشمن بھی نہیں تھے ؟"

"دشمن ہر ایک کا ہوتا ہے.... مگر گاؤں کا دشمن گاؤں نہیں ہوتا۔" بڈھا بولا "وہ چھ لڑکے ایک ہی خاندان کے بھی نہیں تھے... آپس میں سب ایک دُوسرے کو جانتے تھے مگر ان کا کوئی دشمن نہیں۔ سب اچھے محنتی لڑکے تھے۔"

"گویا حُلیہ کسی نے نہیں دیکھا ؟"

"نہیں مائی باپ ... انھوں نے چہروں پر رومال باندھے ہوئے تھے ڈاکو ہوتے تو ڈھاٹے باندھ کر آتے ۔" بڈھا بولا "اور ڈاکو پتلونیں نہیں پہنتے۔"

"پتلونیں.... ؟" محسن چونک کر بولا۔

"ہاں مائی باپ.... اتنا میں نے ضرور دیکھ لیا تھا کہ وہ پتلونیں پہنے ہوئے تھے۔"

"اور اوپر... قمیص... ٹی شرٹ یا کوٹ ۔۔ ؟" محسن نے پوچھا۔

"کوٹ جیسی قمیص تھی جناب...۔" بڈھے نے کہا۔

"ایک کی ٹی شرٹ تھی سر جی ۔" لڑکے نے کہا۔

"اچھا.... رنگ دیکھا تھا ۔۔ ؟"

"پتلونیں تو کالی لگتی تھیں" لڑکے نے کہا "ٹی شرٹ تھی سفید

اور قمیص دھاریوں والی… سفید کالی یا سفید نیلی۔"

"اچھا… تمہارے گاؤں کے اتنے سارے لوگوں میں سے کسی نے لاری کا نمبر وغیرہ دیکھا؟" محسن نے پوچھا۔ "خیر چھوڑو… تم واپس جاؤ اور ان سب کو بُلا لو، جن کے گھروں سے لڑکے اٹھائے گئے ہیں۔ ماؤں کو مت بلانا۔ صرف ان کے باپ آ جائیں یا بھائی — اور وہ سب جنھوں نے کچھ دیکھا تھا۔ اور اُس بہادر لڑکے کو ضرور بلانا جو اپنی جان بچا کے بھاگ آیا تھا۔"

"جیسا حکم مائی باپ۔" بڈھا پھر رونے لگا۔ "بس میرا بیٹا مجھے واپس دلوا دو — اس کی ماں مر جائے گی… سب کے بیٹے دلوا دو… اللہ تم کو عزت دے گا — غریبوں کی دُعائیں لوگے تو سکھ پاؤ گے۔"

"چلو بابا چلو — ہم آتے ہیں۔" محسن نے کہا۔ وہ دونوں پلٹ کر چل پڑے… ہم انھیں اندھیرے میں غائب ہوتا دیکھتے رہے۔

"یہ کیا چکر ہے آخر۔" محسن نے بے تکلفی سے کہا۔

"وہ… ہم…" میں نے کھنکار کر اسے حوالدار کی موجودگی کا احساس دلایا۔ "ہم چل کے دیکھ لیتے ہیں… حوالدار کو آگے بھیج دیتے ہیں۔"

"ہاں… یہ ٹھیک ہے۔" محسن محتاط ہو گیا۔ "جاؤ حوالدار۔ تم نے میرے احکامات سن لیے — اس بڈھے کے ساتھ گاؤں پہنچ کر میرے آنے سے پہلے…"

"جی جنابِ عالی۔" حوالدار پوری بات سُنے بغیر دوڑ گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے دیکھا کہ دونوں کانسٹیبل بھی ہمارے پیچھے ہی موجود ہیں۔ اس نئی واردات میں ان کا دلچسپی لینا ایک فطری امر تھا۔ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ خود میں پولیس چوکی کے دروازے سے کافی دُور آ گیا تھا… اور جتنی دیر شاملِ تفتیش رہا تھا، اپنے قیدی کی طرف سے غافل رہا تھا… سراج کا خیال آتے ہی میں اندر لپکا… دروازے سے داخل ہوتے ہی میں نے 'کمرۂ حوالات' پر نظر ڈالی تو ایک لمحے کے لیے مجھے اپنی آنکھوں پر دھوکے کا گمان ہوا۔ جہاں پہلے خستہ حال اور نیم جاں سراج لیٹا ہوا تھا، وہاں اب کچھ بھی نہیں تھا — سراج اس موقع سے فائدہ اٹھا کے فرار ہو گیا تھا۔ میں نے اندر جا کے دیکھا — وہ جاتے وقت محسن کے کپڑے بھی اٹھا کر لے گیا تھا۔ اس کے پاس کپڑے پہننے کے لیے وقت نہیں تھا… یہ ہماری بے وقوفی تھی کہ تفتیش کرتے کرتے جیپ کی آواز سن کر باہر چلے گئے اور پھر دُوسرے مُعاملات میں اُلجھے تو اپنے قیدی کو بھول گئے۔ میں پلٹا کہ باہر جا کے محسن کو یہ افسوسناک اطلاع دوں مگر وہ میرے پیچھے موجود تھا۔

"نکل گیا وہ کمینہ؟" محسن نے مایوسی اور صدمے کے ساتھ کہا۔

"ہاں یار… میری بے وقوفی سے۔" میں نے کہا۔ "بس چند منٹ کے لیے میں اس کی طرف سے غافل ہوا تھا۔ اس سے پہلے میری نظر دروازے پر تھی — مگر جب وہ بڈھا چلّاتا ہوا آیا تو…" میں نے پھر افسوس سے سر ہلایا۔

"غلطی ہم سب کی ہے۔" محسن دیوار سے ٹیک لگا کے کھڑا ہو گیا۔ "یہ کسی ایک کی ذمے داری نہیں تھی — میں تو اس کی حالت کی وجہ سے تھوڑا سا مطمئن تھا کہ اب بھاگ کر کہاں جائے گا۔"

"ہم نے دروازے کو مقفل تک نہیں کیا اور باہر آ گئے۔" میں نے سخت مایوسی کی کیفیت میں کہا۔ "وہ خبیث مکر کرنے میں ماہر تھا۔ کیسا مرا پڑا تھا — مگر پھر ایک دم کھڑا ہو گیا ہو گا — اس نے جائزہ لیا ہو گا کہ ہم کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ وہ کپڑے اٹھا کے دبے پاؤں نکل گیا — بڈھا اور اس کا لڑکا شور کر رہے تھے۔ ہماری توجہ ان کی طرف تھی… پیچھے اندھیرا تھا — اُسے کسی نے بھی نہیں دیکھا ہو گا۔"

"ہم دونوں کی تو پیٹھ تھی — مگر حوالدار نے بھی نہیں دیکھا؟" محسن نے اچانک کہا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے یار — دروازہ اس کے بالکل سامنے تھا اور کھلی آنکھوں کے ساتھ یہ ناممکن ہے کہ کوئی اس دروازے سے نکلنے والے کو نہ دیکھ پائے۔"

"اور پھر ایک ایسے شخص کو جو برہنہ ہو۔"

"تو نے کیوں فرض کر لیا ہے کہ وہ ننگا ہی نکل بھاگا ہو گا؟" محسن بولا۔

"کپڑے اس کے لیے غیر اہم تھے محسن… کپڑے نہ ہوتے تب بھی وہ بھاگ نکلتا — یہاں سے نکل جانے کے بعد سب کچھ اس کے اختیار میں تھا۔" میں نے کہا۔ "وہ کپڑوں کا بندوبست بھی کر لیتا — اس کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی ایک سیکنڈ ضائع نہ کرتا۔ اس نے بھی یہی کیا ہو گا — وہ کپڑے ہاتھ میں پکڑ کر اندھیرے میں غائب ہو گیا ہو گا۔ یہاں سے نکل کے بھی اس نے کپڑے نہیں پہنے ہوں گے… جب تک اسے یقین نہیں آ گیا ہو گا کہ وہ ہماری دسترس سے دور اور محفوظ ہو چکا ہے — تاریکی اس کی بہترین پناہ گاہ تھی۔"

محسن نے قائل ہو کے سر ہلایا۔ "لیکن یار کیا وہ جسمانی طور پر اس قابل ہے کہ زیادہ دیر تک اور زیادہ دُور تک بھاگ کے جا سکے؟"

"جب آدمی موت سے بھاگتا ہے تو اس کے جسم کی توانائی کا آخری تنکا بھی ایک شہتیر بن کے سہارا دیتا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ اب اس کی تلاش میں جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔" محسن بولا۔

"میں نے یہ نہیں کہا مگر یہ بتا کہ ہم کدھر جائیں — ہم تو جنگل کے راستوں پر دن کے اُجالے میں کوئی سراغ تلاش نہیں کر پاتے

رات کے اندھیرے میں کیا دیکھیں گے — وہ ایک آدمی ہے لیکن چار سمتوں میں تین سو ساٹھ راستے ایک ڈگری کے فرق سے بنتے ہیں۔ ایک ڈگری کا فرق ایک میل کے بعد کتنا پھیل جائے گا۔ اس کا تجھے بھی اندازہ ہو گا — اس کے علاوہ ہم گاؤں کی طرف جا رہے ہیں… ایس پی صاحب…" میں نے کہا۔

"یار، یہ غالب ہی جاگتا رہتا تو کیا تھا — مُردہ بن کے لیٹ گیا۔" محسن نے میز پر لمبے پڑے ہوئے غالب کی طرف دیکھا۔

"اسے تو اُٹھا دُ صورِ اسرافیل پھونک کے۔" میں نے کہا اور زور سے میز کو ہلا کے غالب کے کان میں چیخ ماری۔ "اُٹھ مُردے، قیامت آ گئی۔"

غالب اُچھل کے نیچے اترا۔ "یار، قیامت آئے گی تو آسمان تو نہیں گرے گا نا — یہ آخر تم لوگوں کے چین آرام کے دشمن کیوں ہو گئے ہو؟"

"ہم جا رہے ہیں — گاؤں میں ایک واردات ہو گئی ہے۔" میں نے کہا۔

"مگر اس سے بڑی واردات یہاں ہو گئی ہے — سراج بھاگ گیا ہے۔" محسن نے اسے اطلاع دی — غالب نے بے وقوفوں کی طرح ہم دونوں کو دیکھا — اس کو ہماری باتوں پہ یقین نہیں آ رہا تھا اور وہ سمجھ رہا تھا کہ ہم مذاق کے موڈ میں ہیں۔ ہم نے اسے مختصراً ساری بات بتائی — پھر ہم گاؤں کی طرف چل پڑے۔

"میرا بھی شک حوالدار پر ہے۔" محسن بولا۔

"ہاں… میرا خیال ہے کہ سراج نے کسی طرح اسے پیغام دیا ہو گا کہ مجھے یہاں سے نکال سکو یا نکلنے میں میری مدد کر سکو تو منہ مانگا انعام دوں گا۔" میں نے کہا۔ "ممکن ہے لالچی حوالدار نے پانچ دس ہزار میں سودا کر لیا ہو کہ کوشش کروں گا۔"

"یہ تو بہت بُرا ہوا یار۔" محسن بولا۔ "کیا خبر سراج نے اسے اپنی اور ہماری اصلیت سے بھی آگاہ کر دیا ہو — اور ساتھ ہی کہہ دیا ہو کہ وہ خاموش رہے، ورنہ ہمارے ہاتھوں مارا جائے گا — اگر سراج نکل گیا تو حوالدار کو انسپکٹر بنوانا، اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہو گا؟"

"شاید اب نہ ہو۔" میں نے کہا۔ "وہ ڈیوٹی سے بغیر اطلاع دیے غائب ہونے کے جرم میں معطل کیا جا چکا ہو گا — سُندر کی موت کے بعد اس کے خلاف شکوک بڑھ گئے ہوں گے اور ایس ایس پی ضامن رضوی پوری کوشش کریں گے کہ وہ معطل ہی نہیں گرفتار بھی ہو جائے۔"

"یہ مشکل ہو گا… اپنے سکندر صاحب۔" محسن چلتے چلتے بولا۔ "وہ اپنی صفائی پیش کرے گا کہ اسے ہم اٹھا کر لے گئے تھے۔"

"اور یہ ثابت کیسے کرے گا؟"

"کچھ اور ثابت کرے نہ کرے گا۔" محسن بولا۔ "کہ اُسے ڈاکو لے گئے تھے… یا وہ اسمگلروں کے تعاقب میں نکل گیا تھا اور وہاں پھنس گیا تھا۔ اسے موقع ہی نہیں ملا کہ کسی کو اطلاع دے سکتا… اس کے پاس ہزار بہانے ہوں گے اور خود اس کے ماتحت ہی اس کی جھوٹی کہانی کو سچ بتائیں گے تو وہ فوراً بحال بھی ہو جائے گا۔"

"اِس کا مطلب تو یہ ہے کہ حوالدار سے محتاط رہنا ہو گا۔"

"صرف محتاط رہنے سے کیا ہو گا؟" محسن بولا۔ "اس سے پوچھنا پڑے گا کہ اس نے سراج کو فرار ہونے میں کس طرح مدد دی… اور کیوں مدد دی؟"

گاؤں کا مجمع نمبردار کی حویلی کے دالان میں تھا۔ متاثرہ خاندانوں کے علاوہ گاؤں کے ہر گھر کا تقریباً ہر فرد وہاں موجود تھا… بیک وقت سب بول رہے تھے [illegible] نظر آتے تھے — گریہ و زاری وہ کر رہے تھے جن کے بھائی یا بیٹے اٹھائے گئے تھے۔ گاؤں کی مقامی قیادت اس غم زدہ اور بپھرے ہوئے ہجوم کو خاموش کرنے میں ناکام رہی تھی — زیادہ جوشیلے جوان کلہاڑیاں، ڈانگ سوٹے اور لٹھ لے کر ڈاکوؤں کے تعاقب میں جانا چاہتے تھے مگر ذی ہوش لوگ ان کو روک رہے تھے — اچھی بات یہ تھی کہ خواتین کو اندر نہیں آنے دیا گیا تھا۔ ان کی فریاد و فغاں پس منظر میں مسلسل جاری رہی لیکن وہ براہِ راست اس اجتماع کے سامنے اپنے ہسٹریائی دیوانگی کا مظاہرہ کرنے سے قاصر رہیں، ورنہ حاضرین کی قوتِ فیصلہ بھی بُری طرح متاثر ہوتی۔

"آئیے آئیے… ایس پی صاحب۔" نمبردار نے پریشانی سے سر پہ ہاتھ پھیر کے کہا۔ "آپ بھی موجود ہیں — اچھا ہوا جو یہ واقعہ آپ کے سامنے پیش آیا۔"

"یہ بہت اچھا ہوا۔" کسی نے چلّا کے کہا۔

"اوئے پاگل دے پتر… میرا مطلب تھا کہ کوئی معتبر گواہ تو ہے۔" نمبردار نے دخل در معقولات کرنے والے کو جھاڑا۔

"دیکھیے، میں چشم دید گواہ نہیں ہوں۔" محسن نے فوراً وضاحت ضروری سمجھی۔ "نہ یہ واقعہ میرے سامنے پیش آیا ہے اور نہ میری موجودگی ہی میں…"

"اس کا مطلب ہے تم بھی کچھ نہیں کرو گے؟" کسی نے کہا۔

"آخر ہونا پولیس والے…" دوسری آواز آئی۔

"میں نے یہ نہیں کہا کہ میں کچھ نہیں کروں گا۔" محسن نے گرج کر کہا۔ "جو کچھ میں نے ایک دن میں کیا، وہ آپ لوگوں نے دیکھا تھا… اس کے باوجود تم مجھے پولیس والا ہونے کی گالی دیتے ہو — جب تک مجھے ساری بات معلوم نہیں ہو جاتی، میں کچھ نہیں کر سکتا اور ایسے تو مجھے کچھ پتا نہیں چلے گا — کوئی لڑ رہا ہے — کوئی گالیاں دے رہا ہے۔ کوئی رو رہا ہے تو کوئی صرف ہنگامہ کر رہا ہے — میں حکم دیتا

ہوں کہ یہاں صرف وہ لوگ رہیں جن کا اغوا ہونے والوں سے قریبی تعلق ہے — پانچ جوان اغوا ہوئے ہیں — ان پانچ گھروں کے مردوں کے سوا سب باہر نکل جائیں — اپنے اپنے گھر جائیں اور مجھے کام کرنے دیں — اور ہاں... وہ لڑکا کا جوان بدمعاشوں کی قید سے فرار ہو کے آ گیا تھا... پہلے وہ سامنے آ ئے۔"

مجمع خاموش تو پہلے ہی ہو گیا تھا... اب لوگوں نے ادھر اُدھر دیکھا لیکن نہ کسی نے جواب دیا اور نہ کوئی اپنی جگہ سے ہلا۔

"تم لوگوں نے سُنا نہیں کہ میں نے کیا کہا ہے؟" محسن نے دہاڑ کر کہا اور ایک دم ریوالور نکال کر ہوائی فائر کر دیا... مجمع یوں منتشر ہوا جیسے جلسہ عام میں بم پھٹ جائے — دو منٹ میں وہ سب حویلی کے دالان سے نکل گئے۔ اندر کوئی دس بارہ افراد رہ گئے۔

"جاہل لوگ... میری ایک نہیں سنتے تھے" نمبردار نے اطمینان کا سانس لیا اور یہ بھی بتا دیا کہ وہ خود کو تعلیم یافتہ سمجھتا ہے۔

"وہ لڑکا کدھر ہے؟" محسن نے ایک کرسی پر تشریف فرما ہو کے کہا جو ملازم اندر سے اٹھا کے لایا تھا... دوسری پر میں بیٹھ گیا... نمبردار صاحب تیسری کرسی کے آنے تک کھڑے رہے۔

"وہ تو... نہیں ہے" کسی نے کہا "حکیم صاحب اس کی پٹی کر رہے تھے۔"

"اچھا... اسے بعد میں لے آنا" محسن بولا "پہلے تم آؤ... تم بتاؤ کہ تم نے کیا دیکھا اور کیا سُنا؟"

"او جی... سب نہ دکھائے کسے نوں جو میں نے دیکھا" ایک ادھیڑ عمر کے شخص نے پگڑی کے کونے سے آنکھیں صاف کر کے کہا۔ "ایس طرح دی کدی ہوتا ہے — اتنی زندگی لنگ گئی اے... کدی نہیں سُنا کہ بندیاں نوں کوئی ایس طرح بھیڑ بکریوں وانگ لے جاندا اے... ظلم...!"

"دیکھو — تقریر مت کرو" محسن بولا "یہ بتاؤ تم نے دروازے پر دستک دینے والے کو دیکھا تھا؟"

"ایس طرح سر... جیسے میں آپ کو دیکھ رہا ہوں" وہ اپنی اردو پنجابی کی ملی جُلی زبان بولتا رہا۔

"ایسے تو نہیں دیکھا ہو گا... گاؤں کی گلیوں میں اندھیرا ہوتا ہے اور میں روشنی میں بیٹھا ہوں —" محسن نے کہا "لیکن تم کو اپنی نظر پر اتنا بھروسا ہے تو مجھے اس کا حلیہ لو ناک نقشہ سب بتاؤ۔"

مقرر کو محسن کے حوصلہ شکن رویے نے کچھ مایوس کیا "وہ جی... بندہ تھا میری طرح گبرو جوان... واہ واہ قد... چوڑی چھاتی۔"

"بے وقوف... اس کا قد کتنا تھا... موٹا تھا یا دُبلا پتلا... سر پر بال تھے یا گنجا تھا — بال تھے تو سیاہ تھے یا سفید" محسن نے برہمی سے کہا۔

"وہ سر... قد میں کیسے ناپتا...؟" وہ سر کھجانے لگا۔

"اچھا — اس کا اپنا رنگ کیسا تھا — مونچھیں تھیں...؟ کپڑے کیسے پہن رکھے تھے؟" محسن نے اس پر جرح جاری رکھی — وہ بڑھ چڑھ کے بے تکی بات کہنے یا لَونگیاں مارنے کا عادی تھا... وہ بھی اندھیرے اور افراتفری کے باعث زیادہ کچھ نہیں دیکھ سکا تھا — محسن نے اُسے جھاڑ کے ایک طرف کر دیا اور وہ خاصا افسردہ سا زمین پر اُکڑوں بیٹھ گیا — دُوسرے گواہوں کے بیانات سے ہم نے جو نتائج اخذ کیے ان سے ظاہر ہوا کہ اغوا کرنے والے ایک اسٹیشن ویگن میں تھے۔ اسے دیہاتیوں نے بہت بڑی جیپ قرار دیا تھا۔ ان میں سے ایک نے سفید ٹی شرٹ اور سیاہ پتلون پہن رکھی تھی اور دُوسرے نے نیلی سفید دھاریوں والی قمیص اور نیلی پتلون... دونوں نے منہ پر عام قسم کے رُومال اس طرح لپیٹے تھے کہ صرف ان کا آدھا چہرہ چھُپ سکا تھا۔ ان کی صرف آنکھیں نظر آتی تھیں لیکن صُورت کے نقوش اوجھل تھے — ان دونوں کی عمر پر اتفاقِ رائے تھا کہ تیس پینتیس سال ہو گی۔ قد اور وزن کے تعین کے لیے حاضرین میں سے میرا انتخاب کیا گیا جس سے ثابت ہوا کہ وہ پانچ فٹ دس گیارہ انچ اور ایک سو پچاس ساٹھ پونڈ کے جوان آدمی تھے — انھوں نے گاڑی کو گاؤں کے کنارے آبادی کے قریب لا کے کھڑا کیا اور قریب ترین گھروں سے چھ جوانوں کو اٹھانے کا فیصلہ کیا — جو نوجوان کھیتوں میں پانی لگا کے لوٹ رہا تھا' وہ سب سے پہلے اٹھا لیا گیا تھا اور اسی سے پوچھا گیا تھا کہ وہ اپنے جیسے پانچ جوانوں کے نام اور گھر بتائے — اس نوجوان کی خاصی ٹھکائی ہوئی تھی کیونکہ وہ چلانے لگا تھا اور تعاون پر آمادہ نہ تھا۔

اِس بیان بازی میں تقریباً ایک گھنٹا صَرف ہو گیا۔ پھر وہ بہادر جوان آ پہنچا جو دشمنوں کے نرغے سے نکل بھاگا تھا اور گولی کھانے کا اعزاز بھی حاصل کر چکا تھا — دو افراد اُسے یوں اٹھا کے لائے کہ ان دونوں نے ایک دُوسرے کے ہاتھ کلائی سے پکڑ لیے تھے... اس طرح ایک جھُولا سا بن گیا تھا اور یہ خاصا کارآمد اسٹریچر تھا... اس جوان کے آتے ہی واہ واہ کی آوازیں بلند ہوئیں اور کسی نے اسے بشیر دا پُتر... بھی کہا۔ اسے محسن کے سامنے زمین پر رکھ دیا گیا بلکہ پٹخ دیا گیا۔ محسن نے اسے تھپکی دی۔

"تم واقعی بہادر آدمی ہو —" محسن بولا۔

"جناب! مجھے پولیس میں رکھ لیں —" اس نے فوراً انعام کا مطالبہ کر دیا۔

"بہادر لوگ پولیس میں نہیں جاتے" محسن نے رک کر کہا۔

"پھر کہاں جاتے ہیں...؟" وہ بولا۔

"تم فوج میں جاؤ جوان —" محسن نے کسی قسم کے وعدے سے گریز کرتے ہوئے مشورہ دیا "اب ذرا تفصیل سے بتاؤ کہ وہ کون لوگ تھے... ان کا ناک نقشہ... لباس، حُلیہ سب تم نے اچھی طرح سے دیکھا ہو گا۔"

اس جوان نے بھی جو کچھ بتایا وہ مختلف نہیں تھا۔

"تم نے ان کی گفتگو بھی سنی ہو گی —" محسن نے کہا۔

"ہاں جی — وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ بیٹھے بٹھائے مصیبت پڑ گئی —" وہ بولا۔

"کیسی مصیبت...؟" محسن بولا۔

"یہ تو پتا نہیں —" لڑکا بولا "بس وہ ایک دُوسرے کو الزام دے رہے تھے... ایک نے کہا کہ تم اندھے ہو کے گاڑی چلاتے ہو... دُوسرے نے کہا کہ تم خود ڈرائیور بن جاؤ — دونوں بہت غصّے میں تھے لیکن انھوں نے لڑکوں سے کہا کہ پریشان ہونے کی بات نہیں — دو چار گھنٹے کا سارا کام ہے... تم کو پیسے بھی ملیں گے... صبح ہونے تک تم سب واپس گھر پہنچ جاؤ گے۔"

"کام کے بارے میں انھوں نے کچھ نہیں بتایا — کہ کیا کام ہو گا...؟"

"نہیں سر جی... لڑکے بہت ڈرے ہوئے تھے" وہ بولا — "انھوں نے سب کو اٹھا کر زبردستی گاڑی میں ڈالا تھا۔"

"یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی —" محسن بولا "تم سب جوان اور صحت مند لوگ ہو — وہ کیا ٹارزن تھے کہ تم کو اُٹھا اٹھا کے پھینکتے رہے اور جب گاڑی میں چھ جوان ہو گئے تھے تو کیا اُس کو بھی قابو نہیں کر سکتے تھے... جو پیچھے بیٹھا ہوا تھا؟"

"یہ دیکھیں جناب —" لڑکے نے اپنی زخمی ٹانگ محسن کے قریب کی۔

"لاتے کھاتے... لت ہِیچھے کر —" کسی نے اس کو بدتمیزی کے اس مظاہرے پر ڈانٹا کہ وہ ایک پولیس افسر کی طرف ٹانگ پھیلا رہا ہے۔

"تمھارا مطلب ہے کہ ریوالور تھا اُس کے پاس... اس لیے تم سب کچھ نہ کر سکے؟" محسن نے کہا۔

"ہاں جی... اس نے کہا تھا کہ پستول میں چھ گولیاں ہیں — کسی نے مستی کی تو وہ سب کے سر میں سوراخ کر دے گا... یہاں" جوان نے پیشانی کے وسط میں انگلی رکھ کے بتایا۔

"اللہ توبہ —" کسی نے خوف سے جھرجھری لے کر کہا۔

"تم مجھے سمجھ دار لگتے ہو... پھر تم نے جان کا خطرہ مول کیوں لیا؟" محسن بولا "کیا تم کو ڈر نہیں تھا کہ وہ پیچھے سے تم کو گولی مار دے گا؟"

"ڈر تو تھا جناب... مگر میں نے دیکھا کہ دروازہ کھُلا ہوا ہے" وہ اپنے فرار ہونے کے کارنامے کی تفصیلات بتانے لگا۔ "وہ دروازے کے قریب تھا اور میں اس کے پیروں میں — اس نے ایک بُوٹ میری کمر پر رکھا ہوا تھا — ایک جگہ کھڑا ہوا تھا۔ جھٹکا لگا تو وہ کچھ آگے جھکا... میں نے اس کی گردن پر مکّا مار کے اسے نیچے گرا دیا اور خود اٹھ کے باہر کُود گیا — اُسے بھی اٹھنے میں دیر لگی اور مجھے بھی... اللہ کا شکر ہے، گرنے سے میری ٹانگ نہیں ٹوٹی تھی ورنہ میں وہیں پڑا رہتا — اس وقت تو میں نے کچھ نہیں دیکھا... گرا اور اٹھ کے بھاگا — گاڑی کی رفتار زیادہ نہیں تھی ورنہ ہڈیاں تو ضرور ٹوٹ جاتیں اور وہ آدمی وہیں آ کے میرے سر میں یہاں سوراخ کر دیتا" اُس نے دوبارہ پیشانی کے بیچ میں انگلی رکھی۔

"تم نے بہت حاضر دماغی سے کام لیا" محسن نے کہا "کیا تم پڑھنا لکھنا جانتے ہو؟"

"ہاں جی — ساتویں جماعت تک مُریدکے میں چاچے سے پڑھا تھا وہ ماسٹر ہے وہاں" وہ بولا۔

"گڈ... پھر تو تم نے گاڑی کا نمبر بھی نوٹ کیا ہو گا" محسن بولا۔

لڑکے نے نفی میں سر ہلایا "اس پر نمبر تھا ہی نہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ سر جی کہ جہاں نمبر لکھا ہوتا ہے' وہاں کچھ بھی نہیں تھا — آگے تو میں نے دیکھا نہیں... لیکن جب وہ مجھے اندر دھکیل رہا تھا... وہ مندری والا... تو میں نے...۔"

"مندری والا...!" میں نے اور محسن نے بیک وقت کہا۔ یہ ایک غیر شعوری ردِعمل تھا... بالکل ایسا ہی جیسے بجلی کا جھٹکا لگنے پر ہو سکتا ہے۔

"ان میں سے ایک جو کالا بھینسا تھا جناب... اس کے دونوں کانوں میں پیتل کی مُندریاں تھیں... چھوٹی چھوٹی اور گول..." لڑکے نے وثوق سے کہا۔

"اور اس کے بال چھوٹے، سخت اور گھونگریالے تھے؟" محسن نے کہا۔

"سخت کا تو مجھے پتا نہیں سر جی... میں نے ہاتھ لگا کے نہیں دیکھے تھے لیکن چھوٹے ضرور تھے... اور گھونگریالے بھی تھے" لڑکا سر ہلا کے بولا۔

"پیچھے کی طرف بنے ہوئے؟" میں نے کہا۔

"ماتھا تنگ... موٹے ہونٹ... چوڑی ناک" محسن بولا۔

"صرف ماتھا نظر آتا تھا اس کا جناب" لڑکے نے بوکھلا کے مجھے اور محسن کو دیکھا "ہونٹ اور ناک تو رُومال کے نیچے تھے۔"

"کیا آپ نے اس کو شناخت کر لیا ہے؟" نمبردار نے پُرامید لہجے میں کہا "یہ تو کمال ہو گیا۔"

"ابھی کوئی کمال نہیں ہوا..." محسن اٹھ کھڑا ہوا "یہ ہو سکتا ہے کہ میرا خیال غلط ہو... لیکن اس حُلیے کا ایک ہی شخص میرے ذہن

میں آتا ہے۔"

استاد بیڈرو۔ میں نے دل ہی دل میں کہا.... ذرا سی بات نے جو اب تک غیر اہم سمجھی گئی تھی.. میرے خیالات میں طوفان برپا کر دیا تھا.... اگر وہ پیڈرو ہی تھا تو اس کے ساتھ دوسرا کون تھا ــــ؟ وہ اس گاؤں تک کیسے آ پہنچے تھے۔ ان کو چھ جوان آدمی پکڑ کر لے جانے کی کیا ضرورت پڑ گئی تھی؟ وہ کس حیثیت کا حوالہ دے رہے تھے؟ ایک نے دوسرے کو زخمی ہو کے گاڑی چلانے کا الزام کیوں دیا تھا؟ کیا ان کی گاڑی الٹ گئی تھی؟ یا گاڑی کو حادثہ پیش آ گیا تھا ــــ؟ وہ کون سی گاڑی تھی؟ اس گاڑی میں کیا تھا؟ کون تھا....؟ یکے بعد دیگرے ہزاروں سوالات میرے ذہن میں کلبلانے لگے جیسے بند گٹر کا ڈھکنا کھولتے ہی سیکڑوں کیڑے فرش پر رینگنے کے لیے نکل آئیں۔

"سڑک یہاں سے کتنی دور ہے؟" محسن نے پوچھا۔ لہجے سے وہ خود کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر اندرونی طور پر وہ بھی بہت مضطرب تھا۔

"پکی سڑک ہو گی جناب کوئی تین چار میل....؟" نمبردار نے کہا۔

"اچھا.... میں فوراً وہاں پہنچنا چاہتا ہوں ــــ گاؤں میں کسی کے پاس کچھ ہے.... گاڑی یا موٹر سائیکل؟" محسن بولا۔

نمبردار نے نفی میں سر ہلایا ــــ "میری گاڑی ہے لیکن وہ میرے لڑکے کے پاس رہتی ہے اور وہ ہفتے میں تین دن آوارہ گردی کرتا ہے ــــ کل ہی شہر گیا ہے اور اب آئے گا کل پرسوں تک.... باقی گاؤں میں دو سائیکلیں ہیں اور دو تانگے...."

"زناب عالی....؟" حوالدار نے پہلی بار لب کھولے۔" آپ بغیر گاڑی کے کیسے پہنچے تھے یہاں....؟"

اس کا لہجہ بڑا معنی خیز تھا ــــ اس سے شک کا اظہار بھی ہوتا تھا اور اس میں تمسخر کی جھلک بھی تھی ــــ یہ ایک جملہ سب کے دلوں میں شکوک پیدا کر سکتا تھا.... ایس پی اور دوسرے اعلیٰ سرکاری افسر ہم سے پہلے بھی گاؤں میں آئے تھے ــــ وہ سب شاندار کاروں میں بڑے طمطراق اور جاہ و جلال سے آئے ہوں گے ــــ کاریں نہ سہی سرکاری جیپ میں ضرور پہنچے ہوں گے ــــ یہ کیسا ایس پی تھا، جو پیدل آیا تھا ــــ؟ وہ ایک مجرم کو گرفتار کر کے لایا تھا مگر اس کے پاس سواری نہیں تھی ــــ

"تم جانتے ہو حوالدار...." محسن نے سنجیدہ.... بُردبار مگر ناگوار لہجے میں کہا۔" کہ میں اس خطرناک مجرم کے تعاقب میں تھا ــــ اسے جنگل سے پکڑ کے لایا تھا ــــ دن رات مجھے اس کا تعاقب کرنا پڑا تھا.... مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ گاڑی میں نے کہاں چھوڑی تھی۔" جب محسن نے اس خطرناک مجرم کے فرار ہو جانے کا ذکر نہیں کیا تو میں نے اطمینان کا سانس لیا ــــ فی الحال میں بھی حوالدار سے اس موضوع پر بات کرنے کے حق میں نہیں تھا ــــ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اسے کیا معلوم ہے اور کتنا معلوم ہے ــــ ڈر یہ تھا کہ کہیں وہ سب کے سامنے نہ چلانے لگے کہ یہ دونوں فراڈ ہیں.... یہ جعلی ایس پی ہے.... وہ اصلی ایس پی تھا جو ان کی قید سے نکل کے بھاگ گیا۔ غالباً حوالدار خود یہ بات نہیں جانتا تھا ــــ یا پھر تذبذب کا شکار تھا کہ کس کو اصلی سمجھے اور کس کو نقلی ــــ ثبوت سراج کے پاس تھا لیکن ثبوت نہیں تھا کہ وہ اصلی ایس پی ہے ورنہ وہ گاؤں کے اس مجمع میں ہمیں بے نقاب کر دیتا ــــ حوالدار شاید اسی لیے چپ تھا کہ کہیں نقلی ہی اصلی ثابت ہو گیا تو خود اس کا کیا بنے گا ــــ ابھی تو سراج غائب ہو گیا تھا اور جب تک وہ دوبارہ وردی اور ثبوت کے ساتھ ہماری جعل سازی کا بھانڈا پھوڑنے کے لیے پھر نہ آتا' حوالدار کے لیے محسن کو ہی اصلی ایس پی سمجھتے رہنے میں عافیت تھی ــــ اسے اندازہ تھا کہ شک کے ذرا سے اظہار سے نقصان ہو سکتا ہے ــــ جو لوگ اصلی ایس پی کو پکڑ کے لا سکتے ہیں اور چوکی میں ننگا کر کے جوتے مار سکتے ہیں' وہ ایک حوالدار کو بڑی آسانی سے گولی مار سکتے ہیں۔

تاہم یہ سب میرے ذہن کے اندیشے تھے جو بے بنیاد بھی ہو سکتے تھے اور درست بھی.... میں اب جلد از جلد اس گاؤں سے نکل جانا چاہتا تھا' جہاں خطرہ بڑھنے لگا تھا ــــ یہاں سے بہت قریب پیڈرو اور اس کا کوئی ساتھی موجود تھے اور اسی علاقے میں سراج ہماری قید سے نکل کر فرار ہو گیا تھا ــــ اس کا کسی قریبی تھانے پہنچ کر اپنی شناخت کرانا اور پھر پولیس کی مسلح نفری کے ساتھ دھاوا بول دینا بعید از امکان نہ تھا ــــ میرا اور محسن کا فوراً اس جگہ پہنچنا ضروری تھا' جہاں پیڈرو اور اس کا کوئی ساتھی گاؤں کے پانچ جوانوں کو اپنی مدد کے لیے لے گئے تھے ــــ میرے ذہن میں دو امکانات واضح ہو رہے تھے.... یا تو وہ اپنے اسلحہ لے جانے کے مشن پر کسی حادثے سے دوچار ہو گئے تھے ــــ یا وہ ہمارے تینوں ساتھیوں رابعہ، استاد ٹیڈی اور کیتھرین کو منتقل کرتے ہوئے کسی مصیبت میں پڑ گئے تھے ــــ اس مصیبت کی نوعیت ابھی غیر یقینی تھی مگر اس خیال سے میرا دل دھڑکتا تھا کہ رابعہ مجھ سے تین چار میل دور ہو سکتی ہے' ممکن ہے' وہ زخمی ہو ــــ ممکن ہے' وہ زندہ ہی نہ ہو ــــ لیکن ممکن یہ بھی ہے کہ وہ میرے تصور سے اپنی تنہائی کو آباد کیے ہر سانس کے ساتھ مجھے پکارتی ہو ــــ

اگر پیڈرو کے ساتھ پیش آنے والے حادثے کا تعلق اسلحے کی کسی کھیپ سے تھا' تب بھی ہمارا وہاں پہنچ کے دشمن کے ذخیرے پر قبضہ کرنا یا اسے تباہ کر دینا ضروری تھا ــــ ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی ــــ سائیکل پر ہم کسی مقامی گائیڈ کی مدد سے پندرہ بیس منٹ میں سڑک تک پہنچ سکتے تھے۔ یک لخت مجھے حوالدار کا خیال آیا ــــ اسے یہاں سے اپنے ساتھ گائیڈ بنا کر لے جانے میں دو فائدے تھے' ایک تو یہ ڈر نہیں رہتا کہ ہمارے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی وہ عوام و خواص کے سامنے مدلل تجزیہ کر کے انھیں قائل کرے گا کہ ہم دھوکے باز تھے اور محسن ایک نقلی خود ساختہ ایس پی تھا ــــ دوسرا فائدہ یہ تھا کہ ہم راستے میں اس سے پوچھ سکتے تھے کہ وہ سراج کے فرار کی سازش میں کس حد تک شریک ہے۔

"پھر جناب نمبردار صاحب ــــ آپ وہی سائیکلیں منگوا لیں۔" محسن نے کہا۔

"بالکل ٹھیک فرماتے ہیں ایس پی صاحب ــــ" میں نے کہا۔ "ایک سائیکل پر میں اس بہادر جوان کو لے جاؤں گا.... جو ان کو پہچانتا ہے ــــ کیوں جوان' ہمت ہے نا؟"

"بالکل ہے سر جی ــــ" جوان کھڑا ہو گیا اور تھوڑا سا لنگڑا کر چلنے کے بعد مسکرانے لگا.... اس نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ پیدل بھی چل سکتا ہے۔

"دوسری سائیکل پر حوالدار میرے ساتھ جائے گا۔" محسن نے اچانک اعلان کر دیا ــــ میں دم بخود رہ گیا ــــ ایک بار پھر میری اور اس کی سوچ کے دھارے مل گئے تھے اور اس نے وہی فیصلہ کیا تھا جو میری خواہش سے مطابقت رکھتا تھا۔

"میں.... لیکن زناب.... میں کیسے ناؤں.... اور کیوں زاؤں آپ کے ساتھ۔" حوالدار نے واضح طور پر باغیانہ لہجہ اختیار کر لیا جس سے میرے شکوک کو زیادہ تقویت ملی کہ وہ اصلیت سے واقف ہو چکا ہے۔

"کیوں ــــ؟ تم نے پوچھا ہے کیوں؟" محسن نے یوں گرج کے کہا کہ حوالدار سمیت بہت سے لوگ اچھل پڑے۔" تم مجھ سے سوال کرتے ہو ــــ میرے حکم کو کافی نہیں سمجھتے۔" محسن نے یک لخت ریوالور نکال لیا۔" تم نافرمانی اور بغاوت کا مطلب سمجھتے ہو حوالدار ــــ پولیس میں نافرمانی کو ہی بغاوت سمجھا جاتا ہے اور اس کی سزا میں تم کو یہاں سب کے سامنے دے سکتا ہوں۔"

حوالدار کی گھگھی بندھ گئی۔ وہ زناب اور زناب عالی سے آگے کچھ نہ کہہ سکا لیکن اس کی نظریں بتاتی تھیں کہ وہ مجبور نہ ہوتا اور بزدل نہ ہوتا تو ابھی بتا دیتا کہ مجرم کون ہے ــــ نمبردار نے اور چند دوسرے لوگوں نے اس کو ڈانٹا اور محسن سے درخواست کی کہ اس نادان کی غلطی معاف کر دیں.... پھر سائیکلیں آ گئیں اور محسن نے حوالدار کو ریوالور ہی سے اشارہ کیا ــــ گاؤں کے لوگ ایک مہربان ایس پی کو ...... آشام موڈ میں دیکھ کر حیران و پریشان کھڑے تھے ...... شاید سوچ رہے تھے کہ کیا سچ مچ ایس پی ابھی ...... حوالدار کو گولی مار کے ٹھنڈا کر دے گا ــــ افسر تو افسر ہی ہوتا ہے.... اس کا ہاتھ کون پکڑے گا اور گولی کو کون روکے گا۔

پھر چشم فلک نے ایک دلچسپ کامیڈی سین دیکھا.. جو گاؤں کے لوگوں نے کبھی تصور میں بھی نہ دیکھا ہو گا کہ ایک حوالدار جسے گولی مار دینے کی دھمکی دے کر تعمیل حکم پر مجبور کیا گیا تھا' ایک ایس پی کو سائیکل کے آگے ڈنڈے پر بٹھا کے جنگل کی سمت روانہ ہو رہا ہے۔ دوسری سائیکل پر میں نے بہادر مگر زخمی گائیڈ کو بٹھایا اور یوں چار افراد پر مشتمل یہ مضحکہ خیز پولیس پارٹی ایسے خطرناک مجرموں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لیے روانہ ہوئی جو چھ جوان آدمی اٹھا کے لے گئے تھے ــــ ان کے پاس بہت بڑی جیپ تھی.... وہ سب ٹارزن کی اولاد تھے اور مسلح تھے چنانچہ گاؤں والوں کا ہماری کامیابی کے بارے میں شکوک میں مبتلا ہونا جائز تھا ــــ ہم کیسے اُن کا تعاقب کریں گے ــــ کیسے ان کا مقابلہ کریں گے اور کیسے اُن کو پکڑیں گے؟ یہ سوالات.... ہمارے وسائل کے پیشِ نظر ہماری پوزیشن کو افسوسناک حد تک ناقابلِ اعتبار بناتے تھے۔

لیکن ہم بنیادی طور پر ایم۔آر۔ایس کے ارکان تھے اور اب تک عملاً ثابت کر چکے تھے کہ 'مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی' اسے ایم۔آر۔ایس کا 'موٹو' یا نعرہ بھی سمجھا جا سکتا تھا.... وسائل کے بغیر صرف خدا پر اور خود پر بھروسا کرتے ہوئے آتشِ نمرود میں اس یقین کے ساتھ کود جانا کہ وہ گلزار بن جائے گی' ہمارا ایمان بالیقین تھا ــــ دوسری بات یہ تھی کہ ہم فوراً حوالدار کو اغوا کر کے اس جگہ سے نکال لے جانا چاہتے تھے جہاں ہماری پوزیشن خطرے میں تھی ــــ اور تیسری وجہ یہ تھی کہ ہم پیڈرو تک پہنچنے میں تاخیر کے بالکل متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔

گاؤں کے لوگ منہ کھولے ہمیں اندھیرے جنگل میں غائب ہوتا دیکھتے رہے ــــ میرے ساتھ زخمی مجاہد تھا جو ہمارا گائیڈ بھی تھا۔ چنانچہ ہم آگے تھے.... عام حالات میں سائیکل پر ڈبل سواری جرم تھا اور چالان خود پولیس کرتی تھی مگر اب پولیس خود ہی ڈبل سواری کر رہی تھی۔ ضرورت اس کا سب سے بڑا جواز بن گئی تھی ــــ راستہ بہت پُرپیچ تھا اور اندھیرے میں مجھے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے پگڈنڈی پر رہنے کے لیے سخت جدوجہد کرنا پڑ رہی تھی ــــ ناہموار راستے پر سائیکل چلانے کی مشقت الگ تھی۔ یہ ڈر الگ تھا کہ میں کسی جھاڑی میں نہ گھس جاؤں.... کسی بھیڑیے سے نہ ٹکرا جاؤں یا کسی سانپ پر سے نہ گزر جاؤں۔ کھڈے میں سائیکل سمیت سجدہ ریز ہونے کے یا سائیکل کی ہوا نکل جانے کے امکانات بھی خاصے روشن تھے ــــ اُدھر جنگل میں سے عجیب و غریب جانوروں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں ــــ جنگل زیادہ

گھنا نہیں تھا لیکن ہوا تیز تھی اور سائیں سائیں کرتی درختوں سے گزرتی تھی تو درخت جھومتے تھے اور پورا جنگل سنسنانے لگتا تھا۔ یہ ماحول جن، بھوت اور چڑیل قسم کی ارواح خبیثہ سے ملنے کے لیے بھی نہایت سازگار تھا اور میرے ذہن میں ایسے متعدد واقعات تھے کہ (دروغ برگردن راوی) اچانک کوئی سامنے آ گیا جس کے ہاتھوں میں اپنا ہی کٹا ہوا سر تھا جس سے خون ٹپک رہا تھا۔ مزید غضب یہ ہوا کہ گائیڈ نے رہنمائی کے ساتھ ساتھ میری جنرل نالج بڑھانے کے لیے گاؤں کی سینہ بہ سینہ سنائی جانے والی تاریخ کے اوراق میں سے بھوتوں کے تذکرے نکال لیے۔ پیپل کے کسی پیڑ کے نیچے کوئی راہ گیر کسی چڑیل کا شکار ہوا.... اس کی لاش بعد میں بغیر کلیجی کے پائی گئی۔ نیم کا بھوت کون ہے اور کیا کرتا ہے ۔ آم کے پیڑ میں کس بھوت کا ریسٹ ہاؤس ہے ۔ دریا کے کنارے سے جو ڈھانچہ اکثر برآمد ہو کر ڈانس کرتا ہے... وہ کس کا ہے ۔ یہ سب اسی بہادر جوان نے مجھے راستے میں بتایا۔ وہ گولی سے نہیں ڈرتا تھا تو بھوتوں سے کیوں ڈرتا۔ وہ یہی ثابت کرنا چاہتا تھا مگر میں اس کی بکواس کم سن رہا تھا.... پیچھے ہونے والی گفتگو پر میرے کان زیادہ لگے ہوئے تھے جو نقلی ایس پی اور اصلی حوالدار کے درمیان جاری تھی

حوالدار نے دو مرتبہ آواز بلند کی مگر نہ جانے محسن نے کس طرح دبائی.... ان کے درمیان اب بات چیت شرافت کے دائرے سے باہر ہونے لگی تھی اور مجھے بالکل شک نہیں رہا تھا کہ موضوع سخن کیا ہے ۔ محسن اس سے سراج کے فرار کی سازش کا اقرار کرانا چاہتا تھا.... حوالدار شاید محسن سے اس کے نقلی ایس پی ہونے کا اقرار کرانا چاہتا ہوگا مگر.... دنیا میں زبردست اپنی منوا لیتا ہے.... کمزور مجبور ہوتا ہے کہ اصل کو نقل اور نقل کو اصل مانے .... حوالدار کمزور فریق تھا کیونکہ وہ بزدل تھا ۔ کمزور تھا اور خالی ہاتھ تھا۔

بالآخر ایک دھماکا ہوا ۔ میں نے فوراً سائیکل سے پیر نیچے لٹکا کے بریک لگائے کیونکہ سائیکل کے اپنے بریک تھے ہی نہیں۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو مجھے حاکم و محکوم دونوں جنگل کی زمین پر سائیکل کے قریب پڑے ہوئے نظر آئے ۔ پھر حاکم یعنی ایس پی اٹھ کھڑا ہوا۔

"کیا ہوا؟ سائیکل پنکچر ہو گئی سر.... ؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں ۔ حوالدار پنکچر ہو گیا ہے شاید ۔" ایس پی نے کہا "میں آگے بیٹھا ہوا باتیں کر رہا تھا کہ اس نے اچانک حلق سے عجیب سی آواز نکالی اور بس گر گیا۔"

"وہ کریلا بابا کا بھوت.... ۔" گائیڈ بولا "وہ یہی کرتا ہے... جی ۔ اس جھنڈی کے اوپر رہتا ہے ۔" اس نے بیری کے درخت کو نظر اٹھا کے دیکھا۔

"کریلا بابا ۔ اس کا بھوت کیا کرتا ہے ؟" محسن بولا۔

"جو رات کو یہاں سے گزرتا ہے اس کے حلق میں کریلے کا ست ڈال دیتا ہے اور جناب وہ اتنا کڑوا ہوتا ہے کہ آدمی اوق کرتا ہے اور بس....۔" وہ بولا۔

میں سمجھ گیا تھا کہ حوالدار کس طرح فلیٹ ہوا ہوگا مگر میں نے کہا "آخر یہ کریلا بابا کا بھوت ایسا کیوں کرتا ہے؟ میرا مطلب ہے زبردستی لوگوں کو کریلے کا ست کیوں پلاتا ہے؟"

"جب کوئی آپ کو رات کے وقت سوتے سے جگائے بلکہ آپ کے اوپر سے سائیکل چلاتا ہوا گزر جائے تو کیا آپ اسے شربت پلائیں گے؟" زخمی مجاہد بولا۔

"اوہ... تمہارا یہ کریلا بابا یعنی اس کا بھوت بیری کے نیچے سو رہا تھا اور حوالدار گستاخ اس کے اوپر سے گزرا تو اسے سزا دی گئی ۔" میں نے سر ہلایا "چلو ہم بال بال بچے ۔ شاید بھوت کے بیڈ سے دور تھے...."

"تم لوگ چلو ۔" محسن بولا "میں آتا ہوں ۔ اسے لے کر آتا ہوں ۔" محسن نے کہا "سڑک اب کتنی دور ہے ؟"

"سڑک تو وہ رہی ۔ سامنے ۔" زخمی نوجوان نے کہا۔

"اچھا اچھا ۔" محسن نے سر ہلایا "بھئی لڑکے ۔ تم واقعی بہت بہادر ہو کر بھوت سے بھی نہیں ڈرتے... کیا تم واقعی پولیس میں بھرتی ہونا چاہتے ہو؟"

"یس سر جی ۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی ۔" وہ بولا۔

"اچھا تو پھر ایسا کرو کل پرسوں یا کسی بھی دن لاہور شہر چلے جاؤ اور ایس ۔ ایس پی ضامن رضوی صاحب سے مل لو ۔" محسن بولا "نام یاد رہے گا ؟"

"ایس ایس پی .... ضامن رضوی ۔" وہ حفظ کرنے کے انداز میں بولا۔

"ہاں ۔ نام بھول گئے تو سب گڑبڑ ہو جائے گی ۔" محسن بولا "ان سے مل کر کہنا کہ مجھے کبیر خان نے بھیجا ہے ۔ وہ تم کو بھرتی کر لیں گے ۔"

"میرا نام کبیر خان ہے ۔" میں نے کہا "بتا دینا کہ وہ ایس پی مراج کے ساتھ گاؤں میں آئے تھے تو بات ہوئی تھی ۔ اب تم جاؤ ۔"

"جاؤں ؟" وہ حیران ہو کے بولا "واپس جاؤں ؟..."

"سر یہ کیسے جا سکتا ہے ... زخمی ہے ۔" میں نے کہا۔

"اوہ ۔ پھر تو ایسا کرو اسے اپنی سائیکل دے دو ۔" محسن نے سوچ کر کہا "یہ زخمی ہے اس لیے ہمارے ساتھ اس کو آگے نہیں جانا چاہیے ۔ کیوں جوان سائیکل چلا لو گے ؟"

"میں تو پیدل بھی جا سکتا ہوں سر جی ۔" جوان بھول گیا۔

"نہیں نہیں ۔ سائیکل لے جاؤ ۔" محسن بولا "ہمارا کوئی بھروسا نہیں کہ مجرموں کے تعاقب میں کہاں تک جانا پڑے ۔ صبح تک ہم واپس نہ آئیں تو یہ دوسری سائیکل بھی یہیں مل جائے گی ۔"

نوجوان نے بڑی عقیدت سے ہاتھ ملا کے چوما ۔ ایک بار پھر پوچھا کہ اسے پولیس میں نوکری مل جائے گی اور ہمارے یقین دلانے پر خوشی میں تیز تیز پیڈل مارتا ہوا واپس ہو گیا۔

"اب یہاں سے فوراً کھسک لو دوست ۔" محسن بولا "اس خبیث حوالدار نے سراج سے بات کی تھی ۔ اس سے پوچھا تھا کہ میں تم کو فرار ہونے میں مدد دوں تو کتنے پیسے دو گے ۔ اس نے وہی جواب دیا جس کا ڈر تھا یعنی حوالدار کو بتا دیا کہ اصل ایس پی وہ خود ہے مگر اسے ان بدمعاشوں نے پکڑ رکھا ہے ۔ اس کا شناختی کارڈ اور وردی سب چھین لی ہے اس لیے وہ خود کو اصلی ایس پی ثابت نہیں کر سکتا اور بول بھی نہیں سکتا ورنہ یہ لوگ قتل کر دیں گے لیکن حوالدار نے اسے نکلنے کا موقع دیا تو وہ چند گھنٹوں میں واپس آئے گا اور ان دونوں کی ایسی تیسی کر دے گا ۔ اس نے حوالدار کو اپنی طرف سے دس ہزار نقد انعام دینے کا وعدہ کیا تھا اور سرکار کی طرف سے پکا تھانیدار بنانے کا یقین دلایا تھا لیکن یہ بھی کہا تھا کہ وہ خاموش رہے ورنہ مارا جائے گا ۔"

"حوالدار نے خود ہی سب قبول دیا ؟" میں نے کہا۔

"ہاں ۔ بے وقوف آدمی ہے ۔" محسن بولا "خود ہی مجھ سے پوچھنے لگا کہ کیا تم نقلی ایس پی ہو ۔ میں نے کہا کہ یہ شک تمہیں کیوں ہوا ؟ کہنے لگا کہ کیا تمہارا نام سراج ہے ؟ میں نے کہا کہ ہاں ۔ تو بولا کہ یہ عجیب بات ہے ۔ وہ بھی خود کو ایس پی سراج کہتا ہے جو حوالات میں بند ہے ۔ تم بھی خود کو ایس پی سراج کہتے ہو ۔ وہ تم کو بدمعاش کہتا ہے تم اسے بدمعاش کہتے ہو ۔ آخر میں کس پر اعتبار کروں ۔ میں نے پوچھا کہ کیا تم نے سراج سے بات کی تھی ۔ اور کی تھی تو کیوں کی تھی ؟ اس پر وہ ذرا آئیں بائیں شائیں بکنے لگا تھا ۔ میں نے پلٹ کر ریوالور اس کے سینے پر رکھ دیا اور اس سے کہا کہ سائیکل چلاتے رہو اور بولتے رہو ۔ جیسے ہی مجھے شک ہوا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو میں گولی چلا دوں گا ۔ سچ تمہاری جان بچا سکتا ہے ۔ میں تم کو سڑک پر پہنچ کے چھوڑ دوں گا اور تم دونوں واپس جا سکو گے ورنہ یہ سمجھ لو کہ اکیلا وہ لڑکا واپس جائے گا ۔ تمہارے بارے میں یہ اطلاع لے کر کہ تم بدمعاشوں سے مقابلہ کرتے ہوئے مارے گئے ۔"

"مگر بدمعاش ہیں کہاں ؟" میں نے کہا۔

"یہی حوالدار نے بھی پوچھا تھا ۔" محسن ہنسا "میں نے اس سے کہا کہ جب ہم تمہیں گولی مار سکتے ہیں تو کیا گولی مارنے کی معقول وجہ ایجاد نہیں کر سکتے ۔ تمہارا گاؤں میں کون رشتے دار ہے ۔ ہم اس لڑکے کو سو روپے دیں گے تو وہ گاؤں جا کے یہی بیان دے گا اور سب کہیں گے خس کم جہاں پاک ۔ تم نے آدھے گاؤں کو گنجا کر دیا ہے ۔ تمہاری موت سے وہ سب خوش ہوں گے جن کے سر پہ بال نہیں۔"

پھر حوالدار نے سب بتا دیا اور میں نے اسے گولی تو خیر نہیں ماری اس کی بات ختم ہوتے ہی سر پہ ریوالور مارا اور اسے ناک آؤٹ کر دیا وہی اوق کی آواز تھی جسے ہمارے گائیڈ نے کریلا بابا کے بھوت سے منسوب کر دیا تھا کہ اس نے حوالدار کو کریلے کا ست پلا دیا تھا ۔"

"یہ تو بڑی گڑبڑ ہو گئی ۔" میں نے کہا "مجھے پہلے ہی شک تھا کیونکہ حوالدار کی نظریں بدلی ہوئی تھیں ۔ ہو سکتا ہے گاؤں والوں کو بھی شک ہو کہ یہ کیسا ایس پی تھا ۔ ادھر سراج کی خبر نہیں وہ کب دوسرے گاؤں سے پولیس کی نفری لے کر پہنچ جائے .... گاؤں والے سب بتا دیں گے ... ہمارا گائیڈ اسے بھی ادھر لے آئے گا ۔"

"چل تو سائیکل اٹھا ۔" محسن بولا "میں حوالدار کو اٹھاتا ہوں ۔"

"یار.... اس مصیبت کو کہاں لے جائیں گے ؟" میں نے کہا "اور اس سے چھٹکارا کیسے پائیں گے ؟ غالب کا کیا بنے گا ؟ جو وہیں پھنسا ہوا ہے ۔"

"یہ بعد میں سوچیں گے ۔" محسن بولا "ابھی تو سڑک تک چل کے دیکھتے ہیں کہ ہیڈ کیا کر رہا ہے .... اس کے ساتھ کون ہے اور وہ گاؤں سے مین پاور کیوں لے گئے تھے ۔"

محسن نے حوالدار کو سائیکل کے ہینڈل پر ڈالا اور میں نے سائیکل سنبھالی ۔ یہ بہت مشکل کام تھا مگر ہم کسی نہ کسی طرح سڑک تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے ۔ یہ مین روڈ نہیں تھی بلکہ کوئی ذیلی سڑک تھی جو قصور کو آنے والی سڑک سے کسی قصبے کو ملاتی ہوگی ۔ سڑک پہ ہُو کا عالم تھا اور وہی سناٹا تھا جو جنگل میں تھا.... دائیں بائیں تا حد نظر کچھ نظر نہیں آتا تھا۔

"ہمارے گائیڈ کا اندازہ غلط ہو گیا ؟" میں نے مایوسی سے کہا "وہ ہمیں شارٹ کٹ سے لایا تھا اور اسے یقین تھا کہ وہ گاڑی ادھر ہی آئی تھی ۔"

"یار سکندر.... شارٹ کٹ کو گولی مار ۔" محسن بولا "یہ دیکھ کہ وہ اسٹیشن ویگن کس راستے سے گاؤں پہنچی تھی ۔ ظاہر ہے اس راستے سے گاڑی نہیں جا سکتی جس پہ ہم سائیکل چلا کے آئے ہیں ۔"

"ہاں... ادھر تو کریلا بابا کا بھوت بھی ہے ۔" میں نے کہا "... تو اس لاش کو سنبھال کے بیٹھ... میں اسے دیکھ کے آتا ہوں ۔"

"صرف دیکھ کے مت آ ۔" محسن بولا "اس سڑک کے پیچھے راستے سے گاؤں جا اور غالب کو لے آ ۔ تجھے کسی گائیڈ کی ضرورت نہیں پڑے گی اور تم دونوں آدھے گھنٹے میں یہاں پہنچ جاؤ گے

وہ ہمارا انتظار کر رہا ہوگا اور ایسا نہ ہو کسی بڑی مصیبت میں اکیلا گرفتار ہو جائے۔"

"تو اتنی دیر کیا کرے گا؟" میں نے سائیکل سے حوالدار کو نیچے گرا کر کہا۔

"میں اس کے ساتھ ایک طرف چھپا رہوں گا۔" محسن بولا۔ "اسی جگہ سڑک کے کنارے دائیں طرف یا بائیں طرف... جیپ تو آئے گا تو میں خود باہر نکل آؤں گا ــــ جگہ مت بھولنا۔"

میں نے سر ہلایا اور سائیکل لے کر سڑک پر ایک فرلانگ گیا۔ پھر واپس آ کے دوسری طرف ایک فرلانگ جانے کا ارادہ رکھتا تھا مگر گاؤں کی طرف جانے والی کچی سڑک مجھے سو گز چل کے نظر آ گئی۔ اس پر جیپ کے ٹائروں کے نشان تازہ تھے اور میں نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کے دیکھا تو مجھے یہ نشانات سڑک پر بھی دکھائی دیے۔ جیپ سڑک پر آ کے ادھر ہی مڑ گئی تھی، جدھر میں جا رہا تھا ــــ اس کا مطلب یہ تھا کہ محسن پیچھے بالکل محفوظ تھا اور وہیں جانا تھا تو آگے جانا تھا۔ اپنی سراغ رسانی سے مجھے تھوڑی سی خوشی ہوئی ــــ اب ہماری سمت کا تعین ضروری ہو گیا تھا اور دیکھنا صرف یہ رہ گیا تھا کہ اس راستے پر پیڈرو کتنا آگے ہے۔

اس کچی سڑک پر میں نے سائیکل کو جیٹ طیارے کی طرح دوڑایا ــــ میری طبیعت جولانی پر تھی ــــ بہت عرصے بعد مجھے سائیکل پر سواری کا موقع ملا تھا اور آدھی رات کو جنگل میں کوئی دیکھنے والا بھی نہیں تھا۔ میں نے سائیکل کو ہینڈل پر پیر رکھ کے چلایا۔ پھر ہاتھ چھوڑ کے نتیجہ یہ کہ میں ایک بار سائیکل سمیت بھد سے کچی سڑک پر گرا اور باقی راستہ شرافت سے طے کرنے پر مجبور ہوا ــــ زور سے سیٹی بجانے یا گلا پھاڑ کے گانے کی حسرت دل میں ہی رہ گئی۔ اس کے باوجود یہ پُرلطف ایڈونچر رہا اور جب اچانک پولیس چوکی آ گئی تو میں سمجھ گیا کہ اسٹیشن ویگن جب یہاں سے گزری تھی تو میں نے اس کی آواز سنی تھی لیکن میرے باہر آنے تک اس کی ہیڈ لائیٹس دور نظر آنے لگی تھیں۔

دونوں کانسٹیبل فراغت سے لمبی تان کر سو رہے تھے... لیکن اب انھیں ادائے فرض میں کوتاہی پر سزا دینے کا کوئی موقع نہیں تھا کیونکہ ان کا سونا میرے حق میں نیک فال تھا ــــ اندر غالب خستہ حال یوں پریشان ٹہل رہا تھا جیسے جنگل کا بھیڑیا پہلا دن چڑیا گھر کے پنجرے میں گزارتا ہے۔

"لے آ گئے تم سکندرِ اعظم کے خالو ــــ" وہ مجھے دیکھتے ہی پھٹ پڑا۔

"شور و غوغا غل غپاڑہ مت کر ــــ" میں نے کہا۔ "باہر مرسیڈیز کھڑی ہے جو بطورِ خاص تیرے لیے بھیجی گئی ہے۔"

"بس پانچ منٹ اور تو نہ آتا تو میں بھاگ جاتا۔" غالب باہر آ کے بولا اور مرسیڈیز پر سوار ہو گیا یعنی سائیکل کے ڈنڈے پر بیٹھ گیا۔

"بھاگ کے آپ کہاں جاتے...؟ میرا مطلب ہے چار سمتوں میں سے کدھر کا انتخاب کرتے؟" میں نے کہا۔ "از راہِ عنایت آپ ڈرائیور کی سیٹ پر آ جائیے۔"

"یار، مجھے ڈبل سواری چلانا نہیں آتی ــــ" غالب نے احتجاج کیا۔

"مجھے بھی نہیں آتی تھی... لیکن میں نے ابھی کچھ دیر پہلے یہ کارنامہ سرانجام دیا ہے۔" میں نے کہا۔ "آپ بھی کوشش کریں... آپ انشاء اللہ کامیاب ہوں گے۔"

"اچھی زبردستی ہے...۔" غالب نے بادلِ ناخواستہ مجھے آگے جگہ دی اور پھر سائیکل پر چڑھ گیا...۔ "چالان ہو گیا میرا پھر؟"

"چالان کون کرے گا ــــ پولیس سو رہی ہے۔" میں نے کہا۔

"انھیں میں نے سونے کی اجازت دی تھی۔" غالب نے دانت نکال کے کہا۔ "ورنہ وہ میرے اعصاب پر سوار رہتے... اور مجھے فرار نہ ہونے دیتے ــــ میرا ارادہ تھا کہ سراج کا سراغ لگانے نکل جاؤں۔"

"ویری گڈ ــــ آپ کچھ بتا سکتے ہیں مسٹر شرلاک ہومز آف پاکستان کہ سراغ کدھر ملتا؟" میں نے کہا۔

"شرلاک ہومز کا طریقہ کار یاد کرو... وہ کہتا تھا کہ آپ خود کو مجرم تصور کریں۔" غالب نے کہا۔ "ایک بار اس نے خود کو گھوڑا فرض کر لیا تھا اور پھر وہاں جا پہنچا تھا جہاں گھوڑا گھاس کھا رہا تھا۔ میں بھی فرض کرتا کہ میں ہی سراج ہوں ــــ اگر مجھے فرار ہونا مقصود ہو تو مجھے کدھر جانا چاہیے۔"

"اور آپ کدھر تشریف لے جاتے؟"

"ہم اب بھی اُدھر ہی تشریف لے جا رہے ہیں۔" غالب نے کہا۔ "سراج کو جنگل میں بھٹکنے کا کوئی فائدہ نہ تھا ــــ اُلٹا اسے ڈر ہوتا کہ ہم اسے پکڑ لیں گے ــــ وہ اُدھر گیا ہوگا جدھر کسی کے ملنے کا امکان ہو ــــ جس سے وہ مدد لے سکے۔ اگر وہ گاؤں کی طرف جاتا تو اس کو پھر تم لوگ مل جاتے چنانچہ وہ آیا ہوگا سڑک کی طرف... کہ شاید کوئی آتا جاتا مل جائے جو اسے یہاں سے دور لے جائے۔"

"اسے کیا معلوم تھا کہ سڑک کدھر ہے؟"

"وہ اتنا احمق بھی نہیں ہے۔" غالب بولا۔ "اس نے بھی جیپ کی آواز سنی ہوگی اور اندازہ کر لیا ہوگا کہ جیپ کس طرف سے آئی تھی۔"

میرے جسم میں خوف کی ایک سنسنی دوڑ گئی۔ "یار غالب! تو واقعی عقل مند ہو گیا ہے ہماری صحبت میں ــــ میں تیرا مذاق اڑا رہا تھا ــــ سراج ادھر ہی آیا ہوگا اور یار... بس قسمت اچھی تھی کہ میں تجھے لینے پہنچ گیا ورنہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ راستے میں چھپا کھڑا ہوتا اور میرے سر پر پتھر یا کسی شاخ کا بنایا ہوا ڈنڈا کھینچ مارتا... میں بڑی بے فکری سے سرکس کا تماشا دکھاتا آ رہا تھا ــــ مجھے اس کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔"

"یہ تو اب بھی ہو سکتا ہے۔ وہ جو تیرے ساتھ نہیں ہوا۔" غالب نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"نہیں مرزا ــــ اب وہ نکل گیا ــــ" میں نے کہا۔ "اور غالباً پیڈرو سے جا ملا۔"

سائیکل کا ہینڈل ڈگمگایا اور دوسرے ہی لمحے ہم دونوں سڑک پر گرے ــــ میرے لبوں سے پیڈرو کا نام سن کر مرزا غالب اتنے حیران ہوئے تھے کہ اچھل پڑے تھے... اور انھوں نے ہینڈل تک چھوڑ دیا تھا ــــ جب ہم پھر روانہ ہوئے تو میں نے ڈرائیونگ کی اور مرزا غالب کو مختصراً پیڈرو کے بارے میں بتایا کہ نا معلوم وہ گاؤں سے چھ افراد کو لے گیا تھا... اور اب دیکھنا یہ ہے کہ کیوں لے گیا تھا ــــ؟ اور کہاں لے گیا تھا ــــ؟

"عجیب چکر ہے یہ تو ــــ" مرزا غالب نے کہا۔ "وہ خبیث اس گاؤں میں کیسے آ پہنچا؟"

"گیدڑ کی شامت آتی ہے تو وہ شہر کا رُخ کرتا ہے۔" میں نے کہا۔

"اِس محاورے کے استعمال کی یہاں کیا تُک تھی؟" غالب نے کہا۔

"تمھارے سوال کی بھی کوئی تُک نہیں تھی۔" میں نے کہا۔ "یہ سب تقدیر کے کھیل ہیں بھائی... معلوم نہیں تقدیر کو آگے کیا منظور ہے ... کیسے وقت پر سراج ہاتھ سے نکل گیا... اور اب ہمیں دیکھو کہ ہم ادھر ہی جا رہے ہیں ــــ جدھر سراج کے ساتھ پیڈرو بھی ہے گا... اور ان کا تیسرا ساتھی بھی، جس کا نام میں ابھی نہیں جانتا مگر وہ دلاور بھی ہو سکتا ہے اور نواب خسرو جمشید بھی ــــ میں نے دیکھ لیا ہے کہ وہ گاؤں سے پانچ جوانوں کو لے کر کدھر گئے تھے... ممکن ہے آگے وہ ہمارے استقبال کے لیے موجود ہوں۔"

"اب تو دو گھنٹے ہونے کو ہیں..."

"ہاں... لیکن مجھے امید ہے کہ وہ ملیں گے ــــ اُن کا کام لمبا اور محنت طلب تھا ورنہ وہ گاؤں تک آنے اور مزدور لے جانے کی ضرورت محسوس نہ کرتے۔ وہ خود ہی کر لیتے۔" میں نے کہا۔ "میرے ذہن میں یہ آتا ہے کہ ان کی کوئی اسلحے کی کھیپ سڑک پر بکھر گئی ہے ٹرک کا ٹائی راڈ کھل گیا یا ایکسل ٹوٹ گیا اور ٹرک الٹ گیا... یا مال بردار ٹرک بے قابو ہو کے سڑک سے نیچے اتر گیا... نشیب میں چلا گیا یا کسی ایکسیڈنٹ میں ان کا مال سڑک پر گر گیا ــــ وہ دو آدمی... ٹرک ڈرائیور سمیت تین۔

ان کے لیے اسلحے کے تابوت نما بکس اٹھا اٹھا کے ٹرک پر لادنا بہت مشکل تھا... اگر وہ خود یہ کام کرتے تو صبح ہو جاتی۔ وہ راتوں رات کام ختم کر کے راستہ صاف کر دینا چاہتے ہوں گے... اور اسی لیے وہ ستمری گاؤں سے لیبر فورس لے گئے۔"

"تیری بات دل کو لگتی ہے عزیزم!" مرزا غالب نے کہا۔ "ہو گی کوئی ایسی ہی بات... جو اچھی بھی ہے اور بُری بھی ــــ اچھی لیں کہ ہمیں اُن کا سراغ ملا، جن کو ہم تلاش کر رہے تھے ــــ اور بُری لیں کہ جب ہم ان سے ملیں گے تو وہ مل کر ہمارا سراغ مٹا دیں گے... پیڈرو اور سراج جیسے دشمن اور ان کے دو ساتھی مل کر چار افراد ہوئے... ایک ٹرک اسلحے کا بھی ہے ان کے پاس اور ہم اس منظر پر تخ تخ کرتے نمودار ہوں گے تو وہ اتنے خوش ہوں گے کہ ایک آدمی پیڈرو دستی بم پھینک کر سلامی دیں گے ــــ اب کیا خیال ہے، وہ گیدڑ اور شہر والا محاورہ ہم پر صادق نہیں آتا؟"

"آتا ہے ــــ مگر ہم مجبور ہیں۔" میں نے کہا۔ "جو راہ اُدھر کو جاتی ہے مقتل سے گزر کے جاتی ہے... یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ہم مخالف سمت میں بھاگ جائیں ــــ اس ٹٹو... سوری... مرسیڈیز کے علاوہ ہمارے پاس تین ریوالور ہیں ــــ ہم اتنے بے وقوف بہرحال نہیں ہیں کہ سڑک پر سیدھے چلتے جائیں گے۔ ہم چھپ چھپا کے سفر کریں گے مجھے امید ہے کہ ایک میل سے پہلے وہ ضرور ملیں گے۔"

"یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ جا چکے ہوں۔" غالب نے کہا۔

"تب بھی ان کا سراغ تو ملے گا۔"

"سراغ کا ہم کیا کریں گے؟ چاٹیں گے؟" غالب بولا۔ "گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر۔"

"ہم لکیر کے فقیر ہیں... سانپ کی لکیر پر چل پڑیں گے۔" میں نے کہا۔ "تیری باتیں تو حوصلہ شکن ہیں مگر اس سے زیادہ حوصلہ افزا رابعہ کا خیال ہے۔"

"میں سوچ رہا تھا کہ تو نے اتنی دیر سے اس کی بات نہیں کی ــــ تجھے تو صرف اسی کا خیال ہوگا۔" غالب نے کہا۔ "جیسے قیس پھرتا تھا صحرا میں لیلیٰ کے اونٹ کے پیچھے... تو روانہ ہو جا اپنی لیلیٰ کے پیچھے جو بارود کے ڈھیر پر یا اسلحے کے ساتھ کسی تابوت میں ٹرک پر رواں ہے ــــ ہم مارے جائیں گے تیرے اس عشق میں ــــ بھلا مجھے کیا پڑی ہے کہ میں سائیکل لے کر ٹرک کے پیچھے دوڑوں... آرام سے گاڑی پکڑ کے کراچی نہ چلا جاؤں"

جہاں وہ بندرگاہ پر لنگر انداز ہے ـــ ایچ ایم ایس نازو ــ" نہ جانے اس کی یہ بکواس کتنی دیر جاری رہتی مگر اتنی دیر میں ہم سڑک پر اس جگہ پہنچ گئے تھے جہاں میں نے محسن کو چھوڑا تھا ـــ وہ ایک دم ہمارے سامنے آ گیا۔

"آ گئے تم لوگ .... میں سخت پریشان تھا" محسن نے گھبراہٹ میں کہا۔ "بہت گڑ بڑ ہو گئی ہے۔"

"کیسی گڑ بڑ ـــ ؟" میں نے محسن کی بدحواسی دیکھ کر کہا اور سائیکل کو ایک طرف پھینک دیا۔ "آرام اور حوصلے سے بات کرو۔"

"ادھر آ جاؤ یار ـــ" محسن نے سڑک کے دوسری جانب اشارہ کیا۔

"کیا وہ حوالدار بھی بھاگ گیا ؟" میں نے قیاس آرائی کی۔

"وہ .... وہ تو مر گیا یار ـــ" محسن نے کہا۔ "سڑک کے اس طرف وہیں پڑا ہوا ہے ـــ جہاں پہلے تھا۔" وہ اب سڑک سے نیچے اتر گیا تھا۔

"کیسے مر گیا ؟ تو نے مار دیا ـــ ؟" میں اس کے پیچھے چلا گیا۔

محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں اسے باندھ کے اُدھر گیا تھا۔" اس کے ہاتھ کا اشارہ اسی سمت کو ظاہر کرتا تھا جدھر سے ہم آئے تھے۔

"باندھا کیسے تھا ؟" میں نے کہا۔

"اسی کے کپڑے پھاڑ کر ـــ" محسن بولا۔ "میں نے سوچا کہ آدھے گھنٹے سے پہلے تم آؤ گے نہیں .... کیوں نہ میں اتنی دیر میں آگے تک جا کے دیکھ لوں .... اور میں اُدھر ہی چل پڑا جدھر تو گیا تھا۔ کچی سڑک مجھے سَو سوا سَو گز چل کے نظر آ گئی تھی ـــ میں نے غور سے دیکھا تو جیپ کے ٹائروں کے نشانات بھی مل گئے ۔ وہ اسٹیشن ویگن اسی سمت میں گئی تھی .... میں چلتا رہا۔ پھر اچانک میرے کانوں نے ایک آواز سُنی ـــ میں فوراً چھُپ گیا۔ آواز دوبارہ سُنائی دی تو میں آگے بڑھا ـــ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی کراہ رہا ہو .... اور معلوم ہے میں نے کیا دیکھا .... کون تھا وہ ؟"

"یار مجھے کیسے معلوم ہو سکتا ہے ؟" میں نے چڑ کر کہا۔ "خواہ مخواہ سسپنس مت پیدا کرو۔"

"یار .... وہ کیتھرین تھی ـــ" محسن ایک دم رُک گیا۔ "وہ سڑک پر پڑی ہوئی تھی۔"

میں بھی ایک دم رُک گیا .... غالب بھی ایک دم رُک گیا۔ ہمارا سانس بھی رُک گیا۔ میرے حلق سے کوئی آواز نہیں نکلی۔ غالب کی آواز بھی بند ہو گئی۔

"وہ .... وہ زندہ ہے" محسن نے ہمارے سکتے کی حالت دیکھ کر کہا۔

"مگر وہ کہاں ہے ؟" میں نے اِدھر اُدھر دیکھ کے سرگوشی کی۔

"اُدھر .... جھاڑیوں کے پیچھے ـــ" محسن بولا۔ "میں بہت ڈر گیا تھا ... اسے اٹھا کے واپس دَوڑا اور یہاں لے آیا ... وہ ابھی تک بے ہوش ہے۔"

"چل ... چل آگے چل ـــ" میں نے کہا۔

"اس حوالدار کو سانپ نے ڈس لیا ہے" محسن چلتے چلتے بولا۔

میں پھر رُکا تو غالب مجھ سے ٹکرا گیا۔ "سانپ ؟"

"ہاں یار ـــ میں کیتھرین کو پہلے اُدھر ہی لے گیا تھا۔ پھر وہاں جا کے دیکھا تو وہ اُلٹ پلٹ ہو رہا تھا" محسن بولا ... "مجھے کچھ سرسراہٹ سی محسوس ہوئی ـــ دیکھا تو اتنا لمبا کالا سانپ گھاس میں غائب ہو رہا تھا۔ چند منٹ میں وہ مر گیا ... معلوم نہیں وہ کون سا زہریلا سانپ تھا ـــ پھر میں اُدھر نہیں رُکا ... اس ڈر سے کہ گاؤں کی طرف سے کوئی نہ آ جائے ـــ وہ صبح اس کی لاش تو لے جائیں گے۔"

"خوب سزا دی اسے قدرت نے" میں نے کہا اور نیچے جھک کر کیتھرین کو دیکھنے لگا ۔ وہ بے ہوش تھی اور اس کے سانس کے چلنے کی رفتار میں بھی بے قاعدگی تھی۔ اس کی نبض بھی سُست تھی۔ اس کی بے ہوشی کی نوعیت کا اندازہ کرنا مشکل تھا لیکن اتنا نظر آتا تھا کہ وہ زخمی نہیں ہے۔

"اب تو شک کی کوئی بات نہیں رہی" میں نے کہا۔ "وہی اِدھر سے گزرے تھے اور شاید اب بھی کہیں قریب ہی ہوں گے۔"

محسن نے اقرار میں سر ہلایا۔ "اس کے جسم پر تشدد کے نشانات ہیں۔ میں نے غور سے دیکھی تھی ـــ پرانے نیل گہرے زخم بن گئے تھے لیکن اب وہ مندمل ہو چکے ہیں۔"

"کیتھرین کے مرنے کا اندیشہ تو نہیں ہے ؟" غالب نے کہا۔

"اگر اسی جگہ اس طرح پڑی رہی تو یقیناً مر جائے گی" محسن بولا۔ "اسے فوراً طبی امداد ملنا چاہیے۔"

"یہاں تو کچھ بھی نہیں ملے گا ... اور جو قریبی ... وہاں اب ہم لوٹ کر نہیں جا سکتے" میں نے کہا۔

"صبح تک انتظار کرنے کے سوا ہم کچھ نہیں کر سکتے ... ہو سکتا ہے کہ صبح کوئی ٹرانسپورٹ مل جائے" محسن نے ... "اسے لاہور پہنچا سکیں۔"

"میں اسے سائیکل پر ڈال کے نہ لے جاؤں ؟" غالب نے کہا۔

"کیا فائدہ ـــ یہاں آرام سے لیٹی ہوئی ہے ... ایسا نہ ہو کہ راستے ہی میں مر جائے" میں نے کہا۔ "بظاہر مجھے کوئی تشویش کی بات نظر نہیں آتی۔"

"مجھے تشویش اس بات پر ہے کہ اسے یہاں کیوں پھینک دیا گیا تھا" محسن بولا۔ "وہ خبیث اسے ساتھ لائے تھے تو ساتھ رکھ سکتے تھے۔"

"میدانِ جنگ کی تاریخ میں ایسے حوالے ملتے ہیں کہ کہیں بہت زیادہ قیدی ہاتھ آ گئے اور ان کو اسیر رکھنا مسئلہ بن گیا کیونکہ جتنا راشن فوج کے لیے ضروری تھا وہ قیدی کھا جاتے تھے چنانچہ ایک حکم کے ذریعے بوڑھوں، کمزوروں یا بیماروں کو قتل کرا دیا گیا ـــ پھر چودہ اور سولہ سال کے لڑکوں کو .... صرف جوان اور تندرست باقی رہے جو غلامی کی مشقت جھیل سکتے تھے اور جن کو راشن پانی دے کر کام لیا جا سکتا تھا" میں نے کہا۔

"تیرا مطلب ہے اس کمزور اور بیمار بڑھیا کو وہ بے مصرف سمجھ کر پھینک گئے ہوں گے ؟" محسن نے کہا۔

"ہاں ـــ بے کار بوجھ اٹھائے پھرنے سے کیا حاصل ... ؟"

"مگر کیتھرین کے ذریعے وہ اپنا دباؤ برقرار رکھ سکتے تھے" غالب نے مجھ سے اختلاف کیا۔ "ان کے ہاتھ میں تین پتے تھے رابعہ، ٹیڈی اور کیتھرین ـــ اور وہ جانتے ہیں کہ ہمارے لیے سب کی زندگی اور آزادی یکساں اہمیت رکھتی ہے .... وہ ایک پتا ضائع کرنے والے لوگ نہیں ہیں۔"

محسن نے بھی اس کی تائید میں سر ہلایا۔ "غالباً کیتھرین موقع پا کے خود کسی گاڑی یا ٹرک میں سے کود گئی .... یہ بے ہوشی اسی کا نتیجہ ہے۔"

"کیا انھیں یہ معلوم نہیں ہوا کہ ایک قیدی فرار ہو گیا ہے ؟" میں نے کہا۔

"ممکن ہے معلوم ہوا ہو ... اور انھوں نے گاؤں سے پانچ آدمی اسی لیے حاصل کیے ہوں کہ مفرور قیدی کو تلاش کریں ..." غالب نے کہا۔

"پھر کیتھرین انھیں ملی کیوں نہیں ؟" میں نے کہا۔ "جب کہ وہ محسن کے بیان کے مطابق سڑک پر پڑی ہوئی تھی۔"

"صحیح بات تو خود کیتھرین ہوش میں آنے کے بعد ہی بتا سکے گی" غالب نے کہا۔ "لیکن میرے نزدیک محسن کی بات میں وزن ہے۔ کیتھرین نے اگر کسی تیز رفتار ٹرک میں سے چھلانگ ماری ہو گی تو وہ سڑک پر گرتے ہی جنگل میں غائب ہو گئی ہو گی۔ اس ڈر سے کہ شکاری اسے تلاش کرتے ہوئے ضرور آئیں گے ـــ کیتھرین آسانی سے ان کے ہاتھ نہیں آنا چاہتی تھی .... یہ بھی کیتھرین ہوش میں آ کے بتلائے گی کہ اس کے ساتھ رابعہ اور ٹیڈی بھی تھے یا نہیں اگر تھے تو انھیں لے جانے والے کون تھے اور کہاں لے جا رہے تھے۔ ہم فرض کر لیتے ہیں کہ کسی طرح کیتھرین اپنے بندھن توڑنے میں کامیاب ہو گئی اور موقع پاتے ہی ٹرک یا گاڑی سے باہر کود گئی کچھ دیر جنگل میں رُوپوش رہی لیکن جب اس کی حالت زیادہ خراب ہوئی تو وہ پھر سڑک پر آ گئی ۔ وہ جنگل میں پڑی رہتی تو اسے کون دیکھتا ـــ مرنے کے بعد اس کی لاش کو بھی چیل کوّے اور جنگلی جانور کھا جاتے .... سڑک پر ایک امکان تو تھا کہ اسے کوئی اٹھا لے گا۔ اٹھانے والے خود شکاری ہوں گے تو اس کی بدقسمتی ـــ کسی اجنبی نے اٹھا لیا تو کہیں نہ کہیں ضرور لے جائے گا ـــ جہاں وہ محفوظ ہو گی۔"

مجھے غالب کی دلیل نے قائل کر لیا۔ "شاید اسی لیے وہ گاؤں کے پانچ چھ جوانوں کو لے گئے ہوں گے ـــ وہ خود جنگل میں کہاں کہاں جاتے .... اور جاتے تو یہ ڈر بھی ہوتا کہ راستہ بھول جائیں گے ... چنانچہ انھوں نے مقامی افراد کی خدمات حاصل کرنا بہتر سمجھا جو اس جنگل کے راستوں سے واقف ہوں ـــ کم سے کم چار وہ خود تھے .... چھ کے بجائے ان کو پانچ آدمی ملے مگر اس طرح وہ نو افراد ہو گئے۔ جن کے لیے جنگل کو چھاننا نسبتاً آسان تھا۔"

"یار ان قیاس آرائیوں میں وقت ضائع کرنے سے کیا حاصل" محسن نے کہا۔ "یا تو کیتھرین کے لیے کچھ کرو یا آگے چل کے انھیں دیکھو۔"

"تم کیتھرین کو کندھے پر ڈال کر لے جا سکتے ہو ؟" غالب بولا۔

"کہاں ؟ لاہور ؟"

"نہیں ـــ اُدھر چلے جاؤ ـــ آبادی سڑک کے ایک طرف تھی تو دُوسری طرف بھی ہو گی ـــ .... صبح ہونے میں زیادہ دیر نہیں۔ یہاں کھیت بھی ہیں .... کسان نظر آ جائیں گے" غالب نے کہا۔

"میں اسی جگہ صبح کا انتظار کرنا بہتر سمجھتا ہوں" محسن نے کہا۔

"اچھا تو تم ذرا چھُپ کر رہو ـــ میں اور سکندر آگے جاتے ہیں" غالب نے کہا۔

"یار .... ایسے اکیلے اکیلے مت جاؤ .... کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم بھی بچھڑ جائیں جیسے دوست بچھڑے ..." محسن بولا۔ "پہلے ماں باپ بچھڑے .... پھر دوست مہربان بچھڑے، جیسے انکل رضوی اور اکرم شیخ .... اس کے بعد نازو اور شہلا نے ساتھ چھوڑا ... رابعہ اور ٹیڈی بچھڑے۔"

"کیا ہو رہا ہے تجھے ـــ قنوطیت کا مرض یا نروس بریک ڈاؤن ؟" میں نے کہا۔ "ملنا بچھڑنا تو زندگی کے کھیل ہیں... خدا نے چاہا تو سب بچھڑے ہوئے ملیں گے ـــ انتظار کے لیے

صبر کی سفر طے ہے ـــ وقت پہلے ایک سا نہیں رہا تو آگے کیوں ہوگا ـــ دن رات ہمیشہ ایسے نہیں ہوں گے... جہاں تک ماں باپ کا تعلق ہے تو انھیں خدا نے بُلا لیا ـــ اس کی مرضی۔ شہلا تو خیر سے اپنے ہی گھر میں ہے ـ نازو بھی بھائی کے ساتھ ہمارے انتظار میں ہے ـــ کیتھرین واپس آگئی ہے۔ رابعہ اور ٹیڈی کو بھی ہم لے آئیں گے ـــ ایسی مایوسی کی باتیں مت کرو جو ہمارے حوصلے بھی کم کریں۔"

"خفا مت ہو یار ـــ بس میں ڈرنے لگا ہوں وقت سے۔"

محسن بولا "ہم چاروں کوشش تو کر سکتے ہیں ساتھ رہنے کی۔"

میں اسے کوئی جواب ضرور دیتا لیکن روشنی کا ایک کوندا سا لپکا اور... ہم سب اچھل پڑے۔

"یہ کیا تھا....؟" میں نے اٹھتے ہوئے آسمان کو دیکھا۔

"....میں تو سمجھا تھا... بجلی چمکی ہوگی ـــ مگر بادل دور دور تک نہیں۔" محسن بولا۔

غالب نے مشرق کی جانب اشارہ کیا ـــ درختوں کے اوپر روشنی کبھی کم اور کبھی زیادہ ہو رہی تھی ـــ ہم سب ایک ساتھ سڑک کی جانب لپکے ـــ اتفاق رائے سے ہم سب کے ذہن نے ایک ہی بات سمجھ لی تھی ـــ روشنی کسی گاڑی کی تھی۔ پہلی بار وہ کوندا سا اس لیے نظر آیا تھا کہ گاڑی نے کوئی موڑ کاٹا تھا اور اس وقت سڑک بلندی پر تھی ـــ اب وہ گاڑی ہماری طرف آ رہی تھی اور اس کی ہیڈ لائٹس نے درختوں کے اوپر اُجالا کر دیا تھا ـــ جھٹکوں سے گاڑی اوپر نیچے ہوتی تھی تو روشنی کم زیادہ ہوتی نظر آتی تھی۔

"ایسے بے وقوفوں کی طرح سڑک پہ دوڑنا مت شروع کر دینا۔" غالب نے کہا۔

"تم ادھر سڑک سے دس گز دور رہو ـــ" محسن بولا "میں دُوسری طرف اتنے ہی فاصلے پر رہتا ہوں ـــ آگے بڑھتے جاؤ۔ گاڑی ہمیں اس جگہ سے جتنا آگے ملے اچھا ہے ـــ"

"سکندر تم ہم دونوں کے پیچھے آؤ ـــ دونوں کو نظر میں رکھتے ہوئے کور فراہم کرو ـــ" غالب نے کہا "کیا معلوم یہ کس کی گاڑی ہے۔"

"اگر... اگر یہ وہی ہوئے ـــ شکاری ـــ" میں نے ڈرتے ہوئے کہا ـــ "تو ہم کیا کریں گے؟"

"ماریں گے یا مر جائیں گے۔" غالب نے جھنجلا کے کہا...

"تیسری صورت صرف یہ ہے کہ دم سادھ کے لیٹ جائیں اور گاڑی کو گزر جانے دیں۔"

محسن سڑک پار کر گیا تھا اور میں اس کے سائے کو درختوں اور جھاڑیوں کی اوٹ میں آگے بڑھتا دیکھتا رہا ـــ غالب کے اور میرے درمیان بھی اب دس گز سے زیادہ فاصلہ ہو گیا تھا ـــ ہم دونوں پوری احتیاط کے ساتھ قدم بڑھا رہے تھے لیکن راستہ بہت دشوار تھا ـــ گاڑی اب بہت قریب آ چکی تھی ـــ اس کی ہیڈ لائٹس صاف نظر نہیں آتی تھیں لیکن انجن کی آواز سُنائی دینے لگی تھی۔ یہ آواز رفتہ رفتہ قریب آتی محسوس ہوتی تھی۔ غالباً آگے کوئی موڑ تھا ... اچانک غالب کسی چیز سے ٹھوکر کھا کے گرا ـــ اسی وقت میں نے گاڑی کی روشنی دیکھی۔

صرف ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا اور پھر اِدھر اُدھر دیکھ کر ایک خاصا بڑا پتھر اٹھا لیا ـــ امکانات ہر صورت میں برابر تھے۔ یہ گاڑی وہی ہو سکتی تھی جس میں پیڈرو اپنے ساتھ کیتھرین کو لے کر کہیں جا رہا تھا اور اسے پھینکنے پر مجبور ہو گیا تھا یا وہ خود جان کی پروا نہ کرتے ہوئے گاڑی میں سے چھلانگ لگانے پر مجبور ہو گئی تھی ـــ اگر ٹیڈی اور رابعہ بھی اسی گاڑی میں تھے تو غالباً یہ گاڑی انھیں کسی محفوظ قید خانے میں چھوڑ کے واپس آ رہی تھی.... ایسی صورت میں میرا سڑک کے کنارے کھڑا ہو کے گاڑی کو رُکنے کا اشارہ کرنا خود کو گرفتاری کے لیے پیش کرنے کے مترادف تھا۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی تھی کہ گاڑی میں شکاری نہ ہوں مگر ڈرائیور جنگل میں گاڑی روکنے کا خطرہ مول نہ لے.... گاڑی کے قریب آنے تک میں فیصلہ کر چکا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے ـــ اگر یہ شکاری ہوں گے تو میں پلٹ کر جنگل میں فرار ہونے کی اور خود کو باقی ساتھیوں سے دُور لے جانے کی کوشش کروں گا.... شاید میں درختوں کی بھیڑ میں گم ہو جاؤں یا کسی درخت پہ چڑھ کے بچ جاؤں ـــ وہ گاڑی چھوڑ کر زیادہ دیر تک اور بہت اندر آ کے مجھے تلاش نہیں کریں گے ـــ اگر یہ کسی عام آدمی کی گاڑی ہوگی تو خود ہی رُک جائے گی۔

گاڑی بالکل میرے سامنے تھی جب میں نے وہ لاش دیکھی جس سے ٹھوکر کھا کے غالب گرا تھا لیکن اب اس کے بارے میں غالب سے بات کرنے کا وقت ہی نہیں تھا ـــ میں نے ہاتھ گھما کے پتھر پھینکا جو گاڑی کے بونٹ پہ بڑے زور سے لگا ـــ چند انچ کے فرق سے ونڈ اسکرین بچ گیا ورنہ شیشہ بالکل ریزہ ریزہ ہو کے بکھر جاتا۔ کچھ پتھر کی رفتار تھی جو ایک سمت میں جا رہا تھا ـــ گاڑی مخالف سمت سے آئی، چنانچہ پتھر دُگنی قوت کی رفتار سے لگا اور بونٹ پر ایک دھماکا ہوا ـــ یہ صبح کاذب سے پہلے کا وقت تھا ـــ اب ہوا بھی تھم چکی تھی اور جنگل آخر شب کے سکوت میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس خاموشی میں یہ آواز مجھے کچھ زیادہ ہی اونچی لگی ـــ پلک جھپکتے میں گاڑی میرے سامنے آ گئی اور میں نے اطمینان کا سانس لیا ـــ یہ دودھ لانے لے جانے والا ٹرک تھا ـــ نئے ماڈل کا بیڈفورڈ ٹرک جس کے پچھلے حصے پر دودھ کے ڈرم تین منزلوں میں ایک کے اوپر ایک رکھے گئے تھے ـــ لوہے کے فریم پہ تختے لگا کے ایسا انتظام کیا گیا تھا کہ ڈرم اٹھائے بغیر کھسکا کے آگے پیچھے کیے جا سکتے تھے اور وہ اضافی فلور بنانے سے ٹرک میں دودھ لے جانے کی گنجائش تین گنا ہو گئی تھی۔

پتھر لگتے ہی گاڑی لہرائی اور کچھ بے قابو ہوئی مگر ڈرائیور نے اسے سنبھال لیا۔ اس سڑک پہ سے وہ ہر روز گزرتا ہوگا... اور پُرسکون خالی راستے پر اسے کوئی بھی نہیں ملتا ہوگا ـــ بم کی طرح پھینکے جانے والے پتھر کے دھماکے سے اس کا بدحواس ہو جانا اور بوکھلا جانا برحق تھا ـــ ٹرک کو روکتے ہی وہ ایک زبردست گالی دے کر نیچے اُترا ـــ اسی وقت میں سڑک پہ آ گیا۔

"توں ماریا سی وٹّا ـــ؟" وہ مشتعل ہو کے میری طرف بڑھا۔

"ہاں.... پتھر میں نے سڑک پر پھینکا تھا۔" میں نے بھی پنجابی میں ہی جواب دیا "تم کو کیا ضرورت تھی بیچ میں ٹرک لے کر آنے کی۔"

وہ بھونچکا رہ گیا "توں.... توں پاگل تے نئیں؟"

"نہیں ـــ" میں نے کہا "چلو ناراضگی چھوڑو ـــ ایک پاؤ تازہ دودھ تو دو۔"

اس نے مجھے ایک گالی اور دی اور آگے بڑھا "بیڑا غرق کر دیا گاڑی کا اور اوپر سے مذاق کرتا ہے۔"

میں نے اطمینان سے ریوالور نکال لیا ـــ "یہ مذاق نہیں ہے پہلوان۔"

اس کا منہ کھلا رہ گیا اور وہ وہیں منجمد ہو گیا "کیا... کیا چاہیے تم کو.... میرے پاس.... یہ سو سوا سو روپے ہیں ـــ"

غالب میرے ساتھ ہی نکل آیا تھا... دوسری طرف سے محسن پولیس کی وردی میں نمودار ہوا تو پہلوان کی حالت غیر ہو گئی۔

"معاف کرنا پہلوان ـــ" میں نے کہا "کہ تمھیں روکنے کے لیے ہم یہ طریقہ اختیار کرنے پر مجبور ہوئے.... ہم گولی مار کے ٹائر پھاڑتے تو شاید ٹرک الٹ جاتا۔"

"لیکن.... میری غلطی جناب ـــ" وہ ہاتھ جوڑ کے کھڑا ہو گیا۔

"گھبراؤ نہیں ـــ" محسن نے اس کے کندھے پر تھپکی دی ـــ "یہاں کچھ قاتل اور ڈاکو آ گئے ہیں.... اور چند وارداتیں بھی ہوئی ہیں ـــ ہم صرف تفتیش کے لیے کھڑے ہوئے ہیں۔"

"کیسی وارداتیں؟ اور میرا کیا تعلق جناب....؟"

وہ ہکلانے لگا۔

"تم سے جو پوچھا جائے اس کا جواب دو ـــ" محسن نے ڈانٹ کر کہا "یہ بتاؤ، تم کہاں سے آ رہے ہو؟"

"اِدھر سات میل دور موضع ڈالیاں خورد سے ـــ" وہ بولا۔ "میں روز اسی وقت دُودھ لے جاتا ہوں۔"

"اس سات میل کے راستے پر تم نے کوئی گاڑی دیکھی؟" میں نے کہا۔

"گاڑی.... کیسی گاڑی جناب؟"

"کوئی ٹرک یا بس، ویگن.... کار یا جیپ....؟" میں نے کہا۔

"دیکھی تو ہے ـــ" وہ بولا "جب میں پکی سڑک سے کچھ دور تھا تو ایک گاڑی دوسری طرف جا رہی تھی ـــ" وہ بولا "اس کی بتیاں نظر آئی تھیں۔"

"اس سے تمھیں کچھ اندازہ نہیں ہوا؟" میں نے کہا "کہ گاڑی چھوٹی ہے یا بڑی.... کار اور ٹرک میں تو بڑا فرق ہوتا ہے۔"

"ہاں جی ـــ کار تو خیر وہ نہیں تھی۔" وہ بولا "اس کی بتیاں اونچی ہی تھیں.... میرا خیال ہے کہ وہ لاری تھی ـــ ویسے ادھر تو اس وقت کوئی مسافروں والی لاری نہیں جاتی ـــ ہو سکتا ہے کسی کی جنج ہو یا.... رب خیر کرے.... کسی کی میت آئی ہو ـــ آگے بھی پنڈ ہیں...."

"تمھارا گاؤں ڈالیاں خورد سڑک سے کس طرف ہے؟"

"اِدھر سے جاتے ہوئے کھبے ہتھ پر" وہ بولا "دو میل کا کچا راستہ ہے۔"

"تمھیں یقین ہے کہ وہ لاری تمھارے گاؤں میں نہیں گئی ہوگی؟"

"نہیں جناب.... ڈالیاں خورد جانے کا تو وہی ایک راستہ ہے جس پر میں آ رہا تھا۔" وہ بولا "وہ لاری یا تو سگرالی گئی ہوگی یا پھر.... اس سے آگے فضل پور رچک ہے.... یا جوگی ڈیرا ہے۔"

"اچھا... اِدھر آؤ میرے ساتھ....۔" میں نے کہا اور سڑک سے کوئی دس گز اندر وہاں لے گیا جہاں ایک لاش پڑی ہوئی تھی "یہ کون ہے؟"

گوالے کا رنگ لاش دیکھتے ہی فق ہو گیا تھا ـــ "یا رب جی خیر.... آج تو سویرے سویرے وخت پڑ گیا ہے ـــ بادشاہو میں کیسے بتا سکتا ہوں کہ یہ کون ہے....؟"

"تم اس علاقے کے رہنے والے ہو.... لوگوں کو پہچانتے نہیں ہو....؟"

"قسم سوہنے رب کی تھانیدار صاحب.... میں نے اسے

پہلے نہیں دیکھا ۔۔۔ میں تو اپنے سارے پنڈ کے ہر بندے کو نہیں پہچانتا ۔۔۔ خیر ۔۔۔ یہ کس پنڈ کا تھا ۔۔۔؟"

"تم دیکھ رہے ہو کہ اسے قتل کیا گیا ہے ۔۔۔ یہ دیکھو گولی کا نشان ۔۔۔ یہ ہے کوئی دیہاتی۔" میں نے کہا۔ "کیا سڑک پر آگے تم نے کسی کو فرار ہوتے دیکھا تھا ۔۔۔؟ جھوٹ مت بولنا ۔۔۔"

وہ قسمیں کھانے لگا کہ اس نے سڑک پر کسی کو بھی نہیں دیکھا۔

"اچھا ۔۔۔ کہیں ایسی ہی کوئی لاش دیکھی؟"

"لاش!" وہ اچھل پڑا ۔۔۔ "توبہ توبہ ۔۔۔ یہ بھی آپ نے دکھائی ہے ورنہ میں تو گاڑی چلاتے ہوئے سڑک پر نظر رکھتا ہوں ۔۔۔ اور بھی کوئی مارا گیا ہے کہیں ۔۔۔؟"

"ہاں بھئی ۔۔۔ اندازہ ہے کہ اس واردات میں پانچ افراد کو قتل کیا گیا ہے۔" محسن نے کہا۔ "ایک پولیس کا حوالدار ابھی غائب ہے۔"

"چھ ۔۔۔ چھ بندے ۔۔۔ کوئی زمین کا جھگڑا تھا ۔۔۔ یا رن کا ۔۔۔"

"وہ ڈاکو ہیں ۔۔۔ جیل سے فرار ہوئے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "اطلاع ملی تھی کہ ادھر آئے ہیں ۔۔۔ ہم نے ناکابندی کی مگر وہ کم بخت ہماری گاڑی لے کر فرار ہو گئے ۔۔۔ خیر اب تم بڑے وقت پر آئے ۔۔۔ وہ ابھی زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے ۔۔۔ چلو بھئی ۔۔۔" محسن نے مجھے بڑے رعب سے اشارہ کیا۔

"کیا ۔۔۔ کیا میری گاڑی ۔۔۔" گوالا پریشان ہو کے بولا۔ "مجھے یہ دودھ پہنچانا تھا جناب ۔۔۔"

"دودھ کا بچہ ۔۔۔" محسن نے گرج کر کہا۔ "تیرے نزدیک اس دودھ کی قیمت انسانوں کے خون سے زیادہ ہے؟ آگے وہ نہ جانے کتنے انسانوں کی جان لیں گے ۔۔۔ ان کو روکنا بہت ضروری ہے ۔۔۔ بھئی اسے سمجھاؤ۔"

"دیکھو پہلوان!" غالب نے دودھ والے کو ایک طرف لے جا کے سمجھانا شروع کیا۔ "یہ تو ایس پی صاحب بہت نیک دل اور شریف آدمی ہیں ۔۔۔ ورنہ اتنے بڑے افسر کے سامنے زبان چلانے والوں کی زبان کاٹ دی جاتی ہے ۔۔۔ یہ گاڑی اب سرکاری ڈیوٹی کے لیے استعمال ہو گی۔ دوسرے افسر تو جسے چاہیں بیگار میں پکڑ لیتے ہیں مگر یہ ایس پی صاحب کسی کا نقصان نہیں کرتے اور کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کرتے ۔۔۔ تمہارا دودھ ضائع ہو گا تو ۔۔۔ تم کو اس دودھ کی پوری قیمت مل جائے گی۔"

"پوری قیمت ملے گی ۔۔۔ پھر تو کوئی بات نہیں۔" گوالے نے کہا۔ "گاڑی حاضر ہے سرکار ۔۔۔ مگر آپ کو اس طرح بم مارنے کی ضرورت نہیں تھی۔"

میں نے جیب سے سو کا ایک نوٹ نکالا ۔۔۔ "یہ سراغ کا مال تھا۔" "یہ سو روپے اس نقصان کے جو پتھر پھینکنے سے ہوا۔ دودھ کی مالیت بتاؤ۔"

"دودھ ۔۔۔؟" وہ دل ہی دل میں حساب لگاتے ہوئے بولا۔ "ساڑھے تین ۔۔۔ نہیں ۔۔۔ چار سو ۔۔۔ کچھ اوپر۔" صاف ظاہر تھا کہ وہ موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ اصل لاگت تین سو ہو گی تو اس نے ساڑھے تین کہے ۔۔۔ وہ اسے کم لگے تو اس نے چار سو کیے ۔۔۔ پھر سوچا کہ کچھ اور بھی مانگنے میں ہرج کیا ہے۔ لوڈنگ میں استعمال ہونے والے ٹرک پر ڈینٹ پڑنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا مگر اس نے ایک پتھر لگنے کا جرمانہ سو روپے خوشی خوشی رکھ لیا ۔۔۔ اسے مزید خوش کرنے کے لیے میں نے دودھ کی قیمت کے بھی پانچ سو پیش کیے تو اس کا سارا گلہ شکوہ جاتا رہا۔

"اب ذرا دھیان سے میری بات سنو۔" غالب بولا۔ "تم ایک خطرناک سرکاری مہم میں شریک ہو ۔۔۔ خطرہ سب کے لیے برابر ہے لیکن زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے ۔۔۔ اللہ نے چاہا تو ہم ان بدمعاشوں کو پکڑ لیں گے ۔۔۔ تم کو کچھ نہیں کرنا ہے سوائے اپنا منہ بند رکھنے کے ۔۔۔ جو کچھ تم دیکھو گے اس کے متعلق نہ آج ہم سے کوئی سوال کرو گے اور نہ آج کے بعد کسی سے کچھ کہو گے ۔۔۔ اگر تمہاری زبان بند نہ رہی تو معلوم ہے کیا ہو گا؟"

"کیا ہو گا جی ۔۔۔؟" گوالا ڈر گیا۔

"وہ قاتل تمہارے پیچھے لگ جائیں گے ۔۔۔" میں نے کہا۔ "جب بات ایک زبان سے نکلتی ہے تو دس کانوں تک پہنچتی ہے اور دس زبانوں سے نکلتی ہے تو سو کان سنتے ہیں ۔۔۔ ان خطرناک قاتلوں کو معلوم ہو جائے گا کہ تم بھی پولیس کے ساتھ تھے اور وہ کسی دن رات کو تمہارے گھر آ جائیں گے۔"

"تمہاری بھیڑ بکریاں ۔۔۔ مرغیاں ۔۔۔ گائے بھینس اور بیوی بچے سب کاٹ کر رکھ جائیں گے۔" غالب نے اسے ڈرانے کے لیے کہا۔ "اور اگر وہ نہ پہنچے تو پولیس پہنچ جائے گی ۔۔۔ تم کو گرفتار کر لیا جائے گا کہ تم نے سرکاری راز کو راز نہیں رکھا۔"

"میری توبہ ۔۔۔ میرے باپ کی توبہ۔" وہ کانوں کو ہاتھ لگانے لگا۔

"اچھا اب تم پیچھے بیٹھو گے۔" میں نے کہا۔ "جگہ ہے نا ۔۔۔؟"

"جگہ بہت جناب ۔۔۔ ایک پورا تختہ درمیان میں خالی ہے۔ مجھے آگے سے بھی دودھ اٹھانا تھا۔" وہ بولا۔

اس کے بعد معاملات آسان ہو گئے۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور گاڑی کو پیچھے لے گیا ۔۔۔ سو گز پیچھے سڑک کے کنارے گاڑی روک کر میں جنگل میں گیا اور کیتھرین کو اٹھا لایا ۔۔۔ محسن اور غالب نے اسے خالی تختے پر لٹا دیا۔

گوالا جو ایک لاش دیکھ کر ہی دہشت زدہ ہو گیا تھا اسے دوسری لاش سمجھا مگر غالب نے اسے بتا دیا کہ اس عورت کو ڈاکو اغوا کر کے لے جا رہے تھے لیکن پولیس کی مداخلت سے چھوڑنے پر مجبور ہو گئے اور سڑک پر گرا کر بھاگ گئے۔

"اس بڈھی عورت کو اغوا کر کے لے جا رہے تھے؟" گوالا حیران ہوا تو ٹھیک ہوا کیونکہ دیہاتوں اور شہروں سے عام طور پر جوان لڑکیاں ہی اٹھائی جاتی ہیں۔

"بھئی یہ مال دار عورت ہے۔" میں نے اسے سمجھایا۔ "ڈاکو بعد میں وارثوں سے پانچ دس لاکھ روپے مانگتے۔"

"اور وہ نہ دیتے تو ۔۔۔؟"

"تو اسے قتل کر کے پھینک دیتے۔" میں نے کہا۔

اس نے دونوں گالوں کو ہاتھ لگایا۔ "یا رب جی توبہ! ایسی بڈھی عورت نوں قتل کر دیتے ۔۔۔ کیسا زمانہ آ گیا اے؟"

"اچھا اب تم نیچے آؤ۔" میں نے کہا۔ "مجھے تم سے ایک بات کرنا ہے۔"

جنگل میں ایک جھاڑی کے پیچھے لے جا کر میں نے اس سے کہا۔ "اپنے یہ کپڑے مجھے دے دو۔"

"اور میں ۔۔۔ میں خود کیا پہنوں؟" وہ بھونچکا رہ گیا۔

"تم میرے کپڑے پہن لو بھئی۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "دراصل اب ہم بھیس بدل کر ان کا تعاقب کرنا چاہتے ہیں ۔۔۔ وہ ہمیں پہچان گئے ہیں ۔۔۔ ہمیں دیکھتے ہی گولیاں چلانے لگیں گے۔ میں آگے ہوں اس لیے سب سے پہلے نظر آؤں گا۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ان کو شک نہ ہو ۔۔۔ وہ یہ سمجھیں کہ دودھ لے جانے والی گاڑی ہے اور کوئی گوالا اسے چلا رہا ہے ۔۔۔ تم سمجھ رہے ہو نا؟ خود ایس پی صاحب اور دوسرے تھانے دار صاحب بھی پیچھے بیٹھیں گے چھپ کر ۔۔۔"

"وہ ۔۔۔ وہ بھی تھانے دار ہیں ۔۔۔ اور آپ بھی؟"

"ہاں پہلوان ۔۔۔ اتنے بڑے افسر کے ساتھ تو تھانے دار ہی کو ڈیوٹی دینا پڑتی ہے۔" میں نے کہا۔ "میرے کپڑے تم کو کچھ ڈھیلے ہوں گے لیکن کوئی بات نہیں ۔۔۔ گزارا کر لو ۔۔۔ جب کام ختم ہو جائے گا تو تم کو یہ کپڑے مل جائیں گے۔"

"او جی، نہ لیں ۔۔۔ کون سا ریشمی لاچا اور دو گھوڑا بوسکی کا کرتا ہے۔" وہ اپنی گاڑھے کی دھوتی اور قمیص اتارتے ہوئے بولا ۔۔۔ چند منٹ کے بعد ہم جھاڑیوں میں سے برآمد ہوئے تو دونوں کا رنگ روپ بدل گیا تھا ۔۔۔ تاہم محسن نے انگوٹھا دکھا کے اسٹائل سے 'ویری گڈ' کہا ۔۔۔ وہ اور غالب دودھ کا فراخدلانہ استعمال کر رہے تھے ۔۔۔ انھوں نے کیتھرین کے منہ پر ٹھنڈے دودھ کے چھینٹے مارے اور اب اسے ٹھنڈا دودھ پلانے کی کوشش کر رہے تھے ۔۔۔ زندگی میں پہلی بار ہم نے دودھ کا پورا ٹرک خرید لیا تھا۔ جس میں شاید دس من دودھ ہو گا ۔۔۔ دودھ کے اسٹاک کو وہ اپنا پیٹ بھرنے کے علاوہ غسل کرنے کے لیے بھی استعمال کرنا چاہتے تو کافی ہوتا ۔۔۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ ہالی ووڈ کی کوئی اداکارہ اپنے حسن کی حفاظت کے لیے دودھ سے منہ دھوتی تھی اور غسل کرتی تھی ۔۔۔ مگر ہمارے پاس بیوٹی باتھ کے لیے فرصت نہیں تھی۔

غالب عذر کر کے میرے ساتھ آگے بیٹھا ۔۔۔ سیٹ کافی چوڑی تھی چنانچہ میں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ لیٹ جائے تاکہ سامنے والے شیشے سے صرف میری شکل مبارک دکھائی دے۔ اس حلیے میں مجھے کوئی آسانی سے نہیں پہچان سکتا تھا ۔۔۔ میرے سر پر ایک بہت میلے اور بدبودار کپڑے کی پگڑی سی تھی ۔۔۔ اسے پگڑی کہنا بھی غلط ہو گا ۔۔۔ یہ ایک گز لمبا چوڑا چارخانے والا رومال تھا جسے میں نے دہشت گردی کے دونوں کونے ملا کے سر کے گرد لپیٹ لیا تھا۔ اس سے میری پیشانی جزوی طور پر چھپ گئی تھی ۔۔۔ گاڑھے کا کرتا زیادہ میلا اور بدبودار تھا۔ اس میں سے دودھ، گھی، مکھن کے علاوہ چارے، کھل، سوڑی گائے اور بھینس کے پسینے اور ان کے دوسرے خارج کردہ مواد کی خالص دیہاتی مہک اٹھ رہی تھی ۔۔۔ گوالے کے اپنے بدن کی بو کا اس میں کیا پتا چلتا ۔۔۔ یہی حال دھوتی کا تھا لیکن یہ لباس اس ٹرک سے میچ کرتا تھا بالکل اسی طرح جیسے پائلٹ کی وردی ہوائی جہاز سے میچ کرتی ہے۔

میں نے ٹرک کو اسٹارٹ کیا اور اس کے ڈیش بورڈ پر نظر ڈالی تو فیول میٹر کی سوئی یہ ظاہر کر رہی تھی کہ ٹینک دو تہائی کے قریب بھرا ہوا ہے۔

"آج بریک فاسٹ میں خالص دودھ ملے گا؟" غالب لیٹے لیٹے بولا اور ہاتھ بڑھا کے گلو کمپارٹمنٹ کی تلاشی لینے لگا۔

"ابھی کچھ نہیں ملے گا۔" میں نے کہا۔ "پہلے اس علاقے سے نکل جائیں، پھر کہیں رک کر دیکھیں گے ۔۔۔ لوگوں سے پوچھیں گے کہ وہ سب کدھر گئے ہیں ۔۔۔ آگے بھی آبادی ہے۔"

"ہاں ۔۔۔ اپنے پہلوان کا گاؤں ہے ۔۔۔ ڈالیاں خورد ۔۔۔

اور اس کے بعد چک فضل پور — سنگرالی ...“ غالب نے کہا۔

”واللہ! اس خاکسار صحافی نے یہ نام پہلے نہیں سنے۔“

”اس لیے نہیں سنے کہ یہاں کسی اخبار کا کوئی نمائندہ نہیں پہنچا۔ اور جو کچھ یہاں ہوتا ہے اُسے خبر نہیں سمجھا جاتا — خواہ وہ قتل ہو یا ڈاکا ہو —“ میں نے کہا۔

”ایک لاش سے کیا اندازہ ہوتا ہے؟“ غالب بولا — ”انھوں نے سب کو مار دیا ہوگا؟“

”ان سے کچھ بعید نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”کیا وہ انھی پانچ میں سے ایک تھا؟“

”اور کون ہو سکتا ہے؟“ غالب بولا۔ ”گولی کا نشانہ دیکھا تھا تم نے؟ عین پیشانی کے وسط میں تھا... اور انھوں نے یہی دھمکی دی تھی... ویسے بھی گاؤں دیہات میں قتل کے لیے ریوالور استعمال نہیں ہوتے — سوٹے، کلہاڑی، ڈانگ اور چھرے وغیرہ زیادہ معقول ہیں — وہ اعشاریہ بائیس بور کی گولی کا سوراخ تھا۔“

میں نے حیرانی سے غالب کو دیکھا۔ ”تو ماہر آتشیں اسلحہ ہونے کا بھی دعویٰ رکھتا ہے؟“

”ہاں — کرائم رپورٹر..... عام اخبار نویسوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ جانتے ہیں۔“ غالب بولا۔ ”سوراخ بہت چھوٹا تھا اور اسی لیے خون بھی کم نکلا تھا۔ اس سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ ریوالور ٹھیک اسی جگہ رکھ کر گولی چلائی گئی تھی اور اس سے ایک نتیجہ یہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ مقتول کو سزائے موت دی گئی ہوگی۔ اس کو فرار ہوتے ہوئے گولی نہیں ماری گئی تھی.... یا تو اسے ناک آؤٹ کیا گیا اور پھر شوٹ کیا گیا... یا وہ خود بے ہوش ہو گیا تھا — تھوڑا سا امکان اس بات کا بھی ہے کہ اسے سر پہ ریوالور رکھ کے دہشت زدہ کیا جانا مقصود تھا مگر غلطی سے گولی چل گئی — ممکن ہے اس نے کسی حکم کی تعمیل سے انکار کیا ہو۔ اس کی موت کے بعد باقی چار نے عبرت پکڑی ہوگی اور اپنی جان بچانے کے لیے ان سے پورا تعاون کیا ہوگا۔“

”کیا اس بات کا امکان ہے کہ باقی چاروں کو زندہ واپس جانے کا موقع دیا گیا ہو؟“ میں نے ٹرک چلاتے ہوئے نظر سڑک پر رکھی۔

”ہاں — امکان تو ہے۔“ غالب نے کہا۔ ”بے سبب قتل سے سب گریز کرتے ہیں۔“

”مگر وہ چاروں ایک قتل کے چشم دید گواہ ہو گئے تھے۔“ میں نے کہا۔ ”اور ان سے یہ ڈر ہے کہ وہ بعد میں سب کو شناخت نہ کر لیں — یہ بتا دیں کہ انھیں کہاں لے جایا گیا تھا اور کس کام کے لیے...؟“

”وہ کیسے بتائیں گے؟“ غالب بولا۔ ”گاؤں والوں کو؟ پولیس چوکی کے انچارج صاحب کو تو سانپ نے ڈس لیا ہے“

”سانپ نے سانپ کو ڈس لیا ہے“ میں نے تصحیح کی۔

”گاؤں والے لاشیں لے کر چلے جائیں گے.... کسی دُور کے قصبے سے اگلی تیرہ اٹھانے دار آئے گا تو... بیان وغیرہ لے لیے جائیں گے — تفتیش کون کرتا ہے کہ مجرموں کو ڈر ہو — سب کاغذی کارروائی ہوتی ہے — دلاور اور پیڈرو جیسے لوگ ان گاؤں کے بونڈوں کی گواہی سے ڈرنے والے نہیں۔ انھوں نے اہمیت ہی نہیں دی ہوگی کہ کسی سے کہتے ہیں تو کہتے پھریں“ غالب نے کہا۔ ”البتہ سراج پہنچا تو گاؤں کی شامت آجائے گی۔ ایک دن کی بادشاہت میں جو اچھے کام ہم نے کیے تھے، سب برباد ہو جائیں گے — پیڈرو اور اس کے ساتھیوں کے خلاف کسے بولنے دے گا؟ وہ تو حوالدار کی موت کو بھی قتل کا کیس بنائے گا اور اس نوجوان کی لاش کو بھی ہمارے کھاتے میں ڈالے گا۔ ساری گواہیاں ہمارے خلاف لے گا اور تلاش کرے گا تو ہمارا۔ پیڈرو اور اس کے ساتھ آنے والوں کے لیے کوئی خطرہ نہیں۔“

ہمارے اور پیچھے والے حصّے کے درمیان کیبن کی دیوار حائل تھی اور ہماری بیک پر ایک شیشہ تھا جس میں سے ہم محسن اور کیتھرین کو دیکھ سکتے تھے لیکن درمیان میں دودھ کے ڈرم حائل تھے۔ صبح کے چار بج گئے تھے اور آسمان پر ستارۂ سحری پوری آب و تاب کے ساتھ نمودار ہو چکا تھا — کچھ دیر میں صبحِ کاذب کے آثار نمودار ہونے کو تھے.... ہم جائے واردات سے پانچ میل دُور آ گئے تھے — احتیاطاً میں نے لائٹس بجھا رکھی تھیں چنانچہ ٹرک کی رفتار بہت کم تھی — اس کے انجن کی آواز بھی کم تھی لیکن مجھے اتنا شور بھی بہت محسوس ہو رہا تھا.... اچانک پیچھے سے کسی نے شیشے کو انگلی سے بجایا... میں نے ٹرک کو ایک کنارے پر روک لیا اور اتر کر پیچھے گیا۔

”کیتھرین کو ہوش آگیا ہے۔“ محسن بولا۔

”ہیلو کیتھرین۔“ میں نے ٹرک پر چڑھ کے خوش دلی سے کہا اور مسکرایا۔ ”کیسی ہو؟“

”فائن —“ وہ آہستہ سے بولی۔ ”تم سب کو دیکھ کر... میں پھر زندہ رہنے کی آرزو کرنے لگی ہوں — لیکن... صرف آرزو سے کیا ہوتا ہے؟“

”تم زندہ رہو گی کیتھرین — ابھی سے مرنے کی باتیں کر کے ہمیں مت ڈراؤ —“ میں نے کہا۔ ”ہم سب کو تمہاری فکر ہے.... جولی کو۔“

”جولی ...؟“ اس نے ہنسنے کی کوشش کی مگر آنسو خود بخود اُس کی آنکھوں سے بہہ نکلے — ”اب تک اور کس کے لیے زندہ تھی میں... یو ایڈیٹ...“

”یہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں — آئندہ —“

”واٹ آئندہ....“ اس نے میری بات کاٹ دی۔ ”مجھے معلوم ہے کہ وہ مر چکی ہے.... تم لوگ ایسے جھوٹ کیوں بولتے ہو — کیا جھوٹ سہارا بنتے ہیں؟ زندگی دے سکتے ہیں...؟ جھوٹ تو خود مر جاتے ہیں —“

”کیتھرین میری ماننے کو تیار نہیں کہ جولی زندہ ہے۔“ محسن نے کہا۔ ”کیتھرین — پلیز ہم پر یقین کرو۔“

”مجھے تمہارے جھوٹے یقین کی ضرورت نہیں ہے —“ وہ بولی۔ ”میں سچ کا مقابلہ کر سکتی ہوں — تمام عمر میں نے سچ کا زہر پیا ہے — امرت سمجھ کے نہیں — زہر سمجھتے ہوئے.... حقیقت پر مصلحت کے پردے مت ڈالو.... کب تک ڈالو گے یہ پردے آخر —؟ میرے پاس تو اتنا وقت بھی نہیں ہے کہ.... تم جھوٹ پہ مجھے زندہ رکھو اور سچ کو ٹالتے رہو — جب تک میں اس قابل نہ ہو جاؤں کہ تم جھوٹ کے پردے ہٹانے پر اور جھوٹ کا اعتراف کرنے پہ — اور شرمندہ ہو کے یہ کہنے پر مجبور ہو جاؤ... کہ کیتھرین! وہ ضرورت تھی.... اصل حقیقت یہ ہے.... تو مجھے تم کو شرمندہ دیکھنے کا کوئی شوق نہیں — آئی ڈونٹ وانٹ ٹو... جسٹ لیٹ می ڈائی — پلیز۔“

محسن نے مجھے اشارہ کیا اور میرے ساتھ کود کر نیچے آگیا۔ گلا ہکا بکا بیٹھا ہوا سارا ڈراما دیکھ رہا تھا مگر اس کا ایک لفظ بھی سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس کے دماغ میں کنفیوژن کے سوا کچھ نہیں تھا — ہم نے اسے قاتلوں ڈاکوؤں کے بارے میں ایک کہانی سُنائی تھی — بطور ثبوت اس نے ایک لاش بھی دیکھی تھی۔ کیتھرین کے بارے میں اس کو یقین تھا کہ ڈاکو اغوا کر کے لے جا رہے تھے لیکن جو ڈائیلاگ اس نے سنے تھے وہ اغوا کی واردات سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے — بس وہ پولیس کے معاملات میں دخل در معقولات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے پولیس کا ساتھ دینے میں مالی فائدہ ہی ہوا تھا اور وہ سمجھتا تھا کہ اس نے تعاون نہ کیا تو وہ گھاٹے میں رہے گا — پولیس کیا نہیں کر سکتی۔ اُسے تھانے لے جا کے چھتر مار سکتی ہے — اس کا ٹرک ضبط کر سکتی ہے — اُسے چوری کے شبہے میں جب تک چاہے زیرِ تفتیش رکھ سکتی ہے، یہاں تک کہ اُس کے قبضے سے چوری کا مال بھی برآمد کر سکتی ہے — اس کو ذرا بھی شبہ نہیں تھا کہ ہم جعلی پولیس والے ہیں — چنانچہ وہ چھ سو پہ قناعت کیے چپ بیٹھا تھا اور پنگا لینے کے موڈ میں بالکل نہیں تھا۔

”کیتھرین کو لاہور لے جانا بہت ضروری ہے۔“ محسن نے ٹرک سے ذرا فاصلے پر جا کے کہا اور مجھے ایک سگریٹ پیش کی... پھر ماچس نکالی۔

”یہ سگریٹ کہاں سے آئی —؟“ میں نے سگریٹ کو جھپٹ لیا۔

”ذرا احتیاط سے۔“ محسن بولا۔ ”پہلوان کا تحفہ ہے... باری باری سُوٹے لگائیں گے —“ اس نے ماچس سے سگریٹ جلائی جو مقبولِ عام کنگ اسٹارک برانڈ تھی.....

..... اس کا تند و تلخ بارُودی دُھواں میرے خالی پیٹ میں گھونسے کی طرح لگا مگر جسے نشے کی لت ہو وہی طلب کی اذیت کو جانتا ہے اور نشہ ٹوٹنے کے اعصابی دباؤ کو محسوس کر سکتا ہے پھر نشے کے لیے جو بھی ملے وہ ادنیٰ ہو یا اعلیٰ، سب نعمت ہے

”کیتھرین کو لاہور لے جانے کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا مگر ہم تو غالباً مخالف سمت میں جا رہے ہیں۔“ میں نے ایک طویل کش لینے کے بعد بہت پُرسکون ہو کے کہا۔

”جب تک وہ جولی کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھے گی اُسے کسی کی بات کا یقین نہیں آئے گا۔“ محسن بولا۔ ”میں نے اُسے ساری صورتِ حال سمجھانے کے لیے بہت سر کھپایا مگر وہ اسے بھی جھوٹ سمجھتی ہے کہ شہلا زندہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کا ہمارے ساتھ رہنا خطرناک ہے۔ اس کی حالت زیادہ اچھی نہیں ہے بلکہ کسی حد تک تشویش ناک ہے۔ وہ جسمانی طور پر بہت کمزور ہو گئی ہے اور اُس کی قوتِ مدافعت بالکل ختم ہو چکی ہے، اس لیے بھی کہ وہ زندہ رہنا ہی نہیں چاہتی اور اگر وہ ہمارے ساتھ نہ ہوتی تو شاید خودکشی کر کے مر چکی ہوتی۔ ہوش میں آنے کے بعد وہ ہسٹیریائی انداز میں بہت چیخی چلائی اور اُس نے ٹرک سے چھلانگ لگانے کی کوشش بھی کی، ہم نے اُسے دبوچ لیا۔“

”اچھا! مجھے کچھ معلوم نہیں ہُوا۔ شیشے کے اُدھر آواز نہیں جاتی۔“ میں نے سگریٹ محسن کی طرف بڑھا دیا۔

”پہلے تو وہ سمجھتی رہی کہ اب بھی وہ اسی ٹرک میں ہے۔“ محسن نے دُھواں چھوڑ کے کہا۔ ”جس میں سے وہ کُود گئی تھی۔“

”وہ کسی ٹرک میں تھی؟“ میں نے کہا۔

”ہاں، اُس نے ہمیں پہچاننے کے بعد بتایا تھا۔“ محسن بولا۔ ”وہ ٹرک میں لکڑی کے باکس تھے، جو پیچھے کے حصّے میں بہت اُوپر تک لادے گئے تھے۔ اس کے اندازے کے مطابق کم سے کم سو۔“

”ویسے ہی تابوت...؟“

”نہیں، کیتھرین کا کہنا ہے کہ باکس ڈھائی فٹ لمبے، دو فٹ چوڑے اور دو فٹ اُونچے تھے۔“ محسن بولا۔ ”اس نے کہا کہ موقع ملے تو پیمائش کر لینا، ایک انچ کا بھی فرق نہیں ہوگا۔ باہر کی طرف عام قسم کے وہ کریٹ تھے جن میں پھل سیب، آلو بخارے، ملٹے وغیرہ پیک کیے جاتے ہیں، لیکن ان میں پھل نہیں آلو تھے یا انڈے...!“

”یہ کیتھرین نے کیسے جانا؟“

”اُس کی نظر، قوتِ مشاہدہ اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت حیرت انگیز

ہے" محسن نے کہا "اُس کا کہنا ہے کہ پھل ہوتے تو خوشبو نہ آتی پھا ہر کی طرف آلو کے یا انڈوں کے کریٹ اس لیے رکھے گئے ہوں گے کہ راستے میں کوئی سرپھرا مل جائے یا ضرورت مند تو اُسے مطمئن کیا جا سکے۔"

"ہاں، راستے میں یا تو فرض شناس اور سرپھرے پولیس افسر آتے ہیں یا پھر رشوت مانگنے والے، جن کو حصہ نہ پہنچا ہو" میں نے اتفاق کیا۔

"درمیان میں چار فٹ لمبی اور اتنی ہی چوڑی جگہ تھی، جس میں ان تینوں کو بے ہوش کر کے ڈال دیا گیا تھا۔ رابعہ کو ٹیڈی کو اور کیتھرین کو" محسن بولا "اس ڈھیر کے اُوپر خود پیڈرو ریوالور لیے بیٹھا ہُوا تھا اور اُوپر سے نیچے جھانک کر پندرہ فٹ گہرے چوکور کنوئیں کی تہ تک دیکھ سکتا تھا۔"

"کیتھرین کو پہلے ہوش آگیا...؟"

"نہیں، وہ اوّل تا آخر ہوش میں تھی" محسن بولا "جب انھیں روانہ کیا جا رہا تھا تو پروگرام کے مطابق کچھ دیر ہوگئی تھی۔ ڈاکٹر ایک گھنٹے کی تاخیر سے پہنچا تھا۔ وہ ڈاکٹر تھا یا کوئی عطائی! یہ اُسے نہیں معلوم، وہ سب اس کو ڈاکٹر بھی کہتے تھے اور گالیاں بھی دیتے تھے۔ اس کی کار کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا، چنانچہ وہ چار بجے شام کے بجائے پانچ بجے پہنچا۔"

"کہاں پہنچا؟" میں نے کہا "کیتھرین کو اندازہ ہے؟"

"نہیں، وہ گلبرگ کے آخری حصّے میں واقع کسی کوٹھی کا تہ خانہ تھا، جہاں اُن کو رکھا گیا تھا" محسن بولا "ڈاکٹر نے پہلے رابعہ کو انجکشن لگایا پھر ٹیڈی کو، اُنھوں نے کوئی مزاحمت نہیں کی، وہ اس قابل ہی نہ رہے تھے۔" وہ ذرا سی دیر کے لیے خاموش ہُوا۔

"میں سمجھ گیا محسن" میں نے کہا "وضاحت کی ضرورت نہیں کہ وہ کیوں مزاحمت کے قابل نہیں رہے تھے۔"

"جب کیتھرین کی باری آئی تو نہ جانے کیسے ڈاکٹر کے ہاتھ سے گر کے دوا کی شیشی ٹوٹ گئی" محسن نے کہا اور سگریٹ کا آخری ٹوٹا مجھے دیا۔ "دیر پہلے ہی ہو چکی تھی اور ڈاکٹر کے پاس دوسری شیشی نہیں تھی۔ اُنھوں نے کیتھرین کو ڈرایا دھمکایا کہ خبردار جو راستے میں آواز بھی نکلی۔ ان دونوں کو بے ہوش رکھنا ضروری تھا مگر تمھارا زندہ رہنا بھی غیر ضروری ہے۔ گردن کاٹ کے لاش باہر پھینک دیں گے۔ کیتھرین نے اداکاری سے ان کو یقین دلا دیا کہ وہ صد درجہ بُزدل ہے اور ان کے لیے کوئی خطرہ نہیں بن سکتی۔ اس نے اپنا رویّہ ایسا ہی رکھا جس کا فائدہ اُسے یہ ہُوا کہ وہ بہت کچھ دیکھتی اور سُنتی رہی اور اس کی فراہم کردہ اطلاعات پر بھروسا کرتے ہوئے ہی میں کہہ رہا ہُوں کہ کیتھرین کو آگے لے جانے کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ راستے میں کسی جگہ اُنھوں نے رابعہ، ٹیڈی اور کیتھرین کو ٹرک سے ایک جیپ اسٹیشن ویگن میں منتقل کر دیا تھا۔"

"اسٹیشن ویگن میں؟" میں نے بے اختیار کہا۔

"ہاں، وہ اسی گاؤں میں ہمارے بہت قریب سے گزر گئے۔ ہم نے پولیس چوکی سے باہر آکے دیکھا تھا تو ہمیں ہیڈ لائٹس دکھائی دی تھیں" محسن نے کہا "اس میں وہ پیچھے پڑے ہوئے تھے...... رابعہ اور ٹیڈی تو واقعی بے ہوش تھے مگر کیتھرین دم سادھے پڑی [illegible] محفوظ رہے اور ہوش میں رہنے کا فائدہ بھی اُٹھا سکے۔"

"کاش، کسی طرح مجھے معلوم ہو جاتا" میں نے حسرت سے کہا "کہ وہ میرے اتنے قریب آئی اور پھر اتنی دُور ہو گئی کہ [illegible] تصوّر بھی نہیں کر سکتا۔"

"معلوم ہو جاتا تو آپ کیا کرتے، دوڑ لگاتے جیپ کے پیچھے" محسن نے کہا "آپ خود بھی چوہے کی طرح پکڑے جاتے بھائی [illegible] جب قیدیوں کو ٹرک سے اسٹیشن ویگن میں منتقل کرنے کے [illegible] روکا گیا تھا تو ڈرائیور کی غلطی سے تھوڑا سا نشیب کی جانب ہو گیا [illegible] اُلٹنے سے بال بال بچا تھا۔ کیتھرین نے اسٹیشن ویگن کے پیچھے [illegible] سے، جو اُوپر اُٹھ جاتا ہے، یہ دیکھا کہ اسٹیشن ویگن سڑک پر ہی [illegible] کے واپس جانے لگی تھی، اُسی وقت ڈرائیور نے پھر ٹرک چلا دیا او[ر] وزن کے باوجود اُسے صحیح سالم سڑک پر لے آیا لیکن اُس کی بدقسمتی [illegible] اگلا ٹائر برسٹ ہو گیا۔ ٹرک نشیب کی جانب جُھکا اور اُلٹ گیا [illegible] تو سڑک پر آگرا تھا لیکن ڈرائیور ہلاک ہو گیا۔ یہ سب کیتھرین نے اُن [کی] گفتگو سے اندازہ کیا۔ اسٹیشن ویگن کو دلاور چلا رہا تھا۔ اُس نے نیچے [illegible] پیڈرو کو اُٹھایا اور وہ کچھ دیر دُور کھڑے سر ہلاتے رہے اور نیچے نشیب میں اُلٹ جانے والے ٹرک کو دیکھتے رہے۔ اُن کا سارا مال بکھر گیا [illegible] دیر بعد دلاور اکیلا واپس آیا اور گولی کی طرح لاہور کی طرف چل پڑا [illegible] دوسرے ٹرک کا اور ڈرائیور کا بندوبست کیا اور دو گھنٹے بعد پھر وا[پس] پہنچا، جہاں حادثہ پیش آیا تھا۔ اس وقت وہ بہت جلدی میں تھا اور بہ[ت] پریشان تھا۔ وہ اُتر کے پیڈرو کے پاس گیا اور کچھ دیر بعد پیڈرو اکی[لا] آ بیٹھا۔ دوسرا ٹرک سڑک کے کنارے رُک گیا تھا اُس کا ڈرائیور بھی اسٹیشن [ویگن] میں آگیا اور وہ دونوں گاؤں گئے، وہاں سے اُنھوں نے چھ لڑکے [illegible] اُنھوں نے رابعہ، پیڈرو اور کیتھرین کو سیٹ پر ڈال دیا۔ کیتھرین تو [illegible] حکم پر خود ہی چلی گئی۔ گاؤں سے جو چھ لڑکے پکڑے گئے اُن کے لیے [illegible] کی جگہ بہت ناکافی تھی، چنانچہ پیچھے والا پانچواں دروازہ اُٹھا کے سب کو وہاں ٹھونسا گیا مگر پھر وہ دروازہ بند نہ ہو سکا۔ پیڈرو پچھلی سیٹ [پر] پیچھے کو سرکیے اُن پر ریوالور تانے بیٹھا رہا اور انھیں گالیاں دیتا رہا اور [illegible] دیتا رہا کہ کسی نے ذرا بھی حرکت کی اور آواز بھی نکالی تو اُس کے سر [میں] سوراخ کر دیا جائے گا۔ جگہ کی کمی کے باعث اُس نے کیتھرین سے [illegible] وہ سب سے آگے والی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ جا بیٹھے اور کیتھرین [نے] اپنا تابعداری کا بُزدلانہ رویّہ برقرار رکھا۔ آگے وہ آرام سے بیٹھ کے [illegible] کے سامنے لگے ہوئے شیشے میں پیچھے کا منظر دیکھتی رہی۔ شیشہ [illegible] تھا۔ اُس کی نظروں کے سامنے ایک لڑکے نے چلتی گاڑی سے باہر چھلانگ ماردی۔ کیتھرین نے فوراً پلٹ کر دیکھا تو پیڈرو اُس کا نشانہ لے رہا [تھا] غالباً وہ کیتھرین کی دُعا قبول ہونے کے باعث بچ گیا۔ وہ ایک با[ر] اور پھر اُٹھ کے بھاگ گیا۔ جنگل اور اندھیرے میں گم ہو گیا۔ پیڈرو کا [illegible] اس کے پیچھے جانے کا تھا مگر دوسرے شخص نے کہا کہ وقت ضائع ہو گا۔ وہ لڑکا جنگل کے راستوں سے واقف ہے اب ہاتھ نہیں آئے گا۔ پانچ لڑکے کافی ہیں، ان سب کو وہ اسی لیے لے گئے تھے کہ نیچے بکھرا ہُوا مال دوسرے ٹرک میں لوڈ کریں۔ وہ یقیناً بہت بھاری کریٹ ہوں گے اور سو کریٹ ہوئے تو ہر شخص کو بیس بیس کریٹ نیچے سے اُٹھا کے ٹرک تک لانے پڑے ہوں گے اور پھر ٹرک میں رکھنے پڑے ہوں گے۔ ممکن ہے ٹرک میں پیڈرو کریٹ جمانے پر مامور ہو۔ یہ سب کیتھرین کو نہیں معلوم، صرف اس کا اندازہ ہے۔"

"میرے اندازے کا کمال بھی تو دیکھ" میں نے کہا "بالکل وہی ہُوا جو میں نے سوچا تھا۔"

"بس اب ولی ہونے کا دعویٰ کر دے" محسن بولا "بہت لمبی بات کر دی میں نے۔ قصّہ مختصر یوں کہ پیڈرو نے جب اسٹیشن ویگن کو ٹرک کے پاس لا کے روکا تو وہ اور ڈرائیور فوراً نیچے لپکے کہ اپنی لیبر فورس کو اُتاریں اور دلاور سے کچھ کہنے لگے۔ اُسی وقت کیتھرین کو فرار کا موقع ملا۔ ڈرائیور کی سائیڈ کا دروازہ کھلا ہُوا تھا۔ ٹرک سڑک کے بائیں جانب کھڑا ہُوا تھا۔ اسٹیشن ویگن بھی بائیں جانب روکی گئی تھی اور وہ لیفٹ ہینڈ ڈرائیو گاڑی تھی چنانچہ کیتھرین اُتری اور خاموشی سے جنگل میں سٹک گئی۔ پہلے چند قدم بہت مشکل ثابت ہوئے۔ جبکہ اُسے یقین تھا کہ ابھی کوئی گولی کسی ریوالور سے نکلے گی مگر اس کی آواز بعد میں اس وقت سُنائی دے گی، جب کیتھرین مُنہ کے بل گر چکی ہو گی مگر قدرت اُس کی مدد کر رہی تھی۔ اُس کی باری آنے پر انجکشن کی شیشی کا ٹوٹ جانا بھی تائیدِ ایزدی کے سوا کیا تھا۔ پیڈرو اور دلاور جلدی میں تھے اور پریشان تھے کہ اُن کا دھیان کیتھرین کی طرف نہیں گیا۔ وہ سیدھی بھاگتی گئی۔ یہاں تک کہ بے ہوش ہو کے گر پڑی۔ اُسے نہیں معلوم کہ بعد میں پیڈرو اور دلاور نے پانچوں مدد کرنے والوں کے ساتھ کیا سلوک کیا، اگر اُنھوں نے ایک کو مار دیا تھا تو شاید باقی کو بھی مار دیا ہو گا۔ راز کا راز رہنا اُن کے لیے زیادہ اہم تھا۔ گاؤں کے پانچ لونڈوں کا زندہ رہنا اتنا ضروری نہیں تھا۔"

"پھر کیتھرین سڑک تک کیسے پہنچی؟" میں نے کہا۔

"بہت دیر بعد اُسے ہوش آیا تو اُس نے سوچا کہ کہیں جنگل سے ہی میں نہ مر جاؤں" محسن بولا "وہ گرتی پڑتی سڑک تک لوٹ آئی لیکن اس جگہ سے کافی دُور جہاں حادثہ پیش آیا تھا، اُس نے اسٹیشن ویگن کو واپس جاتے دیکھ لیا تھا جس کا مطلب کیتھرین نے صحیح نکالا کہ ٹرک بھی لوڈ ہونے کے بعد روانہ ہو چُکا تھا اور وہ شاید دو تین گھنٹے کے وقفے سے دوبارہ سڑک پر آئی تھی۔ وہاں کسی آتے جاتے کا انتظار کرتی رہی تھی اور بالآخر بے ہوش ہو گئی تھی۔"

"اب جلدی سے بتا دے کہ وہ ٹرک کہاں گیا اور اسٹیشن ویگن کدھر گئی؟"

"کیتھرین نے جو کچھ سُنا اس کے مطابق ٹرک تو سیدھا ڈپو گیا" محسن نے کہا "ڈپو کے بارے میں ایک اشارہ یہ ملا تھا کہ وہ کسی پہاڑی کے قریب ہے یا اُس کے دامن میں ہے۔ اسٹیشن ویگن میں رابعہ اور ٹیڈی کو سڑک کے راستے کراچی لے جایا گیا ہے۔ کیتھرین کے فرار کا ان کو فوراً پتا چل گیا ہو گا اور دلاور نے پیڈرو کو ذمّے دار ٹھہرایا ہو گا تو پیڈرو نے ڈرائیور کو۔ اُن کے پاس وقت نہیں تھا ورنہ وہ اُسے ضرور تلاش کرتے۔ اپنی حماقت پر بہت پچھتائے ہوں گے کہ بڑھیا کو کمزور، بے وقوف اور بُزدل سمجھ کر بے ضرر مان لیا اور اُس کی طرف سے غافل ہو گئے۔"

"سب لوگ ہمیں گھُور رہے ہیں" میں نے کہا "خصوصاً مرزا غالب بہت خون آشام مُوڈ میں نظر آتے ہیں، اب بتا کرنا کیا ہے؟"

"میں نے کہا نا کہ ٹرک میں کیتھرین کو لاہور بھیج دیا جائے۔"

"اس کے ساتھ کون جائے گا؟" میں نے کہا "غالب؟"

"ہاں، غالب اس کے لیے ضروری طبّی امداد کا انتظام کرے گا، اُسے اس کی بیٹی سے ملوائے گا" محسن بولا "اور ہم دونوں آگے جائیں گے۔"

"نہیں، میں اور غالب آگے جائیں گے" میں نے یکلخت اپنا فیصلہ بدلتے ہوئے کہا "کیتھرین کو تُو لے جا، جو غالب کر سکتا ہے وہ تُو بھی کر سکتا ہے، تیری مدد کرنے والا ہمارا وکیل دوست عبدالودود منظر بھی ہے، کیتھرین اور جُولی کو وہاں چھوڑ دینا اور پھر شہلا سے مل کے آنا۔"

"نہیں یار" محسن نے تھوڑے سے تذبذب کے ساتھ کہا مگر میں دیکھ رہا تھا کہ شہلا سے ملاقات کے ذکر پر اُس کی صورت کے تاثرات کس طرح بدلے تھے۔

"بکواس مت کر خواہ مخواہ، کیا تیرا دل نہیں چاہتا اُسے دیکھنے کو؟"

"وہ تو چاہتا ہے" محسن آہستہ سے بولا۔

"تو پھر جا، شہلا سے مل، اُسے سب بتا، ہو سکے تو رضوی صاحب سے بھی ملنا مگر احتیاط ضروری ہے، اُن کی فرض شناسی بہت خطرناک چیز ہے۔ وہ پہلے تجھے بند کر دیں گے اور پھر کہیں گے کہ اب سناؤ بیٹے، خیریت سے تو ہو کہاں رہے اتنے دن؟ بہت یاد آتی تھی تمھاری۔"

محسن ہنس پڑا "میں اُن سے نہیں ملوں گا مجھے معلوم ہے کہ پھر میں واپس نہیں آسکتا۔ ہاں آنٹی سے ضرور ملوں گا، شاید کہیں سے انکل رضوی کو فون کر لوں۔ نازو اور اکرام شیخ کے گھر بھی جاؤں گا۔ فوزیہ کو بھی ٹیلی فون ضرور کروں گا اور سب کو تسلّی، تشفّی دے کر لوٹ آؤں گا۔ تم لوگ کہاں ملو گے؟"

"کراچی میں" میں نے کہا "نازو اور اکرام شیخ وہاں پہلے ہی موجود ہیں۔ بندرگاہ کا علاقہ بہت وسیع ہے۔ ان کو تلاش کرنا آسان نہیں ہو گا مگر وہ خود بھی ہماری جستجو اور ہمارے انتظار میں ہوں گے۔ تم میں سے کوئی نہ کوئی ایک دوسرے کو دیکھ لے گا۔ دو چار دن دیر میں پھرنے میں کامیابی کا امکان ہے، مگر بھیس بدل کے مت پھرنا۔ میں اور غالب ابھی تو آگے جا رہے ہیں، کوشش کریں گے کہ ایک ہفتے بعد تم سے کراچی میں ہی ملاقات ہو، اگر ایک ہفتے میں نہ آسکیں تو پندرہ دن انتظار کرنا۔ کراچی سے لاہور کال کی جا سکتی ہے۔ شہلا کو بتا دینا کہ تم لوگ کہاں ہو۔ ہم بھی کراچی پہنچنے کے بعد شہلا کو ہی فون کریں گے۔ وہ

تمہارا پتا ٹھکانا بتا دے گی۔"

"ایسا نہ ہو فون رضوی صاحب سُن لیں۔"

"یہ رسک تو لینا ہی پڑے گا۔" میں نے کہا۔ "احتیاطاً یہ ہو سکتی ہے کہ پہلے رضوی صاحب کے دفتر فون کیا جائے، وہ موجود ہوں تو گھر کال کی جائے۔"

"اب آپ دونوں برضا و رغبت حاضر ہوتے ہیں یا میں پاپوشِ خاص کے ساتھ تشریف لاؤں۔" غالب نے چلّا کے کہا۔ اس کے صبر کا پیمانہ بالآخر لبریز ہو گیا تھا۔

ہم واپس گئے اور ٹرک میں بیٹھ گئے۔ اب صبح کا اُجالا نمودار ہونے لگا تھا۔ جب ہم اس مقام تک پہنچے، جہاں ہم نے سائیکل چھوڑی تھی تو ٹرک پھر رُکا۔ ہم نے تازہ دودھ پیٹ بھر کے پیا پھر محسن کو الوداع کہا۔ مرزا غالب ہمارے مذاکرات کی تفصیل جاننے کے لیے بہت بے چین تھے مگر میں نے انھیں صبرِ جمیل کی تلقین کی۔ غالب سمجھ گیا تھا کہ ٹرک کی واپسی اور محسن کا کیتھرین کے ساتھ جانا کوئی مقصد رکھتا ہے اور ہم جو اتنی دیر تک الگ کھڑے باتیں کرتے رہے تھے تو ایک دوسرے کو لطیفے نہیں سُنا رہے تھے۔ دودھ والا بالکل خاموش تھا۔ وہ عقل مند آدمی تھا، اُسے لاہور جانے کے فیصلے سے یقیناً خوشی ہوئی ہوگی۔ اس کے چھ سو روپے کا منافع تو پہلے بھی محفوظ تھا۔ اب وہ خود کو بھی محفوظ سمجھنے لگا ہوگا اور اپنے ٹرک کو بھی، اور اس کا یہ اندیشہ مٹ گیا ہوگا کہ یہ پُراسرار لوگ اُسے کسی جگہ قتل کر کے پھینک دیں گے اور ٹرک لے جائیں گے۔

"اجی مرزا صاحب، وہ تو رہ گئے۔" میں نے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔

"کون رہ گئے؟" غالب بولا۔

"میرے کپڑے اور کلون؟" میں نے کہا۔ "وہ گوالا پہلوان لے گیا۔ اب مجھے اسی ڈیری فارم کی یونی فارم میں باقی زندگی گزارنا پڑے گی۔"

"اس میں سے بہت صحت مند جانوروں کی خوشبو آ رہی ہے۔" مرزا نے سائیکل اُٹھاتے ہوئے کہا۔ "اور چشمِ بددور تم کیا کسی بیل سے کم ہو؟"

"ذرا مجھ سے کہہ کے دیکھ کہ آ بیل مجھے مار۔" میں نے کہا۔

"آ بیل، سائیکل پر بیٹھ۔" غالب نے کہا۔

ہم اس چرخ چوں پطرس کی مشہورِ زمانہ سائیکل کی کزن پر سفر شروع کرنے ہی والے تھے کہ مخالف سمت سے ایک کار نمودار ہوئی۔ غالب نے سائیکل پھر پھینک دی۔ سورج نکل آیا تھا اور درختوں کے ابھی سائے لمبے تھے اور اندھیرے اُجالے کی کیفیت تھی لیکن سڑک پر دھوپ تھی اور چمکتی دمکتی کار پر سے کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔

"لو مرزا، تھا جس کا انتظار وہ شہکار آ گیا۔" میں نے کہا۔ "اس سے پہلے تو لفٹ مانگتے ہیں۔۔۔"

"اور اس کے بعد ہمیشہ کی طرح اس کے ساتھ وہی سلوک کرتے ہیں، جو عرب کے ساتھ اونٹ نے کیا تھا۔" غالب بولا۔ "اونٹ خیمے کے اندر مالک باہر۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس میں تمہارے ماموں چوہدری دلاور ہوں۔"

غالب سڑک کے کنارے واویلا کرنے لگا۔ پیٹ پکڑ کے دُہرا ہونے لگا اور ہاتھ ہلانے لگا۔ اُس نے اپنے منکے اور ساہوکاروں والے مُسے کے لوازمات تو اُتار پھینکے تھے مگر اس کا لباس وہی جوگیا تھا۔ میں نے بھی گوالے پہلوان کا سُوٹ چڑھا رکھا تھا، چنانچہ ہم دونوں خالص دیہاتی نظر آتے تھے اور یہ ہو سکتا تھا کہ کوئی مہذب شہری ہم جیسے کسی بیمار کو بھی اپنی صاف ستھری کار میں بٹھانا پسند نہ کرے، چنانچہ میں نے سڑک کے درمیان آ کے دونوں ہاتھ اُٹھائے اور دُہائی دینے لگا۔ گاڑی مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر ٹھہر گئی۔ ایک موٹی توند والے مغرور اور بدتمیز شخص نے باہر سر نکالا اور مجھے ایک گالی سے نوازا۔

"مرنے کی صلاح ہے، میاں جی؟ مجھے کیوں مصیبت میں ڈالتے ہو، مرو کسی ٹرک کے نیچے آ کے۔" وہ پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولا۔

"ٹرک تو ابھی تک کوئی نہیں آیا۔" میں نے معصومیت سے کہا۔ "بہت دیر سے کھڑے ہیں اور مرنے کی صلاح تو یہ میرا سالا کر رہا ہے۔"

"تو پھر مجھے کیوں روکا ہے؟ قبرستان لے جانا ہے کیا تمہارے سالے کو؟"

"نہیں جی، وہ تو آپ کو مجھے اور ہم سب کو چار بندے مونڈھوں پر چُک کے لے جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "آپ ہم کو آگے تک چھوڑ دو۔"

"آگے کہاں، آگے تو ساری دُنیا ہے؟" وہ بولا۔

"بس جی ڈالیاں سے آگے۔" میں نے کہا۔ گولے کی فراہم کردہ معلومات میرے کام آئیں۔ "سنگرالی۔۔۔"

"چلو بیٹھو۔" اُس نے بُرا سا منہ بنا کے پیچھے کا لاک کھول دیا۔ "میں بھی اتفاق سے سنگرالی ہی جا رہا ہوں، قسمت اچھی ہے تمہاری۔۔۔ لیکن میری سیٹ مت خراب کر دینا۔"

میں اور غالب پیچھے بیٹھ گئے۔ اس نامعقول شخص کے رویے پر مجھے بہت تاؤ آ رہا تھا اور میں اب اُسے تھوڑا سا شرمندہ کرنے کے مُوڈ میں تھا۔

"کیا آپ مُسلمان نہیں ہو جی؟" میں نے گاڑی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

اُس شخص نے مشتعل ہو کے میری طرف گردن گھمائی۔ "کیا مطلب ہے اس بات کا؟ میں تم کو سکھ نظر آتا ہوں؟"

"وہ۔۔۔ دراصل آپ نے پہلے گالی دی تھی۔" میں نے کہا۔ "مسلمان تو ملتے ہی پہلے السلام علیکم کہتے ہیں۔ یہ گالی کس مذہب کا سلام ہے؟"

"بک بک کرو گے تو اُتار دوں گا یہیں۔" وہ شرمندہ ہونے کے باوجود ڈھیٹ بن کے بولا۔

"اب تو مشکل ہے۔" غالب نے کہا۔ "ہم بیٹھ گئے تو بیٹھ گئے۔"

"ہاں، اب اُٹھائے تو بس اللہ ہی اُٹھائے۔" میں نے سر ہلایا۔

"اور دُعا ہے کہ آپ کو پہلے اُٹھائے۔" غالب بولا۔

"تم۔۔۔ مکار۔۔۔ فریبی۔۔۔!" اس نے گاڑی روک دی۔ "تم ہماری کار ڈھونگ رچا رہے تھے، نیچے اُترو۔"

"چلو پہلے تم اُترو۔" غالب نے دانت نکال کے کہا۔

"نہیں جی، پہلے آپ۔" میں نے کہا۔

"پہلے آپ۔" غالب بولا۔

"پہلے آپ۔"

"انھوں نے تم سے کہا ہے۔" غالب بولا۔

"نہیں، تم سے کہا ہے، پوچھ لو ان سے۔"

"لاحول ولا قوۃ، تم دونوں اُترو، دفع ہو جاؤ۔" وہ چلّا کے بولا۔

"دونوں؟ اچھا پہلے تم اُترو اور پھر ہمیں اُتارو۔" میں نے کہا۔ "ایسے تو ہم اُترنے والے نہیں ہیں۔"

"یا پھر جو جس کو اُتار دے۔" غالب نے سر ہلایا۔

"تم دو ہو، اس لیے بدمعاشی دکھا رہے ہو؟"

"نہیں، ایک کا مقابلہ ایک سے۔" غالب نے کہا۔ "پہلے مجھے اُتارو ورنہ میں تم کو اُتار دوں گا۔"

"یا میرے ساتھ مقابلہ کر لو۔" میں نے کہا۔

"مقابلہ؟ کیسا مقابلہ۔۔۔ تمہارے باپ کی گاڑی ہے کیا؟" اُس نے چیخ کر کہا۔

"بھائی جی! اس نے آپ کے باپ کا نام لیا ہے۔" غالب بولا۔ "اسے مارو۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس نے تمہارے باپ کو کہا ہے کاکا، تم مارو۔"

"مگر میرا باپ تو تمہارا بھی چاچا تھا۔"

"اور میرا باپ تمہارا تایا تھا۔"

"چلو پھر دونوں مل کے مارتے ہیں، پہلا مُکا تم مارو۔"

اُس نے ایک نظر ہم دونوں کی غیر سنجیدہ صورت کو دیکھا۔ ہم اُسے مارنے کے مُوڈ میں بالکل نہیں تھے لیکن وہ اشتعال میں آپے سے باہر ہو کے ہم پر ہاتھ اُٹھانے کی غلطی کر بیٹھتا تو اُسے یہ غلطی مہنگی پڑتی۔ اُس نے ہم دونوں کی جسمانی صحت پر غور کیا اور راست اقدام کو ملتوی کر دیا۔

"سمجھ لوں گا تم سے بھی۔" اُس نے غصّے میں گاڑی آگے بڑھائی۔

"آپ تو مجھے بہت بڑے سرکاری افسر معلوم ہوتے ہو۔" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔

"میں نہر کے محکمے کا اوورسیئر ہوں۔" وہ میرے خوشامدانہ لہجے سے متاثر ہو کے بولا۔

"بلے بلے۔۔۔ اوورسیئر۔" غالب نے کہا۔ "تنخواہ کتنی ہے تمہاری؟"

اوورسیئر نے پھر غصّے سے پلٹ کے کہا۔ "جاہل۔"

"یہ گاڑی کتنے کی ہوگی اوورسیئر صاحب!" میں نے کہا۔ "بالکل نئی ہے اور بہت بڑی ہے۔"

"بھائیا جی! سر بھی تو بڑی ہوگی۔" غالب بولا۔ "اس سے آمدنی بھی بڑی ہوگی، تنخواہ چھوٹی ہے تو کیا ہوا۔"

"سچ ہے کاکا، تنخواہ تو یہ ریٹائر ہونے تک جوڑتے رہتے۔ تب بھی آدھی کار ہی خرید پاتے یا بغیر انجن کی کار خریدتے۔" میں نے کہا۔

"اور اسے ایک ہارس پاور سے چلاتے۔" غالب بولا۔ "وہ گھوڑا کار کہلاتی۔ جیسے گھوڑا گاڑی ہوتی ہے یا موٹر کار ہوتی ہے۔"

اب اس کی صورت پر پہلی بار خوف کے آثار عیاں ہوئے۔ اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا لیکن وہ بیک ویو مرر میں ہماری صورتوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ "تم دونوں بہروپیے ہو۔" وہ بولا۔ "کون ہو تم لوگ؟"

"بھائیا جی۔" غالب نے ایک دم چیخ ماری۔ "وہ دیکھو، ایک ٹرک نیچے پڑا ہوا ہے، اُس کے ٹائر اُوپر لگے ہوئے ہیں۔"

"غالباً رات کو حادثہ ہوا ہے۔" اوورسیئر نے نسبتاً نرم لہجے میں اظہارِ خیال کیا۔ "مگر رات کو ادھر ٹرک کیوں آیا تھا؟"

"بے زبان جانور ہے، راستہ بھول گیا ہوگا۔" غالب بولا۔

اوورسیئر ہنسا۔ رویے کی یہ تبدیلی ظاہر کرتی تھی کہ وہ پریشان ہے۔ حرام کی دولت سے ایسی چمکتی دمکتی گاڑیاں خرید کر پھرنے والے ہمیشہ دو قسم کے لوگوں سے ڈرتے ہیں۔ انسدادِ رشوت ستانی والوں سے (بشرطیکہ وہ خود بھی رشوت نہ لیتے ہوں) اور ڈاکوؤں سے جو صرف اس تاک میں پھرتے ہیں کہ 'مالِ حرام بود بجائے حرام رفت' کے مقولے کو سچ ثابت کریں۔

"مگر ہم اُسے نہ پکڑنے والے لگتے تھے اور نہ لوٹنے والے۔" "تم لوگ بڑی دلچسپ باتیں کرتے ہو۔"

"ہاں جی، ہم اور بھی بہت کچھ کرتے ہیں، جو ہم نے ابھی تک آپ کے ساتھ نہیں کیا۔" میں نے کہا۔

اُس کا رنگ فق ہو گیا۔ "دیکھیں۔۔۔ میں معذرت چاہتا ہوں۔۔۔ میں نے آپ لوگوں کے ساتھ غلط رویّہ اختیار کیا، میں کچھ پریشان تھا۔"

"مقدر میں پریشانی اور پشیمانی ہو تو پیسہ بھی خوشی اور اطمینان نہیں دیتا۔" میں نے کسی فلسفی کی طرح کہا۔ "تم نے نہر کے پانی کو بیچ کر خوب مال کمایا، کسان خون پسینہ ایک کرتے رہے، تم نے ہمیشہ اس وقت نہر کا پانی روکا ہوگا جب اُنھیں فصل کے لیے پانی کی ضرورت ہوگی۔ نہر کی صفائی کے بہانے اور فصلوں کی تباہی کے ڈر سے جب ان غریب محنت کشوں نے، جن [illegible] ہوئی گندم تمہارے اور تمہارے بچوں کا پیٹ بھرتی ہے، تم کو منہ [illegible] پیش کر دیا ہوگا تو نہر میں پانی آ گیا ہوگا۔ تم نے باری کے [illegible] جاگیرداروں کے لیے نہر کاٹ دی ہوگی اور اُن سے بھی انعام و اکرام وصول کیا ہوگا مگر اتنی دولت سے تم کو کیا ملا، یہ ڈھول جیسی توند۔۔۔ پکڑے جانے کا خوف، اولاد کے سامنے شرمندگی، بیوی کے سامنے شرمندگی، جن کو اچھی طرح معلوم ہوگا کہ تمہاری تنخواہ کتنی ہے اور تم ہر ماہ کتنے لاتے ہو، تم نے اُن کے خون میں حرام رزق ملایا، انھیں بے غیرتی کے ساتھ عیاشی کرنا سکھایا، اب تم کو بلڈ پریشر یا ذیابیطس ہوگی کیونکہ تم مرغن غذاؤں سے پیٹ کا دوزخ بھرتے رہے، تمہارا کولیسٹرول لیول اتنا اونچا ہوگا کہ ہر وقت ہارٹ

فیل ہونے کے خیال سے تمہارا دل لرزتا ہوگا مگر تمہاری اولاد منتظر ہو گی کہ تم مرو تو تمہاری لاکھوں کی جائداد اُنھیں ملے۔"

اُس کا نروس بریک ڈاؤن ہونے لگا۔"خدا کے لیے ایسی باتیں مت کرو، مجھے معلوم ہوگیا ہے کہ تم سی آئی ڈی کے آدمی ہو۔"

"ہم صرف آدمی ہیں، اے بی سی ڈی نہیں ہیں۔" غالب بولا۔

"آپ لوگ یہاں کس سلسلے میں تشریف لائے ہیں؟" وہ بولا۔"یقیناً کوئی سنگین کیس ہوگا؟"

"سنگین کیس تو تم بھی ہو۔" میں نے کہا۔"لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ تم کو اپنے اعمال کی سزا مل رہی ہے اور ملتی رہے گی۔ دُنیا میں الگ اور آخرت میں الگ، اس لیے ہم تمہارا نام بھی نہیں پوچھیں گے۔"

"ویسے نام پوچھے بغیر بھی تمہارا پتا معلوم کرنا ہمارے لیے مشکل نہیں کیونکہ کار کا نمبر ہم نے دیکھ لیا ہے۔" غالب بولا۔"ممکن ہے یہ تمہاری بیوی کے نام پر ہو یا بیٹی کے نام پر لیکن پتا شاید تمہاری ہی کسی کوٹھی کا ہوگا۔ اُس کوٹھی کا جس میں تم رہتے ہو، یا اُس کا جو تم نے کرائے پر اُٹھا رکھی ہے۔"

"کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم سے مت ڈرو۔" میں نے کہا۔"ڈرنا ہے تو اللہ سے ڈرو یا اپنے ضمیر سے ڈرو اور اپنے انجام سے ڈرو، ہمیں تو چند سوالوں کے جوابات سے غرض ہے۔"

"کیسے سوالات؟" وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولا اور اُس نے گلوز کمپارٹمنٹ میں سے نائٹرو گلیسرین کی ایک گولی نکال کر زبان کے نیچے رکھی۔ یہ صاف انجائنا کی علامت تھی۔ ہماری باتوں کی دہشت نے اُس کے دل پر جُرم کے احساس کا دباؤ بڑھا دیا تھا۔

"اس علاقے کے جغرافیے سے تم اچھی طرح واقف ہو؟"

اُس نے اقرار میں سر ہلایا۔"یہاں میرا تیسرا سال ہے۔"

"گڈ! پھر تو تم گاؤں، دیہات کے لوگوں سے بھی واقف ہوگے۔" میں نے کہا۔"یہ بتاؤ کہ اس سڑک کے دونوں جانب کتنے گاؤں ہیں، جہاں گاڑی جا سکتی ہے؟"

"ایسے دو ہی گاؤں ہیں۔" وہ بولا۔"چک گوہراں اور سنگرالی، جو آخری گاؤں ہے۔ ڈالیاں خورد کو ہم پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔"

"اچھا یہ سڑک کہاں تک جاتی ہے؟"

"سرحد پار تک۔" وہ بولا۔"درمیان میں نہر آئے گی، اس کے بعد بھی کچھ علاقہ پاکستان کا ہے پھر درمیان میں وہ جگہ ہے جو کسی کی نہیں ہے۔"

"نو مین لینڈ۔" میں نے کہا۔

"یس... یس۔" وہ میری انگریزی سے زکس ہوا۔"اس کے بعد انڈین ٹیریٹری شروع ہو جاتی ہے۔"

"بارڈر پر پوزیشن کیا ہے؟" غالب نے کہا۔"دونوں طرف فوج رہتی ہے یا دستے گشت کرتے ہیں؟"

"بھارت کی طرف انڈین بارڈر فورس کے دستے کبھی کبھار آجاتے ہیں، ورنہ سرحد کھلی ہی رہتی ہے۔" وہ بولا۔"میرا مطلب ہے ایسی کوئی رکاوٹ نہیں ہے، یہی حال اِدھر کا ہے۔ رینجرز پھرتے رہتے ہیں لیکن دونوں طرف کے گاؤں کے لوگ آتے جاتے رہتے ہیں، کبھی اِدھر کے مویشی اُدھر چلے گئے تو دو چار آدمی لینے پہنچ گئے، کبھی اُن کو اناج کی ضرورت پڑ گئی تو وہ آ گئے۔"

"اور اُن کو روکنے والا کوئی نہیں؟"

"وہ اسمگلر تو ہیں نہیں، بارڈر سیکورٹی فورس والے بھی یہ بات سمجھتے ہیں۔ رینجرز بھی۔" اوور سیئر نے کہا۔"کبھی مُوڈ ہو تو واپس بھی کر دیتے ہیں لیکن دونوں میں ایسے بہت سے وقفے آتے ہیں، جب سرحد کے پار بلا روک ٹوک آنا جانا مشکل نہیں ہوتا۔ کیا بارڈر پر کوئی خطرہ ہے؟"

"بارڈر پر ہمیشہ خطرہ رہتا ہے۔" میں نے گول مول جواب دیا۔

"آپ لوگ کس مشن پر آئے ہیں آخر؟" وہ بولا۔

"مسٹر اوور سیئر!" میں نے سخت لہجے میں اچانک انگریزی شروع کر دی۔"آپ نے آفیشل سیکریسی ایکٹ پڑھا ہے۔ سال میں دو بار سرکاری ملازم سے دستخط لیے جاتے ہیں کہ وہ اس ایکٹ کی دفعات سے واقف ہیں مگر یہ صرف کاغذی کارروائی ہوتی ہے۔ شاذ و نادر ہی کسی نے اس ایکٹ کا مطالعہ کیا ہوگا مگر قانون میں ناواقفیت کا عذر قبول نہیں ہوتا۔ یہ طے شدہ ہے کہ اَن پڑھ دیہاتی بھی قتل کرے تو ضابطۂ فوجداری کی دفعہ تین سو دو سے ناواقفیت کا عذر پیش کر کے بچ نہیں سکتا۔ ہم ملٹری انٹیلی جنس کے لوگ ہیں چنانچہ ہم تو کسی پر اپنی شناخت تک ظاہر نہیں کر سکتے۔ آپ چونکہ ایک ذمّے دار سرکاری ملازم ہیں، اس لیے آپ کو صرف اتنا بتایا جا سکتا ہے کہ ہم ایک ٹاپ سیکرٹ مشن پر ہیں مگر آپ سے توقع کی جاتی ہے کہ آپ کسی سے کچھ نہیں کہیں گے، یہ بھی نہیں کہ آپ ہم سے ملے تھے، رائٹ؟"

"یس... یس سر!" گالی دینے والا اب سر کہنے پر آ گیا تھا۔

"یہ کبھی نہ بُھولیں کہ ہم کسی بھی وقت آپ کو اُٹھوا سکتے ہیں۔" غالب نے بھی رواں انگریزی میں کہا۔"راستے سے یا گھر سے اور افشائے راز کی صورت میں آپ سے شاہی قلعے کے ٹارچر سیل میں وہ بھی پوچھا جا سکتا ہے، جو آپ نہیں جانتے۔ آپ ہمیشہ کے لیے گم بھی ہو سکتے ہیں۔"

خوف سے اوور سیئر کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔"میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میری زبان سے ایک لفظ نہیں نکلے گا۔ میرے لائق اور کوئی خدمت ہو تو ضرور بتائیں۔"

"آپ کی خاموشی ہی فی الحال بہترین خدمت ہے۔" میں نے کہا۔"بس ہر روز واپسی پر دیکھ لیا کیجیے، ممکن ہے ہم پھر آپ سے لفٹ مانگیں۔"

"میں عموماً شام کو پانچ بجے واپس جاتا ہوں۔" وہ بولا۔"میں خیال رکھوں گا۔"

"کیا اس طرف کوئی پہاڑ ہے؟" میں نے کہا۔

اُس نے نفی میں سر ہلایا۔"ایک پہاڑی ہے، مشکل سے دو سو فٹ اُونچی، اگر آپ نہر کے کنارے پر چلتے جائیں تو سات میل کے بعد نہر دائیں طرف مُڑ جاتی ہے۔ پہاڑی اسی موڑ پر ہے۔ وہاں جنگل بھی خاصا گھنا ہے۔ رات کو بھیڑیے بھی پھرتے ہیں۔"

"گرد و نواح میں کوئی آبادی نہیں؟"

"نہیں، پہلے وہاں ایک چھوٹا سا دیہہ تھا، چک مولا داد۔" اوور سیئر نے کہا۔"ستمبر ۶۵ کی جنگ میں وہاں گولے گرے، آدھے سے زیادہ گھر تباہ ہوگئے اور کافی لوگ مارے گئے پھر وہاں ایک چھوٹا سا آرڈیننس ڈپو قائم ہوا تو پولیس نے وہ علاقہ خالی کرا لیا۔ آس پاس ایک میل کے رقبے میں بورڈ لگے ہوئے ہیں، جن پر لکھا ہے 'علاقہ ممنوعہ' چنانچہ اُدھر کوئی نہیں جاتا۔"

"یعنی سرحد پر آرڈیننس ڈپو؟" میں نے حیرانی سے کہا۔"آپ تو ملٹری انٹیلی جنس کے لوگ ہیں، آپ کو معلوم ہونا چاہیے۔"

"معلوم ہے، اسی لیے تو کہہ رہے ہیں۔" میں نے جلدی سے بات بنائی۔"میری معلومات کے مطابق یہاں ایسا کوئی سب ڈپو بھی نہیں۔"

"میرے علم میں بھی نہیں۔" غالب نے میری تائید کی۔

"کیا آپ نے کبھی یہاں ملٹری کی موومنٹ دیکھی ہے؟" میں نے کہا۔"اگر کہیں آرڈیننس یا ایمونیشن سب ڈپو ہو تو لازماً وہاں ملٹری کے لوگ آئیں گے، جائیں گے، گاڑیاں آتی جاتی دکھائی دیں گی۔"

اوور سیئر نے نفی میں سر ہلایا۔"میں نے کبھی نوٹ نہیں کیا۔ نہر سامنے آگئی ہے اب مجھے بائیں طرف جانا ہے۔ سنگرالی تین میل دُور ہے۔"

"آپ کا آفس سنگرالی میں ہے؟"

"ہاں آفس کیا ہے، ایک ریسٹ ہاؤس کا کمرا ہے۔" وہ بولا۔

"ریسٹ ہاؤس محکمۂ انہار کا ہے؟"

"نہیں محکمۂ جنگلات کا۔" وہ بولا۔

"وہاں ٹیلی فون ہے؟" غالب نے کہا۔

"ہے مگر بہت کم ٹھیک ملتا ہے۔" وہ بولا۔"خراب ہو جائے تو مہینہ لگ جاتا ہے ٹھیک ہونے میں مگر ہم اپنا کام دوسری طرح چلاتے ہیں۔"

"دوسری طرح کیسے؟"

"ڈائریکٹ لائن سے۔" وہ بولا۔"ہمارے پاس وہ پورٹیبل ٹیلی فون انسٹرومنٹ ہے، جو ٹی اینڈ ٹی کے لائن مین لیے پھرتے ہیں۔ ایک میل پیچھے جنکشن باکس ہے، وہاں سے پیٹر ملا کے بات کر لیتے ہیں، اب کیا کریں مجبوری ہیں... خلافِ قانون تو ہے لیکن آپ لوگوں کو اس لیے بتا رہا ہوں کہ کبھی ایمرجنسی ہو تو بندہ خدمت کے لیے حاضر ہے۔"

"تھینک یو۔" میں نے کہا۔"آپ ہمیں اسی جگہ اُتار دیں۔"

اُس نے گاڑی روک دی اور خود بھی نیچے اُتر آیا۔"اُمید ہے آپ لوگوں نے میری گستاخی کو معاف کر دیا ہوگا۔"

"فارگیٹ اِٹ۔" میں نے کہا۔

"بٹ ڈونٹ فارگیٹ دی آفیشل سیکریسی ایکٹ۔" غالب نے کہا اور اپنی جیب سے ریوالور نکال کر قمیص سے صاف کیا۔ اوور سیئر مجھ سے ہاتھ ملا رہا تھا۔ میں نے اُس کے ہاتھ میں واضح لرزش محسوس کی۔ جن کو اُس نے احمق دیہاتی سمجھا تھا، وہ انتہائی خطرناک قسم کے کمانڈوز تھے۔ یہ تجربہ شاید اُسے پہلی بار ہُوا تھا کہ دھوتی کرتے والے پینڈو، جو احمق نظر آتے تھے، فر فر انگریزی بولنے لگے تھے اور اُن کے پاس سروس ریوالور بھی تھے۔ غالب کے پاس سراج کا ریوالور تھا جو فوج یا پولیس کو ہی ملتا ہے۔ اوور سیئر کو ہمارے بارے میں کوئی غلط فہمی تھی تو وہ پوری طرح رفع ہو چکی تھی۔

اُس کی گاڑی نہر کے کنارے کنارے چلنے والی کچی سڑک پر دھول اُڑاتی نظروں سے غائب ہوگئی تو ہم نہر سے ذرا فاصلے پر درختوں کے پیچھے مخالف سمت میں روانہ ہوگئے۔

"وہ ٹرک دلاور اینڈ کمپنی کا ہی ہوگا۔" غالب بولا۔

"اسے وہ لاوارث چھوڑ گئے۔"

"اور کیا کرتے اس کے لیے کرین منگواتے، ایسا کوئی کام دن میں ہوتا ہے۔" غالب بولا۔"ممکن ہے آج رات اُٹھوا لیں۔"

"ٹرک اُن کے لیے اتنا اہم تو نہیں ہوگا، اگر وہ چاہتے تو اُسے آگ لگا کے جا سکتے تھے۔" میں نے کہا۔

"تاکہ آگ پورے جنگل کو لپیٹ میں لے لیتی۔" غالب نے میری عقل پر اظہارِ افسوس کے لیے سر ہلایا۔

"اس آرڈیننس سب ڈپو کے بارے میں میرا خیال ہے کہ یہ دلاور اینڈ کمپنی کا ٹرانزٹ ڈپو ہے۔" میں نے کہا۔"جہاں مال آ کر دن ٹھہرتا ہے اور پھر سرحد پار چلا جاتا ہے۔"

"اور یہ ایک ٹرانزٹ ڈپو ہے۔" غالب نے کہا۔"ایسے اور بھی ہوں گے۔"

"یقیناً ہوں گے اور ایسے ہی مقامات پر ہوں گے، جو بارڈر سے نزدیک ہوں گے اور جہاں گرد و نواح میں آبادی نہیں ہوگی... یا ہوگی تو اسی طرح خالی کرالی گئی ہوگی۔"

"کل رات جس ٹرک میں مال آیا تھا وہ راتوں رات ڈپو میں پہنچا دیا گیا ہوگا اور غالباً ابھی وہیں ہوگا۔" میں نے کہا۔"رات کو وہ لیٹ ہو گئے تھے پھر بھی وہ ساڑھے تین، چار بجے تک ڈپو پہنچ گئے ہوں گے، اگر ان کو 'اَن لوڈ' کرنے میں دو تین گھنٹے لگے ہوں تو چھ سات بجے تک وہ تمام مال اپنے ڈپو میں پہنچا کے فارغ ہوئے ہوں گے۔ اب بجے ہیں ساڑھے سات اور میرا حساب کہتا ہے کہ آٹھ بجے تک ٹرک کو اِدھر سے واپس جانا چاہیے۔"

"رائٹ۔" غالب نے چٹکی بجائی۔"کیا ہم کوئی ایسی پوزیشن لے کر بیٹھ سکتے ہیں، جہاں سے ہم ٹرک کو پہلے سے دیکھ سکیں اور اس کا نمبر بھی نوٹ کر سکیں۔"

اس کے لیے بیٹھنے کی کیا ضرورت ہے۔" غالب نے کہا۔"نہر کے کنارے چلتے ہیں، اس حُلیے میں ہمیں کون قابلِ غور سمجھے گا؟"

"پیڈرو کی نظر ہمیں سات پردوں میں دیکھ سکتی ہے۔"

"بشرطیکہ اُسے سات پردوں میں ہمارے پوشیدہ ہونے کا شک ہو۔" میں نے کہا۔"ابھی اُس کے خواب و خیال میں بھی نہیں آ سکتا کہ اس جگہ ہم گھومتے

ہوئے مل جائیں گے۔ اتنی دُور افتادہ جگہ پر کوئی آسانی سے نہیں پہنچ سکتا۔ یہ پینڈو کو کیا معلوم کہ ہم کتنے مرحلوں سے گزر کے کس طرح ان کے سرحدی اڈے تک آئے ہیں۔ آتے جاتے وہ راستے پر ضرور نظر رکھتے ہوں گے۔ کل رات انہوں نے اپنے ایک ٹرک کے سوا سڑک پر کچھ نہیں دیکھا ہوگا۔"

ہم پلیں نہر کے پُشتے والی سڑک پر چلنے لگے۔ نہر میں پانی بڑے سکون سے بہہ رہا تھا، جو دیکھنے میں تھوڑا سا گدلا تھا۔ ایک جگہ ہم نے گاؤں کی عورتوں کو کپڑے دھوتے دیکھا۔ دوسری جگہ نہر میں چار بھینسیں اور ایک بچہ نہا رہا تھا۔ بچہ چودہ پندرہ سال کا تھا اور جیسے بھینسوں کو اپنی عریانی کا احساس نہیں تھا، ایسے ہی اس کو بھی نہیں تھا۔

"کاکا جی!" میں نے اُسے مخاطب کیا "کیہڑے پنڈ دا رہن والا ایں توں؟"

اُس نے ہاتھ سے پیچھے اشارہ کیا "اوہ پراں ویکھو۔"

پیچھے دیکھنے پر ہمیں درختوں اور جھاڑیوں سے چند کچے گھر جھانکتے دکھائی دیے۔

"کیا ہمیں اس آبادی سے رجوع کرنا چاہیے؟" میں نے کہا "وہاں کچھ نہ کچھ کھانے کو ملے گا؟"

"اور ریٹر نے تو کہا تھا کہ آس پاس آبادی کوئی نہیں" میں نے کہا۔

"اُس نے کہا تھا کہ پہاڑی کے آس پاس ایک میل کا علاقہ ممنوعہ ہے اور ہم ابھی اس پہاڑی سے پانچ میل دُور ہیں" غالب بولا۔

"میں بھی اُردو بول سکتا ہوں" لڑکے نے پانی سے باہر آکے اپنی نیکر پہنتے ہوئے کہا "تم اس پہاڑی کی طرف جا رہے ہو، مرنے کے لیے؟"

"مرنے کے لیے کیوں؟" میں نے کہا۔

"جو بھی اِدھر گیا، وہ زندہ نہیں آیا" لڑکے نے انکشاف کیا اور اُن سب کے نام گنوانے لگا، جو اپنی جان گنوا چکے تھے۔ اس میں لڑکے کا چاچا بھی شامل تھا۔

"کیا اس میں جن ہیں؟" میں نے کہا۔

لڑکا ہنس پڑا "جن پہاڑوں پر نہیں رہتے، قبرستان میں یا پیپل کے درخت پر رہتے ہیں، تم کو اتنا بھی نہیں معلوم؟"

"ہم واقعی ابوجہل ہیں" میں نے کہا "تم بتاؤ کہ تمہارے چاچے کے ساتھ کیا ہوا تھا؟"

"اُسے شیر نے کھا لیا ہوگا" لڑکا بولا۔

"شیر نے؟" میں اور غالب بیک وقت بولے۔

"ہاں ہاں شیر نے، اب آدمی تو شیر کو کھا نہیں سکتا" وہ بولا "اور وہ تو ہے ہی آدم خور شیر۔"

"مگر دوست! شیر اس علاقے میں کہاں سے آیا؟" میں نے کہا۔

"تم اس علاقے میں کہاں سے آگئے ہو؟" لڑکا بولا اور اس کی تیزی طراری نے مجھے تھوڑا سا حیران کیا۔ عقل سے بڑی چیز کے ساتھ غسل کرنے والا اتنا افلاطون ہوگا، یہ میرے لیے اچنبھے کی بات تھی۔

"میرا مطلب یہ تھا کہ شیر پاکستان میں کہیں بھی نہیں ہیں، چھانگا مانگا میں بھی نہیں ہیں" میں نے اُسے سمجھایا۔

"اچھا تو پھر شیر سے ہی پوچھ لینا کہ وہ کہاں سے آیا ہے" لڑکے نے بحث ختم کر دی اور اپنی بھینسوں کو پانی سے نکالنے کے عمل میں مصروف ہوگیا۔

"یہ تو بتاتے جاؤ کہ تمہارے پنڈ میں کوئی دُکان ہے؟" میں نے کہا "جہاں سے کوئی سگریٹ، چائے، روٹی شوٹی مل جائے۔"

"ماسے دی ہٹی ہے" وہ بھینسوں کے پیچھے روانہ ہوگیا "سگرٹ مل جائے گی، چائے نہیں ملے گی، روٹی سب کے گھر پکتی ہے۔"

"سُنا آپ نے، روٹی مانگ کر کھائیے۔ یہ شہر نہیں ہے قبلہ" غالب نے کہا "آپ کسی کے بھی مہمان ہو سکتے ہیں۔ چائے کا فیشن ابھی یہاں نہیں پہنچا، پانی لسی پی کر جان بنائیے۔"

"صبح جو خالص دودھ پیا تھا، وہ تو ہضم ہوگیا" میں نے کہا "آگے پانچ میل تک کھانے کو صرف دھول ہوگی اور پینے کو یہ نہر کا آمیزہ، جس میں حضرات اور خواتین غسل کے علاوہ بھی بہت کچھ کرتے ہیں، وہ سب کچھ جو بھینسیں کر سکتی ہیں۔"

ٹرک بہت دُور ایک گردباد کی طرح نمودار ہوا، میں اور غالب ٹھٹک گئے۔

"اب کیا کریں؟ کسی درخت پر چڑھ جائیں؟" غالب نے کہا۔

"نہیں، پانی بہتر پناہ گاہ ہے، غسل بھی ہو جائے گا۔"

"ایک حمام میں سب..." غالب نے کہا اور دو منٹ میں ہم کپڑے کنارے پر رکھ کر نہر میں کود گئے۔ ٹرک کے آنے تک ہم نے واقعی غسل کیا اور اُس ٹھنڈے پانی نے جسم کو بڑی فرحت دی۔ میں اور غالب سر کو پانی کے نیچے غائب رکھنے کے مقابلے میں مصروف رہے۔ ٹرک ہم سے پچاس گز دُور تھا، جب ہم نے ڈُبکی لگائی اور نیچے ہی نیچے تیر کر دس گز پیچھے گئے۔ ہم نے اُس وقت سر نکالا جب ٹرک ہمارے سامنے سے گزر چکا تھا۔ میں نے اُس کے پیچھے لگی ہوئی کمرشل نمبر پلیٹ کو دیکھا، یہ نمبر بوگس بھی ہو سکتا تھا لیکن میں نے حفظ کر لیا۔ ٹرک کسی پرائیویٹ کمپنی کا تھا اور اُس پر بہت اعلیٰ مصوری کے نمونے تھے۔ ایک عورت بڑے ہیجان انگیز پوز میں ایک شیر کے مقابل کھڑی ہوئی مسکرا رہی تھی۔ شیر کی تین ٹانگیں تھیں اور وہ عورت پر جست لگا رہا تھا۔ غالباً مصور چوتھی ٹانگ میں رنگ بھرنا بھول گیا تھا۔ درمیان میں ایک خوفناک مونچھوں اور مختصر ترین لنگوٹی والا پہلوان بہت بڑا گُرز اٹھائے کھڑا سوچ رہا تھا کہ کسے متوجہ کرے، شیر کو یا عورت کو۔ پہلوان کے سر پر تاج تھا اور تاج پر لکھا ہُوا تھا "مرحوم والد صاحب حاجی قمر دین انبالے والے عرف بونگا پہلوان رستمِ انبالہ گولڈ میڈلسٹ۔"

یہی سب کچھ مرزا غالب نے بھی دیکھا اور نہر سے باہر نکلنے کے بعد مجھے بتایا۔ البتہ اُس نے مجھ سے چند سیکنڈ پہلے سر نکالا تھا اور یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ ٹرک 'گولڈن انبالہ گڈز فارورڈنگ ایجنسی گوجرانوالہ' کا ہے۔ ہمارے درمیان خاصا اتفاقِ رائے تھا کہ یہ ٹرک دلاور اینڈ کمپنی نے کرائے پر لیا تھا چنانچہ اُس کا نمبر وغیرہ سب اصلی ہوگا۔ شاید وہ اس طرح خود کو شک اور مصیبت سے محفوظ رکھتے تھے، اگر ٹرک پکڑا جائے تو وہ صاف بچ جائیں لیکن اس طرح ہمارے ہاتھ ایک اہم سُراغ لگ گیا تھا۔ یہ فرض کرنا تو محال تھا کہ اس ٹرک کمپنی کے مالک یا ڈرائیور کو مال کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوگا۔ مالک کی بے خبری کو تسلیم کیا جا سکتا تھا مگر ڈرائیور سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہوگی کہ وہ کیا مال لے کر جا رہا ہے۔ اُسے اندھیرے میں رکھ کے کوئی غلط کام نہیں ہو سکتا۔ جب کوئی پیاز کا آڑھتی کراچی پیاز لے جانا چاہے تو یہ ناممکن ہے کہ ٹرک میں چرس بھر کے لے جائے۔ اس طرح تو ہمیشہ ڈرائیور ہی پکڑے جاتے ہیں، اصل مجرم یہ کہہ کے الگ ہو جائیں کہ جی ہم کیا جانیں، اس نے راستے میں کیا کیا، یہاں سے تو پیاز بھیجی گئی تھی، ملاحظہ ہو رسید۔

لیکن ڈرائیور کو بتا دیا جائے کہ پیاز کے بہانے چرس لے جانا ہے تو وہ خود ذمے دار ہوتا ہے اور چونکہ راستوں پر سے اُس کا روزگار ہوتا ہے اس لیے جو ڈرائیور غلط کام کرتے ہیں، وہ غلط قسم کے راستے روکنے والوں کو بھی جانتے ہیں اور ان کی فیس بھی جانتے ہیں سو وہ اپنے کام کا معاوضہ الگ لیتے ہیں اور ظاہر ہے چرس لے جانے کا معاوضہ وہ نہیں ہوتا، جو پیاز لے جانے کا ہوتا ہے۔ پیاز ہر للو کلو ڈرائیور لے جا سکتا ہے، چرس لے جانے والے خاص لوگ ہوتے ہیں۔ اپنی فیلڈ کے اسپیشلسٹ اور ٹرک تو ایک ہی چلاتے ہیں لیکن فائدے کی مناسبت سے اپنا معاوضہ دس گنا تک طلب کر سکتے ہیں پھر راستے کی رکاوٹیں دُور کرنے کا جو نذرانہ ہو، وہ خریدار کے کھاتے میں۔ ایسی صورت میں مالک بے چارہ تو یہی سمجھا رہتا ہے کہ ٹرک میں پیاز کراچی گئی ہے مگر ٹرک جا رہا ہوتا ہے کسی اور سمت میں کچھ اور لے کر۔

چنانچہ طے شدہ طور پر ڈرائیور ہیرا پھیری کے ہر کاروبار میں ایک فریق ہوتا ہے۔ ٹرک کا نمبر اور کمپنی کا نام ہمارے پاس تھا۔ یہ معلوم کرنا بہت آسان تھا کہ فلاں دن اس ٹرک کو لے کر کون گیا تھا۔ وہ ڈرائیور بہت کچھ بتا سکتا تھا مگر گزشتہ رات اُس نے جو کچھ دیکھا اور سُنا سب اُس سے معلوم ہو سکتا تھا۔ وہ اس سے زیادہ بھی بتانے کی پوزیشن میں تھا کیونکہ وہ دلاور کے نزدیک 'خاص آدمی' تھا جس پر وہ بھروسا کرتا تھا اور یہ پہلی بار نہیں ہوگا کہ دلاور نے اس کی خدمات ایمرجنسی میں حاصل کی ہوں۔ ایسا پہلے بھی ہوا ہوگا۔

اپنا لائحہ عمل مرتب کرنے کے بعد ہم اُس گاؤں میں گئے جو نہر کے دائیں کنارے پر ایک ڈیڑھ فرلانگ دُور نظر آیا تھا۔ اُسے پنڈ کہنا کسی قصبے کو شہر کا درجہ دینے کے مترادف تھا، وہ مشکل سے چک کے معیار پر پورا اُترتا تھا۔ آبادی میں شاید پچاس گھر ہوں گے یا اس سے بھی کم اور ان سب کی ضروریات ماسے دی ہٹی سے پوری ہو جاتی تھیں۔ ہر گاؤں کی طرح یہ بھی ڈیپارٹمنٹل اسٹور قسم کی چیز تھی، جہاں انسان اور مویشیوں کی ضروریات کا سامان ایک ہی جگہ ملتا تھا۔ انسانوں کے لیے دال چاول تو مویشیوں کے لیے کھل، سوڑی، انسانوں کے لیے کلہاڑی تو مویشیوں کے لیے زنجیر...

وہاں ہمیں پھر کنگ اسٹارک سگریٹ ملے۔ ایک بات نام کی مقبولیت کی تھی تو دوسری بات کم لاگت ہونے کی تھی کہ سارس برانڈ سگریٹ عوام کے نچلے طبقے میں ہر جگہ پیے جاتے تھے، اس سے اُوپر قینچی یا پاسنگ شو کے سگریٹ تھے، جو نسبتاً خوشحال لوگ پیتے تھے۔ سب سے اُوپر گولڈ فلیک کا سُنہرا پیکٹ تھا یا تھری کاسل کا خوبصورت نقشین پیکٹ اور اُس زمانے میں وہی ایک سگریٹ تھا جو بیس کی جوڑی انٹرنیشنل پیکنگ میں دستیاب تھا۔ گاؤں کے لوگ بہرحال کنگ اسٹارک یا قینچی مارکہ سے آگے کچھ نہیں جانتے تھے۔ لائف بوائے کا صابن اور ایک آنے والی لپٹن کی چُورا چائے کی تھیلی بڑے شوق سے خریدتے تھے، جو دکانوں پر ہار کی طرح لٹکی دکھائی دیتی تھی۔

گاؤں والے اتنے ہی سادہ دل اور مہمان نواز تھے، جتنے عموماً ہوتے ہیں۔ ہمیں مقامی زمیندار نے مسافر جان کے روٹی کھلائی۔ وہ اس گاؤں کے واحد پکے مکان میں رہتا تھا، اگر ہم اس دیہاتی حُلیے میں نہ آتے بلکہ پتلون میں آتے یا غلطی سے بھی آپس میں انگریزی بولنے لگتے تو ایک دم وی آئی پی ہو جاتے پھر وہ ہمارے لیے کُکڑ پکواتا اور حلوا۔ ہم بالکل نمایاں ہونا نہیں چاہتے تھے چنانچہ ہم پڑوس کے گاؤں ٹوالیاں خورد کے باسی بن گئے، جن کو سنگرالی جانا تھا۔ اس طرح ہم ایک گھنٹے میں پھر اپنی راہ پر گامزن ہونے میں کامیاب رہے۔ پیٹ بھر گیا تھا اور اب ہم دو دن بھوکے رہ سکتے تھے۔ اس زندگی نے ہمیں فاقے جھیلنے کا عادی بنا دیا تھا۔ سگریٹ سے عیاشی کا کچھ سامان ہو گیا تھا۔ لسی سے چائے کی طلب پوری نہیں ہوئی تھی۔ ہم نے دل کو تسلی دے لی تھی کہ دُنیا میں کسی کو مانگنے سے سب کچھ نہیں ملتا۔

ہمارا راستہ بالکل سیدھا تھا۔ نہانے اور کھانے سے ہم تازہ دم ہو گئے تھے۔ ڈیڑھ گھنٹے میں ہم نے چار میل کا فاصلہ طے کیا۔ اس تمام راستے پر ہمیں کوئی بھی نہیں ملا پھر وہ موڑ آیا جہاں سے نہر دائیں طرف جاتی تھی اور پہاڑی جو ابھی تک درختوں کے پیچھے اوجھل تھی، اچانک ہماری نظروں کے سامنے آگئی۔ وہیں ہم نے 'علاقہ ممنوعہ' کا پہلا سائن بورڈ دیکھا۔ راستہ اب بھی نہر کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا اور ہم چلتے جاتے تو پہاڑی تک پہنچ جاتے لیکن یہ احتیاط کے تقاضوں کے خلاف ہوتا۔ اگر یہ ایک اہم ڈپو تھا تو یقیناً یہاں حفاظتی انتظامات بھی خاصے سخت ہوں گے۔ محافظ ہر وقت راستے کی نگرانی کرتے ہوں گے اور دُوربین سے آس پاس کے سارے علاقے کو چھانتے رہتے ہوں گے۔

"اس وقت آگے جانا خطرے سے خالی نہیں" غالب بولا "شکاری تاڑ جائیں گے کہ آگئے ایم آر ایس کے مجاہدین خودکشی فرمانے۔"

"شہید ہونے" میں نے فوراً اس کی تصحیح کی۔

"بات وہی ہے" غالب ہنسا "ایک ہمارا اندازِ بیان ہے، دوسرا اُن کا۔"

"یہاں کھڑے رہنا بھی تو کوئی دلچسپ اور مفید کام نہیں" میں نے کہا۔

"ابھی دوپہر ہے" غالب نے کہا "ہم وہاں رات کو جائیں گے۔ رات ہونے تک ہم قیلولہ فرما سکتے ہیں۔ آپ اپنی پسند کے خواب دیکھیں' مَیں اپنی پسند کے دیکھتا ہوں"

"بیڈ رُوم ایئرکنڈیشنڈ ہے نا؟" مَیں نے کہا۔

"بالکل ہے، فوم ربر کے گدّے، شنیل کے پلنگ پوش، ایرانی قالین اور مخملیں پردے" غالب نے کہا "مہکتی فضا اور پھر وہ خواب' جو سُنائے بھی نہیں جا سکتے، تشریف لائیے"

جنگل میں چھوٹے بڑے ہر قسم کے درخت تھے چھوٹے درخت بیری کے تھے اور بڑے شیشم کے لیکن بہت گھنے نہیں تھے۔ زمین کی سطح کے ساتھ خود رُو گھاس تھی اور جنگلی پھولوں والے پودے تھے تھوڑی دیر کے بعد ہمیں ایک ہموار قطعۂ زمین مل گیا جہاں لمبے نوکیلے پتّوں والی گھاس نہیں تھی بلکہ کچھ لان ٹائپ ہری گھاس تھی، جو زمین پر اُوپر نہیں اُٹھتی، سطح کے ساتھ ساتھ پھیلتی جاتی ہے اور جڑیں پکڑتی جاتی ہے۔ آس پاس بیس پچیس گز کے فاصلے پر جھاڑیوں کی قدرتی فصیل تھی اور اُوپر صرف کھُلا آسمان تھا چنانچہ یہ خطرہ نہیں تھا کہ کوئی پرندہ ہم پر کچھ ٹپکا دے۔ غالب نے جھک کر زمین کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد فیصلہ دیا کہ بیڈ رُوم میں کیڑے مکوڑے نہیں ہیں۔

"اگر سوتے میں شیر کھا جائے یا ہاتھی اُوپر سے گزر جائے تو بُرا مت ماننا" غالب نے لمبا لیٹتے ہوئے کہا "روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہاں ایک مردم خور شیر ہے"

"نام اُس کا دلاور ہے" مَیں نے کہا "مگر وہ نام کا دلاور ہے"

"محسن تو پہنچ گیا ہوگا اپنی زوجہ کے پاس" غالب آسمان کو تکتے ہوئے بولا "مَیں ان کے بچھڑ کر ملنے کے فلمی منظر کو چشمِ تصوّر سے دیکھ سکتا ہوں، شہلا اُسے دوبارہ ملے گی"

"مجھے اس کی وہ کیفیت یاد ہے جب اُسے پتا چلا تھا کہ شہلا زندہ ہے" مَیں نے کہا "شہلا سے مل کے اس کا کیا حال ہوگا۔ شہلا نہیں سمجھے گی کہ وہ کیوں رو رہا ہے"

"محسن لاہور گیا" غالب نے آنکھوں پر کہنی رکھ کے کہا "مَیں جاتا ہوں کراچی کی بندرگاہ، تُو کہاں جائے گا چیف؟"

"مَیں بھی وہاں پہنچ ہی جاؤں گا' جہاں روشن جمالِ یار سے ہے انجمن تمام" مَیں نے کہا "خیال خود میرے خوابوں کی رہگزر ہوگا"

ہمیں ان پرندوں کے شور نے بیدار کیا' جو شام ہوتے ہی درختوں پر شب بسری کے لیے لوٹ آئے تھے اور آشیانوں کے گرد منڈلاتے ہوئے خوشی سے چہچہا رہے تھے۔ مَیں نے دیکھا تو غالب آلتی پالتی مارے بیٹھا ہوا تھا۔

"یہ پرندے سارا دن فکرِ معاش میں رہے" غالب بولا "اور اب گھر آئے ہیں تو معلوم ہے' بیوی بچوں سے کیا کہہ رہے ہیں؟"

"کیا کہہ رہے ہیں؟"

"جو آدمی شام کو دفتر یا کارخانے سے گھر آتے ہی کہتا ہے، ہیلو ڈارلنگ، بھئی کہاں ہو، ہم آ گئے" غالب بولا۔

"کسی دن ہم بھی کہیں گے" مَیں نے غالب کے کندھے پر تھپکی دی۔

"وہ دن ضرور آئے گا"

"اونہہ... کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا" غالب بولا۔ "یہ کنگ اسٹارک سگریٹ پیو اور خدا کا شکر بجا لاؤ کہ زندہ اُٹھے"

"تجھ پر قنوطیت کا دورہ پڑا ہے" مَیں نے کہا "کیا خواب میں نازو نے اچھا سلوک نہیں کیا؟"

"اچھا کیا اور بُرا کیا" وہ آہ بھر کے بولا "وہ ہمیشہ ایک ہی جیسا سلوک کرتی ہے۔ نظر سے نہیں گراتی، ہاتھوں سے گراتی ہے کبھی اِدھر کبھی اُدھر، سالا عاشق نہ ہُوا والی بال ہوگیا، میلا پجامہ ہوگیا کہ دے دھوبی پٹخا... دے دھوبی پٹخا، مَیل کیا جان تک نکل جائے"

مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی "ہر ایک کے پیار کا انداز جُدا ہوتا ہے، دوست..."

ہم نے ایک بار پھر نہر میں ڈبکی لگائی اور سفر کے اگلے مرحلے کے لیے تیار ہو گئے۔ یہ سفر اندھیرے جنگل کا سفر تھا مگر راستہ گم ہونے کا احتمال کم تھا کیونکہ ہمیں نہر کے متوازی چلنا تھا کسی دُشواری کے بغیر ہم نے وہ ایک میل کا فاصلہ پون گھنٹے میں طے کر لیا۔ ہم بہت محتاط تھے اور ہمارے کان ہر آہٹ پر لگے ہوتے تھے۔ ہم بات بھی کرتے تھے تو ایک دوسرے کے کان میں سرگوشی کے انداز میں۔

"یہ ایک پہاڑی ہے" غالب نے رُک کر کہا۔

"یہ صرف ایک پہاڑی ہے" مَیں نے کہا "اور کچھ نہیں"

"لیکن یہاں ایک آدم خور شیر ہونا چاہیے" غالب بولا "یہ علاقہ ممنوعہ ہے تو کیوں ہے؟"

"شیر کی افواہ بھی بے مقصد تو نہیں پھیلائی گئی" مَیں نے کہا "گاؤں کے اَن پڑھ لوگ علاقہ ممنوعہ کی اصطلاح نہیں سمجھتے۔ انھیں اس علاقے سے دُور رکھنے کے لیے شیر ایجاد کیا گیا۔ ایجاد اس لیے کہ ویسے تو مغربی پاکستان میں شیر سوائے چڑیا گھر کے کہیں دستیاب نہیں، مگر گاؤں والے یہ باتیں کیا جانیں"

"اور اس فرضی آدم خور شیر نے کئی زندہ انسانوں کو سچ مچ کھا لیا"

"ہاں، وہ احمق تھے یا غیر ضروری طور پر تجسّس پسند اور مہم جُو، وہ گئے ہوں گے شیر کی حقیقت دریافت کرنے یا کسی غلطی کے باعث پھرتے دلدولوں سے بچ کے وہاں تک جا پہنچے ہوں گے، جہاں سے واپسی اُن کے اختیار کی بات نہ رہی تھی۔ اُن کی ہڈیاں اور جسم کے بچے ہوئے ٹکڑے بعد میں ملے ہوں گے تو یہ افواہ پھیلانے میں کام آئے ہوں گے کہ انھیں شیر نے کھا لیا"

"مگر مجھے ابھی تک کوئی ایسی بات دکھائی نہیں دی" غالب بولا۔ "اس کے لیے زیادہ قریب جانا پڑے گا" مَیں نے کہا۔

"ایسا تو نہیں کہ ڈپو پہاڑی کے پیچھے ہو؟"

"ہم بیٹھیا" مَیں نے کہا "ہم گھوم کے جاتے ہیں"

غالب کے مُنہ سے نکلی ہوئی بات ایک گھنٹے کے بعد سچ ہوئی۔ پہاڑی کے عقبی حصے میں ہم نے روشنی دیکھی۔ روشنی بہت مدھم تھی اور غالباً لالٹین کی روشنی تھی۔ گھُپ اندھیرے میں چمکنے والی یہ دُھندلی روشنی پہاڑی کے دامن میں کبھی نظر سے اوجھل ہو جاتی تھی اور کبھی پھر نظر آنے لگتی تھی، اس کی وجہ یہ تھی کہ ہَوا سے شاخیں ہلتی تھیں تو ہماری آنکھوں کے اور روشنی کے بیچ میں آ جاتی تھیں۔ مَیں نے اور غالب نے آہستہ آہستہ کوئی آہٹ کیے بغیر بڑھنا شروع کیا۔ ریوالور اب ہمارے ہاتھ میں تھے، اور ہم ایک پلان کے مطابق پیش قدمی کر رہے تھے۔ پہلے مَیں چند قدم چلتا تھا اور غالب کسی درخت کی اوٹ میں ریوالور لیے کھڑا رہتا تھا کہ اچانک کوئی مجھے روک لے تو وہ میری مدد کرے، مدد یہی ہو سکتی تھی کہ وہ سامنے آنے والے کو شُوٹ کر دے اور ہم واپس بھاگ کھڑے ہوں جنگل میں فائرنگ کے بعد اس غیر قانونی آرڈیننس ڈپو سے دُشمن کی سپاہ کا جدید ترین اسلحے کے ساتھ نکلنا اور ہماری تلاش میں ہمارے پیچھے دوڑنا یقینی تھا۔ باری باری ایک دوسرے کو حوصلہ دیتے اور کوَر فراہم کرتے

ہم نے مزید سو گز طے کیے۔ اب ہمیں ایک دروازہ نظر آ رہا تھا۔ لالٹین اُس دروازے کے اُوپر لٹکی ہوئی تھی' اُس کے بالکل پیچھے کوئی شخص شین گن سے مسلح تھا۔ اُس کے پاس ایک دُوربین بھی تھی' جس سے وہ ہر پانچ منٹ کے بعد اپنے سامنے کا سارا علاقہ دیکھتا تھا۔ یہ اندھیرے میں بھی صاف دکھانے والی دُوربین تھی۔ انفراریڈ شعاعوں کی مدد سے تصویریں اُتارنے والے کیمرے بھی اب کوئی جادوئی ایجاد نہیں رہے تھے لیکن اس قسم کے کیمرے اور ایسی دُوربینیں بازار میں دستیاب نہیں تھیں۔ یہ سُراغ رسانی کے سرکاری اداروں کو بطورِ خاص فراہم کی جاتی تھیں۔ ہم نے دوربین کے سامنے آنے سے گریز کیا اور درختوں کی اوٹ سے دروازے کو دیکھتے رہے۔

کچھ دیر بعد اندر سے ایک شخص نمودار ہُوا اور اُس نے پہلے سے کھڑے ہوئے شخص کی جگہ لے لی۔ ہم پھونک پھونک کر قدم بڑھاتے اور آگے گئے۔ آپس میں بات کرنے کی بالکل گنجائش نہیں تھی۔ مجھے ایک ڈر تو یہ تھا کہ یہاں درختوں پر خفیہ کیمرے اور مائیکروفون نہ ہوں۔ اس سے بڑا اندیشہ زمینی شکنجوں کا تھا۔ اس علاقے کو مداخلت کرنے والوں سے محفوظ رکھنے کا ایک طریقہ تو یہ تھا کہ یہاں بارُودی سُرنگیں بچھا دی جائیں لیکن اس میں نقصان یہ تھا کہ جب بھی کوئی اس پر قدم رکھتا تو دھماکا ہوتا اور آس پاس دُور دُور تک سُنائی دیتا۔ دوسرے وہ شخص بھی بارُودی سُرنگ کے ساتھ ہی اُڑ جاتا' جو مداخلت کار تھا۔

چنانچہ میری عقل کہتی تھی کہ یہاں قدم قدم پر شکاری پھندے ہو سکتے ہیں، جال ہو سکتے ہیں اور شکنجے ہو سکتے ہیں، ان کی سیکڑوں اقسام ہیں۔ چوہے دان کی طرز پر بنائے جانے والے بڑے شکنجے آدمی کے پیر کو اس طرح جکڑ سکتے ہیں کہ ہڈی ٹوٹ جائے۔ ایسے جال ہو سکتے ہیں جو اچانک اوپر سے آ گریں اور آدمی اندر ہی بند ہو جائے یا ایسے گڑھے بھی ہو سکتے تھے' جن پر سرکنڈے رکھ کے گھاس پھوس پھیلا دی جائے اور ان پر کوئی قدم رکھے تو اندر گرے اور اندر گرنے والے کے لیے باہر نکلنا ناممکن ہو۔ گڑھے میں نوکیلے بانس گاڑے جا سکتے تھے جو آدمی کے بدن میں گھُس جائیں شکاری ہر قسم کے جانور کے لیے الگ پھندا یا شکنجہ رکھتے ہیں جنگل کے اندھیرے میں رات کے وقت یہ پھندے اور شکنجے نظر آ ہی نہیں سکتے تھے لیکن ہمارے قدم ایک بار غلط پڑ جاتے تو ہم گرفتار ہو جاتے اور شکاری فوراً آ پہنچتے۔

ان سب باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے مَیں نے ایک حفاظتی بندوبست کیا تھا۔ مَیں نے ایک خشک ٹہنی اُٹھالی تھی جو ٹیڑھی میڑھی ضرور تھی لیکن چار فٹ لمبی اور خاصی مضبوط تھی۔ ہر قدم آگے بڑھانے سے پہلے مَیں زمین پر ٹہنی پھیرتا تھا کہ کوئی شکنجہ ہوگا تو ٹہنی کو پکڑے گا میرے پاؤں کو نہیں اور سرکنڈوں کی کھوکھلی چھت پر گھاس بچھی ہوئی ہوگی تو مَیں قدم رکھنے سے بچ جاؤں گا۔ میری اس احتیاط کو غالب نے بھی پسند کیا مگر اُسے اپنے آس پاس کوئی ایسی شاخ نہیں ملی، اگر وہ کسی درخت سے چار فٹ لمبی اور ایک انچ موٹی شاخ توڑتا تو اتنی آواز ہوتی کہ اب پچاس گز دُور نظر آنے والے محافظ اُسے بجلی کی کڑک کی طرح صاف سُنتے۔

مجھے اس حفاظتی انتظام نے پہلی بار اس وقت بچایا' جب میں نے ایک گڑھا دریافت کیا۔ گڑھے کو بہت ہوشیاری سے کیموفلاج کیا گیا تھا اور اس کی سطح جنگل کی عام سطح نظر آتی تھی۔ مَیں نے ڈنڈی ماری تو مجھے سرکنڈوں کی آواز سنائی دی۔ مَیں نے غالب کو روک لیا۔ درخت کی اوٹ میں رہتے ہوئے ... سرکنڈوں ... ہوئی کچی چھت پر سے گھاس اور پتّے ہٹانے ... اس کا ایک کنارہ تلاش کر لیا۔ دس منٹ کی خاموش کوشش کے بعد مجھ پر انکشاف ہُوا کہ وہ کوئی گڑھا نہیں' ایک خندق ہے' جو تین فٹ چوڑی ہے اور ہمارے دائیں بائیں پھیلی ہوئی ہے۔ غالباً پہاڑی کے سامنے والے حصّے کے آس پاس' جہاں وہ دروازہ نظر آ رہا تھا' کوئی کسی سمت سے بھی آتا اس خندق میں ضرور گرتا اور اس سے بچ کے نکلنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ تین فٹ چوڑائی میں لمبے سے لمبے آدمی کا ایک قدم پڑنا یقینی تھا۔

غالب نے شاباش کے انداز میں میرے کندھے پر تھپکی دی اور مَیں کورنش بجا لایا۔ خندق کو عبور کرنے سے پہلے ہم نے پھر دروازے کو دیکھا۔ یہ دروازہ موٹے شہتیروں کو زمین میں گاڑ کے بنایا گیا تھا۔ ایک شہتیر اُوپر رکھا گیا تھا اور مجھے یہ کسی غار کا دروازہ لگتا تھا۔ اس دروازے کے پیچھے بالکل اندھیرا تھا۔ ابھی مَیں نے خندق پر سے گزرنے کے لیے جمپ لینے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ جیسے دن نکل آیا۔ پہاڑی پر ایک ایسی سرچ لائٹ روشن ہوگئی جس کی طرف دیکھنا ناممکن تھا۔ مَیں اور غالب فوراً لیٹ گئے۔ سرچ لائٹ آہستہ آہستہ گھومتی ہوئی ہمارے اُوپر سے گزری۔ میرا دل زمین اور سینے کے درمیان اُچھلنے لگا۔ اس روشنی

کے منعکس ہونے والے اُجالے میں اُلٹا لیٹنے سے مجھے خندق کی گہرائی نظر آگئی۔ اگر میں یا غالب اس میں اُتر جاتے تو چھ فٹ نیچے جاتے۔ بالکل نیچے سیمنٹ کا فرش تھا جس میں کانچ کے ٹکڑے اس طرح جڑے ہوئے تھے جیسے بعض گھروں کی بیرونی دیواروں اور کوٹھیوں کی فصیلوں پر لگے ہوئے نظر آتے تھے۔ اب اس کا اتنا رواج نہیں رہا تھا کیونکہ چور ڈاکو بہت ہوشیار ہو گئے تھے مگر ایک زمانے میں یہ حفاظتی انتظام خاصا معمول تھا۔ خندق میں گرتے ہی ہمارا سارا جسم نوکیلے تیز دھار والے شیشوں کی جراحت سے کٹ جاتا اور ہم اس قابل نہ رہتے کہ اتنے زخموں سے بہنے والے لہو کو روک سکیں اور خندق سے نکل کے فرار ہو سکیں۔

سرچ لائٹ ایک راؤنڈ مکمل کرنے کے بعد آف ہو گئی تو میں نے رُکی ہوئی سانس کو خارج کیا اور غالب کے ساتھ خندق کے پار کود گیا۔ تین فٹ کا فاصلہ کچھ بھی نہیں تھا۔ ہم نے آہستہ سے جست لی اور کسی آہٹ کے بغیر دوسری طرف پہنچ گئے لیکن اس وقت غالب کے حلق سے ایک ایسی آواز نکلی جسے سُن کر میرے دل کی دھڑکن رُک گئی۔ میں نے پہلے دروازے کی طرف دیکھا مگر سنتری نے یہ آواز نہیں سُنی تھی پھر میں غالب کی طرف متوجہ ہوا۔

یہ دیکھ کر میرا خون خشک ہو گیا کہ غالب کا ایک پاؤں شکنجے میں پھنس گیا ہے۔ ٹخنے سے ذرا اُوپر یہ فولادی شکنجہ اُس کے پیر سے یوں چمٹ گیا تھا جیسے جونک کھال سے چمٹ جاتی ہے۔ غالب سخت تکلیف میں تھا اور یہ اُسی کا حوصلہ تھا کہ اُس نے مُنہ میں ہاتھ دے کر اپنی چیخ کو دبا لیا تھا۔ اس میں غالب نے اپنے ہی دانت اپنی ہتھیلی میں گاڑ دیے تھے لیکن اپنی آواز نہیں نکلنے دی تھی۔ میں نے جھک کر شکنجے کو دیکھا۔ یہ مضبوط لوہے کے اسپرنگ لاک والا شکنجہ تھا جسے صرف مخصوص چابی سے کھولا جا سکتا تھا۔ اس کا وزن بھی ڈیڑھ دو سیر سے کم نہیں تھا۔ غالب کا پیر سیدھا اُس پر پڑا تھا اور شکنجے نے مگرمچھ کے دانتوں کی طرح غالب کی ٹانگ پکڑ لی تھی۔

میں نے آہستہ سے شکنجے کو ہلایا تو خوف اور صدمے سے میرا دل ڈوبنے لگا۔ ٹخنے کے اُوپر سے غالب کی پنڈلی ٹوٹ گئی تھی۔ میں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے دبایا اور اُسے حوصلہ نہ ہارنے کی تلقین کی۔ اب یہاں ایک لمحہ ضائع کرنا بھی بے سود تھا۔ میں نے غالب کو اُٹھایا تو شکنجہ بھی ساتھ آگیا اور ٹوٹے ہوئے جوڑ کے ساتھ لٹکنے لگا۔ غالب درد کی شدت سے تڑپا اور میرے ہاتھوں سے نکل کے خندق میں گرتے گرتے بچا۔

"بس غالب... بس ایک منٹ... صرف ایک جھٹکا اور میری جان۔" میں نے کہا اور خندق عبور کر گیا۔ غالب دُہرا ہو گیا مگر اُس نے کمال ضبط سے کام لیا اور مُنہ میں ہاتھ دبائے رہا۔ میں نے اُسے چند قدم دُور لے جا کر ایک جھاڑی کے پیچھے لٹا دیا۔ شکنجے کو الگ کرنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ اب مجھے غالب کو اُٹھا کے پانچ میل واپس جانا تھا اور کوئی ایسا انتظام کرنا تھا کہ شکنجہ اُسے تکلیف نہ دے اور اُس کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ کو نہ ہلائے۔

کچھ دیر سوچنے کے بعد میں نے اپنے گاڑھے کے پُرانے میلے کُرتے کے دامن کو نیچے سے پھاڑا اور ایک لمبی پٹی اُتار لی۔ اِدھر اُدھر تلاش کر کے مجھے کوئی ایسی مضبوط لکڑی نہ ملی جسے میں استعمال کر سکتا۔ مجبوراً میں نے اُسی لکڑی کو توڑا جسے میں ابھی تک پھندے اور شکنجے دریافت کرنے کے لیے استعمال کر رہا تھا۔ یہ سوکھی لکڑی ایک انچ کے قریب موٹی تھی اس سے ایک ایک فٹ لمبے دو ٹکڑے توڑنا کوئی مشکل کام نہیں تھا لیکن مجھے اس طرح پیدا ہونے والی آواز سے ڈر لگتا تھا۔ میں نے لکڑی کو گھٹنے کے نیچے دبا کے موڑا، لکڑی پٹ سے ٹوٹ گئی اور میرا دل ایک بار پھر زور سے دھڑک کے رُکنے لگا کیونکہ آواز کے ساتھ ہی سرچ لائٹ پھر روشن ہو گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ بےرحم روشنی ہم تک پہنچتی میں بھی غالب کے ساتھ ساکت ہو کے لیٹ گیا۔ روشنی جھاڑی کے پتّوں کی جالی سے چھن کر گزر گئی۔

میں نے دونوں لکڑی کے ٹکڑوں کو پنڈلی کے متوازی رکھا اور اندازے سے سیدھا رکھتے ہوئے پٹّی کو کس کر باندھنا شروع کیا۔ یہ ابتدائی امداد کا اصول تھا۔ طبّی امداد نہیں تھی، تاہم اس سے غالب کی مشکل اور میرا کام آسان ہونے کی توقع تھی۔ میں نے دامن کے نیچے سے ایک اور پٹی پھاڑی اور اُسے بھی دونوں لکڑیوں کے اُوپر لپیٹ دیا۔ میں دامن سے دو انچ چوڑائی کی پٹیاں اُتارتا گیا اور لکڑیوں کی گرفت سخت سے سخت ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ میں نے ہاتھ سے ہلا کے دیکھا تو درمیان میں ٹوٹی ہوئی ٹانگ کا جوڑ نہیں ہلا۔ پھر میں نے کُرتا اُتار دیا اور اُس کے پچھلے حصّے کو نیچے سے پھاڑنا شروع کیا۔ میں نے ایک کے بعد ایک چار انچ چوڑی پٹیاں پھاڑیں اور پھر دو دو پٹیوں کو بل دے کر ایک کر لیا۔ اب میرے پاس ایک خاصی مضبوط رسّی تیار ہو گئی تھی، جو دو سیر کا وزن اُٹھا سکتی تھی۔ میں نے اس رسّی کو شکنجے کے ایک حلقے سے گزارا اور پھر اپنی گردن میں ڈال لیا۔

پھر میں نے غالب کو یوں اُٹھایا کہ شکنجہ بھی ساتھ ہی اُٹھ گیا اور اس کا سارا وزن میری گردن نے اُٹھایا۔ غالب کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ پر شکنجے کی گرفت برقرار تھی لیکن اُس کا وزن کسی طرح بھی ٹانگ کے جوڑ پر نہیں پڑ رہا تھا۔ میں نے غالب کو اُٹھا کے چند قدم کا فاصلہ طے کیا تو اندازہ ہُوا کہ رات بھر میں پانچ میل کی مسافت طے کرنا کتنا مشکل کام ہو گا۔ مجھے خود کو اس محافظ کی دُوربین نظروں سے بھی محفوظ رکھنا تھا جو اندھیرے میں میری نقل و حرکت کو دیکھ سکتی تھیں۔ ایک درخت سے دوسرے درخت کی اوٹ میں جاتے ہوئے میں پیچھے مُڑ کر دیکھتا تھا پھر ایک قدم آگے کی زمین کو چھو کر اور ٹٹول کر اگلا قدم بڑھاتا تھا۔ غالب کا وزن [illegible] پر تھا اور پھندے کا وزن میرے گلے میں یوں جھول رہا تھا کہ جب [illegible] حرکت کرتا تھا تو فولادی شکنجہ میرے سینے پر دھم دھم لگتا تھا۔

پچاس گز کا فاصلہ میں نے کتنی دیر میں طے کیا، اس کا مجھے کوئی اندازہ نہیں۔ ہر قدم پُل صراط کی مسافت کا ایک حصّہ تھا جس میں فنا کا خوف لمحہ بہ لمحہ ہم رکاب تھا۔ میں پسینے پسینے ہو رہا تھا۔ یہ جسمانی مشقت سے زیادہ ہر لمحے بڑھنے والے خوف کا احساس تھا جو میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی کی سرد لہر دوڑا دیتا تھا کہ کہیں اگلے قدم پر کوئی شکنجہ مجھے شکار نہ کر لے۔ میں کسی قاتل گڑھے میں نہ گر جاؤں۔ جنگل میں بھیڑیے اور گیدڑ چلّا رہے تھے، جن سے رات کا سنّاٹا زیادہ دہشت ناک محسوس ہوتا تھا۔ غالب کا کراہنا اب کم ہو گیا تھا۔ میری ترکیب نے اُس کے پاؤں کو وقتی طور پر جوڑ کے ہلنے کی تکلیف سے نجات دلا دی تھی، جہاں شکنجے نے اپنے آہنی دانت گاڑ رکھے تھے، وہ جگہ شاید سُن ہو گئی تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس قسم کی چوٹ کچھ دیر بعد زیادہ تکلیف دیتی ہے، جب پٹھے اکڑتے ہیں اور سوجن بڑھتی ہے۔

دو گھنٹے بعد بھی میں ممنوعہ علاقے میں ہی تھا اور میرا اپنا یہ حال تھا کہ مجھے پانچ میل کا فاصلہ پانچ سو میل کے سفر سے زیادہ کٹھن نظر آتا تھا لیکن میں نے اپنی مایوسی کا اظہار غالب پر نہیں ہونے دیا۔ میں اُسے برابر ضبط اور ہمت سے کام لینے کی تلقین کرتا رہا اور اُس کا حوصلہ بڑھاتا رہا۔

"یار، یہ سب مصیبت میری وجہ سے پڑی تجھ پر۔" وہ بولا۔

"کیا چوٹ کا اثر تیرے دماغ پر بھی ہو گیا ہے؟" میں نے برہمی سے کہا۔ "تیری جگہ اس شکنجے میں میں بھی پھنس سکتا تھا۔"

"پھر بھی یار، مجھے شرم آ رہی ہے کہ تیرے لیے... "

"بکواس مت کر مرزا غالب کے کفش بردار۔" میں نے کہا۔ "ایسی غیریت کی باتیں اچھی نہیں لگتیں تیرے مُنہ سے، کیا میں اس طرح ٹانگ تڑوا بیٹھتا تو مجھے کوئی نہ اُٹھاتا؟ محسن یا استاد ٹیڈی... تو اور میں... ہم میں سے کوئی بھی اس پوزیشن میں ہوتا تو دوسرا کیا کرتا؟ بائی بائی اور خدا حافظ کہہ کے چلا جاتا! لعنت ہے تیری اس سوچ پر..."

"لعنت ہے میری اس ٹانگ پر۔"

"ایسا مت کہہ، یہ میرے نزدیک کُفر کا کلمہ ہے۔" میں نے کہا۔ "تمام عمر اس ٹانگ نے کہاں کہاں تیرا ساتھ دیا، تجھے کہاں کہاں لے گئی، تیرے وجود کے بوجھ کو اُٹھا کے پھرتی رہی۔ یہ جسم خدا کی تخلیق کا وہ شاہکار ہے جس کا ایک پُرزہ بھی بے مقصد اور فالتو نہیں۔ جو اس میں نقص نکال کے کفرانِ نعمت کا مرتکب ہو گا۔ تیری یہ ٹانگ بھی اتنی ہی اہم ہے جتنی تیری ایک آنکھ، ہاتھ یا پیر کی ایک انگلی پر بھی لعنت نہیں بھیجی جا سکتی۔ دوست کون ہے جو عام حالات میں ہنسی خوشی کہے کہ لعنت میری اس ٹانگ پر اور اسے کٹوا کے پھینک دے۔"

"یار، واقعی میرا دماغ چل گیا ہے۔" غالب شرمندہ ہو کے بولا۔ "اب زیادہ مت بول، تیری سانس پھول رہی ہے۔ ہم کتنی دُور آ گئے ہیں؟"

"تقریباً علاقہ ممنوعہ سے باہر ہیں۔" میں نے کہا۔

"ہاں، کچھ دیر پہلے میں نے ایک بورڈ دیکھا تھا۔" غالب بولا۔

"اچھا، میں نے نہیں دیکھا۔"

"تو اپنے سامنے دیکھ رہا ہے، میری نظر پیچھے سے دونوں جانب دیکھ سکتی ہے۔" غالب نے کہا۔ "تھوڑی دیر رُک کر دم لے لے ابھی بہت دُور جانا ہے۔"

ہم نے وہاں آدھا گھنٹا آرام کیا۔ میں ایک درخت کے نیچے دراز ہوا تو مجھے اپنی سانس کی رفتار بحال کرنے میں دس منٹ لگے۔ زمین پر چیونٹے رینگ رہے تھے اور درخت کی چھال سے [illegible] جسم پر اُترنے لگے تھے۔ وہ بڑے خونی قسم کے چیونٹے تھے۔ ایک نے میری گردن پر کاٹا تو میں اُچھل پڑا۔ میں نے اُسے نوچ کے الگ کیا تو میری اُنگلیوں نے خون کی معمولی سی نمی کو محسوس کیا۔ پھر دوسرے نے میرے پیٹ پر کاٹا۔ میں نے اُٹھ کر اپنا کُرتہ اُتارا اور جھاڑ کر پہنا۔ کُرتہ اب آگے پیچھے سے ڈیڑھ دو فٹ کم ہو گیا تھا اور اس کی لمبائی کوٹ کے برابر رہ گئی تھی۔ ڈھیلے ڈھالے اور نامکمل کُرتے میں یقیناً میں مضحکہ خیز ہو گیا تھا لیکن مجھے اپنی ہیئت کذائی کا احساس ہی نہ تھا۔

درخت سے ذرا ہٹ کے چیونٹے نہیں تھے۔ وہ ایک بِل سے نکل کر سیدھے درخت پر جا رہے تھے یا درخت سے اُتر کے بِل میں داخل ہو رہے تھے۔ میں اس جگہ سے دو گز دُور لیٹ گیا۔ میری نظر اُوپر تاروں بھرے آسمان تک گئی اور بے اختیار میرے لبوں سے ایک دُعا نکلی۔ خدایا مجھے آج کی رات دوستی کی لاج رکھنے کا حوصلہ دے۔ اور نہ جانے کیسے مجھے ایک سرگوشی سی سُنائی دی۔ میں نے اپنی ہی دُعا کے الفاظ سُنے۔ یہ دو پہاڑوں کے درمیان سُنائی دینے والی صدائے بازگشت محسوس ہوتی تھی۔ یقیناً غالب نے کچھ نہیں سُنا تھا، ورنہ وہ چونکتا۔ یہ میرے دل کا واہمہ تھا یا میری دُعا کا سفر تھا، جو عرش تک پرواز کر گئی تھی۔ یہ ایک بے غرض دُعا تھی، امداد کی التجا تھی یا فریاد تھی۔ میرے دل کو اعتبار آنے لگا کہ خدا نے میری سُن لی ہے۔

ایک سگریٹ جلا کے میں نے غالب کو دی اور دوسری خود پھونکتا رہا۔ خالی پیکٹ کو میں نے بڑی حسرت سے دیکھا۔ یہ خوئے بد بھی کبھی کبھی ایک نفسیاتی سہارا فراہم کرتی ہے۔ غالب بھی خاموش پڑا رہا۔ اسے نیچے رکھتے ہوئے میں نے پوری احتیاط سے کام لیا تھا پھر بھی فولادی شکنجہ اُس کے مُنہ پر لگ گیا تھا۔ دوبارہ سفر کا آغاز کرنے سے پہلے میں نے اپنے کُرتے کو دونوں طرف سے کچھ اور چھوٹا کیا اور ایک رسّی بٹ کے ایسا بندوبست کر لیا کہ شکنجہ میری گردن میں طوق بن کے پڑا رہے لیکن حرکت نہ کرے اور میرے سینے پر وار نہ کرے۔ میں نے اُسے اپنی کمر کے ساتھ بھی کس لیا اور پھر نئے عزم کے ساتھ روانہ ہو گیا۔

رات کا وہ سفر سخت حالات کی وہ داستان ہے جسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ صبح مرغے اذانیں دے چکے تھے، جب مجھے وہ

گاؤں نظر آیا، جہاں سے ہم گزشتہ روز پیٹ بھر کے چلے تھے۔ ہم گاؤں کی حدود میں داخل ہوئے تو مسجد سے آوازِ اذاں بلند ہوئی — گھر سے نکلنے والے پہلے نمازی نے ہمیں دیکھا اور ٹھٹک کر رُک گیا۔ وہ ایک دراز قد سفید ریش و للانیک دل بُوڑھا تھا۔

"ایہہ کی ہویا پُتّر؟" وہ بولا اور پھر آنکھوں پر ہاتھ رکھ کے مجھے دیکھنے لگا "تُوں تے کل وی آیا سی۔ کیہ یاسی نا؟"

"آہو چاچا جی" میں نے کہا "ایہہ میرا دوست وی میرے نال سی، لیکن لے بلا تاں نئیں سی، اے راتی چوٹ لگی ہے"

ذرا سی دیر میں ہمارے گرد کئی نمازی اکٹھے ہو گئے۔ انھوں نے ہمیں وہیں بیٹھنے کو کہا اور مسجد کی طرف جاتے جاتے کہا "اللہ اپنا فضل کرے گا"

پندرہ بیس منٹ بعد وہ پھر آ گئے اور گاؤں میں ایک ہلچل پیدا ہو گئی۔ یہ لوگ بہت کچھ کرنا چاہتے تھے لیکن میں نے کہا کہ اگر ہمیں چائے مل جائے اور غالب کو اسپرو...

انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا "چائے؟"

دوسرے نے سر کھجایا "اسپرو؟" مگر تیسرے نے کہا کہ زمیندار بھی اتنا بُرا آدمی تو نہیں ہے کہ کسی کی مصیبت میں بھی مدد نہ کرے۔ اسے جگانے میں کوئی ہرج نہیں۔ انھوں نے مجھے میرے فرض سے سبکدوش کر دیا اور غالب کو خود اُٹھا کے چل پڑے۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ انھوں نے جس احتیاط کا مظاہرہ کیا اُس سے غالب کو ذرا بھی تکلیف نہیں ہوئی۔

زمیندار وہی شخص تھا جس کا اس گاؤں میں واحد پکا مکان تھا اور جس نے گزشتہ روز ہمیں مسافر جان کر کھانا بھی کھلایا تھا۔ اُس نے مُنہ اندھیرے شور مچانے والوں کو اندر ہی سے کچھ کہا لیکن دروازہ کھول کر دیکھنے پر اُسے حقیقتِ حال کا علم ہُوا تو وہ شرمندہ نظر آنے لگا۔ غالباً وہ گاؤں کا واحد گھر تھا، جہاں چائے پی جاتی تھی۔ کمال یہ ہُوا کہ اس کے پاس سے اسپرو کا پورا خوانہ دریافت ہُوا۔ ان کا کوئی بیٹا جو شہر میں رہتا تھا اکثر فضول ولایتی دوائیں لاتا رہتا تھا جو وہ ایک ڈبے میں ڈالتے جاتے تھے۔ اس یقین کے ساتھ کہ ولایتی دوا کا دیسی امراض سے کیا تعلق اور ولایتی طریقۂ علاج ہمارے مزاج کے موافق ہو ہی نہیں سکتا۔ اس ڈبے میں ملٹی وٹامن بھی تھے جو بیٹا اپنی ماں کے لیے لایا تھا مگر وہ بھی استعمال نہیں ہوئے تھے کیونکہ نیم حکیم صاحب کا ارشاد تھا کہ ان کی تاثیر گرم ہے۔ اینٹی بایوٹک دوائیں تو بقول نیم حکیم صاحب "نری آگ ہیں آگ، اندر سے وجود کو جلا دیتی ہیں، جگر کو پھونک دیتی ہیں اور خون خشک کرتی ہیں۔"

ان سب کی ناپسندیدگی کے باوجود میں نے غالب کو ٹیرامائی سین کا ڈبل ڈوز دیا، اس کے ساتھ بی کمپلیکس دیے اور پھر اسپرو کی چار گولیاں اُس کے حلق سے اُتار دیں۔

میرے سادہ دل میزبانوں کو یقین کامل تھا کہ اتنی گرم دوائیں یکمشت کھانے کے بعد غالب بھک سے اُڑ جائے گا اور اس کے اندر جو آگ لگے گی وہ غالب اس مصرعے کے مطابق ہوگی کہ "کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا" لیکن انھوں نے ہمیں ہماری تقدیر پر چھوڑ دیا اور خودکشی... بلکہ میری مدد کے اقدامِ قتل کی اس کوشش پر احتجاج نہیں کیا۔ اصل کرشمہ چائے نے دکھایا۔ میرے سامنے مکھن اور جہازی سائز کی تنوری روٹیاں بھی رکھی گئیں، جو میں نے میزبانوں کی خواہش کے دس فیصد کے برابر کھا لیں۔ ان کا خیال تھا کہ ہم جیسے جوانوں کو اس سے دس گنا تو کھانا ہی چاہیے۔ پھر ہمیں کیپٹن مارکہ اعلیٰ سگریٹ ملے اور مجھے اس آدھے کُرتے کے بدلے صاحبِ خانہ نے اپنا پورا سوٹ پیش کیا، جو شلوار قمیص پر مشتمل تھا اور بہت پُرانا تھا مگر نیت کے خلوص اور نیکی کے جذبے نے اس کی قدر و منزلت کسی بیش قیمت نئے سوٹ سے ہزار گنا زیادہ کر دی تھی۔

ساڑھے سات بجے ہمیں گاؤں کا واحد تانگا دستیاب ہوا۔ شہر لے جانے کے لیے جوتا گیا۔ میں نے انھیں بتایا تھا کہ وہاں محکمۂ نہر کے اوورسیئر میرے عزیز ہیں اور وہ اپنی گاڑی میں ہمیں شہر لے جائیں گے۔ تانگے کا سفر کوئی آرام دہ سفر نہیں تھا۔ کچی سڑک پر ہچکولے بہت زیادہ لگتے تھے۔ اسپرین نہ ملتی تو غالب کے لیے درد کی اذیت یقیناً ناقابلِ برداشت ہوتی۔ اب وقتی طور پر درد کچھ دب گیا تھا۔ اسپرین میں نے بھی کھائی تھی کیونکہ رات بھر جنگل میں سفر کیا تھا اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہ سخت ترین حالات میں کیا جانے والا سفر تھا۔ تانگے میں بیٹھ کے مجھے بڑی راحت ملی اور مجھے پھر اپنی دُعا کا خیال آیا۔ دُعا قبول نہ ہوتی تو یہ سب کیسے ہوتا۔ چائے تو معمولی چیز تھی مگر کیا اس گاؤں میں اسپرین اور اینٹی بایوٹک دوا ملنے کا سوچا بھی جا سکتا تھا۔ اب میں بڑی فراغت سے بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا اور میرے جسم کو بہت آرام مل رہا تھا۔ ہم تقریباً موت کے مُنہ میں جا کے زندہ لوٹ آئے تھے۔

ساڑھے نو بجے تانگا اوورسیئر کے آفس کے سامنے رُکا تو وہ مجھے دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ پھر اُس نے غالب کو دیکھا اور دوبارہ بھونچکا رہ گیا۔

"یہ... یہ سب کیا ہے سر؟" وہ بولا۔

"بتا دوں گا اطمینان سے" میں نے کہا "آپ کی گاڑی کہاں ہے؟"

"اُدھر پیچھے کھڑی ہوئی ہے" وہ بولا۔

"تو اُسے یہاں لے آئیے۔ میں اپنے دوست کو اس میں منتقل کر دوں۔ پھر میں ایک ٹیلی فون کروں گا، پھر آپ ہمیں شہر لے جائیں گے۔" میں نے کہا۔

"یس... یس سر" وہ بے دلی سے بولا۔ اس کے لیے تعمیل کے سوا چارہ نہ تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ہمارے پاس ریوالور ہیں۔ جب تانگے والا ہم سے ہاتھ ملا کے اور پیسے لینے کی بات کا سخت بُرا مان کے چلا گیا اور ہم نے غالب کو اوورسیئر کی کار کی پچھلی سیٹ پر منتقل کر دیا تو ٹیلی فون استعمال کرنے کا مرحلہ آیا۔ اوورسیئر مجھے اپنے ساتھ آفس میں لے گیا۔

"سر... یہ بہت غیر قانونی طریقہ ہے۔"

"کیوں؟ آپ کا فون پھر خراب ہے؟" میں نے کہا۔

"وہ ہفتے سے خراب ہے" وہ بولا اور اُس نے ایک میز کی مقفل دراز کھول کے وہ ٹیلی فون کا آلہ نکالا، جس سے کھمبے پر چڑھ کے لائن ملائی جا سکتی تھی "میں کسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤں، یہ سرکاری معاملہ ہے۔"

"ہمارے ہوتے ہوئے کس کی مجال ہے، جو تم سے کچھ کہہ سکے" میں نے شیخی مارتے ہوئے کہا "یہ اتنا اہم معاملہ ہے کہ اس میں جائز اور ناجائز کا کوئی سوال نہیں۔"

ہم ایک میل دُور پیدل گئے کیونکہ جہاں کنکشن بکس تھا وہاں گاڑی نہیں جا سکتی تھی۔

اوورسیئر نے مجھے نہر کے کنارے سے ذرا فاصلے پر لگے ہوئے ٹیلی فون پول کے مقابل کھڑا کر دیا "اب آپ کہیں بھی بات کر لیں" وہ بولا "اوپر چڑھ جائیے۔" میں نے جنکشن باکس کو دیکھا جس میں سے چار پیئر مختلف سمتوں میں جا رہے تھے۔ اوورسیئر نے مجھے بتایا کہ کون سی لائن کس کی ہے اور انتخاب مجھ پر چھوڑ دیا کہ میں کس کے بل میں اضافہ کرتا ہوں۔

"آپ خود اس سہولت سے کیسے فائدہ اُٹھاتے ہیں؟" میں نے اوورسیئر کے حرام خوری پر پھیلنے پھولنے والے جسم پر نظر ڈالی۔

"میں، خود نہیں کرتا" وہ جھینپ کر بولا "میرا کوئی بیلدار بات کر لیتا ہے۔"

"آپ کی جگہ وہ کیسے بات کرتا ہے؟" میں نے کہا۔

"جو میں نیچے سے کہتا ہوں، وہ اُوپر بول دیتا ہے" اوورسیئر نے کہا "جو جواب ملتا ہے وہ مجھے سُنا دیتا ہے۔"

"لیکن افسرانِ بالا سے...؟"

"وہ میں خود کرتا ہوں۔" اوورسیئر نے اس جرح کو غیر ضروری اور ناپسندیدہ قرار دیتے ہوئے بُرا سا مُنہ بنایا "میرا ایک بیلدار ہے، وہ مجھے کندھوں پر اُٹھا لیتا ہے، پھر دوسرا ہم دونوں کو اُٹھاتا ہے، وہ پورا ٹارزن ہے۔"

میں ہنسا اور اوورسیئر کو مزید شرمندہ کرنے کے لیے بندر کی طرح کھمبے پر چڑھ گیا۔ یہ غیر قانونی کام جو ٹیلی فون ڈیپارٹمنٹ کے لائن مین عموماً بڑے شوق سے کرتے ہیں، میں نے پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔ چنانچہ پہلے میں نے باکس کے اندر تاروں کے کنکشن کو سمجھا، پھر دو مختلف مقامات پر تار چھو کر دیکھے اور ریسیور کو کندھے سے دبا کے کان پر لگائے رکھا۔ ایک جگہ ٹون آ گئی۔ اوورسیئر صاحب نے نیچے سے ایک پیچ کس پھینکا جو میں نے کیچ کر لیا مگر اس کوشش میں اوورسیئر صاحب پر گرتے گرتے بچا۔ باکس کے پیچ تھوڑے سے ڈھیلے کرنے کے بعد میں نے اپنے آلے کے کنکشن ملائے اور پیچ دوبارہ کس دیے۔

انکل رضوی کا نمبر مجھے یاد تھا۔ اکرم شیخ اور نازو کے علاوہ منظر عبدالودود کا نمبر بھی یاد تھا۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ پہلے کس سے بات کروں۔ نازو کے گھر فون کرتے ہوئے مجھے ڈر لگتا تھا۔ اُس کے ماں باپ پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑ جائیں گے اور میں اُن کی بے نقط کے جواب میں ہکلانے کے سوا کچھ نہ کر پاؤں گا۔ ان کے نزدیک نازو کو باغی کرنے اور گھر سے بے گھر کرنے والا میں تھا۔ میری وجہ سے وہ نافرمان اور گستاخ ہُوئی، گھر والوں سے بے تعلق ہوئی اور نوبت اب یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ وہ بھائی کو بھی ساتھ لے گئی۔ منظر کا گھر پر ملنا غیر یقینی تھا کیونکہ اب دس بجنے والے تھے اور وہ عموماً ساڑھے آٹھ بجے کورٹ چلا جاتا تھا۔ ان حالات میں لے دے کے بس انکل رضوی کے گھر کا نمبر ہی رہ جاتا تھا۔

میں نے اللہ کا نام لے کر نمبر ڈائل کیا۔ گھنٹی تین بار بجی پھر کسی نے کہا "ہیلو...!" اور شہلا کی آواز سُن کر میرا دل مچلنے لگا کہ میں اس کے ساتھ کوئی شرارت کروں مگر نیچے اوورسیئر صاحب مُنہ اُٹھائے گوش بر آواز کھڑے تھے۔

"یہ ایس۔ ایس۔ پی ضامن رضوی صاحب کا گھر ہے؟" میں نے کہا۔

"جی۔ آپ... آپ کون ہیں؟" شہلا کی آواز میں عجیب سی بے چینی اور بے یقینی تھی۔ اُس نے یقیناً میری آواز پہچان لی تھی پھر اُس نے چیخ ماری۔ "سکندر بھائی۔"

"اُم تو کی پٹّھی" میں نے دل ہی دل میں کہا "جذبات کے بریک فوراً فیل ہو جاتے ہیں۔"

"السلام علیکم جناب!" میں نے یوں کہا جیسے اب ایس۔ ایس۔ پی لائن پر ہو "کیا حال ہیں آپ کے، جی میں کرنل سکندر بخت بول رہا ہوں فرام ایم۔ آر۔ ایس۔ کیا ہمارے محسن صاحب پہنچ گئے؟"

"ہاں، وہ پہنچ گیا" شہلا نے یک لخت صورتِ حال کی نزاکت کو سمجھ لیا اور اپنی آواز دبالی "مگر تم کہاں سے بول رہے ہو؟"

"ایک کھمبے پر سے" میں نے کہا "جو میری ذہنی سطح اس وقت عام لوگوں سے پندرہ فٹ بلند ہے، تم ٹھیک ہو؟"

"ہاں، بالکل ٹھیک ہوں... بالکل ٹھیک ہوں" وہ پاگل لڑکی رونے لگی تھی "مجھے محسن نے سب بتا دیا ہے۔"

"اور جس کے ساتھ وہ گیا تھا؟"

"کیتھرین؟ وہ بھی ٹھیک ہے" شہلا بولی "کل تو بیٹی کو دیکھ کر بے ہوش ہو گئی تھی، ہوش میں آئی تو روتی رہی، انکل کی بہت احسان مند تھی۔ دونوں یہیں ہیں، آج شاید اپنے گھر جائیں گی۔"

"اچھا وہ کیسا ہے؟"

"وہ کون؟" شہلا نے کنفیوز ہو کے کہا۔

"وہ جو آنے والا ہے" میں نے کہا "ٹیڈی کا بھانجا۔"

"بھائی جان" شہلا نے مصنوعی خفگی سے کہا اور اُس کی آواز حلق میں پھنس گئی۔

"کس کا فون ہے؟" پس منظر میں انکل کی آواز سُنائی دی۔

"کسی کا نہیں... میری ایک سہیلی ہے" شہلا ہکلائی۔

"شہلا! فون ایس ایس پی صاحب کو دو" میں نے چلّا کے کہا، اور نیچے کھڑا ہُوا اوورسیئر ایک لڑکی کا نام سُن کر بھونچکا رہ گیا۔ وہ بھونچکا رہ جانے کا ماہر

تھا۔ میں نے اُسے اشارہ کیا کہ وہ دُور چلا جائے۔ وہ مُردہ قدموں سے دُور چلا گیا۔ یہ اس کی بے عزتی تھی جسے وہ برداشت کرنے پر مجبور تھا۔

"ہیلو!" انکل رضوی کی آواز ہمیشہ کی طرح پُرسکون تھی۔

"السلام علیکم انکل! میں سکندر بخت بول رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے۔" اُنھوں نے کہا۔

"کیا محسن نے آپ کو کچھ بتایا ہے؟" میں نے کہا۔

"ہاں، کچھ بے سروپا باتیں کی ہیں، صرف فون پر۔" وہ بولے۔

"وہ آپ کے سامنے آتے ہوئے ڈرتا ہے۔" میں نے کہا۔ "آپ اُسے بند کر دیں گے۔"

"یہ تو ہے۔" انکل رضوی نے جذبات سے عاری سپاٹ لہجے میں کہا۔

"آپ اس کی باتوں کو اوٹ پٹانگ کیوں کہتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"اور کیا کہوں؟" وہ بولے۔ "یہ ٹھیک ہے کہ کچھ دھماکے ہوئے ہیں اور اس بات کا ثبوت بھی ملا ہے کہ وہاں غیر ملکی اسلحہ تھا مگر اس کا دلاور وغیرہ سے تعلق ثابت نہیں ہوا۔"

"کیا آپ کو فوجی ماہرین نے یہ نہیں بتایا کہ جو سیل کا پٹھ اب تک تباہ ہو چکے ہیں، وہ کس ملک کے تھے اور..."

"اس معاملے پر میں تم سے کوئی بات نہیں کر سکتا۔ یہ ملکی سلامتی کا مسئلہ ہے اور ٹاپ سیکرٹ لیول پر ڈیل ہو رہا ہے۔" وہ بولے۔ "تم بھی اتنے احمق کیوں ہو گئے ہو کہ ٹیلی فون پر اس قسم کی گفتگو کر رہے ہو؟"

"آئی ایم سوری انکل!" میں نے کہا۔ "میں مجبور ہوں، میں ایک گاؤں بلکہ ایک ویران کھیت کے ٹیلی فون پول پر چڑھا ہوا ہوں کیونکہ آس پاس کوئی فون دستیاب نہیں، میری بات یہاں کوئی نہیں سُن رہا ہے۔"

"مگر وہ لائن وہاں سے یہاں تک پھیلی ہوئی ہے بے وقوف، راستے میں کوئی بھی ٹیپ کر سکتا ہے۔" انکل نے برہمی سے کہا۔

"پلیز آپ یہ رسک لے لیجیے کیونکہ یہ ایمرجنسی ہے، اگر وقت گزر گیا تو بہت نقصان ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔

"ایسی کون سی ایمرجنسی ہے؟" اُنھوں نے کہا۔

"میں آپ کو ایک پتا سمجھا رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اسے اچھی طرح سمجھ لیجیے کیونکہ شاید دوبارہ آپ سے رابطہ قائم نہ ہو۔ وہاں ایک ایمونیشن ڈپو ہے، اگر آپ نے آج ہی فوراً ایکشن نہ لیا تو وہ اسلحہ سرحد پار پہنچ جائے گا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہاں کس قسم کا اسلحہ ہے اور کتنا اسلحہ ہے لیکن کل رات بھی وہاں ایک ٹرک اَن لوڈ کیا گیا تھا اور اس ٹرک کو خود دلاور نے لوڈ کرایا تھا۔ جس ٹرک میں وہ اسلحہ جا رہا تھا، وہ اُلٹ گیا پھر دلاور دوسرا ٹرک لے کر آیا اور اُس نے اپنی موجودگی میں سارا اسلحہ دوسرے ٹرک میں رکھوا لیا۔ آپ سُن رہے ہیں نا؟"

"میں ٹیپ بھی کر رہا ہوں۔" انکل رضوی نے کہا۔

"ضرور کیجیے۔" میں نے کہا۔ "اس ٹرک کے ساتھ اُستاد پیڈرو گیا تھا جو دلاور کا دستِ راست ہے۔ اُنھوں نے ٹرک کو لوڈ کرانے کے لیے راستے کے ایک گاؤں سے پانچ لڑکے پکڑے تھے... بلکہ چھ... ایک جان بچا کے اور زخمی ہو کے نکل گیا، وہ آپ کے پاس آئے گا، اُسے پولیس میں بھرتی ہونے کا بہت شوق ہے، باقی پانچ غالباً قتل کر دیے گئے، میں نے ایک کی لاش بھی دیکھ لی تھی۔ وہ ٹرک بھی راستے میں اُلٹا پڑا ہوا ہے، آپ کو نظر آ جائے گا۔ دوسرے ٹرک کا نمبر نوٹ کر لیں۔ ٹرک گولڈن نہالہ گڈز فارورڈنگ ایجنسی گوجرانوالہ کی ملکیت ہے، معلوم کریں کہ کل رات اُسے کون ڈرائیو کر کے لے گیا تھا۔"

"میں معلوم کر لوں گا۔"

"اور انکل، وہ جگہ بہت خطرناک ہے۔" میں نے کہا۔ "اس کے آس پاس ایک تین فٹ چوڑی خندق ہے۔ اُن وطن دشمنوں نے اپنے مقاصد کے لیے اُسے ممنوعہ علاقہ بنا رکھا ہے، جگہ جگہ پھندے اور شکنجے لگا رکھے ہیں۔ غالب کی ٹانگ ایک شکنجے میں پھنس کر ٹوٹ گئی ہے، ہو سکتا ہے آس پاس بارودی سُرنگیں بھی ہوں۔ آپ کو اپنے ساتھ خاصی مسلح فورس لانا پڑے گی۔ آپ مناسب سمجھیں تو یہ معاملہ اعلیٰ فوجی حکام کے سپرد کر دیں، میں آپ کو دوبارہ فون نہیں کروں گا، آپ کی کامیابی کی خبر اخبار میں دیکھ لوں گا۔"

"ممکن ہے یہ خبر دبا لی جائے، مُلکی سلامتی اور مفادِ عامّہ کے پیشِ نظر..."

"اگر آپ یہ آپریشن رات کے وقت کریں تو بہتر ہوگا۔"

"میرا کام مجھ پر چھوڑ دو، تمھارے مشوروں کے بغیر بھی میں کر لوں گا۔"

"سوری انکل۔" میں نے شرمندگی سے کہا۔ "کیا کیتھرین نے آپ کو کچھ نہیں بتایا؟"

"بتایا تھا۔"

"اس کے باوجود آپ کو شک ہے؟"

"گڈ مے، یہ کس نے کہا ہے کہ شک ہے۔" انکل رضوی بولے۔ "میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ اس سب سے دلاور کا تعلق ثابت نہیں ہوتا۔"

"وہ بھی ہو جائے گا، ابھی اتنا ہی غنیمت ہے کہ آپ کو ہم پر اعتبار آیا کہ ہم کوئی غلط کام نہیں کر رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

"لیکن مجھے اس طریقۂ کار سے اختلاف ہے، جو تم لوگوں نے اختیار کیا ہے۔"

"مجھے افسوس ہے انکل کہ آپ کا قانون اور ضابطوں والا طریقۂ کار ہمارے کام نہیں آ سکتا۔" میں نے کہا۔ "آپ شاید کاغذی کارروائیوں میں ہی اُلجھے رہ جاتے اور نکلنے والے نکل جاتے۔ ہم نے تو بہت کچھ کر لیا۔"

"مجھے معلوم ہے، زیادہ شیخی بگھارنے کی ضرورت نہیں۔" وہ بولے۔

میں ہنسا کیونکہ اب اُن کے لہجے میں واضح طور پر شفقت آ گئی تھی۔ وہ مجبور نہ ہوتے تو شاید کھُل کر اسی طرح ہمارا ساتھ دیتے جیسے اب اکرام شیخ دے رہا تھا کیونکہ اس نے نوکری چھوڑ دی تھی۔ "کیا معاش سراج واپس پہنچ گیا انکل؟"

"نہیں، اس کا کچھ پتا نہیں۔" وہ بولے۔ "اُسے ڈیوٹی سے غائب ہونے کے جُرم میں معطل کر دیا گیا ہے۔"

"کیا اُس کا چارج کسی ڈی آئی جی نے سنبھالا ہے؟"

"نہیں، ابھی تو اس بارے میں کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "بلکہ کسی ڈی آئی جی کے وہاں جانے کا کیا سوال، ایس پی بھی شاید کوئی نہیں ہے ابھی تو... کوئی ڈی ایس پی جائے گا، ایس پی کی جگہ کام کرے گا۔"

"اُس نے انسپکٹر سندر کو قتل کر دیا تھا۔" میں نے کہا۔

"اس کا کوئی ثبوت نہیں ملا۔" انکل رضوی نے کہا۔

"یہی تو خرابی ہے ساری، آپ ثبوت ڈھونڈتے رہ جاتے ہیں، سچ کو کسی کی زبان سے سچ نہیں مانتے۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ میں آپ سے جھوٹ بول سکتا ہوں؟ محسن جھوٹ بول سکتا ہے؟"

"میں جس نظام یا انصاف کی جس مشینری کا پُرزہ ہوں، اس میں ثبوت کے بغیر نہ سچ کو سچ تسلیم کیا جاتا ہے، نہ جھوٹ کو جھوٹ، میرا ذاتی عقیدہ یا یقین کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔" وہ بولے۔ "یہ بتاؤ کہ تم خود کہاں ہو؟"

اُن کے سوال سے میرا ماتھا ٹھنکا۔ "میں ملتان روڈ کی طرف چڑھیسویں میل پر ہوں، واپڈا کے ریسٹ ہاؤس کے قریب۔ آنٹی کیسی ہیں؟"

"ٹھیک ہیں۔"

"اُنھیں میرا اسلام کہیے۔" میں نے کہا۔ "وہ تو مجھ سے خفا نہیں ہیں؟"

"نہیں، تمھارے لیے دُعا کرتی رہتی ہیں۔"

"مجھے آپ کی دُعاؤں کی بھی ضرورت ہے انکل۔" میں نے کہا۔

"میری دُعائیں..." اُنھوں نے جذباتی لہجے میں کہا۔ "ابھی تک تو تمھارے کام آئی نہیں ہیں۔" اور فون بند کر دیا۔ اُنھوں نے اعتراف کر لیا تھا کہ جہاں تک دُعا کا تعلق ہے تو وہ ہمارے لیے دُعا ضرور کرتے ہیں مگر کسی معاملے میں ہماری مدد کرنا اُن کے اختیار کی بات نہیں۔ میرے لیے یہ بھی بڑے اطمینان کی بات تھی کہ ان کی دُعائیں بھی میری خیر خواہی کے لیے وقف ہیں۔

میرا دل چاہتا تھا کہ میں پھر شہلا سے بات کروں، آنٹی سے بات کروں، کیتھرین اور نجولی سے بات کروں لیکن میں سارا دن کھمبے پر ٹنگا نہیں رہ سکتا تھا۔ شاید رضوی صاحب بھی لمبی گفتگو کو غیر محفوظ سمجھتے تھے۔ میں اُس وقت جب میری کھمبے کے گرد لپٹی ہوئی ٹانگیں جواب دینے والی تھیں، نیچے گرنے کے بجائے پھسلتا ہوا نیچے اُتر آیا اور اوورسیئر صاحب کو دیکھ کر مسکرایا۔

"یہ ایس۔ ایس پی شہلا، کوئی خاتون ہیں؟" وہ بولا۔

"شہلا ان کی بیٹی ہے۔" میں نے کہا۔ "میری کلاس فیلو تھی۔"

"وہ سخت مرعوب نظر آنے لگا۔ "کرنل صاحب! میں بہت غریب سا آدمی ہوں۔"

"اگر آپ غریب ہیں تو اللہ ہم سب کو غریب کرے۔" میں نے کہا۔ "پاکستان کے بچّے بچّے کو غریب کرے۔"

"میرا مطلب تھا، یہ نوکری کا معاملہ ہے۔"

"آپ پر آنچ نہیں آئے گی۔ آپ آنچ کے قریب جائیں گے تو ضرور آئے گی اور مجھے لگتا ہے کہ آپ آگ سے کھیل رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

"جی، میں سمجھا نہیں۔" وہ بوکھلا کے بولا۔

"سمجھا کریں۔" میں نے کہا۔ "اوورسیئر جب ایسی شاندار گاڑی میں پھرتا ہے تو اس کا مطلب دیکھنے والے کیا لیتے ہیں! یہی کہ آپ آگ بھر رہے ہیں اپنے نامۂ اعمال میں، اپنی قبر میں، اپنی اولاد کے خون میں۔"

"میں... میں یہ سب چھوڑ دوں گا۔" وہ لرزتے ہوئے بولا۔

"چھوڑ دوں گا۔" میں نے قہقہہ مارا۔ "چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی، عیش کیجیے، جب تک مقدر میں ہے، ہم کسی سے کچھ نہیں کہیں گے، جب بُرا وقت آئے گا تو آپ خود محسوس کریں گے کہ آخری وقت کی توبہ کیوں قبول نہیں ہوتی۔ چلیں، اب ہمیں شہر لے چلیں۔"

غالب گاڑی میں بیٹھا ہوا سخت بے چین تھا مگر اوورسیئر کے سامنے اُس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔

"یار، معاف کرنا... وہ اپنے ایس۔ ایس پی صاحب ذرا لمبی بات کرنے لگ گئے۔"

"ایس۔ ایس پی... ضامن رضوی سے بات کر رہے تھے آپ؟" وہ چونکا۔

"ہاں، میں نے اُن کو سب بتا دیا ہے، اب باقی کارروائی وہ خود کریں گے۔" میں نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ اوورسیئر نے کار اسٹارٹ کی۔ ایک بار پھر ہم پُرانے راستے سے گزرے۔ وہ ٹرک اب بھی اُلٹا پڑا ہوا تھا، شاید وہ لاش بھی وہیں پڑی ہوئی ہوگی۔ میں نے سوچا، اُس نوجوان کی یا اُن پانچوں کی لاشیں جو تاریک راہوں میں مارے گئے، کسی کو معلوم بھی نہیں ہوا کہ کیوں مارے گئے۔ ایک حوالدار کو سانپ نے ڈس لیا تھا۔ کتنی سچ بات تھی کہ سانپ نے سانپ کو ڈس لیا تھا۔ میں اونگھنے لگا۔

گاڑی رُکنے لگی تو میں نے آنکھیں کھولیں اور اچانک میری نظر نے پولیس کو دیکھا جو ٹرک کے درمیان ہمارا راستہ روکے کھڑی تھی۔

اگر میرے ساتھ محسن ہوتا تو میں اطمینان سے فرانسیسی میں کچھ بھی کہہ سکتا تھا لیکن مرزا غالب مادری زبان کے علاوہ کوئی زبان جانتے تھے تو وہ حلقوں کی زبان تھی اور حلقوں کی بیلوری کا ایک ناقابلِ اعتبار نمونہ ہمارے ساتھ اوورسیئر کی شکل میں موجود تھا۔

"یہ تو معاملہ کچھ گڑبڑ نظر آتا ہے۔" میں نے کہا۔

"لگتا تو ایسا ہی ہے کہ یہ خیر دانی صاحب کے قائم مقام حسن کی عنایتِ خسروانہ ہے۔" غالب نے دقیق اُردو میں کہا۔ اس کی مراد انکل رضوی سے تھی جو آجکل شہلا کے والد بنے ہوئے تھے۔

"اس محاصرے کو توڑ کر نکلنا ہے اوورسیئر صاحب۔" میں نے کہا۔

"کیا جو توڑ کر نکلنا ہے۔" اوورسیئر نے کار کی رفتار اب بہت کم کر دی تھی۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے کرنل صاحب۔"

"آپ دیکھتے رہیے کہ کیسے ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم سب کر لیں گے۔"

"لیکن... وہ پیچھے سے گولی مار دیں گے... بلکہ گولیاں..." اوورسیئر نے کہا۔

"پھر کیا ہوا۔" مرزا غالب نے کہا۔ "موت کا ایک دن معین ہے۔"

"آپ... آپ کا مطلب ہے کہ... خواہ میں فوت ہو جاؤں... مگر گاڑی کو بھگا کر لے جاؤں... ان کے بیچ میں سے یوں گزار کے لے جاؤں جیسے ان کی گولی میرے جسم میں سے گزرے گی۔" اوورسیئر نے تقریباً رو کے کہا۔

"نہیں نہیں... آپ گاڑی روک لیں۔" میں نے کہا۔ "فوت ہوں آپ کے دشمن۔"

"یعنی وہ سب جو آپ کو رشوت دینے پر مجبور ہیں۔" غالب نے کہا۔ گاڑی رُک گئی کیونکہ اب ہمارے بالکل سامنے سڑک کے وسط میں ایک پکا تین پھولوں والا تھانیدار اور ایک سب انسپکٹر اس طرح کھڑے ہوئے تھے جیسے روڈ بلاک کرنے کے لیے دو ڈرم رکھ دیے گئے ہوں۔ وہ تھے بھی بالکل ڈرم۔

"اب آپ ان سے کہیں گے کہ ہم محکمۂ انہار کے بیلدار ہیں۔" میں نے ریوالور نکال کے اوورسیئر کی گدی پر رکھا اور ہٹا لیا۔

"یعنی آپ کے ماتحت... آپ ہمارا کچھ بھی نام بتائیں لیکن موت کو مت بھولیں۔" غالب نے اوورسیئر کو دوسرے ریوالور کی جھلک دکھا کے کہا۔

اوورسیئر نے صرف ایک بار تھوڑا سا سر گھمایا تھا۔ پھر شاید اس نے سمجھ لیا تھا کہ گدی پر یہ دھات کا ٹھنڈا لمس صرف ریوالور کی نال کا ہی ہو سکتا ہے۔ وہ اقرار میں سر نہ ہلاتا تو کیا کرتا۔

"پکا تھانیدار گاڑی کے دائیں طرف آ گیا۔ دو پھول والا بائیں طرف سے غالب کے قریب پہنچا۔ ان دونوں کی نخوت اور فرعونیت کے تکبر سے بگڑی ہوئی مکروہ صورت دیکھ کر اور ان کے جسم پر غور کرنے سے یہ خیال آتا تھا کہ وہ بھائی نہیں تو کزن ہیں۔

"نیچے آ جاؤ۔" انسپکٹر نے بڑی تمکنت سے اوورسیئر کو حکم دیا۔

"نیچے کہاں... گاڑی کے نیچے؟" میں نے پیچھے سے کہا اور اوورسیئر کا کندھا دبا کے اسے نیچے اترنے سے روک دیا۔ "تم خود کیوں نہیں آ جاتے گاڑی کے نیچے؟"

"بیکار کے نیچے کیسے آ سکتے ہیں۔" غالب نے مزید اشتعال انگیزی کی۔ "یہ ٹرک کے نیچے شاید آ جائیں۔"

اپنی افسری کی یہ بے عزتی دیکھ کر تھانیدار اس غبارے کی طرح اُچھلا اور پھٹ گیا جسے آگ پر رکھ دیا گیا ہو۔ اس نے عادت کے مطابق مجھے کچھ روایتی گالیاں دیں جو آدمی پولیس میں رہ کے سیکھتا ہے۔ "پہلے تو میاں جی تو نیچے آنا۔" اس نے غضبناک لہجے میں غرا کے پیچھے والا دروازہ کھولا۔ "تجھے ہم اتارتے ہیں قبر میں۔"

تقریباً اسی وقت سب انسپکٹر نے اپنے افسرِ اعلیٰ کی تقلید کرتے ہوئے غالب کی عزت افزائی کی اور دوسری طرف کا دروازہ کھول لیا۔ میں یہی چاہتا تھا۔ خود غالب کے ذہن میں بھی ایسی ہی اسکیم آئی ہوگی کہ وہ دونوں ہمارے جال میں پھنس گئے۔ انسپکٹر کا خوفناک مونچھوں والا بھاری بھرکم چہرہ میرے اوپر آیا اور اس کا ہاتھ مجھے گرفت میں لینے کے لیے آگے بڑھا تو میں جان بوجھ کے پیچھے ہوا اور سیٹ سے چپک گیا۔ میری پشت غالب کی پشت سے لگ گئی۔ میں نے پیچھے کی طرف زور لگانا شروع کیا جیسے میں تھانیدار کے خلاف جسمانی مزاحمت کر رہا ہوں۔ اس سے تھانیدار اور اس کے ماتحت کے غصے میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔

"اوئے... تمھاری تو... اوئے باہر نکل کنجر دے پتر... میں کہتا ہوں گولی مار دوں گا۔" تھانیدار نے سر اندر ڈال کے ہانپتے اور چیختے ہوئے کہا۔ اس وقت میں اوورسیئر کی حالت نہیں دیکھ سکا لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ اپنی کار کی عقبی سیٹ پر ہوتے والی اس دھینگا مشتی اور پکڑ دھکڑ سے سخت بدحواس ہوگا۔ ایک طرف تھانیدار تھا تو دوسری طرف ملٹری انٹیلی جنس کا ایک کرنل۔ دونوں مسلح تھے اور دونوں اس کو مقتول کر سکتے تھے۔ یہ ہاتھیوں کی لڑائی تھی جس میں وہ ایک حقیر کیڑے کی طرح پس جانے کے اندیشے سے دوچار تھا۔

مشکل یہ تھی کہ دونوں طرف سے کار کے دروازے پورے کھول کے بھی تھانیدار ان کا سیدھا اندر آنا ناممکن تھا۔ ان کی چوڑائی زیادہ تھی اور وہ کار میں اس طرح گھس سکتے تھے کہ ایک سائڈ استعمال کریں۔ یعنی اپنے موت کے گولے جیسے پیٹ کو سامنے رکھیں۔ پھر کمر سے جتنی کمر کو تھوڑا سا خم دیں اور سیٹ پر گر جائیں۔ اگر وہ ایسا کرتے تب بھی سیٹ پر کیسے گرتے جہاں ہم دبکے ہوئے تھے اور ان کے لیے بیٹھ جانے کی جگہ بھی نہ تھی۔ نتیجہ یہ کہ وہ کار کے دروازے میں نیچے دوں نیم برہن، پھنسے ہوئے تھے۔ پیٹ سے نیچے کا حصہ کار سے باہر تھا اور بے کار تھا۔ اندر تک ان کے ہاتھ پہنچے ہوئے تھے اور انھوں نے ہمیں دبوچ بھی لیا تھا لیکن ہمیں کھینچ کے باہر نکالنا ان کے لیے چیلنج بن گیا تھا۔

"تو کیا ہمیں گولی مارے گا۔ توپ کے گولے کی اولاد۔" میں نے تھانیدار کی گردن میں باہیں حمائل کر دیں۔ وہ اور پھنس گیا۔

"ہم تیرے مقابلے میں تو انگور ہیں تربوز کے بچے۔" غالب نے کہا۔ "لیکن یہ انگور کھٹے ہیں۔"

"اوئے چھوڑ مجھے۔" تھانیدار نے سانڈ جیسی گردن کو اِدھر اُدھر ہلا کے میری باہوں کے ہار سے نکلنا چاہا۔

سب سے بُرا حال اوورسیئر کا تھا۔ "جناب... اجی سُنیے... کرنل صاحب... تھانیدار صاحب... یا میرے مولا... کس مصیبت میں ڈال دیا تو نے مجھ غریب کو..." وہ مسلسل بول رہا تھا مگر اس کی سننے والا کوئی نہ تھا۔

بالآخر میں نے محسوس کیا کہ اب تماشا کافی ہو چکا۔ میں نے تھانیدار کے سر کو بالوں سے پکڑ کے... کیونکہ اس کی ٹوپی اس دھینگا مشتی میں پہلے ہی گر چکی تھی، کار کے دروازے اور کھڑکی کے درمیان کی جگہ پر مارا۔ اسی وقت غالب نے سب انسپکٹر کے سر پر مارنے کے لیے ریوالور اُٹھایا تو اس کا دستہ پیچھے میرے سر سے ٹکرایا۔

"ابے دیکھ کے... دیکھ کے... یہ اپنا سر ہے۔" میں نے کہا اور تھانیدار کے سر کو 'رِی باؤنڈ' میں دوبارہ اسی جگہ مارا۔ تھانیدار نے پہلے دردِ زہ میں مبتلا بھینس جیسی آواز نکالی۔ پھر سب انسپکٹر بھینسے کی طرح ڈکرایا اور وہ دونوں تقریباً باہم پیر گر گئے۔ غالب کی ٹانگ میں شاید درد کم تھا کہ اس نے میرا ساتھ پورا دیا۔ افسران کے کمترین ماتحت ابھی تک جیپ میں تشریف فرما تھے کیونکہ انھیں اپنے افسران کے اختیارات اور خطرناک مجرموں سے نمٹنے کی اہلیت پر پورا اعتماد تھا۔ جب میں باہر نکلا تو وہ کچھ نہ کر سکے کیونکہ افسروں کے ریوالور اب میرے ہاتھ میں تھے۔ ان کا منہ کھلا رہ گیا۔ انھوں نے ایک نظر افسرانِ اعلیٰ کی طرف دیکھا جن کا نچلا دھڑ کار کے دروازے سے باہر پڑا تھا اور باقی افسر اندر اوندھا ہو چکا تھا۔ پھر میرے تنی ہوئی کو دیکھا اور اوا ئے فرض پر لعنت بھیجتے ہوئے جان بچانا بہتر سمجھا۔ جان ہے تو جہان ہے۔

"نیچے اترو۔" میں نے ڈانٹ کر کہا۔

"پہلے اپنے طنبورے نیچے پھینک دو۔" غالب نے ان کی دقیانوسی رائفلوں کی طرف اشارہ کیا جو انگریز کے دور کی نشانیاں تھیں جن کو وہ ہر وقت سینے سے لگا کے رکھتے تھے مگر یہ جنگ کے لیے طنبورے سے زیادہ کارآمد نہیں تھیں۔ طنبورے بجائے تو جا سکتے تھے مگر وہ ان کو چلانے کے قابل نہیں اور بجانے کے۔ غالب گاڑی میں سے ریوالور نکالے ان کو دیکھتا رہا۔

"جو... ہو ہو ہو... ہو حکم... عالی جاہ..." ایک کانسٹیبل نے کہا جو غالباً پیدائشی ہکلا تھا۔

"مذاق... اُڑا... اڑا... اڑاتے... ہو... میرا۔" غالب نے کہا اور اس کے سر کا نشانہ لے کر اوپر فائر کر دیا۔

"میں... میں... میں... میری... کیا مجال... عالی... جاجا جا... جاہ۔" وہ جیپ سے گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ اس نے اپنی رائفل اپنے قدموں میں ڈال دی تھی۔ دوسرے کی خودی کچھ بلند تھی۔ وہ آہستہ آہستہ اطمینان سے نیچے اترا۔ اپنی رائفل کو اس نے جیپ میں ہی چھوڑ دیا... اوورسیئر بھی ہمت کر کے کار سے نکل آیا۔

"یہ آپ نے کیا غضب کیا... کرنل صاحب..." وہ بولا۔ "میں غریب آدمی..."

"چپ کرو... غریب کے لُطفے..." میں نے دہاڑ کر کہا۔ "دوبارہ خود کو غریب کہا تو پکے یتیم ہو جاؤ گے۔"

"ہمارا راستہ کیوں روکا تھا؟" میں نے واحد ہوش مند کانسٹیبل سے کہا تھا۔

"اس لیے کہ تم جیل سے بھاگے ہو۔" وہ بولا۔

"ہم جیل سے بھاگے ہیں؟" میں نے اور غالب نے ایک ساتھ کہا۔

"اور نہیں تو کیا ہم جیل سے بھاگے ہیں؟" کانسٹیبل نے ایک معقول سوال کیا۔

"مگر... کیا ہم جیل سے بھاگے ہوئے لگتے ہیں؟" غالب نے کہا۔ "حُلیے سے یا شکل سے... یا لباس سے..."

کانسٹیبل نے نفی میں سر ہلایا۔ "تم نے حُلیہ، صورت اور لباس سب بدل لیا ہے۔"

"جیل سے کون فرار ہوا ہے؟" میں نے کہا۔

"اور کس جیل سے؟" غالب نے پوچھا۔

"ایک تو ڈاکو مولا داد عرف پاٹے خاں ہے۔" کانسٹیبل نے کہا۔ "دوسرا اس کا ساتھی اور دشمن ہے زبردست شاہ عرف گورا۔"

"اور کیا پاٹے خاں کالا ہے؟" میں نے کہا۔

"نہیں... مگر زبردست شاہ سورج مکھی ہے۔" کانسٹیبل بولا۔ "اس کے بال بھی سفید ہیں اور سارا جسم سفید ہے... برص کے مریض کی طرح... اس لیے وہ گورا ڈاکو مشہور ہو گیا... بالکل گوروں کی طرح لگتا ہے۔"

"تمھارا مطلب ہے انگریزوں کی طرح۔" غالب نے کہا۔ "کیا ہم دونوں میں سے کوئی ایسا لگتا ہے؟"

"تم دونوں نے ٹھیک آپ کیا جا ہے۔" کانسٹیبل نے قطعی لہجے میں کہا۔ اسے قائل کرنا بہت مشکل تھا کہ ہم وہ مفرور ڈاکو نہیں ہیں۔

"ابھی تم نے کہا کہ ساتھی اور دشمن ... یہ کیا بات ہوئی؟"

"بظاہر وہ ایک دوسرے کے دشمن تھے۔" کانسٹیبل بولا۔ "سب ہی جانتے ہیں۔ مگر جیل سے فرار ہونے میں انھوں نے ایک دوسرے کی مدد کی۔"

"تم مجھے کچھ پڑھے لکھے لگتے ہو۔" میں نے کہا۔

"میں گریجویٹ ہوں۔" وہ بولا۔ "کوئی اعتراض ہے تمھیں؟"

"بالکل ہے ... بی اے پاس کیا تھا تم نے پولیس میں بھرتی ہونے کے لیے جہاں بیشتر لوگ انگوٹھا ٹیک ہیں۔" غالب نے کہا۔ "پیٹھان پڑھے ہیں۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" وہ بولا۔ "کماتے کھاتے تو اچھا ہیں... عیش تو کرتے ہیں۔ بی اے ایم اے کو کون پوچھتا ہے۔"

"افسوس نوجوان..." میں نے کہا۔ "کیا تم حرام اور حلال..."

"چلو چلو... یہ فتوے مت دو۔" کانسٹیبل حقارت سے بولا۔ "بہت وعظ سنے ہیں میں نے... بچپن سے جوانی تک سب کی بہت سنی۔ سب منافق اور ریاکار تھے۔ جو زیادہ نصیحت کرتے تھے وہی زیادہ بدمعاش نکلے۔ خود تم کون سا حرام حلال کے فرق کو سمجھتے ہو۔ باقی سب بھی تمھاری طرح ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ تم ڈاکو کہلانے لگے ہو اور وہ ڈاکو نہیں کہلاتے۔"

"بات یہ ہے عزیزم..." میں نے متاثر ہو کے کہا۔ "ہم اس وقت تم سے معاشرتی یا معاشی مسائل پر بحث نہیں کر سکتے۔ تمھارے پاس بھی یقیناً ایک دردناک کہانی ہوگی کہ تم نے کس طرح ڈگری لے کر ملازمت کی تلاش میں دھکے کھائے اور کس طرح تمھارے وہ سنہرے خواب خاک میں مل گئے جو اس ڈگری سے وابستہ تھے۔ اس لیے کہ تمھارے پاس سفارش کا انجن نہیں تھا جو تمھاری زندگی کی گاڑی کو دھکیل کر منزلِ مراد تک پہنچا سکتا۔ چنانچہ نامراد ہو کے تم نے کوئے ملامت کا رُخ کیا اور کانسٹیبل بن کے حرام کھانے پر کمر باندھ لی۔ دُنیا لے لی اور عاقبت کو چھوڑ دیا۔"

"یہ... یہ سب تمھیں کیسے معلوم ہوا؟" کانسٹیبل نے آنکھیں جھپکا کے کہا۔

"تم ابھی بچے ہو... اپنے برخوردار ہو۔" میں نے خوش ہو کے کہا۔ "یہ کہانیاں تو ایسی ہیں کہ ان پر کوئی فلمساز فلم نہیں بناتا... کوئی ادیب قلم نہیں اٹھاتا اور کوئی غور نہیں کرتا۔ کسی کو اس مسئلے اور اس سے جنم لینے والے دوسرے مسائل سے اس لیے دلچسپی نہیں رہی کہ مسئلے کا حل کوئی نہیں۔ چنانچہ اس پر نہ کابینہ کے اجلاس میں غور ہوتا ہے نہ اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی میں، جہاں پہلے معاشرے کے تین حصے تھے۔

فریاد کرنے والے، فریاد سننے والے... اور وہ جن کے خلاف فریاد کی جاتی تھی۔ اب وہ دو رہ گئے ہیں۔ کیونکہ فریاد سننے والے بھی وہی ہو گئے، جن کے خلاف فریاد کی جاتی ہے۔ یہ بھی حق فریادی کو حاصل نہیں کہ ملزم کو منصف ماننے سے انکار کرے یا منصف کو ملزم قرار دے۔"

"معاف کرنا دوست!" غالب بولا۔ "ہم ہی وہ بدبخت سیاہ کار ڈاکو ہیں۔ پاٹے خاں یہ ہے اور گورا ڈاکو میں ہوں۔"

"ہم نے کسی پولیس والے کو آج تک دوست نہ کہا، نہ ہم۔" میں نے اس کانسٹیبل کو گلے لگا لیا۔ "تم پہلے شخص ہو جس نے پولیس وہ کے بھی سچ بولنا نہیں چھوڑا... اور تمھارے حالات وہی ہیں جو ہمارے حالات تھے۔ فرق صرف کل اور آج کا ہے۔ ہم کل ڈاکو بنے تھے، تم آج بنے ہو لیکن ہو تم ہمارے ہم پیشہ... اچھی بات یہ ہے کہ تم خود کو قانون کا محافظ نہیں کہتے بلکہ ڈاکو تسلیم کرتے ہو۔"

"میں ذرا بزدل تھا، اس لیے ڈاکو نہیں بن سکا۔" نوجوان کانسٹیبل ذرا شرمندہ ہو کے بولا۔ "یہ زیادہ ہمت کا کام ہے۔"

"ہاں، ہم پکڑے بھی جاتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "تم پکڑے نہیں جاتے بلکہ ہمیں پکڑتے ہو۔ ڈاکوؤں کو بھی لوٹتے ہو۔ اب یہ اپنے اوورسیئر صاحب ہیں جو خود کو غریب آدمی کہتے ہیں حالانکہ یہ کار ڈالر کی ہے۔"

"قسم خدا کی خریدی ہے میں نے..." اوورسیئر نے شور مچایا۔

میں نے اس کے ایک جھانپڑ دیا۔ "کیسے خریدی؟ لاٹری نکلی تھی یا پردادا کا گاڑا ہوا خزانہ مل گیا تھا۔ محنت کرنے والوں کے حق پر ڈاکا ڈال کے لی تھی یہ گاڑی۔"

"دیکھو بھائی۔" اوورسیئر نے ہاتھ جوڑ کے کانپنا شروع کیا۔ "یہ کوئی قصور ہے تو بتاؤ... میں نے تو تمھاری مدد کی تھی۔"

"ہاں... تو تم تسلیم کرتے ہو کہ تم نے ڈاکوؤں کی مدد کی تھی..." کانسٹیبل نے اسے ایک اور جھانپڑ مارا۔ "تم زیرِ حراست ہو۔"

"اور ہم... ہمیں اجازت ہے؟" میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

"اگر چاہو تو ہمارے ساتھ چلو۔" غالب نے کہا۔ "اس سرکاری ہار کو اتار پھینکو۔" وہ تمام گفتگو کار کی کھڑکی سے سر نکال کے کر رہا تھا۔

"نہیں سجنو! میں اتنا جی دار نہیں ہوں۔" وہ ہاتھ ملا کے بولا۔ "میں یہی وردی پہن کے زیادہ آسانی سے اپنا کام کر سکتا ہوں۔ تم بھی تو نقاب پہنتے ہو۔ اسے میرا نقاب سمجھ لو... جاؤ بھاگ جاؤ اس سے پہلے کہ میرے افسر ہوش میں آئیں... مگر دیکھو... ایسے مت بھاگو۔ ہم دونوں کو ملبا لٹا جاؤ تاکہ ہم پر تو الزام نہ آئے... اور ہاں جاتے وقت یہ جیپ لے جانا۔"

"دل تو نہیں چاہتا تم پر ہاتھ اُٹھانے کو۔" میں نے کہا۔ "مگر مجبوری ہے۔"

"یہ تو بتاؤ کہ تم اوورسیئر صاحب کا کیا کرو گے۔" غالب نے کہا۔

"یہ فالتو ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہمارے لیے اب ان کا کوئی مصرف نہیں رہا... کہو تو قتل کر دوں، کہو تو پولیس کے حوالے کر دوں؟"

"اوورسیئر صاحب سے پوچھ لو ان کی کیا مرضی ہے۔" غالب نے کہا۔ "کیا بیان دیں گے یہ؟"

"میں وہی بیان دوں گا جو تم کہو گے۔" اوورسیئر اب ہکلانے لگا تھا۔ اس کا بلڈ پریشر یقیناً اتنا بڑھ گیا تھا کہ اُسے ہارٹ اٹیک ہو سکتا تھا۔

"اس بات کی کیا ضمانت ہوگی کہ بعد میں تم اور کچھ نہیں کہو گے؟"

"تم کس قسم کی ضمانت چاہتے ہو؟" اوورسیئر بولا۔ اسے اب ذرا بھی شک نہیں رہا تھا کہ ہم ہی پاٹے خان اور گورا ڈاکو ہیں جو بھیس بدل کے اُسے مل گئے تھے۔ ایک کانسٹیبل کے سامنے ہم نے تسلیم کیا تھا کہ ہم بھی تعلیم یافتہ ہیں اور گردشِ حالات نے ہمیں ڈاکو بنا دیا ہے۔ عموماً لوگ چور ڈاکو ایسے ہی بنتے ہیں۔ شوقیہ کوئی اِس پیشے میں قدم نہیں رکھتا اور ماں باپ جو ہمیشہ اولاد کو ڈاکٹر، انجینئر بنانے کی سوچتے ہیں کسی بھی بیٹے کو ڈاکو بنانے کی پلاننگ نہیں کرتے۔

"ضمانت کی فکر چھوڑ دو۔" میں نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہا۔ "تمھارے وعدے کی ضمانت تمھاری جان ہے۔ اس جان کو تم کسی سیف ڈپازٹ والٹ میں رکھوا دو تب بھی ہم نکال کے ضائع کر دیں گے۔ اس کے علاوہ تمھاری بیوی بچے بھی تمھارے وعدے کے ضامن ہوں گے۔"

"بیوی بچے... ان کا میرے معاملات سے کیا تعلق؟"

"ابھی تو نہیں ہے لیکن تم نے وعدے کی خلاف ورزی کی تو کوئی نہ کوئی تعلق ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔ "تم اس دنیا میں نہ رہے۔ یا وہ اس دنیا کو چھوڑ گئے، بات تو ایک ہی ہے۔ لواحقین اور وارث صرف اثاثوں کے، کوٹھی کار اور بینک بیلنس کے حقدار نہیں ہوتے۔ انھیں مرحوم کے قرضے بھی چکانا پڑتے ہیں۔ ان کے کیے کی سزا بھی بھگتنا پڑتی ہے۔"

میرا مقصد صرف اپنی دھمکی میں اثر پیدا کرنا تھا، ورنہ ایسا نہ ہوا تھا اور نہ ہو سکتا تھا کہ ہم اپنے دشمنوں کے مظالم، ان کی درندگی اور سفاکی کا بدلہ ان کے خاندان والوں سے لیں۔ ان کی بیویوں کو سزا دیں یا معصوم بچوں کو۔

"اپنے بچوں کی زندگی کی قسم کھاؤ۔" غالب نے کہا۔

"پہلے یہ تو بتاؤ کہ تمھارے بچے بھی ہیں یا نہیں۔" میں نے کہا۔ "بچے ہی نہ ہوں تو ہزار بار قسم کھانے سے بھی کیا نقصان ہو سکتا ہے۔"

"میرے چھ بچے ہیں۔" وہ بولا۔ "تین لڑکے، تین لڑکیاں۔ میں ان کی زندگی کی قسم کھاتا ہوں کہ کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

"یہ نہیں... کہو کہ وہی بتاؤں گا جو مجھے بتایا جائے گا۔" غالب نے اُسے ڈانٹا۔

"ہاں، ہاں۔ وہی کہوں گا، ہمیشہ وہی کہوں گا جو تم کہو گے۔"

"اچھا تو سنو۔" میں نے کہا۔ "تم سے ہماری ملاقات ابھی کچھ دیر پہلے اچانک ہوئی تھی جب ہم نے جنگل سے نکل کر سڑک پر تمھارا راستہ روک لیا تھا۔ ہم نے ریوالور دکھا کے تم کو مجبور کیا کہ تم ہمیں گاڑی میں بٹھا کے وہاں لے چلو جہاں ہم کہیں۔ تم انکار نہیں کر سکتے تھے کیونکہ تم کو خطرہ تھا کہ یہ دونوں شخص جرائم پیشہ نظر آتے ہیں۔ یہ تمھارا خون کر کے بھی گاڑی لے جائیں گے۔ ابھی تم مشکل سے ایک میل دور آئے تھے کہ تمھارا راستہ پولیس نے روک لیا۔ تب تمھیں معلوم ہوا کہ ہم تو جیل سے فرار ہونے والے ڈاکو تھے۔ اس کے بعد تمھاری اور کانسٹیبل کی ایک ہی کہانی ہوگی کہ ڈاکوؤں نے پہلے افسروں کو قابو کیا، پھر تمھیں مارا اور جیپ لے کر فرار ہو گئے۔ چونکہ تم بے ہوش پڑے تھے، اس لیے تم نے یہ نہیں دیکھا کہ وہ دونوں ڈاکو کس طرف گئے... بیان سمجھ میں آ گیا؟"

"بالکل آ گیا۔ میری طرف سے بالکل مطمئن رہیں۔" اوورسیئر کانپتے ہوئے بولا۔ "اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہو تو معاف کر دیں، پاٹے خاں صاحب... میں ایک غریب..."

اس مرتبہ میں نے اس کے مُنہ پر اُلٹا ہاتھ مارا۔ اس کا ایک دانت ٹوٹ گیا، ہونٹ کٹ گیا اور خون قطرہ قطرہ اس کی سفید قمیص پر گرنے لگا۔ اس نے ایک چیخ ماری اور پھر بھوں بھوں کر کے مضحکہ خیز طریقے پر رونے لگا۔

"چُپ۔ کیا منحوس کتے کی آواز میں رو رہا ہے۔" غالب نے اسے ڈانٹا۔ وہ ایسے چُپ ہو گیا، جیسے گراموفون ریکارڈ پر سے سوئی اٹھا لی جائے۔

"تم پھر بھول گئے تھے کہ تم غریب آدمی نہیں ہو۔" میں نے کہا۔

"جلدی کرو سجنو!" کانسٹیبل بولا۔ "اس موٹے کی فکر مت کرو۔ اگر اس نے بک بک کی تو ہم اسے اندر کر دیں گے کہ یہ بھی ڈاکوؤں کا ساتھی ہے اور اس نے ڈاکوؤں کی مدد کی تھی۔ تم اب نکل جاؤ۔ ایک افسر کچھ ہل رہا ہے۔"

میں نے دیکھا تو سب انسپکٹر کی ٹانگیں ہل رہی تھیں۔ غالب نے پلٹ کے اس کے سر پر ایک وار کیا تو وہ پھر ساکت ہو گیا۔ میں نے اوورسیئر کے ساتھ یہی سلوک کیا۔ وہ پہلے ہی نیم جاں تھا۔ وہ ایک بار گلا پھاڑ کے چلایا اور گھوم کے پیچھے گر گیا۔

"تم نے سچ کہا ہے۔" میں نے کانسٹیبل سے مخاطب ہو کے کہا۔ "تم پر وار کرنا اچھا تو نہیں لگتا لیکن مجبوری ہے۔"

"اس طرح میں الزام سے بچ جاؤں گا۔" وہ بولا۔ "تمھارا اللہ بیلی۔"

میں نے اس کی پیشانی پر ریوالور کی نال ماری، جس سے ایک لمبا زخم آیا۔ کھال ڈیڑھ دو اِنچ تک پھٹ گئی اور اس کی پیشانی خون

سے تر ہو گئی۔ زخم کی گہرائی زیادہ نہیں تھی مگر دیکھنے میں وہ اوورسیئر اپنے افسران سے زیادہ زخمی لگتا تھا۔ میں نے اس کے کپڑے بھی یوں پھاڑ دیے کہ معلوم ہو اس نے سخت مقابلہ کیا تھا۔ اس عمل میں کچھ خراشیں بھی اس کے جسم پر آئیں۔

"تھینک یو۔" وہ بولا۔ "اب مجھے ترقی ضرور ملے گی کہ میں نے بڑی بہادری کا مظاہرہ کیا۔" اور اطمینان سے آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ پھر میں نے باقی کارروائی مکمل کی۔ میں نے اوورسیئر کی جیب خالی کی اور کاغذات کو غیر ضروری سمجھتے ہوئے وہیں پھینک دیا۔ ہکلا کے جیپ سے گرنے والا کانسٹیبل ابھی تک بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ اسے گولی نہیں لگی تھی چنانچہ مجھے یہ کچھ عجیب سا لگا کہ وہ گولی کی آواز سن کے بے ہوش ہو گیا تھا۔

"تمہارا یہ ساتھی۔ کیا یہ واقعی بے ہوش ہے۔" میں نے کانسٹیبل سے کہا۔

کانسٹیبل نے مجھے ایک آنکھ کھول کے دیکھا۔ "ہو گا۔۔۔ اسے مرگی کا دورہ پڑتا ہے۔ اس وقت بھی شاید مرگی نے ہی اچانک آلیا تھا۔"

مرگی بھی ہکلانے کی طرح ایک دماغی عارضہ ہے۔ میں نے اس کا علاج لوگوں کو جوتی سے کرتے دیکھا تھا۔ معلوم نہیں جوتی سنگھانے کا نسخہ سب سے پہلے کس حکیم افلاطون نے ایجاد کیا ہو گا مگر میں نے اس سے سچ مچ مرگی کا دورہ ختم ہوتے اور مریض کو ہوش میں آتے دیکھا تھا۔ میرے یورپین ساتھی جو لندن میں میرے کلاس فیلوز تھے، ہندوستانیوں کی جہالت اور اوہام پرستی کا بہت مذاق اڑاتے تھے۔ جوتی سنگھانے والی بات بھی ایک بار سخت نزاع کا سبب بن گئی تھی، جب ہم نے ایک جرمن لڑکی کو مرگی کا دورہ پڑتے ہی جوتی سنگھا دی تھی۔ میں اور محسن چلتے چلتے اس لیے رک گئے تھے کہ لڑکی ہوش میں آگئی تھی۔ تاہم یہ معاملہ اوپر تک گیا تھا کیونکہ عام تاثر ہمارے حق میں نہیں تھا۔ کہا یہی گیا کہ لڑکی کو خود ہوش آیا تھا، ہم نے جوتی سنگھا کے گویا سخت بدتہذیبی کا مظاہرہ کیا۔ اس مرتبہ تو معذرت اور وارننگ پر بات ٹل گئی لیکن دوسری بار اسی لڑکی کو دوبارہ دورہ پڑا تو ہم نے چیلنج کیا کہ اب یہ لڑکی خود ہوش میں نہیں آئے گی۔ انڈین طلبا جو ہمیشہ ہر معاملے میں ہماری مخالفت کرتے تھے، ہمارے ساتھ ہو گئے۔ ہم نے پھر جوتی سنگھائی اور لڑکی نے آنکھیں کھول دیں۔ دوسری بار ایک ڈاکٹر نے ہمارا انٹرویو لیا اور سخت حیرانی کا اظہار کیا۔ اس کے خیال میں یہ برین ٹیومر کی ایک بیماری تھی، جس کا واحد علاج آپریشن تھا بشرطیکہ ٹیومر ایسی جگہ ہو جہاں سے اس کو کاٹ کے نکالا جا سکے اور جان کو خطرہ نہ ہو۔ اور آپٹک نرو کے کٹ جانے سے ناقابل علاج دائمی اندھے پن کا اندیشہ نہ ہو۔ ہم نے یعنی پاکستان ہندوستان کے طلبا نے متعدد غلط سلط تاریخی نام اور حوالے دے کر ثابت کیا کہ یہ طریقہ علاج صدیوں سے کارگر ہے اور اب تو جوتا ہر مرض کا علاج بن گیا ہے۔ آج برسوں بعد یہ بات یاد آئی تو میں ہنس پڑا۔

میں نے ایک تیلی ماچس کی جلائی، پھونک مار کے بجھائی اور فوراً مرگی سے بے ہوش ہو جانے والے کانسٹیبل کے کان کی لو پر لگا دی۔ وہ ہلا تک نہیں۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ اس کی بے ہوشی ڈرامہ نہیں تھی اور وہ بے ہوش بنا ہماری گفتگو نہیں سن رہا تھا۔ اس کی جیب میں سے نقد رقم سوا سو روپے نکلی اور ایک پیکٹ کیپسٹن سگریٹ کا برآمد ہوا۔ میں نے فوراً ایک سگریٹ کار سے جھانکنے والے مزارع کو پیش کی اور ایک اپنے لیے نکال لی۔ سگریٹ کے کش لیتے ہوئے غالب نے سب انسپکٹر کی جامہ تلاشی لی اور میں نے تھانیدار کی۔ مجموعی طور پر ان کے قبضے سے بائیس ہزار روپے کی خطیر رقم ملی جو ہم نے مال غنیمت اور حلال سمجھتے ہوئے رکھ لی۔ کاغذات وغیرہ ہمارے لیے بے مصرف تھے چنانچہ ہم نے وہیں پھینک دیے۔

غالب اپنی ٹوٹی ہوئی ٹانگ کو ہلائے بغیر خاصا سرگرم رہا تھا لیکن اب اس کی صورت دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ وہ تکلیف میں ہے۔ میں نے اسے دونوں ہاتھوں پر اٹھایا اور جیپ میں منتقل کر دیا۔ جیپ میں مجھے تھرماس اور ناشتے دان نظر آئے۔ یہ ناکہ بندی کرنے والی پولیس پارٹی کا لنچ تھا اور چونکہ پارٹی میں دو افسر بھی تھے اس لیے ٹفن کیریئر میں تر مال ملنا یقینی تھا۔ کھانے کو غیر ضروری سمجھتے ہوئے میں نے تھرماس کھولا تو اس میں سے گرم چائے کی دلنواز مہک آئی۔ یہ ڈبل کپ والا تھرماس تھا جس میں دودھ الگ تھا اور سیاہ قہوے میں صرف چینی ڈالی گئی تھی۔ میں نے دودھ کو پھینک دیا اور مگ بھر کے غالب کو پیش کیا۔ میری جیب میں اسپرین بھی تھی اور دوسری اینٹی بائیوٹک بھی۔ اینٹی بائیوٹک کی پہلی خوراک کو چار گھنٹے گزر چکے تھے چنانچہ میں نے غالب کو دونوں دوائیں دے دیں۔

جلدی جلدی چائے کا ایک کپ حلق سے اتار کے میں حوالدار کی طرف گیا۔ یہ گرم چائے نہیں، انتہائی قوت بخش اور جادو اثر ٹانک تھا جس نے مجھے آدمی سے ٹارزن بنا دیا۔ میں نے دوسری سگریٹ سلگا کے ایس آئی کو گاڑی کے اندر کیا، پھر مجھے ایک اور خیال آیا۔ میں نے کچھ دیر سوچا اور پھر اسے باہر نکال لیا۔ اس کی وردی اتارنے میں میرے پانچ منٹ بھی صرف نہیں ہوئے۔ یہ وردی مجھے کمر سے بہت ڈھیلی تھی لیکن میں نے بیلٹ کو ٹائٹ کر لیا اور پھر وردی اپنے انہی کپڑوں پر چڑھا لی جو میں نے پہن رکھے تھے، پھر میں نے سب انسپکٹر کو اسی حالت میں کار کے اندر ڈال دیا جس حالت میں وہ پیدا ہوا تھا۔ فل انسپکٹر کے ساتھ بھی میں نے یہی سلوک کیا۔ اسے ماتحت پر ڈال کے کار کو لاک کیا اور چابیاں اپنی جیب میں ڈال لیں۔ وردی میں نے غالب کو تھما دی۔

"میں اسے نہیں پہن سکتا۔" غالب نے اپنی ٹانگ کی طرف اشارہ کیا۔

"بعد میں دیکھیں گے۔" میں نے کہا اور نیچے سے وہ رائفل اٹھا کے جیپ میں ڈال دی جو مرگی زدہ کانسٹیبل کی ملکیت تھی۔

"میری رائفل مت لے جانا بھتو۔" ہمارے مددگار نے کہا۔ "مجھ پر کیس بن جائے گا۔"

"ہم اتنے احسان فراموش نہیں ہیں دوست۔" میں نے کہا اور اس کی رائفل جیپ میں سے اٹھا کے اس کے قریب ڈال دی۔

"میرا خیال ہے کہ تم نکل جاؤ گے۔" وہ بولا۔ "تم بہت ہوشیار اور ذہین لوگ ہو۔ مجھے ایک بات بتاؤ۔"

"پوچھو۔" میں نے کہا۔

"یہ تم لوگ ایک دوسرے کے دشمن کیوں ہو؟" وہ بولا۔ "مل کے کام کیوں نہیں کرتے۔ اپنی طاقت ایک دوسرے کے خلاف کیوں ضائع کرتے ہو۔ جیسے مل کر جیل سے نکلے ہو، ایسے ہی مل کے باہر رہو۔ فائدہ تمہارا اپنا ہے۔"

"یہ سبق ہم نے سیکھ لیا ہے۔" میں نے کہا۔ "پھر بھی تمہاری بات یاد رکھیں گے۔ نام کیا ہے تمہارا دوست؟"

"چھوڑو نام کو۔۔۔ ہمیں کونسا پھر ملنا ہے۔" وہ بولا۔ "اب جاؤ۔"

"آج تم نے ہماری مدد کی ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ ہو سکتا ہے کہ کل ہم تمہاری مدد کریں۔"

"تم میری کیا مدد کرو گے؟" وہ ہنسا۔ "خیر۔۔۔ میرا نام ہے خدا بخش ولد نور بخش۔"

"جب ہم کچھ کریں گے تو تمہیں معلوم ہو جائے گا۔" میں نے اس سے ہاتھ ملایا اور جیپ میں بیٹھ گیا۔ چابیاں ابھی تک اگنیشن سوئچ میں لگی ہوئی تھیں۔ میں نے جیپ اسٹارٹ کی اور چند منٹ میں ہم ساٹھ میل فی گھنٹا کی رفتار سے رواں تھے۔ خدا بخش کی طرف سے میں مطمئن تھا کہ کچھ دیر میں اس کا کوئی افسر ہوش میں آئے گا تو اسے بھی اٹھا لے گا۔ افسروں کے مقابلے میں اس کی پوزیشن بہت بہتر ہو گی۔

"کیسا عجیب آدمی تھا یہ کانسٹیبل بھی۔ تم نے نام پوچھا؟" غالب نے کہا۔

"ہاں، خدا بخش۔" میں نے کہا۔ "ہمارے حق میں تو فرشتہ رحمت بن گیا، ورنہ وہ ایسا شخص تھا کہ آسانی سے ہار نہ مانتا۔ مرتے مارنے پر اتر آتا تو پریشانی میں مبتلا کر دیتا۔"

"غالباً ذہنی طور پر اسے ڈاکو یا ٹے خاں اور گورے ڈاکو سے ہمدردی ہے۔" غالب بولا۔ "یا وہ ان سے متاثر ہے۔ ممکن ہے ان کے بھی حالات ویسے ہی ہوں جیسے ہمارے ہو گئے ہیں۔"

"ہاں، بات صرف زاویے کی ہے کہ کون کسے کس زاویے سے دیکھتا ہے۔" میں نے کہا۔ "قانون کی نظر میں ہم مجرم، قاتل اور ڈاکو ہیں۔ ہماری نظر میں ملاوا اور نواب خسرو جیسے دولت مند اور معزز لوگ سب سے بڑے ڈاکو ہیں۔"

"صرف پولیس میں کیا۔۔۔ ٹھیکیدار بھی ڈاکو ہیں اور ٹھیکے دینے والے افسر بھی ڈاکو ہیں۔ بیشتر محکموں میں بیشتر لوگ اپنے سرکاری فرائض کے سلسلے میں حاصل ہونے والے اختیارات کو ڈاکے ڈالنے کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ زمیندار اور وڈیرے اپنے مزارعین اور ہاریوں کے حقوق پر یہاں تک کہ ان کی عزت پر ڈاکے ڈال رہے ہیں۔ شریف آدمی کہیں ہے تو روپوش ہے۔ اپنی جان و مال اور آبرو بچانے کے لیے خاموش ہے اور پناہ کے سوا کچھ نہیں مانگتا۔"

"ایک دن ایسا ضرور آئے گا، جب کوئی کسی کے حق پر، مال پر، جان یا عزت پر، انصاف پر اور قانون پر ڈاکا نہیں ڈال سکے گا۔" غالب بولا۔ "ہم مایوس نہیں ہو سکتے۔ ہمارا مایوس ہونا ہی شکست کی پہلی علامت ہو گا۔"

"یہ تو ٹھیک ہے مگر وہ دن کب آئے گا۔" میں نے کہا۔ "میں اور تو۔۔۔ محسن اور ایم آر ایس کے سب خدائی فوجدار۔۔۔ ہم سب احمقوں کی جنت میں تو نہیں رہتے؟"

"نور چشم! ایم آر ایس میں صرف ہم ہی نہیں، دنیا کے لاکھوں کروڑوں لوگ ہیں۔ وہ سب جو ایک یوٹوپیا کے خواب دیکھتے ہیں۔ کرۂ ارض پر انسانیت کی معراج مانگتے ہیں اور اس کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں، کچھ عملاً، کچھ خاموشی سے۔ جو دعا دیتے ہیں وہ بھی تو کچھ کرتے ہی ہیں۔۔۔ ہمارے لیے مورل سپورٹ تو فراہم کرتے ہیں۔"

"اچھا مرزا صاحب۔۔۔ یہ فلسفہ چھوڑو۔۔۔ مجھے یہ بتاؤ کہ کیا ہم اسی طرح سیدھے چلتے جائیں۔ آگے دوسری پولیس پارٹی بھی مل سکتی ہے۔" میں نے کہا۔ "آگے ایک سڑک سیدھے ہاتھ کی طرف جاتی نظر آتی ہے، گاڑی ادھر موڑ لوں؟"

مجھے بالکل اندازہ نہ تھا کہ اس وقت ہم کہاں ہیں۔ لاہور ہمارے مشرق میں ہے یا مغرب میں اور شمال یا جنوب میں ہے تو کتنے فاصلے پر ہے۔ وہ سب سرحد کے قریب کا علاقہ تھا اور مجھے کوئی شبہ نہ تھا کہ وہ نہر مشہور بی آر بی کینال ہو گی جہاں ۶۵ء کی جنگ میں ملک کے ایک جیالے سپوت نے بے مثل جرأت اور شجاعت کا ایک تاریخی کارنامہ سرانجام دیا تھا، جس کی یادگار بھی وہاں موجود ہے مگر مجھے ابھی تک نشانِ حیدر پانے والے اس شہید کو خراجِ تحسین پیش کرنے اور دعائے مغفرت مانگنے کے لیے اس یادگار پر حاضر ہونے کا موقع نہیں ملا تھا۔ سگرائی بھی ایک بے حد غیر معروف نام تھا اور دوسرے گاؤں بھی ایسے تھے کہ لاہور میں رہ کے میں نے کبھی ان کے نام سنے تک نہ تھے چنانچہ مجھے اپنی صحیح جغرافیائی پوزیشن کا تعین کرنے میں دشواری پیش آ رہی تھی۔ یہ کوئی پریشانی کی بات نہیں تھی، اگر ہم سیدھے چلتے جاتے تو کسی نہ کسی شاہراہ پر پہنچ جاتے لیکن سیدھا جانے میں یہ امکان بھی تھا کہ ہم تھانے پہنچ جائیں۔ ہر پولیس پارٹی میں تو کوئی گریجویٹ کانسٹیبل خدا بخش نہیں ملتا۔

جیپ کچے راستوں، جنگلوں اور پتھریلے ناہموار میدانوں یا پہاڑوں کے سفر میں اتنی ہی قابلِ اعتماد اور مفید سمجھی جاتی ہے جتنا صحرائی مسافتوں کے لیے وہ جانور جس کی کوئی کل سیدھی نہیں ہوتی۔ دائیں طرف مڑتے ہی مجھے احساس ہوا کہ جو دُور سے ایک نقلی سڑک نظر آتی تھی، وہ ایک کچے راستے سے زیادہ کچھ نہیں اور آگے جا کے یہ راستہ بھی اتنا دشوار گزار ہوگیا کہ ہمارے پاس کار ہوتی تو اس کا وہی حشر ہوتا جو قالین پر نزاکت سے چلنے والی شہری رئیس زادی کا ہو اگر اُسے ننگے پاؤں دھوپ میں پتھروں پر میلوں چلنا پڑے۔

"یار یہ ہم کس طرف جا رہے ہیں؟" غالب نے کہا "یہ نہ ہو کہ ہم آسمان سے گر کے کھجور میں اٹکنے والی بات کو سچ کر دکھائیں۔ پولیس سے بچ رہے ہیں تو اس سے بھی بڑی مصیبت گلے پڑ جائے۔"

"اب تو میرے خیالات بھی کچھ ایسے ہی ہیں۔" میں نے کہا۔ "معلوم نہیں یہ راستہ کہاں تک ایسا ہی ہوگا۔"

"میں نے ٹائروں کے نشانات تو دیکھے ہیں۔" غالب بولا۔ "شاید جنگل سے لکڑی کاٹنے کا ٹھیکا لینے والوں کی گاڑیاں آتی جاتی ہوں گی۔ آگے کسی آبادی کا وجود تو مشکل نظر آتا ہے۔"

"مجھے تو ڈر ہے کہ ہم گھوم پھر کے دوبارہ اسی نہر کے کنارے پہنچ جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "یا پھر اچانک سڑک ختم اور نہر میں ہمارا بیڑا غرق۔"

"جیپ میں نہر اور نہر میں جیپ۔" غالب نے کہا۔ "بہتر ہے کہ آپ واپس چلیں۔"

میں نے گاڑی کو تھوڑا سا موڑا۔ جیپ کے پہیے ایک جھاڑی کو کچلتے ہوئے گھومے اور جیپ کا رُخ کچھ بدلا۔ میں نے جیپ کو ریورس میں ڈالا تو ایک زبردست جھٹکا لگا۔ "شاید پیچھے کوئی گڑھا آ گیا۔" میں نے کہا۔

"گڑھا یا کنواں؟" غالب نے کہا۔

"موت کا کنواں۔" میں نے کہا۔ "اس میں بھی گاڑی چلا سکتا ہوں میں۔"

لیکن یہ دعویٰ فوراً غلط ہوگیا۔ میں نے گاڑی کو دوبارہ آگے بڑھانا چاہا تو انجن غرایا۔ گاڑی نے تھوڑا سا جھٹکا لیا اور آگے بڑھ کے پھر پیچھے آگئی۔ میں نے دوبارہ کوشش کی اور زیادہ ریس دی۔ انجن گرجنے لگا اور پہیے تیزی سے گھومتے ہوئے شور کرنے لگے۔ پیچھے گرد کے ساتھ خشک پتے اُڑے تو میں نے سمجھ لیا کہ پہیہ گڑھے میں زیادہ دھنس گیا ہے۔ اب اس کے آگے پیچھے کی سطح زیادہ بلند اور چکنی ہوگئی ہے۔ میں جتنی کوشش کرتا پہیہ اتنی ہی مٹی کھودتا اور پھنستا چلا جاتا۔ یہ قدرے پریشان کن صورتِ حال تھی۔ اس کا ایک علاج تو یہ تھا کہ دو چار آدمی پیچھے سے جیپ کو آگے دھکیلیں تو انجن کے ساتھ یہ اضافی قوت کام کر جائے لیکن یہاں دو چار

آدمی کہاں تھے۔ میں اور غالب مل کر ڈیڑھ آدمی۔ غالب اگر ذرا ایثار کی ہمت کر لیتا، تب بھی میں اکیلا جیپ کو نہیں دھکیل سکتا تھا۔ یہ کام صرف جنگلوں کا باسی ٹارزن ہی کر سکتا تھا چنانچہ دوسرا قابلِ عمل طریقہ یہ تھا کہ میں جیپ کو جیک پر اوپر اٹھاؤں اور نیچے گڑھے میں خشک ٹہنیاں، کنکر پتھر بھر دوں۔ گڑھے کے دونوں کناروں کو تھوڑا سا کھود کے برابر کر دوں اور گھاس پھوس ڈال دوں تاکہ ٹائروں کی گرفت مضبوط ہو تو جیپ ایک جھٹکے میں آگے بڑھ جائے۔

"اب اسے فرصت سے نکالیں گے۔" میں نے کہا۔ "فی الحال وقفہ برائے آرام، قیام و طعام۔"

"پکنک کے لیے اچھی جگہ ہے۔" غالب نے اِدھر اُدھر دیکھ کے کہا۔

"ہاں، لیکن شاید ہم دونوں کے سوا آج تک کسی کو یہاں پکنک پر آنے کی توفیق خدا نے نہیں دی۔" میں نے کہا۔

"آجکل سب اچھے کام ہم سے سرزد ہو رہے ہیں۔" غالب بولا۔

یہ مذاق کی بات تھی ورنہ وہ جگہ انتہائی بے ہودہ تھی۔ نیچے صرف مٹی تھی جس پر خوفناک قسم کے لال چیونٹوں کی افواج بے مقصد گشت کر رہی تھیں۔ آس پاس کی جھاڑیوں میں عجیب سے کانٹے دار پھل لگے ہوئے تھے جو مٹر کے دانے سے ذرا بڑے تھے مگر اس کی بیرونی سطح پر کانٹے ہی کانٹے تھے اور یہ کانٹے اتنے باریک تھے کہ کپڑوں میں پیوست ہو جاتے تھے۔ گھنے درخت کم تھے اور بہت اونچے نہ تھے۔ جہاں جیپ رُکی تھی، وہاں کسی لومڑی یا گیدڑ کی نسل کا جانور فوت ہوا تھا یا شکار ہوا تھا۔ اس کا بچا کھچا پنجر ڈی کمپوز ہو کے سخت تعفن پھیلا رہا تھا۔

"یہاں تشریف رکھنا تو بہت مشکل ہے۔" غالب نے ناک پر رومال رکھ کے کہا۔ "آپ ذرا سیر و سیاحت کر کے کوئی مناسب جگہ تلاش کریں جہاں خیمۂ شاہی نصب کیا جا سکے۔"

"مطلب یہ کہ کوئی پُرفضا مقام تلاش کر دوں جہاں رنگ رنگ کے مہکتے پھول ہوں اور چہکتے میٹھے سُروں میں گاتے رنگین پروں والے طیور ہوں، سبزہ زار ہو، آبشار ہو، لبِ جوئبار ہو، المختصر مٹیار ہو جس کی زلف مشکبار اور حسن طرحدار ہو۔"

"تختۂ دار ہو، سر پر تلوار ہو، آگے پیچھے تھانیدار ہو۔" غالب نے بھنّا کے کہا۔ "اس جنگل میں آ کے آپ کو بھی شاعری کا روگ لگنا تھا۔"

میں تسلیم بجا لا کے ہر سمت میں چند قدم گیا اور بہت جلد ایک ایسی جگہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا جو قدرے آرام دہ تھی۔ وہاں چیونٹے اور کانٹے بھی وہاں نہیں تھے اور اس ہموار قطعۂ زمین پر کچھ گھاس بھی تھی۔ میں غالب کو گود میں اٹھا کے لے آیا۔ پھر جیپ سے باقی اشیائے خورد و نوش لینے گیا۔ ٹفن کیریئر خاصا بڑا اور بہت وزنی تھا۔ پانی ایک جیری کین میں تھا، جو عموماً جیپ کے پیچھے اضافی پیٹرول رکھنے کے کام آتا ہے۔ پہلے میرا بھی خیال یہی تھا کہ اس میں پیٹرول ہوگا مگر جب مجھے جیپ میں کھانے پینے کا سامان، سگریٹ ہر چیز ملی اور پانی نہیں ملا تو مجھے تھوڑا سا تعجب ہوا کہ اس اہتمام سے روانہ ہونے والے پانی کیسے بھول گئے۔ پھر میں نے جیری کین کو کھول کر سونگھا تو پیٹرول کی مہک نہیں آئی اور میں نے اُسے اتار لیا۔

جنگل میں ہم نے باقاعدہ دستر خوان بچھا کے کھانا شروع کیا۔ "بسم اللہ کیجیے مرزا نوشہ۔" میں نے کہا۔ "ما حضر تناول فرمائیے۔"

"بڑا اہتمام کر لیا آپ نے۔" غالب نے کہا۔ "واللہ آپ نے بڑا تکلف کیا۔"

"بس قبلہ! شرمندہ نہ کیجیے... غریب کے پاس یہی تھا۔" میں نے کہا اور قہقہہ مار کے ہنسا کیونکہ ٹفن کیریئر کے چار ڈبوں میں سے ایک میں نرگسی کوفتے تھے، دوسرے میں بھنا ہوا مرغ۔ تیسرے میں پراٹھے تھے اور چوتھے میں حلوا۔

"واہ یار! آج پھر ثابت ہوا کہ کھانا وہی ہے جس کے مقدر کی مُہر ہو دانے دانے پر۔" میں نے کہا۔

"صبح ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ دوپہر کے لنچ کا مینو ایسا شاندار ہوگا۔" غالب نے کہا۔

"اور تھانیدار کے ساتھ پولیس کو دیکھ کر تو صرف شامتِ اعمال کا خیال آیا تھا، اس دعوتِ بے مثال کا نہیں۔" میں نے کہا۔

"وہ بڑے اہتمام سے کھانا لے کے چلے ہوں گے۔"

"ہاں، منگوایا ہوگا کسی حوالاتی کے گھر سے۔" میں نے کہا۔ "تھانوں میں یہی ہوتا ہے۔ سرکاری فنڈ جو حوالاتی کی خوراک کا انتظام کرنے کے لیے ملتا ہے، وہ الگ ہضم۔ گھر والے حوالات میں بند عزیزوں کے لیے جو بھیجتے ہیں، وہ بھی ہضم۔ روز مفت کا تر مال ملتا ہے۔ اسی لیے تو دونوں ڈرم بنے ہوئے تھے۔"

"کس لیے آئے تھے اور کیا کر چلے۔" غالب بولا۔ "نرگسی کوفتوں اور حلوے پراٹھے کی جگہ جوتے کھائے اور گالیاں کھائیں۔"

"تو نے مجھے ان کی یاد دلا دی مرزا۔" میں نے کہا۔ "ہمارے باقی ساتھی۔"

غالب کا ہاتھ رُک گیا۔ "رابعہ اور ٹیڈی؟"

"معلوم نہیں، انھیں آج کھانے کو کیا ملا ہوگا۔" میں نے اداسی سے کہا۔ رابعہ کے خیال سے نوالہ میرے حلق میں اٹک گیا تھا۔ مجھ سے اور نہیں کھایا گیا۔ غالب نے بھی ہاتھ کھینچ لیا۔ ہم نے تھرماس سے چائے نکالی اور اپنے اپنے مگ سے پیتے ہوئے سگریٹ کے کش لیتے رہے۔ بہت دیر تک ہم اپنے اپنے خیالوں سے ہمکلام رہے، پھر غالب نے کہا۔ "اب چلنا چاہیے۔"

"تو یہ کپڑے بدل لے۔" میں نے چونک کر کہا۔ "اگر تو بھی وردی چڑھا لے تو ہم کچھ محفوظ ہو جائیں گے۔"

"میں بش شرٹ تو پہن لوں گا۔" غالب نے کہا۔ "پتلون کیسے پہنوں گا؟"

"دونوں ڈھیلے ہیں۔" میں نے کہا۔ "میں پہنانے میں تیری مدد کروں گا۔ تو ذرا ہمّت سے کام لینا۔"

غالب نے سر ہلایا اور میں نے پہلے اسے سب انسپکٹر کی بش شرٹ پہنائی پھر پتلون۔ پتلون کا ایک حصہ آسانی سے چڑھ گیا۔ دوسری ٹانگ کو موڑنا بہت مشکل تھا۔ اس کا حل میں نے یہ نکالا کہ پتلون کا پائنچہ اُدھیڑ دیا اور اُسے ٹانگ کے گرد رکھ کے لپیٹ دیا۔ اب یوں لگتا تھا کہ پتلون کے ایک پائنچے کو جراب کے اندر کر دیا گیا ہے۔ شرٹ صرف پیٹ پر سے ڈھیلی تھی۔ اسے پتلون کے اندر کرنے سے وردی زیادہ مضحکہ خیز نہیں رہی۔ اب ہمارے پاس پولیس کی جیپ بھی تھی اور وردی بھی۔ تیز رفتاری میں ہم کسی چیک پوسٹ سے رُکے بغیر گزر جاتے تو اس بات کا امکان تھا کہ کوئی ہمارا پیچھا نہ کرتا۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ ہم کو فوراً کسی جائے واردات پر یا کسی مجرم کو پکڑنے کے لیے پہنچنے کی جلدی تھی۔

اگر اس وقت ہم روانہ ہو جاتے تو وہ سب نہ ہوتا جو بعد میں ہوا لیکن مجھ پر مرغن غذاؤں کا اثر ہو رہا تھا اور تھوڑے سے آرام کی مہلت ملی تھی تو مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی تھی۔ قیلولہ فرمانے کی تجویز میں نے ہی پیش کی اور غالب نے منظور کر لی۔ اس شرط پر کہ ہم گھوڑے بیچ کر نہیں سوئیں گے۔ اور صرف ایک گھنٹا آرام کریں گے لیکن وہاں ہمارے پاس کوئی الارم تو تھا نہیں کہ ہمیں ایک گھنٹے بعد بیدار کر دیتا۔ تھکن اتنی زیادہ تھی کہ میں تو آنکھیں بند کرتے ہی سو گیا۔ یہ ایک پُرسکون نیند تھی چنانچہ بے خواب تھی۔

پھر اچانک مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے مجھے لات ماری ہو۔ میں نے آنکھیں کھولے بغیر کہا۔ "کون ہے بے!"

"تمھارا باپ۔ اُلّو کے پٹھو۔" کسی نے خوفناک لہجے میں کہا۔

میں چونکا اور ایک دم اُٹھ بیٹھا۔ صحیح صورتِ حال کا اندازہ کرنے میں مجھے کچھ دیر لگی۔ غالب کو مجھ سے پہلے اُٹھا دیا گیا تھا اور وہ ایک ٹانگ سیدھی کیے بیٹھا ہوا تھا۔ ہمیں اُٹھانے والے دو افراد تھے۔ جس نے مجھے لات ماری تھی، وہ میرے سر پر سوار تھا اور اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ اس نے ملیشیا کی شلوار قمیص پہن رکھی تھی اور سر پر پگڑی کے انداز میں بہت بڑا صافہ باندھ رکھا تھا جس کے ایک کونے سے اس نے اپنا منہ چھپا لیا تھا۔ یہ ڈاکوؤں کا روایتی حلیہ تھا۔ دوسرا شخص بھی اسی حلیے میں تھا مگر اس کے ہاتھ اور پیشانی دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ وہ دونوں کون ہو سکتے ہیں۔ غالب کا کہا درست ہوا تھا۔ ہم آسمان سے گر کر سچ مچ کھجور میں اٹک گئے تھے، یہ وہی مفرور ڈاکو تھے۔

"اُٹھ اوئے تھانیدار۔" اس ڈاکو نے مجھے دوسری لات رسید

کی جسے پلٹے خاں سمجھا جا سکتا تھا کیونکہ وہ سورج مکھی نہیں تھا۔ دوسرے کے بالکل سفید ہاتھ اور سفید پیشانی ظاہر کرتے تھے کہ وہ گورا ڈاکو ہے۔ پاٹے خاں بالکل فلمی ولن کے انداز میں مجھ سے مخاطب تھا اور لہجے کو خوفناک دہشت ناک بنا کے بات کر رہا تھا۔ یہ اس کا قدرتی انداز نہیں تھا۔

میں اُٹھ کے کھڑا ہو گیا۔ "تم پاٹے خاں ہو...؟"

"آہو... پاٹے خاں میرا نام اے۔" وہ گرج کے بولا۔ "تینوں چنگی طرح معلوم اے فیر وی سوال کرنا ایں؟"

"مجھے حکم ہے کہ تم جہاں نظر آؤ، تم کو گرفتار کر لوں۔" میں نے تفریح طبع کے لیے کہا۔

پلٹے خاں نے پھر ایک فلک شگاف فلمی قہقہہ لگایا۔ "اوئے کون اے تینوں حکم دین والا۔ میرے کول لیا اونوں۔ میں اونوں دساں گا گرفتاری دا مطلب۔" اس کے قہقہے کا ساتھ گورے ڈاکو نے دیا۔

"گویا تم گرفتار ہونے سے انکار کر رہے ہو؟" میں نے سوچ کر کہا۔

"یہ تو بڑی غلط بات ہے، پہلے تم جیل سے فرار ہوئے..."

وہ دونوں پھر ڈرامائی انداز میں ہنسے۔ "اوئے ساتوں جیل دیاں دیواراں نئیں روک سکدیاں۔"

وہ دونوں میرے اور محسن کے ریوالور پہلے ہی اٹھا چکے تھے چنانچہ ان کو اطمینان اور اعتماد حاصل تھا کہ ہم نہتے اُن کا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔ ویسے بھی ڈاکوؤں کی رائے پولیس والوں کے بارے میں اچھی نہیں ہوتی اور وہ سب کو ایک جیسا حرام خور اور بزدل سمجھتے ہیں۔ وہ میرے اتنا قریب تھا کہ میں جب چاہتا اسے ایک جھٹکے سے اپنی طرف کھینچتا، اس کا ریوالور گراتا اور ایک ہی وار میں اُسے اٹھا کے گورے ڈاکو پر دے مارتا۔ اس طرح کہ وہ دونوں پھر اُٹھ نہ پاتے لیکن میں نے جلدی نہیں کی۔

"اچھا چلو میں تم کو گرفتار نہیں کرتا۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس کے بدلے تم مجھے کیا دو گے؟" میں نے اب تھانیداروں کا انداز اختیار کر لیا اور ہماری باقی گفتگو ٹھیٹ پنجابی میں ایک دوسرے سے تعلق کی بنیاد پر ہوئی۔

"ابھی کیا ہے میرے پاس دینے کو۔" وہ مونچھوں پر تاؤ دے کر بولا۔ "جو بھی تھا وہ اندر والوں کو دے دیا۔"

"اب جیل سے نکلے ہیں تو کچھ کریں گے۔" گورا ڈاکو بولا۔ "تمہارے لیے بھی اور اپنے لیے بھی۔"

"بس ہماری نوکری کا خیال کرنا۔" میں نے لجاجت سے کہا۔

"اور کچھ ہمارا..."

"تمہارا خیال ہم نے کب نہیں رکھا۔" پاٹے خاں نے ر... کے لہجے میں کہا۔ "تم کو بھی اتنا ہی ملے گا جتنا دوسرے تھانیدار کو ملتا رہا ہے... مگر دیکھو... پاٹے خاں سے دغا کی تو تمہارا حشر وہی ہو گا جو پہلے والے تھانیدار کا ہوا تھا۔"

"پہلے والا تھانیدار کون تھا؟" میں نے سہم کر کہا۔

"وہی بدبخت افضل شاہ۔" پاٹے خاں بولا۔ "اس نے کیا... تھا کہ مال بھی ہضم کرے گا اور پاٹے خاں کو پھانسی بھی لگوا دے گا... اس نے میرے ساتھ بھی غداری کی۔ اسی کی مخبری سے... گرفتار ہوا۔ میرے سب ساتھی پولیس مقابلے میں مارے گئے۔" ... ڈاکو غصے سے بولا۔

"آج اس کی اور اس کے سارے خاندان کی قبریں ایک جگہ بنی ہوئی ہیں۔" پاٹے خاں فخر سے بولا۔ "لیکن پاٹے خاں سزا... پا کے بھی آزاد ہے اور آزاد رہے گا۔" اس نے اچانک یا علی کا نعرہ...

میں اچھل پڑا۔ "میں اس علاقے میں بالکل نیا ہوں، مجھے معلوم نہیں۔ بس اتنا بتایا گیا تھا کہ کوٹ لکھپت جیل سے دو ڈاکو پا... خاں اور گورا ڈاکو فرار ہو گئے ہیں اور اسی جنگل میں چھپے ہوئے ہیں... دو دن پہلے میں سنگ جانی اسٹیشن پر تھا۔ ٹیکسلا کے پاس ہے..."

"کیا نام ہے تیرا تھانیدار؟" پاٹے خاں نے میرے شریفانہ لہجے اور تعاون کرنے کے انداز سے متاثر ہو کے کہا۔

اگر وہ جاہل نہ ہوتا تو وردی پر لکھا ہوا نام پڑھ لیتا اور سوال ہی نہ کرتا۔ میں نے اپنے سینے پر نظر ڈالی اور کہا۔ "نصیب... یہ میرا ماتحت آغا مبارک ہے۔ یہ تلہ گنگ سے میرے ساتھ ہی... ہے۔ ہمیں چارج لیتے ہی ادھر بھیج دیا گیا، اس لیے تمہارے بارے میں ہماری معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اب ملاقات ہوئی ہے تو انشاء اللہ ہم بھی بتا دیں گے کہ ہم سجنوں کے سجن ہیں اور دشمنوں کے دشمن۔"

"یہی ہمارا بھی اصول ہے نصیب علی۔" پاٹے خاں نے...

"ہم سے بنا کے رکھے گا تو عیش کرے گا۔"

"تم بھی عیش کرو مگر اتنا خیال رکھو کہ میں سرکاری ملازم ہوں۔ میری یہ وردی نہ اتر جائے۔" میں نے کہا۔

پاٹے خاں نے پھر قہقہہ مارا۔ "اوئے تیری وردی کون... سکتا ہے ہمارے ہوتے۔ افضل شاہ بھی ہمارا ساتھ دیتا تو زندہ... اس کا ساتھ دیتی۔"

"اب اس طرح کتنی دیر کھڑے رہو گے۔" میں نے کہا۔ "جاؤ اور ہمیں اپنے بارے میں بتاؤ۔"

"یہ کوئی چال تو نہیں ہے؟" وہ مشکوک لہجے میں بولا۔

"پلٹے خاں! بیٹھنے اور گپ لگانے کے لیے وقت نہیں ہے۔" گورے ڈاکو نے اُسے تنبیہ کی۔ "تو جن کو نہیں جانتا، ان پر بھروسا کر رہا ہے۔"

"بھروسا کر رہا ہوں میں اپنی ہمت اور طاقت پہ۔" پاٹے خاں نے مونچھوں کو بل دیا۔ "رب دی سوں۔ چال ہو گی تو یہ خود دیکھ لے گا، پوری چھ گولیاں ہیں میرے پستول میں۔"

"چھ گولیاں تو میرے پاس بھی ہیں۔"

"تو پھر ڈر کیسا۔ دس لاشیں پھلانگ کے جا سکتے ہیں ہم اور ان میں دو لاشیں ان کی بھی ہوں گی۔" پلٹے خاں بولا۔

"دس کیوں۔" میں نے کہا۔ "بارہ کیوں نہیں۔"

پلٹے خاں گلا پھاڑ کے ہنسا۔ "ایک ایک گولی ہم اپنے لیے رکھیں گے، اب ہم زندہ ہاتھ نہیں آئیں گے کہ وہ ہمیں پھانسی چڑھا دیں۔"

"کیا تم... تم دونوں کو سزائے موت ہو چکی ہے؟" میں نے کہا۔

"اب تک چودہ قتل کیے ہیں۔ ایک بار صرف حکم ہوا ہے پھانسی کا۔ پھانسی کی تاریخ بھی طے ہو گئی تھی مگر ہے کوئی مائی کا لال جو پاٹے خاں کو لٹکا سکے۔" وہ سینے پر ہاتھ مار کے بولا۔ "یہ بتا آگے پیچھے کوئی اور پولیس پارٹی ہے؟"

"نہیں... سڑک پر بہت آگے ایک پارٹی ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن وہ یہاں نہیں آ سکتے، تم کو مجھ سے کوئی خطرہ نہیں۔ اطمینان سے کچھ دیر آرام کرو، ہم بھی تو بے فکر سو رہے تھے حالانکہ ہمیں معلوم تھا کہ تم اسی جنگل میں ہو۔"

"تجھے ڈر نہیں تھا ہمارا؟" وہ کچھ قائل ہو کے بولا۔

"ڈر ہوتا تو میں سو سکتا تھا، مجھے پتا تھا کہ تم سوتے میں گولی نہیں مارو گے کیونکہ تم بہادر آدمی ہو۔" میں نے کہا۔ "میں تم سے ملنا بھی چاہتا تھا۔"

گورا ڈاکو زیادہ ذہین تھا۔ "پاٹے خاں! باتوں میں مت آ۔"

"اونئیں یار! میرا دل کہتا ہے یہ تھانیدار دل کا کھرا ہے۔" پاٹے خاں بولا۔

"میرے ساتھی کی تو ٹانگ ٹوٹی ہوئی ہے۔" میں نے کہا۔ "تم دیکھ سکتے ہو، یہ بالکل بے ضرر ہے۔ میرا ریوالور تمہارے پاس ہے۔ آخر میں کس طرح یقین دلاؤں تمہیں کہ میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔ سب مجھے اپنی جان بھی پیاری ہے اور بیوی بچوں کی زندگی بھی۔"

"لا، جیب کی چابیاں ہمارے حوالے کر۔" گورے ڈاکو نے ہاتھ پھیلایا۔

میں نے چابیاں اس کی طرف اُچھال دیں۔ "اور کوئی خدمت؟ کہو تو یہ وردی بھی اتار کے دے دوں۔"

"اونئیں یار۔" پاٹے خاں نے ریوالور ہٹا کے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "مجھے اعتبار ہے تجھ پر۔"

"تو پھر بیٹھو، کھانا کھاؤ۔" میں نے کہا۔ "پراٹھے، ککڑ، حلوا۔"

"اچھا...؟ واہ بھئی واہ۔" وہ بولا اور فوراً بیٹھ گیا۔ غالباً وہ دونوں بھوکے تھے اور جیل سے فرار ہونے کے بعد اب تک انھوں نے کچھ نہیں کھایا تھا کہ کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ وہ چار افراد کا کھانا تھا اور ہم نے اس کا ایک تہائی بھی نہیں کھایا تھا مگر انھوں نے ذرا سی دیر میں سب صاف کر دیا۔ میں غالب کو آنکھ مار کے اس ڈرامے میں شریک کر چکا تھا۔ ان دونوں کو ناک آؤٹ کر کے جیپ میں ڈالنا کوئی مشکل کام نہ تھا لیکن میں پہلے یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ کس قماش کے ڈاکو ہیں اور ان کے جرائم کی تعداد کیا ہے۔

کھانے کے بعد انھوں نے ہم سے سگریٹ لے کر پیے اور لمبے لمبے سوٹے لگانے لگے۔ ریوالور انھوں نے اندر رکھ لیے تھے اور اب بہت مطمئن بیٹھے تھے۔ پاٹے خاں کی کیس ہسٹری زیادہ پرانی تھی۔ وہ شریف والدین کی خبیث اولاد تھا۔ آوارگی کے شوق میں گھر سے نکلا۔ جیب کتروں کی صحبت سے مستفید ہوا۔ پھر جیل گیا تو چوروں کے گروہ میں شامل ہوا۔ دوسری بار اور تیسری بار جیل جانے سے تجربہ حاصل ہوا تو چھوٹے چھوٹے ڈاکے ڈالنے لگا۔ کچھ دن قسمت نے ساتھ دیا۔ چند وارداتیں کامیاب رہیں اور اسے ایک بڑے ڈاکو نے اپنے گروہ میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ اس وقت تک وہ تین قتل کر چکا تھا۔ دو فرار ہوتے ہوئے اور ایک دشمنی میں مگر پکڑا نہیں گیا تھا۔ گروہ میں شامل ہو کے اس کا حوصلہ بڑھ گیا۔ وہ بڑے ڈاکے ڈالتے تھے اور ان کا مقابلہ کرنے کی حماقت کرنے والے مارے جاتے تھے۔ جب وہ آخری بار پکڑا گیا تو اپنے حساب سے قتل کی دس وارداتیں کر چکا تھا مگر پولیس کو وہ صرف ڈکیتی میں مطلوب تھا۔ اسے سات سال کی جیل ہوئی۔ وہ باہر نکلا تو پرانے ساتھی مارے جا چکے تھے۔ تین کو پھانسی ہو گئی تھی۔ چار پولیس مقابلوں میں ہلاک ہوئے تھے اور باقی اِدھر اُدھر ہو گئے تھے۔ اس نے اپنا گروہ بنایا اور دو سال تک اسی علاقے میں دہشت پھیلاتا رہا۔ بالآخر ایک فرض شناس اور ایماندار پولیس افسر اس کے پیچھے لگ گیا۔ ایک سب انسپکٹر

افضل شاہ نے اس کی ہر پیشکش مسترد کر دی۔ لاکھوں پر تھوک دیا اور جان کی بازی لگا کے اُسے گرفتار کرا دیا۔ پاٹے خاں کے ساتھیوں نے افضل شاہ کو قتل کر دیا اور اس کے گھر کو آگ لگا دی۔ افضل شاہ کے بیوی بچے اندر ہی جل کے مر گئے۔ ڈاکوؤں نے باہر سے کُنڈیاں لگا دی تھیں اور جب وہ اندر سے مدد کے لیے چیخ رہے تھے تو وہ باہر ہوائی فائر کر رہے تھے تاکہ لوگ قریب نہ آئیں۔ افضل شاہ مر گیا مگر وہ

پاٹے خاں کی ساری کامیابیوں کا طلسم توڑ گیا۔ وہ پاٹے خاں کے خلاف چار افراد کے قتل کا پکا کیس بنا چکا تھا جس میں ثبوت گواہ سب پکے تھے۔ جب افضل شاہ قتل کر دیا گیا اور اس کے خاندان کو اتنی بے رحمی سے جلا دیا گیا تو پولیس کا پورا محکمہ پاٹے خاں کو پھانسی لگوانے پر تُل گیا۔ اس کے خلاف مزید قتل کے مقدمات بنائے گئے۔ اسے متعدد ڈکیتی کی وارداتوں میں ملوث کر لیا گیا جو اس نے نہیں کی تھیں۔ کسی

ڈاکو سے تھانیداروں کی ملی بھگت 'جیو اور جینے دو' بلکہ عیش کرو اور عیش کرنے دو کے اصول پر ہوتی ہے۔ مگر پاٹے خاں نے افضل شاہ کے ساتھ جو کچھ کیا تھا، اس نے ہر تھانیدار کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ یہی اُن کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ ڈاکو بہر حال ڈاکو ہیں، اُن کو یہ احساس نہیں ہونا چاہیے کہ تھانیدار اُن سے ڈرتے ہیں یا ان کے زرخرید غلام ہیں۔ ان کے درمیان کوئی بقائے باہمی کا سمجھوتا ہوتا ہے تو یہ تھانیداروں کی دی ہوئی رعایت ہے۔ کوئی تھانیدار

یہ رعایت نہیں دیتا تو اسے قتل کرنا تمام تھانیدار برادری کی توہین ہے۔ کسی تھانیدار کی شرافت، اصول پرستی اور ایمانداری اس کا عیب سہی مگر جرم بہر حال نہیں ہے اور اگر جرم ہے تو کسی ڈاکو کو یہ اختیار نہیں دیا جا سکتا کہ وہ اس کو سزا دے۔ ایک غلط حرکت نے پاٹے خاں کو تختۂ دار تک پہنچا دیا۔ پولیس نے اس کے خلاف درجنوں عینی شاہد عدالت میں لا کھڑے کیے۔ جب پاٹے خاں کو سزائے موت

سنائی گئی تو اسے احساس ہوا کہ معاملہ کتنا سنگین ہو گیا ہے۔ اس نے جیل سے تھانیداروں کو پیغامات بھیجے کہ وہ تلافی کے لیے تیار ہے مگر بات نہ بنی۔ اس نے گورے ڈاکو سے مدد مانگی کہ میں اور تم حریف سہی مگر ایک مقتول تھانیدار کے لیے سب تھانیدار اس کی جان

کے دشمن ہو گئے ہیں تو کیا ایک ڈاکو ساتھی کے لیے دوسرے ڈاکو مل کر کچھ نہیں کریں گے۔ گورے ڈاکو نے اس اپیل پر لبیک کہا۔ اپیل کی سماعت کی تاریخ پر پاٹے خاں کو جیل سے عدالت لایا گیا تو

گورے ڈاکو کی پلٹن نے حملہ کر دیا۔

گورے ڈاکو کو علم نہ تھا کہ مخبری ہو چکی ہے۔ اس نے پوری

قوت کے ساتھ حملہ کیا تھا اور اُسے یقین تھا کہ وہ پاٹے خاں کو چھڑا لے جائے گا مگر اس روز پاٹے خاں کے لیے خصوصی حفاظتی انتظامات کیے گئے تھے۔ سخت مقابلے میں دو پولیس والے مارے گئے اور دو عام آدمی۔ گورے ڈاکو کے چار ساتھی ہلاک ہوئے اور پاٹے خاں

کو چھڑانے کے لیے آنے والا گورا ڈاکو خود گرفتار ہو گیا۔ پاٹے خاں

کی ہر اپیل مسترد ہوتی گئی۔ گورے ڈاکو کو سیشن کورٹ سے سزائے موت سنا دی گئی۔ تھانیدار برادری اس کے خلاف بھی متحد ہو گئی تھی۔ گورے ڈاکو نے کوٹ لکھپت جیل سے ایس او ایس ارسال کیے جو باہر بہت سے گروہوں تک پہنچے۔ انھوں نے طاقت کے استعمال سے گریز کیا کیونکہ کوٹ لکھپت جیل کو توڑ کے کسی سزائے موت پانے والے قیدی کو نکالنا عملاً ناممکن تھا۔ انھوں نے رشوت کا لمبا چکر چلایا۔ نیچے

سے اوپر تک لاکھوں کی تھیلیاں پہنچا دیں اور بالآخر پاٹے خاں اور گورا ڈاکو کال کوٹھری سے 'فرار' ہونے میں کامیاب رہے۔ باقی رسک ان کا اپنا تھا۔ وہ اب سندھ کے جنگلات میں روپوش ہو جانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ سیکڑوں میل دور جانا ان کے لیے بے حد ضروری تھا کیونکہ یہاں پھانسی کا پھندا تقریباً ان کے گلے میں پڑ چکا تھا۔

پاٹے خاں یقیناً بے وقوف تھا کہ اس نے باہر نکلتے ہی پھر پولیس سے گٹھ جوڑ کا سوچا۔ یہ نہیں سوچا کہ اسی پولیس نے اسے

کہاں پہنچا دیا تھا۔ معلوم نہیں کیوں، اس کا ردِ عمل انتقامی نہیں ہوا کہ وہ باہر نکل کے ان سب کو قتل کرتا جو اس کے خلاف استعمال ہوئے یا اس کی جان کے دشمن بنے۔ غالباً دو سال کال کوٹھری میں گزارنے کے بعد اس کا حوصلہ ختم ہو چکا تھا۔ ایک تھانیدار کو قتل کرنے کی سزا بہت سخت ملی تھی۔ اس نے موت کو روبرو دیکھ لیا تھا۔ ایک ایسی

تاریخ کے روپ میں جس کی صبح پھانسی کے اندھے کنوئیں میں ہوتی۔ وہ ڈر گیا تھا اور اب صرف فرار ہونا چاہتا تھا۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ان دونوں ڈاکوؤں کا سارا کس بل نکل چکا تھا ورنہ وہ ہمیں جگانے کے بجائے گولی مار کے ہمیشہ کے لیے سلا دیتے۔ ان کی اداکاری کی وجہ

یہی میری سمجھ میں آنے لگی تھی۔ وہ اب کسی کے لیے دہشت ناک نہیں رہے تھے چنانچہ وہ خوفناک لہجے سے ہی ڈرا سکتے تھے مگر اس شیر کی دہاڑ سے کون ڈرتا ہے جو چڑیا گھر کے پنجرے سے اس لیے نکالا گیا ہو کہ اسے دوسرے پنجرے میں منتقل کر دیا جائے۔ وہ جنگل کے

بادشاہ کی اداکاری کریں تب بھی لوگ مرعوب نہیں ہوں گے۔

پاٹے خاں نے ہم پر اعتبار کر کے رسک لیا تھا۔ شاید اس رسک میں یہ خیال بھی شامل تھا کہ ہر تھانیدار افضل شاہ نہیں ہوتا اور

پہلے ہزاروں میں ایک ہوتا تھا تو اب شاید لاکھوں میں ایک ہوگا۔ پھر میری تعاون کی پیشکش اور میرے بزدلانہ رویّے نے اس کو مزید اعتماد عطا کیا اور وہ خود کو محفوظ سمجھتے ہوئے رُک گیا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ گورا ڈاکو اس کے مقابلے میں بہت زیادہ محتاط ہے اور اس کا ایک ہاتھ مستقل اپنے ریوالور پر ہے۔ تاہم اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

تقریباً دو گھنٹے بعد وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ "اچھا بھئی سجن نصیب علی... ابھی تو ہم چلتے ہیں۔" وہ بولا۔

"تم میری جیپ لے جا رہے ہو۔" میں نے مردہ آواز میں کہا۔ "میں کیا جواب دوں گا؟"

پاٹے خاں نے قہقہہ مارا۔ "او دے جو دل کرے کہہ دینا... کہہ دینا کہ ڈاکو پاٹے خاں کے ساتھ بڑا نے ساتھی تھے۔ انھوں نے بے بس کر دیا تھا۔"

"مگر ہم بے بس کہاں ہیں۔" میں نے کہا۔

"کم سے کم ہمیں باندھ کے ڈال جاؤ۔" غالب نے کہا۔

"مگر یہاں نہیں۔" میں نے کہا۔ "سڑک پر ڈال دینا تاکہ کوئی اُٹھا لے۔ میرا یہ ماتحت تو چل بھی نہیں سکتا۔"

"چل بھئی جیسے تو راضی۔" پاٹے خاں بولا۔ "اسے جیپ میں ڈال دے۔"

میں نے اطمینان سے غالب کو پیچھے والی سیٹ پر بٹھایا جہاں گورا ڈاکو پہلے سے براجمان تھا۔ اس نے اب اپنا ریوالور نکال لیا تھا۔ "تم جیپ چلاؤ۔" گورے ڈاکو نے مجھے حکم دیا۔ "اور خیال رکھو کہ پیچھے سے بھی میں دل میں گولی اتار سکتا ہوں۔"

میں نخوت سے مسکرایا۔ "کیوں ڈراتے ہو گورے بادشاہ...؟"

مگر اسی وقت میرا پورا جسم بجلی کی طرح حرکت میں آ گیا۔ میں نے دایاں ہاتھ گورے ڈاکو پر ڈال دیا۔ بائیں ہاتھ سے میں نے اس کے بازو پر وار کیا اور میں نے بازو کی ہڈی کے ٹوٹنے کی آواز صاف سنی مگر اس سے قبل ہی وہ پاٹے خاں پر گر چکا تھا جو جیپ میں سوار ہونے والا تھا۔ میں نے ان کو اُٹھنے کی بالکل مہلت نہ دی۔ میری ایک لات پاٹے خاں کے سر پر لگی اور اس کا سر جیپ کی سائڈ سے ٹکرایا۔ گورے ڈاکو کا ہاتھ لٹک کر جھولنے لگا تھا مگر اس نے فوراً ریوالور کو دوسرے ہاتھ میں لینے کی کوشش کی۔ میرے دوسرے پیر کی ٹھوکر اس ہاتھ کی کلائی پر پڑی۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے اُڑ گیا اور وہ بُری طرح چلانے اور پاٹے خاں کو گالیاں دینے لگا۔ اس کا دوسرا ہاتھ بھی کلائی کے ٹوٹ جانے سے ناکارہ ہو گیا تھا۔ پاٹے خاں مجھے گالیاں دیتا اُٹھا تو میں نے اسے فلائنگ کِک ماری۔ وہ دوبارہ جیپ سے ٹکرایا اور اُسے چکر آ گئے۔ میں نے اُسے اپنی طرف کھینچا اور سر سے

اوپر اُٹھا کے نیچے دے مارا۔ وہ لمبے لمبے سانس لینے لگا اور وہیں پڑا رہا۔ گورا ڈاکو اچانک بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کے پیچھے دوڑنے سے پہلے میں نے پاٹے خاں پر آخری وار کیا تاکہ وہ اُٹھے تو غالب کو نقصان نہ پہنچا سکے۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں چڑھ گئیں اور اس کا کراہنا بند ہو گیا۔

میں جیپ گورے ڈاکو کے پیچھے لپکا تو وہ تقریباً پچاس قدم آگے تھا۔ میں نے پاٹے خاں کا ریوالور اٹھا لیا تھا چنانچہ میں نے اسے پیچھے سے چلا کے وارننگ دی۔ "گورے کی اولاد... رک جاؤ... ورنہ میں شوٹ کر دوں گا۔"

جواب میں ایک گولی آئی جو شاید میرے کان کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ میں نے ایک دم غوطہ مارا اور ایک درخت کی اوٹ میں ہو گیا۔ اس حالت میں گورے ڈاکو کے نشانے کا خطا ہو جانا ہی ممکن تھا۔ شاید اس نے اپنے شکستہ بازو والے ہاتھ سے کام لیا تھا ورنہ جس ہاتھ کی کلائی ٹوٹی تھی، اس سے وہ ریوالور نہیں تھام سکتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ٹوٹے ہوئے بازو والے ہاتھ سے فائر کرنا بھی آسان نہ تھا مگر مجھے زیادہ افسوس اپنی بے وقوفی پر ہوا۔ میں یہ بھول گیا تھا کہ گورے ڈاکو کے پاس بھی دو ریوالور ہیں۔ ایک اس کا اپنا اور دوسرا وہ جو اس نے غالب سے چھینا تھا۔

میرا جوابی فائر ایک فطری ردِ عمل تھا لیکن اس نے گورے ڈاکو کو محتاط کر دیا۔ اس نے بے تحاشا اور اندھا دھند دوڑنا چھوڑ کے درختوں کی آڑ میں بھاگنا شروع کیا۔ میں نے اُسے نظر میں رکھتے ہوئے پیش قدمی جاری رکھی اور جانتے بوجھتے اسے موقع فراہم کیا کہ وہ مجھ پر گولی چلائے۔ اس کی چلائی ہوئی تیسری گولی میری ران سے رگڑ کھاتی ہوئی گزری اور مجھے آگ کی ایک لکیر کی جلن محسوس ہوئی۔ میں نے اس پر دوسرا فائر صرف اسے بدحواس کرنے کے لیے کیا۔ گورے ڈاکو نے پلٹ کر یکے بعد دیگرے دو گولیاں چلا دیں۔ اب میرے حساب سے اس کے ریوالور میں ایک ہی گولی رہ گئی تھی اور مجھے ان کی وہ بات یاد تھی کہ ایک گولی وہ اپنے لیے بچا کے رکھیں گے کیونکہ وہ زندہ ہاتھ آنے اور پھانسی چڑھائے جانے کا رسک نہیں لے سکتے۔

تیسرا فائر میں نے نشانہ لے کر کیا، اس وقت تک میرے اور گورے ڈاکو کے درمیان فاصلہ کم ہو کے آدھا رہ گیا تھا۔ گولی گورے ڈاکو کی ٹانگ پر گھٹنے کے قریب لگی۔ وہ ایک دم منہ کے بل گرا۔ اس سے پہلے کہ وہ ریوالور کی آخری گولی خود پر چلاتا، میں نے دوڑ کر ایک جست لگائی اور اس کے اوپر جا پڑا۔ اس نے بلبلا کے چیخ ماری۔ ریوالور نیچے گر گیا۔

"خدا کے لیے مجھے مرنے دو... اسی جگہ مر جانے دو..." وہ دہاڑیں مار مار کے رونے لگا۔ "کل بھی تو مجھے پھانسی ہی ہونا ہے۔"

"ہاں۔ مگر وہ انصاف کے عمل کی تکمیل ہوگی۔" میں نے کہا۔ "میں تم کو خودکشی کر کے نہیں مرنے دوں گا۔"

"اچھا تو خود گولی مار دو مجھے۔۔" وہ چلایا۔

"نہیں گورے بادشاہ! میں تمہارا قاتل کیوں بنوں۔" میں نے کہا۔ "تم کو قاعدے قانون کے مطابق پھانسی ہونا چاہیے... اور ضرور ہوگی۔"

میں اُسے گھسیٹتا ہوا لایا اور اٹھا کے جیپ میں پھینک دیا۔ اس کے ٹوٹے ہوئے ہاتھوں کے لیے یہ اذیت ناقابل برداشت تھی۔ وہ آخری بار چیخا اور بے ہوش ہوگیا۔ غالب نے مسکرا کے مجھے دو انگلیوں سے وی کا نشان دکھایا۔ وی فار وکٹری۔ میں نے دوسرے ڈاکو پلٹے خاں کو بھی گورے ڈاکو پر ڈال دیا۔ اب گاڑی کا پہیہ گڑھے سے نکالنے کا مرحلہ میرے سامنے تھا۔ میں نے پہلے سے سوچی ہوئی ترکیب پر عمل کیا اور اس میں کامیاب رہا۔

"ان دونوں پر نظر رکھنا۔" میں نے دوبارہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "کوئی نہ مرنے پائے نہ بھاگنے پائے۔"

کھانے پینے کا سارا سامان وہیں پڑا رہ گیا اور میں نے جیپ کو واپسی کے راستے پر دوڑانا شروع کیا۔ دوبارہ سڑک تک پہنچنے میں ہمیں آدھا گھنٹا لگا۔ اب شام کا سورج ڈھل رہا تھا۔ سڑک بھی سنسان تھی اور ہمارا راستہ صاف تھا۔

"خدا اس وقت قارون کا خزانہ بھی عطا کرتا تو اتنی خوشی نہ ہوتی جتنی دو ڈاکوؤں کو پا کے ہوئی ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں، اب ہم بارگین کر سکتے ہیں۔" غالب نے کہا۔

"ہم کس سے بارگین کریں گے؟" میں نے کہا۔ "رضوی صاحب سے؟"

"اور کس سے کر سکتے ہیں۔" غالب نے کہا۔ "چوبیس گھنٹے میں ہم دوسری بار قانون کی مدد کریں گے۔ انکل رضوی نے اب تک یقیناً اس ایمونیشن ڈپو پر قبضہ کر لیا ہوگا۔ یہ مفرور ڈاکو ان کے حوالے کر کے ہم ثابت کر دیں گے...!"

"ہم کچھ بھی ثابت نہیں کر سکیں گے، کم سے کم انکل رضوی پر۔" میں نے کہا۔ "وہ بارگین کرنے والے آدمی ہی نہیں ہیں۔ اور بارگین ہم کیا کریں گے؟ کیا ان سے کہیں گے کہ ہم پر قائم مقدمات ختم کر دیے جائیں تو ہم دونوں ڈاکو اُن کے سپرد کریں گے؟ یہ ان کے اختیار کی بات ہی نہیں اور ہوتی تب بھی وہ نہ کرتے۔ وہ صاف کہیں گے کہ ٹھیک ہے قانون تمہاری خدمات کے اعتراف میں سزا کم کر سکتا ہے مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ پہلے تم خود کو قانون کے حوالے کرو۔"

"ہمارا اتنا بڑا کارنامہ بلکہ اتنے بڑے کارنامے ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔"

"قانون نہ ہمارے احسان کو تسلیم کرے گا اور نہ ہمارے فرض کو مانے گا۔" میں نے کہا۔ "ہم نے ملک و قوم کے دشمنوں کے ایک اڈے کی نشاندہی کی، جہاں سے کثیر مقدار میں اسلحہ برآمد ہوا۔ جو سب وطن دشمن عناصر کو ملتا تو وطن پرستوں کے خلاف استعمال ہوتا۔ اس کارنامے پر ایک تمغہ۔ ہم نے دو خطرناک ڈاکو جیل سے فرار ہونے کے چوبیس گھنٹے کے اندر پھر پکڑ لیے جن کو پولیس گرفتار نہ کر سکی تھی۔ اس پر دوسرا تمغہ۔ جو کچھ ہم نے اس سے پہلے کیا... اس پر پھانسی... قانون یہی ہے۔"

"پھر ان ڈاکوؤں کا کیا کرنا ہے۔ اگر ان کے بدلے کوئی سودا بھی نہیں کیا جا سکتا۔"

"ہم ایک پوائنٹ اور اسکور کریں گے۔" میں نے کہا۔ "نیکی کر دریا میں ڈال اور ڈالتا رہ۔ ایک دن آئے گا کہ دریا نیکیوں سے بھر جائے گا۔ اتنا بھر جائے گا کہ اسے اپنا رُخ بدلنا پڑے گا۔ وقت کا دریا ہمارے خلاف بہہ رہا ہے مگر ایک دن ہم اس کا رُخ موڑ لیں گے، کیسے موڑ لیں گے؟ یہ تم بھی جانتے ہو مرزا۔ ہم کو غدار، قاتل اور مجرم کہنے والے خود غدار، قاتل اور مجرم ٹھہریں گے اور اگر ہم ملک کو ان وطن فروشوں کے وجود سے پاک کرنے میں کامیاب ہوئے تو اس کا سارا اعزاز بھی ہمیں جائے گا۔"

"دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے۔" غالب نے کہا۔

"نہیں۔ یہ صرف خیال نہیں۔ ہم اسے حقیقت کا روپ دینے کی کوششوں کا آغاز تو کر ہی چکے ہیں۔ ہماری اب تک کی کامیابیاں کم نہیں اور امید کا سفر تو ہر حال میں جاری رہتا ہے۔ ہمارے عزم اور حوصلے کے کارواں کا ہر قدم منزل کی طرف ہے اور جیسے جیسے ہم آگے بڑھتے ہیں، راستے خود صاف ہوتے جاتے ہیں۔ انکل رضوی ہی ایک قابلِ اعتماد گواہ ہیں جو تسلیم کریں گے اور کرائیں گے کہ ہم نے ہی دشمنوں کے ایک خفیہ اسلحہ خانے کا پتا دیا تھا۔"

"اور وہ جو اس سے پہلے ہم کئی ذخائر تباہ کر چکے ہیں؟"

"ان کا کریڈٹ وہ ہمیں دیتے ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "مشکل یہ ہے کہ ان کا ریکارڈ کچھ نہیں۔ میرا خیال ہے کہ پولیس نے ان اڈوں کی تباہی کو ہمیشہ کی طرح نامعلوم شرپسندوں کی تخریبی کارروائی قرار دیا ہوگا۔ اگر ان کو قبل از وقت معلوم ہو جاتا تو وہ کریڈٹ خود کو دیتے اور خوب ڈھول پیٹتے کہ پولیس نے بہت اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے تخریبی عناصر کے مذموم عزائم کو بروقت ناکام کر دیا۔ اوپر والے کامیابی کا سہرا کسی منظورِ نظر کے سر باندھتے اور اسے ترقی دلوا دیتے۔ صرف انکل رضوی ہی ایسا کر سکتے ہیں کہ کھل کر ہمارا نام لیں اور یہ کہیں کہ اس اڈے کا پتا سکندر بخت نے دیا تھا جو کہ مفرور مجرم ہے۔ وہ کسی کو بھی اس کامیابی کا سہرا خود اپنے سر نہیں باندھنے دیں گے اور یہ بات ریکارڈ پر رکھیں گے کہ ہم نے اور صرف ہم نے اس اڈے کا پتا دیا تھا۔

ہم ان ڈاکوؤں کو بھی انکل رضوی کے حوالے کریں گے اور صرف وہی ہیں جو اس کامیابی کو ہم سے منسوب کریں گے۔ ان کی جگہ کوئی اور پولیس افسر ہوتا تو راتوں رات طے کر لیا جاتا کہ اس کامیابی کا اعزاز کسے دیا جائے۔ یہ ناممکن تھا کہ اس کا اعزاز دو مفرور مجرموں کو دیا جاتا۔ بھلا یہ کبھی ہوا ہے کہ دو مطلوب مجرموں نے دو مفرور ڈاکو پکڑ کے پولیس کے حوالے کر دیے ہوں۔ یہی تو موقع ہوتا ہے پولیس کے لیے اپنی کارکردگی کا ڈھنڈورا پیٹنے کا۔ مجرم پکڑے جاتے ہیں، اتفاق سے یا مخبری سے یا اپنی بدقسمتی کے باعث۔ پولیس فوراً نام کما لیتی ہے۔"

"رضوی صاحب کے محکمے والے ان سے ناخوش ہوں گے۔" غالب بولا۔

"وہ تو پہلے ہی ناخوش ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "تاہم یہ بات سب کو خود اپنے منہ پر طمانچہ مارنے کے مترادف لگے گی۔ یہ پولیس کے محکمے میں رہ کے پولیس کے نام کو بٹا لگانے سے کم تو نہیں ہے کہ جیل سے بھاگ جانے والے ڈاکوؤں کو پولیس کی چھاپا مار پارٹیاں اور ناکا بندی کرنے والے نہ پکڑ سکیں اور خبر آ جائے کہ ان کو سکندر بخت اور اس کے ساتھیوں نے پکڑا اور پولیس کے حوالے کر دیا۔ ابھی تم دیکھو میں کیا ڈراما کرتا ہوں۔"

"ڈرامے سے فائدہ ہونے کی امید نہیں تو پھر اتنی محنت کس لیے!"

"فائدہ ہوگا مرزا۔" میں نے کہا۔ "مگر وہ فائدہ نہیں جو تم چاہتے ہو۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ مفرور مجرم اچانک تائب ہو کے نیکی کے کام شروع کر دیں تو ان کے سابقہ جرائم ختم ہو جائیں۔ مثلاً یہی دونوں ڈاکو اگر جیل سے نکل کر دیندار اور نیکوکار ہو جاتے۔ رفاہِ عامہ کے اور ثواب کے کام کرنے لگتے۔ اصلاحِ معاشرہ کے لیے بدمعاشوں اور بدکرداروں کو پکڑوانے لگتے۔ جرائم کو روکنے میں مدد کرتے تو اس سے ان کی سزائے موت کے فیصلے پر کوئی اثر نہ پڑتا۔ یہ ثابت ہو جاتا کہ اب یہ فرشتے ہو گئے ہیں اور بدی سے ان کا دُور کا بھی تعلق نہیں رہا تب بھی کچھ نہ ہوتا۔ یہی پوزیشن ہماری بھی ہے... لیکن..."

"لیکن کیا؟" غالب نے کچھ دیر انتظار کیا۔

"لیکن دوست! ایک بات ایسی ہے جو صرف ہم سمجھتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم سے مراد ہے ہم سب جو خود کو ایم آر ایس کہتے ہیں۔ اگر تم نے حالات کا تجزیہ کیا تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ رضوی صاحب دو حصوں میں بٹ گئے ہیں۔ اور جیسے جیسے وقت گزرے گا انکل رضوی اور ایس ایس پی رضوی کے درمیان فاصلہ بڑھتا جائے گا۔ انکل رضوی ہمارے ساتھ ہیں۔ ان کی نیک خواہشات اور دعائیں ہمارے ساتھ ہیں مگر ایس ایس پی رضوی کے لیے قانون کی بالادستی اہم ہے۔ ایس ایس پی کا انکل کے جذبات سے کوئی تعلق نہیں۔ انکل کو یقین ہے کہ ہم بے گناہ ہیں۔ ہمیں ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت پاکستان لایا گیا تھا۔ وہ جانتے ہیں کہ وزیر خان کو کس نے قتل کیا تھا، میر شرافت علی کو کس نے مارا تھا اور اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کے پیچھے کس شکاری کا ہاتھ تھا مگر ان کے جاننے سے کچھ نہیں ہوتا۔ ان کے ماننے سے کچھ نہیں ہوتا۔ ایس ایس پی کہتا ہے کہ ثبوت لاؤ۔ قانونی تقاضے پورے کرو۔ عدالتی کارروائی ہونے دو۔ پھر جو مجرم ہوگا، اسے سزا مل جائے گی۔ جو بے گناہ ہوگا، وہ رہا ہو جائے گا۔ وہ نظامِ انصاف کو بُرا نہیں سمجھتے مگر یہ جانتے ہیں کہ اس کو مفاد پرست کس طرح استعمال کر رہے ہیں اور اب اس نظام میں جتنی خرابیاں پیدا ہو چکی ہیں، وہ کیا ہیں لیکن وہ اکیلے اس پورے نظام کو نہیں بدل سکتے۔ وہ اس کے خلاف بغاوت بھی نہیں کر سکتے کیونکہ وہ خود اسی نظام کا حصہ ہیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ احتجاج کرتے ہوئے پولیس کی نوکری چھوڑ سکتے ہیں۔ اس سے بُتوں کا بھلا ہوگا۔ پولیس کے بدعنوان اہلکار جو اُن کی وجہ سے مجبور تھے آزاد ہو جائیں گے۔ ان کی موجودگی سے اگر بدعنوانی کی غلاظت کے ڈھیر میں ایک فیصد کا اضافہ رُکا ہوا ہے تو یہ بھی بہت ہے۔ ان جیسے سو افسر ہوتے تو یہ کوڑے کا ڈھیر نظر ہی نہ آتا جس پر بہت سے عزت داروں کے ضمیر اس طرح پڑے ہوئے ہیں جیسے اکثر نوزائیدہ معصوم بچوں کی لاشیں پڑی ملتی ہیں۔"

"کچھ لوگوں کو اب بھی یہ کوڑے کا ڈھیر نظر نہیں آتا۔" غالب بولا۔ "انھوں نے اپنی آنکھیں بند کر لی ہیں۔"

"ایک دن وہ آنکھیں کھولنے پر مجبور ہوں گے مرزا۔" میں نے کہا۔ "اس وقت جب انھیں احساس ہوگا کہ ان کے چاروں طرف غلاظت اور کوڑے کے ڈھیر اتنے اونچے ہو گئے ہیں کہ وہ خود اس گندگی میں ڈوب چکے ہیں اور کوڑے کے متعفن ڈھیر کا ایک حصہ بن گئے ہیں۔"

"اس طرح کیا ہم انکل رضوی کی مشکلات میں اضافہ نہیں کر رہے ہیں؟"

"یہ خیال تو مجھے بھی آتا ہے۔" میں نے کہا۔ "جیسے جیسے ہم اپنی بے گناہی اور مظلومیت ثابت کرتے جائیں گے، اتنا ہی انکل رضوی اور ایس ایس پی رضوی کی دو شخصیتوں کے درمیان نفاق بڑھے گا۔ ان کے دل اور دماغ کی جنگ میں شدت آتی جائے گی۔ ان کے لیے اپنے وجود کے دونوں برسرِ پیکار حصوں کو یکجا اور متحد رکھنا دشوار ہوتا جائے گا۔ پولیس والا بھی گوشت پوست کا بنا ہوا آدمی ہوتا ہے جو احساس رکھتا ہے۔ ایس ایس پی کب تک ثبوت کو ڈھال بنائے گا۔ سچائی بالآخر ان کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دے گی۔ ایک وقت آ جاتا ہے جب سچ کسی ثبوت کا محتاج نہیں رہتا اور اسے تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے۔"

"یار، یہ سامنے کوئی بڑی سڑک آ رہی ہے۔" غالب نے اچانک کہا۔

"ہاں، میں بھی دونوں طرف کی ٹریفک کو دیکھ رہا ہوں۔"

"اب ہمارے لیے خطرناک علاقہ شروع ہوگا۔" غالب نے کہا: "اس جیپ میں ہمارے پکڑے جانے کا خطرہ زیادہ ہے۔"

"اس میں ہمارے بچ کے نکل جانے کے امکانات بھی زیادہ ہیں۔" میں نے کہا: "اگر ہمیں روکے گی تو صرف پولیس۔ پبلک سے ہم کو خطرہ نہیں ہے۔"

"پولیس نے اب تک چوری ہو جانے والی جیپ کے نمبر وغیرہ کی تشہیر کردی ہوگی۔" غالب بولا۔ "کیا خیال ہے، ان پولیس والوں نے سچ بولا ہوگا؟"

"افسرانِ بالا کے سامنے تو سچ ہی بولا ہوگا۔ لیکن افسرانِ بالا محکمہ کی بدنامی کے ڈر سے حقائق کو بدل کر پیش کریں گے۔" میں نے کہا: "خبر یہی آئے گی کہ دونوں مفرور ڈاکوؤں نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے پولیس پارٹی پر حملہ کیا اور ان کا اسلحہ اور جیپ بھی لے گئے۔"

"اور ڈاکوؤں کا حلیہ وہ کیا بتائیں گے؟ وہی جو ہمارا حلیہ تھا؟" غالب ہنس کر بولا: "انھیں اچھی طرح معلوم ہے کہ ہم میک اپ میں تھے اور ہم کو پاٹے خاں یا گورا ڈاکو نہیں سمجھا جا سکتا لیکن ان کو اپنی عزت تو بچانا ہے۔ گرہوبٹ کانسٹیبل خدا بخش کے بیان سے ان کا بیان مختلف نہیں ہو سکتا۔ خود اوورسیئر وہی کہے گا جو پولیس کہے گی حالانکہ وہ ہم سے ایک دن پہلے بھی مل چکا تھا اور وہ جانتا ہے کہ ہم ڈاکو نہیں ہیں۔ اس نے ہمیں کسی میک اپ کے بغیر دیکھا تھا لیکن وہ اپنا حقیقت پر مبنی بیان دے کر مصیبت میں نہیں پھنس سکتا۔ وہ بھی کہے گا کہ پاٹے خاں اور گورا ڈاکو زبردستی اس کی کار میں بیٹھے۔ آگے پولیس نے راستہ روکا تو ان کے ساتھی آگئے اور وہ سب کچھ چھین کر لے گئے۔ اسلحہ، گاڑی اور وردیاں۔ پولیس نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا مگر وہ تعداد میں زیادہ تھے اور ان کے پاس خطرناک قسم کا جدید اسلحہ تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔ بے چارہ اوورسیئر خواہ مخواہ پھنس گیا۔"

"نسب اعمال کی سزا ہے۔" میں نے کہا: "سالا خود کو غریب آدمی کہنے سے باز نہیں آتا تھا۔ اب ساری عمر آئینہ دیکھے گا تو ٹوٹے ہوئے دانت کی جگہ نقلی دانت دیکھ کر یاد رکھے گا کہ اسے یہ سزا کیوں ملی تھی۔ میرا بس چلتا تو میں اس کی گاڑی کو بھی آگ لگا دیتا۔ اس نے کھیتوں کا پانی روک کر کتنے مجبور کاشت کاروں کے دل جلائے ہوں گے۔ اس نے محنت کشوں کے خون پسینے پر غنڈہ ٹیکس عائد کیا اور زبردستی وصول کیا ہوگا۔ ایسے آدمی کی کار کو آگ لگانے میں اتنا ہی ثواب ہے جتنا بدکار کو سنگسار کرنے میں۔"

غالب ہنسنے لگا: "ایسے فتوے مت ایجاد کر۔ مذہب کے ٹھیکیدار بھی تیرے خلاف ہو جائیں گے۔"

"اس میں غلط کیا ہے۔ ایک حرام کھاتا ہے، ایک حرام کرتا ہے۔ حرام کھانے والا تو اپنی نسلوں کے خون میں رزقِ حرام شامل کر دیتا ہے، وہ اور زیادہ بڑا مجرم ہے۔" میں نے کہا: "وہ چوری کا مال تھا، یہ سب جانتے ہیں لیکن ایسے چور محفوظ رہتے ہیں، ہم ان کو کیوں معاف کریں۔ اس کی ایک اور چیز بھی میرے پاس رہ گئی ہے۔"

"وہ کیا ہے؟" غالب نے کہا۔

میں نے اندر ہاتھ ڈالا اور وردی کے نیچے اپنے کپڑوں سے وہ ٹیلی فون کا آلہ نکالا جسے تاروں سے جوڑ کے میں نے ان سے بات کی تھی۔ اوورسیئر کو میں نے دُور بھیج دیا تھا۔ کپڑے اترنے کے بعد میں نے اس آلے کو ہاتھ میں رکھا تھا۔" میں نے "خیال تھا کہ اُسے دے دوں گا۔"

"مگر پھر دل میں بے ایمانی آگئی۔" غالب بولا۔

"سچ فرمایا آپ نے۔" میں نے شرمندہ ہوئے بغیر کہا: "وہ بھول گیا اور میں نے اسے قمیص کے اندر چھپا لیا، کام کی چیز ہے۔"

"اس میں کوئی شک نہیں کہ تو نے دُور اندیشی کا مظاہرہ کیا۔ یہ ایجاد ہمارے بہت کام آئے گی۔" غالب نے کہا: "اسے سنبھال کے رکھ۔"

"سنبھال کے ہی رکھا ہوا ہے ورنہ اب تک برآمد نہ ہو جاتا۔" میں نے کہا۔

"میرا ایک مشورہ ہے، بالکل مفت۔" غالب نے کہا: "روز ہونے سے پہلے ہم شہر میں داخل نہ ہوں۔ ابھی دو گھنٹے میں اندھیرا پھیل جائے گا۔ دن کے اجالے میں پولیس کی جیپ بھی دُور سے نظر آتی ہے اور نمبر بھی پڑھا جاتا ہے، رات کو سڑکوں پر پولیس کم ہوتی ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ زیادہ ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔

"ٹریفک پولیس نہیں رہتی۔" غالب نے کہا: "گشت کرنے والے آجاتے ہیں مگر وہ گشت کرتے ہیں۔ سیر تفریح۔ پکڑ دھکڑ، آوارہ گردی کی دھمکی میں شرفا سے نذرانے وصول کرنا، آوارہ گردوں کی جیبیں خالی کرنا، ائیرپورٹ سے آنے والے مسافروں کو لوٹنا۔ لوگوں کی گھڑیاں اور بٹوے جامہ تلاشی میں ضبط کرنا۔ ان کی نظر میں تو سب ہی مشتبہ ہوتے ہیں۔ جو پکڑا جائے اور خالی ہو تو دو چار ہاتھ کھائے، دس بیس گالیاں سا کڑے تو ایک سو نو میں تھانے ارسال کیا جاتا ہے۔ جو شرافت سے جیب خالی کر دے، وہ گھر چلا جاتا ہے اور کبھی شکایت نہیں کرتا۔ سوائے اپنی تقدیر کے۔"

"میں قائل ہوا۔" میں نے کہا: "رات تک کیا کریں؟"

"صبر۔" غالب نے کہا: "صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔"

ہم نے جیپ کو شاہراہ سے ایک فرلانگ دُور روک لیا۔ وہاں ایک ریلوے کراسنگ تھی اور اس کے ساتھ ہی ریلوے کا کوارٹر تھا جو خالی پڑا ہوا تھا یا باہر سے ایسا ہی لگتا تھا۔ میں نے جیپ اس کے پیچھے کھڑا کیا اور اندر داخل ہوگیا۔ چار افراد جو فرش پر بیٹھے تاش کھیل رہے تھے، ایک دم اُٹھ کے بھاگنے اور دیواریں پھاندنے لگے۔ نیلی وردی میں ریلوے کا ایک گینگ مین پکڑا گیا۔ میں نے اپنا ریوالور نکال لیا۔

"کب سے ہو رہا ہے جوا یہاں؟" میں نے گرج کے کہا اور تاش کے ان بے ترتیب پتوں کی طرف دیکھا جو بھاگتے وقت جواری پھینک گئے تھے۔ وہیں ان کی جیتی ہوئی اور ہاری ہوئی رقم بھی پڑی تھی۔ گینگ مین کا رنگ لاش کی طرح سفید ہوگیا۔

"جوا... نہیں حضور والا..." وہ ہکلانے لگا: "یار دوست تھے۔"

میں نے اس کے ایک جھاپڑ مارا۔ وہ دیوار سے جا لگا۔

"سرکار غلطی ہوگئی، مجھے معاف کردیں۔" اس نے ایک دم میرے پاؤں پکڑ لیے۔

میں نے اُسے کالر پکڑ کے ایک جھٹکے سے اُٹھا لیا: "اس لیے دیا تھا تم کو ریلوے نے کوارٹر کہ یہاں جوئے کا اڈا قائم کرلو۔"

گینگ مین لرزنے لگا: "اڈا کیسا جناب۔ آپس میں تھوڑا بہت کھیل لیتے ہیں۔ دس بیس روپے سے زیادہ نہیں لگاتے۔ غریب لوگ ہیں سب۔"

"غریب جوا کھیل سکتا ہے؟" میں نے کہا: "دس بیس روپے کی بازی کو جوا کہتے ہوئے تم کو شرم نہیں آتی۔ جوا ہوتا ہے ریس کورس میں، سٹے میں اور وہاں جہاں لاکھوں لٹانے والے آتے ہیں۔ موج کار لو میں۔"

"کہاں جی۔" گینگ مین بولا۔

"کہیں نہیں۔" میں نے کہا اور اسے چھوڑ دیا کیونکہ وہ واقعی جواری نہیں تھے، صرف وقت گزارنے اور کھیل میں تھوڑی سی دلچسپی پیدا کرنے کے لیے شرط لگا کے کھیلتے تھے۔

"میری جگہ کوئی اور پولیس افسر ہوتا تو تم کو پکا جواری قرار دے کر قید کر دیتا اور اس جگہ کو جوئے کا اڈا سمجھ لیتا۔" میں نے کہا: "لیکن مجھے تم شکل سے کنگلے نظر آ رہے ہو۔ تم کو ان چکروں میں نہیں پڑنا چاہیے، کیا بیوی بچے نہیں ہیں تمہارے...؟"

"ہیں جناب! مگر وہ یہاں نہیں، والٹن میں رہتے ہیں۔" وہ بولا۔ "آپ کی بڑی مہربانی۔ آپ نے میری عزت اور نوکری بچالی۔"

"ایک مرتبہ تو تم بچ گئے۔" میں نے کہا: "دوبارہ شاید تقدیر تمہارا ساتھ نہ دے۔ غریب جب جوا کھیلتا ہے تو صرف اپنی تقدیر کو داؤ پر لگا سکتا ہے اور اپنے بیوی بچوں کا مستقبل یا تھوڑی بہت عزت داؤ پر لگا سکتا ہے اور ہارنے کو تمہارے پاس کیا ہے۔ تمہاری تقدیر اچھی ہوتی تو تم گینگ مین نہ ہوتے بے وقوف۔ اور ایسی تقدیر سے گریڈ ہونے کے بعد تم جوا کھیلتے ہو؟"

"آئندہ میرے باپ کی بھی توبہ۔" وہ کانوں کو ہاتھ لگا کے بولا۔

"باپ زندہ ہے تمہارا؟" میں نے اس کے ایک جھاپڑ اور مارا۔

"نہیں جناب۔" وہ ہاتھ جوڑ کے کھڑا ہوگیا۔

"تو اس کی روح کو کیوں دُکھ دیتے ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ وعدہ اور یہ ہاتھ جوڑ کے توبہ کرنا، سب دکھاوا ہے، جان بچانے کے لیے۔ کل تم پھر جمع ہو جاؤ گے اور پھر یہی کرو گے اور شاید سمجھو گے کہ عجیب تھانیدار تھا۔ دو جھانپڑ مار کے چھوڑ گیا مگر بیٹا میں روز آدمی بھیجوں گا میرے مخبر سادہ کپڑوں میں یہاں آ کے تاش کھیلیں گے۔" میں نے کہا: "یہ بتاؤ تمہاری ڈیوٹی کیا ہے؟"

"میں جناب یہاں پھاٹک بند کرتا ہوں۔" وہ بولا: "جب گاڑی آنے کا ٹائم ہو۔"

"ابھی کسی گاڑی کے آنے کا وقت ہے؟"

"نہیں جناب! دو گھنٹے بعد ایک گاڑی گزرے گی۔" وہ بولا۔

"اچھا تو دیکھو، ہم یہاں دو گھنٹے ٹھہریں گے۔" میں نے کہا: "باہر ہماری گاڑی میں دو ڈاکو ہیں جو آج ہی پکڑے گئے ہیں۔"

"کون... وہ پاٹے خاں اور گورا ڈاکو؟" وہ بولا۔

"ہاں... تم کیسے جانتے ہو؟"

"یہ تو سب ہی جانتے ہیں حضور۔" وہ بولا: "اخبار میں تھا کہ یہ جیل سے فرار ہو گئے ہیں۔ آس پاس کے رہنے والے بہت ڈرے ہوئے تھے۔"

"اب ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔" میں نے کہا: "ہم نے ان کو جنگل سے گرفتار کرلیا ہے۔"

"واہ واہ جناب! یہ تو کمال کر دیا آپ نے۔" وہ خوشامدانہ لہجے میں بولا: "ان دونوں کی علاقے میں بڑی دہشت ہے۔ سب یہی کہتے تھے اب پھر پہلے کی طرح کسی کی جان و مال محفوظ نہیں رہیں گے۔ سب نے خدا کا شکر ادا کیا تھا جب وہ پکڑے گئے تھے۔ پاٹے خاں کو تو چار دن بعد پھانسی ہونے والی تھی۔"

"اب چار دن بعد تو شاید نہ ہو مگر خدا نے چاہا تو چار ہفتے بھی نہیں لگیں گے۔" میں نے کہا۔

"اللہ کرے جی... بڑے گھر لوٹے انھوں نے۔" وہ ایک دم اداس ہوگیا: "میرا گھر بھی تباہ کیا اس خنزیر کے تخم پاٹے خان نے۔"

"تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا؟" میں نے ہمدردی سے کہا۔

"میری بیٹی کا سارا جہیز لوٹ کر لے گئے تھے۔" وہ رونے لگا: "اس کا رشتہ ختم ہوگیا، پھر وہ مر گئی... اس نے خودکشی کرلی۔ اسی ٹرین کی پٹڑی پر لیٹ گئی۔ ہائے او میری سوہنی دھی... کیسا نصیب لائی تھی تو۔" وہ یکلخت دھاڑیں مارنے لگا۔

میں نے اس کے کندھے پر تھپکی دی: "صبر کرو بھائی... بس موت کی سزا گورے ڈاکو کو بھی سنائی جا چکی ہے اور اسے پھانسی ضرور ہوگی مگر ان کو کبھی کوئی نہیں پکڑے گا جو تمہاری بیٹی کے اصل قاتل ہیں۔ وہ شریف ڈاکو جو جہیز کے نام پر لڑکی والوں کو لوٹتے ہیں۔"

کیا وہ جہیز کے بغیر تمھاری بیٹی کو نہیں لے جا سکتے تھے؟ وہ رشتہ ختم نہ کرتے تو تمھاری بیٹی خودکشی کیوں کرتی؟"

"وہ لے جاتے تو کون سا خوش رکھتے۔" وہ آنسو پونچھ کے بولا۔ "وہ ساری عمر طعنے سہتی... عذاب جھیلتی... جل جل کے مرنے سے پہلے بہت دکھ اٹھاتی اور وہ سارے دکھ ہم بھی اٹھاتے... اچھا ہوا ایک ہی بار مرگئی۔ ہم نے بھی صبر کرلیا مگر حضور... مجھے اس ڈاکو کی صورت تو دکھاؤ۔"

"میں اس کو اندر لاتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "مگر شرط یہ ہے کہ تم خود پر قابو رکھو گے۔"

میں پہلے غالب کو اٹھا کے اندر لایا۔ پھر باری باری ان دونوں ڈاکوؤں کو۔ اب وہ دونوں ہوش میں تھے۔ پاٹے خاں کی حالت کچھ بہتر تھی مگر گورا ڈاکو اپنی ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کی تکلیف سے کراہ رہا تھا۔ کمرے میں ایک ہی چارپائی تھی جس پر میں نے غالب کو لٹا دیا تھا۔ خود میرے بیٹھنے کے لیے گینگ مین نے ایک اسٹول فراہم کردیا۔

"دیکھ تھانیدار۔" پاٹے خاں نے فرش سے سر اٹھا کے کہا۔ "ہم سے سودا کرلے..."

میرے جواب دینے سے پہلے ہی گینگ مین اس پر پل پڑا۔ اپنی بیٹی کے خون کا بدلہ لینے کی آرزو اس پر ایک جنون بن کے سوار ہوگئی اور وہ مجھ سے کیے ہوئے وعدے کو بھول گیا۔ "تو سودا کرے گا... کس کس سے سودا کرے گا... پہلے میری بیٹی کی زندگی کی قیمت دے... تیری تو..." اس نے ایک سے ایک گندی گالی دیتے ہوئے پاٹے خاں کو دیوانہ وار لاتیں ماریں۔ پاٹے خاں نے اسے ایک بار دھکیل دیا مگر وہ پھر اس پر ٹوٹ پڑا۔ میں نے دخل نہیں دیا۔ میں چاہتا تھا کہ میری موجودگی میں گینگ مین اپنے دل میں جلنے والی آگ کو کچھ ٹھنڈا کرلے۔ اس کے تو خواب و خیال میں بھی نہ ہوگا کہ وہ شخص جس کے خلاف اس کے وجود میں نفرت کا زہر بھرا ہوا تھا، یوں بے بس اور لاچار اس کے سامنے لایا جائے گا۔ عام حالات میں پاٹے خاں پھر اس گینگ مین کے سامنے آتا تو وہ ہاتھ جوڑ کے اس کے سامنے گریہ وزاری کرتا اور پوچھتا کہ سب کچھ تو لے گئے ہو، اب کیا لینے آئے ہو مگر یہ صورت حال قدرت کے نظام انصاف نے پیدا کی تھی کہ وقت کی بساط الٹ گئی تھی۔ ظالم اب مظلوم تھا اور جو کل مظلوم تھا اس کو ظلم کا حساب برابر کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ میں نے غالب کو مختصراً گینگ مین کے ساتھ ہونے والے ظلم کی کہانی سنا دی۔ اس عرصے میں گینگ مین نے پاٹے خاں کو دھن کے رکھ دیا۔ اس نے پاٹے خاں کی دو پسلیاں ٹھڈے مار مار کے توڑ دیں اور اس کے سامنے والے دانت توڑ دیے۔ اس کے کپڑے تار تار کر دیے۔ اور کسی وحشی درندے کی طرح اس کے جسم کو ریزہ ریزہ کرنے کی کوشش کرتا رہا مگر وہ جوان آدمی نہیں تھا اور پاٹے خاں میں ابھی تھوڑی بہت مزاحمت کی قوت باقی تھی۔ پاٹے خاں خود کو [illegible] اور مار کھاتا رہا۔ گینگ مین ہانپنے لگا۔ چلاتے چلاتے اور گالی[illegible] دیتے اس کا گلا بیٹھ گیا۔ وہ اپنی بیٹی کو نام لے لے کر پکارتا رہا [illegible] خاں پر مسلسل حملے کرتا رہا۔ اگر وہ خالی ہاتھ نہ ہوتا تو یقیناً پا[illegible] کو قتل کردیتا۔ میں بھی یہ جانتا تھا کہ وہ اس جنونی کیفیت [illegible] خاں کو چیر پھاڑ کے رکھ سکتا ہے چنانچہ میں بہت چوکس ہو[illegible] دو مرتبہ گینگ مین نے پاٹے خاں کا گلا گھونٹنا چاہا لیکن پل[illegible] نے اسے دھکیل دیا۔ پھر اچانک گینگ مین نے ادھر ادھر دیکھا [illegible] ایک کونے کی طرف لپکا۔ میں سمجھ گیا کہ اب وہ کیا کرے گا [illegible] کے واپس آنے سے پہلے ہی میں اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ سبزی کاٹ[illegible] چھری لے کر آیا تو اس نے مجھے اپنی راہ میں مزاحم پایا۔

"ہٹ جاؤ... ہٹ جاؤ تھانیدار صاحب... میں [illegible] کتے کا خون پیوں گا۔" گینگ مین چلاتے اور ہانپنے لگا۔ "اس [illegible] خون سے ہی میرے دل کی آگ ٹھنڈی ہوگی... میں پھانسی [illegible] جاؤں گا۔ آپ مجھے گرفتار کرلینا، بس مجھے اس کی بوٹیاں کرنے [illegible] میں اس کے ٹکڑے کرکے کتوں کو ڈالوں گا۔"

میں نے اس کی کلائی مضبوطی سے پکڑ رکھی تھی اور وہ [illegible] چھڑانے کے لیے بل کھا رہا تھا۔ "بس بھائی... پاگل پن [illegible] مت بڑھو، تم پھانسی چڑھ جاؤ گے تو باقی سب کا کیا بنے گا [illegible] بیوی کا... اور دوسرے بچوں کا... خدا کی لاٹھی بے آواز ہے [illegible] دیکھا کہ کس طرح تمھارا گھر برباد کرنے والا تمھاری ٹھوکروں میں [illegible] اپنا بدلہ خدا پر چھوڑ دو۔ اس نے سب کا حساب بے باق کرد[illegible] بہت جلد یہ اپنی ٹوٹی ہوئی گردن کے ساتھ پھانسی گھاٹ کے [illegible] کنوئیں میں لٹکا ہوگا۔ اسے میں بھی گولی مار سکتا تھا مگر میں نے [illegible] وہیں پہنچانا ہے جہاں اجل اس کے انتظار میں ہے۔ یہ دست [illegible] سے بھاگنا چاہتا تھا۔ بھلا موت سے بھاگ کے کوئی کہاں جا سکتا [illegible]

گینگ مین نے چھری گرا دی اور فرش پر دھپ سے بیٹھ [illegible] رونے لگا اور میں نے چھری اٹھا کے دور پھینک دی۔

"اس ڈاکو سے بھی تم نے کچھ کہا تھا جو جہیز کے نام پر تمھا[illegible] گھر میں ڈاکا ڈالنے آیا تھا؟" میں نے کہا۔ "اس سے تم نے کچھ [illegible] کہا ہوگا، الٹا تم نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑے ہوں گے۔ اس [illegible] قدموں پر سر رکھ دیا ہوگا، یا اپنی پگڑی ڈال دی ہوگی۔ کہا ہوگا کہ [illegible] عزت اب تمھارے ہاتھ میں ہے۔ یہی کیا تھا نا؟ سب یہی کر[illegible] ہیں۔ کوئی یہ نہیں سمجھتا کہ وہ شخص تو خود بے غیرت ہے جو غریب [illegible] آدمی کی بساط سے بڑھ کر جہیز کا مطالبہ کرتا ہے اور جہیز کے بغیر [illegible] کی بیٹی کو ایسے ٹھکرا دیتا ہے جیسے کوئی طوائف [illegible] ہے۔ دونوں کا فعل ایک ہی ہے مگر طوائف صرف عورت کہلا[illegible] تم پر لازم تھا کہ اس ڈاکو کے ساتھ بھی یہی سلوک کرتے۔ اس کو [illegible] اتار کے اسے ٹھوکریں مارتے۔ اسے بھی اتنا ہی بے عزت کرتے جتنا اس نے تمھیں کیا۔ جس دن تمھاری بیٹی کا جنازہ اٹھا اسی دن اگر اس کے بیٹے کا جنازہ بھی اٹھتا تو فرق پڑتا۔ ان سب کو فرق پڑتا جن کی بیٹیوں کی باراتیں لوٹ گئیں یا رشتے ٹوٹ گئے۔ مگر تم اس کے ہاتھوں ذلیل ہوئے اور تم نے خود کو بھی ذلیل کیا۔ اس نے تو اپنے بیٹے کی بارات بھی دھوم دھام سے کہیں اور پہنچا دی ہوگی۔ تم نے اس ڈاکو کو مارا؟ یہ تو ڈاکو ہے، اس کی کوئی عزت نہیں مگر اس عزت دار ڈاکو کا تم کچھ نہ بگاڑ سکے۔"

"یہ تم کیا کر رہے ہو؟" غالب نے مجھے اونچی آواز میں ٹوکا۔ "تم اسے قتل پر اکسا رہے ہو۔ اگر اس نے اب برانگیختہ ہوکے اس لڑکے کا، اس کے باپ کا اور پھر لڑکے کی بیوی کا خون کردیا تو سوچو کیا ہوگا۔ تین گھر تباہ ہوں گے۔ اس کا اپنا، اس لڑکے کا اور اس دوسری لڑکی کا جو بے قصور ہے۔"

مجھے ہوش آگیا۔ "تم ٹھیک کہتے ہو۔ یہ انصاف تو اسی وقت ہونا چاہیے تھا جب ظلم ہوا تھا۔ اب بہت دیر ہوگئی۔"

"ہاں جی اب تو بہت دیر ہوگئی۔" گینگ مین نے کہا۔ "آخر وہ بھی تو کسی کی بیٹی ہے جس کا گھر بعد میں آباد ہوا۔ سارا قصور اس لڑکے کے باپ کا تھا۔ آپ نے بالکل ٹھیک کہا کہ اللہ کی لاٹھی بے آواز ہے۔ میری بیٹی کا چالیسواں اسی دن تھا جس دن اس کا سوئم تھا۔ کہتے ہیں، اسی بیٹے نے جائداد کے لیے باپ کو زہر دیا تھا مگر مشہور یہ ہوا کہ اسے سانپ نے کاٹ لیا۔ سانپ تو وہ خود تھا پھر بیٹا سپنولیا کیسے نہ ہوتا۔"

"تمھارا نام کیا ہے؟" غالب نے موضوع بدلنے کے لیے کہا۔ "یہ تو ابھی تک بتایا ہی نہیں تم نے۔"

"غازی خاں۔" وہ بولا۔ "خدا آپ کو ترقی دے۔ آپ نے میرا کلیجہ ٹھنڈا کردیا۔ جس دن اس کمینے کو پھانسی ہوگی میں مٹھائی تقسیم کروں گا اور آپ کے نام پر بھی بانٹوں گا۔"

"نہ بھئی، ہمارا تو یہ فرض ہے۔ ہم یہ کام مٹھائی بانٹنے کے لیے نہیں کرتے۔" میں نے کہا۔ "ہماری کسی سے بھی ذاتی دشمنی نہیں ہے۔"

"میں اپنی بیوی کو آپ کے متعلق ضرور بتاؤں گا۔ یہ بھی بتاؤں گا کہ میں نے اسے کتنا مارا۔ اس کے منہ پر پیشاب کردیا میں نے مگر وہ کچھ نہ کرسکا۔ اب میرے دل کو بہت قرار آگیا ہے۔ یہ سب آپ کی وجہ سے ہوا۔ اگر تم لوگ میرے غریب خانے پر آئیں۔" وہ بولتا گیا۔ "میری بیوی کی دعائیں بھی لیں۔ وہ غریب تو رو رو کے اندھی ہوچکی ہے، صرف دعا دے سکتی ہے۔"

"ہم... ہم ضرور آتے... مگر تمھارا گھر بھی تو معلوم نہیں ہمیں۔" میں نے کہا۔

"آپ والٹن آئیں، وہاں ریلوے کے کوارٹر ہیں۔" وہ بولا۔ "چھوٹے کوارٹر دیکھے ہوں گے آپ نے۔ وہاں کسی سے بھی پوچھ لیں کہ ڈیرہ غازی خاں کہاں ہے۔"

"ڈیرہ غازی خاں؟" میں نے کہا۔

"ہاں جی... میرا نام غازی خاں ہے نا۔ تو سب میرے گھر کو ڈیرہ غازی خاں کہتے ہیں جناب۔" وہ بولا۔ "میں آپ کا خادم ہوں۔ آپ کا احسان ہے مجھ پر کہ مجھے جوا کھیلنے کے جرم میں نہیں پکڑا اور مجھے موقع دیا کہ میں کچھ تو بدلہ لے سکوں اپنی بیٹی کا۔"

"غازی خاں... تمھاری بیوی کیا بالکل اندھی ہوچکی ہے؟" غالب نے پھر بات کا رخ پلٹا کیونکہ غازی خاں گھوم پھر کے اپنے انتقام پر آجاتا تھا۔

"ہاں جی، ابھی تو بالکل اندھی ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں، بڑا آپریشن ہوگا۔" وہ بولا۔ "ڈھائی ہزار روپے لگیں گے۔ غریب کے پاس ڈھائی ہزار کہاں جناب۔ کافی ہے، جتنی دنیا دیکھ لی۔"

"لیکن سرکاری اسپتال بھی تو ہے۔" میں نے کہا۔

"وہاں بھی ہمیں کون پوچھتا ہے، کہتے ہیں، ریلوے اسپتال جاؤ۔ اور ریلوے اسپتال آپ خود جا کر دیکھ لیں۔" وہ مایوسی سے بولا۔ "کیا فائدہ دھکے کھانے سے۔"

میں نے غالب سے مشورہ کیا۔ بات صرف ڈھائی ہزار کی تھی جس سے ایک بدنصیب عورت کی بینائی واپس آسکتی تھی۔ پاٹے خاں کی پھانسی سے اس کی بیٹی واپس نہیں مل سکتی تھی لیکن بیٹی کے ساتھ چلی جانے والی بیوی کی آنکھوں کی روشنی اس سے صرف ڈھائی ہزار روپے کی مسافت پر تھی مگر اس کی دسترس میں نہ تھی۔ اسے ڈھائی ہزار میل پیدل چل کے اس روشنی کو واپس لانا پڑتا تو وہ اپنی شریک حیات کے لیے سفر کی ہر صعوبت برداشت کرلیتا اور اسے آنکھوں کا نور لا دیتا مگر ڈھائی ہزار روپے لانا اس کے بس کی بات ہی نہ تھی۔ ایسے کئی ڈھائی ہزار ہماری جیب میں پڑے ہوئے تھے اور یہ ڈاکوؤں کا مال تھا، ویسے ہی ڈاکوؤں کا جو ایک غریب گینگ مین کے گھر کی ساری خوشی، ساری روشنی اور ساری زندگی کی کمائی لوٹ کرلے گئے تھے۔

"غازی خاں۔" میں نے جیب میں سے گن کر تین ہزار نکالے۔ "یہ لو۔"

"یہ کیا ہے جناب!" وہ ڈر کے پیچھے ہٹ گیا۔

"تمھاری بیوی کے لیے آنکھوں کی روشنی۔" میں نے کہا۔

"نہیں جناب! ایسے کسی سے لینے ہوتے تو میں بھیک مانگ لیتا۔" غازی خاں نے کہا۔ "بہت سے ساتھیوں نے کہا تھا کہ چندہ کر لیتے ہیں۔ سب کو مجھ سے ہمدردی تھی کہ پہلے جہیز گیا۔ پھر رشتہ گیا۔ پھر بیٹی گئی۔ جب بیوی کی آنکھوں کی روشنی گئی تو ان کے سینے میں دل پانی ہوگئے۔ مگر میں نے کہا کہ یہ سب اس کی رضا ہے۔ تو میں راضی بہ رضا ہوں۔ میں نے کسی کی خیرات نہیں قبول کی۔"

"مگر یہ خیرات نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "انہی ڈاکوؤں کے پاس سے برآمد ہونے والی رقم ہے، اس پر تمھارا بھی حق ہے۔ تمھاری بیٹی کی زندگی انمول تھی مگر جہیز کی مالیت کا تو اندازہ ہو گا تم کو۔"

"ہاں جی... تھا کوئی پانچ ہزار کا۔" وہ بولا۔

"کیا وہ پانچ ہزار تمھیں واپس ملے؟"

"نہیں جناب... جو گیا سو گیا۔ برآمد ہو جائے تب بھی کہاں ملتا ہے۔ سب آپ جیسے تو نہیں ہیں پولیس میں۔" وہ بولا۔

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ یہ تمھارا حق ہے۔" میں نے مزید دو ہزار شامل کر کے رقم اس کے ہاتھ میں تھمائی۔ "اگر یہ رقم پولیس کے حساب میں چلی گئی تو تمھیں کیا ملے گا؟ وقت سے فائدہ اٹھاؤ، ابھی معاملہ میرے اختیار میں ہے۔"

میری دلیل نے اُسے کچھ قائل کیا تھا مگر وہ تذبذب کا شکار تھا۔ "آپ... آپ کیوں اتنے مہربان ہیں مجھ پر جناب... کیا چاہتے ہیں آپ مجھ سے؟"

"ہمیں دعائیں چاہئیں۔" میں نے کہا۔ "وہ دعائیں جو سچی ہوں اور دل سے نکلیں۔ ہم دُکھی دلوں کا درد مٹا کے ہی ایسی دعائیں پا سکتے ہیں جو قبول بھی ہوتی ہیں۔ ہم غرض مند ہیں غازی خاں، یہ رکھ لو۔"

"ایسے نہیں جناب... مجھے معلوم ہے کوئی پولیس افسر اپنی مرضی سے برآمد ہونے والا مال نہیں بانٹ سکتا۔" وہ بولا۔ "اگر یہ ڈاکو کا مال ہے تو آپ کا بھی مال ہے۔"

"کیا تم مجھے ڈاکو کہہ رہے ہو؟" میں نے ہنس کے کہا۔

"نہیں سرکار... میری کیا مجال... میرا مطلب تھا کہ آپ بھی تو اس مال کو رکھ سکتے ہیں۔ آپ سے پوچھنے والا کون ہو گا۔" وہ بولا۔ "میں بھی سامان کا حقدار ہوں، اس کے بدلے مال کا نہیں۔"

"ایک ہی بات ہے غازی خاں۔" میں نے کہا۔ "اگر مجھے یقین ہوتا کہ یہ مال حکومت کے خزانے میں جائے گا تو میں تم کو ایک پیسہ نہ دیتا لیکن میں جانتا ہوں کہ اسے وہ سب لوگ تقسیم کر لیں گے جن کے خزانے ایسے ہی مال سے بھرے پڑے ہیں۔ پھر یہ کسی ضرورت مند کے کام کیوں نہ آئے۔ کسی حرام خور کے لیے یہ ڈھائی ہزار کچھ نہیں، وہ ایک دن میں اس سے زیادہ پیدا کر لیتا ہے مگر تم ساری عمر کوشش کرتے رہو گے تب بھی ڈھائی ہزار نہیں بچا سکو گے اور اگر تم پانچ دس سال میں ڈھائی ہزار جمع کرنے کے قابل ہو گئے تو اس وقت تک آپریشن چار چھ پانچ ہزار ہو جائیں گے۔ کون جانے آپریشن ہو بھی سکے گا یا نہیں۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں، میں خود دے رہا ہوں تم کو۔"

"جناب آپ بڑے آدمی ہیں۔ آپ کا دیا دنیا اور آخرت دونوں میں آپ کے لیے عزت کا باعث ہو سکتا ہے۔" وہ ہاتھ جوڑ کے بولا۔ "ہم غریب اور چھوٹے لوگ ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ دنیا میں رسوا ہوں... آخرت میں بھی... اور اپنی نظر میں بھی۔ کبھی پولیس کو دیکھا نہیں کہ اس نے کسی کو

نیک نیتی سے کچھ دیا ہو۔ لیتے ضرور دیکھا ہے اور اسی لیے یقین نہیں آتا کہ اس میں کوئی دھوکا نہیں۔ یہ نہ ہو نوٹوں پر نشان لگے ہوں بعد میں آپ ہی مجھے گرفتار کر لیں کہ... یہ جوئے کی رقم تھی۔ ابھی تو بھاگنے والے دس بیس روپے چھوڑ کے بھاگے ہیں۔ اس سے بھی آپ جرم تو بنا سکتے ہیں مگر میرے پاس سے تین ہزار برآمد ہوئے تو میں کیسے انکار کروں گا کہ میں جوئے کا اڈا نہیں چلا رہا تھا۔ آپ ہی مجھ سے سوال کریں گے کہ تمھارے پاس تو اندھی بیوی کی آنکھوں کے آپریشن کے لیے ڈھائی ہزار نہیں تھے پھر یہ تین ہزار کہاں سے آ گئے؟ ابھی تک آپ نے میرے ان ساتھیوں کے بارے میں نہیں پوچھا جو چھاپا پڑتے دیکھ کر فرار ہو گئے مگر ہو سکتا ہے کہ تین ہزار برآمد کرنے کے بعد آپ رات کو مجھے تھانے لے جا کر پوچھیں میں چار کے نام بتا دوں تو کہیں باقی چار کے بھی بتاؤ۔"

میرے دل میں درد کی ایک لہر اٹھی اور ٹوٹ گئی۔ میرا آگے بڑھا ہوا ہاتھ پیچھے ہو گیا۔ میرا نیکی کرنے کا جذبہ شرمسار ہو گیا اور میرے لیے احساس جرم بن گیا۔ یہ ایسا المیہ تھا کہ انسانوں کو نیکی، شرافت اور انسانیت کے خلوص پر اعتبار نہ رہا تھا۔ کوئی دوستی یا دستگیری کے لیے ہاتھ بڑھائے تب بھی نظر آستین میں دشنۂ پنہاں دیکھتی ہے۔ شک اور خوف نے دلوں میں بدگمانیوں کا زہر بھر دیا ہے۔ ہر شخص، آدمی سے ڈرتا ہے کہ مار گزیدہ ہے۔ یہ وردی جو قانون کی بالادستی کی علامت تھی، کتنی بدنام ہو کے رہ گئی ہے۔ اب کسی کو یقین نہیں آتا کہ اس وردی میں بھی ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کے دل درد سے خالی نہیں... جو انسانیت کی قدروں کو اتنا ہی محترم سمجھتے ہیں جتنا کہ وہ آدمی جسے انسان ہونا میسر ہے۔ آدمی کے تجربات کا عکس اس کی زندگی کے آئینے میں نظر آتا ہے اور پولیس کے معاملے میں نچلے طبقے کے غریب اور لاچار لوگوں کی رائے ایک دن میں خراب نہیں ہوئی۔ یہ برسوں، شاید صدیوں کا المیہ ہے۔ اس وقت سے جب انگریز بہادر نے پولیس کو اپنی حاکمیت تسلیم کرانے کے لیے ڈنڈے اور رائفلیں دی تھیں اور کہا تھا کہ جاؤ، اپنے ہم وطنوں کو دلیل اور شرافت کی زبان میں نہیں، جوتا کاری، لاٹھی چارج، ٹیئر گیس اور فائرنگ کی زبان میں بتاؤ کہ اقتدار کیا ہوتا ہے۔ آج تک جب ملک میں آزادی کا سورج طلوع ہوئے بائیس سال ہوئے پولیس کے اور عوام کے درمیان فاصلہ بڑھتا رہا ہے۔ لندن کی پولیس کی طرح عام آدمی کے دوست بننے کے لیے نہ انھوں نے کوشش کی اور نہ ضرورت محسوس کی۔ جب زمانہ ہی لاٹھی سے بھینس ہنکا لے جانے والوں کا ہو تو پولیس لاٹھی سے بات کیوں نہ کرے۔ پبلک چلاتی رہے کہ لاٹھی گولی کی سرکار نہیں چلے گی۔

"آپ ناراض تو نہیں ہو گئے سرکار۔" غازی خاں نے کہا۔ "آپ مالک ہیں۔ اقرار کو بھی ہمارا جرم بنا سکتے ہیں اور انکار کو بھی۔"

"ہمارے پاس وقت نہیں ہے غازی خاں کہ ہم بحث کر سکیں اور تم کو قائل کر سکیں کہ کہیں بھی سارے شیطان اور سارے رحمان نہیں ہوتے۔ ہر جگہ، ہر ادارے میں، ہر شہر اور ہر ملک میں اچھے برے لوگ ملتے ہیں۔" میں نے کہا اور رقم جیب میں رکھ لی۔

"تم کچھ چائے وغیرہ پلا سکتے ہو؟" غالب نے کہا۔ "یہاں کوئی بندوبست ہے؟"

"ہے سرکار! میں خود بھی بنا سکتا ہوں۔ اور آپ کہیں تو آگے سے بھی لا سکتا ہوں۔" وہ بولا۔ "سڑک کے موڑ پر ہوٹل ہے۔"

"نہیں... تم خود بناؤ۔" میں نے کہا۔ پھر میں چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس نے نروس طریقے پر اسٹوو جلا کر پانی اُبلنے کے لیے رکھا۔

"جتنی دیر میں یہ پانی اُبلتا ہے۔" میں نے دس کا ایک نوٹ نکال کے کہا۔ "تم دوڑ کے سگریٹ لاؤ، اس ہوٹل پہ ملتے ہیں نا؟"

"میں لاتا ہوں جناب... آپ پیسے رکھیں اپنے پاس۔" وہ ایک دم اُٹھا۔

"ٹھہرو، یہ پیسے کیوں نہیں لے رہے ہو تم؟ کیا اس ہوٹل سے تم کو روز مفت سگریٹ ملتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"روز... نہیں... مگر آپ تو مہمان ہیں۔" وہ گھبرا کے بولا۔

"مہمان۔" میں نے طنز سے کہا۔ "اچھی عزت کی ہے تم نے مہمانوں کی اُن کے خلوص کو گالی دے کر۔"

"میں... میں نے... میں نے تو..." وہ ہکلانے لگا۔

"اگر تم ہماری نیک نیتی پر شک کر سکتے ہو کہ ہم وہ رقم تم کو پھنسانے کے لیے دے رہے تھے تو میں بھی کہہ سکتا ہوں کہ یہ مہمان نوازی نہیں ہے۔ تم رشوت دے رہے ہو۔" میں نے کہا۔ "اور کس کس کو روز دس روپے کے سگریٹ لا کے پلاتے ہو۔ ہم تو چائے کے بھی پیسے دیں گے۔"

وہ شرمندہ نظر آنے لگا۔ "میری کیا مجال کہ رشوت دوں۔"

"اچھا چھوڑو۔ مہمان نوازی کا شوق ہے تو اپنے سگریٹ نکالو۔" غالب نے کہا۔ زمین پر تاش کے پتوں، نوٹوں اور سکوں کے درمیان 'فاکس اون' سگریٹوں کی لال ڈبیا پڑی ہوئی تھی جو بہت سستے قسم کے سگریٹ تھے۔ حیرت زدہ گینگ مین نے وہ ڈبیا اُٹھا کے غالب کو دی۔ پھر خاموشی کا ایک وقفہ آیا جس میں وہ خاموشی سے چائے بنا کے لایا اور ہم نے پی۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ اب نادم ہے۔

"اب ہم چلتے ہیں۔" میں نے چائے کا خالی کپ رکھتے ہی کہا اور غالب کو اُٹھا کے جیپ تک لے گیا۔ باہر رات کا اندھیرا آہستہ آہستہ شام کے دُھندلکے پر غالب آنے لگا تھا۔ دونوں ڈاکوؤں کی حالت خراب تھی لیکن میں نے شہر کے علاقے میں رسک لینا مناسب نہیں سمجھا۔ میں نے گینگ مین غازی خاں کے دیے ہوئے تار کے ٹکڑوں سے انھیں باندھا اور کپڑا ٹھونس کر ان کے مُنہ بند کر دیے۔

"کسی سے ہمارے بارے میں بات کرنے کی ضرورت نہیں..." میں نے جیپ میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اپنے ساتھیوں کو بتا دینا کہ ہم ایسے ہی آ گئے تھے۔"

"جی سرکار..." وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"اچھا غازی خاں۔" میں نے کہا۔ "خدا حافظ... تمھاری مہمان نوازی کا شکریہ۔"

غازی خاں کو بالآخر اس کے دل نے قائل کر لیا تھا کہ ہم ویسے لوگ نہیں ہیں جیسے وہ سمجھا تھا اور اپنے شک کا اظہار کر کے اس نے ہمیں صدمہ پہنچایا ہے۔

"ایک... ایک عرض ہے سرکار۔" غازی خاں نے اس وقت کہا جب میں جیپ کو اسٹارٹ کر چکا تھا۔

"کہو کیا بات ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ... میں رقم آپ سے ضرور لے لیتا۔ مجھے ضرورت بھی ہے۔" وہ بولا۔ "مگر...؟"

"مگر کیا...؟"

"اتنی ہی نیکی کرنا چاہتے ہیں آپ... تو یہ رقم خود اسے دے دیں... جو ضرورت مند ہے۔" وہ بولا۔ "اس کے ہاتھ میں... انہی ہاتھوں سے وہ آپ کو دعا دے گی۔"

"تمھارا مطلب ہے تمھاری بیوی کو... تمھارے گھر آ کے...؟" میں نے کہا۔

اس نے ڈرتے ڈرتے سر ہلایا۔ "ڈرتا تو میں ہوں جی۔ میں بڑا گنہگار ہوں لیکن سچ یہ ہے کہ میں نے جو کبھی دیکھا نہ سُنا اس پر کیسے اعتبار کروں۔ اب میرا دل تو کہتا ہے کہ آپ فرشتے ہیں انسان کے بھیس میں۔ مجھے یقین آ جائے گا اگر آپ نے اس اندھی کے ہاتھوں میں روشنی دینے کے لیے میرے غریب خانے کی دہلیز بھی پار کر لی۔"

"اچھا... اگر تم امتحان لینا چاہتے ہو ہماری نیت کا تو ہم آئیں گے۔" میں نے گاڑی آگے بڑھا کے کہا۔ "ضرور آئیں گے۔"

"کب... کس وقت جناب؟" وہ جیپ کے پیچھے دوڑا۔

"کسی بھی دن... کسی بھی وقت۔" میں نے چلا کے کہا۔ "خدا حافظ غازی خاں۔"

"خدا حافظ سرکار۔" وہ رک گیا اور پیچھے رہ گیا۔

ہم نے غازی خاں کے بارے میں کوئی بات نہیں کی کیونکہ یہ میں بھی جانتا تھا اور غالب بھی کہ جسے وہ امتحان سمجھا تھا، وہ ہمارے لیے کوئی امتحان نہیں۔ ہم کسی بھی وقت جا کے اس کی بیوی کو ایک نیکی کا نذرانہ دے آئیں گے۔ ان ہاتھوں کی دعا بھی آنے والے دنوں میں کہیں ہمیں امید کی روشنی دے گی جب ہم مایوسی کے اندھیرے میں اندھوں کی طرح بھٹک رہے ہوں گے۔

"کیوں نہ میں پہلے انکل رضوی کو فون کر لوں...؟" میں نے کہا۔ "شہر میں یہ کام مشکل ہو گا۔"

"یہ تو ٹھیک سوچا تم نے۔" غالب نے کہا۔ "مجھے وہاں بھی

خیال آیا تھا۔ غازی خاں کے کوارٹر کے پیچھے سے ٹیلی فون کی لائن گزر رہی تھی۔ اور وہاں کھمبا بھی تھا مگر پھر سب سنتے۔"

میں نے جیپ کو سڑک کے قریب سے موڑا اور کچے راستے پر اتار لیا۔ اندھیرے میں ہیڈ لائٹس جلائے بغیر اس ناہموار راستے پر گاڑی چلانے کے لیے مجھے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھنا پڑا۔ بڑے بڑے درخت تو صاف نظر آتے تھے اور چھوٹی موٹی جھاڑیاں جیپ کے نیچے آ کے پس جاتی تھیں لیکن گڑھے اور پتھر دکھائی نہ دیتے تھے۔ جھٹکوں سے میرا بُرا حال ہو گیا اور میں نے بڑی مشکل سے گاڑی کو قابو میں رکھا۔ اس کے ٹائر نئے اور بہت جاندار تھے ورنہ ایک بھی ٹائر برسٹ ہو جاتا تو جیپ الٹ جاتی۔ ابھی تک جیپ میں پچھتر فیصد لوگ لوٹے ہوئے تھے۔ پھر سو فیصد ہو جاتے۔

گاڑی کو میں نے ایک ٹیلی فون پول کے قریب روک لیا جو ہر لحاظ سے محفوظ تھا۔ مین روڈ تو کیا چھوٹی سڑک پر سے گزرنے والا بھی نہ مجھے دیکھ سکتا تھا اور نہ جیپ کو۔ کھمبے سے جیپ اتنی دُور تھی کہ میری گفتگو دونوں ڈاکو نہیں سن سکتے تھے۔ کسی دشواری کے بغیر میں کھمبے پر چڑھا اور اس اینگل آئرن پر بیٹھ گیا جو تاروں سے دو فٹ نیچے شاید اسی مقصد کے لیے لگایا گیا تھا۔ ایک ڈیڑھ فٹ لمبے اینگل آئرن پر میری ایک ٹانگ کھمبے کے ایک طرف لٹکتی رہی اور دوسری ٹانگ دوسری طرف۔ دونوں ہاتھوں سے کام کرتے وقت میں نے ٹانگوں کو کھمبے کے گرد قینچی مار کے لپیٹ لیا۔

اس پول پر وہ کالا سا باکس نہیں تھا جس میں سے کنکشن لینا آسان ہوتا اور یہی سوچ کے میں جیپ کے ٹول باکس سے پلائر ساتھ لایا تھا۔ تار کی بیرونی تہ بہت سخت تھی۔ میں نے ماچس کی تیلی جلا کے اسے گرم کیا اور جب سیاہ پلاسٹک جلنے لگا تو پھونک مار کے بجھاتے ہی پلائر سے کاٹ دیا۔ دو تاروں کی انسولیشن ہٹا کے میں نے اپنے کپڑوں کے اندر سے ڈائریکٹ لائن والا ٹیلی فون انسٹرومنٹ نکالا اور اس کے دونوں تاروں کے کنارے لائن سے ملا دیے۔ جب ریسیور میں ٹون آئی تو مجھے خوشی ہوئی کہ میں نے سر پر سے گزرنے والے چار تاروں میں سے دو صحیح تاروں کو منتخب کیا تھا۔

ریسیور آنٹی نے اُٹھا کے ہیلو کہا تو میں ان کی آواز پہچان گیا۔

"آنٹی! میں آپ کا نالائق، نامعقول، ناہنجار بھتیجا سکندر بخت ہوں مگر پلیز میرا نام مت لیجیے گا۔" میں نے کہا۔

چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد انھوں نے کہا: "اچھا۔"

میں نے کہا: "میں نے آج صبح بھی فون کیا تھا۔ شہلا سے بات ہوئی تھی۔ اُن سے بھی۔"

"اُن سے کن سے؟"

"بھئی وہی جو آپ کے وہ ہیں۔ ایس ایس پی صاحب۔" میں نے ہنس کر کہا: "انھوں نے آپ کو بتایا نہیں؟"

"شہلا نے بتایا تھا۔" وہ بولیں: "کہاں سے بول رہے ہو تم؟"

"بہت بلندی پر سے۔" میں نے کہا: "زمین پر میں بہرحال نہیں ہوں۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو؟" انھوں نے کچھ اور مطلب نکال کر خفگی سے کہا: "یہ کس مصیبت میں ڈال رکھا ہے تم نے سب کو۔ اپنے آپ کو مجھے اور اپنے انکل کو۔ وہ لاکھ ایس ایس پی سہی۔ تم کو کیا معلوم وہ تمھارے لیے... اور تمھاری وجہ سے کتنے پریشان رہتے ہیں... راتوں کو سو نہیں سکتے... اور شہلا کے لیے کیا یہ پریشانی اٹھانے کے دن ہیں... کیا ضرورت تھی اس لڑکے کو شادی کرنے کی اگر وہ بیوی کو سنبھال نہیں سکتا تھا۔"

"آنٹی... آنٹی... پلیز..." میں نے کہا: "مجھے معلوم ہے آپ کتنی ناراض ہوں گی۔ بے شک میں نے آپ کو بہت دُکھ دیے ہیں لیکن کیا کہوں خود کو... سوائے اس کے کہ سکندر بخت بدبخت تھا۔ بدبخت ہی تو ہوتے ہیں وہ بیٹے جو ماؤں کا سُکھ بھی چھین لیتے ہیں۔ ماں تو یاد نہیں۔ ایک آپ کی ذات میں ہی بے غرض محبت کا وہ روپ دیکھا تھا۔ زمانے کی طرح آپ بھی خفا ہیں مجھ سے... مجھے تو آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔"

"اب تک کس کام آئی ہیں میری دعائیں۔" انھوں نے روتے ہوئے کہا۔

میں دم بخود رہ گیا۔ یہی بات مجھ سے انکل رضوی نے کہی تھی۔ بے چارے مجبور لوگ کیا کریں اور کدھر جائیں۔ ایک طرف دنیا اور اس میں رہنے کی ذمے داریاں۔ دوسری طرف ہم اور ہمارے دُکھ۔

"آنٹی... آپ روئیں نہیں پلیز۔ میں کھمبے سے نیچے گر گیا تو میری بھی ٹانگ ٹوٹ جائے گی۔ غالب تو ٹوٹی ٹانگ لیے پہلے ہی میرے ساتھ لنگڑاتا پھر رہا ہے۔ پھر کیا رہا ہے مجھ پر سوار ہے یا جیپ پر..." میں نے انھیں ہنسانا چاہا۔

"بک بک مت کرو۔ مجھے بتاؤ رابعہ کہاں ہے... وہ خبیث محسن بھی مجھے کچھ نہیں بتاتا۔" انھوں نے کہا: "اچھا ہے تمھارے انکل گھر میں نہیں ہیں... میں تم سے بات کر سکتی ہوں۔"

"آنٹی... فون ٹیپ ہو رہا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"نہیں، فون ٹیپ نہیں ہو رہا ہے۔" وہ بولیں۔

"آپ کو نہیں معلوم۔ انکل نے صبح مجھے بتایا تھا کہ..."

"تم کو نہیں معلوم۔ انھوں نے تمھیں غلط بتایا تھا۔" وہ میری بات کاٹ کے بولیں: "انھوں نے مجھ سے بہت پہلے کہا تھا کہ میں نے سب ہٹوا دیا ہے۔ جب سے شہلا آئی ہے یہاں۔ انھوں نے تمام انتظامات ختم کرا دیے ہیں۔ دروازے پر گارڈ بھی نہیں ہے۔ شوفر بھی نہیں رکھا ہے۔"

"میں سمجھا نہیں! کیوں کیا ہے یہ سب اور شہلا سے کیا تعلق ان انتظامات کا۔"

"تم واقعی احمق ہو بیٹی! ان کا مقصد اور کیا ہو سکتا ہے کہ تم کبھی شہلا سے بات کرنا چاہو تو کر سکو۔ مجھ سے کہا تھا انھوں نے کہ کسی کا فون آئے تو شہلا سے کہنا کہ اطمینان سے بات کرے، اب کوئی نہیں سُنے گا۔ انھوں نے کسی کا نام تو نہیں لیا تھا مگر ظاہر ہے کسی سے مراد تم ہو یا محسن۔ وہ سمجھتے ہیں کہ محسن اب شہلا کا شوہر بھی ہے اور شہلا یہاں کتنی مجبور ہو کے آئی ہے۔ وہ اس کو زیادہ سخت قید تنہائی کی سزا سے بچانا چاہتے تھے اور اسی لیے انھوں نے گارڈ بھی ہٹا دی۔"

"یعنی... اس لیے کہ محسن گرفتاری کے لیے آنا چاہے تو آسکے نہیں آنٹی... میں نہیں مانتا۔" میں نے کہا۔

"تمھارا مطلب ہے یہ بھی ان کی چال ہے۔" آنٹی نے خفگی سے کہا: "تم اس پولیس افسر کو اتنی اچھی طرح نہیں جانتے جتنی اچھی طرح میں اپنے شوہر کو جانتی ہوں۔ محسن تین بار آ چکا ہے۔ بے شک وہ ان کی موجودگی میں اور ان کے سامنے نہیں آیا۔ اُسے آنا بھی نہیں چاہیے لیکن انھیں معلوم ہے۔"

"کیسے معلوم ہے؟" اطمینان کا احساس میرے وجود میں خوشی کی لہر بن گیا۔

"تم نے شہلا کو دیکھا ہوتا اس دن تو تم بھی بتا دیتے کہ محسن آیا تھا۔" انھوں نے قدرے شگفتہ لہجے میں کہا: "مگر تم مت آنا ابھی۔"

"کیتھرین اور جولیا کہاں ہیں؟" میں نے اپنی دلی مسرت کو دبا کے کہا: "مجھے بات کرنا تھی اُن سے۔"

"وہ گھر جانا چاہتی تھیں لیکن تمھارے انکل نے اجازت نہیں دی۔ ان کو وہی سونتت کوارٹر دے دیا ہے۔"

یکا یک یادوں کی ایک فلم میرے ذہن میں چلنے لگی جس کا پرنٹ ابھی تک نیا تھا۔

"تم نے میرے سوال کا جواب گول کر دیا۔ رابعہ کہاں ہے؟"

ان کی آواز نے مجھے تصورات کی دنیا سے واپس بُلا لیا: "یہی سوال اگر میں آپ سے کروں؟ آپ ہی کچھ بتائیے کہ وہ کہاں ہے؟"

"سکندر! خدا کے لیے ختم کرو اس خطرناک کھیل کو۔ واپس آجاؤ۔"

"یعنی پہلے خود کو پولیس کے حوالے کر دوں؟" میں نے کہا۔

"کچھ نہیں ہوگا تمھیں، تمھارے انکل سب ٹھیک کر لیں گے۔ وہ تیار ہیں اس پر کہ ایک بار تم قانون کے دائرے میں آ جاؤ تو وہ سب کچھ کر لیں گے، وہ بھی جو انھوں نے آج تک نہیں کیا۔ انھوں نے شہلا سے کہا تھا کہ میں ان پر آنچ نہیں آنے دوں گا۔ میں اپنے سارے وسائل، سارا اثر و رسوخ استعمال کروں گا۔ مجھے یقین ہے کہ میں ان کو بچا لوں گا۔ خواہ اس کے بعد میرے لیے ملازمت بچانا مشکل ہو جائے خواہ مجھے استعفا دینا پڑے۔"

"مجھے... بہت افسوس ہے آنٹی کہ اکیلا میں واپس نہیں آ سکتا۔ آئیں گے تو ہم سب آئیں گے۔" میں نے کہا۔

"تمھیں معلوم ہے نازو کی ماں کا کیا حال ہے؟" وہ بولیں۔

"نہیں... اور میں جاننا بھی نہیں چاہتا۔ اس سے تو اور میرا دکھ بڑھے گا۔"

"اپنے دکھ تو تم نے خود بڑھائے ہیں۔ اور بڑھاتے چلے جا رہے ہو۔ جیسے محسن کی ماں مر گئی، پھر باپ مر گیا اور وہ آخری وقت میں بھی ان سے دور رہا۔ ایسے ہی نازو کی ماں بھی مر جائے گی۔" آنٹی نے کہا۔

"میرا باپ بھی ایسے ہی مر گیا تھا آنٹی۔" میں نے انھیں یاد دلایا۔

"اگر یہ نوشتۂ تقدیر ہے..."

"تقدیر کو الزام مت دو... نازو تو خیر لڑکی تھی۔ اس نے ماں باپ کو رُسوا کیا۔ وہ تمھاری ایم آر ایس کی خیالی دنیا میں رہتی تھی لیکن ماں باپ اسی دنیا میں سب کو مُنہ دکھانے پر مجبور تھے۔ کب تک چھُپا سکتے تھے کہ جوان لڑکی گھر سے نکل گئی اور... دہشت پسندوں سے مل گئی۔ یہ میں نہیں کہہ رہی ہوں۔ یہاں ایسا ہی مشہور کیا گیا تھا۔"

"کس نے مشہور کیا تھا؟" میں نے برہمی سے کہا۔

"تم جانتے ہو پھر بھی مجھ سے پوچھتے ہو۔" آنٹی نے کہا: "باپ کی جان تو دنیا کے دُکھوں سے چھوٹ گئی۔"

"کیا؟" میں نے چلّا کے کہا: "کیا مطلب ہے آپ کا؟"

"تمھیں نہیں معلوم... نازو کے باپ کا ہارٹ فیل ہو گیا تھا۔" آنٹی نے کہا: "نازو نے نہیں بتایا تم کو؟ اُسے تو معلوم تھا۔"

"نہیں آنٹی!" میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا: "اس نے جانتے بوجھتے یہ بات ہم سب سے چھُپائی ہوگی۔"

"اب اس کی ماں اپنے بھائی کے گھر پڑی ہوئی ہے کیونکہ بیٹی تو بیٹی اب تو بیٹے کا بھی دماغ خراب ہو گیا ہے۔ نوکری چھوڑی، پھر گھر چھوڑ دیا اور بہن کے نقشِ قدم پر چل پڑا۔ اب بتاؤ کون کرے گا اس لڑکی سے شادی۔" انھوں نے بالکل زنانہ اندازِ فکر اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"غالب۔" میں نے سوچے سمجھے بغیر کہا: "غالب کرے گا اس سے شادی۔"

"ہونہہ... جیسے تم نے رابعہ سے کر لی۔" آنٹی نے طنزیہ تلخ لہجے میں کہا: "اور شہلا نے کی تو اُسے کیا ملا... پہلے بھی اکیلی تھی... اب بھی بے گھر ہے۔"

"کیا آپ کا گھر اس کا گھر نہیں ہے؟"

"فضول باتیں مت کرو، لڑکیوں کا گھر ان کے شوہر کا گھر ہوتا ہے۔" آنٹی نے کہا: "کتنا اچھا ہوتا اگر تم رابعہ سے شادی کر کے اپنا گھر بساتے۔ غالب بھی صحافی تھا اور اچھا لڑکا تھا۔ نازو کے والدین ہنسی خوشی اُسے قبول کرتے... تم سب کے گھر ہوتے... ملنا ملانا ہوتا... ہم بھی آتے۔"

"ہوگا آنٹی... سب ہوگا... ضرور ہوگا۔" میں نے انھیں تسلی دی: "اک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں۔"

"میں شعر و شاعری نہیں سمجھتی۔" انھوں نے چڑ کر کہا۔

"میرا مطلب تھا کہ... اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔ اور شادی کے سوا۔ پہلے ان سے نمٹ لیں... اس کے بعد کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد۔" میں نے مزید اشعار پڑھ کے انھیں چڑایا۔ "اب یہ بتائیں کہ صاحب بہادر کہاں ہیں آپ کے اور کب آئیں گے۔"

"وہ تو آگئے ہیں۔ کمرے میں جھانک کر چلے گئے تھے۔" انھوں نے اطمینان سے کہا۔

"یا میرے مولا۔" میں نے گھبرا کے کہا۔ "آنٹی! وہ سب سُن رہے ہوں گے۔ یہ آپ نے کیا غضب کیا، مجھے بھی نہیں بتایا۔"

"وہ کچھ نہیں سُن رہے ہیں، باتھ روم میں ہیں۔" انھوں نے کہا۔

"مجھے ان سے ہی بات کرنا تھی، آپ تو خواہ مخواہ بیچ میں ٹپک گئیں..."

"سکندر! میں اتنے جوتے ماروں گی..."

"کب ماریں گی۔" مجھے بے اختیار ہنسی آئی۔ "سچ بہت دن ہو گئے کسی کے پیار بھرے جوتے کھائے۔ قیمہ بھرے کریلے کھائے... آلو بھرے پراٹھے کھائے..."

"بک بک کرنے کی عادت نہیں گئی تمھاری... لو آگئے تمھارے انکل۔"

"آپ فون دیں انھیں۔" میں نے کہا۔

"ہاں بھئی سکندر..." انکل نے کہا۔

"کیا ہوا آپ کے مشن کا؟" میں نے کہا۔ "السلام علیکم۔"

"کون سا مشن؟" وہ بولے۔ "وعلیکم السلام۔"

"وہی آرڈیننس ڈپو کا۔" میں نے کہا۔ "جس کی میں نے اطلاع دی تھی۔"

"وہ... وہ میں نے آرمی انٹیلی جنس کے سپرد کر دیا تھا۔ ہمارے بس کی بات نہیں تھی۔" انھوں نے کہا۔

"آپ نے کیا کہا۔ کس کی اطلاع پر آپ کو معلوم ہوا تھا...؟"

"میں نے تحریری رپورٹ بعد میں بھیجی، ابھی آفس سے ہی اُٹھ کے آرہا ہوں۔ اس میں تمھاری ساری گفتگو لفظ بہ لفظ لکھ دی تھی۔" وہ بولے۔ "تاکہ میری ذمے داری پر کچھ نہ ہو۔ ٹیلی فون پر میری بات اسی وقت ہوگئی تھی۔ تم سے بات ہونے کے بعد... اور شام کو مجھے اُڑتی اُڑتی خبر ملی تھی کہ خاصا اسلحہ ملا ہے۔ پکڑے صرف چار آدمی گئے تھے لیکن یہ معلوم نہیں کہ وہ کون تھے۔"

"یہ بات آن ریکارڈ ہے کہ اُن کا پتا میں نے بتایا تھا۔"

"ظاہر ہے آن ریکارڈ ہی ہوگا۔" وہ بولے۔ "میری ساری رپورٹ میں تمھارا ہی حوالہ ہے... تمھارا کیا خیال تھا کہ کریڈٹ میں لوں گا۔"

"نہیں انکل! آپ ہی پر تو بھروسا تھا مجھے... تھینک یو۔" میں نے کہا۔ "ایک بات تو بتایئے انکل۔"

"پوچھو۔"

"ہم نے اسلحے کے جس ذخیرے کی نشاندہی کی، اس کا سراغ لگانے کے لیے ہمیں اپنی زندگی کو داؤ پر لگانا پڑا تھا۔ اس جگہ شکنجے تھے اور سرنگیں تھیں اور ایک شکنجے میں پھنس کر غالب کی ٹانگ بھی ٹوٹ گئی۔" میں نے کہا۔ "ہم نے اپنی قانونی ذمے داری تو پوری کی لیکن ہم نے ایک بہت بڑی قومی خدمت بھی کی۔ ہمارا یہ کارنامہ جنگ کے محاذ پر دشمن کی کسی چوکی پر قبضے یا کسی مورچے کی تباہی سے کم نہیں اور ہم نے فوج میں رہ کے میدانِ کارزار میں ہمت و شجاعت کا ایسا مظاہرہ کیا ہوتا تو ہمیں ستارۂ جرأت ضرور ملتا... اب ہمیں کیا ملے گا؟"

"تم کیا توقع رکھتے ہو؟" رضوی صاحب نے تلخی سے کہا۔ "میں تم کو بہادری کا میڈل دے دوں؟ میڈل کیا میں دیتا ہوں اور اس کے علاوہ بہادری کے کسی بھی کارنامے کے چشم دید گواہ ہوتے ہیں، وہ سب ایک قاعدے ضابطے کے مطابق ہوتا ہے۔ ستارۂ جرأت لینے والے قانون کی نظر میں مجرم نہیں ہوتے۔"

"کیا ایک مجرم... قاتل یا ڈاکو محبِّ وطن نہیں ہو سکتا؟" میں نے بھی تلخی سے کہا۔ "اس کا پیشہ غلط ہے یا اس کو حالات نے مجرم بنا دیا ہے۔ تو کیا وہ وطن کے لیے کچھ کرنے کے جذبے سے بھی محروم ہو گیا ہے؟ چشم دید گواہ نہ سہی کیا یہ غلط ہے کہ ہم نے اور صرف ہم نے اس ایمونیشن ڈپو کا پتا چلایا اور آپ کو مطلع کیا...؟"

"یہ ٹھیک ہے، اس کا اعتراف میں نے اپنی رپورٹ میں کر دیا ہے۔ سُنو، میرے خیال اور یقین کے مطابق سکندر بخت ولد وزیر خان مرحوم نام کے ایک شخص نے مجھے گمنام ٹیلی فون کیا اور یہ اطلاع دی، چونکہ میں مذکورہ شخص کی آواز پہچان سکتا ہوں اور یہ بھی سمجھتا ہوں کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا اس لیے میں فوری کارروائی کی سفارش کرتا ہوں۔ حال ہی میں ہونے والے چند دھماکوں سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ ملک دشمن عناصر تخریبی مقاصد کے لیے اسلحہ جمع کر رہے ہیں اور بیرونِ ملک سے بھی حاصل کر رہے ہیں۔ ملک کے مشرقی بازو میں جو کچھ ہو رہا ہے اس سے ثابت ہو چکا ہے کہ خفیہ ہاتھ اس ملک کے سیاسی حالات کو انتشار اور بدامنی پھیلانے اور علیحدگی پسند رجحانات کو ہوا دینے کے لیے استعمال کر رہے ہیں اور بعض غیر ملکی طاقتوں نے وطن دشمن عناصر کے گٹھ جوڑ سے تخریب کاروں کو اسلحے کی ترسیل کی ہے اگرچہ ابھی تک دشمن کے ہاتھوں میں کھیلنے والے اور مالی مفاد پر ملکی و قومی مفاد کو قربان کرنے والے چند افراد گرفتار کیے گئے ہیں لیکن اندیشہ ہے کہ ملک کی سالمیت کو نقصان پہنچانے والے ففتھ کالم نے دشمنوں کو اڈے اور پناہ گاہیں فراہم کر رکھی ہیں اور دفاعی نقطۂ نظر سے اس ففتھ کالم کو ختم کرنا اشد ضروری ہے۔ عوام میں شامل ان لوگوں کا پتا وہی دے سکتے ہیں جن کے درمیان یہ غدار موجود ہوں۔ دریں حالات ایک گمنام ٹیلی فون کال کو نظر انداز کر دینے سے نقصان کا احتمال ہے اور میں اپنی ذمے داری اور رسک پر فوری کارروائی کی پُرزور حمایت کرتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ سکندر بخت ولد وزیر خان مرحوم چند قانونی مقدمات میں مطلوب اور ایک مفرور مجرم ہے لیکن صرف اس بنا پر اس کی اطلاع پر کارروائی نہ کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے اور اگر اس کے باوجود یہ معاملہ قابلِ غور اور توجہ طلب نہیں سمجھا جاتا تو بعد میں ہونے والے نقصانات سے مجھے بری الذمہ سمجھا جائے گا اور سکندر بخت ولد وزیر خان مرحوم مجاز ہوگا کہ جانتے بوجھتے مجرمانہ غفلت اور نااہلی کے مرتکب افراد کے طرزِ عمل سے ہونے والے قومی نقصانات کے خلاف پریس اور پبلک میں آواز اُٹھا سکے یا ان پر بالواسطہ طور پر دشمنوں کی اور ان کے ایجنٹوں کی پشت پناہی کرنے کی فردِ جرم عائد کر سکے۔ سُنا تم نے؟ یہ میری رپورٹ کا ایک حصہ ہے، اس سے زیادہ میں کچھ نہیں لکھ سکتا تھا اور اگر میں یہ دھمکی نہ دیتا تو شاید تمھارا نام بھی کہیں نہ آتا... یا تو کچھ بھی نہ ہوتا کیونکہ گمنام کال پر ایکشن نہیں ہوتا۔ یا کریڈٹ دوسرے لے جاتے۔ وہ پہلے اپنے طور پر تصدیق کرتے اور پھر ایک رپورٹ داغ دیتے۔"

"تھینک یو انکل۔" میں نے شرمندہ ہو کے کہا۔ "آپ نے تو مجھے کریڈٹ دے دیا لیکن کیا اوپر والے بھی دیں گے؟"

"میں ان کے بارے میں کیا کہوں؟ اور کیسے کہوں؟" وہ بولے۔

"کیا... یہ بات اخبارات کو نہیں بتائی جا سکتی...؟"

"نو..." انھوں نے صاف کہا۔ "ابھی تو یہ ٹاپ سیکرٹ فیصلہ ہے لیکن عام معاملات میں بھی ہمیں پیشگی اجازت کے بغیر پریس کانفرنس بلانے کا مجاز نہیں۔ سرکاری ملازمین کسی صورت بھی پریس سے رابطہ قائم کریں تو یہ ان ڈسپلن میں شمار ہوتا ہے۔"

"ہمارے خلاف ہر بات تو اخبارات میں خوب بڑھا چڑھا کے پیش کیا گیا تھا..." میں نے کہا۔

"وہ سب میں نے نہیں کیا تھا۔" انھوں نے میری بات کاٹ دی۔ "تمھارے دشمنوں نے کیا تھا۔"

"آپ مانتے ہیں کہ میرے کچھ دشمن ہیں اور انھی کی وجہ سے میں ہر سازش کا شکار رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "وہی جو میرے دشمن ہیں، ملک کے بھی دشمن ہیں۔"

"سکندر! عقل سے کام لو، میرے ماننے یا نہ ماننے سے کوئی فرق نہیں پڑ سکتا کیونکہ میں کوئی سیاسی لیڈر یا کسی اخبار کا رپورٹر نہیں ہوں۔ ایک ذمے دار پوزیشن رکھنے والا سینئر پولیس آفیسر ہوں۔ میں اس لیے تمھارا ساتھ نہیں دے سکتا کہ تم میرے سب سے عزیز دوست وزیر خان کے بیٹے ہو اور اس یقین پر کچھ نہیں کر سکتا کہ تم مظلوم ہو۔ قانون کا معاملہ دوسرا ہے۔ میں قانون کے معاملے میں کیوں اور کیسے نہیں کر سکتا۔ مجھے احکامات کی تعمیل کرنا پڑتی ہے۔ میں تم کو سپورٹ نہیں کر سکتا۔ میری پوزیشن تو اس لیے اور بھی خراب ہے کہ تمھارے اور میرے ذاتی تعلق سے سب واقف ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ ابھی تک سب میری غیر جانبداری کو تسلیم کرتے ہیں لیکن مجھ سے حسد کرنے والے بھی ہیں اور میرے بدخواہ بھی۔ اگر کسی بھی وجہ سے میں نے ان کو موقع فراہم کر دیا تو وہ ضرور فائدہ اٹھائیں گے کہ ایس ایس پی رضوی اب غیر جانبدار نہیں رہا۔ اس نے مجرموں کو رعایت دی۔ مثلاً یہی دیکھو کہ شہلا کا میرے گھر میں موجود ہونا میرے خلاف جاتا ہے لیکن میں اس کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہوں مگر یہ میرے اختیار میں نہیں کہ تمھارے کارناموں کی تشہیر کروں۔ میں تو تمھاری حمایت میں بول بھی نہیں سکتا۔"

"آپ سچ بھی نہیں بول سکتے؟"

"سچ بولنا اچھی بات ہے مگر سچ کو تسلیم کون کرے گا؟" وہ بولے۔ "مثلاً یہی رپورٹ کا معاملہ لو، اس میں تمھارا نام ڈالنے سے پہلے میں نے ایک افسرِ اعلیٰ سے بات کی تو انھوں نے کہا کہ ایک مجرم کا نام لکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ لکھ دو کہ ہمارے مخبروں کی مصدقہ اطلاع ہے۔ میں نے صاف انکار کر دیا کہ میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔ انھوں نے کہا کہ سچ کا آپ کے پاس کیا ثبوت ہے؟ آپ کہتے ہیں کہ وہ سکندر بخت کی آواز تھی۔ ٹیلی فون پر آواز دھوکا بھی دے جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے کوئی سکندر بخت کی... آواز بنا کے دھوکا دے رہا ہو۔ یا اس کی آواز ملتی جلتی ہو۔ میں نے کہا کہ آپ کہیں تو میں حلف نامہ داخل کر دوں۔ اس پر وہ ذرا نرم پڑے کہ بھئی اتنا سیریس ہونے کی ضرورت نہیں۔ سکندر بخت کا نام ضرور لکھو مگر اس کو فائدہ کیا ہوگا۔ بہت سے ماتحت مستحق ہیں کہ انھیں ترقی ملے۔ یہ اُن کے لیے ایک اچھا موقع ہو سکتا ہے۔ میں نے کہا کہ جناب، میں اپنی رپورٹ دے دوں گا اور اس کے بعد جو آپ کا دل چاہے وہ کیجیے۔ آج میری رپورٹ پر سخت ناگوار ردِ عمل ہوا کہ یہ آپ نے کیا دھمکی دے دی ہے آخر میں۔ ابھی کچھ دیر پہلے تک یہی بحث چل رہی تھی۔ ڈی آئی جی صاحب نے کہا ہے کہ میں رپورٹ پر نظرِ ثانی کروں اور صبح پھر بات ہوگی۔ صاف بات یہ ہے کہ وہ میری اور تمھاری ٹیلی فون کی گفتگو کو سند ماننے کے لیے تیار نہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ ایمونیشن ڈپو کی اطلاع کا کریڈٹ ہماری اپنی کسی ایجنسی کو دیا جائے یا پھر آئی جی صاحب کے کسی منظورِ نظر کو۔"

"فرض کیجیے وہ اس بات پہ اڑ گئے...؟"

"تم ہی بتاؤ، تاکہ کسی ثبوت کی عدم موجودگی میں میرے پاس کیا دلیل ہے۔ میں کیسے ثابت کر سکتا ہوں کہ مجھے سکندر بخت نے اطلاع دی تھی۔ اگر کل یہ کہا گیا کہ رضوی اپنے بھتیجے کے جرائم کی شدت کم کرنے کے لیے ایک سازگار ماحول بنا رہا ہے۔ اسے رعایت دلوانے کے لیے بیک گراؤنڈ بنا رہا ہے تو میں کیسے تردید کروں گا... کیا اسٹینڈ لوں گا۔"

"گویا آپ نے ابھی رپورٹ دی نہیں ہے؟" میں نے کہا۔ "اور آپ کو ثبوت چاہیے... او کے انکل... رپورٹ کو صبح تک اپنے پاس رکھیے۔ صبح تک آپ کو دستاویزی ثبوت بھی مل جائے گا۔ آپ

کی پوزیشن خراب نہیں ہوگی۔ آپ میرے اگلے ٹیلی فون کا انتظار کریں۔"

"دیکھو کوئی حماقت مت کرنا۔ میری اس گفتگو کا حوالہ بھی مت دینا کسی کے سامنے۔" انھوں نے کہا۔

"میں بے وقوف ضرور ہوں انکل لیکن اتنا بھی نہیں۔ آپ کی نیک نامی اور پوزیشن دونوں پر میری وجہ سے کبھی حرف نہیں آئے گا۔" میں نے کہا۔ "یہ بتائیے ایس پی سراج کہاں ہے؟"

"اپنی ڈیوٹی پر۔" انکل رضوی نے کہا۔

"لیکن اُسے تو معطل کر دیا گیا تھا۔" میں نے کہا۔

"اس نے براہِ راست ڈی آئی جی صاحب کو رپورٹ دی کہ میں کچھ اسمگلروں کے نرغے میں تھا اور ان کا تعاقب کرتے ہوئے ٹریپ ہو گیا تھا۔" انکل رضوی نے کہا۔ "چنانچہ نہ کسی کو اطلاع دے سکا نہ واپس آسکا۔ ڈی آئی جی صاحب کے سامنے اس نے اپنی مہم جوئی کی کہانی بہت نمک مرچ لگا کے بیان کی ہوگی کہ وہ متاثر ہو گئے۔ اسی وقت معطلی کے احکامات واپس لے کر اسے ڈیوٹی پر جانے کے لیے کہہ دیا گیا۔"

"مجھے یہی امید تھی۔" میں نے مایوسی سے کہا۔ "اچھا انکل فی الحال تو خدا حافظ۔ میں پھر رابطہ قائم کروں گا۔"

"سکندر! مجھے امید تو نہیں کہ تم میرا مشورہ مانو گے۔" وہ بولے "مگر پھر بھی میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس چکر سے نکل جاؤ۔ تم دلدل میں اتر گئے ہو اور گہرے دھنستے جا رہے ہو۔ تم ان سب سے نہیں نمٹ سکتے جن کو تم شکاری کہتے ہو۔ تمھارے پاس ان سے مقابلے کے لیے بہت کم قوت ہے۔ ہاں تم اب تک حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں قانون کی مدد کر سکتے ہو۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ پہلے تم خود کو قانون کے حوالے کر دو۔ میں ہر طرح سے تمھاری مدد کروں گا اور مجھے یقین ہے کہ تم کو زیادہ سے زیادہ رعایت حاصل ہوگی۔ تمھارے خلاف کیس بہت کمزور ہیں لیکن تمھاری غیر حاضری نے ان کو سنگین بنا دیا ہے۔ تمھارے ساتھ رابعہ محسن اور ریڈی غالب اور دوسرے سب بھی شریکِ جرم بن گئے ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ تم اکیلے ہی معرکہ آرائی کرتے رہے تو مارے جاؤ گے۔"

"اکیلے؟ ہم اکیلے کہاں ہیں انکل۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "اتنے بہت سے نام لیے ہیں ابھی آپ نے۔ ان کے علاوہ کیا سارے محبِ وطن ہمارے ساتھ نہیں ہیں؟ آپ کی اور اَن گنت دوسرے لوگوں کی دعائیں ساتھ نہیں ہیں؟ خدا بھی تو معرکۂ حق و باطل میں ہمیشہ حق کے ساتھ ہے۔ مرنے سے کوئی بھی نہیں ڈرتا۔ آپ بالکل پریشان نہ ہوں ہمارے لیے۔"

میں نیچے اترا اور جیپ کو واپس چلا کے سڑک تک لاتے ہوئے میں نے غالب کو وہ سب بتا دیا جو انکل رضوی نے کہا تھا اور جو میں نے ان سے کہا تھا۔ وہ حیرانی اور دلچسپی سے سنتا رہا۔ میں نے ضرورت سے زیادہ طویل گفتگو کی تھی اور غالب سخت جھنجلایا ہوا تھا لیکن تفصیل سے میری بات سننے کے بعد وہ مطمئن اور خوش نظر آنے لگا۔

"چل یار! کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے۔" غالب بولا۔ "ایس ایس پی صاحب کی بدگمانی تو دُور ہوئی۔"

"بدگمانی الگ چیز ہے مرزا۔" میں نے کہا۔ "قانون شکنی الگ۔ یہ میں تم کو پہلے بھی بتا چکا ہوں۔ وہ بدگمان نہیں رہے تو اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ انھوں نے ہمارے جرائم معاف کر دیے۔ ان کی تو بس وہی ایک بات ہے کہ خود کو قانون کے حوالے کر دو پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"ان کا قانون سب ٹھیک کرنے والا ہوتا تو اب تک ٹھیک کر چکا ہوتا اور نوبت یہاں تک پہنچتی ہی کیوں۔" غالب بولا "مگر یار تو نے اتنی دیر میں بھی ادھوری بات کی۔ جو کہنا تھا وہ تو تُو نے کہا ہی نہیں۔"

"ان کی بات نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں اپنا پلان بدل دوں اور پلان بدلنے سے پہلے تم سے مشورہ ضروری تھا۔" میں نے کہا۔ "ہم اب سیدھے اپنے دوست کے گھر چل رہے ہیں۔"

"کس دوست کے گھر؟" غالب نے کہا۔

"عبدالودود منظر ایڈووکیٹ کے۔" میں نے کہا۔ "ہمیں کہیں مل کے بیٹھنا ہے اور بہت سے معاملات طے کرنا ہیں۔ مجھے وہی ایک جگہ محفوظ نظر آتی ہے۔"

دونوں ڈاکو ہوش میں تھے اور ہماری ساری گفتگو سُن رہے تھے لیکن مجھے ان کی پروا نہیں تھی۔ انکل رضوی کی باتوں نے مجھے ایک مختلف لائحہ عمل اختیار کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میرا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔ اس سے بھی زیادہ تیز رفتاری سے جیپ لاہور کے مضافات سے گزرتی جا رہی تھی۔ ایک بار پھر ہم جانی پہچانی سڑکوں پر تھے اور رات کا اندھیرا ہمیں بچا رہا تھا ورنہ اب تک پولیس کی جیپ کہیں نہ کہیں ہٹ لی گئی ہوتی۔ ہم کئی پولیس چوکیوں کے پاس سے گزرے۔ ہمیں راستے میں بہت سے پولیس والے چوک میں ڈیوٹی دیتے اور موٹر سائیکلوں پہ آتے جاتے ملے مگر کسی نے جیپ پر توجہ نہیں دی۔ ایسی درجنوں جیپوں کو وہ ہر وقت دیکھتے رہتے تھے اور ان کے لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ سب کے نمبر چیک کریں۔ اتنا مستعد اور حاضر دماغ بھی کوئی نہ تھا کہ جیپ کو دیکھتے ہی شناخت کر لیتا۔ جیپ ان کے پاس سے گولی کی طرح گزر جاتی تھی اور اس کی نمبر پلیٹ کم لائٹ میں پڑھی بھی نہیں جا سکتی تھی۔ عبدالودود منظر کے گھر سے ایک فرلانگ دُور میں نے جیپ روک لی اور غالب کو جیپ میں چھوڑ کر منظر کے گھر تک پیدل گیا۔

میں نے گھنٹی بجانے کے بجائے دروازے کو پیٹنا شروع کیا۔ منظر سخت مشتعل ہو کے باہر نکلا، وردی والے پولیس مین کو دیکھ کر وہ چراغ پا ہو گیا۔

"کیا بات ہے، دروازہ توڑنا ہے؟" وہ خونخوار لہجے میں بولا۔ "عقل نہیں دی خدا نے مگر تھانیدار بنا دیا۔ یہ گھنٹی سالی کس لیے لگائی گئی ہے یہاں؟"

"گھنٹی... کدھر ہے گھنٹی۔" میں نے آواز کو تھوڑا سا بدل کے کہا۔ "یہ تو ایک بٹن ہے۔"

"اُف... ارے یار تم کس چڑیا گھر سے آئے ہو۔ اسی بٹن کو دبانے سے اندر گھنٹی بجتی ہے۔" منظر نے چلّا کے کہا۔

"اچھا اچھا!" میں نے گھڑا سا سر ہلایا۔ "تو یہ بکھ کر لگا دو نا ادھر کہ اسے دبانے سے اندر گھنٹی بجے گی۔ ایسے کیا پتا چلتا ہے۔ بندہ بٹن دبائے اور لائٹ چلی جائے یا کرنٹ لگ جائے۔"

"اچھا دفع کرو گھنٹی کو بھی اور بٹن کو بھی... کام کیا ہے؟" منظر نے سر پکڑ کے کہا۔

"ہم... کام تو بعد میں بتاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "پہلے تم بتاؤ کہ تم نے کیا کہا تھا ابھی؟ میں کس چڑیا گھر سے آیا ہوں؟ تھانے کو چڑیا گھر کہتے ہو؟ ابھی گھر سے تھانے جا کے پتا چلے گا چڑیا کے بچّے۔"

منظر چونکا کیونکہ پولیس کا کوئی تھانیدار اس سے یوں بات کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ پھر میں نے اپنی آواز بھی رفتہ رفتہ بدل لی تھی اور آخری جملہ میری اصل آواز میں تھا۔

"ابے... ابے تو... بھوتنی کے۔" اس نے حسبِ عادت گلا پھاڑ کے کہا اور مجھ سے بھوت کی طرح چمٹ گیا۔ اس عرصے میں وہ کچھ اور پھیل گیا تھا۔ خصوصاً اس کا پیٹ۔ میں اس پیٹ کی وسعت میں تقریباً دھنس گیا اور بڑی مشکل سے اسے دھکیل کر اندر پہنچا۔

"ابے تو زندہ ہے... قسم اللہ کی میں تو سب کر چکا تھا۔ سوئم چہلم وغیرہ۔" اس نے مجھے کندھے پکڑ کے زور زور سے ہلانا شروع کیا۔ "اچھا ہوا کہ برسی سے پہلے تو لوٹ آیا۔ اکیلا ہے؟"

"نہیں یار۔" میں نے کہا۔ "اور بھی تین عدد ہیں۔"

"تین عدد... ہاہاہا۔" وہ پھر گلا پھاڑ کے ہنسا اور اس کی توند قہقہے سے متلاطم ہو گئی۔ "ابے کیا ڈگی پھینک دی میری گھر والی کی طرح؟ رابعہ سے شادی کب ہو گئی؟"

"یہ کیا بک بک لگا رکھی ہے۔" میں نے اس کے پیٹ میں مُکا ملایا۔ "ایک ٹوٹی ٹانگ والا غالب ہے میرے ساتھ اور دو ڈاکو ہیں جو آج ہی کوٹ لکھپت جیل سے فرار ہوئے تھے۔ انھیں پکڑ لیا ہم نے اور اِدھر لے آئے، تیرے گھر کی بھیڑ میں پتا نہیں چلے گا۔"

منظر کی ہنسی ایک دم بند ہو گئی۔ اس نے مجھے مشکوک نظروں سے دیکھا۔ "کیا کہا؟ دوبارہ کہنا؟ پتا نہیں میرے کان خراب ہیں یا تیرا دماغ آؤٹ ہے۔"

"دونوں ٹھیک ہیں۔" میں نے کہا۔ "ذرا اپنی گاڑی لے کر میرے ساتھ چل، ان تینوں کو یہاں لانا ہے۔ آج رات ہم یہاں رہیں گے۔"

"او یار سکندر... ایمان سے گھر والی مجھے طلاق دے دے گی... کھڑے کھڑے نکال دے گی۔" منظر نے واویلا کیا۔ "میں بارہ بچّوں کو لے کر کہاں جاؤں گا آدھی رات کے وقت۔ میرا تو میکہ بھی نہیں ہے۔"

میں اسے زبردستی گھسیٹ کر لے گیا۔ وہ اپنے کرتے پاجامے میں گاڑی لے کر گیا اور جیپ کے پاس پہنچ کے جب اس نے غالب کو، اس کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ کو اور اس سے منسلک شکنجے کو دیکھا تو اس کی عقل خبط ہو گئی۔ جب میں نے دونوں ڈاکو اس کی گاڑی میں ڈالے تو منظر کی حالت دیکھنے والی تھی لیکن وہاں شور مچانے کی گنجائش ہی نہ تھی۔

"اب آپ جائیں۔" میں نے کہا۔ "میں آتا ہوں۔"

"کہاں جاؤں... جہنم میں۔" منظر نے فریاد کرتے ہوئے کہا لیکن گاڑی لے کر چل پڑا۔ میں نے جیپ کو اچھی طرح صاف کیا۔ اس پر جہاں جہاں بھی ہمارے فنگر پرنٹ ہو سکتے تھے وہ جگہ میں نے کپڑے سے رگڑ رگڑ کر صاف کر دی۔ پھر جیپ کو چلا کے دو میل دُور لے گیا اور اُسے ایک خالی کوٹھی کے احاطے میں چھوڑ کے پھرتی سے باہر نکل آیا۔

کوٹھی کے باہر سے میں نے ٹیکسی پکڑی اور آدھے گھنٹے بعد پھر منظر کے دروازے پر دستک دی۔ اس بار وہ سمجھ گیا کہ گھنٹی نہ بجانے والا کون ہوگا۔

غالب نے اُسے مختصراً بتا دیا تھا کہ ہم کہاں سے آئے ہیں اور ہمارے دونوں قیدی کس طرح ہمارے ہاتھ لگے تھے۔ اس نے ایس ایس پی رضوی صاحب سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بھی بتا دیا تھا۔ چنانچہ منظر کچھ مطمئن تھا۔ اس نے غالب کو باہر ڈرائنگ روم سے ملحق اپنی اسٹڈی میں لٹا دیا تھا اور دونوں ڈاکوؤں کو بھی باندھ کر وہیں ڈال رکھا تھا، جب میں پہنچا تو وہ بدحواسی میں کمرے کے اندر چکر لگا رہا تھا۔

"یار یہ مصیبت یہاں کیوں لے آئے۔ خود کیا کم مصیبت ہو تم لوگ۔" وہ بولا۔ "کسی تھانے کے باہر پھینک آتے۔ کرنا کیا چاہتے ہو تم؟"

"پیارے دوست! ابھی سب پتا چل جائے گا کہ ہم کیا کرنے والے ہیں۔" میں نے کہا۔ "صبح ہونے سے پہلے ہی ڈاکو تو پولیس کی تحویل میں دے دیے جائیں گے لیکن یہ کام ایسے نہیں ہوگا۔"

"پھر کیسے ہوگا۔ کیا پولیس خود آئے گی یہاں؟" وہ بولا۔

"نہیں۔ ہم پولیس کو بلوائیں گے کسی اور جگہ۔" میں نے کہا۔ "پہلے تم ہمارا پروگرام سن لو، ہم پہلے تو یہ وردی اتاریں گے۔ اس کے نیچے ہمارے اپنے کپڑے ہیں، وہ بھی اتار دیں گے۔"

"وہ بھی اتار دو گے؟" ارے یار کچھ خیال کرو۔ میرا نہ سہی میری بیوی کا... کہیں وہ اِدھر آگئی۔ یا میرے کسی بچے... بچوں میں سے کوئی آگیا تو..." وہ بولا۔ "بات تو کپڑے اتارے بغیر بھی کی جاسکتی ہے۔"

"اس کے بعد تم ہمیں کپڑے فراہم کرو گے۔" میں نے کہا۔ "ہمارے لیے کھانے پینے کا بندوبست کرو گے۔ چائے ہم نہیں پئیں گے۔ ہمیں کافی چاہیے اور غالب کو ایک ڈاکٹر۔"

"ڈاکٹر تو آجائے گا لیکن اس شکنجے کا کیا ہوگا؟ وہ پوچھے گا کہ یہ پازیب کیوں پہن رکھی ہے۔" منظر بولا۔

"اپنے کسی یار دوست کو بلاؤ تاکہ وہ سوال نہ کرے اور کرے تو پھر تمھارے جواب پر اعتراض نہ کرے۔" میں نے کہا۔

"بڑی مصیبت ہے۔ کبھی تو خیریت کا پیغام لے کر آیا کرو یار۔ یہ کیسی دوستی ہے کہ جب آتے ہو نئی آزمائش میں ڈال دیتے ہو۔" وہ بولا۔ "آخر شرفا کی طرح کیوں نہیں آسکتے تم لوگ؟"

"اس لیے کہ ہم شرفا نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہمارے پاس وقت کم ہے اور کام زیادہ۔ ہم زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے ٹھہر سکتے ہیں، اس لیے بک بک مت کرو۔"

"اچھا، میں ابھی کہتا ہوں اپنی گھر والی کو؟" وہ بے بسی سے بولا اور اندر چلا گیا۔ منظر کی عادت مذاق میں ہر بات کو بڑھا کے کہنے کی تھی ورنہ اس کی بیوی بہت سعادت مند اور بالکل اللہ میاں کی گائے تھی۔ اپنے کام سے کام رکھنے والی اور اس کا ایک کام تو یہی تھا کہ وہ منظر کو زیادہ سے زیادہ صاحب اولاد کرے۔ وہ منظر کے معاملات میں بالکل دخل نہیں دیتی تھی اور اس سے قطعی سروکار نہیں رکھتی تھی کہ باہر وہ کیا کرتا ہے اور کس سے ملتا ہے۔ وہ جانتی تھی کہ شوہر کے سارے کلائنٹ ہم جیسے ہی ہوتے ہیں۔

"مرزا جی!" میں نے منظر کے جانے کے بعد کہا۔ "اس وقت نو بجنے والے ہیں۔ تمھارے اخبارات کی پوزیشن کیا ہوگی اس وقت۔"

"کیا مطلب... اشاعت کے اعتبار سے؟"

"مطلب یہ کہ ہم ایک پریس کانفرنس بلانا چاہیں..... ٹاپ سیکرٹ قسم کی اور ایک دھماکا کرنے والی اسٹوری دیں۔" میں نے کہا۔

"تو اس کا بندوبست کیسے ہوسکتا ہے؟"

"وقت کم ہے۔" غالب نے سوچ کے کہا۔ "کیا یہ اسلحے کے ذخیرے سے متعلق خبر دینا ہے؟"

"ہاں۔ اس کے سوا اب چارہ نہیں۔" میں نے کہا۔ "تو اخبار والوں کو جانتا ہے، ان میں سے قابلِ اعتماد کون ہے؟ زیادہ نہیں، دو چار بڑے بڑے اخباروں کے خاص نمائندے بلالے۔ ہم اُن کو تفصیلات دیں گے۔ اپنی تصاویر فراہم کریں گے اور میں ایک تحریری بیان دوں گا۔ تو اپنی ٹوٹی ہوئی ٹانگ اور شکنجے کے ساتھ بطور گواہ پیش ہوگا۔ وہ اپنے ساتھ فوٹو گرافر لائیں تاکہ ہم صحیح دھماکا کر سکیں۔"

"آئیڈیا تو اچھا ہے۔" غالب نے کہا۔ "مگر خطرناک بھی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کوئی پولیس لے آئے یا اپنے چوہدری صاحب کو۔"

"رپورٹر چار نہ ہوں، دو ہوں مگر بھروسے کے ہوں۔ جہاں بلائیں، وہاں پہنچ جائیں۔" میں نے کہا۔ "پریس کانفرنس میں ایس پی صاحب بھی ہوں گے۔"

"انکل رضوی؟" غالب نے کہا۔ "نہیں یار، ان کی پوزیشن خراب ہوجائے گی۔ سمجھا یہ جائے گا کہ انھوں نے شہرت کے لیے یہ سب ڈراما کیا ہے۔"

"ہم انھیں ہائی جیک کرلیں گے۔" میں نے کہا۔

غالب نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ بھی ڈراما سمجھا جائے گا بلکہ کہیں گے کہ انھوں نے اپنی رپورٹ کو مستند بنانے کے لیے سکندر کے ساتھ مل کر سارا ناٹک کیا۔"

"چل، وہ نہ سہی لیکن پولیس کا ایک افسر موجود ہوگا۔" میں نے کہا۔ "اسے میں لاؤں گا۔ تو اپنے رپورٹر دوستوں کو بلا لے۔ یہ خبر بہت بے حد ضروری ہے۔ ورنہ کل تک اسلحے کے ڈپو پر چھاپا مارنے والے سارا کریڈٹ خود لے لیں گے۔ ہمارا نام تک نہیں آئے گا کہیں۔"

"اور ان ڈاکوؤں کا معاملہ...؟"

"وہ اتنا ارجنٹ نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "اسے کل پر اٹھا رکھتے ہیں۔ کل دوسری پریس کانفرنس میں ان کو پولیس کے حوالے کیا جائے گا۔ پہلے ایک کام سے تو نمٹ لیں جو زیادہ ضروری ہے۔"

فون اس میز پر رکھا ہوا تھا جس پر منظر کسی کیس کی فائلیں کھولے بیٹھا ہوا تھا۔ پھر ہم نے اس کو ڈسٹرب کردیا تھا اور وہ سب کچھ میز پر پھیلا ہوا چھوڑ کر اٹھ گیا تھا۔ قانون کی موٹی موٹی کتابیں ایک طرف ڈھیر تھیں اور ٹیبل لیمپ دوسری طرف رکھا ہوا تھا۔ ٹیلی فون کے ساتھ بہت لمبا تار تھا چنانچہ میں نے اُسے اٹھایا اور غالب کی گود میں رکھ دیا۔ غالب کی ٹانگ اب سوج رہی تھی لیکن اسپرین کے اثر سے اس کے درد کی شدت کچھ کم ہوگئی تھی۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، اسپرین بھی غیر مؤثر ہونے لگی تھی اور اب غالب کو باقاعدہ علاج، پلاسٹر اور دافع درد انجکشن کی ضرورت تھی لیکن ایک مجبوری کے تحت ہم صورتِ حالات کو جوں کا توں رکھنے پر مجبور تھے۔

غالب نے ایک نمبر ملایا۔ اس کے اپنے اخبار کے کرائم رپورٹر سے غالب کی خاصی بے تکلفی تھی۔ جب غالب نے بتایا کہ وہ کون بول رہا ہے تو شاید اس نے چلّانا شروع کیا۔ غالب نے اسے ڈانٹا۔

"شور مت کرو نورِ چشم! گالیاں پھر کبھی دے لینا۔ ابھی جو کہہ رہا ہوں، وہ غور سے سُنو۔" غالب نے کہا۔ "اخبار کے لیے ایک بہت بڑی اور بہت سنسنی خیز خبر ہے۔ تم کسی فوٹو گرافر کو ساتھ لے کر اسی وقت اخبار میں جگہ روک لو۔ نہیں یار... رک سکتی ہے جگہ۔ ہو اسی وقت اخبار میں جگہ روک لو، یہ ڈائنا مائیٹ ہوگا۔ یار، میں کوئی گھسیارا تھیں فراہم خبریں نکال دو۔ جب میں کہہ رہا ہوں کہ خبر ڈائنا مائیٹ ہے تو ہے۔ تم کو ملنا ہوں۔ نہیں، ایڈیٹر سے کوئی بات مت کرو۔ پہلے تم آجاؤ یہاں۔ لینا چاہیے۔"

"اس سے کہو قذافی اسٹیڈیم۔" میں نے کہا۔ "گیٹ نمبر ون۔"

"قذافی اسٹیڈیم آجاؤ۔" غالب نے ریسیور میں کہہ دیا۔ "دور ہے...؟"

"اچھا... ایبلی ہال کے پیچھے۔" میں نے کہا۔ "رائٹرز گلڈ۔"

"رائٹرز گلڈ کی عمارت کے احاطے میں تو آسکتے ہو؟" غالب بولا۔ "اس سے قریب کون سی جگہ ہوگی... اور دیکھو... اپنے ساتھ کسی دوسرے اخبار والے کو بھی لاسکتے ہو۔ کسی دوسرے کرائم رپورٹر کو۔ نہیں یار، یہ تمھاری ہی اسٹوری ہوگی۔ شیئر کرلینا... نہیں؟... اچھا چھوڑو، تم آجاؤ... ابھی نہیں، بس کوئی ایک گھنٹے میں... اچھا آدھے گھنٹے میں۔" اس نے فون بند کردیا۔

"مجھے معلوم تھا کہ ایک رپورٹر کبھی دوسرے کو ساتھ نہیں لائے گا۔ سب کسی بڑی اسٹوری کا کریڈٹ خود لینا چاہتے ہیں۔" غالب نے دوسرا نمبر ملایا اور پھر وہی بات کی۔ چند منٹ کی بحث کے بعد وہ دوسرے کرائم رپورٹر کو بھی قائل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ تین جگہ بات کرکے اس نے فون رکھ دیا۔

منظر ہمارے لیے کھانے پینے کا سامان لے آیا تھا۔ اس نے بھی غالب کی ساری گفتگو سن لی تھی۔ "یہ تو کوئی لمبا ڈراما ہے۔" وہ بولا۔

"ڈاکٹر کا کیا بنا، منگوایا کہ نہیں۔" میں نے کھانے پر حملہ کرتے ہوئے کہا۔ غالب مجھ سے پہلے کھانا شروع کرچکا تھا۔ کھانے سے زیادہ اس وقت کافی کی طلب تھی جو ہم نے مدت سے نہیں پی تھی۔

"ڈاکٹر آتا ہوگا۔" منظر بولا۔ "مگر ایک ڈاکٹر سے کیا بنے گا۔ یہ تو اچھا خاصا ہڈیوں کا وارڈ بنے گا۔ تین مریض ٹوٹے پڑے ہیں۔"

"تم نے کسی کو فون تو کیا نہیں؟" میں نے کہا۔

"وائرلیس پر بات کی تھی۔" منظر بولا۔ "وہ دراصل میرے پڑوس میں جو نئے لوگ آئے ہیں نا... اُن میں ایک لڑکا ڈاکٹر ہے۔ اسے میں نے چھت پر سے آواز دی تھی۔ ابھی ابھی اسپتال سے پہنچا تھا۔"

"نئے لوگ ہیں۔" میں نے غور کرتے ہوئے کہا۔ "اسے اندر مت کرا دینا۔"

"کھلاؤں گا... مگر بعد میں اور تو دکھاؤں گا۔" منظر نے کہا۔ "یہ بالعموم وقت بے وقت نازل ہونے کا چکر بنا ہے۔ پھر میں خود ملنے آجایا کروں گا تم لوگوں سے جیل میں۔"

گھنٹی بجی اور منظر چند منٹ میں ایک ہم جیسے نوجوان کو لے کر آگیا۔ میڈیکل بیگ اس کے ہاتھ میں تھا۔ اندر آتے ہی وہ ٹھٹکا۔

"آؤ... آؤ... ڈرو نہیں... یہی ہیں میرے مہمان بلائے جان۔" منظر نے کہا۔ "تقریباً میرے ساتھ پیدا ہوئے تھے۔ اسکول کالج میں میرے پیچھے لگے رہے ایک کلاس پیچھے۔ کبھی میں تو کبھی یہ۔ یہ ہیں سکندر بخت عرف سکندرِ اعظم ثانی۔ بلکہ لاثانی۔"

اس نے اصل نام بتایا تو میرا دل ڈوبنے لگا۔ اس تعارف کی کوئی ضرورت نہیں تھی اور اگر تھی تو وہ ہمارے کچھ بھی نام بتا سکتا تھا۔ میں نے زبردستی مسکراتے ہوئے اس سے مصافحہ کیا۔

"یہ ڈاکٹر شہریار ہیں... لندن پلٹ... ایک خصوصیت تو تم دونوں میں مشترک ہے۔" منظر نے کہا۔ ڈاکٹر نے ہنستے ہوئے ہاتھ ملایا۔

"یہ ہیں مرزا غالب، ثانی بلکہ لاثانی۔ یہاں جو بھی ہے ثانی ہونے کے باوجود لاثانی ہے۔" منظر بولا۔ "اصل ان کے آگے ماند ہے۔ یہ اپنے کارناموں کے آگے سکندرِ اعظم کی فتوحات کو خاطر میں نہیں لاتے۔ یہ دوسرے اسداللہ خان غالب کو اپنا چربہ قرار دیتے ہیں۔"

غالب نے میری طرف معنی خیز سوالیہ نظروں سے دیکھا اور ڈاکٹر سے ہاتھ ملایا۔ "آپ دونوں سے مل کر خوشی ہوئی۔" ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے بیٹھ کر کہا۔ "آپ نے تو یہ کہا تھا منظر بھائی کہ کچھ ٹر قسم مہمان ٹوٹ پھوٹ گئے ہیں۔"

"ہاں... دو وہ اُدھر پڑے ہیں۔" منظر نے کہا اور تب ڈاکٹر نے دوسری جانب بے لیٹے ہوئے دونوں کو دیکھا۔ "یہ دونوں ڈاکو ہیں۔ کوٹ لکھپت جیل سے فرار ہوئے تھے کہ ہمارے ان دوستوں نے گھیر لیا اور یہاں لے آئے۔ بس ثابت نہ لا سکے۔"

میری سمجھ میں نہ آیا کہ منظر ایسا کیوں کر رہا تھا۔ وہ ڈاکٹر کو سب سچ بتاتا جا رہا تھا۔ ڈاکٹر ہم جیسا تندرست و توانا شخص تھا، دلکش اور وجیہہ شخصیت کا مالک، وہ خوش لباس و خوش اخلاق تھا مگر ہم اُسے نہیں جانتے تھے اور منظر نے بھی صرف اتنا ہی کہا تھا کہ وہ نئے پڑوسی ہیں۔ اس پر منظر کا یہ اعتماد ہمارے نقطۂ نظر سے خطرناک ہوسکتا تھا۔ وکیلوں کی طرح ڈاکٹر بھی اپنے پیشے کی اخلاقیات پر عموماً سختی سے کاربند رہتے ہیں اور کوئی غیر قانونی کام کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔

"یہ... کیسے ہوا... میرا مطلب ہے کیا آپ تمسکاری ہیں؟" ڈاکٹر نے غالب کے شکنجے کو چھو کر دیکھا۔

"جی... یہی سمجھ لیں۔" غالب بولا۔ "اتفاق سے وہاں چلے گئے تھے جہاں ہم سے بڑے تمسکاری موجود تھے۔"

"یہ فرسٹ ایڈ کس نے فراہم کی ہے؟" وہ بولا۔

"میں نے... اس کے علاوہ میں اسپرین دیتا رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اور چار چار گھنٹے سے یہ اینٹی بایوٹک۔" میں نے باقی ماندہ گولیاں اس کے ہاتھ پر رکھ دیں۔

"میں سمجھتا ہوں کہ آپ نے میرا کام آدھا کر دیا۔" شہریار نے کہا "اب مجھے صرف ہڈی جوڑنا ہے یہ لکڑیاں نہ باندھی گئی ہوتیں تو زیادہ گڑ بڑ سے جوڑ خراب ہو جاتا اور... تکلیف بھی بہت زیادہ ہوتی۔ بیہوش ہونے کا بھی ڈر نہیں رہا۔ لیکن... منظر بھائی! جب تک یہ شکنجہ نہیں ہٹے گا۔ میں پلاسٹر کیسے...؟"

"ابھی آپ میری ٹانگ کو اسی طرح رہنے دیں۔" غالب نے کہا۔ "اگر درد کم کرنے کے لیے کوئی زیادہ مؤثر دوا دے سکتے ہوں تو دے دیں..."

ڈاکٹر نے سوالیہ نظروں سے غالب کو دیکھا۔ "ایسا اچھا لگت ہے آپ کو؟"

غالب مسکرایا۔ "مجھے اپنی یہ ٹوٹی ہوئی ٹانگ کہیں پیش کرنا ہے' اس شکنجے سمیت۔ دو تین گھنٹے کے بعد میں آپ کو زحمت دوں گا' فی الحال آپ ان دونوں کو دیکھ لیں۔"

"ان کو کیا ہوا ہے؟" شہریار نے آگے بڑھ کے کہا۔

"ایک کا دایاں بازو اور بائیں کلائی ٹوٹی ہے۔" میں نے کہا "دوسرے کی غالباً دو پسلیاں۔ ان پر اگر پلاسٹر چڑھانا ممکن ہو تو یہ کام کر لیں اور ہاں... انھیں کسی قسم کی دوا وغیرہ بھی نہیں دی گئی ہے۔"

"یہ تو بے ہوش ہیں۔ غالباً سخت تکلیف ہوگی ان کو۔" وہ بولا۔

"آپ اب جیسا مناسب سمجھیں کریں۔" میں نے کہا۔ "ہم ان کو کل پولیس کے حوالے کریں گے۔ کل تک ان کو زندہ رکھیں۔"

"یہ زندہ رہیں گے۔" شہریار نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کے ان کے ہاتھ پیر کھولتے ہوئے کہا۔ "یہ وہی دونوں ہیں نا' پاٹے خاں لالو گورا ڈاکو؟"

"جی' لیکن آپ کسی سے تذکرہ نہیں کریں گے...!"

"منظر بھائی نے مجھے بتا دیا ہے کہ میں جو کچھ دیکھوں گا یا سنوں گا اسے اپنی ذات تک محدود رکھوں گا۔" شہریار مسکرایا۔ "آپ لوگ بالکل مطمئن رہیں۔ اگر میں اعتماد کے قابل نہ ہوتا تو منظر بھائی مجھے نہ بلاتے اور میں خود بھی نہ آتا۔ کہہ دیتا کہ یہ میڈیکو لیگل کیس ہیں۔ سیدھا اسپتال لے جاؤ۔" وہ جھک کر ڈاکوؤں کے ہاتھوں پیروں کو احتیاط سے ہلا کے دیکھنے لگا۔

"ویسے تو ایکسرے کے بغیر مجھے پلاسٹر نہیں چڑھانا چاہیے اور بعد میں بھی ایکسرے لینا چاہیے۔" وہ بولا۔ "لیکن یہ سمپل فریکچر ہیں۔ امید ہے جوڑ ٹھیک بیٹھ جائے گا۔ پہلے میں ان کو مارفین دے دیتا ہوں۔"

"آپ ان کو کل تک سیڈیشن میں رکھیں۔" میں نے کہا۔ "تاکہ یہ شور نہ مچائیں اور آؤٹ آف کنٹرول نہ ہوں۔"

"کل تک تو لازماً انھیں بے ہوش رکھنا ہوگا۔" وہ بولا۔ "اچھا پہلے میں آپ کو ایک انجکشن لگا دوں۔ اس سے درد کا احساس مٹ جائے گا۔ کم سے کم چھ گھنٹے کے لیے... مگر اس کے بعد..."

"چھ گھنٹے بعد میں خود کو آپ کے حوالے کر دوں گا۔" غالب نے کہا۔

میں نے منظر کو اشارہ کیا۔ "مجھے تیری گاڑی کی چابی چاہیے۔" میں نے منظر کے ڈرائنگ روم میں آنے کے بعد کہا۔ "اور چند کیلیں... ایک لمبی ہوں کم سے کم۔"

"گاڑی تو خیر لے جاؤ... مگر نورِ چشم' یہ کیلوں کا کیا چکر ہے؟ اپنے ساتھ مجھے بھی اندر مت کرا دینا۔ پھر ابھی تو ہونا چاہیے..."

ایک بار پھر میں نے غالب کو شکنجے سمیت اٹھایا اور منظر کی گاڑی میں منتقل کیا۔ کار کو وہاں تک لے گیا جہاں خالی کوٹھی کے ویران احاطے میں جیپ ابھی تک موجود تھی۔ غالب کو جیپ میں منتقل کرنے کے بعد کار کو سڑک کے کنارے ہی چھوڑا اور جیپ دوڑاتا ہوا اس سڑک تک لے گیا جو نہر کے کنارے کے ساتھ ساتھ چلی گئی تھی۔ بانسوں والی سڑک کے موڑ پر میں نے جیپ کو انکل رضوی کی کوٹھی سے کچھ دور روکا۔ نیچے اتر کے میں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ مجھے وہ کھمبا نظر آگیا جس میں سے ایک تار انکل رضوی کی کوٹھی تک جا رہا تھا۔ سڑک ویران تھی اور ٹیلی فون کا کھمبا ایک گھنے درخت کے پیچھے آگیا تھا چنانچہ میں کسی حد تک محفوظ تھا۔ مجھے صرف ایک طرف سے آنے والے ٹریفک کی روشنی میں دیکھا جا سکتا تھا لیکن یہ وقت ٹریفک کے دوسری طرف سے آنے کا تھا اور ویسے بھی اس سڑک پر سے گزرنے والی اکا دکا گاڑی کے کس ڈرائیور کو اتنی فرصت تھی کہ وہ کسی کو ٹیلی فون کے کھمبے پر چڑھا دیکھے تو گاڑی روک کر وجہ پوچھے۔ عموماً ڈرائیور کی نظر اپنے سامنے سڑک پر ہیڈ لائٹس کی روشنی تک محدود رہتی ہے۔ جہاں جیپ کھڑی ہوئی تھی وہاں سے انکل رضوی کی کوٹھی کا گیٹ چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ کسی آتے جاتے سے ہمیں کوئی ڈر نہیں تھا کہ وہ پولیس کی جیپ کو کھڑا دیکھ کر رکے لیکن اتفاق سے کوئی پولیس مین بھی گزرتا تو یہی سمجھتا کہ ایس پی صاحب کی اپنی جیپ ہے۔ خطرہ صرف اس صورت میں تھا کہ خود انکل کہیں باہر سے آئیں یا باہر جانے کے لیے نکلیں تو گاڑی کو دیکھ لیں لیکن یہ خطرہ مول لیے بنا چارہ نہ تھا۔ میں نے غالب کو حوصلے سے کام لینے کی تلقین کی اور ٹیلی فون کے کھمبے پر چڑھ گیا۔ اوپر پہنچ کے مجھے اندازہ ہوا کہ میرا کھمبے پر رہنا ضروری نہیں۔ تار درخت کے تنوں میں سے گزر رہے تھے چنانچہ میں نے ایک شاخ پر بسیرا کیا اور اللہ سے کنکشن ملایا۔ ریسیور انکل کے کسی ملازم نے اٹھایا اور کچھ دیر بعد انکل کی آواز آئی۔ "رضوی..."

"انکل' میں نے کہا تھا نا کہ میں پھر رابطہ قائم کروں گا۔" میں نے کہا۔ "کیا آپ اسی وقت قذافی اسٹیڈیم آ سکتے ہیں؟"

"قذافی اسٹیڈیم...؟ وہاں کیا ہے؟" وہ حیران ہو کے بولے۔

"آپ اکیلے آئیں گے۔" میں نے کہا۔ "میرا دماغ خراب نہیں ہے۔" انھوں نے خفگی سے کہا۔

"میں خود کو آپ کے حوالے کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ "میں نے بہت سوچ سمجھ کے یہ فیصلہ کیا ہے۔ میں نے چند اخباری نمائندوں کو بھی بلایا ہے' آپ سمجھ لیں کہ یہ ایک نجی پریس کانفرنس ہوگی۔ میں اپنا بیان دوں گا۔ ظاہر ہے جو کچھ میں کہوں گا اس کی ذمے داری آپ پر نہیں۔ میں ایک تحریری بیان بھی پریس کے حوالے کروں گا جس میں اس ایمونیشن ڈپو کے بارے میں وہ سب ہوگا جو میں جانتا ہوں یا غالب جانتا ہے۔ اور بہت سی باتیں ایسی ہیں جو آپ بھی نہیں جانتے۔ میرا تحریری بیان میری اور غالب کی تصویر کے ساتھ صبح کے اخبارات میں شائع ہوگا۔ اس کا سو فیصد کریڈٹ ہم کو ملے گا اور میری گرفتاری کا سو فیصد کریڈٹ آپ کو۔"

"مجھے نہیں معلوم کہ تم ایسا کیوں کر رہے ہو۔" انکل رضوی نے کہا۔ "میرا مطلب ہے' یہ پریس کانفرنس وغیرہ..."

"جو کام آپ نہیں کر سکتے تھے' وہ ہم آپ کی طرف سے کر رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور جو کوئی بھی نہیں کر سکتا تھا وہ آپ کریں گے... اگر آپ کو مجھ پر اعتماد ہے تو آپ اکیلے آئیں گے۔"

"آل رائٹ... میں آؤں گا۔" انھوں نے کہا۔ "مگر قذافی اسٹیڈیم بہت بڑا ہے... تم کہاں ملو گے؟"

"گیٹ نمبر ون پر۔" میں نے کہا اور لائن کاٹ دی۔

حسبِ توقع انکل رضوی نے فوراً کوئی نمبر ملانا شروع کیا۔ نمبر پولیس اسٹیشن کا تھا اور دوسری طرف سے ایس ایچ او نے بات کی۔

"ایس ایس پی صاحب' حکم جناب عالی۔" میں نے ایس ایچ او کی آواز سنی۔

"دیکھو بھئی... ایک گرفتاری کرنا ہے۔" انکل رضوی نے کہا۔ "ایک مجرم ہے سکندر بخت ولد وزیر خان مرحوم۔"

"یس سر جی... میں جانتا ہوں۔"

"اس نے مجھے فون کیا تھا کہ وہ خود کو قانون کے حوالے کرنا چاہتا ہے۔" انکل رضوی نے کہا۔ "تمھارے پاس کتنی نفری ہے اس وقت؟"

"جی سر جی... آپ حکم کریں... سب ملا کے تین افسر ہیں... اور پانچ بندے..." ایس ایچ او بولا۔

"اچھا تو ایسا کرو کہ تم ایک افسر کو تھانے میں چھوڑ دو... اور اس کے ساتھ دو ماتحت رہنے دو۔" انکل نے کہا۔ "تم باقی لوگوں کے ساتھ فوراً قذافی اسٹیڈیم پہنچو... گیٹ نمبر ایک پر پوزیشن لو لیکن ذرا چھپ کے اور میرا انتظار کرو۔ میں بھی پہنچتا ہوں۔ سب کے پاس اسلحہ ہونا چاہیے۔"

"کیا میں آپ کو لینے آ جاؤں سر؟" ایس ایچ او نے کہا۔

"اس کی کوئی ضرورت نہیں... تم ڈائریکٹ پہنچو۔" انکل رضوی نے کہا۔ "اور دیکھو کسی کو معلوم نہ ہو کہ تم کس کام سے جا رہے ہو۔"

"آپ بالکل فکر ہی نہ کریں سر۔" ایس ایچ او نے کہا اور لائن کٹ گئی۔

مجھے انکل رضوی کی وعدہ خلافی پر افسوس ہوا۔ غالباً ان کے حوصلہ افزا رویے نے مجھے ان سے غلط امیدیں وابستہ کرنے پر مجبور کیا تھا ورنہ وہ ایس ایس پی پہلے تھے اور کسی کے انکل بعد میں... خصوصاً ایک مجرم کے... میرے اندازے کے مطابق انکل رضوی تیار ہو کے پانچ منٹ میں بھی باہر آ سکتے تھے۔ چنانچہ میں نے ایک منٹ کے وقفے سے پھر ان کا نمبر ملایا۔ حسنِ اتفاق سے ریسیور خود شہلا نے اٹھایا۔ میری آواز پہچانتے ہی وہ نروس ہو گئی۔

"آپ نے انکل سے بات کی تھی؟" وہ بولی۔

"ہاں' ایک بار نہیں' دو بار۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس وقت تم کو ایک ضروری پیغام دینا تھا۔ کیا محسن تم سے ملنے آئے گا؟"

"معلوم نہیں۔"

"تم کو معلوم ہے کہ وہ آئے گا۔" میں نے اسے ڈانٹا۔ "جب وہ آئے تو اسے بتا دینا کہ ہم منظر کے گھر میں ہیں... خدا حافظ۔"

نیچے اترتے ہی میں نے اطمینان کا سانس لیا اور جیپ کو بالکل گیٹ تک لے گیا۔ رضوی صاحب نے واقعی دروازے پر سے گارڈ ہٹا دی تھی اور اندر ان کی جیپ کے پاس بھی کوئی نہیں تھا۔ ڈرائیو وے کے پیچھے مجھے سرونٹ کوارٹر کی روشنی نظر آ رہی تھی۔ میں نے کیتھرین اور جولی کا تصور کیا اور سوچا کہ آخر وہ یہاں کیوں رکی ہوئی ہیں؟ ان کا اپنا گھر ہے لیکن وہاں جانا خطرے سے خالی نہیں۔ یہاں بھی پولیس ان کی کب تک حفاظت کر سکتی ہے اور حفاظت سے پہلے پولیس نے کیتھرین سے تفتیش کی ہوگی۔ پوچھا ہوگا کہ وہ کہاں تھی اور کس کے ساتھ تھی؟ اس نے کچھ تو بتایا ہی ہوگا۔ غالباً انکل رضوی نے اسے مزید تفتیش کے لیے روک رکھا ہے۔

میں دیوار کے سائے میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا گیٹ تک گیا پھر میں نے جیب سے ماچس نکالی اور اس میں ایک کیل یوں گھونپ دی کہ وہ دوسری طرف نکل آئی۔ اسے میں نے جیپ کے اگلے ٹائر کے نیچے پھنسا کے یوں رکھا کہ کیل کا نوکیلا سرا اوپر کی جانب رہا۔ دوسری ماچس میں نے غالب سے لی تھی۔ اس میں دوسری کیل اسی طرح کھڑی کر کے میں نے دوسرے اگلے پہیے کے بالکل نیچے فٹ کی اور دوڑ کر باہر آگیا۔ اب ایک ماچس کے سلپ ہونے کے باوجود دوسری کیل سے ٹائر کا فلیٹ ہو جانا یقینی تھا ورنہ دونوں ٹائر بھی پنکچر ہو سکتے تھے مگر روانہ ہوتے وقت جیپ کی کم رفتار کے باعث یہ اندیشہ نہیں تھا کہ ٹائر برسٹ ہوئے تو جیپ الٹ جائے گی۔ میرے اندازے کے مطابق انکل رضوی کو اپنی کوٹھی سے باہر آ کے سو گز دور جانے سے پہلے معلوم ہو جائے گا کہ ٹائر فلیٹ ہو گئے ہیں۔

دونوں ماچسوں کا پتا بھی نہیں چلنے گا۔ ان کا چُورا منتشر ہو جائے گا مگر کیلیں ٹائروں میں پھنسی رہ جائیں گی۔ فوری طور پر انکل رضوی کو خیال بھی نہیں آئے گا کہ وہ کسی سازش کا شکار ہوئے ہیں۔

تقریباً سات منٹ بعد انکل رضوی کی آواز آئی۔ "کام ہے ایک"

"ابھی تو آئے تھے آپ" یہ آنٹی کی آواز تھی۔

"ارے بابا! یہ بڑی مشکل نوکری ہے۔ تم کہتی ہو بیوی کو شوہر کا غلام بے چارے شوہروں کو دیکھو کس کس کے غلام ہیں۔ پبلک کے۔ افسران کے اور یہاں تک کہ ماتحتوں کے۔" وہ ہنسنے لگے۔ "کتنا اچھا ہوتا اگر ہمارا بھی بس ایک شوہر ہوتا اور اسے خوش رکھ کے قصّہ ساری ختم۔ ایک گھر ہوتا اسے سنبھال کے کام ختم۔"

"بہت آسان سمجھتے ہیں نا... کسی دن کر کے دیکھیں۔"

"ایک دن اس شہر کو سنبھال کے دیکھو۔" وہ بولے اور جیپ اسٹارٹ کی۔ "ایک تھانے کو سنبھال کے دیکھو۔ پھر پتا چلے گا نیچے اوپر سب چور اُچکے بیٹھے ہیں۔"

"اچھا کب تک آئیں گے...؟" آنٹی نے کہا۔

"کتنی بار کہا ہے کہ یہ سوال مت پوچھا کرو۔ کوئی فلم کا شو تو دیکھنے جا نہیں رہا ہوں کہ بتا دوں... کہ فلم اتنے بجے ختم ہوگی اور اتنے بجے تک میں آجاؤں گا... آجاؤں گا کام ختم ہوتے ہی۔ ویسے تم یہ یاد رکھا کرو کہ کسی بھی سپاہی یا پولیس مین کا گھر سے نکلنے کے بعد واپس آنا سو فیصد یقینی نہیں ہوتا۔"

"مت کریں ایسی باتیں۔ میں عاجز آگئی ہوں..."

"تم کو عادی ہو جانا چاہیے۔ اسی لیے میں ایسی باتیں کرتا ہوں۔ جاؤ سو جاؤ، خدا حافظ۔" انکل نے کہا۔

ان کی جیپ باہر نکلی اور ہیڈ لائٹس انھوں نے سڑک پر آکے جلائیں۔ جیپ کا رُخ ادھر ہی تھا جدھر ہماری جیپ کا۔ چنانچہ انھوں نے ہمیں نہیں دیکھا۔ حسبِ توقع ان کی جیپ مشکل سے پچاس گز جا کے رک گئی۔ اسی وقت میں نے اپنی جیپ اسٹارٹ کی اور ایک دم آگے بڑھا دی۔ انکل رضوی ابھی ٹائروں کو دیکھنے کے لیے اترے ہی تھے کہ میں نے بریک لگائے اور جمپ مار کے جیپ سے اتر گیا۔ انھوں نے چونک کر مجھے دیکھا۔

"السلام علیکم انکل! کیا ہوا... دونوں ٹائر فلیٹ ہو گئے؟" میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ "چلیے کوئی بات نہیں۔ گاڑی حاضر ہے۔"

"تم..." انکل رضوی نے سیدھا کھڑا ہو کے کہا۔ "تو یہ تمھاری حرکت ہے؟"

"میں معذرت خواہ ہوں۔" میں نے کہا۔ "تاہم آپ کو زحمت نہیں ہوگی۔"

"مقصد کیا ہے اس حرکت کا؟" انھوں نے متانت سے کہا اور اپنا ہاتھ ریوالور کی طرف بڑھانے کی بالکل کوشش نہیں کی۔ ریوالور غالباً جیب میں تھا۔

میں نے سوچا کہ آپ کہاں تلاش کرتے پھریں گے ہمیں۔ کیوں نہ ہم خود آپ کو لے جائیں۔" میں نے کہا۔

"اور اگر میں جانے سے انکار کر دوں؟" انھوں نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بے خوفی سے کہا۔

"مجھے امید ہے آپ ایسا نہیں کریں گے۔ میری درخواست ہے کہ آپ ہمارے ساتھ چلیں۔" میں نے کہا۔ "اپنے ایس ایچ او کو فوراً اسٹیڈیم جانے دیں... لوٹ آئے گا جھک مار کے۔"

"آئی سی! گویا تم نے میرا فون ٹیپ کیا تھا۔" وہ بولے۔ "ویری گڈ... مجرم اب پولیس افسروں کے فون سنتے ہیں۔ کیا دیدہ دلیری ہے۔"

"وقت کم ہے انکل۔" میں نے کہا۔ "اخباری نمائندے پہنچ گئے ہوں گے۔"

"شٹ اپ۔ میں تمھارے ساتھ جانے سے انکار کرتا ہوں۔" رضوی صاحب نے کہا۔

"آپ مجھے زبردستی پر مجبور کر رہے ہیں۔" میں نے کہا اور ریوالور نکال لیا۔

"مجھے تمھاری سعادت مندی سے یہی امید تھی۔" انکل نے طنز سے کہا۔ "انکل بھی کہتے ہو مجھے اور..."

"میں تو کہتا ہوں۔" میں نے ان کی بات کاٹ دی۔ "آپ کب خود کو انکل سمجھتے ہیں۔ آپ تو صرف ایس پی ہیں۔ آپ نے مجھے کبھی اپنا بھتیجا نہیں سمجھا، ہمیشہ ملزم سکندر بخت ولد وزیر خان مرحوم کہا۔ میں نے آپ سے درخواست کی تھی کہ اکیلے آئیں۔ آپ نے وعدہ کیا اور میرے اعتماد کو دھوکا دیا۔ میں مانتا ہوں کہ آپ بہت ہوشیار شکاری ہیں لیکن اناڑی ہم بھی نہیں رہے۔ ایس ایس پی صاحب کو آپ کے فریب میں آجاتے۔ میں آپ کو ہر قیمت پر لے جاؤں گا۔"

"تم پر اغوا کا ایک اور کیس بن جائے گا۔" انکل رضوی نے کہا "اور ایک سینئر پولیس افسر کے اغوا کو معمولی واردات نہیں سمجھا جائے گا۔"

"مجھے پروا نہیں... جہاں سیر وہاں سوا سیر۔" میں نے کہا۔ "مجھے اپنا کام تو کرنا ہی ہے۔ میں نے کہا تھا کہ میں پریس کے نمائندوں کے سامنے گرفتاری دوں گا۔"

"اور کیا تم واقعی گرفتاری دینا چاہتے تھے؟" انھوں نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ تم جھوٹ بول رہے تھے۔"

"آپ کا خیال درست ہے، مجھے آپ کی موجودگی میں پریس کے سامنے ایک بیان دینا تھا۔" میں نے کہا۔ "آپ کی گواہی کی ضرورت تھی مجھے لیکن آپ نے مجھے پریس سے رابطہ قائم کرنے سے پہلے ہی اپنی مسلح نفری کی مدد سے گرفتار کرنا چاہا..."

"میں نے وہی کیا جو میرے نزدیک جائز اور درست تھا۔"

"میں بھی وہی کر رہا ہوں جو میرے نزدیک جائز اور درست ہے۔ جائز اور درست کا مطلب آپ کے نزدیک کچھ اور ہے میرے نزدیک کچھ اور... اور شاید ہر شخص الفاظ کا مفہوم اپنے حالات کے

اخذ کرتا ہے۔" میں نے کہا۔ "آج میرے لیے چوہدری دلاور بھی اتنا ہی خطرناک شکاری ہے جتنے آپ ہیں۔ قانون کے محافظ اور قانون شکن دونوں شکاری ہیں جو ہمارے تعاقب میں ہیں لیکن ہم نے اس شکارگاہ میں جینا سیکھ لیا ہے اور اب ہم آسان شکار نہیں رہے۔ کیا آپ زحمت کریں گے؟ وقت کم ہے۔" میں نے ریوالور سے اشارہ کیا۔

انکل رضوی اپنی جگہ پر منجمد کھڑے کچھ سوچتے رہے۔

"انکل! میں آپ پر ہاتھ اُٹھانا نہیں چاہتا۔" میں نے کہا۔ "فرض اور محبت کی جنگ میں کوئی مشکل مقام آیا تو آپ نے فرض کو ترجیح دی اور کبھی نہیں پچھتائے۔ مجھے آزمائش میں مت ڈالیں کہ میں نے آپ کی عمر کا رشتے کا کوئی لحاظ نہیں رکھا۔"

انکل رضوی نے سر ہلایا اور جیپ کی طرف بڑھے۔ اس جرنل کی طرح باوقار انداز میں جو اپنے حریف جرنل کے ساتھ جنگی قیدی بن کے جا رہا ہو۔ جنگ میں ہار جیت تو ہوتی رہتی ہے مگر ایک جرنل ہار کے بھی جرنل رہتا ہے۔ وہ جیپ میں بیٹھنے سے پہلے ذرا سی دیر کے لیے رُکے اور انھوں نے جیپ کا نمبر غور سے دیکھا۔

"السلام علیکم انکل رضوی۔" غالب نے پچھلی سیٹ پر سے کہا۔

وہ چونکے۔ "وعلیکم السلام... گویا آپ بھی ہیں۔" وہ بولے اور جیپ کی اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ "یہ جیپ کہاں سے ملی؟"

"یہ دوسری اسٹوری ہے۔" میں نے اُن کے ساتھ بیٹھتے ہوئے کہا اور جیپ کو اسٹارٹ کیا۔ میری گھڑی کے مطابق ہم کچھ لیٹ ہی ہو گئے تھے۔ اخباری نمائندوں سے پہلے ہمارا پہنچنا ضروری تھا لیکن آدھے گھنٹے کا وقت بہت کم تھا۔ میں نے جیپ کو ستر میل فی گھنٹا کی رفتار سے دوڑایا۔ سڑکیں اس وقت خالی تھیں اور مجھے بانسوں والی سڑک عبور کر کے مال تک جانے اور چیئرنگ کراس سے گھوم کر سیدھے ہاتھ پر اسمبلی بلڈنگ کے پیچھے پہنچنے میں دس منٹ بھی نہیں لگے۔ رائٹرز گلڈ کے دفتر کی پرانی عمارت بالکل سنسان پڑی تھی۔ برآمدے میں صرف ایک بلب جل رہا تھا اور ایک شخص سگریٹ کا دھواں نکالتے ہوئے ٹہلائی کے رُخ پر ٹہلنگ کر رہا تھا۔ اس کا حُلیہ اتنا ہی مضحکہ خیز تھا جتنا کہ پبلک ایک روایتی صحافی کا سمجھتی ہے۔ جیپ کو گیٹ سے اندر آتا دیکھ کے وہ رکا اور آگے آیا۔ جیپ کے قریب آکے اس نے پہلے رضوی صاحب سے اور پھر غالب سے ہاتھ ملایا۔

"کتنی دیر ہوئی تم کو پہنچے ہوئے؟" غالب نے کہا۔

"میں ٹھیک وقت پر آگیا تھا۔ تم دس منٹ لیٹ ہو۔" اس نے شکایت بھرے لہجے میں کہا۔ "اتنا کام کارش تھا مگر سب ایسے ہی چھوڑ کر آیا ہوں۔"

"یہاں کوئی اور تو نہیں ہے؟" میں نے جیپ سے اتر کے کہا۔

"ایک چوکیدار تھا۔ میں نے بہت کہا لیکن وہ کوئی کمرا کھلتے پر راضی نہیں ہوا۔" وہ بولا۔ حالانکہ وہ مجھے جانتا ہے۔ خیر میں نے پچھلی طرف چار پانچ کرسیاں ڈلوا دی ہیں۔"

"اور چوکیدار کہاں ہے؟" غالب نے کہا۔

"اسے میں نے کہا تھا کہ چائے کا بندوبست رکھنا پریس کانفرنس ہے..."

میں غالب کو اُٹھا کے پیچھے کی طرف والے برآمدے میں لے گیا اور ایک کرسی پر یوں بٹھا دیا کہ اس کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ دوسری کرسی پر شکنجے کے ساتھ رکھی رہی۔ غالب کے دوست نے اس کا بغور معائنہ کیا اور اپنے فوٹوگرافر کو کوسنے لگا۔ وہ اسی اخبار کا کرائم رپورٹر تھا جس میں غالب تھا۔ چنانچہ دوسرے کرائم رپورٹر کے آنے تک وہ دوستانہ فضا میں آہستہ آہستہ باتیں کرتے رہے۔ ایک کرسی پر انکل رضوی بیٹھے رہے اور ایک پر میں بیٹھا رہا۔ اس طرح پانچ کرسیاں بھر گئیں۔ اگلے دس منٹ میں پانچ افراد پہنچے۔ ہر اخبار کا ایک رپورٹر اور ایک فوٹوگرافر۔ وہ سب نیچے بیٹھے۔ ان سب نے غالب سے شکوہ کیا کہ باقی لوگوں کو کیوں بلایا گیا ہے اور غالب نے وعدہ خلافی کی ہے لیکن غالب ہوشیار آدمی تھا۔ اس نے سب کو خاموش کر دیا اور مطمئن بھی کہ یہ حالات کا تقاضا تھا۔

"ایسے رہنے دو حالات کے بچے۔" مرزا غالب کے اخبار سے آنے والے صحافی دوست نے سب سے زیادہ برہمی کا مظاہرہ کیا۔ "ہم تو جانتے ہیں تیرے ضمیر کو۔ میں تو چاہتا تھا کہ یہ میری "ایکس کلیو سو اسٹوری" ہوتی۔"

"چاہتا تو میں بھی یہی تھا۔" دوسرے رپورٹر نے کہا۔

"کون نہیں چاہتا تھا یہ۔" تیسرے نے تائید کی۔

"مگر حق میرا زیادہ تھا..."

"چُپ بے حق کے بچے۔" غالب نے کہا۔ "یہ کیا، اس سے بڑی بڑی خبریں جب ایجنسی سے ملتی ہیں تو سب کو ملتی ہیں۔ پریس ریلیز سب کے لیے ہوتی ہے۔ یہ بھی ایسی ہی خبر ہے۔"

غالب کا وہ دوست مُنہ پھُلا کے بیٹھ گیا۔ میں نے پریس کانفرنس کے آغاز میں کہا۔ "مجھے ایک بیان دینا ہے۔"

ان سب نے اپنے ٹیپ ریکارڈر آن کر لیے جو وہ ہر پریس کانفرنس میں ساتھ لیے پھرتے تھے۔ میں نے بہت سوچ سوچ کے ہر لفظ کہا۔ یہ بتایا کہ بہت عرصے سے کچھ لوگ یہاں سے مشرقی پاکستان کے علیحدگی پسند عناصر کو اسلحہ فراہم کر رہے ہیں۔ اس میں وہ کاروباری افراد بھی شامل ہیں جن کا ضمیر صرف پیسہ ہے اور غیر ملکی ایجنٹ بھی۔ کسی کا نام لیے بغیر میں نے کہا کہ ہم نے کچھ افراد کا پتا چلایا ہے لیکن ہمارے پاس اُن کے خلاف کوئی ایسا ثبوت نہیں جس کی بنیاد پر ہم انھیں قوم کے سامنے بطور مجرم پیش کر سکیں لیکن ہم بہت جلد ثبوت، شہادت اور

گواہ سب حاصل کرلیں گے۔ اس کے بعد میں نے اسلحے کے متعدد ذخائر کی تباہی کا حوالہ دیا اور کہا کہ وہ میں نے اپنے چند ساتھیوں کی مدد سے تباہ کیے تھے۔ ان میں سے چند نے بے صبری کا ثبوت دیتے ہوئے درمیان میں سوال کیے مگر انھیں میں نے خاموش کر دیا کہ ابھی میرا بیان مکمل نہیں ہوا۔ اپنی کارگزاری کی مفصل روداد پیش کرنے کے بعد میں نے تازہ ترین صورتِ حال سے انھیں آگاہ کیا اور بتایا کہ کس طرح میں نے ٹیلی فون پر ایس ایس پی صاحب کو ایک اسلحے کے ذخیرے کی نشاندہی کی تھی، مگر انھوں نے ایک گمنام کال پر ایکشن سے انکار کر دیا۔ مجبوراً مجھے اخباری نمائندوں کا سہارا لینا پڑا کیونکہ میں خود پولیس کے سامنے پیش نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے بتایا کہ ہم کس طرح سنگرالی کے جنگلوں تک پہنچے اور وہاں ملک دشمنوں کے اس اڈے تک جانا کتنا دشوار ثابت ہوا۔ اس مہم میں غالب کی ٹانگ ایک شکنجے میں پھنسی اور ٹوٹ گئی۔ وہاں بارودی سرنگیں بھی تھیں لیکن خدا نے ہمیں محفوظ رکھا۔ میں نے خندق کا اور آس پاس کی دوسری رکاوٹوں کا ایسا نقشہ کھینچا کہ کوئی تفصیل باقی نہ رہی۔

میرا بیان ختم ہوتے ہی وہ سب پھٹ پڑے لیکن میں نے ان سے کہا کہ وہ باری باری سوال کریں چونکہ میں ان سب کے نام نہیں جانتا تھا اس لیے یہ ساری گفتگو نام کے حوالے کے بغیر ہے جو رضوی صاحب سے ہوئی۔

سوال:۔ ایس ایس پی صاحب، کیا آپ نے ملزم سکندر بخت کے ٹیلی فون کرنے کے بعد کوئی قدم اٹھایا تھا؟

جواب:۔ میں اس کا پابند نہیں تھا تاہم قومی سلامتی کے پیشِ نظر میں نے اعلیٰ حکام کو اطلاع دے دی تھی۔

سوال:۔ اور کیا اعلیٰ حکام نے اس پر کوئی کارروائی کی ہے؟

جواب:۔ ضرور کی ہوگی، اگر نہیں کی تو یہ میری ذمے داری نہیں۔

سوال:۔ کیا وہاں سے اسلحہ دستیاب ہوا ہے؟

جواب:۔ مجھے نہیں معلوم۔

سوال:۔ کیا کچھ گرفتاریاں بھی ہوئی ہیں۔ یا متوقع ہیں؟

جواب:۔ میں قبل از وقت کچھ نہیں بتا سکتا۔

سوال:۔ کیا سکندر بخت کی فراہم کردہ معلومات آپ کے نزدیک معتبر ہیں؟

جواب:۔ میں نہیں سمجھتا کہ سکندر بخت کو ایسا جھوٹ بولنے سے کوئی فائدہ ہوگا۔

سوال:۔ گویا آپ اسے سچ مانتے ہیں؟

جواب:۔ سچ نہ مانتا تو اعلیٰ حکام کو کیوں خبردار کرتا۔

سوال:۔ کیا آپ کے اور ملزم سکندر بخت کے درمیان کوئی رشتہ ہے؟

جواب:۔ نہیں۔

سوال:۔ کیا آپ ملزم سکندر بخت کو گرفتار کر چکے ہیں؟

جواب:۔ نہیں، ملزم سکندر بخت مجھے گرفتار کر کے لایا ہے۔

سوال:۔ کیا مطلب؟

جواب:۔ مطلب یہ کہ مجھے میری مرضی کے خلاف گھر سے اغوا کر کے لایا گیا ہے۔

سوال:۔ کیا اس پر آپ سکندر بخت کے خلاف کوئی کارروائی کریں گے؟

جواب:۔ یقیناً۔ میں موقع ملتے ہی اغوا کی رپورٹ درج کراؤں گا۔۔۔ ایک سرکاری افسر کی حیثیت سے نہ میں پریس کانفرنس سے خطاب کر سکتا ہوں اور نہ کوئی جواب دینے کا پابند ہوں لیکن میں اپنی پوزیشن کلیئر کر دینا پسند کرتا ہوں۔ آپ سب لوگ ملزم سے پوچھ سکتے ہیں کہ کیا وہ مجھے یہاں دھوکے سے اور گن پوائنٹ پر لے کر نہیں آیا۔ اس جرم میں آپ کا دوست اور ہم پیشہ صحافی مرزا غالب بھی برابر کا شریک ہے۔

سوال:۔ سکندر بخت نے اسلحے کے چند ذخائر کا حوالہ دیا ہے، مثلاً گامے ماچھی کا اڈا۔ سائیں پاپڑ والے کی جعلی خانقاہ جو موضع کرہاں والا میں تھی اور ایک ذخیرہ جہاں دو ہیلی کاپٹر تباہ ہوئے تھے۔ ایک ہیلی کاپٹر موضع کرہاں والی میں بھی تباہ ہوا تھا۔ وہاں کسی اخباری نمائندے کو نہیں جانے دیا گیا تھا؟

جواب:۔ سیکیورٹی کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ قومی مفاد میں نہ ہو تو ہر بات اخبار والوں کو نہیں بتائی جا سکتی۔

سوال:۔ کیا آپ سکندر بخت کے دعووں کی تائید کرتے ہیں کہ ان اڈوں کو انھوں نے اور ان کے ساتھیوں نے تباہ کیا تھا؟

جواب:۔ میں کیسے تائید یا تردید کر سکتا ہوں، میں چشم دید گواہ تو نہیں تھا۔

سوال:۔ کیا یہ درست ہے کہ وہاں سے غیر ملکی اسلحہ برآمد ہوا تھا؟

جواب:۔ مجھے نہیں معلوم۔

سوال:۔ کیا وہ ہیلی کاپٹر انڈین تھے جو تباہ ہوئے؟

جواب:۔ میں نہیں جانتا۔

سوال:۔ آپ جانتے نہیں یا بتانا مناسب نہیں سمجھتے؟

جواب:۔ مجھے علم ہوتا تب بھی میں نہیں بتا سکتا تھا کیونکہ ان معاملات کا تعلق حکومت کی خارجہ پالیسی سے اور سیاست سے بھی ہو سکتا ہے جب کہ میں ایک سرکاری ملازم ہوں۔ اس کے علاوہ اس قسم کے کیس پولیس ہینڈل نہیں کرتی۔ اس کے لیے اعلیٰ سطح پر کوئی ایجنسی کام کرتی ہے۔

سوال:۔ کیا آپ نے کوئی انڈین ایجنٹ پکڑا ہے؟ اس کا سراغ لگایا ہے؟

جواب:۔ میں نے۔۔۔ نہیں۔۔۔ یہ میرا کام ہی نہیں ہے۔

سوال:۔ کیا آپ کے پاس ایسے افراد کا ریکارڈ ہے جو ملک کی سالمیت کے خلاف کام کر رہے ہوں۔ غیر ملکی طاقتوں کے آلۂ کار بنے ہوئے ہوں اور تخریبی عناصر سے ملے ہوئے ہوں۔

جواب:۔ ایسے لوگ کہاں اور کس ملک میں نہیں ہوتے۔ ہمارے پاس بھی ایسے افراد کا ریکارڈ ہے۔

سوال:۔ پھر آپ نے ابھی تک ان کو گرفتار کیوں نہیں کیا؟

جواب:۔ ہر کام قاعدے قانون کے مطابق ہوتا ہے، جب ہمارے پاس کسی غدار یا وطن فروش کے خلاف اتنا مواد جمع ہو جائے گا کہ ہم عدالت میں پیش کر کے اسے مجرم ثابت کر سکیں تو ہم ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کریں گے۔

سوال:۔ سکندر بخت نے چند افراد کا ذکر کیا ہے لیکن کسی کا نام نہیں لیا۔ کیا آپ ان افراد سے واقف ہیں؟

جواب:۔ مجھے نہیں معلوم کہ سکندر بخت نے کن افراد کا ذکر کیا ہے۔

سوال:۔ اگر وہ آپ کو نام بتا دے تو آپ کیا کریں گے؟

جواب:۔ تفتیش۔ صرف نام سن کے ہر شخص کو نہ گرفتار کیا جا سکتا ہے اور نہ مجرم سمجھا جا سکتا ہے۔

سوال:۔ اب تک پولیس اور دوسرے اداروں نے اسلحے کے کتنے ذخائر کا پتا چلایا ہے اور کتنے ملک دشمن افراد کے خلاف کارروائی کی ہے؟

جواب:۔ یہ بات بتانا عقل مندی نہیں ہوگی۔ اگر ہم تفصیلات ظاہر کر دیں گے تو ان کے ساتھی روپوش ہو جائیں گے، اپنے ٹھکانے بدل دیں گے یا طریقۂ کار بدل دیں گے۔ یہ کام رازداری سے چلتے رہتے ہیں اور ڈھنڈورا پیٹ کے کیے بھی نہیں جا سکتے۔ اس کے علاوہ میرا کام ملکی قانون کے مطابق لاہور تک محدود ہے۔ مجھے ملکی اور قومی سطح پر ہونے والے کام میں دخل کا اختیار نہیں ہے۔

سوال:۔ آپ کے خیال میں سکندر بخت کے خلاف مقدمات کی تعداد کیا ہے؟

جواب:۔ مجھے کوئی اندازہ نہیں۔

سوال:۔ کیا وہ سب مقدمات بہت سنگین ہیں؟

جواب:۔ اس کا فیصلہ تو عدالت کرتی ہے۔ میرے نزدیک کسی کو گالی دینا بھی ایک سنگین جرم ہے، گولی مارنا تو دور کی بات ہے۔

سوال:۔ کیا سکندر بخت نے کسی کو گولی ماری ہے؟

جواب:۔ میں نے تو ایسا نہیں کہا۔ ایک مثال دی تھی۔

سوال:۔ کیا اس مرحلے پر سکندر بخت کی ضمانت ممکن ہے؟

جواب:۔ یہ بھی عدالت کے اختیار کی بات ہے۔

سوال:۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ سکندر بخت اور اس کے ساتھیوں نے ملک دشمن عناصر کے خلاف قابلِ قدر جرأت کا ثبوت دیتے ہوئے ان کے اسلحے کے ذخائر تباہ کیے۔ دشمن کے ایک خفیہ ٹھکانے کو ٹھکانے لگایا اور جان پر کھیل کے وطن دشمنوں کے عزائم کو ناکام کیا۔ تو کیا انھیں ملکی و قومی خدمات کے عوض قانون سے کوئی رعایت ملے گی؟

جواب:۔ آپ پڑھے لکھے ہو کے ایسا سوال کرتے ہیں۔ قانون میں رعایت یا ترمیم کیسے ممکن ہے اور اگر کسی کو مقدمات واپس لینے کا اختیار ہے تو وہ حکومت کو حاصل ہے۔ میں حکومت نہیں ہوں کہ ابھی سے کچھ بتا سکوں۔ نہ میں عدالتی معاملات پر تبصرہ کرنے کا مجاز ہوں۔

سوال:۔ آپ کا ذاتی خیال کیا ہے۔ سکندر بخت کے ساتھیوں کے دعوے درست ہیں؟

جواب:۔ میری ذاتی رائے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔

سوال:۔ لیکن ابھی تک کسی نے بھی ایسا دعویٰ نہیں کیا۔۔۔ اور حکومت کی طرف سے کوئی بیان بھی جاری نہیں ہوا کہ اسلحے کے وہ ذخائر کس نے تباہ کیے تھے؟

جواب:۔ حکومت کو تردید یا تائید کی ضرورت کبھی پیش نہیں آئی کیونکہ یہ دعوے کبھی حکومت کے سامنے نہیں آئے۔

سوال:۔ سنگرالی کے ایمونیشن ڈپو کے متعلق سکندر بخت کے انکشافات پر حکومت یہ نہیں کہہ سکتی کہ اسے پہلے سے علم تھا۔ کیا اس طرح تصدیق نہیں ہو جاتی کہ درحقیقت سکندر بخت اور ان کے ساتھیوں نے ہی اب تک تمام پیش رفت کی ہے۔ اور بظاہر ان کے دعوے درست ہیں؟

جواب:۔ نو کمنٹ۔

سوال:۔ کیا ان حالات میں یہ فرض نہیں کیا جا سکتا کہ سکندر بخت کے خلاف سارے مقدمات ایک سازش کا نتیجہ تھے جس کا مقصد ان کو جیل میں بند کرا کے اصل مقصد میں کامیابی حاصل کرنے سے روکنا تھا اور کیا یہ فرض نہیں کیا جا سکتا کہ ملک دشمن عناصر کی سکندر سے دشمنی میں پولیس بھی شامل تھی جس نے مقدمات بنائے؟

جواب:۔ فرض کرنے کو آپ کچھ بھی فرض کر سکتے ہیں۔

اس کے بعد میری باری آئی اور ان چاروں نے مجھ سے یہ سوالات کیے۔

سوال:۔ مسٹر سکندر بخت! آپ کے خلاف سب سے پہلے ایک قتل کا مقدمہ درج کیا گیا تھا۔ آپ پر الزام تھا کہ آپ نے اپنے والد کے ایک بزنس پارٹنر کو قتل کیا تھا؟

جواب:۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کے سوالات میرے مقدمات کے بارے میں نہ ہوں۔

سوال:۔ پوچھنے کا مقصد یہ تھا کہ آپ کے خلاف مقدمات قائم کرنے والے وہی لوگ تھے جو اب آپ کے خیال میں وطن دشمن عناصر

ہیں یا ان کے آلۂ کار بنے ہوئے ہیں مثلاً جن کے خلاف وراثت کا مقدمہ تھا؟

جواب :۔ میں ایسا نہیں سمجھتا۔

سوال :۔ کیا یہ فرض کرنا غلط ہوگا کہ آپ کو جان بوجھ کے ایک سے زائد مقدمات میں اُلجھایا گیا تھا تاکہ آپ ان عناصر کو بے نقاب نہ کرسکیں؟

جواب :۔ جیسے۔ یس ایس پی صاحب نے کہا۔ آپ کچھ بھی فرض کر سکتے ہیں۔

سوال :۔ آخر آپ کھُل کر ان کے خلاف بات کیوں نہیں کرتے۔ کیا آپ ان سے ڈرتے ہیں؟

جواب :۔ جی ہاں۔ میں ان سے ڈرتا ہوں۔ میری جگہ آپ ہوتے تو آپ بھی ڈرتے۔ نہ میں سُپر مین ہوں نہ ٹارزن۔ نہ مجھے جوڈو کراٹے میں بلیک بیلٹ ملی ہے اور نہ ہی کنگ فو وغیرہ جانتا ہوں۔ میرا مسئلہ ہے یہاں کا نظامِ انصاف جو قدم قدم پر ثبوت اور شہادت طلب کرتا ہے اور ثبوت کے بغیر تو شاید یہاں ولدیت کے خانے میں باپ کا نام تک غلط درج کر دیا جاتا ہے۔ پھر پولیس ہے جو انصاف کرنے والوں اور انصاف مانگنے والوں کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بن جاتی ہے۔

سوال :۔ کیا آپ اس پورے نظام کو بدل سکتے ہیں جس کی ساری خرابیاں ہم سب جانتے ہیں۔ اگر نہیں تو پھر آپ کیا کریں گے؟

جواب :۔ وہی جو اب ہم کر رہے ہیں۔ صرف خود پر اور خدا پر بھروسا رکھتے ہوئے۔

سوال :۔ آپ نے متعدد بار جمع کا صیغہ استعمال کیا ہے اور کہا ہے ہمارے ساتھی۔ آپ کے یہ ساتھی کون ہیں؟

جواب :۔ میں کسی کا نام بتا کے اسے کسی شکاری کے سامنے نہیں ڈالوں گا۔

سوال :۔ شکاری آپ کسے کہتے ہیں؟

جواب :۔ ان سب کو جو انصاف کے نام پر استحصال کرتے ہیں۔ کمزور سے حق چھینتے ہیں۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے فلسفے کو آج کے حالات کا تقاضا سمجھتے ہیں۔ قانون کو کمزور کا سہارا سمجھتے ہیں لیکن کمزور کے لیے جینے کے حق کو تسلیم نہیں کرتے۔ یہ لاء نہیں جنگل لاء پر یقین رکھنے والے سب لوگ ہیں جو "سروائیول آف دی فٹسٹ" کے قائل ہیں۔ جو اصول، ایمان، اقدار و عقائد کی خرید و فروخت کو جواز عطا کرتے ہیں۔ اس تعریف کی روشنی میں آپ معاشرے کے ہر شکاری کو شناخت کرسکتے ہیں۔

سوال :۔ کیا آپ خود شکاری نہیں ہیں؟

جواب :۔ ہم بھی شکاری ہیں۔ ہم معاشرے کے ہر شکاری کے شکاری ہیں۔

سوال :۔ آپ کب تک اس طرح روپوش رہیں گے اور اپنے جرائم میں اضافہ کرتے رہیں گے؟

جواب :۔ جب تک ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوتے۔ جب ہم کامیاب ہوں گے تو یہ معاشرہ ہمیں خوش آمدید کہے گا۔

سوال :۔ کیا مرزا غالب بھی آپ کے ساتھی ہیں؟

جواب :۔ نہیں۔ یہ صحافی ہیں۔ بعض اوقات خبروں کی جستجو میں یہ جیسے دُور افتادہ مقام تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہ خبروں کے شکاری ہیں۔

سوال :۔ کیا آپ نے ان کو مدعو کیا تھا کہ یہ سنگرالی ڈیرے کو خود دیکھ لیں؟

جواب :۔ جی۔ اور اس کے بعد ہی انھوں نے آج کی پریس کانفرنس کا انتظام کیا۔ یہ سب میں نہیں کرسکتا تھا۔

سوال :۔ آپ کو ایس ایس پی کو اغوا کرکے لانے کی کیا ضرورت تھی؟

جواب :۔ میں انھیں اغوا کرکے نہیں لایا۔ انھی کی جیپ میں لایا ہوں اور جیپ باہر کھڑی ہے۔ آپ لوگ دیکھ سکتے ہیں۔ میں نے ان کو راستے میں دیکھا اور روک لیا۔ میں نے کہا میں اپنی گرفتاری دے سکتا ہوں بشرطیکہ مجھے پہلے پریس کے سامنے اپنا نقطۂ نظر بیان کرنے دیا جائے۔ میں نے ان سے جھوٹ بولا تھا کیونکہ میرا ارادہ ہرگز گرفتاری دینے کا نہیں تھا۔ میں ان کو صرف گواہ رکھنا چاہتا تھا۔

سوال :۔ لیکن انھوں نے کہا ہے کہ یہ آپ کے خلاف اغوا کی رپورٹ لکھوائیں گے؟

جواب :۔ یہ ایس ایس پی ہیں۔ میرے خلاف ڈاکے اور قتل کی رپورٹ بھی لکھوا سکتے ہیں۔ مگر یہ خود جانتے ہیں کہ جرم وہ ہوتا ہے جس کے چشم دید گواہ ہوں۔ جس کا ثبوت ہو۔ کوئی جرم بے مقصد بھی نہیں ہوتا۔ اغوا زبردستی ہوتا ہے جب کہ یہ جیپ خود چلا کے لائے ہیں اور آپ نے دیکھا بھی تھا کہ یہ ہی اتر کے اندر آئے تھے۔ نہ ان کے ہاتھ پاؤں بندھے تھے اور نہ یہ بے ہوش تھے۔

سوال :۔ آپ کے ایک اور ساتھی تھے مسٹر محسن شیروانی؟

جواب :۔ مجھے ان کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔ ان کی بیوی البتہ ایس ایس پی صاحب کے گھر میں مقیم ہیں۔ میری ان سے فون پر بات ہوئی تھی۔ وہ بھی یہیں کہیں ہوں گے یا ممکن ہے باہر ہوں۔ مرحوم محسن کے والد اور ایس ایس پی صاحب کے تعلقات برادرانہ تھے۔ میرے والد وزیر خان مرحوم کی طرح۔

سوال :۔ آپ کے ساتھ ایک خاتون ایڈووکیٹ مس رابعہ کا نام بھی آتا ہے۔

جواب :۔ میں نے سنا ہے کہ وہ کراچی میں ہیں اور پریکٹس

سوال :۔ آپ کے بارے میں یہ بھی مشہور ہوا تھا کہ آپ نے ایک دہشت گرد تنظیم ایم آر ایس کے نام سے بنائی تھی؟

جواب :۔ یہ ہوائی کسی دشمن نے اڑائی ہوگی۔

سوال :۔ مسٹر سکندر بخت! سوال یہ ہے کہ آخر آپ کے ساتھی کون ہیں؟

جواب :۔ آپ سب۔ تمام محبِ وطن پاکستانی۔ تمام انسانیت دوست لوگ، باضمیر انسان... پاکستان کے عوام۔ انصاف اور حق کے علمبردار۔ کیا اتنے ساتھی کم ہیں۔ اب آپ لوگ جاسکتے ہیں۔ میں اور کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔

انھوں نے بہت شور کیا کہ وہ غالب سے بھی کچھ پوچھنا چاہتے ہیں مگر غالب نے کہا کہ وہ کچھ نہیں جانتا۔ سوالات کسی ترتیب سے نہیں کیے گئے تھے۔ درمیان میں کبھی کوئی بولتا تھا کبھی کوئی۔ ایک دو جگہ خود انکل رضوی نے احتجاج کیا مگر میں نے ان کی ایک نہ چلنے دی۔ مثلاً انھوں نے جیپ والی بات کی تردید کی تھی لیکن میں اپنے جھوٹ پر اڑ گیا اور ان کا سچ نہ چل سکا۔ نتائج اور قیاس آرائیاں... تبصرے اور تجزیے کا سارا کام میں نے اخبار نویسوں پر چھوڑ دیا تھا۔ میں ایم آر ایس کا نام لیے بغیر اپنے سارے کارناموں کی روداد پبلک کے سامنے پیش کرنا چاہتا تھا اور میں اس میں کامیاب رہا تھا۔ یہ دلاور اینڈ کمپنی کے خلاف باضابطہ اعلانِ جنگ تھا لیکن میں نے پھر بھی ان کا نام لینے سے گریز کیا تھا ویسے تو یہ بہت پہلے ہی کھلی جنگ بن چکی تھی مگر اب تک پبلک کے سامنے ہم صرف مجرم اور مفرور ملزم بنے ہوئے تھے۔ یہ پبلسٹی کا زمانہ تھا۔ اپنی ڈفلی آپ بجا کے لوگ لیڈر اور ہیرو بنتے تھے۔ یہی میں نے بھی کیا تھا۔ پبلک کے سامنے تصویر کا دوسرا رُخ پیش کر دیا تھا۔ پروپیگنڈا بڑی مؤثر چیز ہے جو رائے عامہ کو بہت جلد متاثر کرتا ہے اور اس میں ذرائع ابلاغ کا سہارا لینا ہی پڑتا ہے۔ ہمارے سارے عیوب پہلے ہی سب کے سامنے آچکے تھے اب ضروری تھا کہ ہمارے محاسن بھی سب کے سامنے آئیں۔ معمولی سپورٹ ایک نفسیاتی فتح سے کم نہیں ہوتی۔

اخباری نمائندے بڑی عجلت میں رخصت ہوئے۔ ان کو بہتر آخری کاپی جانے سے پہلے بنانا تھی اور وہ سب تصاویر سیلیکٹ کرنا تھیں جو فوٹو گرافرز نے اپنے اپنے زاویے سے بنائی تھیں۔ فوٹو گرافر اپنا کام کرکے بہت پہلے جاچکے تھے کیوں کہ انھیں فلموں کی پروسیسنگ کرنا تھی اور رزلٹ دیکھنے تھے۔ اخباری نمائندوں کے جاتے ہی چوکیدار دوڑتا ہوا آیا۔

"او جی میرے پیسے!" وہ بولا۔

"پیسے... کس چیز کے پیسے؟" میں نے کہا۔

"او جی... میں او ناں تو... میرا مطلب ہے او ناں نے آکھیا سی کہ... اور جناب جانے سے تے میں بنا کے پیش کیتی سی..." وہ

اپنا مافی الضمیر بیان کرنے سے قاصر تھا۔ اس کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ میں نے رائل گارڈ کے احاطے میں اپنی اتھارٹی استعمال کرتے ہوئے پریس کانفرنس کرنے کی اجازت دی، کرسیاں لگائیں اور خدمت کی تو اس کا حقِ خدمت تو ملنا ہی چاہیے۔ صحافی برادری ہمیشہ کی کنگال۔ دوسروں کی دعوت اُڑانے والے — کھایا پیا اور دوڑ گئے کہ اب ایس ایس پی جیسے کوتوال شہر کی موجودگی میں غریب چوکیدار کیا بولے گا اور بولے گا تو کوئی نہ کوئی "بل" ادا کر بھی دے گا...

ہر نجی قسم کی پریس کانفرنس بلانے والوں کے لیے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ وہ پریس کانفرنس کسی بہترین ہوٹل میں بلائیں جہاں کھانے پینے کا بہترین انتظام ہو اور اس بہانے ہی کچھ لوگ آجائیں تو ان کو تحفے تحائف پیش کیے جائیں تاکہ وہ آپ کا نقطۂ نظر لوگوں کے سامنے پیش کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ مگر یہ تو خود صحافی لوگ تھے۔ جیل کے گھونسلے میں ماس کہاں۔ پاکستان جیسے ملک میں اسمگلر اور رشوت خوروں کے پاؤں دبانے والے اور ان کے جوتے اُٹھانے والے بھی صحت مند بینک بیلنس پر اکڑ کے چل سکتے ہیں لیکن صحافی ستونِ اپنے سچ پر اڑتا ہے اور جوتیاں چٹخاتا ہے۔ ساری عمر قلم گھستا ہے۔ دماغ کھپاتا ہے اور خون جلاتا ہے مگر اس سے اتنا بھی فرق نہیں پڑتا جتنا فولادی شہتیر میں دیمک سے۔ اپنی ہمت ہے کہ ہم پھر بھی جیے جاتے ہیں۔

میں نے چوکیدار کو دو سو روپے پیش کیے تو وہ خوش ہو گیا۔ غالباً اس نے مجھے ایس ایس پی صاحب کا ریڈر وغیرہ سمجھا ہوگا۔ ابھی تو خود ایس ایس پی صاحب کو معلوم نہیں تھا کہ یہ بھی پولیس کا ہی پیسہ تھا جو ہم نے لٹایا۔

صحافیوں کے جانے کے بعد میں نے سوچنا شروع کیا کہ اب کیا ہوگا۔ انکل رضوی بہت مطمئن کھڑے ہوئے تھے "ہاں بھئی، اب کیا حکم ہے میرے لیے۔" انھوں نے کہا۔

"انکل! میں دل سے شرمندہ ہوں۔ ایک مجبوری تھی جس کے تحت میں نے ایسا کیا۔" میں نے کہا۔

"اور وہ مجبوری کیا تھی جس کے تحت تم نے پولیس سے یہ جیپ چھینی تھی۔" انھوں نے طنزاً کہا۔ "تمھارے پاس تو ہر غلط کام کا عذر ایک ہی ہے ضرورت۔ حالات کا تقاضا۔ یا مجبوری۔ اس کے نام تم خود بدلتے ہو۔"

"کیا آپ یقین کریں گے کہ ہم نے یہ جیپ وہ ڈاکوؤں سے چھینی تھی جو آپ کی پولیس کے سورماؤں کی وردیاں تک اتار چکے تھے اور ان کا اسلحہ بھی لے آئے تھے۔" میں نے کہا۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" انکل نے کہا۔

"میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں انکل۔" میں نے کہا "کیا یہ سچ نہیں ہے کہ لاہور کی کوٹ لکھپت جیل سے دو ڈاکو نکل بھاگے تھے۔ پانے خاں اور گورا ڈاکو۔ ان میں سے ایک کے لیے سزائے موت پر عمل درآمد

کی تاریخ تک مقرر ہو چکی تھی اور دوسرے کو سزائے موت سنائی جا چکی تھی۔" میں نے کہا۔

"یہ تو اخبارات میں بھی آیا تھا۔ پولیس نے ان کی گرفتاری کے لیے ناکا بندی کر رکھی ہے۔" وہ بولے۔ "اور متعدد مقامات پر چھاپے مارے ہیں۔"

"آپ بالکل پولیس کے سرکاری ہینڈ آؤٹ کی زبان بول رہے ہیں ورنہ کیا آج تک ناکا بندی سے کوئی فائدہ ہوا ہے۔ کہیں چھاپے مارنے سے کوئی مجرم ہاتھ آیا ہے۔ انھیں تو چھاپا پڑنے سے پہلے علم ہو جاتا ہے مگر وہ مطمئن بیٹھے رہتے ہیں۔ پولیس صرف کاغذی رپورٹ دیتی ہے کہ چھاپا ناکام رہا۔ یا سرے سے چھاپا مارنے ہی نہیں جاتی۔ آپ کی ایک ناکا بندی کرنے والی پارٹی کی ان ڈاکوؤں سے مڈ بھیڑ ہو گئی تھی۔ وہ غالباً کہیں کھانا کھا کے قیلولہ کر رہے تھے کہ ڈاکو آ پہنچے۔ ڈاکوؤں نے ان کے ساتھ کھانا بھی کھایا۔ میں آپ کو مینو بھی بتاتا ہوں۔ نرگسی کوفتے۔ بھنا ہوا مرغ، پراٹھے اور حلوا۔ ظاہر ہے ایسی مرغن خوراک کھا کے تو نیند ہی آئے گی۔ پھر جنگل کی پُر سکون تازہ ہوا۔ جب وہ جاگے تو ڈاکو ان سے سب کچھ چھین چکے تھے۔ چلتے چلتے ڈاکو ان کو ایک اوورسیئر کی گاڑی میں ڈال گئے۔"

"کون اوورسیئر..." انکل نے حیرانی سے کہا۔

"محکمۂ انہار کا۔ سنگرالی سے چند میل کے فاصلے پر اس کا آفس ہے اور وہ ہر روز اسی سڑک پر سے آتا جاتا ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم سنگرالی سے واپس آ رہے تھے کہ ہمیں وہ گاڑی نظر آئی جس میں اوورسیئر بھی پڑا ہوا تھا اور آپ کے وہ تھانیدار بھی۔ ایک انسپکٹر اور دوسرا سب انسپکٹر۔"

"تمھیں ان کے عہدے کیسے معلوم ہوئے؟"

"ان کے کاغذات سے۔ ہم نے جامہ تلاشی لی تھی۔" میں نے کہا۔ "یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ کون ہیں۔ ڈاکو ہمیں آگے آ کے ملے۔ وہ پولیس کی جیپ میں فرار ہوئے تھے۔ ہم خود جنگل میں چھپتے چھپاتے آ رہے تھے کہ ہم نے جیپ کو گھنی جھاڑیوں میں چھپا ہوا دیکھ لیا۔ پولیس کی جیپ کو سڑک سے اتنا دور جنگل میں پا کے ہمیں تعجب ہوا۔ ڈاکو وہاں کسی کا انتظار کر رہے تھے۔ شاید اپنے ساتھیوں کا کہ ہم پہنچ گئے۔ انھوں نے ریوالور نکال لیے اور شاید وہ ہمیں شوٹ بھی کر دیتے مگر ہم فوراً نیچے گر گئے اور رونے دھونے لگے کہ ہم تو دیہاتی ہیں جو غلطی سے ادھر آ گئے۔ انھوں نے ہماری جاں بخشی کی غلطی کی اور مارے گئے۔"

"کیا مطلب؟ تم نے قتل کر دیا انھیں؟"

"نہیں انکل۔ میں نے انھیں آپ کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے زندہ گرفتار کیا تھا۔" میں نے کہا۔ "ان میں اور ہم میں یہی ایک فرق تھا کہ وہ اسلحے کی طاقت پر لڑتے تھے۔ جب تک اسلحہ ان کے ہاتھ میں تھا، ہمارے لیے اپنی جان بچانا ضروری تھا۔ اس کے بعد ہم نے انھیں آڑے ہاتھوں لیا۔ ایک کی کلائی ٹوٹی اور بازو [illegible] کی دو پسلیاں۔ ابھی کچھ دیر پہلے آپ نے پوچھا تھا کہ یہ جیپ کہاں سے ملی تو میں نے کہا تھا کہ یہ دوسری اسٹوری ہے۔ ابھی یہ اسٹوری صرف آپ کو معلوم ہے۔ صبح شاید اخبارات میں بھی آ جائے۔ دیکھو آپ کی پولیس پارٹی کے حیالے کیا فرماتے ہیں۔ ان کو کچھ نہ کچھ تو ہی پڑے گا۔ اور ظاہر ہے وہ اوورسیئر سے بھی اپنے بیان کی تائید حاصل کریں گے۔"

"پھر وہ ڈاکو کہاں گئے؟" انکل رضوی نے بے یقینی سے کہا۔

"وہ کہاں جا سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ایم آر ایس کے تھانے میں ہیں، جہاں سے کوئی مر کے ہی نکل سکتا ہے۔"

"کیا مطلب! ایم آر ایس کے تھانے سے؟"

"مطلب یہ کہ ہماری تحویل میں ہیں۔ کل پھر ایک ایسی ہی چھوٹی سی پریس کانفرنس ہو گی جس میں ہم خود ڈاکوؤں کو پولیس کے حوالے کریں گے۔" میں نے کہا۔ "اب تو اخبارات میں ہمارے کارنامے ہی شائع ہوں گے۔ ہم ہیرو بن کے دکھائیں گے۔ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ پریس تک ہماری رسائی ہے۔ ہم بچی کہانیوں کے ساتھ جھوٹی کہانیاں بھی لگائیں گے جو پبلک کی نظر میں ہمارا امیج بحال کرنے کے لیے ہوں گی میں۔ ہم لوگوں کو باور کرائیں گے کہ مجرم ہم نہیں، شکاری ہیں اور انھوں نے ایک سازش کے تحت ہمیں مجرم بنایا ہے۔ اس سازش میں پولیس ان کے ساتھ تھی چنانچہ وہ کسی حد تک کامیاب رہے۔ اب ہم حقائق کو بے نقاب کر رہے ہیں۔ پریس کانفرنس بھی اس لیے ضروری ہے کہ ڈاکو خود حقیقت بیان کر سکیں اور بتا سکیں کہ جب ان کی پولیس سے ملاقات ہوئی تھی تو پولیس ناکا بندی کر رہی تھی یا [illegible]"

"تم نے انھیں کہاں رکھا ہے؟" انکل رضوی نے کہا۔

"بہت محفوظ مقام پر۔ ان کا علاج بھی ہو رہا ہے۔" میں نے کہا۔ "اب تک ان کی ہڈیاں جوڑ کے پلاستر چڑھا دیا گیا ہو گا۔ انھوں نے ہمیں بہت بڑی رشوت بھی پیش کی تھی۔ یہ بھی کہا تھا کہ ہمیں شوٹ کر دو یا خودکشی کرنے دو لیکن ہم نے صاف انکار کر دیا اور انھیں کہہ دیا کہ وہ قانون کے سزا یافتہ مجرم ہیں اور انھیں عدالت کے احکامات کے مطابق [illegible] ملے گی۔"

"یہ سب تو تم نے اچھا کیا۔" انکل رضوی نے تشویش سے کہا۔ "لیکن ان کو اپنے پاس رکھ کے تم بہت بڑی حماقت کے مرتکب ہو رہے ہو۔ وہ بہت خطرناک ڈاکو ہیں۔"

"میں نے عرض کیا کہ ان کے فرار ہونے کا سوال ہی نہیں۔"

"افوہ... بھئی وہ خود نہیں فرار ہوں گے۔ ان کے ساتھی ہوں گے جو انھیں چھڑا لے جائیں گے۔ تم سمجھتے کیوں نہیں۔" انکل رضوی نے

خفگی سے کہا۔ "ان کے گروہ کا ہر رکن ڈاکو ہے اور باہر ایک نہیں دو گروہ ہیں۔"

"انھیں کیسے معلوم ہو سکتا ہے کہ سردار لوگ کہاں ہیں۔" میں نے کہا۔

"یہ خوش فہمی تم کو لے ڈوبے گی۔" انکل رضوی کی برہمی بڑھنے لگی۔ "ابھی وقت ہے کہ انھیں پولیس کے حوالے کر دو۔ پولیس انھیں بالتطاہات واپس جیل پہنچا دے گی۔ کسی دوسری جیل میں منتقل کر دے گی۔ پولیس ان کے گروہوں کا مقابلہ کر سکتی ہے اور ان میں اتنی ہمت نہیں کہ حملہ کر کے انھیں چھڑا لے جائیں۔"

"آخر وہ کوٹ لکھپت جیل سے بھی نکلے ہی تھے۔"

"وہ کبھی نہ نکل پاتے، اگر ان کی مدد اندر سے نہ کی جاتی..." انکل رضوی نے کہا۔ "جیل کے عملے کو مجبور کر دیا گیا تھا۔"

"رشوت لینے پر؟" میں نے طنز سے کہا۔

"نہیں۔ باہر ان کے گروہوں نے جیل کے تین ملازمین کو اغوا کیا اور ان کے خاندانوں سمیت کسی نامعلوم مقام پر لے گئے۔" انکل رضوی نے کہا۔ "کچھ اور لوگوں کو بھی ایسی ہی دھمکی دی گئی تھی کہ پائندے خاں کو پھانسی ہوئی تو ان سب کے بیوی بچوں کی خیر نہیں۔ دھمکی کے علاوہ رشوت بھی تھی، کچھ لوگ مجبور ہو گئے۔"

"ایسا تو ہر ڈاکو کا گروہ کر سکتا ہے۔ کیا آپ ان کی دھمکی میں آ کے ڈاکوؤں کو چھوڑتے جائیں گے؟"

"نہیں... ہم قانون کے فیصلے پر عمل درآمد کرائیں گے۔ ان ڈاکوؤں کے بھی خاندان ہیں۔ ہم ان کے تعاقب میں ہیں اور شاید کل تک سب کو برآمد کر لیں گے۔" انھوں نے کہا۔ "میں تم کو وہ بات بتا رہا ہوں جو صرف پولیس کے اعلیٰ حکام کو معلوم ہے۔ بے وقوفی مت کرو اور ان کو ہمارے حوالے کر دو تاکہ ہم اعلان کر سکیں۔"

"اپنی کوششوں کی کامیابی کا؟" میں نے کہا۔

"نہیں، یہ اعلان کہ ڈاکو پکڑے جا چکے ہیں۔ اگر ان کے ساتھی جیل کے عملے کو اور ان کے متعلقین کو چھوڑ دیں تو یہ ہو سکتا ہے کہ پائندے خاں کی سزائے موت ملتوی کر دی جائے اور اسے خصوصی رعایت کے تحت عمر قید دینے کی سفارش کی جائے۔"

"کیا قانون میں اس کی گنجائش ہے؟"

"بالکل نہیں۔ جب صدر نے رحم کی اپیل مسترد کر دی تو پھانسی ہونا یقینی ہے۔" انکل نے کہا۔ "مگر ڈاکو اتنے بڑے قانون داں نہیں ہوتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ سب کچھ حکومت کے ہاتھ میں ہے۔ بیشک حکومت قانون بدل سکتی ہے لیکن اس کا ایک طریقۂ کار ہے۔ کسی سرکاری افسر یا وزیر کے حکم سے قانون نہیں تبدیل ہوتا اور حکومت بھی قانون کے خلاف کوئی کام نہیں کر سکتی۔ عدالتی معاملات میں دخل اندازی کا کیا سوال۔ سپریم کورٹ نے سزائے موت کا فیصلہ بحال رکھا ہو تو صدر بھی خصوصی حالات میں ہی رحم کی درخواست قبول کرتا ہے اور زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا ہے کہ موت کے فیصلے کو عمر قید میں بدل دے مگر ہمارے اعلان سے وہ جھانسے میں آ جائیں گے۔ ہم خود ان ڈاکوؤں سے اپنے ساتھیوں کے نام اپیل کرائیں گے۔"

"یہ آپ کل بھی کر سکتے ہیں۔ ہمیں نیک نامی کا ایک اور پوائنٹ تو اسکور کرنے دیں۔" میں نے کہا۔ "ہم پریس کے ذریعے ایک اور دھماکا کریں۔"

"اور اگر رات کو ان کے ساتھی حملہ کر کے تمھیں بھی مار گئے اور ان کو بھی چھڑا کر لے گئے پھر کیا ہو گا؟" انکل رضوی نے کہا۔ "یا انھوں نے دھماکے سے تم کو ہی اُڑا دیا پھر..."

"انکل! ان کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہو سکتی..."

"ان کو خبر مل چکی ہو گی۔ ان کے مخبر اور ساتھی ہر جگہ ہیں۔ خود پولیس میں ایسے لوگ ہیں جو ڈاکوؤں سے بھتا لیتے ہیں۔ صرف اس بات کا کہ وہ ڈاکوؤں کو پولیس کی سرگرمیوں سے باخبر رکھیں۔ پولیس کے ہر آپریشن کا ان کو قبل از وقت کیسے علم ہو جاتا ہے۔ پولیس مشرق میں کوئی کارروائی کرنے جاتی ہے تو انھیں خبر مل جاتی ہے کہ مغرب میں میدان صاف ہے۔" وہ بولے۔

"لیکن انکل ابھی تو نہ پولیس کو معلوم ہے نہ کسی تیسرے شخص کو۔ میرا مطلب ہے آپ کے سوا؟" میں نے کہا۔

"اور جہاں تم نے ان کو رکھا ہے۔ آس پاس کے لوگوں نے تو دیکھا ہو گا؟"

پہلے میں نے نفی میں سر ہلایا۔ پھر مجھے ایک دم اس ڈاکٹر کا خیال آ گیا جسے ہم نہیں جانتے تھے مگر اس نے ڈاکوؤں کو پہچان لیا تھا۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔

"کیا سوچ رہے ہو۔ اگر وہ نکل گئے تو تم دُہرے مجرم بنو گے۔ تم پر اُلٹا یہ الزام آ جائے گا کہ تم نے انھیں پناہ دی اور فرار ہونے کا موقع فراہم کیا۔ ابھی اور اسی وقت ان کو پولیس کے حوالے کر دو۔ اگر تم کو پریس پبلسٹی کا اتنا ہی شوق تھا تو ابھی کیوں نہیں اعلان کر دیا۔ تم ان کو ساتھ لا سکتے تھے۔" انکل نے کہا۔

"یہ بہت مشکل ہو جاتا۔" میں نے کہا۔ "ہمیں بہت چھپ چھپا کے آنا تھا اور آپ کو بھی لانا تھا۔ ہم ڈاکوؤں کو کیسے لاتے۔ وہ اس قابل بھی نہیں تھے کہ آ سکتے اور اگر ہم یہاں لے آتے تو بات وہی ہوتی۔ آپ اکیلے تھے۔"

"میں پولیس کی پوری مسلح پلاٹون لا سکتا تھا۔"

"ایسی صورت میں ہم کہاں جاتے۔ ہماری پریس کانفرنس کیسے ہوتی۔" میں نے کہا۔ "اب آپ صبح تک انتظار کر لیں۔ چند گھنٹے کی بات ہی تو ہے۔ ہم آپ کو گھر پر ڈراپ کر دیتے ہیں۔"

انکل نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں صبح تک انتظار نہیں کر سکتا۔ کیا تم کو معلوم ہے کہ مجھے ان ڈاکوؤں کی گرفتاری کے لیے خصوصی ٹیم کا

سربراہ مقرر کیا گیا ہے، میں ان کو ابھی گرفتار کروں گا۔"

" یہ تو آپ کی بہت بڑی کامیابی ہوگی۔" میں نے کہا۔" کہ آپ نے چھتیس گھنٹے میں انھیں پھر جیل کے اندر پہنچا دیا۔ تاہم اس کامیابی کو ہم آپ کے ساتھ شیئر کریں گے۔ ہم صبح آپ کو بتائیں گے کہ آپ کو کہاں آنا ہے۔"

" تم مجھے ابھی بتاؤ گے کہ مجھے کہاں جانا ہے۔" انکل رضوی نے ایک دم ریوالور نکال لیا جو انھوں نے قمیص کے اندر چھپا رکھا تھا۔ میں ہکا بکّا رہ گیا۔" میرا خیال تھا کہ آپ کا ریوالور جیپ میں رہ گیا۔"

" برخوردار! اس عہدے تک میں کسی کی سفارش سے یا رشوت دے کر نہیں پہنچا۔" انکل رضوی نے کہا۔" زندگی میں تم سے کہیں زیادہ چالاک اور عیار لوگ ملے ہیں۔ ایسے جو تم کو جیب میں ڈال کے لے جائیں اور بیچ کھائیں مگر وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے۔"

" اگر... اگر یہ آپ کے پاس تھا تو... تو آپ نے مزاحمت کیوں نہیں کی؟" میں نے کہا۔" ہمارے ساتھ کیوں آگئے۔"

" تمھاری خواہش پوری کرنے کے لیے۔" وہ بولے۔" میں خود اغوا ہوگیا اور اپنی مرضی سے میں نے اغوا ہونا قبول کیا۔ تمھیں اجازت دی کہ تم اغوا کا ڈراما کر لو اور مجھے پریس کے سامنے پیش کر سکو۔ تم کو سارا معاملہ پریس کے ذریعے پبلک تک پہنچانا تھا۔ میں خود پریس کانفرنس سے خطاب کر نہیں سکتا تھا۔ یہ موقع تمھاری وجہ سے مجھے ملا۔ میں نے خود کو مجبور ظاہر کیا اور پریس سے وہ سب کہہ دیا جو میں کہنا چاہتا تھا۔ اس سے تمھیں بھی فائدہ ہوا اور مجھے بھی۔"

" مجھے... مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کے بیان کی تردید میں جھوٹ بولا۔" میں نے کہا۔" یہ کہا کہ آپ اپنی جیپ میں ہمیں نکال کے لائے تھے، اور اپنی مرضی سے آئے تھے۔"

" اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" وہ بولے۔" اس لیے کہ وہ جیپ میری نہیں تھی۔ میری جیپ تو تمھاری مہربانی سے گھر کے قریب ہی کھڑی ہوئی ہے اور اخبار والوں کو کیا پتا کہ یہ جیپ کس کی تھی مگر محکمے کے لوگ تو جانتے ہیں کہ اس جیپ میں کون کہاں گیا تھا۔ میں نے اس جیپ کا نمبر دیکھتے ہی پہچان لیا تھا اور تم سے پوچھا بھی تھا کہ یہ جیپ تمھیں کہاں سے ملی؟ مگر تم نے جواب گول کر دیا۔ میرا اس وقت تک یہ خیال تھا کہ ان ڈاکوؤں نے پولیس پارٹی پر حملہ کر کے انھیں ہلاک کر دیا ہوگا اور تمھیں جیپ لاوارث کھڑی ہوئی ملی ہوگی۔ چونکہ تم سنگرالی کے قریب اسلحے کے ایک ذخیرے کی اطلاع پہلے ہی دے چکے تھے اور یہ پولیس پارٹی اسی طرف گئی ہوئی تھی اس لیے مجھے یہ بات قرینِ قیاس لگی تھی۔

" اب آپ دیکھیے گا کہ وہ پولیس پارٹی کیا کہتی ہے۔" میں نے کہا۔" اور ڈاکو کیا کہتے ہیں۔ وہ ہمارے بیان کی تصدیق کریں گے۔"

" میں ان سب کو معطل کر دوں گا۔ بلکہ ان کے خلاف ... غفلت کے تحت مقدمات درج ہوں گے۔" انکل رضوی نے ... " پولیس پارٹی کے ساتھ دو جوان بھی تھے۔"

" جی ہاں... وہ بھی وہیں پڑے ہوئے تھے۔" میں نے ...

" ان کا اسلحہ... وردیاں... سب تمھارے پاس میں ..." رضوی نے کہا۔

" جی سات کے ریوالور اور رائفلیں تو ہیں... کاغذات نہیں ... جو وہیں بکھرے پڑے تھے۔" میں نے کہا۔

" ٹھیک ہے... وہ بھی میرے حوالے کر دو۔"

" آئی ایم سوری انکل... اس وقت یہ ناممکن ہے۔" میں نے ...

" تم اخباری نمائندوں کو پھر بلا سکتے ہو۔" انکل رضوی نے کہا ...

" میں تم کو اتنی رعایت دے سکتا ہوں۔ وہ جہاں بھی ہیں وہیں ... والے آسکتے ہیں اور تمھارا بیان وغیرہ سب لے سکتے ہیں۔"

" میں آپ کو ضرور لے جاتا۔" میں نے کہا۔" لیکن مشکل یہ ہے کہ آپ اپنی وردی اور اپنے خصوصی اختیارات کے باوجود وہاں داخل نہیں ہو سکتے۔"

" کیا وہ کسی کے گھر میں ہیں؟ تم فکر مت کرو۔"

" وہ ایک ایسی جگہ ہیں جہاں آپ زبردستی داخل ہوں گے تو ہو سکتا ہے کہ آپ خود معطل ہو جائیں۔ آپ کا یہ فعل قانون کی ... میں جرم بھی بن جائے اور کامیابی کا کریڈٹ ناکامی کا ڈریبٹ بلکہ ... شمار ہو۔" میں نے کہا۔

" کیا وہ کسی وکیل کے گھر میں ہیں؟" انکل رضوی نے ...

میں ان کی ذہانت پر حیران رہ گیا۔ اور اپنی بے وقوفی پر ... پچھتایا کہ میں نے ان کو ایسا اشارہ دے دیا جو انھوں نے سمجھ لیا۔

" وہ عبدالودود منظر کے گھر میں ہیں؟" انھوں نے پھر کہا۔" تم نے میرا کام آسان کر دیا۔ اب میں اس پورے علاقے کا محاصرہ کرا ... گا۔ صبح ہونے سے پہلے پہلے وہ گرفتار ہو جائیں گے۔"

" اور ہم بھی؟" میں نے مایوسی سے کہا۔

" کیا تم توقع رکھتے ہو کہ میں تم کو یہاں سے کہیں اور جانے دوں گا؟" انکل نے کہا۔" اس وقت جب ریوالور میری جیب میں تھا، میں نے تمھارے اصرار پر تم سے تعاون کیا تھا۔ اب ریوالور تمھاری جیب میں ہے اور تم مجھ سے تعاون پر مجبور ہو..."

میرا ذہن بہت دیر سے مصروفِ عمل تھا اور موقع کا منتظر تھا۔ میری مایوسی صرف اداکاری تھی۔ انکل رضوی کی بات ختم ہوئی ... ہوئی تھی کہ میں نے جھپٹ کر ان کے ریوالور پر ہاتھ مارا لیکن ... پہلے سے تیار تھے۔ انھیں جتنا میں سمجھتا تھا، اس سے زیادہ ... مجھے سمجھتے تھے۔ میں اپنے ہی زور میں جیپ کے بونٹ پر گرا اور انکل رضوی نے ریوالور کا دستہ میرے سر پر مارا۔ میں بڑی خفگی سے اٹھا

کا سہارا لے کر آنکھوں کے سامنے پھیل جانے اور کچھ دیر جیپ والے اندھیرے کو دور کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ غالب معذور ہو چکا تھا ورنہ وہ کچھ نہ کچھ ضرور کرتا۔ اس وقت ہم رائٹرز گلڈ کے احاطے میں تھے اور انکل رضوی نے ہم دونوں کو ایک ہی ریوالور سے بے بس کر لیا تھا۔

" چلو... بیٹھو جیپ میں..." میں نے انکل کی آواز سنی۔" اور یاد رکھو کہ میں نے زندگی میں کبھی کسی مجرم کو رعایت نہیں دی۔ یہ نہ ہو کہ مجھے تم پر گولی چلانا پڑے۔"

میں لڑکھڑاتا ہوا جیپ میں بیٹھا۔ غالب نے میرے شانے پر تھپکی دی۔" گاڑی تم چلاؤ گے۔" انکل رضوی نے کہا۔" میں پیچھے بیٹھوں گا۔ چند منٹ میں تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

میں نے سر کو جھٹکا اور اقرار میں سر ہلایا۔ چند منٹ کا وقفہ پانچ منٹ کا وقفہ بن گیا۔ اس کے بعد میں نے جیپ میں لگی ہوئی چابیوں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

" اپنا رُخ میرے گھر کی طرف رکھنا۔" انکل رضوی نے کہا۔" وہاں سے میں پولیس کی نفری طلب کر لوں گا، مجسٹریٹ کو بلاؤں گا تاکہ چھاپا مارنے میں قانونی دشواری کوئی نہ ہو... اور تم میرے لیے کوئی مشکل پیدا نہ کرو۔"

اپنے پیچھے میں نے ایک قہقہے کی آواز سنی۔" چلو جی، اپنے ایس ایس پی صاحب۔ ہم آپ کی مشکل آسان کر دیتے ہیں۔ گولی مارو ڈاکوؤں کو... اب آپ سب اپنے مہمان ہو... کیسی رہی یہ ملاقات اپنے سکندر صاحب... ہاں جی؟"

مجھے یقین تھا کہ اس آواز کو انکل رضوی نے بھی پہچان لیا ہوگا۔ انداز اور لہجہ دلاور کا تھا لیکن آواز محسن کی تھی۔ اس وقت میں اپنی وقتی کامیابی کی خوشی کے خاک میں مل جانے کے خیال سے بہت دل گرفتہ اور ملول تھا۔ بہت عظیم الشان اور بہت غور و خوض، پلاننگ اور احتیاط کے ساتھ بنائے جانے والے بڑے بڑے منصوبے ایک بہت معمولی، ناقابلِ فہم اور قطعی ناقابلِ معافی غلطی سے کس طرح چوپٹ ہوتے ہیں، یہ میں نے دیکھ اور سمجھ لیا تھا۔ اس وقت میرے لیے امید کی روشنی تو صرف تائیدِ غیبی سے ملنے والی کوئی رعایت یا مہلت تھی جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں ایک بار پھر پانسہ پلٹ دوں۔ اگر ایسا کوئی موقع آتا تو یہ میرے اور انکل رضوی کے درمیان فنا و بقا کی آخری جنگ بن سکتی تھی۔ وہ مجھے کسی رشتے سے کوئی رعایت نہ دیتے اور گولی مارنا ناگزیر ہو جاتا تو وہ دل پتھر کر کے مفرور مجرم سکندر بخت کو شوٹ کرنے میں ذرا تامل نہ کرتے۔ بالکل ایسا ہی میں بھی کرتا۔ میرے لیے ان کی فرض شناسی قابلِ احترام تھی اور ان کی اصول پرستی ان کے مضبوط مثالی کردار کی بے مثل صفت تھی لیکن موجودہ حالات میں

سوال یہ تھا کہ کیا اہم ہے۔ سب سے اہم میری آزادی اور زندگی تھی جو بھی مجھ سے میری آزادی چھیننے کی کوشش کرتا یا میری زندگی کی راہ میں مزاحم ہوتا وہ میرے نقطۂ نظر سے صرف دشمن تھا اور یہ حساب کا سیدھا سادہ سوال تھا کہ مرنا ہو تو کسے مرنا چاہیے۔ مجھے یا انکل رضوی کو؟ اور میرے فارمولے سے اس کا صرف ایک ہی جواب آتا تھا کہ مجھے ہر جذباتی رشتے کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک ایس ایس پی کو قتل کر دینا چاہیے۔ کسی بھی ایس ایس پی کی پوسٹ خالی نہیں رہتی۔ رضوی نام کا ایک شخص قتل ہوتا ہے تو اس سے ایک عورت بیوہ ہوتی ہے، دو بچے یتیم ہوتے ہیں اور ایک خاندان بدبختی کے اندھے غار میں گرتا ہے۔ میری موت سے ایم آر ایس کی قوت کمزور پڑتی تھی اور ہمارا مشن ناکامی سے دوچار ہو سکتا تھا کیونکہ میری جگہ فوری طور پر دوسرا کوئی لینے والا نہیں تھا۔ یہ مشن ناکام ہو جاتا تو ہزاروں لاکھوں عورتیں اور بچے بیوہ اور یتیم ہوتے اور وہ دشمن کامیاب ہوتے جن کو رضوی صاحب کا قانون ابھی تک پہچانتا بھی نہیں تھا۔ یہ بات یقینی تھی کہ بغیر لڑے قانون کے سامنے ہتھیار ڈالنا بھی موت ہے۔ پھر میں آزادی حاصل کرنے کی کوشش کر کے کیوں نہ مروں۔ جان دینا یا جان لینا جنگ میں کوئی جذباتی مسئلہ نہیں ہونا چاہیے۔ مگر فیصلے کا لمحہ آجاتا تو صرف ایک زندہ گھر پہنچ سکتا تھا، رضوی صاحب یا میں۔

لیکن وہ فیصلہ کن اور آزمائش کا لمحہ آنے سے پہلے محسن آ گیا۔ اس وقت میں نے یہ بالکل نہیں سوچا کہ آخر محسن کو یہاں کس نے بھیجا۔ اس کا آنا کچھ نہیں تھا، صرف تائیدِ ایزدی تھا اور اس قادرِ مطلق کے کسی فعل کو جواز کی ضرورت نہیں کہ اس نے یہ کیوں کیا اور کیسے کیا۔ اس کی ذات کے مددگار ہونے پر میرا یقین ہمیشہ غیر متزلزل رہا تھا۔ آج میں زندہ تھا اور میرا ساتھ دینے والے دوست وفادار تھے تو اس میں میرا کوئی کمال نہ تھا۔ وہ ایسا ہی چاہتا تھا اور ایسا ہی ہوا تھا۔ خوشی سے میرا دل بھر گیا اور میرا حوصلہ پہلے سے دو چند ہو گیا۔

انکل رضوی منجمد ہو گئے۔" کیا تم مجھے دھوکا دینے کی کوشش کر رہے ہو محسن؟"

" نہیں انکل! آپ کو دھوکا دینا آسان نہیں اور مجھے بہت ڈر لگتا ہے آپ سے۔" محسن بولا۔

" تم لوگ اب بڑی روانی سے جھوٹ بولنے لگے ہو۔" رضوی صاحب نے طنز سے کہا۔" حقیقت یہ ہے کہ تم کو اب کسی کا بھی خوف نہیں رہا۔"

" باقی باتیں ہم راستے میں بھی کر سکتے ہیں۔" محسن نے کہا۔" کیا آپ یہ ریوالور..."

" نہیں... ایسے نہیں دوں گا۔" رضوی صاحب نے کہا۔

"تم چھین سکتے ہو تو چھین لو مگر اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہ میرا نشانہ سکندر ہے اور یہ ہو سکتا ہے کہ تم ریوالور نہیں، سکندر کی جان لے لو۔"

انکل رضوی کا لہجہ بہت پُریقین تھا اور وہ ذرا بھی خوف زدہ نہیں تھے۔

"آپ سمجھنے کی کوشش کریں انکل۔" محسن نے بے بسی اور عاجزی سے کہا۔

"نہیں.... نہ میں تمھاری بات سمجھ سکتا ہوں، نہ تم میری بات سمجھتے ہو۔ یہ اس لیے ناممکن ہے کہ تمھاری اور میری سوچ کی سمت بالکل مختلف ہے۔" انکل رضوی نے کہا۔ "اس لیے یہ کوشش بھی فضول ہوگی کہ ہم ایک دوسرے پر اپنے نظریات اور اپنے مقاصد مسلط کرنے کے لیے بحث کریں یا توقع کریں کہ ہم میں سے کوئی ایک صرف باتوں سے دوسرے کو قائل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ جس دن ایسا ہو گا اُس دن یا تو میں اپنی نوکری اور وردی چھوڑ کے تمھارے ساتھ چل پڑوں گا یا تم خود کو پولیس کی تحویل میں دے دو گے۔"

"آپ اس وقت وردی کی اور فرض کی مجبوری کی بات نہ کریں انکل کیونکہ ہم آپ کے لیے صرف مطلوب و مفرور مجرم ہی نہیں..."

"تم میرے لیے اور کچھ نہیں..."

"کیا آپ جذباتی رشتوں کے وجود کو تسلیم ہی نہیں کرتے۔" محسن نے برہمی سے کہا۔ "میں نہیں مان سکتا۔ ہر زندہ شخص احساس رکھتا ہے۔"

"میرے لیے پہلے اپنی ذمّے داریوں کا احساس ہے، پھر جذباتی رشتوں کا اور یہ بات تم اچھی طرح جانتے ہو۔" انکل رضوی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

میں اس تمام عرصے میں بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ مجھے ذرا بھی خوش فہمی نہ تھی کہ میری پھرتی اور چالاکی میرے کام آ سکتی ہے اور میں انکل رضوی کو دھوکا دے کر اُن سے ریوالور چھین سکتا ہوں یا اس ریوالور سے نکلنے والی گولی کا نشانہ بننے سے بچ سکتا ہوں لیکن محسن کی بحث نے مجھے کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ بحث بے مقصد تھی مگر وہ اسے بلاوجہ طول نہیں دے رہا تھا، اگر وہ وقت ضائع کر رہا تھا تو اس کا بھی کوئی مقصد ضرور تھا جو ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ غالب خستہ حال اپنی شکستہ ٹانگ اور فولادی شکنجے کے باعث بے عمل اور غیر فعال ہو چکا تھا چنانچہ وہ ذہنی اور جسمانی طور پر لاتعلق پڑا ہوا تھا اور اس کے سوا کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا کہ خود کو تقدیر کے فیصلے پر چھوڑ دے۔

"انکل! آخر ہم آپ کے کزن ہیں۔" محسن نے لجاجت کہا۔ "میرے والد اور سکندر کے والد آپ کے کتنے عزیز دو

"وہ سب مجھے ہمیشہ عزیز رہیں گے۔ ان کی یاد کبھی غافل نہیں ہو سکتا۔" انکل رضوی نے کہا۔

"پھر ہم آپ کو عزیز کیوں نہیں ہیں؟"

"پہلی بات تو یہ کہ تم بھی مجھے اتنے ہی عزیز ہو... مگر عزیز ہو اس سے مجھے کچھ امیدیں ہوتی ہیں۔" انکل نے کہا۔ بیٹا بھی اگر تمھاری ہی عمر کو پہنچ کر وہ سب کرنے لگے جو میرے کے مطابق غلط اور غیر قانونی ہو تو میں اس کو یہ رعایت نہیں سکتا کہ وہ قانون کو تماشا بنا لے اور جو چاہے کرتا پھرے۔ میں سے خون کا رشتہ تسلیم کروں گا مگر وہ قتل کرے گا تو اسے تختۂ دار بھی لے جاؤں گا۔ اس کے بعد اگر صدمے سے مر جاؤں تو الگ بات ہے۔"

"ٹھیک ہے انکل!" محسن نے ہار ماننے کے انداز میں
"اگر آپ اتنے ہی مجبور ہیں تو ہم آپ کی مجبوری سے فائدہ نہیں اٹھ

محسن نے پیچھے سے اپنا ریوالور آگے بڑھایا اور رضوی کے سامنے کر دیا۔ رضوی صاحب نے بہت محتاط رہتے ہوئے بائیں ہاتھ سے ریوالور وصول کیا مگر دائیں ہاتھ کے اپنے ریوالور زاویہ وہی رکھا اور اپنی نظر کو دہیں مرتکز رکھا۔ وہ بھی سمجھتے تھے ہم چالاک لوگ ہیں اور پلک جھپکنے سے پہلے بازی اُلٹ دینے ماہر ہیں۔ وہ کسی قسم کا رِسک لینے پر تیار نہ تھے اور طے کر چکے تھے انھیں سکندر بخت کی لاش بھی لے جانا پڑی تو وہ کمزور نہیں پڑ گے۔ ان کا عزم مجھے ان کی آنکھوں کی بے حسی سے اور ان کے کی بیگانگی میں نظر آ رہا تھا۔ خود محسن نے یہ بات سمجھ لی تھی چنانچہ نے جو کچھ کیا وہ انتہائی ذہانت کا مظاہرہ تھا۔

ابھی انکل رضوی نے محسن کا ریوالور ضبط کر لینے کے بعد کامیابی پر اطمینان کا سانس بھی نہیں لیا تھا کہ ایک گولی آئی اور ان ہاتھ سے ریوالور اُڑا کر لے گئی۔ میں نے اس وقت بالکل نہیں کہ یہ گولی کس نے چلائی تھی اور کہاں سے چلائی تھی۔ جیسے فیوز بم کو فعال کر دیتا ہے ایسے ہی گولی کی آواز نے مجھے متحرک کر دیا ہی ریوالور انکل رضوی کے ہاتھ سے نکلا میں نے دوسرا ریوالور لیا لیکن ریوالور میرے ہاتھ میں نہیں آیا۔ انکل رضوی کے بائیں کی گرفت بھی ریوالور پر بہت مضبوط تھی۔ محسن نے چلا کر کچھ جو میں نے نہیں سُنا۔ اب میرے اور رضوی صاحب کے درمیان دست بہ دست لڑائی چل رہی تھی۔ میں نے ان کے ریوالور بائیں ہاتھ کو نیچے دبا رکھا تھا تاکہ گولی چلے تو نیچے جائے ان کی مزاحمت ختم ہو گئی۔ میں نے ریوالور لے کر دیکھا تو وہ

جھکنے والے تھے۔

یہ کام غالب نے کیا تھا۔ اس نے جیپ کے پیچھے سے اُن کے سر پر کوئی چیز ماری تھی۔ اگر دن کا وقت ہوتا تو اتنی دیر میں وہاں مجمع لگ جاتا اور فائر کی آواز پر بھگدڑ مچ جاتی لیکن رات کے سناٹے میں اس سڑک پر سے گزرنے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ نہ جانے کہاں سے کسی نے چلا کے پوچھا "کون ہے؟" پھر پولیس کی سیٹی سنائی دی اور محسن ایک دم جیپ میں بیٹھ گیا۔

"چلو۔ فوراً انکل چلو یہاں سے۔" محسن نے کہا۔

"تم انکل رضوی کو سنبھالو۔" میں نے کہا۔ "میں بیک وقت دو کام نہیں کر سکتا۔"

"غالباً گشت کرنے والی پولیس آ رہی ہے۔" غالب نے تشویش سے کہا۔

"انھیں میں روک لوں گا۔" محسن بولا اور نیچے اتر گیا۔

"کیسے روک لو گے؟" غالب نے کہا۔ "اور کیا عقل مندی ہے آدھی رات کو پولیس مقابلے میں؟"

پولیس آ جاتی تو مقابلہ ناگزیر ہو جاتا مگر دو منٹ میں ہم نے سب ٹھیک کر لیا۔ غالب کے ساتھ انکل رضوی کو ڈال دیا گیا اور محسن نے ڈرائیونگ سنبھالی۔ میں نے غالب کے ہاتھ میں ایک ڈنڈا سا دیکھا جو لوہے کا پائپ ثابت ہوا۔ جیپ کا ٹول باکس پیچھے تھا اور جس وقت محسن اور انکل رضوی کے درمیان گفتگو چل رہی تھی، غالب اس ٹول باکس کو آواز کیے بغیر کھول کر اس میں کوئی ایسی چیز تلاش کر رہا تھا جو ہتھیار کے طور پر استعمال ہو سکے۔ غالب نے بعد میں بتایا کہ ویسے تو ٹول باکس میں ایک ہتھوڑی بھی تھی لیکن وہ ڈرتا تھا کہ اس کی ضرب مہلک ثابت نہ ہو جائے۔ اس نے تو پائپ مارتے وقت بھی ایک بار خدا سے اس گناہ پر معافی مانگی تھی اور دعا کی تھی کہ اس کا وار ضرورت کے مطابق کارگر ہے۔ یہ بھی نہ ہو کہ انکل رضوی کا سر پھٹ جائے اور ان کی جان جائے اور وار اتنا ہلکا بھی نہ رہے کہ رائیگاں جائے۔ وہ کامیاب رہا۔ اگر وہ کامیاب نہ ہوتا تو محسن بھی طے کر چکا تھا کہ اپنے ریوالور کا دستہ مار کے انکل رضوی کو ناک آؤٹ کر دے گا۔ اس نے بڑی عقل مندی سے ایک ایسا منصوبہ بنایا تھا کہ پوری طرح ہوشیار رہنے والے انکل رضوی بھی اس سے دھوکا کھا گئے۔ محسن کا نشانہ کبھی قابلِ رشک نہ تھا۔ غالب اس فن میں سرفہرست تھا اور بلاشبہ اُڑتی چڑیا کے پَر گن کر کسی بھی پَر کا بے خطا نشانہ لے سکتا تھا۔ دوسرا نمبر مجھے دیا جا سکتا تھا یا پھر کیتھرین کو۔ محسن میرے اندازے کے مطابق رالعہ کے بعد پانچویں نمبر پر تھا لیکن ابھی اس نے گولی سے ہاتھ کے ریوالور کو اُڑا دیا تھا مگر ہاتھ پر خراش نہ آنے دی تھی۔ وجہ صرف یہ تھی کہ اس نے مشکل سے چار فٹ کے فاصلے سے نشانہ لیا

تھا۔ اس کی سب سے بڑی کامیابی رضوی صاحب کے ذہن کو ذرا سی دیر کے لیے غیر حاضر کرنا تھی۔ جیسے میں اُن سے ایک ریوالور لے کر مطمئن ہو گیا تھا کہ انھیں غیر مسلح کر دیا ہے۔ ایسے ہی ان کے ذہن نے بھی تسلیم کر لیا تھا کہ محسن سارے ہتھیار ان کے حوالے کر چکا ہے۔ انھیں یقین دلانے میں محسن کی باتوں کو بھی دخل تھا۔ انکل رضوی سمجھ بیٹھے تھے کہ وہ جذباتی ہو کے شکست قبول کر رہا ہے۔ درحقیقت ایسا نہ تھا۔ محسن نے دوسرا ریوالور ہاتھ میں رکھتے ہوئے یہ تاثر دیا تھا کہ اب خطرے کی کوئی بات نہیں رہی اور رضوی صاحب بھی اُسی چال سے مات کھا گئے تھے جو انھوں نے میرے خلاف چلی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ انکل رضوی نے اپنی طاقت کو ظاہر کرنے میں عمداً تاخیر سے کام لیا تھا اور دوسرا ریوالور فوراً نہیں نکالا تھا۔ شاید اسی کوتاہی نے ان کی کامیابی کا قلعہ مسمار کر دیا۔

جب ہم جائے واردات سے دُور نکل آئے تو میں نے کہا۔ "کیا آپ خود اس راز پر سے پردہ اُٹھانا پسند کریں گے کہ غیب سے آپ کا ظہور اچانک کیسے ہوا؟" میں نے کہا۔

"ہم ہر جگہ ایسے ہی پہنچتے ہیں۔ کیونکہ ہم بہت پہنچے ہوئے صاحبِ کشف و کرامت ہیں۔" محسن نے کہا۔ "اللہ کا حکم ہوا کہ جا اپنے مصیبت میں گرفتار دوستوں کو دشمن کے پنجے سے چھڑا۔ بس ہم آ گئے۔"

"تجھے شہلا نے بتایا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"کیا تم نے شہلا کو بتایا تھا کہ تمھارا پروگرام کیا ہے؟" محسن بولا۔

"ہم نے اُسے بتایا تھا کہ ہم منظر کے گھر میں ہیں۔" میں نے کہا۔

"لیکن میں تو منظر کے گھر گیا ہی نہیں۔" محسن بولا۔ "اور تم لوگوں نے منظر کو بھی اس جگہ کا پتا نہیں دیا تھا۔"

"اچھا بھائی! آپ کو ہم نے صاحبِ کشف و کرامات مانا۔" غالب نے کہا۔ "اب آپ بتا دیں کہ آپ فلمی ہیرو کی طرح کیسے صحیح وقت پر نازل ہو گئے؟"

"یہ فلمی اتفاق نہیں تھا دوستو۔" محسن نے ہنس کر کہا۔ "مجھے شہلا سے صرف اتنا معلوم ہوا تھا کہ تم منظر کے گھر پہنچے ہو۔ میں نے منظر کو فون کیا تو وہ چلّانے لگا کہ کیا تم اور کیا تمھارے ہم زاد اور عم زاد۔ سب میرے اعمال کی سزا بن کے نازل ہوتے ہو۔ وہ اکیلے آتے تب بھی کم نہ تھا۔ اپنے ساتھ راہ میں ملنے والی ہر مصیبت بھی اُٹھا لائے ہیں اور مزید مصیبتوں سے شوق فرمانے کہیں گئے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ کہاں اور کس طرف تو منظر نے کہا کہ اب یہ تو خود اُن کے فرشتے بھی نہیں جانتے کہ ان کی نیت کیا ہے اور وہ گھر سے مشرق کا رُخ کر کے نکلے ہیں تو مغرب کی سمت نہیں جائیں گے مگر میں نے غالب کو چلّا چلّا کر اخبار والوں سے باتیں کرتے سُنا تھا۔ اس نے پہلے قذافی اسٹیڈیم کی بات کی تھی مگر بعد میں کہا تھا کہ رائٹرز

گھڑ آجاؤ... منتظر کی بات سن کر میں نے سیدھا یہاں آجانا مناسب سمجھا۔ تم لوگ یہاں نہ ملتے تو میں قذافی اسٹیڈیم جاتا۔ یہاں بھی مجھے گھوم پھر کے دیکھنا پڑا تو تم لوگ پچھلے حصّے میں نظر آئے اور تمھارے ساتھ رضوی صاحب کو دیکھ کر میں چکّر میں پڑ گیا۔ بالآخر میں نے طے کیا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اگر رضوی صاحب اپنی مرضی سے آئے ہیں تو مجھے کچھ نہیں کرنا ہے۔ صرف تم سے معلوم کرنا ہے کہ یہ کیا ڈراما تھا۔ اور اگر تم ان کو اٹھا کر لائے ہو تو پھر مجھے کسی بھی ناپسندیدہ صورتِ حال کے لیے تیار رہنا چاہیے۔"

"یہ شک تمھیں کیوں ہوا کہ ہم رضوی صاحب کو زبردستی لائے ہوں گے؟"

"اس لیے کہ میں نے شہلا سے پوچھا تھا اور اس نے بتایا تھا کہ انکل رضوی کو سکندر بھائی نے فون پر کچھ کہا تھا اور وہ چھاپا مارنے کی نیّت سے قذافی اسٹیڈیم گئے ہیں۔ یہ بات انھوں نے اپنی بیوی کو بتائی تھی تاکہ وہ پریشان نہ ہوں۔ آنٹی نے ہمیشہ اپنے شوہر کی فرض داریوں کو نبھایا یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ کس قسم کے شوہر ہیں اور کس قسم کے افسر ہیں۔ لیکن انکل چلے گئے تو وہ کچھ پریشان نظر آرہی تھیں۔ شہلا کے پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ وہ کیوں پریشان ہیں۔ انکل رضوی چوروں اور مجرموں کو گرفتار کرنے کے لیے پہلے بھی وقت بے وقت چھاپے مارنے جاتے رہے تھے اور یہ آنٹی کے لیے کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ پریشان ان کو یہ اندیشہ کر رہا تھا کہ انکل غالباً سکندر کو گرفتار کرنے گئے ہیں اور وہ بار بار کہہ رہی تھیں کہ سکندر اور [illegible] بے وقوف ہیں۔ آخر کیا ضرورت تھی ان کو ایس پی صاحب سے بات کرنے کی۔ اس بات سے شہلا کو بھی پریشانی لاحق ہوگئی۔ تاہم اس نے آنٹی کو تسلی دی اور سمجھایا کہ محسن اور سکندر اتنے بے وقوف بہرحال نہیں ہیں کہ خود پولیس کو کسی جگہ بلائیں اور گرفتار ہو جائیں۔ وہ گرفتار ہونا چاہتے تو کیا گھر نہیں آسکتے تھے۔ میرے ذہن میں شہلا کی بات رہی کہ تم نے کسی خاص مقصد کے تحت انکل رضوی کو قذافی اسٹیڈیم بلایا ہے۔ جب منتظر سے بات ہوئی تو صورتِ حال کھل کر سامنے آگئی۔ تم پہلے قذافی اسٹیڈیم جانا چاہتے تھے مگر کسی وجہ سے تم نے اپنا پروگرام بدل دیا۔ ایس ایس پی صاحب تم کو گرفتار کرنے کی غرض سے چھاپا مارنے کے لیے قذافی اسٹیڈیم جانا چاہتے تھے مگر بلیے گئے رائٹرز گلڈ میں۔ اس سے اور کیا نتیجہ اخذ کر سکتا تھا میں؟ اس بات کا امکان کم تھا کہ وہ ہنسی خوشی تمھارے ساتھ آگئے ہوں۔ چنانچہ میں نے جیپ میں سے دوسرا ریوالور بھی نکال لیا جو اس کے گلوو کمپارٹمنٹ میں پڑا ہوا تھا۔ میں قریب آکے کچھ نہیں سن سکتا تھا لیکن دُور سے ایسا لگتا تھا کہ کچھ سوال جواب قسم کا پروگرام چل رہا ہے اور جو لکھ رہے ہیں وہ اخباری نمائندے ہیں۔ یہ عجیب معمّا بن گیا میرے لیے۔ آخر تم کو کس نے پریس کے سامنے جانے پر مجبور کیا؟ رضوی صاحب نے یا کسی ہنگامی ضرورت نے۔ پہلی بات مشکل لگی تھی چنانچہ میں نے فرض کیا کہ تمھیں پریس کانفرنس بُلانا پڑی۔ اور یہ کام ہمارے صحافی دوست کی مدد سے ہوا۔ میں جیپ کے قریب موجود رہا اور جب تم کو آتے دیکھا تو جیپ کے پیچھے چھپ گیا۔ اگر سب ٹھیک ہوتا تو میں جیپ کے روانہ ہونے سے پہلے نمودار ہو کے کورنش بجا لاتا لیکن میرے اس خیال کی تائید بہت جلد ہوگئی کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ اور اس کے بعد میں نے وہی کیا جو مجھے کرنا چاہیے تھا اور جو تم نے دیکھا۔"

"تیری حاضر دماغی اور جرأت پر ہم تجھے ایم آر ایس کی طرف سے نوبل پرائز دیتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"وہ میں بعد میں وصول کر لوں گا۔ پہلے یہ بتاؤ کہ جانا کدھر ہے؟" محسن نے کہا۔ "انکل کو کہاں پہنچانا ہے؟"

"ان کے گھر اور کہاں۔" میں نے کہا۔ "لیکن پہلے ہمیں منتظر کے گھر پہنچنا ہے۔" میں نے کہا۔ "غالب کی حالت خراب ہو رہی ہے۔"

"یہ شیر آخر چوہے دان میں کیسے جا گھسا؟" محسن بولا۔

"سب اس کی تقدیر کا قصور ہے۔" میں نے کہا۔ "دل لگایا اس سراپا ناز سے جس کا شیوہ ہی دھول دھپّا ہے۔ ٹانگ پھنسا بیٹھا اس جنجال میں۔"

غالب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی تکلیف بہت بڑھ گئی تھی۔ اگر اسے وقت پر صحیح طبی امداد مل جاتی تو اب تک وہ خاصا سنبھل چکا ہوتا لیکن پہلے تو مسیحائی کے فرائض میں نے سرانجام دیے اور انھی دواؤں کے سہارے پر وقت گزار دیا جو دستیاب تھیں۔ جب ڈاکٹر ملا تو غالب نے پریس کانفرنس کے جہاد پر روانگی اختیار کی۔ نتیجہ یہ کہ اب درد کی شدت کے ساتھ وہ بخار میں تپ رہا تھا لیکن اپنی تکلیف کو خاموشی سے برداشت کر رہا تھا۔ اس کے لیے شکنجے سمیت ٹانگ اٹھا کے پھرنے اور بار بار ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے میں کتنی اذیت تھی۔ اس کا میں صرف اندازہ کر سکتا تھا مگر وہ تو ساری اذیت خود جھیل رہا تھا۔

منتظر کے دروازے پر جیپ رکی تو میں نے کہا: "انکل رضوی کو میں اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔ تو غالب کے ساتھ منتظر کے گھر پر میرا انتظار کر۔ صبح ہونے میں ابھی چار گھنٹے ہیں۔ میں انکل کو چھوڑ کر ایک گھنٹے میں لوٹ آؤں گا۔"

"یار غالب بے ہوش ہوگیا ہے۔" محسن نے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ یہاں ایک ڈاکٹر ہے۔" میں نے کہا۔ "اس سے کہنا کہ فوراً مرہم پٹی اور علاج شروع کر دے۔ ہمیں یہاں سے ... میں ہی نکل جانا ہوگا۔ یہ میں آکے بتاؤں گا کہ ہمیں کہاں جانا ہے۔ یہاں ہمارے دو مہمان بھی ہیں۔ ان کی طرف سے بھی محتاط رہنا۔"

ہم آہستہ آہستہ تقریباً سرگوشی میں بات کر رہے تھے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ منتظر کا دوست ڈاکٹر شہریار مجھے پولیس کی اس جیپ

میں دیکھے اور یہ دیکھے کہ اس جیپ میں کوئی اور بھی بے ہوش پڑا تھا جسے میں نے غالب کے ساتھ نہیں اتارا بلکہ اپنے ساتھ لے گیا۔ وہ انکل رضوی کی صورت دیکھ لیتا تو بعد میں یہ ہو سکتا تھا کہ اخبار میں ان کی تصویر دیکھے اور شناخت کر لے۔ وہ مجھ سے واپسی پر یہ سوال بھی کر سکتا تھا کہ پولیس کی اس جیپ میں میرے ساتھ کون تھا اور اسے میں کہاں چھوڑ آیا۔ وہ جیپ کہاں گئی؟ وہ منتظر کے تعلق سے پہلے ہی ایک غیر قانونی کام میں ہماری مدد کر رہا تھا۔ پولیس کی جیپ اور میرا پولیس سے مشتبہ قسم کا تعلق دیکھتے ہی وہ گھبرا جاتا تو ہمارے لیے مسائل کھڑے کر دیتا۔

میں نے غالب کو آہستہ آہستہ جیپ سے اتارا اور منتظر کے گھر کے دروازے پر لٹا دیا۔ پھر میں جیپ لے کر روانہ ہوگیا جس کی پچھلی سیٹ پر اب صرف انکل رضوی لیٹے ہوئے تھے۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ ہوش میں آنے ہی والے ہوں گے اور جب وہ مجھے اکیلا پائیں گے تو کچھ نہ کچھ ضرور کریں گے۔ پیچھے سے مجھ پر حملہ کر دیں یا چلتی جیپ سے کود جائیں۔ میں ان کے ساتھ اس سے زیادہ کچھ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

قریب ترین جگہ غالب کا آبائی گھر تھا جس کا جلا ہوا کھنڈر مجھے رات کی تاریکی اور ویرانی میں زیادہ ہی پُرآسیب لگا۔ میں نے جیپ کو اس کے پچھلے حصّے میں روکا۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں مجھے جلے ہوئے دروازوں اور کھڑکیوں کے فریم نظر آئے۔ میں نے گاڑی اور ہیڈ لائٹس بند کرنے کے بعد انکل رضوی کو کندھے پر ڈالا اور ایک کمرے میں لے گیا۔ اس کمرے میں ایک رات رابعہ اور ناز سوئی تھیں۔ اب وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ کچھ جلنے سے بچا ہوگا تو لوگ اٹھا لے گئے ہوں گے۔ دھماکے سے وہ کمرا مسمار ہوگیا تھا جس میں محسن اور شہلا نے رات گزاری تھی۔ میں نے یادوں کو اپنے تصور میں جاگتے اور تصویر کی صورت میں متحرک ہوتے دیکھا۔ یہاں کیا کچھ نہ ہوا تھا۔ رابعہ اور ناز کی وہ کیفیت مجھے یاد آئی جب ان کو ایک چوہے نے دہشت زدہ کر دیا تھا تو میرے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ پھیل گئی۔ اسی جگہ سے ہمارے مصائب کا آغاز ہوا تھا۔ لاکھ کا گھر خاک ہوگیا تھا۔ غالب کے والدین نے اسے بڑے ارمانوں سے بنایا تھا۔ بڑے فخر سے سجایا تھا اور بڑی امیدوں کے ساتھ یہ ورثہ غالب کے سپرد کرنے کا سوچا تھا۔ غالب یوں اس کا وارث ہوا کہ لاوارث ہوا۔ گھر بھی اور گھر کا رکھوالا بھی۔

انکل رضوی کے کراہنے کی آواز پر میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ دوسرے کمرے میں تھے اور میں نے انھیں مجبوراً فرشِ خاک پر لٹا دیا تھا۔ یہ میری احتیاط پسندی تھی جس نے مجھے محفوظ رکھا، ورنہ میں زخمی ضرور ہو جاتا۔ یہ ممکن تھا کہ میرا سر پھٹ جاتا اور جب ہوش آتا تو میں زنجیروں سے بندھا ہوا کسی پولیس لاک اپ میں ہوتا۔ انکل رضوی اندھیرے میں اسی طرح لیٹے ہوئے تھے مگر میں نے نوٹ کیا کہ ان کی پوزیشن کچھ بدل گئی ہے۔ میں نے ان کو فرش پر سیدھا رکھا تھا مگر اس وقت وہ کروٹ لیے پڑے تھے اور غالباً اسی دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے جدھر سے میرے آنے کی امید تھی۔ میں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ ان کا ایک ہاتھ کچھ پھیلا ہوا ہے اور اس ہاتھ میں آدھی اینٹ ہے۔ بغیر پٹ کے دروازوں اور کھڑکیوں سے آنے والی روشنی کافی تھی، ورنہ میں یہ سب نہ دیکھ پاتا۔

اس کا فائدہ یہ ہوا کہ میں ایک دم دروازے میں نمودار نہیں ہوا۔ میں تھوڑا سائڈ میں رہا اور پھر جست لگا کے نکل گیا۔ وہ اینٹ بعد میں اس دروازے کے خلا سے گزری جو رضوی صاحب نے بڑی قوت کے ساتھ ہاتھ گھما کر پھینکی تھی تاکہ انھیں دوبارہ یہ موقع نہیں ملا۔ میں ان کے سر پر جا کھڑا ہوا۔

"مجھے بہت افسوس ہے انکل..."

"شٹ اپ۔ افسوس تو اب مجھے ہونے لگا ہے کہ میں تمھارا انکل ہونے سے انکار بھی نہیں کر سکتا۔ بیٹا ہوتا تو عاق کر دیتا۔" انھوں نے برہمی سے کہا۔

"ایک دن آئے گا جب آپ اس نالائق بھتیجے پر فخر کریں گے۔"

"وہ دن آنے سے بہت پہلے میں تم کو مار دوں گا یا تم مجھے مار دو گے۔" ان کا غصّہ قابو سے باہر ہو رہا تھا۔ "میں اس سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتا۔ کسی مجرم نے مجھے اتنا پریشان نہیں کیا۔ میری پوزیشن کو اتنا نقصان نہیں پہنچایا جتنا تم پہنچا چکے ہو۔ صرف اس لیے کہ تم سیدھی راہ پر ٹیڑھی چال چلنے کو ضروری سمجھتے ہو۔ تم اچھا کر رہے ہو مگر بُرے سلیقے سے۔"

"میں اچھائی برائی کے معیار کی بحث میں پڑنا نہیں چاہتا۔ سارا فرق آپ کی اور میری پوزیشن کا ہے۔" میں نے کہا۔ "آپ کے رویّے نے بالآخر مجھے بھی اس مقام تک پہنچا دیا ہے کہ میں بھی رشتوں کو نظر انداز کروں، اسی طرح جیسے آپ کرتے ہیں۔ آپ میرے ساتھ وہ سلوک کرتے آئے ہیں جو کسی بھی مجرم کے ساتھ ہونا چاہیے۔ کیا اس کے بعد مجھے یہ حق حاصل نہیں ہو جاتا کہ میں بھی آپ کے ساتھ عام مجرموں کی طرح پیش آؤں۔ آپ کے ساتھ وہی کروں جو کوئی بھی مجرم کسی بھی ایس ایس پی کے ساتھ کر سکتا ہے؟"

"تو کرو، کس نے روکا ہے تمھیں۔" وہ دہاڑ کر بولے۔

"کاش یہ میرے اختیار میں ہوتا کہ میں آپ کی شفقت اور محبت اور آپ کے احسانات کو فراموش کر سکتا۔" میں نے کہا۔ "مشکل تو یہ ہے کہ خود آپ بھی ثابت قدم نہیں۔ آپ کے وجود کے دونوں حصوں میں سے کوئی ایک مکمل طور پر غالب نہیں۔ آپ بیشتر وقت ایس ایس پی رہتے ہیں مگر تمام وقت نہیں۔ جب انکل رضوی بنتے ہیں تو شہلا کو گھر میں رکھتے ہیں۔ بولی اور کیتھرین کے لیے انسانی ہمدردی

اور شرافت کے دریا بہا دیتے ہیں اور انھیں بھی صرف ہم سے تعلق کی بنا پر گھر میں مہمان بنا لیتے ہیں۔ جانتے بوجھتے محسن کو سہولت فراہم کرتے ہیں کہ وہ شہلا سے مل سکے اور اسے فوق کر سکے۔ اپنے گھر سے گارڈ آپ نے کیوں ہٹالی تھی آخر... اپنے فوق کو آپ نے ورش پر کیوں نہیں رکھا آپ نے؟ ایس ایس پی تو کسی کو بھی رعایت نہیں دیتا۔"

وہ شکست خوردہ اور مضمحل سے بیٹھے رہے۔ "غالباً اب مجھے مستعفی ہو جانا چاہیے۔ میں کمزور پڑنے لگا ہوں۔ اپنے فرض کے ساتھ وفاداری میں پہلے کی طرح مستقل مزاج نہیں رہا۔ میں مفاہمت کرنے لگا ہوں اور میرے رویے میں لچک پیدا ہونے لگی ہے۔"

"آپ اس احساس کو ختم نہیں کر سکتے انکل کہ آپ صرف ایس ایس پی نہیں ایک اچھے انسان بھی ہیں۔" میں نے کہا۔ "آپ روبوٹ نہیں ہیں۔ آپ کے سینے میں ایک دل ہے، یہ دل حساس ہے اور محبت کرنے والا ہے۔ اس کو آپ نکال کر نہیں پھینک سکتے۔ اس سے آپ کی نیت کی خرابی ظاہر نہیں ہوتی۔ آپ جہاں تک ممکن ہوتا ہے، اصول پرستی اور فرض شناسی کے صبر آزما راستے پر گامزن رہتے ہیں مگر انسانی فطرت کی کمزوریاں اور خامیاں آپ کے ساتھ بھی ہیں۔ بے عیب تو بیشک صرف خدا کی ذات ہے۔ آپ جو کچھ کرتے ہیں، وہ آپ کی غلطی نہیں، مجبوری ہے۔"

"معلوم نہیں۔" وہ بے خیالی میں بولے۔ "مجھے بتاؤ، اب میرے لیے تم نے کیا سزا تجویز کی ہے؟"

"کچھ نہیں۔ یہاں سے آپ گھر جائیں گے، اس کے بعد جو آپ مناسب سمجھیں وہ کریں۔" میں نے کہا۔ "میں آپ سے کوئی درخواست نہیں کروں گا۔ منظر کے گھر چھاپا نہ مارنا خود آپ کے حق میں بہتر ہے۔ ہم آپ کو وہاں نہیں ملیں گے۔"

"میرے لیے اتنی مشکلات مت پیدا کرو سکندر کہ میں حوصلہ ہار جاؤں۔ تم آخر کب تک مفرور ہوتے رہو گے؟" انکل رضوی نے کہا۔

"یہ فرار نہیں ہے، جہاد ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم صرف بے بس اور لاچار ہونا نہیں چاہتے۔ آپ کا قانون نہ ہمیں تحفظ فراہم کر سکتا ہے اور نہ اُن دشمنوں کو دیکھ سکتا ہے جو ہماری نظر میں ہیں، اس لیے ہم چھپ کر لڑنے پر مجبور ہیں۔ فرار ہوتے ہیں مجرم، بزدل اور کسی سے ڈرنے والے۔"

"کیا تم اور کیا تمھارا جہاد۔ اکیلا چنا بھاڑ پھوڑنے کا دعویٰ کرنے لگا ہے۔" انھوں نے تلخی سے کہا۔ "خود کو بچا نہیں سکتے۔ ملک کو دشمنوں سے بچانے نکلے ہیں۔ چند لڑکیاں اور چند لڑکے۔"

میرا چہرہ سُرخ پڑنے لگا۔ "کیا آپ اب تک کی تمام جدّوجہد کو اور کامیابیوں کو خیالی سمجھتے ہیں؟" میں نے برہمی سے کہا۔ "آپ کے خیال میں یہ سب جھوٹ ہے۔ فلمی کہانی ہے۔ گامے شاہ کا اڈا۔ سائیں بابا پیر والے کی خانقاہ کا ٹھکانا۔ چوہڑ والہ کا زمین دوز ذخیرہ۔ یہ سب کیا آپ کے محکمے کی کارکردگی کے باعث تباہ ہوئے ہیں؟ جو کچھ ملا، وہ کم ثبوت ہے۔ آپ کو تو وہاں سے بھی کا بڑا ذخیرہ اور غیر ملکی ایجنٹوں کی لاشیں تک ملی ہوں گی۔ کس کی کارروائی تھی؟ اور اب کل تک آپ کو سنگرالی کے ایمونیشن ڈپو کے بارے میں معلوم ہو جائے گا۔" میں اتنا مشتعل تھا کہ چلانے لگا تھا۔ یہ حقائق کی نفی کرنے کا رویہ ہی اتنا اشتعال انگیز تھا کہ میں جذبات پر قابو نہ رکھ سکا۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے کوئی مجھ سے کہتا کہ کہاں کا عشق، کیسا عشق۔ رالو کی چاہت صرف ہوس ہے۔ یا کوئی الزام لگاتا کہ شہلا کو میں نے دنیا کی آنکھوں میں دُھول جھونکنے کے لیے بہن بنا رکھا ہے۔ کم سے کم انکل رضوی ایسا نہیں کہہ سکتے تھے۔

یکلخت مجھے ہوش آگیا۔ میں ان کی چال کو سمجھ گیا۔ وہ مجھے مشتعل کر کے میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سلب کر لینا چاہتے تھے۔ غصّے کی حالت میں آدمی کا ذہن مفلوج ہو جاتا ہے تو وہ مغلوب بھی آسانی سے ہوتا ہے۔ اس وقت انکل رضوی مجھ سے جسمانی طور پر مقابلہ کر کے نہیں جیت سکتے تھے لیکن کوئی نفسیاتی کمزوری میری ہار کا سبب بن سکتی تھی۔ یہ بات سمجھنے کے بعد میں مسکرانے لگا۔

"آئی ایم سوری انکل! مجھے آپ کو اسی جگہ چھوڑ کے جانا ہوگا۔"

"تمھیں روپوش ہونے کے لیے مہلت چاہیے؟" رضوی صاحب نے کہا۔

"جی ہاں، کم سے کم چار گھنٹے۔"

"تو ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔" وہ بولے۔ "میں چار گھنٹے سے پہلے کچھ نہیں کروں گا۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "آپ کو جاننے والا آپ کے لیے وعدے پر کبھی اعتبار نہیں کر سکتا بشرطیکہ وہ احمق نہ ہو۔"

"تم افلاطون ہو... تم کیا کرو گے؟ مجھے یہاں ہاتھ پیر باندھ کے اور میرے مُنہ میں کپڑا ٹھونس کے ڈال دو گے؟" انھوں نے تلخ لہجے میں کہا۔

میں نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کا مطلب واضح تھا کہ میں یہی کر سکتا ہوں۔ سب ایسا ہی کرتے ہیں۔ اگر ان کی اپنی مجبوریاں ہیں تو میرے لیے میری مجبوریاں جدا ہیں۔ ان کو روکے رکھنے کے دوسرے طریقے بھی تھے مثلاً یہ کہ میں ان کو کہیں مقفل کر دیتا یا خواب آور گولیاں دے کر سلا دیتا لیکن یہ طریقے میرے امکان میں نہ تھے۔

"میں... نہیں چاہتا... مگر تم ایسا کرو..." انکل رضوی نے کچھ دیر بعد کہا۔

"چاہتا تو میں بھی نہیں انکل... مگر..."

"مگر یہ کہ محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔" وہ بولے۔ "اور دشمن پر بھروسا کرنا تم نے نہیں سیکھا۔ تمھاری جگہ میں ہوتا تو یہی کرتا۔ لیکن اچھا ہے اگر تم اعتبار کی کوئی صورت نکال لو۔ مجھے بھی وہ سب نہ کرنا پڑے جو تم نہیں چاہتے اور میں خود اپنی نظر میں بہتر رہوں۔ اس ذلّت آمیز سلوک سے بچ جاؤں جو تم کر سکتے ہو۔ کوئی بھی مجرم کر سکتا ہے مگر میں نہیں چاہتا کہ تم ایسا کرو۔" انھوں نے دوبارہ ایک بات کہی۔

"اگر آپ کوئی ایسی صورت پیدا کر دیں تو یہ مجھ پر احسان ہوگا۔" میں نے شرمندگی سے کہا۔

"تم جانتے ہو کہ میں قسم نہیں کھاتا۔"

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔

"دنیا کے معاملات میں خدا کی قسم کھانا بھی میرے مسلک کے خلاف ہے۔" انکل رضوی نے کہا۔

"آپ... آپ اپنے ضمیر کی قسم کھا سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا جس میں وہ کچھ سوچتے رہے۔ شاید ان کو توقع نہ تھی کہ میں ان کو ایک ایسی قسم کا پابند بھی کر سکتا ہوں جسے توڑ کر وہ صرف اپنی نظر میں مجرم ٹھہرتے ہیں۔ جسے توڑنے کے لیے وہ کوئی اخلاقی جواز تک فراہم نہیں کر سکتے۔ قسم توڑنے کی قانون میں کوئی سزا نہیں۔ عادتاً قسم کھانے والے دن میں دس بار خدا اور رسولؐ کی قسم کھا کے بھی شرمسار نہیں ہوتے۔ مذہب نے قسم توڑنے کا کفارہ رکھا ہے اور انتہائی ناگزیر حالات میں قسم توڑنے کی اجازت دی ہے مثلاً اس وقت جب جھوٹی قسم کھانے سے اپنی یا کسی اور کی زندگی بچائی جا سکتی ہو۔ موجودہ صورتِ حال میں اس کا اطلاق نہیں ہوتا تھا۔ شرعاً یہ غلط ہوتا کہ وہ خدا کی قسم کھا کے کچھ نہ کرنے کا وعدہ کرتے اور میرے جاتے ہی ایس ایس پی بن کے احکامات جاری کرنے لگتے۔ بلاشبہ جواز لانا کبھی مشکل نہیں ہوتا۔ وہ اپنے سامنے یہ عذر رکھتے کہ قسم انھوں نے حالتِ جبر میں ایک قیدی کی حیثیت سے کھائی تھی مگر ایک قانون کے پابند اور با اختیار ایس ایس پی پر وہ قسم لاگو نہیں ہوتی۔ چنانچہ میرے خیال میں صرف ضمیر کو گواہ بنا کے ہی وہ ایسی قسم کھا سکتے تھے جسے توڑ کے نہ وہ مجرم بنتے تھے اور نہ گناہگار۔ مگر ان کا اپنا ضمیر انھیں معاف نہ کرے تو یہ معاملہ ان کے اندر کی عدالت کا تھا۔

"مجھے منظور ہے۔ میں اپنے ضمیر کی قسم کھا کے وعدہ کرتا ہوں کہ صبح کے پانچ بجے تک اسی جگہ خاموش بیٹھا رہوں گا۔" انکل رضوی نے بالآخر کہا۔

"ٹھیک ہے انکل! میں یہ جُوا کھیلوں گا صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ آج بھی انسان کا ضمیر زندہ ہے یا نہیں؟" میں نے کہا۔ "بات آدمی کی نہیں، انسان کی ہے اور ابھی تک آپ کے انسان ہونے پر میرا اعتقاد متزلزل نہیں ہوا حالانکہ آپ ایس ایس پی بھی ہیں۔"

"جس دن انسانیت کا ضمیر مر جائے گا اُس دن یہ دنیا ایک ایسی عذاب ناک جہنم ہوگی جس پر شیطان حکمراں ہوگا اور اس کی رعایا میں بھی صرف شیاطین ہوں گے۔" انکل رضوی نے کہا۔

"میں آپ کے الفاظ یاد رکھوں گا۔" میں نے ان سے مصافحہ کیا اور باہر نکل آیا۔ اس وقت میرے دل کی کیفیت اس جواری کی طرح تھی جس نے آخری داؤ پر اپنا سب کچھ لگا دیا ہو اور یہ فیصلہ کرنے سے قاصر ہو کہ ایسا کر کے اُس نے اچھا کیا ہے یا بُرا۔ باہر آنے کے بعد بھی میں تذبذب اور بے یقینی کا شکار رہا۔ عقل نے کہا کہ رضوی صاحب بھی شکاری ہیں۔ وہ بھی اپنا ایک جال رکھتے ہیں۔ دھوکے فریب کے پھندے لگاتے ہیں۔ اس کے بغیر وہ قانون کی محافظت کے فرائض کی انجام دہی میں ناکامی سے بھی دوچار ہو سکتے ہیں۔ ان کا واسطہ شریف لوگوں سے نہیں، اخلاقی مجرموں سے پڑتا ہے جو ضمیر کا مفہوم بھی نہیں سمجھتے۔ دل کہتا تھا کہ کسی انسان کا ضمیر دھوکے باز نہیں ہوتا۔ جب وہ مجرموں سے بات کرتے ہیں تو قانون کی زبان بولتے ہیں۔ ضمیر کو درمیان میں نہیں لاتے۔ انھوں نے آج ضمیر کی ضمانت دی ہے۔ اس ضمانت کو ضبط کرا کے وہ ضمیر کے قیدی ہو جائیں گے اور بے ضمیر ہو کے جینا ان کو منظور نہ ہوگا۔

یہی کشمکش تھی جس نے دوبار میرے قدم روک لیے۔ میں نے سوچا کہ پلٹ کر جاؤں اور دیکھوں کہ کیا وہ اپنے وعدے پر قائم رہنے کی ہمت رکھتے ہیں اور اسی طرح وہاں خاموش بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایک جلے ہوئے کھنڈر کی درسگاہِ عبرت میں۔ لیکن میرا ضمیر آڑے آگیا۔ اس نے مجھے شرم دلائی کہ اعتماد کی بات کرتے ہو مگر خود پر اعتبار نہیں کرتے۔ انسان کی سرشت میں شامل نیکی کے وجود کو تسلیم نہیں کرو گے تو اپنا اعتبار بھی کھو دو گے۔ میں چلتا گیا۔ جیپ کے انجن کی آوازیں سناٹے میں یوں گونجتی رہی جیسے وسوسوں اور اندیشوں کے جنگل میں بھٹکنے والی پُرآسیب پاگل ہوا۔

ایک بار پھر میں نے جیپ کو منظر کے گھر سے دُور اسی خالی پلاٹ پر کھڑا کیا جو دو گھروں کی دیواروں کے حصار میں تھا۔ وہاں سے چند منٹ کا فاصلہ پیدل طے کر کے میں نے منظر کے دروازے کو بجایا۔ اس مرتبہ دروازہ کھولنے کے لیے آنے والا محسن تھا۔

"کہاں چھوڑا انکل رضوی کو؟" وہ میرے پیچھے دروازہ بند کر کے بولا۔

"غالب کے خانۂ ویراں میں۔" میں نے کہا۔

"انھیں ہوش تو نہیں آیا تھا؟"

"نہیں..." میں نے مختصر ترین وقفے میں جھوٹ بولنے کا تہیّہ کر لیا۔

"ان کو باندھ کر ڈالنا تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو..."

"یار! میں عقل سے اتنا بھی پیدل نہیں۔" میں نے جھنجلا کر کہا۔

"غالب کیسا ہے؟"

"جیسا پہلے تھا... بے ہوش..." محسن نے میرے ساتھ ڈرائنگ روم کا فاصلہ طے کیا۔ "خطرے کی بات نہیں۔"

ڈاکٹر شہریار مجھے دیکھ کر مسکرایا۔ وہ غالب کو قالین پر لٹائے اس پر جھکا ہوا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ بڑی مہارت اور مستعدی کے ساتھ غالب کی ٹانگ پر پٹی لپیٹ رہے تھے۔

"سمپل فریکچر تھا۔" وہ میری سوالیہ نظریں دیکھ کر بولا۔ "ایکسرے وغیرہ کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ میں نے پلاسٹر چڑھا دیا ہے۔ دو ہفتے تک احتیاط ضروری ہوگی۔"

"آپ کا مطلب ہے... دو ہفتے تک چلنا پھرنا بند۔" میں نے کہا۔

"مطلب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔ اس ٹانگ پر زور نہیں پڑنا چاہیے۔ ورنہ معاملہ لمبا ہو جائے گا۔" وہ بولا۔ "لوگ یہی غلطی کرتے ہیں کہ بیساکھی کے سہارے گھومنے پھرنے لگتے ہیں۔ پریکٹس ہوتی نہیں۔ ایسا ہوتا ہے کہ کبھی تو خود گر پڑتے ہیں اور زیادہ نقصان کر بیٹھتے ہیں۔ سمپل فریکچر کو کمپاؤنڈ بنا لیتے ہیں۔ یا شفایابی کے عمل کو صفر کر دیتے ہیں۔ کبھی حادثے کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس حالت میں کسی آدمی یا کھمبے سے، موٹر سائیکل یا دیوار سے ٹکرانا بھی حادثہ ہے اور ملبے سے ٹھوکر کھانا بھی۔"

میں نے سر ہلایا۔ "اور یہ بے ہوشی..."

"یہ ابھی دو تین گھنٹے میں ختم ہو جائے گی... جب درد ختم ہوگا۔" وہ پٹی لپیٹتے ہوئے بولا۔ "تاہم آرام ضروری ہے۔"

"آپ دوائیں وغیرہ لکھ دیں۔" میں نے کہا۔ "تاکہ یہ جہاں بھی رہے علاج جاری رہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ غالب یہاں نہیں رہے گا۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "خود ان کے الفاظ ہیں۔ ایک چکر ہے میرے پاؤں میں زنجیر نہیں۔"

"آپ تو خوش ذوق آدمی ہیں۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "چکر آپ کے سامنے ہی ہے۔ اس فولادی شکنجے سے نجات دلوانے کی صورت بھی نکالیے۔"

"میں تو سرجن ہوں۔" وہ بولا۔ "یہ ہو سکتا ہے کہ ٹانگ کاٹ کے شکنجہ الگ کر دوں۔ شکنجے کو کاٹنے کا کام لوہار کر سکتا ہے اور کوئی جادوگر مل جائے تو یہ کر سکتا ہے کہ نہ ٹانگ کاٹے اور نہ شکنجہ اور دونوں کو الگ کر دے۔"

"آپ دلچسپ آدمی ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہنستے کھیلتے اتنے مشکل کام کر سکتے ہیں۔"

"کیا ڈینٹر پینٹر کسی ٹوٹی پھوٹی کار کو دیکھ کر پریشان ہوتا ہے یا جذباتی ہوتا ہے کہ کیسی نئے ماڈل کی کتنی خوب صورت کار تھی جو تباہ ہوگئی۔ پریشان صرف کار کا مالک ہوتا ہے۔" ڈاکٹر شہریار نے کہا۔ "ڈینٹر تو اسے اپنی مہارت کے لیے ایک چیلنج سمجھتا ہے اور اسے پھر اصل حالت میں لا کے ویسی ہی دوسری کاروں میں شامل کر دیتا ہے۔ ہم بھی ڈینٹر پینٹر ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ہمارے پاس ٹوٹے پھوٹے آدمی لائے جاتے ہیں۔"

"اب کتنا وقت اور لگے گا؟" میں نے کہا۔

"تقریباً ایک گھنٹا۔" وہ بولا۔

میں نے دونوں ڈاکوؤں کو دیکھا۔ وہ سکون سے سو رہے تھے لیکن کبھی کبھی خواب میں ڈر کے کراہنے لگتے تھے۔ سکون آور خواب آور دوائیں بھی ان کے لاشعور سے پھانسی کے پھندے کا خوف دور کرنے میں ناکام رہی ہوں گی کہ وہ سہمے ہوئے لگتے تھے۔ موت کے ناگزیر ہاتھوں کی بے رحم گرفت سے نجات کا تقدیر کا ایک مذاق بن گیا تھا اور وہ گھڑی کی سوئیوں کے ... پہنچنے سے قبل ہی پھر وہاں تھے جہاں سے چلے تھے۔ زندگی ایک فریب خیال سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ موت اٹل تھی اور ... کا راستہ روک چکی تھی۔ جینے کی امید ایسی ہی تھی جیسے صبح کاذب، جھوٹی صبح۔ جو درحقیقت صبح نہیں ہوتی۔ اس کے بعد پھر اندھیرا چھا جاتا ہے اور صبح صادق کے ساتھ ہی جلاد آ پہنچتا ہے جو ایک اشارے سے سانس کی ڈوری توڑ دیتا ہے اور دائمی اندھیروں کے خلا میں معلق کر دیتا ہے۔

میں، محسن اور منظر ڈرائنگ روم میں آ پہنچے۔ غالباً منظر نے محسن کو بتا دیا تھا کہ ہم اپنے ساتھ کیا اضافی مصیبت اٹھا لائے ہیں مگر ابھی خود اسے تفصیلات کا علم نہ تھا۔ میں نے ان دونوں کو اختصار سے کام لیتے ہوئے اپنی قید سے رہائی، سنگرالی پہنچنے، غالب کے ایک شکنجے میں پھنسنے، پھر پولیس سے ملاقات اور ڈاکوؤں کے ہاتھ آنے تک کے واقعات سنا دیے۔ محسن اور منظر کو اپنی پریس کانفرنس کی روداد سنا کے میں نے گھڑی ... پون گھنٹا گزر گیا تھا۔

"معلوم نہیں تم لوگ کیا کر رہے ہو اور کیوں کر رہے ہو۔" منظر نے فریاد کناں لہجے میں کہا۔ "ارے بابا چھوڑو یہ سارے چکر۔ شادی کرو، ہر سال بچے بناؤ۔ پیسہ بناؤ۔ گھر بناؤ... نام بناؤ۔"

"نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا۔" میں نے کہا۔

"پل بنا، چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا۔" محسن نے میری تائید میں کہا۔

"وہ سب چیزیں بنانے سے کچھ نہیں ہوتا، جو تم بنا رہے ہو اور ہمیں بنا لینے کا مشورہ دے رہے ہو۔" میں نے کہا۔

"وہ سالا پاگل جو تم کو مشورہ دے کیونکہ تم خود پاگل ہو۔" منظر نے جھلا کے کہا۔ "قسم خدا کی کسی دن تنگ آ گیا تو دو دستی ... کر دوں گا۔"

"یار وہ بچوں کا باپ کچھ نہیں کر سکتا۔" محسن نے کہا۔

"سوائے تیرھواں بچہ پیدا کرنے کے۔" میں نے سر ہلایا۔

"تیرہ کا عدد منحوس ہوتا ہے دوست۔ انگریز تک اسے تسلیم کرتے ہیں چنانچہ کئی بہت مشہور فائیو اسٹار ہوٹلوں میں تیرھویں منزل نہیں ہوتی۔"

"ہوتی کیوں نہیں، وہ بناتے ہی نہیں۔" محسن بولا۔ "تم بھی تیرھویں کو گول کرو۔ اگلا بچہ چودھواں ہونا چاہیے... بیوی کو سمجھا دو۔"

وہ بھنا کر اٹھنے ہی والا تھا کہ میں نے اس کو روک لیا اور پھر صوفے پر گرا دیا۔ "ہم اب دو گھڑی کے مہمان ہیں، اب جائیں گے تو پھر نہ جانے کب آئیں گے۔"

"آنا۔ مگر یوں نہ آنا۔" منظر بولا۔

"رات کے وقت مے پیے ساتھ رقیب کو لیے۔" میں نے کہا۔ "آئے یہاں خدا کرے پر نہ خدا کرے کہ یوں۔"

"تم لوگ واقعی خبطی ہو۔ ادھر بم بارود، مار دھاڑ، قتل و غارتگری کو شغل سمجھتے ہو۔ ادھر شاعری کی جان نہیں چھوڑتے۔ کیا زمانہ آگیا ہے کہ سب چور ڈاکو قاتل اور تخریب کار دہشت گرد اور شرپسند کوئی بھی واردات کرنے سے پہلے دیوان غالب سے فال نکالتے ہیں۔" منظر بولا۔

"ہم صبح کا تارہ ہیں۔" میں نے کہا۔ "روشنی ہونے سے پہلے ہی غائب ہو جائیں گے۔ مرزا غالب کو ہم نے ایک جگہ تین ہفتے آرام دینے کے لیے منتخب کر لی ہے اور وہ تمہارا یتیم خانہ بہرحال نہیں ہے۔ ان ڈاکوؤں کو ہم بہ قلم خود پولیس کی تحویل میں دیں گے۔ پہلے صبح کے اخبار میں پولیس کا بیان دیکھ لیں۔"

"قسمت کا لکھا کون جانتا ہے۔" منظر آہ بھر کے بولا۔ "ہو سکتا ہے صبح بیان سے پہلے تمہیں پولیس حوالات میں دیکھے۔"

"ہماری وصیت سن لو۔" میں نے کہا۔ "پہلی بات تو یہ کہ نماز ظہر یہاں ایس ایس پی رضوی صاحب کی آمد متوقع ہے عرف عام میں اسے چھاپا کہا جاتا ہے۔ ان کے سامنے یہ ظاہر کرنا کہ سکندر یا محسن نام کے کسی شخص کو تم نے خواب میں بھی نہیں دیکھا اور غالب... غالب کون؟ اداکاری تم اچھی کر لیتے ہو۔ اسی لیے ایک کامیاب شوہر اور وکیل ہو۔ ممکن ہے وہ سرچ وارنٹ وغیرہ کے ساتھ دھاوا بولیں۔ اپنے سارے بیوی بچے ان کو دکھا دینا اور بھی جو چاہیں دکھانا اور گھبرانا مت۔ ہم برآمد نہیں ہوں گے اور تم ایس ایس پی صاحب سے وہ سب کہہ سکو گے جو تمہیں نہیں کہنا چاہیے مثلاً یہ کہ شرفا کا جینا حرام ہے۔ پولیس راج ہے اور لاقانونیت ہے وغیرہ وغیرہ۔ دوسری بات یہ کہ شہلا یہیں ہے۔ وہ تم سے وقتاً فوقتاً رابطہ قائم کرتی رہے گی۔ ہم اس سے براہ راست بات نہیں کر سکتے۔ اس سسٹم کی فون ایکسچینج کا کام بھی کرو گے۔ اس کے پیغامات ہمیں دو گے اور ہمارے پیغامات اسے اسی طرح پہنچا دو اور اس کا بھائی سلطان سلے ایس آئی اکرام آج کل کراچی میں ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ بھی تمہیں فون کریں۔ ان سے پتا لے لینا اور جب ہماری کال آئے تو ہمیں بتا دینا۔"

"بہت بہتر۔" منظر بولا۔ "آج سے وکالت کا پیشہ ترک کرتا ہوں اور ٹیلی فون آپریٹر کے فرائض سنبھالتا ہوں۔ سارے مقدمات مع مؤکلوں کے بھاڑ میں جائیں۔ ان کے لیے پھر وقت ہی کہاں ہوگا۔"

"یار اتنی بڑی جان لیے پھرتے ہو اور حوصلہ ذرا نہیں۔ ہم جیسے دو کے برابر ہو۔" محسن بولا۔

"اور وہ محاورہ درست مان لیا جائے کہ ایک اکیلا اور دو گیارہ تو پھر تم گیارہ کے برابر ہو۔" میں نے کہا۔ "گویا تم منظر الیون ہو۔ ایک ٹیم ہو۔"

"میں کچھ نہیں، الو کا پٹھا ہوں، پاگل کا بچہ ہوں۔"

"یہ تو تمہارے بارہ لخت جگر کہہ سکتے ہیں۔" میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ "تم کو اس انکسار کی کیا ضرورت ہے۔ صبح کا اخبار ضرور پڑھنا۔ آج بھی اور کل بھی۔ اور تم کو یہ دیکھ کر خوشی ہوگی کہ تمہارے دوستوں نے ایک قابل فخر کارنامہ سرانجام دیا ہے اور دنیا ان پر اش اش کر رہی ہے۔ جیل سے فرار ہونے والے دونوں مجرموں کو زندہ گرفتار کر کے ہم پولیس کے منہ پر کالک مل گئے۔ اس کے بعد ہم چلے جائیں گے کراچی۔ یہاں کے معاملات تمہارے سپرد کر کے۔"

"کچھ تمہارے سپرد کچھ رضوی صاحب کے، کچھ شہلا کے۔" محسن بولا۔ "مثلاً میرے بچے کی ماں تم نہیں بن سکتے۔ میرے وکیل تم ہی رہو گے۔"

"کیسا وکیل اور کہاں کا مقدمہ۔ بس تاریخوں پر تاریخ لینا ہی میرا کام رہ گیا ہے۔" منظر نے کہا۔ "عدالتیں بھی کب تک ڈھیل دیں گی۔"

"تمہارا یہ دوست ڈاکٹر شہریار، کس حد تک بھروسے کے قابل ہے۔ تم نے اسے بہت کچھ بتا دیا ہے۔" میں نے کہا۔

"تم اس پر اتنا ہی بھروسا کر سکتے ہو جتنا تمہیں مجھ پر ہے۔" منظر نے کہا۔ "جذباتی اور سر پھرا جوان ہے۔ میری بیوی کے لیے جان دے سکتا ہے۔"

میں اور محسن ہنس پڑے۔ "رقیب کو ابھی تک مقتول نہیں کیا تو نے؟"

"رقیب نہیں... وہ سالا ہے۔" منظر بولا۔ "یہ کچھ فلمی اسٹوری ہے۔ اس کی ایک بڑی بہن تھی جسے شوہر نے قتل کر دیا تھا شادی کی رات۔ بعد میں قاتل کو پھانسی ہوگئی۔ اس صدمے نے ماں کو تقریباً پاگل کر دیا تھا۔ یہاں آئے تو عجیب نفسیاتی مسئلہ پیدا ہوگیا۔ اس کی ماں نے میری بیوی کو دیکھا تو اسے دورہ پڑ گیا۔ شہریار نے بعد میں مجھے بتایا کہ میری گھر والی کی صورت ایک سو ایک فیصد اس کی بڑی بہن کی صورت ہے۔ اس نے کچھ مدد مانگی کہ میری بیوی تھوڑی سی توجہ دے

تو اس کی ملں نارمل ہو جائے گی۔ عورتیں اس معاملے میں بڑی جذباتی اور رقیق القلب ہوتی ہیں۔ تین مہینے میں بڑی بی نے مجھے ریگولر داماد کا درجہ دے دیا ہے اور اب ذہنی طور پر مطمئن ہیں کہ یہ بارہ بچوں کی ملں اسی کی بیٹی ہے۔ اتنے سارے نواسے نواسیاں مفت میں مل گئے اور یہ لڑکا شہریار بھی کہتا تو خود کو نارمل ہے مگر وہ بھی باجی کے چکر میں ایسا پڑا کہ اب دونوں بہن بھائی ایک دوسرے پر جان چھڑکتے ہیں اور بات وہی ہے کہ جورو کا بھائی اک طرف۔ بیوی اپنی محبت کو پہلے بارہ بچوں میں تقسیم کرتی تھی اور بچی کھچی محبت مجھے مل جاتی تھی۔ اب یہ ایک خلائی فوجدار مزید شامل ہو گیا ہے تو میرا نمبر لائن میں بہت پیچھے ہو گیا ہے۔ تاہم مجھے کوئی اعتراض نہیں میں خود کام میں اتنا الجھا رہتا ہوں کہ بیوی سے محبت خاک کروں اور بیوی تھی جیب بھی۔ اب تو گھر کی ہری بھری کھیتی ہے۔ اچھا ہے اس کا بھائی ہی کچھ محبت کرے۔"

روانی میں منظر خوب بولتا تھا۔ اس کی بات نے ہمیں شہریار کی طرف سے بےفکر کر دیا۔ اسی وقت وہ ہمارے پاس آ گیا۔

"میرا کام تو ختم ہوا۔" وہ بولا۔ "اب کچھ دیر سوتا ہوں۔ صبح پھر آ کے دیکھوں گا۔"

"اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔" میں نے کہا۔ "ہم جا چکے ہوں گے۔"

ڈاکٹر شہریار نے کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔ "اچھا۔ تو پھر میں دوائیں لکھ دیتا ہوں۔" اس نے ہمارے قریب بیٹھ کے ایک کاغذ پر چند سطریں گھسیٹتے ہوئے کہا۔

"ہمیں منظر نے آپ سے متعارف کرا دیا ہے۔" میں نے کہا۔ "وقت ہوتا تو..."

"سارا مسئلہ ہی وقت کا ہے۔" وہ مسکرایا۔ "وقت ہوتے ہوئے بھی اپنا نہیں ہوتا۔ خیر کبھی وقت ملے گا تو بیٹھ کے گپ شپ کریں گے۔ یار زندہ صحبت باقی۔" وہ اٹھا اور اپنے بیگ کے ساتھ باہر نکل گیا۔ کلاک نے ساڑھے تین بجے کا ایک گھنٹا بجایا۔ مجھے انکل رضوی کا خیال آیا۔ کیا وہ اب بھی اسی اندھیرے میں اپنے ضمیر سے کیے ہوئے وعدے کی آبرو نباہنے کے لیے اکیلے بیٹھے ہوں گے۔ ایک بااختیار افسر کتنا بے اختیار ہو گیا۔ صرف اپنے آپ کو مقامِ انسانیت پر رکھنے کے لیے۔ انھوں نے رضاکارانہ طور پر چار گھنٹے ایک ایسی جیل میں گزارنا قبول کیے جس کی نہ دیواریں ہیں نہ سلاخوں والے مقفل دروازے نہ پہرے دار ہیں اور نہ نگراں۔ اگر انھوں نے ضمیر کی زنجیر توڑ دی ہوتی تو اب تک یقیناً اپنی سپاہ کے ساتھ حملہ کر چکے ہوتے۔ ان سے بنیادی نظریاتی اختلاف رکھنے کے باوجود میرے دل میں ان کے لیے احترام کا جذبہ پہلے سے زیادہ روشن ہو گیا۔

"ہمارے پاس تقریباً ستائیس ہزار روپے نقد ہیں۔" میں نے کہا۔ "ایک گھر میں ہم نے پندرہ سیر سونا دفن کر رکھا امانت ہے لیکن جس کی وہ امانت ہے وہ خود ہم میں سے ایک ہمیں اس مدفون خزانے کی ضرورت نہیں۔ یہ بتاؤ رابعہ کے ... میں نقد رقم کتنی ہے؟"

"اب تو شاید... ایک لاکھ۔ یا کچھ کم ہو گی۔" منظر ...

"وہ رقم ہمیں مل سکتی ہے؟" میں نے کہا۔

"ہاں... رابعہ کے دستخط کیے ہوئے دو چیک میرے پاس پڑے ہیں۔"

"کل یہ رقم نکلوا لو۔" میں نے کہا۔ "اس نے ایک ... خسرو جمشید کو بھی تھی؟"

"وہ رقم دوسرے اکاؤنٹ میں ہے۔ اس کا میرے ... کوئی چیک نہیں اور اچھا ہے کہ وہ چار لاکھ پڑے رہیں ... بولا۔ "کبھی تم لوٹ کر آئے اور اپنا گھر بسایا تو کام آئیں گے۔"

"ایک لاکھ میں تم سے کل لے لوں گا۔" میں نے کہا۔ "... ہم چلتے ہیں۔"

ڈاکو پاٹے خاں اور گورا ڈاکو بے ہوشی کی نیند میں تھا ... میں نے اور محسن نے جیپ میں ڈالا۔ جیپ میں پچھلا ... تھی کہ دو افراد کو لٹایا جا سکتا۔ چنانچہ وہ کچھ اوپر کچھ نیچے ... سنبھالا اور میں نے منظر کو خدا حافظ کہا۔ اس نے ہمارے ... سے مسائل حل کر دیے تھے۔ وہ شور ضرور مچاتا تھا ... کسی کام سے نہیں کرتا تھا۔ بزدل نظر آتا تھا مگر دلیر تھا کہ ... دوستوں کی مدد کرتے ہوئے ذرا نہیں ڈرتا تھا اور بالکل بےپروا ... تھا کہ اس طرح خود اس کی پوزیشن قانون کی نظر میں خراب ہو ... فولادی شکنجے سے نجات پانے کا مسئلہ ابھی باقی تھا ... ایسے بہت سے چھوٹے چھوٹے مسائل کے لیے ایک ... مہلت کافی تھی۔

"دن کے اجالے میں اس جیپ کو لے کر پھرنا خطرناک ہو گا۔" میں نے کہا۔ "تو مجھے ڈیرہ غازی خان پہنچا کے اس ... سمیت روپوش ہو جا۔"

"جیپ کو کہاں لے جاؤں؟" محسن بولا۔

"یہ سوچنے کی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "رضوی صاحب تو صبح ہنگامی حالت کا اعلان کر دیں گے۔ وہ کوئی جگہ نہیں چھوڑیں گے جہاں ہمارے ملنے کا ذرا بھی امکان ہو گا۔"

"ہم اس پر کور ڈال کے اسے کہیں بھی کھڑا کر سکتے ..."

میں نے اس تجویز کو پسند کیا۔ "مگر کور کہاں ہے؟"

"بہت سی گاڑیوں پر کور ہو گا۔ جو کسی گیراج میں نہیں ... گی۔ ہر گھر میں اتنی گنجائش نہیں ہوتی۔" محسن بولا۔ "گلی سڑک ... گیراج استعمال کرنے والے سب کار مالکان کے ... ڈال ... "مطلب یہ کہ ہم ایک کور چرائیں گے؟"

"ہم کور کے نیچے سے کار بھی چرانے کا حوصلہ رکھتے ہیں لیکن ... کئی بار کر چکے ہیں؟" محسن نے کہا۔ "ایک کور چوری ہونے سے کار والا مر نہیں جائے گا۔ وہ دوسرا کور خرید لے گا۔ ایک کور اس کی طرف سے ہم آرائیں کو عطیہ برائے جنگ تحفظِ آزادی۔"

کور آسانی سے مل گیا اور آسانی سے اتار بھی لیا گیا۔ مسئلہ اب یہ تھا کہ جیپ کو کہاں کھڑا کیا جائے اور محسن اپنے دونوں قیدیوں کے ساتھ کہاں چھپ کر رہے۔ خود مجھے اس وقت غازی خان کے گھر پہنچنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ پہلے خود اس کی خواہش کے مطابق اکیلا جاؤں اور اسے بیوی کی آنکھوں کے آپریشن کے لیے تین ہزار روپے دوں۔ میرا غالب کو ساتھ لے جانا اور اس کی اندھی بیوی کی تیمارداری میں دینا ایک طرح کا سودا ہو جاتا۔ غازی خان مشکل میں پڑ جاتا۔ وہ تین ہزار لینے سے انکار کرتا اور غالب کی ذمے داری بھی بڑی خوشی سے قبول کرتا۔ تین ہفتے تک اس کی دیکھ بھال کرنے کے بعد وہ محسوس کرتا کہ اس نے کسی حد تک احسان کا بدلہ چکا دیا ہے مگر اسے یہ خیال بھی آ سکتا تھا کہ ہمارے تین ہزار دینے کا مقصد ہی اس کے گھر کو استعمال کرنا تھا۔ غالب کے پاؤں میں اٹکے ہوئے شکنجے کو دیکھ کر اس کے دل میں شک پیدا ہو سکتا تھا اور اگر اسے رازداری سے شکنجے کو کاٹنے کا انتظام بھی کرنا پڑتا تو وہ سمجھتا کہ وہ کام غلط تھا۔ اتنا ہی غلط جتنا جیل سے فرار ہونے والے کی ہتھکڑی بیڑی کاٹنا۔ ہمارے تین ہزار روپے رشوت بن جاتے۔ میں ایک نیکی کو رشوت بنا کے خراب کرنا نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ میں سوچ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔

اس کا حل مجھے فوراً مل گیا۔ میں نے گھڑی دیکھی تو چار بج کے پندرہ منٹ ہوئے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ابھی پینتالیس منٹ تک ہم ایس ایس پی ضامن رضوی صاحب سے محفوظ تھے۔ ابھی وہ گھر نہیں پہنچے ہوں گے تو ان کی بیگم بھی رات آنکھوں میں کاٹ رہی ہوں گی۔ شہلا بھی تشویش کے باعث جاگ رہی ہو گی۔ ان سے بات کرنے کا یہ بہترین وقت تھا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا۔

یہ خیال آتے ہی میں نے جیپ کو روک لیا۔ سڑک تا حدِ نظر بالکل سنسان پڑی تھی اور ہم ایرمال کے علاقے میں تھے۔ گشت کرنے والی پولیس کی نظر سے محفوظ رہنے کے لیے میں اندر کی سڑکوں کے راستے دالٹن کی طرف جا رہا تھا۔ ادھر ادھر نگاہ ڈالنے پر مجھے ٹیلی فون کے کئی کھمبے دکھائی دیے۔ سب سے محفوظ کھمبا وہ تھا جو ایک کوٹھی کی پشت اور ایک درخت کے درمیان آ گیا تھا۔ میں نے جیپ میں سے اپنا پورٹیبل فون اٹھایا جو ایک حرام خور اور دوسرے کی طرف سے ملنے والا بہترین تحفہ تھا۔ اس کی افادیت اب تک متعدد بار ثابت ہو چکی تھی۔

انکل رضوی کے گھر کا نمبر ملتے ہی پہلی گھنٹی پر ریسیور اٹھا لیا گیا۔ "ہیلو۔" میں نے آنٹی کی آواز سنی۔

"آنٹی! صبح بخیر۔" میں نے کہا۔ "سکندر بخت عرض کر رہا ہوں زمین سے دس فٹ کی بلندی سے۔"

"تم آدمی ہو کہ بھوت؟" انھوں نے کہا۔ "خواہ مخواہ پریشان کرتے ہو اور وقت بھی نہیں دیکھتے۔"

"آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔" میں نے کہا۔ "بھوت جانتا ہے کہ آپ کو دو فکریں لاحق ہیں۔ پہلی اپنے شوہر نامدار کی۔ وہ بالکل خیریت کے ساتھ صبح ساڑھے پانچ اور چھ بجے کے درمیان گھر پہنچ جائیں گے۔"

"یہ تم کیسے جانتے ہو؟"

"آنٹی... میں دنیا کو ذرا بلندی سے دیکھ رہا ہوں۔ میری نظر میں وہ ہے جسے آپ کی نظر نہیں دیکھ سکتی۔" میں نے کہا۔ "دوسری فکر آپ کو میری طرف سے ہے تو آپ اطمینان رکھیں۔ میں ابھی آپ سے بات کرنے کے بعد زمین پر خیریت کے ساتھ ایسے ہی اتر آؤں گا جیسے چاند پر قدم رکھنے کے بعد نیل آرمسٹرونگ واپس زمین پر اترا تھا۔ دونوں فکریں ختم... اب آپ بیگم مسماۃ شہلا زوجہ محسن حسن خان شیروانی کے حوالے کیجیے۔"

وہ ہنسنے لگیں۔ "جب تم ایسی بک بک کرتے ہو تو مجھے ہنسی بھی آتی ہے اور میں اداس بھی ہو جاتی ہوں۔ تم ہمارے ساتھ ہوتے تو... خیر... بات کرو شہلا سے۔"

"بی بی شہلا! کیا حال ہے؟"

"اچھی ہوں بھائی جان!" وہ بولی۔

"اچھی؟ ارے تم بہت اچھی ہو۔" میں نے کہا۔ "یہ بتاؤ اکیلی ہو؟"

"نہیں۔ آنٹی ہیں میرے ساتھ۔"

"اچھا تو میری بات دھیان سے خاموش رہ کے سنو۔" میں نے کہا۔ "تم میری بات سننے کے بعد جولی اور کیتھرین کے پاس جاؤ گی۔ ان سے کہنا کہ وہ اسی وقت گھر سے نکل آئیں۔ اس طرح کہ کسی کو معلوم نہ ہو۔ ہمیں ان کی اشد ضرورت ہے۔ ہم باہر نہر کے کنارے کھڑے ملیں گے۔ وہ نہر کی طرف روانہ ہو جائیں۔ اپنے ساتھ کچھ بھی لانے کی ضرورت نہیں۔ جولی کی صحت ٹھیک ہے نا؟"

"جی ہاں۔" شہلا نے کہا۔

"پھر تو وہ پیدل چل سکتی ہے۔ وہ پندرہ بیس منٹ میں نہر تک پہنچ جائیں گی۔ اتنی دیر میں ہم بھی پہنچ جائیں گے۔"

"ہم کون؟"

"ارے بھائی میں اور تمھارا میاں... صاف پوچھو نا۔" میں

نے کہا۔" اس نے بھی ایک پیغام دیا تھا مگر وہ اتنا رومانٹک ہے کہ مجھے شرم آتی ہے' وہ ساری باتیں دُہراتے...."

"آپ بہت تنگ کرتے ہیں مجھے...."

"ارے سنو بابا... فون مت رکھ دینا۔" میں نے کہا۔" جولی اور کیتھرین سے کہنا کہ ہوشیاری سے کام لیں۔ کل سے راستے بند ہو جائیں گے۔ شاید گھر پہ دوبارہ گارڈ آ جائے گی اور فون بھی ٹیپ ہوگا۔ لیکن ہم تم سے بات کرتے رہیں گے۔ ممکن ہے' کل ہم کراچی چلے جائیں۔ نازو اور اکرام شیخ کے پاس۔"

"بھائی جان! رابعہ باجی اور ٹیڈی بھائی کی کوئی خبر...."

"نہیں، ہم جا کے ان کی خبر لیں گے۔" میں نے کہا۔" اور تم کو اطلاع دیں گے۔ یہاں تم منظر سے رابطہ رکھنا۔ تم کو ہمارے بارے میں معلوم ہوتا رہے گا۔ اچھا اب خدا حافظ۔"

میں نیچے اتر آیا اور پھر جیپ میں جا بیٹھا۔ میں نے محسن کو اپنی گفتگو کے متعلق بتایا۔" میں نے پروگرام بدل دیا ہے۔"

"اب کیا پروگرام ہے؟" محسن بولا۔

"جولی اور کیتھرین کے ساتھ اب ہم ایک گھر کرائے پر حاصل کریں گے۔" میں نے کہا۔" مکمل صحت یابی تک غالب اسی گھر میں ان کے ساتھ رہے گا۔ اگر ان تین ہفتوں یا ایک ماہ کے عرصے میں کسی کو واپس آنا پڑا تو یہ گھر اس کے لیے ایک ٹھکانا ہوگا۔ مجھے یہ بھی امید ہے کہ اس عرصے میں رابعہ اور ٹیڈی کا سراغ مل جائے گا۔ پھر ہم سب اکٹھے ہو جائیں گے۔"

تقریباً پونے پانچ بجے جب ہم نہر کے بائیں کنارے پر ایک درخت کے پیچھے دبکے ہوئے کھڑے تھے' میں نے پہلے کیتھرین کو اور پھر جولی کو نمودار ہوتے دیکھا۔ کیتھرین اور اس کی بیٹی کی عمر میں دو اور ایک کی نسبت ضرور ہوگی۔ یعنی ماں کی عمر بیٹی کے مقابلے میں دُگنی تھی لیکن یہ فرق زیادہ محسوس نہیں ہوتا تھا۔ وجہ یہی تھی کہ جسمانی ساخت کے اعتبار سے کیتھرین دبلی پتلی تھی' اس کے آفتابِ حسن کی ڈوبتی کرنوں میں وہی دلکشی کا رنگ تھا جو بیٹی کی جوانی کے طلوع ہوتے سورج کی شفق میں۔ دونوں کے نقوش میں حیرت انگیز مماثلت تھی چنانچہ انھیں پانچ سات سال کے فرق سے چھوٹی بڑی بہن سمجھا جا سکتا تھا۔ جولی کو میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ لیمپ پوسٹ کی روشنی میں تھی اور اپنی ماں سے چند قدم پیچھے چلتی ہماری طرف آ رہی تھی۔ کیتھرین کی نگاہیں پُرتجسس انداز میں دائیں بائیں دیکھ رہی تھیں۔

میں اچانک ان کے سامنے آ گیا۔" ہیلو آنٹی کیتھرین... صبح بخیر...."

وہ چونک کر رکی۔" اوہ مین... تم نے تو مجھے ڈرا دیا۔"

میں ہنس پڑا۔" آپ کسی سے ڈرنے والی نہیں ہیں...."

"ٹائم ٹائم کی بات ہے ڈیئر۔" وہ بولی۔" جب میں اکیلی تھی اور مجھے یقین تھا کہ میں اکیلی رہ جاؤں گی۔ آئی مین مجھے یہ یقین تو تھا کہ مجھے جولی کے لیے بھی زندہ رہنا پڑے گا۔ تب میں واقعی نہیں ڈرتی تھی۔"

"اور اب جولی نے آپ کو ڈرنا سکھا دیا ہے؟" میں نے کہا۔

"یہ تو ہوتا ہے سکندر... آدمی رشتوں کے ٹوٹنے سے' تعلق محبت سے ڈرتا ہے جو وہ دوسروں سے کرتا ہے۔ یا دوسرے اس سے کرتے ہیں۔ خیر چھوڑو یہ بات۔ جولی سے ملو۔" کیتھرین نے کہا۔

جولی نے بے تکلفی سے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔" میں تمھارے بارے میں سب جانتی ہوں۔ ممی جب سے واپس آئی ہیں بہت زیادہ تم لوگوں کی باتیں کرتی ہیں۔ میں تم سب سے اتنی اچھی طرح متعارف ہوں جیسے تمھارے ساتھ رہ چکی ہوں اور تم میں سے ایک ہوں۔"

وہ بڑی روانی سے بات کر رہی تھی۔ اس کے لہجے میں بھی وہی معصومیت تھی جو اس کے چہرے پر عمر کی ناتجربے کاری کی دلیل بن کر پھیلی ہوئی تھی۔ اسے اپنے حسن کے اعتبار سے کوہ قاف کی پری یا مس یونیورس نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ غیر جانبداری سے کام لیا جائے تو نازو بہ لحاظِ حسن سب سے اوپر تھی۔ پھر رابعہ کا نمبر آتا تھا' اس کے بعد جولی ان سب سے کم حسین تھی۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بدصورت تھی۔ اس کے چہرے کے نقوش بہت تیکھے تھے۔ اس کی ملاحت میں ملاحت سے زیادہ رعنائی تھی اور ایک دلنواز جاذبیت تھی جسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے ایک طویل عرصہ بیماری میں زندگی کے لیے جدوجہد کرتے گزارا تھا۔ شفایابی کے باوجود اس کا جسم بیماری کے اثرات سے پوری طرح سنبھلا نہیں تھا۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ نہیں تھی لیکن اس عمر میں جو صحت مندی شباب کے ساتھ آتی ہے' وہ دب گئی تھی۔ اس کا رنگ بھی اسی لیے کچھ بُجھا بُجھا سا لگتا تھا۔ یہ بات یقینی تھی کہ جیسے جیسے وقت گزرے گا اس کی صحت میں بہتری آئے گی۔ اس کے رنگِ شباب میں شوخی اور چمک آئے گی۔ اس کے رخسار بھر جائیں گے تو گلابی ہوں گے اور مجموعی طور پر وہ نسوانی دلکشی میں کسی سے کم نہ رہے گی۔ ابھی صرف اس کا لہجہ شوخ اور جوان تھا۔ اس نے اسکرٹ پہن رکھا تھا اور بال شانوں پر دو چوٹیوں کی شکل میں نظر آ رہے تھے۔ اس سے وہ بالکل اسکول گرل لگتی تھی۔

"بہت دیکھ لیا میری بیٹی کو۔" کیتھرین نے کہا۔" نظر مت لگا دینا۔"

میں چونک پڑا۔" کبھی بھائیوں کی نظر بھی لگتی ہے بہنوں کو۔ دراصل اب تک نام ہی نام سنا تھا۔ آج دیکھا تو عجیب سا لگا کہ یہی وہ لڑکی ہے جس نے موت کو شکست دی۔ دیکھنے میں تو بہت چھوٹی سی اور کمزور سی اسکول گرل لگتی ہے مجھے۔"

جولی ہنسنے لگی۔" موت کو میں کیسے شکست دے سکتی تھی۔

میرے ساتھ تم جیسے بھائی تھے۔ ان کی محبت تھی' ان کا خلوص تھا۔ اماں کی دعائیں تھیں۔"

"کیا تم اکیلے ہو؟" کیتھرین نے کہا۔

"نہیں، محسن آپ کا منتظر ہے۔" میں نے پیچھے اشارہ کیا۔

"کیسے بیوقوف آدمی ہو۔ یہاں کھڑے باتیں کیے جا رہے ہو۔ چلو یہاں سے اور مجھے بتاؤ کہ اس طرح رات کے وقت میں گھر سے بے گھر کیوں کیا۔" کیتھرین نے چلتے ہوئے کہا۔

"وہ آپ کا گھر تو نہیں تھا آنٹی۔" میں نے کہا۔

"میرا گھر تو اب کہیں بھی نہیں ہے۔" وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

"کیوں؟ آپ کا ایک گھر تھا تو...."

"تھا... جب گھر والا تھا تو واقعی گھر تھا۔ اس کے بعد بھی میں نے اُسے گھر سمجھا کیونکہ اس کی یاد بہرحال میرے ساتھ تھی۔" وہ بولی۔" اب کچھ بھی نہیں ہے۔ جو بچا تھا' وہ ڈاکو لے گئے۔ صرف دیواریں چھوڑ گئے۔"

"کون ڈاکو...؟"

"وہی ڈاکو جو دن دہاڑے لوٹتے ہیں۔ کبھی قانون کے محافظ بن کے تو کبھی دوستی کا لبادہ اوڑھ کر۔" کیتھرین نے کہا۔" شرافت کے ٹھیکیدار بن کر یا خدائی فوجدار بن کر۔ کچھ لوگوں نے درخواست دے رکھی تھی کہ یہاں ایک فاحشہ رہتی ہے جو خود بھی پیشہ کرتی ہے اور اپنی بیٹی سے بھی پیشہ کراتی ہے۔ ان سب کا پیشہ ہی یہ ہے... عزتوں کو اچھالنا اور عزتوں سے کھیلنا۔ معلوم نہیں پہلے کون اندر گھسا۔ کس نے چادر اور چار دیواری کا تقدس پامال کیا۔ پولیس نے یا اخلاق اور کردار کے ان خود ساختہ ٹھیکیداروں نے۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ کون پہلے گھسا اور کون بعد میں۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ سب کچھ لے گئے۔ وہاں تھا بھی کیا۔ وہ امیر تو نہیں ہوگئے ہوں گے' بلکہ ان کو بہت مایوسی ہوئی ہوگی' جو اس یقین کے ساتھ آئے ہوں گے کہ بہرام دادا جیسے شخص نے گھر میں قارون کے خزانے چھپا رکھے ہوں گے۔ سارا مالِ غنیمت زر و جواہر کی شکل میں گاڑ رکھا ہوگا۔ اسے دنیا ڈاکو کہتی تھی۔" کیتھرین تلخی سے ہنسی۔" زمانے کا اب یہی چلن ہے۔ ڈاکو کو ڈاکو کہنے کی ہمت کسی میں نہیں رہی مگر ڈاکو جسے ڈاکو کہیں' وہ ڈاکو ہو جاتا ہے۔ بنا دیا جاتا ہے اور مشہور ہو جاتا ہے۔ ان کمینے چوروں نے میری عدم موجودگی میں گھر کا فرش کھود کے رکھ دیا۔ شاید وہ رات کو وہاں مدفون خزانے تلاش کرتے رہے۔ انھوں نے دیواروں کو اُدھیڑ دیا۔ سارا سامان تو وہ پہلے ہی لے گئے تھے۔ انھوں نے فرنیچر کو بھی توڑ پھوڑ کے دیکھا ہوگا کہ کس کس کھوکھلے خانے میں ہیرے ہیں اور کس خفیہ دراز میں موتی۔ آدمی کے لالچ کی تصویر دیکھنا ہو تو میرے گھر کی دیواروں پر دیکھو۔"

وہ یکلخت چپ ہوگئی کیونکہ محسن ایک زیرِ تعمیر کوٹھی کے احاطے سے جیپ لے کر نکل آیا تھا۔

ایک بار پھر تعارف کی رسم ادا ہوئی اور جولی نے اسی بے تکلفی سے محسن سے ہاتھ ملایا اور محسن سے ایسے ملی جیسے بھائیوں سے برسوں کی بچھڑی ہوئی کوئی بہن ملے۔ مجھے کیتھرین سے اظہارِ افسوس کا موقع بھی نہ ملا تھا مگر شاید اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ الفاظ کھوکھلے بھی ہوتے ہیں۔ جو دکھ مجھے اس کے گھر کی تباہی کا حال سن کے ہوا تھا' وہ کھوکھلا نہیں تھا۔ آخر قدرت کیا چاہتی ہے۔ وہ سب بے گھر اور جلاوطن، لاوارث اور بے آسرا لوگوں کو ملوا رہی ہے۔ سب کے گھر اسی طرح تباہ کیے گئے۔ جلائے گئے۔ لوٹے گئے یا برباد ہوئے۔ ہر کہانی الگ تھی مگر انجام ایک تھا۔ میرا گھر جو وزیر خان نے بنایا' چوہدری دلاور اور شرافت علی جیسے لیڈروں نے چھینا۔ رابعہ کا گھر اندھی تشکاری گرگوں نے بم سے اُڑا دیا۔ ٹیڈی ملا تو اس نے بتایا کہ کس طرح اس کا ہنستا بستا گھر متعصب' تنگ نظر اور جاہل... شیطان صفت انسانوں کے ہاتھوں تاخت و تاراج ہوا۔ غالب کے گھر کی بربادی کا قصہ پرانا بھی تھا اور نیا بھی۔ تازہ ترین واردات کیتھرین پر گزری تھی۔ میں یہ سوچنے پر مجبور تھا کہ خدا ہم سب بے گھروں کو اکٹھا کر کے کیا دے گا۔ ہمارے حوصلے آزمانے کے بعد ہمارے صبر کا انعام؟ سب کے لیے ایک ایک نیا گھر۔ نئی خوشیوں کی ضمانت کے ساتھ۔ نئی امیدوں کی روشنی کے ساتھ۔

"مہاراج... گیان دھیان بس کرو۔" محسن نے میری آنکھوں کے سامنے چٹکی بجائی۔ میں پھر چونک پڑا۔ یکلخت مجھے احساس ہوا کہ میں بہت زیادہ سوچنے لگا ہوں۔ مجھے ذہنی طور پر غیر حاضر ہونے کی بیماری سی ہوگئی ہے۔ گزشتہ چند دن میں بار ہا ایسا ہوا تھا۔

"اب جیپ میں جگہ نہیں ہے۔" محسن نے کہا۔" اور پانچ بجنے والے ہیں۔"

"گویا خطرے کی گھڑی آ گئی ہے۔" میں نے کہا۔

"خطرہ کیسا؟" جولی نے کہا۔

میں ہنسنے لگا۔" خطرہ تو بس خطرہ ہوتا ہے بے بی... ایسا ویسا کچھ نہیں۔ اور ہم تو خطرات کے سمندر میں جینے والی وہ مخلوق ہیں جس نے تحفظ کی زمین چھوڑ دی ہے۔ ہمارے ساتھ رہو گی تو سمجھ جاؤ گی کہ خطرہ اب ہماری سرشت میں شامل ہو چکا ہے اور جیسے مچھلی بغیر پانی کے نہیں رہ سکتی' ایسے ہی شاید ہم خطرے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔"

"پھر کیا یہیں فوت ہونے کا ارادہ ہے؟" محسن جھنجھلا کے بولا۔

"خان صاحب! آپ اب وہی کریں جو ہم اس قسم کے حالات میں کرتے آئے ہیں۔" میں نے کہا۔" اپنے وسائل پیدا کرو۔ میں جاتا

ہوں ایمبولینس لے کر۔"

"ایمبولینس! کہاں ہے ایمبولینس؟" جولی نے کہا۔

"اس جیپ میں تین زخمی اور بے ہوش ہیں۔ اسے ایمبولینس ہی سمجھو۔" میں نے کہا۔ میں پھر محسن سے مخاطب ہو گیا۔ "جولی اور کیتھرین کے ساتھ تم خاصے معتبر نظر آؤ گے۔ کسی سے لفٹ لے لو۔ کچھ ہی دیر میں گاڑیاں چلنے لگیں گی۔ میں دونوں جنگی قیدیوں کے ساتھ اپنے آبائی گھر میں پہنچتا ہوں۔"

"اب تو وہ آبائی گھر ہے، میری آپا کا۔" محسن بولا۔ "مگر عزیزم کیا وہاں جانا خطرے سے خالی نہیں؟"

"ہمیشہ کی طرح تم نے احمقانہ سوال کیا عزیزم۔" میں نے کہا۔ "خطرے سے کون سا گھر خالی ہے۔ کون سا راستہ محفوظ ہے اور کس سمت میں خطرہ نہیں ہے؟ وہ گھر میرا دیکھا بھالا ہے۔ میں پچھلی طرف سے اندر جا کے جیپ کو پرانے گیراج میں بند کرنے کی کوشش کروں گا اور تمھارا انتظار کروں گا۔ ڈائریکٹ مت آنا۔"

"سیدھی راہ چلنا ہم بہت پہلے چھوڑ چکے۔ اب چال ہی ٹیڑھی ہو چکی ہے؟" محسن نے کہا۔ "آپ فوراً تشریف لے جائیں اب۔"

میں ویران پڑے ہوئے تاریک گھر میں گیا اور جیپ اسٹارٹ کر کے نکل آیا۔ محسن اب کیتھرین اور جولی کے ساتھ نہر کے کنارے کنارے جا رہا تھا۔ میں ہاتھ ہلا کے گزر گیا۔ اپنے سامنے میں نے ایک گاڑی کی ہیڈلائٹس کو بہت دور سے ڈپ ہوتے دیکھا... جواباً میں نے بھی ڈپر دبایا۔ چند منٹ کے بعد جب میں دو فرلانگ دور آ چکا تھا، وہ گاڑی میرے قریب سے گزری۔ یہ ایئرپورٹ کی جانب سے آنے والی ٹیکسی تھی۔ تیز رفتاری کے باعث میں دیکھ نہ سکا کہ ٹیکسی میں مسافر بھی تھے یا نہیں۔ اگلے تین میل کی مسافت طے کرتے ہوئے مجھے کوئی گاڑی نہیں ملی۔ میں نے آسمان کو دیکھا جس پر ستاروں کے کارواں کا سفر آخرِ شب کی منزل پہ تھا۔ ستارۂ سحری کی تابندگی نے مجھے رابعہ کی یاد دلائی۔ دل میں بیتی ہوئی صبحوں کی کسک جاگ اٹھی۔ ایسی کتنی صبحوں کا درد میرے دامنِ خیال میں تھا۔ جب اس کی اور میری نظر نے ایک ساتھ صبح کے تارے سے امید کی روشنی لے کر اپنے خوابوں میں بھر لی تھی اور اس کی ہر کرن کے ساتھ افق تک سفر کیا تھا جہاں سے امید کی یہ مشعل نئے دن کی نقیب بن کر آنے والی سورج کی پہلی کرن نے لے لی تھی۔ اب وہ کہاں ہو گی؟ مایوسی اور ناامیدی میں اس کے لیے ہر لمحہ کتنا پُرعذاب گزرا ہو گا۔ خیالوں اور خوابوں کی بے وفائی نے اس کے ہر زخمِ تمنا پر کتنے انگارے رکھے ہوں گے۔

میں نے سر کو جھٹکا اور رابعہ کے خیال کو دل سے جدا کر دیا۔ اپنے اختیار میں کچھ نہیں تو پھر سوچ کے کانٹے چُن کر اپنی ہی راہوں

پر ڈالنے سے کیا حاصل۔ یہ سفر جاری رہنا چاہیے خواہ اس کی [illegible] کبھی ختم نہ ہونے والی وصل کی شب ہو یا دائمی فرقت کی شب [illegible] جذبۂ عشق سلامت رہنا چاہیے۔ پھر غم کیسا۔ اس دنیا میں [illegible] تو دوسری دنیا میں کون چوہدری دلاور ہو گا جو ملنے سے روک [illegible]

افق پہ صبحِ کاذب کے آثار ہویدا تھے کہ میں نے جیپ [illegible] اپنے ماضی اور مستقبل کے گھر میں روکا۔ یہ احساس بہت عجیب [illegible] کہ یہ پہلے میرا گھر تھا۔ پھر یہ میرا نہ رہا اور آج بھی ایک جذباتی [illegible] سوا اس گھر کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہ تھا۔ بے شک اب اس [illegible] حقِ ملکیت کا خیال امید دیتا تھا کہ ایک دن پھر یہ میرا گھر ہو گا [illegible] اور رابعہ کا گھر۔ وزیر خان مرحوم نے اسے اپنے بیٹے اور بہو کے لیے [illegible] چاہا تھا مگر اس کے خواب بھی ڈاکو لے گئے اور مرتے وقت [illegible] دامنی کے دکھ کے ساتھ دنیا سے گیا۔ کاش کوئی اسے بتا سکتا [illegible] خواب جو آج جھوٹے ہو گئے، اپنے دامن میں سچ کی تعبیر رکھتے [illegible] اور یہاں بالآخر تمھارا بیٹا اور بہو اسی طرح آباد ہوں گے جیسے [illegible] سوچا تھا۔ وہ جلاوطن خوشیوں کے ساتھ لوٹ کر ضرور آئیں گے مگر اسے کون بتاتا۔ آدمی کا احساس، ماضی سے گزر کر حال کی سرحد پر رک جاتا ہے۔ مستقبل ایک دیوار کے دوسری طرف رہتا ہے جس سے نظر کو گزرنا نہیں آتا۔

پچھلی طرف سے میں نے ایک ٹوٹے ہوئے شیشے میں ہاتھ ڈالا اور انگلیوں کی مدد سے ٹٹول کر چٹخنی تلاش کی جو عرصہ دراز سے بند رہنے کے باعث چٹخنی جام ہو گئی تھی۔ میں نے دروازے کو تھوڑا سا ہلایا اور چٹخنی کو نیچے کھینچنے میں کامیاب ہوا۔ دروازہ کھلا تو ایک عجیب سی مہک نے میرا استقبال کیا۔ یہ برسہا برس تک تنہائی میں رہنے والی یادوں کی مہک تھی اور محبوس ہوا کی خوشبو تھی۔ خانہ ویرانی کی اداس کر دینے والی خوشبو تھی اور درد کی خوشبو جسے صرف میرا دل پہچانتا تھا۔ میں چند منٹ ساکت و صامت کھڑا ویران دیواروں میں مقید اندھیرے کو دیکھتا رہا جس پر پرچھائیاں سی متحرک محسوس ہوتی تھیں۔ میرے والد کے بہت سے روپ سامنے آئے اور اسی اندھیرے میں کھو گئے۔ میں نے اس بوڑھے ریٹائرڈ سیشن جج کا ایک رحمی سایہ بھی دیکھا جس نے اپنی عمر کے آخری دور میں یہاں وقت کی قید اسی طرح کاٹی تھی جیسے معزول اور جلاوطن شہنشاہِ ہند بہادر شاہ ظفر نے رنگون میں اس کی آواز آج میرے گھر کے سناٹے میں گونج رہی تھی۔ دو گز زمین نہ ملی کوئے یار میں۔ نہ وزیر خان کو، نہ اس بوڑھے جج کو۔

ایک بار پھر میں نے بھٹک کر آوارہ پھرنے والے ذہن کو اسیر کیا اور آگے بڑھا۔ دوسرے اور تیسرے کمرے سے ہوتا ہوا میں گیا اور [illegible] کر باہر آ گیا۔ ایک ایک کر کے میں نے تینوں زخمی اور بے ہوش افراد کو اٹھایا اور اندر لے گیا۔ غالب کا بخار ٹوٹ چکا تھا اور جب میں نے

اسے اٹھایا تو ایک ہاتھ سے مجھے وہ شکر بھی تھامنا پڑا جو ڈاکٹر شہریار نے بہت اوپر ایک پٹی کے ساتھ باندھ دیا تھا تاکہ اس کی حرکت سے نیچے کا حصہ زیادہ متاثر نہ ہو۔ پھر بھی احتیاط لازم تھی۔ میں نے غالب کو باقی دو افراد سے الگ ایک کمرے میں لٹا دیا۔

"سکندر..." اس نے آہستہ سے مجھے پکارا۔

"میری جان غالب۔" میں نے اس کے گالوں پر تھپکی دی۔ "میں ابھی آتا ہوں۔"

"کیوں... کہاں جا رہے ہو تم... مجھے چھوڑ کر..."

"کہیں نہیں۔ تم کو چھوڑ کے میں کہاں جا سکتا ہوں۔ تم بالکل محفوظ ہو۔ اسی طرح لیٹے رہنا۔ میں دو منٹ میں آیا۔" میں نے کہا اور باہر آ گیا۔

پرانا گیراج عمارت کے دائیں جانب تھا اور اس کا گیٹ لکڑی کا تھا، پرانی وضع کے بھاری کواڑوں والا۔ اس زمانے میں یہ اسٹیل شٹر نہیں تھے جو اوپر سے نیچے کھینچ لیے جاتے ہیں۔ اس دروازے کو توڑنے یا دھکا دے کر کھولنے کی کوشش کرنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا مگر اسے قفل کے بغیر دیکھ کر مجھے بہت اطمینان حاصل ہوا۔ اس میں تالا کون لگاتا اور کیوں لگاتا۔ زنگ خوردہ کنڈی سے کواڑ بند کر دینا کافی سمجھا گیا تھا کیونکہ اندر کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے باری باری دونوں کواڑ کھولے۔ قبضوں میں تیل نہ ہونے کے باعث صدائے احتجاج بلند ہوئی۔ میں لوٹ کر جیپ تک آیا اور اسے ڈرائیو کر کے سیدھا گیراج میں لے گیا۔ اس کے ایک گوشے میں کچھ کاٹھ کباڑ پڑا رہ گیا تھا جس میں ایک پرانا ناکارہ ٹائر بھی شامل تھا۔ جیپ کو میں نے کور سے ڈھانپ دیا تاکہ اس کی شناخت کا ایک فیصد امکان بھی نہ رہے۔ ویسے تو یہ بات ہی بعید از امکان لگتی تھی کہ کوئی اس خانۂ ویراں میں آ کے جھانکے گا۔

میں فارغ ہوا ہی تھا کہ سفید رنگ کی ایک ہل مین کار اندر آ گئی جسے محسن چلا رہا تھا۔ میں نے اسے اشارہ دیا کہ پیچھے کی طرف جائے۔ جولی اور کیتھرین کچھ پریشان اور خوفزدہ تھیں، کیونکہ انھوں نے پہلی بار دیکھا تھا کہ ہم راہ چلتے لوگوں سے کار کس طرح چھینتے ہیں۔ محسن نے انھیں خاصی تسلی دی تھی کہ ہم ایسا ضرورت سے مجبور ہو کے کرتے ہیں اور بالآخر کار اس کے مالک کو واپس مل جاتی ہے۔

"یہ وہ گھر ہے جہاں سے میں نے ہوش کا سفر شروع کیا تھا۔" میں نے کہا۔ "میرے والد کو اس گھر تک پہنچنے کے لیے اپنا وطن چھوڑنا پڑا تھا۔ اپنا پورا خاندان قربان کرنا پڑا تھا اور نئے ملک کی سرحد عبور کرنے کے بعد بھی اٹھارہ سال تک جدوجہد کرنا پڑی تھی۔ یہ میرے بچپن کا گھر ہے۔ میری جوانی اس گھر سے باہر گزری مگر اب اسے پھر رابعہ نے خرید لیا ہے۔"

"ہاؤ ونڈرفل..." کیتھرین نے مسرت سے کہا اور جولی کے ساتھ اندر داخل ہو گئی۔ جولی نے عجائبات کی ایک نئی دنیا میں پہلا قدم رکھا تھا۔ ہر قدم پر اس کے لیے ایک سنسنی خیز کہانی تھی۔ ایک حیرانی کا سامان تھا اور نیا تجربہ تھا۔

"غالب کو ہوش آ گیا ہے۔" میں نے کہا۔ "اسے میں یہیں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ دونوں ڈاکو دوسرے کمرے میں ہیں۔ سات ہزار روپے میں لے جا رہا ہوں، چالیس ہزار چھوڑ رہا ہوں۔"

"یہ چارج رپورٹ کیوں دے رہا ہے تو مجھے..." محسن نے کہا۔

"میں تقریباً دو گھنٹے میں واپس آؤں گا۔" میں نے کہا۔ "گاڑی کو کہاں چھوڑوں؟"

محسن نے مجھے ایک ٹیلی فون نمبر دیا۔ "جہاں بھی چھوڑنا پڑے اس نمبر پہ اطلاع کر دینا۔ یونیورسٹی کے ایک پروفیسر کی ہے۔ بہت شریف مگر تھوڑا سا کریک تھا۔ کہتا تھا کہ یہ سب چھینا جھپٹی آخر کیوں ہے؟ کیسے شروع ہوئی۔ پھر خود ہی اپنے سوال کا جواب دینے لگا کہ قصوروار میں ہوں جس نے کار خریدی اور عام لوگوں سے الگ ہوا۔ جو پیدل چلنے والے لوگ تھے۔ ظاہر ہے وہ مجھ سے حسد کرنے لگے اور میرے خلاف ان کے جذبات کو احساسِ کمتری نے ہوا دی۔ پھر وہ میری تحلیلِ نفسی کرتا رہا کہ میرا منفی ردِعمل میری شخصیت پر کیوں غالب آ گیا اور مسلسل بولتا رہا۔ میں کیا بولتا۔ اسے میں نے اسی کی درخواست پہ یونیورسٹی کے نئے کیمپس پہنچا دیا۔ کہہ رہا تھا کہ گاڑی لے جاؤ مگر مجھے ایک ٹیکسی پہلے لا دو۔ کیونکہ میں اتنی دور پیدل نہیں جا سکتا۔ میں نے کہا کہ چلیے میں آپ کو ڈراپ کر دیتا ہوں۔" محسن قہقہہ مار کے ہنسا۔ "کار اس کی اور ڈراپ میں کر دیتا ہوں، ہے نا لطیفہ۔ اس نے بھی جواب میں کچھ نہیں کہا، ورنہ کہتا کہ جناب! مجھے موقع دیجیے کہ میں آپ کو ڈراپ کروں اور گھر جاؤں۔ اترتے اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور بولا کہ گاڑی تو دس بجے تک پہنچا دینا اور بڑے مہذب طریقے سے خواتین کو وِش کر کے چلا گیا۔ گڈ مین دی لائیٹن۔"

"خود باہر نہ جانا۔" میں نے کہا۔ "کیتھرین کو بھیج دینا کسی پاس پڑوس کے گھر میں۔ عورتوں کے لیے مسئلہ نہیں ہوتا۔ وہ کہہ سکتی ہیں کہ ہم نئے آئے ہیں۔ چائے ناشتا وغیرہ لا سکتی ہیں۔"

"اگر پڑوسی اتنے بااخلاق ہوئے تب۔ ورنہ ہم بازار سے منگوا لیں گے۔"

"میں دس بجے تک ضرور آ جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "امید ہے دوپہر کے بعد ہمیں کہیں نہ کہیں کوئی مکان مل جائے گا۔ ایک اور عارضی ٹھکانا جس کو ہم ضرورت کا تھوڑا بہت سامان خرید کر استعمال کریں گے۔ جولی اور کیتھرین وہاں گمنام رہ سکتی ہیں۔ انکل رضوی کے پاس ان کے خلاف کچھ نہیں کہ وہ انھیں تلاش کریں۔ وہ سمجھ لیں گے

کہ دونوں ہمارے ساتھ نکل گئی ہیں۔ غالب کے بالکل ٹھیک ہونے تک اس کا لاہور میں ہی رہنا ضروری ہے۔ میں اور تو کراچی چلیں گے؟"

"ضرور چلیں گے۔ ابھی تو آپ جائیں جہاں جانا ہے۔" محسن بولا۔ "صبح ہو گئی ہے۔ دن بہت مصروف گزرے گا۔ رات کو پھر پریس کانفرنس بلانا ہے۔"

"رات کو ضروری نہیں۔" میں نے کہا۔ "مکان مل گیا تو ہم اُس گھر میں پریس کانفرنس منعقد کریں گے۔ ... کو پولیس کے کسی سینئر آفیسر کی موجودگی میں پیش کریں گے اور پھر ... مجھے یقین ہے کہ انکل رضوی نہیں آئیں گے۔"

والٹن تک پہنچنے میں چالیس منٹ صرف ہوئے۔ خبطی پروفیسر کی گاڑی بھی اس کے مزاج کی آئینہ دار تھی۔ کچھ گاڑی پرانی تھی اور کچھ بے توجہی کا شکار تھی چنانچہ اس کی رفتار تیس میل سے اوپر جاتی تو گاڑی کا سارا ڈھانچہ کپکپانے لگتا تھا۔ خرابی بال جوائنٹس یا ٹائی راڈ کی تھی جو معمولی خرابی تھی لیکن ہم تو کہتے ہیں کہ چلتی کا نام گاڑی۔ جب تک چلتی ہے چلاؤ اور اچانک بیٹھ جائے یا بٹھا دے تو الزام بھی گاڑی کو دو۔ اس ملک کا پروفیسر یا دانشور غریب شمار ہوتا ہے اور ایسی کار رکھ لے تو بہت غنیمت مگر دکھتا ہے تو روز روز کی مرمت کے خرچے پورے کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ نئی کار کے نئے ماڈل کو وہ صرف اشتہار میں دیکھ سکتا ہے۔

کسی سے کچھ پوچھنے کی نوبت نہ آئی۔ چھوٹے لوگوں کے چھوٹے کوارٹرز مجھے دور سے ہی نظر آ گئے۔ یہ گلبرگ کا علاقہ نہ تھا جہاں آدمی ایکس ہی بلاک میں کسی کوٹھی کے نمبر کی تلاش میں بھٹکتا پھرتا ہے اور کس نمبر کے بعد کہ بھتیا کون ہے۔ کوارٹروں کے درمیان دیواریں مشترک تھیں اور فاصلے اتنے کم تھے کہ دل ملتے تھے چنانچہ سب پرانے لوگ ایک دوسرے کو جانتے پہچانتے تھے اور اجنبی کو ایک نظر میں تاڑ لیتے تھے۔ ایک جگہ میں نے حلوائی کی دکان پر پوری کے حصول کے لیے گھمسان کا رن پڑتے دیکھا۔ یہ لاہور کی صبح کا ایک دلچسپ نظارہ ہے۔ بچے بوڑھے ہر قسم کے ڈول برتن لیے اس جنگ میں شریک ہوتے ہیں جو زیادہ سے زیادہ آٹھ بجے تک جاری رہتی ہے۔ پھر دہی ختم ہو جاتا ہے۔ ... برتن بجاتے تصویر یاس بنے لوٹتے ہیں اور حلوائی کونڈے دھو دھلا کے سوکھنے کے لیے قطار میں رکھ دیتے ہیں۔

میں نے گاڑی روکی ہی تھی کہ ایک خشخشی داڑھی والا رضاکارانہ طور پر قریب آ گیا۔ ... ہے او صاب۔" وہ لنگی سے ناک صاف کر کے بولا۔

"مجھے ڈیرہ غازی خان جانا ہے۔" میں نے کہا۔

رضا کار خوشدلی سے ہنسا۔ "اوہ... تیسرا کوارٹر۔" اس نے اشارے سے بتایا۔ "جتھے او کھوتی کھلوتی اے۔ اُس دے نال اے ڈیرہ غازی خان۔"

"مہربانی چاچا جی۔" میں نے کہا اور گاڑی کو کوارٹروں کی تنگ قطاروں سے گزار کے غازی خان کے دروازے تک لے گیا۔ اس وقت وہ اپنی نیلی وردی پہن کے ڈیوٹی پر جانے کے لیے نکلا۔ پہلے کار کو اور پھر مجھے دیکھ کر خوشی سے اس کا چہرہ دمکنے لگا۔ وہ میری طرف لپکا۔

"تھانیدار صاحب! آپ نے غریب کو یاد رکھا۔" اس نے ... طریقے پر ہاتھ ملا کے کہا۔ "بڑی مہربانی جناب کی۔ بڑی عزت دی ہے مولا نے مجھے، سخی داتا خود غریب خانے تک آ گئے۔"

"یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو غازی خان۔" میں نے کہا۔ "مجھے شرمندگی محسوس ہوتی ہے۔"

اِرد گرد کے بہت سے لوگ غازی خان کے معزز مہمان کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ تھانیدار کا لفظ سُن کے وہ چونکے۔ اتنے قریب رہنے والے ایک دوسرے کا شجرۂ نسب تک جانتے ہیں اور انھوں نے آج تک نہ سُنا تھا کہ غازی خان کے عزیز و اقارب یا جاننے والوں میں کوئی کاروالا تھانیدار بھی ہے۔ میں فوراً غازی خان کے کوارٹر میں داخل ہو گیا۔ ٹاٹ کے پردے کے پیچھے مختصر ترین صحن تھا جس میں ایک بکری بندھی ہوئی تھی اور ایک چارپائی پڑی تھی۔ صحن کے ایک طرف باورچی خانہ تھا اور دوسری طرف باقی دو خانے جن کے بغیر غریب خانہ مکمل نہیں ہوتا۔ کوٹھیوں میں یہ اٹیچ باتھ کہلاتے ہیں۔ پھر ایک برآمدہ تھا جس میں دونوں کوٹھڑی نما کمروں کے دروازے کھلتے تھے۔ ہر کوٹھڑی آٹھ فٹ بائی دس فٹ سے زیادہ نہ تھی۔

"کون ہے غازی؟ تو گیا نہیں؟" اندر سے کسی نے پوچھا۔

"گیا تھا نیک بخت... مگر راہ میں ایک فرشتہ مل گیا۔" غازی خان بولا۔

"کون فرشتہ؟"

"تجھے بتایا تھا نا میں نے کل۔ ایک تھانیدار آیا تھا۔"

"ہاں ہاں۔" وہ فرطِ جذبات میں کھڑی ہو گئی۔ وہ چالیس سال کی عورت تھی۔ اگر اس کے مقدر میں خوشحالی کا سورج ہوتا تو اس عمر میں بھی شباب کی دھوپ نظر آتی مگر مفلسی اور سختیٔ حالات نے اس سے جوانی کو قبل از وقت چھین لیا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے ڈاکوؤں نے اس کی بیٹی کو چھین لیا تھا۔ وہ ساٹھ سال کی لگتی تھی۔ اس کے بال آدھے سے زیادہ سفید ہو چکے تھے اور جسم لاغر ہو گیا تھا۔ تاہم صورت کے نقوش میں عہدِ رفتہ کی دلکشی کے آثار دیکھے جا سکتے تھے۔ "کیا وہ... آ گیا ہے... واقعی آ گیا ہے؟" وہ بولی۔

"ہاں... یہ دیکھ... میرے ساتھ کھڑے ہیں تھانیدار صاحب۔"

"سلام تھانیدار صاحب۔" وہ سفید لٹھے کا میلا دوپٹہ سر پہ رکھ کے اور ہاتھ پیشانی تک لے جا کر بولی۔ "غازی نے مجھ سے کہا تھا۔ مگر میرا دل نہیں مانتا تھا... میں نے کہا تو جھوٹ بول رہا ہے، بہلا رہا ہے مجھے... ایسا کہاں ہوتا ہے۔"

"یہ... غازی خاں کدھر چلا گیا؟" میں نے اِدھر اُدھر دیکھ کے کہا۔

غازی خاں ٹاٹ کا پردہ ہٹا کے نمودار ہوا۔ وہ کہیں سے ایک کرسی لینے گیا تھا۔ یہ کرسی اس نے کپڑے سے صاف کر کے میرے قریب رکھ دی۔ "تشریف رکھیں جناب۔"

"یہ تم کیا کر رہے ہو۔ میں بھی تمھاری طرح ایک معمولی آدمی ہوں۔ ایسا ہی گھر تھا میرا بھی۔" میں نے اس کی تسلی کے لیے کہا لیکن پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔

"اُٹھ بھئی بو گے... مہمان کے لیے کچھ لسی پانی کا کر..."

"غازی خاں! تکلف میں مت پڑو۔" میں نے کہا۔

"تکلف تو بڑے لوگ کرتے ہیں جناب۔" وہ بولا۔ "ہم غریبوں کے پاس تکلفات کے لیے کیا ہے۔"

"تو اُٹھ... اب باتیں ہی کرتا جائے گا... جا کے کوئی مٹھائی لا۔ صاحب جی... آپ تو چائے ہی پیتے ہوں گے۔" وہ آگے بڑھی۔ "میں بناتی ہوں۔"

"دیکھیے... میں چائے ضرور پی لوں گا... مگر یہ مٹھائی وغیرہ بالکل نہیں کھا سکتا۔" میں نے کہا۔ "تم بیٹھ جاؤ غازی خان۔"

غازی خان کا چہرہ اُتر گیا۔ کیونکہ میرا لہجہ ضرورت سے زیادہ سخت ہو گیا تھا۔ "ہاں جناب، اس علاقے میں تو مٹھائی بھی گندی ملتی ہے۔ آپ کے لائق نہیں ہوتی۔"

"اُفوہ۔ تم سمجھتے کیوں نہیں، صبح صبح مٹھائی کون کھاتا ہے۔ تم کو بہت اصرار ہے تو میں ناشتا کر لوں گا۔" میں نے کہا۔ "صبح سے ابھی تک فرصت ہی نہیں ملی تھی۔"

"ناشتا کریں گے آپ!" غازی خان نے مسرت کے جوش میں کہا۔ "میں ابھی حلوہ پوری لے کر آتا ہوں۔" وہ اُٹھا اور ایک دم باہر دوڑ گیا۔ اس نے میری آواز پہ دھیان ہی نہیں دیا۔

"میں چائے بناتی ہوں۔" غازی خان کی بیوی نے کہا اور ہاتھ آگے رکھتے ہوئے دروازے کی طرف چلنے لگی۔ "آپ یہ مت سمجھنا کہ میں اندھی ہوں تو کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ مجھے سب نظر آتا ہے۔ میرے ہاتھ دھوکا نہیں دیتے۔ مجھے معلوم ہے کون سی چیز کہاں ہے۔" وہ چولھا جلاتے، برتن میں پانی اُبلنے کے لیے رکھتے اور چائے کا سامان اُٹھاتے ہوئے بولتی رہی۔ "ایسا کبھی نہیں ہوا کہ میں نے چائے کی پتی... یہ ہے وہ ڈبا۔ اس کی جگہ مرچ مسالے کا ڈبا اُٹھاتے ہی مجھے پتا چل جاتا ہے۔ حالانکہ ڈبے سب ایک جیسے ہیں مگر سب سے بھاری مرچ ہوتی ہے۔ دھنیا ہلکا ہوتا ہے۔ چائے کی پتی سب سے ہلکی۔"

غالباً وہ خود کلامی کی عادی تھی۔ غازی خان نے بتایا بھی تھا کہ اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا تھا۔ اس کا کچھ اثر اب تک باقی تھا کہ وہ اپنی تنہائی سے بچنے کے لیے خود کو مصروف رکھتی تھی اور خیالوں کو منتشر رکھنے کے لیے بولتی رہتی تھی۔ میں اُسے باورچی خانے میں نقل و حرکت کرتے دیکھتا رہا۔ اس کے پُراعتماد انداز سے ایک ناواقفِ حال شخص یہ اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ وہ بینائی سے محروم ہے مگر اپنے گھر کے ... اور اس کی ہر چیز کے ساتھ وہ لمس کی شناسائی کا پرانا رشتہ رکھتی تھی۔ صرف اس گھر کے اندر وہ اندھی نہیں تھی۔ تصور کی مدد سے اور چھو کر وہ بصارت کی کمی کے احساس پر قابو پا لیتی تھی۔ باقی دنیا اس کے لیے بے وجود ہو گئی تھی۔

حیرت کی بات ہے کہ وہاں چوراہے والی، اُبلی ہوئی نصف دودھ کی سفید چائے پیتے ہوئے مجھے وہ لُطف آیا جو شیزان کی چائے میں کبھی محسوس نہ ہوا تھا۔ شاید اس لیے کہ یہاں چائے میں چاہ کی خوشبو شامل تھی اور خلوص کی سادگی کا رنگ شامل تھا اور سچے جذبوں کی مٹھاس شامل تھی۔ میں نے غازی خان کے اصرار کے بغیر پیٹ بھر کے کھایا اور ایک کے بعد چائے کا دوسرا کپ پیا۔ اس دوران میں غازی خان دست بستہ کھڑا رہا۔ میرے بہت مجبور کرنے کے باوجود وہ چارپائی پر نہیں بیٹھا۔ اس کی بیوی بھی پلنگ کی پٹی پر ٹکی مجھے پنکھا جھلتی رہی اور دعائیں دیتی رہی۔ مجھے انتظار تھا کہ وہ اپنی بیٹی کے ساتھ ہونے والے ظلم کا افسانہ چھیڑے اور اس کی المناک موت کا ذکر کرے لیکن ایسا لگتا تھا کہ غازی خان نے اُسے منع کر دیا تھا۔

ناشتے کے بعد میں بہت تازہ دم ہو گیا تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی تو ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ "غازی خان!" میں نے جیب سے سگریٹ نکال کے سلگائی۔ "میں اس لیے آیا تھا کہ اپنا وعدہ پورا کروں۔"

"آپ کی بڑی مہربانی ہے صاب جی۔" اس کی بیوی نے کہا۔ "مگر ہم پہ اتنا بڑا بوجھ مت ڈالو۔ ہم غریب اتنی بڑی نیکی کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتے۔"

"یہ آپ مجھے شرمندہ کیوں کر رہی ہیں۔" میں نے کہا۔ "آپ پر کوئی بوجھ نہیں۔ میں قرض نہیں دے رہا ہوں۔ خدا کے لیے انکار مت کریں۔ میں یہاں انکار سننے کے لیے نہیں آیا ہوں۔" میں نے جیب سے تین ہزار روپے نکال کے الگ کیے۔ "اگر ان سے آپ کی آنکھوں کی روشنی واپس مل گئی تو میں سمجھوں گا کہ یہ خدا نے مجھ پر احسان کیا ہے کہ مجھے ایک نیکی کا ثواب کمانے کا موقع دیا... یہ موقع وہ کسی اور کو بھی دے سکتا تھا۔ اس کے علاوہ یہ ایک ہزار میری بیوی نے بھیجے ہیں۔ آپریشن کے بعد دوائیں وغیرہ آئیں گی۔"

"خدا تم دونوں کو وہ ساری خوشیاں دے، جو اس کے اختیار میں ہیں اور تمھیں کوئی غم نہ دے۔ تم وہ سب پالو جو تمھارے دل کی تمنا ہے۔ تمھارے نصیب میں کامیابیاں ہوں۔" غازی خان کی بیوی نے گلوگیر لہجے میں دعائیں دینا شروع کیں۔ اس نے اپنی سفید چادر کو دونوں ہاتھوں پر پھیلا لیا تھا اور اپنی بے نور آنکھوں سے اوپر دیکھ رہی تھی۔ چھت کے اوپر... آسمان سے پرے۔ عرش کی بلندیوں پر۔ وہ براہِ راست خدا کے سامنے جھولی پھیلائے کھڑی تھی، خاموش آنسو اس کے چہرے پر لکیریں بناتے گر رہے تھے۔

میں ایک دم اٹھا اور کچھ کہے بغیر باہر آگیا۔ غازی خان میرے پیچھے لپکا۔

"غازی خان، اس بات کا ذکر کسی سے مت کرنا۔" میں نے کار کا دروازہ کھول کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اللہ آپ کو ترقی دے۔ آپ کا اقبال بلند کرے۔" وہ ہاتھ جوڑ کے کھڑا ہو گیا۔

"میں پھر آؤں گا۔" میں نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ "یہ دیکھنے کے لیے کہ تم نے آپریشن کرا لیا ہے یا نہیں۔ دیر مت کرنا۔ خدا نے چاہا تو تمھاری بیوی دوبارہ دیکھنے لگے گی۔ خدا حافظ۔" میں نے گاڑی کو گیئر میں ڈالا اور وہاں سے بھاگ آیا۔ ان کی دعاؤں اور ممنونیت کے جذبات کے نیچے دب کر میری نیکی کے جذبے کا دم گھٹ رہا تھا۔ ہمارے لیے چار ہزار روپے کوئی اہمیت نہ رکھتے تھے۔ اس سے دس گنا رقم ہمارے پاس موجود تھی۔ ایسے سیکڑوں چار ہزار ہم نہ جانے کہاں کہاں پھینک چکے تھے۔ ہمارے پاس لاکھوں آتے تھے اور نکل جاتے تھے۔ ہم نے کروڑوں

کے سودے ہوتے دیکھے تھے جن میں انسان اپنی شرافت، اپنا ضمیر اور اپنی نیکی سب بیچ دیتے تھے۔ دنیا ہر منٹ میں لاکھوں ڈالرز سگریٹ اور بیڑوں کے دھوئیں کی صورت میں اڑا رہی تھی۔ عورتیں کروڑوں ڈالرز کے ہیرے جواہرات کی خریداری کر رہی تھیں۔ لاکھوں ڈالرز کی پرفیومز کے تحائف وصول کر رہی تھیں۔ فائیو اسٹار ہوٹلوں میں۔ مونٹی کارلو کے جوئے خانوں میں۔ پیرس کے عشرت کدوں میں۔ ٹوکیو کے نائٹ کلبوں میں ہر رات لاکھوں کروڑوں ڈالرز عیش اور عشرت کے اسباب پیدا کرنے میں صرف ہو رہے تھے۔ یہاں صرف چار ہزار روپے میں ایک اندھی عورت سچی، پاک اور قبول ہونے کی ضمانت رکھنے والی دعائیں دے رہی تھی۔ تین ہزار روپے میں آنکھوں کی روشنی پا لینا اس کے لیے دولت مندوں کی دنیا کی سب سے مہنگی خوشی سے زیادہ انمول تھا... کیا وہ تین ہزار روپے میں اپنی آنکھوں کی روشنی دے سکتا ہے، جو تین ہزار ڈالر کے کمرے میں ایک رات بسر کرنے والی فاحشہ کی ایک مسکراہٹ پر تین ہزار ڈالر قربان کر دیتا ہے۔ ہمارے معیار، ہمارے نقطۂ نظر کے پیمانے، اخلاقی اقدار کے حوالے، پستی اور بلندی آخر یہ سب کیا ہے اور کیوں ہے۔

میں بے حد قنوطی اور جذباتی ہو رہا تھا۔ واپس آتے ہوئے میں نے گلبرگ تھری کا راستہ اختیار کیا۔ سرکاری دفاتر کے افسران اب ڈیوٹی پر حاضر ہونے کے لیے نکل رہے تھے اور کاروباری لوگ بھی چنانچہ اس رہائشی علاقے میں بھی مجھے بہت سی کاریں آتی جاتی دکھائی دیں۔ کچھ دیر بعد ان سڑکوں کو پھر سنسان ہو جانا تھا۔ گزرتے گزرتے میں نے ایک گیٹ پر 'ٹو لیٹ' کا سائن دیکھا۔ گتے کا ایک چکور ٹکڑا گیٹ پر لٹکا ہوا تھا اور اس پر کسی بدخط نے مارکر سے ٹیڑھے ترچھے حروف بنائے تھے۔ جہاں کال بیل کا بٹن تھا وہیں ایک نیم پلیٹ پر 'ڈیوڈ براؤن' لکھا ہوا تھا۔

گھنٹی بجنے کے ساتھ ہی ایک شخص گاؤن پہنے عینک ٹھیک کرتا نمودار ہوا۔ گاؤن کے نیچے اس نے دھاری دار پاجامہ سوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ ایک دم سیاہ صاحب تھا، چھ فٹ لمبا اور سوکھا چمرخ۔ اس کا سر بھورا اور بالوں سے بے نیاز تھا۔ میں نے اس کی عمر کا اندازہ پچاس اور ساٹھ سال کے درمیان کیا۔

"یس؟" اس نے برآمدے میں ہی رک کر پوچھا۔ کیا بات ہے؟

"کیا میں مسٹر ڈیوڈ براؤن سے بات کر سکتا ہوں؟" میں نے کہا۔

"تم اسی سے بات کر رہے ہو۔" وہ انگریزی میں بولا۔

"گڈ... کیا میں اندر آسکتا ہوں؟" میں نے کہا۔

"اگر کوئی کام ہے تو آسکتے ہو ورنہ جا سکتے ہو۔" وہ بولا۔

اس کی بدتمیزی اور بدتہذیبی پر مجھے تاؤ آنے لگا تھا مگر بڑھا اور سنکی سمجھتے ہوئے میں نے درگزر کیا۔ "اگر اس سائن کا وہی مطلب ہے جو میں سمجھا ہوں..."

"اس کے دو مطلب نہیں ہو سکتے۔" اس نے میری بات کاٹ دی۔ "تم کو مکان کرائے پر چاہیے... یس اور نو؟"

"یس..." میں نے کہا۔ وہ اندر لوٹ گیا اور میں سوچنے لگا کہ کہیں وہ پاگل تو نہیں تھا۔ یا اس نے میرے یس کو نو تو نہیں سنا تھا مگر وہ دروازے کا لاک کھولنے کے لیے ہی اندر گیا تھا۔ اس کا الیکٹرک لاک اندر کا کوئی بٹن دبانے سے کھلتا تھا۔ ایسے لاک یورپ میں تو عام تھے مگر ابھی یہاں میں نے کہیں نہیں دیکھے تھے۔ عموماً یہ بہت دولت کے مقناطیسی تالے ہوتے تھے۔ چنانچہ ان سے کسی کو الیکٹرک شاک نہیں لگ سکتا تھا۔ ایسا حفاظتی انتظام یہ ظاہر کرتا تھا کہ صاحبِ خانہ خوف کے نفسیاتی مرض کا شکار ہے یا پھر واقعی اپنے دشمنوں کے خلاف موثر دفاعی نظام کو اہم سمجھتا ہے۔

اندر وہ اکیلا تھا اور ڈرائنگ روم کے وسط میں کھڑا ہوا تھا۔ جیبوں میں دونوں ہاتھ ڈالے وہ کچھ دیر مجھے گھورتا رہا۔

"تم نے مکان دیکھا؟"

"جی... کیا یہی مکان کرائے پہ دینا ہے؟" میں نے کہا۔

"یہاں تم کو اس کے علاوہ بھی کوئی مکان نظر آ رہا ہے؟" وہ بولا۔

"میرا مطلب تھا کہ یہاں آپ رہتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"جب کرائے دار آجائے گا تو میں اس کے ساتھ تو نہیں رہوں گا۔ میں چلا جاؤں گا۔" وہ بولا۔

"کیا میں اندر جا کے ایک نظر ڈال سکتا ہوں؟" میں نے کہا۔

"تم کو سب کچھ دیکھنے کا حق حاصل ہے۔" وہ بولا۔ "کسی چیز کو ہاتھ مت لگانا۔"

میں نے مکان کا جائزہ لیا۔ اس میں ہر چیز پرانی اور فرسودہ تھی جو مکان کی ہم عمر نظر آتی تھی اور اس قابل تھی کہ باہر پھینک دی جائے۔ ٹوٹا پھوٹا گرد آلود فرنیچر۔ گھسے ہوئے کارپٹ۔ رنگ اڑے ہوئے پردے، بے رنگ دیواریں۔ بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے برتن۔ سب مل کر کسی کباڑ خانے کا نقشہ پیش کرتے تھے اور کباڑی وہ تھا جو ہر بات جارحانہ لہجے میں کرتا تھا۔ وہ دو ٹوک بات کرتا تھا اور لہجے کی شائستگی کو بھی غیر ضروری سمجھتا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ مکان ہماری ضرورت کے لیے مناسب ہوگا۔

"مسٹر ڈیوڈ... اس کا ماہانہ کرایہ بتاؤ۔" میں نے اب اسی کا انداز اپنا لیا۔

"اس کا کرایہ ماہانہ نہیں، سالانہ ہوگا۔" وہ بولا۔ "دس ہزار روپے۔"

"ٹھیک ہے، کیا میں دس ہزار ادا کر دوں؟" میں نے کہا۔

"پہلے تم کرایہ نامہ وغیرہ بھرو گے اور میرے بارے میں تفتیش کرو گے؟"

"میں خود دیکھ سکتا ہوں کہ تم غلط قسم کے آدمی نہیں ہو۔" وہ بولا۔ "میرا اطمینان کافی ہے۔"

"تھینک یو۔" میں نے کہا۔ "تم کب تک مکان خالی کرو گے؟"

"میں کسی کرائے دار کا انتظار کر رہا تھا۔" وہ بولا۔ "ورنہ میں بہت پہلے چلا جاتا۔ اب مجھے دیکھنا ہوگا کہ مجھے کون سی فلائٹ پر کب سیٹ ملتی ہے۔ مجھے کینیڈا جانا ہے۔"

"یہاں کون ہوگا۔ کوئی اٹارنی...؟"

"کوئی نہیں..." وہ بولا۔ "میرا ایک ہی بیٹا ہے جو کینیڈا میں سیٹل ہو چکا ہے... وہ ڈاکٹر ہے۔ اس نے مجھے بلایا ہے تاکہ میرا دل چیر سکے۔ پرانا دل کچھ مرمت مانگتا ہے۔ چانس برابر ہے کہ ایک سال بعد میں تندرست ہو کے واپس آجاؤں اور اس صورت میں تم کو مکان خالی کرنا ہوگا... فوراً... میں مر بھی سکتا ہوں۔ آپریشن کے دوران... یا کسی اور عارضے میں مبتلا ہو کے۔ کسی حادثے کا شکار ہو سکتا ہوں۔ ایسی صورت میں میرا بیٹا آئے گا۔ مجھے نہیں معلوم کب... جب بھی اسے ضرورت محسوس ہوگی یا فرصت ملے گی۔ وہ مکان کو بیچے گا اور واپس چلا جائے گا۔ ابھی میں نے اس کی بات نہیں مانی کہ ہمیشہ کے لیے کینیڈا چلا جاؤں۔ اگر میں زندہ رہوں گا تو اسی کالے لوگوں کے ملک میں جہاں کوئی مجھے میرے رنگ کے باعث نفرت سے نہیں دیکھتا۔ وہ گوری چمڑی والا احمقانہ غرور رکھنے والے میری نظر میں سفید کتے ہیں۔ جیسے ان کی نظر میں ہم سب کالے کتے ہیں۔ زندگی کے آخری دور میں کسی کو نفرت اور حقارت کے ماحول میں رہنے سے کیا ملتا ہے؟ صرف پچھتاوا... میں نے زندگی میں بہت عزت کمائی۔ میں بے عزت ہو کے مرنے کے لیے تیار نہیں۔ تم جانتے ہو میں کون ہوں؟"

"آپ جو بھی ہیں۔ ایک قابلِ تعریف اور قابلِ تعظیم انسان ہیں۔" میں نے کہا۔

"میں کرایہ کم نہیں کروں گا۔" وہ بولا۔ "خوشامد کے الفاظ ضائع مت کرو۔"

"میں آپ کو دو ہزار ایڈوانس اسی وقت دے سکتا ہوں، باقی شام تک۔ میں اپنی فیملی کو لانا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "ابھی کچھ دیر میں۔"

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "ایڈوانس کی ضرورت نہیں مسٹر؟"

"جارج بیک!" میں نے کہا۔ "انشورنس بیوموٹر... میں کراچی سے صرف اسی لیے آیا تھا کہ اپنی فیملی کے لیے کوئی مستقل انتظام کر جاؤں۔ میں ہر وقت سفر میں رہنے والا آدمی ہوں۔"

اس کی صورت کے تاثرات میں میرا نام سن کے کوئی فرق نہیں پڑا۔ "اسے تم مستقل بھی کہہ سکتے ہو لیکن ایک وعدہ تم کو ابھی کرنا ہوگا کہ ایک سال گزر جانے کے بعد تم دوسرے سال کا کرایہ فوراً جمع کرا دو گے۔ میں تم کو بنک کا اکاؤنٹ نمبر دے جاؤں گا اور اس کے بعد کسی بھی وقت میرا بیٹا آئے تو تم اس کو پریشان نہیں کرو گے، جیسا کہ کرائے دار کرتے ہیں۔ اس کے پاس کم وقت ہوگا۔ وہ مکان کو بیچ کر جانا چاہے گا... مقدمے بازی..."

"میں دشمنی میں بھی کمینگی سے نفرت کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "جہاں تک کرائے کا سوال ہے تو میں دو سال کا بھی جمع کرانے کو تیار ہوں۔"

"نو... ابھی صرف ایک سال..."

"اس سامان کا کیا ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"یہ سب مجھے بہت عزیز ہے؟" وہ بولا۔ "اور اسے تم احتیاط سے ایک کمرے میں رکھ کے کمرا لاک کر سکتے ہو... اسٹور کافی بڑا ہے۔ میری موت کی خبر ملتے ہی بے شک سڑک پر پھینک دینا۔ لیکن واپس آنے کی صورت میں مجھے سب اسی طرح پھر سیٹ کرنا ہوگا جیسا تم اس وقت دیکھ رہے ہو۔"

"آپ کی عدم موجودگی میں کوئی آسکتا ہے؟ جو خواہ مخواہ آپ کا نام لے کر ہمیں پریشان کرے؟"

"کوئی نہیں۔ پچھلے ایک سال سے کوئی نہیں آیا تو اب کون

آئے گا۔ رشتے دار کوئی نہیں۔ دوست کوئی نہیں۔ ایک خادمہ آتی ہے' اُسے میں نے نوٹس دے دیا ہے۔" وہ بولا۔

"آپ نوٹس واپس لے لیں۔" میں نے کہا۔ "وہ ہمارے ساتھ رہے گی۔"

پہلی بار اس کی صورت پر سختی کے آثار کچھ کم ہوئے۔ "تھینک یو مسٹر جارج بلیک... تم نے میری ایک خلش مٹا دی۔"

میں اس سے مصافحہ کرکے روانہ ہوا تو میرا دل غم کے نئے احساس سے بوجھل تھا۔ زندگی کتنے آئینے دکھاتی ہے۔ ہر آدمی کتنے زخم لیے پھرتا ہے عمر کے طویل سفر میں سب کے ساتھ چلنے والا سب سے الگ ہو جاتا ہے۔ کسی کو راہ میں خوشی کے پھول ملتے ہیں اور وہ کانٹوں کی زبان سے نا آشنا رہتا ہے۔ دوسرا صرف کانٹوں پر چلتا ہے اور پھولوں کے رنگ یا مہکار سے کوئی رشتہ نہیں رکھتا... میں... میرے ساتھی... غازی خان اور اس کی اندھی بیوی۔ ڈیوڈ براؤن جس سے میں نے جھوٹ بولنے کا گناہ کیا تھا۔ سب کے پاس اپنے اپنے غموں کا الگ حساب ہے۔ سب کو اپنا حساب خود چکانا ہے۔

کار اچانک لڑکھڑانے لگی۔ میں نے اُسے سڑک کے ایک کنارے پر روک لیا اور نیچے اتر کے دیکھا۔ اس کا ٹائر فلیٹ ہو گیا تھا۔ میں نے ڈکی کھول کے دیکھا تو اس میں امتحانی کاپیاں بھری ہوئی تھیں۔ کم سے کم ایک ہزار کاپیاں جو سب انٹر آرٹس' فائنل اپر کا امتحان دینے والے پرائیویٹ طلبا کی تھیں۔ میں نے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔ کار کا کچھ نہیں مگر اس میں ایک ہزار طلبا کے ایک ہزار سال پڑے ہیں۔ کاپیاں گم ہو جائیں یا ضائع ہو جائیں تو سب کے ہزار سال ضائع ہوئے۔ ہر سال کا ہر دن قیمتی ہے۔ وقت کا ایک ایک لمحہ اور اس لمحے کی محنت کا کوئی مول نہیں۔ پروفیسر صاحب نے بھی کمال کیا کہ کار کے ساتھ ایک ہزار بچوں کا مستقبل بھی محسن کے حوالے کر دیا۔ جب محسن نے انھیں گھر پہ ڈراپ کیا تھا تو ان پر لازم تھا کہ امتحانی کاپیاں تو اتروا لیتے۔ خدانخواستہ محسن نے گاڑی کسی جگہ ڈاکا ڈالنے کے لیے چھینی ہوتی تو یہ پرچے بھی پولیس کی تحویل میں جلتے یا محسن اُسے آگ لگاتا تو اُسے خبر بھی نہ ہوتی کہ اس نے ایک ہزار علم کے طالب جوانوں کی محنت اور امیدوں کو جلا کے خاک کر دیا ہے۔ یہ محض اتفاق تھا کہ ٹائر فلیٹ ہوا تو میں نے ڈکی کھول لی تاہم اس سے میرا مقصد پورا نہیں ہوا۔ گاڑی میں نہ جیک تھا اور نہ اسٹیپنی وہیل' میں نے گاڑی کو لاک کیا اور چل پڑا۔ میں مسٹر ڈیوڈ کے مکان سے دو میل دور آ چکا تھا۔ مزید ایک میل چلنے کے بعد مجھے پبلک ٹیلیفون آفس نظر آیا اور میں نے پروفیسر کو رنگ کیا۔

"جناب' وہ آپ کی گاڑی..."

"ہاں بھئی... وہ تم ابھی تک لائے نہیں۔" انھوں نے میری بات سُنے بغیر خفا ہونا شروع کیا۔ "آدمی کو وعدہ پورا کرنا چاہیے۔"

"سر وہ گاڑی رک گئی ہے۔ ٹائر پنکچر ہو گیا ہے۔"

"تو پھر کیا میں آ کے پنکچر لگاؤں...؟ حد ہے بھئی... وہ لڑکا... تم جوان آدمی ہو۔"

"جناب' اس کی ڈکی میں امتحانی کاپیاں ہیں۔"

"ہاں ہیں... یہ تو تمھاری سخت غلط حرکت تھی کہ تم چلے گئے اور وہ کاپیاں بھی لے گئے... آخر یہ کیا تھا۔ تمھارے کسی عزیز یا خود تم نے تو امتحان نہیں دے رکھا ہے؟ میں بالکل فیل کر دوں گا... رول نمبر بتاؤ اپنا..."

مجھے اچانک ہنسی آئی۔ "جناب پروفیسر صاحب... یہ آپ کا کام تھا کہ کاپیوں کو یاد رکھتے۔ میں پڑھ لکھ کے عالم فاضل ہو چکا۔ میرے سب عزیز بھی۔ پنکچر لگانا مجھے نہیں آتا۔ جوان آدمی سے فرق نہیں پڑتا۔ آپ کی گاڑی کی چابیاں گاڑی کے اندر ہیں اور گاڑی یہاں سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی ہے۔ آیئے اور لے جایئے۔" میں نے ان کو پتا بتایا اور ان کے شورِ احتجاج کو نظرانداز کرتے ہوئے ریسیور رکھ دیا۔

میں ٹھیک دس بجے واپس پہنچا۔ اس وقت تک غالب پوری طرح ہوش میں آ گیا تھا۔ دونوں ڈاکو بھی ہوش میں تھے اور بُری طرح کراہ رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ بتاتا میری نظر اخبار پر گئی اور میں نے اُسے جھپٹ کر اٹھایا۔ اس میں ہماری پریس کانفرنس کا پورا احوال تھا اور ہماری تقاریر بھی شائع ہوئی تھیں۔ دوسری اہم خبر سنگالی ڈپو سے پکڑے جانے والے دو تخریب کاروں کی اور ان سے برآمد ہونے والے اسلحے کی تھی۔ ہمارے انٹرویو اور اس خبر کی ایک ساتھ اشاعت نے واقعات کے تمام سلسلے ایک کر دیے تھے اور ہمارے دعوے سچ کر دیے تھے۔ میں نے برآمد ہونے والے اسلحے کی تصاویر دیکھنے کے بعد دونوں گرفتار ہونے والوں کو دیکھا۔ غالباً وہ صرف محافظ تھے۔ تاہم ان کو سی آئی اے کی تحویل میں دے دیا گیا تھا۔ ابھی ہمارے انٹرویو پر کسی نے تبصرہ نہیں کیا تھا کیونکہ یہ آخری وقت میں لگایا گیا تھا۔ لیکن اسلحے کی برآمدگی اور اس کے ممکنہ نتائج پر بہت سے بیانات تھے جن میں علیحدگی پسندوں اور غداروں کی مذمت کی گئی تھی۔ ان کے عزائم پر تشویش کا اظہار کیا گیا تھا اور حکومت سے سخت اقدام کا مطالبہ کیا گیا تھا۔

"ہماری تصاویر دیکھ کر چوہدری ملاور اینڈ کمپنی کو دلی مسرت حاصل ہوگی۔" محسن نے کہا۔

"اب تو ہم اعلانِ جنگ کر چکے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ایم آر ایس نے تمام دھماکوں کی ذمے داری قبول کر لی ہے۔"

"کیا ہم نے ایسا کر کے عقل مندی کا ثبوت دیا ہے؟" محسن نے کہا۔

"وہ جھوٹ اب نہیں چل سکتا تھا کہ ہم چوہدری ملاور سے وراثت کی جنگ لڑ رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "یا اس کے کاروبار کی نوعیت کے بارے میں بے خبر ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ منشیات کا اسمگلر ہے۔ ملاور اور اس کے تمام ساتھی شکاری جان چکے ہیں کہ ہم سے حقیقت پوشیدہ نہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ان کے خلاف تمام تخریبی کارروائی ہم نے کی۔ ہمارا ساتھ کس نے دیا؟"

"لیکن اس کا نتیجہ رابعہ اور ٹیپو کے حق میں بُرا ہو سکتا ہے۔"

"وہ پہلے کب اچھے حالات میں ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ہمارے اعلانِ جنگ کو وہ ہماری طاقت کا مظاہرہ سمجھتے ہوئے محتاط ہو جائیں۔ دشمن کی قوت برابر تسلیم کر لینے والے صلح پر بھی مجبور ہو سکتے ہیں۔ اس کے لیے مذاکرات کی پیش کش کر سکتے ہیں۔ ابھی ہمیں ردِعمل کا انتظار کرنا ہوگا۔"

"تو نے پولیس کا بیان دیکھا۔" محسن بولا۔ "ڈاکوؤں کے بارے میں؟"

"نہیں۔" میں نے کہا اور پورے صفحے پر نظر دوڑائی۔

غالب مسکرایا۔ "آخری صفحے پہ دیکھو... خبر کو بہت غیر نمایاں رکھا گیا ہے۔"

میں نے صفحہ پلٹ کے دیکھا۔ اس میں تصویر صرف اسں اودر سیئر کی تھی لیکن بیانات سب کے تھے اور ظاہر ہے اتفاقِ رائے کے بعد جاری کیے گئے تھے۔ انسپکٹر اور سب انسپکٹر نے بتایا تھا کہ وہ دونوں مفرور ڈاکوؤں کو پکڑنے کی غرض سے گشت پہ تھے کہ اچانک جنگل میں سے دونوں ڈاکو ایک کار میں بدلے ہوئے حلیے کے ساتھ نمودار ہوئے۔ انھوں نے محکمۂ انہار کے ایک اوورسیئر کو ریوالور دکھا کے قابو کر لیا تھا۔ پولیس پارٹی نے ان کا مقابلہ کیا اور مقابلے میں ایک کانسٹیبل خدا بخش نے ملزمان کی گرفتاری کے لیے اپنی جان خطرے میں ڈال اور شدید زخمی ہوا۔ ڈاکو جدید ترین اسلحے سے لیس تھے اور جنگل میں ان کے دیگر ساتھی بھی روپوش تھے جو مقابلے کے وقت سامنے آ گئے اور پولیس کا اسلحہ اور جیپ وغیرہ چھین کر فرار ہو گئے۔ اوورسیئر نے بھی یہی کہا تھا مگر اس نے زیادہ تفصیل سے بتایا تھا کہ اسے دونوں ڈاکوؤں نے سنگالی سے واپسی کے راستے پر کس طرح بیچ سڑک میں آ کے روکا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ جیل سے فرار ہونے والے ڈاکو ہیں چنانچہ اس نے دونوں کو کار میں بٹھا لیا مگر آگے جا کے انھوں نے ریوالور نکال لیے اور اسے مجبور کیا کہ وہ گاڑی سے اتر جائے۔ دریں اثنا پولیس پارٹی نمودار ہوئی اور ڈاکوؤں سے مقابلہ ہوا۔ ڈاکوؤں کے کچھ ساتھی بھی آ گئے جو مشین گن لیے ہوئے تھے۔ پولیس پارٹی نے بہت بہادری سے مقابلہ کرتے ہوئے انھیں گرفتار کرنے کی کوشش کی مگر وہ اپنی طاقت کے بل پر پولیس کا اسلحہ' وردیاں اور جیپ وغیرہ چھین کر فرار ہو گئے۔ وہ خود بھی ایک ڈاکو کی ضرب سے بے ہوش ہو گیا تھا' اس لیے وہ نہیں جانتا کہ ڈاکو فرار ہو کے کس طرف گئے تھے۔

مجھے اس بیان پر بہت ہنسی آئی۔ پولیس نے اپنی عزت بچا لی تھی۔ اوورسیئر نے وہی کہا تھا جو ہم چاہتے تھے۔ وہ پولیس کے مقابلے میں ہم سے زیادہ خائف تھا اور خود پولیس کے لیے بھی ایسا ہی بیان دینا ضروری تھا۔ میں نے اس وقت کا تصور کیا جب خود ڈاکو اس بیان کی نفی کریں گے اور پریس کے سامنے اپنی گرفتاری کے متعلق بیان دیں گے۔ اس کے بعد پولیس کی پوزیشن کیا ہوگی۔ پریس کس طرح ان کے لتے لے گا اور محکمہ خود ان کے خلاف کیا کارروائی کرے گا۔ اس کا اندازہ کیا جا سکتا تھا۔

ڈاکو دوسرے کمرے میں تھے چنانچہ ہماری گفتگو نہیں سُن سکتے تھے۔ میں نے محسن اور غالب کو بتایا کہ میں رہائش کا پورا انتظام کر آیا ہوں اور ان کو مسٹر ڈیوڈ براؤن کے متعلق بتایا۔ پروفیسر کی کار کی بات نے سب کو محظوظ کیا۔ وہ سب لوگ ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو چکے تھے۔ محسن نے مناسب نہیں سمجھا تھا کہ کیتھرین کو کسی کے گھر بھیجے۔ اس میں اندیشہ تھا کہ کوئی بہت زیادہ ہمدرد بن کے ساتھ نہ آ جائے۔ وہ ریوالور غالب کو دے کر بازار گیا تھا اور چونکہ یہاں کا بازار اس کا دیکھا بھالا تھا اس لیے وہ پہلے تھرماس خریدنے گیا اور اس میں چائے بھروانے کے بعد واپسی میں ڈبل روٹیاں اور مکھن کے پیکٹ لے آیا۔

"اب یہاں ٹھہرنے کا فائدہ کوئی نہیں۔" میں نے کہا۔ "چل کے گھر آباد کرتے ہیں۔"

"ابھی تک میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ تم نے ہمیں وہاں سے... میرا مطلب ہے ایس ایس پی رضوی صاحب کے گھر سے کیوں نکالا تھا۔" کیتھرین نے کہا۔

"مجھے اندیشہ تھا کہ بعد میں تمھارا نکلنا مشکل ہوگا۔" میں نے کہا۔ "تمھارے وہاں رہنے سے ہماری مشکلات میں اضافہ ہو سکتا تھا۔ ملاور اینڈ کمپنی تم کو پھر لے جاتی۔ اس بار تمھارے ساتھ تمھاری بیٹی بھی ہائی جیک ہوتی اور جتنی ہمت یا مستقل مزاجی کا مظاہرہ تم نے اکیلے کیا تھا' شاید جولی کی موجودگی میں ممکن ہی نہ رہتا۔ جولی تمھاری کمزوری بن جاتی اور تم دونوں کو بچانے کے لیے ہمیں کہیں نہ کہیں جھکنا پڑتا... یہ بھی ہو سکتا تھا کہ پولیس تم کو جال بنا کے رکھے اور ہم کبھی نہ کبھی اس جال میں پھنس جائیں۔"

"کیا وہاں یہ سب نہیں ہوگا؟"

"میرا خیال ہے کہ وہ خاصی محفوظ جگہ ہے۔" میں نے کہا۔ "اور اگر تم احتیاط سے کام لو' میرا مطلب ہے ایسے علاقوں میں بہت زیادہ نہ گھومو پھرو جہاں کسی بھی شکاری کے ملنے کا امکان ہو..."

"شکاری کون؟" جولی کھلکھلا کے ہنس پڑی۔ کیتھرین نے اُسے گھورا۔

"وہ سب جو ہمارے تعاقب میں ہیں' شکاری ہیں۔" میں نے وضاحت کے لیے کہا کیونکہ جولی نے ہماری زبان سے یہ لفظ پہلے

نہیں سُنا تھا۔ وہ شکاری ہیں جو تمھاری ماں کو اغوا کر کے لے گئے تھے۔ پولیس بھی شکاری ہے۔ بہرام دادا کے پرانے دشمن بھی شکاری ہیں۔ ممکن ہے کچھ دوست بھی شکاری ہوں۔ جو تم سے بہرام دادا کی دولت کا پتا لگا کے اس پر قابض ہونے کی فکر میں ہوں۔ اس کے علاوہ کچھ بین الاقوامی... سیاسی نوعیت کے شکاری ہیں۔"

"کیا تم شکاری نہیں ہو؟" جولی نے کہا۔

"ہاں، ہم ان کے شکاری ہیں جو ہمارے شکاری ہیں۔ اس طرح جو یہاں شکار ہے، وہی شکاری بھی ہے۔ بات وقت، حالات اور موقع یا نقطۂ نظر کی ہے۔" میں نے کہا۔

"میں نے تمھاری عدم موجودگی میں خاصی بریفنگ کی ہے۔" غالب بولا۔

"تم نے اپنی ڈیڑھ ٹانگ کے حوالے سے کی ہوگی۔" میں نے کہا۔

"میں نے جولی کو کچھ بتانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔" کیتھرین نے کہا۔

"چنانچہ میں نے سب بتا دیا ہے۔ ایم آر ایس کے وجود میں آنے کے اسباب اور اس کے اغراض و مقاصد۔ کامیابیاں، ناکامیاں، عزائم اور ارادے۔" محسن بولا۔ "جولی تقریباً سب سے متعارف ہے اور میرا خیال ہے کہ کچھ عرصے بعد جب یہ بالکل صحت مند ہو جائے گی اور اس کی تھوڑی سی ذہنی تربیت بھی مکمل ہوگی، تو یہ بھی ماں سے پیچھے نہیں رہے گی۔"

"ابھی ہم اپنے جلوس میں زیادہ افراد کو شامل کریں گے تو زیادہ غیر محفوظ ہو جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "ابھی ہم ایک ٹیم ہیں، شہلا اور جولی اس ٹیم کے لیے باہر رہ کے بھی بہت کچھ کر سکتی ہیں۔ ویسے تو حیدلو وہ دستورا ایڈووکیٹ اور ڈاکٹر شہریار۔ غالب کے صحافی دوست اور بہت سے دوسرے لوگ جنھوں نے اب تک ہماری مدد کی۔ سب ہی ایم آر ایس کے حامی ہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ آئندہ ہمیں زیادہ منظم ہو کے الگ الگ ٹیم کی صورت میں کام کرنا ہوگا۔ ابھی تک ہم اپنے ہی ملک میں تھے اور ہمیں آمد و رفت کے یا سرحدی پابندیوں کے مسائل درپیش نہیں تھے۔ راستہ آسان تھا اور پیسا اسلحہ بھی مل ہی جاتا تھا۔ ہم کو ان مجرموں کے پیچھے بھارت یا مشرقِ پاکستان جانا پڑا تو حالات مختلف ہوں گے۔ فوج کی تنظیم کس طرح ہوتی ہے۔ ایک حصہ پیش قدمی کرتا ہے اور قبضہ برقرار رکھتا ہے۔ دوسرا مواصلاتی رابطہ فراہم کرتا ہے۔ ان کو تم انفنٹری اور سگنل کور کہہ سکتے ہو۔ تیسرا موٹر ٹرانسپورٹ کا ذمے دار ہوتا ہے۔ ای ایم ای۔ چوتھا راشن، کپڑے اور دیگر ضروریات کی فراہمی کرتا ہے۔ سپلائی کور۔ یہ سب ضروریات تو ہماری بھی ہیں مگر ہم نے ذمے داریوں کو تقسیم نہیں کیا ہے۔ آگے چل کر ہر فرد کو ایک ٹیم کی ذمے داری سنبھالنا ہوگی۔ اپنے کارکن منتخب کرنے ہوں گے اور ضروری ہوگا کہ وہ کارکن بااعتماد ہوں۔ مقامی آبادی کی مدد کے بغیر گمنام رہ کے اپنی کارروائی جاری رکھنا مشکل ہی نہیں، ناممکن ہوتا ہے مگر ہر جگہ ایسے لوگ مل جاتے ہیں جن کو پیسے یا جذباتی ہمدردی کے نام پر اپنے ساتھ شامل کیا جا سکتا ہے مگر یہ ابھی دور کے مسائل ہیں۔"

"تاہم غور طلب ہیں۔" غالب نے مجھ سے اتفاق کیا۔

"یہ خیال تو میرے ذہن میں بھی تھا کہ آگے چل کے جنگ شدت اختیار کرے گی تو ہمیں زیادہ منظم ہو کے لڑنا ہوگا۔ اور فنڈز بھی درکار ہوں گے۔ اس پر ہم بعد میں بات کریں گے۔ پہلے آج کل کے مسائل سے نمٹ لیں۔"

ہم نے ایک ٹیکسی میں نقل مکانی کی۔ ٹیکسی کو لاہور چھاؤنی اسٹیشن پر چھوڑا اور آدھے گھنٹے بعد وہاں سے دو تانگوں میں گلبرگ کے اس مکان میں پہنچے جس کا میں نے نمبر بھی نہیں دیکھا تھا لیکن راستوں کو شناخت کرتا ہوا میں صحیح پتے تک بغیر پوچھے پہنچ گیا۔ ڈیوڈ براؤن نے برآمدے میں آ کے مجھے دیکھا اور گیراج کا لاک کھولنے کے لیے اندر گیا۔

میں نے کیتھرین کا تعارف کرایا۔ "یہ میری آنٹی ہیں۔ اور یہ ان کی بیٹی جولیا عرف جولی... میری کزن۔"

ڈیوڈ نے ان سے ہاتھ ملایا۔ "میں سمجھا تھا کہ یہ لڑکی تمھاری بیوی ہوگی اور یہ تمھاری ساس... اور یہ تمھارا سالا۔"

چونکہ میں سب کو ڈیوڈ براؤن کے مسیحی ہونے کے بارے میں بتا چکا تھا، اس لیے بُرا کسی نے نہیں مانا... کیتھرین مسکرائی اور جولی کے سندر رخسار حیا سے لال ہو گئے۔

"یہ جولی کا بھائی ہے... ایڈورڈ... مگر یہ میرا سالا نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ اور اپنی بات پر خود میرے دل نے مجھے وقت کا آئینہ دکھا کے شرمسار کیا۔ وہ وقت کتنی جلدی خواب و خیال ہو گیا تھا۔ جب فوزیہ سے میرا عشق ایک جنون تھا۔ اور اس وقت محسن واقعی میرا سالا تھا۔ اس کی بہن فوزیہ سے میری منگنی کئی سال باقی رہی تھی اور رابعہ کے ملنے تک فوزیہ کے لیے میرے جذبات نہیں بدلے تھے۔ میں محسن کو باقاعدہ سالا اعظم اور جورو کے بھائی جیسے خطابات سے نوازتا تھا اور سارا زمانہ فوزیہ سے میری دائمی رفاقت کے رشتے کو تسلیم کرتا تھا۔ پھر وقت بدلا اور آغازِ شباب کے ناپختہ جذبات کو شعور کی آندھی اُڑا لے گئی۔ حالات کے ساتھ دل بدل گئے اور نگاہیں بدل گئیں۔ یہ سب کیوں ہوا اور کیسے ہوا۔ یہ ایسا سوال ہے جس کا جواب صرف کاتبِ تقدیر کے پاس ہوگا۔ میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ ایسا ہونا ناگزیر تھا اور آج فوزیہ کا خیال مجھے نہ پریشان کرتا تھا، نہ پشیمان... وہ اپنے شوہر اور دو بچوں کے ساتھ خوش تھی۔ ہم دونوں جو ابتدا میں احساسِ بے وفائی کے آزار سے... دل فگار تھے، اب یہ محسوس کرتے تھے کہ شاید وہ عشق نہیں تھا، نادانی کی پسند تھی۔ پرانی وابستگی کے جذبات تھے یا ایک خیال کی گرفت تھی کہ ہم ایک دوسرے کے لیے ہیں۔ عملی زندگی کی حقیقت برعکس تھی۔ آج ہم نیک نیتی سے تسلیم کرتے تھے کہ ہم ایک دوسرے کے لیے نہیں بنے تھے اور اگر ساتھ رہتے تو تباہ ہو جاتے مگر اس حقیقت کو تسلیم کرتے کہ وہ محبت نہیں تھی۔ رابعہ نے زندگی کے ایسے موڑ پر میری رفاقت قبول کی اور مجھ کو محبت کا مطلب سمجھایا، جب مجھے صرف محبت کی ضرورت تھی اور اب میں جانتا تھا کہ محبت کا کوئی دوسرا روپ نہیں ہو سکتا بالکل اسی طرح جیسے سچ ایک ہی ہوتا ہے۔

"جارج..." محسن نے چٹکی بجا کے کہا۔ "واپس آ جاؤ۔"

میں چونکا۔ "سوری... میں تھوڑا سا وہ ہوں۔ تصور پرست اور تخیل کی دنیا میں رہنے والا۔ کبھی کبھی حقائق کی دنیا سے بے سبب اپنی دنیا میں لوٹ جاتا ہوں۔"

"بے سبب کچھ نہیں ہوتا۔" ڈیوڈ براؤن نے کہا۔ "ہم سب فرار چاہتے ہیں۔ اس دنیا کے سخت حالات سے لڑتے لڑتے اور مخالف قوتوں کا مقابلہ کرتے کرتے ہمارے اعصاب، ہمارا ذہن اور جسم سب تھک جاتے ہیں۔ اس تھکن کا علاج خواب ہیں، خواہ ہم جاگتے ہوئے دیکھیں یا سوتے ہوئے۔"

"میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ ایک بیماری ہے۔" میں نے کہا۔

"اوہ نو... سختیِ حالات اور مخالف قوت سے تم غلط مطلب نکال رہے ہو نوجوان..." ڈیوڈ براؤن نے کہا۔ "ایک فنکار کے لیے سازگار ماحول کا نہ ملنا۔ ایک موسیقار کے لیے ایک کمپوزیشن کا پرفیکٹ نہ ہونا۔ مصور کے لیے اس کے شاہکار کے لیے ایسے خریدار کا نہ ملنا جو صرف دولت مند ہوں مگر تصویر کا اُلٹا سیدھا نہ سمجھتے ہوں۔ ادیب پر اظہارِ رائے کی پابندی۔ مفکر کی سوچ پر پہرے۔ حریت پسند کے لیے آزادی کی منزل کے حصول کی دشواریاں۔ یہ سب مخالف قوتیں ہیں جو اسے اعصابی و ذہنی شکست دیتی ہیں اور وہ فرسٹریشن کا شکار ہوتا ہے تو خواب دیکھتا ہے۔ ایک سپاہی کی مثال لو جس نے گولیوں کی بوچھاڑ میں، برستے بم کے دھماکوں میں موت کے خونی رقص کو دیکھتے پورا ہفتہ گزارا ہو۔ اُسے خندق میں سکون کے چند لمحے بھی میسر آتے ہیں تو وہ کس کے بارے میں سوچتا ہے۔ کیا دیکھتا ہے خواب میں یا تصور میں؟ اپنا گھر، بیوی بچے، زمانۂ امن کی خوشیاں... یہ خواب اس کو سکون دیتے ہیں، ریلیکس کرتے ہیں۔"

"کیا آپ ماہرِ نفسیات تھے... ہیں مسٹر ڈیوڈ براؤن؟" میں نے کہا۔

"ماہرِ نفسیات؟ وہ کیا ہوتا ہے؟" وہ طنز سے مسکرایا۔ "یہ زندگی کا علم ہے جو زندہ انسانوں کو دیکھنے، سمجھنے اور پرکھنے سے آتا ہے۔ تجربے اور مشاہدے سے آتا ہے اور کبھی مکمل نہیں ہوتا۔ کوئی آدمی کسی بھی علم میں خود کو ماہر کہے تو وہ احمق ہے کیونکہ علم ایک پھیلتا ہوا افق ہے۔ تم جتنا اوپر جاؤ گے، اتنا ہی وسیع نظر آئے گا۔ کیا یہ غلط نہیں ہوگا اگر زمین سے اوپر اُڑنے والا خود کو ماہرِ افلاک کہنے لگے۔ خیر چھوڑو یہ بحث... یہ کیا بات ہے کہ تم لوگ خالی ہاتھ ہو! میں نے کسی خانہ بدوش فیملی کو بھی اس حد تک بے سروسامان نہیں دیکھا۔"

میں نے فوراً ایک غلطی کو چھپا لیا۔ "سامان بعد میں آ جائے گا۔ ہم لوگ فوری طور پر نئی رہائش میں منتقل ہونا چاہتے تھے۔"

اس نے سر ہلایا۔ "تم چاہتے ہو میں ابھی واک آؤٹ کر جاؤں؟"

"اوہ نو... آپ رہیں جب تک آپ کا دل چاہے۔" میں نے کہا۔ "آپ کے ساتھ رہنے سے ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"تھینک یو۔ میرا خیال ہے کل میں کراچی چلا جاؤں گا۔" وہ بولا۔ "کینیڈا کے لیے مناسب پرواز وہیں سے ملے گی۔"

میں نے بیس ہزار روپے نکالے۔ "یہ دو سال کا ایڈوانس رینٹ قبول کر لیں۔"

"میں نے کہا تھا کہ میں ایک سال سے زیادہ کا کرایہ نہیں لوں گا۔" وہ بگڑنے لگا۔ "مگر تم مصر ہو تو... ٹھیک ہے۔"

میں اور محسن لوٹ کر گئے تو ہمارے سامنے بہت سے کام تھے۔ سب سے پہلے تو ہمیں غالب کی ٹانگ کو شکنجے سے آزاد کرانے کا بندوبست کرنا تھا۔ اگرچہ ڈاکٹر شہریار کی مسیحائی سے اس کی حالت سنبھل گئی تھی مگر وہ شکنجہ بلائے جان بن کے چمٹا ہوا تھا، اور یہ غالب ہی کا حوصلہ تھا کہ اس فولادی کیکڑے کو برداشت کر رہا تھا۔

"یہ کام کون کرے گا؟" محسن نے پوچھا۔ "کوئی لوہار؟"

"ہاں، لوہا کاٹنا تو لوہار ہی کا پیشہ ہے۔" میں نے کہا۔ "ویلڈر بھی کر سکتا ہے لیکن اس کے لیے ضروری ہوگا کہ ہم غالب کو ویلڈنگ پلانٹ پر لے جائیں۔"

"ویلڈنگ پلانٹ موبائل بھی ہوتے ہیں، جو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جائے جا سکتے ہیں۔" محسن نے کہا۔

"ہاں... مگر بہت بھاری ہوتے ہیں۔ اس کے لیے گاڑی چاہیے۔ ظاہر ہے، رازداری کا معاوضہ الگ ہوگا۔ ہر شخص پر اعتبار بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ہم جسے بھی لے کر آئیں گے، وہ دس قسم کے سوال کرے گا۔ اس بات پر تو کبھی راضی نہ ہوگا کہ اُسے آنکھ پر پٹی باندھ کے لے جائیں۔" میں نے کہا۔

"کیا یہ محاورہ غلط ہو چکا ہے کہ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے؟" محسن بولا۔

میں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ "لاحول ولا قوۃ۔ یہ بات مجھے کیوں نہیں سوجھی؟"

"ہر عقل مندی کی بات کرنے کا ٹھیکا میرے پاس ہے۔"
محسن بولا: "لوہا کاٹنے کی مخصوص آری ہر جگہ ملتی ہے۔ اس کے بلیڈ سخت ترین اسٹیل کے ہوتے ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔"

"خاک معلوم ہے، کیا فائدہ اس معلومات کا جو وقت پر کام نہ دے۔" محسن بولا۔

"تم نے کون سا وقت پر بتا دیا۔" میں نے کہا۔ "تم اور غالب بھی یہ بات جانتے تھے، پھر کل کیوں نہیں خیال آیا۔ بے وجہ وہ ایک مصیبت میں گرفتار رہے۔"

"ہاں یار" اس شکنجے کو کل ہی کاٹ کے الگ کیا جا سکتا تھا۔ وہ نرم لوہے کا بنا ہوا ہے۔" محسن بولا۔ "ہتھکڑی کاٹنا پھر بھی مشکل ہوتا ہے۔"

"اس آری سے ہتھکڑی بھی کاٹی جا سکتی ہے۔" میں نے کہا۔

ہارڈویئر کی ایک دکان سے ہم نے دو اسٹیل کٹر بلیڈ خریدے اور واپس پہنچتے ہی اس کام میں لگ گئے جو بہت پہلے ہو سکتا تھا۔ غالب نے ہمیں اس کوتاہ بینی پر شرمندہ کرنے کی ناکام کوشش کی اور خود شرمندہ ہوا۔ ہم آدھے گھنٹے تک آری کو ایک ہی جگہ رگڑتے رہے۔ اس میں ایک آری ٹوٹی کیونکہ محسن نے زیادہ جوش و خروش دکھایا تھا۔ ایسی ہر آری ذرا سا موڑنے سے خشک لکڑی کی طرح پٹ سے دو ٹکڑے ہو جاتی ہے۔ بالآخر ہماری محنت رنگ لائی۔ محسن نے ایک گالی دے کر اس شکنجے کو باہر پھینکا اور پھر اس انڈر گراؤنڈ ٹینک میں ڈال آیا جس میں برسوں کا پانی کائی کے رنگ کا ہو گیا تھا۔

دوسرے کمرے میں ڈاکو اب چلّانے لگے تھے۔ بھوک اور تکلیف سے ان کی حالت خراب ہو رہی تھی۔ وہ ہمیں گالیاں دے رہے تھے اور پوچھ رہے تھے کہ ان کو کہاں لا کے ڈال دیا گیا ہے۔ مگر ہم میں سے کسی نے ان کو جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔ ان کی حالت اتنی ابتر تھی کہ وہ شام تک مر جاتے۔ پولیس سے چھینی ہوئی وردیاں اب بھی جیپ میں موجود تھیں۔ ہم نے منظر کے فراہم کیے ہوئے کپڑے پہن رکھے تھے اور ڈاکوؤں نے ہوش آنے سے پہلے ہمیں صرف وردی میں دیکھا تھا۔ اب یہ ضروری تھا کہ ہم اپنی تھانیداری کا بھرم قائم رکھیں اور ان کو شک نہ ہونے دیں کہ ہم پولیس والے نہیں ہیں۔

میں نے باہر جا کے گیراج کا دروازہ کھولا اور جیپ میں سے دونوں وردیاں نکال لایا۔ ایک انسپکٹر کی وردی تھی اور دوسری سب انسپکٹر کی۔ محسن نے خیال ظاہر کیا کہ اب غالب کو بھی کیتھرین اور جولیا کے پاس پہنچا دینا چاہیے۔ میں نے اتفاق کیا اور یہ بھی کہا کہ وہ دوسرے ضروری کام بھی نمٹا آئے مثلاً کچھ فرنیچر اور گھر میں استعمال ہونے والے برتن خرید لے۔ کیتھرین اور جولی اپنے لیے کپڑے بعد میں اپنی پسند اور ضرورت کے مطابق خرید سکتی تھیں لیکن ہمیں دو چار اپنے لیے

جوڑے درکار تھے جو ہماری ظاہری وضع قطع کو بدلنے میں معاون ہوں۔ وہ اپنے ساتھ اس مقصد کے لیے پندرہ ہزار روپے لے گیا۔ میں نے اسے یہ بھی تاکید کی کہ وہ منظر سے رابطہ قائم کر سکے تو ایک لاکھ روپے بھی لیتا آئے جو اس نے رابعہ کے اکاؤنٹ سے نکلوائے ہوں گے۔

جب وہ ٹیکسی کی تلاش میں نکل گیا تو میں نے غالب سے کہا "آج پھر تم کو اپنے اخبار نویس ساتھیوں کو بلانا ہے۔"

"ہاں، میں سوچ رہا تھا کہ کیا پھر انہی کو بلاؤں" غالب نے کہا۔

"کسی اور کو بلانا مناسب نہ ہو شاید۔" میں نے کہا۔ "ان کو اشارہ دے چکے ہیں کہ ہمارے پاس جیل سے فرار ہونے والے ملزم کی اسٹوری بھی ہے۔ یہ اسٹوری بھی ان کو ملے گی تو وہ ہم سے تعاون کریں گے۔ ظاہر ہے ان کی تو دھاک بیٹھ جائے گی۔"

"ہاں... لیکن دوسرے مایوسی کے ردِ عمل کا شکار ہوں گے تو ہمارے پیچھے لگ جائیں گے۔" غالب نے کہا۔ "اور شکاری دوسرے بھی ہیں مگر سب سے خطرناک شکاری یہ صحافی ہوتے ہیں۔"

"یہ تو ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ تمہارے طے کرنے کا مسئلہ ہے، تم جیسا مناسب سمجھو کرو۔ ایک بات اہم ہے کہ وہی آئے جو ہمارے کے قابل ہو۔"

"کل میں نے انہی کا انتخاب کیا تھا جو میرے نزدیک قابلِ اعتماد تھے۔" وہ بولا۔ "آج کس پولیس افسر کی موجودگی میں بلانا ہوگا۔ سب سے اچھا تو یہی ہوتا کہ خود رضوی صاحب آتے جو اس کیس کی تفتیش بھی کر رہے ہیں۔" غالب نے کہا۔

"ہمارے بلانے سے وہ ہرگز نہیں آئیں گے۔ اور اگر آئیں گے تو یہ بات یقینی سمجھو کہ واپسی میں ہمیں ساتھ لے جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "وہ کوئی ایسا بندوبست کریں گے کہ ہمیں خاک بھی پتا نہیں چلے گا اور ہم محصور ہو جائیں گے۔"

"رپورٹر یہ کام کر سکتے ہیں۔" غالب نے کہا۔ "وہ پہلے رضوی سے بات کر لیں کہ مفرور ڈاکوؤں کو چوبیس گھنٹے کے اندر اندر پکڑنے کا سکوپ! بہت فائدہ ان کو ضرور ہوگا۔ محکمہ اگر رزلٹ پر نظر رکھتا ہے تو پھر اس سے سروکار نہیں ہونا چاہیے کہ وہ کہاں اور کیسے پکڑے گئے اور کس کے ذریعے پکڑے گئے۔ بیشتر جرائم کا سراغ مخبر دیتے ہیں۔"

"مگر یہاں تو کان کو اُلٹی طرف سے پکڑنے والے بیٹھے ہیں جو سیدھی سی بات نہیں سمجھیں گے۔" میں نے کہا۔ "سوال یہ کریں گے کہ ڈاکوؤں کو اخبار والوں کے سامنے لانے والے خود مجرم تھے، وہ کیسے نکل گئے اور ایس ایس پی صاحب نے دو خطرناک ملزم خود نہیں پکڑے مگر خود اس کوتاہی کے مرتکب ہوئے کہ دو خطرناک ملزم اتنی دیدہ دلیری سے فرار ہو گئے۔"

"اس کا بھی ایک طریقہ ہے۔" غالب نے کہا۔ "فرض کرو کہ ہم اخبار والوں کو پہلے بلا لیں۔ ان کے سامنے ڈاکو اپنا بیان دیں اور جو سوال جواب ہونا ہیں ہو جائیں۔ وہ تصویریں وغیرہ لیں اور چلے جائیں۔ پھر ہم انکل رضوی کو فون کریں اور بتائیں کہ وہ اپنی نفری لے کر جائیں اور فلاں جگہ سے ڈاکوؤں کو گرفتار کر لیں۔ اس طرح گرفتاری کا کریڈٹ انھیں مل جائے گا مگر ہمیں گرفتار نہ کرنے کی کوتاہی کا الزام ان پر نہیں آئے گا۔"

"آئیڈیا۔" میں نے کہا۔ "مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارے وہ یار اس وقت کہاں ہوں گے۔ میرا خیال ہے گھروں پر لمبی تان کے سو رہے ہوں گے۔"

"ہاں، رات کی مخلوق ہیں نا..."

"تمھیں ان کے ٹھکانے معلوم ہیں؟" میں نے کہا۔

"ہاں... اب بھی وہیں ہوں گے جہاں پہلے رہتے تھے۔"

"تو فون مت کرو۔ جاتے ہوئے ہر ایک کو گھر پر پیغام دے جاؤ کہ تیار رہیں۔ اور جب محسن آئے تو اس کے ساتھ وہ بھی آ جائیں۔" میں نے کہا۔

باہر ایک گاڑی کے رُکنے کی آواز پر میں سمجھ گیا کہ محسن ٹیکسی لے آیا ہے۔ میں نے اور محسن نے غالب کو ٹیکسی میں شفٹ کیا اور ٹیکسی روانہ ہو گئی۔ مجھے امید تھی کہ راستے میں غالب خود محسن کو سارا پروگرام بتا دے گا۔

اب میں نے تھانیدار کی وردی پھر پہنی اور ریوالور ہاتھ میں لے کر ڈاکوؤں کے سامنے گیا۔ وہ واقعی سخت تکلیف میں تھے اور مجھے دیکھتے ہی گڑگڑا کے بلبلانے لگے۔

"پلٹے خاں... اور گورے خاں۔" میں نے کہا۔ "تم کو کچھ کہنا ہے؟"

"ہاں... تھانیدار..." پلٹے خاں بولا۔ "آخر ہمیں یہاں کیوں رکھا گیا ہے؟"

"تمہاری گرفتاری کی خبر ابھی پوشیدہ رکھی گئی ہے۔ آج ایک خصوصی ٹیم تم سے تفتیش کرے گی۔" میں نے کہا۔

"ہم کچھ نہیں بتائیں گے... بس پھانسی چڑھا دیں ہمیں۔" وہ چلّایا۔

"تم کو تقدیر نے ایک موقع فراہم کیا ہے۔" میں نے کہا۔ "تم اس سے فائدہ اُٹھا سکتے ہو... سچ بول کر..."

"سچ بول کر۔" گورے ڈاکو نے تلخ لہجے میں کہا۔ "تو پاگل ہے تھانیدار... سچ ہی تو آدمی کو پھانسی لگواتا ہے۔"

"یہ ذرا مختلف صورتِ حال ہے۔" میں نے کہا۔ "تمہارے فرار کے بعد بہت سے ذمے دار لوگ معطل ہو گئے ہیں۔ اب اگر تم سچ بتا دو کہ تم کس طرح فرار ہونے میں کامیاب ہوئے، کس طرح دوبارہ پکڑے گئے تو مقدمے کی سماعت پھر شروع ہوگی اور اس میں نئے معاملات اُٹھائے جا سکتے ہیں۔"

"مشکل ہے۔ اب کوئی ہمیں نہیں بچا سکتا۔"

"تمہارا کیس اخبارات میں دیا جا رہا ہے۔" میں نے کہا۔ "حکومت کے نوٹس میں بہت سی باتیں آ سکتی ہیں جو آج تک نہیں آئیں۔ وجہ یہ تھی کہ تم نے اپنا سارا مقدمہ جھوٹ پر لڑا۔ اب سچ بول کے تم حالات کی دوسری تصویر پیش کر سکتے ہو۔ مثلاً تم تفصیل سے بتاؤ کہ تم ڈاکو کیسے بنے۔ کس نے تمہاری سرپرستی کی۔ کون کون پولیس افسر تم سے مال کھاتا رہا۔ یہاں تک کہ ہمارے خلاف جانے والی بات بھی کہہ دو... صاف بتا دو کہ پولیس والے کھانے کے کہاں سو رہے تھے، ان کی جیپ کہاں کھڑی ہوئی تھی اور... تم نے ان کے ساتھ بیٹھ کے کیا کھایا۔"

وہ دونوں تعجب سے میری صورت دیکھنے لگے۔ "یہ بھی بتا دیں؟"

"ہاں۔" میں نے کہا۔ "ہماری فکر مت کرو... یہ کوئی بڑا الزام نہیں ہے۔"

"تم کہتے ہو گرفتاری کے بعد پھر مقدمہ چلے گا؟" پلٹے خاں بولا۔

"ظاہر ہے، نئے بیان کی روشنی میں سماعت دوبارہ ہوگی۔" میں نے کہا۔ وہ میرے جھانسے میں آ گئے تھے کیونکہ وہ قانون سے ناواقف تھے۔ انھیں امید کی ایک کرن درکار تھی جو میں نے انھیں فراہم کر دی۔

"ایک صورت اور بھی ہے۔" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔

وہ میری صورت دیکھنے لگے۔

"تم سلطانی گواہ بن جاؤ۔" میں نے کہا۔ "دونوں اپنے گروہ کے تمام جرائم کا اعتراف کر لو۔ سب کے پتے ٹھکانے بتا دو اور سب کو گرفتار کرا دو۔"

"یہ... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" گورا ڈاکو نے کہا

"ہم... ہم اپنے ہی سنگی ساتھیوں کے ساتھ دغا کریں۔" پلٹے خاں بولا۔

"زندہ رہنا ہے تو پھر کچھ کرنا ہی ہوگا۔" میں نے کہا۔ "یہ تو زمانے کا دستور ہے۔ کوئی بھی دوسروں کی خاطر جان نہیں دیتا۔ وہ کون سے تمہارے جگری دوست تھے۔ ہم پیشہ تھے اور بس... ایک غلط کام کے لیے تم سب اکٹھے ہو گئے تھے۔ تم عدالت کے سامنے تائب ہو سکتے ہو۔ کہہ سکتے ہو کہ ہم آئندہ شرافت کی زندگی گزارنے کا عہد کرتے ہیں... تمہارے سب ساتھی اندر ہو جائیں گے اور تم کو قانون کی مدد کرنے کی رعایت ملے گی۔"

"لیکن... وہ ہم کو زندہ نہیں چھوڑیں گے... ہمارے ساتھی۔"

"وہ جیل میں ہوں گے۔ کچھ لٹک جائیں گے۔ کچھ عمر قید کاٹیں گے۔ باقی کو لمبی سزائیں ہوں گی۔ ان کے باہر آنے سے پہلے ہی تم روپوش ہو سکتے ہو۔ دنیا بہت بڑی ہے۔ جہاں چاہو چلے جانا۔ لیکن پہلے سوچ لو کہ زندہ رہنا چاہتے ہو یا نہیں۔" میں نے کہا۔

یہ سوال آہستہ آہستہ غیر ضروری ہو گیا تھا۔ ان کی آنکھیں جھوٹی امید کی روشنی دیکھنے لگی تھیں۔ جو شخص تختۂ دار کے اتنا قریب ہو، اس سے کیا پوچھنا کہ زندہ رہنے کی خواہش رکھتے ہو تو بتاؤ۔ اس وقت وہ زندگی کے لیے سب کچھ کر سکتا ہے۔ پلٹے خاں اور گورا ڈاکو بھی سوچنے لگے تھے کہ اس طرح زندگی مل سکتی ہے تو کیا ہے... یہ غداری ہو یا بے وفائی۔ بزدلی ہو یا نامردی۔ ایسے دس الزام لے کر بھی زندگی کا سودا کرنا مہنگا نہیں ہو گا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرا داؤ چل گیا ہے۔ اب وہ میری مرضی کے مطابق بیان دیں گے اور ادھر اخبار والوں کے ہاتھ ایک دلچسپ سنسنی خیز کہانی لگے گی، ادھر اکمل رضوی کو موقع ملے گا کہ وہ دونوں ڈاکوؤں کے باقی گینگ کو بھی گھیر لیں... اور یہ ان کی بہت بڑی کامیابی شمار ہو گی۔ میں نے انھیں تنہا چھوڑ دیا کہ وہ اچھی طرح سوچ لیں اور آپس میں مشورہ بھی کر لیں۔

اس کمرے کے باقی دروازے باہر سے مقفل تھے۔ کھڑکیاں قدرے غیر محفوظ تھیں مگر مجھے ان دونوں کی حالت ایسی نظر نہیں آتی تھی کہ وہ اٹھ کر کھڑکی کے راستے کود جائیں اور نکل جائیں۔ مجھ پر کچھ تھکن غالب تھی۔ وردی اتار کے اور اپنے کپڑے پہن کے میں دروازے کے قریب لیٹ گیا۔ سگریٹ ابھی آدھا ہی ختم ہوا تھا کہ مجھے نیند نے آ لیا۔ پھر میں کسی گاڑی کا دروازہ بند ہونے کی آواز پر جاگا۔ میں ایک دم اٹھا اور ریوالور لے کر باہر آیا مگر آنے والے محسن کے ساتھ آئے تھے اور وہی اخباری رپورٹر تھے جنھوں نے گزشتہ رات زگلڈ کے آفس میں ہم سے ملاقات کی تھی۔ وہ بہت خوش تھے کیونکہ ان کی خبر نے بہت بڑا دھماکا کیا تھا۔ پولیس اور انٹیلی جنس والے حیران اور پریشان تھے کہ یہ سب تفصیلات ان کو کیسے ملیں مگر قانوناً وہ کسی بھی اخبار نویس کو ذریعۂ اطلاع بتلانے پر مجبور نہیں کر سکتے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ دونوں خبروں نے نیچے سے اوپر تک تہلکہ مچا دیا ہے اور آنے والے اخبارات میں مزید طوفان کھڑا ہو گا۔ مجموعی طور پر اخبارات کا رویہ ہمارے حق میں ہمدردانہ ہو گا۔ کوشش یہ کی جائے گی کہ ہمیں آہستہ آہستہ ہیرو بنا دیا جائے۔ یہ ثابت کیا جائے کہ ہم سازش کا شکار ہوئے۔ سازش کرنے والے غدار اور ملک دشمن عناصر تھے جن کی مدد پولیس نے کی۔ اس کے بعد تحریک چلائی جائے کہ ہمارے خلاف مقدمات واپس لیے جائیں۔

یہ بڑی خوش آیند خبر تھی۔ میں نے ان کو بتایا کہ دونوں ڈاکو آمدہ ہیں اور حالات کا تقاضا ہے کہ میں ان کے سامنے نہ جاؤں۔ محسن بھی پولیس کی وردی میں رہے گا اور اخبار والے ان کا مفصل بیان لینے کے بعد جتنے سوالات کرنا چاہیں کر سکیں گے۔ غالب اپنا بیان دے چکا تھا۔ میں نے بھی وہی کہا جو غالب نے کہا تھا کہ یہ ڈاکو پولیس پارٹی سے ان کی جیپ، رائفلیں، ریوالور اور وردیاں لے کر فرار ہو رہے تھے کہ ہم سے مڈبھیڑ ہو گئی اور ہم نے انھیں پکڑ لیا۔

ان کا خیال تھا کہ ہم خالی ہاتھ ہیں اور ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے
نے خود کو احمق قسم کے دیہاتیوں کے روپ میں پیش کیا اور
ان کو قابو کر لیا۔ اس موقع پر میں نے بتایا کہ میں ک
مارشل آرٹس سے واقف ہوں اور خالی ہاتھوں سے ایسے
پکڑ سکتا ہوں۔ غالب کے دوستوں نے وعدہ کیا کہ وہ
کا یہ قصہ خوب بڑھا چڑھا کے لکھیں گے۔ بہت بلا
اور مفرور مجرم کا نہیں، ایک حیالے نوجوان کا بن جائے گا
استبداد کے خلاف نبرد آزما ہے اور اپنے مٹھی بھر ساتھیوں
ملک دشمن عناصر کو نیست و نابود کرنے کا عزم رکھتا ہے
کے حامی بیوروکریٹ اور بے ضمیر انتظامیہ کے افراد میرے
مشکلات پیدا کر رہے ہیں۔ کیونکہ وہ محب وطن نہیں ہیں
چکے ہیں۔

ڈاکوؤں نے میری توقع کے مطابق بیان دیا۔ محسن وردی پہن کے اندر گیا اور اس نے کہا کہ وہ خصوصی تفتیشی ٹیم ہے۔ اگر ڈاکو سچ بولیں گے تو وہ رپورٹ میں ان کے لیے کی سفارش بھی کرے گا اور اگر وہ چاہیں گے تو ان کو وعدہ بنا لیا جائے گا اور یہ ممکن ہے کہ ان کی سزا معاف کر دی یہ سب جھوٹ آف دی ریکارڈ رہا۔ محسن نے رپورٹرز کو بریف کر دیا تھا۔

گورے ڈاکو نے ایک گھنٹے میں بتایا کہ وہ کس طرح ڈاکو کیسے جیل سے فرار ہوا۔ اس نے کہاں کہاں واردات میں پولیس مدد لی یا ان کو شریک کیا۔ وہ کس کس کو بھتہ دیتا رہا تھا۔ اور اس نے اپنی گرفتاری کا احوال سنانا شروع کیا کہ انھوں نے جنگل پولیس کو دیکھا۔ دو تھانیدار تھے جو جیپ کے پاس سو رہے انھوں نے دعوت اڑائی تھی اور کھانے میں مرغ، نرگسی کوفتے اور حلوہ کھایا تھا۔ یہی سب کچھ انھوں نے بھی کھایا اور پولیس والوں کا اسلحہ چھین کر انھیں بے بس کر دیا۔

محسن کے اشارے پر اس نے اپنا بیان ختم کر دیا۔ یہ تھا کہ اس سے آگے وہ کچھ نہ کہیں۔ گورے ڈاکو نے تسلیم کر لیا کہ اب وہ جن پولیس والوں کی تحویل میں ہیں ان کی ہر بات ماننا ہے کیونکہ وہی ان کو بچانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ پولیس والے پہلے بھی ان کے مددگار رہے تھے چنانچہ یہ کوئی انوکھی اور حیران کن والی بات نہ تھی۔ ڈاکو سمجھتے تھے کہ اس مدد کی قیمت پولیس کو بھی ادا کرنا ہی ہو گی۔ پلٹے خاں کی سوانح حیات قدرے مختلف اور اس میں پولیس کے دو سربد عنوان افسران کے نام آتے تھے جو اس کے دوست اور دشمن رہے تھے لیکن وہ بنیادی بات دونوں کے بیان میں مشترک تھی۔ پولیس کا وہ غلا تھا۔ وہ سب پولیس افسر بھی موجود تھے اور ترقی بھی پا چکے تھے۔ جن کے نام

صاف ظاہر تھا کہ اس بیان کی اشاعت کے بعد وہ ڈاکوؤں کی بات کو جھوٹ کا پلندا، بہتان تراشی اور اخبار والوں کی سازش قرار دیں گے۔ انھیں سچا تسلیم کیا جائے گا کیونکہ وہ حاکم اور با اختیار ہیں اور سچ بولنے والے مجرم اور بے بس ہیں۔ وہ کوئی ثبوت بھی نہیں رکھتے۔ اس پورے نظام میں سچائی صرف وہ ہے جو ثابت کی جا سکے۔ پلٹے خاں کو بھی اسی جگہ روک دیا گیا جہاں اس کے ساتھی گورے ڈاکو کو روکا گیا تھا۔ یعنی یہ کہ وہ پولیس کے دو تھانیداروں سے جیپ اور سرکاری اسلحہ چھین کر انھیں بے بس کرنے کے بعد فرار ہو گئے تھے۔

اس کے آگے ہمارا بیان تھا کہ ہم نے ان ڈاکوؤں کو پولیس کی وردی میں پولیس کی جیپ چلاتے دیکھا اور شناخت کر لیا۔ ان کو ناک آؤٹ کر کے یہاں لے آئے۔ ہمارے اس بیان کا ڈاکوؤں کو بالکل علم نہ تھا اور یہ ناممکن تھا کہ وہ بعد میں بیان بدل سکتے۔ اخبار نویس سب سمجھ رہے تھے مگر ان کی دوستی غالب سے تھی۔ پولیس کے وہ بھی اتنے ہی دشمن تھے جتنی عام پبلک تھی۔ شاید اس سے زیادہ ہی کیونکہ وہ بہت سے ایسے معاملات کی خبر بھی رکھتے تھے جو اندر سے کچھ تھے اور باہر سے کچھ اور دکھائے جاتے تھے۔ انھوں نے میرے اور محسن کے مشورے سے ڈاکوؤں کے اور ہمارے بیانات ریکارڈ کیے۔ ڈاکوؤں کی تصاویر اتاریں پھر جیپ کی تصویریں لیں۔ وردی اور اسلحے کو پھیلا کے تصاویر بنائیں۔ اس طرح کہ ہر وردی پر لکھا ہوا نام واضح رہے اور ریوالور اور رائفل کا سیریل نمبر نمایاں ہو۔ انھوں نے شناختی کارڈ وغیرہ کی تصویریں بھی اتاریں اور پھر ہم سے ہاتھ ملا کے اور ہمارا شکریہ ادا کر کے بھاگ گئے۔ انھیں شام تک بہت سے کام کرنا تھے۔ اب ہمارا وہاں ٹھہرنا فضول تھا۔

میں نے اور محسن نے اس نمائش کو اسی طرح چھوڑا جس میں پولیس کی وردیاں، ان کا اسلحہ اور شناختی کارڈ وغیرہ کمرے کے فرش پر پھیلے ہوئے تھے۔ جیپ کو گیراج سے نکال کے باہر کھڑا کیا۔ اپنا پورٹیبل فون اٹھایا اور اپنی موجودگی کے سارے آثار مٹا کے نکل گئے۔ قریب ترین ٹیلی فون بوتھ پر پہنچ کے میں نے اکمل رضوی کے آفس کا نمبر ملایا مگر آواز بدل کے بات کی۔ انھیں بتایا کہ جیل سے فرار ہونے والے دونوں ڈاکو کہاں گرفتار کیے جا سکتے ہیں۔

"تم کون ہو... سکندر...؟" انھوں نے کہا۔ "آواز بدل کے دھوکا دیتے ہو؟"

"سکندر؟ سکندر کون؟ ہم پورس ہیں۔" میں نے کہا اور فون منقطع کر کے اتر آیا۔

"تو سب کام کر لیے تھے۔" میں نے محسن کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

"تھکن..." محسن بولا۔ "غالب نے راہ میں دو گھنٹے لگا دیے۔"

محسن بولا۔ "اس کے یہ صحافی دوست عجیب و غریب گلی کوچوں میں رہتے ہیں۔"

"اور کیا صحافی گلبرگ میں رہیں گے۔ وہ بھی پاکستان کے صحافی؟"

"ہر گلی میں ٹیکسی نہیں جا سکتی تھی۔ مجھے اتر کے پیدل جانا پڑتا تھا اور سونے والے کو جگا کے لانا پڑتا تھا۔" محسن نے کہا۔

اس کا مطلب ہے کہ اسبابِ خانہ داری بھی نہیں پہنچا؟"

"کچھ پہنچ گیا... کانے صاحب کی تسلی کے لیے۔" محسن بولا۔ "راستے میں ایک پرانے فرنیچر کی دکان اتفاق سے آ گئی۔ میں نے جو نظر آیا وہ خرید لیا۔ چار پرانے بیڈ ملے۔ دو ڈبل دو سنگل... میزیں کرسیاں... ایک الماری۔ بائیس سو روپے میں کام چل گیا اور لینڈ لارڈ کو شک نہیں ہوا۔ فرنیچر استعمال شدہ نہ ہوتا تو وہ مزید پوچھتا۔ ایک بیڈ ٹمک اسٹور سے تکیے چادریں لے لیے تھے۔ بس برتن رہ گئے ہیں۔"

"اور وہ فرنیچر... کیا وہ بھی ٹیکسی میں ڈال لیا تھا؟"

"اسے پتا سمجھا دیا تھا۔" محسن بولا۔ "دکاندار نے کہا کہ آپ بالکل فکر نہ کریں۔ ہمارے آدمی سارے شہر میں پھرتے ہیں۔ ہر پتا ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اب تک پہنچ گیا ہو گا۔"

"کیوں نہ ہم باقی شاپنگ کر لیں؟" میں نے کہا۔ "ضروری برتن اور کپڑے خریدتے ہوئے چلیں... منظر ملا تھا؟"

"نہیں... وہ نہ چیمبر میں تھا اور نہ گھر میں۔" محسن بولا۔ "غالباً کورٹ سے روانہ ہونے میں دیر ہوئی تھی۔ اس وقت چیمبر میں ہو گا اور وہاں اس سے ملنا ٹھیک نہیں۔ رات کو گھر پہنچ جائیں گے۔"

میرا اور محسن کا یوں گھومتے پھرنا خطرناک تھا۔ خصوصاً اس لیے کہ آج ہی اخبارات میں ہماری تصویریں شائع ہوئی تھیں۔ ایسے ہی چلتے چلتے میں نے محسن کو تجویز پیش کی کہ اب ہمیں حلیہ بدل لینا چاہیے۔ آدھے شہر نے ہماری تصویر آج دیکھی ہو گی۔ باقی آدھا شہر کل دیکھ لے گا۔ یہ سب پبلک کے لیے بہت سنسنی خیز خبریں ہیں اور ڈاکوؤں کی گرفتاری تو ایسا موضوع ہو گا جس پر گھر کی خواتین بھی اظہارِ خیال فرمائیں گی۔ محسن کو مجھ سے اتفاق تھا۔ اچانک ہم ایک ہیئر ڈریسر کی دکان کے سامنے سے گزرے۔ اس نے شوکیس میں ہر طرح کی وِگ سجا رکھی تھی۔ میں نے محسن کو متوجہ کیا۔ اندر بہت کم لوگ تھے۔ جو رش صبح شام کے اوقات میں نظر آتا ہے، وہ نہیں تھا۔ ہیئر آرٹسٹ ہمارے سر پہ وِگ لگا بھی سکتا ہے۔" محسن نے کہا۔

"ہیئر ڈریسر کی دکان بہت خطرناک جگہ ہوتی ہے۔" محسن بولا۔ "سب شیو کروانے والے مفت کے اخبارات پڑھتے ہیں اور پھر تبادلۂ خیالات کرتے ہیں۔ یہاں ہر ایک باخبر اور باشعور شخص ہوتا ہے جو سب کی سنتا ہے۔"

"تیرا مطلب ہے وہ ہمیں شناخت کرے گا؟"
"اس کا امکان ہے۔"
"ہم رسک لیتے ہیں۔" میں نے کہا۔

محسن نے ٹھیک کہا تھا۔ چیف باربر نے کاؤنٹر پر ہی ہمیں شناخت کر لیا۔ ابھی اس نے منہ کھولا ہی تھا کہ ہم دونوں نے آگے جھک کر ریوالور نکال لیے۔ اس کا منہ فوراً بند ہو گیا۔

"آج کے اخبارات پڑھنے کے بعد تم کو اتنا اندازہ تو کر ہی لینا چاہیے کہ ہم کس قسم کے لوگ ہیں۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "ہم نے سیکڑوں تخریب کاروں کا صفایا کر دیا۔ ان کے اسلحہ خانے برباد کر دیے۔ ہیلی کاپٹر گرائے اور درجنوں ایجنٹ قتل کیے۔ تم کیا چیز ہو؟"

"ہم نہ چور ڈاکو ہیں نہ قاتل ہیں، نہ مفرور مجرم۔" محسن نے کہا۔ "ہم اس ملک کے محبِ وطن شہری ہیں۔"

"بے... بے شک جنابِ عالی..." باربر نے بمشکل تمام کہا۔ "آج تو سارے لوگ یہی کہہ رہے ہیں... آپ... آپ لوگوں نے تو بڑا کام کیا ہے جی... وہ کارنامہ سرانجام دیا ہے... کہ لوگ فخر کر رہے ہیں۔"

"اچھا؟" میں نے اس حوصلہ افزا اطلاع پر خوش ہو کے کہا۔ "کیا تم سچ بول رہے ہو؟ یا اپنی جان بچانے کے لیے..."

"لو جی... آپ کوئی دشمن ہیں ہمارے۔ اللہ آپ کو حوصلہ دے اور پولیس کو عقل دے۔" چیف باربر نے کہا۔ "ہم تو جی دل سے تعریف کرتے ہیں کہ آپ نے کمال کر دیا۔"

"کل تم کو ایک اور خبر ملے گی۔" میں نے کہا۔
"وہ کیا جی؟" چیف باربر سرگوشی میں بولا۔

"یہاں نہیں... اندر کوئی جگہ ہے تو ہمیں لے چلو۔ ہمیں تمھاری مدد کی بھی ضرورت ہے۔" میں نے کہا۔ "بس ایک بات مت بھولنا۔ دھوکا دینے یا چالاک بننے والے کو ہم بھون دیتے ہیں۔ ہمارے لیے ہمارا مشن اہم ہے، ہم صرف تم کو ہی نہیں ان سب کو ٹھنڈا کر کے بھی نکل جائیں گے۔ اگر ضروری ہوا... کوئی ہماری گرد کو بھی نہیں پہنچ سکے گا۔"

"خدانخواستہ... خدانخواستہ جی..." چیف باربر نے خشک حلق کو تھوک نگل کے تر کیا۔ "آپ حکم کریں عالی جاہ... اندر میرا گھر ہے... پچھلی طرف سے اندر چلیں۔ مجھ سے جو خدمت ہو گی بجا لاؤں گا۔"

سیلون کے آخری حصے میں ایک قدِ آدم شیشہ گھوم گیا اور اس کی جگہ دروازہ نمودار ہوا۔ ہم اس کے پیچھے ایک اور دروازے سے گزرے تو خود کو ایک کمرے میں پایا۔ ایک عورت جو تخت پر لیٹی کوئی فلمی رسالہ دیکھ رہی تھی۔ دوپٹہ اٹھا کے بھاگی اور اندر غائب ہو گئی۔ ایک بچہ جو کرسی سے فرش پر کود رہا تھا آرام سے بیٹھ گیا۔

"اِدھر بیٹھو شہنشاہو!" چیف باربر نے کہا۔ "میری قسمت کہ آپ نے مجھے خدمت کا موقع دیا... میرا دل کرتا ہے بتا دوں..."

"ایسی بے وقوفی ہرگز مت کرنا۔" میں نے کہا۔ "ہم رہنے کے لیے سب کچھ کرتے ہیں۔ ہم تو چلے جائیں گے میں پھنس جاؤ گے۔ تم ہی نہیں تمھارے گھر والے بھی۔"

"سمجھ گیا... بالکل سمجھ گیا جی..." وہ بولا۔ "وہ کیا خبر کل اخبار میں آئے گی؟"

میں نے اسے بتایا کہ کس طرح گورا ڈاکوا اور یاسمین جیل سے فرار ہوتے تھے۔ یہ خبر اس نے بھی پڑھی اور سنی تھی، انھوں نے پولیس کے ساتھ کیا سلوک کیا اور بالآخر ہمارے ہاتھوں کیفرِ کردار کو پہنچے۔ چیف باربر ہکّا بکّا رہ گیا۔ وہ ہمیں یوں دیکھ رہا تھا جیسے ہم سپرمین قسم کی چیز ہیں یا مریخ کی مخلوق ہیں جو گھر میں اتر آئی ہے۔ یہ اتنی ہوش رُبا خبر تھی کہ اس کے لیے ضبط سے کام لینا دشوار ہو رہا تھا۔ وہ سارے زمانے کو چیخ چیخ کر بتانا چاہتا تھا کہ اسے کس کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا ہے اور اسے کتنی تہلکہ خیز خبر سارے شہر سے پہلے معلوم ہو چکی ہے۔ ہم نے اسے چُپ رہنے پر مجبور کر دیا تھا لیکن مجھے لگتا تھا کہ ہمارے جانے کے بعد وہ پھٹ جائے گا۔ وہ رازداری سے ایک کو بتائے گا، ایک دوسرے کو۔ دوسرے سے تیسرے اور چوتھے تک بات پہنچے گی اور صبح کا اخبار آنے تک اس محلے کے کافی لوگ اس راز سے آشنا ہو جائیں گے۔ یہ الگ بات ہے کہ ایک زبان سے دوسرے کان تک پہنچتے ہوئے خبر بدلتی جائے۔ ہر شخص زیبِ داستاں کے لیے کچھ اضافہ کرے اور صبح اخبار میں حقیقت اتنی ہی آئے جتنی چیف باربر جانتا تھا۔

"تمھارا نام کیا ہے استاد جی؟" میں نے کہا۔
"امام دین ہیئر آرٹسٹ۔" وہ بولا۔ "لوگ پنڈت کہتے ہیں۔"
"پنڈت؟ یہ کیا بات ہوئی؟" میں نے کہا۔

"وہ جی... میں کچھ ستاروں کی چال وغیرہ کے حساب سے باتیں بتا دیتا تھا جو درست ہوتی تھیں۔" وہ خفت سے بولا۔ "شوق تھا۔"

"اور باتیں اتفاق سے درست ہوتی تھیں۔"

"وہ تو ہے جی... ہم شغل کرتے تھے۔ ہوتا تو وہی ہے جو رب کو منظور ہو اور بندہ بشر کیا جانے غیب کا حال۔" وہ ہنسا۔ "جی تُکّا لگ جاتا تھا اور سچ ہو تو لوگ دوڑے آتے تھے کہ پنڈت تو نے ٹھیک بتایا تھا۔ غلط ہو تو کسی کو میرا خیال بھی نہیں آتا کہ میں نے کیا کہا تھا۔ کچھ لوگ مذاق اُڑاتے تھے کہ بڑا پنڈت پھرتا ہے۔ بس وہ پنڈت ایسا چلا کہ اب زیادہ لوگ پنڈت ہی... خلیفہ پنڈت۔"

"پھر تو ہم بھی پنڈت ہی کہیں گے۔" میں نے کہا۔ "یہ بتاؤ پنڈت کہ ہمارے بارے میں تمھارا ستاروں کا علم کیا کہتا ہے۔"

"کیوں شرمسار کرتے ہیں شہنشاہو۔ اللہ نے آپ کو اتنی مشہوری دی ہے اور اتنے بڑے بڑے کام کرنے کا حوصلہ دیا ہے۔ آپ تو اس کے خاص بندے ہو۔ اس کی حمایت حاصل ہے آپ کو۔" وہ بولا۔ "ہمارا کیا ہے جی، ہم کچھ نہیں ہے۔ بس تُکّا لگ گیا تو واہ واہ۔"

"اچھا پنڈت! اب ہمارا مسئلہ سنو۔" میں نے کہا۔ "تمھاری طرح جانے کتنے لوگ اس شہر میں ہمیں پہچان سکتے ہیں۔ ابھی تک ہمیں اندازہ نہیں ہوا تھا۔ ہم تو مزے سے گھوم رہے تھے۔ شاید کسی نے غور نہیں کیا لیکن ہم ایسے نہیں پھر سکتے۔ کل کے بعد تو بہت مشکل ہو گا۔ ہم چاہتے ہیں کہ تم ہمارا حلیہ بدل دو۔ ہم اندر آئے تھے وِگ لینے۔ تم ہمارے سر کے لیے ایسی وِگ لاؤ جو فٹ بیٹھے۔"

"فٹ تو جناب میں خود کروں گا..." وہ دکان کی طرف لپکا۔
"مجھے اس صورتِ حال سے خوشی ہوئی۔" میں نے کہا۔

"میں بھی نہیں بتا سکتا کہ میرا حوصلہ کتنا بڑھ گیا ہے۔" محسن بولا۔ "اب ہمارے معاون اور مددگار بہت ہیں۔ ان کے مقابلے میں شکاری جتنے بھی ہوں کم ہیں۔"

"کل کے بعد اخبارات میں جو مہم شروع ہو گی اس کا بہت فائدہ ہو گا۔ ہم کو پبلک کی سپورٹ مل جائے گی۔ ہمارے لیے پناہ دینے والوں کی کمی نہ رہے گی۔ ہمارے مددگار اس ملک کے سب محبِ وطن ہوں گے۔ ان میں بڑے بڑے دل والے ہیں جو ہر طرح سے ہمارا ساتھ دیں گے۔ دامے درمے سخنے۔"

"یہ ہمیں بہت پہلے کرنا چاہیے تھا۔"

"ہر کام اپنے وقت پر ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم صحیح وقت پر صحیح کام کر کے پبلک کے سامنے آئے ہیں۔ آئندہ دو چار دن میں ہمارا جو امیج بنے گا، وہ ہماری سب سے بڑی فتح ہو گا۔ ہم جہاں بھی جائیں گے اس ملک کے عوام ہمارے ساتھ ہوں گے۔ ہم خود شناخت کرا کے بہت سے کام نکال سکیں گے۔"

"غالب سے کہنا ہے کہ وہ اپنے سب صحافی دوستوں کو اس مہم پر لگا دے۔" میں نے کہا۔ "پولیس نے اور دلاور اینڈ کمپنی نے ہماری بہت عرصہ کردار کشی کی ہے۔ اب رائے عامہ کو ہمارے حق میں ہموار کرنے کے لیے ہمارے کارناموں کو خوب اُچھالنا ضروری ہے۔"

اُسی وقت پنڈت آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں چار ڈبے تھے۔

"یہ ولایتی وِگ کا سیٹ ہے بادشاہو۔" اس نے ایک ڈبا کھول کے کہا۔ "یہاں تو شوقین مزاج استعمال کرتے ہیں۔ بڑے بڑے نامور لوگ میرے گاہک ہیں اور فلم اسٹار حسن کا نام بتا دوں تو شرما جائیں گے۔ ان کے ہیئر اسٹائل کی لونڈے کاپی کرتے ہیں مگر ان کو کیا معلوم کہ یہ سب شو شا ہے۔ اوپر تو نقلی بالوں کی اسٹائل ہے۔" وہ قہقہہ مار کے ہنسا۔ "بوڑھے گنجے اس سے جوان اور خوب صورت نظر آتے ہیں۔ آپ تو خیر سے خود بھی ہیرو ہو۔" اس نے ایک ایک ڈبا کھول کے دکھانا شروع کیا۔

"چیز تو لاجواب ہے استاد۔" میں نے کہا۔

"لاجواب کیوں نہ ہو گی جناب، اصلی فرانس کا مال ہے۔ سات سو میں پڑتی ہے اور ڈیڑھ ہزار میں آسانی سے نکل جاتی ہے۔ دو بھی مل جاتے ہیں۔"

"ہم سے کیا لو گے؟" میں نے کہا۔

"آپ سے؟ لو جی... میں نے قیمت اس لیے تو نہیں بتائی تھی۔" وہ بڑے دُکھی لہجے میں بولا۔ "بے وقوف آدمی ہوں جی... اس لیے روانی میں بات منہ سے نکل گئی۔"

"ہم مفت نہیں لیں گے۔" محسن نے کہا۔

"ایسا مت کہو سرکار! آپ کو نہیں، یہ نذرانہ میں اپنے وطن کو دے رہا ہوں۔ اگر آپ دشمنوں کے خلاف جنگ لڑ رہے ہو تو یہ میری طرف سے عطیہ، تحفہ، چندہ کچھ بھی سمجھ لو۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے پینسٹھ کی جنگ میں اپنی ساری آمدنی میں نے وار فنڈ میں دی۔" میں نے کہا۔ "پنڈت، اس ملک میں سکھ چین سے بیٹھ کے سارا سال کھاتا رہا۔ صرف اپنے لیے کماتا رہا۔ اب ملک اپنا حق مانگتا ہے۔ اپنی کمائی میں سے اس کو بھی دے... دیکھو نا جی... ماں اپنے بچّے کے لیے کیا نہیں کرتی۔ باپ کتنی محنت سے کماتا ہے اور اسے کھلا پلا کے اتنا بڑا کرتا ہے۔ پھر جوان بیٹا صرف اپنے لیے کمائے اور سب خود کھا جائے۔ ادھر ماں باپ نے کبھی نہ مانگا ہو مگر ان پر سخت دن آ جائیں تو کیا بیٹا ان کے لیے کچھ نہیں کرتا۔ حلالی ہو تو ضرور کرتا ہے جی۔ بس جی میں نے کہا کہ آج تک اس ملک نے مجھے پالا ہے۔ سال کے تین سو پینسٹھ دن میں نے کمایا اور خرچ کیا اور اٹھارہ سال سے ملک نے کچھ نہیں مانگا تھا۔ اب اٹھارہ دن کی کمائی بھی اس کو نہ دوں؟ سال میں صرف ایک دن کی آمدنی بھی اس وطن کو پیش کروں جس میں مجھے عزت سے روزگار کے مواقع صرف اس لیے حاصل ہیں کہ میں اس ملک کا شہری ہوں۔ پھر جناب میں نے سترہ دن کی جنگ میں ایک دن کی کمائی اپنے پاس نہیں رکھی۔ اللہ کے فضل سے بھوکا نہیں مرا۔ آج پھر وطن کچھ مانگتا ہے۔ اس وطن کا مجھ پر، ہم سب پر بڑا قرض ہے۔ اس کا سود بھی میں ادا نہیں کر سکتا۔"

"سود تو حرام ہے پنڈت۔" میں نے کہا۔ "مگر تمھارے جذبات بے حد قابلِ قدر ہیں۔ جب وقت آئے تو وطن کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دینا مگر ابھی نہیں۔ ہم اس وقت چندہ نہیں لیں گے۔ نذرانے اور عطیات مستحق لوگوں کو دینا۔"

"پتا نہیں جی مستحق کون ہوں گے۔" وہ مایوسی سے بولا۔ "اور وہ

وقت کب آئے گا۔"

اس نے ایک ایک وگ کو ہمارے سر پر سیٹ کیا۔ پہلی وگ ایسے بالوں کی تھی جیسے افریقی اقوام کے سروں پر نظر آتے ہیں۔ سخت، کھڑے ہوئے اور گھونگریالے۔ انتہائی گھنے اور بَیا کے گھونسلے کی طرح نظر آنے والے۔ اس وگ کے ساتھ اگر ہم مُنہ پر سیاہی مل لیتے تو بالکل نیگرو نظر آتے۔ یہ وگ یقیناً بہت کارآمد تھی اور ہماری ظاہری صورت کو اتنا بدل سکتی تھی کہ ہم خود ایک دوسرے کو شناخت نہ کر پاتے۔ اس وقت میرے ذہن میں پہلی بار خیال آیا کہ نام تو میں بدلتا ہی رہا ہوں اور کسی کو اپنا نام کچھ بھی بتایا جا سکتا ہے۔ صورت بھی میک اپ سے بارہا بدلی مگر یہ ہو سکتا ہے کہ آئندہ کسی مشکل مرحلے میں مجھے نام کے ساتھ صورت۔ قومیت اور شہریت بھی بدلنا پڑے۔

اس وگ کے ساتھ میں سوڈانی مسلمان بن سکتا تھا۔ ویسٹ انڈیز میں جمیکا سے تعلق رکھنے والا امریکی سیاہ فام باشندہ بن سکتا تھا اور ان مخصوص خطوں سے سنے والے الگ شناخت رکھنے کے علاوہ ہندوستان، پاکستان ۔ ۔ ۔ ست سے نام کا بھی واسطہ نہیں رکھتے۔

دوسری وگ سفید بالوں کی تھی اور میچنگ داڑھی مونچھوں کے ساتھ ہم بالکل بوڑھے نظر آتے۔ شخصیت میں ظاہری تبدیلی کے دیگر اسباب یعنی لباس۔ چشمہ، چھڑی یا آلۂ سماعت آسانی سے دستیاب تھے۔ اصل چیز بال ہیں جو نقلی ہوں تو پہچانے جاتے ہیں۔ مگر یہ وگ ایسی نقلی نہیں تھی۔ امام دین خلیفہ عرف پنڈت نے دونوں وگیں ہمارے سروں پر فٹ کرنے میں ایک گھنٹا صرف کیا اور ہمیں یہ سمجھایا کہ ضرورت پڑنے پر ہم اسے کس طرح ہٹا کے دوبارہ اسی طرح لگا سکتے ہیں۔ اسی دوران میں اندر سے پنڈت کی گھر والی نے چائے کے ساتھ گرم پکوڑے۔ مٹھائی اور سموسے ارسال کیے۔ رات کے آٹھ بجنے والے تھے۔ اور ہم نے ابھی تک ٹیکسی کو روک رکھا تھا۔ اس میں ہمارا سامان بھی بھرا ہوا تھا۔ چنانچہ ٹیکسی والے سے سودا ہو گیا تھا کہ ہم اسے سو روپے گھنٹا دیں گے۔ یہ اس کی توقع سے کہیں زیادہ تھا۔ اب تک اس حساب سے اس کے ڈھائی سو بن گئے تھے اور میرا اندازہ تھا کہ منظر کے گھر سے ہو کے ہم اپنے ٹھکانے پر پہنچتے پہنچتے اس کو چار سو ضرور دے دیں گے۔ عام حالات میں ٹیکسی والے کے لیے یہ دو دن کی کمائی تھی چنانچہ وہ مطلق ہی نہیں، خوش بھی تھا۔

میں نے پہلا گرم پکوڑا مُنہ میں ڈالا ہی تھا کہ باہر دکان میں سے کسی کے زور زور سے بولنے کی آواز سنائی دی۔

"کہاں ہیں وہ دونوں..." کسی نے چیخ کر کہا۔ یہ آواز اور لہجہ دونوں اجنبی تھے۔

"کون دونوں..." کسی ملازم نے چلا کے کہا۔

پھر یوں لگا جیسے کسی نے گالی کے ساتھ ایک تھپڑ مارا ہو۔ کرسی یا میز کے گرنے اور شیشہ ٹوٹنے کی آواز کے ساتھ ہی شور بلند

ہوا۔ دکان کے کاریگر بہ یک وقت چلا رہے تھے اور گالیاں دے رہے تھے۔

"ایسا لگتا ہے کسی گاہک سے جھگڑا ہو گیا ہے۔" پنڈت وم اٹھا۔

میں نے اُسے ہاتھ پکڑ کے کھینچا۔ "ٹھہرو۔ یہ معاملہ اور لگتا ہے۔"

باہر ایک فائر ہوا اور کوئی چیخ مار کے بلبلایا۔

"دروازے پر نظر رکھو۔ اندر مت آنے دو کسی کو۔"

"اندر پردہ ہے... تم اندر نہیں جا سکتے۔" کوئی اور چلایا۔

"ہٹ جاؤ میرے راستے سے۔" پہلا شخص دہاڑا۔

میرے اور محسن کے لیے اتنا سمجھ لینا کافی تھا۔ ہم ساتھ ریوالور نکال کے اُٹھے۔ "پنڈت... اندر جاؤ... جاؤ..." میں نے اُسے دھکیلا۔ "اپنے بیوی بچے کو لے کر نکل جاؤ۔"

"کہاں... کہاں سے... یہ کیا ہے..." پنڈت کا رنگ زرد پڑ گیا۔

"بعد میں بتائیں گے... تم کسی طرف سے بھی نکلو مگر نکلو" محسن بولا۔

"ادھر... اُدھر تو کوئی راستہ نہیں۔" پنڈت ہکلایا۔

"چھت کا راستہ ہے... باہر کود جاؤ... کسی کے گھر جاؤ۔" میں نے کہا۔ "یہاں مت رُکو ورنہ مارے جاؤ گے ہم کے ساتھ۔"

باہر ایک شورِ قیامت برپا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ دکان میں زلزلہ آ گیا ہو۔ سامان اُٹھا اُٹھا کے پھینکنے کی آوازوں کے ساتھ دکان کی دکان کے چاروں طرف لگے ہوئے شیشے ایک کے بعد ایک ٹوٹ رہے تھے اور اس کے ساتھ ہی میں لڑنے والوں کی آہ و زاری سُن رہا تھا۔ معلوم نہیں پہلی گولی انھیں ڈرانے کے لیے ہوا میں چلائی گئی تھی یا کسی کو نشانہ بنایا گیا تھا لیکن شور سے اندازہ ہوتا تھا کہ مزاحمت کرنے والوں کا حوصلہ اس سے کم نہیں ہوا اور حملہ آور ابھی تک پوری طرح غالب نہیں آئے ہیں۔ وہ یقیناً ہماری تلاش میں آئے تھے۔ انھوں نے نہ جانے کہاں سے ہمارا تعاقب شروع کیا تھا اور جب ہمیں اس ہیئر ڈریسر کے سیلون میں داخل ہوتے دیکھا تو فیصلہ کر لیا تھا کہ اب ہم محصور ہو چکے ہیں اور ہمیں اندر ہی گرفتار یا شوٹ کیا جا سکتا ہے۔ وہ دلاور کے کتے تھے، دشمن کے آلۂ کار تھے یا پولیس والے تھے۔ یہ ہم ان کے سامنے آئے بغیر نہیں جان سکتے تھے۔

پنڈت بھاگ گیا تھا۔ اندر سے ہم نے اس کی بیوی اور بچے کی چیخ پکار سُنی تھی جو دکان میں ہونے والی توڑ پھوڑ۔ مار پیٹ، گالی گلوچ کا مطلب سمجھنے سے قاصر تھی اور بار بار پوچھ رہی تھی

اندر آنے والا راستہ اگر واضح اور نمایاں ہوتا تو ڈاکو آ گئے ہیں۔ دکان سے اندر آ جانے والوں کو کسی سے کچھ نہ پوچھنا پڑتا اور وہ سب کو ہینڈز اَپ کراتے ہوئے اندر پہنچ جاتے لیکن انھیں اس آئینہ خانے کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا جو دکان کی تین دیواروں پر پھیلا ہوا تھا اور ہم ان کی نظر کے سامنے اندر داخل ہو کے اس طرح غائب ہو گئے تھے جیسے آئینے میں عکس بن کے چُھپ گئے ہوں۔ انھوں نے کاریگروں سے پوچھ گچھ کی لیکن تنگ ملال کاریگر سمجھدار ہی نہیں، بہادر بھی ثابت ہوئے کہ مقابلے پر ڈٹ گئے اور انھیں اندر کا راستہ نہیں بتایا۔ غالباً وہ سمجھ گئے تھے کہ انہی کا ونٹرز کے شیشوں کے پیچھے کوئی خفیہ راستہ ہے جو اندر کسی گھر میں کُھلتا ہے۔ اب وہ راستہ تلاش کرنے کے لیے کاریگروں سے لڑ رہے تھے اور شیشوں کو پاش پاش کر رہے تھے۔

ہم بھی بچ گئے تھے اور ہمیں بچاؤ کی مہلت بھی مل گئی تھی۔ پنڈت چھت کے زینے پر چڑھ گیا تھا اور روتی پیٹتی بیوی کو گھسیٹ کر اوپر لے گیا تھا۔ اوپر سے کسی ساتھ والے گھر کی چھت پر کودنا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ یہ ایسا ہی محلہ تھا جس کی گلیوں کے سارے اونچے نیچے مکانوں کی دیواریں ملتی تھیں اور یہ ہو سکتا تھا کہ پنڈت کے گھر کی چھت کسی بھی ہمسائے کی چھت سے ایک منزل اونچی ہو یا نیچی ہو۔ اونچی چھت پر چڑھنا مشکل تھا مگر ایک منزل نیچی چھت پر یا کسی کے صحن میں دس بارہ فٹ کی بلندی سے کودنا ناممکن نہیں تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ کودنے والے کی ٹانگ ٹوٹ جائے مگر ٹانگ پھر جوڑی جا سکتی تھی۔ یہاں ان کے ٹھہرنے میں جان سے جانے کا خطرہ تھا۔

میں اور محسن بہت محفوظ پوزیشن لے چکے تھے۔ ابھی تک کوئی اندر نہیں پہنچا تھا مگر کوئی آ جاتا تو اس سے پہلے کہ وہ ہمیں دیکھتا، ہم اُسے شوٹ کر دیتے۔ ہم نے کمرے کی لائٹ بُجھا دی تھی۔ اندھیرے کونے میں ہم روشنی سے آنے والے کو دکھائی ہی نہ دیتے لیکن جو بھی کُھلے دروازے میں نمودار ہوتا وہ پیچھے سے آنے والی دکان کی روشنی میں بہت نمایاں ہوتا اور ہم اسے پہچان جاتے کہ وہ کس قسم کا دشمن ہے۔

لیکن باہر کا ہنگامہ اب بہت بڑھ گیا تھا۔ مار پیٹ اور توڑ پھوڑ کا شور ختم ہونے کے بعد لوگوں کے ہجوم کا شور زیادہ ہو گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ دکان کے ہنگامے نے اور کاریگروں کی چیخ پکار نے راہ چلتے لوگوں کو روک لیا تھا جو دکان کے سامنے جمع تھے یا اندر آ چکے تھے۔

"یہ کون ہو سکتے ہیں محسن؟" میں نے کہا۔ "کیا ہم نکل کے دیکھیں؟"

"میرا بھی یہی خیال ہے کہ اندر چُھپ کر کھڑے رہنے میں خطرہ لاحق ہے۔ وہ نکل جائیں گے۔" محسن بولا۔ "اور راستہ نہ ملا تو نہ جانے کتنے لوگوں کو مار جائیں گے۔ مجھے یہ خطرناک شکاری لگتے ہیں۔"

"ممکن ہے پولیس والے ہوں۔"

"پولیس اس طرح مقابلہ نہیں کرتی۔ طاقت اور نفری کے اعتبار سے زیادہ ہو تو کمزور کو مارتی ہے ورنہ دم دبا کے بھاگ جاتی ہے۔" محسن بولا۔

"خبردار جو کوئی آگے آیا۔" کوئی چیخ کر بولا۔ یہ اسی شخص کی آواز تھی جس نے سب سے پہلے ہمارے بارے میں پوچھا تھا۔

"ز ب و... میں کہتا ہوں... پیچھے ہٹ جاؤ۔"

جواب میں ایک شور بلند ہوا۔ بہت سے لوگوں نے انھیں ماں بہن کی گالیاں دے کر کہا کہ وہ ایسی تیسی کر دیں گے۔ اس کے ساتھ ہی مسلسل فائر ہوئے اور لوگ بھاگے۔ بھاگتے قدموں کی آوازیں یوں سنائی دیں جیسے گائے بھینسوں کا بدحواس ریوڑ فرار ہو رہا ہو۔ میں نے دروازے میں ایک جھری تلاش کی اور باہر جھانکنے میں کامیاب ہو گیا۔ میرے بالکل سامنے ہیئر ڈریسنگ سیلون کا وہ دروازہ تھا جس سے ہم اندر آئے تھے۔ اس کے باہر ایک ہجوم تھا جو منتشر ہو رہا تھا۔ مجھے بیس بائیس افراد اِدھر اُدھر دوڑتے دکھائی دیے۔ ظاہر ہے، ان میں بیشتر فارغ قسم کے تماشبین تھے جو دخل در معقولات کا بالکل ارادہ نہیں رکھتے تھے اور اب جان بچا کے بھاگ رہے تھے۔

میں نے محسن کو اشارہ کیا کہ آگے آئے اور دروازے کو آہستہ سے اپنی طرف کھینچا۔ دروازے کے قبضے چرچرائے مگر ابھی ہمارے سامنے ایک مختصر سا خلا تھا جس کی لمبائی اور چوڑائی دو فٹ تھی۔ اس کے بعد وہ گھومنے والا شیشہ تھا جو دکان میں سب شیشوں کی طرح نظر آتا تھا۔ اس کا پچھلا حصہ اب سیاہ نہیں تھا۔ اس میں روشنی کی دو لکیریں افقی سمت میں متوازی نظر آ رہی تھیں۔ اس کا مطلب صاف یہی تھا کہ دوسری طرف کا شیشہ بھی شہید ہو گیا ہے اور ہم اس تختے کو دیکھ رہے ہیں جو آئینے کا فریم تھا۔ شاید حملہ آوروں نے سارے آئینے چکنا چور کر دیے تھے مگر پھر بھی نہ جان سکے تھے کہ کون سا فریم اندر جانے والے راستے کو چُھپائے ہوئے ہے۔

ایک دم دروازے میں دو افراد نمودار ہوئے۔ میں صرف ان کی پشت دیکھ سکا لیکن میری نظر ایک شخص کے ہاتھ پر گئی۔ اس کے ہاتھ میں کوئی سیاہ رنگ کا گولا سا تھا۔ دوسرے لمحے میں دروازے کو ایک جھٹکے سے کھول کے باہر آ گیا۔

"ہاتھ اوپر..." میں نے چیخ کے کہا۔

اس شخص نے ایک دم پلٹ کے دیکھا۔ اس کا دوسرا ساتھی جیب سے ریوالور نکال رہا تھا کہ ایک فائر ہوا اور وہ سینے پر ہاتھ رکھے گھوما۔ جھکا اور وہیں گر کے پلٹنے کھانے لگا۔ میں نے سمجھ لیا کہ اسے محسن نے شوٹ کیا ہے۔ محسن میرے پیچھے پیچھے باہر آ گیا تھا۔ ایک کو میں پہلے ہی نشانے پر لیے کھڑا تھا۔ اس نے دوسرے کو سنبھالا اور اسے بالکل مہلت نہ دی۔ اگر محسن ذرا بھی تذبذب کا

مظاہرہ کرتا یا اُسے خبردار کرتا تو میں مارا جاتا۔

پہلے شخص نے ایک دم حرکت کی۔ اس نے غوطہ مارا اور ایک ہی حرکت میں دستی بم کی پن کو منہ سے نکال کے پیچھے اُچھال دیا۔ وہ خود باہر گرا اور میں نے محسن کے ساتھ زمین پر گرنے میں دیر نہیں لگائی۔ یہ دستی بم پن نکل جانے کے پانچ سیکنڈ بعد پھٹتا ہے۔ اس شخص نے پانچ سیکنڈ گزرنے کا انتظار نہیں کیا تھا اور پن نکالتے ہوئے دستی بم اُچھال دیا تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ مجھے اور محسن کو گرنے کے بعد مقامی پوزیشن میں آنے کے لیے بھی دو تین سیکنڈ مل گئے۔ ہم نے ہتھیلیوں سے دونوں کان بند کیے۔ چہرہ دونوں بازوؤں میں یوں چھپایا کہ سر محفوظ رہے اور گردن دونوں ہاتھوں کے درمیان میں آجائے۔

دھماکا ہوا تو ذرا سی دیر کے لیے میرے کان سُن ہو گئے۔ میں نے دو سیکنڈ میں جان لیا کہ نہ میں براہِ راست ہٹ ہوا ہوں اور نہ ملبے کا ڈھیر مجھ پر گرا ہے۔ تیسرے سیکنڈ میں میری نظر محسن پر گئی۔ وہ سر اٹھا کے مجھے دیکھ رہا تھا۔ ہم ایک ساتھ اُٹھے تو ہمیں اپنے مقابل سیدھے ہاتھ کے گوشے میں دھواں۔ گرد و غبار اور شعلوں کے الاؤ کے درمیان سے گزرنے والا راستہ نظر آیا۔ دستی بم ایک کونے میں گرا تھا کیونکہ اسے نشانہ لیے بغیر بدحواسی میں پھینکا گیا تھا اس لیے وہ کونا اور چھت کا ایک حصہ مسمار ہو گیا تھا اور باہر جانے والا دروازہ تو بند ہو گیا تھا مگر کونے میں ایک نیا راستہ بن گیا تھا۔

اس وقت میں نہیں دیکھ سکا کہ دستی بم سے دکان میں کتنے لوگ ہلاک اور زخمی ہوئے یا ملبے میں دب گئے۔ دکان کے اندر کسی چیز کے سلامت رہنے کا سوال ہی نہ تھا چنانچہ ساری لائٹس ٹوٹ گئی تھیں اور اب اندر صرف شعلوں کی روشنی تھی جو ایک کونے سے پھیل رہے تھے اور اس دیوار کے ساتھ لمبائی کے رُخ بنے ہوئے لکڑی کے کاؤنٹر کو جلا رہے تھے۔ میزوں کے اور کرسیوں کے ٹکڑے اینٹوں کے ملبے میں بھی آگ پکڑ چکے تھے لیکن ابھی یہ آگ پوری دکان میں نہیں پھیلی تھی اور اسے کنٹرول کیا جا سکتا تھا بشرطیکہ باہر والے نظم و ضبط اور حوصلے کا مظاہرہ کرتے۔

مگر میں نے اس وقت کچھ نہیں سوچا اور ملبے کے ڈھیر کو پھلانگتا ہوا سیدھا اس شگاف کی طرف گیا جو کونے کی دیوار کے گرنے سے نمودار ہوا تھا۔ اس دھماکے نے ساتھ والی دکان کا وہ حصہ بھی گرا دیا تھا جو بینڈٹ کی دکان سے ملا ہوا تھا۔ دھوئیں اور گرد و غبار میں راستہ صاف دکھائی نہ دیتا تھا اور مجھے یہ ڈر بھی تھا کہ کہیں اوپر سے مزید ملبہ نہ آ گرے یا آگ میرے کپڑوں تک نہ پہنچ جائے لیکن میں نتائج سے بے پروا باہر نکلنے کی جدوجہد کرتا رہا۔ اینٹوں کے ڈھیر پر دو بار لڑکھڑانے کے بعد فٹ پاتھ پر جست

لگانے میں کامیاب ہوا۔ دکان کے سامنے دو افراد فرش پر پڑے ہائے ہائے کر رہے تھے اور سڑک پر ایک افراتفری

"کدھر گیا وہ؟" میں نے چیخ کر ایک دوڑتے ہوئے سے پوچھا۔

"اُدھر... وہ سامنے۔" دوسرا شخص ایک کار کی طرف اشارہ کر کے چلایا۔

میں اُدھر ہی بھاگا لیکن میری راہ میں ایک ایسی صورت ہو گئی۔ صرف ایک بار میری نظر کار کے ڈرائیور پر گئی۔ وہ کوئی صورت پڑھا لکھا آدمی تھا جو اس منظر سے خوف زدہ ہو گیا تھا۔ راستہ ملتا تو وہ فوراً بھاگ جاتا مگر میں نے اس کو دروازہ کے آگے ہونے کو کہا تاکہ میں اس کی جگہ لے سکوں۔

"اُدھر... دوسری سیٹ پہ... آگے۔" میں نے ریوالور سے اشارہ کیا۔

"کیا؟" وہ چلّایا۔ "تم ایسا نہیں کر سکتے۔"

"تمھاری..." میں نے ایک گندی گالی دی اور اسے ایک جھٹکے سے باہر کھینچ کر سڑک پر گرا دیا۔ میں نے دروازہ بند کرتے ہی محسن کو دیکھا۔ وہ شاید میرے ساتھ ساتھ تھا اور میں نے آگے کھسکائی ہی تھی کہ وہ دوسرا دروازہ کھول کے جلدی سے میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ کھلا دروازہ ایک شخص سے ٹکرایا اور وہ جھٹکے سے دُور جا پڑا۔ پھر محسن نے دروازہ بند کر دیا۔ کار والا سڑک پر گرتے ہی اٹھا اور میرے پیچھے دوڑا۔

"بدمعاش... میری کار... اسے پکڑو..." وہ چلانے لگا۔ اس نے کھڑکی کے قریب آکے اسٹیئرنگ کو پکڑنے کی کوشش کی کیونکہ ابھی کار کی رفتار زیادہ نہیں ہوئی تھی۔ میں نے اس کے سر پر ریوالور مارا اور اس کی چیخ سُنی۔ وہ گر کے پیچھے رہ گیا۔ میری نظر اس کار پر تھی جس کی طرف ایک شخص نے اشارہ کیا تھا۔ وہ کار تیر کی طرح نکلی اور ایک آدمی اُچھل کر الگ ہونے کی پوری کوشش کے باوجود خود کو نہ بچا سکا۔ وہ کار کے ایک پہیے کے نیچے آ گیا۔ میں نے اس کے آدھے دھڑ کو تکلیف سے اُچھلتے دیکھا۔ ایک دم اُٹھا اور اس نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اُٹھا کے بڑی دلخراش چیخ ماری اور پھر اتنے زور سے سڑک پر گرا کہ شاید اس کا سر پھٹ گیا ہو گا۔ گاڑی اس کے اوپر سے گزری اور ڈرائیور نے پھر اسپیڈ دی مگر گاڑی کے سامنے ایک ریڑھا آ گیا۔ گاڑی نے گھوڑے کو ٹکر ماری۔ گھوڑا اور ہنہنا کے پلٹا۔ پیچھے گرا اور لاتیں چلانے لگا۔ غالباً گاڑی نے اس کی گردن توڑ دی تھی۔

لوگ اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے چنانچہ مجھے خود بخود راستہ ملتا گیا۔

"وہ بدمعاش اس کار میں فرار ہو رہے ہیں۔" میں نے محسن سے کہا تو وہیں رہ گیا مگر اس میں بھی کم سے کم دو افراد ہیں۔ ایک ڈرائیور ہے۔

"وہ تو مارا گیا، دستی بم پھینکنے والا، جو دکان میں گرا تھا۔" محسن بولا۔ "اس کا ریوالور میں اٹھا لایا ہوں۔"

"میری نظر اس گاڑی پر تھی جو اب رفتار پکڑ چکی تھی۔" "اس کی جیب میں سے اور کچھ ملا؟"

"نہیں... مگر یہ ریوالور انڈین ہے۔ فوجی ساخت کا۔" محسن بولا۔

"اس کا مطلب ہے یہ آج کل کی خبر کا ردِ عمل ہے۔" میں نے کہا: "یہ دشمن کے کمانڈوز ہوں گے۔ اپنا ریوالور تیار رکھنا۔ جیسے ہی وہ رینج میں آئیں..."

"تو فکر مت کر... میں تیار ہوں۔" محسن نے سر باہر نکال کے کہا۔

اگلی گاڑی کا فاصلہ کچھ بڑھ گیا تھا۔ میں نے ٹریفک رولز اور احتیاط کے تقاضے نظر انداز کرتے ہوئے پیڈل دبا دیا۔ سیکنڈوں میں کھلی کی رفتار حاصل کر لینے والی فاکس ویگن کا انجن غرایا اور وہ چیتے کی طرح اپنے شکار کی طرف لپکی۔ گاڑی میکلوڈ روڈ سے سیدھی جا رہی تھی اور اِدھر اُدھر سے آنے والی ٹریفک درہم برہم ہو گئی تھی۔ غنیمت تھا کہ ہم پاکستان میں تھے ورنہ اب تک نہ جانے کتنی ٹریفک پولیس کی گاڑیاں ہمارے پیچھے لگ چکی ہوتیں۔ اور خود پبلک میں سے ذمے دار افراد ہمارا تعاقب کرتے مگر یہاں عام لوگ جان بچا رہے تھے اور جہاں بھی کوئی ٹریفک پولیس کا نمائندہ چوک کے درمیان بیزاری کے عالم میں ہاتھ ہلا رہا تھا یا سڑک کے کنارے ہاتھ باندھے رونق میلہ دیکھ رہا تھا تو اس نے فقط سیٹی بجانے پر اکتفا کیا۔ ممکن ہے انھوں نے دونوں کار والوں کو خصوصی گالیوں سے بھی نوازا ہو لیکن ان کی روایتی کاہلی اور عدم دلچسپی کے باعث مجھے یقین کامل تھا کہ انھوں نے کسی کار کا نمبر نوٹ کرنے کی زحمت بھی فضول سمجھی ہو گی۔

تمام حادثات سے بچتا بچاتا بالآخر میں درمیانی فاصلے کو اتنا کم کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ محسن فائر کر سکے مگر اس سے پہلے کہ وہ نشانہ لیتا اگلی کار سے ایک ہاتھ نکلا اور اس نے ہمارا نشانہ لیا۔ ہم ایک دم نیچے ہو گئے۔ گولی نہ جانے کدھر گئی۔ پھر محسن نے فائر کیا اور اگلی کار کا پیچھے والا شیشہ پاش پاش کر دیا۔ گاڑی تھوڑا سا لہرائی۔ پھر ہم پر دوسرا فائر ہوا جو کار کے بونٹ پر لگا۔ میرا دل اچھل کے حلق میں آ گیا۔ ہم بال بال بچے تھے۔ کیونکہ بونٹ کے نیچے پیٹرول ٹینک تھا۔ انجن پیچھے تھا اور گولی بونٹ پر ونڈ اسکرین کے قریب لگتی تو پیٹرول کی ٹنکی میں گھس جاتی۔ محسن نے دوسرا فائر کیا۔ گاڑی پھر لہرائی اور ایکدم بائیں جانب فٹ پاتھ پر چڑھ گئی۔ ایک کھمبے سے ٹکرائی اور رک گئی۔

میں اور محسن ایک ساتھ چھلانگ لگا کے اُترے۔ ہم نے اپنی فاکس ویگن کو سڑک پر ہی روک دیا تھا۔ لوگ ہر طرف سے دوڑ دوڑ کر آ رہے تھے۔ سڑک پر سے گزرنے والی ٹریفک بھی رک رہی تھی اور یہ بات یقینی تھی کہ چند منٹ میں ہمارے گرد مجمع لگ جائے گا۔

میں نے کار میں دو افراد کو دیکھا جو آگے بیٹھے ہوئے تھے۔ دونوں ڈیش بورڈ پر جھکے ہوئے بے حس و حرکت پڑے تھے۔ گاڑی کا انجن بند تھا مگر ہیڈ لائٹس روشن تھیں۔

"محسن... رُکنا نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"گاڑی اسٹارٹ کر کے دیکھ۔" محسن نے پلک جھپکتے میں ڈرائیونگ کرنے والے کو پیچھے کی سیٹ پر الٹ دیا۔ میں نے اگنیشن کی میں لگی چابی کو گھمایا اور کار نے ایک جھٹکا لیا۔ محسن اب پیچھے بیٹھ چکا تھا۔ میں نے کار کو ریورس گیئر میں ڈالا اور ایک بار پھر چابی گھمائی۔ انجن اسٹارٹ ہوا تو محسن نے آس پاس جمع ہونے والوں سے چلا کر ہٹنے کو کہا مگر لوگ راستے روکنے پر آمادہ نظر آتے تھے۔

مجبوراً میں نے کار کو تھوڑا سا پیچھے لے کر موڑا اور پھر آگے بڑھا کے فٹ پاتھ پر دوڑا دیا۔ بہت سے لوگوں نے شور مچاتے ہوئے پیچھے دوڑنے کی کوشش کی مگر میں نے خاصی رفتار پہ گاڑی کو فٹ پاتھ سے سڑک پر اتارا۔ گاڑی اچھلی اگر اس کے شاک آبزرور درست نہ ہوتے تو اس جھٹکے سے یقینی ٹوٹ سکتی تھی۔ ایکسل بھی ٹوٹ سکتا تھا۔ دھماکا ہونے سے قبل ہی میں نے اسٹیئرنگ کو مضبوطی سے تھام لیا۔ چنانچہ کار کے سڑک پر گرتے ہی میں بھی اپنی سیٹ پہ اُچھلا اور میرا سر چھت سے لگا لیکن میں نے اسٹیئرنگ کو نہیں چھوڑا اور سیدھا رکھا۔ گاڑی میرے قابو میں رہی اور جیسے بدک جانے والے منہ زور گھوڑے کو بالآخر ماہر شہسوار ہی راہ پہ لاتا ہے ایسے ہی میں اس طاقتور بی ایم ڈبلیو کو جائے واردات سے نکال لانے میں کامیاب رہا۔ بی ایم ڈبلیو کوئی عام گاڑی نہیں تھی۔ شاید لاہور میں گنتی کی چار چھ کاریں ایسی ہو سکتی تھیں۔ جرمنی کی یہ پاور فل کار عموماً ڈپلومیٹ یا غیر ملکی رکھتے ہیں جو اس کے اخراجات کا بار اُٹھا سکیں کیونکہ عام نہ ہونے کے باعث اس کے پُرزے آسانی سے دستیاب نہیں ہوتے۔

گاڑی کا تعاقب کرنے کی کوشش اگر کسی نے کی تھی تو مجھے اس کا علم نہیں ہوا۔ رات کے وقت میرے پیچھے روشنیوں کی ایک قطار تھی اور اپنی تیز رفتاری کے باعث میں آگے جانے والی سب کاروں کو پیچھے چھوڑتا جا رہا تھا مگر ابھی تک ایک بھی کار مجھ سے آگے نکلنے میں کامیاب نہیں ہوئی تھی۔ اس میں زیادہ کمال گاڑی کا تھا جس کی کارکردگی کو شاید مرسیڈیز ہی شکست دے سکتی تھی۔ باقی میری ڈرائیونگ تھی۔ چار سال باہر رہنے کے بعد مجھے انٹرنیشنل ہائی ویز پہ ماکٹ کی رفتار سے گاڑی چلانے کی بہت مشق تھی۔ یہ بھی اچھا ہی تھا کہ میں فاکس ویگن کی چابیاں نکال لایا تھا، ورنہ اس چھپکلی سی گاڑی میں بھی کوئی بڑے دل والا بیٹھ کر ہمارے پیچھے چل پڑتا تو ہمیں اتنی آسانی سے نہ نکلنے دیتا۔ طے شدہ طور پر وہ دونوں جو اَب بے سُدھ پڑے تھے اچھے ڈرائیور نہیں تھے اور غالباً بدحواس ہو گئے تھے کہ ہم نے انھیں آ لیا۔

محسن نے ان دونوں کی اچھی طرح تلاشی لے لی تھی۔ ان کے پاس سے صرف ریوالور برآمد ہوئے تھے۔ یہ سب سوس ریوالور تھے جس کا سیریل نمبر مٹا دیا گیا تھا۔ ہر غیر ملکی جاسوس ایجنٹ کی طرح ان کی شناخت ناممکن تھی۔ اب وہ پکڑے گئے تھے تو ان سے کچھ اگلوانا بھی آسان نہ تھا۔ ہم جانتے تھے کہ ان کو کس ملک نے کس مقصد کے تحت بھیجا تھا مگر سرکاری سطح پر اس ملک کے خلاف کوئی ثبوت نہیں تھا اور اگر ان ایجنٹوں کو کسی دشمن ملک سے منسوب کیا جاتا تو وہ ملک صاف تردید کر دیتا۔ جاسوس کا کوئی دوست نہیں ہوتا۔ یہ بات ہمیشہ سچ تھی اور رہے گی۔ نہ پکڑے جائیں اور ملک کے لیے بہادری کا اور ذہانت اور حوصلے کا قابلِ رشک کارنامہ سرانجام دے آئیں تو حکومت کی طرف سے انعام بھی بڑا ملتا ہے مگر پکڑے جائیں تو اپنے ہی بیگانے ہو جاتے ہیں۔ کوئی بھی ان کو پہچانتا تک نہیں اور دشمن تو خیر دشمن ہوتا ہی ہے۔

"یار... اب ان کا کیا کریں؟" محسن نے کہا۔ "ہم ان کو اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتے۔"

"پھر کیا کریں... گولی مار دیں؟" میں نے کہا۔

"کیوں نہ انھیں بھی سرکاری حکام کے حوالے کر دیں؟" محسن بولا۔

"سول حکام یا فوجی حکام؟"

"معاملہ تو فوجی نوعیت کا ہے اور صحیح تفتیش بھی ملٹری انٹیلی جنس والے کر سکتے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "مگر سوال وہی ہو گا۔ بلی کے گلے میں گھنٹی باندھنے کا... ہم حوالے کرتے جائیں گے تو اپنا کیا حوالہ دیں گے؟"

میں نے گاڑی کو ایک طرف روک دیا۔ "اس کا بھی کوئی حل سوچتے ہیں۔ پہلے گاڑی کی تلاشی لے لیں۔"

اب ہم پل پار کر کے فورٹریس اسٹیڈیم کے پاس پہنچ چکے تھے۔ آگے کینٹ کا علاقہ تھا۔ شک و شبہے سے بچنے کے لیے میں نے کار کا بونٹ اٹھا دیا تاکہ معلوم یہ ہو کہ ہم انجن میں کسی خرابی کے باعث رکے ہیں۔ ایکسیڈنٹ نے گاڑی کی سامنے والی خوشنما گرل توڑ دی تھی اور بمپر کو ٹیڑھا کر دیا تھا۔ اگر کار فٹ پاتھ سے نہ ٹکراتی اور براہ راست کھمبے کو ٹکر مارتی تو کھمبا گر جاتا اور گاڑی کو بھی زیادہ نقصان پہنچتا۔ فٹ پاتھ کی بلندی نے گاڑی کی فورس ختم کر دی تھی اور غالباً اسی کے جھٹکے سے ان دونوں کا سر ڈیش بورڈ پر لگا تھا۔ ڈرائیور کے بارے میں مجھے شبہ تھا کہ اس کی پسلیاں بھی ٹوٹ گئی ہیں۔ اسے سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ دوسرا بھی مردے کی طرح پڑا تھا مگر میں ایک لمحے کے لیے بھی اس کی طرف سے غافل نہیں ہوا۔ یہ ہو سکتا تھا وہ مکر کر رہا ہو۔

محسن نے کار کی ڈکی کھولی اور ایک دم بند کر دی۔ اس کی وہ سیٹی جو اظہارِ حیرت کا سگنل تھی میں نے بھی سنی۔

"مسٹر سکندرِ اعظم..." وہ بولا۔ "ادھر تشریف لائیے۔"

میں نے ریوالور کا رخ اندر کی طرف رکھا اور گھوم کر آیا۔ چونکہ پیچھے والا شیشہ ہماری فائرنگ سے غائب ہو گیا تھا، وہ بدستور میری زد میں رہے۔ محسن نے ایک بار پھر ڈکی کھولی۔ یار میں نے بھی اسٹریٹ لائٹ کی تیز روشنی میں وہ اسلحہ دیکھا جو اس میں بھرا ہوا تھا۔ اس میں چار تو غیر ملکی ساخت کی مشین گنیں تھیں۔ ایک باکس میں ویسے ہی کالے رنگ کے دس بارہ دستی بم تھے جو ہیئر ڈریسر کی دکان میں پھینکا گیا تھا۔ بالکل ویسے ہی دو بکسوں میں مشین گن کے راؤنڈ تھے۔

"میرا خیال ہے کہ پہلے یہ سامان اتار دیں۔" محسن نے کہا۔ "اس کے ساتھ ہی پکڑے جائیں تو..."

"کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو بتائے نہ بنے۔" میں نے کہا۔

پھر ڈرائیونگ کے لیے بیٹھ گیا۔ گاڑی کو میں نے پل سے نیچے اترنے والی چھوٹی سی سڑک پر موڑا۔ یہ پتلی سی سڑک ... کے سامنے سے گزری۔ تھوڑا آگے جا کے بائیں طرف ریلوے ... تھی۔ اسے عبور کرتے ہی ہم گلبرگ میں داخل ہو گئے ... کا اسٹاپ کہلاتا تھا اور وہاں چار نمبر بس کا ٹرمینل تھا۔

"کیا اس کی نمبر پلیٹ بوگس ہو گی؟" محسن بولا۔ "... معلوم ہوتی ہے۔"

"دوسری صورت صرف یہ ہو سکتی ہے کہ گاڑی چرائی گئی ہو۔" میں نے کہا۔

"وہ بڈھا ہمیں یہ سامان اندر لے جاتے نہ دیکھے۔" محسن بولا۔ "کہے گا کہ کیا یہی ہے وہ سامان جو آنے والا تھا۔"

"فرنیچر تو پہنچ چکا ہو گا۔" میں نے کہا۔ "کہہ دو گے یہ ہماری خواتین کے امورِ خانہ داری کی چیزیں ہیں۔ ہم شاہین بچے ہیں تو وہ بھی..."

"مذاق مت کر یار... اتنا خطرناک اسلحہ اس بڈھے سے چھپانا بے حد ضروری ہے، ورنہ وہ تو شور مچا دے گا۔ اوّل تو ہماری اپنی حالت ماشاء اللہ ہو رہی ہے۔ دھماکے سے جتنا گرد و غبار اڑا وہ سب ہم پر گرا تھا اور پھر ہم ملبے پر گرے تھے۔ بالوں اور کپڑوں سے لگتا ہے کہ سیدھے میدانِ جنگ سے آ رہے ہیں۔ او پر سے یہ گاڑی اور اس کی یہ حالت۔" میں نے کہا۔

"گاڑی دور روک لیں گے۔" محسن بولا۔ "سامان ... اٹھا کے لے جائیں گے اور خواتین سے کہیں گے چھپا کر رکھیں۔ اب تک انھوں نے بڈھے کا سارا کاٹھ کباڑ اسٹور میں رکھ دیا ہو گا اور وہ فرنیچر سیٹ کر دیا ہو گا جو میں نے خرید کر بھیجا تھا۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔" میں نے کہا۔ "جو سامان ہم نے خریدا تھا وہ تو ٹیکسی میں ہی رہ گیا۔"

"اور ٹیکسی والا نہ جانے کدھر گیا۔ مجھے تو نظر آیا نہیں۔"

"وہ سب سے پہلے فرار ہوا ہو گا کہ کسی مصیبت میں نہ پھنس ..."

"اس کے ڈھائی تین سو روپے گئے۔" ... نے کہا۔

"وہ دو ہزار سے زیادہ کا مال لے گیا۔ مجھے تو اس کا نمبر بھی یاد نہیں۔"

"نمبر تو میں نے بھی نہیں دیکھا تھا۔ خیر جانے دو۔" میں نے کہا۔ "افسوس تو اس ہیئر ڈریسر پہ ہے۔ اس کا ... اب ... ہو گیا..."

"اس کا ایک کاریگر بھی مارا گیا۔" محسن نے کہا۔ "اب پولیس کے چکر میں آ جائے گا۔ تفتیش ہو گی اور رہی سہی کسر پوری ہو جائے گی۔" میں نے کہا۔ "ہم سے ہمدردی اسے بہت مہنگی پڑی۔"

"کیا وہ ہمارا نام لے گا؟" محسن بولا۔

"مجھے تو امید نہیں؟" میں نے کہا۔ "وہ محبِ وطن اور سچا پاکستانی ہے۔ اسے صدمہ اگر ہو گا تو اپنے ایک کاریگر کی موت کا یا پھر اس کا کہ وہ ہماری مدد نہ کر سکا۔ اگر اس نے عقلمندی سے کام لیا تو بیان مختصر رکھے گا کہ معلوم نہیں کون تھے جو اندر دستی بم پھینک کر فرار ہو گئے۔ مرنے والا تو مر گیا۔ اب کہا جا سکتا ہے کہ شاید اسی کے دشمن تھے۔ اگر وہ بڑی مصیبت سے بچنا چاہے گا تو ہمارے سامنے آنے کی بات خود بھی نہیں کرے گا اور کسی کاریگر کو بھی نہیں کرنے دے گا۔"

"ہم اس کا نقصان پورا کر دیں گے۔ وہ کام کا آدمی تھا۔"

"وہ کام کا آدمی ہے۔" میں نے ہے پر زور دے کر کہا۔ "آئندہ بھی انکار نہیں کرے گا۔ بس ہم احتیاط کریں گے کہ اس سے ملنے جائیں تو چوروں کی طرح جائیں۔"

میں نے گاڑی کو ایک موڑ پر روک لیا۔ ڈیوڈ کا مکان موڑ کے بعد دوسرا تھا۔ میں اتر کے اکیلا گیا اور کال بیل بجائی تو جولی نے گیٹ کو اندر سے کھولا۔ گیٹ لائٹ کی روشنی میں اس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔

"بڈھا کہاں ہے؟" میں نے سرگوشی میں پوچھا اور اندر چلا گیا۔

"ڈنر کر رہا ہے۔" جولی ہنسی۔ "عجیب کارٹون ہے..."

مگر میں اس وقت کارٹون دیکھنے یا سننے کے موڈ میں نہیں تھا۔ میں اندر گیا تو مجھے کمرے میں فرنیچر دیکھ کر اطمینان ہوا۔ جولی اور کیتھرین نے واقعی گھر کا نقشہ بدل دیا تھا۔ فی الحال دو کمرے ٹھیک ہوئے تھے کیونکہ تیسرے کمرے میں ڈیوڈ موجود تھا۔ غالب ایک بیڈ پر آرام سے لیٹا ہوا تھا۔

"غالب!" میں نے قریب جا کے کہا۔ "میں کچھ خطرناک سامان لا رہا ہوں۔ اسے چھپا کے رکھنا ہے۔"

"کیسا خطرناک سامان؟" غالب اٹھ بیٹھا۔

"ابھی دیکھ لینا۔ وہ مہمان ہیں، انھیں کہیں چھوڑنے جانا ہے۔" میں نے کہا۔ "واپسی پر سب بتا دوں گا۔" میں نے ادھر ادھر سے چادریں کھینچ کے باہر کا رخ کیا۔ پہلی چادر میں ایک کریٹ پلیٹ کراتے ہوئے میرا سانس پھول گیا۔ یہ اتنا ہی بڑا اور ویسا ہی کریٹ تھا جیسے پھل پیک کرنے میں استعمال ہوتے ہیں لیکن ہر کریٹ کا وزن بہت زیادہ تھا۔ دوسرے پھیرے میں دوسرا کریٹ رکھنے کے بعد میں واپس گیا تو میں نے محسن کو غائب پایا۔ پھر وہ کار کے دوسری جانب سے نکلا۔

"سالا ہوش میں آ گیا تھا۔" محسن نے کہا۔ "ایک دم اچھل کے بھاگا تھا۔"

"پھر؟" میں نے پریشانی سے کہا۔

"پھر کیا... میں نے گولی چلانے سے گریز کیا۔ سر پہ ہی مارا۔" اس نے ریوالور دکھایا۔ "اور پھر اندر ڈال دیا۔"

"کسی نے دیکھا تو نہیں؟"

"پتا نہیں... ویسے تو کوئی دکھائی نہیں دیتا۔" محسن بولا۔ "تو جلدی کر..."

میں نے چاروں مشین گنوں کو چادر میں لپیٹ کر اٹھایا اور ایک اکڑی ہوئی لاش کی طرح اندر لے گیا۔ دونوں کریٹ جولی اور کیتھرین نے بیڈ کے نیچے کر دیے تھے۔ کیتھرین پر کوئی اثر نہ تھا مگر جولی کا رنگ تبدیل ہو رہا تھا۔ اس نے یہ سب پہلے کہاں دیکھا تھا۔ اسپتال کے بستر پر زندگی سے مایوس لیٹنے والی جولی نے یکلخت ہماری ہنگامہ خیز، خطرناک اور جنون پرور زندگی میں قدم رکھ دیا تھا۔ یوں جیسے کوئی کسی مقبرے کی سوگوار خاموشی سے اچانک پاپ میوزک کے شور سے گونجتے ہوئے ڈانس ہال میں قدم رکھ دے۔ میں نے مشین گنوں کو بھی ایک بیڈ کے نیچے کھسکایا ہی تھا کہ ڈیوڈ آ گیا۔

"کیا یہ عجیب بات نہیں ہے؟" وہ کسی تمہید کے بغیر بولا۔ "کہ تم سب آ گئے ہو مگر تمھارا سامان ابھی تک نہیں پہنچا ہے۔ عموماً لوگ سامان پہلے روانہ کرتے ہیں اور خود بعد میں آتے ہیں۔"

"ہمارے پاس بہت زیادہ ساز و سامان پہلے بھی نہیں تھا۔" میں نے کہا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے مجھے کچھ بھی رکھتے نہیں دیکھا تھا۔

"یہ بات بھی میں نے نہیں پوچھی تھی کہ تم لوگ پہلے کہاں رہتے تھے اور وہ جگہ تم نے کیوں چھوڑ دی؟" وہ بولا۔ "تم کچھ پُراسرار قسم کا قبیلہ ہو۔"

"تمھاری یہ تفتیش میری سمجھ میں نہیں آئی۔" میں نے کہا۔ "لوگ جو کرائے پر رہتے ہیں وہ دربدر ہوتے ہی رہتے ہیں۔ مالک مکان سے لڑ جھگڑ کے رہنا ہمیں اچھا نہیں لگتا اور جب کرائے کے مکان مل جاتے ہوں تو پھر..."

"میں تمھیں اصل بات بتاتی ہوں مسٹر ڈیوڈ۔" کیتھرین نے میری بات کاٹ کے انگریزی میں کہنا شروع کیا۔ "میں ایک بیوہ ہوں۔ میرے شوہر کے کچھ دشمنوں نے میرا گھر جلا دیا۔ اس میں جتنا سامان تھا وہ سب..."

بھی جل گیا۔ یہ میری لڑکی جولی چھ ماہ سے اسپتال میں موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا تھی۔ اس کے گردے ناکارہ ہو گئے تھے۔ ان لوگوں نے میری مدد کی اور میری بیٹی کو گردے کا عطیہ ملا۔ یہ جولی کی دوسری زندگی ہے۔ اسے اسپتال سے واپس اس گھر میں لے جانا مشکل تھا جہاں اب ایک کھنڈر کی راکھ کے سوا کچھ بھی نہیں رہا۔ اس موقعے پر ان دو نوجوانوں نے پھر میری مدد کی اور میرے لیے کرائے کا یہ گھر تلاش کیا جہاں میں سکون سے اپنی بیٹی کے ساتھ رہ سکوں اور مجھے کسی سے کوئی اندیشہ نہ ہو۔ تم تصدیق کرنا چاہو تو کر سکتے ہو۔ میں تم کو اپنا پتا دیتی ہوں اس مکان کا جو جلا دیا گیا، تم اسے دیکھ بھی سکتے ہو۔ تم اسپتال جا کے ڈاکٹروں سے مل کر جولی کے سارے کیس کی تفصیلات بھی حاصل کر سکتے ہو۔ اگر اس سچ میں ایک فیصد بھی جھوٹ ہو تو ہمارا سامان اُٹھا کے باہر پھینک دینا۔ ہم بڑے ہمارے رویے پر۔ رہن سہن پر، آپس کے تعلقات پر نہ تمھیں شک کرنا چاہیے اور نہ تشویش میں مبتلا ہونا چاہیے۔"

"میں اس سچ کو تسلیم کرتا ہوں۔" وہ متانت سے بولا۔ "بہت بہتر ہوتا اگر مجھے ابتدا ہی میں یہ سب بتا دیا جاتا۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے۔"

"تھینک یو مسٹر ڈیوڈ۔" کیتھرین نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ تمھارے یہ دونوں مددگار نوجوان تمھارے رشتے دار نہیں ہیں۔ اور غالباً کرسچین بھی نہیں ہیں۔" ڈیوڈ اسی طرح اپنے پرانے کالے سوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا رہا جس پر اس نے مضحکہ خیز بُو لگا رکھی تھی۔

"یہ بھی ٹھیک ہے۔" کیتھرین نے کہا۔ "مگر کیا اس میں کوئی معیوب بات ہے اگر میں ان پر رشتے داروں سے زیادہ بھروسا کروں...؟"

"میں اعتماد کو بہت بڑی طاقت اور صفت تسلیم کرتا ہوں۔ انسان کے جذبات اور اس کی فطرت کا تعلق اس کے مذہبی عقائد سے ہونا بھی نہیں چاہیے ورنہ وہ خطرناک ہو جاتا ہے۔" وہ بولا۔

"یہ مکان حاصل کرنے کے لیے میں نے ایک بے ضرر سا جھوٹ بولا تھا۔" میں نے شرمندگی کے احساس کو مٹانے کے لیے کہا۔

"آئی ڈونٹ مائنڈ۔ یہ بے ضرر ہی نہیں، فائدہ پہنچانے والا جھوٹ تھا۔" وہ پہلی بار مسکرایا۔ "اور خود کو فائدہ پہنچانے کے لیے تو سب ہی جھوٹ بولتے ہیں... جو گناہ ہے۔ مگر دوسروں کے فائدے کی خاطر جھوٹ کو بھی نیکی شمار کرنا چاہیے۔ میں نے دخل اندازی کی۔ اس کے لیے معذرت۔ دراصل یہ جھوٹ مجھے پریشان کر رہا تھا۔ میری چھٹی حس کو۔ اب میں مطمئن ہوں۔ تم لوگ اس کو اپنا گھر سمجھ کے رہو۔"

وہ واپس چلا گیا تو میں نے کیتھرین کی طرف تعریفی نظروں سے دیکھا۔ "تم نے سب کی عزت بچا لی۔"

"مجھے اس کا شک بُرا لگا تھا۔" کیتھرین نے کہا۔

"ایک بات اب بھی قابلِ غور ہے۔" میں نے کہا۔ "ہمارے اصل نام ابھی تک نہیں پوچھے۔"

"صبح پوچھے گا جب اُسے احساس ہو گا۔" جولی بولی۔ میں واپس نکل گیا۔ محسن میرے انتظار میں پریشان ہو رہا تھا۔

"اتنی دیر کر دی۔" وہ بولا۔ "میں نے کچھ اور مال برآمد کیا۔"

"کہاں سے؟" میں نے کہا۔

"سیٹوں کے نیچے سے۔" محسن بولا۔ "ایسے ہی مجھے خیال آیا کاروں میں مال سیٹوں کے نیچے بھی چھپایا جا سکتا ہے۔ پچھلی سیٹ کے نیچے سے ڈائنا مائیٹ اسٹک اور اگلی دو سیٹوں کے نیچے سے چار ٹائم بم نکلے ہیں۔ ان کو بھی جلدی سے رکھ آ۔ پھر ہم چلتے ہیں۔"

پندرہ منٹ بعد ہم اس علاقے سے نکل گئے۔ اگلا مرحلہ قیدیوں سے نمٹنے کا تھا۔ کینٹ ایریا سے گزرتے ہوئے میں نے نمبر پلیٹ کے نام پر نگاہ رکھی۔ اس سارے علاقے میں آرمی آفیسرز کے بنگلے تھے۔ گاڑی کو ایک جگہ روک کے میں چند قدم واپس گیا اور ایک بنگلے میں داخل ہو گیا۔ یہ پرانی طرز کا بیرک نما بنگلا تھا جس کے باہر میجر سلطان کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی۔ میں نے کال بیل بجائی تو جو شخص باہر آیا وہ میجر سلطان بھی ہو سکتا تھا۔

"میں معذرت چاہتا ہوں۔" میں نے شائستگی سے انگریزی میں کہا۔ "مجھے ایک بہت ارجنٹ کال کرنا تھی۔ کیا میں آپ کا فون استعمال کر سکتا ہوں۔"

"شیور۔" وہ ہاتھ بڑھا کے بولا۔ اور مجھے اس کمرے میں لے گیا جسے ڈرائنگ روم سمجھا جا سکتا تھا۔ فون کرنا تو بہانہ تھا۔ میں نے نمبر ملا کے اُسے کہا کہ ایمبولینس فوراً بھیج دی جائے۔ میں ڈاکٹر شاہ بول رہا ہوں۔ اس نے کہا۔ سوری رانگ نمبر اور فون رکھ دیا۔ مگر اس دوران میں میجر سلطان کے فون پر لکھا ہوا نمبر میرے ذہن میں نقش ہو گیا۔ اب میں اُسے باہر کسی بھی جگہ سے ٹیلی فون کر سکتا تھا۔

میجر سلطان مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔

"تھینک یو میجر۔" میں نے ہاتھ ملا کے کہا۔

"ڈاکٹر شاہ۔" میجر سلطان نے مصافحے کے بعد میرا ہاتھ تھامے رکھا۔ "یہ تم نے کس اسپتال سے ایمبولینس طلب کی تھی؟"

سوال قطعی غیر متوقع تھا لیکن میں نے اپنے ردِ عمل پر قابو پایا۔ "میرا اپنا پرائیویٹ کلینک ہے۔"

"اور اب یہ ایمبولینس کہاں آئے گی؟" میجر سلطان نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا لیکن بہت ہوشیاری سے میری راہ میں حائل ہو گیا۔ "میرا مطلب ہے تم نے جس سے بھی بات کی تھی اُسے کوئی ایڈریس نہیں سمجھایا۔"

"بات میں نے اپنے اسسٹنٹ سے کی تھی۔" میں نے کہا۔ "اور وہ جانتا ہے کہ اُسے ایمبولینس کہاں بھیجنی ہے۔ میں اُسے بتا چکا تھا کہ ضرورت پڑی تو میں فون کر دوں گا۔"

"آپ جس مریض کو دیکھنے آئے تھے وہ کہیں آس پاس ہی ہو گا ڈاکٹر شاہ۔" میجر سلطان بولا۔ "اور اس کے گھر میں یا تو فون نہیں ہو گا یا خراب ہو گا۔ ایم آئی رائٹ؟"

میں نے محسوس کر لیا تھا کہ اس کے لہجے میں شکوک کا رنگ گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ "یہ اندازہ کرنا مشکل کام نہیں۔"

"کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ مریض یا اس کے گھر والوں میں سے کسی نے خود فون کرنے کی زحمت گوارا کیوں نہیں کی اور ایک پرائیویٹ کلینک کے مالک ڈاکٹر سے کیوں کہا کہ وہ کسی بھی جگہ سے فون کر کے ایمبولینس منگوائے۔ وہ یقیناً بہت بد اخلاق اور بد تہذیب لگ ہوں گے لیکن جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، اس علاقے میں تعلیم یافتہ اور ذمے دار قسم کے لوگ ہی رہتے ہیں۔" میجر سلطان نے کہا۔

"میں اس بحث اور جرح کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔" میں نے بُرا مانتے ہوئے ناگواری سے کہا۔

"مطلب تو میں بھی تمھارے آنے کا نہیں سمجھ سکا۔" میجر سلطان نے کہا۔ "بلاشبہ تم پڑھے لکھے آدمی ہو۔ بہت اچھی انگریزی بول لیتے ہو۔ تمھاری شخصیت بھی متاثر کرتی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ تم ڈاکٹر نہیں ہو کوئی دھوکے باز ہو۔" اس کا لہجہ حسبِ سابق سپاٹ رہا۔

"یہ خیال تمھیں کیوں آیا میجر سلطان؟" میں نے محتاط ہو کے کہا۔

"یہاں ایسی وارداتیں ہوئی ہیں کہ کوئی شخص جعلی پولیس افسر یا میٹر ریڈر بن کے گھر میں داخل ہوا اور گھر کے اندر کا نقشہ دیکھ گیا۔ بعد میں گھر کا صفایا ہو گیا۔" میجر سلطان نے کہا۔

"کیا میں صورت سے ایسا نظر آتا ہوں؟" میں نے غصے سے کہا۔

"نہیں... صورت سے تم ایسے نہیں لگتے۔" میجر سلطان نے کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ تم اسی شخصیت کے فریب سے لوٹتے ہو... ضروری نہیں کہ تم چور ڈاکو ہو۔ تم نوسر باز بھی ہو سکتے ہو۔ جو باتوں سے بے وقوف بناتے ہیں، کبھی رقم دگنی کرنے تو کبھی زیورات کو دگنا کرنے والے اب بھی شہروں میں آ جاتے ہیں۔ پلاٹ دلوانے والے، گاڑی دلوانے والے، فلموں میں چانس دلوانے والے، ہزار دھندے ہیں تم جیسے لوگوں کے۔ مجھے یقین ہو چلا ہے کہ فون کرنے کے بہانے تم اندر آنا چاہتے تھے یا مجھ سے تعلق پیدا کرنے آئے تھے۔ ایم آئی رائٹ؟"

"نو... یو آر ایب سلیوٹلی رانگ... میرے پاس وقت ہوتا تو میں تمھارے شکوک دُور کر دیتا۔" میں نے کہا۔

"تمھارے پاس اتنا وقت ہے... اور نہیں ہے تو تم نکالو گے یہاں سے جانے سے پہلے مجھے مطمئن کر جاؤ... ورنہ تم جا نہیں سکو گے۔" اس نے ایک دم پتلون کی جیب میں سے ریوالور نکال لیا۔

"یہ تم کیا کر رہے ہو؟" میں نے بوکھلانے کی اداکاری کی اور سخت وحشت زدہ نظر آنے لگا۔

"اگر تم نے سچ نہ بولا تو میں تمھیں شوٹ کر دوں گا اور پھر خود پولیس کو بلاؤں گا کہ تمھاری لاش اُٹھا کے لے جائے۔" میجر سلطان نے کہا۔ "میں تم کو نہیں جانتا۔ میرے سارے خاندان یا کسی دوست، واقف کار نے آج تک تمھاری صورت نہیں دیکھی مگر تم میرے گھر میں موجود ہو۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ تم چوری کی نیت سے اندر گھسے تھے اور میں نے وہی کیا جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔ کیا تمھیں معلوم ہے کہ میرا تعلق فوج کے کس شعبے سے ہے؟"

"میں نے باہر صرف نام دیکھا تھا۔"

"خیر، میں بتاتا ہوں تمھیں۔ میں اے ایم سی میں ہوں۔ آرمی میڈیکل کور۔ اور اس کا مطلب تم سمجھ گئے ہو گے۔ میں خود ڈاکٹر ہوں۔ اس لیے اب تک تم خود کو ڈاکٹر پوز کر رہے تھے تو اب یہ احمقانہ کوشش چھوڑ کے مجھے سچ سچ بتا دو کہ آخر تم کون ہو؟"

میرے لیے بہت مشکل اور پریشان کن صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی اور جھوٹ، چالاکی یا ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے جان بچا کے نکلنا مشکل ہی نہیں ناممکن نظر آنے لگا تھا۔ میرے لیے اب ایک راستہ ہی رہ گیا تھا کہ میں میجر سلطان کے ریوالور کو ایک غیر مؤثر قوت بنا دوں۔ اس سے پہلے کہ وہ ریوالور سے نشانہ بھی لیتا میں اُسے ناک آؤٹ کر سکتا تھا اور اس کے ریوالور پر بھی قبضہ کر سکتا تھا مگر مجھے میجر سلطان کی مدد کی ضرورت تھی اور میں نے اُسے ایک کام کے لیے ہی منتخب کیا تھا مگر انتخاب کے طریقۂ کار میں خامی کے باعث معاملہ اُلٹا ہو گیا تھا۔

"کیا تم چاہتے ہو کہ میں ملٹری پولیس کو طلب کر لوں؟" میجر سلطان نے میری خاموشی پر مسکرا کے کہا۔ "وہ خود تم سے پوچھ لیں گے کہ تم ڈاکٹر ہو یا ذہنی مریض۔ مجرم درحقیقت ذہنی مریض ہی ہوتے ہیں۔"

میں نے ایک طویل سرد آہ بھری۔ ہاتھوں اور کندھوں کی حرکت اور شکل و صورت کے تاثرات سے یہ ظاہر کیا کہ میں نے اپنی شکست تسلیم کر لی ہے اور میں مقابلے کا بالکل ارادہ نہیں رکھتا۔

"کیا میں بیٹھ سکتا ہوں؟" میں نے خفت زدہ لہجے میں کہا۔

"نو..." میجر سلطان نے کہا۔ "تم میرے مہمان نہیں ہو۔"

"ایک سگریٹ تو..."

"نو... یہ سب وقت ضائع کرنے اور چکر دینے کے حربے ہیں۔" وہ بولا۔

"آل رائٹ... تم سوال کرو... میں جواب دوں گا۔"

"تم ڈاکٹر نہیں ہو؟" وہ بولا۔

"ظاہر ہے۔" میں نے غیر سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"صرف ہاں یا نا میں جواب دو۔" وہ مشتعل ہو گیا۔

"میں ڈاکٹر نہیں ہوں۔" میں نے کہا۔

"تم نے کہاں فون کیا تھا؟" میجر سلطان نے کہا۔
"اس نمبر سے تم کو کچھ معلوم نہیں ہو گا۔" میں نے کہا۔
یہ فکر تم کو نہیں کرنی چاہیے... نمبر بتاؤ۔" وہ بولا۔
میں نے اُسے نمبر بتا دیا جو اس نے نوٹ کر لیا۔
"یہ بھی تمہارا کوئی لنک ہے... میں معلوم کروں گا۔" میجر سلطان نے کہا۔ "اور وہ تم کو شناخت کرے گا... جسے تم نے فون کیا تھا۔"
تم اس سے بات کیوں نہیں کر لیتے؟"
"یہاں بیٹھ جاؤ۔" اس نے ایک کونے کی طرف اشارہ کیا۔
"میں فون پر بات کروں گا... تم بھی سنو گے... اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا اور یہ مت سمجھنا کہ فوج کا ڈاکٹر گولی نہیں چلا سکتا... میں توپ بھی چلا سکتا ہوں۔"
میں اس کی بتائی ہوئی جگہ پر بیٹھ گیا۔
اس نے نمبر ملایا اور ایک بٹن دبا کے ہینڈ سیٹ رکھ دیا... آواز اب براہِ راست فون کے چھوٹے سے اسپیکر سے آ رہی تھی اور میں دوسری طرف کی گھنٹی سُن سکتا تھا۔ چوتھی رِنگ پر کسی نے ہیلو کہا۔
"کون بول رہا ہے؟" میجر سلطان نے کہا۔
"آپ کو کس سے بات کرنی ہے؟" جواب دینے والی عورت نے کہا۔
"ابھی آپ کو ڈاکٹر شیلا نے فون کیا تھا؟"
"میں کسی ڈاکٹر شیلا کو نہیں جانتی۔" وہ تند لہجے میں بولی۔
"پھر اس نے تمہارا نمبر کیوں ملایا تھا؟"
"اگر تم ڈاکٹر شیلا کو جانتے ہو تو اسی سے پوچھو۔"
"اگر آپ کے لیے وہ اجنبی تھا تو آپ نے اُسے کیا جواب دیا تھا؟"
"جو مجھے دینا چاہیے تھا۔ میں نے کہا تھا کہ رانگ نمبر... مگر تم یہ سب پوچھنے والے کون ہو؟"
"پولیس۔"
"یہ ڈاکٹر ابراہیم سرور کا گھر ہے۔ دوبارہ سوچ سمجھ کے بات کرنا۔"
فون بند ہو گیا اور میں نے میجر سلطان کے ماتھے پر بل دیکھے۔ وہ پہلے سے زیادہ خفا نظر آتا تھا۔
"کیا یہ عجیب اتفاق نہیں ہے کہ میں بھی ڈاکٹر... تم بھی ڈاکٹر اور میں نے سوچے سمجھے بغیر جو نمبر ملایا تھا، وہ اتنے بڑے ڈاکٹر کا گھر..." میں نے کہا۔
"آئی سی... تم نے سوچے سمجھے بغیر نمبر ڈائل کیا تھا... گویا تمہارا مقصد صرف اندر آنا تھا۔" میجر سلطان بولا۔ "میرا خیال ہے کہ مجھے تفتیش کے چکر میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ میں ایم پی کو بلاتا ہوں۔"
"انگریزی میں کہتے ہیں کہ کودنے سے پہلے سوچ لو... کہ کہیں تم گڑھے میں تو نہیں کود رہے ہو؟" میں نے کہا۔ "یا آسمان سے کود کے کھجور میں اٹکنے کے امکانات تو پیدا نہیں کر رہے ہو۔"
"شٹ اپ... میں جانتا ہوں کہ میں کیا کر رہا ہوں۔"
میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "تم صرف میرے لیے مشکلات پیدا کرنے کی سوچ رہے ہو۔ تمہارا ذہن ان وے ٹریک پر ہے۔ تم ان مشکلات کو بھول رہے ہو جو تم خود اپنے لیے پیدا کرو گے۔"
"کیا مطلب ہے اس بکواس کا...؟"
"فرض کرو، ملٹری پولیس یا پولیس کے سامنے میں نے بکواس شروع کر دی؟" میں نے کہا۔
"وہ تمہارا دماغ درست کر دیں گے۔"
"مگر تمہارا معاملہ تو بہر حال بگڑ جائے گا۔ میرے صرف ایک بیان سے۔" میں نے کہا۔ "کیا یہ تمہاری مسز کی فوٹو ہے؟" میں نے ایک فریم کو اٹھا کے غور سے دیکھا۔
"میری بیوی کی تصویر وہیں رکھ دو... سؤر کے بچے۔" وہ چلا کے بولا۔
"تمہاری وائف بہت ینگ ہے اور بہت خوب صورت۔" میں نے کہا۔ "اور اگر میں نے بیان دے دیا کہ یہاں میں اس کے بلاوے پر آیا تھا... میں اس کا یار ہوں... شادی سے پہلے کا... وہ ایک آوارہ..."
حسبِ توقع میجر سلطان نے مجھے انگریزی میں ایک گندی گالی دی اور ریوالور اٹھا کے فائر کیا۔ اس کی عزت و ناموس پر یہ براہِ راست حملہ اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ میں اس کے ہاتھ پر نظر جمائے بیٹھا تھا اور میرے آخری لفظ کے ساتھ ہی اس کا ردِعمل دیکھتے ہی میں غوطہ مار کے صوفے سے فرش پہ گر گیا لیکن گرتے گرتے میں نے تصویر کا فریم میجر سلطان پہ پھینک مارا۔ فریم دھات کا بھاری تھا۔ میرا نشانہ بھی خطا ہوا۔ فریم ریوالور والے ہاتھ پر نہیں لگا، میجر سلطان کے منہ سے ٹکرایا تاہم اس سے میرا مقصد پورا ہو گیا۔ میجر سلطان ایک کشن والے اسٹول پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ جھٹکا تو اس کا توازن بگڑ گیا اور اس سے پہلے کہ وہ اُٹھتا، میں نے اُسے دبوچ لیا۔
"تم نے یہ سب کچھ بلاوجہ کیا۔" میں نے میجر سلطان کی کلائی کو جھٹکا دے کر فرش پر مارا اور ریوالور لے لیا۔
"یو باسٹرڈ۔" میجر نے زور لگا کے مجھے دُور پھینک دیا اور چلانے لگا۔ "نور خان۔" مگر گولی کی آواز پر اس کا بیٹ مین پہلے ہی اندر آ چکا تھا۔ دوسری طرف سے اس کی بیوی آ گئی تھی۔ بلاشبہ وہ بے حد حسین تھی مگر اتنی معصوم صورت تھی کہ مجھے اپنے بے ہودہ الفاظ پر شرم آئی۔
"سب رُک جاؤ... اپنی اپنی جگہ..." میں نے ریوالور سنبھال کے کہا۔ "ورنہ میجر صاحب کی جان جائے گی۔ میرا ارادہ ابھی تک کسی کو بھی نقصان پہنچانے کا نہیں ہے... بس میں یہاں سے جاتا ہوں... میرا راستہ کوئی نہ روکے۔"
"خدا کے لیے تم جاؤ۔" میجر سلطان کی بیوی نے کانپتے ہوئے کہا۔ "میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمہارا راستہ کوئی نہیں روکے گا۔" وہ آگے بڑھ کے اپنے شوہر کے سامنے آ گئی۔
"میں تم کو چھوڑوں گا نہیں۔" میجر سلطان نے غرا کے کہا۔
"پلیز... تم چپ رہو۔" میجر سلطان کی بیوی نے پلٹ کر کہا۔ "میری خاطر۔"
"مجھے بہت افسوس... اور شرمندگی ہے خاتون۔" میں نے کہا۔ "کہ میں نے آپ کے شوہر کے سامنے انتہائی نامناسب اور بے ہودہ الفاظ استعمال کیے... آپ کے لیے... میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔" میں نے ریوالور کا میگزین خالی کر کے گولیاں جیب میں ڈال لیں۔
میجر سلطان نے پھر مجھے ایک گالی دی۔ "میں اکیلا ہوتا تو دیکھتا۔"
"تم مت بولو۔" میجر سلطان کی بیوی نے تلملا کے کہا۔
"یہ آپ کا سروس ریوالور ہے۔" میں نے ریوالور نیچے ڈال دیا۔ "اس لیے میں ساتھ نہیں لے جا رہا ہوں... اس کی گمشدگی سے آپ کے لیے مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ یہ گولیاں بھی میں باہر ڈال جاؤں گا۔ تاہم آپ کسی خوش فہمی میں مبتلا نہ رہیں۔ میرے پاس ذاتی اسلحہ بھی ہے۔" میں نے جیب کے اندر سے اپنا ریوالور نکال کے دکھایا۔ "اگر میرا مقصد آپ کو لوٹنا ہوتا تو میں فون کرنے کا احمقانہ ڈراما نہ کرتا میجر سلطان۔ بے شک میں ڈاکٹر نہیں ہوں لیکن میں چور ڈاکو یا نوسرباز بھی نہیں ہوں۔ میں اتنا ہی شریف آدمی ہوں جتنے آپ ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں آپ سے ضرورت کے تحت ایک تعلق پیدا کرنے کے لیے آیا تھا۔ ابھی میں وضاحت نہیں کر سکتا مگر میجر... ایک دن آئے گا کہ تم مجھ سے تعلق پیدا کرنا چاہو گے اور اس تعلق کو اہم سمجھو گے۔ ہو سکتا ہے کل ہی تمہاری غلط فہمی رفع ہو جائے تو تم یہ سب بھول جاؤ۔ اور ہم پھر ملیں تو دوست ہوں۔"
"معلوم نہیں تم کیا کہہ رہے ہو۔" میجر سلطان نے کہا۔ وہ کنفیوژ ہو گیا تھا اور اب اس کے لہجے میں نفرت یا اشتعال کا جذبہ سو رہا تھا۔
"کچھ نہیں۔" میں نے کہا۔ "فی الحال شب بخیر... خدا حافظ مسز سلطان... پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں... اطمینان سے سو جائیے اور اس واقعے کو بھول جائیے۔"
میں اطمینان سے باہر نکلا تھا مگر مجھے میجر سلطان کی طرف سے اطمینان نہیں تھا چنانچہ میں ایک دیوار کی اوٹ میں چھپ کر کھڑا ہو گیا۔ مشکل سے دو منٹ کے بعد میجر باہر آیا۔ بیوی نے اس کی قمیص کی ایک آستین پکڑ رکھی تھی۔
"گیا کدھر آخر وہ...؟"
"کہیں بھی گیا... تم چلو اندر..." میجر کی بیوی نے کہا۔
"آپ بولیں تو میں اس بدمعاش کو گلی سے پکڑ لاؤں؟" اس کے بیٹ مین نور خان نے کہا۔
"چلو تم بھی اندر... اب سورما بن رہے ہو۔" مسز سلطان نے اُسے جھاڑا۔ "جب وقت تھا تو چوہے کی طرح دبک گئے تھے۔ کوئی ضرورت نہیں کسی کو اُس کے پیچھے جانے کی۔ اس نے ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ وہ نقصان پہنچانے والا آدمی تھا بھی نہیں۔"
"یہی تو مجھے حیرانی ہے... کہ وہ آیا کیوں تھا..." میجر سلطان نے کہا۔ "نہ کچھ لینا نہ دینا... خواہ مخواہ ایک بوگس کال کی... بہت پُراسرار آدمی تھا۔"
"شکر کرو کوئی مسئلہ نہیں کھڑا ہوا... تم نے تو گولی چلا دی تھی۔"
"تمہارا دماغ خراب ہے... معلوم ہے اس نے کیا کہا تھا؟" میجر سلطان بگڑ کے بولا۔
"کچھ بھی کہا ہو... جاتے جاتے معافی تو مانگ گیا..."
"مارا جاتا میرے ہاتھوں تو یہ مذاق مہنگا پڑتا۔" میجر نے کہا اور بیوی کے ساتھ اندر لوٹ گیا۔
میں نے اطمینان کا سانس لیا اور اس کے بنگلے سے باہر نکل آیا۔ بی ایم ڈبلیو وہیں کھڑی ہوئی تھی جہاں میں نے اُسے چھوڑا تھا۔ میں نے مخالف سمت میں سفر کیا اور تقریباً پچاس قدم چلنے کے بعد گھوم کر پیچھے والی اسٹریٹ پر ہو لیا۔ وہیں کونے پر مجھے ایک ٹیلی فون کا کھمبا دکھائی دیا اور میں اللہ کا نام لے کر اس پر چڑھ گیا۔ بنگلے سے نکلنے کے چند منٹ بعد میں پھر میجر سلطان کا نمبر ملا رہا تھا۔
"ہیلو..." میجر سلطان کی آواز آئی۔
"میجر سلطان۔" میں نے کہا۔ "اب میں بتاؤں گا کہ میں کیوں آیا تھا۔"
"تم!" انتہائے حیرت سے میجر سلطان صرف ایک لفظ بول سکا۔
"یس... میں..." میں نے کہا۔ "فون بند مت کرنا... مجھے تم سے ایک انتہائی اہم بات کرنی ہے... میں صرف تمہارا فون نمبر نوٹ کرنے آیا تھا۔"
"مائی گڈنس... اور اب کس کے بنگلے میں گھسے ہو فون کرنے؟"
"یہ میں نہیں بتا سکتا۔" میں نے کہا۔ "میں ہر جگہ رسائی رکھتا ہوں۔"
"تم نے ریوالور کی گولیاں کہاں ڈالی ہیں؟"
"گیٹ پوسٹ کے اوپر..." میں نے کہا۔ "اب میری بات سن لو... جو تم کو مضحکہ خیز لگے گی مگر یہ قومی سلامتی سے تعلق رکھنے والا انتہائی اہم معاملہ ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ تم ملک کا دفاع کرنے والوں میں ہو اس لیے تم اس معاملے سے اچھی طرح نمٹ لو گے۔"
"کیا تم پاگل ہو... یا مجھے پاگل سمجھتے ہو...؟"
"تمہارے گھر کے باہر ایک کار کھڑی ہوئی ہے۔" میں نے اس کی بات کو اَن سُنی کرتے ہوئے کہا۔ "جرمنی کی بی ایم ڈبلیو۔ اس کے اندر دو افراد ہیں۔ ان کو ملٹری انٹیلی جنس کے حوالے کر دو... یہ ہمارے ملک کے دشمن ہیں۔ کیا تم نے گزشتہ دن کے اخبارات میں سنگرالی

سے اسلحے کا بہت بڑا ذخیرہ دریافت ہونے کی تفصیل پڑھی تھی؟"
"آں... ہاں..." وہ چونکا۔ "پڑھی تھی۔"
"اس میں سائیں پاپڑ والے اور رحوریوالہ کے ذخائر کا تذکرہ بھی تھا۔"
"تم... تم سکندر بخت... او مائی گاڈ..."
"تھینک یو میجر... کہ تم نے مجھے دیر سے سہی مگر شناخت کر لیا... امید ہے اب تمھیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہو گی۔" میں نے کہا۔
"تم براہِ راست بھی بات کر سکتے تھے... اپنا نام بتا کے۔"
"میں اعتماد کا خطرہ مول نہیں لیتا مگر اعتماد کرنا جانتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اب تم باہر جا کے اُن دونوں کو قابو کرو اور دیکھو کہ وہ تفتیش میں کیا بتاتے ہیں۔ وہ خطرناک لوگ ہیں اور ان کے پیچھے بھی خطرناک لوگ ہیں اس لیے بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ وہ خود کو بھی مار سکتے ہیں... اور تم کو بھی... میں نہیں چاہتا کہ تمھاری خوب صورت بیوی اس عمر میں بیوہ ہو۔"
"ایک آوارہ اور بدکردار عورت۔" وہ ہنسا۔
"میں معافی مانگ چکا ہوں میجر۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "وہ سب تم کو مشتعل کرنے کے لیے ضروری تھا... تم مشتعل نہ ہوتے تو میں خود کو یا تمھیں نقصان پہنچائے بغیر وہاں سے کیسے نکلتا۔"
"اچھا سبق دیا ہے تم نے مجھے۔" وہ بولا۔ "آئندہ میں اپنے جذبات کو قابو میں رکھوں گا۔"
"بہت مشکل ہے میجر سلطان... بلکہ ناممکن۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "کوئی بھی غیرت مند شوہر ایسی بے ہودہ بات پر وہی کرے گا جو تم نے کیا۔"
"تم بھی یہی کرتے؟"
"بالکل... بشرطیکہ میری بیوی ہوتی اور تم اسی طرح میرے گھر میں گھس کے اس کے بارے میں یہی کہتے۔" میں نے کہا۔ "خیر اب میں لمبی بات نہیں کر سکتا، کیونکہ میں سولی پر ٹنگا ہوا ہوں۔ یار زندہ صحبت باقی، پھر کبھی ملیں گے تو دوست بن کر ملیں گے۔ ابھی تو مجھے صرف ایک بات اور کہنی ہے۔ کل صبح کا اخبار دیکھو گے تو اس میں میکلوڈ روڈ پر ایک ہیئر ڈریسر کی دکان میں بم کے دھماکے اور کچھ تخریب کاروں کی دہشت انگیزی کا ذکر ملے گا۔ اس تمام ہنگامہ آرائی کے ذمے دار یہی دونوں ہیں جو کار میں پڑے ہوئے ہیں۔ یہ مشرقی پاکستان میں علیحدگی پسند عناصر کے مددگار ہیں اور بھارتی ایجنٹ بھی ہو سکتے ہیں۔ تمھاری ملٹری انٹیلی جنس ان سے بہت کچھ معلوم کر سکتی ہے۔"
"مائی گاڈ... ہم ان کا سر توڑ کے اندر سے تمام ضروری اور اہم معلومات کا ذرّہ ذرّہ نکال سکتے ہیں۔" میجر سلطان نے کہا۔ "لیکن مجھے یہ تو بتاؤ..."
"فی الحال اس سے زیادہ نہیں۔"

"کیا تم ڈرتے ہو کہ میں کال ٹریس کرا لوں گا؟"
میں ہنسا۔ "ابھی ہم ترقی کے اس دور سے بہت دور ہیں۔ شاید ایک گھنٹے تک وہاں کوئی نہ پہنچے جہاں سے میں بات کر رہا ہوں۔ میرے پاس وقت کم ہے اور مجھے دوسرے کام بھی ہیں۔"
"گڈ لک سکندر بخت۔"
"تھینک یو میجر سلطان۔ مجھے خوشی ہوئی کہ اب اچھے اور مجھے اچھا سمجھنے لگے ہیں اور میرے اچھے کام کے لیے اپنی اچھی تمنائیں رکھتے ہیں۔ یہ مورال سپورٹ ملے تو ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں۔" میں بولا۔
"صرف مورال سپورٹ ہی تو کافی نہیں ہوتی۔"
"مگر جب کوئی کسی سے اصولی طور پر اتفاق کرتا ہے تو ہر طریقے سے اس کی مدد بھی کرتا ہے۔ جتنی جس کی استطاعت ہو یا جتنی کسی میں ہمت ہو۔ یہ احساس ہی بہت بڑی طاقت ہے کہ اب میرے دشمن بھی صفِ دوستاں میں شامل ہونے لگے ہیں۔" میں نے کہا۔ "خدا حافظ۔"
"تم مجھ پر اعتماد کر سکتے ہو۔"
"میں کل تم کو پھر فون کروں گا۔ اگر موقع ملا۔" میں نے کہا۔ لائن کاٹ کے کھمبے سے نیچے اتر آیا۔ زمین پر قدم رکھتے ہی میں نے ایک شخص کو دیکھا جو مجھے گھور رہا تھا۔ وہ چھ فٹ سے زیادہ کا بہت موٹا آدمی تھا۔
"کون ہو تم... اوپر کیا کر رہے تھے؟" وہ بولا۔
"اوپر؟" میں نے سر اٹھا کے کھمبے کو دیکھا۔ "اوپر کہاں؟"
"اوپر کھمبے پر؟" وہ چلّا کے بولا۔
"لیکن میں تو اب نیچے آ چکا ہوں۔" میں نے کہا۔
"میں کہتا ہوں تم چڑھے کیوں تھے؟"
"میں... بس ایسے ہی... ٹھنڈی ہوا کھانے..." میں نے کہا اور سوچنے لگا کہ آخر وہ کون ہو سکتا ہے۔ کوئی پولیس کا آدمی؟
"بکواس کرتے ہو میرے سامنے۔ میں نے دیکھا تھا کہ تم تار لٹکا کے لائن ملا کے فون کر رہے تھے... یہ جرم ہے۔" وہ مشتعل ہو کے بولا۔
"یہ کون سا جرم ہے؟ میں ہر روز دیکھتا ہوں کہ لوگ کھمبوں پر چڑھ کے فون کرتے ہیں۔ میرے گھر میں فون ہوتا تو میں ایسا کیوں کرتا مگر مجبوری سب کراتی ہے جناب۔" میں نے کہا۔
"مجبوری کے بچّے... میں ٹیلی فون کے محکمے کا ایس ڈی او ہوں۔ تم کھمبے کے لائن مین نہیں ہو۔ میں تمھیں پولیس کے حوالے کر دوں گا۔" ایس ڈی او نے کہا۔
"او ایس ڈی صاحب۔" میں نے کہا۔ "میں بھی آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی ہوں مگر میری ڈیوٹی کی اسپیشل نیچر..."
"میں ایس ڈی او ہوں... او ایس ڈی نہیں..."
"چلیں یوں ہی سہی... میرا ایک بھائی بھی ڈی ایس او ہے۔ ڈسٹرکٹ سیلز آفیسر۔" میں نے کہا۔
اس نے اپنے سر پہ ہاتھ مارا۔ "میں ایس ڈی او ہوں سب ڈویژنل آفیسر محکمہ ٹیلی فون کا... تم خود کو زیرِ حراست سمجھو۔"
"اگر میں بھاگ جاؤں تو آپ کیا کریں گے؟" میں نے کہا۔
"میں... میں شور مچاؤں گا۔" وہ پریشان ہو کے بولا۔
"اس سے کیا ہو گا؟" میں نے تفریح لیتے ہوئے کہا۔ "یہاں آپ کی سننے والا کون ہے... گھر میں لوگ آرام سے بیٹھے ہیں۔ وہ آپ کی مدد کے لیے نہیں آئیں گے... آپ کا گلا بیٹھ جائے گا۔"
اس نے مجھے دبوچنے کی کوشش کی۔ میں نے اُسے دھکا دیا اور وہ پیچھے گر پڑا لیکن فوراً اُٹھا اور میرے پیچھے دوڑا۔ میں نے قہقہہ مارا اور خود بھی دوڑا۔ وہ مشکل سے پچاس گز دوڑ کے رُک گیا۔ میں نے بہت فاصلے سے پلٹ کے ہاتھ ہلایا اور اسے خدا حافظ کہا۔ مجھے دنیا کے ان موٹے افراد پر افسوس ہوا جو اتنے بے بس ہوتے ہیں کہ ان کی نظر کے سامنے سے کوئی قتل کر کے بھاگ جائے یا ان کی دولت اُٹھا کے فرار ہو رہا ہو تو وہ شور مچانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے اور بالکل کتاب پیچھے لگ جائے تب بھی بچ کے نہیں جا سکتے۔ اس چھوٹے سے ایک ایکٹ کے پُرلطف ڈرامے نے میری ساری کوفت دُور کر دی جو مجھے کچھ دیر پہلے کے معرکۂ دار و گیر سے اُٹھانی پڑی تھی۔
میجر سلطان نے بڑی ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے مجھے تقریباً گرفتار کر لیا تھا چنانچہ مجھے امید تھی کہ اسی ذہانت سے کام لیتے ہوئے وہ دونوں قیدیوں کو پولیس یا ملٹری کے حوالے کر دے گا اور کرنے والے تفتیش بھی کر لیں گے۔ مسئلہ اس گاڑی کا تھا۔ اگر وہ سفارتی عملے کے کسی رکن کی ہو گی تو سفارت خانہ احتجاج کرے گا اور بات کچھ کی کچھ ہو جائے گی۔ وہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے عملے کے دو معزز ارکان شاپنگ کے لیے انارکلی گئے تھے اور چائے پی کر ایک ریسٹورنٹ سے نکل رہے تھے جب انھیں مسلح افراد اغوا کر کے لے گئے۔ متحارب سیاسی گروہ یا دوستانہ تعلقات نہ رکھنے والے ممالک ایک دوسرے پر کچھ بھی الزام لگا سکتے ہیں۔ ممکن ہے ان دونوں افراد کی بازیابی کا مطالبہ کیا جائے مگر یہ سیاسی مسئلہ خود حکومت سیاسی طور پر حل کرے گی۔ میرے لیے یہی اطمینان کافی تھا کہ میں ان کے دامِ اجل سے بچ کر نکل آیا اور اس مقابلے میں ہمارا فائدہ یہ ہوا کہ کچھ اسلحہ مل گیا جو وقتِ ضرورت کام آئے گا۔ مجھے صرف اس ہیئر ڈریسر کی دکان کی تباہی کا افسوس تھا جس نے بڑے وطن پرست جذبے کے ساتھ ہماری مدد کی تھی۔
خوشی کی بات یہ بھی تھی کہ سارا ہنگامہ اس وقت شروع ہوا جب ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکے تھے۔ اس ہیئر ڈریسر کے نقصانات کی تلافی بعد میں کی جا سکتی تھی۔ اس نے میرے اور محسن کے لیے جو وِگیں نکالی تھیں وہ ہمارے پاس ہی رہی تھیں۔ ایک تو اس نے فٹ کر کے بھی بتا دی تھی اور دوسری ہم دیکھ ہی رہے تھے کہ شکاری آ گئے تھے۔ محسن نے حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے وِگ وہاں نہیں چھوڑی تھی اور مجھے یقین تھا کہ آگے چل کے جب اپنی صورت بدلنے کی ضرورت پیش آئے گی تو یہ وِگیں بہت کارآمد ثابت ہوں گی۔
اس رات ہم نے ڈٹ کر سو جانے کے سوا کچھ نہیں کیا۔ ہمارا لینڈ لارڈ بہت کائیاں آدمی تھا اور ہماری نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ ہم نے غالب کو چپکے چپکے وہ سب بتا دیا جو ہمارے ساتھ پیش آیا تھا لیکن جولی اور کیتھرین کو صبح تک کوئی بات معلوم نہیں ہوئی۔
صبح ہم سو کے بھی نہیں اُٹھے تھے کہ ہمارے لینڈ لارڈ نے دستک دی۔ "تم لوگ ابھی تک سوئے پڑے ہو؟" وہ خفگی سے بولا۔
"یہی تو دن ہیں سونے کے۔" محسن بولا۔ "بڑھاپے میں نیند کہاں آتی ہے۔"
"نان سنس۔" وہ بولا۔ "جوانی ہوتی ہے کام کرنے کے لیے۔ یہ وقت سو کر گنوا دو گے تو کیا بڑھاپے میں کام کرو گے۔ اور کون کہتا ہے کہ بڑھاپے میں نیند نہیں آتی... لُک ایٹ می... میں پورے آٹھ گھنٹے سوتا ہوں۔ نہ ایک منٹ کم نہ ایک منٹ زیادہ... آدمی کا جسم کلاک کی طرح کام کر سکتا ہے بشرطیکہ آدمی اس کو ایک ڈسپلن کا پابند بنائے۔ خیر میں یہ بتانے آیا تھا کہ میں جا رہا ہوں۔"
"کب؟" میں نے کہا۔
"آج ہی... میری سیٹ کنفرم ہو گئی ہے۔" وہ بولا۔ "مجھے امید ہے کہ تم بعد میں شریفوں کی طرح رہو گے اور وہ سب نہیں کرو گے جو کرتے رہے ہو۔"
میں نے محسن کی طرف دیکھا۔ "ہم کیا کرتے رہے ہیں جناب؟"
"وہی جو تم کو نہیں کرنا چاہیے۔" اس نے کہا۔ "لیکن میں تمھارا باپ بھی نہیں ہوں اور دوست بھی نہیں ہوں۔ میں نہ حکم دے سکتا ہوں اور نہ مشورہ... تم جو چاہو کرو مگر میری پراپرٹی محفوظ رہنی چاہیے۔"
اس نے ہم سے ہاتھ ملایا اور رُخصت ہو گیا۔ اس کی باتوں نے مجھے چکرا دیا تھا۔ معلوم نہیں وہ کیا کہنا چاہتا تھا اور کیا کہہ گیا تھا۔
"تم اس کی بات کا مطلب سمجھے؟" محسن بولا۔
"ہاں اور نہیں۔" میں نے کہا۔ "تم میرے جواب کا مطلب سمجھے؟"
"نہیں اور ہاں۔" محسن نے کہا۔ "غالباً بڈھا سب جان گیا تھا۔"
"کیا جان گیا تھا؟"
"یہی کہ ہم کون ہیں۔" محسن نے کہا۔
"اور کیا کر رہے ہیں۔" غالب نے اتفاق میں سر ہلایا۔
"اس نے ہمیں پہچان بھی لیا تھا۔" محسن بولا۔
"پھر اُس نے ظاہر کیوں نہیں کیا؟"

"وہ جا رہا تھا تو اُسے ہمارے معاملات میں پڑنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔" غالب نے کہا۔ "بقول شاعر۔ بلبل نے آشیانہ چمن سے اُٹھا لیا۔ اس کی بُلا سے بوم بسے یا ہما رہے۔"

"میرا تو خیال ہے کہ وہ ہمیشہ کے لیے گیا۔" محسن بولا۔ "اور وہ جانتا تھا کہ اس کی واپسی نہیں ہوگی۔"

"یہ پراپرٹی کا خیال رکھنے والی بات بھی ایسے ہی تھی۔ نہ وہ خود واپس آئے گا نہ اس کا بیٹا مگر اس نے دس ہزار روپے کرا کاؤنٹ میں صرف اس لیے ڈالے کہ قانونی طور پر ہم کرائے دار رہیں اور خود کو مالک نہ سمجھنے لگیں۔" غالب نے کہا۔

"تم نے کیسے فرض کر لیا کہ وہ لوٹ کر نہیں آئے گا؟"

"بس اس کا رویّہ، اس کی عمر اور اس کے حالات دیکھ کر۔ اب کتنی عمر رہ گئی ہے اُس کی۔ اور بیٹا جو کینیڈا میں سکونت اختیار کر چکا ہے، واپس آ کے کیا کرے گا؟ یہ پرانی فرسودہ حال کوٹھی کون سا بڑا اثاثہ ہے جس کے لیے وہ لوٹ کر آنا ضروری سمجھے۔ یہاں ایسے بہت سے پرانے گھر ہیں جن کے مکین ہجرت یا ترکِ وطن کر گئے اور جلاوطن ہوئے۔ ان کے سب رشتے ٹوٹ گئے اور جذبات بدل گئے۔ گھر کھنڈر ہو گئے۔ میرا گھر ایک مثال ہے۔" غالب نے بتایا۔

"میرا گھر... ... مثال ہے۔" میں نے کہا۔

"بڈھا کچھ نہ لینے کے باوجود بہت کچھ کہہ گیا۔ ایک امانت ہمارے سپرد کر گیا اور یہ بھی سمجھا گیا کہ اب اس کی حفاظت بھی ہمیں اپنی زندگی کی طرح کرنی چاہیے۔" محسن بولا۔

"مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ وہ بھی ہمارا طرف دار اور حامی تھا۔ ہم سے اور ہمارے مشن سے اصولی اتفاق رکھتا تھا لیکن کھل کر یہ بات نہیں کہنا چاہتا تھا کہ کہیں ہم پریشان اور خوف زدہ نہ ہوں۔" غالب نے کہا۔ "اس نے اپنے شکوک کا اظہار بھی نہیں کیا۔"

"یہ بڑی حوصلہ افزا بات ہے۔" میں نے کہا۔ "کہ آہستہ آہستہ لوگ ہمارے کام اور ہمارے نام سے آشنا ہو رہے ہیں۔ یہ ماننے لگے ہیں کہ ہم مجرم نہیں ہیں، مجاہد ہیں۔ ہم ڈائریکٹ ایکشن لیتے ہیں تو غلط نہیں کرتے۔ لوگ اس پورے سماجی، معاشی اور اخلاقی نظام کی ہیرا پھیری سے عاجز ہیں جس میں کوئی قانون، اصول یا ضابطہ کام نہیں آتا۔"

"یا کام آتا ہے تو غلط کام کرنے کرانے میں۔" محسن نے کہا۔ "اگر کوئی صحیح کام کرنا چاہے... صحیح طریقے پر... تو بدعنوان لوگ انہی قواعد و ضوابط کی رکاوٹیں کھڑی کر دیتے ہیں اور اچھا کام کرنے والے کو بُرا بنا دیتے ہیں۔"

"اخبارات نے ہمارا امیج درست کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔" غالب نے کہا۔ "لوگ اصل چہرے کو پہچان رہے ہیں۔"

"ہاں۔ اس ہیئر ڈریسر کے بعد میجر سلطان نے اور اب ہمارے لینڈ لارڈ نے ثابت کر دیا ہے کہ ہم سے اور ہمارے مشن سے ہمدردی رکھنے والے ہر جگہ پیدا ہو گئے ہیں۔" محسن بولا۔ "ایسا نہ ہوتا تو یہ سب ہمیں پولیس کے حوالے کرنے کی کوشش ضرور کرتے۔"

"وہ کیا کہا ہے شاعر نے کہ۔ ظلم کی کھیتی سدا پھلتی نہیں۔ کاغذ کی سدا چلتی نہیں۔" غالب بولا۔ "بالآخر سچ سب کے سامنے آنے لگا ہے اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ لوگ سچ کے ساتھ ہو رہے ہیں۔"

"یہ بڑی خوش آئند تبدیلی ہے اور بہت حوصلہ افزا بات ہے۔" میں نے کہا۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اب بہت محفوظ ہو گئے ہیں۔ کیونکہ ہمیں پناہ دینے والے، ہمارے مددگار اور حمایتی بن گئے ہیں۔ یہ صورتِ حال صرف یہاں تک محدود نہیں ہوگی۔ جب اخبارات میں ہمارے متعلق مزید تفصیلات آئیں گی تو ہم کہیں بھی غیر معروف نہیں رہیں گے۔ پناہ گاہیں زیادہ ہوں گی تو شکاری بھی آسانی سے ہم تک نہیں پہنچ پائیں گے۔"

"یہ جگہ بھی بہت محفوظ ہے۔" محسن نے کہا۔

"اور اسے محفوظ ہی رہنا چاہیے۔"

"ہاں۔ جب تک غالب بالکل صحت یاب نہیں ہوتا۔" محسن نے کہا۔

"اس کے بعد بھی کیتھرین اور جولی کو یہاں رہنا ہے۔" میں نے کہا۔ "کیونکہ ان کا اپنا کوئی گھر نہیں رہا۔ ہم فی الحال ان کو ساتھ نہیں رکھ سکتے۔"

محسن نے اتفاق کیا۔ "کیتھرین پر شاک کا اثر ہے اور جولی پر بھی طویل بیماری کا اثر ہے۔"

"وہ ناتجربہ کار بھی ہے۔" غالب نے کہا۔

"ناتجربہ کار شہلا اور رابعہ بھی تھیں۔" محسن نے کہا۔

"نازو کا نام بھی لو یارو... اس کے نام سے اس کا تصور وابستہ ہے۔" غالب نے کہا۔

"ہاں دوست، رابعہ کے نام سے اس کا تصور وابستہ ہے۔ مگر میں جانتے بوجھتے نہ اس کی بات کرتا ہوں اور نہ اس کا نام لیتا ہوں۔ اس سے سوچ کے راستے کھل جاتے ہیں اور خیال ڈرانے لگتے ہیں۔ میں نے رابعہ کے لیے اپنے جذبات کو دل کے ایک سرد خانے میں ڈال دیا ہے تاکہ احساس کی اذیت میرے دماغ کو ماؤف نہ کرے اور میں وہ سب کچھ کر سکوں جو میں کرنا چاہتا ہوں۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو شاید زندہ بھی نہ رہ پاتا۔ اب رابعہ پھر ملے گی تو یہ ایسا ہی ہوگا جیسے کسی کے نہ ہونے کا یقین آ جائے اور وہ اچانک مل جائے۔ فی الحال اسی یقین کی ضرورت ہے کہ رابعہ مر چکی ہے اور میں اُسے بھول چکا ہوں۔"

"اگر تیرے یہی جذبات رہے تو بہت جلد تو پاگل ہو جائے گا۔ یہ جنون کے آثار ہیں۔" محسن بولا۔

"پاگل تو میں ہوں... تم بھی ہو... ورنہ ہمارے راستے اور ہماری منزلیں جُدا ہوتیں۔ ہم یہاں نہ ہوتے۔ بہت پیچھے رہ جاتے یا اتنا آگے چلے جاتے کہ خود اپنا سراغ نہ ملتا۔ جنون کی ایک منزل ماورائے طلب میں طلب سے بے نیازی ہے۔" میں نے کہا۔

غالب نے سر کھجایا۔ "یہ قنوطیت کا فلسفہ ہے جو میری سمجھ میں نہیں آتا۔"

"میرا خیال ہے کہ ہمیں اخبارات کی رپورٹ دیکھنی چاہیے۔" محسن نے کہا۔ "اور اس کے بعد شہلا سے رابطہ قائم کرنا چاہیے۔"

"شہلا سے کس لیے؟" میں نے کہا۔

"ہر شوہر کو حق حاصل ہے کہ وہ بیوی سے جس قسم کا رابطہ قائم کرنا چاہے کرے۔" غالب نے فرمایا۔

"وہاں انکل رضوی نے پھر ایمرجنسی نافذ کر دی ہوگی۔ ان کی پوزیشن بہت خراب ہوئی ہے۔"

"صرف ہماری۔ بس ہے۔" میں نے کہا۔

"اب بہتر ہے کہ اپنے بھائی منظر کے ذریعے مواصلاتی رابطہ قائم کیا جائے۔ اور اسی سے تازہ ترین صورتِ حال دریافت کی جائے۔" محسن بولا۔

"میں نے منظر سے کہا تھا کہ وہ رابعہ کے اکاؤنٹ میں پڑے ہوئے ایک لاکھ روپے لا دے۔ سینتالیس ہزار کے لگ بھگ ہمارے پاس ہیں اور یہاں ہمارا کام بھی ختم ہو چکا ہے۔ ہمیں آج ہی یہاں سے نکل جانا چاہیے۔"

"نازو اور اس کے بھائی اکرام نے بھی کراچی میں کچھ تو کیا ہوگا۔"

"مگر حیرت ہے کہ انھوں نے یہاں کسی سے رابطہ قائم نہیں کیا۔" میں نے کہا۔

"کہیں وہ بھی کسی مصیبت میں گرفتار نہ ہو گئے ہوں۔" محسن نے کہا۔ "رابعہ اور ٹیڈی کی خبر لینے گئے تھے اور خود گم ہو گئے۔"

"ان کی طرف سے کوئی پیغام مل جاتا تو ہمارے لیے آسانی ہو جاتی۔ خیر ہم بھی ہمت ہارنے والے نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔

"وہ جو چاہنے والے ہیں تیرے... ... تجھے ڈھونڈھ ہی لیں گے کہیں نہ کہیں۔" غالب نے آہ بھر کے کہا۔

"اپنی ٹانگ ہر جگہ اڑانے کا نتیجہ دیکھ لیا۔" محسن بولا۔ "نہ صحافی ہے نہ شاعر۔ آدھے عاشق اور آدھے تیمز بانڈ۔"

جولی اور کیتھرین گھر کی صفائی اور سامان کو اپنی اپنی جگہ رکھنے میں مصروف تھیں۔ مالک مکان کے رخصت ہوتے ہی انھوں نے اس کا کاٹھ کباڑ ایک کمرے میں رکھ کے تالا ڈال دیا تھا اور اب عملاً وہ پورے مکان کی مالک تھیں۔ دوپہر تک وہ کچن کو اس قابل کر چکی تھیں کہ وہاں کھانا پکایا جا سکے۔ محسن اخبارات لینے گیا اور اس کے واپس آنے تک میں نے اپنے اسلحے کے ذخائر کا جائزہ لیا۔ یہ سب خطرناک قسم کا تباہ کن اسلحہ تھا اور اسے ہم پستول کی طرح جیب میں ڈال کے ساتھ نہیں لے جا سکتے تھے لیکن یہ ضروری تھا کہ ہم جہاں بھی ہوں، یہ اسلحہ ہماری دسترس میں رہے۔

محسن آیا تو اس کے پاس اُردو انگریزی کے چار اخبارات تھے، ان میں ایک وہ بھی تھا جس نے گورے ڈاکو اور پاٹے خاں ڈاکو کی گرفتاری، ان کے بیانات اور تصاویر کے علاوہ ہمارے کارنامے کی پوری خبر دی تھی لیکن اس خبر کے ساتھ جو پہلے صفحے پر شہ سرخی کے علاوہ ذیلی سرخیوں میں کئی جگہ مختلف حوالوں سے لگائی گئی تھی ہماری کوئی تصویر نہیں تھی۔ خبروں کے درمیان باکس میں کچھ ہلکی پھلکی باتیں بھی تھیں مثلاً ایک باکس میں لکھا ہوا تھا کہ "جو سوتا ہے وہ کھوتا ہے۔" کھوتا ذومعنی لفظ بن گیا تھا کیونکہ آگے ذکر تھا کہ پولیس پارٹی حلوے پراٹھے، مرغ اور نرگسی کوفتے کھا کے سوئی تو جاگنے پر انھوں نے خود کو ڈاکوؤں کی تحویل میں پایا۔ ان کی وردی، ان کا اسلحہ، جیپ اور ان کی آزادی سب چھن چکی تھی اور ڈاکوؤں کو گرفتار کرنے کے لیے جانے والے ڈاکوؤں کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے تھے۔ اس طرح "کھوتا" بمعنی گدھا بھی سمجھا جا سکتا تھا اور اتنا کچھ کھو دینے والوں کے لیے عام مطلب میں بھی آتا تھا۔

یہ صحافتی حلقوں میں ہلچل مچا دینے والی خبر تھی اور دوسرے اخبارات کے لیے اتنی بڑی خصوصی خبر کا نہ ملنا سخت پریشانی اور خفت کی بات تھی۔ غالب کا دوست راتوں رات ملک کے سب سے ذہین اور ہوشیار رپورٹر کی حیثیت سے مشہور ہو گیا تھا۔ اگر یہ سب جھوٹ ہوتا تو معاملہ اُلٹا ہو جاتا مگر ایس ایس پی رضوی صاحب نے ڈاکوؤں کو عین اسی مقام سے اُٹھا لیا تھا جہاں انھیں رپورٹرز سے ملوایا گیا تھا۔

پولیس کے ایک ڈی آئی جی نے مشتعل ہو کے رات کو کچھ رپورٹرز کو پکڑ لیا تھا جو ایک دن پہلے کی پریس کانفرنس میں شریک تھے اور ان سے پوچھنا چاہا تھا کہ ہم سے ان کا کیا رابطہ ہے لیکن ایک گھنٹے بعد انھیں اپنے احکامات واپس لینے پڑے۔ صحافیوں نے یہ بتانے سے صاف انکار کر دیا تھا کہ ان کو ہمارے متعلق کیا معلوم ہے۔ سب نے صاف کہا تھا کہ جو کچھ معلوم ہوا تھا، وہ اخبارات میں آ گیا ہے۔ سکندر بخت اور اس کے ساتھی خود فون کر کے بلاتے ہیں اور رازداری کا وعدہ کرنے کے بعد وہ خلاف ورزی کے مرتکب نہیں ہو سکتے۔ وہ پولیس کو مطلع کر کے نہیں جا سکتے اور بدعہدی کر کے اپنا اعتبار کھونا نہیں چاہتے۔

ڈی آئی جی صاحب کی اس حرکت کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ تمام صحافی جو غالب کو جانتے تھے اور ہمارے مشن کی نوعیت کو سمجھ چکے تھے، ہاتھ دھو کے پولیس کے بدعنوان اہلکاروں کے پیچھے پڑ گئے تھے۔ اب مجرم پولیس بن گئی تھی جس نے مجرموں کی پشت پناہی کی اور زرخرید غلاموں کی طرح اُن کے ... اردوں پر ہمارے خلاف ناکردہ جرائم کی فہرست کو طویل سے طویل تر کرنے میں لگے رہے۔ بقیہ ... آئندہ

نے ہماری بے گناہی کے حق میں ایک مہم شروع کر دی تھی۔

جس اخبار میں ڈاکوؤں کی گرفتاری کی خبر اور ان کے بیانات شائع ہوئے تھے اس نے تو پولیس کی نااہلی پر پورا اداریہ لکھ مارا تھا اور صاف مطالبہ کیا تھا کہ اصل مجرم پولیس ہے اور اس پورے معاملے کی تحقیقات کے لیے ایک اعلیٰ اختیاراتی کمیشن تشکیل دیا جائے جو ابتدا سے تمام معاملات کا جائزہ لے۔ یہ دیکھے کہ اصل مجرم کس طرح قانون کے ہاتھوں سے محفوظ رہے۔ وہ کون پولیس افسر تھے جو ملک دشمنی کے کاروبار میں مددگار رہے اور دشمن کے ایجنٹ کا کردار ادا کرتے رہے۔ ہمارے خلاف تمام قانونی معاملات کی ازسرِ نو تفتیش کی جائے اور ان کو سزا دی جائے جنھوں نے ہمارے خلاف سازش کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کی۔

یہ تمام صورتِ حالات بہت خوش آئند تھی۔ اس سے دلاور اینڈ کمپنی کے لیے مشکلات پیدا ہوئی تھیں۔ ہمارا راستہ صاف ہونے لگا تھا اور اب یہ محسوس ہوتا تھا کہ ایم آر ایس کی تحریک کو اخبارات کی حمایت مل گئی ہے۔ اس طرح ہمیں رائے عامہ کی تائید حاصل ہونا یقینی تھا اور ہم یہ سمجھنے میں حق بجانب تھے کہ محبِ وطن عوام کی اکثریت نے ایم آر ایس کو اسی طرح تسلیم کر لیا ہے جس طرح تنظیم آزادئ فلسطین کو دنیا کے حریت پسندوں نے تسلیم کر رکھا تھا۔ اب ہم زیادہ بے خوفی کے ساتھ کہیں بھی جا سکتے تھے اور امید رکھ سکتے تھے کہ ملک دشمنوں کے خلاف مدد کرنے والے ہر جگہ ہمارا ساتھ دیں گے۔

پھر آخری صفحے کی ایک خبر نے مجھے متوجہ کیا۔ اپنے بارے میں اتنی بہت سی خبریں، تبصرے اور اداریے پڑھتے ہوئے ہم سب بہت خوش تھے اور اتنے منہمک تھے کہ دوسری خبروں پر کسی نے توجہ ہی نہیں دی تھی۔ ہم سب کے جذبات ایک جیسے تھے۔ سب یہ محسوس کرتے تھے کہ ہماری طاقت کئی ہزار گنا بڑھ گئی ہے۔ ہم اکیلے نہیں رہے۔ ہمارے وسائل لامحدود ہو گئے ہیں۔ وہ سب جو اس ملک سے محبت کرتے ہیں۔ اس کی مٹی سے عہدِ وفا رکھتے ہیں اور اس کی سرحدوں کی محافظت کو ایمان جانتے ہیں نظریاتی طور پر مانتے ہیں اور عملی طور پر پہچانتے ہیں۔ وہ سب ایم آر ایس میں شامل ہو چکے ہیں۔

یہ بہت بڑی تبدیلی تھی اور سخت ترین دورِ ابتلا کے بعد ہمارے صبر و استقامت کے عوض ملنے والا، منزل کا نشان دینے والا اور یقین عطا کرنے والا وہ انعام تھا جس نے ہمارے حوصلوں کو بھی کئی ہزار گنا بڑھا دیا تھا۔ ہم تین آدمی تین مختلف اخبار دیکھتے جاتے تھے۔ بار بار ایک دوسرے کو کسی خبر کا متن سناتے تھے اور ہوتا یہ تھا کہ بہ یک وقت سب بولنے لگتے تھے۔ ایسے یہ دیکھ اس میں کیا ہے۔ یار یہ سن... اور یہ خبر... کوئی انگریزی کا اقتباس پڑھ رہا تو کوئی اردو کا۔ سب کا تبصرہ اور شور الگ تھا۔

"یہ خبریں انکل رضوی نے پڑھ لی ہوں گی۔" محسن بولا۔

"انھوں نے کیا، شہلا اور منظر نے بھی دیکھ لی ہوں گی۔"

"کیا بے وقوفی کی بات ہے۔ سارے شہر نے پڑھ لی ہوں گی اور شہر میں دلاور بھی ہے اور اس کے شکاری کتے بھی ہیں۔"

"تم شہر کی بات کرتے ہو۔ ملک کے دوسرے شہروں سے شائع ہونے والے اخبارات میں بھی کچھ تو ہوگا۔" میں نے کہا۔

"یہ تو ہے۔ خبر ایسی ہی ہے... میرا مطلب ہے قومی اہمیت کی خبر ہے۔" غالب بولا۔

"اس کا مطلب ہے کہ کراچی کے اخباروں میں بھی یہ سب ہوگا۔"

"یقیناً ہوگا... یہ اخبار بہ یک وقت کراچی اور لاہور سے شائع ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔

"راولپنڈی، پشاور اور لندن سے بھی شائع ہوتا ہے۔" محسن بولا۔ "اکرام اور نازو نے بھی یہ اخبار دیکھا ہوگا... ہو سکتا ہے کہ ہم اخبار کے رپورٹر سے رابطہ قائم کریں۔ یا منظر کو فون کریں۔"

"وری گڈ۔" میں نے چٹکی بجا کے کہا۔ "اب کام آسان ہو گیا۔"

"آسان۔" غالب نے کہا۔ "کام مشکل ہو گیا ہے نورِ چشمو! آنا شور مچ گیا ہے کہ دلاور اینڈ کمپنی بہت محتاط ہو جائے گی۔ وہ سارے راستے سارے رابطے بدل دیں گے۔ انڈر گراؤنڈ تو پہلے ہی تھے، اب اور گہرائی میں چلے جائیں گے۔ پہلے کچھ بے خوفی تھی کہ پولیس اپنی ہے اور پکڑے گا کون۔ اب پولیس والے بھی ناک اونچی رکھنے کے لیے کچھ کارروائی تو کریں گے ہی۔ رائے عامہ کے احتساب سے بچنے کے لیے... اعلیٰ سطح پر حکام بھی ان باتوں کا نوٹس لیں گے۔"

"تم بہت امید پرست ہو رہے ہو دوست۔" میں نے کہا۔ "یہاں صرف کاغذی کارروائی ہوتی ہے۔ کچھ بیانات آئیں گے اس قسم کے کہ ملک دشمن عناصر کی بیخ کنی کر دی جائے گی۔ غداروں کو سخت سزا دی جائے گی۔ حکومت تخریب کاری اور انتشار پھیلانے کی اجازت نہیں دے گی۔ ملک کی سالمیت کے خلاف کام کرنے والوں سے سختی سے نمٹا جائے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب سکہ بند بیوروکریٹ اسی قسم کے بیانات ہمیشہ دیتے آئے ہیں اور دیتے رہیں گے۔ دلاور اینڈ کمپنی کے ساتھ صرف حشمت خان اے ایس آئی۔ یا ایس پی سراج ہی نہیں، اس سے بہت اوپر کی سطح کے لوگ بھی ہوں گے۔ سیدھی سی بات ہے کہ اوپر والے بدعنوان نہ ہوں تو نیچے والوں کو آسانی سے پکڑ سکتے ہیں اور اوپر والوں کا خوف ہو تو نیچے والے کیسے غلط کام کر سکتے ہیں مگر اوپر والے براہِ راست شریک نہیں ہوتے۔ وہ بالواسطہ طور پر شامل رہتے ہیں۔ ان کی آشیرباد نیچے والوں کو حاصل ہوتی ہے اور نیچے والوں سے آشیرباد کا معاوضہ انھیں حاصل ہوتا رہتا ہے۔ اگر اعلیٰ سطح پر کرپشن نہ ہو تو سب درست ہو جائے۔ اب تم دیکھ لینا کہ چند دن میں اخباروں کو نوٹس مل جائیں گے۔ ان کے خلاف عدالتی کارروائی ہوگی یا ضابطے کے مطابق انھیں "مفادِ عامہ کے خلاف" خبریں چھاپنے پر پابند کر دیا جائے گا۔ کچھ دن میں یہ ہنگامہ ختم ہو جائے گا۔ پھر سب کچھ پہلے کی طرح ہوگا۔"

"تم نے ٹھیک کہا دوست۔ یہاں یہی کچھ ہو رہا ہے ——— حق کی آواز ایک ہو تو اُسے دبانے والی آوازوں کا شور غالب آجاتا ہے اور خرابی بڑھ جاتی ہے کیونکہ خرابی کی نشاندہی کرنے والوں کا انجام خراب ہوتا ہے۔" مرزا غالب نے مایوسی سے کہا۔ "مگر ایسا بھی نہیں ہے کہ اس خراب خانے میں کوئی مجاہد ہی نہیں رہا۔ کچھ صحافی اب بھی ہیں جو قلم کی آبرو پر جان بھی دے سکتے ہیں۔ یہ محاورے کی بات نہیں۔ وہ عملاً ایسا کر سکتے ہیں۔ اوپر والے معاملہ کتنا بھی دبائیں۔ لوگوں میں بات پھیل گئی ہے اور کچھ نہ کچھ آئندہ بھی پھیلے گی۔"

"چوہدری دلاور اینڈ کمپنی والے اب زخم خوردہ سانپ سے زیادہ خطرناک ہو جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "ہم نے ان کو خطرات کی دلدل میں دھکیلنے کی پوری کوشش کی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ دولت، اثر و رسوخ اور اوپر کے بدعنوان سہاروں کی طاقت سے ہر خطرے کا رُخ پھیر ہماری طرف کر دیں گے۔ جیسے ماہر کھلاڑی اسکواش کی خطرناک ترین شاٹ کو اپنے حریف کی طرف لوٹا کر پوائنٹ حاصل کر لیتا ہے۔"

اسی گفتگو کے دوران میں آخری صفحے پر میری نظر نے ایک چھوٹی سی خبر دیکھ لی۔ اس کی سرخی بہت زیادہ نمایاں نہیں تھی لیکن میری نظر کو گرفتار کرنے والا صرف ایک نقطہ تھا... دلاور...

"مشہور صنعت کار چوہدری دلاور نے سیاست میں حصہ لینے کا فیصلہ کر لیا۔" میں نے بہ آوازِ بلند کہا۔

ایک لمحے کے لیے سب خاموش ہو گئے۔ محسن اور غالب نے غیر سنجیدگی اور بے یقینی کے ساتھ میری صورت کو دیکھا۔

"کیا وہ پاکستان کا وزیرِاعظم اور صدر بننے کا فیصلہ بھی خود ہی کر لیں گے؟" غالب نے کہا۔

"تم لوگ اسے مذاق سمجھ رہے ہو؟" میں نے کہا۔

"نہیں... میں اسے بکواس سمجھ رہا ہوں۔" محسن نے کہا۔

"یہ خبر بھی اُسی اخبار میں موجود ہے جس کی دوسری خبروں سے آپ اور ہم سب ابھی تک خوش ہو رہے تھے۔" میں نے کہا اور اخبار اٹھا کے پڑھنے لگا۔ "معلوم ہوا ہے کہ مشہور صنعت کار چوہدری دلاور عملی سیاست میں حصہ لینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس خیال کا اظہار انھوں نے گزشتہ شام شاہدرہ کے علاقے میں دلاور بلڈنگ کا سنگِ بنیاد رکھتے ہوئے کیا۔ ایک سوال کے جواب میں انھوں نے بتایا کہ ابھی تک انھوں نے کسی سیاسی جماعت میں شمولیت کے امکانات پر غور نہیں کیا ہے۔ لیکن وہ ایک نئی سیاسی جماعت کی تشکیل پر اپنے ہم خیال احباب سے مشورہ کر رہے ہیں۔ چوہدری دلاور نے کہا کہ موجودہ حالات میں تعمیرِ وطن، خدمتِ انسانیت اور اصولِ اخلاق کی اہمیت کو تسلیم کرنے والے ایسے افراد کی اشد ضرورت ہے جو آگے آئیں اور ملک و ملت کی بے غرض خدمت کے جذبے سے سرشار ہوں۔"

"اُلّو کا پٹھا... حرامزادہ..." محسن کے صبر و ضبط کا پیمانہ چھلک گیا اور اس نے ایک سانس میں نصف درجن گالیاں دے ڈالیں۔ ان میں سے نصف کو انتہائی فحش قرار دیا جا سکتا تھا۔

"سنو... آگے سنو۔" میں نے محسن کو ہاتھ کے اشارے سے ٹھنڈا کیا۔ "تمھاری گالیوں سے چوہدری دلاور کی سیاسی بصیرت پر اور اس قوم کی بصارت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ وہ محبِ وطن، انسان دوست اور اخلاق پرست ہونے کی سند حاصل کر لے گا۔"

"یار تم آگے کی فکر میں پڑ گئے۔ اگلا جملہ پڑھو۔" غالب نے جھنجلا کے کہا۔

"آگے لکھا ہے... چوہدری دلاور نے ہمارے نمائندے کو یہ بھی بتایا کہ دلاور بلڈنگ کئی منزلہ عمارت ہوگی لیکن اس کے فرسٹ فلور پر ایک جدید طرز کا اسپتال ہوگا۔ اپنے والد مرحوم کی وصیت پر عمل کرتے ہوئے اس اسپتال کے بستر غریب اور مستحق مریضوں کو بلامعاوضہ فراہم کیے جائیں گے۔ سرکاری اسپتالوں کی زبوں حالی کے پیشِ نظر وہ محسوس کرتے ہیں کہ کم آمدنی والے طبقے کو علاج معالجے کی بہتر سہولت فراہم کرنا بے حد ضروری ہے لیکن یہ کام تنہا حکومت کے وسائل پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اگر صاحبِ ثروت لوگ اسی طرح فلاحی کاموں کے لیے آگے آئیں تو کوئی وجہ نہیں کہ مسلمان بھی گنگا رام اسپتال، گلاب سنگھ جمعیت دیوی اسپتال، دیال سنگھ لائبریری جیسے ادارے نہ بنا سکیں۔ واضح ہو کہ دلاور بلڈنگ اسی جگہ تعمیر کی جائے گی جہاں ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس کے نام سے زرعی مشینری کے پُرزے بنانے کا کارخانہ قائم تھا۔"

"یہ اس کے باپ کی ملکیت تھا۔" محسن نے غصّے میں میز پر مکّا مارا۔ "یہ کیس تو عدالت میں ہے... وہ کون ہوتا ہے..."

"کون کیا ہوتا ہے اور کیا نہیں ہوتا، یہ سب فضول باتیں اخبار میں نہیں ہیں۔" میں نے برہمی سے کہا۔ "اس خبر میں صرف وہ ہے جو ہو رہا ہے... اور ضرور ہوگا... تیرے میرے یا عدالت کے کہنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ سمجھ میں آئی بات؟"

"یار تم چپ نہیں رہ سکتے۔" غالب نے محسن سے مخاطب ہو کے کہا۔ "پہلے خبر سن لو۔ پھر چلے جانا زمزمے کے ساتھ اور داغ دینا۔"

"پوری خبر سننے سے پہلے میں پھٹ جاؤں گا۔ میرے اندر غصّے کا ایٹمی دھواں بھر رہا ہے۔" محسن نے کہا۔

"بس چند سطریں اور سُن لے... پھر پھٹ جانا۔" میں نے کہا۔ "آخر میں لکھا ہے کہ ہمارے نمائندے کی رپورٹ کے مطابق عمارت کے نچلے حصّے میں ایک شاپنگ سنٹر ہوگا جو شاہدرہ ٹاؤن کی رونق میں بھی اضافہ کرے گا اور علاقے کی ضروریات بھی پوری کرے گا۔ اسپتال

میں دوسو بیڈ ہوں گے۔ بعد میں یہ تعداد دُگنی کردی جائے گی۔ دوسری منزل ڈاکٹروں کے بیٹھنے کے کمروں اور لیبارٹری وغیرہ پر مشتمل ہوگی۔ اس سے اوپر کی چار منزلیں چار بیڈروم والے لگژری فلیٹوں کے لیے رکھی گئی ہیں۔ تقریب میں شہر کے معززین، رؤسا اور اعلیٰ حکام، تاجر اور صنعت کار شریک تھے جنھوں نے چوہدری دلاور کے جذبات کو خراجِ تحسین پیش کیا اور انھیں نادار لوگوں کو جدید طبی سہولتوں کی فراہمی کے نیک ارادے پر مبارکباد دی۔ ہمارے نمائندے کے مطابق چوہدری دلاور اس اسپتال کو اپنے مرحوم دوست کی یاد میں "وزیر اسپتال" کا نام دینے کا فیصلہ بھی کر چکے ہیں۔"

میرے وجود کے اندر غصّے کا آتش فشاں کھولنے لگا۔ میں نے اخبار پھینک دیا اور کھڑا ہوگیا۔ میرا خون میرے جسم میں تیزاب بن گیا اور انتقام کی آگ مجھے یوں جھلسانے لگی کہ میں سب کچھ بھول گیا۔ ایم آر ایس کو بھی اور اس کے مشن کو بھی۔ اپنے سب عظیم مقاصد کو، ان سب نقصانات کو جو میں نے اٹھائے تھے اور میری خاطر میرے دوستوں نے برداشت کیے تھے۔ اپنی کامیابیوں کو۔ وقت اور حالات کے تقاضوں کو۔ یہاں تک کہ رشتوں کی حُرمت کو اور رابعہ کی محبت کو۔ ایک آرزو رہ گئی جس نے مجھے پوری طرح مغلوب کر لیا۔ یہ عقل و ہوش کی بات ہی نہ تھی۔ سودا لئے سر تھا جس نے مجھے پاگل کر دیا۔

"میں اس کتّے کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" میں نے یکلخت چیخ کر کہا۔ "وہ جہاں بھی ملے گا، میں اسے مار ڈالوں گا۔"

اس سے پہلے کہ کوئی مجھے روک سکتا، میں بیڈ کے نیچے گھس گیا جہاں مشین گن سے دستی بم تک ہر قسم کا اسلحہ موجود تھا۔

"سکندر... پاگل مت بن..." محسن نے مجھے پکڑ لیا۔

"بس اب مجھے مت روک محسن۔ مجھے اسی پاگل پن کی ضرورت ہے۔" میں نے محسن کو ایک طرف پھینک دیا۔ "یہ عقل سے کام لینے کا ہی نتیجہ ہے کہ آج تک وہ زندہ ہے۔"

"یہ سب کرنا تھا تو..." محسن پھر اُٹھ کے آگے آیا۔

"ہاں... مجھے یہی کرنا چاہیے تھا۔" میں نے چلا کے کہا اور کپڑوں میں لپٹی ہوئی مشین گن نکال لی۔ "اب میں اس سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ مجھے کہیں نہ کہیں تو ملے گا۔ میں اس کو چھلنی کر دوں گا۔ بنا ہے وہ محبِ وطن اور انسان دوست اور اخلاق پرست سیاسی جماعت... اس سے پہلے میں..."

محسن نے مجھے پھر پکڑ لیا... وہ مجھ سے لپٹ گیا۔ "ایسا مت کر سکندر۔"

"نہیں محسن... اب ایسا ہی ہوگا... یہ کھیل ختم... زندگی ایک ہی بار ملتی ہے اور ایک ہی بار لی جا سکتی ہے۔ وہ شکاری کتّوں کی طرح میرے باپ کو مار چکے ہیں، اب وہ میرے پیچھے ہیں اور میں بھاگتا جا رہا ہوں... ہم سب بھاگنے پر مجبور ہیں..." میں نے خون پیتے ہوئے کہا۔

"یہ غلط ہے... یہ غلط ہے سکندر... ہم اس سے ڈرتے نہیں ہیں۔" محسن نے مجھے چھوڑے بغیر کہا۔ "ہمارا مقصد مختلف ہے، ہم کو اس کی جان لینی ہوتی تو ہم بہت پہلے ایسا کر سکتے تھے۔"

"ہمیں ایسا ہی کرنا چاہیے تھا محسن..." میں نے محسن کو پرے الگ کر کے ایک طرف دھکیل دیا۔ "جو کچھ ہم نے کیا غلط تھا، اس سے دلاور کا نہیں صرف ہمارا نقصان ہوا۔ آئندہ بھی صرف ہمارا نقصان ہوگا۔ ہم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے... کبھی اس کا راستہ نہیں روک سکیں گے۔ وہ ترقی کرتا رہے گا۔ اس کا کاروبار جاری رہے گا۔ وہ زیادہ دولت مند ہوتا جائے گا اور زیادہ عزت دار بھی... تو نے دیکھا... اس شہر کے معززین، رؤسا اور اعلیٰ حکام اس کے ساتھ ہیں... تاجر اور صنعت کار اس کے ساتھ ہیں۔ اُسے خراجِ تحسین پیش کر رہے ہیں۔ ایک نیک کام پر۔ وہ غریبوں، ناداروں کے لیے اسپتال بنا رہا ہے، اسی زمین پر جو میری ہے اور کبھی دلاور کی نہیں ہو سکتی مگر کیا قانون مجھے میرا حق دلا سکا۔ مجھے تو وہاں قبر کے لیے دو گز زمین تک نہیں ملے گی۔ وہاں اس وزیر خان کے نام پر ایک خیراتی اسپتال قائم ہو رہا ہے جو خود بھی خیراتی اسپتالوں کے چکر لگاتے ہوئے مر گیا تھا۔ اور یہ اسپتال کون قائم کر رہا ہے؟ اس کا قاتل۔ مگر وہ سب کے سامنے کہتا ہے کہ وہ وزیر خان کا دوست تھا اور کوئی اُسے جھٹلا نہیں سکتا... اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے اب وہ سیاست کا ہتھیار اُٹھا رہا ہے۔"

"سکندر... یہ سب ٹھیک ہے۔" محسن نے کہا۔ "مگر جو کچھ تو کرنا چاہتا ہے، یہ ٹھیک نہیں ہے... تو اسے قتل کر دے گا... پھر کیا ہوگا؟ ہم سب کا کیا بنے گا؟ کیا ہم نے صرف اسی لیے تیرا ساتھ دیا تھا کہ بالآخر پھانسی گھر سے تیری لاش لینے جائیں... رابعہ کہاں جائے گی... کیا تو اُسے دلاور کے کتّوں کے پاس چھوڑ دے گا؟ کہ وہ اس کی بوٹیاں نوچ کھائیں۔ اس کی ہڈیاں تک چبا لیں؟ ہم سب کی طرف دیکھ سکندر..."

میرا کانپتا ہوا جسم پُرسکون ہونے لگا۔ میں نے مشین گن کو لوڈ کر لیا تھا، جب محسن کی آواز میرے کانوں کے راستے میرے دل میں یوں اترنے لگی جیسے بھڑکتے انگاروں پر بارش کی پھوار اُترتی ہے۔

"ڈونٹ بی سلی مائی بوائے۔" کیتھرین یکلخت میرے سامنے آگئی۔ میں نے اُسے غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"میری طرف دیکھو۔" کیتھرین نے روتے ہوئے کہا۔ "میں سب کچھ گنوا چکی ہوں... میرا شوہر تم سے زیادہ بہادر تھا... وہ ایک شیر تھا جسے مجبور پا کے بازاری کتّوں نے مار دیا۔ مگر تم نے دیکھا کہ میں زندہ رہی اور پھر بھی دیکھا کہ جولی کو موت مجھ سے نہیں چھین سکی۔ اس لیے کہ جب میں مایوس تھی اور ہمّت ہار چکی تھی تو خدا نے مجھے ایک بیٹا دے دیا۔ بہرام دادا کو ایک بیٹے کی بہت آرزو تھی۔ وہ کہتا تھا کہ کبھی ایک بیٹا ہوگا تو میں اسے پروفیسر بناؤں گا۔ میں خود نہ پڑھ سکا مگر وہ سب کو پڑھائے گا۔ اس کے پڑھائے ہوئے پروفیسر ہوں گے، شاعر اور ادیب ہوں گے۔ ایک ڈاکو کا بیٹا علم کی روشنی دے گا۔ ان سب کو جو ڈاکو بن سکتے تھے مگر نہیں بنے۔ کاش وہ آج زندہ ہوتا تو دیکھتا کہ خدا نے اُسے کیسا بیٹا دیا ہے... پلا پلایا جوان بیٹا... وہ تم پر اتنا ہی فخر کرتا جتنا میں تم پر کرتی ہوں... تم جو حق و صداقت کے علمبردار تھے۔ انصاف کی آواز تھے اور ظلم کے خلاف دیوار تھے۔ یکلخت تم نے قاتل بننے کا فیصلہ کیوں کر لیا ہے مائی سن؟"

مشین گن میرے ہاتھ سے گر گئی۔ میں نے زار و قطار روتی ہوئی کیتھرین کو عین اس وقت سنبھال لیا جب وہ گرنے ہی والی تھی۔ میں نے اُسے آہستہ سے اُٹھا کے بستر پر لٹا دیا۔ "تم ہم سب کو چھوڑ کے مرنے جا رہے ہو؟"

"اس کا کسی سے کوئی رشتہ نہیں آنٹی۔" محسن نے تلخی سے کہا۔ "یہ صرف اپنے بارے میں سوچ رہا ہے۔"

"کیا یہ ٹھیک ہے سکندر؟" کیتھرین نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "تم محسن کو اپنا بھائی نہیں سمجھتے؟ جولی اور شہلا کو بہن نہیں مانتے... صرف اس لیے کہ تمھارے اور ان سب کے درمیان خون کا رشتہ نہیں ہے؟"

"ایسا نہیں ہے آنٹی۔" میں نے ندامت سے کہا۔ "یہ رشتے تو خون کے رشتوں سے زیادہ پائیدار ہیں... مگر..."

"مگر میں وہی کروں گا جو میرا دل چاہے گا... کسی کی پروا کیے بغیر۔" غالب نے سنجیدگی سے کہا۔ وہ اب تک چُپ بیٹھا تھا۔

میں نیچے بیٹھ گیا اور میں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ "میں کیا کروں آخر... میرے اعصاب بھی فولاد کے بنے ہوئے تو نہیں ہیں۔ کوئی ایسی بات سنتا ہوں تو مجھ پر پاگل پن سوار ہو جاتا ہے۔"

میں نے جولی کو دیکھا جو دروازے میں ساکت و صامت کھڑی ہوئی تھی اور اس کی خاموش آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ پھر وہ آہستہ آہستہ آگے آئی اور اس نے فرش پر پڑی ہوئی مشین گن اُٹھا کے دوبارہ کپڑے میں لپیٹ دیا اور بیڈ کے نیچے ڈال دیا۔

"آئی... ایم سوری آنٹی۔" میں نے کیتھرین سے کہا۔ "میں سب کے ساتھ ہوں اور ہمیشہ رہوں گا۔"

"سکندر... مائی سن... یہ تمھاری اپنی فیملی ہے۔" کیتھرین نے کہا۔ "اگر تمھاری اپنی ماں ہوتی تو کیا تم اس کی بات نہ مانتے۔ تمھارے بہن بھائی زندہ ہوتے تو تم ان کا خیال نہ کرتے... دیکھو، خدا نے مجھے ہی نہیں تمھیں بھی سب رشتے دے دیے ہیں اور تم کو ان کی قدر نہیں... اگر ہم ساتھ ہیں تو ایک خاندان ہیں ورنہ لاوارث ہیں۔ تم ان رشتوں کو مانتے ہو مگر پہچانتے نہیں؟ پہچان اصل چیز ہے۔"

"میں... شرمندہ ہوں..." میں نے کہا۔ "آئندہ میں سب کے ساتھ وہی کروں گا، جو سب چاہیں گے... یہ بات ہی ایسی تھی کہ میں اشتعال میں آگیا۔ تم تو جانتی ہو آنٹی کہ میرے والد کے ساتھ کیا ظلم ہوا تھا۔ اس کے پاس لاکھوں کی دولت تھی مگر وہ زندگی کے آخری دنوں میں کس طرح عذاب جھیلتا ہوا دنیا سے رخصت ہوا۔ اس کو سرکاری اسپتال کی دوا تک نصیب نہ ہوئی۔"

"وہ سب میں جانتی ہوں۔ خدا پر بھروسا رکھو... ایک دن انصاف کا ضرور آئے گا۔" کیتھرین نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ ہم چلتے ہیں۔" محسن نے اچانک کہا۔ "جا کے دیکھتے ہیں کہ یہ معاملہ کیا ہے۔"

"کون سا معاملہ؟" غالب نے کہا۔ "دلاور کے سیاست میں حصّہ لینے کا؟"

"نہیں... ذرا ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس تک جاتے ہیں۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ کارخانے کی جگہ عمارت کھڑی کرنے کا سلسلہ کیسے شروع ہوگیا اچانک۔" محسن نے کہا اور مجھے ہاتھ پکڑ کے کھینچ لیا۔

"میرا خیال ہے کہ تم دونوں جھوٹ بول کے باہر جا رہے ہو۔" کیتھرین اُٹھ بیٹھی۔ "تم کچھ کرنا چاہتے ہو؟"

"آپ کی قسم آنٹی... میں کچھ نہیں کروں گا... اور سکندر کو بھی نہیں کرنے دوں گا۔" محسن نے کہا۔ "بس وہاں تک جا کے لوٹ آئیں گے۔"

"آخر کیوں... کیا دیکھنا ہے وہاں جا کے...؟"

"یہی کہ کارخانہ قائم ہے یا عمارت کی بنیادیں کھودی جا رہی ہیں۔" محسن بولا اور مجھے گھسیٹ کر باہر لے گیا۔

"دیکھو احتیاط سے جانا۔" کیتھرین نے چلا کے کہا۔ "کسی مصیبت میں مت پڑ جانا۔"

باہر آنے کے بعد محسن نے کہا۔ "یہ خبر تو منظر نے بھی دیکھی ہوگی؟"

"ہاں... وہ تو اخبار کا کیڑا ہے۔"

"اس سے پوچھتے ہیں کہ یہ سب کیسے ہوگیا۔" محسن نے کہا۔

"میں پہلے جائے واردات کا معائنہ کروں گا۔" میں نے کہا۔

"یار کہیں یہ خبر جعلی نہ ہو۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ صرف ہمیں متوجہ کرنے کے لیے نہ لگوائی گئی ہو۔" محسن نے کہا۔ "کوئی نیا جال نہ ہو کہ ہم وہاں جائیں اور گرفتار ہو جائیں۔"

"کیا اخبار نویس اتنے غیر ذمے دار لوگ ہوتے ہیں؟"

"بیشتر نہیں ہوتے۔ چھاپنے سے پہلے خبر کی تصدیق کر لیتے ہیں لیکن محض نام نہاد صحافی سب کچھ کر سکتے ہیں۔" محسن بولا۔

کیونکہ نہ ان کا کوئی ضمیر ہوتا ہے نہ اصول۔ ان کا مشن صحافت نہیں تجارت ہوتا ہے۔ اگر ان کا سودا ہو جائے تو وہ اپنا قلم بیچ دیتے ہیں۔"

"پھر بھی... اس خبر میں معززین، رؤسا اور تاجر و صنعت کار سب کی شرکت کا ذکر ہے۔" میں نے غور کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن نام کسی کا نہیں ہے۔" محسن نے کہا۔ "کہ فلاں فلاں حضرات اور خواتین شریک تھے... یہ ایک بے معنی سا جملہ ہے۔ چار لوفر لپاڑیے اور چار بدمعاش خود کو معززین شمار کر سکتے ہیں۔ چار ریڑھی پر سبزی بیچنے والے ہوں اور چار ریوڑیاں بنانے والے تو تاجر اور صنعت کار ہو گئے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "یہاں سب ہی خود کو معزز قرار دیتے ہیں... دکاندار اپنے آپ کو تاجر کہتا ہے اور جس کی ایک کھڈی ہو وہ صنعت کا مالک کہلانا چاہتا ہے۔"

"اسی سے تو مجھے شک ہوتا ہے۔" محسن نے کہا۔

"ایک چال اور بھی ہو سکتی ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ کیا؟"

"کل اس کی تردید آ جائے گی۔" میں نے کہا۔

"ایسا ہوتا رہتا ہے۔" محسن نے اتفاق کیا۔ "آج میں کسی ذریعے سے بیان چھپوا دوں کہ میں نے صرف لنگوٹ باندھ کے ننگے پاؤں اور خالی ہاتھ ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کرنے کا فیصلہ کیا ہے، تو بڑی سنسنی پھیلے گی۔ وقتی اور سستی شہرت حاصل ہو گی اور بے وقوف جو کہ ہمیشہ اکثریت میں ہوتے ہیں، کہیں گے کہ بھئی واہ... ہے نا شیر دا پُتّر۔ تردید تو بعد میں کسی بھی وقت کی جا سکتی ہے۔"

"بیان چھپوانے میں کیا ہے۔ تو میری طرف سے چھپوا دے کہ میں درحقیقت فلم اسٹار زیبا کا پہلا شوہر ہوں۔ تو پریشانی ہو گی زیبا کے لیے... وہ خود تردید کرتی پھرے گی اور اس کے پرستار خنجر بکف مجھے قتل کرنے کے لیے تلاش کرتے رہیں گے۔" میں نے کہا۔

"اسی لیے مجھے یہ خبر جھوٹ لگتی ہے... آخر ایک ہی اخبار نے یہ خبر کیوں دی؟" محسن بولا۔

"ہاں... اس قسم کی تقریب میں تو سب اخباری نمائندے ہوتے"

"ہمارے دوست بھی ہمیں بتاتے کہ چوہدری دلاور کیا کر رہا ہے۔ یا کیا کرنے والا ہے... انھیں تو پہلے ہی معلوم ہو جاتا" محسن نے کہا۔

"سچ کہا تو نے... ہماری پریس کانفرنس میں آنے والے سب ہی مشہور صحافی ہیں۔ وہ ہمارے اور دلاور کے تعلق کو بھی جانتے ہیں اور اس تعلق کے پسِ منظر کو بھی سمجھتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"وہ ضرور اس بات کا ذکر کرتے۔"

"پھر کیا خیال ہے... نہ جائیں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں... جال پھیلا کے ہمیں مدعو کیا گیا ہے تو ہمیں بھی ایسی بے مروتی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔" محسن نے کہا۔

"ہاں، ورنہ دلاور کو مایوسی ہو گی۔" میں نے جواب دیا۔

"ہم اسے مایوس نہیں کریں گے۔ ہم اُسے یہ بتاتے ضرور جائیں گے کہ ہم آ گئے ہیں لیکن گرفتار ہونے کے لیے نہیں۔" محسن بولا۔ "اس کے لیے ضروری ہے کہ چوہدری صاحب کو پتا نہ چلے کہ ہم کب آئے اور کب گئے؟"

میں نے تائید میں سر ہلایا۔ "میرا بھی ان سے ملاقات کو دل چاہتا ہے۔"

"گزشتہ چند دن میں ہم بہت مصروف رہے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "اور انہی مصروفیات کے باعث مشہور بھی ہوئے ہیں۔ یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ اب ہمیں پہچاننے والے آسانی سے پہچان جاتے ہیں۔"

"اور پہچاننے والے اتنے زیادہ ہوں تو یہ کوئی اچھی بات نہیں۔"

"یہ ہمارے مشن کی راہ میں رکاوٹ ہے۔" محسن بولا۔

"پہچاننے والوں میں سب دوست نہیں ہوں گے۔ زیادہ دوست ہوں گے لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سو میں ایک دشمن ہو یا ہزار میں ایک۔ جتنا فائدہ ننانوے یا نوسو ننانوے دوستوں کی حمایت سے ہو گا، وہ ایک دشمن کے ہاتھوں نقصان بن جائے گا۔" میں نے کہا۔

"اب ہمیں پھر گمنام ہو جانا چاہیے۔ حالات کا تقاضا ہے کہ ہمارے چہرے بدل جائیں۔" محسن نے کہا۔ "یہ بات یقینی ہے کہ شکاری ہمیں تلاش کرتے پھر رہے ہوں گے۔ دشمنی اور نفرت کے ننگے زیادہ زہریلے اور خطرناک جذبے کے ساتھ۔"

"ویسے بھی ہمارے مشن کا اگلا مرحلہ شروع ہونے والا ہے جس میں ہمارے لیے خاموشی اور رازداری سے ہر قدم اٹھانا ضروری ہو گا۔ جو پبلسٹی ہم نے اب تک حاصل کی، وہ ہمارے کام آئے گی۔ جب ضرورت پڑے گی اور ہم محسوس کریں گے کہ ہمارے لیے اپنی شناخت ظاہر کر دینے میں کوئی خطرے کی بات نہیں تو ہم خود بتا دیں گے کہ ہم کون ہیں۔ ورنہ کسی کو شک بھی نہیں ہونا چاہیے۔" میں نے کہا۔

اس مسئلے پر ہمارے درمیان مکمل اتفاق رائے تھا چنانچہ ہم نے گھر سے نکلنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ ہم نے کیتھرین کو سامانِ ضرورت کی ایک فہرست دے کر بازار بھیجا۔ اس کے واپس آنے تک ہم نے ایک دوسرے کی صورت بدلی۔ امام دین عرف پنڈت ہیئر آرٹسٹ نے ہمیں وہ تحائف پیش کیے تھے جن کی افادیت مسلّم تھی۔ ایک وِگ میں نے دوسری محسن نے اپنے سر پر سیٹ کی۔ یہ بہت اعلیٰ قسم کی وِگ تھی جس کو لگانا بھی مشکل کام نہ تھا۔ وِگ لگانے کے بعد ہمارے بالوں کی جگہ سر پر جو بال نظر آنے لگے وہ سخت، کھردرے اور مڑے ہوئے تھے۔ جیسے کہ افریقہ کے حبشی نسل سے تعلق رکھنے والی اقوام کے ہوتے ہیں یا ہمارے ملک میں مکران کے علاقے میں نظر آتے ہیں۔

ہم نے سیاہی مل کے چہرہ، گردن اور ہاتھوں کی جلد کو بڑے یکسانیت سے کالا کیا تاکہ ہمارا سیاہ رنگ بالکل قدرتی لگے۔ جولی ہماری یہ مضحکہ خیز صورت دیکھ کر بہت ہنسی مگر اس نے ہماری مدد بھی کی۔ غالب ایک غیر جانبدار مبصر کی حیثیت سے تبدیلی کے اس عمل کو دیکھتا رہا اور ہمیں اپنے مشوروں سے بھی نوازتا رہا۔

کیتھرین تقریباً دو گھنٹے بعد واپس آئی۔ اُس نے بہت ہوشیاری سے تمام اسباب کا انتخاب کیا تھا۔ میرے لیے ایک تنگ موری والی پرانی پتلون تھی جس کا نیلا رنگ جگہ جگہ سے اُڑا ہوا تھا اور اس کے گھٹنوں پر چمڑے کے گول ٹکڑوں کے پیوند تھے۔ یہ زین کی پتلون تھی مگر زین اتنی موٹی تھی کہ کینوس کا گمان ہوتا تھا۔ محسن کی پتلون ٹوئیڈ کی قسم کے کپڑے کی تھی جس پر بڑے بڑے لال رنگ کے چار خانے بنے ہوئے تھے۔ میری قمیص زرد تھی اور اس پر سامنے کسی فٹ بال ایسوسی ایشن کا بہت بڑا مونوگرام چھپا ہوا تھا۔ محسن کے لیے وہ سُرخ رنگ کی بنیان نما جرسی لائی تھی جس پر ایک نیم عریاں عورت کے رقص کا پوز سفید رنگ میں اُبھرا ہوا لگتا تھا۔ اس کے اوپر پہننے کے لیے ہم دونوں کی جیکٹ تھی۔ میری سرخ رنگ کی اور محسن کی سیاہ رنگ کی۔ عام حالات میں ہم انھیں پہننے سے کچھ نہ پہننے کو ترجیح دیتے مگر اس وقت یہی لباس ہمیں سب کی نظر میں نمایاں بھی کر سکتا تھا اور سب کی نظر سے چھپا کے بھی رکھ سکتا تھا۔ کوئی بھی ہمیں دیکھتا تو حیران ہوتا۔ مسکراتا یا ہنستا۔ ہمیں کارٹون سمجھتا یا غیر ملکی سیاح لیکن کسی کا ذہن سکندر بخت اور محسن کی طرف نہ جاتا۔ ظاہر کی یہ تبدیلی اتنی بڑی تھی کہ دلاور جیسے چالاک آدمی کے ذہن کو بھی گمراہ کر سکتی تھی۔ اس لباس اور سیاہ رنگ کے ساتھ ہم نے سفید فریم اور گہرے رنگ کے شیشوں والی عینک لگا لی اور دو کیمرے لٹکائے جو کیتھرین خرید کے لائی تھی۔

"تم اب خود کو کچھ بھی کہہ سکتے ہو۔" کیتھرین نے ہمیں تعریفی نظروں سے دیکھا۔ "کسی کا باپ بھی تم کو نہیں پہچان سکتا۔"

"خود ان کا باپ ہوتا تو نہ پہچانتا۔" غالب نے کہا۔

"ہمیں یہ طے کر لینا چاہیے کہ ہم کیا ہیں۔" میں نے کہا۔

"تاکہ کسی موقع پر کنفیوژن نہ ہو۔" محسن نے اقرار میں سر ہلایا۔

"تم دونوں ہی کہہ سکتے ہو کہ تم یورپ کے کسی سرکس میں جوکر تھے۔" غالب نے کہا۔ "کرتب بھی دکھا سکتے ہو۔"

"کرتب تو ہم ہر وقت، ہر جگہ دکھا سکتے ہیں لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہم جوکر ہی کہلائیں۔ ہم کسی امریکی یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالر بھی بن سکتے ہیں۔ پروفیسر انگینہ مظہر۔ سطحِ سمندر کے نیچے آثارِ قدیمہ کی

تلاش کے ماہر۔ اور ڈاکٹر واوٹ چانگ ۔ انسانی اخلاق پر ہوا کے دباؤ اور جراثیم کُش ادویات کے اثرات کا مطالعہ کرنے والے وہاں سے اس قسم کے لوگ آتے رہتے ہیں۔"

"کیوں ایسے مشکل مضمون تلاش کرتے ہو۔" غالب نے کہا۔ "سیدھے سیدھے غیر ملکی صحافی بن جاؤ۔ فرنچ تم دونوں کو آتی ہے۔ اس طرح تم ہر جگہ پہنچ سکو گے۔"

میں نے اور محسن نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ "یہ ڈیڑھ ٹانگ کا غالب بات پتے کی کہتا ہے۔" میں نے کہا۔

"غیر ملکی صحافیوں کے پاس ایکریڈیشن کارڈ ہوتے ہیں۔ یا اُن کے اداروں کے جاری کردہ پاس۔" محسن بولا۔

"اگر ہم اپنا اعتماد بحال رکھیں تو مجھے یقین ہے بیشتر لوگ چکر میں آجائیں گے۔" میں نے کہا۔ "بعد میں ہم کوشش کریں گے کہ جعلی شناختی دستاویزات بھی بنالیں۔"

"سُنا ہے کراچی میں یہ کوئی مشکل کام نہیں ہوتا۔"

"ہاں... غیر ملکی پاسپورٹ مل جاتے ہیں مگر آسانی سے نہیں۔ ان کو زیادہ تفصیل سے کوئی چیک بھی نہیں کرتا۔" محسن بولا... "شناختی کارڈ وغیرہ کا مسئلہ اتنا مشکل نہیں۔ فی الحال تو ہمیں صرف اپنے چوہدری صاحب کے پاس ہی جانا ہے۔ وہ کچھ نہیں پوچھے گا۔ اگر یہ خبر سچ ہوئی تو بہت خوش ہو کے انٹرویو دے گا۔"

"لیکن جھوٹ ہوئی تو فوراً شک میں مبتلا ہو جائے گا۔" میں نے کہا

"ہم اس کے شک کا علاج ساتھ رکھیں گے۔" محسن نے کہا۔

ہم تیسرے پہر کے قریب نکلے۔ حُلیے سے ہم کتنے عجیب لگتے ہیں، اس کا اندازہ ہمیں سڑک پہ آتے ہی ہوگیا۔ لوگ ہمیں مڑ مڑ کر دیکھتے تھے اور زیرِ لب مسکراتے تھے۔ ایک جگہ دو ریڑھی والوں نے بہ آوازِ بلند اظہارِ خیال بھی کیا۔

"اوئے... ایہہ مخلوق کتھوں لتھی اے؟"

دوسرا قہقہہ مار کے ہنسا۔ "پُچھ کے ویکھ... کیہڑے چڑیا گھر توں نسّے ہوئے نے؟ باندر دے پُتر..."

"اک تے تیرا ماما لگدا اے..."

"دوجا تیرا پیو اے..." دوسرے نے فوراً جواب دیا۔

ان کو یقین تھا کہ ہم غیر ملکی ہیں چنانچہ وہ کچھ بھی کہیں ہم نہیں سمجھ سکتے اور ہم نے بھی خوشدلی سے دانت نکال کے یوں ہاتھ ہلائے جیسے ہم ان تعریفی کلمات سے بے حد خوش ہوئے ہوں۔ ہم نے ایک شخص سے جو کار میں بیٹھ رہا تھا، فرانسیسی میں پوچھا کہ اس کے اصل والد گدھے تھے یا خچر... اور وہ خود آدمی سے زیادہ ڈرم کیوں نظر آتا ہے۔

اُس نے مسکرا کے ہم سے ہاتھ ملایا۔ "میں صرف انگریزی جانتا ہوں۔"

"انگلش؟" میں نے مسرت سے کہا اور اس کو گلے لگالیا۔ "ہم بھی انگلش جانتے ہیں۔"

میری ٹوٹی پھوٹی انگریزی پر وہ ہنسا۔ "میں آپ لوگوں کے لیے کیا کرسکتا ہوں؟ آپ لوگ میرے ملک میں مہمان ہیں۔"

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ "ہم... صحافی..."

"صحافی... آپ لوگ صحافی ہیں؟" وہ دم بخود رہ گیا۔ "یہاں کس سلسلے میں آئے ہیں؟"

میں نے اپنا سر کھجایا اور فرنچ میں کہا۔ "ہم جھک مارنے آئے ہیں۔"

اس نے مظلوم صورت بنا کے محسن کو دیکھا۔ "میں نہیں سمجھا۔"

پھر ہم نے بہت اچھی اداکاری اور بہت بُری انگریزی کی مدد سے واضح کیا کہ ہمیں کہاں جانا ہے اور کیا کرنا ہے۔ بالآخر وہ سمجھ گیا کہ ہم ایک اخبار کی خبر کا حوالہ دے رہے ہیں۔ ہم نے وہ اخبار اس کے سامنے رکھ دیا جس میں دلاور کے متعلق خبر تھی۔ خبر کے گرد ہم نے حاشیہ سا بنا دیا۔

اس نے ہمیں اپنی کار میں شاہدرہ پہنچا دیا اور عین اس جگہ اتار دیا، جہاں ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس تھا۔ وہ اچھے پاکستانی میزبان کی حیثیت سے ہماری مدد کر کے بہت مطمئن تھا۔ جانے سے پہلے اس نے ہمیں اپنا کارڈ بھی دیا، جس سے ہمیں اندازہ ہوا کہ وہ انجینئر تھا۔

ہم جھک کر ہاتھ ملاتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کر رہے تھے کہ پاس قریب سے چوہدری دلاور کی گاڑی گزری۔ پیچھے کی سیٹ پر بیٹھے ہوئے دلاور نے غور سے ہم تینوں کو دیکھا۔ پھر اس کی گاڑی سڑک سے بائیں جانب فیکٹری کے گیٹ تک جانے والی سڑک پر مُڑ گئی۔

ہم دونوں نے گیٹ تک واک شروع کی۔ دلاور نے شاید ہم دونوں کو بیک ویو مرر میں دیکھ لیا یا اُسے ڈرائیور نے بتا دیا کہ وہ دو نمونے غیر ملکی ادھر آرہے ہیں۔ اس کی گاڑی گیٹ سے گزر کے اندر نہیں گئی۔ وہ باہر ہی اتر گیا اور پلٹ کر ہماری طرف دیکھنے لگا۔

"ہَیّو... دلاور؟" میں نے قریب جا کے ہاتھ بڑھایا اور آواز بدل کے کہا۔ چوہدری دلاور نے اقرار میں سر ہلایا۔

"ہو آر یُو؟" دلاور نے محسن سے بھی ہاتھ ملا کے کہا۔ اس کی صورت پہ حیرانی کے ساتھ تجسس، تمسخر، دلچسپی اور شکوک کے جذبات کا ملا جُلا عکس نظر آرہا تھا۔

"می... پیئر استنوف۔" میں نے کہا۔ "کارس پونڈنٹ ڈیلی لاموندے دو، مارسیلز... ایت تریپولی... قاہرہ... کراچی۔"

"می... جان آرمت... رپورتر... لاموند... آتی... ناداپت بنکاک... فار ایسٹ ایڈیشن۔"

"آپ لوگ جرنلسٹ ہیں؟" دلاور نے سنجیدہ اور محتاط ہو کے کہا۔ جواب میں محسن نے فرفر بولنا شروع کیا۔ پھر میں نے چند جملے بولے جو سب فرنچ تھے۔ دلاور پریشان ہوگیا۔ اس نے کبھی ان اخبارات کا نام نہیں سنا ہوگا جن کے ہم نمائندے بن گئے تھے۔ دنیا کے کس حصے کے کس شہر سے کس زبان کے کتنے اخبارات اور رسائل نکلتے ہیں اور اُن کے نمائندے کہاں کہاں ملتے ہیں یہ خود پاکستان کے پُرانے صحافی بھی بعض اوقات نہیں جانتے۔

"میں یہ فرنچ نہیں سمجھتا۔" دلاور نے کہا۔ "کیا آپ لوگ بالکل انگریزی نہیں جانتے؟"

"می... گُڈ انگلش۔" میں نے کہا۔ عمداً میں نے ڈی اور ٹی کو انگریزی لہجے میں ادا نہیں کیا۔ کوئی فرانسیسی یا اطالوی ایسا نہیں کرسکتا۔

"می اسپیک انگلش۔" محسن نے کہا۔

"اچھا تو آپ لوگ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟" وہ بولا۔

"انٹرویو۔" میں نے کہا۔

"یس... انٹرویو... تھینکس..." محسن نے سر ہلا کے کہا۔ "فوٹوگراف۔"

"مگر کیوں؟" وہ بولا۔ "خیر آپ لوگ اندر آئیں۔ یہاں بات کرنے کی کوئی جگہ نہیں... اور انٹرویو وغیرہ کی تو میں سوچوں گا لیکن میں اتنا بداخلاق بہر حال نہیں ہوں کہ آپ لوگوں کو کھڑا رکھوں۔ یہاں تک آئے ہیں تو میرے ساتھ بیٹھ کے ایک کپ چائے یا کافی ضرور پئیں۔"

"یہ کتے کا بچّہ بڑی روانی سے انگریزی بولنے لگا ہے۔" میں نے محسن سے فرنچ میں کہا اور یوں دانت نکالنے لگا جیسے میں نے دلاور کی تعریف کی ہے۔

"بنالیا ہوگا کسی میم کو والدہ۔" محسن نے کہا اور سر کو خم کر کے مسکرایا۔ دلاور نے اُسے شکریہ سمجھ کے قبول کیا اور ہم اندر داخل ہوگئے۔ گیٹ کے اندر قدم رکھتے ہی میرے ذہن کو شدید جھٹکا لگا اور میرا ردِّعمل بہت شدید تھا مگر میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ آگے ہونے کی وجہ سے دلاور نے کچھ نہیں دیکھا۔

اندر جہاں پہلے ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس کے گودام، شیڈ اور پروڈکشن یونٹ تھے وہاں اب کچھ نہیں تھا۔ میں نے ایک بالکل بدلا ہوا منظر دیکھا اور ایک لمحے کے لیے مجھے یوں لگا جیسے یہ سراب کے سوا کچھ نہیں یا پھر میں غلط جگہ آگیا ہوں۔ جب یہاں عمارات تھیں تو یہی جگہ بہت بھری ہوئی اور پھیلی ہوئی لگتی تھی۔ اب خالی میدان میں کہیں کہیں پُرانے آثار ملبے کی صورت میں نظر آتے تھے۔ سامنے والے حصے کو کھودا جارہا تھا اور بنیادوں کا پورا نقشہ دیکھ کر نئی تعمیر ہونے والی عمارت کا تصور کیا جاسکتا تھا۔

اخبار میں جو کچھ ہم نے پڑھا تھا، وہ غلط نہیں تھا۔ اور اس جھٹکے کا صدمہ اتنا شدید تھا کہ میرے اور محسن کے یقین کی بنیادیں تک مسمار ہوگئیں۔ وہاں دلاور بلڈنگ کا سنگِ بنیاد رکھا جاچکا تھا اور یہ بات درست تھی تو پھر وزیرِ اسپتال کے قیام کی بات بھی درست تھی اور شاید یہ بھی غلط نہ تھا کہ اس تقریب میں معززین، رؤسا، تاجر اور صنعت کار واقعی شریک ہوئے تھے۔ ہم نے اُسے جھوٹ یعنی مذاق، ڈراما اور فریب سمجھ کے خود اپنے اندازوں کے کھوکھلے پن کو ثابت کردیا تھا۔ دلاور نے ہمارے لیے کوئی جال نہیں پھیلایا تھا۔

اُس نے ہمیں متوجہ کرنے اور زیرِ دام لانے کے لیے یہ خبر کسی صحافی کو خرید کے نہیں لگوائی تھی۔ وہ بہت بڑا شکاری تھا اور اس نے سیاست میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا تھا تو یہ اس کی بہت بڑی چال تھی، وہ ہمارے خلاف سیاست کا جال بچھا رہا تھا۔ وہ اسلحے کی طاقت آزما چکا تھا۔ اب وہ سیاسی قوت حاصل کر کے ہمیں دوسری طرف سے محصور کرنے کی سوچ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ ہم دلاور کو سیاسی غدّار یا ملک دشمن قرار دینے کے مشن میں کامیاب ہوں، وہ سیاست کے پلیٹ فارم سے اپنے لیے حُبّ الوطنی کی سند حاصل کرلینا چاہتا تھا۔ وہ انسانیت کا خادم اور اخلاقیات کا علمبردار بن کے مشہور ہونے کی طے کر چکا تھا تاکہ اس کے خلاف ہر سچ بھی مخالفانہ جھوٹ بن جائے۔ اور وہ کہہ سکے کہ اس کے سیاسی مخالفین اس کی کردار کشی کے لیے جھوٹا پروپیگنڈا کرتے ہیں اور اس کی ذات کو بے بنیاد الزامات کا ہدف بنا کے اپنا اُلّو سیدھا کرنا چاہتے ہیں۔ ہر ملک کی سیاست میں اپنے حریف کے خلاف جائز و ناجائز، اخلاقی و غیر اخلاقی مہم چلانا بھی کھیل کا ایک حصّہ ہے۔ اور کامیاب سیاستداں وہ ہے جو اپنے سیاسی مخالف کی کمزوری کو اپنی شہ زوری بنائے اور جب شہ زور ہو جائے تو اس کا سر زورِ بازو سے کچل دے۔ دلاور نے اگر ہمارے خلاف سیاسی داؤ پیچ آزمانے کا طے کیا تھا اور اپنی ساکھ کو سنبھالنے کے لیے سیاست کی بیساکھی استعمال کرنے کا سوچا تھا تو یہ اس کی فہم و فراست اور دُوراندیشی کا ثبوت تھا۔

محسن کے خیالات بھی مجھ سے مختلف نہیں ہوسکتے تھے۔ ایک سے حالات میں ہم دونوں کی سوچ کے دھارے اور ہمارے ردِّعمل ایک سے ہو جاتے تھے۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو مجھے اس کی صورت پہ اپنے جذبات کا عکس نظر آیا۔ میں نے پھر فرانسیسی میں کہا۔ "اب کیا خیال ہے؟"

"لاقانونیت کی کوئی حد بھی ہے یار۔" محسن نے کہا۔

دلاور نے پلٹ کے کہا۔ "دِس وے پلیز۔"

میں اور محسن اسی آفس میں داخل ہوگئے جس میں پہلے بھی بارہا آئے تھے۔ کبھی سر بکف کبھی جاں بکف۔ کبھی چوری چھپے اور کبھی طبلِ جنگ بجاتے ہوئے۔ اور جیسے آئے تھے ویسے ہی گئے بھی تھے مگر آج سارا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ دلاور کے آفس کا فرنیچر

وہی تھا مگر وہ پرانے لوگ بھی بدل چکے تھے۔ جن کو ہم پہچانتے تھے۔ فیکٹری نہیں رہی تھی تو کارکن کیسے رہتے۔ باہر مزدور اور راج کام کر رہے تھے۔ اندر دلاور کے پرانے سیکرٹری کی جگہ ایک ہوشربا قسم کی سیکرٹری براجمان تھی۔

دلاور نے ہمیں اشارے سے بیٹھنے کو کہا۔

ہم نے فرنچ میں شکریہ ادا کیا۔ پھر گورا شاہی اُردو میں شکریہ ادا کیا اور دلاور کو مسکراتے دیکھا۔

"مس عاشی... پلیز اندر آجائیں۔" دلاور نے کہا۔

میں نے اور محسن نے سر ہلا کے پسندیدگی کا اظہار کیا۔ لڑکی اور اس کا نام دونوں اچھے تھے۔ اس کا اندر آنا بھی اچھا تھا۔ اس کی مسکراہٹ بھی اچھی تھی۔

"عاشی... یہ دونوں اُلو کے پٹھے کہتے ہیں کہ یہ فرانسیسی اور اطالوی اخباری نمائندے ہیں۔" دلاور نے اُردو میں کہا۔

"کافی۔" میں نے احمقوں کی طرح مسکرا کے کہا۔ محسن نے میری تائید کی۔

"ان کے لیے کافی منگوانے کے بعد یہاں بیٹھو۔" دلاور نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ "ان سے تم کو ہی بات کرنی ہوگی۔ انگریزی تو یہ ایسے بولتے ہیں جیسے انگریز شوقیہ اُردو بولتے ہیں۔"

میں خواہ مخواہ مسکراتا رہا لیکن میرے دل میں تشویش پیدا ہو چکی تھی کہ کیا یہ نازک اندام اور خوش خرام عاشی بھی فرنچ سمجھتی ہے۔ چند منٹ میں میرے اندیشے درست ہو گئے۔

"مس عاشی نے پنجاب یونیورسٹی سے فرانسیسی میں ڈگری لی ہے اور یہ فرنچ اسی طرح بولتی ہیں جیسے مادری زبان ہو۔" دلاور نے مس عاشی کے جانے کے بعد کہا۔

"ویری گُد... ویری گُد..." میں نے سر ہلایا اور محسن سے مخاطب ہو کے کہا۔ "لے بیٹا۔ سیر کو سوا سیر مل گئی۔ ترکی تمام شد۔"

"یار! ابھی سے کیوں ڈرتا ہے۔ تو دیکھ خدا کیا کرتا ہے۔" محسن نے فرنچ میں جواب دیا۔ "اس خبیث کی باتوں پر مت جا۔ ویسے بھی اگر فرنچ جانتی ہے یہ حسینہ تو اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے۔ اسے دنیا بھر کے چکروں کا پتا نہیں ہوگا۔ ابھی عمر ہی کیا ہے اس کی۔"

"میں ڈرا نہیں ہوں اس سے۔ اس خیال سے فکرمند ہوں کہ اس نے دلاور کے سوالات کا ترجمہ شروع کر دیا تو ہم کیا جواب دیں گے؟ دلاور کائیاں آدمی ہے۔ جو سوال اس بھولی بھالی لڑکی کے دماغ میں نہیں آئے گا، وہ دلاور کے ذہن میں آسکتا ہے... وہ جرح کر سکتی ہے... دلاور کی طرف سے۔"

"دیکھی جائے گی... ابھی تک تو دلاور کو شک نہیں ہے۔ اسے ہم مطمئن کر دیں گے۔" محسن نے کہا۔ ہم نے گفتگو میں دلاور کا نام نہیں لیا تھا بلکہ اس لفظ کا فرانسیسی متبادل استعمال کیا تھا جس کے معنی بہادر کے ہوتے ہیں۔

مس عاشی پانچ منٹ کے لیے باہر گئی اور پھر لوٹ آئی تو دلاور کے داہنے ہاتھ کی جانب کرسی پر بیٹھ گئی۔ ہم دلاور کے مقابل تھے لیکن میز اتنی پھیلی ہوئی تھی کہ ہمارے درمیان چھ فٹ کا فاصلہ تھا اور شاید اتنے ہی فاصلے پر عاشی بھی تھی (میں نے فرض کیا کہ اس کا نام عائشہ ہوگا)

"عاشی... ان سے پوچھو کہ یہ میرے پاس کیوں آئے ہیں؟ میرا انٹرویو کیوں لینا چاہتے ہیں؟" دلاور نے کہا۔

عاشی نے اس کا ترجمہ کیا تو اپنی فرنچ میں مہارت کا سارا پول کھول دیا۔ اس نے فرنچ میں ڈگری ضرور لی ہوگی مگر ہمارے کالجوں سے ڈگری لینے والے دس سال انگلش کو ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھتے ہیں مگر اس کے باوجود انگریزی کا ایک آدھ جملہ ہی صحیح بولتے ہیں۔ مسلسل بات کرنی پڑے تو ان کی گرامر غلط اور ڈکشنری ختم ہو جاتی ہے۔ یہی حال مس عاشی کا بھی تھا۔ وہ درسی کتب والی فرنچ کے جملے بنا بنا کے ادا کر رہی تھی۔ درسی کتب کی زبان اور بولی جانے والی زبان میں اتنا فرق ہوتا ہے کہ فارسی میں شاعری کرنے والے ایران جا کے وہاں کی بولی نہیں سمجھتے۔

"مسٹر دلاور آپ کے جواب کے منتظر ہیں موسیو۔" عاشی نے کہا۔

"پیتر استنوف... تم صرف پیتر کہہ سکتی ہو۔" میں نے مسکرا کے اور چونک کے کہا۔ "کیا تم سوال دُہراؤ گی... میں کچھ سمجھا نہیں۔"

میری بات نے عاشی کو نروس کر دیا۔ کیونکہ عمداً میں نے وہ فرنچ بولی تھی جو بے حد عوامی تھی۔ اور اس کی کتابی فرنچ سے بے حد مختلف تھی۔ تاہم اس نے زیادہ محتاط الفاظ میں سوال دُہرایا۔ دوسری بار اس کی فرنچ زیادہ غلط ہو گئی۔

میں نے سر ہلایا اور محسن کی طرف دیکھا۔ "موسیو جان آرمٹ اس سوال کا بہتر جواب دے سکتے ہیں۔"

محسن نے کھنکار کے گلا صاف کیا۔ جیب میں سے ایک سگریٹ نکالی جو خاصی ٹیڑھی اور کمر خمیدہ ہو گئی تھی اسے میز پر لٹا کے اور گھما پھرا کے سیدھا کیا اور ماچس نکالی۔ یہ انداز بالکل نشہ آور سگریٹ استعمال کرنے والوں کا تھا۔ دلاور نے ناگواری سے یہ سب کچھ برداشت کیا۔

"دراصل... ہم بین الاقوامی ادارۂ صحت کے مشرقِ وسطیٰ اور مشرقِ بعید کے پراجیکٹ پر ایک سروے کر رہے ہیں اور جہاں عوام کے لیے طبّی سہولتوں کا فقدان ہے وہاں حکومت کے تعاون سے چلنے والے ہر ہیلتھ پراجیکٹ کی کامیابی کے تناسب کا تعین کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم ان سب کی رائے بھی جاننا چاہتے ہیں جو صحت کے مسائل میں دلچسپی رکھتے ہیں اور عملاً کچھ کرنا چاہتے ہیں۔

کل ہم یہاں تھے اور ہمیں اپنے ایک ہم پیشہ ساتھی سے پریس کلب میں یہ انفارمیشن ملی تھی کہ آج کسی رفاہی اسپتال کا سنگِ بنیاد رکھنے کی تقریب ہے اور یہ اسپتال ایک ایسا شخص تعمیر کر رہا ہے۔ جو زرعی معیشت سے وابستہ تھا۔ زرعی مشینری کے پُرزے بناتا تھا۔ قدرتی طور پر ہم یہ سمجھتے تھے کہ اسے دیہی آبادی کی ہیلتھ پرابلم سے زیادہ دلچسپی ہونی چاہیے۔ مگر اس نے خیراتی اسپتال بنانے کے لیے ایک ایسے شہر کو منتخب کیا جہاں پہلے ہی سرکاری اور نجی اسپتال بہت ہیں اور..."

مس عاشی کی سٹّی گُم ہو گئی کیونکہ محسن نے رک رک کر انتہائی دقیق اور ناقابلِ فہم فرنچ میں بڑی ثقیل گفتگو کی تھی۔ شاید وہ مشکل سے اس کے نصف کا صحیح مطلب سمجھی ہوگی۔ تاہم اس نے اپنی پریشانی کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔ ایک دیہاتی بھی اگر شہر کے کسی عالم کے پلّے پڑ جائے جو غالب کے لب و لہجے میں فارسی آمیز اُردو بولتا ہو تب بھی دونوں ایک دوسرے کی بات تو سمجھ ہی لیتے ہیں۔ خواہ دیہاتی دکن یا بنگال کے کسی علاقے کی اردو بولے۔ عاشی نے محسن کی طویل تقریر ختم ہونے پر اطمینان کا سانس لیا اور پھر جتنا اسے یاد رہا تھا اتنا دلاور کو بتا دیا۔

"یہ لوگ جاننا چاہتے ہیں کہ آپ نے فری ہوسپٹل لاہور جیسے شہر میں قائم کرنے کا فیصلہ کیوں کیا جبکہ دیہات کو اس کی ضرورت زیادہ تھی۔" عاشی نے کہا۔

"یہ اتنی دیر سے بھونک رہا تھا۔ صرف اتنی سی بات تھی؟" دلاور حیران ہو کے بولا۔

"وہ... نہیں سر..." عاشی نے کہا۔ "یہ بتا رہا تھا کہ انھیں پریس کلب میں کسی نے کل شام کی تقریب کے متعلق بتایا تھا مگر یہ مصروفیت کے باعث آنہیں سکے تھے۔ اور یہ کہ ان کا مقصد اقوام متحدہ کے لیے ایک رپورٹ بنانا ہے۔"

دلاور نے سر ہلایا۔ "ان سے کہو کہ بہت جلد ہی دیہات کے لیے بھی موبائل ہیلتھ یونٹس قائم کروں گا اور میرا ارادہ ہے کہ فی الحال دس گاڑیاں ہوں گی جو ہر طرح کے ساز و سامان، اسٹاف اور ادویات کے ساتھ گاؤں گاؤں جائیں گی۔ ہر گاڑی روزانہ کم سے کم سو مریض دیکھے گی، اور ان گاڑیوں میں ہنگامی نوعیت کے معمولی آپریشن بھی ہوا کریں گے۔ اوسطاً ایک گاڑی دن بھر میں دس دیہات کا دورہ کرے گی۔"

میں نے اس جواب پر اطمینان کا اظہار کیا۔ اصل اطمینان کی بات یہ تھی کہ محسن کی بات نے دلاور کو قائل کر لیا تھا اور اس کے دل میں شک کے بیج کو پھوٹنے نہیں دیا تھا ورنہ جواب سے پہلے وہ ہم سے شناخت مانگتا۔ اب اس کو یقین آچکا تھا کہ ہم وہی ہیں جو خود کو بتا رہے ہیں۔ ہم نے تقریباً ایک گھنٹے تک انٹرویو کا ڈراما کیا۔ میں نے دلاور کی کچھ تصاویر بنائیں۔ ہم نے سو فیصد غیر ملکی صحافیوں والی اداکاری کی اور دلاور کو مسکراتا ہوا دیکھتے رہے۔

وہ اس خیال سے خوش تھا کہ مقامی اخبار کی بات اتنے کم وقت میں ایک بین الاقوامی خبر کی بنیاد بن گئی۔ اس نے شہر میں ہماری موجودگی کو اپنی خوش قسمتی کی علامت سمجھا ہوگا کہ ہم نے جیسے ہی اسپتال کی تقریب کا ذکر سنا ویسے ہی انٹرویو لینے پہنچ گئے، ورنہ کسی غیر ملکی اور بین الاقوامی سطح کے اخباروں کو متوجہ کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا اور ان کے نمائندوں کو انٹرویو کے لیے بلانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

"ہم کل شام تک اس انٹرویو کو ٹائپ کر لیں گے۔" میں نے عاشی کو مخاطب کیا۔ "اور قابلِ اشاعت مسودہ بنا کے مسٹر دلاور کے دستخط لینے کے لیے پھر آئیں گے۔"

عاشی نے ہماری بات اُسے سمجھا دی۔

"ان سے کہو کہ رات کو مصروف نہ ہوں تو ڈنر میرے ساتھ کریں۔" دلاور بولا۔

میں نے محسن کی طرف اور محسن نے میری طرف دیکھا۔ ہم کچھ دیر آپس میں مشورہ کرتے رہے۔ پھر میں نے سر ہلایا۔

"یہ ہمارے لیے مشکل ہوگا لیکن ہم مسٹر دلاور کے لیے مشکل بھی برداشت کریں گے۔" میں نے کہا۔ "ہم ہر مشکل کا سامنا کریں گے۔"

"جیسے آج تک کرتے آئے ہیں۔" محسن بولا۔

"اور ان کو شکار کرنے تک یہ مشکلات کا سلسلہ جاری رہے گا۔" میں نے کہا۔ "اللہ ہماری مشکل آسان کرے گا۔"

"ورنہ یا ہم نہیں یا پھر یہ نہیں..."

"جی؟" عاشی نے گھبرا کے پوچھا۔ یہ سب گفتگو ہم نے بہت تیز تیز لہجے میں آواز کو بنا کے اور بگاڑ کے اس طرح کی تھی کہ عاشی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا لیکن ہم ایسے ہنستے رہے تھے جیسے یہ کوئی بے تکلف دوستانہ مذاق کی بات ہے۔ "میں سمجھی نہیں۔"

"ہم ایک شرط پر آنے کا وعدہ کر رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

"کس شرط پر؟" دلاور نے عاشی سے ترجمہ سن کے کہا۔

"ہماری حسین میزبان بھی کھانے کی میز پر اسی طرح موجود ہوگی۔"

"بلکہ ہمارے دل کے زیادہ قریب رہے گی۔" محسن بولا۔

"اور طعام کے بعد جب نشۂ شراب بے اثر ثابت ہوگا..."

"تو اس کا نشۂ شباب ہمارے ساتھ جائے گا..." محسن بولا۔

"اور صبح ہونے تک...؟"

عاشی کا چہرہ شرم اور غصے سے لال پڑ گیا۔ اس نے پنسل میز پر پٹخ دی۔

"کیا بات ہے عاشی؟" دلاور نے کہا۔
"یہ بدمعاش..." اُس نے بڑی مشکل سے کہا۔
"کیا کہہ رہے ہیں... کچھ پتا تو چلے؟" دلاور بولا۔
"یہ... یہ کہہ رہے ہیں... کہ ڈنر میں..."
"میں سمجھ گیا... تم کو بھی بلا رہے ہوں گے۔" دلاور ہنسنے لگا۔
"نہیں سر... یہ بہت ذلیل... شیطان قسم کے لوگ ہیں... مجھ سے کہہ رہے ہیں... کہ اس کے بعد... اس کے بعد ان کے ساتھ جاؤں۔" وہ بمشکل پر قابو پا کے بولی۔
"ارے ان کی تو عادت ہوتی ہے۔ لاہور کو بھی پیرس سمجھ لیا ہے تو ان کا قصور نہیں۔" دلاور نے کہا "یہ اپنے ماحول کے عادی ہیں۔"
"میں بالکل نہیں آؤں گی سر۔" عاشی نے خفگی سے کہا۔
"اچھا اچھا... مت آنا... میں ان کو ٹال دوں گا۔" دلاور نے کہا۔ "ابھی تو کہہ دو کہ آؤں گی... بعد میں کوئی بہانہ کر دینا... میرا مطلب ہے تمھاری طرف سے میں کر دوں گا۔"
میں اور محسن ایک دوسرے کو احمقوں کی طرح دیکھتے رہے اور سر ہلا ہلا کے اظہارِ حیرت کرتے رہے کہ ہم نے تو کوئی معیوب بات نہیں کی پھر یہ خوب صورت لڑکی اتنی خفا کیوں ہو رہی ہے عاشی نے بادلِ ناخواستہ کہا کہ وہ آئے گی لیکن اسے پہلے گھر جانا ہو گا تاکہ وہ لباس بدل سکے۔
"چلو میں تم کو راستے میں ڈراپ کر دوں گا۔" دلاور بولا۔
"تو کیا آپ یہاں سے سیدھے ہوٹل جائیں گے؟" عاشی نے کہا۔
"نہیں... سیدھا تو نہیں۔" دلاور بولا۔ "راستے میں ایک دو کام ہیں۔ پہلے وہ نمٹاؤں گا... انھیں ساتھ ہی رکھوں گا۔ اس وقت تک کھانے کا تو ٹائم نہیں ہو گا۔ میں چاہتا ہوں دو چار مقامی صحافیوں کو بھی بلوا لوں۔ صرف کافی کے لیے... تاکہ انھیں بھی انٹرویو کے بارے میں معلوم ہو جائے کل کچھ اور خبریں آ جائیں... اور مجھے بھی معلوم ہو جائے کہ ان کو میرے پاس کس نے بھیجا تھا پریس کلب میں ان کی کس سے بات ہوئی تھی۔ ظاہر ہے صحافیوں کے جانے کے بعد ہی کھانا کھائیں گے... میں سوچ رہا ہوں نواب صاحب کو بھی بلوا لوں... نواب خسرو... یہ دو..."
"میرا تو خیال ہے کہ آپ ان صحافیوں کو بھی ڈنر میں شامل کر لیں۔" عاشی نے کہا۔ "ورنہ ان کو بعد میں پتا چلے گا کہ آپ نے انھیں کافی پر ٹال دیا تھا اور ان کو ڈنر دیا تھا تو وہ اپنی توہین محسوس کریں گے۔"
"تم ٹھیک کہتی ہو۔" دلاور نے کہا۔ "جو اخباری نمائندے کل رات کی تقریب میں شریک تھے ان سب کو فون کر کے میری طرف سے دعوت دے دو۔"
"یس سر... میں انھیں نو بجے کا وقت دے دوں؟"
"نو بجے ٹھیک ہے۔" دلاور نے کہا اور ٹیلی فون اٹھا لیا۔ اس نے پہلے اپنے گھر کا نمبر ملایا۔ میں نے اس کی انگلی کی حرکت کو بہت غور سے نوٹ کیا۔ ایٹ... سیون... فور... تھری... زیرو... ہائی... ٹائن... اس نمبر کو میں نے ذہن نشین کر لیا۔
"دیکھو مجھے دیر ہو جائے گی۔" دلاور شاید اپنی بیوی سے بات کر رہا تھا۔ "تم شوفر کے ساتھ چلی جانا... ارے بابا مجھے معلوم ہے تمھاری بہن کو دیکھنے کے لیے لوگ آ رہے ہیں۔ مگر وہاں میرے نہ ہونے سے کیا فرق پڑے گا... تمھارے ماں باپ دیکھیں گے اصل میں تو... پھر تم ہو... لاحول ولا قوۃ... بتایا نا کہ غیر ملکی صحافی ہیں میرے ساتھ... ڈنر ہے رات کو... ہاں اچانک پروگرام بنا ہے، وہ بھی اچانک آ گئے تھے... میں عاشی کو تمھارے گھر ڈراپ کر دوں گا... ابھی کچھ دیر میں... وہ بھی اپنی بڑی بہن کے میاں کو پسند کرے گی۔
یکلخت وہاں عاشی کی موجودگی کا سبب میری سمجھ میں آ گیا۔ وہ دلاور کی بیوی کی چھوٹی بہن تھی۔ غالباً چھوٹی سے چھوٹی یا سب سے چھوٹی... ورنہ اس جیسی لڑکی کا دلاور کے ساتھ ہونا سمجھ میں نہیں آتا تھا۔
دلاور نے دوسرا فون نواب خسرو جمشید کو کیا۔ لیکن اس مرتبہ اس نے نمبر ڈائل نہیں کیا۔ اس کے ٹیلی فون کی میموری میں یہ نمبر پہلے سے موجود تھا چنانچہ اس نے صرف ایک نمبر کا بٹن دبایا اور کال ملنے کا انتظار کرتا رہا۔ پھر اس نے نواب خسرو جمشید کو تفصیل سے ہمارے متعلق بتایا۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ ہم اردو نہیں سمجھتے اس نے بڑے اطمینان سے گفتگو کی اور عادتاً ہمیں خاصی گالیوں سے نوازتا رہا۔
"اپنے نواب صاحب... یہ ٹھیک ہے کہ کسی پر بھی آنکھ بند کر کے بھروسا نہیں کر لینا چاہیے... مگر یار ہم نے بھی دنیا دیکھی ہے۔ اور پھر ان کے بارے میں دوسروں سے معلوم ہو ہی جائے گا۔ مجھے بہر حال اطمینان ہے کہ یہ صرف اخباری نمائندے ہیں۔" دلاور نے کہا۔ "بس تم آ جاؤ وہاں... یہی کوئی آٹھ ساڑھے آٹھ بجے... ہاں ٹیبل ریزرویشن میں کرا دوں گا۔"
صاف ظاہر تھا کہ نواب خسرو جمشید نے اپنے عدم اطمینان اور شکوک کا اظہار کر دیا تھا۔ دلاور نے اپنی طرف سے اُسے یقین دلا دیا تھا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں ہے مگر اب یہ ہو سکتا تھا کہ دلاور کو بھی عدم تحفظ کا احساس پریشان کرنے لگے تو وہ ہم سے شناخت کرانے کو کہے۔ دستاویزی ثبوت مانگ بیٹھے یا اپنے طور پر تصدیق کرنا چاہے۔
ٹیلی فون رکھنے کے بعد دلاور کچھ سوچتا رہا۔ پھر وہ مسکراتا ہوا اٹھا اور اس نے ہم سے چلنے کو کہا۔ غالباً اس نے اپنے شکوک کو جھٹک دیا تھا یا موخر کر دیا تھا۔ کچھ دیر بعد اس کو چند مقامی صحافیوں کے ساتھ ڈنر کرنا تھا اور وہاں ہمارا تعارف بھی ہونا تھا۔ اگر ہم جعلی صحافی ہوں گے تو پول کھل جائے گا۔ یہی سوچ کے اس نے خود کو قائل کر لیا کہ فی الحال تشویش کا اظہار بھی بے سود ہو گا۔ اصل بات یہ تھی کہ دلاور کے دل اور دماغ پر ہمارے حلیے، لب و لہجے، فرانسیسی زبان میں بات چیت اور ہماری پُراعتماد اداکاری کا اثر بہت خوشگوار تھا، ورنہ وہ ایسا آدمی تھا کہ اپنی ولدیت کے بارے میں بھی شک کا شکار ہو جائے تو ماں کو نہ بخشے۔
میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔ یہ صورتِ حال بالکل مختلف تھی اور بالکل غیر متوقع تھی جس کے لیے ہم تیار ہو کے نہیں آئے تھے مگر اب حالات کی موافقت سے میرے ذہن میں ایک نیا منصوبہ جنم لے رہا تھا۔ اس کے بارے میں محسن سے رائے لینے اور مشورہ کرنے کی راہ میں عاشی حائل تھی۔ ہم فرنچ بولتے تب بھی وہ دشمنِ جاں سمجھ لیتی۔
اس کا موقع ہمیں باہر آنے کے بعد ملا۔ ہم دلاور کی گاڑی کے قریب کھڑے ہو کے زیرِ تعمیر عمارت کا نقشہ دیکھنے لگے۔ دلاور ہمیں انگلش میں کچھ سمجھاتا رہا جو ہم نے نہیں سنا۔ بظاہر ہم اس کی طرف متوجہ تھے اور اسی کی بات پر تبصرہ کرتے جا رہے تھے لیکن درحقیقت ہم آپس میں کچھ اور ہی بات کر رہے تھے۔ دلاور کو عاشی کا انتظار تھا جو ٹیلی فون کر رہی تھی اور صحافیوں کو ڈنر پر مدعو کرنے کا پیغام پہنچا رہی تھی۔
"یہ فرسٹ فلور پورا اسپتال ہے... بلکہ سیکنڈ فلور بھی اسی کا حصہ ہے۔" دلاور نے کہا۔
"ویری گڈ..." میں نے کہا۔ "یار محسن... میں نے ایک بہت بڑا قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔" پھر میں زور سے ہنسا۔
"اور اوپر والی منزل میں..." دلاور بولتا رہا۔
"میرا بھی ارادہ بدل گیا ہے۔" محسن نے دلاور کی طرف دیکھ کے تائید میں سر ہلایا۔ "یہ بہت خطرناک اقدام ہو گا۔"
"مگر یہ بہترین موقع ہے..." میں نے دلاور کی طرف دیکھ کے مکالمہ لہجے میں کہا۔
"میں سمجھا نہیں؟" دلاور بولا۔
"سوری... وات یو سے..." میں نے سر کھجایا اور پھر محسن سے مخاطب ہو گیا۔ "بس برخوردار... اب تخت یا تختہ... ہمیشہ کی طرح۔"
"ہاں..." محسن نے سر ہلایا۔ "اللہ مددگار ہے۔"
اسی وقت عاشی نمودار ہو گئی۔ وہ بیس بائیس سال کی لڑکی تھی جس کی صورت میں حیرت انگیز طور پر اداکارہ رانی کی مشابہت تھی۔ معلوم نہیں وہ کیا مجبوری تھی جس کی وجہ سے وہ دلاور کی سیکرٹری بنی تھی۔ میرے ذہن میں اس کے دو اسباب آ رہے تھے۔ ایک یہ کہ وہ پروفیشنل ٹریننگ حاصل کر رہی تھی۔ کسی اچھی فرم میں اچھی ملازمت حاصل کرنے میں یہ تجربہ اس کا معاون ہو سکتا تھا جو وہ اپنے بہنوئی کے ساتھ کام کر کے کسی پریشانی کے بغیر حاصل کر سکتی تھی۔ دوسری وجہ اس کی بڑی بہن یعنی دلاور کی بیوی ہوتی تو مجھے تعجب نہ ہوتا۔ بیشتر بیویاں اپنے شوہروں کی آؤٹ ڈور مصروفیات کے بارے میں زنانہ قسم کا حسد اور شک رکھتی ہیں۔ خصوصاً ان شوہروں کے بارے میں جن کے آنے جانے کا کوئی وقت نہ ہو اور کام کی نوعیت کا پتا نہ چلتا ہو۔
عاشی آگے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گئی۔ دلاور اور ہم دونوں پچھلی سیٹ پر رہے۔ باہر اتنی دیر میں غروبِ آفتاب کے بعد کا اندھیرا گہرا ہو کے رات میں ڈھل رہا تھا۔ کچھ گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس بھی روشن تھیں لیکن زیادہ تر گاڑیاں چھوٹی پارکنگ لائٹ جلا کے چل رہی تھیں۔
"کہاں جانا ہے سر؟" شوفر نے سڑک پر آ کے کہا۔
"پہلے بیگم صاحبہ کے گھر۔" دلاور نے مختصراً کہا۔
شوفر ایک خطرناک قسم کا شکاری کتا لگتا تھا اور دلاور جیسے آدمی کے لیے ایسے ہی شخص کا شوفر ہونا ضروری تھا جو وقتِ ضرورت اس کے باڈی گارڈ کے فرائض بھی پورے کر سکے۔ میں یہ سمجھ سکتا تھا کہ وہ کوئی پیشہ ور لڑنے والا ہو گا جو خنجر سے مشین گن تک ہر قسم کا اسلحہ استعمال کرنے کا اہل ہو گا۔ خالی ہاتھ بھی لڑ سکتا ہو گا۔ جان دینے یا جان لینے میں ذرا بھی پس و پیش نہ کرتا ہو گا اور دلاور کے اعتماد پر ہر طرح سے پورا اترنے کی صلاحیت رکھتا ہو گا... یہ بھی یقینی تھا کہ وہ مسلح ہو گا۔
"پاکستان... ویری بیوٹی فل کنٹری۔" میں نے مسکرا کے کہا۔
"ویری بیوٹی فل۔" محسن نے سر ہلایا۔ "دی گریٹ۔"
عاشی نے ناگواری سے پیچھے پلٹ کے دیکھا۔ "تم لوگ لڑکیوں کے علاوہ بھی کچھ سوچتے ہو۔ تمھاری ساری فرانسیسی قوم عورت، شراب اور خوشبو کے پیچھے دیوانی ہے۔ معلوم نہیں تم لوگوں نے اتنی ترقی کیسے کر لی۔"
میں دم بخود رہ گیا۔ اس لڑکی نے یہ بات بڑی بے جھجکی میں کہی تھی اور روانی میں وہ بالکل صحیح فرنچ بول گئی تھی۔
"تمھارا خیال ایک سو ایک فیصد درست ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر ہم فرنچ نہیں ہیں۔ فرنچ قوم کے بارے میں تمھاری رائے سے ہمیں اتفاق ہے۔ وہ ایک حسن پرست اور خوش ذوق، خوش مزاج اور مہذب قوم ہے۔ انفرادی آزادی اور جمہوریت پر یقین رکھنے والی۔

عملاً یقین رکھنے والی۔ محض نظریاتی یقین نہیں۔"

ہم سمجھتے ہیں کہ اگر سب لوگ دنیا میں صرف خوب صورتی کے پرستار بن جائیں تو بدصورتی کا وجود مٹ جائے۔" محسن نے کہا۔ "وہ ساری بدصورتی جو سماجی تفریق، معاشی عدم توازن۔ ہوسِ اقتدار۔ جنگ و جدل، تعصب اور تنگ نظری سے پیدا ہوتی ہے۔ جو آدمی کو نفرت سکھاتی ہے اور محبت کو مشروط کر دیتی ہے۔ حالانکہ محبت مشروط ہو ہی نہیں سکتی مگر کچھ لوگ محبت کو اور احساس کو۔ جذبات اور خیالات کو۔ نظریات کو اور انسانی رشتوں کی سرحدوں کو متعین کر دیتے ہیں اور آدمی کو رنگ و نسل، ملک و قوم اور مذہب و ملت۔ خاندان برادری کے خانوں کا اسیر بنا دیتے ہیں۔ یہ ساری تقسیم صرف نفرتوں کے رشتے اور حوالے دیتی ہے۔ اور سب کچھ لے لیتی ہے۔"

"تم... تم فلاسفر ہو۔" عاشی نے مرعوب ہو کے کہا۔

"کیا کہہ رہے ہیں یہ لوگ؟" دلاور نے تجسس سے مجبور ہو کے کہا۔

"تعریف کر رہے ہیں اس ملک کی۔ اور لوگوں کی..." عاشی نے کہا۔

دلاور طنز سے ہنسا "یہ بھی فیشن ہے۔ سیاسی اخلاق کا تقاضا ہے کہ روم میں وہی کہو جو رومن سننا چاہتے ہیں۔ ان اُلّو کے پٹھوں سے کہو کہ یہ سچ ہے تو یہاں رہ جائیں۔ چھوڑ دیں اپنا گھر شہر اور ملک۔"

عاشی نے یہ بات ہم تک پہنچا دی اور ہنسنے لگی۔

"اگر تم کہو تو میں اس سے بھی زیادہ بہت کچھ کر سکتا ہوں۔" میں نے دل پر ہاتھ رکھ کے اداسے عاشی سے کہا۔ "سب کچھ چھوڑ سکتا ہوں۔"

"مثلاً؟" عاشی کی ہنسی ایک حیا آمیز مسکراہٹ بن گئی۔

"مثلاً... مثلاً یہ دنیا چھوڑ سکتا ہوں لیکن تم مسٹر دلاور کو بتا دو کہ ایک دن وہ خود ہمیں اسی ملک کے ایک معزز شہری کی حیثیت سے جانیں گے اور پہچانیں گے۔"

"اور وہ وقت مری جان بہت دُور نہیں ہے۔" محسن نے کہا "جب ہم بھی یہاں آباد ہوں گے۔ سارے رشتوں کے تحفظ کے ساتھ خوشی اور عافیت کے ساتھ اور ہمارے بعد آنے والی نسلوں کو ہم یہ سب کچھ وراثت میں دیں گے۔ ثقافتی تہذیبی اور..."

"کیا تمھارا یہ دوست ہر وقت ایسا ہی فلسفہ بولتا رہتا ہے" عاشی نے کہا۔

"ہمیشہ اور ہر وقت تو نہیں۔" میں نے کہا "لیکن کسی خوبصورت لڑکی کو دیکھتے ہی یہ اسے متاثر کرنے کی کوشش شروع کر دیتا ہے۔ دراصل یہ اس کا احساسِ کمتری ہے۔ آج تک تم جیسی لڑکی نے اسے گھاس نہیں ڈالی۔ کیا تم یہ نیک کام کر سکتی ہو؟ گھاس میں لا دوں گا۔"

بہت اچھا ہوا کہ اسی وقت عاشی کا گھر آگیا جو دلاور کا گھر بھی تھا جسے ہم پہلی بار دیکھ رہے تھے۔ عاشی اُتر کے اندر چلی گئی اور ہم آگے بڑھ گئے۔ اب ہم کھل کے بات کر سکتے تھے۔

"ہماری پوزیشن خاصی محفوظ ہے۔" میں نے کہا "کچھ نہ کچھ مسٹر بہادر کی سیکرٹری اور سالی۔ نواب صاحب اور بہادر کی بیوی یہ سب جانتے ہیں کہ ہم کہاں ڈنر کے لیے مدعو تھے۔"

"غالباً وہ پولیس افسر بھی جانتا ہے۔" محسن نے سر اٹھائے بغیر کہا۔

"بہت سے لوگوں نے ہمیں مسٹر بہادر کے ساتھ انہی کی گاڑی میں روانہ ہوتے بھی دیکھا ہے۔" میں نے کہا "ہمارے پاس بہت وقت ہے۔"

"ہاں... رات کے دس بجے تک مسٹر بہادر کا انتظار کیا جائے گا" محسن بولا "اور دس بجنے میں تین گھنٹے باقی ہیں۔"

تین گھنٹے میں ہم لاہور سے سو میل دُور ہوں تو بڑا اچھا ہے۔ دلاور نے بے چینی سے پہلو بدلا "آپ لوگ آپس میں کیا بول رہے ہیں؟"

میں اور محسن ایک ساتھ ہنسنے لگے جیسے ہم اس بدتمیزی پر شرمندہ ہیں۔ اس کے بعد ہم نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں دلاور کے ساتھ گفتگو شروع کی۔ ہم نے اُسے بتایا کہ ہم کس کس ملک میں اپنا مطالعاتی دورہ مکمل کر کے آئے ہیں اور اب کہاں جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ہم نے اس کی تعریف کی اور کہا کہ ہم واپسی میں یا جب بھی موقع ملا اس کے زیرِ تعمیر اسپتال کو پھر دیکھنے آئیں گے اور اگر مدعو کیا گیا تو اس کی تقریبِ افتتاح میں بھی شریک ہوں گے۔

دلاور نے دو جگہ کار رکوائی تھی۔ ایک جگہ تو اس کے سسرال کے قریب ہی سہ منزلہ عمارت تھی۔ وہ چند منٹ کے لیے معذرت کر کے گیا اور ہمیں موقع فراہم کر گیا کہ ہم کھل کے بات کر سکیں۔ دس منٹ بعد وہ لوٹا تو کچھ پریشان سا تھا۔

"وہ لڑکی... کیا تھا اگر وہ ساتھ آجاتی۔" وہ بولا۔

"کون لڑکی؟" میں نے کہا "تمھاری کوئی گرل فرینڈ؟"

"نہیں... میں عاشی کی بات کر رہا تھا۔" دلاور بولا۔

"اوہ یس... شی ویری بیوٹی فل۔" میں نے کہا۔

"وہ آجاتی تو ہم زیادہ خوش ہوتے... وہ کیوں نہیں آئی؟" محسن نے سادگی سے کہا۔

دلاور نے ہمیں گالی دے کر کہا "تم دونوں... کی وجہ سے" مگر یہ جملہ اس نے اُردو میں کہا تھا چنانچہ ہم انجان بنے رہے۔ "میرا مطلب ہے آج اتفاق سے اس کی بڑی بہن کی شادی کا مسئلہ طے ہو رہا ہے۔"

"کیا اس میں آپ کے لیے کوئی پریشانی اور افسوس کی بات ہے؟"

میں نے کہا۔

دلاور مسکرایا: "مجھے صرف یہ پریشانی ہے کہ تمھارے اور دوسرے لوگوں کے درمیان مترجم کے فرائض انجام دینے والا کوئی نہیں۔ یہاں ایک شخص تھا جو کئی سال فرانس میں رہ چکا تھا۔ اب کئی سال سے کراچی فرانسیسی کلچرل سینٹر میں لینگویج انسٹرکٹر ہے۔ مگر وہ ملا نہیں۔"

"کراچی میں... الائنس فرانس... فریئر ہال کے سامنے؟" میں نے کہا۔

"ہاں... وہ اتفاق سے لاہور آیا ہوا تھا۔" دلاور بولا۔ "مگر اس وقت وہ خود کسی فنکشن میں مدعو ہے... خیر... میں نے پیغام چھوڑ دیا ہے کہ وہ آئے تو سیدھا ہوٹل آجائے۔"

میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے ہمارے جھوٹ کا پردہ فوراً چاک نہیں ہونے دیا۔ کوئی بھی شخص جو فرانس میں رہا ہو اور اب فرانسیسی پڑھاتا ہو... وہ بھی سفارتی مشن کے زیرِ اہتمام چلنے والے ادارے میں۔ وہ فوراً ہماری فرنچ اور ہماری صحافت دونوں کا ملیہ کر دیتا اور چند سوالوں میں ہماری اصلیت جان لیتا۔ عاشی اگر ہمارے سامنے طفلِ مکتب تھی تو ہم اس ماہرِ زبان کے سامنے ساری فرنچ بھول جاتے۔

دوسری مرتبہ گاڑی پلازا سینما سے کچھ آگے نکل جانے کے بعد رکی... دلاور نے یہ ظاہر کیا کہ وہ اپنے خیالات میں گم تھا چنانچہ شوفر سے کہنا بھول گیا تھا۔

"میں ابھی آتا ہوں۔" وہ اترتے ہوئے بولا "آپ لوگ بور تو ہوں گے... دس پندرہ منٹ میں..."

"ہم وقت گزار لیں گے۔" میں نے کہا اور دلاور کو واپس پیدل جاتا دیکھتا رہا۔ وہ ایک باہر سے تاریک نظر آنے والی عمارت میں داخل ہو گیا۔

"کیا وہ نہیں چاہتا تھا کہ ہم اس عمارت کو دیکھیں یا اس کا نمبر اور باہر لگی ہوئی نام کی تختی۔" محسن نے کہا۔

"اگر ہم دیکھ لیتے تو کیا فرق پڑتا... مطلب یہ کہ اسے ہم سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں... ہم تو اجنبی ہیں۔" میں نے کہا۔

"اسے احتیاط پسندی سمجھا جا سکتا ہے۔ حد سے بڑھی ہوئی۔"

"یہ کیوں نہیں سمجھا جا سکتا کہ وہ ہمارے بارے میں تھوڑے بہت شکوک کا ضرور شکار ہے۔" میں نے کہا۔

"ابھی معلوم ہو جائے گا۔" محسن بولا۔ میں نے اس خیال کو بالکل مسترد نہیں کیا ہے کہ وہ بے وقوف بن کے ہمیں بے وقوف بنا رہا ہے... جیسا کہ اس کی عادت ہے... اور سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان بن کے ہمارے خلاف ایک مضبوط جال بُن رہا ہے۔"

"میں بالکل تیار ہوں۔" میں نے کہا "جو کچھ دیر بعد ہونا ہے وہ اگر کچھ دیر پہلے ہو جائے گا تو کیا۔ ہم نمٹ لیں گے۔"

"تم نے غور کیا۔ وہ کس عمارت میں داخل ہوا ہے؟"

"نہیں۔ یہاں سے کیا پتا چلتا ہے۔" میں نے کہا۔

"میں دیکھ رہا تھا۔ بیک ویو مرر میں۔" محسن بولا "بھوت بنگلے سے تیسرا یا چوتھا گیٹ ہے۔"

"بھوت بنگلا؟"

"ہاں... جسے کچھ لوگ جادو گھر بھی کہتے ہیں۔" محسن نے کہا۔

"تیرا مطلب ہے فری میسن ہال؟" میں نے کہا۔

"ہاں... فری میسن ہال ایک پُراسرار عمارت سمجھی جاتی ہے۔"

"اس سے تیسرا یا چوتھا گیٹ دیکھا جا سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"دیکھنے کی ضرورت نہیں... مجھے معلوم ہے۔"

"کیا معلوم ہے؟"

"یہاں ایک مشہور ایمونیشن ڈیلر رہتا ہے۔" محسن نے کہا "جس کی مال روڈ پر ریگل کے قریب دکان ہے۔"

"آفرین ہے جوان... کیا دماغ اور کیا حافظہ پایا ہے!" میں نے چلّا کے کہا اور محسن کی کمر پر مُکّا مارا۔ ہم دونوں ایک سنجیدہ موضوع پر بات کرتے ہوئے بے وجہ چلّا رہے تھے اور ہنس رہے تھے تاکہ ڈرائیور یہ سمجھے کہ ہم محض دوستانہ گپ شپ یا بکواس کے سوا کچھ نہیں کر رہے ہیں۔

آدھے گھنٹے کے بعد دلاور اندھیرے میں سے نمودار ہوا

"مجھے زیادہ دیر تو نہیں ہوئی؟" اس نے گھڑی دیکھ کر کہا اور زبردستی مسکرانے کی کوشش کی لیکن اس طرح وہ اپنی حالت میں رونما ہونے والے تغیر کو نہ چھپا سکا۔ وہ بے حد پریشان تھا اور یہ پریشانی سے زیادہ تشویش تھی۔ اس کی آنکھیں سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں اور رنگ اُڑا ہوا تھا۔ ہم نے ظاہری اخلاق سے کہا کہ دیر کی کوئی بات نہیں۔

"اب ہم سیدھے ہوٹل جائیں گے۔" وہ بولا "اور کافی پئیں گے۔ میں نے کافی وقت لے لیا آپ لوگوں کا۔ لیکن میں نے مناسب سمجھا کہ آپ کے ساتھ ہی رہوں۔"

چور میرے دل میں چھپا ہوا پکڑے جانے کے خوف میں مبتلا تھا چنانچہ دلاور کی بات پر میں چونکا۔ کہیں وہ اس لیے تو ہمارے ساتھ رہنا نہیں چاہتا تھا کہ ہم ابھی تک مشتبہ تھے۔ دلاور ایسا شخص تھا جو دل کے جذبات کا ہلکا سا عکس بھی صورت پر نہیں آنے دیتا تھا اور یکلخت ڈرامائی صورتِ حال پیدا کر کے تماشا دیکھتا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ وہ اچانک ہمیں سب کے درمیان کھڑا کر دے گا۔ خسرو جمشید... ایس پی سراج... مقامی صحافی اور پولیس والوں کے سامنے۔ وہ ایک قہقہہ مارے گا اور کہے گا کہ اپنے سکندر صاحب اور محسن صاحب، اتنا ڈراما کافی ہے۔ بس اب چھوڑیں یہ فرانسیسی۔ بڑی

مشکل زبان ہے۔ اپنی مادری زبان میں بتاؤ کیسی رہی؟

لیکن گاڑی خاموشی سے بڑھتی گئی اور جب ہوٹل کے گیٹ سے اندر داخل ہوئی تو مستعد دربان نے دلاور کو پہچان کے سلامی دی۔ اس کے انداز پذیرائی سے میں نے جان لیا کہ وہ دلاور کو ایک وی آئی پی کی حیثیت سے جانتا ہے اور شاید اس کی گاڑی کو بھی پہچانتا ہے۔ یہ ایک اچھی بات تھی۔ گاڑی گھوم کر پیچھے کی طرف والی قطار میں جا کھڑی ہوئی کیونکہ سامنے والے حصے میں بالکل جگہ نہیں رہی تھی۔ یہ میری توقع کے عین مطابق تھا۔ ہوٹل میں شام سے گاڑیاں بھرنے لگی تھیں اور بعد میں آنے والوں کو پیچھے ہی جانا پڑتا تھا کچھ دیر بعد مزید گاڑیوں کا دلاور کی گاڑی کے پیچھے آنا یقینی تھا۔ ڈنر ٹائم تک دلاور کی کار تقریباً درمیان میں آ چکی ہوگی۔

گاڑی کے رُکتے ہی میں اور محسن یوں حرکت میں آئے جیسے ہم دونوں کو متحرک کرنے والا بجلی کا ایک ہی سوئچ ہو۔ محسن عین ڈرائیور کے پیچھے تھا۔ اس نے بڑی پھرتی سے ریوالور نکال کے وار کیا۔ ریوالور کا دستہ ڈرائیور کے سر کے پچھلے حصے پر اتنی قوت سے لگا کہ اس کے لیے ہوش بحال رکھنا ناممکن ہوگیا۔ محسن نے دوسرے ہاتھ سے اس کا منہ دبایا تھا چنانچہ وہ آواز نکالے بغیر بے حس ہوگیا۔

تقریباً یہی دلاور کے ساتھ ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ شوفر نیچے اترے گا اور اس کے لیے دروازہ کھولے گا۔ میرے لیے ریوالور نکالنا ممکن نہیں تھا کیونکہ میں وسط میں بیٹھا ہوا تھا۔ نہ جانے کیوں دلاور اگلی سیٹ پر نہیں بیٹھا تھا جو عاشی کے اتر جانے کے بعد خالی ہوگئی تھی۔ محسن میری اوٹ میں تھا' چنانچہ اس نے ریوالور پہلے سے نکال کے سائڈ میں رکھ لیا تھا لیکن میں جیب میں ہاتھ ڈالتا تو دلاور کو شک ہو جاتا۔ میں نے محسن کے اُٹھتے ہی دلاور کو کھینچ کے گرایا اور پھر اس کی کنپٹی پر کھڑی ہتھیلی ماری۔ وہ مچلا اور میں نے دوسرا وار شانے سے ذرا اوپر گردن کے قریب کیا۔ دلاور کی مزاحمت ختم ہوگئی۔

یہ سب کچھ ایک منٹ میں ہوگیا۔ باہر رنگا رنگ روشنیوں کا جھلمل اُجالا تھا مگر ائیر کنڈیشنڈ کار کے بند شیشوں کے پیچھے اندھیرا تھا' چنانچہ باہر سے کوئی بھی اندر کا منظر اس وقت تک نہیں دیکھ سکتا تھا جب تک کہ وہ بہت قریب نہ ہو۔

ان دونوں کو بے ہوش چھوڑ کے ہم دونوں بڑی مستعدی کے ساتھ مسکراتے ہوئے باہر نکلے۔ اگنیشن کی چابی اب محسن کے ہاتھ میں جھول رہی تھی' دُور کھڑے ہوئے کچھ شوفروں نے ہمیں واجبی سی دلچسپی کے ساتھ دیکھا اور پھر گپ لگانے لگے۔ ہم دونوں نے بلاوجہ ایک قہقہہ لگا کے ہاتھ ملایا۔ ایک اور گاڑی دلاور کی گاڑی کے ساتھ آ کھڑی ہوئی۔ میں آگے بڑھا ہی تھا کہ ایک اور

کار آگئی۔۔۔ میں رُک گیا۔ پہلی کار میں سے ایک جوڑا نکلا اور عور[ت]
بڑے نخرے کے ساتھ ساری سنبھالتی مرد کے ہاتھ کا سہا[را لیتی]
اندر چلی گئی' دوسری کار میں سے ایک نوجوان کو اترتے [دیکھ کر]
اس نے دروازہ کھولا ہی تھا کہ میں نے ...
دیا۔ میرے ریوالور کی ضرب عجلت میں زیادہ سخت پڑ گئی ...
پیچھے گرا تو میں نے اس کے سر سے خون پھوٹتے دیکھا۔ لیکن اب
پچھتانے یا افسوس کرنے کا وقت ہی نہیں تھا۔ درمیان میں ...
کار کے آجانے سے ہمارا کام کچھ مشکل ہوگیا تھا لیکن ہم ذرا بھی ...
جاتے تو بنا بنایا کھیل بگڑ جاتا اور ہمیں دو چار منٹ کی جو مہلت
تھی اس میں کوئی اور گاڑی آجاتی تب بھی کام خراب ہوتا۔

دو منٹ میں محسن نے دلاور کو دوسری گاڑی میں منتقل ...
اور میں نے دلاور کے شوفر کو۔ ان دونوں کو ہم نے پچھلی سیٹ ...
ڈھیر کر دیا۔ تیسرے منٹ میں محسن بھی پیچھے بیٹھ گیا اور میں ...
کے ڈرائیور کی جگہ سنبھال لی۔ اس کے سر سے بہنے والا خون ...
پر آگیا تھا لیکن بہت زیادہ نہیں تھا۔ چوتھے منٹ میں گاڑی ...
ہوگئی۔ اس وقت ایک اور کار گھوم کے پارکنگ کے لیے ...
آرہی تھی۔ اس کی ہیڈ لائٹس ہم پر پڑیں۔ میں نے گاڑی کو ریور[س]
گیئر میں ڈالا اور پیچھے سے آنے والی کار رُک گئی۔ اس نے ہمیں ...
جانے کا موقع فراہم کیا۔ تیز روشنی براہِ راست میری آنکھوں پر پڑ رہی
تھی چنانچہ میں صرف یہ دیکھ سکا کہ وہ ایک سیاہ رنگ کی ...
مرسیڈیز تھی۔ جب میں گھوم کے باہر جانے والے راستے پر آیا تو
میں نے بلاارادہ مرسیڈیز کی طرف دیکھا۔ یہ نواب خسرو جمشید کی کار
تھی۔ وہ اپنے مخصوص سفید طرّے والی دستار اور سیاہ شیروانی ...
تھا اور پہلے سے ذرا بھی مختلف نہ لگتا تھا حالانکہ میں نے اُسے
بہت عرصے کے بعد دیکھا تھا۔ پھر اس کار میں سے دوسرا نواب
خسرو جمشید نکلا۔ میں بھونچکا رہ گیا' کیونکہ خسرو جمشید کی ایک ...
کو ہم ٹھکانے لگا چکے تھے۔ وہ ہمیشہ اپنے ساتھ بالکل اپنے جیسا ...
رکھتا تھا اور اکثر ہمیں دھوکا دیتا تھا۔ کبھی ہم اصل نواب خسرو ...
کو اس کا شوفر سمجھ بیٹھے تھے تو کبھی شوفر کو نواب خسرو جمشید۔ یہ ...
اس وقت ختم ہوا تھا' جب بالآخر شوفر ہمارے ہاتھوں مارا گیا ...
گاڑی سڑک پر دوڑنے لگی تھی۔

"اس خبیث نے ایک اور کاربن کاپی بنالی؟" محسن ...

"ہاں یار۔۔۔ بہت چالاک اور خطرناک آدمی ہے یہ۔" ...
کہا۔ "لیکن اسے دوسرا ہمشکل کہاں سے ملا؟"

"میک اپ ہوگا۔" محسن بولا۔ "مگر کنفیوژن بہرحال ...
گا۔ آخر یہ ایسا کیوں کرتا ہے؟"

"اسی سے معلوم کریں گے کسی دن۔" میں نے کہا۔

"... اس نے ہمیں ضرور دیکھا ہوگا۔" محسن بولا۔
"ہاں۔۔۔ مگر دلاور نہیں پہچان سکا تو وہ کیسے پہچانتا۔" میں نے کہا۔
"وہ دلاور کی گاڑی بھی دیکھ لے گا۔"
"... مگر اس سے کیا پتا چلے گا۔" میں نے کہا۔
"ہم بال بال بچ گئے۔" محسن بولا۔ "اگر وہ ایک منٹ پہلے وارد
... جاتا تو دیکھ لیتا کہ ہم دلاور کی گاڑی کا مال دوسری گاڑی میں ڈال
رہے ہیں۔ اور ہمارے پیچھے لگ جاتا۔"
"یہ ہل مین بھلا مرسیڈیز کا کیا مقابلہ کرتی۔" میں نے کہا۔
"مجھے اس نوجوان کے زخمی ہونے کا افسوس ہے۔ میں اسے زخمی
کرنا نہیں چاہتا تھا۔ خدا کرے زخم معمولی ہو۔"
"نواب خسرو جمشید اندر جا کے زیادہ دیر انتظار نہیں کرے گا۔"
"آدھا گھنٹہ تو دیکھے گا۔ پھر معلوم کرے گا۔" میں نے کہا۔
"چوکیدار سے پوچھے گا۔ وہ کہے گا کہ میں نے خود انھیں اندر جاتے
دیکھا تھا۔ گاڑی ان کا شوفر چلا رہا تھا لیکن میں نے کسی کو باہر جاتے
نہیں دیکھا۔"
"کیا ہماری کارروائی کو آس پاس کھڑے ہوئے لوگوں میں سے
کسی نے دیکھا تھا؟"
"مجھے نہیں معلوم۔۔۔" میں نے کہا۔ "کچھ ڈرائیور تھے مگر وہ دُور
کھڑے ہوئے تھے۔"
"ابھی تفتیش اور حقائق کو سامنے آنے تک گھنٹا بھر تو
لگے گا۔ پھر پولیس میں رپورٹ ہوگی اور تلاش کا آغاز ہوگا' دو تین گھنٹے
بعد۔۔۔ یا پھر صبح کے بعد۔" محسن بولا۔ "اس وقت تک ہمیں لاہور
سے نکل جانا چاہیے۔۔۔ دلاور کو ساتھ لے کر۔۔۔"
"یہ خطرناک ہوگا محسن۔" میں نے کہا۔ "ہمیں کم سے کم دو دن
چپ کر گزار دینے چاہئیں۔ ہم دلاور کو قید میں رکھ سکتے ہیں اور
اپنے میک اپ کے ساتھ نکل سکتے ہیں۔ جب حقیقی خطرے کا
احتمال جاتا رہے اور تلاش کرنے والے زیادہ مستعد نہ رہیں۔"
"وہ مستعد رہیں گے۔ ایک تو معاملہ صنعت کار چوہدری دلاور
کے اغوا کا ہے۔ دوسرے اغوا ایک بہت مشہور ہوٹل کے اندر سے
ہوا ہے۔ تیسرے ایس پی سراج کا سارا دباؤ پیچھے ہوگا۔ کوئی اور
سمجھے یا نہ سمجھے وہ سمجھ جائے گا کہ دلاور سے ملنے والے غیرملکی صحافی
ہم تھے۔ اسے نواب خسرو جمشید یہ بھی بتا دے گا کہ اس نے دلاور پر
شبہ کا اظہار کیا تھا اور اسے محتاط رہنے کی تاکید کی تھی۔" محسن نے کہا۔
"وہ تو شاید یہ بھی بتا دے گا کہ اسے ہم کب اغوا کر کے لے گئے
... وہ گاڑی کے متعلق بھی بتا دے گا کیونکہ اس نے ہیڈ لائٹس کی
روشنی میں ہمیں دیکھا تھا۔" میں نے کہا۔ "اس کار میں ہم لاہور سے
نہیں نکل سکتے اور اس حلیے کو بدلے بغیر بھی نہیں جا سکتے۔ بہتر

ہے کہ ہم اس گاڑی کو جلد از جلد چھوڑ دیں۔"

میں نے بحث کر کے محسن کو قائل کر لیا کہ موجودہ حالات میں ہمارا چند دن روپوش رہنا ہمارے ہی حق میں تحفظ کی ضمانت بن جائے گا اور ہم نے عجلت میں فرار اختیار کیا تو ممکن ہے شہر سے نکل نہ پانے تھے کہ گرفتار ہم ہونے والی کیفیت ہو جائے۔

ہل مین کار کو ہم نے راستے میں روک دیا۔ کار سے اُترتے وقت میں نے نوجوان کے زخم کا معائنہ کیا اور مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ چوٹ سے اس کا سر نہیں پھٹا تھا صرف کھال پھٹی تھی' اور یہ سطحی زخم کسی صورت میں مہلک یا خطرناک ثابت نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ کراہنے لگا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ہوش میں آرہا تھا۔ جب میں نے دلاور کو گاڑی میں سے اُتارا تو محسن نے اس کے شوفر کو زمین پر لٹا رکھا تھا اور کسی ڈاکٹر کی طرح اس کا معائنہ کر رہا تھا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے کہا۔

"یار سکندر۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ تو مر گیا۔" محسن نے افسوس سے سر ہلایا۔

"مر گیا؟ یہ تو بہت بُرا ہوا۔"

"ہاں۔۔۔ زیادہ سخت ہاتھ پڑ گیا تھا۔" محسن نے کہا۔

"ہاتھ کتنا بھی سخت کیوں نہ پڑے' جب تک چوٹ نازک اور خطرناک جگہ پر نہ لگے کوئی مرتا نہیں۔" میں نے کہا۔ "زیادہ سے زیادہ لمبی بے ہوشی طاری ہو جاتی ہے۔ یہ تو بہت جلدی مر گیا۔"

"میں اسے مارنا نہیں چاہتا تھا یار۔"

"میرے سامنے کیوں صفائی پیش کر رہا ہے۔۔۔؟" میں نے کہا۔ "کیا یہ بات میں نہیں سمجھتا؟ ان تینوں میں سے کوئی بھی مر سکتا تھا لیکن مرا وہی جس کی قضا آگئی تھی۔ یہ دنیا کا قانون نہیں ہے جس کے تحت تجھ پر قتل کی فردِ جرم عائد کی جا سکے۔ خدا نیت کو جانتا ہے اور اس کے نظامِ انصاف میں ضابطے کی پکڑ دھکڑ نہیں ہے۔ ویسے بھی مرنے والا کون سا نیک آدمی تھا۔ خس کم جہاں پاک۔"

"آدمی تو تھا۔۔۔ نیکی بدی کا فیصلہ کرنے والے ہم کون ہوتے ہیں۔" محسن بولا۔ "اگر وہ بُرا تھا' تب بھی یہ اختیار کسی اچھے آدمی کو نہ اخلاقاً حاصل ہے اور نہ قانوناً کہ وہ جسے بُرا سمجھے اُسے قتل کر دے۔۔۔ بس اللہ ہی ہے جو مجھے اس نادانستہ قتل پر معاف کرے۔ میری اور اس کی کوئی دشمنی نہیں تھی۔"

"مگر وہ دشمن کا آدمی تھا اور اگر اُسے موقع ملتا یا حکم ملتا تو وہ تجھے قتل کرنے میں ایک لمحے کا توقف نہ کرتا۔" میں نے کہا۔

محسن اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا چہرہ اداس ہوگیا تھا اور وہ میرے دلائل سے مطمئن نہیں ہوا تھا۔ یہ ایک فطری بات تھی۔ اس کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی مطمئن نہ ہوتا۔

"اب اس کا کیا کریں؟"

"اسے ساتھ لے جانے میں کوئی عقل مندی نہیں۔"

"پھر کیا یہیں چھوڑ دیں؟" محسن بولا۔

"گاڑی میں چھوڑا تو یہ نوجوان خواہ مخواہ چکر میں پڑ جائے گا۔" یہ خود تو اب کچھ بتانے سے رہا۔" محسن بولا۔ "اسے یہیں چھوڑ دیتے ہیں۔ گاڑی میں گھر چلتے ہیں۔ وہاں تو اپنے ساتھ دلاور کو اتار لینا اور میں اس گاڑی کو..." وہ بات کرتے کرتے رک گیا۔

"کیوں نہ میں اسے گھر چھوڑ آؤں۔"

"لیکن اس کا پتا..."

"میں دیکھ لیتا ہوں۔" محسن نے گلوز کمپارٹمنٹ کھول کے دیکھا۔ اس میں سے کاغذات نکالے اور گاڑی کی مدھم سے روشنی میں غور سے دیکھے پھر اس کی جیبوں کی تلاشی لی۔ جیب میں ڈرائیونگ لائسنس پر بھی وہی پتا تھا جو گاڑی کی رجسٹریشن بک پر تھا۔

ایک بار پھر میں نے دلاور کو گاڑی میں ڈالا۔ محسن نے ڈرائیور کی لاش کو سڑک سے ذرا فاصلے پر رکھا اور واپس آ کے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ پندرہ منٹ بعد اس نے گاڑی کو اس گھر کے سامنے روکا جہاں اب ہمارا بسیرا تھا۔ میں دلاور کو اندر لے گیا اور محسن گاڑی لے کر چلا گیا۔

غالب نے دلاور کو دیکھا تو بھونچکا رہ گیا۔ "یہ کیا؟"

"یہ اپنے چوہدری صاحب۔" میں نے ہاتھ مل کے کہا۔

"زندہ یا مردہ؟" غالب نے فرش پر پڑے ہوئے دلاور کو دیکھا۔

"ابھی تک تو زندہ ہیں۔" میں نے کہا۔ کیتھرین نے اُسے قریب آ کے دیکھا۔

"یہ... یہ تو وہی شیطان ہے؟" وہ نفرت سے بولی اور اس کا چہرہ ایک دورِ اذیت کی یاد سے دُکھ کی تصویر بن گیا۔

"ہاں... یہ وہی شیطان ہے جس نے ہمیشہ آدم و حوا کو جنت سے محروم کیا... ہر جگہ... ہر زمانے میں۔" میں نے کہا۔

"تم اسے کیوں اُٹھا لائے؟" غالب نے پریشانی سے کہا۔

"ایک موقع ملا تھا۔ ہم نے فائدہ اُٹھا لیا۔ اور آئندہ بھی اس کے فوائد حاصل ہوتے رہیں گے۔" میں نے کہا۔ "میں نے اور محسن نے اتفاقِ رائے سے چوہدری صاحب کو یرغمال بنانے کا فیصلہ کیا۔ فی الحال ہم ان کے بدلے رابعہ اور ٹیڈی کی رہائی کا مطالبہ کریں گے۔"

"کس سے؟" غالب نے طنز سے کہا۔ "لواحقین سے؟"

"لواحقین کیا دے سکتے ہیں۔ سوائے جان کی قیمت کے۔" میں نے کہا۔ "نواب خسرو جمشید کا فون نمبر میں نے نوٹ کر لیا ہے۔ اس کے علاوہ ایس پی سراج ہے۔"

غالب نے نفی میں سر ہلایا۔ "ان کے نزدیک دلاور صرف ایک آدمی ہے۔ اس کی جگہ دوسرا آدمی لے سکتا ہے۔ شاید تم نے دونوں کی دلی خواہش پوری کر دی۔"

"کیسی خواہش؟"

"نمبر ون پوزیشن حاصل کرنے کی۔" غالب نے کہا۔ "... چاہیں گے کہ تم دلاور کو ختم کر دو... ان کے لیے رابعہ اور ٹیڈی کو چھوڑنا ویسے بھی مشکل ہو گا۔"

"کیوں مشکل ہو گا؟"

"اگر انھیں معلوم ہو گا کہ وہ کہاں ہیں تب ہی چھوڑیں گے۔ ہو سکتا ہے یہ صرف دلاور جانتا ہو۔" غالب نے کہا۔

"ہم نے ایک چانس لیا ہے۔ اسے ہم ضائع نہیں کریں گے اور اگر جمشید یا سراج نے انکار کیا تو ان پر واضح کر دیں گے کہ ہم دلاور کو اٹھا لائے ہیں تو کل ان کو بھی اٹھا کر لا سکتے ہیں۔ ہم ٹاپ کے آدمی کو سکۂ رائج الوقت کے طور پر استعمال کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اب تم اسے سنبھالو... میں ایک فون پر بات کر لوں۔"

گھر کے عقبی حصے کی دیوار سے میں ٹیلی فون کے پول پر چڑھا اور اپنے پورٹیبل فون کے تار کنکشن باکس میں لگا دیے۔ پھر میں نے اس ہوٹل کا نمبر ملایا جہاں ہم ڈنر پر مدعو تھے۔

"یس سر..." ہوٹل کے ایکسچینج کی آپریٹر نے کہا۔

"ڈائننگ ہال میں ٹیبل نمبر سیون پر..."

"سوری سر۔ مسٹر دلاور ابھی پہنچے نہیں ہیں۔" وہ بولی۔

"پوری بات سننے سے پہلے بولنا بدتمیزی ہے۔" میں نے کہا۔

"سوری سر۔" وہ محتاط ہو کے بولی۔

"ٹیبل نمبر سیون پر نواب خسرو جمشید ہوں گے... یا ایس پی سراج صاحب ہوں گے... کسی کو بلوا دو۔" میں نے کہا۔

"کیا نام بتاؤں سر؟"

"نام... وزیر خان... علام آباد سے..." میں نے کہا۔

"پلیز ہولڈ کیجیے۔" وہ سمجھے بغیر بولی۔

تین چار منٹ میں کھمبے پر ٹنگا تاروں بھری رات کا نظارہ کرتا رہا اور یہ سوچ کر مسکراتا رہا کہ میرے پیغام سے وہاں کتنی سنسنی پھیلے گی۔ وہ دونوں فوراً سمجھ جائیں گے کہ پیغام دینے والا میرے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔

"سکندر..." ریسیور میں سے سراج کی آواز آئی۔

"کون سکندر اور کون دارا... لاکھ دارا اور سکندر ہو گئے... تم کو کس سے بات کرنی تھی؟" میں نے کہا۔

"دلاور کہاں ہے؟" سراج نے دھاڑ کر کہا۔

"میری جیب میں۔" میں نے قہقہہ مار کے کہا۔ "انگریزی ...

... تمھارا باپ بھی وہاں نہیں پہنچ سکتا۔"

"... بہت تھوڑے دن رہ گئے ہیں تمھاری زندگی کے سکندر۔"

"... مت... یہ بتاؤ کہ دلاور کی موت میں کتنے دن باقی ہیں ... عالم غیب ہو اس لیے بتا سکتے ہو۔" میں نے کہا۔ "جہاں تک ... کا سوال ہے تو ہم اسے قتل نہیں کریں گے۔ یہ تو ہم بہت ... بھی کر سکتے تھے۔ آج بھی کر سکتے تھے۔ ہمارا ارادہ ایک بارٹر ... مال کے بدلے مال کی بات کرنی ہے تو میری بات ... سنو آج سے ٹھیک چوتھے دن ہم کراچی میں ہوں گے۔ تم کبھی ... گئے ہو؟"

"... کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"اس لیے کہ مجھے معلوم ہونا چاہیے۔" میں نے کہا۔ "کہ تم کون ... ہوٹل میں ملو گے۔ جہاں میں تم سے بات کر سکوں۔"

"کیسی بات؟"

"ہم نے آج تک مقابلہ کیا ہے... سودا نہیں کیا۔" میں نے ... لیکن اب میں ایک آفر دے رہا ہوں۔ تم رابعہ اور خواجہ نیک محمد ... چھوڑ دو۔ ہم چوہدری دلاور کو چھوڑ دیں گے۔"

سراج ہنسا۔ "تم بارگین کی پوزیشن میں نہیں ہو۔"

"ہنسنے والوں کے لیے بھی ایک انگریزی مقولہ ہے۔" میں نے کہا۔ "کہ دیکھو آخر کار کون کس پر ہنستا ہے۔ تم شاید کہنا چاہتے ہو ... دلاور کی کوئی قیمت نہیں۔ مگر ایسا کہنے سے پہلے اپنی قیمت طے ... اور اس ڈبل رول والے نواب سے بھی پوچھ لو کہ اس کی کیا ... ہے۔ اگر دلاور کے بدلے سودا نہ ہوا تو پھر تم دونوں میں سے ... ایک کے بدلے میں ہو گا۔ اور تمھارے بدلے نہ ہوا تو تمھارے ... کے بدلے ہو گا۔ مت بھولو کہ کچھ جذباتی رشتے تمھارے ... اتنے ہی اہم ہوں گے، جتنا میرے لیے رابعہ سے رشتہ ہے۔"

"... آل رائٹ۔" سراج کچھ دیر کے بعد بولا۔ "تم ہوٹل میٹروپول ... بات کر سکتے ہو۔"

"کس سے؟"

"مجھ سے یا جمشید سے۔" وہ شکست خوردہ لہجے میں بولا۔

"ایک بات اپنی پولیس افسری میں مت بھولنا... تم فون کو ... پر رکھو یا خود ٹیلی فون میں گھس جاؤ۔ کال کبھی ٹریس نہیں ... کہ کہاں سے کی گئی تھی۔" میں نے کہا۔ "شوقیہ سراغ رسانی ... تو مجھے کوئی اعتراض نہیں... ایک بات اور... دلاور ... کو تسلی دے دینا کہ وہ خیریت سے ہے اور کام سے ... ہے۔ دو چار دن میں لوٹ آئے گا۔"

"تم کو ان کی پریشانی کی بہت فکر ہے۔"

"مجھے تو تمھاری ضعیف ماں کی بھی فکر ہے۔" میں نے کہا۔ "آج اگر دلاور کی بیوی پریشان ہو گی تو سوچو کل تمھاری ماں کا کیا حال ہو گا۔ کوئی احمقانہ کارنامہ سرانجام دینے سے پہلے سوچ لینا۔"

وہ کچھ اور بھی کہتا مگر میں نے فون بند کر دیا اور عبداللہ ود منظر کے گھر کا نمبر ملانے لگا۔ ریسیور اس کی بیوی نے اُٹھایا۔

"منظر کہاں ہے بھابی؟ میں سکندر بول رہا ہوں۔"

"ابھی ابھی تھانے سے چھوٹ کر آئے ہیں۔" وہ بولی۔ "باتھ روم میں ہیں۔"

"تھانے سے؟" میں نے کہا۔

"ہاں... تمھارے انکل رضوی نے چھاپا مارا تھا۔" منظر کی بیوی نے تلخ طنز آمیز شکایتی لہجے میں کہا۔

"ہمیں برآمد کرنے کے لیے؟"

"ہاں... اور اس جرم میں ان کے خلاف مقدمہ درج کر لیا ہے کہ انھوں نے جیل سے فرار ہونے والے دو ڈاکوؤں کو پناہ دی۔"

"یہ اُن کو کس نے بتایا؟"

"ڈاکٹر شہریار نے۔" منظر کی بیوی بولی۔ "وہ بیان نہ دیتا تو کچھ بھی نہ ہوتا۔"

"اُس نے ہمارے متعلق بھی بتا دیا ہو گا؟"

"ہاں۔"

"منظر کو بہت بھروسا تھا اُس پر۔" میں نے تلخی سے کہا۔

"بعد میں وضاحت کرنے آیا تھا۔ میں نے بے عزت کر کے نکال دیا اور صاف کہہ دیا کہ آئندہ اِدھر کا رُخ نہ کرے۔" وہ بولی۔ "لو اُن سے بات کرو۔"

"میاں منظر۔" میں نے کہا۔ "سنا ہے تھانے کا منظر دیکھ آئے ہو؟"

"تمھاری صورت دیکھنے کے بعد یہی سب دیکھنا ہے۔" وہ بولا۔

"مگر یار... میں نے تمھارے اس فرض شناس انکل کی ایسی تیسی نہ کر دی تو میرا نام بھی عبداللہ ود نہیں۔"

"مگر جو کیس درج کیا گیا ہے؟"

"کیس کی بھی ایسی تیسی۔" وہ بولا۔ "میں خود وکیل ہوں، خود اپنی ضمانت پر رہا ہو کے آیا ہوں۔ اب دیکھنا اُس سالے ڈاکٹر کی..." اُس نے ایک بہت گندی گالی دی۔ "تم کہاں سے بول رہے ہو؟"

"زمین اور آسمان کے بیچ میں معلق ہوں۔" میں نے کہا۔ "فون صرف اس لیے کیا ہے کہ تم سے دلاور کے بارے میں معلوم کرنا تھا۔ تم نے اس کے متعلق شائع ہونے والی خبر دیکھی؟"

"ہاں... مجھے پتا چلا ہے کہ وہ تمھارے باپ کی جاگیر پر اپنے دوست کی یاد میں اسپتال بنا رہا ہے۔"

"لیکن یار... یہ سب کیسے ممکن ہوا؟" میں نے کہا۔ "وہ جائداد تو متنازعہ تھی۔ ابھی اس کی ملکیت کا تصفیہ بھی نہیں ہوا تھا۔"

"اس میں کوئی گھپلا ہوا ہے۔" منظر نے کہا۔ "میں معلوم کرلوں گا اور ہائی کورٹ سے اسٹے آرڈر لے لوں گا۔"

"گھپلا کیا ہو سکتا ہے؟"

"یہی یا تو یکطرفہ فیصلہ ہوا تیرے نہ آنے کی وجہ سے" منظر نے کہا۔ "یا تیری طرف سے کوئی حلف نامہ وغیرہ داخل کر دیا گیا... کہ تو اپنے دعوے سے دستبردار ہوتا ہے۔"

"میری طرف سے؟ بغیر میری مرضی کے؟"

"تیرے جعلی دستخط کیے جا سکتے ہیں۔" منظر نے کہا۔ "آخر وہ اسپتال بھی تو تیرے باپ کے نام پر تعمیر ہو رہا ہے۔"

"مگر کیا عدالت میں کوئی وکیل شناخت نہیں کرتا؟"

"وکیل ہر قسم کے ہوتے ہیں۔" منظر نے کہا۔ "جعلی حلف نامہ داخل کرنے کے لیے جعلی سکندر بخت حاضر ہوا اور ایک جعلی وکیل نے اُسے شناخت کیا۔ عدالت نے کاغذات قبول کر لیے۔ اب اس جعلسازی کو چیلنج کرنا بہت بڑا اور لمبا کام ہے۔ مجھے جعلسازی، دھوکا دہی اور عدالت میں غلط بیانی کے پتا نہیں کتنے مقدمات درج کرانے ہوں گے۔ میرا خیال ہے کہ میری بقیہ زندگی صرف تم لوگوں کے مقدمات کی پیروی کرتے گزرے گی۔ ان کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ باقی لوگوں کے لیے وقت ہی نہیں بچے گا۔"

"ہم فیس دیں گے تجھے۔" میں نے کہا۔ "آخر تو ہمارا اکلوتا وکیل ہے۔"

"خدا کے لیے مجھے بخشو... جتنی فیس اب تک ملی ہے وہ سب میری جان کا عذاب ہے۔" منظر بولا۔ "مجھ سے فیس لے تو راہِ راست پر آنے کی۔"

"یار میں زیادہ لمبی بات نہیں کر سکتا۔" میں نے کہا۔ "اتنا تھک گیا ہوں کہ کسی بھی لمحے عرش سے فرش پر ٹپک سکتا ہوں۔ یہ بتا کہ وہ رقم نکلوالی۔"

"کون سی رقم... جو تیری زوجہ کے حساب میں تھی؟" وہ بولا۔

"ہاں یار... اپنے حساب میں تو صرف دولتِ عشق ہے۔"

"نہیں... آج سارا دن تھانے میں گزرا۔ بار ایسوسی ایشن نے زبردست حمایت کی ورنہ ہتھکڑی پڑ جاتی۔" وہ بولا۔

"اچھا اب ہم جا رہے ہیں کراچی۔" میں نے کہا۔ "رقم ہمیں کل پرسوں تک مل جائے تو اچھا ہے کیونکہ ہم اپنے ساتھ ایک بہت اہم چیز بھی لے جا رہے ہیں۔"

"کیا چیز لے جا رہے ہو جھنڈوں کی توپ؟"

"نہیں... اپنے چوہدری صاحب کو..." میں نے کہا اور فون کی لائن کاٹ کے نیچے اتر آیا۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو سچ مچ کھمبے سے نیچے گر پڑتا، منظر سے دوبارہ کسی وقت بھی بات کی جا سکتی تھی۔

میں نے محسن کو بھی واپس آتا دیکھ لیا تھا۔

"چھوڑ دیا اُسے اپنے گھر؟" میں نے کہا۔

"ہاں..." محسن بولا۔ "گاڑی کی آواز پر اس کی بیوی [illegible] تھی۔ میں نے اُسے سمجھا دیا کہ اس کا شوہر معمولی طور پر زخمی ہے۔ اس کی کسی سے لڑائی ہو گئی تھی۔ جب وہ ہوش میں آئے اس کو بھی سمجھا دینا کہ چُپ رہے اور اس کے سوا کوئی بیان کسی سے کوئی بات نہ کرے اور یہ سمجھ لے کہ وہ آج گھر سے نکلا نہیں۔ کوئی پوچھے تو تمہارا بیان یہی ہونا چاہیے کہ وہ شام سے گھر میں ہی تھا۔ اس کی بیوی بہت پریشان ہوئی مگر میں نے سمجھایا کہ وہ تفصیل میں نہ جائے اور وہی کرے جو میں کہہ رہا ہوں۔ کسی بات کا ذکر بھی کسی سے نہ کرے، ورنہ وہ بہت بڑی مشکل میں پڑ جائے گا۔"

"چل یہ تو نے اچھا کیا۔"

"میں نے شہلا کو بھی فون کیا تھا۔" محسن بولا۔

"بے وقوف۔ انکل رضوی کا فون ٹیپ ہو رہا ہوگا۔"

"بس یار... میرا دل چاہ رہا تھا۔ مگر معلوم ہے اُس نے کیا بتایا؟ کراچی سے رابعہ کے متعلق ایک اطلاع ملی ہے۔"

میرا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

سسپنس ... کیوں پیدا کر رہا ہے؟ کہا تو بتاتا کیوں نہیں؟

خبر ہے؟"

"خبر اچھی ہے۔" محسن نے کہا۔ "مگر میں سناتے ہوئے ڈرتا ہوں۔"

"اچھی خبر سنانے میں ڈر کس بات کا؟"

"سُنا ہے وضعدار قسم کے لوگ خوشی سے بھی اللہ کو پیارے ہو جاتے ہیں۔" محسن بولا۔

"بھاڑ میں گئی وضعداری۔" میں نے بھنا کے کہا۔ "کیا تجھ سے سچ اُگلوانے کے لیے مجھے تھرڈ ڈگری کا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔ سو جوتے اور سو پیاز کھا کے بتائے گا؟"

"بجا ارشاد، دونوں چیزیں حاضر کی جائیں۔" محسن [illegible] گیا مگر میں نے جوتا اٹھایا ہی تھا کہ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "یار تم بھی کیا بے صبری، بتاتا ہوں، ذرا دم تو لے لوں، جلد بازی اچھی نہیں ہوتی۔ بزرگوں نے کہا ہے کہ عجلت کار شیطان است۔"

میں نے اُسے جوتا کھینچ کے مارا۔ "بزرگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ جوتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔" [illegible] چھلانگ ماری تھی مگر جوتا اس کی کمر میں لگا۔

میں نے اُسے جانے دیا۔ میں نے اُس کے دونوں کان پکڑ کے مروڑنا شروع کیے۔ "اب بول... ورنہ بے کان کا رہ جائے گا۔"

وہ چلانے لگا۔ "ابے یار! اس نے ایک فون نمبر دیا تھا اور بس۔"

"صرف فون نمبر؟" میں نے اُس کے کان چھوڑ دیے۔

"ہاں، فون نمبر۔" محسن نے دونوں کان دبا دبا کے کہا۔ "اس نمبر پر رات بارہ بجے سے صبح چار یا پانچ بجے تک کوئی نہ کوئی ملے گا۔"

"کوئی کا کیا مطلب ہوا؟" میں نے کہا۔ "ہر فون نمبر پر کوئی تو ملتا ہی ہے۔"

"افسوس نوجوان کہ عشق کے وٹامن کی کمی کے باعث تیرے دل اور دماغ کی کارکردگی متاثر ہوئی ہے۔" محسن بولا۔ "کوئی کا مطلب صاف ظاہر ہے۔ رابعہ نہیں ملے گی تو اس کے استاد یا بڈھی ملیں گے... یا اکرام اور تازو میں سے کوئی ہوگا۔"

"کیا یہ وضاحت رابعہ نے کی تھی؟"

محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "اگر اُسے موقع ملتا تو ضرور کرتی مگر نہ جانے کیسے لائن کٹ گئی۔"

"لائن کیوں کٹ گئی؟"

"یار لائن آخر ہوتی کس لیے ہے؟" محسن نے کہا۔ "کوئی پوچھے کہ ٹرین لیٹ کیوں ہو گئی تو بھیا ٹرین ہوتی کس لیے ہے، طویل فاصلے کی کال کا بہت نازک رشتہ ہوتا ہے۔ کراچی سے لاہور تک کسی ٹیلی فون کے کھمبے پر کا کروچ چڑھ جائے یا تار پر مچھر بیٹھ جائے تو لائن کٹ جاتی ہے۔ پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر... تو لائن..."

"یار پھر بک بک... میرا مطلب تھا کہیں لائن کسی نے ڈسکنکٹ تو نہیں کی۔" میں نے کہا۔ "رابعہ کو موقع ملا ہو فون کرنے کا اور ابھی بات پوری نہ ہوئی ہو کہ کسی نے دیکھ لیا ہو۔"

"نہیں، میں ایسی قنوطیت سے سوچتا ہوں تو صحیح نتائج برآمد نہیں ہوتے۔" محسن نے کہا۔ "اگر یہ فرض کیا جائے کہ وہ کہیں قید ہے اور پھر بھی جہاں اُسے یہ موقع مل گیا تو متعدد سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ اُسے قید میں رکھنے والے احمق کوتاہ بیں ... اور [illegible] اندیش تھے کہ انھوں نے وہیں ایک فون بھی رکھا، اس کا نمبر بھی درج کیا اور رابعہ کو اس فون تک رسائی حاصل کرنے کا ذریعہ بھی فراہم کیا۔ مزید یہ کہ رابعہ نے وہ فون نمبر ہمیں پہنچایا اس یقین کے ساتھ کہ جب بھی ہمیں موقع ملے گا تو اس

نمبر پر بات کرنے سے فائدہ ہوگا۔ نقصان کا اندیشہ ہوتا تو وہ نمبر بتاتی ہی کیوں۔ ظاہر ہے کوئی نہ کوئی اس نمبر تک پہنچنے کے لیے آزاد ہے۔ کم سے کم رابعہ ضرور آزاد ہے جس نے یہ کال کی۔"

"وہ آزاد ہے تو اُس نے اپنے بارے میں تفصیل سے کیوں نہیں بتایا، اپنا نیا ٹھکانا...؟"

"میں نے کہا نا کہ لائن کٹ گئی تھی، اس کے بعد شہلا نے بہت دیر تک انتظار کیا... یا تو رابعہ کو دوبارہ لائن نہیں ملی، کسی بھی خرابی کے باعث... یا پھر وہی ہوا کہ کوئی آ گیا جس کے سامنے وہ بات نہیں کر سکتی تھی یا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ پہلی قیاس آرائی کا زیادہ امکان ہے۔ کیونکہ پندرہ بیس منٹ کے بعد شہلا نے اس نمبر کو ملانے کے لیے بہت کوشش کی۔ ایک بار لائن ملی تو ایکسچینج کی ٹون آنے لگی۔ اس کا مطلب یہی نکالا جا سکتا ہے کہ دوسری طرف سے رابعہ نے ریسیور اُٹھا رکھا تھا اور وہ شہلا یعنی انکل رضوی کے گھر کا نمبر ملانے میں مصروف تھی۔ شہلا نے عقل مندی تو کی تھی کہ لائن کٹتے ہی فوراً خود نمبر گھمانا شروع نہیں کیا۔ اُس نے ریسیور رکھ کے انتظار کیا اور رابعہ کو موقع دیا کہ وہ دوبارہ رنگ کرے مگر کبھی کبھی لائن ملنا محبوب کے ملنے سے بھی زیادہ مشکل ہو جاتا ہے۔ کہنا یہ ہے میری زوجہ مسماۃ شہلا محسن کا کہ وہ دس پندرہ منٹ تک ڈائل گھماتی رہی اور نمبر نہیں ملا تو انکل رضوی وارد ہو گئے اور پوچھنے لگے کہ کسے فون کر رہی ہو، کوئی ٹرنک کال ہے؟"

"اُن کا ایسا سمجھنا برحق تھا۔"

"ہاں، لوکل کال میں اتنی دیر نہیں لگتی اور پھر شہلا کچھ جذباتی ہو گئی تھی چنانچہ نمبر ڈائل کرنے میں اُس نے غیر ضروری جوش و خروش کا مظاہرہ کیا تھا۔ لوکل نمبر نہ ملے تو آدمی دو چار منٹ کے وقفے سے دوبارہ کوشش کرتا ہے۔ ٹرنک کال کے لیے مسلسل نمبر ملانا پڑتا ہے۔ چنانچہ انکل نے کہا کہ مجھے بتاؤ کون سا نمبر ہے، ابھی مل جائے گا۔ ان کو تو شہلا نے ٹال دیا کہ کوئی ایسی اہم اور ضروری بات نہیں مگر مجھے شک پڑتا ہے کہ انکل رضوی نے نمبر نوٹ کر لیا ہوگا۔" محسن نے کہا۔

"وہ کیسے؟ کیا شہلا نے نمبر کہیں لکھا تھا؟"

"نہیں، اب میری گھر والی اتنی بے وقوف بھی نہیں ہو سکتی۔" محسن نے بُرا ماننے کے انداز میں کہا۔ "ایس ایس پی صاحب بہت ہوشیار ہیں۔ اسی فون لائن سے منسلک دوسرا ٹیلی فون ان کے کمرے میں بھی لگا ہوا ہے۔ ہر مرتبہ جب شہلا ڈائل گھماتی ہوگی تو گھنٹی رضوی صاحب کے کمرے میں بھی بجتی ہوگی۔ مثلاً اُس نے نمبر چھ ڈائل کیا تو انکل کے کمرے میں چھ بار گھنٹی بجے گی پھر آٹھ

کا ہندسہ ہوگا تو آٹھ بار اور مسلسل ٹن ٹن سُن کے اُنھیں خیال آیا ہوگا کہ آخر یہ کون فون کر رہا ہے اور کیسے کر رہا ہے کہ نمبر نہیں ملتا۔ ذرا سا غور کرنے سے وہ نمبر سمجھ سکتے ہیں۔ یہ تھوڑی سی پریکٹس کی بات ہے جیسے کوئی مورس کوڈ سمجھتا ہے ایسے ہی جہاں فون ہو وہاں سے ڈائل رِنگ شمار کر کے صحیح نمبر نوٹ کیا جا سکتا ہے یا تقریباً صحیح نمبر سمجھا جا سکتا ہے۔ ایک نمبر اِدھر اُدھر ہو جائے تو یہ غلطی نمبر ملانے سے درست ہو جاتی ہے۔"

"اور اس کے باوجود تو دعویٰ رکھتا ہے کہ تیری گھر والی اتنی احمق نہیں ہے، وہ تجھ سے زیادہ احمق ہے اور تو اس سے زیادہ۔ بھلا کیا ضرورت تھی اُسے یہ رِسک لینے کی، نمبر آؤٹ ہوگیا تو سب چوپٹ ہو جائے گا، خاموشی سے نمبر نوٹ کرتی اور ہمیں بتا دیتی۔" میں نے کہا۔

"یار! آخر عورت ذات ہے، افلاطون یا سکندر بخت نہیں ہے اور خود سکندر بخت ہوتے تو میں شرط لگا سکتا ہوں کہ اس سے زیادہ جذباتی حماقت فرماتے۔ سر کے بل کھڑے ہو کر رابعہ، رابعہ پکارنے لگتے یا فون میں گھس جاتے۔" محسن نے خفگی سے کہا۔ "اور میں صرف ایک امکان کی طرف اشارہ کر رہا ہوں۔ یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ نمبر رضوی صاحب کے پاس پہنچ چکا ہے۔"

"چل بُرا مت مان، جو ہُوا اچھا ہُوا۔ بُرا ہُوا تب بھی اس میں بُرائی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "اب ہم آج رات کوشش کریں گے۔"

"یہ آدھی رات کے بعد والا مسئلہ کچھ عجیب ہے۔" محسن نے کہا۔ "لائن چارجز تو شاید رات کے گیارہ بجے کے بعد ہی کم ہو جاتے ہیں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "لائن چارجز کی بات نہیں۔ غالباً یہ فون رات کے بعد دستیاب ہوتا ہے۔ کسی ایسی جگہ پر واقع ہے جہاں رات بارہ بجے سے صبح پانچ بجے تک کسی کی موجودگی کا امکان نہیں اور وہاں سے چوری چھپے بات ہو سکتی ہے۔"

"گویا ناجائز طور پر۔" محسن بولا۔

"غالباً یہ کسی آفس کا فون ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "تمام دفاتر رات کے وقت بند پڑے رہتے ہیں، اگر ان میں سے کوئی عقل اور پیسہ استعمال کرے تو کسی کمپنی یا سرکاری دفتر کے چوکیدار کو رشوت دے سکتا ہے اور چوکیدار کوئی بھی کمرا کھول کے فون اُن کے سامنے رکھ سکتا ہے۔ ایسا ہوتا بھی ہے۔ سرکاری دفتروں اور صنعتی اداروں کے لمبے چوڑے بل ہوتے ہیں۔ اس میں نجی کالوں کا پتا ہی نہیں چلتا۔ یار لوگ سرکار کے خرچے پر نصف شب کو بیویوں اور محبوباؤں سے فلمی محبت بھرے ڈائیلاگ بھی بول سکتے ہیں اور دُشمنوں کو ولن کی طرح گالیاں بھی دے سکتے ہیں۔"

"کیا آئیڈیا ہے۔" محسن بولا۔ "افسوس کہ ہم نے کبھی نہیں سوچا ورنہ سرکاری دفاتر اور لالچی چوکیدار کہاں نہیں... خیر آئندہ کے لیے یہ بھی ایک وسیلہ ہے۔"

"جو ہم آج رات ہی استعمال کر سکتے ہیں۔" میں نے...

"اور کریں گے۔" محسن جوش سے بولا۔ "رابطے کی کوئی... تو نکلی۔"

"ہاں، ورنہ کراچی تو انسانوں کا سمندر ہے اور... جانے بغیر کسی کو تلاش کرنا بھوسے کے ڈھیر میں سوئی تلاش کرنے سے زیادہ مشکل کام ہوتا۔" میں نے کہا۔ اس خیال... میں رابعہ کی آواز سُن سکوں گا میرے دل میں بے قراری... جب تک رابعہ کے اور میرے درمیان نااُمیدی کا... احساس کا فاصلہ تھا، میرے جذبات پر بھی جیسے بے حسی کی... سی جمی رہی تھی۔ میں دیدہ و دانستہ اس کے خیال سے گریز... اور اس کے تصوّر کی اذیت سے بچتا تھا۔ اب وہ پھر دل کے... میں درد جگا کے اُتری تھی تو اس طرح کہ اس کا عکس جمال... خیالوں میں بس گیا تھا اور اس کا نام ہر دھڑکن کی بازگشت... تھا۔ یہ برف پگھلتے ہی میرے عشق کا آتش فشاں دہکنے لگا تھا۔ ہجر... راستوں کے تاریک سفر میں یک لخت اس کے آفتاب حسن... اُجلی دُھوپ آگئی تھی چنانچہ میرے جذبات کی شدت... صورت سے بھی عیاں ہونے لگی تھی۔

محسن قہقہہ مار کے ہنسا۔ "شروع ہوگئی پیٹ میں مروڑ... اس کے بعد آنے لگیں گے عشق کے جُلاب۔"

"تُو نے گولی ہی ایسی دی ہے۔" میں نے کہا۔ "خواہ... وہ نام لیا جو میں بھولنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔"

"پھر کیا کرتا، نہ بتاتا یہ بات ابھی؟"

"نازو کے حوالے سے بتا دیتا۔" میں نے کہا۔

"پھر اپنے مرزا غالب کا یہی حال ہوتا۔" محسن بولا۔ "... اب پہلے تو اپنے مہمان کی خبر لیں کہ وہ کس حال میں ہے۔"

"سرکس کا شیر لوہے کے جال میں ہے۔" میں نے کہا۔

دلاور ہوش میں آچکا تھا اور کیتھرین کی تحویل میں تھا۔ میں نے کمرے میں قدم رکھا تو مجھے عجیب منظر دکھائی دیا۔ دلاور... کُرسی پر دیوار کی طرف پیٹھ کیے بیٹھا ہُوا تھا۔ دلاور کے ہاتھ... کی پُشت کی طرف کر کے باندھے گئے تھے اور کُرسی دیوار... لگی ہوئی تھی۔ دلاور کے کپڑے تار تار ہو چکے تھے۔ دراصل... بدن پر جگہ جگہ زخموں کی خونی لکیریں نظر آ رہی تھیں۔ کیتھرین... ہاتھ میں نائلون کی دُہری بل دی ہوئی رسّی تھی جسے اس نے... بے دردی سے کوڑے کے طور پر استعمال کیا تھا۔

کیتھرین کے بال بکھر گئے تھے اور اُس کی آنکھوں میں ...نفرت تھی، وہ جس حد تک دلاور سے اپنی تذلیل کا انتقام لے ...سکتی تھی، اُس کے جسم پر تشدد کر کے لے چکی تھی پھر شاید وہ ...تھک گئی تھی یا اُسے خیال آگیا تھا کہ دلاور کا زندہ رہنا ...ضروری ہے۔ اب وہ ایک ہاتھ میں مگ اور دوسرے ہاتھ ...میں نمک کا چمچہ لیے کھڑی تھی۔ میرے سامنے اُس نے مگ ...میں ایک چمچہ پانی لیا اور دلاور کے زخم پر ڈال دیا۔ دلاور کا جسم ...بے ساختہ اینٹھا مگر اس کی صورت پر ایک تحقیر آمیز مسکراہٹ ...برقرار رہی۔

"اب بولو... یُو ڈرٹی سوائن... کیسا ہے؟" کیتھرین نے ...وائی وِش... کہ میرے پاس تیزاب ہوتا۔"

دلاور نے مجھے اور محسن کو دیکھا۔ "لو تمھارے مددگار آگئے، ...اِن سے جو چاہو منگوا لو، تمھارے دل میں حسرت نہ رہے کوئی۔"

کیتھرین نے پورا مگ اُس پر پھینک دیا، وہ نمک ملا ...پانی تھا جو اُس کے ہر زخم پر پھیل گیا۔ وہ آہستہ آہستہ کراہنے ...لگا مگر کیتھرین کی کوششوں کا مذاق اُڑانے کے لیے پھر مسکرانے لگا۔

"تم ایسا کرو، ایک مشین منگوا لو قیمہ بنانے کی یا گنّے کا رس ...نکالنے کی۔" دلاور نے کہا۔ "اُس میں مجھے ڈالو اور مشین چلا دو پھر ...میرا گوشت کھا لو اور خون پی لو، اپنی بیٹی کو بھی پلا دو یہ ٹانک۔"

کیتھرین نے ایک جنونی ردِعمل کے ساتھ دلاور پر حملہ ...کیا۔ اُس کے ناخن لمبے تھے مگر اس سے پہلے کہ وہ دلاور کا ...منہ نوچتی، دلاور نے اُس کے مُنہ پر تھوک دیا۔ "پاگل کُتیا۔" ...دلاور نے حقارت کے زہر میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ "کیا ...اس طرح تُو وہ سب بُھلا سکتی ہے جو تیرے ساتھ ہُوا تھا، جو میں ...نے دیکھا تھا؟"

کیتھرین ایک دم رُک گئی، اُس کا چہرہ احساسِ ذلت سے ...سُرخ پڑ گیا۔ اُس نے مجرم نظروں سے ہماری طرف دیکھا۔ دلاور ...نے وہ بات کہہ دی تھی جو کیتھرین نے آج تک ہم سے چھپائی تھی ...اور شاید وہ کسی عورت سے بھی نہیں کہہ سکتی تھی، وہ مُنہ چھپا کے ...روتی ہوئی دروازے کی طرف لپکی۔

"تم واقعی دلاور ہو۔" میں نے آگے جا کے دلاور کے مُنہ پر ...اُلٹے ہاتھ کا تھپڑ مارا۔ "تم نے اور تمھارے شکاری کتّوں نے ...ایک کمزور اور بے بس عورت کے ساتھ جو کچھ بھی کیا تھا، اس پر ...تمھیں شجاعت و مردانگی کا اعلیٰ اعزاز ملنا چاہیے۔ تم جسم کے زخموں ...اور نمک پاشی کو بھی مُسکرا کے جھیل گئے مگر اصل اذیت رُوح کے ...زخم ہوتے ہیں جو تم نے نہیں کھائے اور میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ تم وہ تکلیف برداشت نہیں کر سکو گے جو احساس کے ناسور دیتے ہیں۔"

"آپ ڈائیلاگ اچھے بولتے ہو۔ اپنے سکندر صاحب! میں نے ہمیشہ تعریف کی ہے۔" دلاور بولا۔

"ہم نے اب تک اچھا ہی کیا ہے۔ ہم بُرائی سے گریز کرتے رہے مگر اب ایسا لگتا ہے کہ ہمیں اپنی طبیعت پر جبر کر کے تمھاری سطح پر آنا پڑے گا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ تمھارے ساتھ بھی آج کچھ ایسی بات ہو جائے جسے تم کبھی نہ بُھلا سکو۔"

"اور تمھیں افسوس ہو کہ تم نے وہ سب کیتھرین کے ساتھ کیوں کیا تھا، جس پر انسان نہیں شیطان بھی شرمائے مگر تم اس کا حوالہ فخر کے ساتھ دیتے ہو۔" محسن نے کہا۔ "وہی تمھارے ساتھ ہوگا۔"

"میرا تم کیا بگاڑ سکتے ہو۔" دلاور نے اطمینان کی اداکاری کے ساتھ کہا۔ "اپنے سکندرِ اعظم صاحب! نہ اپنی جوان بیٹی ہے نہ بہن اور نہ کوئی معشوقہ، جیسی کہ تم لوگوں کے لیے مجبوری اور کمزوری بن جاتی ہے۔ ایک پُرانی بیوی ہے تو اُسے بے شک اُٹھا لاؤ، جیسے چاہو مار دو، نقصان ہوگا تو بچّوں کا، انھیں دوسری ماں نہیں ملے گی، ہمارا کیا ہے، ہمیں دوسری، تیسری، چوتھی بیوی بھی مل سکتی ہے، اگر زندہ رہے۔"

"کیا تم اپنے بیوی بچّوں کے ساتھ ہونے والی ہر زیادتی کو اتنے ہی سکون کے ساتھ برداشت کر سکو گے؟" میں نے پوچھا۔

"کر لیں گے جی، آدمی کا دل پتھر ہونا چاہیے۔" وہ بولا۔ "یہ جو آپ لوگ موم کا دل لیے پھرتے ہو، یہی عذاب دیتا ہے، یہی آدمی کا راستہ روکتا ہے اور اُسے پیچھے ہٹنے پر مجبور کرتا ہے۔"

"تم جانتے ہو کہ ہم وہ نہیں کر سکتے جو تم کر سکتے ہو۔" میں نے غصّے سے کہا۔ "مگر یہ سوچو کہ..."

"نہیں، یہ تو کبھی سوچنا ہی نہیں چاہیے کہ دُشمن ہمارے ساتھ وہ سب نہیں کر سکتا جو ہم دُشمن کے ساتھ کر سکتے ہیں۔ ہر آدمی کے اندر ایک حیوان ہے، ایک درندہ ہے، جب وہ باہر آ جاتا ہے تو شرافت اور تہذیب کے سارے لباس تار تار کر دیتا ہے۔ میری اپنی زندگی ہر وقت تمھارے نشانے پر تھی، بالکل اسی طرح جیسے تمھیں قتل کر دینا یا کرا دینا ہر وقت اور ہر جگہ ہمارے اختیار میں تھا۔ تم وہ فلسفہ بگھار سکتے ہو کہ موت کا ایک دن معیّن ہے اور اس سے پہلے کوئی کسی کو نہیں مار سکتا پھر بھی ہم حقائق کو تسلیم کرتے ہیں، اپنی حفاظت بھی کرتے ہیں اور احتیاط بھی کرتے ہیں۔ میں کبھی اس خیال سے غافل نہیں رہا کہ تم میرے بیوی بچّوں کو میری کمزوری بنا سکتے ہو، ایک بار ذہن...

گھر کے اندر تک پہنچ گئے تھے مگر ایسا تم انتقاماً نہیں کرو گے، یہ میرا اندازہ تھا۔ تم مجھ سے کچھ اُگلوانے کے لیے، کچھ منوانے کے لیے یا مجھ سے کوئی سودا کرنے کے لیے ایسا کرو گے۔" دلاور نے کہا۔
"میرے اندازے کم ہی غلط ہوتے ہیں اپنے سکندر صاحب۔"
میں اُس کی ذہانت کا پھر قائل ہُوا۔ "ہم نے تمھاری زندگی کا سودا کرنے کی بات کی تھی۔"
"کس سے؟ میرے بیوی بچّوں سے؟" دلاور مُسکرانے لگا۔
"نہیں، تمھارے یاروں سے۔" میں نے کہا۔
"یار کون ہے کسی کا، آدمی خود اپنا یار نہیں۔" وہ بولا۔
"آج بڑا فلسفہ بول رہے ہو۔" محسن نے کہا۔ "یاد نہیں تو وہ لوگ کیا ہیں، سراج اور جمشید؟"
"بس بزنس پارٹنر، بزنس نہیں تو پارٹنر بھی نہیں اور پارٹنر نہیں تو بزنس کی بات نہیں۔" وہ بولا۔ "وہ تم سے کوئی سودا نہیں کریں گے، نیا پارٹنر تلاش کریں گے۔"
"کیا تمھاری بیوی بھی دوسرا شوہر تلاش کرے گی؟" محسن نے مشتعل ہو کے کہا۔
"میرے جیتے جی تو نہیں کرے گی، میرے بعد کرے تو پتا نہیں۔ کسی اور کا دل آجائے اُس پر یا اُس کا دل کسی پر آجائے۔"
دلاور ہنسنے لگا۔
"اور تمھارے بچّے؟" میں نے کہا۔
"وہ یتیم ہو جائیں گے، ہونے دو۔ دُنیا میں ہزاروں بچّے ہر روز یتیم ہوتے ہیں۔ ان کے لیے بہت کچھ ہوگا جس سے ان کی زندگی آرام اور آسائش میں گزر جائے گی جیسے اب گزر رہی ہے۔ باپ اہم ضرور ہوتا ہے مگر میرا خیال ہے کہ اُس کا پیسہ زیادہ اہم ہوتا ہے۔"
"صرف تم جیسا شخص ہی یہ بات کہہ سکتا ہے۔" میں نے کہا۔
دلاور ہنسا۔ "میرے کہنے کی بات نہیں اپنے سکندر صاحب، حقیقت تو ایسی ہی ہے کیا اہمیت اور ضرورت ہوتی ہے اُس باپ کی جو مفلس اور محتاج ہو، معذور ہو اور ایک ایسا بوجھ ہو جسے اُٹھا کے چلنا بھی بدنامی کے سوا کچھ نہ دے۔ ایک بدکردار، عیاش باپ بھی قابلِ برداشت ہوتا ہے اگر وہ دولت مند ہو۔ اس اُمید میں کہ وہ کبھی تو مرے گا مگر وہی باپ سب کچھ ختم کر کے مرنا چاہے تو کیا اولاد برداشت کرے گی؟ بے شک بچّے مجھے مِس کریں گے لیکن کتنے دن، اُن کی ساری زندگی پڑی ہے۔ اُن کے لیے جو بندوبست میں نے کیا ہے، وہ میری محبت کا بہترین نعم البدل ہوگا۔ ایک موازنہ کریں جی کہ باپ ہو اور پیسہ نہ ہو... یا پیسہ ہو مگر باپ نہ ہو، اولاد کے حق میں کون صورتِ حال بہتر رہتی ہے۔"
"تم رشتوں کے بیوپاری لوگ ایسے فارمولوں کے... سکتے ہو مگر ایسے آدمی کو انسان نہیں سمجھا جا سکتا جو ہر جذبے کو... بدی، اچھائی بُرائی خیالات اور احساسات سب کو مال و زر کے... سے دیکھتا ہو۔ اپنی بیوی سے ہی پوچھ کے دیکھو۔ کیا وہ ایک... بیچ سکتی ہے۔ کتنے لاکھ یا کتنے کروڑ میں وہ ایک بچّے کا... گی کہ اسے آدم خور قبائل کے حوالے کر دیا جائے یا اپنے سہار... کی کیا قیمت لے گی۔"
دلاور ہنسنے لگا۔ "اپنے سکندر صاحب! جب بنگال... قحط پڑا تھا تو عورتوں نے اپنی ماتا کے اور اپنی عصمتوں... سودے ایک مُٹھی چاول اور ایک روٹی کے بدلے کیے... میری بیوی کے پاس جذباتی عیاشی کے وسائل ہیں، وہ... تمھاری توقعات پر پورا اُترے گی۔ قحطِ بنگال جیسے حالات... کا ردِّ عمل کیا ہوتا، یہ تم تصوّر کرو گے تو تمھاری نظر میں آدمی... نہیں رہے گا، وہ اپنے شیخ سعدی نے بھی تو کہا ہے کچھ... میں ایسا قحط پڑا کہ لوگ عشق تک بھول گئے، وہ غلط... گئے ہیں کیا؟"
دلاور کو قائل کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن تھا۔ یہ ہمارے... مزاج، ہماری سوچ اور فطرت کا فرق تھا۔ شیطان کو بحث... سے نیکی کے وجود کا قائل کون کر سکتا ہے۔ "یہ بحث چھوڑو، ہم تمھیں ایک موقع دیں گے، زندہ رہنے کا۔" محسن بولا۔
"کہ تم اپنی دُنیا میں لوٹ جاؤ، سیاسی پارٹی بناؤ، الیکشن لڑو اور اپنی ساری طاقت ہمارے خلاف استعمال کرو۔ وزیرِ... کے نام پر اسپتال بناؤ جسے خود تم نے قتل کیا تھا۔ ان سب کے... نام پر نیکی کمانے کا ڈراما کرو، جن کو تم نے اپنی بربریت سے... کیا اور اپنے شیطانی عزائم کی قربان گاہ پر مار ڈالا۔ ان سب بچّوں کے لیے یتیم خانے کھولو جن کو تم نے یتیم کیا اور ان سب عورتوں کے لیے فلاحی ادارے بناؤ جو تمھاری وجہ سے... قبول کرنے پر مجبور ہوئیں۔" میں نے کہا۔
"اتنی رحمدلی اور فیاضی کس لیے؟" دلاور طنز سے بو...
"ہم تمھیں قتل نہیں کریں گے، تم صرف ایک آدمی ہو..." ...نے کہا۔ "تمھیں مار کے ہمیں کچھ نہیں ملے گا۔ تم جیسے سیکڑوں... جو ملک فروشی کے کاروبار میں تمھارے ساتھ ہو گئے ہیں... اور ان سب کو سزا دے گا اس ملک کا قانون۔ قدرت... نظامِ انصاف، اس ملک کے عوام کا اتحاد۔ ہم نے تم سے... دشمنی کا بدلہ بھی خدا پر چھوڑ دیا ہے۔ اب تم اور تمھارے... ہمارے نہیں، اس قوم کے مجرم ہو، تم سب کی... ہوگی جو تمھیں ضرور ملے گی۔ ابھی تو ہم تمھیں اس... لائے ہیں کہ تم سے ایک سودا کریں، تم واپس جا...
"سودا کیا ہے؟" دلاور بولا۔ "اور فائدہ کس کا ہے؟"
"فائدہ برابر کا نہ ہو تو سودا نہیں ہوتا۔" محسن نے کہا۔ "تمھاری... تمھارے بیوی بچّوں کو لوٹائی جا سکتی ہے۔"
"بشرطیکہ رابعہ اور تمھارے استادِ محترم ٹیڈی کو تمھارے... کر دیا جائے۔" دلاور سمجھ گیا۔ وہ بہت کائیاں شخص تھا اور... کا دماغ مشین کی طرح سوچتا تھا۔ "یہے نا یہی بات؟"
"نہیں، تمھارا اندازہ غلط ہو گیا۔" میں نے ہاں کہتے کہتے... وہ بدل دیا۔ شاید یہ میری چھٹی حس کا کرشمہ تھا کہ میں نے... الفاظ بدل دیے۔ مجھے یک لخت خیال آگیا تھا کہ اب... سے براہِ راست سودا ممکن نہیں رہا۔ اب تک جتنی گفتگو... تھی اس سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ ابھی وہ خود کو مجبور... سمجھتا۔ "میرا خیال ہے کہ رابعہ اور ٹیڈی کی رہائی صرف تمھارے... اختیار کی بات بھی نہیں۔" میں نے سوچ کے کہا۔
"پھر کیا چاہتے ہو؟" دلاور بولا۔
"ہمارے مطالبات معمولی ہیں جو خود تم پورے کر سکتے ہو۔" ...نے کہا۔ "ایک تو تم کو ایم آر ایس کے مالی وسائل کی کمی کو پورا کرنا... تم نے میرے والد کا اور میرا بہت مال ہضم کیا ہے۔ ایک... بدلے پر تم مجھے کئی کروڑ کی رشوت بھی دے رہے تھے، اب... اس کا کچھ حصّہ اپنے دُشمنوں کو دو۔ ان دُشمنوں کو جو تمھیں... تمھارے کاروبار کو۔ تمھارے کاروبار میں شریک غداروں کو... اُکھاڑنے کے درپے ہیں۔ تمھاری سزا یہی ہے کہ تم ان کے... مضبوط کرو جو تمھاری جڑیں کاٹ رہے ہیں۔"
دلاور نے حیرانی سے مجھے دیکھا۔ "کتنا پیسہ چاہیے تمھیں؟"
"فی الحال دس لاکھ۔" میں نے کہا۔
"صرف دس لاکھ؟" دلاور نے بے یقینی سے کہا۔
"ہاں، آئندہ ضرورت پڑے گی تو پھر وصول کر لیں گے۔" ...نے کہا۔ "اس کے علاوہ ہمیں ایک پتا بھی چاہیے۔"
"کس کا پتا؟"
"ایس ایس پی سراج کی منگیتر کا۔" میں نے کہا۔
"کون سی منگیتر؟"
"چار شادیوں کا ایک مشروط مسئلہ تو ہے مگر چار جگہ منگنی تو سونے سے رہی۔" محسن بولا۔
"ہم اُس کی منگیتر کا نام جانتے ہیں اور اُس کی تصویر بھی دیکھ چکے ہیں۔"
"اچھا وہ... تو تم اُس سے ملنا چاہتے ہو؟" دلاور مُسکرانے لگا۔
"تمھیں کوئی اعتراض ہے؟" میں نے پوچھا۔
"نہیں، شوق سے ملو مگر اس کے لیے تمھیں سات سمندر پار جانا پڑے گا، وہ امریکا میں ہے، کس شہر اور ریاست میں، یہ شاید سراج کو بھی معلوم نہیں۔" دلاور بولا۔
"اس قسم کے جھوٹ سے معاملات بگڑ جائیں گے دلاور۔"
"نہیں، یہ سچ ہے۔" دلاور نے کہا۔ "اس لڑکی کے گھر والوں نے یک طرفہ طور پر نسبت ختم کر دی تھی۔ ان کے خیالات سراج کے بارے میں اچھے نہیں رہے تھے۔"
"کیا وہ شریف لوگ تھے؟" محسن نے طنز سے کہا۔
"ہاں، تمھارے معیارِ شرافت پر پورے اُترنے والے لوگ تھے چنانچہ وہ سمجھ گئے تھے کہ ان کی بیٹی کا مستقبل سراج کے ساتھ غیر محفوظ ہوگا۔ اُنھوں نے منگنی توڑ دی اور لڑکی کا نکاح کسی کزن سے کر دیا جو امریکا سے چند دن کے لیے آیا ہُوا تھا۔ اس سے پہلے کہ سراج کو معلوم ہوتا، وہ واپس بھی چلا گیا اور جاتے ہوئے بیوی کو بھی لے گیا۔"
"اس بے عزّتی کا بدلہ نہیں لیا سراج نے؟" میں نے کہا۔
"سراج تو اُس کی تصویر سینے سے لگائے پھرتا تھا۔" محسن بولا۔
"وہ سب کرنا پڑتا ہے۔" دلاور بولا۔ "لڑکی اکلوتی تھی اور والدین لکھ پتی تھے۔ اُن کا جی ٹی روڈ پر ہی کوئی کارخانہ تھا۔ انارکلی میں ایک کمرشل بلڈنگ تھی۔"
"گویا سونے کی چڑیا تھی، ہاتھ سے نکل گئی۔" میں نے کہا۔
"ہاں، ورنہ لڑکیاں تو بہت۔" دلاور بولا۔ "بعد میں بہت افسوس ناک واقعات پیش آئے۔ پہلے انارکلی کی اُس کمرشل بلڈنگ میں آگ لگ گئی پھر ایک رات اُن کے گھر میں ڈاکو گھس گئے، وہ صرف مال لے جاتے لیکن گھر والوں نے مزاحمت کی تو..."
"اور مارے گئے۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "شاید کسی دن وہ لڑکی اور اُس کا شوہر امریکا میں کسی کار کے حادثے میں ہلاک ہو جائیں گے۔ افسوس ناک واقعات کیسے پیش نہ آتے، اُن کی حرکت ہی افسوس ناک تھی۔ ایک ایس پی کو کیا سمجھا تھا اُنھوں نے؟"
"تم سراج کی منگیتر سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟ اغوا کرنے کے لیے...؟" دلاور بولا۔ "تاکہ اس کے بدلے میں رابعہ کو

مانگ سکو۔"

"تم نے بالکل ٹھیک سمجھا۔"

"میں تمہیں نہیں سمجھوں گا تو کون سمجھے گا۔" دلاور بولا۔ "لیکن اس طرح تمہیں کچھ حاصل نہ ہوگا۔ سراج کو کیا معلوم کہ رابعہ کہاں ہے؟"

"وہ ہم معلوم کر لیں گے۔" میں نے کہا۔

"اور کوئی مطالبہ؟"

"تم ایک بیان تحریر کرو گے اور اس پر دستخط کر کے ہمارے حوالے کرو گے، یہ بیان اخبارات میں شائع ہوگا۔" میں نے کہا۔ "یہ تمہاری طرف سے اعلان ہوگا کہ مجوزہ وزیر اسپتال کا نام اب دلاور اسپتال ہوگا، تم چاہو تو اپنے باپ کا نام بھی لکھ سکتے ہو۔"

محسن کی آنکھوں میں اُلجھن تھی اور حیرانی بھی، وہ میرے مطالبات کو یقیناً احمقانہ سمجھ رہا ہوگا۔ دلاور کے اغوا کا ہرگز یہ مقصد نہیں تھا مگر میں بہت سوچ سمجھ کے بے وقوف بن رہا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ دلاور کے لیے اپنی زندگی کوئی مجبوری نہیں اور وہ سمجھتا ہے کہ اس کی زندگی کسی کے لیے بھی اتنی اہم نہیں ہوگی کہ ہم اُسے جان سے مارنے کی دھمکی دیں تو ہمارا ہر مطالبہ تسلیم کر لیا جائے۔ وہ خود اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ رابعہ اور ٹیڈی کو اپنی رہائی کے بدلے میں رہا کرا سکے، یہ فیصلہ دوسروں کے ہاتھ میں تھا چنانچہ میں ایسے حالات پیدا کرنے کی پلاننگ کر رہا تھا جس میں دوسرے مجبور ہوں، خود دلاور مجھے بے وقوف سمجھ رہا ہوگا کہ میں نے اتنے معمولی مطالبات پیش کیے۔ دس لاکھ وہ دس پیسے کی خیرات سمجھ کے پھینک سکتا تھا۔

رہا اسپتال کا نام بدلنے کا اعلان تو اُس نے سمجھا ہوگا کہ میں جذباتی اشتعال سے مغلوب ہوں، حالانکہ ایسے کسی بھی اعلان کی کوئی اہمیت نہیں تھی، وہ بعد میں جب چاہتا اپنے بیان کی تردید کر سکتا تھا۔

"بس یا کچھ اور؟"

"ہم چیک قبول نہیں کریں گے۔" میں نے کہا۔

"تمہیں نقد مل جائے گا۔" دلاور نے کہا۔

"دس لاکھ بہت معمولی رقم ہے، اس رقم کو بچانے یا ہمیں پکڑوانے کے لیے کوئی جال پھیلاؤ گے تو جان سے جاؤ گے اور تمہارے اپنے فلسفے کے مطابق نقصان صرف تمہارا اپنا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"تم کس قسم کی ضمانت چاہتے ہو؟"

"پہلے تم ادائیگی کا طریقِ کار بتاؤ۔" میں نے کہا۔

"طریقِ کار کچھ بھی نہیں، تم جاؤ اور میری بیوی سے رقم لے لو، ابھی اور اسی وقت۔" دلاور بولا۔

"اتنی نقد رقم وہ اپنے ساتھ رکھتی ہے اور آدھی رات کو وقت کسی کو بھی دے سکتی ہے؟" میں نے کہا۔

"وہ میری بیوی ہے۔" دلاور نے غرور سے کہا۔ "تم مجھے آزما چکے، اب اُسے بھی آزما کے دیکھو۔ میری تحریر تمہارے لیے دس لاکھ کا بیئرر چیک ثابت ہوگی۔"

"ٹھیک ہے، تم چیک لکھو۔" میں نے کہا۔ "رقم نواب خسرو جمشید وصول کریں گے، ان کو تمہاری بیوی ضرور پہچانتی ہو گی، مجھے اس کا فون نمبر تو بتاؤ۔"

دلاور نے اقرار میں سر ہلایا اور خسرو جمشید کا فون نمبر بتایا۔

"اب یہ رقم نواب صاحب خود ایس پی سراج کے گھر اُس کی والدہ کو پہنچائیں گے۔" میں نے کہا۔ "ہم یہ رقم اُن سے لے لیں گے اور اگر درمیان میں کسی نے کوئی چکر چلایا تو ہم سراج کی ماں کو ساتھ لانے پر مجبور ہوں گے۔"

"تم واقعی بہت چالاک ہو۔ تم نے ایک زنجیر میں سب کو باندھا ہے۔" دلاور نے کہا۔ "مجھے تمہاری نیت پر شک ہے کہ درپردہ تم کوئی دوسرا کھیل کھیلنا چاہتے ہو مگر میں دس لاکھ ایسے جوئے میں ہار جانے کے لیے تیار ہوں جس میں میری جیت کا کوئی امکان نظر نہیں آتا، لاؤ کاغذ اور قلم۔"

میں نے اُسے کاغذ اور قلم دیا اور جب وہ لکھ رہا تھا تو میں نے محسن سے فرانسیسی میں بات کی اور اُسے اپنا پلان بتا دیا۔ دلاور نے ایک تحریر نواب خسرو جمشید کے نام بھی دی، اُس نے خاصی عقل مندی سے کام لیا اور صرف یہ لکھا کہ ایک ضروری کام کی وجہ سے وہ ہوٹل نہ پہنچ سکا اور باہر سے ہی ایک مہمان کے ساتھ چلا گیا۔ یقیناً ان کو کوفت اور تشویش ہوئی ہو گی لیکن معاملہ ایسا ہے کہ وہ زیادہ نہیں لکھ سکتا اور وضاحت نہیں کر سکتا۔ اسے دس لاکھ روپے نقد درکار ہیں جو اس کی بیوی کے پاس ہیں مگر وہ صرف اُسی کو دے گی جس کو وہ اعتماد کے قابل سمجھتی ہے۔

چنانچہ وہ جائیے اور رقم لے آئیے اور پھر یہ رقم سراج کی والدہ کو پہنچا دیے، ایک پارٹی یہ رقم سراج کی ماں سے لے جائے گی۔

دوسری تحریر اُس نے بیوی کے نام دی، اس میں بھی تقریباً وہی بات دُہرائی گئی تھی جو جمشید کے خط میں تھی اور کہا گیا تھا کہ وہ دس لاکھ ادا کر دے مگر اس بات کا تذکرہ کسی سے نہ کرے اور فکر بھی نہ کرے، وہ بہت جلد واپس پہنچ جائے گا۔

"یہ لو۔" دلاور نے کہا۔ "آگے تمہارا کام، تم مجھے جہاں بھی لے جانا چاہو...."

"ہم تمہیں تکلیف نہیں دیں گے۔" میں نے کہا۔ "تم ہماری واپسی تک یہیں ہو گے۔"

"مجھے معلوم تھا۔" دلاور نے زندگی سے مایوس پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "تم صرف دس لاکھ میں میری جان بخشی کرنے والے نہیں ہو۔ تم سمجھتے ہو کہ بڑی چالاکی سے تم نے مجھے لوٹ لیا۔ اپنے سکندر صاحب! میرے ہاتھ کا میل بھی دس لاکھ سے زیادہ کا ہے، یہ رقم میں نے سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی ایک فضول چال پر ہار دی ہے کیونکہ میں ایک سفید چانس بھی ضرور لیتا ہوں۔"

"بہت جلد تم کو اندازہ ہو جائے گا دلاور کہ ہم نے جھوٹ نہیں بولا تھا اور تم نے دس لاکھ میں اپنی وہ زندگی بچالی ہے جو دوسروں کے لیے بے مصرف تھی۔ ہم تمہیں آزاد کر دیں گے۔" میں نے کہا۔

دلاور کی صورت کے تاثرات بدل گئے۔ "مجھے یقین نہیں آتا۔"

"آ جائے گا۔" میں نے کہا۔ "اب ہم چلتے ہیں، تمہاری نگرانی وہی عورت کرے گی جسے تمہاری جان لینے میں کوئی عار نہیں، ہم اسے سمجھا دیں گے کہ تمہیں جسم اور روح ایک ساتھ لے کر نہ نکلنے دے مگر اس کا نشانہ کتنا بے خطا ہے اس کا اندازہ تمہیں خود ہی ہو جائے گا۔"

"تم ایسے کہاں جاؤ گے؟"

"تمہارا مطلب ہے کہ ہم نواب خسرو جمشید تک کیسے رسائی حاصل کریں گے اور سراج کے گھر کیسے جائیں گے۔" محسن بولا۔ "اپنے دلاور صاحب! ہم اپنا کام خود کر سکتے ہیں۔"

غالب نے دوسرے کمرے میں رہتے ہوئے ہماری تمام گفتگو سنی تھی لیکن دخل اندازی سے گریز کیا تھا۔ جب محسن پھر دلاور کے ہاتھ پیر باندھ رہا تھا تو میں نے غالب کے بیڈ کے نیچے سے مشین گن نکالی اور اُسے لوڈ کرنے لگا۔ اس وقت میری غالب سے مختصر سی بات ہوئی اور میں نے مناسب سمجھا کہ اُسے بھی اپنے پروگرام سے آگاہ کر دوں۔

"دلاور کو کیتھرین کی تحویل میں دے کر جانے کی ضرورت نہیں۔" غالب نے کہا۔ "اُس کے ہاتھ میں ریوالور ہوگا، یہ نہ ہو کہ اُس کے وجود میں بھری ہوئی نفرت کا سارا زہر گولیوں کی صورت میں دلاور کے جسم میں اُتر جائے۔"

"غالباً غالب نے ٹھیک کہا۔" محسن بولا۔ "یہ کام اسے کرنے دو۔"

"مگر کیا یہ لنگڑا اس کا اہل ہے؟"

"وہ گولی لنگڑی نہیں ہوگی جو اس کا راستہ روکنے جائے گی۔" غالب بولا۔

میں اور محسن باہر آئے تو رات کے گیارہ بج کر بیس منٹ ہوئے تھے۔ میں نے ایک چادر میں مشین گن لپیٹ لی تھی۔ اور ریوالور محسن کی جیب میں تھا۔ ہم ابھی تک اسی غیر ملکی صحافیوں والے حلیے میں تھے۔ پروگرام کے مطابق میں نے ایک پول پر چڑھ کے اپنا فون لگایا اور پھر دلاور کے گھر کا نمبر ملایا۔ میرا خیال تھا کہ موجودہ حالات میں دلاور اور خسرو جمشید مستقل طور پر کسی ایک گھر میں نہیں رہ سکتے۔ دو چار مہینے میں وہ ٹھکانا بدلتے ہوں گے تو ان کا ٹیلی فون نمبر بھی بدل جاتا ہوگا۔ یہ خیال مجھے دلاور کا نیا فون نمبر نوٹ کر کے آیا تھا جو اُس نے میرے سامنے ڈائل کیا تھا۔

"ہیلو۔" کسی بچے نے ریسیور اُٹھا کے کہا۔

"یہ چوہدری دلاور صاحب کا گھر ہے؟" میں نے کہا۔

"وہ تو گھر پر نہیں ہیں انکل۔" بچے نے کہا۔

"امی تو ہوں گی۔" میں نے سوچ کر کہا۔

"وہ نانی کے گھر گئی ہیں، آپ کون ہیں؟"

"میں... تم نہیں جانتے، یہ بتاؤ کہ تمہارے گھر ایک انکل آتے ہیں جن کی بڑی بڑی مونچھیں ہیں، کالی شیروانی اور سفید پگڑی باندھتے ہیں۔ کالے رنگ کی مرسڈیز میں آتے ہیں، بالکل اپنے جیسے ایک ڈرائیور کے ساتھ، اُن کا ڈرائیور بالکل اُنہی کی شکل کا ہے اور اُنہی کے جیسے کپڑے بھی پہنتا ہے۔"

"جی، وہ آتے تو ہیں... انکل جمشید... مگر وہ تو اکیلے آتے ہیں اور اپنی مرسڈیز خود چلاتے ہیں۔" بچے نے کہا۔

"اچھا، خیر یہ بتاؤ کہ اُن کے گھر کا فون نمبر کیا ہے؟"

"جی، وہ میں نہیں بتا سکتا۔ پاپا نے منع کیا ہے کہ..."

"ہاں بیٹا، غیروں کو کبھی کچھ نہیں بتانا چاہیے، میں تمہارے انکل جمشید کا باپ ہوں۔" میں نے کہا۔

"اچھا، تو پھر آپ ٹھہریں، میں دیکھ کے بتاتا ہوں۔" بچہ میری بات سے قائل ہو گیا۔ چند منٹ کے بعد اُس نے نمبر بتا دیا۔ یہ نمبر دلاور کے دیے ہوئے نمبر سے مختلف نہیں تھا۔ میں نے بچے کا شکریہ ادا کیا اور ٹیلی فون انکوائری کا نمبر ملایا۔ رات کی ڈیوٹی دینے والی ایک آدم بیزار آپریٹر نے کہا۔ "ہیلو۔"

"دیکھیں مس، میں ایئرپورٹ سے بول رہا ہوں۔"

"ہاں جی، بولیں۔"

"مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔"

"ہم یہاں اور کس لیے بیٹھے ہیں سر۔" آپریٹر نے کہا۔

"میں ایک پتا گم کر بیٹھا ہوں، میرے پاس صرف فون نمبر ہی ہے۔"

"کس کا فون ہے؟"

"وہاں رہتے تو خسرو جمشید ہیں، نواب خسرو جمشید لیکن وہ کرائے دار ہیں۔ فون شاید لینڈ لارڈ کے نام پر ہوگا، آپ مجھے پتا بتا دیں تو میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔"

"دیکھیں جی، ایسے نہیں بتاتے ہم۔"

"کیوں، آپ کے پاس ترتیب وار نمبروں کی ڈائریکٹری ہوگی؟" میں نے کہا۔

"کون سے نمبروں کی؟"

"نیومیریکل ڈائریکٹری۔" میں نے کہا "یہاں ہوتی تو میں دیکھ لیتا، اب میں کراچی سے لاہور پہنچا ہوں، اُنھوں نے لندن میں فون نمبر دیا تھا۔"

آپریٹر نے مجھے پتا بتا دیا، وہ زیادہ لمبی کہانی سُننے کے موڈ میں نہیں تھی۔ میں نے وہیں سے خسرو جمشید کا نمبر ملایا۔ کسی لڑکی نے فون اُٹھایا۔

"یہ نواب خسرو جمشید کا گھر ہے؟" میں نے کہا۔

"سوری، رانگ نمبر۔" اُس نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔ دوسری بار پھر ایسا ہی ہُوا۔ میں نیچے اُتر آیا۔

"معلوم نہیں کیا چکر ہے۔" میں نے کہا "نمبر تو غلط نہیں لگتا لیکن وہاں کوئی لڑکی ہے جو یہ ماننے کو تیار نہیں ہے کہ وہاں کوئی نواب خسرو جمشید رہتے ہیں۔"

"کہیں اُس کی سیکرٹری نہ ہو۔" محسن بولا۔

"کیا وہ ہر کال پر انکار کر دیتی ہے کہ رانگ نمبر، پھر بات کرنے والے کیسے بات کرتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"بات کرنے والے پوچھتے نہیں ہوں گے... یا اُن کے درمیان کوئی کوڈ ورڈ چلتا ہوگا۔ مثلاً یہ کہ کیا یہ اُلو کے پٹھے کا گھر ہے اور وہ پوچھتی ہوگی کہ آپ کون، تو جواب دیا جاتا ہوگا کہ میں اُلو ہوں... یا دوسرا اُلو کا پٹھا ہوں وغیرہ وغیرہ۔" محسن نے کہا "یہ بھی ہو سکتا ہے عزیزم کہ نواب خسرو جمشید ایک فرضی نام ہو، اصل نام کچھ اور ہو اور تجھ سے بات کی ہو گھر کی کسی عورت نے۔"

"یس، یہ ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا "کیونکہ دلاور کے گھر کے ایک بچے نے بھی ایک انکشاف کیا ہے کہ خسرو جمشید جب وہاں جاتا ہے یعنی دلاور کے گھر تو گاڑی خود چلاتا ہے، اپنے ڈپلی کیٹ کو ساتھ نہیں رکھتا۔ کیا مطلب ہے آخر اس کا؟ وہ دوسرا شخص ہر جگہ نہیں جاتا، صرف خصوصی مواقع پر کیموفلاج کرتا ہے۔"

ریلوے اسٹیشن کی طرف جانے والے ایک رکشہ نے ہم پر بڑا احسان کیا کہ میٹر سے دس روپے زیادہ پر شادمان کالونی جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس عالیشان کوٹھیوں کے ویران علاقے میں آدھی رات کے وقت ہم پر غور کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ بڑی مشکل سے ہمیں ایک چوکیدار ملا جو ایک کوٹھی کے دروازے پر کرسی ڈالے بیٹھا ہُوا تھا۔

"نواب... کدھر کا نواب ہے؟" سیدھے سادے چوکیدار نے کہا۔

"ریاست چکر پور کا۔" محسن بولا۔

"تم نام کو چھوڑو۔" میں نے کہا "کالے رنگ کی مرسیڈیز گاڑی، کالی شیروانی، لمبی مونچھیں کلف لگی ہوئی اور اونچا شملہ پگڑی کا۔"

"اچھا اچھا... وہ اِدھر سے گزرتا ہے۔ تم اُدھر سے سیدھا جاؤ پھر پیچھے والا لین میں، سیدھے ہاتھ پر چوتھا کوٹھی، اُس کے ایک جڑواں بھائی کا ہے۔" چوکیدار بولا۔

"بالکل ٹھیک۔" میں نے کہا۔ یہ سب سے بڑی تصدیق تھی۔ ہم فوراً چل پڑے اور دس منٹ بعد کوٹھی کے گیٹ تک پہنچ گئے۔

"کیا سیدھا اندر جانا مناسب ہوگا؟" میں نے پورچ میں کھڑی ہوئی بالکل نئی مرسیڈیز کو دیکھ کر کہا۔ خسرو جمشید لوٹ کے گھر آ چکا تھا۔

"مجھے یہاں کوئی حفاظتی انتظام نظر نہیں آتا۔" محسن بولا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ خبط کی حد تک احتیاط پسند خسرو جمشید نے اپنا دروازہ ہم جیسے لوگوں کے لیے کھلا چھوڑ دیا ہو۔" میں نے کہا "نہ کوئی چوکیدار، نہ کال بیل۔"

"ممکن ہے کہ وہ ہر آنے والے کو اندر ہی دیکھ لیتا ہو۔ اُسے فوراً خبر مل جاتی ہو کہ کوئی دروازے سے گزرا ہے۔"

"تو ہم دروازے سے نہیں گزرتے۔" میں نے کہا "دیوار پھاند جاتے ہیں۔"

"دیواریں پھاندنا شرفا کا قاعدہ نہیں عزیزم۔" محسن بولا۔

"شرفا اب بے قاعدہ ہو گئے ہیں شیروانی صاحب۔" میں نے کہا "اس کے علاوہ بقولِ شاعر۔ خط کبوتر کس طرح لے جائے بامِ یار پر۔ پَر کترنے کو لگی ہیں قینچیاں دیوار پر۔ یہ ہو سکتا ہے کہ دیوار پر بھی نظر نہ آنے والی شعاعوں کا پہرا ہو۔"

"تیرا مطلب ہے انفرا ریڈ الارم؟"

"ہاں، ایسے برگلر الارم تو عام استعمال ہوتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"دروازے سے بھی نہیں گزرنا اور دیوار بھی نہیں پھاندنی۔ ایسی صورت میں ایک راستہ تو یہ ہے کہ ہم راکٹ کی طرح سیدھے خلا میں پرواز کر جائیں اور پھر اندر گریں۔" محسن بولا "دوسرا راستہ زیرِ زمین سُرنگ بنا کے نکالا جا سکتا ہے مگر کیا ہمارے پاس اتنا وقت ہے؟"

"وقت نہیں تو کیا، عقل تو ہے۔" میں نے کہا۔

"اور ایجاد ضرورت کی بیٹی ہے۔" محسن بولا "چلیے قبلہ، پہلے آپ..."

اُس نے ایک درخت کی جانب اشارہ کیا تھا جسے میں غور سے دیکھ رہا تھا، وہ سمجھ گیا تھا کہ میں کیا کرنے کی سوچ رہا ہوں۔ درختوں پر چڑھنا بچپن میں میرا محبوب مشغلہ تھا مگر اس کے بعد بیس تیس سال تک درختوں کے نیچے سے گزر ہوتا رہا یا بُلندی تک پہنچنے کے لیے لفٹ استعمال کی لیکن کچھ عرصہ ٹیلی فون کے کھمبوں پر چڑھنے کی جو مشق کی تھی، وہ کام آئی۔ میں درخت پر بڑھا اور اس آخری شاخ تک گیا جو دیوار کے اُوپر سے گزر کے کوٹھی کے لان تک پہنچتی تھی۔ جب آخر میں پہنچا اور میرے وزن سے شاخ کے ٹوٹنے کا امکان پیدا ہونے لگا تو میں جھول کر نیچے لٹک گیا اور پھر ہاتھ چھوڑ دیے۔

محسن میرے پیچھے تھا مگر وہ مجھ سے زیادہ ماہرِ درخت پیما ثابت ہُوا۔ جب میں نے ممنوعہ علاقے میں لینڈ کیا تو وہ استقبالیہ انداز میں مسکراتا ہُوا ملا۔ اُس نے مجھے خوش آمدید بھی کہا اور مجھ سے مصافحہ بھی کیا۔ ہم دونوں آہستہ آہستہ آگے بڑھے۔ میں نے دائیں جانب سے اور محسن نے بائیں طرف سے کوٹھی کا ایک راؤنڈ لگایا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ دُشمن کے قلعے کا کون سا دروازہ اندر پہنچنے کے لیے سب سے موزوں رہے گا۔ ہم عقبی دیوار کے وسط میں ملے۔

"ایک روشن دان ہے اِدھر۔" محسن نے سرگوشی میں کہا "جو غالباً باتھ رُوم کا حصّہ ہے، اس میں پٹ نہیں ہے۔"

"تو جالی یا سلاخ ہوگی؟" میں نے کہا۔

"نہیں، غالباً پٹ نکل گیا ہے، وہ گھومنے والا پٹ جس کو ڈوری کھینچ کے بند کرتے اور کھولتے ہیں۔" محسن بولا۔

میں نے محسن کے کندھوں پر سوار ہو کے روشن دان میں جھانکا، یہ باتھ رُوم ہی تھا جس میں لائٹ جل رہی تھی۔ عین روشن دان کے نیچے انگلش اسٹائل کا ڈبلیو سی لگا ہُوا تھا۔ میں نے بازوؤں کے زور پر خود کو اُٹھایا اور اپنا توازن قائم رکھتے ہوئے اندر کی جانب جُھکا، یہ دیکھنے کے لیے کہ کیا میں سر کے بل اُتر سکتا ہوں، اگر میری جگہ سرکس میں کام کرنے والا کوئی بازی گر ہوتا جو فضا میں معلق جھُولوں سے پیروں کے سہارے لٹک جاتے ہیں تو میں بھی روشن دان کو پنجوں سے پکڑ سکتا تھا۔

لیکن میں نے سر کے بل ڈبلیو سی میں گرنے سے گریز کیا۔ میں واپس آیا اور دوبارہ یوں کیا کہ محسن نے چادر کا ایک کونا میری ایک ٹانگ میں ٹخنے سے ذرا اوپر گرہ دے کر مضبوطی سے باندھ دیا تھا۔ یہ وہی چادر تھی جس میں ابھی تک مشین گن لپٹی ہوئی تھی۔ روشن دان سے آدھا گزر جانے کے بعد مجھے محسن ہی باہر سے چادر کا دوسرا کونا تھام کے سنبھال سکتا تھا۔

"گانٹھ ذرا مضبوط رکھنا دوست، کہیں محاورے میں ترمیم نہ ہو جائے۔"

"ہم بہت سے محاورے بدل چکے ہیں۔" محسن بولا "یہ کس کا حوالہ ہے؟"

"ایسا نہ ہو کہ پانچوں روشن دان میں اور سر ڈبلیو سی میں ہو۔" میں نے کہا "یا روشن دان سے گرا فلش میں اٹکا۔"

"آؤں گا تو میں بھی ساتھ ہی۔" محسن بولا "چڑھ جا بیٹا، رام بھلی کریں گے۔"

میں سانپ کی طرح اندر لٹکا اور میں نے اپنے دونوں ہاتھ نیچے رکھے۔ میرا سارا وزن ایک بندھی ہوئی ٹانگ پر آ گیا تھا اور یوں لگتا تھا کہ میرا پیر ٹخنے کے پاس سے نکل کر الگ ہو جائے

گا پھر وہی ہوگا، یعنی مَیں سر کے بل فلش میں گروں گا اور محسن باہر گرے گا مگر محسن آہستہ آہستہ ڈھیل چھوڑتا گیا اور مَیں نیچے پہنچ گیا۔ ڈبلیو سی فرش سے ڈیڑھ دو فٹ اُوپر تھا، اُس کے کناروں پر ہاتھ رکھتے ہی مَیں محفوظ ہوگیا۔

اندر اُترنے کے بعد مَیں نے چادر کا کونا کھول کر ایک جھٹکا دیا اور محسن نے دوسرے کونے پر مشین گن باندھ کے اوپر کی، مَیں نے اُسے اندر کھینچ لیا اور چادر کا کونا پھر باہر پہنچا دیا۔ دوسری بار محسن نے اُسے ہاتھوں سے پکڑا اور پیر دیوار پر رکھ کے اُوپر اُٹھا۔ جب وہ روشن دان کی بُلندی تک پہنچ گیا تو اُس نے پہلے ایک ہاتھ سے روشندان کا کنارا تھاما اور پھر چادر کو چھوڑ دیا۔ مَیں نے چادر اندر کھینچ لی اور محسن کو سنبھال لیا جو روشن دان سے اندر لٹک آیا تھا۔

سب سے خطرناک مرحلہ کامیابی سے طے ہوگیا تھا۔ اس میں چند پُرتشویش لمحے ضرور آئے تھے مثلاً اس وقت جب مشین گن دیوار سے رگڑ کھاتی اُوپر آئی تھی تو معمولی سی آواز پیدا ہوئی تھی اور اس وقت جب مَیں نے ڈبلیو سی پر ہاتھوں سے اپنا وزن ڈالا تھا تو میرے پیر دیوار پر لگے تھے یا اس وقت جب محسن کا سر روشن دان کی چوکھٹ پر لگا تھا مگر ان خفیف سی آوازوں نے اندر کسی کو متوجّہ نہیں کیا تھا۔

چونکہ ریڈیو اور ٹیلی وژن کی نشریات ختم ہوچکی تھیں، اس لیے اندر مکمل خاموشی تھی۔ مَیں نے دروازے کے ہینڈل کو آہستہ سے گھمایا اور دروازہ کھولا۔ جو منظر یک لخت میری نظروں کے سامنے آیا، اُس نے مجھے مبہوت کر دیا۔ یہ ایک بیڈ رُوم تھا۔ تقریباً اٹھارہ فٹ لمبا اور چوڑا۔ اس کے ایک حصّے میں جو دائیں جانب تھا، کوئی لڑکی بڑے انہماک کے ساتھ ایزل پر چڑھے ہوئے کینوس پر روغنی رنگوں سے ایک تصویر بنا رہی تھی، اگر وہ اپنے کام میں مگن نہ ہوتی تو وہ کھٹکا ضرور سن لیتی جو باتھ رُوم کا دروازہ کھلنے سے ہُوا تھا۔

میری طرف اُس کی پُشت تھی۔ پُشت کی جانب سے اُس کا نظارہ بہت نظر نواز تھا۔ اُس کی لمبی اور موٹی چوٹی کمر سے نیچے تک لٹکی ہوئی تھی۔ اُس کی کمر چُست قمیص میں مشکل سے دو بالشت لگتی تھی۔ وہ ساٹن کے سفید غرارے میں تھی چنانچہ قمیص مختصر تھی اور اس کے وجود کی ساری نزاکت اپنے تمام ہوشربا نشیب و فراز کے ساتھ عیاں تھی۔ دوپٹے کو اس نے بیڈ کے کنارے پر ڈال دیا تھا کیونکہ اُسے یہاں اپنے سوا کسی کی نظر نہیں دیکھ رہی تھی۔

غرارہ ایک مشکل مگر خوبصورت لباس ہے۔ وضعداری کے حُسن کی علامت، نسوانیت کے حُسن سے منسوب، مشرق کی تاریخ کے ایک جاوداں دَور کی علامت۔ ایک تہذیب کا ورثہ جس میں ادب آداب، تکلفات اور رکھ رکھاؤ کو بہت دخل تھا۔ اب لڑکیاں کبھی تنگ اور کبھی کھلے پائنچوں کی شلواریں پہنتی ہیں۔ بیل باٹم پاجامے پہنتی ہیں جو تقریباً پتلون ہوتے ہیں یا ساریاں باندھتی ہیں۔ لباس میں غرارے کا دخل صرف تقریبات تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔

مصوّر کے بعد مَیں نے تصویر کو دیکھا جو میرے سامنے تھی۔ یہ کسی عورت کی تصویر تھی، ایک عمر رسیدہ عورت کی جو لباس اور زیورات سے، چہرے کی پُرمتانت دبدبے اور آنکھوں کے پُرتحکم، پُرغرور اور پُراعتماد انداز سے رانی مہارانی یا ملکہ لگتی تھی۔ اُس کی صورت کے نقوش کو اُجاگر کرنے میں مصوّر نے کمالِ فن کا ثبوت دیا تھا۔ وہ لڑکی بلاشُبہ ایک خداداد صلاحیت سے بھرپور فائدہ اُٹھانے پر قادر تھی مگر جس چیز نے مجھے حیران کیا وہ تصویر کے چہرے سے آشنائی کا احساس تھا۔ میرے ذہن میں بہت سی صورتیں آئیں۔ ملکہ نور جہاں، ممتاز محل، چاند بی بی، رضیہ سلطانہ، جھانسی کی رانی، زیب النساء مگر یہ تاریخ کے کسی حوالے سے ذہن میں آنے والی شخصیت نہیں تھی۔ فوری طور پر میرے ذہن میں کسی کا نام نہیں آیا، بس ایک شناسائی کا تاثر قائم رہا۔ تھوڑے سے کھُلے دروازے سے مَیں اُس پیکرِ حُسن کے جمال آفریں ہاتھوں کو اپنی تخلیق سے زبانِ خاموشی میں محوِ کلام دیکھتا رہا، وہ اس تصویر سے کچھ پوچھ رہی تھی یا کچھ سُن رہی تھی۔ خالق اور مخلوق کے درمیان جو ربطِ باہمی رہتا ہے، وہ احساس اور خیال کا منفرد تجربہ ہوتا ہے جسے کوئی اور نہیں سمجھ سکتا۔ میرے پیچھے محسن تھا جو تھوڑا سا ایڑیوں پر اُٹھ کے یہی دیکھ رہا تھا اور شاید یہی سوچ رہا تھا۔

ہمارے جذبات وقتی طور پر ہمارے فرض کی راہ میں حائل ہوگئے تھے۔ کبھی دلاور کے گھر میں چوروں کی طرح داخل ہوتے یا کسی شکاری کی پناہ گاہ پر شب خون مارتے ہوئے ہم کسی احساسِ جُرم وندامت سے نہیں، اپنی فتح مندی اور قوت کے احساس سے سرشار رہے تھے مگر یہ ایک لڑکی، ایک خوبصورت نازک اندام لڑکی کی خواب گاہ تھی اور وہ لڑکی بم بارود سے قتل و خونریزی، تخریب کاری اور دہشت گردی سے دُور کا بھی واسطہ نہیں رکھتی تھی، وہ فنکار تھی۔ رنگ آمیزی سے ہر نقشِ فطرت کو کینوس پر دوام عطا کرنے والی۔ اُس کی خلوت میں مشین گن کے ساتھ قدم رکھنا مجھے جُرم سے کم نہ لگا۔

مَیں دبے پاؤں اُس کے پیچھے پہنچا اور عین اُس وقت جب اُس کا ہاتھ تصویر کو بُرش سے چھُونے کے لیے آگے بڑھا، میرے ہاتھ نے پیچھے سے اس کو دبوچ لیا، وہ بُری طرح کسمائی لیکن میرا ایک ہاتھ اُس کے مُنہ پر اتنی سختی سے جم گیا تھا کہ اُس کے حلق سے کوئی آواز نہ نکل سکی۔ میرے دوسرے ہاتھ نے اُس کی کمر میں پیچھے سے ہاتھ ڈال کے اُسے بے بس کر دیا پھر محسن ریوالور لے کر اُس کے سامنے آگیا۔

"ہم چور ڈاکو نہیں ہیں۔" محسن نے نرم شائستہ لہجے میں آہستہ سے کہا۔ "اور تمہیں نقصان پہنچانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے لیکن تمہیں ہم سے تعاون کرنا ہوگا۔"

"فی الحال صرف اس حد تک کہ تم خاموش رہوگی۔" مَیں نے کہا۔ لڑکی نے آہستہ سے سر کو اقرار میں جُنبش دی۔

"تم بہت اچھی مصوّرہ ہو۔" محسن نے کہا۔ "لیکن ہم بڑے اچھے شکاری ہیں۔ کسی تم جیسی خوبصورت اور معصوم ہرنی کو مارنا ہمارا شیوہ نہیں، ہم سفاک بھیڑیوں اور خونی درندوں کے شکاری ہیں۔"

"لیکن مجبوری بن جائے تو غزالانِ خوش خرام کو بھی نشانہ بنانا پڑتا ہے۔" مَیں نے کہا۔ "تم ایک فنکار بھی ہو۔ یقین کرو ہمیں بہت رنج ہوگا، اگر تم نے ہماری بات نہ مانی اور ہمیں تمہارے ساتھ کوئی زیادتی کرنا پڑی ــــ" مَیں نے مزید کہا۔ اُس نے پھر رضامندی کا اظہار کیا اور مَیں نے اُس پر اپنی گرفت کو کچھ کم کیا۔ بہت آہستہ آہستہ اُس کے مُنہ پر سے اپنا ہاتھ ہٹایا لیکن پوری طرح چوکس رہتے ہوئے کہ وہ چیخ مارنے کا ارادہ بھی کرے تو اس کی آواز کو حلق میں ہی روک دوں۔ وہ میرے ہاتھوں میں اسی طرح لرز رہی تھی جیسے کبھی مَیں بچپن میں چڑیا کو پکڑ لیتا تھا تو اُس کا نرم گرم وجود میری مُٹھی میں کانپتا رہتا تھا۔

جب مَیں نے اُس کا رُخ اپنی طرف کیا تو یک لخت مجھ پر تصویر کی اور اُس کی صورت میں مشابہت کا انکشاف ہُوا۔ دونوں میں فرق صرف ماضی و حال کا تھا اور ماہ و سال کا تھا۔ غالباً وہ اپنی ماں کی تصویر بنا رہی تھی۔ ماں پیکرِ جلال تھی تو بیٹی پیکرِ جمال مگر اندازہ ہوتا تھا کہ جب وہ اپنے دَورِ شباب سے گزری ہوگی تو اسی حسنِ بے مثال کا نقشِ ثانی رہی ہوگی جو اَب ہمارے روبرو تھا۔

"ہم... اپنا دوپٹہ اُٹھالیں؟" اُس نے سہمی ہوئی آواز میں کہا اور مَیں چونک پڑا۔ میرے دل میں کوئی بُرا خیال نہیں تھا اور نہ میری نیت بُری تھی۔ حسن تصویر کا ہو، مناظرِ فطرت کا یا عورت کا، دل پر اثر تو کرتا ہی ہے مگر وہ ایک جوان لڑکی تھی جس کی خواب گاہ میں نصف شب کو دو مسلح اور جوان مرد گھُس آئے تھے اور وہ دونوں اسے مسلسل گھُور بھی رہے تھے۔ اس کا دہشت زدہ ہونا فطری امر تھا وہ اپنے دونوں ہاتھ سینے پر سمیٹے کھڑی تھی۔

"آپ تشریف رکھیں۔" مَیں نے کہا۔ "مَیں معافی چاہتا ہُوں اس بدتہذیبی کے مظاہرے پر۔"

اس کا سانس تیزی سے چل رہا تھا اور بڑی بڑی کالی آنکھوں میں خوف اُترا ہُوا تھا۔ ابھی تک اُسے یقین نہیں آیا تھا کہ اتنی مہذب گفتگو کرنے کے باوجود ہم مہذّب ثابت بھی ہوں گے اور بالآخر اپنی مردانگی اور درندگی کا مظاہرہ نہیں کریں گے جس کے سامنے ایک تنہا اور کمزور عورت اتنی ہی بے بس اور مجبور ہوتی ہے جتنا کسی سیلاب کے سامنے ایک حقیر تنکا، وہ ڈرتے ڈرتے بیڈ کی طرف بڑھی لیکن اُس کی نظر ایک لمحے کے لیے بھی ہم پر سے نہیں ہٹی۔ اس کے ہاتھ نے شیفون کے دوپٹے کو کھینچ لیا تو اُسے تھوڑا سا اعتماد اور اطمینان حاصل ہُوا، وہ بیڈ کے کنارے پر ٹِک گئی اور لمبے لمبے سانس لینے لگی پھر اُس نے بیڈ سائڈ ٹیبل کی طرف دیکھا۔

"ہم... پانی پی لیں تھوڑا سا...؟" وہ خشک لبوں پر زبان پھیر کے بولی۔

مَیں نے آگے بڑھ کے وہ شیشے کا گلاس اُٹھایا جس پر موتیوں کے کام والا سفید دھاگے سے بنا ہُوا کور پڑا تھا۔ مَیں نے وہ گلاس اُٹھا کے اُسے مودّبانہ انداز میں پیش کیا اور مُسکرایا۔ اُس کی آنکھوں میں خوف کا تاثر مزید کم ہُوا اور تھوڑی سی حیرانی کے آثار نظر آنے لگے۔ اُس نے ایک نظر میری مشین گن کو دیکھا جو میرے ایک ہاتھ میں تھی اور پھر اُس گلاس کو جو مَیں اُسے پیش کر رہا تھا، اُس لڑکی نے اپنی معصومیت سے اور اپنی گفتگو کے معصوم انداز سے مجھے واقعی شرمسار کر دیا تھا۔ پانی کے دو گھونٹ لے کر اُس نے گلاس مجھے تھما دیا۔ جیسے مَیں اُس کا خادمِ خاص ہُوں۔

"شکریہ۔" وہ آہستہ سے بولی۔ "آپ کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں ہم سے؟"

"آپ سے صرف تعاون۔" مَیں نے گلاس رکھ کے کہا۔

"ہم سمجھے نہیں۔" وہ بولی۔

"دیکھیے، ہم نواب خسرو جمشید سے ملنے آئے ہیں۔" مَیں نے کہا۔ "یہ انہی کا گھر ہے نا؟"

اُس نے چند سیکنڈ مجھے نظر جما کے دیکھا اور آہستہ سے نفی میں سر ہلایا۔ "آپ... کیا کہہ رہے ہیں، وہ تو نانا تھے ہمارے اور اُن کے انتقال کو بہت عرصہ ہُوا، وہ اپنے آبائی محل میں مدفون ہیں، ہم سچ کہہ رہے ہیں۔"

"یہ... آپ کی والدہ ہیں؟" مَیں نے تصویر کی جانب اشارہ کیا۔

"یہ ہماری نانی ہیں۔" وہ بولی۔ "نواب بیگم خلد آشیانی۔"

"اچھا، یہاں ایک صاحب ہیں... لمبے چوڑے... چھ فٹ قد کے جو بالکل نوابی ٹھاٹ باٹ کے ساتھ رہتے ہیں۔" مَیں نے کہا۔ "ہم اُن کی گاڑی کو پہچانتے ہیں، یہ جو باہر کھڑی ہے، یہ غالباً نئی لی ہے انھوں نے، اس سے قبل جو گاڑی اُن کے

پاس تھی، وہ بھی ایسی ہی تھی۔"
"اُن کی لمبی لمبی مونچھیں ہیں۔" محسن نے غیر موجود مونچھوں کو بل دے کر کہا۔ "سر پر پگڑی باندھتے ہیں جس کا طرہ ایک ہاتھ اُوپر رہتا ہے۔ سیاہ شیروانی..."
"ہم سمجھ گئے، آپ بھائی جان کی بات کر رہے ہیں۔" وہ بولی۔
"آپ کے بھائی؟" میں نے کہا۔
"جی۔ ہمارے سب سے بڑے بھائی۔" وہ بولی۔
"کیا نام ہے اُن کا؟"
"مرشد رضا خاں، کیا آپ نہیں جانتے؟" وہ بولی۔
"جانتے تو آپ سے کیوں پوچھتے۔" محسن نے کہا۔
"عجیب بات ہے، آپ اُن کا نام نہیں جانتے لیکن نانا مرحوم کا نام جانتے ہیں، ان کا حلیہ بھی آپ نے درست بتایا، گویا آپ انھیں دیکھ بھی چکے ہیں، آپ نے ان کے گھر کا بھی سُراغ لگا لیا اور... آخر ان سے کیا چاہتے ہیں آپ لوگ... ہمیں پریشانی اور وحشت ہونے لگی ہے کہیں آپ... نصیبِ دُشمناں...؟"
"آپ بلا وجہ پریشان نہ ہوں، ہم بھی اُنھیں قتل کرنے نہیں آئے ہیں۔" میں نے کہا۔ "صرف ملاقات مقصود تھی۔"
"لیکن ان سے ملنے کوئی اس طرح نہیں آتا، آپ لوگوں کے ارادے ٹھیک نہیں ہیں۔" وہ بولی۔ "آپ کو ہماری قسم..."
"خواہ مخواہ کی قسموں سے ہم پابند نہیں ہوتے۔" میں نے جھلا کے کہا۔ "یہ بتا دیجیے کہ وہ کہاں ہیں؟"
"وہ... اپنی خواب گاہ میں ہوں گے۔" وہ پھر سہم گئی۔
"آپ ہمیں اُن کی خواب گاہ تک لے چلیں۔" میں نے کہا۔
"ہم! آپ کے ساتھ..." اُس نے گھبرا کے کہا اور غالباً خشک حلق کو تر کرنے کے لیے تھوک نگلا۔ "ہم نہیں جا سکتے، بالکل نہیں جا سکتے۔"
"آخر کیوں؟" میں نے اُس کی حیا سے لال ہوتی صورت دیکھ کر کہا۔
"ہم... یہ بھی نہیں بتا سکتے۔" وہ بڑی مشکل سے بولی۔ "ہم آپ کو بھی روک سکتے تو ضرور کہتے کہ اس وقت وہاں نہ جائیے، صبح مل لیجیے گا مگر آپ لوگ ماننے والے کہاں ہیں۔"
"یہ ٹھیک ہے خاتون۔ ہم کو ابھی اور اسی وقت ملنا ہے، آپ اگر ڈرتی ہیں تو اسی کمرے میں ٹھہریے، ہمیں بتا دیجیے کہ اندر ان کا بیڈ رُوم کون سا ہے؟" میں نے کہا۔
"ویسے ہم خود بھی تلاش کر سکتے ہیں۔" محسن بولا۔
"آپ باہر جا کے دیکھیں گے تو راہداری ہے، اس پر بائیں طرف آخر میں ٹی وی لاؤنج ہے۔" وہ بولی۔ "لاؤنج کے دائیں طرف ان کی خواب گاہ ہے۔ آپ ہماری مان لیں، ابھی نہ جائیں۔"
میں نے مشین گن محسن کو دی۔ "جا کے نواب صاحب کو اُٹھا لاؤ۔"
لڑکی نے ایک مرتبہ پھر کچھ کہنا چاہا مگر محسن کو دروازے کی سمت بڑھتا دیکھ کے خاموش ہو گئی۔ اُس کی صورت سے بے بسی کے ساتھ پریشانی عیاں تھی۔
"آپ لوگ ویسے تو شریفانہ گفتگو کرتے ہیں... اور تعلیم یافتہ بھی لگتے ہیں۔" وہ بولی۔ "لیکن ہم کسی طرح بھی اس طرزِ عمل کو شریفانہ نہیں سمجھ سکتے۔ اس طرح اسلحہ لے کر کسی کے گھر میں داخل ہونا جرم ہی تو ہے، کیا چاہتے ہیں آخر آپ لوگ...؟"
"آپ بڑی اچھی مصوّرہ ہیں۔" میں نے کہا۔
"کیا آپ نانا جانی کے دُشمن تھے؟ اور اب اُن کا کوئی بدلہ بھائی جان سے لینے آئے ہیں؟" وہ بولی۔
"آپ نے کہا تھا کہ یہ آپ کے سب سے بڑے بھائی ہیں۔ گویا ان سے چھوٹے بھی ہیں؟" ہم دونوں ایک دوسرے کے سوالات کو نظر انداز کرتے رہے۔
"جی، ان سے چھوٹے ارشد رضا ہیں... لندن میں... اُنھوں نے وہاں کسی انگریز لڑکی سے شادی کی ہے اور وہیں کے ہو گئے ہیں، اُن سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔" وہ بولی۔
"کیا آپ جانتی ہیں، میرا مطلب ہے کہ کیا آپ کے نانا واقعی نواب تھے؟"
"واقعی کا کیا مطلب؟" اُس کے لہجے میں خفگی اور دُکھ کا احساس نمایاں ہو گیا۔ "وہ صحیح نواب تھے۔ ریاست ہندوستان میں ضم ہو گئی تو یہاں چلے آئے۔"
"اور اب آپ کے یہ بھائی مرشد رضا خاں، یہ خود کو کہاں کا نواب سمجھتے ہیں؟" میں نے کہا۔ "کیا کرتے ہیں؟"
اس کا چہرہ میرے اندازِ گفتگو سے تاریک ہو گیا۔ "آپ کو ہم کیا بتائیں۔ آپ کے نزدیک تو نواب بھی ایسے ہی ہیں جیسے نانبائی یا قوال اور حکیم۔ خاندانی نجابت اور خاندانی پیشہ کیا ایک برابر ہوتے ہیں، نانا حکومت کرتے تھے، اپنی رعایا کے دلوں پر بھی۔ ان کے بعد حکومت نہیں رہی لیکن عزت تو ہے۔ کیا مرشد رضا خاں یہاں گھی فروخت کریں گے... مویشی پالیں گے؟"
میں اُسے حیرانی سے دیکھتا رہا۔ معلوم نہیں وہ کس تصوراتی دُنیا کی مخلوق تھی۔ "میرا مطلب تھا آمدنی کے ذرائع سے۔"
"یہ ہم کیا جانیں، ہمارا کام ہی نہیں ہے۔" وہ بولی۔ "مرا ہاتھی بھی سوا لاکھ کا سمجھا جاتا ہے، یہ جو کچھ آپ دیکھ رہے ہیں، ہم خود

تو اسے شان و شوکت نہیں کہہ سکتے لیکن اس طرزِ زندگی کے لیے آمدنی کا معمولی وسیلہ کافی نہیں ہو سکتا۔ کوئی ملازمت نہ وہ کرتے ہیں اور نہ کر سکتے ہیں۔ تجارت میں ہوتے تو ہم بتا دیتے۔"
"پھر آپ کے خیال میں یہ آمدنی کیسے ہوتی ہے؟ عقل کیا کہتی ہے آپ کی؟" میں نے اُس نادان لڑکی کو افسوس سے دیکھا۔
"سب کو جاگیر کے بدلے جاگیر ملی تھی جن کے چھوٹے چھوٹے مکانات تھے، اُنھوں نے بھی کلیم داخل کیے تھے پھر کیا نواب خسرو جمشید کے وارثوں کو حکومت نے کچھ نہ دیا ہو گا۔ وہ جاتے رہتے ہیں اپنی زمینوں کے انتظام و انصرام کے لیے۔"
"انتظام و انصرام... بہت خوب۔" میں نے کہا۔ "آپ نے کبھی دلچسپی نہیں لی، کبھی نہیں پوچھا ان سے؟"
"ہمیں کیا ضرورت ہے، جب ہماری ہر ضرورت پوری ہوتی ہے، گھر میں خادم ہیں، آرام و آسائش کے اسباب ہیں، فرمائش کرتے ہی ہر چیز حاضر ہو جاتی ہے، ہم جو چاہتے ہیں خود ہی لے آتے ہیں۔ ہماری گاڑی الگ ہے، ہمارا شوفر الگ ہے اور ہماری دلچسپی کے اسباب الگ ہیں۔ ہم کو شوق ہے تصویریں بنانے کا، ریکارڈ جمع کرنے کا اور گانے کا۔" وہ بولی۔ "ہم باقاعدہ ریاض کرتے ہیں اور ہمیں موسیقی کی تعلیم دینے کے لیے..." اُس کی بات فائرنگ کی آواز میں ادھوری رہ گئی۔ یہ آواز اندر کی طرف سے آئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی کوئی بڑی پُر اذیت آواز میں چلّایا جیسے وہ نزع کے کرب کا شکار ہو پھر کوئی عورت چلّائی۔
"یا اللہ۔" وہ سینے پر ہاتھ رکھ کے چلّائی۔ "در دروازے کی طرف دیوانہ وار دوڑی۔ "بھائی جان۔" میں نے اُسے پکڑنے کی کوشش کی مگر وہ بازو چھڑا کے نکل گئی۔ "آپ چھوڑ دیں ہمیں، آپ لوگ قاتل ہیں، خونی ہیں۔" وہ چیختی ہوئی راہداری میں آگے آگے بھاگنے لگی۔
"زیب النساء۔" نواب خسرو جمشید کی بارُعب آواز سُنائی دی۔ "ہوش میں آئیے، ہم ٹھیک ہیں۔"
"آپ... آپ ٹھیک ہیں۔" زیب النساء ایک دم اُس سے لپٹ گئی۔ "ہم سمجھے ان لوگوں نے..."
"ہم نے کہا نا کہ ہم ٹھیک ہیں، آپ کا یہ رویّہ بالکل نامناسب ہے، نامحرموں کے سامنے۔" وہ شخص جسے ہم نواب خسرو جمشید کے نام سے جانتے تھے اور جو درحقیقت مرشد رضا خاں تھا اس وقت بالکل مختلف نظر آ رہا تھا۔ اُس کا لب و لہجہ تک بدل گیا تھا۔ جب میں نے اُسے دیکھا تو وہ ٹی وی لاؤنج میں ہاتھ اوپر کیے کھڑا تھا اور صرف انڈر ویئر میں تھا۔
"چلیے آپ اندر جائیے۔" جمشید نے چھوٹی بہن کو حکم دیا۔ شاید ایسا پہلے کبھی نہ ہوا ہو گا کہ وہ صرف انڈر ویئر میں ہو اور بہن اس سے لپٹ جائے۔ زیب النساء نے اُسے چھوڑ دیا۔ پلٹی اور ڈرتی ہوئی واپس اپنے کمرے میں چلی گئی۔
ٹی وی لاؤنج ایک وسیع برآمدہ سا تھا جس کی ایک دیوار کے برابر کھڑکی کے سارے پٹ شیشے کے تھے۔ اس شیشے کی دیوار کا نصف سے زیادہ حصّہ شنیل کے سُرخ بھاری پردوں کے پیچھے تھا۔ باقی نصف میں سے باہر کی رات نظر آتی تھی۔ اندھیری، سنسان، تاروں بھرے آسمان والی۔ لاؤنج کے وسط میں چھت سے فانوس معلق تھا جس کی روشنی نیچے بچھے ہوئے سُرخ اور نیلے حاشیوں والے کاشانی قالینوں پر پڑ رہی تھی۔ چند قدم پیچھے قالین پر ایک عورت بے ہوش پڑی ہوئی تھی۔ عورت کے جسم پر لباس برائے نام تھا اور وہ ایک گداز بدن والی جوان عورت تھی۔ اُس کے جسمانی خدوخال اور رنگ و رُوپ سب اُس کی زرخرید جوانی کا اشتہار دیتے تھے۔ عورت کے پیچھے دروازہ کھلا ہوا تھا اور میں نواب خسرو جمشید کے عشرت کدے کی مدھم روشنیوں میں ایک چھپر کھٹ دیکھ سکتا تھا جس کے گرد نفیس پردے تھے۔ یہ بالکل الف لیلوی انداز کی خوابگاہ کا منظر تھا اور اب میں زیب النساء کے انکار کا سبب سمجھ سکتا تھا کہ وہ کیوں اس وقت اپنے بھائی کے بیڈ رُوم کی جانب جانے سے گریزاں تھی، وہ جانتی تھی کہ وہاں کیا ہو رہا ہو گا۔ حیرت کی بات تھی کہ اس ماحول میں بھی وہ اپنی مصوّری کے ذوق اور اپنی نجابت پر معصوم غرور کے احساس کو زندہ رکھے ہوئے تھی اور تمام گمراہ کُن خیالوں اور پریشان کرنے والے سوالوں سے محفوظ اپنے کمرے میں اپنی تصوّراتی دُنیا آباد کیے زندہ تھی۔
نواب خسرو جمشید کے کسی جاں نثار محافظ نے محسن کا راستہ روکنے کی غلطی کی تھی اور مارا گیا تھا۔ اُس کی لاش خون میں لتھڑی ہوئی دوسری طرف اُلٹی پڑی تھی۔ فائرنگ کی آواز پر بیدار ہو کر نکل آنے والے دو ملازم اپنے مالک و آقا کے ساتھ ہی ہاتھ اُٹھائے کھڑے ہوئے تھے اور ان کی خوفزدہ نظریں ہم دونوں سے رحم کی بھیک مانگتی محسوس ہوتی تھیں۔ نواب اس مضحکہ خیز پوز میں اُن کے سامنے کبھی نہ آیا تھا۔
"چلو تم لوگ بھی جاؤ۔" خسرو جمشید نے اپنے نمک خواروں کو حکم دیا۔
"کوئی کہیں نہیں جائے گا۔" محسن نے کہا۔ "اس وقت وہی ہو گا جو ہم کہیں گے۔ جمشید! تم کو مناسب کپڑے پہننے کے لیے پانچ منٹ ملیں گے پھر تم کو ہمارے ساتھ جانا ہے۔"
"تم دونوں ادھر چلو، زیب النساء کے کمرے میں۔" میں

نے دونوں تھر تھر کانپتے ہوئے نوکروں کو ریوالور سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اس کا خیال رکھنا، وہ کہیں فون نہ کر دے کسی کو۔" محسن بولا۔

"فون نہیں ہے اس کے کمرے میں۔" میں نے کہا۔

"وہ باہر نہ نکل جائے۔" محسن بولا۔

"تُو فکر مت کر۔" میں نے کہا۔ "میں ان کو کہیں دفن کرتا ہوں، اتنی دیر میں نواب صاحب تیار ہو جائیں گے۔"

جب میں دونوں نوکروں کے پیچھے چلتا ہوا دوبارہ زیب النساء کے کمرے میں پہنچا تو وہ فرش پر دو زانو بیٹھی چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپائے زار و قطار رو رہی تھی مگر اس کے رونے کی آواز بھی اتنی کم تھی کہ باہر نہیں سُنی جا سکتی تھی۔

مجھے دیکھ کر اُس نے چہرے پر سے ہاتھ ہٹائے اور اشکبار آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ "آپ جو چاہیں لے جائیں، ہم کچھ نہیں کہیں گے۔" اُس نے اپنے گلے سے نیکلس اُتارا اور پھر کانوں کے ٹاپس اُتارنے لگی جو سب ہیرے کے تھے۔ "ہم کسی کو کچھ بتائیں گے بھی نہیں، ہم قسم کھاتے ہیں مگر آپ بھائی جان کو چھوڑ دیجیے، انھیں مت ماریئے آپ کو ہمارے سر کی قسم۔"

سخت سنگین صورتِ حال کے باوجود میں اس قسم پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ "مس زیب النساء! اپنے آنسو مت گنوائیے اور قسمیں ضائع مت کیجیے، مجھے آپ سے کیا اور آپ کے سرِ عزیز سے کیا لینا، نہ ہی یہ سب کچھ لینے آیا ہوں جو آپ مجھے پیش کر رہی ہیں، گو آپ کا حُسن اس کا محتاج نہیں مگر یہ پھر پہن لیجیے، اپنے سب زیورات آپ کو مبارک ہوں۔ میں آپ کو یقین دلا رہا ہوں کہ میرا ارادہ آپ کے بھائی کی جان لینے کا بالکل نہیں ہے، نہ ہمیں ان کا مال چاہیے۔"

وہ خاموش ہو گئی۔ اُس نے بڑی نزاکت سے پلّو کے کونے سے اپنی آنکھیں صاف کر کے مجھے دیکھا۔ اُس کا نازک جسم اب بھی سسکیوں کی زد میں ہچکولے لے رہا تھا۔ "پھر کیا چاہیے آپ کو؟ کس لیے یہ سب کچھ کر رہے ہیں آپ؟"

"ہم آپ کے بھائی جان کو ساتھ لے جائیں گے۔" میں نے کہا۔

"یا اللہ!" اُس نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ کے کہا۔ "کہاں؟"

"یہ ہم نہیں بتا سکتے، آپ کو معلوم ہو جائے گا کیونکہ آپ بھی ساتھ ہی ہوں گی۔" میں نے کہا۔

"خدارا ایسا مت کیجیے، ہم مر جائیں گے، آپ کو قسم...."

"پھر وہی قسم۔" میں نے ڈانٹ کر کہا۔ "بس اب خاموشی سے وہی کیجیے جو ہم کہتے ہیں، یہ ہمارا وعدہ کہ نہ آپ کو کچھ ہو گا نہ آپ کے بھائی جان کو مگر اُن کو ذرا سمجھا دیجیے گا۔ ہم گولی مارنے میں دیر نہیں لگاتے، وہ بہادر نہ بنیں، ورنہ آپ دُنیا میں اکیلی رہ جائیں گی۔"

جتنی دیر میں خسرو جمشید پاجامہ کُرتہ اور شیروانی والے لباس میں تیار ہو کے پہنچا، میں نے اس کے دونوں نمک خواروں کو باندھ کے باتھ روم میں بند کر دیا تھا، وہ بے حد فرماں بردار ثابت ہوئے تھے اور اُن میں سے ایک نے دوسرے کو باندھا تھا، وہی چادر پھاڑ کے جو ہم ساتھ لائے تھے پھر دوسرے نے رضاکارانہ طور پر خود کو میرے حوالے کر دیا تھا۔ اُنھوں نے مُنہ بھی خود ہی کھول دیے تھے کہ میں کپڑا ٹھونس دوں اور پھر خاموشی سے باتھ روم میں چلے گئے تھے۔ زیب النساء نے یہ سب پتھرائی ہوئی دہشت زدہ نظروں سے دیکھا تھا۔ مجھے تعجب تھا کہ وہ بے ہوش نہیں ہوئی تھی۔

"گھر میں کوئی اور تو نہیں ہے، جو بعد میں ہنگامہ کرے؟" میں نے کہا۔

محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں نے سارے کمروں میں جھانک لیا تھا۔"

"ہماری آپا اماں ہیں۔" زیب النساء نے سوچ کے کہا۔

خسرو جمشید نے اُسے گھور کے دیکھا۔ "وہ ایک مجہول الحواس عورت ہے جو دُنیا میں زیب النساء کے سوا نہ کسی کو جانتی ہے اور نہ پہچانتی ہے۔"

"وہ اگر زیب النساء کو خطرہ لاحق دیکھے گی تو ضرور خطرے کا الارم بجائے گی۔" میں نے کہا۔

"اور زیب النساء کو غائب پائے گی تب بھی شور مچائے گی۔" محسن بولا۔ "کیوں نہ اُسے بھی...؟"

"نہیں، ایسا مت کیجیے۔ ہم اُنھیں بتا دیتے ہیں، ہم خود سمجھا دیتے ہیں کہ ہم جا رہے ہیں۔" وہ منت کرتے ہوئے بولی۔ "کیا کہیں کہ اس وقت ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"مگر وہ ہیں کہاں؟" میں نے کہا۔

"بس اب تہجد اور وظیفے میں مصروف ہوں گی۔" زیب النساء نے کہا۔ "ہم وہیں جا کے اُن سے کہہ دیتے ہیں کہ ہم بھائی جان کے ساتھ جا رہے ہیں۔"

"کیا وہ دیکھنے کے لیے نہیں آئیں گی کہ یہ غلط تو نہیں؟"

"کیوں؟ جب ہم بتائیں گے تو وہ مانیں گی کیوں نہیں، وہ تو جانتی ہیں کہ ہم نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔" زیب النساء نے کہا۔ "ہم انھیں بتا کے ابھی آتے ہیں۔"

محسن اُس کے ساتھ جانا چاہتا تھا لیکن میں نے روک دیا۔ اس لڑکی نے مجھے اپنی سادگی اور معصومیت سے قائل کر لیا تھا کہ وہ جھوٹ بولنے کی اہل ہی نہیں اور یہ ایک ناقابلِ یقین تضاد تھا جو اس کوٹھی کے اندر حیرت کی انتہا پیدا کرتا تھا۔

اگر اس گھر کے اندر زمین میں سے کوئی شخص درخت کی طرح نکل آتا جس کے ہاتھ میں ایٹم بم ہوتا تب بھی میں اتنا حیران نہ ہوتا۔ دھوپ میں جھلستی ریت کے صحرا میں میلوں تک پھیلی ویرانی میں چلنے والے کو کسی پیاس سے مر جانے والے مسافر کا ڈھانچا نظر آ جائے تو وہ اتنا حیران نہیں ہو گا جتنا ایک تازہ کھلے ہوئے گلاب کے پھول کو دیکھ کر ہو گا۔

"کون کہہ سکتا ہے کہ زیب النساء تمھاری بہن ہو سکتی ہے۔" میں نے کہا۔ "اور تم نے بھی اسی ماں کا دودھ پیا ہے جس کا زیب النساء نے۔"

"مجھے اُمید تو نہیں کہ تم میری بات مانو گے لیکن ہو سکے تو اسے ساتھ نہ لے جاؤ۔ اس نے وہ دنیا نہیں دیکھی جس میں ہم شکاری ہیں، تم اور میں۔"

"اسے وہ دنیا دیکھ لینی چاہیے مرشد رضا خاں۔" میں نے کہا۔ "آج تک وہ تمھاری دُہری شخصیت سے بے خبر رہی۔ حالانکہ تم اور وہ ایک ہی چھت کے نیچے تھے۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ بہتر ہے کہ اب ہم یہ نقاب اُٹھا دیں۔ حقائق کتنے ہی بے رحم کیوں نہ ہوں ان کے وجود سے بے خبری کا مطلب یہ نہیں ہوتا...."

"سکندر بخت، وہ ہماری جنگ میں شریک نہیں...."

میں تلخی سے ہنسا۔ "نواب صاحب! بہت سے لوگ تھے جو اس جنگ میں فریق نہیں تھے۔ وزیر خان کے نام سے شروع کروں تو ناموں کی ایک لمبی فہرست ہے۔ رابعہ کی ماں کب اس جنگ میں شریک تھی؟ آج تمھاری بہن کی باری آئی ہے تو تم ابھی سے پریشان ہو۔"

"وہ.... وہ مر جائے گی۔"

"پھر کیا ہوا۔ اپنے چوہدری دلاور صاحب کا تو فلسفہ ہی یہ ہے کہ جب بم گرتا ہے تو کسی بے گناہ کو اور معصوم کو نہیں بخشتا۔ بچوں، بوڑھوں اور عورتوں یا معذوروں کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کرتا۔" میں نے کہا۔

"اس کے علاوہ۔ کیا تم نے جولی کی ماں لیتھرین یا رابعہ کے ساتھ کوئی رعایت کی تھی؟" محسن نے اس کے مُنہ پر مکّا مارا۔ "تم نے ہمارے ساتھ ہمارے رشتوں کو بھی رسوا کیا۔ جسم کے ساتھ ہماری روح کو بھی زخم دیے۔ ہم سے جذباتی تعلق رکھنے والوں کو بھی کچل دیا اور پھر ہماری اذیت کا تماشا دیکھا بھی اور دکھایا بھی۔ کس نے کی تھی اس غیر انسانی کھیل کی ابتدا؟ تم نے دیکھا نواب زادے! آج تمھاری شہ رگ کس طرح دبی ہے۔ اب کوئی منت سماجت، کوئی التجا اور واسطہ کام نہیں آئے گا۔ قسم خدا کی اگر میری ماں قبر سے اُٹھ کر آئے اور تمھاری سفارش کرے تب بھی میں تم کو نہ بخشوں۔"

میں نے محسن کے کندھے پر تھپکی دی۔ "جذبات کو قابو میں رکھ۔ ان کے اور ہمارے درمیان ایک فرق تھا اور رہے گا۔ ہم چاہیں بھی تو ایک سطح پر نہیں آ سکتے۔ نہ یہ ہماری سطح تک پہنچ سکتے ہیں اور

نہ ہم اتنے گر سکتے ہیں۔"

زیب النساء کے آجانے سے میری بات پوری نہ ہو سکی۔ وہ بے حد خوفزدہ تھی لیکن اسے اپنے اعصاب پر قابو پانے کا ہنر بھی آتا تھا۔

"گاڑی کی چابیاں کہاں ہیں؟" میں نے خسرو جمشید سے کہا۔

خسرو جمشید نے خاموشی سے چابیاں ہمارے حوالے کر دیں۔

"باہر کے دروازے پر کوئی حفاظتی الارم وغیرہ ہے تو بند کر دو۔ ہم خاموشی سے نکل جانا چاہتے ہیں۔" محسن نے کہا۔

"جب تم لوگ اندر آئے تھے تو کیا...؟"

"ہم دروازے سے گزر کے نہیں آئے تھے۔" میں نے خسرو جمشید کی بات کاٹ دی۔ "ہم نے دیوار بھی نہیں پھاندی تھی۔"

"ہم آسمان سے ٹپکے تھے۔" محسن نے کہا۔

"اللہ! اب تو بتا دیجیے ہم کہاں جا رہے ہیں؟" زیب النساء نے کہا۔

"ہم آپ کے بھائی جان کے ایک دوست کے گھر جا رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "شاید آپ نے کبھی ان کا نام سنا ہو گا۔ پولیس کے ایک بہت بڑے افسر ہیں —— ایس پی سراج۔"

ان الفاظ کا شدید ردِ عمل ہوا۔ زیب النساء بری طرح چونکی اور اس کا رنگ جو خوف سے زرد تھا، یکلخت لال پڑ گیا۔ "وہاں۔ ہم وہاں نہیں جا سکتے۔ بالکل نہیں جا سکتے۔ بھائی جان...!"

"آپ کے بھائی جان بھی ساتھ ہی جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "ہم آپ کو اپنی مرضی سے لے جا رہے ہیں۔ آپ کے بھائی جان کی اجازت سے نہیں۔"

"اللہ۔ اب ہم کیسے بتائیں۔" اس کا رنگ گلابی پڑ گیا۔ "آپ ہی بتائیے ان کو بھائی جان۔ ہم مر جائیں گے مگر وہاں نہیں جائیں گے۔"

"زیب النساء! ان سے مذمت کیجیے۔ یہ ماننے والے لوگ نہیں ہیں اور یہ مجبوری ہے۔" جمشید نے کہا۔

"ہمیں کوئی مجبور نہیں کر سکتا۔" وہ ایک قدم پیچھے ہٹی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے جھٹکا دیا۔ "کیا آپ چاہتی ہیں کہ ہم آپ کو باندھ کر لے جائیں۔ آخر کیا ہے وہاں، کوئی کھا تو نہیں جائے گا آپ کو۔ ہم وہیں رک کر انتظار کریں گے۔ آپ کے بھائی جان ذرا سی دیر کے لیے جائیں گے اور واپس آجائیں گے۔ مجھے امید ہے کہ صبح ہونے سے پہلے ہم آپ کو واپس لے آئیں گے۔"

"دیکھیے۔ یہ بہت مشکل ہے۔" وہ ہاتھ جوڑ کے بولی۔ "ہمارا وہاں جانا کسی صورت بھی مناسب نہیں۔ آپ سمجھتے کیوں نہیں۔"

"یہ نامناسب والی کیا بات ہے... قبلہ نواب صاحب؟" میں نے زیب النساء کے ردِ عمل پر غور کرتے ہوئے کہا۔

"وہ... دراصل میں نے اس کی نسبت سراج سے طے کر دی تھی اور ظاہر ہے کہ رخصتی سے قبل اس کا اپنے سسرال جانا نامناسب ہی سمجھا جائے گا۔" خسرو جمشید بولا۔

"ہمیں یہ اطلاع تو مل گئی تھی کہ سراج کے ساتھ پہلی نسبت کیوں کر اور کیوں ختم ہوئی۔" میں نے کہا۔ "لیکن یہ علم نہ تھا کہ اس سازش میں تم بھی برابر کے شریک تھے۔ خیر، تم اپنی بہن کو بھی اپنے کاروباری رشتوں کی مصلحت کی بھینٹ چڑھانے کا فیصلہ کر چکے ہو تو ہم کون ہوتے ہیں منع کرنے والے۔"

"بھائی جان! یہ کس قسم کی باتیں سن رہے ہیں ہم؟" زیب النساء نے مجروح لہجے میں کہا۔

"یہ سب فضول باتیں ہیں۔ آپ برداشت کیجیے۔" خسرو جمشید نے بہن کو تسلی دینے کے لیے کہا۔ "یہ ہمارے دوست نہیں ہیں۔"

"چلو، باہر نکلو۔ ہمارے پاس وقت کم ہے۔" میں نے کہا۔ "جھوٹ سچ خود ہی زیب النساء کے سامنے آجائے گا۔ آپ بھی چلیے زیب النساء، ہم مجبور ہیں کہ آپ کو ساتھ رکھیں۔ شاید اس طرح آپ کو بہت کچھ معلوم ہو جائے جو آج تک آپ کی نظر نے نہیں دیکھا اور عقل نے نہیں جانا۔"

"معلوم نہیں، آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ ہم تو کچھ بھی نہیں سمجھ پائے۔" وہ بولی اور بوجھل قدموں سے ہمارے ساتھ چل پڑی۔ محسن نہ جانے کدھر غائب ہو گیا تھا۔ ہمارے پورچ میں آتے ہی پوری کوٹھی اندھیرے میں ڈوب گئی تو میں سمجھ گیا کہ وہ مین سوئچ آف کرنے گیا ہو گا۔ وہ چند منٹ میں نمودار ہوا تو میرے خیال کی تصدیق ہو گئی۔ اس نے ٹیلی فون کے دونوں تار بھی کاٹ دیے تھے۔ گیٹ پر کوئی الارم تھا تو اب بے کار ہو چکا تھا۔

خسرو جمشید کا غصے اور بے بسی سے برا حال تھا۔ "یہ جو کچھ تم لوگ کر رہے ہو...!"

"ہم جانتے ہیں کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "تم بیٹھو آگے۔ گاڑی میں چلاؤں گا، تم صرف راستہ بتاؤ گے۔ سراج کی نئی کوٹھی میں نے نہیں دیکھی۔"

"اور آپ کے پیچھے میں رہوں گا۔ آپ کی ہمشیرہ کے ساتھ اور مشین گن کے ساتھ۔" محسن بولا۔

"تم نکل نہیں سکتے۔" جمشید نے کہا۔ "دلاور کے اغوا کی خبر پھیل چکی ہے۔ ہم سب کی حفاظت کے خصوصی انتظامات کیے جا رہے ہیں۔"

"ابھی تک تو مجھے یہ انتظامات نظر نہیں آئے۔" میں نے ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "لیکن نواب صاحب! جب آپ ہمارے ساتھ ہیں تو کوئی ہمارا راستہ کیوں روکے گا۔ آپ کی حفاظت کرنے والے آپ کی جان کے دشمن تو نہیں ہو سکتے نا۔" میں نے کار کو اسٹارٹ کیا اور گیٹ سے باہر نکالا ہی تھا کہ ایک پولیس جیپ نے میرا راستہ کاٹ دیا۔ اس میں سے ایک تھانیدار قسم کا افسر اترا۔

"ان سے کہیے کہ راستہ چھوڑ دیں۔" میں نے کہا۔

جمشید نے تعمیل کی، اس نے سر نکال کر تھانیدار کو بلایا۔ "جیپ کو سامنے سے ہٹا لو۔"

"ہمیں علم تھا سر جی کہ آتے جاتے آپ کا خیال رکھیں۔" وہ بولا۔

"ہاں ہاں۔" جمشید نے کہا۔ "تم لوگ یہاں ٹھہرو اور خیال رکھو گھر میں کوئی داخل نہ ہونے پائے۔"

"مطلب یہ سر جی کہ آپ کے ساتھ نہ چلیں؟"

"نہیں۔" جمشید نے مجبوراً کہا۔ "میں اپنی فیملی کے ساتھ جا رہا ہوں۔"

جیپ سامنے سے ہٹ گئی۔ جمشید کی گردن پر سے وہ دباؤ بھی ہٹ گیا جو محسن نے ریوالور سے ڈال رکھا تھا۔ اعصاب شکن خاموشی کا ایک وقفہ ٹل گیا جس میں بہت کچھ ہو سکتا تھا۔ ہم رکنے والے نہیں تھے۔ جمشید عقل سے کام نہ لیتا تو ہمیں پولیس کو راہ سے ہٹانے کے لیے طاقت استعمال کرنی پڑتی۔ زیب النساء چپکے چپکے پچھلی سیٹ پر روتی رہی۔ محسن نے اسے تسلی دے کر چپ کرانے کی واجبی سی کوشش کی پھر اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

"حالات بتاتے ہیں کہ سراج کے گھر پر ہمارا استقبال کرنے والے زیادہ ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "امید ہے وہاں بھی تم اسی سمجھ بوجھ کا مظاہرہ کرو گے۔ بصورتِ دیگر یہ سمجھ لو کہ ان سب کا خون تمہاری گردن پر ہو گا جو ہمارا راستہ روکنے آئیں گے۔ ہم بہرحال اندر پہنچ جائیں گے خواہ اس کے لیے ہمیں قتلِ عام کرنا پڑے۔"

"تم اپنی بہن کے سسرال میں کسی خونریز معرکے سے گریز کرنا چاہتے ہو تو خاموشی سے وہی کرتے جاؤ جو ہم کہیں۔" محسن بولا۔ "اور یہی اپنے اس ہونے والے بہنوئی سے بھی کہنا۔ اس کی ماں کا بھی خیال رکھنا جو بیمار رہتی ہے۔ تمہارے یا سراج کے غلط رویے کے باعث ہم جوابی قدم اٹھانے پر مجبور ہوئے اور اس کے نتائج غلط نکلے تو قصوروار ہم کو مت سمجھنا۔"

خسرو جمشید نے یا مرشد رضا خاں نے، سہولت کی خاطر ہم اسے پرانے نام سے ہی مخاطب کرتے تھے، ہماری کسی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اسے امید تو ہو گی کہ دلاور کے بعد ہم اس کی طرف بھی آنے کی سوچ سکتے ہیں لیکن ایک تو کبھی ہمارا اس سے براہِ راست تصادم نہیں ہوا تھا۔ اس نے ہمارے خلاف کسی کارروائی میں براہِ راست اور ذاتی طور پر حصہ نہیں لیا تھا اور دلاور کے ایک پارٹنر کی حیثیت سے بھی وہ سب سے کم فعال تھا۔ دوسرے اس نے اپنے لیے حفاظتی انتظامات بھی بہتر کر لیے تھے۔

اس کی نئی مرسڈیز جیسی شاندار گاڑی میں نے کبھی نہیں چلائی تھی۔ وہ ایک زبردست قوت رکھنے والی مگر خاموش اور سبک خرام گاڑی تھی جس میں سو میل فی گھنٹا کی رفتار کا بھی پتا نہیں چلتا تھا۔ اس میں سہولتوں اور آسائشوں کی بھی کمی نہ تھی۔ مثلاً اس کی کھڑکیاں اور دروازے بٹن دبانے سے کھلتے اور لاک ہوتے تھے۔ خود کار ٹرانسمیشن اور پاور اسٹیئرنگ کے ساتھ شاید وہ کار ملک کی گنی چنی کاروں میں ہو گی۔

ایس پی سراج کے گھر تک کسی نے کسی سے کوئی بات نہیں کی۔ یہ راستہ رات کو خالی ملنے والی سڑکوں پر دس منٹ میں طے ہو گیا۔

آخری موڑ کاٹنے سے پہلے میں نے گاڑی روک کے بند کی اور چابی لے کر اتر گیا۔

"اب آپ ڈرائیونگ کریں گے نواب صاحب۔" میں نے کہا اور گھوم کے دوسرے دروازے پر پہنچا۔ جب خسرو جمشید میری جگہ بیٹھ گیا اور میں اس کی جگہ تو میں نے چابیاں اس کے حوالے کر دیں۔

"یہاں حفاظتی انتظامات بہت سخت ہوں گے۔" محسن نے کہا۔

"تمہارے لیے تو سراج نے چار اونگھتے ہوئے سپاہی اور ایک توندیل تھانیدار بھیج کے محض ضابطے کی [illegible] کی تھی۔" میں نے کہا۔ "مگر خود اپنے لیے اس نے گھر کے چاروں طرف مسلح حصار قائم کر رکھا ہو گا کیونکہ ایک تو وہ خود ایس پی ہے۔ دوسرے وہی سب سے بڑا مجرم ہے چنانچہ وہ سب سے زیادہ خائف بھی ہو گا۔ دلاور ایک عام آدمی ہے اور اس کا جرم غداری ہے۔ سراج ایک سرکاری افسر ہے جس کا کام قانون کی حفاظت کرنا بھی ہے چنانچہ وہ دہرا مجرم ہے۔"

"اور یہ بھی حقیقت ہے کہ دلاور جیسے لوگ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اگر سراج جیسے چور افسر اُن کی پشت پناہی نہ کریں۔ آج اسے ڈر ہو گا تو اس نے قانون کے محافظ جمع کر لیے ہوں گے۔" محسن نے کہا۔ "تم خود ہی ان محافظوں سے بات کرو گے اور بات نہ بنے تو سراج کو تمام صورتِ حال سمجھا دو گے کہ تعاون میں خیریت ہے اور عدم تعاون کا نتیجہ تم سب کی توقع سے زیادہ برا نکل سکتا ہے۔"

گاڑی آگے بڑھی تو مجھے پولیس کی پہلی گاڑی ملی جو ہماری طرف آ رہی تھی۔ اس میں مسلح پولیس مین دقیانوسی [illegible] رائفلیں لیے بیٹھے تھے اور آگے کوئی سب انسپکٹر یا انسپکٹر تھا جو وائرلیس کے ماؤتھ پیس میں کچھ بول رہا تھا۔ جیپ کے اوپر لہرانے والا انٹینا ظاہر کرتا تھا کہ اس گاڑی کا وائرلیس کے ذریعے ہیڈ کوارٹر یا تھانے سے رابطہ قائم ہے۔ انھوں نے ہمیں دیکھا مگر ایک اتنی عظیم الشان مرسڈیز کو روکنے کی ہمت ان میں نہ تھی جس کا مالک کوئی وزیر، اسمگلر یا صنعتکار بھی ہو سکتا تھا اور ڈپٹی کمشنر یا آئی جی قسم کا افسر بھی۔ دوسری گاڑی عین کوٹھی کے دروازے پر موجود تھی جس کے سامنے جمشید نے کار کو روکا۔ گیٹ بند تھا اور گیٹ لائٹس جل رہی تھیں۔ ایک وردی والا دروازے پر نسبتاً جدید قسم کا اسلحہ لیے کھڑا تھا۔ دوسرے کو میں اندر جانے والے راستے پر پورچ کے قریب دیکھ سکتا تھا۔ باقی دو کوٹھی کے باہر دیوار کے آخری کناروں پر

لگے ہوئے تھے۔ دیواروں پر ہنگامی ضرورت کے تحت سرچ لائٹس لگائی گئی تھیں جو اندر کے اور باہر کے علاقے کو روشن کر رہی تھیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس روشنی میں کسی کا کوٹھی میں نظر آئے بغیر داخل ہونا ناممکن تھا۔

"سراج ہے؟" خسرو جمشید نے کار کی کھڑکی سے سر نکال کے سنتری سے سوال کیا۔

"ایس پی صاحب۔ لیکن آپ نیچے اتریں" سنتری نے کہا۔

"میں نیچے اتروں؟"

"آپ بھی اور باقی سب لوگ بھی" سنتری نے کہا۔

"لیکن کس لیے؟" خسرو جمشید نے رعونت سے کہا۔

"تلاشی کے لیے" سنتری نے کہا "گاڑی کی تلاشی بھی لی جائے گی۔ آرڈر ہے۔"

"تم جاکے سراج سے کہو...."

"میں کہیں نہیں جاسکتا۔ میری یہاں ڈیوٹی ہے" سنتری نے متاثر ہوئے بغیر کہا۔

"بکواس بند کرو۔ میں سراج کا دوست ہوں" جمشید کا پارہ چڑھ گیا۔

"صاحب کا آرڈر ہے کہ میرا باپ بھی آئے تو اسے اندر مت آنے دو۔ آپ نیچے آجائیں۔"

"اگر سراج آکے کہے گا تو میں اتروں گا۔ ورنہ میں بیٹھا ہوں گاڑی میں اور ساری رات اسی جگہ دروازہ روکے بیٹھا رہوں گا۔ تم سے جو ہوتا ہے کرلو" خسرو جمشید نے کہا اور بٹن دبا کے سب شیشے اور دروازے لاک کر دیے۔

یہ صورت حال سنتری کے لیے غیر متوقع تھی۔ اس نے کچھ احتجاجی شور کیا۔ شیشے بجائے اور دروازے کھولنے کی بے سود کوشش کی۔ پھر آواز دے کر کسی کو بلایا۔ دور کھڑی ہوئی گاڑی میں سے ڈی ایس پی کے عہدے کا ایک افسر سخت خونخوار موڈ میں برآمد ہوا۔ سنتری نے اسے صورت حال بتائی لیکن بند شیشوں کے پیچھے ہم صرف اس کے ہاتھوں اور ہونٹوں کی حرکت ہی دیکھ سکتے تھے۔ اس کی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ڈی ایس پی نے سر ہلایا "چیلنج قبول کر لینے کے انداز میں۔ اور آگے آیا۔ اس نے جیب میں سے ریوالور نکالا اور شیشے کو آہستہ سے بجایا۔ وہ اپنے عہدے غصے اور ارادے سے ہمیں ڈرا کے کام چلانا چاہتا تھا۔ وہ اتنا بے وقوف نہیں تھا کہ کسی شاہانہ مرسیڈیز کا شیشہ توڑ دے اور اپنی مہینے بھر کی تنخواہ یہ نقصان پورا کرنے میں گنوائے۔

جمشید نے شیشہ تھوڑا سا نیچے کیا "میں تمہارے ماتحت کو بتا چکا ہوں کہ سراج کے آنے تک گاڑی اسی جگہ موجود رہے گی اور میں باہر نہیں آؤں گا۔"

"آپ اپنے خلاف شکوک بڑھا رہے ہیں" ڈی ایس پی بولا۔

"ایسی کی تیسی شکوک کی۔ تم دیکھ نہیں سکتے کہ میرے ساتھ کون ہے۔ میں بتا بھی چکا ہوں کہ سراج میرا دوست اور بزنس پارٹنر ہے۔ اگر میرا نام سن کے بھی اس نے گیٹ تک آنے سے انکار کیا تو میں اتر آؤں گا۔ ورنہ وہ خود ہمیں اندر لے جائے گا" خسرو جمشید نے کہا۔

"کیا نام بتایا آپ نے؟"

"میں نے ابھی تک کسی کو نام نہیں بتایا۔ اس لیے کہ کسی نے پوچھا ہی نہیں۔"

"اچھا اب میں پوچھ رہا ہوں۔"

"نواب خسرو جمشید اور سراج سے کہنا کہ ان کی ہمشیرہ بھی ہمراہ آئی ہیں" جمشید بولا "اور یہ ریوالور سوچ سمجھ کے نکالا کرو ڈی ایس پی صاحب۔ میرے محافظوں کے پاس اس سے بہتر اسلحہ ہے۔"

غالباً محسن نے اسے مشین گن اٹھا کے دکھائی کیونکہ ڈی ایس پی کی صورت پر بارہ بج گئے تھے۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا اور پھر گیٹ تک گیا۔ وہاں دیوار پر ایک فون اس طرح نصب تھا کہ آویزاں لگتا تھا۔ اس نے ریسیور اٹھا کے چند منٹ تک بات کی۔ پھر ریسیور رکھ کے ہمارے پاس آیا۔

"اب آپ بتائیں میں کیا کروں" ڈی ایس پی بولا "وہ ماننے کو تیار نہیں کہ نواب خسرو جمشید اپنی بہن کے ساتھ آسکتے ہیں اور ان کے ساتھ کوئی شخص مشین گن لے کر آسکتا ہے۔"

"اگر وہ نہیں مانتا تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟" خسرو جمشید نے کہا۔

"نواب صاحب! وہ مجھے گالیاں دیتے ہیں کہ تم بے وقوف اور گدھے ہو کہ کوئی کچھ بھی کہے مان لیتے ہو۔ وہ خسرو جمشید نہیں کوئی خطرناک آدمی ہے۔ اگر تم نے اسے نہ روکا تو میں تم کو گولی مار دوں گا" ڈی ایس پی کا لہجہ انتہائی بے بسی کا تھا "دیکھیے ضد نہ کیجیے۔ اچھا ایسا کیجیے، یہ گاڑی گیٹ سے اندر لے جائیے۔ اس طرح کہ آدھی اندر ہو اور آدھی باہر اور رفتار کم سے کم ہو۔"

"اس کا فائدہ؟"

"میں پھر بات کرتا ہوں" ڈی ایس پی بولا "کہ وہ خود آپ کو دیکھ لیں۔ کلوز سرکٹ کیمرے سے۔"

"یہ ہوسکتا ہے" خسرو جمشید نے مصالحانہ انداز میں کہا۔

"لیکن یہ سمجھ لیں کہ گاڑی کے سامنے خود میں رہوں گا" ڈی ایس پی نے کہا "گیٹ کھلنے کے بعد آپ کو رکنا ہوگا ورنہ گاڑی میرے اوپر سے گزار کے لے جانی ہوگی۔"

"میں گاڑی گندی کرنا نہیں چاہتا" جمشید نے کہا "گیٹ کھولو۔"

ڈی ایس پی کا چہرہ بگڑ گیا مگر اس کے سامنے ایک نواب تھا جو شاید جھوٹ نہیں کہہ رہا تھا کہ وہ ایس پی کا دوست ہے۔

وہ اتنا خود سر تھا کہ ایک ڈی ایس پی کو کچل کے گزر جانے سے دریغ نہ کرتا، اگر اسے اپنی قیمتی گاڑی پر خون کے چھینٹوں کے داغ پڑنے کا ڈر نہ ہوتا۔ ایک ڈی ایس پی کا خون کتنا قیمتی اور کتنا اہم ہوتا ہے، یہ بات وہ ایک عام آدمی کو بہت اچھی طرح سمجھا دیتا جو اس کے خون کا ایک قطرہ بھی ضائع کرتا۔ اب وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا اور گیٹ سے گزر کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

گاڑی تھوڑا سا کھسکی اور گیٹ کے درمیان میں جا کے رک گئی۔ ڈی ایس پی نے پھر فون کا ریسیور اٹھا لیا تھا۔ اس کے ہینڈ سیٹ کا تار لمبا ضرور تھا مگر اتنا لمبا بھی نہیں تھا کہ دروازے میں دو گز اندر تک گھس جانے والی مرسیڈیز کے سامنے کھڑا رہ کے وہ سراج سے بات کرسکتا چنانچہ وہ بونٹ پر کہنیاں ٹکا کے بہت آگے جھک آیا تھا۔

"سر آپ خود دیکھ لیں۔"

"کیوں۔ خدا نے تمہیں آنکھیں نہیں دی ہیں کیا؟" سراج کی آواز گیٹ پر لگے ہوئے انٹرکام ٹائپ اسپیکر سے سنائی دی۔

"وہ میری نہیں مانتے سر! ان سے کہیں کہ وہ مانیٹر کیمرے کے سامنے آجائیں" ڈی ایس پی بولا۔

چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد سراج کی آواز آئی "جمشید؟"

"ہاں" جمشید نے اس ریسیور کے ماؤتھ پیس میں کہا جو ڈی ایس پی نے سامنے کر دیا تھا "کیا اب مجھے بھی تلاشی دینی ہوگی؟"

"دیکھو۔ برا ماننے کی بات نہیں۔ میں نہیں مان سکتا کہ تمہارے ساتھ زیب النساء بھی ہے۔"

"بھئی ہے نا۔ میں جو کہہ رہا ہوں" خسرو جمشید نے جھنجلا کے کہا "اچھا میری بات کراؤ اس سے۔"

"وہ کرے گی تم سے بات؟" جمشید نے کہا۔

"یار جب آسکتی ہے تو بات کیوں نہیں کرسکتی" سراج نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے نا۔ جب میں ساتھ ہوں تو تم کو ڈر کس بات کا ہے۔ تم میری آواز نہیں پہچانتے ایس پی صاحب۔"

"آواز... تو ٹھیک ہے لیکن یار... زیب النساء کی جگہ کوئی اور نہ ہو" سراج بولا "میں ان دونوں بدمعاشوں کے چکر سے ڈرتا ہوں۔ وہ بھیس بدلنے کے ماہر ہیں۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ میرے بھیس میں سکندر نہ ہو اور زیب النساء کے بھیس میں محسن" جمشید نے برہمی سے کہا۔

"محسن تو نہیں لیکن ایک شخص اور بھی ہے تمہارے ساتھ جس کے پاس مشین گن ہے۔ یہ کون ہے؟"

"میرا باڈی گارڈ۔"

"تمہارے پاس کوئی ایسا باڈی گارڈ پہلے تو نہیں تھا۔"

"پہلے تو تمہارے گیٹ پر بھی یہ ڈراما نہیں ہوتا تھا۔ تم نے تو سرکاری خرچ پر اپنی حفاظت کا بندوبست کیا ہے۔ میں اپنے خرچ پر بھی نہیں کرسکتا؟" جمشید نے کہا۔

"کرسکتے ہو لیکن اسے لے کر یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"باڈی گارڈ ہر جگہ ساتھ رہتا ہے" جمشید نے جواب دیا۔

"ابھی کچھ دیر پہلے تم ہمارے ساتھ تھے، اس وقت تک تم نے ایسا کوئی انتظام نہیں کیا تھا۔ گھر جاتے جاتے تم کو نیا باڈی گارڈ بھی مل گیا؟"

"سراج! میں ساری رات بک بک نہیں کرسکتا۔ تم کو گیٹ تک آنا ہی پڑے گا، آکے دیکھ لو ایس پی صاحب...."

"میں رسک نہیں لوں گا لیکن دیکھنے کی بات ہے تو پلیز، ایسا کرو کہ گاڑی سے نکل کر گیٹ پوسٹ پر کھڑے ہو جاؤ، درمیان میں کسی بھی جگہ اور ہاں، زیب النساء کو بھی اترنے کی زحمت دو، یہ بدتہذیبی نہیں، ایک ضرورت ہے، میں بعد میں تم سے معافی بھی مانگ سکتا ہوں" سراج بولا۔

میرے اشارے پر جمشید نے دروازہ کھولا اور باہر اتر گیا۔ کہیں سے کسی کلوز سرکٹ ٹی وی نے گیٹ کو فوکس کر رکھا تھا تو سراج نے اندر اپنے ٹی وی پر اسے ضرور دیکھا ہوگا پھر جمشید نے پیچھے والا دروازہ کھولا اور زیب النساء کو تقریباً باہر گھسیٹ لیا کیونکہ وہ باہر نکلنے پر آمادہ نہ تھی۔

"بس بس... سوری یار جمشید، میں آرہا ہوں" سراج کی آواز آئی "بھئی گاڑی کے سامنے سے ہٹ جاؤ" یہ آخری جملہ اس نے اپنے ڈی ایس پی سے مخاطب ہو کے کہا تھا۔

"یس سر" ڈی ایس پی نے کہا اور راستہ چھوڑ دیا۔ اتنی دیر میں زیب النساء پھر بیٹھ چکی تھی۔

"آئی ایم ویری سوری سر" ڈی ایس پی نے کہا۔

"کوئی بات نہیں" جمشید نے تلخی سے کہا۔

"آپ کے دوست اب ایس پی نہیں سر! ایس ایس پی ہیں، آپ کو بھی مبارک ہو" ڈی ایس پی نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

"ایس ایس پی؟" خسرو جمشید نے کہا۔

"یس سر! ان کو ضامن رضوی کی جگہ مقرر کیا گیا ہے" ڈی ایس پی نے کہا "ابھی کچھ دیر پہلے آئی جی صاحب نے فون پر احکامات دیے ہیں۔"

ان الفاظ کا صدمہ کتنا شدید تھا، اس کا اندازہ میں نے محسن کی صورت اور محسن نے میری شکل دیکھ کر کیا۔ پھر خسرو جمشید نے ایک تمسخر اڑانے والی اور طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ ہم دونوں کی طرف دیکھا اور نظروں ہی نظروں میں سوال کیا کہ کہو، اب کیا خیال ہے۔ میاں بھٹے کوتوال... اور تمہارے انکل تو

ڈکان اپنی بڑھا گئے۔ گاڑی آگے بڑھی تو میرے ذہن پر ایک ہی سوال کی بازگشت کے ہتھوڑے برس رہے تھے۔ کیا انھیں معطل کر دیا گیا ہوگا؟ ہماری وجہ سے۔ ہماری پریس کانفرنس، ہم سے تعلق، شہلا کو پناہ دینا، جولی اور کیتھرین کا فرار، دو مفرور ڈاکوؤں کے معاملے میں ان کی مجموعی کارکردگی، سراج اور اُس کی پُشت پناہی کرنے والے رشوت خور، لالچی ہاتھوں کی رسّہ کشی، انکل رضوی کی ناپسندیدہ فرض شناسی اور ایمانداری۔ ان سب عوامل نے بالآخر ان کو رسوا کیا، بے اختیار کیا اور شرمسار کیا۔

سراج نے پورچ میں آکے ہمارا استقبال کیا، اس کے لیے یقیناً زیب النساء کا آدھی رات گئے وہاں آنا ایک ناقابلِ یقین بات تھی۔ چنانچہ اس کے ساتھ اس کی بوڑھی ماں بھی باہر آگئی تھی۔ جیسے ہی خسرو جمشید ایک دروازے سے نکلا، دوسرے دروازے سے میں باہر آگیا پھر محسن اُتر آیا اور سراج کا رنگ اُڑ گیا۔ اُس کا ہاتھ غیر ارادی طور پر جیب کی طرف جاتے جاتے رُک گیا۔

"تو... یہ تم ہو؟" سراج نے کہا۔

"ہاں، یہ ہم ہیں، تمھارے سامنے۔" میں نے کہا۔ "تمھارے گھر میں۔"

"مجھے ایک لمحے کے لیے خیال آیا تھا۔" سراج بولا۔

"تمھارے خیال کی... اور ایسے خیال کی کیا اہمیت ہے جس سے وقت گزر جانے کے بعد صرف پشیمانی ملے۔" میں نے کہا۔

"یہ کیا ہے سب؟" سراج کی ماں نے چلّا کے کہا۔ "زیبا! اندر چل بیٹی، ان کو نمٹنے دے اپنے کام سے۔"

"جائیے آپ۔" جمشید نے اپنی بہن سے کہا۔

آنسو زیب النساء کی آنکھوں سے نہ تھمتے تھے اور اس کے لیے قدم اُٹھانا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ سراج کی ماں آگے بڑھی۔

"آپ اِدھر سے آئیں ماں جی۔" محسن نے کہا۔ "پیچھے سے۔"

سراج ابھی تک بے حس و حرکت کھڑا ہُوا اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا اور غصّے سے اُس کا چہرہ سُرخ پڑ گیا تھا۔ محسن نے اُسے زد پر لیا ہُوا تھا اور اگر وہ اس لمحے سے فائدہ اُٹھانا چاہتا تھا، جب ماں اور زیب النساء درمیان میں حائل ہوں گی تو ایسا نہیں ہُوا تھا۔ سراج کی ماں پیچھے سے دوڑتی ہوئی آئی۔

"میں صدقے، روتی کیوں ہے بیٹی، ان لوگوں نے کچھ کہا ہے تجھ سے تو بتا۔" اس نے زیب النساء کو تھام لیا اور اپنے ساتھ لے جانے لگی۔ زیب النساء نے نفی میں گردن ہلا کے اس خیال کی تردید کر دی تھی کہ ہم نے اس کے ساتھ بد سلوکی یا کسی قسم کی زیادتی کی ہو گی۔ یہ صورتِ حال بڑی عجیب تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے جب زیب النساء اپنے کمرے کی خلوت میں اپنے خیالوں کے ساتھ تنہا تھی اور صرف اپنی مصوّری کے شوق میں کھوئی ہوئی تھی تو وہ تصوّر بھی نہیں کر سکتی تھی کہ ابھی اچانک دو مسلح افراد اس کے کمرے میں وارد ہو جائیں گے اور پھر اُسے رخصت کر کے یوں سسرال جانا ہوگا کہ کسی کے سر پہ سہرا ہوگا اور نہ وہ دُلہن بنے گی۔ اسے بارات کے ساتھ نہیں مسلح حملہ آوروں کے ساتھ خود چل کے دُلہا کے گھر میں اُترنا پڑے گا۔ اتنی بے بسی اور بے عزّتی کے ساتھ۔

"ہم نے تمھاری ماں کو اور اس کی بہو کو کچھ نہیں کہا ہے ایس ایس پی صاحب۔ صرف اس اُمید میں کہ وہ بھی کسی سے کچھ نہیں کہیں گی۔" میں نے کہا۔ "یا میں ٹیلی فون کی لائن کاٹ دوں؟"

"میری ماں تمھارے عزائم کی راہ میں حارج نہیں ہوگی، وہ تم کو بچانے کے لیے بھی نہیں آئے گی۔" سراج بولا۔

"اس کے ہم کیا لگتے ہیں، بس اسے سمجھا دینا کہ وہ تم کو بچانے بھی نہ آئے۔" محسن نے کہا۔ "ہم یہاں جان ہتھیلی پر رکھ کے پہنچے ہیں اور اس بارے میں کوئی شبہ تمھارے دل میں ہے تو نکال دو کہ تم اپنی چالاکی سے یا اپنے اختیارات اور وسائل سے کام لیتے ہوئے ہمیں گرفتار کرا دو گے یا ہمارا راستہ روک لو گے۔ ہم محاورے کے مطابق ہی نہیں، عملاً کشتوں کے پُشتے لگا دیں گے۔"

"ان کو کیوں اغوا کر کے لائے ہو؟" سراج نے کہا۔

"ہم یہاں کھڑے رہ کر مذاکرات جاری نہیں رکھیں گے۔" میں نے کہا۔ "اندر چلو، وہیں جہاں تمھاری ماں اور تمھاری ہونے والی بیوی ہیں۔"

"اور اگر میں انکار کروں...؟" سراج نے مشتعل ہو کے کہا۔

"تو تم یہاں سب کے سامنے مار کھاؤ گے؟" میں نے کہا۔ "تمھارے نچلے درجے کے ماتحت بھی دیکھیں گے کہ ایس ایس پی بنتے ہی تم کو مرغا بننا پڑا۔"

"یہ پروموشن تمھارے حق میں سخت نامبارک ثابت ہو گی۔" محسن بولا۔

"او کے، اندر چلو، اگر اتنا ہی ضروری ہے۔" سراج نے اپنی شکست کو قبول کر لیا۔ "مگر ایک وضاحت میری بھی سن لو، مجھے تم اس طرح اغوا کر کے نہیں لے جا سکو گے جیسے تم دلاور کو لے گئے تھے یا اب جمشید کو اٹھا لائے ہو۔"

"ہم تمھارے سامنے ہی جمشید کو بھی چھوڑ دیں گے۔"

میں نے کہا۔ "ہم جس مقصد کے تحت آئے ہیں، وہ مختلف ہے۔"

ایک بڑے کمرے میں سراج کی ماں، زیب النساء کو چپ کرانے کی اور یہ پوچھنے کی کوشش میں مصروف تھی کہ ہم کون ہیں

... کیوں لائے ہیں مگر زیب النساء نے ابھی تک کچھ ... نہیں بتایا تھا۔

"... اب کیا ہے؟" سراج کی ماں نے ہمیں دیکھتے ہی کہا۔ "... کیوں چلے آئے ہو؟ کیا مقصد ہے تمھارا؟"

"ہمارے یہاں آنے کا مقصد جان کے آپ کیا کریں گی، ... کاروباری معاملات ہیں۔" میں نے کہا۔

"کاروباری معاملات یوں طے ہوتے ہیں! ہم بندوق کے ... اور اگر ہوتے ہیں تو جاؤ دوسرے کمرے میں۔" وہ گرم ... کے بولی۔

"کچھ مجبوریاں ہیں ایسی کہ ہم یہاں رہیں گے۔" میں نے ... آپ کے سامنے..."

"ایسی بد معاشی پر تم کو شرم آنا چاہیے۔"

"ماں جی! آپ کے بیٹے کا تو سارا دھندا ہی ایسا ہے، ... سب ہے اس کا واسطہ اور تعلق بد معاشوں سے ہی رہتا ہے۔" ... نے کہا۔ "شریف آدمی تو پولیس کے سائے سے بھی بھاگتا ... اور پولیس خود بھی کسی شریف طبقے سے تعلق نہیں رکھتی، ... شرم کی تو بات ہی نہیں۔"

"ہم زیادہ دیر نہیں رُک سکتے۔" محسن نے کہا۔ "خسرو جمشید! ... تم جاؤ اور دلاور کے گھر سے دس لاکھ روپے لے آؤ۔"

میں نے خط نکال کے جمشید کو دیا۔ سراج نے اس کو ... سے دیکھا تو خط میں نے اُس کی طرف بڑھا دیا۔ "تم بھی ... ویسے اگر کسی کی بیوی کے نام خط ہو تو اسے پڑھنا نہیں ... چاہیے لیکن یہ پرائیویٹ بات نہیں ہے۔"

سراج نے خط لے لیا اور کھول کر پڑھا۔ محسن مشین گن ... لے ایک کونے میں کھڑا رہا۔ وہیں ایک ٹیلی فون بھی رکھا ہُوا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ مار کے اس کا کنکشن توڑ دیا۔ سراج کی ... ماں نے اب سمجھ لیا تھا کہ صورتِ حال سنگین ہے چنانچہ وہ ... اپنی ہونے والی بہو کو سمیٹ کر بیٹھ گئی تھی اور خاموش تھی۔

"اس بات کی کیا ضمانت ہے...؟"

"کوئی ضمانت نہیں۔" میں نے سراج کی بات کاٹ دی۔ "ضمانت طلب کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہو۔"

"جاؤ جمشید۔" سراج نے کچھ دیر سوچ کے کہا۔

"تمھارے پاس صرف ایک گھنٹا ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر ... دلاور کی بیوی کے پاس ہو گی تو دیر لگنی بھی نہیں چاہیے۔ اگر تم نے بے وقوفی کی اور اپنے ساتھ پولیس یا فوج کی پوری ... پلٹن لے آئے، تب بھی تم آسانی سے ہمیں گرفتار نہیں کرا ... سکو گے۔ ہم مر جائیں گے اور مرنے سے پہلے سب کو مار جائیں ... گے، مرنے والوں میں زیب النساء بھی شامل ہو گی۔"

"تم میں سے کون میرے ساتھ جائے گا؟" جمشید نے کہا۔

"کوئی بھی نہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن واپسی میں تم کو ایک کام اور بھی کرنا ہو گا۔ تم دلاور کی بیوی کو یا اُس کی بہن کو ساتھ لاؤ گے۔"

"یہ اس خط میں نہیں لکھا ہے۔" جمشید نے کہا۔

"یہ ہم کہہ رہے ہیں، ہمیں ضامن بھی تو چاہیے۔" میں نے کہا۔

"اگر دلاور کو لانا ہے تو خود اس کی بیوی جا کے لا سکتی ہے، وہ ہمارے ساتھ نہیں ہو گی تو ہم غیر محفوظ رہیں گے۔"

"میں کوشش کروں گا مگر وہ راضی نہ ہوئی تو...؟"

"تم اُسے راضی کر سکتے ہو۔ عورت ذات کو چکر دینا تمھارے لیے کیا مشکل ہے۔"

"وہ دلاور کی بیوی ہے۔" خسرو جمشید نے کہا۔

"تم زبردستی بھی تو کر سکتے ہو... یا دھمکی دینے سے آگے کچھ کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔" میں نے کہا۔ "میں نہیں مان سکتا کہ تم اتنے نااہل ہو کیونکہ جن کے تم ساتھی ہو، وہ تو اس ملک کے قانون کو، حکومت کو اور عوام کو چکر دے رہے ہیں اور ان کے دشمنوں سے آزادی اور حب الوطنی کا سودا کر رہے ہیں۔ ملک کے اندر قتل و خونریزی اور دہشت گردی کی کارروائیوں میں مصروف ہیں لیکن معزز و معتبر بھی بنے ہوئے ہیں۔ تم سب کی آنکھوں میں دُھول جھونکنے والوں کے ساتھی ہو۔ سانپ چوروں کے ساتھ ہو جو کوتوال بنے پھرتے ہیں اور اب تو خیر سے اپنے چوہدری دلاور صاحب عوام کے محبوب رہنما بننے کا فیصلہ کر چکے ہیں بلکہ... پریس کانفرنس میں اپنی خیر خواہی اور خدمتِ خلق کے جذبات کا اظہار بھی فرما چکے ہیں اور تم یہ ظاہر کر رہے ہو کہ بہت معصوم ہو۔ جاؤ خسرو جمشید عرف مرشد رضا، وقت ضائع مت کرو، جیسے بھی ہو، دس لاکھ کی رقم ایک ضامن کے ہمراہ لے آؤ۔ ہم صبح ہونے تک انتظار نہیں کریں گے۔ اس بات کا خیال رکھنا، تمھارے پاس ایک گھنٹا ہے، پانچ دس منٹ کی رعایت مل جائے گی، اس سے زیادہ نہیں۔" میں نے دیکھا کہ زیب النساء میری بات پر دم بخود بیٹھی ہے۔

"دیر سے آؤ گے تو یہاں کوئی بھی نہیں ملے گا۔" محسن نے کہا۔

"ممکن ہے چند لاشیں ملیں۔" میں نے کہا۔ زیب النساء کا چہرہ لاش کی طرح سفید پڑ گیا۔

"مگر وہ ہماری لاشیں نہیں ہوں گی۔" محسن نے کہا۔

ہمارے لہجے اور اعتماد نے خسرو جمشید کے قدموں کے نیچے سے زمین کھینچ لی۔ اُس نے کانپتے ہاتھوں سے چابی لی اور باہر نکل گیا۔ سراج اُس کے ساتھ جانے لگا۔

"تم کہاں جا رہے ہو؟" میں نے اُسے دروازے میں ہی

روک لیا۔

"میری اجازت اور میرے حکم کے بغیر محافظ اسے نہیں نکلنے دیں گے۔" وہ بولا۔

"تم اُن کو اندر رہ کے بھی تو احکامات دے سکتے ہو یا تم یہ بات بھول گئے ہو؟" میں نے کہا۔

"وہ... انتظام دوسرے کمرے میں ہے۔" سراج بولا۔

"میں اس نظام کی کارکردگی کا بذات خود مشاہدہ کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "چلو۔"

"تم حد سے بڑھ رہے ہو، میرے گھر میں مجھ پر حکم چلا رہے ہو۔" سراج نے چراغ پا ہو کے کہا۔

"میں تمھارے گھر میں تم پر بلڈوزر بھی چلا سکتا ہوں اُلو کے پٹھے۔" میں نے دہاڑ کر کہا اور سراج کے سر پر مُکا مارا۔ وہ جھٹکا کھا کے آگے جھکا اور نیچے گر گیا۔ اُس کی ماں نے اور زیب النساء نے ایک ساتھ چیخ ماری۔

"خدا کے لیے رحم کرو۔" سراج کی ماں چلائی۔ "تم کو جو کچھ چاہیے لے جاؤ، جو بھی اس گھر میں ہے۔"

سراج کھڑا ہو گیا۔ اپنی ماں اور منگیتر کے سامنے اُس کی سخت تذلیل ہوئی تھی۔ وہ پُرانا ایس پی تھا جو کڑوے کریلے سے کم نہیں ہوتا۔ اب وہ ایس ایس پی ہو کے گویا نیم چڑھ گیا تھا مگر یہاں وہ صرف دو افراد کے سامنے اپنی ساری کڑواہٹ کو خود ہی پینے پر مجبور تھا۔

"آپ دُور رہیں ماں جی۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "ہم ڈاکو نہیں ہیں۔"

"ڈاکو نہیں ہو تو پھر کون ہو نامرادو؟" سراج کی ماں نے رو کے کہا۔

"ہم علی بابا ہیں اور ہمارا واسطہ چالیس چوروں سے ہے۔ تمھارا یہ ایس پی بیٹا ایک چور ہے۔ دوسرا چور اس کا سالا ہے۔" میں نے کہا۔

"آپ... آپ کو شرم آنا چاہیے ہمارے بھائی کو چور کہتے ہوئے۔ کیا خاندانی شرفا کی یہی عزت رہ گئی ہے؟" زیب النساء نے روتے ہوئے کہا۔

مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ "تم ایک بے وقوف اور کم عقل لڑکی ہو، جس کو یہ بھی نہیں معلوم کہ شرافت کسے کہتے ہیں۔ تمھاری آنکھیں بند ہیں جیسے اندھا اپنی کالی دُنیا میں رہتا ہے۔ ایسے ہی تم اپنی تصویروں کے ساتھ زندگی گزار رہی ہو۔ تصویریں گونگی بہری ہوتی ہیں، سب کچھ دیکھتی ہیں، تب بھی خاموش رہتی ہیں اور اتنی مجبور ہوتی ہیں کہ کوئی بھی انھیں بنا یا بگاڑ سکتا ہے۔ ان کے خدوخال مسخ کر سکتا ہے اور انھیں تباہ کر سکتا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو تم بھی ایک تصویر ہو، خوبصورت مگر صرف نقشِ خیال جو کینوس کے رنگ میں قید ہو جائے۔ تم کو ... کی دُنیا دیکھنے کی فرصت نہیں ملی یا اجازت نہیں ملی مگر اب ... آ گیا ہے زیب النساء کہ تم دُنیا کو اپنی آنکھوں سے دیکھو ... ابھی تمھیں کیا معلوم کہ نیکی کیا ہے اور بدی کیا ہے، کون شریف ہے اور کون ڈاکو۔"

"تم یہاں تقریر کرتے رہو گے۔" سراج نے کہا۔ "باہر ... نے گاڑی کو روک رکھا ہوگا۔"

"محسن باقی تقریر کرے گا لیڈیز۔" میں نے کہا۔ "فصاحت و بلاغت میری زیادہ ہے مگر حقائق سے وہ بھی آپ کو آگاہ کر سکتا ہے۔"

"جی تو میں... میرا مطلب ہے میرے دوست کیا ... رہے تھے؟" محسن نے فوراً بات یوں شروع کی جیسے کرکٹ میں ایک کمنٹری کرنے والے سے دوسرا مائیک لیتا ہے۔ "بات تھی علی بابا اور چالیس چوروں کی..."

میں اور سراج کمرے سے نکل گئے۔ سراج آگے تھا ... نے ایک کمرے کا دروازہ بڑی چالاکی سے کھولا۔ بظاہر وہ اس بند دروازے کے سامنے سے سیدھا گزرنے والا تھا مگر اچانک اُس نے دروازے کو ٹکر ماری اور ایک دم اندر ہو کر دروازہ بند کرنا چاہا۔ میں نے دروازے کو کندھے سے روک کر دھکیلا لیکن خود ایک دہلیز اور پٹ کے درمیان پھنس گیا۔ سراج نے کوشش کو ناکام ہوتا دیکھ کے ایک وحشیانہ قوت کے ساتھ دروازے کو دبایا جیسے وہ مجھے بیچ میں ہی سینڈوچ کر دے گا مگر میں نے ریوالور والا ہاتھ اندر ڈال کے اُس کی کلائی پر وار کیا۔ میرا ایک پیر دروازے میں بُری طرح دبا ہوا تھا۔ ریوالور کا یوں استعمال کرنا ایک غلطی بن گیا۔ سراج کے ہاتھ پر چوٹ ضرور آئی تھی مگر اُس نے حاضر دماغی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دروازے کو چھوڑ کے میرے ریوالور والے ہاتھ کو قابو میں کر لیا۔ اُس نے اب میری کلائی کو دروازے کے کونے پر مارا۔ ریوالور میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور میں دروازے سے ایک دم اندر گیا۔ میرے جسم کا سارا بوجھ دروازے پر تھا۔ سراج کے ہٹتے ہی دروازہ پیچھے ہُوا تو میں خود کو نہ سنبھال سکا۔ تاہم اُس کی غلطی نے میری جان بچالی۔ کمرے میں ایک اسپیکر چلانے لگا۔ "ہیلو، ہیلو سر۔"

سراج نے ریوالور ہاتھ میں لیتے ہی گولی چلائی تھی لیکن میں جھک کر مُنہ کے بل فرش کی سمت جا رہا تھا چنانچہ گولی مجھے نہیں لگی اور شاید میرے سر سے اُوپر نکل گئی۔ پھر میں نے خود کو سنبھال لیا اور ابھی سراج کی طرف پلٹا ہی تھا کہ ایک ... کی آواز اور پھر دوسرا فائر ہونے کی آواز سُنی۔ یہ پہلے ... فائر سے مختلف آواز تھی۔ "یہ کیا ہے سر؟" اسپیکر نے ... "ہیلو۔"

"بس جی اب سیدھے کھڑے ہو جاویں آپ۔" کسی نے ... میں نے دیکھا تو مجھے پولیس کی وردی میں ایک اے ایس آئی ... نظر آیا جو اپنے ریوالور کا رُخ میری جانب کیے سکون سے کھڑا ... رہا تھا۔ خود سراج نے اپنے اشتعال کے جذبات پر قابو ... تھا اور پیچھے ہٹ گیا تھا ورنہ وہ چاہتا تو اتنی دیر میں ... دوسری گولی میرے سر میں اُتار سکتا تھا۔ اسپیکر اب بھی پکار رہا تھا۔ "ہیلو... ہیلو۔"

"کیوں بے، یہ کیا دنگا کر رہا تھا؟" اے ایس آئی میری جانب بڑھا۔ میں نے ہاتھ اوپر اُٹھا لیے اور احمقوں کی طرح مسکرانے لگا۔ "بس ایسے ہی جی۔"

"اتنی ہمت تیری سالے، مسکرا رہا ہے۔" اے ایس آئی بولا۔ "ہم نے خود تیس مُردے گاڑے ہیں مسکراتے ہوئے، ان کے ڈھانچے بھی مسکرا رہے ہوں گے۔"

"واہ واہ... پھر تو آپ تیس مار خاں ہیں۔" میں نے کہا۔ سراج نے بالکل آخری وقت میں اے ایس آئی کو خبردار کرنا چاہا کہ وہ میرے قریب نہ جائے مگر اُسے پھر بھی دیر ہو گئی۔ ایک سیکنڈ میں تیس مار خاں فضا میں کبوتر کی طرح اُڑتے ہوئے اور فرش پر نظر آئے۔ سراج نے فائر کیا، گولی اس راستے سے گزری جس پر اُڑتے ہوئے تیس مار خاں نیچے آ رہے تھے۔ ان کی ایک ٹانگ کی گولی سے ملاقات ہوئی۔ تیس مار خاں ہوا میں ہی اُچھلے، چلائے پھر گرے تو دوسری بار چلائے۔ غالباً انھوں نے کلمہ پڑھا تھا۔

محسن اپنی مشین گن کے ساتھ اندر آ گیا۔ "بند کرو یہ آتش بازی۔" اُس نے ایک نظر میں صورتِ حال کا جائزہ لے کر کہا۔ "سراج! ... میں تین تک گنوں گا۔" لیکن گنتی شروع کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ سراج نے خود ہی ریوالور نیچے گرا دیا۔ میں ریوالور اُٹھانے کے لیے جھکا اور اچانک میں نے اُسے ٹانگوں سے پکڑ کے اُٹھایا اور اسے اے ایس آئی تیس مار خاں پر پھینک دیا، وہ بُری طرح بلبلایا پھر باہر سے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سُنائی دی۔ سراج کے چہرے پر مُردنی کی جگہ بشاشت نے لے لی۔

محسن ایک دم بائیں جانب دوڑ کر اس پردے کے پیچھے ... پوزیشن ہو گیا جو غالباً باتھ رُوم کے دروازے پر پڑا ہُوا تھا۔ میں نے فوراً سراج کے پیچھے پوزیشن سنبھال لی۔

"یہ تمھارے رکھوالے کُتے ہیں۔" میں نے ریوالور کی نال کو ... سے چھو کر کہا۔ "انھیں واپس کر دو، اچھی طرح سمجھا کے۔"

ڈی ایس پی دروازے میں نمودار ہُوا تو ہانپ رہا تھا۔ "خیریت تو ہے سر؟"

"تم سے کس نے کہا کہ خیریت نہیں ہے؟" سراج نے کہا۔ میں اس کے پیچھے لاتعلقی سے کھڑا مسکرا رہا۔

"میں نے فائرنگ کی آواز سُنی تھی۔" ڈی ایس پی نے مجھ پر نظر جما کے کہا۔ "اور کوئی ریسیور پر جواب بھی نہیں دے رہا تھا۔"

"پھر بھی تم کو ڈیوٹی چھوڑ کے اندر نہیں آنا چاہیے تھا۔" سراج نے کہا۔

"سر، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں! میری ڈیوٹی ہے آپ کی حفاظت کرنا اور میں کوئی غیر معمولی بات دیکھوں یا سُنوں تو یہ میرا فرض ہے کہ میں معلوم کروں۔" ڈی ایس پی نے کہا، وہ کوئی احمق نہیں تھا کہ صورتِ حال کا صورتوں سے اندازہ نہ کر سکتا۔ اس عہدے تک پہنچنے میں اس نے پندرہ بیس سال تک پولیس میں پاپڑ بیلے تھے۔ اُس نے تاڑ لیا تھا کہ انہونی ہو چکی ہے اور اس کا افسرِ اعلیٰ ٹریپ ہو گیا ہے، چنانچہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے مجبوری میں کہہ رہا ہے لیکن وہ اپنے شک کا اظہار کرتا تو خود بھی پھنس جاتا۔

"تم یہاں کیوں کھڑے ہوئے ہو؟" ڈی ایس پی نے سب انسپکٹر تیس مار خاں کو ڈانٹا۔ "سیٹ پر تمھارا باپ بیٹھے گا؟"

اُس نے کچھ کہنے کے لیے مُنہ کھولا اور پھر خاموشی سے اس میز پر جا بیٹھا، جس پر ایک ٹی وی اور ایک ٹرانسمیٹر قسم کی چیز رکھی ہوئی تھی۔ اس کے بہت سے ڈائل تھے اور سوئچ تھے اور اس کی ایک سُرخ روشنی ظاہر کرتی تھی کہ یہ مواصلاتی رابطہ کام کر رہا ہے۔ اس ٹرانسمیٹر سے نکلنے والے مختلف تاروں میں سے ایک ٹیلی فون کے ساتھ ملا ہُوا تھا۔ دوسرا ایک ٹیپ ریکارڈر سے اور تیسرا باہر جا رہا تھا جو شاید ایریل تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہاں جو کچھ کہا اور سُنا جاتا تھا، ٹیلی فون پر یا براہِ راست، وہ سب ریکارڈ ہوتا تھا اور شاید نشر ہونے کے بعد کسی دوسری جگہ بھی پہنچتا تھا۔ ٹیلی ویژن پر مجھے کوٹھی کا صدر دروازہ نظر آ رہا تھا اور نواب خسرو جمشید کی گاڑی بھی دکھائی دے رہی تھی۔ سراج نے اُسے آف کر دیا۔

"سر، وہ آپ کے دوست؟" ڈی ایس پی نے ٹی وی کی جانب اشارہ کیا۔ "ان کو جانے دیں؟"

"ہاں، جانے دو انھیں۔" سراج نے کہا۔ "اور کچھ دیر بعد وہ آئیں گے تو انھیں روکنا نہیں ہے، ممکن ہے اُن کے ساتھ کوئی اور بھی ہو۔"

"اور کون سر؟"

"خواتین ہو سکتی ہیں۔" سراج نے کہا۔ "تم وہی کرو جو میں کہہ رہا ہوں، نہ اس سے زیادہ نہ کم۔ اپنی عقل سے کام لے کر کچھ

کرنے کی ضرورت نہیں، سمجھے۔"
"یس سر۔" ڈی ایس پی نے سمجھتے ہوئے کہا۔
"تم میرے ماتحت ہو میں حکم عدولی بالکل برداشت نہیں کرتا، اگر تم نے مجھ سے پوچھے بغیر کچھ کیا تو میں تم کو معطل کرا دوں گا۔" سراج بولا۔
"میں کچھ نہیں کروں گا سر۔" ڈی ایس پی بولا۔
"کچھ نہیں کا مطلب سمجھتے ہو، کسی سے فون پر یا وائرلیس پر بات نہیں کرنا ہے، میں خود بات کروں گا، اگر کہیں سے پیغام آئے تو مجھے بتاؤ۔ کوئی کچھ بھی پوچھے تو تم جواب دینے سے پہلے مجھ سے پوچھو۔ رائٹ؟"
"رائٹ سر۔" ڈی ایس پی اندر آکے پچھتا رہا تھا۔
"اگر تمھاری وجہ سے نقصان ہوا، یہ سمجھ لو کہ نقصان بہت سنگین ہو سکتا ہے اور ناقابلِ تلافی بھی" سراج بولا "تو تم کچھ نہیں کر سکو گے۔"
"سیدھی صاف بات سنو۔" محسن اچانک پردے کے پیچھے سے نکل آیا۔ "تمھارے ایس ایس پی اور اس گھر کے تمام افراد کی زندگی اور موت کا انحصار تمھارے رویّے پر بھی ہے، یہ ہماری قید میں ہیں، باہر کی صورتِ حال کو ہوشیاری سے کنٹرول کرو تاکہ ان کی جان بچی رہے ورنہ ان کے ساتھ ہم ہی نہیں شاید تم بھی مارے جاؤ گے۔ باہر ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں آجائیں تب بھی ان سب کی جان بچانے کوئی اندر نہیں آسکتا، آئے گا تو صرف لاشیں پائے گا۔"
"ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد ہم چلے جائیں گے۔" میں نے ریوالور نکال کے کہا۔ "تم ہمیں خیریت کے ساتھ نکل جانے دو گے تو یہاں بھی سب خیریت ہی رہے گی ورنہ . . ."
"یس . . . آپ بالکل فکر نہ کریں۔" ڈی ایس پی نے ہونٹوں پر زبان پھیر کے کہا۔ "کیا اب میں جا سکتا ہوں؟"
"جاؤ۔" میں نے کہا۔ "مواصلاتی رابطہ ٹوٹنا نہیں چاہیے ورنہ شکوک پیدا ہوں گے۔ سب کو بتاتے رہو کہ سب ٹھیک ہے، بعد میں تم اپنی مجبوری کی وضاحت کر سکتے ہو۔ ایس ایس پی صاحب تمھیں بچائیں گے اور اگر تم نے ان کو مزید مشکلات میں مبتلا نہ کیا تو تمھارے بارے میں اچھی رپورٹ بھی دیں گے۔"
ڈی ایس پی واپس جانے لگا تو محسن نے کہا۔ "ڈی ایس پی، جو کچھ تم نے دیکھا یا سنا اور تم سے کہا گیا، وہ صرف تمھارے لیے تھا باہر جو تمھارے ماتحت ہیں انھیں کچھ بتانا ضروری نہیں۔"
"آپ مجھ پر بھروسا کریں، میں ایسی کوئی بات نہیں ہونے دوں گا۔" وہ بولا۔
"تمھارا یہ ماتحت واقعی سمجھ دار ۔ ۔ ۔ بے وقوف

بنا کے نکل جانا چاہتا تھا۔" میں نے کہا۔ "وہ باہر جا کے اپنی خود مختاری سے ناجائز فائدہ تو نہیں اُٹھائے گا؟"
"تم اگر مطمئن نہیں ہو تو میں کیا کر سکتا ہوں۔" سراج بولا۔
"اب آپ بھی جائیں۔" میں نے محسن سے کہا۔ "آپ کا لیکچر ڈسٹرب ہوا، خواتین باقی لیکچر سننے کے لیے بے چینی سے منتظر ہوں گی، انھیں سب سمجھا دینا۔"
"خاک سمجھا دوں، عجیب کوڑھ مغز خواتین ہیں۔" محسن بولا۔
"جب آپ نے خواتین کہہ دیا تو کوڑھ مغز کہنا ضروری نہیں۔" میں نے کہا۔
"مناسب وقت پر یہ بات خواتین تک پہنچا دی جائے گی۔ ان خواتین تک جو آپ کی رائے بدل سکتی ہیں۔" محسن بولا۔ "میرے لیکچر سے مستفید ہونے والی تو کچھ سمجھنے کے لیے تیار ہی نہیں۔ وہ دراصل ایک ماں ۔ ۔ ۔ ایک منگیتر، ایک بہن ہے تو ایک بیوہ، ایک ساس ہے اور ایک بہو، ایک سیدھی سادی عورت ہے تو ایک معتورہ۔"
"اُف! میں دو کو چھوڑ کے آیا تھا، یہ دس کیسے جمع کر لیں تو نے؟" میں نے سر پہ ہاتھ مار کے کہا۔ محسن ہنسا اور واپس چلا گیا۔
"ہاں بھئی۔" میں نے اے ایس آئی کے کندھے پر ہاتھ مارا۔
"آہ! قسم اللہ کی بڑا دکھ رہا ہے۔" وہ کراہ کے بولا۔
"تمیں مسکراتے ہوئے مُردے گاڑے ہیں۔ میرا خیال ہے اس وقت بھی وہ مسکرا رہے ہوں گے، تمھاری حالت پر۔" میں نے کہا۔
"وہ تو میں ایسے ہی کہہ رہا تھا۔" وہ پان چباتے ہوئے بولا۔
"ہمت سے کام لو، خود تم کو اکتیسواں مسکراتا ہوا مُردہ بننا ہے۔ منکر نکیر کے سامنے بھی مسکراتے رہنا۔ صورِ اسرافیل سن کے مسکراتے ہوئے اُٹھنا۔" میں نے کہا۔ "اور یہ جو تم شیطانی جھاڑ جھنکار لیے بیٹھے ہو، اس میں بھی کسی سے بات کرو تو مسکراتے ہوئے بات کرنا، کیسے بھلا؟ ذرا مسکرا کے دکھاؤ۔"
"ہیں جی؟" وہ بوکھلا گیا۔
میں نے اس کے ایک ہاتھ مارا، وہ کرسی سمیت لڑھک گیا اور بڑی مشکل سے اُٹھا۔
"مسکراؤ۔" میں نے دہاڑ کر کہا۔ اُس نے زبردستی بتیسی کی نمائش کی۔
"ہم اب یہیں بیٹھ جاتے ہیں۔" میں نے کہا، وہ کھانے کا کمرا تھا اور کھانے کی میز پر ہی ریڈیو، ٹیلی فون، وائرلیس اور کلوز سرکٹ ٹی وی کا تمام اسباب پھیلا ہوا تھا۔ دو کرسیاں لے کر ہم ایک طرف بیٹھ گئے۔ سراج نے ہی نہیں اُس کے سر ماتحت نے اب تسلیم کر لیا تھا کہ دشمن ان کے قلعے

ہو کے انھیں یرغمال بنا چکا ہے اور اس کی طاقت کا مقابلہ کرنا جان گنوانے کے مترادف ہے۔ سراج یہ بھی سمجھتا تھا کہ اسلحہ نہ ہونے سے اسے فرق پڑتا ہے، مجھے نہیں۔ وہ ایک بزدل اور کم ہمت آدمی تھا۔ ہر لالچی اور خود غرض آدمی کے لیے جرأت اور بہادری، غیرت و حمیت اور اعلیٰ انسانی صفات کی پاسداری اتنی اہم نہیں ہوتی جتنی اپنی زندگی، کیونکہ زندگی اُس کے لیے ہوسِ زر اور بے لگام خواہشوں کا سرچشمہ رہتی ہے اور وہ کسی مقصد کے لیے جان دے کر گھاٹے کا سودا کبھی نہیں کرتا، وہ آتشِ نمرود میں کبھی نہیں کودتا۔
"کیا تم واقعی دس لاکھ لے کر چلے جاؤ گے؟" سراج نے کہا۔
"تمھارا اندازہ کیا کہتا ہے؟" میں نے کہا۔
"میرے خیال میں تمھارے لیے دس لاکھ کی رقم کچھ نہیں، جب تم اس سے دس گنا یا سو گنا لے سکتے تھے تو تم نے نہیں لیے تھے۔" سراج بولا۔
"تمھارا دماغ ابھی تک صحیح خطوط پر سوچ رہا ہے، ہم دس لاکھ تمھیں بخش کے بھی جا سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "مگر بخشیں گے نہیں۔ تمھارے پاس حرام کا مال جمع کرنے کے ذرائع پہلے بھی کم نہ تھے، اب اور زیادہ ہو جائیں گے، تم ایس ایس پی جو ہو گئے ہو، ماننا پڑتا ہے کہ تمھارے پیچھے بہت لمبے ہاتھ ہیں۔"
"مجھے اندیشہ ہے کہ تم دلاور کی بیوی کو لے جاؤ گے۔"
میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ "اُسے ہی نہیں، تمھاری منگیتر کو بھی . . ."
"وہ ایسی لڑکی نہیں ہے، وہ مر جائے گی۔" سراج بولا۔
"مر جانے دو، تم سے شادی کر کے وہ موت سے بدتر عذاب تو نہیں جھیلے گی اور جیتے جی درگور تو نہیں ہو گی۔" میں نے کہا۔
"اس کا مطلب ہے، تم میری ماں کو بھی لے جاؤ گے؟"
"ہاں، یہ ماں، بہن یا بیوی کے سب رشتے جذبات کے رشتے ہیں اور تمھارا بھلا جذبات سے کیا رشتہ۔" میں نے کہا۔ "ویسے بھی تم پولیس والے ہو، رشتوں کی قدر و قیمت اور آبرو کو سمجھتے تو رابعہ اور کیتھرین کا لحاظ کرتے، تم کو اب ہم سے کسی رعایت کی توقع کیوں ہے؟" میں نے کہا۔ "بہت مجبور ہو کے ہم نے یہ قدم اُٹھایا ہے۔ وقت نے ہمیں سمجھا دیا ہے کہ جنگ میں رشتے اور جذبات ہی آدمی کی کمزوری بنتے ہیں۔ میں بہت پہلے خود کو قائل کر چکا ہوں کہ میری محبت رابعہ کو تحفظ فراہم نہیں کر سکی تھی، اُلٹا وہ رابعہ کے حق میں نقصان دہ بن گئی تھی۔ تم نے اسے مجھ پر غلبے کے لیے استعمال کیا، اُس کے ساتھ وہ سب کیا جو شاید نازی سپاہ نے اپنے کیمپوں میں عورتوں کے ساتھ نہ کیا ہو گا۔ اُس کو

میں نے دیکھا، تم نے مجھے دیکھنے پر مجبور کیا۔ اُس وقت تم نے نہیں سوچا تھا کہ تم ہی مجھے بے حس اور سفاک بنا رہے ہو، میرے ذہن کو بدل رہے ہو، خود اپنے خلاف . . . آج میں اتنا پتھر دل ہو گیا ہوں کہ وہ سب کر سکتا ہوں جو تم نے کیا تھا۔ تمھاری ماں یا زیب النساء اور دلاور کی بیوی، یہ سب وسیلے ہو گئے ہیں تم پر غلبہ پانے کے، میں احترامِ آدمیت کے احساس سے بیگانہ ہو گیا ہوں۔ تمھاری کوششوں کے طفیل اور آگے چل کے شاید شیطان بھی بن جاؤں۔ جو اذیت میں جھیل چکا تم وہ اب جھیلو گے۔"
"رابعہ ہماری قید میں نہیں ہے۔" وہ اپنے ہونٹ کاٹتا رہا۔
"پھر کیا ہوا، ضامن رضوی صاحب کے گھر پر چڑھائی کر دو، وہاں سے محسن کی بیوی کو اُٹھا لو۔" میں نے کہا۔ "کیتھرین اور جو لی کو تلاش کر لو، رابعہ کو پھر پکڑ لو۔"
"ہم آپس میں سمجھوتا بھی تو کر سکتے ہیں۔"
میں ایک دم اُٹھا اور میں نے اُس کے چہرے پر مکّے مارے۔ اسے کئی بار نیچے سے اُٹھایا اور پھر گرا کے ٹھوکریں ماریں۔ سخت دہشت زدہ اے ایس آئی یہ سب دیکھتا رہا۔ اس کا بہت بڑا افسر بڑی بے بسی کے ساتھ پٹ رہا تھا۔
"آج، اب بات کرتے ہو سمجھوتے کی۔ جب خندہ تمھارے پلڑے میں آگیا ہے تو کہتے ہو اس کا کیا فائدہ۔ جنگ میں عورتوں کو لانے کی کیا ضرورت ہے۔ اس ضرورت کا احساس تمھیں دیر سے ہوا۔" میں نے پھر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "تم جب بازی ہارنے لگو گے تو صلح کی بات بھی کرو گے، وہ وقت بھی آئے گا مگر اس سے پہلے تم کو وقت کئی سبق پڑھا جائے گا، یہ ہو سکتا تھا کہ ہم تمھیں گولی مار کے نکل جاتے۔ سابق ایس ایس پی تمھیں چارج دینے کے بجائے تمھارے جنازے کو کندھا دینے آتے مگر میں تم کو جینے کی سزا دینا چاہتا ہوں۔ یہ میں دلاور کو سمجھا چکا ہوں کہ اُسے، جمشید کو اور تمھارے سب حواریوں کو ہم جب چاہتے، کتّے کی موت مار دیتے لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا۔ صرف اس لیے کہ ہم پر تمھارے قتل کا الزام نہ آئے۔ کوئی یہ نہ کہے کہ تم ہمارے انتقام کا نشانہ بنے اور وہ بڑے خطرناک مجرم تھے جنھوں نے تمھیں مار دیا۔ نہیں، ہم چاہتے ہیں کہ ایک دن تمھارا مقدمہ ایک وطن فروش اور غدار ٹولے کی حیثیت سے قانون کی عدالت میں اور عوام کے سامنے جائے، تمھارے خلاف ہر ثبوت ہو، ہر شہادت ہو، ان سب کے خون کی جس کے داغ تمھارے دامن پر ہیں۔ ان سب کی جو تمھاری ہوسِ زر پر قربان ہوئے پھر ایک دن فیصلے کا آئے اور ایک دن فیصلے پر عمل درآمد کا۔"
"تم کتنی لاحاصل خواہشوں کے اسیر ہو۔" سراج نے تلخی

سے کہا "تم کو آج تک کسی خواب کی تعبیر ملی ہے جو تم اس دن کے لیے زندہ ہو اور رہو گے"

"یہی دلاور نے پوچھا تھا اور میں نے کہا تھا کہ ہاں، میں وہ دن دیکھنے کے لیے زندہ رہوں گا، جب خدا نے مجھے ایک مشن سونپا ہے تو وہ مجھے اپنی جدوجہد کا اتنا انعام ضرور دے گا کہ میں کامیابی کی خبر سن سکوں اور تمہارے انجام کو دیکھ سکوں۔" میں نے کہا "تمہاری وہ سزا میرے ساتھ سارا زمانہ دیکھے جو تم کو اس دنیا میں ملنی ہے، باقی رہ جائے گی عاقبت کی سزا تو اس کا حساب ہم بھی دیں گے، ہم بڑے گناہ گار ہیں لیکن مجرم نہیں ہیں۔"

"آج اس وقت تم بڑا بول، بول سکتے ہو، ہر دعویٰ کر سکتے ہو، یہ بھی کہ زندگی اور موت پر تمہارا اختیار ہے... مگر یہ وقت گزر جائے گا اور بالآخر تم دیکھو گے کہ تمہارے لیے زمین کتنی تنگ ہو چکی ہے، تم خود کو ایک دلدل میں محصور پاؤ گے" سراج بولا۔

"کل کی بات کل کریں گے" میں نے کہا "وقت بتلائے گا کہ کون دلدل میں ہے اور کس نے کسے محصور کیا ہے۔"

یکلخت وائرلیس کا اسپیکر سیٹی سی بجانے لگا "ہیلو ایس آئی تیس مار خاں" کسی نے کہا۔

"یس سر، بول رہا ہوں۔"

"ایس ایس پی صاحب کے بارے میں کیا رپورٹ ہے، کہاں گئے ہیں؟"

"کچھ نہیں معلوم سر، بتلا کے نہیں گئے۔"

"گھر میں بھی کسی کو نہیں بتایا؟"

"نہیں سر۔"

"تم سب چوکس رہنا، وہ دونوں بدمعاش ابھی تک روپوش ہیں، سب تھانوں کو خبردار کر دیا گیا ہے، ان کی اصل تصویریں بھی دے دی گئی ہیں، شہر کی ناکابندی ہے، تم کوئی ایسی ویسی بات دیکھو تو فوراً رپورٹ کرو۔ ابھی کچھ دیر پہلے شور کیسا تھا؟"

"کچھ دیر پہلے؟ نہیں سر۔"

"ہاں، میں نے خود سنا تھا جیسے فائر کیا گیا ہو مگر اس کے بعد لائن کٹ گئی تھی۔"

"فائرنگ کون کرے گا سر؟ باہر ڈی ایس پی صاحب مسلح گارڈ کے ساتھ موجود ہیں۔" اے ایس آئی بولا "لائن آپ کی طرف سے خراب تھی سر، میں کوشش کر رہا تھا مگر جواب نہیں ملتا تھا۔"

"چلو اب ٹھیک ہے، ڈی ایس پی صاحب کو سلام بولنا۔"

"یس سر" اے ایس آئی نے کہا۔

"کس کی کال تھی؟" میں نے کہا۔

"تھانے سے ایس ایچ او صاحب کی" وہ بولا۔

"تم کو سب ہی تیس مار خاں کہتے ہیں۔" میں نے کہا۔ وہ کچھ نہیں بولا۔ شاید اس کو یہ بات ہر جگہ موقع محل دیکھے بغیر کہنے کی عادت ہو گی کہ وہ مسکراتے ہوئے تیس مردے دفن کر چکا ہے۔

اس کال کے علاوہ بھی درمیان میں متعدد فون آئے تھے۔ خیر خواہی کے جذبات کا اظہار کرنے میں پہل کی کوشش کرنے والوں کو اس جواب سے مایوسی ہوتی تھی کہ ایس ایس پی صاحب گھر پر موجود نہیں ہیں۔ سب خوشامدی چمچے سراج کو مبارک باد دینا چاہتے تھے، کچھ زیادہ چاپلوس تھے کہ خود حاضر ہوئے تھے اور دروازے سے لوٹا دیے گئے تھے۔ اندر اور باہر سراج کے محافظ بڑی ہوشیاری سے تمام صورتِ حال کو ہینڈل کر رہے تھے۔

ایک گھنٹا گزر گیا۔ دس منٹ اوپر ہو گئے تو مجھے تشویش لاحق ہوئی مگر اسی وقت ٹی وی اسکرین روشن ہو گیا۔ میں نے جمشید کی مرسیڈیز دیکھی جو گیٹ سے اندر آ رہی تھی۔

"تیس مار خاں، جاؤ انھیں یہاں لے آؤ۔" میں نے کہا۔

"آگے جانے کی ضرورت نہیں۔ اسی جگہ دروازے میں کھڑے رہو، وہ ادھر ہی آئیں گے۔"

تیس مار خاں نے تعمیل کی۔ جمشید پہلے اندر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سوٹ کیس تھا پھر عاشی اس سے چند قدم پیچھے کمرے میں داخل ہوئی۔ ہم پر نظر پڑتے ہی اس کا چہرہ غصے سے لال پڑ گیا۔

"تم... تم ہو یہاں؟" اس نے پلٹ کر جمشید کی طرف دیکھا "آپ نے کیوں جھوٹ بولا تھا؟"

"وہ ضروری تھا" جمشید نے مختصراً کہا۔

"خوش آمدید اے نازنین گلبدن" میں نے سینے پر ہاتھ رکھ کے سر کو بڑی عاشقانہ نیازمندی سے جھکایا اور فرانسیسی میں کہا۔

"تم نے کہا تھا کہ پھر ملیں گے۔"

"شٹ اپ" وہ اردو میں بولی "تم ایک دھوکے باز ہو، جعلساز ہو، صحافی نہیں، مجرم ہو۔"

"ان کو آتا ہے پیار پر غصہ" میں نے ایک سرد آہ بھر کے کہا "ہم کو غصے پر پیار آتا ہے۔ جو چاہو کہو، ہم گالیاں کھا کے بے مزہ نہیں ہوتے۔"

"عائشہ، ان کے منہ مت لگو" جمشید نے کہا "جاؤ ادھر۔"

"پہلے میں اس سے پوچھنا چاہتی ہوں کہ جیجا جی کہاں ہیں اور کیسے ہیں؟"

"جیجا جی؟ کس کے جیجا جی، کیسے جیجا جی؟" میں نے کہا "ہم کیا کسی کے جیجا جی سے کم ہیں، ہم سے بھی پوچھ لو کہ ہم کیسے ہیں؟"

"بکو مت، میں تم کو کچھ بتانا چاہتی ہوں تاکہ تمہاری

غلط فہمی دور ہو جائے" وہ تیز لہجے میں بولی "چوہدری صاحب کوئی ایرے غیرے نتھو خیرے نہیں ہیں۔ ان کے اغوا سے تہلکہ مچ گیا ہے۔ میرے پاس اخباری نمائندے بھی آئے تھے میں نے انھیں سب بتا دیا کہ وہ کون تھے جو انھیں لے گئے تھے۔ کل اخبار میں تمہارا حلیہ بھی شائع ہو گا۔ چوہدری صاحب کی بازیابی کے لیے پولیس کی خصوصی ٹیم تشکیل دی گئی ہے کیونکہ وزارتِ داخلہ کے حکام تک دباؤ میں ہیں۔"

"تت تت تت" میں نے افسوس سے سر ہلایا "بے چارے چوہدری صاحب ابھی کوچۂ سیاست میں نو وارد تھے، یقیناً ان کو کسی سیاسی حریف نے اٹھوا لیا ہو گا، جس کو اندیشہ ہو گا کہ آئندہ انتخابات میں چوہدری صاحب اس سے صوبائی اسمبلی کی نشست چھین لیں گے۔"

"ان کا کوئی سیاسی حریف نہیں، سب نے مذمت کی ہے۔"

"ہاں ہاں، مذمت کیوں نہیں کی ہو گی، ایک ایسا فرشتہ سیرت آدمی دن دہاڑے اغوا کر لیا گیا اور قانون کے یہ محافظ کچھ نہ کر سکے" میں نے سراج کی طرف اشارہ کیا "مذمت کرنے والے بھی سیاستداں ہی ہوں گے۔ خودساختہ عوامی لیڈر۔ دلاور سے زیادہ قوم کا درد دل میں رکھنے والے۔ بوگس رفاہی ادارے چلا کے نیک نامی کمانے والے۔ فلاحی تنظیموں کی آڑ میں بدمعاشی کرنے والے۔ چندے کھانے والے۔ دین کے نام پر دنیا کی تجارت میں مصروف۔ چہروں پر منافقت اور جھوٹ کی نقاب ڈال کے فرشتہ بننے والے شیطان، سب دلاور کے لیے بیان دیں گے کہ وہ بھی فرشتہ تھا۔ ملک و ملت کے لیے تن من دھن سب لٹانے کا عزم رکھتا تھا۔ غریبوں کے مفت علاج کے لیے اسپتال قائم کرنے کا اعلان کر چکا تھا، ہائے! حسرت ان غنچوں پہ ہے..."

"سراج صاحب! یہ شخص اتنا بول رہا ہے اور آپ چپ ہیں، یہ آپ کے گھر میں موجود ہے، آپ کے پاس اتنی پولیس کی نفری ہے اور پھر بھی آپ کچھ نہیں کر رہے ہیں؟" عائشہ نے چلا کے کہا۔

"بے وقوفی کی باتیں مت کرو" سراج نے سخت لہجے میں کہا "جاؤ ادھر دوسرے کمرے میں اماں کے پاس... وہاں زیب النساء بھی ہے۔"

"لیکن جیجا جی کہاں ہیں؟" وہ ضدی لڑکی اڑی رہی "باجی کی طبیعت بہت خراب ہے، میں وعدہ کر کے آئی تھی..."

"عائشہ، پاگل مت بنو" سراج نے اسے پکڑ لیا ورنہ وہ شاید مجھ پر حملہ کر دیتی "مسئلہ دلاور کی جان بچانے کا ہے اور اسی لیے اتنے مجبور ہو گئے ہیں۔"

"آپ چھوڑ دیں مجھے، میں خود نمٹ لوں گی" عائشہ نے زور لگاتے ہوئے کہا "ان کمینوں سے..."

سراج نے اسے جھنجوڑا "تم مجھ سے زیادہ عقل مند نہیں ہو، یہ دس لاکھ روپے آخر کس لیے دے رہے ہیں ہم؟ دلاور کو خیریت سے واپس لانے کے، تم جاؤ ادھر..."

"میں نہیں جاؤں گی" اس نے چیخ کر کہا۔

سراج کا تھپڑ اس کے گال پر یوں پڑا کہ وہ دور جا گری۔ تھپڑ کی ضرب سے زیادہ اس تذلیل کا صدمہ تھا کہ وہ فوراً اٹھ بھی نہ سکی۔ وہیں ایک ہاتھ مضروب گال پر رکھے سراج کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی رہی پھر اچانک اس کا ہسٹریا اشکوں کے سیلاب میں بہہ گیا۔

"چلو اٹھو" جمشید نے کہا اور اس کا بازو پکڑ کے کھینچا "اسی لیے تم کو سمجھایا تھا کہ یہ معاملات ہم پر چھوڑ دو۔"

"کیا تم رقم گنو گے؟" سراج نے کہا۔

"نہیں، اتنا وقت نہیں ہے ہمارے پاس" میں نے کہا۔

جمشید نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور میں نے محسوس کیا کہ اس کے چہرے پر طمانیت کے آثار نظر آنے لگے ہیں۔

"میرا بھی یہی خیال تھا" وہ بولا اور عاشی کو دروازے کی طرف کھینچ کر لے گیا۔ سراج نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔

"کیا خیال تھا؟" میں نے کہا اور جمشید کو روک دیا۔

"یہی کہ دس لاکھ کا گننا آسان نہیں ہوتا" جمشید بولا اور پھر عاشی سے مخاطب ہوا "تم دفع کیوں نہیں ہوتیں؟"

سراج اور جمشید دونوں ہی عاشی کو جلد از جلد کمرے سے دور بھیج دینا چاہتے تھے۔ یہ بات میرے دل میں شک پیدا کرنے کے لیے کافی تھی۔

"مس عائشہ! آپ ذرا ادھر آئیں" میں نے کہا "وہ سوٹ کیس تو آپ کی باجی کا ہے نا؟"

عائشہ نے اقرار میں سر ہلایا۔ اس نے اب اپنے آنسو خشک کر لیے تھے۔

"اس میں رقم آپ کے سامنے رکھی گئی تھی؟" میں نے کہا۔

"اس سے کیا پوچھتے ہو، کھول کے دیکھ لو" جمشید نے کہا اور عائشہ کو دروازے سے باہر دھکیل دیا۔ میں نے ایک جست لگائی اور عائشہ کو پھر دروازے سے اندر کھینچ لیا۔ میرے ریوالور کا رخ اس عرصے میں سراج اور جمشید کی جانب ہی رہا تھا۔

"میرے سوال کا جواب دو" میں نے عائشہ کو کلائی سے پکڑ کے اندر میز کی جانب پھینک دیا۔ وہ میز کے کنارے کا سہارا نہ لیتی تو یقیناً گر جاتی۔

"مجھ سے یہی کہا تھا" عائشہ نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

"کس نے کہا تھا؟"

"باجی... ہاں باجی نے کہا تھا۔" وہ ہکلا کے بولی۔

"گویا تم نے نہیں دیکھا تھا کہ اس میں دس لاکھ روپے ڈالے گئے ہیں یا نہیں؟" میں نے کہا۔

"باجی جھوٹ کیوں بولیں گی۔"

"کیا وہ دس دس لاکھ کے نوٹوں سے بھرے ہوئے بریف کیس تیار رکھتی ہیں کہ ادھر مجازی خدا کا حکم ہو اُدھر وہ رقم حاضر کردیں۔" میں نے کہا۔

عاشی نے بے بسی سے سراج اور جمشید کی طرف سوالیہ نظریں اُٹھائیں۔ شاید یہ پوچھنے کے لیے کہ بتاؤ اب میں کیا کہوں؟

"چلو تم مجھے کھول کے رقم دکھا دو۔" میں نے کہا۔ "مجھے اندازہ ہو جائے گا کہ رقم کتنی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اُوپر نوٹ ہوں اور نیچے برابر کیے ہوئے سادہ کاغذ۔ یہ بہت عام ٹرِک ہے۔"

"میں... میں اسے نہیں کھول سکتی۔" عاشی نے کہا۔

"کیوں، سیدھا سادہ بریف کیس جیسا سُوٹ کیس ہے، قفل بھی نمبر والے نہیں ہیں کہ تم نمبر بھول جاؤ یا کہو کہ مجھے نمبر معلوم ہی نہیں۔" میں نے کہا۔

"میرے پاس چابی نہیں ہے۔" وہ بولی۔

"نواب صاحب! کیا چابی آپ کے پاس ہے؟" میں نے کہا۔ "ہے تو عاشی کو دے دیں۔"

"چابی... وہ تو تمہارے پاس ہونا چاہیے۔" جمشید نے کہا مگر وہ اتنا اچھا ایکٹر نہیں تھا جتنا دلاور تھا۔ یہ بات کہتے ہوئے وہ مجرم بن گیا۔

"چلو چھوڑو۔" میں نے کہا۔ "میں اعتبار کرلیتا ہوں کہ رقم پوری ہوگی مگر اب اس سُوٹ کیس کو اُٹھاؤ اور دوسرے کمرے میں چلو۔" میں نے کہا۔ "جہاں سب خواتین محسن کی جنرل نالج کے لیکچر سے مستفید ہو رہی ہیں۔"

عاشی نے سُوٹ کیس اُٹھالیا۔ سراج اور جمشید کچھ دیر اپنی جگہ سے نہیں ہلے۔ میں نے انھیں ریوالور سے اشارہ کیا۔ وہ پھر بھی کھڑے رہے۔

"کیا بات ہے، تم جام کیوں ہوگئے ہو؟ تمہیں اسپیڈ لگاؤں؟" میں نے اُن کے پیچھے جا کے کہا، وہ بادلِ ناخواستہ آگے بڑھے۔

محسن دوسرے کمرے میں کسی کالج کے پروفیسر کی طرح بیٹھا ہوا تھا اور غالباً سراج کی ماں اور ہونے والی بیوی کو وہ سب کچھ بتا چکا تھا جو انھیں معلوم نہیں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس نے تمام حقائق کے سمندر کو ایک کوزے میں بند کر کے پیش کیا ہوگا۔ زیب النساء اور سراج کی ماں یوں بیٹھی تھیں جیسے ان پر فالج گر گیا ہو، اگر انھوں نے محسن کی باتوں پر یقین نہ کیا ہوتا تو ان کے چہروں کا ردِعمل مختلف ہوتا۔

"عاشی! یہ سُوٹ کیس ایس ایس پی صاحب کی والدہ کو دے دو۔" میں نے کہا۔ "سراج اور جمشید تم دونوں دیوار کی طرف مُنہ کر کے کھڑے ہو جاؤ، تاکہ تم کچھ نہ دیکھ سکو۔"

"تم کیا کرنا چاہتے ہو؟" سراج نے کہا۔

"میں کچھ نہیں کروں گا۔ تمہاری والدہ یہ سُوٹ کیس کھول کے مجھے دکھائیں گی کہ اس میں نوٹ ہی ہیں۔" میں نے کہا۔ عائشہ نے سُوٹ کیس رکھ دیا۔

"نہیں۔" سراج چلایا کیونکہ اس کی ماں نے سُوٹ کیس کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا۔ ان کی انگلیوں کے ذرا سے دباؤ سے سُوٹ کیس کے ہُک الگ ہو جاتے۔

"کیا بات ہے؟" میں نے [illegible] بن کے پوچھا۔ "تم کیوں چلّانے لگے؟"

"سُوٹ کیس مت کھولنا۔" سراج نے اپنی ماں سے کہا۔

"سُوٹ کیس کھُلے گا بھی کیسے۔" میں نے کہا۔ "مس عاشی اور نواب صاحب دونوں میں سے کسی کے پاس چابی نہیں ہے۔"

"لیکن اسے کھول کے دیکھنا تو پڑے گا۔" محسن بولا۔ وہ بھی معاملے کی تہ تک پہنچ گیا تھا۔ "ماں جی! آپ ایسا کریں کہ تالا توڑ دیں۔"

"نہیں... ماں... سُوٹ کیس ان کے حوالے کردو، یہ خود ہی کھول لیں گے۔" سراج نے سخت لہجے میں کہا۔

"افسوس ایس ایس پی صاحب! آپ نے کوئی عقلمندی کا ثبوت نہیں دیا۔" میں نے کہا۔ "آپ کے پاس ایک موقع تھا وہ آپ نے گنوا دیا۔ ہم نے بہت کچھ آپ سے ہی سیکھا تھا اب بھی سیکھ رہے ہیں۔ ہم یہ حماقت کیسے کرسکتے تھے کہ دس لاکھ کی رقم کے بدلے خودکشی کرلیتے، یہ تو مجھے اسی وقت سمجھ لینا چاہیے تھا کہ دلاور نے فوراً دس لاکھ دینا کیوں منظور کرلیا تھا۔ اپنی بیوی کو خط کیوں لکھ کر دے دیا تھا، وہ بھی آخر دلاور کی بیوی ہے۔ اُسے پہلے سے معلوم ہوگا کہ اس سُوٹ کیس میں کیا ہے۔ دلاور نے اُسے خط میں کوئی اشارہ دے دیا جو وہ جانتی تھی۔ تم نے فرض کرلیا کہ ہم خود ہی سُوٹ کیس کھول کے رقم دیکھنے کی بے وقوفی کریں گے۔ تم عاشی کو وہاں سے جلد از جلد نکالنا چاہتے تھے۔ تم تو جانتے تھے کہ سُوٹ کیس میں بم ہے، اس کو کھولتے ہی دھماکا ہوگا، تم فوراً غوطہ مار کے فرش پر لیٹ جاتے۔ مارے جاتے تو صرف ہم۔"

"دیکھو، مجھے... میری باجی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔" عاشی نے ایک دم چلّانا شروع کردیا۔ "انھوں نے تو خط دیکھ کر رونا دھونا شروع کردیا تھا کہ کون سے دس لاکھ، اس وقت کہاں سے لاؤں۔ دلاور نے میرے پاس کوئی دس لاکھ نہیں رکھوائے۔ ایک منٹ میں تو بینک والے بھی دس لاکھ نہیں دیتے، نوٹس مانگتے ہیں۔"

"عاشی، فضول مت بولو۔" جمشید نے غرّا کے کہا۔

"اگر تم نے دوبارہ عاشی کو ٹوکا تو میں تمہیں خاموش رکھنے کے دوسرے کسی طریقے پر عمل کروں گا۔" میں نے کہا۔ "جو تمہارے لیے زیادہ ناپسندیدہ ہوگا، آگے کہو مس عاشی۔"

"اس پر جمشید صاحب نے کہا کہ دس لاکھ ایک تجوری میں محفوظ پڑے ہیں۔" عائشہ نے مجبوراً بات جاری رکھی۔ "انھوں نے باجی کو ایک چابی دی اور کہا کہ یہ تجوری کی چابی ہے، اس میں ایک سُوٹ کیس ہے، اسے نکال لو مگر... خبردار! اسے کھولنا نہیں، بس احتیاط سے جیسا رکھا ہے، ویسا ہی اُٹھا لاؤ۔ پھر باجی نے نہیں، میں نے سُوٹ کیس نکالا اور پھر ہم یہاں آگئے۔"

"تمہیں یہاں لانے کے لیے جمشید نے کیا جھوٹ بولا تھا؟"

"انھوں نے کہا تھا کہ چوہدری صاحب نے سراج کے گھر بلایا ہے، مجھے نہیں معلوم کیوں مگر وہاں جانا بہت ضروری ہے۔ باجی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی چنانچہ میں آگئی۔ مجھے نہیں معلوم یہ سب کیا ہے؟"

"معلوم ہو جائے گا، آئندہ چند دن میں تمہیں بہت کچھ معلوم ہوگا مس عاشی۔" میں نے کہا۔ "یہ سُوٹ کیس اُٹھالو محسن، ان دونوں کا خیال رکھنا، میں خواتین کو لے جا رہا ہوں۔"

"تم ایسا نہیں کرسکتے۔" سراج نے چیخ کر کہا۔

"میں ایسا ہی کرنے کی نیّت سے آیا تھا ایس ایس پی صاحب۔" میں نے کہا۔ "اور ایسا ہی ہوگا۔ خواتین ہمارے ساتھ جانے کے لیے ہی آئی ہیں۔ تم اور جمشید یہاں رہو گے، صبح تک دلاور بھی پہنچ جائے گا۔"

"تم... تم مجھے بھی لے جاؤ گے؟" سراج کی ماں نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "خیر، میں چلتی ہوں مگر اسے چھوڑ دو..." وہ زیب النساء کے سامنے آگئی۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "ایس ایس پی صاحب کی والدہ، نواب خسرو جمشید کی بہن اور دلاور کی سالی، ہم نے انہی کا انتخاب کیا تھا۔"

"آخر کیوں، کیا چاہتے ہو تم؟" سراج کی ماں رونے لگی۔

"ماں جی، آپ فکر مت کریں۔" میں نے کہا۔ "ہم کسی کی جان کے دشمن نہیں ہیں۔ ہم ایک سودا کریں گے۔ اپنے بیٹے کو سمجھا دیں کہ وہ جلد از جلد ہم سے معاملات طے کرے تاکہ آپ سب واپس جائیں۔ دیر اور خرابی کے ذمّے دار ہم نہیں، یہ لوگ ہوں گے جن میں آپ کا فرزند بھی شامل ہے۔"

زیب النساء اچانک نیچے لڑھک گئی۔ جمشید آگے بڑھا ہی تھا کہ محسن نے اُسے مشین گن کا بٹ مار کے پیچھے کردیا۔ جمشید کی آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا مگر وہ بے بس تھا۔ "زیبا بے ہوش ہوگئی ہے۔" وہ بولا۔

"ہونے دو، ہم اسی حالت میں لے جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "اور اپنے جذبات پر قابو رکھو۔ تم ہمیں روک نہیں سکتے، دخل دو گے تو اچھا نہیں کرو گے، نہ اپنے لیے اور نہ ان کے لیے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ہمارا راستہ روکا نہیں جاسکتا۔"

"یہ... جو یہاں موجود ہیں، اپنی جان پر بھی کھیل جائیں گے، تم مجھے مجبور مت کرو۔" سراج نے کہا۔

"جتنے لوگ یہاں اس وقت موجود ہیں، اس سے زیادہ گولیاں ہمارے پاس ہیں۔" میں نے کہا۔ "اگر تم خون خرابا چاہتے ہو تو تمہاری مرضی، چھوڑ دو اپنے کتّوں کو اور پھر دیکھو کہ ہم کیسے شکاری ہیں اور ہمارا نشانہ کیسا ہے۔"

"دیکھو سکندر، اگر تمہارا کوئی مطالبہ ہے تو مجھے بتاؤ، ان عورتوں سے تم کچھ نہیں مانگ سکتے۔" سراج نے کہا۔

"ہم ان کو اس وقت تک اپنے پاس رکھیں گے جب تک ہمارے ساتھی تمہارے پاس رہیں گے۔" میں نے کہا۔

"اور اگر رابعہ کو پہنچا دیا جائے...؟"

"صرف رابعہ ہی نہیں، ایک اور دوست بھی ہے ہمارا۔" میں نے کہا۔ "وہ دونوں بخیر و عافیت پہنچ جائیں گے تو پھر دیکھیں گے۔"

"دیکھیں گے کیا مطلب؟" جمشید نے غصّے سے کہا۔

"دیکھنا یہ ہوگا کہ تمہاری اگلی چال کیا ہے؟" میں نے کہا۔ "اُمید ہے اس کے بعد تم ایک بات ضرور سمجھ جاؤ گے۔ اب تک تم نے کچھ فائدہ ضرور اُٹھالیا۔ آئندہ ہم اخلاق اور شرافت کو اپنی کمزوری نہیں بننے دیں گے، اس لیے تم کو بھی محتاط رہنا ہوگا۔ [illegible] جا رہے ہیں۔ ہمارا راستہ کھُلا چھوڑ دو اور ہمیں نکل جانے دو۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر ہم تمہیں فون کریں گے۔"

"صرف اپنے خیریت سے پہنچ جانے کی اطلاع دیں گے اور اگر تم نے راستے بند کیے...." محسن بولا۔ "تو ہم یہ بریف کیس کھول دیں گے۔"

"گاڑی کے اندر ہی۔" میں نے سر ہلایا۔ "جس میں ہمارے ساتھ دوسرے بھی ہوں گے۔ تم انھیں بھی ہمارے ساتھ دوسری دُنیا میں بھیجنا چاہو تو تمہاری مرضی، وہاں سے واپسی نہیں ہوتی۔"

"نواب صاحب کا دُہرا نقصان ہوگا۔" محسن ہنسا۔ "گاڑی سے زیادہ حسین بہن اور بہن سے زیادہ قیمتی نئی گاڑی نہیں

رہے گی۔ سراج کی ماں نہیں رہے گی اور اسے تیسری جگہ منگنی کرنا پڑے گی، دوسری منگیتر کو بھول کر... سب سے کم نقصان میں دلاور رہے گا جس کی صرف سالی جائے گی۔"

"سالی بھی آدھی گھر والی ہوتی ہے۔ چوہدری صاحب بڑے مہربان ہیں آج کل، ممکن ہے پوری گھر والی بنانے کا سوچ رہے ہوں۔ منگوائی تو تھی پرانی بیوی کہ ضائع ہو جائے تو نئی کریں۔ چمکتی دمکتی، انگلش اور فرنچ بولنے والی جو سیاست کے کاروبار میں اچھی پی آر کے لیے ضروری ہے۔" میں نے کہا۔

میری بات پر عاشی کا رنگ فق ہو گیا۔ اگر یہ جھوٹ ہوتا تو وہ مشتعل ہوتی مگر میں نے اس سچ کو پکڑ لیا تھا جو دل میں چور بن کے چھپا ہوا تھا۔ "تم گندے ذہن کے مالک ہو۔" وہ بڑی مشکل سے بولی۔

"ہاں، چوہدری صاحب ہیں بس صاف ستھرے ذہن کے مالک، ایک بہن کو دل میں رکھتے ہیں تو دوسری کو نظر میں۔" میں نے کہا۔ "اسی لیے عقل مند کہتے ہیں، داشتہ آید بکار، فرنچ اور فارسی میں فرق ہے، تم نے یقیناً داشتہ کا مطلب غلط لیا ہوگا۔"

"ہمارا کہنا صرف یہ ہے کہ وہ دوراندیش ہیں..." محسن بولا۔ "ایک بیمار عورت مر بھی تو سکتی ہے۔ فرشتۂ اجل ویسے بھی چوہدری صاحب کے در پر دست بستہ ان کے اشارے کا منتظر رہتا ہے۔ کم سے کم وہ خود ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ گھر کی مرغی دال برابر، بچوں کی خالہ ماں برابر۔"

میں نے اندازے اور قیاس کی بنیاد پر ایک بات کی تھی جو اتنی سچ تھی کہ عاشی کے چہرے پر فردِ جرم کی تحریر بن گئی۔ اسے جیسے سانپ سونگھ گیا تھا، وہ اس کی تردید کر سکتی تھی مگر سب کے سامنے یہ انکشاف ایسا ہی تھا جیسے کوئی بھرے بازار میں اس کے کپڑے اتار دیتا۔ مجھے یقین آ گیا کہ دلاور نے اپنی بیوی کو ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا ہوگا اور بہت جلد ہم اس کی موت کی خبر بھی سن لیں گے، یہ موت بھی بالکل طبعی ہو گی، جیسے اس کی بیماری کو طبعی سمجھا جا رہا ہوگا اور کسی کو شک نہ ہوگا کہ وہ مسیحا نہیں قاتل ہے جو اس کو دوا دیتا ہے۔ ایسا ہوتا آیا تھا اور اب پھر ہو رہا تھا۔ ہم نے قبل از وقت سب پر ایک راز افشا کر دیا تھا لیکن ہم یہ بھی جانتے تھے کہ اس سے کچھ نہیں ہوگا۔

"چل یار، ہمیں کیا ان کے گھریلو معاملات سے۔" میں نے کہا۔ "ہمیں اپنے مسائل بہت ہیں تو عاشی کو اور سراج کی ماں کو لے کر گاڑی تک چل۔ ایس ایس پی صاحب! آپ آگے چلیں، محسن آپ کے نقشِ قدم دیکھتا آئے گا اور موت بن کے پیچھے چلے گا، تمہارے محافظ بھی دُور ہوں گے، تمہاری آواز اُن تک دیر سے پہنچے گی، گولی قریب سے آئے گی اور تیز رفتار ہو گی۔ سب کتوں کو پٹّا ڈال کے رکھنا۔"

سراج نے تعمیل کے سوا چارہ نہ دیکھا۔ ہمارا پلان واضح ہو چکا تھا اور ان دونوں نے حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا۔ سراج کی ماں اب بالکل چپ تھی۔ شاید محسن کی باتیں سن کے وہ یہ سمجھ گئی ہو گئی تھی کہ اسے جو سزا مل رہی ہے اپنے ہی بیٹے کے اعمال کا نتیجہ ہے۔ عاشی اس کے مقابلے میں زیادہ باخبر تھی چنانچہ وہ سر جھکائے سراج کی ماں کے ساتھ رہی۔ محسن ان کے پیچھے یوں کہ اس نے پھر ایک بستر کی چادر کندھوں پر ڈال لی تھی اور مشین گن کو اس کے نیچے کر لیا تھا تاکہ باہر والے اسے نہ دیکھ سکیں۔

صورتِ حال مکمل طور پر ہمارے کنٹرول میں تھی۔ اندر اور باہر سارے فرض شناس لوگ سمجھ چکے تھے کہ اندر کیا ڈراما چل رہا ہے۔ ان سے کوتاہی ضرور ہوئی تھی مگر وہ کسی طرح بھی قصوروار نہیں سمجھے جا سکتے تھے۔ خود ایس ایس پی صاحب نے حکم دیا تھا کہ ان کو اندر آنے دیا جائے جن کو انھوں نے گیٹ پر روکا تھا۔ اس کے بعد بھی وہ صرف تعمیلِ حکم کر رہے تھے۔ اگر وہ اپنی ذمہ داری پر کچھ کرتے تو ایس ایس پی صاحب یا ان کی فیملی کو نقصان ہوتا چنانچہ وہ تعاون کر رہے تھے۔ ابھی تک کوٹھی کے باہر کسی کو کچھ معلوم نہیں ہوا تھا۔ میں نے کار کا دروازہ بند ہونے کی آواز سنی تھی۔

"چلیے نواب صاحب، اُٹھائیے اپنی ہمشیرہ کو۔" میں نے کہا۔ وہ کچھ دیر زیب النساء کو دیکھتا رہا جو بیڈ پر بے ہوش پڑی تھی۔ "کیا یہ مناسب ہوتا اگر خود سراج اسے اُٹھا کے لے جاتا؟"

میں نے کہا۔ "معلوم نہیں تم ایسا کیوں کر رہے ہو جمشید! ایسی بہن کو کس کے حوالے کر رہے ہو؟" میں نے افسوس سے سر ہلایا۔

"یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے۔" وہ زیب النساء کو اُٹھانے لگا۔

"ہاں، سب ہی معاملات تمہارے ذاتی معاملات ہیں۔ تم بہنوں کو بھی کاروبار میں سرمایہ سمجھ کے لگا دیتے ہو، خواہ بعد میں سرمایہ ڈوب جائے، تمہارے لیے سب مالِ تجارت ہے۔" میں نے کہا اور جمشید کے پیچھے چلنے لگا۔ "لیکن میری مانو تو اسے زہر دے دو، کم گناہ ہوگا۔"

"تم اس لڑکی کے دماغ میں زہر بھر دو گے، اسے سراج کے خلاف کرو گے۔" وہ آگے چلتے ہوئے بولا۔ "مگر اس سے تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔ میں اپنا فیصلہ نہیں بدلوں گا، تم اس لڑکی کے لیے مشکلات پیدا کرو گے اور کچھ نہیں۔ شادی تو اسے کرنا ہی پڑے گی۔"

"میرا خیال ہے کہ یہ لڑکی تمہارا فیصلہ قبول نہیں کرے گی۔" میں نے کہا۔ "یہ خودکشی کر لے گی یا گھر سے بھاگ"

جمشید نے مجھے پلٹ کے دیکھا۔ "اپنی بہن کو میں جانتا ہوں۔"

"میں نہیں مانتا۔" میں نے کہا۔ "کہ تم اسے بہن بھی سمجھتے ہو۔"

اس وقت تک ہم باہر گاڑی کے قریب پہنچ گئے تھے۔ محسن نے عاشی کو آگے بٹھایا تھا اور خود عین اس کے پیچھے بیٹھا تھا۔ درمیان میں سراج کی ماں تھی اور دوسری طرف کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ جمشید نے بہن کو اس دروازے سے سراج کی ماں کی گود میں ڈال دیا۔

"یہ آپ کی ہی امانت تھی۔" جمشید نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔

"امانت ہی رہے گی، جب تک زندگی ہے۔" سراج کی ماں نے کہا۔

"آپ دونوں پیچھے ہٹ جائیں۔" میں نے کہا۔ "رخصتی کے منظر کو زیادہ دردناک نہ بنائیں اور خیال رکھیں کہ یہ دہشت ناک نہ بنے۔"

"سکندر!" جمشید نے کچھ کہنا چاہا اور پھر چپ ہو گیا۔ شاید اس نے الفاظ کے بے اثر رہنے کا اندازہ کر لیا تھا۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کے چابی محسن سے لی۔

"وہ سوٹ کیس کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

"ڈکی میں۔" محسن نے کہا۔

"اس میں پورے دس لاکھ ہیں۔" جمشید بولا۔ "تم کھولو گے تو معلوم ہو جائے گا۔"

"ہم... ہم کیوں کھولیں گے۔" میں نے کہا۔ "شاید کسی دن خود تم ہی اسے کھولو گے۔"

"عاشی اسے کھول سکتی ہے۔" جمشید نے آخری وقت میں مجھے اس راز سے باخبر کر دینا بہتر سمجھا، وہ اپنی بہن کی طرف سے پریشان اور خوفزدہ تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ لاعلمی میں ہم زیب النساء سے یہ کام کرنے کو کہیں تو وہ ماری جائے۔

"اس اطلاع نے تمہاری بہن کو بچا لیا۔" میں نے کہا۔ "اور سراج کی ماں کو بھی۔"

گاڑی آگے بڑھی تو دروازہ سراج کے اشارے پر کھول دیا گیا۔ محسن پوری طرح چوکس تھا، اگر کوئی حرکت بھی کرتا تو اس کی مشین گن آگ اُگلنے لگتی۔

چند منٹ میں ہم خطرے کی حدود سے نکل آئے۔ مجھے اطمینان ضرور تھا کہ جب تک ہمارے پاس تین یرغمالی ہیں، سراج بھی طاقت کے استعمال سے گریز کرے گا مگر پھر بھی میں اتنا مستعد تھا کہ ہر لحظہ میری نظر ویران سڑک پر رہی۔ میرے اعصاب اتنے کشیدہ تھے کہ درخت کا سایہ بھی زمین پر حرکت کرتا تھا تو مجھے یوں لگتا تھا جیسے اچانک ہر طرف اندھیرے میں چھپ کر بیٹھے ہوئے مسلح افراد کو حملہ کرنے کا اشارہ مل گیا ہے اور وہ ہمارے سامنے صف در صف کھڑے ہو کے ایک ناقابلِ تسخیر دیوار بنا دیں گے۔ سناٹے میں مجھے سرگوشیاں سی محسوس ہوتی تھیں اور میرے کان کسی دھماکے کے منتظر تھے جو سکوتِ شب کو پارہ پارہ کر دے اور ہماری پیش قدمی روک دے۔

ذہنی طور پر میں تیار تھا کہ میرے راستے میں سنگ و خشت کی دیوار بھی ہو گی تو میں گاڑی کو اس سے ٹکرا دوں گا یا دیوار سے گزر جاؤں گا یا اسی دیوار کے ملبے میں سب دفن ہو جائیں گے۔ ہمارے خلاف شہر کی انتظامی مشینری حرکت میں آ چکی تھی اور پولیس اس بار زیادہ پیشہ ورانہ تن دہی سے ہماری تلاش میں سرگرمِ عمل تھی کیونکہ معاملہ ان کے اپنے محکمے کے ایک انتظامی سربراہ کا تھا۔ ایس ایس پی قسم کا ہر نیا افسر جب چارج لیتا ہے تو پبلک کے سامنے پریس کے ذریعے بڑے اُمید افزا بیانات کا تاثر قائم کرتا ہے اور قانون کی سخت گیری، مساوات اور مستعدی کو مثالی بنانے کے دعوے کرتا ہے۔ اخبارات میں اس قسم کے بیانات آنے لگتے ہیں کہ قانون شکنی کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ معاشرے کے ناسوروں کا خاتمہ کر دیا جائے گا۔ شرپسندوں سے سختی سے نمٹا جائے گا۔ جرائم پیشہ افراد اور بدعنوانی کے خلاف سخت اقدامات کیے جائیں گے۔ لفظوں کے ہیر پھیر سے یہی بیانات بار بار پڑھنے والے عوام پھر بھی اُمیدیں باندھ لیتے ہیں کہ شاید کچھ ہو مگر ہوتا کچھ نہیں۔ خداوندا! یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں! اور جہاں سراج جیسے حاکم ہوں اور رضوی صاحب جیسے معتوب، میرے خیالات کی رو محسن نے توڑ دی۔ "کس خیال میں گم ہے سکندرِ اعظم؟"

"کیوں، کیا ہوا؟" میں نے کہا۔

"میں نے کچھ کہا تھا۔" محسن بولا۔

"وہ، دراصل یار میں انکل رضوی کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ کیا ظلم ہے، ان کے ساتھ اور ہمارے ساتھ۔ اس شہر کے لوگوں کے ساتھ کہ ایک ایمانداری اور فرض شناسی میں مثالی کردار رکھنے والے کی جگہ آیا بھی تو کون... سراج، جسے ان صفات سے دُور کی بھی نسبت نہیں۔"

"گو واں نہیں یہ واں سے نکالے ہوئے تو ہیں، کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دُور کی۔" محسن بولا۔ "ہیں تو دونوں پولیس والے، ایک زمین ہے اور ایک آسمان تو یہ تضاد ہمارے قومی مزاج کا ہے، اچھا تو ذرا گاڑی روک لے۔"

میں نے بریک لگا کے گاڑی روک دی۔ "کیا بات ہے؟"

"ہمیں عاشی کو اندھا کر دینا چاہیے۔" محسن بولا۔

"کیا؟" عافی نے سہم کر چیخ ماری "اندھا کرو گے مجھے؟"

"وقتی طور پر" محسن بولا "آپ کی آنکھیں بند کریں گے، آپ ہی کے دوپٹے سے۔ زیب النساء تو ہوش میں ہی نہیں"

"میں تو واقعی پھر غیر محتاط ہو گیا تھا" میں نے کہا۔

عاشی کی آنکھوں پر میں نے پٹی باندھی۔ اُس نے احتجاجی انداز میں اس کی اجازت دی۔ سراج کی ماں نے چُپ سادھ لی تھی اور خود کو ہمارے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ اس بوڑھی عورت کی حالت پر مجھے افسوس ہوتا تھا جس نے ایک بیٹے کو سب ماؤں کی طرح بڑی نیک خواہشات اور تمناؤں کے ساتھ پال پوس کے بڑا کیا تھا اور کبھی نہیں چاہا تھا کہ وہ ایک وطن فروش اور غدار بنے مگر اب وہ اپنی تمام عمر کی محنت کے رائیگاں جانے کا دُکھ اُٹھا رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اس سے کیا غلطی ہوئی تھی جس کی قدرت نے یہ سزا دی۔ وہ ہمارے لیے کوئی خطرہ نہیں تھی۔ خطرہ عاشی ثابت ہو سکتی تھی جو شاید دلاور کے مستقبل کی ہمسفر بننے کے لیے نیکی بدی کی تمیز کھو بیٹھی تھی۔ اس نے دلاور کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا تھا تو یہ ساتھ ہر قدم کا تھا خواہ وہ غلط سمت میں اُٹھے۔ اس کا آغاز ہی غلط تھا۔ عاشی نے اپنی خوشی پر اپنی بہن کو قربان کرنا منظور کر لیا تھا۔ معلوم نہیں ایسا کیوں ہُوا تھا۔ کیا عافی اور اس کی باجی کے درمیان پہلے سے جذباتی دوری تھی؟ آخر اسے کس چیز نے دلاور کی طرف کھینچا تھا۔ دلاور کی شخصیت اتنی پُرکشش ہرگز نہ تھی کہ عاشی جیسی لڑکی اس پر مرمٹتی مگر لڑکیوں کا کیا بھروسا، یہ میں کیسے جان سکتا ہُوں کہ عورت کی نظر کیا ہے۔ لیلےٰ را با چشم مجنوں باید دید، تو پھر مجنوں کو بھی لیلیٰ کی آنکھ سے دیکھنا چاہیے۔ دوسری قابلِ قبول وجہ دلاور کی موت ہو سکتی تھی۔ دلاور کی بیوی بن کے ملنے والی شہرت اور عزت ہو سکتی تھی جس کی طرف عاشی کو خود دلاور نے کھینچا ہو گا، لالچ دے کر بُلایا ہو گا اور ناپختہ شعور رکھنے والی اور بے لگام خواہشات رکھنے والی عاشی نے اسے اپنی کامیابی جانا ہو گا کہ اس نے ایک ہوشیار صنعت کار، کاروباری اور سیاسی طور پر سمجھ دار، بااختیار اور صاحبِ اعتبار شخص پر اتنی آسانی سے اقتدار حاصل کر لیا۔

گاڑی ایک بار پھر روانہ ہوئی تو میرے دل میں عاشی سے نفرت کے جذبات میں شدّت آ چکی تھی۔ عورت کو عورت کا گھر اُجاڑتے۔ اسے شوہر کی ملکیت اور گرہستی کا مالک ہونے کی خوشی سے محروم کرتے اور احساسِ رسوائی و ذلت دے کر زندگی سے متنفر کرتے دیکھا اور سُنا تھا مگر کیا عورت صرف عورت ہوتی ہے، بہن نہیں ہوتی۔ بات یہ ہے کہ ہر عورت عاشی نہیں ہوتی جیسے ہر مرد دلاور نہیں ہوتا۔ میں نے اپنی منفی سوچ کو کنٹرول کیا۔

تاہم عاشی سے محتاط رہنے کی ضرورت تھی، وہ بے وقوف لڑکی نہیں تھی اور محسن نے اس کی آنکھیں کھلی چھوڑنے میں خطرہ محسوس کیا تھا تو یہ احتیاط پسندی کا تقاضا تھا۔ وہ راستہ نوٹ کر سکتی تھی۔ دلاور نے اُسے شریکِ حیات بنانے کا فیصلہ کرتے وقت کیا دیکھا تھا۔ صرف اس کا نو دمیدہ گلاب جیسا تازہ شباب اور حُسنِ خانہ خراب۔۔ یا اس کے ساتھ شمعِ محفل بن جانے کی وہ اضافی صلاحیت جو چراغِ خانہ قسم کی پہلی بیوی میں نہیں تھی۔ میں نے سوچا کہ اُس سے پوچھوں اور پھر اُسے غیر ذاتی مسئلہ سمجھتے ہوئے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔

صُبح کے ڈھائی بجے تھے جب میں نے گاڑی کو اپنے گھر یا موجودہ ٹھکانے کے سامنے روکا۔ اندر کے ہر کمرے میں جلتی ہوئی لائٹ باہر سے کھڑکی کے شیشوں پر نظر آتی تھی مگر خاموشی مکمل تھی۔ میں نے ایک بار کار کا ہارن بجانے میں کوئی حرج نہ سمجھا پھر نیچے اُتر کے گیٹ تک گیا اور کال بیل دبائی اور اس کے کھلنے کا منتظر رہا جو اندر سے بٹن دباتے ہی گیٹ کے کھلنے کی خبر دیتا تھا۔ انتظار کے آدھے منٹ کا ہر سیکنڈ طویل سے طویل تر ہوتا گیا۔ خطرے کی سرگوشی ایک پکار بننے لگی۔ میں نے اضطراب میں بار بار کال بیل بجائی۔

"کیا بات ہے؟" محسن نے کہا "کال بیل تو بج رہی ہے"

"ہاں کیا سب سو گئے ہیں؟" میں نے کہا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے" محسن نے کہا۔

میں گیٹ پر چڑھ کے اندر کُود گیا۔ کیتھرین اور جُولی بھی اگر سو جاتیں تو مسلسل کال بیل سُن کے اب تک جاگ جاتیں۔ غالب یا چوہدری دلاور کے سونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اندر یقیناً کوئی گڑبڑ ہوئی تھی۔ میں نے ریوالور ہاتھ میں رکھا اور دروازے پر لات ماری، دروازہ پہلے ہی کھلا ہُوا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی میں نے اس کمرے کو خالی پایا جس میں غالب اپنی پلاستر میں لپٹی ہوئی ٹانگ کے ساتھ موجود تھا۔ ہم نے اسے ریوالور کے ساتھ بیڈ پر بیٹھا ہُوا چھوڑا تھا اور اُس نے کہا تھا کہ وہ خود دلاور کی نگرانی کرے گا۔ دلاور صرف ایک ہی دروازے سے باہر آ سکتا تھا اور غالب کے ریوالور کا رُخ اسی دروازے کی سمت میں تھا۔

میرا دل کسی بہت منحوس خبر سے ڈرنے اور لرزنے لگا "غالب!" میں نے چِلّا کے کہا اور دوسرے کمرے کی طرف بڑھا۔

"اِدھر آ جا یار" غالب کی آواز آئی۔

میں دروازے کے وسط میں رُک گیا پھر میری نظر کیتھرین کی ہولناکی پر ٹھہر گئی جو میرے سامنے آ گیا تھا۔ کمرے کے وسط میں کیتھرین بے حس و حرکت پڑی ہوئی تھی، بالکل چت اور ہاتھ پیر پھیلائے۔ اس کے پیچھے دیوار کے ساتھ دلاور بیٹھا ہُوا تھا لیکن وہ کرسی سے نہیں بندھا ہُوا تھا۔ کرسی کمرے میں ایک طرف گری ہوئی تھی اور وہ رسّی بھی وہیں پڑی تھی۔ دلاور کے دائیں بازو کی آستین کہنی سے کچھ اُوپر خون سے تر تھی اور وہ دوسرے ہاتھ سے زخم کو دبائے لمبی لمبی سانسیں لے رہا تھا۔ غالب اس کے بالکل سامنے والی دیوار سے ٹیک لگائے فرش پر یوں بیٹھا تھا کہ اس کی پلاستر والی ٹانگ سیدھی تھی۔ ریوالور اُس کے ہاتھ میں تھا۔

"کیتھرین" میں نے چِلّا کے کہا اور گھٹنوں کے بل فرش پر بیٹھ گیا۔ میں نے اس کا ہاتھ اُٹھایا پھر اس کے سینے پر سر رکھ کے دل کی دھڑکن کو سُنا۔ یہ سب غیر ضروری تھا۔ اُسے پہلی نظر میں دیکھتے ہی مجھے یقین آ چکا تھا کہ وہ زندہ نہیں ہے۔ میں پھر بھی چاہتا تھا کہ اپنے یقین کو خود ہی جھٹلا دوں۔ اس سچ کو جھوٹ کرنے کی خواہش نے مجھے مجبور کیا تھا کہ میں نبض اور دل کی دھڑکن دیکھوں۔ میں نے دلاور کی طرف دیکھا تو وہ مجھے گھور رہا تھا۔

"ہاں، میں نے مارا ہے اسے" دلاور نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ میں نے غالب کی طرف دیکھا اور کھڑا ہو گیا۔ شاید اُس نے مجھے آواز دی تھی۔

"سکندر! پہلے میری بات سن لے" غالب نے چِلّا کے کہا۔ میرے، دلاور کی جانب بڑھتے قدم اور اس کی گردن کو دبوچ کے سانس کا رشتہ توڑ دینے کی آرزو سے مغلوب ہاتھ رُک گئے۔

"وہ، جُولی کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم، وہ بھاگ گئی تھی" غالب نے کہا۔ "تو اکیلا ہے کیا؟ باقی لوگ کدھر ہیں؟"

"باہر گاڑی میں" میں نے کہا اور باہر کا گیٹ کھولنے والا بٹن دبایا۔

"کون کون ہے؟" غالب نے پوچھا۔

"ابھی سب سامنے آ جاتے ہیں" میں نے پھر باہر کا رُخ کیا۔ محسن میری واپسی میں دیر سے پریشان ہونے لگا تھا۔

"کیا ہُوا؟" اُس نے پوچھا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا "بس جو ہونا تھا ہو گیا" میں نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا "یہاں کیا بتاؤں"

محسن میرے لہجے سے سمجھ گیا کہ کوئی سنگین صورتِ حال درپیش ہے لیکن اُس نے صبر و ضبط کا مظاہرہ کیا اور خود بھی باہر آ گیا۔

"اندر چلو" میں نے عائشہ سے کہا "آپ بھی ماں جی"

"مجھے کیا معلوم کہ اندر کیا ہے اور باہر کیا" عائشہ نے کہا اور مجھے خیال آیا کہ اس کی تو آنکھوں پر پٹی ہے۔ میں ذہنی طور پر اتنا اپ سیٹ تھا کہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے بھی محروم ہو رہا تھا۔ جب میں، عائشہ اور سراج کی ماں کو ہاتھ تھام کے اندر لے جا رہا تھا تو محسن تیزی سے آگے نکل گیا۔ پچھلی سیٹ پر لیٹی ہوئی زیب النساء سے یہ اندیشہ نہیں تھا کہ وہ فرار ہو جائے گی۔ غالباً اندر جاتے ہی محسن پر اس اندوہناک خبر کی بجلی گری کہ کیتھرین مر گئی ہے اور جُولی پاگل پن میں گھر سے نکل گئی ہے۔ میں نے اُس کے چیخنے چِلّانے اور دیوانہ وار گالیاں بکنے کی آواز سُنی۔ گالیاں وہ دلاور کو دے رہا تھا اور شاید اُس پر ٹوٹ پڑا تھا کیونکہ غالب اُسے چِلّا چِلّا کے ہوش میں رہنے کو کہہ رہا تھا۔ جو گالیاں محسن نے دیں، وہ حد درجہ فحش تھیں اور اس کے ناقابلِ برداشت صدمے کا اور [illegible] کی کیفیت کا نتیجہ تھیں۔ میں نے عائشہ کے اور سراج کی ماں کے چہرے پر کسی ناخوشگوار صورتِ حال سے دوچار ہونے کا خوف دیکھا۔

انھیں ایک طرف بٹھا کے میں محسن کی طرف گیا۔ اس نے دلاور کو دُھن کر رکھ دیا تھا۔ دلاور پھر اُسی طرح بیٹھا ہُوا تھا لیکن اس کے چہرے پر چوٹوں کے آثار تھے۔ اس کے لبوں سے اور ناک سے خون بہہ رہا تھا اور وہ ایک ہاتھ سے گولی کے زخم کو دبا کے بُری طرح کراہ رہا تھا۔ اس کے زخم سے زیادہ خون بہہ کر پورے ہاتھ کو تر کر چکا تھا۔ محسن نے اس کے کپڑے بھی پھاڑے تھے اور اس کے سر کے بال پکڑ کے کھینچے تھے یا سر دیوار سے ٹکرایا تھا کہ وہ پوری طرح ہوش میں نہیں تھا اور اپنی جگہ بیٹھا ہُوا جھُول رہا تھا۔

"محسن، بس کر یار! اس کو مارنے سے کیتھرین تو واپس آنے سے رہی" میں نے کہا "ہمیں جُولی کی فکر کرنا ہے۔ اس کو تو واپس کرنا ہی ہے تاکہ رابعہ اور ٹیڈی کی واپسی کی صورت پیدا ہو۔ ہمیں بہت کچھ کرنا ہے دوست، ہم دونوں کو۔۔۔"

"ہاں یار، بس صدمہ اتنا شدید تھا کہ میں پاگل ہو جاتا" محسن نے کہا "اب تو ہم ہی ہیں۔ کیتھرین اور جُولی کے بغیر ہم یہ سب کیسے کریں گے"

"ہاں، سوچا تھا کہ تینوں عورتوں کو ان کی تحویل میں دے کر نکل جائیں گے" میں نے کہا۔

"اب ایک کام بڑھ گیا۔ کیتھرین کو سپُردِ خاک کرنے کا" غالب نے رنج سے کہا "خدا اس کے گناہ معاف کرے، ایک زندگی میں اس عورت نے بہت دُکھ اُٹھائے جو کئی زندگیوں کا بوجھ تھے"

"میں۔۔ میں اسے بھی لے آؤں" میں نے کہا "اور پھر گاڑی کو ٹھکانے لگا دوں، کسی نے دیکھ لیا تو۔۔" میرا جملہ

نامکمل رہ گیا کیونکہ باہر کسی نے گاڑی کا دروازہ بند کیا تھا۔ پچھلی سیٹ کا ایک دروازہ میں کھلا چھوڑ آیا تھا۔ میں تیزی سے باہر نکلا گیٹ کے باہر کھڑی ہوئی گاڑی کے آس پاس کوئی نہیں تھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے یہ خیال ضرور آیا تھا کہ رات کو گشت کرنے والے چوکیداروں یا پولیس والوں نے ایک گاڑی کا کھلا دروازہ دیکھ کر نہ جانے کیا سمجھا ہوگا اور کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ شکوک رفع کرنے کے لیے رُک گئے ہوں۔

پھر سارے بند دروازے دیکھ کر مجھے یہ خیال آنا لازمی تھا کہ پیچھے والا دروازہ کیسے بند ہوگیا۔ ہوا تھی بھی نہیں اور ہوا کیا آندھی سے بھی ایک مرسیڈیز کا بھاری بھرکم دروازہ بند ہونا مشکل تھا۔ میں نے ریوالور ہاتھ میں رکھتے ہوئے دروازے کو پھر کھولا تو مجھے اپنی آنکھوں پر دھوکے کا گمان ہوا، وہ سیٹ اب خالی پڑی تھی، جس پر میں زیب النساء کو بے ہوش چھوڑ گیا تھا۔

یہ ایک نئی پریشانی تھی۔ میں اس بے وقوفی کی حد تک سادہ لوح اور معصوم نظر آنے والی لڑکی سے ایسی چالاکی اور مکاری کی کیسے توقع رکھ سکتا تھا اور وہ مجھے اعتماد سے دھوکا دے کر فرار ہونے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ وہ بے ہوشی کا مکر کیے پڑی رہی تھی اور موقع کی منتظر تھی جو ہم نے اپنی بے وقوفی سے خود ہی فراہم کر دیا تھا۔ اب تک ہمیں کسی پر اعتبار نہ کرنا آ جانا چاہیے تھا مگر ہم تھے کہ کہیں نہ کہیں فریبِ اعتبار میں مار کھا جاتے تھے۔

میں نے سڑک پر دُور دُور تک دیکھا لیکن ہر سو سناٹا تھا اور ہر شے ساکت تھی۔ اتنے کم وقت میں وہ بہت دُور نہیں جا سکتی تھی۔ اگر وہ سڑک پر سیدھا بھی گئی تو نظر میں آجاتی چنانچہ وہ چالاک لڑکی کہیں چھپی ہوئی تھی۔ میں اب تک بے یقینی میں مبتلا تھا، وہ سب اس کی اداکاری تھی۔ کیسے کیسے فنکار پڑے ہیں دنیا میں۔ اب تک اداکاری میں پہلا نمبر دلاور کا تھا جو صورت کے تاثرات آواز اور لب و لہجے پر حیرت انگیز قدرت رکھتا تھا اور کبھی معلوم نہیں ہونے دیتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے اور کیا کہہ رہا ہے۔ یا کیا کہہ رہا ہے اور کیا کرنا چاہتا ہے مگر یہ لڑکی، اس نے تو کمال ہی کر دیا۔ مجھے بار بار اس کا سہما ہوا انداز۔ خود کو "ہم" کہنا۔ ہائے اللہ اور واللہ کہنے کی معصوم ادا، اُس کا رونا دھونا، خاموش اظہارِ بے بسی، کیا وہ سب ڈراما تھا، تھی نا آخر جمشید کی بہن جو خود ایسا ڈرامے باز ہے کہ اپنی اصل شخصیت کو دوسرے چہروں میں چھپا کے رکھتا ہے۔

میں دونوں جانب دیکھتا ہوا اور ہر آواز پر کان رکھتا ہوا پیچھے گیا، اگر وہ کسی درخت کی اوٹ میں یا کسی دیوار کے سائے میں تھی تو مجھے دکھائی دے جاتی۔ آدھے منٹ سے کم وقت میں وہ کتنی دُور جائے گی۔ میں نے سوچا، وہ کون سی سو میٹر دوڑ کی چیمپئن تھی اور پھر غرارے کے ساتھ وہ بھاگ بھی کیسے سکتی ہے۔ دروازہ بند ہونے کے ساتھ ہی تو میں پہنچ گیا تھا۔

میں پچاس قدم کے فاصلے سے واپس ہوا اور گاڑی سے آگے نکل گیا۔ اُلّو کی پٹھی، غصے اور جھنجلاہٹ میں میرے لبوں سے اُس کے لیے گالی ہی نکل سکتی تھی۔ ہاتھ آجائے تو مار ڈالوں مگر وہ ہاتھ نہ آئی تو! ایسی چالاک لڑکی سب کچھ کر سکتی ہے اس کے ذہین ہونے میں کوئی شک نہیں، وہ فوراً کسی کوٹھی میں گھس جائے گی۔ ایک تو عورت ذات پھر جوان لڑکی، صورت سے شریف اور معصوم نظر آنے والی، اُس کی جگہ کوئی مرد منہ اُٹھا کے کسی بھی گھر میں گھس جائے تو مار کھائے مگر اسے کسی کا ڈر نہیں۔

میں نے ڈرتے ڈرتے اِدھر اُدھر کی کوٹھیوں کو دیکھا لیکن سب میں اندھیرا اور سکوت مکینوں کے محوِ خواب ہونے کا پتا دیتا تھا۔ وہ کسی بنگلے میں ہوگی، شاید وہ مجھے دیکھ رہی ہوگی اور منتظر ہوگی کہ میں لوٹ جاؤں تو وہ دستک دے اور گھر والے اُٹھ کر دروازہ کھولیں تو انھیں بتا دے کہ کس طرح بدمعاش ایک ایس ایس پی کے گھر سے تین عورتوں کو اُٹھا لائے ہیں اور اب وہ کہاں موجود ہیں، وہ فون کر دے گی اور آدھے گھنٹے میں یا اس سے بھی پہلے پولیس پہنچ جائے گی، وہ جس گھر سے فون کرے گی وہاں رہنے والا خود پولیس کو صحیح پتا سمجھا دے گا۔

میں نے محسوس کیا کہ ان حالات میں ہمارا یہاں رُکنا خطرات کی دلدل میں اُترنے کے ڈوبنے کے مترادف ہوگا۔ عین اس وقت جب ہم اپنی کامیابی کے یقین سے سرشار تھے ایک اَلھڑ اور نادان نظر آنے والی لڑکی نے ہماری غفلت سے فائدہ اُٹھایا۔ اُس نے اپنے رویّے سے خود کو بے ضرر ثابت کرنے کی بہترین اداکاری کی اور ہمیں اپنی طرف سے مطمئن کر دیا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں اپنا سر پیٹ لوں، وہ مصور تھی۔ اس کی نظر تو بہت تیز ہوگی۔ چیزوں کے ظاہر اور باطن تک اُتر جانے والی اور احساس کے ہر رنگ سے آشنا۔ ہمیں دیکھتے ہی اُس نے طے کر لیا تھا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ شور مچا کے اور لڑ کے وہ نہیں جیت سکتی تھی۔ اس نے کمزور ہونے اور شکست خوردہ نظر آنے کا کھیل رچایا اور اپنی ہار کو بالآخر جیت میں بدل دیا۔

میں سخت پریشانی میں واپس ہوا۔ اب یہ انتہائی ضروری ہوگیا تھا کہ ہم اس جگہ سے نکل جائیں۔ میں نے سب سے پہلے محسن کو خبردار کیا۔

"یار! وہ حرافہ نکل گئی، زیب النساء" میں نے محسن کو باہر بُلا کے کہا۔

"نکل گئی، کیا مطلب؟" محسن بھونچکا رہ گیا "بھاگ گئی؟"

"ہاں بھاگ گئی، وہ بے ہوش نہیں تھی، مکر کیے پڑی تھی۔"
"اوہ مائی گاڈ! لیکن بھاگ کے کہاں جا سکتی ہے وہ؟" محسن بولا۔
"میں نے اِدھر اُدھر دیکھ لیا... یا تو وہ کہیں چھپی ہوئی ہے یا کسی گھر میں گھس گئی ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم اسے ساری رات تلاش نہیں کر سکتے۔"
"ساری رات کیا، ہم ایک گھنٹا بھی یہاں محفوظ نہیں۔" محسن بولا۔ "وہ کہیں سے فون کر کے ہمیں پھنسا دے گی اور ہم ایسے پھنس جائیں گے جیسے چوہے دن میں چوہے پھنس جاتے ہیں مگر کمال ہو گیا یار، وہ سب اس کی اداکاری تھی۔"
"بس یار، دھری رہ گئی ہماری سب افلاطونیت۔" میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ "لعنت ہماری مردانگی پر اور بہادری پر۔ بہت چالاک بنتے تھے، ریوالور اور مشین گن لے کر گئے تھے، کیسا جوتا مار کے گئی ہے منہ پر۔"
"ہم کتنے بڑے گدھے ثابت ہوئے۔" محسن بولا۔ "کہ اس ناگن کو بے ضرر سمجھ لیا۔ اب تو واقعی نکلو یہاں سے ورنہ محصور ہو جائیں گے سب۔ میرا تو دل نہیں مانتا کہ وہ ایکٹنگ کر رہی تھی۔ نہ سراج نے کسی قسم کی حیرت کا اظہار کیا، نہ خسرو جمشید نے۔ میرا مطلب ہے اس کا رویہ دیکھ کر۔ وہ ایسی تو نہیں تھی جیسی بن گئی تھی۔"

"وہ کنفیوز تو ہوئے ہوں گے کہ وہ ایسے کیوں بول رہی ہے اور اس طرح کیوں بی ہیو کر رہی ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس خیال سے خاموش رہے ہوں گے کہ اس کا کوئی مقصد ہے اور شاید وہ کچھ کر جائے جو دوسرے نہیں کر سکیں گے۔ ان کو کیا ضرورت تھی زیب النساء کا راز فاش کرنے کی اور دیکھ لو، وہ اس لشکرِ جرار سے بڑی طاقت ثابت ہوئی جو ایس ایس پی کے قلعے کی حفاظت پر مامور تھا۔ کم سے کم اس نے خود کو بچا لیا۔"
غالب کو یہ صورتِ حال جان کے سخت تشویش لاحق ہونا لازمی تھی۔ "اب کیا کریں، نکل جائیں؟"
"بالکل نکل جائیں اس جگہ سے جتنی دور جا سکتے ہوں اور جتنی جلدی جا سکتے ہوں۔" میں نے کہا۔
"مگر یار، جولی؟" غالب نے دکھ سے بھرپور لہجے میں کہا۔ "وہ کہاں جائے گی، میرا مطلب ہے آئے گی تو؟"
"کیا معلوم آئے گی یا نہیں۔" میں نے کہا۔ "اور اس وقت ہم خود کو بچائیں یا جولی کی فکر کریں۔ تم نے اسے کدھر جاتا دیکھا تھا؟"
"میں نے تو بس کمرے سے فرار ہوتے دیکھا تھا۔ جب دلاور نے اس کی ماں کو مارا تو وہ چلائی تھی۔ اس کی چیخ پر میں لپکا۔ دوسری طرف سے جولی آئی مگر اتنی دیر میں سب ہو گیا تھا۔"

"کیسے، آخر دلاور آزاد کیسے ہوا؟" میں نے کہا۔
"مجھے نہیں معلوم، اس نے کسی طرح رسیاں کھول لی تھیں۔ وہ اسی طرح بیٹھا رہا تھا۔" غالب بولا۔ "کیتھرین نے اسے پانی پلاتے سنا۔ میں نے بھی سنا تھا، جولی سو گئی تھی۔ کیتھرین نے مجھ سے پوچھا کہ پانی دے دوں اور میں نے کہا کہ دے دو۔ مجھے کیسے خیال آ سکتا تھا۔ قصوروار تو میں ہی ہوں۔ میں نے فرض کر لیا کہ وہ بندھا ہوا ہے اور بھاگ کے جانے کی تو دلاور سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ میرے سامنے سے گزرتا، میں اسے شوٹ کر دیتا۔"

"کیا کیتھرین نے اسے مشتعل کیا تھا؟"
"نہیں، اس نے ضرور کہا تھا کہ کتے، میں پانی نہیں تم کو کچھ اور پلاتی لیکن کیا کروں۔" غالب بولا۔ "ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ دلاور نے اسے پکڑ لیا۔ وہ چلائی اور میں اٹھا۔ میرا اٹھنا بھی تم جانتے ہو۔ ایک ٹانگ کے پلاستر کا بوجھ بھی تھا، پھر بھی میں نے دیر نہیں لگائی لیکن اتنی دیر میں دلاور اس کو مار چکا تھا۔ اس نے کیتھرین پر کرسی ماری تھی۔ کیتھرین کی گردن ٹوٹ گئی۔ دلاور کا ارادہ بھی اس کی جان لینے کا نہیں ہوگا۔ وہ تو شاید کیتھرین سے کوئی اسلحہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال ہوگا کہ یہاں سب مسلح ہیں اور اس کے اتنے قریب آنے کا خطرہ مول لینے والی عورت خالی ہاتھ نہیں ہو سکتی۔ وہ کیتھرین کے بہترین نشانے سے ضرور واقف ہوگا اور یہ بھی جانتا ہوگا کہ وہ بہرام دادا کی شریکِ حیات تھی۔ کرسی کا ایک پایہ کیتھرین کی گردن پر پڑ گیا۔ دلاور کے ... تو کچھ نہیں لگا۔ اس نے اپنی جان گنوا دی۔ وہ اپنے بدترین دشمن کو پانی پلاتے ہوئے ماری گئی۔ کیا اسے شہادت کہیں گے یارو؟ وہ مسلمان نہیں تھی مگر یہ موت کچھ کم محترم بھی نہیں تھی۔"

"موت کے بعد اسے محترم کہو یا نہ کہو۔ وہ ایک ناگزیر لمحے کے اٹل ہونے کا احساس دلانے ضرور آتی ہے۔" میں نے کہا۔
"اس وقت اگر مجھے معلوم ہو جاتا کہ کیتھرین مر گئی ہے تو شاید میں خود بھی دلاور کو مار دیتا۔ میں اس کے بازو کا نہیں اس کے خبیث دل کا اور شیطانی دماغ کا نشانہ لیتا۔ میں تو سمجھا کہ وہ بھاگنا چاہتا ہے اور کیتھرین کو مار رہا ہے۔ میں نے کیتھرین کو گرتے بھی دیکھا تھا مگر یہ نہیں سمجھا تھا کہ اس کی گردن ٹوٹ چکی ہے۔ میں نے تو بس ایک گولی چلا کے دلاور کو بے بس کیا تھا۔ یہ بھی مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ کیتھرین کا جسم بے جان پڑا ہے۔ میں اسے بے ہوش سمجھتا رہا تھا۔" بالکل نامعلوم طریقے پر غالب کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے اور جب وہ خاموش

سوگ کے ایک ماتمی لمحے نے ہمیں احساس دلایا کہ خود ہمارے دل کا درد آنکھوں سے اشک بن کے ٹپک رہا ہے۔
"جب جولی آئی تو میں کیتھرین کو پکار رہا تھا۔ وہ ماں کے پاس بیٹھ کر اسے ہلانے لگی اور اس کا سر یوں فرش پر لڑھکنے لگا جیسے... جیسے دھڑ سے الگ ہو۔ جولی نے ایک چیخ ماری پھر دہشت زدہ ہو کے اٹھی اور پیچھے ہٹی۔ اس نے دلاور کی طرف بھی نہیں دیکھا، میری طرف بھی نہیں دیکھا۔ میری آواز بھی نہیں سنی۔ میں نے اس کے دوڑنے کی آواز سنی۔"
"کیا وہ چلا رہی تھی، دوڑتے ہوئے؟"
"نہیں، میں نے اس دروازے سے دیکھا، وہ گیٹ کھول کے نکل اور اندھیرے میں کھو گئی۔ میں اس کے پیچھے دوڑ سکتا تو ضرور دوڑتا لیکن ایک تو مجھے دلاور کا خیال تھا، دوسرے میری ایک ٹانگ دوسری کا بوجھ بنی ہوئی تھی۔ میں چلاتا رہ گیا اور اس کے دور جاتے قدموں کی آواز سنتا رہ گیا۔ میں کیا بتاؤں، وہ کہاں گئی۔ میرا خیال ہے اس کا دماغی توازن قائم نہیں رہا تھا۔ صدمے نے اسے وقتی طور پر پاگل کر دیا تھا۔" غالب نے کہا۔
"غالب!" میں نے اچانک کہا۔ "میں... میں اندازہ کر سکتا ہوں کہ وہ کہاں گئی ہوگی۔"
"کہاں گئی ہوگی، انکل رضوی کے گھر؟"
میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں، ایسی حالت میں وہ یا تو پولیس کے پاس پہنچ سکتی ہے یا ایک جگہ اور بھی ہے۔"
"اس کا پرانا گھر؟" غالب نے کہا۔ "ہاں، وہ جولی کے لیے ایک جذباتی پناہ گاہ ہے۔ ماں کی گود کی طرح، اس کا بچپن وہیں گزرا تھا اور اس گھر کے باہر وہ جہاں بھی رہی غیر محفوظ رہی۔ تو شاید ٹھیک کہتا ہے، ہم دیکھ سکتے ہیں اسے وہاں...؟"
"سامان رکھو، اس وقت خود ہمارے لیے اس سے بہتر پناہ کی کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔" میں نے کہا۔ "اگر ہم دس منٹ میں نکل جائیں۔"
"اور ان کو، قیدیوں کو؟" محسن نے کہا۔
"ظاہر ہے جہاں ہم وہیں ہمارے قیدی۔" میں نے کہا۔
سارا اسلحہ ڈکی میں ڈالنے کے سوا ہم نے اس گھر سے کچھ نہیں لیا، دس منٹ پورے ہونے سے پہلے ہم نے عائشہ اور سراج کی ماں کو پھر گاڑی میں بٹھا دیا۔ ان کی آنکھوں پر سے ابھی تک پٹی اتاری ہی نہیں گئی تھی کہ سفر پھر شروع ہو گیا۔
"اب ہم کہاں جا رہے ہیں؟" عائشہ نے کہا۔
"جہنم میں۔" میں نے دہاڑ کر کہا۔ "تمہارے خصم کے پاس، سال وہ ... زیب النساء گئی ہے۔"

"زیبا، کیا وہ کہیں چلی گئی ہے؟" سراج کی ماں نے کہا۔
"ہاں، وہ دغاباز اور مکار لڑکی، وہ ہماری آنکھوں میں دھول جھونک کے نکل گئی ہے۔" محسن بولا۔
سراج کی ماں مسکرانے لگی پھر ہنسنے لگی۔ اس کی ہنسی ہمارا تمسخر اڑا رہی تھی اور میرے خون کی حدت بڑھا رہی تھی مگر میں نے ایک بوڑھی عورت کے منہ پر ہاتھ مارنے سے گریز کیا۔ آخر ہے نا میرے سراج کی دلہن۔ میں تو سمجھ گئی تھی کہ وہ شرارت کر رہی ہے تو ایسے ہی نہیں کر رہی ہے۔"
میں نے محسن کی طرف دیکھا۔ "ہمارا اندازہ درست تھا۔" میں نے کہا۔ "وہ ہمیں بے وقوف بنا رہی تھی۔"
"اور دوسرے سب جانتے تھے کہ ہم بے وقوف بن رہے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "اب دیر کیسی، سب تو آ گئے۔"
"یارو، ایسی بھی کیا بے مروتی۔" غالب بولا۔ "اسے بھول گئے۔"
"نہیں یار۔" میں نے سر جھکا کے افسردگی سے کہا۔ "بھول تو ہم کبھی نہیں سکتے مگر اس کی صرف یاد کو اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں، اس کے بے جان وجود کے لیے گنجائش نہیں رہی۔"
"کیتھرین جانتی تھی اور خدا بھی جانتا ہے کہ ہم خود غرض اور کمینے نہیں۔" محسن بولا۔ "وہ سب بھی بچھڑ جانے والوں کے ساتھ جذبات کے اظہار میں اتنے مخلص نہیں ہوتے جو بڑی دھوم دھام سے سوئم اور چہلم پر پلاؤ، زردے کی دیگیں پکواتے ہیں۔ کیتھرین کے لیے احترام اور عزت کے جذبات جو ہم رکھتے ہیں، نمائشی نہیں ہیں۔ ہم اس کے ساتھ رہتے تو اس کو اپنے ہاتھوں سے سپردِ خاک کرتے۔"
"لیکن رسمِ دنیا کے مطابق اسے آخری تعظیم دینے کی فرصت ہی نہیں ملی۔ اس سے فرق بھی نہیں پڑے گا، کیتھرین و... اگر ... میں ہم شریک نہ ہوئے۔ وہ ہمیں معاف کر دے گی۔ ہما... مجبوری کو سمجھتے ہوئے۔" میں نے کہا۔
"ہاں، یہ مجبوریاں نہ ہوں تو ہم خود کو خدا سمجھنے لگیں۔" غالب بولا۔ اور جب میں کار میں بیٹھا تو اس نے ایک آہ سرد بھری۔
"یار، موقع ملے تو اسے بھی لے آنا۔" غالب بولا۔ میں نے اسے پچھلی سیٹ پر ریوالور تھما کے بٹھا دیا۔ جہاں وہ پلاستر والی ٹانگ کو پھیلا کے بیٹھ سکتا تھا۔ میں نے مناسب سمجھا کہ محسن مجھے راستہ بتانے کے بجائے خود ہی ڈرائیونگ کرے کیونکہ کیتھرین کا پرانا گھر صرف اسی نے دیکھا تھا۔ میں نے چابیاں اسے دیں اور خود اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اسی وقت اچانک ہر سمت سے سائرن سنائی دینے لگے۔ یوں لگتا تھا جیسے ہر طرف سے پولیس نے ادھر آنے والے تمام راستوں پر یلغار کر دی ہو۔ دور کی یہ آواز رات کی خاموشی میں بھر گئی تھی۔

"پولیس آہی گئی۔" محسن نے کہا۔ "زیب النساء نے کام دکھا دیا۔"

"تو ڈکی کھول۔" میں نے کہا۔ "اس میں سے ایک دستی بم تو نکال ہی لے، اگر وہ بہت نزدیک آ پہنچے تو ہم اُن کی پیش قدمی روک دیں گے۔"

محسن نے سر ہلایا اور پیچھے جا کے ڈکی کھولنے لگا۔

"اب تو کیتھرین کی لاش بھی پولیس ہی لے جائے گی۔" غالب نے کہا۔

"جلدی کر محسن۔" میں نے کہا کیونکہ سائرن زیادہ قریب سے سُنائی دینے لگے تھے۔

"اندھیرے میں پتا نہیں چل رہا ہے یار۔" محسن نے کہا۔ "سب سامان ڈھیر ہوا پڑا ہے۔"

"عمر بھری نماز جنازہ پڑھائی غیروں نے۔ مرے تھے جن کے لیے وہ رہے وضو کرتے۔" غالب نے کہا۔ وہ کیتھرین کی موت پر ہم سب سے زیادہ دُکھی اور جذباتی ہو رہا تھا سائرن کی آواز ہر لمحہ قریب ہوتی جا رہی تھی اور اب آگے پیچھے سے سُنائی دے رہی تھی۔ صرف کیتھرین اس آواز کو نہیں سُن رہی تھی۔ اس کی لاوارث لاش اس جلنے عبرت و سرائے فانی میں جسے ہم نے اپنا ٹھکانا سمجھا تھا، غبارِ کارواں کی طرح پیچھے رہ گئی تھی۔

محسن نے بڑی عجلت میں ڈکی بند کی۔ اُسی وقت سامنے سے دو ہیڈ لیمپس کی روشنی نمودار ہوئی۔

"گاڑی کو ریورس میں لے۔" میں نے کہا۔

"اور اگر کوئی پیچھے سے بھی آگیا۔" محسن بولا۔ لیکن اس نے گاڑی کو ریورس کر لیا۔ یہ کوئی عام قسم کی کار نہیں تھی، چنانچہ محسن کا اندازہ کچھ غلط ہو گیا۔ طاقتور گاڑی ایک دم بے قابو ہو کے پیچھے گئی اور اس سے پہلے کہ محسن رُخ بدلتا یا بریک لگاتا، گاڑی ایک ٹیلیفون کے کھمبے سے ٹکرا گئی۔ مجھے ایک زبردست جھٹکا لگا اور عاشی نے خوفزدہ ہو کے چیخ ماری۔ گاڑی کو تھوڑا بہت نقصان ضرور پہنچا ہوگا۔ اس کی ٹیل لائٹس تو ٹوٹ ہی گئی تھیں مگر ٹیلی فون کا کھمبا بھی اس ٹکر کی تاب نہ لا سکا اور پیچھے کی طرف جھک کر جھولنے لگا۔ اسے تاروں نے مل کے سنبھال لیا تھا جو دونوں طرف سے کھمبے کی گرفت میں تھے۔

پلٹ کر دیکھنے پر مجھے ایک گلی سی دِکھائی دی جو دراصل ایک خالی پلاٹ تھا۔ دو کوٹھیوں کے بیرونی احاطے کی دیواروں کے درمیان یہ پلاٹ جو شاید ایک کنال کا ہوگا بہت چھوٹا لگتا تھا۔ یہاں سب کوٹھیاں اس طرح بنائی گئی تھیں کہ ایک کے پیچھے دوسری تھی اور دونوں کی عقبی دیوار مشترک اور منطبق رہتی تھی، چنانچہ ایک قطار کی ساری کوٹھیوں کا رُخ مشرق کی جانب ہو تو اس کے پیچھے والی کوٹھیاں مغرب کو فیس کرتی تھیں۔ ہر سڑک ایسی دو کوٹھیوں کی قطار کے درمیان سے گزرتی تھی۔ میں نے جو خالی پلاٹ دیکھا تھا، اس کے پیچھے والا پلاٹ بھی خالی تھا۔ شاید اس کا مالک ایک ہی شخص تھا جو آگے پیچھے کے پلاٹوں پر تعمیر کرتا تو اسے دونوں جانب سڑک ملتی یا شاید وہ ایک خاندان کی ملکیت تھے جو الگ رہتے ہوئے بھی مشترک عقبی دیواروں میں دروازہ نکال کے دو گھروں کو ایک سمجھ سکتے تھے۔ وجہ کچھ بھی ہو، اس وقت انہی دو خالی پلاٹوں نے ہمیں ایک سڑک سے دوسری سڑک تک پہنچنے کا راستہ فراہم کیا۔ سائرن کی آواز اور ہیڈ لائٹس سے اندازہ ہوتا تھا کہ پولیس چند سیکنڈ میں ہم تک پہنچ جائے گی۔

"یہ راستہ بند کر دے۔" محسن نے کہا۔

میں خود اسی امکان پر غور کر رہا تھا۔ جھک کر زمین سے لگ جانے والے کھمبے نے جزوی طور پر ایک رکاوٹ [illegible] تھی، مگر جیسے ہم نکل آئے تھے، ایسے ہی ہمارا تعاقب کرنے والے بھی آ سکتے تھے۔ میری نظر نے صورتِ حال کے عملی پہلو کو سمجھ لیا۔ پھر میں نے دستی بم کی پن مُنہ سے کھینچ کے نکالی اور کھڑکی سے باہر ہاتھ نکال کے اسے پیچھے پھینک دیا۔

دھماکا عین اسی وقت ہوا جب پولیس کی گاڑی سامنے آ چکی تھی۔ پلاٹ کی چوڑائی شاید بیس گز یا کچھ کم ہوگی۔ دستی بم اس کے تقریباً وسط میں گرا۔ اس وقت تک ہم نصف فاصلہ طے کر چکے تھے یعنی ایک پلاٹ کی لمبائی سے آگے نکل کر دوسرے پلاٹ پر پہنچ گئے تھے۔ دھماکے نے بیچ میں ایک گڑھا بنا دیا اور دونوں جانب کی دیواروں کو مسمار کر دیا۔ میں نے اندازہ کیا کہ جیپ میں سوار افراد براہِ راست اس دھماکے سے متاثر نہیں ہوئے ہوں گے لیکن ان کا معمولی طور پر زخمی ہو جانا ممکن تھا۔ دھماکا ہونے تک مرسیڈیز کچھ اور آگے چلی گئی تھی لیکن جیپ کا رُخ اسی طرف تھا جہاں دستی بم گرا تھا۔

اب بیس گز چوڑے راستے کے درمیان میں اتنا گہرا گڑھا تھا کہ جیپ اس میں سے نہیں گزر سکتی تھی اور گڑھے کے دونوں جانب دیواروں کے ملبے کا ڈھیر تھا۔ جیپ ان اینٹوں کے ڈھیر پر بھی نہیں چڑھ سکتی تھی۔ وہ اب واپس جا کے اور پھر کسی موڑ سے گھوم کر ہی آ سکتے تھے۔ دھماکے سے دھواں پھیلا ہوا تھا اور گرد و غبار کا بگولا سا اُٹھا تھا جس نے ہمیں اسکرین فراہم کر دیا اور ہم پولیس کی نظر سے اوجھل ہو گئے۔ میں نے فائرنگ کی آواز سُنی تھی مگر وہ اندھا دُھند چلائی جانے والی گولیاں ضائع ہوئیں۔

ہنگامی صورتِ حال میں تقسیم کار میں ڈسپلن قائم رکھنے سے افراتفری نہیں پھیلتی۔ محسن نے اپنی ساری توجہ ڈرائیونگ پر رکھی تھی اور مقابلے کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دیا تھا۔ اگر میں اُسے ڈرائیونگ کے بارے میں ہدایات بھی دیتا یا وہ ڈرائیونگ کے ساتھ مجھے بھی مشورہ دیتا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے تو ہم ایک دوسرے کو ڈسٹرب کرتے [illegible] خود بھی ڈسٹرب ہوتے۔ ہمیں ایک دوسرے کی صلاحیت پر [illegible] اعتماد تھا جتنا خود اپنی ذات پر اور اس دُہرے اعتماد کی قوت ہمیشہ مؤثر ثابت ہوتی تھی۔

جب میں نے محسن کو اطلاع دی کہ اب پولیس پیچھے نہیں ہے تو ہم [illegible] واردات سے بہت دُور تھے۔ گاڑی اسّی نوّے میل کی رفتار سے موڑ کاٹتی جا رہی تھی۔ کبھی دائیں تو کبھی بائیں۔ منزلِ مقصود کا علم تو محسن کو تھا مگر وہ سیدھا جانے سے گریز کر رہا تھا۔ اس نے فقط سر ہلایا اور اپنی نگاہ سامنے رکھی۔

"تم... تم لوگوں نے پولیس پر بم پھینک دیا۔" عاشی نے کہا۔

"ہاں... مجبوری تھی۔" میں نے کہا۔ "ہمارے پاس ایٹم بم نہیں تھا۔"

"خدا تم سے سمجھے۔" سراج کی ماں نے کہا۔ "تم واقعی دہشت گرد اور تخریب کار ہو۔ بے گناہوں کے خون سے ہولی کھیلنے والے شیطان ہو۔"

"آپ نے سُنا ایس پی کی والدہ نے کیا کہا؟" محسن بولا۔

"ایس پی نہیں گستاخ... ایس ایس پی صاحب۔" میں نے کہا۔

"ان کی رائے ہمارے بارے میں اچھی نہیں ہے۔"

"اچھی ہو بھی کیسے سکتی ہے۔ بیٹے نے ماں کو بریف کر رکھا ہے اور ہم ہیں بیٹے کے دُشمن۔" میں نے کہا۔ "ہم بتائیں گے کہ وہ دن کو رات اور رات کو دن سمجھ رہی ہیں تو ہم ہی جھوٹے ہوں گے۔"

"رہنے دو یہ باتیں۔" سراج کی ماں نے کہا۔ "میں نے سچ کو دیکھا بھی ہے اور بھگت بھی رہی ہوں۔"

"فرض کریں صرف ایک لمحے کے لیے۔" میں نے کہا۔ "کہ کسی دن وقت نے آپ کی آنکھوں پر پڑا ہوا پردہ ہٹا دیا۔ آپ پر اچانک انکشاف ہوا کہ آپ کا یقین تو ایک سراب تھا۔ آپ کے ساتھ سب سے بڑا جھوٹ تو خود آپ کا اپنا بیٹا بولتا رہا تھا اور سب سے زیادہ دُکھ دینے والا دھوکا بھی اُسی نے دیا تھا تو آپ کیا کریں گی؟"

"میں مر جاؤں گی، خدا نہ کرے کہ میں اُس دن کے لیے زندہ رہوں۔"

"آمین۔" میں نے کہا۔ "ویسے تو ہر ماں کا وجود ایک شجر سایہ دار ہوتا ہے اور کوئی بھی کسی کی ماں کے لیے موت نہیں مانگتا۔" میں نے کہا۔ "مگر یہ بہت اچھا ہوگا، اگر آپ اس وقت سے ایک لمحہ پہلے تک ہی سُکھ، چین، خوشی اور صحت کے ساتھ جئیں جو انکشاف کا لمحہ ہو۔ زندگی کے ایک لمحے سے دستبردار ہو کے آپ بہت سے ناقابلِ برداشت عذاب رکھنے والے لمحوں کی چیرہ دستی سے [illegible] جائیں گی۔"

"اب تک پولیس نے کیتھرین کی لاش قبضے میں کر لی ہو گی۔" غالب نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔

"اب وہ اس سے کیا معلوم کریں گے، جب اُس کے جیتے جی نہ معلوم کر سکے۔" محسن نے کہا۔ "مجھے زیادہ فکر جُولی کی ہے۔ کیا یہ نئی زندگی جُولی کو اسی لیے ملی تھی۔ ہم نے کتنی جدوجہد کی تھی اُسے موت کے مُنہ سے واپس کھینچ لانے کی خاطر مگر اس کے بعد ہم نے اُسے کیا دیا؟"

گاڑی نے ایک موڑ کاٹا اور گھنے درختوں کے پیچھے چُھپے ہوئے ویرانے میں ٹھہر گئی۔ ہیڈ لائٹس نے پل بھر کے لیے ایک پُرانی طرز کے [illegible] روشن کیا جس کے برآمدے میں محرابی دروازے تھے [illegible] میں صرف دیواروں کے خلا تھے جو بغیر چوکھٹ [illegible] ہوں اور دروازوں کی نشاندہی کرتے تھے۔ میں نے نیچے اُتر کے چاروں طرف دیکھا۔ آس پاس آباد گھر تھے جن کے درمیان بہرام دادا کا لاوارث رہ جانے والا گھر زمانے کی بے حسی پر نوحہ خواں تھا۔ میں مختصر سے قطعۂ زمین پر اُگے ہوئے جھاڑ جھنکاڑ سے گزرا جو کسی زمانے میں باغیچہ ہوگا۔

دروازوں اور کھڑکیوں کی جگہ باقی رہ جانے والے دیوار کے خالی ٹکڑے ان قبروں کی طرح لگے تھے جن میں سے کفن چوروں نے مُردے نکال پھینکے ہوں۔ بہرام دادا کی بیوی نے مجھے بتا [illegible] کہ اس دریادل ڈما کو نے اپنا سب کچھ بانٹ دیا تھا، ساتھیوں میں اور ضرورت مندوں میں مگر پھر بھی اس کی موت کے بعد مدفون خزانے ڈھونڈنے والوں نے جھوٹی اُمیدوں کی خاطر اُس کی بنیادیں تک کھود ڈالی تھیں اور جب کچھ نہیں ملا تھا تو بھاگتے چور کی لنگوٹی کے مصداق تنکا تنکا سمیٹ کے لے گئے تھے۔ میں نے اندر جا کے ایک دیا سلائی روشن کی۔ ایک سے دوسرے کمرے میں جاتے ہوئے میں نے تین تیلیاں جلائیں اور اچھی طرح دیکھ لیا کہ گرد آلود فرش اور پلاستر اُدھڑی دیواروں کے سوا وہاں کچھ بھی نہیں ہے۔

دونوں عورتوں کو اندر کے ایک کمرے میں منتقل کر دیا گیا۔ قریب ہی کے کسی اسٹریٹ لیمپ کی روشنی اس میں سے براہِ راست ایک کھڑکی کے خلا سے پہنچ رہی تھی۔ غالب ان کے مقابل دوسری دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھ گیا تو میں نے اور محسن نے وہ سب سامان دوسرے کمرے میں لا کے رکھا جو ہم ساتھ لے آئے تھے۔ اس میں وہ سوٹ کیس بھی تھا

جس کی ہلاکت خیزی میں کوئی شُبہ نہ تھا مگر اُسے عائشہ کھول سکتی تھی، اگر اس میں واقعی دس لاکھ روپے بھی تھے تو یہی ہمارا سب سے بڑا اثاثہ بھی تھا۔

ڈکی میں گاڑی کا کور بھی تھا جسے میں نے چادر کی جگہ استعمال کرنے کے لیے اُٹھا لیا۔ محسن کو گلوز کمپارٹمنٹ میں سے ایک ٹارچ ملی۔

"پہلے تو اس گاڑی سے چھٹکارا پانا ضروری ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں، اس کھنڈر میں اس کا وجود ہی شکوک پیدا کرتا ہے۔ کسی رات کے پہرے دار نے اگر دیکھ لی تو مال پوچھنے آ جائے گا۔" محسن بولا۔ "میں اسے کیا کروں؟ کہیں چھوڑ آؤں یا۔"

"کیا تیرے دل میں جمشید کے نقصان کا درد اُٹھ رہا ہے؟" میں نے کہا۔

"نہیں، بس ایسے ہی کسی خوبصورت چیز کو تباہ کرتے ہوئے خیال تو آتا ہے۔" محسن بولا۔

"یہ خوبصورتی فریبِ نظر ہے ورنہ یہ مال حرام کا ڈھیر ہے۔ سوچ لے ذرا کہ کس کس نے اپنے خون سے اس کی قیمت چکائی ہوگی۔ ان سب نے جو تخریب کاروں کے ہاتھوں میں جلنے والے اسلحے سے اپنے بھرے گھروں میں ہی زندہ دفن ہو گئے۔ خون اور گوشت کے لوتھڑے بن کے بکھر گئے اور بچے بھی تو بالکل ادھورے رہ گئے، بے گھر یا بے دھڑ، آنکھوں یا ٹانگوں کے بغیر، یتیمی یا بیوگی کے ساتھ۔ یہ بدبودار و متعفن لاشوں کی تجارت کا مال ہے۔"

"میں نے تو ایسے ہی بات کی تھی۔" محسن بولا۔ "بس ابھی آتا ہوں۔"

"اتنی دور لے جانا کہ ہماری طرف کی ہوا بھی وہاں نہ پہنچے۔" میں نے کہا۔ "اور خیال رکھنا اپنا بھی، صبح ہونے والی ہے۔"

محسن نکل گیا تو میں نے اِدھر اُدھر گھوم پھر کے محفوظ ترین ٹیلی فون کا کھمبا تلاش کیا۔ اتفاق سے ٹیلی فون کی ایک لائن کھنڈر کی چھت کے پیچھے سے گزر رہی تھی۔ لائن کا دوسرا کنارہ پیچھے والے گھر تک گیا تھا۔ میں نے چھت پر چڑھ کے ٹیلی فون کے تار کو دانتوں سے چھیلنے کی کوشش کی مگر انسولیشن بہت سخت تھی۔ مجبوراً میں نے دیا سلائی سے پلاسٹک کو گرم کیا اور پھر دانتوں سے توڑا۔ دوسرے تار کو میں نے دو انچ کے فاصلے سے ننگا کیا اور پھر اپنے پورٹیبل فون کے دونوں کنارے جوڑ دیے۔ سراج کا نمبر ملانے میں خطرہ تھا۔ اس وقت کنکشن ایک فون نمبر سے ملا ہوا تھا اور سراج کے گھر میں ہر فون کال کو ٹیپ کرنے اور ٹریس کرنے کا پورا انتظام تھا۔ وہ آدھے پونے گھنٹے میں اس گھر تک آ پہنچتے جس کی یہ لائن تھی۔ چنانچہ میں نے دلاور کی بیوی سے بات کرنا مناسب سمجھا۔

"ہیلو۔" کسی مرد نے گھنٹی بجتے ہی ریسیور اُٹھا لیا۔

"کیا میں مسز دلاور سے بات کر سکتا ہوں؟" میں نے کہا۔

"آپ کون ہیں؟" اس نے کہا۔

"پہلے مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ میں نے صحیح نمبر ملایا ہے یا نہیں۔"

"میں اس کا والد بول رہا ہوں، دلاور کا فادر اِن لا۔" وہ بولا۔

"کیا آپ کو داماد صاحب کی خیر و عافیت سے کوئی دلچسپی ہے؟" میں نے کہا۔

"تم... تم وہی بدمعاش ہو؟" اس کا غصہ کسی آتش فشاں کے لاوے کی طرح اُبل پڑا۔ "میں پوچھتا ہوں، عائشہ کہاں ہے؟"

"عائشہ خیریت سے اور بالکل محفوظ ہے لیکن آپ کو اس قسم کا اشتعال انگیز اور غیر ذمے دارانہ رویہ اختیار نہیں کرنا چاہیے۔" میں نے کہا۔

"کیا! اشتعال انگیزی میں نے کی ہے اور جو تم نے کیا... کیا وہ ذمے دارانہ فعل تھا۔" بڈھے نے چلانا شروع کیا۔

"دیکھیے، نہ میں آپ کو جانتا ہوں نہ آپ کو میرے بارے میں کچھ معلوم ہے۔" میں نے کہا۔ "سوائے اس کے کہ آپ کی ایک بیٹی میری تحویل میں ہے۔ دلاور کو ہم نے چھوڑ دیا ہے۔"

"خدا کے لیے اسے بھی چھوڑ دو، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ تمہاری اور دلاور کی کیا دشمنی ہے مگر عائشہ نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ تم نہیں جانتے کہ اس کی بہن کی کیا حالت ہے، اُس کی بڑی بہن بہت بیمار ہے اور اُس کی زندگی کا کوئی بھروسا نہیں، وہ صدمے سے مر جائے گی، اُس پر نہیں تو مجھ پر رحم کرو۔ میں بھی بوڑھا ہوں اور دل کا مریض بھی۔ کہاں تک صدمے اُٹھاؤں۔ ایک جوان بیٹا تھا، اس کے بعد جینا تو نہیں چاہتا تھا مگر بیٹیوں نے مجبور کر دیا تھا، اب صرف عائشہ رہ گئی ہے، کسی کو معلوم ہو گیا تو اُس کی بدنامی میرا بوجھ بن جائے گی۔" وہ منت سماجت کرنے لگا۔

"مجھے آپ سے یقیناً ہمدردی ہے۔" میں نے کہا۔ "ایک اجنبی کو بھی کسی کے حالات سے ہمدردی ہو سکتی ہے۔"

"جھوٹ بکتے ہو تم... تم جیسے لوگ کسی کے ہمدرد نہیں ہوتے۔ تم کو کیا، کسی کی زندگی تباہ ہوتی ہے تو ہو جائے، کوئی مرتا ہے تو مر جائے۔" وہ پھر برہم ہو گیا۔

"جو میں کہنا چاہتا ہوں، وہ آپ کے مفاد میں ہے۔ مجھے بتائیں کہ آپ سنیں گے یا میں فون بند کر دوں؟" میں نے کہا۔

"نہیں نہیں، بتاؤ کیا بات ہے؟" وہ جلدی سے بولا۔

"پہلی اطلاع تو میں دے چکا، دلاور کے بارے میں۔"

"ابھی کچھ دیر پہلے ہی اُس کے کسی دوست نے فون کر کے مجھے بتایا تھا کہ وہ بہت بُری حالت میں ملا ہے۔" وہ بولا۔

"خدا کا شکر ادا کریں کہ وہ زندہ مل گیا۔" میں نے کہا۔ "دوسری بات مجھے اُس کی بیوی کے بارے میں کہنا تھی، صرف آپ سے۔ آپ کے سوا کسی اور کو کچھ معلوم ہوا تو آپ کی بڑی بیٹی مر جائے گی۔"

"وہ... اُسے تو مرنا ہی ہے۔" اُس نے کہا۔

"ابھی سے آپ کیا کہہ سکتے ہیں؟" میں نے کہا۔ "کیا یہ ٹھیک ہے کہ اس کی بیماری کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی ہے؟"

"ہاں۔"

"کیا یہ بھی ٹھیک ہے کہ اب تک ایک ہی ڈاکٹر نے اُس کا علاج کیا ہے جو دلاور کے لیے قابلِ اعتماد ہے؟" میں نے کہا۔

"وہ ان کا فیملی ڈاکٹر ہے۔"

"کیا یہ بھی درست ہے کہ آپ کی بیٹی کو صرف ایک اسپیشلسٹ نے دیکھا ہے اور اُس کے پاس بھی دلاور خود لے کر گیا تھا؟"

"اور کون لے جاتا، آخر وہ شوہر ہے اس کا۔" بڈھے نے بگڑ کر کہا۔

"کیا اس نے آپ سب کو اور اپنی بیوی کو سختی سے منع کر دیا ہے کہ اس سے پوچھے بغیر کسی بھی ڈاکٹر سے بیماری کے بارے میں بات تک نہ کی جائے۔"

"ہاں، مگر تم... تم کیسے جانتے ہو یہ سب؟" وہ بولا۔ "اُس نے میری بیٹی سے یہ بات کہی تھی اور مجھ سے..."

"ظاہر ہے آپ دونوں ہی ایسا کر سکتے تھے۔ کیا اُس نے کوئی دھمکی بھی دی تھی؟ مثلاً یہ کہ کسی اور ڈاکٹر سے مشورہ کیا تو بُرا ہوگا، وہ طلاق دے دے گا؟"

"یہ... یہ تو نہیں، آخر تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"پہلے میری بات کا جواب دیں۔" میں نے کہا۔ "دلاور نے دھمکی دی تھی، کسی قسم کے نتائج کی؟" میں نے کہا۔

"دھمکی؟ نہیں... بس ایک بار ایسا ہوا تھا کہ وہ اپنی کسی سہیلی کے پاس چلی گئی تھی، اُس کا میاں اسپیشلسٹ ہے، تو دلاور نے اُسے مارا تھا اور میرے پاس بھیج دیا تھا کہ... کہ یہ بہت خودسر ہو گئی ہے اور اپنے شوہر پر اعتماد نہ رکھنے والی بیوی کو اس کے گھر میں بھی نہیں رہنا چاہیے پھر کبھی ایسا نہیں کیا کسی نے۔" وہ بولا۔

"گویا اب علاج وہیں ہو رہا ہے، جہاں دلاور چاہتا ہے؟"

"ہاں، وہ بھی اچھا ڈاکٹر ہے، بہت بڑا اسپیشلسٹ ہے۔" وہ بولا۔

"پھر فائدہ کیوں نہیں ہو رہا ہے اُس کے علاج سے؟" میں نے کہا۔ "چچا میاں! ایک بات کہتا ہوں، ماننا نہ ماننا تمہارے اختیار میں ہے۔ یہ تمہارا اپنا انتخاب ہے کہ تم بیٹی کی زندگی اور اُس کے سہاگ میں سے کس کا انتخاب کرتے ہو۔"

"میں... میں کون ہوتا ہوں اور یہ کیا فضول بات ہے؟" وہ سخت پریشان ہو گیا۔ "تم مجھے دہشت سے مار ڈالو گے۔"

"غور سے سنیے میری بات۔ دلاور اپنی بیوی سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہے اور اس کے لیے وہ بیماری کو بہانہ بنا چکا ہے۔ چونکہ وہ اُسے زندہ رکھنا نہیں چاہتا اس لیے یہ بیماری اُس کی جان لیے بغیر نہیں ٹلے گی۔"

"تم... تم اُس پر... الزام... لگا رہے ہو کہ وہ قتل کرنا چاہتا ہے اپنی بیوی کو... خبیث... مردود... لعنت ہو تم پر۔"

"میری بات ابھی ختم نہیں ہوئی۔" میں نے کہا۔ "اگر یہ جھوٹ ہو تو ابھی جو کچھ آپ نے کہا اُس پر مجھ سے غائبانہ اظہارِ شرمندگی ضرور کرنا۔ کل اپنی بیٹی کو خاموشی سے کسی دوسرے اسپیشلسٹ کو دکھاؤ۔ دلاور کو کچھ معلوم نہ ہو۔ اُس کے سارے ٹیسٹ کرا کے دیکھو، نتیجہ تمہارے سامنے آ جائے گا۔ تم کو معلوم ہو جائے گا کہ اُسے کوئی مہلک مرض نہیں ہے اور علاج کے نام پر اس کے ساتھ دھوکا ہو رہا ہے، اُسے دوا کے نام پر زہر دیا جا رہا ہے۔"

"بکواس کرتے ہو تم، بھونکتے ہو تم کتے...!"

"حقیقت کو تسلیم نہیں کرو گے تو بیٹی کو خود مٹی دو گے، یہ کوئی عمر نہیں ہے اُس کے مرنے کی۔ اُس کے بچوں کو اُس کی ضرورت ہے، تم دلاور کو صرف داماد کی حیثیت سے جانتے ہو، تمہارے سامنے وہ انتہائی شریف اور فرماں بردار بن کے آتا ہوگا مگر یہ ناممکن ہے کہ بیوی سے اس کی اصلیت پوشیدہ ہو۔ کوئی شوہر اپنی بیوی کے سامنے ظاہر اور باطن کے فرق کو نہیں چھپا سکتا اور اگر چھپانے میں کامیاب ہوتا ہے تو یہ اس بیوی کی کم عقلی ہے یا بدنصیبی ہے کہ وہ آنکھیں بند رکھنا پسند کرتی ہے۔ اپنی بیٹی سے کہو کہ آنکھیں کھول کر دیکھے، اُسے موت کو سامنے دیکھ کر ڈرنا نہیں چاہیے۔ موت برحق ہے اور سب کو آنا ہے مگر اپنی زندگی کی حفاظت بھی ایک فرض ہے، اس وقت کچھ نہیں ہوگا جب دلاور اپنی کوشش میں کامیاب ہو جائے گا۔"

"لیکن ایسا... وہ ایسا کیوں کرے گا؟" بڈھا اب ہانپ رہا تھا۔

"مجھے افسوس ہے کہ آپ کا دل کمزور ہے۔" میں نے کہا۔ "اور آپ کی یہ عمر بھی نہیں صدمے جھیلنے کی مگر میں کسی اور کو یہ سب نہیں بتا سکتا، آپ کا بیٹا زندہ ہوتا تو اُس سے کہتا لیکن اب تو آپ کو ہی سنبھلنا پڑے گا اور حوصلہ رکھنا ہوگا۔ دلاور

یہ سب عائشہ کے لیے کر رہا ہے۔"

وہ ایک دم پھٹ پڑا۔ اُس نے مجھے ایک سے ایک گندی گالی دی۔ میں سب سُنتا رہا۔ بالآخر وہ تھک کے خاموش ہوگیا۔

"خدا کے لیے الیسامت کہو... کہو کہ یہ بیہودہ مذاق کیا تھا تم نے... میری جان لینے کے لیے مگر میں بے غیرت کہ سُن کے بھی زندہ رہا۔"

"میں نے آپ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا سچ کا بوجھ آپ کو ہی اُٹھانا ہے اور برداشت بھی کرنا ہے۔" میں نے کہا۔ "دلاور نے عائشہ سے شادی کرنے کا سوچا ہے، جب اس کی بیوی مر جائے گی۔"

"یہ ناممکن ہے، ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ میں ایسا کبھی نہیں ہونے دوں گا۔" وہ چلّانے لگا۔

"آپ کی مرضی کا اس سارے کھیل میں کوئی دخل نہیں ہے۔" میں نے اُس کی بات کاٹ دی۔ "عائشہ خود اُس کے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس چکی ہے، وہ اُس کے ساتھ سازش میں شریک ہے۔ تم کہو گے کہ بہن بھلا بہن کے قتل کی سازش میں کس طرح ساتھ دے سکتی ہے مگر چچا، زر اور زن کے خونی کھیل کو آج تک کسی نے سمجھا ہے؟ ایسا ہو رہا ہے، ایسا پہلے بھی ہُوا ہے اور آئندہ بھی ہوگا۔ دولت اور ہوس کا جال لے کر پھرنے والے شکاری آپ نے دیکھے کہاں ہیں۔ آپ سُن رہے ہیں نا میری بات؟ آپ اس سازش کو ناکام بنا سکتے ہیں، آپ اپنی بیٹی کی زندگی بچا سکتے ہیں۔ اُس کی زندگی آپ کے لیے نہیں، اُس کے بچّوں کے لیے سب سے زیادہ اہم ہے۔ آپ کو اور کتنے دن جینا ہے۔ بچّے تمام عمر ماں کے بغیر کیسے رہیں گے۔ اُسے کل ہی کسی اسپتال میں لے جائیے۔ ایک نہیں، دو اچھے ڈاکٹروں سے الگ الگ رائے لیجیے۔ بے شک دلاور کو معلوم ہوگا تو وہ بہت برہم ہوگا، کوئی سخت قدم اُٹھائے گا، دھمکی دے گا طلاق دینے کی اور ممکن ہے طلاق بھی دے دے لیکن یہ تو آپ کو سوچنا ہے۔ میں نے بتا دیا تھا کہ فیصلہ اور انتخاب آپ کا ہے۔ دلاور کو اس بیوی کی ضرورت نہیں رہی، عائشہ کو بہن کی ضرورت نہیں رہی۔ اُسے دلاور کی دولت کی خواہش نے سارے رشتوں کی تقدیس کا خون کرنے پر آمادہ کیا ہے مگر اس کے بچّوں کو اپنی ماں کی ضرورت ہے۔ انھیں دولت سے زیادہ ماں کا پیار چاہیے، اس لیے دلاور سے مت ڈریں۔ وہ طلاق دیتا ہے تو اُسے ایسا کرنے دیں۔ وہ بالآخر یہی کرے گا اور ایسا نہ کر سکا تو پھر وہ کرے گا جو میں بتا چکا ہُوں۔ وہ کسی نہ کسی طرح بیوی کو قتل کر دے گا۔ آپ کچھ ثابت نہیں کر سکیں گے، سُنا آپ نے؟ میری بات کو گرہ سے باندھ لیں، وہ مر جائے گی اگر آپ نے میری بات کو اہمیت نہ دی... ہیلو، آپ خاموش کیوں ہیں... ہیلو... ہیلو۔"

مجھے احساس ہوا کہ نہ جانے کتنی دیر سے میں اکیلا بول رہا ہُوں اور تاروں سے گزر کے جانے والی میری آواز کو دوسری طرف کوئی بھی سُننے والا نہیں ہے۔ اُس نے ریسیور رکھ دیا تھا یا وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ شاید مر گیا تھا۔ اُس کا بوڑھا، بیمار دل اس صدمے کو نہ جھیل سکا تھا۔ میرے دل پر صدمے اور ملامت کے احساس کا بوجھ سا پڑ گیا، اس کے ساتھ ہی مجھے یہ افسوس بھی ہُوا کہ میں نے غیر ضروری طور پر لمبی بات کی، اُسے قائل کرنے کے لیے یہ ضروری بھی تھا، ورنہ میں دو جملوں میں بات ختم کر دیتا کہ عائشہ سے شادی کے لیے تمھارا داماد اپنی بیوی کو قتل کر رہا ہے تو بات نہ بنتی۔ اس وقت یہی بات میرے ذہن میں آئی جو میں نے پہلے کی اور دوسری بات کہنے کی نوبت ہی نہ آئی۔ میں دلاور کی بیوی کے ذریعے جو پیغام سراج تک پہنچانا چاہتا تھا وہ نہ دیا جا سکا۔

جب میں نے دوبارہ نمبر ڈائل کیا تو میرے کانوں نے انگیج کی ٹوں ٹوں سُنی اور چشمِ تصوّر سے بہت کچھ دیکھا۔ مثلاً یہ کہ عائشہ کا باپ وہیں گر کے مر گیا ہے، جہاں کھڑا وہ مجھ سے فون پر بات کر رہا تھا اور ریسیور نیچے جھول رہا ہے یا فون بھی نیچے جا پڑا ہے۔ میں انھی افسوسناک خیالوں کے جال میں اُلجھا ہُوا نیچے اُتر آیا۔ خسرو جمشید کے گھر فون کرنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ وہاں جو نوکر تھے وہ دست بستہ ہاتھ مُنہ میں بند تھے۔ ایک محافظ مارا گیا تھا اور ایک مہمان شب بھر اپنے حُسن و شباب کے ساتھ جان کا نذرانہ دے کر دُنیا سے جا چکی تھی۔ خود جمشید کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ ابھی تک سراج کے گھر میں اور اُسی کے ساتھ ہوگا۔

ایسی صورت میں سراج سے رابطے کے سوا چارہ نہ تھا اور اس کے لیے میں کسی کی پرائیویٹ لائن استعمال کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے کچھ دُور جانا پڑا اور بالآخر مجھے ایک جنکشن باکس مل گیا۔ کھمبے پر چڑھ کے چھپکلی کی طرح چمٹے رہنے، اسکریو ڈرائیور سے جوائنٹ کھولنے اور تار لگانے کی مجھے اتنی مشق ہو گئی تھی کہ اب میں اندھیرے میں بھی یہ کام دو یا تین منٹ میں کر لیتا تھا۔

نمبر ملتے ہی سراج کے گھر میں آپریٹر کی ڈیوٹی کرنے والے اے ایس آئی تیس مار خاں نے کہا۔ "ہیلو۔"

"کون بول رہا ہے؟" میں نے اُسی کے لہجے میں پوچھا۔

"کون ہے تُو میاں؟ جو ہم سے مذاق کر رہا ہے۔" وہ بولا۔

"میں ایک مُسکراتا ہُوا مُردہ ہوں جسے تم دفن نہ کر سکے تھے اور میں اس وقت بھی مُسکرا رہا ہُوں۔" میں نے کہا۔ "تمھارے ایس ایس پی سے بات کرنا ہے مجھے۔"

چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد سراج کی آواز آئی۔ "بولو۔"

"جان کی امان پاؤں تو آپ سے کچھ عرض کروں ایس ایس پی صاحب!" میں نے کہا۔ "اب تو آپ خیر سے حاکمِ شہر ہیں۔"

"کیا محض فضول مسخرے پن کے لیے فون کیا تھا؟" وہ بولا۔

"مسخرہ پن اور آپ کے ساتھ! آپ تو خود سب سے بڑے مسخرے ہیں۔" میں نے کہا۔ "کم سے کم اس وقت ضرور لگ رہے ہیں جب میں آپ کی والدہ ماجدہ اور دلاور کے کبھی نہ ہونے والے سسرال کی والدہ ماجدہ کے ساتھ روانہ ہُوا تھا۔ آپ کی منگیتر تو واقعی سونے پر سہاگا ہے۔"

"اگر ان دونوں کو کسی قسم کا نقصان پہنچا...."

"تو آپ کیا کریں گے؟" میں نے کہا۔ "توپ چلائیں گے تو الله مرا سال کریں گے۔ آپ کے تو فرشتے بھی نہیں جانتے کہ ہم پار ستوں میں سے کس سمت میں ہیں یا ہوں گے۔"

"فرشتے تو پہنچ گئے تھے مگر قسمت نے تمھارا ساتھ دیا۔"

"تو آپ قسمت کو کوستے، اکثر آپ کا ہی ساتھ دیتی آئی ہے مگر قسمت آپ کی زر خرید بہرحال نہیں ہے اور نہ آپ کی ماتحت ہے۔ میں نے تم کو یہی بتانے کے لیے فون کیا ہے کہ تعاقب کا اور ہمیں محصور کرنے کا خیال دل سے نکال دو۔ ہم تک تم صرف فرشتۂ اجل کے ساتھ ہی پہنچ سکتے ہو، وہ آدمی کو ڈھونڈ نکالنے کا ماہر ہے مگر وہ آئے گا تو اس کے ساتھ ہم اکیلے نہیں جائیں گے، ہمارے مہمان بھی ساتھ ہی رہیں گے۔ تم اگر چاہتے ہو کہ ان کو گزند نہ پہنچے تو سب سے پہلے اپنے شکاری کتّوں کو روک لو۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ انھیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی اور ہم ان کی حفاظت کریں گے۔ عائشہ اور تمھاری والدہ کو ہم خود واپس پہنچانے آئیں گے مگر اس وقت جب رابعہ اور خواجہ نیک محمد کو ہم تک پہنچا دیا جائے گا۔"

"تم زیب النساء کی بات نہیں کر رہے ہو۔"

"اُس کی کیا بات ہے۔" میں نے کہا۔ "باتوں ہی باتوں میں اُس نے ہمیں گھن چکر بنا دیا۔ جیسی رُوح ویسے فرشتے... تمھاری اور اس کی جوڑی اچھی رہے گی حالانکہ پہلے میرا خیال بالکل مختلف تھا۔ وہ تو خود ایس ایس پی بننے کے لائق ہے کہ جن کو تم نہ پکڑ سکے تھے، انھیں زیب النساء نے تقریباً پکڑوا دیا تھا۔ ہم اس کے حُسن، اُس کی ذہانت اور بے مثل اداکارانہ صلاحیت کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔"

"مگر وہ اب ہے کہاں؟" سراج نے کہا۔

"کیا اس نے تمھیں فون نہیں کیا تھا؟"

"کیا تھا، خود اُس نے نہیں، بات کرنے والا کوئی اور تھا۔"

"کوئی اور کون؟" میں نے کہا۔

"یہ تم مجھ سے پوچھتے ہو؟" وہ دہاڑ کر بولا۔ "تم ہی آواز بدل کے بول رہے تھے، تم نے اس سے زبردستی جو کہلوایا اُس نے کہا۔ پھر تم نے ریسیور لے کے پتا سمجھایا، تم ہمارا مذاق اُڑانا چاہتے تھے۔ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ تم کتنے بہادر اور کتنے چالاک ہو، پولیس کو اپنا پتا ٹھکانا بتا سکتے ہو اور پھر اُن کی آنکھوں میں دھول جھونک کے نکل سکتے ہو۔"

"سراج! تم نے ایک مثل سُنی ہے، چاہ کن را چاہ در پیش مگر فارسی تم کہاں سمجھو گے۔ یوں سمجھو کہ اُس نے ہمیں چکّر دیا تھا، اب شاید وہ خود کسی چکّر میں پڑ گئی ہے۔ کیا وہ وہاں موجود نہیں تھی، جہاں سے دلاور ملا؟"

"نہیں، کیا تم نے اُسے وہیں چھوڑ دیا تھا؟" وہ بے یقینی سے بولا۔

"سراج! میں تم کو ایس ایس پی سمجھ کے نہیں، زیب النساء کا منگیتر ہونے کی وجہ سے ایک بات بتا رہا ہُوں، سچ نہ مانو تو تمھاری مرضی، وہ ہمیں بے وقوف بنا کے نکل گئی تھی اور اُسی کے فون پر تم نے پولیس بھیج دی ہوگی۔ فون پر کسی مرد نے بات کی تھی تو وہ ہم نہیں تھے، میرا اپنا خیال ہے کہ...."

"کیا خیال ہے؟" سراج نے مضطرب لہجے میں کہا۔

"مجھے بتاتے ہوئے ڈر لگتا ہے، تم سے نہیں، اس خیال سے کہ شاید کسی نے اُس سے فون کال کے چار جز وصول کرنے...." میں نے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ وہ بھاگی تو مُنہ اُٹھا کے کسی بھی گھر میں گھُس گئی، وہ کوئی آس پاس کا بنگلا ہی ہوگا کیونکہ اُسے غائب ہونے میں چند منٹ بھی نہیں لگے تھے۔" میں نے کہا۔ "کسی شریف اور مہذب نظر آنے والے مرد نے اُس کی مدد کی۔ تم نظر آنے کا مطلب سمجھتے ہو نا؟ ہیں کوا کیسے کچھ نظر آتے ہیں کچھ۔ زیب النساء نے تم سے یا جمشید سے کیا کہا، اس کا مجھے اندازہ ہے مگر اُسے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے۔ اُس شریف اور مہذب نظر آنے والے شخص نے کہا کہ لاؤ میں پتا سمجھا دوں اور پتا سمجھانے کے بعد...."

"اوہ نو!" سراج نے پریشان ہو کے کہا۔

"یس سر! تمھاری وہ منگیتر بہت حسین اور انداز و اطوار میں حد درجہ سنسنی خیز ہے۔ ایسی لڑکی اگر آدھی رات کے بعد اچانک کسی مرد کی خلوت میں وارد ہو جائے تو تہذیب اور شرافت کا لبادہ اُتر سکتا ہے۔ اگر وہ آزاد ہوتی تو یقیناً واپس وہیں پہنچ جاتی جہاں پولیس پہنچی تھی۔ پولیس کے آنے تک وہ چھُپی رہ سکتی تھی مگر پولیس کو دیکھ کر تو اُس کا سامنے آ جانا ضروری تھا۔"

"یہ... یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ فون کرنے کے بعد اکیلی ہی گھر کی طرف چل پڑی ہو۔" سراج نے کہا۔

"تم کیوں خود کو دھوکا دینا چاہتے ہو، وہ اتنی بے وقوف لڑکی ہوتی تو مَیں مان لیتا مگر کیا وہ نہیں جانتی کہ اس کا گھر کتنی دُور ہے، رات کتنی سنسان ہے اور وہ خود کتنی پُرکشش ہے اور راستوں پر بھُوکے بھیڑیے بھی گھومتے ہیں۔ نہیں، ایسا رِسک لینے کی کیا ضرورت تھی جب کہ اُسے معلوم تھا کہ پولیس آجائے گی تو اُسے بہ حفاظت اور آرام کے ساتھ گھر پہنچادے گی اور پولیس اُس کی غلام ہے کیونکہ سیّاں بھئے کوتوال"

"شاید تم ٹھیک کہتے ہو، تھینک یو۔"

"تمھارے مُنہ سے یہ لفظ بڑا عجیب لگتا ہے۔" مَیں نے کہا۔

"اگر ایسا ہُوا تو مَیں اس علاقے . . . ." وہ چپ ہوگیا۔

"ہاں ہاں، کہو . . تم اس علاقے پر بلڈوزر چلوادوگے۔ یہاں ایس ایس پی بہادر! وہاں جتنے ہیں سب بلڈوزر ہیں، اپنی طاقت کے زعم میں ہی کسی نے زیب النساء کو بلڈوز کردیا۔ وہ جانتا ہوگا کہ بعد میں اس کے نام پتے کی نشاندہی ہوجائے گی مگر اسے ڈر نہیں ہوگا، وہ اُن لوگوں میں سے ہوگا، جن کا نام کوئی لے تو اُس کی زبان کاٹ دی جاتی ہے یا اُس پر تالے ڈال دیے جاتے ہیں اور ان کا پتا 'ہُو از ہُو' میں ملتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ خود تم کبھی اس کے بنگلے پر سلام کرنے گئے ہو اور یہ بھی کہ وہ تمھارے ہی گروہ کا شکاری ہو، کوئی تم سے بڑا شکاری . . . خدانخواستہ تمھارے محکمے کے کوئی ڈی آئی جی وغیرہ تو اُدھر نہیں رہتے؟ ہر فرعونے راموسیٰ، کبھی سیر کو سوا سیر بھی ٹکر جاتا ہے۔ ٹکر جانا تو سمجھتے ہو، نا؟"

"شٹ اپ . . . یہ ضروری نہیں۔" وہ یکلخت ایس ایس پی بن گیا۔

"شٹ اپ کرنے سے پہلے مَیں تم سے دو باتیں کہوں گا۔" مَیں نے کہا۔ "ایک یہ کہ جو قدم اُٹھاؤ سوچ سمجھ کے اُٹھانا، کہیں تمھاری غلطی کا خمیازہ تمھارے اپنے رشتوں پر اثر انداز نہ ہو، دوسری بات یہ کہ ہمارے اگلے پیغام کا انتظار کرنا جس میں ہم بتائیں گے کہ جنگی قیدیوں کا تبادلہ کیسے ممکن ہے۔ تم اس وقت تک یہ معلومات حاصل کرلینا کہ رابعہ اور خواجہ نیک محمد عرف اُستاد میڈری کہاں ہیں اور تم اُنھیں لاسکتے ہو یا نہیں۔ دونام اور نوٹ کرلو۔ ایک تمھارے اپنے محکمے کا سابق ڈبل ایس آئی ہے"

"ڈبل ایس آئی؟"

"ایس آئی، سیّد اکرام شیخ اور اُس کی ایک بہن ہے نازلی، اگر وہ نہ ملے تو تم کو ہماری عدالت میں حلف نامہ داخل کرنا ہوگا کہ وہ تمھاری تحویل میں نہیں ہیں۔" مَیں نے کہا۔ "مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ میری یہ گفتگو تمھارے علاوہ کتنے لوگ سُن رہے ہیں۔ اسے کہاں کہاں ٹیپ کیا جارہا ہے اور اب تک کتنے لوگ میری کال کو ٹریس کرنے کے لیے لاحاصل کوشش کررہے ہوں گے مگر اِٹ از جسٹ ناٹ پاسیبل، اس لیے انرجی ضائع مت کرو، وہ کام کرو جس سے تمھارا اور ہمارا مسئلہ جلد حل ہونے کے امکانات پیدا ہوں۔" مَیں نے تار الگ کردیے۔

جب مَیں واپس اُس کھنڈر میں پہنچا تو غالب نے عائشہ اور سراج کی ماں کو اجازت دے دی تھی کہ وہ کار کے کوَر میں لپٹ لپٹا کے سوجائیں۔ اُنھوں نے آنکھوں پر سے پٹیاں بھی اُتار دی تھیں اور اب وہ بہ ظاہر بالکل ساکت پڑی تھیں مگر یہ سمجھنا مشکل تھا کہ وہ واقعی سوگئی ہوں گی۔ ان حالات میں نیند کے آنے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

"کہاں غائب ہوگئے تھے دونوں؟" غالب نے برہمی سے کہا۔

"کون دونوں؟" مَیں نے بے وقوف بن کے کہا۔ "ہم دونوں تو یہاں موجود ہیں، غائب کہاں ہوگئے؟"

"یہ منکر نکیر کی طرح تم دونوں نے ہر جگہ ایک ساتھ جانے کا عہد کرلیا ہے کیا؟" غالب بولا۔

"منکر سطحِ زمین پر سفر کررہا تھا۔" مَیں نے کہا۔ "مَیں سطحِ زمین سے زیادہ بلندی پر تھا۔ یہ بڑا دل توڑنے والا الزام ہے کہ ہم ایک ساتھ تھے۔ ویسے آپ کیوں چاہتے ہیں کہ ہم میں سے ایک مشرق کو جائے تو دوسرا مغرب کو۔"

"یار تم کن چکروں میں پڑ گئے۔" غالب کا موڈ سخت خراب تھا۔ "مجھے یہ بتاؤ کہ ہم یہاں کیوں آئے تھے، کس نے پیش کیا تھا ایک آئیڈیا؟"

مَیں سخت شرمندہ ہُوا۔ "وہ . . . اُسے بھولا نہیں ہُوں مَیں۔"

"بھُولے ہوئے ہو تم۔" غالب نے میری بات کاٹ دی۔ "تم نے کیتھرین کو بھی چھوڑ دیا۔"

"ہم بہت مجبور تھے۔ ڈکی میں بھی نہیں ڈال سکتے تھے اُسے اور مَیں نے تو کہا تھا کہ اُسے بھی لے آؤں گا۔" مَیں نے کہا۔ "وقت ملتا تو لے بھی آتا۔"

"چلو اسے چھوڑو، جُولی کو پہلے تلاش کرنا چاہیے تھا۔" غالب نے کہا۔

"مَیں دیکھتا ہُوں، کمروں میں تو نہیں ہے۔" مَیں نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔ "اور ہاں، وہ زیب النساء گُم ہوگئی ہے؟"

"گُم ہوگئی، کیا مطلب؟"

"غتر بود ہوگئی۔" مَیں نے کہا۔ "کہیں سے اُس نے فون کیا مگر اب پتا نہیں کہ کہاں سے کیا تھا اور پھر وہیں کی کیوں ہو رہی؟"

مَیں نے ایک مرتبہ پھر کمروں سے گزرتے ہوئے کونوں میں نگاہ ڈالی جو تاریک تھے۔ پُرانے وقتوں کے کچن اور باتھ روم کے آثار دریافت کیے پھر باہر نکلا اور عقبی حصّے کا جائزہ لیا۔ پیچھے ایک آنگن سا تھا جو تین طرف کی کوٹھیوں کے احاطوں کی دیواریں ملنے سے بنا تھا۔ اس میں ایک پُرانا برگد کا درخت تھا جس نے کم و بیش نصف حصّے کو گھیر لیا تھا۔ اُس کے نیچے ایک ہینڈپمپ کا ڈھانچا کھڑا ہُوا تھا۔ ایک گز سے زیادہ پھیلے ہوئے تنے کے علاوہ برگد کی داڑھی دُور دُور تک زمین میں پیوست تھی چنانچہ گھنی شاخوں کے نیچے بھی پتلے پتلے تنوں کا جنگل سا بن گیا تھا۔ مَیں نے گھُوم کر دیکھا تو مجھے دوسری طرف ایک بینچ نظر آئی۔ جُولی اُس سیمنٹ کی بینچ پر سکڑی پڑی تھی۔

مَیں نے اُسے قریب جانے سے پہلے ہی پہچان لیا تھا۔ اس بینچ کے قریب ہی ایک بہت موٹی شاخ، تنے سے نوّے درجے کا زاویہ بناتی الگ ہوئی تھی۔ شاخ کے مضبوط بازو سے دو زنگ خوردہ زنجیریں لٹکی ہوئی تھیں اور زنجیروں نے ایک فولادی جھُولے کو تھام رکھا تھا۔ جھُولے کا فریم لوہے کا تھا لیکن درمیان کا حصّہ نِوار سے بنایا گیا تھا۔ سالوں پُرانی نِوار گل گئی تھی اور اس کے ٹکڑے نیچے لٹک رہے تھے۔ درمیانی حصّہ خالی رہ گیا تھا۔ خود جھُولا ہر طرف سے شاخوں اور لٹکنے والی داڑھی کے ریشوں میں گھر گیا تھا لیکن مَیں اس وقت کا تصوّر کرسکتا تھا، جب رنگین نِوار والے اس جھُولے میں لیٹ کر جُولی فرحت بخش ہَوا کی اٹکھیلیاں محسوس کرتی ہوگی۔ آنکھیں کھول کر نیلے آسمان کی گہرائی پر غور کرتی ہوگی اور اُڑنے والے پرندوں کی طاقتِ پرواز کے اسرار کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہوگی اور اس کا باپ جسے بہرام داد کے نام سے دُنیا ایک خطرناک ڈاکو مانتی تھی، ایک باپ کی محبت اور شفقت اور غرور کی نظر سے یہ سب دیکھ دیکھ کے خوش ہوتا ہوگا اور جُولی اپنے ماں باپ کے قرب میں اس جھُولے کو ایک مہربان آغوشِ راحت سمجھتی ہوگی۔

مَیں نے ایک گہرا سانس لیا۔ میرا خیال ایک جذباتی پرواز کے سوا کچھ نہ تھا مگر دل کے سارے سچّے جذبے ایک ہی آکاش کے پنچھی ہوتے ہیں اور میرے تخیل نے جُولی کے ساتھ اسی محبت کی پناہ گاہ کو ایسے دیکھ لیا تھا جیسے دو معصوم بچّوں کا تصوّر چاند پر ایک ساتھ اور ایک ہی طرح بڑھیا کو چرخہ کاتنے میں مصروف دیکھتا ہے۔ مَیں نے اُسے آہستہ سے آواز دی پھر اُس کے شانے کو نرمی سے تھپکا لیکن وہ نیند میں نہیں تھی کہ جاگ جاتی۔ وہ بے ہوش تھا۔ ہسٹیریا کی دیوانگی نے اُسے وہاں تک تو پہنچا دیا تھا جہاں اس کے لیے پیار بھری یادوں کے پہرے میں ایک محفوظ جذباتی حصار اب تک موجود تھا مگر پھر اس کی ساری توانائی ختم ہوگئی تھی۔

ایسے میں بے ہوشی ہی احساس کے عذاب سے نجات دلاتی ہے اور جسم کی بیٹری کو اس حد تک چارج کردیتی ہے کہ آنکھیں کھولنے کے بعد گراں باریٔ ایام کے ساتھ نئے غم کا بوجھ سنبھالا جاسکے۔ اگر صدمہ بڑا اور دل چھوٹا ہو تو بے ہوشی کا بدل موت یا خود فراموشی بھی بن جاتی ہے۔

مَیں نے جُولی کو دونوں ہاتھوں میں اُٹھالیا۔ وہ اس قدر کم وزن تھی کہ مجھے تعجب ہُوا۔ مَیں اُسے اُٹھائے ہوئے اندر گیا تو محسن بھی واپس پہنچ چکا تھا۔

"یہ مل گئی؟" غالب اور محسن نے ایک ساتھ پُرمسرت لہجے میں کہا۔ حالانکہ یہ مسرت کے اظہار کا کوئی موقع نہ تھا مگر کبھی کبھی ایک چھوٹا نقصان اُٹھا کے بڑے نقصان سے بچ جانے والے کا ردِعمل یہی ہوتا ہے۔

"ہاں، ہم نے مَن کی آنکھ سے اسے دیکھ لیا تھا جو تم عقل کے اندھے نہیں دیکھ سکتے تھے۔" مَیں نے کہا۔

"خدا کا شکر ہے۔" غالب نے کہا۔ "میرے دل کو ملامت کے قرض سے چھٹکارا ملا، ورنہ تمام عمر کیتھرین کی لاش اپنی کھُلی آنکھوں کے ساتھ میرے سامنے فریاد کُناں رہتی۔"

مَیں نے جُولی کو کار کے کوَر پر لٹا دیا۔ عائشہ اور سراج کی ماں ہماری گفتگو سُن کے اُٹھ بیٹھی تھیں۔ عائشہ کی آنکھوں میں تجسّس اور حیرت تھی تو سراج کی ماں کی نظر میں صرف ملامت۔

"اسے کچھ دیر میں ہوش آجائے گا۔" مَیں نے کہا۔

"پھر یہ ہنگامہ کرے گی۔" محسن بولا۔

"کچھ دیر میں صبح بھی ہوجائے گی۔" غالب نے کہا۔ "تم نے کچھ سوچا ہے کہ سارا دن کیسے گزرے گا؟"

"یہ تو مَیں نہیں جانتا کہ کیسے گزرے گا۔" مَیں نے کہا۔ "لیکن گزرے گا اسی جگہ۔ ہمارے لیے کسی بھی جگہ جانا بلاوجہ خطرے سے کھیلنے کے مترادف ہوگا۔ آج کے دن کوئی سڑک محفوظ نہیں ہوگی۔ سب سے بہتر یہی ہوگا کہ ہم یہاں دُبکے پڑے رہیں، کل تک۔"

"کل کیا ہوگا؟" غالب نے کہا۔

"سفر۔" مَیں نے جواب دیا۔ "جو وسیلۂ ظفر ہوتا ہے مگر اب یہ نہ پوچھنا کہ منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ لاہوری، کیونکہ آدمی اور اس کے ارادے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ اُس نے سوچا اسلام آباد جانے کا اور پہنچ گیا عدم آباد یا مشرق کا کہہ کے نکلا اور مغرب کی جانب چل پڑا۔"

غالب سمجھ گیا کہ مَیں عائشہ کے سامنے اپنے پروگرام پر بات کرنے سے گریز کررہا ہوں۔ اُس نے کہا۔ "چل لاہور کے لالے، تیری مان لی۔ آج اسی ہوٹل خانہ خراب میں قیام کرتے

ہیں، پورا فلور بُک کرا کے مگر مجھے اس ہوٹل میں صرف قیام کے امکانات نظر آتے ہیں، طعام کے نہیں۔"

"روزہ رکھو مرزا غالب اور ایک دن فقر و فاقے میں گزار کے تو دیکھو۔" محسن نے مشورہ دیا۔

"یا اللہ پر بھروسا کرو،" میں نے کہا۔ "اس نے ہمیں رزق فراہم کرنے کے لیے گرد و نواح کے کسی کونے کھدرے میں کوئی نہ کوئی حلوائی نہ بٹھا رکھا ہوگا جو نہار مُنہ حلوا پوری تلنے کا نیک کام شروع کرے گا۔"

"اُسے اپنا ماموں، سُسر یا والدِ ثانی بنا لو گے تب بھی وہ پیسے ضرور مانگے گا۔" غالب بولا۔

"پیسے... کتنے پیسے؟ لاکھ دو لاکھ روپے؟ پانچ چھ لاکھ روپے... غالباً اتنی رقم میں حلوا پوری کیا پورا حلوائی آ جاتا ہے اور تم یہ جانتے ہو کہ ہمارے پاس تو دس لاکھ ہیں۔"

"ہم جانتے نہیں، ہم نے صرف سُنا ہے۔" غالب بولا۔

"اور وہ بھی ان سے جو سچ اور جھوٹ کے درمیان تفریق کو مانتے ہی نہیں۔" محسن نے اس کی تائید کی۔

"مگر اُنھوں نے سچ جاننے کا طریقہ بتا دیا تھا۔" میں نے کہا۔ "یا یوں سمجھ لو کہ خزانے کی چابی ہمارے حوالے کر دی تھی۔"

محسن نے عائشہ کی طرف دیکھا۔ "تم سمجھ دار ہو۔"

"میں... میں... کیا کر سکتی ہوں؟" عائشہ نے چونک کر کہا۔

"ہمیں بتایا گیا تھا کہ تم اس سُوٹ کیس کو کھول سکتی ہو۔" میں نے کہا۔ "اور یہ کہ اس میں واقعی دس لاکھ روپے ہیں۔"

"انھوں نے غلط بیانی کی تھی۔" عائشہ نے خشک لبوں پر زبان پھیر کے کہا۔ "مجھے کچھ نہیں معلوم۔"

"اچھی طرح سوچ لو، کہیں تم تو غلط بیانی سے کام نہیں لے رہی ہو، ہم ہر قفل کھولنا جانتے ہیں۔ مثلاً جھوٹ کا قفل اور سچ کا قفل، اگر تمھارے لبوں کا قفل کھولنے کے بعد ہمیں یقین آ گیا کہ تم کو واقعی کچھ نہیں معلوم تو پھر ہم خود اس سُوٹ کیس کو بھی کھول لیں گے۔" میں نے کہا۔

"کیا تم مجھ پر تشدد کرو گے؟" عائشہ سہم کر بولی۔

"میں نے کہا تھا نا کہ تم سمجھ دار ہو۔" محسن بولا اور اس نے عائشہ کو بازو سے پکڑ کے کھڑا کر دیا۔

"چھوڑ دو... مجھے چھوڑ دو۔" وہ چلّانے لگی۔ محسن نے اس کے مُنہ پر اُلٹے ہاتھ کا تھپڑ مارا، وہ نیچے گر گئی۔

"آواز کم رکھو۔" محسن نے آہستہ سے کہا اور اُسے پھر کھڑا کر دیا۔

"تم پولیس والوں کے طریقۂ تفتیش سے تو واقف ہو؟" میں نے نرمی سے کہا۔ "ہم پولیس والوں کے باپ ہیں، وہ ہم سے پناہ مانگتے ہیں۔ تم صرف چند منٹ میں سُوٹ کیس کھولنے کو ترجیح دو گی خواہ اس کے نتیجے میں تم کو مرنا ہی کیوں نہ پڑے۔"

عائشہ خاموش کھڑی مجھے گھورتی رہی۔ اُس کی آنکھوں میں نفرت اور غصّے کی ایسی آگ تھی جس کے شعلوں کو وہ دبائے رکھنے پر مجبور تھی چنانچہ یہ آگ اُس کے وجود کے اندر ہی اندر پھیل رہی تھی۔

"ٹھیک ہے محسن، اس کو دوسرے کمرے میں لے جاؤ۔" میں نے کہا۔ "یہ بہادر لڑکی ہے، بس اتنا خیال رکھنا کہ جان نکل جائے مگر آواز نہ نکلے۔"

محسن نے اُسے ایک دم دبوچ لیا۔ اُس کا ہاتھ یوں موڑا کہ وہ خود ہی گھوم گئی مگر چیخ نہ سکی کیونکہ محسن نے اس کے مُنہ کو اپنے دوسرے ہاتھ سے دبا لیا تھا۔ محسن اُس کی کلائی کو تھوڑا سا بل دیتا تھا تو وہ کرب سے بُری طرح بل کھاتی تھی مگر اس کا جسم محسن کے اور دیوار کے درمیان دبا ہوا تھا۔

"ضد چھوڑ دے لڑکی۔" سراج کی ماں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ محسن نے اُسے ذرا سی دیر کے لیے آزاد کیا۔ وہ لمبے لمبے سانس لینے لگی اور پھر کانپتی آواز میں بولی۔ "میں... میں مرنا نہیں چاہتی۔"

"مرنا کوئی بھی نہیں چاہتا۔" محسن نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "مگر موت کا وقت ٹالا تو نہیں جا سکتا، اگر یہ سُوٹ کیس ایک ڈیتھ ٹریپ ہے جو تمھارے دُلہا بھائی نے ہمارے لیے بنایا تھا تو اسے وقت کی ستم ظریفی سمجھو کہ اس طرح تمھارے لیے موت کا سامان کیا۔ میرا مطلب ہے آسان اور فوری موت کا۔ تم تھوڑا تھوڑا مرنا یقیناً پسند نہیں کرو گی۔ ہم رحم اور رعایت کرنے والے لوگ نہیں ہیں۔ دُشمن ہمارے لیے بھی دُشمن ہے۔ یہ جاننے کے لیے کہ سچ کہاں چھپا ہوا ہے، ہمیں تمھارے دماغ کو خالی کرنا پڑے گا، اس کا ریزہ ریزہ چھاننا ہوگا۔ تمھارے خون کے آخری قطرے سے بھی سچ کشید کرنا پڑا تو ہم کریں گے، اگر اس کے بعد ثابت ہو گیا کہ تم کو واقعی کچھ معلوم نہیں تھا تو ہم سوری کہہ کے تم کو یہیں چھوڑ جائیں گے۔ جنگ میں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ بم پھینکنے والا جانتا ہے کہ اس سے بے گناہ عورتیں، معصوم بچے اور معذور بوڑھے بھی ہلاک ہوں گے۔ تم صُبح کا سورج نہ دیکھ سکو گی مس عائشہ۔"

"بصورتِ دیگر، شاید تمھیں اپنے خوابوں کی تعبیر دیکھنے کے لیے مہلت مل جائے۔" میں نے کہا۔ "یہ قید عارضی ہے، تم کو واپس جانا ہی ہے۔"

"کیونکہ اب چوہدری دلاور اور ایس ایس پی صاحب ہماری شرائط پر سودا کرنے پر مجبور ہیں۔" غالب نے کہا۔

"تمھاری بہن بھی تھوڑے دن کی مہمان ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ بہت جلد مر جائے گی پھر تم مسزِ دلاور بن کے عیش کرو گی، دلاور کے پروگرام کے عین مطابق... تم پر کسی کے قتل کا الزام نہیں آئے گا۔"

"میں... میں بتاتی ہوں۔" عائشہ نے لرزتے ہوئے کہا۔ "میں وہ سُوٹ کیس کھول دوں گی۔"

ہمارے ڈائیلاگ جو صرف عائشہ کو دہشت زدہ کرنے کے لیے تھے، مؤثر ثابت ہوئے تھے۔ "چلو پھر سُوٹ کیس اُٹھاؤ۔" محسن بولا۔

عائشہ نے سُوٹ کیس اُٹھا لیا۔ "باہر چلو۔" اس نے محسن کو اشارہ کیا۔

"باہر کیوں؟" محسن بولا۔ "یہاں کیا ہرج ہے؟"

"ہرج میرے لیے یہ ہے کہ سب کے ساتھ مجھے بھی مرنا پڑے گا۔" عائشہ نے تلخی سے کہا۔

"کیا اس سے کوئی دھماکا ہوگا؟" میں نے کہا۔

"نہیں، دھماکا وغیرہ کچھ نہیں ہوگا۔" عائشہ نے کہا۔ "اس کو کھولنے کا کوئی پیچیدہ عمل ہے، یہ لاک دباؤ، ذرا سے دباؤ کے ساتھ دائیں اور بائیں کھینچو، لاک کھٹ سے کھل جائیں گے مگر ایسا کرنے سے پہلے مجھے باہر جانے دو یا پھر تم بھی میرے ساتھ باہر چلو۔"

اُس نے مجھے کنفیوز کر دیا تھا۔ میں نے محسن سے کہا۔ "ٹھیک ہے، اسے باہر لے جاؤ۔"

"اس بات کا خیال رکھنا کہ تمھاری کوئی چالاکی نہیں چلے گی۔" محسن نے کہا۔ "تمھاری بدقسمتی کہ میں شادی شدہ ہوں، تم جیسی خوبصورت لڑکی کو ٹھائیں سے گولی مارتے ہوئے میرے دل پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔"

عائشہ نے بُرا سا مُنہ بنایا اور بڑی تنک مزاجی سے باہر نکل گئی۔ میں بھی صرف دلچسپی کے باعث محسن کے ساتھ رہا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ اس سُوٹ کیس میں موت کو کس طرح پیک کیا گیا تھا۔ عائشہ کی طرف سے مجھے فکر نہیں تھی کہ محسن اکیلا اس سے نہ نمٹ سکے گا۔ عائشہ نے باہر نکل کے اِدھر اُدھر کچھ دیکھا پھر نیچے جُھک کر ایک پُرانے کاغذ کے ٹکڑے کو اُٹھا لیا۔ اُسے سر سے اُوپر لے جا کے چھوڑ دیا۔ وہ ہَوا کا رُخ دیکھنا چاہتی تھی جو بظاہر ساکت لگتی تھی مگر کاغذ تھوڑا سا دائیں طرف گیا۔ عائشہ نے اپنا رُخ اُدھر ہی رکھا۔ نیچے جُھکی اور اگرچہ وہ ہم سے پانچ چھ فٹ دُور تھی مگر اندھیرے میں اس کی انگلیوں کی حرکت نہیں دیکھی جا سکتی تھی، ہم نے تو بس ایک کھٹکا سُنا۔ پر وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی کہ یہ عام قسم کا لاک تھا، جسے کھولنے کی کوئی خاص ٹیکنک نہیں تھی۔

میں اور محسن غوطہ مار چکے تھے، جب عائشہ ایک دم پیچھے ہٹی، اتنی تیزی سے کہ وہ ہم سے ٹکرائی۔

"پیچھے چلو اور دُور ہو جاؤ۔" اُس نے چلّا کے کہا۔

"آہستہ۔" محسن نے غرّا کے کہا اور ہم چند قدم پیچھے ہٹ گئے۔

"کیا اس میں سے جن نکلنے والا ہے؟ کوئی آدم خور جن؟" میں نے کہا۔

"جو دلاور کا تربیت یافتہ غلام ہوگا اور ہم دونوں کا سر قلم کر دے گا۔" محسن نے کہا۔ "جسے دلاور تمھاری آنکھوں میں لگا دے گا تو ہمیشہ خوش رہے گا، مسکراتا رہے گا، مرتے دم تک۔"

"ہمّت ہے تو ذرا قریب جا کے سانس لو۔" عائشہ نے طنز سے کہا۔ "پھر دیکھوں گی کہ تم کس طرح مسکراتے ہوئے مرتے ہو۔ اس میں سے وہ قاتل گیس خارج ہو رہی ہے جسے تم ایک بار سانس کے ساتھ اندر لے جاتے تو دوسرا سانس نہ لے پاتے۔"

"آئی سی، گویا اس میں سے سائنائیڈ گیس نکل رہی ہے جو امریکا میں سزائے موت دینے کے لیے گیس چیمبر میں استعمال ہوتی تھی؟"

عائشہ نے کوئی جواب نہیں دیا اور سُوٹ کیس کو برابر دیکھتی رہی۔

"اتنا بتا دیا ہے تو اب یہ بھی بتا دو کہ گیس کتنی دیر تک نکلتی رہے گی اور یہ سب انتظام کس طرح کیا گیا تھا؟" محسن بولا۔

"مجھے نہیں معلوم۔" عائشہ نے مختصراً کہا۔

"تمھیں بہت کچھ معلوم ہے۔" میں نے کہا۔

"مجھے وہی معلوم تھا جو مجھے راستے میں جمشید نے بتایا تھا کہ تم اس سُوٹ کیس کو ہرگز ہرگز مت کھولنا اور جب وہ لوگ کھولیں تو فوراً اپنا سانس روک کے دُور نکل جانا۔" عائشہ نے کہا۔ "کمرے سے باہر۔"

"گویا اُس کے ذہن میں یہ اندیشہ تھا کہ ہم تمھیں مجبور کر سکتے ہیں؟"

"ہاں اور اُس نے مجھے احتیاط بھی سمجھا دی تھی۔" عائشہ نے کہا۔

اُسی وقت ایک عجیب بات ہوئی۔ کوئی چیز دھپ سے نیچے گری۔ یہ کالی سی چیز برگد کے درخت کی شاخوں میں سے ٹپکی تھی۔ اُس کے چند سیکنڈ بعد دوسری آواز آئی۔ یہ درخت کی شاخوں میں آشیانہ رکھنے والے پرندوں کے بے جان جسم تھے۔ اس قاتل گیس نے تحفّظ کے ضامن ہر نشیمن کو گیس چیمبر بنا دیا تھا اور جو گیس ہَوا کے ساتھ مل کر اُوپر اُٹھی تھی، اس سے چڑیاں اور کوّے مر مر کے ٹپکتے جا رہے تھے۔ دس منٹ میں اس سُوٹ کیس کے آس پاس مُردہ پرندوں کا بستر سا بچھ گیا۔ میں اپنے آپ سے

شرمندہ سا کھڑا رہا۔ یہ ہم تھے جنھوں نے شجرِ سایہ دار کی محفوظ آغوش میں رہنے والوں کی پوری بستی کو موت کی نیند سلا دیا تھا۔ پرندے کسی جنگ میں شریک نہیں تھے اور کسی کے دُشمن نہیں تھے۔ وہ کائنات کا حُسن تھے۔ نغمہ تھے اور رنگ تھے۔ یہ درخت ایک ہیروشیما تھا جس پر ہم نے یکلخت ایٹم بم گرا دیا تھا۔ یوں کہ پلک جھپکتے میں زندگی کی جگہ موت نے لے لی تھی۔ وہ سب طائرانِ بے نوا ہماری جگہ اپنی جان دیتے جا رہے تھے۔

میرا اندازہ تھا کہ شاید دس منٹ میں پچاس ساٹھ پرندے مر کے گرے تھے۔ ان میں زیادہ تر چڑیاں تھیں اور چڑے تھے، باقی کوّے تھے۔ چڑیا چڑے کی کہانی بھی میں نے بچپن میں پڑھی تھی۔ ان میں سے ایک دال کا دانہ لایا تھا اور دوسرا چاول کا، پھر اُنھوں نے مل کر کھچڑی پکائی تھی۔ پیاسے کوّے سے بھی میری پُرانی شناسائی تھی۔ اُس نے کم پانی میں کنکریاں ڈال کے کیسے پیاس بُجھائی تھی، یہ بھی ایک کہانی تھی اور شاید نصف صدی میں تیسری نسل کے بچّے بھی انہی کہانیوں سے عملی زندگی کا سبق حاصل کر رہے تھے۔ یہ تیسری کہانی سب سے الگ تھی کہ جب وہ بچّے بڑے ہوتے ہیں تو اشتراکِ عمل اور جدوجہد سکھانے والے انہی پرندوں کے آشیانوں میں سائنائیڈ گیس چھوڑ دیتے ہیں، اگر آج کے بچّے یہ تیسری کہانی پڑھیں تو اُنھیں کتنا دُکھ ہو اور کتنی مایوسی ہو۔

"اب کیا رات بھر یہاں چِلّہ کاٹیں گے مہاراج..."محسن نے کہا۔

مَیں چونکا۔"کیا سارے پرندے مر گئے، سب آشیاں اُجڑ گئے..."

"اچھا، تو آپ فلسفۂ حیات و موت پر جذباتی قنوطیت میں مُبتلا تھے۔"محسن نے کہا۔

"دیکھ نا یار! وہ تو مرتے ہی ہیں جو دُشمن بن کے لڑتے ہیں مگر اصل المیہ ان کا ہے جو بے سبب مارے جاتے ہیں۔"

"دیکھ بھائی، فنا اور بقا کی یہ جنگ تو دُشمنی کے جذبات کے بغیر بھی ہمیشہ سے جاری ہے۔ انسان نے درندوں کو ہلاک کیا اور درندوں نے جنگل کے کمزور جانوروں کو مارا۔ یہ تو ہُوا جنگل کا قانون مگر شہر میں جہاں قانون ہے اور آدمی مہذب کہلاتا ہے، وہاں کیا ہوتا ہے۔ کیا کمزور زندہ رہ سکتا ہے؟ بیشتر انسان زمین پر حشرات الارض کی طرح جیتے اور مرتے ہیں، وہ دیوہیکل، طاقت، اقتدار اور دولت کے نشے میں چُور بدمست ہاتھیوں کے پیروں تلے کچلے جاتے ہیں کیونکہ وہ ان کے لیے راستہ چھوڑ کے نہیں چلتے یا ان کی لڑائی کے میدان ہی میں رہتے ہیں۔ سیاست میں بڑی طاقت، شہر میں بڑا بدمعاش، ملک میں ظالم حکمراں، یہ سب ایسے ہی ہاتھی ہیں جیسے دلاور، جمشید اور ایس ایس پی بن جانے والا سراج ہیں، ان کے راستے میں آنے والے اور ان کی ہوسِ اقتدار اور ہوسِ زر کا شکار کون ہو رہے ہیں۔ وہی جو اپنے چھوٹے چھوٹے گھروں میں سکون سے رہتے تھے۔ ان پرندوں کی طرح... مس عائشہ، تم ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟ یہ تمھاری سمجھ میں آنے والی باتیں نہیں ہیں۔"

"ہاں، میں نے محسوس کیا ہے تم جو کچھ کر رہے ہو سوچ سمجھ کے کر رہے ہو۔"وہ بولی۔"اور مَیں سوچے سمجھے بغیر کر رہی ہوں۔ تم بڑے عجیب لوگ ہو، مشین گن لے کر اور جان ہتھیلی پر رکھ کے مرنے مارنے کے لیے تیار پھرتے ہو مگر چڑیاں کوّے مریں تو اُداس ہو جاتے ہو۔"

"ہم عجیب و غریب نہ ہوتے تو آج اس ویران کھنڈر میں اُلو کی طرح نہ بیٹھے ہوتے۔"مَیں نے کہا۔"پیرس یا ٹوکیو کے کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں دادِ عیش دے رہے ہوتے۔ مونٹی کارلو کے کیسینو میں جُوا کھیل رہے ہوتے یا لاکھ کے کروڑ اور کروڑ کے ارب بنانے کی فکر کر رہے ہوتے، یہ سب ہمارے اختیار میں تھا مگر ہم نے چھوڑ دیا، چنانچہ ہم عجیب بھی ہیں... اور غریب بھی۔"

"کیا اب تم اس سوٹ کیس کو اُٹھا کے لا سکتی ہو؟"محسن بولا۔

"اب تو تم بھی لا سکتے ہو۔"عائشہ نے کہا۔

"مگر ہم تمھیں ہی زحمت دیں گے۔"محسن نے کہا۔

عائشہ تذبذب کے عالم میں کھڑی رہی۔ وہ بے یقینی کے خوف کا شکار تھی۔"اُنھوں نے کہا تھا کہ پانچ منٹ بعد خطرے کی کوئی بات نہیں ہو گی۔"

"اب تو پندرہ منٹ گزر چکے ہیں۔"مَیں نے کہا۔

عائشہ آگے بڑھی۔ پرندوں کی موت نے اُسے دہشت زدہ کر دیا تھا اور اُسے سائنائیڈ گیس کی بے پناہ ہلاکت خیزی کا اندازہ ہو چکا تھا۔ گیس ہَوا میں شامل ہو کے اُوپر اُٹھ چکی تھی مگر یہ اندیشہ بڑا جان لیوا تھا کہ کہیں ہَوا میں اس کا تناسب ہزار میں ایک حصّہ بھی ہو گا تو وہ انہی پرندوں پر گرے گی جن کے مُردہ جسم اب ٹھنڈے اور سخت ہو رہے تھے۔ وہ ایک قدم چل کے رُک گئی تھی۔ محسن نے اُسے پیچھے سے یوں دھکیلا کہ وہ مُنہ کے بل سُوٹ کیس پر جا گری۔ اُسے محسن سے اس قسم کی بے رحم اور سفاکانہ کارروائی کی بالکل اُمید نہ تھی، اس کے حلق سے بے اختیار ایک چیخ نکلی اور وہ چند سیکنڈ تو اُٹھ بھی نہ سکی۔

ہمارے لیے اتنا یقین کافی تھا، اگر سُوٹ کیس میں یا اس کے قریب ذرہ برابر بھی زہریلی گیس ہوتی تو عائشہ اُٹھ نہ سکتی۔ وہ جیسے ہی اُٹھی، مَیں نے اُسے پکڑ لیا۔ محسن نے سُوٹ کیس کو احتیاط کے ساتھ اُٹھایا اور ہم اندر چلے گئے۔ مجھے تھوڑی سی تشویش عائشہ کی چیخ سے لاحق ہو گئی تھی۔ کچھ دیر ہم دم سادھے منتظر رہے کہ آس پاس کے کسی گھر سے کوئی باہر آئے اور یہ جاننے کی کوشش کرے کہ چیخ کس نے ماری تھی مگر رات کے آخری حصّے میں نیند بہت گہری ہوتی ہے۔ کسی نے کچھ نہیں سُنا تھا، سُنا تھا تو خواب یا وہم سمجھ کے نظر انداز کر دیا تھا یا باہر نکل کے دیکھا تھا، تب بھی یہ نہیں سمجھا تھا کہ چیخ اس کھنڈر سے سُنائی دی تھی جو مدّت سے ویران پڑا تھا۔

"یہ... یہ بہت ذلیل حرکت تھی۔"عائشہ نے ہانپتے ہوئے کہا۔ خوف سے اُس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔

محسن ہنسا۔"کیا اس سے بھی زیادہ جو تم کر رہی ہو۔ ہمارا تم سے کوئی رشتہ نہیں... یا ہے تو نفرت کا اور دُشمنی کا مگر تم اپنی بڑی بہن کے ساتھ کیا کر رہی ہو؟ تم مر جاتیں تو مجھے بالکل افسوس نہ ہوتا۔ میں سمجھتا کہ یہ قدرت کی سزا تھی جو تم کو ملی اور وہ بھی دلاور کے ہاتھوں۔"

"خیر، خدا کے انصاف میں دیر ہے، اندھیر نہیں۔"مَیں نے کہا اور ایک امکان پر غور کرنے لگا کہ ہم نے دس لاکھ مانگے تو کیا دلاور نے یہ بندوبست پہلے سے کر لیا تھا؟ نہیں، پھر اسی خیال نے مجھے مجبور کیا کہ مَیں محسن کو دوسرے کمرے میں لے جاؤں کیونکہ مَیں عائشہ کے سامنے کوئی بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مَیں نے غالب کو بھی درمیانی دروازے کے قریب بُلا لیا جہاں سے وہ عائشہ پر نظر رکھ سکتا تھا۔ سراج کی ماں کی طرف سے کسی کو خطرہ نہیں تھا مگر اُس کے کانوں میں پڑنے والی بات خطرہ بن سکتی تھی۔

"مرزا غالب! کیا یہ انتظام صرف ہمارے لیے تھا۔ دلاور عالمِ غیب نہیں ہے کہ پہلے ہی اُس نے صحیح اندازہ کر لیا تھا کہ ہم دس لاکھ طلب کریں گے۔"مَیں نے کہا۔

"یہ واقعی غور طلب نکتہ ہے۔"محسن نے کہا۔"ظاہر ہے، جمشید نے ایک گھنٹے میں یہ بندوبست نہیں کیا۔ سُوٹ کیس پہلے سے تیار تھا اور اس کی چابی جمشید کے پاس تھی مگر سوال یہ ہے کہ کس کے لیے؟"

"اور پورے دس لاکھ!"غالب نے حیرانی سے کہا۔"اگر ہم بیس یا پچاس لاکھ مانگ لیتے پھر... نہیں دوست... یہ ڈیتھ ٹریپ ہمارے لیے تیار کر کے نہیں رکھا گیا تھا۔"

"پھر کس کے لیے تھا؟"میں نے کہا۔

"اسلحہ کس کے لیے ہوتا ہے؟"غالب بولا۔"مشین گن کی گولی پر کس کا نام ہوتا ہے اور ٹائم بم پر کہاں لکھا ہوتا ہے کہ اسے کس وقت اور کہاں استعمال کیا جائے گا، یہ لوگ جس کاروبار میں ملوّث ہیں اس میں یہ ہتھیار کسی دُشمن کے خلاف بھی کام آ سکتا ہے اور کسی دوست کے بھی۔ اس میں کون اپنا کون پرایا۔ دس لاکھ لوا کر کے اس کی جان بھی لی جا سکتی ہے جو ادائے فرض میں کوتاہی کا مرتکب ہوا اور اس کی بھی جس کا ضمیر اُسے پریشان کرنے لگے یا جسے شرافت کا دورہ پڑ جائے۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہُوا کہ ایسے ہی مہلک کھلونے دوسروں کے پاس بھی ہوں گے۔"مَیں نے قائل ہو کے کہا۔

"بالکل ہوں گے۔ دلاور کے پاس جو مہلک گیس والا بم تھا، اس کا فیوز جمشید کے پاس تھا یعنی چابی کسی اور کے پاس تھی تاکہ اس بات کا ایک فیصد امکان بھی نہ رہے کہ دلاور کے گھر میں کوئی تجوری کھول لے۔ آدمی کتنی بھی احتیاط کرے کبھی نہ کبھی چابی کو اِدھر اُدھر بھول جاتا ہے، بچّوں کو نہ سہی بڑوں کو خصوصاً عورتوں کو تجسّس مجبور کرتا ہے کہ جو چیز چھپا کے رکھی جائے یا شجرِ ممنوعہ ہو، اس کا راز ضرور جان لیں۔"غالب نے کہا۔

"ہاں، پنڈورا کا باکس بھی کھول کے ضرور دیکھیں گی، خواہ اس کے بعد کتنی ہی بڑی مصیبت کیوں نہ نازل ہو جائے۔"محسن بولا۔

"ایسے ہی ہتھیار اُنھوں نے گھر میں رکھے ہوں گے تو اُس کی چابی کسی دوسرے کے پاس رکھوائی ہو گی۔"مَیں نے کہا۔"یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے مگر دس لاکھ کی رقم کیا اتفاق سے مانگ لی تھی ہم نے... اور حسنِ اتفاق سے سُوٹ کیس میں بھی دس لاکھ رکھے گئے تھے، پانچ لاکھ کیوں نہیں تھے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ رقم بعد میں ڈالی گئی۔"

"اس راز پر سے تو وہی پردہ اُٹھا سکتے ہیں جنھوں نے پردہ ڈالا تھا مگر دوستو! کیا تم خوش اعتقادی میں یقین کرنے سے پرہیز نہیں کر سکتے۔ کم سے کم دُشمنوں کے معاملے میں۔"غالب نے کہا۔"تم کو شک سے آغاز کرنا چاہیے اور تصدیق کی عادت ڈالنی چاہیے۔"

"ذرا اس نکتے کی وضاحت فرمائیے۔ ہم کُند ذہن لوگ بات کی تہ تک نہیں پہنچتے۔"محسن نے کہا۔

"مَیں پہنچ گیا۔"مَیں نے چٹکی بجائی۔"مرزا نے بڑے پتے کی بات کی ہے۔ میاں شیروانی! تم نے کیسے جانا کہ یہ دس لاکھ ہیں۔"

"ایسے جانا؟"محسن سر کھُجا کے بولا۔"بس ایسے ہی، مان لیا۔"

"ہاں، یہی آپ کی کم عقلی ہے۔"جمشید نے کہا اور آپ نے مان لیا۔ اب ذرا گن کے دیکھیے، اگر واقعی دس لاکھ ہوئے تو پھر یہ اتفاق ہو گا کہ ہماری زبان سے بھی دس لاکھ ہی نکلے۔ دُنیا

اتفاقات سے خالی نہیں "۔ غالب بولا۔

"میں سوٹ کیس اٹھا لاتا ہوں" میں نے کہا۔

"دس لاکھ کی گڈیاں ہیں، نوٹ پرانے ہیں" محسن بولا۔ "ہم خود گن کر دیکھ لیتے ہیں۔"

"ٹھہرو یار، تم پھر غلطی کر رہے ہو" غالب نے کہا۔

"اب کیا ہوا؟" محسن نے نوٹوں کے ڈھیر کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تم شکاری نہیں اناڑی ہو" غالب نے کہا "ہر شکاری جب دام لگاتا ہے تو ناکامی کے امکانات کا سدِ باب بھی رکھتا ہے۔ شکار اگر ایک جگہ سے بچ کر نکل جائے تو دوسری جگہ پکڑا جائے۔ متبادل بندوبست رکھنا دُور اندیشی کی بات ہے اور تم سب اچھی طرح جانتے ہو کہ دلاور کس حد تک دُور اندیش ہے؟ کیا اُس کے ذہن میں نہیں ہوگا کہ ترکیب نمبر ایک ناکام بھی ہو سکتی ہے۔ کسی کی خوش قسمتی کے امکانات کو یکسر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کوئی بھی وجہ ہو سکتی ہے کہ ایک آدمی کسی دامِ اجل سے بچ جائے۔ فرض کرو، ہم سوٹ کیس ایسی جگہ کھول لیتے جہاں ہوا کا رُخ موافق ہوتا۔ مثلاً ہمارے پیچھے سے ہوا آ رہی ہوتی۔ کوئی ٹیبل فین یا پیڈسٹل فین ہوتا جو زہریلی گیس کو باہر پھینک دیتا۔ کسی بھی قریبی دروازے یا کھڑکی سے۔"

"ہم نہیں جانتے اور یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ یہ سب ہمیں ہلاک کرنے کے لیے تھا۔"

"میں بھی صرف اپنی بات نہیں کر رہا ہوں، وہ کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ اگر وہ ایک چال سے بچ جائے تو دلاور ایسا نہیں کہ اس کے لیے دوسری چال بعد میں سوچے نہیں، وہ دوسری چال کو زیادہ اہم سمجھتا ہوگا جس کا شکار ہونے سے کسی کو تقدیر بھی نہیں بچا سکتی۔ تم ایسا کرو، عائشہ سے کہو کہ رقم شمار کرے۔"

"تم بہت دُور کی کوڑی لائے ہو لیکن مرزا غالب، اسے تم اپنی غیر معمولی عقل و ذہانت کا کرشمہ مت سمجھنا۔ یہ صرف فیضانِ صحبت ہے کہ تم ہمارے ساتھ رہ کے کچھ سوچنے لگے ہو" میں نے کہا "ورنہ تم تو ناچیز، ہیچ مداں وغیرہ تھے۔"

"میں سمجھتا ہوں کہ اتنی احتیاط پسندی سے کام لیں گے تو ہم ایک قدم اُٹھانے کے بعد دوسرا قدم اُٹھانے تک بہت وقت ضائع کریں گے" محسن نے کہا۔

"وقت اور زندگی، دونوں میں سے ایک کو ضائع ہوتے سے بچانے کی کوشش تو کرنا چاہیے" غالب نے کہا۔

اس کی بات دس منٹ کے بعد ایک رونگٹے کھڑے کر دینے والی حقیقت بن کے سامنے آئی۔ محسن نے عائشہ سے کہا کہ وہ رقم شمار کرے۔ غالب وہیں بیٹھا رہا۔ میں تقریباً درمیان میں تھا اور کھڑکی سے باہر اُفق پر صبحِ کاذب کا اُجالا دیکھ رہا تھا اور رابعہ کا تصوّر کر رہا تھا۔

"ایک ایک نوٹ کو شمار کر دوں؟" عائشہ نے کہا۔

محسن نے جواب دینے سے پہلے میری طرف دیکھا "نہیں، بس اندازہ ہو جائے کہ یہ دس لاکھ ہیں۔"

"ایک روپیہ بھی کم ہوا تو تمہیں لانا پڑے گا" میں نے کہا "اور زیادہ ہوا تو ہم واپس کر دیں گے۔ تم لے جا کے چوہدری صاحب کو دے دینا۔ ان میں اور تم میں ایک ہی قدر مشترک ہے، پیسہ... اس کی خاطر وہ اپنے ہم وطنوں کی جان لے رہے ہیں اور تم اپنی بہن کی جان لے رہی ہو" غالب بولا۔

عائشہ نے زخمی ناگن کی طرح بل کھا کے غالب کی طرف دیکھا۔ یہ اس کی دُکھتی رگ تھی جو ہم نے چور کی داڑھی والے تنکے کی طرح پکڑ لی تھی اور اب اس پر جانتے بوجھتے وار کر رہے تھے۔ سراج کی ماں اُسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے قریب ہی جُولی بدستور ہوش سے بیگانہ پڑی تھی۔ عائشہ نے ایک ایک گڈی کو سوٹ کیس سے نکال کے باہر رکھنا شروع کیا، یہ سب سو سو کے نوٹ تھے چنانچہ سوٹ کیس میں سو گڈیاں ہونی لازمی تھیں۔

"ذرا یہ بھی دیکھتی جاؤ اور دکھاتی جاؤ کہ سب نوٹ ہی ہیں، اُوپر نوٹ اور اندر سادے کاغذ نہیں ہیں" میں نے کہا۔

"یہ کام تم خود کیوں نہیں کر لیتے" عائشہ نے تنک کے کہا۔

"میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ خوبصورت لڑکی لاکھوں میں کھیلتی ہوئی کتنی حسین لگتی ہے" میں نے کہا۔

عائشہ نے ایک گڈی کو ایک کونے سے پکڑ کے نوٹوں کو ایسے پھیلایا جیسے کوئی کتاب کے ورق پھیلائے کہ ہر ورق ایک مسلسل حرکت میں انگلیوں کے لمس سے پھسلتا ہوا نکلتا جائے۔ ابھی اُس نے بیس گڈیاں ہی دیکھ کے رکھی تھیں کہ اس کا ہاتھ رُک گیا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے اُسے غور سے دیکھ کر کہا۔

"کچھ نہیں، مجھے ذرا چکّر سے آ رہے تھے" وہ بولی اور پھر گڈیاں نکالنے لگی۔ آدھی رقم نکالتے نکالتے اُس کی حالت غیر ہونے لگی۔ اُس کی صورت پر نمایاں ہونے والے تغیّر کو محسن نے بھی نوٹ کیا اور وہ بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹ کے کھڑا ہو گیا۔ اُس کے دماغ میں کیا آیا ہو یا نہ آیا ہو مگر میرے دماغ میں یہ خیال ضرور آیا تھا کہ کہیں ان نوٹوں کی ہوا میں تو زہریلے اثرات شامل نہیں۔ عائشہ نے دو گڈیاں اور اُٹھائیں پھر اُس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ اچانک وہ بیٹھے بیٹھے فرش پر گر گئی۔

"کیا ہوا ہے اسے؟" سراج کی ماں نے خوفزدہ ہو کے کہا۔

"معلوم نہیں" غالب بولا۔ اس کا لہجہ سپاٹ اور ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔ میں اور محسن دیکھ رہے تھے کہ غالب کے دماغ نے بہت دُور کی سوچی تھی جس کو ہمارے ذہن نے خیال و محال سمجھا تھا مگر عائشہ کی ہر لحظہ بگڑتی حالت اس اَمر کی تصدیق کرتی تھی کہ وہ دُور کی کوڑی نہیں، غالب کی چھٹی حس کا کارنامہ تھا یا بچانے والے کا ہاتھ تھا جو مارنے والے ہاتھ سے ہمیشہ زبردست رہا ہے کہ ہم محفوظ رہے۔

"پانی... تھوڑا سا..." عائشہ نے کہا اور اس کا جسم کرب سے زمین پر پھیل گیا۔

"دیکھو، اتنے سنگدل نہ بنو" سراج کی ماں نے کہا "اس کی طبیعت بہت خراب ہے، اسے تھوڑا سا پانی لا دو۔"

"پانی کہاں سے لا دیں؟" میں نے کہا "اچھا میں دیکھتا ہوں، باہر ایک پرانا ہینڈ پمپ ہے تو سہی۔"

"لیکن پانی لائیں گے کس میں؟" محسن بولا۔ عائشہ اب اپنے دونوں ہاتھ یوں گلے پر لے جا رہی تھی جیسے اُس کا دم گھٹ رہا ہو۔

"کوئی کپڑا اتر کر لاؤ" سراج کی ماں نے چلّا کے کہا "باہر کوئی ٹھیکرا، ٹین ڈبا، کچھ بھی ملے بھر لاؤ۔"

میں اور محسن ایک ساتھ باہر نکلے۔ محسن نے نلکے کے ہینڈل کو ہلانا چاہا مگر وہ جام ہو رہا تھا۔ اُس کے نٹ بولٹ، ہینڈل اور پائپ سب پر زنگ کی مار تھی۔ زنگ سالہا سال سے لوہے کو کھا رہا تھا اور کاٹ رہا تھا۔ دھوپ اور بارش، اوس اور پالے میں لوہا گل رہا تھا۔ محسن نے زور لگایا تو ہینڈل ٹوٹ کر اُس کے ہاتھ میں آ گیا۔ محسن نے آدھے ہینڈل کو دُور پھینک دیا۔

"کیا کوئی نلکا نہیں ہوگا اندر؟" محسن بولا۔

"ہوا تو بدتر حالت میں ہوگا" میں نے مایوسی سے کہا۔ ہم سر جھکائے لوٹ آئے۔ عائشہ کے لبوں سے جھاگ سا نکل رہا تھا اور اُس کے ہونٹ نیلے پڑ گئے تھے۔ میں نے اُس کی آنکھوں کی طرف دیکھا تو مجھے خوف آیا۔ کچھ دیر پہلے میں نے کہا تھا کہ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ خوبصورت لڑکی لاکھوں میں کھیلتی ہوئی کتنی خوبصورت لگتی ہے۔ اب میں دیکھ رہا تھا کہ خوبصورت لڑکی لاکھوں کے ڈھیر میں مرتی ہوئی کیسی تصویرِ عبرت لگتی ہے۔ اُس کے ہاتھوں نے نوٹوں کو پھیلا دیا تھا۔ سوٹ کیس کو اُلٹ دیا تھا، اُس کا چہرہ اندر کی اذیّت سے مسخ ہو رہا تھا۔ موت اس لڑکی پر خندہ زن تھی، جس نے دستِ قضا کا اختیار اپنے ہاتھوں میں لینے کا سوچا تھا۔ اس عورت پر خندہ زن تھی جس نے دوسری عورت کی لاش پر اپنے لیے کمینی خوشیوں کا سامان رکھنے والی زندگی مانگی تھی۔

اُس بہن پر خندہ زن تھی جس نے طوائف سے زیادہ قعرِ ذلت میں گر کے اپنے جسم کا سودا کیا تھا۔ طوائف تو صرف پیسے کے لیے عورت نہیں رہتی لیکن عائشہ نے جسم کے ساتھ رشتوں کی تقدیس بھی بیچ دی تھی اور اس کے بدلے کیا پایا تھا؟ یہ موت جس میں وہ اپنے سارے دُکھ، ندامت کے عذاب، پچھتاووں کی بے بسی اور بے کسی کی اذیت کے ساتھ تنہا تھی۔

سراج کی ماں اپنے ہاتھوں میں چہرہ چھپا کے رونے لگی۔ عائشہ مر گئی تھی۔ انہی قاتل نوٹوں کے درمیان جو کاغذ کے بوسیدہ ٹکڑوں سے زیادہ کچھ نہ تھے اور عائشہ کو اب اس کاغذی کفن کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی۔

"میرا خیال ہے کہ اسے یہاں سے ہٹا دیں" میں نے کہا۔

محسن نے سر ہلایا اور عائشہ کو اُٹھانے کے لیے جھکا۔ اُس نے احتیاط کے ساتھ نوٹوں کو چھوئے بغیر عائشہ کو دونوں ہاتھوں سے تھام کے کچھ دُور کھینچا مگر ہاتھ تھامتے ہوئے بھی اُس نے عائشہ کی کلائیاں پکڑیں۔ اُس نے ان انگلیوں کو مس کرنے سے گریز کیا جو نوٹ نکالتی اور شمار کرتی رہی تھیں۔ ان نوٹوں میں ایسے زہر کی موجودگی ممکن تھی جو براہ راست جلد میں سرایت کر جائے اور خون میں شامل ہو جائے۔ یہ زہر عائشہ کی انگلیوں سے محسن کی انگلیوں میں بھی پہنچ سکتا تھا۔

اچانک سراج کی ماں ہنسنے لگی "لو، یہ بھی لے جاؤ۔" اُس نے ایک ایک نوٹ کی گڈی اُٹھا کے ہماری طرف پھینکنی شروع کی "کمینے، کتّو یہ لو، دس لاکھ پورے گن لو، اس کی خاطر ہی سب کچھ کیا تھا نا تم نے... قتل اور اغوا... یہ لو... اور یہ بھی لو۔" وہ دیوانہ وار نوٹ اُٹھانے لگی اور قہقہے لگانے لگی۔ "میری جان بھی لے لو، خود بھی مر جاؤ۔" اُس نے نوٹوں کے ایک ڈھیر کو ہوا میں اُچھال دیا۔

"محسن! اس کا دماغ صدمے سے اُلٹ گیا ہے" میں نے چلّا کے اور خود کو بچاتے ہوئے کہا۔

"یہ... یہ خود بھی مر جائے گی" محسن نے عائشہ کی لاش کو دوسرے کمرے میں ڈال کے غالب کو کھینچ لیا۔

"اسے روکو یار... یہ نوٹ... جُولی..." میں ایک دم بھاگا۔ نتائج کی پروا کیے بغیر میں نے سراج کی ماں کو پکڑ لیا، وہ اب سوٹ کیس اُلٹ چکی تھی اور اس کے نوٹوں کو نوچ رہی تھی، پھاڑ رہی تھی، دانتوں سے اور ہاتھوں سے۔ میں نے اُسے ایک جھٹکے سے اُٹھایا اور دور پھینک دیا پھر میں نے پیر کے جوتوں سے نوٹوں کو ایک طرف کیا جو اب جُولی پر اور اُس کے آس پاس بھی پھیل گئے تھے۔ عائشہ کے انجام کے بعد مجھے کوئی شک نہیں رہا تھا کہ سراج کی ماں بھی زندہ نہیں رہے گی۔ میں جُولی کے انجام کے

بارے میں بھی متفکر ہو گیا تھا۔ میں، محسن اور غالب اپنی شکست کے احساس سے دوچار تھے۔ ہم رابعہ اور ٹیڈی کو چھڑانے کی کوشش میں دلاور کے عیار ذہن سے مار کھا گئے تھے۔ اُس نے بڑی آسانی سے عائشہ کو اور سراج کی ماں کو اپنی فتح پر قربان کر دیا تھا۔ اتنی آسانی سے میں رابعہ کی یا ٹیڈی کی زندگی کو داؤ پر نہیں لگا سکتا تھا۔ میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا لیکن جو کچھ میں نے سوچا تھا، وہ غلط ہو گیا تھا اور بازی ایسے اُلٹ گئی تھی جیسے بعض لوگوں کے نزدیک سفلی عمل اُلٹ جاتا ہے۔ پہلے اگر رابعہ یا ٹیڈی کے بچنے کی کوئی صورت تھی تو اب نہیں رہی تھی۔ دلاور کی ہنسی اور اُس کی آواز رات کے آخری پہر میں بازگشت کی طرح میرے تصور میں گونجنے لگی۔ "واہ بھئی اپنے سکندر صاحب! آپ نے تو افلاطون کو بھی مات دے دی۔ ایسی چال چلی ہمارے ساتھ... ہیں جی... ہم ٹھہرے اَن پڑھ بندے... خیر جی پوچھنا آپ سے یہ تھا کہ وہ جو آپ کی ہمشیرہ... معاف کرنا، اپنے محسن صاحب کی... کیا نام ہے اُن کا... رابعہ... ہاں... ان کی لاش کا کیا کریں؟ کہو تو آپ کے لیے... ہاں پہنچا دیں وہاں... کیا کہتے ہیں اُسے... بڑا مشکل سا لفظ ہے فارسی کا... حجلۂ عروسی میں؟ ہاہاہا... آپ تو بڑے جوکر ہو... کیسا رہا یہ مذاق؟ ہم بھی کر لیتے ہیں تھوڑا بہت مخول..."

"سکندر! کیا ہو گیا ہے تجھے؟" محسن نے مجھے بُری طرح جھنجوڑا۔ میں چونکا۔ "مجھے... کیا ہُوا... کیا وہ دونوں مر گئیں؟"

"کون دونوں؟"

"وہی بُڑھیا... سراج کی ماں... اور جُولی۔" میں نے کہا۔ "اب رابعہ کو بھی مار ڈالیں گے وہ اور ٹیڈی کو بھی۔"

"پاگل ہُوا ہے کیا، مری صرف عائشہ ہے۔" محسن بولا۔ "جُولی تو اب ہوش میں آنے لگی ہے اور سراج کی ماں... وہ بھی آ جائے گی ہوش میں۔"

میں نے بے یقینی سے پیچھے دیکھا، واقعی جُولی آنکھیں کھول رہی تھی اور بند کر رہی تھی۔ "یہ... یہ کیا محسن؟" میں نے کہا۔

"کچھ نہیں، ان نوٹوں میں اب کچھ بھی نہیں ہے۔" محسن بولا۔

"پھر... وہ کیسے مر گئی تھی؟" میں نے اُس کمرے کی طرف دیکھا جس میں عائشہ کی لاش پڑی تھی۔

"وہ غالب نے دریافت کر لیا ہے۔" محسن بولا۔ "نوٹوں کی ایک گڈی پر عائشہ کے خون کا ایک قطرہ لگا ہُوا ہے، اُس کی انگلی میں ایک پن کی نوک گھُس گئی تھی۔"

میں نے غالب کے قریب بیٹھ کر اُس خون کے منجمد داغ کو دیکھا۔ اُس کا رنگ کچھ زردی مائل ہو گیا تھا حالانکہ جمنے کے بعد اس کو سیاہ پڑ جانا چاہیے تھا۔ میں نے اس پن کو بھی دیکھا۔ ہر گڈی کو ایسی کئی پنوں سے اسٹیپل کیا گیا تھا۔ بینک والے سو سو کے نوٹ اکٹھے کر کے بڑی مضبوطی سے اسٹیپل کرتے ہیں اور اس مقصد کے لیے وہ جو مشین استعمال کرتے ہیں، وہ بہت بڑی ہوتی ہے لیکن اُس سے لگائی ہوئی ہر پن کے دونوں کنارے جب دوسری طرف نکلتے ہیں تو مُڑ کر برابر ہو جاتے ہیں۔ خود میں نے بارہا بینکوں سے ملنے والی نوٹوں کی گڈیوں سے ان پنوں کو چھُری چاقو کی نوک سے اُٹھایا تھا اور پھر پن کو دوسری جانب سے کھینچ کر نکالا تھا۔ اگر پن کے دوسرے کنارے مُڑے ہوئے نہ ہوں تو ایک ایک کر کے نوٹ نکل جائیں اور گڈی اصل صورت میں باقی نہ رہے۔

یہ ساری گڈیاں ایسی ہی تھیں یعنی ان میں ہر اسٹیپل پن کے دونوں نوکیلے کنارے سیدھے کھڑے ہوئے تھے۔ اگر یہ خرابی مشین کی ہوتی تو بینک والے فوراً اسے دُور کرتے یا پھر دوسری مشین استعمال کرتے، وہ ہر گڈی کو دو تین جگہ سے اسٹیپل کرتے ہیں اور یہ کبھی نہیں کر سکتے کہ انھیں کھُلا چھوڑ دیں۔ ایسا عملاً کیا گیا تھا۔ ہر اُٹھی ہوئی نوک پر کوئی بہت مہلک زہر تھا۔ یہ بات خاصے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی تھی کہ سو گڈیوں کی دو تین سو پنوں کے چار چھ سو کنارے زہر میں بجھے ہوئے ہوں گے تو ایک نہ ایک گڈی کھولتے ہوئے ضرور ہاتھ میں چبھ جائے گا۔ سراج کی ماں نے نوٹوں کو اُچھالا تھا اور گڈیاں پھینکی تھیں مگر اُسے کسی نوک سے گزند نہیں پہنچا تھا۔ عائشہ کی قضا آ گئی تھی کہ کوئی قاتل نوک اُس کی جِلد میں پیوست ہو گئی۔ غالباً اس وقت جب ہم نے اسے مجبور کیا تھا کہ وہ ہر گڈی کو کھول کے دکھائے۔

"کیا آپ کی نظر رنگ کے فرق کو دیکھ سکتی ہے؟" غالب نے کہا۔

"ہاں، غور سے دیکھنے پر اندازہ ہوتا ہے کہ پن کی سطح چمکیلی اور صاف ہے اور اس کا رنگ ویسا ہی ہے جیسا کہ المونیم کی پن کا ہوتا ہے مگر ہر نوک پر زردی سی کوئی چیز لگی ہے۔" میں نے کہا۔

"یہی زردی موت ہے۔" غالب نے کہا۔ "ہم کسی پلاس کی مدد سے ہر پن کو الگ کر دیں تو باقی نوٹ صرف نوٹ ہیں۔ صرف اتنی احتیاط ضروری ہے کہ کوئی پن کسی کے ہاتھ پر یا جِلد پر ہلکی خراش تک نہ ڈالے۔"

"ہم مزید احتیاط کے لیے دستانے پہن کے یہ کام کر سکتے ہیں۔"

"کیا یہ دوسری بات جمشید کو معلوم نہیں تھی؟" محسن بولا۔

"یا تو معلوم نہیں تھی یا وہ عائشہ سے کہنا بھول گیا۔" غالب نے کہا۔

"اُس نے سوچا ہو گا کہ عائشہ کو ہم سُوٹ کیس کھولنے پر تو مجبور کر سکتے ہیں۔" غالب نے کہا۔ "لیکن اس کے بعد ہمارے دل میں کوئی اندیشہ نہیں رہے گا۔ نوٹ تو ہم خود ہی نکالیں گے۔"

"سوچو یار کہ ہم میں سے کوئی بھی وہاں پڑا ہوتا۔" میں نے جُھرجُھری لے کر کہا۔

"اس سے آگے سوچو تو خیال آتا ہے کہ ہم جس کو بھی یہ نوٹ دیتے، وہ اس انجام سے دوچار ہو سکتا تھا۔" غالب نے کہا۔ "مگر دلاور کو اس سے کیا کہ کتنے لوگ اس زہر سے ہلاک ہوں گے، خدا نے ہمیں بچا لیا۔"

محسن ایک دم پیچھے گیا تو میں نے بھی پلٹ کے دیکھا۔ جُولی اُٹھ بیٹھی تھی اور بڑی دہشت کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔

"محسن بھائی... سکندر بھائی... میری ماں مر گئی ہے نا؟" وہ عجیب سے کھوکھلے اور سپاٹ لہجے میں بولی۔ اس کی آنکھوں میں یہ بات کہتے ہوئے آنسوؤں کی نمی تک نہیں آئی تھی۔

"ہاں جُولی۔" میں نے کہا۔ اس اعتراف کے سوا میں کیا کر سکتا تھا۔

"اُسے دلاور نے قتل کر دیا تھا؟" وہ بولی۔ "کرسی مار کے اُس کا سر پھاڑ دیا تھا۔ میں نے دیکھا تھا۔ وہ ماں کو مار رہا تھا۔"

"ہم سب کو بہت رنج ہے۔"

"کیا دلاور کو مار دیا تم نے؟ اُسے پولیس کے حوالے تو نہیں کیا نا؟ پولیس تو اُس کو چھوڑ دے گی، وہ بہت پیسے والا ہے، بہت طاقت ور ہے... اور شیطان ہے۔" وہ بولتی گئی۔ "مجھے بتاؤ تم نے...؟"

"ہم نے اُسے وہیں مار دیا تھا جُولی۔" میں نے بڑے اعتماد کے ساتھ اور نیک نیتی کے ساتھ وہ جھوٹ بولا جو سچ سے زیادہ اجر رکھتا تھا۔ "میں نے بھی اُس کا سر پھاڑ دیا۔" محسن نے سر ہلا کے میری تائید کی۔

جُولی نے ایک گہرا سانس لیا اور اُس کی صورت پر طمانیت کا احساس جھلکنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی ہسٹریا کا زور ٹوٹنے لگا۔ احساس جاگنے لگا اور میں نے جُولی کے جسم میں لرزش سی محسوس کی۔ وہ بُری طرح کانپنے لگی تھی۔

"تم وہاں سے کیوں بھاگ آئی تھیں جُولی؟" محسن نے کہا۔

"میں... مجھے ڈر لگا کہ وہ مجھے بھی مار ڈالے گا، وہ ایک خونی درندہ تھا، میں اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے اپنے والد کی آواز سُنی، وہ مجھے پکار رہے تھے، جُولی یہاں آ جاؤ، میرے پاس، یہاں میں تمہاری حفاظت کروں گا اور میں بھاگ نکلی۔" اُس نے یکلخت پھُوٹ پھُوٹ کر رونا شروع کر دیا تھا اور اب اُس کا سارا جسم ہچکیوں کی زد میں جھٹکے لے رہا تھا۔ ہمارے تسلی کے الفاظ اُس کے لیے بے معنی اور بے اثر تھے۔

"وہ... وہ کہاں ہے؟" جُولی نے روتے روتے کہا۔ "میں دیکھوں گی اُسے۔"

"ہم نے اُس کی تدفین کر دی ہے۔" میں نے پورے یقین اور اطمینانِ قلب کے ساتھ دوسرا جھُوٹ بولا۔ "تم تو کل سارا دن بے ہوش پڑی رہیں۔ ہم نے تم کو پرسوں رات یہاں آتے دیکھ لیا تھا۔"

"تم جھُوٹ بول رہے ہو۔" جُولی نے ایک دم سر اُٹھا کے کہا۔ "اس وقت تم گھر پر کہاں تھے؟"

"ہم اُسی وقت باہر سے آ رہے تھے، جب تم گیٹ کھول کے نکلی تھیں اور میں نے تمہارا تعاقب کیا تھا۔" میں نے کہا اور محسن کی طرف دیکھا۔ اُس نے پھر سر ہلایا اور میرے جھُوٹ کے سچ ہونے کی تائید کی۔

جُولی خون کے آنسو رو رہی تھی۔ اُس کے دل پر صدمے کا اثر بہت شدید تھا مگر بے ہوشی کے وقفے میں اُس کی وہ شدت کم ہو گئی تھی جو اُس کے ذہن کو متاثر کر سکتی تھی۔ میں نے اُسے بڑی تفصیل سے بتایا کہ ہم نے کس طرح اُس کی ماں کی آخری رسوم ادا کی تھیں اپنے عقیدے کے مطابق۔ میں نے بتایا کہ عیسائی عقیدے کے مطابق تدفین ممکن نہ تھی کیونکہ ہمیں بہت سی باتوں کا علم نہیں تھا۔ مثلاً یہ کہ وہ عیسائیت کے کس فرقے کی پیروکار تھی۔

"اس سے میری ماں کو کیا فرق پڑتا ہے کہ اس کی تدفین کیسے ہوئی۔ اُس کا شوہر مسلمان تھا۔ اُس کے عقائد میں کوئی بات ایسی نہیں تھی کہ کوئی اُسے مسلمان نہ مانے۔ خود میں بھی تو مسلمان ہی ہُوں، نام کے سوا اور تم سب جو میرے بھائی ہو، مجھے نئی زندگی کی جدوجہد میں کامیابی کی منزل تک لانے والے، تم بھی تو مسلمان ہو۔" وہ روتی گئی۔ "میری ماں کو تم سب پر فخر تھا، وہ کہتی تھی کہ جُولی! کیسے بھائی ملے ہیں تجھے، فرشتے کے رُوپ میں انسان یا انسان کے رُوپ میں فرشتے۔"

"ہم ایسا نہیں سمجھتے جُولی، ہم بڑے گناہ گار ہیں۔" میں نے کہا۔

"بھائی، مجھے میری ماں کی قبر پر لے چلو۔" وہ بولی۔

"لے چلیں گے مگر ابھی نہیں۔" میں نے کہا۔ "شام کو چلیں گے، دن میں ہم باہر نہیں جا سکتے۔ ہم تمہارے ساتھ اسی لیے یہاں چھپے ہوئے ہیں کہ ہمیں پولیس تلاش کر رہی ہے۔"

"کیونکہ انھیں دلاور کی لاش مل گئی ہے۔" محسن نے کہا۔

میں نے اُسے جُولی کے پاس چھوڑا، وہ جُولی سے اُس کی ماں کی باتیں کرتا رہا اور اُس کے غم کے زہر کو اُس کے وجود سے نکالتا رہا، کسی ماہر جرّاح کی طرح جو ناسور سے زہریلا مواد کھینچ لے۔ یہ زہر جُولی کے اشکوں میں ڈھلتا گیا۔

میں نے غالب سے کہا کہ میں باہر جاتا ہُوں کیونکہ صبح کا اُجالا اندھیرے پر غالب آنے لگا تھا۔ پہلے تو مجھے کھانے پینے

کے لیے کچھ لانا تھا، اس کے بعد کیا کرنا تھا، یہ طے کرنے کے لیے پورا دن پڑا تھا۔ دس لاکھ کی رقم کو مَیں نے چھوا تک نہیں۔ ہمارے پاس اب بھی تقریباً چوبیس ہزار روپے تھے جو ہماری فوری ضروریات پوری کرنے میں کام آ سکتے تھے۔

تقریباً دو فرلانگ کے فاصلے پر مجھے چند دُکانیں نظر آئیں۔ اُن میں ایک سبزی فروش کی تھی۔ وہ منڈی سے سبزی لا کے دھو رہا تھا اور دُکان میں سجا رہا تھا۔ دوسری دُکان پر قصاب بکروں کی سر بُریدہ اور کھال اُتری ہوئی لاشوں کو لوہے کے ہُک سے ایک قطار میں ٹانگ رہا تھا۔ تیسری دُکان بند تھی اور چوتھی پر کچھ لوگ ناشتا کر رہے تھے۔ لکڑی کی بینچوں پر بیٹھے وہ حلوہ پوری کھا رہے تھے اور لسّی کے گلاس پی رہے تھے۔ صرف ایک شخص تھا جو چائے پی رہا تھا اور عینک لگا کے بڑے انہماک سے تازہ اخبار کی تازہ خبریں ریڈیو کی طرح سُنا رہا تھا۔ اس کے پیچھے سے گزرتے ہوئے مَیں نے صفحۂ اوّل کی سُرخیوں پر نظر ڈالی۔

"لو بھئی، اب صنعت کار بھی اغوا ہونے لگے۔" وہ بولا۔

"صنعت کار اغوا نہیں ہوں گے تو کیا مزدور ہوں گے ہمارے جیسے؟" کسی نے کھاتے کھاتے لسّی کا ایک گھونٹ لیا اور طنز سے کہا۔

"اغوا تو روز کا معمول بن گئے ہیں جی۔" ہوٹل والا بولا۔

"مگر یار! یہ تو پوچھو کہ کون اغوا ہُوا؟" اخبار پڑھنے والے نے کہا۔

"تم پڑھو نا باؤجی آ گے، ہمیں تو آپ سے ہی معلوم ہوگا۔"

"وہ اپنے چوہدری دلاور صاحب نہیں ہیں؟" اخبار پڑھنے والے نے کہا اور اُس کا لہجہ اور انداز ایسا تھا کہ مَیں دلاور کی خبر اُسی کی زبان میں سُن کے بلا ارادہ مُسکرانے لگا۔ "اُنھوں نے ابھی کل پرسوں ہی تو اعلان کیا تھا کہ غریبوں کے لیے ایک مفت اسپتال بنے گا۔"

"مفت اسپتال!" مزدور نے پھر تلخی سے کہا۔ "ارے چاچا' سب چکّر ہے یہ سیاست کا، بے وقوف بناتے ہیں ہمیں۔"

"یار، تم ہو ہی بے وقوف۔" اخبار پڑھنے والا برہم ہو گیا۔ "تم سے کس نے کہا ہے تبصرہ کرنے کو؟"

باقی خبر کا خلاصہ تقریباً حقیقت پر مبنی تھا کہ دو افراد نے چوہدری دلاور سے غیر مُلکی صحافی بن کے رابطہ قائم کیا تھا اور چوہدری دلاور نے ان کے اعزاز میں ایک ڈنر کا بندوبست کیا مگر وہاں نہ وہ صحافی پہنچے اور نہ چوہدری دلاور۔ دوسرے مہمان انتظار کرتے رہے۔ پولیس کے ایک اعلیٰ افسر نے جو چوہدری دلاور کے قریبی دوست بتائے جاتے ہیں اور جو خود بھی دعوت میں شریک تھے، رات دس بجے اُن کے لاپتا ہو جانے کی تصدیق کرتے ہوئے بتایا کہ ان کی گاڑی کو ہوٹل میں آتا دیکھا گیا تھا۔ ہوٹل کے گیٹ پر موجود دربان کے کہنے کے مطابق گاڑی کو خود چوہدری دلاور ہی چلا رہے تھے لیکن بعد میں اُن کی گاڑی ہوٹل کے اندر ہی کھڑی ہوئی پائی گئی۔ خیال ہے کہ اُنھیں دوسری کار میں ڈال کے لے جایا گیا جو ہوٹل کے اندر ہی چھینی گئی تھی۔ چھینی جانے والی کار کے مالک نے دو افراد پر شبہ ظاہر کیا ہے اور اُن کا حُلیہ وہی بتایا ہے جو تقریباً صحافی بن کر دلاور کے پاس پہنچنے والوں کا تھا۔ مذکورہ دونوں افراد کے بارے میں خبر رساں اداروں اور پریس کلب کے باخبر حلقوں نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ وہ کوئی پیشہ ور قسم کے بدمعاش تھے۔ آخری خبریں ملنے تک چوہدری دلاور کا پتا نہیں چل سکا تھا اور اُن کے گھر سے رابطہ قائم نہیں ہُوا تھا۔

یہ ساری خبریں مَیں نے پوریاں خریدتے ہوئے سُنی۔ پُوریاں بیلنے والا ایک تھا اور وہ قدرے سُست رفتار تھا۔ جتنی پوریاں وہ تلتا تھا، اُس میں سے ایک آدھ ہی میرے حصّے میں آتی تھی۔ باقی جائے واردات پر کھانے والوں کو پیش کر دی جاتی تھیں کیونکہ اُن کے نالشتے میں 'انتظار فرمائیے' کا وقفہ آتا تو وہ شور کرتے۔ مَیں فاضل پوریاں جمع کرتا گیا اور خبریں بھی سُنتا رہا۔ ابھی تک اُس میں شہر کے نئے ایس ایس پی کے تقرر کی خبر بھی نہیں تھی اور پرانے ایس ایس پی کی معزولی کا ذکر بھی نہیں تھا۔ ایس پی سراج کے گھر میں ہونے والے اغوا کے ڈرامے، خسرو جمشید کے گھر میں پائی جانے والی لاش اور عائشہ کے بارے میں کوئی خبر آنے کا سوال ہی نہیں تھا کیونکہ یہ نصف شب یا اس کے بعد پیش آنے والے واقعات تھے، جب اخبارات کی آخری کاپی پریس میں جا چکی تھی۔ ظاہر ہے پھر دلاور کی بازیابی اور زیب النساء کے بارے میں کوئی اطلاع کیسے ہوتی۔ یہ ایک اچھی بات تھی کہ لوگوں کو یہ سب مزید چوبیس گھنٹے کے بعد اخباروں کے ذریعے معلوم ہوگا جب ان واقعات کو پیش آئے تیس بتیس گھنٹے گزر چکے ہوں گے۔ اس سے زیادہ خوشی مجھے اس بات سے ہوئی کہ اس خبر کو ہم سے منسوب نہیں کیا گیا تھا۔ غالباً یہ احتیاطی پیش بندی سراج نے کی تھی۔ اخبار میں ان جعلی صحافیوں کا حُلیہ ضرور تھا مگر حُلیے سے کوئی کسی کو نہیں پہچانتا۔ خصوصاً عام لوگ جو خبر پڑھ کے بھول جاتے ہیں، حُلیے کیسے یاد رکھ سکتے ہیں لیکن تصویر خود بخود ذہن میں نقش ہو جاتی ہے اور ہمارے موجودہ حُلیے کی کوئی تصویر تھی ہی نہیں کہ کوئی اخبارات کو اشاعت کے لیے دیتا۔

"ہاں جی، ہور کی چاہیدا ہے؟" پوریاں بنانے والے نے کہا۔

"ہور... چائے۔" مَیں نے چونک کر کہا۔ "چائے ملے گی؟"

"کیوں نہیں ملے گی، بیٹھو۔" دُکاندار بولا۔

"نہیں... مجھے دس بیس کپ چائے کی ضرورت ہے۔" مَیں نے کہا۔

"دس یا بیس؟ پہلے سوچ لو۔" دُکاندار نے کہا۔

"بیس... بیس کپ۔" مَیں نے بے وقوفوں کی طرح مُسکرا کے کہا۔ "لیکن میرے پاس برتن کوئی نہیں۔"

دُکاندار ہنسنے لگا۔ "فیر کی کراں، جھولی وِچ پا دیاں... یا جیب وِچ پا کے کھڑتی جے؟" اُس کی بات سے چند ناشتا خور بھی محظوظ ہوئے۔

"تم یہ کیتلی مجھے دے دو۔" مَیں نے المونیم کی ایک کیتلی کی طرف اشارہ کیا جو استعمال نہیں ہو رہی تھی۔

"ایہہ... یار، حد ہوگئی، فیر توں آکھیں گا کہ مینوں ایہہ بینچ دی چاہیدی اے... چار پین لئی۔" دُکاندار نے پبلک کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"آپ سمجھے نہیں۔" مَیں نے کہا۔ "ہم ابھی اس علاقے میں نئے نئے پہنچے ہیں، سارا سامان بندھا پڑا ہے، آپ یہ کیتلی دے دیں اور ضمانت کی جتنی رقم چاہیں رکھ لیں۔" مَیں نے جیب سے سو روپے کا ایک نوٹ نکال کے بڑھایا۔ "مَیں کیتلی واپس کر جاؤں گا اور ہاں، دو چار کپ بھی عنایت کر دیں۔"

"عنایت تو خیر مَیں کر دیاں گا لیکن جانا کتھے جے؟" دُکاندار میری بات سے مطمئن ہو گیا۔ اُس نے سو کا نوٹ تقریباً جھپٹ لیا۔ اب اس کے لیے تشویش کی کوئی بات نہیں رہی تھی۔ کیتلی مشکل سے بیس روپے کی تھی۔ چار کپ آٹھ دس روپے کے۔ حلوہ پوری کے دس روپے۔ مَیں نہ بھی واپس آتا تو وہ فائدے میں تھا۔ وہ ایک کی جگہ دو نئی کیتلیاں خرید لیتا۔ پُرانی کیتلی اپنی قیمت تو ادا کر ہی چکی تھی اور پھر بھی پوری قیمت میں بک رہی تھی۔ اُس نے تو چاہا ہوگا کہ مَیں لوٹ کر نہ آؤں اور خدا نے اس کی سُن لی۔

کیتلی کی چائے میرے لوٹ کر جانے تک ٹھنڈی ہوگئی تھی۔ اسے پُرانے کچن میں لکڑیاں جلا کے گرم کیا گیا۔ لکڑیاں خشک تھیں لیکن دُھواں پھر بھی اُٹھا۔ آس پاس کے کسی رہنے والے نے دیکھا ہوگا تو سوچا ضرور ہوگا کہ آج یہ دُھواں سا کہاں سے اُٹھا ہے مگر دیکھا کسی نے نہیں کیونکہ تفتیش کرنے کوئی نہیں آیا۔

"لگتا آج کا سارا دن اسی جگہ ایسے ہی گزرے گا۔" غالب نے کہا۔

"نہیں، کچھ کرتے ہیں۔" مَیں نے کہا۔ "یہاں سے نکلنے کی صورت..."

"اور اس بدبخت کا کیا کریں گے؟" محسن نے کہا اور دوسری طرف اشارہ کیا جہاں عائشہ کی لاش پڑی تھی۔

"اس کا ہم کیا کر سکتے ہیں؟" مَیں نے کہا۔ "جب یہاں سے چلے جائیں گے تو دلاور کو مطلع کر دیں گے کہ اپنے ارمانوں کا جنازہ اُٹھا لو۔"

"سراج کی ماں نے اور جُولی نے کچھ کھایا پیا ہے؟"

"جُولی نے چائے پی ہے صرف، سراج کی ماں گُم صُم بیٹھی ہے۔" محسن نے کہا۔ "اس کھنڈر میں پورا دن کاٹنا مشکل ہوگا۔"

"مجبوری میں جیل سمجھ کے رہیں گے سب۔" مَیں نے کہا۔ "مَیں چاہتا ہُوں کہ آج رات اس فون نمبر پر پھر رابطہ قائم کریں۔ وہ جو کراچی کا نمبر تھا اور رابعہ نے دیا تھا۔ اس کے علاوہ سراج سے بھی ایک آخری بات ہو جائے۔"

"کیا ضرورت ہے؟"

"ضرورت ہے۔" مَیں نے کہا۔ "اب تک اُس نے صورتِ حال کو صحیح پس منظر کے ساتھ سمجھ لیا ہوگا۔ اس کا رویّہ اب کیا ہے۔ دلاور کیا کہتا ہے۔ زیب النساء کے بھائی کا ردِّ عمل کیا ہے؟"

"اس وقت جب ہم پہنچے تھے۔" محسن بولا۔ "تو وہ دادِ عیش دے رہا تھا۔ زیب النساء جانتی تھی..."

"ہاں مگر اس کرائے کی عورت نے بعد میں کیا کیا؟" میں نے کہا۔

"اپنے گھر کے معاملات خسرو جمشید دبا دے گا۔" غالب بولا۔ "عورت خود ڈر سے خاموش ہو جائے گی۔ نوکروں کو خسرو جمشید ڈرا کے خاموش کر دے گا اور مرنے والے کی لاش غائب ہو جائے گی، سب یہی چاہیں گے۔ آج یہاں کی صورتِ حال واضح ہو جائے اور اس نمبر سے رابطہ ہو جائے، کراچی کے نمبر سے تو ہم رات کو کسی وقت یا کل صبح نکل جائیں۔"

"کہاں نکل جائیں اور کیسے نکل جائیں؟" محسن بولا۔

"مَیں سمجھتا ہُوں کہ ایک ٹرک ہو تو سفر آسان اور محفوظ رہے گا۔" مَیں نے کہا۔ "ہم خود بھی جا سکتے ہیں اور ان سب کو بھی لے جا سکتے ہیں۔ یہاں سے کراچی تک قومی شاہراہ پر ہزاروں ٹرک چلتے ہیں اور ہر قسم کا سامان لاتے لے جاتے ہیں۔ انڈے، پھل، سبزیوں سے لے کر لوہے، سیمنٹ اور مشینری تک... ہم سبزی لے جا سکتے ہیں۔"

"آئیڈیا قابلِ عمل ہے۔" غالب نے کہا۔ "مگر ٹرک کہاں سے آئے گا؟"

"ٹرک اس رقم سے آئے گا۔" مَیں نے فرش پر پڑے ہوئے نوٹوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ "میرے ذہن میں تو یہ تھا کہ کوئی لمبا ٹریلر مل جاتا۔ کارواں ٹائپ یا جیسے کارگو کنٹینر ہوتے ہیں۔ لوہے کے بیس فٹ یا چالیس فٹ لمبے اور بارہ فٹ اونچے، ہر طرف سے بند فولادی ڈبے۔"

"اس میں کیا گھر بنا کے سفر کرنا تھا؟" محسن بولا۔

"نہیں یار! میرے دماغ میں ایک زبردست پلان تھا" میں نے کہا "شرط یہی ہے کہ ہمیں ایک ایسا ٹریلر مل جائے۔ عام ٹرک لاکھ ڈیڑھ لاکھ کا ملتا ہے تو ٹریلر مل جائے گا چار پانچ کا، اس میں ایک سرکس قائم کیا جائے۔"

"سرکس؟" غالب بے اختیار ہنس پڑا "اچھا خیال ہے۔ کم سے کم مسخرے بھرتی نہیں کرنے پڑیں گے۔"

"تم مذاق اُڑا رہے ہو" میں نے کہا "میری پوری اسکیم بہت شاندار ہے اور اس کے فوائد کا تم ابھی اندازہ نہیں کر سکتے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم مسخرے ہیں مگر پیشہ ور نہیں۔ اگر بھیس بدلنا پڑے تو کیا مسخرے سے بہتر کوئی بھیس ہوتا ہے؟ جو چاہو پہن لو، صورت کو جیسے چاہو بگاڑ لو۔ منہ پر سیاہی ملو یا سفیدی۔ آج ایک شکل تو کل دوسری۔ کارٹون دیکھنے والا صرف ہنستا ہے، اصل چہرہ کیسے پہچان سکتا ہے۔"

"عجیب بے وقوفی کا نظریہ ہے۔ بھائی، سرکس میں صرف جوکر ہی تو نہیں ہوتے۔" محسن نے کہا "بازیگر بھی ہوتے ہیں۔"

"بازیگر یہ ہے۔" میں نے غالب کی طرف اشارہ کیا۔ "کرتب دکھلاتے ہوئے اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ اس کے علاوہ ہم سرکس کا شو کریں گے ہی نہیں۔ سرکس تو بس سفر کرے گا یہاں سے کراچی تک۔ راستے میں کسی بھی جگہ پڑاؤ ڈال دو۔ کوئی شک نہیں کرے گا۔ سرکس ایک موبائل ہیڈ کوارٹر بن سکتا ہے۔ مطلب یہ کہ ہم سرکس کو کہیں چھوڑ کر دائیں بائیں آگے پیچھے سو دو سو میل کے علاقے میں کہیں بھی جا سکتے ہیں۔ راتوں رات شب خون مار کے واپس بھی آ سکتے ہیں۔"

"جوکر کے حلیے میں؟"

"نہیں یار! جوکر کا لباس تو ایک پردہ ہوگا۔ جب ضرورت ہوگی تو ہم کسی گاڑی یا موٹر سائیکل پر نکل جائیں گے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ جو کچھ آج مشرقی حصے میں ہو رہا ہے اسے خانہ جنگی یا بغاوت کہنا غلط ہوگا۔ یہ ایک سیاسی سازش ہے اور حکومت اپنے طور پر اس سے نمٹ رہی ہے۔ ہم حکومت کے برابر طاقت اور وسائل نہیں رکھتے کہ سب سے لڑ سکیں اور سب کا مقابلہ کر سکیں۔ سارے تخریب کار، شرپسند، ففتھ کالمسٹ، غدار اور وطن فروش، علیحدگی کے رجحانات کو ہوا دینے والے سیاست داں اور اس کے اسباب پیدا کرنے والے بیورو کریٹس، سب کو ختم کرنے کی سوچنا ایسا ہی ہے جیسے کہ تیشۂ فرہاد سے ہمالیہ کو کاٹ کے برابر کرنے کی سوچنا۔ ہمارا مقابلہ صرف ایک گروہ سے ہے۔ ہم اس گروہ کو اور اس کی ملک دشمن سرگرمیوں اور کارروائیوں کو ختم کر سکے تو ہم سمجھیں گے کہ ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ ہم جیسے اور بھی ہیں جو اپنے اپنے محاذ پر ایسے ہی ملک کے دشمنوں سے لڑ رہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں، وہ نابینا اور بوڑھی عورت بھی جنگ کر رہی ہے جو صبح شام خالقِ کائنات کے حضور ہاتھ اُٹھا کے حق کی فتح کے لیے صدقِ دل سے دعا مانگتی ہے۔ وہ بوڑھے بھی شامل ہیں جو ہر نماز میں وطن کی سلامتی کے لیے سجدہ ریز ہو کر دعا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر، انجینئر، مزدور، کسان، طالبِ علم سب اس جنگ میں کسی نہ کسی طور شریک ہیں۔ میدانِ جنگ میں فوج ہے، اس کے پیچھے ایک قوم کا جذبہ ہے۔ ان کی تمنائیں اور نیک خواہشات ہیں۔ دلاور اور اس کے ساتھی دوسری طرف ہیں۔ ان جیسے بھی سیکڑوں یا ہزاروں ہوں گے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ایم آر ایس جیسی قوت رکھنے والے بھی سیکڑوں یا ہزاروں ہیں، خواہ ان کی کوئی باقاعدہ تنظیم ہو یا نہ ہو اور اس تنظیم کا کوئی نام ہو یا نہ ہو۔ ہم خود کون سی تنظیم ہیں، بس دوست ہیں جو خلوص اور اتحاد کے پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے ہیں۔ نام تو محض مذاق ہے مگر اس مذاق نے دلاور اینڈ کمپنی کو چیلنج کر دیا ہے۔ یہ چیلنج باقی ہے، ہم باقی سب کو دوسروں کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ اس شیطانی قوت کو ہم نیست و نابود کریں گے جس کے کئی نام ہیں۔ دلاور، جمشید، سراج، پیڈرو اور نہ جانے ایسے کتنے دوسرے نام ہمارے سامنے آئیں گے۔ تم نے دیکھا کہ دلاور نے اپنا کاروبار یہاں سمیٹ دیا ہے۔ میرے والد نے جو فیکٹری زرعی مشینری کے آلات بنانے کے لیے قائم کی تھی اس میں اسلحہ بننے لگا تھا مگر اب دلاور نے ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس کا راز افشاں ہونے سے پہلے وہاں سے سب کچھ ختم کر دیا ہے اور وہاں وہ ایک اسپتال بنا رہا ہے، غریب عوام کے لیے اور یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی بردہ فروش اپنے اڈے کی جگہ لاوارث عورتوں کے لیے پناہ گاہ بنانے کا اعلان کر دے۔ اس کے سیاسی مقاصد اس کی ملک دشمن سرگرمیوں پر شرافت کا، شہرت کا اور عزت کا جھوٹا پردہ ڈالنے کے سوا کچھ نہیں۔ وہ کرپٹ اور بے ضمیر تاجروں کے علاوہ گردن زدنی سیاستدانوں کی حمایت حاصل کرے گا جو اسے حُب الوطن قرار دیں گے مگر ہم حقیقت کو اپنی آنکھ سے دیکھ رہے ہیں۔ خوبصورت ارادوں اور لفظوں کے پیچھے ایک بدبودار، غلاظت اور تعفن سے بھرے ناسوروں والا جسم ہے، روحِ ابلیس ہے۔ ہم ان سب کے چہرے بے نقاب کریں گے جو دلاور کے ساتھ ہیں۔ ایسے لوگ کم نہیں ہوں گے، ان سے نمٹنا آسان بھی نہیں ہوگا مگر ہم نمٹنا جانتے ہیں۔ جب ہم اس راستے پر چلیں گے جو ان غداروں کا راستہ ہے تو یہ چہرے خود بخود سامنے نہیں آئیں گے، ہمیں ان کو تلاش کرنا ہوگا یہاں سے کراچی تک... کراچی سے اس محاذ تک جہاں سیاسی سازش کی آگ بھڑک رہی ہے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو، نا؟ اس جنگ کو ہم ایک گروہ کے خاتمے تک محدود رکھیں گے۔ اس سے ہم جنگ جیتنے کی اُمید نہیں رکھ سکتے۔ جنگ بہت بڑی بلا ہے مگر ہم اس بلا کو تھوڑا سا نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ اس کی طاقت کو تھوڑا سا کم کر سکتے ہیں، اگر یہ ایک خون پینے والا آدم خور جن ہے تو ہم اس کی ایک آنکھ پھوڑ دیں، اس کی ایک ٹانگ توڑ دیں یا ایک انگلی بھی کاٹ دیں تو بہت ہے۔ یہ ہم کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے، دلاور اینڈ کمپنی کی طاقت کو ختم کر دینا سیکڑوں نہیں، ہزاروں گھروں کی سلامتی کا ضامن ہوگا۔ شاید لاکھوں افراد کی زندگی کو بچا لے گا موت، بھوک اور افلاس سے، تباہی اور بربادی سے، یتیمی اور بیوگی سے، نہ جانے کتنی عمارات، کتنے پل، کتنی لمبی ریلوے لائن، کتنے دفاتر اور سرکاری ادارے، کتنے ہزار مربع میلوں میں پھیلی ہوئی فصلیں، مویشی اور پالتو جانور، اسپتال اور اسکول، یہ سب تباہی سے بچ جائیں گے، اگر ہم نے وہ سب اسلحہ روک لیا یا تباہ کر دیا جو دلاور اینڈ کمپنی آگے بھیج رہی ہے تو کیا اتنا کم ہوگا؟ مگر اس کے لیے ہمیں جستجو اور جدوجہد کرنا ہوگی۔ ہم نکلیں گے تو ہمیں ہر راستے پر ہر طرف آنکھیں کھلی رکھ کے دوستوں اور دشمنوں کی شناخت کرنی ہوں گی اور آگے بڑھتے ہوئے ان کو چن چن کر ختم کرنا ہوگا، یہ سب ہم اسی صورت میں کر سکتے ہیں جب تم پہچانے نہ جائیں اور ہمارے دشمن کبھی نہ جان سکیں کہ ان کی تباہی و بربادی کی ذمے دار ایم آر ایس ہے تو ایم آر ایس کہاں ہے، کون ہے؟ میں نے سرکس کے بارے میں غور کیا تو مجھے یہ ممکن نظر آیا کہ ہم اس پلان پر عمل کر سکتے ہیں۔ ہم سرکس کے ساتھ ہی ڈراما کمپنی بنا سکتے ہیں۔ لوگوں کو بھرتی کر سکتے ہیں، گاؤں گاؤں پھر سکتے ہیں اور دیکھ سکتے ہیں کہ کون کہاں کیا کر رہا ہے۔ یہ چلتے پھرتے تھیٹر اور سرکس دیہات میں انوکھی چیز بھی ہیں اور مقبول بھی بہت ہوتے ہیں، اگر ہم اس طرح ہر جگہ پہنچ کے لوگوں میں اپنے دوست تلاش کر سکے تو یہ بہت بڑی کامیابی ہوگی اور مزے کی بات یہ ہے کہ خود دشمن ہمارا تماشا دیکھتے ہوئے نہ جان پائیں گے کہ یہ تماشا دکھلانے والے نہیں شکاری ہیں جو ان کے شکار کو نکلے ہیں۔"

وہ دونوں دم بخود بیٹھے میری بات سُن رہے تھے، بڑی توجہ سے اور میں بولتا جا رہا تھا۔ وہ سب جو رات سے میرے ذہن میں تھا، الفاظ کی صورت میں سب کے سامنے آگیا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ میرے منصوبے کے خیال نے ان کو کس حد تک متاثر اور مسحور کیا ہے۔ بالآخر میں بولتے بولتے تھک گیا۔ باقی سب میں نے ان کی قوتِ پروازِ تخیل پر چھوڑ دیا، وہ بھی بہت ذہین لوگ تھے اور خاکے سے تصویر کو مکمل کر کے دیکھنے کی خداداد صلاحیت رکھتے تھے۔ خاکہ ان کے سامنے آگیا تھا اور وہ اپنے تصور سے اس مکمل تصویر کو دیکھ رہے تھے جس میں کامیابی کے رنگ تھے اور کوئی نقش ادھورا یا خیالی نہیں تھا، ایسا ہو سکتا تھا۔

"یار، کاش! میں ڈیڑھ ٹانگ والا غالب نہ ہوتا، شہنشاہ اکبر ہوتا تو تیرا منہ موتیوں سے بھر دیتا اور تجھے خلعتِ فاخرہ عطا کر کے اپنے نورتنوں میں شامل کرتا۔" غالب نے بالآخر کہا "تو دسواں رتن ہوتا، چیف رتن۔"

"اور کاش! میں اس کمیٹی کا سربراہ ہوتا جو نوبل پرائز دیتی ہے تو اس سال کے پانچوں انعامات تجھے دے دیتا۔" محسن بولا۔ "خواہ بعد میں اس دھاندلی پر میرا انجام وہی ہوتا جو ہونا چاہیے۔"

"ابھی تم لوگوں کے اعتراضات باقی ہیں۔" میں نے کہا۔ "سرکس میں ہم دو تو ہوئے مسخرے... مرزا غالب کیا ہرج ہے، اگر تم اس کے پروپرائٹر بن جاؤ۔ میں دو چار دن میں کچھ لوگ بھرتی کرتا ہوں، یہ دیکھتا ہوں کہ ان میں سے کتنے سکندر اور محسن کو جانتے ہیں اور ان کے کارناموں کے مداح ہیں، ان میں سے چند کرتب دکھانے والے رکھے جا سکتے ہیں اور کچھ ڈراما آرٹسٹ۔ تمہیں معلوم ہے کہ یہاں گاؤں گاؤں جو تھیٹر پھرتے ہیں، وہ کس قماش کے ڈرامے دکھاتے ہیں۔ زیادہ تر لیلیٰ مجنوں، ہیر رانجھا قسم کے یا آغا حشر ٹائپ، اس کے لیے لمبے چوڑے ساز و سامان کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ ناظرین بہت کچھ فرض کر لیتے ہیں اور تھیٹر بھی اوپن ائیر چلتے ہیں۔"

"یہ بہت زیادہ لوگ ہو جائیں گے۔" محسن نے کہا۔

"اچھا تو ہم فی الحال ڈراما آرٹسٹ ڈراپ کر دیتے ہیں۔" میں نے کہا "کچھ ہاتھ کی صفائی دکھانے والے جادوگر، سانپ، بندر اور ریچھ کا تماشا دکھانے والے، تاش کے پتوں کا کھیل دکھانے والے اور دو چار بھانڈ... بھانڈوں کا تماشا دیہات اور شہروں میں یکساں مقبول ہے۔ ایک اچھی جوڑی ہو تو پورے مجمع کو محظوظ کر سکتی ہے۔ ان سب کو [illegible] کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ اپنے اپنے فن میں طاق ہوتے ہیں۔ ان کا تو بس ایک ہی مسئلہ ہے۔ ریڈیو، ٹی وی اور فلم نے اور تعلیم نے ان کے لیے ذرائع معاش کو بہت کم کر دیا ہے۔ ان کی آمدنی اتنی کم ہو چکی ہے کہ وہ بڑی مشکل میں گزر اوقات کرتے ہیں۔ ہم ان کو بندھی تنخواہ دے سکتے ہیں۔ ان کی موجودہ آمدنی سے دُگنی پھر وہ ہمارا ساتھ کبھی نہیں چھوڑیں گے۔"

"کیا یہ ممکن ہے یار سکندر؟" محسن نے جوش سے کہا۔

"ممکن کیوں نہیں، ہمارے علاوہ مشکل سے آٹھ دس آدمی ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "اور کچھ جانور۔ ۔ ۔"

"میں بتا سکتا ہوں کہ جانور کہاں ملیں گے۔" غالب بولا۔

"کہاں ملیں گے؟" محسن بولا۔

"چڑیا گھر سے۔" غالب نے کہا۔ "ہر جانور مل سکتا ہے۔"

"کیا وہ جانور بیچ دیتے ہیں؟"

"ان کا بس چلے تو وہ شیر اور ہاتھی تک بیچ دیں مگر اس کے علاوہ ہرن اور ریچھ، رنگین طوطے اور بندر، لومڑی اور بھیڑیے، یہ سب تو مل جائیں گے، شاید چیتے کے بچے بھی مل جائیں۔" غالب نے کہا۔ "پیسہ چاہیے انھیں۔"

"ہم اپنی سرکس کمپنی کو رجسٹرڈ کرائیں گے۔" محسن نے کہا۔

"نہیں، خود کوشش نہیں کریں گے۔" میں نے کہا۔ "متعلقہ لوگ خود ہی آئیں گے۔ پیسہ لیں گے اور ضابطے کی کارروائی خود ہی مکمل کریں گے۔ مثلاً تفریحی ٹیکس کا معاملہ اٹھے گا تو دیکھی جائے گی۔ کمپنی بھی بالآخر رجسٹرڈ ہو جائے گی۔ اس میں کوئی زیادہ خرچ نہیں ہوگا۔ چار پانچ لاکھ کا ٹریلر جس میں ہم سارے جانور رکھ سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ایک لاکھ کے اندر اندر تمام جانور مل جائیں گے۔ یہی عام قسم کے جانور جو ضرر رساں نہ ہوں اور تماشا دکھانے میں کام آئیں ۔۔۔ ان کے پنجرے وغیرہ بھی مہنگے نہیں ہوں گے۔ تار کے پنجرے بنے بنائے ملتے ہیں۔ اسی میں ہمارا کاسٹیوم ڈیپارٹمنٹ بن جائے گا، سب کے ملبوسات۔"

"کس کس کے ملبوسات؟ افراد تو شمار کرو۔" غالب جوش سے بولا۔

"بھئی دو جوکر، آپ کے یہ دونوں خادم۔" میں نے سر جھکا کے کہا۔ "ان کے چار چھ رنگ برنگے لباس، ٹوپیاں وغیرہ۔ ایک مداری، ایک ایک ریچھ، بندر کا تماشا دکھانے والا۔ ایک ماہر قسم کا سپیرا۔ ان لوگوں کو میں گلیوں میں سے تلاش کر لوں گا۔ ہمیں چھوڑ دو تو یہ ہوئے چار آدمی۔ دو بھانڈ بہت اعلیٰ ظرافت کا مظاہرہ کرنے والے، ایک گھوڑے کی سواری کا ماہر جو معمولی کرتب دکھا سکے یعنی کھڑا ہو کے، سر کے بل، ایک ٹانگ پہ، ایک ایسا ہی سائیکل سوار۔ ۔ یہ ہوئے چار اور چار آٹھ آدمی۔ میرا خیال ہے اتنے لوگ کافی ہیں۔ سب اپنا اسباب لائیں گے اور خود ہی اس کی دیکھ بھال بھی کریں گے۔ مثلاً سپیرا اپنے ساتھیوں کو سنبھالے گا تو ریچھ والا ریچھ کو، کھلانا پلانا سب انھی کے ذمے مگر خرچ ہمارا۔ ۔ ۔ ان لوگوں کی محدود ضروریات ہوتی ہیں اور محدود سامان کے ساتھ یہ ہمارے ساتھ کہیں بھی رہ سکتے ہیں، جہاں رات ہو وہاں کھلے آسمان کے نیچے بھی سو سکتے ہیں اور رہنے کو ٹریلر ہے، ہم خیمے بھی رکھ سکتے ہیں لیکن ہمارا شو جہاں بھی ہوگا اوپن ہوگا، صرف قناتیں لگا کے رتھائی تختوں کی مدد سے اسٹیج بنا کے۔"

"میرا ایک مشورہ ہے۔" غالب نے کہا۔ "ایک ڈھول بجانے والا بھی ہونا چاہیے بیلے ٹھیلے اور دنگلوں والا، ذرا جوشیلے قسم کا۔"

"اسامی منظور کی جاتی ہے۔" میں نے کہا۔ "باقی کی جگہ خالی تم دیکھنا کہ لوگ خود ہی آئیں گے۔ مثلاً جہاں ہم نے اڈا جمایا وہاں آلو چھولے اور گول گپے یا دہی بھلے والے تو آئیں گے ہی مگر ہے کوئی موت کے کنوئیں یا موت کے گھر والا ہم سے اشتراک کا خواستگار ہو کہ مجھے بھی قریب ہی رہنے کی اجازت دی جائے، کوئی پنگوڑے والا آ جائے، ان کو ہم ہر جگہ عارضی طور پر لے سکتے ہیں۔ مطلب یہ کہ وہ ہمارے ساتھ نہیں جائیں گے مستقل عملہ وہ ہوگا جو یہاں سے جائے گا، نو آدمی۔"

"ہمارے نورتن۔" غالب نے ہنس کر کہا۔

"ویری گڈ، نورتن سرکس کمپنی۔" میں نے کہا۔ "نام طے ہو گیا۔"

"اب باقی کام کی بات۔" میں نے کہا۔ "یہ نورتن اور ایم آر ایس کے ارکان۔ اس وقت ہم چار ہیں، چار کراچی میں ہیں لیکن ابھی جو یہاں سے جائیں گے وہ تیرہ ارکان ہوں گے۔"

"اور دو قیدی۔" غالب نے کہا۔ "ان کا کیا ہوگا؟"

"یہ ہمارے ساتھ زیادہ دن نہیں رہیں گی۔" میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ ایک ٹریلر تو جانوروں کے لیے اور اسباب کے لیے، ایک لیتے ہیں ویگن جس میں ہم سب سفر کر سکیں، آگے ویگن، پیچھے ٹریلر۔"

"ایک ٹریلر ڈرائیور بھی چاہیے۔" محسن نے کہا۔ "ہیوی وہیکل کا لائسنس رکھنے والا۔"

"یہ تو دس ہو گئے۔" غالب نے مایوسی سے کہا۔

"یہ دسواں صرف ڈرائیور ہے، رتن نہیں۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "نورتن سرکس کمپنی کے نام پر اس سے کوئی حرف نہیں آئے گا۔ ٹریلر میں ہم سفری سامان بھی بھر سکتے ہیں مثلاً گیس بیپ ۔ ۔ بیب کاٹ، موبائل کچن، ممکن ہو تو ایک پورٹیبل جنریٹر۔ اس سب ساز و سامان میں ہم وہ سب چھپا کے لے جا سکتے ہیں جس کی ہمیں ضرورت ہے۔ مثلاً جتنا اسلحہ ہمارے پاس ہے اور جو مزید ہمیں ملے گا، ٹرانسمیٹر، ریڈیو اور مواصلاتی رابطے کا نظام جس میں ہمارا یہ ہر جگہ کام آنے والا فون بھی شامل ہے۔"

"ایسے ہی ایک دو آ لے اور مل جائیں تو اچھا ہے۔"

"مل جائیں گے، ٹیلی فون ڈیپارٹمنٹ کے لائن مین ہر جگہ لیے پھرتے ہیں، ان سے خریدے یا چھینے جا سکتے ہیں ہمارے نورتن پوچھ سکتے ہیں کہ یہ گولا بارود کس شو کے لیے ہے؟" غالب نے کہا۔

"ہاں، ہم یہ سامان مقفل رکھیں گے، چابی ہم میں سے ہی کے پاس ہوگی اور ہم اس قسم کی مہم جوئی میں رازداری تو برتیں گے۔ یہ بھی کوشش کریں گے کہ ہمیں کوئی کچھ نکالتا دیکھے اور استعمال کرتا نہ دیکھے۔ ایک شو سے دوسرے شو کے درمیان کا وقفہ ایک ہفتہ بھی ہو سکتا ہے اور ایک مہینہ بھی جب سرکس کہیں رکا رہے گا۔ ہم راتوں رات بھی لوٹ کر آ سکتے ہیں اور دو چار دن لگ جائیں گے تو کوئی بات نہیں۔ ہماری عدم موجودگی میں ایک شخص معاملات کو سنبھال سکتا ہے۔"

غالب نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ ناممکن ہے کہ ہمارے دوہرے معاملات چھپے رہیں۔"

"بالکل ٹھیک، یہ زیادہ عرصہ نہیں چل سکتا۔" میں نے کہا۔ "لوگوں کو اندھا، بہرا اور بے وقوف فرض کرنا بے وقوفی ہوگی۔ رفتہ رفتہ شکوک پیدا ہوں گے اور شک سے ہی تجسس جنم لیتا ہے۔ جاہل یا احمق شخص بھی تجسس میں مبتلا ہو جائے تو حقیقت کی تہ تک پہنچنے کی کوشش ضرور کرتا ہے اور ہمارے نورتن جاہل ہو سکتے ہیں مگر انھیں کم عقل سمجھنا غلط ہوگا۔ شعبدہ باز اور بازیگر قسم کے سب لوگ ذہین ہوتے ہیں اور ان کی قوتِ مشاہدہ بہت تیز ہوتی ہے چنانچہ یہ بات یقینی ہے کہ ہمارا کوئی راز ہمیشہ راز نہیں رہ سکتا مگر ہم کچھ عرصہ ضرور گزار سکتے ہیں اور یہی وہ عرصہ ہوگا جس میں ہم صحیح اور غلط آدمی کا انتخاب کر لیں۔ یعنی باتوں سے یا ان کے خیالات سے یا پھر ردِ عمل سے اندازہ کر لیں کہ اگر ان کو ہمارے بارے میں حقیقت کا پتا چل جاتا ہے تو وہ کیا کریں گے؟ ہمارا ساتھ دیں گے یا ہمارے خلاف ہوں گے؟ خلاف ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ دلاور اینڈ کمپنی سے جا ملیں گے۔ فرض کرو وہ پولیس کے پاس چلے جائیں اور سارا بھانڈا پھوڑ دیں، ہمارا تو بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا، سارا مشن چوپٹ ہو کے رہ جائے گا، اس لیے ہم آدمی کو جج کریں گے اگر وہ بھروسے کے قابل ہوگا تو ایم آر ایس کی قوت میں اضافہ کرے گا۔ بصورتِ دیگر کسی بھی بہانے اس کی چھٹی۔ ایگریمنٹ میں یہ شرط رکھی جا سکتی ہے کہ ہم ایک ماہ کی تنخواہ دے کر رخصت کرنے کا اختیار رکھتے ہیں۔ ہم بہ معنی مرزا غالب پروپرائٹر نورتن سرکس کمپنی۔"

"مرزا غالب پروپرائٹر نورتن سرکس کمپنی۔" غالب نے افسوس سے سر ہلایا۔ "کیا ستم ظریفی ہے؟ اسد اللہ خاں قیامت ہے تمھارا نام نامی ایک سرکس کمپنی کے ساتھ استعمال ہو رہا ہے۔ خدا انھیں معاف کرے جو نہیں جانتے کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔"

"تمھارا نام مرزا غالب ہے تو اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔" محسن نے کہا۔ "اصولاً تو تمھارے والدین کو تمھارا نام حاجی لغلول یا مرزا پھویا رکھنا تھا۔"

"مجھ میں اور مرزا غالب میں بہت سی صفات مشترک ہیں مثلاً درویشی و قلندری، فقر و فاقہ اور خودداری و انا پرستی ۔ ۔ ۔!" غالب نے اپنا دفاع کیا۔ "مگر تم میں اور شیروانی میں کون سی بات مشترک ہے، تم کیوں شیروانی کہتے ہو خود کو، کیا تم قومی لباس ہو؟"

"بس مجاہدو، آپس میں نہ لڑو۔" میں نے کہا۔ "دن چڑھ گیا۔ اب سوچو کہ کس کو کیا کرنا ہے؟"

"سب سے پہلا مسئلہ اس لاش بے گور و کفن کا ہے۔" محسن نے کہا۔

"اسے ہم دریا کے حوالے کرنے کی کوئی صورت کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم اب چلتے ہیں باہر۔"

"یہ سارا بندوبست آج ہی کر لو گے؟" غالب نے پوچھا۔

"خدا کے لیے سوچ کے بولا کرو۔" میں نے کہا۔ "اگر بہت جلدی کی تب بھی ایک ہفتہ تو لگے گا، ٹریلر نہ ملا تو سب ٹھپ، مل گیا تو اس کی رجسٹریشن، پھر نورتنوں کی تلاش، اسباب کا حصول، جانوروں کی خریداری۔"

"یار تو یہ ایک ہفتہ کیسے گزرے گا اس کھنڈر میں ۔۔۔" غالب بولا۔

"یہاں سے نکل جائیں گے آج۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "شام تک کچھ کر لیں گے، ٹریلر نہ سہی، ویگن تو آج ہی مل جائے گی، کہیں بھی نکل جائیں گے۔"

"ہمارے واپس آنے تک تم کو کچھ نہیں کرنا ہے۔ لنچ کے لیے بھی لنچ اسی حلوے پوری کا ہوگا، اسی چائے کو گرم کرو اور پیو۔" میں نے کہا۔

"یار، سگریٹ تو لا دو۔" غالب نے کہا۔

"ہاں، سگریٹ اور اخبار ہم لا دیں گے۔" میں نے کہا۔ "سراج کی ماں کو سنبھال کے رکھنا۔"

"میری فکر مت کرو۔" وہ گھٹنوں پر سے سر اٹھا کے بولی۔ "میں نہ بھاگوں گی اور نہ مروں گی۔"

"کیا ہم یہ سارا زہریلا سرمایہ ساتھ لے جائیں گے؟" محسن بولا۔

"ابھی نہیں۔" میں نے کہا۔ "میں سوچ رہا ہوں کہ عائشہ کی لاش واپس کرنا چاہیے یا نہیں؟"

"ہم اسے یہاں بھی چھوڑ کے جا سکتے ہیں جیسے ہم کیتھرین کی لاش کو چھوڑ آئے تھے۔" محسن بولا۔ سچ خود بخود اس کی زبان

آگیا تھا۔
میں نے گھبرا کے جُوہی کی طرف دیکھا لیکن وہ دیوار سے ٹیک لگائے نہ جانے کس سوچ میں گم تھی، اُس نے کچھ نہیں سُنا تھا۔

”کیوں نہ ہم اس کی تدفین کردیں یا کرادیں؟“ میں نے کہا۔ ”اور اس کی موت کی خبر کو اُس وقت تک راز رکھیں جب تک ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو جاتے، وہ مقصد جس کے لیے ہم عائشہ کو لائے تھے۔“

غالب نے میری بات کو سمجھ کے سر ہلایا۔ ”کارڈ ہاتھ میں رکھیں۔“

”ہاں، یہ کیوں تسلیم کریں کہ ہمارے پاس صرف ایک کارڈ رہ گیا ہے۔“ میں نے سراج کی ماں کی طرف دیکھا جو زیب النساء پہلے ہی نکل گئی۔ عائشہ کی موت کا سُن کے دباؤ صرف سراج پر رہ جائے گا، جو ابھی دلاور پر بھی ہے جب ہم رابعہ اور ٹیڈی کی بحفاظت واپسی کی ضمانت حاصل کرلیں گے تو دلاور کو بتادیں گے کہ عائشہ کو خود اسی کے زہر نے مارا تھا، ہم نے نہیں۔ وہ غلط چال نہ چلتا تو عائشہ زندہ رہتی۔“

”یہ مشکل کام ہوگا۔“ محسن نے کہا۔ ”کفن دفن، میت کا غسل اور پھر کسی قبرستان میں نمازِ جنازہ وغیرہ۔ گورکن بھی مشکوک حالات میں جگہ دینے سے انکار کردیتے ہیں۔“

”ہاں مگر بات پھر پیسے پر آجاتی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”جو سارے کام نکالتا ہے۔ تجہیز و تکفین کا سارا بندوبست رفاہی ادارے کرتے ہیں۔ اُن سے سامان مل جائے گا، آدمی بھی مل جائیں گے۔ تدفین آسان ہے اور مغرب کے وقت ہوگی۔“

”دیکھ لو، ایک تو عورت کا معاملہ ہے، گناہ ثواب تمہارے سر۔“ غالب نے کہا۔

”یار، یہ بھی تو ہم کرسکتے تھے کہ لاش کو یہاں لاوارث چھوڑ جاتے۔“ محسن بولا۔ ”اس کھنڈر میں کون آتا، بعد میں خود بو بتا دیتی۔ وہ بھی دو چار دن گزر جانے کے بعد، اگر مناسب طریقے پر تجہیز و تکفین ہو جاتی ہے تو... تو ٹھیک ہے۔“

”اچھا اب اُٹھ، میرے ساتھ چل۔“ میں نے کہا۔ ”بہت سے کام کرنے ہیں۔“

”تم لوگ اسی حلیے میں پھرو گے؟“ غالب تشویش سے بولا۔ ”آج کے دن تو بہت خطرہ ہے۔“

”مجبوری ہے۔“ میں نے کہا۔ ”کوشش کریں گے کہ اپنا حُلیہ جس حد تک بدل سکتے ہوں، بدل لیں اور کم سے کم نظر آئیں۔“

ہمارے باہر آنے کے بعد پہلا اچھا کام تو یہ ہُوا کہ ہمیں ایک ٹیکسی مل گئی۔ اُس نے سارا دن ساتھ رہنے کے تین سو روپے مانگے تھے ہم نے کہا کہ پانچ سو روپے دیں گے مگر شرط یہ ہوگی کہ تم سوال نہیں کرو گے۔ وہ تھوڑا سا حیران ہُوا پھر کچھ سوچ کے تیار ہوگیا۔ ہم نے اُسے یقین دلایا کہ ہم کوئی ایسا کام نہیں کر رہے ہیں جس سے اس کو پریشانی ہو۔ ”ہمارے کچھ دُشمن پیچھے لگے ہوئے ہیں اور ہم اُن سے بچنا چاہتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”یہ تو اور بھی بُرا ہے جی۔“ وہ پریشان ہو کے بولا۔ ”وہ ماریں گے گولی آپ کو، لگے گی مجھے۔“

”ارے نہیں بھائی، وہ گولی مارنے والے لوگ نہیں ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”وہ ہمیں گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔“

”کون، پولیس والے، کیا کیا ہے تم نے؟“ وہ بولا۔

”ہم جیل سے بھاگے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”بیس سال کے لیے گئے تھے مگر ایک مہینے میں نکل آئے، قتل کیا تھا ہم نے۔“

”بس جی بس، آپ مجھے جانے دو۔“ وہ بولا۔ ”پانچ سو روپے کے لیے میں بھی پکڑا جاؤں۔ مجھ پر الزام آئے گا کہ میں نے مدد کی تھی اور میں تمہارا ساتھی ہُوں، میرے بیوی بچے رُل جائیں گے۔“

”وہ تو اب بھی رُل جائیں گے، اگر تم نے انکار کیا۔“ میں نے زبردستی بیٹھنے کے بعد کہا۔ میرے ساتھ ہی محسن نے پچھلی سیٹ پر قبضہ کرلیا۔

”ہم دوسرا قتل بھی کردیں گے مگر واپس نہیں جائیں گے۔“ محسن نے ریوالور نکال کے کہا۔ ہم دونوں کے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کے اس کی گھگھی بندھ گئی۔ وہ ہکلانے لگا۔ وہ حد درجہ بزدل آدمی تھا۔

”میں... دیکھو جی... ٹھیک ہے... بالکل ٹھیک ہے، میں لے چلتا ہُوں... جہاں آپ کہو... بے شک آپ پیسے بھی مت دینا اور میں... بالکل... بالکل خاموش رہوں گا بعد میں بھی بولوں تو میرے باپ کی بھی توبہ... لیکن اس کو ہٹا لو... گولی چل جائے گی... میرے بیوی بچے رُل جائیں گے، ان کا کوئی نہیں۔“

”ان کے تم ہو اور تم سے پہلے خدا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”خدا کا نام لو اور چل پڑو۔“

پروگرام کے مطابق ہم نے سب سے پہلے لباس بدلا۔ ہمارے لیے غیر ملکی صحافیوں کا تاثر دینے والا یہ لباس کیتھرین لائی تھی جو لُنڈے کی سوغات تھا۔ اب ہم نے سو فیصد مشرقی لباس اختیار کیا۔ شلوار قمیص، پشاوری چپل اور قراقلی ٹوپی۔ یہ لباس ہم نے ریڈی میڈ خریدا اور ٹیکسی میں ہی تبدیل کیا۔ اس وقت ٹیکسی ایک گودام کے پیچھے کھڑی رہی اور ڈرائیور بیٹھا سامنے دیکھتا رہا۔ اس نے اب یقین کرلیا تھا کہ ہم وہی ہیں جو خود کو بتا رہے ہیں اور وہ سب کچھ کرسکتے ہیں جو کہہ رہے ہیں۔

پُرانے لباس کو ہم نے مختلف مقامات پر پھینکا اور خاصے بے فکر ہو گئے کیونکہ ہماری ظاہری وضع قطع نے ہمیں بہت محفوظ کردیا تھا۔ محسن نے ایک عینک ساز سے جو فٹ پاتھ پر صندوق کھولے بیٹھا تھا، اپنے اور میرے لیے زیرو نمبر کے شیشوں والی عینک بھی لی۔ اس کے پاس پُرانی اور نئی عینکوں کا ملا جلا انبار تھا۔ دیہاتی اور ان پڑھ قسم کے لوگ اس کے پاس آتے تھے۔ مختلف چشمے لگا کے دیکھتے تھے جس سے بھی انھیں بصارت میں زیادہ اضافہ محسوس ہوتا تھا، اُس کا بھاؤ تاؤ کر کے سودا کر لیتے تھے اور یہ ریڈی میڈ چشمہ لگا کے ہنسی خوشی چلے جاتے تھے، نہ کسی آئی اسپیشلسٹ سے سائٹ ٹیسٹ کرانے کا جھگڑا، نہ نمبر لینے کا اور نہ شیشے بنوانے کا جھنجٹ۔

پلاسٹک کے فریم والی عینکوں کے شیشے میلے تھے اور کمانیاں ڈھیلی تھیں۔ میرے حصے میں جو عینک آئی، اس کے شیشے بھی بالکل گول تھے۔ محسن کی عینک اُس کے چہرے کی مناسبت سے بہت چھوٹی تھی مگر اس عینک سے ہمارا چہرہ تک بدل گیا۔ ہم نے ہاتھ ملا کے ایک دوسرے کو مبارکباد بھی دی کہ اس کم خرچ بالا نشیں نسخے نے ایک گھنٹے میں کسی میک اپ کے بغیر ہم دونوں کو ناقابلِ شناخت بنادیا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے یہ سب دیکھا مگر اس نے صرف دو چیزوں کو عزیز رکھا۔ اپنی جان کو اور پانچ سو کی رقم کو۔ اسے مزید دہشت زدہ کرنے کے لیے ہم خطرناک قسم کی گفتگو بھی کرتے رہے تھے۔ مثلاً یہ کہ کالے ناگ کو چھوڑنا نہیں ہے، اس کی تلاش کے بھی ٹکڑے کر کے کتوں کو ڈالنے ہیں اور پھر اُستاد سے انعام لینا ہے کہ مخبری کرنے والے کو ٹھنڈا کر آئے ہیں۔ کیسا کالا ناگ اور کہاں کا اُستاد، مگر ٹیکسی ڈرائیور کانپتا رہا، یہ سوچ سوچ کر کہ ہمارا اُستاد کتنا خطرناک ہوگا۔ ہم نے جیل کے اندر کی بہت سی باتیں کر کے اُسے ڈرایا، وارداتوں کے تذکرے کیے جو ہم کر چکے تھے اور آئندہ کے منصوبوں کی بات کی۔ درمیان میں اسے تنبیہ کرتے رہے کہ وہ کچھ نہ سُنے اور سُن رہا ہے تو زبان بند رکھے، ورنہ ہم بعد میں کاٹنے آجائیں گے۔

ایک گھنٹے بعد جب ہماری گھڑیوں میں صبح کے دس بجے تھے، میں نے ٹیکسی کو گاڑیوں کے ایک شوروم سے کچھ فاصلے پر رکوایا اور خود اُتر کے واپس گیا۔ محسن ٹیکسی میں ہی بیٹھا رہا۔ شوروم ابھی کھلا ہی تھا اور میں اس کے مالک کو گاہک بالکل نہیں لگتا تھا۔
”کیا بات ہے؟“ اُس نے کام کرتے کرتے ہاتھ روک کر پوچھا۔

”خو کیسا بات کرتا اے؟“ میں نے پٹھانوں کا لب و لہجہ بنا کے کہا۔ ”اَم گاہک ہے۔ سلام نہیں کرتا اے اَم کو... خیر کوئی بات نہیں ماڑا۔“

وہ ذرا محتاط ہوگیا۔ ”آپ گاڑی خریدیں گے؟“
میں مُسکرایا۔ ”ادیارا اور کیا لے گا؟ مونگ پھلی؟ تمھارا دُکان میں اور کیا اے؟ یہ فرنیچر بیچے گا، بولو؟“

”یہ... یہ تو ہمارے ذاتی استعمال کا ہے۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”خیر آپ فرمائیے کتنے تک کی گاڑی چاہیے؟“
”کتنا تک؟“ میں نے سوچ کے کہا۔ ”خو یارا! اَم کو ایک نہیں، دو گاڑی چاہیے... بوت بڑا۔“

”بہت بڑی گاڑی، شیورلٹ یا بیوک وغیرہ؟“ اُس نے یوں کہا کہ طنز اور تمسخر محسوس نہ ہو مگر اس کا مقصد یہی تھا۔
”نئیں، اَم بتاتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ایک تو اَم یہ لے گا۔“ میں نے فوکس ویگن کی مائکرو بس کی جانب اشارہ کیا۔
”یہ... یہ تو نئی ہے، صرف سال بھر پہلے کا ماڈل ہے۔“ وہ بولا۔
”ایک دم نیا نئیں اے؟“ میں نے کہا۔
”وہ بھی مل جائے گی۔“ شوروم کے مالک نے پہلی بار سنجیدہ ہو کے مجھے غور سے دیکھا۔ ”لیکن یہ بھی نئی ہی سمجھ لیں آپ، مالک نے مشکل سے تین ماہ استعمال کی تھی۔ اس کی رننگ پوری ہوگئی ہے بس...“
”کیا پورا ہو گیا اے؟“ میں نے چونک کر کہا۔
”کچھ نہیں خان صاحب۔“ وہ بولا۔ ”اسے آپ یہاں سے لندن لے جائیں۔“
”لندن؟ نئیں یارا... ہم کو لندن نئیں جانا اے۔ اَم یہ نئیں لے سکتا، تم کراچی جانے والا گاڑی دکھاؤ۔“ میں نے کہا۔

وہ مجھے اوّل درجے کا احمق سمجھ چکا تھا اور اسے یہ بھی یقین آگیا تھا کہ میرے پاس دولت ضرور ہے۔ شاید میں کسی قبیلے کا سردار یا زمیندار وغیرہ ہُوں، جس نے علاقۂ غیر سے لاہور میں پہلی بار قدم رکھا ہے۔
”یہ بھی جائے گی کراچی۔“ وہ بولا۔ ”لیکن اس کی قیمت ذرا زیادہ ہے، مالک نے اس میں بہت کچھ لگوایا تھا، آپ دیکھ لیں، قالین ہے اور ریڈیو ہے، ایئر کنڈیشنر ہے، نئی سے زیادہ کی بیٹھے گی یہ آپ کو۔“
”ماڑا تم بولو کتنا مانگتا ہے؟“ میں نے بُرا مان کے کہا۔
”آپ چوالیس ہزار دے دیں۔“ وہ سوچ کر بولا۔
میں نے جیب میں سے رقم نکالی اور دس ہزار اُس کے

سامنے ڈال کے کہا۔ "بیانہ رکھو، رسید بناؤ اور امارا نام پر گاڑی کرو، ام ابھی آئے گا، ایک گھنٹا میں، باقی پیسہ دے گا، گاڑی لے جائے گا۔"

"بالکل... بالکل تشریف لائیے۔" شوروم کے مالک نے بے یقینی سے نوٹ اُٹھا کے دیکھے۔ شاید اتنے کم وقت میں اتنی آسانی سے اُسے منہ مانگی قیمت کسی نے نہ دی ہوگی۔ "ٹرانسفر وغیرہ سب کرا دوں گا میں شام تک۔"

"شام تک نہیں، ام گاڑی ابی لے جائے گا۔"

"گاڑی آپ شوق سے لے جائیں۔" وہ بولا۔ "میرا مطلب کاغذات سے تھا، وہ ذرا وقت لگتا ہے نا، تین چار بجے تک..."

"ٹھیک ہے، ام جاتا ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ رسید کس نام سے؟" دکاندار بولا۔ "خیر ابھی آپ آرہے ہیں نا، باقی رقم لے کر، اُس وقت لکھ دیجیے گا اپنا نام پتا، یہ فرمائیے کہ دوسری گاڑی کا آپ نے کیا سوچا، آپ نے دو گاڑیوں کی بات کی تھی۔"

"دوسرا گاڑی... خو یارا ادھر سے تمارا پاس بڑا گاڑی یہ بڑا تھا، ام لے لیا۔" میں نے کہا۔

"اس سے بھی بڑی۔" وہ چکرا گیا۔ "کوئی بس وغیرہ یا ٹرک...؟"

"نہیں، بس سے بھی بڑا گاڑی۔" میں نے کہا۔

"بس سے بڑی گاڑی کون سی ہوتی ہے خان صاحب؟" وہ بولا۔

"ہوتا ہے، ام دیکھا ہے۔" میں نے کہا۔ "ام کراچی میں دیکھا بوت لمبا گاڑی، آگے ٹرک ہوتا اور اُس کا پیچھے بوت لمبا گاڑی جیسا کہ مال گاڑی کا ڈبا ہوتا، ایک دم ویسا، تمارا دُکان سے بھی لمبا۔"

"آپ کو سامان لے جانے والا ٹریلر چاہیے، کنٹینر ٹائپ ٹرک چاہیے؟" دکاندار نے مشتبہ لہجے میں کہا۔ اس نے کاغذ پر شکل بنا کے واضح کیا۔

"ہاں ہاں یہی چاہیے، بوت مشکل نام تھا، ام بھول گیا۔ ام کو بولا تھا کسی نے۔" میں نے سر ہلا دیا۔

"مگر جناب! وہ ایسے کہاں ملے گا۔" شوروم کا مالک بولا۔ "اس کا تو پتا کرنا پڑے گا، شاید کوئی پارٹی بیچ رہی ہو، اگر ملا تو بہت مہنگا ہوگا۔"

"اچھا، دس لاکھ سے زیادہ ہوگا؟" میں نے سادگی سے کہا۔

وہ دم بخود رہ گیا۔ "دس... نہیں اتنا تو نہیں، یہی ساڑھے تین چار لاکھ کے درمیان... کنڈیشن پر ہے، میرا مطلب ہے حالت اچھی ہوگی تو مہنگا بھی ملے گا، پانچ لاکھ ہو سکتے ہیں۔"

"پروا نہیں مارا۔" میں نے بے تکلفی سے اس کے ... پر زور دار ہاتھ مار کے کہا۔ "ام لے گا، تم پتا کرو، ام کو ... ام تم کو ابھی اس کا بھی بیانہ دے کر جائے گا۔"

"جی بہت اچھا۔" شوروم کے مالک نے کندھا ... کرنے کے بعد کہا۔ "آپ کریں گے کیا اس کا؟"

"خو تم کیسا بات کرتا ہے، ام اس کو آگ لگائے گا۔" ... نے خفگی کا اظہار کیا۔ "امارا چیز ہے، ام اس کو آگ لگائے، تم ابی پوچھے گا کہ گاڑی کا کیا کرے گا، کیسا بے وقوف ہے تم... امارا پیسہ۔"

"وہ... میں معافی چاہتا ہوں۔" وہ بولا۔ "میرا ہرگز ... نہیں تھا جناب، آپ جو چاہیں کریں، میں تو مدد کرنا چاہتا ... جناب کی تاکہ صحیح چیز مل جائے۔"

"اچھا... ام جاتا ہے، ابھی آئے گا۔" میں نے اس سے ہاتھ ملا کے اپنے سینے پر رکھا اور چل پڑا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ ہکا بکا کھڑا مجھے دیکھ رہا ہوگا۔ کاروبار میں عجیب و غریب ... آتے ہیں اور کیسے کیسے تجربے ہوتے ہیں، وہ بہت خوش ... گا کہ آج کسی اچھے آدمی کا منہ دیکھا تھا کہ صبح صبح ایک دم ... دولت مند آگیا، وہ ابھی تو خاموش رہے گا کہ کہیں دوسرے شوروم والے اس کا گاہک نہ توڑ لیں مگر بعد میں ضرور سب ... سے تذکرہ کرے گا۔

میں گھوم کر ٹیکسی تک پہنچا اور ٹیکسی پھر چل پڑی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب اگر مجھے ایک گھنٹے میں مائکرو بس مل جائے تو ... اس ٹیکسی سے بھی نجات حاصل کر لیں گے اور اس کھٹارا ... سے بھی۔ چنانچہ میں نے یہ بات محسن کو فرنچ میں سمجھا دی۔ ... ٹیکسی ڈرائیور ہماری جناتی بولی سُن کے اور ڈر رہا ... جیل سے فرار ہوئے تھے یا کسی دوسرے سیارے کی مخلوق تھے۔ اس کے لیے یہ اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا سب سے دہشت ... تجربہ تھا۔

آدھے گھنٹے بعد میں نے ٹیکسی کو سڑک پر وہیں رکوا لیا جہاں ہم ٹیکسی والے کو ملے تھے۔ وہاں سے بہرام دادا کا پرانا گھر تھوڑے سے فاصلے پر تھا اور میں یہ فاصلہ پیدل طے کر کے جا سکتا تھا۔ مجھے اچانک یاد آیا کہ میں نے پلاس تو خریدا ہی نہیں، یہ ضرورت ٹیکسی ڈرائیور نے پوری کی۔ اُس کے پاس ضرورت کے سارے ٹول تھے، وہ سمجھ نہ سکا کہ اچانک واپس آ کے ... صرف پلاس لے کر اترنے اور منہ اُٹھا کے ایک طرف چل پڑنے کا مقصد کیا ہو سکتا ہے لیکن مقصد کو سمجھنا اُس کے لیے اتنا ضروری نہیں تھا جتنا زندہ رہنا اور ہم سے خیر و خوبی کے ساتھ جان چھڑانا ...

... ہونا۔

... غالب مجھے دیکھ کر حیران ہوا۔ میں نے اسے مختصراً وہ بتا دیا جو میں کر آیا تھا اور اب جا کے کرنے والا تھا۔ ... مجھے احتیاط کی تاکید کی۔ میں نے نوٹوں کی ہر گڈی سے ... کو یوں علیحدہ کیا جیسے میرے ہاتھوں میں بجلی کا ننگا تار ہے ... ہوتے ہی گیارہ ہزار وولٹ کا کرنٹ میرے وجود میں دوڑ ... جائے گا۔ ایک ایک کر کے میں نے سبز زہر میں بجھی ہوئی پن ... کیا اور دس گڈیاں محفوظ کر لیں۔ یہ مجموعی طور پر ایک ... رقم تھی اور فوری ضرورت کے لیے کافی تھی، باقی سب ... کو اطمینان اور فرصت کے ساتھ ایک ایک پن سے ... جا سکتا تھا۔ مجموعی طور پر بیس زہر کے نشتر جیسی پنوں کو ... نے احتیاط سے ایک طرف رکھ دیا۔ یہ بھی اسلحہ تھا جو مخصوص ... میں استعمال کیا جا سکتا تھا۔

ایک گھنٹے بعد میں نے اور محسن نے ٹیکسی کو ریلوے ریزرویشن آفس کے سامنے روک لیا۔ میں نے اُسے پانچ سو ... روپے دیے۔

"گھبرانا نہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم ابھی آتے ہیں ٹکٹ لے کر۔"

"اور کہیں جانا بھی نہیں۔" محسن نے کہا۔

"میری کیا مجال جناب۔" ڈرائیور نے یہ جھوٹ بڑی مشکل ... بولا۔ جان بچ جانے اور دو گھنٹے کی محنت کے بدلے پانچ ... روپے مل جانے کی خوشی اتنی بڑی تھی کہ وہ چھپانے سے ... قاصر تھا۔ ابھی ہم اندر داخل ہوئے ہی تھے کہ وہ بھاگ گیا۔ ... اور محسن دو منٹ بعد لوٹ کر آئے تو اُس کا کہیں پتا نہ تھا۔ ... ہنسے اور ہاتھ ملا کے مخالف سمت میں روانہ ہو گئے۔

"اب آج کا دن تو یہ گھر سے نکلے گا نہیں۔" میں نے کہا۔

"ہاں، ٹیکسی کھڑی کر کے سارا دن شکرانے کے نفل پڑھے ... اللہ نیاز دلوا کے جلیبیاں بانٹے گا کہ فوت نہیں ہوا ورنہ بڑے خطرناک قسم کے مجرم ٹکر گئے تھے جو آدمی کو قتل کرتے ہوئے ... درد بھی محسوس نہیں کرتے جتنا بکرے پر چھری پھیرتے ہوئے ... قصاب کے دل میں اُٹھتا ہے۔" محسن نے کہا۔

"اس طرح ہم بھی محفوظ ہو گئے۔" میں نے کہا۔ "ورنہ ایک بعید امکان تو تھا کہ سارا دن گھومتے پھرتے اس کا اور ہمارا ... سامنا ہو جاتا۔"

کار کے شوروم کا مالک ایک اور کارٹون کو دیکھ کر مزید ... حیران ہوا۔ اس کے نزدیک دیسی کپڑوں میں اس قسم کی گفتگو ... کرنے والا کارٹون ہی تھا۔ ہم سوٹ پہن کے آتے تو وہ ایک ... لمحے میں دوہرا ہو کر جھکتا اور ہمارے قدموں میں بچھ جاتا۔

"یہ امارا بھائی... بڑا بھائی عجیب خان ہے۔" میں نے محسن کا تعارف کرایا۔ "اس کو سلام کرو۔"

"السلام علیکم جناب عالی۔" شوروم کے مالک نے مؤدبانہ انداز میں محسن سے ہاتھ ملایا۔ "فرمائیے کیا حاضر کروں، چائے کافی؟"

"ام سبز چائے پیے گا۔" محسن خان نے میرے ہی لہجے میں کہا۔

"سبز چائے، گویا قہوہ... وہ تو ذرا مشکل ہی سے ملے گا۔" دُکاندار کا رنگ فق ہو گیا۔ شوروم میں اب تین دوسرے سیلز مین بھی آ گئے تھے اور ایک چوکیدار یا چپراسی بھی نظر آ رہا تھا۔

"پھر ام کچھ نہیں پیے گا۔" محسن نے دو ٹوک بات کی۔ "گاڑی لے گا اور جائے گا، اس کو پیسہ دو۔"

میں نے جیب میں سے دس کی دس گڈیاں نکالیں اور میز پر رکھ دیں۔ شوروم کے مالک کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "آپ... آپ ایسا کریں، اندر آ جائیں میرے آفس میں، میں وہیں بیٹھ کے رسید بنا دیتا ہوں۔"

اس نے اتنی دیر میں فون کر کے اِدھر اُدھر سے بہت سی مفید معلومات حاصل کر لی تھیں اور اسے پتا چلا تھا کہ ایک غیر ملکی کنسٹرکشن کمپنی اپنا کوئی ٹریلر بیچنا چاہتی ہے جس میں غالباً منگلا ڈیم کے لیے مشینری آئی تھی۔ اس کے بیان سے ظاہر ہوا کہ وہ خود بھی زیادہ نہیں جانتا مگر وہ مجھے اپنے مطلب کی چیز لگی۔ میں نے اُسے مائکرو بس کی پوری قیمت ادا کی۔ ٹیکس، رجسٹری اور ٹرانسفر کی فیس دی اور پچاس ہزار اس کے علاوہ دیے۔

"یہ بیانہ بڑا گاڑی کا۔" میں نے کہا۔

"لیکن جناب! ابھی تو میں اسے دیکھوں گا پھر آپ دیکھیں گے، کمپنی سے سودا ہوگا۔" وہ بولا۔

"سودا تم کرو مارا، ام تم کو اختیار دیا۔" میں نے کہا۔ "تم کو اچھا لگے تو ام کو بولو، ام بھی دیکھ لے گا، کل پھر آئے گا — فی امان اللہ۔"

"فی امان اللہ۔" محسن نے بھی اُس سے مصافحہ کیا اور ہم دونوں نے ہاتھ سینے پر رکھے۔ دُکاندار نے ہماری تقلید کی۔ سیلز مین یہ تماشا حیرت سے دیکھتے رہے۔ ان کو زیادہ حیرت اُس وقت ہوئی جب میں نے اگنیشن سوئچ میں چابی لگائی اور پورے اعتماد کے ساتھ گاڑی کو اسٹارٹ کر کے چلاتا ہوا لے گیا۔ معلوم نہیں اُنھوں نے بعد میں کیا تبصرے کیے ہوں گے۔ تاہم ایک بات یقینی تھی۔ اب وہ ہمارے لیے ہماری ضرورت کے مطابق ایک ٹریلر حاصل کرنے میں دن رات ایک کر دے گا۔ مائکرو بس، عجیب خان ولد پشاور خان، ساکن محلہ ڈوگری، پشاور شہر کے نام پر ٹرانسفر ہوئی تھی۔

اس مائکرو بس کا رنگ سلیٹی مائل نیلا تھا۔ محسن نے تجویز

پیش کی کہ "نورتن سرکس" کی اسکیم کا دوسرا سب سے اہم مرحلہ طے ہو جائے یعنی ہمیں اپنی ضرورت کے مطابق ٹریلر مل جائے تو دونوں کا ایک ہی رنگ کر دیا جائے۔ دونوں پر کمپنی کا نام شوخ حروف میں لکھا جائے تاکہ یہ چلتی پھرتی پبلسٹی سب کو متوجہ کرے۔ محسن کا خیال تھا کہ دونوں گاڑیوں پر چمکتا ہوا زرد رنگ ہو اور اس پر نیلے حروف سے سیدھی پٹی کی صورت میں نورتن سرکس دونوں جانب اور پیچھے لکھا جائے، میں اس کلر اسکیم کو اُلٹا رکھنا چاہتا تھا یعنی گاڑیوں پر شوخ نیلا رنگ ہو اور اس پر نیم دائرے میں زرد حروف سے نورتن سرکس لکھا ... ہوا ... سب کرے گا ... سرکس خدا ... بیت سے خصوصی ... واپس جا کے ہمیں اپنا ساز و سامان سمیٹنا تھا۔ غالب اور جُولی کے ساتھ سراج کی ماں کو لانا تھا اور عائشہ کو اُٹھانا تھا۔

عائشہ دُنیا سے اُٹھ گئی تھی اور اس کے جسدِ خاکی کو ایک کھنڈر سے اُٹھا کے کھنڈر بننے کے لیے تہِ خاک رکھنے کا ناخوشگوار فریضہ باقی رہ گیا تھا۔ اب دوپہر ہو رہی تھی۔ میں نے مناسب سمجھا کہ رابعہ اور ٹیڈی کی بازیافت کے مسئلے پر ایک آخری بات سراج یا دلاور سے کر لی جائے۔ اگر صورتِ حال اُمید افزا ہو تو عائشہ کے سفرِ آخرت کی ذمے داری دلاور ہی کو سونپ دی جائے۔ میں ڈرائیونگ کرتے ہوئے یہ دیکھتا جا رہا تھا کہ کوئی مناسب جگہ نظر آئے تو فون کی لائن ملاؤں۔

مناسب جگہ ملی تو میں نے مائکروبس کو ایک سائڈ اسٹریٹ کے موڑ پر روک دیا اور خود چند قدم واپس گیا۔ مجھے وہاں پہنچنے میں شاید پانچ منٹ ہی لگے تھے مگر اتنی دیر میں ٹیلی فون کے کھمبے کا ایک کارکن نہ جانے کدھر سے ٹپک پڑا تھا اور اب اپنی سائیکل کھمبے کے ساتھ ٹکا کے اُوپر روانہ ہو رہا تھا۔ میں مایوس ہو کے پلٹنے ہی والا تھا کہ مجھے ایک اور خیال آیا۔ میں آگے بڑھا اور انتظار کرنے لگا کہ لائن مین کھمبے پر پہنچ کے کنکشن ملا لے۔ اُسے نیچے میری موجودگی کا بالکل علم نہیں تھا۔ اس نے کراچی کا کوئی نمبر ملایا اور اپنی کسی آپا جی سے گپ شپ کرنے لگا۔ اس نے آپا جی کے یہاں کی خیریت، بچوں کی طبیعت، موسم کا حال اور بازار کے بھاؤ تفصیل سے دریافت کیے اور ان کا موازنہ لاہور کے حالات سے کیا۔ میں نے اپنی ٹوپی اور اپنا چشمہ اس کی سائیکل پر رکھ دیا۔

صحیح وقت پر میں نے کھمبے پر چڑھنا شروع کیا تو اس نے میری طرف دیکھا "اوئے... اوئے کیا بات ہے... کچھ نہیں آپا جی... یہ بات آپ سے نہیں کی میں نے... اوئے یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"کیا ہو رہا ہے، میں اُوپر آ رہا ہوں" میں نے خوشدلی سے کہا۔

"آپا جی... معاف کرنا... یہ کوئی بندہ آ گیا ہے، زبردستی میرے دفتر میں" اس نے اپنی آپا کے سامنے اپنی خودی رکھی اور یہ ظاہر نہیں کیا کہ وہ خود کتنی بلندی سے مخاطب ہے۔ اس کا آفس ایک کھمبے پر واقع ہے۔ میں اتنی دیر میں اس کے ... پہنچ گیا۔ اب ہم دونوں ایک ہی کھمبے سے چھپکلی کی طرح چمٹے ہوئے تھے اور ہم دونوں کے پیر ایک ہی بریکٹ پر جمے ہوئے تھے۔

"تم... تم کھمبے پر آخر کیوں چڑھے ہو؟" لائن مین ... سے ...

"تم بھی تو چڑھے ہوئے ہو یار" میں نے کہا۔

"یہ تو کام ہے یار، ڈیوٹی ہے میری" وہ جھنجلا کے بولا۔

"مجھے شوق ہے یار ... تمہاری طرح مجھے بھی مفت کے ٹیلی فون کرنے کا بہت شوق ہے میری بھی ایک آپا ہر جگہ ہے۔"

"یہ کیا بکواس ہے، نیچے اترو ورنہ..."

"ورنہ کیا، تم مجھے دھکا دے کر نیچے گرا دو گے؟" میں نے کہا "میں بھی تم کو گرا دوں گا پھر تمہاری ٹانگ ٹوٹ جائے گی، تم لنگڑے ہو جاؤ گے تو اس نوکری سے بھی جاؤ گے جس میں کسی کے فون پر بھی اپنی آپا سے یہ گپ شپ ہو جاتی ہے۔"

"تم کو فون کرنا ہے کہیں؟" وہ مجھے کچھ دیر گھورنے کے بعد بولا۔ اس نے اپنا آلہ میری طرف بڑھا دیا۔

"یہ بڑی اچھی چیز ہے" میں نے تعریفی نظروں سے اس پورٹیبل فون کو دیکھا جیسا ایک میرے پاس بھی تھا۔ یہ کچھ نیا اور جدید وضع کا تھا۔

"بات کرو اور جاؤ" لائن مین نے کہا۔

"یہ ٹیلی فون بیچو گے؟" میں نے کہا۔

"تم تو پاگل ہو بلا" اس نے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر میں نے ہاتھ پیچھے کر لیا "یہ سرکاری چیز ہے"

"سرکاری چیز تو یہ زمین بھی ہے جس پر کھمبا کھڑا ہے، یہ کھمبا بھی سرکاری ہے جس پر تم چڑھے ہوئے ہو اور وہ نوکری بھی سرکاری ہے جو تم کر رہے ہو۔ سرکار کی ہر چیز اتنی ہی تمہاری بھی ہے جتنی میری ہے۔ بولو، یہ ٹیلی فون بیچو گے؟" میں نے کہا۔

اس نے سر پر ہاتھ مارا "یا میرے مولا! کس پاگل کے ہتھے لگ گیا۔ او بھائی، یہ چیز بیچی نہیں جا سکتی، اس کو بیچنا جرم ہے۔"

"اچھا اگر یہ چوری ہو جائے، فرض کرو میں اسے چرا لوں تو جرم تو پھر میرا ہو گا" میں نے کہا۔

لائن مین نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا "یار! خدا کا واسطہ"

"اچھا فرض کرو میں یہ لے کر بھاگ جاؤں" میں نے کہا "تم شرط لگا کے بھی میرے ساتھ نہیں دوڑ سکتے یا میں اسے نیچے ... اور یہ ٹوٹ جائے تو تم کیا کرو گے؟"

"میں کچھ نہیں کروں گا" وہ فریاد کناں لہجے میں بولا "اپنی ... کرو دنے کے سوا۔ مجھے بتاؤ تم چاہتے کیا ہو؟"

"وہ تو میں نے پہلے ہی بتا دیا تھا" میں نے کہا "میں یہ خریدنا چاہتا ہوں"

"آخر کیوں؟"

"اس لیے کہ مجھے فون کرنے کا بہت شوق ہے" میں نے ... میں نے جو درخواست دے رکھی ہے اس پر تو فون ... سال بعد ملے گا، یہ دس سال میں کیسے گزاروں گا۔ میرا تو ... چاہتا ہے کہ ہر وقت فون کرتا رہوں"

"... کیسے فون کرتے ہو تم؟"

"اپنی ہر گرل فرینڈ کو، ہر شہر میں اور ہر شہر کے ہر محلے میں ... کوئی نہ کوئی گرل فرینڈ رہتی ہے"

"تم جوان لڑکیوں کو تنگ کرتے ہو اور اس کے لیے فون ... ہیے تمہیں؟"

"میں لڑکیوں کو تنگ کرتا ہوں، یہ کس نے کہہ دیا تم سے؟" میں نے کہا "اور یہ کون کہتا ہے کہ وہ جوان ہیں۔ کسی کی عمر دس سال سے زیادہ نہیں، پانچ سے دس سال کے درمیان ہیں سب، بڑے مزے کی باتیں کرتی ہیں، تم کو اندازہ نہیں کہ ان کی باتیں کتنی معصوم اور دلچسپ ہوتی ہیں"

"مذاق چھوڑو، مجھے جانا ہے" وہ ضبط کرتے ہوئے نرمی سے بولا۔

"اچھا، خدا حافظ" میں نے کہا۔

"یہ فون مجھے دو" وہ چلّا کے بولا۔

"یہ تو میں نہیں دوں گا" میں نے کہا "اس کے بدلے یہ لے لو" میں نے جیب میں سے ایک ہزار روپے نکالے "کم ہیں ... بتاؤ"

وہ ہکا بکا نوٹوں کو گھورتا رہا۔ اس وقت روئے زمین پر ہر قسم کے سودے ہو رہے تھے۔ ہر بڑے شہر کے اسٹاک ایکسچینج ... کاٹن ایکسچینج میں، سڑکوں بازاروں، کوٹھوں اور قحبہ خانوں میں، بازار کی جنس سے آدمی کی جنس تک سب ... فروخت ہو رہا تھا مگر یہاں روئے زمین سے پندرہ فٹ ... بلندی پر دُنیا کا انوکھا سودا ہو رہا تھا۔

"کم ہیں تو بولو" میں نے کہا "دُگنے کر دوں؟"

"دو ہزار... مگر یار میں کیا کروں گا، کیا کہوں گا؟" وہ پریشان ... نے لگا۔

"تم بس ایک جھوٹ بول دینا" میں نے کہا "کہ یہ چوری ہو گیا ... چوری ہوا، یہ کہانی تم خود گھڑ لینا جو تمہارے اُوپر والوں کو مطمئن کر سکے۔ ڈرنا تو اُوپر والے سے چاہیے، اوپر والوں کی کیا فکر، وہ خود اس سے بڑے جھوٹ بولتے ہیں۔ سچ کی کمائی میں تو تنخواہ کے سوا کچھ نہیں ملتا"

"مجھے ڈر لگتا ہے تم سے، تم بہت چالاک اور خطرناک آدمی ہو، بعد میں مجھے مروا دو گے" وہ بولا۔

"نہیں، کرۂ ارض پر بہت جھوٹ بولا جا رہا ہے" میں نے کہا "لیکن میں اور تم عام انسانوں کی سطح سے بلند ہو کے بات کر رہے ہیں، یہ لو دو ہزار اور اپنی سائیکل اُٹھا کے رفوچکر ہو جاؤ، پلٹ کے مت دیکھنا۔ دس منٹ بعد میں بھی غائب ہو جاؤں گا۔ اس کھمبے کی نوک پر ہونے والی یہ ملاقات ہم دونوں کے لیے فائدہ مند ہے۔ دُنیا کے سامنے اس کا ذکر مت کرنا ورنہ دُنیا والے بڑے حاسد ہیں، کسی کا بھلا نہیں دیکھ سکتے"

وہ نوٹ لے کر بڑی عجلت میں نیچے اُترا۔ اُس کی زندگی کا یہ ناقابلِ فراموش تجربہ تھا۔ غالباً وہ ضرورت مند بھی تھا۔ ضرورت مندی آدمی کے چہرے پر لکھی ہوتی ہے اور یہ تحریر ہمیشہ یکساں مفہوم رکھتی ہے جو آسانی سے سمجھ میں آ جاتا ہے۔ غربت اور مفلسی کی مجبوریاں ایسی بہت سی ضرورتوں کو جنم دیتی ہیں، جن کا مداوا صرف پیسہ کرتا ہے، سب لوگ نوٹ نہیں چھاپ سکتے چنانچہ وہ چوریاں کرتے ہیں، کبھی مال چراتے ہیں تو کبھی ٹیلی فون کال۔

جب وہ میری نظر سے اوجھل ہو گیا تو میں نے نئے ٹیلی فون انسٹرومنٹ کو آزمایا جو بدستور لائن سے ملا ہوا تھا۔ میں نے سراج کا نمبر ملایا۔

"ہیلو" سب انسپکٹر تیس مار خان نے فوراً جواب دیا۔

"تیس مار خان! میں مسکراتے ہوئے مُردوں کی ایسوسی ایشن کا اعزازی صدر بول رہا ہوں، یعنی تمہارا باپ" میں نے کہا۔

"ایس ایس پی صاحب سے بات کرو گے؟" تیس مار خان نے میری آواز یقیناً پہچان لی تھی مگر وہ ضبط کرنے پر مجبور تھا "میں لائن دے رہا ہوں"

"سکندر! میری ماں کیسی ہے؟" سراج کی آواز آئی۔

"ماں، ہر ماں کی طرح وہ بھی بہت اچھی ماں ہے مگر ہر بیٹے کی طرح تم اچھے بیٹے نہیں ہو" میں نے کہا۔

"میرا مطلب تھا وہ ٹھیک تو ہے نا، کیا میں بات کر سکتا ہوں اُس سے؟"

"نہیں، وہ خود تم سے بات نہیں کرے گی" میں نے کہا "اس لیے کہ وہ یہاں موجود ہی نہیں۔ ویسے تم فکر مت کرو، ہم اسے کوئی تکلیف نہیں دیں گے"

"تم اُسے جتنی اذیت دے سکتے تھے، دے چکے" وہ بولا "جو کچھ تم نے زیب النساء کے ساتھ کیا..."

"ہم نے صرف اتنا کیا تھا کہ اُسے ایک ایئرکنڈیشنڈ ٹمبر لیبڈیز میں ڈال کے لے گئے تھے، باقی جو کچھ کیا خود اُس نے کیا۔ وہ ہمارے ساتھ رہتی تو اس کے ساتھ کچھ نہ ہوتا۔"

"کیا تمھیں معلوم ہے کہ اُس کے ساتھ کیا ہُوا؟" وہ بولا۔

"نہیں، اگر بُرا نہیں ہُوا تو اچھا ہے اور اچھا نہیں ہُوا تو... سوری!"

"وہ ابھی تک ہوش میں نہیں آئی ہے، اُسے ہم نے سڑک پر پڑا ہوا پایا تھا، اسی علاقے میں۔" وہ بولا۔ "پولیس پارٹی نے اس سارے علاقے کو چھان مارا تھا۔ وہ صبح ساڑھے تین بجے ملی، اس حالت میں کہ میں بیان بھی نہیں کرسکتا۔"

"مگر میں تصوّر کرسکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "کیا تم نے اس درندے کا پتا چلالیا جس نے اُس کے ساتھ یہ انسانیت سوز سلوک کیا؟"

"نہیں لیکن میں پتا چلالوں گا، بس وہ ہوش میں آجائے۔ اُس کے ذہن پر صدمے کا شدید اثر ہے۔"

"میڈیکل رپورٹ کیا کہتی ہے؟"

"وہ کم سے کم تین افراد تھے جنھوں نے اس کے ساتھ زیادتی کی۔ اُنھوں نے اسے زبردستی شراب بھی پلائی، اگر وہ بچ گئی تب بھی اس بات کا امکان زیادہ ہے کہ وہ ذہنی صدمے سے ریکوَر نہ کرسکے۔ اس کا نروس بریک ڈاؤن لمبا ہو جائے یا کبھی ختم نہ ہو۔ کیا تم کو احساس ہے کہ اس سب کے ذمّے دار تم ہو؟" وہ بے حد مشتعل تھا۔ جھنجلاہٹ اور بے بسی کے احساس سے خود اُس کا نروس بریک ڈاؤن ہو رہا تھا۔

"ایس ایس پی صاحب!" میں نے سکون سے کہا۔ "ہم نے ایسا نہیں چاہا تھا مگر کیا تم کو یاد ہے کہ رابعہ کے ساتھ تم نے جو کچھ کیا تھا، وہ جانتے بوجھتے کیا تھا، اُس وقت تمھیں احساس تھا کہ تم کیا کر رہے ہو!؟"

"چھوڑو... چھوڑو یہ بات... زندگی بہت پڑی ہے، میں اور تم پھر ملیں گے۔" وہ بولا۔ "اور اُس وقت تم آج کے دن کی یہ بات یاد کرکے پچھتاؤ گے۔ میں تم کو ایک موقع دے سکتا ہوں سکندر۔ ذاتی سطح پر عداوت کا یہ سلسلہ ختم کردو۔"

"یہ تو آغاز ہے ایس ایس پی صاحب ہماری طرف سے۔ تم نے ہی یہ فصل بوئی تھی، اس کا پھل کاٹتے ہوئے روتے کیوں ہو؟" میں نے کہا۔

"دیکھو، رابعہ کے بارے میں مجھے معلوم ہُوا ہے کہ وہ ہماری تحویل میں نہیں ہے، ہمارے کسی آدمی کے پاس نہیں ہے۔" وہ بولا۔

"پھر کہاں ہے، تمھارے آدمی یہ تو بتا سکتے ہیں کہ اُنھوں نے رابعہ کو مار کے سمندر میں پھینکا تھا... یا گاڑا تھا تو کہاں گاڑا تھا؟"

"وہ فرار ہوگئی تھی، قید سے نکل گئی تھی۔" وہ بولا۔

"یہ کب کی بات ہے؟" میرا دل ایک دم سینے میں ... میں نے اُسے تھپک کر خاموش کردیا۔ اسے دلِ بے تاب ... میں اپنے زعم میں اک بازیافت پر خوش ہُوں، یہ واقعہ ... کو ملا وہ اب بھی نہیں۔

"تقریباً ایک ہفتے پہلے۔" میں نے سراج کی آواز سُنی۔

"تم جھوٹ بول رہے ہو، اُس نے ہم سے رابطہ قائم نہیں ...

"جھوٹ شاید تم بول رہے ہو، اُس نے تم سے رابطہ قائم ... تھا۔" سراج نے تلخی سے کہا۔

میں حیران رہ گیا کہ وہ کتنا باخبر ہے۔ "وہ خود بھی تو آسکتی ... اگر وہ آزاد تھی۔" میں نے کہا۔

"یہ اُس سے ملو تو پوچھ لینا کہ وہ کیوں نہیں آئی اور ... وہیں رہی تو کس کے لیے؟" سراج نے کہا۔

"ممکن ہے وہ اکیلی آنا نہ چاہتی ہو، اُس کے ساتھ ہمارا ایک ... اور دوست بھی تھا۔" میں نے کہا۔

"ہاں، تھا... اُسے ہم چھوڑ دیں گے۔ مجھے معلوم کرنا ہوگا اُس کے بارے میں کہ وہ کہاں ہے؟" وہ بولا۔

"ٹھیک ہے، میں تم سے پھر رابطہ قائم کرلوں گا۔" میں نے کہا۔ "اور تم کو بتادوں گا کہ کب، کہاں اور کیسے ہمارے اور تمھارے قیدیوں کا تبادلہ ممکن ہے۔"

"ٹھہرو، بدمت کرنا۔"

"کیوں؟ کیا کال کو ٹریس کرنے کا خیال ہے؟" میں نے کہا۔

"نہیں، تمھاری یہ گفتگو صرف میں سُن رہا ہوں۔" سراج نے کہا۔ "میں نے اس کا رابطہ آبزرویشن سے الگ کردیا تھا۔"

"کیا عائشہ کے بارے میں کچھ کہنا ہے؟"

"ہاں، اُسے چھوڑ دو۔" سراج نے کہا۔ "اُسے گھر جانے دو ... وہاں بڑی قیامت آگئی ہے۔ تم نے اُس کے باپ سے فون پر کیا کہا تھا؟"

"میں نے صرف سچ بولا تھا۔" میں نے کہا۔

"اس سچ کے ذریعے تم نے ایک قتل کردیا۔" اُس نے بے اختیار مجھے ایک گالی دی۔

"اچھا تو یہ آلۂ قتل میرے قبضے سے برآمد کرلو۔" میں نے کہا۔

"تمھارا وہ سچ ایک ٹیپ پر محفوظ ہے۔ دلاور کا فون بھی آبزرویشن پر تھا۔ یہ تم کو سمجھ لینا چاہیے تھا کہ اس کے اغوا کے بعد کارروائی ضرور ہوگی۔ پولیس وہ سب کچھ کرے گی جو کرنا چاہیے۔"

"مگر جو عام آدمی کے اغوا پر نہیں ہوتا۔" میں نے کہا۔

"دلاور عام آدمی نہیں تھا۔" سراج نے کہا۔ "اس کے بے ...

... انتظامی مشینری کا حرکت میں آنا لازمی تھا۔ تمھاری گفتگو کا ... ایک ایک لفظ ٹیپ ہُوا اور میں نے بھی سُنا لیکن اس سے ... کو نقصان نہیں ہُوا۔"

"کیونکہ وہ ٹیپ تم نے غائب کردیا ہے۔" میں نے کہا۔ "... اس عورت کا باپ، جو دلاور کی بیوی ہے۔"

"وہ دلاور کی بیوی تھی۔" سراج بولا۔

"کیا... کیا وہ مرگئی؟" میں نے چونک کر کہا۔ "مار دیا دلاور نے راتوں رات، وہ واقعی دلاور ہے۔"

"اُسے تم نے مارا ہے سکندرِ اعظم، دلاور نے نہیں۔"

"میں نے اُس کے باپ کو سب سمجھا دیا تھا۔" میں نے کہا۔ "... موت اُس عورت کا مقدر ہو چکی تھی۔ دلاور اُسے بہت ... سے قتل کر رہا تھا، مجھے الزام کیوں دیتے ہو، یہ ویسے بھی ... کی زندگی کی آخری رات تھی۔ اُسے صبح ہونے سے پہلے ... ہی تھا۔ شاید دلاور یہ فیصلہ پہلے ہی کر چکا تھا۔ اب دلاور ... یہ کہو کہ اس کے باپ کو بھی مار دے۔"

"دلاور کا یہ کام تم نے کردیا۔ صرف ایک فون کرکے، سچ ... کے، تم نے ہمیشہ سچ بولا ہے اور نیکی کا ثواب کمایا ہے، ... یہ بھی اپنے کھاتے میں ڈال لو کہ تم نے اس بڈھے کی جان ... لی، وہ سچ کا زہر برداشت نہ کرسکا کیونکہ وہ پہلے ہی ... دل کا مریض تھا، وہ سچ بھی اُس کے ساتھ ہی مرگیا اور ... کے ساتھ ہی دفن ہو جائے گا جو تم نے بولا تھا۔"

"اب تم کہو گے کہ دلاور کی بیوی باپ کی موت کا صدمہ ... جھیل سکی، وہ پہلے ہی سخت بیمار تھی۔" میں نے نفرت سے ... دیری گڈ! کیا اچھا موقع ملا تمھیں۔ تم کہو گے کہ قدرت ... تمھاری مدد کر رہی ہے مگر یہ شیطان کی مدد ہے سراج۔"

"شیطان کی!؟" سراج نے کہا۔ "فون تو تم نے کیا تھا، یہ سب ... تمھاری وجہ سے ہی تو ممکن ہُوا اور اب تمھارا سچ دلاور کا کیا ... بگاڑ سکتا ہے؟"

"دلاور کو آج ہی معلوم ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔ "کہ سزا ... اُن کو ملی ہے اور یہ اُس کی آخری سزا نہیں ہوگی۔ عاقبت کی ... بات میں نہیں کرتا کیونکہ خوفِ عاقبت نہ اُس کو ہے نہ تمھیں، ... میں اس دُنیا کی بات کر رہا ہوں۔ اگر وہ مرسکتا تو اچھا تھا مگر وہ ... زندہ رہے گا کیونکہ خدا اُس کی زندگی کو ایک تکلیف دہ پُرعذاب ... اور عبرت آموز سزا بنائے گا۔" میں نے فون کے تار کھینچ کر ... الگ کیے اور نیچے اتر آیا۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو شاید گر پڑتا۔ میں ... جسمانی تھکن کے علاوہ اعصابی تناؤ کا شکار تھا۔

محسن بے چینی سے میرا منتظر تھا اور دو بار چکر لگا کے ... اور کھڑکی سے جھانک کر دیکھ گیا تھا کہ میں ابھی تک کھمبے سے چمٹا ہُوا ہُوں۔ اُس سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ چند گاڑیاں اور تانگے بہت دُور سے گزر رہے تھے اور میں ایسی جگہ تھا جہاں کسی کی نگاہ براہِ راست مجھ پر نہیں پڑ سکتی تھی۔

"یہ کیا مصیبت ہے یار!" محسن نے بگڑنا شروع کیا۔ "بات مختصر کرنا چاہیے، آدھا گھنٹا لگادیا۔"

میں نے جواب دیے بغیر دوسرا فون گاڑی میں پھینکا اور آگے محسن کی جگہ بیٹھ گیا۔ "گاڑی چلاؤ۔" میں نے کہا۔ "میں ماردوں گا کسی دیوار میں یا چڑھا دوں گا کسی پر۔"

"کیا ہُوا تجھے؟" محسن نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کے مجھے غور سے دیکھا۔ میرا خون اُبل رہا تھا اور غصّے میں میرا چہرہ گرم ہو کے تپنے لگا تھا۔ جب گاڑی چلی تو میں نے محسن کو بتایا کہ دلاور نے اپنی بیوی کو رات ہی قتل کردیا اور اُسے بہانہ بھی مل گیا کہ وہ باپ کی موت کی تاب نہ لاسکی۔

"یہ تو بہت غلط ہوگیا۔" محسن نے افسوس سے سر ہلایا۔

"وہ خبیث صاف بچ گیا۔ اب اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ جس بڈھے نے سچ سُنا تھا، وہ کچھ جی لیتا تو بیٹی کو بھی بچا لیتا مگر سب قدرت کے کھیل ہیں۔ اب میں سوچ رہا ہُوں کہ کیا واقعی میں نے غلطی کی تھی مگر میں اسے نہ بتاتا تو کیسے بتاتا اور کوئی صورت بھی تو نہیں تھی۔ میں نے نیک نیتی سے کوشش کی تھی کہ دلاور کی بیوی کو قتل نہ ہونے دوں۔ معلوم نہیں کیوں میری کوشش ناکام گئی۔ شاید قدرت کو میری دخل اندازی پسند نہیں آئی۔ اُس نے تو موت کا ایک وقت مقرر کردیا ہے۔ میں کیا اور میری بساط کیا کہ آئی موت کو ٹالنے کی کوشش کروں۔ اس عورت کو ایسے ہی مرنا تھا اور اُس کے باپ کو بھی۔ وہ سؤر کا بچہ سراج کہتا ہے کہ تم نے اُسے مارا، میں کیوں ماروں گا، ایک بڈھے کو... مگر وہ زبردستی مجھ پر تھوپ رہا ہے دونوں کی موت کا الزام...!"

"سکندر یار، ہوش میں رہ۔" محسن نے میرے کندھے پر تھپکی دے کر کہا۔ "کسی کے کہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ خدا تو نیّت کا حال جانتا ہے نا... پھر تُو کیوں پروا کرتا ہے کتّوں کے بھونکنے کی، اپنے ضمیر پر بوجھ مت رکھ۔"

"معلوم نہیں قدرت کی سزا کس کے لیے ہے، میرے لیے، دلاور کے بچّوں کے لیے، یا دلاور کے لیے۔" میں نے کہا۔

"سراج نے اور کیا بتایا؟" محسن نے کہا۔

"اُس نے... اُس نے زیب النساء کے بارے میں بتایا۔" میں نے کہا۔

گھر پہنچنے تک میں نارمل ہوگیا تھا مگر میرا دل غم کے بار سے بوجھل تھا۔ اس احساس کو رابعہ کا تصوّر بھی پناہ نہیں دیتا

تھا کہ میں نے عائشہ کے باپ کو فون نہ کیا ہوتا تو وہ نہ مرتا۔ وہ نہ مرتا تو دلاور کی بیوی کچھ دن اور جی لیتی مگر کتنے دن ... اور اسے پھر کوئی کیسے بچاتا؟ میں اگر یہ بات یوں نہ کہتا تو پھر کیسے کہتا، کس ... ب کہتا۔ گھر پہنچ کے میں نے ... شہ کو دیکھا تو پشیمانی ... مل کی شدت بڑھ گئی۔ ... جبھی دلاور نے قتل ... رے قتل کا اہتمام کیا تھا مگر نشانہ بن گئی وہ لڑکی جو ... ت جسم بڑا پُرکشش، بڑا سفاک اور بڑا سستا تھا۔

"ہم یہاں زیادہ دیر نہیں رُک سکتے" محسن نے کہا۔ "جلد از جلد سب کچھ سمیٹو اور نکل چلو، اسی میں خیریت ہے ورنہ یہاں پولیس آ گئی تو گواہ بھی مل جائیں گے کہ اس قسم کی ایک گاڑی آئی تھی، کسی نے نمبر نوٹ کر لیا تو مصیبت گلے پڑ جائے گی۔"

گاڑی کو ہم نے کھنڈر سے کچھ فاصلے پر کھڑا کیا تھا جہاں ایک بند گیراج تھا۔ پیچھے سے گزرنے والی چھوٹی سڑک تھی جس کے دونوں جانب احاطوں کی دیواریں تھیں۔ میں نے محسن سے کہا کہ وہ مائکروبس کو دیوار سے جتنا قریب لگا سکتا ہو، لگا لے اور اس کا سلائیڈنگ گیٹ کھلا چھوڑ دے۔

اسلحہ میں نے اور محسن نے دس منٹ میں منتقل کر دیا۔ اس کے لیے مائکروبس کے پیچھے انجن کے اوپر بنا ہوا مختصر سا خانہ کافی رہا اور زیادہ محفوظ بھی رہا۔ غالب کو میں نے اور محسن نے سہارا دے کر پہنچایا اور اسے دیوار کے اُوپر سے اُتارا۔ غالب نے ہماری غیر موجودگی میں فارغ بیٹھنا مناسب نہیں سمجھا تھا اور سارے نوٹوں کی گڈیوں سے زہریلی پنّوں کو نکال کے رقم واپس سُوٹ کیس میں ڈال دی تھی۔

"جُولی! تم ماں جی کو لے جاؤ" میں نے کہا۔

"میں خود چل کے جا سکتی ہوں" سراج کی ماں کھڑی ہو گئی۔

"ہم بھی یہی چاہتے ہیں" میں نے کہا۔ "کہ آپ ہمارے لیے کوئی مسئلہ کھڑا نہ کریں۔ آپ سمجھتی ہیں ناکہ آپ کو کیا کرنا ہے۔ آپ کو صرف خاموش رہنا ہے۔"

"یہ نہ ہو کہ ہم آپ کو خاموش کرنے پر مجبور ہو جائیں" محسن بولا۔

"معلوم نہیں میں مر کیوں نہیں جاتی" وہ دُکھی لہجے میں بولی۔ "اور کیا دیکھنے کو رہ گیا ہے۔ تم نے تو مجھ سے ماں کا وہ غرور بھی چھین لیا ہے جو اسے اپنے بیٹے پر ہوتا ہے۔ میں بہت کوشش کرتی ہوں کہ اسے جھوٹ سمجھوں، وہ سب کچھ جو تم نے کہا مگر سچ کا گھاؤ بہت گہرا ہے۔ میرے دل کو یہ زخم دے کر کیا ملا تمہیں، کیوں۔ بولا تم نے وہ سچ جو میری ممتا کا آزار بن گیا ہے؟"

"دُکھ کی بات تو یہی ہے ماں جی کہ ہم سب منافقت کے پردوں میں رہنا چاہتے ہیں" میں نے کہا۔ "وہی دیکھنا اور سننا چاہتے ہیں جو ہمیں اچھا لگے۔ بُرائی اور بدصورتی کو ہم جذبات کے رنگ و روغن سے چھپا لیتے ہیں اور پھر دل کو فریب دیتے رہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ پورا معاشرہ رِستے ہوئے ناسوروں والا ناقابلِ نفرت جسم بن گیا ہے مگر ہم زرق برق الفاظ سے ملمع لگے دعووں سے اور کھوکھلے نعروں کی چمک والے کپڑے پہنا کے اس کی خوبصورتی کو سراہتے ہیں، میک اپ کی تہ جما کے خوش ہو لیتے ہیں۔"

"... نہیں تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"... صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ جب تک آپ جیسی مائیں سراج جیسے بیٹوں کو نفرت نہیں دیں گی، انہیں احساس نہیں ہو گا کہ انہوں نے دُنیا میں کچھ پانے کے لیے بہت کچھ کھو دیا ہے۔ اُسے احساسِ زیاں تو ہونا ہی چاہیے کہ اُس نے اپنی ممتا کا خزانہ گنوا دیا ہے" میں نے کہا۔

وہ کچھ سمجھی اور کچھ نہیں سمجھی۔ اُس نے جُولی کے ساتھ آہستہ آہستہ دروازے کی طرف قدم بڑھائے اور پھر رُک گئی۔ "اس کو تم ایسے ہی چھوڑ جاؤ گے" وہ اُدھر اشارہ کر کے بولی جدھر عائشہ کی لاش پڑی تھی۔

"ہم اسے ساتھ رکھ کے ... رہیں گے" میں نے کہا۔

"ہم تو کل ..." محسن کہنے ہی والا تھا کہ ہم کیتھرین کو بھی ایسے ہی چھوڑ آئے تھے مگر میں نے اُسے پاؤں کی ٹھوکر ماری۔ جُولی کا چہرہ دوسری طرف تھا چنانچہ اُس نے یہ حرکت نہیں دیکھی۔

"کل نہ جانے کہاں ہوں گے" محسن نے اپنی بات بدل دی۔

"اور اس کی لاش یہاں سڑتی رہے گی" سراج کی ماں نے خوفزدہ ہو کے کہا۔

"نہیں، ہم اس کے وارثوں کو اطلاع کر دیں گے" میں نے کہا۔ "وہ اسے یہاں سے اُٹھا کے لے جائیں گے اور دفنا دیں گے۔"

سراج کی ماں مطمئن ہو گئی۔ اس نے دیوار تک کا فاصلہ سر جُھکا کے خاموشی سے طے کیا اور جُولی کے سہارے دیوار کے اُوپر سے دوسری جانب اُتر گئی۔ میں نے دروازے کو کھینچ کر برابر کیا اور محسن نے گاڑی چلانے میں دیر نہیں کی۔ میں نے عائشہ کی خود تدفین کا ارادہ بدل دیا تھا کچھ اس لیے بھی کہ یہ مشکل اور خطرناک کام تھا اور کچھ دلاور کو سزا دینے کے لیے۔

مجھے اُمید تھی کہ وہ بھی عائشہ کی موت کی اطلاع اس گھر کے باقی افراد کو نہیں دے گا جس میں ایک رات نے دو جانوں کا نذرانہ لے لیا تھا۔ سب سے مظلوم عائشہ کی ماں تھی۔ ابھی ایک دن پہلے ہی اُس نے ایک بیٹی کا رشتہ طے کیا تھا اور اُسی رات ...ری بیٹی نے زندگی سے رشتہ توڑ لیا تھا۔ اُسی رات میں ... جیسی ... سی۔ اگر اُسے معلوم ہُوا کہ فرشتۂ اجل کا تیسرا شکار ... تھی تو شاید یہ صدمہ اُس کی جان لینے کے لیے ... ہو ... دلاور خاموشی سے عائشہ کی تدفین کرا دے گا ... کی ماں کو وہ دلاسا دیتا رہے گا کہ عائشہ زندہ ہے اور خیریت سے ہے۔ اس وقت تک جب حقیقت خود آشکار ہونے ... یہ حالات کا حصار نہ توڑ دے۔ جھوٹ کے پردوں سے سچ ... نکل آئے جیسے ایک لمبی کالی رات کے سمندر کو عبور ... کے سورج کی پہلی کرن نکلتی ہے۔

"میں سمجھتا ہوں ابھی شہر سے باہر نکلنے کی کوشش کرنے ... خطرہ ہے" محسن بولا۔

"ہاں، ابھی ناکا بندی ختم نہیں ہوئی ہو گی" میں نے کہا۔ "لیکن ... بڑے شہروں کے راستوں پر ہی نظر رکھی جاتی ہے۔ پشاور ... ملتان کے راستے کا تو سوال ہی نہیں، لائل پور، سیالکوٹ یا سرگودھا ... یہ رو کی طرف بھی نہیں جانا۔"

"پھر راستہ کون سا رہا؟" محسن نے کہا۔

"مضافات کی جانب بہت سی کچی سڑکیں ہیں" میں نے ... اور ایسے گاؤں ہیں جو لاہور ہی کا حصہ بن گئے ہیں۔"

"اس گاڑی میں ہم بہت نمایاں ہوں گے" محسن بولا۔ "ہم ... لائی آبادی میں کوئی کچا مکان لے کر نہیں رہ سکتے۔"

"ہم اب منظر کی طرف بھی نہیں جا سکتے" میں نے کہا۔ "اسے ... بڑے ہی ہماری اور ڈاکوؤں کی مدد کرنے کے الزام میں گرفتار ... کر لیا گیا تھا، وہ ضمانت پر رہا تو ہو گیا مگر دوسری بار اس پر ... ہم نہیں آنا چاہیے۔ باقی سارے ٹھکانے پولیس چھانتی پھر ... رہی ہو گی۔ جہاں جہاں بھی ہم رہے ہیں، آدھے سے زیادہ لاہور ... اندر اور محسن کے نام سے واقف ہے اور کوئی ہوشیار ... نظر والا مل گیا تو اس حلیے میں بھی پہچان لے گا۔ ہم ہوٹل میں ... یا کسی سرائے تک میں نہیں جا سکتے کیونکہ ہمارے ساتھ خواتین ... ہیں اور ہم صورت سے بھی کام چلا لیں مگر نہ ہمارے پاس سامانِ ... نہ گھر بلو ... سب۔ کوئی ہمیں ایک فیملی نہیں مانے گا۔"

"اس کا مطلب تو یہی ہُوا کہ اب ہمارا ٹھکانا زمین اور آسمان کے درمیان کہیں بھی نہیں رہا" محسن بولا۔

"ڈکیرہ غازی خاں" میں نے اچانک چلّا کے کہا۔ "مل گیا محسن، ... ٹھکانا مل گیا، وہ انکار نہیں کر سکتا۔"

"یہ بات اس سے ایک نیکی کا معاوضہ طلب کرنے سے کم نہیں" ... محسن بولا۔

"مرد آدمی کس سے مانگ سکتا ہے، اپنوں سے" میں نے ... منزل کے ... تو میں نے وعدہ کیا تھا کہ پھر آؤں گا۔"

"ہماری وجہ سے وہ غریب آدمی مشکل میں نہ پڑ جائے۔"

"ہم اُس کے گھر تک نہیں رہیں گے۔ اُس سے کہیں گے کہ ہماری رہائش کا کوئی انتظام کر دے، صرف ایک ہفتے کے لیے" میں نے کہا۔ "لوگ ہمیں انکار کر سکتے ہیں مگر وہ ضامن ہو گا تو بات بن جائے گی۔"

آدھے گھنٹے بعد میں نے مائکروبس کو غازی خاں کے گھر کے قریب روکا۔ ایک بار میں صبح سویرے کار میں آیا تھا تو میری گاڑی عین اُس کے دروازے تک پہنچ گئی تھی مگر یہ بڑی گاڑی تھی جو چھوٹے چھوٹے کوارٹروں کے درمیان پھنس جاتی۔ میں نے محسن کو وہیں چھوڑا اور خود غازی خاں کے گھر کے دروازے تک گیا۔

غازی خاں کے دروازے پر لگا ہُوا قفل دیکھ کے مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ میں نے پڑوس میں رہنے والے کا دروازہ بجایا۔ ایک شخص ریلوے کی نیلی وردی میں باہر آیا، وہ سفید مونچھوں اور بالوں والا ضرورت سے زیادہ ہی صحت مند شخص تھا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ غازی خاں اور اُس کی بیوی تو ٹیکسلا گئے ہوئے ہیں۔

"ٹیکسلا۔ آنکھوں کے اسپتال؟" میں نے کہا۔ "اپنی بیوی کی آنکھوں کا آپریشن کرانے کے لیے؟"

"ہاں جی، اب تو خیر سے واپس آنے والا ہے" وہ بولا۔ "اس کی چٹھی آئی تھی کہ آپریشن کامیاب رہا۔ ڈاکٹروں نے صرف تین دن رکھا اور چُھٹی کر دی۔"

"کب تک پہنچے گا وہ؟"

"یہ تو نہیں لکھا" وہ بولا۔ "آپ کو کیا کام تھا جی؟"

"میں اُس کا دوست ہوں" میں نے بڑے تذبذب کے ساتھ کہا۔ "میں نے ہی اُسے مجبور کیا تھا۔" مجھے بہت شرم آئی کہ میں ایک ذاتی مقصد کے حصول کی خاطر اپنی نیکی کا احسان گنوا رہا ہوں۔

"ہاں جی، مجھے معلوم ہے" وہ بولا۔ "کسی نیک دل تھانیدار نے اُسے پیسہ دیا تھا، پیسہ تو اُس کے پاس سارا حرام کا ہی ہو گا مگر اللہ اُس کی نیکی قبول کرے۔ آپ کون ہو، کہاں سے آئے ہو؟"

"میں ... مجھے اس علاقے میں ایک مکان کی ضرورت تھی۔ غازی خاں ہوتا تو اُس کے پاس ٹھہر جاتا" میں نے کہا۔

"آپ اکیلے ہو؟" وہ بولا۔

"نہیں فیملی ہے میرے ساتھ، بہن ہے اور خالہ ہے۔ ایک زخمی بھائی ہے، ٹانگ ٹوٹ گئی تھی اُس کی" میں نے کہا۔ "پشاور سے آئے تھے اور یہاں ..."

"دیکھو جی ... تو کوارٹر کی ... مجھے دے گیا تھا" وہ بولا۔ "لیکن صرف اس لیے کہ میں صفائی کر دوں اور دھیان رکھوں۔ تو

میری گھر والی خیر سے روز جھاڑو دے آتی ہے مگر میں کسی کو اس کے گھر ٹھہرا دوں، یہ مشکل ہے۔ جسے میں جانتا نہیں، اُسے چابی دے دوں۔ ہاں آپ نے جو بات کی ہے کہیں ٹھہرنے کی تو پیچھے والی لائن میں کونے کا کوارٹر کرائے کے لیے ہے، ابھی دو دن ہوئے اپنے ایک یار کو الاٹ ہوا تھا۔"

"وہ خود نہیں رہتا وہاں؟" میں نے پوچھا۔

"وہ کوارٹر میں رہے گا؟" وہ ہنسنے لگا۔ "اُس کے چار چار مکان ہیں شہر میں، دو بیویاں ہیں، اندھی کمائی کر رہا ہے۔ اُسے تو بس الاٹ ہو گیا کوارٹر باری پر۔ اُس نے مجھ سے کہا کہ کوئی بھروسے کا آدمی ہو تو کرائے دار رکھ لوں، ڈرتا بھی ہے۔" اُس نے ایک گالی پر جملہ ختم کیا۔

"کہ کوئی رپورٹ نہ کر دے۔" میں نے کہا۔ "میں سمجھ گیا مگر بھائی میں کرایہ تو پورے مہینے کا دے دوں گا مگر صاف بات ہے کہ رہوں گا دس دن بھی نہیں، بس ایک ہفتہ۔"

"اچھا جی۔" وہ سوچ میں پڑ گیا۔ "ایک بات ہے، آپ اس سے مت کہنا۔"

"کیا نہ کہوں؟" میں نے کہا۔

"یہی کہ آپ ایک ہفتہ رہو گے، کسی سے بھی مت کہنا۔" وہ بولا۔ "ایک ہفتہ تو ایسے ہی گزر جائے گا، کوئی پوچھے تو یہ مت بتانا کہ کرائے پر لیا ہے۔ کہہ دینا کہ... مگر تم سے کوئی کیوں کہے گا۔ ابھی کسی کو معلوم نہیں کہ کوارٹر کسے الاٹ ہوا ہے، تم آؤ جی میرے ساتھ۔"

"لیکن وہ خود آ گیا تو؟"

"وہ... اس کا کیا کام ادھر، بس صبح حاضری لگاتا ہے اور ایک افسر کا اسٹال چلاتا ہے، ریلوے اسٹیشن پر۔" وہ بولا۔ "افسر نے بھی اپنی سالی کے نام سے اسٹال کا ٹھیکا لیا ہوا ہے، چائے کا اسٹال ہے، اُس کی تو حاضری بھی خود بخود لگ جاتی ہے۔ کوارٹر اس نے میرے سپرد کر دیا ہے۔ اب میں اس کو کرایہ پہنچاتا رہوں گا تو وہ خوش، اس کا خدا خوش۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ کیا چکر چلا رہا ہے، وہ مجھ سے ایک ماہ کا کرایہ لے کر جیب میں ڈال لے گا، جس کو کوارٹر الاٹ ہوا ہے، اُسے معلوم ہی نہ ہوگا کہ کوارٹر میں کوئی رہا اور چلا گیا۔ ہفتہ دس دن بعد جب کوئی پکا کرائے دار ملے گا تو اُسے بتا دے گا . . . . گیا۔ وہ اپنی پاور آف اٹارنی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے امانت میں خیانت کا مرتکب ہو رہا تھا۔ ایک ڈاکو کی جیب کاٹ رہا تھا جو فرق ڈاکو اور جیب کترے کے پیشے میں ہوتا ہے وہی کوارٹر کے الاٹی اور اس شخص میں تھا۔ ایک بڑا ہاتھ مارتا تھا۔ یہ اُسی کے مال سے تھوڑا سا لے رہا تھا جیسے کوئی کنوئیں سے ایک ڈول پانی نکال لے تو اس سے کنوئیں میں پانی کم نہیں ہوتا۔ اس حمام میں سب ایک سے تھے۔ وہ افسر جس نے اسٹال کا ٹھیکا فرضی نام سے لے رکھا تھا، فرضی نام اُس کی سالی کا تھا۔ ایک شخص ریلوے سے مفت کی تنخواہ لے رہا تھا۔ افسر اور ماتحت مل کے ریلوے سے کمائی کر رہے تھے۔

"یہ ہے جی کوارٹر۔" وہ اچانک رُک گیا۔ یہ بالکل ویسا ہی کوارٹر تھا، جیسا غازی خاں کا تھا مگر یہ ان کوارٹروں کی قطار کا آخری کوارٹر تھا اور اس اعتبار سے بہترین تھا کہ یہاں آنے جانے کے لیے ہمارا اس آبادی سے گزرنا ضروری نہیں تھا۔ ایک طرف تو کوئی گھر ہی نہیں تھا۔ دوسری طرف والے کوارٹر میں تالا پڑا ہوا تھا۔

"ادھر کون رہتا ہے؟" میں نے جیب سے نوٹ نکالے اور اپنے سامنے کھڑے ہوئے شخص کی آنکھوں میں پیدا ہونے والی حریص چمک دیکھی۔

"ادھر کوئی نہیں، ایک پٹھان سگنل مین تھا۔" وہ بولا۔ "بچارا اپنے فرض کی ادائیگی کے چکر میں جان سے گیا، بڑی بے وقوفی کی۔ مرنے والے کو بُرا کہنا تو نہیں چاہیے مگر دیکھو نا جی، اس تنخواہ کی خاطر جان دے دی۔"

"کیا بے وقوفی سرزد ہوئی تھی اُس سے؟" میں نے کہا۔

"بس، کانٹا غلط بدل دیا تھا، عین وقت پر احساس ہو گیا وہ دوڑا کانٹا بدلنے، جب واپس آ رہا تھا تو دوسری طرف سے گاڑی آ گئی۔"

"اور اگر وہ کانٹا نہ بدلتا، اپنی غلطی کو نہ دیکھتا...؟"

"تو اپ ڈاؤن ایک کھڑی ہوئی مال گاڑی میں گھس جاتی۔" وہ بولا۔ "وہ لنگڑا تھا، پہلے بھی ٹانگ کٹ چکی تھی، جانتا تھا کہ دوڑ نہیں سکتا مگر دوڑ گیا اور کیا ملا جی اسے، کس نے انعام دیا، کس نے پوچھا؟ بیوی بچے لاش لے کر چلے گئے۔ ابھی تک اُن کا سامان پڑا ہے یا پڑا ہوگا اگر چوروں نے چھوڑا ہوگا۔ ابھی تو انکوائری ہو رہی ہے کہ غلطی کس کی تھی، غلطی اُس کی اپنی تھی۔ کچھ بھی نہیں ملے گا اُسے، ملا بھی تو بڑے چکروں کے بعد۔ انکوائری کے بعد اُس کے وارثوں کو ڈیتھ سرٹیفکیٹ لینا پڑے گا، اکاؤنٹ آفس کے چکر لگانا پڑیں گے، پتا نہیں کتنی درخواستیں دینا ہوں گی، کتنے حلف نامے داخل کرنا پڑیں گے۔"

"پھر تو واقعی مرحوم نے بے وقوفی کی، دنیا کے نقطۂ نظر سے۔ اللہ شاید اُس کی قربانی کو شہادت کا درجہ دے۔ اُس نے کتنی زندگیوں کو بچایا، یہ اب کون بتا سکتا ہے۔ انکوائری رپورٹ میں بھی نہیں آئے گا کہ حادثہ نہ ہونے سے کتنے بچے۔ حادثہ ہو جاتا تو مرنے والوں کے اور زخمی ہونے والوں کے اعداد و شمار آ جاتے، خیر چھوڑو، یہ تو اس دنیا کے دھندے ہیں اور اسی طرح چلتے رہیں گے، تم بتاؤ کرایہ کیا دوں؟"

"کرایہ... آپ کو کیا بتاؤں۔" وہ بولا۔

"دو سو کافی ہیں؟" میں نے کہا اور پھر اُس کی آنکھوں میں ایک چمک دیکھی۔

"ہاں جی، آپ تو جانتے ہیں کہ خیر سے کرائے کتنے چڑھ گئے ہیں لاہور میں۔" وہ دونوں نوٹ جھپٹ کے بولا۔ "ویسے آپ کو تکلیف کوئی نہیں ہوگی یہاں، ہر چیز موجود ہے، بجلی پانی اور کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے حکم کریں، آپ غازی خاں کے دوست تو میرے بھی دوست، فیملی کدھر ہے؟"

"وہ گاڑی میں ہے۔" میں نے کہا۔ "میرا ایک دوست ہے، وہ ہمیں چھوڑنے آیا تھا۔"

اُس نے پلٹ کر ماتر دیس کی طرف دیکھا اور چابی مجھے تھما دی۔ "بس تو آپ خیر سے مجھے اجازت دیں، میں ڈیوٹی کے لیے تیار ہوا تھا۔ رات کو آؤں گا لوٹ کے تو کل ملاقات ہو گی۔ سلام علیکم۔" وہ ہاتھ ملا کے چل پڑا۔

میں نے واپس جا کے محسن کو چابی دکھائی۔ "اللہ بڑا کارساز ہے۔ غازی خاں نہیں ملا مگر اس کا نام بھی کام آ گیا۔"

"تُو نے کہا ہوگا کہ میں ڈیرہ اسماعیل خاں ہوں، ڈیرہ غازی خاں کا پھپھیڑ۔" محسن بولا۔

"میں نے کچھ بھی کہا۔ اصل بات یہ ہے کہ لوگوں نے اعتبار کیا۔ ظاہر ہے میری صورت دیکھ کر۔" میں نے کہا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ "خدا کا شکر ہے جس نے مجھے تیری صورت نہیں دی۔"

"شکر تو مجھے بھی ادا کرنا چاہیے کہ خدا نے مجھے تیری سیرت نہیں دی۔" محسن نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ "ورنہ اب تک لنڈورا پھر رہا ہوتا۔ معتبر ہوتے ہیں شادی شدہ لوگ برخوردار! تم جیسے چھانٹ ہر جگہ بدمعاش اور مشتبہ سمجھے گئے ہو اور سمجھے جاؤ گے۔"

"یار وہ تیری سندِ شرافت کا حال کیا ہے؟" میں نے کہا۔ "انکل رضوی تو معطل ہونے کے بعد وہ سرکاری جگہ چھوڑ دیں گے اور ظاہر ہے تیری بیوی اُن کے ساتھ نکل جائے گی۔ گاڑی ذرا ادھر موڑ لے، وہ آخری کوٹھی ہماری ہے۔"

"کوٹھڑی اور کوٹھی میں صرف ایک حرف کا فرق ہے۔" محسن نے سرد آہ بھر کے فلسفیانہ انداز میں فرمایا اور گاڑی کو روک دیا۔

"اسے بالکل سسرال سمجھیے اور گھر داماد کی طرح شان سے رہیے۔" میں نے کہا اور پیچھے والا دروازہ کھینچ کر کھسکا دیا۔ جولی پہلے اُتری۔ اُس لڑکی نے حیرت انگیز طور پر اپنے غم کے آتش فشاں کو بجھا دیا تھا۔ کیتھرین بہت مضبوط اعصاب اور ارادے رکھنے والی عورت تھی۔ جولی کمزور نظر آنے کے باوجود اپنی ماں کی بیٹی ثابت ہو رہی تھی۔ اُس کے انداز و اعتماد میں مجھے ایک نئی خود اعتمادی محسوس ہوئی جو کل تک نہ تھی، شاید اس لیے کہ وہ ماں کی موجودگی میں خود کو بچی سمجھتی تھی۔ جذباتی طور پر ہی نہیں، عملاً بھی کیتھرین نے اُسے ماں باپ بن کے پالا تھا، دوست بن کے سہارا دیا تھا اور محافظ بن کے ہر آزمائش اور ابتلا سے بچایا تھا، اب وہ نہیں رہی تھی تو جولی کا احساسِ خود اعتمادی جاگ اُٹھا تھا اور وہ اپنی ذمّے داریوں کا بار خود اُٹھانے کے لیے تیار ہو گئی تھی۔

جولی نے سراج کی ماں کو نیچے اُتارا۔ "ماں جی! آپ نے ابھی تک ہم سے تعاون کیا ہے۔ اُمید ہے آپ ہماری مجبوریوں کو سمجھتے ہوئے کوئی ایسا موقع نہیں آنے دیں گی کہ بعد میں آپ کو افسوس ہو اور ہمیں ندامت۔"

"چل چل لڑکی، تو یہ سب مت بتا مجھے۔" سراج کی ماں نے برہمی سے کہا۔ "تو نہیں جانتی میں کس کی ماں ہوں۔ میں اگر نہ چاہوں تو تم مجھے ایک منٹ قید نہیں رکھ سکتے، ایک قدم چلنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔"

"ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں ماں جی۔" جولی نے نرمی سے کہا اور سراج کی ماں کو کوارٹر میں لے گئی۔ میں، محسن اور غالب دم بخود کھڑے رہے۔

"تم نے اس لڑکی کی گفتگو سُنی؟" میں نے غالب سے کہا۔

"صرف گفتگو ہی نہیں سُنی، اُس کا لہجہ بھی دیکھا۔" غالب نے سر ہلایا۔

"اور جس انداز سے اُس نے ہم کا لفظ استعمال کیا۔" محسن نے تعریفی انداز میں سر ہلایا۔ "وہ ہم میں سے تھی مگر اُس نے ہمیں اپنی زبان سے احساس دلا دیا کہ ہم اُسے الگ یا کمتر اور غیر ذمّے دار نہ سمجھیں۔ کس آسانی سے اُس نے خود ایک کام اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ہمیں بتا دیا کہ وہ ذمّے داری قبول کر سکتی ہے۔"

"کمال ہے یار۔" میں نے کہا۔ "ہماری مجبوریاں کہہ کے اُس نے دو لفظوں میں ہم پر واضح کر دیا کہ وہ سب جانتی ہے اور سب سمجھتی ہے کہ ہم کیا کر رہے ہیں اور کیوں کر رہے ہیں۔ بے شک وہ آج تک سُنتی آئی تھی مگر مجھے واقعی اندازہ نہ تھا کہ وہ اتنا سمجھتی بھی ہے۔"

"یہ ایک خوشگوار تبدیلی ہے، مثبت اور تعمیری۔" غالب

نے کہا اور سہارے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے اور محسن نے اُسے اُتارا اور اندر پہنچا دیا۔ اندر کچھ بھی نہیں تھا مگر پُرانی بان کی دو دو چارپائیاں دونوں کمروں میں موجود تھیں جو شاید کوارٹر خالی کر کے جانے والے بے مصرف جان کے چھوڑ گئے تھے۔ خسرو جمشید کی گاڑی کا کور ہم ساتھ ڈال لائے تھے۔ اس میں اسلحہ لپیٹ کر ہم نے ایک چارپائی کے نیچے ڈال دیا۔ ضروری تھا کہ چارپائی پر اب ایک دری بستر بھی ہو، اس کے لیے میں اپنے محسن کے گھر گیا جو گھر سے نکل کر روانہ ہونے ہی والا تھا۔

”آپ لوگ اپنے ساتھ کچھ نہیں لے کر چلے تھے؟“ وہ بولا۔

”سب کچھ لے کر چلے تھے بھائی صاحب!“ میں نے کہا۔ ”مگر جس گاڑی میں ہم تھے، اس کا راستے میں ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ بڑے بھائی کی تو ٹانگ ٹوٹی . . .“

”اوہ! کہاں ہوا تھا ایکسیڈنٹ؟“ وہ بولا۔

”راولپنڈی کے قریب۔“ میں نے کہا۔ ”دو دن راولپنڈی میں ہی لگ گئے، ایکسرے ہوا اور پھر پلاستر لگا، گاڑی تو سمجھو ختم ہو گئی تھی۔“

”مگر آپ لوگوں کے خراش بھی نہیں آئی۔“ وہ مجھے دیکھ کے بولا۔

”اسی کو قسمت کہتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”حسن ابدال کے اڈے پر ہم اُتر گئے تھے کہ چائے وغیرہ پی لیں۔ بھائی صاحب گاڑی لے گئے پیٹرول ڈلوانے کے لیے اور وہاں ایک ٹرک نے آ کے ملبہ کر دیا۔ پیٹرول ڈلوا کے نکل رہے تھے کہ وہ غلط سائیڈ سے اندر آ گیا اور بس سامنے سے ٹکر ماری تو . . . بس اللہ نے جان بچا لی۔ گاڑی کو دیکھ کر تو آپ بھی کہتے کہ اس میں کون بچا ہو گا۔ جو سامان تھا، سب غارت ہو گیا۔ ہم تو بڑی مشکل سے راولپنڈی پہنچے اور وہاں سے یہ دوست ہمیں چھوڑنے آ گئے، جن کی گاڑی ہے۔ ادھر چھوٹی بہن ہے کہ اس کو میو اسپتال میں داخل کرا کے آئے ہیں مگر اس کے بچنے کی کوئی اُمید نہیں۔“

وہ ایک دم چونکا۔ ”میو اسپتال میں . . . ! یہ تو آپ نے پہلے بتانا تھا جی! کیا ہوا ہے اُسے؟“

”بس جی کیا بتائیں، جو بیماریاں پہلے بوڑھوں کو ہوتی تھیں، وہ اب جوانوں کو ہونے لگی ہیں۔ جوان لڑکی کو شکر کی بیماری ہو گئی پھر گُردوں میں پتھری پڑی تو معاملہ خراب ہو گیا۔ پشاور کے ڈاکٹروں نے پوری کوشش کر لی تھی مگر حالت بگڑتی جا رہی تھی۔ سُنا ہے یہاں میو اسپتال میں بڑے ماہر ڈاکٹر ہیں اور بڑا اچھا انتظام ہے۔ اللہ ہی بچانے والا ہے۔“

اس نے ایک سرد آہ بھری۔ ”تو ابھی آپ میو اسپتال سے آئے تھے؟“

”ہاں جی، صبح کے لاہور پہنچے ہوئے تھے، اسپتال میں دن گزر گیا۔“ میں نے کہا۔ ”پھر یہاں آئے تو بھائی غازی خاں نہیں۔ اب خدا کی قدرت دیکھو کہ ہم اس وقت حسن ابدال میں تھے اور وہ ٹیکسلا میں۔ کہاں پشاور اور لاہور کا فاصلہ اور کہاں کہ وہ چند میل پر بیوی کی آنکھوں کا آپریشن کرا کے بیٹھے تھے اور وہیں ہمارا ایکسیڈنٹ ہُوا۔ انھیں پتا چلتا تو دوڑے آتے۔ اب بیٹھنے کی جگہ بن گئی ہے، کچھ کھا پی لیں تو پھر اسپتال جائیں۔“

”آپ اللہ پر بھروسا رکھو جی۔“ وہ بولا۔ ”اور دُعا کرو، آج داتا صاحب کے حضور میں جا کے، میں چادر تکیے اپنے گھر سے پورے نہیں کر سکتا۔ غازی خاں کے گھر سے نکال دیتا ہوں، بلکہ آپ یہ چابی لو، جو چیز ضرورت پڑے، وہاں سے لے کر پھر تالا ڈال دینا اور چابی میری گھر والی کو دے دینا، مجھے دیر ہو رہی ہے۔“

میں نے چابی لے لی اور اُسے سائیکل کے پیڈل مارکے جاتا ہُوا دیکھتا رہا۔ یہ اعتبار کرنے والے اور مدد کرنے والے سادہ دل لوگ اگر جان لیں کہ ہم کون ہیں اور ہمارے جھوٹ کا انکشاف ہو جائے تو ان کا ردِعمل کیا ہو گا۔ میں نے سوچا۔ اطمینان مجھے یہ تھا کہ غازی خاں آ جائے گا تو میری پوزیشن خراب نہیں ہو گی بلکہ مزید بہتر ہو جائے گی۔ چابی سے قفل کھولنے کے بعد میں کچھ دیر ایک گزرے ہوئے وقت کی تصویر کو دیکھتا رہا۔ اس میں غازی خاں تھا اور اُس کی اندھی بیوی تھی اور میں تھا مگر سارا حسن اُس فضا میں تھا جو میرے فرشتۂ رحمت کی صورت میں اچانک آ جانے سے پیدا ہوئی تھی۔ احسان مندی اور ممنونیت کے جذبات سے میرے دل کو جو طمانیت اور خوشی حاصل ہوئی تھی، وہ ایک انمول احساس رکھتی تھی۔ اُس کی یاد بھی بڑی تسکین دینے والی تھی مگر اس وقت مجھے یوں لگا جیسے اپنے اعتماد سے ناجائز فائدہ اُٹھا کے میں نے وہ تصویر خراب کر دی ہے اور اس احساس کو مجروح کر دیا ہے۔ میں نے پہلے بھی غازی خاں سے جھوٹ بولا تھا مگر اس کا مقصد نیکی کرنا تھا۔ آج پھر میں جھوٹ کے سہارے اس گھر میں آیا تھا تو اس نیکی کا صلہ وصول کر رہا تھا۔

میں جانتا تھا کہ غازی خاں کو کبھی میرے جھوٹ کا پتا نہیں چلے گا مگر وہاں سے سامان اُٹھاتے ہوئے تھوڑی سی شرمندگی کا احساس مجھ پر غالب رہا۔ میں نے دریاں، میلے بستر اور تکیے ہی نہیں، ضرورت کے برتن بھی اُٹھائے اور آس کوارٹر میں لے گیا جہاں ہمارا بسیرا تھا۔ محسن نے مقامی تنور سے روٹیاں اور سالن خریدنے کا نیک کام کیا اور بھوکوں کا پیٹ بھرا۔ سراج کی ماں نے برائے نام کھایا اور پڑ کے سو گئی، وہ بوڑھی عورت اس تگ و دو میں تھک گئی تھی۔ اُس نے خود کو ہمارے اور نذیر کے سپُرد کر دیا تھا اور ذہنی طور پر قبول کر لیا تھا کہ رہائی ہو گی تو اپنے وقت پر، اس کے فکر کرنے یا احتجاج کرنے سے کچھ نہیں ہو گا۔ ہم نے اسے مُجولی کی نگرانی میں ایک کمرے میں چھوڑا اور خود دوسرے کمرے میں بیٹھ کے سگریٹیں پھونکنے لگے۔ فراغت کا وقفہ میسر آتے ہی سب پر غنودگی طاری ہونے لگی تھی۔

میں نے ٹھنڈے پانی سے ہاتھ مُنہ دھو لیا۔ محسن نے بھی یہی کیا تھا۔ اس سے ہمارے تھکے ہوئے جسم اور جاگی ہوئی آنکھوں کو کچھ سکون ملا۔ میں نے ایک فرضی بہن کے میو اسپتال میں قریبِ مرگ ہونے کا تذکرہ اس لیے کیا تھا کہ میرے ذہن میں عائشہ کی خود تدفین کا خیال ابھی تک موجود تھا۔ میں اس بات کے امکانات پر غور کر رہا تھا کہ اگر ایک کہانی سُنانے کے بعد ہم وہ لاش یہاں اُٹھا لائیں اور مشہور کر دیں کہ وہ اسپتال میں مر گئی تھی۔ لاش کسی کرائے کی ایمبولینس میں بھی لائی جا سکتی تھی تو کیا یہاں سے اُسے باقاعدہ جنازے کی صورت میں لے جانا ممکن ہو گا؟

محسن اور غالب نے میرے خیال کی مخالفت کی۔

”اس چکر میں مت پڑو۔“ محسن نے کہا۔ ”وہ جانے اور دلاور جانے۔“

”میں دلاور کو اسی دباؤ میں رکھنا چاہتا تھا کہ عائشہ ہمارے پاس ہے۔“

”مگر اس میں بہت سی نئی پریشانیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔“ غالب نے کہا۔ ”کہیں کسی کو شک ہو گیا تو پولیس کو اطلاع کر دے گا۔“

”ویسے بھی لاش کو یہاں لا کے ہم یہ پورا ڈراما اسٹیج کرنے پر مجبور ہوں گے۔ سب کے سامنے رونا دھونا اور مغموم نظر آنا، لوگوں کی تعزیت وصول کرنا، تجہیز و تکفین اور پھر اس کے بعد کی رسومات۔ مُجولی تو شاید ہمارے ساتھ اداکاری کر لے مگر سراج کی ماں بھی ہے، وہ اتنا برداشت نہیں کرے گی۔ سب کے سامنے چِلّانے لگی تو سمجھو مارے گئے۔“ محسن نے کہا۔

”ٹھیک ہے، پھر ہم دلاور کو ہی اطلاع کر دیتے ہیں۔“ میں نے ان کے دلائل سے قائل ہو کے کہا۔ ”اس کے لیے بھی کہیں فون کرنا ضروری ہو گا۔“

”فون ہم کر دیں گے، ہمیں ویسے بھی جانا ہے۔“ محسن نے کہا۔ ”ہاں، وہ ٹریلر کا سودا ہو جائے تو کچھ آگے کی پلاننگ کریں۔ اس کے لیے ہمیں ایک ہفتہ شہر میں پھرنے کا رسک لینا ہو گا۔“ میں نے کہا۔ ”اس گاڑی کو دوبارہ یہاں نظر نہیں آنا چاہیے اور محسن کو بھی۔“

”تو کیا میں گاڑی جنگل میں کھڑی کر کے رات گاڑی میں گزارا کروں گا؟“ محسن بولا۔

”نہیں، گاڑی کو یہاں سے کچھ فاصلے پر کوئی محفوظ جگہ دیکھ کر پارک کیا جا سکتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”جہاں سے ہم صبح پہلے سکیں تو رات کے وقت اندر آ کے رہ سکتا ہے۔ کوئی بھی سیدھا گھر میں نہیں آئے گا، پردہ ہے۔“

”تم اب چاہو تو سو جاؤ۔“ میں نے غالب سے کہا۔ ”رات تک سوتے رہو، واپس آ کے ہم سوئیں گے اور تم جاگو گے، کل انشاء اللہ تم کو کسی ڈاکٹر کو بھی دکھائیں گے۔“

”میری دوائیں تو لیتے آنا یار۔“ غالب نے کہا۔ ”خدا کرے یہ ہفتہ ختم ہونے تک اس پلاستر کا جنجال بھی ختم ہو جائے۔“

ہم مُجولی کو تسلی دے کر روانہ ہوئے تو پہلے کے مقابلے میں زیادہ پُرسکون تھے۔ نوٹوں سے بھرا ہُوا سوٹ کیس ہماری گاڑی میں پیچھے کی سیٹ کے نیچے رکھا ہُوا تھا۔ ایک ایک بھرا ہُوا ریوالور ہم دونوں نے چھپا رکھا تھا اور گاڑی پھر محسن چلا رہا تھا۔

”میرا خیال ہے گاڑی پر نیا رنگ کرا لیا جائے۔“ محسن نے اچانک کہا۔ ”ابھی نہ سہی، یہاں سے چلتے وقت۔“

”رنگ کھڑے کھڑے نہیں ہو جاتا۔“ میں نے کہا۔ ”نیا رنگ کم سے کم ایک ہفتے میں ہوتا ہے۔“

”میں چاہتا ہوں یہ گاڑی کچھ پُرانی نظر آئے۔“ محسن بولا۔ ”اور کوئی اس پر پینٹ کا ایک اسپرے کر دے۔ کھڑے کھڑے ایک کوٹ کر دے جو اس رنگ کو بدل دے مثلاً اس پر سفید رنگ پھیر دے، صفائی کی ضرورت نہیں، شیشوں وغیرہ پر اور نکل والے حصوں پر اسپرے پڑ جائے تو کوئی ہرج نہیں اور یہ میں بعد میں بتاؤں گا کہ دنوں کا کام گھنٹوں میں کیسے ہوتا ہے۔“

”فی الحال میری ایک تجویز ہے، ہمیشہ کی طرح منفرد، ایک جینئس کے ذہن کی پیداوار۔“ میں نے کہا۔

”جینئس آدھے پاگل مشہور ہوتے ہیں، پورے پاگل نہیں ہوتے۔“

”تجویز یہ ہے عزیزم!“ میں نے اُس کی بات کا بُرا مانے بغیر کہا۔ ”کہ گاڑی پر ہم کسی سرکاری محکمے یا ادارے کا نام لکھوا لیں۔ گاڑی کے دونوں طرف ایک پٹی ہو لال رنگ کے حروف کی۔“

”اور نام کیا ہو، محکمۂ پرورش حیوانات۔“ محسن بولا۔

”نہیں، ایسا جو اچھا بھی لگے مگر کسی کی سمجھ میں بھی نہ آئے۔“ میں نے کہا۔ ”جو دیکھے، وہ سوچنے کے سوا کچھ نہ کرے کہ کیا ایسا بھی کوئی ادارہ ہے اور سمجھ لے کہ ہو گا۔ سرکاری گاڑی شک سے

محفوظ رہتی ہے۔ آگے پیچھے کی نمبر پلیٹ پر ولیسٹ پاکستان گورنمنٹ بھی لکھوایا جا سکتا ہے۔"

"میں تجویز کی معقولیت کے امکانات پر موافقت کے دلائل سے اتفاق کرنے پر آمادگی کے جائزے کی رپورٹ پر غور کرنا مناسب سمجھتے ہوئے۔۔۔"

"فضول بکواس سے گریز کیجیے۔" میں نے کہا۔ "اور مجھے زحمت نہ دیجیے کہ میں آپ کے ساتھ وہ کروں جو دلاور نہیں کر سکا۔"

"بھائی صاحب! میں نے یہی تو کہا ہے کہ تجویز اچھی ہے۔"

"تو پھر نام بتائیے۔ مثلاً کنٹرولر آف پروڈکشن۔" میں نے کہا۔

"یہ تو بڑی ادھوری سی بات ہوئی، کس چیز کی پروڈکشن؟"

"یہ سمجھنے والے کی مرضی ہے کہ وہ جس چیز کی پیداوار چاہے سمجھے، زرعی یا صنعتی پیداوار۔۔۔ فلم پروڈکشن، چائلڈ پروڈکشن۔" میں نے کہا۔

محسن ہنسا۔ "اچھا ہے مگر امپریس نہیں کرتا۔"

"اچھا۔۔۔ تو۔۔۔" میں نے غور کر کے کہا۔ "ڈائریکٹریٹ آف ڈائریکٹ ڈسپوزل۔"

محسن نے قہقہہ مارا۔ "زبردست، بہترین متبادل ہے، ایم آر ایس کا، ہم یہی تو کرتے ہیں، براہِ راست ہر معاملے کو نمٹاتے ہیں۔"

ایک فارغ بیٹھے ہوئے آدم بیزار پینٹر نے اس مائکروبس پر انگریزی حروف میں اس غیر موجود محکمے کا نام لکھنے کے سو روپے مانگے، وہ اپنے کام میں ماہر تھا اور اس کا ہاتھ بہت صاف چلتا تھا مگر خرابی یہ تھی کہ اس کی زبان کی دھار تیز تھی۔ وہ بات نہیں کرتا تھا، کاٹتا تھا اور غالباً اسی لیے بے روزگار تھا۔ اس نے دونوں طرف چار انچ کے حروف لکھے اور آگے پیچھے کی نمبر پلیٹ پر ڈیڑھ انچ کے، یہ سارا کام اس نے ایک گھنٹے سے بھی کم وقت میں مکمل کر لیا۔ یہ اسکیم ایک نفسیاتی چال بن گئی جو ہمیں بہترین تحفظ فراہم کر سکتی تھی۔

کسی گاڑی پر سرکاری محکمے کا نام ہو تو وہ معتبر ہو جاتی ہے۔

"اب تو ہم ناکا بندی سے بھی گزر سکتے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "شرطیہ۔"

"ہاں کوئی سرکاری گاڑی میں کسی مجرم کا تصور ہی نہیں کرتا اور اگر اس میں خواتین ہوں تو اچھے خاصے پولیس افسر پیچھے ہٹ جاتے ہیں کہ ہو گی محکمے کے کسی اعلیٰ افسر کی فیملی۔" میں نے کہا۔

"اگر ہم میں سے ایک شوفر کی وردی بھی پہن لے تو کام پکا ہو جائے۔" محسن بولا۔

"وردی تو ریگل سے مل جائے گی، جوتے ٹوپی سمیت۔" میں نے کہا۔

"اب پہلے ٹیلی فون کر لیں۔" محسن نے کہا۔ "ایک کال تو میں بھی کروں گا۔"

"اپنی نصف بہتر کو۔۔۔؟" میں نے کہا۔ "اجازت ہے ویسے تو ہم سرکاری ٹیلی فون پر میاں بیوی کو بھی عشق نہیں کرنے دیتے لیکن خیال آتا ہے کہ آج تم کل ہماری باری ہے اس لیے قانون میں رعایت کرتے ہیں۔"

"تو بھی آج رات پھر کوشش کرنا یار! آخر رابعہ نے وہ نمبر دیا تھا تو کوئی وجہ ضرور ہو گی۔" محسن نے کہا۔

دلاور کو میں نے ایرمال کے قریب ایک پول سے فون کیا۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ اپنے سسرال میں ہو گا اور اس گھر سے آج ایک نہیں دو جنازے اٹھے ہوں گے ظاہر ہے وہاں کی فضا سخت ماتمی ہو گی۔ ایک بچے نے ریسیور اٹھایا اور دلاور کو اطلاع دی۔

"کون بول رہا ہے؟" دلاور نے کہا۔

"وہ شخص جو جانتا ہے کہ تم نے اپنی بیوی کو قتل کیا ہے۔"

"تمہارے جاننے میں اور دنیا کے جاننے میں بہت فرق ہے، کوشش کر کے دیکھ لو۔" وہ ضبط سے کام لیتے ہوئے بولا۔ اس نے میرا نام بھی نہیں لیا۔

"دوسری شادی کب رچا رہے ہو؟" میں نے کہا۔ "تمہاری دلہن تمہارے انتظار میں چشم براہ ہے۔"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"میں تم کو ایک پتا بتانا چاہتا ہوں۔ اچھی طرح ذہن نشین کر لو کیونکہ میں دوبارہ فون نہیں کروں گا۔" میں نے کہا۔

"وہ۔۔۔ وہ کہاں ہے؟" اس نے عائشہ کا نام لینے سے گریز کیا اور آواز بھی کم رکھی، شاید اس گھر میں اور لوگ بھی قریب ہی تھے جن کے سامنے وہ کھل کے بات کرتے ہوئے ڈرتا تھا اور یہ بھی ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ کس سے مخاطب ہے۔

میں نے اسے پتا سمجھا دیا۔ "دیر مت کرنا، وہ اکیلی ہے وہاں۔" اور فون بند کر دیا۔ چشمِ تصور سے میں نے اسے بہرام دادا کے خانۂ ویراں میں جا کے عائشہ کی لاش دریافت کرتے دیکھا۔ اس کی صورت کے ردِ عمل کو دیکھا، اس اذیت کو دیکھا جو اس سزا کا نتیجہ تھی اور میرے دل کو ایک کمینی سی طمانیت دینے والی خوشی ہوئی، جیسے میں نے رابعہ کی ساری تذلیل اور اس کے ساتھ ہونے والی ہر زیادتی کا تھوڑا سا حساب برابر کر دیا ہے۔

یہ وقت شہلا سے بات کرنے کے لیے مناسب نہیں۔ محسن کا خیال تھا کہ براہِ راست انکل رضوی سے لائن مل سکے گی۔ شہلا کو رات کے وقت بلانا آسان ہو گا جب انکل رضوی کھانے کے بعد اپنی اسٹڈی میں جا چکے ہوں گے۔

"ہم مائکروبس کے کاغذات لے لیں۔" میں نے کہا۔ "اس نے چار بجے کا وقت دیا تھا۔"

"اگر اس نے ٹریلر کا بندوبست کر دیا تو کیا بات ہے۔"

"پیسے کے لالچ میں وہ خود بھیجے گا۔" میں نے کہا۔ "ہمیں یا ضرورت ہے ہر ڈیلر سے ملنے کی یہ لوگ کمیشن کی بنیاد پر سودے کرتے ہیں، اگر کسی دوسرے ڈیلر کے پاس ہمارے مطلب کی چیز ہو گی تو وہ ہمیں نہیں بھیجے گا، دوسرے ڈیلر کو ہمارا نام پتا کچھ نہیں بتائے گا۔ یہی کہے گا کہ ہے ایک جینوین پارٹی۔۔۔ سودا فائنل کرے گا تو ہم سے رقم لے کر ادائیگی کرا دے گا۔ دوسری پارٹی کو اپنے کمیشن سے غرض۔ یہ بیچ میں اپنا منافع کھرا کرے گا۔ پچاس ہزار تو ضرور زیادہ اینٹھے گا ہم سے۔"

شوروم کا مالک ہمارے انتظار کی گھڑیاں ایسے گن رہا تھا جیسے فرقت زدہ عاشق تارے گنتے ہیں۔ وہ لپک کر آیا اور اس نے فرداً فرداً مجھ سے اور محسن سے ہاتھ ملا کے سینے پر رکھا۔

"مبارک۔۔ مبارک خان صاحب؟" وہ بولا۔ "مل گئی۔"

"اچھا۔۔ کیسی اے؟" محسن بولا۔ "امارا مطلب ہے رنگ کیسا ہے؟"

"رنگ۔۔۔ رنگ سبز۔۔۔"

"اور قد۔۔ وزن۔۔۔ عمر کیا اے۔۔۔ کتنا پڑھی ہوئی ہے، ذات اور باپ۔۔۔"

"بھائی صاحب! یہ گاڑی کی بات کرتا ہے، آپ کے رشتے کا نئیں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "خو یارا ماف کرنا، ام اپنا بھائی کا واسطے لڑکی بھی تلاش کرتا ہے، بھائی صاحب سمجھا۔ تیرہ ور بوڑھا"

شوروم کے مالک کی صورت جو پرانے جوتے کی طرح ہو گئی تھی پھر چمکنے لگی۔ "جناب! آپ چل کے ملاحظہ فرمائیں۔ آپ بہت خوش قسمت ہیں، پارٹی ذرا اڑی ہوئی ہے۔"

"کون سا پارٹی؟ ام سب کا اڑی ٹھیک کر دے گا۔ لالرا پارٹی۔۔۔"

"بھائی صاحب! یہ سیاسی پارٹی کا نئیں بولتا۔" میں نے محسن کو ٹوکا۔ "معاف کرنا مارڈا بھائی صاحب سیاست میں گھس گیا ہے، بولتا ہے ام وزیر بنے گا۔"

"جی۔۔۔ جی۔۔۔" شوروم کا مالک بولا۔ "ساڑھے چار لاکھ مانگ رہے ہیں وہ۔۔ مگر ہم چار لاکھ سامنے رکھیں گے تو سودا ہو جائے گا، بیعانہ میں نے دے دیا ہے، آپ گاڑی تو ابھی دیکھ لیں مگر بات کل ہو گی۔"

"چلو مگر امارا گاڑی کا کاغذ بنایا اے تم نے؟" میں نے کہا۔

"وہ۔۔۔۔ ہاں۔" اس نے ایک میز کی دراز کھینچی۔ "یہ لیجیے، سب کام مکمل کرا لیا ایک ہی دن میں، رشوت تو دینا پڑی مجھے اپنی جیب سے مگر خیر کوئی بات نہیں۔ کیا اب چلیں؟" میں نے سر ہلایا۔

وہ مائکروبس کے قریب آیا تو ٹھٹک کے رک گیا۔ "یہ ڈائریکٹریٹ آف ڈائریکٹ ڈسپوزل۔" اس نے نام پڑھا۔ "یہ کون سا محکمہ ہے، میرا مطلب ہے کیا کرتا ہے؟"

"ڈائریکٹ ڈسپوزل۔" میں نے کہا۔ "کسی کا بھی ہو سکتا ہے تمہارا بھی، ام ڈائریکٹر اے۔"

"جی!" وہ گڑبڑا کے بولا اور پیچھے کا دروازہ گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

میں اور محسن فرنچ میں باتیں کرتے رہے۔ دلاور کے بارے میں کہ وہ عائشہ کی لاش اٹھاتے ہوئے کس قدر اپ سیٹ ہو گا اور ہمیں کیسی گالیاں دے گا اور خسرو جمشید کے بارے میں جس کی اکلوتی ناز پروردہ فنکار مزاج کی مالک اور عیاری میں لومڑی جیسی بہن نے بھائی کے گناہوں کی بڑی بھاری قیمت ادا کی مگر کیا اس سانحے کے بعد اور حقائق سے آگاہی کے بعد وہ سراج سے شادی کرے گی؟

شوروم کا مالک بھونچکا بیٹھا رہا۔ اس کے پلّے نہ ہم پڑے تھے اور نہ ہماری زبان پڑ رہی تھی۔ اتنا تو وہ بھی جانتا ہو گا کہ یہ پشتو نہیں ہے اور ممکن ہے اس نے اندازہ کر لیا ہو کہ یہ فرنچ ہے۔ ہمارے پیسے کے علاوہ اسے میرے عہدے نے متاثر کیا تھا اور اب میری فرنچ نے۔

"جناب برا نہ مانیں تو پوچھوں؟" وہ بولا۔ "یہ آپ لوگ کس چیز کا ڈسپوزل کرتے ہیں، گورنمنٹ آکشنرز ہیں کیا؟"

"یہ آدمی بے وقوف اے۔" محسن نے کہا۔

"بھائی صاحب، بے وقوف نہیں جاہل اے۔" میں نے کہا۔

"اس جاہل کو بولو چپ کرے، ورنہ ام اس کا منہ بند کر دے گا، ہر طرف سے۔" محسن بولا۔

ظاہر ہے اس کے بعد شوروم کے مالک کے بولنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کی بے عزتی ہوئی تھی لیکن وہ عزت پر حملے کے خلاف شور مچاتا تو اپنا سودا خراب کرتا۔ اس نے خود کو قائل کر لیا ہو گا کہ وہ بازار میں عزت کمانے کے لیے نہیں پیسہ کمانے کے لیے بیٹھا ہے۔ وہ بڑی افسردگی سے ہمیں ہدایات دے

رہا۔ بلوامی باغ کے قریب اُس نے ایک احاطے کے قریب گاڑی رکوانے کو کہا۔ یہ کسی گڈز فارورڈنگ ایجنسی کا آفس تھا۔

"گاڑی اندر لے چلیں؟" اُس نے کہا "معلوم نہیں آج ان کا دفتر ابھی تک کیوں کھلا ہُوا ہے؟"

"اگر ابھی بات کرتا اے تو اَم ابھی پیسہ دے گا۔" مَیں نے گاڑی کو گیٹ سے اندر لے جا کے ایک سائڈ پر کھڑا کر دیا۔ ٹریلر مجھے گاڑی کو گیٹ کی طرف موڑتے ہی نظر آ گیا تھا۔ دائیں ہاتھ پر بہت سے ٹرک ایک قطار میں کھڑے ہوئے تھے۔ وہ ٹریلر بائیں جانب تھا۔ چالیس فٹ کا کنٹینر جس ٹریلر پر رکھا ہُوا تھا، اُس کے چیسس کے نیچے بارہ ٹائر تھے جو ہر پہیے میں دو ایک ساتھ لگائے گئے تھے، اُس کا وزن سہارنے کے لیے ٹریلر کے تین پہیے ایک طرف تھے اور تین ہی دوسری طرف آگے پیچھے اور درمیان میں، اس [illegible] کا ایک طاقتور انجن کھینچتا تھا جس میں ڈرائیور کا کیبن [illegible] سے آٹھ فٹ اُوپر تھا۔ انجن اور کیبن کے نیچے [illegible] دو ٹائر تھے کیونکہ اس پر کوئی وزن نہیں پڑتا تھا۔ لمبے فاصلوں کے لیے یہ کارگو کنٹینر ساری دُنیا میں بھاری ساز و سامان کی نقل و حرکت کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ ٹریلر کے پیچھے چمکنے والے زرد اور سرخ رنگ کی لکیریں تھیں اور واضح حروف میں لکھا ہُوا تھا "لانگ وہیکل" یہ وارننگ سڑک پر دوسرے ڈرائیوروں کے لیے تھی۔

مَیں نے اور محسن نے اُسے ہر طرف سے دیکھا اور پسند کیا۔ یہ بالکل آئیڈیل چیز تھی اور میرے پروگرام کی ضروریات کے عین مطابق بھی۔ اس کی حالت بھی اچھی تھی، اُسے بالکل نیا نہیں کہا جا سکتا تھا مگر اس کی دیکھ بھال صحیح طریقے سے کی گئی تھی چنانچہ یہ نیا ہی معلوم ہوتا تھا۔ ہمارے ساتھ آنے والا شوروم کا مالک نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ ایک پستہ قد اور گول مٹول شخص کے ساتھ نمودار ہُوا جس کے چہرے پر چیچک کے پُرانے داغ تھے۔

"یہ ہیں جی مالک!" شوروم کے مالک نے ہمیں متعارف کرایا۔ وہ غالباً ٹریلر کے مالک سے بات کر آیا تھا کہ ان بے وقوف نظر آنے والوں کو بے وقوف مت سمجھنا، یہ صرف پیسہ پھینکنے کے معاملے میں بے وقوف ہیں اور وہ بھی شاید اس لیے کہ پیسہ گورنمنٹ کا ہے۔

"اَم اس کو لے گا۔" مَیں نے کہا "مگر ساڑھے چار لاکھ نئیں دے گا۔"

"چار لاکھ دے گا۔" محسن نے سر ہلایا۔

"[illegible] ظلم ہے جناب؟" ٹریلر کے مالک نے شور مچانا

شروع کیا۔ "آپ چیز بھی تو دیکھیں۔ یہ کوئی ہر شوروم میں ملنے والی گاڑی نہیں ہے۔ مَیں تو شرط لگانے کو تیار ہُوں کہ پورے لاہور میں یہ ایک ہی ہے۔"

"شرط لگائے گا؟" محسن نے کہا "ٹھیک اے، اَم بھی شرط لگائے گا، ایک لاکھ کا۔"

ٹریلر کا مالک گڑبڑا گیا "وہ جناب... دیکھیں میرا مقصد یہ مطلب نہیں تھا، مَیں غریب آدمی ایک لاکھ کی شرط کیسے لگا سکتا ہُوں، وہ تو میرے مُنہ سے ایک بات ایسے ہی نکل گئی۔ آپ ایسا کریں سوا چار لاکھ کر لیں۔"

"اَم چار لاکھ دے گا۔" محسن نے فیصلہ کُن لہجے میں کہا۔

"ابھی دے گا، نقد..." مَیں نے کہا۔

"دیکھیے خان صاحب! ہم معمولی لوگوں سے سودے نہیں کرتے اور جو چیز ہمارے پاس ملتی ہے، وہ کسی کے پاس ملتی بھی نہیں۔" ٹریلر کا مالک بولا "ہم تو آدمی کو پہچانتے ہیں۔ آپ انشاءاللہ پھر آئیں گے، ہمارے تو مستقل گاہک ہیں اور سب بڑے بزنس مین ہیں۔ مثلاً آپ ان کو دیکھیں، یہ بھی ہمارے پُرانے گاہک ہیں، ان سے پوچھ لیں آپ ہمارے بارے میں۔"

مَیں نے پلٹ کے دیکھا۔ ایک کار سے اُستاد پیڈرو اُتر رہا تھا۔ اُس کے ساتھ ساتھ دو بلڈاگ کی شکل والے بد[illegible] تھے۔

وہ

ہم سے سو گز یا اس سے کچھ کم فاصلے پر وہاں تھا جہاں ٹرک کھڑے ہوئے تھے۔ محسن نے بھی اُسے دیکھ لیا تھا اور پیڈرو نے اگر ہمیں دیکھا تو پہچانا نہیں تھا۔ ہم اُسے کئی ماہ کے وقفے سے دیکھ رہے تھے لیکن وہ اپنے اصل حُلیے میں تھا۔ وہ جس کار سے اُترا تھا، وہ سلیٹی رنگ کی اور بالکل نئے ماڈل کی ٹویوٹا کرونا تھی۔ پیڈرو نے دروازہ بند کیا اور چابی گھماتا آفس میں چلا گیا۔

"یہ تمہارا ساتھ کب سے ہے؟" مَیں نے کہا۔

"یہ تو ہمارے دیرینہ کرم فرما ہیں۔" گڈز فارورڈنگ ایجنسی کا ڈیلر بولا "دراصل ہم گاڑیاں بیچتے نہیں، کبھی کوئی ٹرک پُرانا ہو جائے اس پر مرمت کے اخراجات زیادہ آنے لگیں اور لمبے راستوں پر بریک ڈاؤن زیادہ ہونے لگیں تو اُسے نکال دیتے ہیں۔ گاہک کے لیے تو وقت کی قیمت ہے جناب! یہاں سے مال بھیجا جائے اور وقت پر نہ پہنچے تو اُس کا جہاز نکل جائے گا۔ آگے باہر کے کسی ملک کی پارٹی کے ساتھ جو معاہدہ ہے، وہ ختم ہو جائے گا اور وہ سارے نقصانات ہم سے وصول کرنے آ جائے گا۔"

"ایسا ہُوا ہے کبھی؟" مَیں نے کہا۔

"نہیں، ابھی تک تو نہیں ہُوا۔" وہ بولا "اللہ کا شکر ہے جیسے ہی کوئی ٹرک بھروسے کے قابل نہیں رہتا اُسے بدل دیتے ہیں۔"

مَیں نے افسوس سے سر ہلایا "ایسے تو بوت نقصان ہوتا اے۔"

"نہیں خان صاحب! نقصان ہو تو دھندا ہی کیوں کریں۔" وہ بولا "ٹرک ایسے ختم نہیں ہوتا، اپنی لاگت نکال دیتا ہے۔ اس کے بعد بھی آدھی قیمت پر کوئی لے لیتا ہے، یہ آدھی قیمت ہمارا منافع بن جاتی ہے اور اب آپ سے کیا پردہ، سب کام مل کے ہوتا ہے۔"

"ہاں، اللہ کا مرضی شامل ہوتا ہے۔" محسن نے سر ہلایا۔

"جی... ہاں... وہ تو خیر ہے... میرا مطلب تھا کہ بندوں کی مرضی بھی شامل ہوتی ہے۔" وہ ڈھٹائی سے ہنسا "سرکاری محکموں کو نیا بنا کے بھی بیچ دیتے ہیں لوگ... یہی ان جیسے لوگ۔" وہ شوروم کے مالک کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ شوروم کے مالک کا رنگ فق ہو گیا کیونکہ وہ تو جانتا تھا کہ ہم بھی سرکاری آدمی ہیں۔

مَیں حوصلہ افزا اور معاملہ فہم انداز میں مسکرایا "ہم بھی سُنا ہے کہ ایسا ہوتا اے مگر یارا کیسے ہوتا ہے؟"

"بس جی، پُرانے ٹرک پر نیا رنگ روغن، ڈینٹ پینٹ کرایا اور اس کی نئی رجسٹریشن کرا دی۔ موٹر رجسٹریشن والے نے پانچ ہزار بنا لیے، باقی حکومت کو پچاس کی چیز سو میں پڑی تو کسی کا کیا گیا، باقی پچاس آدھے آدھے، ڈیلر کے اور خریدار کے۔"

"کوئی اُس کو دیکھ کر پُرانا نہیں بولتا؟"

"واہ خان صاحب! نیا چمکتا ہُوا رنگ ہو، نئی رجسٹریشن ہو اور مجاز افسر اسے نیا تسلیم کرے تو پُرانا کون کہے گا۔" وہ ہنسا۔

"او بھائی، تو کم دی گل کرا ایتاں نال یار۔" شوروم کا مالک گھبرا کے پنجابی پر اُتر آیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ سرکاری محکموں میں گھپلے کا موضوع مزید طویل ہو۔

"ہاں جی، تو پھر ٹھیک ہے۔" وہ بولا۔

"ایک دم ٹھیک اے۔" مَیں نے کہا "ابھی بولو ہم قیمت ادا کر دے... نقد...؟"

"نقد... دیکھیں، بیعانہ تو آپ نے دے دیا۔" ٹریلر بیچنے والے نے کہا "چیز آپ کی ہو گئی۔ بہتر ہے آپ ادائیگی صبح کر دیں، ہم رات کو اتنا کیش کہاں رکھیں گے؟"

"خو یارا! اَم بھی تو رکھے گا۔" محسن بولا۔

"وہ... دراصل کسی کی نیت بدلتے دیر نہیں لگتی، مالک اس وقت یہاں نہیں۔" وہ بولا "رقم وہی لیتے ہیں اور رسید بھی وہی دیں گے۔"

"اچھا اچھا۔" مَیں نے سر ہلایا "اَم صبح آئے گا، یارا! ایک بات بولو۔"

"فرمائیے۔"

"یہ تو نیا گاڑی لگتا ہے جو اَم خریدا اے مگر تم بولتا کہ جب گاڑی تنگ کرتا تو تم اس کو بیچتا۔" مَیں نے کہا۔

"لاحول ولا قوۃ۔ خان صاحب! یہ وہ عام قسم کا ٹرک نہیں ہے، یہ تو ہمارے کام کا ہی نہیں ورنہ ہم رکھ لیتے۔" وہ بولا "اسے ہم نہیں، کوئی اور بیچ رہا ہے، وہ اِدھر مال لے کر آیا تھا، یہاں سے اُسے کہیں اور جانا تھا۔"

"وہ اس ٹریلر کو یہاں چھوڑ گیا۔" ہمارے ساتھ آنے والے شوروم کے مالک نے کہا "اُسے اپنے مال کی قیمت تو مل ہی گئی تھی، وہ اس ٹریلر کو بھی بیچ گیا۔ گڈز فارورڈنگ ایجنسی کے مالک نے نقد رقم دے کر لیا تھا۔"

"مگر یہ بولتا کہ اس کا مطلب کا نہیں تو پھر کیوں لیا؟"

"بس اس لیے کہ کوئی پارٹی مل جائے گی تو چار پیسے منافع میں بِک جائے گا۔"

"وئی وئی۔" محسن بولا "صرف چار پیسہ منافع۔ تم دیکھا برادر، اس نے ٹرک تین لاکھ ننانوے ہزار نو سو ننانوے روپیہ چھیانوے پیسہ میں خریدا، چار لاکھ میں اَم کو دیا۔"

"بھائی صاحب! یہ محاورے کا بات تھا۔" مَیں نے کہا۔ "اس کا مطلب تھا تھوڑا سا منافع اور تھوڑا کا مطلب ہے بوت۔"

محسن نے تعجب سے سر ہلایا "تھوڑا کا مطلب بوت۔"

ساری بات اب میری سمجھ میں آ گئی تھی۔ کمپنی کے مالک نے دیکھا کہ ٹریلر میں سامان لانے والا مجبور ہے اور اب ٹریلر کو اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا تو اس نے اونے پونے خرید لیا۔ اتنا بڑا ٹریلر بہت سُست رفتار ہوتا ہے اور قومی شاہراہ پر عام قسم کے مال کی نقل و حمل میں استعمال نہیں ہو سکتا۔ مخصوص قسم کا سامان مثلاً ہیوی مشینری جسے دھوپ اور بارش سے بچا کے لے جانا مقصود ہو، وہی اس ٹریلر پر جا سکتی تھی اور ایسا سامان روز نہیں ملتا۔ جو کمپنیاں یہ کام کرتی ہیں، ان کے پاس پہلے سے اپنے ٹریلر ہیں۔ وہ ان لوگوں سے یہ ٹریلر چار لاکھ میں کیوں لینے لگے، وہ ہم جیسے کسی احمق کے منتظر تھے۔

جب ہم واپس آ رہے تھے تو مَیں عمداً آفس سے کچھ فاصلے پر رُک گیا "اس کا کیا نام اے؟" مَیں نے گاڑی کی طرف اشارہ کر کے کہا "جس کا یہ کورولا اے؟"

"نام... نام تو ہم نہیں جانتے، ہم مینیجر صاحب بولتے ہیں۔" گڈز فارورڈنگ ایجنسی والے نے کہا "ایک کمپنی کا مینیجر ہے۔"

"کس چیز کا کمپنی اے؟ کیا بیچتا اے؟"

"کچھ مشین کے پُرزے وغیرہ کراچی بھیجتے ہیں۔" وہ بولا۔ "کیا تم دیکھتے ہو..." مَیں کہنے والا تھا مگر پھر اس خیال سے چُپ ہو گیا کہ کہیں ہمارے کریدنے سے وہ خواہ مخواہ شک میں نہ پڑ جائے اور پیڈرو سے نہ کہہ دے کہ دو پٹھان اس کے بارے میں بڑی پوچھ گچھ کر رہے تھے۔ پیڈرو تو ایسا چور تھا

جس کی داڑھی میں تنکے ہی تنکے تھے، وہ فوراً کھٹک جاتا اور یہ جاننے کی کوشش ضرور کرتا کہ اس کے متعلق معلومات حاصل کرنے والے کون تھے؟

کوئی اور بات ہونے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ پیڈرو لیجانک آفس سے نکلا اور سیدھا اپنی کار کی طرف گیا۔ کار کا نمبر میں نوٹ کر چکا تھا، جب وہ گاڑی کو گھما کے گیٹ سے باہر لے گیا تو میں نے آہستہ آہستہ آفس کی طرف قدم بڑھائے۔

"ام اس کا سارا کاغذات دیکھے گا۔" میں نے کہا۔

"ضرور دیکھیں، ہم کوئی فراڈ تھوڑی کر رہے ہیں، بازار میں بیٹھے ہیں، چار لاکھ لے کر کہیں نہیں جا سکتے۔" وہ تقریباً بُرا مان کے بولا۔ "اور یہ تو ہاتھی ہے۔ چوری کی کار بِک سکتی ہے، اتنا بڑا ٹریلر نہ کوئی چُرا سکتا ہے اور نہ چُرا کے رکھ سکتا ہے۔"

"اویار! تسلی کر دے ان کی، تُو بولتا بہت ہے۔" شورُوم کا مالک عاجز آ کے بولا۔

آفس ایک بیرک نما گندی عمارت تھی جس میں ڈیزل کی بُو بسی ہوئی تھی۔ فرش اور دیواروں پر بھی چکنائی کی تہ ڈیزل کے رنگ کی محسوس ہوتی تھی۔ اصل دفتر صرف دو کمروں کا نام تھا، باقی کمروں میں شاید فاضل ٹائر اور اسٹور تھے یا ڈرائیوروں کے قیام کا انتظام تھا۔ آفس بھی کوئی صاف ستھری جگہ نہیں تھی۔ ایک کمرے میں دو ہم جیسے حُلیے کے لوگ میزوں ڈالے بیٹھے تھے اور ڈرائیور حضرات کے جمِ غفیر سے اُلجھ رہے تھے۔ ان کے درمیان والدہ اور ہمشیرہ کے رشتوں کو اِدھر سے اُدھر جوڑ کے بات کرنا بے تکلفی اور دوستی کی علامت تھا۔ کچھ ڈرائیور آئے تھے اور حساب دینا چاہتے تھے۔ وہ ایک ٹیبل کے گرد شور و غوغا کر رہے تھے۔ چرس کی سگریٹیں پی رہے تھے اور فحش مذاق کرتے ہوئے زور زور سے قہقہے لگا رہے تھے۔ دوسری ٹیبل کے گرد روانہ ہونے والے جمع تھے اور منظر وہاں بھی یہی تھا۔ بابو یا منشی کاغذی کارروائی میں بڑی پھرتی دکھا رہے تھے۔ وہ دیواروں کے ساتھ ساتھ لگے ہوئے تختوں پر ڈھیر کی صورت میں رکھے ہوئے رجسٹروں اور لیجروں میں سے ایک اُٹھاتے تھے تو دوسرا رکھ دیتے تھے۔ غالباً ہر ٹرک کی آمد و رفت کا حساب ایک الگ رجسٹر میں تھا کیونکہ مجھے ایک پُرانے رجسٹر پر نمبر نظر آیا تھا۔

ہمیں جس کمرے میں تشریف رکھنے کو کہا گیا، وہ غالباً سیٹھ کا کمرا تھا۔ اس میں ایک ہی بڑی میز تھی جس پر دو فون رکھے ہوئے تھے۔ کاغذات اور پُرانے اخبار پڑے تھے اور کسی گاڑی کے پسٹن سے بنائی ہوئی ایک ایش ٹرے رکھی ہوئی تھی۔ لکڑی کی اس میز کے داغ ظاہر کرتے تھے کہ چائے پینے کے علاوہ اس پر کھانا بھی کھایا جاتا ہے، اگر یہ رات کو سونے کے کام آتی ہو تو بھی

کوئی تعجب نہیں۔ میں نے اس کی وسعت پر غور کر کے سوچا۔ میز کے گرد بید سے بُنی ہوئی پُرانی کُرسیاں بے ترتیبی سے رکھی ہوئی تھیں۔ بے رنگ، میلی دیواروں کے کونوں میں اُوپر سے نیچے تک جالے آویزاں تھے اور اس کی نیم تاریک فضا کو ایک ٹیوب لائٹ روشن کرنے میں ناکام تھی کیونکہ ٹیوب کی اُوپری سطح گرد اور مکھیوں کی غلاظت سے تقریباً سیاہ پڑ چکی تھی۔ مجھے اُن چمکتے دمکتے وال ٹو وال کارپٹ والے... ایئرکنڈیشنڈ دفاتر کا خیال آیا جہاں باس قسم کے لوگ بہترین سُوٹ اور ٹائیوں میں گھومنے والی کرسیوں پر بیٹھ کے خوش شکل اور خوش لباس سیکرٹریوں سے انٹرکام پر بات کرتے ہیں، یہ مختلف نوعیت کا کاروبار تھا جس میں صفائی رکھنا عملاً ناممکن تھا۔

ہمیں اندر لانے والے شخص نے ہمارے لیے چائے کا آرڈر دیا اور خود ایک فائل نکال لایا۔ میں نے اس کا بہ غور مطالعہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ٹریلر کسی غیر ملکی کمپنی کا تھا جو یورپ سے خشکی کے راستے کچھ سامان لے کر کراچی پہنچاتی رہی مگر اس بار سامان کراچی میں نہیں اُتارا گیا بلکہ سیدھا لاہور بھیج دیا گیا۔ یہاں کمپنی کے لیگل اٹارنی نے ٹریلر کو فروخت کرنے کے معاملات طے کیے اور اب ٹریلر بالکل جائز اور قانونی طور پر گڈز فارورڈنگ ایجنسی کی ملکیت تھا اور وہ اس کو بیچنے کا اور ہمارے نام پر ٹرانسفر کرنے کا اختیار رکھتے تھے۔ یورپ کی کارگو کنٹینر سروس کا لیگل اٹارنی کراچی کا ایک کلیئرنگ ایجنٹ تھا۔ ان کاغذات میں سے یہ معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ یورپ کے کس ملک سے کتنی بار سامان آیا، کس کے نام آیا اور وہ سامان کیا تھا مگر یہ معلومات کراچی کے اس کلیئرنگ ایجنٹ سے حاصل کی جا سکتی تھیں۔ اُس کا نام پتا قانونی دستاویز کی صورت میں فائل کا حصّہ تھا اور یہ فائل ٹرانسفر ہو کے ہمارے پاس ہی آنا تھی چنانچہ میں نے اس پر زیادہ توجّہ نہیں دی۔

چائے آنے تک ہمیں فرصت کے چند منٹ میسر آئے جب فائل ہمارے حوالے کرنے والا دوسرے کمرے میں کوئی تنازعہ طے کرنے گیا جس نے نقصِ امن کا اندیشہ پیدا کر دیا تھا۔

"عزیزم! آپ نے استاد کی یہاں موجودگی کا کیا مطلب نکالا؟" میں نے پیڈرو کا نام لینے سے گریز کرتے ہوئے فرنچ میں کہا۔ شورُوم کا مالک چونکا نہیں کیونکہ وہ ہمیں پہلے بھی یہ عبرانی، لاطینی قسم کی بولی بولتے سُن چکا تھا۔

"یہ لوگ اس کمپنی کے ذریعے بھی اسلحہ ارسال کرتے رہے ہیں۔" محسن نے دودھ پتّی کا اُبلتا ہُوا مکسچر شڑپ شڑپ کر کے پیتے ہوئے کہا۔

"کیا ہم ان ٹرکوں کے نمبر حاصل نہیں کر سکتے جن پر آج تک مال بھیجا گیا ہے؟"

"اس سے کیا فائدہ، وہ مال تو نکل گیا۔" محسن نے کہا۔

"بات اس مال کی نہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ معلوم ہو جائے گا کہ کس کس ٹرک کو اس غیر قانونی کاروبار میں استعمال کیا گیا۔ میں ایک پتے کی بات عرض کرتا ہُوں۔ ہر ٹرک ڈرائیور آنکھیں بند کر کے ہر قسم کا مال نہیں لے جاتا ہو گا۔ کچھ ٹرک ڈرائیور پہلے دیکھتے ہیں کہ کیا بھیجا جا رہا ہے اور کہیں ایسا تو نہیں ہو گا کہ راستے میں چیکنگ ہو تو وہ دھر لیے جائیں۔"

"ان لوگوں کی چیکنگ کیا فرشتے کریں گے جو کر سکتے ہیں وہ تو پہلے ہی آل کلیئر کا سگنل ہاتھ میں رکھتے ہیں۔" محسن بولا۔

"فرض کرو مال حرام کھانے والوں میں ٹھن جاتی ہے، کوئی مخبری کر دیتا ہے یا کوئی پیچھے لگ جاتا ہے۔ کوئی خبطی قسم کا صحافی یا ایماندار افسر جو نیا آیا ہو۔" میں نے کہا۔ "اگر ٹرک ڈرائیور پکڑا جائے تو کیا مالک تسلیم کریں گے کہ یہ مال اُنھوں نے دیا تھا؟ نہیں، وہ صاف کہیں گے کہ بدمعاش ڈرائیور نے خود لوڈ کیا ہو گا۔ ہم نے تو کدّو، کریلے دیے تھے۔ یہ بات ڈرائیور بھی سمجھتے ہیں، سب ڈرائیور حرام کھانے والے اور غلط کام کرنے والے نہیں ہوتے، وہ صرف مزدوری کرتے ہیں، اسمگلنگ نہیں مگر کچھ بڑے شوق سے ناجائز کام کرتے ہیں اور ایسے ہی لوگ ہوں گے جو ہمارے شکاری دوستوں کے منظورِ نظر ہوں گے۔ ان کے ٹرک بھی مخصوص ہوں گے۔ عام طور پر ایک ڈرائیور کسی کمپنی کا ایک ہی ٹرک چلاتا ہے۔ اسے ہر روز نیا ٹرک نہیں دیا جاتا۔ وجہ صاف ظاہر ہے جو ڈرائیور کسی ایک ٹرک کو چلاتا ہے، وہ اس کی رگ رگ سے واقف ہو جاتا ہے اور کسی حد تک اس سے ایک جذباتی وابستگی رکھتا ہے۔ دوسرے ڈرائیوروں سے کچھ پیشہ ورانہ چپقلش چلتی ہے۔ اوئے میرا ٹرک شیر ببر ہے، تیرا ٹٹّو کیا مقابلہ کرے گا۔ دوسرا کہے گا کہ میرا راکٹ ہے، راکٹ۔ تیسرا اسے جمبو جیٹ کہے گا اور ایسا ہی بنا کے بھی رکھے گا۔ اس میں رنجش کوئی نہیں ہوتی، یہ ایک دوستانہ قسم کا مقابلہ ہے جو جاری رہتا ہے محض دلچسپی کے لیے۔"

"میں کوڑھ مغز سب سمجھ گیا۔" محسن نے کہا۔ "اگر ہمیں معلوم ہو جائے کہ کون کون سے ٹرک، بہادر اینڈ کمپنی، استعمال کرتی رہی ہے تو ہم خاصے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ آئندہ بھی وہ انھی ٹرک ڈرائیوروں پر اور اُن کے ٹرکوں پر بھروسا کریں گے اور ہمیں تفصیلات حاصل ہو جائیں تو ہم یہاں سے کراچی تک قومی شاہراہ سے گزرنے والے ہر ٹرک پر نگاہ رکھ سکتے ہیں اور اس کی منزل بھی بدل سکتے ہیں۔"

"آپ سمجھ گئے، خدا آپ سے سمجھے۔" میں نے کہا۔ "اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تفصیلات کیسے حاصل ہوں؟"

"اس کے دو طریقے رائج ہیں، زر سے یا زور سے۔"

"ہاں جی، دیکھ لیے آپ نے کاغذات؟" گُڈز کمپنی والا جھگڑا ختم کر کے لوٹ آیا۔ "اطمینان ہو گیا آپ کا؟"

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ "ام صبح آئے گا۔ تمارا نام کیا اے؟"

"میرا نام؟ نام تو معتصم ہے۔ پورا نام اس سے بھی زیادہ مشکل ہے جو ابا جی نے رکھا تھا معتصم احتشام۔ اُن کا اپنا نام احتشام تھا۔ یہاں لوگ چکری کہتے ہیں، بس یہی مشہور ہے۔"

"چکری! خو یارا اچھا نام اے۔" محسن بولا۔ "وہ کیا بولا تم؟ موت سے شام؟"

"وہ چھوڑو جی! آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔" چکری ہنسنے لگا۔

"اچھا ام چلتا اے۔" میں اُٹھ کھڑا ہُوا۔ "ادھر کا فون نمبر بتاؤ، ام صبح آنے سے تو معلوم کر کے آئے۔"

"وہ جناب خان صاحب! آپ کو میں لے کر آؤں گا۔" شورُوم کا مالک بولا۔ "میرے ذریعے یہ سودا ہو رہا ہے، آپ میرے پاس تشریف لائیں۔"

"ہاں یارا، ام ادھر آ جائے گا۔" میں نے کہا مگر اتنی دیر میں چکری مجھے کمپنی کا کارڈ تھما چکا تھا اور اب شورُوم والے کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ کارڈ میرے ہاتھ سے چھینے، وہ ہمیں براہِ راست پارٹی سے ملوا کے پچھتا رہا تھا اور اُسے اندیشہ لاحق ہو رہا تھا کہ اس کا کمیشن مارا جائے گا، ہم براہِ راست چکری سے سودا کر لیں گے اور جیسا کہ نام سے ظاہر تھا، چکری کوئی چکرباز تھا، ورنہ اُس کا نام شیطان کی طرح نہ پڑتا۔

ہم باہر آئے تو شورُوم کا مالک فوراً اُردو نے پیٹنے پر آ گیا۔ "جناب خان صاحب! میرے کمیشن کا خیال کریں۔ میں نے تو آپ پر بھروسا کیا اور یہاں لے آیا مگر یہ چکری بڑا شیطان ہے، سب کے پیٹ پر لات مارتا ہے۔"

"تم اس کو دو لات مارو۔" محسن نے اس کو مشورہ دیا۔ "روتا کیوں اے زنخا کا بچہ، الیا لات مارو کہ تشریف رکھے تو ہائے کرے۔"

میں نے ہنسی کو بڑی مشکل سے روکا۔ "بھائی صاحب! یہ محاورہ تھا۔ مطلب یہ کہ چکری دوسروں کا حق چھینتا ہے۔"

"خو یارا! ام اس محاورہ سے بوت تنگ اے۔" محسن نے کہا۔

"خو تم فکر مت کرو یارا۔" میں نے دوستانہ انداز میں اُس کے کندھے پر زور سے ہاتھ مارا۔ اُس کا یہی کندھا پہلے بھی میری بے تکلفی کا نشانہ بن چکا تھا۔ اُس نے بے اختیار ہائے کی۔ "ام

تمارا پاس آئے گا، تم کو پیسہ دے گا۔"

"بڑی مہربانی جناب کی۔" وہ بولا لیکن اس کی صورت سے اندازہ ہوتا تھا کہ اب بھی وہ مطمئن نہیں ہے، اگر اس کے پاس نقد رقم ہوتی تو وہ ٹریلر خود خرید لیتا اور پھر ہمیں مُنہ مانگی قیمت پر بیچ دیتا لیکن مجبوری یہ تھی کہ ٹریلر دوسری پارٹی کے پاس تھا اور وہ ہم دیکھے بغیر قیمت دینے پر رضامند نہ تھے۔ کار ہوتی تو وہ دکھانے کے لیے لے آتا مگر ٹریلر کو لانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

ہم اس سے رخصت ہوئے تو شام بیت چکی تھی اور رات اُتر رہی تھی۔ میں نے اور محسن نے گاڑی کو ریگل کے قریب کھڑا کیا اور بہت مدّت کے بعد شیزان میں قدم رکھا۔ اعلیٰ قسم کی کافی پیتے ہوئے ہمیں اپنی موجودہ زندگی کی سختی اور آزمائش کے قدر کی صبر آزما طوالت کا شدّت سے احساس ہُوا۔ ہم دونوں آسودگی کے خمار میں چُپ بیٹھے رہے۔

پھر محسن نے ایک سرد آہ بھری "معلوم نہیں، وہ دن کب آئے گا؟"

"اور وہ رات کب آئے گی؟" میں نے زیادہ سرد آہ بھر کے کہا۔

"جب میں تجھے فون کر کے کہوں گا کہ سکندر! شام کو تم لوگ کیا کر رہے ہو پھر میں کہوں گا کہ یار شرم آنا چاہیے تمھیں کہ آج ہماری شادی کی سالگرہ ہے اور تم بھولے ہوئے ہو اور تو ہنس کر اور گالی دے کر کہے گا کہ ہم بھول کیسے سکتے ہیں۔ ہم تو سرپرائز دینے والے تھے اور میں کہوں گا کہ سرپرائز تو ہم دے رہے ہیں۔ رابعہ بھابی کے ساتھ لارڈز میں آجاؤ۔ چائے پئیں گے پھر الحمرا میں ڈراما چل رہا ہے، وہ دیکھیں گے اور اس کے بعد ڈنر ہماری طرف سے... اور دیکھو گفٹ نہیں لاؤ گے تو لارڈز کے باہر کھڑے رہ جاؤ گے چائے، تھیٹر، ڈنر کچھ نہیں ملے گا۔"

"اور اس کے بعد میں رابعہ سے کہوں گا کہ معلوم ہے کس کا فون تھا؟" میں نے خواب کا دوسرا حصّہ شروع کیا۔ "وہ ہنس کر کہے گی، محسن بھائی کے سوا کس کا ہو سکتا ہے۔ آج ان کی شادی کی سالگرہ ہے نا۔ میں نے شہلا کو سرپرائز دینے کا سوچا تھا اور میں کہوں گا کہ اچھا اب تیار ہو جاؤ۔ وہی نیلی، آسمان کے رنگ کی اور ستاروں کی افشاں والی ساری اور رابعہ کہے گی کہ حد ہے آپ کی بھی اور کچھ اچھا ہی نہیں لگتا اور میں کہوں گا، اچھا تو تم پر سب کچھ لگتا ہے کیونکہ مجھے تم اچھی لگتی ہو مگر یہ آسمانی ساری اور زرد پھول میرے ماضی کی سب سے خوبصورت یاد کا گلستاں ہیں۔ اُس وقت جب میں حالات کی کڑی دھوپ میں وقت کے بے سمت صحرا میں آبلہ پا چل رہا تھا تو یہی پھول تسکینِ قلب و نظر کا ساماں تھے اور یہی آسمان کا رنگ میرا دم ساز تھا۔ اور پھر جب وہ رنگِ غازۂ رخسار اور سُرخیِ لب کے ساتھ حیا کی حجاب آلود مُسکراہٹ سجائے خوشبو کی سفیر بن کے میرے سامنے آئے گی تو میں شہرِ طلسمات کے مسافر کی طرح پتھر ہو جاؤں گا اور وہ شرما کے کہے گی کہ اب چلیے بھی..."

"اور جب تم اپنی چمکتی دمکتی کار سے لارڈز کے سامنے اُترو گے تو ہم اپنی کار سے اُتر رہے ہوں گے۔ میں اور شہلا۔ سب لوگ ہمیں رشک سے دیکھ رہے ہوں گے۔ اشاروں اشاروں میں کہہ رہے ہوں گے۔ یہ وہی ہیں، محسن اور سکندر۔" محسن نے کافی کے خالی کپ میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"کافی اور لاؤں صاحب؟" ویٹر نے یوں کہا کہ ہمارے سپنے اور خواب ریزہ ریزہ ہو گئے۔

"کافی... ہاں، لے آؤ۔" میں نے کہا۔ "مے سے غرض نشاط ہے کس رُوسیاہ کو... کافی لاؤ گھول کر تلخیِ ایّام میں امروز کا زہر۔"

"جی؟" ویٹر بوکھلا گیا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے کہا۔ "میں تم سے نہیں کہہ رہا تھا۔"

"معلوم نہیں، ایسے خواب رات کو کیوں دکھائی نہیں دیتے؟" محسن بولا۔

"اگر ہم ایسے خواب دیکھ کر جاگے تو سخت فرسٹریشن کا شکار رہیں گے چنانچہ ہمارا دماغ ہمیں بے خواب نیند دیتا ہے۔ آرام اور صرف آرام کے لیے۔" میں نے کہا۔

"میں اس وقت چکری کی بات کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں، میں شہلا کی باتیں کرنا چاہتا ہوں، اس کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں، اُس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"اُس سے رات کو بات کرنا۔" میں نے کہا۔ "چکری سے بات نہ کی تو یہ ایک کامیابی کے راستے کو نظر انداز کرنے کے مترادف ہوگا، صرف اس لیے کہ ہم خواب کے راستوں کی باتوں میں گم تھے۔ میں اُسے فون کر رہا ہوں۔"

میں اُٹھ کر کاؤنٹر تک گیا۔ کارڈ میرے پاس تھا۔ میں نے رسماً اجازت لے کر نمبر ملایا۔ "خو چکری بھائی سے بات کرے گا۔"

"چکری... بلانا واں اُنوں۔" کسی نے کہا اور چلّایا۔ "اوئے چکری، تیرے سورے دا فون جے۔"

میں چکری کا سورا یعنی سُسر نہیں تھا اور نہ ہو سکتا تھا مگر پھر بھی میں نے اس عزت افزائی کا بُرا نہیں مانا، ورنہ کہنے والا تو مجھے کچھ بھی کہہ سکتا تھا۔

"ہاں جی، کون اے؟" چکری نے ایک منٹ بعد کہا۔

"یارا چکری بھائی! اَم تمارا دوست اے۔" میں نے کہا۔

"اچھا اچھا، میں سمجھ گیا، خیریت ہے نا جناب؟"

"ہاں یارا، ایک دم سب خیریت اے۔ ابھی تم کیا کرتا اے؟"

اس نے کہا۔

"میں... کچھ نہیں، بس یہی روز کا کام ہے۔"

"تم اِدھر ہم سے ملنے کا واسطے آسکتا ہے یا ٹھہرو، اَم اگر ملنے کا واسطے آوے تو تم باہر مل سکتا ہے اَم کو؟" میں نے کہا۔

"پہلے بتائیں بات کیا ہے؟" وہ متجسّس لہجے میں بولا۔

"بات تمارا فائدہ کا ہے۔ بوت فائدہ ہو سکتا اے تم کو... دس بیس ہزار کا۔" میں نے کہا۔ "تم اَمارا ایک کام کرے گا؟"

"خان صاحب! آپ کہیں کہ میں کسی... تو یہ کام دس بیس ہزار میں مشکل ہے۔"

میں ہنسا۔ "مارا، تم کیا بولتا اے، اَم ایسا کام بولے گا تیرے واسطے بوت آسان کام اے یارا، ابھی ہم آتا ہے بس آدھا گھنٹا میں... تم اَمارا گاڑی دیکھا اے نا، اَم باہر انتظار کرے گا لیکن دیکھو کسی کو کچھ مت بولنا کہ اَم نے فون کیا تھا اور کیا بات بولا تھا۔"

"ٹھیک ہے جی۔" چکری نے کہا۔ "کرنے کا کام ہوگا تو ضرور کریں گے، چار پیسے کمانے کے لیے ہی تو ہم خوار ہیں۔" اُس نے ریسیور رکھ دیا۔

میں اور محسن لوٹ کر وہاں پہنچے ہی تھے کہ وہ آ گیا۔ ہم بیس منٹ میں پہنچ گئے تھے لیکن دس بیس ہزار کی رقم کے خیال نے اُس کو بدحواس اور مضطرب کر دیا تھا۔ وہ ڈرتا ہوا قریب آیا۔

"ڈرتا کیوں اے مارا، اندر بیٹھو، اَم تم کو اغوا کر کے نہیں لے جائے گا۔" میں نے کہا۔

"اندر بیٹھو پھر بات کرے گا۔" محسن نے کہا اور وہ اندر بیٹھ گیا۔

"اَم کون اے؟ تمارا کیا خیال ہے؟" میں نے کہا۔

"آپ خفا تو نہیں ہوں گے، اگر میں سچ بولوں؟"

"نئیں، تم بولے گا کہ اَم بلوچ کا بچّہ ہے تب بھی اَم ناراض نئیں ہوگا۔" میں نے کہا۔ "ہاں بتاؤ، تم کیا سمجھتا اے اَم کو؟"

"میرا خیال ہے کہ آپ لوگ اسمگلر ہیں۔" چکری نے کہا۔ "اور یہ اتنا بڑا ٹرک بھی اسی کام کے لیے خرید رہے ہیں۔ وہ بھی اسمگلر تھا جس کا یہ ٹریلر تھا۔"

میں نے اور محسن نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر سر ہلایا جس کا کوئی مطلب نہیں تھا۔ "چکری اچھا آدمی اے..." محسن نے کہا۔

"مگر خان صاحب! آپ چاہتے ہیں کہ میں اسمگلنگ کروں یا اس کام میں آپ کا ساتھ دوں یا مدد کروں آپ کی، تو یہ میں نہیں کروں گا۔"

"چکری بوت اچھا آدمی اے۔" یہ بات دوسری بار محسن نے کہی۔

چکری کنفیوز ہو گیا۔ "آخر آپ لوگ کیا چاہتے ہیں؟"

"چکری! تم کو اِدھر کتنا عرصہ ہو گیا؟" میں نے اچانک اپنا لہجہ بدل لیا۔ "کب سے ملازم ہو یہاں؟"

چکری دم بخود رہ گیا۔ "آپ... آپ پٹھان نہیں ہیں؟"

میں ہنسا۔ "میرے پٹھان یا پنجابی، سندھی یا بلوچی ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے چکری، یہ بتاؤ میں ایکٹر کیسا ہوں؟"

"ایک نمبر... سوُں رب دی... ایک نمبر... اور آپ۔" وہ محسن کی طرف دیکھ کے بولا۔ "آپ بھی..."

"ہاں، میں بھی۔" محسن نے مُسکرا کے کہا۔ "چور کا بھائی گرہ کٹ۔"

"چکری، ہم خود بڑے چکر باز ہیں اور ہم دُنیا کی وجہ سے چکر میں ہیں تو دُنیا ہماری وجہ سے چکر میں ہے۔" میں نے کہا۔ "چکر کیا ہے، یہ ہم نہیں بتا سکتے مگر تم تو خود چکری ہو۔ یہ بتاؤ اِس کمپنی میں ملازمت کرتے کتنا عرصہ ہو گیا ہے؟"

اُس نے خود کو سنبھال کے اور بہت سنبھل کے جواب دیا۔ "ہو گئے ہیں یہی کوئی چار سال، پہلے ڈرائیور تھا۔"

"اور اب کیا ہو؟" میں نے کہا۔

"اب... آپ نے تو دیکھا۔ اُوپر کے سارے کام کرتا ہوں۔ ہیرا پھیری، منشی... سیکرٹری... مینجر... کچھ بھی سمجھ لیں آپ۔ مالک بھروسا کرتے ہیں مجھ پر۔" وہ بولا۔

"ڈرائیوری کیوں چھوڑ دی؟"

"وہ... بس چھوڑ دی۔" وہ بولا۔ "غلط کام نہیں کر سکتا تھا میں۔ ہیرا پھیری میرے بس کی نہیں تھی۔ جو دوسرے ڈرائیور کر لیتے ہیں۔" وہ بولا۔

"کیسی ہیرا پھیری؟ کیسے غلط کام؟"

"یہی... اس کا مال رکھ لیا۔ اُدھر کا مال یہاں لے آئے۔ کبھی مالکوں کی مرضی سے کبھی انھیں بتائے بغیر۔" وہ بولا۔ "کبھی پولیس راستے میں پکڑ لیتی تھی تو جوتے اور گالیاں کھانا بھی ڈیوٹی میں شامل۔ میں نے کہا جی کہ میرے باپ کی توبہ، میں ٹرک چلا سکتا ہوں یہ سب نہیں کر سکتا۔ دوسرے مجھے سمجھاتے تھے کہ پاگل ہُوا ہے۔ خالی تنخواہ لے کر کیا کرے گا۔ ہر پھیرے میں کسی کا مال لے چل۔ چرس... سونا... اسلحہ... دو چار سال میں اپنا ٹرک خرید لے گا مگر ہُوا یہی کہ دو چار سال میں ٹرک لینے والے دو چار سال کے لیے اندر گئے اور مالکوں نے ان کو پہچاننے سے بھی انکار کر دیا۔"

"پھر تم کو لوگ چکری کیوں کہتے ہیں؟"

"اس لیے کہ وہ خود چکری ہیں۔" اُس نے بے ساختگی سے کہا۔ "پھر یہ کہ سب کو مجھ سے گلہ تھا کہ میں ان کی شکایت کر دیتا ہوں۔ مالک خود اسی چکر میں رہتے تھے۔ انھوں نے مجھے ڈرائیونگ

سے ہٹالیا اور اپنے ساتھ رکھ لیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ شریف اور ایماندار آدمی ڈرائیور تو نہیں رہ سکتا مگر یہاں سارے معاملات ایمانداری سے سنبھال لے تو اُن کی بہت سی فکریں دُور کر سکتا ہے۔

"اور تم ایسے مالکوں کے ساتھ خوش ہو؟"

"خوش... خوشی کیا جی، نوکری تو مجبوری کراتی ہے۔ پیٹ بڑا کافر ہے جی مگر پیٹ بھر جاتا ہے تو نظر بے ایمان ہو جاتی ہے، اِدھر اُدھر بھٹکتی ہے۔ کبھی مال پر کبھی عورت پر، کبھی شراب پر، یہ سب مل جائے تو ایمان جاتا ہے، دُنیا ملتی ہے تو آخرت جاتی ہے۔"

مَیں نے اُسے حیرانی سے دیکھا۔ وہ جاہل اور چکر باز نظر آنے والا ایک قلندر تھا۔ بڑے موذی کو مارا، نفس امّارہ کو گرمارا۔ یہ بات کہنی آسان ہے مگر نبھانی مشکل۔ یہاں ایک شخص تھا جو ارادے کی مضبوطی سے ایمان کی طاقت سے اور محنت سے ساری نفسانی خواہشوں کے خلاف ڈٹا ہُوا تھا۔ بے ایمان اور زر پرست لوگوں کے درمیان رہ کے بے نذر تھا۔ وہ کیچڑ میں اُگا ہُوا پھُول تھا، جس نے اپنے وجود کی خوبصورتی کو بچا کے رکھا ہُوا تھا اور وہ اس بات سے بے نیاز تھا کہ اس کے آس پاس غلاظت ہے اور اسے بدزبان اور بدنیت اور بدخواہ لوگ پھُول نہیں کانٹا سمجھتے ہیں، اسے تقدیر سے بھی گِلہ نہیں تھا کہ اسے کسی گوشۂ چمن میں کیوں پیدا نہیں کیا۔

"چکری! تم کو یہاں کتنی تنخواہ ملتی ہے؟" مَیں نے کہا۔

"گیارہ سو۔" اُس نے رسان سے کہا۔

"فرض کرو ہم تمھیں دُگنی تنخواہ دیں...؟"

وہ نفی میں سر ہلانے لگا۔ "مَیں نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ مَیں آپ کے کام نہیں آ سکتا۔"

"چکری، اگر ہم کہیں کہ تم نے غلط سمجھا تھا، ہم اسمگلر نہیں ہیں اور جب تم ہمارا ساتھ دوگے تو یہ ایک اچھا کام ہوگا، ایک نیک مقصد کے لیے ہوگا، تم کو یہ کام پسند آئے گا، تم مطمئن رہوگے، اس کام میں خوشی بھی محسوس کروگے۔"

وہ حیران ہو کے ہماری صورت دیکھنے لگا۔ "میں یہاں بھی مطمئن ہوں۔"

"ہاں... مگر تم نے مجبوری کا ذکر بھی کیا تھا۔" میں نے کہا۔ "ہم مجبوری کی بات نہیں کرتے، اس کام میں تم کو خوشی ملے گی۔"

"لیکن جب تک کام کا پتا نہ چلے..."

"تم نے کہا تھا کہ تم ڈرائیور ہو۔" میں نے کہا۔ "یہ ٹریلر چلا لوگے؟"

اس نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ "میرے پاس ہیوی لائسنس ہے۔"

"ویری گڈ، پھر تم ایسا کرو کہ یہاں سے صرف ایک مہینے کی چھٹی لے لو کسی بھی بہانے سے۔" میں نے کہا۔ "یہ ایک مہینہ تم ہمارے ساتھ رہو۔ ہم یہاں سے کراچی جائیں گے، اس ایک مہینے میں تم کو سب معلوم ہو جائے گا۔ تم صرف ڈرائیونگ کروگے، وہ سب کچھ تمھارے سامنے ہوگا جو ہم کریں گے۔ اگر کسی بھی وقت تم کو احساس ہو کہ ہم غلط کام کر رہے ہیں تو تم واپس آ جانا، کسی بھی جگہ گاڑی روک کے کہہ دینا کہ میں جا رہا ہوں۔ ہم تمھیں نہیں روکیں گے۔ جتنا عرصہ تم ہمارے ساتھ گزاروگے تمھیں بائیس سو روپے ماہانہ کے حساب سے تنخواہ ملے گی۔ کھانا پینا سب ہمارے ساتھ۔ ہم اکیلے نہیں ہیں، اور بھی کچھ لوگ ہوں گے۔ تم ان سب سے ملوگے اور سب کو دیکھ کر فیصلہ کروگے کہ ہمارا ساتھ دینا فرض ہے یا مجبوری ہے۔"

وہ سوچ میں پڑ گیا لیکن مَیں نے محسوس کیا کہ وہ میرے دلائل سے قائل ہُوا ہے۔ "مَیں ایک دم نہیں بتا سکتا۔"

"نہ بتاؤ، ہم کل پھر آئیں گے، اسی بہروپ میں لیکن تم اتنا ضرور کروگے کہ ہمارے اصل رُوپ کے بارے میں کسی سے بات نہیں کروگے۔ ہم تمھیں دھمکی نہیں دیتے۔ تم پر اعتبار کرتے ہیں اور تم سے درخواست کرتے ہیں کہ اس راز کو راز ہی رکھنا۔ اگر تم کسی بھی وجہ سے انکار کرو، تب بھی ان باتوں کا حوالہ بھی نہ دینا جو ابھی ہوئی ہیں۔ یہ سمجھنا کہ ہم ملے ہی نہیں تھے۔"

"ٹھیک ہے جی، اب مَیں جاؤں؟"

"ٹھہرو، ابھی وہ بات تو ہوئی ہی نہیں جس کے لیے ہم آئے تھے۔" محسن بولا۔

"وہ کیا بات ہے جناب؟"

"جب ہم اس کار ڈیلر کے ساتھ آئے تھے۔" محسن نے کہا۔ "اور تم سے سودا کر رہے تھے تو ایک ٹویوٹا کرونا آئی تھی، سلیٹی رنگ کی۔"

"ہاں جی، آئی تھی۔"

"ہم نے اس کا نمبر نوٹ کر لیا تھا۔" محسن بولا۔ "تم اس شخص کو جانتے ہو؟"

چکری نے اقرار میں سر ہلایا۔ "اس کے بارے میں بات بھی ہوئی تھی۔"

"ہاں، یہ بتاؤ وہ کیسا آدمی ہے؟" مَیں نے کہا۔ "ہماری رائے یہ ہے کہ وہ ایک بدمعاش ہے۔ اسمگلروں کا ساتھی ہے اور اس کا نام استاد پیڈرو ہے۔"

چکری اُچھل پڑا۔ "آپ... آپ یہ سب جانتے ہو تو... تو پھر میں کیا کہوں جناب؟"

"کچھ نہیں، تم نے تصدیق کر دی ہے کہ تم ہمارے ہم خیال ہو۔ تم بھی یہ سب جانتے ہو مگر تمھارا یہ کام نہیں کہ اس کے بارے میں زمانے کو بتاتے پھرو کہ وہ کون ہے۔" مَیں نے کہا۔ "وہ کمپنی کو فائدہ پہنچاتا ہے اور تم کمپنی کے ایک معمولی ملازم ہو۔ تم اس کی دُشمنی بھی مول نہیں لے سکتے، ایک آفر تو ہم دے چکے لیکن یہ

کہ تم ہمارے ساتھ ہو لیکن وہ منظور نہ ہو تو ایک کام اور ہے، تم ہمیں کمپنی کے ریکارڈ سے دیکھ کر کچھ معلومات فراہم کر دو۔"

"کس قسم کی معلومات...؟"

"پہلی یہ کہ آج تک... فرض کرو گزشتہ ایک مہینے میں اُس نے کون کون سے ٹرک پر مال بھیجا ہے۔" مَیں نے کہا۔ "اس ٹرک کا ڈرائیور کون تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ مخصوص ٹرک ڈرائیوروں سے کام لیتا ہوگا۔"

چکری نے اقرار میں سر ہلایا۔ "یہ... یہ تو ٹھیک ہے۔"

"گڈ، اس کے علاوہ بتاؤ کہ وہ ٹرک کہاں گئے تھے۔" مَیں نے کہا۔

"اس کے سارے ٹرک کراچی جاتے ہیں۔" چکری نے کہا۔

"چلو پھر یہ رہنے دو۔" مَیں نے کہا۔ "کچھ معلوم ہے وہ کیا مال بھیجتا رہا ہے؟"

"مَیں نے عرض کی تھی کہ مشینوں کے پُرزے..."

"چکری! میرا خیال ہے کہ تم حقیقت جانتے ہو مگر بتاتے ہوئے ڈرتے ہو۔" مَیں نے کہا۔ "کیا یہ غلط ہے کہ اس مال میں اسلحہ بھی ہوتا ہے؟"

چکری کا رنگ اُڑ گیا۔ "دیکھیں جی، ایسی بات مت کریں۔"

"یہ سچ ہے یا غلط؟" مَیں نے کہا۔

"سچ ہے، میرا مطلب ہے ہوگا، مَیں کیسے کہوں؟"

"تم کچھ مت کہو، ہم جانتے ہیں۔" مَیں نے کہا۔ "مگر تم کو معلوم نہیں کہ یہ اسلحہ کراچی سے آگے کہاں جاتا ہے۔ یہ جاتا ہے مشرقی پاکستان اور وہاں کے تخریب کاروں کو، علیٰحدگی پسندوں کو اور پاکستان کے دُشمنوں کو تقسیم کیا جاتا ہے۔ تم جانتے ہو نا کہ وہاں کے کیا حالات ہیں؟"

"آپ... آپ کون ہیں جی؟" چکری سہم گیا تھا۔

"ہم ان لوگوں کے گروہ کے پیچھے ہیں۔" مَیں نے کہا۔ "یہ غدّار لوگ ہیں، بہت سے پکڑے جا چکے ہیں، کچھ مارے گئے ہیں، بہت سا اسلحہ تباہ کیا جا چکا ہے مگر یہ سلسلہ بند نہیں ہُوا۔ ان کو دُشمن سے پیسہ ملتا ہے۔ ممکن ہے تم نے ہمارا نام سنا ہو۔ میں سکندر ہوں، یہ محسن ہے۔"

ایکدم اپنی شناخت ظاہر کر کے مَیں نے رِسک ضرور لیا تھا مگر نہ جانے کیوں مجھے یقین تھا کہ یہ رِسک نہیں ہے اور جیسے ہماری تحریک کا ایک حامی پنڈت مل گیا تھا اور اس کے بعد بھر سلطان ملا تھا، ایسے ہی لوگوں میں ایسے بہت سے لوگ ہیں جو ہماری مدد کر سکتے ہیں اور ہمارے لیے کام کر سکتے ہیں۔ چکری کے خیالات جان کر مَیں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ چکری اگر دوست نہ بنا تو دُشمن کبھی نہ ہوگا، اگر وہ بزدل ہُوا تو شاید کھُل کر ہمارا ساتھ نہ دے مگر دل سے وہ یقیناً ہمارا ساتھی ہوگا۔

چکری کچھ دیر بے یقینی سے مجھے اور محسن کو دیکھتا رہا۔ "تم... تم دونوں وہی ہو جنھوں نے دو ڈاکوؤں کو پکڑا تھا۔ گودا ڈاکو اور پاٹے خاں کو، جو جیل سے فرار ہوئے تھے اور پولیس کو چھٹی لگا کے اُن کی وردیاں اُتروا چکے تھے؟"

"بالکل ٹھیک۔" مَیں نے کہا۔ "یہ تو ابھی کی بات ہے۔"

"مَیں نے تمھارے بارے میں بہت کچھ سنا ہے۔" وہ بولا۔

"کس سے سنا ہے؟" مَیں نے کہا۔

"لوگوں سے، یہاں ڈرائیور کلینر لاہور سے کراچی تک آتے جاتے ہیں تو سارے زمانے کی خبریں اکٹھی کر لاتے ہیں۔" وہ بولا۔ "استاد پیڈرو کے بارے میں تو مجھے معلوم ہے کہ وہ کتنا ہے پیسے کی خاطر وہ اپنی ماں کو بیچ دے مگر یہ جو تم بتا رہے ہو، یہ عجیب سی بات ہے۔"

"کیا تم نے اسلحہ جاتا نہیں دیکھا؟"

"دیکھا تو ہے۔" وہ بولا۔ "اور... اور یہ بھی ہے کہ اس کام کا سیٹھ کو پتا نہیں مگر کچھ ڈرائیور بڑے... ہیں۔" اس نے پھر وہی گالی دی جو اس سے پہلے پیڈرو کو دے چکا تھا۔

"تمھیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ مشرقی پاکستان میں کیا ہو رہا ہے۔"

"ہاں، وہ کیسے معلوم نہیں۔" وہ افسوس سے سر ہلا کے بولا۔ "دُشمن کے ساتھ ان کے ایجنٹ مل گئے ہیں۔"

"تم تو بہت سمجھ دار نکلے یار۔" مَیں نے کہا۔ "یہ پیڈرو انھی میں سے ایک ہے مگر اس کے اُوپر بہت سے لوگ ہیں۔ ایک بہت بڑے کارخانے کا پیڈرو ایک چھوٹا سا پُرزہ ہے اور ہم اس کارخانے کو ٹھکانے لگانے کا کام کر رہے ہیں۔ اس کام میں تم ہماری مدد نہیں کروگے؟"

"مَیں... مَیں کیا کر سکتا ہُوں جی! کیا مَیں اور کیا میری اوقات، مَیں بہت چھوٹا اور کمزور آدمی ہُوں، بہت معمولی حیثیت کا۔ میرے بیوی بچے ہیں، اُن کا بار اُٹھانا ہی بہت ہے۔" وہ بولا۔

"تمھیں کون سی توپ چلانا ہے چکری!" مَیں نے کہا۔ "تم ایک پیشہ ور ڈرائیور ہو، تم کو کوئی زیادہ تنخواہ، بہتر سہولتوں کے ساتھ عزّت کی نوکری دے تو کیا تم نہیں کروگے؟"

"دیکھو، یہ بات ایسی نہیں کہ یہاں طے کی جائے۔" محسن نے کہا۔ "تم اس لیے پس و پیش کر رہے ہو کہ تمھیں پوری بات معلوم نہیں ہوئی ہے، اگر میں کہوں کہ تم کو ایک سرکس کی گاڑی کا ڈرائیور بننا ہے تو تم کہو گے جی کہ یہ کیا مذاق ہے۔ ابھی آپ اسلحے اور دُشمن کے ایجنٹوں اور مشرقی پاکستان کے حالات کی بات کر رہے تھے اور اب آپ سرکس پر آ گئے۔ تم ہمیں بتاؤ کہ آج، کل، پرسوں میں تم دو چار گھنٹے نکال سکتے ہو؟"

"دو چار گھنٹے؟ کیوں نہیں جی"۔ وہ بولا۔
"تمہاری ڈیوٹی کب ختم ہوگی؟"
"ڈیوٹی تو رات تک چلتی ہے، دس گیارہ بجے تک"۔
"اور صبح شروع کب ہوتی ہے؟" میں نے کہا۔
"یہی نو دس بجے"۔ وہ بولا۔ "لیکن میں سیٹھ سے دو چار گھنٹے کی چھٹی لے کر کہیں بھی جاسکتا ہوں، آپ بولو تو کل آجاؤں؟"
"ٹھیک ہے"۔ میں نے کہا۔ "کل کس وقت؟"
"آپ حکم کرو"۔ وہ بولا۔
"تم ایسا کرو، آج تو ہمیں ٹرک نمبر اور ڈرائیوروں کے نام بتاؤ، میرا مطلب ہے لکھ دو"۔
"لکھنا کیا جی، مجھے زبانی یاد ہیں۔ اکہتر اکونجا، ڈرائیور غلام دین، ستائی اُنیس، ڈرائیور بادشاہ گل"۔
"ایسے نہیں"۔ میں نے کہا۔ "ہم اتنی جلدی از بر نہیں کر سکتے اور اس کے علاوہ ہمیں زیادہ تفصیل چاہیے، مثلاً گزشتہ ماہ کی تاریخ وار رپورٹ کہ کون سا ٹرک کس تاریخ کو گیا اور کس کا مال لے کر گیا"۔
"پورے مہینے کی، یہ ذرا لمبا کام ہے، ہر ٹرک کے چار پھیرے تو ہوتے ہیں اور شاید دس ٹرک۔۔۔ ہاں، دس ہی ہیں جو اس ہیرا پھیری کے کام میں چالو ہیں"۔ چکری نے سوچ کر کہا۔
"بس تو چالیس تاریخوں کا اندراج کرو۔ تمہارے لیے کوئی بہت لمبا کام نہیں۔ ٹرک کا نمبر اور ڈرائیور کا نام تو تم زبانی لکھ لو گے، بس تاریخ اور مال کی تفصیل دیکھنا ہوگی۔ ایسا کرو کہ دس پرچیاں بنالو، ہر پرچی پر الگ الگ لکھتے جاؤ۔ میرا خیال ہے، تمہارا آدھا گھنٹا صرف ہوگا"۔
چکری مسکرایا۔ "او نہیں جی! گھنٹا تو لگ جاتا ہے، پر آپ فکر مت کرو۔ رب نے چاہا تو کل آپ کو دے دوں گا"۔
میں نے دس ہزار کے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی۔ "یہ ہے اس کام کا معاوضہ"۔
اُس نے گڈی کی طرف دیکھا مگر ہاتھ آگے نہیں بڑھایا۔ "یہ تو رشوت ہوگئی، اک نی تو نہ ہوئی جناب۔ آپ ایسا کریں، وہ جو بابو دوسرے کمرے میں بیٹھے تھے، اُن میں سے ایک ٹرک بک کرتا ہے۔ گنجا اور موٹا، وہ بڑے شوق سے آپ کا کام کرے گا"۔
"لیکن ہم اُس پر اعتبار نہیں کر سکتے چکری"۔ میں نے کہا۔
"اور مجھ پر اعتبار ہے آپ کو؟"
"ہاں، اس میں شک کی کون سی بات ہے۔ اعتبار نہ ہوتا تو تم کو اپنے بارے میں کیوں بتاتے؟"
"اعتبار ہوتا تو آپ مجھے خریدنے کی کوشش نہ کرتے"۔ وہ بولا۔
"معاف کرنا"۔ میں نے شرمندہ ہو کے کہا۔ "ہمارا یہ مطلب نہیں تھا، تم کو بُرا لگا تو ہمیں افسوس ہے۔ کل تم دس گیارہ بجے فارغ مل سکتے ہو؟"
"صبح۔۔۔ میرا خیال ہے کہ آپ یا تو سویرے سویرے آجاؤ، سات بجے سے بھی پہلے، میں دس گیارہ بجے تک یہاں آجاؤں یا پھر اسی وقت آئیں تو میں رات تک آپ کے ساتھ رہوں"۔ وہ بولا۔
"ہم کل شام اسی وقت آئیں گے"۔ میں نے کہا۔
"یہ آپ نے سرکس کی کیا بات کی تھی جناب!" وہ اترتے اترتے بولا۔
"ہاں، یہ جو ٹریلر خرید رہے ہیں ہم، اس میں ایک سرکس لے کر روانہ ہوں گے"۔ میں نے کہا۔ "لاہور سے کراچی تک تماشا دکھاتے جائیں گے، مقصد کچھ اور ہوگا، لوگ تماشا دیکھیں گے۔ ہم اور ہمارے کچھ ساتھی پبلک کو تماشے میں لگا کے اپنا کام کریں گے"۔
"سرکس میں کون کام کرے گا، آپ لوگ۔۔۔؟"
"ہم بھی۔۔۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "ہمارے علاوہ ریچھ، بندر کا تماشا دکھانے والے ہوں گے، بہیرا ہوگا، مداری ہوگا، گھوڑے اور سائیکل سواری کے کرتب دکھانے والے ہوں گے۔ دو بھانڈ، ایک ڈھول بجانے والا اور دسویں تم جو صرف ڈرائیور ہو۔ ہمارے دوسرے معاملات سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ تمہاری مرضی کی بات ہے ورنہ سب کی طرح تم بھی سرکس کے ساتھ رہو گے ہم تو بس چلتے جائیں گے، دو دو چار چار دن رُکتے ہوئے"۔
"سرکس کا تو مجھے بچپن سے بڑا شوق تھا۔ میں امرتسر کا رہنے والا ہوں جی، وہاں لاہوری سرکس کا سال میں ایک دو بار پھیرا ہوتا تھا تو میں روز میلا جاتا تھا۔ ایسے روز جوتے کھاتا تھا مگر روز ماں کے پیسے چُرا کے جاتا ضرور تھا، اللہ معاف کرے"۔ اُس نے کانوں کو ہاتھ لگا کے کہا۔ "ان کو میں نے بہت پریشان کیا تھا"۔
"اب کہاں ہیں وہ؟"
"اب اللہ میاں کے پاس، فسادات میں شہید ہو گئے تھے۔ میں آٹھ سال کا تھا جب اکیلا پاکستان پہنچا تھا۔ اسپیشل ٹرین میں ایک جاننے والے کے ساتھ بیٹھ گیا تھا۔ اُس نے لاہور میں چھوڑ دیا۔ بس اس کے بعد اپنی تو زندگی ایسے ہی گزری مگر ابھی چار سال ہوئے میں نے شادی کر لی ہے۔ ایک بڑے نیک دل حافظ جی کی بیٹی ہے، مسجد میں امامت کرتے تھے، پچھلے سال انتقال کر گئے۔ اب اس نیک بخت کا بھی کوئی نہیں۔ ہمارا ایک بچہ ہے جسے ہم انگلش اسکول میں پڑھائیں گے"۔
"ضرور پڑھانا مگر کیا اسے چھوڑ کر جاؤ گے، جب اس کا اللہ تمہارا کوئی آگے پیچھے نہیں ہے"۔

"میں نے ابھی کون سا فیصلہ کر لیا ہے جی۔ گھر جا کے بات کروں گا اُس سے، وہ کیا کہتی ہے"۔
"اُس کو تم صرف یہ بتاؤ گے کہ تم نے ایک سرکس کی گاڑی چلانے کی نوکری قبول کی ہے، تنخواہ تین ہزار"۔ میں نے کہا۔
"ابھی تو آپ بائیس سو بول رہے تھے"۔
"اس وقت ہمیں علم نہیں تھا کہ تم شادی شدہ ہو اور اپنے بچے کو انگلش میڈیم اسکول میں پڑھانا چاہتے ہو"۔ میں نے مسکرا کے کہا۔
"وہ تو دُور کی بات ہے جی، تین سال بعد داخلہ ہوگا"۔
"مگر اس کے لیے تیاری تو ابھی سے کرنا ہوگی تمہیں۔ تمہارے کھانے پینے کا خرچ کوئی نہیں، تم ہمارے ساتھ رہو گے، اگر تم چلے گئے تو پوری تنخواہ تین ہزار روپے ہر ماہ تمہاری بیوی کو یہاں دے دی جائے گی۔ تم جہاں بھی ہو گے۔۔۔"
"میں پندرہ دن میں ایک بار تو اُس سے ملنے کے لیے آسکوں گا نا؟"
"صاف بات یہ ہے چکری کہ ہم وعدہ نہیں کر سکتے"۔ میں نے کہا۔
"یہ ہو سکتا ہے کہ تم ہفتے بھر بعد آجاؤ"۔ محسن نے کہا۔ "اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم کو پورا مہینہ موقع نہ ملے"۔
"ویسے ڈرائیور کا اتنا کام نہیں ہوتا"۔ میں نے کہا۔ "اگر ہم کسی جگہ دو چار دن کے لیے قیام کریں گے تو تمہاری چھٹی ہی ہوگی"۔
"پھر۔۔۔ پھر تو میں چلوں گا جی۔۔۔ ضرور چلوں گا"۔ وہ بولا۔
"ایک بات اور بتا دیں مجھے، یہ نوکری پکی ہے کہ کچی؟"
"پکی۔۔۔ سو فیصد پکی، جب تک ہم ہیں تم ہمارے ساتھ ہو"۔ میں نے کہا۔
اُس نے ایک بار پھر ہم سے مصافحہ کیا اور نیچے اُتر گیا۔
"مسٹر سکندرِ اعظم"۔ محسن نے کہا۔ "بھروسا اچھی چیز ہے مگر اس میں اتنی عجلت کا مظاہرہ کرنے کی کیا ضرورت تھی"۔
"کیا مطلب؟" میں نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔
"مطلب یہ کہ تُو نے ایک دم اس پر اپنی شناخت ظاہر کر دی، یہ رسک کیوں لیا تُو نے؟"
"میری چھٹی حس نے مجھے قائل کر لیا تھا کہ آدمی اعتماد کے قابل ہے"۔
"میری ساتویں حس کہتی ہے کہ ہم سے غلطی ہوئی"۔ محسن نے کہا۔ "وہ چکری کیوں مشہور ہو گیا آخر، ذرا گاڑی روک لے، اس بس کے پیچھے"۔
"زبانِ خلق نے مشہور کر دیا اور کیا"۔ میں نے کہا اور گاڑی روک لی۔
"زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو۔ بُرا کہے جسے دُنیا اُسے بُرا سمجھو"۔
"کیا اس کے جواب میں مرزا غالب کا فرمایا ہُوا مستند نہیں ہو گا؟" میں نے کہا۔ "ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں۔ آج تک میری چھٹی حس نے تیری ساتویں حس کو غلط ثابت کیا ہے"۔
"عزیزم! فرمایا ہے شیکسپیئر نے کہ یہ دُنیا ایک اسٹیج ہے اور اس میں رہنے والے سب اداکار"۔ محسن نے کہا۔ "کیا ہم اداکار اور بہروپیے نہیں ہیں۔ دن رات میک اپ بدل کے کبھی کچھ بن جاتے ہیں تو کبھی کچھ۔ دلاور سے بڑا ایکٹر دیکھا تھا پہلے کبھی۔۔۔ مگر بی بی زیب النساء نے اپنی معصوم اداکاری سے اور بھولپن سے ہماری عیاری اور مستعدی، ہوشیاری اور مردانگی کو کیا خوبصورت مات دی اور ثابت کر دیا کہ پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر"۔
"میرے کوہِ نُور ہیرے، اب تو جو ہونا تھا ہو گیا"۔ میں نے کہا۔
"ابھی کچھ نہیں ہُوا"۔ محسن بولا۔ "لیکن غور کرو دوسرے امکانات پر کہ چکری سچ مچ چکر باز ہُوا تو کیا ہوگا۔ ہم اس مرحلے پر جُوا نہیں کھیل سکتے دوست! ہم صرف اپنی کامیابی کو داؤ پر لگا سکتے ہیں۔ پانسا غلط پڑ جائے تو سب جدوجہد کا حاصل ناکامی، ساری پلاننگ کا ملیہ"۔
اُس کی بات نے مجھے اپنی جلد بازی پر متفکر کر دیا۔ "پھر اب کیا کریں؟"
اس سے پہلے کہ محسن جواب دیتا، میں نے چکری کو اس ٹرک کمپنی سے باہر آتا دیکھا۔ ہم جس بس کے پیچھے تھے، وہ مدت سے خراب کھڑی ہوئی تھی۔ اس پر پڑی ہوئی گرد کی تہ اور کسمپرسی کی حالت سے یہی ظاہر ہوتا تھا۔ دو ٹائروں کی ہوا نکل گئی تھی یا مہم جُو بچوں نے نکال دی تھی۔ اندر کی سیٹوں پر کچھ پھٹے پُرانے کپڑے ظاہر کرتے تھے کہ اس ڈبے کی حرکت پذیری ختم ہو جانے کا فائدہ کسی بے گھر نے اُٹھایا تھا اور اپنے بیڈ رُوم کو فٹ پاتھ سے بس کے اندر شفٹ کر لیا تھا۔ یہ جگ رَین بسیرا بنے نہ تیرا نہ میرا۔ جس دن کوئی بس کو لینے آگیا تو ہم بھی اپنا بوریا بستر اُٹھائیں گے۔ پائے گدا لنگ نیست۔ ملک خدا تنگ نیست۔ میں اور محسن اپنی گاڑی سے اُتر کے بس میں چڑھ گئے اور اگلے شیشے سے دیکھنے لگے۔ چکری کی نظریں کسی رکشا ٹیکسی کو تلاش کر رہی تھیں۔ اس نے کئی بار ہاتھ دیا مگر قریب آنے پر وہ رکشا ٹیکسی بھرے ہوئے ملتے۔ اس کی صورت پر اب ایک ایسا اضطراب تھا جو اُس کے کچھ دیر پہلے کے سکون سے بہت مختلف لگتا تھا یا شاید یہ محسن کا پیدا کردہ شک تھا جس نے میری نگاہ کو مشکوک کر دیا تھا۔ بالآخر ایک خالی رکشا اس کے اشارے پر رُک گیا مگر پھر نہ جانے کیا ہُوا کہ ان کے درمیان تکرار ہونے لگی۔
دو منٹ میں تکرار نے تنازعے کی شکل اختیار کر لی اور رکشا ڈرائیور

نے نیچے اُتر کے چکری کو پکڑ لیا۔ چند لوگ اتنی دیر میں جمع ہو گئے تھے اور ہم دست وگریباں ہونے والوں کو الگ کرنے کی کوشش میں مصروف تھے۔

مَیں نے محسن کو اشارہ کیا اور ہم دونوں بس کے گیٹ سے اُتر کے بھیڑ کے پیچھے مگر بس کی اوٹ میں کھڑے ہو گئے۔ ایک نسبتاً تندرست شخص نے جھگڑا ختم کرا دیا تھا اور اب جسٹس آف پیس کے فرائض انجام دے رہا تھا۔

"او پہلوان جی! مَیں کیہا کہ میں جا ریا آں جو بُری ویل" رکشا والے نے کہنا شروع کیا "میرا جی ٹھیک نئیں سی، فیر وی مَیں کیہا کہ چلو رستے دی سواری لبدی اے تے لے لواں، مَیں رہنا واں اُتھے..."

"او یار! ایویں بہانے بازیاں کر دے او تُسی لوگ" چکری بول پڑا۔

"قسم رب دی مینوں بخار اے، تُسی آپ ویکھ لو" رکشا والے نے ہاتھ آگے بڑھایا "مَیں تے گھر جا کے آرام کرن دی سوچ ریا سی، ایہہ مگر ہو گیا کہ مینوں لے کے چل"

"جاناں کتھے سی یار؟" پہلوان نے رکشا والے کا ہاتھ تھاما اور قائل ہو کے کہا "بخار تے ہے غریب نوں"

"اینے جاناں سی کسی پولیس افسر دے گھر" رکشا والے نے فریاد کرتے ہوئے کہا "پتا نہیں کیہڑا توپ خاں سی"

"مَیں ایس ایس پی سراج دی کوٹھی تے جانا سی" چکری نے چلّا کے کہا۔

"تے ہور رکشے تھوڑے نے" پہلوان نے کہا "ایدے نال کیوں پیاز بردستی کرنا ایں"

"کتھے نے رکشے؟" چکری نے برہمی سے کہا "تُساں ٹُٹ گیاں نے میریاں کھلوتے ہوئے"

"او جی مینوں کیہندا کہ تیرا تے پیو وی جائے گا" رکشا والا پہلوان کی حمایت پر اکڑ گیا "مَیں کیہا کہ خبردار جے پیو دا ناں لیا"

"چل میاں تُوں جا" پہلوان نے رکشے والے کو رخصت کیا اور چکری کو گردن سے دبوچ لیا "تیرے اس پولیس افسر دی تے مَیں..." اُس نے پولیس افسر کے نام سے ناجائز فائدہ اُٹھانے والے چکری کو زبردست گالی کے ساتھ ایسا جھٹکا دیا کہ وہ نیچے گر گیا "جا ہُن اُس اپنے پیو نوں دس دئیں میرا ناں، پھانسی لا دیوے مینوں، پولیس افسر دا پُتر"

دیگر حاضرین نے بھی اس بات پر اتفاقِ رائے کیا کہ نہ صرف پولیس خود کو پبلک کا آقا سمجھتی ہے بلکہ ان کے چچے تک فرعون بنے پھرتے ہیں مگر ابھی یہ مجمع منتشر بھی نہیں ہُوا تھا کہ مَیں اور محسن واپس دوڑے۔ ہم نے اپنی گاڑی میں بیٹھ کے اُسے تقریباً پچاس گز بیک کیا۔ پھر سکنے کی گنجائش ہی نہ رہی تھی کہ مَیں نے گاڑی کو یو ٹرن دیا اور ٹریفک میں شامل ہو گیا۔

"اب فرمایئے" محسن نے میری گدّی پر ہاتھ مارا۔

"حضرت... یہ کیا، دھول دھپّا تو شرفا کا شیوہ نہیں ہے" مَیں نے گردن سہلا کے کہا "اگر آپ کی ساتویں حس آج اتفاقاً..."

"اتفاقاً؟" محسن نے مجھے دوسرا ہاتھ مارنے کی کوشش کی "میری ساتویں حس ہمیشہ صحیح خبر دیتی ہے"

"یار مَیں گاڑی چلا رہا ہوں" مَیں نے کہا "گاڑی گھس جائے گی کسی کے ریڑھے میں"

"اس وقت قدرت نے ہماری مدد کی، اگر اس رکشا ڈرائیور کو بخار نہ ہوتا تو یہ جھگڑا کھڑا نہ ہوتا۔ چکری اس میں خاموشی سے بیٹھتا اور ہمیں خاک پتا نہ چلتا کہ وہ کدھر گیا؟" محسن نے مجھے ڈانٹنا جاری رکھا۔

یہ قدرت کی طرف سے ملنے والا ایک سبق تھا۔ مَیں خود اعتمادی اور قیافہ شناسی کی صلاحیت کے مظاہرے میں حد سے آگے بڑھ گیا تھا۔ اس امر کے باوجود کہ زیب النسا نے جو دھوکا دیا تھا اس کا زخم تازہ تھا۔ محسن نے ٹھیک کہا تھا، ہم اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ رسک لے سکیں اور جُوا کھیل سکیں۔ اب یہ سوچ کر میرا دل ڈوبنے لگتا تھا کہ خدانخواستہ چکری نکل کر سراج کے پاس جا پہنچتا تو کیا ہوتا۔ ہماری سرکس کی اسکیم دیوانے کا خواب بن جاتی۔ اتنا بڑا پلان ایک چھوٹی سی غلطی کی نذر ہو جاتا اور ساری ذمّے داری مجھ پر آتی جس نے احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا تھا۔ اب تو ہمیں جان لینا چاہیے اور سمجھ لینا چاہیے کہ سارے چہرے وہ نہیں ہوتے جو دکھائی دیتے ہیں اور انسان ہی انسان کو دوستی، نیک نیتی اور شرافت کے نام پر دھوکا دیتے ہیں، ان سے دشمنی کرتے ہیں اور نفرتوں کا زہر بانٹتے ہیں۔

پیڈرو کو وہاں دیکھتے ہی مجھے سمجھ لینا چاہیے تھا کہ یہاں ہمارا دوست اور حامی یا ہم خیال کوئی نہیں ہو سکتا۔ دلاور اینڈ کمپنی کا سارا کاروبار مخصوص مفادات رکھنے والے لوگوں کے باہمی اشتراک سے چل رہا ہے۔ وہ کسی بھی ایسی جگہ نہیں جا سکتے جہاں انھیں کسی ایک آدمی سے بھی اندیشہ ہو کہ وہ مستقبل میں کسی مرحلے پر ان کے لیے خطرہ بن سکتا ہے۔ جب اُنھوں نے اس گڈز ٹرانسپورٹ ایجنسی کا انتخاب کیا ہوگا تو پوری طرح اطمینان کر لیا ہوگا کہ یہاں سب انھی کے جیسے ہیں۔ اُنھوں نے فرداً فرداً سب کو آزمایا ہوگا کہ کس میں حب الوطنی کے جراثیم ہیں اور کون ایمان کو پیسے سے زیادہ اہم سمجھتا ہے۔ ایسے تمام افراد کو اُنھوں نے نکلوا دیا ہوگا اور اُن کی جگہ ایسے آدمی رکھوا دیے ہوں گے۔ اب ایک طرح سے یہ اُن کی اپنی کمپنی تھی جس میں سب مل کے کام

کر رہے تھے۔ سب وطن کی آزادی اور سلامتی کو بیچ رہے تھے اور اپنے خزانے بھر رہے تھے چونکہ سب مجرم تھے اور سب زر پرست تھے اس لیے کسی کو کسی سے ڈر نہیں تھا۔ کوئی کسی پر انگلی نہیں اُٹھا سکتا تھا اور کسی کو الزام نہیں دے سکتا تھا۔ ایک وہ ہوتے ہیں جو اپنی آنکھ میں شہتیر نہیں دیکھتے مگر دوسرے کی آنکھ کا تنکا دیکھ لیتے ہیں۔ یہاں تو سب ہی وہ تھے جن کی آنکھوں میں شہتیر تھے۔

محسن بھی مجھے پشیمان دیکھ کر خاموش تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ غلطی کا احساس ہی تجربے کا نام ہے اور انسان غلطیاں نہ کرے تو کچھ نہ سیکھے۔ غلطی اس سے بھی ہو سکتی تھی اور کسی سے بھی ہو سکتی تھی چنانچہ مجھے زیادہ کچھ کہنا بے کار تھا۔ سراج کے گھر کی طرف جاتے ہوئے مجھے وہ سب باتیں یاد آئیں جو مَیں نے اور محسن نے چکری سے کی تھیں۔

"یار محسن! ہم نے اُسے بہت کچھ بتا دیا" مَیں نے کہا۔ "تُو نے بھی مجھے نہیں روکا، میرے ساتھ شامل ہو گیا"

"بھائی صاحب! مَیں روک کے کیا کرتا اور روکتا کیسے؟ جب آپ نے اُسے بتا دیا کہ ہم کون ہیں، اپنے ساتھ میرا تعارف بھی کروایا تو مَیں نے بھی کہا کہ ٹھیک ہے، جب اوکھلی میں دیا سر تو موسلوں کا کیا ڈر۔ مَیں کیسے شامل نہ ہوتا۔ یہ تو ایسا ہی ہے کہ کوئی خود سوئمنگ پول میں کود جائے اور اپنے ساتھ دوسرے کو بھی لے جائے، جب ڈوبنے لگے تو کہے کہ مَیں تو ڈوب ہی رہا ہوں، تم کیوں ڈوب رہے ہو" محسن بولا۔

"میرا خیال ہے اس نے سراج کو فون کیا ہوگا؟" مَیں نے کہا۔

"یہاں سے نہیں؟" محسن بولا "وہاں ایک ازدحام تھا۔ ان سب کے درمیان رہتے ہوئے وہ کسی ایس ایس پی سے بات کرتا تو اس کا راز فاش ہو جاتا۔ وہ ایک معمولی ڈرائیور ہے، اس کا کسی ایس ایس پی سے کیا تعلق؟"

"تعلق تو سب کا ہوگا" مَیں نے کہا۔

"کاروبار کی حد تک" محسن بولا "وہ جانتے ہوں گے کہ ٹرک میں کیا مال جا رہا ہے اور کہاں جائے گا۔ ان کو اس کام کا معاوضہ بھی بہت معقول ملتا ہوگا لیکن ڈرائیور صرف پیڈرو کو جانتے ہوں گے۔ وہی مال لاتا ہوگا اور ادائیگی کرتا ہوگا۔ ان کے نزدیک وہ کسی کمپنی کا مینجر ہے۔ چکری خاص آدمی ہے کیونکہ وہ چکری ہے، دوسروں سے زیادہ مکار اور چالاک ہے۔ اُسے سراج نے اپنے مخبر کے طور پر یہاں چھوڑ رکھا ہوگا کہ کبھی کوئی مشکوک معاملہ دیکھے تو فوراً اطلاع دے۔ شاید وہی ایک شخص ہوگا جو یہ جانتا ہوگا کہ اس کاروبار میں ایس ایس پی سراج کا حصہ بھی ہے۔ ممکن ہے اُسے دوسروں کی خبر نہ ہو۔ مخبر کے ذریعے اندر کی باتیں اور خبریں جاننے کا طریقہ پولیس والے استعمال کرتے ہیں اور یہ ذمّے داری سراج نے قبول کر رکھی ہو گی کہ وہ نمک خوار ڈرائیوروں میں ایک ایسا آدمی چھوڑ دے جو ان کی ہر بات آگے پہنچاتا رہے اور پل پل کی خبر دیتا رہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اُسے دلاور اور جمشید وغیرہ کے پورے گروہ کی خبر ہو۔ وہ ایس پی کو رپورٹ دینے پر مامور ہوگا اور اس اعزاز پر ہی مطمئن ہوگا کہ وہ شاہ کا مصاحب ہے۔ ایس ایس پی کا افسر بکارِ خاص بھی کم تو نہیں ہوتا۔ تُو نے دیکھا وہ رکشا والے سے کس طرح اکڑ گیا تھا جیسے وہ خود ایس پی ہو"

"مجھے تو لگتا ہے کہ کل اُس رکشے والے کو اس نافرمانی کی سزا ملے گی۔ چکری نے نمبر نوٹ کر لیا ہوگا اس گستاخ رکشا ڈرائیور کا"

"ہم بال بال بچ گئے" محسن بولا۔

"ہاں، چکری نے فون پر بات کرنے کے بجائے بقدم خود حاضر ہو کے ایس پی صاحب کو ایک سنسنی خیز رپورٹ دینا بہتر سمجھا۔ یہ اتنی بڑی خبر تھی کہ اس کا انعام بھی بہت بڑا ملتا۔ وہ اندر گیا اور ضروری کام کا بہانہ کر کے نکل آیا۔ یہ مزید اچھا ہُوا کہ اتنی دیر میں ہم نے گاڑی وہاں سے ہٹا لی تھی۔ چکری نے باہر آتے ہی اپنا اطمینان کر لیا ہوگا کہ ہم چلے گئے" مَیں نے کہا۔

"کتنے اطمینان اور اعتماد کے ساتھ اُس نے دس ہزار لینے سے انکار کر دیا" محسن نے کہا "سالا ڈرامے باز..."

"اُسے دس ہزار کے دُگنے انعام میں ملنے کی اُمید ہو گی۔ نمک حرامی کرنے کا معاوضہ لینے میں خطرہ تھا۔ نمک حلال ثابت کرنے میں آئندہ کے لیے بھی اپنی اہمیت اور افادیت کا یقین دلایا جا سکتا تھا اور خود کو بہتر ذمّے داریوں کا اہل ثابت کیا جا سکتا تھا"

"اب ذرا سوچ لو کہ کیا کرنا ہے" محسن بولا "ہم سراج کے گھر کے آس پاس بھی نہیں جا سکتے"

"ہم اُسے راستے میں ہی روک لیں گے، جب ہم روانہ ہوئے تھے تو وہ دوسرے رکشے کا انتظار کر رہا تھا" مَیں نے کہا "رکشا کسی طرح بھی ہم سے پہلے نہیں پہنچ سکتا"

"سوال یہ ہے کہ ہم اُسے کس راستے پر اور کہاں روکیں گے"

"ایک رکشا والا بن کے سوچ" مَیں نے کہا "تو کون سا راستہ اختیار کرتا"

"سوچ لیا" محسن بولا "اب بھی دو راستے ہیں"

"بالکل ٹھیک۔ ایک راستے پر مَیں نظر رکھوں گا، دوسرے پر تُو ناکا بندی کرے گا" مَیں نے کہا "گاڑی تیسری جگہ ہو گی۔ اس کام میں کوتاہی کی گنجائش نہیں۔ چکری کو ہر قیمت پر روکنا ہوگا۔ اب دیکھ، اگلے موڑ پر مَیں تجھے ڈراپ کرتا ہوں، وہاں سے

سراج کے گھر کا فاصلہ شاید ایک فرلانگ سے بھی کم ہے۔ اس موڑ کے بعد والی سڑک سیدھی سراج کی کوٹھی کے سامنے سے گزرتی ہے۔"

"رکشا اسی سڑک پر مخالف سمت سے بھی آ سکتا ہے۔"

"ہاں، میں ادھر ہی جا رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"اس کے لیے تجھے سراج کی کوٹھی کے بالکل سامنے سے گزر کے جانا ہوگا۔"

"ہاں، میں تیزی سے نکل جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "ایک تو رات کا وقت ہے پھر یہ گاڑی سرکاری ہے اور میرا حلیہ بھی وہ نہیں جو پہلے تھا۔"

"پھر بھی یہ چانس تو ہے کہ پولیس تجھے روک لے۔" محسن نے کہا۔

"ہاں، چانس تو ہے مگر میں یہ چانس لوں گا کیونکہ اس کے سوا چارہ نہیں، اگر میں نے سڑک کے دوسرے کنارے تک پہنچنے کے لیے متبادل راستہ اختیار کیا تو کئی میل کا چکر پڑے گا اور چکری کو بہت وقت مل جائے گا۔"

محسن نے سر ہلایا اور مائکروبس کی رفتار کم ہوتے ہی نیچے کود گیا۔ میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ موڑ کاٹتے ہی مجھے سراج کی کوٹھی کا گیٹ نظر آنے لگا۔ وہاں دونوں جانب سرچ لائٹس کا اُجالا تھا اور سڑک کے ساتھ پولیس کا ایک ٹرک کھڑا ہوا تھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر ایک جیپ تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ حفاظتی انتظامات بدستور انتہائی سخت تھے۔ ابھی میں گیٹ سے سو گز دور تھا کہ کہیں سے اچانک ایک شخص نکل کے سڑک کے درمیان میں آگیا۔ وہ سادہ کپڑوں میں تھا لیکن اس کی سفید شلوار قمیص اور اس کے جوتے، اس کے بالوں کا کٹ اور اس کی صورت کی سفاک بے حسی خود بتاتی تھی کہ وہ خفیہ پولیس کا آدمی ہے۔

میں نے بریک لگا کے گاڑی روک لی۔ "السلام علیکم، خو کیا بات ہے یارا، مرنے کا صلاح ہے؟"

"کس کی گاڑی ہے؟" اس نے ٹارچ سے مائکروبس کی [illegible] روشنی ڈالی۔ "ڈائریکٹوریٹ آف ڈائریکٹ ڈسپوزل۔"

"گورنمنٹ کا گاڑی ہے۔" میں نے [illegible] لہجے میں کہا۔

"[illegible] جا رہے ہو اس وقت؟" وہ ٹارچ سے اندر لائٹ [illegible] بولا۔

"[illegible] صاحب کا فیملی کو لینے۔" میں نے کہا۔ "کیا بات [illegible] دیکھتا ہے ایسا؟"

"[illegible] وہ غرا کے بولا۔ "بک بک مت کرو، جاؤ۔"

[illegible] انداز میں زیر لب اسے گالی دی اور سر کو ناقابلِ فہم انداز میں ہلاتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی۔ کلیئرنس مل جانے پر اطمینان کا گہرا سانس بھی میں نے اس وقت لیا جب میں کوٹھی کے سامنے سے گزر گیا۔ آگے ایک اور شخص ٹہل رہا تھا مگر وہ دوسری طرف سے آنے والی گاڑیوں کو چیک کرنے پر مامور تھا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ مجھے کلیئرنس مل چکی ہے۔ وہ سارا دن آتی جاتی گاڑیوں کو دیکھتے رہے تھے اور اس بیزار کن کام کی یکسانیت سے اُکتا گئے تھے جس کا حاصل کچھ نہیں ہوا تھا، اب وہ سرکاری ڈیوٹی کو دلچسپی کے بغیر ایک رسمی کارروائی سمجھ کے پورا کر رہے تھے۔ گاڑی سرکاری نہ ہوتی تو شاید وہ مجھ سے کاغذات طلب کرتے اور مجھے زیادہ غور سے دیکھتے مگر گورنمنٹ آف ویسٹ پاکستان کے نام نے اُن کے سارے شکوک رفع کر دیے تھے۔

میں تقریباً پچاس گز جا کے دائیں طرف مڑا۔ وہاں گاڑی کو چھپانے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ اُسے میں نے راستے سے بہت ہٹا کے اور سڑک کے ایک تاریک حصے میں کھڑا کیا اور خود پیدل چل کے اور آگے چلا گیا۔ اس سڑک پر گاڑیوں کی آمدورفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ ایک جانب کوئی فارم یا باغ تھا جس کی کچی پکی دیوار جگہ جگہ سے منہدم ہو گئی تھی اور اندر درخت اندھیرے میں سرنگوں دیوزادوں کی طرح ساکت کھڑے تھے۔ دوسری طرف پرانی وضع کے سرکاری بنگلے تھے جن میں پہلے اصلی گورے حاکم رہتے ہوں گے۔ اب ان میں سراج جیسے کالے افسر رہتے تھے جو بلحاظ ذہنیت پرانے فرنگی آقاؤں کے صحیح جانشین ثابت ہو رہے تھے۔

مجھے خیال آیا کہ میری نسبت محسن کا کام زیادہ مشکل ہوگا اگر اس نے چکری کو قابو میں کر لیا تب بھی اسے گاڑی تک تو رکشا ہی میں آنا پڑے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ محسن کو چکری کے علاوہ رکشے والے سے بھی نمٹنا ہوگا اور ان دونوں میں سے ایک نے بھی شور مچا دیا تو... مگر ریوالور کی نال کو سامنے دیکھ کر موت کو آواز کون دے گا؟ پھر بھی اسے گیٹ کے سامنے سے تو گزرنا ہی ہوگا۔ وہ ریوالور دیکھ کر مزاحمت نہ کریں مگر اتنے مسلح محافظوں کی موجودگی ان کو واویلے پر اُکسائے گی۔ پھر محسن کیا کرے گا؟ بفرضِ محال اس نے دونوں کو گولی مار دی تب بھی وہ کیا رکشے میں فرار ہو سکے گا۔ پولیس والے جیپ لے کر اس کے پیچھے دوڑیں گے۔

مجھے پلاننگ میں خامی کا احساس ہوا۔ بہتر ہوتا اگر میں محسن کو واپس لوٹ جانے کو کہتا۔ اسے آگے آنے کا مشورہ نہ دیتا، جہاں گاڑی کھڑی ہوگی۔ وہ رکشے کو کسی خطرے کے بغیر واپس لے جا سکتا تھا۔ گاڑی کو درمیان میں کہیں روکنے کا سوال ہی نہ تھا۔ میں نے دل ہی دل میں دعا مانگی کہ چکری اس طرف سے نہ آئے۔ ویسے زیادہ امکان یہی تھا کہ چکری کا راستہ میں کاٹوں گا۔ بیشتر رکشے والے دوسری طرف سے آنا پسند نہیں کر سکتے کیونکہ اس طرف کی سڑک بہت خستہ حالت میں تھی۔ گاڑی میں بھی مجھے ہچکولے محسوس ہوئے تھے۔ رکشے کے پہیے بہت چھوٹے ہوتے ہیں، اس میں تو پائلٹ اور مسافر دونوں گیند کی طرح اُچھلتے ہوں گے۔

میں ایک درخت کے چوڑے تنے کی آڑ لے کر کھڑا ہوا تھا اور ایک ہی سمت میں دیکھ رہا تھا جدھر سے رکشے کے نمودار ہونے کی اُمید تھی۔ اس کی ایک روشن آنکھ بعد میں نمودار ہوئی، رات کی خاموشی کو اس کے سائیلنسر کی کرخت آواز نے پہلے منتشر کیا۔ میں چوکس ہو گیا۔ آواز بڑھتی گئی اور وہ روشنی قریب آتی گئی۔

صحیح وقت پر میں نے نیچے سے پتھر اُٹھا کے رکشے پر پھینکا۔ پتھر اس کے سامنے والے حصے سے ٹکرایا۔ رکشا ایک دم رُک گیا اور رکشے والا گالی دے کر نیچے اُترا۔ مجھے صرف اتنی مہلت درکار تھی کہ میں پیچھے بیٹھے ہوئے مسافر کو دیکھ سکوں مگر وہ مجھے اب بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

"کیا ہوا یار؟" میں نے چکری کی آواز سنی۔

"پتا نئیں کون... کسی نے وٹا ماریا سی۔" رکشے والا پریشانی کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ "لائٹ ٹٹ جاندی تے فیر۔"

"او چل یار! جب ٹوٹی نہیں تو..." چکری نے کہا۔ اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ میں درخت کے تنے کی اوٹ سے نکلا اور آہٹ کیے بغیر رکشے کے پیچھے جا پہنچا۔ میں نے دس قدم کا فاصلہ بہت جھک کر طے کیا تھا چنانچہ رکشے والا مجھے نہ دیکھ سکا۔ میں نے بڑی پھرتی سے چکری کے منہ پر ایک ہاتھ رکھا اور دوسرے ہاتھ سے اس کے سر پر ریوالور مارا۔ اس کی آواز تو نہیں نکلی مگر وہ میری گرفت سے نکلنے کے لیے تڑپا تو رکشا بُری طرح ہلا اور رکشے والے نے ایک دم پلٹ کے دیکھا۔

"چوپ..." میں نے چکری کو چھوڑ کے ریوالور کا رُخ اُس کی طرف کر دیا اور ہونٹوں پر انگلی رکھی۔ "آواز نہ نکلے۔"

اُس نے رضاکارانہ طور پر ہاتھ اُٹھا دیے تھے۔ [illegible] لاشعوری قسم کا ردِعمل تھا۔ عموماً فلموں میں وہ شخص ہینڈز اَپ کرنے کا حکم دیتا ہے جس کے ہاتھ میں ریوالور ہو۔

"کیا... کیا چاہتے ہو؟" وہ ہکلا کے بولا۔ "مال...؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ مال آمادہ ودا اور جاؤ، بالکل خاموشی کے ساتھ، جس راستے سے آئے تھے، اسی سے لوٹ جاؤ اور اس واقعے کو بھول جاؤ، سمجھو کہ نہ کوئی مسافر سوار ہوا، نہ تم یہاں آئے اور نہ مجھ سے ملے۔" میں نے چکری کو باہر کھینچ لیا۔ "میری صورت مت دیکھو، جاؤ۔" میں نے ریوالور سے رکشے والے کو اشارہ کیا۔ "میں تمہاری جان لینا نہیں چاہتا۔"

"خدا کے لیے رحم کرو مجھ پر۔" وہ ہاتھ جوڑ کے بولا۔

"ڈرو نہیں، کسی کو کچھ معلوم نہیں ہوگا مگر تم نے خود ہی کسی سے یہ بات کی تو پھر سمجھ لو کہ اپنی گرفتاری کا سامان خود کرو گے۔ جو بات ایک بار ہونٹوں سے نکل جائے، وہ کوٹھے چڑھ جاتی ہے۔ اس نے تمہارے رکشے کا نمبر نہیں دیکھا ہوگا۔ کوئی بھی مسافر بیٹھنے سے پہلے رکشے کا نمبر حفظ نہیں کرتا مگر تم نے بیوی کو بھی بتایا تو سمجھ لینا کہ وہ بیوہ ہو گئی۔ عورت کو کبھی وہ راز مت بتاؤ جس سے تمہاری زندگی اور سلامتی وابستہ ہو۔"

"وہ بے چاری تو کب کی اللہ کو پیاری ہو گئی۔" وہ بولا۔

"بس تو پھر وہی کرو جو میں نے کہا، بھول جاؤ اس واقعے کو۔"

اُس نے تعمیل کی۔ رکشا واپس موڑا اور آہستہ آہستہ روانہ ہو گیا۔ شاید اسے میری بات پر پوری طرح اعتبار نہیں آیا تھا کہ میں اس کی جان لینے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ اس کا خیال ہوگا کہ اس کے پلٹتے ہی میں گولی چلا دوں گا پھر جیسے جیسے فاصلہ بڑھتا گیا اس کا یقین بھی بڑھتا گیا اور اس کے رکشے کی رفتار بھی بڑھتی گئی۔ میں نے چکری کو اُٹھا کے کندھے پر ڈال لیا تھا۔ دو منٹ سے بھی کم وقت میں میں نے اُسے گاڑی میں پھینک دیا اور دروازہ بند کر دیا۔ گاڑی اسٹارٹ کر کے میں نے سوچا کہ محسن کی طرف لوٹ جاؤں۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں اسی راستے سے گزرا تھا۔ راستے پر گاڑیاں چیک کرنے والے سرکاری گاڑی کو پہچان لیں گے اور مجھے گزر جانے دیں گے مگر یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ دوبارہ روک لیں۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ میں ڈائریکٹر صاحب کی فیملی کو لینے کے لیے جا رہا ہوں۔ انھوں نے ٹارچ کی روشنی میں اس فیملی کو دیکھنا چاہا تو انھیں صرف چکری نظر آئے گا، بے ہوش لیکن ایک نظر میں لاش نظر آنے والا۔ اس کے علاوہ اب مجھے پہلے وہ روکے گا جس نے آتے وقت نہیں روکا تھا۔

یہ سوچ کے میں نے گاڑی کو اسی سمت میں بڑھا دیا جدھر رکشا گیا تھا۔ مجھے اب کم سے کم تین چار میل کا چکر کاٹ کے وہاں پہنچنا [illegible] جہاں محسن کو ڈراپ کیا تھا۔ پون گھنٹا پہلے کی بات تھی۔ دوبارہ وہاں پہنچنے میں پندرہ بیس منٹ صرف ہونا لازمی تھے۔ محسن یقیناً پریشان ہوگا کہ اتنی دیر کیوں ہوئی۔ چکری کو دوسرا رکشا پانچ دس منٹ بعد مل جانا چاہیے اور اس طرح ہمارے اور اس کے ایک ہی جگہ پہنچنے میں دس پندرہ منٹ کا فرق ہونا چاہیے۔ وہ جائے گا تو کہیں نہیں مگر اندیشے یقیناً اسے پریشان رکھیں گے۔ ناکامی کے اندیشے، صورتِ حال کے برعکس ہو جانے کے اندیشے، میرے پولیس کے ہاتھ پڑ جانے یا کسی بھی غیر متوقع بات کے اندیشے۔

کم سے کم وقت میں محسن تک پہنچ جانے کے خیال سے مَیں نے رفتار زیادہ رکھی۔ نئی مائکرو بس کا انجن پندرہ سو سی سی کی طاقت کا تھا اور سپر فاکس ویگن کی طرح اس کی پک اپ بھی غیر معمولی تھی۔ تنگ اور ناہموار سڑک پر میری ساری توجہ ڈرائیونگ کی طرف تھی۔ سن چھیاسٹھ سے پہلے کی فاکس ویگن میں چھ وولٹ کی بیٹری کی لائٹ بہت ہی کم ہوتی تھی۔ اب بارہ وولٹ سے بھی ہیڈ لائٹس اتنی تیز نہیں تھیں جتنی کہ نئی جاپانی کاروں میں ۔۔ تی تھیں۔

وہ ایک بلائنڈ کارنر تھا جہاں مَیں نے پوری احتیاط کرتے ہوئے گاڑی کو موڑا تھا مگر دوسری طرف سے ایک ٹرک کسی پاگل ہاتھی کی طرح دوڑتا ہُوا آیا۔ مَیں نے اسٹیئرنگ وہیل کو ایکدم بائیں جانب موڑ کے تصادم کو بچا لیا۔ ٹرک اس کے باوجود مائکرو بس کی باڈی کو تقریباً چھوتا ہُوا گزرا۔ اس کا اگلا بمپر مائکرو بس کے پچھلے بمپر پر لگا۔

لیکن یہ سب رفت گزشت والی بات ہو جاتی، اگر اسی وقت ایک حادثہ پیش نہ آتا۔ معلوم نہیں کس وقت چکری ہوش میں آ گیا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق اس کا ایک گھنٹے سے پہلے ہوش میں آنا مشکل تھا۔ مَیں نے ناپ تول کے صحیح جگہ پر ضرب لگائی تھی مگر ہر انسان کی قوّتِ مدافعت اور قوّتِ برداشت جدا ہوتی ہے۔ بہ ظاہر بہت صحت مند نظر آنے والے کو سُوئی چبھ جائے یا وہ خون کا ایک قطرہ بہتا دیکھ لے تو بے ہوش ہو جاتا ہے اور اس کے برعکس کمزور نظر آنے والے کو گولی لگ جائے اور خون مسلسل بہہ رہا ہو تو وہ بے ہوش نہیں ہوتا اور مقابلہ کرتا ہے یا جان بچانے کے لیے اپنے پیروں پر چل کے کسی گھر یا اسپتال تک جا پہنچتا ہے۔

چکری موقع کا منتظر رہا اور جب موڑ آیا تو اُس نے یہ سمجھتے ہوئے کہ اب میں رفتار لازمی طور پر کم کروں گا، ایک دم دروازہ کھول ۔۔ باہر چھلانگ ماردی، اگر یہ عام گاڑی ہوتی، جس کا دروازہ باہر کی طرف کُھلتا ہے تو چھُو کر گزر جانے والا ٹرک اس دروازے سے ٹکراتا اور اسے توڑ کر سڑک پر گرا کے روندتا ہُوا گزر جاتا مگر دروازہ سلائیڈنگ تھا اور تھوڑا سا پُش کرنے سے کھسک کر سائڈ میں ہو گیا تھا۔ نتیجہ یہ کہ ادھر چکری نے باہر جست لی، اُدھر ٹرک سامنے آ گیا، اس کے لیے ایک لمحے کی مہلت بھی نہ تھی جس میں وہ خود کو بچانے کی کوشش کے بارے میں سوچ بھی سکتا۔ غالباً وہ ہَوا میں ہی تھا جب ٹرک نے سامنے سے اس کو ٹکر ماری۔ مائکرو بس کا دروازہ سامنے نہیں آیا مگر چکری آ گیا۔

اگر ٹرک ذرا فاصلے سے گزرتا تو شاید چکری سڑک پر گرتا مگر اس صورت میں بھی اس کے بچنے کے امکانات بہت کم تھے یا تو وہ مائکرو کے پچھلے پہیّوں سے کچلا جاتا یا ٹرک کے اگلے پہیّوں سے۔ پیچھے کیا ہُوا اور کیا نہیں ہُوا، یہ مَیں نے سب نہیں دیکھا۔ مَیں نے عین اُس وقت دروازے کے سلائیڈ کرنے کی آواز سُنی تھی جب میں مائکرو بس کو ٹرک کی زد سے بچا رہا تھا۔ دوسرے لمحے چکری کی ایک بہت مختصر سیکنڈ کے سوویں حصّے تک یا اس سے بھی کم عرصے تک ارتعاش پیدا کرنے والی ... دلخراش اور نزع کے کرب سے موت تک کے سفر کا عنوان بننے والی چیخ سُنی پھر میں آگے نکل گیا اور مَیں نے بریک تو ذہن کے ایک خودکار ردِّ عمل کے طور پر لگا دیے تھے مگر مائکرو بس کے رُکتے رُکتے بیس پچیس گز اور گزر گئے۔

ٹرک والے نے واضح طور پر سب دیکھا تھا اور شاید سمجھ بھی لیا تھا کہ فرشتۂ اجل نے کسی بدنصیب کو سامنے لا ڈالا ہے، تو وہ کیا کر سکتا ہے۔ اسے تو ایک فٹ کا فاصلہ یا سیکنڈ کے ہزارویں حصّے کی مہلت بھی نہ ملی۔ اُس نے چکری کو سامنے سے ٹکراتے، گرتے اور مرتے دیکھا ہوگا۔ چکری شاید فضا میں تصادم کے فوراً بعد ہی مر گیا ہوگا۔ جب وہ سڑک پر گرا ہوگا تو لاش ہوگا اور ٹرک نے کسی جیتے جاگتے آدمی کو نہیں ایک لاش کو کچلا ہوگا۔

مائکرو بس کو روکتے ہی میں نے سڑک کے وسط میں وہ دھبّا سا دیکھا جو پچاس گز کے فاصلے سے یوں لگتا تھا جیسے سڑک پر کیچڑ ہے اور کچھ غلاظت پھیلی ہوئی ہے۔ چکری سڑک پر پس کر دُور دُور تک پھیل گیا تھا۔ اُس کا خون، گوشت اور ہڈّیاں سڑک پر گرد، تارکول، کنکر، پتّھر اور گھاس پھونس میں مل کر بچھ گئی تھیں۔ ٹرک والے عموماً ایسے معاملات میں سمجھداری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ کسی اور کے نقطۂ نظر سے یہ سفّاکی اور بربریت ہو سکتی ہے مگر ٹرک ڈرائیور جانتے ہیں کہ نادانستہ قتل کے الزام میں ان کو پولیس، کچہری اور جیل خانے کے کتنے پُرعذاب سالوں پر پھیلے ہوئے مرحلے جھیلنے ہوں گے۔ اس کا ارادہ کسی کو مارنے کا نہیں تھا چنانچہ اُس کی سب سے بڑی سزا وہ ذہنی اذیت بنی ہوگی جو اُس نے بعد میں اس منظر کا تصوّر کر کے کاٹی مگر اس وقت وہ رُکا نہیں، سیدھا گزر گیا۔ وہ جانتا تھا کہ مرنے والا خودکشی کرنا چاہتا تھا، اُسے کوئی نہیں بچا سکتا تھا پھر وہ خود کو کیوں نہ بچائے۔

معلوم نہیں آگے اس ٹرک کو کسی پولیس والے نے روکا یا نہیں۔ چوروں، ڈاکوؤں اور قاتلوں کو وہ کم ہی روکتے ہیں۔ ان کا شوق اور ان کی ہابی ہے، ان کو روکنا اور ٹرک دینا جو کمزور ہوں، اپنا دفاع نہ کر سکتے ہوں، دُنیاوی طور پر لاوارث ہوں اور خود کو بے گناہ نہ ثابت کر سکتے ہوں چنانچہ اُن پر کسی بھی ۔۔ میں ملوّث ہونے کا الزام عائد کیا جا سکتا ہے۔

مَیں اس حادثے پر خاصا دل گرفتہ تھا۔ چکری نے مجھے چکر دیا تھا اور اس وقت یہ بھُولا ہُوا تھا کہ سب سے بڑی چکر باز تقدیر ہے۔ وہ اپنے آقائے ولی نعمت کی خدمت میں اپنے کارنامے کی تفصیل بیان کرنے کے لیے حاضر ہونے دوڑا تھا کہ اُس نے اپنی چالاکی اور ذہانت سے محسن اور سکندر کو کیا چکر دیا ہے مگر اُسے علم نہ تھا کہ راستے تو اجل نے بند کر رکھے ہیں۔ وہ سراج کو کچھ بتائے بغیر مر گیا تھا، یہ میرے نقطۂ نظر سے اچھا ہُوا تھا مگر مَیں ان بدنصیبوں کے عبرت ناک انجام پر افسوس کیے بنا نہیں رہ سکتا جو قدرت کے نظامِ انصاف کی گرفت میں آنے سے بچتے رہتے ہیں تو بالکل ہی بھُول جاتے ہیں کہ دُنیا کو چلانے کے لیے خالقِ کائنات نے اس نظام میں ایک توازن ہمیشہ برقرار رکھا ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو اب تک انسان کی فطرت اور سرشت میں شامل بدی کا عنصر غالب آ چکا ہوتا اور شیطان ہی خدا کہلاتا۔

مَیں بے اختیار چند قدم آگے بڑھا۔ سڑک پر خون کی دو متوازی لکیریں سی بن گئی تھیں۔ ان سے ذرا ہٹ کے چکری کے آدھے ادھورے ٹکڑے اور کپڑوں کے چیتھڑے بکھرے ہوئے تھے مگر جس چیز نے مجھے متوجّہ کیا، کچھ کاغذات تھے۔ غالباً ٹرک کی ٹکر کے ساتھ ہی یہ کاغذات اُس کے کوٹ کی جیب سے نکل کر گر گئے تھے۔ مَیں نے جُھک کر ان کاغذوں کو اُٹھانا چاہا تو مجھے ایک پرس بھی دکھائی دیا۔ مَیں نے اُسے بھی جیب میں ڈال لیا اور پلٹ کر اپنی گاڑی کی طرف چلنے لگا۔ میری طبیعت اچانک مالش کرنے لگی تھی۔ نیچے جُھکتے ہوئے مجھے ایک عجیب سی رونگٹے کھڑے کر دینے والی بُو محسوس ہوئی تھی۔ یہ بُو مَیں نے قصابوں کی گندی دُکانوں میں اور ایک بار کمیلے میں محسوس کی تھی۔ مجھے ایک اُبکائی سی آئی اور ذرا سی دیر کے لیے مجھے زمین و آسمان گھومتے ہوئے لگے۔ مَیں نے مائکرو بس کا سہارا نہ لیا ہوتا تو مَیں یقیناً گر جاتا۔

چند منٹ بعد میری طبیعت سنبھل گئی اور مَیں نے چہرے پر سے وہ پسینہ خشک کیا جو میرے جسم پر بھی بہہ رہا تھا۔ مجھے کمزوری کا احساس ہوا لیکن میں ڈرائیونگ کرنے لگا۔ اب مَیں بہت محتاط تھا۔ مَیں گاڑی کو بہت آہستہ چلا رہا تھا اور کوشش کر رہا تھا کہ احساس سے اس خونی منظر کو کھُرچ کر مٹا دوں جو ساری لرزہ خیز تفصیلات کے ساتھ میرے ذہن پر یوں نقش ہو گیا تھا جیسے شفّاف شیشے پر چپکی ہوئی تصویر۔

ایک طویل سفر طے کر کے مَیں محسن تک پہنچا تو ذہنی اور اعصابی تکان کے آثار میری صورت سے عیاں تھے۔

”اتنی دیر کیوں ہوئی؟“ محسن نے گاڑی کے رُکتے ہی قریب آ کے کہا۔ ”مَیں تو گھبرا گیا تھا۔“ پھر اُس نے میری صورت دیکھی۔ ”تجھے کیا ہُوا ہے، سکندر؟“

”کچھ نہیں۔“ مَیں نے اسٹیئرنگ پر سر رکھ کے کہا۔ ”بڑی اچھی بات ہے کہ کچھ بھی نہیں ہُوا۔ چکری کچھ نہیں کر سکا۔“

”کیا تُو نے اُسے مار دیا؟“ محسن بولا۔ ”اگر مار دیا ہے تو کوئی بات نہیں۔ ناگزیر سمجھ کے ہی ایسا کیا ہوگا تُو نے۔“

”نہیں یار، مَیں نے اُسے نہیں مارا، اُسے قدرت نے مار دیا، اُسے وہیں مرنا تھا۔ تقدیر نے ہمیں بھیجا اور ہم نے اس کے لیے وہاں پہنچنے کا سبب پیدا کر دیا جہاں عزرائیل کو اس کی رُوح قبض کرنے کا حکم تھا۔ جب وقت آتا ہے تو سب ہی وہاں پہنچ جاتے ہیں جہاں موت منتظر ہوتی ہے۔“

”چل تُو ادھر ہو۔“ محسن نے کہا۔ ”گاڑی مَیں چلاؤں گا تُو اطمینان سے بتا مجھے کہ کیا ہُوا۔ ایسا کرتے ہیں کہ گلبرگ کی طرف چلتے ہیں، وہاں بیٹھ کے کافی پئیں گے۔ تیری طبیعت کچھ بحال ہو جائے گی پھر وہیں سے سب کے لیے کھانا لے کر گھر چلیں گے۔“

مَیں نے فقط تائید میں سر ہلایا اور پھر محسن کو چکری کی موت کے بارے میں بتانے لگا۔

”مَیں سمجھتا ہُوں کہ یہ اچھا ہی ہُوا۔“ محسن نے پوری بات سُن کے کہا۔ ”اگر ہم اُسے بھی اغوا کر لیتے تو دلاور اینڈ کمپنی والے اپنی واردات کو اغوا کی دوسری وارداتوں کے ساتھ ملا کے دیکھتے اور محتاط ہو جاتے۔ وہ کسی ٹرک پر سامان نہ بھیجتے۔ وقتی طور پر یہ سلسلہ ضرور روک دیتے۔“

”اور اگر ہم وہیں سے ٹریل لیتے تو شاید وہ سُراغ لگا لیتے کہ چکری ہم سے ملا تھا۔“ مَیں نے کہا۔

”اگر وہ ہمارے ہاتھوں مارا جاتا تب بھی شکوک جنم لیتے۔ تفتیش ہوتی اور عین ممکن تھا کہ بات اس کار ڈیلر تک پہنچ جاتی۔“ محسن بولا۔ ”اب جو ہُوا وہ ایک عام حادثہ ہے۔ سڑکوں پر انسان ان مشینوں کے نیچے پستے رہتے ہیں جن کو وہ خود بناتے اور چلاتے ہیں۔ کارخانوں میں بھی یہی ہوتا ہے اور گھروں میں بھی۔ آدمی نے بجلی ایجاد کی۔ اب ایجاد اپنے موجد کو قتل کرتی رہتی ہے، اُسے سزائے موت دیتی ہے۔ تخلیق اپنے خالق کو ختم کر دیتی ہے۔“ اُس نے گاڑی کو پارک کرنے کے لیے ترچھی کھڑی ہوئی گاڑیوں کی صف میں شامل کر دیا۔

کافی کا پہلا کپ پی کر میری طبیعت بحال ہو گئی اور ڈیپریشن کا وہ بخار اُتر گیا جو ایک سانحے کا ردِّ عمل تھا۔ سگریٹ سُلگا کر میں نے اطمینان سے ایک طویل گہرا کش لیا اور پھر وہ کاغذ نکالے جو مَیں نے سڑک سے اُٹھا لیے تھے۔ پرس کے اندر سات ہزار روپے تھے۔ پندرہ پندرہ ہزار کے دو چیک تھے

ایک کراس اور دوسرا بیئرر۔ ان کے نیچے صرف دستخط تھے، کراس چیک گڈز فارورڈنگ ایجنسی کے نام پر تھا اور بیئرر چیک ملک حق نواز کے نام پر۔

"یہ ملک حق نواز ہی اس گڈز فارورڈنگ ایجنسی کا مالک ہو سکتا ہے۔" محسن نے چیک کو دیکھ کر کہا۔

"ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔"

"ظاہر ہے، یہ چیک کسی نے دیے تھے، یہ ٹرک سے سامان پھجوانے کا معاوضہ ہو گا۔" محسن بولا۔

"یہ تو معلوم کیا جا سکتا ہے کہ ٹرک کس نے لیے تھے۔ ہر چیک پر ایک اکاؤنٹ نمبر ہے۔" میں نے کہا۔ "بیئرر چیک مقامی ہے۔ کراس چیک کراچی کا ہے۔ اکاؤنٹ نمبر سے اکاؤنٹ ہولڈر کے بارے میں معلومات حاصل کرنا بہت مشکل ہے مگر مشکل سے مشکل کام بھی ناممکن نہیں ہوتا۔"

"خصوصاً اس معاشرے میں جہاں اصول اور قانون سے زیادہ سکہ چلتا ہو۔" محسن نے کہا اور چیک جیب میں رکھ لیے پھر ہم نے کاغذات کا معائنہ شروع کیا۔

یہ ایک ہی کاپی سے پھاڑے ہوئے صفحات لگتے تھے، کچھ پرانے تھے۔ ان کے مڑے ہوئے کناروں کی خستہ حالی اور میلا رنگ دیکھ کے یہی اندازہ ہوتا تھا۔ صرف ایک کاغذ بالکل نیا اور سفید تھا۔ اس پر صرف نمبر لکھے ہوئے تھے اور یہ سب نمبر گاڑیوں کے تھے۔ غور کرنے پر میں یہ نتیجہ اخذ کرنے میں بھی کامیاب رہا کہ سارے نمبر کمرشل تھے۔ پرائیویٹ کاروں کی سیریز میں یہ نمبر نہیں آتے تھے۔

"یہ غالباً ٹرک ہیں۔" میں نے کہا۔

محسن نے کاغذ لے لیا۔ "چیزن نے کیوں نوٹ کیے ہیں؟"

"ہم نے اس سے کہا تھا کہ ہمیں ان ٹرکوں کے بارے میں تفصیلات درکار ہیں۔" میں نے کہا۔ "نمبر اُسے زبانی یاد تھے۔"

"ایک منٹ، اس نے کچھ نمبر بتائے بھی تھے۔" محسن نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اکتیس اکونجا یعنی سیون ون فائیو ون۔ یہ تو اس میں نہیں ہے۔ دوسرا نمبر کیا تھا؟"

"ستائیس انیس، ٹو سیون ون نائن۔" میں نے کہا۔

"یہ بھی نہیں ہے۔" محسن بولا۔ "کیا فرماتی ہے آپ کی چھٹی حِس بیچ اس مسئلے کے؟"

"میرا خیال ہے کہ چکری نے بڑی عجلت میں یہ نمبر ایک کاغذ پر لکھے۔" میں نے کہا۔ "غالباً سراج کو بتانے کے لیے کہ ان ٹرکوں کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے کیونکہ سکندر اور محسن نے پیڈرو کو وہاں دیکھ لیا تھا اور انھیں شک ہو گیا تھا کہ اس کمپنی کے ٹرک دوسرے مال کے ساتھ اسلحے کی ترسیل کے لیے استعمال ہو رہے ہیں۔ چکری بتانا چاہتا ہو گا کہ آپ کے دشمنوں نے مجھے دس ہزار کی رشوت دے کر ان ٹرکوں کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہی تھی۔ میں نے بہت ہوشیاری سے انھیں ٹال دیا۔"

"بلکہ غلط ٹرکوں کے نمبر دے دیے۔" محسن نے کہا۔ "اور دو ایسے ڈرائیوروں کے نام بتا دیے جو یہ کام نہیں کرتے یا جن کا وجود ہی نہیں۔"

"اس کا مقصد سراج کو خبردار کرنا ہو گا کہ جو اطلاع ہم اس کے ذریعے سے حاصل نہیں کر سکے وہ کسی اور سے حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ وہ خود تو نمک خوار ہے مگر دوسروں میں سے کسی کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ دس بیس ہزار کی خاطر انھیں بتا دے۔ یہ تو اطلاع بھی ایسی ہے کہ کوئی ان کو فون کر کے بھی دے سکتا تھا اور ٹرک دشمنوں کے ہاتھ لگ جاتے تو پتا بھی نہ چلتا کہ کس نے نمک حرامی کی تھی۔ بہتر ہو گا کہ ان ٹرکوں کو روک لیا جائے یا ان کا راستہ بدل دیا جائے۔"

"تیرا مطلب ہے، یہ ٹرک روانہ ہو چکے ہیں اور راستے میں ہیں؟"

"ایک نظریہ ہے یہ..." میں نے کہا۔ "دوسرا نظریہ کہتا ہے کہ یہی وہ دس ٹرک ہیں جو دلاور اینڈ کمپنی کے زیرِ استعمال ہیں۔ خطرہ محسوس کرتے ہی وہ ٹرک بدل دیتے یا ان کے نمبر بدل دیتے۔"

"یہ تو بہت مفید معلومات حاصل ہو گئی ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم ان ٹرکوں پر نظر رکھ سکتے ہیں۔ ڈرائیور کوئی بھی ہو کیا فرق پڑتا ہے، ہو گا تو وہ انہی کا آدمی۔"

"میں اس شخص کی طرح محسوس کرتا ہوں جیسے دشمن نے اپنی ٹیلی اسکوپ رائفل سے گولی کا نشانہ بنانے کا سوچا ہو مگر عین اس وقت جب گولی چلانے والی انگلی حرکت میں آ چکی ہو، زلزلہ آ جائے اور نشانہ خطا ہو جائے۔ چکری پہلے رکشے میں بیٹھ جاتا تو خاموشی سے سراج کے پاس پہنچ کے اُسے ہمارے سارے عزائم اور ارادوں کے متعلق بتا دیتا۔ ہم نے تو اُسے سرکس کا سارا پلان بتا دیا تھا۔ وہ رکشے والا جس نے اُسے لے جانے سے انکار کیا، خدا کا بھیجا ہوا کوئی فرشتہ تھا۔"

"خدا کا بھیجا ہوا یا فرشتۂ اجل کا بھیجا ہوا۔" محسن بولا۔ "اس کا تو حساب کتاب غلط ہو جاتا۔ یہ ضروری تھا کہ چکری کو کچھ دیر ہو تاکہ وہ مقررہ وقت پر اپنی موت سے ملنے پہنچے۔"

"خدا نے ایک بہت بڑی آفت سے بچا لیا، صبح سیدھے اُس کار ڈیلر کے پاس چل کے ٹریلر کا سودا کرو۔" میں نے کہا۔ "وہ خود بھی چاہتا تھا کہ چکری بیچ میں کوئی چکر نہ چلائے۔ چکری کے نہ آنے سے وہ خوش ہو گا۔ ہم بھی اُس کا نام نہیں لیں گے۔"

"ہم چار لاکھ روپے اُسے ہی کیوں نہ دے دیں؟" محسن بولا۔

"دوبارہ وہاں کیوں جائیں جہاں ایک بار بیڈرو سے ملاقات ہوتے ہوتے رہ گئی۔ نہ معلوم کل کون مل جائے۔"

"یہ ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "شوروم کے مالک سے لیں کہ بھائی یہ لو باقی رقم، جاؤ اور ٹریلر لے آؤ، ہم تم کو جانتے ہیں اور تم پر ہی بھروسا کرتے ہیں، وہ بہت خوش ہو گا۔ اُسے موقع ملے گا بیچ میں پڑ کے رقم مارنے کا مگر افشائے راز کا بالکل ڈر نہیں ہو گا، پھر اُسی سے کہیں گے کہ ٹریلر کو بھی ہمارے نام پر منتقل کرانے کی ساری کاغذی کارروائی پوری کرے۔"

"کیا ٹریلر بھی عجب خان کے نام پر ہو گا؟"

"اور کس نام پر ہونا چاہیے، نورتن سرکس کمپنی کے نام پر؟"

"نہیں، ہونا تو چاہیے کسی شخص کے نام پر۔ کمپنی کا کیا ہے، کل ہو نہ ہو۔" محسن بولا۔ "کسی عورت کے نام پر کر دیتے ہیں، مثلاً کوئی منتری بائی یا ناڑیا قسم کا نام ہو۔"

"بجلی بائی بمبئی والی۔" میں نے کہا۔ "نہیں دوست، بیشک سرکس میں اوٹ پٹانگ ناموں والے ملتے ہیں مگر ایسے نام آج کل کون رکھتا ہے۔ نام ایمپریس کرنے والا ہونا چاہیے، ثریا شاہانی آف بھوپال، بیگم ارجمند بانو قزلباش... یا مسز صاحبزادہ شوکت حیات۔"

"یہ ٹھیک ہے۔" محسن بولا۔ "یہی نام بتا دیں گے اُسے۔"

"میرا خیال ہے کہ اب چلنا چاہیے۔ نو بجنے والے ہیں، غالب تشویش میں مبتلا ہو گا۔"

ہم نے وہیں سے چھ افراد کے لیے کھانا پیک کرایا اور اسی سات ہزار کی رقم میں سے ادائیگی کی جو چکری سے ملی تھی۔ یہ مال دشمن کا تھا اور مالِ حرام بھی ہو سکتا تھا مگر ہمیں تردد کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ ہمارے لیے تو یہ مالِ غنیمت تھا جس کے حلال ہونے میں شبہ نہیں۔ ساڑھے نو بجے ہم نے ماکروبس کو ریلوے کوارٹرز سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر روک دیا جہاں بہت سی گاڑیاں ایک قطار میں کھڑی ہوئی تھیں۔ ان میں بیشتر پرائیویٹ بسیں تھیں جو شہر کو مضافات سے ملاتی تھیں اور صبح سے شام تک مسافر ڈھونے کے بعد رات کو یہاں کھڑی کر دی جاتی تھیں۔ وہاں تین چار گیراج تھے جہاں رات بھر میں ان بسوں کے چھوٹے موٹے نقائص دور کر دیے جاتے تھے تاکہ وہ اگلا دن پھر باربرداری میں خیریت سے گزار لیں۔

"کوئی کام ہے جناب؟" ایک نوجوان مکینک ہماری طرف لپکا تھا۔

"ہاں۔" میں نے کہا۔ "چاروں پہیوں کی بریک الائنمنٹ ہونی ہے۔"

"ہو جائے گی جناب، کب چاہیے گاڑی؟"

"ہم صبح آئیں گے، آج کا دن تو گزار لیا۔" میں نے کہا۔

"گاڑی کھنچ رہی تھی؟" مکینک بولا۔

"ہاں، بہت زیادہ... دائیں طرف۔" میں نے کہا اور محسن کے ساتھ چل پڑا۔

"وہ... جناب چابی؟" مکینک نے کہا۔ "میں بریک ٹیسٹ کیسے کروں گا؟"

"دروازہ کھلا ہوا ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر یہ مت کرنا کہ رات بھر گاڑی دوڑاتے پھرو، میں نے میٹر دیکھا ہوا ہے۔"

"آپ فکر مت کریں جی۔" مکینک نے کہا۔ میں نے اُسے ایک لمبے کام میں اُلجھا دیا تھا اور یہ کام اچھا ہی تھا۔ وہ ایک ایک وھیل کو کھول کے بریک سیٹ کرے گا۔ بریک شو یا واشر کے خراب ہونے کا کوئی امکان نہ تھا چنانچہ ہم صبح اُسے حقِ محنت ادا کرنے کے پابند تھے، اگر ہم اسے کہتے کہ میاں یہ گاڑی کھڑی ہے۔ رات بھر اس کا خیال رکھنا تو وہ کبھی راضی نہ ہوتا اور ڈرتا کہ کہیں وہ پھنس نہ جائے مگر اب اس کا بھی بھلا ہو گیا تھا اور ہمارا بھی۔ چابی میں نے اس لیے نہیں دی تھی کہ اگنیشن اور ڈور لاک کے علاوہ وہی چابی پیچھے انجن کور کھولنے میں بھی کام آتی تھی اور پیچھے کے مختصر سے خانے میں اسلحہ بھرا ہوا تھا۔

ہم سوٹ کیس اور کھانے کے بنڈل اُٹھائے مارچ کرتے ہوئے دو فرلانگ دُور واقع کوارٹر میں پہنچے تو ساڑھے دس بجے تھے۔ غالب سو کے اُٹھ گیا تھا اور اب جولی سو رہی تھی سراج کی ماں بھی سو رہی تھی مگر ہماری باتوں کی آواز پر وہ اُٹھ بیٹھی۔ اُس نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا۔ قیدِ تنہائی اس کے اعصاب پر اثر انداز ہونے لگی تھی اور یہ کوئی اچھی بات نہیں تھی۔

"کوئی آیا تو نہیں تھا؟" میں نے کہا۔

"کون آئے گا اس خانہ خرابی میں۔" غالب نے سرد آہ بھر کے کہا۔ "اب تو اس بتِ کافر کا خیال تک نہیں آتا۔"

"یہ بھی اچھا ہوا۔" میں نے کہا۔ "ورنہ اس جفاپیشہ کے پیکرِ خیال سے بعید نہیں کہ آئے تو دوسری ٹانگ بھی توڑ جائے۔"

"تم دونوں کی صورت پر آج فاقہ مستی نہیں، آسودگی ہے، تم عیش کرتے رہے ہو۔" غالب نے کہا۔

میں نے حیران ہو کے محسن کی طرف دیکھا۔ "یہ تو سچ ہے مرزا! ایک بار نہیں ہم نے دو بار کافی پی، ایک بار شیزان میں۔ اور وہاں بیٹھ کے اپنے اپنے خواب بھی دیکھے، کیا یہ عیاشی ہے؟"

"ہاں، میری جگہ ایک ٹانگ پلستر میں پھنسا کے بیٹھو اور پھر فیصلہ کرو۔" غالب بولا۔

"لیکن ہم نے اور بھی بہت کچھ کیا۔" میں نے کہا۔ "لیکن پہلے ڈنر..."

"جُولی کو بھی اُٹھالو۔" غالب نے کہا۔ "کمال حوصلہ رکھنے والی اور صابر لڑکی ہے، سختی تو جھیلتی آئی ہے۔ ماں کی موت کا صدمہ بھی جھیل گئی اور اب بالکل نارمل ہے۔"

"جانے اس پر بعد میں کیا بیتی؟" غالب نے سرد آہ بھر کے کہا۔

"موت سب کو برابر کر دیتی ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ انگریزی مقولہ ہے، شاہ اور فقیر، مجرم اور منصف، دوست دُشمن سب مر گئے تو فقط ایک مشتِ خاک رہ گئے، جو عالیشہ پر بیتے گی، وہی کیتھرین پر، اس سے اُنھیں کوئی فرق نہیں پڑے گا کہ کسے لاوارث قرار دے کر دفن کیا گیا، کسے سرکاری مُردہ خانے کے فرش پر ڈال دیا گیا یا چیر پھاڑ کرنے والے متجسس طالب علم ڈاکٹروں کے حوالے کر دیا گیا اور کس کا جنازہ دُھوم دھام سے اُٹھا اور سوئم چہلم ہُوا، یہ فرق دُنیا کی نظر دیکھتی ہے، مرنے والے کو کیا۔"

"تم نے دلاور کو بھی مطلع کر دیا تھا؟" غالب نے کہا۔

"ہاں اُسے بتاتے وقت میری خواہش تھی کہ اس کا چہرہ دیکھوں۔" میں نے کہا۔ "کہ کیا اس خبر کا بھی اس کی صورت پر کوئی ردِ عمل نہیں ظاہر ہُوا۔"

"جُولی شام کو قبرستان جانا چاہتی تھی۔" غالب بولا۔

"ہاں، ہم نے اس سے وعدہ کیا تھا۔" میں نے کہا۔

"کل ضرور لے جانا۔" غالب نے کہا۔ "کوئی تازہ قبر دیکھ لینا۔"

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ "اس جھوٹ کو نبھانے کے لیے یہ بھی کرنا ہوگا۔"

محسن نے جُولی کو جگا دیا تھا۔ ہمارے اصرار پہ اُس نے تھوڑا بہت کھایا۔ غالب کے لیے دوا خریدتے وقت میں نے کچھ سکون آور ادویات بھی لے لی تھیں۔ غالب کے لیے تو وہی دو گولیاں تھیں۔ ایک اینٹی بایوٹک اور ایک درد کش۔ جُولی نے ایک سکون بخش گولی کھائی اور پھر سو گئی۔ سراج کی ماں نے پھر ضد کی اور ہمیں دھمکی دینا پڑی کہ اُس نے گولیاں نہ کھائیں تو ہم زبردستی انجکشن لگا دیں گے۔ آدھے گھنٹے میں وہ بھی سو گئی۔

"اب تم بھی آرام کر لو، یہ فرصت بہت غنیمت ہے۔" غالب نے کہا۔

"ہم ابھی آتے ہیں، آدھے پون گھنٹے میں۔" میں نے کہا۔

"اب اس وقت کہاں کی سُوجھ گئی ہے؟"

"کل رابعہ کے دیے ہوئے نمبر پہ رابطہ نہیں قائم ہو سکا تھا، آج پھر کوشش کرتے ہیں۔" محسن نے کہا۔

"اسے بھی شہلا کی خبر لینا ہے۔" میں نے کہا۔

"خوب اچھی طرح خبر لینا۔" غالب بولا۔ "آخر منکوحہ ہے، تیری اُسے کون روک سکتا ہے تیرے خوابوں میں آنے سے۔"

"ہاں جیسے چاہے آئے، باپردہ یا بے پردہ۔"

"تمھیں کیا معلوم کہ وہ نہیں آتی۔" محسن بگڑ کے بولا۔

"نورِ چشم، وہ ایک بار آتی تو تم ہمیں دس بار بتلاتے۔" غالب نے ہنس کر کہا۔ "مگر تم میاں بیوی زندگی کی گاڑی کے عجیب پہیے ہو، ایک کی ہَوا نکلی ہوئی ہے۔"

"دوسرے میں ہَوا نہیں بھری ہوئی ہے مرزا۔" میں نے متانت سے کہا۔

اور مطلب سمجھ کے غالب نے قہقہہ لگایا۔ محسن شرما کے دانت نکالنے لگا۔

ہم تفریح کے انداز میں باہر نکلے۔ سگریٹیں پیتے اور اطمینان سے چلتے ہوئے ہم رابعہ اور شہلا کی باتیں کرتے رہے۔ مجھے کچھ اندازہ تھا کہ یہاں آتے ہوئے میں نے سرکاری اور نیم سرکاری دفاتر کہاں دیکھے تھے، اس کے لیے ہمیں تین چار میل دور جانا پڑا۔ پہلی جگہ ہمیں شرمندگی اور ناکامی کا مُنہ دیکھنا پڑا، چوکیدار بہت فرض شناس اور ایماندار ثابت ہُوا۔ دوسرے دفتر میں دو چوکیدار تھے۔ ایک تھوڑا سا متامل تھا مگر دوسرے نے اُسے راضی کر لیا۔ اُس نے ایک کمرے کا قفل کھول دیا۔

"بہت لمبی بات مت کرنا جی۔" وہ بولا۔ "یہ نہ ہو پیسے جیب کے برابر بل بنا دو۔" وہ نسبتاً سیدھا آدمی تھا۔

"بن بھی گیا تو تم پر الزام نہیں آئے گا۔" میں نے کہا۔ "سرکاری فون کو دن میں سب ہی استعمال کرتے ہوں گے۔"

"لیکن تم فکر مت کرو، ہم زیادہ وقت نہیں لیں گے، لائن مل گئی تو زیادہ سے زیادہ آدھا گھنٹا۔" محسن بولا۔

"آدھا گھنٹا!" چوکیدار کا دم خشک ہونے لگا۔

"اچھا دس پندرہ منٹ۔" میں نے کہا۔

"اور دیکھو جی، باہر بات مت کرنا ملک سے باہر، ورنہ بل میں لکھا ہُوا آ جائے گا کہ کہاں بات ہوئی تھی اور کتنے بجے ہوئی تھی، ہم پکڑے جائیں گے۔" وہ بولا۔

"میں نے بتایا ہے نا کہ ہم کراچی بات کریں گے۔ اعتبار نہیں ہے تو خود نمبر ملا دو۔" میں نے کہا۔ "پھر ڈائل میں تالا ڈال کے باہر چلے جاؤ۔"

وہ کچھ شرمندہ ہو گیا۔ "نہیں جی، آپ بات کریں۔"

"فضول باتیں کر رہا ہے۔" اس کے ساتھی نے ڈانٹ کر کہا۔ "او پاگل، کام کی بات بھی کر لے، پوچھ پیسے کتنے دیں گے؟"

"پیسے، دو سو کافی ہوں گے۔" میں نے کہا۔

"لو جی، اتنے بڑے کام کے دو سو۔" چالاک چوکیدار نے کہا۔ "ڈھائی سو تو دو۔ اور پہلے بات کر کے تم نے خالی جیب دکھا دی تو ہم کیا کریں گے۔"

"اصول تو ٹھیک ہے تمھارا۔" میں نے کہا اور اسے ڈھائی سو روپے نکال کر دے دیے۔ "بے ایمانی میں اُدھار کا کیا کام اور اعتبار کیسا۔"

"بڑا افسوس ہے جی۔" وہ ڈھائی سو لے کر بولا۔ "ایک تو ہم آپ کا کام کر رہے ہیں اور آپ ہو کہ ہمیں ہی بے ایمان کہہ رہے ہو۔"

"نہیں یار، تم خواہ مخواہ بُرا مان گئے۔" میں نے ہنس کے کہا۔ "تم بے ایمان کہاں ہو، خدا تمھارا ایمان سلامت رکھے۔"

وہ کچھ زیرِ لب بڑبڑایا۔ اُسے میری صاف گوئی اچھی نہیں لگی تھی لیکن ڈھائی سو کے لالچ نے اُسے خاموش رہنے پر مجبور کر دیا اور وہ اپنے ساتھی کے ساتھ باہر چلا گیا۔ باہر جا کے شاید اُس نے دوسرے چوکیدار پر اپنی ہوشیاری ثابت کی ہو گی کہ اُس نے ہماری جیب سے مزید پچاس روپے نکلوا لیے اور ممکن ہے، ہمیں بُرا بھلا کہہ کے دل کی بھڑاس بھی نکالی ہو کہ نیکی کا زمانہ ہی نہیں۔

محسن نے دروازے سے جھانک کر دیکھا اور مجھے سب ٹھیک ہے کا سگنل دیا۔ میں نے نمبر ملانا شروع کیا۔ تیسری کوشش میں لائن مل گئی۔ رات کے وقت ٹرنک لائن پر لوڈ اتنا نہیں تھا جتنا دفتری اور کاروباری اوقات میں رہتا ہے۔ محسن نے پاس کے کمرے کا دوسرا ریسیور اُٹھا لیا۔

"ہیلو،" کسی نے پہلی گھنٹی پر ہی ریسیور اُٹھا لیا۔

آواز کسی مرد کی تھی مگر میں شناخت نہ کر سکا۔ احتیاط کے پیشِ نظر میں نے بھی ماؤتھ پیس پر رومال رکھ کے بات کی۔ "کون صاحب بول رہے ہیں؟"

"آپ کو کس سے بات کرنا تھی؟" دوسری طرف سے کہا گیا۔

میں نے محسوس کیا کہ بات کرنے والا بہت محتاط ہے اور از خود اپنی شناخت کا شبہ بھی ہونے نہیں دے گا۔ وہ آواز ہی نہیں لہجہ بھی بدل کے بول رہا تھا۔

"مجھے اس نمبر پر بات کرنے کو کہا گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "ہم نے کل بھی رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔"

"ہم کون؟"

"ہم یعنی میں اور مسٹر اچکن۔" دیکھ کیا رو دیا اداس کا دوست اچکن یا شیروانی۔" میں نے گول مول بات کی۔

"کس نمبر سے بات کر رہے ہو؟"

"یہ تو ہمیں بھی معلوم نہیں۔" میں نے کہا۔ "لاہور سے بول رہے ہیں۔"

"اور یہ نمبر آپ کو کس سے ملا تھا؟"

"ایک خاتون ہیں رابعہ۔" میں نے کہا۔ "رابعہ قاری۔"

"انھوں نے آپ کو فون کیا تھا؟"

"مجھے نہیں یار۔ ایک خاتون اور بھی ہیں یہاں شہلا نام کی، رابعہ نے اُنھیں فون کیا تھا، شہلا نے مجھے بتایا، تم یہ سسپنس ختم کیوں نہیں کرتے؟"

"کیسا سسپنس؟"

"مطلب یہ کہ ابھی تک تم نے یہ بھی نہیں بتایا ہے کہ تم کون ہو، اگر ہم نے رانگ نمبر ڈائل کر دیا ہے تو بتاؤ۔" میں نے جھنجلا کے کہا۔

"نمبر ٹھیک ہے مگر یہ اطمینان تو مجھے ہونا چاہیے کہ میں غلط آدمی سے بات نہیں کر رہا ہُوں۔" وہ بولا۔ "کوئی اور حوالہ دو۔"

"میں، ایم آر ایس کا ممبر ون ہُوں۔"

"ایم آر ایس، یہ کیا بنا؟" وہ حیران ہو کے

"مائنٹ از رائٹ سوسائٹی۔" میں نے کہ بیٹھے

اس کا مطلب سمجھتے ہو؟ میں تمھارا باپ سکندر بخت بول رہا ہُوں اور میرے ساتھ ہے محسن شیروانی۔ اب تم جو بھی ہو اور جو کر سکتے ہو کر لو مگر مجھے یہ بتا دو کہ رابعہ نے رابطے کے لیے یہ نمبر دیا تھا تو کیوں دیا تھا، تم اُسے جانتے ہو یا نہیں، دوست ہو یا دُشمن؟"

اُس نے کچھ دیر بعد کہا۔ "کل بتاؤں گا، اسی وقت فون کرنا۔" اور لائن کٹ گئی۔

"ہیلو... ہیلو..." میں نے سخت غصّے، بے بسی اور کوفت کے عالم میں کئی بار کہا مگر سیاں لب پہ لاکھ لاکھ سخنِ اضطراب میں۔ وہاں ایک خامشی تیری سب کے جواب میں، والی پوزیشن ہو گئی تھی۔ رابعہ جو ایک بھولا بسرا خیال تھی۔ ٹیلی فون کی لائن کے دوسرے کنارے پر ایک تصویرِ خواب بن کے روشن ہوئی اور پھر اندھیرے میں کھو گئی۔ اس کی آواز کے سائے اور ہونٹوں کے سراب میرے دشتِ تنہائی میں لرزاں رہ گئے۔

پھر میں نے محسن کی طرف دیکھا تو وہ مُسکرا رہا تھا اور یہ اُمید کی روشنی تھی۔ "میں سمجھتا ہُوں تیرے دل کی کیفیت کو۔" وہ بولا۔ "مگر اب کوئی بے یقینی تو نہیں رہی نا، صرف چوبیس گھنٹے کا ایک دن درمیان میں ہے۔"

"پھر کیا ہوگا؟" میں نے ریسیور پر ہاتھ رکھ کے بے خیالی میں کہا۔

"پھر؟ میں حیران ہُوں کہ تیری عقل کو کیا ہو گیا ہے۔" محسن بولا۔ "بہت زیادہ مایوسی ہوئی ہے تجھے۔ تیرا کیا خیال تھا کہ اِدھر

تو نمبر ملائے گا اُدھر وہ ریسیور اُٹھا کے اپنی نقرئی آواز میں کہے گی۔ ہیلو ڈارلنگ سکندر۔" اُس نے زنانہ نخرے کی ایسی نقل اُتاری کہ میں ہنس پڑا۔

"پتا نہیں کون پاگل کا بچہ تھا، سالے نے کچھ قبول کیے ہی نہیں دیا، کم سے کم یہ تو بتا دیتا...!"

"اس سے زیادہ کیا؟ صاف تو کہہ دیا اُس نے کہ کل رابعہ موجود ہوگی، بات کر لینا۔" محسن نے کہا۔

"کیا اس کی بات کا یہ مطلب نکالا جا سکتا ہے؟"

"اس کی بات کا دوسرا مطلب ہو ہی نہیں سکتا، شرط لگاتا ہے۔" محسن بولا۔

"کس بات پر؟" میں نے کہا۔

"یہی کہ کل رابعہ سے تیری بات ہوگی اور مشتاق نگاہوں کی سُنی جائے گی۔" محسن نے کہا۔ "بول کیا شرط ہے؟"

اچانک میں مُسکرانے لگا۔ میرے وجود میں پھوٹنے والا خوشی کا نغمہ میرے لبوں پر مُسکراہٹ کی لہر بن کے پھیل گیا۔ "تو بتا۔" میں نے کہا۔

"اچھا پہلے میں شہلا سے بات کر لوں۔" محسن نے کہا۔ "یہی تو فرق پڑ جاتا ہے، جب عاشق ایک شوہر بنتا ہے۔ ایک تیرا اضطراب و اشتیاق اور تیری وارفتگی اور بے خودی۔ ایک میرا سکون اور اطمینان۔ سارا پاگل پن ختم ہو جاتا ہے اور بیوی کا بڑا دل ٹوٹتا ہے۔"

"یہ تو ہے۔" میں نے تسلیم کیا۔ "شادی کے بعد خدمات کی نوعیت تو بدل ہی جاتی ہے۔ عورتیں کچھ خیال پرست رہتی ہیں۔ پُرانے خوابوں کی دُنیا کو چھوڑنا ان کے لیے زیادہ مشکل ہوتا ہے مگر اب یہ کیسے ممکن ہے کہ شوہر بے چارہ تمام عمر اسی طرح عاشق کا رول کرتا رہے۔"

"اب دیکھنا میں کیسے کرتا ہوں۔" محسن نے فون اپنی طرف کرتے ہوئے کہا۔ "اس کا مطلب یہ نہیں کہ میری محبت کم ہو گئی ہے۔ محبت تو شاید پہلے سے دُگنی ہو گئی ہے، تین گنا ہونے والی ہے۔" وہ قہقہہ مار کے ہنسا۔ "مگر کیا شہلا اور کیا رابعہ، یہ اظہار مانگتی ہیں۔ مرد یقین پر مطمئن رہتا ہے۔"

"یہاں سے اپنے یقین کا اظہار مت فرمائیے۔" میں نے کہا۔ "رضوی صاحب کے گھر کا نمبر آبزرویشن پر ہوگا۔ فوراً معلوم ہو جائے گا کہ ہم نے یہاں سے کال کی تھی، پکڑا جائے گا وہ جس نے ڈھائی سو روپے ایڈوانس لیے تھے۔"

"پھر تو یہی کرنا چاہیے۔" محسن نے نمبر ملاتے ہوئے کہا۔ "آج ڈھائی سو روپے نقد، کل کے ڈھائی سو جوتے اُدھار۔ آئندہ ایسی نیکی نہیں کرے گا۔ کم سے کم ایک سرکاری چور توبہ کر لے گا۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ بہت چھوٹا چور ہے، ہمیشہ یہی پکڑے اور پکڑائے جاتے ہیں، وہ جو اُوپر بڑے بڑے ڈاکو بیٹھے ہیں اور ملک کے خزانے کو ایسے لوٹ رہے ہیں جیسے غنیم کسی شہر مفتوحہ کو لوٹتا ہے۔"

"وہ بھی پکڑے جائیں گے۔ فی الحال ہمارے ہاتھ جس چھوٹے چور کے گریبان تک پہنچ سکتے ہیں اسے تو نہ چھوڑیں۔" محسن نے کہا۔ "ہیلو۔" اُس نے دوسری طرف سے کسی کی آواز سُن کے کہا۔ میں فوراً نسبتاً چھوٹے کمرے میں چلا گیا جو بڑے صاحب کے پی اے یا سیکرٹری کا کیبن تھا۔ ہر کال اسی کیبن کے فون سے چیک ہو کے آگے جاتی تھی۔ بڑا صاحب ہے یا نہیں ہے، میٹنگ میں ہے یا دورے پر۔ اس کا انحصار کال کرنے والے کی ضرورت اور اہمیت پر رہتا ہے۔

جب میں نے فون اُٹھایا تو محسن کی مسز رضوی سے بات ہو رہی تھی۔

"جب تم فون کرتے ہو تو میری طبیعت خراب ہونے لگتی ہے۔" انھوں نے کہا۔ "میرا بلڈ پریشر بڑھ جاتا ہے۔"

"یہ بات آپ مذاق میں کہہ رہی ہیں؟"

"نہیں، گزشتہ چند ماہ سے پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔" وہ بولیں۔ "ڈاکٹر تو کہتے ہیں کہ ڈپریشن ہے، میں سوچا نہ کروں مگر کیا نہ سوچنا کسی کے اختیار کی بات ہے؟"

"مجھے معلوم ہے آپ کیا سوچتی ہیں، پلیز آنٹی! آپ اپنی صحت مت خراب کریں۔" محسن نے کہا۔ "ہم پہلے ہی بہت شرمندہ ہیں، ہم نے آپ کی نیکی کے بدلے جو کچھ کیا، وہ آپ کے حق میں اچھا نہیں ہوا۔"

"میرے حق میں؟ تم نے اپنے حق میں کیا اچھا کیا؟" وہ دُکھ

"آنٹی! ہم آپ کے مجرم ہیں اور آپ سے تو معافی مانگنے کا حوصلہ بھی نہیں پڑتا۔" محسن نے کہا۔ "ہماری وجہ سے آپ کے گھر میں ہر پریشانی آئی۔ ظاہر ہے آپ کے سارے تفکرات جو آپ کے ڈپریشن کا باعث بنے، میرے، سکندر اور رابعہ کے بارے میں ہیں۔ شہلا کی ذمے داری اضافی ہے۔"

"محسن! آخر تم کو کیا ضرورت تھی شادی کرنے کی؟" آنٹی نے کہا۔ "میں تو خود ایک پولیس افسر کے ساتھ پندرہ سال گزار چکی ہوں۔ اکیلی رہنے کے خطرات اور مشکلات کا مقابلہ کرنے کی اور رضوی صاحب جیسے شوہر کا ساتھ دینے کی ہمت تھی مجھ میں۔ مجھے گلہ نہیں اپنے شوہر سے کہ وہ اصول پرست، ایمان دار اور فرض شناس کیوں ہیں، اور دوسرے پولیس افسروں کی طرح میرے پاس کوٹھیاں اور کاریں، نوکر چاکر اور عیش و عشرت کے اسباب کیوں نہیں۔ مجھے فخر ہے اُن کی عزتِ نفس پر، یہ تو ہر عورت کہہ دیتی ہے کہ میں ہی تھی جس نے تمہارے ساتھ گزارا کیا مگر حقیقت یہ ہے کہ اگر وہ دوسری قسم کے افسر ہوتے تو شاید میں اُن کا ساتھ نہ دے پاتی۔"

"یُو آر گریٹ آنٹی، آپ کو خدا نے اُن کے لیے بنایا تھا جیسے انھیں آپ کے لیے بنایا تھا۔" محسن نے کہا۔

"مگر شہلا کو تم نے شادی کے بعد رفاقت تک نہیں دی۔ مجھے اپنے شوہر سے وہ چیز ضرور ملی تھی جس کی مجھے ضرورت تھی اور جس کے بغیر میاں بیوی کا رشتہ ہی بے معنی ہو کے رہ جاتا ہے، ان کی محبت اور ان کا اعتماد۔"

"کیا شہلا کو میری محبت اور میرے اعتماد کی کمی محسوس ہوتی ہے؟"

"کمی! تم نے اُسے صرف محبت اور اعتماد کے خوبصورت لفظوں سے بہلا رکھا ہے۔ رفاقت کے بغیر ان الفاظ میں کوئی خوشی ہے، تحفظ کی کون سی ضمانت دی ہے تم نے اُسے؟"

"وہ آپ کے ساتھ ہے تو اُسے ہر ضمانت حاصل ہے۔"

"احمق! تحفظ شادی کے بعد کسی ایک کی ذات سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ میں تم دونوں کی ازدواجی زندگی کے تحفظ کی بات کر رہی تھی۔ یہ ضمانت اُسے میں کیسے دے سکتی ہوں، وہ زبان سے کچھ نہیں کہتی مگر کیا دل کی بات آنکھوں سے نہ کہنا اس کے لیے ممکن ہے۔ عمر کے فرق کے باوجود وہ بھی عورت ہے اور میں اُس کے دُکھ سمجھ سکتی ہوں۔ ندامت مجھے اس احساس سے ہوتی ہے کہ میں اس دُکھ کو دُور نہیں کر سکتی۔ تم کو یہ سب بتا تو سکتی ہوں مگر سمجھا نہیں سکتی۔ تم سمجھو گے ہی نہیں کیونکہ تم سمجھنا نہیں چاہتے۔"

"ہاں آنٹی۔" محسن نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "میں ابھی کچھ سمجھنا نہیں چاہتا، سوائے اپنی مجبوریوں کے اور ان کو آپ سمجھنے سے قاصر ہیں، اس لیے حالات کے دھارے کو اُسی رخ پر بہنے دیں۔ اس کا رُخ موڑنا میرے یا آپ کے بس کی بات ہی نہیں۔ جب تک وقت خود اس کا درماں فراہم نہیں کرے گا ہم سب اپنے اپنے دُکھ کے ساتھ جئیں گے۔ میں آپ اور شہلا، رابعہ اور سکندر۔ ہمیں ابھی ابھی معلوم ہوا ہے کہ رابعہ بالکل خیریت سے ہے۔"

"چلو کوئی تو اچھی بات کی تم نے۔" وہ بولیں۔

"اب آپ ذرا مجھے بھی اچھی سی بات سُنائیں، اپنی زبانی نہیں، اُس کے لبوں سے جس کے لیے میں زبردست جذباتی درد مانی ڈائیلاگ یاد کر کے آیا ہوں۔"

آنٹی ہنسنے لگیں۔ "تم شہلا سے بات نہیں کر سکتے۔"

"یہ کیا ظلم ہے آنٹی، سزا دے رہی ہیں آپ؟" محسن بولا۔

"نہیں، یہ تو انعام ہے قدرت کا جو میں خوشخبری کی صورت میں دے رہی ہوں۔" انھوں نے کہا۔ "وہ اسپتال میں ہے۔"

"اسپتال میں... کیوں؟ کیا ہوا ہے اُسے؟" محسن نے چلّا کے کہا۔

"ارے ارے، ابھی سے؟ ہوگا جب ہونا ہوگا۔" آنٹی نے ہنس کے کہا۔

"ہو گی یا ہوگا؟" میں نے دخل در معقولات کیا۔ "یا ہوں گے؟"

"یہ... یہ کون بولا تھا بیچ میں؟" آنٹی نے چونک کر کہا۔

"بیچ میں؟ کوئی نہیں آنٹی۔" محسن ہنسنے لگا۔ "یہ بتائیں کہ وہ ٹھیک تو ہے نا؟"

"ہاں ہاں، بس ایک رات رہے گی وہاں، ڈاکٹر نے کہا تھا کہ ایک ڈرپ لگ جائے تو اچھا ہے۔" وہ بولیں۔ "مگر کیا بیچ میں سکندر نہیں بولا تھا؟"

"آپ بھی ایس ایس پی سے کم نہیں ہیں آنٹی۔" میں نے کہا۔ "آداب عرض کرتا ہوں۔"

"جیتے رہو، خدا خوش رکھے۔"

"بس آپ دُعا دیتی رہیں، کبھی تو قبول ہو گی۔" میں نے کہا۔ "تاہم وہ جو ایک سوال کیا تھا میں نے؟"

"اس کا جواب اپنے انکل سے پوچھ لو۔" وہ بولیں۔ "وہ اسپتال میں ہی ہیں اور اسی لیے میں تم سے بات بھی کر رہی ہوں۔"

"آنٹی، آخر آپ بھی کچھ علم اور تجربہ رکھتی ہیں۔ کچھ تو فرمائیے کہ کلینڈر اور علم اعداد کی روشنی میں..."

"سکندر نالائق! تم بدتمیز ہی نہیں، بے شرم بھی ہوتے جا رہے ہو۔" آنٹی نے کہا۔

"آنٹی، مجھ میں تو ہمت ہے نہیں۔" میں نے کہا۔ "کیا آپ میری طرف سے ایس ایس پی صاحب کی خدمت میں ایک درخواست برائے معافی دائر کر سکتی ہیں؟"

"چھوڑو معافی کو، کس کس بات پر معافی مانگو گے اور کرنا تو آئندہ بھی تم کو وہی ہے جو اب تک کرتے آئے ہو۔" انھوں نے قدرے تلخ لہجے میں کہا۔

"مجھے اُن کے معطل کیے جانے پر اپنے مجرم ہونے کا احساس ہوتا ہے۔"

"مگر انھیں کوئی صدمہ نہیں ہے اور تم سے یہ کس نے کہا ہے کہ ان کو معطل کر دیا گیا تھا؟" آنٹی نے کہا۔

"پھر... پھر انھیں اُس عہدے سے الگ کیوں کیا گیا؟"

"انھوں نے استعفا دیا ہے، اپنی مرضی سے۔" آنٹی نے احتجاجی انداز میں میرے الزام کی تردید کی۔ "خود آئی جی نے ان کو بہت مجبور کیا کہ وہ استعفا واپس لے لیں مگر وہ اپنے

مطمئن تھے۔ اُنھوں نے کہا کہ مَیں نے یہ پندرہ سال عزت سے گزارے، یہ بھی اب بہت ناممکن سی بات لگتی ہے۔ یہ ملازمت نہیں میرے لیے ہر قدم پر آزمائش تھی۔ زبانِ خلق پولیس والا جان کے بُرا کہتی تھی، تھینک لیس جاب تھا، اچھائی کوئی نہیں دیکھتا تھا۔ نفرت سب سے بے سبب ہی ملتی تھی مگر اس سے زیادہ اپنوں کا رویّہ تھا جو ہمیشہ مخالف رہے۔ حاسد لوگ، سازشی لوگ اور بدعنوان لوگ میرے خلاف محاذ رکھتے تھے مگر مَیں پھر بھی پندرہ سال تک ڈٹا رہا اور خدا نے میری عزّت رکھی، یہی اس کا انعام ہے مگر اب میرے اعصاب بھی جواب دے گئے ہیں اور میرے حالات بھی میرا ساتھ نہیں دے رہے ہیں۔ مَیں بدخواہوں کے سامنے شرمندہ ہو جاتا ہُوں، بہت سی باتوں کا جواب نہیں دے سکتا۔"

"اور یہ . . . یہ ہماری باتیں ہیں جو لوگ ہمارے بارے میں ان کے مُنہ پر اور پیٹھ پیچھے کہتے ہوں گے کیونکہ وہ بہ یک وقت ایس ایس پی اور انکل رضوی تھے۔ اُنھوں نے تو اپنے ایس ایس پی ہونے کی لاج رکھ لی۔ ہم انکل رضوی سے رشتے کی لاج رکھنے میں ناکام رہے۔" مَیں نے افسوس اور دکھ کے ساتھ کہا۔

"تم سمجھتے ہو اُن کی پوزیشن خراب ہو رہی تھی؟" آنٹی نے کہا۔ "شہلا ہمارے ساتھ تھی اور ہم اُس کو بیٹی سمجھتے تھے مگر دُنیا کچھ اور سمجھتی تھی۔"

"دُنیا اُسے ایک مجُرم کی بیوی سمجھتی ہو گی؟" محسن نے تلخی سے کہا۔

"ہاں، غلط سوچ رکھنے والوں کا کوئی کیا کرے۔" آنٹی نے کہا۔ "تم کیوں دل بُرا کرتے ہو، تمھارے انکل کسی کی پروا نہیں کرتے۔ پولیس کا تو یہ عام طریقہ ہے کہ مجُرم کو پکڑنا ہے تو اُس کے بیوی بچّوں کو اُٹھا لو، ماں باپ، بھائی بہن جو ملے اُسے تھانے منگوا لو، مجُرم خود ہاتھ جوڑتا حاضر ہو گا مگر تمھارے انکل تو جُولی کے لیے بھی دن رات اسپتال میں رہے اور اُنھوں نے اتنا کیا جو شاید تم بھی نہ کر سکتے۔ اُنھوں نے صاف کہا کہ مَیں مجُرم کو پکڑنے کا پابند ہُوں، جس کے خلاف کوئی الزام تک نہیں اور مَیں ذاتی طور پر مطمئن ہُوں کہ اس نے بالواسطہ طور پر بھی نہ اعانتِ جُرم کی اور نہ مجُرم کی مدد کی۔ اسے تو مَیں مظلوم سمجھ کے بچاؤں گا۔ اس کے ساتھ یہی ظُلم کیا کم ہے کہ مجُرم کے ساتھ اس کا نام خواہ مخواہ لیا جاتا ہے۔ کسی مجُرم سے رشتہ ہونا کون سے قانون کے تحت جُرم ہے اور وہ اب فیصلہ کر چکے تھے کہ یہ نوکری چھوڑ دیں گے جس میں مخالفوں کو ان پر جانبداری کا الزام عائد کرنے کا موقع مل رہا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔"

"مگر آنٹی! اب وہ کیا کریں گے؟"

"اُنھوں نے مجھے نہیں بتایا۔" آنٹی نے کہا۔ "کچھ تو ضرور کریں گے، وہ فارغ رہنے والے آدمی نہیں ہیں اور گزراوقات کے لیے بھی کوئی وسیلہ چاہیے۔ تھوڑی بہت زمینوں کی آمدنی ہے جو اُن کے والد نے چھوڑی تھیں، اس لیے فکر کی تو کوئی بات نہیں۔"

"آپ کو تو یہ بنگلا بھی خالی کرنا ہو گا۔"

"ہاں، محکمے نے بڑی مستعدی دکھائی ہے اس معاملے میں۔" آنٹی نے تلخ لہجے میں کہا۔ "نوٹس مل گیا ہے کہ ہم ایک ماہ میں اپنا بندوبست کر لیں۔"

"یہ بنگلا تو غالباً لیز پر ہے۔" مَیں نے کہا۔ "ان کے محکمے نے کنٹریکٹ پر حاصل کیا تھا۔"

"ہاں، گزشتہ ماہ کنٹریکٹ بھی ختم ہو گیا۔ مالک ایک بیوہ ہے جو معاہدے میں توسیع پر تیار نہیں مگر پولیس کا محکمہ ہے نا، اس پر دباؤ ڈالا جا رہا ہے کہ مزید تین سال کے لیے لیز کر لے۔"

"اگر یہ سرکاری رہائش گاہ نہ رہی تو آپ کہاں رہیں گی؟"

"جہاں سینگ سمائیں، محاورے کے مطابق۔" وہ ہنس کر بولیں۔ "شہر میں کوئی ٹھکانا مل ہی جائے گا۔ کوئی چھوٹا موٹا گھر کرائے پر لے لیں گے۔"

"جانے سے پہلے ہمیں پتا بتا کے جائیے گا۔" مَیں نے کہا۔

"تمھیں! خود تمھارا پتا ہو تو کوئی پتا بتائے۔"

"آپ . . . منظر کو بتا جائیں، اُسے جانتی ہیں نا آپ؟"

"ہاں، عبدالودود منظر، تمھارا دوست ہے، کوئی وکیل ہے۔" انھوں نے کہا۔

"اچھا آنٹی، وہ کس اسپتال میں ہے؟" محسن نے کہا۔

"چیمبرلین روڈ پر ڈاکٹر پروین کا پرائیویٹ کلینک ہے۔ ایک بہت کوالیفائڈ گائنک اسپیشلسٹ ہے، تمھارے انکل کی کلاس فیلو رہی ہے۔" آنٹی نے کہا۔

"شادی شدہ ہے؟" مَیں نے کہا۔

"نہیں مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟" آنٹی نے کہا۔

"عمر کیا ہے، رنگ رُوپ، ناک نقشہ؟"

"بدتمیز۔" آنٹی نے ہنس کر کہا۔ "وہ تمھارے انکل سے بھی پانچ سال بڑی ہے، اڑتالیس سال کی بُڑھیا ہے مگر دیکھو، اُدھر جانے کی بے وقوفی مت کرنا، وہاں سادہ کپڑوں میں پولیس اندر بھی موجود ہے۔"

"مَیں پولیس کی وردی پہن کے چلا جاؤں گا۔" محسن بولا۔

"تم باز آنے والے نہیں ہو۔"

"آنٹی، بہت دل چاہ رہا ہے اُسے دیکھنے کو۔" محسن نے کہا۔

"اچھا تمھارے انکل آ گئے ہیں شاید۔" اُنھوں نے کہا اور فون ایک دم بند ہو گیا۔ ہم باہر آ گئے، دونوں چوکیدار شاید شب تقسیم سے فارغ ہو چکے تھے اور قناعت اُن کے چہروں سے عیاں تھی۔

"میاں جی، ہم کل بھی آئیں گے۔" مَیں نے کہا۔

"مگر ڈھائی سو روز نہیں دیں گے۔" محسن بولا۔ "ہم پکّے گاہک ہیں، کچھ رعایت کرو یار۔"

"ہول سیل ریٹ پر سودا کر لو۔" مَیں نے کہا۔

"ہفتہ وار یا ماہانہ بنیادوں پر کنٹریکٹ کر لو۔" محسن بولا۔

"چلو بھائی جاؤ، معاف کرو ہمیں۔" پہلے والے چوکیدار نے کہا۔ "ہم سے کیوں مخول بازی کرتے ہو۔"

"روز تم بات کرو گے تو مہینے کے آخر میں بل کتنا آئے گا؟" دوسرے نے وسیع تر کاروبار کے امکانات پر غور کرتے ہوئے کہا۔

"جتنا بھی آئے کون سا تم دو گے، گورنمنٹ کے خزانے سے ادا ہو گا۔" مَیں نے کہا۔ "اور اگر صاحب نے بہت زیادہ بل پر شور کیا تو ایک مہینے بعد ہی کرے گا۔ اسٹاف پر برہم ہو گا کہ وہ چاچے، ماموں اور مجبوباؤں کو کال کرتے رہے۔ اسٹاف اُسے الزام دے گا کہ خود گھنٹا گھنٹا گپ بازی کرتا ہے، تم پر بہرحال الزام نہیں آئے گا۔"

اُنھوں نے آپس میں کچھ کانا پھُوسی کی۔ دوسرا چوکیدار شاید پورے مہینے کی آمدنی کا حساب لگا کے اپنے ساتھی کو قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس رقم سے کیا کچھ کیا جا سکتا ہے مگر دوسرا ساتھی آمادہ بہ ہمت نہیں تھا۔ اُسے ڈر تھا کہ کہیں چھاپا نہ پڑ جائے اور ایک دن کی تو کوئی بات نہیں مگر روز روز کے چکر میں خطرہ ہے، معلوم نہیں یہ کون لوگ ہیں۔ نتیجہ یہ کہ اُنھوں نے ہمیں ہری جھنڈی دکھا دی۔

واپسی کے سفر میں ہمارا موڈ بہت بہتر تھا۔ انکل رضوی کی قدر و منزلت ہمارے دل میں بہت بڑھ گئی تھی اور احساسِ جُرم بہت کم ہو گیا تھا کہ ان کی معزولی میں ہمارا بھی دخل ہے، یہ ان کے بدخواہوں نے مشہور کیا تھا کہ وہ معطل اور معزول کر دیے گئے ہیں۔ اُنھوں نے باعزّت طور پر وہ نوکری چھوڑ دی تھی جس میں اُن کی عزّت پر حرف آ رہا تھا۔

"یار، کیا انکل رضوی اب سچ مچ کسی چھوٹے سے کرائے کے مکان میں رہیں گے؟" محسن نے کہا۔

"ہاں، اس معاشرے میں ایماندار لوگ ایسے ہی رہتے ہیں۔ حکومت فرض شناس آدمی کی یہی قدر کرتی ہے۔" مَیں نے کہا۔ "ذرا سوچ کہ وہ کیا نہیں کر سکتے تھے۔ ایک معمولی ایس ایچ او کے پاس کوٹھیاں ہوتی ہیں اور کاریں ہوتی ہیں۔ ڈی ایس پی اور ایس پی تو بادشاہ ہیں۔ فرضی ناموں سے وہ گلبرگ کے ہر بلاک میں کوٹھیاں بنوا سکتے تھے۔ ان کا کرایہ ہی اتنا آتا کہ ہر سال ایک نئی کوٹھی کھڑی ہو جاتی، کون پوچھتا اُنھیں۔ بھانجوں بھتیجوں اور بیوی بچّوں کے نام پر نہ بینک بیلنس چیک ہو سکتا ہے، نہ پراپرٹی کا پتا چلایا جا سکتا ہے اور نہ انویسٹمنٹ کا کہ کتنے شیئر کہاں کہاں کے خرید رکھے ہیں، کتنی بسیں چل رہی ہیں اور کس کس روٹ پر . . . "

"پتا کون چلائے گا؟" محسن بولا۔ "پتا چلانے والے تو خود یہی کر رہے ہیں۔ محاسبہ تو وہ کر سکتا ہے جس کا اپنا حساب درست ہو۔ آپ تحقیقات ایف آئی اے کے سپرد کریں یا اینٹی کرپشن والوں کے۔ انکوائری کمیٹی بٹھائیں یا کمیشن، ان میں سے بیشتر خود انھی الزامات میں ملوّث ہوں گے۔ چور کو چوروں کے بارے میں رپورٹ دینا ہو تو وہ کیا کہے گا، یہی کہ وہ تو بڑا شریف آدمی ہے، میری طرح اور چور تو ہیں الزام لگانے والے۔"

"آنٹی بڑی صابرہ اور حوصلہ مند عورت ہیں۔ خدا نے کیا جوڑی ملائی ہے کہ ایک ستارہ ہے تو دوسرا اُس کی کرن مگر یار بچّے تو بچّے ہی ہوتے ہیں۔ آج انھیں گاڑی اسکول لاتی لے جاتی ہے، بنگلے پر گارڈ رہتی ہے، وہ آتے جاتے لوگوں کو سیلوٹ کرتا دیکھتے ہیں اور اسکول میں بھی اُن کی بڑی ٹور رہو گی۔ ان کے ذہن کے لیے صورتِ حالات کی اس تبدیلی کو قبول کرنا آسان نہیں ہو گا۔" مَیں نے کہا۔ "ایک چھوٹے سے گھر میں جو کسی فضول سے علاقے میں ہو، ان کے لیے بہت سے نفسیاتی مسائل پیدا ہو جائیں گے۔"

"کیا ہم ان کے لیے کچھ نہیں کر سکتے؟" محسن نے کہا۔

"بہت کچھ کر سکتے ہیں، مثلاً ہم یہ گھر خرید کے اُنھیں پیش کر سکتے ہیں مگر کیا انکل رضوی اسے قبول کریں گے؟" مَیں نے کہا اور نفی میں سر ہلایا۔

"ہاں، ان کی طبیعت اور مزاج کو دیکھتے ہوئے یہی کہا جا سکتا ہے کہ ہم مکان اُن کی بیوی کے نام کریں یا بچّوں کے نام، وہ بالکل نہیں مانیں گے مگر فرض کرو اسے ہم خرید لیں۔"

"کیسے خرید لیں؟" مَیں نے کہا۔ "تُو نے خواہ مخواہ فرض کر لیا ہے کہ مکان برائے فروخت ہے۔"

"تا وقتیکہ مکان کسی کے لیے کوئی جذباتی اہمیت نہ رکھتا ہو، ہر شخص پُرانے مکان کو فائدے میں بیچنے پر تیار ہو جاتا ہے۔" محسن بولا۔

"چل مان لیا کہ ہم مکان خریدنے میں کامیاب رہے۔ پچاس ہزار زیادہ دے دیے مارکیٹ پرائس سے اور مالک مکان کو راضی کر لیا، تب بھی انکل رضوی کب راضی ہوں گے،

ہمارے کرائے دار کی حیثیت سے اس گھر میں رہنے کو بکواس کرنے والے کیا کہیں گے کہ دیکھا' حقیقت کھل کے سامنے آگئی نا، جن کی حمایت کرتے تھے ایس ایس پی صاحب' وہی اُن کے کام آئے۔ گھر سے بے گھر نہیں ہونے دیا۔ کھڑے کھڑے مکان لے کر اُن کی خدمت میں پیش کر دیا۔ رشوت لینے کے ہزار طریقے ہوتے ہیں جو نظر نہیں آتے۔ بے وقوف آدمی نقد لے کر پھنس جاتا ہے۔ ایس ایس پی ضامن رضوی ہوشیار تھے کہ جب تک حاکم رہے، رعایات [illegible] کرتے رہے۔ عادل اور نیک بھی کہلائے اور پس پردہ ایسے ہی نہ جانے کس کس سے کیا کچھ نہیں لیتے رہے، پتا کیسے چلتا ہے۔ یہ تو ناممکن ہے کہ وہ ہمارے ہی کرائے دار بنیں۔ شہلا کا خیال بھی نکال دے اپنے دل سے کہ تو اُسے لینڈ لیڈی بنا دے تو مسئلہ حل ہو جائے گا جیسے وہ اپنی بیٹی کہتے ہیں اُس کے گھر میں رہیں گے، وہ تو وضعداری کے اعتبار سے ان پرانے لوگوں میں شامل ہیں جو شادی کے بعد بیٹی کے گھر میں پانی کا ایک گلاس تک نہیں پیتے۔"

"آخر مالک مکان نے اب تک تو مکان کرائے پر دیا ہُوا ہی تھا۔ اسے کرایہ بھی باقاعدگی سے مل رہا ہوگا۔"

"کیا معلوم؟" میں نے کہا۔ "پولیس والوں سے کرایہ وصول کرنا بھی آسان کام تو نہیں۔ جن کی عادت ہی مفت خوری کی ہو وہ قیمت اسی کو دیتے ہیں جو ان کا بھی باپ ہو، قیمت وصول کرنا جانتا ہو۔ ممکن ہے تھانے سے ایس ایچ او کے نمائندے حاضر ہوتے ہوں کہ لاؤ رسید پر دستخط کر دیا انگوٹھا لگاؤ اور بس۔ محکمے سے ملنے والی رقم بھی ماہانہ آمدنی کا ایک چھوٹا سا ذریعہ شمار ہوتی ہو۔ شکایت کرنے والا کہاں جائے اور کس سے کہے۔ کہے گا تو رسیدیں پیش کر دی جائیں گی کہ جھوٹ اور بکواس کی عادت ہے اسے اور پھر اس ناپاک جسارت پر اُسے تھانے بلا کے پاک کیا جائے گا۔"

"یہ ہو سکتا ہے بلکہ ہوتا ہے اور شاید اسی لیے اب مکان مالک کے لیے نجات کی ایک ہی صورت رہ گئی ہے کہ وہ کرائے نامے کی تجدید نہ کرے۔ بے شک یہ بھی آسان نہیں ہوگا۔ جو ہر ماہ کرائے کی رسید حاصل کر سکتے ہیں، وہ نئے معاہدے کی توثیق بھی کرا سکتے ہیں۔" محسن بولا۔

"ایک بات اور بتاؤں۔" میں نے کہا۔ "ایسے مکان سے جان چھڑانے کا دوسرا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اُسے بیچ دیا جائے۔ کرایہ داری کے معاہدے کے ساتھ ہی مکان فروخت کیے جا سکتے ہیں۔ مالکِ مکان بدلتا ہے تو بدل جائے۔ کرائے دار تو رہے گا اور بعض اوقات لوگ ایسا کرتے بھی ہیں مگر جس مکان کا کرایہ لینے تھانے والے آتے ہوں اور دیتے کچھ نہ ہوں لیکن دستخط لے جاتے ہوں، اُسے کون خریدے گا، نہ [illegible] بزنس پیسہ لگائے جائیداد میں اور پھنس جائے مصیبت میں۔ اتنا احمق کوئی نہیں ہوتا۔"

"بس ہم ایک احمق حاصل کر سکتے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "جس کا نام الف خاں، بے خاں کچھ بھی ہو اور وہ حسبِ سابق کرائے نامے کی توسیع پر تیار ہو جائے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس سے کیا فائدہ؟ اس میں انکل تو بہرحال نہیں رہ سکیں گے۔ مکان محکمے کی لیز پر ہوگا تو اس میں انہی کا کوئی افسر رہے گا۔ نیا ایس ایس پی بھی رہ سکتا ہے۔"

"ویری گڈ، تو میری عقل کی داد دے۔"

"ایڈ وانس داد دوں؟" میں نے کہا۔ "خواہ بعد میں معلوم ہو کہ آپ نے بونگی ماری۔ تو سر، پہلے بات کیجیے۔"

"ایس ایس پی ضامن رضوی کے مداح صرف ہم ہی تو نہیں۔" محسن نے کہا۔ "اور بھی بہت ہوں گے۔"

"ضرور ہوں گے، ان کو جاننے والوں میں سے بیشتر ہوں گے۔"

"ان میں وکیل بھی ہوں گے؟"

"بالکل ہوں گے۔"

"ایسے وکیل بھی ہوں گے جو منظر کو بھی جانتے ہوں گے۔"

"کیا قصہ بنا رہا ہے سیدھی بات کو؟" میں نے جھنجلا کے کہا۔

"سُن سُن... صبر سے سُن۔" محسن بولا۔ "فرض کر ہم اپنے یار منظر سے کہتے ہیں کہ وہ مالک مکان کا پتا چلائے، ان اسباب کا پتا چلائے جن کی بنا پر وہ اپنا مکان مزید تین سال کے لیے پولیس کو کرائے پر دینے کے لیے تیار نہیں۔ ایک وجہ تو وہی ہو سکتی ہے جو تو نے بیان کی۔ ایک یہ بھی ہو سکتی ہے کہ کرایہ ابھی تک قیامِ پاکستان سے پہلے کی شرح پر چل رہا ہو، اگر یہ بات ہے تو ظاہر ہے کرایہ نہ ہونے کے برابر ہوگا مگر میرے خیال میں کرایہ بہت ہوگا کیونکہ فائدہ اُٹھانے والے دوسرے ہیں جو تھوڑے کو زیادہ نہیں سمجھتے، زیادہ کو تھوڑا سمجھتے ہیں۔ کرایہ ملتا ہے سرکاری خزانے سے، دو ہزار روپے ماہانہ کرائے والے مکان کی مالیت دو ہزار بتا کے ایگریمنٹ کرتے ہیں۔ تمام سرکاری محکموں میں اگر کسی نے دو چار مکان بنا رکھے ہیں یا ان کے چاچے، مامے، بھانجے، بھتیجے کے مکانات ہیں تو وہ دُگنی شرح پر گورنمنٹ کو کرائے پر اُٹھا دیے جاتے ہیں۔ حکومت کو بعض اوقات دفاتر کے لیے اور افسروں کی رہائش کے لیے مناسب مکانات کی کمی کے باعث پرائیویٹ گھر اور بنگلے لینے پڑتے ہیں۔ تاہم یہ ذرا مختلف کیس ہے کیونکہ اس میں مالک مکان کو نہیں، بیچ کے لوگوں کو فائدہ ہو رہا ہے۔ ہم مالک مکان کی مدد کر سکتے ہیں۔"

"وہ کس طرح؟" میں نے بات کو کچھ سمجھ کے کہا۔

"فرض کر، مالک مکان کسی وکیل کو مختار نامہ دے دیتا ہے۔" محسن نے کہا۔ "اگر انکل رضوی کی بدگمانی کا ڈر نہ ہوتا تو ہم منظر سے کہتے کہ وہ خود مالک مکان کا اٹارنی بن جائے مگر انکل فوراً سمجھ جائیں گے کہ یہ چکر ہم نے چلایا ہوگا چنانچہ منظر یہ کرے کہ اپنے کسی بہت بڑے وکیل دوست سے بات کرے۔ اتنے بڑے وکیل سے جس سے پولیس بھی ایک بات کرتے ہوئے دو بار سوچے۔ منظر مظلوم مالک مکان کو سمجھائے کہ اب مکان کے سلسلے میں نہ وہ کسی سے بات کرے اور نہ ڈرے۔ جو اس کے پاس آئے، اُسے آگے اٹارنی کے پاس بھیج دے کہ میں نے تمام اختیارات اُسے سونپ دیے ہیں۔ اب وہ بڑا وکیل پولیس کو تو صاف جواب دے کہ جناب بہت کھا لیا کرایہ۔ اب حق تو ملے گا حقدار کو۔ اپنے لیے کوئی دوسرا بے وقوف تلاش کیجیے جو آپ کو مکان بھی دے اور کرایہ بھی دے اور ظاہر ہے اس بڑے وکیل کی بات میں اثر ہوگا۔ پولیس نہ اس کا کچھ بگاڑ سکتی ہے نہ مالک مکان کا۔ بعد میں وہی وکیل انکل رضوی کی خدمت میں حاضر ہو کہ جناب میں آپ کی ایمانداری اور شرافت کو سمجھتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ کے مسائل کیا ہیں۔ مالک مکان نے مجھے اختیار دیا ہے کہ میں جس کو چاہوں یہ مکان کرائے پر اُٹھا دوں۔ سوائے محکمہ پولیس کے۔ تو میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ حسبِ سابق اس میں رہیں اور براہِ راست مالک مکان کو کرایہ ادا کریں، میری معرفت۔ کرایہ وہ چاہے تو نصف کر دے اور نصف ہم سے لیتا رہے یا انکل رضوی نہ مانیں تو جو کرایہ اب چل رہا ہے وہی رہے۔ فرق صرف اتنا ہو کہ محکمہ بیچ میں سے نکل جائے اور انکل رضوی کو نہ نکال سکے۔"

"میں اَش اَش کر رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اور اب داد بھی دیتا ہوں، یہ لیجیے۔" میں نے اُس کی کمر پر ایک ساتھ دو دھپ مارے۔

"آہ... ایک جینئس، ایک شوہر... ایم آر ایس کے ایک جاہد پر آدھی رات کو قاتلانہ حملہ..." محسن چلّایا۔ "تین کیس بنتے ہیں بلکہ ساڑھے تین، تقریباً نصف باپ بھی بن چکا ہوں میں۔"

"معاف کرنا یار، میں ذرا جذباتی ہو گیا تھا۔" میں نے کہا۔

*

غالب زندگی سے سخت بیزار بیٹھا تھا۔ اس کی ٹانگ نے اُسے قیدی بنا دیا تھا۔ وہ بیٹھے رہنے یا لیٹے رہنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا اور جب ہم باہر سے آ کے اُسے بتاتے تھے کہ ہم کہاں کہاں گئے تھے اور کیا کیا تیر مار آئے ہیں تو اس کو اپنی نظر بندی کا احساس زیادہ ہوتا تھا۔ ہمیشہ کی طرح جب ہم نے اُسے رابعہ کے دیے ہوئے نمبر پر ہونے والی گفتگو کا پھر آنٹی سے ہونی والی بات کا مختصراً احوال سُنایا اور پھر انکل رضوی کے سلسلے میں اپنی اسکیم کا ذکر کیا تو وہ دل گرفتہ نظر آنے لگا۔

"افسوس کہ میں ایک عضوِ معطل ہو کے رہ گیا ہوں۔" وہ [illegible] "کسی کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔"

"ملٹن نے کہا تھا کہ وہ بھی بہت کچھ کرتے ہیں جو صرف انتظار کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور اس میں مایوسی اور اُداسی کی تو کوئی بات نہیں ہے۔ تم نے تو وہ کام کیا ہے مرزا جو ہم سے نہ ہُوا۔ تم نے مزید کہا۔ "ہم ابھی تک ثابت ہیں، اپنی ٹانگ تک نہیں تڑوا سکے۔"

"لیکن آج تم کل ہماری باری ہے۔" محسن بولا۔ "ٹانگ ٹوٹنے کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ عضوِ معطل ہونے کی باری کسی اور کی آجائے۔ کبھی کبھی مشین بھی خراب ہو جاتی ہے مگر ٹھیک ہونے کے بعد پھر اس کی کارکردگی وہی ہو جاتی ہے۔ مرزا غالب! اب اور اس سے زیادہ ہم آپ کو نہیں سمجھا سکتے۔" محسن نے بستر پر دراز ہو کے کہا۔

"کیونکہ آپ کی عقل دانی میں اتنی ہی گنجائش ہے۔" میں نے اتفاق کیا اور تکیہ فرش پر ڈال کے لیٹ گیا۔ دوسرے کمرے میں جُولی بھی سو رہی تھی اور سراج کی ماں بھی محوِ خواب تھی۔ کہیں کسی اسپتال میں لکڑی کی بینچ پر یا سیمنٹ کے فرش پر کیتھرین بھی سو رہی تھی۔ کسی بے نشان قبر میں عائشہ بھی تھی۔ مر جانے والے اور سونے والے سب قیدِ مقام و وقت سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ فرق صرف اگلی صبح کے سورج کا رہتا ہے جسے سونے والے آنکھیں کھول کے دیکھتے ہیں تو نئے دن کے آغاز کی طمانیت ہی زندگی کا احساس بن جاتی ہے، ورنہ کچھ نہیں۔ رات... مسلسل رات... اندھیرا اور بے حسی اور صورِ اسرافیل کا انتظار۔

ایسے ہی خیالات میں مجھے نیند نے آ لیا۔ لاشعور کے پردے سے رابعہ نکل آئی۔ ہر نقشِ ماضی ایک خواب کا حصہ بن گیا۔ وقت جو گزر چکا تھا پھر لوٹ آیا۔ جہاں جہاں اس کے آفتابِ حسن کی دھوپ اتری تھی۔ کہاں کہاں اس کے گالوں کی شفق کا رنگ بکھرا تھا، کس کس جگہ اس کے لمس کی خوشبو ٹھہری تھی۔ وہ سب مقامات کے فاصلے خواب میں یکجا ہونے لگے۔ آرزوؤں نے جال پھیلائے، خواہشوں نے کمند پھینکی اور اس وقت کو اسیر کر لیا جو ابھی ہم سے گریزپا تھا۔ آگے آگے بھاگ رہا تھا اور ہم اس آہوئے خوش خرام کے پیچھے سرگرداں تھے۔ میں نے آنے والے دنوں کی تصویر کے رنگ دیکھے، ارمانوں کے رُوپ دیکھے اور ماضی سے مستقبل کے سفر میں رابعہ کے ساتھ رہا۔ پھر آنکھ کھل گئی تو زیاں تھا نہ سود تھا۔ میں نے خود کو حال کے لمحۂ گزراں کے

ساتھ پایا۔ اس میں رابعہ میرے ساتھ نہیں تھی، وہ ماضی میں تھی اور مستقبل میں بھی تھی مگر حال ایک بے وجود حقیقت کے سوا کچھ نہ تھا۔ ایک خیال جو احساس سے پہلے گزر جائے۔

پھر بھی میں بہت تازہ دم، بہت پُرعزم اور خوش تھا۔ یہ رابعہ کے تصور کے قریب ہونے کا نتیجہ تھا کہ اُس نے پھر میرے خوابوں میں جلوہ افشانی کی ورنہ جب میں اُسے بھلانے کی کوشش کر رہا تھا تو وہ خوابوں سے بھی دُور تھی اور اس کا فائدہ یہ ہوا کہ میں ذہنی انتشار سے محفوظ رہا۔ رابعہ کیسے کراچی پہنچی، کراچی تک پہنچنے میں اُس پر کیا گزری اور پھر کس طرح وہ اس قابل ہوئی کہ کہیں سے ہمیں ایک فون کر سکے، یہ سب خود رابعہ سے ملے بغیر نہیں معلوم ہو سکتا تھا۔ میں مفروضات تو بہت سے قائم کر سکتا تھا لیکن یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ رابعہ اب دُشمنوں کی قید میں نہیں ہے۔ اس کے ایک ٹیلی فون نے ہزار امکانات کو جنم دیا تھا۔ مثلاً یہ کہ رابعہ نے فون کیا نہیں تھا، اُس سے فون کرایا گیا تھا یا اُسے اتفاق سے ایک کال کرنے کا موقع مل گیا تھا اور اُس نے کسی کو اپنی مجبوری بتا کے کہہ دیا تھا کہ ہم میں سے کوئی رابطہ قائم کرے تو اُسے کیا بتایا جائے۔ یہ فرض کرنا ہی مشکل تھا کہ وہ آزاد ہے۔ وہ آزاد ہوتی تو لاہور آ جاتی یا ہر روز کال کرتی، اپنا نیا ٹھکانا بتاتی۔

میں نے گھر کی خاموشی پر غور کیا تو گھبرا کے اُٹھ بیٹھا۔ میری کلائی کی گھڑی دس بجا رہی تھی۔ بہت مدّت کے بعد اتنی لمبی اور گہری نیند نصیب ہوئی تھی۔ محسن میرے قریب ہی دوسری چارپائی پر سویا تھا مگر اب وہاں نہیں تھا۔ غالب کی چارپائی بھی خالی تھی۔ میں نے اُٹھ کے دوسرے کمرے میں دیکھنا چاہا تو مجھے اس کی کنڈی باہر سے بند ملی۔ میں تھوڑا سا حیران ہُوا اور کنڈی کھول کے اندر گیا۔ اندر صرف سراج کی ماں تھی مگر اُس کی حالت دیکھ کر میرے دماغ کو شدید صدمہ ہُوا۔ وہ اپنے کپڑے پھاڑ چکی تھی اور اب بندھی پڑی تھی۔ اس کے ہاتھوں اور پیروں کو ملا کے باندھا گیا تھا اور رسّی ایک بند کھڑکی کی سلاخوں سے باندھ دی گئی تھی چونکہ یہ قطار کا آخری کوارٹر تھا، اس لیے ایک کمرے کی کھڑکی بائیں جانب بھی کُھلتی تھی۔ باقی کوارٹروں میں یہ کھڑکی صرف عقبی دیوار میں تھی۔ کھڑکی کے پٹ باہر تھے اور سلاخیں اندر لگائی گئی تھیں۔ کھڑکی کو بند کرنے کے لیے سلاخوں میں سے ہاتھ گزارنے پڑتے تھے۔

سراج کی ماں کے سفید بال بُری طرح بکھرے ہوئے اور اُلجھے ہوئے تھے اور اس کا مُنہ بھی کپڑا ٹھونس کے بند کر دیا گیا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ خون آشام شیرنی کی طرح غرّائی اور اُس نے بَل کھا کے میری جانب بڑھنا چاہا مگر رسّی نے اُسے ایک جھٹکے سے روک لیا۔ اُس کی آنکھوں کی وحشت اور نفرت کی نظر نے مجھے ڈرا دیا۔ میں نے دروازہ پھر بند کیا اور باہر صحن کی طرف گیا۔ جُولی دونوں ہاتھوں سے غالب کو سہارا دے کر لا رہی تھی۔ غالب کو باتھ رُوم جانے کی ضرورت پیش آئی تھی۔ جُولی اُس کے ساتھ بیساکھی بن کے گئی تھی۔ غالب کا ایک ہاتھ جُولی کے کندھے پر تھا۔ اگرچہ وہ اپنے وجود کا بوجھ ایک ٹانگ پر سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا مگر پھر بھی جب وہ قدم بڑھاتا تھا تو اُس کے وزن سے جُولی جُھک جاتی تھی۔ اس منظر نے میرے دل میں محبت، خلوص اور دل کے پاکیزہ جذبوں کی طہارت کا احساس پیدا کیا۔ وہ ایک جوان لڑکی، غالب ایک جوان مرد، دونوں اجنبی، ایک مسلمان ایک عیسائی، اس طرح ایک دوسرے کا ساتھ دے رہے تھے کہ میرا دل چاہتا تھا، میں دُنیا کے لوگوں سے کہوں کہ اے ہوس پرستو! تعصّب کے جذبات سے مغلوب انسانو! اخلاقی قدروں کے کھوکھلے نعرے لگانے والو! ذہنوں کی غلاظت کی نظروں سے تشہیر کرنے والو! دیکھو کہ یہ کتنا خوبصورت خیال ہے۔ اگر ہم سب ایسے ہوں تو کیا آسمانوں پر کسی جنت کے حاصل ہونے تک ہم اس دُنیا میں جنت نہیں بنا سکتے؟

میں نے غالب کو جُولی سے لے لیا ”کیا حال ہے اب پیر کا...؟“

”بہت بہتر۔ میرا خیال ہے، دو چار دن میں چلنے لگوں گا۔“ غالب بولا۔

”اپنے خیال کو اپنے پاس رکھیے۔ خیال تو ڈاکٹر بھی اُس وقت تک ظاہر نہیں کرتا جب تک کہ ایکسرے نہ دیکھ لے۔“ میں نے کہا ”محسن کہاں ہے؟“

”اخبار لینے گیا ہے۔“ غالب نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”جُولی! تم کیا کر رہی ہو؟ کچھ تو کرو۔“ میں نے کہا۔

”میں ناشتا بنا رہی ہُوں بھائی۔“ وہ بولی ”محسن ڈبل روٹی اور مکھن لے آئیں بس جائے تو بس تیار ہے۔“

”اس کو کیا ہُوا؟“ میں نے جُولی کے جانے کے بعد کہا۔

”سراج کی ماں کو؟ نروس بریک ڈاؤن۔“ غالب بولا۔ ”بس ایک دم دماغ اُلٹ گیا، اعصاب جواب دے گئے۔ محسن نے تو صرف اتنا کہا تھا کہ آپ باتھ رُوم چلیں اور مُنہ ہاتھ دھولیں۔ اُسی وقت باہر وہ آ گیا جس نے ہمیں یہاں آباد کیا تھا، اُدھر بڑھیا چلّانے لگی کہ باتھ رُوم نہیں مجھے قبر میں جانا ہے۔ کل سے یہاں دفن کر رکھا ہے۔ نہ مارتے ہو نہ مرنے دیتے ہو، وہ دیوار میں سر مارنے لگی تو محسن نے مجبوراً اُسے خاموش کیا۔“

”اور اُس سے کیا کہا جو باہر آیا کھڑا تھا؟“

”اُس سے کہا کہ ہماری جو بہن میو اسپتال میں تھی، وہ مر گئی، ماں پر اُس کے صدمے کا اثر ہے۔“ غالب نے کہا۔

”کہاں ہے؟ مجھے کچھ پتا نہیں چلا، اتنا ہنگامہ ہُوا۔“

”تُو گھوڑے نہیں پورا اصطبل بیچ کے سو رہا تھا۔“ غالب بولا ”ہم نے سوچا کہ جگانے سے کیا فائدہ، جسے جتنی نیند مل جائے غنیمت ہے۔ صورتِ حال پر ہم نے قابو پا ہی لیا تھا۔“

”وہ تو پھر آئے گا جس نے ہمیں مکان دیا تھا۔“ میں نے کہا ”وہ پوچھے گا نہیں کہ اب میّت کا کیا ہوگا؟“

”اُس نے پوچھا تھا، محسن نے کہہ دیا کہ وہیں سے تدفین کے لیے گاؤں بھیج دیں گے۔“ غالب نے کہا ”اُس کی گھر والی بھی آئی تھی تعزیت کے لیے، جُولی نے باہر ہی سے ٹرخا دیا۔“

”یہ تو کچھ غلط ہو گیا۔“ میں نے کہا ”اب ہمیں بھی جانا پڑے گا۔ ظاہر ہے ہم جس بہانے یہاں ٹھہرے تھے، اب وہ بہانہ ہی نہیں رہا۔ یہ تو بڑا عجیب سا لگے گا، اگر ہم کسی بہن کی میّت کو روانہ کر دیں اور خود یہاں رُکے رہیں، آئے تو ہم اُسی کے علاج کے لیے تھے۔“

”اور کوئی بہانہ چلتا بھی تو نہیں ہے۔“ غالب بولا ”یا تو بڑھیا شروع سے پاگل ہوتی، اس کے اچانک پاگل ہو جانے کی وجہ ایک وجہ میری بھی سمجھ میں آئی۔“

”مجھے اُس کی طرف سے فکر لاحق ہو رہی ہے۔“ میں نے کہا ”ابھی اُسے نہ جانے اور کتنے دن ہماری قید میں رہنا پڑے گا، ایسے تو یہ مر جائے گی۔“

”پھر کیا کریں، اسے چھوڑ دیں؟“

”نہیں یار! پھر تو ہمارے پاس کچھ نہیں رہے گا۔ زیب النساء بھاگ گئی، عائشہ مر گئی۔ اُسے ہم نے چھوڑ دیا تو دلاور اینڈ کمپنی پر ہمارا دباؤ ہی ختم ہو جائے گا۔“ میں نے کہا۔

غالب نے کہا ”خسرو جمشید تو دباؤ سے نکل گیا اور دلاور بھی۔ ان کا رویّہ اب پہلے سے زیادہ انتقامی ہوگا۔ صرف سراج پر دباؤ رکھنے سے شاید بات نہ بنے۔“

میں نے کہا ”تم یہ سمجھ لو کہ اس پورے وطن فروش گروہ کو اگر سراج کی تائید و حمایت حاصل نہ ہو تو وہ جیل میں نظر آئیں۔ ان کے سارے راستے صرف سراج کے حکم سے کُھلتے ہیں۔ وہ سراج کو نظر انداز نہیں کر سکتے اور اس سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ تم جاؤ بھاڑ میں، تمھاری ماں مرتی ہے تو مر جائے، ہم اُن کی ایسی تیسی کر دیں گے جو عائشہ کی موت کے ذمّے دار ہیں اور جن کی وجہ سے زیب النساء پر یہ ظلم ہُوا۔ نہیں، سراج انھیں کچھ نہیں کرنے دے گا جب تک کہ اُس کی ماں خیریت سے واپس نہیں پہنچ جاتی۔ اس کا دُنیا میں کوئی نہیں رہا اور صرف ایک ماں ہے جس کی خاطر وہ سب کچھ کر سکتا ہے اور ہماری ہر بات مان سکتا ہے۔“

محسن تین اخبارات بغل میں دبائے اور ایک کاغذ کا تھیلا ہاتھ میں اُٹھائے آیا اور اخبار گرا کے کچن میں چلا گیا۔ اُن میں دو اخبارات اُردو کے تھے اور تیسرا انگریزی کا تھا۔ میں نے اُردو اخبار کو دیکھا۔ اُس میں بہت سی خبریں ہمارے نقطۂ نظر سے اہم تھیں۔ دلاور کے اغوا پر مزید بیانات تھے اور تبصرے تھے۔ بیان خودساختہ سیاسی لیڈروں کے تھے اور نام نہاد رفاہی تنظیموں کے تھے۔ سب نے اغوا کی مذمت کی تھی اور حکومت سے چوہدری دلاور کی بازیابی کا مطالبہ کیا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ عملی سیاست میں کچھ کرنے سے پہلے ہی دلاور نے اپنی تشہیر کا سامان کر لیا تھا اور ایک لابی بنالی تھی جو اب اسے سیاست دان بنانے کے لیے بیان بازی میں مصروف تھی۔ یہ اُس کی نئی طاقت تھی جس کی حیثیت ایسی ہی تھی جیسے صبحِ کاذب کا اُجالا جو جھوٹا ہوتا ہے اور وقتی ہوتا ہے۔

غیر مصدقہ خبریں ایک مخصوص علاقے میں رات کے وقت پولیس کی غیر معمولی سرگرمی کے بارے میں تھیں جہاں کچھ لوگوں نے فائرنگ بھی سُنی تھی اور ایک دھماکا بھی جو دستی بم کا دھماکا معلوم ہوتا تھا۔ تاہم پولیس کی طرف سے اس قسم کی اطلاع پر لاعلمی کا اظہار کیا گیا تھا۔ عائشہ کی لاش کی دستیابی کی خبر اُسی طرح چھاپی گئی تھی جیسے زیب النساء کے اغوا اور فرار کی خبر۔ ایک کونے میں سیاہ حاشیے میں ”مشہور صنعت کار، سوشل ورکر اور سیاسی شخصیت چوہدری دلاور کے خاندان میں ہونے والی دو اموات کا ذکر بڑے جذباتی اور اشتعال انگیز پیرائے میں کیا گیا تھا۔ اُس میں بتلایا گیا تھا کہ چوہدری دلاور کے اغوا کے بعد ایک نامعلوم شخص نے اُن کی بیوی سے فون پر دو کروڑ روپے کی رقم کا مطالبہ کیا تھا اور عدم ادائیگی یا پولیس کو اطلاع دینے کی صورت میں چوہدری دلاور کو قتل کر دینے کی دھمکی دی گئی تھی کیونکہ اہلِ خانہ اتنی بڑی رقم ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے، اس لیے چوہدری صاحب کے خسر نے ایس ایس پی سراج صاحب سے رابطہ قائم کیا۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد دوسرے فون کے ذریعے چوہدری دلاور کے خسر کو بتایا گیا کہ اب وہ اپنے داماد کی واپسی کی اُمید نہ رکھیں، اُس کی لاش گھر پہنچا دی جائے گی۔ اس اطلاع سے چوہدری دلاور کے خسر کو دل کا دورہ پڑا جو مہلک ثابت ہُوا۔ مرحوم دل کے پُرانے مریض تھے اور یہ صدمہ برداشت نہ کر سکے۔ باپ کی موت نے چوہدری دلاور کی اہلیہ کی جان لے لی جو عرصۂ دراز سے خون کے سرطان میں مُبتلا تھیں اور ڈاکٹر ان کے مرض کو لاعلاج قرار دے چکے تھے۔ خبر میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ جس خبر نے دو افراد کی جان لی، وہ بعد میں جھوٹ ثابت ہوئی کیونکہ چوہدری دلاور صاحب اغوا کرنے والوں کے قبضے سے

رہائی پا کے گھر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

دلاور نے اپنے اغوا کیے جانے اور پھر رہائی پانے کی کہانی خود گھڑ کے اخبار والوں کو سنائی تھی جس کے مطابق اسے آنکھوں پر پٹی باندھ کے لے جایا گیا تھا۔ اُسے معلوم نہیں کہ اغوا کرنے والے کون تھے مگر وہ دو کروڑ روپے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ اُنھوں نے یقین نہیں کیا تھا کہ چوہدری دلاور جیسا صنعت کار دو کروڑ کے اثاثے نہیں رکھتا۔ اس بات کا اقرار کرانے کے لیے اُنھوں نے دلاور کو مارا پیٹا تھا اور اُس کے گھر فون بھی کیے تھے جس کے نتیجے میں اُس کی بیوی اور سُسر کا صدمے سے انتقال ہو گیا تھا۔ دلاور نے بھی تصدیق کی تھی کہ اس کی بیوی کو یہ عارضہ سال بھر پہلے لاحق ہُوا تھا اور ڈاکٹروں نے بتا دیا تھا کہ وہ چھ ماہ ہی گزار سکے گی۔ یہ ایک معجزہ تھا اور کچھ علاج کا کرشمہ کہ وہ سال بھر زندہ رہی۔ اس درمیان میں کئی بار خون بدلا گیا اور لندن سے خصوصی ماہرین کی خدمات بھی حاصل کی گئی تھیں مگر متفقہ طور پر اس مرض سے شفایابی ممکن نہ تھی۔ تاہم باپ کی اچانک موت ایک بہانہ بن گئی۔ اپنے سُسر کے متعلق بھی دلاور نے وہی کہا تھا کہ ان پر دو بار ہارٹ اٹیک ہو چُکا تھا چنانچہ وہ کوئی بُری خبر برداشت کرنے کا حوصلہ ہی نہیں رکھتے تھے۔ دلاور نے اپنے فرار ہونے کا قصّہ بڑے ڈرامائی انداز میں بیان کیا تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ صرف اپنی ذہانت اور جُرأت سے کام لے کر اغوا کرنے والوں کے قبضے سے نکلنے میں کامیاب ہُوا تھا۔

ان سب خبروں میں جھُوٹ کے سوا کچھ نہیں تھا۔ سب سے بڑا جھُوٹ یہ تھا کہ چوہدری دلاور صاحب سیاست دان، صنعت کار اور سوشل ورکر تھے۔ اس کی بیوی کے قتل کو بلڈ کینسر کی بیماری کا نتیجہ قرار دینا دوسرا بڑا جھُوٹ تھا۔ اُس عورت کو مرنا ہی تھا۔ دلاور نے موقع سے پورا فائدہ اُٹھایا اور اُسے صحیح وقت پر دُنیا سے رخصت کر دیا۔ اُسے چیلنج کرنے والا اب کوئی نہیں تھا۔ کوئی ثابت نہیں کر سکتا تھا کہ اسے بلڈ کینسر نہیں تھا۔ کوئی اس ڈاکٹر کا نام نہیں پوچھ سکتا تھا اور یہ نہیں پوچھ سکتا کہ.... لندن سے کون سا خصوصی معالج آیا تھا۔ صنعت کار، سیاستدان اور سوشل ورکر چوہدری دلاور کا فرمایا ہُوا مستند تھا۔ غریب آدمی بھُوک اور بیروزگاری یا بیماری سے تنگ آ کے خودکشی بھی کرے تو پولیس اُس کی بیوہ کو قتل کے الزام میں دھر لیتی ہے کہ بتا کس آشنا کے ساتھ مِل کر شوہر کو مارا تھا۔ خیر! اپنے چوہدری صاحب! یار زندہ صحبت باقی۔ ہم اس قتل کو بھی معاف نہیں کریں گے۔ ہم لاش نکلوا کے پوسٹ مارٹم کرائیں گے۔ سال دو سال بعد بھی زہر کے آثار بالوں سے اور ناخنوں سے پتا چل جاتے ہیں۔

ایک خبر شہر کے نئے ایس ایس پی کے چارج لینے کے بارے میں تھی۔ اُس میں پریس ریلیز کے مطابق ایس ایس پی کے شاندار سروس ریکارڈ کے بہت سے حوالے تھے۔ آخر میں ایک سطر اُس شخص کے بارے میں تھی جس کا قابلِ فخر سروس ریکارڈ اس کی سبکدوشی کا سبب بنا تھا۔ کسی نے ضامن رضوی کے کردار کی اعلیٰ صفات کا ذکر نہیں کیا تھا۔ خبر صرف اتنی تھی کہ سابق ایس ایس پی نے ذاتی وجوہ کی بنا پر استعفا دیا تھا جو حکام بالا نے منظور کر لیا۔ اس طرح ایک بے داغ کیریئر کا خاتمہ بھی شکوک و شبہات کی فضا میں کیا گیا تھا۔ اب باتیں کرنے والے باتیں کرتے رہیں گے کہ یار! ایسے کون چھوڑتا ہے نوکری، کیا ہوگا کوئی بڑا گھپلا جس میں بچنے کی یہی صورت تھی۔ سب اُوپر والوں کی مِلی بھگت ہوتی ہے۔ یہ جب اپنے جیسے کسی کو پھنستا دیکھتے ہیں تو اُسے عزّت سے نکل جانے کا موقع فراہم کرتے ہیں تاکہ کل کو وہ پھنسیں تو ان کا راستہ بھی کوئی نہ روکے۔

خبریں پڑھ کر میرا بلڈ پریشر کے ٹُو سے بھی اُونچا ہو رہا تھا۔ غالب اور محسن دوسرے اخبار لیے بیٹھے تھے اور ان کی کیفیت بھی کچھ مجھ سے مختلف نہ تھی۔ صرف جُولی تھی جو بار بار سب سے کہہ رہی تھی کہ خدا کے واسطے ناشتا کر لو، چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ جُولی کی وجہ سے ہم کیتھرین کے بارے میں بات نہیں کر سکتے تھے کہ اُس کا کیا بنا، اُسے پولیس اُٹھا کر لے گئی تھی تو یہ خبر کیوں نہیں آئی۔ شاید دلاور نے خود کو بچانے کے لیے خبر رُکوا دی تھی کیونکہ کیتھرین کا نام آتا تو ساتھ اس کا نام بھی آتا۔ اُس نے تو اپنے فرار کی ایک جھُوٹی کہانی سُنائی تھی، جس میں وہ سب نہیں تھا جو اس کے ساتھ کیتھرین نے کیا تھا یا اُس نے کیتھرین کے ساتھ کیا تھا۔ وہ کیتھرین کا قاتل تھا اور یہ بات اچھی طرح سمجھتا تھا چنانچہ اُس نے کیتھرین کے قتل کا ہی نہیں، اُس کی لاش کی دستیابی کا ذکر تک کہیں نہیں آنے دیا۔

حیرت کی بات عائشہ کے اغوا اور اُس کی گمشدگی پر دلاور اور اُس کے گھر والوں کی خاموشی تھی۔ عائشہ کو یقیناً دلاور نے خاموشی سے سپردِ خاک کر دیا تھا مگر اس کی موت کو راز رکھا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ رشتہ متاثر نہ ہو جو ابھی نیا تھا۔ دو دن قبل ہی تو عائشہ سے بڑی بہن کی نسبت طے ہوئی تھی۔ اس خاندان میں اب صرف وہ بچی تھی یا اُس کی بڑی بہن اور دلاور کی بیوی کے بچّے رہ گئے تھے۔ کیا اب دلاور اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرے گا؟ مجھے بے اختیار خیال آیا۔ عائشہ کی بہن بھی کیا عائشہ جیسی ہی ہو گی۔ وہ بچّوں کی پرورش بہرحال کر لے گی۔ کسی غیر عورت کے مقابلے میں وہ عورت یقیناً بہتر ثابت ہوتی ہے جو بہن کے بچّوں سے محبّت کرتی ہو، وہ سوتیلی ماں کے روایتی کردار کو نہیں اپناتی۔ دلاور کو اگر بچّوں کی پرورش کا خیال ہو اور عائشہ کی بہن بھی ویسی ہی ہوئی تو دلاور شاید اس سے شادی کرنا چاہے۔ اس کو حاصل کرنا دلاور کے لیے کیا مشکل ہو گا۔ وہ عورت کی ذات کے حصار کو اُس کی کمزوریوں سے سر کر سکتا ہے۔ سبز باغ، دولت کا سُنہرا جال، پُرتعیش زندگی، عزّت اور شہرت کے خواب۔ ان سے عائشہ جیسی کوئی عورت کیسے گریز کر سکتی ہے، کہاں تک مزاحمت کر سکتی ہے۔ رہا اُس کی نسبت طے پا جانے کا معاملہ تو دلاور کسی سے کچھ بھی چھین سکتا ہے۔ کسی کا احساسِ تمکنت، غرور، عزّتِ نفس، جائیداد اور زندگی، وہ منسوب کو ختم کر دے تو نسبت کہاں رہے گی۔

لاحول ولا قوۃ۔ مَیں نے سر کو جھٹک کے سوچا۔ مجھے بھی ذہنی عارضہ لاحق ہو گیا ہے سوچنے کا اور دلاور ایک کمپلیکس بنتا جا رہا ہے۔ ایسا ہونا تو نہیں چاہیے، مجھے دلاور کے ذاتی افعال سے کیا لینا جن کے لیے وہ قانون یا خدا کے سامنے جواب دہ ہوگا۔ میری جنگ تو اس کے مقصد سے ہے اور اگر خدا نے اس جنگ میں کامران کیا تو پھر دلاور سے یہ بھی پوچھوں گا کہ میرے والد وزیر خاں کی زندگی اور موت کا حساب کیا ہے۔

سب اخباروں کی خبریں ایک سی تھیں۔ مجھے اطمینان صرف یہ تھا کہ کیتھرین کے بارے میں اس کی بیٹی کو کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ وہ ہمارے جھُوٹ سے بہل جائے گی۔ اُسے ہم پر اعتبار نہ ہوتا تو وہ ہمارے ساتھ ہی کیوں رہتی۔ وہ سمجھتی ہوگی کہ ہم اس کے ساتھ جھُوٹ بول ہی نہیں سکتے۔

"بھائی!" جُولی نے اچانک کہا۔ "شام کو چلیں گے نا، قبرستان؟"

مَیں ایسے چونکا جیسے جُولی نے میرے دل کے خیال کو پڑھ لیا ہو۔ "ہاں! بالکل چلیں گے، ہم سب چلیں گے۔"

"لیکن ابھی تو ہم نے کہیں اور جانا ہے۔" محسن نے گھڑی پر نگاہ ڈال کے کہا۔

"یہاں سے تو سب ہی کو جانا ہے۔" غالب نے کہا جو ایک فلسفیانہ سی بات لگتی تھی مگر اس کا مطلب یہ تھا کہ اب ہم یہاں نہیں رہ سکتے۔

مَیں اور محسن اس گیراج میں پہنچے جہاں ہم نے اپنی مائکروبس کھڑی کی تھی۔ وہ لڑکا سخت بیزار اور پریشان بیٹھا تھا۔

"لو جی! آپ نے بھی کمال کر دیا۔" وہ بولا۔ "آپ کی وجہ سے مَیں ابھی تک گھر نہیں گیا، رات بھر کا جاگا ہُوا ہوں۔"

"ہم نے تو منع نہیں کیا تھا تم کو۔" مَیں نے کہا۔

"مگر گاڑی تو مَیں نے ہی لی تھی۔" وہ بولا۔ "آپ کو مَیں پہچانتا تھا۔ آپ نے تو صُبح آنے کو کہا تھا۔"

"تو کیا یہ صُبح نہیں ہے؟"

"واہ جی، دوپہر ہو گئی ہماری، بڑے لوگوں کی اب صُبح ہوئی ہے۔ خیر جناب، گاڑی دیکھ لیں، بریک ایک دم مائٹ ہیں۔"

"اچھی طرح چیک کر لیے تھے؟"

"ہاں جی، آپ بھی دیکھ لیں۔" وہ بولا۔

مَیں نے اپنی تسلّی کے لیے گاڑی میں ایک میل کا راؤنڈ لگایا۔ اس کا کیا بھروسا، اچھے بھلے بریک کھول دے اور اسے کا ستیاناس کر دیتا مگر غالباً اُس نے ہمیں ناتجربہ کار اور وہمی سمجھا ہوگا کہ بریک ٹھیک تھے اور ہم ٹھیک کرانے آ گئے تھے۔ اُس نے کچھ بھی نہیں کیا تھا مگر ہم سے پچاس روپے وصول کر لیے۔

کاروں کے شوروم کا مالک جس کی معرفت ٹریلر کا سودا ہونا تھا، ہمارے فراق میں سخت بے قرار تھا۔ ہمیں دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی اور اس کا یہ اندیشہ دُور ہُوا کہ ہم نے براہِ راست معاملہ طے کر کے اس کے کمیشن کا خون نہیں کیا۔ اُس نے بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔

"جناب خان صاحب! پارٹی بہت بدمعاش ہے۔" وہ بولا۔

"اَم اس سے بڑا بدمعاش اے۔" محسن بولا۔ "دس نمبری اے۔"

"جی، میرا مطلب یہ نہیں تھا۔" وہ بولا۔ "مقصد تھا اُن کی دھوکے بازی سے خبردار کرنا۔ ضرورت مند کو دیکھ کر مُنہ پھاڑتے ہیں۔ کل صاف بات ہو گئی تھی۔ رات کو پچاس ہزار زیادہ مانگنے لگے۔"

"اچھا... بے ایمان، داؤس اَم گولی مار دے گا۔" مَیں نے ریوالور نکال کے کہا۔ "وعدہ خلافی کرتا اے۔"

"ارے نہیں وہ... وہ مَیں نے ٹھیک کر لیا۔ آپ اسے جیب میں رکھ لیں۔" وہ گھبرا کے بولا۔ "بالکل فکر مت کریں؟ سودا اتنے میں ہی ہوگا، جتنے میں بات ہوئی تھی۔"

"ٹھیک اے۔ ابھی اَم ایسا آدمی سے بات نہیں کرے گا۔" محسن نے کہا۔ "تم جاؤ اور اس کو پیسہ دو، اگر ایک پیسہ بھی زیادہ دے گا تو اَم تم کو گولی مار دے گا۔" اب محسن نے ریوالور نکال لیا۔

"بالکل نہیں، ہرگز نہیں۔" اُس کا حلق خشک ہو گیا۔ "مَیں ایک پیسہ زیادہ نہیں دوں گا۔ آپ یہ گولا بارود چھپا کے رکھیں۔"

"اچھا تو جاؤ، اَم ادھر بیٹھے گا۔" مَیں نے کہا۔

"اور سبز چائے پیئے گا۔" محسن نے کہا۔

شوروم کے مالک کے لیے اس سے اچھی بات کیا ہو سکتی تھی کہ وہ خود رقم لے کر جائے اور سودا کینسل کر آئے۔ اب اس میں پچاس ہزار بچتے ہیں یا ایک لاکھ۔۔۔ اس میں وہ خود ہی مختارِ کُل تھا۔ ہم دوبارہ وہاں جانے کا رِسک نہیں لے سکتے تھے بکری کی موت کا راز اتنی جلدی فاش نہیں ہو سکتا تھا، جہاں حادثہ پیش آیا تھا وہاں اس کی کوئی شناخت نہیں بچی تھی اور اس کی پُراسرار گمشدگی کی رپورٹ درج ہو جانے کے بعد یہ ہو سکتا تھا کہ دو چار دن میں اس کی حادثاتی موت بھی ثابت ہو جائے لیکن ٹرک اسٹینڈ پہ بیٹھے رہنا یا اُس کے کسی ایجنٹ کا مل جانا بعید از قیاس نہیں تھا۔ ہم یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ کوئی تجسس کا مارا ہمیں دیکھے اور پوچھے کہ ٹریلر ہم نے کیوں خریدا ہے۔

شوروم کا مالک تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد ٹریلر کے ساتھ نمودار ہُوا۔ میں نے اُسے دُور ہی سے آتا دیکھ لیا تھا۔ وہ خود ڈرائیور کے ساتھ زمین سے تقریباً آٹھ نو فٹ کی بلندی پر اس کیبن میں بیٹھا ہُوا تھا جو انجن کے پیچھے تھا۔ ڈرائیور ایک صحت مند اور جوان، سُرخ و سفید پٹھان تھا جس کی مونچھیں شاہانہ قسم کی تھیں۔

"میاں محسن! یہ تو کوئی اصلی پٹھان آگیا۔" میں نے کہا۔

"ہمارا اس سے کیا تعلق اور تعلق نہیں تو ڈرنا کیا، جیسے شاعر نے کہا ہے کہ پیار کیا تو ڈرنا کیا۔" محسن بولا۔

"اب یہ ہم سے اپنی مادری زبان میں بولنے لگا تو ہمارے پٹھان ہونے کا ڈراما فیل کر دے گا۔" میں نے کہا۔ "آدمی جذباتی ہو تو کسی بھی ہم زبان اور ہم سخن سے گلے مل کر بہت خوش ہوتا ہے۔"

"ہم نے صرف ٹریلر منگوایا تھا، یہ ڈرائیور کیوں لے آیا۔"

"ممکن ہے ٹرک کے ساتھ تحفے میں ڈرائیور دیا گیا ہو۔" میں نے کہا۔ "جیسے بعض اشتہارات میں ہوتا ہے کہ دندان شکن منجن کے فیملی سائز کے ساتھ ایک ہوشربا کیلنڈر مفت۔"

"یہ ڈرائیور بھی دنداں شکن ہی لگتا ہے۔" محسن بولا۔ "اگر یہ پشتو نہ بولے تو فریقین کا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔"

مختصر اور بھڑکیلا کار شوروم کا مالک جست لگا کے اُترا اور سڑک پار کرتے ہوئے ایک گائے سے ٹکرا گیا جو کسی نے صدقے میں آزاد چھوڑ دی تھی۔ ایسے مویشی ہر شہر میں ہر جگہ آزادانہ پھرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور کوئی ان سے تعرض نہیں کرتا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ لوگ جو گھر میں نقب لگا کے سوئے ہوئے آدمی کے نیچے سے چادر چرا لیتے ہیں، وہ بھی ان لاوارث مویشیوں کو پکڑ کے نہیں لے جاتے۔

مذکورہ گائے سے ٹکرانے کے بعد شوروم کا مالک کراہتا ہُوا اور لنگڑاتا ہُوا اندر آیا تو سخت برہم تھا۔

"بس، چھوڑ دیتے ہیں، اب جس سے چاہیں ٹکراتی پھریں گاڑیوں سے یا بندوں سے۔" وہ بے ربط الفاظ میں بولا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ اسی اللہ میاں کی گائے کا شکوہ کر رہا تھا جس نے اُسے ٹکر مار دی تھی۔

"خیر یار! خدا کا شکر کرو۔" میں نے کہا۔

"جی؟ خدا کا شکر ادا کروں؟ کس بات پر؟"

"اس بات پر کہ تم بچ گیا۔" محسن بولا۔ "سالم بچ گیا۔"

"اور اس بات پر کہ وہ گائے تھی، شیر نہیں تھا۔" میں نے کہا۔ "یا ہاتھی نہیں تھا۔"

شوروم کا مالک خون کے گھونٹ پی کر اس مذاق پر مُسکرایا کیونکہ وہ مُسکرانے پر مجبور تھا۔ "آپ کی چیز آگئی۔"

"کون سا چیز؟" میں نے کہا۔ "وہ جو اُوپر بیٹھا ہے؟"

"وہ تو ڈرائیور ہے۔" شوروم کا مالک بولا۔

"اچھا، ٹرک کا ساتھ ڈرائیور مفت؟ کتنے کا ملا؟"

"چار لاکھ، پورے۔" شوروم کا مالک کرسی پہ بیٹھ گیا۔

"ام کو ڈرائیور نئیں چاہیے، اس کا قیمت کاٹ دو، کمپنی کو بولو ڈرائیور واپس۔" محسن نے کہا۔ "امارا چاچے کا پتر خود ڈرائیور ہے، موت کا کنواں میں موٹر سائیکل چلاتا ہے۔"

"مگر جناب! موٹر سائیکل کہاں اور یہ ہیوی ڈیوٹی ٹرک کہاں؟" شوروم کا مالک بولا۔ "اگر آپ کے پاس ڈرائیور نہیں ہے تو میری مانیں، اسے رکھ لیں، یہ ضرورت مند ہے۔۔۔ اور پریشان ہے۔"

"کیوں پریشان ہے؟"

"اور تم اس کا پریشانی پر کیوں پریشان ہے؟" میں نے کہا۔

"جناب! ایماندار آدمی ہے نا، اس لیے ہمیشہ پریشان رہتا ہے۔ تین بار نوکری سے نکالا جا چکا ہے کیونکہ غلط کام نہیں کرتا۔ اب جو ٹرک کمپنی والے ہوتے ہیں، اُن کے تو ہزار دھندے ہوتے ہیں اور ہزار طریقوں سے وہ راستہ بناتے ہیں۔ چُنگی محصول، ایکسائز، نذر نذرانہ، یہ سب دیتے ہیں، تب کہیں جا کے اِدھر کا مال اُدھر پہنچتا ہے اور اُدھر کا مال اِدھر آتا ہے، مال سمجھتے ہیں نا آپ؟ تو یہ پٹھان زادہ بالکل پٹھان ہے، کہتا ہے یہ غلط ہے، دھوکا ہے، گناہ ہے اور جرم ہے، ہم یہ نہیں کرے گا اور کسی کو کرنے بھی نہیں دے گا۔ نتیجہ تو آپ خود سمجھ لیں، اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ کہیں بھی وہ ہفتے سے زیادہ نہیں رہتا۔ ویسے ڈرائیور بہت اچھا ہے اور بھروسے کا آدمی ہے، اس لیے میں اپنے ساتھ لے آیا۔" وہ بولا۔

"اچھا، ہم دیکھے گا۔" میں نے کہا۔

"مجھے اُمید تھی کہ آپ لوگوں کے ساتھ چل جائے گا کیونکہ آپ لوگوں کا کام سیدھا ہے، میرا مطلب ہے کوئی ہیرا پھیری والا نہیں ہے۔"

"اس کو بولو، گاڑی کو ملتان روڈ پہ لے جائے اور فلم اسٹوڈیو سے آگے کھڑا کرے۔" میں نے کہا۔ "ہم ادھر ہی آ جائے گا۔"

"باقی بات اُدھر کرے گا۔" محسن نے کہا۔

شوروم کا مالک یہ خوشخبری سُنانے کے لیے پھر سڑک پار کر کے گیا اور اس مرتبہ ایک دو منزلہ بس سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ ہم نے ٹریلر کو پھر روانہ ہوتے دیکھا اور اطمینان کا سانس لیا۔ فوری طور پر ہمارے پٹھان نہ ہونے کا راز فاش نہیں ہُوا تھا۔ ڈرائیور کی ہمیں واقعی ضرورت تھی اور جیسا کہ شوروم والے نے بتایا تھا، یہ آدمی اپنی ایمانداری اور اصول پرستی کے باعث دربدر ہو رہا تھا، اگر ہمیں اس جیسے شخص کی ضرورت تھی تو اسے بھی ہم جیسے لوگوں کی۔

شوروم والا لوٹ کر آیا اور اس سے باقی معاملات طے کرنے میں مزید آدھا گھنٹا صرف ہُوا۔ ہم نے رسید اور ٹرانسفر لیٹر وغیرہ حاصل کیے اور اُسے رجسٹریشن کے مصارف ادا کیے۔

"رجسٹریشن نورتن سرکس کمپنی کے نام پر ہوگا۔" میں نے کہا۔

"آپ ایک دسواں رتن شامل نہیں کر سکتے؟" شوروم والا اب ہم سے بے تکلفی پر آمادہ تھا۔ ہمارے اور اس کے درمیان تمام کاروباری معاملات افہام و تفہیم اور خوشگوار ماحول میں طے ہوئے تھے۔ سودا بہت بڑا تھا اور اُس نے فائدہ بھی بہت بڑا حاصل کیا تھا چنانچہ وہ خوش تھا۔ اُس نے ہمارے متعلق جو ابتدا میں رائے قائم کی تھی، وہ بالکل بدل چُکی تھی اور ہم جو بے حد ٹیڑھے نظر آتے تھے، اس کے نقطۂ نظر سے بہت سیدھے ثابت ہوئے تھے۔ ہم نے اُس کے کہنے پر ایک ڈرائیور کو بھی ملازم رکھ لیا تھا۔ اُس نے ہمیں ایک اور کاروباری مشورہ دینا مناسب سمجھا۔

"دسواں رتن، وہ ہم نے ابھی رکھا ہے۔" میں نے کہا۔

"میرا مطلب تھا گیارھواں، گیارہ کی ٹیم ہوتی ہے جناب!" وہ ہنسا۔ "میرا ایک بھتیجا ہے، اُسے بڑا شوق ہے ایسے کرتب دکھانے کا۔ چھوٹا تھا تو ایک بار چھت پر سے کُود گیا، مشکل سے سات سال کا ہوگا۔"

"پھر کیا ہُوا، لنگڑا ہو گیا سات سال کی عمر میں؟"

"وہ۔۔۔ جی وہ تو نہیں، اس کے والد یعنی میرے بھائی کا ہاتھ ٹوٹ گیا۔" شوروم والا بولا۔ "انھوں نے بچے کو کیچ کرنے کی کوشش کی تھی۔ بڑے اچھے کرکٹر تھے مگر خیر، کیچ سب سے ڈراپ ہو جاتے ہیں۔ دوسری بار جناب اُس نے بہ عمر چودہ سال ایک درخت سے دوسرے درخت پر چھلانگ ماری مگر درخت ذرا دُور رہ گیا۔"

"اچھا، پھر اُس کا ٹانگ ضرور ٹوٹا ہوگا۔"

"نئیں بھائی صاحب! اُس کو پھر کسی نے کیچ کر لیا ہوگا۔" میں نے کہا۔

شوروم والے نے نفی میں سر ہلایا۔ "ایک بکری ٹوٹ گئی۔ پیڑ کے نیچے کھڑی تھی، وہ بکری کی کمر پہ گرا۔ خیر مرنے سے پہلے اس کو ذبح کر لیا گیا تھا اور بریانی اچھی پکی تھی۔ اب وہ اکیس سال کا ہے۔"

"ہر سات سال بعد وہ کسی کا کچھ توڑتا ہے۔" میں نے فیصلہ کیا۔ "سات سال میں باپ کا ہاتھ، چودہ سال میں بکری کا کمر، اب اکیس سال میں وہ کیا توڑے گا، ہمارا گردن؟ نئیں اس کو بولو کہ چڑیا گھر کے پنجرے پر چڑھ کے شیر پہ کُود دے۔"

ظاہر ہے، ہمارے اس مشورے کے بعد شوروم والے سے مذاکرات ختم ہو گئے اور ہم اس سے ہاتھ ملانے کے بہانے اس کو اچھی طرح جھنجوڑ کے رخصت ہوئے۔ اُس نے کہا کہ وہ نورتن سرکس کمپنی کے نام ٹریلر کے ٹرانسفر کی کارروائی اگلے چوبیس گھنٹوں میں پوری کرے گا۔

"اس ٹرک ڈرائیور کا انٹرویو نہ کریں۔" محسن نے وہاں سے روانگی کے بعد کہا۔

"کر لیتے ہیں، شاید ایک کام کا آدمی مل جائے۔" میں نے کہا۔

"ہمیں اس کوارٹر سے بھی فوراً نکل جانا چاہیے۔" محسن بولا۔ "سراج کی ماں کی وجہ سے گڑبڑ نہ ہو جائے، کہیں پاگل پن میں اُس نے بولنا شروع کر دیا سب کے سامنے تو ہم پھنس جائیں گے۔"

"مگر ہم اب جائیں گے کہاں؟"

"میرا خیال ہے کہ ٹریلر میں ہم محفوظ ہوں گے۔" محسن بولا۔

"کیا اس پر سرکس کا نام لکھوا لیں؟"

"ابھی نہیں۔" محسن نے کہا۔ "خواہ مخواہ لوگ جمع ہوں گے اور دس قسم کے سوال کریں گے۔ ابھی تو وہ عام قسم کا ٹرک لگتا ہے جو عموماً بڑے شہروں کے درمیان سامان لاتے لے جاتے دکھائی دیتے ہیں۔"

میں نے تائید میں سر ہلایا۔ "اگر یہ بیان نہ دیا جاتا۔۔۔ کہ میو اسپتال میں داخل بہن مر گئی ہے تو ہم دو چار دن وہیں گزار لیتے۔"

"لیکن اب نہیں گزار سکتے، ہمیں روانہ ہونا پڑے گا۔ یہ بتا کے کہ ہم بھی میت کے ساتھ واپس جا رہے ہیں۔" محسن بولا۔

ٹرک ابھی ملتان روڈ پر ہی تھا کہ ہم نے اُسے جا لیا۔ اُس کی رفتار بہت کم تھی اور شہر کی ٹریفک میں اور بھی کم ہو گئی تھی۔ اس قسم کے ٹریفک کو مخصوص سڑکوں پر سے گزرنے کی اجازت تھی۔

تنگ سڑکوں اور بازاروں میں ہیوی ڈیوٹی ٹرک نہیں جا سکتے تھے چنانچہ اُس نے راستہ بھی لمبا اختیار کیا تھا۔ ہم اُس کے پیچھے پیچھے چلتے گئے۔ ہم نے اُسے صرف ملتان روڈ پر اسٹوڈیو سے آگے جانے کی ہدایات دی تھیں۔ یہ نہیں بتایا تھا کہ اُسے کتنا آگے جانا ہے۔ میں نے بہتر سمجھا کہ اُسے خود گائیڈ کروں۔ آبادی سے نکلتے ہی میں نے مالکروبس کی رفتار بڑھا کے اُسے اوورٹیک کیا اور اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ آٹھویں میل کے نشان پر مجھے سڑک کے بائیں کنارے پر ایک صاف حصہ نظر آیا جہاں ٹرک کو کھڑا کرنے سے ٹریفک میں ذرا بھی خلل نہیں پڑ سکتا تھا۔

ڈرائیور نے ٹرک کو میری ہدایت کے مطابق بالکل آخری حصے میں روک دیا۔ ٹرک اب سڑک سے تقریباً پچاس گز دُور تھا اور یہ جگہ ہر لحاظ سے محفوظ تھی۔ ایک جانب غیر آباد کھیت تھے جو کسی تعمیراتی کمپنی نے خرید لیے تھے۔ ان کا سائن بورڈ سڑک کے کنارے نصب تھا جس پر مجوزہ منصوبے کے بارے میں پبلک کو کارآمد معلومات فراہم کرنے کے بعد مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ تفصیلات کے لیے فلاں فلاں نمبر پر رابطہ قائم کریں۔ آگے پیچھے مکانات اس خالی پلاٹ کے بعد شروع ہوتے تھے چنانچہ تین طرف سے ہم الگ تھلگ تھے۔ چوتھی سمت یعنی سڑک کے دوسرے کنارے پر نئی بنی ہوئی دکانیں تھیں۔ ان میں سے بیشتر کے شٹر گرے ہوئے اور مقفل تھے۔ صرف چار دکانیں آباد ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک میں چائے خانہ اور ریسٹورنٹ تھا جو دو دکانوں کو ملا کے بنایا گیا تھا۔ اس کے اوپر سفید پیپر کے پروپرائٹر نے بقلم خود شاندار ہوٹل اینڈ ریسٹورنٹ تحریر کیا تھا اور دائیں بائیں ایک ایک پھول بنا کے اس میں یا اللہ اور یا محمد بھی لکھا تھا۔ یہ ہوٹل یوں تھا کہ مسافرانِ شب کے لیے خدا کی بنائی ہوئی زمین پر اور آسمان کے سائبان کے نیچے چارپائیاں ڈال کے سونے کا بندوبست کیا گیا تھا اور یہ اعلان بھی مالک اور پینٹر نے سائن بورڈ پر کر دیا تھا کہ منجی بستر ایک روپیہ۔ [illegible] دکانیں بالترتیب موٹر میکینک ہینڈ پمپ بنانے اور مرمت [illegible] لے اور تعمیر میں کام آنے والے میٹریل فروخت کرنے والوں کی تھیں۔

"السلام علیکم" ٹرک ڈرائیور نے نیچے اُتر کے ہم سے پُرجوش مصافحہ کیا۔ "میرا نام شیر علی ہے۔"

مجھے اُس کے لہجے پر شک گزرا۔ "شیر علی! تم مجھے پٹھان تو نہیں لگتے، میرا مطلب ہے لہجے سے۔"

وہ مسکرایا۔ "میں سو فیصد اور خالص پٹھان ہوں۔ کوہاٹ کا رہنے والا۔"

"مگر تم اردو بہت صاف بولتے ہو۔" میں نے کہا۔

"اس میں حیرانی کی کون سی بات ہے۔ بہت سے دیسی لوگ جب انگریزی بولتے ہیں تو انگریزوں کو شرمندہ کر دیتے ہیں۔" شیر علی نے کہا۔ "انگریز ہیں جو فارسی، عربی جانتے ہیں، یہ تو اپنے ہی وطن کی قومی زبان ہے۔"

"تم نے کہاں تک تعلیم حاصل کی ہے شیر علی؟" محسن نے اُس کی بات سے متاثر ہو کے کہا۔

"میں نے اسلامیہ کالج پشاور سے بی اے کیا تھا۔" وہ بولا۔

"اچھا اور تم ٹرک چلا رہے ہو؟" میں نے کہا۔

"آپ کے خیال میں یہ کوئی بُرا کام ہے، جس پر مجھے شرم آنا چاہیے۔" وہ بولا۔

"ہرگز نہیں۔" میں نے فوراً کہا۔ "مجھے تو خوشی ہوئی یہ دیکھ کر کہ تم نے محنت کی عظمت کو پہچانا ورنہ بی اے کر کے لوگ جسمانی محنت کے کام میں توہین محسوس کرتے ہیں۔"

"میں محنت کر سکتا ہوں، نوکری شاید نہیں کر سکتا۔"

"میں نے سنا ہے کہ تم کو یہ کام بھی تین بار چھوڑنا پڑا تھا۔" محسن بولا۔

"جی، بات وہی ہے کہ نوکری میں آدمی اپنی خدمات بیچتا ہے، اپنی عزتِ نفس، خودداری، دین ایمان یا اصول نہیں بیچتا۔" شیر علی نے کہا۔ "میں تنخواہ لوں گا تو اس کے ایک ایک پیسے کا حقِ محنت ضرور ادا کروں گا، جہاں کام نہیں ہوگا، وہاں میں مفت کی تنخواہ بھی نہیں لے سکتا مگر ملازمت کے نام پر میں غلامی کروں، یہ ممکن نہیں ہے اور آج کل ہر نوکری میں غلامی ہے۔"

"اگر تم اور ہم ساتھ رہے۔" میں نے محتاط ہو کے کہا۔ "تو تم دیکھو گے کہ یہ ملازمت بھی نہیں ہے، رفاقت ہے۔ ہم مل کے کام کریں گے اور ساتھی ہوں گے، نہ کوئی آقا نہ کوئی ملازم۔ ہم عزت دے کر عزت حاصل کرنے کے اصول کو سمجھتے ہیں اور اس پر عمل بھی کرتے ہیں۔"

"فرض کرو ہم تمہاری خدمات حاصل کرنا چاہیں۔" محسن بولا۔ "تو تم کیا معاوضہ یا حقِ محنت لو گے؟"

"میں اکیلا آدمی ہوں، مجھے ایک ہزار بہت ہیں۔" وہ بولا۔ "پانچ سو خرچ کروں گا تو پانچ سو بچا لوں گا۔"

"ٹھیک ہے، ہم تمہیں دو ہزار روپے ماہانہ دیں گے، کھانا پینا سب ہمارے ساتھ ہوگا۔"

اُس نے انکار میں سر ہلایا۔ "کھانا پینا میرا اپنا ہوگا۔"

"یہ کوئی رعایت نہیں ہے۔ ان سب کے لیے جو ہمارے ساتھ ہوں گے کھانے پینے کا ایک ہی جگہ بندوبست ہوگا۔ سب ایک ساتھ کھائیں گے اور ایک سا کھائیں گے، ہم بھی۔ سب کی تنخواہ اس کے علاوہ ہوگی، پھر بھی تم بازار سے کھانا چاہو یا اپنا پکانا چاہو تو پانچ سو کا اضافہ کر لو۔"

اُس نے کچھ سوچ کے انکار میں سر ہلایا۔ "ایسی صورت میں دو ہزار مجھے منظور ہیں، میں کچھ اور سمجھا تھا، سب سے الگ میں پکا سکتا ہوں، اب آپ مجھے کام بتا دیں۔"

"کام... کام صرف ٹرک چلانا۔" میں نے کہا۔

"میں نے سنا ہے آپ کوئی سرکس قائم کر رہے ہیں۔" وہ بولا۔ "صرف سرکس ہی ہوگا نا، کچھ اور تو نہیں ہوگا۔"

"کچھ اور سے تمہارا کیا مطلب ہے؟"

"مطلب یہ کہ بہت سے تھیٹر، سرکس والے آوارہ عورتیں دراصل کے رکھ لیتے ہیں۔"

"اوہ نو، ہم کوئی بھی غلط کام نہیں کریں گے، تم دیکھ لو گے خود ہی۔" میں نے کہا۔ "ہم اسمگلر بھی نہیں ہیں کہ ٹرک کو غیر قانونی کاروبار کے لیے استعمال کریں۔"

"سرکس کے باقی ساتھی کون ہیں؟" وہ بولا۔

"اُن سے بھی تم بہت جلد مل لو گے۔" میں نے کہا۔ "[illegible] ب ہم جا رہے ہیں، اگر تم ٹرک کو چھوڑ کے جانا چاہو تو جا سکتے ہو۔"

"مجھے اپنا سامان لے کر آنا ہے۔" شیر علی نے کہا۔

"سامان کم سے کم ہو تو اچھا ہے، بس پہننے کے کپڑے، باقی سب چھوڑ دو، ہم بھی اسی چلتے پھرتے گھر میں رہیں گے۔" میں نے کہا۔

"میرے پاس ہے بھی کیا، دو چار جوڑے کپڑوں کے علاوہ ایک پرانی چارپائی، اُسے میں چھوڑ آؤں گا۔" وہ بولا۔

"شام تک لوٹ آنا۔" میں نے کہا اور جیب میں سے پانچ سو روپے نکالے۔ "یہ ایڈوانس رکھ لو، کچھ خریدنا ہو تو۔"

"بہت بہت مہربانی۔" وہ بولا۔ "میری ہمت نہیں پڑتی تھی کہ کچھ مانگوں، ان بدمعاشوں نے میرے دو ہفتے کے پیسے مار لیے جہاں میں پہلے ملازم تھا، میں نے اُن کو مارا تھا۔"

"کیوں مارا تھا؟" میں نے کہا۔ "مار پیٹ کوئی اچھی بات ہے؟"

"اور کسی کو ٹکے کا ڈرائیور کہنا، ذلیل کرنا اور گالیاں دینا کوئی اچھی بات ہے۔ آپ نے مجھے پانچ سو روپے دیے ہیں، اس کے ساتھ اگر آپ مجھے گالی دیتے تو میں آپ کو بھی مارتا۔" وہ بولا۔

"ہم کسی کو گالی دیتے ہیں تو پیار سے۔" میں نے کہا۔ "مگر جب ملتے ہیں تو ایسا کہ پھر اُٹھنے نہیں دیتے، تم اب جاؤ، ہم اگر شام تک نہ آئیں یا کل آئیں تو فکر مت کرنا۔ یہ ٹریلر تمہارا گھر ہے اور وہ سامنے ایک ہوٹل ہے، وہاں شرفاء کے لیے طعام و قیام کا اعلیٰ انتظام ہے۔"

جب وہ چلا گیا تو میں نے محسن سے کہا۔ "یہ آدمی مجھے کام کا لگتا ہے اور اپنے جیسا لگتا ہے۔"

"میں ابھی کوئی رائے نہیں دوں گا۔" محسن بولا۔

"چکری کے چکر نے سب کا اعتبار ختم کر دیا ہے۔" میں نے کہا۔

"سانپ کا کاٹا رسّی سے ٹھیک ڈرتا ہے اور اس تجربے کے بعد میں کسی پر بھی اعتبار کرنے میں عجلت نہیں کر سکتا۔ آدمی کو دیکھیں گے، پرکھیں گے اور اس کے بعد دوست کہیں گے۔" محسن نے کہا۔

"اب اس ٹریلر کو کیا لاوارث چھوڑ جائیں۔" میں نے کہا۔ "یہ ہے تو بڑے خطرے کی بات، کوئی راہ چلتے جیب میں ڈال کر لے گیا تو؟"

جواب دینے کے بجائے میں نے سڑک کے دوسرے کنارے پر واقع گیراج کا رُخ کیا۔ وہاں ایک گنجے سر والا اپرنٹس فارغ کھڑا تھا مگر ہمیں آتا دیکھ کر وہ ایک گاڑی کے اُٹھے ہوئے بونٹ میں گھس گیا۔ ہم نے بونٹ بجا کے اُسے متوجہ کرنا چاہا تھا مگر بونٹ تو بس اشارے کا منتظر تھا کہ ایک دم گر گیا۔ اپرنٹس نے ایک زوردار ہائے کی اور سر کو رگڑتا ہوا باہر نکلا۔

"واہ جی واہ! آپ نے تو سر پھا... پھا... پھاڑ... دیا تھا۔"

"اور کیا پھاڑتے؟" میں نے کہا۔ "کپڑے تو تمہارے پہلے ہی پھٹے ہوئے ہیں، یہ بتاؤ اس گاڑی کی ٹیوننگ کر لو گے؟"

"اس گاڑی کی؟" وہ انگلی سے اشارہ کر کے بولا۔ "وہ گاڑی ہے؟"

"گاڑی نہیں ہے تو کیا ہے، جھاڑی ہے، داڑھی ہے؟" محسن نے کہا۔

"میرا مطلب تھا کہ گا... گا... گاڑی ہوتی ہے کار... یہ تو جی... ہا... ہا... ہاتھی ہے، استاد کریں گے ابھی آ کے۔" وہ بولا۔

"بس تو اپنے اُستاد سے کہہ دینا کہ صحیح سیٹ کر دیں۔" میں نے کہا۔

میں چل پڑا تھا کہ محسن نے کہا۔ "وہ چاچا... چا... چابی۔"

"چاچا... چابی۔" میں نے کہا۔ "کون چاچا چابی؟"

"چا... چاچا... چابی دے کر جائیں گے تو ٹیوننگ ہو... ہوگی نا جی۔" اپرنٹس نے دانت نکال کے کہا۔ "ورنہ ہم ٹیسٹ کیسے کریں گے۔" میں نے چابی اُس کے ہاتھ پر رکھ دی۔ غالباً وہ اپنے سکلے پن پر سب کے ہی مذاق کا نشانہ بنتا تھا اور بُرا ماننا چھوڑ چکا تھا۔

ہم اپنی سرکاری گاڑی میں واپس ہوئے۔ ابھی تک سب خیریت تھی۔ ہمارے نئے پراجیکٹ کا سب سے اہم اور مشکل مرحلہ طے ہو گیا تھا۔ ہمیں جس قسم کے ٹریلر کی ضرورت تھی وہ ہمارے پاس تھا اور اب اگلا مرحلہ تھا نورتن تلاش کرنے کا۔ دو ہم خود تھے چنانچہ ہمیں سات افراد کی ایک باصلاحیت ٹیم کا انتخاب کرنا تھا لیکن یہ کام آج ہی شروع نہیں کیا جا سکتا تھا۔ سب سے پہلے ہمیں اس کوارٹر سے شفٹ ہونا تھا اور آج ہی رات کو پھر کراچی فون کرنا تھا۔ ہم نے راستے میں رُک کر کھانا بھی لیا۔ دوپہر کے بعد ہم گھر پہنچے تو سراج کی ماں سو رہی تھی۔ غالب نے اُسے خاموش رکھنے کے

لیے پھر سکون آور گولیاں دے دی تھیں، اس حالت میں اُسے لے جانا آسان تھا چنانچہ کھانے سے فارغ ہوتے ہی ہم نے غالب کو گاڑی میں پہنچایا اور پھر سراج کی ماں کو۔ ایک گھنٹے بعد میں کوارٹر کی چابی دینے گیا تو غازی خاں کا پڑوسی موجود تھا۔

"آپ جا رہے ہو جی؟" وہ بولا۔ "غازی خاں کا خط آیا ہے وہ بھی شام تک پہنچے گا۔"

"اچھا۔" میں نے کہا۔ "اب اس سے تو ملاقات نہیں ہو سکتی۔"

"ہاں جی، آپ کی بھی مجبوری ہے، بڑا افسوس ہُوا... "

"بس بھائی، اللہ کی یہی مرضی تھی۔" میں نے ایک سوگوار قسم کی سرد آہ بھر کے کہا۔ "یہ بتاؤ کہ غازی خاں کی بیوی تو ٹھیک ہے؟"

"ہاں جی، میں نے نہیں بتایا آپ کو کہ اس کا آپریشن کامیاب ہو گیا۔" وہ بولا۔ "ابھی پٹی نہیں کھُلی مگر غازی خاں نے لکھا ہے کہ ایک ہفتے بعد وہ دیکھ سکے گی، جیسے پہلے دیکھتی تھی۔"

"تم وہ سامان دیکھ لیتے، جو ہم نے لیا تھا۔"

"لو جی، آپ ہمیں شرمندہ کرتے ہو۔" وہ بولا۔ "میں تو آپ سے کرایہ بھی نہ لیتا مگر کوارٹر کسی اور کا تھا۔"

وہ بھُول گیا کہ پہلے اُس نے مجھ سے کیا کہا تھا۔ اُس نے چند دن قیام کر کے ایک ماہ کا کرایہ ادا کرنے والوں سے ملنے والی رقم جیب میں ڈال لی تھی اور اس کا ارادہ یہ تھا کہ وہ اصل مالک مکان سے یہ ذکر تک نہیں کرے گا کہ کوارٹر کرائے پر اُٹھا تھا۔ اب وہ بڑا امانت دار بن رہا تھا۔ میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور چل پڑا۔ دس منٹ میں ہم اس علاقے سے نکل چکے تھے۔ گلبرگ کے علاقے میں ایک نیا کافی ہاؤس کھُلا تھا جو اس وقت ویران پڑا تھا۔ میں نے اور محسن نے اندر بیٹھ کے کافی پی اور غالب کے لیے گاڑی میں بھجوا دی۔ جُولی نے صرف چائے پی۔

"مجھے تو یہ آدمی شیر علی بھی مشکوک لگتا ہے۔" محسن بولا۔

"اُسے ہم مشکوک لگے ہوں گے۔" میں نے کہا۔

"بالکل لگے ہوں گے اور بہت جلد ہمیں اُس کو مطمئن کرنا ہوگا۔" محسن نے کہا۔ "یہ تو اچھا ہُوا کہ اُس نے ہمیں پٹھانوں کے لہجے میں اُردو بولتے سُنا ہی نہیں تھا مگر ہم نے غلطی سے بھی انگریزی بولنی شروع کر دی تو وہ چونکے گا۔ فرانسیسی تو خواب میں بھی مت بولنا۔"

"فی الحال میں اُردو یا پنجابی پر اکتفا کروں گا۔" میں نے کہا۔

"کیا یہ بات عجیب نہیں کہ اُس نے ابھی تک ہم سے ہمارے نام بھی نہیں پوچھے۔" محسن بولا۔ "اگر وہ پوچھتا تو ہم کیا بتاتے؟"

"اب وہ پوچھے گا تو کیا بتائیں گے، وہی جو رجسٹریشن کے کاغذات میں ہیں۔" میں نے کہا۔ "میں عجیب خان ہوں۔"

"اوں ہوں، میں عجیب خان ولد پشاور خان، ساکن ڈیگری شہر ہوں۔" محسن بولا۔ "تو بھُول گیا۔"

"آئندہ یاد رکھوں گا مگر یار، یہ کسی کو کیا معلوم کہ ہم نے گاڑیوں کی رجسٹریشن کس نام سے کرائی ہے۔ صرف ماشکو کمپنی کے کاغذات میں عجیب خان کا نام ہے، اسے بھی نورتن سرکس کمپنی کے نام کرا دیں گے۔ ٹریلر بھی نورتن سرکس کی ملکیت ہوگا تو پھر یہ نام نہیں چلیں گے۔ ہمارے نام ماڈرن قسم کے ہونے چاہئیں جیسے کہ سرکس یا تھیٹر کمپنی کے مالک رکھتے ہیں یا رکھنا پسند کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"مالک تو غالب ہوگا۔" محسن بولا۔ "ہم صرف جوکر ہیں اور سرکس میں ہمارے نام بھی مسخروں والے ہوں گے مگر اصل نام ہمارے ساتھی ضرور جاننا چاہیں گے۔"

"بٹ برادرز۔" محسن نے کہا۔ "بٹ برادرز سرکس... بی بی سی..."

"خیال تو اچھا ہے اور اچھوتا ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن بٹ برادران کے لیے تین عدد ہم وزن اور ہم قافیہ نام بھی مطلوب ہیں۔"

"مثلاً مسرور بٹ یعنی یہ خاکسار جو وصلِ محبوب سے شاد کام ہوا اس لیے مسرور ہے۔" محسن بولا۔ "مشہور بٹ ہو سکتا ہے مرزا غالب کیونکہ اس کا نام خاصی شہرت رکھتا ہے اور آپ ہوئے مغرور بٹ اور اگر یہ پسند نہیں تو زیادہ بھاری بھرکم نام ہیں استعمار بٹ، استغفار بٹ اور استفسار بٹ۔ ورنہ ایکس بٹ وائی بٹ اور زیڈ بٹ..."

باہر سے کسی نے مائکرو بس کا ہارن بجانا شروع کیا۔ غالباً جولی نے غالب کے کہنے پر ہمیں یاد دلایا تھا کہ وہ انتظار کر رہے ہیں۔ میں نے ویٹر کو بل ادا کیا اور اسے کہا کہ وہ گاڑی میں سے بھی برتن اٹھا لائے۔

"بہت جلد آ گئے آپ۔" غالب نے طنز سے کہا۔

"ہم... جی آپ نے بالکل درست فرمایا۔" میں نے ڈھیٹ بن کر کہا۔ "ہم واقعی کچھ جلدی آ گئے، میرا مطلب ہے اس دُنیا میں۔ ہر جینئس کے بارے میں یہی کہا جاتا ہے کہ وہ قبل از وقت پیدا ہوا۔ مثلاً محمد تغلق۔"

"ہم بھی اکیسویں صدی کے لوگ بیسویں صدی میں پیدا ہو گئے تو گویا جلدی ہی آ گئے۔" محسن نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

"پھر آپ لوگ جلدی ہی رخصت کیوں نہیں ہو جاتے اس دُنیا سے؟" غالب نے بھنا کے کہا۔ "شام ہو گئی ہے۔"

"صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے۔ شام ہوتی ہے صبح ہوتی ہے یہ کوئی پریشانی کی بات نہیں۔"

"میں چاہتا تھا کہ اپنی اس ٹانگ کا آزادانہ استعمال کر سکوں جس پر پلاسٹر خواہ مخواہ چڑھا ہوا ہے۔" غالب نے کہا۔

"آپ غالباً بھول گئے ہیں کہ یہ ٹانگ ٹوٹ گئی تھی۔" میں نے کہا۔ "اور صحیح فیصلہ آپ کو نہیں کسی ڈاکٹر کو کرنا ہے۔"

"میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں، مجھے کسی آرتھوپیڈک سرجن کے پاس لے چلو۔" غالب نے کہا۔ "جو پلاسٹر کاٹ کے دیکھے۔"

"او کے، مگر پہلے خواتین کو گھر چھوڑ دیں۔ ہمارا اپنا گھر چلتا پھرتا گھر ہے۔" میں نے کہا۔ "اور اس کے بعد..."

"اس کے بعد کیا؟" محسن نے میرے لہجے پر غور کرتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

"میں سوچ رہا ہوں کہ زیب النساء کی عیادت کے لیے جاؤں۔" میں نے کہا۔ "اسپتال جا کے دیکھوں۔"

"تو پاگل ہو گیا ہے کیا؟" محسن بولا۔

"یس سر، میں پاگل تھا، پاگل ہوں اور رہوں گا۔" میں نے کہا۔ "میں خود کو عقلمند سمجھنے والوں میں شامل نہیں کر سکتا۔"

"تجھے معلوم ہے، وہاں وہ سب آتے ہوں گے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "ممکن ہے اس کا بھائی آتا ہو۔ مگر وہ بھی صرف ملاقات کے لیے مقررہ وقت پر آتا ہوگا۔ سراج کو اسے فرصت کہاں اور ممکن ہے ضرورت بھی نہ ہو۔"

"پھر تجھے کیا ضرورت ہے یار؟" غالب نے کہا۔

"نہ جانے کیوں میرے دل پر ایک بوجھ سا ہے۔" میں نے کہا۔ "بے شک اس کے ساتھ جو زیادتی ہوئی اس کی ذمے دار وہ خود تھی اگر وہ ہمارے ساتھ رہتی تو کچھ نہ ہوتا۔ مگر کیا یہ درست نہیں ہے کہ ابتدا ہم نے کی۔ ہم اسے ساتھ نہ لاتے تو..."

"تو وہاں پہنچے گا کیسے؟" محسن نے میری بات کاٹ کے کہا۔

"جہاں چاہ ہے، وہاں راہ ہے۔" میں نے کہا۔

"چاہ..." غالب نے چلّا کے کہا۔ "اُف، یہ میں کیا سُن رہا ہوں۔ بے وفا عاشق عرف بالم ہرجائی۔ چاہ کو تو نے ایسے بدل لیا جیسے لیڈر سیاسی جماعت بدلتے ہیں۔ آہ رابعہ، اب تیرا کیا ہوگا۔"

"تم کیوں چاہتے ہو کہ پہلی ٹانگ کے ٹھیک ہونے سے پہلے میں تمہاری دوسری ٹانگ توڑ دوں۔" میں نے کہا۔ میں نے محاورہ استعمال کیا تھا۔

"اچھا اچھا۔ محاورہ استعمال کیا تھا تو بتا دیتے۔" غالب نے کہا۔ "میں ذرا اَن پڑھ آدمی ہوں۔"

"دل تو میرا بھی چاہتا ہے کہ اس سے پھر ملوں۔" محسن بولا۔ "اور پوچھوں کہ اب کیا حال ہے اور کیا خیال ہے۔"

"کیا اس کے خیالات بدل گئے ہوں گے؟" غالب نے کہا مگر اسے جواب دینے سے پہلے میں نے گاڑی روک دی۔ جولی کو اور سراج کی ماں کو ہم نے ٹریلر کے اندر پہنچا دیا۔ شیر علی لوٹ آیا تھا۔ ہم نے اسے شاندار ہوٹل بھیجا جہاں سے وہ ایک روپیہ فی بستر کے ریٹ پر چار بستر اور چار پائیاں اٹھا لایا۔

"چار پائی کی ضرورت نہیں تھی۔" میں نے کہا۔

"میں نے کہا تھا کہ صرف بستر ہے دو، چار پائی کے آٹھ آنے کاٹ لو مگر وہ کہتے لگا، یہ بھی بستر ایک ساتھ ہیں۔ لو یا نہ لو، روپیہ ہی ہوگا۔ پھر میں کیوں چھوڑتا۔" شیر علی نے کہا۔

"چلو اچھا ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "ہم باہر سوئیں گے مگر ابھی ہم ذرا کام سے جا رہے ہیں، تم عورتوں کا خیال رکھنا۔"

غالب کو ہم نے ایک پرائیویٹ اسپتال میں چھوڑ دیا۔ وہاں کا آرتھوپیڈک سرجن بہت خوش مزاج بوڑھا تھا۔ پہلے تو وہ مرزا غالب کے نام سے محظوظ ہوا۔

"واہ میاں، مرزا غالب اس بیسویں صدی میں۔" وہ بولا۔ "دل تو خیر شاعروں کا وہ ہوتا ہے، کیا کہتے ہیں اسے آبگینہ مگر ٹانگ تو شاعر کی بھی ٹانگ ہوتی ہے۔ یہ ٹانگ کہاں اڑائی کہ ٹوٹ گئی، پرائے معاملے میں؟" اپنی بات پر وہ خود ہی ہنسا۔ "خیر ابھی کاٹ دیتے ہیں میرا مطلب ہے، پلستر کاٹ دیتے ہیں۔ رہا اندر کا حال تو وہ خدا جانتا ہے مگر ہم بھی جان لیں گے ایکسرے دیکھ کر۔ جیسے خط کا مضمون بھانپ لیتے ہیں لفافہ دیکھ کر ایسے ہی تمہاری صورت دیکھ کر میں کہہ سکتا ہوں کہ حال اچھا ہے۔"

"اچھے عیسیٰ ہو مریضوں کا خیال اچھا ہے۔" غالب نے کہا۔ "ہم مرے جاتے ہیں تم کہتے ہو حال اچھا ہے۔"

"مرے جاتے ہو، نا میاں۔ شاعر اب مری جاتے ہیں۔ وہاں ہوتا ہے جشن مری۔" وہ ہنسا۔ "ایک بار میں بھی گیا تھا۔ بڑا بھاری شاعرہ تھا۔ مجھ پر بہت بھاری پڑا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ کون کیا کہہ گیا۔ شاعری تو خیر سمجھ لیتا ہوں میں ورنہ وہاں جاتا ہی کیوں مگر وہ لاؤڈ اسپیکر سسٹم بڑا خراب تھا۔ خیر..... تو ہاں تم دو ٹانگوں پہ جانا چاہتے ہو؟ آئے کیسے تھے، ایک ٹانگے پر..." وہ صرف باتیں نہیں کر رہا تھا کام بھی کر رہا تھا۔ اس نے ایک مریض کو رخصت کیا۔ "جاؤ میاں عیش کرو، یہ ٹانگ یہاں سے پھر نہیں ٹوٹے گی کسی اور جگہ سے ٹوٹ جائے تو میرا ذمہ نہیں۔ پھر آ جانا۔"

بالآخر غالب کے بارے میں اس نے کہا کہ یہ سارا کام چٹکی بجاتے میں نہیں ہو سکتا چنانچہ ہم لوگ تشریف لے جائیں اور پھر ایک گھنٹے بعد لوٹ کر آئیں اور محسن بڑے اچھے موڈ میں باہر نکلے۔

"ایسا ڈاکٹر آدھا مرض باتوں سے دور کر دیتا ہے۔" میں نے کہا۔

"اور باتوں سے آدھا پاگل کر دیتا ہے۔" محسن بولا۔ "مجھے تو اس کے سرجن ہونے پر بھی شک ہے۔ اسے سرکس میں جوکر کیوں نہ رکھ لیں۔ دونوں کام کرے گا۔ ہم ہڈیاں توڑتے رہتے ہیں اور تڑواتے رہتے ہیں۔ نازو کی واپسی کے بعد غالب کو اس کی زیادہ ضرورت رہے گی۔"

"اگر آج رات کراچی کے ٹیلی فون نمبر پر رابطہ ہو گیا اور ریچ رابعہ سے بات ہو گئی تو نازو کی خیر خبر بھی ملے گی۔" میں نے کہا۔

"کیا تو زیب النساء سے عیادت کے لیے جانے کی بات سنجیدگی سے کر رہا تھا؟" محسن بولا۔

"ہاں مگر یہ کیسے معلوم ہوگا کہ وہ کس اسپتال میں ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ نواب خسرو جمشید کی بہن ہیں۔ کسی سرکاری یا نیم سرکاری اسپتال میں نہیں ہوں گی۔" محسن بولا۔ "لاہور کا سب سے بڑا اور مہنگا اسپتال کون سا ہے۔ اسے پہلے وہیں دیکھنا چاہیے۔"

"اور وہاں اندر کیسے جائیں گے؟" میں نے کہا۔ "جیسے پہلے کئی بار دوسرے اسپتالوں میں جاتے رہے ہیں؟"

"ہاں اب تو ہر ممنوعہ جگہ تک پہنچنے کا خاصا تجربہ حاصل کر چکے ہیں، وہ کس دن کام آئے گا؟" محسن نے کہا۔

محسن کا خیال کچھ دیر بعد درست ثابت ہوا لیکن ہم سراج اور جمشید کے مقابل ہونے سے بال بال بچ گئے۔ محسن نے ابھی مائکرو بس کو اسپتال کے احاطے میں موڑا ہی تھا کہ ساتھ والے دوسرے گیٹ سے ایک کار گزر کے باہر گئی۔ میں نے ان دونوں کی ایک جھلک دیکھی۔ کار کو سراج ڈرائیو کر رہا تھا۔ گیٹ سے سڑک پر آتے ہوئے اس کی تمام توجہ سامنے تھی ورنہ مائکرو بس کے ونڈ اسکرین سے ہم دونوں کی صورت اسے صاف نظر آتی۔ خسرو جمشید دوسری طرف تھا اور وہ بھی سیدھا بیٹھا ہوا تھا۔

"چلو یہ بھی خطرہ ٹل گیا۔" محسن نے کہا اور گاڑی کو ایک طرف پارک کر دیا جہاں دوسری بہت سی کاریں صف بستہ تھیں۔ ملاقاتی اب اندر سے باہر آ رہے تھے اور ایسا لگتا تھا کہ ملاقات کا وقت ختم ہو چکا ہے یا ختم ہونے ہی والا ہے۔

زیب النسا کا کمرا اسپیشل پرائیویٹ وارڈ میں گراؤنڈ فلور پر ہی تھا۔ ایک نرس نے ہمیں ریسپشن پر ہی روک لیا۔

"دیکھیے سات بج گئے ہیں۔" وہ بولی۔ "ملاقات کا وقت پانچ سے سات بجے تک ہے۔ اب آپ کل آئیں۔"

"بس ہم دو منٹ بھی نہیں لیں گے۔" میں نے کہا۔

"سب یہی کہتے ہیں اور پھر اندر جا کے بیٹھ جاتے ہیں۔" وہ بولی۔ "بعد میں ڈاکٹر صاحب ہم پر خفا ہوتے ہیں۔"

"آپ فکر نہ کریں۔ سات بج کر پانچ منٹ پر ہم باہر ہوں گے۔ ہم پشاور سے آئے ہیں اور ہمیں رات کو واپس بھی جانا ہے۔" میں نے کہا۔ "کل ہمیں کوئی وقت نہیں ملے گا۔" میں نے سو کا نوٹ اُس کی طرف بڑھایا۔

"اچھا جائیے۔" نرس نے کاؤنٹر پر ہی نوٹ کو بڑی صفائی سے اپنے ہاتھ میں منتقل کیا اور ہاتھ کو نیچے غائب کر دیا۔

اسپیشل پرائیویٹ وارڈ میں صرف آٹھ کمرے تھے، چار ریڈ کے دائیں جانب اور چار بائیں جانب۔ کمرہ نمبر تین دائیں ہاتھ پر تیسرا کمرا تھا۔ ہر بند دروازے کے پیچھے سے اب بھی باتیں کرنے والوں کی آوازیں یہ ظاہر کرتی تھیں کہ وقتِ ملاقات کے معاملے میں بہت زیادہ سختی نہیں برتی جاتی اور دس پندرہ منٹ کی تاخیر ان کے لیے یقیناً خصوصی رعایت کا درجہ رکھتی ہے جو اسپیشل پرائیویٹ وارڈ کے مریضوں سے ملنے آتے ہیں۔ تاہم تین نمبر کمرے میں خاموشی تھی۔ میں نے دروازے پر رک کر چند سیکنڈ انتظار کیا۔ . . . . میں ایک نمبر کمرے سے نکلنے والی فیملی کے چار افراد . . . جا رہے تھے لیکن ان کے چہرے دوسری طرف تھے۔ میں نے تھوڑا سا جھک کے ڈور لاک کے سوراخ سے اندر جھانکا۔ زیب النسا کا بیڈ میری نظر کے فوکس میں آ گیا۔ وہ دروازے کے مقابل کھڑکی کے ساتھ لگے ہوئے بیڈ پر نیم دراز تھی۔ کوئی شخص جو بیڈ کے قریب کھڑا ہوا تھا ایک دم پلٹ کے دروازے کی طرف آیا۔ میں نے محسن کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا اور مُنہ دوسری طرف کر کے چلنے لگا۔ ابھی ہم دو قدم بھی نہیں گئے تھے کہ ہم نے دروازہ کھلنے اور پھر بند ہونے کی آواز سنی۔ چند سیکنڈ کے وقفے سے میں نے سر گھما کے دیکھا۔ وہ شخص واپس جا رہا تھا اور ہماری طرف اُس کی پیٹھ تھی۔ مجھے اس کی چال سے شک ہوا کہ اسے میں نے پہلے بھی دیکھا ہے مگر پھر وہ کوریڈور میں مڑ کے غائب ہو گیا۔ میں نے اس کے پیچھے جانے کا سوچا اور پھر بلاوجہ خطرے سے دوچار ہونے کو خلافِ مصلحت سمجھتے ہوئے اپنا ارادہ بدل دیا۔

واپس آ کے میں نے بہت آہستہ سے د . . . ے کا ہینڈل گھمایا۔ دروازہ کُھل گیا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ ہم جیسے دو اجنبی افراد کو دیکھتے ہی وہ خوفزدہ ہو جائے گی تو چلّانے لگے گی۔ میں فیصلہ کر چکا تھا کہ اس کی آواز کو خاموش کرنے کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا۔ لیکن اندر قدم رکھتے ہی میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ محسن بھی میرے پیچھے اندر آ گیا تھا اور دروازے کو پھر بند کر چکا تھا مگر زیب النسا کا بیڈ خالی تھا۔ وہ کمرے میں نہیں تھی حالانکہ ابھی دو منٹ پہلے خود میں نے اسے اسی بیڈ پر دراز دیکھا تھا۔ وہ کھڑکی بھی اندر سے بند تھی جس کے قریب بیڈ لگا ہوا تھا۔

ابھی مجھے محسن پر اپنی حیرت کے اظہار کا موقع بھی نہیں ملا تھا کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ اگر محسن نے دروازے کو اندر سے لاک نہ کیا ہوتا تو دستک دینے والا سیدھا اندر آ جاتا۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات آٹھویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں

جاسوسی ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ
شکاری
آٹھواں حصہ

معاشرے کے اُن ناسُوروں کی رُوداد جو گوشت پوست سے گزر کر انسانی ہڈیوں میں اُتر رہے تھے۔ ایک کفن بردوش نوجوان کی کہانی جس کے روز و شب موت کی بستی میں گزر رہے تھے۔ جلتے دن، سلگتی راتیں، آس و یاس، خوف و ہراس، شیریں خواب، تلخ حقیقتیں۔

"یہ کون ہو سکتا ہے؟" میں نے زیرِ لب کہا مگر میری خاموشی کی زبان کے اشارے سے محسن نے میرا سوال سمجھ لیا۔

اس نے فقط سر ہلایا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ اُس نے جواب میں کہا تھا۔ "میں دیکھتا ہوں۔" اور اب وہ جیب میں سے ریوالور نکال چکا تھا۔ دستک پھر ہوئی تو محسن نے پلٹ کر میری طرف اور پھر باتھ روم کی طرف دیکھا۔

میں نے سر ہلا کے اس پر واضح کیا کہ میں بھی اُدھر ہی جا رہا ہوں۔ باتھ روم کا دروازہ کھُلا ہوا تھا جو عجیب سی بات تھی۔ زیب النساء نے کمرے کا دروازہ اندر سے مقفل نہیں کیا تھا۔ جو آدمی گھر میں اکیلا ہو اور جسے بالکل اندیشہ نہ ہو کہ کوئی سیدھا اندر آ سکتا ہے، وہ بھی باتھ روم میں جاتا ہے تو عادتاً دروازہ بند کر لیتا ہے۔ زیب النساء تو ایک لڑکی تھی مگر یہی ایک بات تھی جو اس کے باتھ روم میں ہونے کا یقین دلاتی تھی۔ وہ بھوت کی بچی یا چھوتی نہیں تھی کہ پل بھر میں غائب ہو جائے۔ شاید وہ باتھ روم میں سے کمرے پر نظر رکھنا چاہتی تھی یا یہ بھی اس کی پُرفریب معصومیت کا کوئی سمجھ میں نہ آنے والا انداز تھا۔

میں باتھ روم میں ایسے داخل ہوا جیسے مجھے بذریعہ توپ فائر کیا گیا ہو۔ مجھے زیب النساء کی دلنواز 'ہائے اللہ' سنائی دینے کا یقین تھا مگر اندر اس کے وجود کی خوشبو تک نہ تھی۔ میں چند سیکنڈ تک احمقوں کی طرح ریوالور تانے کھڑا رہا۔ پھر میں نے دروازہ کھُلنے کی آواز سُنی اور باتھ روم کے دروازے سے جھانک کر دیکھا۔ حسبِ توقع اندر آنے والا سیدھا گزر گیا تھا اور جب اس نے پلٹ کر دیکھا تو محسن دروازہ بند کر چکا تھا۔

"کون ہو تم؟" وہ محسن کے ریوالور پر نظر جما کے بولا۔ "اور یہ سب کیا ڈراما ہے آخر؟" وہ ریوالور سے ذرا بھی مرعوب نہیں ہوا تھا۔

"تم کون ہو؟" محسن نے تھوڑا سا کنفیوژ ہو کے کہا۔

"میں... میں ڈاکٹر ہوں۔" قمیص پتلون میں ملبوس ادھیڑ عمر کے اس سنجیدہ صورت اور صحت مند شخص نے کہا۔ "تم نواب صاحب کے آدمی ہو؟"

"یس سر..." محسن نے اپنی خفت مٹانے کے لیے دانت نکال کے کہا اور ریوالور جیب میں رکھ لیا۔ "معاف کرنا... ہم نئے آدمی ہیں۔"

"نئے ہو یا پُرانے..." ڈاکٹر نے برہم ہو کے کہا۔ "کس کی اجازت سے ٹھہرے ہوئے ہو تم یہاں؟"

"ہم تو نواب صاحب کے حکم کے غلام ہیں۔" محسن نے کہا۔

"مگر میں نے اس... نواب کو بتا دیا تھا کہ یہ اسپتال ہے۔"

ڈاکٹر غصے میں خسرو جمشید کو گالی دیتے دیتے رُک گیا تھا۔ "پہلے دن ہی میں نے اُسے انکار کردیا تھا کہ زیب النسأ اسپتال میں بالکل محفوظ ہے اور اس کی حفاظت ہماری ذمے داری ہے... اگر وہ مطمئن نہیں ہوسکتا تو اپنی بہن کو کہیں اور لے جائے۔ شہر میں بہت اسپتال ہیں۔ وی آئی پی وارڈ کی طرف ہم کسی غیر متعلقہ شخص کو نہیں آنے دیتے۔ مگر یہاں وی آئی پی وارڈ نہیں ہے جہاں ہماری سیکیورٹی کا خصوصی انتظام ہو۔ کوئی ذاتی باڈی گارڈ متعین کرسکے یا سرکاری حفاظتی عملہ رکھ سکے۔" آہستہ آہستہ اس کی آواز تیز ہوتی گئی اور اس کا چہرہ سُرخ ہوگیا۔ "ناؤ گیٹ آؤٹ... اس سے پہلے کہ میں تم کو پولیس کے حوالے کروں... جا کے اپنے اس نواب آف نواسٹیٹ سے کہدینا کہ دس واز بائی ٹولی دی لاسٹ چانس فار ہم۔"

محسن مجرموں کی طرح سر جھکائے دروازے سے باہر نکل گیا۔ اس نے میرے نقطۂ نظر سے بہت سمجھ بوجھ کا ثبوت دیا۔ ان حالات میں ضروری تھا کہ ہم میں سے ایک بہ خیر و عافیت باہر نکل جائے۔ دوسرا میں تھا اور اپنی باری آنے پر صورتِ حال سے نمٹ سکتا تھا۔ بے سبب ہنگامہ آرائی ہمارا مقصد بھی نہیں تھا۔

"مس زیب النسأ..." ڈاکٹر نے دروازہ بند کرنے کے بعد باتھ روم کی طرف مُنہ کر کے آواز دی۔ "وِل یو پلیز کم آؤٹ ناؤ۔" جواب نہ پاکے وہ چند قدم آگے آیا۔ "مس زیبا۔" اُس نے پھر کہا۔ زیب النسأ کی بجائے میں برآمد ہوا تو وہ بے اختیار ایک قدم پیچھے ہٹا۔ اس نے مجھ پر ایک قہر و غضب کی نگاہ ڈالی۔ "ہو دی ہیل آر یو؟ تم بھی اسی کے ساتھی ہو؟ اندر کیا کر رہے تھے...؟ زیب النسأ... ؟"

"ڈاکٹر... وہ اندر نہیں ہے۔" میں نے اطمینان سے کہا۔

"کیا؟ اندر نہیں ہے!" ڈاکٹر بے یقینی کے ساتھ آگے بڑھا۔ اس نے کھلے دروازے سے باتھ روم میں ایک نظر ڈالی اور پھر مشتعل ہو کے پلٹا۔

"ویئر از شی؟" (وہ کہاں ہے)

"ویٹ از واٹ آئی ایم ہیئر ٹو آسک یو اباؤٹ شی۔" میں نے اسی اطمینان کے ساتھ کہا۔ (میں بھی یہی معلوم کرنا چاہتا ہوں)

ڈاکٹر چند سیکنڈ ساکت و صامت کھڑا رہا اور مجھے گھورتا رہا۔ وہ نہ کچھ سمجھا تھا اور نہ کوئی فیصلہ کرسکا تھا کہ ان حالات میں اسے کیا کرنا چاہیے۔

"آپ کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔" میں نے کہا۔ "جب ہم یہاں آئے تھے تب بھی وہ کمرے میں نہیں تھی۔"

"ان دیٹ کیس۔" ڈاکٹر دروازے کی طرف بڑھا۔ "مجھے فوراً پولیس کو خبر کردینی چاہیے... اور اس کے بھائی کو بھی۔ آئی تھنک آئی ایم ان ٹربل۔"

"ایسی تو کوئی بات نہیں۔" میں نے اُس کے سامنے آ کے کہا۔ "ابھی تک۔"

"تم مجھے ادائے فرض سے روک رہے ہو۔" ڈاکٹر نے اپنی متانت برقرار رکھی اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا رہا۔

"نو سر... میں آپ کو بھی ٹربل سے بچانا چاہتا ہوں اور خود بھی کسی مشکل میں نہیں پڑنا چاہتا۔" میں نے خوش اخلاقی سے مگر سپاٹ لہجے میں کہا۔ "اور پولیس آلویز مینس ٹربل... پولیس کا خیال چھوڑ دیجیے۔"

"کیا مطلب... تم جانتے ہو کہ وہ کہاں ہے؟" ڈاکٹر نے کہا۔

"نہیں... لیکن جاننا ضرور چاہتا ہوں..." میں نے کہا۔ "نہ میں نے اسے اغوا کیا ہے اور نہ اغوا ہوتے دیکھا ہے۔ از اے میٹر آف فیکٹ... میرے اندر آنے سے چند منٹ پہلے تک وہ کمرے میں موجود تھی۔ میں نے خود دیکھا تھا مگر باہر رہ کے۔ اس ڈور لاک کے سوراخ میں سے... اس وقت دو ایسے آدمی اندر تھے جن کی موجودگی میں ہم اندر نہیں جاسکتے تھے... اور چلے جاتے تو ہمیں شاید وہ سب کرنا پڑتا جو اسپتالوں میں نہیں ہوتا... ہونا بھی نہیں چاہیے۔"

"اوہ مائی گاڈ...!" ڈاکٹر نے سر پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ "مجھے اسی وقت خیال آیا تھا کہ میں انکار کردوں... جب اس باسٹرڈ نواب نے کہا تھا کہ یہاں میرے محافظ رہیں گے۔ مشکل یہ ہے کہ اس پیشے میں ہم انکار کرنا بھی چاہیں تو نہیں کرسکتے۔" وہ ایک صوفے پر بیٹھ گیا اور اس نے مجھے بھی اشارہ کیا کہ دوسرے صوفے پر بیٹھ جاؤں۔

"تھینک یو۔" میں نے کہا۔

"میں جاننا چاہتا ہوں کہ یہ معاملہ کیا ہے؟" ڈاکٹر نے کہا۔

"زیب النسأ کے کیس کے بارے میں؟"

"اوہ نو... وہ میں جانتا ہوں۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "لیکن وہ کون لوگ تھے؟"

"یہ تو کوئی بھی نہیں جانتا۔ میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ وہ انسان کے بھیس میں درندے تھے..." میں نے کہا۔ "سفاک بھیڑیے تھے۔"

"یہ جذباتی ڈائیلاگ میرے سامنے مت بولو۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "ہمارے لیے یہ ویسا ہی ایک کیس ہے جیسے ہزاروں دوسرے کیس... سیکس فرسٹریشن اور حیوانی جبلت کے بے لگام ہونے کا۔ ہر آدمی کے اندر ایک حیوان ہے مگر فرق صرف اس کنٹرول کا ہے جو ہم اس حیوان پر رکھتے ہیں۔ جیسے گھر کا پالتو کتا... وہ بے ضرر ہوگا اگر مالک کے اشارے پر چلے ورنہ کسی کو بھی کاٹ لے گا۔"

"رائٹ..." میں نے کہا۔ "وہ کتنے کتے تھے؟"

"کم سے کم دو..." ڈاکٹر نے کہا۔ "تم نے کہا کہ اُنھیں کوئی نہیں جانتا... یہ کیسے ہوسکتا ہے؟"

"کیوں نہیں ہوسکتا؟" میں نے کہا۔ "ضروری تو نہیں کہ کسی گھر کا پلا ہوا کتا ہی کاٹے... گلی کوچوں میں بھٹکنے والے ہزاروں آوارہ اور بے نشان کتے بھی تو ہیں۔"

"یو مین... وہ دشمن نہیں تھے؟" ڈاکٹر نے کہا۔

"کس کے دشمن؟" میں نے کہا۔

"اس نواب آف نواسٹیٹ کے... یا اس لڑکی کے؟"

"انھوں نے جو کچھ کیا دشمنی میں یا انتقام لینے کے لیے نہیں کیا تھا۔" میں نے کہا۔

"پھر وہ اتنا فکرمند کیوں تھا... اپنے دشمنوں کے بارے میں۔" ڈاکٹر نے نفی میں سر ہلایا۔ "تم کو نہ سہی... نواب کو یقیناً معلوم ہے کہ وہ کون تھے۔ وہ ان کا نام نہیں لے رہا ہے تو اس کے بھی اسباب ہوں گے۔ وہ اپنی عزت محفوظ رکھنا چاہتا ہے... ہر شریف آدمی کی طرح... یہ بات میں محاورتاً کہہ رہا ہوں ورنہ میرا خیال ہے کہ نواب از ناٹ اے جنٹلمین... بس وہ پولیس کے چکر میں نہیں پڑے گا... خود بدلہ لے گا... اور غالباً اسے ابھی ان دشمنوں سے مزید خطرہ تھا... کہ وہ اس سے زیادہ کچھ کرسکتے ہیں چنانچہ وہ اپنی گارڈز رکھنا چاہتا تھا۔"

"آپ کے اندازے درست ہی ہیں... نواب شریف آدمی نہیں ہے اور اس کے دشمن بھی ہیں۔" میں نے کہا۔ "مگر یہاں گارڈز رکھنے کے اسباب مختلف تھے... میں نہیں بتا سکتا کہ وہ ایسا کیوں کرنا چاہتا تھا۔"

"اوکے۔ تم کچھ مت بتاؤ... یہ بتادو کہ تم یہاں کیا کر رہے تھے اور زیب النسا کہاں ہے؟" ڈاکٹر نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ زیب النسأ فرار ہوگئی ہے۔" میں نے کہا۔

"شٹ اپ... تم نے اُسے اغوا کرلیا ہوگا... یا کسی اور نے... ٹو ہیل ود دس حیکڑ۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "میرا کام تو ویسے بھی ختم ہوگیا تھا۔"

"مطلب یہ کہ وہ ٹھیک تھی... خطرے سے باہر...؟"

"یس... وہ خطرے کے اندر کبھی نہیں تھی... ایک نروس بریک ڈاؤن کا اٹیک تھا۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "جسمانی طور پہ... وہ بہرحال ایک جوان عورت تھی۔ مگر تم نے کیا اسے فرار ہوتے دیکھا تھا؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "اور کیا ہوسکتا تھا اتنے کم وقت میں جب ہم اندر آئے تو میرا بھی خیال یہی تھا کہ وہ باتھ روم میں [illegible] کھڑکی کا راستہ دیکھا... کیا یہ ناممکن لگتا ہے آپ کو کہ کوئی بھی مریض بھاگ جائے۔"

"پاگل ہو تو اور بات ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "لیکن وہ پاگل نہیں تھی۔ اور ویسے بھی وی آئی پی وارڈ جیلخانہ نہیں ہوتا... آج تک جنرل وارڈ سے بھی کوئی مریض فرار نہیں ہوا... اور کیوں فرار ہوگا۔"

"واجبات ادا نہ کرنے کے لیے۔"

"وہ یہاں نہیں آتے۔" ڈاکٹر نے حقارت سے کہا۔ "ناؤ لیٹ می گو... اور یہ مت سمجھنا کہ میں ڈر گیا تھا... تمھارے اس توپ خانے سے..."

"میں آپ کو خالی ہاتھوں سے بھی روک سکتا تھا۔" میں نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"معلوم ہے... کیسے معلوم ہے!" میں نے حیرانی سے کہا۔

"میں بہت کچھ جانتا ہوں تمھارے متعلق... بہت کچھ پڑھتا رہتا ہوں کیونکہ میں اخبار کا کیڑا ہوں۔" وہ بولا۔ "تم سکندر بخت ہو نا۔ اور وہ دوسرا ایڈیٹ... وہ تمھارا پارٹنر تھا... محسن... تم دونوں کا کیا تعلق ہے اس لڑکی کے معاملے سے؟"

"کوئی تعلق نہیں۔" میں نے اس وقت کہا جب مجھے یقین آگیا کہ وہ نیک دل ڈاکٹر ہمارے عزائم کی راہ میں حائل نہیں ہوگا۔ وہ ہمارے ساتھ اگر نہیں تھا تو اس کی ہمدردیاں ہمارے ساتھ تھیں مگر وہ ہمارے دشمنوں کے ساتھ بالکل نہیں تھا۔

"تم کو یہاں سے فوراً نکل جانا چاہیے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "اس سے پہلے کہ کوئی تمھیں اور مجھے ایک ساتھ دیکھے... مجھے بہرحال یہیں رہنا ہے۔"

"تھینک یو..." میں نے ڈاکٹر سے ہاتھ ملا کے کہا۔ "یہ بہت اچھا ہوا کہ ہم نے ایک دوسرے کا راستہ تو روکا، مگر دوستوں کی طرح... مجھے امید ہے کہ اس ملاقات کی خبر ہمارے دشمنوں کو نہیں ہوگی۔"

"اگر دشمنوں سے تمھاری مراد ہے... دیٹ نواب آف نواسٹیٹ۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "تو مطمئن رہو... مجھے کمرے میں کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ زیب النسا کے بارے میں مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں گئی... جو معلوم کرسکتا ہے، کرے۔ میں اسے روکوں گا نہیں۔ مگر پولیس اس اسپتال کے اندر اپنے اختیارات کا لامحدود استعمال نہیں کرسکتی... گڈ لک فار یو۔"

جب ڈاکٹر [illegible] نکل گیا تو میں نے دوڑ لگائی اور کھلی کھڑکی [illegible] بھی نکلی ہوگی۔ یہ الگ بات ہے کہ مجھے اس کی توقع نہیں تھی، چنانچہ میں نے یہی سمجھا تھا کہ وہ باتھ روم میں ہوگی۔ کھڑکی سے

نکل کے وہ کہاں گئی ہوگی۔ یہ خیال مجھے بھی کھڑکی سے گزر جانے کے بعد آیا میرے سامنے ایک چھوٹا سا باغ تھا۔ اس کے بعد اسپتال کی دیوار تھی لیکن بائیں جانب اسپتال کی لانڈری تھی اور پھر کچھ سرونٹ کوارٹرز تھے جن میں نچلے درجے کے ملازم ہی رہ سکتے تھے۔ زیب النسأ کا اسپتال کی دیوار پر چڑھ کے سڑک کی طرف کود جانا محال تھا۔ وہ انہی کوارٹروں کی طرف جا سکتی تھی۔

وقت ملتا تو میں بھی اُدھر ہی جاتا اور شاید اُسے تلاش بھی کرتا مگر مجھے معلوم تھا کہ ڈاکٹر نے خسرو جمشید کو اور پولیس کو ضرور اطلاع کر دی ہوگی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ بہت جلد سراج اپنی تمام پولیس فورس کے ساتھ اسپتال پر چڑھائی کرنے والا تھا۔ ابھی تک اس ڈاکٹر کو یہ علم نہیں تھا کہ نواب آف نو اسٹیٹ کی بہن جس کی منگیتر ہے وہ ایس ایس پی ہے۔ ڈاکٹر تو اپنی پوزیشن محفوظ رکھنے میں کامیاب رہے گا، مگر دوسرے عملے کی یقیناً شامت آجائے گی کہ انھی کی غفلت نے کسی کو اندر داخل ہونے کا اور زیب النسأ کو اغوا کر کے لے جانے کا موقع فراہم کیا۔ یہ خسرو جمشید بھی نہیں مانے گا اور سراج بھی کہ وہ بہ قائمی ہوش و حواس اور اپنی مرضی سے فرار ہوگئی۔ وہ اسپتال کا چپہ چپہ چھان ماریں گے اور سرونٹ کوارٹروں کو کھنگال ڈالیں گے۔ زیب النسأ اگر اسپتال سے نہیں نکل سکی ہوگی تو برآمد ہو جائے گی۔

لیکن نہ جانے کیوں مجھے ایک اطمینان حاصل تھا کہ زیب النسأ نکل چکی ہوگی۔ وہ اتنی ہوشیار لڑکی تھی کہ اس نے پورا پلان پہلے ہی بنا لیا ہوگا۔ وہ جب تک بے بس تھی یا بے بسی کا ڈراما کر رہی تھی تب تک اس کو حالات کا جائزہ لینے اور اپنی پوزیشن کو سمجھنے کی کافی مہلت ملی تھی۔ میں اس لڑکی کی معصوم عیاری سے مار کھا چکا تھا چنانچہ میں مطمئن تھا کہ زندگی میں ایکبار اعتماد کے فریب کا شکار ہونے والی زیب النسأ دوسری بار زک نہیں اُٹھائے گی۔

میں باہر آیا تو محسن خاں کا کہیں پتا نہ تھا۔ میں دس پندرہ منٹ بعد باہر آیا تھا اور سیدھے راستے سے نہیں آیا تھا۔ محسن پر واجب تھا کہ مجھے چشم براہ ملتا۔ میرا یہاں زیادہ دیر رُک کر اس کی راہ دیکھنا پولیس کی راہ دیکھنے کے مترادف تھا۔ چند منٹ اِدھر اُدھر نظر دوڑانے کے بعد میں نے واپسی کا وہی راستہ پکڑا جس سے ہم دونوں اسپتال پہنچے تھے۔ ابھی میں سو قدم ہی گیا تھا کہ محسن خاں گاڑی دوڑاتے ہوئے پیچھے سے آئے۔

"ہیلو... میں آپ کو لفٹ دے سکتا ہوں۔" اس نے قریب آ کے دروازہ کھولا۔ "بے شک پیدل چلنا صحت کے لیے اچھا رہتا ہے مگر آپ یہ بھی تو جانتے ہوں گے کہ پیدل چلنے والے کی عزت کوئی نہیں۔ عزت اور صحت میں سے کیا بہتر ہے؟"

"دولت۔" میں نے کہا۔ "کیونکہ اس سے باقی دونوں چیزیں خود بخود حاصل ہو جاتی ہیں۔" اور دروازہ بند کر لیا۔ "تو نے کہیں اس آفت کی پر کالہ عرف شیطان کی خالہ کو دیکھا؟"

"زیب النسأ کو؟" محسن نے گاڑی چلاتے ہوئے کہا۔ "وہ خالہ ہے تیری!"

"مذاق کی بات نہیں یار۔" میں نے کہا۔ "وہ نکل گئی۔"

"کیا... وہ باتھ روم میں نہیں تھی؟" محسن بولا۔ "میں تو سمجھا تھا کہ تو اُسے قابو کر چکا..."

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ فرار ہوگئی۔ اور بعد میں میری اس ڈاکٹر سے جو گفتگو ہوئی... وہ بے حد حوصلہ افزا رہی... وہ دوست ثابت ہوا۔"

"تو نے ڈرا دیا تھا مجھے۔" محسن بولا۔ "میں سمجھا تو اس کو ملبا لٹ آیا۔"

"نہیں یار... ضرورت پیش نہیں آئی۔ اُس نے ہم دونوں کو پہچان لیا تھا اور میں نے اُسے یقین دلا دیا کہ ہم نہ زیب النسأ کو اغوا کرنے والوں میں سے ہیں اور نہ اس سے کوئی غلط تعلق رکھتے ہیں۔ تو اس نے کہا کہ بھاگ جاؤ۔ اب تک وہ پولیس کو اور نواب صاحب کو اطلاع دے چکا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"سوال یہ ہے دوست کہ زیب النسأ کیوں فرار ہوئی... کیا وہ ہوش میں نہیں تھی؟"

"وہ ہوش مندوں کے ہوش اُڑانے کے قابل تھی۔ ذہنی طور پر بھی اور جسمانی طور پر بھی۔" میں نے کہا۔

"پھر وہ کیوں فرار ہوئی؟"

"میں یہ نہیں سمجھتا کہ وہ اپنے بھائی یا منگیتر سے متعلق ہماری فراہم کردہ معلومات کے باعث کسی نفرت کے ردِ عمل کا شکار ہوئی۔" میں نے کہا۔ "وہ کوئی عام لڑکی نہیں ہے محسن... اس کی قوتِ مشاہدہ غیر معمولی ہے۔ ہر مصوّر کو خدا وہ نظر دیتا ہے جو انسانی آنکھ، کیمرے اور ایکسرے مشین سے بڑھ کر چیزوں کی حقیقت کو دیکھتی ہے۔ ظاہر کا پردہ ہٹا کے باطن میں جھانکتی ہے اور جذبات کو پڑھ لیتی ہے۔ اپنے بھائی کے بارے میں وہ بہت کچھ پہلے سے جانتی تھی۔ اس کی نجی زندگی کا کوئی پہلو اس کی نظر سے اوجھل نہیں ہوگا۔ ہماری معلومات نے اس کے علم میں صرف اتنا اضافہ کیا کہ اسے بھائی کے کاروبار کا بھی پتا چل گیا۔ ایسے بدکردار، عیاش اور مکار بھائی کی بہن نے اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا مگر نظر انداز کیا اور خاموشی سے اپنے کمرے میں تصویریں بناتی رہی۔ جب اس کے بھائی نے رشتہ طے کیا ہوگا تو کیا زیب النسأ کو معلوم نہ ہوگا کہ جسے اس کی تمام زندگی کا مالک بنایا جا رہا ہے وہ کون ہے اور کس قماش کا آدمی ہو سکتا ہے۔ چلو مانا کہ وہ سراج

سے ناواقف تھی مگر وہ اتنا تو سمجھتی ہوگی کہ اس کے بھائی کی صحبت کس قسم کے لوگوں میں ہے۔ اُسے یہ ضرور بتایا گیا ہوگا کہ وہ ایک ایس پی ہے۔ کیا زیب النسأ نے مان لیا ہوگا کہ وہ ایس پی کوئی فرشتہ سیرت شخص ہوگا۔ کیا زیب النسأ جیسی لڑکی کا آئیڈیل ایک پولیس مین ہو سکتا ہے؟ نہیں... اس کے ذہن میں کسی اعلیٰ تعلیم یافتہ... روشن خیال... باضمیر شخص کے ساتھ زندگی گزارنے کا تصوّر ہوگا۔ وہ شخص شاعر یا افسانہ نگار... مصوّر یا موسیقار ہو یا نہ ہو... وہ کوئی پروفیسر یا وکیل بھی ہو سکتا تھا مگر پولیس کے محکمے کا افسر نہیں ہو سکتا تھا۔"

"آپ کیا ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں؟" محسن بولا۔

"یہی کہ زیب النسأ وقت گزار رہی تھی۔" میں نے کہا۔ "اُس نے اپنی اور سراج کی نسبت پر اختلاف اور احتجاج کو بے سود سمجھا ہوگا کیونکہ وہ ایک کمزور اور تنہا عورت تھی۔ اندر سے جذبات کا آتش فشاں مگر اوپر سے بالکل سرد... اس کے ذہن میں پہلے سے طے تھا کہ اُسے کیا کرنا ہوگا اور اگر وقت ناگزیر حد تک قریب آجاتا تو وہ ایسا ہی کرتی... جیسا کہ اس نے آج کیا... وہ گھر سے بھی نکل جاتی..."

"ابھی آپ نے فرمایا ہے کہ وہ اکیلی کمزور عورت تھی۔"

"ہاں... اس کا ثبوت دو جیالے مرد دے چکے ہیں۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "مجھے یہ بات ڈاکٹر نے بتائی ہے۔ مگر یہ ہو سکتا ہے کہ وہ بالکل تنہا نہ ہو۔ اسے کسی کا سہارا مل چکا ہو۔ کوئی پہلے سے اس کے دل میں اپنی محبت کی جوت جگا چکا ہو۔"

"کون ہوگا وہ خوش نصیب؟" محسن بولا۔

"وہی جس کے پاس زیب النسأ اب گئی ہوگی۔" میں نے کہا۔ "یہ تو میں مان ہی نہیں سکتا کہ اس لڑکی کے چاہنے والے کم تھے۔ اس شمع کے پروانے تو بہت ہوں گے۔ مگر وہ جس نے اسے بھی موم کر دیا کوئی ایک ہوگا۔"

"بات سمجھ میں آتی ہے۔" محسن نے کہا۔ "اس کا مطلب یہ ہوا بھیا کہ آئے بھی وہ، گئے بھی وہ ختم فسانہ ہوگیا۔"

"ہاں... مجھے افسوس ہے کہ ہمارے اور اس کے درمیان دو منٹ کا وقفہ شاید ایک لمبی اور کبھی ختم نہ ہونے والی دُوری بن گیا ہے۔ وہ مل جاتی تو اس سے کچھ کہتے... کچھ اس کی بھی سُنتے۔" میں نے کہا۔ "وہ لڑکی اپنے ڈھب کی تھی۔ اگرچہ اس نے ہمارے ساتھ زبردست فریب کیا۔ مگر ہم اس کے ساتھ کون سی شرافت برت رہے تھے۔ میں اس کی ذہانت اور ہمت کا معترف اور مدّاح ہوں۔ اس نے واقعی کمال کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد میں اس کے ساتھ ظلم ہوا۔ مجھے اس ظلم کا بھی افسوس ہمیشہ رہے گا۔ کسی حد تک میں خود کو اس میں شامل سمجھتا ہوں۔ نہ ہم اسے

یوں لاتے، نہ وہ یوں فرار ہوتی... اور نہ وہ سب ہوتا جو ہوا۔ وہ ایک خوب صورت جسم کے اندر ایک خوب صورتی کی خالق روح کا آزار بھی رکھتی تھی۔ وہ ایک جمالیاتی ذوق کی مالک تھی... مگر دیکھنے والوں نے اسے صرف عورت سمجھا... کاش مجھے معلوم ہو جائے کہ وہ کون تھے تو میں خود انھیں آدابِ مردانگی سکھاؤں..."

"آہ... یہ دو دل میں کیا ماجرا ہوگیا۔" محسن بولا۔ "تم کو جن سے وفا کی تھی امید... وہ نہیں جانتے وفا کیا ہے۔ رابعہ قاری کے دل پر کیا گزرے گی؟ آج رات میں تیرے خیالات کا متن اُسے سناؤں گا... اور بتاؤں گا کہ عشق پیشہ سکندر اعظم نے وکیل کی جگہ مصوّر کو دے دی ہے۔ تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے۔"

"زیب النسأ کہاں جائے گی۔" میں نے چٹکی بجا کے کہا۔ "میاں محسن خان شیروانی! آپ کی عبرت آموز تشریحات میں دخل اندازی پر معافی چاہتا ہوں لیکن ابھی ابھی میرے قابلِ رشک دماغ میں ایک قابلِ غور خیال آیا ہے۔"

"ہاں... اب تو سارے خیال زیب النسأ کے ہوں گے۔ آہ رابعہ...!"

"اگر وہ اسپتال سے نکلنے میں کامیاب رہی ہے۔" میں نے محسن کی بکواس کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "تو میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ کہاں پہنچی ہوگی... یا پہنچے گی۔ اگر اسے کسی کی رفاقت قبول کرتے ہوئے اپنی زندگی کے سفر کا آغاز اپنی مرضی سے کرنا ہوتا تو اس کے لیے اسپتال سے فرار ہونا ضروری نہیں تھا... نہیں محسن... وہ ہمیشہ آزاد تھی۔ اس پر کبھی پہرے نہیں تھے۔ اس کی گاڑی الگ تھی اور شوفر الگ تھا۔ اُسے کسی کے ساتھ جانا ہوتا تو پہلے ہی چلی جاتی... یا اسپتال سے لوٹ کر جاتی تو اطمینان سے اپنا پورا انتظام کر کے قدم گھر سے نکالتی... اسے کون روکتا... یہاں سے وہ کسی کو کچھ بتائے بغیر اچانک فرار ہوئی ہے تو اس کے اسباب مختلف ہوں گے۔"

"یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے۔" محسن نے کہا۔ "ممکن ہے اس کے سرپرستِ اعلیٰ نواب خسرو جمشید نے فوری طور پر اس کو سراج کے عقد میں دینے کا فیصلہ کر لیا ہو۔ اس اندیشے کے پیشِ نظر کہ ہماری زر افشانی کے بعد کہیں وہ حقیقت پسند نہ ہو جائے اور رشتے سے انکار نہ کر دے... باغی نہ ہو جائے۔"

"مگر زیب النسأ کی حالت ابھی ایسی نہیں تھی کہ وہ ایسا فیصلہ کرتے تو اسے اسپتال میں ہی بتاتے۔" میں نے کہا۔ "یہ کام وہ زیب النسأ کو بتائے بغیر گھر جا کے زیادہ آسانی سے کر سکتے تھے۔ زیب النسأ کا ذہن ایک صدمے سے متاثر تھا اور میرا علمِ نفسیات کہتا ہے کہ اسی صدمے کے جذباتی ردِ عمل نے زیب النسأ کو خود

کچھ کرنے پر مجبور ... دوسرے نہیں کر سکتے تھے... یا نہیں کر سکتے تھے۔"

"تیرا مطلب ہے... اپنا انتقام خود لینے کے لیے نکل گئی۔" محسن نے کہا اور سیٹی بجائی۔

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ "شاباش... بالکل صحیح بوجھا۔"

گاڑی تھوڑا سا لہرائی۔ پیچھے آنے والے ایک شخص نے اپنی کار کو بچایا اور آگے نکلتے ہوئے بہت غصّے میں کچھ کہہ گیا۔

"پھر... اب کیا کریں... اُدھر چلیں؟" محسن نے بائیں کندھے کو اوپر نیچے ہلا کے کہا۔

"پہلے غالب کو لے لیں۔" میں نے... افسوس کہ خیال دیر سے آیا، ورنہ اِدھر نہ آتے۔ معلوم نہیں ہمارے پہنچنے تک کیا ہو جائے۔"

غالب کا پلاسٹر کاٹنے والا ڈاکٹر جو کہ اب مریضوں سے فارغ ہو چکا تھا۔ وہ اور غالب آمنے سامنے بیٹھے چائے پی رہے تھے اور ان کے درمیان زبردست بیت بازی کا مقابلہ چل رہا تھا۔ غالب دیکھنے میں بالکل ٹھیک نظر آتا تھا۔

"بس میاں تم نے بچا لیا اپنے دوست کو... ڈرا ہو گیا۔" ڈاکٹر نے ہمارے سوال پر کہا۔ "ایسا شعر داغا تھا کہ جواب نہیں تھا۔"

"وہ شعر نہیں تھا۔" غالب نے احتجاج کیا۔

"وہ شعر تھا... ردیف قافیے اور بحر کے معیار پر جس سے چاہو فیصلہ کرا لو... ضروری تو نہیں کہ شعر غالب یا میر کا ہو... وہ میرا شعر تھا۔" ڈاکٹر نے فخر سے کہا۔

"ایسے شعر میں ایک سو ایک کہہ سکتا ہوں۔ فی البدیہہ..."

"پہلے جوابی شعر کہو... پھر باقی شعر کہتے رہنا..." ڈاکٹر زور سے ہنسا۔ "اور ہار نہیں مانتے تو پھر کبھی آ کے سنا جانا۔"

"شعر کیا تھا آخر؟" میں نے غالب کی لٹکی ہوئی صورت دیکھ کر کہا۔

"شعر تھا جناب کہ... میں نے سنایا جب انھیں اپنا ریپورتاژ بولے کہ تُو ادب کو بھی کرتا ہے سبوتاژ؟"

"واہ... گویا مرزا کو اب 'ژ' سے شروع ہونے والا شعر سنانا ہے۔" میں نے کہا۔ "آپ نے تو شاعری کی ٹانگ توڑ دی۔ شاعر کا کیا حال ہے؟"

"تمھارا شاعر جوڑ دیا۔" ڈاکٹر ہنسا۔ "مگر دونوں ٹانگوں کا فوراً استعمال نہیں کرنا... اس حد تک تو ٹھیک ہے کہ تھوڑا سا چل پھر لیں... مگر ریس کورس میں گھوڑے کے ساتھ یا بحرِ ظلمات میں دوڑنے کی کوشش ابھی نہ کریں... کم از کم ایک ہفتہ۔"

"تو اب اجازت؟" میں نے کہا۔ "کیا فیس ہوئی آپ کی؟"

"فیس؟ میاں نذرانہ یا ہدیہ کہتے۔" ڈاکٹر ہنسا۔ "تم سے ہم کیا لیں گے مجاہدو! ہم پر تو لازم تھا کہ تمھیں کچھ دیتے... مگر اب ایک تو اپنی خدمات پیش کر سکتے ہیں۔ اور نصیحت دے سکتے ہیں کہ ایسے ہر جگہ منہ اُٹھا کے مت چلے جایا کرو... یہ منہ بہت لوگ دیکھ چکے ہیں۔ آئندہ کبھی ہڈی پسلی ٹوٹے... اور امید ہے کہ جس قسم کے شوق ہیں تمھارے اس میں یہ سب ہوتا ہی رہے گا۔ تو دوبارہ آنے سے پہلے مجھے فون کر لینا میاں سکندرِ اعظم... میں خود بلا لوں گا موقع محل دیکھ کے... دوسروں کے لیے اتنا کر رہے ہو تو اپنی حفاظت کے لیے بھی کچھ کیا کرو... جاؤ فی امان اللہ۔ اللہ تمھیں کامیاب کرے۔"

واپسی پر میں، محسن اور غالب دم بخود بیٹھے رہے۔ غلطی ہم سے خود ہوئی تھی مگر خوبیٔ تقدیر کہ ہمیں پہچاننے والے ہمارے ہم خیال تھے۔ ورنہ ہم نے تو اپنی طرف سے خود حفاظتی کے سارے تقاضوں کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ یہ ایک خوشگوار اتفاق تھا کہ دو مختلف مقامات پر ملنے والے دو ڈاکٹروں نے ہمیں پہچان لیا تھا۔ یہ اتفاق خطرناک بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ ایسا پہلے بھی ہو چکا تھا۔ اس میں کچھ شائبہ خوبیٔ تقدیر بھی تھا۔ لیکن یہ بھی سمجھا جا سکتا تھا کہ لوگوں میں عام طور پر ہمارے ہمنوا زیادہ تھے اور تعلیم یافتہ افراد جو ملک کے اندر کی ساری صورتِ حالات کا صحیح تجزیہ کرنے کی بہتر صلاحیت رکھتے تھے، بطورِ خاص ہمارے مشن سے ذہنی طور پر ہم آہنگی رکھتے تھے۔ وہ سب اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ عملاً ہمارے لیے کچھ کر سکتے مگر ان کا ہمارے خلاف کچھ نہ کرنا۔ صرف ہماری حوصلہ افزائی کرنا۔ ہمیں صداقت کی راہ پر تسلیم کرنا اور ہمارے لیے نیک جذبات کا اظہار کرنا بھی بہت تھا۔

تاہم اس سے تصویر کا دوسرا پہلو بھی سامنے آیا تھا کہ ہم کتنی آسانی سے پہچان لیے جاتے ہیں۔ راہ چلتے لوگوں کی بھیڑ میں یا سڑکوں بازاروں کی ریل پیل میں کوئی بھی کسی چہرے کو غور سے نہیں دیکھتا لیکن روبرو ہم اپنی شناخت کو چھپانے میں ناکام بھی رہتے ہیں۔ لوگوں میں سب تو محسن، میں اور غالب کے طرفدار نہیں ہوتے۔

"یہ تم لوگ کس سمت میں رواں ہو؟" غالب نے کہا۔

"ہم زیب النساء سے ملنے گئے تھے۔" محسن بولا۔

"اور اب پھر اُس سے ملنے جا رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

"پہیلیوں میں باتیں مت کرو۔" مرزا غالب نے کہا۔ "میں بہت اچھے موڈ میں ہوں۔ مقامِ شکر ہے کہ میں پھر دو ٹانگوں پر چلنے والے حیوانِ ناطق کی نسل میں شامل ہوا۔"

"جہاں ہم جا رہے ہیں وہاں کچھ بھی پھر ٹوٹ سکتا ہے۔" محسن نے کہا۔ "میرے دانت... سکندر کی ناک۔ تمھاری ٹانگ۔"

"پھر مجھے یہیں اتار دو... کم سے کم میں ایک رات تو صحیح سالم گزار لوں... ورنہ آئندہ کے لیے تو ڈاکٹر سلامت کے دروازے کھلے ہی ہیں۔"

"کون ڈاکٹر سلامت؟"

"یہی... جس نے میری ٹانگ جوڑی مگر شاعری کی ٹانگ توڑی اور مجھے بیت بازی میں شکست دی۔" غالب نے افسوسناک لہجے میں کہا۔ "کیا یہ وہی جگہ نہیں آ گئی جہاں سے ہم ایسے نکلے تھے کہ خدا دشمن کو نہ نکالے۔"

"ہاں مرزا... زیب النساء اسپتال سے فرار ہو گئی۔" میں نے کہا۔ "اور میری چھٹی حس کہتی ہے کہ وہ اپنا انتقام خود لینے آئی ہو گی۔"

"تمھاری ساتویں حس بھی یہی فرماتی ہے؟" غالب نے بے بسی سے کہا۔ "مارا گیا میں جو بے حس ہوں... تم دونوں کی یہی مصیبت ہے کہ ایک عقل کی بات کرتا ہے تو دوسرا بھی کرتا ہے مگر ایک جھک مارتا ہے تو دوسرا بھی جھک مارتا ہے۔ دونوں ایک ساتھ گھاس کھا گئے ہو... کیا ضرورت ہے اس سے ملنے کی؟ اور جب وہ اسپتال میں نہیں ملی تو..."

"تو شاید یہاں مل جائے۔" میں نے کہا۔

"عجیب شاید ہے... ایسے تو شاید وہ یادگارِ پاکستان پہ مل جائے۔ شاید شاہی قلعے کے تہ خانے میں مل جائے... شاید ہمیں اپنے ہی گھر میں مل جائے۔"

"انتقام لینے والی تھیوری قابلِ غور ہے۔"

"دوستو... وہ لڑکی ان لوگوں کی اور اس گھر کی نشاندہی کر سکتی تو سراج کو بتا دیتی۔ وہ انھیں توپ دم کرا دیتا... یا اپنے بھائی کو بتاتی اور ان کا کریا کرم ہو جاتا... اسے تو معلوم ہی نہیں کہ وہ کون تھے اور وہ جگہ کہاں تھی۔" غالب نے کہا۔

"وہ انجان بننے کی اور اپنے خیالات پر ایسا ہی لاعلمی کا پردہ ڈالنے کی ماہر ہے۔" میں نے کہا۔ "خسرو جمشید نے اور سراج نے معاملے کو دبا دیا ہے۔ لیکن زیب النساء نے انھیں بھی کچھ نہیں بتایا تو یہ اس کی چال ہو سکتی ہے۔ یہ اس کی انا کی شکست تھی۔ اسے کمزور لڑکی سمجھ کے کچھ جسمانی طور پر زیادہ طاقتور مردوں نے اس کا استحصال کیا تو وہ ایک وقت کی بات تھی۔ دوسرے وقت میں وہ انہی مردوں پر ثابت کرے گی کہ جسمانی طاقت کو ایک کمزور نظر آنے والی لڑکی کیسے زیادہ عبرتناک شکست دے سکتی ہے۔"

"تم اتنے یقین کے ساتھ یہ بات کر رہے ہو۔" غالب نے افسوس سے سر ہلایا۔ "جیسے ماہرِ نفسیات ہو۔ زیب النساء کی نفسیات میں ہی پی ایچ ڈی کر چکے ہو۔ ایک بار مجھے کتے نے کاٹ لیا تھا۔ میں ڈاکٹر کے پاس گیا تو اس نے کہا کہ کیا وہ کتا پاگل تھا۔ میں نے کہا کہ یہ تو میں نے نہیں دیکھا۔ وہ بولا کہ جاؤ دیکھ کے آؤ... میں دیکھنے گیا تو اس نے مجھے پھر کاٹ لیا۔ دوسری ٹانگ پر... کیا زیب النساء کو یہ خیال نہیں آیا ہو گا کہ وہ کتے پھر کاٹ لیں گے۔ وہ خالی ہاتھ جائے گی وہاں؟"

"میرا خیال ہے کہ وہ خالی ہاتھ ہوتی تو ایسا نہ سوچتی۔ اس کے پاس ریوالور ہے یا کوئی ایسی ہی چیز... جو اسے اپنی حفاظت کرنے کے لیے دی گئی ہو گی۔" میں نے کہا۔ "اسپتال میں بھی وہ زیب النساء کی حفاظت کے لیے خصوصی انتظام کرنے پر مصر تھے مگر ڈاکٹروں نے اجازت نہیں دی تھی۔"

"آخر کس کا ڈر تھا اُنھیں؟" غالب بولا۔ "کیا وہ سمجھتے تھے کہ مجرم اسپتال پہنچ سکتے ہیں؟ مجرم تو چھپتے پھر رہے ہوں گے..."

"یار مرزا! حفاظتی انتظامات زیب النساء کو ہم سے محفوظ رکھنے کے لیے تھے۔" میں نے جھنجلا کے کہا۔ "کہ کہیں ہم اسے دوبارہ نہ لے جائیں۔ انھیں یہ فکر بھی ہو گی کہ اخباری نمائندے زیب النساء تک نہ پہنچ جائیں۔ وہ کڑی سے کڑی جوڑنے والے لوگ ہوتے ہیں۔"

"کیا تمھیں معلوم ہے... کوئی اندازہ ہے کہ وہ اس علاقے میں کہاں ہو گی؟ اس رات وہ غائب ہوئی تھی تو کوئی سراغ نہیں چھوڑ کے گئی تھی۔" غالب نے کہا۔ "کسی کو پتا نہیں چلا تھا۔"

"لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ زیادہ دُور نہیں گئی تھی۔ اتنے کم وقت میں وہ آس پاس کے ہی کسی گھر میں داخل ہو سکتی تھی۔" میں نے کہا۔

ڈرائیونگ محسن کر رہا تھا اور ہم اس گھر کے آگے پیچھے کی گلیوں سے آہستہ آہستہ گزر رہے تھے جہاں سے ہم جان بچا کے بڑی مشکل سے فرار ہوئے تھے اور اگر ایک دستی بم پھینک کے ہم نے پولیس کی پیش قدمی نہ روکی ہوتی تو شاید نکل ہی نہ پاتے۔ یہاں ہم کیتھرین کی لاش بھی چھوڑ گئے تھے اور پولیس نے یقیناً بعد میں آس پاس کے سب لوگوں سے ہمارے بارے میں معلومات حاصل کی ہوں گی۔ یہ زیادہ پرانی بات نہیں تھی۔ اب بھی اس گھر پر پولیس کی نظر ہو سکتی تھی جہاں خطرناک مجرم چھپے رہے تھے۔ وہ مجرم جو شہر کی مشہور سیاسی و سماجی شخصیت اور صنعت کار چوہدری دلاور کی سالی اور کوتوالِ شہر کی ماں کو زبردستی اغوا کر لائے تھے۔ چنانچہ ہم خطرے کی جگہ سے دُور دُور رہے۔

عین اس وقت جب ہم اپنی چھٹی اور ساتویں حس کی غلط راہ نمائی پر شرمسار تھے اور مرزا غالب ہماری خام خیالی کا تمسخر اُڑا کے ہماری شرمندگی میں اضافہ فرما رہے تھے، ایک غیر معمولی بات ہوئی۔ میری نظر نے ایک کوٹھی میں کچھ ہلچل دیکھی۔ وہ پرانے طرز کا سرکاری بنگلا تھا جس کے آس پاس اجاڑ باغ اور خشک گھاس والا لان تھا۔ ایک شخص تیز تیز قدموں سے باہر آ رہا تھا۔ محسن نے میرے کہنے پر جیپ کو روک لیا۔

"کیا بات ہے بھائی صاحب؟" میں نے کہا۔

"وہ جی... قتل ہو گیا... دُہرا قتل..." وہ ہمیں یہ سنسنی خیز اطلاع دیتے ہوئے سخت بدحواس تھا۔ "میں جا رہا ہوں پولیس کو فون کرنے۔"

"کیا فون نہیں ہے اس گھر میں... !" میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

"ہے... بلکہ تھا... مگر قاتل نے تار کاٹ دیے باہر سے۔" وہ بولا۔

"اچھا... تو قاتل فرار ہو گیا؟... یا ہو گئے۔" محسن بولا۔

"نہ ہو گیا نہ ہو گئے..." وہ بولا۔ "ہو گئی... ایک عورت نے دو بندے مار دیے... اللہ توبہ... دونوں کے سر میں اور دل میں تین تین گولیاں ماریں... میں تو مارا گیا۔"

"آئیں ہمارے ساتھ۔" میں نے گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔ "ہمارے گھر سے فون کر لیں... اور پریشان نہ ہوں... ہم آپ کی مدد کریں گے۔"

"آپ... قریب ہی رہتے ہیں۔" وہ بولا اور میرے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ محسن نے گاڑی پھر اسٹارٹ کر دی۔

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ "کیا کسی نے دیکھا تھا اس لڑکی کو؟"

"اب کیا بتاؤں آپ کو جناب۔" وہ فریاد کے انداز میں بولا۔ "جھوٹ بولوں تو مشکل... سچ بولوں تو زیادہ مشکل... میں نے ہی دیکھا تھا اُسے... میں بھی یہیں رہتا ہوں۔"

"اچھا... تو مقتول تمھارے کیا تھے؟" میں نے کہا۔

"کچھ نہیں جی... بنگلا ایک سرکاری افسر کو ملا ہوا تھا۔" وہ بولا۔ "اس کے سرونٹ کوارٹر کو میں نے کرائے پہ لے لیا تھا۔ میں اسٹوڈنٹ ہوں... ہوسٹل میں جگہ نہیں ملی تھی اور مکان بہت مہنگے ہیں۔ کرائے پر کمرا ملتا بھی نہیں کسی چھڑے چھانٹ کو۔ کسی کی سفارش سے یہ کوارٹر مل گیا تھا۔ کیا معلوم تھا کہ سر منڈاتے ہی اولے پڑیں گے۔ ابھی ایک ہفتہ پہلے ہی تو میں نے منجی بسترا لا کے ڈالا تھا۔"

"تو تم نے اس لڑکی کو دیکھا تھا؟" میں نے کہا۔

وہ چونکا۔ "ہاں جی... بڑی مصیبت میں پھنس گیا میں تو... میں نے اُسے دیکھا ضرور تھا۔ ایک رات وہ بڑی پریشانی میں فون کرنے آئی تھی۔ وہ باہر سے آئی تو میں باہر جا رہا تھا۔ اُس نے مجھ سے کہا کہ گھر میں کوئی ہے۔ مجھے فون کرنا ہے... میں نے اشارے سے اندر بھیج دیا کہ حشمت صاحب ہیں۔ آجکل اُن کی فیملی نہیں ہے۔ لائل پور گئے ہوئے ہیں سب کسی شادی میں۔ اندر حشمت صاحب کے ساتھ کوئی دوست تھا اُن کا... قسم سے لیں جو میں نے اس لڑکی کو پہلے کبھی دیکھا ہو۔ مجھے تو حشمت بیگ کے بارے میں بھی کچھ نہیں معلوم۔ سوائے اس کے کہ... وہ ایکس ای این تھا... اور یہ کہ..."

"کہ وہ ایک بدکردار آدمی تھا۔"

"بدکردار کا تو مجھے پتا نہیں۔ رشوت خوب لیتا تھا اور عیش کرتا تھا۔ وہ اور اس کا دوست شراب پی رہے تھے... یہ بھی مجھے پتا ہے۔" وہ بولا۔

"اور بدکردار کیا ہوتا ہے؟... خیر... پھر کیا ہوا؟"

"پھر کیا جی... میں باہر چلا گیا تھا۔" وہ بولا۔ "آج میں اپنے کوارٹر میں پڑھ رہا تھا کہ میں نے حشمت کے چلّانے کی آواز سنی۔ پھر فائر ہونے تو میں اُٹھ کے دوڑا۔ میں اندر گیا تو حشمت صاحب اور ان کا دوست دونوں مر چکے تھے۔ ان کے جسم سے نکلنے والا خون سارے کمرے میں پھیلا ہوا تھا۔ ایک میز اُلٹی پڑی تھی، ساتھ ہی شراب کی بوتل گلاس وغیرہ پڑے ہوئے تھے۔ میں اتنا بدحواس ہوا کہ اُلٹے پاؤں بھاگا۔ اور اس وقت اچانک میری نظر کھڑکی سے باہر گئی تو میں نے بس ایک جھلک دیکھی اس کی۔ اسی لڑکی کی جو فون کرنے آئی تھی۔ پورچ میں روشنی تھی... میں نے کپڑوں سے بھی پہچان لیا اور صورت سے بھی۔"

"اور پھر بھی تم نے اُسے پکڑا نہیں؟" میں نے کہا۔

"میں... کیسے پکڑتا... وہ مجھے بھی قتل کر دیتی... جب آدمی پر خون سوار ہو تو اس سے ڈرنا چاہیے۔ اس کے لیے دو قتل اور دس قتل برابر ہو جاتے ہیں۔" وہ بولا۔ "وہ کوٹھی سے سیدھی باہر نکل گئی۔"

"پیدل تھی وہ؟"

"نہیں جی... باہر کوئی ٹیکسی تھی یا کار... مگر یہ آپ مجھے کہاں لے جا رہے ہیں؟" وہ ایک دم گھبرا کے بولا۔ "ہم تو بہت دُور آ گئے۔ گاڑی روکو۔"

"دیکھو مسٹر..." میں نے اس کی کلائی پکڑ لی۔ "تم کو کسی کے گھر جا کے فون کرنے کی ضرورت نہیں۔ اپنی جان بچاؤ... سمجھے۔"

"ورنہ پولیس یہ سب کچھ سُنے گی تو تمھیں پھانسی لگا دے گی... وہ لڑکی تو ان کے ہاتھ آئے گی نہیں... وہ تم کو ہی اس کا ساتھی ثابت کر دیں گے اور تم سے اقرار بھی کرا لیں گے۔ قتل کے وقت تم ہی وہاں موجود تھے۔ یا وہ کسی لڑکی کے آنے جانے کی بات کو تمھارا جھوٹ قرار دیں گے اور قتل کی واردات کو تم سے منسوب کر دیں گے۔ اُن کے لیے تمھارے قبضے سے آلۂ قتل برآمد کرنے کا کوئی مسئلہ نہیں۔ ہر تھانے میں ریوالور اسی لیے رکھے جاتے ہیں کہ ضرورت پڑنے پر مشکل کیس کو آسان بنانے میں کام آئیں۔ تم کو آسانی سے قاتل ثابت کیا جا سکتا ہے۔" محسن نے گاڑی روک کر کہا۔

"پھر... پھر میں کیا کروں جی..." وہ لڑکا رونے پر آ گیا۔ "مجھے تو سب نے مجبور کیا کہ تم ہی اطلاع دو پولیس کو..."

"سب کون؟"

"آس پاس رہنے والے گھروں کے نوکر آ گئے تھے۔" وہ بولا۔

"صاحب لوگ نہیں آئے تھے؟" میں نے طنز سے کہا۔

"نہیں جی... انھوں نے نوکروں کو معلوم کرنے کے لیے بھیج دیا تھا کہ یہ فائرنگ کی آوازیں کیسی ہیں۔" وہ بولا۔ "ایک اور سرونٹ کوارٹر میں رہنے والے دو کلرک آ گئے تھے... وہ خود کسی چکر میں نہیں پڑنا چاہتے تھے۔"

"ایسا ہی ہوتا ہے۔ چکر میں صرف تم پڑ گئے ہو... کل کو پولیس انھی لوگوں میں سے گواہ حاصل کرے گی... زبردستی کر کے اور دھمکی دے کر وہ کسی کو بھی گواہ بنا لیتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور یہ لوگ بیان دے دیں گے کہ انھوں نے تم کو آلۂ قتل کے ساتھ گولیاں چلاتے دیکھا تھا۔ یہ چشم دید گواہ تو بیان دے کر الگ ہو جائیں گے مگر تم پہنچ جاؤ گے پھانسی کے تختے پر... میرا تو خیال ہے کہ تم بھی گول ہو جاؤ۔"

"گول ہو جاؤں؟ کیسے... جی...؟"

"کیا یہ سب لوگ تم کو جانتے ہیں؟" محسن نے کہا۔

"نہیں جی... ابھی ہفتہ ہی تو ہوا تھا، مجھے یہاں آئے..."

"اور کوئی جانتا ہے کہ تم یہاں رہتے ہو؟" میں نے کہا۔

"پتا نہیں جی... مشکل ہی ہے... مجھے یہاں بھیجنے والا بھی تو مارا گیا۔" وہ بولا۔ "یہاں آنے سے پہلے میں بھی لائل پور میں تھا۔ وہاں سے بیس میل دُور میرا پنڈ ہے... کیا میں واپس چلا جاؤں؟"

"اگر جا سکتے ہو تو تمھارے حق میں یہی بہتر ہے۔" میں نے کہا۔ "کیا تم خاموشی سے کسی کو بتائے بغیر اس سرونٹ کوارٹر سے منجی بسترا اٹھا کے نکل سکتے ہو؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "میں پچھلی طرف سے جاؤں تو کوئی نہیں دیکھے گا۔"

"تو جاؤ... ابھی پولیس نہیں آئی ہے اور تمھارے لیے موقع ہے۔" میں نے کہا۔ "کوئی اور پولیس کو اطلاع نہیں دے گا کیونکہ اس کام کے لیے تم کو بھیجا گیا تھا۔ وقت سے فائدہ اٹھاؤ اور بھاگ جاؤ اپنے گھر۔"

"لیکن... میری تعلیم...؟"

"بے وقوف... تعلیم تو بعد میں بھی جاری رکھی جا سکتی ہے۔ یہاں رہے تو سمجھو کہ اس دُہرے قتل کا الزام تمھارے سر منڈھ دیا جائے گا۔ غریب کی کوئی نہیں سُنتا۔ انصاف کا عمل بہت مہنگا اور بہت مشکل ہے۔ اپنے گھر جا کے ماں باپ کو سب بتا دینا اور ایک ہفتے کی بات ہی تو ہے۔ اُن سے کہنا کہ تمھاری موجودگی کے گواہ بنا لیں۔ یہ مشہور کر دیں کہ تم لاہور نہیں... کہیں اور گئے تھے۔ مثلاً کسی چاچے مامے کے گھر..."

"منٹگمری میں میرا بڑا بھائی ہے..."

"ویری گڈ... اسی کے پاس تھے تم... وہ مل کر تم کو بچا سکتے ہیں۔ سچ بول کے تم نہیں بچ سکتے... اس لیے یہ جھوٹ جائز ہے۔ تم قسم کھا لو یا حلف اٹھا لو تب بھی جائز ہے کیونکہ تم جانتے ہو کہ قتل تم نے کیا ہی نہیں اور اس کا یقین دلانا بے حد ضروری ہے کہ تم جائے واردات سے بہت دُور تھے۔" میں نے کہا۔

"اچھا جی... تو آپ پھر مجھے واپس وہیں لے چلیں، پیچھے والی سڑک سے۔" وہ بولا۔ "میں دس منٹ میں منجی بسترا اٹھا لاؤں گا۔"

"منجی چھوڑ دینا... بسترا اور کپڑے کتابیں وغیرہ اُٹھا لانا۔" محسن نے گاڑی کا رُخ موڑتے ہوئے کہا۔ پانچ منٹ بعد ہم نے اُسے جائے واردات سے پچاس قدم کے فاصلے پر دوسری طرف اتار دیا۔

"فٹافٹ آ جاؤ... ہم یہاں کھڑے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم تمھیں بس کے اڈے تک پہنچا دیں گے۔"

"مہربانی جناب... مگر ایک بات پوچھوں۔ آپ نے تو کہا تھا کہ آپ لوگ پڑوس میں رہتے ہیں۔" وہ بولا۔

"ہم نے جھوٹ بولا تھا۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"کیوں جی... اور میری مدد کیوں کر رہے ہیں آپ؟"

"اس لیے کہ ہم نے اس لڑکی کی مدد بھی کی تھی۔" میں نے کہا۔ "ہم ہی اُسے لائے تھے اور ہم ہی نکال کر لے گئے تھے۔"

"وہ ہماری بہن تھی۔" محسن نے کہا۔ "سگی بہن نہیں، ایک رشتے سے... اور اسے حشمت سے اپنا بدلہ لینا تھا۔ چونکہ تم نے اُسے دیکھ لیا تھا اس لیے ہم خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ تمھارے لیے خود کو بچانے کی ایک ہی صورت ہے کہ خاموشی سے بھاگ جاؤ... ورنہ تم دونوں طرف سے مارے جاؤ گے۔"

"اگر پولیس نے تمھیں مجرم قرار نہ دیا... تو ہم تمھیں زبان کھولنے سے پہلے مار دیں گے۔" میں نے کہا۔ "ابھی تو ہم تمھاری مدد کر رہے ہیں... چلو اترو۔"

وہ ایسے اترا جیسے مجرم عدالت کے کٹہرے سے موت کی سزا سُن کے اترتا ہے۔ میں اس کے ساتھ ہی اترا۔ زیب النسا کی مدد کے لیے یہ سب کچھ ناگزیر ہو گیا تھا۔ ہمارے درمیان اس معاملے میں مکمل اتفاقِ رائے تھا کہ جو کچھ ہوا تھا انصاف کے تقاضوں کے عین مطابق تھا اور زیب النسا نے ان مجرموں کو وہ سزا دی تھی جس کے وہ مستحق تھے مگر جو اُنھیں قانون نہیں

دے سکتا تھا۔ زیب النسا کسی ٹیکسی یا پرائیویٹ کار میں آئی تھی۔ یہ بات قدرے ناقابلِ فہم تھی اور میرا ذاتی خیال یہ تھا کہ نوجوان نے بدحواسی میں کسی گزرنے والی گاڑی کے بارے میں فرض کر لیا کہ وہ زیب النسا کو لے کر نکل جانے والی گاڑی تھی۔ اس کے مشاہدے میں فرق کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا تھا کہ اس نے ہماری بات مان لی تھی کہ ہم ہی زیب النسا کو لے گئے تھے۔ ورنہ ایک ٹیکسی یا کار اور ایک مائیکرو بس میں بہت فرق ہوتا ہے۔ مائیکرو بس اگر اندھیرے میں نظر نہ آئے تب بھی اس کی ہیڈ لائٹس نسبتاً زیادہ بلندی پر ہوتی ہیں اور پھر سب سے بڑا فرق تو انجن کی آواز کا ہے۔ کار یا ٹیکسی خاموشی سے گزر جاتی ہے جب کہ فاکس ویگن کی مائیکرو بس اپنی مخصوص آواز سے پہچانی جاتی ہے۔ لیکن قتل کے فوراً بعد اس نوجوان کو اپنا ہوش نہیں تھا۔ وہ صرف اتنا ہی دیکھ سکتا تھا کہ وہ لڑکی باہر گئی اور باہر سے ایک گاڑی گزری۔ نتیجہ خود اس کے ذہن نے اخذ کر لیا کہ لڑکی اسی گاڑی میں فرار ہو گئی۔

ہم دونوں ایک کوٹھی کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے گئے۔ اس کوٹھی میں اندھیرا تھا اور باہر کوئی آواز بھی سنائی نہیں دیتی تھی۔ یہ سب ایک جیسے سرکاری بنگلے تھے، جو نام کے بڑے افسروں کو الاٹ کر دیے گئے تھے چنانچہ کسمپرسی کا شکار تھے۔ ان کی ذاتی کوٹھی ہوتی تو وہ اس کی دیکھ بھال بھی کرتے۔ وہ جانتے تھے کہ انھیں ٹرانسفر ہونے تک ہی یہاں رہنا ہے۔ پھر کوئی اور آجائے گا۔ اس سرکاری مہمان خانے میں ذاتی دلچسپی لینے کی کیا ضرورت ہے۔

دیوار کے ختم ہوتے ہی ہمارے سامنے دوسری دیوار آگئی۔ اس کے اوپر سے پھاند کر ہم پھر اسی بنگلے کے عقبی حصے میں جا اترے جہاں دو مجرم لاشیں ابھی تک اجنبی لوگوں میں تصویرِ عبرت بنی پڑی ہوئی تھیں۔ ہم بالکل خاموشی سے کھلے ہوئے سرونٹ کوارٹر میں داخل ہوئے۔ نوجوان کی ساری کائنات چند جوڑے کپڑوں، دو جوتوں، بستر اور چند کتابوں پر مشتمل تھی۔ باقی سب کچھ اس نے افراتفری میں اٹھایا اور ایک ٹین کے صندوق میں بھر دیا۔ میں نے اس کا لپٹا ہوا بستر اٹھا لیا اور ہم جس راستے سے آئے تھے اسی سے واپس لوٹ گئے۔

میری طرح محسن اور غالب کے ذہن میں بھی یہ سوال تھا کہ زیب النسا اپنا حساب برابر کر کے کہاں گئی۔ کیا وہ واپس اسپتال چلی گئی؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس نے اپنا پروگرام بھائی کے ساتھ مل کے بنایا ہو۔ بھائی نے اتفاق کیا ہو کہ مجرموں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کی خواہش کا احترام کرنا بالکل جائز ہے اور ویسے تو یہ کام ایک غیرت مند بھائی کو کرنا چاہیے مگر بہن کے جذبات کی تسکین اپنی عزت کے قاتلوں کو خود قتل کرنے سے ہوتی ہو تو اس میں بھی کوئی ہرج نہیں۔ زیب النسا پر کوئی الزام نہیں آ سکتا تھا۔ وہ اسپتال میں موجود تھی اور اگر ہم اچانک اس کے کمرے میں نہ پہنچ جاتے تو اس کی عدم موجودگی ثابت بھی نہ ہوتی۔

یہ ایک منطقی جواز رکھنے والا خیال تھا۔ جب محسن نے پھر مائیکرو بس کی ڈرائیونگ سنبھالی تو میں اپنا پہلا خیال بدلنے لگا تھا کہ اس نوجوان نے پریشانی میں غلط دیکھا تھا۔ ممکن ہے وہ خسرو جمشید ہی کی گاڑی ہو جو باہر زیب النسا کو واپس لے جانے کے لیے منتظر ہو اور اس سے پہلے کہ کسی کو خبر ہو، زیب النسا واپس اسپتال میں اپنے بیڈ پر پہنچ گئی ہو گی۔ اس حقیقت سے بے خبر کہ اس کا راز ہم پر فاش ہو چکا ہے اور ہماری وجہ سے ایک ڈاکٹر کو بھی بہت کچھ معلوم ہو گیا ہے۔ جو اسے پہلے معلوم نہیں تھا۔

"کیا آپ مجھے لاری اڈے پر چھوڑ دو گے؟" نوجوان نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا... آپ کے بارے میں..."

"ہم تم کو اتنی دور نہیں لے جا سکتے۔" میں نے کہا۔ "جہاں بھی کوئی تانگا نظر آیا ہم تمھیں اس میں سوار کرا دیں گے... اور یہ لو..." میں نے جیب میں سے ایک ہزار روپے نکال لیے۔ "یہ تمھارا سفر خرچ۔ تم اس وقت تک محفوظ ہو جب تک تمھاری زبان بند ہے... ہماری بہن کے یا ہمارے بارے میں تم نے کچھ بھی کہا تو ہمیں معلوم ہو جائے گا... پھر تمھاری خیر نہیں... ہم تمھارے پتا بھی آجائیں گے۔ میں نے دیکھ لیا ہے کہ تمھارا نام فیصل حیات ہے اور تم سیلی کالج آف کامرس کے اسٹوڈنٹ ہو۔"

وہ بُری طرح کانپنے لگا۔ "خدا کے لیے جناب... میں بے قصور ہوں... میرا باپ بہت ضعیف ہے اور میری ماں چکی ہے... آپ جو کہیں گے میں وہی کروں گا... آپ کی بڑی مہربانی۔"

"تم بس اتنا کہنا کہ جس گھر میں تم تھے، وہاں قتل ہو گیا تھا۔ کب اور کیسے اور کیوں؟ یہ تم کو نہیں معلوم... تم تو اپنی جان بچا کے بھاگ آئے۔ تمھاری زبان سے اتنا ہی بیان کافی ہے اور تم کو اسی پر قائم رہنا ہے۔" میں نے کہا۔

اس نے خدا اور رسولؐ کی قسم کھا کے کہا کہ اس کی زبان سے اس کے علاوہ کچھ نہیں نکلے گا۔ جب ہم نے اُسے ایک تانگے میں بٹھا دیا اور تانگا چل پڑا تو میں نے دیکھا کہ اس کی صورت پر اطمینان جھلکنے لگا تھا۔ ابھی تک اُسے ہماری بات پر پورا اعتبار نہیں تھا۔ اس کے دل میں ایک اندیشہ ضرور تھا کہ کہیں ہم اس کا قصہ ہی پاک نہ کر دیں مگر ہم نے اُسے بچا لیا تھا تو کم سے کم اسے یقین آچکا تھا کہ ہم اس کے مددگار ثابت ہوئے ورنہ سے شاید

چوبیس گھنٹے میں ہی پھانسی ہو جاتی۔ وہ روانہ ہوتے وقت شکریہ ادا کرنے کے انداز میں ہاتھ ہلا کے مسکرایا اور ہم نے جواب میں دوستانہ طریقے پر اسے الوداع کہا۔

"دیکھا تم نے... مرزا غالب کے گھوڑے۔" میں نے موقع ملتے ہی چلّا کے کہا۔

"غالب کے گھوڑے کی دُم کے بال۔" محسن نے ہوا میں مکا چلایا۔

"ہماری چھٹی اور ساتویں حس کے خلاف آئندہ زبان سنبھل کے ہونا۔" میں نے کہا۔ "تمھاری جگہ کوئی اور ہوتا تو ہم اس کی ٹانگ توڑ دیتے۔"

"توڑ دو... توڑ دو... تمھیں میری سالم ٹانگ بُری لگ رہی ہے۔" غالب خود کو بچاتے ہوئے بولا۔ "ایسے تو کبھی کبھی موسم کا حال بھی درست ہو جاتا ہے۔ جس کی پیش گوئی محکمۂ موسمیات والے کرتے ہیں۔"

"کیا خیال ہے اب؟" محسن بولا۔ "واپس چلیں؟"

"واپس کہاں...؟" میں نے کہا۔ "اسپتال... یا گھر...؟"

"ہم نے یعنی میں نے اور غالب نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ زیب النسا کو نواب خسرو جمشید یہاں تک لائے۔ زیب النسا نے اپنے مجرموں کو خود سزا دی۔ پھر وہ اُسے واپس لے گئے۔" محسن بولا۔

"یہی بات میری عقل میں بھی آتی ہے۔" میں نے کہا۔

"مگر اسپتال سے تو پولیس کو بھی مطلع کر دیا گیا ہو گا۔" محسن بولا۔ "اور اگر زیب النسا کے واپس پہنچنے سے پہلے پولیس پہنچ گئی۔"

"تو کیا ہوا... پولیس واپس چلی جائے گی... پولیس بھی تو اپنی ہی ہے۔" میں نے کہا۔ "ڈاکٹر خاموش رہنے پر مجبور ہو جائے گا۔ ہماری وجہ سے۔"

"ہماری وجہ سے کیوں؟"

"بھئی اب یا تو وہ کہے کہ زیب النسا کمرے میں نہیں تھی اور اس کے دو گواہ بھی ہیں۔ محسن اور سکندر۔" میں نے کہا۔ "یا فرض کر لیا جائے کہ ڈاکٹر کو غلط فہمی ہو گئی تھی۔ اور زیب النسا تو باتھ روم میں تھی۔ نہ ہم سمجھے نہ آپ آئے کہیں سے... پسینہ پونچھیے اپنی جبیں سے..."

"اگر وہ پولیس کے پہنچنے سے پہلے ہی کمرے میں پہنچا دی گئی تو سب ٹھیک ہے۔ ڈاکٹر کیا اسپتال کا سارا عملہ گواہ کہ وہ کہیں بھی نہیں گئی۔ یہ محض پانچ فیصد سے بھی کم خطرات کے خلاف حفاظتی انتظام ہے۔ ورنہ اپنے نواب صاحب بھی گولیاں نہیں کھیلتے۔" میں نے کہا۔ "وہ سراج کے ساتھ ہی واپس گئے تھے۔ اس کے گواہ ایس ایس پی صاحب ہوں گے کہ نواب خسرو جمشید تمام وقت ان کے ساتھ رہے تھے مگر حقیقت یہ ہو گی کہ نواب صاحب باہر نکلتے ہی اتر گئے ہوں گے۔ اور پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق ان کے جاتے ہی زیب النسا بھی نکل گئی۔ وہ اسپتال کے اندر ہی کھڑی ہوئی نواب خسرو جمشید کی کار میں بیٹھی اور کار چلاتی ہوئی گئی تو گیٹ پر بھی اسے کسی نے نہیں روکا۔ باہر کہیں اس نے نواب صاحب کو پک کر لیا۔ نواب صاحب اُسے وہاں تک لے گئے جہاں زیب النسا کو جانا تھا اور کم سے کم وقت میں واپس پہنچا کے رخصت ہو جاتے لیکن اب شاید انھیں معاملات کو سنبھالنے کے لیے رکنا پڑا ہو گا۔"

"ویسے زیب النسا کے اس دُہرے قتل کی واردات میں ملوث ہونے کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں۔" میں نے کہا۔

"اور کیا اُس بات کا ایک فیصد بھی امکان نہیں کہ تمھارا سارا مفروضہ ہی غلط ہو۔" غالب نے کہا۔ "وہ اکیلی آئی ہو قتل کرنے... اس نے کسی کو نہ بتایا ہو۔"

"تب بھی وہ واپس تو جائے گی۔" میں نے کہا۔ "اور ممکن ہے کہ تھوڑی بہت خرابی ہو... مگر سنبھالنے والے پھر بھی معاملات کو سنبھال لیں گے۔"

"ہاتھ کنگن کو آرسی کیا... فون کرو اور اسپتال سے معلوم کر لو۔" غالب نے کہا۔

"یہاں سے تو نہیں... لیکن گھر کے قریب سے کوشش کریں گے۔" میں نے کہا۔ "ٹیلی فون لائن قریب سے ہی گزر رہی ہے۔"

"اسے گھر کہتے ہو... اس سرکس کو...؟"

"مسافروں کے ٹھکانے بدلتے رہتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور خانہ بدوشی کی زندگی میں گھر ایسا ہی ہونا چاہیے کہ جہاں گئے ساتھ لے گئے۔ سہولت کے لیے ہر چیز پورٹیبل بنائی جا رہی ہے۔ یورپ اور امریکا میں بہت سے لوگ تو مستقلاً ایسے چلتے پھرتے گھروں میں رہنا پسند کرتے ہیں۔"

میں نے محسن اور غالب کو ٹریلر کے قریب اتار دیا۔ رات کے گیارہ بجے بھی سامنے والے ہوٹل میں رونق تھی اور شمشاد بیگم کے گانے اونچی آواز میں بج رہے تھے۔ چارپائیوں پر ڈرائیور اور کلینر حضرات چادر تانے سو رہے تھے یا چائے پی رہے تھے اور گپ شپ میں مصروف تھے۔ ان کے ٹرک ذرا آگے ایک قطار میں کھڑے ہوئے تھے۔ سدیا پر سامان اوپر تک لدا ہوا تھا جو سے لے کر کاروں تک وہ راتوں رات ہر چیز دوسرے شہروں میں پہنچاتے رہتے تھے اور جگہ جگہ ان کے قیام و طعام کے لیے ایسے ہی اڈے قائم تھے۔ موٹر مکینک اس وقت دن کے مقابلے

میں زیادہ مصروف نظر آرہا تھا۔

ہماری طرف سب ٹھیک تھا۔ ڈرائیور شیر علی لوٹ آیا تھا اور ٹریلر سے کچھ فاصلے پر چارپائی ڈالے بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اُسے محسن سے باتیں کرتا چھوڑا اور خود آگے نکل گیا۔ تقریباً دو میل دور جانے کے بعد مجھے ٹیلیفون کا پول ملا جہاں سے میں کنکشن ملا سکتا تھا۔ اسپتال کا نمبر مجھے معلوم نہیں تھا۔ یہ نمبر مجھے ایکس چینج نے دیا۔

"یس سر۔" ایک خوش آواز اور خوش اخلاق آپریٹر نے کہا۔

"میں مس زیب النساء سے بات کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"آپ کا نام سر؟" آپریٹر نے تھوڑے سے توقف کے بعد کہا۔

"حشمت بیگ... ایکس ای این۔" میں نے کہا۔

"ہولڈ آن پلیز..." آپریٹر بولا اور میں ریسیور کان سے لگائے کھمبے سے چپٹا رہا۔

"ہیلو..." بالآخر زیب النساء کی حیرت زدہ اور سہمی ہوئی آواز آئی۔ "کون ہیں آپ؟"

"میں حشمت بیگ ہوں بی بی۔" میں نے کہا۔ "اتنی جلدی آپ کو میرا نام تو نہیں بھول سکتا۔"

"دیکھیے... ہم آپ کو نہیں جانتے۔" وہ بولی۔ "ہو سکتا ہے کہ ہمیں یاد نہ آرہا ہو۔"

"افسوس کہ مجھے اس وقت فانی کا بھی کوئی شعر یاد نہیں آرہا ہے کچھ اس قسم کا... کہ وہ خود اپنے کشتۂ جفا سے پوچھتے ہیں کہ یہ کیسے مرگیا اور اسے کس نے مارا...!"

"بخدا ہم بالکل نہیں سمجھے... آپ ہمیں مہذب اور معقول آدمی لگتے ہیں... کیا آپ کو یہ زیب دیتا ہے کہ اسپتال کے مریضوں کو فون کرکے بے سبب پریشان کریں۔" وہ بولی۔

"دیکھو، فون مت بند کرنا۔" میں نے کہا۔ "زیب النساء کیا تمہارے بھائی نواب خسرو جمشید کہیں آس پاس موجود ہیں؟"

"خسرو جمشید... ہم یہ نام دوسری بار سن رہے ہیں۔" وہ بولی۔ "بے شک ہمارے بھائی ہیں۔"

"لیکن ان کا نام مرشد رضا خان ہے۔" میں نے کہا۔ "چلیے یونہی سہی..."

"آپ... اُن کے کوئی شناسا ہیں...؟" وہ کنفیوز ہوکے بولی۔ اس کی حیرانی کا پُراعتماد انداز مجھے حیران کرنے لگا مگر میں اس کے چکر میں آنے والا نہیں تھا۔

"زیب النساء... میں وہ شخص ہوں جس نے تمہیں سمجھ لیا ہے۔" میں نے کہا۔ "تمہاری یہ پُرفریب معصومیت تمہارے جرم کو دنیا سے چھپا سکتی ہے لیکن میں ایک چشم دید گواہ ہوں۔ میں نے سب کچھ ویسے ہی دیکھا تھا... جیسے تمہاری آنکھوں نے... میں وہیں تھا... جب تم نے ان دونوں کو جہنم رسید کیا۔"

"اللہ... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں... کس کی بات کررہے ہیں؟"

"میں تمہیں مبارک باد دینا چاہتا تھا۔" میں نے کہا۔ "ڈرنے کی تو کوئی بات ہی نہیں... میں سمجھتا ہوں تم نے بہت اچھا کیا... وہ اسی سزا کے مستحق تھے۔ ہم خود بلاواسطہ اور براہ راست انصاف کے اصول پر یقین رکھتے ہیں اور مجھے خوشی ہے کہ تم بخیر و عافیت واپس پہنچ گئیں۔"

"آپ... آپ وہی لگتے ہیں... جو ہمیں زبردستی لے گئے تھے..."

"بالکل صحیح پہچانا تم نے۔" میں نے کہا۔ "ہم اسی لیے اسپتال آئے تھے کہ اگر تمہاری مدد کرسکتے ہوں تو ضرور کریں..."

"آپ کو شرم آنی چاہیے جھوٹ بولتے ہوئے... آپ ہمیں پھر لے جانے کے لیے آئے ہوں گے... لیکن ہم آپ کو بتا دیتے ہیں کہ ہمارے تکیے کے نیچے ایک پستول ہے اور ہمیں اجازت ہے کہ ہم کسی بھی اندر آنے والے کو گولی ماردیں... جسے ہم نہ پہچانتے ہوں..." وہ خفگی سے بولی۔ "اس دن بھی آپ نے ہمارے ساتھ... اور سب کے ساتھ انتہائی غیر شریفانہ سلوک کیا۔"

"اس دن کی بات چھوڑو۔" میں نے کہا۔ "یہ بتاؤ آج تو تمہیں کسی نے آتے جاتے نہیں دیکھا...؟"

"کہاں آتے جاتے؟" وہ بولی۔ "آج شام تو ہم..."

"مجھے معلوم تھا کہ تم یہی کہو گی... کہ تم تو کمرے سے نکلی ہی نہیں۔"

"تو کیا ہم غلط کہہ رہے ہیں... ہم جھوٹ نہیں بولتے... ہم باہر بالکل نہیں گئے اپنے کمرے سے..." وہ بولی۔ "اور گئے تو آپ کو کیا... ہم قیدی تو نہیں ہیں۔"

"زیب النساء... جب تم کمرے میں نہیں تھیں تو ہم آئے تھے۔" میں نے کہا۔ "اس کے بعد ہم نے یہ بھی دیکھا تھا کہ تم کہاں گئی تھیں۔ تم نے حشمت بیگ اور اس کے دوست کو شوٹ کیا۔ اس کا ایک چشم دید گواہ بھی ہے..."

"آخر آپ کیا چاہتے ہیں؟ ہمیں بلیک میل کرنا..." وہ بولی۔ "جب ہم نے بتا دیا کہ کسی حشمت بیگ کا نام ہم نے آج تک نہیں سُنا تو آپ ایسی باتیں کیوں کررہے ہیں... ہمیں کوئی ضرورت تو نہیں ہے ثبوت پیش کرنے کی... لیکن آپ چاہیں تو اسپتال آجائیں... تصدیق کرلیں کہ ہم بیمار ہیں، اور کہیں جا ہی نہیں سکتے۔"

"آخر کیا بیماری لاحق ہوگئی آپ کو...؟" میں نے طنز سے کہا۔

"خواتین سے اس قسم کے سوالات نہیں کرنے چاہئیں۔" وہ بولی۔ "اور ہم اتنی دیر آپ سے ہرگز بات نہ کرتے... لیکن ہمیں آپ سے کچھ پوچھنا تھا کہ کیا وہ سب سچ تھا جو آپ لوگوں نے بتایا تھا۔"

"وہ سب اتنا ہی سچ تھا جتنا اس کے بعد کا سچ جس

کی گواہ صرف تم ہو۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "ایک اس رات کا سچ جب تم ہمیں چکما دے کر نکل گئی تھیں اور ایک آج رات کا سچ جب تم اسپتال والوں کو ہی نہیں... قانون کے محافظوں کو بھی چکما دے کر نکلی تھیں اور میں حیران ہوں کہ تم دو قتل کرنے کے بعد بھی اتنی معصوم اداکاری کرسکتی ہو..."

"اللہ... ہمارا دماغ خراب ہوجائے گا۔" وہ بولی۔ "آپ تو ہمیں بس اتنا بتادیں کہ وہ کیسی ہیں... جن کو آپ ہمارے ساتھ ہی لے گئے تھے۔"

"عائشہ کے اور سراج کی ماں کے بارے میں پوچھ رہی ہو؟" میں نے کہا۔ "ان میں سے ایک دلاور کی ہوس پر قربان ہوگئی۔ سراج کی ماں کو ہم کچھ نہیں کہہ سکتے... وہ صرف ایک ضمانت کے طور پر ہمارے ساتھ ہے مگر زیب النساء... تم اتنی سمجھدار اور ذہین لڑکی ہو... تم جانتے بوجھتے خود پر یہ ظلم کرو گی۔"

"کیسا ظلم...؟ ہم سمجھے نہیں..."

"تم سب سمجھتی ہو زیب النساء۔" میں نے دانت پیس کر کہا۔ "میری مراد سراج سے تھی۔ بتاؤ کیا تم اب بھی اس جیسے آدمی کے ساتھ شادی کرو گی، یہ ظلم برداشت کرلو گی۔ کیا تم جانتی نہیں ہو کہ اس کی اور تمہاری فطرت اور مزاج میں کتنا فرق ہے... تم میں ہمت نہیں ہے انکار کی... یا تم ڈرتی ہو اپنے بھائی مرشد رضا سے... دیکھو... مجھے تم سے ہمدردی ہے... تم ایک حساس طبیعت رکھنے والی... ضمیر کے ساتھ چلنے والی... فنکار مزاج رکھنے والی نیک دل لڑکی ہو... اگر تم میں ہمت نہیں ہے اس زبردستی کے خلاف... ہیلو... ہیلو... زیب النساء... ہیلو..." میں نے چلا کے کہا مگر وہ ریسیور بہت پہلے رکھ چکی تھی۔ وہ میری توقعات سے کہیں زیادہ ہوشیار ثابت ہورہی تھی۔ میرے ٹیلی فون نے اسے ہراساں نہیں کیا تھا۔ دُہرے قتل کے الزام اور چشم دید گواہ کا ذکر سُن کے بھی وہ بالکل مضطرب نہیں ہوئی تھی۔ اس نے اپنا فطری انداز معصومیت برقرار رکھا تھا اور سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان بن رہی تھی... "اُلو کی پٹھی...!" میں نے جھنجلاہٹ میں کہا اور کھمبے سے نیچے اتر آیا۔

زیب النساء کا مشن کامیاب رہا تھا لیکن وہ اس کامیابی کا اقرار کرکے بھی خود کو مجرم تسلیم کرنے پر تیار نہ تھی... وہ بڑی ہوشیاری سے نکلی۔ اس نے دو ایسے افراد کو قتل کیا جو اس کے مجرم تھے اس نے شاید ان کے بارے میں سراج کو بھی نہیں بتایا تھا اور خسرو جمشید کو بھی۔ وہ ایسی لڑکی تھی کہ اپنی سوچ کو اپنی ذات تک محدود رکھتی تھی۔ وہ بہت پہلے طے کرچکی ہوگی کہ اسے بعد میں مجرموں کے ساتھ کیا سلوک کرنا ہے مگر اس نے کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ انھیں جانتی ہے اور پہچانتی ہے... اس نے اپنے ذہن کے خیالوں کو بھی مقفل رکھا اور مناسب وقت کا انتظار کرتی رہی... جو کچھ اس کے ساتھ ہوا تھا، وہ بھی کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ جو کچھ اس نے کیا، وہ بھی کسی نے نہیں دیکھا۔ وہ بیک وقت اتنی جذباتی بھی ہوسکتی ہے اور ایسے غیر جذباتی انداز میں بھی فیصلے کرسکتی ہے۔ فنکار بھی ہے اور ایک سفاک قاتل بھی... کمزور عورت بھی ہے اور انتہائی خطرناک حریف بھی۔ معصوم بھی ہے اور اتنی عیار بھی کہ جب چاہے اپنی شخصیت کا بھیس بدل لے اور اتنی کامیابی سے کہ اصل شخصیت کو چھپالے۔

میں زیب النساء کے بارے میں سوچتا ہوا واپس پہنچا۔ اس وقت تک مجھے یقین آچکا تھا کہ چشم دید گواہ کی نظر کو دھوکا ہوا۔ زیب النساء اکیلی ہی گئی تھی اور اطمینان سے قتل کرکے اکیلی ہی لوٹ آئی۔ وہ ڈاکٹر جس نے پولیس کو رپورٹ کی ہوگی کہ ایک مریضہ وی آئی پی وارڈ سے غائب ہے، اسے کمرے میں پاکے شرمندہ ہوا ہوگا۔ اور کنفیوز بھی۔ وہ پولیس کے سامنے ہمارا نام نہیں لے سکتا تھا کہ زیب النساء کی عدم موجودگی کے دو گواہ بھی ہیں۔ زیب النساء نے اتنی ہی سادگی اور معصومیت کے ساتھ اُسے یقین دلادیا ہوگا کہ وہ ذراسی دیر کے لیے باہر ضرور نکلی تھی۔ کینٹین تک گئی تھی یا باغ میں ٹہل رہی تھی۔ بے شک وہ کھڑکی کے راستے گئی تھی مگر اسپتال سے باہر ہرگز نہیں گئی تھی۔ اور ڈاکٹر نے یقین کرلیا ہوگا، اس نے مانا ہوگا کہ وہ احمق ہے اور اُلو کا پٹھا ہے۔ کیونکہ زیب النساء سچی ہے۔ اور اگر وہ ڈاکٹر نہ ہوتا تو پولیس اسے جھوٹی رپورٹ کرنے پر آئندہ سچ بولنے کا ایسا سبق دیتی کہ وہ یاد کرتا مگر وہ بھی رپورٹ کو 'مبنی بر غلط فہمی' سمجھ کے لوٹ گئے ہوں گے۔ سراج اور خسرو جمشید عرف مرشد رضا بھی اس کے سچ کے خلاف جانے والے لوگ نہیں تھے۔ میں غصے میں اندر ہی اندر سے دُھواں دیتا واپس پہنچا تو سب لوگ کھانا کھارہے تھے۔ ٹریلر کے پیچھے شیر علی نے اپنی دری بچھا دی تھی اور اس پر سراج کی ماں کے سوا سب ایسے بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک فیملی لگتے تھے۔

"زیب النساء سے بات ہوئی؟" محسن نے مجھے غور سے دیکھ کے کہا۔

"ہوئی یا نہیں ہوئی۔" میں نے کہا۔ "پہلے مجھے کھانے کو کچھ دو۔"

محسن ہنسنے لگا۔ "وہ اسپتال میں موجود تھی۔"

"اور اس نے پُرزور الفاظ میں تردید کردی۔ سب کچھ جو آپ نے فرمایا، غلط کردیا۔" غالب نے بھی ہنس کے کہا۔ "بلکہ ثابت کردیا کہ آپ بھونکتے ہیں۔"

"ہاں ہاں... میں بھونکتا ہوں۔" میں نے چلا کے کہا۔ "کاٹ بھی لوں گا تمہیں۔ بچہ سمجھ رکھا ہے اس نے سب کو... جد موتی

ہے کوئی دوسرے کو بے وقوف سمجھنے کی۔"

"اگر دوسرا حد سے زیادہ بے وقوف ہو تو حد کیسی؟" غالب بولا۔

محسن اور غالب سب سمجھ گئے تھے چنانچہ ان کو کچھ بھی بتانا ضروری نہیں تھا۔ شیر علی نے کسی قسم کے تجسس کا مظاہرہ نہیں کیا اور کھانا ختم کرتے ہی اُٹھ کے چلا گیا۔ محسن اور غالب مجھے بلا کر تے ہے۔

"یہ بتاؤ سراج کی ماں تو ٹھیک ہے؟" میں نے کھانا کھاتے ہوئے کہا۔

"ہاں... اسے کیا ہو سکتا ہے۔"

"اس کی وجہ سے ہمیں بہت کچھ ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

میں نے اُسے بتا دیا ہے۔" جولی نے کہا۔ "کہ وہ خاموش رہے اور ہم سے تعاون کرے تو اُسے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ ہم اُسے مہمان بنا کے رکھیں گے اور اس کے ہر آرام کا خیال بھی رکھیں گے مگر اس نے شور ہنگامہ کیا تو ہم سب کے لیے اُسے پاگل قرار دینا مشکل نہیں۔ ہم دنیا کو یقین دلا سکتے ہیں کہ اس کا ذہنی توازن درست نہیں... اس نے یہ بات سمجھ لی اور اب خاموش ہے۔"

"ویری گڈ جولی... [illegible] داری سنبھال کے تم نے ہمارا بوجھ بہت کم کر دیا ہے۔" میں نے کہا۔

"کیا وہ ہر جگہ ہمارے ساتھ ہی جائے گی؟" جولی نے کہا۔

"نہیں... مجھے امید ہے کہ بہت جلد سراج اسے لے جائے گا۔" میں نے کہا۔

"وہ خود آئے گا یہاں؟" جولی نے ایسے کہا کہ ہم سب ہنس پڑے اور جولی خفیف ہو گئی۔

"سراج اپنی ماں کو لے جائے گا تو کچھ دے کر بھی جائے گا۔" محسن نے اُسے سمجھایا۔ "دیکھنا یہ ہے کہ وہ کیا دیتا ہے۔"

محسن نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ "پونے بارہ بجنے والے ہیں۔" وہ بولا

"ہاں... بیس منٹ ہیں بارہ بجنے میں۔" غالب نے کہا۔

"ہم ایک کام سے جا رہے ہیں۔" محسن بولا۔ "ایک گھنٹے میں لوٹ آئیں گے۔"

"ایسے نہیں۔" غالب نے کہا۔ "صاف بتا کے جاؤ کہ کہاں جا رہے ہو۔"

"رابعہ سے بات کرنے۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" غالب نے کہا۔ "نازو کو میرا سلام نیاز کہنا۔"

"ٹانگ ٹھیک ہو گئی مگر دماغ خراب ہو گیا۔" محسن نے افسوس سے سر ہلا کے کہا۔ "رابعہ کہو تو نازو سمجھتا ہے۔"

"یار د... اپنا دل بھی مجبور ہے۔" غالب نے سرد آہ بھر کے کہا۔ "جو تم کو رابعہ سے کہنا ہے وہی مجھے نازو سے کہنا ہے۔ جب اپنی کہو تو میری بھی کہہ دینا" یہ سمجھتے ہوئے کہ غالب سوختہ جاں اسس

بُتِ طناز سے ہمکلام ہے۔"

"ایسی دردناک باتیں مت کرو دوست... ہم سب فراق کی آگ میں ایک ساتھ اور ایک سے جل رہے ہیں۔"

میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور سڑک پہ لے آیا۔ دوسری جانب ہوٹل کی رونق تھوڑی سی ماند پڑ گئی تھی۔ اب بیشتر لوگ چارپائیوں پر سو رہے تھے اور ٹرکوں کی قطار بھی لمبی نہیں رہی تھی۔

"میں نے یہاں آتے ہوئے ایک تجرباتی فارم دیکھا تھا۔" محسن نے کہا۔ "محکمۂ زراعت کا بورڈ لگا ہوا تھا۔"

"کیا وہاں کوئی تجربہ کرنے کا خیال ہے؟" میں نے کہا۔

"وہ جگہ قریب ہے۔" محسن بولا۔ "باہر سے تو اجاڑ لگتی تھی مگر وہاں ٹیلی فون ہو سکتا ہے۔"

محسن کا خیال درست تھا۔ تقریباً آدھا میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد میں نے سڑک کے کنارے ایک پرانا بورڈ دیکھا جو اس حد تک پیچھے جُھک گیا تھا کہ خاردار تاروں کی باڑھ کے سہارے [illegible] ت کا نام سب سے اوپر تھا۔ نیچے "سیڈ پیتھالوجی لیبارٹری" لکھا ہوا تھا۔

"سیڈ پیتھالوجی؟" محسن نے حیرانی سے کہا۔ "یہاں کیا ہوتا ہے؟"

"غالباً بیج ٹیسٹ ہوتے ہیں۔ اور کچھ بھی نہ ہوتا ہو تو ایک دفتر کا نام تو چلتا ہے۔ کسی کو سرکار کے خزانے سے کچھ کرنے کی تنخواہ تو ملتی ہوگی۔ وہ کچھ کرے یا نہ کرے ایسے بہت سے عہدے اور دفاتر کسی اسامی کو کھپانے کے لیے بنائے جاتے ہیں۔"

"میرے ڈیڈی نے بھی ایک واقعہ سُنایا تھا۔ محکمۂ زراعت ہی کے کوئی سیکرٹری تھے یا ڈپٹی سیکرٹری۔" محسن بولا۔ "ان کے کسی بھانجے بھتیجے نے ایم ایس سی کے بعد بے روزگاری سے تنگ آ کے ٹیکسی چلانے کا فیصلہ کیا تھا اور بڑا اچھا فیصلہ کیا تھا مگر مذکورہ سیکرٹری صاحب کو اپنی ناک کی فکر لاحق ہو گئی کہ لوگ کیا کہیں گے کہ ان کا وہ بھانجا بھتیجا ٹیکسی ڈرائیور ہے۔ حالانکہ موصوف خود ایک نمبر کے راشی اور بدعنوان تھے مگر انھیں کسی کا محنت کر کے حق حلال کی روزی کمانا اپنی بے عزتی محسوس ہوا۔ انھوں نے ایک ایسا ہی عہدہ اور محکمہ ایجاد کیا۔ کوئی تجرباتی فارم یا لیبارٹری وغیرہ قائم کرنے کی ضرورت پیدا کی جو ایجاد کی ماں ہوتی ہے منظوری ملتے ہی ایک قطعۂ زمین پر ایک کمرے کا دفتر بنایا گیا۔ ایک مالی رکھا گیا۔ فرنیچر اور ساز و سامان خریدا گیا۔ سالانہ بجٹ میں اخراجات کا تخمینہ شاید تین لاکھ بتایا گیا تھا۔ اس میں ریسرچ کا سامان، ایک افسر، ایک ماتحت کلرک اور ایک چپراسی کی تنخواہ شامل تھی اور ذاتی ضروریات کے لیے ٹائپ رائٹر، ٹیلی فون وغیرہ بھی شامل کیے گئے اس بے روزگار شخص کو ریسرچ آفیسر بنا کے بٹھایا گیا اور ظاہر ہے کہ کام

تو تھا نہیں۔ سب فضول قسم کی کاغذی کارروائی کے نام پہ عیش کرتے تھے۔"

"کیا اب اندر چلیں؟" میں نے کہا۔ اگر محسن نے اپنے مرحوم والد انکل شیروانی کا حوالہ نہ دیا ہوتا تو اس وقت میں یہ قصہ اتنے ضبط و تحمل سے نہ سُنتا۔ میرے اپنے دل کی کیفیت ایسی تھی کہ تاخیر اور انتظار کا ہر لمحہ مجھ پہ اب بھاری ہو گیا تھا، جب کہ رابعہ سے نصف ملاقات کا خیال پوری طرح میرے اعصاب پر سوار ہو گیا تھا۔

خاردار تاروں کی باڑھ اس بورڈ کے دونوں جانب سو سوا سو گز تک پھیلی ہوئی تھی۔ بورڈ کے ساتھ ہی ایک کچا راستہ اندر جا رہا تھا اور اگرچہ وہاں دوسرا بورڈ یہ اعلان کر رہا تھا کہ بلا اجازت اندر آنے والے کو حوالۂ پولیس کیا جائے گا مگر وہاں راستہ روکنے والا ہی کوئی نہ تھا۔ گاڑی کو اندر موڑتے ہی میں نے سائڈ لائٹس آف کر کے انجن کو تھوڑا سا چلایا اور پھر نیوٹرل کر دیا۔ گاڑی اپنے ہی زور میں کسی آواز کے بغیر چلتی ہوئی اس دو کمروں کی مختصر سی عمارت تک پہنچی جو اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ میں نے نیچے اتر کے چند سیکنڈ انتظار کیا کہ کوئی ہم سے کچھ پوچھے مگر وہاں تو چاروں طرف مختصر تجرباتی نوعیت کے کھیت تھے جن کو کیاری کہنا زیادہ مناسب ہوگا یا گملوں میں لگے ہوئے پودے تھے۔ اس جگہ کو دفتر سے زیادہ نرسری سمجھا جا سکتا تھا۔

برآمدے میں ایک شکستہ کرسی پڑی ہوئی تھی اور وہیں ایک سوئچ بورڈ تھا۔ میں نے اوپر دیکھا تو مجھے چھت میں ٹین کے شیڈ والا بلب بھی نظر آیا اور میں نے بٹن دبا کے اُسے روشن کر دیا۔ محسن نے اُسے فوراً بُجھا دیا۔ اگر وہاں کوئی ہوتا تو اتنی روشنی کا الارم بھی کافی تھا لیکن دو منٹ بعد بھی کوئی نہ پہنچا تو میں نے شیشے کے پینل والے دروازے کو دیکھا۔ اس میں بہت مضبوط قسم کا تالا پڑا ہوا تھا۔ اوپر سینئر سائنٹفک آفیسر کے نام کی تختی تھی۔

"اسے ہم آسانی سے نہیں توڑ سکتے۔" محسن نے کہا۔

"مشکل سے تو توڑ سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"توڑنے کو ہم دروازہ بھی توڑ سکتے ہیں اور دیوار توڑ کے بھی اندر جا سکتے ہیں۔" محسن بولا۔ "مگر آسان راستہ کیوں نہ اختیار کیا جائے۔"

آسان راستہ پیچھے کی طرف تھا۔ وہاں تک پہنچنے کے لیے ہمیں گملوں سے بچ بچ کے اور دیوار کے ساتھ لگ کر چلنا پڑا۔ دونوں کمروں کے پچھلے حصّے میں ایک ایک کھڑکی تھی جو زمین سے چار فٹ اوپر تھی۔ میں نے ایک تاریک شیشے پر ناک رکھ کے اندر کے اندھیرے کا جائزہ لینے کی بے سود کوشش کی۔ پھر محسن نے نیچے سے ایک ٹوٹے ہوئے گملے کا کنارا اُٹھایا اور آہستہ سے اوپر کے شیشے پر مارا۔ شیشہ اندر کی طرف گرا اور کچھ ٹوٹتے ہوئے

شیشے کی کرچیاں کناروں پہ لگی رہ گئیں۔ محسن نے انھیں احتیاط سے پکڑ کے کھینچا اور باہر پھینک دیا۔ اوپر کی چٹخنی آسانی سے کھل گئی مگر نیچے کی چٹخنی بھی بند تھی اور اسے کھولنے کے لیے نیچے والا شیشہ توڑنا ضروری تھا۔

"کون ہے؟" اچانک دوسری طرف سے کسی نے چلّا کے پوچھا۔

"غالباً چوکیدار۔" میں نے سرگوشی میں محسن کو بتایا۔ شاید وہ اندر سویا پڑا تھا۔ قفل صرف ایک دروازے میں تھا۔ دوسرے کو اس نے اندر سے بند کر لیا تھا۔ میں نے محسن کو ایک طرف جانے کا اشارہ کیا اور خود دوسری طرف گیا۔ مجھے یقین تھا کہ چوکیدار باہر ضرور نکلے گا۔ یہاں چوری ہونے والی کوئی چیز نہیں تھی اور جو بھی تھا سب سرکاری مال تھا، جو کسی کے کام نہیں آ سکتا تھا۔ وہ سوچنے پر مجبور ہو گا کہ کسی نے شیشہ کیوں توڑا۔ باہر نکلتے ہی اُسے مائیکرو ولس دکھائی دے گی اور اس پہ لکھا ہوا کسی سرکاری محکمے کا نام تو وہ پریشان ہو گا کہ آدھی رات کو یہاں کون سرکاری کام سے آ گیا۔

چوکیدار نے پہلی بار پکارنے کے بعد کچھ دیر جواب کا انتظار کیا تھا اور دوبارہ زیادہ بلند آواز میں پوچھا تھا کہ "کون ہے؟" پھر شاید اس نے کچھ وقت ٹوٹے ہوئے شیشے سے باہر جھانکنے میں صرف کیا اور اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ہمیں پھر سامنے کے حصّے میں پہنچنے کی مہلت مل گئی۔ دروازوں کے پیچھے اب لائٹ نظر آ رہی تھی۔ میں اور محسن دیوار سے چپک کے کھڑے ہو گئے۔ چوکیدار جیسے ہی کنڈی کھول کے باہر نکلا، اس کی نظر نے سفید مائیکرو ولس کو دیکھا۔ وہ ایک قدم آگے بڑھا اور میں نے پیچھے سے اس کے مُنہ پہ ہاتھ رکھ کے اُسے دبوچ لیا۔ وہ جوان آدمی تھا چنانچہ اُسے گھسیٹ کر اندر لے جانے کے لیے مجھے سخت جدوجہد کرنی پڑی۔

"خبردار جو آواز بھی نکالی۔" میں نے آواز اور لہجہ بدل کے کہا۔ "تمھیں کوئی نقصان نہیں ہو گا... اگر تم نے تعاون کیا۔"

وہ انکار میں گردن ہلانے لگا۔ ابھی تک اس نے نہ میری صورت دیکھی تھی اور نہ محسن کی۔ میں نے اُسے دبوچتے ہی اس کا چہرہ دوسری جانب کر دیا تھا اور اسے کمرے کے اندر کی طرف دیوار کے ساتھ لگا دیا تھا۔ محسن نے اِدھر اُدھر دیکھا اور ایک کونے میں لگے ہوئے میلے چکیلے بستر کی چادر سے بالشت بھر چوڑی پٹی اتار لی۔ اسے دُہرا کر کے اس نے چوکیدار کی آنکھوں پہ باندھ دیا۔ اس وقت میں بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ ہمارے چہرے نہ دیکھے۔ جیسے ہی میں نے اپنی گرفت ڈھیلی کی وہ تیزی سے پلٹا مگر اس سے پہلے کہ وہ چلّاتا میں نے اس کے کان کے نیچے کھڑی ہتھیلی کا ہلکا سا وار کیا۔ وہ لڑکھڑایا اور نیچے گر گیا۔ ان دو کمروں کے ساتھ کوئی باتھ روم ہوتا تو ہم اُسے بے ہوش نہ کرتے۔ اُسے باندھ کے اند

اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کے اندر ڈال دیتے۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ وہ ہماری گفتگو سنے اور وہ کمرے میں رہتا تو ظاہر ہے، سب سنتا۔

اب میں نے اس کمرے کا جائزہ لیا۔ اس میں ایک میز کرسی تھی میز پر بہت خوب صورت رائٹنگ سیٹ تھا جو کسی کھاد بنانے والے کارخانے کا تحفہ تھا۔ ان کا مونوگرام ہر چیز پر کندہ تھا۔ اس کے علاوہ ایک ٹیلی فون تھا جو ایک چھوٹے سے لکڑی کے باکس میں آدھا مقفل تھا۔ آدھا اس طرح کہ گھنٹی بجنے پر ریسیور اٹھایا جا سکتا تھا مگر نمبر ملانے والے ڈائل تک رسائی ڈھکنا کھولے بغیر ممکن نہ تھی۔ یہ سرکاری افسران کی مخصوص ذہنیت کا ایک نمونہ تھا۔ وہ خود تمام دن دوستوں سے گپ لگاتے رہیں یا بیویوں اور محبوباؤں کو بے وقوف بناتے رہیں نچلے درجے کے چپکیدار کو رات کے وقت ہنگامی ضرورت میں بھی فون کا 'ناجائز' استعمال نہیں کرنے دیتے۔

دوسرے کمرے میں چاروں طرف الماریاں تھیں اور شیشوں کے پیچھے ہر ایک میں مرتبانوں کی قطار تھی۔ ہر مرتبان پر گندم، چاول اور دوسری اجناس کے بہت مشکل نام لکھے ہوئے تھے۔ نمبر پڑے ہوئے تھے اور اقسام کی درجہ بندی کے کوڈ تھے۔ دیوار کے ساتھ ساتھ اسٹینڈ جیسی میز تھی جس پر بہت سی شیشیاں ٹیسٹ ٹیوبس اور ایسی چیزیں پڑی ہوئی تھیں جو لیبارٹری کے سوا کہیں نظر نہیں آتیں۔ دیواروں پر مختلف اجناس اور زرعی فصلوں کے چارٹ گراف اور اعداد و شمار یہ ظاہر کرتے تھے کہ یہاں واقعی کام ہوتا ہے۔

محسن نے تالے کو گھما کے توڑنا چاہا تو وہ کنڈی الگ ہو گئی جس میں تالا پڑا ہوا تھا۔ محسن کرسی پر بیٹھ گیا اور میں نے میز پر بیٹھ کے نمبر ملانا شروع کیے۔

"تیرا ہاتھ کانپ رہا ہے۔" محسن نے مجھے اطلاع دی۔

"میرا دل بھی کانپ رہا ہے۔" میں نے کہا اور کراچی کی لائن کلیئر کرنے کے لیے بار بار وہی نمبر گھماتا رہا یہاں تک کہ ایک کلک کے بعد مجھے کوئی بزی ٹون سنائی نہ دی۔ اس کے بعد میں نے رابعہ کا دیا ہوا نمبر ملایا۔ گھنٹی ایک بار... دو بار... تین بار بجی... پھر کسی نے ریسیور اٹھالیا۔

"ہیلو..." میں نے چند سیکنڈ انتظار کرنے کے بعد کہا۔ میرے دل کے دھڑکنے کی رفتار یکلخت اتنی بڑھ گئی تھی کہ اس کی دھمک میرے وجود کو مرتعش کرنے لگی تھی۔ "ہیلو..." میں نے مسلسل خاموشی سے گھبرا کے کہا۔

"سکندر..." ایک آواز آئی... ہلکی سی... جذبات کے گلوگیر جالوں میں لپٹی ہوئی۔ بوجھل سانسوں کے ہمرکاب... خوابوں اور خیالوں کے دشتِ امکان سے پرے کسی شہرِ طلسمات کے ویران حصاروں میں مقید۔ اس نے سوتے سوتے آنکھیں کھول کے مجھے پکارا اور سیکڑوں میل کی مسافت طے کر کے رابعہ کی آواز تے... جو برقی مقناطیسی لہروں میں ڈھل گئی تھی، ٹیلی فون کے تاروں سے گزر کے پھر اصل آواز کا روپ دھارا اور میرے کانوں میں جیتی جاگتی صدا بن کے اتر گئی۔

"رابعہ!" میں نے چلا کے کہا۔ "یہ تم ہو... رابعہ تم...!" میری آواز میرے حلق میں پھنس گئی... میں بھول گیا کہ مجھے کیا کہنا تھا۔ کہنے کو بہت کچھ تھا۔ دورِ ہجراں کے ان گنت لمحوں کے فسانہ ہائے طول و طویل۔ دل فرقت زدہ پر بیتنے والے تمام صدموں کا حساب بے خواب راتوں کی ہر ساعتِ دلدار کا حال۔ امیدوں کی ناامیدی کے افسانے اور ناامیدی کو سہارا دینے والی ہر امید کی کرن کا احوال۔ چاہت کے ہر جذبے کی سخت جانی کی داستان... یادیں... وعدے... خواہشیں... کئی صدیوں کے قصے۔

محسن نے مجھے جھنجوڑا۔ "سکندر... پاگل مت بن... بات کر رابعہ سے۔"

"سکندر..." رابعہ نے کہا۔ "تم رو رہے ہو...؟" اور میں نے دیکھا کہ آنسو اس کی آنکھوں کی شفاف جھیلوں سے قطرہ قطرہ اس کے رخساروں کے چمن زار میں ٹپک رہے ہیں۔

"میں... نہیں تو..." میں نے آنسوؤں کے درمیان ہنس کے کہا۔ "رو تو تم رہی ہو۔"

"جھوٹ..." وہ بولی۔ "جھوٹ تم بھی بول رہے ہو... مجھ سے۔" اور اس کی ہنسی نے مجھے شرمسار کیا۔ "بہت دیر کی تم نے... میں ساڑھے گیارہ بجے سے انتظار کر رہی تھی... دیکھو وقت کیا ہوا ہے۔"

"وقت... ہاں... آدھی رات گزر چکی ہے... صبح ہو گئی ہے نا؟" میں نے گھڑی کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"نہیں سکندر... رات ابھی آدھی گزری ہے۔" وہ بولی۔ "خود کو فریب دینے سے کیا حاصل کہ رات کے بارہ بجے سے صبح شروع ہو جاتی ہے نئے دن کی۔"

"ایسا مت کہو... دیکھو رابعہ... یہ آدھی رات نہیں، آدھی صدی تھی جو میں نے انتظار کی سولی پر کاٹ دی۔" میں نے کہا۔ "مجھ سے مت کہو کہ ابھی آدھی رات باقی ہے... مجھے بتاؤ تم کہاں ہو...! میں پر لگا کے تو نہیں پہنچ سکتا مگر اڑ کے آ سکتا ہوں۔"

"یہ مشکل ہے سکندر..."

"سب کچھ ممکن ہے میرے لیے۔" میں نے کہا۔ "وقت میری گرفت میں ہے اور میں تم کو دیکھ سکتا ہوں... اس تار کے دوسرے کنارے پر... جہاں ہو، بس وہیں بیٹھی رہو... میں اس تار کے سہارے آجاتا ہوں..."

"نہیں سکندر... ابھی نہیں..."

"ابھی نہیں؟ یہ کیا کہہ رہی ہو تم...؟" میں نے کہا۔

"تم یہاں نہیں آسکتے۔" وہ بولی۔

"اچھا تو تم آجاؤ" میں نے چلا کے کہا۔ "سنو... تم لاہور آجاؤ" اور وہیں پہنچ جاؤ۔"

"سکندر... یہ سب اتنا آسان نہیں ہے۔" رابعہ نے کہا۔

"کیوں؟ کون حائل ہے اب تمہارے اور میرے بیچ میں؟"

"وقت۔" رابعہ نے کہا۔

"وقت کوئی سمندر نہیں ہے... کوئی دیوارِ زنداں نہیں ہے۔ وقت تو ارادوں کا غلام ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے بتاؤ کہ تم کہاں ہو؟"

"میں یہاں کراچی میں ہی ہوں۔" وہ بولی۔ "اور بالکل خیریت سے ہوں..."

"پھر کیا بات ہے؟"

"کوئی بات نہیں۔" وہ ہنسی۔ "تم سناؤ کیا بات ہے...؟"

"رابعہ... یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔" میں نے پھر چلا کے کہا۔ "مجھے بتاؤ کہ تم کہاں ملو گی؟"

"میں بتا چکی ہوں کہ ابھی میں تم سے نہیں مل سکتی۔"

"لیکن کیوں؟" میں نے چیخ کر کہا۔

"سکندر... تم ٹھیک ہو نا...؟" رابعہ نے کہا۔ "محسن کیسا ہے اور..."

"میں پوچھ رہا ہوں کہ تم سے ملنا کیوں ممکن نہیں... میں کیوں نہیں آسکتا اور تم کو کس نے روکا ہے؟" میں نے کہا۔

"ہے کوئی مجبوری۔" وہ افسردگی سے بولی۔

"مجھے بھی نہیں بتاؤ گی؟" میں نے کہا۔ "کیا تم کسی کی قید میں ہو؟"

"نہیں..."

"رابعہ، تم مجھے پاگل کر دو گی...!" میں نے برہمی سے کہا۔ "آخر یہ کیا لفظوں میں بات کر رہی ہو... مجبوری کی بات بھی کرتی ہو اور آزادی کی بھی... جب قید میں نہیں ہو تو پھر نہ آنے اور نہ ملنے کا کیا سوال۔"

"سوال ہے نا..." وہ بولی۔ "ابھی صرف اتنا ہی سمجھ لو کہ مجھے اور تمھیں تھوڑا سا انتظار اور کرنا ہے... کیا تم انتظار نہیں کر سکتے؟"

"انتظار تو میں قیامت تک کر سکتا ہوں..."

"ہم انتظار کریں گے ترا قیامت تک۔ خدا کرے کہ قیامت ہو اور تو آئے۔" محسن نے زور سے کہا۔

"یہ محسن کی آواز تھی نا...؟" رابعہ بولی

"گولی مارو محسن کو... مجھے بتاؤ کہ یہ کیا چکر ہے؟" میں نے کہا۔ "کیا تمھیں یہ سلوک زیب دیتا ہے... جو تم میرے ساتھ کر رہی ہو؟"

"کیا تمھیں اعتماد نہیں ہے مجھ پر...؟"

"مجھے؟ عدم اعتماد کا مظاہرہ میں کر رہا ہوں؟" میں نے برہم ہو کے کہا۔ "تم کچھ چھپا رہی ہو مجھ سے۔"

"یہی تو تمھارا عدم اعتماد ہے۔" رابعہ بولی۔ "جب میں کہہ رہی ہوں کہ میں کچھ نہیں چھپا رہی ہوں... تو تم کو مان لینا چاہیے کہ ایسا ہی ہے اور اگر تم نہیں مانتے تو اس کا مطلب ہے تمھارا اعتماد مجھ پر سے اٹھ گیا ہے... تم یہ سمجھنے لگے ہو کہ میں بھی تم سے جھوٹ بول سکتی ہوں؟"

"دیکھو رابعہ..." میں نے بے بسی سے کہا۔ "یہ ناممکن ہے... کہ میں خود پر اعتماد نہ کروں... مگر تم کو کیا عار ہے بتانے میں؟"

"میں صرف انتظار کرنے کو کہہ رہی ہوں... تم اتنے کچے تو کبھی نہ تھے اپنے یقین میں۔" وہ بولی۔ "یہ کیا ہو گیا ہے تمھیں؟"

"معلوم نہیں... کیا تم جانتی ہو؟ جانتی ہو تو مجھے بتاؤ کہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔" میں نے کہا۔ "اور تم اتنی بے رحم کیوں ہو گئی ہو... صرف اپنی آواز سنانے کے لیے آئی ہو...؟"

"تصور میں تو میں تمھارے ساتھ ہوں... جیسے تم میرے ساتھ ہو... کبھی دن رات کے کسی بھی لمحے میں ہم جدا نہیں ہوئے۔" وہ مجھے سمجھانے لگی۔ "جدائی تو نام ہے وقت اور فاصلوں کو درمیان میں محسوس کرنے کا اور اگر یہ احساس نہیں تو پھر میرے یہاں اور تمھارے وہاں ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑنا چاہیے۔ یا تم سمجھتے ہو کہ محبت نام ہے... جسمانی طور پر یکجا ہونے کا... اور یہ محبت آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل کی طرح..."

"خدا کے لیے مجھے ایسا افلاطونی محبت کا فلسفہ مت پڑھاؤ... میں صرف تمھارے خیال سے محبت کر کے زندہ نہیں رہ سکتا کیونکہ میں گوشت پوست کا بنا ہوا جیتا جاگتا انسان ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں تمھیں اپنے سامنے دیکھنا چاہتا ہوں۔ صرف تمھارے تصور سے میں نہیں بہل سکتا۔ دیکھو، یہ محبت وہ پودا ہے جس کو ہم نے مل کے پروان چڑھایا... جیسے سورج کی روشنی اور ہوا اور زمین کی مٹی، ان سب عناصر کا یکجا ہونا ضروری ہے۔ ان میں سے ایک بھی نہ ہو تو پودا جی نہیں سکتا... ایسے ہی محبت ایک مادی وجود بھی رکھتی ہے... اسے زندہ رہنے کے لیے میں اور تم اور ہمارے جذبات... سب ضروری ہیں... تمھاری عدم موجودگی میں میرا وجود ادھورا رہ جاتا ہے۔"

"سکندر... افسوس یہ ہے کہ تم جذبات کی دھند میں عقل

کا راستہ گم کر بیٹھے ہو۔" وہ بولی۔" میں نے کہا نا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ وہ کیا کہتے تھے تم... کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں، کب ہاتھ میں تیرا ہاتھ نہیں... صد شکر کہ اپنی راتوں میں اب ہجر کی کوئی رات نہیں۔"

" اچھا رابعہ... مجھے یہ تو بتادو کہ تم وہاں کیا کر رہی ہو؟ ایم آر ایس کے مشن سے الگ تمہاری کیا مصروفیت ہے اور کیا مجبوری ہے؟" میں نے کہا۔

"ایم آر ایس تو میرا اور تمہارا مشن ہے جو بالآخر ختم ہو جائے گا، لیکن اس کے بعد بھی زندگی کی طویل مسافت ہے... یہ مشن تو ایسا ہی ہے جیسے راستے کو وقتی طور پر اوپر سے ٹوٹ کر گرنے والی چٹانیں یا پھسل کر نیچے آنے والے برفانی تودے روک دیتے ہیں۔ انھیں صاف کرنے کے لیے رُکنا پڑتا ہے اور انتظار بھی کرنا پڑتا ہے۔ مگر اس رکاوٹ سے نہ راستہ بدلتا ہے اور نہ منزل بدلتی ہے... تم بالکل مطمئن رہو... میں نہ کسی کی قید میں ہوں اور نہ مجھے کوئی ایسی پریشانی لاحق ہے۔ نہ میں ذہنی طور پر بیمار ہوں اور نہ جسمانی طور پر... متفکر تو میں صرف تمہاری طرف سے رہتی ہوں۔ لیکن مجھے اپنی دعاؤں پر پورا بھروسا ہے۔ خدا مجھے یقین دیتا ہے اور مایوسی سے بچاتا ہے..." رابعہ نے کہا۔" آئندہ بھی میرے لیے سرمایۂ حیات یہی اعتقاد اور ایمان ہو گا..."

" رابعہ... خدا کے لیے یہ بتاؤ کہ تم کس کے ساتھ ہو...؟ " میں نے کہا۔" اگر میں کراچی آؤں تو تم سے کیسے ملوں... ہم سب بہت جلد پہنچنے والے ہیں۔"

" تم اسی نمبر پر فون کر دینا۔" وہ بولی۔" اس سے اگلی رات میں تمھیں فون پر منتظر ملوں گی... اسی وقت..."

" آدھی رات کو؟ یہ کیا تک ہے آخر...؟"

" یہ احتیاط کے تقاضے ہیں..." وہ بولی۔

" مگر یہ فون نمبر کس کا ہے؟" میں نے کہا۔

" اس پر تو کوئی نمبر بھی نہیں لکھا ہوا ہے۔" وہ بولی۔" نام کس کا ہے... مجھے کیا معلوم۔"

" پھر تم کو کس نے بتایا...؟ وہ کون تھا جس نے میرا پیغام تم تک پہنچایا تھا؟" میں نے کہا۔" جس سے کل میری بات ہوئی تھی۔"

" وہ ایک اچھا آدمی ہے... دوست..."

" اس اُلّو کے پٹھے کا نام بھی ہو گا کوئی... ایکس وائی زیڈ۔ وہ بات مت کرنا شیکسپیئر والی کہ نام میں کیا رکھا ہے۔" میں نے چلاتے ہوئے کہا۔

" اُفوہ... بھئی نام ہی تو بتا رہی تھی... دوست محمّد نام ہے اس کا اور وہ بھی ہمارے ساتھ ہے۔" رابعہ نے کہا۔

" یہ تو میں معلوم کر لوں گا کہ نمبر کس کا ہے۔" میں نے کہا۔

" اس سے تمھیں کوئی خاص فائدہ نہیں ہو گا۔" وہ بولی۔ " یہ سرکاری نمبر ہے... ایک دفتر کا... وہاں وہ رات کے وقت موجود ہوتا ہے۔"

" تو میں معلوم کر لوں گا کہ وہ دفتر کہاں ہے۔" میں نے کہا۔

" تم کو وہاں تک پہنچنے کوئی نہیں دے گا۔ اور ویسے بھی تمھارا اس جگہ تک پہنچنا مشکل ہے۔"

" مشکل ہی ہے نا... ناممکن تو نہیں..."

" دیکھو، میں ساری رات تم سے باتیں نہیں کر سکتی... میرا یہاں آنا بھی خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔" وہ بولی۔" دوست محمد نے کہا ہے کہ جب تک کسی کو شک نہ ہو، یہ رابطہ چلے گا۔ اس کے بعد وہ کوئی دوسری صورت نکال لے گا..."

" کیا تم دوست محمد کے ساتھ ہو؟ اس کے گھر میں۔"

" یہی سمجھ لو۔" رابعہ ہنسی۔" رقابت میں جلنے مت لگنا... وہ میرے باپ کی عمر کا آدمی ہے۔ اس کے دو جوان بیٹے کینیڈا میں ڈاکٹر ہیں... دو امریکا میں، اور سب شادی شدہ ہیں۔ یہاں وہ اکیلا ہے۔"

" بیوی تو ہو گی؟"

" نہیں، وہ بچّوں کے پاس رہتی ہے۔ کبھی امریکا میں کبھی کینیڈا میں۔ لڑکے بھی باپ کو خبطی سمجھنے لگے ہیں۔ بُلا بُلا کے تھک گئے... بہت سمجھاتے ہیں کہ اب آرام کریں اور عیش کریں... لیکن وہ ہے ہم سب کی طرح... کہتا ہے کہ میں وطن کو چھوڑ کے کہاں جاؤں اس عمر میں... صرف عیاشی کے لیے اور آرام کی خاطر ترکِ سکونت کروں؟ یہ تو ایسا ہی ہو گا جیسے کوئی ماں کو چھوڑ دے... اور وہ بھی صرف پیسے کے لیے... خود اس کی بیوی ایک زمانے میں ناقابلِ یقین حد تک خوب صورت تھی۔ اس نے مجھے تصویریں دکھائی ہیں۔ شادی کے سال بھر بعد اس کے جسم پر دھبّے سے نمودار ہوئے۔ علاج کے باوجود ... کا اور آدھے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ وہ کہتا ہے کہ اس وقت کیا میں بیوی کو چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ طلاق دینا تو ہمارے معاشرے میں مرد کے لیے کوئی مسئلہ نہیں۔ میں کسی دوسری لڑکی سے شادی کر لیتا جو خوب صورت ہوتی۔ مگر یہ شادی تو نہ ہوتی۔ خوب صورتی کا سودا ہوتا۔ صرف ظاہری خوبصورتی کا اور میرے اپنے وجود کی بدصورتی اس سے ظاہر ہوتی۔ پھر میں اپنے ملک سے زیادہ خوب صورت یا خوش حال ملک میں کیوں جاؤں۔ جہاں لاکھ آرام سہی، آسائش سہی... ہزار خوبیاں سہی... لیکن میرے وطن کا اس سے کوئی مقابلہ نہیں مگر یہ معاملہ جذبات کا ہے۔ مادّی اقدار کا نہیں... وہ ریڈیو آفیسر تھا... آرمی سگنل کور میں تھا۔ اسکول آف سگنل راولپنڈی کے کورس کیے۔ پھر حالات ایسے ہو گئے کہ اُسے ریلیز لینی پڑی۔ بارہ سال تک وہ ایک حادثے کے نتیجے میں یادداشت سے محرومی کا شکار رہا۔ دعا اور دوا سے بالآخر وہ ٹھیک ہو گیا۔ جو کچھ اس کے ذہن میں تھا، رفتہ رفتہ اُسے واپس مل گیا۔ اس نے ریڈیو آفیسر کا کورس کیا اور شاندار کامیابی حاصل کی۔ اب وہ ایک ایکسپرٹ ہے۔ ریڈیو انجینئرنگ میں... ریڈیو ریسیور اور ٹرانسمیٹر اس کے لیے کھلونے ہیں۔ وہ مرچنٹ نیوی... پرائیویٹ شپنگ کمپنیوں اور مواصلاتی اداروں کے لیے کام کرتا ہے۔ معاہدے کی بنیاد پر۔ لیکن پاکستان نیوی کے لیے بھی اس کی خدمات مستعار لی جاتی ہیں۔ یہ کام وہ رضاکارانہ طور پر کرتا ہے۔ پیسہ وہ جتنا چاہے لے سکتا ہے۔ لاکھوں کے حساب سے۔ مگر صرف اتنا ہی لیتا ہے جتنا اس کی ضروریات کے لیے کافی ہو۔ لوگ اسے کریک سمجھتے ہیں۔ سب اپنا کام نکال لیتے ہیں۔ اور بعض اوقات یہ بھی سمجھتے ہیں کہ بے وقوف بنا لیا۔ مگر ایسا نہیں ہے۔"

" وہ رہتا کہاں ہے؟" میں نے متاثر ہو کے کہا۔" تم کو کہاں ملا؟"

" ایسے ہی مل گیا... جیسے ہم سب ملے..." رابعہ نے کہا۔" گھر اس کا کوئی نہیں ہے... وہ سمندر کو اپنا گھر کہتا ہے۔"

" تم... پھر چھپا رہی ہو نا... آخر وہ آدمی کا بچہ ہے۔ مچھلی کا بچہ تو نہیں ہے نا کہ سمندر میں رہتا ہو۔" میں نے کہا۔

رابعہ ہنسنے لگی۔" میں سچ بتا رہی ہوں۔ وہ کبھی ایک لانچ پہ ہوتا ہے تو کبھی دوسری پہ۔ بحری جہاز پر کبھی ایک جگہ تو کبھی دوسری جگہ... جہاز تو آتے جاتے رہتے ہیں نا... سب جانتے ہیں اُسے اور وہ کہیں بھی سو جاتا ہے۔ جہاں چاہے کھا لیتا ہے۔ یہ نہیں کہ شہر نہیں جاتا۔ وہ ٹاپ کلاس ہوٹلوں میں بھی نظر آتا ہے، اور پہچانا جاتا ہے۔ اس کی ایک پرانی کار بھی ہے جو عموماً ساحل پر کھڑی رہتی ہے اور جب اسٹارٹ کرنے کا وقت آتا ہے تو اسے دھکا لگانا پڑتا ہے یا پٹرول ڈالنا پڑتا ہے۔ عجیب قلندر آدمی ہے۔ پینتالیس سال کی عمر ہے مگر جوانوں سے زیادہ جوان اور زندہ دل ہے۔"

" اب بھی تم کہتی ہو کہ میں اس کے خلاف رقابت کے جذبات نہ رکھوں۔" میں نے کہا۔" ویسے کیا تم بھی اس کے ساتھ ساتھ پھرتی ہو؟"

وہ ہنسی۔" ہاں... ابھی تو ایسا ہی ہے..."

" لوگ کیا سمجھتے ہیں تمھیں اور اُسے ساتھ دیکھ کر...؟"

" وہی جو سمجھنا چاہیے۔" رابعہ نے کہا۔

" ایک جوانوں سے زیادہ جوان اور زندہ دل آدمی کے ساتھ ایک ایسی خوب صورت عورت ہو تو...؟"

" بکو مت... اس نے سب کو بتا دیا ہے کہ یہ میری بیٹی ہے اور میرے بیٹوں سے زیادہ قابلِ فخر ہے۔" رابعہ نے کہا۔" اب میں نے تم کو اتنی تفصیل سے اس کے بارے میں بتا دیا۔ تم کو میری فکر بالکل نہیں کرنی چاہیے۔"

" ٹھیک ہے رابعہ... لیکن بہت جلد ہم سب کراچی پہنچنے والے ہیں ایک سرکس کے ساتھ۔" میں نے کہا۔

" سرکس میں نوکری کر لی ہے؟ چلو اچھا کیا۔" وہ ہنسنے لگی۔

" سرکس قائم کیا ہے ہم نے۔ ایم آر ایس کے مشن کو آگے بڑھانے کے لیے۔" میں نے کہا۔" نورتن سرکس کمپنی۔ جس کی مالک ہے بی بی سی۔"

" یہ کیا فضول بات ہے۔ بی بی سی والے دعویٰ کر دیں گے۔"

" بی بی سی تین حروف ہیں۔ کسی کی اجارہ داری نہیں ہے ان پہ... ہمارے لیے اس کا مطلب ہے بٹ برادرز کارپوریشن۔ جس کے نام پہ ہم نے اپنی گاڑیوں کی رجسٹریشن کرائی ہے۔ ایک ٹریلر ہے اور باقی دوسری گاڑیاں۔ جب ہم کراچی میں وارد ہوں گے تو تمھیں معلوم ہو جائے گا۔ لیکن اس سے پہلے بھی تم کسی بھی وقت ہمیں تلاش کرنا چاہو تو تمھارے لیے کوئی مشکل نہیں ہو گی۔ تم کراچی سے لاہور کے راستے پہ کہیں نہ کہیں نورتن سرکس کو ڈھونڈ لو گی، ہماری شہرت ہم سے آگے ہو گی۔"

" میں جب بھی مناسب سمجھوں گی آجاؤں گی۔" وہ بولی۔ " تمھارے بہت سے کارناموں کی تفصیل میں نے اخبار میں دیکھی۔ باقی کے لیے وقت نہیں ہے۔ یہ بتاؤ کہ محسن اور شہلا... غالب اور دوسرے لوگ کیسے ہیں؟"

" محسن اور شہلا کی خیریت تو محسن سے پوچھ لینا۔ مجھے بتاؤ، نازو اور اکرام شیخ کہاں ہیں؟"

وہ بولی۔" تمھیں نہیں معلوم؟"

میں نے کہا۔" معلوم ہوتا تو تم سے کیوں پوچھتا۔ غالب کی مت پوچھو۔ اُس نے مجھ سے کہا تھا کہ اس کی طرف سے نازو کو وہ سب کہہ دوں جو اس کی اور میری حالت کی ایک سی کیفیت کی ترجمانی کرے۔"

رابعہ ہنسنے لگی۔" مگر وہ ہے کہاں جو میں غالب کی طرف سے غائبانہ اظہارِ عشق کر سکوں۔ اکرام شیخ اور نازو نے پورٹ کے علاقے میں تم سب کا انتظار کیا۔ اسی انتظار میں انھوں نے پورا مہینہ گزار دیا اور پھر اچانک غائب ہو گئے۔ دوست محمد نے معلوم کیا تو صرف اتنا پتا چلا کہ وہ کسی کارگو شپ پر کہیں گئے ہیں۔"

" کہیں کا کیا مطلب... ہر بحری جہاز ایک مقررہ راستے پر سفر کرتا ہے اور اس کی ایک منزل ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔

" مال بردار جہاز کو سنگاپور جانا تھا۔ لیکن بمبئی، کولمبو کے راستے۔" رابعہ بولی۔" اس پہ مختلف ممالک کو بھیجا جانے والا سامان تھا۔ بھارت، سیلون اور سنگاپور کی بندرگاہوں پہ اسے کچھ سامان اتارنا

تھا اور وہاں سے مزید اسباب ملنا بھی تھا۔"

"اسباب کی تفصیلات حاصل نہیں کر سکا۔ تمھارا یہ دوست؟"

"نہیں... کچھ فہرستیں ملیں... کچھ نہیں ملیں۔"

"ان کمپنیوں کے نام پتے معلوم ہوئے جنھوں نے سامان منگوایا تھا؟" میں نے کہا۔

"نہیں... سب کے نہیں۔ شپنگ ایجنٹ بتاتے نہیں تھے۔ پھر بھی کلکتہ کی دو فرمیں ہیں جنھوں نے زرعی مشینری کے پرزے برآمد کیے تھے۔ اور غالباً ان کا سامان بمبئی یا کولمبو سے کلکتہ جائے گا۔ بمبئی سے گیا تو زمینی راستے سے پہنچے گا۔ کولمبو گیا تو لانچوں سے۔ مجھے شک ہے کہ اکرام شیخ اور نازو انہی دو ناموں کا سراغ لگانے نکل گئے۔ ایک تو زرعی مشینری کے پرزے اور پھر کلکتہ کا پتا...؟"

"انھوں نے بالکل ٹھیک کیا اور تمھارا خیال بھی سو فیصد درست ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "بعد میں ان کی کوئی خبر ملی؟"

"ہاں... چھٹے دن وہ کارگو شپ غرق ہو گیا۔ افواہیں تو بہت تھیں لیکن دوست محمد نے تصدیق کی تو سب درست ثابت ہوئیں۔ جہاز پر ایک دھماکا ہوا تھا۔ جہاز کے پرخچے اڑ گئے۔ دس میل دور سے گزرنے والے ایک اطالوی جہاز کے عملے نے دھماکا بھی سنا اور شعلے بھی دیکھے۔ دھماکا رات کے وقت ہوا تھا۔ مگر اُن کے پہنچتے تک کچھ نہیں بچا تھا۔ جہاز کے ٹکڑے میلوں تک بکھر گئے تھے۔ اطالوی جہاز کے عملے کا کہنا ہے کہ اس جہاز پر کسی کے زندہ بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"اوہ مائی گاڈ...! اگر نازو اور اکرام شیخ بھی اسی پر تھے...؟"

"اگر وہ اس جہاز پر تھے تو میرا خیال ہے کہ وہی دھماکے کے ذمے دار بھی ہوں گے۔" رابعہ نے کہا۔ "اور انھوں نے دھماکا کیا ہوگا تو خود یقیناً پہلے ہی نکل گئے ہوں گے... مگر یہ کوئی مصدقہ خبر نہیں... اس کے برعکس یہی ہو سکتا ہے کہ انھیں موقع ہی نہ ملا ہو... اور ہیں تو وہ بھی تمھاری طرح سرپھرے... سربکف پھرنے والے۔"

میں کچھ دیر خاموش رہا۔ "اس کے بعد کوئی افواہ بھی نہیں سُنی تم نے؟"

"افواہیں تو سُنی ہیں۔ ایک یہ کہ اس پر انڈین نیوی نے غلطی سے راکٹ داغ دیا۔" رابعہ بولی۔ "کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اسے پاکستانی کمانڈوز کی گن بوٹ نے ڈبو دیا۔ بہرصورت اس کارگو شپ میں اسلحے اور آتش گیر مادّے کی موجودگی ثابت ہوتی ہے۔"

"یہ کتنی پرانی بات ہے؟"

رابعہ نے کہا۔ "پندرہ سولہ دن پہلے وہ جہاز غرق ہوا تھا مگر اخبارات میں کچھ نہیں آیا۔ دوست محمد کا کہنا ہے کہ اسے خود انھی لوگوں نے ڈبو دیا، جن کا مال جہاز پر تھا۔"

"یہ کیا بات ہوئی...؟"

"اس کے خیال میں وزن ہے۔" رابعہ بولی۔ "اسلحہ بھیجنے والوں نے کراچی سے دور گہرے سمندروں میں پہنچنے کے بعد اپنا مال کسی لانچ پر منتقل کیا یا کسی دوسرے جہاز پر... وہ جہاز بمبئی سے روانہ ہو چکا تھا اور کولمبو کے قریب تھا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اصل خطرناک سامان بمبئی میں اُتار کے دوسرے جہاز سے بھیج دیا گیا۔ اور پہلے والے جہاز کو ڈبو دیا گیا۔"

"پھر تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اکرام شیخ اور نازو بمبئی میں اُتر گئے ہوں۔" میں نے کہا۔

"سب کچھ ہو سکتا ہے... یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اکرام شیخ اور نازو پکڑے گئے ہوں۔" رابعہ بولی۔ "وہ اپنی شناخت نہ چھپا سکے ہوں... اور یہ بھی کہ وہ اپنا کام ختم کر کے واپس پہنچنے والے ہوں... یا پہنچ گئے ہوں۔ جب تک وہ خود رابطہ قائم کر کے کچھ نہیں بتلاتے ہم قیاس آرائیوں کے سوا کیا کر سکتے ہیں۔"

"کیا ان کا کراچی میں کوئی پتا ٹھکانا ہے؟"

"ہے تو سہی... لیکن مجھے نہیں معلوم۔" رابعہ نے کہا۔ "وہ خود ہی دوست محمد کے ذریعے رابطہ قائم کرتے تھے۔ اکرام شیخ کے ذریعے مجھے لاہور کے سارے واقعات کی خبر ملتی رہی اور وہ سب کچھ معلوم ہوتا رہا جو تم کر رہے تھے۔ ایک بات میں بھول گئی تھی۔ اس کارگو شپ کی روانگی کے دوسرے یا تیسرے دن بندرگاہ کے علاقے میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ ایک یونانی جہاز پر مال لادا جا رہا تھا کہ عملے نے ایک کریٹ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ دوست محمد یونانی جہاز کے کمیونیکیشن سسٹم پر کچھ کام کر رہا تھا۔ شور سن کے وہ باہر نکلا اور اس نے ہی مجھے یہ واقعہ سُنایا تھا۔ کریٹ پر کسی کمپنی کا پتا تھا اور شہر کا نام تھا۔ 'ایلڈ دیسٹ سی'۔"

"اور ملک کا نام دسی دانیا؟" میں نے کہا۔

"ہاں... یونانی کپتان نے کہا کہ یہ کیا بکواس ہے۔ نہ اس نام کا کوئی شہر ابھی تک آباد ہوا ہے اور نہ یہ کسی ملک کا نام ہے۔" رابعہ بولی۔ "وہ خود بلڈ پریشر کا مریض تھا۔ اس نے دوا کی شیشی نکال کے دکھا دی کہ یہ دیکھو ایلڈومیٹ یہ تو دوا کا نام ہے جو صرف ہائی بلڈ پریشر میں استعمال ہوتی ہے اور دسی دانیا کا مطلب بھی اس نے بتا دیا کہ روسی زبان میں 'خدا حافظ' یا الوداع کو کہتے ہیں۔ اس سے بڑی سنسنی پھیلی۔ کسٹم انٹیلی جنس والے آ گئے اور انھوں نے کریٹ پر قبضہ کر لیا۔ اسی وقت کسی پڑھے لکھے کرین آپریٹر نے انکشاف کیا کہ ایسے ہی بہت سے کریٹ تو کل پرسوں کسی کارگو شپ پر گئے ہیں۔ یہ غالباً رہ گیا ہوگا... ابھی یہ ہنگامہ چل ہی رہا تھا کہ ایک شخص آ گیا جس نے ظاہر کیا کہ وہ ایک پڑوسی ملک کے سفارتی عملے میں شامل ہے۔ اور وہ ہمارا دوست ملک تھا۔ چنانچہ کریٹ کو اس نے اپنی ملکیت قرار دیا اور اس کا قبضہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ مگر وہ کسٹم انٹیلی جنس والوں کو مطمئن نہ کر سکا کہ کریٹ پر یہ فرضی اور بے سروپا پتا کیوں لکھا گیا تھا۔ وہ کہتا رہا کہ ہم تفتیش کرکے بتا دیں گے مگر کسٹم والوں نے کہا کہ پہلے ہم تو تفتیش کر لیں۔ دوست محمد کا کہنا ہے کہ شام تک کسٹم والے اعلیٰ حکام سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرتے رہے مگر چھٹی کا دن تھا اس لیے واضح احکامات نہ مل سکے۔ کسٹم والوں کو کچھ ٹیلیفون بھی ملے کہ سفارتی عملے کے اس رکن کو چھوڑ دیا جائے اور اس کا سامان بھی دے دیا جائے مگر تصدیق پر وہ فون بھی بوگس ثابت ہوئے۔ اس نے شکوک میں اضافہ کیا اور کسٹم انٹیلی جنس والوں نے اس شخص کو جانے نہیں دیا۔ اس کی موجودگی میں کریٹ کھولا گیا تو اس میں سے خطرناک قسم کا اسلحہ برآمد ہوا۔ ڈائنامائیٹ، ٹی این ٹی، آتش گیر بم اور ڈیٹونیٹر۔ بارودی سرنگیں جو زیرِ زمین اور سمندروں میں بچھائی جاتی ہیں۔ اور یہ معاملہ فوراً ملٹری انٹیلی جنس تک پہنچایا گیا۔ دوست محمد کو صرف اتنا ہی معلوم ہوا کہ اس جعلی ڈپلومیٹ نے تفتیش کا آغاز ہونے سے قبل ہی خودکشی کر لی۔ اس کے دانتوں کی کسی کیوٹی میں سائنائیڈ کا پاؤڈر بھرا ہوا تھا۔"

"پھر تو شک کی بات ہی نہیں رابعہ... یہ یقینی بات ہے کہ نازو اور اکرام اسی جہاز پر چڑھ گئے جس پر باقی کریٹ لادے گئے ہوں گے اور وہی جہاز تھا جو انھوں نے غرق کر دیا۔" میں نے کہا۔ "قیاس آرائیاں کوئی کتنی بھی کرے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کارنامہ انھی دونوں نے سرانجام دیا۔"

"تمھارا یقین کس حد تک درست ہے، یہ اُن کے واپس آنے کے بعد پتا چلے گا۔" رابعہ نے کہا۔

"وہ آتے ہی تم سے رابطہ قائم کریں گے۔"

"ظاہر ہے... مجھے ان کی طرف سے کسی خبر کا شدّت سے انتظار ہے۔ اور دل تو میرا بھی گواہی دیتا ہے کہ وہ خیریت سے ہوں گے۔"

"رابعہ... اوہ استاد ٹیڈی... اس کے بارے میں تو کچھ پوچھا ہی نہیں میں نے... اور تم نے بھی نہیں بتایا۔" میں نے کہا۔

"مجھے خیال آیا تھا۔" رابعہ نے آہستہ سے کہا۔ "لیکن میں نے تو خود ہی اس کے ذکر سے گریز کیا..."

"کیوں؟" میں نے ڈوبتے دل کو سنبھالا۔

"اس کی کوئی اطلاع نہیں... میں تو قید سے نکل گئی تھی۔ مجھ سے پہلے کیتھرین فرار ہوئی تھی۔"

"ہاں... مگر وہ تو قیدِ حیات سے ہی چھوٹ گئی۔"

"کیا... ! کیتھرین مر گئی؟" رابعہ نے کہا اور میں نے اُس کے صدمے کو محسوس کیا۔

"ہاں... وہ شہید ہو گئی۔" میں نے دکھی لہجے میں کہا۔

"مگر کیسے؟... کیا چلتی گاڑی سے کودتے ہی...."

"نہیں... اس وقت وہ زندہ رہی تھی۔ بعد میں ایک براہِ راست جنگ میں وہ ولاور کے ہاتھوں ماری گئی۔" میں نے کہا۔

"استاد ٹیڈی... اس نے میری رہائی کے لیے جان کی بازی لگا دی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ رابعہ باجی... آپ جاؤ... میری خیر ہے۔ اور حالات ایسے تھے کہ اس کا جرم ثابت ہو گیا ہو گا۔ وہ میرے کپڑے پہن کے میری جگہ لیٹ گیا تھا اور اس نے مجھے چابی دے کے کہا تھا کہ جاتے ہوئے میں باہر سے تالا لگا جاؤں۔ اس نے مجھے مجبور کر دیا تھا... وہ خود کروٹ لیے پڑا رہا اور... پیچھے سے دیکھنے پر میرے کپڑوں میں وہ بالکل میری طرح لگتا تھا... وہ خود ایک محافظ کو قتل کر کے اور اس کی وردی پہن کے آیا تھا۔ وہی وردی میں نے پہنی پھر میں نکل گئی۔ ظاہر ہے یہ بات دیر تک چھپی نہیں رہی ہوگی۔ اس کے دونوں جرم بہت سنگین تھے۔ محافظ کو قتل کرنا اور مجھے فرار ہونے میں مدد دینا... کیا تم امید کر سکتے ہو کہ... اسے معاف کر دیا گیا ہوگا؟" وہ یکلخت پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ اسی وقت محسن اندر آیا۔

"رابعہ... روتی کیوں ہو۔" میں نے اپنے آنسو ضبط کر کے کہا۔ "اگر وہ زندہ ہے تب بھی ہمارے ساتھ ہے... اور نہیں ہے تب بھی... ہم سب دعا ہی کر سکتے ہیں... اور صبر کر سکتے ہیں... لو محسن سے بات کرو... میں بعد میں بات کروں گا۔" میں نے کہا اور ریسیور محسن کو دے کر باہر نکل گیا۔ کیونکہ میں اس کے سامنے رونا نہیں چاہتا تھا۔ میں ٹیڈی کے لیے رونا نہیں چاہتا تھا مگر باہر آ کے میں اپنے ہی اشکوں کے سیلاب میں بہہ گیا۔

مجھے رابعہ سے دوبارہ بات کرنے کا موقع نہیں ملا۔ ابھی اس کی اور محسن کی گفتگو جاری ہی تھی کہ لائن کٹ گئی اور دوبارہ نہیں ملی۔ چوکیدار ہوش میں آنے لگا تھا۔ میں نے اُسے دیوار کا سہارا دے کر بٹھا دیا۔

"معاف کرنا بھائی۔" میں نے کہا۔ "ہمارا ارادہ ہرگز تمھیں نقصان پہنچانے کا نہیں تھا۔ ہمیں مجبوراً ایسا کرنا پڑا۔"

"اچھی مجبوری ہے۔" وہ آہستہ سے سر کو جھٹک کے بولا۔ اس کی آنکھوں پر ابھی تک پٹی تھی۔ "آخر کیا چاہتے ہو تم لوگ؟"

"کچھ نہیں... تم سے ہمیں کچھ نہیں چاہیے۔" میں نے کہا۔ "ہمارے جانے کے بعد اچھی طرح دیکھ لینا... ہم یہاں سے ایک تنکا بھی اُٹھا کے نہیں لے جا رہے ہیں۔ دو شیشے ضرور ٹوٹے ہیں، تو شیشے ٹوٹتے ہی رہتے ہیں۔"

"شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں۔" محسن نے کہا۔

"یہ لو ایک ہزار روپے۔" میں نے اس کا ہاتھ تھام کے ہتھیلی پر نوٹ رکھے۔ "بعد میں گن لینا۔"

"لیکن... یہ کس بات کا انعام ہے؟" وہ نوٹ مٹھی میں دبا کے بولا۔ "مجھے تو دال میں کالا نظر آتا ہے۔"

"تم کو تو صرف کالا ہی کالا نظر آ رہا ہوگا۔" محسن بولا۔ "کیونکہ تمھاری آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی ہے۔ پٹی کھولو گے تو نوٹوں کے اصل رنگ کو بھی پہچان لو گے۔"

"یہ تمھارا انعام ہے... یا اس تکلیف کا معاوضہ جو ہمارے ہاتھوں تمھیں اُٹھانی پڑی۔" میں نے کہا۔ "اب ہم جا رہے ہیں۔ اگر تم خواہ مخواہ ہنگامہ کرنا چاہو تو تمھاری مرضی۔ افسرانِ بالا کو اور پولیس کو جسے چاہو رپورٹ کرو۔ وہ تمھیں سوالات سے پریشان کریں گے اور جواب میں تم کچھ نہیں بتا سکو گے کہ تم کو مار کے بے ہوش کرنے والے کون تھے اور کیوں آئے تھے۔ ہم نے ایک کاغذ تک اوپر نیچے نہیں کیا ہے۔ تم اگر بھول جاؤ کہ ہم آئے بھی تھے... تو فائدے میں رہو گے... بس پہلے کی طرح دروازے بند کر کے لائٹ بجھاؤ اور سو جاؤ۔"

"تم مجھے بے وقوف بنا رہے ہو۔" وہ بولا۔ "تم نے کچھ بھی نہیں کیا اور لیا... تو پھر آئے ہی کیوں تھے... صرف مجھے مارنے اور مارنے کے بعد معافی مانگنے اور ہزار روپے دینے کے لیے؟"

"ہم نے یہ ٹیلی فون استعمال کیا ہے۔" میں نے کہا۔

"تم مجھ سے کہتے... تو میں انکار نہ کرتا۔" وہ بولا۔

"ہمیں کیا معلوم تھا کہ تم انکار کرتے یا نہ کرتے۔ ہم تو یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ تم اندر ہو۔" محسن بولا۔ "باہر تو تالا تھا علیگڑھ والا۔"

"اس کے علاوہ۔" میں نے کہا۔ "ہم نہیں چاہتے تھے کہ تم ہماری گفتگو سنو... ایک ٹیلی فون کال کا کسی کو پتا نہیں چل سکتا۔ سرکاری ٹیلی فون ہے۔ تمھارا افسر سارا دن استعمال کرتا ہوگا۔ اس کو کچھ بتا کے پریشانی میں مبتلا ہونے سے کیا حاصل ہے؟"

"لیکن... تم کل پھر آؤ گے؟"

مجھے بے اختیار ہنسی آئی۔ "نہیں بھائی... یہ ہمارا وعدہ کہ ہم پھر نہیں آئیں گے اور آئیں گے تو تمھیں جگا لیں گے۔"

"مگر ہر بار ہزار روپے نہیں دیں گے۔" محسن بولا۔

"چلو جی آپ کی مرضی... پانچ سو روپے دے جانا۔" وہ بولا۔

میں حیران رہ گیا... لالچ بھی کیا لعنت ہے۔ "ہم پانچ سو بھی نہیں دے سکتے صرف ایک ٹیلی فون کرنے کے۔"

"ہاں سو روپے دے سکتے ہیں۔" محسن نے میرا ہاتھ دبا کے کہا۔ "سودا کرتے ہو؟"

اس نے جواب میں سر ہلایا اور ہم اسے وہیں چھوڑ کے باہر نکل گئے۔ لائٹ جلائے بغیر ہم نے گاڑی اسٹارٹ کی تاکہ وہ چاہے بھی تو ہماری نمبر پلیٹ نہ دیکھ سکے۔ اس نے ہمارے رخصت ہوتے ہی اپنی پٹی اتار دی ہوگی کیونکہ اس کے ہاتھ آزاد تھے۔ اور ممکن ہے وہ فوراً اُٹھ کے دروازے تک بھی آیا ہو اور شیشوں کے پیچھے سے جھانکتا رہا ہو۔ باہر آنے کی ہمت اس نے بہرحال نہیں کی اور ہم اندھیرے کی پناہ میں نکل گئے۔ ڈرائیور شیر علی اور غالب ٹریلر کے بند دروازے کے سامنے ایک ہی چارپائی پر لیٹے ہوئے سگریٹ پی رہے تھے۔ جلی اور سراج کی ماں اندر سو چکی تھیں۔ رات کے دو بج رہے تھے۔ ریکارڈنگ بند کر دی گئی تھی مگر ہوٹل کھلا ہوا تھا اور پانچ چھ ٹرک بھی موجود تھے۔ اوسطاً اتنے ٹرک وہاں ہر آدھے گھنٹے میں آ جاتے تھے اور انہی کی آمد و رفت سے 'شان دار ہوٹل اینڈ ریسٹورنٹ' کی رونق برقرار تھی اور انہی سے 'شان پاکستان گیراج' کا پروپرائٹر رات بھر مصروف رہتا تھا۔ وہ جس ٹرک کو چیک کرتا ہوگا اس میں کوئی نہ کوئی نقص ضرور نکال دیتا ہوگا۔ اچھے مکینک اس قسم کے نقص نکالنے میں ماہر ہوتے ہیں جن کا وجود نہ ہو یا کسی کو پتا نہ ہو۔

میں نے شیر علی سے کہا۔ "دوست... چائے تو پلواؤ۔"

"اور خود بھی پیو۔" محسن بولا۔

"مجھے تو پہلے ہی نیند نہیں آ رہی ہے۔ چائے پی کے تو ساری رات جاگتا رہوں گا۔" وہ بولا اور کھڑا ہو گیا۔

"ہاں بھائی... یہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے۔" محسن آہ بھر کے بولا۔ "راتوں کو نیند نہیں آتی۔ دن میں تارے نظر آتے ہیں۔"

شیر علی ہنسنے لگا۔ "دراصل نئی جگہ ہے۔ ماحول بدل جائے تو ایسا ہوتا ہے۔"

"کسی کی یاد میں جاگنا بھی کوئی بُری بات تو نہیں۔" غالب نے کہا۔ "اب ہمیں ہی دیکھ لو... ہم سب غمِ فراق میں راتوں کو جاگ جاگ کے اُلّو ہو گئے ہیں۔"

جب شیر علی چلا گیا تو غالب نے کہا۔ "میں شیر علی سے اس کی سوانحِ حیات کے دلچسپ اور سنسنی خیز اقتباسات سُن رہا تھا۔ اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے۔ جادۂ وفا اور راہِ حق و صداقت پر چلنے والوں اور ایمان سلامت رکھتے ہوئے صراطِ مستقیم پر سفر کرنے والوں کی سرگزشت ایک ہی ہوتی ہے۔"

"اچھا... کیا شیر علی بھی گردشِ روزگار اور فلکِ کج رفتار کی روشِ خانہ خرابی کا شکار رہے؟" محسن بولا۔

"مشکل اردو غالب نے بھی چھوڑ دی تھی۔" غالب نے کہا۔ "ایسے الفاظ بولو گے تو اپنے ساتھ ایک تشریح کرنے والا بھی رکھنا پڑے گا۔ شیر علی بھی ہم میں سے ایک ہے۔ اس کی زندگی بھی ایسی ہی آزمائشوں کی کہانی ہے جو ہم نے برداشت کی ہیں۔ بہت صاحبِ کمال شخص ہے۔ بولتا کچھ نہیں اور بتاتا کچھ نہیں۔ مگر بے حد ذہین اور پڑھا لکھا آدمی ہے۔ ہر بی اے پاس پڑھا لکھا نہیں ہوتا۔ شیر علی کی تعلیم کا ڈگری سے کوئی تعلق نہیں۔ پہلے میں نے اُسے اپنی سنائی۔ ایم آر ایس کے حوالے کے بغیر بھی میری... آٹوبائیوگرافی بے حد سبق آموز ہے۔ اس نے بڑی دلچسپی سے سُنی کہ پدرم سلطان بود... میرے والدین کیا تھے... اور میں کیا تھا۔"

"یہ نہیں بتایا کہ اب کیا ہوں۔"

"یہ وہ دیکھ سکتا ہے۔ اُسے عقل کا اندھا مت سمجھو۔" غالب بولا۔ "حیرت کا مقام یہ ہے دوستو کہ ایک قوت ہے جو ہم جیسوں کو اکٹھا کرنے کے لیے سرگرمِ عمل ہے۔ کوئی نادیدہ ہاتھ ایک سے دل اور ایک سے دماغ... ایک جیسے ماضی، حال اور مستقبل کے حوالے رکھنے والوں کو گھیر کر ایک مرکز پہ لا رہا ہے۔ اکٹھا کر رہا ہے۔"

"کیا ہم شیر علی کے سامنے بات کر سکتے ہیں؟" میں نے کہا۔ "وہ چائے لے کر آ رہا ہے۔"

"میرے خیال میں تو کوئی ہرج نہیں۔" غالب نے کہا۔

محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "احتیاط بہتر ہے ابھی۔"

"برتن وہ خود لے جائے گا۔" شیر علی نے کہا۔ "اب آپ لوگ باتیں کریں... میں سونے کی کوشش کرتا ہوں۔"

"اچھا تو تم یہ چارپائی اُٹھا کے اتنی دُور لے جاؤ کہ ہماری بک بک کی آواز تمھارے کانوں تک نہ پہنچے۔" محسن بولا۔

"میں نیچے دری بچھا کے سو جاؤں گا۔"

"نہیں بھائی... یہ کھلی زمین ہے... اور وہ بھی غیر آباد۔ کیڑے مکوڑے سونے نہیں دیں گے۔" میں نے کہا۔ "ہم تو جاگ رہے ہیں... سونا ہوگا تو اندر جا کے سو جائیں گے۔"

شیر علی ہمارے اصرار پہ چارپائی اُٹھا کے لے گیا تو میں نے غالب کو رابعہ سے ہونے والی ساری گفتگو کا احوال سنایا اور محسن نے بھی توجہ سے سُنا کیونکہ جب میں اور رابعہ بات کر رہے تھے تو اُس نے یکطرفہ گفتگو سُنی تھی اور جب اس کی باری آئی تھی تو اُسے زیادہ باتیں کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ ہمیں پُرامید رہنا چاہیے۔" غالب نے میرے خاموش ہو جانے کے بعد میری اُداس صورت دیکھ کر کہا۔ "اکرام شیخ اور نازو کے بارے میں تو میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ آسانی سے مرنے والے نہیں۔ مطلب یہ کہ خودکشی نہیں کر سکتے۔ اگر انھوں نے وہ کارگوشپ غرق کیا ہوگا تو خود نہیں ڈوبے ہوں گے۔ اُن کے پاس عقل ہے۔"

"اور نازو ہے۔" محسن نے کہا۔ "جو ایک تباہ کن قوت کا نام ہے۔"

"مجھے استاد ڈیڈی کا خیال آتا ہے تو میں اُمید کے فریب سے دل کو تسلی نہیں دے پاتا۔" میں نے کہا۔ "وہ سب سے بچھڑ کے بالکل بے یار و مددگار رہ گیا تھا۔"

"کیوں یارو... کیا وہ خدا جو ہمارے ساتھ تھا، ہے اور رہے گا۔" غالب نے کہا۔ "اُس نے ہمارے دوست کو تنہا چھوڑ دیا ہوگا؟"

"مجھے تو رابعہ کے رویّے پر حیرانی ہے... بلکہ تشویش ہے۔" محسن بولا۔ "آخر وہ کیوں ٹالتی رہی؟"

"واقعی عجیب سا رویّہ تھا۔" میں نے کہا۔ "پہلے تو کچھ بتانے پر آمادہ ہی نہ تھی کہ وہ کیوں نہیں آ سکتی... یا ہم کیوں نہیں پہنچ سکتے اس کے پاس۔"

"ہوگی کوئی وجہ جو وہ بتانا نہیں چاہتی تھی۔" غالب نے کہا۔

"ہمیں بھی نہیں بتانا چاہتی تھی؟" میں نے خفگی سے کہا۔ "ایسی کون سی وجہ ہو سکتی ہے؟"

"ہو سکتی ہے... فرض کرو اس سے ہماری پریشانی بڑھتی ہو۔ یا رابعہ سمجھتی ہو کہ ہمارا مورال ڈاؤن ہو جائے گا۔"

"مورال!" میں نے تلخی سے کہا۔ "وہ تو اس کے کچھ نہ بتانے سے بھی ڈاؤن ہی ہے... کون سا اَپ ہو گیا ہے۔"

"یار یہ بے ایمانی ہے۔" غالب نے کہا۔ "کیا تمھیں اطمینان حاصل نہیں ہوا۔ یہ جان کر کہ وہ خیریت سے ہے؟"

"یہ میں فرض کر سکتا ہوں... مگر خود اُس نے تو اس کے برعکس ہی ثابت کیا۔" میں نے کہا۔ "وہ خیریت سے ہوتی تو کسی مجبوری کی بات نہ کرتی۔"

"پھر بھی... پہلے جب اس کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں تھی۔ کوئی رابطے کی صورت تک نہ تھی خوابوں کے سوا... اور وہ بھی صرف تم دیکھ سکتے تھے برادرم سکندر بخت۔" غالب نے مجھے ڈانٹنا شروع کیا۔ "آج تم اس سے تقریباً مل آئے ہو۔ لوگ خط کو نصف ملاقات کہتے ہیں... یہ تو کچھ نصف سے زیادہ ہی ملاقات تھی کہ تم نے اس کی آواز سُنی... کیا اُس کی آواز سے پتا چلتا تھا کہ وہ... مجبور ہے؟"

"ہاں... ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے پیرول پر رہا کیا ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ آزاد ہوتے ہوئے بھی آزادی کے احساس سے محروم تھی۔ اس کا لہجہ اسیر تھا مگر وہ مجھے یقین دلانا چاہتی تھی کہ ایسا نہیں ہے۔ اور وہ ہنس بھی رہی تھی۔ مگر میں اس کی ہنسی کے ہر رنگ کو پہچانتا ہوں... یہ ہنسی اجنبی سی لگتی تھی..."

"تیرے خیال میں بات کیا ہو سکتی ہے؟" محسن نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے۔" میں نے سوچ کے کہا "کہ دلاور اینڈ کمپنی نے اُسے ایک موقع فراہم کیا۔ بالفاظِ دیگر ہم پر واضح کیا کہ قیدیوں کا تبادلہ ممکن ہے۔ انھوں نے رابعہ کے زندہ اور خیریت سے ہونے کا یقین صرف اس لیے دلایا کہ سراج کی ماں کو واپس لیا جائے۔ دلاور کا اس میں دخل نہیں رہا۔ عاشی کے مرنے کے بعد اس پر کوئی دباؤ نہیں... مگر سراج یقیناً پریشان ہوگا۔ دنیا میں اگر وہ کسی سے محبت کرتا ہے یا کسی کی پروا کرتا ہے تو وہ اس کی ماں ہے اور اس نے کراچی میں کوئی ایسا انتظام کیا کہ رابعہ خود آزادانہ طور پر مجھ سے بات کر سکے... مگر وہ بدستور قید میں ہے۔"

محسن نے اقرار میں سر ہلایا "میں کچھ قائل ہوا۔ تقریباً بیس فیصد۔"

"اب یہ نہیں معلوم کہ انھوں نے کس طرح رابعہ کو مجبور کیا کہ وہ اپنے رویّے سے سب ٹھیک ہے کا اظہار کرے۔" میں نے کہا "ممکن ہے انھوں نے رابعہ کو خطرناک نتائج سے خبردار کیا ہو۔ اور سمجھایا ہو کہ سکندر کا مطمئن ہونا شرط ہے اور تم کو اپنے لہجے اور رویّے سے اُسے مطمئن کرنا ہے... ورنہ..."

"ورنہ کیا ہوگا؟" غالب نے کہا "اسے گولی مار دی جائے گی۔ یا دوسری طرف سے ٹھاہ کی آواز اور سکندر کی آخری چیخ سُننے کو ملے گی؟ فضول بلکہ واہیات۔"

"کیا واہیات؟" میں نے گرم ہو کے کہا۔

"یہ مفروضہ... تمھاری خیال آرائی... تم قنوطی ہونے پر آمادہ ہو تو تمھیں کون روک سکتا ہے۔ مگر رابعہ سے اس قسم کی اداکاری نہیں کرائی جاسکتی۔" غالب بولا۔

"یار، وہ بڑے خبیث لوگ ہیں۔ ڈرامے باز۔" میں نے کہا "انھوں نے تو ہمیں ایک دوسرے کے انتقال کر جانے کی خبر بھی بڑے مصدقہ انداز میں سنا دی تھی۔ کیتھرین کو مرنے سے بہت پہلے مار دیا تھا۔ اور یقین دلا دیا تھا کہ جولی اسپتال میں چل بسی... اور شہلا نے اُسے اپنا گردہ دیا تھا تو وہ بھی نہیں رہی۔ کیا وہ سب جھوٹ نہیں تھا جسے ہم نے سچ مان لیا تھا۔ اور پھر وہ ڈراما جو رابعہ کے ساتھ کیا گیا تھا اس پر تشدد اور نتیجے میں موت واقع ہونے کا جس نے مجھے پاگل کر دیا تھا۔ کیا رابعہ سے نہیں کہہ سکتے کہ تمھیں چھوڑنا تو ممکن نہیں مگر سکندر سے بات کرو... کیونکہ وہ مرنے والا ہے؟"

"یہ بات ہوتی تو میں بتا نہ دیتا اسے... یا وہ نہ تاڑ جاتی میرے لہجے سے؟" محسن نے کہا "تمھارے بارے میں وہ مجھ سے سوال نہ کرتی... اور تم بہت دل سے بات کر رہے ہوتے تو یوں کرتے؟"

"یار تم سب تصویر کا روشن رُخ دیکھنے پر مُصر ہو۔" میں نے کہا "اگر کوئی رابعہ کو یقین دلا دے... کہ سکندر کو کینسر ہو گیا ہے مگر یہ بات اسے معلوم نہیں کہ اس کی زندگی کے دو چار مہینے ہی رہ گئے ہیں تو میرا رویّہ کیا ہوگا اور رابعہ کا کیا ہوگا؟ ایسا ہی۔"

"میں ایک دم پچاس فیصد قائل ہوا۔" محسن بولا "مگر رابعہ وکیل ہے۔ اُسے آسانی سے قائل نہیں کیا جاسکتا۔"

"رابعہ پہلے ایک عورت ہے۔ ایک پاگل عورت... ہم سے زیادہ پاگل۔" میں نے کہا: "پاگل نہ ہوتی تو آج بھی بہت بڑی وکیل ہوتی۔ مگر اس نے تو سب کچھ گنوا دیا اپنے پاگل پن میں۔"

"پوائنٹ نوٹ کیا میں نے... آپ نے رابعہ کو اس لیے پاگل قرار دیا کہ وہ آپ سے محبت کرتی ہے۔" محسن بولا۔

"ارے بابا ہم سب پاگل ہیں۔ محبت کا ایک روپ تو نہیں ہوتا۔ میں تو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ وہ وکیل ہو یا جج... جذبات اس کی سوچ کو کمزور اور غیر منطقی کر سکتے ہیں۔" میں نے کہا "اور وہ بہت ہوشیار شکاری ہیں۔ انھوں نے رابعہ کو لاہور کے کسی ڈاکٹر کی رپورٹ، کسی ریڈیالوجسٹ کی رپورٹ اور پیتھالوجسٹ کی رپورٹ دکھا دی ہوگی۔ شاید اس سے براہِ راست بات بھی کرا دی ہو۔ اور ان رپورٹوں پر میرا نام اور میرے مرض کی نوعیت سب کچھ ہو۔ کیا رابعہ کہے گی کہ تم جھوٹے ہو؟"

"بالکل کہے گی... سو فیصد کہے گی۔" غالب نے ہوا میں مکّا مارا۔

"ہاں... مگر بعد میں خوف اُسے مغلوب کرے گا، اور وہ مانے گی۔ دل آدمی کو شکست دیتا ہے۔" میں نے کہا "اور میں تو بات کر رہا ہوں کہ رابعہ کو قائل کرنے کا یہ ایک طریقہ ہو سکتا ہے۔ ایسے بہت سے طریقے آتے ہوں گے اُنھیں... ورنہ کیا تُک ہے بیک وقت آزادی اور مجبوری کا ذکر کرنے کی۔ میں اس سے کب تک بحث کرتا اور کیا سارا وقت اسی میں گزار دیتا؟"

"میں پچھتر فیصد قائل ہوا۔" محسن بولا "مگر ایک آخری بات جو شک میں ڈالتی ہے وہ رابعہ کی گفتگو ہے۔ وہ بیرودل پر رہا کی جاتی تو اتنی بہت سی باتیں نہ بتاتی... اگر اسے قید خانے میں مشروط طور پر موقع فراہم کیا گیا ہوتا تو وہ فون پر اتنی آزادی سے وہ سب نہ بتاتی۔ جو اس نے نازو اور اکرام شیخ کے بارے میں بتایا۔ کیا اُسے خیال نہیں آیا ہوگا کہ وہ بالکل آزاد اور محفوظ نہیں ہے۔ اس کی گفتگو شکاری بھی سن سکتے ہیں... اس کے علاوہ... دوست محمد کا کردار۔ کیا اس کے ذہن کی اختراع تھی؟ اور ایسا تھا تو تم نے ہر بات کیوں بک دی؟"

"یار، ان مفروضات پہ دماغ خراب کیوں کرتے ہو۔ رابعہ سے بات ہو گئی۔ سب کی خیریت مل گئی۔ آج کے لیے اتنا کافی ہے۔" غالب نے جھنجلا کے کہا: "اب حقیقت کیا ہے۔ یہ کل معلوم ہو جائے گا۔ ہم کوشش کریں گے معلوم کرنے کی۔"

"میں اس شخص کو تلاش کروں گا... دوست محمد کو۔" میں نے کہا: "وہ فون نمبر تو ہے نا ہمارے پاس... میں تو اب سو رہا ہوں۔ صبح کے چار بج رہے ہیں۔"

"ابھی بہت کام باقی ہیں۔ آگے جانے سے پہلے سب تیاری کرنی ہے اور بہت سے لوگوں کا انتخاب کرنا ہے... بہت کچھ خریدنا ہے۔" محسن بولا: "اور یہ سارا کام جلد از جلد ختم کرنا ہے... ہم سارا دن اور اکثر راتوں کو خوار پھرتے ہیں۔ آرام کے لیے بالکل وقت نہیں نکالتے... ایسے کب تک چل سکتا ہے۔ ہم سب کی صحت متاثر ہو رہی ہے۔"

"پھر کیا کریں... سارے کام چھوڑ کے سوتے رہیں؟"

"نہیں... مگر کام بھی بہت ہی کرنا ہے... آدمی جب کام کرنے کے قابل ہو۔" محسن بولا۔

"اچھا تم لوگ سو جاؤ۔" میں نے کہا: "میں جانتا ہوں کہ میں نہیں سو سکتا۔ حالانکہ میں سونا چاہتا ہوں، ورنہ میرا دماغ خراب ہو جائے گا۔"

"یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔" محسن بولا "اور اسی لیے میں نے یہ گولیاں خرید لی تھیں... اسپتال سے باہر آ کے۔"

"خواب آور گولیاں... بغیر نسخے کے مل گئیں؟"

"سب ملتا ہے دنیا میں بچّہ... مانگ فقیر سے کیا مانگتا ہے... بس دل کا قرار مت مانگنا... وہ اس فقیر کے کشکول میں بھی نہیں ہے۔" محسن بولا۔

خواب آور گولی نے صرف اتنا اثر کیا کہ میں آنکھیں بند کرنے کے قابل ہو گیا۔ اسے نیم غنودگی بھی نہیں کہا جاسکتا۔ چند سیکنڈ کے لیے نیند کا ایک جھونکا آتا تھا تو رابعہ کی آواز سنائی دینے لگتی تھی... سکندر... میں کیا کروں؟... کیسے آؤں تمھارے پاس... میں پہلی بار چونک کے اُٹھا اور پھر لیٹ گیا۔ دوسری بار پھر وہ میرے سامنے آ کھڑی ہوئی... میں آنا چاہتی ہوں سکندر... مجھے بلا لو اپنے پاس... تیسری بار اس نے کہا... کیا تم میں ہمّت نہیں ہے کہ مجھے تلاش کر سکو۔ ساری بھول بھلیّوں سے گزر کے مجھ تک پہنچ سکو، میں کھو گئی ہوں سکندر... تم میری آواز تو سُن سکتے ہو نا؟ اسی آواز کے سہارے چلے آؤ۔

میں پھر اُٹھا... محسن اور غالب ٹریلر کے فرش پر بے خبر سوئے پڑے تھے۔ میں نے آہستہ آہستہ محسن کی واسکٹ کی جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

محسن ایک دم اُٹھ بیٹھا اور اس نے میری کلائی پکڑ لی۔ "چوری؟ پوری شیشی کھا کے ہمیشہ کے لیے سونا چاہتا ہے، میں اسی لیے جاگ رہا تھا۔"

"ایک گولی اور دے مجھے۔" میں نے کہا "ایسے تو نہ میں سونے پر قادر ہوں اور نہ جاگنے پر۔"

"کیمسٹ نے کہا تھا کہ دو گولیاں اشد ضرورت میں بے ضرر ہیں۔" محسن بولا۔ اور میرے ساتھ اس نے بھی دوسری گولی کھالی۔

محسن نے غالب کی طرف رشک سے دیکھا "کیسے مزے سے سو رہا ہے۔ اس آدمی کو دل کا سکون حاصل ہے۔"

"اس کا عشق بے طلب ہے... اور سچّا ہے۔" میں نے کہا۔

"کچھ لوگ خوش قسمت ہوتے ہیں۔" محسن بولا: "جذبات کے کنٹرول کا سوئچ رکھتے ہیں... آن کیا تو مجسم عشق... آف کیا تو مجسم عقل۔"

"ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی۔" غالب نے آنکھیں کھول کے اور ایک ہاتھ پھیلا کے کہا "اس کے نام پر ایک گولی مجھے بھی دو۔"

"جس کے نام پر مرتے کم ہو، مارے زیادہ جاتے ہو۔" محسن بولا۔ "تم کو بھی آج نیند نہیں آ رہی ہے؟"

"ہاں یارو... آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے۔" غالب نے کہا۔

تین گھنٹے کے بعد کسی نے مجھے جھنجوڑنا شروع کیا تو میری نیند اتنی گہری تھی کہ آنکھیں کھولنے اور اُٹھ کر بیٹھ جانے کے بعد بھی میں پوری طرح نہیں جاگا تھا۔

"یارو غضب خدا کا! اتنی کوشش سے تو مُردے بھی اُٹھ جاتے۔" غالب نے کہا۔

"کیا قیامت آ گئی ہے؟" میں نے جماہی لے کر کہا: "جو آپ صورِ اسرافیل کی طرح میرے کان میں چلّا رہے ہیں۔"

غالب نے ایک لات محسن کے رسید کی۔ "پھر سو گیا لاتوں کے بھوت۔"

"لاحول ولا قوۃ۔" محسن ہڑبڑا کے اُٹھا "کیا مصیبت ہے یار؟"

"کیا وقت ہوا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"صرف سات بجے ہیں۔" محسن نے احتجاج کرتے ہوئے کہا "اور وہ بھی صبح کے سات... یہ بھی کوئی وقت ہے شرفاء کے اُٹھنے کا...؟"

"اور یوں اُٹھائے جانے کا؟" [illegible] نے کہا اور پھر سونے کی کوشش کی۔ غالب نے پانی کا ایک گلاس اس پر بہا دیا۔

"ایسے نہیں اُٹھو گے تو پھر اللہ تمھیں اُٹھائے گا۔" غالب

نے کہا۔

"یار ہوا کیا ہے۔ جو یہ آپ پا شی ہو رہی ہے۔" محسن نے کہا۔

جولی اندر آ کے ہنسی۔ "منہ دھو لیا بھائی... یہ لیں کافی۔" اس نے میرے ہاتھ میں ایک مگ تھما دیا۔

"بلیک کافی!" میں نے حیران ہو کے کہا۔

"گرما گرم بلیک کافی؟" محسن نے کہا۔ "بادواز دیٹ جولی؟"

"کل جب آپ لوگ گئے ہوئے تھے تو میں نے شیر علی سے کچھ سامان منگوا لیا تھا۔" جولی نے کہا اور تیسرا مگ غالب کو تھما دیا۔

"اوہ جولی... لو آر این انجیل۔" میں نے کہا۔

"تم فلورنس نائٹ انگیل ہو۔" محسن بولا۔

"تم فاطمہ بنت عبداللہ ہو۔" غالب نے کہا۔

جولی کا چہرہ مسرت سے دمکنے لگا۔ "وہ کون تھی بھائی؟"

"وہ مجاہدوں کو میدانِ جنگ میں پانی پلاتی تھی۔" غالب بولا۔

"جیسے تم مجاہدوں کو بلیک کافی پلا رہی ہو۔" میں نے تائید میں سر ہلایا۔

"اس پر اقبال نے نظم لکھی تھی۔ تم پر میں لکھوں گا۔" غالب بولا۔

جولی کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔ میں نے اس کونے کی طرف دیکھا جہاں سراج کی ماں تھی... وہاں اب کوئی نہیں تھا۔ جولی پھر باہر چلی گئی۔

"اُسے شیر علی لے گیا ہے۔" غالب نے میری سوالیہ نظروں کے جواب میں کہا۔ "گاڑی میں۔"

"کہاں لے گیا ہے...؟"

"کہیں نہیں... اُسے مائیکرو بس میں منتقل کر دیا ہے۔" غالب نے کہا۔ "جلدی سے کافی ختم کرو... پھر ہمیں چلنا ہے۔"

"... کیا بات ہے آخر... وہ ٹھیک تو ہے نا...؟" میں بہت سے اندیشوں میں گھر گیا۔ خدانخواستہ قید میں وہ بیمار تو نہیں ہو گئی... مر تو نہیں گئی۔ اس نے اعصابی دباؤ میں خودکشی تو نہیں کر لی؟"

"ہمیں یہاں سے فوراً نکلنا ہے۔" غالب نے کہا۔

"سب کو؟" محسن نے پوچھا۔

"صرف شیر علی اور جولی یہاں رہیں گے۔" غالب نے کہا۔ "رات کو شاندار ہوٹل میں ایک ٹرک ڈرائیور کا قتل ہو گیا ہے۔ ابھی تک پولیس نہیں پہنچی ہے۔ ہمیں پولیس کے سائے سے بھی دُور رہنا ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ پولیس کو ہمارا سایہ تک نہ ملے۔"

"تمھیں کس نے بتایا...؟"

"شیر علی نے...؟" غالب نے کہا۔ اسی وقت شیر علی اندر آیا۔

"پولیس کی ایک جیپ آ گئی ہے۔" شیر علی کچھ گھبرایا ہوا تھا۔ "آپ لوگ جاتے کیوں نہیں...؟"

"تم تو ہم سے بھی زیادہ پریشان ہو شیر علی۔" میں نے کہا۔

"سکندر صاحب... آپ تو سمجھتے ہیں ان کی سرشت کو..." شیر علی نے روانی میں کہا۔ "اصل مجرم کو پکڑنے کے بہانے یہ کسی کو بھی پکڑ سکتے ہیں اور تفتیش کے بہانے یہاں بھی گھس جائیں تو ان کو روکنے والا کوئی نہیں۔"

میں دم بخود بیٹھا ہوا شیر علی کو دیکھ رہا تھا۔ خود محسن اور غالب بھی شیر علی کی بات سن کر سکتے میں آ گئے تھے۔

"شیر علی..." میں اُٹھ کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ "تمھیں میرا نام کس نے بتایا؟"

"جی؟... آپ کا نام؟" وہ حیران ہوا...

"ہاں... تم نے ابھی میرا اصل نام لیا تھا..." میں نے کہا۔

"میں نے لیا تھا؟" وہ اعترافِ جرم کے انداز میں سب کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "دیکھیے جناب... مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ آپ کون ہیں... پہلے مجھے شک ہوا تھا آپ سب کے رویے سے۔ پھر میں نے معلوم کر لیا۔ میرا تجسس میں مبتلا ہو جانا ایک قدرتی بات تھی۔ مگر آپ ایک مسلمان... ایک پٹھان اور ایک مرد کی زبان پر بھروسا رکھیں۔ وقت آیا تو آپ دیکھیں گے کہ شیر علی آپ کے ساتھ ہے۔ آپ کے پیچھے بھی ہے تو پیٹھ میں چھرا گھونپنے کے لیے نہیں... آپ کو بچانے کے لیے... ویسے تو خدا نے چاہا تو شیر علی آپ سے آگے ہو گا۔"

میں نے ایک گہری سانس لی۔ "شیر علی... ہم اعتماد کے بہت فریب کھا چکے ہیں... اور تم جانتے ہو کہ سانپ کا ڈسا ہوا رسّی سے بھی ڈرتا ہے... مگر اب تم کو سب پتا چل گیا ہے... تو ٹھیک ہے... ہم اعتبار کرنے کے سوا کیا کر سکتے ہیں۔"

"یہ ہم بعد میں پوچھیں گے کہ تم کتنا جانتے ہو ہمارے متعلق۔" غالب نے کہا۔ "مثلاً کیا تم یہ جانتے ہو کہ ہم مرنے سے نہیں ڈرتے چنانچہ مارنے میں بھی پس و پیش نہیں کرتے۔"

"آستین کا سانپ زیادہ خطرناک ہوتا ہے شیر علی۔" میں نے کہا۔

"ہوتا تو ہے مگر کیا آپ انھیں نہیں پہچانتے۔" شیر علی نے کہا۔ "انہی کا سر تو کچل رہے ہیں آپ لوگ۔"

"ہم لوگ کون؟... تم کس کس کے نام سے واقف ہو... اور جو کچھ تمھیں معلوم ہوا ہے، کس سے معلوم ہوا ہے؟" غالب نے کہا۔

"دیکھیے... یہ سب آپ بعد میں بھی پوچھ سکتے ہیں مجھ سے... ابھی تو آپ نکلنے کی فکر کریں... یہ نہ ہو کہ وہ خواہ مخواہ ادھر آ جائیں۔ اتنا بڑا ٹریلر سب کو متوجہ کرتا ہے۔" شیر علی نے کہا۔

"اگر ہمارے جانے کے بعد وہ آئے اور تم سے پوچھ گچھ کی تو تم [illegible] میں نے کہا۔

"آپ بتا دیں کیا کہنا ہے۔" شیر علی نے کہا۔ "یا مجھ پر چھوڑ دیں... میں انھیں مطمئن کر دوں گا۔"

"ٹھیک ہے... تم جو چاہو کہہ دینا۔" میں نے کہا۔ "فی الحال سرکس وغیرہ کا ذکر مت کرنا۔"

چند منٹ بعد میں اور محسن کود کے باہر نکلے۔ غالب ہم سے پہلے جا چکا تھا۔ ہم نے اُسے مائیکرو بس کے پیچھے جولی سے باتیں کرتا پایا۔ جولی نے ہماری طرف دیکھا اور نہ جانے غالب کی کس بات پر اقرار میں سر ہلایا۔ سڑک کے دوسری جانب پولیس نے اپنے روایتی انداز میں ڈیرا ڈال لیا تھا۔ دو چارپائیوں کے درمیان ایک میز کرسی پر انسپکٹر یا اس سے کم عہدے کا ایک افسر بیٹھ گیا تھا۔ چار پولیس والے اس کے دونوں جانب چارپائیوں پر رائفلیں لیے بیٹھے تھے اور باقی مجمع قدرے دُور ایک نیم دائرے میں کچھ سہما ہوا اور وحشت زدہ سا کھڑا تھا۔ ایک ٹرک باقی چار ٹرکوں سے الگ کھڑا ہوا تھا اور وہاں بھی دو پولیس والے خاصی بے دلی سے پہرا دینے لگے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ واردات اسی ٹرک کے ڈرائیور کے ساتھ ہوئی تھی چنانچہ دوسرے ٹرک والوں نے خود ہی اپنے ٹرک جائے واردات سے دُور لے جا کر روکے تھے ورنہ اس سے پہلے وہ ایک ہی قطار میں کھڑے ہوتے جاتے تھے۔

"قتل ٹرک کے اندر ہوا ہے یا باہر...؟" میں نے کہا۔ چلتے چلتے شیر علی سے پوچھا۔

"اندر ہی جناب۔" شیر علی نے کہا۔ "لاش تو میں نے نہیں دیکھی۔"

"کیا تم بھی گئے تھے تفتیش کے لیے؟" محسن نے گاڑی میں بیٹھ کے کہا۔

"تفتیش کیا جی... شور ہوا تو سب ہی اکٹھے ہو گئے تھے۔ میں بھی چلا گیا تھا۔" شیر علی نے کہا۔

"اور کیا معلوم ہوا؟" میں نے کہا۔

"کچھ نہیں... ڈرائیور کا نام لے رہے تھے لوگ... ہمارے علاقے کا آدمی تھا، اس لیے میں رُک گیا۔ نوشہرہ کا رہنے والا بادشاہ گل تھا۔ سب جانتے تھے اُسے کہ اچھا آدمی ہے۔ اسے کسی نے ٹرک میں ہی مار دیا... وہ کچھ لینے گیا تھا... چائے پیتے پیتے۔ جب لوٹ کر نہیں آیا بہت دیر تک تو کوئی دیکھنے گیا۔ وہ ڈرائیور کیبن میں اُلٹا پڑا ہوا تھا اور اس کے سینے میں کسی نے ایک برف توڑنے والا نوکیلا سُوا گھونپ دیا تھا۔" شیر علی نے کہا۔

"شیر علی... کیا ٹرک کا نمبر ستائیس اُنیس ہے؟" میں نے کہا۔

شیر علی چونکا۔ "جی... مگر آپ نے کیسے دیکھ لیا!"

"میری نظر بہت تیز ہے شیر علی۔" میں نے ٹرک کی سمت میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں یہاں سے نمبر پڑھ رہا ہوں... وہ ٹرک ہے نا جو الگ کھڑا ہے۔"

ظاہر ہے شیر علی کے لیے میری بات پر یقین کرنا دشوار تھا کیونکہ اتنے فاصلے سے ٹرک کی نمبر پلیٹ تک صاف نظر نہ آتی تھی۔

"اب تم ایسا کرو۔" میں نے کہا۔ "کہ ہماری واپسی تک اس ٹرک کے بارے میں اور ٹرک ڈرائیور کے بارے میں جتنی معلومات حاصل کر سکتے ہو... خود کو محفوظ رکھتے ہوئے ضرور حاصل کرو۔"

"خود کو محفوظ رکھنا پہلی شرط ہے۔ کیونکہ تمہارے ساتھ ہی ہم بھی غیر محفوظ ہونا نہیں چاہتے۔" محسن نے کہا اور پھر گاڑی سے سر نکالا۔ "یہ غالب کیوں دیر کر رہا ہے؟"

"بڑی لمبی الوداعی ملاقات ہو گئی۔" میں نے کہا۔ "اتنا جذباتی ہونے کی کیا ضرورت ہے... ہم کوئی مریخ پر تو نہیں جا رہے ہیں۔"

"غالب کے گھوڑے!" محسن نے اُسے آواز دی اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ "ہم جا رہے ہیں۔"

غالب نے جواب میں کہا۔ "جاؤ۔" مگر پھر دوڑ کے گاڑی میں سوار ہو گیا۔ وہ جولی کو ہدایات دے رہا تھا اور اُسے رابعہ سے ہونے والی گفتگو کا خلاصہ سُنا رہا تھا۔ جولی یہ سب کچھ جاننے کے لیے بہت بے چین تھی۔ گاڑی کے اندر سب سے پیچھے والی سیٹ پر سراج کی ماں اپنی آنکھیں بند کیے لیٹی ہوئی تھی۔ ہم نے آپس میں بات کرتے ہوئے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ ہماری گفتگو کا ایک لفظ بھی اس کے کانوں تک نہ پہنچے مگر یہ فرض کرنا مشکل تھا کہ وہ اندازوں کی بنیاد پر بھی کوئی رائے قائم نہیں کر سکتی... وہ کھلی آنکھوں سے بھی بہت کچھ دیکھ رہی تھی اور ہمارے ساتھ ساتھ ایک چشم دید گواہ کی حیثیت سے سفر کر رہی تھی۔ اُس نے مائیکرو بس بھی دیکھی تھی اور ٹریلر بھی دیکھا تھا۔ ہم اُسے غیر معینہ عرصے کے لیے اسیری میں نہیں رکھ سکتے تھے... وہ بوڑھی عورت تھی، اور اگرچہ اب تک ہم نے اسے کسی قسم کی تکلیف نہیں ہونے دی تھی مگر اپنی تنہائی کا اور قید میں ہونے کا خیال ہی کم تکلیف دہ نہ تھا۔ وہ گھر سے اور بیٹے سے دُور تھی اور اس نے کیتھرین کے بعد عاشی کو مرتے دیکھا تھا اور ہمیں روپوشی کے ٹھکانے بدلتے دیکھا تھا۔ بے شک اس نے حالات کے خلاف اپنی جدوجہد کو بے مصرف سمجھتے ہوئے خود کو تقدیر پر چھوڑ دیا تھا۔ اس نے ہمارے تمام معاملات سے بے نیازی کا انداز اختیار کرتے ہوئے چُپ سادھ لی تھی اور آنکھیں ہی نہیں کان بھی بند کر لیے تھے مگر اس سے ہمارا مطمئن ہو جانا غلط ہوتا کیونکہ وہ بہرحال سراج کی ماں تھی اور سراج سے بڑا دشمن ہمارا کوئی نہیں تھا۔ خود سراج کی ماں کو بیٹے کے مذموم کاروبار کی حقیقت کا علم ہونے سے بہت زیادہ فرق اس لیے نہیں پڑتا تھا کہ وہ پہلے ایک ماں تھی اور ہر ماں کی طرح ماں کے جذبات دوسرے تمام جذبات پر حاوی تھے۔ وہ بیٹے کی دشمن اور ہماری مددگار نہیں بن سکتی تھی، خصوصاً ان حالات میں کہ ہم نے اس کے ساتھ اس کے گھر میں بھی اچھا سلوک نہیں کیا تھا اور گھر سے باہر اس کے سامنے کوئی قابلِ تعریف کارنامہ سرانجام نہیں دیا تھا۔ وہ اپنے نقطۂ نظر سے سوچنے میں حق بجانب تھی۔ ایک عورت کو جو

عمر کے اس حصے تک پہنچ چکی ہو کسی بھی جنگ کے سیاسی یا معاشی پہلو کو سمجھنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ ہر معاملے کو اخلاقی یا مذہبی کسوٹی پر ہی پرکھ سکتی تھی چنانچہ اس سے پوچھا جاتا تو وہ کہتی کہ اچھا ہم بھی نہیں کر رہے ہیں۔ اس کا بیٹا بھی بُرا اور ہم بھی بُرے تو طرفدار وہ ہماری ہو... یہ ناممکن اور بعید از قیاس تھا۔ آئندہ بھی عملی طور پر وہ ہمارے خلاف جنگ میں براہِ راست شریک نہیں ہوگی۔ مگر اپنے بیٹے کی یوں مدد ضرور کرے گی کہ اسے ہمارے متعلق تمام معلومات بہم پہنچائے گی۔ بیٹا خود ایک سینئر پولیس افسر تھا اور تفتیش کے سارے طریقے جانتا تھا۔ وہ ماں سے خود ایسے سوالات کر سکتا تھا جن کے جواب میں وہ بتا سکے کہ ہمارے ساتھ رہ کے اس نے کیا دیکھا اور کیا سُنا۔

میں انہی خیالات میں غلطاں تھا کہ محسن نے مجھے ٹوکا۔

"کیا سوچ رہا ہے؟"

"میں...؟ یہی کہ اب کیا کرنا چاہیے۔" میں نے چونک کر کہا۔

"سراج اور دلاور سے آخری بات کر لینی چاہیے۔" غالب نے کہا۔ "بلاوجہ اس بڑھیا کو ساتھ لیے پھرنا کوئی عقلمندی نہیں۔"

"ہاں۔ عاشی زندہ رہتی تو دلاور سے بھی بات کی جا سکتی تھی۔" محسن بولا۔ "اب تو سراج ہی رہ گیا ہے۔ وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھے نہیں بیٹھا ہوگا۔"

"اس نے لاہور کا چپہ چپہ چھان مارا ہوگا۔ اندر باہر کے سارے راستوں کی ناکابندی کی ہوگی۔ مگر ابھی تک ناکامی اور مایوسی کے سوا اس کے ہاتھ کچھ نہیں آیا ہے۔ وہ سخت جھنجلاہٹ اور بے بسی کا شکار ہوگا۔"

"اور یہی وقت ہے کہ ہم اس سے سودا کر لیں۔" غالب بولا۔

"سودا کس کا؟" محسن بولا۔

"اب تو صرف ٹیڈی ہی رہ گیا ہے جس کے بارے میں وہ بتا سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں... رابعہ تو نکل گئی تھی۔ نازو اور اکرام شیخ کے بارے میں کوئی بھی کچھ نہیں جانتا۔" محسن بولا۔ "مگر ٹیڈی ان کے قبضے میں تھا اس کے بارے میں سراج ضرور جانتا ہوگا۔ اگر وہ زندہ ہے۔"

"وہ زندہ ہے... اگر کا کیا سوال۔" میں نے برہمی سے کہا۔

"ہاں... وہ زندہ ہے۔" محسن بولا۔ "میں بھی اس یقین سے محروم نہیں ہوا۔ لیکن میں تصویر کے دوسرے رُخ سے نظریں نہیں چرا سکتا۔ اگر وہ زندہ ہے تو سیدھی صاف بات یہ ہوگی کہ ٹیڈی کو چھوڑ دو۔ جس دن وہ ہمارے پاس پہنچ جائے گا، اسی دن ہم سراج کی ماں کو گھر پہنچا دیں گے۔"

"کیا وہ اُدھار کرے گا؟" غالب نے پوچھا۔

"کیا مطلب؟" میں نے کہا۔

"مطلب یہ کہ وہ ٹیڈی کو پہلے چھوڑ دے گا۔ یا چھڑا دے گا ہمارے وعدے پر... وہ اعتبار کر لے گا...؟" غالب بولا۔ "اس کے دل میں خیال نہیں آئے گا کہ بعد میں ہم وعدے سے پھر جائیں گے تو وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔"

"مرزا... ایک بات اس جنگ میں کھل کر سامنے آ چکی ہے... اب تک دونوں فریق ایک دوسرے کے متعلق اچھی طرح جان چکے ہیں۔"

"کیا جان چکے ہیں... کہ کون زیادہ طاقتور ہے؟"

"نہیں... طاقت کا توازن تو اِدھر سے اُدھر ہوتا رہتا ہے۔ اور ظاہر ہے ہماری طرح وہ بھی پُرامید ہیں اور شکست کا خیال انھیں بھی خوفزدہ نہیں کرتا۔" میں نے کہا۔ "لیکن میں بات کر رہا تھا متحارب فریقوں کے مزاج کی۔ ان کی فطرت اور طریقۂ جنگ کی... جیسے ہم جانتے ہیں کہ ولاور اینڈ کمپنی جنگ میں انسانیت کے مقام سے کس حد تک نیچے جا سکتے ہیں۔ ایسے ہی ہم نے جنگ کے کردار سے ثابت کر دیا ہے کہ ہم اخلاقی اقدار کی پامالی میں ایک خاص حد سے آگے نہیں جا سکتے۔ سراج کو ہماری طرف سے یہ اطمینان یقیناً حاصل ہوگا کہ ہم اس کی ماں کے ساتھ نہ بدسلوکی کریں گے اور نہ اس بوڑھی عورت کو اس کے بیٹے کے گناہوں کی سزا دیں گے۔ دشمن ہونے کے باوجود وہ ہمارے بہادر... باضمیر اور بااصول ہونے کا اعتراف کرتا ہے۔ سب کے سامنے نہ سہی... اپنے آپ سے وہ سچ بولنے پر مجبور ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ہم اس کی ماں پر تشدد کر ہی نہیں سکتے اور اُسے قتل کرنے کا تو سوال ہی نہیں۔ ایک نہ ایک دن اس کی ماں واپس آ جائے گی۔ لیکن اپنی اور ماں کی ذہنی اذیت کا وقفہ کم سے کم کرنے کے لیے وہ ہمارا مطالبہ مان لے گا۔"

"یہ تو بڑا اچھا ہو... اگر وہ ٹیڈی کو واپس کرا دے۔" غالب بولا۔

"چلو پھر پہلے تو یہی معاملہ ختم کریں۔" محسن بولا۔ "وقت کم ہے۔ ہمیں واپس بھی جانا ہے۔"

"یہ واپس جانے کی جلدی کیوں؟"

"ہمیں اس ٹرک ڈرائیور کے قتل سے دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ میں دستِ قاتل کو اس کے لہو کی سرخی سے پہچاننا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

محسن بولا: "ہاں... وہ کیا ہے کہ جو چُپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا۔"

"پولیس تو بس زبانِ خنجر کی خاموشی چاہے گی... مگر لہو کی فُغاں کیا کہتی ہے، یہ ہم جاننا چاہیں گے۔" میں نے کہا: "یہ واردات ایک پس منظر رکھتی ہے۔"

"سراج سے بات کیسے ہوگی؟" غالب نے کہا۔ "اسی قومی مواصلاتی رابطے پر... ڈائریکٹ ڈائلنگ کے ذریعے۔"

میں ہنس پڑا۔ "محفوظ طریقہ تو وہی ہے... مگر میں سوچ رہا ہوں کہ انھیں آزمانا چاہیے جو ہمارے مشن کے لیے نیک جذبات کا اظہار کر چکے ہیں، وہ عملاً بھی کچھ کر سکتے ہیں یا نہیں۔"

"ایسے تو بہت سے لوگ ملے ہیں۔"

"ہاں... ان میں سب سے پہلے ایک ہیئر آرٹسٹ ملا تھا۔ خلیفہ پنڈت اور ایک آرمی کا ڈاکٹر تھا میجر سلطان۔" میں نے کہا۔ "مجھے اور محسن کو واپس جانا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس ٹرک کے پیچھے جانا پڑے۔ میں پنڈت خلیفہ کے ہاتھوں کی کاریگری کا قائل ہوں... میں اس کے نقصانات کی تھوڑی بہت تلافی بھی کرنا چاہتا ہوں اور یہ بھی چاہتا ہوں کہ وہ ہمیں ایک نیا ناقابلِ شناخت حلیہ اور چہرہ عطا کرے۔"

"باجماعت اور ڈیپارٹمنٹ آف ڈائریکٹ ڈسپوزل کی گاڑی میں لکشمی چوک جانا کوئی عقلمندی نہیں۔" غالب نے کہا۔

"وہاں تو میں اور محسن جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "پہلے تو سراج سے ہی بات کریں گے۔ میرا خیال ہے کہ میں میجر سلطان کے گھر سے فون کروں۔"

"کیا فائدہ۔ کال ٹریس ہو جائے گی۔" غالب نے کہا۔

"میجر سلطان خواہ مخواہ ملوث ہو جائے گا۔" محسن نے غالب کی تائید کی۔

"اس کا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اس کی پوزیشن بہت محفوظ ہے۔"

"محفوظ ہے تو اُسے غیر محفوظ کرنا ضروری ہے؟" غالب نے کہا۔ "اس کے علاوہ میجر سلطان اس وقت گھر پر نہیں ڈیوٹی پر ہوگا۔"

غالب کی اس بات نے میرے ارادے کو بدل دیا... میں مجبور ہو گیا کہ پھر کسی ٹیلی فون پول کو تلاش کروں... جب بالآخر ایک پول نظر آیا تو میں نے محسن سے کہا کہ وہ گاڑی آگے لے جائے اور میرا انتظار کرے لیکن اُس نے گاڑی غالب کے حوالے کی اور خود میرے ساتھ ہی اتر گیا۔ غالب کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ تو جُڑ گئی تھی مگر ڈاکٹر سلامت نے کچھ عرصہ احتیاط کی تاکید کی تھی اُسے مائیکروبس کی ڈرائیونگ پر بٹھانا خلافِ احتیاط تھا لیکن ایک خالی سڑک پر سو دو سو گز کی ڈرائیونگ میں زیادہ خطرہ نہیں تھا۔

میں کھمبے پر چڑھ گیا اور محسن نیچے کھڑا ہو گیا۔ ابھی میں نے تار جوڑے ہی تھے کہ ایک کوٹھی کے گیٹ سے ایک کار نکلی، اور سیدھی ہماری طرف آئی۔ بے اختیار میری نظر اس سلیٹی رنگ کی ٹویوٹا کورونا پر گئی اور اس کا نمبر دیکھتے ہی ایک لمحے کے لیے میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔ یہ وہی گاڑی تھی جو میں نے استاد پیڈرو کے پاس دیکھی تھی مگر اس وقت گاڑی میں وہ خود نہیں تھا۔ گاڑی کو محسن نے بھی پہچان لیا تھا اور جب گاڑی اس کے سامنے پہنچ کے رُک گئی تو قدرتی طور پر وہ چوکنا ہو گیا اور کھمبے کے اوپر میں بھی کسی ناخوشگوار صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے تیار ہو گیا۔

گاڑی میں سے گینڈے اور گوریلے کی نسلی صفات رکھنے والا ایک دیو قامت شخص برآمد ہوا۔ وہ ساڑھے چھ فٹ قد کے ساتھ ساڑھے چھ سو پونڈ وزن رکھتا تھا چنانچہ خاصی دِقت کے ساتھ کار سے نکلا تھا۔ اس کے سر پر خشخشی بال تھے۔ جو بہت ہموار تراشی گئی لان کی گھاس کی طرح لگتے تھے۔ اگر میں سر کو بالکل صاف کرا دیتا تو شاید ایک ڈیڑھ ماہ بعد میرے سر کی کھیتی بھی ایسی ہی نظر آتی۔ لیکن اس کے چہرے پر سیاہ و سفید بالوں کی داڑھی بہت پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے بند گول گلے کا کرتہ اور ٹخنوں سے اوپر ختم ہو جانے والی شلوار پہن رکھی تھی۔ کرتہ شلوار دونوں میں کورا لٹھا استعمال ہوا تھا۔ اس کے کندھے پر ایک دسترخوان نما سبز رومال پڑا ہوا تھا، اور وہ چپل پہنے ہوئے تھا۔ اس نے بہت بھاری بھر کم شیشوں اور فریم والی عینک بھی لگا رکھی تھی جس کے پیچھے سے اس کی لال لال آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔

دائیں ہاتھ سے گز بھر کی تسبیح کے موٹے موٹے دانے گھماتے ہوئے اس نے بڑی قرأت کے ساتھ کہا۔ "میاں السلام علیکم... ہم ہی کہہ دیتے ہیں... حالانکہ بزرگ ہم ہیں۔"

"قبلہ بزرگوار..." میں نے کہا۔ "سلام آنے والے پر فرض ہے خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا۔"

"تاہم... السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔" محسن نے انہی کے انداز میں قرأت کے ساتھ کہا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

بزرگوار کے ماتھے پر ناگواری کی شکنوں کا جال گہرا ہو گیا۔ ان کی انگلیاں تسبیح کے دانوں کو زیادہ تیزی سے گردش دینے لگیں... "پوچھنا یہ تھا کہ تم کیا کر رہے ہو؟"

"ہم ادائیگیٔ فرض کر رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ اس گول مول جواب کے سوا میں ان سے کیا کہتا۔

"ماشاء اللہ۔" وہ داڑھی پر ہاتھ پھیر کے بولا۔ "وہ دونوں بھی بڑے فرض شناس تھے... اور بے حد خلیق اور خدمت گزار۔"

"کون دونوں...؟" میں نے کہا۔

"وہی میاں، جن کو بدخواہوں کی شکایات پر معطل کر دیا گیا۔" وہ بولے۔ "سب سے صاحب سلامت رکھتے تھے اور سب کے کام آتے تھے۔"

"انشاء اللہ آپ ہمیں بھی ویسا ہی پائیں گے۔" میں نے اُسے ٹالنے کے لیے کہا۔

اس نے میری بات کا غلط مطلب نکالا اور تعریفی انداز میں سر ہلانے لگا۔ "بس میاں یہی ہونا بھی چاہیے۔ خلقِ خدا کے ساتھ حُسنِ سلوک اور بندگانِ خدا کے ساتھ نیکی۔ جس نے حقوق العباد کو

فراموش کیا گویا اس نے مقصدِ حیات کو فراموش کیا۔ وہ کیا خوب فرمایا ہے کسی نے کہ۔ دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو...۔"

"ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کرّ وبیاں۔" محسن نے سر ہلا کے کہا۔

"سبحان اللہ!" بزرگوار نے کہا۔ "بڑی خوشی ہوئی تم سے مل کے۔ اللہ نے چاہا تو سب ویسے ہی چلتا رہے گا۔"

"جی؟... کیا چلتا رہے گا...؟" میں نے کوفت کے ساتھ کہا۔

"وہ... تعاونِ باہمی کا جذبہ۔" وہ بولے۔ "تم ہمارے کام آؤ گے تو ہم سے فیض پاؤ گے... شکایت کیوں ہو...؟"

"دیکھیے... اگر آپ کے فون کی لائن میں خرابی ہے...۔"

"ارے نہیں میاں... فون تو الحمد اللہ ٹھیک ہے... خرابی دلوں میں نیت کے کھوٹ سے پیدا ہوتی ہے۔" وہ بولے۔ "طمع اور حرص سے...۔"

"بجا ارشاد... لیکن اس وعظ و نصیحت کا یہ کون سا موقع ہے۔" میں نے جھنجلا کے کہا۔

"وہ... دراصل میں نے مناسب سمجھا کہ معاملات طے کر لیے جائیں... اور اس حسنِ انتظام میں خلل واقع نہ ہو۔" وہ بولے۔ "جس کی بنیاد... گویا خیر خواہی کے جذبات پر تھی... ہم انھیں سو روپے ماہانہ دیتے تھے۔ بلاشبہ اس گرانی کے دور میں یہ رقم ناکافی محسوس ہوتی ہے لیکن انسان کو قانع ہونا چاہیے اور صبر و شکر اختیار کرنا چاہیے۔" انھوں نے جیب سے سو کا ایک نوٹ نکال کے ادھر اُدھر دیکھا اور محسن کی طرف بڑھا دیا۔ "یہ آپس میں تقسیم کر لینا۔"

محسن نے ہاتھ پیچھے کر لیا۔ "یہ کیا ہے؟" وہ مشتعل ہو کے بولا۔

"اوہو... ناراضی کس بات کی... یہ لو...۔" انھوں نے سو کا دوسرا نوٹ نکالا۔ "چلو اب تو ٹھیک ہے... بس یہ خیال رہے کہ...۔"

"کہ آپ کا ٹیلی فون بل اگر لاکھوں میں ہو تو ہزاروں تک محدود رہے اور ہزاروں میں ہو تو سیکڑوں میں آئے۔" محسن نے کہا۔

"ارے بھئی..." میں نے تسا وپر سے کہا۔ "لے لو... اتنی محبت سے دے رہے ہیں وہ... آپس کی بات ہے۔" پھر میں نے بزرگوار سے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔ "معاف کیجیے گا... میں سمجھا لوں گا اسے... آپ بالکل فکر نہ کریں... لیکن ذرا بتا دیں ہمیں اپنے بارے میں... ہم نئے ہیں نا...۔"

"ہم تمھاری معاملہ فہمی سے خوش ہوئے میاں۔" بزرگوار بولے۔ "ہم یہاں رہتے ہیں۔ نام ہے ہمارا حاجی سیٹھ عبداللہ... اور ہمارے چار فون ہیں۔"

"ماشاء اللہ۔" میں نے کہا۔ "کاروبار کیا ہے آپ کا؟"

"ہم تو بس اب عملاً ہر جھنجھٹ سے آزاد ہو گئے ہیں... سارا کاروبار اپنے دونوں لڑکوں کے سپرد کر دیا ہے۔ امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس ہے۔ بڑا لڑکا یہاں سے فروٹ، سبزیاں اور مچھلی، انڈے وغیرہ باہر بھیجتا ہے... میں بس نگرانی کرتا ہوں۔"

"کیا نام ہے اس کا... اور فرم کا...؟" محسن نے کہا۔

"غلام رسول... اور فرم کا تو ایک ہی نام ہے۔ عبداللہ اینڈ سنز لاہوری۔ دوسرا لڑکا عبدالرب...... سینٹری کا سامان، ماربل اور مشینری وغیرہ بھیجتا ہے... مگر وہ کراچی میں ہے۔" وہ بولے لو، انھوں نے گاڑی کا دروازہ کھول کے گلوز کمپارٹمنٹ میں سے دو کارڈ نکالے۔ "یہ لو... اس میں سب کچھ ہے کسی معاملے میں ہماری مدد کی ضرورت ہو تو بتانا... سب کچھ کر سکتے ہیں ہم...۔"

"گویا آپ قادرِ مطلق ہیں؟" محسن نے کارڈ لے کر کہا۔ "حاجی صاحب یہ تو کلمۂ کفر ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ... میاں ہم... ہمارا مطلب تھا کہ اللہ ہمیں توفیق دیتا ہے... وہی کارساز ہے سب کا... لیکن وسیلہ تو کوئی بنتا ہی ہے۔" انھوں نے خفگی سے کہا اور کار میں بیٹھ گئے۔

"حاجی صاحب... جاتے وقت بھی سلام ضروری ہے۔" محسن نے کہا۔

"وعلیکم السلام...۔" حاجی صاحب نے غرا کے کہا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

"الو کا پٹھا... خبیث آلڈ ہیر...۔" محسن ایک دم پھٹ پڑا۔ "نام تو دیکھو ذرا... اور کرتوت دیکھو... حُلیہ دیکھو اور اعمال دیکھو۔ کیا مفہوم نکالتا ہے الفاظ کے... حقوق العباد... نیکی... صبر و شکر اور قناعت کا مطلب سمجھا رہا تھا ہمیں۔" محسن نے سو کے دونوں نوٹوں کو پرزہ پرزہ کر کے پھینک دیا۔

"افسوس کہ ایسے ہی لوگ دین کو بدنام کرتے ہیں... ریاکار اور منافق... جو اپنے ساتھ ہی نہیں خدا کے ساتھ بھی جھوٹ بولتے ہیں۔" میں نے کانوں کو ہاتھ لگا کے کہا۔ "ظاہر ہے ایسے باپ کی اولاد کیا ہو گی۔"

"خدا کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں پہچانا نہیں۔" محسن بولا۔ "مگر یار اب یہاں سے کھسکنے کی کر... یہ خطرناک علاقہ ہے۔ اس شیطان کی اولاد کا یقیناً استاد پیڈرو سے کوئی تعلق ہے... غلام رسول اور عبدالرب پیچھے رہ کر مدد کرتے ہوں گے... اور یہ تو اتفاق سے ہمیں "عبداللہ اینڈ سنز لاہوری" کا نام معلوم ہو گیا۔ ایسے نہ جانے کتنے دوسرے ادارے ہوں گے جو امپورٹ ایکسپورٹ کے کاغذی لائسنس پر ولاور اینڈ کمپنی کے معاون اور مددگار ہوں گے۔"

خود میں بھی یہ بات سمجھتا تھا کہ یہ جگہ واقعی محفوظ نہیں ہے اور ابھی تو ہم بال بال بچ گئے تھے لیکن یہاں کسی بھی وقت کوئی شکاری آ سکتا تھا۔ میں پندرہ بیس منٹ تک کھمبے پر لٹکا ہوا اپنی خیریت کی اور حاجی صاحب کے دفع ہو جانے کی دعا مانگتا رہا تھا ان کی موجودگی میں بات تو میں کیا کرتا خود کو ٹیلی فون لائن مین ثابت کرنے کے لیے میں نے باکس کھول کر تھوڑا بہت کام ضرور جاری رکھا تھا اور کسی وجہ کے بغیر پیچ کس استعمال کرنے کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ میں نے ادھر کے تار کھول کر ادھر جوڑ دیے تھے۔ اس سے کتنے لوگوں کے ٹیلی فون خلط ملط ہو گئے ہوں گے، اس کا مجھے کوئی اندازہ نہ تھا۔ حاجی صاحب نے پیڈرو کی سلیٹی کار میں نمودار ہو کے میرے ہوش گم کر دیے تھے۔ وہ خود ہیرا پھیری کرنے والا آدمی تھا۔ با اصول آدمی ہوتا تو سب سے پہلے پوچھتا کہ تم لوگ ٹیلی فون لائن مین ہو تو وردی میں کیوں نہیں ہو اور ہم سے شناختی کارڈ طلب کرتا... لیکن اس سے پہلے معاملہ رکھنے والے بھی شاید بغیر وردی کے ہی گھومتے تھے۔

نیچے اتر کے میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ میں اور محسن اس کوٹھی کے سامنے سے گزرے جس میں سے وہ سلیٹی رنگ کی کار نکلی تھی تو میں نے گیٹ پر پیتل کی چمکتی ہوئی تختی دیکھی۔ دو فٹ ضرب ایک فٹ کی اس تختی پر تین انچ کے بڑے حروف میں "عبداللہ اینڈ سنز لاہوری" کا نام کندہ تھا اور نیچے ایک انچ کے حروف میں... "امپورٹر... ایکسپورٹر اینڈ جنرل آرڈر سپلائرز" لکھا ہوا تھا۔ کوٹھی کے اندر بائیں ہاتھ پر تین گاڑیاں اور چھ سات موٹر سائیکلیں کھڑی ہوئی تھیں۔ نچلی منزل رہائشی لگتی تھی۔ اوپر کی منزل اپنی تعمیر سے دفتر نظر آتی تھی۔ اس کے بڑے بڑے شفاف شیشوں کے پیچھے وینی شین بلائنڈز کی پٹیاں نظر آ رہی تھیں اور اس کی چھت بھی مشکل سے آٹھ فٹ بلند تھی۔ ائیرکنڈیشنگ کے نظام کی بہتر کارکردگی کے لیے کم سے کم جگہ اسی طرح رکھی جاتی ہے۔ اندر اگر کچھ لوگ فائلوں میں پھل سبزی، انڈے اور مچھلی کی درآمد برآمد کا حساب کتاب رکھنے یا ٹائپ رائٹر پر انگلیاں چلانے میں مصروف تھے تو ان کی مصروفیت کا باہر بالکل پتا نہیں چلتا تھا۔

غالب سرکاری گاڑی کے ڈرائیوروں کے انداز میں فٹ پاتھ پہ اکڑوں بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ "ہو گئی بات؟" اس نے سگریٹ اچھال کے کہا۔ وہ آخری ٹکڑے کو ایک انگلی اور انگوٹھے کی مدد سے فائر کرنے کا عادی تھا۔

"یہ ایک بے ہودہ عادت ہے۔" محسن نے کہا۔ "دیکھو وہ ٹوٹا کہاں جا کے گرا ہے۔ خشک گھاس اور پتوں کے ڈھیر میں آگ لگ سکتی ہے۔"

"آگ کہاں نہیں لگی ہوئی ہے۔" غالب نے خفت مٹانے کے لیے کہا اور سگریٹ کے ٹکڑے کو جوتے سے دبا کے بجھا دیا۔ "کیا نتیجہ رہا؟"

"صفر جمع صفر برابر ہے دو صفر۔" محسن بولا۔ "گاڑی میں بیٹھو... ہم دشمن کے علاقے میں ہیں۔"

غالب نے برا سا منہ بنایا۔ "وہ خوفناک صوفی کون تھا؟"

"تمھارا ماموں سسُر۔" میں نے کہا اور گاڑی چلا دی...

"اپنی بھانجی کے مستقبل سے کھیلنے والے ہر شخص کو تباہ کر دینے کی دھمکی دے گیا ہے۔"

"میں مستقبل سے نہیں... اس کی بھانجی سے کھیل رہا ہوں۔" غالب نے کہا۔ "ظاہر ہے مجھے کوئی خطرہ نہیں۔ مگر تم لوگ مجھے حواس باختہ لگتے ہو۔"

جواب میں محسن نے اُسے عبداللہ اینڈ سنز سے متعارف کرایا اور میں نے گاڑی کو دو میل دور لے جانے کے بعد روکا اور پھر پیدل چل کے واپس گیا۔ یہ دوسری جگہ جہاں سے میں نے سراج کو فون کیا زیادہ محفوظ تھی۔

"سکندر...۔" سراج نے ریسیور اٹھاتے ہی چلانا شروع کیا۔ "آخر تم کیا چاہتے ہو؟"

"ایک ایس ایس پی کو اتنا لاعلم نہیں ہونا چاہیے۔" میں نے کہا۔ "کیا تم واقعی نہیں جانتے کہ ہم کیا چاہتے ہیں؟"

"دیکھو... میں تمھیں موقع پر موقع دے رہا ہوں۔ ابھی تک میں نے تمھارے خلاف کوئی رپورٹ نہیں لکھوائی ہے۔ نہ اغوا کی اور نہ اس بدمعاشی کی جو تم نے میرے گھر میں کی۔ اور جس کے دس گواہ ہیں... تم نے عاشی کو بھی قتل کر دیا مگر میں نے دلاور کو خاموش رکھا۔"

"یہ سب لکھ کر اپنے افسرانِ بالا کو بھجوا دو۔" میں نے کہا۔ "کہ تم نے سکندر بخت پر کتنے احسانات کیے ہیں۔ اور بدمعاشی کے جواب میں تم نے کتنی شرافت دکھائی ہے اور کیا نیکی کی ہے۔ تمھیں اس کا اجر ملے گا۔"

"میں اگر چاہتا تو تمھیں زمین سے کھود کے برآمد کر لیتا۔" وہ غصے میں پاگل ہو رہا تھا۔

"پھر کیا کیوں نہیں... ہم کوئی گاجر مولی تو تھے نہیں کہ زمین کے اندر ہوتے... ہم تو کھمبی کے پھول کی طرح اوپر تھے۔" میں نے کہا۔ "اور مجھے اپنی اس فضول بکواس سے متاثر مت کرو۔ میں جانتا ہوں کہ تم نے ایڑی چوٹی کا زور لگا لیا ہے۔ میرے باپ کی ہڈیاں مجھے آج تک نہیں ملیں۔ تم اپنی ماں کی ہڈیوں کے خاک ہونے تک جی کے دیکھ لو۔"

"کیا...؟" سراج نے چیخ کے کہا۔ "تم نے مار دیا ہے اُسے؟" جملے کے اختتام پر اس کے لبوں سے مغلظات کا دریا بہنے لگا۔ "اور اب تم بھی سمجھ لو کہ ان سب کی خیر نہیں... میں ایک ایک کی لاش پر روڈ رولر پھروا دوں گا... تم کیا مجھے اتنا بے بس سمجھتے ہو...؟ بہت سے لوگ میرے قبضے میں ہیں... محسن کی بیوی... اس کی بہن فوزیہ... اور اس کا بہنوئی... تمھاری اس نازو کے گھر والے... رابعہ اور تمھارا استاد ٹیڈی... سب کی

بوٹیاں کتوں کے آگے نہ ڈال دوں تو میرا نام سراج نہیں۔"
"یہ سب تو تم پہلے بھی کرتے رہے ہو... میرے باپ کو... شہلا کے بھائی کو... رابعہ کی ماں کو... سب کو مار کے تمھیں کیا ملا؟ تم نے دوسرے بہت سے لوگوں کی زندگی بھی لے لی جو ہم سے کوئی نسبت نہ رکھتے تھے۔ عاشی اور دلاور کی بیوی تک اور زیب النسا کی عزت لوٹنے والوں تک تمھارے شیطانی عزائم کی بھینٹ چڑھنے والے کتنے ہیں... شاید سیکڑوں... صحیح تعداد خود تم بھی نہیں بتا سکتے... مگر کیا اس سے تمھیں فتح کا اطمینان اور جیت کی خوشی اور کامیابی کا احساس ملا؟ تمھاری ہی وجہ سے مشرقی پاکستان میں..."
"سکندر... یہ بات چھوڑو۔" سراج نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ "مجھ سے سودا کرلو... تم نے رابعہ اور ٹیڈی کی بات کی تھی۔ میں نے تمھاری بات رابعہ سے کرادی۔"
"تم نے...؟ تم بکواس کرتے ہو۔"
"ہاں... کیا تمھاری بات رابعہ سے نہیں ہوئی؟" وہ بولا۔
"ہوئی ہے... لیکن اس میں تمھارا کیا دخل تھا۔" میں نے کہا۔
"اگر میں کوشش نہ کرتا... تو دوست محمد کبھی رابعہ کو نہ لے جا پاتا اور میں کوشش کرتا تو شاید تمھاری کال بھی ٹریس کرلیتا۔"
"پھر تم نے ایسا کیوں نہیں کیا؟" میں نے کہا۔
"اس لیے کہ میں رسک لینا نہیں چاہتا تھا۔" وہ بولا۔ "تم چالاک لوگ ہو... آج تک تمھاری کال ٹریس نہیں ہو سکی... ظاہر ہے کہ تم کسی ٹیلی فون پول سے ڈائریکٹ کنکشن ملا کے بات کرتے ہو یا کسی ایکس چینج میں تمھارا کوئی ہمدرد بیٹھا ہوا ہے۔"
"لیکن دوست محمد سے تمھارا کیا تعلق...؟" میں نے اپنی پریشانی کو چھپاتے ہوئے کہا۔ "تم اسے کیسے جانتے ہو؟"
"اسے بہت سے لوگ جانتے ہیں۔ ہم نے ہی رابعہ کو اس کی تحویل میں دیا تھا۔" سراج نے کہا۔ "خود اس کی ضمانت پر۔"
"اوہ مائی گاڈ...!" میں نے ڈوبتے دل کے ساتھ سوچا۔ رابعہ تو اُسے اپنا ہمدرد اور دوست سمجھتی ہے۔ اس پر اعتماد کرتی ہے۔ اس نے دوست محمد کی تعریف بھی بہت کی تھی۔ مگر اسے نہیں معلوم کہ دوست محمد کسی کا دوست نہیں ہے۔ وہ تو بس ایک ضامن ہے۔ ایک جیلر ہے... ایک ایسا ٹھیکیدار ہے جس نے ضمانت دے رکھی ہے کہ رابعہ محفوظ اور مطمئن رہے گی۔ اسے احساس بھی نہیں ہوگا کہ وہ ایک آزاد قیدی ہے۔ میں نے اس سے سوچے سمجھے بغیر بہت سی باتیں کہہ دی تھیں۔ جو مجھے نہیں کہنی چاہیے تھیں۔ مگر اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ ٹیڈی کی مدد سے فرار ہوئی تھی۔ ٹیڈی اس کے کپڑے پہن کے لیٹ گیا تھا اور وہ محافظ کی وردی میں نکل گئی تھی۔ کیا وہ سب ڈراما تھا جس کے لیے اسٹیج فراہم کرنے والے خود شکاری تھے؟ میرا دماغ سخت کنفیوژن کا شکار ہو رہا تھا۔ کیا یہ بات رابعہ نہیں جانتی تھی کہ وہ آزاد نہیں ہے؟ اس نے اپنی مجبوری کا ذکر تو کیا تھا۔ یہ بھی کہا تھا کہ تم مجھ تک نہیں پہنچ سکتے۔ لیکن دوسری طرف اس نے دوست محمد کے ساتھ بالکل محفوظ اور خیریت سے ہونے کا ذکر بھی کیا تھا۔ آخر یہ سب کیا تھا۔ شکاری یہ کون سا جال پھیلا رہے تھے۔ وہ رابعہ کو قید میں آزادی کا یقین دلا کے اپنے کس مقصد کی تکمیل کا سامان کر رہے تھے؟
جواب فوراً میرے ذہن میں اچانک ہی نازل ہوا۔ یہ دامِ فریب ہمارے لیے پھیلایا گیا تھا۔ شکاری جانتے تھے کہ کوئی اور جائے نہ جائے میں رابعہ کی تلاش میں ضرور جاؤں گا، اور اُسے نکال لانے کی کوشش بھی کروں گا۔ انھوں نے رابعہ کو یقین دلا دلا دیا تھا کہ وہ دوست محمد کے ساتھ ہے تو کسی کی قید میں نہیں ہے اور رابعہ نے یہی یقین مجھے ٹرانسفر کر دیا تھا۔ لیکن رابعہ نے اس یقین میں تھوڑی سی مجبوری کا شک بھی شامل کر دیا تھا۔ شاید خود اس کے یقین میں شک کی آمیزش تھی۔ دوست محمد ہمارا دوست تھا، یا ہمارے دشمنوں کا۔ یا بالکل غیر جانبدار فریق تھا۔ مگر وہ ہر وقت دشمنوں کی نظر میں تھا۔ رابعہ کی نگرانی کرنے والے اس کی بھی نگرانی کر رہے تھے۔ انھوں نے ہی دوست محمد کو پیغام دیا ہوگا کہ رابعہ سے سکندر بخت کی بات کرا دو۔ نہ رابعہ کو احساس ہو کہ اس انتظام کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے اور نہ مجھے شک ہو... اس کے بعد جذبۂ عشق سلامت ہے تو ہم دیکھیں گے۔ کچے دھاگے سے چلے آئیں گے سرکار بندھے، اور سرکار کو ہم یہاں باندھ لیں گے...
"ہیلو... سکندر... کیا بات ہے... جواب دو میری بات کا۔"
"کس بات کا؟" میں نے چونک کر کہا۔
"میں نے کہا تھا کہ میری بات کرادو... ماں سے..."
"سوری ایس پی صاحب... یہ مشکل ہے۔" میں نے کہا۔
"کیوں مشکل ہے۔ کیا تم کو ٹیڈی سے بات نہیں کرنی ہے؟"
"ٹیڈی سے؟... تم بات کراؤ گے؟" میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ "ابھی؟"
"کیا تم نے سُنا نہیں تھا، میں نے کیا کہا تھا؟" سراج بولا۔
"نہیں... درمیان میں تمھاری آواز بند ہوگئی تھی۔ شاید لائن خراب تھی۔" میں نے کہا۔
"میں نے کہا تھا کہ ایک گھنٹے بعد تم ٹیڈی سے بات کر سکتے ہو... لیکن میں بھی اپنی ماں سے بات کروں گا۔" وہ بولا۔

"ٹیڈی کہاں ہے؟" میں نے کہا۔
"وہ کہیں بھی ہو... میں ایک گھنٹے میں اُسے لے آؤں گا۔" وہ جھنجھلا کے بولا۔
اس کے الفاظ پر میرے کان کھڑے ہوگئے... "لے آؤ گے؟ کہاں...؟"
"میرا مطلب تھا... کہ میں لائن پر لے آؤں گا۔" سراج نے بات بنانے کی کوشش کی۔ مگر تیر اس کی کمان سے نکل چکا تھا۔
"سنو سراج... یہ چکر بازی چھوڑو۔" میں نے کہا۔ "تم ٹیڈی کو ہمارے حوالے کرو... اور اپنی ماں کو لے جاؤ... اُس کی حالت ایسی نہیں ہے کہ وہ تم سے بات کر سکے۔"
"کیا وہ بیمار ہے؟" سراج نے مضطرب لہجے میں پوچھا۔
"تم اپنی ماں کو جانتے ہو تو یہ سوال فضول ہے — ان حالات میں اس کے اعصاب کب تک ساتھ دے سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اس نے کھانا پینا سب چھوڑ رکھا ہے۔ ہر وقت روتی رہتی ہے... حالانکہ ہم نے اس کے ساتھ اونچی آواز میں بات تک نہیں کی۔ اُسے پوری عزت دی اور اس کے آرام کا ہر ممکن خیال رکھا۔"
"تم کو جو کرنا تھا وہ تم پہلے ہی کر چکے تھے...!" سراج نے مجھے ایک فحش گالی دے کر کہا۔ "وہ مر جائے گی..."
"ظاہر ہے کہ تم نے معاملے کو طول دیا تو وہ مر جائے گی... اس کی عمر بھی تو دیکھو..." میں نے اپنے جھوٹ کے تیر کا نشانہ دیکھ کر کہا۔ "فیصلہ تو اب تمھارے ہاتھ میں ہے۔ بعد میں ہمیں الزام مت دینا۔"
"بہت کمینے ہو تم سکندر..." یوں لگتا تھا کہ وہ رو پڑے گا۔
"بولو، ایک گھنٹے میں ٹیڈی کو کہاں لاؤ گے؟" میں نے کہا۔
"میں... ابھی نہیں بتا سکتا... وہ میرے پاس نہیں ہے۔ مجھے دوسروں کو بھی راضی کرنا ہوگا۔" سراج نے کہا۔
"تم جیسے چاہو راضی کر سکتے ہو۔" میں نے کہا۔ "تم کو میں ایک گھنٹے کے بعد فون کروں گا۔" میں نے لائن کاٹ دی۔
یہ خیال کہ ٹیڈی زندہ ہے اور لاہور میں ہی ہے میرے حوصلے کو دوچند کرنے کے لیے کافی تھا۔ سوچے سمجھے بغیر میں نے کہہ دیا تھا کہ ٹیڈی کو لے آؤ۔ اس وقت میرے ذہن میں یہ نہیں تھا کہ بفرضِ محال سراج نے ہاں کہہ دی تو ہم اُسے کیسے ملیں گے اور کہاں ملیں گے۔ کس طرح ٹیڈی کو حاصل کریں گے اور سراج کے سپرد اس کی ماں کو کیسے کریں گے۔ یہ بہت خطرناک کام تھا۔ ایک ایس ایس پی اپنے وسیع اختیارات سے کام لیتے ہوئے ایسا جال بھی پھیلا سکتا تھا جو ہمیں نظر نہ آئے اور ہم اپنی ساری چالاکی اور ہوشیاری کے باوجود اس میں پھنس جائیں۔ مجھے رابعہ کا خیال ضرور آیا تھا کہ میں نے اس کی رہائی کا سودا نہیں کیا مگر وہ کام اتنا آسان نہیں تھا۔ ایک تو وہ کراچی میں تھی اور اس کا یہاں پہنچنا محال تھا۔ دوسرے وہ جس حال میں بھی تھی محفوظ اور مطمئن ضرور تھی تو میرے لیے فی الحال یہی احساس باعثِ طمانیت تھا۔ تیسری بات یہ تھی کہ میں آتشِ نمرود میں کود پڑنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اگر رابعہ اور اس کی آزادی کو شکاری دانہ و دام بنائے بیٹھے تھے تو میں یہ ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا کہ میری آنکھوں نے اس دامِ ہم رنگِ زمیں کو دیکھ لیا ہے۔ میں بھی انھیں اسیری کا فریب دے کر رہائی کا جُوا کھیلنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے صرف ٹیڈی کی بات کی۔
محسن اور غالب میری بات پر دم بخود رہ گئے۔ ان کا پہلا تاثر بے یقینی اور خوشی کے ملے جُلے جذبات کا تھا۔
"یار یہ دھوکا ہے۔" محسن بولا۔ "وہ چکر دے رہا ہے۔"
"کیا چکر دے رہا ہے؟" میں نے کہا۔ "میں اُسے اچھی طرح سمجھا چکا ہوں کہ اسے ماں کی زندگی عزیز ہے تو جلد فیصلہ کرے۔ ہیرا پھیری اور چکر بازی کا رسک وہ نہیں لے گا۔"
"فرض کرو ایسا ہی ہوتا ہے۔" غالب نے کہا۔ "کہ وہ ٹیڈی کو لے آتا ہے... یہ تبادلہ کہاں ہوگا... اور کیسے ہوگا؟"
"میں بتاتا ہوں۔" میں نے چٹکی بجا کے کہا۔ "ڈاکٹر سلامت کے کلینک میں۔"
غالب نے نفی میں سر ہلایا۔ "ہم محصور ہو جائیں گے اور ہمیں پتا بھی نہیں چلے گا... اور اگر ہم کشتوں کے پشتے لگا کے نکل بھی گئے تو کیا فائدہ... بہت لوگ مارے جائیں گے بے گناہ۔ کلینک میں کشت و خون ہوگیا۔"
"ایک اور جگہ ہے۔" میں نے کہا۔ "میجر سلطان..."
"بابا، وہ گھر پر نہیں ہوگا۔" غالب بولا۔
"اس کے گھر سے ہم معلوم کر لیتے ہیں کہ وہ کہاں ملے گا۔ وہ آرمی میڈیکل کور کا ڈاکٹر ہے۔ کسی سی ایم ایچ میں ہی ہوگا، اور ملٹری ہوسٹل میں ایس پی صاحب بھی بلا اجازت نہیں گھس سکتے۔ اگر ان کو گیٹ پر ہی روک دیا جائے تو وہ کمانڈنگ افسر کی مرضی اور اجازت کے بغیر آگے نہیں جا سکتے۔ میجر سلطان ہماری مدد کر سکتا ہے۔"
"سوال یہ ہے... کہ کیا وہ کرے گا؟" غالب نے کہا۔
"میں اس سے بات کر لیتا ہوں۔" میں نے کہا۔
"سی ایم ایچ کا نمبر معلوم ہے؟"
"اس کے گھر سے معلوم ہو جائے گا... مجھے گھر کا نمبر یاد ہے۔" میں نے کہا۔
"او کے۔" غالب نے کہا۔ "ٹرائی کرلو۔"
میجر سلطان کو میں نے ایک ریسٹورنٹ سے فون کیا جہاں

میں نے اور محسن نے چائے پی۔ غالب گاڑی میں رہا اور ایک ویٹر نے تین افراد کے لیے چائے گاڑی میں پہنچا دی۔ ریسیور غالباً اس کی بیوی نے اٹھایا۔

"میجر صاحب تو نہیں ہیں۔" وہ بولی۔

"مجھے معلوم ہے بھابی کہ وہ ڈیوٹی پر ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "آپ کو زحمت اس لیے دی کہ مجھے ان سے بات کرنی تھی۔ ڈیوٹی کہاں ہے ان کی؟"

"سی ایم ایچ میں۔" وہ بولی۔

میں ہنسا۔ "یہ تو معلوم تھا مجھے۔ سی ایم ایچ کا نمبر بتائیے۔ اور ان کی ایکسٹینشن۔"

اس نے سی ایم ایچ کا نمبر بتانے کے بعد کہا۔ "ایکسٹینشن نمبر ہے سیون ٹو زیرو... آپ کون صاحب ہیں؟"

"میں ان کا ایک دوست ہوں۔" میں نے کہا اور فون بند کردیا۔ "ایک کال اور کروں گا میں۔" میں نے مینیجر سے اجازت لینے کا اخلاقی فرض پورا کیا اور اس کے سر ہلانے سے پہلے ہی سی ایم ایچ کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔

"گڈ مارننگ... سی ایم ایچ ہیئر۔" کسی آپریٹر نے مستعدی سے کہا۔

"گیوی ایکس ٹینشن سیون ٹو زیرو... میجر سلطان" میں نے کہا۔

"یس سر۔" جواب ملا۔

پھر چند سیکنڈ کے وقفے سے سلطان نے کہا۔ "یس؟"

"میجر سلطان... میں سکندر بخت بول رہا ہوں۔" میں نے کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے شخص کی پروا کیے بغیر کہا۔ "آپ نے پہچانا... ایک بار میں..."

"او... یس... وائی ناٹ... میں نے اس دن بھی پہچان لیا تھا تمھیں۔"

"اور آپ سے میں نے ایک وعدہ کیا تھا... کہ میں پھر آؤں گا۔" میں نے کہا۔

"مجھے یاد ہے... بلکہ میں کہوں کہ مجھے انتظار ہے تو غلط نہ ہوگا... تم جب چاہو آسکتے ہو۔" میجر سلطان نے خوشدلی سے کہا۔

"میں اسی وقت آرہا ہوں... ایک گھنٹے میں..."

"ابھی؟... لیکن میں تو دو بجے کے بعد گھر پہنچوں گا۔" وہ بولا۔

"میں سی ایم ایچ میں آکے ملنا چاہتا ہوں۔"

"کیوں؟ کیا ایمرجنسی ہے؟" وہ بولا۔ "دیکھو سکندر... آئی ایم اے سروس مین... اپنی ذاتی حیثیت میں تمھاری مدد ضرور کرسکتا ہوں میں، لیکن تم کو سی ایم ایچ میں علاج کی سہولت فراہم کرنا میرے اختیار میں نہیں۔"

"میجر صاحب... میں زخمی نہیں ہوں۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "اور مجھے سی ایم ایچ سے کچھ نہیں لینا۔ میں آپ کے پاس آؤں گا... آپ کے کمرے میں بیٹھوں گا اور چلا جاؤں گا۔"

"بٹ واٹ از دی ایمرجنسی...؟"

"یہ میں وہیں آکے بتاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "کوئی مجھے گیٹ پر روکے گا تو نہیں؟"

"میں گیٹ پر کہہ دوں گا۔" میجر سلطان نے کہا۔ "اپنا نام مت بتانا، بس کہہ دینا کہ مجھے میجر سلطان کے پاس جانا ہے۔ تم نے دیکھا ہے میرا آفس۔"

"جی نہیں... آپ مجھے گائیڈ کریں۔"

"اوہ نو... تم بھٹکتے پھرو گے... اور تم کو رسک نہیں لینا چاہیے... ٹھیک ہے تم کو گیٹ سے ایک آدمی لے آئے گا۔" وہ بولا۔

"تھینک یو میجر۔" میں نے کہا اور فون بند کردیا۔ بل اور کال کے چارجز ادا کرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ مینیجر مجھے غور سے دیکھ رہا ہے۔

"جی؟ کیا بل بنا؟" میں نے سو کا نوٹ نکال کے کہا۔

"کچھ نہیں..." مینیجر نے مسکرا کے کہا۔ "بی مائی گیسٹ مسٹر سکندر۔"

"آپ پیسے نہیں لے رہے ہیں؟" میں نے جان بوجھ کے انجان بننے کی کوشش کی۔ "کیوں؟"

"مجھے اپنا دوست سمجھیے۔" وہ ہاتھ ملا کے بولا۔ "میں ذرا بزدل آدمی ہوں... صرف اتنا ہی کرسکتا ہوں... کہ آپ کو نہ پہچانوں... آپ سے بھی ایک درخواست ہے... ہر جگہ اپنا نام یوں نہ بتایا کریں... اور ہر جگہ ایسے مت جایا کریں... میری طرح اور لوگ بھی پہچانتے ہوں گے آپ کو..."

میں نے اقرار میں سر ہلایا اور نوٹ جیب میں ڈال لیا۔ "پیسوں کی تو کوئی بات نہیں... ایسے دوستانہ جذبات اور جذبے کی حمایت بہت اہم ہے؟"

"لیکن... پلیز... میں نہیں چاہتا کہ میرا ہوٹل تباہ ہو... مجھے امید ہے آپ پھر نہیں آئیں گے۔" وہ بولا۔ "میں ایک بزدل آدمی ہوں۔"

"اپنی بزدلی کا اعتراف کرنا بھی تو بہادری ہے۔" میں نے کہا۔ "تھینک یو۔"

"وش یو گڈ لک اگین۔" وہ محسن سے مصافحہ کرکے بولا... "کاش میں بھی اتنا بے غرض اور حوصلہ مند ہوتا کہ اپنے نفع نقصان کی پروا نہ کرتا۔ اور آپ کے ساتھ چل پڑتا... مسٹر محسن..."

باہر آکے جہاں ایک طرف مجھے اس احساس تفاخر نے سربلند کردیا تھا کہ لوگ ہمارے ساتھ ہیں، وہیں مجھے چوکنا بھی کردیا تھا۔ شکاری اپنے تمام وسائل اور اپنی ساری طاقت صرف کرکے بھی ہمیں مجرم... قانون شکن اور شرپسند، سماج دشمن یا غدار ثابت کرنے کی سازش میں ناکام تھے۔ آہستہ آہستہ سچائی نے خود کو ظاہر کردیا تھا اور ہر جگہ ہر سطح پر ملنے والے اس سچ کا اعتراف کرنے لگے تھے مگر میں اچانک تشویش میں مبتلا ہوگیا تھا۔

"شاید ہم ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی کا مظاہرہ کررہے ہیں۔" محسن نے میرے خیالوں کی ترجمانی کی۔ ہم دونوں سگریٹ خرید کے لوٹ رہے تھے۔

"ہاں... اسے خوش فہمی کی نادانی بھی کہا جاسکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"اگر ہم نے فوری طور پر خود کو ناقابلِ شناخت نہ کیا... اور روپوش نہ ہوئے تو بہت جلد ہمارے نام کے چرچے گلی گلی ہوں گے۔ کہ سکندر اور محسن فلاں جگہ دیکھے گئے تھے اور فلاں شخص کے ساتھ نظر آئے تھے۔" محسن بولا۔

"اس وقت تو میں یہ سوچ رہا ہوں کہ کیا ہمارا سی ایم ایچ جانا ٹھیک ہوگا۔" میں نے کہا۔

"اب تو میجر سلطان سے بھی کہہ دیا ہے۔" محسن بولا۔ "اور ہم ٹیڈی کو چھوڑ تو نہیں سکتے۔"

"ہاں... مگر ہم اس سے شام کو کہیں اور مل سکتے ہیں۔"

"بالکل..."

"خطرہ تو ہر جگہ ہوگا... ہم جتنی احتیاط چاہے کریں اور کتنی بھی ہوشیاری سے کام لیں... سو فیصد تحفظ کی ضمانت حاصل نہیں کرسکتے... میجر سلطان دھوکا دینے والا آدمی تو نہیں ہے؟" محسن نے کہا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس زندگی کے تجربات نے دوستوں اور دشمنوں کی نظر پہچاننا تو سکھا ہی دیا ہے۔"

"کیا چہرے دھوکا نہیں دیتے رہے ہیں؟"

"ہاں... مگر میجر سلطان پر میرا اعتماد غلط نہیں ہوسکتا... اگر وہ چاہتا تو پہلی بار ہی مجھے گرفتار کرادیتا۔ لیکن میں نے اس کے ہاتھوں وطن دشمنوں کو گرفتار کرکے ثابت کردیا تھا کہ ہم کون ہیں اور ہمارا مشن کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آرمی انٹیلی جنس نے ان تخریب کاروں اور دشمن کے ایجنٹوں سے بہت کچھ اگلوالیا ہوگا۔" میں نے کہا۔ "اور میجر سلطان نے اس کا کریڈٹ خود نہیں لیا ہوگا۔ وہ لے بھی نہیں سکتا تھا... یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں ٹہلنے کے لیے باہر نکلا اور میں نے یہ دشمنوں کے ایجنٹ پکڑ لیے۔ اس نے سچ بولا ہوگا، تو ہمارا نام ضرور لیا ہوگا۔"

"کیا بات ہے؟" غالب نے گاڑی سے سر نکال کے کہا۔ "ہم پکنک منانے کے لیے رُکے ہیں؟"

"یہ پکنک سے زیادہ دلچسپ ایڈونچر ہے۔" میں نے کہا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ سراج کی ماں پچھلی سیٹ پر اسی طرح گم سم پڑی تھی۔ ہم نے اُسے مسلسل سکون بخش اور خواب آور گولیاں دی تھیں، چنانچہ وہ ہر وقت کچھ سوئی سوئی رہتی تھی۔ ہم اس کے نروس بریک ڈاؤن کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے اور اسے باندھ کے اور اس کا منہ بند کرکے بھی نہیں رکھ سکتے تھے۔ وہ بوڑھی عورت سختی برداشت کرہی نہیں سکتی تھی چنانچہ اس کے حق میں یہی بہتر تھا کہ وہ ذہنی اور جسمانی طور پر بے حس رہے۔

باہمی مشورے سے محسن اور غالب نے واپس جانے کا فیصلہ کیا اور جولی میرے اصرار کے باوجود مجھے اکیلا چھوڑنے پر تیار نہیں ہوئی۔

"آپ اکیلے ہوں گے بھائی تو ان کو کون دیکھے گا۔" اس نے سراج کی ماں کی طرف اشارہ کیا۔

"میرا خیال ہے ان سے کوئی خطرہ نہیں۔"

"نہیں بھائی۔ آپ کو پریشانی لاحق ہوسکتی ہے۔" وہ بولی۔ "کیا آپ انھیں ساتھ اٹھائے پھریں گے... میں گاڑی میں رہوں گی۔ جب آپ میجر سلطان سے ملنے جائیں گے۔"

"ہوسکتا ہے کہ... وہ گاڑی کو اندر نہ جانے دیں... یا صرف مجھے اندر لے جائیں۔" میں نے کہا۔

"تو کیا ضرورت ہے کہ آپ گاڑی اندر لے جائیں اور ہمیں بھی ساتھ رکھیں۔" وہ بولی۔ "آپ گاڑی کہیں بھی چھوڑ دیں، اور پھر ٹیڈی بھائی کے ساتھ وہیں پہنچ جائیں۔ میں انتظار کرلوں گی۔"

محسن نے بھی اس کی تائید کی تو میں نے کہا۔ "تمھاری مرضی۔ تم دونوں کہاں جاؤ گے؟" میں نے غالب اور محسن کو مخاطب کیا۔

"ہمیں میکلوڈ روڈ کے چوک میں گرادینا یعنی ڈراپ کردینا۔" غالب نے کہا۔ "ہم استاد فنکار خلیفہ پنڈت کو سلام کریں گے اور وہاں سے چہرہ بدلوا کے جائیں گے۔ یہ صورت اب زمانے کو دکھانے کے قابل نہیں رہی۔"

"اس کا احساس تم کو جوانی میں ہوجاتا تو اچھا تھا۔" محسن نے ایک سرد آہ بھر کے کہا۔ "اس شکل کو گم کردیتے کہیں۔ سرہانے لکھا جاتا... خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں؟ سوالیہ نشان کے ساتھ۔"

"تم کو اب تک احساس نہیں کہ سیرت کا حسن کیا ہوتا ہے۔" غالب نے کہا۔ "ورنہ تمھارے لیے شرم سے ڈوب مرنے کے مواقع بہت..."

"خود مرنے کی کیا ضرورت ہے جب اتنے لوگ مارنے کے لیے کوشش کررہے ہیں۔ اور مایوس نہیں ہوئے۔ یہ ٹھیک ہے کہ تقدیر یاور ہے اور دوست زیادہ ملے ہیں مگر دشمن ایک بھی بہت ہوتا ہے۔ ان چہروں کی اتنی تشہیر ہوگئی ہے کہ اب گمنامی ہی

ہمیں بچا سکتی ہے۔ ہم دھر لیے گئے تو سارے پلان دھرے رہ جائیں گے۔"

ان دو تواناؤں کو کشتی چوک پر اتار کے میں واپس ہوا اور کینٹ کے علاقے کی طرف جانے کے لیے مال روڈ پر نکل گیا۔ میرے پاس تقریباً آدھا گھنٹا تھا۔ دس منٹ سے بھی کم وقت میں گاڑی باغِ جناح سے آگے نکل گئی۔ میجر سلطان کے پاس جانے سے پہلے سراج سے پوچھنا بھی ضروری تھا کہ اس نے کیا فیصلہ کیا ہے۔ وہ اپنی ماں کی طرف سے بہت پریشان تھا چنانچہ مجھے کسی حد تک یقین تھا کہ وہ ٹیڈی کو ضرور لائے گا۔ خواہ اس کے لیے اُسے دوستوں پر دباؤ ڈالنا پڑے یا ان کی خوشامد کرنی پڑے... پھر بھی تصدیق ضروری تھی۔

وزیروں اور سیکرٹریوں کی رہائش گاہوں کے پاس میں نے گاڑی روک کے اپنا ریوالور جولی کو دیا۔ "میں ابھی آتا ہوں... دس منٹ میں۔"

"بھائی آپ میری فکر نہ کریں۔ اسے اپنے پاس رکھیں۔" جولی نے کہا۔

میں گھنے درختوں کے پیچھے ایک ٹیلی فون پول پر چڑھ گیا جسے میں پہلے بھی استعمال کر چکا تھا۔ حسبِ توقع سراج میری کال کے انتظار میں تھا۔

"سکندر... میں نے... تمھاری بات مان لی ہے۔" وہ بولا۔ "بلکہ منوالی ہے سب سے... تم ٹیڈی کو لے جا سکتے ہو۔"

"تم ٹیڈی کو لا سکتے ہو۔" میں نے کہا۔ "جگہ کا انتخاب میں نے کیا ہے اور تم کو وہیں آنا ہوگا۔"

"ٹھیک ہے... کیا تم اکیلے آؤ گے؟"

"یہ غیر ضروری سوال ہے۔" میں نے کہا۔ "تم بھی چاہو تو اپنی ساری مسلح نفری کے ساتھ آ جاؤ... مقابلہ کیے بغیر ہم بھی ہار ماننے والے نہیں ہیں۔"

"میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔" سراج نے کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ کسی کو بھی کچھ معلوم نہ ہو... صرف میرے اور تمھارے درمیان ملاقات ہو اور ایک ہی وقت میں تم میری ماں کو میرے حوالے کر دو اور میں ٹیڈی کو تمھارے حوالے کر دوں... کیا یہ ٹھیک نہیں ہے؟"

"اگر تمھاری نیّت ٹھیک ہے اور تمھارے الفاظ میں نیّت کا کھوٹ شامل نہیں ہے تو سب ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔

"تو پھر بتاؤ میں کہاں آؤں؟"

"تم اکیلے آؤ گے... کسی کو بتائے بغیر..." میں نے کہا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں۔"

"تمھارے وعدے پر اعتبار کرنے والا احمق۔" میں نے کہا۔ "صرف اتنا یاد رکھنا کہ تمھاری ذہانت اور چالاکی تمھیں ہی نقصان پہنچائے گی۔ تم تمام عمر خود کو قائل نہ کر سکو گے کہ اپنی ماں کو خود تم نے مارا..."

"آج ماں نہ ہوتی تو میں زندگی میں پہلی بار خود کو اتنا مجبور اور بے بس محسوس نہ کرتا سکندرِ اعظم... اور تم کو یہ فتح بہت مہنگی پڑے گی۔ ایسے دس ہزار اَسّاڈ ٹیڈی میں اپنی ماں پر قربان کر سکتا ہوں۔" وہ برہمی سے بولا۔

"تم کیسے آؤ گے؟"

"اس کا انحصار جائے ملاقات پر ہے۔" وہ بولا۔ "شہر کی حدود میں یا دس بیس میل کے لیے میں ٹیکسی استعمال کروں گا۔ زیادہ دور آنے کے لیے کسی کی گاڑی لوں گا۔"

"تم کو شہر کی حدود میں ہی رہنا ہے... لیکن تم نہ اپنی گاڑی استعمال کرو گے نہ کسی اور کی... تم ٹیکسی میں بھی نہیں آؤ گے... تانگے میں آؤ گے جو کھلا ہوگا... آگے تم بیٹھو گے..."

"یہ ناممکن ہے..." اس نے میری بات کاٹ دی۔ "تم یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ میں ایس ایس پی ہوں... مجھے پہچاننے والے بہت ہیں۔ اس کے علاوہ ٹیڈی تانگے میں نہیں آ سکتا۔ وہ جسمانی طور پر اس قابل نہیں ہے۔"

"اچھا... تو پھر تم ریڈ کراس کی ایمبولینس طلب کرو... ٹیڈی کو اس میں لٹا کے لاؤ۔" میں نے کہا۔ "ایمبولینس گیٹ سے گزر جائے گی اور تم گیٹ پر اتر جاؤ گے۔ ایمبولینس اندر چیک ہوگی... تم کو گیٹ پر چیک کیا جائے گا... کہ تمھارے پاس اسلحہ تو نہیں ہے۔"

"شٹ اپ... یہ میری بے عزتی ہوگی۔"

"کوئی تمھاری جسمانی تلاشی نہیں لے گا۔" میں نے اُسے اطمینان دلانے کے لیے کہا۔ "جب تم گیٹ سے گزرو گے تو خود ہی پتا چل جائے گا کہ تمھاری کسی جیب میں ریوالور یا دھات کی کوئی چیز تو نہیں ہے... بہتر ہے کہ تمھاری کسی جیب میں سکے تک نہ ہوں۔"

"لیکن میں ایمبولینس کو چھوڑ نہیں سکتا۔ تمھارا کیا بھروسا کہ تمھارے آدمی ایمبولینس پر قبضہ کر لیں۔" وہ بولا۔ "وہ تمھارا علاقہ ہوگا۔ شاید تمھاری ایم آر ایس کا ہیڈ کوارٹر جہاں تمھارے اپنے سیکیورٹی چیک پوسٹ ہوں گے۔"

میں ہنسا۔ "ایس ایس پی صاحب! آپ کو سی ایم ایچ آنا ہے۔ کمبائنڈ ملٹری ہوسپٹل... چھاؤنی کے علاقے میں۔"

"سی ایم ایچ؟" سراج کی زبان اتنا کہتے حیرت سے گنگ ہوئی۔

"یس... سی ایم ایچ۔" میں نے کہا۔ "تم جانتے ہو کہ وہ کتنا محفوظ علاقہ ہے۔" میں نے کہا۔ "اسپتال تو عالمی جنگ میں بھی علاقۂ تحفظ سمجھے جاتے ہیں۔ وہاں کشت و خون کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا... اور لڑائی کا بھی... تم قانون کے محافظ ہو۔ تم وہاں پابند رہو گے۔"

"لیکن سی ایم ایچ... کیا تم کو ملٹری کی حفاظت حاصل ہے؟"

"ہم نے جو کام وطن کی سرزمین کے دشمنوں سے حفاظت کے لیے کیے ہیں، وہ وطن کا دفاع کرنے والوں سے پوشیدہ نہیں۔" میں نے کہا۔ "ظاہر ہے ہم انہی کے ساتھ ہیں۔ وہ ہم پر کیسے آنچ آنے دیں گے۔ اگر تمھارے ذہن میں کوئی شیطانی منصوبہ تھا... تو اُسے بھول جاؤ... اکیلے آؤ... بالکل اسی طرح جیسے کوئی ذمے دار آدمی اسپتال جاتا ہے۔ میرے آدمی بھی ایمبولینس پر قبضہ نہیں کر سکتے۔ ریڈ کراس جیسا عالمی ادارہ عزت اور احترام کا مستحق ہے اور ان کے ساتھ زیادتی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"تم مجھے کہاں ملو گے؟" سراج نے یوں کہا کہ مجھے اس کے لہجے کی مایوسی کا اندازہ ہوا۔

"ممکن ہے میں نہ ملوں۔" میں نے کہا۔ "ایمبولینس ڈرائیور سے کہنا کہ گاڑی کو دوسری گاڑیوں کے ساتھ روک لے۔ تم گیٹ پر اپنی شناخت کراؤ گے اور کرنل حضور احمد سے ملنے کے لیے اندر جاؤ گے... ان کے بنگلے پر۔"

"یہ کرنل حضور احمد کون ہے؟"

"یہ جاننا تمھارے لیے ضروری نہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ بنگلہ آخری حصے میں ہے اور گیٹ پر موجود سنتری خود تم کو بتا دے گا کہ تمھیں کدھر سے جانا ہے۔ اگر تم اپنی کار میں آؤ تب بھی کوئی حرج نہیں لیکن کار کو ایمبولینس کے پیچھے رکھنا۔ اور ایمبولینس کے ساتھ مت رہنا۔ جتنی دیر میں تم اندر کا چکر لگا کے آؤ گے تمھاری ماں کو ٹیڈی کی جگہ ایمبولینس میں لٹا دیا جائے گا اور تم ایمبولینس کو ساتھ لے جا سکو گے۔ چونکہ تم اپنی ایک شناخت رکھتے ہو اس لیے سب کو معلوم ہوگا کہ ایس ایس پی صاحب کسی کام سے کرنل حضور احمد خاں سے ملنے کے لیے آئے تھے۔ تم کسی قسم کی ہنگامہ آرائی میں ملوث ہو ہی نہیں سکتے۔"

"سنتری پہلے کرنل سے پوچھے گا۔" سراج نے کہا۔

"پوچھنے دو... وہ ایک ایس ایس پی کو بلاوجہ نہیں روکے گا... وہ تمھیں عزت کے ساتھ ریسیو کرے گا... بٹھائے گا اور چائے پلائے گا..." میں نے کہا۔

"وجہ بھی تو پوچھے گا میرے آنے کی..."

"تم دس وجوہات بیان کر سکتے ہو۔" میں نے کہا۔ "ایمبولینس کے ڈرائیور کو سمجھا دینا کہ دخل در معقولات نہ کرے۔ جب مریض اتار لیا جائے اور دوسری خاتون مریضہ کو لٹا دیا جائے تو وہ تمھاری کوٹھی پر پہنچ جائے۔ تمھاری گاڑی کا نمبر کیا ہے؟"

"ایل ای ایچ۔ ڈبل فور ڈبل سیون زیرو... یہ مت بھول سکندر کہ تم دھوکا دے سکتے ہو... آج... مگر کل بھی آئے گا۔"

"کل کی کل سوچیں گے اور دیکھیں گے۔" میں نے کہا۔

"میری طرف سے تم اسے ایک جنٹلمین کا ورڈ آف آنر سمجھ سکتے ہو... تم کو تو مطمئن ہو جانا چاہیے۔ مجھے دیکھو کہ تم جیسے بدمعاش پر اعتبار کر رہا ہوں۔"

اس سے پہلے کہ وہ مجھے گالی دیتا میں نے لائن کاٹ دی اور نیچے اتر آیا۔ میں نے میجر سلطان کو جو وقت دیا تھا وہ ہو گیا تھا اور ابھی میں سی ایم ایچ سے بہت دور تھا لیکن آگے چھاؤنی کے علاقے تک مال روڈ صاف اور خالی تھی۔ میں نے نئے ماڈل فاکس ویگن کے سولہ سو سی سی انجن کی طاقت سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور سی ایم ایچ پہنچنے تک جولی کو سب کچھ سمجھا دیا۔ حسبِ توقع گیٹ پر گارڈ نے مجھے بیریئر سے پہلے ہی روک لیا۔

"مجھے میجر سلطان کے پاس جانا ہے۔" میں نے کہا۔

"اور کون ہے آپ کے ساتھ؟" گارڈ نے کہا۔

"میری بیمار ماں... اور میری سسٹر۔" میں نے کہا۔

گارڈ نے سر ہلا کے اشارہ کیا اور بیریئر اُٹھ گیا۔ "سیدھے ہاتھ پر چوتھی بیرک۔ ان کا کمرا ساتواں ہے۔"

"تھینک یو۔" میں نے کہا۔ سو ڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر ایک چوک سا تھا، جس کے وسط میں پول پر بہت سے رہنمائی کرنے والے سائن لگے ہوئے تھے۔ میں دائیں جانب چوتھی بیرک کے پاس رکا اور گاڑی سے اتر گیا۔ جولی نے میری جگہ سنبھالی اور گاڑی کو ڈرائیو کرتی ہوئی اُدھر لے گئی، جہاں بہت سی دوسری گاڑیاں اور ایمبولینسیں کھڑی ہوئی تھیں۔ میجر سلطان کا کمرا تلاش کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی اُٹھ کر پُرجوش مصافحہ کیا۔

"آئی ایم سوری۔ مجھے کچھ دیر ہوگئی۔" میں نے کہا۔

"میں تو سمجھا تھا کہ پھر نکل گئے کسی غیر متوقع ایڈوینچر کے لیے۔" وہ ہنسا۔ "یہ بتاؤ کہ کیا پیو گے... چائے یا کافی؟"

"کافی۔" میں نے کہا۔ "لیکن پہلے ایک ضروری بات۔ ایک شخص جو خود کو ایس ایس پی سراج کہتا ہے میرے تعاقب میں ہے۔ اگر وہ یہاں آئے تو اُسے گیٹ پر روک لیا جائے۔ اور ریڈ کراس کی ایک ایمبولینس کو چیک کر کے گزرنے دیا جائے۔ اس میں ڈرائیور کے علاوہ صرف ایک مریض ہونا چاہیے۔"

"معاملہ کیا ہے... آئی ہوپ...!" وہ پریشان ہو کے بولا۔

"ایوری تھنگ اِز فائن۔" میں نے کہا۔

"کیا ہم اس شخص کو گرفتار کر لیں؟" میجر سلطان نے فون اٹھا کے کہا۔ "جو ایس ایس پی بن کے آئے گا۔"

"میرا مشورہ ہے کہ آپ ملبے چکر میں نہ پڑیں۔ اُسے واپس کر دیں، تھوڑا سا ڈرا دھمکا کے... یا تھوڑی دیر بند رکھیں اور پھر چھوڑ دیں۔" میں نے کہا۔

میجر سلطان نے سرہلایا اور فون پہ ہدایات دینے لگا۔ پھر اس نے گھنٹی بجا کے بیٹ مین کو طلب کیا اور اس کو کافی لانے کے لیے کہا۔

"اب بتاؤ معاملہ کیا ہے؟" میجر سلطان نے کہا۔

"معاملہ صرف اتنا ہے۔" میں نے کہا "کہ میرا ایک ساتھی اُن کی قید میں تھا۔ وہ اس کو چھوڑنے پر مجبور ہو گئے ہیں کیونکہ ہم نے بھی ان کا ایک آدمی پکڑ لیا تھا۔ جنگی قیدیوں کا یہ تبادلہ باہر مشکل تھا کیونکہ کسی کو کسی پر اعتبار نہیں تھا۔ میں نے یہ تجویز دی کہ ہمارا آدمی ریڈ کراس کی ایمبولینس میں یہاں پہنچا دیا جائے۔ ان کے آدمی کو میں لے آیا ہوں۔ اندر ہی کسی کی مداخلت کے بغیر تبادلہ ہو جائے گا۔ یہاں نہ وہ گڑبڑ کر سکتے تھے... اور نہ ہم... ایمبولینس ان کے آدمی کو لے کر چلی جائے گی تو میں اپنے آدمی کے ساتھ روانہ ہو جاؤں گا۔ نیوٹرل زون میں یہ پُرامن کارروائی کسی خرابی یا اندیشے کے بغیر آپ کی مدد کے بغیر ممکن نہیں تھی۔"

میجر سلطان ہنسنے لگا "بس یار میری نوکری کا خیال رکھنا۔"

"کیسی باتیں کرتے ہیں آپ... یہ ایک ہوسپٹل ہے۔ یہاں کوئی اونچی آواز میں بات بھی کرے تو غلط... گڑبڑ کا کیا سوال..." میں نے کہا۔

اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ "یس؟" میجر نے ریسیور اُٹھا کے کہا "ہاں... میں نے کہا تھا کہ ایمبولینس کو گزرنے دو۔ لیکن چیک کرو پہلے۔ ڈرائیور کا شناختی کارڈ دیکھو۔ ایک مریض کے سوا کچھ نہیں ہونا چاہیے اس میں۔" اس نے ریسیور رکھا ہی تھا کہ کافی آ گئی۔ بیٹ مین نے ایک مگ میرے سامنے رکھا اور دوسرا میجر کے سامنے۔ اسی وقت گھنٹی پھر بجی۔

"ہاں... کیسے؟" میجر سلطان نے کہا "کون کرنل حضور احمد خاں؟ کیا تم نہیں جانتے کہ اس نام کا کوئی آفیسر نہیں ہے یہاں... کون ہے؟ وہی ایس پی... ویٹ باسٹرڈ... ہولڈ کرو اس کو اپنے پاس... اندر بٹھاؤ اور جب تک میں نہ کہوں جانے مت دو۔"

میرا دل چاہتا تھا کہ میں قہقہہ مار کے ہنسوں۔ اصلی ایس ایس پی سراج کو ایک جعلساز قرار دے کر روک لیا گیا تھا۔ اب وہ لاکھ اپنا شناختی کارڈ دکھائے، وہ اسے چھوڑنے والے نہیں جن کے لیے "آرڈر از آرڈر۔"

"مجھے ایک بات بتاؤ۔" میجر سلطان نے اچانک کہا "کیا یہ واقعی جعلی ایس ایس پی ہے؟"

"نہیں۔" میں نے کہا "وہ اصلی ایس ایس پی ہے۔"

"اور وہ تمھارے پیچھے... تم کو گرفتار کرنے کے لیے آیا ہے۔"

میں نے اقرار میں سرہلایا "تمھیں مجھ کو بچانا ہے میجر سلطان۔ میں تم کو دوست سمجھ کے آیا ہوں۔"

"تم نے مجھے آزمائش میں ڈال دیا ہے۔" وہ پریشان ہو کے بولا "کیا کرنل حضور احمد خاں کا نام تم نے دیا تھا اُسے؟"

میں نے پھر گردن ہلا کے اپنے جرم کا اقرار کیا۔

"میرے خیال میں یہ وجہ کافی ہے۔" وہ سوچتے ہوئے بولا "تم نے اچھا کیا کہ مجھے بتا دیا۔ میرے پاس اس کو روکے رکھنے کی معقول وجہ ہے۔ مجھ پر کوئی الزام نہیں آسکتا... خیر چھوڑو... یہ بتاؤ کہ آجکل کیا کر رہے ہو؟"

"بہت کچھ... وہی جو پہلے کرتے تھے۔" میں نے کہا۔ "لیکن تفصیل ابھی نہیں بتا سکتا... کیونکہ مجھے جانا ہے۔"

"یہ تم کو آنے سے پہلے سوچنا تھا کہ تم واپس کیسے جاؤ گے" میجر سلطان نے گرج کے کہا۔ اس نے گھنٹی پر ہاتھ مارا۔

میں اس تبدیلی پر دم بخود رہ گیا۔ "واٹ از آل دس... کیا مطلب ہے آخر اس کا...؟"

"مطلب بھی سمجھ جاؤ گے... یہ ممنوعہ علاقہ ہے... تم نے کیا اپنے باپ کا گھر سمجھ لیا تھا؟" میجر سلطان نے کہا "تم آئے کیسے اندر...؟"

"یس سر..." بیٹ مین نے اٹینشن ہو کے کہا۔

"گارڈ کو بلاؤ۔" میجر سلطان نے کہا۔ اور اس وقت میں نے محسوس کیا کہ بازی الٹ گئی ہے۔ سراج اندر آ چکا تھا اور میری حیثیت اس گیدڑ کی طرح ہو گئی تھی جسے شامت گھیر کر شہر کی طرف لے گئی ہو۔

"**میجر سلطان**" سراج نے ایک تمسخر اڑانے والی طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور آگے بڑھا۔

"یس" میجر سلطان نے کہا "آر یو دی ایس پی۔"

"ایس ایس پی" سراج نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ "ناٹ جسٹ ایس پی۔ میرا نام سراج ہے۔"

میجر سلطان نے اس سے ہاتھ ملایا اور اسے کرسی پیش کی۔

"میرا خیال ہے..."

"آپ کا خیال ٹھیک ہے" سراج بولا "آپ نے مجھے گیٹ پر روک لینے کا حکم دیا تھا لیکن میں پھر بھی اندر آ گیا۔"

میجر سلطان کے چہرے پر ناگواری کے آثار پھیل گئے "مجھے بتایا گیا تھا کہ تم کسی کرنل حضور احمد خان کو پوچھ رہے تھے اور اپنی شناخت بھی نہیں کرا رہے تھے۔"

"واٹ نان سنس۔ میں خود اپنی شناخت ہوں۔ میں کوئی سڑک پر کھڑا ہوا فٹ کانسٹیبل نہیں ہوں۔ یو سی دِس یونیفارم۔"

"معاف کیجیے، یہ وردی میں نے بہت سے فلمی اداکاروں کے جسم پر بھی دیکھی ہے۔ فلموں میں" میجر سلطان نے خشک لہجے میں کہا "ہمارے لیے آپ کی شناخت یہ وردی نہیں ہے اگر کوئی

جنرل کی وردی میں بھی آ جائے اور ہم اسے پہچانتے نہ ہوں تو اسے چیک کیا جائے گا۔ اسے اپنی شناخت کا ثبوت پیش کرنے میں عار محسوس نہیں ہو گی اور وہ ہماری فرض شناسی پر خفا نہیں ہو گا۔ دی آر سپوزڈ ٹو ڈو سو۔"

"ان دیٹ کیس" سراج نے اپنا شناختی کارڈ جیب سے نکال کے میز پر ڈال دیا "یہ آپ دیکھ لیں اور اگر اس پر بھی جعلی ہونے کا شک ہے تو میں یہاں بیٹھا ہوں۔ آپ تصدیق کرا لیں۔"

میجر سلطان نے شناختی کارڈ کو میز پر سے اٹھا کے غور سے دیکھا لیکن اس تمام عرصے میں وہ ایک لمحے کے لیے بھی میری طرف سے غافل نہیں ہوا۔ اس کا ریوالور میرے سینے کا نشانہ لیے ہوئے تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے۔ کیا میجر سلطان نے سراج کو مجھ سے پہلے دیکھ لیا تھا اور اس کے رویے میں اچانک جو تبدیلی آئی تھی، وہ ایک ضرورت کا تقاضا تھی۔ کیا اس طرح وہ مجھے سراج کی تحویل میں نہ دینے کا جواز پیدا کر رہا تھا۔

"گیٹ پر بھی میں نے اپنی شناخت کرانے سے انکار نہیں کیا تھا" سراج نے اپنی بات جاری رکھی "کرنل حضور احمد خان کو پوچھنے کی غلطی ضرور کی تھی میں نے۔ میں دراصل سی ایم ایچ کے او سی کا نام بھول گیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ شاید سی ایم ایچ میں آخری بار میں دو سال پہلے آیا تھا۔ میرا ایک دوست یہاں داخل تھا۔"

"اور آج آپ کس سلسلے میں تشریف لائے ہیں؟"

"یو نو میجر" سراج نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔ "اٹ واز اے میٹر آف چانس۔ کہ جس وقت تمھارے حکم پر مجھے روکا گیا تو اندر سے لیفٹیننٹ کرنل بخاری باہر جا رہے تھے۔ ہی از فرام سگنلز۔ اور ان کے گھر میں حال ہی میں گیا تھا۔ وہ مجھے جانتے تھے۔ ان کا گھریلو ملازم کچھ چوری کر کے نکل گیا تھا۔ میں نے اسے چوبیس گھنٹے گزرنے سے پہلے پکڑ لیا تھا۔ ایک ایک چیز ان کو واپس مل گئی۔ ان کی وائف کی جیولری میں سے ایک انگوٹھی تک کم نہیں ہوئی تھی۔ کرنل بخاری نے میری مدد کی۔ میں نے کہا کہ مجھے میجر سلطان ــــ ڈاکٹر میجر سلطان کے پاس جانا ہے اور یہ کہتے ہیں کہ آئی ایم ناٹ آتھرائزڈ پرسنل۔ خیر انھوں نے گارڈ کو سمجھا دیا۔ اینڈ ہیئر آئی ایم۔"

"فائن" میجر سلطان نے گھڑی دیکھ کر کہا "آپ کے آنے کا مقصد میں سمجھ گیا۔ غالباً آپ اس شخص کے تعاقب میں تھے۔"

"غالباً کی اس میں کیا بات ہے" سراج نے کہا "یو نو دس مین ــــ یہ ایک خطرناک قاتل ہے۔ مفرور مجرم ہے اور جیسا کہ آپ نے ابھی کہا تھا، اس پر غداری اور ملک دشمنی کے الزامات ہیں۔"

میجر سلطان نے اقرار میں سر ہلایا "مجھے معلوم ہے۔"

"ایسی صورت میں" سراج نے میز پر جھک کر معنی خیز لہجے میں کہا "کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہ آپ کے کمرے میں کیا کر رہا تھا۔"

"یہ مجھے ایک آفر دینے آیا تھا۔"

"نہیں ــ آپ نہیں پوچھ سکتے۔ میں آپ کو جواب دہ نہیں ہوں مسٹر ایس ایس پی" میجر سلطان نے کہا "میں نے اسے گرفتار کر لیا ہے۔"

"بڑے دوستانہ طریقے پر" سراج نے تلخی سے کہا "کافی پلا کے۔ شاید یہ ٹریپ کرنے کے لیے ضروری تھا۔"

"کیا ضروری تھا اور کیا نہیں تھا" میجر سلطان نے سختی سے کہا "یہ میں سمجھتا ہوں۔"

"اور میں سمجھتا ہوں کہ جو کچھ تم کر رہے ہو، وہ بالکل غیر ضروری ہے۔ یہ تمھارا کام نہیں ہے میجر" سراج نے برہمی سے کہا "تم مجھے بے وقوف بنا رہے ہو۔ اس آدمی کو میرے حوالے کر دو..."

"ڈونٹ یو فارگٹ" میجر سلطان نے اس کی بات کاٹ دی۔ "کہ جہاں تم اس وقت بیٹھے ہوئے ہو یہاں تمھارے اختیارات کی اہمیت صفر ہے۔ یہ علاقہ تمھاری جیورس ڈکشن میں نہیں آتا مسٹر ایس ایس پی۔ اگر تم صرف یہی کہنے آئے تھے تو تم جا سکتے ہو۔ میں تمھارا مطالبہ مسترد کرتا ہوں۔"

"تمھیں ایسا کرنے کا کوئی اختیار نہیں۔"

"میں پوری طرح با اختیار ہوں۔ میں اس شخص کو ایف آئی یو کے حوالے کر دوں گا۔ اس کے بعد میری ذمّے داری ختم" میجر سلطان نے کہا "میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ ایک رات یہ شخص زبردستی میرے گھر میں گھس آیا تھا۔ میری بیوی ابھی تک نروس بریک ڈاؤن کا شکار ہے۔ اس کے ساتھ دو آدمی اور تھے۔ ان کو میں نے پکڑ لیا تھا مگر یہ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ میں نے اس کے دونوں ساتھیوں کو بھی ایف آئی یو کے حوالے کر دیا تھا۔ ایف آئی یو کا مطلب سمجھتے ہو؟ فیلڈ انٹیلی جنس یونٹ ــ یہاں کینٹ میں ان کے ایک آفیسر نے تفتیش کی تو وہ دشمن کے ایجنٹ ثابت ہوئے۔ ان سے بہت سی مفید معلومات حاصل ہوئیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ انھوں نے کیا بتایا۔ مگر ایف آئی یو کے اس آفیسر نے بعد میں مجھ سے فون پر کہا کہ ان کی گرفتاری کے بعد سنسنی خیز انکشافات ہوئے۔ بہت سے دوسرے لوگ پکڑے گئے اور کافی مقدار میں غیر ملکی اسلحہ بھی ملا۔ جو غالباً مشرقی پاکستان میں خانہ جنگی کے حالات کو بگاڑنے کے لیے وہاں بھیجا جانے والا تھا۔ آئی ایم ناٹ شیور۔ یہ خیال ہے میرا..."

سراج یقین اور بے یقینی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ سب کچھ سن رہا تھا اور شاید یہ سوچ رہا تھا کہ وہ پکڑے جانے والے کون تھے؟ اگر اس کے اپنے آدمی ہوں گے تو وہ فوراً سمجھ گیا ہو گا کہ ان کو پکڑوانے والا میں تھا۔

"تمھاری بات سے ابھی تک یہ وضاحت نہیں ہوئی" سراج نے کہا "کہ اس وقت یہ ملزم خود تمھارے پاس گرفتار ہونے کے لیے کیوں چلا آیا۔"

"یہ مجھے ایک آفر دینے آیا تھا۔"

"جسے تم نے مسترد کر دیا ہوگا۔" سراج نے تمسخر اڑانے کے طنزیہ انداز میں کہا۔ "لائک اے ویری فیتھ فل افسر اینڈ محبِ وطن پاکستانی اور پھر اس نے تمھیں دھمکی دی ہوگی کہ تمھارے بیوی بچوں کی خیر نہیں۔ کیا تم چاہتے ہو کہ میں اس فضول اور بے سروپا بات پر یقین کروں میجر؟"

"تم کیا کرو گے، یہ میرے سوچنے کی بات نہیں ہے۔" میجر سلطان نے کہا۔ "اور مجھے کیا کرنا ہے، یہ تمھارے سوچنے کی بات نہیں۔"

دو گارڈ اندر داخل ہوئے جن کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔ اسی وقت گھنٹی بجی۔

"یس — ہاں — وہ موجود ہیں یہاں۔" میجر سلطان نے کہا۔ "میرے پاس بیٹھے ہیں۔ او کے — میں بھیج دیتا ہوں۔" اس نے ریسیور رکھ دیا۔ "کمانڈنٹ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اگر آپ کو کوئی کام تھا تو کسی میرے جیسے ماتحت کے پاس آنے کے بجائے آپ کو ان کے پاس جانا چاہیے تھا۔ گارڈ آپ کو وہاں پہنچا دیں گے۔"

سراج کا چہرہ بگڑ گیا۔ "جانے سے پہلے میں ان سے بات کروں گا ٹیلی فون پر۔"

میجر سلطان نے نفی میں سر ہلایا۔ "ہم صرف وہی کرتے ہیں جو ہم سے کہا جاتا ہے۔ کمانڈنٹ نے کہا ہے کہ آپ کو بھیج دیا جائے اور یہ میری ڈیوٹی ہے کہ میں آپ کو بھیج دوں۔ وہ آپ کے منتظر ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" سراج کھڑا ہوگیا۔ "لیکن مجھے واپسی پر یہ شخص یہیں ملنا چاہیے۔"

"تم مجھے آرڈر دے رہے ہو؟" میجر سلطان نے کہا۔

"آرڈر بھی لے آؤں گا میں۔ میں تمھارے کمانڈنٹ کو پوری صورتِ حال سمجھا دوں گا کہ ایک میجر ادائے فرض کی راہ میں حائل ہو رہا ہے۔ تم زیادہ سے زیادہ اپنے او سی سے بات کر سکتے ہو مگر میں آئی جی صاحب کے ذریعے ہوم سیکرٹری سے اور تمھارے وزارتِ دفاع کے اعلیٰ حکام سے بھی احکامات حاصل کر سکتا ہوں۔"

"میں تم کو روک نہیں رہا ہوں۔" میجر نے سرسری لہجے میں کہا۔ "جب میں اپنا فرض پورا کر رہا ہوں تو مجھے کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ اپنی دھمکیاں اپنے پاس رکھو۔ شاید تم جانتے نہیں کہ میری واقف تمھارے آئی جی صاحب کی کیا ہے لیکن تم جان لو گے بہت جلد۔"

سراج کا رنگ پل بھر کے لیے بدلا۔ "ٹک، ہیئر میجر۔ وائی ٹیک آل دس ٹرابل۔ تم سکندر بخت کو میرے حوالے کر دو۔"

"سکندر بخت کون ہے؟" میجر سلطان نے سکون سے کہا۔

"سکندر بخت کون ہے۔ ڈونٹ ٹیل می۔" سراج کا چہرہ سرخ ہوا مگر پھر اس نے مصلحت کا تقاضا سمجھتے ہوئے خود پر قابو پالیا۔ "سکندر بخت یہ شخص ہے۔" اس نے ایک جھٹکے سے میری طرف انگلی اٹھائی۔

"میرا خیال ہے کہ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس شخص کا نام میری معلومات کے مطابق سکندر بخت نہیں ہے۔" میجر سلطان نے کہا۔

"تو اپنی معلومات کو درست کر لو۔ یہ سکندر بخت ہے۔" سراج کا حوصلہ جواب دے گیا۔ "میں بتا رہا ہوں تمھیں۔"

"معلوم کرنے والے خود ہی معلوم کر لیں گے۔" میجر سلطان نے اسی سپاٹ لہجے میں کہا۔ "اس کے ساتھ جو لوگ پکڑے گئے تھے، انھوں نے کچھ اور نام بتایا تھا۔"

"کیا نام بتایا تھا؟"

"اٹ از ٹاپ سیکرٹ انفارمیشن۔ میں بھی اس لیے جانتا ہوں کہ میرا براہِ راست تعلق ہوگیا تھا۔ ورنہ صرف تفتیش کرنے والے جانتے ہوں گے یا وہی جو مجاز ہیں۔ میرا کمانڈنگ آفیسر بھی اس معاملے میں ایک غیر متعلق شخص ہے۔ تم اس سے بات کر کے دیکھ لو۔ وہ کچھ نہیں جانتا اور وہ دخل دے گا بھی نہیں۔ آئی تھنک کہ تم کو دیر نہیں کرنی چاہیے ایس ایس پی صاحب۔ کمانڈنٹ صاحب کے پاس بہت کام ہوتے ہیں۔ وہ سارا دن آپ کے انتظار میں ضائع نہیں کر سکتے۔"

میجر سلطان کا رویہ تقریباً گیٹ آؤٹ کہنے کا تھا۔ سخت بے بسی اور اشتعال کے عالم میں سراج مجھے خوں آشام نظروں سے گھورتا ہوا اور اپنی بے بسی پر پیر پٹختا ہوا کمرے سے نکلا۔

"دیکھ لوں گا میں۔" اس نے زیرِ لب کہا۔

"یو مے گو ٹو ہیل۔" میجر سلطان نے بھی زیرِ لب کہا۔

سراج ایک دم پلٹا۔ "کیا کہا تم نے؟"

میجر سلطان نے نفی میں سر ہلایا۔ "جو تم نے کہا تھا، اس کا جواب میں نے نہیں دیا۔"

دونوں مسلح گارڈ جن کو بیٹ مین نے بھیجا تھا، اب میجر سلطان کے اشارے کے منتظر تھے، کھڑے ہوئے تھے۔

"اسے کیپٹن افتخار کے پاس لے جاؤ۔" میجر سلطان نے کچھ سوچ کر کہا۔ "ان سے کہنا کہ اسے چیک کریں۔ ایک منٹ، پہلے میں بات کر لوں۔" اس نے فون اٹھا کے کیپٹن افتخار کا نمبر مانگا۔

"افتخار! بھئی میں ایک کیس بھیج رہا ہوں۔ آئی تھنک ہی از ناٹ نارمل۔ تم ذرا دیکھو کہ یہ کس حد تک ابنارمل ہے۔ میرا مطلب ہے کہ از ہی ڈینجرس۔ پھر میں تم سے وہیں آ کے بات کرتا ہوں۔ ابھی میری گاڑی سروس کے لیے گئی تھی۔ یہ شاید سروس اسٹیشن سے گاڑی میں چھپ کر بیٹھ گیا اور میرے کمرے میں گھس آیا۔ کہتا ہے کہ میں پاکستان کا بادشاہ ہوں اور یہ کہ اگر کسی نے اس کی حکومت کو تسلیم نہ کیا تو یہ اپنا کیس اقوامِ متحدہ میں لے جائے گا۔ یہ مجھے اپنا وزارتِ دفاع کا قلمدان سونپنے کو تیار تھا۔" میجر سلطان ہنسا۔ "وزیرِ اعظم اس نے اپنے ماموں کو نامزد کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ خطرناک نہیں۔ بس کریک ہے۔"

اس نے فون رکھ دیا اور گارڈز سے کہا کہ مجھے لے جائیں۔

میں اب بہت مطمئن تھا اور میں نے اس تمام گفتگو میں دخل اندازی سے گریز کیا تھا جو میجر سلطان اور سراج کے درمیان ہوئی تھی۔ میجر سلطان نے بہت ذہانت سے کام لیا تھا۔ اس کے لیے اپنی پوزیشن کو محفوظ رکھنا بھی بے حد ضروری تھا۔ مجھے شرمندگی تھی تو صرف اس بات کی کہ میری وجہ سے وہ ذہنی پریشانی میں مبتلا ہوا اور اسے ایک جھوٹ کو چھپانے کے لیے دس جھوٹ بولنے پڑے۔ بے شک یہ سب جھوٹ نیک نیتی سے بولے گئے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ سچ کیا ہے مگر وہ خود اس سچ کو تسلیم کرتا تو سچائی کے راستے پر چلنے والوں کی مدد کرنے کے بجائے ان کی راہ میں مشکلات کا اضافہ کرتا۔ شرمندگی سے زیادہ مجھے پریشانی تھی کہ یوں سراج کے عزائم کی راہ میں حائل ہو کے میجر سلطان نے اپنے لیے اور اپنے خاندان کے لیے مصیبت کا سامان نہ کیا ہو۔ یہ کینہ پرور اور کمینے لوگوں کا گروہ تھا جو ہمارے لیے نیک جذبات رکھنے والوں کو بھی معاف نہیں کرتے تھے۔

ایک جیپ مجھے کیپٹن افتخار کے پاس لے گئی۔ وہ یقیناً میجر سلطان کے لیے قابلِ اعتماد تھا اور وہ مجھے براہِ راست نکالنے سے پیدا ہونے والی مشکلات سے بچنا چاہتا تھا۔ میں طے کر چکا تھا کہ ان حالات میں میرا رویہ کیا ہونا چاہیے۔ کیپٹن افتخار کا تعلق یقیناً شعبۂ ذہنی امراض سے تھا اور وہ ماہرِ نفسیات یا سائیکاٹرسٹ ہو سکتا تھا۔

جیپ رکی اور گارڈ مجھے ایک بیرک کے آخری کمرے میں لے گئے۔ بظاہر بیرک خالی لگتی تھی اور وہاں کا سناٹا بھی افسردہ لگتا تھا۔ کیپٹن افتخار نے مجھے اپنے کمرے میں بڑی خوشدلی سے ریسیو کیا۔ وہ گھنی برابر تراشی ہوئی داڑھی والا تیم شحیم اور لباس کی طرف سے بے پروا شخص تھا۔ اس کی پتلون چونکہ توند کے گنبد پر ٹھہر نہیں سکتی تھی، اس لیے وہ الاسٹک والے گیلرز کا سہارا لینے پر مجبور تھا۔ ڈھیلی ڈھالی قمیص پر اس نے بہت چوڑی ٹائی باندھ رکھی تھی مگر کالر کھلے ہوئے تھے چنانچہ ٹائی کی ناٹ بھی ڈھیلی تھی۔ وہ منہ میں ایک بجھا ہوا پائپ دبائے کھڑا تھا۔

"ہیلو مائی بوائے۔" اس نے مجھ سے ہاتھ ملا کے کہا۔ "بیٹھو یہاں میرے سامنے۔ تم جاؤ۔" اس نے دونوں گارڈز سے کہا۔

میڈیکل کور اور ایجوکیشن کور میں ایسے لوگ بہت نظر آتے ہیں جو کسی طرح بھی فوجی نہیں لگتے مگر وہ اعزازی عہدے رکھتے ہیں یا پھر شارٹ سروس کمیشن کے لیے اپنی اعلیٰ فنی صلاحیتوں کی بنیاد پر منتخب ہوتے ہیں، ان کے لیے جسمانی فٹنس کے معیار کو مدِنظر نہیں رکھا جا سکتا۔

"تو تم ہو پاکستان کے بادشاہ۔" وہ پائپ سلگاتے ہوئے بولا۔

"ہم اس طرزِ تخاطب کو پسند نہیں کرتے۔" میں نے کہا۔ "کیا بادشاہوں سے گفتگو کے یہی آداب ہیں۔ افسوس کہ ابھی ما بدولت تخت نشین نہیں ہوئے ورنہ ہم تمھیں اس گستاخی کی سزا دیتے۔"

"میں معافی کا خواستگار ہوں ظلِ الٰہی۔" ڈاکٹر افتخار نے قدرے سنجیدہ ہو کے کہا مگر اس کی زیرِ لب مسکراہٹ بدستور میری دیوانگی کا تمسخر اڑاتی رہی۔ "تخت نشینی میں تاخیر اور التوا کا سبب کیا ہے؟"

"ہم مناسب وقت کا انتظار کر رہے ہیں۔" میں نے کرسی پر یوں بیٹھتے ہوئے کہا جیسے وہ تختِ طاؤس ہو۔

"حضورِ والا جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں۔"

"اجازت ہے۔" میں نے باوقار آواز میں کہا۔

"آپ موروثی بادشاہ تو نہیں ہیں۔ پھر آپ کو پاکستان کا بادشاہ کس نے بنایا؟"

"تمھاری تقرری اور ترقی کے احکامات کہاں سے آتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"اوپر سے۔" کیپٹن افتخار نے کہا۔

"ہمیں بھی اوپر سے حکم ملا۔" میں آسمان کی طرف انگلی اٹھا کے بولا۔ "کہ اے بندے! اٹھ اور امتِ مسلمہ کے آٹھ سو سالہ عہدِ حکومت کی یاد تازہ کر۔ مغلوں کے جاہ و جلال کو بحال کر۔ مسلمانانِ پاکستان کو فاتحِ عالم قوم بنا اور دنیا میں اسلام کا ڈنکا بجا۔"

"بہت خوب اور یہ احکامات آپ کو کیسے موصول ہوئے تھے شہنشاہِ معظم۔" کیپٹن افتخار نے لطف لیتے ہوئے کہا۔

"یہ سب ہم سے آوازِ غیب نے کہا۔ ہمیں خواب میں بشارت ہوئی اور خود ہم پر علم و عرفان سے آگہی کے دروازے کھلے۔" میں نے کہا۔

"آپ کا ارادہ کب تک اپنی بادشاہت کا اعلان کرنے کا ہے؟"

"اس صدی کے اواخر تک۔" میں نے متانت سے کہا۔ "ابھی ہمیں امت کے بکھرے ہوئے شیرازے کو سمیٹنا ہے۔ اپنی صفوں کو منظم کرنا ہے۔ ہم اپنی کابینہ کے لیے ہم خیال اور باصلاحیت افراد کا انتخاب کر رہے ہیں۔"

"میں نے سنا ہے کہ وزارتِ دفاع کے لیے آپ نے میجر سلطان کو منتخب فرما لیا ہے۔" کیپٹن افتخار نے کہا۔

"تم نے ٹھیک سنا ہے۔"

"اور وزارتِ عظمیٰ کا منصب آپ کسے تفویض کر رہے ہیں عالم پناہ؟"

"اس کے لیے ہم اپنے برادرِ نسبتی سے بہتر کسی کو نہیں پاتے لیکن ہم اپنے جدِ امجد کو غائبانہ وزیرِ اعظم بنانے کے امکانات کا بھی جائزہ لے رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

"غائبانہ وزیرِ اعظم۔" کیپٹن افتخار نے ہنسی پر قابو پالیا۔ "ان کی عدم موجودگی میں۔"

"ان کے عدم آباد میں ہونے کے باعث۔" میں نے سکون سے کہا۔

"اچھا۔ خیر چھوڑیے۔" کیپٹن افتخار نے کہا۔ "یہ فرمائیے کہ آپ کو میجر سلطان کا پتا کس نے دیا۔ میرا مطلب ہے' اسے اپنا وزیرِ دفاع بنانے کے لیے آپ یہاں کیسے پہنچ گئے۔"

"ہم جو کچھ کرتے ہیں' اس کو تائیدِ غیبی حاصل ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔

اس سے پہلے کہ یہ بے مقصد گفتگو آگے بڑھتی' میجر سلطان اندر آ گیا۔

"ہاں بھئی۔ کیا رپورٹ ہے؟"

"یار سلطان۔ کون ہے آخر یہ۔" کیپٹن افتخار نے انگریزی میں کہا۔

"کچھ نہیں یار۔ ہمارا بہت پرانا ملنے والا ہے۔ آج کل ہمارے ہی پاس رہتا ہے۔" میجر سلطان نے بھی انگریزی میں کہا۔ "تھوڑا سا کریک ہے مگر بے ضرر ہے۔ نام تو غلام علی تھا مگر سب گلو کہتے ہیں۔"

"ہاں۔ اندازہ میں نے بھی یہی لگایا کہ بس تھوڑا سا سنکی ہے' یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ بہت سے لوگوں کو خواب میں بشارت ہوتی رہتی ہے۔" کیپٹن افتخار نے کہا۔ "یہ اپنے تصورات کی ایک دنیا بنا لیتے ہیں اور اسی میں سوتے جاگتے ہیں۔ تم اسے یہاں کیوں لے آئے تھے۔"

"میں کہاں لایا یار۔" سلطان نے کہا۔ "یہ پتا نہیں کیسے گاڑی میں چھپ کر بیٹھ گیا اور میں نے تو اس وقت دیکھا جب یہ بھی آفس میں آ گیا۔ بڑی گڑبڑ ہو جاتی' اگر گلو اندر گھومنا شروع کر دیتا اور سب کے سامنے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیتا۔ اسے پکڑ کر کوارٹر گارڈ میں بند کر دیا جاتا اور مجھے پتا بھی نہ چلتا۔ میں نے سوچا کہ تمھارے پاس بھیج دوں۔"

"کیا تم چاہتے ہو کہ میں اس کی پوری کیس ہسٹری۔۔۔"

"چھوڑو یار۔ مجھے سب معلوم ہے۔" سلطان نے کہا۔ "دس بارہ سال سے تو میں جانتا ہوں اسے۔ گھر کا سارا کام کر لیتا ہے۔ بس کبھی کبھی بادشاہت کا دورہ پڑتا ہے تو وہ کوئی خاص سیریس بات نہیں۔"

سلطان کی بات ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے سے ادھوری رہ گئی افتخار نے فون اٹھا لیا۔ "یس۔۔۔ یس سر۔۔۔ جی سر۔۔۔ وہ یہاں ہے وہ کوئی ایسی خاص بات نہیں سر۔ ہی از اے لٹل ابنارمل۔ خود کو پاکستان کا بادشاہ سمجھتا ہے۔ دیٹ از آل۔ ویسے بالکل ٹھیک ہے۔ میں نے ایک گھنٹے تک اس کو چیک کیا۔ اسے تھوڑے سے ٹریٹمنٹ کی ضرورت ہے۔ نو سر۔ ہم کیسے رکھ سکتے ہیں۔ وہ میجر سلطان کا ملازم ہے۔ یس سر' ملازم۔ گلو نام ہے اس کا۔"

میجر سلطان نے اسے اشارے سے منع کیا کہ وہ اس کے بارے میں کچھ نہ کہے۔ اس کی بات افتخار نے سمجھ لی۔

"نہیں سر۔ مجھے تو سلطان نے کچھ نہیں بتایا تھا۔ خود میں نے ساری باتیں اسی سے پوچھی ہیں۔ وہ مانتا ہے کہ دس بارہ سال سے سلطان کے گھر میں ہے۔ یس سر۔ اس نے اپنا نام غلام محمد عرف گلو خود ہی بتایا ہے۔ نہیں سر۔ میجر سلطان سے میری کوئی بات نہیں ہوئی۔ نہیں سر۔ آج تو میں نے اسے نہیں دیکھا۔ رائٹ سر۔ اگر وہ ادھر آیا۔ رائٹ سر۔" اس نے ریسیور رکھ دیا۔ میں احمقوں کی طرح ان دونوں کو دیکھتا رہا اور یہ ظاہر کرتا رہا کہ انگریزی میں ہونے والی اس گفتگو کا ایک لفظ بھی میری سمجھ میں نہیں آیا۔

"تم فوراً بھاگ جاؤ یہاں سے۔" کیپٹن افتخار نے کہا۔ "کمانڈنٹ کو شاید بادشاہ سلامت کے بارے میں معلوم ہو گیا ہے اور وہ بادشاہ سلامت سے ملنا چاہتا ہے۔ اسے میں وہاں لے جا رہا ہوں۔"

"میرے بارے میں کیا بات تھی؟"

"اولڈ مین وانٹس ٹو سی یو۔" کیپٹن افتخار نے کہا۔ "معلوم نہیں وہ اتنا خفا کیوں تھا۔ اس نے تمھارے آفس میں بھی تم کو پوچھا تھا مگر تم نہیں تھے۔ میرا مشورہ ہے کہ تم مجھ سے پہلے پہنچ جاؤ۔"

میجر سلطان نے سر ہلایا۔ وہ کچھ تشویش میں مبتلا تھا اور اس کی یہ تشویش جائز تھی۔ کمانڈنٹ سے گفتگو میں کسی ایس ایس پی کا حوالہ نہیں تھا۔ مگر میں جانتا تھا کہ سراج اسی سے ملنے گیا تھا۔ وہ اب بھی وہاں موجود ہوگا اور کمانڈنٹ کے سامنے اصرار کرے گا کہ میں گلو نہیں' سکندر بخت ہوں۔ وہ شاید میرے خلاف تمام الزامات کی فہرست بھی سنا چکا ہوگا۔ اس کے سامنے سلطان کیسے انکار کرے گا کہ میں سکندر بخت نہیں ہوں؟ میں کیسے ثابت کروں گا کہ میں غلام محمد عرف گلو ہوں اور کمانڈنٹ پرانے تجربہ کار افسر ہوتے ہیں۔ اسے بے وقوف بنانا آسان نہیں ہوگا۔ وہ فوراً معاملے کی تہ تک پہنچ جائے گا۔ کہیں میری وجہ سے میجر سلطان بھی مشکل میں نہ پڑ جائے کمانڈنٹ فیصلہ کرے کہ مجھے پولیس کے حوالے کر دیا جائے۔

"بادشاہ سلامت!" کیپٹن افتخار نے کہا۔ "کیا آپ میرے ساتھ چلنے کی زحمت کریں گے؟"

"ہمیں کہاں جانا ہوگا؟" میں نے کہا۔

"ایک بااختیار شخص آپ سے ملاقات کا خواہاں ہے۔ وہ آپ کی بادشاہت کو تسلیم کرانے میں بے حد مددگار ثابت ہوگا اور اگر آپ اسے سپہ سالارِ اعلیٰ مقرر فرما لیں گے تو وہ جاں نثار آپ کے دشمنوں کو نیست و نابود کر دے گا۔"

"پھر ہم اس کو ضرور شرفِ ملاقات بخشیں گے۔" میں نے کہا۔

جب میں ایک جیپ میں جس کے پچھلے دروازے پر سرخ رنگ کا کراس بنا ہوا تھا' کیپٹن افتخار کے ساتھ روانہ ہوا تو مجھے احساس ہونے لگا تھا کہ یہ جھوٹ کی دلدل ہے اور میں اس میں دھنستا جا رہا ہوں۔ شاید میرے لیے اپنی شناخت کو چھپانے کی یہ کوشش کامیاب نہیں ہوگی۔ ایک ایس ایس پی سب کچھ کر سکتا ہے۔ وہ پولیس کا سارا ریکارڈ منگوا سکتا ہے' میری تصاویر کے ساتھ۔

کمانڈنگ افسر ایک پختہ عمر کا کرنل تھا جس کی عمر کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ وہ چالیس سال کا بھی ہو سکتا تھا اور پچاس کا بھی۔ جسمانی طور پر وہ اتنا تندرست و توانا تھا کہ تیس کا لگتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ذہانت کی ایسی چمک تھی کہ وہ دیکھتا تھا تو اس کی نظریں جسم سے گزرتی محسوس ہوتی تھیں۔ اس کے سامنے جاتے ہی سب سے پہلے مجھے یہ دیکھ کر اطمینان حاصل ہوا کہ وہاں سراج موجود نہیں۔ کرنل غصے میں تھا اور ہاتھ پیچھے باندھ کر کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ سلطان اس کے سامنے کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ایک بار چند سیکنڈ کے لیے مجھے غور سے دیکھا۔ میرا دل اس خوف سے بیٹھنے لگا کہ کہیں وہ خود ہی مجھے شناخت نہ کر لے۔

"واٹ از آل دس افتخار؟" اس نے ناراضگی سے کہا۔

"میں نے آپ کو بتایا تھا سر۔"

"ہاں۔ وہ سب مجھے میجر سلطان نے بھی بتایا۔ لیکن وہ سب کیا تھا جو اس اسٹوپڈ نے کہا۔ دیٹ بلڈی ایس پی۔ واٹ واز ہز نیم؟ سراج۔ یس۔" کرنل نے ٹہلتے ہوئے اچانک پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ "یہ آدمی تو مجھے اس سے بھی زیادہ اسٹوپڈ لگتا ہے۔ میرا ذہن تسلیم نہیں کرتا کہ یہ کوئی خطرناک قاتل مجرم ہو سکتا ہے۔"

"اوہ نو سر۔ وہ ایس پی غلط فہمی۔۔۔"

"نو میجر۔ یہ ایس پی اگر خود آیا تھا۔ تو کوئی بات ضرور تھی۔ صرف غلط فہمی کی بات ہوتی تو وہ اتنا اپ سیٹ نہ ہوتا۔" کرنل نے کہا۔ "وہ تمھارے گھر آ کے تفتیش کرتا۔ یہاں تک اس کا آنا مجھے شک میں مبتلا کرتا ہے۔"

"وہ اس کا تعاقب کرتا ہوا نہیں آیا تھا سر۔" میجر سلطان نے کہا۔ "وہ کسی کرنل حضور احمد خاں سے ملنے آیا تھا۔"

"کرنل حضور احمد خاں۔ ہو دی ہیل از ہی؟"

"مجھے بھی نہیں معلوم سر۔ آپ گیٹ سے معلوم کر لیں۔ وہ بضد تھا کہ اسے کرنل حضور احمد خاں سے ملنے کے لیے اندر جانے دیا جائے۔ گیٹ نے مجھ سے رابطہ قائم کیا۔ نیچرلی میں نے اسے روک دیا۔ مگر اسی وقت ادھر سے لیفٹیننٹ کرنل بخاری گزرے۔ ہی از فرام سگنلز۔ وہ ایس پی کو جانتے تھے۔ کرنل بخاری نے اسے میرے پاس بھیج دیا اور وہاں اتفاق سے یہ موجود تھا۔ جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا' یہ چھپ کر آ گیا تھا۔ اب معلوم نہیں ایس پی کو کس حد تک صورت کی مشابہت نے دھوکا دیا۔ وہ میرے پیچھے پڑ گیا کہ گلو کو اس کے حوالے کر دوں۔"

"گلو۔ ہُو از گلو۔"

"یہ سر۔" میجر سلطان نے میری طرف اشارہ کیا۔

"اور۔ یہ بادشاہ سلامت۔" کرنل نے کہا۔ "دیٹ ایس پی واز رئیلی اڈامنٹ۔ اس نے یہاں بھی مس بی ہیو کیا۔ ایز اف ہی واز مائی باس۔ میں نے اسے یہی کہا تھا کہ کوئی غلط فہمی سے تو سرفع کی جا سکتی ہے۔ اس پر وہ تو بم کی طرح پھٹ گیا کہ غلط فہمی مجھے ہوگی۔ میں ایس ایس پی ہوں۔ اتنی سروس ہے میری۔ اتنی عمر گزر گئی ہے ایسے ہی کام کرتے۔ میں یہ ہوں اور وہ ہوں اور میں نے یہ کیا ہے اور وہ کیا ہے۔ مائی فٹ۔ وہ تو ایسے بات کر رہا تھا جیسے ہی از ایوری تھنگ۔ میں نے کہا کہ لک ہیئر مین۔ جسٹ فارگیٹ کہ تم کیا ہو۔ مجھے حکم مت دو کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ اس سے پہلے کہ میں تم کو نکلوا دوں' تم خود چلے جاؤ۔ اس معاملے کو میں خود دیکھ لوں گا۔ اگر وہ انسان کے بچوں کی طرح بات کرتا تو میں اس کی مدد کرتا۔ میرا تو خیال ہے کہ وہ خود بھی تھوڑا سا ابنارمل ہے اور غالباً ہم سب تھوڑے سے بہت ابنارمل نہ ہوں تو نارمل نہیں رہ سکتے۔ ایم آئی رائٹ۔"

"وہ تو کڑوا کریلا تھا سر' جو نیم چڑھ گیا ہو۔ میرے ساتھ تو اس نے حد کر دی۔" میجر سلطان نے جلتی پر تیل چھڑکتے ہوئے کہا۔ "تھینکس گاڈ کہ میرا ٹمپر لوز نہیں ہے ورنہ میں اسے شوٹ کر دیتا۔"

کرنل نے ہاتھ اٹھایا۔ "ٹو ہیل ود ہم۔ میں اس قسم کی غلط فہمی وغیرہ کو بالکل پسند نہیں کرتا۔ غلطی تمھاری تھی جو اس کو ساتھ لائے۔ تم کو آنکھیں کھلی رکھنی چاہئیں۔ کل کو خدانخواستہ تمھاری گاڑی میں آدم خور شیر چھپ کر بیٹھ گیا اور تمھیں پتا نہ چلا تو ہمیں بھی پتا نہیں چلے گا کہ تم کہاں گئے۔ اب اپنے اس بادشاہ سلامت کو یہاں سے لے جاؤ اور جا کے اس پولیس افسر سے ملو۔ کلیئر دس تھنگ۔ میں اس کے بارے میں مزید کچھ سننا نہیں چاہتا۔ اینڈ آئی ڈونٹ وانٹ ٹو سی اینی بلڈی ایس ایس پی ہیئر۔ نیور نیور اگین۔" اس نے ٹوپی سر پر رکھی۔ چھڑی بغل میں دبائی اور باہر نکل گیا۔ "خدا حافظ۔"

"افتخار!" میجر سلطان نے اطمینان کی گہری سانس لے کر کہا۔ "مجھے معلوم ہے تم ماہرِ نفسیات ہو۔ تم کو بے وقوف نہیں بنایا جا سکتا۔ اس لیے میں اعتراف کرتا ہوں کہ بے وقوف میں ہوں۔" میجر سلطان نے کہا۔ "تم کو جو کچھ پوچھنا ہے کل پوچھنا۔ خدا کا شکر ہے' ایس ایس پی نے کرنل کے ساتھ جارحانہ رویّہ اختیار کیا۔ ورنہ ابھی وہ سب بتانا پڑتا جو میں نہیں بتانا چاہتا تھا۔"

"تم کل یا اس کے بعد۔ ایک اطمینان بخش وضاحت کر لو گے؟"

"میں کوشش ضرور کروں گا۔ کوشش تو مجھے کرنی ہی پڑے گی۔" میجر سلطان نے کہا۔ "ابھی تو تم اس آدمی کو اپنی جیپ میں لے جاؤ۔ میں اکیلا جانا چاہتا ہوں۔ یو آر اے فرینڈ۔ میں تم پر ٹرسٹ کر رہا ہوں۔"

کیپٹن افتخار نے کچھ دیر سوچا اور پھر اقرار میں سر ہلا کے اٹھ کھڑا ہوا۔ "اس کو کہاں لے جانا ہے۔" وہ بولا۔

"آپ اطمینان سے اپنے گھر جائیں۔" میں نے انگریزی میں کہا۔

روز کی طرح اور گاڑی کو باہر چھوڑ کے اندر چلے جائیں۔ پھر میں نکل جاؤں گا۔"

"تم ایک بہادر انسان مخلص سپاہی اور کھرے پاکستانی ہونے کے ساتھ ساتھ اتنے اچھے اداکار بھی ہو۔" کیپٹن افتخار نے کہا "مسٹر سکندر بخت!"

"اس دنیا کے اسٹیج پر ہم سب اداکار ہیں۔" میں نے سر کو خم کر کے کہا۔

کیپٹن افتخار زور سے ہنسا۔ "مگر شیکسپیئر یہ کہنا بھول گیا تھا کہ کچھ اداکار آسکر لیتے ہیں۔ باقی تمام عمر جھک مارتے ہیں۔"

"آسکر کا حق دار تو آپ نے ثابت کیا ہے خود کو۔" میں نے کہا۔ "میں تمام وقت یہی سمجھتا رہا کہ آپ نے مجھے نہیں پہچانا ہے۔"

"پھر تم نے خود کو متعارف کرانے کا رسک کیوں لیا تھا؟"

"میں تو اسے رسک نہیں سمجھتا۔" میں نے کہا۔ "اگر میجر سلطان آپ پر ٹرسٹ کرتے ہیں تو میں بھی کر سکتا ہوں۔"

"پلیز ڈونٹ ڈو اٹ اگین۔" میجر سلطان نے کہا۔ "جو کچھ میں نے کیا اپنی مرضی کے خلاف کیا۔ آل ان گڈ فیتھ۔ یہ بہت مشکل کام تھا اور معلوم نہیں، اس سے آگے کیا مشکلات پیدا ہوں گی۔"

"یس۔ ایس پی آپ کے لیے پریشانی کا سبب بن سکتا ہے۔" میں نے شرمندگی سے کہا۔ "آئی ایم سوری کہ میں نے آپ کو آزمائش میں ڈالا۔"

"اٹ از او کے ناؤ۔" میجر سلطان نے کہا۔ "تمھارے پلان اور میری کوشش میں معمولی سی خامی رہ گئی جس کی وجہ سے وہ اندر آگیا اور پھر اسے کیا کہا جائے کہ اسی وقت کرنل بخاری نے اسے دیکھ لیا۔ ورنہ تم نکل جاتے۔ میرا وہ کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ویسے بھی سپاہی کے لیے تو زندگی ایک میدانِ جنگ ہے۔ اسی ہفتے میں میری پوسٹنگ کھاریاں متوقع ہے۔"

"یہ بات اچھی ہی ہے کیونکہ اس طرح آپ خواہ مخواہ کے چکر سے نکل جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "اور میرے لیے بُری ہے کہ پھر ملاقات اپنے اختیار کی بات نہیں رہے گی۔ صرف امید رہ جائے گی۔ جو کچھ آپ نے کیا اُس کے لیے میں احسان مند رہوں گا۔"

میں نے اس سے ہاتھ ملایا اور کیپٹن افتخار کے ساتھ جیپ میں بیٹھ گیا۔ اس طرح کہ اگلی سیٹ پر اکیلا رہا۔ میں پیچھے کی محدود سی جگہ میں چھپ گیا۔ گیٹ تک پہنچنے سے پہلے میں سر اٹھا کے باہر جھانکتا رہا۔ یہ بند جیپ تھی جس کے عقبی دروازے کی کھڑکیوں سے باہر کا منظر صاف نظر آتا تھا۔ پارکنگ ایریا سے گزرتے ہوئے مجھے مائکرو بس دکھائی نہ دی تو میرے دل کو تھوڑا سا اطمینان حاصل ہوا۔ جولی نکل گئی تھی۔

کیپٹن افتخار نے اپنے سرکاری بنگلے کے احاطے میں جیپ روکی اور پلٹ کے مجھ سے کہا۔ "گڈ بائی۔ اینڈ گڈ لک بولے دو منٹ بعد تم نکل جانا۔ باہر کوئی نہیں ہو گا۔"

"تھینک یو کیپٹن افتخار۔" میں نے کہا۔ "آپ نے جو کچھ کیا۔"

"آئی وش۔ کہ میں اس سے زیادہ کر سکتا۔" وہ اترتے ہوئے بولا۔ "اتنا ہی جتنا تم لوگ کر رہے ہو۔ مگر ہم مجبور لوگ ہیں بھئی۔"

"پاپا۔" اندر سے کوئی بچہ دوڑتا ہوا آیا۔ "پاپا آگئے۔"

"ارے شانی۔ پھر گر دو گی تم۔" کسی عورت نے چلا کے کہا۔ "ہزار بار سمجھایا ہے کہ ایسے دیوانوں کی طرح مت بھاگا کرو۔"

"ہا ہا۔" افتخار قہقہہ مار کے ہنسا۔ "ارے بھئی تم کیوں جلتی ہو۔ ہمارا ابھی کوئی دیوانہ ہے تو۔"

"پاپا۔ کل تو آپ ممی سے کہہ رہے تھے کہ ہم تمھارے دیوانے ہیں۔" اس بچی نے اپنی معصوم آواز میں کہا۔

"شانی۔" اس کی ماں نے ڈانٹا اور کیپٹن افتخار نے ایک اور قہقہہ بلند کیا۔ میں آوازوں سے چھلکنے والی خوشی اور محبت کی شوخی سے بھرپور فضا کو محسوس کر سکتا تھا جو اس مختصر سے خاندان کو میسر تھی۔ اس گھر میں وہ سب کچھ تھا جو میرے خوابوں کی تعبیر ہو سکتا تھا۔ محسن اور شہلا یا غالب اور نازو کے خواب بھی ایسے ہی تھے۔ اس عمر میں سب کی آنکھیں ایسے ہی خواب مانگتی ہیں اور سب کے دل ایسی ہی تعبیروں کے لیے مچلتے ہیں لیکن ہم نے تو اپنے خوابوں سے بھی رشتہ توڑ لیا تھا اور تعبیر کے بدلے تعزیر قبول کر لی تھی۔

دو منٹ کے بعد میں نے پیچھے والا دروازہ آہستہ سے کھولا اور چند سیکنڈ منتظر رہا کہ کسی نے یہ آواز سنی تو نہیں۔ اس وقت میں کوئی بھی آسکتا تھا۔ مالی، کوئی نوکر یا پوسٹ مین۔ لیکن باہر واقعی کوئی نہ تھا۔ میں نے جیپ سے اتر کے دروازہ بند کیا اور پلٹ کر دیکھے بغیر گیٹ سے نکل گیا۔ یہ چھوٹا سا ڈی ٹائپ بنگلا تھا جس کی چار دیواری تک چالیس فٹ کا فاصلہ بھی نہ تھا۔ باہر ایک پتلی سی نیم پختہ اور غیر آباد سڑک تھی جس کے دونوں جانب ایسے ہی بنگلے تھے۔

مجھے صرف اتنا اندازہ تھا کہ میں چھاؤنی کے علاقے میں ہوں۔ سورج کو دیکھ کر میں سمت کا بھی اندازہ کر سکتا تھا لیکن مجھے بالکل معلوم نہیں تھا کہ میں کسی بڑی سڑک سے یا شہری آبادی سے کتنے فاصلے پر ہوں۔ میرے قدم خود بخود ایک سمت میں اٹھ رہے تھے اور اب میرا ذہن ایک طرف ٹیڈی سے ملنے کے لیے بے قرار تھا اور اس کی بحفاظت واپسی پر خوش تھا تو دوسری طرف مجھے رابعہ کا خیال شرمندہ اور افسردہ کرتا تھا۔ میرے پاس اس سوال کا جواب کوئی نہیں تھا کہ جیسے میں نے سراج سے اس کی ماں کے بدلے استاد ٹیڈی کو حاصل کر لیا تھا، کیا ایسے ہی میں رابعہ کو بھی لا سکوں گا؟ اس کا جواب اگر ملتا تھا تو نفی میں۔ اب کیا ہے ہمارے پاس کہ ہم رابعہ کی واپسی کا سودا کریں؟ اگر عاشی زندہ رہتی تو شاید بات بن جاتی۔

اگر زیب النسأ ہمارے ارادوں کی شکست اور اپنی رسوائی کا سامان نہ کرتی تو شاید اس طرح ہم رابعہ کو مانگ لیتے۔ ایسا لگتا تھا کہ تقدیر کو میرے اور رابعہ کے درمیان دوری ہی منظور ہے۔ نہ وہ مجھ تک پہنچ سکتی ہے اور نہ میں اس تک پہنچ سکتا ہوں۔ رابعہ اگر مجبور ہے تو کیا میں بھی مجبور ہوں؟ مجھے چلتے چلتے خیال آیا۔ مجھے روکنے والا کون ہے؟

جب تک رابعہ بے یقینی کی سرحدوں کے پار ناامیدی کے اندھیروں میں گم تھی، میرے جذبات پر بھی بے حسی کی برف جمتی رہی تھی اور اس کی یاد بھی دل کو بس اتنا ہی تڑپاتی تھی جتنا بچھڑ جانے والوں کی یاد جو خیالوں کے سفر میں شریک تھے لیکن جدا ہوئے تو پھر کبھی ملنے کی امید تک ساتھ لے گئے لیکن اب احساس پر پڑی ہوئی برف ٹوٹ کر پگھلنے لگی تھی۔ اس کی آواز نے دل کے درد کو پھر جگا دیا تھا اور وقت کی راکھ میں دبی ہوئی آرزو کی چنگاری یکلخت شعلہ ساماں ہو گئی تھی۔ اس نے تو نہیں کہا تھا کہ میرے لیے آتشِ نمرود میں کود پڑو مگر کیا یہ تقاضائے عشق نہیں تھا۔ یوں جینے کے مقصد ہزار ہوں مگر ایک رابعہ کی چاہت میں مر مٹنے کا مقصد اولیں نہیں تو زندگی کا راستہ ایک صحرائے بے نشاں کا بے سمت سفر ہے۔

میں نے محسوس کیا کہ میرے ذہن سے انتشار کے جالے صاف ہو گئے ہیں اور میں سوچ کی واضح روشنی میں اپنی منزل کا راستہ دیکھ سکتا ہوں۔ میرا دل پہلے کے مقابلے میں بہت مطمئن تھا۔ ایک سڑک تک پہنچتے ہوئے میرے قدموں نے شاید آدھا میل کا فاصلہ طے کیا مگر مجھے پتا نہ چلا۔ جب میں نے ایک تانگے کی ٹخ ٹخ سنی تو پلٹ کے دیکھا اور اس کی پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔ میں نے سگریٹ جلائی تاکہ یکسوئی کے ساتھ کچھ سوچ سکوں مگر تانگے والا گپ شپ کے موڈ میں تھا۔ اس نے پہلے تو مجھ سے سگریٹ طلب کی۔

"واہ جی، واہ۔" اس نے تھری کاسل کے پیکٹ کو دیکھتے ہوئے بڑے احترام سے ایک سگریٹ نکالی۔ "سگریٹ تو یہ بہت ودیا ہے جناب عالی، پر ایک بات کی سمجھ ہم کو نہیں آتی۔"

"کس بات کی؟" میں نے کہا۔

"یہ ودیا سگریٹ میں سواد کیوں نہیں ہوتا۔" وہ بولا۔ "ایک دم پھیکی اور بے مزہ۔ نرا دھوئیں کا چھوک۔ اب آپ پوچھو کہ مجھے کون سی پسند ہے۔"

"اچھا۔ تمھیں کون سی سگریٹ پسند ہے؟" میں نے مجبوراً کہا۔

"بگلا مارکہ۔ کیا کوڑا اور ظالم سوٹا ہوتا ہے جی۔" وہ بولا۔ "جگرا چاہیے اس کے پینے کے لیے۔ یہ تو زنانیاں بھی پیتی ہیں اودھر ولایت میں۔"

"کیا تم نے ولایت دیکھا ہے؟" میں نے کہا۔

"لو جی۔ ولایت کس نے نہیں دیکھا۔" وہ بولا۔ "یہ ساری فلمیں جو باہر سے آتی ہیں، ان میں ولایت ہی تو دکھاتے ہیں۔ ہم تو جی بس میموں کو دیکھنے جاتے ہیں۔ سچی بات ہے۔ اور وہ سگریٹ، شراب سب پیتی ہیں۔ اللہ توبہ۔" اس نے دونوں کانوں کو ہاتھ لگایا۔ "ایسے ہی نخرا کرتی ہیں جناب۔ اپنی بگلا مارکہ سگریٹ پی کے دکھائیں، ٹھاہ کر کے دھواں لگتا ہے اِدھر۔" اس نے سینے پر ہاتھ مار کے کہا۔

"اچھا بھئی، آئندہ تمھارے تانگے میں بیٹھوں گا تو بگلا مارکہ سگریٹ ساتھ رکھنا نہیں بھولوں گا۔" میں نے چڑ کے کہا۔

میری بات نے اسے ذرا سی دیر کے لیے چپ کیا۔ پھر اس نے کہا۔ "باؤ جی اک گل تے دسو۔ یہ اِدھر مشرقی پاکستان میں کیا ہو رہا ہے۔"

"مجھے کیا معلوم کیا ہو رہا ہے۔" میں نے محتاط اور بیزار لہجے میں کہا۔

"او جی، یہ بنگالی بڑے سر چڑھ رہے ہیں۔ بھارت کے غلام بننا چاہتے ہیں۔"

"بنگالی مسلمان ایسا نہیں چاہتے۔ وہاں ہندو بہت ہیں۔"

"اچھا جی۔ کیا ادھر ہندو زیادہ ہیں، مسلمانوں سے بھی زیادہ؟" وہ بولا۔

"نہیں۔ مگر وہ سیاسی اور معاشی طور پر غالب ہیں اور غداروں کو شہ دے رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

"میں نے سنا ہے کہ بھارت سے بھی بہت ہندو آگئے ہیں وہاں اور اسلحہ بھی جا رہا ہے۔" وہ خاصا باخبر آدمی تھا۔

"سنا تو میں نے بھی ہے کہ بھارت نے فوجی مداخلت کا پروگرام بنا لیا ہے۔" میں نے کہا۔ "اللہ خیر کرے۔"

"لو جی، فکر کی کیا بات ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ اب حکومت کو جہاد کا اعلان کر دینا چاہیے۔" وہ بولا۔ "ہر مسجد میں ہونا چاہیے اعلان۔ آپ دیکھنا، جتھے کے جتھے سر سے کفن باندھ کے جائیں گے۔ [illegible] کے دُنبہ بنا دیں گے۔ اگر انھوں نے ہماری سرحد کے اندر قدم رکھا۔"

"انشاء اللہ۔" میں نے کہا۔ اس کے سوا میں کہہ بھی کیا سکتا تھا۔ یہ ایک عام آدمی کے جذبات تھے جو پڑھا لکھا نہیں تھا اور شاید سیاسی اور معاشی غلبے کا مطلب بھی نہیں سمجھتا تھا مگر پاکستان کے بارے میں اس کے جذبات بہت واضح تھے اور وہ یقین رکھتا تھا کہ فوج کیا، عوام ہی بھارت کے عزائم سے نمٹنے کے لیے کافی ہیں۔ اسی یقین کے سہارے وہ دشمن کے ٹینک پر اپنے تانگے کا مریل گھوڑا لے کر چڑھائی کر سکتا تھا اور شاید ٹینک کا راستہ بھی روک سکتا تھا۔ شاعرِ مشرق نے یہ بات بہت پہلے محسوس کر لی تھی کہ ؎

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسا
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

لکشمی چوک میں عین خلیفہ کی دکان کے مقابل اترنے کے بعد میں نے کرایہ ادا کیا اور پھر ایک نظر میں اس جگہ کا جائزہ لیا، جہاں ایک مختصر جنگ لڑ کے ہم تو نکل گئے تھے مگر اپنے پیچھے ایک ہمدرد کے لیے صرف تباہی چھوڑ گئے تھے۔ خلیفہ نے اپنی دکان پھر بنا لی تھی اور باہر سے اس کی نئی زیب و زینت دیکھنے سے پرانی دکان کا نقشہ یاد آتا تھا۔ پہلے والی اور موجودہ دکان میں وہی فرق تھا جسے وقت کا فرق سمجھا جا سکتا ہے۔ جو قدیم طرزِ تعمیر کا حسن رکھنے والی ہائیکورٹ کی عمارت اور الفلاح بلڈنگ کے انداز میں نمایاں طور پر محسوس ہوتا ہے۔ اچانک میری نگاہ سائن بورڈ پر گئی اور میں رک گیا۔ مجھے دکان کا نام ہی نہیں پروپرائٹر بھی بدلا ہوا نظر آیا۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور ایک مختصر سی کیبن جیسی دکان کے بوڑھے مالک سے پوچھنے کا فیصلہ کیا۔ بوڑھا چند زنگ خوردہ ٹین کے ڈبوں میں ٹافیاں اور مُرمُرے سیٹی بل اور ریوڑیاں لیے اونگھ رہا تھا۔ قطار میں رکھے ہوئے ڈبوں میں باہر کی رخ دھندلا شیشہ تھا جس میں سے بچوں کو اپنی پسند کی چیزیں نظر آجاتی تھیں۔ اس قسم کی دکانداری کا مقصد منافع کمانا کم اور وقت گزاری کے لیے خود کو مصروف رکھنا زیادہ ہوتا ہے۔

"چاچا جی" میں نے قریب جا کے کہا "سلاما لیکم"

"وعلیکم السلام" اس نے چونک کے سر اٹھایا اور مجھے غور سے دیکھا۔

"چاچا۔ ایتھے ایک پنڈت ہوندا سی۔ خلیفہ" میں نے کہا۔

بڈھے کی صورت پر ایک افسردہ مسکراہٹ نمودار ہوئی "آہو۔ ہوندا سی"

"فیر... او کتھے گیا؟" میں نے کہا۔

"جانا کتھے سی اونے" بڈھا بولا "اوبوا کھڑ کالے جے اونوں ملنا اے"

میرا اندیشہ درست ثابت ہوا تھا۔ دکان اب کسی اور نے لے لی تھی۔ اگر خلیفہ پنڈت کا وہی گھر نہ ہوتا تو مجھے اس بوڑھے سے اور بہت کچھ پوچھنا پڑتا لیکن دروازے کی طرف اشارہ کر کے اس نے خلیفہ کے زندہ ہونے کی تصدیق کر دی تھی۔ باقی باتیں میں خود خلیفہ سے پوچھ سکتا تھا۔ میں نے بوڑھے کا شکریہ ادا کر کے سلام کیا اور درمیان کی گلی عبور کر کے اس دروازے پر جا پہنچا جو دکان کے پیچھے کی تنگ گلی میں کھلتا تھا۔ دروازے کے سامنے ٹاٹ کا بوسیدہ پردہ جھول رہا تھا اور پٹ نیم وا تھے۔ میں نے کنڈی ہلائی تو ایک عورت نے کسی بچے کو باہر بھیجا۔ وہ پنڈت کا بیٹا تھا۔ وہ ایک بار اندر گیا اور پھر لوٹ کر آیا۔

"ابا کہندا اے ناں دسو"

نام" میں نے سوچ کے کہا "ابا سے کہو۔ ایک پرانا دوست ہے"

بچے نے نفی میں سر ہلایا جس کا مطلب صاف تھا کہ [illegible] پوچھے بغیر وہ واپس نہیں جائے گا "ابا کہے دوست نوں نئیں ملا[illegible]"

"اچھا" میں مخمصے میں پڑ گیا "اسے کہو سکندر بخت آیا ہے"

بچہ اندر گیا ہی تھا کہ ایک عورت نے چلانا شروع کیا "فیر [illegible] او مرن جوگا۔ سب کجھ تے لے گیا سی۔ ہن کی لین آیا جے سا[illegible] کولوں"

خلیفہ پنڈت نے اسے ڈانٹ لگائی "چپ کر"

"کیوں چپ کروں" عورت نے باغیانہ لہجے میں چیخ کر [illegible]

پھر ایک چانٹے کی آواز آئی "چپ نئیں کریں گی تے [illegible] گچی مروڑ دیاں گا" پنڈت نے کہا۔ میرا دل بیٹھنے لگا۔ پنڈت [illegible] چانٹا مار کے اپنی گھر والی کی زبان بند کر دی تھی مگر اتنی دیر میں [illegible] جو کچھ کہا تھا، وہ میں سن چکا تھا اور مجھے ذرا بھی شک نہیں رہا [illegible] کہ پنڈت کی گھر والی میرا نام سن کے کیوں بھڑک اٹھی تھی۔ اس [illegible] نزدیک سکندر بخت ایک دشمن کا نام تھا جس نے ان کو تباہی و بربا[دی] اور مصائب کے سوا کچھ نہیں دیا تھا۔ فرق صرف جذبات کی نوعیت کا [illegible] عورت اپنے پیار اور اپنی وفاداری کو اپنے شوہر، اپنے گھر اور اپنے بچو[ں] تک محدود رکھنا چاہتی ہے۔ مرد کی ذمے داریوں کے دائرے وسیع [illegible] ہوتے ہیں چنانچہ وہ اپنے جذبات کو سمیٹ کر ایک گھر کے حصار [میں] محدود نہیں کر سکتا۔

پنڈت میرے سامنے آیا تو صدمے نے میری قوتِ گویائی سلب کر لی۔ وہ اپنی بے نور آنکھوں سے مجھے دیکھ کر مسکرا رہا [تھا] اور اس کا ایک بازو میری طرف بڑھا ہوا تھا۔ اس کا دوسرا بازو [illegible] کی خالی آستین کی صورت میں لٹک رہا تھا "سکندر صاحب۔ آؤ جی اندر آؤ" وہ بولا "میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا"

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا "پنڈت... یہ..."

"او جی، یہ کچھ نہیں" وہ بولا "آپ اندر آؤ۔ آپ کا با[ہر] کھڑے رہنا ٹھیک نہیں"

"میں سمجھتا ہوں کہ میرا اندر آنا بھی ٹھیک نہیں۔ ایک بار پہلے بھی آیا تھا۔ نہ آتا تو اچھا تھا" میں نے بڑے دکھ سے کہا اور اندر داخل ہو گیا۔

"ایسی باتیں مت کرو جی۔ یہ تو سوہنے رب کی رضا ہے وہ جس حال میں چاہے رکھے" وہ بولا "آپ کا اس میں کیا قصور تھا۔ اگر آپ کو معلوم ہوتا تو کیا آپ پھر بھی آتے۔ آپ کی میری کون سی دشمنی تھی کہ آپ مجھے برباد کرتے۔ وہ تو آپ کے اور ملک کے دشمن تھے۔ اللہ نے بڑی خیر کی کہ آپ کو بچا لیا۔ ہمارا کیا ہے جی۔ بال کاٹتے تھے، اب ہم نہیں کاٹتے تو ہماری جگہ دوسرے کاٹ رہے ہیں لیکن جو کام آپ کر رہے ہیں، وہ کون کر سکتا تھا؟"

میں اس کے جذبۂ ایثار پر حیران تھا۔ تکیۂ کلام کے طور پر بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ میرا سب کچھ آپ پر قربان، مگر عملاً اس شخص نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ صرف گفتار کا غازی نہیں ہے، اس کی بصارت زائل ہو گئی تھی۔ وہ دائیں ہاتھ سے محروم ہو گیا تھا اور کچھ کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اس کی آمدنی ختم ہو گئی تھی۔ اس نے ہنر مند ہاتھوں کی کمائی سے اپنے گھر کی خوشحالی کو استوار رکھا تھا اور مستقبل کے تحفظ کو یقینی بنایا تھا۔ یہ سب کچھ اس نے میری وجہ سے گنوایا تھا مگر اس کی استقامت، اس کے حوصلے اور جذبے میں کمی نہیں آئی تھی۔

"خلیفہ پنڈت" میں نے کہا "تمہاری۔ وہ دکان..."

"وہ میں نے بیچ دی تھی جناب" وہ بولا "اتنا پیسہ نہیں تھا کہ پھر اس کی مرمت کراتا اور سب سامان خریدتا۔ پھر جناب، پولیس نے بہت لوٹا۔ مجھے اسپتال میں پریشان کرتے رہے۔ میرے بیوی بچوں سے زبردستی رقم وصول کرتے رہے کہ تم سب تخریب کاروں سے ملے ہوئے تھے اور ان کو پناہ دیتے تھے۔ اللہ موقع دے ان کو۔ یہ اپنے سگوں کو بھی بخشنے والے نہیں۔ ان پر بھی کیس بنا[دیں]۔ میری گھر والی کو تھانے لے جا کر پوچھ گچھ کرنے کی دھمکی دیتے تھے۔ آپ تو جانتے ہیں ان کی پوچھ گچھ کیا ہوتی ہے۔ عزت بچانے کے لیے اور تھانے سے بچنے کے لیے ان کو ہزاروں دیے۔ میرے کاریگر بے چارے جو میرے بچوں کی طرح تھے، انہیں پکڑ کر لے گئے۔ وہ غریب گھروں کے بچے تھے۔ ان کی تو ضمانت کرانے والا بھی نہ ملتا۔ میں نے ان کی بھی گلو خلاصی کرائی۔ ایک ایک کے پانچ ہزار دیے مگر پرچہ نہیں کٹنے دیا۔ وہ کہاں وکیل کرتے اور کب تک پیشیاں بھگتنے جاتے۔ اپنا تو سارا جمع کیا ہوا نکل گیا۔ پتا نہیں جی، اللہ نے کس گناہ کی سزا دی۔ بندہ بشر نہیں جانتا کہ کب اس سے خطا ہوئی تھی۔ وہ سوہنا رب بے انصاف تو نہیں ہے ناجی کہ خطا کے بغیر سزا دے۔ حرام کمانے والوں کا مال حرام میں جاتا ہے تو دنیا کہتی ہے "ٹھیک ہوا، ایسا ہی ہونا بھی چاہیے تھا۔ مگر قسم پیدا کرنے والے کی۔ میرا تو پیسہ پیسہ محنت اور حق حلال کی کمائی کا تھا۔ علاج معالجے پر بھی دس ہزار سے اوپر اٹھ گیا۔ فائدہ صرف یہ ہوا کہ زندگی بچ گئی۔ پھر ایسی اندھی اور معذور زندگی کا بچنا بھی تو سزا ہے۔ دکان بیچنے سے جو رقم ملی، وہ اپنے بھائی کو دے دی ہے۔ وہ ہمیشہ کہتا تھا کہ یہ کام چھوڑو اور میرے ساتھ مل کے بزنس کرو۔ آبائی پیشہ تھا۔ باپ دادا کا فن تھا۔ میرا دل نہیں مانتا تھا کچھ اور کرنے کو۔ اب مجبوری نے سب کرا دیا ہے۔ بھائی کا کاروبار بھی ٹھیک نہیں لیکن آمدنی ٹھیک ٹھاک ہے۔ میرا اپنا کوئی تجربہ نہیں کاروبار کا۔ کسی غیر کو دیتا تو رقم ڈوبنے کا ڈر ہوتا۔ اب یہ اطمینان تو ہے کہ کاروبار اپنے بھائی کے ہاتھ میں ہے۔ جب تک رب نہ کرے۔ وہ خود نہیں ڈوبتا، میرا پیسہ بھی نہیں ڈوبے گا۔ خیر جی، پیسہ آنی جانی چیز ہے۔ مجھے تو بس یہ دکھ ہے کہ اپنا ہنر نہیں رہا اور ہنر مندوں کا ٹھکانا نہیں رہا۔ میرے شاگرد کل میری جگہ لیتے تو میں بھی اتنا ہی فخر محسوس کرتا جتنا میرا باپ مجھ پر محسوس کرتا تھا۔ پتا نہیں اب وہ کدھر گئے۔ ان میں سے دو بعد میں ملنے آئے تھے۔ بہت روتے تھے کہ استاد جی، ہم رُل گئے۔ جہاں اب کام کرتے ہیں، وہ پیسے کم دیتا ہے گالیاں زیادہ۔ میں نے کہا کہ میرے بچو۔ ہمت مت ہارنا۔ غربت، ذلت، بیماری، موت سب اللہ کی آزمائش ہے اور آزمائش میں صبر شکر سے کام لینے والا ہی اس کا نیک بندہ ہے۔ گلہ کرو گے تو سوہنا رب ناراض ہو گا کہ انہوں نے اچھے وقت کو اتنی جلدی بھلا دیا۔ خود مجھے دیکھو۔ جہاں مالک تھا، اب وہیں نوکر ہوں اور نوکر بھی کیسا۔ گھنٹے دو گھنٹے میں چکر لگاتا ہوں۔ جھاڑو سے فرش پر گرنے والے سارے کٹے ہوئے بال سمیٹتا ہوں اور ایک بالٹی میں ڈال دیتا ہوں۔ اس کے پانچ روپے روز ملتے ہیں مگر میں شکوہ نہیں کرتا۔ شکر کر کے پانچ روپے لے لیتا ہوں۔ گھر والی کہتی ہے کہ تم ہمیں ذلیل کراتے ہو۔ جب گھر بیٹھے گزارے لائق رقم مل جاتی ہے تو جھاڑو دینے کیوں جاتے ہو۔ میں کہتا ہوں کہ نیک بخت۔ وہ رقم جو مجھے کوئی اور کما کے دیتا ہے، مجھے خوشی نہیں دیتی۔ یہ پانچ روپے میں اپنی محنت سے صرف اپنی خوشی کے لیے کما کے لاتا ہوں۔ اس سے مجھے حوصلہ اور یقین ملتا ہے کہ میں مرا نہیں۔ ناکارہ نہیں ہوا۔ ایک ہاتھ سے بھی میں کچھ نہ کچھ ضرور کر سکتا ہوں لیکن دوسری بات میں اس سے نہیں کہتا۔ عورت ذات ہے نا۔ سمجھے گی نہیں۔ میں وہاں دوسروں کو عبرت دینے جاتا ہوں۔ وہاں میرے پرانے گاہک آتے ہیں جو برسوں سے آتے تھے۔ وہ مجھے جھاڑو دیتا دیکھ کر بہت حیران ہوتے ہیں اور ان کو صدمہ بھی ہوتا ہے۔ وہ پوچھتے ہیں پنڈت، یہ کیا کر رہے ہو۔ اور میں کہتا ہوں کہ جی، وہی جو سوہنے رب کی رضا ہے۔ بندے کو اچھا وقت راس آئے تو برے وقت کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ وہ فکر مند اور پریشان ہو جاتے ہیں۔ سوچنے لگتے ہیں کہ آج وہ مالک ہیں یا افسر ہیں۔ کل خدانخواستہ انہیں نوکر اور ماتحت بن کے ایسی ہی حیثیت کو قبول کرنا پڑا تو وہ کر سکیں گے؟ اور اس طرح میں لوگوں کو بھی پہچان رہا ہوں جناب۔ کل جب میں ایک ہیئر ڈریسنگ سیلون کا مالک تھا تو وہ مجھ سے کیسے ملتے تھے اور آج کیسے ملتے ہیں۔ جو ظرف والے ہیں، وہ پہلے سے زیادہ عزت دیتے ہیں۔ کم ظرف سیدھے منہ بات نہیں کرتے۔ جتنے منہ ہیں اتنی باتیں۔ مگر میں سب کی سنتا ہوں اور کسی کو جواب نہیں دیتا۔ کچھ نہیں بتاتا کہ ایسا کیوں ہوا تھا۔ جس کا جو دل چاہے سمجھے"

میں دم بخود بیٹھا اس کی باتیں سنتا رہا۔ وہ ایک مبلغ، ایک ناصح، ایک مفکر کی طرح بول رہا تھا۔ اس کی باتوں میں سچائی تھی اور گہرائی تھی۔ ایسی دانائی کی باتیں بڑے بڑے عالم فاضل کر سکتے

تھے جو اس نے اپنی سیدھی سادی زبان میں کہہ دیں، بغیر یہ جانے کہ نہ وہ لیڈر ہے نہ دانشور۔ بلکہ وہ ایک ایسا آدمی ہے جسے عزت و تکریم کے دُہرے معیار رکھنے والا یہ معاشرہ بڑی حقارت سے نائی کہتا ہے۔ اس کے حوصلے، ظرف اور صبر و قناعت کے جذبات کی ہمسری کا دعویٰ میں بھی کرتا تو غلط ہوتا۔ دنیا میں کہاں کہاں، کیسے کیسے مردِ قلندر ملتے ہیں۔

"آپ رنجیدہ مت ہوں جی" وہ شرمندہ لہجے میں بولا "میں بے وقوف ہوں کہ اتنا بول گیا۔ دل کی بات پر اختیار نہیں رہا۔ مجھے تو آپ سے پوچھنا چاہیے تھا کہ خیر سے کیسے پھر ادھر آنا ہوا۔ خلیفہ پنڈت اب کیا کر سکتا ہے آپ کے لیے۔ پھر بھی جو کچھ کر سکتا ہے، ضرور کرے گا"۔

"پنڈت!" میں نے کہا "تم کو اس دکان کے کتنے ملے تھے؟"

"چالیس ہزار صاحب" وہ بولا "بس جگہ کی قیمت ملی۔ باقی سب تو ملبہ تھا"۔

"اور اب... خیر چھوڑو" میں نے کچھ سوچ کے اپنا ارادہ بدل دیا "یہ بتاؤ کہ میرے دو ساتھی آئے تھے یہاں؟"

"ہاں جی۔ آئے تھے" وہ بولا "میں خود تو ان کی خدمت نہیں کر سکتا تھا لیکن انھیں میں نے اپنے ایک بہت ہونہار شاگرد کے پاس بھیج دیا تھا۔ بارہ سال کام کیا اس نے میرے ساتھ۔ بڑا فنکار بندہ تھا جی۔ پر اُسے فلموں کے شوق نے کھینچ لیا۔ ہیرو بننے کے چکر میں پڑ گیا تھا۔ دوسرے تو مذاق اڑاتے تھے کہ اگر تو ہیرو کیا، ولن بھی بن گیا تو پھر فلم نہیں بنے گی اور بن گئی تو چلے گی نہیں۔ اس کی صورت اور ٹھرک پر ہنستے تھے سب لوگ۔ میں سنجیدگی سے سمجھاتا تھا کہ بیٹا گلفام، ہر کام ہر شخص نہیں کر سکتا۔ مگر جی وہ دُھن کا بڑا پکا تھا۔ نہ میرے سمجھانے سے سمجھتا تھا نہ کسی کے ہنسنے کی پروا کرتا تھا۔ ہیرو تو وہ نہیں بنا مگر دھکے کھاتے کھاتے ایک دن کسی فلم کے سیٹ پر گیا تو وہاں میک اپ مین سے لڑ پڑا کہ تم نے خاک چہرہ بدلا ہے۔ اسے تو اندھا بھی پہچان لے گا کہ وہی ہے۔ ڈائریکٹر نے یہ بات سنی تو کہنے لگا کہ تم جانتے ہو یہ کام تو کر کے دکھاؤ۔ اب لو جی وہ جھگڑا ہی بہانہ بن گیا۔ آج وہ بڑا کامیاب میک اپ مین اور ہیئر اسٹائلسٹ ہے۔ مگر ہفتے میں ایک بار سلام کرنے ضرور آتا ہے۔ کہتا ہے، آپ استاد نہیں میرے باپ ہو اور یہ کسی حد تک سچ بھی ہے۔ اسے میں نے پالا تھا کیونکہ وہ گھر سے بھاگ آیا تھا۔ پہلے ماں سوتیلی تھی پھر باپ مر گیا تو ماں نے دوسری شادی کر لی اور باپ بھی سوتیلا ہو گیا۔ معاف کرنا جی۔ جب سے آنکھیں گئی ہیں، میں زیادہ بولنے لگا ہوں۔ کرنے کو کچھ نہیں ہوتا تو باتیں کرتا ہوں۔ پہلے ہاتھ چلتے تھے، اب زبان چلنے لگی ہے۔ آپ سے تو پوچھا ہی نہیں کہ کیا پیو گے۔ چائے یا ٹھنڈا"۔

میرے بہت انکار کے باوجود وہ خود باہر گیا اور کسی حلوائی کی دکان سے لسی کے دو گلاس بنوا لایا۔ اتنی دیر میں اکیلا بیٹھا رہا۔ پنڈت کی بیوی شاید ناراض ہو کے کہیں چلی گئی تھی۔ پنڈت کی واپسی تک میں طے کر چکا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ محسن اور غالب کی طرف سے مجھے کامل اطمینان حاصل ہو چکا تھا کہ انھوں نے پرانی دکان کا نیا روپ دیکھ لیا تھا اور سوچے سمجھے بغیر اندر گھسنے کی غلطی نہیں کی۔

"معاف کرنا جی۔ مجھے کچھ ٹائم لگ گیا" پنڈت نے کہا اور جگ سے اپنے اور میرے لیے لسی انڈیلنے لگا "مزہ تو اُدھر ہی لسی پینے کا مگر میں آپ کو ساتھ لے جاتا تو یہ خطرے کی بات ہوتی"۔

"استاد!" میں نے کہا "اپنے اس ہونہار شاگرد کا پتا بھی دو۔ کیا نام بتایا تھا تم نے؟"

"گلفام" وہ بولا "کوئی شہزادہ گلفام کہتا ہے کوئی شہزادہ"۔

"تمھارا اس پر پورا بھروسا ہے نا؟"

"لو جی۔ بھروسا نہ ہوتا تو میں آپ کو وہاں بھیجتا۔ وہ تو میرا غلام ہے بالکل۔ میں کہوں کہ گلفام قتل میں نے کیا ہے۔ پھانسی چڑھ جا۔ تو وہ چڑھ جائے گا"۔

"اچھا تو وہ رہتا کہاں ہے؟"

"آپ ادھر سے جاؤ نا جی۔ چوبرجی کی طرف سے۔ تو ایک گلی راج گڑھ کی طرف نکلتی ہے" وہ بولا "اس میں سیدھے ہاتھ پر ساتواں یا آٹھواں گھر ہے۔ نمبر تو مجھے نہیں پتا لیکن اس کے کھڑکی دروازے نیلے ہیں اور۔ اوپر کے حصے میں گلفام رہتا ہے۔ اس نے تار باندھ کے گملے لٹکا رکھے ہیں پھولوں کے..."

"بس اتنا کافی ہے" میں نے کہا "میں پہنچ جاؤں گا"۔

میں اس سے پھر ملنے کا وعدہ کر کے رخصت ہوا اور گلی سے باہر آ کے کچھ دیر دکان کے باہر کھڑا رہا۔ اس کے سائن بورڈ پر "ہالی ووڈ اسٹائل ہیئر ڈریسنگ سیلون" کا چمکتا دمکتا بورڈ، خاصا فحش تھا اور میری نظر میں چبھ رہا تھا۔ ظاہر ہے، پینٹر نے پروپرائٹر کی خواہش کے مطابق وہ تصویر بنائی تھی جس کا سر کے بالوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ موجودہ مالک کے ذہن اور فکر کی نمائندگی کرنے والا یہ سائن بورڈ مجھ سے احتیاط کا تقاضا کرتا تھا۔ پنڈت سے ہمدردی اور اس کے نقصانات کی تھوڑی بہت تلافی کرنے کا خیال نیک تھا اور یہ میری اخلاقی ذمے داری بھی تھی مگر میں خود کسی مصیبت کا شکار ہو جاتا تو یہ وہی بات ہوتی کہ نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم۔ نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے۔

میں نے پہلے گلفام سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ تانگے یا ٹیکسی کی نسبت رکشا زیادہ محفوظ تھا۔ آدھے گھنٹے سے بھی کم وقت میں رکشا نے مجھے گلفام کے گھر پہنچا دیا۔ اس کا معلق گملوں والا مکان میں نے دور سے ہی دیکھ لیا تھا۔ گملے جھول رہے تھے اور زنگ خوردہ تار کو دیکھ کر میں نے اندازہ کیا کہ وہ نیچے گلی سے گزرنے والوں کے سر پر لٹکنے والی خطرے کی تلوار سے کم نہیں۔ کوئی بھی گملا کسی بھی راہ گیر

کے سر پر گر سکتا تھا۔

گلفام بالکل نام زنگی نہند کافور کی مثال تھا۔ وہ تقریباً میرا ہی ہم عمر، دبلا پتلا اور مرجھایا ہوا سا جوان آدمی تھا۔ اس کا رنگ کالا تھا اور دانت پان کھانے سے خراب ہو چکے تھے۔ وہ بنگال کا رہنے والا تھا اور اس کے لہجے میں اب بھی فرق تھا۔ حالانکہ وہ تمام عمر اسی خطے میں گزار چکا تھا۔ اس کی ناک چپٹی اور چھوٹی تھی۔ ماتھا بہت آگے نکلا ہوا تھا لیکن سامنے کے حصے سے بال بہت پیچھے تک گر چکے تھے۔

"میرا نام سکندر بخت ہے" میں نے کہا۔

"پھر ہم کیا کرے، بولو" اس نے رکھائی سے کہا اور دونوں دروازوں کے پٹ میں منہ کو فٹ کیے مجھے گھورتا رہا۔

"مجھے تمھارے استاد خلیفہ پنڈت نے بھیجا ہے" میں نے کہا۔

"اچھا۔ استاد بھیجا ہے تم کو" اس کا رویہ ایک دم بدل گیا۔ "ہم سے پھر غلطی ہو گیا" وہ مجھے راستہ دیتے ہوئے بولا اور افسوس سے سر ہلانے لگا۔

"پھر کا کیا مطلب؟" میں نے اس کی صورت پر شرمندگی اور ملال دیکھ کر کہا۔ وہ پہلے ہی اتنا بجھا بجھا آدمی تھا کہ اس کی جوانی بھی عمر کا آزار لگتی تھی۔ معلوم نہیں زندگی کے سب سے خوبصورت دور میں وہ اتنا دکھی کیوں تھا اور اتنا مظلوم کیوں نظر آتا تھا۔ شاید دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں اسے یہی احساسِ محرومی و کمتری دیا تھا۔ اس کی بدصورتی پر اس کے نام کا طعنہ دینے والے لوگوں نے اس کی فطرت کی خوبصورتی پر کم نگاہ کی تھی۔

"پھر یہ کہ۔ تھوڑا دیر پہلے دو بابو لوگ آیا تھا۔ ان کو بھی استاد نے بھیجا تھا" وہ بولا "اور ہم نے ایسا ہی بات کیا تھا"۔

"کوئی بات نہیں۔ انسان خطا کا پتلا ہے" میں نے کہا۔ "میں بھی ہوں"۔

"تم تو پتلا نہیں ہے۔ ہم دُبلا پتلا ہے" وہ بولا "تشریف رکھو اور حکم کرو۔ آپ کا بھی میک اپ کرنے کو مانگتا؟"

"ہاں" میں نے ایک کرسی پر بیٹھ کے آئینے میں اپنا چہرہ ملاحظہ کیا "ویسے تو یہ بھی میرا اصل چہرہ نہیں ہے لیکن اس کو پھر بدلنا ضروری ہو گیا ہے"۔

"وہ بھی ایسا بولتا تھا" گلفام سوچ میں پڑ گیا "وہ تمھارا دوست تھا۔ ہم سمجھ گیا۔ ایک ہی گینگ کا آدمی ہے تم سب"۔

"گینگ سے تمھارا مطلب ہے کہ چوروں ڈاکوؤں کا گروہ تو یہ تمھاری غلط فہمی ہے کیونکہ تمھارا استاد چوروں ڈاکوؤں کا ساتھی نہیں ہے" میں نے کہا "کیا وہ ایسے لوگوں کو نہیں پہچانتا اور پہچان لے تو ان کی مدد کرتا ہے؟"

"اوہ۔ ہم سے پھر غلطی ہو گیا" وہ سر پر ہاتھ مار کے بولا۔ "ہم تم سے معافی مانگتا ہے، ابھی بولو تم کیا بنے گا"۔

"میں... کچھ طے نہیں کیا تھا میں نے۔ میرے دونوں دوست کیسا میک اپ کرا کے گئے ہیں؟" میں نے کہا۔

"وہ۔ ایک جیسا بن گئے ہیں" گلفام نے کہا "بالکل ایک صورت۔ جیسے جڑواں بھائی ہوتے ہیں"۔

"ویری گڈ" میں نے غالب اور محسن کی دانش مندی پر خوش ہو کے کہا "دو بھائی تو کہلاتے ہیں جڑواں۔ اگر تین ہوں تو؟"

"تین؟"

"ہاں تین۔ یہ تو عام سی بات ہے۔ چھ کے تک سُنے ہیں میں نے بلکہ شاید کسی نے چھکا مارنے کا ریکارڈ بھی قائم کیا تھا"۔ میں نے کہا "تم ایسا کرو کہ مجھے بھی انھی جیسا بنا دو"۔

"یہ آئیڈیا کیسا ہے" وہ بولا "کسی فلم میں ہوتا تو جائز تھا"۔

"تم یہ سمجھو کہ ہماری زندگی بھی ایک فلم ہے۔ مار دھاڑ اور جنگ و جدل، ہنسی مذاق اور عشق و محبت سے بھرپور" میں نے کہا۔ "گویا باکس آفس پر کامیابی کے فارمولے پر بنی ہوئی۔ ہر شخص کی زندگی ایک فلم ہوتی ہے۔ کبھی کامیڈی اور کبھی ٹریجڈی۔ جیسے کہ تمھاری زندگی"۔

اس نے ایک سرد آہ بھری اور سر ہلانے لگا "تم سچ کہتا ہے۔ مگر ایک بات بولو ہم کو۔ اپنا بارے میں تم کو کس نے بتایا کہ ہمارا لائف ایک دم ٹریجڈی ہے"۔

"تمھارے استاد نے سب سے پہلے" میں نے کہا "پھر تمھاری صحت نے اور صورت نے۔ تمھیں کچھ یاد پڑتا ہے کہ آخری بار تم کب مسکرائے تھے، کب نہائے تھے، کب کپڑے بدلے تھے۔ تم کبھی کسی پر عاشق ہوئے۔ اس حد تک کہ تمھارے عشق کا علاج نہ حکیم ڈاکٹر کر سکیں نہ تھانے والے۔ دنیا میں کسی کو تم نے اپنا دوست سمجھا، دنیا پر کبھی غور کیا کہ بغیر میک اپ کے بھی پھولوں کا رنگ اور چاندنی، لتا کی آواز اور پہاڑوں کی برف سے چمکتی دھوپ، اسٹین بیک کی فلم اور صوفیہ لورین کی اداکاری اور ماجد خان کی بیٹنگ کے کمال میں کتنا حسن ہے اور خوشی حاصل کرنے کے کتنے سمندر پوشیدہ ہیں۔ پھر تم صحرا میں کیوں بھٹک رہے ہو"۔

وہ احمقوں کی طرح میری صورت دیکھنے لگا "تم تو فلاسفر ہے بابا۔ مگر تمھارا تھوڑا سا بات سمجھ میں آتا ہے۔ ہم ایک دم اُلو ہے، ہمارا کوئی فرینڈ نہیں، کوئی ماسوک نہیں اور یہ سب ہمارا اسکل کا قصور ہے"۔

"ابھی تو وقت نہیں ورنہ میں تم کو سمجھاتا کہ صورت کو صرف تم ہی اپنے آئینے میں دیکھتے رہتے ہو۔ دوسروں کی آنکھوں سے دیکھ سکتے تو تمھیں اندازہ ہو جاتا کہ اس کی کوئی اہمیت ہی نہیں" میں نے کہا۔ "یہ تو صرف شناخت کا ایک ذریعہ ہے۔ تمھاری خوبصورتی یا بدصورتی تو تمھارے اندر ہے۔ اب مجھے ہی دیکھ لو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے بدصورت بنا دو"۔

اس نے صرف آدھے گھنٹے میں میری صورت بگاڑ دی۔ وہ میک اپ مین تھا۔ چنانچہ اس کے پاس صورت گری کا سب سامان بھی تھا اور ہنر بھی۔ اس نے میرے بالوں کو ایک جھلّی کے نیچے یوں چھپا دیا کہ میرا سر کسی کے استرے کی تیز دھار سے وجود میں آنے والی ٹنڈ بن گیا۔ فٹ پاتھوں کے بہت سے فنکار صبح سے شام تک سر مونڈ کے چمکانے کا کمال دکھاتے رہتے ہیں اور میں نے صاف شدہ سروں پر پالش کے لیے آم کی گٹھلی رگڑنے کا رواج بھی دیکھا تھا۔ میرا بے بال و پر سر ایسا ہی ہو گیا مگر گلفام نے مزید حسن یہ پیدا کیا کہ اس گنجے سر کے گرد بالوں کی ایک جھالر سی چپکا دی۔ اب میں وہ عمر رسیدہ شخص لگتا تھا جس کے بال غمِ روزگار اور فلکِ کج رفتار نے اڑا دیے ہوں۔ گلفام نے مجھے بتایا کہ اوپر کی جھالر کیسے ہٹا کے میں یُل برائنر بھی بن سکتا ہوں اور اس گنجے سر پر حسبِ ضرورت کوئی وِگ کیسے لگائی جا سکتی ہے۔ پھر اس نے میرے چہرے کے گرد مغل شہنشاہوں کے انداز کی داڑھی سجائی جو ایک مشت سے قدرے کم اور سطح سے برابر تھی۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں شیو نہ کروں تو مہینے بھر بعد نقلی داڑھی ہٹا بھی سکتا ہوں۔ فی الحال اسے دن میں باہر جاتے وقت استعمال کرنے میں کوئی خطرہ نہیں۔ کوئی اسے نقلی نہیں کہہ سکتا۔ اس نے میچ کرتی ہوئی مونچھیں لگا کے مجھے دو کچّے رنگ دیے۔ ان کو پانی میں حل کر کے بالوں پر لگانے سے داڑھی مونچھوں کو براؤن یا بلیک کیا جا سکتا تھا۔ اصل حالت میں داڑھی مونچھوں کا رنگ سیاہ و سفید کا وہ امتزاج تھا جسے کھچڑی بال کہا جاتا ہے۔ اس نے میرے ایک دانت پر سونے کا ایسا رنگ چڑھا دیا کہ وہ دانت اصلی سونے کا نظر آنے لگا۔ سامنے کا یہ دانت مسکراتے ہوئے بہت نمایاں ہو جاتا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد مَیں نے خود کو آئینے میں دیکھا اور گلفام کی مہارت کا قائل ہوا اور اچانک مجھے ایک اور خیال بھی آیا۔ گلفام بھروسے کا آدمی تھا۔ اس میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کیونکہ اس کے قابلِ اعتماد ہونے کی سند خلیفہ پنڈت دے چکا تھا۔ ایسا شخص ہمارا ساتھی بن سکتا تھا۔ ہر وقت ہمارے کام آ سکتا تھا اور انتہائی مددگار ثابت ہو سکتا تھا۔ تاہم یہ اسی وقت ممکن تھا جب وہ خود اپنے فن کو پیشہ بنانے کے بجائے وطن کی خدمت کے لیے وقف کرنے پر رضامند ہو۔ اس نے معاوضے کی بات پر خفا ہو کے یہ تو بتا ہی دیا تھا کہ وہ ایک جذباتی آدمی ہے۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا۔

"بھائی گلفام! تمھارے بارے میں جیسا سنا تھا تمھیں ویسا ہی پایا۔"

"کیا سنا تھا آپ...؟" وہ بولا۔

"یہی کہ تم بڑے اچھے میک اَپ مین ہو۔ کتنا کما لیتے ہو ہر مہینے؟" میں نے کہا۔

وہ بادلِ ناخواستہ مسکرایا۔ "اپنا مرضی کا بات ہے۔ میرے جیسے لوگ دن رات کام کرتے ہیں۔ ہر فلم لینے کو بھاگتے ہیں۔ دس بیس ہزار بنا لیتے ہیں۔ میں زیادہ بھی بنا سکتا ہوں کیونکہ میں کسی کے پیچھے نہیں بھاگتا۔ کام خود میرے پیچھے بھاگتا ہے۔ مگر میں زیادہ کما کے کیا کروں گا۔"

"عیش کرنا۔ دنیا عیش کرتی ہے کیش سے۔" میں نے کہا۔

"اپن دنیا کی طرح نہیں ہے۔ اکیلا آدمی ہے۔ دو چار ہزار بھی بہت ہوتا ہے۔ دو تین ڈائریکٹر ہے۔ ان کے سوا کسی کا کام نہیں لیتا۔ وہ اچھا فلمیں بناتا ہے اور ان کی ٹیم میں سب لوگ اچھا ہے۔ مگر اچھا فلم کوئی دیکھتا نہیں۔ وہ ڈائریکٹر لوگ کو فنانسر نہیں ملتا۔ سب بولتا ہے کہ فلم وہ اچھا جو اچھا بزنس کرے۔ پڑھا لکھا لوگ اور اخبار والا کیا بولتا۔ ان سب کو گولی مارو۔ پبلک کو دیکھو۔ ابھی وہ اتنا بد دل ہے کہ فلم لائن چھوڑنے کی سوچتا ہے۔ پھر ہم بھی کچھ سوچے گا۔"

"اچھا گلفام۔" میں نے اس سے ہاتھ ملا کے کہا۔ "تم واقعی بہت اچھے آدمی ہو۔ تمھارا استاد تمھاری صحیح تعریف کرتا ہے۔ میں پھر آؤں گا تم سے ملنے۔"

گلفام کے چہرے پر تھوڑی سی خوشی کی مسکراہٹ آئی۔ "کیا نام بولا تھا تم ــ ہم بھول گیا۔"

"میرے دوستوں نے بھی اپنا نام تو بتایا ہو گا۔"

"ہاں ــ ایک نے کہا کہ میں اوّل خاں ہوں۔ دوسرا بولا کہ نہیں میں اوّل خاں ہوں ــ یہ دوئم خاں ہے۔"

میں نے ہنس کر کہا۔ "دونوں غلط کہہ رہے تھے۔ اوّل خاں میں ہوں۔" اور اسے ہکا بکا چھوڑ کے باہر نکل گیا۔ اب میں زیادہ اعتماد اور اطمینان کے ساتھ گھوم پھر سکتا تھا۔ اس حلیے میں دلاور جیسا کائیاں دشمن بھی مجھے شناخت نہ کر پاتا۔ میں نے اپنے لیے ایک شلوار قمیص کا جوڑا خریدا اور پھر کھانا کھانے کے لیے نعمت کدہ میں گیا۔ وہاں میں نے عمداً سالن کی پلیٹ کپڑوں پر گرا لی اور اس بہانے باتھ روم میں جا کے کپڑے بدل آیا۔ ویٹر کے اور میرے درمیان معمولی سی تکرار بھی ہوئی۔ کیونکہ میں اپنی غلطی کو اس کے سر منڈھنے پر مُصر تھا۔ بالآخر اسے ہی خاموش ہونا پڑا۔

شام کے چار بجے میں واپس پہنچا تو قتل کی تفتیش کرنے والے جا چکے تھے لیکن وہ ٹرک اب بھی وہیں کھڑا ہوا تھا جس کا ڈرائیور مارا گیا تھا۔ محسن اور غالب ابھی تک نہیں لوٹے تھے۔ جولیا نے مجھے دیکھا تو پہچان نہ سکی۔

"شیر علی ــ دیکھو، یہ کون گھسا چلا آرہا ہے۔"

شیر علی دوسری طرف سے آیا۔ "کیا بات ہے۔ کس سے ملنا ہے؟"

"کس سے ملنا ہے؟" میں نے آواز بدل کے اور گرج کے کہا۔

"سب کو ایک دن مٹی میں ملنا ہے بندے سے۔"

"میرا مطلب تھا کہ آپ کا یہاں کیا کام ہے؟" شیر علی بولا۔

"کبھی تو نے سوچا بندے کہ دنیا میں تیرا کیا کام تھا؟" میں نے اسی لہجے میں کہا۔ "اور تو کیا کرتا رہا؟"

جولی سہم کر شیر علی کے پیچھے ہو گئی تھی۔ "یہ تو پاگل لگتا ہے مجھے۔"

"تم خواہ مخواہ ڈرتی ہو۔ میں اس کا سارا پاگل پن نکال دوں گا۔" شیر علی نے کہا اور آگے بڑھ کر اس نے میری گردن دبوچ لی۔ "سیدھی طرح بتاتا ہے یا نہیں کہ یہاں کیوں آیا تھا۔"

ہم ٹریلر کے پیچھے تھے چنانچہ سڑک کے دوسرے کنارے سے ہمیں کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں نے خود کو چھڑانے کی واجبی سی کوشش کی اور پھر ایک دم شیر علی کو اپنے سر کے اوپر سے گزار کے پھینک دیا۔ جولیا ایک دم چیخ مار کے اس کی طرف لپکی۔

"شیر علی... تم... ٹھیک ہو نا۔" وہ اسے سہارا دے کر اٹھاتے ہوئے بولی اور اس وقت جولی کے لہجے سے میں نے اس کے جذبات کا اندازہ کیا۔ کھٹکا تو میں اسی وقت تھا جب جولی نے عادتاً اسے بھائی نہیں کہا تھا۔ اس کے شیر علی کہنے میں بھی تھوڑا سا حجاب آمیز اپنائیت کا انداز تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ ابھی شیر علی نے اسے محسوس نہ کیا ہو، یا محسوس کیا ہو تو وہ کچھ ظاہر ہونے نہ دینا چاہتا ہو۔ وہ ٹھنڈے مزاج کا بے حد محتاط رہنے والا اور خاموش طبع آدمی تھا۔

شیر علی کچھ خفت اور اشتعال میں ایک دم کھڑا ہوا۔ "میں ٹھیک ہوں۔" اس نے جولی کے ہاتھ کو جھٹک دیا۔

"ٹھیک ہو تو پھر آؤ۔" میں نے اپنی اصل آواز میں کہا۔

"بھائی سکندر۔" جولی اپنی جگہ پر منجمد ہو گئی۔ "آپ...؟"

شیر علی مسکرانے لگا۔ میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔ "معاف کرنا دوست ــ جب ہم لوگ بے تکلف ہو جاتے ہیں تو ایسے ہی مذاق کرتے ہیں۔" پھر میں جولی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "اپنا استاد ٹیڈی کہاں ہے؟"

جولی نے ہاتھ سے ٹریلر کی طرف اشارہ کیا۔ "اندر لیٹے ہوئے ہیں۔"

"وہ ــ ٹھیک تو ہے نا۔"

جولی نے اقرار میں سر ہلایا۔ "ہاں ــ آپ دیکھ لیں۔"

"تمھیں وہاں کوئی مشکل تو پیش نہیں آئی تھی؟" میں نے کہا۔

"نہیں ــ ریڈ کراس کی ایمبولینس کا ڈرائیور شریف آدمی تھا۔ اس نے میری مدد کی۔ بھائی نیک محمد کو ہماری گاڑی میں شفٹ کیا اور سراج کی ماں تو خود ہی چلی گئی۔ جاتے جاتے اس نے کہا...؟"

"کیا کہا ــ ؟"

"کہنے لگی کہ خدا تم سب کو عقل دے۔ میرے ساتھ تم نے جو کچھ کیا اس پر میں تم کو معاف کرتی ہوں۔ پھر اس نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا کہ لڑکی ــ تو نے بہت خدمت کی میری۔ اللہ تجھے اپنی امان میں رکھے۔ ریڈ کراس کی ایمبولینس کا ڈرائیور دور جا کھڑا ہوا تھا۔ اور کچھ حیران تھا کہ یہ معاملہ کیا ہے لیکن اس نے کوئی سوال نہیں کیا۔ اس کے جاتے ہی میں بھی نکل گئی تقریباً پانچ منٹ کے بعد۔ بہت عرصے کے بعد ڈرائیونگ کی تھی میں نے۔ بھولی تو نہیں تھی مگر اتنی بڑی گاڑی چلانے میں خاصی مشکل پیش آئی۔ ایک جگہ تو بس مار ہی دی تھی میں نے۔ ایک پرائیویٹ کار تھی۔ اس نے مجھے بچایا تو فٹ پاتھ پر چڑھ گیا۔ آگے کی جالی ٹوٹ گئی اس کی گاڑی کی۔ بہت لال پیلا ہو کے آیا تھا مگر میں نے رونی شکل بنا کے معافی مانگ لی کہ کیا کروں۔ بھائی بیمار ہیں، گاڑی چلا نہیں سکتے، انھیں خود ہی اسپتال لے جا رہی ہوں۔ اس پر وہ ٹھنڈا پڑ گیا۔"

"تم بھی چالاک لومڑی ہوتی جا رہی ہو ہماری صحبت میں۔"

"آپ کی تو ساری چالاکی دھری رہ جاتی، اگر میں عقل سے کام نہ لیتی۔ عین وقت پر مجھے خیال آ گیا کہ انھوں نے ہماری گاڑی کا نمبر دیکھ لیا تو گڑبڑ ہو جائے گی۔"

میں نے سر پر ہاتھ مارا۔ "پھر ــ تم نے کیا کیا؟"

"کیا کرتی ــ ایک نلکا نظر آ گیا مجھے۔ میں نے زمین پر سے تھوڑی سی مٹی اٹھائی اور نلکے سے پانی لے کر گیلی کر لی۔"

"وہاں اور بھی گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ کسی نے دیکھا نہیں تمھیں؟"

"میرا خیال ہے کہ نہیں دیکھا۔" وہ بولی۔ "دائیں بائیں جو گاڑیاں تھیں، ان کے تو ڈرائیور ہی موجود نہیں تھے اور میں نے اِدھر اُدھر دیکھ کے یہ کام کیا تھا۔ کسی نے دیکھا ہو گا تو سمجھا ہو گا کہ میں ہاتھ دھو رہی ہوں۔ پھر میں نے ایک نمبر پلیٹ پر ہاتھ پھیر دیا ــ جو سامنے تھی۔ دوسری آگے تھی اور اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا کیونکہ گاڑی کا اگلا بمپر دیوار سے صرف چھ انچ دور تھا۔ جس پر مٹی کا رنگ پھیرا تھا، وہ نمبر پلیٹ نہیں پڑھی جاتی تھی۔"

"مگر وہ مشتبہ ضرور نظر آنے لگی ہو گی۔" میں نے کہا۔ "باہر کوئی بھی شک میں مبتلا ہو کے پیچھے لگ جاتا تو۔"

"پہلے تو میں ایسے راستے سے آئی تھی جہاں ٹریفک پولیس کے ملنے کا ڈر نہیں تھا۔" وہ ہنسی۔ "کوئی مل جاتا سامنے سے تو اسے کوئی شک کی بات نظر نہ آتی۔ پھر آدھے راستے میں ایک جگہ رُک کے میں نے مٹی کو کپڑے سے صاف کر دیا تھا۔ اب دیکھ لیں آپ۔"

میں نے مائکروبس پر ایک نگاہ ڈالی اور پھر شیر علی کو دیکھا۔ وہ جولی کو پُرستائش نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ستائش کے اس انداز میں مجھے کوئی جذباتی وابستگی محسوس نہیں ہوئی۔ وہ صرف جولی کی ذہانت اور ہمت سے متاثر نظر آتا تھا۔ مگر جولی کو احساس ہوا کہ شیر علی کی نگاہیں اس پر ہیں تو اس کے گالوں میں حیا کی لالی مسکرانے لگی اور اس کی آنکھیں بھی شوخ اور بے باک ہو گئیں۔ شیر علی سرخ و سفید پٹھان، وجیہہ و شکیل اور صحت مند نوجوان تھا۔ اس کی متانت آمیز خاموشی کی عادت میں بھی ایک وقار تھا۔ اپنے کردار کے اوصاف سے وہ پہلے ہی خود کو با اعتبار ثابت کر چکا تھا چنانچہ جولی اگر اس سے متاثر ہو گئی تھی تو یہ کوئی حیران کن

بات نہیں تھی۔ اسے دل جوئی اور سہارے کی ضرورت تھی۔ ستم گر وقت نے اس کو بڑے دھوکے دیے تھے۔ ہوش سنبھالتے ہی اس نے خود کو دو حصّوں میں بٹا ہوا پایا تھا۔ اس کی ماں کا مذہب الگ تھا اور باپ کا الگ۔ پھر باپ کی بھی شخصیت کے دو روپ تھے۔ وہ بہرام دادا کے روپ میں ایسا ڈاکو تھا جس کے نام سے لوگ کانپتے تھے لیکن گھر میں وہ ایک فراخ دل انسان، محبت کرنے والا شوہر اور بیٹی پر مرنے والا باپ تھا۔ جولی کے ذہن میں نیکی، بدی اور عذاب و ثواب کے تصوّرات خلط ملط ہو کر رہ گئے تھے۔ اس کے وجود کی یہ داخلی کشمکش باپ کی موت سے ختم ہوئی تو خود اس کی اپنی موت عالمِ شباب کی امنگوں اور خوشیوں کی دشمن بن کے سامنے آگئی ... ایک وقت ایسا بھی آیا جب اس نے جینے کے عذاب سے نجات کی دعائیں مانگنا بھی چھوڑ دی تھیں کیونکہ دعا بھی بے اثر ہو گئی تھی مگر اسی وقت قدرت نے اجل کو واپس بلا لیا اور اسے ایک نئی، زیادہ پُرامید اور پُرمسرت زندگی کی طرف لوٹا دیا مگر یہ خوشی بھی اسے راس نہ آئی اور ماں کے مرتے ہی وہ تنہا رہ گئی لیکن وہ ایک حوصلہ مند لڑکی تھی۔ ہمارے درمیان رہ کے اس نے خلوص اور محبت کے حقیقی رشتوں کو محسوس کیا اور اپنی زندگی کی گم ہو جانے والی خوشیاں پھر حاصل کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہو گئی۔ خوشی کا ایک انداز چاہنے اور چاہے جانے کی آرزو میں بھی زندہ تھا۔ ہر نوجوان لڑکی کے جذبات اس کے دل میں بھی سلگتے تھے اور اس کے خوابوں میں بھی رنگ بھرتے تھے۔ کیا تاریخ اتنی جلدی اپنے آپ کو دُہرا رہی ہے۔ کیتھرین کے روپ میں جولی اور بہرام دادا کے روپ میں شیر علی محبت کی ایک اور داستان رقم کریں گے اور ثابت کریں گے کہ عشق کا مذہب کوئی نہیں ہوتا۔

ٹریلر کے اندر آخری حصّے کا روشندان کھلا ہوا تھا۔ اس کے بالکل نیچے فرش پر کوئی چادر تانے سو رہا تھا۔ یہ ٹیڈی تھا۔ استاد ٹیڈی۔ خوجی۔ خواجہ نیک محمد۔ ہمارا وہ یار جس نے سب سے بڑھ کر یاری کا حق ادا کیا۔ میں اور محسن تو بچپن کے دوست تھے۔ استاد ٹیڈی سے ہماری دوستی کی عمر بہت کم تھی مگر اس نے برق رفتاری سے پیش قدمی کی تھی اور اب دوستی کی اسی منزل پر تھا جہاں ہم سب اکٹھے تھے۔

فرطِ جذبات نے میری آواز روک لی۔ میں اس کے قریب جا بیٹھا اور اسے کچھ دیر ایسے ہی دیکھتا رہا۔ پھر میں نے آہستہ سے کہا۔ "ٹیڈی!" مگر چادر کے نیچے کوئی جنبش نہ ہوئی۔ دوسری بار میں نے اسے زیادہ بلند آواز میں پکارا لیکن وہ بہت گہری نیند میں معلوم ہوتا تھا۔

میں نے اسے جگانے کا ارادہ ترک کر دیا اور اٹھا ہی تھا کہ جولی میرے پاس آ کے کھڑی ہو گئی۔ اس کی مجرمانہ خاموشی دیکھ کر میں نے کہا۔ "جولی"۔

"بھائی! مجھ میں ہمت نہیں تھی۔ یہ بتانے کی"۔ وہ اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا کے رونے لگی۔

"کیا بتانے کی؟" میں نے دل میں اترنے والے خوف سے لرز کر کہا۔

"آپ۔ آپ نے دیکھا نہیں"۔ جولی نے آنسوؤں کے درمیان سر اٹھایا۔

میں نے آہستہ سے نفی میں سر ہلایا اور پھر بیٹھ گیا۔ میرے ایک ہاتھ نے جھٹکے سے چادر ہٹا دی۔ نیچے ٹیڈی آنکھیں کھولے ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ زبردستی مسکرایا۔ ٹیڈی کے گال پچک گئے تھے اور آنکھیں گہرے گڑھوں میں دھنس گئی تھیں۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا اور صاف نظر آتا تھا کہ اس کی یہ حالت جسمانی تشدد کا نتیجہ ہے۔ وہ دونوں ہاتھوں کے سہارے پر اٹھا اور میرے گلے میں جھول گیا۔ اس کے گرم گرم آنسو میری گردن پر گرے۔

"ٹیڈی! میری جان۔ اب رونے کی ضرورت نہیں۔ ہم سب پھر ساتھ ہیں"۔ میں نے کہا اور اس کے کندھے کو تھپکتا رہا۔ "مجھے معلوم ہے تم نے بہت سختی جھیلی ہے لیکن خدا کا ہزار شکر ہے کہ ہم تمھیں ان سفاک دشمنوں سے چھین لانے میں کامیاب ہوئے۔ ایک نہ ایک دن ہم ان کے ہر ظلم کا حساب بے باق کریں گے۔ ابھی ان کا وقت ہے لیکن وقت ہمیشہ ان کا نہیں رہے گا"۔

اچانک میں نے محسوس کیا کہ میں اکیلا ہی بول رہا ہوں۔ ٹیڈی تو خاموشی سے آنسو بہانے اور کانپنے کے سوا کچھ نہیں کر رہا ہے۔ میں نے اسے ایک جھٹکے سے الگ کیا۔

"ٹیڈی! تم بولتے کیوں نہیں"۔ میں نے کہا۔ "جب میں نے تم کو آواز دی تھی تب بھی تم نے جواب نہیں دیا تھا حالانکہ تم جاگ رہے تھے۔ کیا تم نے میری آواز نہیں سنی تھی؟ ٹیڈی! کیا بات ہے۔ جواب دو مجھے ٹیڈی"۔ میں نے اسے زور زور سے جھنجوڑنا شروع کیا۔

ٹیڈی زور زور سے نفی میں سر ہلانے لگا۔ میں نے دہشت زدہ ہو کے جولی کی طرف دیکھا... "کیا۔ یہ بول نہیں سکتا؟"

"بھائی، یہ سن بھی نہیں سکتے"۔ جولی نے زار و قطار روتے ہوئے کہا۔

"مگر کیوں۔ کیا ہوا ہے تمھیں ٹیڈی؟" میں نے چلّا کے کہا۔ "زبان تو ہے تمھارے منہ میں۔ پھر تم کیوں نہیں بول سکتے۔ بولو۔ بولو ٹیڈی؟"

"بھائی! خود پر قابو رکھیں"۔ جولی نے کہا۔ "ان کی یہ حالت دشمنوں نے کی ہے۔ محسن اور غالب کسی ڈاکٹر کے پاس گئے ہیں۔ کوئی ڈاکٹر ہیں جو غالب کے والد کے دوست تھے۔ ان کے پاس رابعہ باجی بھی رہی تھیں۔ بھائی نیک محمد کو بھی وہ وہیں چھوڑنا چاہتے ہیں۔ اس حالت میں انھیں ساتھ نہیں لے جایا جا سکتا۔ ممکن ہے یہ معذوری عارضی ہو اور علاج سے یہ ٹھیک ہو جائیں"۔

جولی بول رہی تھی اور میں ٹیڈی کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے پھر سیدھا لٹا دیا تھا اور اب ہم دونوں اپنے اپنے دل کا درد آنسوؤں کی زبان میں بیان کر رہے تھے۔ میرے دل میں رنج و غم کا ایک آتش فشاں اُبل رہا تھا مگر اس کی تپش میرا ہی خون جلا رہی تھی۔ میں ٹیڈی کا بدلہ کسی سے نہیں لے سکتا تھا۔ میں انھیں جانتا تھا اور چاہتا تھا کہ میرے ہاتھ ان کی گردن تک پہنچ جائیں تو میں ایک ایک کے گوشت پوست کے ریشے بکھیر دوں اور ان کو خاک میں ملا کے نیست و نابود کر دوں مگر بے بسی کا احساس مجھے پاگل کر رہا تھا۔ میں اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا کہ یہ سب کیسے ہوا؟ اسے اغوا کرکے لے جانے والے کون تھے اور اس کے ساتھ رابعہ اور کیتھرین کو کہاں لے گئے تھے۔ رابعہ کا کچھ پتا نہیں چلتا تھا کہ قید میں ہے یا آزاد ہے۔ کیتھرین مر چکی تھی اور ٹیڈی لوٹ کر آیا تھا تو اپنی مظلومیت کی لہو رُلانے والی تصویر بنا پڑا تھا۔

آہستہ آہستہ میں نے بھی صبر کا دامن امید سے باندھا اور میرے صدمے کی شدّت میں دیوانگی نہ رہی۔ ٹیڈی سن نہیں سکتا تھا مگر میں نے اسے ہر طرح سے یقین دلایا کہ وہ ٹھیک ہو جائے گا حالانکہ میرا اپنا یقین ایک آرزو کے سوا کچھ نہ تھا۔

"جولی! وہ اسے اپنے ساتھ گاڑی میں کیوں نہیں لے گئے"۔ میں نے کہا۔

"وہ معلوم کرنے گئے ہیں"۔ جولی نے کہا۔ "کہ بھائی نیک محمد کو کہاں چھوڑا جا سکتا ہے۔ اگر وہ ڈاکٹر صاحب نہ ملے۔ یا انھوں نے پس و پیش کیا تو پھر شاید وہ انکل رضوی سے بات کریں گے"۔

"انکل رضوی سے؟" میں نے چونک کر کہا۔

"ہاں۔ شہلا باجی بھی ہیں وہاں"۔

"لیکن۔ شہلا کی بات اور ہے"۔ میں نے کہا۔ "ٹیڈی تو ان کی نظر میں ایک مجرم ہوگا"۔

"بھائی، وہ اب ایس ایس پی نہیں رہے"۔

"مگر ان کی سوچ تو نہیں بدلی ہوگی۔ اس کے علاوہ۔ ایک شہلا ہی کیا کم بوجھ تھی ان پر۔ کہ ایک معذور اپاہج کی ذمّے داری بھی ان پر ڈال دی جائے"۔

"یہ بات نہیں بھائی سکندر۔ ان کا خیال تھا کہ یہ شہلا باجی کے ساتھ خوش رہیں گے اور کہیں نہیں۔ وہ ان کا خیال رکھ لیں گی اور اگر خدا نے چاہا تو یہ ٹھیک ہو جانے کے بعد شہلا باجی کی دیکھ بھال کریں گے اور ان کے بچّے کے ساتھ ان کا دل لگ جائے گا۔ اگر ان کے ذہن پر نفسیاتی صدمہ ہوگا تو اس کا اثر زائل کرنے کے لیے سب سے سازگار ماحول وہیں مل سکتا ہے۔ انھوں نے بہت سوچ بچار کے بعد یہ طے کیا تھا کہ دونوں میں سے ایک جگہ ٹھیک رہے گی"۔

"بشرطیکہ انکل رضوی نے ایک مجرم کو قبول کرنے سے انکار نہ کیا"۔ میں نے کہا۔

"کچھ بھی نہ ہوا تو میں یہاں رک جاؤں گی"۔ جولی نے کہا۔ "جب تک بھائی نیک محمد ٹھیک نہیں ہو جاتے، یہ کسی اسپتال میں داخل رہیں گے اور میں..."

"نہیں۔ پھر ہم سب ساتھ رہیں گے"۔ میں نے کہا۔ "ٹیڈی کا علاج ہمارے ساتھ رہ کے بھی ہو سکتا ہے"۔

"انکل رضوی مان جائیں گے بھائی"۔ وہ بولی۔ "میں نے ان کی باتیں سنی تھیں۔ بھائی محسن کہہ رہے تھے کہ ان کی رہائش دہیں رہے گی، انکل رضوی کی۔ ان کے مکان کا کچھ بندوبست ہو گیا ہے، وہ جو آپ کے وکیل دوست ہیں، ان کی معرفت۔ وہ اب براہِ راست مالک مکان کو کرایہ دیتے رہیں گے"۔

"چلو یہ اچھا ہوا"۔ میں نے کہا۔ "یہ بتاؤ تم نے ٹیڈی کو کھانے کے لیے کچھ دیا ہے۔ یہ بہت کمزور ہو رہا ہے"۔

"میں تھوڑا سا جوس اور سوپ دے چکی ہوں"۔ وہ بولی۔

ٹیڈی سونے لگا تھا۔ اس کے نزدیک ہماری سب گفتگو بے معنی تھی۔ وہ ہمارے ہلتے ہوئے ہونٹوں کو دیکھ سکتا تھا۔ شاید یہ بھی سمجھتا تھا کہ ہم اسی کے بارے میں بات کر رہے ہیں مگر وہ خود خاموشی سے پلکیں جھپکانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ ٹیڈی پاگل نہیں ہوا تھا، اندھا نہیں ہوا تھا اور یادداشت سے محروم نہیں ہوا تھا۔ میں باہر نکلا تو شیر علی اکیلا چارپائی پر بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو شیر علی؟" میں نے اس کے قریب جا کر کہا۔

"کچھ نہیں سکندر صاحب۔ اتنی بہت سی باتیں ہیں جو مجھے معلوم نہیں اور میں کسی سے پوچھ بھی نہیں سکتا"۔ وہ بولا۔

"آہستہ آہستہ سب معلوم ہو جائے گا تمھیں بھی"۔ میں نے کہا۔ "تم اب ہمارے ساتھ ہو تو تم سے ہم کچھ نہیں چھپا سکتے"۔

"یہ آپ نے اچھا نہیں کیا سکندر صاحب۔ یہ جو سب نے ایک سا حلیہ بنا لیا ہے"۔ وہ بولا۔ "دو کی حد تک تو ٹھیک تھا۔ مگر ایک سے تین افراد سب کو متوجہ کرتے ہیں۔ آپ بلا مت مانیں میری بات کا"۔

"صاف گوئی کا ہم میں سے کوئی برا نہیں مانتا"۔ میں نے کہا۔ "تم یہ بتاؤ کہ اس قتل کے بارے میں کیا معلوم ہوا؟"

"کوئی خاص بات نہیں جی"۔ شیر علی نے کہا۔ "قاتل کو کسی نے بھی نہیں دیکھا لیکن خیال ہے کہ یہاں دو چار دن سے ایک ملنگ قسم کا جو فقیر بیٹھنے لگا تھا، وہی قتل کر کے فرار ہو گیا"۔

"قتل کا سبب بھی کچھ پتا چلا؟"

شیر علی نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں نے براہِ راست تو کسی سے کچھ نہیں پوچھا لیکن باتیں سن کے اندازہ لگایا ہے کہ ڈرائیور پرانا تھا اور اکثر اس راستے پر چلتا تھا۔ سب ہی جانتے تھے اسے"۔

"اور اس کے بارے میں کیا رائے رکھتے تھے؟"

"رائے اچھی رکھتے تھے"۔ شیر علی نے کہا۔ "نیک اور نمازی آدمی تھا۔ یہاں سے کراچی مال لے جاتا تھا۔ جیسا موسم ہو ویسا مال جاتا تھا"۔

"تمھارا مطلب ہے سبزی، پھل، انڈے۔" میں نے کہا۔

"ہاں جی۔" شیر علی نے کہا۔

"کیا وہ عبداللہ اینڈ سنز کا ملازم تھا؟" میں نے کہا۔

"یہ بھی ٹھیک بتایا آپ نے۔" شیر علی بولا۔ "کمپنی کا مالک آپ کے جانے کے بعد آیا تھا۔ اس نے پولیس سے سارا معاملہ طے کر لیا۔"

"کون تھا وہ سیٹھ۔ ایک موٹا تازہ پلا ہوا سانڈ؟" میں نے کہا۔ "جس نے دنیا کو دھوکا دینے کے لیے بہت بڑی داڑھی چہرے پر سجا رکھی تھی اور تسبیح ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی۔ ہیٹلے رنگ کی ٹولیوٹا کرونا میں۔"

"ہاں جناب۔ آپ جانتے ہیں اسے؟"

"شیطان کو کون نہیں جانتا۔" میں نے کہا۔ "خیر تم بتاؤ کہ ٹرک میں آج کیا مال تھا؟"

"کم سے کم ایک کریٹ میں پھل نہیں تھے۔" شیر علی نے کہا۔ "اس کا پتا یوں چلا کہ ڈرائیور کو بتائے بغیر دو چھوکرے ٹرک پر چڑھ گئے۔ ایک تو وہی گیراج والا لڑکا تھا جس سے آپ نے بات کی تھی۔ وہ غالباً اس قسم کی چوری کرتے رہتے ہیں ہر وقت یہاں رہتے ہیں اس لیے جانتے ہیں کہ کس ٹرک میں کیا مال ہوگا۔ ایک پیٹی انڈوں کی غائب کر دی یا ایک کریٹ پھلوں کا اتار لیا۔ کھاتے کتنا ہوں گے کسی کو بیچ دیتے ہوں گے۔ ایک پورے ٹرک میں سے جو اوپر تک بھرا ہوا ہو ایک پیٹی نکل جائے تو کسی کو پتا نہیں چلتا۔"

"مال بھیجنے والے اتنے بے وقوف تو نہیں ہوتے شیر علی۔ وہ گن کر پیٹیاں رکھتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"میرا مطلب تھا کہ فوراً پتا نہیں چلتا۔" شیر علی نے وضاحت کی۔ "کراچی پہنچنے کے بعد مال اتارتے وقت معلوم ہوتا ہوگا۔ یہ تو مالکوں پر منحصر ہے کہ وہ اپنے ڈرائیور پر اعتبار کرتے ہیں یا نہیں۔ ایک پیٹی مال کچھ نہیں۔ پیٹی راستے میں گر بھی جاتی ہے۔ کسی کو نذرانے میں بھی دینی پڑ جاتی ہے۔ مال چڑھاتے ہوئے گنتی غلط ہو سکتی ہے۔ یہ دونوں لونڈے جب پیٹی اٹھانے گئے تو ان کو پسینہ آ گیا۔ پیٹی بہت زیادہ وزنی تھی۔ پھلوں یا انڈوں کے وزن کا تو انھیں اندازہ تھا۔ وہ حیران ہوئے ہوں گے کہ اس میں کیا ہے اور تجسس میں انھوں نے ایک کونا کسی پیچ کس سے اٹھا کے دیکھ لیا۔ اس میں پستول اور ریوالور بھرے ہوئے تھے۔ پہلے تو وہ گھبرائے۔ پھر انھوں نے ایک ایک پستول نکال لیا۔ یہ ان کی بڑی بے وقوفی تھی۔ انھوں نے معلوم نہیں کیا سوچا تھا۔ یہ کہ بعد میں کسی کو بیچ دیں گے یا وہ پستول ہاتھ میں لے کر خود کوئی بڑا کارنامہ سرانجام دینا چاہتے تھے جس سے یہ محنت مزدوری کا چکر ختم ہو جائے اور وہ عیش سے زندگی گزار دیں۔ وہ جو ملنگ فقیر سڑک کے کنارے بیٹھا رہتا تھا اس نے ان کو ٹرک سے اترتا ہوا دیکھ لیا اور چلانے لگا "چور۔ چور!" لڑکے گھبرا گئے اور پستول پھینک کر بھاگ گئے۔ ملنگ نے دونوں پستول اٹھائے اور سڑک کے بیچ میں ناچنے لگا۔ دونوں پستول اس نے دو ہاتھوں میں اوپر اٹھا رکھے تھے اور مسلسل فائر کر رہا تھا۔ پستولوں میں گولیاں نہیں تھیں۔ وہ منہ سے ٹھاہ۔ ٹھاہ کی آوازیں نکال رہا تھا۔ دوسرے لوگوں نے اسے پکڑا اور اس سے ریوالور چھین لیے۔ اس سے بہت پوچھا گیا کہ یہ کہاں سے آئے مگر اس نے کچھ نہیں بتایا۔ بس یہی کہتا رہا کہ چور آئے تھے چوری کرنے۔ ڈاکوؤں کے گھر میں۔ اس کا مطلب کسی نے نہیں سمجھا۔ چونکہ بالکل نئے اور غیر ملکی ساخت کے ریوالور تھے اس لیے ملنگ کو تو پاگل جان کے چھوڑ دیا گیا۔ ریوالور چھیننے والوں نے ہر ڈرائیور سے پوچھا۔ بادشاہ گل نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا۔"

"ان لڑکوں نے کچھ نہیں بتایا؟" میں نے کہا۔

"وہ پہلے تو بھاگ گئے تھے۔ پھر انھوں نے اپنے استاد کو بتانا مناسب سمجھا اور استاد نے ان کو مارا اور کہا کہ خبردار جو منہ سے ایک لفظ بھی نکالا۔ اندر ہو جاؤ گے سالو! اس نے گل بادشاہ کو الگ بلا کے اس سے بات کی۔ گل بادشاہ نے کہا کہ تم بکتے ہو۔ گیراج کے مالک نے کہا کہ پہلے دیکھ لو۔ تمھاری کوئی پیٹی کھلی ہوئی تو نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے خود تمھیں بھی علم نہ ہو۔ کسی نے اپنا مال بیچ میں ڈال دیا ہو۔ اس پر گل بادشاہ اوپر چڑھا اور اس نے درمیان کی ایک پیٹی کو تھوڑا سا کھلا ہوا پایا۔ وہ بہت پریشان ہوا اور اس نے نیچے آ کر گیراج والے سے مشورہ کیا۔ اس نے کہا کہ پولیس کو اطلاع دے دو۔ ورنہ تم پھنس جاؤ گے کہیں۔"

"اور وہ دو ریوالور کہاں گئے؟" میں نے کہا۔

"سنا ہے وہ ہاتھوں ہی ہاتھوں میں غائب ہو گئے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ سب دیکھ رہے تھے۔ ایک سے دوسرے ہاتھ میں گیا اور دوسرے سے تیسرے کے ہاتھ میں، اور معلوم نہیں کس نے ہاتھ کی صفائی دکھائی کہ کسی کو پتا نہیں چلا۔ کچھ لوگ اسی وقت ٹرکوں سے اتر کے آئے تھے اور کچھ جا رہے تھے، اسی میں گڑبڑ ہو گئی۔" شیر علی نے کہا۔ "گل بادشاہ نے بالآخر اپنے مالکوں سے بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا وہ پہلے سارا معاملہ ان کے علم میں لانا چاہتا تھا۔ وہ ٹرک میں سے کوئی نوٹ بک نکالنے گیا تھا جس میں ٹیلی فون نمبر لکھے ہوئے تھے مگر وہ لوٹ کر نہیں آیا اور جب کافی دیر گزر گئی تو گیراج والے نے ہی جا کے دیکھا۔"

"اندازاً کتنی دیر کے بعد؟"

"یہ مجھے نہیں معلوم جناب۔" شیر علی نے کہا۔

میں نے کہا۔ "کیا یہ گیراج والے کا بیان ہے؟"

"ہاں جی۔ اس نے سب کچھ پولیس کو سچ سچ بتا دیا تھا۔ پولیس تو اسے اپنے ساتھ لے جاتی مگر جب سیٹھ آیا تو اس نے کہا کہ بابا سچ بولنے والے کو پکڑتے ہو۔ چور کو پکڑو۔"

میں نے کہا۔ "کون چور۔ وہ دونوں لڑکے؟"

شیر علی نے کہا۔ "ان کا تو نام پتا لکھوا دیا تھا استاد نے۔ سیٹھ کو ان غائب ہو جانے والے پستولوں کی فکر تھی۔ مگر وہ کس کس کو پکڑتے۔ وہاں تو رات بھر ٹرک آتے جاتے رہتے تھے۔ دونوں طرف سے۔"

"وہ لڑکے تو مارے گئے۔" میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ "مگر تم کہتے ہو کہ قتل کا شک اس ملنگ پر کیا گیا۔ آخر کیوں؟"

"اس لیے کہ واردات کے کچھ دیر بعد ہی وہ غائب ہو گیا تھا۔"

"وہ غائب نہیں ہوا۔ اسے اٹھا لیا گیا ہوگا۔" میں نے کہا۔ "تم نے بہت کچھ معلوم کر لیا شیر علی۔ پولیس نے تم سے بھی تو کچھ پوچھا ہوگا؟"

"ہاں جی۔ پوچھا تھا۔" شیر علی نے کہا۔ "میں نے بتا دیا کہ مرحوم گل بادشاہ میرے گاؤں کا رہنے والا تھا۔ انھوں نے کہا کہ پھر تم اس کی لاش لے جاؤ۔ لیکن میں نے کہا کہ جی یہ مالکوں کی ذمے داری ہے۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ کسی پڑوسی کے گھر جاؤں تو اس کی لاش لے کر۔ وہ جو حاجی صاحب تھا، اس نے میری بات مان لی۔"

"تم سے نہیں پوچھا گیا کہ کون ہو اور کیا کرتے ہو؟"

"پوچھا تھا۔ میں نے بتا دیا کہ پہلے کس کے پاس تھا اور اب بے روزگار ہوں۔" شیر علی نے کہا۔ "اسی لیے یہاں بیٹھا ہوا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "بہت سے لوگوں نے تم کو یہاں آتے جاتے دیکھا ہوگا۔"

"میں نے کہا کہ اس کمپنی میں جگہ خالی ہے۔ مالک آئیں گے تو بات کروں گا۔ میں نے تو حاجی صاحب سے بھی کہا تھا کہ مجھے رکھ لیں۔ وہ مجھے شرمندہ کرنے لگے کہ بڑے افسوس کی بات ہے۔ تمھارا پڑوسی مارا گیا۔ تم اس کی میت نہیں لے جا سکتے۔ اس کا ٹرک لے جانے کے لیے بے تاب ہو۔ اس کی موت تمھارے لیے روزگار کی خوش خبری۔ وہ بک بک کرتا رہا کہ یہ حالت ہے ہمارے اخلاق و کردار کی۔ مجھے غصہ تو بہت آیا مگر میں اصل بات سمجھ گیا تھا۔ وہ مجھ پر کیسے بھروسا کر لیتا۔ اب اس کا اپنا کوئی آدمی آئے گا تو ٹرک لے جائے گا۔ وہ حاجی صاحب بہت مکار آدمی تھا۔ اس نے فوراً پولیس کی ساری کارروائی ختم کرا دی اور سب کو اپنے ساتھ لے گیا۔ بات بات پر تو وہ تقریر شروع کر دیتا تھا کہ سب اس کی رضا کے سامنے مجبور ہیں اور آدمی کو صبر شکر اختیار کرنا چاہیے۔ مرحوم کا وقت آ گیا تھا۔ وقت ہم میں سے کسی کا بھی آ سکتا ہے۔ اس کے ورثا کو میں خود معاوضہ ادا کرنے جاؤں گا۔ خبیث۔ جان کے معاوضے کی بات کرتا تھا۔ اس کا مقصد معاملے کو جلد از جلد ختم کرنا تھا اور اس میں وہ کامیاب رہا۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ اس نے تو شاید پرچا بھی نہیں کٹنے دیا ہوگا۔" میں نے کہا۔ "پولیس گواہوں کو لے گئی تھی۔"

"نہیں۔ کسی کو نہیں۔" شیر علی نے کہا۔ "حاجی صاحب نے کہا کہ بس نام پتے لکھ لو اور ضرورت پڑے گی تو بیان کے لیے بلا لیں گے۔ پولیس تو اس کے حکم پر چلتی تھی جناب۔ جیسے وہ افسر ہے ان کا۔"

"کچھ ایسا ہی ہے شیر علی۔ افسروں کا افسر اُن کے ساتھ ہے اور حاجی صاحب کے پاس پیسہ ہے۔ وہ معاملے کی اس حد تک تشہیر نہیں چاہتے تھے کہ بات اخبار والوں تک پہنچے۔ وہ فرداً فرداً ہر چشم دید گواہ کو بلا کے زبان بند رکھنے کے فائدے اور سچ کا اظہار کرنے کے نقصانات بتا دیں گے۔ اس ملنگ کا غائب ہو جانا البتہ ایک پُراسرار معاملہ ہے۔ وہ پاگل تھا تو اس پر قاتل ہونے کا الزام عائد کرنا بھی پاگل پن ہے۔ یا تو وہ پاگل نہیں تھا۔ کوئی واقفِ حال تھا جسے ٹھکانے لگا دیا گیا۔ یا وہ خود صورتِ حال کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے روپوش ہو گیا۔"

"کیا وہ خفیہ پولیس کا آدمی ہوگا؟"

"ہو سکتا ہے۔ اور وہ سچ مچ پاگل تھا تو تفتیش کو یہیں روکنے کے لیے اسے قاتل قرار دے دیا گیا تاکہ کسی اور پر الزام ہی نہ آئے۔ اصل بات کیا ہے، یہ وہی جانتے ہوں گے۔ ہم تو صرف اندازہ کر سکتے ہیں۔" میں نے کہا اور گھڑی کی طرف دیکھا۔

شام کے چھ بج چکے تھے لیکن ابھی تک نہ محسن کا کچھ پتا تھا اور نہ غالب کا۔ ادھر میرا دماغ دوسرے راستے پر چل نکلا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ یہ ٹرک اب پھر رات کی تاریکی میں روانہ ہوگا۔ اس کے لیے رات کو حاجی صاحب خود کسی قابلِ اعتماد ڈرائیور کو بھیج دیں گے۔ ٹرک دن میں اس لیے نہیں جا سکتا تھا کہ دن میں راستوں کی نگرانی کرنے والے دوسرے لوگ ہوں گے۔ جن سے اس ٹرک کو گزارنے کی بات طے تھی، اب وہ پھر رات کو ہی ڈیوٹی پر ملیں گے۔ حاجی صاحب انھیں بتا دیں گے کہ گزشتہ رات ٹرک کیوں نہیں پہنچا تھا اور وہی ٹرک آج کون لے کر جائے گا۔

"شیر علی!" میں نے کہا۔ "گاڑی لے کر میرے ساتھ چلو۔"

"کہاں جناب؟" شیر علی نے کہا۔ "جولی کو بھی لینا ہے ساتھ؟"

میں نے کہا۔ "نہیں۔ جولی یہاں رہے گی۔ ٹیڈی کی دیکھ بھال کے لیے۔"

"اگر۔ تھوڑی دیر انتظار کر لیتے... جولی کو اکیلا چھوڑنا مناسب نہیں ہے کچھ...."

"کیا مناسب ہے اور کیا مناسب نہیں ہے، یہ میں اچھی طرح سمجھتا ہوں شیر علی۔" میں نے کہا۔ "جولی اپنی حفاظت کر سکتی ہے اور میں تم کو ایک خاص کام سے لے جا رہا ہوں۔ تم ایک گھنٹے میں واپس آ جاؤ گے۔"

"جیسی آپ کی مرضی جناب۔" وہ بولا۔ "آپ جولی کو بتا دیں۔"

"یار تم کو جولی کی بہت فکر ہے۔" میں نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ تاکہ اس کی شرمندگی کچھ کم ہو جائے۔ میں نے جولی سے کہا کہ میں ایک ٹیلی فون کرنے جا رہا ہوں اور آدھے گھنٹے میں واپس آ جاؤں گا۔ پھر میں شیر علی کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ شیر علی نے گاڑی کو موڑنا چاہا تو میں نے کہا۔

"گاڑی کو آگے لے جاؤ۔ ملتان کی طرف۔"

شیر علی نے کوئی سوال کیے بغیر گاڑی کو پھر موڑا اور ہم ٹریلر کی اوٹ سے نکل کے تھوڑا سا کچا راستہ طے کرنے کے بعد سڑک پر آ گئے۔

آدھے گھنٹے میں گاڑی تیس میل دور آ چکی تھی اور میں دونوں طرف کے علاقے کو دیکھتا جا رہا تھا۔ ایک پٹرول پمپ گزرا تو میں نے شیر علی سے کہا۔

"گاڑی ایک طرف کھڑی کر لو۔ مجھے یہاں اترنا ہے۔"

شیر علی نے تعمیل کی "محسن صاحب کو اور دوسروں کو کیا بتاؤں جناب؟"

میں نے کہا "صرف یہ کہ میں کسی ضروری کام سے گیا ہوں۔ دو چار دن بعد لوٹوں گا۔"

شیر علی نے کہا "کیا میں یہ بھی نہ بتاؤں کہ آپ کہاں اترے تھے؟"

"بتا دینا۔ لیکن اس کا فائدہ کچھ نہیں۔" میں نے کہا "میں اسی جگہ تو نہیں کھڑا رہوں گا۔ تم کو کچھ اور بھی کہنا ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ اب تم لوگ بھی وہاں سے کوچ کرو۔ وہ کوئی محفوظ جگہ نہیں ہے۔ وہاں آتے جاتے ٹرک ڈرائیور سب ہی اتنے بڑے ٹریلر کو دیکھ چکے ہیں۔ ٹریلر کوئی انوکھی چیز نہیں لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ اس ٹریلر کو کچھ لوگ پہچانتے ہوں۔ جس کمپنی سے یہ ٹریلر خریدا گیا تھا اس کے ٹرک بھی وہاں سے گزرتے ہیں۔ ٹریلر کو آگے لے آؤ۔ پانچ دس میل۔ پھر ویسی ہی کوئی جگہ دیکھ کر کھڑا کر دو۔ سڑک کے کنارے مگر اتنے فاصلے پر کہ ٹریفک میں کسی قسم کا خلل نہ پڑے۔ کوئی بھی پوچھے تو کہو کہ بریک ڈاؤن ہو گیا ہے اور ایک پُرزہ ٹوٹ گیا ہے۔ اب کراچی سے وہ پُرزہ آئے گا تو مرمّت ہو گی۔ اس بہانے تم وہاں رک سکتے ہو مگر باقی لوگ اگر ٹریلر سے ہٹ کے کسی جگہ خیمہ لگا کر رہیں تو اچھا ہے۔"

"میں یہ سب سمجھا دوں گا۔" شیر علی نے کہا۔

"دوسری بات۔" میں نے کہا "محسن کو سمجھانا کہ یہ سرکاری گاڑی ہے۔ اس کا شہر میں پھرنا تو شک پیدا نہیں کرتا لیکن ویرانے میں کھڑے ہوئے ایک ٹریلر کے پاس آنا جانا ٹھیک نہیں۔ یا تو اس گاڑی کو کہیں اور کھڑا کریں اور تانگا رکشا میں آئیں جائیں۔ یا گاڑی کا رنگ بدل کے سرکاری محکمے کا نام مٹا دیں۔ تیسری بات یہ کہ جلد از جلد سرکس کے لیے آدمی بھرتی کر لیں اور تمام ضروری سامان خرید کے سفر کی تیاریاں مکمل کر لیں۔"

"آپ کی باتوں سے تو اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کا ارادہ ابھی واپس آنے کا نہیں ہے۔" شیر علی نے کہا۔

"ارادہ تو ہے لیکن ارادے بدل جاتے ہیں یا بدلنے پڑ جاتے ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ مجھے زیادہ دن لگ جائیں۔" میں نے کہا "تم سب لوگ اپنے پروگرام کے مطابق کام کرو۔ میرا انتظار مت کرنا۔ میں واپس آؤں گا تو خود ہی تم کو تلاش کر لوں گا۔ سرکس جہاں بھی ہو گا اس پاس کے گاؤں دیہات میں اس کی شہرت ہو گی۔"

"آپ کیا اسلحے کے اس ٹرک کے پیچھے جا رہے ہیں؟"

"ہاں شیر علی۔" میں نے کہا "تمہارا اندازہ درست ہے۔"

"اگر آپ کسی کو ساتھ لے جاتے تو کیا ہرج تھا۔" وہ بولا "کم سے کم محسن صاحب کو ساتھ رکھتے۔"

"اس کام کے لیے میں اکیلا ہی کافی ہوں۔" میں نے کہا "آخری بات اور سن لو۔ محسن اور غالب سے کہنا کہ خلیفہ پنڈت کی دکان اسے واپس دلوا دیں۔"

"کس کی دکان؟" شیر علی حیرانی سے بولا۔

"خلیفہ پنڈت۔" میں نے کہا "تم اسے نہیں جانتے۔ وہ ہمارا محسن اور دوست ہے جو ہماری مدد کرنے کے جرم میں تباہ ہوا۔ اس کو اپنی دکان تک فروخت کرنی پڑی۔ ممکن ہے موجودہ مالک آسانی سے دکان واپس نہ کرے کیونکہ وہ بہت موقعے کی اور چلتی ہوئی دکان ہے اور اس نے کافی خرچ کیا ہے۔ اسے لاگت سے دُگنے تک کی پیشکش کر دینا۔ میرا اندازہ ہے کہ اس نے چالیس ہزار میں دکان خریدی تھی۔ بیس پچیس ہزار اوپر لگائے ہوں گے۔ وہ ڈیڑھ لاکھ تک مان جائے تو ٹھیک ہے۔ ورنہ پھر دوسرا طریقہ اختیار کرنا۔"

"دوسرا طریقہ کیا ہو گا؟"

"سیدھی انگلیوں سے گھی نہ نکلے تو کیا کرنا پڑتا ہے؟" میں نے کہا "ٹیڑھی انگلیوں سے نکالنا پڑتا ہے۔ محسن اور غالب اسے ایک طریقے سے نہ سمجھا سکے تو دوسرے طریقے سے سمجھا لیں گے۔ خلیفہ پنڈت کو اس کا ٹھکانا واپس مل جائے گا تو اس کے دوسرے شاگرد بھی واپس آ جائیں گے۔ جن سے بچھڑنے کا اسے بے حد قلق ہے۔ یاد رہیں گی یہ سب باتیں؟"

"میرا حافظہ اتنا خراب نہیں ہے جناب۔" شیر علی نے کہا۔

"اچھا تو ذرا مجھے آموختہ سناؤ۔ کیا کہو گے تم؟" میں نے کہا۔

شیر علی مسکرایا اور اس نے میری ہر بات دُہرا دی۔

"ویری گڈ۔" میں نے اس سے ہاتھ ملا کے کہا "اب تم جاؤ لیکن پہلے مجھے چابیاں دو ایک منٹ کے لیے۔"

شیر علی نے چابیاں نکال کے مجھے تھما دیں۔ میں نے پیچھے والا خانہ کھولا اور کچھ دیر سوچتا رہا کہ اپنے لیے کس قسم کا اور کتنا اسلحہ نکالوں۔ پھر میں نے ایک ریوالور اور چار راؤنڈ نکال لیے۔ شیر علی نے یہ اسلحہ خانہ پہلی بار دیکھا تھا مگر اب تک وہ ہمارے بارے میں بہت کچھ جان چکا تھا۔ اس کے لیے حیرانی کی کوئی بات نہیں رہی تھی۔ خانے کو مقفل کر کے میں نے چابیاں شیر علی کے ہاتھ پر رکھ دیں اور سائڈ کا دروازہ کھولا۔ دلاور سے وصول ہونے والی ساری رقم اس سوٹ کیس میں ہی تھی جو گاڑی کے پچھلے حصّے میں پڑا رہتا تھا۔ تقریباً نصف رقم ہم نے ٹریلر اور مائکرو بس خریدنے میں صرف کر دی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق اب بھی ساڑھے چار لاکھ باقی تھے۔ اس میں سے میں نے صرف ایک گڈی نکالی اور سوٹ کیس کو شیر علی کے سامنے ہی بند کر دیا۔ دس ہزار کی رقم میری کسی بھی فوری ضرورت کی کفالت کے لیے کافی تھی۔

"اچھا۔ اب خدا حافظ۔" میں نے پھر شیر علی سے ہاتھ ملایا۔

"خدا حافظ۔" شیر علی نے کہا "جلد واپس آنے کی کوشش تو کریں گے آپ!"

"ہاں بھئی۔ تم سب سے دور اور اکیلا میں کیا کر سکتا ہوں اور کیسے رہ سکتا ہوں۔"

"یہاں سب آپ کے لیے فکر مند رہیں گے۔" وہ بولا "آپ اتنا تو کر سکتے ہیں کہ اپنی خیریت کی اطلاع دیتے رہیں۔"

"میں کوشش کروں گا۔" میں نے کہا "کہ محسن کے لیے کہیں پیغام چھوڑ دوں۔ منظر کے پاس یا ڈاکٹر سلامت کے پاس۔ میجر سلطان کے گھر کے فون پر یا خلیفہ پنڈت کے پاس۔ ایک فون میں لے جا رہا ہوں۔ دوسرا محسن کے پاس ہو گا۔ وہ معلوم کرتا رہے۔"

تیسری بار خدا حافظ کہنے کے بعد شیر علی نے گاڑی کو واپس موڑا تو رات کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ ہم شاید پندرہ بیس منٹ تک ایک ہی جگہ ٹھہرے تھے اور اس وقفے میں پندرہ بیس گاڑیاں ایک طرف سے اور اتنی ہی دوسری طرف سے گزر گئی تھیں۔ ان میں بسیں، کاریں اور ٹرک سب ہی شامل تھے۔ جب میں تنہا رہ گیا تو میں نے سڑک سے ہٹ کر درختوں کی قطار کے پیچھے چلنا شروع کیا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ ٹرک رات کو دس گیارہ بجے سے پہلے نہیں آ سکتا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ رات کے وقت اس ایک ٹرک کو پہچان کر روکنے کے لیے مجھے کیا کرنا ہو گا۔ اندھیرے میں تو صرف ہیڈ لائٹس نظر آتی ہیں اور دور سے یہ بھی پتا نہیں چلتا کہ لائٹس کسی بس کی ہیں یا ٹرک کی۔ ہر بس اور ٹرک کو روکنا کیسے ممکن ہو گا۔

تقریباً ایک میل آگے جانے کے بعد میں نے سڑک عبور کی اور دوسری طرف سے واپس ہوا۔ میرا ذہن بدستور الجھن میں مبتلا تھا کہ میں نے ایک خشک ہو جانے والے درخت کا کھوکھلا تنا دیکھا جو نہ جانے کب سے گرا پڑا تھا۔ میں نے اسے ہلا کے دیکھا۔ یہ بہت ہلکا تھا۔ چھ سات فٹ لمبا اور ڈیڑھ دو فٹ موٹا لکڑی کا لٹھا مجھ سے دُگنا وزنی ضرور ہوتا مگر دیمک نے اسے اندر سے چاٹ لیا تھا۔ اس کا وزن اب دس سیر بھی نہیں رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی ترکیب میرے دماغ میں آ گئی۔ تجربے کے لیے میں نے کھوکھلے تنے کو خالی سڑک کے بیچ میں ڈال دیا اور خود چھپ کے بیٹھ گیا۔ لاہور کی طرف سے آنے والی ایک بس کے ڈرائیور نے قریب آ کے بریک لگائے۔ نیچے اتر کے اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر جلدی سے لٹھے کو ایک طرف پھینکا اور بس کو نکال لے گیا۔ عام طور پر اس طرح بس کو ڈاکو روکتے ہیں۔ ڈرائیور کے لیے بس کو سائڈ سے نکال کے لے جانا بھی ممکن نہیں تھا کیونکہ وہیں ایک خشک برساتی نالے کی پُلیا تھی جس نے راستے کو محدود کر دیا تھا۔ دوسرے درخت کا تنا بہت اونچا اور بھاری بھرکم دکھائی دیتا تھا اور کوئی ڈرائیور بھی یہ ہمت نہیں کر سکتا تھا کہ بس کو اس کے اوپر سے گزار کر لے جائے۔ بس ڈرائیور نے خدا کا شکر ادا کیا ہو گا کہ یہ کسی کی شرارت تھی۔ راستہ روکنے والے ڈاکو نہیں تھے۔

وقفے وقفے سے میں نے تین بار تجربہ کیا اور ہر بار یہی ہوا کہ بس یا ٹرک کے ڈرائیور نے نیچے اتر کے درخت کے تنے کو ہٹایا اور یہ حرکت کرنے والے کے نام کوئی گالی دے کر وقت ضائع کیے بغیر بھاگ گیا۔ یہ کام خطرناک بھی تھا۔ کوئی مجھے درخت کو سڑک پر رکھتے ہوئے دیکھ لیتا تو مجھ پر گولی بھی چلا سکتا تھا۔ رات کے وقت سفر کرنے والے ٹرک اور بس ڈرائیور عموماً مسلح ہوتے ہیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ایک ساتھ دو تین ٹرک اور بسیں رک جائیں۔ اور یہ بھی کہ کوئی راستے کی رکاوٹ کو ہٹانے کے بعد لکڑی کے کھوکھلے تنے کو بھی اٹھا لے جائے کہ نہ رہے گا بانس، نہ بجے گی بانسری۔

میری گھڑی میں ابھی ساڑھے آٹھ بھی نہیں بجے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مجھے کم سے کم ڈیڑھ گھنٹا اور اسی طرح گزارنا تھا۔ مجھے بھوک بالکل نہیں تھی۔ شام سے کچھ دیر قبل ہی میں نے دوپہر کا کھانا کھایا تھا۔ پیاس میں برداشت کر سکتا تھا۔ تقریباً ایک میل دور مجھے پٹرول پمپ کی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ دوسری طرف تا حدِ نگاہ چھدرے درختوں والا جنگل تھا اور رات کا اندھیرا تھا۔ میں نے ایک درخت کا انتخاب کیا اور اوپر دو شاخے کی صورت میں پھیلے ہوئے تنے پر پاؤں پھیلا کے اور کمر لگا کے بیٹھ گیا۔ ایک سگریٹ جلا کے میں نے پہلا کش لیا اور سوچنے لگا کہ میرے اس اقدام کا محسن اور غالب کیا مطلب نکالیں گے۔

میں نے شیر علی کو بھی نہیں بتایا تھا کہ میرا ارادہ اسلحے کے ٹرک کا پیچھا کرنے کے علاوہ بھی کچھ کرنے کا ہے۔ محسن یقیناً خفا ہو گا کہ ایک ٹرک کو روکنے یا اس پر قبضہ کرنے کے لیے میں کسی سے مشورہ کیے بغیر چل پڑا۔ یہ کام تو ان میں سے کسی کو ساتھ لے کر بھی کیا جا سکتا تھا اور اس کے لیے اتنی افراتفری میں روانہ ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ اصل بات میں انھیں اس لیے نہیں بتانا چاہتا تھا کہ پھر وہ مجھے روکتے اور مجھے قائل کرنے کے لیے دلائل دیتے، مجھے سمجھاتے کہ یوں رابعہ کو واپس لانے کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم دشمنوں سے نمٹنے کے مشن کو بھول کر ایک عورت کو بچانے کے مشن کو زیادہ اہم سمجھیں۔

رابعہ ان کے لیے ایک عورت تھی۔ پہلے میں نے بھی اس خیال سے سمجھوتا کرنے کے لیے اپنے دل کو پتھر کیا اور جذبات کو عقل پر غالب نہیں آنے دیا تھا مگر اس کی آواز سننے کے بعد میرے لیے یہ سمجھوتا مشکل ہی نہیں ناممکن ہو گیا تھا۔ بے شک وہ ہمارا مشن نہیں تھی مگر وہ مشن کا ایک حصّہ تو تھی۔ ہم نے اس کی رہائی کے لیے جو پلان بنایا تھا وہ ناکام ہو گیا تھا۔ عاشی مر گئی تھی اور زیب النسا ہمیں جُل دے کر نکل گئی

-ورنہ ہم رالعہ کو بھی اسی طرح حاصل کر لیتے جیسے ٹیڈی کو واپس لینے میں کامیاب ہوئے تھے۔ اب مجھے رالعہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ غیر محفوظ محسوس ہوتی تھی۔ اس کی آزادی کا سودا کرنے کے لیے ہمارے پاس کچھ نہیں تھا۔ دوسری طرف وہ شکاری تھے جو ایک بار مجبور ہو گئے تھے کہ اپنا شکار ہمارے حوالے کر دیں۔ مگر رالعہ اب بھی ان کے پاس تھی۔ اس کی آزادی کا یقین ادھورا تھا۔

اسی ادھورے یقین نے میرے دل کو ایک ایسی خلش میں مبتلا کر دیا تھا جس سے مجھے سوتے جاگتے دن رات کے کسی لمحے قرار نہ ملتا تھا اگر مجھے پورا یقین ہوتا کہ وہ قید میں ہے اور اس سے ملنے کی کوئی صورت نہیں تو میں پہلے کی طرح صبر کی سل سینے پر رکھ کے اس وقت کے انتظار میں زندہ رہتا جب اسے مجھ سے دور اور مجبور رکھنے والے حالات بدلنا میرے اختیار میں ہوگا۔ وہ مجھے اپنے آزاد ہونے کا پورا یقین دے سکتی تو۔ مگر یہ تو اسی صورت میں ممکن تھا کہ وہ میرے پاس پہنچ جاتی اور کہتی کہ سکندر، دیکھو میں تمھارے سامنے ہوں میں تمھارے تصوّر کا سراب نہیں ہوں۔ میں خواب بھی نہیں ہوں۔ میں حقیقی وجود رکھنے والی جیتی جاگتی تمھاری اپنی رالعہ ہوں۔ یا وہ کہتی کہ سکندر آؤ مجھے لے جاؤ' میں تمھارے انتظار میں ہوں۔ پھر وہ مجھے سرحدِ افلاک پر ملتی۔ وہاں ملتی جہاں زمین آسمان ملتے ہیں یا جہاں زندگی کی سرحد موت سے ملتی ہے۔ میں سر کے بل جاتا۔ مگر اس نے تو مجھے اپنا پتا بھی بتا دیا تھا اور یہ بھی کہہ دیا تھا کہ مجھ سے ملنے کی کوشش مت کرنا۔ یہ بھی کہا تھا کہ میں بالکل خیریت سے ہوں اور کسی کی قید میں نہیں ہوں مگر آنے کی بات مت کرو۔ میں نہیں آؤں گی۔ آخر کیوں؟ وہ کیوں نہیں آسکتی؟ اور کیوں مجھے دور رکھنا چاہتی ہے؟ یہ کیسی ستم گری کی ادا ہے۔ کیسا امتحان ہے . . .

میرے خیالات کی رو اس وقت ٹوٹی جب سڑک سے گزرنے والی ایک کار اچانک کچے راستے پر مڑ گئی اور سیدھی میری سمت میں آئی۔ میں جہاں تھا' وہیں منجمد ہو گیا۔ ہیڈ لائٹس ناہموار زمین کے ہچکولوں سے اوپر نیچے ہو رہی تھیں۔ روشنی بار بار مجھ پر پڑتی تھی اور اگر میں ذرا بھی حرکت کرتا تو ان کی نظر میں آجاتا جو ونڈ اسکرین کے پیچھے سے شاید میری ہی جستجو میں وہاں پہنچے تھے۔ میرے سامنے اور آگے پیچھے بہت کم پتّوں والی شاخیں تھیں۔ میں زمین سے دس بارہ فٹ کی بلندی پر تھا۔

سب سے پہلا خیال مجھے یہی آیا کہ آخر وہ کون ہو سکتے ہیں؟ سوائے شیر علی کے کسی کو معلوم نہ تھا کہ میں یہاں ہوں۔ کار اس جگہ سے ایک فرلانگ پہلے ہی سڑک چھوڑ چکی تھی۔ پٹرول پمپ سے یہاں تک میں نے کوئی کچا راستہ نکلتا نہیں دیکھا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ کار درختوں کے درمیان سے گزرتی آرہی تھی۔ یہ ماٹگرولس ہرگز نہیں تھی۔ اس کی لائٹس اونچی ہوتی ہیں اور انجن کی آواز سب سے الگ ہوتی ہے۔ کیا یہ محسن اور غالب ہو سکتے ہیں جو ٹیکسی لے کر مجھے تلاش کرنے آئے ہوں۔ شیر علی نے انھیں سب بتا دیا ہو اور وہ مجھے میرے ارادے سے باز رکھنے یا میرا ساتھ دینے کے لیے نکل کھڑے ہوئے ہوں۔ وہ ٹیکسی میں بھی آسکتے تھے اور کسی سے چھینی ہوئی کار میں بھی۔ شیر علی نے ان کو بتا دیا ہوگا کہ سکندر صاحب پٹرول پمپ سے ایک میل آگے اترے تھے مگر یہ ٹیکسی نہیں تھی۔ قریب آنے سے پہلے ہی کار نے اپنا رخ تھوڑا سا بدل لیا اور اس کی ہیڈ لائٹس آف ہو گئیں۔ گیارھویں یا بارھویں تاریخ کا چاند درختوں سے اوپر اٹھ چکا تھا اور اس کی روشنی راستہ دکھلانے کے لیے کافی تھی۔ اب کار بالکل رینگتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی میں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی پوزیشن بدلی اور بلّی کی طرح دبے پاؤں دوشاخے کے اس حصّے پر چڑھ گیا جس سے میں کمر لگائے بیٹھا ہوا تھا۔ مزید پانچ فٹ اوپر جانے کے بعد میں خود کو پتّوں کے پیچھے گم کرنے میں کامیاب رہا۔

کار مجھ سے بیس پچیس گز کے فاصلے پر رکی تو میں نے اس میں سے یکے بعد دیگرے چار افراد کو اترتے دیکھا۔ انھوں نے اپنی اپنی ٹارچ روشن کی تو میری ساری خوش فہمی دور ہو گئی۔ یہ محسن اور غالب نہیں تھے۔ ہر ٹارچ کی روشنی کا دائرہ زمین پر تھا مگر اس اُجالے میں جو کار سے منعکس ہو رہا تھا، میں نے گاڑی کو پہچان لیا۔ اس میں سے اترنے والی پانچویں سواری حاجی عبداللہ کی تھی۔ وہی اس گاڑی کو چلا کے لایا تھا اور اس کا بھاری بھرکم وجود کار کے دروازے سے پھنس کر نکلا تھا۔ باقی چار حکم کے غلام معلوم ہوتے تھے کہ دست بستہ کھڑے ہوئے تھے۔ ان سب کی صورت تو نظر نہیں آتی تھی لیکن وہ جوان اور چاق و چوبند لوگ تھے۔ ان کے جسم پر گہرے رنگ کی قمیص پتلون تھی۔ چاند کی دھندلی روشنی میں مجھے وہ سیاہ پوش لگے۔ صرف حاجی صاحب کی شلوار قمیص کا رنگ سفید تھا۔

حاجی عبداللہ کے ہاتھ میں اس وقت تسبیح نہیں' مشین گن تھی اور اس جنگل میں اپنے چیلوں کے سامنے وہ ایک شیطان نظر آتا تھا۔ دنیا کے سامنے اس کے ظاہر اور باطن کا جو فرق میں نے دیکھا تھا' وہ یہاں ختم ہو گیا تھا۔

"دیکھو۔ تم میں سے دو ایک ساتھ اس طرف جاؤ" حاجی صاحب نے بارعب لہجے میں کہا "دو دوسری طرف سے"

"ابا جی۔ سب کو الگ الگ جانے دیں" ایک شخص نے کہا۔

"یہ ٹھیک کہتا ہے" دوسرے نے کہا۔ وہ غالباً حاجی صاحب کا بڑا برخوردار تھا کیونکہ اس کے لہجے میں بھی وہی رعونت تھی اور اس کے بولنے کا انداز بھی انھیں ابلیس اور ابلیس کی اولاد ثابت کرتا تھا۔

پھر حاجی صاحب نے اس کی تصدیق کر دی "میرے باپ مت بنو۔ میں تمھارا باپ ہوں" اس نے برہمی سے کہا "عقل کی بات بتا رہا ہوں تمھیں۔ ایک اکیلا اور دو گیارہ والی بات سنی ہے نا"

"اس کا مطلب تو ہوتا ہے' اتحاد میں برکت ہے" بڑے احمق نے کہا۔

"اور ہم کب کہتے ہیں کہ آپ ہمارے باپ نہیں ہیں" چھوٹا ہنسنے لگا۔

"بکومت۔ ایک آدمی جنگل میں ایسے غائب ہو جاتا ہے کہ پتا بھی نہیں چلتا۔ تم سب ایک ایک کر کے غائب ہو جاؤ گے اور سمجھتے ہو گے کہ دوسرے سب محفوظ ہیں" حاجی صاحب نے گرج کے کہا۔ "تم میں سے ایک آگے چلے گا۔ دوسرا دس بیس قدم پیچھے سے اس پر نگاہ رکھے گا۔ آگے والا بھی منہ اٹھا کے نہیں چلتا جائے گا۔ اسے بھی برابر پیچھے نظر رکھنی ہو گی"

"آپ کو یقین ہے کہ یہی وہ جگہ ہے؟"

"تمھارے سامنے پٹرول پمپ والوں نے کیا کہا تھا" حاجی صاحب بولے "وہ اسی علاقے میں ہے' بس ایک میل کے اندر اندر"

خوف کی سرسراہٹ مجھے پورے جسم پر یوں محسوس ہونے لگی، جیسے میرے بدن پر چیونٹے رینگنے لگے ہوں۔ وہ مجھے تلاش کر رہے تھے اور میرے سامنے پھر وہی سوال تھا کہ انھیں میرے بارے میں اتنی صحیح اطلاع کس نے فراہم کی۔ میرا دل یہ اعتراف کرتے ہوئے انجام کے خیال سے کانپنے لگتا تھا کہ حاجی صاحب کو یہ بات صرف شیر علی ہی بتا سکتا تھا اور اگر شیر علی بھی دوست کے بھیس میں دشمن تھا تو پھر باقی سب کا بھی اللہ ہی حافظ ہے۔

"ایک دوسرے کو اور مجھے خبردار رکھنا" حاجی صاحب نے کہا۔

"یس ابا جی" چھوٹے برخوردار نے ایک تیز سیٹی بجائی جو دونوں انگلیاں منہ میں ڈال کے ہم بھی بجاتے تھے "یہ ہے میرا سگنل۔ اپنے کانوں کے راڈار کھلے رکھیے"

"تم دو بار سیٹی بجاؤ گے۔ اتنی لمبی نہیں" حاجی صاحب بولے۔

"مجھے سب پتا ہے ابا جی" بڑے لڑکے نے جھلّا کے کہا۔

"اچھا شیرو اور ڈبّو کو نکالو" حاجی صاحب نے حکم دیا۔

باقی دو آدمی جو ابھی تک چپ رہے تھے' گاڑی کی طرف بڑھے اس کی ڈکی کھولی اور کوئی چیز اٹھا کے باہر رکھ دی۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے ان شکاری کتّوں کو دیکھا جو بالکل چپ کھڑے ہوئے تھے۔ ڈبّو اور شیرو کے نام سے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کتّے لے کر آئے ہیں۔ مگر ایسے کتّے میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے جو حلق سے آواز تک نہ نکالتے ہوں۔ عموماً شکاری کتّے غرّاتے' بھونکتے اور حلق سے خوں آشام آوازیں نکالتے ہوئے دوڑتے ہیں مگر کھڑے ہوئے بھی وہ بالکل چپ نہیں رہتے۔

"آپ اپنا خیال رکھیں" چھوٹے لڑکے نے ایک کتّے کی رسّی تھام کر کہا "یہ نہ ہو کہ وہ پیراشوٹ سے آپ کے اوپر اتر جائے، آپ دائیں بائیں دیکھتے رہ جائیں"

"چلو اب دفع ہو جاؤ" حاجی صاحب نے گرم ہو کے کہا۔

"یس سر۔ ہم دفع ہو جاتے ہیں" چھوٹے والے نے کتّے کو تھپکی دی اور ایک شخص کو روانگی کا سگنل دیا۔ کتّے نے زمین کے ساتھ تھوتھنی لگا کے چلنا شروع کیا۔ وہ ایک منہ زور کتّا تھا جو رسّی تھامنے والے کو اپنی مرضی کے مطابق کھینچ کر لے جانا چاہتا تھا۔ حاجی صاحب کے دونوں لڑکے ایک ایک کتّے کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ انھوں نے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی ٹارچ بجھا دی تھی۔ ان کے پیچھے چلنے والے دوسرے شخص نے حاجی صاحب کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے اپنا فاصلہ برقرار رکھا تھا۔ لیکن وہ وقفے وقفے سے ٹارچ روشن کرتا تھا اور بجھا دیتا تھا۔ غالباً یہ آگے جانے والے کے لیے ایک اشارہ تھا کہ پیچھے سب خیریت ہے اور پلٹ کر دیکھنے کی ضرورت نہیں۔

جب وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گئے تو میں نے سینے میں رک جانے والے سانس کو خارج کیا۔ نہ جانے کس وقت میرے ہاتھ نے ریوالور نکال لیا تھا۔ اگر وہ اس درخت کے نیچے پہنچ جاتے۔ تو میں بلاتوقف ان سب کتّوں کو شوٹ کر دیتا۔ میں بہت محفوظ مقام پر مورچہ بند تھا۔ خطرہ صرف حاجی صاحب کی طرف سے تھا جو میری رینج سے باہر تھے لیکن وہ اندازے سے بھی مشین گن کا برسٹ مار دیتے تو میں مر کے نیچے گرتا لیکن اب مجھے اطمینان حاصل ہو گیا تھا کہ وہ کسی اور کو تلاش کر رہے تھے۔ مجھے اس بات کی بھی خوشی تھی کہ شیر علی سے منسوب اندیشے غلط ثابت ہوئے اگر وہ بھی دوست نما دشمن ہوتا تو پھر اعتبار کا لفظ ہی بے معنی ہو جاتا۔

دو تین منٹ کے بعد میں نے ایک سیٹی سنی۔ اس کے جواب میں دو سیٹیاں سنائی دیں۔ میں نے حاجی صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ ایک کھلی جگہ پر مشین گن دونوں ہاتھوں میں تھامے بڑے مستعد نظر آرہے تھے دوران کی نظریں چاروں طرف مسلسل گردش کر رہی تھیں۔ میں نے ریوالور سے ان کے سر کا نشانہ لیا۔ بیس پچیس گز کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ مجھے اپنے نشانے پر بھی بھروسا تھا لیکن حاجی صاحب کا سر متحرک تھا اور روشنی کم تھی۔ نشانہ خطا نہ ہوتا' تب بھی فائر کی آواز پر چار مسلح افراد کا دوڑتے ہوئے آنا یقینی تھا۔ پھر وہ مجھے چاروں طرف سے گھیر سکتے تھے۔ اگر میں حاجی صاحب کو مار کے ان کی مشین گن پر قابض ہو جاتا تو ان چاروں کو بھی لمبا لٹا سکتا تھا مگر پہلی بات تو رسک لینے کی تھی۔ درخت کی اتنی بلندی سے نشانہ خطا ہونے یا نہ ہونے کے چانس ففٹی ففٹی تھے۔ دوسری بات یہ تھی کہ ان سب کو مار کے مجھے کچھ بھی معلوم نہ ہوتا۔ ابھی تو میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس وقت وہ جنگل میں مجھے شکار کرنے نہیں آئے تھے تو ان کا شکار کون تھا۔

درخت پر چڑھنے کے مقابلے میں درخت سے اترنا بہت آسان کام تھا۔ اگر مجھے ایک منٹ کی مہلت بھی ملتی تو میں شاخ سے جھول کے زمین پر اس طرح قدم جما دیتا کہ اس نام کے حاجی کو آہٹ تک محسوس نہ ہوتی لیکن وہ بہت چوکنا کھڑا ہوا تھا۔ اس کی پشت سڑک کی جانب تھی،

وہ مطمئن تھا کہ اس طرف سے کوئی خطرہ لاحق نہیں۔ میری طرف اس کا چہرہ تھا۔ وہ خفیف سی حرکت کو بھی دیکھ سکتا تھا کیونکہ جنگل میں کسی درخت کا ایک پتا بھی نہیں ہل رہا تھا۔ اس کے کان بھی بہت تیز تھے۔ کسی درخت پر اپنے آشیانے میں کوئی پرندہ بھی پھڑپھڑاتا تھا تو وہ فوراً ادھر متوجہ ہوجاتا تھا۔ اس عمر میں حاجی صاحب کی بصارت اور سماعت کی قوت بہت سے نوجوانوں سے بہتر تھی۔

میں دم سادھے بیٹھا ہوا خدا کے حضور بہت سی فضول خواہشات کو دعا بنا کے ارسال کرچکا تھا۔ مثلاً یہ کہ اے خدا۔ اس وقت مجھے چھینک نہ آئے۔ سنا ہے کہ کہ موت عشق اور چھینک کا کوئی وقت مقرر نہیں اور یہ کہ مجھے سانپ بچھو نہ کاٹیں۔ کوئی چیونٹی میرے جسم کے علاقۂ ممنوعہ میں داخل ... ں نہ کاٹے کہ میں بلبلا اٹھوں۔ کچھ دعائیں فریقِ ثانی کے لیے بھی تھیں مثلاً یہ کہ اچانک اس کو عطا کی جانے والی زندگی کی آخری سانس پوری ہو فرشتۂ اجل کے بارے میں کون نہیں جانتا کہ وہ ایسی جگہ روح قبض کرنے پہنچتا ہے۔ جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتی۔ حاجی صاحب کی عمر مہلک قسم کے ہارٹ اٹیک کے لیے بہت موزوں ہے۔ یہ نہیں تو اسے پیشاب کی حاجت ہی محسوس ہو کہ وہ چند منٹ کے لیے مشین گن رکھے اور انگریزی محاورے کے مطابق پانی بنائے۔

مگر ایسی دعائیں نہ دل سے نکلتی ہیں اور نہ اثر رکھتی ہیں۔ حاجی ایک خون کے پیاسے چالاک چیتے کی طرح وہیں موجود رہا۔ جنگل میں سے اس کے لواحقین کی سیٹیاں سنائی دیتی رہیں۔ جو اپنے ملازمین کے ہمراہ ایک محدود علاقے کو چھان رہے تھے۔ ادھر میری گھڑی میں ساڑھے نو بج گئے تھے اور میرے اندازے کے مطابق اگلے ایک ڈیڑھ گھنٹے میں اس ٹرک کو آنا تھا۔ ٹرک رات کے بارہ بجے کے بعد بھی آسکتا تھا لیکن گیارہ بجے تک میرا آبزرویشن پوسٹ ... حال لینا ضروری تھا۔

درمیان میں یہ نئی صورتِ حالات سامنے آگئی تھی اور میں نہیں کہہ سکتا تھا کہ عبداللہ اینڈ سنز کی واپسی کتنی دیر میں ہوگی۔ وہ ساری رات بھی شکار کھیل سکتے تھے۔ سیٹیوں کی آوازیں بہت دور سے آنے لگیں اور پھر معدوم ہوگئیں۔ شکاری اور ان کے کتے اتنی دور نکل گئے تھے کہ ان کے سگنل اب حاجی صاحب کو موصول نہیں ہورہے تھے۔ حاجی بڑی بے قراری سے جنگل کی طرف دیکھ رہا تھا اور پارے کی طرح مضطرب تھا۔ آدھے گھنٹے بعد اچانک ایک فائر ہوا تو میں بھی اچھل پڑا۔ انتظار کا سکوت میرے اعصاب پر سوار تھا۔ ایسے میں بہت نزدیک ہونے والے دھماکے کا اثر زیادہ شدت کے ساتھ محسوس ہوا۔

"کون ہے؟" حاجی نے چلّا کے کہا اور ... گن کو یوں سامنے کرلیا جیسے درختوں کی اوٹ سے دشمن کی فوج کا مسلح دستہ نمودار ہونے والا ہو۔ جواب میں دوسرا فائر ہوا اور حاجی نے خود کو گاڑی کی اوٹ میں کرلیا۔ میں نے کسی کے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنی۔ وہ شاخوں اور جھاڑیوں کی سرسراہٹ کے درمیان بھاگتا ہوا ادھر ہی آرہا تھا۔ وہ اچانک سامنے آگیا۔

"خبردار!" حاجی صاحب نے چلّا کے کہا "رک جاؤ ورنہ بھون کر رکھ دوں گا۔ میرے پاس مشین گن ہے۔"

وہ دوڑتے دوڑتے اسی پیڑ کے نیچے پہنچا جس پر میں سوار تھا۔ پیچھے سے ایک اور گولی آئی اور وہ درخت پر چڑھنے کی کوشش کے پہلے مرحلے میں ہی ناکام ہو کے نیچے گرا۔ اس کا جسم دو تین پلٹے کھانے کے بعد ساکت ہوگیا۔ پندرہ فٹ اوپر سے میں مرنے والے کو صاف دیکھ سکتا تھا۔ وہ کوئی دبلا پتلا سیاہ فام بنگالی تھا جس نے دھوتی کے ساتھ بنیان پہن رکھی تھی۔ وہ جنگل کی پُرخار زمین پر ننگے پاؤں بھاگتا ہوا آیا تھا وہ گولی کی رفتار سے نہیں جیت سکا تھا۔ ورنہ چند سیکنڈ میں وہ بھی اسی درخت پر آجاتا جہاں میں پہلے سے پناہ گزیں تھا۔

قاتل اس کے پیچھے تھا اور بنگالی کے گرتے ہی وہ بھی سامنے آگیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ریوالور تھا اور دوسرے ہاتھ میں کتے کے پٹے سے بندھی ہوئی ڈوری کا سرا۔ یہ حاجی کا کوئی بیٹا تھا۔ اس کے ساتھ جانے والا دوسرا شخص خود کو گھسیٹتا ہوا نمودار ہوا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر لڑکھڑا کے منہ کے بل گرا اور پھر آگے رینگنے لگا۔

حاجی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا آگے آیا "یہ تو مکرجی ہے!"

"ہاں — غالباً ..."

"غالباً کے بچے — یہ تم نے کیا کیا" حاجی صاحب بگڑے۔

"جو اس نے کیا وہ بھی تو دیکھیں ابّا جی۔ پہلے اس نے گولی چلائی تھی۔ کیا یہ اندھا ہوگیا تھا" یہ حاجی کا بڑا لڑکا تھا۔

"اور تم اندھے نہیں تھے؟ تم دیکھ سکتے تھے کہ یہ اپنا ہی آدمی ہے۔"

"اس کی گولی مجھے بھی لگ سکتی تھی۔"

"لگی تو نہیں تھی" حاجی صاحب نے برہمی سے کہا "چلو اب لاش اٹھاؤ۔ خیر سے دوسرے بھی واپس آنے والے ہوں گے۔ فائر کی آواز پر سمجھے ہوں گے کہ بڑے بھائی نے شکار مار لیا۔"

میں ان کی گفتگو سننے کے ساتھ یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ دوسرے شخص کی طرف کوئی متوجہ نہیں ہے جو بنگالی کی گولی سے شدید زخمی ہوا اور مرنے کے قریب نظر آتا تھا۔ وہ بار بار کہہ رہا تھا کہ اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ۔ ورنہ وہ مرجائے گا مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے سوا کسی کے کانوں تک اس کی آواز پہنچ ہی نہیں رہی ہے۔ اس نے حاجی کو خدا رسول کا واسطہ دیا مگر باپ بیٹے کو اپنے ہی ایک آدمی کے غلط فہمی کی بنا پر مارے جانے کا صدمہ زیادہ تھا۔ مکرجی کے بارے میں اس کے سوا میں کیا فرض کرتا کہ وہ درمیان کی کوئی چھوٹی سی کڑی تھا۔ یہ نہیں ہوسکتا تھا کہ مکرجی اس ویران جنگل میں کیوں چھپا ہوا تھا۔ میں نے ایک بات اور نوٹ کی۔ کتے کا منہ بند رکھنے کے لیے اس کی تھوتھنی پر کوئی خول چڑھا دیا گیا تھا یا رسی لپیٹی گئی تھی۔ اس طرح کہ وہ اپنی ناک سونگھنے کے لیے استعمال کرسکتا تھا مگر اپنی مرضی سے چوں بھی نہیں کرسکتا تھا۔

رحم کے لیے چلانے والا ابھی کراہتے کراہتے خاموش ہوگیا۔ کسی نے اس کی طرف دیکھا تک نہیں کہ وہ بے ہوش ہوا تھا یا مر گیا تھا۔ جنگل کی طرف سے .... ایک سیٹی سنائی دی۔ اسے جوابی سگنل دیا گیا اور وہ اپنی گاڑی کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ تمام وقت میں کچھ کرنے یا نہ کرنے کی کشمکش میں مبتلا رہا۔ تجسس بھی میری راہ میں حائل تھا۔ میں نے بہت کچھ سن لیا تھا اور دیکھ لیا تھا لیکن اصل بات کا ابھی تک پتا نہیں چلا تھا۔ اس وقت جب باپ بیٹا درخت کے نیچے کھڑے ہوئے تھے، میں دونوں کو ایک ہی جست میں سمیٹ سکتا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتے میں دونوں کے سر بھی توڑ سکتا تھا۔ ہاتھ پیر بھی اور گردن بھی۔ مجھے ان کی سفاکانہ بے حسی پر اتنا ہی غصہ آیا تھا جتنا مرتے ہوئے شخص کی حالت پر رحم لیکن میں نے خود کو سمجھا لیا تھا کہ یہ جنگ ہے۔ مجھے صرف اپنی ذات کے تحفظ کی فکر کرنی چاہیے۔

دوسرا شکاری دس منٹ بعد لوٹا تو اکیلا نہیں تھا۔ اس کے آگے آگے ایک عجیب حلیے کا شخص چل رہا تھا۔ اس نے شوخ رنگ کے پھولوں والی دھوتی پر لمبی دھاریوں والا کرتا پہن رکھا تھا۔ وہ ننگے پاؤں تھا اور اس کا سر حال ہی میں استرے سے صاف کیا گیا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں کلائی کے برابر موٹا ڈنڈا تھا اور دوسرے ہاتھ میں کشکول۔ اسے گھیر کر لانے والے چار قدم کے فرق سے اس کے پیچھے دائیں بائیں چل رہے تھے۔

"لو ابّا جی۔ آپ کے سمدھی آگئے۔ اب آپ ان کی سمادھی بناؤ یا مزار شریف" چھوٹا لڑکا ذرا غیر سنجیدہ قسم کی گفتگو ضرور کرتا تھا مگر اپنے کام میں زیادہ ہوشیار تھا۔

حاجی نے بڑے بیٹے کی طرف دیکھ کر کہا "کبھی تم بھی عقل میں بڑے ہونے کا ثبوت دے دیا کرو۔"

"یہ پٹاخے کس خوشی میں چلائے جا رہے تھے" چھوٹے لڑکے نے کہا۔ پھر اس کی نگاہ نے دونوں لاشوں کو دیکھ لیا "میرا خیال ہے کہ میں نے تین فائر سنے تھے۔ تیسری لاش کہاں ہے۔ یا انھیں فی کس ڈیڑھ گولی ماری گئی ہے۔"

مگر حاجی اس کی نہیں سن رہا تھا۔ وہ اس ملنگ کی طرف متوجہ تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اسی ملنگ پر بادشاہ گل کے قتل کا الزام تھوپ دیا گیا تھا۔

"اس کے پاس سے کچھ ملا؟" حاجی نے کہا۔

"آپ کے مطلب کی تو یہی دو چیزیں ہیں" چھوٹے لڑکے نے کہا اور اپنی دو جیبوں سے دو ریوالور نکال کے باپ کے قدموں میں ڈال دیے "باقی کچھ تصویریں تھیں۔"

"کیسی تصویریں" حاجی نے کہا "دکھاؤ مجھے۔"

"ابّا جی — وہ صرف ہم جیسے بالغوں کے مطلب کی ہیں۔ آپ کیا کریں گے اس عمر میں دیکھ کر" وہ بولا۔

"بکو مت — اِدھر لاؤ تصویریں۔"

"آپ کی مرضی" اس نے جیب سے دو تصویریں نکال کے باپ کو تھما دیں۔

"لاحول ولاقوۃ" حاجی نے تصویروں کو دیکھتے ہی کہا "خبیث کیوں جھوٹ بولتے ہو" اس نے تصویریں پھاڑ کے پھینک دیں۔ "سچ بتاؤ اس کی تلاشی لی تھی تم نے؟"

لڑکا ہنسا "ابّا جی! فقیر ملنگ لوگوں کی جیب میں اور کیا ہوگا۔"

"یہ دونوں ریوالور۔ تم نے غائب کیے تھے؟" حاجی نے ملنگ سے پوچھا۔

"یہی سمجھ لو" ملنگ نے بڑی متانت سے کہا۔

حاجی کا مکّا اس کے منہ پر پڑا "سمجھ لو کے بچے۔ سیدھی طرح بتاؤ کہ یہ تم نے کس سے لیے تھے۔ خریدے تھے؟"

"یہ جان کے تم کیا کرو گے — تمھارا مال تمھیں مل گیا۔"

حاجی نے اس پر مشین گن کا بٹ مارا "اگر ریوالور تمھیں کسی نے بیچے تھے تو مجھے بیچنے والے کا نام بتا دو۔ میں تم کو چھوڑ دوں گا۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔ اس لیے میں بھی سچ نہیں بول سکتا۔"

"رانا شمشاد علی! تم نے خود بھی لوگوں سے سچ اگلوایا ہوگا۔ تمھاری بیس سال کی نوکری کا ریکارڈ میں جانتا ہوں" حاجی نے کہا۔ "خفیہ پولیس میں تمھیں اچھی کارکردگی کی بنا پر بھیجا گیا تھا۔ مگر تمھارے اپنے محکمے کے لوگوں نے مجھے بہت پہلے بتا دیا تھا کہ تم کس چکر میں ہو اور تب سے میرے آدمی تم پر نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ تم نے حکامِ بالا کو جو رپورٹ بھیجی وہ غلط ثابت ہوئی۔ چار مرتبہ چھاپا مارنے والوں کو کچھ نہیں ملا۔ ہم نے جانتے بوجھتے تمھیں گمراہ کیا تھا تاکہ تم دوسروں کو گمراہ کرو۔ اب تمھارے ایک افسر نے تمھاری کارکردگی کو سخت مایوس کن اور ناپسندیدہ قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ آئندہ ... ری اطلاع کو اس وقت تک مصدقہ نہ سمجھا جائے جب تک دوسرے ذرائع سے بھی تصدیق نہ ہوجائے۔"

"اس بار میری رپورٹ غلط نہ ہوتی حاجی" رانا شمشاد علی نے کہا۔

"لیکن اس پر کارروائی نہیں ہوئی۔ کیونکہ دوسرے ذریعے نے تمھاری رپورٹ پر شبہ ظاہر کیا تھا۔"

"مجھے معلوم ہے۔ وہ دوسرا ذریعہ تمھارا زرخرید ہے" رانا نے بے خوفی سے کہا "وہ بھی تمھاری طرح غدار ہے۔ تمھارا یہ دینداری اور پرہیزگاری کا سارا ڈھونگ ..."

حاجی کے بڑے لڑکے نے اس پر مکّوں کی بارش کردی۔ ساتھ ساتھ اس کے منہ سے غلیظ گالیوں کا بدبودار طوفان امڈ پڑا۔ "یہ ساری دنیا زرخرید ہے۔ سب پیسے کے غلام ہیں اور وہ سب بھی ڈھونگ رچاتے ہیں جو تیری طرح محبِ وطن بنتے ہیں۔"

رانا شمشاد علی گر گیا تھا۔ اس کے لبوں سے خون بہنے لگا تھا۔

وہ اٹھا اور اپنے کُرتے کی آستین سے منہ صاف کرنے لگا۔" آج نہیں تو کل۔ بہت جلد تم کو اندازہ ہو جائے گا کہ تمھاری آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ تم صحیح دیکھ ہی نہیں سکتے حاجی۔ ورنہ تم دیکھتے کہ غدار اور وطن فروش آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں۔ اس مرتبہ میں نے ثبوت بھی حاصل کر لیا تھا تمھارے خلاف ۔ پکّا ثبوت "۔

" یہ دو ریوالور "۔ حاجی نے تمسخر اڑاتے ہوئے کہا۔" یہ تم اپنے کسی فرض شناس افسر کی خدمت میں پیش کرتے اور کہتے کہ دیکھیے جناب' یہ کہاں کے بنے ہوئے ہیں۔ یہ مہلت حاصل کرنے کے لیے تم نے ڈرائیور بادشاہ گل کو مار ڈالا "۔

" مجھے افسوس ہے کہ میرے ہاتھوں ایک بے گناہ کا خون ہوا "۔ رانا نے کہا۔" وہ تو خود بھی بے خبر تھا کہ اس کے ٹرک میں چل نہیں' اسلحہ ہے "۔

" تم نے اس کی بے گناہی کا کیسے یقین کر لیا "۔

" آدمی مرتے وقت سچ ضرور بولتا ہے "۔ رانا شمشاد علی نے کہا۔" جب میں نے وہ زہریلا سُوا اس کے دل میں اتار دیا تھا تو وہ بہت حیران ہوا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کا دشمن کوئی نہیں ہے اور اس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میں نے ایسا کیوں کیا؟ جب میں نے اسے بتایا۔ تو اس نے کلمہ پڑھ کے کہا کہ بھائی' اللہ تم کو معاف کرے۔ نہ میں غدار تھا نہ غداروں کے ساتھ تھا۔ مجھے معلوم ہوتا تو میں خود یہ ٹرک لے کر حاجی عبداللہ اینڈ سنز کے دفتر میں گھس جاتا اور ان سب کو ایک دھماکے میں نیست و نابود کر دیتا "۔

" تم نے صرف ٹرک کو روکے رکھنے کے لیے بادشاہ گل کو مارا تھا مگر رانا شمشاد علی! تم نے صرف چوبیس گھنٹے کی دیر کرا دی۔ ٹرک آج رات بارہ بجے روانہ ہو جائے گا۔ ٹرک کل بھی گزرے گا اور اس کے بعد بھی۔ تم سے پہلے بھی ایک احمق ایسی ہی فرض شناسی کے چکر میں اپنی جان دے چکا تھا۔ پھر تم نے یہ بے وقوفی کیوں کی؟ میں نے تو بہت اچھی آفر دی تھی تمھیں۔ تم نے ان سب کی کوٹھیاں اور ان کے ٹھاٹھ باٹ بھی دیکھے ہوں گے جو میرے راستے میں حائل نہیں ہوئے "۔

" میں لعنت بھیجتا ہوں تم پر اور تمھارے پیسے پر "۔ رانا شمشاد علی نے حاجی کے منہ پر تھوک دیا۔ وہ جانتا تھا کہ حاجی اور اس کے شکاری بیٹے اب اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ اگر وہ اب ان سے تعاون کرنے کا وعدہ کر کے جان بچانے کی کوشش کرتا تو اس سے کوئی فائدہ نہ ہوتا چنانچہ مرنے سے پہلے اس نے کسی بزدلی کا مظاہرہ نہیں کیا اور شاید حاجی کے منہ پر تھوکنا اس کی آخری آرزو تھی جو پوری ہوئی۔ اس کے فوراً بعد حاجی کے بڑے بیٹے نے اپنا ریوالور اٹھایا اور رانا شمشاد علی کے سر پر رکھ کے گولی چلا دی۔ رانا وہیں گر گیا۔ اس کا جسم گرتے ہی ساکت ہو گیا۔ قدرت نے اس شہید کے لیے نزع کے عذاب کو انتہائی مختصر کیا۔

" یہ تمھیں کہاں ملا تھا ؟" حاجی نے کہا۔

" وہیں ۔ اپنے ٹھکانے پر۔ ڈبو مجھے سیدھا اس کے گھر لے گیا "۔

" کسی نے دیکھا تو نہیں تمھیں ؟"

" مجھے کون دیکھ سکتا تھا "۔ وہ بولا۔" گاؤں میں گنے چُنے گھر ہیں اور اس کا گھر تو باہر ہی ہے "۔

" گھر میں اور کوئی نہیں تھا ؟"

" ایک تو اس کی ماں تھی۔ میرا خیال ہے کہ اسے رات کے وقت کچھ نظر نہیں آتا۔ میرے قدموں کی آہٹ پر اٹھ بیٹھی تھی۔ کہنے لگی ۔ رانا' کیا تو جا رہا ہے اور میں اسے جواب دیے بغیر اندر چلا گیا۔ اس کی موٹر سائیکل بھی وہیں کھڑی ہوئی تھی "۔

" خبیث ۔ صبح ہوتے ہی یہ نکل جاتا "۔ حاجی نے لاش کو ٹھوکر مار کے کہا۔

" یہ اپنی محبوبہ سے ملنے نکلا تھا "۔ حاجی کے چھوٹے لڑکے نے قہقہہ مار کے کہا۔" کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ میں نے باہر جھانکا تو مجھے دونوں نظر آ گئے۔ پھر میں بھی کھڑکی سے نکل گیا۔ یہ دونوں رہٹ والے کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھے تھے۔ سر جوڑے ۔ میں نے کھنکارا اور آواز بدل کے کہا کہ کون ہے بھئی۔ اور لڑکی ایک دم اٹھ کے بھاگی تو اس نے قابو کر لی "۔ اس نے اپنے ساتھی کی طرف اشارہ کیا۔" میں نے اس کے سینے پر ریوالور رکھ دیا کہ لڑکی کی زندگی چاہتے ہو تو چپ چاپ چلو۔ یہ چل پڑا "۔

" اور تم نے اسے چھوڑ دیا۔ جو چشم دید گواہ تھی؟" بڑے بھائی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

" تم ہوتے تو شاید اسی شرافت کا مظاہرہ کرتے ۔ میں شریف آدمی نہیں ہوں "۔

" مار دیا تم نے اسے "۔ حاجی نے کہا۔

" ہاں ابا جی "۔ وہ ایک حسرت بھری ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔" مارتا نہ تو کیا کرتا۔ لڑکی اچھی تھی۔ مگر وقت برا تھا اور قسمت خراب تھی میری کہ اکیلا نہیں تھا۔ دو کتے میرے ساتھ سائے کی طرح لگے ہوئے تھے "۔

" تمھیں ۔ کچھ بتایا اس نے ۔ کہ اس نے کسی کو اطلاع تو نہیں دی تھی "۔ حاجی بولا۔" گھر میں کوئی ٹرانسمیٹر وغیرہ تو نہیں تھا "۔

" نہیں ابا جی "۔ بڑے لڑکے نے کہا۔" آپ جانتے ہیں کہ ہم نے مکرجی کو پیچھے لگا رکھا تھا "۔

" تو مکرجی نے کیا کہا ؟"

" کچھ نہیں ۔ مگر کوئی ایسی ویسی بات ہوتی تو وہ ضرور بتاتا۔ خود رانا کو کہاں معلوم تھا کہ وہ ہماری نظر میں ہے۔ وہ بالکل مطمئن تھا کہ اس کو بدلے ہوئے بھیس میں کسی نے شناخت نہیں کیا۔ صبح یہ موٹر سائیکل پر نکل جاتا اور اپنے افسرِ اعلیٰ کو اپنی کارکردگی کی رپورٹ پیش کر دیتا۔ مع ثبوت ٹرانسمیٹر کبھی کسی نے نہیں دیکھا تھا اس کے پاس "۔

" چلو ٹھیک ہے ۔ اب واپس چلو "۔ حاجی نے کہا۔

" ان کو بھی لے جانا ہے "۔

" صرف مکرجی کو ۔ رانا صاحب کو ان کے وارث لے جائیں گے "۔ حاجی نے طنز اور تمسخر کے ساتھ کہا۔

انھوں نے دونوں کتّوں کو اسی طرح کار کی ڈکی میں ڈال دیا لیکن ان کے منہ کھول دیے۔ وہ ایک دم غرانے اور دھاڑنے لگے۔ میں نے یہ نوٹ کیا تھا کہ وہ حد سے زیادہ مضطرب ہیں۔ جب ان کا منہ بندھا ہوا تھا تب بھی وہ اپنی وحشیانہ قوت کا مظاہرہ کر رہے تھے مگر آزاد ہوتے ہی اس وحشت میں جنون کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ یہ کچھ حیوانی جبلّت کا قصور تھا۔ آدمی کے ہاتھ بھی اگر پیچھے باندھ دیے جائیں اور اسے دوڑنے کو کہا جائے تو وہ جسم کی پوری قوت کے ساتھ نہیں دوڑ سکتا لیکن ہاتھ آزاد ہوں تو وہ بہت تیز بھاگتا ہے۔ ہاتھوں کا رفتار سے کوئی تعلق ہونا تو نہیں چاہیے کیونکہ دوڑتا آدمی ٹانگوں پر ہے لیکن بندھے ہاتھوں کے ساتھ اس کے پورے جسم کی توانائی جیسے محدود ہو جاتی ہے۔ وہی کتے جو پہلے زیادہ خطرناک محسوس نہیں ہوتے تھے' اب خوں آشام درندوں کی طرح چلّا رہے تھے۔ اس کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ سابقہ تجربے کی بنا پر وہ جانتے تھے کہ اب ان کو انعام ملے گا۔

" صبر کر و یار "۔ حاجی کے چھوٹے لڑکے نے کہا۔" مانا کہ تم صبح سے بھوکے ہو "۔

حاجی کے ایک ملازم نے مکرجی کی لاش اٹھائی۔" ابے پاگل ہو گیا ہے کیا۔ کپڑوں سمیت ڈال رہا ہے "۔

ملازم چند سیکنڈ ساکت کھڑا رہا۔ پھر اس نے تعمیلِ حکم کی اور مکرجی کی لاش کے کپڑے اتار کے وہیں پھینک دیے۔ پھر وہ لاش اٹھا کے کار کی جانب بڑھا۔ کتّوں نے ایک شور برپا کر دیا۔ میرا دل لرزنے لگا۔ غصّے کی ایک پاگل کر دینے والی لہر کے سامنے میرا وجود لڑکھڑانے لگا۔ میں نے سوچا کہ مصلحت کے تقاضے اور حالات کی ضرورت سب کو بھول جاؤں اور انجام کی پروا کیے بغیر اس شکاری ٹولے پر ٹوٹ پڑوں جو انسانوں کا شکار کرتے تھے اور اس شکار پر اپنے کُتّے پالتے تھے۔ انھوں نے کتّوں کو آدم خور بنا دیا تھا اور وہ بے قیمت مل جانے والے انسانی گوشت سے ان کا پیٹ بھرنے کے عادی معلوم ہوتے تھے۔

لاش کے ڈکی میں گرتے ہی کتّے یوں غرائے کہ میرا سارا وجود سن ہو گیا۔ مجھے اپنے انسان ہونے پر شرم آئی اور اپنی بزدلی' بے حسی اور کمزوری پر شرم آئی۔ اس وقت مجھے افسوس ہوا کہ جب وہ عین پیڑ کے نیچے تھے تو میں نے انھیں کیوں چھوڑ دیا۔ اب وہ اتنے فاصلے پر تھے کہ میں بجلی کی رفتار سے حملہ کرتا تب بھی انھیں پلٹ کر مجھ پر مشین گن کھول دینے کی مہلت مل جاتی۔ پھر وہ میری لاش کو بھی انھی کتّوں کے سامنے ڈال دیتے جو اس وقت میرے ہی جیسے گوشت پوست کے بنے ہوئے ایک انسان کو اپنے بے رحم پنجوں سے اور سفاک دانتوں سے جھنبھوڑ رہے تھے اس کا گوشت ادھیڑ رہے تھے اور ہڈیاں چبا رہے تھے۔ یہ ایک ناقابلِ برداشت عذاب تھا اور وہ وقت ناقابلِ فراموش تھا جب میں نے انسانیت کی اس تذلیل کو دیکھا اور کچھ نہ کر سکا۔ مکرجی میں اور مجھ میں صرف ایک فرق یہ تھا کہ وہ ہندو تھا اور میں مسلمان۔ وہ غدار تھا اور میں وطن کی مٹی سے جسم و جاں کے رشتے کو مقدس سمجھنے والا سپاہی۔ لیکن اس کے باوجود مکرجی انسان تھا اور کوئی مذہب' کوئی معاشرہ، کوئی قانون اور کوئی ضابطۂ اخلاق کسی دوسرے انسان کو یہ حق نہیں دیتا کہ وہ انسانوں کو حیوانوں کا راتب بنائے۔

مگر یہاں ایک شخص جو دنیا کو دھوکا دینے کے لیے خود کو حاجی کہتا تھا' وہ سب کچھ کر رہا تھا جو شاید انسانی کھوپڑیوں کے میناروں کی بلندی سے اپنی طاقت کے غرور میں مبتلا ہونے والے ہلاکو خان جیسے ظالموں نے بھی نہ کیا ہوگا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس وقت ان سب کو شوٹ کر دینے کی خواہش پر میں نے کیسے قابو پایا اور کیوں قابو پایا۔ میں خود کو یہ سمجھاتا رہا کہ میرے پیشِ نظر عظیم تر مقاصد ہیں اور مجھے صرف اپنی جنگ لڑنی ہے اور اگر میں اپنی محبت کی ترجیحات کو دیکھوں تو سب سے پہلے میری اپنے وطن سے محبت اہم ہے' پھر رابعہ کی محبت ہے۔ اس کے بعد جذباتی رشتوں کی اور پھر انسانیت کی اور اخلاقی سچائیوں کی محبت ہے۔ مکرجی دشمن تھا اور اب دشمن ہی کے ہاتھوں اپنے منطقی انجام کو پہنچا تو مجھے اس کی خاطر جذبات میں اندھا ہو کے اپنا نقصان کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ سب جنگل کے شکاری ہیں جو جنگل کے قانون کے مطابق لڑ رہے ہیں اور درحقیقت حیوان ہی ہیں۔

جب گاڑی چلی گئی تو میں اپنے آپ سے شرمسار نیچے اترا۔ ایسا اکثر ہوتا ہے کہ آدمی کے ضمیر کو مطمئن رکھنے والے دلائل بھی تاثیر کھو دیتے ہیں اور عقلی جواز کو دل اسی طرح قبول کرتا ہے جیسے ایک بزدل بچّہ انجکشن کی سوئی کو برداشت کرتا ہے۔ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر اب دو لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ رانا شمشاد علی کی جو شاید مجھے نہیں جانتا تھا مگر میں نے اسے دیکھا تو جان لیا کہ وہ بھی ہمارا ساتھی تھا۔ ایم آر ایس کے نام سے بھی ناواقف ہونے کے باوجود وہ ایم آر ایس میں شامل مجاہدوں کا حلیف تھا اور انھی کی طرح اس شان سے شہید ہوا تھا کہ جان گئی مگر آن نہ گئی۔ اس سے کچھ دور حاجی کا ایک زرخرید مرا پڑا تھا۔ میں نے اس کی جامہ تلاشی لی لیکن اس کے پاس سے کچھ بھی نہیں ملا۔

رانا شمشاد علی کے پاس بھی ایسی کوئی چیز نہیں تھی جس سے اس کی شناخت ممکن ہوتی۔ میں نے گھڑی دیکھی تو رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ حاجی کے کہنے کے مطابق اس ٹرک کو رات بارہ بجے اس طرف سے گزرنا تھا۔ میرے پاس کم سے کم ایک گھنٹا اور تھا۔ میں نے سوچا کہ رانا شمشاد علی کے گاؤں تک جا کے کسی کو بتا آؤں کہ اس جیالے جواں مرد کی لاش کہاں پڑی ہوئی ہے اور اس کے قاتل کون ہیں۔ وہ گاؤں اس جگہ سے زیادہ دور نہیں ہو سکتا تھا۔ حاجی کے کتّے وہاں تک جا کے

ایک گھنٹے سے بھی کم وقت میں لوٹ آئے تھے۔ مجھے تھوڑا بہت اندازہ اس سمت کا بھی تھا جدھر وہ گئے تھے۔ میں درخت پر بیٹھا ہوا ان کی سیٹیوں کے سگنل سنتا رہا تھا۔ اس کے باوجود جب میں نے قدم بڑھائے تو میری ہمت جواب دے گئی۔ میرے لیے ایک ماں کی بے نور آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں کو دیکھنا ناممکن تھا۔ اس ناخوشگوار فرض سے کوئی اور نمٹ لے گا۔ صبح ہوگی تو رات کی ساری بے رحمی کا راز فاش کر دے گی۔ زیادہ سے زیادہ وہ ماں صدمے سے مر جائے گی۔ عورت اپنے خوابوں کی موت کے بعد زندہ رہنا ہی کب چاہتی ہے۔ وہ ماں ہو یا محبوبہ۔ دونوں کے دل حسرتِ تعمیر میں دھڑکتے ہیں۔ ماں اپنی اولاد کو تخلیق سے تشکیل و تعمیر کے سارے مراحل سے گزار کے بھی اپنے خوابوں کو تعبیر دینے کے لیے جدوجہد جاری رکھتی ہے۔ اس کے لیے وہ خوابوں کا سلسلہ دراز کرتی جاتی ہے۔ وہ آگے دیکھتی ہے جب اس کا لگایا ہوا پودا پھل دے گا اور بیٹوں کے بعد پوتے جوان ہوں گے اور عورت جو محبوبہ اور بیوی بن کے ماں بننے کے عظیم رتبے پر فائز ہوتی ہے انھی خوابوں کو وقت کے اگلے کارواں میں شامل کر دیتی ہے اور خود بھی شریکِ سفر ہو جاتی ہے۔

اس وقفے میں جب میرا ذہن انتشار کے بدترین عذاب سے دوچار تھا، میں نے مکرجی کے بارے میں بھی سوچا کہ اس کے وجود کا کتنا حصہ کتوں کے پیٹ میں پہنچے گا اور فضلہ بن کے مٹی میں ملے گا اور کتنا بچا ہوا جسم کتنے پھر کھا سکیں گے۔ بالآخر سب مٹی میں ملے گا مگر کتنا بے آبرو ہو کے۔ کیا مکرجی نے کبھی ایسا سوچا ہوگا۔ کیا رانا شمشاد علی نے اس وقت جب وہ اپنی محبوبہ کے کندھے پر سر رکھے اس کی خوشبوئے زلف اور اس کے بدن کی ساحر مہک میں کھویا ہوا تھا، یہ سوچا ہوگا کہ اس ساعتِ نایاب کے بعد کا لمحہ اجل کی خوں آشامی کا لمحہ ہوگا۔ پھر میں کیا سوچ رہا ہوں اور کیوں سوچ رہا ہوں۔ رابعہ تک رسائی کی راہ تو بہت لمبی ہے۔ دلوں، ہفتوں اور سالوں کے پیمانے بھی مختصر ہوتے ہیں۔ درمیان میں ... لمحہ حائل ہو جائے تو انتظار جاری رہتا ہے۔ لاانتہا تک۔ یوم محشر ...

صاف ظاہر تھا کہ میں ایک انسانیت سوز منظر کا تماشہ ... سے قنوطیت کے دورے میں مبتلا ہو گیا تھا۔ میں نے اس جگہ ... جانا بہتر سمجھا۔ جاتے جاتے میں نے رانا شمشاد علی کے سامنے ... کیا کہ ایک نہ ایک دن میں اس حاجی کہلانے والے شیطان سے اور ... کی مجسم گناہ اولاد سے ان سب کا بدلہ ضرور لوں گا جو اُن کے ناپاک ... کی سفلی قوت کا شکار ہوئے اور اگر ممکن ہوا تو انھیں یہ سزا انھی کے ضابطۂ اخلاق کے مطابق دوں گا۔ اگر اس لیے کہ میں کتنا بھی گرنا چاہوں ... انتقام اور اشتعال کے جذبات سے مغلوب ہو کے انسانیت کی سطح سے نیچے جانا بھی چاہوں۔ تو شاید میں خود کو ... پاؤں۔ میرے مذہب میں تو یہ بھی دشوار اور ممنوع ہے ... اور ایذا دے کر مارو۔

سڑک پر اب گاڑیوں کی آمدورفت پہلے کے مقابلے میں بہت کم ہو گئی تھی۔ پانچ دس منٹ کے وقفے سے کوئی ٹرک یا بس لاہور سے ملتان یا ملتان سے لاہور جاتی نظر آتی تھی۔ لکڑی کا وہ لٹھا وہیں پڑا ہوا تھا۔ اس پر بیٹھ کے میں نے ایک سگریٹ جلائی اور شعلے کو چھپائے رکھنے کے لیے دونوں ہاتھوں کی پناہ فراہم کی۔ میں نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے بھی ایک ہاتھ سامنے رکھا تاکہ سڑک پر سے گزرنے والا کوئی بھی اس چنگاری کی طرف متوجہ نہ ہو۔ وقت کے تجربات سے حاصل ہونے والا سبق آہستہ آہستہ میرے دل کو سخت کر رہا تھا اور میں محسوس کرتا تھا کہ اب میری وہ حساس طبیعت نہیں رہی جو قتل اور خونریزی کے واقعات پڑھ کر یا سن کر ہی خراب ہونے لگتی تھی۔ مکرجی کے عبرتناک انجام اور رانا شمشاد علی کی افسوسناک موت کا اثر بھی کم ہونے لگا۔ میں پھر رابعہ کے بارے میں سوچنے لگا جس کی طلب اور تلاش نے مجھے یکلخت اپنا راستہ سب سے الگ کر لینے پر مجبور کر دیا تھا لیکن اس سے میری منزل کھوٹی ہوتی نہیں تھی۔ یہ تو کچھ ویسی ہی بات تھی کہ جو راہ اُدھر کو جاتی ہے مقتل سے گزر کے جاتی ہے۔ میں بیک وقت دو مقاصد کے حصول کے لیے نکلا تھا اور دونوں غلط نہ تھے۔ دوسروں کے نقطۂ نظر سے میرا یکطرفہ فیصلہ غلط ہو سکتا تھا مگر دوسروں کا معاملہ وہ نہیں تھا جو میرا اور رابعہ کا معاملہ تھا۔

پونے بارہ بجے کے بعد میں مستعد ہو گیا۔ میں نے ایک کام تو یہ کیا کہ اپنے حلیے میں تھوڑی سی ترمیم کر لی۔ مجھے شیر علی کی بات غلط نہیں لگی تھی کہ تین افراد کا ایک جیسا نظر آنا شکوک پیدا کر سکتا ہے۔ میں نے سر کے اوپر سے بالوں کی جھالر ہٹا دی اور صرف وہ جھلّی رہنے دی جس سے میرا سر بالکل صاف گھٹا ہوا نظر آتا تھا۔ ایسا کرنا میں نے اس لیے بھی ضروری سمجھا کہ آگے چل کر میں کسی کی نظر میں آؤں تو غالب یا محسن گرفت میں نہ آئیں۔

پہلے چار ٹرک ایک ہی سمت سے آئے۔ ان سب کے ڈرائیوروں نے ایک سے ردِ عمل کا مظاہرہ کیا۔ یعنی وہ کچھ ڈرتے ڈرتے رُکے اور محتاط رہتے ہوئے انھوں نے کلینر سے کہا کہ درخت ہٹائے اور جاتے ہوئے نامعلوم شرپسند کو حسبِ توفیق گالیاں دے گئے۔ دو بسوں کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ ایک بس میں کوئی بہت بزدل یا بہت پیسے والی فیملی بیٹھی ہوئی تھی کہ انھوں نے ڈاکوؤں کے اندیشے کا ذکر سنتے ہی رونا پیٹنا اور چیخنا چلانا شروع کر دیا تھا۔ رات کے سوا بارہ بجے تک وہ بھی جا چکے تھے۔

میں سڑک کے کنارے پلیا کے نیچے دبکا بیٹھا رہتا تھا تاکہ ٹرک رُکے تو سر اٹھا کے نمبر پلیٹ کو دیکھ سکوں۔ بالآخر میرا انتظار ختم ہو گیا اور میں نے اچانک اس ٹرک کو رکتے ہوئے دیکھا جس کا ڈرائیور بادشاہ گل تھا۔

"اوئے مردار" ڈرائیور نے غصے سے کہا "نیچے اتر کے دیکھ..." اس نے جملہ ایک بھاری بھرکم گالی پر ختم کیا۔

"کیوں۔ کیا ہے جی استاد جی" کلینر نے کہا۔ جو شاید سو رہا تھا۔ پھر وہ سمجھ گیا کہ استاد نے کیا دیکھنے کو کہا ہے۔ وہ اسی طرف سے نیچے اترا، جدھر میں چھپا ہوا تھا۔

"او جی۔ استاد جی۔ یہ تو ڈاکو..."

"اوئے ڈرمت۔ میں دیکھ رہا ہوں۔ نزدیک آنے والے کو بھون کے رکھ دوں گا" استاد نے کہا۔

پھر اس وقت جب کلینر درخت کا لٹھا اٹھا رہا تھا، میں دبے پاؤں مگر انتہائی پھرتی سے سڑک پر آیا اور اس سے پہلے کہ ڈرائیور میری طرف پلٹ کے دیکھتا، میں اس دروازے سے ٹرک میں بیٹھ چکا تھا جو کلینر نے اترنے کے بعد کھلا چھوڑ دیا تھا۔ ڈرائیور نے اپنے سائڈ کی کھڑکی سے سر نکال رکھا تھا اور اس کے ایک ہاتھ میں واقعی مشین گن تھی مگر اس طرح کر ڈاکو پچ آجاتے تو وہ وہیں بیٹھ کے انھیں نہیں بھون سکتا تھا۔ اس کے سیدھے ہاتھ میں ریوالور ہوتا تو شاید وہ فائر کر دیتا۔ مگر مشین گن کو دونوں ہاتھوں میں تھامنا پڑتا ہے۔ اس کے لیے یا تو وہ پیچھے ہٹتا اور مشین گن کو کھڑکی پر ٹکا کے چلاتا۔ یا پھر اسے نیچے اترنا پڑتا۔ بڑے ہتھیار نے اسے زیادہ بے بس کر دیا۔

"ہاتھ آہستہ آہستہ اندر کرو" میں نے دروازہ بند کر کے کہا۔ "مشین گن نیچے رکھو اور ٹرک آگے بڑھاؤ"

مریل سا کلینر لکڑی کا لٹھا پھینک کر بھاگا۔ میں نے ریوالور بائیں ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ اسی ہاتھ کو باہر نکال کے میں نے بڑی پھرتی سے ایک فائر کیا۔ کلینر اچھلا اور چیخ مار کے سڑک سے دور اسی سمت میں بھاگ کھڑا ہوا جدھر دو لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ ڈرائیور نے میری اس احمقانہ کوتاہی سے فائدہ اٹھانے میں دیر نہیں کی۔ وہ ایک دم مجھ پر حملہ آور ہوا۔ مشین گن اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے وہی مجھ پر مارنی چاہی لیکن میں سمجھتا تھا کہ ایسا ہوگا۔ میں نے مشین گن کے وار کو ہاتھ پر روکا اور پھر جھٹکا دیا تو ڈرائیور کا سر دروازے کی سائیڈ سے لگا۔ مشین گن میرے ہاتھ میں آگئی۔ ڈرائیور نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا اور کراہنے لگا۔

"اور ایکٹنگ مت کرو" میں نے کہا "یہ ٹرک میں خود بھی چلا کے لے جا سکتا ہوں۔ تمھاری لاش کے اوپر سے"

"آخر کیا چاہتے ہو تم؟" ڈرائیور بولا۔

"میں چاہتا ہوں کہ تم ٹرک چلاؤ" میں نے کہا۔

"دیکھو۔ تمھیں پیسہ چاہیے۔ تو میرے پاس دس ہزار سے کچھ اوپر ہیں" وہ پنڈی کے پوٹھوہاری لہجے میں پنجابی بول رہا تھا۔

"اتنی ہی رقم میرے پاس بھی ہے" میں نے کہا "لیکن اس کے علاوہ میرے پاس یہ مشین گن بھی ہے۔ ایک ریوالور بھی ہے لیکن فضول باتوں میں گنوانے کے لیے وقت نہیں ہے"

"تمھیں معلوم ہے یہ ٹرک کس کا ہے؟" صورت سے عادی مجرم نظر آنے والے ڈرائیور نے چابی گھماتے ہوئے کہا۔

"بیڈ فورڈ کمپنی کا" میں نے کہا "نیا ماڈل"

"یہ ٹرک حاجی کا ہے" ڈرائیور نے ٹرک کو گیئر میں ڈال کے آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اس پاجی کا نام دوبارہ میرے سامنے مت لینا۔ مجھے دورہ پڑ جاتا ہے اور پھر میں بہت خطرناک ہو جاتا ہوں۔ پاگل کتے سے بھی زیادہ" میں نے کہا "تم یہ ساری باتیں مجھے نہ بتاؤ۔ میں تو اس پاجی کی اولادِ گناہ کے نام بھی بتا سکتا ہوں۔ یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ اس ٹرک کو کل تک ایک باضمیر اور نیک ڈرائیور بادشاہ گل چلاتا تھا۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ کیوں اور کیسے مارا گیا تھا"

"رانا شمشاد" ٹرک ڈرائیور اچانک بولا "تم بہت بے وقوف آدمی ہو۔ کس سے دشمنی کر رہے ہو۔ اپنی اور بیوی بچوں کی جان کو داؤ پر لگانے سے تمھیں کیا ملے گا۔ حاجی..."

میں نے ڈرائیور کے منہ پر تھوک دیا" میں نے کہا تھا کہ اب یہ نام مت لینا۔ کہنا ہے تو اسے پاجی کہو"

"رانا" ڈرائیور نے چہرے کو آستین سے صاف کیا "اب بھی وقت ہے چھوڑ دو یہ دھندے۔ وہ افسر جس نے تم کو بانس پر چڑھایا تھا، میں ڈی ایس پی غیور حیدر کی بات کر رہا ہوں۔ وہ گیا خفیہ پولیس سے بھی اور پنجاب سے بھی"

"پنجاب سے تو ہم بھی جا رہے ہیں۔ سندھ کی طرف" میں نے کہا اور اس صورتِ حال سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ وہ میرے گنجے سر اور مضحکہ خیز حلیے کے باعث سمجھ رہا تھا کہ میں رانا شمشاد علی ہوں جس نے بھیس بدل رکھا ہے۔ تھوڑی سی تشویش مجھے کلینر کی طرف سے تھی جو فرار ہو گیا تھا۔ گولی غالباً اس کی ٹانگ میں لگی تھی کیونکہ وہ لنگڑاتا ہوا بھاگا تھا۔ وہ ابھی تو بدحواسی میں منہ اٹھا کے جنگل کی طرف نکل گیا تھا مگر یہ بات یقینی تھی کہ وہ صبح ہونے سے پہلے ہی لوٹ کر آئے گا اور کسی نہ کسی طرح واپس پہنچنے کی کوشش کرے گا۔

"تمھیں یہ بھی ضرور معلوم ہوگا کہ اس ٹرک میں کیا ہے" ڈرائیور بولا۔

"ہاں۔ آگے انجن ہے" میں نے کہا "پیچھے چھ پہیے ہیں۔ ٹائر ہیں۔ ٹائروں میں ہوا ہے۔ ہوا میں تقریباً تین چوتھائی نائٹروجن ہے اور پانچواں حصہ آکسیجن"

ڈرائیور نے کچھ حیران ہو کے میری طرف دیکھا "اس ٹرک میں اسلحہ ہے"

"اچھا۔ کیا کچھ ہے؟" میں نے کہا "ایٹم بم کتنے ہیں۔ مجھے تو بس ایک چاہیے اس پاجی کے لیے۔ میں اسے بم پر بٹھا کے بم کو تیلی دکھا دوں اور۔ بوم۔ پاجی کی روح بھی فنا ہو جائے"

ڈرائیور نے مجھے یقیناً بہت جاہل سمجھا ہوگا کہ میں ایٹم بم کو ایک دیاسلائی سے پھٹنے والا بم سمجھتا ہوں۔ وہ میری طرف دیکھ کے مسکرایا۔

"تم ہو تو میرے بھی دشمن۔ مگر باتیں مزے کی کرتے ہو"

"تمھیں مجھ سے ڈر نہیں لگتا" میں ...

... نے نفی میں سر ہلایا "ہم پولیس والے سرکاری ملازم۔ تم سے

کیا ڈرنا۔ تم زیادہ سے زیادہ مجھے گرفتار کرادو گے۔ چلو اپنا یہ شوق بھی پورا کرلو۔ تمہارے بھلے کی بات کی تھی تو تم نے مذاق میں ٹال دیا۔"

"چلو اب مذاق ختم۔" میں نے کہا۔ "نام بتاؤ پہلے اپنا۔"

"میرا نام۔ ڈنگا۔" وہ بولا۔ "لوگوں نے ضد میں کہنا شروع کر دیا۔"

"کیوں؟ کیا تم بہت سیدھے تھے؟"

نہیں۔ ماں باپ نے غلط نام رکھ دیا تھا۔ مستقیم خاں۔ جس کا مطلب وہی ہوا کہ سیدھے خاں۔" وہ بولا۔ "مگر میں بچپن سے جلیبی کی طرح سیدھا تھا۔ سب طعنے کے طور پر کہتے تھے کہ نام مستقیم مگر خود کتنا ڈنگا ہے۔ ڈنگا سمجھتے ہونا۔ ٹیڑھا۔"

"میں تم کو سیدھا کر دوں گا۔" میں نے سادگی سے کہا۔

وہ ہنس پڑا۔ "کیسے کیسے گھامڑ پولیس میں بھرتی ہو جاتے ہیں۔ او یار رانا! پہلے تو خود سیدھا ہو جا۔ اس ٹرک کو کہاں لے جانا ہے تو نے؟ اپنے سورے کے گھر؟"

"تمہیں معلوم ہے میرے سسر کا گھر؟" میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے، وہیں لے چلو۔ وہ خریدے گا سارا اسلحہ اور مجھے دکان ڈال دے گا۔ وہ جو کلینر بھاگ گیا اس کا نام کیا تھا؟" میں نے اچانک کہا۔

"وہ کلینر نہیں تھا۔" ڈنگے نے کہا۔ "میرے ساتھ رہتا تھا۔" وہ معنی خیز طریقے پر اور نہایت فحش انداز میں آنکھ مار کے ہنسا۔

"میں نے اس کا نام پوچھا تھا۔ کام نہیں۔" میرا ہاتھ ایک دم حرکت میں آیا اور ضرب اس کی ناک پر پڑی۔ ٹرک ذرا سی دیر کے لیے لہرایا۔ ڈنگے نے درد سے بلبلا کے بریک لگائے اور اسے روک لیا۔ سامنے سے آنے والا ایک ٹرک چند انچ کے فاصلے سے گزر گیا۔

"پاگل دے پتر۔ ابھی ٹکر ہو جاتی۔" ڈنگے نے چیخ کر کہا۔

"کلینر کا نام کیا تھا؟" میں نے اس کے دوسرا ہاتھ رسید کیا۔ اس کا سر ڈیش بورڈ پر بڑی آواز کے ساتھ لگا۔

"چانن دین۔" ڈنگا سر اٹھا کے بڑی مشکل سے بولا۔ وہ اب کچھ خوفزدہ نظر آنے لگا تھا۔ "یہ کسی کو معلوم نہیں۔ کہ وہ سفر میں میرے ساتھ جاتا تھا۔"

"ٹرک چلاؤ۔" میں نے کہا۔ "اور میرے سوالوں کے ٹھیک ٹھیک جواب دیتے رہو۔ ورنہ میں تم کو واقعی سیدھا کر دوں گا اور سیدھا اس راستے پر روانہ کر دوں گا جو جہنم کو جاتا ہے۔"

"واہ او ئے شیر دیا پترا۔ ہاتھ میں بندوق لے کر کیسا بول رہا ہے۔" ڈنگے نے حقارت سے کہا۔ ٹرک پھر روانہ ہو گیا۔ ڈنگا اپنی ناک سے بہنے والے خون کو ایک میلے کپڑے سے صاف کرتا جا رہا تھا۔ میں نے گلوز کمپارٹمنٹ کھولا۔ اس میں بھی ایک ریوالور تھا اور کچھ کاغذات تھے۔

"رانا شمشاد علی۔ تم مجھے جلنے دو۔" ڈنگے نے کہا۔ "اس ٹرک میں تمہارے مطلب کی کوئی چیز نہیں ہے۔ اگر پہلے تھی تو۔ ب نہیں ہے۔ تم خواہ مخواہ کھجل ہو رہے ہو۔"

"تم نے یہ روڈ سائن دیکھا؟" میں نے کہا۔

"کون سا روڈ سائن؟"

"میں نے دیکھا تھا۔" میں نے کہا۔ "آگے دائیں طرف کوئی چھوٹی سڑک ہے۔ ٹرک ادھر ہی موڑ لینا۔"

"اور اگر میں نہ موڑوں؟"

"تو میں تمہاری گردن موڑ دوں گا۔ ایسے کہ تم پیچھے دیکھنے لگو گے اور تمہاری گردن کی چوڑیاں الٹی ہو جائیں گی۔" میں نے کہا۔ "تم تو صرف ڈنگے ہو۔ میں بڑا ڈونگا ہوں۔ بہت گہرا۔"

ڈنگے نے مجھ پر ایک حقارت کی نظر ڈالی۔ "پتا چل جائے گا یہ بھی۔" اور ٹرک کو سیدھے ہاتھ کی پتلی سی سڑک پر موڑ لیا۔ سڑک کسی چھوٹے سے قصبے کی طرف جاتی تھی چنانچہ اس کی خستہ حالی بہت نمایاں تھی۔ اس کے دونوں جانب درختوں کی قطار تھی اور پھر کھیت تھے۔ میں بہت سکون سے اپنے سامنے دیکھ رہا تھا اور کسی مناسب جگہ کی تلاش میں تھا۔ مشین گن میرے پیروں میں دبی ہوئی تھی اور ریوالور اب میرے سیدھے ہاتھ میں تھا۔

"رفتار کم رکھو۔" میں نے کہا۔ "دس میل۔ اور یہ دیکھو الٹے ہاتھ پر ایک کچا راستہ ہے۔"

ڈنگے نے ٹرک کو کچے راستے پر اتار لیا۔ ہچکولے کھاتا ٹرک تقریباً دو سو گز تک رینگتا ہوا گیا۔ پھر مجھے درختوں کا ایک جھنڈ نظر آیا۔ میں نے ٹرک کو الٹے ہاتھ پر درختوں کے پیچھے لے جانے کا اشارہ کیا۔

"مسٹر ڈنگے۔ ٹرک روک دو۔" میں نے کہا۔ "اور سیدھی طرح نیچے اتر آؤ۔"

ڈنگے نے مجھے ریوالور ٹرک کے گلوز کمپارٹمنٹ میں رکھتے دیکھا اور بڑی چالاکی سے کام لیتے ہوئے چابیاں نکال کے مٹھی میں دبالیں۔ میں نے اس کی نیت کو بھانپ لیا تھا۔ وہ ابھی تک مجھے رانا شمشاد علی سمجھ رہا تھا۔ چنانچہ اس خوف سے بالکل بے نیاز تھا کہ میں اسے قتل بھی کر سکتا ہوں۔ میری توقع کے مطابق اس نے چابی کھیتوں کی طرف اچھال دی۔ اس وقت میں ٹرک کے سامنے سے گزر کے آ رہا تھا۔ میں نے ظاہر کیا کہ میں نے ڈنگے کی یہ حرکت بھی نہیں دیکھی۔ ڈنگے نے اپنی دانست میں بہت بڑا تیر مارا تھا کہ ٹرک کو ناقابلِ استعمال بنا دیا تھا۔ حالانکہ کسی بھی گاڑی کو ڈائریکٹ تار ملا کے اسٹارٹ کرنا معمولی بات ہے۔

"ہاں بھئی ڈنگے۔ اسلحہ نہیں ہے تو پھر ٹرک میں کیا ہے؟"

"تیری ماں دے انڈے۔" ڈنگا مجھے گالی دے کر بولا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ میں خالی ہاتھ ہوں چنانچہ اس کا حوصلہ بہت بڑھ گیا تھا۔ اس نے ایک دم نیچے جھک کر مٹی کا سخت ڈھیلا اٹھایا اور میری طرف پھینکا۔ میں غوطہ مار کے بچ گیا۔ ڈنگا ایک دم پلٹ کے بھاگا اور اس نے اچانک نیچے جھک کر کوئی چیز اٹھالی۔ میں اس کے پیچھے لپکا ہی تھا کہ وہ پلٹ کر مجھ پر حملہ آور ہوا۔ اس نے کسی درخت کی ٹوٹی ہوئی شاخ اٹھا

لی تھی۔ میں نے اسے کچھ دیر خوش کیا۔ میں کئی دفعہ گرا اور بظاہر شکست تسلیم کرنے کے انداز میں پیچھے ہٹتا گیا۔ میں نے اسے ڈنگے بھائی بھی کہا۔ وہ اور شیر ہو گیا اور مجھے وہ گالیاں بکنے لگا جو انتہائی غلیظ شمار ہوتی ہیں۔ پانچ منٹ بعد میں نے کھیل ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایک بار وہ ڈنڈے جیسی شاخ گھما کے تھوڑا سا قریب آیا ہی تھا کہ میں ایک دم ہوا میں اٹھا اور میں نے اس کے سینے پر کک ماری۔

میرا خیال ہے کہ اسے چوٹ اتنی نہیں آئی تھی جتنا کہ اسے حیرت کے صدمے نے بے حال کیا۔ یہ ایک خالص پروفیشنل کک تھی جو بڑے بڑے سورماؤں کو چت کر دیتی۔ روزمرہ کی لڑائیوں میں گھونسے لاتیں اور ٹکریں مارتے تو اس نے سب کو دیکھا ہوگا مگر یوں اڑ کر دونوں پیروں کی ضرب لگاتے شاید فلموں میں ہی دیکھا ہوگا۔

"آؤ مسٹر ڈنگے۔" میں نے ہاتھ بڑھا کے کہا۔ "اس وقت تو میرے ہاتھ بھی خالی ہیں۔ تم کو شکایت تھی نا کہ اسلحہ ہاتھ میں لے کر میں شیر بن گیا تھا۔"

وہ خود ہی اٹھا۔ اس کا ارادہ مقابلے کو جاری رکھنے کا نہیں تھا مگر وہ میرے بڑھے ہوئے ہاتھ کو نہ پکڑتا تو یہ ہتھیار ڈالنے کے مترادف ہوتا وہ ایک بار پھر بڑک مار کے مجھ پر لپکا۔ غالباً وہ میرا ہاتھ تھام کے مجھے اپنی جانب کھینچنا چاہتا تھا اور میرے سینے پر اپنا سر مارنے کی سوچ رہا تھا مگر ہوا اس کا الٹا۔ یعنی پہلے میں اس کی طرف بڑھا اور پھر ایک دم جام ہو گیا۔ نتیجہ یہ کہ اس کو جھٹکا لگا اور اس کے قدم اکھڑ گئے۔ وہ جھک کر تھوڑا سا آگے آیا ہی تھا کہ میں نے اسے دوسرا جھٹکا دے کر ایک گھٹنے پر اٹھالیا اور پلٹ کے دوسری جانب پھینک دیا۔ اس دفعہ وہ بلبلایا اور اس نے اٹھنے کی کوشش ہی نہیں کی لیکن میں نے اسے کھینچ کر پیروں پر کھڑا کر دیا۔ وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے جھولتا رہا۔

"بس یار۔" میں نے کہا۔ "تم تو بچپن سے ڈنگے ہو۔ اتنی جلدی سارے بل نکل گئے۔ کتے کی دم سے بھی گئے گزرے ہو تم تو یار۔ اسے بھی بارہ برس تو نلکی میں رکھنا پڑتا ہے۔ پھر بھی سنا ہے وہ ٹیڑھی ہی رہتی ہے۔" میں نے اس کے منہ پر مکا مارا۔ وہ کراہ کے دہرا ہوا تو دوسرا مکا اس کے پیٹ میں لگا۔ وہ گرنے لگا تھا کہ میں نے اسے اوپر اٹھا لیا اور تھوڑا سا گھمایا۔

"رانا صاحب۔ رانا جی۔ غلطی ہو گئی مجھ سے سجنو۔" وہ ایک دم منت سماجت پر اتر آیا۔

میں نے اسے دور پھینکنے کے بجائے پیروں پر کھڑا کر دیا۔ "غلطی تو انسانوں سے ہوتی ہے۔ تم شیطانوں میں شامل ہو۔ تم سے گناہ اور جرم ہوتے ہیں۔ ایک بار پھر کہو کہ میں نے گناہ کیا۔ کہ پاجی کو حاجی کہا۔"

وہ چپ کھڑا لمبے لمبے سانس لیتا رہا۔ "ہاں۔ جی۔"

میری لات پڑتے ہی وہ منہ کے بل گرا۔ اس کا چہرہ اور اس کے کپڑے سب کھیتوں کی مٹی میں بھر گئے۔ "ہاں جی کے بچے۔ جو میں نے کہا ہے وہ دہراؤ۔"

"میں... گناہ کیا میں نے کہ... پاجی کو... حاجی کہا سجنو۔"

میں نے اس کے منہ پر الٹا ہاتھ مارا۔ "دوسری بات یہ یاد رکھنا کہ میں تمہارا سجن نہیں ہوں۔ دشمن ہوں۔ اب یہ بتاؤ کہ اس ٹرک میں کیا مال ہے؟"

"صرف پھل جناب۔" وہ بولا۔ "آپ بے شک دیکھ لو۔"

"دیکھنے کے لیے وقت نہیں ہے مسٹر ڈنگے۔" میں نے کہا۔ "میں تمہاری بات پر اعتبار کرتا ہوں۔ اب اپنی عزت اٹھاؤ جو خاک میں مل چکی ہے۔" میرا اشارہ اس کی پگڑی کی طرف تھا۔ وہ ایک لنگی تھی جو اس نے بدمعاشوں کے انداز میں سر پر لپیٹ رکھی تھی۔

ڈنگے نے لنگی اٹھالی اور میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ "اب اس کو لمبائی کے رخ چار حصوں میں تقسیم کرو۔" میں نے کہا۔ "ہر حصے کو گانٹھ باندھ کے لمبی رسی بناؤ۔ اسے پیٹرول۔ میرا مطلب ہے ڈیزل کے ٹینک میں ڈال کے نکالو۔"

"وہ کس لیے سچ... جناب۔" وہ بولا مگر پھر میرے تیور دیکھ کے تعمیلِ حکم میں مصروف ہو گیا۔ میں نے ڈیزل میں بھیگی ہوئی لمبی پٹی کو ٹرک سے باندھ کے دور تک پھیلایا تو ڈنگا سمجھ گیا کہ میں کیا کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے گلوز کمپارٹمنٹ میں سے دوسرا ریوالور بھی نکال لیا۔ دونوں ریوالور اپنی جیبوں میں ٹھونس کر میں نے مشین گن اٹھالی۔ سیٹ ہٹا کے دیکھنے سے مجھے اس کا ایک اضافی راؤنڈ دستیاب ہوا۔

"اب اسے آگ لگاؤ۔ اور میرے ساتھ بھاگو۔" میں نے کہا۔

"یہ۔ آپ کیا ظلم کر رہے ہیں۔ وہ حاجی۔ میرا مطلب ہے پاجی تو مجھے مار ڈالے گا۔" وہ فریاد کرنے لگا۔ "میرے بیوی بچوں کو بھی اٹھوا لے گا۔ وہ اپنا نقصان کرنے والے کو نہیں چھوڑتا۔"

"اپنا نقصان کوئی بھی پسند نہیں کرتا ڈنگے۔ مگر نقصان کا سودا تم بہت پہلے کر چکے تھے۔" میں نے کہا۔ "فائدہ تو بہت عارضی تھا اور اس نقصان کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھا جو اب تمہیں ہوگا۔ بس اس وقت تمہیں یقین تھا کہ نقصان کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔ بیوی بچے تو ہمیشہ بے ... مارے جاتے ہیں۔ وہ کچھ کرتے نہیں مگر سزا ضرور پاتے ہیں۔ تم ... پہلے سوچا ہوتا تو وہ بچ جاتے۔ مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔ چلو آگ لگاؤ اپنے گھر کو۔"

اس نے جیب سے ماچس نکال کے کپڑے کو یوں آگ لگائی جیسے وہ واقعی اپنے گھر کو جلا کے خاک کر رہا ہے۔ میں نے ... اور سڑک کی طرف دوڑنے لگا۔ اسے مجبوراً میرا ساتھ دینا پڑا۔ مجھے ... تھا کہ ڈنگا جھوٹ بول رہا ہے اور ٹرک میں اب بھی اسلحہ ہوگا۔ مگر حاجی نے رسک نہیں لیا تھا۔ اس نے ٹرک کا مال بدل دیا تھا کہ خدانخواستہ خبر دشمنوں کے کانوں تک پہنچ گئی ہو تو وہ محفوظ رہے۔ جس قسم کے کاروبار میں وہ ملوث تھا، اس میں دشمن ہی زیادہ ہوتے ہیں۔

دس منٹ میں ہم پھر بڑی سڑک کے قریب تھے۔ ڈنگا بری طرح

ہانپ رہا تھا۔ تقریباً آدھا میل دور ہم ٹرک کو ایک روشن الاؤ کی صورت میں دیکھ سکتے تھے۔ اس میں صرف ایک دھماکا ہوا تھا جو ڈیزل ٹینک کے پھٹنے کا دھماکا تھا۔ اس سے آگ اور بھڑکی تھی مگر مزید دھماکے نہیں ہوئے تھے جس کا مطلب یہی تھا کہ ٹرک میں صرف پھل تباہ ہو رہے تھے۔ مجھے امید تھی کہ جب یہ الاؤ بھڑکے گا تو گرد و نواح سے کچھ لوگ ضرور آئیں گے۔ قریب ترین آبادی بھی زیادہ دور نہیں ہو سکتی تھی۔ پانچ سات میل بعد کوئی نہ کوئی گاؤں آ ہی جاتا ہے جبکہ سڑک کی طرف سے بھی کسی کا آجانا بعید از امکان نہ تھا۔ چنانچہ میں نے بھاگتے ہوئے جنگل کے درختوں کے درمیان سے شارٹ کٹ اختیار کیا تھا اور اس طرح سڑک سے دور رہا تھا۔ کھیتوں میں ہل چلایا جا چکا تھا۔ اس کھدری ہوئی مٹی میں بھاگنا خاصا دشوار کام تھا۔

ٹرک جب سو گز دور رہ گئی اور متحرک روشنی کے ساتھ مجھے ہر گزرنے والی گاڑی کا معمولی سا شور بھی سنائی دینے لگا تو میں نے ڈنگے کو روک لیا۔ سانس میری بھی پھول رہی تھی۔

"ڈنگے۔" میں نے کہا۔ "اس ٹرک کا اسلحہ کس ٹرک میں منتقل کیا گیا تھا؟"

ڈنگا دھونکنی کی طرح سانس لیتا رہا۔ "مجھے... نہیں... معلوم۔"

"میں ایک بار اور پوچھوں گا۔" میں نے کہا۔ "اس سوال کے صحیح جواب پر تمہاری زندگی یا موت کا انحصار ہے۔ حاجی شاید تم کو بخش دے [illegible] یقین کرے کہ تم کو کس طرح ہائی جیک کیا گیا تھا۔"

"[illegible] کیا گیا تھا؟"

"[illegible] زبردستی اغوا۔" میں نے کہا۔ "تمہارا وہ دوست بطور [illegible] ہے۔ اس کے علاوہ تم کو بہت سے بس اور ٹرک ڈرائیور [illegible] گے۔ جو گواہی دیں گے کہ انھیں بھی اسی طرح روکا گیا تھا۔"

"تم نے [illegible] کیوں روکا تھا؟"

"صرف نمبر دیکھنے کے لیے۔" میں نے کہا۔ "تم مجھے دوسرے ٹرک کا نمبر بتا دو۔"

"رانا صاحب۔" وہ ہاتھ جوڑنے لگا۔

"دیکھو۔ نمبر تو میں پوچھ کر رہوں گا۔" میں نے کہا۔ "اور یہ خیال بھی دل سے نکال دو کہ تم کوئی بھی نمبر دے کر مجھے ٹال سکتے ہو۔ میرے پاس ان سب ٹرکوں کے نمبر ہیں جو اس کام میں استعمال ہوتے ہیں۔"

یہ بات غلط بھی نہیں تھی۔ یہ فہرست چکری کی فراہم کردہ تھی۔

"میں تصدیق کروں گا۔ سچ بتاؤ گے تو تمھیں انعام میں وہ دس ہزار دے جاؤں گا جو تمہارے پاس ہیں۔" میں نے کہا۔

"میرے دس ہزار..."

"ہاں۔ میں تم سے وہ دس ہزار نہیں لوں گا۔" میں نے کہا۔ "مگر تم اس پاجی سے کہہ دینا کہ رانا نے سب چھین لیا۔ اسلحہ بھی اور رقم بھی۔ اسے جلا ہوا ٹرک دیکھ کر یقین آجائے گا۔ میں تم کو بے ہوش کر کے یا باندھ کے ایسی جگہ ڈال جاؤں گا جہاں سے کوئی بھی تم کو اٹھا لے گا۔ لیکن..."

وہ منتظر رہا کہ میں آگے کیا کہتا ہوں۔

"اگر تم نے مجھے اس ٹرک کا نمبر نہ بتایا۔" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے کہا۔ "تو میں۔ پہلے ایک ایک کر کے تمہاری انگلیاں توڑوں گا۔" میں نے اس کے بائیں ہاتھ کی پہلی انگلی یوں توڑ دی جیسے وہ کچی پنسل تھی۔ ڈنگا بری طرح چلایا۔ میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"تم نے دیکھا کہ ایک انگلی کتنی مشکل سے ٹوٹتی ہے اور ابھی ایک جگہ سے ٹوٹی ہے۔ لاؤ میں اسی کو درمیان سے توڑ کے دکھاؤں۔"

ڈنگا ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔ وہ سخت تکلیف میں کراہ رہا تھا۔ اپنے ہاتھ کی انگلی کو پکڑے کھڑا تھا۔ "مجھ پر رحم کرو۔"

"تمہارا وہ پاجی آقا تم پر رحم کرتا ہے۔" میں نے کہا اور ایک بار اس کا ہاتھ پھر دبوچ لیا۔ "وہ تو تمہارا ان داتا ہے۔ تم اس کا نمک کھاتے ہو۔ میں دشمن ہوں۔ مجھ سے رحم کی امید کیوں رکھتے ہو؟"

ڈنگے نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی پوری کوشش کی مگر میں نے اس کا بازو مروڑ کے اسے پلٹنے پر مجبور کر دیا۔ پھر میں نے اسے دبا کے نیچے گرا دیا اور اس کی پیٹھ پر اپنا گھٹنا رکھ کے اسے ہلنے کے قابل نہیں چھوڑا۔

"ہاں۔ کیا نمبر ہے اس ٹرک کا۔" میں نے اس کے ہاتھ کی دوسری انگلی کو الگ کیا۔ وہ تکلیف کے باعث چیخ رہا تھا اور بار بار "رانا صاحب۔ رانا صاحب" کر رہا تھا۔ اس کے لیے اپنی مٹھی بند کر کے دوسری انگلی کو بچانا بھی ناممکن تھا۔

"دس انگلیاں بیس جگہ سے توڑنے کے بعد بھی میں نمبر نہ لے سکا تو ڈنگے خاں۔" میں نے اس کی سب سے چھوٹی انگلی پٹ سے توڑ دی۔ وہ تڑپا اور بلبلا کے اٹھنے لگا۔ میں نے اسے پھر دبا دیا اور اس کی دونوں ٹوٹی ہوئی انگلیوں کو ہلانے لگا۔ وہ ایسے کراہنے لگا جیسے مرنے والا ہو لیکن میں جانتا تھا کہ ابھی وہ بے ہوشی کا ڈراما کر سکتا ہے، بے ہوش بھی نہیں ہو سکتا۔ "دس انگلیاں بیس جگہ سے تڑوانے کے بعد تم بہادری سے اس پاجی کے وفادار بنے رہے۔ تو میں باری باری بازو توڑوں گا۔ کہنی سے نیچے۔ کلائی کے پاس سے۔ پھر ذرا اوپر۔ اس کے بعد شانوں کے قریب سے۔"

میں نے اس کے بازو پر ہر جگہ نشان لگانے کے انداز میں تھپکی مار کے اسے یقین دلا دیا کہ ایسا بھی ممکن ہے۔

"اور جناب ڈنگے خاں صاحب۔" میں نے کہا۔ "اس کے بعد بھی تم نہ بولے تو پھر تمہاری ٹانگوں کی باری ہے، پھر پسلیوں کی۔ جسم میں شاید دو سو سے اوپر ہڈیاں ہوتی ہیں۔ میں سب نہیں توڑ سکتا لیکن اوپر سے نیچے تک تم اتنی جگہ سے ٹوٹ جاؤ گے کہ کم سے کم دو سال پلستر میں رہو گے اور کوئی بہت ماہر ہڈیوں کا ڈاکٹر ہوگا تو ممکن ہے سب کچھ پھر جوڑ دے۔ مگر ایک تو اس میں خرچہ بہت ہے۔ کون دے گا تمھیں اتنا پیسہ۔ وہ پاجی تو دینے سے رہا۔ اس کے لیے تم اتنے ہی بے کار ہو جاؤ گے۔ جتنا یہ ٹرک بے کار ہو گیا ہے اور ٹھیک ہونے کے بعد بھی تم ٹیڑھے ضرور ہو جاؤ گے۔ اب نہیں ہو مگر بعد میں ہو جاؤ گے۔ تمہارے ہاتھ پیر بالکل سیدھے نہیں رہیں گے۔ تم ٹیڑھا چلو گے۔ ٹیڑھا دیکھو گے۔"

"خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔ میں بتاتا ہوں۔" وہ دہشت زدہ ہو کے چلانے لگا۔

"بولو بولو۔ مگر آہستہ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھے تمہارے منہ میں کچھ بھرنا پڑے۔ یہاں تو یہی گوبر وغیرہ ہے۔" میں نے کہا۔ "تمہارا منہ میٹھا کرانے کے لیے۔ مٹھائی نہیں لا سکتا میں۔"

اس نے مجھے ایک نمبر بتایا۔ میں نے اسے چھوڑ دیا اور جیب میں سے ایک کاغذ نکالا۔ دیا سلائی جلا کے اس پر لکھے ہوئے نمبروں سے چیک کیا۔ وہ نمبر ٹھیک ہی معلوم ہوتا تھا۔ ڈنگا اب مٹی میں بیٹھا بری طرح لرز رہا تھا اور رو رہا تھا۔ اس کا بایاں ہاتھ شدید تکلیف میں تھا لیکن وہ اس درد کا علاج کرنے سے قاصر تھا۔

"یہ ٹرک کب مال لے کر چلے گا؟" میں نے کہا۔

"رات دو بجے۔" وہ بولا۔ "اور تین بجے کے درمیان۔"

"گویا ابھی تھوڑی دیر میں۔" میں نے گھڑی کے روشن ڈائل کو غور سے دیکھ کر کہا۔ "ٹھیک ہے۔ میں جاتا ہوں۔ تمھیں ایک گھنٹے میں معلوم ہو جائے گا۔ جھوٹ کا انجام۔ اگر وہ ٹرک نہ آیا تو میں آؤں گا۔ اور تم سے پھر پوچھوں گا لیکن جرمانہ وصول کرنے کے بعد۔ پہلے میں تمہارے دونوں ہاتھ توڑوں گا۔"

"تم مجھے ایک ہی بار گولی کیوں نہیں مار دیتے۔" وہ پاگل ہو کے مجھے گالیاں بکنے لگا۔

"ڈنگے... میں تمہارے قتل کا الزام اپنے سر کیوں لوں۔ تم نے کہا بھی تھا کہ تم کیا قتل کرو گے۔ ملازم سرکار۔ میں واقعی قتل نہیں کروں گا لیکن میں تم کو موت سے زیادہ سخت سزا دے سکتا ہوں۔ میں تم کو لنگڑا لولا ہی نہیں، اندھا بھی کر کے چھوڑ سکتا ہوں۔ اس کے بعد تم چاہو تو خودکشی کر لینا، حرام موت مر جانا۔ اگر وہ ٹرک آگیا۔ تو پھر میں نہیں آؤں گا۔ صبح کوئی آجائے گا تم کو اٹھانے۔"

اس نے اقرار میں سر ہلایا اور غالباً اس خیال سے خوش ہوا کہ میں اسے آزاد چھوڑ جانے کی حماقت کا مرتکب ہو رہا ہوں۔

"ڈنگے بادشاہ۔" میں نے کہا۔ "تم کو باندھنے کے لیے میرے پاس تو کچھ ہے ہی نہیں۔ تم کچھ بندوبست کرو۔"

"میں؟" وہ خون آلودہ خشک لبوں پر زبان پھیر کے بولا۔ "میں کیا کروں۔"

"تم یہ کرو۔ کہ اپنا ازار بند نکال کے مجھے دے دو۔" میں نے کہا۔

"یہ کیسے۔ ہو سکتا ہے؟"

"سب کچھ ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "تم شلوار کو اوپر ایسے باندھ لو جیسے دھوتی باندھتے ہیں۔"

"رانا صاحب۔ میں کہیں نہیں جاؤں گا۔"

"میری طرف سے تم جہنم میں جاؤ۔" میں نے کہا۔ "پہلے وہ کرو جو میں کہہ رہا ہوں۔ ورنہ تم جانتے ہو کہ یہ کام میں بھی کر سکتا ہوں۔"

ڈنگے نے بادل ناخواستہ تعمیل کی۔ اس کا ریشمی ازار بند خاصا لمبا تھا۔ جب وہ شلوار کو کمر کے گرد گرہ دے کر فارغ ہوا تو میں نے اسے ایک درخت کے ساتھ کھڑا کیا اور اس کے دونوں ہاتھ تنے کے پیچھے سے گزار کے ایک ساتھ باندھ دیے۔ [illegible] دونوں بار اس کی کلائیوں کے گرد لپیٹنے کے بعد میں نے اس ریشمی ڈوری کو ایسے گرہ دی کہ ڈنگا لاکھ کوشش کرتا اسے ڈھیلا نہیں کر سکتا تھا۔ ویسے بھی ٹوٹی ہوئی انگلیوں کی خفیف سی حرکت بھی اسے شدید تکلیف میں مبتلا کرتی تھی۔ اس کا منہ بند کرنے کے لیے میں نے اس کی قمیص کا دامن پھاڑا اور کپڑے کا گولا اس کے منہ میں ٹھونسنے کے بعد میں نے اپنے رومال سے اس کا منہ باندھ دیا۔

"چار پانچ گھنٹے کی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "پھر صبح ہو جائے گی۔ ممکن ہے اس سے پہلے ہی میں لوٹ آؤں۔ تمھیں غلط بیانی کی سزا دینے کے لیے۔ ابھی وقت ہے۔ اگر تم نے جھوٹ بکا ہے تو بتا دو۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ اس کی حالت بہت غیر ہو رہی تھی اور وہ اپنا سر بلند رکھنے میں بھی ناکام تھا۔ مجھے جواب دے کر اس نے پھر سر کو یوں جھکا لیا جیسے وہ غنودگی میں ہو۔

"مسٹر ڈنگے۔ سیدھے کھڑے رہو گے اور ہاتھ پیر نہیں چلاؤ گے تو تمہاری دھوتی بھی نہیں کھلے گی۔ زور آزمائی کرنے یا چیخنے چلانے کی کوشش سے بھی فائدہ کوئی نہیں ہوگا۔ پس صبر اختیار کرو۔" میں نے کہا۔

دس منٹ بعد میں پھر سڑک پر تقریباً اسی جگہ تھا۔ جہاں سے میں نے ٹرک کو دائیں جانب موڑا تھا۔ ملتان کی طرف سے ایک گاڑی آئی اور میں نے صرف پلٹ کر ہی دیکھا تھا مگر وہ تھوڑا سا آگے جا کے رک گئی۔ میں قریب پہنچا تو گاڑی سے ایک شخص نے سر نکالا۔

"تم یہیں کے رہنے والے ہو؟" وہ کوئی زمیندار معلوم ہوتا تھا۔

"ہاں جی۔" میں نے کہا۔

"کچھ بتا سکتے ہو کہ یہاں سے پیٹرول پمپ کتنی دور ہوگا؟"

"پیٹرول پمپ۔" میں نے دل ہی دل میں خوش ہو کے کہا۔ "زیادہ دور نہیں ہے۔ میں بھی ادھر ہی جا رہا تھا۔ خیر تو ہے نا؟"

"ہاں ہاں۔" وہ بولا۔ "بیٹھو پیچھے۔ گاڑی میں پیٹرول ختم ہو گیا ہے۔ فیول میٹر دھوکا دے گیا۔ ہو سکتا ہے گاڑی کو دھکا لگا کے پیٹرول پمپ تک پہنچانا پڑے۔"

"آپ کے پاس کوئی خالی ڈبا نہیں ہے؟"

"ہے۔ لیکن پمپ والے کھلا پٹرول کہاں دیتے ہیں۔" وہ بولا۔

"آپ جا کے حاجی عبداللہ کا نام لینا۔ اسی کا پٹرول پمپ ہے۔" میں نے کہا۔ "اور بولنا کہ میں ڈنگے کو جانتا ہوں۔ وہ پٹرول دے دیں گے۔"

"کون ہے یہ ڈنگا؟" وہ حیران ہو کے بولا

"ایک ٹرک ڈرائیور ہے۔ روز کے آنے جانے والے ڈرائیورز کو یہ سب پٹرول پمپ والے جانتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "کہنا وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو یہاں سے گیا ہے۔ مجھے راستے میں ملا تھا اور اسی نے یہ حوالے دیے ہیں۔"

"کیا۔ تم ڈنگے ہو؟"

میں نے دانت نکال دیے۔ یہ نہ تردید تھی اور نہ تائید۔ پھر وہ جگہ آگئی۔ جہاں میں نے ڈنگے کا ٹرک روکا تھا۔ گاڑی کا مالک سخت تشویش میں مبتلا تھا اور اس کی نظر برابر فیول میٹر پر تھی۔ جس کی سوئی 'ای' پر ٹھہر چکی تھی اور نہ جانے کب سے ٹھہری ہوئی تھی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ گاڑی بند نہیں ہوئی۔ وہ گاڑی میرے سپرد کر کے خود ڈبے میں پٹرول لینے کے لیے کبھی نہ جاتا۔ وہ ڈبا مجھے پکڑاتا کہ جاؤ اور پٹرول لے کر واپس آؤ

"بس جی۔ مجھے اتار دیں یہاں۔" میں نے کہا۔

اسے گاڑی کو روکنا سخت گراں گزرا کیونکہ اسے پٹرول پمپ کی لائٹس نظر آنے لگی تھیں اور وہ چند قطرے پٹرول کے ضائع کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس نے کار کو آہستہ کیا اور بولا۔ "چلو اترو۔ گاڑی بند ہو گئی تو خواہ مخواہ پریشانی ہو گی۔"

"مہربانی جناب کی۔" میں نے چھلانگ مارتے ہوئے کہا۔ گاڑی ایک دم آگے بڑھی۔ میں نے اس کی ٹیل لائٹس کو غائب ہونے تک دیکھا اور امید کی کہ وہ پٹرول پمپ پہنچ گیا ہو گا۔ پھر اسے حاجی عبداللہ یا ڈنگے کا حوالہ دینے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی۔

مجھے جانے اور واپس آنے میں ڈیڑھ گھنٹا لگا تھا۔ اب رات کے سوا دو بج رہے تھے۔ میرے پیچھے وہی جگہ تھی۔ جہاں رانا شمشاد علی اور ایک نامعلوم شخص کی لاشیں اب ٹھنڈی ہو کے اکڑ چکی تھیں۔ ادھر ہی ڈنگے کا خاص دوست فرار ہوا تھا۔ وہ ایک بزدل قسم کا لڑکا تھا جو ایک اخلاقی جرم میں بھی شریک تھا۔ چنانچہ اس بات کا قوی امکان تھا کہ وہ کچھ عرصہ روپوش رہے گا۔

[illegible] پر سے اب گاڑیاں اکا دکا ہی گزر رہی تھیں۔ دس پندرہ منٹ میں ایک ادھر سے اور ایک دوسری طرف سے۔ یہ بھی سب ٹرک اور بسیں تھیں۔ [illegible] نے ملتان کی طرف سے آنے والی ٹریفک کو نظر انداز کیا اور [illegible] طرف سے آنے والی تین گاڑیوں کو روکا۔ ان میں دو ٹرک تھے۔ [illegible] کا وہی کھوکھلا لٹھا میرے کام آیا۔ ڈرائیوروں نے مجھے غائبانہ گالیوں سے نوازا اور چلے گئے۔ صبح کے سوا تین بجے تھے جب میں نے چوتھے ٹرک کو روکا اور اس کی نمبر پلیٹ دیکھی۔ ایک بار ڈرائیور نے کلینر کو آواز دے کر نیچے اترنے کو کہا۔ کلینر اس کے ساتھ نہیں تھا بلکہ پچھلے حصے میں سامان پر ڈھکی ہوئی ترپال سے اوپر ہوا تھا۔ آگے میں نے ڈرائیور کے ساتھ ایک عورت کو دیکھا جس کی صورت کے خدوخال نمایاں نہیں تھے۔ "بوٹے" ڈرائیور نے پکارا۔

"یہ۔ کیا چکر ہے؟" وہ سہم کر چلائی۔

ڈرائیور ہنسا۔ "کچھ نہیں بلبل۔ کوئی چکر نہیں۔ چکر میں تو ہم ہیں تمہارے۔"

"مذاق چھوڑو۔ کوئی ڈاکو تو نہیں ہیں۔"

"تم سے بڑا ڈاکو کون ہے بلبل۔ جس نے ہمارا سب کچھ چھین لیا اور اگر ڈاکو ہوں تو بس ان کو ایک ترچھی نظر سے دیکھنا۔ اوئے حرام دے بوٹے۔"

"کیا ہے استاد جی۔"

"او تھلے آ فٹافٹ۔" استاد نے کہا اور عورت نہ جانے کیوں چلائی۔

بوٹا نیچے اترا اور ٹرک کے آگے سے درخت کا تنا ہٹانے گیا۔ میرے لیے اتنی مہلت کافی تھی۔ میں نے مشین گن کو وہیں چھوڑا اور ریوالور کافی سمجھتے ہوئے ٹرک کے پچھلے حصے میں چڑھ گیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ترپال کے نیچے آدھے حصے میں بوریاں ہیں اور باقی آدھے میں کریٹ ہیں۔ میں آخری حصے میں ساکت ہو کے لیٹ گیا۔ ایک طرف سے میں نے ترپال کو تھوڑا سا اوپر اٹھا دیا اور اس طرح کچھ محفوظ ہو گیا۔ اب بوٹا اوپر آتے ہی مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

بوٹا چند منٹ بعد بڑبڑاتا ہوا اوپر آیا۔ اسے سخت گلہ تھا کہ استاد نے اسے اتنی بلندی سے نیچے اترنے کی زحمت دی مگر اپنی عاشقی ملتوی نہیں چھوڑی۔ کیا تھا اگر خود اتر جاتا۔ مگر اس کی تو شان گھٹتی تھی۔ بس رعب جھاڑنا مقصد تھا اپنی 'ماشوک' کے سامنے۔ ٹرک اس کے اوپر آنے سے بہت پہلے چل پڑا تھا۔ بوٹے کی ساری توجہ توازن برقرار رکھتے ہوئے اپنی جگہ تک پہنچنے پر مرتکز تھی۔ نیچے ٹرک کے انجن کا شور تھا۔ ڈرائیور اپنی 'ماشوک' سے اٹکھیلیاں کر رہا تھا اور اس کی تفریح طبع کے لیے فلمی گانوں کا ایک کیسٹ بجا رہا تھا۔ چنانچہ جب میں نے بوٹے کو دبوچا اور ایک لمحے کا توقف کیے بغیر یا رحم دلی کے جذبات کی مداخلت سے پہلے اسے سڑک کے کنارے کی طرف اچھالا تو بوٹے کی فریاد استاد جی کے کانوں تک نہیں پہنچی۔ میں نے صرف اتنی احتیاط کی تھی کہ بوٹے کو سڑک پر نہیں پھینکا تھا تاکہ اسے چوٹ کم آئے اور وہ مرنے سے بچ جائے لیکن بے ہوش ہو جائے تو کسی گاڑی سے نہ کچلا جائے۔

یہ احساس تو مجھے حرام کے بوٹے کو پھینک دینے کے بعد ہوا کہ وہ کون تھا۔ ابھی دو گھنٹے پہلے اسی نے مکرجی کی لاش کو کتوں کے سامنے ڈالا تھا۔ وہ عبداللہ کے بک جانے والے زرخرید غلاموں میں سے ایک تھا۔ جسے بطورِ خاص ٹرک کے ساتھ اس لیے بھیجا گیا تھا کہ وہ راستے کی دشواریوں سے نمٹنے میں ڈرائیور کی مدد کر سکے۔ وہ بھی اس پاجی کا خاص آدمی تھا۔ مجھے اس کے انجام پر بالکل تاسف کا احساس نہ رہا۔

ڈرائیور کی صورت میں نے ابھی تک نہیں دیکھی تھی اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ عورت کون ہے۔ ڈنگے کے ساتھ بھی ایک لڑکا تھا مگر مجھے عبداللہ سے یہ امید نہیں تھی کہ وہ کسی ڈرائیور کے ساتھ اس کی 'ماشوک' کو بھی پروانۂ راہداری دے گا۔ ماشوک کو خود ڈرائیور نے بے ٹکٹ مسافر کی طرح بٹھایا تھا یا وہ بھی کوئی افسر بکارِ خاص تھی۔ ایک حادثے کے بعد جس میں بادشاہ گل مارا گیا تھا اور اسلحے کی کھیپ کا راز فاش ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔ عبداللہ کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا کہ مال کسی غیر ذمے دار شخص کے حوالے کر دے۔

میرے لیے مال کا جائزہ لینا بھی مشکل تھا۔ اصل مال نیچے دبا ہوا ہو سکتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ بوریوں میں اناج ہو اور اسی میں گولیاں بھی ہوں۔ ٹرک اگر کراچی جا رہا تھا تو ساڑھے چھ سو میل کا سفر باقی تھا اور یہ مسافت ختم ہونے سے پہلے ہی میرا اور ڈرائیور کا تعارف ہو جانا یقینی تھا۔ میں سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ کیا میں ڈرائیور کو کسی ٹرک اسٹینڈ تک پہنچنے دوں۔ ملتان سے پہلے شیر شاہ پر ٹرک والے عموماً چائے ناشتے کے لیے رکتے ہیں۔ وہاں ڈرائیور نے بوٹے کلینر کی جگہ مجھے پایا تو وہ ہنگامہ کھڑا کر دے گا۔ ٹرک ڈرائیوروں کی برادری کے اتنے لوگ جمع ہو جائیں گے کہ میری آواز بھی ان کے شور میں دب جائے گی اور وہ میری سنے بغیر مجھے پولیس کے حوالے کر دیں گے۔ اس کے بعد رہے نام اللہ کا۔ پولیس والے جانیں اور شکاری جانیں۔

میں نے طے کیا کہ صبح کا اجالا پھیلنے سے پہلے ہی مجھے ٹرک پر قبضہ کر لینا چاہیے۔ اکیلے ٹرک ڈرائیور سے نمٹنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ میں اوپر سے ایک بار دردناک "ہائے" بلند کرتا تو ڈرائیور ضرور پوچھتا کہ کیا ہوا؟ جواب کیوں نہیں دیتا حرام دے بوٹے۔ اور پھر بھی جواب نہ ملتا تو ٹرک روک کے صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لیے خود نیچے اترتا۔ تشویش میں مبتلا ہوتا تو لقلم خود اوپر آتا۔ نہ آتا تب بھی کوئی بات نہیں تھی۔ میں اوپر سے نیچے آ سکتا تھا۔ براہ راست اس کے اوپر۔ ڈرائیور کو رعایت دینے کا کوئی سوال نہیں۔ اسے مار کے ایک طرف پھینکنے سے عورت کو بھی تابع فرمان بنایا جا سکتا تھا۔ وہ ضرور جانتی ہو گی کہ ڈرائیور کون تھا اور اسے کہاں جانا تھا۔

ابھی میں قطعی فیصلے پر نہیں پہنچا تھا کہ ٹرک گھوم گیا۔ میں نے اوپر سے جھانک کر دیکھا تو یہ کوئی سائڈ روڈ تھی۔ گھڑی میں ساڑھے چار بج رہے تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ ٹرک نے لاہور کو تقریباً سو میل پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ میدانوں کھیتوں اور درختوں کے ایک سے منظر کے باعث کسی اور جگہ کی شناخت صرف سنگِ میل سے ممکن تھی یا اس روڈ سائن سے جو بغلی سڑکوں پر تیر کے نشان سے کسی خاص قصبے یا گاؤں کا پتا دیتے ہیں۔

ٹرک کی منزل کراچی نہیں تھی۔ یہ بات تو اب ثابت ہو چکی تھی۔ یہ بھی تقریباً ثابت تھا کہ وہ لڑکی یا عورت ڈرائیور نے اپنی مرضی سے تفریحِ طبع اور سفر کو رومانٹک بنانے کے لیے نہیں بٹھائی تھی۔ اسے ڈرائیور کے ساتھ بھیجا گیا تھا۔ پھر مجھے ایک اور خیال آیا۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ عورت اس ڈرائیور کی بیوی ہو اور اس نے ٹرک صرف بیوی کو گھر چھوڑنے کے لیے موڑا ہو۔ وہ کسی کام سے اس کو جاتے وقت اپنے ساتھ لے گیا ہو اور اب واپسی میں ساتھ ہی لے آیا ہو۔ اسے گھر چھوڑ کے وہ واپس کراچی کا راستہ پکڑے۔

ٹرک اسی وقت پھر گھوما اور ایک نیم پختہ سڑک پر چلنے لگا۔ اندھیرے میں کسی آبادی کے خدوخال نمایاں ہونے لگے۔ کچے مکان اندھیرے میں اپنی پسماندگی کی تصویر نظر آتے تھے۔ یہاں ابھی بجلی نہیں پہنچی تھی اور اس اعتبار سے یہاں کے رہنے والے انیسویں صدی سے بھی پیچھے تھے۔ یہاں گلیاں کچی ہوں گی۔ اسکول اور اسپتال نہیں ہوں گے اور ریڈیو، ٹی وی ان کے لیے عجائبات اور طلسمات کا درجہ رکھتے ہوں گے۔ اس ترقی کی دوڑ میں جو شہروں کو بیسویں صدی سے اکیسویں صدی میں پہنچا رہی تھی۔ گاؤں والے اور پیچھے ہوتے جا رہے تھے کیونکہ وہ پہلے کی طرح محکوم و مجبور و فقیر تھے۔ گورے آقاؤں کے بعد کالے آقا ان کے حقوق کا اور ان کی محنت کا اور ان کے جذبات کا پہلے سے زیادہ استحصال کر رہے تھے۔

ٹرک ایک دیوار کے ساتھ چلنے لگا جو باہر سے کچی نظر آتی تھی۔ اس پر بھوسے گارے کی ایک انچ موٹی تہ تو ضرور ہو گی۔ اندر یقیناً اینٹوں کی چنائی تھی اور شاید یہی ہماری منزل تھی یا سفر کا پہلا پڑاؤ تھا۔ اسلحے کے ٹرک اگر صرف رات کے اندھیرے میں ہی چلتے ہوں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ آدھی رات سے صبحِ کاذب تک چھ گھنٹے بہرحال ملتے ہیں اور ہر چھ گھنٹے کی مسافت پر ایک ٹھکانا ہو تو لاہور سے روانہ ہونے والا مال پانچویں دن بحفاظت کراچی پہنچ سکتا ہے۔ میں نے ریوالور چیک کیا اور تیار ہو کے بیٹھ گیا۔

چالیس پچاس گز کی دیوار کے وسط میں لکڑی کا دس بارہ فٹ اونچا پھاٹک تھا۔ ڈرائیور کے ہارن دینے سے قبل ہی کسی نے اس پھاٹک میں ایک کھڑکی کھولی۔ کھڑکی میں لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ اندر سے کسی نے کچھ کہا۔ ٹرک کی ہیڈ لائٹس بجھ گئیں۔

"ڈنگے بادشاہ۔ خیر ہووئی۔"

"ڈنگے دے پتر۔" ڈرائیور نے کہا۔ "باہر نکل کے دیکھ اندھے، تیرا باپ آیا ہے۔"

"ماں نوں وی نال لیایا ای جے؟" اندر والا ہنسا اور اس نے پھاٹک کھول دیا۔ ٹرک گزرا تو اس نے پھاٹک پھر بند کر دیا۔ میں اوپر سے احاطے کا جائزہ لیتا رہا۔ اس میں دوسرا کوئی ٹرک نہیں تھا۔ ایک پرانی طرز کی ملٹری ولز جیپ اس برآمدے کے سامنے کھڑی ہوئی تھی جس کے پیچھے چارپائی کسے

دکھائی دیتے تھے۔ کوئی شخص برآمدے میں کھڑا ہوا سگریٹ پی رہا تھا۔ اندھیرے میں ہر کش کے ساتھ سگریٹ کی چنگاری زیادہ فروزاں ہو جاتی تھی۔ عورت اتری اور اندر چلی گئی۔

"ٹرک کو یہاں کیوں لائے ہو؟" ڈرائیور نے کہا۔

"اور کہاں لے جاتا جی؟" ڈرائیور نے کہا۔

"کیا سب گھاس کھا گئے ہیں؟" وہ شخص برہمی سے بولا۔ "معلوم نہیں کہ یہاں چھاپا پڑ سکتا ہے۔ اس رانا شمشاد علی نے خطرہ پیدا کر دیا ہے۔ کسی نے نہیں بتایا تمھیں؟"

ڈرائیور ہنسنے لگا۔ "بڑے بے خبر ہو جی آپ تو شہنشاہ ہو۔ رانا اب کہاں؟"

"کیوں۔۔ اس کا ٹرانسفر ہو گیا ہے کیا؟"

"ٹرانسفر۔ ایسا ویسا" ڈرائیور نے کہا۔ "سیدھا دوسری دنیا میں۔ مرنے والے کو گالی دے کے کیوں گناہگار ہوتے ہو۔"

"دیکھو سائیں۔ مجھے کوئی اطلاع نہیں۔"

"یار، بڑے افسوس کی بات ہے۔ کیا ہم جھوٹ بول رہے ہیں؟"

"جھوٹی اطلاع تمھیں بھی تو مل سکتی ہے۔" وہ بولا۔

"حاجی صاحب دے گا مجھے جھوٹی اطلاع؟"

"حاجی صاحب۔۔ اس نے خود کہا تھا تم سے؟"

"تم شریمتی جی سے پوچھ لو۔" ڈرائیور نے برہمی سے کہا۔ "اور اگر اپنی ذمے داری پر کتے ہو تو میں چلا جاتا ہوں۔ اد حرام دے بوٹے تو ابھی تک مرا پڑا ہے اوپر۔ تھلے اتر۔" ڈرائیور بھی اسی دروازے سے اندر چلا گیا جس سے عورت اندر گئی تھی۔ باہر کھڑا ہوا شخص بھی آہستہ آہستہ پلٹا اور اس کے پیچھے غائب ہو گیا۔

میں ایک دم نیچے اتر آیا۔ چند سیکنڈ بعد میں ان کمروں کی قطار کے پیچھے پہنچ چکا تھا۔ پچھلی طرف ہر کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ یہ پکے نظر آنے والے بڑے بڑے کمرے تھے۔ میں نیچے جھک کر پہلی کھڑکی تک پہنچا اور پھر تھوڑا سا اٹھا۔ اندر صرف اندھیرا تھا اور میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گھورنے کے باوجود کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ کوئی چارپائی چرچرائی اور میں نے چوڑیاں کھنکنے کی آواز سنی۔ پھر سناٹا چھا گیا اور رفتہ رفتہ کسی نے خراٹے لینے شروع کیے۔ خراٹوں کی آواز مردانہ تھی۔ ایک مرد ایک عورت؟ میں نے سوچا۔ ایک عورت ابھی ابھی اندر گئی ہے جسے ڈرائیور نے شریمتی جی کہا تھا۔ راستے میں وہ اسے بلبل کہہ کے بڑی بے تکلفی جتا رہا تھا اور غالباً اس کے ساتھ کچھ "عاشکی ماشوکی" بھی کر رہا تھا۔ یہاں پہنچتے ہی وہ اس کے لیے شریمتی جی ہو گئی۔ تو کیا وہ مسلمان نہیں تھی؟

میں تھوڑا سا آگے بڑھا اور دوسرے کمرے کی کھڑکی سے جھانکنے لگا۔ خاموشی یہاں بھی گہری تھی اور اندھیرے میں کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا لیکن میں نے انتظار کیا اور دو منٹ بعد اس کا فائدہ ہوا۔ کوئی عورت گہری نیند میں گنگنائی۔ آخرِ شب کی نیند یا تو بہت کچی تھی یا وہ خواب دیکھ رہی تھی۔ کسی مرد نے کہا۔ "کیا مصیبت ہے۔" میں تیسری کھڑکی پر پہنچا۔ یہاں ایک لالٹین رکھی ہوئی تھی جس کی لو انتہائی کم کر دی گئی تھی۔ برائے نام سی روشنی میں مجھے ایک پارٹیشن نظر آئی۔ کمرے کی اونچائی بارہ فٹ کے قریب تھی۔ چوڑائی بھی شاید اتنی ہی تھی لیکن لمبائی میرے دائیں بائیں اٹھارہ فٹ یا اس سے کچھ زیادہ تھی۔ اس لمبائی کو آٹھ فٹ اونچی تین دیواریں اٹھا کر اس طرح تقسیم کیا گیا تھا کہ کمرے میں چھ فٹ چوڑے اور بارہ فٹ لمبے تین کمرے یا کیبن بن گئے تھے۔ ہر کیبن اوپر سے کھلا ہوا تھا لیکن باہر کی طرف سب کے دروازے الگ تھے اور یہ دروازے بند تھے۔ لالٹین کی روشنی راہداری تک محدود تھی۔ کھڑکیاں کھلی رکھنے کا مقصد تازہ ہوا کی فراہمی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ اندر کی تقسیم نے ایک بڑے کمرے کو تین افراد کے لیے قابلِ استعمال بنا دیا تھا اور جیسا کہ میں آوازوں کو سننے کے بعد سوچنے پر مجبور تھا۔ یہ ایک پرائیویٹ عشرت کدہ، نائٹ کلب یا ایسی ہی کوئی جگہ تھی جہاں پر بدقماش مرد اور بدکردار عورتیں اکٹھے ہوتے تھے۔

سوال یہ تھا کہ اس دور افتادہ گاؤں میں جہاں بجلی نہ ہونے کی وجہ سے ایئرکنڈیشنر تو کیا پنکھے تک نہ تھے اور عیاشی کے اسباب بھی محدود تھے کسی نے یہ سب اہتمام کیوں کیا تھا۔ میرے پاس زیادہ دیر باہر رہ کے سوچنے کے لیے وقت نہیں تھا۔ بہت جلد بوٹے کی غیر موجودگی کا راز خود بخود فاش ہو جاتا۔ اس دشمن کے قلعے میں میرا چھپنا بہت مشکل تھا جس کا پورا جغرافیہ بھی ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

سب سے زیادہ حیرت مجھے اس عورت پر تھی جو ڈرائیور کے ساتھ آئی تھی۔ وہ کس اندھیرے کمرے میں غائب ہو گئی تھی۔ اس کے پیچھے جانے والا ڈرائیور کہاں گیا تھا اور جو شخص برآمدے میں پہلے سے موجود تھا۔ وہ کہاں تھا۔ میں کسی کے باتیں کرنے کی آواز بھی نہیں سن رہا تھا۔ یہ فرض کرنا محال تھا کہ وہ سرگوشیوں میں گفتگو کر رہے ہوں گے۔ ایسا انھوں نے باہر ضروری نہیں سمجھا تھا تو اندر ان کو ڈرنے کی ضرورت کیا تھی۔ یہ بھی ناممکن تھا کہ وہ اندھیرے میں ہی بیٹھے ہوں۔ ڈرائیور کو اور اس عورت کو سو میل تک ٹرک میں سفر کے بعد کم سے کم ایک پیالی چائے کی ضرورت ہوگی۔ اگر وہ سوئیں گے تب بھی کپڑے وغیرہ تو بدلیں گے اور ایک دوسرے سے کوئی بات کیے بغیر ان کے سونے کا کیا سوال۔

صاف بات یہ نظر آتی تھی کہ وہ کسی زیرِ زمین کمرے میں اتر گئے جہاں وہ اطمینان سے بیٹھے ہوں گے۔ میرا ذہن اوپر کے کمروں میں موجود افراد کو بھی مختلف زاویۂ نظر سے دیکھنے لگا تھا۔ وہ سب غدار بھی ہو سکتے تھے۔ ایسے بے ضمیر لوگ بھی ہو سکتے تھے۔ جو پیسے کے یا عورتوں کے چکر میں پھنس گئے تھے اور اب دشمنوں کے ہاتھوں میں کھیل رہے تھے۔ عورت کو جال کے طور پر استعمال کرنے کا حربہ پرانا ہے۔ یہ عورتیں بھی شکاری ہوں گی جو احمق مردوں یا ناتجربہ کار لونڈوں کو پھانستی ہوں گی اور جب وہ پھنس جاتے ہوں گے تو انھیں بلیک میل کیا جاتا ہوگا۔ اس ڈرائیور نے شریمتی جی کہا تھا تو شاید سب اگل دیا تھا۔ میں ہی احمق تھا کہ اتنی دیر میں سمجھا۔

اس وقت میں نے طے کیا کہ اب واپسی کا راستہ اور دروازہ تو بند ہے۔ آگے بڑھنے کے لیے مجھے کیا کرنا چاہیے۔ ٹرک میں سے کوئی مشین گن تلاش کر کے لانی چاہیے یا دو ریوالوروں کی قوت کے سہارے اندر داخل ہو جانا چاہیے۔ مجھے ڈنگے کا خیال آیا۔ اس نے اپنی سیٹ کے نیچے مشین گن چھپا رکھی تھی۔ کیا اس ڈرائیور کے پاس اپنی حفاظت کے لیے کچھ نہیں ہوگا۔

میں تیزی سے کوئی آہٹ کیے بغیر واپس ہوا۔ ٹرک تک جاتے ہوئے میں نے افق پر سفیدی کو پھوٹتا دیکھا۔ یہ صبح کاذب تھی۔ کچھ دیر کے لیے پھر اندھیرا غالب آئے گا اور اس کے بعد صبح آئے گی۔ سونے والے جاگ اٹھیں گے۔ آدھے گھنٹے بعد مجھے پناہ دینے والا اندھیرا ابھی نہ ہوگا۔ میں نے ٹرک کا دروازہ کھولا تو اس کی آواز سے خود ہی ڈر گیا۔ لیکن اب ڈرنے اور دبک کر بیٹھنے کے لیے وقت ہی نہیں تھا۔ میں نے ایک ہاتھ سے سیٹ اٹھائی اور پلٹ کر دیکھا۔ ابھی تک باہر کوئی نہیں آیا تھا۔ میرا ہاتھ فوراً سیٹ کے نیچے گیا اور جب مشین گن کے ساتھ باہر آیا تو میرا حوصلہ دگنا ہو گیا۔ میں اسی طرح جھکے جھکے واپس ہوا۔

پہلی کھڑکی سے اندر اترتے ہوئے میں نے پوری احتیاط سے کام لیا۔ میں قبل از وقت خون خرابے کے حق میں بہرحال نہیں تھا۔ میں نے پنجوں پر چلتے ہوئے راہداری میں آگے بڑھنا جاری رکھا اور ایک ایک دروازے کو آہستہ سے دباتا گیا۔ وہاں ایک سے بارہ دروازے تھے اور ہر دروازے کے پیچھے کا منظر میں چشمِ تصور سے دیکھ سکتا تھا۔

ساتواں دروازہ خلافِ توقع پیچھے ہو گیا۔ میں نے اندر کسی چٹخنی کے گرنے کی آواز بھی نہیں سنی تھی۔ شاید وہ دروازہ کھلا رہ گیا تھا یا اندر سے اسے بند نہیں کیا جا سکتا تھا چنانچہ اسے بھیڑ دیا گیا تھا۔ میں نے اسے تھوڑا سا اور دھکیلا اور دل ہی دل میں دعا مانگی کہ اس کے قبضے آواز نہ کریں۔ دروازہ کچھ اور کھل گیا۔ بہت آہستہ آہستہ میں نے اپنا راستہ بنایا اور اس کیبن میں داخل ہو گیا۔ کمرے میں ایک ہی ڈبل بیڈ تھا مگر اس پر سونے والے دو تھے جو یک جان دو قالب ہوئے پڑے تھے۔ اس منظر نے میرے ذہن کو غیر متوقع صدمہ نہیں پہنچایا کیونکہ میں اس کے لیے پہلے سے تیار تھا اور میرے جذبات میں کوئی ہلچل نہیں مچائی کیونکہ میں اس وقت آنکھوں سے دیکھ رہا تھا اور دماغ سے سوچ رہا تھا۔ میرا جسم عمل کے لیے پوری طرح مستعد تھا لیکن اس عمل میں دل کے جذبات کا ذرا بھی دخل نہ تھا۔

دروازے کو پھر اس طرح بھیڑنا کہ وہ باہر سے دیکھنے والے کو بند نظر آئے، دوسرا مشکل مرحلہ تھا جو میں نے کامیابی سے سر کیا۔ پھر میں بے سدھ اور مدہوش ہونے والوں کے سر پر جا کھڑا ہوا۔ لڑکی بائیس چوبیس سال کی اور خاصی دلکش تھی۔ اس کا رنگ مجھے اندھیرے میں سانولا سا لگا۔ مرد بھی اسی کا ہم عمر محسوس ہوتا تھا۔ میری آنکھیں اب اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہو رہی تھیں۔ جھک کر دیکھنے سے مجھے لڑکی کے ماتھے پر بندیا نظر آئی۔ اس نے میرے لیے فیصلے کو آسان بنا دیا۔

میں نے صرف ایک وار کیا۔ لڑکی کا جسم تڑپا۔ مرد ایک دم ہڑبڑا کے اٹھا تو میں نے اسے یوں دبوچ لیا کہ اس کے حلق سے آواز باہر نہ نکل سکے۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس عورت کو دیکھتا رہا جس کا بے لباس اور بے آبرو جسم موت کے کرب میں بل کھا رہا تھا۔ میرے وار نے اس کی گردن توڑ دی تھی۔

"دیکھو۔ میں نے اس طوائف کو مار ڈالا ہے۔" میں نے اس سہمے ہوئے نوجوان کے کان میں سرگوشی کی۔ "اسی طرح میں تمھاری گردن بھی توڑ سکتا ہوں لیکن میں تمھاری جان بخشی بھی کر سکتا ہوں۔ اگر تم خاموش رہنے کا وعدہ کرو اور میرے ساتھ تعاون کرو۔"

لڑکی کا جسم اب ساکت ہو گیا تھا۔ چنانچہ میری گرفت میں بے بس نوجوان کے لیے میرے الفاظ پر یقین نہ کرنے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور میں نے مشین گن ایک طرف رکھ کے ریوالور نکال لیا۔ ریوالور کی نال کو اس کے سر سے لگا کے میں نے اس نوجوان کے منہ پر سے ہاتھ ہٹایا۔ وہ بالکل بے حس و حرکت بیٹھا لرزتا رہا۔ اسے اپنی برہنگی کا قطعی احساس نہ تھا۔

اچانک میرے کانوں نے ایک زنانہ ہنسی کی صدا سنی۔ پھر کسی مرد نے کہا۔ "وہ کلینر۔ حرام دا بوٹا۔ وہ تمھارے ساتھ آیا تھا تو اندر کہاں غائب ہو گیا۔ تلاش کروا سے۔ سب جگہ دکھو۔"

اس آواز پر میرا لہو میری رگوں میں منجمد ہونے لگا۔ کیونکہ اس آواز کو میں اچھی طرح پہچانتا تھا۔

یہ آواز استاد پیڈرو کی تھی جو میں نے طویل وقفے کے بعد سنی تھی لیکن اس نام سے اور اس آواز سے میری زندگی کی اتنی پُراذیت یادیں وابستہ تھیں کہ میں ہزاروں کے مجمع میں اس آواز کو پہچان سکتا تھا۔ دس سال یا بیس سال بعد بھی میرا ردِعمل مختلف نہ ہوتا۔ نفرت کی پرانی آگ میرے وجود کو جلانے لگی اور میرے دل میں ایک خواہش پیدا ہوئی کہ میں مشین گن لے کر باہر نکلتے ہی اس کے ناپاک جسم کو چھلنی کر دوں۔ اس طرح کہ جسم میں دوڑنے والے گندے خون کا ایک ایک قطرہ بہہ جائے۔ مگر میں نے آسانی سے اس خواہش کو تھپک کر سلا دیا۔ "ابھی نہیں۔" میں نے دل کو سمجھایا۔ "ابھی کچھ کام باقی ہیں جو ذاتی انتقام کی خواہش سے زیادہ بڑے اور اہم ہیں۔ پیڈرو ایک آدمی ہے۔ اسے ایک گولی ختم کر دے گی مگر اس کے مرتے ہی وہ سب شکاری روپوش ہو جائیں گے جو ہماری نظر میں ہیں اور وہ اپنی شکارگاہیں بدل لیں گے۔"

"جاؤ سائیں۔۔۔ کیا میرا منہ دیکھتے رہو گے۔" پیڈرو نے بگڑ کے کہا۔

"ہاں جی۔۔۔ دیکھتا ہوں۔" سائیں نے کہا۔ "مجھے ڈر ہے۔۔۔"

"کیا ڈر ہے؟" پیڈرو نے اس کے اچانک چپ ہو

جلنے پر کہا۔

"کہیں وہ پیچھے نہ رہ گیا ہو؟"

"پیچھے کہاں؟"

"یہ تو پتا نہیں... وہ راستے میں ایک جگہ اُترا تھا۔" سائیں کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"کیوں اُترا تھا؟"

"سڑک پر سے رکاوٹ ہٹانے کے لیے۔" سائیں بولا۔ "ایک خشک درخت کا تنا پڑا ہوا تھا۔ شاید کسی ٹرک سے گرا ہوگا۔"

"کیا بے وقوفی کی باتیں کر رہے ہو۔ درخت سامنے پڑا ہوگا۔"

"ہاں... اچانک سامنے آگیا تھا۔"

"یار تو کیا تم اس کے اوپر سے گزر کے آگئے...؟"

"او نئیں استاد..... ہمیشہ ایسا ہوتا ہے... وہ کبھی نیچے اُترتا ہے تو میں اندازہ کر لیتا ہوں کہ پھر پیچھے چڑھ گیا ہوگا۔ ہوشیار لڑکا ہے اور دوڑ کے چڑھ جاتا ہے..."

"مطلب یہ ہے کہ تم فرض کر لیتے ہو... کہ وہ چڑھ گیا ہوگا۔ تصدیق نہیں کرتے اور ٹرک پہلے ہی چلا دیتے ہو؟" پیڈرو نے برہمی سے کہا۔

"میں... کیا... سب ہی ایسا کرتے ہیں جی..."

"سب کو گولی مارو... جاؤ اور دیکھو، وہ تمھارے ساتھ پہنچا بھی ہے یا نہیں۔" پیڈرو نے کہا۔ "کہیں اُسے جنگل میں تو نہیں چھوڑ آئے۔ وہ دوڑ مارا رہ گیا ہو تمھارے پیچھے... تم نے تو اس کی آواز تک نہیں سنی ہوگی... بہت مستی میں تھے تم... مجھے زرلا نے بتایا ہے..."

"آپ اس کنجری کی بات مت کرو جی۔" ڈرائیور نے اپنی عزت بچانے کے لیے کہا۔ "مستی میں تو وہ خود تھی۔ میں تو اُسے منع کرتا رہا کہ آرام سے بیٹھے... میں ٹرک چلا رہا ہوں مگر..."

"چھوڑو یہ اگر مگر... جاؤ بوٹے کو دیکھو۔"

"بوٹے کی فکر نہ کریں استاد جی... اوّل تو وہ میرا خیال تھا... ایسا کبھی پہلے نہیں ہوا... مگر بندہ بشر ہے... کہیں پیچھے رُک گیا ہو ذرا سی دیر کے لیے... پیر میں کانٹا لگ گیا ہو... یا پیشاب کرنے بیٹھ گیا ہو... وہ گیا ہوگا تو آجائے گا... وہ اتنا بے وقوف اور ناواقف بھی نہیں ہے کہ یہاں نہ پہنچ سکے... کسی بھی پیچھے آنے والے ٹرک میں بیٹھ سکتا ہے۔"

"سارے ٹرک یہاں نہیں آتے۔" پیڈرو بولا۔

"ہاں... مگر سڑک تک تو آسکتا ہے... آگے یہ دس میل کا راستہ ہے۔" سائیں بولا۔ "پیدل طے کر لے گا۔"

"بکواس بند کرو اپنی... اگر وہ نہیں ہے تو اُسے لینے کے لیے جاؤ، یہاں میرے سامنے کھڑے کتے کی طرح بھونکتے مت رہو۔" پیڈرو نے دہاڑ کے کہا۔

"زیادہ گرمی دکھانے کی ضرورت نہیں ہے... میں کُتا ہوں تو حاجی کا تمھارا دیا نہیں کھاتا۔" سائیں مشتعل ہو گیا۔

"حاجی کس کا دیا کھاتا ہے... یہ معلوم ہے؟" پیڈرو غرّایا۔

"مجھے کوئی ضرورت نہیں معلوم کرنے کی۔" سائیں نے کہا۔ "تم میرے ساتھ انسانوں کی طرح بات کرو۔ ایسے میں نے اپنے باپ کی کبھی نہیں سُنی تھی... تم میرے باپ یا آقا نہیں ہو... خود بھی کسی کے کتے ہو۔"

پیڈرو نے اُسے ایک گالی دی۔ بات بہت بڑھ گئی تھی اور دونوں کتے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے تھے۔ غالباً ان کے درمیان پہلے سے اختلاف اور رنجش کے اسباب موجود تھے۔ پیڈرو خود کو بڑے اور زیادہ طاقتور حریف کا کتا سمجھتے ہوئے سب پر حاوی رہنا چاہتا ہوگا، مگر لنکا میں جو تھا سو باون گز کا۔

سائیں نے جواب آں غزل کے طور پر پیڈرو کو زیادہ مرصّع گالی دی۔ اور اگلے چند سیکنڈ میں نہ جانے کیا ہوا... پیڈرو نے ڈرائیور پر حملہ کیا، یا ڈرائیور نے پیڈرو پر۔ میں ایک فائر کے دھماکے پر اچھل پڑا۔ اس نوجوان نے چلاّ کے کہا: "کتل... کتل ہو گیا... مر... ..."

میں نے ریوالور اس کے منہ میں ڈال دیا۔ "ابھی تمھارا کتل ہو جائے گا۔ منہ بند رکھو اپنا۔"

وہ کوئی بنگالی تھا۔ اس کے لہجے اور تلفظ نے میرے لیے شک کی گنجائش نہ چھوڑی کہ وہ علیحدگی پسند غداروں کے ٹولے کا آدمی تھا۔ دھماکا سُن کر وہ اتنا بدحواس ہوا تھا کہ میری ہدایات پر عمل کرنا بھول گیا تھا اور بے اختیار چلاّنے لگا تھا۔ دوسرے خلوت خانوں سے کئی مردوں عورتوں کی ملی جُلی چیخوں میں اُس کی آواز دب گئی تھی۔ اس کی طرح دوسرے دادِ عیش دینے والے بھی دہشت زدہ ہو گئے تھے۔

"سب اندر چلو..." پیڈرو نے چیخ کر کہا۔ "خبردار! جو کوئی باہر آیا... میں گولی مار دوں گا سب کو..."

خوف اور سراسیمگی کے مارے ہوئے واپس دوڑے۔ دروازے دھڑ دھڑ کر کے بند ہوئے۔ ایک عورت ہسٹریا میں چلاّنے لگی۔ "کھون... کھون..."

"چوپ شالی..." کسی مرد نے کہا۔ "تیرے باپ کا کھون ہو گیا ہے جو اتنا سور کرتی ہے۔" عورت کی آواز بند ہو گئی یا کر دی گئی۔

پیڈرو کی آواز سُننے کے بعد مجھے بالکل شک نہیں رہا تھا اس مختصر اور اچانک شروع ہو جانے والی جنگ میں شکست کس کی ہوئی، ڈرائیور مارا گیا تھا اور میں باہر جھانکے بغیر چشمِ تصور سے اس کی لاش کو راہداری میں پڑا ہوا دیکھ سکتا تھا۔ یہ صورت حالات مجموعی طور پر میرے حق میں ہو گئی تھی۔ کلینر جسے میں نے چلتے ٹرک سے سڑک پر پھینکا تھا، پہلے ہی مارا جا چکا تھا۔ ڈرائیور اب مارا گیا تھا چنانچہ میری موجودگی کا راز افشا ہونے کے امکانات وقتی طور پر معدوم ہو گئے تھے۔

وہ بنگالی جس کے منہ میں ریوالور کی نال تھی، سانس روکے بیٹھا تھر تھر کانپ رہا تھا اور بے ہوش ہو کر گرنے والا تھا... اُسے زیادہ ڈر یہ ہوگا کہ مجھ سے غیر ارادی طور پر ٹریگر نہ دب جائے۔

میں نے ریوالور باہر نکال لیا۔ "پھر منہ مت کھولنا۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "اپنی زندگی کی ضرورت خود تمھیں ہوگی سب مجھے اتنی زیادہ نہیں ہے۔"

"وہ تی (غلطی) ہو گیا۔" وہ ہاتھ جوڑنے لگا۔ "مافی دو بابا۔"

"بابا؟... میں بابا نظر آتا ہوں تمھیں۔" میں نے اُسے گھور کے کہا۔

"نئیں... ہم ایسا نئیں بولا... تم نئیں، ہم بابا..." وہ ہکلانے لگا۔ "یہ سالا لوگ ہم کو پھنسایا۔"

میں نے اُسے منہ پر انگلی رکھ کر خاموش ہو جانے کو کہا کیونکہ باہر خاصی افراتفری تھی۔ لذّتِ خوابِ سحر سے بیدار ہوتے ہی خوف اور دہشت کے عذاب سے دوچار ہونے والے سہمے ہوئے تھے اور آخری شب کے ہمسفر لمحوں سے نظریں چرا رہے تھے۔ صرف پیڈرو کی آواز تھی، جواب بھی سنائی دے رہی تھی: "اُٹھا لو اس کتے کی لاش اور باہر لے جاؤ۔"

"باہر کہاں...؟" کسی نے پوچھا۔

"پچھلی طرف... جہاں کل اس لڑکی کو گاڑا تھا۔" پیڈرو بولا۔ "اسی قبر کو کھود لو... مٹی ابھی نرم ہوگی۔ دوسری قبر کھودو گے تو زیادہ وقت لگے گا۔"

"ٹھیک ہے جناب۔" حکم کا غلام بولا۔

"او بے وقوف... اس طرح مت اٹھاؤ۔" پیڈرو نے کہا۔ "کیا یہاں سے وہاں تک خون ٹپکاتے جاؤ گے؟... دری لاؤ کوئی... اس میں لپیٹ کر اٹھاؤ۔"

"دری؟ فالتو کوئی نہیں..."

"فالتو کے بچے... کسی بھی کمرے میں سے دری نکال لو... ہر بیڈ پر دری ہے۔" پیڈرو بولا۔ "سب جاگے ہوئے ہیں... اور دیکھو... وہ دری کا کفن بھی ساتھ ہی دبا دینا مٹی میں... یہ نہ ہو کہ خون آلودہ دری واپس لے آؤ۔"

"جی جناب۔" یہ دوسرے حکم کے غلام کی آواز تھی۔

"اس کے بعد واپس آؤ اور یہ فرش گیلے کپڑے سے رگڑ کے اچھی طرح صاف کرو... نشان نظر نہ آئے۔"

"جی جناب..."

"کیا جی جناب جی جناب لگا رکھی ہے... جاؤ... دفع ہو جاؤ... ہلو اپنی جگہ سے..." پیڈرو نے دہاڑ کر کہا۔ "کہیں وہ حرام دا بوٹا نہ آجائے اپنے استاد جی کے پیچھے... دیر کر دی گے تو وہی قبر تیسری بار کھودنی پڑے گی... میں نہیں چاہتا کہ وہ استاد جی کی موت یا تدفین کا چشم دید گواہ بنے۔"

"مگر جناب... وہ پوچھے گا کہ ٹرک تو کھڑا ہوا ہے۔ استاد جی کہاں ہیں؟"

"اُسے میں جواب دے لوں گا... کہ وہ ٹرک کو یہاں چھوڑ کے کسی سے ملنے گیا تھا۔ کسی عورت سے اس کے ناجائز مراسم تھے۔ وہ اس کے بارے میں صرف اتنا ہی بتاتا تھا کہ ایک بہت بڑے اور بوڑھے زمیندار کی نئی چوتھی بیوی ہے۔" پیڈرو کسی حکم کے غلام سے نہیں خود سے ہمکلام تھا اور یہ کیفیت اس کے ذہنی انتشار کی غماز تھی۔

"واہ جناب... کیا دماغ پایا ہے۔" پہلا غلام بولا۔ "سمجھنے والے خود ہی سمجھ جائیں گے کہ وہ کیوں واپس نہیں آیا۔"

"ہاں..." پیڈرو کے لہجے میں کچھ اطمینان آگیا۔ "مگر تم دونوں بھی سمجھ لو کہ تمھیں بھی یہی کہنا ہے... میرا ساتھ دو گے تو فائدے میں رہو گے..."

"ہماری طرف سے بے فکر رہیں جناب... لیکن یہ دوسرے..."

"ان کو چھوڑو... یہ کل چلے جائیں گے... ان کی جگہ نئے آجائیں گے، نہ انھیں کسی کا نام اور کام معلوم ہے... نہ آنے والوں کو معلوم ہوگا۔" پیڈرو بولا۔ "شاباش! اب جلدی کرو... اور یہ لو... ایک ہزار تمھارے... اور ایک ہزار تمھارے... ابھی یہی ہیں میرے پاس... بعد میں اور انعام ملے گا۔"

صاف ظاہر تھا کہ پیڈرو ڈرا ہوا ہے۔ وہ اس قتل پر پردہ ڈالنے کے انتظامات اسی لیے کر رہا تھا کہ وہ خود کو الزام سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ سائیں کوئی عام ڈرائیور نہیں تھا کیونکہ وہ ایک خاص آدمی کا افسرِ بکارِ خاص تھا۔ حاجی اس کے قاتل کو آسانی سے معاف نہ کرتا۔ پیڈرو کی پشت پناہی کرنے والے یقیناً طاقتور لوگ تھے مگر انھوں نے بھی پیڈرو کو بے سبب قتل کرتے پھرنے کا کھلا لائسنس نہیں دے رکھا تھا۔

مجھے ان کی گفتگو سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ اس جگہ ابھی پیڈرو کی ماتحتی میں دو ہی افراد تھے، ورنہ وہ سارے کام انہی کے سپرد نہ کرتا... زیادہ مددگار ہوتے تو وہ دو کو تدفین پر مامور کرتا اور دو یا کم سے کم ایک کو لہو کا سراغ مٹانے پر لگاتا لیکن اب جو کچھ کرنا تھا انہی دو کو کرنا تھا۔ ایک شخص کو میں نے رات کے اندھیرے میں دیکھا تھا، جو سائیں کو ڈنگا سمجھا تھا۔ دوسرا گیٹ پر متعین تھا۔

تھا۔ اس طرح میرے حساب سے اندر تین افراد بھی ہو سکتے تھے۔ یہ ناممکن تھا کہ چوکیدار نے گولی چلنے کی آواز نہ سُنی ہو مگر وہ اپنی ڈیوٹی کی جگہ چھوڑ کے نہیں آسکتا تھا۔ چوتھا خود پیڈرو تھا اور نرملا نام کی ایک عورت تھی جو کسی نامعلوم جگہ پہ موجود تھی مگر گولی کی آواز سن کے بھی نہیں آئی تھی تو اس کے متعدد اسباب ہو سکتے تھے۔ وہ گہری نیند میں تھی۔ کسی ساؤنڈ پروف کمرے میں تھی یا ڈر کے مارے باہر نہیں نکلی تھی۔

میں نے اس بنگالی کو دیکھا جس نے دھوتی نما لنگی باندھ لی تھی۔ اوپر اس نے اب بھی کچھ نہیں پہن رکھا تھا۔ صبح کا اُجالا اب باہر کی اُجلی دھوپ کی خبر دے رہا تھا۔ اس روشنی میں میری نگاہ اس لڑکی کو بھی واضح طور پر دیکھ رہی تھی جو موت کی نیند میں بالکل پُرسکون تھی، اس کی آنکھیں بند تھیں اور سر تکیے پر یوں رکھا ہوا تھا کہ شانوں کے گرد بال پھیل گئے تھے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ کسبی تھی۔ ہر عورت جو کسی بھی عُذر، مجبوری پہ خود کو بیچتی ہو طوائف کہلاتی ہے۔ مگر میرے نزدیک وہ بنگالی بھی طوائف تھا۔ اس نے بھی خود کو اسی سکۂ رائج الوقت کی خاطر بیچا تھا جو اس عورت کو ملتا تھا۔ جسم کی قربانی دونوں کے لیے ناگزیر تھی اور فرق اگر تھا تو صرف قیمت کا... نیت کا فرق بہرحال نہ تھا۔ بنگالی نے شاید خود کو ایک لاکھ میں بیچا ہو تو اس عورت نے ایک ہزار میں۔ ہوس، بے ضمیری اور بے حیائی میں دونوں کے جذبات ایک تھے۔

باہر اب قدرے خاموشی تھی۔ شاید دونوں حکم کے غلام اپنا اپنا کام کر رہے تھے اور پیڈرو ان کی کارکردگی سے مطمئن ہو کے کوئی دوسرا معاملہ نمٹانے کے لیے جا چکا تھا۔ میں نے دروازے تک جا کے ایک پٹ کو تھوڑا سا کھینچا اور باہر جھانک کے دیکھا۔ راہداری میں کوئی بھی نہیں تھا۔ دائیں جانب ایک دروازے سے اندر پہنچنے والی دھوپ کا آدھا مستطیل حصہ فرش پر پھیل جانے والے خون کو روشن کر رہا تھا۔ خون کا آدھا داغ سائے میں تھا۔ ایک ہی خون کے دو رنگ نظر آتے تھے۔ جس کا یہ خون تھا وہ کسی بے نشان مدفن کی مٹی میں ملنے کے لیے جا چکا تھا۔

اچانک میں نے نرملا کی آواز سُنی: "چلیے بھئی آپ لوگ... اُٹھ جائیے۔" اس نے تالی بجا کے حکم دینے کے انداز میں کہا۔ "سلوچنا ... ساوتری... شیاما... چلو اُٹھو... ناشتے کا وقت ہو گیا...!" وہ ہر بند دروازے پر دستک دیتی آ رہی تھی۔ دوسرے سب لوگ پہلے ہی جاگ چکے تھے اور صرف پیڈرو کے حکم کی تعمیل میں در بند کیے بیٹھے تھے۔

"اس کا نام کیا ہے؟" میں نے سرگوشی میں بنگالی سے کہا۔

بنگالی نے نفی میں سر ہلایا۔ "ہم نہیں جانتا۔"

"اچھا اس عورت کو جواب دو... کہ تم جاگ گئے ہو۔" میں نے ریوالور ہلا کے کہا۔ "اور تمہارا جواب غلط ہوا تو انجام بھی غلط ہو گا۔"

میں نے دروازے کو اندر سے دبا کے رکھا۔ باقی دروازے کھل چکے تھے اور میں باہر نکلنے والوں کی آوازیں سُن رہا تھا۔ بالآخر نرملا نے اس دروازے کے پٹ پر ہاتھ مارا۔ میں نے بنگالی کے سر کا نشانہ لیا۔

"چلو، اب باہر آجاؤ... کوئی خطرے کی بات نہیں رہی۔"

"آتا ہے دیدی۔" بنگالی نے ریوالور پر نظر جما کے کانپتی آواز میں جواب دیا۔ نرملا مطمئن ہو کے لوٹ گئی۔ اس کی اونچی ہیل پکے فرش پر تال دیتی ہوئی نرملا کے دور ہو جانے کی خبر دیتی گئی۔

"تم نے ایک رات اس عورت کے ساتھ گزار لی اور اس کا نام پوچھنا بھی ضروری نہیں سمجھا۔" میں نے کہا۔

"ہم پوچھا تھا۔" بنگالی بولا۔ "اُس نے نہیں بتایا۔ بولتا تھی، نام لاش ہے۔"

"کیوں؟" میں نے چونک کر لڑکی کے بے جان جسم کی طرف دیکھا۔

"بولتا تھی... ہم مر گیا ہے۔" بنگالی نے کہا۔ "ہم وہ لڑکی نہیں رہا جس کا کوئی نام ہو... پہلے نام تھا۔ گھر تھا اور ماں باپ تھا۔ اب کچھ نہیں ہے۔"

"اور... تم نے...؟" کوئی چیز میرے حلق میں اٹکنے لگی۔

"ہم بولا کہ یہ کیا بات ہے؟ ہم کو اپنا گھر اور ماں باپ کے بارے میں بتاؤ... یہ بولا کہ نئیں... ہم کچھ نئیں بتائے گا۔ ان کا خراب نہیں کرے گا... ہم تو مر گیا ہے مگر ان لوگ کو جینا ہے۔ ایسا ویسا سوال مت کرو... ہم سچ نئیں بولے گا... روز ہم ایک جھوٹا اسٹوری سناتا ہے اور اب کوئی اسٹوری بھی نئیں ہے۔ سب تنگ کرتا ہے۔ ہمارا بارے میں پوچھتا ہے... ہم کو کسی کا نئیں چاہیے... ہم بھی کسی سے نئیں پوچھتا ہے کہ تم کون ہے، تم بھی مت پوچھو۔"

میرے ہاتھوں ماری جانے والی لڑکی مرنے سے پہلے ہی مر چکی تھی۔ وہ خود کو لاش سمجھتی تھی اور اب ایک لاش ہی تھی۔ جس طرح وہ اپنے کسی خریدار کا نام و نسب نہیں پوچھتی تھی، اسی طرح مرنے سے پہلے اس نے اپنے قاتل کے بارے میں کچھ نئیں جانا تھا۔ رنج اور ندامت کے احساس سے بوجھل ایک سرد آہ خود بخود میرے سینے سے نکل گئی۔

"تم خود کون ہو؟" میں نے کہا۔

"ہم طاہر میاں۔" وہ بولا۔

"گویا مسلمان اور پاکستانی...!" میں نے تلخی سے کہا۔

وہ چُپ چاپ کھڑا رہا... اُسے خوف ضرور لاحق تھا کہ میرے ہاتھوں اس کا انجام کیا ہو گا۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ وہ شرمندہ نہیں ہے۔

"کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"بنگلہ دیش..." اُس نے کہا۔

میں اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا اور میرا اُلٹا ہاتھ اس کے منہ پر یوں پڑا کہ وہ پیچھے لاش کے اوپر گرا۔ آس پاس کے کمرے خالی ہو چکے تھے۔ چنانچہ اس طمانچے کی آواز کسی نے نہیں سنی۔ وہ چلّانے ہی والا تھا کہ میں نے پھر اُس کے مُنہ میں ریوالور گھسیڑ دیا۔

"تم زندہ رہنا چاہتے ہو تو میرے ساتھ تعاون کرو... مجھے ہر بات کا ٹھیک ٹھیک جواب دو۔" میں نے کہا۔ "اس لڑکی کے ساتھ ہی میں تمہاری گردن بھی توڑ سکتا تھا۔ تمہیں یہ رعایت اسی شرط پر مل سکتی ہے... ورنہ تمہاری جگہ دوسرا لے سکتا ہے۔"

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھتا رہا۔

"اسے ڈھانپ دو۔" میں نے آہستہ سے پیچھے ہٹ کے کہا۔ اور مجھے غالب کا فرمودہ یاد آیا۔ "ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی، میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا۔" یہ بات اس لڑکی پر کتنی صادق آتی تھی۔

طاہر میاں نے چادر کو پھر لاش کے اوپر تک کھینچ دیا۔

"میں اپنا سوال دہراتا ہوں... کہاں کے رہنے والے ہو تم؟"

"مشرقی بنگال...!"

میں نے پھر اس کے مُنہ پر ویسا ہی اُلٹا ہاتھ مارا۔ "مشرقی پاکستان کہو... میں آخری بار پوچھوں گا اور اس مرتبہ غلط جواب ملا تو اپنی گردن کے ٹوٹنے کی آواز بھی شاید نہ سُن پاؤ۔ کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"مشرقی... پاکستان کا...!" وہ آنکھوں میں آنسو بھر کے بولا۔

"مشرقی پاکستان کے کس شہر، ضلع یا دیہات کے...؟"

"چاٹگام۔" اس نے مختصر ترین جواب دیا۔

"کتنے عرصے پہلے یہاں آئے تھے؟"

"ایک مہینہ ہوا۔" وہ بولا۔

"اکیلے آئے تھے؟ یا اُن سب کے ساتھ۔" میں نے دوسرے خالی کمروں کی طرف اشارہ کیا۔

"ہم چھ آدمی آیا تھا۔" وہ بولا۔

یہ آدمی مجھے بہت کچھ بتا سکتا تھا لیکن میرے پاس وقت کم تھا۔ جو لوگ نہا دھو کے ناشتا کرنے گئے ہوئے تھے انہیں اچانک خیال آ سکتا تھا کہ ان کے دو ساتھی غیر موجود ہیں اور کوئی بھی ان کو جگانے کے لیے آ سکتا تھا۔ اگر کوئی آ جاتا تو اس کیمپ میں کسی دشمن کی موجودگی کا راز ایک لاش کی ٹوٹی ہوئی گردن سے فاش کر دیتی۔

"اس وقت سب لوگ کہاں ہوں گے؟" میں نے کہا۔

"کچن میں..." وہ بولا۔ "ناشتا کے لیے۔"

"کچن کہاں ہے؟"

"آخری حصے میں۔" بنگالی نے کہا۔ "سیدھا ہاتھ پر۔"

"اگر میں باہر جانا چاہوں۔" میں نے کہا۔ "تو میرے لیے کون سا راستہ محفوظ ہو گا؟"

"سامنے سیدھا ہاتھ پر دروازہ ہے۔ اس میں سے باہر جاؤ اور دیوار کے اوپر سے کود جاؤ۔" وہ بولا۔

"مجھے کوئی نہیں دیکھے گا؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔

"نہیں..." وہ بولا۔ "ادھر کوئی نہیں ہوتا۔ اس وقت سب"

"باہر دو آدمی ایک قبر کو دوبارہ کھود رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

"وہ ادھر نہیں ہے۔" بنگالی نے کہا۔ "تم مشرق کی طرف کو جائے گا، وہ سیدھے ہاتھ پر جنوب کی طرف والی دیوار کے پیچھے ہے۔"

"اچھا۔" میں نے کہا۔ "تو پھر اُٹھاؤ اس لاش کو۔ ہم سب اسی راستے سے نکلیں گے۔"

بنگالی کا رنگ پھر اُڑ گیا۔ "تم جاؤ بابا... ہم کو چھوڑ دو۔"

میں نے اس کی گردن یوں دبوچ لی کہ اس کا سانس رُکنے لگا اور آنکھیں باہر نکل آئیں۔ "تم کو میرے ساتھ جانا ہے یا دنیا سے جانا ہے؟"

بلاشبہ وہ ایک بزدل آدمی تھا۔ ہر غدار لالچی، کمینہ اور بزدل ہوتا ہے ورنہ وطن کی خاطر جان دینے سے نہ ڈرے۔ بنگالی نے بڑی مشکل سے سر ہلا کے رضامندی کا اظہار کیا۔ میں نے اُسے چھوڑ دیا۔ ابھی وہ لاش کو چادر میں لپیٹ کر اُٹھانے کی سوچ ہی رہا تھا کہ باہر سے زنانہ سینڈل کی ٹک ٹک سنائی دینے لگی۔ نرملا کسی سے باتیں کرتی ہوئی آ رہی تھی۔

"بس وہی دونوں سوئے پڑے ہیں۔"

"تم جگاؤ انہیں اور تیار کرو۔" پیڈرو نے کہا۔ "میں ذرا گاڑی لے کر جاتا ہوں۔"

"زیادہ دیر مت کرنا۔" نرملا بولی۔ "ان سب کو آج جانا ہے۔"

"میں بس گیا اور آیا۔" پیڈرو بولا۔ "زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں... مجھے سڑک تک جا کے بوٹے کو دیکھنا ہے۔ وہ پیدل آنے والا تو ہے نہیں... بیٹھا ہو گا سڑک کے کنارے اس انتظار میں کہ کوئی آئے اور لے جائے۔"

"کون ہے یہ بوٹا؟"

"وہی کلینر... جو ٹرک کے ساتھ تھا۔ وہی کام آ سکتا ہے اب... اسے ٹرک چلانا بھی آتا ہے اور یہ ذمے داری بھی سونپی جا سکتی ہے۔"

"تم کو بھروسا ہے اس پر، تو ٹھیک ہے۔"

"وہ بھی حاجی کا خاص آدمی ہے۔ میں بوٹے کو سمجھا لوں گا

کہ اُسے کیا بیان دینا ہے۔" پیڈرو بولا۔

"اگر وہ راضی نہ ہوا..." نرملا نے کہا۔ وہ دونوں شاید دروازے کے سامنے ٹھہر گئے تھے۔

"راضی کیوں نہیں ہوگا۔ اسے ڈرائیور بننے کا موقع ملے گا۔ میری طرف سے دس ہزار کی رشوت ملے گی۔" پیڈرو بولا۔ "صرف یہی کہنا ہے اُسے کہ ڈرائیور سائیں کو اس کا ضمیر گمراہ کرنے لگا تھا اور وہ ٹرک سمیت کسی تھانے میں حاضر ہونے کی سوچ رہا تھا چنانچہ میں نے اُسے مار دیا اور ٹرک میں اس کی لاش یہاں لے آیا۔ لاش ہم دکھا سکتے ہیں حاجی کو۔ وہ ایک نمک حرام کے مارے جانے پر خوش ہوگا اور بوٹے کو اس کی جرأت اور فرض شناسی پر انعام دے گا۔ بوٹا یقیناً ہم سے تعاون کرے گا۔"

"ٹھیک ہے تم جاؤ۔"

"میری واپسی تک سب کو تیار رکھنا۔" پیڈرو نے کہا اور شاید باہر نکل گیا کیونکہ اس کی آواز کچھ فاصلے سے سنائی دی تھی۔

نرملا سینڈل بجاتی آگے آئی۔ میں نے بنگالی کو اشارہ کیا کہ وہ لاش کے سا... جائے۔ اس نے دہشت زدہ نظروں سے مجھے دیکھا... سے چند انچ کا فاصلہ رکھتے ہوئے لیٹ گیا

بھنگی کیا کھا کے سوئے ہو..." نرملا نے دروازہ بجاتے ہوئے کہا۔ "کیا اُٹھنے کا ارادہ ہی نہیں ہے...؟" وہ نہایت بے شرمی سے ہنسی۔ "ارے بابا یہ تمھاری زندگی کی آخری رات تو نہیں تھی۔"

پھر وہ اندر آ گئی کیونکہ اُسے جواب نہیں ملا تھا۔ وہ یقیناً جانتی تھی کہ اس دروازے میں کنڈی اندر سے نہیں لگائی جا سکتی۔

وہ دروازے سے سیدھی بیڈ کی طرف گئی۔ اس نے مجھے نہیں دیکھا جو دروازے کے پیچھے تھا۔ یہ چند سیکنڈ کی مہلت تھی۔ اس کے بعد نہ میں خود کو چھپا سکتا تھا اور نہ حقیقت کو... وہ ابھی بیڈ تک نصف راستہ ہی طے کر پائی تھی کہ میں نے ایک پاؤں کی ٹھوکر سے دروازہ بند کر دیا۔ وہ چونک کر تیزی سے پلٹی اور ایک لمحے کے لیے اپنی جگہ پر منجمد ہوگئی۔ میں نے اسی ایک لمحے میں اسے دبوچنے کے لیے جست لگانے کی غلطی کی، غیر متوقع طور پر نرملا غوطہ مار کے نیچے سے نکل گئی اور میں اپنے ہی زور میں سیدھا... گیا تو اس لاش پر گرا جو ٹھنڈی ہو کے اکڑنے لگی تھی۔ بنگالی حلق سے عجیب سی آواز نکال کے اُچھلا مگر میں نے اُسے اہمیت نہیں دی۔ میں نے نرملا کو دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اس کی پھرتی نے مجھے حیران بھی کر دیا تھا اور یہ سبق بھی پھر سکھا دیا تھا کہ حالات کیسے بھی ہوں، مجھے محتاط رہنا چاہیے اور اپنی طاقت کی برتری پر اندھا یقین رکھنے سے گریز کرنا چاہیے۔

میں گرتے ہی اٹھا اور ابھی نرملا دروازے میں ہی تھی کہ میرے ہاتھ نے اُسے واپس اندر کھینچ لیا۔ اُس نے ایک چیخ ماری... پھر میں نے اُس کے سر پر ریوالور کا بٹ مارا اور وہ ... فرش پر گر گئی۔ اس ایک چیخ نے صورتِ حالات بدل دی... کمرے کے اندر کی جنگ باہر تک پھیل گئی۔ میں اندازہ کر... کہ اس چیخ کو ان سب نے سنا ہوگا، جو وہاں موجود تھے ... کیمپ کے محافظ تو ضرور اس چیخ کا سبب جاننے کے لیے ... گئے۔ وہ سب آئیں نہ آئیں جو خود کو متاعِ جسم و جاں کے ... رکھ چکے تھے۔ ابھی تک میں نے ریوالور کو کافی سمجھا تھا ... نے ریوالور جیب میں ڈال کر مشین گن اٹھانے کا ارادہ ... عین ... وقت یہ خیال بنگالی کو بھی آیا کہ وہ میری مشین گن... مجھے بھون ڈالے۔

وہ مشین گن اُٹھا چکا تھا جب میں نے اس کی طرف چھلانگ لگائی۔ وہ کمرے کی لمبائی کے رُخ پیچھے ہٹتا تو ... مشین گن کو سیدھا کر کے فائر کرنے کا موقع مل جاتا مگر بد ... میں اس کے لیے کچھ سوچنا ممکن ہی نہیں رہا تھا۔ میں نے ... سے اسے دیوار کے ساتھ جا لیا۔ اس نے آخری وقت میں ... اُٹھا کے مجھ پر مارنی چاہی۔ لیکن میں نے وار کو اُس کے ہاتھ ... پہنچنے پر روکا اور ایک جھٹکے میں مشین گن چھین لی۔ وہ سمجھ گیا ... اس 'بغاوت'، کی سزا کیا ہوگی چنانچہ وہ چلّانے لگا۔ "کھون ... ہیلپ..." پھر میرا سیدھا ہاتھ پھسل کر اس کی گردن پر جم گیا ... نے اسے اپنی طرف کھینچا اور جب وہ آگے آیا تو میں نے ... گھٹنا اُٹھا کے اس کے پیٹ پر مارا۔ وہ بلبلا کے دُہرا ہوا اور ... اٹھی ہوئی ٹانگ پر لٹک گیا۔ اس کا جسم کمان ہو رہا تھا ... درد سے تڑپ رہا تھا کیونکہ اس سے زیادہ لچک اس کے ... میں تھی ہی نہیں۔ میں نے ایک زوردار جھٹکا دیا اور ... گردن ایسے چٹخ کر ٹوٹی جیسے سوکھی ہوئی لکڑی ٹوٹتی ہے ... اور ساکت ہو گیا۔ اس کی گردن جو صرف گوشت پوست کے ... اور لچکدار رگوں کے ساتھ جسم سے جُڑی رہ گئی تھی، لمبی ہو کے ... تک چلی گئی اور اس کا سر میرے گھٹنے کے اوپر سے دو ... طرف پنڈولم بن کے جھولنے لگا۔

میں نے اُسے نیچے گرا دیا۔ یہ سب ایک منٹ ... وقت میں ہو گیا تھا۔ گناہ کی ایک رات کی مسافت میں شر... سفر رہنے والے تھوڑے سے فرق سے راہِ عدم پر روانہ ہو... تھے۔ مشین گن تھام کے میں نے دروازے کے قریب پوزیشن ... سنبھال لی جہاں نرملا بھی لاش کی طرح بے حس و حرکت پڑی ... تھی۔ لیکن مجھے باہر کسی قسم کی ہلچل محسوس نہیں ہوئی۔ بنگالی ... خوف سے حلق میں گھُٹ کر رہ گئی تھی لیکن نرملا کی چیخ بہت ... تشکاف تھی اور بیرک کے اندر آخری حصے تک بھی پہنچی ہو... کوئی آیا کیوں نہیں، کیا اس ... یہاں ایسی چیخوں کو سننے والے کان بے حس تھے؟ یہاں ایسی چیخوں سے دل نہیں دہلتے تھے کیونکہ یہاں دردمندی کا رشتہ کوئی نہیں رکھتا تھا۔ یہ خود غرض جذبوں سے مغلوب انسانوں کی دنیا تھی جس میں صرف اپنی ذات اور اس کے مفادات کا تحفظ اہم تھا۔ کون آیا اور کون گیا، کیوں گیا اور کیسے گیا... اور کہاں گیا... اس سے کسی کو کیا۔ شاید یہاں ہر روز چلّانے والے چلّاتے ہوں گے۔ کسی غلطی پہ ملنے والی سزا کے خلاف فریاد کرتے ہوں گے اور مدد کے لیے پکارتے ہوں گے مگر کوئی نہیں آتا ہوگا۔ حاکموں کا حکم ہوگا کہ خبردار جو کوئی دخل در معقولات کا مرتکب ہوا۔ پیڈرو نے گزشتہ روز کسی لڑکی کے دفن کیے جانے کا ذکر کیا تھا۔ اسی قبر میں دوسرا مردہ اتارا جا رہا تھا لیکن سب چپ تھے۔ وقتی طور پر جو اضطراب کی لہر اٹھی تھی اسے پیڈرو کی ایک ڈانٹ نے دبا دیا تھا۔ وہ اس چیخ کو سُن کر بھی دبک گئے ہوں گے یہ سوچ کر رہ گئے ہوں گے کہ جو ہوگا، سامنے آ جائے گا۔ انھیں کیا ضرورت ہے کہ دخل اندازی کا الزام لیں۔

لیکن محافظ... کیا انھوں نے بھی نرملا کی چیخ نہیں سُنی تھی؟ میرے اندازے کے مطابق یہاں کم سے کم چار افراد تھے۔ ان میں سے پیڈرو گیا ہوا تھا۔ چوکیدار باہر کے گیٹ پر تھا۔ باقی دو قبر کھود رہے تھے۔ کسی کے بھی نہ آنے کے ظاہری اسباب میری سمجھ میں آ چکے تھے لیکن اصل اسباب مختلف بھی ہو سکتے تھے۔ محافظ چار کے بجائے آٹھ یا دس بھی ہو سکتے تھے یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اتنی دیر میں وہ کسی خطرے کے خلاف مؤثر کارروائی کے لیے اقدامات میں مصروف ہوں۔

میں نے دروازے کا پٹ تھوڑا سا کھول کے باہر جھانکا۔ مجھے باہر نکلنے کا راستہ صاف نظر آیا۔ خون جو راہداری میں تھا ابھی صاف نہیں ہوا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ دونوں حکم کے غلام ابھی تک ڈرائیور کو گاڑنے میں مصروف ہیں۔ میں نے نیچے پڑی ہوئی نرملا کو دیکھا اور ایک لمحے میں فیصلہ کر لیا۔ مجھے پیڈرو کی واپسی سے پہلے ہی اس جگہ کو چھوڑ دینا چاہیے ورنہ محصور ہو جانے کے بعد میں کچھ نہ کر سکوں گا۔

میں نے نرملا کو اُٹھا کے بائیں کندھے پر ڈال لیا... وہ گدرائے ہوئے بدن والی جوان لڑکی تھی لیکن بہت ہلکی پھلکی۔ اس کی دونوں ٹانگیں میری پشت کی جانب رہیں اور دونوں ہاتھ آگے رہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کی کمر ایک بالشت تھی ورنہ میرے شانے پر اس کا جسم متوازن کیسے ہوتا۔ اس کا چہرہ بھی آگے کی جانب جھکا رہا اور اس کے کالے بالوں کی چوٹی میرے گھٹنوں تک پہنچ گئی۔ وہ جنوبی ہندوستان کے کسی حصے کی رہنے والی معلوم ہوتی تھی۔ اپنی سانولی رنگت کے باوجود صورت کے تیکھے نقوش اور بڑی بڑی غلافی آنکھوں میں جادو کا اثر رکھنے والی۔ اس نے بالوں میں ناریل کا تیل لگا رکھا تھا اور اس کے جسم سے بھی کچے ناریل کی مہک آتی تھی۔ تازہ اور میٹھی۔

اس کے کومل بوجھ کو سنبھالے، مشین گن اٹھائے میں باہر نکلا اور دبے پاؤں آگے بڑھنے لگا۔ دروازے تک پہنچنے کے بعد میں نے باہر جھانکا۔ بیرک کے عقبی حصے میں ایک دیوار تھی لیکن میں اکیلا بھی اس دیوار کو عبور نہیں کر سکتا تھا۔ دیوار تقریباً دس فٹ بلند تھی اور اس کے اوپر ایک ایک فٹ کے فاصلے سے خاردار تاروں کی تین لکیروں کا حصار تھا۔ انھیں چھوئے بغیر میں ہزاروں وولٹ کے اس کرنٹ کو دیکھ سکتا تھا جو ایک بے وجود اور نظر نہ آنے والی ہلاکت خیز قوت تھی۔

بیرک سے دیوار تک کا فاصلہ اٹھارہ بیس گز تھا۔ دیوار کے دامن میں حلقہ در حلقہ اُلجھے ہوئے خاردار تاروں کا جال بچھا ہوا تھا اور یہ دیوار مجھے دونوں جانب پچاس پچاس گز تک پھیلی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ بنگالی نے مجھ سے غلط بیانی کی تھی چنانچہ اب مجھے دائیں یا بائیں اپنے رسک پر جانا تھا۔ بیرک تو مشکل سے بیس گز لمبائی رکھتی تھی۔ اس کے دونوں جانب چالیس گز تک کھلا میدان کس لیے رکھا گیا تھا، یہ آگے جا کے ہی معلوم ہو سکتا تھا۔

بیرک کی دیوار کے ساتھ لگ کر چلتے ہوئے میں دو بند دروازوں اور تین کھلی کھڑکیوں کے سامنے سے گزرا۔ کھڑکیوں کی فرش سے اونچائی چار فٹ تھی۔ میں اکیلا ہوتا تو جھک کے گزر جاتا لیکن نرملا کے ساتھ یہ ناممکن تھا۔ میں اُسے پیچھے بھی نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ ایک تو وہ کسی حد تک میری ڈھال تھی۔ اسے اپنے تحفظ کی ضمانت بنا کے میں نکلنے کی کوشش مزید کر سکتا تھا۔ پھر وہ دوسری سب لڑکیوں کے مقابلے میں مجھے زیادہ مفید معلومات فراہم کر سکتی تھی چنانچہ میں ہر کھڑکی کے سامنے سے سیدھا گزر گیا۔

بیرک کا موڑ کاٹتے ہی میری نظر نے سب سے پہلے ان دونوں کو دیکھا جو دھوپ میں کھڑے ہوئے ایک قبر سے مٹی نکال رہے تھے۔ انھوں نے یہ کام تقریباً مکمل کر لیا تھا۔ مٹی کا ڈھیر قبر کے دونوں کناروں پر جمع تھا اور ان میں سے ایک قبر میں اترا ہوا تھا۔ دوسرا اسے اوپر سے دیکھ رہا تھا۔ وہ بے حد مضبوط جسم کا مالک اور قد آور شخص تھا۔ اس کا رنگ کالا تھا اور بال چھوٹے۔ پسینے میں مل کر کیچڑ بن جانے والی مٹی اس کے چہرے اور ہاتھوں پر پھیل گئی تھی۔ دوسرے کی صورت مجھے اس وقت نظر آئی جب وہ بیلچے سے مٹی اوپر پھینکنے کے لیے اُٹھا۔ وہ باہر کھڑے ہوئے شخص سے بہت زیادہ مشابہ تھا۔ یہ ایک جیسے رنگ اور حلیے کا نتیجہ تھا یا ان کی شکلیں واقعی جڑواں بھائیوں جیسی تھیں۔

کرنا مشکل تھا۔

دوسری طرف وہ ٹرک ان سے دس گز دُور اور بیرک کی سیدھ میں کھڑا ہوا تھا جس نے مجھے یہاں پہنچایا تھا۔ ٹرک کے اوپر سایہ رکھنے کے لیے ترپال پھیلا دی گئی تھی مگر میں اس کا نمبر دیکھ سکتا تھا۔ لمبائی کے مقابلے میں اس احاطے کی چوڑائی نصف تھی۔ باقی خالی جگہ میں مجھے دو چوکور سیمنٹ کے قطعے نظر آئے جو کسی مین ہول کے چوکور ڈھکن لگتے تھے۔ ظاہر ہے یہ زیرِ زمین کروں یا تہ خانوں کے راستے تھے اور میں فرض کر سکتا تھا کہ ان تہ خانوں میں اسلحہ رکھا جاتا ہوگا۔

اگر میں اگلے موڑ تک جاتا تو شاید مجھے وہ گیٹ نظر آتا جس سے ٹرک اندر آیا تھا لیکن یہ بیس گز کا فاصلہ طے کرنے سے پہلے ہی مجھے دونوں گورکن دیکھ لیتے۔ میں اس انتظار میں تھا کہ دوسرا بھی قبر سے باہر آجائے۔

اوپر آتے ہی اس نے مجھے پہلے دیکھا کیونکہ دوسرا شخص میری جانب پیٹھ موڑے کھڑا ہوا تھا۔ ڈرائیور سائیں کی لاش اسی کے قریب ہی مٹی کے فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ قبر کے گڑھے سے نکلنے والے نے اپنے ساتھی سے چلّا کے کچھ کہا اور خود ایک جست لگا کے کچھ اٹھانے کے لیے جھکا۔ دوسرا اتنی دیر میں میری جانب پلٹ کر دیکھ چکا تھا اور اس کا ہاتھ بڑی تیزی سے حرکت میں آیا تھا لیکن اس سے زیادہ برق رفتاری کا مظاہرہ میں نے کیا۔ خاموش فضا مشین گن کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھی اور وہ دونوں پلٹ کے تھوڑا سا اُچھلے اور زمین پر لوٹنے لگے۔ گولیاں ایک کے پیٹ اور سینے میں لگی تھیں اور دوسرے کے بازو، زخرے اور کمر کے نچلے حصے میں۔ اس کا اندازہ مجھے خون کی پھوٹتی دھاروں سے ہوا۔

میں نرملا کو اُٹھائے ہوئے بھاگا۔ ابھی میں قبر کی خندق سے آٹھ دس فٹ دور تھا کہ پہلا فائر ہوا اور گولی میرے کان کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ دوسری گولی نے میرے بازو کو مَس کیا اور مجھے ایک جلتی ہوئی خراش سی محسوس ہوئی۔ پھر میں نے نرملا کو نیچے پھینکا اور خود قبر میں کود گیا۔ میں اس لاش پر گرا جو چوبیس گھنٹے پہلے دبائی گئی تھی۔ ایک عجیب سی کراہیت رکھنے والی اور دماغ کو ماؤف کرنے والی بدبو نے اور اس خیال نے کہ میں ایک لاش پر کھڑا ہوں، میرے احساس کو شدید صدمے سے دوچار کیا لیکن میرے لیے اور کوئی جائے پناہ بھی تو نہ تھی۔ اس قبر کے مورچے میں بیٹھ کے میں زندگی کی جنگ لڑ سکتا تھا۔

فائرنگ اب تین طرف سے ہو رہی تھی۔ میرا یہ اندازہ غلط ہو گیا تھا کہ وہاں پیٹر و سمیت چار افراد کیمپ کی نگرانی کرتے ہیں۔ دو کو میں نے پہلے ہی راؤنڈ میں مار دیا تھا اور اس کے باوجود تین مجھے گھیرے میں لینے کے لیے مسلسل گولیاں چلا رہے تھے۔ میں نہیں سکتا تھا لیکن اندازہ ضرور کر سکتا تھا کہ بے ہوش نرملا کتنی گولیوں کا نشانہ بنا ہوگا۔ میں اسے پھینکنے پر مجبور تھا کیونکہ قبر کے اندر اس کے لیے جگہ نہ تھی۔ میں اُسے لے کر کودتا تو خود بھی پھنس جاتا اور آزادانہ حرکت نہ کر پاتا۔ قبر میں ایک مردہ اور دو زندہ انسانوں کو پناہ دینے کی گنجائش نہیں تھی۔

"تم جو بھی ہو،" کسی نے چلّا کے کہا۔ "باہر آجاؤ۔" لہجے تحکمانہ انداز سے وہ مجھے کوئی فوجی لگا۔ "ورنہ وہیں مارے جاؤ گے جہاں اس وقت چھپے ہو...."

"تم مقابلہ نہیں کر سکتے۔" یہ دوسری آواز تھی۔

"اپنا اسلحہ پہلے باہر پھینک دو۔" تیسرے شخص نے تیسری سمت سے کہا۔ وہ میرے سامنے اور دائیں بائیں سے بول رہے تھے۔

"وِل یو تھاٹ آف یو بلیز شٹ اَپ۔" پہلے شخص نے سختی سے کہا۔ "میں بات کر سکتا ہوں... یا تم زیادہ قابل ہو؟"

"سوری کرنل۔" ایک ساتھ بولنے والے ماتحت چپ ہوئے۔

"تم نے سُنا... میں نے کیا کہا ہے۔" کرنل نے چند سیکنڈ خاموشی کے بعد کہا۔ "یو آر اے فول... اگر تم سمجھتے ہو کہ لڑتے ہوئے یہاں سے نکل جاؤ گے۔ اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو۔ اس کے بعد میں دیکھوں گا۔"

"کیا دیکھو گے تم کرنل بھوت ناتھ؟" میں نے چلّا کے جواب دیا۔ "تم دنیا کو آخری بار دیکھ رہے ہو... زندہ رہنا چاہتے ہو تو ہتھیار ڈال دو اور ہاتھ اوپر اُٹھا کے آگے آجاؤ۔"

"ہی از میڈ..." کرنل نے کچھ حیران ہو کے کہا۔ "کیا تم پاگل ہو۔ کیا تمھیں معلوم ہے کہ تم کہاں بیٹھے ہو، آخر تم ہو کون؟"

"میں یم دُوت ہوں... موت کا فرشتہ۔" میں نے قہقہہ لگا کر اونچی آواز میں کہا۔ "جس نے تمھارے باپ، تمھارے دادا، پردادا اور لکڑ دادا سب کی جان لی تھی۔ آج تمھاری باری ہے۔"

کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر کرنل نے کہا۔ "کیا تم سکندر بخت ہو؟" غالباً وہ اپنے کسی ماتحت سے مشورہ کرتا رہا تھا۔

"ہم سب سکندر بخت ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم میں سے ہر ایک سکندر بخت ہے کیونکہ سکندر بخت صرف ایک نام ہے۔ ہم سب ایک جذبہ ہیں۔ ایک مشن ہیں اور ایک منزل ہیں۔"

"بکواس بند کرو۔ میں تمھیں صرف دس سیکنڈ دوں گا۔" کرنل نے برہمی سے کہا۔ "مجھے بے وقوف بنانے کی ضرورت نہیں۔ کفن پوش مجاہدوں نے ہمیں ہر طرف سے شوقِ شہادت میں ... ہے۔ یہاں چڑیا کا بچہ بھی پَر مارے تو ہمیں پتا چل جاتا ہے۔"

"چڑیا کے بچے... میں تم کو نو سیکنڈ دیتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"نو سیکنڈ؟" کرنل نے تمسخر اڑانے کے انداز میں کہا۔ "اس کے بعد تم کون سی توپ چلاؤ گے؟"

"تمھاری اپنی توپ۔" میں نے کہا۔ "کیا میں کاؤنٹ ڈاؤن شروع کر دوں؟"

"ضرور کرو... لیکن یہ خیال رکھنا کہ ایک دستی بم پانچ سیکنڈ میں تمھارے کاؤنٹ ڈاؤن کو ختم کر سکتا ہے۔"

"ایسی کوئی بھی حرکت خودکشی کہلائے گی۔" میں نے کہا۔ "ایک سیکنڈ سے بہت کم وقت میں گولی اس ٹرک تک پہنچ جائے گی جسے میں اپنے سامنے دیکھ رہا ہوں۔ شاید تم بھی دیکھ سکتے ہو۔ میرا نشانہ اس کا پیٹرول ٹینک ہوگا۔ جب پیٹرول میں آگ لگے گی اور ٹینک پھٹے گا تو تم اور تمھارا یہ سارا شیطانی کارخانہ دُھواں بن کے اُڑ جائے گا۔"

خاموشی کا ایک مختصر وقفہ آیا جس سے مجھے اپنی دھمکی کے کارگر ہونے کا یقین آیا۔ شاید وہ آپس میں صلاح مشورہ کر رہے تھے۔ بالآخر کرنل نے کہا۔ "ہم تمھیں بحفاظت نکل جانے کا موقع دے سکتے ہیں۔"

"تھینک یو... میں خیرات میں کچھ نہیں لیتا۔" میں نے کہا۔ "اپنے لیے یہ موقع میں خود حاصل کر لوں گا... لیکن ایسی ہی فراخدلانہ پیش کش میری طرف سے بھی ہے۔"

"تم یہ کہہ رہے ہو کہ ہم سب نکل جائیں۔" کرنل نے برہمی سے کہا۔

"اگر تم آن ڈیوٹی مرنا چاہتے ہو... تو یو آر ویلکم..." میں نے کہا۔ "تم دستی بم پھینکو... میں ایک گولی چلاتا ہوں... تمھارے ساتھ یہ سب کرائے کے مرد اور عورتیں... غدّاروں اور طوائفوں کا یہ ٹولہ بھی ختم ہو جائے گا۔"

"اور تم بچ جاؤ گے؟" اس نے طنز سے کہا۔

"ہم الگ الگ مقصد کے لیے جان دیں گے۔" میں نے کہا۔ "چنانچہ میں شہید کہلاؤں گا اور تم جہنم رسید ہو جاؤ گے۔ یہ تمھارے لیے گھاٹے کا سودا ہو سکتا ہے... میرے لیے نہیں..."

میں بڑی مشکل صورتِ حال میں گرفتار تھا۔ میرے ذہن میں ایسی کوئی صورت نہ تھی کہ میں بحفاظت اس مورچے سے نکل سکوں۔ ان کی پیش کش بھی ایک دھوکا تھی۔ اس بات کی کوئی ضمانت نہیں تھی کہ میرے باہر نکلتے ہی وہ مجھے گولیوں سے چھلنی نہیں کریں گے۔ میں انھیں مجبور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ سامنے آئیں اور خود کو میرے حوالے کر دیں... اگر وہ کہتے کہ ٹھیک ہے ہم جا رہے ہیں۔ تو میں یہ بات کیسے مان لیتا کہ وہ واقعی چلے گئے ہیں... وہاں بیٹھ کے میرے لیے تصدیق کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ میں ان کی صحیح تعداد سے ناواقف تھا۔ ان میں سے آدھے اندر چھپ کے بیٹھ سکتے تھے اور آدھے مجھے یہ تاثر دے سکتے تھے کہ وہ روانگی اختیار کر چکے ہیں۔ میں کچھ دیکھ نہیں سکتا تھا کیونکہ باہر جانے کے لیے استعمال ہونے والا واحد راستہ میری نظر سے اوجھل تھا۔ وہ خود بھی اسی شش و پنج کا شکار تھے کہ اگلی چال کیا ہو۔ شطرنج کی بازی کی طرح سب کے مہرے پھنس گئے تھے اور پہلی غلط چال چلنے والے کو مات ہو سکتی تھی۔

سورج آہستہ آہستہ بلند ہو رہا تھا اور دھوپ کی تیزی میں اضافہ ہونے لگا تھا۔ میں نے رات سے کچھ بھی کھایا پیا نہیں تھا اور زیادہ دیر اس مورچے میں نہیں گزار سکتا تھا جس میں میرے پیروں کے نیچے زمین نہیں، ایک عورت کی لاش تھی۔ یہ احساس ہی میرے اعصاب کو متاثر کرنے کے لیے کافی تھا۔ اضافی عذاب اس تعفن کا تھا جو میرے حواس کو مختل کر رہا تھا۔ باہر مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر کم سے کم تین لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ ایک مقتول سائیں کی اور دو اس کی تدفین پر مامور حکم کے غلاموں کی۔ چوتھی لاش نرملا کی ہو سکتی تھی۔ لیکن میں یہ دیکھ نہیں سکتا تھا کہ ابھی تک وہ بے ہوش پڑی ہوئی ہے یا گولیاں لگنے سے بے ہوشی میں ہی موت سے ہمکنار ہو چکی ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ خود میرے حریف قوتِ فیصلہ سے محرومی کے باعث پریشان ہیں اور میری طرح وہ بھی باتوں میں وقت گزارتے ہوئے کچھ سوچنا چاہتے ہیں۔ ان کی اور میری پوزیشن میں ایک فرق بہت نمایاں تھا۔ وہ جتنا وقت چاہتے گزار سکتے تھے اور اس وقت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اپنے لیے باہر سے مدد حاصل کر سکتے تھے۔ اس کے برعکس میں یہاں دو چار گھنٹے بھی گزار لیتا تو یہ میری قوتِ برداشت کی سخت ترین آزمائش ہوتی۔

دھوپ میرے سر کو گرم کر رہی تھی اور اب قبر کے ایک گوشے سے نیچے بھی پہنچنے لگی تھی۔ ڈرتے ڈرتے میں نے لاش کے چہرے پر نگاہ کی۔ عورت یقیناً جوان تھی لیکن اس کے بالوں اور اس کی آنکھوں میں مٹی بھر گئی تھی۔ اس کے چہرے اور جسم پر نمی نے مٹی کو کیچڑ کی تہ بنا دیا تھا۔ میں صرف اس کا سائڈ پوز دیکھ سکتا تھا۔ جب اسے قبر میں پھینکا گیا تھا تو وہ منہ کے بل گری تھی اور اُلٹی پڑی رہ گئی تھی۔

مشین گن میرے ہاتھ میں تھی اور میری ہتھیلیاں پسینے میں تر ہو رہی تھیں۔ اس وحشتناک ماحول کے عذاب کا ہر لمحہ میرے لیے شکست کے اسباب فراہم کر رہا تھا۔ دشمن کی طرف سے خاموشی کا وقفہ

بھی بہت سے اندیشوں کو جنم دیتا تھا۔ معلوم نہیں اب وہ کیا کرنا چاہتے ہیں اور ان کی نئی حکمتِ عملی کیا ہوگی۔ میرے مقابلے میں ان کا زیادہ پُراعتماد ہونا بھی جائز تھا۔ بکر میں محصور تھا اور وہ محاصرہ کیے بیٹھے تھے۔ آہستہ آہستہ میری گردن اور کمر سے بہنے والا پسینہ ایڑیوں تک پہنچنے لگا تھا۔

پھر اچانک صورتِ حالات میں ایک ڈرامائی عنصر شامل ہو گیا۔ نہ جانے کہاں سے کسی نے چیخ کر کہا۔ "ہوشیار ہو جاؤ کتو... تم سب کی موت کا وقت آ گیا..." وہ قہقہہ مار کے ہنسا... اس ہنسی میں صرف دیوانگی تھی۔

"مدن موہن... تم...!" میں نے کرنل کی آواز سُنی۔

"ہاں... میں... مدن موہن..." وہ اسی طرح چیخ کے بولا۔ "اچھی طرح دیکھ لو مجھے... میں اس کی روح نہیں ہوں... میں جیتا جاگتا مدن موہن ہوں۔"

"مگر... یہ تم... کیا کر رہے ہو؟"

"وہی جو مجھے کرنا چاہیے... جو تم نے میری موہنی کے ساتھ کیا تھا کمینو... سور کے بچو... خبردار جو کوئی ہلا بھی... ہتھیار نیچے پھینک دو۔" پھر مشین گن کے ایک برسٹ کی آواز آئی۔ کوئی بڑے بھیانک انداز میں چلّایا۔ یہ سب ڈراما میری نظروں کے سامنے نہیں ہو رہا تھا مگر میری آنکھیں سب کچھ دیکھ رہی تھیں... ابھی ابھی کوئی اس دیوانے مدن موہن کا حکم نہ ماننے کی پاداش میں مارا گیا تھا۔ مگر وہ کون تھا اور کہاں سے سب پر حکم چلا رہا تھا، اس کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔

تاہم ایک بات یقینی تھی۔ وہ اپنے حریفوں کے سامنے سے نمودار نہیں ہوا تھا۔ اس نے انھیں پیچھے سے اچانک اور غیر متوقع طور پر آ لیا تھا۔ ممکن ہے اس نے گیٹ پر متعین محافظ کو بھی خاموشی سے مار دیا ہو۔ محافظ نے اُسے اندر داخل ہونے سے نہیں روکا ہوگا کیونکہ وہ اندر کا آدمی تھا اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ کسی دوسرے راستے سے اندر پہنچا ہو۔ وہ جانتا ہوگا کہ گیٹ کے علاوہ آنے جانے کے کتنے محفوظ راستے ہیں... اور اب وہ انھیں اپنے سامنے بے بس کیے کھڑا ہوا تھا تو میں خاصے وثوق سے کہہ سکتا تھا کہ اب دشمن کی نظر مجھ پر نہیں ہے۔ وہ ایک دم پلٹے ہوں گے اور اب اسی پوزیشن میں کھڑے ہوئے ہوں گے۔

اس خیال نے مجھے بڑی تقویت دی۔ میں نے خدا کا نام لیا اور اس قبر سے باہر نکل آیا جس میں مزید قیام پر تعفن سانس کے ساتھ زیادہ دشوار ہوتا جا رہا تھا۔ میرا دماغ اس بدبو سے پھٹنے لگا تھا۔ مجھے دوپہر تک بھی وہاں کھڑا رہنا پڑتا تو شاید میں پاگل ہو جاتا اور اس اذیت سے چھٹکارا پانے کے لیے دیوانہ وار اپنے دشمنوں پر حملہ کرتا تو مارا جاتا... اب موقع ملتے ہی میں اس جہنم کدے سے نکل بھاگا جہاں اوپر سے آگ برس رہی تھی تو نیچے سے ایک سڑی لاش میرے احساس میں زہر بھرے کانٹے چبھو رہی تھی۔

بیرک کے سامنے تک میں ایک جست میں پہنچ گیا۔ ہر کو میں نے فائر کرنے کی پوزیشن میں تھام رکھا تھا کہ میرے قدموں کی آہٹ کسی کو متوجہ کرے تو سامنے آنے والا پہلا آدمی پہلے ہی سے چھلنی ہو جائے۔ اس کے بعد کوئی مجھے چھلنی کر دے تو میری قسمت... مگر چند سیکنڈ سکوت میں گزر گئے تو میں نے اطمینان کا گہرا سانس لیا اور پلٹ کے دیکھا۔ نرملا کا جسم وہیں ساکت پڑا تھا۔ مجھے ایک نظر میں خون بھی دکھائی نہ دیا۔ شاید مجھ پر گولی چلانے والوں نے احتیاط سے کام لیا تھا اور نرملا کو نشانہ نہ بننے دیا تھا۔ وہ ایک جھاڑی کے پیچھے گری تھی، جہاں سایہ...

"مدن موہن...! ہوش میں آؤ۔" کرنل کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ "کل سے ہم تمھیں تلاش کر رہے ہیں... کہاں تھے تم؟"

میں دبے پاؤں آگے بڑھا اور بیرک کی دیوار کے سائے میں آخری موڑ تک جا پہنچا۔ وہاں سے وہ چند قدم کے فاصلے پر تھے اور میں ان کی ساری گفتگو سُن سکتا تھا۔ میں نے جھانک کر دیکھنے سے گریز کیا۔ اس طرح مجھے مدن موہن دیکھ لیتا اور اس کی نظر ایک لمحے کے لیے بھی ہٹتی تو وہی سیکنڈ اس کی زندگی کا فیصلہ کر دیتا۔

"میں پھر کہتا ہوں کہ ہتھیار نیچے ڈال دو۔" مدن موہن چلّایا۔

"دیکھو مدن موہن...! تم اچھی طرح جانتے ہو کہ... موہنی کو میں نے نہیں مارا تھا... کیپٹن شرما نے مارا تھا..." کرنل کی آواز آئی۔ "اور تم نے اُسے مار دیا... اب یہ مشین گن رکھ دو... ہم بھی رکھ دیتے ہیں... یہ لو... بس؟" وہ چالاک آدمی اپنے ہوش و حواس برقرار رکھتے ہوئے پوری کوشش کر رہا تھا کہ مدن موہن کے اشتعال اور جنون کی کیفیت کو ختم کر دے اور پھر اس پر قابو پا لے۔

"ہاں مدن موہن..." دوسرے فوجی نے کہا۔ "ایسا نہ ہو گولی چل جائے..."

"اپنی موہنی کے قاتل سے تم نے انتقام لے لیا۔" کرنل بولا۔

مدن موہن نے ایک اور پاگل پن سے بھرپور قہقہہ لگایا۔

"ابھی سے گھبرا گئے... شرما نے تو صرف گولی چلائی تھی۔ اُسے چلانے کا حکم کس نے دیا تھا؟ یہ حساب ایسے برابر نہیں ہوگا... تم جانتے ہو کہ میں کہاں چلا گیا تھا... میں تم سب کی موہنیوں کو تلاش کر رہا تھا... شرما کی موہنی اور اس کے بھائی لیفٹیننٹ ورما کی... وہ دونوں مجھے ایک ہی گھر میں ایک ہی جگہ مل گئیں۔ اس سے میرا کام آسان ہو گیا... پھر میں تمھاری موہنی کے پاس گیا تھا... ان سب کا کریا کرم بھی ہو چکا..."

"یہ کیا بھونک رہے ہو تم...؟" یہ غالباً لیفٹیننٹ ورما تھا۔

مدن موہن کی ہذیانی ہنسی پھر گونجی... "ڈر گئے ورما... تم نے میری موہنی کو کتنی آسانی سے میرے سامنے مار دیا تھا، وقت تم نے یہ نہیں سوچا تھا کہ جو تم دوسروں کے ساتھ کر رہے ہو، وہی تمھارے ساتھ دوسرے بھی کر سکتے ہیں۔ مجھے تو مجبور سمجھ رکھا تھا تم نے... پالتو کتے سے بھی زیادہ... اب بتاؤ دل کا کیا حال ہے؟ کیا گزری تم پر یہ خبر سن کے اور ابھی تو صرف خبر سنی ہے تم نے انھیں مرتے ہوئے نہیں دیکھا... جیسے میں نے موہنی کو مرتے دیکھا تھا... کاش یہ میرے لیے ممکن ہوتا... کہ میں اُسے گھسیٹ کر تمھارے سامنے لاتا... یاد ہے تم موہنی کو کیسے گھسیٹ کر لائے تھے... اس کے بالوں سے پکڑ کے... اور گولی تمھارے بھائی نے کیسے چلائی تھی؟"

"یہ... یہ جھوٹ ہے... بکواس کرتے ہو تم... چوبیس گھنٹے پہلے ہی تم غائب ہوئے تھے۔" ورما نے چلّا کے کہا۔ "اتنے کم وقت میں تم یہ سب نہیں کر سکتے..."

مدن موہن پھر ہنسا۔ "لاہور سے امرتسر کا فاصلہ ہی کتنا ہے ورما... صرف اکتیس میل... یہاں مجھے سرحد عبور کرانے والا وہی تھا جس سے تم نے مجھے ملوایا تھا... اور اپنے دیش کی سرحد میں میرے لیے کوئی مسئلہ نہ تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ تم تینوں ایک ہی رجمنٹ سے تعلق رکھتے ہو... اور وہ رجمنٹ امرتسر کے نواح میں ہے۔ وہیں تم سب رہتے بھی تھے... وہیں میری ٹریننگ ہوئی تھی۔ یاد ہے نا... میں نے تم سب کے گھر دیکھے تھے۔ وقت بے وقت تم مجھے طلب کر لیتے تھے... خصوصی تربیت کے لیے... تین مہینے میں نے کیمپ کے اندر ہی ایک قیدی کی طرح گزارے تھے۔ میری وجہ سے ہی موہنی اس مشن میں شامل ہوئی تھی۔ مگر وہ ایک بزدل اور کمزور عورت تھی۔ وہ کہتی تھی کہ موہن، یہ تم کو مجھ سے چھین لیں گے... یہ پیسہ بہت منحوس ہے جو تم کو مجھ سے جدا کر دے گا... مگر میں نے اُسے سمجھا لیا تھا کہ اس مشن کی کامیابی ہماری زندگی کی کامیابی ہوگی... ہم اپنا گھر بنائیں گے... شادی کریں گے... کاروبار کریں گے... تمام عمر عیش کریں گے... مگر وہ پھر بھی ڈرتی تھی۔ اُسے ڈر رہتا تھا کہ میں پکڑا گیا تو کیا ہوگا... سرحد پار کرنے والا دونوں طرف کا شہری نہیں رہتا۔ وہ جاسوس اور تخریب کار سمجھ کے پکڑ لیا جائے تو اس کا حشر کیا ہوتا ہے؟ وہ سمجھتی تھی سب کہ جاسوس کو تو اپنے لوگ بھی پہچاننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ وہ بھی اجنبی بن جاتے ہیں جو وطن کے نام پر جان دینے کے لیے اکساتے ہیں، دولت ہیں اور لالچ دیتے ہیں... وہ ڈرتی تھی کہ کسی نے اُسے پکڑ ہوگا اس کی تسلی ان کاغذ کے پرزوں سے نہیں ہوتی تھی جو ہمیں مسلمان، میاں بیوی اور پاکستانی ثابت کرتے تھے۔ تم نے تو بہت دیر سے جانا کرنل کہ اس کے ضمیر پر بوجھ ہے۔ وہ خون خرابے اور تباہ کاری کے لیے ملنے والے پیسے سے نفرت کرنے لگی تھی۔ اور جب پتا چلا تو تم نے اُسے مار دیا... صرف اس لیے مار دیا کہ اس کا ضمیر تمھارے لیے خطرناک تھا۔ تم نے مجھے کوئی موقع نہیں دیا کہ میں اُسے سمجھا سکوں... میری منت سماجت بھی نہیں مانی... تم مجھے بھی مار ڈالتے اگر میں احتجاج کرتا... میں نے دل کو پتھر کیا اور وہ سب دیکھا جسے دیکھنے کے بعد میں مر جاتا اگر مجھے ایک خیال سہارا نہ دیتا... انتقام لینے کا خیال۔ اور اسی خیال نے مجھے راتوں رات سرحد پار امرتسر پہنچا دیا۔ تمھاری رجمنٹ کے علاقے میں بہت سے لوگ مجھے جانتے تھے۔ میں نے کہا کہ میں تم سب کی بیویوں کے لیے پیغامات لے کر آیا ہوں۔ کسی دشواری کے بغیر میں تمھارے گھر پہنچ گیا... اور ورما... جب تمھارے گھر کے سب لوگ جمع ہو گئے... تمھارے ماں باپ... بھائی بہن... اور تم دونوں بھائیوں کی بیویاں... مادھوری اور مدھومتی... جو نئی نویلی دلہنیں تھیں... واقعی ابھی ان کے ہاتھوں سے مہندی کا رنگ بھی نہیں چھوٹا تھا۔ جب ہم ٹریننگ لے رہے تھے تب ہی تو شادی ہوئی تھی تم دونوں بھائیوں کی... ان دونوں بہنوں سے... دونوں واقعی خوب صورت تھیں... مگر میری موہنی سے کم... موہنی میری دھرم پتنی نہیں تھی۔ ابھی ہم نے اگنی کنڈ کے پھیرے نہیں کیے تھے۔ لیکن ہمارے درمیان پریم... کا وہ بندھن تھا جو کسی طرح بھی شادی سے کم نہ تھا۔ کمزور نہ تھا اور اتنا ہی مقدس بھی تھا۔ وہ میری خاطر سب کچھ چھوڑ آئی تھی۔ اپنے گھر کو۔ اپنے اونچی ذات کے غرور میں مبتلا برہمن باپ کو جو مجھ جیسے شودر کے ساتھ اس کا بیاہ کبھی نہ کرتا... ہمیں کسی پنڈت کے اشلوک اور کسی مندر کے پرساد کی ضرورت نہیں تھی۔ بھگوان ہمارے گواہ تھے اور اس بندھن کی پوترتا کو مانتے تھے... تم نے اس بندھن کو ختم کر دیا ورما کشش... میں تم کو مار دیتا اسی وقت... مگر میں نے نہیں... پہلے تم بھی وہی دُکھ اُٹھاؤ... جو میں نے جھیلا تھا... میں نے جلدی کی ورنہ شرما بھی جان لیتا کہ اس کی بے گناہ بیوی نے اس کے جرم کا کفارہ کیسے ادا کیا۔ مگر میں تم کو بتاتا ہوں... ان دونوں نے ایک جیسی ساریاں باندھ رکھی تھیں۔ گلابی رنگ کی اور لال پھولوں والے بارڈر کی۔ اور جب میں نے ان کے سر پہ ریوالور رکھ کے گولی ماری... بالکل اسی طرح جیسے شرما نے موہنی کو ماری تھی۔ تو ان دونوں کے سروں سے خون کے فوارے پھوٹے اور انھوں نے ایک دوسرے کی ساریوں کو اپنے خون سے رنگ دیا۔ تمھارے ماں باپ اور بھائی بہن صدمے سے سُن کھڑے رہ گئے اور میں کھڑکی سے کود کر فرار ہو گیا۔ اس وقت وہ دونوں فرش پہ تڑپ رہی تھیں۔"

ورما ابھی تک بے یقینی کی کیفیت میں سب کچھ سُن رہا تھا

اور شاید بھائی کی موت نے اُسے وقتی طور پر مفلوج کر دیا تھا۔ اچانک اس کے دماغ کا توازن بگڑ گیا۔ صدمہ اس کی قوتِ برداشت سے بڑھ گیا۔ اس نے چیخ کر مدن موہن کو گالی دی۔ میں دیکھ کچھ نہیں سکتا تھا مگر میں نے کرنل کی آواز سُن کے سب سمجھ لیا۔ کرنل نے اپنے ماتحت کو روکنے کی بے سود کوشش کی تھی۔ اس نے صرف اتنا کہا تھا کہ "ورما..." اور اس کا انداز تنبیہ کا تھا مگر ورما شاید مدن موہن پر حملہ کر چکا تھا۔ مشین گن نے پھر موت اُگلی۔ ایک راؤنڈ نے ورما کے پرخچے اُڑا دیے۔ ورما کی آواز بند ہو گئی۔ مدن موہن کے جنونی قہقہے باقی رہ گئے۔

"مدن موہن... بھگوان کے لیے دَیا کرو مجھ پر..." کرنل نے موت کو سامنے دیکھتے ہوئے سارے کرّو فر کو بالائے طاق رکھ دیا۔ افسری کی شان کو فراموش کر دیا۔ اس ساری تربیت کو بھُلا دیا، جو اُسے ادائے فرض کی خاطر بہادری کے ساتھ جان دینے کے لیے ملی تھی۔ وہ ایک عام آدمی رہ گیا جو مرنا نہیں چاہتا تھا۔ اب تک اس نے جانے کتنے اپنے جیسے انسانوں کو مارا تھا۔ وہ سیاست کی شکار گاہ میں نفرت اور تعصب کے جذبات، اسلحے کی طاقت، تجربے اور مہارت کے ساتھ ایک مشن کی تکمیل کے لیے آیا تھا اور وہ مشن تھا ایک ملک کے دو حصّے کرنا۔ بھائی کے ہاتھوں بھائی کا خون کروانا۔ مسلمان سے مسلمان کو لڑوانا... قومیت... ثقافت اور استحصال کے نام پر اور چھ نکات کو بنیاد بنا کے... وہ اس مشن کے لیے سیکڑوں، ہزاروں یا لاکھوں انسانوں کو چیونٹی سے حقیر تر جان کے قربان کر سکتا تھا اور بہت پُرامید تھا کہ اس کارنامے کو سرانجام دے کر وہ اپنے ملک کے نیتاؤں کے سامنے فخر سے جائے گا اور وہ اس کے سینے پر بہادری اور فرض شناسی کی اعلیٰ مثال قائم کرنے پر کوئی تمغہ سجا دیں گے۔ اسے کرنل سے ترقی دے کر بریگیڈیر بنا دیا جائے گا۔

اور یہ سب کچھ اُسے اپنے امکان میں نظر آتا تھا... لیکن اچانک ایک چیونٹی نے ہاتھی کا راستہ روک لیا۔ یہ چیونٹی موہنی تھی۔ اس نے موہنی کو مسل دیا... خاک میں ملا دیا... اُسے صرف ایک کمزور عورت جان کے مٹا دیا اور بھُلا دیا۔ لیکن اسی عورت کا نام محبت تھا۔ ایٹمی تابکاری سے زیادہ قوت رکھنے والی مگر نظر نہ آنے والی۔ موہنی کے بے جان جسم سے بھی اپنی ہلاکت خیزی پھیلانے والی یہ محبت مدن موہن کے دل میں زندہ تھی اور ایک آتش فشاں بن گئی تھی۔ اچانک کرنل نے محسوس کیا تھا کہ زمین نے اس کے قدم پکڑ لیے ہیں۔ اور وہ اس آتش فشاں کے دہکتے... خاکستر کر دینے والے... تباہ کُن لاوے کے سیلاب سے بچ کے فرار نہیں ہو سکتا۔

"... مدن موہن... یہ... یہ دونوں... ان کی تو ابھی شادی ہوئی تھی..." کرنل گڑگڑا رہا تھا۔ "ان کی بیویاں بھی مر گئیں... خود بھی مر گئے... لیکن میرے بچّے ہیں... ان کا دنیا میں اور کوئی نہیں..."

"اُٹھ... سیدھا کھڑا ہو... کمینے خود غرض... بزدل مرد... میں تجھے بخشنے والا نہیں ہوں... تیرے بچّوں کی خاطر ہی میں نے تیری بیوی کو نہیں مارا تھا... اس عورت کی زندگی اس کے بچّوں نے مانگی تھی اور میں نے دے دی تھی۔ کیونکہ ماں تو صرف ماں ہوتی ہے..."

"تم نے... اُسے نہیں مارا؟" کرنل نے کہا۔

"ہاں... میں اُسے مارنے ہی گیا تھا... مگر اس عورت نے کہا کہ پہلے ان بچّوں کو مار دو... میں مرنے سے نہیں ڈرتی۔ ان بچّوں کو یوں چھوڑنے سے ڈرتی ہوں... بعد میں اُن کی زندگی ادھوری رہ جائے گی... سوتیلی ماں کے ہاتھوں بگڑ جائے گی... میں ان کو بھی اپنے ساتھ ہی لے جاؤں تو اچھا ہے... وہ بہت بہادر عورت تھی کرنل... نہ وہ روئی دھوئی... نہ اس نے منّت سماجت کی نہ اس کا یہ حال ہوا... جو تمھارا ہو رہا ہے... دیکھو ذرا کہ تم کس طرح کانپ رہے ہو... کاش، تمھاری رجمنٹ یہ سین دیکھتی کہ کرنل صاحب کی تو پتلون بھی خراب ہو گئی ہے۔ تمھاری بیوی دیکھتی کہ اس کا سورما شوہر جو بہادری اور جواں مردی کی ڈینگ مارا کرتا تھا، موت کے سامنے کتنا بے بس ہو گیا ہے... وہ عورت تو بہت پُرسکون رہی تھی اور پھر اس کے بچّے... وہ ماں کے سامنے ہاتھ پھیلا کے کھڑے ہو گئے تھے... وہ تمھارے بچّے نہیں ہو سکتے کرنل... تم تو اُن چھوٹے چھوٹے بچّوں سے زیادہ ڈرے ہوئے اور بے حال ہو۔ انھوں نے کہا کہ پہلے گولی ہمیں لگے گی... پھر ماتا جی کو... اور میں نے... میں نے ان سے... ان کی ماں کو نہیں چھینا..."

"تم اچھے آدمی ہو... ایک نیکی اور کر سکتے ہو... وہ عورت تو صرف ماں تھی... میں بیک وقت ان بچّوں کا باپ بھی ہوں اور اس عورت کا شوہر بھی... مجھے مارو گے تو ان بچّوں کو یتیم کرو گے اور عورت کو بیوہ کرو گے..." کرنل نے اپنی منّت سماجت جاری رکھی۔

"میں تم کو چھوڑ دیتا... اگر ایسا ہی ہوتا..."

"کیا مطلب... ایسا ہی ہے مدن موہن..."

"نہیں... اس عورت نے مجھ سے پوچھا تھا کہ آخر تم مجھے کیوں مارنے آئے تھے؟"

"پھر تم نے کیا کہا؟"

"میں نے اُسے اصل سبب بتا دیا۔" مدن موہن بولا۔ "میں وہاں رُکا... کیمپ ایریا کے اندر فائرنگ کی آواز سب نے سنی تھی... اور میرے فرار ہوتے ہی شرما اور ورما کے گھر والوں نے کہرام بپا کر دیا تھا... میں جانتا تھا کہ یہی ہوگا... چنانچہ میں بھاگا تو اڈے کا صاحب کے گھر میں گھس گیا..."

"دروازے پر گارڈ نے تم کو نہیں روکا؟"

"میں اتنا بے وقوف ہوتا تو تم میرا انتخاب اس مشن کے لیے نہ کرتے کرنل صاحب..." مدن موہن نے کہا۔ "میں پچھلی طرف سے اندر کودا تھا اور کچن کے راستے تمھارے بنگلے میں پہنچا تھا... مگر ذرا سی دیر میں یونٹ ایریا کے اندر میری تلاش شروع ہو گئی اور فوجی وہاں بھی آ پہنچے۔ تمھاری بیوی نے کہہ دیا کہ یہاں کوئی نہیں آیا اور نہ آ سکتا ہے... میں نے ریوالور کے زور پر اسے سمجھا دیا تھا کہ وہ کیا کہے گی... اس نے کہا "تم فکر مت کرو... اس گھر کے اندر تم محفوظ ہو... اندر کوئی نہیں آ سکتا۔" میں نے اس کی زندگی اُسے بخش دی تھی... پھر وہ میری زندگی کیسے نہ بچاتی... مگر احتیاط کا دامن میں نے ہاتھ سے نہیں چھوڑا... میں نے اس کے دونوں بچّوں کو اپنے ساتھ رکھا اور اسے کہا کہ وہ میری تلاش میں آنے والوں کو مطمئن کر کے نہ لوٹا سکی تو ممکن ہے وہ خود بچ جائے مگر اس کی گود خالی ہو جائے گی... میں تو جان ہتھیلی پر رکھ کے نکلا ہوں اور ویسے بھی جینا نہیں چاہتا... جب فوجی جوان چلے گئے تو میں نے بچّوں کو چھوڑ دیا... اس نے کہا کہ تم نے کبھی کوئی ایسی عورت دیکھی ہے... کوئی ماں یا بہن یا بیوی بیٹی جو اپنے شوہر... بھائی... باپ یا بیٹے کے لیے اپنی زندگی قربان کرنے کا حوصلہ نہ رکھتی ہو... بچّوں کو یرغمال بنا کے خوفزدہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی... میں نے کہا کہ مجرم تمھارا شوہر تھا... اسے زیادہ سخت سزا دینے کے لیے میں تمھیں بھی مارنے کا فیصلہ کر چکا تھا مگر تمھیں چھوڑ دینے کا مطلب یہ نہیں کہ میں اصل مجرم کو بھی چھوڑ دوں گا... اور معلوم ہے اس نے کیا کہا؟"

"اس نے کہا ہوگا... کہ اسے معاف کر دو..."

"نہیں... اس نے کہا کہ تمھارے کسی فیصلے کو میں کیسے بدل سکتی ہوں... تم وہی کرو گے جو تمھارے لیے ضروری ہوگا..." مدن موہن نے کہا۔ "تمھیں تو انتقام لینا ہے... تم معاف کر دینے کی صلاحیت سے محروم ہو چکے ہو کیونکہ تمھیں کوئی خوف نہیں رہا... تم نے دو بے گناہ عورتوں کو قتل کر دیا ہے... تم تیسرا قتل ضرور کرو گے... تم میرے کہنے سے اصل مجرم کو نہیں چھوڑو گے... میں نے کہا کہ میری جگہ تم ہوتیں تو کیا کرتیں... اور اس عورت نے مجھے اجازت دے دی کہ تم کو قتل کر دوں۔"

"تم... تم جھوٹ کہتے ہو..."

"نہیں... تمھاری بیوی نے صاف کہا کہ میری جگہ وہ ہوتی تو ایسا ہی کرتی... ویسے بھی اسے کوئی زیادہ فرق نہیں پڑے گا... وہ شخص اب صرف دنیا کو دکھانے کے لیے میرا شوہر رہ گیا ہے... سب ہی جانتے ہیں کہ وہ ملٹری ہاسپٹل کی ایک نرس نرملا کے چکر میں ہے... اسی کے ساتھ رہتا ہے اور دھرم قانون کا مسئلہ نہ ہوتا تو اب تک اس سے بیاہ کر چکا ہوتا... بچّے بھی اتنے چھوٹے نہیں ہیں کہ کچھ نہ سمجھتے ہوں... وہ سب جانتے ہیں اور انھیں باپ کی صورت سے نفرت ہے... کیا مطلب نکالا جا سکتا ہے اس بات سے کرنل صاحب...؟ یہی کہ تمھارے بیوی بچّوں کو تمھاری ضرورت نہیں ہے... پہل تم نے کی کہ ان کی ضرورت سے بے نیاز ہو گئے... اب تم مرو یا جیو انھیں کوئی فرق نہیں پڑتا... اسے میں اجازت ہی سمجھتا ہوں..."

"تم تو ایسے بات کر رہے ہو... جیسے وہ اجازت نہ دیتی تو تم مجھے چھوڑ دیتے..." کرنل نے تلخی سے کہا۔

"یہ ہو سکتا تھا... بالکل ہو سکتا تھا کرنل۔" مدن موہن نے کہا۔ "اس وقت میرے جذبات کا رُخ بدلا ہوا تھا... میں دُو دُلہنوں کو ان کے سسرال میں سارے رشتے داروں کے سامنے گولی مار چکا تھا... اس وقت میں پاگل ہو رہا تھا... مگر انھیں مرتا دیکھ کے میرے ذہن کی کیفیت میں عجیب سی تبدیلی آئی۔ میں کچھ احساسِ جرم و ندامت کا شکار ہو گیا تھا۔ اُن کی موت نے مجھے جھنجوڑ کر میرے احساس کو بیدار کر دیا تھا۔ میں نے بھاگتے ہوئے سوچا تھا کہ یہ میں نے اچھا نہیں کیا... مجھ سے زیادتی ہو گئی ہے کہ میں نے مجرم کو سزا دینے سے پہلے بے گناہ کو مار دیا ہے۔ بے شک اس میں اصل مجرموں کے لیے بہت ذہنی اذیت کا سامان ہے مگر ان نئی نویلی دلہنوں کو موردِ الزام تو نہیں سمجھا جا سکتا اور شرما، ورما سے زیادہ دُکھ تو ان کے ماں باپ اور بھائی بہن اُٹھائیں گے۔ اسی ردِّعمل کا نتیجہ تھا کہ میں تمھاری بیوی کو ایک دم گولی نہ مار سکا... جیسا کہ میں نے سوچا تھا۔ اور جب اس نے تم پر بے وفائی کا الزام بھی ثابت کر دیا تو وہ عورت مجھے مظلوم لگی۔ میں صبح ہونے تک تمھارے گھر میں چھپا رہا... صبح تمھاری بیوی نے مجھے اپنی گاڑی میں سرحد سے چند میل دُور چھوڑ دیا۔"

"اس عورت نے... ایک قاتل کی مدد کی۔" کرنل چلّایا۔

"وہ مجبور تھی... اگر وہ ایسا نہ کرتی تو اس کے بچّوں کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی... میں نے انھیں باتھ روم میں بند کر دیا تھا اور خود باہر سو گیا تھا۔ یہ تمھیں بہت عجیب لگے گا کہ آدمی دو قتل کرے اور پھر سکون کی نیند سے بھی محروم نہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کرنل صاحب کہ اپنی موہنی کے قتل کا بدلہ لے کر میرے دل کو بڑا سکون حاصل ہو گیا تھا۔ دو راتوں کے بعد میں نے چھ گھنٹے کی نیند پوری کی

اور صبح اُٹھ کے تمھارے بیوی بچوں کو آزاد کیا۔ پھر تمھاری بیوی نے میرے لیے ناشتا تیار کیا اور میں نے تمھاری بیوی کو سمجھا دیا کہ اسے کیا کرنا ہوگا... میں تمھارے چھوٹے بیٹے کے ساتھ ڈکی میں چھُپ گیا اور تمھاری بیوی کار خود چلاتی ہوئی مجھے یونٹ ایریا سے نکال لائی۔ رات بھر یونٹ ایریا میں میری تلاش جاری رہی تھی۔ کوئی کیسے فرض کر سکتا تھا کہ میں کمانڈنگ افسر ہی کے بنگلے میں موجود ہوں اور اسی کی کار میں چھُپ کر نکل سکتا ہوں۔ تمھاری بیوی چاہتی تھی کہ میں بچے کو ڈکی میں ساتھ نہ رکھوں۔ وہ میری مدد کا وعدہ کر چکی ہے تو نبھائے گی۔ لیکن میں عورت ذات، دشمن اور سانپ بچھو پر بھروسا نہیں کرتا۔ تریا چلتر سے ڈرنا ہی چاہیے۔ میں نے بچے کو ضمانت بنا کے ساتھ رکھا اور وہ مجھے سخت چیکنگ کے باوجود باہر نکال لائی۔ کس کی مجال تھی کہ سی او صاحب کی بیوی کو روکتا۔ صبح ساڑھے سات بجے وہ مجھے بارڈر سیکیورٹی فورس کے حوالے کر کے لوٹ گئی۔ بی ایس ایف والوں کو اپنے مشن کے بارے میں بتا کے میں پھر سرحد عبور کر آیا... اور اب دیکھ لو... چوبیس گھنٹے کے اندر اندر میں نے موہنی کے قاتلوں کو سزا دے دی ہے۔"

"مجھے اپنی موہنی کا قاتل مت سمجھو... میں نے کسی کو حکم نہیں دیا تھا کہ اُسے مار ڈالیں۔ یہ اطلاع ورما نے دی تھی کہ موہنی کا دماغ خراب ہو رہا ہے اور شرما نے کہا تھا کہ ہمارے پاس کسی کا دماغ درست کرنے کے لیے وقت نہیں ہے۔ آسان اور محفوظ طریقہ یہ ہے کہ اس دماغ کو نیست و نابود کر دو۔" کرنل نے کہا۔

"تم نے انھیں روکا کیوں نہیں تھا؟"

"میں نے روکا تھا... کہا تھا کہ پہلے اس لڑکی کو سمجھاؤ... مگر وہ کہنے لگے کہ یہ سمجھانے کی نہیں سمجھنے کی بات ہے۔ اسے سب سمجھا دیا گیا تھا یہاں آنے سے پہلے۔ اب سمجھانے کا وقت گزر چکا..."

"تم اپنی جان بچانے کے لیے جھوٹ بول رہے ہو۔"

"میں قسم کھا سکتا ہوں..."

"میں جانتا ہوں کہ تم کتنے سچے ہو... اور تمھاری قسم کتنی سچی ہوگی... لیکن میں تم کو ایک چانس دوں گا کہ تم خود کو بے قصور ثابت کر سکو... میں ان سب سے پوچھوں گا جو اس وقت موجود تھے۔ ان میں تمھاری نرملا بھی شامل تھی۔" مدن موہن بولا۔ "وہ سب مجھے نظر نہیں آ رہے ہیں۔"

"ان سب کو ہم نے تہ خانے میں بند کر رکھا ہے۔"

"کیوں؟"

"یہاں دشمن کا ایک ایجنٹ گھُس آیا تھا۔ اس نے ایک لڑکی اور ایک لڑکے کو مار دیا... نرملا اسی کے قبضے میں ہے۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو...؟"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔" کرنل نے زیادہ پُراعتماد لہجے میں کہا۔ "وہ غالباً خود سکندر بخت ہے یا اس کا کوئی ساتھی۔"

"اس وقت کہاں ہے وہ؟"

"تمھاری موہنی کی لاش پر قدم جمائے کھڑا ہوا ہے۔" کرنل نے محسوس کیا کہ بالآخر اپنی حاضر دماغی اور ہوشیاری سے وہ مدن موہن کے ذہن سے انتقام کا خیال نکالنے اور اس کے خیالات کا رُخ پلٹنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔

"میری موہنی کی قبر پر...؟" مدن موہن چلّایا۔

"قبر پر نہیں... قبر کے اندر... اس کی لاش پہ..." کرنل نے اس کے غصّے کی آگ پر تیل چھڑکا۔ "ہم نے تو موہنی کی تدفین کر دی تھی باعزت طور پر... یہاں چِتا جلانے کی تو گنجائش ہی نہیں تھی۔ مگر وہ قبر کھود کے اندر اُتر گیا... اور اب وہیں مورچا جمائے بیٹھا ہوا ہے... ہم سب اس کو قبر سے نکالنے کی کوشش کر رہے تھے کہ تم آ گئے... وہ ملیچھ جوتوں سمیت موہنی کے جسم پر سوار ہے۔"

"میں... میں اُسے کتّے کی موت مار دوں گا... اس کا خون پی جاؤں گا... جس نے میری موہنی کے ساتھ ایسا سلوک کیا..." مدن موہن پاگلوں کی طرح چیخنے لگا۔ "مجھے بتاؤ، وہ ملیچھ کہاں ہے۔"

"اُدھر... اِدھر سے دیکھو..." کرنل نے کہا۔

میں بہت پہلے سے تیار تھا۔ مدن موہن ایک دم میرے سامنے آ گیا... وہ کسی طوفانی بگولے کی طرح گزر رہا تھا کہ میں نے لات گھمائی جو اس کی ٹھوڑی پر لگی۔ وہ چیخ مار کے اُلٹ گیا... مشین گن اس کے ہاتھوں سے نکل کے اوپر گئی اور چند قدم پیچھے جا گری۔ کرنل نے میری توقع کے مطابق اس پر قبضہ کرنے کے لیے جست لگائی مگر میں نے اپنی مشین گن کا بٹ اس کے سر پر مارا اور وہ کراہ کے ایک سائڈ پر گرا۔ ضرب صحیح نہیں پڑی تھی چنانچہ اس نے پلٹا کھا کے اُٹھنا چاہا مگر میں نے اُسے پے در پے ٹھوکریں ماریں... سر میں، پسلیوں میں اور پیٹ میں، وہ بلبلاتا رہا اور لڑھکتا رہا۔

اس وقفے کا فائدہ مدن موہن نے اُٹھانا چاہا... وہ آگے بڑھا ہی تھا کہ میں نے مشین گن کا رُخ اس کی طرف کر دیا۔ "خبردار... اپنی جگہ پر کھڑے رہو..." میں نے کہا۔ "میں تمھارا دشمن نہیں ہوں۔"

"تم جھوٹ بکتے ہو۔" مدن موہن غرّایا۔

"جھوٹ یہ بکتا ہے۔" میں نے بے سُدھ پڑے ہوئے کرنل کی طرف اشارہ کیا۔ "کون ہے موہنی کی قبر میں... کوئی نظر آ رہا ہے تمھیں جوتوں سمیت اس کی لاش پر کھڑا ہوا... وہ دیکھو... وہ ہے تمھاری موہنی کی قبر..."

مدن موہن نے پلٹ کے دیکھا۔

"وہ مٹی کا ڈھیر نظر آ رہا ہے تمھیں؟" میں نے کہا۔ "وہی ہے موہنی کی قبر... اور اس کے پاس ہی تین لاشیں اور پڑی ہوئی ہیں۔"

"تین نہیں... چار ہیں..."

"ان میں سے ایک نرملا ہے... وہ زندہ ہے... دوسرا ایک ڈرائیور سائیں ہے... باقی دو کو پہچانتے ہو تم؟"

مدن موہن نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا۔ "وہ محافظ کُتّے تھے... اپنے آقاؤں کے حکم پر دُم ہلانے والے... ذلیل کُتّے... بے رحم درندے۔"

"انہی حکم کے غلاموں نے تمھاری موہنی کو یہاں گاڑا تھا۔ اب وہ اس کی قبر کو کھود کے اسی میں دوسری لاش بھی ڈالنے والے تھے... سائیں ڈرائیور کی لاش..." میں نے کہا۔ "لیکن وہ میرے ہاتھوں مارے گئے... کرنل نے جھوٹ بولا تھا تم سے کہ میں موہنی کی لاش پر جوتوں سمیت چڑھا ہوا ہوں... میں ایسا کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا مدن موہن... اس نے تمھاری توجہ اپنی طرف سے ہٹانے کے لیے اتنا بڑا جھوٹ بولا تھا کہ میں مشین گن کے ساتھ قبر میں مورچا بنائے بیٹھا ہوا ہوں... ابھی تک تو میں نے قبر کے اندر جھانکا بھی نہیں۔"

"پھر تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ موہنی کی قبر ہے؟"

"میں نے سائیں ڈرائیور کے قتل کے بعد کسی کو حکم دیتے سُنا تھا۔ اس نے ان دونوں سے کہا تھا کہ ڈرائیور کو بھی اسی قبر میں گاڑ دو جس میں کل موہنی کو گاڑا تھا... اس وقت نرملا بھی موجود تھی... وہ تصدیق کرے گی میری بات کی... تم کو مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں... میں تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا..."

"مگر... تم ہو کون؟"

"میں ایک پاکستانی ہوں..." میں نے مختصراً کہا۔ "اور جو کچھ میں کر رہا ہوں پاکستان کے لیے کر رہا ہوں... اپنے لیے کچھ نہیں کر رہا ہوں..."

"پھر تو تم... مجھے زندہ نہیں چھوڑو گے..."

"یہ میری مرضی اور میرے اختیار کی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر تم نے مجھ سے تعاون کیا تو ہو سکتا ہے کہ میں تمھیں رعایت دے دوں... میں جانتا ہوں کہ تم کو میری ذات سے کوئی دشمنی نہیں۔ جو کچھ تم کر رہے تھے، پاکستان سے دشمنی کے جذبات کے باعث نہیں کر رہے تھے۔ ہوسِ زر کے جذبات سے مغلوب ہو کے کر رہے تھے... تم ایک ایسے شخص ہو، جس کا کوئی وطن... کوئی ضمیر اور کوئی اصول نہیں... تمھارا دھرم ایمان صرف پیسہ ہے... اگر تمھیں پیسہ دینے والا میں ہوتا تو تم خود اپنے بھارت دیش کے خلاف میری مدد کرتے... اس لیے میں قصوروار تمھیں نہیں سمجھتا۔ میں اسے تمھاری فطرت کی خرابی یا کمزوری سمجھتا ہوں... لالچ میں پیسے کے لیے ساری دنیا میں لوگ اپنا... اپنے ناموس کا... وطن کا... انسانیت اور شرافت کا... عزت اور غیرت کا... ہر چیز کا سودا کرتے ہیں اور تم بھی انہی میں سے ایک ہو۔"

"تم مجھ سے کس قسم کا تعاون چاہتے ہو؟"

"تم مجھے کرنل کے اور اس کے مشن کے بارے میں سب کچھ بتاؤ گے... جو کچھ بھی تم جانتے ہو۔" میں نے کہا۔ "مثلاً سب سے پہلے تو یہ بتاؤ کہ اس وقت وہ سب لوگ کہاں ہیں۔"

"کون لوگ؟"

"تمھارے جیسے دوسرے... جسم فروش... ایمان فروش... وطن فروش مرد اور عورتیں..." میں نے کہا۔ "وہ سب جو گزشتہ شب یہاں دادِ عیش دے رہے تھے... کرنل نے تمھیں بتایا تھا کہ وہ کسی تہ خانے میں ہیں... تم کو معلوم تو ہوگا کہ وہ تہ خانہ کدھر ہے؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا اور پھر قبر کی طرف دیکھنے لگا۔

"تم موہنی کو دیکھنا چاہتے ہو؟"

اس نے پھر اقرار میں سر ہلایا۔

"اس کا کوئی فائدہ نہیں۔" میں نے کہا۔ "اُسے کل مٹی میں دبایا گیا تھا۔ اب تک اس کی لاش سڑنے گلنے لگی ہوگی... عام طور پر چوبیس گھنٹے میں پیٹ پھول کے پھٹ جاتا ہے... گوشت میں کیڑے پیدا ہو جاتے ہیں... کیا ملے گا تمھیں یہ اذیّت ناک منظر دیکھ کر... تمھارے ذہن میں موہنی کی صورت کچھ اور ہوگی۔ اسی آخری تصویر کو یادوں میں تازہ رکھو... اگر تم نے اس کی خاک و خون میں لتھڑی ہوئی بدہیّت و متعفّن لاش دیکھ لی تو ساری عمر اس منظر کو بھلا نہ پاؤ گے... تمھاری جگہ میں ہوتا تو شاید پاگل ہو جاتا... موہنی مر چکی ہے... اس کی موت کو ایک حقیقت سمجھ کے قبول کر لو۔ اس کے تصوّر میں بدصورتی کو شامل مت کرو۔"

اس نے یوں آہستہ سے سر ہلایا جیسے میری بات سمجھ رہا ہے لیکن اس کی نگاہ بدستور کھُلی قبر پر جمی رہی۔

"چلو، مجھے اس تہ خانے تک لے چلو..." میں نے لہجہ بدل کے اُسے حکم دیا۔ "میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔"

"کیا تم سب کو آزاد کر دو گے؟"

"ابھی میں کچھ نہیں بتا سکتا..." میں نے کہا۔ "یہ ان سب کے رویّے پر منحصر ہے... پہلے تو میں انھیں اس کام پر لگاؤں گا... وہ موہنی کی قبر کو بند کریں گے... اور باقی تین لاشوں کو ٹھکانے لگائیں گے۔"

"تہ خانے کا راستہ اندر ہے۔" وہ بولا۔

میں نے مشین گن ہلا کے اُسے آگے چلنے کو کہا۔ دوسری مشین گن وہیں پڑی ہوئی تھی جہاں سے اُسے کرنل نے اٹھانے

کی بے سود کوشش کی تھی۔ میں نے اُسے بھی اُٹھا لیا۔ بیک وقت دو مشین گنوں کو استعمال کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا لیکن میں اس ہتھیار کو کرنل کے لیے چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ مدن موہن پر مشین گن استعمال کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اُسے میں خالی ہاتھوں سے بھی قابو میں رکھ سکتا تھا۔ مدن موہن کے پیچھے جانے سے پہلے میں نے مناسب سمجھا کہ کرنل کا طبی معائنہ بھی کر لوں... کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ مکر کیے پڑا ہو اور میرے جاتے ہی اُٹھ کھڑا ہو۔ نیچے بیٹھ کر اُسے غور سے دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ وہ زندہ نہیں ہے... اس کی نبض بھی تھمی ہوئی تھی۔ میرا پہلا اندازہ یہی تھا کہ شاید میرے بوٹوں کی کوئی ٹھوکر مہلک ثابت ہوئی اور دماغ کے اندر کوئی رگ پھٹ گئی یا جگر کی چوٹ نے کام تمام کر دیا مگر پھر مجھے اس کے بند ہونٹوں پر تھوڑے سے جھاگ نظر آئے... میں نے بہت قریب سے سونگھا تو مجھے کڑوے باداموں جیسی بُو آئی۔ کرنل نے خودکشی کر لی تھی۔ اس کے مُنہ میں کسی دانت یا داڑھ کے خلا میں سائنائیڈ کا انتہائی قاتل زہر پوشیدہ تھا جسے وہ ایسے ہی وقت میں خاص طریقے سے دبا کے توڑ سکتا تھا... یہ بہت پرانا طریقہ ہے جو سب جاسوس اور تخریب کار ایجنٹ استعمال کرتے ہیں۔ اگر وہ دیکھتے ہیں کہ ان کے لیے فرار کے سارے راستے بند ہو گئے ہیں تو دشمن کی قید میں جانے سے بہتر وہ خودکشی کو سمجھتے ہیں۔ دشمن زیادہ اذیت دے کر اور سب کچھ معلوم کرنے کے بعد مارتا ہے۔ کسی بھی انسان کے لیے جسمانی ایذا رسانی کے جدید طریقوں کا مقابلہ کرنا ممکن نہیں... وہ بالآخر سچ اگل دیتا ہے اور جب دشمن کو یقین آ جاتا ہے کہ اب معلوم کرنے کو کچھ بھی نہیں رہا تو وہ باقی ماندہ ٹوٹے پھوٹے شکستہ اور نامکمل آدمی کو کیلشیم فاسفورس اور پروٹین والی کھاد سمجھتے ہوئے مٹی میں ملا دیتا ہے... غدار اور جاسوس کو نہ اپنے معاف کرتے ہیں نہ پرائے۔ چنانچہ سمجھدار وہی ہوتا ہے جو فوری اور بے عذاب موت قبول کر لے۔

میں نے کرنل کی جامہ تلاشی لی... وہ عام آدمی جیسی شلوار قمیص میں تھا اور اگر مخاطب کرنے والوں نے اسے کرنل نہ کہا ہوتا تو مجھے کبھی اس کے عہدے کا پتا نہ چلتا۔ وہ مقامی آدمیوں سے ذرا بھی الگ نہ لگتا تھا۔ ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ سری لنکا، نیپال، بھوٹان اور تبت کے لوگ بھی ایک جیسے رنگ، چہرے کے نقوش اور لب و لہجے کے مالک ہوتے ہیں۔ کرنل کی قمیص کی کسی جیب سے کوئی ایسی چیز نہیں ملی جس سے اس کی شناخت ممکن ہوتی۔ ایک جیب میں سے مجھے سگریٹ کیس اور لائٹر ملے۔ انھیں میں نے سنبھال کے رکھ لیا... یہ ٹرانسمیٹر بھی ہو سکتے تھے اور خطرناک قسم کے مہلک ہتھیار بھی... شلوار کے اندر بھی ایک جیب تھی... اس میں سے ایک بھرا ہوا ریوالور میرے ہاتھ لگا۔ یہ [illegible] حفاظتی نظام کا ایک حصہ تھا... اگر کوئی اس سے مشین گن یا [illegible] سے ریوالور چھین لینے کے بعد یہ سمجھتا کہ اس نے کرنل کو نہتا [illegible] ہے تو وہ اسی غلط فہمی کے باعث مارا جاتا۔

میں نے مدن موہن کو نگاہ میں رکھا تھا... وہ ایک [illegible] شخص تھا جس کو انتقام کی آرزو نے ہوش و خرد سے بیگانہ کر [illegible] مگر طبعاً وہ دیوانہ نہیں تھا۔ وہ ایک ذہین اور عیار آدمی نہ ہو[illegible] اسے جاسوسی اور تخریب کاری کے اس مشن کے لیے منتخب [illegible] کیا جاتا۔ تخریب کاری کی تربیت دینے والے انسان کی [illegible] کمزوریوں سے بھرپور فائدہ اُٹھاتے ہیں... کوئی مایا جال میں پھنس جاتا ہے تو کوئی ہوس کے جال میں... وہ ترسے ہوئے محرومیوں کے مارے ہوئے خواہشوں کی ناکامیوں سے دل برداشتہ لوگوں کو سبز باغ دکھاتے ہیں۔ بہلا پھسلا کے انھیں اس راستے پر لے آتے ہیں جہاں وہ دولت مندی کی منزل کو اپنی دسترس میں دیکھتے ہیں۔ پھر انھیں عیش و عشرت کی اس زندگی سے روشناس کرا دیتے ہیں جو حقیقی زندگی میں صرف خوابوں تک محدود تھی اور بالآخر انھیں ذہنی طور پر بلند زندگی کا جُوا کھیلنے پر آمادہ کر لیتے ہیں کہ کامیابی کا صلہ عیش [illegible] کی اس زندگی کا دوام ہے مگر جیت گئے تو کیا کہنا۔ دنیا ہی جنت ہو گی... ہار کے بھی تو بازی مات نہیں... کیونکہ اس جہنم سے نجات ملے گی جس میں تم اب زندہ ہو۔

لیکن انتخاب وہ اہلیت کی بنیاد پر کرتے ہیں۔ اپنا دھن اپنے وسائل اور اپنا تجربہ کسی ایسے امیدوار پر ضائع نہیں کرتے جس کی ناکامی کے امکانات زیادہ ہوں۔ جو ذہانت... حوصلہ مندی اور قوتِ فیصلہ سے محروم ہو... مدن موہن میں یہ سب صفات بدرجہ اتم موجود تھیں۔ اس نے اپنے انتقام کو صحیح طور پر پلان کیا تھا اور اس میں کامیاب بھی رہا تھا... وہ کیمپ سے فرار ہو کے جس طرح امرتسر اور کیمپ ایریا کے اندر گیا اور اپنا کام کر کے جس انداز سے نکل آیا، وہ اس کی ذہانت اور عیاری کو ثابت کرنے کے لیے [illegible] تھا... تاہم جو بات اس کی طبعی نیکی کی دلالت کرتی تھی وہ کرنل کی بیوی کے قتل سے باز رہنا تھا۔ اس نے کچھ سوچا اور محسوس کیا [illegible] ارادہ بدل دیا۔

مدن موہن کو یقیناً صدمہ ہو گا کہ اپنے دشمن کو وہ خود نہ مار [illegible] لیکن دوسری طرف اس کے اطمینان کے لیے یہ بات کم نہ تھی کہ ا[illegible] دونوں بھائیوں کو خود اس نے مار دیا جن میں سے ایک نے مو[illegible] کو پکڑا تھا اور دوسرے نے اس پر گولی چلائی تھی۔ مدن موہن جذبات میں پاگل ہو رہا تھا، اس کا دماغ خراب نہیں ہوا تھا۔ اس نے یہ بات سمجھ بھی لی تھی اور مان بھی لی تھی کہ اب موہنی کو دیکھنے کا ف[illegible]

کوئی نہیں... میرے لیے فائدہ مند بھی ہو سکتا تھا اور خطرناک بھی ثابت ہو سکتا تھا... ابھی وہ مجبور تھا... کچھ جذباتی انتشار سے اور کچھ خالی ہاتھ ہونے کے باعث۔

اس نے تہ خانے تک میری راہنمائی کی... یہ برک کے دوسرے کنارے پر واقع ایک زینہ تھا جس کا دروازہ اوپر سے مقفل تھا۔

"مدن موہن!" میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ "تم واپس اندر کیسے آئے تھے؟"

"گیٹ سے اور کیسے۔" وہ بولا۔

"لیکن وہاں ایک دربان مسلح بیٹھا رہتا ہے..."

"وہ مجھے پہچانتا تھا۔" مدن موہن بولا۔ "اس نے جیسے ہی میرے لیے گیٹ کھولا، میں نے اُسے مار دیا۔"

"کیسے مار دیا؟ گولی چلتی تو آواز آتی۔"

"میں نے اس کے سر پر پتھر مارا تھا۔" مدن موہن بولا۔ "جو میرے ہاتھ میں تھا لیکن میں نے پیچھے چھپا لیا تھا... وہ اس کے لیے بالکل تیار نہ تھا، وہ چکرا گیا اور میں نے اس سے مشین گن چھین لی۔ پھر اسی کے وار سے اس کا سر پھاڑ دیا۔"

"اس نے شور نہیں مچایا تھا؟"

"وہ چلایا تھا... جب میں نے اس کے سر پر پتھر مارا تھا۔"

"میں نے تو کوئی آواز نہیں سُنی تھی۔" میں نے کہا۔ "اور شاید دوسروں نے بھی نہیں سُنی تھی... ورنہ وہ ضرور آتے..."

"گیٹ کافی دور ہے... اور وہ بہت بلند آواز میں نہیں چیخا تھا... جب وہ نیچے گرا تو میں نے ایک بہت بھاری پتھر سے اس کا سر کچل دیا تھا..." مدن موہن نے کہا۔

جب قفل والا دروازہ سامنے آ گیا تو میں نے مدن موہن کی طرف دیکھا۔ "اس کی چابی...؟"

"انھی میں سے کسی کی پاکٹ میں ہو گی۔" وہ بولا۔

میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا کہ کیا میں واپس جاؤں اور شرما اور ورما کی جیبوں کو بھی ٹٹولوں... پھر میں نے تالا توڑ دینے کا فیصلہ کیا۔ میں نے تالے پر مشین گن کے بٹ سے مسلسل چوٹیں لگائیں... دروازے کے پیچھے سے میں نے عورتوں کے چیخنے چلانے کی آواز سنی۔ ان سب کو حفظِ ماتقدم کے طور پر اسیر کر دیا گیا تھا... وہ حیران پریشان ہو گئے کہ دروازہ کھولنے والے کے بجائے دروازہ توڑنے والا کون آ گیا؟ تالا اور دروازہ دونوں میری توقع سے زیادہ مضبوط ثابت ہوئے۔ اس سے مجھے تھوڑی سی جھنجلاہٹ محسوس ہوئی... بس ایک سیکنڈ کے لیے میری ساری توجہ تا[illegible] کی طرف ہو گئی اور میں نے اس پر آخری وار پوری قوت سے کرنے کا فیصلہ کیا... مدن موہن نے اس ایک سیکنڈ کو تاڑ لیا اور اس سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے مجھ پر حملہ کر دیا۔

دیوانہ بکارِ خویش ہوشیار... مدن موہن نے اپنا انتقام لے لیا تھا۔ اس نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ میں بھی اس کرنل کا اور اس کے حواریوں کا جانی دشمن ہوں مگر وہ یہ بات نہیں بھولا تھا کہ ہم بھی ایک دوسرے کے دشمن ہیں... ایک مشترک دشمنی کا جذبہ رکھنے کے باوجود ہمارے درمیان دوستی اور تعاون کا رشتہ قائم نہیں ہو سکتا۔ اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ میں بھی اُسے وہی سزا دوں گا جو کرنل اُسے بچ جانے کی صورت میں دیتا... شاید میری سزا زیادہ سخت ہو گی۔

اس کے پہلے حملے نے میرے قدم اکھاڑ دیے۔ میں اس دروازے سے ٹکرایا جس پر وار کر رہا تھا۔ میرا سر دروازے پر لگا اور مشین گن بڑے بے تکے طریقے پر دروازے سے ٹکرا کے اُچھل گئی۔ میں تیزی سے گھوما... یہ میرے جسم کا خودکار مدافعتی عمل تھا۔ بالکل ایسا ہی جیسے غلطی سے انگارے کو چھو لینے والا ہاتھ ایک جھٹکے سے پیچھے آ جاتا ہے... مجھے احساس تھا کہ دشمن میرے پیچھے ہے مگر پلٹ کر دیکھنے کے باوجود مجھے کچھ نظر نہ آیا۔ اس ضرب نے جو سر کے دروازے پر لگنے سے آئی تھی میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیلا دیا تھا... یہ اندھیرا فوراً ہی چھٹ گیا... خطرے کے احساس نے میرے حواس کو سہارا دیا اور میں نے سر کو جھٹک کے دیکھا تو مجھے مدن موہن کے ہاتھ میں مشین گن نظر آئی جسے وہ زمین سے اُٹھا چکا تھا۔

ابھی وہ سیدھا بھی نہ ہوا تھا کہ میرا دایاں پیر حرکت میں آ گیا اور فٹ بال اسٹائل کی یہ کک مشین گن پر ہی پڑی... مشین گن مدن موہن کے ہاتھ سے نکل کے اوپر گئی اور چھت سے ٹکرا کے واپس آئی لیکن اتنی دیر میں خود مدن موہن اوپر اُٹھ چکا تھا... وہ نیچے گرا تو اس نے مشین گن کو میرے ہاتھ میں دیکھا۔

"بس مدن موہن... جہاں پڑے ہو وہیں پڑے رہو۔" میں نے مشین گن کا رُخ اس کی طرف کرتے ہوئے کہا۔ "یہ تم نے اپنے حق میں اچھا نہیں کیا... میں سوچ رہا تھا کہ تم سب کو آزاد کر دوں اور واپس جانے دوں... تم سب بھٹکے ہوئے لوگ ہو... جو بہکانے میں آ گئے تھے... تمھیں زندہ رہنے کا ایک موقع ملنا چاہیے۔"

"نہیں چاہیے مجھے یہ موقع..." مدن موہن نے کراہ کے کہا۔ "میں جینا بھی نہیں چاہتا موہنی کے بغیر... مار ڈالو مجھے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "تم نے مرنے جینے کا اختیار بہت پہلے گروی رکھ دیا تھا... یہ اختیار پہلے کرنل کے پاس تھا اور اس سے میں نے لے لیا ہے... نہ میں تمھاری یہ درخواست قبول کروں گا کہ تمھیں جینے دوں اور نہ یہ خواہش پوری کروں گا کہ مار دوں...

اس کا فیصلہ وقت کرے گا۔" میں نے ایک دم گھوم کر تالے پر دو فائر کیے۔ تالا ٹوٹ کے بکھر گیا... اندر سے ہسٹریا میں مبتلا عورتوں نے چیخنا شروع کیا۔ میں نے کنڈی کھولی اور دروازے کو لات ماری... نیچے جانے والا زینہ میرے سامنے آگیا۔ تھوڑا سا اُجالا اوپر کے حصّے میں ہی ختم ہو جاتا تھا۔ آگے سرنگ جیسا اندھیرا تھا۔ اس اندھیرے کو سو واٹ کا ایک بلب اپنی زرد روشنی سے پُر آسیب بنا رہا تھا... جہاں زینہ ختم ہوتا تھا، وہاں وہ سب خوف اور دہشت میں مبتلا کھڑے ہوئے تھے... وہ نہیں جانتے تھے کہ میں کون ہوں... دوست ہوں یا دشمن ہوں۔ ان کو اس قیدِ زنداں سے نجات دلانے آیا ہوں یا قیدِ حیات سے... تاہم اُن کے خوف سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ میرے ارادے اور اپنے انجام کو میری صورت پر پڑھ رہے ہیں۔

"چاروں مرد اوپر آجائیں۔" میں نے حکم دیا اور میری آواز خود مجھے بڑی اجنبی لگی۔ اس آواز میں تہ خانے کی بازگشت تھی۔ "چاروں عورتیں پیچھے ہٹ جائیں۔"

مردوں نے تعمیل کی اور عورتوں کو دھکا دے کر آگے بڑھے۔

"ایسے نہیں..." میں نے کہا۔ "چاروں ہاتھوں پیروں پر چل کے آنا ہے... کتّے کی طرح... جس نے بھی سر اُٹھا کے دیکھا، اس کا مغز فرائی کر دوں گا... زینے کا دروازہ بند کر دو۔ عورتیں نہیں آئیں گی۔"

وہ چاروں بڑے مضحکہ خیز انداز میں زینہ چڑھ کے اوپر آئے۔ میں نے انھیں بیرک کے کوریڈور میں بھی اسی طرح ایک قطار میں دکھا کہ آگے پیچھے چلتے ہوئے وہ سچ مچ جانور لگتے تھے۔ مدن موہن سب کے آگے تھا۔ میں انھیں بیرک میں سے گزار کے باہر لے گیا۔ آتے جاتے میری آنکھوں نے دیکھ لیا تھا کہ وہ جگہ اسلحے کی تقسیم و ترسیل کا ایک ڈپو تھی جہاں سے تربیت یافتہ تخریب کار اسلحہ لے کر آگے جاتے تھے... انھیں ٹیم کی صورت میں کسی مشن پر روانہ کیا جاتا تھا... ایک مرد اور ایک عورت کی ٹیم مقامی آبادی میں آسانی سے گُم ہو سکتی تھی۔

"مدن موہن... اتم نرملا کو اُٹھا کر لاؤ گے۔" میں نے باہر آکے حکم دیا۔ "باقی چار آدمی دس منٹ میں تین لاشوں کو قبر میں ڈالیں گے اور مٹی برابر کریں گے۔"

میں ان سب سے دس قدم پیچھے رہا... باہر کی زمین دھوپ میں تپ رہی تھی لیکن میں نے کسی کے ساتھ رعایت نہیں کی اور ان سب کو چوپایوں کی طرح لے گیا۔ ان کی ہتھیلیاں گھٹنے اور پیر یقیناً جلے ہوں گے۔ مگر میرے نزدیک وہ بدترین سزا کے مستحق تھے۔ مدن موہن سب سے پہلے نرملا کے نزدیک پہنچ کر رُکا۔ اُس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور میں نے اُسے کھڑا ہونے کی اجازت دی۔ میں نے صرف سر کے اشارے سے ایسا کیا تھا اور میرا خیال تھا

کہ وہ آہستہ آہستہ اُٹھے گا لیکن وہ بجلی کی طرح اُٹھا اور اس رُخ پر فائر جھونک دیا۔ ریوالور اس نے نرملا کے پاس سے اٹھایا اور شاید یہی دیکھنے کے لیے اس نے سر گھمایا تھا کہ میں کس پوزیشن میں اور کہاں ہوں۔ میں نے اُسے اجازت مانگنے کا انداز سمجھا۔ اس نے موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے جان کی بازی لگا دی۔ ویسے بھی جینے کی خواہش سے محروم ہو چکا تھا اور یہ چانس لے رہا تھا۔ اگر گولی مجھے لگ جاتی تو وہ اپنے ساتھ دوسروں کی جان بچا لیتا... لیکن عجلت میں نشانہ لینے سے گولی نے مجھے چھو لیا۔ بالکل غیر ارادی طور پر میں نے غوطہ مارا اور زمین پر لیٹ گیا۔ اس طرح میری جان بچ گئی کیونکہ دوسری گولی مدن موہن نے نشانہ لے کر چلائی تھی... اس سے زیادہ کی اسے مہلت ہی نہ ملی۔ میری مشین گن کا راؤنڈ ختم ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی مدن موہن کی زندگی کا یہ کھیل بھی ختم ہو گیا جس میں تقدیر نے اُسے ہر قدم پر سراب دکھائے تھے اور وہ ہر سراب کو حقیقت جان کے اس کے پیچھے دوڑتا رہا تھا... وہ مظلوم بھی تھا اور ظالم بھی... مدن موہن نے عدالتِ انصاف سے ایک قتل پر چار مجرموں کو موت کی سزا دی تھی۔ اُن میں سے دو عورتیں مجرم نہیں تھیں۔ وقت نے اُن کے قاتل کو بھی مہلت نہ دی۔

باقی چار افراد خوف زدہ ہو کے زمین پر اُلٹے لیٹ گئے تھے اور ابھی تک جلتی ہوئی زمین پر پڑے ہوئے تھے۔ میں نے اُنھیں پھر اُٹھنے اور اپنا کام ختم کرنے کا حکم دیا۔ مدن موہن کا انجام ان کے سامنے تھا۔ اس کی لاش میں کئی سوراخ تھے اور ان سے رسنے والا خون مٹی میں جذب ہو رہا تھا۔ اس کی کھلی آنکھیں آسمان میں بہت بلندی پر اُڑنے والے چیل کوّوں کو دیکھ رہی تھیں۔ اب موہنی کی لاش پر اوپر تلے چار لاشیں ڈال دی گئیں۔ ان میں اس کے محبوب کی لاش بھی تھی جس سے دنیا میں اس کا ساتھ بہت عارضی تھا۔ شاید کہیں آکاش یا پاتال میں ان کی بدبخت روحوں کے لیے کوئی جگہ ہو جہاں وہ دنیاوی زندگی کی محرومیوں پر اکٹھے ہو کے رو سکیں۔

قبر لاشوں سے ہی بھر گئی تھی چنانچہ بہت کم مٹی اوپر ڈالی گئی۔ میں نے انھیں واپسی کا حکم دیا۔ ان میں سے تین اسی طرح چاروں ہاتھوں پیروں پر چلتے واپس آئے۔ چوتھے نے نرملا کو اٹھا لیا۔ نرملا کی اتنی طویل بے ہوشی میرے لیے حیرت کا باعث بھی تھی اور تشویش کا بھی... اتنا تو مجھے پہلے ہی اندازہ تھا کہ وہ کچھ اہمیت ضرور رکھتی ہے... مدن موہن کی بات سن کے مجھے اہمیت کا سبب بھی معلوم ہو گیا تھا... وہ کرنل کی منظورِ نظر تھی جسے وہ شاید موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ساتھ ہی لے آیا تھا۔ مدن موہن کے بیان کے مطابق وہ کسی اسپتال میں نرس تھی۔ میں اس سے بہت

مفید معلومات حاصل کر سکتا تھا لیکن اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ ہوش میں آئے... سر کی اندرونی چوٹ سے وہ بے ہوشی کی کیفیت میں مر بھی سکتی تھی اور اس کی بے ہوشی کا وقفہ لامحدود بھی ہو سکتا تھا۔

مجھے بیڈرو کی طرف سے بھی واپسی کا اندیشہ تھا... وہ کہہ کر تو ہی گیا تھا کہ 'حرام دے بوتے' کو لینے جا رہا ہے۔ اس بات کو دو گھنٹے ہو گئے تھے۔ وہ کسی بھی وقت آسکتا تھا۔ حالات اب میرے کنٹرول میں تھے، چنانچہ میں اس کا شایانِ شان استقبال کر سکتا تھا... تاہم مجھے اتنی مہلت درکار تھی کہ میں ان سب مردوں اور عورتوں کو پھر قید خانے میں ڈال دوں اور اس امر کو یقینی بنا لوں کہ ان کی طرف سے مجھے کوئی خطرہ لاحق نہیں... میں بھوک پیاس سے بھی بے حال ہو رہا تھا اور محض اپنی قوتِ برداشت اور قوتِ ارادی کے سہارے ان حالات کا مقابلہ کر تا رہا تھا۔ کیمپ میں کھانے پینے کی کسی بھی چیز کی کمی نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ کیمپ ہی نہیں، ایک عشرت کدہ بھی تھا۔ میں نے کرنل کی جیب میں سے نکلنے والی سگریٹ سلگانے کا سوچا تھا لیکن خشک حلق اور خالی پیٹ کے ساتھ دھواں نگلنا مشکل کام تھا چنانچہ میں نے دل کو صبر کے میٹھے پھل کی دلیل سے بہلا لیا۔

تہ خانہ درحقیقت کچھ جمنازیم قسم کی چیز تھا۔ یہاں حضرات اور خواتین کو دیواریں پھاندنے... رکاوٹیں عبور کرنے اور ایسی ہی مشکلات سے نمٹنا سکھایا جاتا تھا... اس کے لیے لانگ جمپ، ہائی جمپ... دیوار پر کسی سہارے کے بغیر سیدھا چڑھنا۔ بلندی سے کودنا، رسّے سے کمند ڈالنا اور رسّی کو جھولا بنا کے ایک جگہ سے دوسری جگہ تک پہنچنا۔ خندق یا کھائی عبور کرنا اور ایک دیوار سے دوسری دیوار پر پہنچنا سکھایا جاتا تھا... تہ خانے کی گہرائی شروع میں بارہ فٹ اور آخری حصّے میں اٹھارہ فٹ کے قریب تھی... گہرائی بتدریج بڑھتی تھی اور اس ہال کی چالیس فٹ لمبائی ایک مسلسل نشیب کا راستہ تھی۔ اس راستے پر بیس فٹ کے بعد پہلی دیوار تقریباً آٹھ فٹ اونچی تھی۔ غالباً اوپر سے دوڑ کر آنے والے جمپ لگا کے یا کسی بانس کے سہارے پر اسے عبور کرتے ہوں گے۔ دوسری دیوار اس سے دس فٹ آگے اور بارہ فٹ بلند تھی۔ بالکل آخری حصّے میں چھت کے کُنڈوں سے رسّے لٹک رہے تھے۔ ایک رسّہ قدرے لمبا تھا۔ اس کی لمبائی چھت سے فرش تک تھی۔ دوسرا صرف چھ سات فٹ لمبا تھا۔

وہاں اور بھی بہت کچھ تھا جو تخریب کاروں کی تربیت کے مختلف مراحل میں کام آتا تھا... یہاں سخت ترین حالات سے گزرنے کی تربیت عملی طور پر وہ حالات پیدا کر کے دی جاتی تھی جو اجنبی اور دشمن ملک میں پیش آسکتے تھے... انھیں بھوکا پیاسا رہنا بھی سکھایا جاتا ہو گا اور درختوں کے پتّے کھا کے گزارا کرنا بھی... اس کے علاوہ نظریاتی تعلیم دینے کے لیے ایک حصّہ بالکل کلاس روم جیسا تھا... وہاں ان کو سمجھایا جاتا ہو گا کہ انھیں دشمن کے علاقے میں گھسنے کے بعد کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ کس قسم کے مشن کی تکمیل کے لیے کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے اور مقامی حالات سے کیا مدد لینی چاہیے... وغیرہ وغیرہ... ظاہر ہے انھیں وہاں مختلف قسم کے اسلحے کا استعمال بھی سکھایا جاتا ہو گا لیکن اسلحہ انھیں وقت سے پہلے نہیں دیا جاتا ہو گا... کتّے کو بھی جب تک پوری طرح سُدھا نہ لیا جائے، اس پر کیسے اعتبار کیا جا سکتا ہے کہ وہ کسی دن اچانک مالک کو نہیں کاٹ لے گا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ سب نہتے تھے... ریوالور صرف نرملا کے پاس تھا جو میں اس لیے نہیں نکال سکا تھا کہ مجھے نظر نہیں آیا تھا... اس کے پاس کوئی پرس یا ہینڈ بیگ ہوتا تو میں ضرور اس کی تلاشی لیتا مگر غالباً ریوالور کو اس نے اپنے زنانہ سیف ڈیپازٹ والٹ میں یعنی بلاؤز میں چھپا رکھا تھا۔ جب میں نے اُسے پھینکا تھا تو ریوالور باہر گر گیا تھا۔ مدن موہن نے اُسے نرملا کے قریب جا کے دیکھا ہو گا... ذرا سی بے احتیاطی میری جان لے سکتی تھی۔ مدن موہن کی بدحواسی کے باعث میں بچ گیا تھا۔ اب مجھے خیال آیا کہ ریوالور تو شرما، ورما کے پاس بھی ہوں گے جو اُنہی کے ساتھ دفن ہو گئے۔ مدن موہن کے انجام نے باقی سب کے حوصلے پست کر دیے تھے ورنہ وہ بھی ایسی ہی کوشش ضرور کرتے۔ انھوں نے سمجھ لیا تھا کہ مقابلے سے بازی جیتنے کے امکانات معدوم ہو گئے ہیں... زندہ رہنے کی امید کو اب میرے رحم و کرم سے ہی وابستہ رکھا جا سکتا تھا... وہ نہایت فرماں بردار ثابت ہو رہے تھے اور شاید سوچ رہے تھے کہ منت سماجت اور آہ و زاری سے وہ مجھے جاں بخشی پر آمادہ کر لیں گے۔

مجھے ابھی بہت کچھ دیکھنا اور پوچھنا تھا لیکن پہلے میں اپنی جسمانی کمزوری کا علاج کرنا چاہتا تھا جو بھوک پیاس کی صورت میں مجھ پر غالب آرہی تھی... میں نے ان سب کو ہال کے ایک باتھ روم میں بند کر کے باہر سے کنڈی لگا دی۔ مجھے معلوم تھا کہ ہال میں اسلحہ نہیں ہے لیکن وہ سب مل کے کوشش کرتے تو ایسی بہت سی چیزیں تھیں جن سے دروازہ توڑا جا سکتا تھا... اور میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ فرار ہونے کی کوشش بھی کریں کیونکہ پھر مجھے ان سب کو شوٹ کرنا پڑتا اور میری تفتیش ادھوری رہ جاتی۔

باتھ روم زیادہ بڑا نہیں تھا اور وہ سب اس کے اندر بس کھڑے رہ سکتے تھے... بیٹھ نہیں سکتے تھے۔ عورتیں مسلسل رو رہی تھیں اور تقریباً ہسٹریا کی کیفیت میں مبتلا تھیں۔ وہ ہاتھ جوڑ رہی تھیں اور دہائی مانگ رہی تھیں... خدا رسولؐ کے واسطے دے رہی تھیں اور وضاحت کر رہی تھیں کہ وہ اپنی مجبوری کے باعث

اس غلط کام میں پھنس گئیں لیکن میں نے ان کی طرف سے اپنے کان بند کر لیے تھے۔ مرد خود اپنی نظر میں ذلیل تھے اور پٹے ہوئے کتے کی طرح سر نہیں اُٹھا سکتے تھے۔

اب باہر صرف نرملا رہ گئی تھی... میں نے اس کا سرسری معائنہ کیا۔ نبض کی رفتار اور دل کی دھڑکن مجھے نارمل لگی... مجھے خیال آیا کہ کہیں وہ مکر کیے نہ پڑی ہو۔

"نرملا...!" میں نے اُسے آہستہ سے ہلا کے کہا: "نرملا! ہوش میں آؤ..."

میں نے اس کے گالوں کو تھپکا اور اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا جو صرف اداکاری تھی۔

"لاحول ولا قوۃ۔" میں نے اپنے آپ سے کہا۔ "یہ تو گلے پڑ گئی۔" پھر میں نے کچھ دور جا کے سگریٹ جلائی اور چند کش لیے۔

"ارے بابا! اب تو ہوش میں آجاؤ۔" میں نے یوں کہا جیسے میں اس کی بے ہوشی سے سخت عاجز آگیا ہوں۔ "میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمھیں کچھ نہیں کہوں گا۔" اس کے پاس بیٹھ کے میں نے نرمی سے کئی بار اس کا نام پکارا اور پھر اچانک جلتی ہوئی سگریٹ اس کی گردن پر لگا دی۔ ایسے وقت میں جب اُسے مجھ سے اس قسم کے سلوک کی ذرا بھی امید نہ تھی۔

نرملا نے ایک چیخ ماری اور آنکھیں کھول کر دیکھنے پر مجبور ہو گئی۔ میں نے ایک قہقہہ مارا: "تو تم بے ہوش تھیں؟" میں نے کہا۔

وہ اُٹھ بیٹھی اور ایک ہاتھ سے بال سنوارنے لگی۔

"میں مانتا ہوں تمھاری قوتِ برداشت کو۔" میں نے کہا۔ "اور تمھاری اداکاری کو کہ تم نے بے ہوشی کا اتنا لمبا ڈراما کامیابی سے کیا... کیا تمھیں امید تھی کہ بالآخر تمھارے چاہنے والے کرنل صاحب اور ان کے مددگار و معاون شرما اور رما مجھ پر غالب آجائیں گے... تم دم سادھے ہماری گفتگو سنتی رہیں... اور انتظار کرتی رہیں میری شکست کے لمحے کا...!"

اس نے حیرانی سے پلکیں جھپکا کے مجھے دیکھا: "میں کتنی دیر سے بے ہوش پڑی رہی ہوں... میں نے تو... وہ سب نہیں سنا۔"

"گویا تمھیں کچھ معلوم نہیں ہے؟" میں نے طنز سے کہا۔ "یہ بھی کہ وہ دونوں بھائی مدن موہن کے ہاتھوں جہنم رسید ہو گئے۔"

"کیا؟... مدن موہن نے... انھیں مار ڈالا؟" وہ خوفزدہ لہجے میں بولی: "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

میں تلخی سے ہنسا: "تم اب یہ بھی کہو گی کہ تمھیں اپنے کرنل صاحب کے مارے جانے کی بھی خبر نہیں..."

"بکتے ہو تم..." وہ ایک دم چلائی: "مجھے وحشت زدہ کرنے کے لیے ایسا کہہ رہے ہو۔"

میں نے اُسے غور سے دیکھا: "کیا تم اس کی لاش دیکھنا پسند کرو گی؟"

نرملا کا رنگ پیلا پڑ گیا... وہ پلک جھپکائے بغیر مجھے تکتی رہی... یہ ایک فطری ردِعمل تھا جسے میں اداکاری نہ سمجھنے پر مجبور تھا۔

"یہ... یہ ٹھیک ہے کہ میں ابھی ہوش میں تھی... اس وقت جب تم نے میرے جلتی ہوئی سگریٹ لگائی تھی...!" وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولی: "میں تمھیں شوٹ کر دینے کا موقع تلاش کر رہی تھی۔"

"خالی ہاتھوں سے شوٹ کرنے کے لیے۔" میں نے پھر طنز کیا۔ اس کا ہاتھ بے اختیار اپنے سینے پر گیا۔

"تمھارے ریوالور سے مدن موہن بھی مجھے شوٹ کرنا چاہتا تھا مگر وہ اس ریوالور سمیت دفن ہو گیا... اسی قبر میں جس میں کل موہنی کو گاڑا گیا تھا... کیا یہ سب تمھیں معلوم نہیں؟... تم نے نہیں دیکھا؟"

اس نے آہستہ سے انکار میں سر ہلایا: "مجھے... صرف اتنا یاد ہے کہ... تم نے... مجھ پر حملہ کیا تھا... اس کے بعد کیا ہوا تھا؟ شاید میں گر پڑی تھی... پھر جب میں نے دیکھا تو... تم مجھے اُٹھا کے لا رہے تھے۔"

میں نے اس کے جواب پر غور کیا تو میرے شک کی بنیاد ہی غلط ہونے لگی... ایک وقت ایسا آیا تھا جب وہ اُٹھ کر آ سکتی تھی اور مجھے پیچھے سے گولی مار سکتی تھی... اس وقت میں مدن موہن کے ہمراہ تہ خانے کے دروازے کی طرف جا رہا تھا... تہ خانے کے قیدیوں کو باہر تک لانے میں میرے پندرہ بیس منٹ ضرور صرف ہوئے تھے اور اس وقت نرملا کو کسی کا خطرہ نہ تھا... یہ میری کوتاہی تھی کہ میں نے اُسے بے ضرر سمجھتے ہوئے وہاں چھوڑ دیا تھا... مجھے تو یہ بھی علم نہ تھا کہ وہ مسلح ہے... یہ سب نادانستگی میں ہونے والی مگر فاش غلطیاں تھیں... اگر میں اکیلا نہ ہوتا تو مجھ سے ایسی بھول چوک نہ ہوتی... محسن میرے ساتھ ہوتا تو ایک صورتِ حال کی نگرانی کرتا اور دوسرا تلاشی لیتے اور مجرموں کو باندھ کر ڈالنے کی کارروائی پوری کرتا... یہ اکیلے آدمی کا حسن نہیں تھا جو میں نے ابھی تک تقدیر کی یاوری سے کامیابی کی سمت بڑھتا تھا... لیکن میں خود کب اس مشن پر نکلا تھا... میرا مشن تو [illegible] مگر تقدیر نے مجھے یہاں پہنچا دیا تو میں کیا کرتا؟

"دیکھو نرملا...!" میں نے اُسے گھورتے ہوئے کہا: "جو ہونا تھا، وہ ہو چکا ہے... یہ بازی تمھارے کرنل صاحب نے ہار دی ہے... مجھے سب کچھ معلوم ہو چکا ہے کہ یہاں کیا ہوتا تھا... جو نہیں معلوم وہ معلوم ہو جائے گا... یہاں اگر کسی کو اس کی شامتِ اعمال گھیر کے لا سکتی ہے تو وہ استاد پیڈرو ہے۔"

"استاد پیڈرو...؟"

"ہاں... یہ اس کا ایک نام ہے۔" میں نے کہا۔ "اس لیے حیران ہونے کی ضرورت نہیں... ممکن ہے تم سے اس کا تعارف کسی اور نام سے کرایا گیا ہو... وہ گاڑی لے کر گیا تھا مقتول ڈرائیور سائیں کے ساتھی کلینر کی تلاش میں... اگر وہ آگیا تب بھی وہ کوئی توپ نہیں چلا سکتا۔"

"آخر... تم کیا چاہتے ہو؟" وہ سر جھکا کے بولی۔

"صرف تمھارا تعاون..." میں نے کہا: "تعاون کے لفظ سے غلط فہمی پیدا نہ ہو، اس لیے وضاحت کر دیتا ہوں کہ میری مراد اس تعاون سے نہیں ہے... جو تم کرنل صاحب سے کرتی رہیں۔"

"میں تم سے ہر قسم کا تعاون کرنے کے لیے تیار ہوں۔" وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"ویری گڈ... تمھاری اس کایا کلپ کو میں کیا سمجھوں...؟ ابھی تو میں نے کوئی قیمت بھی نہیں لگائی تھی کہ تم نے اپنی وفاداریاں تبدیل کر لیں... تم سب کچھ بھول گئیں کہ تم نے کرنل سے کیا عہد و پیمان کیے تھے۔ تمھارا تعلق کس ملک سے ہے اور تمھارے مذہبی عقائد کیا ہیں؟"

"تم کچھ بھی سمجھ لو..." وہ نخوت سے مسکرائی... مگر یہ مسکراہٹ بے جان اور مصنوعی تھی۔

"چلو سمجھنے سمجھانے کے لیے تو بہت وقت ہے۔ فی الحال تم اپنے تعاون کا آغاز امورِ خانہ داری سے کرو۔" میں نے کہا۔

وہ مجھے حیرانی سے دیکھنے لگی۔ "کیا کروں؟"

"آخر تم عورت ہو... اور ہندوستانی عورت... جو کام تم کر رہی ہو یہ تو ماں باپ نے نہیں سکھایا تھا... مگر جو سکھایا تھا وہ سب تم بھولی نہیں ہو گی۔ پتلا جائے بنانا... کھانا پکانا اور کھلانا... یہاں کوئی کچن بھی ہو گا... ذرا سی دیر کے لیے فرض کر لو کہ میں تمھارا پتی مہاراج ہوں... میں تھکا ہارا اور بھوکا پیاسا گھر لوٹا ہوں۔ اب تم کس طرح سیوا کرے..."

"ایسا مت کہو... بھگوان کے لیے۔" اس کا چہرہ ایک دم تاریک ہو گیا: "ایسے خوابوں کے آسیب نے میری زندگی اجیرن کر دی تھی... بڑی مشکل سے ان سب کو مارا تھا میں نے... اور دفن کر دیا تھا... جیسے لوگ اپنے گناہوں سے پیچھا چھڑاتے ہیں۔ ہندوستانی عورت کیا... میں عورت بھی نہیں ہوں... میں فقط ایک جسم ہوں... برائے فروخت اور مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ خریدار کون ہے... میری قیمت بھی حالات اور ضرورت کے مطابق بدلتی رہتی ہے... تم نے تو نہیں لگائی مگر آج میری قیمت صرف زندہ رہنے کا حق ہے... جو تم خیرات سمجھ کے بھی دو گے تو میں قبول کر لوں گی۔" وہ ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی... اور نیچے گر گئی۔

میں نے اُسے بازو سے پکڑ کے کھڑا کر دیا۔ "ڈراما مت کرو۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ تم کس کا ساتھ دے رہی تھیں اور کیوں... یہ قتل و غارت گری اور خونریزی کا مشن تھا... کبھی تم نے سوچا تھا کہ ان عورتوں، مردوں، بوڑھوں اور بچوں کی زندگی بھی ایک قیمت رکھتی ہے جو تمھارے اس مشن کی بھینٹ چڑھے... اور چڑھتے رہیں گے۔ وقت بدل گیا ہے تو قیمت کے بجائے تم خیرات مانگ رہی ہو... میں تم سے جھوٹا وعدہ بھی نہیں کر سکتا کہ تمھیں خیرات ملے گی۔"

میں اُسے دھکیلتا ہوا کچن کی طرف لے گیا... وہ آگے تھی اور خود ہی قدم بڑھاتی جا رہی تھی مگر جہاں اس کی رفتار کم ہوتی تھی، میں اس کو پیچھے سے لات رسید کرتا تھا۔ وہ دو بار گری اور پھر اُٹھ کے چلنے لگی۔ وہ میرے لیے ایک جنگی قیدی تھی لیکن میں کسی جنیوا کنونشن کے اصولوں کا پابند نہ تھا... عام حالات میں ایک عورت کے ساتھ یہ سلوک نامناسب سمجھا جا سکتا تھا مگر یہ عورت میرے ملک کی اور میری قوم کی دشمن تھی۔ اس کے ہاتھ لاتعداد بے گناہوں کے خون میں رنگے ہوئے تھے۔ میں اس کو بدترین عذاب کے ساتھ قتل کرنے کی خواہش پر بڑی مشکل سے قابو پا رہا تھا۔ اور وہ اب تک زندہ تھی تو صرف اس لیے کہ میرے نزدیک اس کی اہمیت ایک ایسی ڈائری سے زیادہ نہ تھی جس سے مجھے کارآمد معلومات حاصل ہونے کی امید ہو... جس کو پڑھنے کے بعد ہی طے کیا جا سکتا تھا کہ اسے تباہ کر دیا جائے یا آئندہ ضرورت کے لیے محفوظ اور مقفل رکھا جائے۔

کچن میں وہ سب کچھ تھا جس کی مجھے توقع تھی یا خواہش تھی... اس نے الیکٹرک کیٹل کا پلگ لگایا... فریج میں سے مکھن، انڈے اور ڈبل روٹی نکالے... ٹوسٹر آن کیا اور آملیٹ بنانے کے لیے انڈے توڑنے لگی... میں اس کے قریب ہی ایک اسٹول پر بیٹھ گیا تھا کہ اس کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھ سکوں... اگر وہ میرے لیے آملیٹ یا کافی میں زہر ملا دیتی تو اس سے کچھ بعید نہ تھا۔

"کام کے ساتھ ساتھ تم باتیں کر سکتی ہو۔" میں نے کہا۔

"کیسی باتیں...؟"

"میں تم سے جو پوچھوں اس کا جواب دیتی رہو۔" میں نے کہا۔

اس نے سر ہلایا۔ "پوچھو!" اور پیشانی پر سے بالوں کی ایک لٹ کو پھر پیچھے کیا جو ایک سیکنڈ بھی اپنی جگہ نہیں ٹھہرتی تھی۔

"غالباً یہ کہنا ضروری نہیں کہ تم جو کہو گی سچ کہو گی... مجھے بہت کچھ تو پہلے ہی معلوم ہو چکا ہے... تم نے تو مجھے بہت دیر سے دیکھا تھا... میں نے راستے میں ہی اس ٹرک کے کلینر کو مار دیا تھا جسے سائیں چلا رہا تھا۔ شاید تمھیں یاد ہو گا کہ ایک جگہ سڑک پر لکڑی کا لٹھا پڑا ہوا تھا۔ بوٹا اُسے ہٹانے کے لیے اترا تھا مگر وہ پھر ٹرک پر چڑھ نہیں سکا تھا۔ اس کی جگہ میں نے لے لی تھی... مجھے معلوم تھا کہ ٹرک کس وقت وہاں سے گزرے گا اور یہ بات

مجھے ایک اور ڈرائیور نے بتائی تھی جس کا نام ڈنگا تھا۔ میں تمھارے ساتھ ہی یہاں پہنچا تھا اور رات کو بھی فارغ نہیں بیٹھا تھا۔ میں نے کیبن نمبر تین میں داخل ہو کے ایک بوڑھے کو ڈسٹرب کیا تھا... مرنے سے پہلے انھوں نے جاں بخشی کے وعدے پر بہت سی کارآمد باتیں بتادی تھیں۔ اس کے بعد سائیں میری معلومات میں اضافہ کرتا مگر وہ مارا گیا... شرما، ورما بھی ضائع ہوئے لیکن ملک موہن میرے ہاتھ لگ گیا تھا۔ اسے بھی میں نے بچا لیا تھا، اور وہ مرتے مرتے بہت کچھ بتا گیا... کچھ لوگ ہوتے ہیں سخت جان اور زندگی کی پروا نہیں کرتے... مرجاتے ہیں مگر لب نہیں کھولتے۔ ابھی تک مجھے اتنا بہادر آدمی کوئی نہیں ملا... یہ سب تم کو بتلانے کا مقصد یہ ہے کہ جھوٹ بولو یا سچ کو چھپاؤ تو سوچ لینا...“

” اس سے کیا فائدہ ہوگا... ؟“ وہ تلخی سے بولی۔ ” وہ بھی کہاں بچے جنھوں نے سچ بولا تھا... ان سے بھی تم نے یہی کہا ہوگا...“

” ہاں..... کہا تھا... مگر جیسے ہی انھوں نے جھوٹ بولا مجھے پتا چل گیا اور پھر میں اُن سے کیے ہوئے وعدے کا پابند نہیں رہا۔“ میں نے کہا۔ ” ان کو مارنے سے پہلے یہ بات میں نے انھیں بتادی تھی۔ سچ کا مطلب ہے سو فیصد سچ اگر ایک فیصد بھی کم ہو تو وہ سچ نہیں۔“

اس نے کافی کا ٹن ایک الماری میں سے نکالا۔

” تم ایک نرس تھیں۔“ میں نے کہا۔ ” نرس کا پیشہ تو زخموں پر مرہم رکھنا اور بیمار جسموں کو شفایابی کی منزل تک لے جانے میں مدد کرنا ہوتا ہے۔ تم کرنل کے ساتھ کیسے آگئیں ؟“

” اس سوال سے تو تمھاری لاعلمی ظاہر ہوتی ہے۔“

” کرنل سے تمھارے ناجائز مراسم تھے ؟“ میں نے اطمینان سے کہا۔ ” اس کا اعتراف میرے سامنے اس کی بیوی نے کیا تھا۔“

” تم اس کی بیوی سے مل چکے ہو ؟“ نرملا چونکی۔

” اس کے علاوہ میں شرما اور ورما کی بیویوں سے بھی مل چکا ہوں... وہ دونوں بنیں ہیں۔ صرف تین مہینے پہلے ان کی شادی ہوئی تھی۔“ میں نے کہا۔

وہ متفکر نظر آنے لگی... شاید میں اسے امپریس کرنے کے مقصد میں کامیاب رہا تھا اور اس نے سمجھ لیا تھا کہ جھوٹ نہیں چلے گا۔

” کرنل تم پر بہت اعتماد کرتا تھا ؟“ میں نے کہا۔ ” اس حد تک کہ تم ایک ٹاپ سیکرٹ مشن میں اس کے ساتھ رہیں... کیا تمھیں معلوم تھا کہ اس ٹرک میں کیا ہے جسے سائیں چلا رہا تھا ؟“

” ہاں... اس میں اسلحہ تھا...“

” کہاں سے آیا تھا یہ اسلحہ ؟“ میں نے کہا۔

” لاہور سے...“ وہ کام میں مصروف رہی۔

” لاہور میں کہاں سے ؟“

” ٹرک عبداللہ اینڈ سنز کے آفس سے روانہ ہوا تھا... میں وہیں موجود تھی... پہلے سے...“ وہ بولی۔

” جس وقت ٹرک روانہ ہوا تھا... تو وہاں اور کون موجود تھا ؟“

” ایک شخص چوہدری دلاور نام کا تھا۔“ وہ بولی۔ ” اُسے میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔“

” پھر اس کا نام کیسے جان لیا تم نے ؟“

” دوسرے سب اسے چوہدری دلاور کے نام سے ہی مخاطب کررہے تھے۔“

” دوسرے کون ؟“

” خود حاجی عبداللہ... ڈرائیور سائیں...“

” تم نے ان کی گفتگو سُنی تھی... ؟“ میں نے کہا۔

” ہاں... کرنل ہمیشہ کہتا تھا کہ لڑکی اپنے کان اور اپنی آنکھیں سوتے میں بھی بند مت کرنا۔“ اس نے قدرے بوجھل لہجے میں کہا اور پھر ماتھے سے بال ہٹائے... یہ ادا اس کی عادت میں شامل تھی۔ ایک شادی شدہ اور ذمے دار آدمی جو کرنل کے عہدے پر فائز تھا، گھر بار اور فرائض کو بھول کے اس پر مرمٹا تھا تو قصور صرف اس کے دل کا تھا جس پر اسے اختیار نہ رہا۔ بلاشبہ نرملا ایسی عورت تھی اور اس کے حسن و شباب میں وہ ساحرانہ قوت تھی کہ کرنل سارا ڈسپلن اور سیلف ڈسپلن بھول گیا تھا... وہ بلاشبہ ان عورتوں میں سے تھی جو ڈکٹیٹروں پر حکومت کرتی ہیں اور حکومتوں کے تختے الٹتی ہیں... بات صرف موافق حالات ملنے کی ہے۔

” ایسے کیا دیکھ رہے ہو... ؟ زہر نہیں ملایا ہے میں نے اس میں...“ وہ ایک ہاتھ کمر پر رکھ کے بولی۔

میں چونکا۔ ” تمھیں موقع نہیں ملا۔“ میں نے خفت سے کہا اور اس ٹرے کو اپنے قریب کرلیا جو نرملا نے میرے سامنے رکھ دی تھی... وہ اب پہلے سے زیادہ پُراعتماد انداز میں مسکرا رہی تھی اور اس کی وجہ وہ غلط فہمی تھی جو اُسے میرے وقتی انہماک سے ہوئی تھی۔ اس نے کام کرتے ہوئے یہ محسوس کرلیا تھا کہ اپنی تمام بے حسی سفاکی اور سنگدلی کے مظاہرے کے باوجود میں بہرحال ایک مرد ہوں جو اس کے حسن کی تابکاری اور شباب کی مقناطیسی کشش کے خلاف مزاحمت کی کوشش میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوا... ایسا پہلے بھی ہوا ہوگا چنانچہ اسے اپنی قوتِ تسخیر پہ ناز تھا تو بے جا نہ تھا۔ اس ہنگامہ دار و گیر میں اس کی قمیص بائیں شانے پر سے پھٹ گئی تھی اور نیچے اس کی سفید جلد پر خراشوں کی سرخی بہت نمایاں نظر آتی تھی۔

اپنے موجودہ حالات میں میرا ذہن خیالوں کے انتشار کا شکار تھا اور میں بیک وقت بہت کچھ سوچ رہا تھا... یہ کہ نرملا نے اب تک سچ بولا ہے۔ اگر اس نے ’تعاون‘ جاری رکھا تو کیا میرے لیے اس کو ساتھ رکھنا ممکن ہوگا؟ مجھے تو آج ہی پھر اس سفر پہ روانہ ہونا پڑے گا جس کی منزل رابعہ تھی... میں نرملا کو کیسے ساتھ رکھ سکتا ہوں اور اسے ساتھ رکھنا ممکن نہ ہو تو میں دو مشکل راستوں میں سے کون سا راستہ اختیار کرسکتا ہوں... اسے آزاد کردوں یا سب کے ساتھ ختم کردوں ؟ میں پیڈرو کی واپسی کے خیال سے بھی متفکر تھا اور حاجی کے جوابی ردِعمل کے متعلق بھی سوچ رہا تھا۔ اب تک کسی نے ڈنگے کو ضرور آزاد کردیا ہوگا اور وہ میرے ظلم کی فریاد لے کر حاجی کے پاس پہنچ چکا ہوگا یا پہنچنے والا ہوگا۔ میں حاجی اور چوہدری دلاور کے تعلق پر بھی غور کررہا تھا اور اپنی روانگی سے قبل آخری ... کا منصوبہ بھی بنا رہا تھا... مگر یہ سب کام میرا ذہن کررہا تھا۔ میری آنکھیں وہی دیکھ رہی تھیں جو میرے سامنے تھا اور اس کیبن میں خوبصورتی اور دلکشی کا سامان صرف نرملا فراہم کررہی تھی... کسی بھی حسن شناس نظر رکھنے والے کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ خوب صورتی سے نظر چرالے... اُسے دلچسپی بہرحال نہیں سمجھا جاسکتا تھا مگر نرملا نے میری نظر کے مفہوم کو غلط سمجھا۔

اس حقیقت کا ادراک ہوتے ہی میں محتاط ہوگیا۔ میں نے اس کے ناز و انداز، خود نمائی کے خلاف اپنا دفاع مضبوط کرلیا۔

میں نے کہا۔ ” کیا تم نے میرے سوال کا جواب دے دیا ہے ؟“

وہ مسکرائی۔ ” کون سا سوال ؟“

” میں نے پوچھا تھا کہ وہاں دوسرے کون تھے ؟“

” دوسرے... یہی ٹرک ڈرائیور اور وہ لڑکا... جسے سب حرام دا پوترا کہنے کے عادی ہیں۔“ وہ بولی۔

” گفتگو میں اور کسی کا ذکر آیا تھا... کوئی ایسا نام سُنا تھا تم نے جو پہلے بھی سُنا ہو ؟“ میں نے کہا۔

” ہاں... وہ اسکواڈرن لیڈر مشاہد میاں کا ذکر کررہے تھے۔ شرما اور ورما کا ذکر بھی آیا تھا۔“ وہ بولی۔ ” انھوں نے کرنل پریتم کی بات بھی کی تھی۔“

” یہ کرنل پریتم کون ہے ؟“

اس نے دُکھ اور ملامت بھری نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ” میرا پریتم جسے تم نے مار دیا... کیا تم جانتے نہیں... ؟“

میں ہنسا۔ ” میں تمھاری زبان سے اس کا نام سُننا چاہتا تھا... یہ مشاہد میاں کون ہیں ؟“ میں نے آخری سلائس کے ساتھ آملیٹ ختم کرتے ہوئے کہا۔

” وہ جاچکا ہے... ایک ہفتہ قبل وہ اپنے گروپ کے ساتھ نکل گیا تھا... اسی روز ہم پہنچے تھے۔“

” ہر گروپ کو وہاں صرف ایک ہفتے کی تربیت دی جاتی ہے ؟“

” ایک مہینے کی ... “ وہ بولی۔

” تم سے پہلے ... گروپ جاچکے ہیں ؟“

یہ بھی مجھے کیسے معلوم ہوسکتا ہے... شاید پریتم بھی نہیں بتا سکتا تھا کہ یہ سلسلہ کب سے جاری تھا اور کہاں کہاں سے کتنے لوگ اس مشن کے لیے منتخب ہوئے تھے۔“ نرملا نے کہا۔ ” اُسے تو اچانک حکم ملا کہ ہائی کمان کو رپورٹ کرو... ایک ٹاپ سیکرٹ مشن کے لیے... پھر اسے یہاں پہنچنے کو کہا گیا تھا کیپٹن شرما اور لیفٹیننٹ ورما کا انتخاب خود کرنل کی سفارش پہ ہوا تھا۔“

” اور تمھارا ؟“

” ہر گروپ کے کمانڈر کو اس کی مرضی کے مطابق ایسے افراد کے انتخاب کا موقع دیا جاتا تھا جو مشن کی تکمیل میں اس کے لیے قابلِ اعتماد معاون ہوں... ان میں ایک عورت کا ہونا شرط تھا۔ کرنل نے میرا نام دیا تھا تو کسی کو اس پر کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔“ وہ بولی۔

” عورتوں کو عموماً رازداری کے معاملات سے دُور رکھا جاتا ہے۔“

” یہاں تربیت پانے والوں میں عورتیں بھی شامل ہیں۔ ان کو کنٹرول کرنے کے لیے بھی تو کوئی ہونا چاہیے۔ عورتوں کے سارے معاملات مردوں پر نہیں چھوڑے جاسکتے۔ بعض اوقات عورت ہی ان کے مسائل کو ہینڈل کرسکتی ہے... اور یہاں ہر گروپ میں عورتوں کی تعداد مساوی رکھی جاتی تھی... ایک مرد اور ایک عورت کی ایک ٹیم... یہاں سے وہ گروپ کی صورت میں جاتے تھے۔ آگے ہر ٹیم الگ ہوجاتی تھی مگر ان کے درمیان رابطہ رہتا تھا۔“

” اور یہ مرد عورتیں... کس منڈی سے آتے تھے ؟“ میں نے کہا۔

” مجھے نہیں معلوم... ظاہر ہے انتخاب کرنے والے دوسرے لوگ تھے... وہ اپنا اطمینان کرلینے کے بعد ہی انھیں یہاں بھیجتے تھے...“ وہ بولی۔ ” تاہم ان کو اتنی رعایت ملتی تھی کہ اپنے اپنے پارٹنر کا خود انتخاب کریں...“

” آئی سی...“ میں نے کہا۔ ” میں تو سمجھا تھا کہ یہ سب کرائے کی عورتیں ہیں۔“

” صرف مرد کرائے کے ہیں۔“ وہ طنز کرتے ہوئے بولی۔ ” ان کے ساتھ عموماً وہی آجاتی ہیں، جو ان سے پیار کرتی ہیں... اور ان کی خاطر جان دینا قبول کرلیتی ہیں مگر جدائی قبول نہیں کرتیں...“

” تم مردوں کو بدنام کررہی ہو۔“ میں نے کہا۔

” کیا مدن موہن نے اپنے اور موہنی کے بارے میں نہیں بتایا ؟“

” بتایا تھا...“ میں نے کہا۔ ” ان کی بھی ایسی ہی اسٹوری تھی۔“

” صرف ایک مرد ہے ان میں... جو اپنی مرضی سے آیا ہے ایک لڑکی کا ساتھ دینے کے لیے“ نرملا نے کہا۔ ” انتخاب لڑکی کا ہوا تھا... مجھے خود کرنل نے بتایا تھا کہ جب بھی کوئی لڑکی منتخب ہوئی تو اس کا ساتھ دینے والا نہ ملا... کسی اجنبی کے ساتھ آنے پر وہ تیار نہ ہوئی اور اسے ڈراپ کردینا پڑا لیکن جب بھی مرد منتخب ہوئے... ان میں سے بہت کم ڈراپ ہوئے۔“

"مجھے یہ مرد نہیں... لڑکے لگتے ہیں۔"

"یہ لڑکے ہی ہیں... انھیں کالجوں سے نکل کے بے روزگاری کا سامنا تھا اور یہ لوگ مایوسی کا شکار تھے۔" نرملا نے کہا۔ "ایسے ہی لوگ زندگی کو داؤ پر لگاتے ہیں۔ اور یہ لڑکیاں جو ان سے محبت کرتی تھیں، اسی لیے ساتھ نکل آئیں کہ تقدیر کی مہربانی رہی تو واپسی پر ایک لاکھ نقد ملیں گے... ایک پلاٹ اور مکان بنانے کے لیے قرض ملے گا... باقی زندگی سکھ چین سے گزر جائے گی... اور تقدیر کو اس جنم میں ملن منظور نہ ہوا تو پھر ایک ساتھ مر جائیں گے۔"

"ان سب کو الگ الگ مشرقی پاکستان بھیجا جائے گا؟"

"الگ الگ نہیں... یہ ایک ہی بحری جہاز میں کلکتہ جائیں گے... وہاں سے ان کو مکتی باہنی والے لے جائیں گے۔ یہ سرحد عبور کرنے کے بعد مقامی آبادی میں اپنے ٹھکانے بنالیں گے... چونکہ سب اردو بولنے والے نہیں ہیں اور مغربی پاکستان کی شہریت کا ثبوت رکھتے ہیں اس لیے ڈبل ایجنٹ بننے کے اہل ہیں۔ یہ ایک طرف وفادار پاکستانی کے دوست ہوں گے اور ان کے بارے میں مفصل معلومات حاصل کرسکیں گے تو دوسری طرف بنگالی بول کے ان میں گھل مل جائیں گے جو شیخ مجیب کے حامی ہیں اور اپنا الگ بنگلہ دیش بنانا چاہتے ہیں... یہ ایسے عناصر کی نشاندہی کریں گے اور انھیں اسلحہ پہنچاتے رہیں گے... پھر ان کے ذریعے اسلحہ آگے جائے گا... خاموشی اور رازداری سے یہ سب اسلحہ انہی ہاتھوں میں پہنچے گا جو ہم خیال ہیں یعنی مجیب کے چھ نکات کی بنیاد پر مغربی صوبے کے خلاف لڑ سکتے ہیں۔ انہی کی مخبری پر مکتی باہنی والے خاموشی سے مخالف عناصر کا خاتمہ بھی کرتے رہیں گے۔"

"اور ان کو کتنا عرصہ وہاں گزارنا ہوگا؟"

"ایک مہینہ..." وہ بولی۔ "ان سے تین مہینے کا معاہدہ ہوتا ہے۔ ایک ماہ کی تربیت... ایک ماہ کی ایکٹیو سروس... اور ایک مہینہ ٹرانزٹ کے لیے... یعنی آنے جانے کے لیے۔"

"کبھی یہ معلوم ہوا کہ ایک جوڑا ایک مہینے میں کتنے انسانوں کے قتل کا سبب بنتا ہے؟" میں نے مشتعل ہو کے کہا۔ "کتنے گھر اجاڑتا ہے، کتنی عورتوں کو بیوہ کرتا ہے اور کتنے بچوں کو یتیم؟"

"تم جذباتی ہو کے سوچ رہے ہو... جنگ تو جنگ ہے۔"

"ہاں..." میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "اس کا احساس ان لوگوں کو اپنی ایکٹیو سروس کا ایک مہینہ پورا کرنے کے بعد ہو جاتا ہوگا... کیا آج تک کسی کو ایک لاکھ دیے گئے ہیں؟ کوئی ہے ایسا جو کہہ سکے [illegible] سے پلاٹ ملا تھا اور قرضہ بھی... اور اس نے اپنا گھر [illegible] جہاں وہ شاد و آباد ہے... اسی عورت کے سا[illegible] کرتا تھا... ایک لاکھ کی رقم کاروبار میں [illegible]

نرملا خاموشی سے اپنے ہونٹ کاٹتی رہی اور دوسری طرف دیکھتی رہی۔ "میں جانتا ہوں اس نفرت کی سیاست کے سارے داؤ پیچ... مگر یہ بے وقوف لڑکے اور لڑکیاں۔" میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ "یہ نہیں سمجھتے کہ ان کو سبز باغ دکھا کے اور جھوٹے وعدوں سے بہلا کے موت کی قربان گاہ میں بھیجنے والے بنیے ہیں۔ انھیں ایک گولی دو روپے کی پڑتی ہے یا تین کی... جو کام دو تین روپے میں نکلتا ہو اس پر ایک لاکھ خرچ کرنے والا کوئی احمق ہو سکتا ہے... ایک جوڑے کا کام ختم ہوا... اس کا کام تمام کرو، پانچ چھ روپے میں دو گولیاں مارو اور لاش سمندر میں ڈال دو۔ ننانوے ہزار نو سو چورانوے بچ گئے... ان کی جگہ دوسرا آجائے گا... انھیں بتاؤ کہ پہلے والوں کو سرکار نے کتنا دیا اور وہ کہاں کہاں آباد ہیں... وہ یقین کرتے رہیں گے۔"

ناشتا ختم کرنے کے بعد میں وہی سگریٹ پی رہا تھا جو کرنل کی جیب سے برآمد ہوئے تھے۔ یکے بعد دیگرے دو سگریٹ پی کے میں بالکل تازہ دم ہو گیا تھا۔ میری جسمانی توانائی کو بہترین ناشتے اور کافی نے پوری طرح بحال کر دیا تھا... آدھے گھنٹے تک میں کچن میں ایک اسٹول پر بیٹھا رہا تھا۔ مشین گن میرے قریب ہی رکھی ہوئی تھی۔ اگر پیڈرو آجاتا تو اس کی گاڑی کی آواز سنتے ہی میں تیار ہو کے چڑھا دیتا... میں پیڈرو کے ساتھ حاجی عبداللہ کے استقبال کے لیے بھی پوری طرح تیار تھا۔ نرملا میرے سامنے تھی اور اس کے لیے میں اکیلا ہی کافی تھا... اگر وہ کسی الماری میں سے اچانک ریوالور یا دستی بم نکال لیتی تب بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔ میں نے اس امکان کو نظرانداز نہیں کیا تھا اور جب تک وہ ناشتا بنانے میں مصروف رہی تھی، میں نے اس پر سے نظر نہیں ہٹائی تھی۔ اس سے کچھ غلط فہمی پیدا ہوئی تھی اور نرملا نے اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ دکھلاتے ہوئے یہ دیکھنا چاہا تھا کہ اس کا شکاری حسن و شباب مجھے شکار کر سکتا ہے یا نہیں... اور وہ خاصی پُرامید پیش قدمی کر رہی تھی۔

میں ایک دم اُٹھ کھڑا ہوا تو اُسے مایوسی ہوئی۔ "باتوں میں بہت وقت ضائع ہو گیا۔" میں نے کہا۔ "دراصل مجھے انتظار تھا پیڈرو کی واپسی کا... ورنہ میں نکل جاتا۔"

"یہ پیڈرو کون ہے؟"

"جو شخص گاڑی لے کر نکلا تھا۔ جس نے ڈرائیور سائیں کو قتل کیا تھا... وہ کون ہے؟" میں نے برہمی سے کہا۔ "تم اس کے ساتھ تھیں۔"

"وہ... وہ تو پاکستان آرمی کا میجر شاہ ہے۔"

"بکواس کرتا ہے وہ کمینہ..." میں نے کہا۔ "نام بدنام کرتا ہے پاکستان آرمی کا... وہ ایک تھرڈ ریٹ بدمعاش ہے...

ایک ضمیر فروش غدار اسمگلر کا دست راست... اور... اور میرے باپ کا قاتل..."

"اسی لیے تم...؟"

"نہیں..." میں نے لات مار کے اسٹول گرا دیا۔ "یہ ذاتی عداوت کی بات نہیں ہے... میں اپنے باپ کے قاتل کو معاف بھی کرسکتا ہوں... مگر اسے نہیں جو غدار ہے... ملک کا دشمن ہے... انسانیت اور شرافت کا دشمن ہے۔"

"تم پھر جذباتی ہو رہے ہو۔"

"ہاں..." میں نے چلا کے کہا۔ "میں جذباتی آدمی ہوں... میں سینے میں دل رکھتا ہوں... احساس رکھتا ہوں... محبت اور نفرت کرسکتا ہوں... نیکی بدی میں تمیز کرسکتا ہوں۔ خوب صورتی کو بدصورتی سے الگ کر کے دیکھ سکتا ہوں... نہ میں خدا ہوں نہ شیطان... میں انسان ہوں اس لیے میرے جذباتی ہونے پر حیرانی کیسی...؟ اب چلو میرے ساتھ... اب تک تم نے میرے ساتھ تعاون کیا ہے... اگر تمھارا یہی رویہ رہا تو..."

"تو کیا...؟" وہ نظر اُٹھا کے بولی۔

"تو کچھ نہیں..." میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

اس بیرک سے مجھے بہت کچھ ملا... ایک بہت بڑا سوٹ کیس پاکستانی کرنسی سے بھرا ہوا تھا... ظاہر ہے یہ سب تخریب کاروں میں تقسیم کے لیے تھی... اُسے میں نے باہر رکھ دیا... ایک الماری میں جعلی دستاویزات تھیں جن سے ہندو کو مسلمان اور بھارتی کو پاکستانی ثابت کیا جاسکتا تھا... ان کو میں نے ایک بریف کیس میں ڈال لیا... یہ بریف کیس مجھے کرنل کے کمرے سے ملا تھا اور اس میں کرنل کے ذاتی کاغذات تھے۔ لیکن ان کاغذات سے کچھ بھی معلوم نہیں ہو سکتا تھا۔ کرنل کی وردی ایک ہینگر پر استری کی ہوئی لٹک رہی تھی... اسے بھی میں نے بریف کیس میں ڈال لیا۔ بہت جلد مجھے بریف کیس کا اسباب ایک سوٹ کیس میں منتقل کرنا پڑا۔ کیپٹن شرما اور لیفٹیننٹ ورما کے ذاتی کپڑے بھی میرے کام آسکتے تھے۔ ایک اور الماری سے زیادہ کارآمد اشیا کا ذخیرہ ملا... ایک ڈبے میں مختلف رنگ کے قوٹن پین تھے۔ انھیں غور سے دیکھنے سے مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ پین پستول تھے۔ ان کے کلپ ٹریگر کا کام دیتے تھے اور ان کے نوکیلے حصے زہر میں بجھے ہوئے تیر تھے جو گولی کی طرح جسم میں پیوست ہو سکتے تھے۔ دوسرے ڈبے میں ایسی ہی مختلف رنگ کی سوئیاں تھیں... جو دیکھنے میں بال پوائنٹ پین کے 'ری فل' لگتی تھیں... تیسرے ڈبے میں بہت چھوٹے جیبی چاقو تھے... اتنے چھوٹے کہ نیفے میں چھپائے جاسکتے تھے۔ میں نے انھیں کھول کر نہیں دیکھا مگر میرا خیال تھا کہ ان [illegible] بھی مہلک قسم کے زہر میں بجھے ہوئے ہوں گے... بھیڑ بھاڑ میں یا نظر بچا کے وہ

خنجر کسی کی جلد پر پھیر دیا جاتا تو اسے صرف ایک خراش کا احساس ہوتا مگر یہی خراش بعد میں اس کی جان لیتی... مجھے دو اسٹیتھسکوپ بھی ملے... مگر وہ عام ڈاکٹروں کے استعمال میں آنے والے اسٹیتھسکوپ نہیں تھے۔ ان کا نچلا حصہ ایک مائکرو ٹرانسمیٹر قسم کی چیز تھا... اوپر کے دونوں بازوؤں میں سے ایک انٹینا تھا اور دوسرے میں ریسیور تھا... ان کو ٹیسٹ کرنے کے لیے وقت نہیں تھا، مگر میں اندازہ کرسکتا تھا کہ ان دونوں کی فریکوئنسی ایک ہوگی اور انھیں گلے میں پہن کے دو افراد ایک محدود فاصلے میں بات کرسکتے ہوں گے۔

نرملا نے میرے کسی کام میں مداخلت نہیں کی اور مجھ سے کوئی سوال بھی نہیں کیا... وہ عدم دلچسپی کا انداز اپنائے مجھے خاموشی سے دیکھتی رہی۔ میں اس کے 'تعاون' کا مطلب سمجھنے سے [illegible] اس نے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا اور جتنا میں نے پوچھا تھا اس سے زیادہ ہی بتا دیا تھا... وہ نہ نروس تھی [illegible] نہ اس کے تیور جارحانہ تھے اور نہ عزائم... میں اس اعتماد اور اطمینان کے مظاہرے کو غیر فطری سمجھتے ہوئے بہت محتاط رہنے پر مجبور تھا۔ وہ اب متفکر اور پریشان تک نہیں تھی... جیسے میں نے اُسے تحفظ کی ضمانت دے دی ہو یا اسے بحفاظت گھر پہنچانے کا وعدہ کرلیا ہو... ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ ان حالات میں کوئی بھی مضبوط سے مضبوط اعصاب رکھنے والی عورت نارمل نہیں رہ سکتی تھی مگر وہ نارمل تھی... حالانکہ وہ اپنی اس طاقت کو بھی آزما چکی تھی جو پتھر دل مردوں کو پگھلا کے موم کر دیتی اور اسے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ میں اس کے ناز و ادا اور جلوۂ بے حجابی کا شکار نہیں ہوا۔

وہ میرے ساتھ رہی اور میں نے بھی اسے ایک لمحے کے لیے اپنی نظر سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ اس کا سکون مجھے جھنجلاہٹ میں مبتلا کرنے لگا... آخر یہ عورت کیا چاہتی ہے... کیا سوچ رہی ہے اور کیا کر رہی ہے...! کیا یہ سمجھتی نہیں کہ اس کی مدد کرنے والا کوئی نہیں اور میں اسے بھی مار سکتا ہوں... وہ رضاکارانہ طور پر میرا ساتھ کیوں دے رہی ہے... اسے ڈرنا چاہیے مجھ سے... پوچھنا چاہیے مجھ سے کہ میں نے کیا سوچا ہے... دوسروں کے بارے میں اور خود اس کے بارے میں...

بالآخر میں نے کہا۔ "تمھارے پاس اور کپڑے بھی تو ہوں گے۔"

"ہاں..." وہ بولی۔ "کیا میں بدل آؤں؟"

"تم کو بدل لینے چاہئیں... کیوں پھر رہی ہو تم ان پھٹے ہوئے کپڑوں میں؟" میں نے مڑ کر کہا۔ "کہاں ہیں تمھارے کپڑے؟"

"وہیں... کرنل کے کمرے میں..." وہ بولی۔ "جہاں سے تم نے اس کی وردی اٹھائی تھی... کیا تم نے زنانہ کپڑے نہیں دیکھے تھے؟"

"دیکھے تھے... خیر... چلو..." میں نے کہا۔ "میں تمھارے ساتھ رہوں گا... میں تم کو اکیلا چھوڑنے کا رسک نہیں لے سکتا۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" وہ بولی۔
اس نے میری موجودگی میں ہی کپڑے تبدیل کر لیے۔ کسی قسم کے تذبذب یا شرم و حیا کے مظاہرے کے بغیر... اس نے ایک بار بھی نظر اٹھا کے نہیں دیکھا کہ میں کدھر دیکھ رہا ہوں... میں کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا... اس طرح کہ وہ تھوڑا سا دائیں جانب تھی۔
"یہاں کوئی گاڑی تو ہوگی...؟" میں نے کہا۔
"ایک گاڑی تو وہ لے گیا ہے... میجر شاہ..."
"میں بتا چکا ہوں کہ وہ سؤر کا بچہ میجر نہیں ہے۔" میں نے خفگی سے کہا۔
"مجھے... بس عادت سی ہے... آئندہ نہیں کہوں گی۔" وہ بالوں کو برش کرتے ہوئے بولی: "دوسری گاڑی گیراج میں ہے... مگر مجھے نہ گیراج کی چابیوں کا علم ہے اور نہ میرے پاس اس گاڑی کی چابیاں ہیں۔"
"یہ سب نخرے میت کے لیے چھوڑ دو..." میں نے کہا: "اور مجھے گیراج تک لے چلو۔"
"گیراج اسی تہ خانے میں ہے۔" وہ بولی۔
"لیکن مجھے تو وہاں کوئی گاڑی نظر نہیں آئی تھی۔" میں نے مشکوک لہجے میں کہا۔
"تم آخر تک نہیں گئے تھے... گاڑی ہے... جیپ اسٹیشن ویگن فور وہیل ڈرائیو..." وہ بولی۔
"مجھے چکر دے رہی ہو؟" میں نے اس کا بازو پکڑ کے اُسے ایک جھٹکا دیا اور اس کا چہرہ اپنی طرف کر لیا: "کس طرف سے آتی جاتی ہے وہ گاڑی... اس زینے کے راستے...؟"
"تم خود دیکھ لو گے..." وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سپاٹ لہجے میں بولی: "میں تم کو لے چلتی ہوں... چلو..."
"تمھیں ڈرائیونگ آتی ہے؟" میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔
"آتی ہے۔" وہ بولی۔
میں نے اُسے حیرانی سے دیکھا: "تم انکار بھی کر سکتی تھیں۔"
"اس سے کیا ملتا مجھے؟"
"ایک چانس... پھر ڈرائیونگ میں کرتا... اور تمھارے ہاتھ آزاد ہوتے۔" میں نے کہا۔
"میں ابھی مرنا نہیں چاہتی۔" وہ اسی سپاٹ لہجے میں بولی۔ "میں زندہ رہنے کے لیے پوری کوشش کروں گی... تم کو بالکل موقع نہیں دوں گی کہ تم میری کسی بات کو بہانہ بنا کر مجھے مار ڈالو۔ تمھارے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے... تم نے اتنے بہت سے لوگوں کو مارا ہے... پہلے بھی مارتے رہے ہو گے... پھر میں کیا ہوں... اس کے باوجود تم مجھے مارنا چاہو تو بہانہ مت کرنا... صاف کہنا کہ

نرملا... میں تم کو معاف نہیں کر سکتا کیونکہ تم دشمن ہو... خواہ مجھ پر کوئی احسان بھی کرتا... تمھیں ہر طرح سے یہ حق حاصل ہے کہ مجھے قتل کر دو۔"
"تمھاری حقیقت پسندی قابلِ تعریف ہے۔" میں نے کہا لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا... نہ میں اس سے کوئی وعدہ کر سکتا تھا اور نہ اپنی زبان سے ایسے الفاظ کہہ سکتا تھا جن کی آڑ لے کر وہ مجھ سے غلط توقعات وابستہ کر لے... نیچے جانے والے راستے پر وہ آگے رہی اور میں اس کے پیچھے رہا... نہ جانے کیوں میں نے اپنے دل میں ایک عجیب سی بے کلی محسوس کی... رابعہ کا خیال میرے احساس پر یوں سایہ فگن ہونے لگا جیسے سورج گرہن میں ہو تو چاند کا سایہ زمین کو ڈھک لیتا ہے... رابعہ کا خیال میرے شعور پر ہر دم موجود رہتا تھا مگر اچانک اس نے شعور پر قبضہ کر لیا۔ دوبار مجھے یوں لگا جیسے میرے سامنے نرملا نہیں رابعہ چل رہی ہے۔ یہ بڑا عجیب خیال تھا... لیکن بہت جلد میں نے اس کا سبب تلاش کر لیا... نرملا نے جو لباس بدلا تھا وہ رنگ اور ڈیزائن میں ویسا ہی تھا جیسا رابعہ نے پہن رکھا تھا... جب اُسے میں نے آخری بار دیکھا تھا... پھر یہ کہ نرملا کے بالوں کا انداز بھی رابعہ کے جیسا ہی تھا... اس کی صورت کے نقوش میں رابعہ کی جھلک تک نہیں ملتی تھی لیکن اس کی چال وہی تھی چنانچہ پیچھے سے دیکھنے پر وہ مجھے رابعہ نظر آئی تو یہ خیال دنظر کا سراب تھا۔
باتھ روم کو دیکھتے ہی میں نے اپنے سر پہ ہاتھ مارا: "اوہ مائی گاڈ... انھیں تو میں بھول ہی گیا تھا۔"
"پریشانی کی اس میں کون سی بات ہے۔" نرملا نے کہا لیکن اس کے لہجے میں طنز کی کوئی بات نہ تھی۔
"دم گھٹنے سے نہ مر گئے ہوں سب...؟" میں نے کہا۔
"مرنے والوں کو کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ کیسے مرے تھے۔" وہ بولی۔
میں نے اسے پلٹ کے دیکھا: "تمھارا رویہ مجھے بہت مصنوعی لگتا ہے... تمھارے جذبات کی سمت کوئی نہیں... نہ تم میرے ساتھ ہو... نہ اُن کے ساتھ ہو..."
"میں صرف اپنے ساتھ ہوں..." وہ بولی: "کل بھی میں نے جو کچھ کیا تھا صرف اپنے لیے کیا تھا... آج بھی یہی کر رہی ہوں... بندوق کی گولی کو اس سے کیا کہ وہ کس ٹریگر سے فائر ہوتی ہے... کس کے ہاتھوں فائر ہوتی ہے... کدھر جاتی ہے اور کسے نشانہ بناتی ہے... آدمی کے دل کو... شیر کے سر کو... درخت کو یا پتھر کو..."
یہ لڑکی مجھے عجیب لگنے لگی تھی... مگر وہ حد درجہ ناقابلِ اعتماد تھی کیونکہ وہ اصولی، جذباتی بنیادوں پر... اخلاقی یا معاشرتی، مذہبی یا سیاسی وفاداریوں کی سرے سے قائل ہی نہ تھی۔ جب کل تک اس نے کرنل کو اپنی زندگی میں ایک سائبان سمجھ رکھا تھا۔ ایسے ہی

آج وہ میرے تحفظ کی ضمانت میں پناہ لے چکی تھی اور کل کسی بھی زبردست دشمن کی چھت کے سائے میں ٹھہر سکتی تھی۔ اس نے مجھے سے تسلیم کر لیا تھا کہ وہ کسی کی نہیں صرف اپنی ہے... وہ کسی کے لیے بھی مر نہیں سکتی تھی۔
باتھ روم کا دروازہ کھولنا ایک دشوار کام ثابت ہوا... وہ سب جو اندر تھے ان کی خاموشی ہی بتاتی تھی کہ اب کوئی بھی ہوش میں نہیں... وہ بے ہوش ہوئے جہاں کھڑے تھے وہیں ڈھیر ہو گئے تھے اور ان کے اوپر تلے پڑے ہوئے جسموں نے دروازے کو بلاک کر دیا تھا... میں نے واجبی سی کوشش کے بعد دروازے کو دھکیل کے لیے ہی بند کر دیا... موت ان لوگوں کا مقدر ہو چکی تھی۔ انھیں ہوش میں لانے کا فائدہ کوئی نہیں تھا۔ زیادہ سے زیادہ میں اُن سے ذاتی اور نجی نوعیت کی معلومات حاصل کر سکتا تھا کہ وہ کون ہیں... کہاں سے آئے ہیں اور کیوں آئے ہیں... وغیرہ وغیرہ...
یہ سب مجھے نرملا سے پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا۔
میں آگے بڑھ گیا... نرملا کی طرف میں نے دیکھا ہی نہیں کہ وہ طنز سے مسکرا رہی ہے یا اپنے انداز بے اعتنائی میں مگن ہے۔ آخری حصے کی دیوار کے بالکل ساتھ مجھے جیپ کی بالکل نئی اسٹیشن ویگن کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی رجسٹریشن لائل پور کی تھی اور کاغذات دیکھنے سے مجھے معلوم ہوا کہ اُسے ملک فتح محمد نام کے کسی زمیندار سے خریدا گیا تھا۔ فتح محمد کا پورا نام پتا رسید پر موجود تھا مگر ٹرانسفر لیٹر کسی کے نام پر نہیں تھا۔ اوپن لیٹر پر ٹرانسفر بہت عام بات ہے۔ گاڑی دس بار بک جاتی ہے مگر فرسٹ اونر رہتی ہے۔ خریدار اپنے نام ٹرانسفر نہ کرائے تو اس پر کوئی جرم ثابت نہیں ہوتا۔ وہ دستخط شدہ مگر بغیر نام اور تاریخ والا ٹرانسفر لیٹر دکھا کے کہہ سکتا ہے کہ اس نے تو کل ہی گاڑی خریدی ہے اور مقررہ مدت میں ٹرانسفر بھی کرا لے گا... یہ اوپن لیٹر میرے کام بھی آ سکتا تھا۔
گاڑی کو چیک کرنے سے مجھے معلوم ہو گیا کہ اس کو بہت کم چلایا گیا ہے... شاید وہ زمیندار کوئی سابق رکن اسمبلی وغیرہ تھا جس نے یہ گاڑی باہر سے ڈیوٹی وغیرہ ادا کیے بغیر منگوا لی تھی اور اس کا مقصد ہی اسے منافع پر بیچنا ہوگا۔ اتفاق سے اسے گاہک بھی وہ ملے جو منہ مانگی قیمت ادا کر سکتے تھے۔ گاڑی کا مائلو میٹر دس ہزار چار سو میل دکھا رہا تھا... فیول میٹر سے پیٹرول ٹینک کے بھرے ہوئے ہونے کا پتا چل سکتا تھا مگر اس کے لیے اگنیشن کو آن کرنا ضروری تھا۔ چابی کی غیر موجودگی میں مجھے گاڑی کو ڈائریکٹ کنکشن سے اسٹارٹ کرنا تھا چنانچہ میں نے پینل کھولا اور سیلف کے تاروں کو اگنیشن سوئچ سے الگ کر دیا۔
تیسری کوشش میں انجن رواں ہو گیا۔ میں نے ہاتھ سے ایکسیلریٹر کے اسپرنگ کو کھینچ کر اسے ریس دی اور پھر تار الگ کر دیے

انجن سلو موشن میں چلتا رہا۔
دیوار کے عقب میں وہ دروازہ تھا جو میں نے نہیں دیکھا تھا... اس کے سامنے بارہ فٹ اونچی دیوار تھی جس نے آٹھ فٹ اونچے شٹر ٹائپ گیٹ کو چھپا لیا تھا۔ دیوار سے گیٹ تک کا فاصلہ مشکل سے بیس فٹ تھا اور اتنی کم جگہ میں اسٹیشن ویگن کو صرف ریورس گیئر میں ڈال کر نکالا جا سکتا تھا۔ مشین گن اب میرے کندھے پر لٹک رہی تھی اور ریوالور میرے ہاتھ میں تھا۔ اسی سے میں نے شٹر کے دونوں تالے توڑے جو سیمنٹ کے فرش پر مٹک سے ملا دیے گئے تھے... تنہائی میں وہ دھماکے اس طرح گونجے کہ میرے کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی۔
دروازے کو تھوڑا سا اٹھا کے میں نے باہر جھانکا تو مجھے ایک اوپر چڑھتا ہوا راستہ دکھائی دیا جو بائیں طرف گھوم گیا تھا۔
"میں دروازے کو اُٹھاتا ہوں..." میں نے نرملا کی طرف دیکھ کے کہا: "تم جیپ کو نکالو۔"
"اسے آخر تک ریورس میں لے جانا پڑے گا۔" وہ بولی۔
"تم نے کہا تھا کہ تمھیں ڈرائیونگ آتی ہے۔"
"یہ بھاری گاڑی ہے... اور ریورس میں..." اس نے تھوڑے سے تذبذب کے ساتھ کہا اور پھر میرا موڈ دیکھ کر آگے بڑھی۔ گاڑی کے دروازے کسی نے مقفل نہیں کیے تھے کیونکہ سالم گاڑی ہی مقفل دروازے کے پیچھے تھی۔ جب نرملا ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی تو میں نے پھر انجن اسٹارٹ کرنے کے لیے تار ملائے۔ گاڑی ایک جھٹکے سے پیچھے گئی۔
"اسے نیوٹرل میں رکھو بے وقوف..." میں نے کہا۔
نرملا نے شرمندگی سے سر ہلایا: "میں نے دیکھا نہیں تھا۔"
لیکن اس کے بعد یہ ہوا کہ جیسے ہی میں نے تار ملائے تو انجن غرّایا اور گاڑی ایک دم آگے بڑھی... اگر میں سائڈ میں نہ ہوتا تو یقیناً ٹکر سے نیچے گرتا اور کچلا جاتا... اب میں بائیں جانب گرا اور میں نے گاڑی کو دیوار کی طرف بڑھتے دیکھا... وہ صرف ایک لمحے کی بات تھی جب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ نرملا نے گاڑی کو بارہ فٹ اونچی دیوار سے ٹکرانے کا فیصلہ کر لیا تھا... مضبوط اور طاقتور اسٹیشن ویگن کی باڈی اوپر گرنے والے ملبے سے تباہ ہو سکتی تھی جبکہ اندر بیٹھی ہوئی نرملا ملبے میں نہیں دب سکتی تھی۔ صرف میں دیوار کے نیچے دفن ہو سکتا تھا۔ میں دیوار سے چند فٹ کے فاصلے پر ہی تو تھا۔ پُرسکون اور پُراعتماد رہنے والی نرملا نے اس پہلے موقع سے پورا فائدہ اٹھایا تھا جو اُسے میری غلطی نے فراہم کیا تھا۔
میں نے پلٹ کر کھڑے ہوتے ہی ریوالور نکال لیا اور فائر کرتے کرتے رہ گیا... عین وقت پر مجھے احساس ہوا کہ گاڑی تو رکی ہوئی ہے... دیوار سے صرف ایک فٹ کے فاصلے پر... مگر

اتنی دیر میں تو میرے کان دھماکا سُن لیتے اور دیوار کی جگہ ملبے کا ڈھیر نظر آتا... بچ میں نے نرملا کو گاڑی سے اترتے دیکھا۔ "الو کی پٹھی!" میں نے چیخ کر کہا۔

"میں... میں یہ نہیں کر سکتی۔" اُس نے بے بسی سے کہا۔

میرا ہاتھ اُٹھا ہوا رہ گیا۔ "تم نے جانتے بوجھتے ایسا کیا تھا۔"

"کیا؟" وہ اپنی جگہ پر منجمد ہو گئی۔ "غلطی سے فرسٹ گیئر پڑ گیا تھا..."

"تم نے مجھے مارنے کی کوشش کی تھی۔" میں نے کہا۔

"سامنے تو دیوار تھی۔" وہ بولی۔ "تم کہہ سکتے ہو کہ میں خودکشی کرنا چاہتی تھی... لیکن کامیاب نہیں ہوئی... وقت پر بریک لگ گئے۔"

ایک بار پھر میں نے خود کو اس پر یقین کرنے کے لیے مجبور پایا اور وہ اسی بے نیازی کے ساتھ دوپٹے کے آنچل سے پسینہ صاف کرنے لگی۔ میں کچھ دیر اُسے گھورتا رہا اور پھر گاڑی میں جا بیٹھا۔ اُسے میں نے کھینچ کر اپنے ساتھ بٹھا لیا... وہ کچھ نہیں بولی۔ میں نے بیک ویو مرر میں دیکھتے ہوئے گاڑی کو واپس دروازے تک پہنچایا اور آہستہ آہستہ باہر نکال لیا۔ اب میں ایک سات آٹھ فٹ چوڑے راستے پر تھا جو سیمنٹ سے بنایا گیا تھا۔ اُس کے دونوں جانب اونچی دیواریں تھیں جن کی بلندی پیچھے کی طرف بتدریج کم ہوتی تھی۔

نرملا بھیگی بلی بنی کچھ سہمی ہوئی بیٹھی اپنے ہونٹ کاٹ رہی تھی۔

"کیا میں پھر ٹکرا دوں؟" اس نے کہا۔

"کوئی ضرورت نہیں۔" میں نے غرا کے کہا۔ "تم وہی کرو گی جو میں کہوں گا... مجھے معلوم ہے کہ تم موقع کی تلاش میں ہو۔"

"اور تم شاید بہانہ ڈھونڈ رہے ہو۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ "حالانکہ میں چاہتی تو بہت پہلے تمھیں شوٹ کر سکتی تھی۔"

"نگاہِ ناز سے؟" میں نے طنز سے کہا اور گاڑی کو پیچھے کرتا رہا۔

"نہیں... اس ریوالور سے..." اس نے اچانک اپنے بلاؤز کے اندر ہاتھ ڈالا اور ریوالور نکال کے ڈیش بورڈ پر رکھ دیا۔

میں بھونچکا رہ گیا... ایک دم بریک لگا کے میں نے پارکنگ بریک کھینچے اور ریوالور اُٹھا لیا... یہ اعشاریہ تین آٹھ کولٹ آٹومیٹک تھا اور پوری طرح لوڈڈ تھا۔ "یہ... یہ کہاں سے آ گیا...؟"

وہ مسکرائی۔ "بہت ہوشیار تھے تم تو... پلک جھپکائے بغیر مجھے دیکھتے بھی رہے تھے... تمھیں نہیں پتا چلا؟"

میں نے خود کو ایک حد سے زیادہ چالاک بننے والے احمق کی طرح خفت میں مبتلا پایا۔ "مجھے واقعی پتا نہیں چلا۔"

"جب میں کپڑے بدل رہی تھی تو تم کدھر دیکھ رہے تھے؟"

"تمھیں نہیں دیکھ رہا تھا... کوشش کر رہا تھا کہ نہ دیکھوں۔" میں نے محسوس کیا کہ میرے کانوں کی لوئیں سرخ ہو کے دہکنے لگی ہیں۔

وہ ہنسی... آہستہ سے اور پُرتمسخر انداز میں بولی۔ "دیکھتے رہتے، جب حیا مجھے نہ آئی تو تم کیوں شرما گئے تھے؟" اس نے ... دیا... اور پھر ہنسی۔

میں نے اُس کے منہ پر اُلٹا ہاتھ مارا۔ "ایسے کھیل مت [illegible] ساتھ... مجھے یہ احساس مت دلاؤ کہ تم میرے لیے خطرہ ہو... میں تمھارے جوان جسم کی خوب صورتی سے نہیں ڈرتا... مگر یہ شیطانی ذہانت تمھاری جان لے سکتی ہے۔" میں نے ریوالور جیب میں ڈال لیا۔

وہ طمانچہ کھا کے بھی مسکراتی رہی۔ "کیا میں دوسرا گال آگے کر دوں؟" وہ تلخی سے بولی۔ "مجھے یہ تھپڑ اپنے منہ پر محسوس نہیں ہوا... تمھیں لگا؟"

میں نے اُسے کوئی جواب نہیں دیا اور گاڑی کو تیزی سے چلاتا ہوا وہاں لے آیا جہاں راستہ سطحِ زمین کے برابر ہو گیا تھا۔ گیٹ اب میرے سیدھے ہاتھ پر تھا جس سے ٹرک گزر کے اندر آیا تھا۔ مجھے مدن موہن کے ہاتھوں قتل ہونے والے چوکیدار کی لاش کہیں نظر نہ آئی۔ گیٹ کے دونوں پٹ بند تھے مگر مقفل نہیں تھے۔ میں جیپ کو آگے بڑھا کے اسی راستے پر لے گیا جس پر سے ٹرک گزرا تھا۔ بیرک کی لمبائی عبور کرنے کے بعد میں نے بائیں جانب موڑ کاٹتے ہی ٹرک کو دیکھا تو سارا نقشہ میری سمجھ میں آ گیا۔ میں نے گاڑی ... نرملا کو نیچے اترنے کا اشارہ کیا اور ٹرک کی طرف چلنے لگا۔ اس نے کرنل کی لاش کو دیکھا لیکن کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔

میری توقع کے مطابق چابیاں مجھے ٹرک میں ہی لگی ہوئی ملیں۔ ٹرک ڈرائیور اس حفاظتی حصار میں داخل ہو جانے کے بعد خود کو نفسیاتی طور پر محفوظ سمجھا ہوگا... یہ اس کے ذہن میں آ ہی نہیں سکتا تھا کہ کوئی اندر داخل ہو کے ٹرک لے جا سکتا ہے... چنانچہ وہ چابیوں کو ساتھ رکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا تھا... نرملا خود ہی میرے ساتھ بیٹھ گئی۔

"تم نے پوچھا نہیں کہ میں کیا کرنے والا ہوں۔" میں نے چابی گھما کے انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

"کیا کروں گی میں کچھ پوچھ کے..." وہ بولی... "ویسے مجھے معلوم ہے کہ تم کیا کرو گے۔"

"کیا معلوم ہے؟" میں نے ٹرک کو پہلے گیئر میں آگے بڑھایا۔

"تم ٹرک کے ساتھ ہی اس جگہ کو اُڑا دو گے... لیکن اس سے پہلے مجھے لے کر جیپ میں نکل جاؤ گے۔" اُس نے بڑے یقین کے ساتھ کہا۔

"میرا خیال ہے کہ کرنل اسی لیے تم پر مرتا تھا اور تم پر اتنا اعتماد کرتا تھا۔" میں نے کہا۔ "کہ تم دو دھاری تلوار ہو... بلکہ دو نالی بندوق ہو۔ تم صرف جسم کی خوب صورتی پر ہی نہیں، ذہنی سطح پر بھی ناز کر سکتی ہو۔ اس کی بیوی تو ایک پرانی وضع کی بدصورت اور بھاری بھر کم کم عقل اور جاہل عورت ہوگی۔"

"تم تو اس کی بیوی سے مل چکے ہو۔" وہ بولی۔

ایک لمحے کے لیے میرے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ اس نے جھوٹ نہیں کہا تھا۔ مجھے اپنے ہی آئینے میں اپنا چہرہ دکھا دیا تھا لیکن میں اُس کے دوسرا طمانچہ نہ مار سکا۔

"وہ... وہ سب کچھ مدن موہن نے بتایا تھا مجھے۔" میں نے کہا اور ٹرک کو نشیب کی جانب اسی راستے پر موڑ لیا جس پر جیپ کو اُتار کے لایا تھا۔ اس راستے کی تنگی ایک مسئلہ تھی۔ ٹرک کی ہر سائڈ دیوار سے دو انچ ہی دور ہوگی۔ نتیجہ یہ کہ باڈی کا کوئی حصہ کبھی دائیں طرف رگڑ کھاتا تھا تو کبھی بائیں طرف اور وہ دیوار جگہ جگہ سے ٹوٹتی جا رہی تھی۔ جب سیدھا راستہ سامنے آ گیا تو میں نے اسٹیئرنگ گھما کے وہیل بالکل سیدھے کیے اور ہینڈ بریک کھینچ دیا۔ ٹرک وہیں رک گیا۔ میں نرملا کے ساتھ واپس جیپ تک گیا اور نرملا کو اپنے ساتھ بٹھا کے پھر وہیں پہنچ گیا جہاں ٹرک کھڑا ہوا تھا۔ اس مرتبہ میں جیپ کو پلٹ کے لایا اور اسی نشیبی راستے پر ایک ایک انچ بڑھاتا ہوا ٹرک کے قریب لے گیا۔ جب ٹرک ایک فٹ کے فاصلے پر رہ گیا تو میں نے جیپ کو بھی ہینڈ بریک لگا کے روک لیا۔ ٹرک اور جیپ اب مخالف سمتوں میں روانگی کے لیے تیار تھے اور ان کے پچھلے حصے تقریباً ملے ہوئے تھے۔

نرملا کو تنہا چھوڑنا کسی طرح مناسب نہ تھا۔ اُسے ساتھ لے کر میں گیٹ تک گیا اور دونوں پھاٹک پورے کھول کے لوٹ آیا۔ نرملا یہ سب کارروائی غور سے دیکھتی رہی مگر منہ سے کچھ نہیں بولی... آخری کام میں نے یہ کیا کہ نیچے سے وہ دونوں سوٹ کیس اُٹھا لایا جس میں سے ایک نوٹوں سے بھرا ہوا تھا اور دوسرا مختلف کارآمد چیزوں سے... ان کا وزن بہت زیادہ تھا... اوپر آتے آتے میں ہانپ گیا... دونوں سوٹ کیس میں نے جیپ کے پیچھے اوپر اُٹھنے والے دروازے سے اندر ڈال دیے۔ جیپ کا انجن بھی آہستہ آہستہ چل رہا تھا اور ٹرک کا بھی۔

"تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟" نرملا نے اچانک کہا۔

"کس بارے میں؟" میں نے ٹوٹی ہوئی دیوار کی اینٹوں کو اُٹھا کے کہا۔

"میرے بارے میں۔" وہ بولی۔ "مجھے یہاں سے لے کر کہاں جاؤ گے؟"

"تم دیکھ لو گی..." میں نے کہا۔ "قبل از وقت میں تمھیں کچھ نہیں بتا سکتا... یہ ہو سکتا ہے کہ میں تمھیں پولیس یا ملٹری انٹیلی جنس کے حوالے کر دوں... کرنل نے خودکشی نہ کی ہوتی..."

"اس نے... خودکشی کر لی تھی؟" نرملا نے کہا۔

"ہاں... میں چاہتا تھا کہ وہ زندہ رہے... اس سے بہت کچھ پوچھا جا سکتا تھا... مگر وہ بھی تجربہ کار آدمی تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ وہ ہار گیا ہے تو اس نے موت کو دشمن کی قید پر ترجیح دی۔" میں نے کہا۔ "کیپٹن شرما اور اس کے بھائی کو خود مدن موہن نے مار دیا تھا ورنہ میں انھیں بھی زندہ گرفتار کر کے لے جانا پسند کرتا۔"

نرملا کا چہرہ مایوسی اور اداسی کی تصویر بن گیا۔ اس کی آنکھیں خلا میں دیکھنے لگیں۔ "تم مجھے انھی لوگوں کے ساتھ چھوڑ کے نہیں جا سکتے؟" اس نے تہ خانے کے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

میں ٹرک کے اگلے پہیوں کے سامنے چار چار اینٹوں کی رکاوٹ کھڑی کر رہا تھا۔ "میرا خیال تھا کہ تم زندہ رہنا چاہتی ہو۔"

"ہاں... مگر کسی ٹارچر سیل میں نہیں۔" وہ بولی۔

"گاڑی میں بیٹھو..." میں نے ہاتھ جھاڑ کے کہا۔ آہستہ آہستہ میں نے ٹرک کے پارکنگ بریک ہٹا دیے۔ ٹرک ایک دو انچ ہلا اور رک گیا۔ اینٹوں کا چھوٹا سا ڈھیر ٹرک کو اس کے وزن سمیت روکنے میں کامیاب رہا تھا۔ اگر میرا اندازہ غلط ہو جاتا تو ٹرک کے اگلے ٹائر اینٹوں کو روندتے ہوئے گزر جاتے اور مجھے شاید بالکل مہلت نہ ملتی۔ اب میں اطمینان سے جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔ نرملا میرے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی اور اس کا رنگ خوف سے پیلا پڑ گیا تھا۔

میں اس کی طرف دیکھ کے مسکرایا اور کلچ دبا کے میں نے جیپ کو فرسٹ گیئر میں ڈالا... پھر پارکنگ بریک چھوڑ دیے۔ جیپ پیچھے گئی اور اُس نے ٹرک کو ٹکر ماری... تصادم کی آواز کے ساتھ ہی میں نے کلچ چھوڑ دیا اور ایکسیلریٹر دبا دیا۔ جیپ تیزی سے آگے بڑھی۔ بیک ویو مرر میں مجھے ٹرک آگے بڑھتا دکھائی دیا... جیپ نے دھکا دیا تو ٹرک نے اینٹوں کی رکاوٹ کو عبور کر لیا۔ اس کا سارا وزن نشیبی راستے پر اس طرح متوازن تھا کہ اسے ایک معمولی جھٹکے کی ضرورت تھی۔

جیپ کو میں نے بڑی تیزی سے سیکنڈ گیئر میں ڈالا اور ابھی موڑ کاٹا ہی تھا کہ میرے کانوں نے پہلا دھماکا سُنا۔ ٹرک آٹھ فٹ اونچائی کے شٹر والے گیٹ سے ٹکرا کے دیوار کو توڑتا ہوا اندر چلا گیا تھا۔ میں نے جیپ کی رفتار کو اور بڑھایا۔ اس کے طاقتور انجن نے مجھے مایوس نہیں کیا... مجھے معلوم تھا کہ ٹرک اتنے وزن کے ساتھ رُکے گا نہیں اور تہ خانے میں داخل ہونے کے بعد سامنے کی بارہ فٹ اونچی دیوار سے ٹکرائے گا تو تباہ ہو جائے گا۔ اس میں آگ لگ جائے گی اور یہ آگ گولہ بارود کے ذخیرے کو اُڑا دے گی۔ عام طور پر اس قسم کے حادثات کے بعد پٹرول ٹینک کے پھٹنے سے اور تاروں کے شارٹ سرکٹ ہونے سے آگ لگ جاتی ہے... لیکن یہ ہو سکتا تھا کہ آگ نہ لگے... ایسی صورت میں مجھے واپس جانا پڑتا اور ملبے کے ڈھیر میں کھڑے ہوئے ٹرک کو آگ لگانے کی کوئی ایسی صورت

پیدا کرنی پڑتی کہ جتنی دیر میں آگ ٹرک تک پہنچے، میں واپس گیٹ تک پہنچ جاؤں۔

ابھی جیپ گیٹ تک نہیں پہنچی تھی کہ جیسے زلزلہ آ گیا۔ وہ پہلا دھماکا تھا جس نے زمین کو ہلا دیا اور ایک لمحے کے لیے گاڑی کو بے قابو کر دیا۔ میں نے حواس بحال رکھے اور رفتار بڑھاتے ہوئے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ جیپ اسّی نوّے میل کی طوفانی رفتار سے گیٹ کراس کر گئی۔ پھر دوسرا دھماکا ہوا... یہ پہلے دھماکے سے زیادہ بڑا تھا لیکن میں اس وقت تک کافی فاصلہ طے کر چکا تھا۔ مجھے بیک ویو مرر میں بھی کچھ نظر نہیں آ رہا تھا سوائے دھوئیں اور گرد و غبار کے... میں نے جیپ کو دو فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد روکا اور نیچے اتر گیا۔

جہاں وہ ٹریننگ کیمپ تھا، وہاں سو گز کے دائرے میں آگ بھڑک رہی تھی... چھوٹے موٹے دھماکے اب بھی ہو رہے تھے اور میں فضا میں اینٹوں کے ساتھ بہت کچھ اڑتا ہوا دیکھ رہا تھا... میری توقع کے مطابق ٹرک میں آگ لگ گئی تھی اور بارود سے بھرے ہوئے ٹرک نے کسی بہت بڑے بم کا کام کیا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ اس بیرک کی جگہ صرف گڑھا رہ گیا ہوگا۔ اور وہ سب لاشیں جو باہر بکھری پڑی تھیں... جو ایک قبر میں اوپر تلے پڑی تھیں اور جو تہ خانے میں بے ہوش انسانوں کی صورت میں قید تھیں، ایک ساتھ پرزہ پرزہ ہو کے بکھر گئی ہوں گی... اس کیمپ نما عمارت کے پیچھے تقریباً آدھے میل کے فاصلے پر کوئی بستی تھی... تباہی کے اثرات ایک فرلانگ تک ہی محدود رہے تھے مگر دھماکے سے بستی کے ہر گھر کے در و دیوار بھی کانپ اٹھے ہوں گے۔ کچھ دیر میں بستی کے لوگوں کا وہاں پہنچ جانا یقینی تھا... میں واپس گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس خیال نے مجھے ایک طمانیت آمیز غرور اور انتقامی خوشی عطا کی تھی کہ میں نے ایک اور شکارگاہ ختم کی... یہ وہ جگہ تھی جہاں سے شکاری کتے تربیت پا کے نکلتے تھے۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس قسم کا یہ واحد مرکز تھا۔ ملک گیر پیمانے پر تخریب کاری کا پروگرام بنانے والوں نے اپنی سرگرمیوں کو بھی پورے ملک میں پھیلا رکھا ہوگا... سب کا پتا چلانا اور سب کو تباہ کرنا میرے اکیلے یا ایم آر ایس کے بس کی بات نہیں تھی۔ فوج ان معاملات سے نمٹنے کی پوری صلاحیت رکھتی تھی اور عوام بھی ملک دشمنوں کے خلاف پورے جذبے کے ساتھ صف آرا تھے۔ یہ اتفاق تھا یا دستِ غیب کا اشارہ تھا، میں یہاں پہنچ گیا۔ اس میں نہ میری نیت کو دخل تھا اور نہ ارادے کو... تائیدِ ایزدی پر میرا ایمان ہمیشہ رہتا تھا... اس نے میرے دل میں اور میرے ساتھیوں کے دل میں ... جذبہ پیدا کیا تو ہمیں عزم حوصلہ اور توفیق سے بھی محروم نہیں... ہمارے لیے وسائل فراہم کیے، مشکلات کو دور کیا اور ہمارے راستوں کو کھلا رکھا۔

نرملا کے بارے میں میرا ذہن ابھی تک کسی قطعی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکا تھا۔ ایک خیال یہ تھا کہ مجھے اس سے محتاط رہنا چاہیے تھا۔ وہ ایک زیادہ خطرناک عورت تھی اور کسی بھی موڑ پر مجھے مصیبت سے دوچار کر سکتی تھی۔ وہ انتہائی ... میرا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ظاہر تو اس نے یہی کیا کہ وہ زندہ رہنا چاہتی ہے اور اس رعایت کے لیے مجھ سے ہر قسم کا تعاون کر رہی ہے لیکن مجھے ایسا لگتا تھا کہ اس کا مقصد کچھ اور ہے۔ اگر وہ میرا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب رہی تو اس کی اگلی کامیابی کا مرحلہ میرے لیے شکست کا مرحلہ بنے گا۔ اس نے اچانک بھرا ہوا ریوالور خود میرے حوالے کر کے مجھ پر ثابت کرنا چاہا تھا کہ وہ میری دشمن نہیں... یہ ماننے والی بات ہی نہیں تھی۔ وہ میری دشمن نہ ہوتی تو اس مشن پر ہی کیوں بھیجی جاتی اور تمام خطرات کو سمجھنے کے باوجود وہ سرحد عبور کر کے آئی تھی تو خیر سگالی کے جذبات لے کر نہیں آئی تھی مگر وہ ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ کام کرنے والی عورت تھی۔ اپنی خوب صورتی اور بھرپور جوانی کو بھی وہ اپنے مقصد کا ایک ذریعہ ہی سمجھتی تھی۔ اس نے پہلے جسمانی طور پر ... کی کوشش کی تھی مگر میرا رویہ دیکھ کر یہ خیال چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ ذہنی طور پر میرے قریب آنا چاہتی تھی۔ ریوالور میرے حوالے کرنا اسی ڈرامے کا ایک حصہ تھا۔ وہ مجھے یقین دلانا چاہتی تھی کہ وہ مجھ سے متاثر ہو گئی ہے اور میرے لیے سب کچھ کر سکتی ہے... اپنے ماضی سے کٹ کر میرے ساتھ ایک نئے مستقبل کے سفر پر روانہ ہو سکتی ہے۔ ایسا اس نے زبان سے نہیں کہا تھا مگر رویے سے سمجھا دیا تھا۔

دوسری طرف میں یہ سمجھتا تھا کہ وہ عام عورت نہیں ہے۔ صرف ایک نرس یا ایک کرنل کی محبوبہ نہیں تھی۔ مجھے تو یہ بھی شبہ تھا کہ نرس کا پیشہ بھی ایک پردہ تھا اور کرنل کے ساتھ مراسم بے مقصد نہیں تھے... شاید اس طرح وہ اوپر والوں کے احکامات کی تعمیل کر رہی تھی... کرنل پر اور اس کے دونوں نائبین پر نظر رکھتی تھی اور ان کے بارے میں کسی اور کو باخبر رکھتی تھی... وہ اپنی ذہانت، حسن اور غیر جذباتی اندازِ فکر کے باعث ان کے لیے زیادہ اہم تھی جو کرنل جیسے لوگوں کا انتخاب کرتے تھے۔ انھیں صلاحیت اور استعداد کے مطابق مشن سونپتے تھے... اور ان کی صلاحیت اور استعداد کے بارے میں رپورٹ نرملا دیتی تھی۔ مختصراً یہ کہ وہ بائی کمان کی نمائندگی کرتی تھی یا خود اس کا ایک حصہ تھی۔

اپنی دانست میں وہ مجھ سے ایک رعایت حاصل کر کے پہلی بازی جیت چکی تھی۔ اس نے خود کو میرے ہاتھوں ... بچا لیا تھا۔ یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ عام عورت نہیں ہے۔ میں اسے عام عورت سمجھتا تو سب کے ساتھ ہی باتھ روم میں بند کر دیتا اور...

نا ... تاکہ اپنے ساتھ نتھی نہ لاتا... اب اس کی کوشش یہ ہو سکتی تھی کہ وہ خود کو مجھ سے مخلص ثابت کرے۔ حالات کا رخ اور میرا ردِ عمل دیکھتے ہوئے اپنی راہِ عمل متعین کرے۔ اگر میں اس کے چکر میں پڑ جاتا ہوں تو وہ ایک خطرناک حسن و شباب رکھنے والی عورت کی طرح مجھے مکمل طور پر اپنے تابع کر لے۔ مجھے جسمانی شکست دے کر ذہنی طور پر بے بس کر دے۔ اگر میں جسم کے جال سے نکل جاؤں تو مجھے یہ تاثر دے کہ وہ مجبور تھی... اپنی مجبوری کی کوئی قابلِ یقین اور دکھ بھری کہانی سنائے کہ وہ کرنل کے ساتھ اپنی مرضی سے نہیں آئی تھی۔ ایسے دباؤ ڈال کے مجبور کر دیا گیا تھا۔ اس کے ماں باپ اور بھائی بہن اس کے انکار سے مصیبت میں پڑ سکتے تھے... وہ کہہ سکتی تھی کہ اس کے واپسی کا اب کوئی سوال نہیں... وہ تائب ہو کے میرا ساتھ دینے پر تیار ہے... مسلمان بھی ہو سکتی ہے اور اپنے ماضی کی ہر غلطی کا کفارہ یوں ادا کر سکتی ہے کہ اب میرے دشمنوں کے خلاف میری مدد کرے۔ کسی کو معلوم نہیں کہ وہ زندہ ہے... یہ خبر تو آگے پہنچ ہی جائے گی کہ وہاں جتنے بھی تھے سب مارے گئے۔

یہ سب ذہن میں رکھ کے میں نے نرملا کو ساتھ لے لیا تھا... مجھے اس سے زیادہ مفید معلومات حاصل ہونے کی امید تھی۔ ابھی تو میں نے صرف اتنا کیا تھا کہ اس کی ہر بات مان لی تھی۔ مزید کامیابی کے لیے ضروری تھا کہ میں اس کو کچھ اور قریب آنے کا موقع دوں۔ ذہنی طور پر... اور اگر ناگزیر ہو تو جسمانی طور پر بھی... تاکہ وہ سمجھے کہ اس نے مجھے شکار نہیں کیا تو گھائل ضرور کر دیا ہے... اور گھائل ہونے والا شکار ہونے سے کیسے بچ سکتا ہے۔

"کیا سوچ رہے ہو اتنی دیر سے؟" نرملا نے کہا۔

میں چونکنے کی اداکاری کر کے مسکرایا۔ "اگر میں کہوں کہ تمھارے بارے میں سوچ رہا تھا تو؟"

"تو میں کہوں گی کہ..." وہ رک گئی۔

"کہ یہ جھوٹ ہے؟"

"نہیں... یہ سچ ہے..." وہ بولی۔ "تم ضرور سوچ رہے ہو گے کہ اب اس کا کیا کیا جائے... غالباً تم ابھی تک اس کشمکش سے نجات نہیں پا سکے کہ مجھے زندہ رہنے دینا چاہیے یا نہیں..."

میں اس کی منطقی سوچ پر حیران رہ گیا لیکن میں نے اپنی حیرت کا اظہار نہیں ہونے دیا... میں نے نفی میں سر ہلایا اور ہنس پڑا۔ "غلط بالکل غلط، کیونکہ یہ فیصلہ تو میں بہت پہلے ہی کر چکا تھا... میں قوتِ فیصلہ کی کمزوری کا شکار نہیں ہوں مس نرملا... تم نے تعاون کا وعدہ کیا تھا... میں نے شرط رکھی تھی کہ تم سچ بولو گی... اب بھی یہ عہد ... نہیں ... ہاں یہ ابھی میں نے طے نہیں کیا کہ تمھیں آزاد کر دوں کہ تم واپس بھی جاؤ۔"

"واپس بھی جاؤں!" وہ حیران ہو کے بولی۔ "کس کے پاس؟

اپنے گھر..." میں نے ظاہر کیا کہ اس کے جواب پر میں حیران ہوا۔

"میرا کوئی گھر نہیں..." وہ بولی۔

"عزیز رشتے دار، دوست تو ہوں گے..." میں نے کہا۔

"تم سمجھتے کیوں نہیں... میں واپس جاؤں گی تو مشکل میں پڑ جاؤں گی، مجھ پر مقدمہ چلایا جائے گا... ناکامی کا جرم غداری سے کم نہیں سمجھا جاتا... پھر تفتیش ہوگی کہ کہیں میں تو اس کیمپ کی تباہی میں ملوث نہیں... عورت ہوں نا... اور خوب صورت بھی ہوں۔ شک کرنے والے شک کر سکتے ہیں کہ پھنس گئی ہوگی کسی کے جال میں اور اُگل دیا ہوگا سب... یہ نہ ہوا تب بھی پوچھا ضرور جائے گا کہ تم اکیلی کیسے بچ گئیں... کہاں رہیں... واپس کیسے آئیں... دشمن کی قید میں رہ کر آنے والا مشکوک ہو جاتا ہے... ایسا بھی ہوتا ہے کہ خود اپنے ملک کے خلاف کام کرنے لگتا ہے۔ دشمن سے کچھ بعید نہیں... ایسی مشتبہ پوزیشن ہو تو کچھ ثابت نہ ہونے کے باوجود نگرانی کی جاتی ہے اور ملازمت تو کہیں بھی نہیں ملتی۔ سماج میں تو دو کوڑی کی عزت نہیں رہتی... شریف زادیاں صاف کہتی ہیں کہ دشمنوں کی قید میں رہ کے آئی ہے... معلوم نہیں کہاں کہاں کس کس نے زیرِ تفتیش رکھا۔"

"او کے... تم واپس جانے پر تیار نہیں تو میں زبردستی تمھیں سرحد کے پار نہیں دھکیل سکتا..." میں نے کہا۔ "اور اب میرے لیے زیادہ مشکل یہ فیصلہ ہے کہ تم کو کہاں رکھوں... تم سرکاری تحویل میں رہنے کو تیار نہیں اور میرے پاس تو اپنا ٹھکانا نہیں... مگر خیر... کچھ سوچتے ہیں۔"

میں نے گاڑی کو ایک کچے راستے پر موڑ لیا۔ درختوں کے درمیان سے گزرتی اور چھوٹی موٹی جھاڑیوں کو روندتی اسٹیشن ویگن ایک جنگل سے گزری... پھر پتھریلی چٹانوں کا سلسلہ شروع ہوا تو میں نے گاڑی روک لی اور نیچے اتر گیا... کچھ آگے مجھے کسی سوکھے ہوئے برساتی دریا کی تہ دکھائی دے رہی تھی اور اس کے بعد پھر جنگل تھا۔ میں نے ٹرین کی ڈھلوان اور درختوں کے بیچ میں سے اسے گزرتے بھی دیکھا، مگر فاصلہ اتنا تھا کہ کہیں کہیں حرکت سی محسوس ہوتی تھی اور باقی سب میرا تصور تھا جو پہیوں کی آواز سے تصویر بناتا تھا۔ یہ جگہ ہر لحاظ سے محفوظ تھی۔ میں کم از کم آج کا دن اور ایک رات یہاں روپوش رہنا چاہتا تھا... مجھے معلوم تھا کہ بالآخر پیڈرو یا حاجی عبداللہ میں سے کوئی ٹرک کے بارے میں معلوم کرنے آئے گا اور ڈرائیور سائیں کی پُراسرار گمشدگی کا معاملہ بھی اٹھے گا تو کیمپ کی تباہی دیکھ لے گا... لاشوں کے ٹکڑے دیکھ کر وہ مرنے والوں کی صحیح تعداد کا اندازہ شاید نہ کر سکیں مگر انھیں یہ ضرور پتا چل جائے گا کہ اسٹیشن ویگن غائب ہے... انھیں ٹرک کا ڈھانچا ملے یا اس کے الگ الگ ٹکڑے۔ وہ جیپ کا ڈھانچا اور اس کے پرزے

بھی تلاش کریں گے اور جب اس کا سراغ ہی نہیں ملے گا تو وہ سمجھ جائیں گے کہ جس نے کیمپ کو تباہ کیا، وہی جیپ لے کر بھاگ گیا۔ وہ سب کو مار گیا لیکن خود اسٹیشن ویگن میں بچ کے نکل گیا۔ پھر وہ مجھے کراچی سے پشاور تک کی سڑک پر تلاش کریں گے۔ آج دن میں اور پھر رات بھر... اس امید میں کہ شاید میں رات کے اندھیرے کی پناہ میں نکلوں۔

"اب کیا ارادہ ہے؟" نرملا نے پُرامید نظروں سے مجھے دیکھا۔

"کچھ نہیں..." میں نے ایک ہموار جگہ دیکھ کر سوکھے پتوں پر لیٹتے ہوئے کہا۔ "یہ جگہ روپوش رہنے کے لیے اچھی ہے..."

"جگہ تو اچھی ہے... مگر ہم یہاں کب تک رہ سکتے ہیں..."

"روپوشی کے لیے وقت کی کوئی قید نہیں..." میں نے آسمان کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"مگر ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہے... کھانے پینے کو..."

"میں نے سنا ہے کہ آدمی کھائے پیے بغیر ایک ہفتہ زندہ رہ سکتا ہے... ہم ایک دن تو ویسے بھی گزار لیتے ہیں... ہم روزہ رکھتے ہیں... تم لوگ اسے برت کہتے ہو۔" میں نے جیب سے سگریٹ نکال کے سلگائی۔ "صرف دو گھنٹے پہلے ہی تو ہم نے پیٹ بھرا ہے۔ شام تک تو کوئی مسئلہ نہیں۔"

"کیا رات بھی یہیں گزرے گی؟"

"کیا تم ڈرتی ہو...؟"

"کس سے؟" وہ گھاس پر بیٹھ گئی۔

"مجھ سے... یا رات سے..." میں نے کہا۔ "یا [illegible] سے۔"

"ڈرتے تو تم بھی ہو... مجھ سے بھی اور رات سے بھی... مرد ہونے کے باوجود۔"

"یہی تو مجھے حیرانی ہے... کہ کل اور آج میں زمین کی گردش نہیں بدلی... سورج کی سمت نہیں بدلی... لیکن تم نے زندگی کا راستہ بدل لیا۔ اس طرح تو کوئی بھی ایک نئی زندگی اختیار نہیں کر سکتا جس میں پرانے جذبات کے رشتے... زمین سے اور انسانوں سے... وقت سے اور مقامات سے اور یادوں سے... یہ سب بے وجود ہو جائیں... یہ ناممکن ہے۔"

"مجبوری میں اختیار کی بات کرتے ہو..."

"میں نے تم پر کوئی جبر نہیں کیا..." میں نے کہا۔ "اُلٹا میں نے تمھیں اختیار دیا تھا کہ واپس لوٹ جاؤ... لیکن تم نے کہا کہ میرا کوئی گھر نہیں... کوئی عزیز دوست اور رشتے دار نہیں... تم نے میرا ساتھ دینا پسند کیا... آخر کیوں...؟ تم نے تو یہ بھی جاننے کی کوشش نہیں کی کہ میں کون ہوں۔"

"میں جانتی ہوں کہ تم سکندر بخت ہو..."

میں ایک دم اُٹھ بیٹھا۔ "یہ جانتی ہو تم؟ مگر کیسے... کیسے پہچان سکتی ہو تم سکندر بخت کو...؟"

"مجھے اس کے بارے میں بتایا گیا تھا... اس کی تصویر دکھائی گئی تھی..."

"وہ ایسی ہی تصویر تھی جیسا میں ہوں؟" میں نے ہنس کر کہا۔

"مجھے ایک نہیں... کئی تصویریں دکھائی گئی تھیں،" وہ بولی۔ "مختلف بھیس میں۔"

"کس نے دکھائی تھیں یہ تصویریں؟"

"خود کرنل نے..." وہ بولی... "لیکن میں نے تمھیں صورت سے نہیں پہچانا۔"

"پھر کیسے پہچانا... تمھارے دل نے کہا... یا چھٹی حس نے بتایا؟"

"میں نے تمھاری آواز پہچانی..."

میں بھونچکا رہ گیا... "آواز... میری آواز بھی سنی تھی تم نے، کیسے...؟"

"تمھاری آواز کے ٹیپ موجود ہیں۔" وہ بولی۔ "مجھ سے کہا گیا تھا کہ اس آواز کو ذہن میں رکھو... وہ صورت بدل بدل کے آ سکتا ہے مگر آج تک اس نے اپنی آواز بدلنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ وہ اسی طرح پہچانا جا سکتا ہے۔"

"اور... تم نے جو ٹیپ سنا تھا... اس میں کیا کہا تھا میں نے، میں کس سے بات کر رہا تھا؟" میں سخت تشاک کی حالت میں بیٹھا رہا... یہ ایک ایسا انکشاف تھا جس نے میرے حواس گُم کر دیے تھے... بلاشبہ خود کو حد سے زیادہ چالاک سمجھنے والا کوئی معمولی سی مگر بالآخر تباہ کُن ثابت ہونے والی غلطی کرتا ہے۔

"تم کسی چوہدری دلاور سے بات کر رہے تھے... تم نے اس سے کہا تھا کہ باغِ جناح میں ملو... منٹگمری ہال کے پاس... پھر تم نے اسے اقبال پارک کے باہر شاہی قلعے کے سامنے بلایا تھا۔"

بے ساختہ میرا ہاتھ سر پر گیا... یہ بہت پرانی بات تھی۔ اس دن میں نے اور محسن نے مال روڈ سے ایف ایم مائیکرو فون خریدے تھے اور کار کے ریڈیو پر دلاور سے بات کی تھی۔ ہم ایک دوسرے کی آواز اپنی اپنی گاڑی کے ایف ایم بینڈ کو ٹیون کر کے سنتے رہے تھے۔ دلاور نے سب کچھ ٹیپ پر ریکارڈ کر لیا تھا اور میری وہی آواز میری شناخت کے طور پر متعارف کرائی جا رہی تھی۔ آدمی کے بہترین خیرخواہ اس کے دشمن ہوتے ہیں جو اس کی غلطیاں اور خامیاں شمار کرتے ہیں اور اسے موقع فراہم کرتے ہیں کہ وہ ان سے سبق سیکھے... بظاہر بہت موٹی بات تھی جو ہماری عقل میں نہ آئی کہ آدمی کی شناخت صرف چہرے سے ہی نہیں ہوتی۔ اس کی آواز اپنی الگ پہچان رکھتی ہے... جیسے ایک آدمی کے فنگر پرنٹ دوسرے سے نہیں ملتے ایسے ہی ایک آواز دوسری آواز سے مختلف ہوتی ہے۔ کسی سائنسی مشاہدے اور تجربے کے بغیر اس فرق کو عام آدمی بھی محسوس کر لیتا ہے۔

یہ میرے اور محسن یا غالب کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ہماری آوازیں ایک دشمن کے پاس محفوظ ہیں۔ نرملا نے غلط نہیں کہا تھا۔ مجھے وہ گفتگو اب بھی جُزوی طور پر یاد تھی۔

میرے کہنے پر نرملا نے تفصیل سے بتایا اور وہ گفتگو تقریباً لفظ بہ لفظ دہرا دی جو میں نے اور محسن نے دلاور سے کی تھی۔ اُسے ٹیپ بار بار سننے سے سب زبانی یاد ہو گیا تھا... جہاں تک مجھے یاد پڑتا تھا، ہم نے وہ ٹیپ حاصل کر کے تباہ کر دیا تھا مگر دلاور چالاک آدمی تھا... اس نے کوئی اور بندوبست بھی کیا تھا... ہماری آواز ایک جگہ نہیں دو جگہ ریکارڈ ہوئی تھی۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم محسن کی آواز بھی پہچانتی ہو؟"

نرملا نے اقرار میں سر ہلایا۔ "میں کیا... بہت سے لوگ پہچانتے ہیں جن کو اس مقصد کے لیے بھیجا جاتا ہے۔"

"کس مقصد کے لیے؟" میں نے کہا۔

"یہی... جاسوسی اور تخریب کاری... اسلحے کی ترسیل اور تقسیم۔ تم جانتے ہو... سب کچھ، پھر کیوں پوچھ رہے ہو؟" وہ گھاس کا ایک تنکا چباتی رہی۔

"ہمارے متعلق اور کیا بتایا جاتا تھا؟"

"تمھارے متعلق... یہ کہ تم بہت چالاک اور خطرناک ہو... جوڈو کراٹے میں بلیک بیلٹ سے زیادہ جانتے ہو۔ باتیں بہت پہلے دار کرتے ہو کیونکہ تم اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو... تم اور محسن دونوں... مذاق بہت کرتے ہو... انتہائی پُرخطر حالات میں بھی سیریس نہیں ہوتے... لڑکیوں کو خاص طور پر تاکید کی جاتی تھی کہ تم سے بچ کر رہیں۔ تم انھیں ہپناٹائز کر لیتے ہو۔"

مجھے بے اختیار ہنسی آئی۔ "کیا تم ہپناٹزم کے زیرِ اثر یہ سب بتا رہی ہو۔"

"کیا یہ سب غلط ہے؟"

"میری ذات ضرورت سے زیادہ بدنام ہے... نہ میں بلیک بیلٹ ہوں... نہ ہی عورتوں کا شکاری..." میں نے کہا۔ "ہندوستان، پاکستان میں تمھیں ایک بھی لڑکی نہیں ملے گی جو یہ ثابت کر سکے۔"

"سوائے دو لڑکیوں کے... ایک کا نام فوزیہ ہے۔ اس کی اب شادی ہو چکی ہے... دوسری کا نام رابعہ ہے۔ وہ ایڈووکیٹ تھی اور اب تمھارے ساتھ ہے... تمھاری شریکِ حیات ہے... اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ تمھاری بیوی ہے۔" نرملا نے کہا۔

میری ساری شوخی کافور ہو گئی۔ "مائی گڈنس... اتنا جانتی ہو تم میرے بارے میں؟"

"میں وہی جانتی ہوں جو مجھے بتایا گیا ہے... اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اور بھی بہت سے لوگ یہ سب کچھ جانتے ہیں، شاید اس سے زیادہ بھی جانتے ہیں..." نرملا نے کہا۔ "اور بتاؤں؟... تمھارا یہ کہنا کہ تم عورتوں کے شکاری نہیں ہو... یہ بھی غلط ہے... جب تم انگلستان میں تھے تو سفید فام مائیں اپنی جوان بیٹیوں کو تمھارے سائے سے بھی دُور رکھتی تھیں، تم لیڈی کلر مشہور تھے۔ ایک لارڈ کی بیٹی تو تمھارے ساتھ جلاوطن بھی ہونے کو تیار تھی۔ تم نے ایک نہیں درجنوں عشق کیے... جو بات تمھارے لیے درست ہے وہی محسن کے لیے بھی درست ہے۔"

میں اب پوری طرح دلچسپی لینے پر مجبور تھا... نرملا نے مجھے خود میرے بارے میں ہی نہیں بتایا... اس نے رابعہ اور شہلا کے متعلق بتایا... نازو کے بارے میں بتایا کہ وہ بے حد حسین اور بے حد خطرناک ہے... مردوں کو تاکید کی جاتی تھی کہ اس آفت کی پرکالہ سے بچیں جو کمزور اور معصوم نظر آتی ہے لیکن خالی ہاتھوں سے بھی طاقتور مردوں کو چِت کر دیتی ہے اور اس کا حُسن تو مصیبت ہے ہی۔

نرملا کی باتوں نے مجھے پریشان کر دیا۔ وہ رضاکارانہ طور پر سب کچھ بتا رہی تھی... میرا ذہن جو یہ بات قبول کرنے سے قاصر تھا کہ نرملا منحرف ہونے کا ڈراما کر رہی ہے اب قائل ہونے لگا تھا کہ شاید وہ جھوٹ نہیں بول رہی ہے... اس نے ماضی کو پیچھے چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور مستقبل کو مجھ پر چھوڑ دیا ہے... میرا خیال تھا کہ اس سے تفتیش کا عمل طویل اور مشکل ہوگا... وہ مزاحمت کرے گی... جھوٹ بولے گی اور ہمیں گمراہ کرے گی... لیکن وہ میری ساری توقعات کو غلط ثابت کر رہی تھی۔ مجھے یہ خیال بھی تھا کہ وہ میرا اعتماد حاصل کرنے کے لیے ایک ماہر شکاری عورت کی طرح جال پھیلائے گی۔ اور جیسے مکڑی جال پھیلا کے مکھی کو گرفتار کر لیتی ہے، ایسے ہی مجھے اچانک بے بس کرنے کی کوشش ضرور کرے گی... مگر ایسا نہیں ہو رہا تھا۔ اُس نے خود کو میرے حوالے کر دیا تھا... یہی بات میری عقل قبول نہیں کرتی تھی کہ وہ ایسا کیوں کرے گی... کیا وہ بے وقوف تھے جنھوں نے اس پر اعتماد کیا... اسے پرکھا آزمایا اور بھروسے کے قابل پا کے کرنل کے ساتھ بھیج دیا؟ کیا وہ اسی لیے ان کی ہر آزمائش میں پوری اتری کہ بالآخر اُن کا ساتھ چھوڑ دے؟ ان کے دشمنوں سے مل جائے۔ آخر کیوں؟ اسے کیا ضرورت تھی اس کی... وہ ہندو تھی... بھارتی شہری تھی... وہ پاکستان سے یا کسی پاکستانی سے جذباتی تعلق کیوں رکھے گی... اور بالفرضِ محال وہ منحرف ہونا ہی چاہتی تھی تو بہت پہلے زیادہ آسان طریقہ اختیار کر کے بھی آ سکتی تھی۔

میں نے فیصلہ کیا کہ ان حالات میں مجھے نرملا کو ساتھ ہی رکھنا ہوگا... لیکن اس کی طرف سے بہت محتاط رہنا بھی ضروری ہوگا۔ اس کی باتوں میں آ کے اس پر اعتماد کرنا بہت بڑی غلطی ہوگی۔ اب یہ بہت مشکل تھا کہ میں اُسے گولی مار دوں... لیکن میں اسے سب کے ساتھ مار سکتا تھا... پھر مجھے نہ افسوس ہوتا اور نہ یہ پریشانی ہوتی۔

"نرملا... اگر میں تم کو یہیں چھوڑ جاؤں؟" میں نے کہا۔

"تم ایسا نہیں کر سکتے۔" وہ پہلی بار خوف زدہ ہوئی۔

"کیوں نہیں کر سکتا؟" میں نے کہا۔ "تم زبردستی تو میرے ساتھ نہیں جا سکو گی۔"

"میں تم کو بھی نہیں جانے دوں گی... جانا ہے تو مجھے یہیں مار کے چھوڑ جاؤ۔" وہ چلائی۔ "یا ریوالور دو مجھے... میں خود بھی مر سکتی ہوں۔"

"تم زندہ بھی رہ سکتی ہو۔" میں نے کہا۔ "خدا نے تمھیں عقل اور ذہانت بھی دی ہے۔ خوب صورتی اور جوانی بھی دی ہے۔ ضروری نہیں کہ تم واپس انہی کے پاس جاؤ... ہندوستان بہت بڑا ملک ہے... اس کی آبادی میں تم کہیں بھی گم ہو سکتی ہو۔"

"لیکن میں واپس جانے کے لیے نہیں آئی تھی۔" وہ چلائی۔

"پھر کس لیے آئی تھیں... اس ملک کی شہریت تو تمھیں مل نہیں سکتی تھی اور تمھارا تعلق بھی کیا ہے اس ملک سے؟" میں نے کہا۔ "تم کب سے ہو یہاں... میں نے تمھیں لا... سے واپس آتے ہوئے دیکھا تھا۔ بالفرض محال تم کو اتنا ہی شوق تھا یہاں رہنے کا تو لاہور سے واپس آنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہیں رہ جاتیں۔"

"لیکن... مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم کہاں ہو... میں اس وقت کا انتظار کر رہی تھی... جب میں تم سے ملوں..."

میں ہنس پڑا۔ "ویری گڈ... کیا غالباً عشق ہو گیا تھا تم کو مجھ سے؟ میں تمھارے خوابوں اور خیالوں میں بس گیا تھا؟"

"یہ بات نہیں ہے..."

"پھر کیا بات ہے؟" میں نے کہا۔ "میں نے سنا ہے کہ بھارت کے کئی بڑے شہروں بمبئی کلکتہ وغیرہ میں بہت بڑی آبادی فٹ پاتھوں پر رہتی ہے۔ اور ہر جگہ خانہ بدوش یا فقیر بے گھر ہوتے ہیں۔ مگر تم ایک تعلیم یافتہ عورت ہو... تم نرسنگ کے پیشے میں تھیں اور تمھاری صورت ... ہے کہ تم نے ... کبھی نہیں دیکھی۔ تم کہتی ہو کہ تمھارے عزیز دوست رشتے دار نہیں... یہ میں کیسے مان لوں...؟ تم تو جس کی طرف ایک نظر دیکھ لو وہ تمھارا ہو جائے۔"

"کیا تمھارا کوئی گھر ہے؟" وہ آہستہ سے بولی۔

ایک لمحے کے لیے میرے ... لفظ ختم ہو گئے اور میری زبان گنگ ہو گئی۔

"خاموش کیوں ہو گئے؟ کہاں ہے تمھارا گھر؟ تمھارے ماں باپ بھائی بہن، رشتے دار... یہ سب کہاں ہیں؟" اس نے تلخی سے کہا۔ "تم بھی تعلیم یافتہ ہو... خانہ بدوش یا فقیر نہیں ہو..."

"یہ... یہ ٹھیک ہے کہ..." میں نے سنبھل کے کہنا شروع کیا۔ "کہ تم کو میرے متعلق بڑی اچھی بریفنگ دی گئی ہے۔ واقعی میں گھر اور خون کے رشتوں سے محروم ہوں... لیکن میرے پاس دوسرے بڑے اچھے رشتے ہیں... وطن کی مٹی سے پیار کے... محسن جیسے دوستوں کے خلوص کے... رابعہ کی محبت کے... شہلا جیسی بہن کی محبت کے اور ان گنت اپنے جیسے انسانوں کی محبت کے جو شرافت اور اخلاقی اقدار کے رشتے سے میرا خاندان ہیں۔"

"اگر میں اس خاندان میں شامل ہونا چاہوں تو...؟"

"میں ہنس پڑا۔ اس کے لیے تمھارے پاس کیا جواز ہے؟ کیا تم مجھے کوئی مظلومیت کی داستان سناؤ گی...؟ کہ تم اس معاشرے سے متنفر تھیں اور تمھارا استحصال ہوا۔ تمھیں جبراً وہ کام کرنے پر مجبور کیا گیا جس کو تمھارا ضمیر قبول نہیں کرتا تھا... تم پہلے ہی متضاد بیانات دے چکی ہو مس نرملا... جھوٹ بولنے والے کا حافظہ نہیں ہوتا... لیکن مجھے یاد ہے کہ ایک وقت میں تم نے کیا کہا تھا اور دوسری بار خود اپنی تردید کر دی تھی۔"

"کیا تمھیں اپنا بچپن یاد ہے کبیر خان؟"

میں چونک پڑا۔ "یہ بھی بتا دیا گیا ہے تم کو؟ کہ میں کبیر خان تھا... بڑی ریسرچ ہوئی ہے مجھ پر... تمھیں تو شاید میرے والد کا نام اور ان تمام واقعات کا بھی علم ہو گا جو اُن کے ساتھ یا میرے ساتھ پیش آئے تھے۔"

وہ عجیب سے انداز میں ہنسی۔ "کبھی موقع ملے تو کسی اور سے بھی یہ سب پوچھنا... جو میں جانتی ہوں۔"

"کیا جانتی ہو تم... ایسی کون سی بات ہے...؟"

"کبیر خان... کیا تم کو چاچا دیا ناتھ یاد نہیں؟" وہ بولی۔

دیا ناتھ... پنڈت دیا ناتھ...؟ میں نے محسوس کیا کہ اس جنگل میں ہر طرف سے آدم خور شیر... سفاک بھیڑیے اور ... آشام چیتے... پھنکارتے ہوئے سانپ اور ڈنک مارنے والے بڑے بڑے بچھو نکل آئے ہیں، اور میں جان بچانے کے لیے اس دشت کی ویرانی میں بھٹکتے بھٹکتے ایک گھر تک جا پہنچا ہوں جس کے محفوظ دروازوں کے پیچھے میرے لیے سلامتی... تحفظ اور عافیت ہے — محبت پیار اور شفقت ہے... وقت چوبیس برس پیچھے چلا گیا... ایک گھر کو میری نظر نے فوکس کر لیا... اس گھر میں اور کون تھا؟

"تم میرٹھ میں رہتے تھے نا کبیر خان؟" نرملا نے کہا۔ "کیا تم یہ بھی بھول گئے ہو؟"

"نہیں... میں کچھ نہیں بھولا۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "لیکن میں اس وقت کی کوئی بات سننا پسند نہیں کروں گا... سنا تم نے؟ تم نے مجھے اس وقت کی یادوں کے نام پر دھوکا دینے کی کوشش کی تو میں تم کو زندہ گاڑ دوں گا۔"

"تم کچھ بھی کر سکتے ہو کبیر خان..." وہ سہم کے بولی۔

"مت کہو مجھے کبیر خان۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "دغا باز عورت... میں اس مکر و فریب کے جال میں پھنسنے والا نہیں ہوں..."

"میں تو اسی نام سے جانتی تھی تمھیں... اور مجھے نہیں معلوم کہ تم سکندر بخت کب سے ہوئے... اور کیوں ہوئے؟" وہ کانپنے لگی اور رونے لگی۔ "تم مجھے مار ڈالو مگر پہلے میری سن لو... یہ جان لو کہ میں وہی ہوں..."

"وہی کون؟" میں نے دل کے سناٹے میں اپنی اجنبی آواز کو سنا۔

"چاچا دیا ناتھ کی بیٹی..."

میں ایک دم اُٹھا اور میں نے چاہا کہ میں اس کا گلا گھونٹ دوں... اس جھوٹ بولنے والی زبان کو کھینچ کر باہر نکال دوں... اسی دیوانگی میں میں نے اسے اٹھا لیا اور میرے ہاتھ اس کی گردن پر جم گئے... اس کا چہرہ میرے سامنے میرے بہت قریب آ گیا... اتنا قریب کہ میں اس کی آنکھوں کے اندر جھانک کر دیکھ سکتا تھا۔ اس کا وجود میرے سخت ہاتھوں کی بے رحم گرفت میں تڑپا اور اس کی آنکھوں سے نکلنے والے آنسوؤں کے قطرے تیزاب کی طرح میرے ہاتھوں پر گرے... اس کے پیر زمین سے اوپر اُٹھ گئے تھے... آہستہ آہستہ میں نے اپنی گرفت ڈھیلی کی اور اس نے زمین پر قدم ٹکا دیے... میں اب بھی اس کی آنکھوں کی گہرائی میں جھانک رہا تھا اور وہ پلک جھپکائے بغیر مجھے دیکھ رہی تھی... میں بہت بے بس ہو گیا تھا میرے لیے چوبیس برس پیچھے رہ جانے والے وقت کے سائے دیکھ کر اصلی اور نقلی چہروں کے درمیان فرق کو محسوس کرنا بہت مشکل تھا... ناممکن تھا... آخر میرے لیے اس جھوٹ کا سر کچلنا زیادہ ناممکن کیوں ہے؟

میں نے اپنے آپ سے سوال کیا... میں سچ کی کسوٹی کھتا ہوں تو مجھے ڈر کیسا؟ عقل کی دلیل نے مجھے ہوش میں آنے پر مجبور کر دیا... میں نے اُسے چھوڑ دیا۔

وہ ریت کے گھروندے کی طرح گر گئی اور پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ میں قطعی بے حسی کے ساتھ اس کے قریب کھڑا اپنے احساس کی آندھی کے تھپیڑے برداشت کرتا رہا... یہ گزرے ہوئے وقت کی ہوا تھی جو ویران ... سنسان گھروں کی گرد اور یادوں کی گلیوں کی دھول ... تھی... اس میں آگ کی لپٹ تھی اور جھلستے جسموں کی جلتے ہوئے ... نے ذہن کے دریچے بند کیے تھے کیونکہ ... گھسنا ہی نہیں چاہتا تھا۔

وہ اچانک اٹھی اور میرے پیروں سے لپٹ گئی۔ "کبیر خان! ... مجھے پہچانو... آخر کیا ہو گیا ہے تمھاری آنکھوں کو... کیا تم دیکھ نہیں سکتے کہ میں کون ہوں... میں نرملا نہیں ہوں..."

میں نے اُسے بڑی بے دردی سے جھٹک دیا۔ "تم نرملا ہو..." میں نے چیخ کر کہا۔ "تم موہنی نہیں ہو..."

روتے روتے وہ ہنس پڑی۔ "تم کو یاد ہے میرا نام... بلکہ یاد رہا تمھیں یہ نام کبیر... چوبیس سال میں تم نے بہت سے نام بھلا دیے ہوں گے... پھر یہ نام کیوں نہیں بھولے تم... کیا تم مجھے بھولنا نہیں چاہتے تھے؟"

آہستہ آہستہ میرا وجود سرد پڑنے لگا... میری نظر نرملا پر ٹھہر گئی۔ اس کی صورت کے نقوش میری نگاہ میں تھے اور میں دل کے اندھیرے کنوئیں میں اُتر کے آشنائی کے مدفون لمحوں کی روشنی ڈھونڈ رہا تھا۔

"صرف نام کے فرق کو دیکھ رہے ہو... نام تو تم نے بھی بدل لیا ہے... مگر کیا خود تم بدلے ہو...؟" وہ بولتی رہی... زیادہ پُرامید ... زیادہ پُراعتماد لہجے میں... "بتاؤ مجھے کہ اس بدلے ہوئے چلیے... روپ بہروپ کے اندر کون ہو تم؟"

میں گھٹنوں کے بل اس کے پاس بیٹھ گیا... میں نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کے اپنی طرف کر لیا۔ "اب بھی کہہ دو کہ یہ جھوٹ ہے جو تم مجھے بے وقوف بنانے کے لیے بول رہی تھیں۔ اور تم موہنی کی بہن نہیں ہو... تم وہی ہو جو میں نے تمھیں سمجھا تھا۔"

"کبیر... میرے ساتھ پیچھے لوٹ چلو... اس گھر میں جہاں تم اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ رہتے تھے... تم سات بہن بھائی تھے... پانچ بہن بھائی ہندو بلوائیوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ تمھاری ایک بہن اپنی عزت بچانے کے لیے کنوئیں میں اُتر گئی تھی۔ اور تمھاری ماں... جسے میں چاچی کہتی تھی... وہ بھی بچوں کو بچاتے ہوئے تم پر قربان ہو گئی تھی... یہ سب میں نے نہیں دیکھا تھا۔ مجھے میرے پتاجی نے بتایا تھا... پنڈت دیا ناتھ نے... اور بعد میں موہن نے بھی بتایا تھا... تم سال بھر ہمارے گھر میں رہے تھے ... یاد ہو گا تمھیں... تم بھول کیسے سکتے ہو۔"

"ہاں... اور وہاں تمھارے گھر میں... ایک ریڈیو تھا... کوئی اُسے ہاتھ نہیں لگا سکتا تھا... مگر چاچا دیا ناتھ نے وہ ہمارے کمرے میں رکھ دیا تھا... جہاں موہن اور میں... اور تم... اس کے کان مروڑتے رہتے تھے... مجھے بہلانے کے لیے... تم سب نے بہت کوشش کی تھی... اور جب میں نہیں مانا تھا تو تمھارے پتاجی نے مجھے ایک چانٹا لگایا تھا... وہ پولیس میں حوالدار تھے نا... اور مجھے تمھارے ماما کے گھر بھیج دیا گیا تھا... مراد نگر... دہلی اور میرٹھ کے درمیان کوئی جگہ تھی... وہاں سے میں پھر تمھارے گھر آ گیا تھا اور اس کے بعد ابا مجھے لینے آ گئے تھے..."

"کبیر...!" موہنی نے ایک چیخ ماری اور مجھ سے لپٹ گئی۔ "تم وہی ہو نا... میرا دل گواہی دیتا تھا... تم نے مجھے پہچان لیا؟"

وہ آنسو جو چوبیس برسوں سے رُکے ہوئے تھے۔ وہ لہو جو مندمل ہو جانے والے زخموں میں جم گیا تھا... وہ جذبے جو دل میں پتھر ہو گئے تھے... وہ یادیں جو قبروں کے سادہ کتبے رہ گئی تھیں، ان

سب نے مل کے مجھے شکست دی اور سچ کے یقین کا عذاب دیا... بالآخر میں نے اُسے اپنے سے جُدا کیا... وہ بے ہوش تھی اور مجھے پتا نہ تھا... میں اس سے بہت کچھ کہتا رہا تھا جو اس نے نہیں سُنا تھا۔

میں نے اُسے آرام سے لٹا دیا۔ میں گاڑی تک گیا اور اس کے پیچھے سامان کے ڈھیر میں سے ایک کینوس کا ٹکڑا اُٹھا لایا جو اتنا بڑا تھا کہ اس کو اسٹیشن ویگن پر ڈالا جا سکتا تھا۔ چند سیدھی اور لمبی شاخیں مل جاتیں تو اسی کو میں خیمہ بھی بنا سکتا تھا۔ فی الحال میں نے اُسے کھول کے زمین پر بچھایا اور موہنی کو اس پر شفٹ کر دیا۔ ابھی تک میں ذہن میں اُٹھنے والے اس سوال سے گریز کر رہا تھا جس کا تعلق موہنی کے مستقبل سے تھا... ابھی مجھے اس سے بہت کچھ پوچھنا بھی تھا... لیکن سب سے پہلے مجھے اس کو ہوش میں لانے کے لیے کچھ کرنا تھا۔

ایک چٹان پر چڑھ کے میں نے غروب ہوتے ہوئے سورج کی روشنی میں چاروں طرف دیکھا... برساتی ندی کے پار مجھے دُھواں سا نظر آیا... پھر میں نے ایک گوالے کو دیکھا جو اپنے ریوڑ کے ساتھ ندی کے سوکھے پاٹ سے گزر رہا تھا... یقیناً اُدھر کوئی آبادی تھی۔ یہ فاصلہ میرے اندازے کے مطابق آدھے میل سے زیادہ اور ایک میل سے کم تھا... وہاں آنے جانے میں میرا ایک گھنٹا صرف ہو سکتا تھا... ایک گھنٹے بعد تو جنگل میں رات ہو گی... اندھیرے میں واپسی کا سفر کیسے ہو گا۔ میں لوٹ کر اس جگہ کیسے پہنچوں گا... اگر میرے قدم ذرا بھی بھٹک گئے تو موہنی اکیلی پڑی رہ جائے گی۔ اور اس جنگل میں کسی کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے... وہ تو ایک لڑکی ہے... نہیں... اسے اکیلا چھوڑ کے جانے میں کوئی عقلمندی نہیں۔ اگر میرے جاتے ہی اُسے ہوش آ گیا تو وہ نہ جانے کیا سمجھے گی لیکن میں اُسے ساتھ بھی کیسے لے جاؤں... اُسے کندھے پر ڈال کے لے جاؤں گا تو یہی فاصلہ دو گھنٹے میں طے ہو گا اور پھر گاؤں کے لوگ نہ جانے کیا سمجھیں گے... میں گاڑی سے کر جا سکتا تھا مگر اس سے بھی شکوک و شبہات جنم لیتے۔ سب کو یہ بات عجیب لگتی کہ میں جنگل کی طرف سے ایسی شاندار گاڑی میں نمودار ہوا اور واپس جنگل میں گُم ہو گیا۔

بالآخر میرے ذہن میں ایک ترکیب آ گئی۔ میں نے واپس گاڑی میں جا کے گلوز کمپارٹمنٹ کھولا۔ اس میں کاغذات کے نیچے ایک بال پوائنٹ پین بھی پڑا ہوا تھا۔ میں نے ایک سادہ صفحہ پھاڑ کے اس پر موٹے موٹے حروف میں لکھا۔ "میں ابھی واپس آتا ہوں۔" اور یہ چٹ موہنی کے کپڑوں پر سامنے کی طرف لگا دی۔ کاغذ اور کپڑے کو نتھی کرنے کے لیے میں نے ببول کا ایک کانٹا استعمال کیا۔ مجھے یقین تھا کہ ہوش میں آتے ہی موہنی کی نظر اس پیغام کو دیکھے گی۔

گاڑی کی چابیاں میری جیب میں تھیں... سارا سامان ... تھا اور گاڑی کے دروازے بند تھے۔ میں نے ایک نظر موہنی پر ڈالی اور تیز تیز قدموں سے روانہ ہو گیا۔ میری جیب میں خاصی رقم موجود تھی، چنانچہ مجھے وہ سوٹ کیس نہیں کھولنا ... مالِ غنیمت سے بھرا ہوا تھا۔ اپنی حفاظت کے لیے ... پاس وہ ریوالور تھا جو مجھے موہنی نے دیا تھا۔

میں جنگل کے راستے پر تقریباً دوڑ رہا تھا... اس جگہ آ جانے کے بعد مجھے پریشان کرنے والے سوالات ... وہ بدروحوں کی طرح میرا تعاقب کرنے لگے اور مجھے ڈرانے ... اگر یہ جھوٹ ہوا... یہ بھی اداکاری ہوئی... کسی نے اُسے ... بتا دیا ہو گا سکندر بخت... وہ موہنی کیسے ہو سکتی ہے... ہی ہو گی... موہنی کا تو اپنا ایک گھر تھا... اس کا بھائی بھی ... ماں باپ ممکن ہے زندہ نہ ہوں... مگر موہنی کی شادی ہو ... وہ کہیں اپنے شوہر اور بچّوں میں بیٹھی ہو گی... یہ عورت ... شاطر ہے... اس نے اپنے آنسوؤں سے اور اپنے جذباتی ... سے تم کو پاگل کر دیا۔ اس نے تمھارے ماضی کے مندمل ہو جا... والے زخموں کی کسک کو بیدار کر دیا کیونکہ وہ جانتی تھی یہ زخم ... کہاں ہیں... اب تم کیسے تصدیق کرو گے کہ وہ جھوٹ کے ... تمھارا یقین حاصل کرنے میں کامیاب رہی ہے؟ تم اس کو کیسے ... لے جاؤ گے؟ تم اس پر اعتبار نہیں کر سکتے... تم کو اعتبار کرنا ... چاہیے... وہ تمھاری ہم مذہب نہیں... اس کا تعلق دشمن ... سے ہے اور وہ آئی بھی دشمنوں کے ساتھ تھی... وہ موہنی ... سکتی... اور موہنی ہو تب بھی کیا... وہ بچپن کا دور تھا... اور اس وقت کے جذبات کا آج کے حالات سے کیا تعلق ... دھوکا کھاؤ گے اور نقصان اٹھاؤ گے... اپنے ساتھ اپنے ... تباہی کا سبب بنو گے۔

پھر میں کیا کروں... اُسے مار دوں؟... یہ ناممکن ہے ... اسے سرکاری حکام کے حوالے کر دوں؟ یہ اور بھی زیادہ ناممکن ... اس سے تو بہتر ہو گا کہ میں اسے مار ڈالوں... کیا میں اُسے چھوڑ کر ... بھاگ جاؤں؟ لیکن یہ تو بہت بے وقوفی کی بات ہو گی... اب ... اس پر نظر رکھنی زیادہ ضروری ہے... یہ معلوم کرنا بھی ضروری ... وہ موہنی سے نرملا کیسے بنی اور کیوں بنی... وہ کیوں مجھ سے ... تھی اور اب کیوں میرے ساتھ رہنا چاہتی ہے؟

گاؤں تک پہنچتے پہنچتے میرا دماغ خراب ہونے لگا ... میں سخت مشکل میں پڑ گیا تھا اور قوتِ فیصلہ سے بالکل محروم ... تھا... گاؤں کے پہلے گھر پر دستک دیتے ہوئے میں نے سوچا ... دیکھا جو افق کی آخری لکیر کے پیچھے گم ہو گیا تھا... جوانی میں ...

جانے والی ایک عورت نے دروازے تک آ کے کہا... "کون ہے تو ویر...؟"

میرا حلیہ بے حد مضحکہ خیز تھا مگر اس دیہاتی عورت نے مجھے عادت اور روایت کے مطابق ویر کہہ کے مخاطب کیا تھا۔

"مجھے کچھ کھانے کو دے بہن۔" میں نے کہا۔

"روٹی کھانی ہے؟" وہ بولی۔ "کہاں سے آیا ہے تو...؟"

"میں راستہ بھول گیا ہوں..." میں نے کہا۔

عورت نے مجھے شک کی نظروں سے دیکھا اور اندر چلی گئی۔ پھر ایک مرد آ گیا جو اس عورت کا شوہر ہو سکتا تھا... "کیا بات ہے میاں؟" وہ بولا۔

"بات یہ ہے بھائی کہ ہم شکار پر آئے تھے۔" میں نے کہا۔

"ہم کون...؟" وہ بولا... "تو تو اکیلا ہے۔"

"میں تو نوکر ہوں۔" میں نے کہا۔ "میرا صاحب اور بیگم اپنی گاڑی میں نکلے تھے... رات کے وقت جنگل میں گاڑی خراب ہو گئی... انھوں نے مجھے بھیجا کہ جا کے کہیں سے مستری کو لاؤ، مستری یہاں کہاں... میں نے کہا کہ کچھ کھانے پینے کو لے آتا ہوں... صبح شہر جا کے مستری کو لاؤں گا۔"

وہ مجھے غور سے دیکھتا رہا جیسے میری بات پر یقین کرنے کی کوشش کر رہا ہو... بالآخر اُس نے مجھے بھروسے کے قابل مان لیا۔ "کتنی دُور سے آیا ہے؟"

"اُدھر... میل بھر پرے گاڑی کھڑی ہے۔" میں نے ہاتھ سے بالکل غلط سمت میں اشارہ کیا۔ "میں پیسے دوں گا... مجھے کھانے پینے کو کچھ دے دو۔"

مرد کی آنکھوں میں لالچ اتر آیا۔ "کتنے پیسے دے گا؟"

"سو روپے۔" میں نے کہا۔ "لیکن میں برتن بھی لے جاؤں گا۔ پانی کا ڈول اور کھانے کی چنگیر..."

"اوئے جا نا یار..." وہ اندر دیکھ کے بولا۔ "لیکن پہلے سو روپے نکال... اور ہاں... کسی کو بتانا نہیں ہے کہ تو نے سو روپے دیے ہیں مجھے ورنہ چلا جا کسی اور دروازے پر..."

"میں نہیں بتاؤں گا..." میں نے اُسے سو کا نوٹ پیش کیا جو اس نے فوراً اپنے لاچے میں اُڑس لیا۔ "تمھاری ماں کو بھی نہیں بتاؤں گا...؟"

"میری گھر والی تھی وہ۔" وہ خفا ہو کے بولا۔ "آ جا اندر... تیرا صاحب تو بڑا امیر ہو گا... مرغی کھاتا ہو گا... مرغیاں ہیں ہمارے گھر میں... میری گھر والی کو دس روپے دے دینا... وہ پکا دے گی۔"

"میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "جو ہے وہی دے دو۔"

"اس وقت کیا ہو گا... روٹی... گڑ... مکھن۔" وہ بولا۔

"شاید لسّی بھی مل جائے مگر تیرا صاحب اور میم صاحب کیسے کھائیں گے۔"

"کھا لیں گے۔" میں نے کہا۔ "تم اتنا ہی کر دو تو کافی ہے۔"

وہ بہت خوش ہوا کیونکہ سو روپے اس کو مُفت کے مل گئے تھے۔ اس نے اپنی بیوی سے کہا کہ سب باندھ دے... جو کچھ بھی گھر میں ہے۔

"سب باندھ دوں؟ ایک آدمی کے لیے؟" اُس نے کہا۔

"یہ ایک آدمی نہیں ہے۔" شوہر نے جھنجلا کے کہا۔

"ایک نہیں ہے تو کیا دو ہیں؟"

"بک بک نہ کر کُتیا... جو میں کہہ رہا ہوں وہ کر۔" وہ دہاڑ کے بولا۔

"پھر تو کیا کھائے گا... میرا سر...؟ بچّے کیا کھائیں گے؟"

اس سے پہلے کہ وہ اپنی نافرمان بیوی کی بک بک کو جھاپڑ یا جوتے سے بند کرتا میں نے دخل اندازی کی۔ "یہ لو بہن... تم بعد میں اپنے لیے بندوبست کر لینا۔" میں نے ایک سو کا نوٹ اس کے سامنے ڈال دیا... میاں کی تو باچھیں کھل گئیں۔ لیکن عورت دل گرفتہ اور شرمندہ نظر آنے لگی۔ اس نے سو کے نوٹ کو چھُوا بھی نہیں... اس نے کھانا باندھ دیا جو موٹی موٹی چار روٹیوں۔ پاؤ بھر مکھن کی پیالی... اور شاید ایک پاؤ گُڑ پر مشتمل تھا۔ اس نے روٹیاں چنگیر میں رکھیں۔ اس پر مٹی کا پیالہ اور گُڑ رکھ کے ایک کپڑے سے گٹھڑی سی بنا دی... وہ مجھے لسّی بھی دینا چاہتی تھی، مگر میں نے صرف سادہ پانی کو ترجیح دی۔ دو سو روپے وصول کرنے کے بعد صاحبِ خانہ مجھے ڈول دے دیتا تب بھی نقصان میں نہ رہتا مگر وہ طبعاً کمینہ تھا۔ اُس نے ایک پرانے ٹین کا انتخاب کیا جس میں آٹا بھرا ہوا تھا۔ آٹے کو ایک کپڑے پر انڈیل کے اس نے دس لونڈے ڈالڈا کے ٹین کو دھویا اور اس میں دو سوراخ کیے۔ ایک رسّی باندھ کے اُسے باقاعدہ ڈول کی شکل دی اور پانی سے بھر کے میرے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ رسمی طور پر اس نے کہا کہ میں چھوڑ آؤں۔ مگر میرے پہلے انکار پر ہی بیٹھ گیا۔ وہ ایک کاہل اور نکما آدمی تھا۔ شاید اسی لیے پیسے کا محتاج تھا۔ جب میں باہر نکل چکا تھا تو میں نے پھر میاں بیوی کے لڑنے کی آواز سُنی۔ وہ بیوی سے سو کا دوسرا نوٹ بھی ہتھیانا چاہتا تھا اور بیوی اُسے 'ہڈ حرام' کے لقب سے نوازنے کے بعد صاف اعلان کر چکی تھی کہ اسے ایک پیسہ نہیں دے گی۔

واپسی پر میں نے گھڑی دیکھی تو ساڑھے سات بج رہے تھے۔ مجھے پون گھنٹے سے زیادہ ہو چکا تھا۔ واپسی کے سفر میں سب سے زیادہ خطرہ راستے سے بھٹک جانے کا تھا۔ میں نے آتے وقت چند نشانیاں ذہن میں رکھی تھیں۔ اب انھی نشانیوں کو تلاش

کرتا ہوا میں اپنے اندازے کے مطابق صحیح سمت میں بڑھ رہا تھا لیکن آدھے گھنٹے کے بعد مجھے معلوم ہو گیا کہ میں راستہ بھول گیا ہوں۔ وہاں سب درخت ایک سے تھے اور اندھیرے میں جنگل کا ایک حصہ دوسرے حصے سے ذرا مختلف نہ لگتا تھا۔

بھٹک کر زیادہ دُور جانے کے بجائے میں نے وہیں اپنی سمت درست کر لینے کا فیصلہ کیا۔ میں نے کھانا اور پانی کا ڈول نیچے رکھا اور ایک درخت پر چڑھ گیا۔ میں اس چٹان کو تلاش کرنا چاہتا تھا جس پر سے میں نے گاؤں کے کسی گھر سے اُٹھنے والا دھواں دیکھا تھا۔ گاؤں اب مجھے اپنے پیچھے دکھائی دیا۔ اس کے چند گھروں میں ٹمٹمانے والے چراغ تاریکی میں جگنو سے لگتے تھے۔ دائیں جانب وہ سوکھا ہوا برساتی دریا تھا۔ ان دونوں مقامات کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے پھر اپنی سمت کا تعین کیا تو مجھے وہ چٹان بھی نظر آ گئی۔ اندھیرے میں اس کا سیاہ وجود بہت دھندلا نظر آتا تھا مگر میں نے اس کی مخروطی بناوٹ کو پہچان لیا۔

میں اترنے ہی والا تھا کہ میری نظر بہت دُور کی ایک تیز روشنی سے چندھیا گئی۔ وہاں کہیں کسی گاڑی نے موڑ کاٹا تھا اور یہ اس کی ہیڈ لائٹس تھیں۔ میں ٹھٹک کے رک گیا۔ غالباً یہ وہی سڑک تھی جس پر میں نے واپسی کا سفر کیا تھا۔ سمت سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ یہ بڑی سڑک سے نکلنے والی وہی چھوٹی سڑک ہے جس پر گزشتہ رات میں نے اور موہنی نے ایک ٹرک میں سفر کیا تھا۔ کوئی گاڑی اسی سڑک پر کیمپ کی سمت میں جا رہی تھی... میں درخت پر سے اس کی متحرک روشنی کو آگے بڑھتے ہوئے دیکھ سکتا تھا۔ بائیں جانب افق سرخ دکھائی دیتا تھا۔ غالباً کیمپ میں لگنے والی آگ ابھی تک بجھی نہیں تھی۔

جب گاڑی کی روشنی میری نظر سے اوجھل ہو گئی، تو میں نیچے اترا۔ اس تباہ شدہ کیمپ کی طرف جانے والی یہ گاڑی دشمنوں کی بھی ہو سکتی تھی اور پولیس کی بھی۔

دس منٹ بعد میں نے اچانک خود کو وہیں پایا جہاں میں موہنی کو چھوڑ کر گیا تھا۔ اس مرتبہ میں نے اپنی سمت متعین کرنے میں اندازے کی کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ لیکن موہنی وہاں نہیں تھی جہاں میں اسے کینوس بچھا کے لٹا گیا تھا۔ کینوس کا وہ ٹکڑا اسی طرح پھیلا ہوا تھا اور غور سے دیکھنے پر مجھے سیاہی میں سفیدی کا چھوٹا سا دھبہ نظر آیا... یہ وہی چٹ تھی جسے میں موہنی کے کپڑوں پہ لگا گیا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ ہوش میں آتے ہی اس نے میرا پیغام پڑھ لیا تھا۔ اس کاغذ کے پرزے کی وہاں موجودگی یہ بھی ثابت کرتی تھی کہ موہنی کچھ دیر پہلے ہی اُٹھی ہو گی۔ کاغذ کا وہ پرزہ وہاں زیادہ دیر تک پڑا نہیں رہ سکتا تھا۔ معمولی سا ہوا کا جھونکا اسے اُڑا لے جاتا۔

فوری طور پر مجھے دو خیال آئے۔ پہلا یہ کہ موہنی کا ... حوالہ استعمال کرنے والی نرملا موقع پاتے ہی فرار ہو گئی۔ دوسرا ... کہ اس عرصے میں کوئی اُسے اٹھا لے گیا۔ ہم ابھی تخریب ... اس تربیت گاہ سے اتنے دُور نہیں ہوئے تھے کہ خود کو ... سمجھنے لگتے۔ شکست کے احساس سے دوچار ہونے والے ... چوٹ کھائے ہوئے ناگ سے زیادہ مشتعل ہوں گے... جب انھیں معلوم ہوا کہ کوئی یہاں سے اسٹیشن ویگن نکال لے ... وہ سب اردگرد کے علاقے کو چھان ماریں گے۔ یہ جنگل ایک محفوظ پناہ گاہ ہے... یہ بات وہ بھی جانتے ہیں... جو بات ... ذہن میں تھی وہ ان کے دماغ میں بھی آ سکتی ہے۔ وہ ... سکتے ہیں کہ فی الحال میں اسٹیشن ویگن لے کر کراچی یا پشاور جانے والی سڑک سے دُور رہوں گا... اور اس وقت ... جب جستجو کرنے والے مایوس ہو جائیں۔

ہر صورت میں یہ میری کوتاہی سے زیادہ کم عقلی ... تھی... اگر وہ لڑکی جو بلاشبہ بہت ہوشیار اور باخبر تھی مجھے ... کی بنا پر موہنی ہونے کا یقین دلانے میں کامیاب رہی اور ... ماضی کی تصویر دیکھ کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت گم کر بیٹھا ... میری جذباتی حماقت تھی۔ اور اگر کوئی شکاری جو میری تلاش ... آیا تھا، اسے اُٹھا کر لے گیا تو یہ میری عاقبت نااندیشی تھی... سوچنا چاہیے تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے اور اگر ایسا ہوا تو وہ نرملا ... دفاع نہیں کر سکے گی۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور اُسے آہستہ سے آواز دی... مکمل خاموشی نے میری پکار کا مذاق اُڑایا... کون موہنی... وہ نرملا تھی... میں ڈرتے ڈرتے چٹان کی طرف بڑھا جس کے ... میں نے گاڑی کو چھپا کے کھڑا کیا تھا... یہ میری بھول تھی ... نے دشمن پر اعتبار کیا اور ایک عورت کی باتوں میں آ گیا۔ یہ ... ہوئے بھی کہ تریا چلتر کے آگے بڑے بڑے عاقل خان ... پٹ جاتے ہیں۔ وہ یقیناً گاڑی بھی لے گئی ہو گی۔ وہ اسی ... کے انتظار میں تھی... گاڑی کے ساتھ وہ سب کچھ لے گئی ... سب ثبوت جو تخریب کاروں کی سرگرمیوں کو ثابت کرتے ... لاکھوں روپے کی پاکستانی کرنسی جو تخریب کاروں کے لیے ... گئی تھی... اور وہ اسلحہ جو میرے کام آ سکتا تھا... میں اب ... خالی ہاتھ اس جنگل میں بھٹک رہا تھا... بائیں جانب سے ... کاٹ کے میں اس چٹان کے پیچھے پہنچا۔

گاڑی کو اپنی جگہ دیکھ کے میری جان میں جان آئی... جاتے ہوئے گاڑی بھی لے جاتی تو میری ساری محنت اکارت ... جاتی۔ اب بھی اس نے میری کامیابی کے غرور میں شرمندگی کا ... شامل تو کر ہی دیا تھا۔ میں نے سُنا تھا کہ موہن ایک ہی سوراخ ...

دوبارہ نہیں ڈسا جاتا... یہ وہی عورت تو نہ تھی مگر بہرحال یہ بھی عورت تھی۔ پہلی بار مجھے اعتماد کرنے کی سزا زیب النساء نے دی تھی... میں اس کی معصومیت کے انداز میں چھپی ہوئی عیاری نہ دیکھ سکا تھا اور وہ مجھے چرکا دے کر نکل گئی تھی۔ یہ دوسری عورت تھی جس نے میرے دل میں یادوں کے چراغ روشن کیے تھے۔ میں محتاط رہنے کے باوجود بھول گیا تھا کہ وہ ایک تربیت یافتہ ایجنٹ ہے جس کو تیار کرنے میں جزئیات اور تفصیلات پر مہینوں ریسرچ میں صرف کر دیے گئے ہوں گے۔ وہ میرے بارے میں اتنا جانتی تھی جتنا رابعہ اور محسن بھی نہیں جانتے تھے۔ یہ تاثر دے کر اس نے مجھ سے میرا یقین چھین لیا تھا۔

میں انھی خیالات میں غلطاں جنگل کی ویرانی سے گزرنے والی رات کو دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ شام کو آشیانوں میں بسیرا کرنے سے پہلے شور مچانے والے پرندے اب خاموش تھے اور درختوں سے ہوا سرسراتی گزر رہی تھی۔ میں ایک ہاتھ میں پوٹلی اور دوسرے میں ڈول لٹکائے خود کو سفر کی اگلی منزل کے لیے تیار کر رہا تھا۔ وہ عورت اگر اتنی چالاکی سے فرار ہوئی تھی تو اس سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ کسی بھی شارٹ کٹ سے سڑک تک پہنچ جائے اور میرے بارے میں تفصیلی رپورٹ دے کر شکاری کتوں کو خبردار کر دے۔ وہ ہر راستے پر پہلے سے میرے استقبال کے لیے موجود ملیں۔

ان حالات میں یہ اسٹیشن ویگن لے جانا ایک اور فاش غلطی ہوتی۔ اب میں چھپ کر تو نکلنے کی امید کر سکتا تھا مگر گاڑی لے کر جانا ایسا ہی ہوتا جیسے راجا کا ہاتھی چرا کے کوتوال کے سامنے جانا... پھر یہ سب میں کیسے لے جاؤں گا جو میں نے مالِ غنیمت سمجھ کے اُٹھایا تھا؟ اس سوال کا میرے ذہن میں کوئی جواب نہ آیا تھا کہ میرے کانوں میں ایک عجیب سی آواز آئی۔ میں اُچھل پڑا۔

"شش" تاریکی میں ایک سائے نے گاڑی کی اوٹ سے سر نکالا۔ خفت سے میرا بُرا حال ہو گیا کیونکہ یہ موہنی تھی۔ میں اس سے چند فٹ کے فاصلے پر کھڑا ہوا اندیشہ ہائے دور و دراز میں مبتلا تھا اور وہ شاید مجھے دیکھ رہی تھی... مجھے غصہ بھی آیا لیکن میں پی گیا۔

"کیا بات ہے موہنی؟" میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔"

"کیا... وہ چلا گیا؟" وہ گاڑی کے پیچھے سے نکل کر سامنے آ گئی۔

"کون چلا گیا؟" میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔

"معلوم نہیں کون تھا۔" وہ خوف زدہ لہجے میں بولی۔

"تم نے دیکھا نہیں تھا؟"

"نہیں... میں نے صرف آہٹ سنی تھی۔"

"ہو گا کوئی جانور۔" میں نے کہا۔ "آخر جنگل ہے... مگر اس جنگل میں شیر چیتے تو کیا بھیڑیے تک نہیں ہیں...۔"

"وہ جانور نہیں تھا...۔"

"تو پھر کیا تھا... بھوت...؟"

"مذاق مت کرو... میں کیا انسانی قدموں کی آواز اور جانور کے چلنے کی آواز میں فرق محسوس نہیں کر سکتی۔" وہ بولی۔

"آدمی تھا تو کیا سامنے نہیں آیا؟" میں نے کہا۔

"نہیں... میں تو اُدھر چھپ کر جھانکتی بھی رہی تھی... وہ خاصا قریب آیا تھا... اس جگہ تک جہاں تم مجھے چھوڑ گئے تھے۔ پھر لوٹ گیا۔"

"لوٹ کر کدھر گیا؟"

"اسی طرف... جدھر سے تم آئے ہو۔" وہ بولی۔

"مگر مجھے تو راستے میں کوئی نہیں ملا...۔"

"نہیں ملا تو میں کیا کروں۔" وہ چڑ کے بولی۔ "مجھ میں تو اتنی ہمت تھی نہیں کہ اس کے سامنے جاتی اور کہتی کہ کبیر خان صاحب اُدھر گئے ہیں، تم ان سے ضرور مل لینا... آتے ہی ہوں گے۔"

میں ہنس پڑا۔ "چلو چھوڑو... پھر آ جائے گا اگر کوئی ملاقاتی ہوا۔ تمھارا یا میرا۔"

"مجھے وہاں ڈر لگ رہا تھا... تم کو مجھے اس طرح چھوڑ کے نہیں جانا چاہیے تھا۔" وہ شکایت کے انداز میں بولی۔

"مجھے یقین نہیں آتا کہ... یہ وہی عورت بول رہی ہے... جو میرے دشمنوں کے ساتھ ایک خطرناک مشن پر جاسوسی کرنے کے لیے آئی تھی... جو قاتلوں اور بدمعاشوں کے ساتھ پھرتی تھی... اور رہتی تھی... قتل و خونریزی کے معمولات کی عادی تھی اور خود ایک زبردست ایجنٹ تھی۔" میں نے کہا۔

"تم خود کیوں ڈر گئے تھے... مجھے نہ پا کے...؟" وہ بولی۔

"وہ... میں کچھ اور سمجھا تھا...۔" میں نے سر کھجا کے کہا۔

"سمجھا تھا کہ میں بھاگ گئی... تمھیں اُلّو بنا کے... جھوٹ بول کے؟"

"ہاں... جھوٹ بولنے سے کوئی فائدہ نہیں۔" میں نے کہا۔

"میں یہی سمجھا تھا۔"

"مگر تم گئے کہاں تھے... اور کیوں گئے تھے؟"

"تم تو بے ہوش ہو کے لیٹ گئی تھیں... جو کچھ کرنا تھا، مجھے ہی کرنا تھا... میں ڈنر لے کر آیا ہوں۔" میں نے پوٹلی اُٹھا کے کہا۔ "آؤ..."

"کہاں سے؟" وہ بولی اور میرے ساتھ چلنے لگی۔

"جوئندہ یابندہ...۔" میں نے کہا۔

"مجھے فارسی کیا اُردو بھی نہیں آتی۔" وہ بولی۔

"اس کا مطلب ہے کہ تلاش کرنے سے کیا نہیں ملتا... مجھے

ایک گاؤں مل گیا۔ وہاں ایک لالچی آدمی مل گیا... اس سے سب کچھ مل گیا۔" میں نے کہا۔

"مجھے بھوک تو خیر بالکل نہیں ہے۔" وہ بولی۔ "مگر تم لائے کیا ہو؟"

"خالص قدرتی خوراک جو میرے آباؤ اجداد کو میسر تھی۔" میں نے پوٹلی کھول کے کہا۔ "خالص مکھن... خالص گڑ... خالص گندم کی روٹی اور خالص پانی..."

"تم کھاؤ گے یہ سب؟" اس نے حیرانی سے کہا۔

"کھانا تو پڑے گا..." میں نے کہا۔ "ورنہ بھوک میں تو نہ نیند آئے گی اور نہ عقل کام کرے گی... مگر کاش...!"

"کاش کیا؟" وہ پانی کا ڈول اٹھا کے بولی۔

"کاش اس وقت کوئی فرشتہ نمودار ہو کے پوچھے کہ اپنی ایک خواہش بیان کرو..." میں نے کہا۔ "تو میں کہوں کہ ایک مگ کافی... ویری بلیک اینڈ ویری ہاٹ... اینڈ تھینک یو ویری مچ فرشتے۔"

وہ ہنس پڑی۔ اس نے ڈول سے دو گھونٹ پانی پی لیا تھا۔

"فرض کرو ایسا ہو جائے... میں فرشتہ تو نہیں۔"

"ہاں... فرشتے غالباً مذکر ہوتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "تم واقعی کچھ نہیں کھاؤ گی؟ مجھے تو سخت بھوک لگی ہے۔"

"میں چائے بناتی ہوں۔" اس نے کہا۔

میں خاصی رفتار سے کھانے لگا تھا۔ ان الفاظ کا مفہوم چند سیکنڈ بعد واضح ہوا تو میرا ہاتھ رک گیا اور ایک نوالہ میرے حلق میں اٹک گیا۔

"کیا کہا تم نے... کیا بنانے کی بات کی؟" میں نے لقمہ نیچے اتارنے کے لیے ڈول سے منہ لگا کے پانی پیا۔ "میرے کانوں نے غلط سنا۔"

"تم نے ٹھیک سنا... کافی تو نہیں مگر چائے مل سکتی ہے۔" وہ بولی۔

"کیسے مل سکتی ہے... جادو سے؟ یا تم وائرلیس پر پیغام دو گی کہیں؟"

"اسٹیشن ویگن میں ایک ہفتے کا ڈرائی راشن رہتا ہے... تم نے دیکھا نہیں؟" وہ بولی۔ "ایمرجنسی میں چار آدمی پورا ہفتہ گزار سکتے ہیں۔"

"وہ ڈرائی راشن... جو فوجیوں کو میدانِ جنگ کے لیے ملتا ہے؟" میں نے کہا۔

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "اس کا مطلب ہے تم نے دیکھا ہے۔"

"دوسری جنگِ عظیم کے بعد کی کچھ چیزیں دیکھی تھیں۔" میں نے کہا۔ "ان میں چھوٹی چھوٹی ڈبیاں بھی ہوتی تھیں۔ ایک ڈبیا کھولتے ہوئے پانی میں ڈالو اور ایک کپ چائے تیار... کیا یہ بھی ویسی ہی چیز ہے... خیر جیسی بھی ہے... تم لے آؤ۔"

"تم پیو میرے ساتھ۔" وہ بولی۔

اسٹیشن ویگن کے پیچھے والے حصے میں سیٹ کے نیچے ایک باکس سا تھا... اگر میں اسے دیکھتا تو شاید یوں باکس میں گاڑی کی مرمت میں کام آنے والے اوزار رکھے جاتے ہیں لیکن اس کے اندر سے موہنی نے کئی پیکٹ نکالے۔ گیٹ کھولنے سے اندر چھت میں لگی ہوئی لائٹ روشن ہو گئی تھی۔ اس ذرا سی روشنی میں چند چیزیں میں نے پہچان لیں... ایک تو شہد جیسے بسکٹ تھے... مجھے نہیں معلوم کہ یہ بسکٹ کس چیز کے بنائے جاتے ہیں لیکن ان میں کیلوریز بہت زیادہ ہوتی ہیں۔ ایک بسکٹ چوبیس گھنٹے کے لیے غذا اور توانائی فراہم کر دیتا ہے۔ آدھا بسکٹ پورے کھانے کے برابر ہوتا ہے۔ یہ سخت ٹھوس اور بے ذائقہ... میں نے کسی فوجی سے لے کر چکھا تھا اور بہت مشکل سے چبا پایا تھا... اس سے مجھے پیٹ بھر جانے کا احساس ہوا تھا۔

باکس میں ایسے بسکٹ پیکٹ کی صورت میں رکھے ہوئے تھے اور ایک ایک درجن والے چھ پیکٹ خوراک کا کافی بڑا ذخیرہ سمجھے جا سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی سو ٹی بیگس تھے... سو کپ چائے بنانے کے لیے... کنڈنس کیے ہوئے دودھ کے چار ڈبے تھے۔ چینی کی جگہ سویٹیکس کی گولیاں تھیں۔ ہر گولی دال کے دانے جتنی چھوٹی تھی... یہ سیکرین تھی جو ذیابیطس کے مریض بھی استعمال کرتے ہیں اور میری معلومات کے مطابق سیکرین تو چینی کے مقابلے سو گنا سے بھی زیادہ میٹھا کرنے کی صلاحیت حاصل ہے چنانچہ مضر ہونے کے باوجود تجارتی پیمانے پر یہ سستی چیز مٹھاس پیدا کرنے میں چینی کی جگہ عام استعمال کی جاتی ہے۔ ایک ننھی سی گولی ایک چینی کے چمچے کے برابر تھی اور جو ڈبیا موہنی نے مجھے دکھائی اس میں شاید پانچ سو گولیاں ہوں گی۔ باقی حصے میں سگریٹ بھرے ہوئے تھے۔

یہ لاٹری میں نکلنے والا خزانہ تھا۔ اس کی دریافت نے مجھے اتنا ہی خوش کیا جتنا امریکا کی دریافت نے کولمبس کو کیا ہو گا۔ میرا موڈ تھوڑی سی دیر کے لیے بالکل بدل گیا... میں جنگ اور سیاست کے حالات اور ماضی و مستقبل کو بھول کے حال کے لمحۂ گزراں سے وابستہ ہو گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ جنگل میں پکنک کی رات ہے اور ہم یہاں صرف ایڈونچر اور مسرت کی تلاش میں آئے ہیں۔ اس کے اور میرے درمیان بہت فاصلے تھے... وقت کے... سرحدوں کے... عقیدوں کے... رشتوں کے اور جذبوں کے... مگر میرا تھکا ہوا ذہن اور دماغ ایک عارضی خوشی کی پناہ کے لیے مچل گیا۔

میں نے بڑے شوق اور انہماک سے جنگل کے درختوں کی ٹہنیاں توڑیں... اس وقت مجھے وہ بات یاد نہیں آئی جو بچپن میں ماں نے کہی تھی کہ درخت بھی جاندار ہوتے ہیں اور رات کو سوتے ہیں... میں نے سوتے میں ان کو شاخوں سے محروم کر دیا۔

اپنے مطلب اور ضرورت کے مطابق لکڑیاں جمع کرنے والے اور جب میں کامیاب ہو گیا تو میں نے اس کینوس کے ٹکڑے کا خیمہ کھڑا کیا۔ اس طرح کہ اگلے حصے میں دو شاخیں آپس میں آٹھ کے ہندسے کی طرح کھڑی کر دیں۔ ایسی ہی دو شاخیں پیچھے تھیں۔ ان کے اوپر ایک لمبی سیدھی شاخ آ گئی جس نے دونوں آٹھ کے ہندسوں کی نوک سے رشتہ پیوست کر لیا۔ جب میں نے اس پر کینوس ڈالا تو یہ ایک مخروطی خیمہ بن گیا جو نیچے سے پانچ فٹ چوڑا تھا اور پیچھے آٹھ فٹ تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کی بلندی تین فٹ تھی۔

اتنی دیر میں موہنی نے خشک لکڑیاں اکٹھی کر کے پانی والے ڈول کو درخت کی ایک شاخ کے ساتھ باندھ دیا... پتلی سی شاخ اس کے بوجھ سے جھکی تو ڈول زمین سے ایک فٹ اوپر رہ گیا۔ موہنی نے اس کے نیچے لکڑیاں جلانے میں زنانہ مہارت کا مظاہرہ کیا اور آدھے گھنٹے میں آدھا ڈول اُبلتی ہوئی چائے تیار ہو گئی... یہ شاید دس کپ چائے تھی۔ موہنی نے اس میں پندرہ ٹی بیگس ڈال دیے تھے۔ چائے پینے کے لیے وہ پیالہ صاف کیا گیا جس میں مکھن تھا۔ مکھن کو دو روٹیوں کے درمیان پیک کر دیا گیا اور تھوڑی سی اُبلتی ہوئی چائے نے پیالے کی چکنائی صاف کر دی۔

جب موہنی نے مجھے چائے کا پیالہ پیش کیا تو میں خیمے کے نیچے کی زمین صاف کر رہا تھا۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"یہ چائے ہے اور کیا ہے۔" وہ بولی۔

"اسے چائے کہتے ہیں؟" میں نے کہا۔ "دودھ کے چار ڈبے گھول دیے کیا؟... چینی بھی سب ڈال دی ہو گی۔"

"پی کے تو دیکھو۔" موہنی نے خفگی سے کہا۔

"یہ تم پیو..." میں نے کہا۔ "مجھے تو صرف چائے چاہیے۔ اس رات سے زیادہ کالی... سچ سے زیادہ تلخ... نہ دودھ، نہ وہ مٹھاس کی گولی..."

"صرف قہوہ، پیو گے؟" وہ افسوس سے سر ہلانے لگی۔ "ایسی مزیدار چائے ہے۔"

"مزیدار ہو گی... مگر چائے نہیں ہے۔" میں نے اسے سمجھایا۔

جب بالآخر میری باری آئی تو میں نے نہایت ندیدے پن سے یکے بعد دیگرے دو پیالے حلق میں انڈیلے... میری زبان اور ہونٹ جلے مگر لذت اور سرور کی کیفیت نے مجھے احساس نہ ہونے دیا... عام زنانہ سوچ کے مطابق موہنی کو بھی سخت صدمہ تھا کہ میں یہ کالا زہر پی کے اپنی جان جلا رہا ہوں... میں نے اس کے خیالات بدلنے کی بالکل کوشش نہیں کی۔ کرنل کی جیب سے ملنے والے میس سگریٹوں کے پیکٹ میں سے پانچ ابھی باقی تھے۔ اس کے بعد مجھے وہی سگریٹ پینے تھے جو اسٹیشن ویگن کے اسٹاک میں تھے۔

ایک گھٹیا برانڈ جو بھارت میں مقبول تھا۔

"تم نے یہ خیمہ لگانے میں بڑی محنت کی۔" موہنی نے اس وقت کہا جب میں دوسرا سگریٹ پہلے سگریٹ سے جلا رہا تھا۔

"ہاں... مجھے فضول محنت کی عادت ہے۔" میں نے کہا۔ "کچھ کیے بغیر رہا نہیں جاتا۔" میں فرشِ خاک پر بڑے آرام سے لیٹا ہوا تھا۔

وہ مجھ سے دو فٹ دُور بیٹھی ہوئی تھی۔ "سونے کے لیے گاڑی تھی۔"

"نیند کے بارے میں مشہور ہے کہ سولی پر بھی آ جاتی ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے تو یہاں بھی نہیں آ رہی ہے... تم چاہو تو گاڑی میں جا کے سو جاؤ۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "تم نے میرے بارے میں کچھ نہیں پوچھا...!"

"کیا پوچھوں؟" میں نے کہا۔

"یہی کہ... میں نے ایسا کیوں کیا؟" وہ بولی۔ "میں نے اپنوں کا ساتھ کیوں چھوڑا... تم نے موہن کے بارے میں بھی نہیں پوچھا۔"

"موہن؟ تمھارا بھائی۔" میں نے کہا۔ "وہ کہاں ہے؟"

"وہ... اپنی موہنی کے پاس۔" وہ تلخی سے بولی۔

"کیا مطلب!" میں ایک دم اُٹھ بیٹھا۔

"مدن موہن میرا بھائی ہی تھا..." وہ بولی۔ "تمھیں تو اس کا پورا نام کہاں یاد ہو گا..."

"وہ... مدن موہن... یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟" میرا دماغ سُن ہو گیا۔

"میں تمھیں الزام نہیں دیتی۔" وہ بولی۔ "تم نے وہی کیا جو تمھیں کرنا چاہیے تھا۔ اُسے بھی موقع ملتا تو وہ تمھیں نہ بخشتا... وہ تمھارا اتنا ہی دشمن تھا جتنا کرنل... یا شرما... شاید اُن سے بھی زیادہ۔"

"تمھیں... اس کی موت کا کوئی افسوس نہیں؟" میں دم بخود بیٹھا رہا۔

"نہیں... میرے لیے تو وہ بہت پہلے مر گیا تھا۔" وہ اچانک خاموشی سے رونے لگی۔ "کتنی بدنصیب ہوتی ہے وہ بہن جس کا ایک ہی بھائی ہو اور وہ اس کی محبت، شفقت اور جذباتی قربت سے محروم ہو..."

"جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔" میں نے افسوس سے کہا۔ "وہ پہلے تو ایسا نہیں تھا۔"

"ہاں... مگر وقت بدلا تو اس کی فطرت بھی بدل گئی۔" موہنی نے کہا۔ "کیا تمھیں یاد ہے کہ میرے پتا پنڈت دیانا تھ کیسے آدمی تھے؟"

"وہ انسان تھے... مکمل انسان..." میں نے کہا۔ "نہ ہندو نہ مسلمان..."

"یہی انسانیت پرستی ان کے لیے تباہی کا سبب بنی۔" موہنی

نے کہا" انھوں نے فسادات میں تمھارے گھرانے کا ساتھ دیا... وہ کسی اور کو تو نہ بچا سکے مگر تمھیں انھوں نے سال بھر اپنے گھر میں رکھ کے سب کو اپنے خلاف کر لیا تھا۔ وہاں انتہا پسند اور متعصب ہندو اکثریت میں تھے اور ان کی شہ پر غنڈے انھیں دن رات دھمکیاں دیتے تھے کہ اس مسلمان کے بچے کو ہمارے حوالے کر دو۔"

"اچھا... انھوں نے مجھے کبھی نہیں بتایا تھا۔" میں نے ایک احمقانہ بات کی۔

"تم کو کیسے بتاتے... تم ٹانگ برابر بھی تو نہیں تھے۔" وہ بولی۔

"لیکن ایک بار انھوں نے تم کو میرے ماما کے گھر بھیج دیا تھا مگر۔"

"تمھارا ماما مجھے یاد ہے... وہ ایک خوفناک، خطرناک اور ہیبت ناک شخص تھا۔" میں نے کہا۔ "غالباً بہن کی وجہ سے وہ مجھے رکھنے پر مجبور ہو گیا تھا ورنہ خود مجھے شہید کر دیتا۔"

"اسی لیے تم کو واپس بلا لیا گیا تھا۔" موہنی بولی۔ "پھر جب چاچا وزیر خان تم کو لے گئے تو ہماری شامت آ گئی... تمھارے زندہ نکل جانے پر وہ سخت سیخ پا ہوئے جو تمھیں ختم کرنے کے لیے موقع کی تلاش میں تھے۔ انھوں نے ہمارے خلاف ... کی... یہ تک کہا کہ ہم اپنے مذہب سے پھر گئے ہیں اور چوری چھپے مسلمان ہو چکے ہیں۔ موہن کو لڑکوں نے کئی بار مل کے مارا اور کہا کہ تم دوغلے ہو... غدار ہو اور ملیچھ ہو گئے ہو... کیونکہ تم نے ایک ماس خور مسلمان کے ساتھ ایک ہی برتن میں کھایا ہے... اور ایک ہی گلاس سے پانی پیا ہے... انھوں نے موہن کے ساتھ بات کرنا چھوڑ دیا... ایک مرتبہ اس کی مار پیٹ اسکول میں ہوئی... کسی بڑے لڑکے نے اعلان کر دیا تھا کہ موہن نے اپنی بہن اس مُسلے کو دے دی ہے۔ موہن کا مشتعل ہونا جائز تھا مگر شکایت اُلٹی ہوئی اور ماسٹر نے پتا جی کو بلا کے برا بھلا کہا۔ پتا جی نے ماسٹر سے کہا کہ آپ طالب علموں میں مذہبی تعصب کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں... بات آگے گئی اور موہن کو اسکول سے نکال دیا گیا۔ اس کے بعد موہن نے اپنا بدلہ لیا۔ وہ رات کو گھر سے سبزی کاٹنے کی چھری لے کر گیا، اور اس لڑکے کو زخمی کر آیا جس نے اُسے بہن کی گالی دی تھی۔ وہ لڑکا اسپتال میں پڑا رہا اور موہن حوالات میں... متعصب اخباروں نے اس خبر کو خوب اچھالا اور نمک مرچ لگا کے شائع کیا۔ ایک اخبار نے تو یہ لکھ مارا کہ پنڈت دیا ناتھ کی بڑی بیٹی کے کبیر خان سے ناجائز مراسم تھے... تم سوچو ذرا... میں تو موہن سے بھی چھوٹی تھی۔ کسی نے تصدیق تک نہیں کی کہ میری تمھاری عمر کیا تھی... پتا جی کس کس کے خلاف آواز اٹھاتے یا مقدمے بازی کرتے۔"

"اس کا مطلب ہے انھوں نے تردید بھی نہیں کی؟" میں نے غصّے کی آگ میں جلتے ہوئے کہا۔

"نہیں... وہ خود اخبار کے دفتر گئے۔" موہنی بولی۔ "اور انھوں نے یہ خبر چھاپنے والے کو مارا... اخبار کا سارا عملہ موجود تھا، سامنے پتا جی نے رپورٹر کا سر پھاڑ دیا... نتیجہ یہ کہ وہ بھی ... ہمیں کوئی اپنا ضامن تک نہ ملتا تھا... موہن تو بچ گیا ... کو دو سال کی قید ہوئی۔ اس میں ہمارا سب کچھ تباہ ہو گیا... بک گیا... غنڈے ایک بار مجھے اٹھا کے لے گئے... اور ماتا جی کو..."

"اٹھا کے لے گئے؟" میں بھونچکا رہ گیا۔ "کیوں..."

"غنڈے عورتوں کو کیوں اٹھا کے لے جاتے ہیں..." ... نے تلخی سے کہا۔ "میں اس وقت چودہ سال کی تھی... ماتا ... تئیس سال کی تھی۔"

"او مائی گاڈ... یہ سب میری وجہ سے ہوا۔" میں نے سر تھام لیا۔

"یہ سب پنڈت دیا ناتھ کی شرافت اور انسانیت پر... فطرت کے باعث ہوا تھا۔" موہنی نے کہا۔ "تمھیں خود کو ... کی ضرورت نہیں۔ اس کے بعد کا وقت بڑا سخت ہی گزرا... کسی اسکول میں داخلہ نہ ملا۔ وہ اپنے گھر سے، اپنے باپ سے، اخلاقی اقدار سے سب سے متنفر اور برگشتہ ہو گیا... وہ سمجھتا... ساری خرابی کے ذمے دار پتا جی ہیں... نہ وہ تمھیں پناہ دیتے ... پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹتے... معلوم نہیں اس کے خیالات ... تبدیلی کیوں آئی۔"

"یہ ایک شکست خوردہ ذہنیت کی علامت تھی..."

"کچھ بھی سمجھ لو... وہ تمھارے وجود کو ساری نحوست ... سمجھنے لگا۔ اور تمھارا غائبانہ دشمن ہو گیا۔" موہنی نے کہا۔ "... اٹھنا بیٹھنا بھی غلط قسم کے لوگوں میں ہو گیا... جب پتا جی کا انتقال ہوا تو موہن نے رونے کے بجائے خوشی کا اظہار کیا اور ... مارا کہ میں جس باپ کی وجہ سے بچپن میں ہی عورت بن گئی تھی ... رو رہی ہوں۔"

"اس میں... ان بدمعاشوں سے بدلہ لینے کی ہمت ... تھی؟" میں نے برہمی سے کہا۔ "جو اس کی ماں اور بہن کو ... لے گئے تھے؟"

"ان کے بارے میں... خود مجھے نہیں معلوم تھا... کون تھے... اور آج تو میں بات بھی کر سکتی ہوں... ایک وقت ... میں اپنی ماں سے آنکھ نہیں ملا سکتی تھی۔ اور ماں تو نیم پاگل ... وہ ایسی باتیں کرتی تھی کہ سن کر مجھے پسینہ آ جاتا تھا۔ اس نے حرمت کی جس چادر کو اپنی نسوانیت کی ناموس بنا رکھا تھا ... تار ہو گئی تو اس کا احساس ہی مر گیا... باپ کی موت کے بعد ... نے گھر آنا بھی چھوڑ دیا... ہمیں کوئی پوچھنے والا نہ رہا۔"

"کیوں... تمھارا وہ ماما... جو تمھاری ماتا جی کا بھائی ...

"وہ ایک بار آیا تھا... ماتا جی نے پاگل پن میں اس سے جو کچھ کہا... وہ میں بیان نہیں کر سکتی... وہ جان چھڑا کے بھاگ گیا کہ ایسی فاحشہ کو اپنے گھر میں کیسے رکھوں... وہ ایک حادثہ تھا جس نے ماں کو فاحشہ کا درجہ دے دیا... وہ فاحشہ نہیں تھی مگر یہ لیبل اس پر لگا دیا گیا... مرتے دم تک وہ اپنے شوہر کی وفادار تھی۔ اس نے فحاشی کا لفظ بھی نہ سنا ہوگا... مگر اس حادثے کے بعد وہ انہی لوگوں کی باتیں دہرانے لگی تھی... جو اُسے اغوا کر کے لے گئے تھے۔ وہ بہت گندی باتیں تھیں لیکن اس کی اپنی باتیں نہیں تھیں... ان لوگوں نے اس کے ذہن کو جلا دیا تھا اور اس کے حافظے میں اپنی غلاظت کے انگارے بھر دیے تھے... وہی انگارے اگلتی تھی۔ باپ کی موت کے بعد وہ مشکل سے چھ ماہ زندہ رہی... اس تمام عرصے میں موہن ہم سے بالکل لاتعلق ہو گیا... اور تم جانتے ہو ہم نے وہ دن کیسے گزارے؟ تم کہہ سکتے ہو کہ میں بزدل اور بے شرم تھی ورنہ مر جاتی... خودکشی کر لیتی لیکن گناہ کے راستے پر نہ چلتی... لیکن مجھے ... کر لے جانے والے زندہ تھے اور میں مر جاتی تو ان کا کیا بگڑتا۔ انہی بھیڑیوں نے جب بھیڑ کی نقاب پہن کے ہمدردی کرنے آئے اور انھوں نے مدد کے لیے ہاتھ بڑھایا تو میں نے ان ہاتھوں کو پہچان لیا۔ میں نے ان کی مدد قبول کر لی اور ان سے بدلہ بھی لیتی رہی... میری بے حیائی کو نظر انداز کر دینا... یہ ساری زندگی جو میں نے اب ... گزاری ہے، حیا کے مفہوم سے ناآشنا تھی... میں پہلے تین مہینے محلے کے سب سے بڑے بدمعاش کی محبوبہ رہی... اس کے ہاتھوں میں نے دوسرے نمبر کے بدمعاش کو مروا دیا... اور نمبر ایک کے خلاف گواہی دے کر اُسے بھی پھانسی چڑھوا دیا... تیسرا بدمعاش میری خاطر گواہ بنا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ایک تیر سے دو شکار کر سکتا ہے... مجھے بھی حاصل کر سکتا ہے اور سب سے بڑے بدمعاش کا جانشین بھی بن سکتا ہے... اس کی یہ آرزو تو پوری ہوئی مگر اس کے ساتھ ہی زندگی بھی پوری ہو گئی۔ اس کی لاش ساتویں دن ایک گڑھے سے نکلی... اب میں تفصیل سے کیا بتاؤں... میں نے ایک طوائف سے بدتر زندگی گزاری... طوائف تو صرف پیسے کے لیے ہی خود کو بیچتی ہے نا... میں نے پیسہ بھی لیا اور پیسہ دینے والوں کی جان بھی لی... بالآخر ایک وقت ایسا آ گیا کہ میرے لیے یہ کھیل جاری رکھنا ناممکن ہو گیا اور میری اپنی زندگی خطرے میں پڑ گئی... موہن نے مجھے بروقت خبردار کر دیا کیونکہ اس کا تعلق انہی بدمعاشوں سے تھا... میں فرار ہو کے دہلی چلی گئی اور وہاں سال بھر ٹھوکریں کھانے کے بعد ایک سفارش کی بنیاد پر نرس بن گئی۔ اس طرح میری زندگی کا دوسرا آبرو مندانہ دور شروع ہوا۔ میں نے ایک لیب اسسٹنٹ سے شادی بھی کر لی جس سے میرے دو بچے ہوئے۔ ایک پیدائش کے وقت مر گیا... دوسرا پیدائش کے بعد صرف ایک ماہ زندہ رہا۔ میری زندگی کا یہ دور اب سے تین سال پہلے ختم ہوا۔"

"کیا تمھارا شوہر مر گیا؟" میں نے بے حد دکھی دل کے ساتھ کہا۔

"نہیں... اس نے اپنی بیوی کو مار دیا۔" وہ بولی۔ "اس نے ایک دن مجھ سے کہا کہ تم چاہو تو میری ترقی ہو سکتی ہے... میں نے کہا کہ پاگل ہوئے ہو... کیا میں تمھاری افسر ہوں... اس پر وہ بے شرمی سے بولا کہ افسر کیا چیز ہے... میرا افسر تو تمھارے حکم کا غلام ہے... اور میں پھر بھی نہیں سمجھی تو اس نے بتایا کہ اس کا وہ افسر جو اسے ترقی دے کر لیب اسسٹنٹ سے لیبارٹری انچارج بنا سکتا ہے، مجھ پر فریفتہ ہے... چنانچہ میں اس کے پاس جاؤں اور میری ترقی کا حکم نامہ لے کر آؤں۔ میں مجبور ہو گئی... لیکن جب شوہر کی ترقی ہو گئی تو میں نے اسے چھوڑ دیا۔ میں نے اُسے صاف بتا دیا کہ اب میں تمھاری نہیں سب کی بیوی ہوں... جو بھی مجھے فائدہ پہنچا سکے... اور پھر میں نے اپنی زندگی کو اسی ڈھب سے گزارا۔ آج میں تمھارے سامنے ہوں۔

میں مختلف شہروں اور راستوں سے ہوتی ہوئی اس کرنال تک آ گئی تھی۔"

خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا جس میں میرا دل خون کے آنسو روتا رہا... اس موہنی کے لیے جو میرے بچپن کی سب سے خوب صورت یاد تھی۔ سب سے زیادہ معصوم اور پاکیزہ جذبوں کی امین اور محبت کے اوّلین بے غرض احساس کی آئینہ دار تھی۔ وہ موہنی زمانے کے ہاتھوں بڑے دکھ اٹھا کے مر گئی تھی، اس کی جگہ میرے سامنے دوسری موہنی بیٹھی تھی جو مجھے زمانے کے ہاتھوں اپنی سفاکانہ موت کی کہانی سُنا رہی تھی۔ اور میں محسوس کر رہا تھا جیسے کسی نے وزیر خان کا مدفن پھر کھود ڈالا ہے، اس کی لاش کی ہڈیاں نکال کے میرے لیے ایک خالی گڑھا چھوڑ دیا ہے... میں احترام اور عقیدت کے پھول چڑھاؤں تو کہاں... دعا مانگوں تو کس لوحِ مزار کے سرہانے کھڑا ہو کے... موہنی ایک خوب صورت یاد کا مزار تھی۔ اس پر میں نے زندگی کے سب سے زیادہ معصوم جذبوں کے پھول کھلا رکھے تھے۔ لیکن نرملا نام کی ایک عورت نے سب کچھ تہس نہس کر دیا تھا۔ اس نے پھولوں کو راکھ کر دیا تھا اور یاد دل کو دکھ کے لمحوں میں ڈھال دیا تھا۔

"آخر تم کیوں زندہ رہیں موہنی؟" میں نے کہا۔

"کبھی تم نے اپنے آپ سے بھی یہ سوال کیا ہے؟" وہ بولی۔ "کیا تمھاری زندگی کبھی ایسے موڑ پر نہیں آئی جب تم موت سے ایک آبرو مندانہ سمجھوتا کر سکتے تھے... مگر تم کر نہ سکے۔"

میں نے شرمندگی سے کہا۔ "شاید میں بھی بزدل تھا۔"

"نہیں... ہم بے اختیار لوگ ہیں... مرنا جینا کچھ نہیں جانتے۔" وہ بولی۔

"تم نے کہا تھا کہ... تم مجھ سے ملنا چاہتی تھیں۔" میں نے موضوع بدلنے کے لیے کہا۔

"ہاں... میں تمھارا نام نہیں بھولی تھی۔"

"صرف نام... نام بھی کیوں یاد رہا تمھیں؟" میں نے کہا۔

"یہ تو تم بھی جانتے ہو... جب میں ان باتوں کا مطلب نہیں سمجھتی تھی، تب بھی تم مجھے اچھے لگتے تھے۔ اس جذبے کو تم کیا نام دوگے جو خود تمھارے دل میں میرے لیے تھا؟" وہ بولی۔

"وہ محبت تو نہیں تھی۔"

"اور... وہ کیا تھا... وہ احساس..." میں نے کہا۔ اور اس احساس پر تو وقت کی آنی گرد پڑ چکی تھی۔

"اب سے تین مہینے قبل میں نے تمھارا نام سُنا۔" وہ بولی۔ "اسی یونٹ میں لوگ تربیت کے لیے بھیجے جاتے تھے... جہاں میری پوسٹنگ تھی... میں نے تمھارا ذکر سُنا... اخباروں کے تراشے دیکھے... تمھاری تصویریں دیکھیں... اور نہ جانے کیوں وہ گرد ہٹتے لگی... میرے جذبات کا پرانا رنگ نمایاں ہونے لگا۔ میں نے اور جستجو کی... اور پھر مجھے معلوم ہو گیا کہ تم وہی ہو... میں یہ بات کسی کو بھی نہیں بتا سکتی تھی کہ تم کون ہو... میں نے تمھارے نام پر اپنا سب کچھ لٹا دیا تھا... لیکن اپنی مرضی سے نہیں... تمھارا نام لے کر دنیا نے مجھے لوٹا تھا... اس کے باوجود میرے دل میں تمھارے خلاف نفرت نہیں تھی... میں تم سے انتقام لینا نہیں چاہتی تھی... جیسے کہ موہن چاہتا تھا..."

"کیا اُسے بھی پتا چل گیا تھا کہ میں وہی کبیر خان ہوں؟"

"ہاں... اور اسی لیے وہ سامنے آ گیا... اُس نے کچھ پیسے کے لالچ میں اور کچھ تمھاری دشمنی میں اپنی خدمات پیش کر دیں۔ جب اس نے اپنے بارے میں بتایا تو اُسے فوراً اس مشن میں شامل کر لیا گیا۔ وہ کبیر خان کو پہچانتا تھا اور اس کا ذاتی دشمن تھا۔ یہ بات مجھے معلوم ہوئی تو میری راتوں کی نیند اُڑ گئی۔ موہن کے اور میرے درمیان جذباتی دوری ہمیشہ رہی تھی... میں اُس سے نفرت کرتی تھی۔ جب اس نے تمھاری جان لینے کے مشن میں شرکت اختیار کی تو میں بھی نہ رہ سکی... میں نے تمھاری جان بچانے کا مشن اپنا لیا۔"

"صرف اسی اختلاف کے باعث؟"

"نہیں... ایک وجہ اور بھی تھی۔" وہ بولی۔ "میں ایک بار تم سے مل کے تمھیں بتا دینا چاہتی کہ تمھاری موہنی کے ساتھ دنیا نے کیا ظلم کیا تھا۔ اور موہنی نے وہ سب ظلم سہہ کے بھی تم سے نفرت نہیں کی... موہنی اپنے دل کے سامنے بے بس تھی... میں کوئی شریف عورت نہیں ہوں... اسی لیے مجھے موہنی سے نرملا بننا پڑا... موہنی تمھارے لائق تھی۔ نرملا تمھارے جسم کی غلاظت سمیٹنے کے قابل بھی نہیں... مگر میں پھر تمھارے پاس آ گئی ہوں۔"

"ایسا مت کہو موہنی۔" میرا دل آنچ پر رکھے ہوئے کانچ کی طرح تڑخنے لگا۔ "میرے لیے تم وہی ہو... سوچنا مجھے یہ ہے کہ اب تم کو کس طرح ساتھ رکھوں۔"

"تم رابعہ سے ڈرتے ہو۔" وہ بولی۔ "فکر مت کرو... میں اس کی جگہ کبھی نہیں مانگوں گی... میں مانگ بھی نہیں سکتی اور تم دے بھی نہیں سکتے لیکن تمھارا ساتھ دینے والے تو بہت سے دوسرے بھی ہیں۔ ان میں مجھے بھی شامل کر لو... میں کبھی تمھاری راہ میں حائل نہ ہوں گی... کبھی تمھارے لیے کوئی مشکل پیدا نہیں کروں گی... تم جس طرح چاہو مجھے رکھنا... کبیر خان... میرا جسم... میری جان... سب تمھارے قبضے میں رہے گا..."

"یہ... یہ کیا کہہ رہی ہو تم...!" میں نے گھبرا کے کہا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی میں نے ایک آہٹ سی سُنی۔ کوئی خشک پتوں پر قدم رکھتا آگے آ رہا تھا... میں نے موہنی کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا اور پچھلی طرف سے خیمے سے باہر آ گیا۔ قدموں کے وزن سے چرمرانے والے پتوں نے مجھے ہر طرف سے محصور ہونے کا احساس دلایا... ایک نہیں کم سے کم چار آدمی تھے جو چار مختلف سمتوں سے بڑھتے چلے آ رہے تھے... میں ان کے تاریک سایوں کو شاخوں کے پیچھے متحرک بھی دیکھ سکتا تھا۔ اسٹیشن ویگن کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے میں نے ان سب کو چند قدم کے فاصلے پر دیکھا... اب مجھے چٹان کے پیچھے کھڑی ہوئی اسٹیشن ویگن تک پہنچنا بھی ناممکن محسوس ہو رہا تھا۔ میں بالکل خالی ہاتھ تھا اور مجھے یہ ڈر بھی تھا کہ کہیں اسٹیشن ویگن پر بھی شکاری قابض نہ ہو جائیں۔

تعداد میں چار تھے اور اُن کی پیش قدمی کا انداز ہی ان کے غلط عزائم کی غمازی کرتا تھا۔ وہ سانس روک کے پھونک پھونک کر قدم رکھتے انتہائی محتاط انداز میں آگے بڑھ رہے تھے اس شکاری کی طرح جو کسی وحشی درندے کی کمین گاہ پر حملہ کرتے ہوئے خود شکار ہونے کے اندیشے میں گرفتار ہو۔

وقت اور موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے میں نے اسٹیشن ویگن تک پہنچنے کا خیال چھوڑ دیا۔ میں جان کی بازی لگا کے لڑتا تو اپنے بارے میں کچھ امید رکھتا مگر موہنی کو ساتھ رکھتے ہوئے ایسی کوشش صریحاً خودکشی کے مترادف محسوس ہوتی تھی۔

میں نے موہنی کو نیچے کھینچ لیا اور ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے خاموشی اختیار کرنے کو کہا۔ وہ تیز دھار رکھنے والی خشک گھاس اور کانٹوں کی چُبھن رکھنے والی زمین پر یوں دراز ہوئی کہ اس کا نازک بدن میرے اور ایک بہت بڑے پتھر کے درمیان پھنس گیا۔ خود میں اپنی جگہ سے ایک انچ دُور نہیں سرک سکتا تھا کیونکہ دوسری طرف کوتاہ قامت گھنیری جھاڑیوں کا جھنڈ تھا۔

میرے کان جھاڑیوں کے پیچھے نظر نہ آنے والے دشمن کے قدموں کی آہٹ بھی سُن رہے تھے اور وہ سرسراہٹ بھی جو جھاڑیوں کے اندر سے سنائی دینے لگی تھی۔ اس جھنڈ میں سانپوں کے کسی جوڑے کا بسیرا بھی ہو سکتا تھا جن کو ایک انسانی جوڑے کی اپنی خلوت گاہ میں دخل اندازی نے مشتعل کر دیا ہو۔

"اُف... میرا تو جسم چھل گیا۔" موہنی نے بل کھا کے کہا۔ میں نے اس کے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "جب تک ہم خود انھیں اپنی موجودگی کی خبر نہیں دیں گے، وہ ہمیں تلاش نہیں کر سکیں گے۔" میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"لیکن... اس وقت تک میری کھال اُدھڑ جائے گی۔" وہ کسمسا کے بولی۔

"یہ لوگ تمھاری کھال کھینچ لیں گے۔" میں نے کہا۔ "اگر انھوں نے تمھیں یہاں میرے ساتھ دیکھ لیا۔"

"یہاں تو کیڑے مکوڑے بھی ہیں۔" وہ بے چینی سے بولی۔

"اور کیا ہاتھی گھوڑے ہوں گے۔" میں نے مذاق میں کہا... "اگر میں کہتا کہ یہاں تو سانپ، بچھو بھی ہو سکتے ہیں تو وہ چیخ پڑتی۔

"اُف... یہ کیا چیز رینگ رہی ہے... میری ٹانگوں پر..."

"میں نہیں دیکھ سکتا۔" میں نے کہا۔ "بس چند منٹ کی بات ہے۔"

"میری گردن پر کسی چیز نے کاٹا ہے۔" وہ دہشت زدہ ہو کے بولی۔

"پلیز... حوصلہ رکھو... اس وقت ہم یہاں سے نہیں نکل سکتے۔" میں نے کہا۔ "تم یہ ہلنا جُلنا بند کرو..."

"ہلنے کی جگہ بھی کہاں ہے۔" وہ بولی۔ "مگر کیا سانس بھی نہ لوں؟"

یہاں دشمن کی نگاہ ہمیں نہیں دیکھ سکتی تھی لیکن میں ان کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھ سکتا تھا۔ اگر وہ ہماری جستجو میں آگے آتے تو میں ان کو آسانی سے نشانہ نہ بنا سکتا تھا۔ مجھے خود کو اور موہنی کو ہی نہیں بچانا تھا، اسٹیشن ویگن کی حفاظت بھی کرنی تھی۔

وہ لوگ اب اس عارضی کیمپ تک آ گئے تھے جہاں چند منٹ پہلے ہم دونوں جنگل میں منگل منا رہے تھے۔ فضا یکلخت فائروں کی آواز سے دہل اُٹھی۔ پرندے آشیانوں سے چلاتے ہوئے اُڑے اور تاریکی میں درختوں کے درمیان گشت کرنے لگے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ کم سے کم دو افراد نے بیک وقت خیمے پر اپنے ریوالور خالی کر دیے ہیں۔ موہنی کانپنے لگی... اس کے جسم کی لرزش میرے جسم میں ارتعاش پیدا کرنے لگی۔

"وہ یہاں نہیں ہیں سر۔" کسی نے کہا۔

"اندر جا کے دیکھو۔" یہ دوسری آواز تحکمانہ تھی۔ "لیکن احتیاط سے... ایک آگے سے جاؤ... دوسرا پیچھے کی طرف سے دیکھے۔"

میں نے شاخوں کے ٹوٹنے کی آواز سُنی... یقیناً انھوں نے کینوس کے ٹکڑے کو کھینچ کر خیمہ گرا دیا تھا۔

"وہ یہاں تھے سر۔" یہ تیسری آواز تھی۔

"مگر اب نہیں ہیں سر۔" چوتھے نے تصدیق کی۔

"وہ جا چکے ہیں..."

"مگر اتنے کم وقت میں وہ زیادہ دُور نہیں جا سکتے۔" دوسرا بولا۔ "تم دونوں دائیں بائیں جاؤ... ایک شمال کی طرف، دوسرا جنوب کی طرف... زیادہ دُور نہیں جانا ہے... بس ایک فرلانگ تک دیکھو اور پھر واپس اسی جگہ پہنچو۔ اپنی ڈائریکشن کا خیال رکھنا... کہیں یہ نہ ہو کہ راستہ بھول جاؤ... ہم ساری رات کسی ایک کی واپسی کے انتظار میں نہیں گزار سکتے۔"

اس کی آواز کرخت اور درشت تھی... وہ اپنے ماتحتوں پر غلاموں کی طرح حکم چلانے کا عادی معلوم ہوتا تھا اور کوئی چھوٹا موٹا سرپھرا فوجی افسر لگتا تھا... اس کی آواز کو غور سے سُننے کے باوجود میں شناخت نہ کر سکا۔ میرے ذہن میں سیکڑوں ہزاروں جانی پہچانی آوازیں ایسے محفوظ تھیں جیسے کسی لائبریری میں کتابیں رکھی رہتی ہیں مگر میں عام آدمی کی طرح مشکل سے سو آوازوں کے چہرے تصور کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ باقی آوازیں لاشعور سے بھی نیچے تحت الشعور کے نہاں خانوں میں بند تھیں اور انھیں حوالوں کے بغیر نہیں پہچانا جا سکتا تھا۔

"میرے لیے کوئی حکم تو نہیں سر۔" یہ پہلا شخص تھا۔ اس کے سر کہنے کے انداز میں طنز آمیز تلخی محسوس ہوتی تھی۔

دوسرا شخص ہنسا۔ "کم آن بوائے... ایک سگریٹ دو مجھے... تم اور میں اکیلے ہوں تو افسری ماتحتی کا رشتہ ختم ہو جاتا ہے... وی کین بی گُڈ فرینڈز..."

"نو سر... یہ اب ممکن نہیں رہا۔"

"اب اور تب کیا..." پہلے شخص نے غالباً سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔ "تم کو ایسا نہیں سمجھنا چاہیے کہ... میں نے تم کو بلیک میل کیا۔ میں صرف یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ جس کو میری بیٹی نے پسند کیا ہے... اُسے میں بھی پسند کر سکتا ہوں یا نہیں... اور اسی لیے میں نے تمھارا نام دیا تھا... جب مجھے اپنی ٹیم کے انتخاب کا حق ملا تھا... میں نہیں چاہتا تھا کہ میرا ہونے والا داماد ایک نااہل... بزدل اور... غیر عملی شخص ہو... تمھارے بارے میں یہ مشہور تھا کہ تم ایک آئیڈیلسٹ ہو... خیالوں کی جنت کے تصور میں گم رہنے والے احمق... ادب اور موسیقی اور یہ سب ویلیوز... یہ خراب چیزیں نہیں ہیں۔ لیکن آدمی کی کمزوری بن جائیں... خصوصاً ایک فوجی کی... تو یقیناً قابلِ نفرت ہیں..."

میں ان کی گفتگو سے پریشان ہونے لگا تھا... جنگل میں ایک فرلانگ جانے اور واپس آنے کے لیے ایک گھنٹے کا وقت بھی کم تھا لیکن میرے اور موہنی کے لیے یوں ایک گھنٹے تک تکلیف دہ حالت میں پڑے رہنا مشکل ہی نہیں، ناممکن تھا۔ جھاڑیوں میں پھر سرسراہٹ ہو رہی تھی اور موہنی شکایت کر رہی تھی کہ اس کی پُشت میں نوکیلے پتھروں کے

کلائی پیوست ہو گئے ہیں تو جائز تھی۔ اچانک اس نے کروٹ لی اور اوپر آگئی ...... جسمانی اذیت کے ناقابلِ برداشت ہو جانے کے بعد موہنی کے ذہن میں نجات کی اور کوئی آسان صورت نہیں آئی۔ پہلے بھی میں مجبور تھا اب زیادہ مجبور ہو گیا... میں اُسے اٹھا کے نیچے نہیں پھینک سکتا تھا۔ ایک طرح سے یہ میرے لیے بھی پہلے سے بہتر پوزیشن تھی۔ اس کے وزن کے نیچے سانس لینا زیادہ آسان تھا۔

اب میں اس قابل بھی ہو گیا تھا کہ اپنا ہاتھ اپنی جیب تک لے جا سکوں۔ سابقہ پوزیشن میں دشمن کے سامنے آتے ہی مجھے ایک دم اُٹھنے کے بعد ریوالور نکالنے کا موقع ملتا۔

"اب میں اُٹھتی ہوں۔" موہنی نے سر کو میرے کان کے قریب لا کے سرگوشی کی تو اس کے بال میرے چہرے پر آ گئے... "پھر تم بھی اُٹھ جانا..."

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ موہنی نے پوزیشن بدلنے کے لیے سوچا تھا تو ٹھیک ہی سوچا تھا۔

"حالانکہ دل تو نہیں چاہتا۔" اُس نے میرے دوسرے کان کی طرف سر لا کے شوخ لہجے میں کہا۔ "مگر خیر..." اور ایک ٹھنڈی سانس بھری تو کہ بخی... میں نے دل ہی دل میں اُسے ایک گالی دی۔ یہ تو تسمہ پا بن گئی ہے یہ تو... میرے دونوں دشمن بحث میں اُلجھ گئے تھے۔

"میں منافقت پسند نہیں کرتا..."

"ہم سب منافق ہیں... حالات اور ضروریات کو بہانہ بنا کے اپنے سچ بدلتے رہتے ہیں۔"

"لیکن میں سچ کہہ رہا ہوں... مجھے نفرت ہے جنگ سے۔" یہ وہی نوجوان تھا جو دوسرے شخص کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا تھا...

"ہر جنگ ایک امن کا پیش خیمہ ہوتی ہے... جارحیت کا ارتکاب کرنے والے کو ختم کرنا پڑتا ہے... بالآخر ایسا وقت آ جاتا ہے جب کوئی بھی جارحیت کی ہمت نہیں کرتا..."

"یہ فیصلہ کون کرے گا کہ جارحیت کا مرتکب کون ہوا... اور اس کے لیے اصول... آپ کے ہوں گے یا فریقِ ثانی کے؟"

"شٹ اپ... کیا تم ثابت کر رہے ہو کہ تم وہی احمق آئیڈیلسٹ ہو... اگر ایسا ہے تو مجھے افسوس ہے کہ میری زندگی میں تمہارے لیے میری بیٹی سے شادی کرنا ممکن نہیں ہوگا۔"

"آپ کی زندگی میں؟" نوجوان تلخی سے ہنسا۔ "یہ مجھے معلوم تھا۔"

"میں یہ بدنام کرنے والا طعنہ نہیں سنوں گا ینگ مین کہ میری بیٹی ایک ایسے شخص کی بیوی ہے... جس نے فوج میں آ کے غلطی کی تھی۔ میں کبھی اپنے مستقبل میں شرمندگی دیکھنا نہیں چاہتا۔"

"میں آپ کو سرخرو کروں گا... اپنی بہادری کی تمام جھوٹی اور مبالغہ آمیز روایتی داستانوں کے ساتھ... آپ کی یہ زندگی ایک قابلِ فخر اختتام کو پہنچ جائے گی۔"

"واٹ... واٹ از دس... تم پاگل ہو گئے ہو؟"

"نو سر... جیسا کہ آپ نے کہا... اور میں نے بھی سمجھا... یہ آپ کی زندگی تھی جو ہمارے درمیان حائل تھی... اور آئندہ بھی رہتی... اس کو ممکن بنانے کے لیے میرے پاس یہی سب سے اچھا موقع ہے..."

"تم... مار دو گے مجھے... تمہارا کورٹ مارشل ہو جائے..."

وہ پھر ہنسا۔ "میری شادی ہو جائے گی... آپ کی بیٹی کے ساتھ... بہت آسانی سے... عزت سے... دھوم دھام سے... یقیناً وہ آپ کو مس کرے گی... کچھ روئے گی... مگر تین مہینے بعد وہ ... دلہن بنی... اور آپ کی تصویر کے سامنے... اس تصویر کے فریم کو میں بھی بڑی عقیدت سے ہار پہناؤں گا... کیونکہ ہو گیا شی... ایک مہان سپوت تھا اس بھارت دیش کا... جو دشمن کی سرزمین پر بہادری کے ساتھ مارا گیا... گولی کا زخم اس کے سینے پر تھا... بھاگنے والوں کی طرح پیٹھ پر نہیں تھا... اُسے بھارت سرکار نے مرنے کے بعد ایک اور اعزاز دیا تھا... میں ایک ایسی کہانی بیان کروں گا کہ وہ اعزاز دینے پر مجبور ہوں گے۔"

"سنو... ایسا مت کہو... فار گاڈ سیک... میں وعدہ کرتا ہوں کہ..." وہ چلّایا مگر اس کی آواز ایک فائر کی گونج میں دب کے رہ گئی... ڈراما ختم ہو گیا۔ پھر وہ گرا تو جنگل کے باسی جو دم سادھے آخری منظر میں گم تھے ایک جھٹکے سے ہوش میں آ گئے۔ انہی میں ہم دونوں بھی شامل تھے۔ مجھے یاد نہیں رہا تھا کہ موہنی نے آخری بات کیا کہی تھی اور کب کہی تھی... وہ خود بھی بھول چکی تھی کہ اُس نے جگہ بدلتے ہوئے کیا کہا تھا۔ جو پرندے پہلے ہونے والی فائرنگ پر احتجاج کر کے آشیانوں میں لوٹ گئے تھے وہ اب پھر چلا رہے تھے۔

اسی وقت میں نے اچانک جھاڑیوں سے گھبرا کے نکل آنے والے سانپ کو دیکھا۔ موہنی نے ایک چیخ ماری... یہ ایک غیر ارادی فعل تھا مگر اس کی یہ حماقت ہم دونوں کی جان لے سکتی تھی۔ فرار ہونے والا سانپ پلٹ کے مجھے ڈس سکتا تھا اور وہ احمق آئیڈیلسٹ جس نے ابھی ابھی اپنی محبت پر اپنے فرض کو قربان کیا تھا موہنی کو شوٹ کر سکتا تھا۔ اس کے لیے کسی چشم دید گواہ کو زندہ چھوڑنا کورٹ مارشل میں قتلِ عمد کے لیے سزائے موت پانے کے مترادف تھا۔ میں نے بھی جو کچھ کیا وہ ذہن کے خودکار عمل کا نتیجہ تھا۔ میں نے موہنی کو پیچھے اُچھال دیا اور خود قلابازی کھا کے ... آگے گیا۔ وہ گولی جو موہنی کی چیخ کا نشانہ لے کر چلائی گئی تھی اپنے ٹارگٹ پر رہی۔ اگر ہم وہیں ہوتے تو ہمیں مس نہ کرتی... گولی چلانے والا اناڑی بہرحال نہیں تھا۔

اگلی جست نے جو میں نے آگے گرتے ہی لی تھی مجھے اس شخص کے سامنے ... دیا۔ یہ میری خوش قسمتی یا اس کی بدقسمتی تھی کہ وہ ایک لمحہ جو فیصلہ کن تھا اور جس پر ہم ایک ساتھ جھپٹے تھے میری گرفت میں آ گیا کیونکہ اسی لمحے کے ایک حصے میں میرے دشمن کی نظر اپنے دوسرے دشمن کی طرف ہو گئی تھی۔ اس نے تیزی سے ایک سانپ کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا اور فیصلہ نہ کر سکا کہ پہلے کسے نشانہ بنائے سانپ کو... یہ فیصلہ میں نے کر لیا... میں نے ایڑی پر گھوم کے جھکتے ہوئے خود کو بچایا اور دائیں ٹانگ سے اس کی کمر پر وار کیا۔ وہ ایک جھٹکے سے آگے گیا۔ اُس وقت وہ خود بھی پلٹ کے مجھ پر فائر کرنے والا تھا... لات پڑتے ہی اس کا توازن بگڑ گیا... سانپ راستہ کاٹ کے ... رہا تھا کہ وہ سانپ کے راستے میں مُنہ کے بل گرا اور سانپ نے ... ایک چیخ نکلی مگر اس نے زندگی کی لڑائی جاری رکھی۔ اس نے سانپ کو ایک ہاتھ سے جھٹک کر دُور پھینکا اور کروٹ لے کر اُٹھنے لگا۔ سانپ کتنا ہی زہریلا ہو اس کے کاٹنے سے آدمی فوراً ہلاک نہیں ہوتا۔ یہ بات وہ بھی سمجھتا ہوگا کہ سب سانپ زہریلے نہیں ہوتے... یہ ہو سکتا تھا کہ سانپ کے زہر سے وہ ہلاک نہ ہو... مگر دوسرا دشمن سانپ سے زیادہ خطرناک تھا... وہ جانتا تھا کہ اُسے کیا کرنا ہے۔

مگر میں نے اُسے کچھ کرنے نہیں دیا۔ میں نے اس کی کلائی پر اپنا پاؤں رکھ کے اپنے جسم کا وزن ڈال دیا۔ اس کا دوسرا ہاتھ حرکت میں آیا اور اس نے مجھے کھینچ کر گرانا چاہا۔ میں نے اس کے ہاتھ کو پکڑ کے جھٹکا دیا تو اس کا بازو کندھے سے اتر گیا۔

"ریوالور چھوڑ دو..." میں نے کہا۔ "ورنہ تمہاری کلائی ٹوٹ جائے گی۔" اس نے ریوالور چھوڑ دیا۔ موہنی جو میرے پیچھے آ گئی تھی آگے بڑھی اور اس نے ریوالور اُٹھا کے مجھے تھما دیا۔ میں نے زمین پر بے بس پڑے ہوئے نوجوان کو آزاد کر دیا۔ وہ شکل سے بیس سال کا لگتا تھا۔ اس کی اصل عمر تیس سال بھی ہو سکتی تھی مگر کچھ دانہ چہرے ایسے بھی ہوتے ہیں جو لڑکپن کے نقوش برقرار رکھتے ہیں اور عمر میں اضافے کے باوجود ان کی صورت پر بھولپن باقی رہتا ہے۔

وہ آہستہ آہستہ اُٹھا اور اپنا دایاں شانہ دبانے لگا۔ ایک سوال اس کی آنکھوں میں صاف پڑھا جا سکتا تھا لیکن میں نے اس کا جواب دینے میں وقت ضائع نہیں کیا... مجھے اندیشہ تھا کہ یکے بعد دیگرے ہونے والے فائروں کی آواز سن کر وہ دونوں یقیناً پلٹے ہوں گے جو جنگل میں مجھے تلاش کرنے نکلے تھے۔

"ادھر چلو..." میں نے اُسے ریوالور کے اشارے سے حکم دیا۔

اس نے سر ہلایا اور کسی تذبذب کے بغیر چل پڑا۔

میں نے ریوالور موہنی کے ہاتھ میں تھما دیا۔ "اسے چٹان کے پیچھے لے جاؤ... لیکن اس بات کا خیال رکھنا..."

"میں ہر بات کا خیال رکھ سکتی ہوں۔" وہ بولی۔ "اگر اس نے پلٹ کے بھی دیکھا تو میں اس کے ریوالور کی گولی سے اسی کا سر اُڑا دوں گی..."

"میں تمہارے تجربے اور تمہاری مہارت پر بھروسا کرتا ہوں ... لیکن..."

"لیکن مجھ پر بھروسا کرتے ہوئے ڈرتے ہو۔" وہ بولی۔ "کیوں؟"

"وجہ تم جانتی ہو..." میں نے کہا۔ "وفاداریاں بدلنے والے کسی کا اعتماد فوراً حاصل نہیں کر سکتے۔"

"میں بتا چکی ہوں کہ میری ساری وفاداریاں میری مجبوریاں تھیں۔" وہ برہمی سے بولی۔ اُس نے اچانک ریوالور سیدھا کیا۔

"ٹھہرو... یہ کیا کر رہی ہو...؟" میں نے کہا۔

"ثبوت فراہم کر رہی ہوں اپنی وفا کا..." وہ بولی اور اس نے نوجوان پر گولی چلا دی۔

نوجوان شاید اندازہ کر چکا تھا کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ اس نے اپنی چھٹی حس پر بھروسا کرتے ہوئے غوطہ مارا اور زمین پر گر گیا۔ گولی اس کے شانے کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔

"بے وقوف!" میں نے چلّا کے کہا۔

"کیا یہ گولی میں تم پر نہیں چلا سکتی تھی؟" موہنی نے بھی چلّا کے کہا۔ "آخر میں کیسے یقین دلاؤں تمہیں کہ میں نرملا نہیں ہوں... میں پہلے بھی موہنی تھی جس پر نرملا نے غاصبانہ قبضہ کر لیا تھا۔ میں نے اس نرملا کو مار دیا اور اب پھر موہنی ہوں... اور صرف تمہارے ساتھ ہوں... میں نے سب کا ساتھ چھوڑا ہے تو تمہارے لیے... میں اپنے بھائی کے قاتل کے ساتھ ہوں تو کیوں؟ یہ کیوں نہیں سوچتے تم؟"

"آئی ایم سوری... چلو تم اسے لے جاؤ..." میں نے نرمی سے کہا۔ "میں آتا ہوں۔"

"تمہیں اب یہاں کیا کام ہے؟"

"میں باقی دونوں سے بھی نمٹ لوں۔" میں نے کہا۔ "وہ آتے ہی ہوں گے۔"

وہ اسی وقت آ گئے۔ موہنی اپنے قیدی کو ہینڈز اپ کرا کے لے جا چکی تھی کہ ایک فائر ہوا۔ میں نے ایک دل خراش 'ہائے' بلند کی اور جست لگا کے چٹان کی اوٹ میں ہو گیا... میری چال کامیاب رہی۔ گولی چلانے والا ایک دم سامنے آ گیا... اسے یقین آ گیا تھا کہ اس کی گولی نے میرا کام تمام کر دیا ہے۔ پھر اس کی نگاہ نے اپنے باس کی لاش کو دیکھی اور اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ اس خیال سے کہ غلط فہمی میں اس نے ہی باس کو گولی مار دی ہے۔ اس نے جھک کر دیکھا اور کچھ مطمئن نظر آنے لگا۔ افسر اس کی گولی سے ہلاک نہیں ہوا تھا... گولی کا نشان عین افسر کے دل پر تھا اور اس زخم سے خون نہیں بہہ رہا تھا۔

اس نے ریوالور ہاتھ میں رکھتے ہوئے چاروں طرف گھوم کے دیکھا۔ پھر اس کی نظر چٹان پر ٹھہر گئی... وہ سمجھ گیا کہ اس کا دشمن اگر چھپے گا تو اسی چٹان کے پیچھے... اسی وقت کسی اُڑنے والے

کیرٹ نے میری گردن پر ڈنک مارا۔ میرے حلق سے تو آواز نہیں نکلی تھی لیکن بے اختیار میرے جسم نے جھٹکا لیا تھا اور میرا ہاتھ گردن پر گیا تھا۔ اس نے یہ خفیف سی حرکت محسوس کرلی اور فائر کردیا۔ گولی میرے چہرے کے سامنے پتھر پر لگی اور سنگریزے میرے منہ پر کانٹوں کی طرح چبھے۔۔۔ میں نے جوابی فائر کیا اور اپنے دشمن کو اُچھل کر زمین پر گرتے دیکھا۔

میں دوسرے آدمی کی طرف سے بے خبر نہیں تھا مگر وہ اپنے ساتھی کی نسبت چالاک ثابت ہوا۔ وہ میرے پیچھے سے آیا اور اس نے فائر کیے بغیر مجھے دبوچنے کے لیے جست لگائی۔ میں اپنے اوپر اچانک آپڑنے والے وزن کو نہ سنبھال سکا اور نیچے گرا۔ وہ میرے اوپر آیا اور اس نے ریوالور میرے سر میں مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا۔ وہ ایک طویل قامت اور بھاری بھرکم آدمی تھا اور پہلوانی کے فن سے آشنا معلوم ہوتا تھا کیونکہ اس نے مجھے یوں چت کیا تھا جیسے ہم دونوں اکھاڑے میں ہوں۔

میں نے ضرب سے بچنے کے لیے سر کو جھٹکا۔ اس کے باوجود ریوالور کا دستہ میری پیشانی پر لگا۔ جو تارے مجھے دن میں نظر آتے وہ آسمان پر پہلے ہی روشن تھے۔ میں نے ان کی چمک کو ماند پڑتے محسوس کیا۔ میرا جسم ڈھیلا پڑنے لگا۔ میں نے کوشش کی کہ اس پہاڑ جیسے شخص کو اچھال دوں۔ اگر ہوش و حواس ساتھ دیتے تو یہ کام مشکل نہ تھا' وہ ایک جھٹکے میں اوپر اُٹھتا اور میرے پاؤں اسے پیچھے پھینک دیتے لیکن اب میرے جسم کا سنہ مول ذرا سی دیر کے لیے ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ یہ بات اس نے بھی محسوس کرلی جو میرے سینے پر سوار تھا۔ اُس نے میرے دونوں بازو اپنی دونوں ٹانگوں کو موڑ کر دبا رکھے تھے۔ اب اس نے میرے گلے کو اپنے بڑے بڑے گوریلے کے پنجوں جیسے ہاتھوں کی گرفت میں لے لیا۔ کسی ناقابلِ فہم زبان میں اس نے اپنے جنون آمیز اشتعال کا اظہار بھی کیا اور میرے سر کو زمین پر پٹخنے لگا۔

ستارے ڈوب گئے اور میں نے اپنی سانس کو سینے میں رُکتا ہوا محسوس کیا۔ ہوا کی نالی بند ہوگئی تھی اور میرے پھیپھڑے جیسے پھٹنے والے تھے۔ خالی ہاتھوں سے لڑنے کے فن کی ساری مہارت دھری رہ گئی تھی۔ ایک اناڑی کے ہاتھوں ایک کھلاڑی کو شکست ہونے لگی تھی۔ ریوالور جو میرے ہاتھ میں تھا' نہ جانے کہاں گر چکا تھا۔ آخری خیال جس نے میرے احساس سے گزر کیا' یہ تھا کہ میں مر رہا ہوں اور میرے لیے وہ سب بے معنی ہو رہا ہے جو زندگی سے مشروط تھا۔۔۔ رابعہ کا عشق۔۔۔ حسرتِ تعمیر۔۔۔ جدوجہد اور بے تعبیر خوابوں کا سفر۔۔۔ پھر میں مر گیا۔

مجھے مرنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا چنانچہ میں اور کچھ نہیں سمجھ سکتا تھا۔ میرے نزدیک احساس سے بیگانگی کا نام ہی موت تھا۔ مگر کیا احساس مر گیا ہے؟ جو مر جائے' وہ تو کچھ بھی نہیں سوچ سکتا۔ لیکن میں سوچ رہا ہوں۔۔۔ اس خیال نے مجھے پھر زندگی دی۔ لمحے یقین کی خوشی میں گزرے اور یہ خوشی میرے جسم میں قوت کی ... کو جارح کرنے لگی۔۔۔ پھر مجھے ستارے نظر آنے لگے اور میرے کانوں ... ایک آواز سُنی' یہ موہنی کی آواز تھی۔

"کبیر۔۔۔ ہوش میں آؤ۔" اس کے ہاتھ میرے گالوں کو تھپتھپا رہے تھے۔ مجھ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے پڑے تو مجھے ایک ... ہوش آگیا۔ میں نے سر کو جھٹکا اور اُٹھ بیٹھا۔ وہ شخص جو میرا ... گھونٹ رہا تھا' میرے قریب ہی اُلٹا پڑا ہوا تھا۔

"یہ۔۔۔ یہ کیسے مر گیا؟" میں نے ایک ہاتھ سے گردن کی ... کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے۔۔۔ مجھے کیا معلوم۔۔۔!" موہنی نے کہا۔

"اسے تم نے نہیں مارا!" میں نے حیران ہو کے پوچھا۔

"نہیں۔۔۔ کیا گولی تم نے نہیں چلائی تھی؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے اس ... لاش کو پلٹ کے دیکھا۔ وہ سجدہ کرنے کے انداز میں زمین پر ماتھا ٹیکے پڑا تھا۔ جب وہ سیدھا ہوا تو مجھے اس کی پیشانی سے بہنے والا خون نظر آیا جو اَب تک جنگل کی سوکھی مٹی میں جذب ہو ... تھا۔ اس کا ریوالور بھی قریب ہی پڑا ہوا تھا۔ میں نے اس ... میگزین کو چیک کیا۔ اس میں ایک بھی گولی کم نہیں تھی۔ ویسے بھی یہ بعید از قیاس بات تھی کہ اس نے خود کو گولی ماری ہو۔ شکست کھا ... مغلوب ہو جانے والا دشمن تو ایسا کر سکتا ہے لیکن وہ مجھ پر غالب تھا اور اس کے ذہن میں صرف مجھے ہلاک کر دینے کا خیال تھا۔

میں نے یہ دوسرا ریوالور بھی موہنی کو تھما دیا۔ یہ روسی ساخت کا اسلحہ تھا جو اَب تک ہمارے ہاتھ لگا تھا یا ہم نے تباہ کیا تھا۔ اپنا ریوالور مجھے تلاش کرنے پر چٹان کے قریب ایک جھاڑی میں اُلجھا ہوا ملا۔

اس دوسرے شخص کی موت کا معما حل کرنے میں مجھے دیر نہیں لگی۔ وہ اپنے ہی ساتھی کی گولی کا نشانہ بن گیا تھا۔ جس پر میں نے چٹان کی اوٹ سے فائر کیا تھا۔ مجھے تصدیق کا موقع نہیں ملا تھا کہ میں قریب جا کے اس کی موت کا یقین کرتا۔ گولی لگتے ہی وہ اچھلا تھا اور زمین پر گر گیا تھا۔ اسی وقت دوسرا شخص مجھ پر آ گرا تھا۔

اب لاشوں کی پوزیشن دیکھ کر میں نے یہ نظریہ قائم کیا کہ پہلے جس شخص کو گولی لگی تھی' وہ فوراً نہیں مرا تھا۔ وہ مہلک طور پر زخمی ہوا تھا اور اس میں کچھ جان باقی تھی کہ وہ اپنے آپ کو کھینچتا ہوا دس بارہ فٹ لے گیا۔ اس کے بعد شاید وہ حوصلہ ہار گیا۔ اس نے چٹان کے سامنے مجھے اور اپنے ساتھی کو اوپر نیچے دیکھا۔ جنگل میں یوں بھی گھُپ اندھیرا تھا اور خود اس کی آنکھوں میں موت کا اندھیرا چھا رہا تھا۔ اس کی نگاہوں نے اُسے دھوکا دیا۔ اس نے مجھے غالب فریق سمجھ ... نشانہ لے کر گولی چلا دی جو اس کے اپنے ساتھی کی پیشانی میں پیوست ہوگئی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اس کا نشانہ خطا ہونے سے ایسا ہوا' تاہم اس میں کوئی شبہے کی بات نہیں تھی کہ اسی نے گولی چلا کے مجھے بچا لیا۔ گولی نہ موہنی نے چلائی تھی اور نہ میں نے' تو صاف ظاہر تھا کہ کسی تیسرے شخص نے چلائی تھی۔ تیسرے شخص کا خیال آتے ہی میرا ذہن اس نوجوان کی طرف گیا جسے موہنی لے گئی تھی۔

"موہنی۔۔۔ تم نے اسے کہاں چھوڑا ہے؟" میں نے کہا۔

"میں نے۔۔۔ میں نے تو اُسے نہیں چھوڑا۔" موہنی نے سر جھکا کے مجرم لہجے میں کہا۔ "وہ خود ہی چھوڑ گیا مجھے۔۔۔"

"کیا مطلب؟" میں نے درشت لہجے میں کہا۔

"مطلب یہ کہ وہ بھاگ گیا۔" موہنی نے تنک کر کہا۔

"کیسے بھاگ گیا۔۔؟" میرا پارہ چڑھ گیا۔ "جبکہ ریوالور تمہارے ہاتھ میں تھا"

"اُس نے۔۔۔ اُس نے دھکا دیا مجھے۔۔۔"

"دھکا دیا؟" میں نے چیخ کر کہا۔ "آگے تم تھیں یا وہ تھا؟"

"آگے چلتے چلتے وہ ایک دم آتی تیزی سے پیچھے آیا۔۔۔ چند فٹ کا ہی فاصلہ تو تھا۔۔۔" موہنی سہم کر بولی: "کہ میں بچ نہ سکی۔۔۔ اگر وہ آگے بھاگتا۔۔۔ تو میں اُسے نہ جانے دیتی۔۔۔ میں بالکل تیار تھی اور اُسے گولی مار دیتی۔۔۔ ایسے کیا دیکھ رہے ہو مجھے؟ اگر تم نے کہا نا کہ میں نے اُسے جان بوجھ کر فرار ہونے کا موقع فراہم کیا ہے تو۔۔؟"

"تو کیا۔۔۔ مجھے گولی مار دو گی؟"

"میں خود کو گولی مار لوں گی۔" وہ چلا کے بولی: "جب میں اُسے گولی مارنے والی تھی تو تم نے مجھے روک دیا تھا۔۔۔ اس کا فائدہ اُٹھا لیا اُس نے۔۔۔ تو میرا کیا قصور ہے۔۔۔؟"

"تمہارا قصور یہ ہے کہ تم عورت ذات ہو۔۔۔ ناقص العقل اور ناقابلِ اعتبار۔۔۔ اور میرا قصور یہ ہے کہ میں نے تم کو ایک ایسی ذمہ داری سونپ دی جس کی تم اہل نہ تھیں۔" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے کہا۔ "اب لاؤ یہ دونوں ریوالور مجھے دے دو۔۔۔ ورنہ تم واقعی گولی مار لوگی خود کو۔۔۔ اس لیے کہ تم احمق ہو۔۔۔ دماغ سے نہیں' دل سے سوچتی ہو۔"

وہ ہسٹریائی کی طرف بڑھتے بڑھتے رک گئی۔۔۔ میرے ہاتھوں کی سخت گرفت میں وہ بَل کھانے لگی: "چھوڑو میرا ہاتھ۔۔۔ وحشی۔۔۔ جنگلی۔۔۔ کیا کلائی توڑ دو گے میری؟"

"ضرورت پڑنے پر میں تمہاری گردن بھی توڑ دوں گا۔" میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"ابھی کیوں نہیں توڑ دیتے۔" اس نے دوسرے ہاتھ سے اپنی کلائی کو مسلتے ہوئے کہا: "لو۔۔۔ مارو ایک ہاتھ اور جاؤ۔۔۔ تمہارے گلے پڑ گئی ہوں نا میں۔۔۔ زبردستی میں نہیں کر سکتی۔۔۔ زبردست تم ہو۔۔۔ میں ایک ناقص العقل عورت بچپن سے جوانی تک تمہاری یاد کو دل سے نہ نکال سکی۔۔۔ بائیس سال سفر میں رہی۔۔۔ ساری سرحدیں عبور کر کے یہاں پہنچی۔۔۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم مجھ پر اعتبار نہیں کرو گے۔۔۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم کسی اور سے پیار کرتے ہو۔۔۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میرے اور تمہارے درمیان وقت' مذہب' معاشرے اور جذبات کے فاصلوں کی بہت سی دیواریں ہیں۔ بے وقوفی کی تھی میں نے۔۔۔ تم بہت عقل مند ہو۔۔۔ ختم کرو میرا یہ دیوانے پن کا سفر۔۔" وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔

"آئی ایم سوری۔۔۔"

"نہیں۔۔۔ یہ رسمی الفاظ مت دُہراؤ بار بار۔۔۔ کل تم پھر کہو گے کہ میں بھروسے کے قابل نہیں۔۔۔ الفاظ سے نہیں کہو گے تو رویّے سے بتاؤ گے کہ میں ناقابلِ قبول ہوں۔۔۔ کیونکہ میں ہندو ہوں اور تم مسلمان ہو۔۔۔ میں بھارتی ہوں اور تم پاکستانی۔۔۔ میں نرملا ہوں اور تم سکندر ہو۔۔۔ وہ موہنی جس سے کبیر نے کچھ کہا تھا۔۔۔ وہ مر گئی۔۔۔ بہت پہلے۔۔۔"

"کیا کہا تھا؟" میں نے شرمندگی سے کہا۔

"تمھیں یاد نہیں۔۔۔ تو یاد دلانے سے فائدہ؟" وہ آنسو پونچھ کے بولی۔

"مجھے یاد ہے۔۔۔ میں نے کہا تھا کہ موہنی' جب میں بڑا ہو جاؤں گا تو تم سے بیاہ کروں گا۔" میں نے کہا۔ جو سو فیصد جھوٹ تھا۔۔۔ مجھے ایسی کوئی بات یاد نہیں تھی لیکن میرا اندازہ تھا کہ شاید میں نے ایسی ہی بات کی ہوگی۔

"تمھیں یاد ہے؟" موہنی نے رونا بھول کے پُرمسرت لہجے میں کہا۔ "اور۔۔۔ تم کو یاد ہے میرا جواب؟"

"ہاں بابا' سب یاد ہے۔۔۔" میں نے اُسے ٹالنے کے لیے کہا: "مگر یہ کون سا وقت ہے ان باتوں کو یاد کرنے کا۔۔۔ اور دُہرانے کا۔۔۔ اور پھر وہ بچپن کی بات تھی۔۔۔ اب ہم بچے تو نہیں ہیں۔"

"ہاں۔۔۔ ہم ہمیشہ بچے کیسے رہ سکتے تھے۔" وہ اداسی سے بولی۔ "بچپن کی وہ بات یاد دلانے کا مقصد بھی یہ نہیں تھا کہ میں تم سے کچھ مانگ رہی ہوں۔۔۔ یا میں چاہتی ہوں کہ تم اپنا وعدہ پورا کرو۔۔۔ میں تو اچھی طرح سمجھتی ہوں کہ میرا وہ حق بہت پہلے ختم ہو چکا تھا۔ اور اب میرے پاس بھی تمھیں دینے کو کچھ نہیں ہے۔۔۔ میں تم سے جھوٹ نہیں بول سکتی تھی' اس لیے میں نے بتا دیا تھا کہ میں اپنی شرافت کو بھی نیلام کرتی رہی ہوں۔۔۔ اور میرا جسم بھی میرا نہیں۔۔۔ مگر میرا احساس تو وہی ہے۔۔۔"

"پلیز موہنی۔۔۔ ہم بعد میں بات کریں گے۔۔۔" میں نے کہا۔ "ہمیں پہلے یہاں سے نکلنا چاہیے۔۔۔ ابھی تو یہ چار آئے تھے۔۔۔ ایسا نہ ہو کہ ان کے پیچھے آٹھ دوسرے آجائیں۔۔۔ آخر یہ لوگ کیسے آ پہنچے

تھے یہاں... ظاہر ہے وہ ہمیں تلاش کر رہے ہیں... ممکن ہے تمہیں انھوں نے مرنے والوں میں شمار کر لیا ہو... لیکن وہ جانتے ہیں کہ میں اسٹیشن ویگن لے کر نکل گیا... وہ سمجھتے ہیں کہ ان کے ٹریننگ کیمپ کو میں نے تباہ کیا تھا... وہ اس کا بدلہ ضرور لیں گے۔"

میں بُری طرح پھنس گیا تھا۔ وقتی طور پر میں نے اس کے جذبات کے دھارے کا رُخ بدل دیا تھا، مگر آئندہ کے لیے میں خود بے یقینی کا شکار تھا۔ میں موہنی کو کس طرح اپنے ساتھ رکھوں گا۔ اس سوال کا جواب بہت مشکل تھا۔ اور میں اس کو ساتھ نہ رکھنے کے لیے کیا کروں گا؟ یہ پہلے سوال سے زیادہ مشکل سوال تھا۔ اب میں اُسے دشمن ملک کی ایجنٹ نرملا سمجھ کے گولی نہیں مار سکتا تھا۔ اُسے پولیس کے حوالے نہیں کر سکتا تھا۔ وہ وقت گزر چکا تھا۔ جب میں ایسا کر سکتا تھا۔ اب وہ مجھے میرے بچپن کی یادوں کے حوالے سے یہ احساس دلانے میں کامیاب ہو چکی تھی کہ میرے اور اس کے درمیان ایک بھولا بسرا تعلق ضرور ہے۔ میں اُسے کس طرح دشمن سمجھ سکتا تھا جبکہ وہ میرے محسن کی بیٹی تھی۔ پنڈت دیانا تھ ہندو ضرور تھا مگر اس نے میری جان بچائی تھی اور اس کے بدلے میں اپنی جان گروی رکھ دی تھی۔ اس نے اپنے خاندان کے مستقبل کو قربان کر کے میرے مستقبل کو تحفظ فراہم کیا تھا۔ میں اس کا مقروض تھا اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں موہنی کو وہ قرض مع سود کیسے ادا کروں گا... مجھے اس سے کسی قسم کی جذباتی وابستگی نہیں تھی جبکہ وہ کھُل کے کہہ چکی تھی کہ اس کے دل نے کبھی مجھے اور میری چاہت کو فراموش نہیں کیا تھا اور جیسے سرحد پار کرنے والے قافلے راہ میں لُٹ جاتے ہیں ایسے ہی مجھ تک پہنچتے ہوئے وہ بھی لُٹی تھی... مگر اس نے اپنا سفر جاری رکھا تھا اور سب کچھ لُٹا کے بالآخر اپنی منزل تک پہنچنے میں کامیاب رہی تھی... مگر کیا ملا اُسے منزل پا کے؟

لاشوں کی جیبوں کو ٹٹولتے ہوئے میں نے بہت کچھ سوچا اور سوچوں کے جال میں اُلجھنے کے باوجود سوچتا رہا۔ کسی لاش کی جیب میں سے مجھے کچھ نہیں ملا... ایسے لوگ اپنی شناخت کا سامان نہیں لیے پھرتے... وہ تو اپنی شناخت کے سارے سُراغ مٹا کے آگے جاتے ہیں۔

"اب یہاں ٹھہرنا بے سود ہے۔" میں نے کھڑے ہو کر کہا۔

"وقت کیا ہوا ہے؟" موہنی نے پوچھا۔

"وقت... سوا بارہ۔" میں نے کلائی کی گھڑی کو آسمان کی طرف گھما کے تاروں کی مدّھم روشنی میں چمکنے والے ڈائل کو دیکھا۔

"ابھی تو صبح دُور ہے۔" موہنی نے کہا۔ "ہم چار پانچ گھنٹے آرام کر سکتے ہیں۔"

میں نے سر ہلایا اور موہنی کے ساتھ چل پڑا... لاشوں کو وہیں چھوڑنے کے سوا چارہ نہ تھا۔ دن کا اُجالا پھیلنے کے بعد ان کے ساتھی یا گاؤں والے انھیں اٹھا لیں گے اور نہیں اُٹھائیں گے تو جانور کھا لیں گے... مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ ان کو گڑ دفن کروں۔ میرا دماغ بھی ماؤف ہو رہا تھا اور اس سے میر فیصلہ بھی متاثر ہوئی تھی... میں خود بھی چاہتا تھا کہ سو جاؤں تو میرا دماغ تازہ ہو۔

اسٹیشن ویگن اس پہاڑی نما چٹان کے پیچھے خاموش اب سوال یہ پیدا ہوا کہ سونے کی صورت کیا ہوگی... سوتے ہو سکتا تھا لیکن میری حالت ایسی تھی کہ میں جاگ نہیں سکتا تھا

"تم پیچھے سو جاؤ۔" میں نے موہنی کی طرف دیکھے بغیر

"تم بھی پیچھے سو سکتے ہو۔" وہ بولی۔

"میں آگے سو رہا ہوں... ڈرائیور کی سیٹ پر..."

"سارا اسلحہ سیٹ کے نیچے رکھ لینا۔" وہ تلخی سے بولی کی چابیاں محفوظ رکھنا اور دروازے اندر سے لاک کر لینا۔"

"تم سمجھتی ہو میں ڈرتا ہوں تم سے؟" میں نے کہا۔

"تم اپنے آپ سے ڈرتے ہو۔" وہ بولی۔

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا لیکن دی اس نے کہا تھا۔ میرا ذہن اب اس قابل ہی نہیں رہا تھا کہ کسی کے معاملے میں جذباتی عملیت کا مظاہرہ کرے، یا احتیاط کے تقاضوں کو نظر انداز کر سکے... میں نے اس کے بُرا ماننے کی پروا نہیں کو مقفل کر کے سو گیا... اب جو ہو سو ہو... میں نے آنکھیں بند خود سے کہا۔ موہنی فرار ہوتی ہے تو فرار ہو جائے۔ اتنا ضرور ہے گاڑی لے کر فرار نہیں ہو سکتی اور مجھے قتل کر کے فرار نہیں ہو وہ باہر سے دروازہ نہیں کھول سکتی۔

بہت دیر تک میں گہری نیند کی آرزو اور جاگتے رہنے کی ضرورت کی کشمکش میں مبتلا رہا۔ ایک طرف جسم کو چند گھنٹوں لیے سکون اور آرام کے وقفے کی طلب تھی تاکہ وہ اپنی تھکن اتارے اور آئندہ کے لیے توانائی کا تھوڑا بہت ذخیرہ کرے۔ دوسری طرف خطرات کے حصار سے نامعلوم اندیشے پکارتے تھے کہ جاگتے رہو

بہت سی باتیں دل اور دماغ کے درمیان تصفیہ طلب

موہنی کی مجھ سے جذباتی وابستگی سمجھ میں آتی تھی۔ ایسی ہی وابستگی رابعہ کو بھی میری منزلوں کی راہ میں شریکِ سفر کر دیا تھا۔ یہ بات م میں نہیں آتی تھی کہ موہنی کو نرملا بن کے وہ سب کچھ کرنے کی کیا تھی، جو اس نے کیا تھا۔ اسے اگر میری جستجو تھی تو وہ کسی بھی وقت

سرحد عبور کر کے پاکستان آ سکتی تھی۔ دونوں ملکوں کے لوگ اپنے اپنے عزیزوں سے ملنے کے لیے قاعدے اور ضابطے کے مطابق بھی آتے جاتے رہتے تھے اور چوری چھپے بھی اسمگل کیے جاتے تھے۔ ہندوستان سے پاکستان منتقل ہو کے یہاں کی شہریت حاصل کرنے کے آرزومند مسلمانوں کا تناسب زیادہ تھا۔ خصوصاً لڑکیوں کا۔ وہ سب والدین جو ہندوستان میں فرقہ وارانہ تعصب کے باعث اپنی لڑکیوں کے مستقبل کو غیر محفوظ سمجھتے تھے یا اچھے رشتوں سے مایوس تھے، وہ پاکستان کے ویزے لے کر اپنی لڑکیوں کو حقیقی رشتے داروں کے پاس بھیج دیتے تھے اور وہ اُن کے گھروں میں روپوش رہتی تھیں اور شادی کے بعد ان سے کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا تھا کہ اُن کے پاس پاکستانی شہریت ہے یا نہیں۔ اگر موہنی چاہتی تو ایک غلط نام پتے سے پاسپورٹ بنوا کے کسی بھی بہانے پاکستان پہنچ سکتی تھی اور پھر مجھے تلاش کر سکتی تھی۔ اگر اس کی معلومات اتنی وسیع تھیں کہ وہ رابعہ اور محسن کے بارے میں بھی سب کچھ جانتی تھی تو پھر اس کے لیے مجھے تلاش کر لینا بھی ناممکن نہیں تھا۔ لیکن اس نے ایک مشکل راستہ اختیار کیا تھا اور اب اپنے لیے دُہری مشکلات پیدا کر لی تھیں۔ ایک طرف وہ اپنوں کی نظر میں غداری کے جرم کی مرتکب ہوئی تھی تو دوسری طرف بھی اس کے لیے اعتبار حاصل کرنا آسان نہ تھا۔ میں اپنے جذبات کو الگ رکھتے ہوئے غیر جانبداری سے سوچتا تو اس پر بھروسا نہ کرتا۔ اور میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ دوسرے لوگ، محسن اور غالب اور اس جدّوجہد میں شریک ساتھی میرے اقدام کو کس نظر سے دیکھیں گے۔

مدن موہن اور موہنی کے درمیان نظریاتی اختلاف بھی سمجھ میں آتا تھا مگر یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ وہ اس اختلاف کے باوجود ایک ہی مشن میں یکجا کیسے ہوئے اور یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اپنے بھائی کے قاتل کے خلاف کسی قسم کے جذباتی ردِّعمل میں مبتلا نہ ہو... انتقام لینے اور اس سے نفرت کرنے کے بجائے وہ اس کو حسبِ سابق چاہتی رہے۔

بلاشبہ ابھی تک موہنی نے اپنے قول و فعل سے یہی ثابت کیا تھا کہ وہ میرے ساتھ ہے اور اس کے سچ پر شبہ کرنے کو بھی دل نہیں چاہتا تھا مگر ایک خیال کبھی کبھی سارے شکوک کا سرچشمہ بن جاتا تھا۔ کہیں یہ سب اس کی لمبی چال نہ ہو۔ وہ عورت ہے، جو خوب صورت بھی ہو اور ذہین بھی... بے باک بھی ہو اور بے حیا بھی تو وہ کسی بھی انتہا تک جا سکتی ہے اور سب کچھ کر سکتی ہے کہیں موہنی بھی وہ دام ہمرنگِ زمیں تو نہیں پھیلا رہی ہے جو میری نگاہ نہیں دیکھ سکتی۔ اس کا مقصد صرف میری ذات تک رسائی نہ ہو۔ اس نے میری ذات کو ایک وسیلہ بنا لیا ہو اور میرا اعتماد حاصل کرنے کا مقصد میرے مشن کو سبوتاژ کرنا ہو... ہمارے پلان... ہمارے عزائم... ہمارے طریقِ کار اور ہمارے ساتھیوں کے بارے میں زیادہ تفصیل سے جاننے کے بعد وہ غائب ہو جائے اور اپنی ہائی کمان کو پوری رپورٹ پیش کر دے۔ ایک کامیاب اور تجربہ کار ایجنٹ کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہوتا ہے کہ وہ جان ہتھیلی پر رکھ کے دشمن کے کیمپ میں چلا جائے۔ وہاں اپنی ذہانت سے بااعتماد ساتھی شمار ہونے لگے اور سارے راز جان لے اور دشمن کو اچھی طرح بے وقوف بنانے کے بعد اس کی آنکھوں میں دھول جھونک کے [illegible]۔

ابھی تک موہنی نے متعدد مواقع پر یہ ثابت کیا تھا کہ وہ میری خاطر جسم اور جان دونوں قربان کر سکتی ہے لیکن مجھے اس سے محتاط رہنے کی ضرورت تھی... یہ ہو سکتا تھا کہ دشمن کی انٹیلی جنس سروس کے اعلیٰ حکام نے میرے اور موہنی کے درمیان بچپن کے جذباتی رشتے کا سراغ لگا لیا ہو اور پھر فیصلہ کیا ہو کہ موہنی کو میرے خلاف میری کمزوری بنا کے استعمال کیا جائے۔ اعلیٰ سطح پر ایسے وسیلے بہت مؤثر سمجھے جاتے ہیں۔ موہنی اگر خود راضی نہ ہوتی تو اُسے دباؤ ڈال کے بھی راضی کیا جا سکتا تھا۔ لالچ کا حربہ ناکام ہو جائے تو خطرناک نتائج کی دھمکی کام کر جاتی ہے۔ اگر موہنی کو بُلا کے کہا گیا ہو کہ دیکھو لڑکی... تم اس شخص کو بہت اچھی طرح جانتی ہو... تم اس کے بچپن کی ساتھی ہو اور ہماری معلومات کے مطابق تمہارے گھرانے کے سب افراد نے تقسیم کے بعد اُسے بچایا تھا اور پاکستان پہنچانے میں اس کی مدد کی تھی۔ اب تم جاؤ اور اُسے قابو کرو... اس کے ذریعے تمام کارآمد معلومات حاصل کرو اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تمہارے ماں باپ کی اور بھائی کی خیر نہیں... وہ تمہاری کامیابی تک نظربند رہیں گے اور ہمارے رحم و کرم پر ہوں گے... تم نے غداری کی یا کمزوری دکھائی تو سزا انھیں ملے گی۔ ہمارے آدمی وقتاً فوقتاً تم سے رابطہ قائم کرتے رہیں گے۔

اگر ان سب باتوں کو مدِنظر رکھا جاتا تو بہت سے امکانات کے دروازے کھُل جاتے تھے۔ مثلاً کرنل سے اس کے تعلق کی کہانی جھوٹی ہو سکتی تھی۔ اس کے والدین کے ساتھ پیش آنے والے واقعات جھوٹے ہو سکتے تھے۔ مجھے یہ واقعات سنانے کا مقصد مجھ پر احسان کے قرض کا بار لادنا ہو سکتا تھا... اب تو میں یہ سمجھتا تھا کہ وہ میرے محسن کی بیٹی ہے جس کا سارا خاندان میری وجہ سے تباہ ہوا... لیکن میرے پاس تصدیق کا کوئی ذریعہ نہ تھا جس سے میں معلوم کر سکتا کہ کیا واقعی ایسا ہوا تھا... اور مدن موہن واقعی اس کا بھائی تھا یا محض اس جھوٹے ڈرامے کا ایک کردار...

انہی مثبت اور منفی خیالوں کی کشمکش میں بھٹکتا ہوا میں نہ جانے کس وقت نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ یہ نیند بھی مکمل بے خبری اور بے ہوشی کی نیند نہیں تھی۔ میرا جسم سو رہا تھا... شعور بھی خوابیدہ تھا لیکن لاشعور کے خوف جاگ رہے تھے اور خطرے کا الارم بجا کے بیدار کرنے کی ڈیوٹی پر مامور پہرے دار بہت مستعد تھے۔

معلوم نہیں کس وقت میری آنکھ بے سبب کھُل گئی۔ ابھی میرے

چاروں طرف جنگل میں رات کا اندھیرا محیط تھا۔ خاموشی کو صرف ان گیدڑوں کی چیخ و پکار مجروح کر رہی تھی جو شاید بھوک کے نقے اور بہت دور سے چلا رہے تھے۔ مجھے یوں لگا جیسے ابھی ابھی میں نے کسی کتے کو بھی بھونکتے سنا تھا۔ کیا وہ خواب تھا؟ نہیں... میں کوئی خواب بھی نہیں دیکھ رہا تھا ورنہ مجھے یاد آ جاتا کہ خواب کیا تھا... پھر کیا گاؤں کی طرف سے کوئی کتا بھٹکتا ہوا آ گیا تھا؟ کتے آبادیوں میں یا ان کے قریب رہتے ہیں۔ گھنے جنگلوں میں نہیں بھٹکتے پھرتے۔

دروازہ کھول کے میں نیچے اترا۔ ایک فوری خیال کے تحت میں نے اسٹیشن ویگن کا پیچھے والا دروازہ اوپر اٹھایا۔ اندر ایک لائٹ جل گئی۔ اس کی مدھم روشنی میں میری آنکھوں نے دونوں لمبی سیٹوں کو دیکھا جو خالی تھیں۔ ان میں سے ایک پر موہنی کو ہونا چاہیے تھا لیکن وہ غائب تھی۔

میں نے اندر داخل ہو کے باقی اسباب کو چیک کیا۔ سارا اسلحہ تو میں نے آگے ہی رکھا تھا لیکن پیچھے وہ سوٹ کیس تھے جن میں کرنسی بھری ہوئی تھی۔ موہنی کے کپڑے تھے اور وہ سب دستاویزات تھیں جو میں نے قبضے میں کر لی تھیں۔ ہر چیز اپنی جگہ موجود تھی۔

میں واپس نیچے اتر آیا... مجھے یقین آنے لگا تھا کہ موہنی فرار ہو گئی... اس کے بارے میں میرے اندیشے سچ ثابت ہوئے تھے۔ لیکن وہ ابھی تک کیوں رکی ہوئی تھی؟ وہ میرا اعتماد حاصل کرنے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوئی تھی اور اگر اس کا مشن یہی تھا کہ وہ مجھ سے معلومات حاصل کرے۔ ہمارے ٹھکانوں کے بارے میں اور ساتھیوں کے متعلق اور ہمارے مستقبل کے پلان کے متعلق... تو ابھی تک میں نے اسے کچھ بھی نہیں بتایا تھا... وہ مشن کو ادھورا چھوڑ کے کیوں چلی گئی... حالانکہ اس کی کامیابی کے امکانات خاصے روشن ہو چلے تھے... اگر اس کا مقصد صرف مجھے ٹھکانے لگانا تھا تو اس نے متعدد مواقع کیوں ضائع کیے... کیا اس کا حوصلہ ساتھ چھوڑ گیا۔ اس کے جذبات نے عقل کو بے بس کر دیا... وہ اپنے ارادوں کے سامنے کمزور پڑ گئی، میرے سامنے آنے کے بعد وہ سب کچھ نہ کر سکی جو وہ کرنا چاہتی تھی؟

میں نے اسے بیس پچیس گز کے دائرے میں دیکھا کہ شاید وہ کسی ضرورت کو رفع کرنے کے لیے اتری ہو۔ میں نے اسے آوازیں بھی دیں مگر مجھے مایوسی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔ تین لاشیں اسی طرح خاک بسر پڑی تھیں۔ انھیں دیکھ کر مجھے چوتھے آدمی کا خیال آیا۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ خود موہنی نے اسے فرار ہو جانے کا موقع دیا ہو؟

اپنی کمزوری پر مجھے تاؤ آنے لگا۔ آخر میں نے اسے اتنی ڈھیل ہی کیوں دی؟ کیوں سنی اس کی بات؟ مجھ پر لازم تھا کہ اس چوتھے آدمی کو اسی طرح گولی مار دیتا، جس طرح اس نے اپنی محبوبہ کے باپ کو ماری تھی... اس نے ایک معمولی سے مقصد کے لیے یعنی صرف ایک عورت کو حاصل کرنے کے لیے ایک قتل کر کے اپنے افسر کو خود ہی حالتِ جنگ میں مار دیا۔ پھر میں نے اسے کیوں بخشا؟ اب وہ لوٹ کر جائے گا تو میرے بارے میں تفصیلی رپورٹ دے گا... موہنی کی کامیابی کی رپورٹ دے گا کہ اس نے کتنی ہوشیاری سے کبیر خان عرف سکندر بخت پر اپنا جادو چلا دیا تھا... اور دشمن زیادہ طاقت کے ساتھ نئے شکاری بھیج دیں گے۔ ایک ٹریننگ کیمپ کی تباہی سے سبق حاصل کریں گے اور دوسرے ایسے ہی مقامات پر سب کو چوکس کر دیں گے۔

میں واپس اسٹیشن ویگن تک آیا اور اپنی جذباتی کم عقلی اور کوتاہ بینی پر کڑھتا ہوا پھر سیٹ پر دراز ہو گیا... موہنی کے فرار پر میرے ذہن کے لیے تسکین کا صرف ایک پہلو تھا کہ وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکی اور مجھ سے کچھ معلوم نہ کر سکی۔ اگر وہ ساتھ رہتی تو نہ جانے میں اسے کتنی رعایت دیتا اور اس پر کتنا اعتماد کرتا... شاید میں اسے ساتھ رکھتا اور وہ بہت کچھ جان لیتی۔ میں ممکنہ نقصانات سے بچ جانے پر مطمئن تھا۔ اسے ساتھ رکھنا ایک خطرناک ذمے داری بن جاتی۔ اب میں سبکدوش تھا اور کسی اندیشے کے بغیر اپنا سفر جاری رکھ سکتا تھا۔

صبح کے ساڑھے تین بجے تھے۔ میں نے کلائی کی گھڑی دیکھنے کے بعد دو گھنٹے آرام سے سونے کا فیصلہ کیا... مجھے خیال ضرور آیا کہ موہنی کے فرار ہونے کے بعد میرے لیے اپنے قیام کو طول دینا خطرناک بھی ہو سکتا ہے اور مجھے بھی فوراً نکل جانا چاہیے تاکہ وہ خود کسی اور کے ساتھ آئے تو اسے مایوسی ہو۔ لیکن رات کے وقت مجھے راستے سے بھٹک جانے کا ڈر تھا اور یہ خیال بھی تھا کہ کہیں میں خود دشمنوں کے حصار میں نہ پہنچ جاؤں۔

خود کو خدا کی حفاظت میں دے کر میں نے پھر سونے کا تہیہ کیا اور اس ارادے میں کامیاب بھی رہا۔ نیند کے اس دوسرے دور میں مجھے ایک خواب نے بہلایا۔ خواب میں کچھ عجیب سا منظر تھا... سامنے سرسوں کے کھیت تھے۔ زرد پھولوں کے شوخ رنگ میں سے موجیں سی اٹھ رہی تھیں۔ پس منظر میں گہرا نیلا آسمان تھا... آسمان بھی ہوا سے لہرانے لگا۔ جیسے کسی نے آسمانی جارجٹ کا دوپٹہ سوکھنے کے لیے الگنی پر پھیلا دیا ہو... سرسوں کے پھول اڑ اڑ کر اس پر جمنے لگے تھے کہ ایک لڑکی آئی۔ اس نے یہ آنچل اپنے سر پر ڈال لیا... پہلے میں نے اسے پیچھے سے دیکھا تھا مگر اچانک اس نے اپنا رخ سامنے کیا تو میں رابعہ کو دیکھ کر دنگ رہ گیا... وہ مجھے دیکھ کر اداسی سے مسکرائی اور کہنے لگی... کیا تم راستے سے بھٹک گئے ہو؟... اور میں نے کہا کہ کس راستے کی بات کرتی ہو... میں اور تم ایک ہی راستے پر تو چل رہے ہیں... وہ پلٹ کر جانے کو تھی کہ میں نے اسے آواز دے کر پوچھا... رابعہ! تمھاری وہ ساری کہاں ہے جس کے نیلے رنگ میں زرد پھولوں کا گلشن تھا... اور وہ آنچل لہرا کے بولی... تمھارے سامنے تو ہے... آسمان کو دیکھو اور زمین کو دیکھو... اور ابھی میں دم بخود کھڑا تھا کہ وہ غائب ہو گئی... وہ نیلا آسمان اور سرسوں کے پھول سب غائب ہو گئے۔

میں اٹھ بیٹھا۔ میرے چاروں طرف صبح پھیلی ہوئی تھی۔ اوپر آسمان زیادہ روشن تھا۔ نیچے درختوں سے چھن کر آنے والی دھوپ کے دھبے بالکل سفید تھے۔ میں نے گھڑی میں وقت دیکھا تو سوا آٹھ بج رہے تھے... میں ضرورت سے زیادہ سوتا رہ گیا تھا... اگر میں چھ بجے اٹھ جاتا تو اب تک اس جنگل سے نکل گیا ہوتا... میرے دائیں ہاتھ پر وہی گاؤں تھا جہاں سے میں گزشتہ رات کھانے پینے کا سامان لایا تھا۔ اسی سمت میں تھوڑا سا پیچھے دیکھنے پر مجھے آسمان کی طرف اٹھنے والی دھوئیں کی پتلی سی لکیر نظر آئی، یہ غالباً وہی جگہ تھی جہاں سے میں موہنی کے ساتھ فرار ہوا تھا... اگرچہ وہ جگہ کئی میل دور تھی لیکن میں نے یوں محسوس کیا جیسے فضا میں انسانی لاشوں کے جلنے کی بو ہے اور سڑتے ہوئے گوشت کا تعفن ہے... وہ بھی تو موہنی ہی تھی جس کی بوسیدہ اور ایک دن پرانی لاش پر میں مورچہ بنائے کھڑا رہا تھا۔ ناموں کا یوں ملنا کوئی غیر معمولی اتفاق نہیں تھا۔ کچھ نام بہت عام ہوتے ہیں۔

ایک آہٹ سن کے میں چونکا اور پھر باہر آیا... مجھے یہ آواز اسٹیشن ویگن کے عقبی حصے سے آئی تھی۔ آگے والے کیبن اور پیچھے کے حصے کے درمیان ایک پارٹیشن تھا جو ہر اسٹیشن ویگن میں نہیں ہوتا۔ کسی خاص رازداری کے مقصد کے تحت اس گاڑی میں آگے بیٹھنے والوں کو الگ کر دیا گیا تھا... اس طرح یہ ایک ڈیلیوری وین قسم کی چیز بن گئی تھی۔

پچھلا دروازہ اوپر اٹھاتے ہی میرے ذہن کو شدید جھٹکا لگا۔ موہنی ایک سیٹ پر سوئی پڑی تھی۔ اس کا ایک بازو سیٹ سے نیچے لٹک رہا تھا۔ وہ خود الٹی لیٹی ہوئی تھی چنانچہ اس کے بال بھی نیچے جھول رہے تھے اور ایک ریشمی کالے ڈھیر کی صورت میں گاڑی کے فرش پر پڑے ہوئے تھے۔

"موہنی... ا" میں نے اس کی ٹانگ پکڑ کے ہلائی۔ "اے موہنی...!"

"کیا ہے۔" وہ ٹانگ کھینچ کر منمنائی۔

"اٹھو۔" میں نے سیٹ کو بجا کر کہا۔

وہ آہستہ آہستہ اٹھی... اس نے جماہی لے کر مجھے دیکھا اور مسکرا کر ایک انگڑائی لی۔ اس زہد شکن ادا کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا... رات بھر میں میرے خیالات بہت بدل گئے تھے۔

"بہت دیر ہو گئی۔" وہ بولی۔ "ایسے کیوں گھور رہے ہو؟"

"رات کو تم کہاں تھیں؟" میں نے اس پر نظر جما کے کہا۔

"رات کو تم کہاں تھے؟" وہ بولی۔

"میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔" میں نے سختی سے کہا۔

"تم نے کہاں دیکھا تھا؟" وہ بولی۔

"میں نے دیکھا تھا تم یہاں نہیں تھیں۔"

وہ نیچے اتر آئی۔ "اس وقت دیکھا ہوگا، جب میں سونے سے پہلے نکلی تھی۔ ٹومیک واٹر۔"

"جھوٹ مت بولو۔" میں نے برہمی سے کہا۔ "اس وقت ساڑھے تین بجے تھے۔"

"بجے ہوں گے۔" وہ سادگی سے بولی۔ "میرے پاس تو گھڑی نہیں تھی۔"

"میں نے گھڑی دیکھی تھی... تم ساڑھے بارہ ایک کے درمیان سونے گئی تھیں۔" میں نے کہا۔

"ہاں... مگر میں سوئی نہیں تھی... نیند نہیں آئی تھی بہت دیر تک اور آتی بھی کیسے... تم نے اس ڈبے میں جو بند کر دیا تھا... معلوم نہیں کب تک کروٹیں بدلتی رہی... پھر ضرورت محسوس ہوئی تو پہلے میں نے سوچا کہ تمھیں بھی جگاؤں... ڈر لگتا تھا نیچے اترتے ہوئے... میں نے درمیان کی پارٹیشن کو بجایا بھی تھا لیکن تم جاگے نہیں... تو میں اکیلی چلی گئی۔"

میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے جھوٹ کے آثار تلاش کرتا رہا۔ اس حد تک وہ درست کہہ رہی تھی کہ ساڑھے تین بجے میں نیند سے جاگا تھا۔ اس سے پہلے میں سو رہا تھا... اور اگر وہ جاگ رہی تھی تو میں کیسے کہہ سکتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔

"کہاں تک گئی تھیں تم؟" میں نے کہا۔

"ادھر... پندرہ بیس قدم..."

"بے وقوف مت بناؤ مجھے... میں نے ہر طرف دیکھا تھا۔" میں نے کہا۔

"تم کیا سمجھ رہے ہو؟" وہ سنجیدہ ہو گئی۔ "جو کہنا ہے صاف کہو... مجھ سے مت کہلواؤ۔"

"دروازہ تو بند تھا؟"

"کیا میں کھلا چھوڑ جاتی؟" وہ تند لہجے میں بولی۔ "تم پہلے کس سمت میں گئے تھے... یاد کرو..."

"یہ ٹھیک ہے کہ... میں نے پہلے مخالف سمت میں دیکھا تھا۔"

"جب تم ادھر تھے تو میں واپس آ گئی۔" وہ بولی۔ "اس میں کون سی تفتیش طلب بات ہے... اور یہ سب پوچھنے کا مقصد کیا ہے؟"

"مجھے تم پر اعتبار نہیں کہ تم سچ بول رہی ہو۔"

"کیا میں تمھیں وہ جگہ دکھاؤں؟" وہ مشتعل ہو گئی۔ "وہ مٹی تجزیے کے لیے رکھ لو...!"

میں نے اسے چانٹا مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا اور روک لیا۔ وہ مجھے چیلنج کرنے کے انداز میں مسکرائی کہ ہمت ہے تو مار کے دیکھو۔ طمانچہ کس کے منہ پر پڑتا ہے... سچ بولنے والے کے یا سچ سننے کی قوت

برداشت نہ رکھنے والے کے۔

"میں... میں پریشان ہوگیا تھا۔" میں نے فوراً اپنی حکمتِ عملی بدل لی... اگر موہنی کے دل میں وہ نہیں ہے جو اس کی زبان پر ہے تو مجھے دل کی بات جاننے کے لیے جوش سے نہیں ہوش سے کام لینا ہوگا... وہ مجھے کسی غلط مقصد کے حصول کا ذریعہ بنانے آئی ہے اور میرا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہے تو مجھے جارحانہ رویّہ اختیار کرنے کے بجائے یہ ظاہر کرنا چاہیے کہ میں اس کے جال میں پھنس رہا ہوں... اس کے برعکس اگر وہ غلط عزائم نہیں رکھتی تو میرا رویّہ بعد میں کسی پشیمانی کا سبب نہیں بن سکتا۔

"کس بات سے پریشان تھے؟" وہ بولی۔ "یہ سمجھے تھے کہ میں بھاگ گئی... تمہارے دشمنوں کو خبر دینے..."

"بے وقوفی کی بات مت کرو... میں تمہارے لیے پریشان تھا۔ یہ کوئی تفریح گاہ نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے ہر وقت خطرات کے سائے اپنے تعاقب میں نظر آتے ہیں... خصوصاً جو کچھ گزشتہ رات ہوا اس کے بعد... ایک آدمی کا بچ کے نکل جانا اچھا نہیں ہوا۔"

"سچ کہو... تم یہ تو نہیں سمجھے کہ اُسے میں نے بھگا دیا؟"

"اگر مجھے ذرا بھی شک ہوتا تو اس جرم کی سزا تمہارے لیے بہت سخت ہوتی..." میں نے مسکرا کر کہا۔ "چلو اب ناراضگی ختم کرو اور چلنے کی تیاری کرو۔"

"مجھے کیا تیاری کرنی ہے؟" وہ بولی۔ "چلو..."

"کل رات تو ایک آرزو پوری ہوگئی تھی... مگر ہر دعا میری ہی کیسے قبول ہو سکتی ہے۔" میں نے کہا اور آگے کا دروازہ کھول دیا۔

"اب کیا مانگتے... اگر ملنے کی امید ہوتی؟" وہ میرے ساتھ بیٹھ کے بولی۔

"چار سلائس... ہاف براؤن... دو انڈے ہاف فرائی... مکھن جام اور کافی کا ایک مگ۔" میں نے کہا اور اگنیشن میں چابی گھمائی۔

"سب اپنے لیے؟" وہ ہنسی۔

"اور کیا تمہارے لیے... بابا اپنے ناشتے کا انتظام خود کرو..." میں نے کہا، اور انجن کو پھر اسٹارٹ کیا... تیسری کوشش میں انجن رواں ہوگیا۔

"بابو جی نے کبھی ہمیں چائے تک نہیں پینے دی۔" وہ اداس ہوکے بولی۔ "جب تک وہ زندہ رہے، ہم ناشتے میں ایک گلاس دودھ کا پیتے تھے... اب تو کاہلی کا یہ حال ہے کہ آنکھ کھلتے ہی چائے کی طلب ہوتی ہے... دن کا آغاز بیڈ ٹی سے ہوتا ہے... یہاں سے سڑک کتنی دور ہوگی؟"

"مجھے قطعی اندازہ نہیں۔" میں نے کہا۔ "دو چار میل تو ہوگی۔"

گاڑی نصف دائرے میں گھوم کے نکلی اور اس جگہ سے دور ہونے لگی جہاں ایک رات کے قیام نے میری زندگی کو امید کی نئی جہت عطا کی تھی۔ دشمن جو میری تلاش میں میرے پیچھے آئے تھے، مارے گئے اور اب دن کے اجالے میں مجھے نسبتاً کم خطرہ محسوس ہوتا تھا۔ ایک مجھے اس نوجوان کا خیال پریشان کرتا تھا جو موہنی کے کہنے کے مطابق دھکا دے کر بھاگ گیا تھا... کیا وہ کسی کو بتلائے گا کہ میں کہاں ہوں؟ میں نے اس کی ساری گفتگو سنی تھی۔ وہ جنگ کے خلاف تھا اور مرضی کے بغیر زبردستی یہاں لایا گیا تھا۔ اس نے موقع پاتے ہی زبردستی کرنے والے کو قتل کر دیا تھا اور اپنی محبت کی راہ میں حائل دیوار تھی۔ وہ کچھ نہیں کرے گا... وہ سیدھا وہیں لوٹ جائے گا جہاں کوئی نامعلوم لڑکی اس کی واپسی کی راہ میں آنکھیں بچھائے بیٹھی ہو[گی]۔ وہ اپنے جرم پر ایک اچھی سی کہانی کا پردہ ڈالے گا جس سے سسر کی آتما تو خیر بہت مشتعل ہوگی مگر اس کی بیٹی کو قرار آ جائے[گا] کہ پتا جی بڑے بہادر تھے۔ اور حکام کو یقین آ جائے گا کہ وہ ادائے فرض میں مارا گیا۔ زیادہ امکان اسی بات کا تھا کہ وہ احمق آئیڈیلسٹ میرے لیے کوئی مشکل پیدا کرنے سے گریز کا راستہ اختیار کرے گا۔

یہ اسٹیشن ویگن میری پریشانی کی دوسری وجہ تھی۔ مجھے اس میں مجبوراً سفر کرنا پڑ رہا تھا کیونکہ جنگل میں کسی قسم کے ذرائع نقل و حمل دستیاب نہ تھے۔ میں اکیلا اور خالی ہاتھ تو اس جنگل سے [illegible] سکتا تھا لیکن میرے ساتھ اسباب سفر میں اسلحہ بھی تھا، مال غنیمت بھی اور ایک لڑکی بھی۔ میں کچھ بھی پیچھے چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ کسی دوسری گاڑی کا بندوبست ہونے تک اسٹیشن ویگن کو استعمال کرنے پر مجبور تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ سڑک پر پہنچتے ہی میں اُسے بدل دوں گا۔ یہ گاڑی دشمن کے زیرِ استعمال تھی اور اب ان کی نظریں اس کی جستجو کر رہی ہوں گی... پیسہ میرے پاس بہت تھا۔ اتنا زیادہ کہ اسے ساتھ لے کر پھرنا عقل مندی نہ تھا... میں پکڑا جاتا تو تمام ڈکیتی کے جرم میں دھر لیا جاتا... اگر مجھے یقین ہوتا کہ یہ پیسہ حکومت کے خلاف سازش کے لیے دیا گیا تھا، سرکاری خزانے میں جمع [کر] دیا جائے گا تو میں ساری رقم کسی بھی تھانے میں پہنچا دیتا، یا [کسی] چلتے آدمی کو دے دیتا۔ مگر مجھے معلوم تھا کہ اتنا پیسہ دیکھ کر بیشتر لوگوں کا ایمان ڈول جائے گا... یہ پیسہ خورد برد ہو جائے گا... اس سے بہتر تھا کہ میں خود ہی اسے آگ لگا دوں۔

سڑک اچانک آگئی... یہ مین روڈ نہیں تھی۔ وہی تنگ [سڑک] تھی جس پر سفر کرتا ہوا میں دشمن کے ایک خفیہ کیمپ کے اندر داخل ہوگیا تھا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ جنگل میں ٹائر پنکچر نہیں ہوا اور گاڑی نے میرا ساتھ دیا۔ دھوپ میں تیزی تھی اور جنگل کے ناہموار خشک راستے پر ڈرائیونگ نے مجھے کچھ تھکا دیا تھا۔ یہ تھکن [اس] لیے بھی زیادہ محسوس ہو رہی تھی کہ پیٹ خالی تھا۔

غلطی کا احس[illegible] ہو گیا۔ میں نے آسمان پر دھوئیں کی [illegible]

سامنے آگئی تھی۔ دشمن کے علاقے سے دور جانے کے بجائے میں پھر وہیں جا رہا تھا جہاں سے گزشتہ روز فرار ہوا تھا۔

"لاحول ولا قوۃ۔" میں نے گاڑی کو بریک لگائے۔

"کیا ہوگیا؟" موہنی نے چونک کر کہا۔

"ہونا کیا تھا... اُلٹے راستے پر جا رہے تھے۔" میں نے گاڑی کو نصف دائرے میں موڑا۔ "تم نے بھی نہیں روکا۔"

"مجھے... مجھے کیا معلوم۔" موہنی نے کہا۔

مجھے پھر اس پر اعتبار کرنا مشکل ہوگیا... میں تو اس راستے پر پہلی بار آیا تھا اور دائیں کے بجائے بائیں مڑ گیا تھا تو یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی مگر موہنی تو اس راہ سے آشنا تھی۔ وہ سائیں ڈرائیور کے ساتھ جس اعتماد سے سفر کر رہی تھی اس سے تو یہی پتا چلتا تھا کہ وہ اکثر آتی جاتی رہتی ہے۔ پھر وہ کیسے کہہ سکتی ہے کہ اس نے میری غلطی کو نوٹ نہیں کیا تھا... تاہم میں نے اس سے کچھ نہ کہنا بہتر سمجھا۔

چار میل کے بعد سڑک سیدھی ہوگئی۔ اوپر درختوں کی شاخیں آپس میں ملی نظر آتی تھیں اور نیچے تنگ سڑک ایک لمبی سرنگ محسوس ہوتی تھی۔ سڑک کے دونوں جانب کھیت تھے۔ کھلیانوں سے فصل اٹھائی جا چکی تھی اور نئی فصل کے لیے زمین تیار کرنے کا کام ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ تاحدِ نگاہ ویرانی کا راج تھا۔ صرف ایک جگہ میں نے آبادی کے آثار دیکھے۔ وہ کوئی بہت مختصر سا گاؤں تھا۔ اِکّا دُکّا کھیت میں مجھے ہل چلانے والے بھی دکھائی دیے اور پیدل چلنے والے بھی جو شاید ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں جا رہے تھے۔

اچانک میرے سامنے سڑک کے وسط میں ایک دھبّہ سا نمودار ہوا۔ سورج کی چمک نے مجھے کسی آنے والی کار کی خبر دی۔

"اِدھر کون آ سکتا ہے؟" میں نے اسٹیرنگ سنبھال کے کہا۔

"کوئی بھی آ سکتا ہے۔" موہنی نے کہا۔ "سڑک سب کے لیے ہے۔"

"کیا تم نے پہلے کبھی غیر متعلق افراد کی گاڑیوں کو آتے جاتے دیکھا تھا؟" میں نے سامنے نظر جما کے کہا۔ "غیر متعلق کا مطلب سمجھتی ہو نا؟"

"ہاں... عموماً دیہی لوگ آتے تھے..." موہنی نے کہا۔

"اچھا... تو پھر تیار ہو جاؤ۔" میں نے کہا۔ "یہ وہی لوگ ہوں گے۔"

موہنی کا رنگ اُڑ گیا تھا۔ "تم... کیا کرو گے؟"

"میں کیا کر سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "مقابلہ کرنے کے سوا... فرار کے لیے نہ راستہ ہے نہ گنجائش..."

گاڑی اب بہت قریب آ چکی تھی... میں ابھی تک کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکا تھا... ایک صورت تو یہ ہو سکتی تھی کہ میں رفتار بڑھا دوں اور کار کو ٹکر مار کے تباہ کرتا ہوا نکل جاؤں۔ اسٹیشن ویگن کے مقابلے میں وہ کار بہت کمزور چیز تھی۔ مگر ایسے حادثے کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ کہنا مشکل تھا... یہ بھی ہو سکتا تھا کہ میں گاڑی کو نہ سنبھال سکوں اور خود بھی اسی حادثے کا شکار ہو جاؤں... یہ بہت خطرناک فیصلہ ہوتا۔ دوسری صورت یہ تھی کہ میں گاڑی کو اسی جگہ روک دوں اور مشین گن لے کر سڑک سے دور کسی نشیبی جگہ پر لیٹ جاؤں مگر میں اکیلا صرف ایک مشین گن سے یہ جنگ کب تک جاری رکھ سکتا تھا۔

میرے لیے فیصلہ کرنا اس وقت آسان ہوگیا جب میں نے تیزی سے بڑھتی ہوئی گاڑی کو موڑ کاٹ کے رُکتے ہوئے دیکھا... اب وہ کار لمبائی کے رُخ سڑک کو بلاک کیے کھڑی ہوئی تھی۔ اس جگہ سڑک کے کنارے ایک پُلیا سی بنی ہوئی تھی۔ میں دونوں جانب کی سفید دیوار سے اندازہ کر سکتا تھا کہ میرے لیے سائڈ سے گاڑی نکالنے کا کوئی امکان ہی نہیں۔ گاڑی اب بھی دو فرلانگ دور تھی کہ میں نے ایک خطرناک جُوا کھیلنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے سیٹ کے نیچے سے مشین گن نکال کے قریب رکھ لی۔

"موہنی..." میں نے کہا۔ "دروازہ کھولو... میں رفتار کم کرتا ہوں جیسے ہی کہوں ایک... دو... تین... تم تین پر باہر کود جانا۔"

"چلتی گاڑی سے!" وہ دہشت زدہ ہو کے بولی۔

"ہاں چلتی گاڑی سے۔" میں نے چلّا کے کہا۔ "ایک... دو... تین۔" موہنی نے دروازہ کھولا اور باہر کود گئی... اس کے پاس سوال جواب کے لیے وقت ہی نہیں تھا۔ میں نے ایک سیکنڈ کے لیے بریک جام کر دیے تھے۔ اور گاڑی کی رفتار گھٹ کر دس میل پر آگئی تھی۔ میں نے اُسے کچّی زمین پر گرتے اور پھر کھڑا ہوتے دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے رفتار میں اضافہ کیا۔ جب میرے اور کار کے درمیان فاصلہ سو گز سے بھی کم رہ گیا تو میں نے ایک سفید کپڑا ہاتھ میں پکڑ کے کھڑکی سے باہر لہرانا شروع کیا۔ کپڑا بالکل سفید نہیں تھا لیکن میرا مقصد تو صرف ایک پیغام دینا تھا کہ مجھ پر فائرنگ نہ کی جائے۔ میں لڑنے کے ارادے سے نہیں آرہا ہوں۔

وہ کار میں مورچا بند بیٹھے تھے اور انھیں یقین تھا کہ میں گاڑی روکنے پر مجبور ہو جاؤں گا یا مجبور کر دیا جاؤں گا۔ اب میں گاڑی کو بھی پہچان رہا تھا... یہ مرسیڈیز تھی... سیاہ رنگ کی اور بالکل نئی... بالکل ویسی ہی جیسی نام کے نواب خسرو جمشید کی ملکیت تھی۔ میرے سفید جھنڈے نے دشمنوں کے لبوں پر مسکراہٹیں بکھیر دی ہوں گی کہ انھوں نے بہت آسانی سے مجھے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔

گاڑی پچاس گز دور تھی، جب میں نے ایک ہاتھ سے اپنی طرف کا دروازہ کھولا۔ دوسرے ہاتھ سے مشین گن تھامی اور یکلخت اپنے پیر کا سارا دباؤ ایکسیلریٹر پر ڈال دیا... گاڑی کسی وحشی درندے کی طرح جست لگا کے آگے بڑھی۔ اُسی وقت میں دروازے سے کود گیا۔ میں نے خود کو اُڑتا ہوا محسوس کیا۔ میں نے مشین گن پھینک دی

اور خود کو اس پوزیشن میں کرلیا کہ میں زمین پر گروں تو تصادم کی شدت کو کم سے کم کرلوں۔

زمین پر جسم کے لگتے ہی میں نے آگے کی طرف قلا بازی کھائی اور ایک دم اُٹھ کے بھاگا... یہ چند سیکنڈ کا وقفہ تھا۔ پھر میں نے مشین گن کے فائر سُنے اور دوبارہ زمین پر گرا ہی تھا کہ ایک خوفناک دھماکے کی آواز سنائی دی... میں پھر اُٹھا اور مشین گن کی طرف لپکا... اتنی دیر میں مجھے دو باتوں کا علم ہوچکا تھا... ایک یہ کہ میرے جسم پر خراشیں ضرور آئی ہوں گی۔ مگر خدا کے فضل سے نہ مجھے موچ آئی تھی اور نہ میری کوئی ہڈی ٹوٹی تھی۔ دوسرے یہ کہ گاڑی میری ہاتھوں سے نکلنے کے بعد بھی سیدھی گئی تھی۔ اس کا اسٹیئرنگ سیدھا رہا تھا اور پچاس گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد بھی اس کی رفتار کم نہیں ہوئی تھی۔

مجھے یقین تھا کہ انھوں نے گولیاں پاگل ہاتھی کی طرح بڑھنے والی اسٹیشن ویگن کو ماری ہوں گی لیکن وہ آہنی ہاتھی چند سوراخ ہوجانے سے مر نہیں سکتا تھا۔ ممکن ہے کہ آخری وقت میں انھوں نے کار کا دروازہ کھول کے نکل جانا چاہا ہو لیکن اسٹیشن ویگن نے انھیں آلیا۔

مرسیڈیز کو سائڈ سے ٹکر لگی تھی اور اسٹیشن ویگن کے زیادہ مضبوط، بڑے اور باہر نکلے ہوئے بمپر نے سامنے سے ٹکر ماری تھی۔ کار کی باڈی تھی اور اسٹیشن ویگن کا انجن والا حصّہ۔ جب میں مشین گن کی طرف لپک رہا تھا تو میں نے دھماکا سُنا اور پلٹ کر دیکھا تو مرسیڈیز دوبار اُلٹنے اور سیدھا ہونے کے بعد پھر اُلٹ چکی تھی۔ اسٹیشن ویگن ایک بار اُسے ٹکر مارنے کے بعد بھی نہیں رُکی تھی اور اس سے دوبارہ ٹکرا کے ایک سائڈ پر گر گئی تھی۔

میں مشین گن ہاتھ میں لیے کھڑا ہوا تھا کہ موہنی بھاگتی ہوئی میرے پاس آگئی۔ ابھی تک میں نے اس کی طرف دھیان ہی نہیں دیا تھا۔

"تم... تم ٹھیک ہو نا؟" وہ ہانپتے ہوئے بولی۔

میں چونک کر پلٹا۔ "تم... بے وقوف..." میں نے اُسے بازو سے پکڑ کر ایک طرف پھینک دیا۔ "مرنا چاہتی ہو... خبردار! جو سر بھی اُٹھایا۔"

وہ سڑک سے دُور مٹی میں جا پڑی اور میں مخالف سمت میں دوڑ کر اس جگہ سے چند گز کے فاصلے پر لیٹ گیا، جہاں مرسیڈیز کا تباہ شدہ ڈھانچا پڑا ہوا تھا۔ میرے کان ان لوگوں کی آوازیں سُن رہے تھے جو پچکی ہوئی کار کے اندر ہی پھنس کر رہ گئے تھے اور شاید چُورا چُورا ہو گئے تھے۔ اس بات کا بہت ہی کم امکان تھا کہ اُن میں سے کوئی بچ سکے... وہ شدید زخمی ہوئے تھے اور بُری طرح چلّا رہے تھے۔

آہستہ آہستہ میں کار کے قریب ہوتا گیا... میرے لیے سب سے زیادہ اطمینان کا سبب یہ تھا کہ کسی گاڑی میں آگ نہیں لگی تھی۔ زخمی ہونے والے اگر باہر نکلنے کے قابل ہوتے تو اب تک نکل آئے ہوتے لیکن دوبار سائڈ پر اُلٹ کر سیدھی ہونے والی اور پھر اُلٹ جانے والی گاڑی کے دروازے اتنے اندر دب چکے تھے کہ اب ان کے کھُلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اگر مرسیڈیز کو بھی سامنے سے ٹکر لگتی تو شاید وہ بچ جاتے۔ کار کا انجن تباہ ہوتا لیکن باڈی محفوظ رہتی... گاڑی کو آڑا کھڑا کر کے انھوں نے خود اپنی موت کا سامان کیا تھا۔ میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ میں اسی طرح رینگتا ہوا گاڑی تک پہنچا۔

گاڑی کے اندر چار افراد تھے۔ ان میں سے دو کے بارے میں یقین کے ساتھ کہا جاسکتا تھا کہ وہ مرچکے ہیں... وہ آگے ڈرائیور اور اس کے ساتھ والی سیٹ پر تھے۔ ان کے ہاتھ پیر ٹوٹ کر کچھ اس انداز سے اسٹیئرنگ وھیل، سیٹوں اور کھڑکیوں کے درمیان پھنس گئے تھے کہ گاڑی کو کاٹے بغیر انھیں نکالا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ خون کے دھارے اُن کے جسم کے ہر حصّے سے پھوٹ رہے تھے اور ان کے سر پیچھے کی جانب سے کھلی آنکھوں میں عبرت کا افسانہ لیے مجھے گھور رہے تھے۔

باقی دو پیچھے تھے۔ ان میں سے ایک کو میں نے پہچان لیا۔ وہ نواب خسرو جمشید تھا۔ اس کی شیروانی اور طرّہ و کلاہ و دستار سب خون رنگ ہوچکے تھے۔ وہ بھی اپنے دوسرے ساتھی کی طرح شدید زخمی تھا اور مدد کے لیے چلّا رہا تھا۔ اس کے ساتھ بیٹھا ہوا دوسرا شخص زیادہ خراب حالت میں تھا اور دم توڑ رہا تھا۔ یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ اس کو کہاں زیادہ چوٹ آئی ہوگی کیونکہ وہ سر سے پیر تک لہو میں ڈوبا ہوا تھا۔

خود خسرو جمشید سیٹ کے دُہرا ہو جانے سے اور دروازوں کے اندر گھس جانے سے اس طرح پھنس چکا تھا کہ میں اسے کسی طرح بھی کھینچ کر باہر نہیں نکال سکتا تھا۔ میں نے دونوں جانب کے دروازوں کو دیکھا کہ شاید کوئی کھولا جاسکے مگر ان کے قبضے تک ٹوٹ چکے تھے اور چیسس کے چرمر ہو جانے کے بعد دروازے بھی ٹوٹ پھوٹ کے اندر گھس گئے تھے۔ میں نے کسی دروازے کو ہاتھ لگا کے کھولنے کی کوشش کا بھی کوئی فائدہ نہ دیکھا۔ تصادم نے شیشوں کو ریزہ ریزہ کردیا تھا اور یہ کانچ کے موٹے موٹے دانے چھرّوں کی طرح اندر بیٹھنے والوں کے جسم کو کاٹتے اور چھیلتے ہوئے گزرے تھے اور ان کی جلد میں پیوست ہوگئے تھے۔

پیچھے کی طرف زمین پر بیٹھ کے میں نے خسرو جمشید کو دیکھا۔ وہ اُلٹا پھنسا ہوا تھا۔ اس کی ٹانگیں اوپر دو سیٹوں کے شکنجے میں کسی ہوئی تھیں اور دونوں ہاتھ اپنے ہی جسم کے نیچے آگئے تھے۔ جھٹکے سے یا کرب میں بل کھا کے اس کا جسم گھوم گیا تھا اور میں اس کا لہو آلود چہرہ اس خلا میں دیکھ سکتا تھا، جو ونڈ شیلڈ کے غائب ہو جانے سے پیدا ہوا تھا۔ اس کے دوسرے ساتھی کی پوزیشن بالکل الٹی تھی۔ وہ

سر کے بل نیچے گرا تھا اور اس کا سر فرش پر ہی سیٹوں کے درمیان آگیا تھا۔ سینے سے اوپر تک شکستہ دھڑ بھی میری نظروں سے اوجھل تھا۔ اوپر صرف اس کی دونوں ٹانگیں تھیں جو وہ مسلسل چلا رہا تھا جیسے وہ یوگا کے کسی آسن کے مطابق اُلٹا ہو کے ہوا میں سائیکل چلانے کی مشق کر رہا ہو... اس کے حلق سے نکلنے والی بھیانک آوازوں کو سُن کے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کتنے شدید عذاب سے گزر رہا ہے۔

خسرو جمشید کی ناک اور آنکھوں سے خون بہہ رہا تھا۔ شاید شیشے کے چھرّے اس کی آنکھوں میں گھس گئے تھے۔ اب وہ اندھا تھا اور مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

"نواب خسرو جمشید..." میں نے اُسے آواز دی۔

"کو... کون... کون...؟" وہ بلبلایا۔

"میں سکندر بخت ہوں جمشید..." میں نے کہا۔

"سکندر... سکندر! مجھے نکالو... میری مدد کرو... ورنہ... میں مر جاؤں... گا..." وہ چلّانے لگا۔

"میں اکیلا ہوں جمشید... اور خالی ہاتھوں سے تم کو نہیں نکال سکتا..."

"مجھے نکالو... سکندر... خدا کے لیے..." وہ چیخنے لگا۔ "مجھے معاف کردو... میں مجرم ہوں تمھارا..."

"جمشید... اس وقت کے آنے سے پہلے تم ایسا نہیں سوچتے تھے... اور چند منٹ قبل بھی تمھیں خیال تھا تو صرف مجھے مشین گن سے بھون کر چھلنی کردینے کا..." میں نے کہا۔ "لیکن تقدیر نے پلک جھپکتے میں تمھارے وجود کو اپنی طاقت کے غرور اور برتری کے زعم کے ساتھ خاک و خون میں ملا دیا۔ اس حالت میں بھی تم میرے دشمن تو ہو... مگر میں تم سے دشمنی نہیں نکال سکتا... دشمن جب زبردست ہو اور اتنا بے بس ہو تو اس پر طاقت آزمائی میں کوئی مردانگی نہیں..."

"سکندر... یہ سب ٹھیک ہے... یہ میرے اعمال کی سزا ہے یا... تمھارے ساتھ... ہونے والے ظلم... کا بدلہ... لیکن اس وقت تم مجھے بچا لو... مجھے مرنے مت دو۔"

"جمشید... یہ میرے بس میں ہوتا تو میں ضرور کرتا۔" میں نے کہا۔

"تم جھوٹ... بولتے ہو... تم کچھ بھی کرنا نہیں چاہتے..." وہ چیخنے لگا... "تم... مجھے نکال سکتے ہو... مگر نکالنا نہیں چاہتے..."

"تم دیکھ نہیں سکتے جمشید کہ تم کس بُری طرح پھنسے ہوئے ہو... تمھیں یا تو گاڑی کاٹ کے نکالا جاسکتا ہے یا ٹانگیں کاٹ کے اور یہ دونوں کام میں اکیلا کیسے کرسکتا ہوں... میرے پاس لوہا کاٹنے والی آری تو کیا چھُری تک نہیں ہے... اور تمھاری ٹانگیں کاٹ کے نکال لیا جائے تب بھی کیا تم زندہ ہوگے... تمھارا بہت خون بہہ گیا ہے..."

"خدا کے لیے کسی کو... لاؤ... جو تمھاری مدد کرے..."

"سوری جمشید... یہاں میلوں تک کوئی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "اس حالت میں تم زیادہ دیر زندہ نہیں رہوگے۔"

"نہیں... تم بکتے ہو... بھونکتے ہو... میں زندہ رہوں گا... مجھے زندہ رہنے دو سکندر... میری مدد کرو..." وہ پاگلوں کی طرح رونے لگا۔

"یہ سب بے کار ہے۔" میں نے کہا۔ "نہ میرے چاہنے سے کچھ ہوگا، نہ تمھارے چاہنے سے... اگر میں مدد لینے جاؤں تب بھی میری واپسی شام سے پہلے نہیں ہوسکتی کیونکہ مجھے اپنے ساتھ گاڑی کو کاٹنے والے ویلڈر... ڈاکٹر... ایمبولینس سب لانے ہوں گے... اور یہ سب کچھ شہر میں ملتا ہے... شام تک تم اسی طرح پڑے رہے تو کیسے زندہ رہو گے... تمھارے جسم میں جتنا خون ہے وہ ایک گھنٹے میں قطرہ قطرہ بہہ جائے گا۔" میں نے کہا۔

وہ دہاڑیں مار مار کے رونے لگا۔ اس کے مُنہ سے خون کے چھینٹے اُچھلنے لگے۔ "تم میرے قاتل ہو... تم نے مارا ہے مجھے۔"

"نہیں جمشید... تمھارے ارادوں نے تمھیں مارا۔" میں نے کہا۔ "راستہ تم نے روکا تھا... مجھے قتل کرنے کے لیے... اس وقت تم سوچ بھی نہیں رہے تھے کہ یہ دامِ اجل تم خود اپنے لیے پھیلا رہے ہو... تم بہت تجربے کار اور پرانے شکاری تھے مگر اجل تم سے زیادہ عیار شکاری ہے... جو ازل سے آج تک تم جیسے اور میرے جیسے انسانوں کے غرور کو شکست دیتی آئی ہے اور انسان کو اپنی بے بسی اور بے خبری کا احساس دلاتی آئی ہے... اور ایک طے شدہ مگر غیبی انتظام کے تحت شکار ہونے والوں کو گھیر کر وقت کے اس لمحے تک اور اس مقام تک لاتی رہی ہے جہاں انھیں اپنی افلاطونیت، رعونت اور یقین کی قوت کے ساتھ فرشتۂ اجل کی موجودگی میں آخری سانس لینی تھی۔ اس وقت وہی تمھیں بچا سکتا ہے جس نے آج مجھے بچا لیا۔ اس کے دستِ امکاں میں ہر معجزہ ہے... لیکن میں کچھ نہیں کرسکتا... تم خود بھی کچھ کرنا چاہو تو مرنے سے پہلے کوئی نیکی کرسکتے ہو جو تمھارے سفرِ آخرت کا توشہ بن جائے۔"

جمشید کا دوسرا ساتھی مرچکا تھا... اس کی ٹانگیں جو قینچی کی طرح چل رہی تھیں ساکت ہو کے نیچے لٹک گئی تھیں اور اس کی فریاد و فغاں کا دلخراش شور تھم گیا تھا... صرف جمشید باقی تھا جو اپنی موت کو سامنے دیکھ رہا تھا لیکن اس سے بچ کے فرار نہیں ہوسکتا تھا۔ یہی بے چارگی انسان کو احساس دلاتی ہے کہ اس کی زندگی ایک بے حد ناقابلِ اعتبار اور عارضی قوت کا نمونہ تھی۔ بلاشبہ اس قوت نے اس کے لیے سمندروں کی گہرائی اور پربتوں کی بلندی... ایٹم کی طاقت اور خلا کی تسخیر کو ممکن کیا مگر وہ خود ایک مشتِ خاک سے عبارت تھی۔

مجھے جمشید پر ترس آیا۔ موت سے کس کو رستگاری ہے مگر کچھ لوگ مرتے ہیں تو ان کی موت بھی باعثِ رشک ہوتی ہے۔ جمشید کی موت میں صرف سامانِ عبرت تھا۔ اگر یہی حادثہ کسی شہر کی سڑک پر پیش آتا

تو شاید اُسے بچایا جا سکتا تھا۔ اُسے گاڑی کو کاٹ کے نکال لیا جاتا اور بروقت طبّی امداد فراہم ہو جاتی تو خواہ وہ معذور زندگی گزارتا مگر زندہ رہتا۔ اُسے موت بھی کہاں آئی جہاں اس کا واحد تماشائی ایک دشمن تھا۔ اور وہ دشمن بھی اُسے معاف کر دینے کے باوجود بچانے سے قاصر تھا... موت ابھی دُور تھی مگر موت کے لمحے نے اُسے قید کر دیا تھا... وہی کار جس کی شان و شوکت جمشید کے لیے وجہِ افتخار تھی، اب موت کا سبب بن گئی تھی۔ اس کی آرام دہ نشستوں پر اُس نے طرّۂ دستار کو بلند رکھتے ہوئے کامیابیوں کے بہت سے سفر کیے تھے مگر آج انہی سیٹوں نے اُسے جکڑ رکھا تھا کہ ٹھہرو... یہیں رُک کر موت کی راہ دیکھو... روح قبض کرنے والا فرشتہ ابھی کہیں اور مصروف ہے لیکن اس کو یہاں بھی آنا ہے۔ اور تب تک یہ ہمارا کام ہے کہ تمھیں روکے رکھیں۔

"جمشید..." میں نے بہت دُکھ کے ساتھ روتے ہوئے بے بس آدمی کو دیکھا۔ "آخری وقت کی توبہ قبول نہیں ہوتی... مگر آخری وقت کی نیکی ضرور کام آجاتی ہے... کیا تم سچ بولنے کے لیے تیار ہو...؟"

"ہاں... اب بھی سچ نہ بولا تو کب بولوں گا..." وہ کراہتے ہوئے بولا... "مگر پہلے ایک بات سُن لو... میں نواب خسرو جمشید نہیں ہوں۔"

میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ "کیا... !"

"میں... نواب خسرو جمشید نہیں ہوں۔" اس نے دُہرایا۔

"پھر تم کون ہو؟" میں نے مایوسی سے کہا۔

"اس کا غلام..." وہ بولا... "اُس کے حکم پر... اس کی جگہ لینے والا... اور اس کی جگہ... مرنے والا..."

میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ "کیا یہ خیال پہلے نہیں آیا تھا تم کو... کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے...؟ اس کی جگہ تم نشانہ بن سکتے ہو... تم کو معلوم تھا کہ وہ کس قسم کے کاروبار میں ملوّث ہے... اس کی جان کے دشمن کتنے ہیں... اس کے باوجود تم نے اپنی زندگی اس کے پاس گروی رکھ دی تھی۔ کیا معاوضہ دیتا تھا وہ تم کو اپنی ڈھال بنانے کا؟"

"بہت... اتنا کہ... کہ میں اور کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا..."

"کب سے تم اس کے ساتھ ہو؟" میں نے کہا۔

"ایک سال سے کم... دس مہینے ہوئے ہیں..."

"تمھارا اصلی نام کیا ہے... گھر بار... بیوی بچے ہیں...؟"

"کوئی نہیں... نہ نام نہ گھر..." وہ چیخ مار کے تڑپا اور اس کے مُنہ سے خون بہہ نکلا۔

"وہ خود کہاں ہے...؟"

"اس وقت... مظفر گڑھ..." وہ خشکی سے بولا۔ "وہاں ایک حویلی ہے..."

"کیا نام ہے اس جگہ کا... جہاں یہ حویلی ہے؟" میں نے کہا۔

"وہ... رانی کی حویلی کہلاتی... ہے۔" وہ بولا۔ "سب جانتے ہیں..."

"اور نواب خسرو وہاں کب تک ملے گا...؟"

"کل... صبح تک..."

"کیا وہ اکیلا ہوگا؟"

"ہاں... ایک عورت ضرور ہوگی... کوئی فاحشہ..."

"اور اس کے محافظ؟" میں نے کہا۔

"دو محافظ... ایک میں تھا... ایک گن مین..." وہ رُک رُک کر بولا۔ "اندر دو ملازم ہو سکتے ہیں..."

"گھریلو ملازم؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں... دو میاں بیوی... مگر وہ بھی... مسلّح ہوں گے... آہ مجھے... پیاس لگی ہے..." وہ خول میں تر ہونٹوں پر زبان پھیر کے بولا۔

"پانی... یہاں پانی کہاں ہے۔" میں نے مایوسی سے سر ہلایا۔

"میں لاتی ہوں پانی۔" موہنی نے میرے پیچھے سے یوں کہا کہ میں اُچھل پڑا۔ میں اُسے بالکل بھولا ہوا تھا لیکن وہ نہ جانے کب سے یہ ساری گفتگو دم سادھے سُن رہی تھی۔ میں نے اُسے سائڈ پر گر جانے والی اسٹیشن ویگن کی طرف جاتے دیکھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کرنا چاہتی ہے۔ وہ گاڑی کے ریڈی ایٹر سے پانی نکالنا چاہتی تھی... لیکن یہ کام اس کے اکیلے کے بس کا نہیں تھا۔

اُس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ "کبیر... !"

"کیا بات ہے؟" میں نے اُٹھتے ہوئے...

وہ اوپر دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ "اس دروازے کو کھولو۔"

خاصی دقت سے میں ایک وھیل پر قدم جما کے اوپر چڑھا اور دروازے کو کھینچ کر کھولا۔ کروٹ کے بل پڑی ہوئی گاڑی کا بھاری دروازہ اپنے وزن سے خود نیچے گر کے بند ہونے لگتا تھا۔ میں نے اُسے ایک ہاتھ سے کھینچ کر دُور کیا اور کیبن میں داخل ہو گیا۔ سیٹ عموداً کھڑی ہوئی تھی... میں نے اوپر سے نیچے پہنچنے کے لیے ہاتھوں کو سہارا بنایا اور بالآخر بونٹ کھولنے والے لیور کو کھینچنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ شخص اب 'پانی... پانی' چلّا رہا تھا۔

موہنی کو بونٹ اُٹھانا نہیں پڑا... اس نے بونٹ کو ایک پٹ کے دروازے کی طرح باہر کھول دیا۔ ریڈی ایٹر اس کے سامنے آگیا۔ اس نے اپنا دوپٹہ تر کرنے کے لیے ریڈی ایٹر کیپ کو تھوڑا سا گھمایا۔ پانی اس میں سے قطرہ قطرہ اور پتلی سی دھار بن کے بہنے لگا۔ اسے موہنی نے دوپٹے پر روک لیا جسے وہ رسّی کی طرح بل دے کر اس کا گولا سا بنا چکی تھی۔

لیکن جب وہ بھیگا ہوا دوپٹہ لے کر مرتے ہوئے شخص کے حلق میں پانی نچوڑنے پہنچی تو اسے یہ دیکھ کر صدمہ پہنچا کہ وہ اب پانی کی ضرورت سے بے نیاز ہو چکا ہے۔

"یہ تو مر گیا..." میں نے افسوس سے کہا۔

موہنی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ عورتیں طبعاً رقیق القلب ہوتی ہیں۔

"کتنا بھروسا کیا اس نے جھوٹے سہاروں پر۔" میں نے موہنی کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "کون کام آیا اس وقت؟ نواب جمشید... اس کی دولت؟ مشین گن کی طاقت؟"

"چلو کبیر... اب مرنے والے کو کیا کہنا۔" موہنی نے میرا بازو تھام لیا... وہ رو رہی تھی اور اس کا جسم کانپ رہا تھا۔ شاید ایسی پُرعذاب موت اس نے پہلے نہیں دیکھی تھی... کچھ دیر پہلے وہ بھی تصور نہیں کر سکتی تھی کہ ایک خاموش صبح کے سفر کا انجام اتنا دردناک ہوگا۔

"مجھے ابھی اس سے اور بہت کچھ پوچھنا تھا۔" میں نے کہا۔

موہنی نے ایک اُبکائی لی... میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ یہ جسم کا طبعی ردِعمل تھا جو خون کو بہتا نہیں دیکھ سکتا اور انسانی خون کا ایسا نظارہ کمزور طبیعت رکھنے والوں کے اعصاب پر زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔

وہ گرنے ہی والی تھی کہ میں نے اُسے سنبھال لیا اور دونوں ہاتھوں میں اُٹھا کے دُور لے گیا۔ سڑک سے چند قدم کے فاصلے پر مجھے ایک سرسبز قطعۂ زمین نظر آیا۔ میں نے موہنی کو وہاں لٹا دیا اور لوٹ کر بھیگا ہوا دوپٹہ لینے گیا۔ اُسے موہنی نے اوندھی پڑی ہوئی کار کے ایک کنارے پر رکھ دیا تھا۔ کچھ پانی بہہ گیا تھا مگر اُسے نچوڑ کر کام چلایا جا سکتا تھا۔

میں واپس آیا تو موہنی بے ہوش ہو چکی تھی۔ اس کے دانت آپس میں مضبوطی سے جُڑ گئے تھے اور ہاتھ پاؤں اینٹھ چکے تھے۔ خاصی کوشش کے بعد میں اس کا مُنہ کھول کے پانی کے چند قطرے ٹپکانے میں کامیاب ہو گیا۔ گیلا دوپٹہ میں نے اس کے چہرے پر پھیرا اور اس کے گلے، بازوؤں اور پیروں پر پھیرا لیکن اُسے ہوش نہ آیا۔ اس سے زیادہ میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے اُسے وہیں چھوڑا اور لوٹ کر اسٹیشن ویگن کی طرف گیا۔ اس کے پچھلے دروازے کو کھولنا نسبتاً آسان کام تھا۔ دونوں سوٹ کیس لُڑھک کر اس سائڈ پر گر گئے تھے جو سڑک سے لگی ہوئی تھی... میں نے انھیں باہر کھینچ لیا۔ ایک ایک کر کے میں دونوں سوٹ کیس سڑک سے کچھ دُور لے گیا... وہاں خود رو جنگلی جھاڑیوں کا ایک جُھنڈ سا تھا۔ میں نے انھیں جھاڑیوں کے درمیان پھینک دیا۔ اب سڑک پر سے تو کیا قریب سے بھی کسی کی نظر انھیں نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اسٹیشن ویگن میں بھی ریوالور کم نہ تھے اور مجھے مرنے والوں کا اسلحہ بھی مل سکتا تھا لیکن میں نے صرف دو ریوالور کافی سمجھے جن میں سے ایک میں نے جیب میں رکھا اور دوسرا پتلون کی بیلٹ کے نیچے چھپا لیا۔ مشین گن بھی فی الحال میرے لیے بے مصرف تھی۔ اُسے بھی میں نے جھاڑیوں میں اُچھال دیا۔

موہنی کراہنے لگی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ بہت جلد ہوش میں آجائے گی۔ میں تیزی سے تباہ شدہ مرسیڈیز تک گیا جس میں چار لاشوں کا خون اب منجمد ہو چکا تھا۔ اس کی کراہیت پیدا کرنے والی بُو ذہن کو ماؤف کرتی تھی مگر میں نے دل کڑا کر کے اندر جھانکا۔ اگر میں کوشش کرتا تو آگے کی سیٹ پر پڑی ہوئی دونوں لاشوں کی جامہ تلاشی کے لیے ہاتھ اندر پہنچا سکتا تھا مگر اس طرح میرے ہاتھ خون میں بھر جاتے۔ پیچھے ایک شخص کی صرف ٹانگیں اوپر تھیں لیکن خسرو جمشید کی ڈمی کی جیب ٹٹولنا مشکل نہ تھا۔ مشکل وہی تھی کہ اپنے ہاتھوں پر لہو کا داغ آتا تھا۔

موہنی کی آواز پر میں واپس دوڑا... وہ مجھے پکار رہی تھی۔ اس کی آواز میں لرزش تھی۔

"موہنی... !" میں نے اس کے قریب بیٹھ کے اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ "ہوش میں آؤ۔"

وہ دیوانہ وار مجھ سے لپٹ گئی۔ "چلو... یہاں سے نکل چلو۔"

"چلتے ہیں۔" میں نے اُسے نرمی سے الگ کیا۔ "پہلے تمھاری حالت تو اس قابل ہو جائے... مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنی کم حوصلہ ہو۔"

"یہاں سے چلو کبیر... کوئی آجائے گا..."

"آجائے گا تو ہمیں کیا...؟"

"ہم پکڑے جائیں گے۔" وہ کانپتے ہوئے بولی۔

"کیوں... ہم نے کیا کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"یہ... سب ہماری وجہ سے..."

"پاگل... کسی کو کیا معلوم کہ اس دوسری گاڑی میں کون تھا۔" میں نے کہا۔ "جو مر گئے، وہ تو کچھ بتانے سے رہے... رہے ہم تو ہمیں بھی کچھ معلوم نہیں کہ حادثہ کب ہوا تھا اور کیسے ہوا تھا... ہم تو یہاں سے پیدل گزر رہے تھے۔ اگر راستے میں کوئی نظر آیا تو ہم یہی کہیں گے۔ لیکن ہمارا یہاں رُکنا کسی صورت مناسب نہیں... خدا کا شکر ہے کہ آس پاس کوئی نہیں تھا اور اس آدھے گھنٹے میں کوئی آیا بھی نہیں۔ کیا تم چل سکتی ہو؟"

"میں کوشش کروں گی۔" اُس نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"میں تم کو اُٹھا کر نہیں چل سکتا۔" میں نے کہا۔

"کتنی دُور جانا ہے کبیر؟" موہنی نے میرے کندھے کا سہارا لے کر کہا۔

"معلوم نہیں... سڑک تک نہ جانے کتنا فاصلہ ہے۔" میں نے کہا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ فوری طور پر میں چاہتا تھا کہ اس جگہ سے جتنا بھی دُور جا سکوں اچھا ہے۔ پھر کوئی جگہ مل جائے جہاں ہم چُھپ کر آرام کر لیں۔ تھکن اور بھوک پیاس سے ہم دونوں کی حالت

غیر ہو رہی تھی لیکن یہاں ہمارے لیے خطرے کے سوا کچھ نہیں تھا۔

رک رک کر قدم قدم چلتے ہوئے ہم بالآخر ایک فرلانگ دُور چلے گئے۔ ہم سڑک سے پچاس گز دور رہتے ہوئے سڑک کے ساتھ ساتھ چلتے رہے تھے... سڑک کو نظر میں رکھنا ضروری تھا ورنہ ہم اس ویرانے میں بھٹک جاتے۔

دو فرلانگ کے بعد امید کی پہلی روشنی نے مجھے سہارا دیا... سڑک پر دائیں جانب ایک کچا راستہ نمودار ہوا۔ اس راستے پر میں نے دُور سے آتی ہوئی بیل گاڑی کو دیکھا... میں رُک گیا اور میں نے موہنی کو ایک کیکر کی دھوپ چھاؤں میں بٹھا دیا۔ بیل گاڑی آہستہ آہستہ قریب آ گئی۔ اسے بارہ چودہ سال کا ایک لڑکا چلا رہا تھا۔ اس نے ہمیں مشکوک نظروں سے دیکھا۔

"دیکھو بچے... کیا تم ہماری تھوڑی سی مدد کر سکتے ہو؟" میں نے کچے راستے کے درمیان میں آ کے کہا۔

"کیسی مدد؟" لڑکے نے پنجابی میں کہا۔

"میری بیوی بیمار ہے..."

"اچھا اچھا... تو آپ کو حکیم جی کے پاس جانا ہے... مگر وہ تو اُدھر ہمارے گاؤں سے بھی چار کوس دور رہتے ہیں۔" لڑکا بولا۔ "میں واپس جاؤں گا تو ابا مارے گا۔"

"ہمیں واپس نہیں جانا ہے۔" میں نے کہا۔ "تم کہاں جا رہے ہو؟"

"میں اُدھر آگے کنڈیانوالہ... کھل سوڑی لینے۔" وہ بولا۔

"اُدھر؟" میں نے اس کے ہاتھوں کی سمت کو دیکھا۔ "کتنی دُور ہے یہ گاؤں...؟"

"یہ تو پتا نہیں۔" وہ بولا۔ "میں اس وقت جاتا ہوں تو شام تک گھر واپس پہنچ جاتا ہوں۔"

"اچھا وہ بڑا گاؤں ہے... تو وہاں کوئی سواری بھی مل جائے گی؟"

"ہاں جی... تانگا بھی شاید مل جائے... ورنہ ریڑھے ہوں گے... آپ کو جانا ہے تو میرے ساتھ بیٹھو۔" وہ بولا۔

میں نے موہنی کو پیچھے بٹھایا اور خود بھی اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔

بیل گاڑی ہچکولے لیتی ہوئی چلنے لگی۔

"آپ... کدھر کے رہنے والے ہو جی...؟" لڑکے نے بالآخر وہ سوال کر لیا جس کا مجھے انتظار تھا... گاؤں کے رہنے والے اپنے علاقے میں ہر اجنبی کو فوراً پہچان لیتے ہیں۔

"ہم یہاں کے رہنے والے نہیں ہیں۔" میں نے اُسے گول مول جواب دیا۔

"وہ تو مجھے پتا ہے۔" وہ بیلوں کی دُم مروڑ کے بولا۔

"تمھیں کیسے پتا ہے؟"

"تم کوئی گاؤں کے رہنے والے ہو؟" وہ بولا۔ "تم شہری بندے ہو۔"

"تم ہر گاؤں سے واقف ہو؟" میں نے کہا۔

"آس پاس دس کوس تک۔" اس نے ہاتھ کو تقریباً دائرے میں حرکت دے کر کہا۔

"ہم ملتان سے آئے تھے۔" میں نے اعتراف کے انداز میں کہا۔

"پیدل آئے تھے؟" وہ لڑکا سخت سراغ رسانی کے موڈ میں تھا۔

"نہیں یار... چند دوست تھے ساتھ... سب ٹانگوں پر آئے تھے۔"

"اچھا... جبھی کل رات ٹھز ٹھز ہو رہی تھی؟" وہ بولا۔

"تم نے سُنی تھی گولیاں چلنے کی آواز؟" میں نے کہا۔

"میں نے تو نہیں... لیکن چاچے نے سُنی تھیں... وہ کم سوتا ہے نا..." لڑکا بولا۔ "تمھارے وہ دوست کدھر ہیں؟"

"یہ تو ہمیں بھی نہیں معلوم۔" میں نے مسکرا کے کہا۔ "معلوم ہوتا تو ہم اُن کے ساتھ ہوتے... تمھارے جمبو جیٹ میں نہ ہوتے۔"

"کس میں؟" لڑکے کا چہرہ ایسا ہو گیا جیسے میں نے اس کی گاڑی کو بہت افسوسناک گالی دے دی ہے۔

"جمبو جیٹ جہاز ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔

لڑکا دانت نکالنے لگا۔ "کیا تم اُن سے بچھڑ گئے تھے؟"

"ہاں دوست... فلمی کہانیوں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔" میں نے موہنی کو دیکھ کر آہ بھری۔ "کیا تم فلمیں دیکھتے ہو؟"

"ایک دیکھی تھی... یکّے والی..." وہ بولا۔ "چاچے نے بہت مارا تھا۔ حالانکہ اسی نے مجھے بتایا تھا کہ مسرت نذیر کیا غضب ڈھاتی ہے جب ٹوپی سر پر رکھ کے یکہ چلاتی ہے۔"

"تمھیں بتایا تھا؟"

"میں نے سن لیا تھا... وہ اپنے یاروں کے سامنے ڈینگ مار رہا تھا کہ اس نے یکے والی سات دن تک روز دیکھی ہے۔" لڑکا بولا اور بیل گاڑی کو دوسری طرف جانے والے دوسرے کچے راستے پر موڑ لیا... یہ راستہ چھوٹی سڑک پر تقریباً پون میل چلنے کے بعد آیا تھا۔

لڑکا ایک ماہر گاڑی بان اور بیلوں کی رفتار بڑھانے کے لیے دُم کو بطور ایکسیلریٹر استعمال کرتا تھا۔ اس کے پاس ایک نوکیلی لکڑی بھی تھی جسے بیلوں کی دُم کو مہارت سے مروڑ کے چبھوتا تھا تو بیل دوڑنے لگتے تھے۔ پون میل کا یہ فاصلہ اسی برق رفتاری کے باعث پچیس منٹ میں طے ہوا۔

صبح اب دوپہر میں ڈھلنے لگی تھی۔ سورج اتنا اوپر آ گیا تھا، دھوپ کی تمازت ناقابلِ برداشت ہونے لگی تھی۔ خود میرا حلق خشک ہونے سے میری زبان پر کانٹے پڑ رہے تھے۔ موہنی کی حالت زیادہ غیر تھی۔ وہ نیم بے ہوش سی گاڑی میں پڑی ہوئی تھی۔ اچانک مجھے ایک کنواں نظر آیا... اس کا رہٹ گھوم رہا تھا اور شفاف ٹھنڈے پانی کے کنوئیں کی گہرائی سے طلوع ہو کے ایک نالی میں گرتے جا رہے تھے۔

میرے کہنے سے لڑکے نے گاڑی روک لی۔ میں نے موہنی کو سہارا دے کر اُتارا اور ہم نے گھٹنوں کے بل جھک کر نالے سے جانوروں کی طرح پانی پیا۔ اس کی ٹھنڈک، مہک اور تازگی نے لگایا اور چوپایوں کی طرح پانی پیا... راحت اور سکون کا احساس بن کے اتر تی گئی۔ شاید ہمیں نے وجود میں لاہور کے کسی ایئرکنڈیشنڈ ریسٹورنٹ میں یخ بستہ مشروب کی بوتل سے کبھی اتنا لطف حاصل نہ کیا ہو گا جتنا اس کچے کنوئیں سے نکلنے والے اور مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو رکھنے والے پانی سے ملا۔

میں نے اس پانی سے اپنے ہاتھ دھوئے اور منہ پر چھپکے مارے۔ پھر میں نے پانی کے بہتے دھارے میں سر رکھ دیا اور اس کی ٹھنڈک میرے سر کو تراوٹ دینے لگی۔ میں نے اپنے پیر اس میں بھگوئے اور اگرچہ وہ صرف پانی تھا لیکن میں نے محسوس کیا کہ اس پانی نے مجھے نئی توانائی بخش دی ہے۔ میں اس نیم غسل سے تازہ دم ہو گیا تھا۔

موہنی نے سر نہیں بھگویا تھا لیکن ہاتھ منہ دھونے کے بعد اس نے پانی کے دھارے میں پیر ڈبو دیے تھے اور جب میں نے دوبارہ اس کی طرف دیکھا تو وہ مجھے دیکھ کر مسکرا دی تھی۔ اس کا رنگ روپ اور مسکراہٹ بالکل نئے اور اُجلے ہو گئے تھے۔ رہٹ چلانے والا بوڑھا پہلے ہمیں دیکھ کر حیران ہوا تھا اور اب خوشی سے مسکرا رہا تھا۔ اس وقفے میں جمبو جیٹ کے پائلٹ نے اُسے ہمارے متعلق ضروری معلومات فراہم کر دی تھیں۔ اس نے اصرار کیا کہ ہم اس کے ساتھ چل کے روٹی شوٹی کھائیں اور لسی دسی پئیں۔ مگر ہم نے شکریہ ادا کر کے رخصت ہو جانا بہتر سمجھا کیونکہ منزل اب بہت قریب تھی۔

گاؤں ایک میل کے بعد آ گیا اور ابھی کچے مکان شروع ہی ہوئے تھے کہ ایک موڑ پر منڈی آ گئی۔ یہ ایک دیہاتی مارکیٹ تھی جس میں حضرات اور خواتین کی مساوی تعداد خرید و فروخت کر رہی تھی۔ سارا بازار ہمیں دیکھ کر لین دین بھول گیا۔ نوجوان گاڑی بان بڑے فخر کے ساتھ ہمیں سب کے درمیان سے یوں گزار کے لے گیا جیسے وہ بیل گاڑی نہیں چاند گاڑی ہے اور وہ خود نیل آرمسٹرونگ ہے جو چاند سے واپس لوٹا ہے تو اپنے ساتھ وہاں کی مٹی کے نمونے لایا ہے۔

اس پاسنگ آؤٹ پریڈ نے موہنی کو بہت نروس کیا۔

"یہ لوگ ایسے کیا دیکھ رہے ہیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے؟"

"تمھیں... تم دیکھنے کی چیز ہو..." میں نے کہا۔ "کیوں نہ دیکھیں"

"نمونہ تو تم بھی ہو۔"

"جب آسمان پر بیک وقت چاند اور سورج نظر آ رہے ہوں تو آنکھیں صرف سورج کی روشنی سے چندھیاتی ہیں۔" میں نے کہا۔

بیل گاڑی رُک گئی۔ وہ ایک چوک سا تھا جہاں چار خستہ اور خراب ڈھول میں اٹی ہوئی گلیاں ملتی تھیں۔ جھاڑ جھنکار داڑھی والے بوڑھے اور گٹھے ہوئے سروں والے نوجوان لنگیاں باندھے اور میلے کرتے پہنے کالی پڑ جانے والی بان کی چارپائیوں پر بیٹھے تھے۔ بھاری نتھ ناک میں لٹکائے اور چاندی کے کڑے ہاتھوں پیروں اور گلے میں ڈالے خواتین کی ایک جماعت فرشِ خاک پر قیام پذیر تھی۔

ان میں مجھے سب بوڑھی اور تیزی سے بڑھاپے کی طرف بڑھنے والی نظر آئیں ایسے مجمع کے درمیان ہم نے خود کو زمین پر اُتر آنے والی خلائی مخلوق کی طرح محسوس کیا۔

وہ ایک لسی اور چائے کا ہوٹل تھا۔ اس کے سامنے دو تانگے اور دو ریڑھے بھی اُونگھ رہے تھے۔ وہاں ہر چیز اونگھتی ہوئی لگتی تھی یا پھر جھگڑتی ہوئی۔

"یہ شکاری ہیں۔" ہمیں لانے والے جمبو جیٹ کے پائلٹ نے اچانک اعلان کیا۔ مجمع ایک بار پھر دم بخود رہ گیا۔ انھوں نے کبھی ایسے شکاری نہیں دیکھے تھے جن کے پاس بندوق کیا غلیل تک نہ ہو لیکن ایک میم ٹائپ کوہ قاف کی پری ساتھ ہو۔

کچھ دیر میں شکوک اور تجسس کی دُھند چھٹ گئی۔ ہماری طرف سے پائلٹ نے ایک وضاحتی بیان جاری کیا اور مجمع گھوڑے جیسے سر ہلانے لگا... ہم نے صرف مسکرانا جاری رکھا۔

"اچھا بھئی نوجوان۔" میں نے لڑکے کو تھپکی دے کر ایک پچاس کا نوٹ پیش کیا۔ "بڑی مہربانی تمھاری اب تم جاؤ۔"

لڑکے نے کچھ نہیں سُنا اُس کی آنکھیں پچاس کے نوٹ پر جم کے رہ گئی تھیں۔ باقی لوگ بھی اس افراطِ زر سے پریشان تھے۔

"لے لو..." موہنی نے کہا۔ "تم بہت اچھے لڑکے ہو۔"

لڑکے کا سماجی مرتبہ اس تعریفی سند سے بہت بلند ہو گیا تھا جو اُسے سب کے سامنے عطا کی گئی تھی۔ اس نے پچاس کا نوٹ تقریباً جھپٹ کے اپنے کھیسے میں اُڑس لیا۔ پھر وہ ایسے بھاگا جیسے اُسے اندیشہ ہو کہ ہم نوٹ واپس نہ مانگ لیں۔ یا مطالبہ نہ کر دیں کہ دو روپے رکھ کے اڑتالیس واپس کر دو۔

"اتنے چھوٹے بچے کو اتنا پیسہ نہیں دینا چاہیے۔" ایک شخص نے حسد میں مبتلا ہو کے مجھے مطعون کیا۔

"وہ شہر بھاگ جائے گا تو ماں باپ کو وخت ڈالے گا۔" دوسرے بوڑھے نے اس کی تائید کی... میں پشیمانی میں مبتلا ہو گیا... سخاوت کا مظاہرہ بھی موقع محل دیکھ کر ہی کرنا چاہیے... یہی انعام میں نے سب کے سامنے نہ دیا ہوتا تو رائے عامہ خلاف نہ ہوتی اور لڑکا زیادہ خوش ہوتا کہ اُس کے باپ یا چاچے کو معلوم نہیں ہو گا۔ اب تو زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ ایک تھپڑ رسید کر کے باپ اس سے نوٹ نکلوا لے گا۔

میری اور موہنی کی مشکل ہوٹل والے نے آسان کی۔ وہ ایک برآمدے پر مشتمل ریسٹورنٹ تھا۔ برآمدے کی چھت گھاس پھونس اور لکڑیوں سے بنائی گئی تھی مگر عقبی حصے میں ایک کچی دیواروں والا کمرا بھی تھا جس میں ہوٹل والا رات کے وقت اپنا سامان بند کر جاتا ہو گا۔ ہمیں اس وی آئی پی لاؤنج میں مدعو کیا گیا۔ وہاں بھی ایک چارپائی تھی جو ہمیں اندھیرے میں قدم رکھنے کے کچھ دیر بعد دکھائی دی۔ اسی کے سامنے ایک جھولتی ہوئی میز لا کے رکھی گئی۔ پھر پرائیٹر نے بقلم خود

میزبانی کے فرائض سنبھالے اور ہمارے لیے "اسپیشل" چائے بنا کے لایا... اس کا ذائقہ بالکل ایسا تھا جیسے اس نے لسّی کے دو گلاس چائے کی پتی ڈال کے اُبال دیے ہوں۔ کھانے کے لیے کہیں سے کنگ سائز گرما گرم جلیبی درآمد کی گئی جو مقامی بولی میں جلیب کہلاتی تھی... جلیبی کا مذکر... اس کی تازگی کا یہ حال تھا کہ اس میں سے گرم گرم گڑ کا شیرا ٹپک رہا تھا اور ٹھنڈا ہوتے پر واپس گڑ کی شکل اختیار کر رہا تھا۔

تاہم جب پیٹ میں دوڑنے والے چوہے بھی بھوک سے بے ہوش ہو چکے ہوں اور قُل ھُو اللہ پڑھنے والی آنتیں اِنّا لِلّٰہ کا ورد کرنے لگی ہوں تو محاورے کے مطابق کواڑ بھی پاپڑ لگتے ہیں... وہ جلیب اور چائے جیسا گرم مشروب اس وقت کلب سینڈوچ اور بلیک کافی، سے زیادہ پُرلطف اور تازگی دینے والے ثابت ہوئے۔

میرا پنجابی بولنا غیریت کی دیوار گرانے اور اجنبیت کی فضا کے ختم کرنے میں بے حد مددگار ثابت ہوا۔

"مجھے کوئی سواری چاہیے... مثلاً تانگا..." میں نے ہوٹل والے سے کہا۔ وہ ایک سابق پہلوان اور علاقے کا رستم زماں تھا۔ اب اس کی دیگ جیسی توند ڈھلک گئی تھی مگر قد کاٹھ سے وہ اب بھی اپنے ماضی کے دھندلا جانے والے آئینے کا عکس نظر آتا تھا۔ موہنی تو اس کی مونچھیں دیکھ کر سہمی جا رہی تھی جو گلوں کے دونوں جانب چھ چھ انچ تک پھیلی ہوئی تھیں اور بڑے خطرناک انداز میں اُٹھی رہتی تھیں مگر وہ خود ایک نرم گفتار اور منکسر مزاج شخص تھا۔

"تانگے... ایک نہیں، دو کا حکم کرو تو دو حاضر۔" وہ بولا۔

"نہیں پہلوان جی... ابھی تو ایک ہی کافی ہے۔" میں نے کہا۔

"جانا کہاں ہے؟" وہ بولا۔

"اس جگہ کا نام... تو معلوم نہیں کیا ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ لڑکا جانتا ہوگا جو ہمیں لایا تھا... اُدھر سے واپس جا کے... سڑک پر پیچھے کی طرف تقریباً ایک میل پر ہمارا سامان پڑا ہے...!"

"کوئی بندہ بیٹھا ہے اُدھر؟"

"نہیں... ہم نے جھاڑیوں میں رکھ دیا تھا۔" میں نے کہا۔ "بس دو سوٹ کیس ہیں... وہ اُٹھانے ہیں اور پھر واپس بڑی سڑک تک جانا ہے۔"

"ملتان روڈ کے اڈے تک؟"

"ہاں... کتنی دُور ہے وہ یہاں سے؟" میں نے کہا۔

"ہوگا یہی کوئی... بتیس میل..." پہلوان نے کہا۔

"کتنی دیر میں پہنچا دے گا تانگا...؟"

"یہی کوئی... تین گھنٹے..." پہلوان بولا۔ "آپ اُدھر سے پھر کے جاؤ گے تو چار گھنٹے..."

"اچھا تو پہلوان جی... تم ہی کسی سے طے کر دو۔"

"کیا طے کر لوں؟"

"یہی... کرایہ... مجھے تو کچھ اندازہ نہیں۔" میں نے کہا۔

"او بادشاہو... آپ بھی کمال کرتے ہو..." پہلوان بولا "... ہے جو آپ سے زیادہ لے... آپ مسافر ہو اور میرے مہمان ہو... میرے مہمان کو ٹھگے گا، وہ پھر اپنی ہڈیاں سلامت کیسے رکھ... یہاں... جو آپ کی خوشی ہو دے دینا۔"

پہلوان کو دو طرفہ اطمینان حاصل تھا۔ ایک تو اس نے... تھا کہ میں نے بیل گاڑی میں سواری کے لیے پچاس روپے کرایہ... در غبت دیا تھا... ظاہر ہے میں کنجوس نہیں احمق تھا۔ دوسرے... کے ذاتی مہمان کی حیثیت اختیار کرنے کے بعد ہم خصوصی مراعات... حقدار ہو گئے تھے... شاید وہ حکم دیتا کہ میرے مہمانوں کو تانگے پر... چھوڑ آؤ مگر خبردار جو ایک پیسہ لیا... تو تانگے والا ہڈیاں سلامت رکھنے کے لیے میل پڑتا۔

جب تانگا آ گیا تو میں نے پہلوان کو چائے اور جلیب کے... دینے کی بے وقوفی کی۔ پہلوان کا موڈ ایک دم خراب ہو گیا۔

"اوئے باؤ...!" اس نے ایک خوفناک نعرہ مارا۔ "ہماری بے... نہ کر... رکھ لے اس نوٹ کو کھیسے میں۔"

میں نے نوٹ کو فوراً واپس لے لیا۔ "معاف کرنا... وہ... کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔"

"اوئے ہم اتنے بےغیرت نہیں ہوئے ہیں ابھی۔" وہ شیر... طرح دہاڑ کے بولا۔ "کہ مہمان بھی کہیں اور روٹی کے پیسے بھی مانگیں۔"

موہنی سہم کر میرے پیچھے ہو گئی تھی کیونکہ وہ پنجابی نہیں... رہی تھی اور اس کا خیال تھا کہ اب خون خرابا ہونے ہی والا ہے... میں نے دس کا نوٹ پیش کر کے پہلوان کو مشتعل کر دیا تھا اور مجھے... سو کا نوٹ نکال لینا چاہیے۔

"کیا کر رہے ہو...؟" وہ آہستہ سے بولی۔ "دے دو جتنے مانگتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "تم دے کر دیکھو۔"

موہنی نے سر ہلایا اور سو کا نوٹ نکال کے آگے بڑھایا۔ "... جی ناراض نہ ہوں... پیسے کم تھے تو یہ سب رکھ لیں۔"

کچھ دیر بعد پہلوان نے ایک گونج دار قہقہہ برآمد کیا جس... اس کا خالی مشک جیسا پیٹ اوپر نیچے ہونے لگا۔ "او جھلّی..." نے اپنا بھاری بھرکم ہاتھ موہنی کے سر پر رکھ دیا۔ "جب چاچا آکھے... تو پیسے مانگ... وڈوں کا کام ہے دینا۔" دیگر حاضرین نے... ہوئے سر ہلا کے اس نظریے کی توثیق کی تو موہنی کو اصل بات سمجھ... جب اس نے سب کے ساتھ مجھے بھی ہنستے دیکھا تو اس کا چہرہ... سرخ ہو گیا۔

تانگے میں بیٹھنے کے بعد بھی اس کا مُنہ پھولا رہا۔ وہ دوسری... طرف دیکھتی رہی۔ میں نے جانتے بوجھتے اس کا مذاق اُڑا دیا تھا...

"پیسے بچانے کے لیے اُسے چاچا جی بنا لیا۔" میں نے کہا۔ "واقعی نیت تھی..."

"واقعی کا کیا سوال... تم نے مجھے بے وقوف بنایا سب کے سامنے۔"

"سب کے سامنے میں تمھیں عقل مند کیسے بناتا؟" میں نے کہا۔ "میں تو خود بے وقوف بنا تھا۔"

"تم کیسے بے وقوف بنے تھے؟"

"تم کو گھر والی بنا کے..." میں نے کہا۔ "لوگ کیسے دیکھ رہے تھے۔"

"کیسے دیکھ رہے تھے؟" وہ مسکراہٹ کو دبا کے بولی۔

"پہلوئے حور میں لنگور خدا کی قدرت۔" میں نے کہا۔ وہ ہنس پڑی۔ تانگے والے نے مڑ کے دیکھا... پھر گھوڑے نے بھی گردن گھمائی۔ "اگاں دیکھ اگاں... تیری تے..." تانگے والے نے اس کی دُم کے ایکسیلیٹر کو دبا کے کہا۔ گھوڑا اچھلا اور ہم گرتے گرتے بچے۔ ہمارے ساتھ تانگے والا بھی ہنسنے لگا۔

میری ہنسی اس وقت کافور ہوئی جب میں نے دُور سے ہی جائے حادثہ پر اجتماع دیکھا۔ اتنی دیر میں دونوں گاڑیوں کے ٹکرانے کی خبر کسی ذریعے سے آگے یا پیچھے تک پہنچ گئی تھی اور اب جو لوگ وہاں جمع تھے ان کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ دوست ثابت ہوں گے یا دشمن۔

"یہ... آگے تو سڑک بند ہے۔" میں نے کہا۔

تانگے والے نے مجھے حیرانی سے دیکھا۔ "سڑک کیوں بند ہے؟"

"دیکھ نہیں رہے ہو... لوگ جمع ہیں... حادثہ ہوا ہے کوئی..."

"پھر کیا... نکال لوں گا... لوگ خود ہی راستہ دے دیں گے۔" تانگے والے نے...

"نہیں... تم تانگا موڑ لو۔" میں نے اس سے ... کے سختی سے کہا۔ "واپس چلو ملتان روڈ کی طرف۔"

"سامان نہیں اُٹھانا؟"

"ابھی نہیں اُٹھانا..." میں نے کہا۔

"پھر کب اُٹھاؤ گے؟"

"فضول بکواس بند کرو اور تانگا موڑو۔" میں نے برہمی سے کہا۔

تانگا آہستہ آہستہ گھوم کر واپس ہوا اور ملتان روڈ کی طرف چلنے لگا... وہاں سے دو فرلانگ واپسی کا سفر طے کرنے تک میرا دل اس خوف کا شکار رہا کہ کہیں دیکھنے والوں نے دیکھ نہ لیا ہو... تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔ وہ مجھے اور موہنی کو ایکس رے سے پہچان لیں کہیں انھیں اپنی طرف آنے والے تانگے کا اچانک واپسی اختیار کرنا مشکوک نہ لگے۔

لیکن ایسا نہیں ہوا... لوگ دونوں کاروں کے اور چار مرنے والوں کے نقصان کو دیکھ رہے تھے۔ ایک دیہاتی تانگے سے انھیں دلچسپی نہیں تھی جو راستے میں رکاوٹ دیکھ کے واپس چلا گیا... یہ ہو سکتا تھا کہ حادثے کی جگہ پر پہنچنے والے غیر جانبدار لوگ ہوں... لیکن یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اس راستے پر وہی دشمن سرگرداں ہوں جو میری تلاش میں تھے۔ ان کا ایک اہم مرکز اور اسلحے سے بھرا ہوا ایک ٹرک ضائع ہو گیا تھا۔ تربیت یافتہ ایجنٹ اور انھیں تربیت دینے والے مارے گئے تھے اور نقصانات کا یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا تھا۔ گزشتہ رات ایک سرچ پارٹی لاپتا ہوئی تھی اور اب یہ دونوں گاڑیاں اور اس کے سب مسافر خود اپنی داستانِ عبرت کہہ رہے تھے۔ شکاری اپنی پے در پے شکست سے کتنے آتش زیر پا ہوں گے، اس کا میں اندازہ کر سکتا تھا۔

اگر میرے لیے ممکن ہوتا تو میں واپسی کے لیے بھی کوئی دوسرا راستہ اختیار کرتا اور اس سڑک سے بھی دُور رہتا جس پر کسی وقت بھی کوئی شکاری ہمارے تعاقب میں آ سکتا تھا یا ہمیں سامنے سے گھیر سکتا تھا... تانگا ایک بیزار کن یکساں رفتار سے چلتا جا رہا تھا۔ اس کی رفتار میں اضافے کے مطالبے کو کوچبان نے بے دردی سے مسترد کر دیا تھا... ہم نے اس کے ساتھ نہایت غیر دوستانہ رویّہ اختیار کیا تھا اگر وہ مجبور نہ ہوتا تو ہمیں وہیں اُتار دیتا، جہاں سے ہم نے واپسی کے معاملے میں زبردستی کی تھی۔ ایک طرف تصوّر سے زیادہ ملنے والے معاوضے کا خیال تھا تو دوسرا پہلوان کا ڈر۔

ایک گھنٹا گزر گیا... پھر وقت رینگنے لگا۔ میں آدھے گھنٹے بعد گھڑی دیکھتا تھا تو معلوم ہوتا تھا کہ دس منٹ گزرے ہیں... تارکول کی کالے فیتے جیسی سڑک سمٹنے کے بجائے لمبی ہوتی جا رہی تھی۔ دونوں طرف سے مناظر کی یکسانیت... تیز دھوپ... خاموشی میں گونجنے والی گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز... ہچکولے اور اعصابی کشیدگی... یہ سب سفر کو زیادہ بیزار کن بنا رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہم خلا میں گردش پذیر ہیں اور یہ سفر کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے۔ موہنی بھی خاموش تھی اور اپنے خیالوں میں گم تھی۔ میں نے اندازہ کرنا چاہا کہ اس کے خیالات کیا ہوں گے مگر صورت سے تو لگتا تھا کہ کچھ بھی نہیں سوچ رہی ہے... میں نے خاموشی کے اس وقفے میں چار سگریٹ پیے اور اپنے مستقبل کے لائحۂ عمل پر غور کیا۔

میری خوشی کی انتہا نہ رہی جب مجھے سڑک کے کنارے ایک چائے خانہ نظر آیا۔ اس کیفے ڈی پھوس کے سامنے وہی یونیورسل چارپائی ڈال دی گئی تھی جو ہماری تاریخ اور تہذیب کا سب سے پرانا سمبل ہے اور گاؤں سے شہر تک ہر دور میں ایک ہی صورت رکھتی ہے... ڈارون کے نظریۂ ارتقا کا اطلاق چارپائی اور ٹکے پر یا حقے پر نہیں ہوتا... میں نے اس فضول خیال کو جھٹلا کے تانگے کو روکنے کا حکم دیا۔

میرے لیے تانگے میں طویل ترین سفر کا ریکارڈ پہلے ہی قائم ہو چکا تھا اور ابھی ایک تہائی سفر باقی تھا۔ تانگے سے اتر کے مجھے احساس ہوا کہ میرے رگ، پٹھے اور جوڑ حسب دستور حرکت میں ہیں۔ جب میں چلا تو میری چال اس مسخرے کی طرح ہو گئی جو اپنی چال

بھول گیا ہو۔ کیفے ڈی پھونس کے عقب میں گھاس تھی اور ایک پتلی سی نالی میں نہر کا صاف پانی بہہ رہا تھا۔ وہاں پانی میں پیر ڈال کے بیٹھنے اور ابلتا ہوا دودھ چینی پتی کا لیس دار مکسچر پینے کے بعد ہم دونوں سفر کے اگلے مرحلے کے لیے تیار ہو گئے۔

دوسرا مرحلہ زیادہ کٹھن رہا کیونکہ سورج سر کے اوپر سے گزر کے سامنے آگیا تھا اور ہمیں براہِ راست فرائی کر رہا تھا۔ تانگے کی چھت ہمیں روسٹ ہونے سے بچانے میں ناکام تھی۔ دن کے پونے تین بجے تانگے نے بڑی سڑک پر چلنا شروع کیا تو میں نے چھلانگ مار کے گھوڑے سے آگے دوڑنے کی خواہش پر بڑی مشکل سے قابو پایا۔ میں پھر راہِ راست پر آگیا تھا اور میں اس بچے کی طرح محسوس کر رہا تھا جو جنگل میں بھٹک گیا ہو اور اچانک اُسے گھر کا راستہ مل جائے۔

لاری اڈے پر تانگے والے نے مڑ کر میری طرف دیکھا تو میں نے اُسے چلتے رہنے کا اشارہ کیا۔ اس سڑک پر خاصی ٹریفک تھی اور میں کسی نسبتاً غیر آباد حصے کا انتخاب کر رہا تھا۔.. ایک میل آگے جانے کے بعد تانگے والے کی قوتِ برداشت جواب دے گئی۔

"پہلوان جی نے اکھیا تھا لاری اڈے..."

"کیا تم تھک گئے ہو؟" میں نے کہا۔

"میں... نہیں جی... مگر گھوڑا بے زبان جانور... اس نے بھی تو کچھ مائنڈ! نی کرنا ہے جی۔" وہ بولا۔

"اوہ... تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔" میں نے کہا۔ "بس اسی جگہ روک دو... اب ہم ایک قدم آگے نہیں جائیں گے۔"

"ویسے آپ کو جانا کہاں تھا؟" وہ لگام کھینچ کے بولا۔

"لاری اڈے۔" میں نے اترتے ہوئے مختصراً کہا۔

لاری اڈا تو پیچھے رہ گیا۔" وہ حیران ہو کے بولا۔

"ہمیں ملتان کے لاری اڈے پر اترنا تھا۔" میں نے کہا اور سو کا نوٹ آگے بڑھا دیا۔ حیرت کی ڈبل ڈوز نے کوچبان کی زبان بند کر دی... میری بات نے اور پھر اس اجرت نے اُسے بھونچکا کر دیا۔

یہ گھوڑے کے لیے۔" میں نے پچاس کا ایک اور نوٹ نکال کے کہا۔ "ہم نے اس بے زبان پر بہت ظلم کیا، اسے دانے پانی کے بغیر دوڑایا... تم ہماری طرف سے معافی مانگ لینا۔" معلوم نہیں تانگے والے نے واپس جاتے ہوئے شہر والوں کی ذہنی حالت کے بارے میں کیا رائے قائم کی ہو۔

"اب کیا ہوگا؟" موہنی نے سڑک کے کنارے بنی ہوئی منڈیر پر ٹکتے ہوئے کہا۔

"یہ سوال ہر جگہ اور ہر وقت کیا جاتا ہے خاتون۔" میں نے کہا۔ "لیکن حقیقت یہ ہے کہ کوئی نہیں جانتا کہ کب کیا ہوگا اور کچھ ہوگا یا نہیں ہوگا... مگر بقولِ شاعر... ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔"

"کیا پہلا مصرعہ میرے لیے تھا۔" وہ مسکرائی۔

میں نے سر کھجا کے کہا۔ "تم تو انتہا کی منزل پر ہو... پہلا مصرعہ منسوخ سمجھو۔"

"میرا مطلب تھا کہ اتنا لمبا سفر کیا اس لیے کیا تھا کہ سڑک کے کنارے ڈیرا ڈال لیں؟"

"تم ذرا دیکھتی جاؤ۔" میں نے کہا اور ایک کار والے کو ہاتھ سے اشارہ دے کر لفٹ مانگی۔ اس نے سخت بُرا مان کے مجھے پانچوں انگلیوں کا علامتی نشان دکھایا جس کے معنی... کچھ لوگ کہتے ہیں کہ تم پر لعنت... وہ مجھ پر لعنت بھیجنے میں برحق تھا۔ ایک ایسی سڑک پر جہاں پبلک ٹرانسپورٹ دن رات چلتی ہو کوئی اپنی بیش قیمتی گاڑی ایک مشکوک نظر آنے والے جوڑے کے لیے کیوں روکے مگر ناامیدی میرے مذہب میں حرام تھی۔ میں ملتان کی طرف جانے والی سب کاروں کو انگوٹھا دکھاتا رہا اور کاریں زن زن گزرتی گئیں۔

"یہاں کوئی نہیں روکے گا گاڑی۔" موہنی نے آدھے گھنٹے بعد کہا۔

"ہاں... میرے لیے کوئی نہیں روکے گا۔" میں نے آہ بھر کے کہا۔

"اب تم بیٹھو... میں کوشش کرتی ہوں۔" وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

میں اس کی جگہ جا بیٹھا اور اس نے یہ کیا کہ بال تھوڑے سے پریشان کیے۔ دوپٹہ ہاتھ میں تھاما اور اپنے ہر اندازِ حسن کو بہت بے باکی سے نمایاں کر کے آنچل لہرانے لگی۔ پہلی کار میں ایک بوڑھی سی فیملی بیٹھی تھی۔ انھوں نے خاصی ملامت آمیز نظروں سے موہنی کو گھورا اور زیرِ لب کچھ کہا بھی... شاید وہی جو مجھے ایک شخص نے پانچ انگلیاں دکھا کے کہا تھا... میں نے ایک قہقہہ مارا... موہنی نے خفت زدہ ہو کے مجھے دیکھا اور دوسری کار کو اشارہ دینے لگی۔ اس میں ایک ہی آدمی تھا مگر جب اس نے مجھے دیکھا تو رفتار پھر بڑھا دی۔ حالانکہ موہنی نے خاصی بے تکلفی کا مظاہرہ کیا تھا۔

"ایسے کوئی نہیں پھنسے گا بھئی۔" موہنی نے اِٹھلا کے کہا۔

"اس سے زیادہ کیا کرو گی؟" میں نے کہا۔

"تم کباب میں ہڈی بنے ہوئے ہو۔" وہ ہنس کے بولی۔

"کیا مطلب؟" میں نے چڑ کے کہا۔

"مطلب یہ کہ بلبل کے ساتھ کوا کوئی نہیں لیتا۔" وہ پھر ہنسی۔

"اچھا بلبل... کوا اپنی شکل گم کرتا ہے۔" میں نے کہا اور واپس منڈیر کے پیچھے لیٹ گیا اس طرح کہ فوراً نظر نہ آؤں۔

موہنی کو فوری کامیابی ہوئی۔ ایک کار نے اتنی قوت سے بریک لگائے کہ پہیے چیختے ہوئے جام ہو گئے اور میں نے اندازہ کیا کہ گاڑی کی رفتار کتنی زیادہ تھی... پھر گاڑی ریورس گیئر میں واپس آئی۔

"ہیلو... سوئیٹی..." کسی نے لوفروں کے انداز میں سیٹی بجائی۔

"لفٹ چاہیے؟" یہ کسی دوسرے کی آواز تھی۔

"یس... اِف یو ڈونٹ مائنڈ..."

"ہُو ہُو..." پہلے والا ریڈ انڈین کی طرح آواز نکال کے بولا۔ "ارے ہم تو خود بھٹک رہے ہیں کہ کوئی ہمیں لفٹ دے۔"

"جگہ ہے نا آپ کے پاس؟" موہنی نے کہا۔ "آئی مین..."

"جگہ... جگہ دل میں ہوتی ہے بے بی..." دوسرا بولا۔ "کم آن... تم تو انگریزی بھی بول لیتی ہو... جنگل کی پری۔"

اس نے دروازہ کھولا ہی تھا کہ میں پیچھے سے لنگڑاتا ہوا اور کراہتا ہوا نکل آیا۔ موہنی نے میرے لیے دروازہ تھام لیا۔ میں نے آگے بیٹھے ہوئے دونوں بگڑے دل رئیس زادوں کو دیکھا۔ ان کے چہرے نفرت سے مسخ ہو گئے۔

"ہو از دِس ڈرٹی سوائن...؟" ایک نے غصے سے کہا۔

"یہ ایک غریب آدمی ہے... بیمار تھا۔" موہنی نے ایک ادائے دلبری کے ساتھ کہا۔ "راستے میں اتر جائے گا۔"

"تم بھی اس کے ساتھ ہی اترو گی؟" دوسرا فیصلہ کُن اور کاروباری لہجے میں بولا۔

"اوہ نو..." موہنی نے کہا۔

"تم کہاں جاؤ گی؟" پہلے نے موہنی کو آنکھ ماری۔

"ابھی تو فیصلہ نہیں کیا..." موہنی بولی۔ اس کا لہجہ یہی کہتا تھا کہ یہ فیصلہ تو تم کو کرنا ہے۔

"اوکے... دیٹ از اے ڈیل۔" دوسرا بولا۔

"مجھے معلوم تھا۔" موہنی نے مجھے بٹھاتے ہوئے کہا۔ "یو آر سو نائس اینڈ ڈیسنٹ۔" پھر وہ خود میرے ساتھ بیٹھ گئی۔

"ہم سمجھتے ہیں کہ غریبوں کی مدد کرنا چاہیے۔" پہلے والے نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ غریب بڑے غلیظ ہوتے ہیں۔ گاڑی گندی کرتے ہیں۔"

"اور احسان فراموش ہوتے ہیں۔" دوسرا بولا۔ وہ اب انگریزی میں باتیں کر رہے تھے اور انھیں یقین تھا کہ میں کچھ نہیں سمجھ رہا ہوں۔

"بائی دا وے... ابھی تک ہم نے ایک دوسرے کو متعارف نہیں کرایا۔"

"میں جونی ہوں... نام تو جان محمد تھا... مگر تم سوچو ذرا کہ کتنا عجیب اور دقیانوسی لگتا ہے میرے جیسے نوجوان کو جان محمد کہنا۔" پہلے والے نے کہا۔ "یہ میرا بڑا بھائی ہے شفیع محمد... اسے سب جیکی کہتے ہیں۔ ہمارے اولڈ مین کو ایسے ہی نام رکھنے کا شوق ہے۔ خود کو تو وہ سلطان محمد خان گردیزی لکھتا اور کہتا ہے۔ میں کہتا ہوں اس سے پہلے عالم پناہ ظلِ سبحانی کیوں نہیں لگاتے..." وہ قہقہہ مار کے ہنسا۔

"جونی شٹ اپ۔" پہلا والا بولا۔ "تم نے ابھی تک اس جنگل کی پری سے نہیں پوچھا کہ وہ یہاں کیا کر رہی تھی؟"

موہنی مسکرائی۔ "میرا بھی کیس عجیب ہے... میرے والد بڑے سخت مولوی ہیں... میری ان سے نہیں بنتی... انھوں نے میرا نام رضیہ سلطانہ رکھا تھا... مگر سب مجھے روزی کہتے ہیں۔"

"روزی... ہُو ہُو..." جیکی نے کلکاری ماری۔ "وائلڈ روز۔"

"آج میرا ان سے جھگڑا ہو گیا تھا... میں گھر سے نکل آئی۔" موہنی بولی۔ "جب بھی میرا اُن سے پھڈا ہوتا ہے، میں واک آؤٹ کر جاتی ہوں۔"

"اور واک اِن کب کرتی ہو؟" جونی بولا۔

"جب میرا موڈ ٹھیک ہو جائے۔"

"موڈ کون ٹھیک کرتا ہے؟" جیکی نے کہا۔

"میرے دوست۔" موہنی نے ہنس کے کہا۔ "مجھے دوستوں کی کمی کبھی نہیں رہی۔"

"تمھیں دوستوں کی کمی نہیں ہو سکتی۔"

"آج سے ہم بھی تمھارے دوست ہیں... اینی ٹائم... اینی پلیس۔" جیکی نے گانا شروع کیا۔ "ڈے اینڈ نائٹ۔"

میں نے آہستہ سے ریوالور نکالا اور جیکی کے سر پر مارا۔ اس کا گراموفون ریکارڈ اٹک گیا۔ "ڈ... ڈے... اینڈ..." پھر ریکارڈ رک گیا۔ جونی نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔ جیکی اب دروازے کی طرف لڑھک رہا تھا۔

"ہے بوائے... یو اوکے؟" (تم ٹھیک تو ہو نا؟)

"ہی وِل بی فائن اِن نو ٹائم۔" میں نے ریوالور اس کی گدی پر رکھ کے کہا۔ "آنلی اِف یو ڈو واٹ آئی وانٹ یو ٹو ڈو۔" (وہ بہت جلد ٹھیک ہو جائے گا بشرطیکہ تم نے میرے کہنے پر عمل کیا)

"اینڈ اِف آئی ڈونٹ؟" وہ چند سیکنڈ تک وحشت سے منجمد بیٹھا سامنے والے آئینے میں مجھے گھورتا رہا (اور اگر میں نہ کروں تو)

"دین یو وِل بی نو بیٹر۔" میں نے کہا (پھر تمھارا حشر اس سے بھی بُرا ہو سکتا ہے)

"تم دونوں... سوئنڈلر ہو...؟" جونی نے کہا۔

"اور تم دونوں مجھے کسی سوئنڈلر کی اولاد لگتے ہو۔" میں نے انگریزی میں کہا۔ "کسی ایسے دھوکے باز یا نوسرباز کی ناجائز اولاد جو ناجائز آمدنی پر پلتی ہے تو ایک ذلت، نفرت اور فرسٹریشن سے بھرپور معاشرہ وجود میں آتا ہے۔"

اس نے حیرانی سے نظریں اُٹھا کے مجھے دیکھا۔ "تمھیں کیا چاہیے؟" وہ بولا۔ "ہمارے پاس دس بارہ ہزار روپے ہوں گے۔"

"اتنے ہی میری جیب میں بھی ہوں گے... شاید زیادہ ہوں مگر میرا مسئلہ کچھ اور ہے... میں ایک مفرور قیدی ہوں۔ راولپنڈی سنٹرل جیل سے بھاگا ہوا۔" میں نے کہا۔ "مجھے پھانسی ہونے والی تھی۔"

"پھر ہوئی کیوں نہیں؟"

"مجھے کوئی پھانسی نہیں دے سکتا تھا۔" میں نے شیخی مارنے کے انداز میں کہا۔ "وہ تو بس میں کچھ وقت گزار رہا تھا جیل میں تاکہ پریس اور پبلک خاموش ہو جائے۔ میرے ساتھیوں کے ہاتھ بہت

ملے تھے۔ وہ کسی بھی وقت مجھے جیل خانے کی دیواروں میں سے نکال سکتے تھے۔ کیا تم نے کبھی بہرام ڈاکو کا نام سنا ہے؟"

"بہرام ڈاکو... آف کورس... تم بہرام ہو؟"

میں قہقہہ مار کے ہنسا۔ "وہ میرا دادا تھا... میرٹل انکل آف مائی فادر... میرے چچا کا چچا جو دوسرے رشتے سے میرے ماموں کا ماموں ہوتا تھا۔ پھر چچا کی خلیری بہن سے ماموں کے پھوپی زاد بھائی کا رشتہ طے ہوا تو..."

وہ پریشان ہو کے بولا۔ "تمھارا کیا نام ہے؟"

"میں بہرام ثانی مشہور ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں نے کتنے ڈاکے ڈالے ہیں اب تک؟" میں نے سوہنی کو مخاطب کیا۔

"مجھے... زبانی تو یاد نہیں۔" وہ سٹپٹا کے بولی۔ "ڈائری میں سب لکھا ہوا ہے۔ تاریخ... مقام... رقم اور لوٹے جانے والے کا نام۔"

"یہ کون ہے تمھاری؟"

"سیکرٹری... پارٹنر اور وائف۔" میں نے کہا۔ "اسی نے باہر میرے ساتھیوں کو اکٹھا کیا اور مجھے نکالنے کے لیے ایکشن پلان بنایا۔ تم نے سلطانہ ڈاکو کا نام سنا ہے؟"

"یس... ایک فلم بھی تھی۔"

"یہ سلطانہ ڈاکو کی نواسی ہے... اس کے بہنوئی کی دوسری بیوی کا سالا بہرام ڈاکو کا سمدھی تھا۔" میں نے کہا۔

"مجھے رشتوں سے کوئی دلچسپی نہیں... کیا یہ بھی تمھارے ساتھ ڈاکے ڈالتی ہے؟"

"ہر بیوی کو شوہر کا ساتھ دینا چاہیے۔" میں نے کہا۔ "یہ ہر جگہ میرے ساتھ جاتی ہے... جتنے قتل میں نے کیے ہیں اتنے ہی اس نے..."

"اور... تم... تم نے کتنے قتل کیے ہیں؟"

"گیارہ..." میں نے غرور سے کہا۔ "پھانسی تو ایک ہی بار ہو سکتی تھی نا... ویسے میں نے اس کا ہر الزام بھی اپنے سر لے لیا... بائیس قتل کرنے کی فردِ جرم عائد کی گئی تھی مجھ پر... میں اب بائیس قتل اور کر سکتا ہوں اپنی ہاف بیٹر کی مدد سے... اس کے بعد پھر پکڑے گئے تو کیا۔؟"

"میں پھر نکال لاؤں گی تمھیں..." سوہنی نے کہا۔

"کیا تم چاہتے ہو کہ اپنے اس دوسرے راؤنڈ میں سب سے پہلے میں تم کو فوت کروں؟" میں نے خطرناک لہجے میں کہا۔ "کیوں جان محمد خان گردیزی؟"

"بٹ وائی؟... میں تو... میں تو کوآپریٹ کر رہا ہوں... بالکل وہی کر رہا ہوں... جو آپ فرما رہے ہیں..." جونی ہکلا کے بولا۔

"کوآپریشن کا مطلب سمجھتے ہو؟" میں نے ریوالور کو اس کی گدی پہ دبا کے کہا۔ "اس کا مطلب ہے کہ جو میں کہوں وہ کرو... سوال کوئی مت کرو... اور زبان بند رکھو... ہمیشہ... ہمیشہ اگر ہے جب تک زندہ رہنا چاہو۔ جس دن تمھاری زبان سے میرے بارے میں ایک لفظ بھی نکلا... تم نے اپنے باپ کو یا پولیس یا کسی بھی حمایتی کو بتایا، اس کے ٹھیک ایک ہفتے بعد... رات بجے... بہرام ثانی تم سے ملنے آئے گا..." میں نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ "تم اس سے چھپ کے قبر میں بھی جا لیٹو گے تو وہ تم کو نکال لے گا... کفن اندر رہ جائے گا لاش باہر... اور..."

"آئی... آئی پرامز... میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

"اگر تم نہیں بتاؤ گے تو فائدے میں رہو گے... کافی دن بچ جاؤ گے... اور تمھارے باپ کی کوٹھی میں کوئی ڈاکا نہیں ڈال سکے گا۔ تم بہرام کی پناہ میں آجاؤ گے... اور جو بہرام کی پناہ میں ہو، اسے دوسرا بہرام بھی ان کا بال بیکا نہیں لگا سکتا۔"

"سمجھ گیا... بہت اچھی طرح..." وہ ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔

"اب شرافت سے چلتے جاؤ۔" میں نے کہا۔ "اگر کسی بھی جوہر میں کسی کو اشارہ بھی کیا تو سلطانہ ڈاکو کی نواسی دروازہ کھول دے گی۔ جیکی باہر لڑھک جائے گا... یوسی... وہ دروازے کے سہارے ٹکا ہوا ہے... اسے دھکا دینے کی ضرورت بھی نہیں ہوگی۔"

"جانا کہاں ہے آپ کو؟... میرے پاس پٹرول..."

"میں دیکھ رہا ہوں... آدھے سے کم ہے۔" میں نے کہا۔ "تم قتل کراؤ، پیسے میں دوں گا... لیکن یہ ضرور یاد رکھنا کہ جو شخص پھانسی سے بچ کے جیل بھاگا ہو، وہ آسانی سے واپس جیل نہیں جاتا... وہ سب پہلے مارے جائیں گے جو مجھے گرفتار کرنے یا کرانے کی کوشش کریں گے۔ تمھارے باپ کو دو جوان بیٹوں کی موت کا صدمہ اٹھانا پڑے گا... وہ بیٹے ہیں تو اسی قابل کہ انھیں گولی مار دی جائے... کیا اس کی کوئی اولاد صالح بھی ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "بس ہم دو جڑواں بھائی ہیں۔ ہماری پیدائش کے وقت ماں مر گئی تھی۔"

"پھر تو موت کے وقت باپ مر جائے گا۔" میں نے کہا۔

"اس کی ساری دولت، جائداد کسی اور کو مل جائے گی۔ کون بچے گا پھر؟"

"اس کی دوسری بیوی... جو اس کی تیسری سیکرٹری تھی اور اس کے منہ پہ بڑھاپے میں کالک مل چکی ہے۔" وہ نفرت سے اور حقارت سے بولا۔ "وہ اس کے پیچھے دیوانہ ہو رہا ہے... جیسے مجنوں لیلیٰ پہ ہوا کرتے ہوں گے... ایسے رہتے ہیں وہ..."

"اپنی والدہ کے بارے میں...؟"

"والدہ... مائی فٹ..." وہ بولا۔ "لک ہیئر... تم مجھ پر بھروسا کر سکتے ہو... میں آئندہ بھی تمھاری مدد کر سکتا ہوں... جب تم چاہو، تم مجھے فون کر کے بلاؤ گے تو میں آجاؤں گا... اور تم میری کوٹھی پر بھی مجھ سے ملنے آنا چاہو تو میں تم کو اپنا مہمان رکھ سکتا ہوں۔ لاہور... کراچی... سب جگہ ہماری کوٹھیاں ہیں... مری میں بھی کوٹھی ہے... لیکن تم میرا ایک مسئلہ حل کر سکتے ہو۔"

"تم میں اس کی ہمت نہیں ہے؟"

"فرینکلی... نو..." وہ بولا۔ "ہم کوئی شریف آدمی نہیں ہیں۔ لیکن مرڈر ہمارے بس کی بات نہیں۔"

"تم اپنے باپ کو قتل کرانا چاہتے ہو؟" میں نے کہا۔

"اوہ نو... اس نے ہمارے لیے بہت قربانیاں دی تھیں۔ اکیس سال اس نے شادی نہیں کی ہماری خاطر... ایک گورنس نے ہمیں پالا... بے شک، وہ اچھی عورت تھی۔ اگر ہمارا باپ اس سے شادی کر لیتا تو ہمیں اعتراض نہ ہوتا مگر یہ بات ایک دن میں نے اس سے کہی تو وہ ہنسنے لگا اور بولا کہ سن... تم ان معاملات کو نہیں سمجھتے... وہ اس لیے اچھی ہے کہ تمھاری سوتیلی ماں نہیں ہے۔ تمھاری گورنس ہے... میری بیوی نہیں ہے... ملازمہ ہے... مگر وہ گورنس بہت مایوس ہوئی جب ہمارے باپ نے اس تھرڈ ریٹ عورت سے شادی کر لی... اکیس سال کے ڈسپلن کو ختم کر دیا۔ او جاتے ہوئے اس نے ہم سے کیا کہا... اس نے کہا سن... مجھ پہ ایک ذمے داری تھی... تمھاری پرورش کی... وہ میں نے پوری کر دی۔ تم اب بالغ ہو اور اپنی مرضی کے مالک ہو... اپنا برا بھلا خوب سمجھتے ہو... پھر اب مجھے کیوں ٹوکتے ہو... تم مجھے اپنی مرضی پہ چلانا کیوں چاہتے ہو... گورنس نے بھی یہی کہا کہ بوائز... میری ذمے داری پوری ہو گئی... اب مجھے جانے دو... ہم نے اسے بہت روکا لیکن وہ چلی گئی۔ ایک دن صبح اس کا کمرا خالی تھا... اس نے خط چھوڑ دیا تھا کہ مجھے تلاش مت کرنا... یوسی... اس سب خرابی کی ذمے دار وہ عورت ہے۔"

"میں اتفاق کرتا ہوں تم سے۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تمھارا باپ چوتھی سیکرٹری سے شادی نہیں کرے گا؟"

"نہیں... شاید وہ دوبارہ غلطی نہ کرے لیکن اس نے پھر ایسا کیا... تو کیا تم پھر میری مدد نہیں کر سکتے؟"

"گویا تیسری بیوی کا... پھر چوتھی اور پانچویں کا قتل؟"

"تم نے کہا نا کہ مل کے تم دونوں..."

"ہاں، ہم بائیس قتل اور کر سکتے ہیں... لیکن صرف تمھارے لیے نہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم ہول سیل ٹھیکے نہیں لیتے... وہ تو جب کوئی ہمارے رستے میں ٹانگ اڑاتا ہے تو ہم اسے کاٹ دیتے ہیں... ٹانگ کے مالک کو... ہم پیشہ ور قاتل نہیں ہیں۔"

"او کے... تم ایک بار تو یہ کام کر سکتے ہو..."

"ہم سوچیں گے..." میں نے کہا۔

"سوچنا کیا... تم ہمارے گھر میں ڈاکا ڈالنے آؤ۔ وہ عورت ہر وقت زیورات میں لدی پھندی رہتی ہے۔ سونے اور پلاٹینم کے ہیروں والے سیٹ ملیں گے تمھیں۔ اسے اپنے ساتھ لے جانا اور گردن کاٹ کے اتار لینا..." وہ بولا۔ "اور پھر کہیں گاڑ دینا... میرا باپ تو یہی سمجھے گا کہ وہ بھاگ گئی۔ ہم اسے یقین دلا دیں گے کہ ایسا ہی ہے۔ دو چار لاکھ پیسے ہم تجوری سے نکال لیں گے... تمھارے لیے..."

"کیا زبردست منصوبہ ہے۔" میں نے سوہنی کی طرف دیکھ کر کہا۔ "تم تو جینئس ہو۔ پہلے سے سب طے کیے بیٹھے ہو۔"

"کوئی کام کا آدمی نہیں ملا تھا اب تک۔" وہ مسکرایا۔

"او کے... پہلے تم میری مدد کرو..." میں نے کہا۔ "یہ ہو سکتا ہے کہ ہمیں کل تک تمھاری ضرورت پڑے... یا ہم رات کو تمھیں فارغ کر دیں۔"

"مجھے گھر پہنچنے کی کوئی خاص جلدی نہیں ہے۔ کیا میں یہاں سے پٹرول لے لوں؟" وہ بولا۔

"ضرور لے لو۔" میں نے کہا۔ "مگر جیکی..."

"کوئی پوچھے گا تو میں کہہ دوں گا کہ سو گیا ہے۔" وہ بولا۔

جیکی آدھے گھنٹے بعد جاگ اٹھا۔ اس وقت گاڑی تیزی سے ملتان کی طرف بڑھ رہی تھی۔

"او گاڈ... یہ شخص ابھی تک زندہ ہے جونی؟" اس نے ہوش میں آتے ہی سر پکڑ کے چلانا شروع کیا۔

"مجھے تو تعجب ہے کہ تم ابھی تک زندہ ہو۔" میں نے انگریزی میں کہا۔ جیکی نے پلٹ کر مجھے خون آشام نظروں سے دیکھا اور میرے ہاتھ میں ریوالور دیکھتے ہی سیدھا ہو گیا۔ پھر اس نے جونی کو مسکراتے دیکھا۔

"اٹ از آل رائٹ برادر۔" جونی نے اس کے کندھے پہ تھپکی دے کر کہا۔ "یہ سب غلط فہمی میں ہو گیا۔ ناؤ وی آر فرینڈز۔"

"فرینڈز؟" جیکی نے یوں کہا جیسے اسے سخت صدمہ ہے کہ جب وہ بے ہوش تھا تو اس کے اپنے بھائی نے بے ہوش کرنے والے سے صلح نامہ کر لیا۔ لیکن جونی نے آہستہ آہستہ اسے صلح نامے اور امدادِ باہمی کے معاہدے کی تفصیلات سے آگاہ کر دیا۔ وہ سر ہلاتا رہا اور بار بار اس جگہ کو دباتا بھی رہا جہاں ایک گومڑا ابھر آیا تھا۔

"اگر یہ بات ہے۔" اس نے ساری بات سن کے کہا۔ "تو بے شک ہم دوست ہیں۔" اور مجھ سے ہاتھ ملانے کے بعد سوہنی سے بھی ہاتھ ملانا چاہتا تھا کہ میں نے اسے روک دیا۔

"اپنی بیوی کی طرف سے میں ہاتھ ملاؤں گا۔" اور دوبارہ

مصافحہ کیا۔

وہ تھوڑا سا خفیف ہوا۔" ہم دونوں بھائی نہیں، دوست ہیں۔" وہ بولا۔" اور اچھے دوستوں کی طرح ہم انڈر اسٹینڈنگ کو اہمیت دیتے ہیں۔"

" اور ہر معاملے میں شیئر کرتے ہیں۔" جونی نے کہا۔

" خدا کرے آپ دونوں میں یہ اشتراک شادی کے بعد بھی برقرار رہے۔" میں نے کہا۔

وہ دونوں بے شرمی سے منہ پھاڑ کے ہنسنے لگے۔ پھر مجھے سڑک کے کنارے ایک ریسٹورنٹ نظر آیا جو فلائنگ کوچ قسم کی گاڑیوں کے مسافروں کے لیے مخصوص تھا۔ وہاں ہمیں معمولی درجے کی کافی اور بہت اعلیٰ قسم کے سینڈوچ ملے۔ جیکی نے مجھے بہت اعلیٰ قسم کے غیر ملکی سگریٹ پیش کیے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ اپنے بھائی کے مقابلے میں زیادہ چالاک ہے۔ اس کی نظریں بار بار میرے چہرے کا طواف کرتی تھیں اور وہ کچھ کہتے کہتے رک جاتا تھا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں شک نظر آرہا تھا۔

بلآخر یہ شک اس کی زبان پر آگیا۔" اولڈ مین... ایک بات کہوں... تم برا تو نہیں مانو گے؟"

"نہیں... میں دوستوں کی بات کا برا نہیں مانتا۔"

" تم... اور تمہاری وائف... دونوں کی عمر میں بہت فرق ہے۔" وہ بولا۔

" ہاں... یہ میری چوتھی بیوی ہے۔" میں نے کہا۔

" چوتھی؟... اوہ گاڈ... باقی تین کہاں ہیں؟" وہ بولا

" بیک ٹو دی پویلین۔" میں نے گول مول بات کی۔ اس کا مطلب یہ بھی سمجھا جاسکتا تھا کہ انا للہ اور یہ بھی کہ وہ ماں باپ کے گھر بیٹھی ہیں۔

" میرا خیال ہے... کہ تم اتنے بوڑھے نہیں ہو... جتنے نظر آرہے ہو۔" وہ مجھے غور سے دیکھ کر بولا۔" یا نظر آنا چاہتے ہو... تم نے میک اپ کیا ہے؟"

" مجبوری ہے..." میں نے کہا۔" میں واپس جیل جانا نہیں چاہتا۔"

جیکی نے اطمینان کا سانس لیا۔" تم گنجے بھی نہیں ہو۔" وہ بولا۔" اور تمہاری یہ داڑھی بھی نقلی ہے۔"

" تم نے کیسے جانا؟" میں تھوڑا سا متفکر ہوگیا۔

جیکی ہنسا۔" ہر شخص جس کی نظر تیز ہوگی' دیکھ لے گا کہ تمہارے گنجے سر اور بلیک اینڈ وائٹ داڑھی کے ساتھ تمہارا جسم میچ نہیں کرتا... میرا مطلب ہے کہ... اپنے ہاتھ دیکھو... کتنے جوان ہیں۔ اور تمہاری گردن کے قریب جو کھال ہے' وہ بہت ٹائٹ اور فریش ہے۔"

میں اس کے مشاہدے پر حیران رہ گیا۔ بلاشبہ... سے محسوس کیا جاسکتا تھا۔" اس کا مطلب ہے کہ مجھ... محتاط ہو جانا چاہیے۔" میں نے کہا۔

ہم وہاں سے روانہ ہوئے ہی تھے کہ ہمارے پیچھے... آ کے رکی۔ میں تھوڑا سا آگے جھکا ہوا تھا کیونکہ گر جانے والی... اٹھا رہا تھا چنانچہ میں نے بیک ویو مرر میں کار کی اور اس... ہوئے شخص کی صرف ایک جھلک سی دیکھی۔ ایک لمحہ... میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔ مجھے شک ہوا کہ میرے دل... خوف مجھے بھیانک تصویریں دکھا رہا ہے جن کا تعلق... سے ہے حقیقت سے نہیں... لیکن پلٹ کر دیکھنے پر مجھ... آنکھوں پر یقین آیا۔ میں نے پیڈرو کو ہی دیکھا تھا۔ اس... وہی تھی سلیٹی رنگ کی ٹویوٹا... شاید میری صورت نے... نے بھی محسوس کر لیا تھا۔ اس نے بھی پیچھے دیکھا مگر اتنی دیر... بہت آگے نکل آئے تھے اور پیڈرو کی کار نظر سے اوجھل...

بال بال بچے اس وقت تو۔" جیکی نے اچانک...

میں اچھل پڑا لیکن یہ بات اس نے مجھ سے نہیں...

"کیوں... کیا ہوا؟" جونی نے کہا۔

" ییل وو دیٹ فیس۔" جیکی بولا۔" اس کی گاڑی... پیچھے آ کے رکی تھی۔"

کس کی بات کر رہے ہو؟"

" ہماری ڈیئر مدر کا برادر ان لا۔" جیکی نے کہا۔" کسی... اسے گولی مار دوں گا... لگتا ہے' وہ پھر ڈیڈی کو شرف ملاقات... بخشنا چاہتا ہے۔"

" اوہ نو..." جونی نے کہا۔" اب وہ کیا لینے آرہا ہے..."

پہلے پیڈرو کو عین اپنے پیچھے دیکھ کر اور اب یہ گفتگو... میں اتنا حیران اور پریشان ہوا تھا کہ سانس بھی لینا بھول گیا... خدا نے تو مجھے بال بال بچایا تھا۔ اگر میں جھکا نہ ہوتا تو اتنے... سے پیڈرو مجھے ضرور دیکھ لیتا۔ اور اس خبیث کی خرکار... یہ ہو سکتا تھا کہ وہ میرے موجودہ حلیے سے واقف ہو۔ دلاور... کمپنی بہت باخبر لوگ تھے۔ موہنی کو اس نے پیچھے سے دیکھا ہو... اس کا صرف سر نظر آیا ہوگا۔ موہنی کا چہرہ بکھرے ہوئے بالوں کی... اوٹ میں تھا لیکن ابھی سے کیا کہا جاسکتا ہے کہ پیڈرو نے... دیکھا یا نہیں... اگر اس نے دیکھا ہوگا تو وہ اطمینان سے... میں آئے گا۔ اس نے کار کا نمبر نوٹ کر لیا ہوگا۔ ملتان پہنچنے... پہلے وہ اپنی بڑی کار کو دوڑاتا ہوا لائے گا تو آدھے گھنٹے... روانہ ہو کے بھی اس فرق کو ختم کرنے میں کامیاب ہو جائے... جیکی اور جونی کی گفتگو نے مجھے مزید تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔

وہ پیڈرو کی بات کر رہے تھے یا کسی اور کی۔ میں اس کار کے... ان مسافروں کو نہیں دیکھ سکا تھا۔ کون تھا ان کی ڈیئر مدر کا... دوست؟ میں ان سے پوچھنا چاہتا تھا لیکن اس طرح نہیں کہ... برادر ان لا؟ ...ان کے دل میں شکوک پیدا کر دے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ... تجسس... وہ کار کے کسی دوسرے مسافر کی بات کر رہے ہوں۔ میں منتظر رہا... وہ خود ہی کوئی بات کریں گے لیکن ایسا لگتا تھا کہ وہ مجھے کچھ بتانے کے موڈ میں نہیں ہیں۔ اس سے پہلے کہ موضوع سخن بدل جاتا میں نے کہا۔" یہ تم کس کو گولی مارنے کی بات کر رہے تھے؟"

" ہے ایک شیطان... اس نے ہمیں تقریباً لوٹ لیا ہے۔" جیکی نے برہمی سے کہا۔" یہ جو ہماری برانڈ نیو ماں ہے... یہ اسی کا بھائی ہے۔ لیکن مجھے شک ہے۔"

" کیا شک ہے؟" میں نے ظاہری بے نیازی سے کہا۔

" یہی... کہ وہ بھائی بہن ہیں..." جیکی بولا۔" اس نے ہمارے ڈیڈ کو بے وقوف بنانے کے لیے یہ چکر چلایا ہے۔"

" تمہارا ڈیڈ مجھے ایسا آدمی تو نہیں لگتا جیسے کوئی بے وقوف بنا کے لوٹ سکے۔" میں نے کہا۔

" ہر آدمی کی عقل اس عمر میں گھاس چرنے جاسکتی ہے۔ خصوصاً اس وقت جب گھاس بہت تر و تازہ اور نظر فریب ہو۔" جیکی بولا۔" اور ایک بوڑھا بیل برسوں سے بھوکا ہو۔" وہ اس مثال پر خود ہی قہقہہ مار کے ہنسا۔

" ہماری کچھ بہت قیمتی زمین تھی... بہت عمدہ لوکیشن پہ۔" جونی نے بات آگے بڑھائی۔" دِس وومن... اس کا نام ہے مرکری۔"

" مرکری!" موہنی نے کہا۔ وہ اپنی حیرانی پر قابو نہ رکھ سکی تھی ورنہ معاملات کے قابو میں آجانے کے بعد وہ بیشتر وقت خاموش رہی تھی۔

" پارہ... یہی ہے اس کا نام... اور صفت بھی ایسی ہی پائی ہے اس نے..." جیکی بولا۔" بیگم پارہ نے..."

میں چونک پڑا۔" بیگم پارہ!"

میرا چونکنا انھیں عجیب لگا لیکن گڑبڑ میرے لاشعور میں ہوئی تھی۔ میں نے ایک فلم دیکھی تھی ' استاد پیڈرو ' جس میں پیڈرو کا کردار شیخ مختار نے کیا تھا اور اس کی ہیروئن تھی بیگم پارہ جو اپنے زمانے کی ایسی اداکارہ جو بے باک رول کرنے میں خاصی شہرت رکھتی تھی۔ مجھے بیگم پارہ کا نام سنتے ہی استاد پیڈرو کا خیال آیا اور ان دونوں ناموں کا فلم سے حقیقت کی دنیا میں رشتہ قائم ہوا تو میں چونک پڑا۔

" سوری... مجھے اس اداکارہ کا خیال آگیا تھا۔" میں نے کہا۔

" اداکارہ تو یہ بھی ہے۔" جیکی نے اس وضاحت سے مطمئن ہو کے کہا۔" تم ایسا کیوں نہیں کرتے... آج رات ہمارے مہمان ہو جاؤ۔"

" اوہ یس..." جونی نے کہا۔" تم صورت حال کو دیکھ اور سمجھ سکو گے۔"

" اسے تو میں نے سمجھ لیا ہے۔" میں نے کہا۔" آئی وش کہ میں تمہاری دعوت قبول کر سکتا... لیکن آج کی رات میرے لیے اہم ہے... میں وقت ضائع نہیں کر سکتا۔"

" اچھا... تو پھر ایسا کرو... دو چار گھنٹے کے لیے اسٹاپ اوور کرو۔"

" ہاں... اتنی دیر میں یہ لوگ بھی پہنچ جائیں گے۔" جونی بولا۔

" میں شرط لگا سکتا ہوں کہ وہ ہمارے پیچھے آرہے ہوں گے۔"

میرا خون خشک ہونے لگا۔" کیوں یقین ہے تمہیں...؟"

" اس لیے کہ وہ اپنی ڈیل فائنل کریں گے۔" جیکی بولا۔" میں جس زمین کی بات کر رہا تھا' وہ انڈسٹریل ایریا کا پلاٹ ہے۔ ہم خود یہ چاہتے تھے کہ وہاں انویسٹمنٹ کریں... اس کی قیمت تو پہلے بھی بہت دے رہے تھے لوگ... ہم اسے بیچنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ ایسی جگہ تھی کہ کوئی بھی پارٹی ہمارے ساتھ مل کے ایک ٹیکسٹائل مل لگانے پر تیار ہو جاتی... ہم نے کچھ بات بھی آگے بڑھائی تھی کہ اس عورت نے کوئی چکر چلا دیا اور ہمارے ڈیڈ نے وہ زمین بیچ دی... صرف پچاس لاکھ کے لیے... اور اس عورت کو غالباً اسی لیے ہمارے ڈیڈ کے پیچھے لگایا گیا تھا۔"

" یہ دوسری پارٹی وہاں کیا کرنا چاہتی ہے؟"

" وہ کوئی مشین ٹول فیکٹری قائم کر رہے ہیں۔" جیکی بولا۔" زرعی مشینری کے آلات اور پرزے بنانے کا پروجیکٹ ہے جو میرے خیال میں بالکل منافع بخش نہیں ہو سکتا کیونکہ ایسی ہی دو فیکٹریاں خسارے میں چل رہی ہیں... اور ایک تو انھیں بہت سستی مل سکتی ہے... اگر یہی ان کی پلان ہے تو دگنے سرمائے سے یہ بزنس۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔

لیکن اصل بات یہ لڑکے نہیں سمجھ سکتے تھے ان کی پلان میں نے سمجھ لی تھی۔ زرعی مشینری کے پرزوں کا نام سنتے ہی مجھ پر چودہ طبق روشن ہو گئے تھے اور میرے دماغ کے کمپیوٹر نے بہت سے حقائق کو یکجا کر کے ایک رزلٹ میرے سامنے رکھ دیا تھا۔ یہ چوہدری دلاور کے ذہن کی منصوبہ بندی تھی کہ اس نے لاہور کے ' ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس ' کو ختم کیا۔ وہاں سے تمام اسلحہ ساز مشینوں کو ہٹا لیا کیونکہ ہم ان کے کاروبار کی تہ تک پہنچ چکے

تھے۔ وہ زیادہ عرصہ وہاں زرعی مشینوں کے پرزوں کے نام پر اسلحہ سازی نہیں کر سکتے تھے۔ دلاور نے اس پلاٹ پر رفاہی اسپتال بنانے کا اعلان کر دیا۔ میدانِ سیاست میں قدم رکھنے کے لیے یہ ایک چونکا دینے والا اور سب کی تعریف و توصیف حاصل کرنے والا عمل تھا۔ چوہدری دلاور نے بہت اچھا اسٹارٹ لیا تھا۔ دوسرا قدم اس نے یہ اٹھایا کہ اسپتال کو اپنے مرحوم دوست وزیر خان کے نام سے منسوب کر دیا۔ چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد۔ جس کو اپنے ہاتھوں مارا اسی کے نام سے نیکی کمالی۔ سب کے دل سے شکوک و شبہات مٹ گئے اور بات یوں مشہور ہوئی کہ دوست ہو تو ایسا... بدنام میں ہوا کہ اسے بدنام کیا۔ تیسرا قدم اُس نے مختلف سمت میں یوں اٹھایا کہ کسی کو پتا نہ چلا... اس نے ملتان کے قریب کوئی جگہ منتخب کر لی، جہاں وہ ایم ڈبلیو ڈی کمپلیکس کو منتقل کر سکے۔ پرانا کاروبار نئی جگہ پر جا رہا ہے۔ میری وجہ سے انھیں منتقلی کے عمل سے گزرنا پڑا لیکن یہ چوہدری دلاور کے شاطر ذہن کا کمال تھا کہ اس نے زحمت کو رحمت میں بدل لیا۔ اُس نے پیڈرو سے کہا کہ وہ زمین حاصل کرے... شاید یہ زمین حاصل کرنے میں انھیں دشواری پیش آئی۔ جان محمد عرف جونی اور شفیع محمد عرف جیکی بگڑے ہوئے ضرور تھے مگر بے وقوف نہیں تھے۔ بگاڑا ان کو پیسے کی فراوانی نے تھا لیکن وہ تھے تو سلطان محمد خان گردیزی کی اولاد... وہ ایک ذہین، حوصلہ مند اور سیلف ڈسپلن کا پابند مضبوط قوتِ ارادی اور صحیح قوتِ فیصلہ رکھنے والا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ یہ خواص اس کی اگلی نسل میں بھی منتقل ہوئے تھے۔ جونی اور جیکی نے باپ کی مخالفت کی اور شاید وہ کامیاب بھی ہو جاتے مگر ایک عورت کے شباب اور عشوہ گری نے بوڑھے دماغ کو شکست فاش دی۔ پیڈرو نے آدمی کی اس کمزوری سے فائدہ اُٹھایا جس نے اُسے جنت سے نکلوایا تھا۔ ایک بنتِ حوا نے اس کی قوتِ فیصلہ مفلوج کر دی اور جوان بیٹے کچھ نہ کر سکے۔

فیصلہ میں نے فوراً کیا۔ میں نے کہا۔ "میں ایک شرط پر رُک سکتا ہوں۔"

"وہ کیا شرط ہے؟" وہ دونوں بولے اور پھر ہنسنے لگے۔

"شرط یہ ہے کہ میں سامنے نہیں آؤں گا۔" میں نے کہا۔ "اگر تم کوئی ایسا انتظام کر سکتے ہو کہ ہمیں کوئی بھی نہ دیکھے... لیکن ہم ان سب کو دیکھ لیں... جن سے ہمارا واسطہ ہوگا۔"

"میں سمجھ گیا۔" جیکی نے چٹکی بجائی۔ "تم بہت دور اندیش ہو۔"

"ایسے کام میں ہونا پڑتا ہے۔" میں نے کہا۔ "ورنہ ہر قتل کے بعد پھانسی ہوتی تو اب تک بائیس بار ہو جاتی۔"

"ان کو پیچھے سے لے جانا۔" جونی نے ... کی طرف سے اوپر لے جانا۔"

"اوپر... مگر ڈیڈ کا بیڈ روم تو ہے اوپر..."

"وہ بیڈ روم میں جائیں گے گیارہ بارہ بجے کے بعد۔"

"ہم زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے ٹھہریں گے۔" میں ... جیکی نے گھڑی دیکھی۔ "ہم سات بجے تک ... جائیں گے۔ سوا سات ساڑھے سات بجے تک اندھیرا ... جاتا ہے۔"

"اگر تمھارے نوکروں نے دیکھا تو...؟" میں نے کہا۔

"وہ نہیں دیکھیں گے۔ ہم ان سے کہہ دیتے ہیں کہ آنکھیں بند کر لو تو وہ آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔" جیکی بولا۔ "ایسا اکثر ہوتا ..."

صورتِ حال کا تقاضا یہ تھا کہ ہم یہ سب برداشت کریں ... نے آہستہ سے موہنی کا ہاتھ دبایا اور اُسے خاموش رہنے کا ... یقیناً حیران ہو گی کہ میں یہ سب کیوں کر رہا ہوں لیکن ... کچھ نہیں بتا سکتا تھا۔

غروبِ آفتاب کے بعد ہم ملتان پہنچے اور تقریباً پندرہ منٹ بعد جیکی اور جونی کے چار کنال پر پھیلے ہوئے محل ... قدیم طرز کی کوٹھی تھی جو تعمیر میں مشرقی روایات کا حُسن رکھتی ... صدر دروازے پر میں نے ایک مسلح محافظ کو ٹہلتے دیکھا... بہت سی گاڑیاں نظر آئیں جو ایک طرف کھلے حصے میں پارک کی گئی تھیں۔ ان میں یقیناً ملنے کے لیے آنے والوں کی گاڑیاں ... ہوں گی... درجن بھر سے زائد گاڑیاں کون رکھتا ہے۔

جیکی مجھے اور موہنی کو پچھلی طرف نسبتاً چھوٹی سڑک ... کھلنے والے ایک دروازے سے گزار کے اندر لے گیا۔ ... کوارٹروں میں سے کوئی عورت نکلی اور اس نے جیکی کو سلام ...

"تیرا میاں کہاں ہے؟" جیکی نے کہا۔

"نہیں معلوم چھوٹے صاحب۔" وہ گھبرا کے بولی۔

"چل پھر تو بھی اندر ہو جا... باہر کیوں کھڑی ہے؟" ... نے کہا۔

وہ عورت فوراً غائب ہو گئی۔ میں نے اندازہ کیا کہ جیکی ... حکم بھی فرمانِ شاہی کا درجہ رکھتا ہے اور ملازمین بلا چون و چرا تعمیل کے عادی ہیں۔ اُس نے پہلے سرونٹ کوارٹر پر دستک ... دروازہ کھولنے والی ایک جوان اور صحت مند عورت تھی ... نے پھول دار ریشم کی تنگ قمیص پہن رکھی تھی۔

"ایوا کارڈنر... وہ تیرا خصم کہاں ہے؟"

... دم لگانے کی تیاری کر رہا ہے۔" وہ ہنس پڑی۔

"اسے فوراً باہر پھینک دے۔" جیکی بولا۔

"...اسے ایوا گارڈنر کیوں کہتے ہو تم؟ وہ تو بڑی زبردست ... اور بہت خوب صورت بھی ہے۔" میں نے کہا۔

"اس کا نام حوا بی بی ہے۔" جیکی بولا۔ "اور اس کا شوہر مالی ہے... چنانچہ یہ ایوا گارڈنر ہے... اور حسن تو دیکھنے والے کی نظر میں ہے... ڈیڈ کے پیر دباتی ہے اور ان کا کہنا ہے کہ اس سے بہتر پاؤں دبانے والا کوئی نہیں... پانچ سال سے وہ یہی کام کر رہی ہے۔ جب تک وہ پیر نہ دبائے ڈیڈ کو نیند نہیں آتی۔"

اس قسم کے ماحول میں پرورش پانے والے لڑکے عیاش تو ہوں گے، میں نے سوچا۔ ان کے نزدیک ہر عورت صرف عورت ہے خواہ وہ کسی کی بھی ماں، بہن یا بیوی بیٹی ہو۔

مالی ایک چمرخ بڈھا تھا۔ اس کی عمر تو زیادہ نہیں تھی اور میرے اندازے کے مطابق چالیس پینتالیس سال کا ہوگا مگر وہ حد سے زیادہ لاغر تھا۔ اس کی سیاہ کھال اس کے جسم کے ڈھانچے پر منڈھی ہوئی نظر آتی تھی اور اپنی فربہ بدن گوری چٹی بیوی کے برعکس وہ بے حد غم زدہ بھی لگتا تھا۔

"مالی بادشاہ... کیا گل کھلا رہے تھے؟" جیکی نے کہا۔ "دیکھو یہ ہمارے ساتھ مہمان آئے ہیں، انھیں کمرۂ خاص میں پہنچا دو۔"

مالی نے سر ہلایا اور ہمیں ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ جیکی اسی چور دروازے سے باہر چلا گیا۔ غالباً صدر دروازے سے باقاعدہ اندر داخل ہو کے ڈیڈ کو سلام کرنے کے لیے۔

میں نے مالی کے پیچھے مختلف کمروں اور راہداریوں سے گزرتے ہوئے محسوس کیا کہ اس کی چال میں لڑکھڑاہٹ ہے اور اس کی آواز ڈوبتی جا رہی ہے۔ غالباً وہ دم لگا چکا تھا۔ نشے کا اثر غالب آ رہا تھا۔

جب وہ ہمیں ایک انتہائی آراستہ خواب گاہ میں چھوڑ کے چلا گیا تو موہنی صوفے پر گر پڑی۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمھیں یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی...؟"

"میری ہر ضرورت تمھاری سمجھ میں آنی بھی نہیں چاہیے۔" میں نے کہا۔

"یہ تو... بڑی غلط جگہ ہے۔ کیسے عجیب لوگ ہیں۔" وہ خوف زدہ لہجے میں اِدھر اُدھر دیکھ کے بولی۔ "ایسا نہ ہو ہم بھی یہاں قید ہو جائیں... ایسا لگتا ہے کہ یہاں آنے کے بعد جانے کا راستہ نہیں ملتا ہوگا۔"

"اس وقت آٹھ بجے ہیں۔" میں نے کہا۔ "دس بجے ہم اسی راستے سے لوٹ جائیں گے۔"

وسیع بیڈ روم میں چاروں طرف چھت سے فرش تک سرخ ریشمی پردے تھے۔ نیچے وال ٹو وال گہرا سبز قالین بالکل قدرتی گھاس کے رنگ کا تھا۔ کنگ سائز بیڈ ملتان کے دستکاروں کی فنکاری کا نادر نمونہ تھا اور اس کی سائیڈ پر ایک پینل تھا جس میں ایک درجن کے قریب سوئچ لگے ہوئے تھے۔ مجھے کمرے کے چار کونوں میں چار رنگ کی اسپاٹ لائٹ نظر آئی۔ تجربے کے لیے میں نے ایک بٹن کو دبا کے دیکھا۔ سرخ روشنی کا دائرہ بیڈ کے مرکز میں ٹھہر گیا۔ میں نے اسے آف کر دیا۔ بیڈ کے بالکل اوپر چھ فٹ لمبا اور چوڑا آئینہ بڑی مہارت سے آویزاں کیا گیا تھا۔ اس کو معلق رکھنے والی راڈ چھت تک پہنچتی تھی۔ باقی سوئچ ٹی وی اور میوزک سسٹم آن کرنے کے تھے۔ کال بیل اور انٹرکام کے تھے۔ میں نے سب کو چیک نہیں کیا کیونکہ جیکی یا جونی میں سے کوئی کسی بھی وقت آ سکتا تھا۔ کمرے میں دو ایئرکنڈیشنر چل رہے تھے اور ایئر فریشنر کے ساتھ ان کی ٹھنڈک مل کے بڑی فرحت بخش فضا پیدا کر رہی تھی۔

جیکی اچانک اندر آ گیا... وہ کچھ اپ سیٹ تھا۔

"وہ خبیث آ گیا ہے۔" جیکی نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ اس نے ہمیں دیکھ لیا تھا۔ اس نے ڈیڈ سے شکایت کی کہ ہم اسے نظرانداز کر کے نکل گئے۔"

"تم نے نام نہیں بتایا ابھی تک اس کا۔" میں نے کہا۔

"وہ خود کو میر شرافت علی کہتا ہے۔" جیکی نے کہا۔

میں بے اختیار اچھل پڑا۔ اگر جیکی میرے سامنے غبارے کی طرح اُڑ کر چھت سے جا لگتا تو میں اتنا حیران نہ ہوتا۔ "میر شرافت علی...؟"

"کیا تم اسے جانتے ہو؟" جیکی نے حیرانی سے پوچھا۔

اس وقت میں سچ بولتا تو کہتا کہ ہاں۔ میں میر شرافت علی کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں کیونکہ میں اس کا قاتل ہوں۔ اسے میں نے قتل نہیں کیا تھا۔ اس کا قاتل وہی ہے جو آج میر شرافت علی بن کے آیا ہے۔ کیا ایسا بھی ہوا ہے کبھی کہ قاتل نے مقتول کا نام رکھ لیا ہو اور اس کا روپ دھار لیا ہو۔ قانون تو قتل کی فردِ جرم مجھ پر عائد کرتا ہے مگر میر شرافت علی زندہ ہے تو میں بھی قاتل نہیں رہا۔ جب مقتول کوئی نہیں تو قاتل کون۔ میں اسے بتا سکتا تھا کہ میرے ایماندار اور اصول پرست باپ نے وزیر خان اینڈ کمپنی قائم کی تھی۔ پھر وہ میر شرافت علی کے شامل ہونے سے میر وزیر اینڈ کمپنی بن گئی تھی۔ جب دلاور شامل ہوا تو وہ ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپنی ہو گئی تھی لیکن اس میں سے ایم اور ڈبلیو ایسے خارج کر دیے گئے جیسے وہ کبھی تھے ہی نہیں۔

مگر میں نے اس سوال کے جواب میں کہا۔ "نہیں... میں

کسی میر شرافت علی کو کیسے جان سکتا ہوں... اس وقت وہ کہاں ہیں ؟"

" پیچھے ڈیڈ کے ساتھ کانفرنس میں شریک ہیں۔"

" کیا میں انھیں دیکھ سکتا ہوں... یا اُن کی گفتگو سُن سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔

" دیکھنا ذرا رسکی ہوگا۔ گفتگو سُن لو... لیکن دیکھو... یہ ایک خفیہ انتظام ہے... ڈیڈ کو بھی اس کی خبر نہیں۔" وہ بولا اور اس نے سوئچ بنیل کے نیچے بیڈ سائڈ ٹیبل کا مقفل خانہ کھول کر ایک چھوٹا سا واکی ٹاکی نکالا۔ اس کے اینٹینا کو کھینچ کے لمبا کیا اور اسے آن کر دیا۔ ڈائل پر ایک ننھی سی سُرخ لائٹ روشن ہوگئی۔ اس نے واکی ٹاکی مجھے پکڑا دیا۔ میں نے اسے کان سے لگا لیا۔

" یہ تو غلط بات ہے سلطان صاحب۔" میں نے پیڈرو کی آواز سُنی۔" آپ بیعانہ لے چکے ہیں۔"

" اچھا... مجھے تو یاد نہیں پڑتا۔" یہ یقیناً جیکی اور جونی کا باپ تھا۔ وہ اُتنی کے لہجے میں مگر زیادہ اعتماد کے ساتھ بات کرتا تھا۔

" کیا مطلب... ہم نے رسید نہیں لی... آپ پر بھروسا کیا اس لیے آپ انکار کر سکتے ہیں ؟" پیڈرو برہمی سے بولا۔

" یہ تو میں نے نہیں کہا۔" سلطان بولا۔ وہ بے حد محتاط اور ہوشیار آدمی تھا۔ غالباً اسے اندیشہ تھا کہ اس کی گفتگو کوئی ریکارڈ نہ کر رہا ہو... یا وہ اس لیے غیر سنجیدہ تھا کہ اسے کسی کا ڈر نہیں تھا۔

" سلطان صاحب... معاملہ طے ہو جانے کے بعد آپ کا رویّہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔" پیڈرو بے بسی سے بولا۔" رقم بڑھائی بھی جا سکتی ہے۔"

" بات یہ ہے میر صاحب کہ میرے بیٹے میری مخالفت کر رہے ہیں۔ ویسے کتنے میں ہوا تھا یہ سودا ؟ معاف کرنا میری یادداشت کچھ قابلِ اعتماد نہیں رہی اس عمر میں..." سلطان بولا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے اور جانتے بوجھتے پیڈرو کو زچ کر رہا ہے۔

" آئندہ ہم تحریری معاہدے کریں گے۔ بیٹے کا غذ پر قانون کے مطابق ساری کارروائی ہوگی۔ وکیلوں اور گواہوں کی موجودگی میں۔" پیڈرو نے ضبط کرتے ہوئے کہا۔" ہماری آفر پچاس لاکھ کی تھی۔ دس فیصد بیعانہ دیا تھا ہم نے... آپ اسے بھول رہے ہیں تو ہم بھی بھول جاتے ہیں۔ ہم پھر پورے پچاس لاکھ دیں گے... یکمشت مگر اس وقت جب سیل ایگریمنٹ کی رجسٹری ہوگی۔"

" اخراجات آپ کے ؟"

" اخراجات بھی ہمارے... چلیے منظور... مگر اب آپ صاف بات کریں... اپنے بیٹوں کے کندھے پر بندوق رکھ کے نہ چلائیں۔

یس یا نو..." پیڈرو کے صبر کا پیمانہ چھلکنے لگا تھا۔

" اگر میں نو کہہ دوں تو کیا ہوگا ؟" سلطان نے تیز لہجے میں سوال کیا۔

" وہ آپ دیکھ لیں گے..."

" تم دھمکی تو نہیں دے رہے ہو مجھے ؟" سلطان مشتعل نہیں تھا۔ الٹا وہ پیڈرو کا مذاق اُڑاتا محسوس ہو...

" ہم کچھ دوسری طرح کے لوگ ہیں سلطان صاحب جو کرنا ہو کر گزرتے ہیں۔ دھمکی کیا دینی۔"

" یہ اچھی بات ہے... میں بھی دوسری قسم کا آد... سلطان نے جیسے خوش ہو کے کہا۔" ایک بات سنی... میر صاحب۔ آپ کے فائدے کی بات ہے... یہ جو آپ... والے ہیں نا... ؛"

" مجھے معلوم ہے وہ اپنی فیکٹری پچاس لاکھ میں..."

" کمال ہے... تم بنی بنائی چلتی ہوئی فیکٹری کیوں نہیں..." سلطان نے کہا۔ پھر ان کے درمیان کاروباری بحث ہو...

میں نے واکی ٹاکی واپس جیکی کو تھما دیا۔

" ان مذاکرات میں تمھاری والدہ ماجدہ شریک نہیں..."

" وہ ایک پروفیشنل فیشن شو میں گئی ہے۔" جیکی نے ماجدہ کے نام پر بُرا سا منہ بنایا۔" ورنہ وہ ڈیڈ کو اتنا بولنے... کیا تم نہانا پسند کرو گے ؟ ایسا زبردست ٹرکش باتھ ہے۔"... کی طرف دیکھ کے ہنسا۔ موتی کا چہرہ گلابی پڑ گیا۔ میں نے... سر ہلا دیا۔

" ہم صرف تمھاری بیگم پارہ کو ایک نظر دیکھیں گے اور... بھائی میر شرافت علی کو۔" میں نے کہا۔

" معلوم نہیں وہ کس وقت آئے گی۔" جیکی نے کہا...

" اس کی کوئی تصویر تو ہوگی ؟"

" آف کورس... میرے ساتھ آؤ... مگر ذرا دھیان... ڈیڈ کے کمرے میں جانا ایسا ہی ہے جیسے شیر کی کچھار میں... ہونا۔" وہ بولا۔ اور باہر کوریڈور میں جھانکنے لگا۔ پھر اس... ہمیں ہاتھ کا اشارہ کیا۔ میں باہر نکلا تو موتی بھی اُٹھ کھڑ...

" تم ٹھہرو..." میں نے کہا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔" مجھے ڈر لگتا ہے۔ اس... میں معلوم نہیں کیا ہو جائے۔"

اس کی بات جیکی نے نہیں سُنی تھی۔ ہم فانوسوں... نیلے رنگ کے قالینوں والی راہداری میں چلنے لگے... جیکی... جو تھا دروازہ کھولنے کی کوشش کی اور مایوسی سے سر ہلا... مقفل تھا... اسی وقت جونی نمودار ہوا۔ اُس نے دروازے...

...ل کر دیا... وہ تالے کھولنے کا ماہر معلوم ہوتا تھا۔

" وہ آگئی ہے۔" جونی نے پیچھے دیکھ کر کہا۔

" آگئی ہے۔" جیکی بولا۔" کیا کر رہی ہے ؟"

" بیٹھی ہے اپنے سوکالڈ بھائی کے ساتھ... اور وہ اُسے لپٹا کے پیار کر رہا ہے... شیطان..." جونی نے برہمی سے کہا۔

" اگر تم ان دونوں کو ایک ساتھ دیکھ لو تو مان لو گے کہ وہ بہن بھائی نہیں ہیں۔"

" میں ان کو تصویر دکھانے لایا تھا۔" جیکی بولا۔

" جلدی سے دیکھو اور نکل جاؤ۔" جونی نے کہا۔" کہیں وہ لباس بدلنے کے لیے ہی نہ آ جائے۔"

جیکی نے کہا۔" وہ ہر ایک گھنٹے کے بعد لباس بدلتی ہے۔"

اس بیڈ روم کی شان و شوکت ہی نرالی تھی۔ یہ بیڈ روم نہیں مونٹی کارلو کے کسی ٹاپ کلاس نائٹ کلب یا ٹوکیو کے کسی فائیو اسٹار ہوٹل کا برائڈل سوئٹ لگتا تھا... میں بڑے میاں کی رنگینیٔ طبع کے نظارے پر دنگ رہ گیا۔ موتی تو ایسی گھبرائی کہ ممکن ہوتا تو وہ اُلٹے پاؤں بھاگ لیتی مگر وہ اپنی مرضی سے آئی تھی اور اب نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن۔ وہ منہ پھیرے کھڑی ہوئی کانپ رہی تھی اور میں اندازہ کر سکتا تھا کہ پسینہ اُس کے سر سے پیر تک جاری ہوگا۔ صرف بیڈ کے سامنے والی دیوار خالی تھی اور اس پر ایک ہی عورت کی قدِ آدم پورٹریٹ لگی ہوئی تھی۔

اس تصویر خانے میں قدم رکھتے ہی میں بھی مبہوت کھڑا رہ گیا تھا اور دونوں بھائی میری حیرت پر خندہ زن تھے۔

" لوسی... ہمارے ڈیڈ کتنے باذوق ہیں ؟"

" اور ہم سے زیادہ جوان دل رکھتے ہیں۔"

پھر میں نے اس پورٹریٹ کو دیکھا اور مجھ پر بجلی گر پڑی... زیب النساء۔" میرے لبوں سے بے اختیار نکل گیا۔

" زیب النساء ؟" جیکی نے حیران ہو کے کہا۔" اس کا نام پارہ ہے... میں نے بتایا تھا۔"

" ہاں... ہاں..." میں نے خود کو سنبھالا۔" مجھے یاد آگیا۔"

" یہ زیب النسا کون ہے ؟" جونی نے کہا۔" جو تمھیں یہ پورٹریٹ دیکھ کر یاد آئی۔"

" وہ... شاید تم نے تاریخ نہیں پڑھی۔" میں نے اپنے ذہن کو صدمے سے سنبھال لیا تھا۔" شہنشاہ اورنگ زیب کی بہن تھی۔ بہت خوب صورت عورت تھی۔ اور شاعرہ تھی۔ یہ ہو بہو اس کی تصویر ہے۔"

مجھے یقین تھا کہ یہ وضاحت انھیں مطمئن کر دے گی... زیب النساء جو اورنگ زیب کی بہن تھی سخت پردے میں رہتی تھی کیونکہ سخت پابندِ شرع بھائی کے عہدِ حکومت میں موسیقار، شاعر اور مصوّر معتوب تھے۔ شاید اسی لیے میں نے زیب النساء کی کوئی خیالی تصویر تک نہیں دیکھی تھی۔ انگلش میڈیم کے جیکی اور جونی نے تو اس کا نام بھی نہیں سُنا تھا۔

میرے دماغ میں زیب النساء کی اس تصویر نے عجیب طوفان بپا کر دیا تھا۔ اگر اس تصویر اور زیب النساء کے نقوش میں سرِ مُو فرق ہوتا تو میں اس مشابہت کو اتفاقیہ سمجھتا لیکن اب میں قسم کھا سکتا تھا کہ یہ وہی زیب النساء ہے جو نواب خسرو جمشید کی بہن تھی لیکن وہ لاہور میں تھی اور اس کے روز و شب کا سارا افسانہ مجھے معلوم تھا۔ وہی زیب النساء کسی سلطان محمد خان کی عشوہ فروش بیوی کیسے ہو سکتی تھی۔ بلاشبہ وہ زیب النساء بھی عشوہ گر تھی مگر وہ عشوہ فروش نہیں تھی۔ وہ بھی اپنی عشوہ طرازی سے فتنۂ محشر بپا کرنے کی اہل تھی اور اپنی معصوم ادائے حسن سے بڑے بڑے افلاطونیت کے دعوے رکھنے والوں کو کاٹھ کا اُلّو بنا سکتی تھی اور اپنی مردانگی پر ناز کرنے والوں کو اشارۂ ابرو سے چت کر سکتی تھی... یہ عورت بھی ایسا ہی کر رہی تھی لیکن مختلف انداز سے۔ جیکی اور جونی کے بیان کے مطابق یہ عورت ان کے باپ کی سیکرٹری بھی رہی تھی۔ چنانچہ طے شدہ طور پر یہ زیب النساء نہیں تھی۔ سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ پھر یہ کون تھی ؟ کیا زیب النساء کی کوئی اور بہن ؟ پورٹریٹ میں تو مصوّر نے شباب کے سورج کو نصف النہار پر دکھایا تھا لیکن ایسا تو سب ہی مصوّر کرتے ہیں۔ کوئی عورت ایسی پورٹریٹ پسند نہیں کرتی جو اس کی اصل عمر ظاہر کرے۔ وہ خود کو پورٹریٹ میں بہرحال ہمیشہ جوان دیکھتے رہنا چاہتی ہے۔ یہ زیب النساء کی بڑی بہن ہو سکتی تھی۔ مگر اس کا فیصلہ میں پارہ کو دیکھ کر ہی کر سکتا تھا۔ اس سوال کا جواب بھی صرف نواب خسرو جمشید ہی دے سکتا تھا کہ زیب النساء کے علاوہ بھی اس کی کوئی بہن تھی یا نہیں... جہاں تک مجھے یاد پڑتا تھا اس نے زیب النسا کو اپنی اکلوتی بہن کہا تھا۔ میرا دماغ اس معمے میں اُلجھنے لگا تھا۔ پیڈرو... بیگم پارہ... زیب النساء اور خسرو جمشید۔ ان سب کے درمیان تعلق تو ثابت تھا اور اس کی نوعیت بھی واضح تھی۔ یہ ایک ایسی مستطیل بنتی تھی جس کے دو ضلعے جمشید اور زیب النساء تھے تو دوسرے دو ضلعے پیڈرو اور یہ عورت بیگم پارہ... جسے پیڈرو میر شرافت علی بن کے اپنی بہن کہتا تھا مگر جیکی کا یقین بہن بھائی کے رشتے کی نفی کرتا تھا۔ خیر آج رات خسرو جمشید سے تو ملاقات ہونی ہے۔ میں نے سوچا۔

" اب چلو بھی نا..." میں نے موتی کی آواز سنی اور جیکی کو ہنستا ہوا دیکھا تو چونکا۔ مجھے احساس ہوا کہ میں بہت دیر تک اس پورٹریٹ کو گھورتا رہا ہوں۔ میں پلٹا ہی تھا کہ دروازہ کھلا اور میں نے سلطان محمد خان کو اپنے سامنے پایا۔ اسے ایک نظر دیکھتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ وہ جیکی اور جونی کا باپ ہے۔ اس کی صورت

میں اپنے دونوں بیٹوں کے نقوش کی جھلک تھی۔ اس کی آنکھیں جیکی کی آنکھوں کی طرح بڑی اور براؤن تھیں۔ اس کی ناک جونی کی طرح اٹھی ہوئی تھی۔ بال جیکی کی طرح براؤن شیڈ دیتے تھے تو دہانہ جونی کی طرح تھا۔ وہ قد کاٹھ میں دونوں بیٹوں سے بہتر تھا اور پچاس سال کی عمر میں بھی قابلِ رشک صحت رکھتا تھا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے یہاں؟" اس نے مجھے اور موہنی کو گھورنے کے بعد دونوں بیٹوں کی طرف دیکھا۔

"کچھ نہیں ڈیڈ..."

"کچھ نہیں کے بچّے... تم نے دروازہ کیسے کھولا... کس کے پاس ہے چابی...؟" اس نے چٹکی بجا کے ہاتھ پھیلایا۔

جونی نے چابی نکال کے باپ کے ہاتھ پر رکھ دی۔ باپ کے سامنے ان دونوں کی ساری سرکشی اور شوخی ہوا ہوگئی تھی۔

"یہ دونوں کون ہیں؟"

"ہمارے مہمان۔" جیکی نے بے اعتماد لہجے میں کہا۔

"مہمان۔" سلطان نے طنز سے کہا۔ "یہ لڑکی تو ہو سکتی ہے لیکن یہ بڈھا کارتوس... یہ تمہارا مہمان نہیں ہو سکتا... کیوں لائے تھے ان کو میرے بیڈروم میں... تمہارے مہمان تھے تو تمہارے کمرے میں کیوں نہیں رہے۔" وہ اب شیر کی طرح گرج رہا تھا۔ صورتِ حال یکلخت خطرناک ہونے لگی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں جیکی اور جونی سچ نہ بک دیں۔ باپ کے سامنے وہ احمق اور بے بس لگتے تھے۔ موہنی ڈر کے تقریباً مجھ سے چمٹ گئی تھی اور مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا۔ پیڈرو اسی گھر کی چھت کے نیچے موجود تھا اور یہ شور سن کے اوپر بھی آ سکتا تھا۔ اپنی بہن کے گھر میں وہ بلا روک ٹوک ہر جگہ جانے کے لیے آزاد تھا۔

"تم لوگ نہیں بتاؤ گے؟" سلطان نے کہا۔ "ٹھیک ہے، میں خود معلوم کر لوں گا۔"

"ڈیڈ... یہ شخص..." جیکی نے کہا۔ "اور اس کی بیٹی..."

سلطان کا ہاتھ ایک سوئچ کی طرف بڑھتے بڑھتے رک گیا۔ "یس؟"

"یہ آپ کو کچھ بتانا چاہتا تھا..." جیکی نے کہا۔ "اس زمین کے بارے میں جس کا سودا آپ میر شرافت علی سے کر رہے ہیں۔"

"وہ میری زمین ہے... اس کے بارے میں کوئی مجھے کیا بتائے گا؟" سلطان نے کہا۔

"یہ دونوں بہت دیر سے باہر بیٹھے ہوئے تھے کوئی ان کو اندر نہیں آنے دیتا تھا۔" جیکی نے کہا۔ "اور یہ بضد تھے کہ صرف آپ سے بات کریں گے... وہ بھی اکیلے میں... چنانچہ..."

"چنانچہ تم ان کو میرے بیڈروم میں لے آئے؟ کیا اکیلے میں کہیں اور بات نہیں ہو سکتی تھی۔" سلطان نے برہمی سے کہا۔

"ایسی کون سی بات تھی بڈھے... اسی وقت بتاؤ ورنہ بہ...
نہیں ہوگا..."

"ہم اپنے پیرومرشد کے حکم سے آئے تھے اللہ کے بند...
میں نے اوپر انگلی اٹھا کے کہا۔ "اس زمین کو ہمارے پیرومرشد...
سونگھا اور کہا یہ مٹی نہیں سونا ہے... مگر کوئی اسے کوڑیوں...
مول بیچ رہا ہے۔"

"او شٹ اپ..." سلطان نے چلّا کے کہا۔ "مجھے بتہ...
یہ کس قسم کا ڈراما ہے... گویا اب تم مجھے ان پیروں فقیروں...
ذریعے قائل کرو گے کہ میں غلطی کر رہا ہوں... اتنا بے وقوف سمجھ...
ہو تم مجھے؟ میں انھیں اور ان کے پیرومرشد جیسے بدمعاش...
سیدھا کرنا جانتا ہوں... مجھ سے بڑا پیر کوئی نہیں۔" اس ن...
ایک بٹن دبا دیا۔

حسبِ توقع دو خادم نمودار ہوئے۔ وہ دونوں خاصے...
تندرست تھے اور مسلح بھی ہو سکتے تھے۔ موہنی نے رونا شروع...

"ان دونوں کو تہ خانے میں لے جاؤ۔" سلطان نے...
"اور اُلٹا لٹکا دو... مجھے یہ کوئی نوسرباز لگتے ہیں... جو مجھے لو...
آئے تھے... اور یہ میرے احمق بیٹے انھیں اندر لے آئے...
کا نقشہ دیکھ لیں۔ بعد میں گروہ کے دوسرے لوگ آئیں تو ان کو...
پریشانی نہ ہو... میں خود ان سے تفتیش کروں گا... ذرا ہم...
پہ چلے جائیں۔"

وہ دونوں آگے بڑھے اور انھوں نے اپنے جارحانہ...
سے خود کو ٹارزن کا باپ ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ جیکی کا رنگ...
اُڑ گیا۔ وہ خود کو اس صورتِ حال کا ذمّے دار سمجھتا تھا اور اسے...
زیادہ اپنی فکر تھی۔ اس نے اور جونی نے ہم سے ایک معاہدہ...
تھا اور اب اسے سخت پریشانی لاحق ہو گئی تھی کہ تفتیش کے...
نتیجے میں ہم نے اس معاہدے کے بارے میں بھی بتا دیا تو ڈیڈ...
کا کیا حشر کریں گے؟

میں نے ان دونوں کو نظروں میں تولا جو مجھے دبوچنے...
لیے ایسے بڑھ رہے تھے جیسے وہ ببر شیروں کی جوڑی ہو...
ہم دونوں کمزور ہرنوں کا جوڑا۔ ان کی خوش فہمی ایک داؤ میں...
ہو سکتی تھی اور پلک جھپکنے میں وہ اُلٹ کر اپنے مالک کے...
میں جا گرتے اور شاید خود اُٹھ بھی نہ پاتے... لیکن میں نے مقاب...
کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ یہ لڑنے بھڑنے کے لیے صحیح جگہ نہ تھی...
میں اس کمرے سے نکل جاتا تو اتنی بڑی کوٹھی میں سے بہرحال...
نکل پاتا۔ میں نے موہنی کے شانے پر تھپکی دے کر اسے حوصلہ...
رکھنے کو کہا۔

"رُک جا۔" میں نے کڑک کر ایک نعرہ مارا۔ "اللہ کے بند...
وہیں رُک جا... فقیروں کو ہاتھ مت لگا بھسم ہو جائے گا۔"

وہ دونوں رُک گئے۔ یہ ایک غیر ارادی عمل تھا۔

میں خود آگے بڑھا۔ "چل... ہم خود چلتے ہیں تیرے ساتھ... تو اپنی طاقت آزما... ہم تجھے اپنا جلال دکھاتے ہیں۔" میں نے گرج کر کہا۔ "تو ڈال بیڑیاں... ہم اللہ ہُو سے کاٹ دیں گے تو اونچی دیواریں... ہم پھونک مار کے گرا دیں گے... حق اللہ..."

میں سمجھتا ہوں میری اداکاری کام کر گئی۔ وہ دونوں تذبذب کا شکار ہو گئے کیونکہ وہ جاہل اور کمزور عقیدے کے لوگ تھے جو پیری فقیری کے شعبدوں اور درویشوں کی کرامات کے جھوٹے سچے قصے سنتے رہتے تھے اور دل میں ان کے لیے عقیدت کے جذبات بھی رکھتے تھے۔ انھوں نے مجھے ہاتھ نہیں لگایا۔ خود سلطان خان کے غصّے کا آتش فشاں سرد پڑنے لگا۔ اب میں سینہ تانے آگے چل رہا تھا اور موہنی میرے ساتھ تھی۔ دونوں غلام میرے پیچھے ہو گئے تھے۔

"سنو... ایک منٹ ٹھہرو۔" سلطان محمد نے کہا۔

دونوں محافظ رُک گئے۔ میں نے حق اللہ کا ایک اور نعرہ مارا۔

"انھیں باہر چھوڑ آؤ۔" سلطان محمد نے کہا۔ "لیکن جیکی، یہ چکر پھر مت چلانا... تم ایسی حرکتوں سے میرا فیصلہ نہیں بدل سکتے۔"

"یس ڈیڈ..." جیکی نے اطمینان کا سانس لیا۔

"چلو اللہ لوگ۔" دونوں محافظوں میں سے ایک نے باادب ہو کے مجھے اشارہ کیا۔ "گستاخی معاف..."

میں نے ایک قدم آگے بڑھایا اور پیڈرو سے ٹکرا گیا جو سیدھا اندر آ رہا تھا۔ وہ نعرے بازی سن کے تیزی سے اوپر آیا تھا اور اُسے مجھ سے مڈبھیڑ ہونے کی بالکل توقع نہیں تھی۔ اس کے برعکس میں جانتا تھا کہ وہ گھر میں ہے۔ اسے تصادم کے بعد مجھے غور سے دیکھنے کی مہلت نہ ملی۔ میں نے بڑی پھرتی سے اس کا ایک ہاتھ لیں مروڑا کہ وہ گھوم گیا۔ اتنی دیر میں میرا دوسرا ہاتھ ریوالور نکال چکا تھا۔ میرے آرم لاک نے پیڈرو کو اتنا بے بس کر دیا تھا کہ وہ ہل بھی نہیں سکتا تھا۔ اگر وہ زور لگاتا تو اس کا بازو کلائی پر سے ٹوٹ جاتا... میں اب راہداری میں تھا اور موہنی ایک دم میرے پیچھے آ گئی تھی۔ باقی سب اس ڈرامائی تبدیلی کو سمجھنے کی کوشش میں ہکا بکا کھڑے رہ گئے تھے۔ جب محافظوں کو اپنا فرض یاد آیا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔

"خبردار... بالکل آرام سے کھڑے رہو... اللہ کے بندو۔" میں نے اسی فقیرانہ لہجے میں کہا۔ "جس نے حرکت کی، وہ فقیر کا جلال دیکھے گا۔"

"سلطان۔" پیڈرو نے چیخ کر کہا۔ "گولی مار دو اس کتے کو..."

میں تمہارے گھر میں ہوں... تمہارا مہمان ہوں..."

سلطان نے سر ہلایا۔ "فکر مت کرو... یہ تم کو نقصان نہیں پہنچا سکے گا... جیکی... تم اسے ساتھ لائے تھے؟"

جونی اور جیکی نے بمشکل تمام سر ہلایا... "تم... یہ کیا کر رہے ہو؟"

"یہ تمہارے سمجھنے کی باتیں نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔ "تم ابھی بچے ہو... بہتر ہے کہ خاموش رہو۔"

ایک محافظ نے بڑی تیزی سے جست لگائی تھی مگر میرا سیدھا پاؤں بجلی کی طرح حرکت میں آیا۔ ٹھوکر اس کے سینے پر پڑی۔ وہ ایک چیخ مار کے دروازے کی چوکھٹ سے ٹکرایا اور نیچے گر گیا۔ وہ بالکل فٹ بال کی طرح اُچھل کے گیا تھا اور یہ منظر ان سب کے لیے ناقابلِ یقین تھا کہ ایک کھچڑی داڑھی اور گنجے سر والے بوڑھے نے چھ فٹ قد والے دو سو پونڈ وزن کے جوان آدمی کو ایسے اُچھال دیا تھا۔ نیچے گرنے والا اب درد سے بلبلا رہا تھا اور سینے کو مٹھی سے پکڑے لوٹ رہا تھا۔

"میر صاحب کی جیب سے ریوالور نکال لو۔" میں نے موہنی کو اشارہ کیا۔ موہنی ڈرتے ڈرتے آگے بڑھی۔

"کمینی......" پیڈرو نے اُسے دانت پیس کے گالی دی اور اس کا بایاں ہاتھ حرکت میں آیا۔ موہنی اگر اچھل کے پیچھے نہ ہو جاتی تو ہاتھ اس کے مُنہ پر پڑتا۔

میں نے پیڈرو کو آگے جھٹکا دیا اور اس کی کمر میں سر مارا۔ وہ جھٹکے سے پیچھے آیا تو میں نے پھر اس کے ساتھ یہی سلوک کیا۔ وہ آگے جھکا اور اس کا سر راہداری کی دیوار سے ٹکرایا۔ ایک عورت پیچھے سے چیختی ہوئی اوپر آئی۔ میں نے اُسے پہچان لیا۔ وہ سلطان کی دوسری بیوی تھی، جو زیب النساء کی ہم شکل ضرور تھی مگر اس کی اور زیب النساء کی عمر میں بہت فرق تھا۔ زیب النساء میرے اندازے کے مطابق اٹھارہ بیس سال کی تھی تو یہ عورت اڑتیس چالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ مصوّر نے اس کی پورٹریٹ میں دس سال کم کیے تھے تو دس سال خود وہ اپنی عمر سے چھوٹی لگتی تھی۔ اس میں کمال اس کی صورت کے نقوش اور جسم کی ساخت کا بھی تھا اور خود اس کی توجہ اور محنت کا بھی... جو اس نے خود کو فٹ رکھنے میں صرف کی ہو گی۔ لباس اور میک اپ کا انداز اس کا مزید معاون ثابت ہوا تھا مگر اس کے باوجود مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ زیب النساء کی بڑی بہن نہیں، اس کی ماں ہے۔

"خدا کے لیے چھوڑ دو اسے... یہ کیا کر رہے ہو تم۔" وہ تیر کی طرح میری طرف بڑھ رہی تھی کہ موہنی نے اس کو اپنی حاضر دماغی سے روک لیا۔ اس نے اپنی ٹانگ اڑا دی اور وہ تیز رفتاری میں خود کو سنبھال نہ سکی۔ وہ مُنہ کے بل گری اور پھر اُٹھی تو موہنی نے

اُسے اندر دھکیل دیا۔
پیڈرو اب ایسے جھوم رہا تھا جیسے وہ نشے میں ہو۔ میں نے پھر موہنی سے کہا "اس کو نہتا کردو۔ اب اس نے کوئی حرکت کی تو میں اس کے کپڑے اتار کر اسے سب کے سامنے اتنا ماروں گا کہ یہ اپنی اصلیت بھی بھول جائے گا۔"
موہنی نے اس کی جیب سے ریوالور نکال لیا۔
"جیکی... میں کسی کو نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "اپنے ڈیڈ سے کہو کہ میرا راستہ روکنے کی کوشش نہ کریں۔ میں صرف اس شخص... میر شرافت علی کے لیے آیا تھا اور اسے ضرور اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"
سلطان نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں نہیں جانتا کہ تم کون ہو اور تمھاری میر شرافت علی سے کیا دشمنی ہے... لیکن جو تم چاہتے ہو وہ نہیں ہو سکتا۔"
"ڈیڈ... پلیز آپ دخل مت دیں۔" جونی نے کہا۔
"آپ کو کیا ضرورت ہے...؟" جیکی نے کہا۔
"ضرورت ہے...!" سلطان نے اس کی بات کاٹ دی۔ "ان کی دشمنی اس گھر کی چار دیواری سے باہر رہنی چاہیے۔ یہاں جو بھی ہے سلطان محمد خان کا مہمان ہے اس کی حفاظت میں ہے۔"
"کیا یہی ضمانت آپ میرے لیے بھی فراہم کر سکتے ہیں؟" میں نے کہا۔
"تمھارے لیے؟ تم میرے مہمان نہیں ہو۔" سلطان نے حقارت سے کہا۔
"آپ ہمارے مہمانوں کو اس گھر کا مہمان نہیں سمجھتے؟" جیکی نے تیز ہو کے کہا۔
"اگر آپ اپنے مہمانوں کی حفاظت کر سکتے ہیں تو ہم بھی اپنے مہمانوں کی حفاظت کر سکتے ہیں۔" جونی نے سرکش لہجے میں کہا۔
"کیا... تم دونوں پاگل ہو گئے ہو؟" سلطان نے اپنے جوان بیٹوں کو دیکھا جو اس کے خلاف صف آرا ہو گئے تھے۔
"تم نہیں جانتے... یہ کون ہے...؟" پیڈرو کراہ کے بولا۔
"میر صاحب... یہ بھی نہیں جانتے کہ آپ کون ہیں؟" میں نے کہا۔
"دیکھو... یہ ناممکن ہے کہ تم اس حویلی سے میری اجازت کے بغیر نکل سکو... تمھیں اندازہ نہیں کہ باہر حفاظتی انتظامات کتنے سخت ہیں اور کتنے محافظ ہیں جو تمھارا راستہ روک سکتے ہیں۔" سلطان نے کہا۔ "تمھیں یہ بھی سوچنا چاہیے کہ تم کس کے گھر میں ہو۔ میرا ایک ٹیلی فون کافی ہے۔ میں کمشنر یا ڈی آئی جی سے براہ راست بات کر سکتا ہوں اور..."

"میں آپ کو فون تک جانے کی اجازت دیتا ہوں" میں نے کہا۔ "مگر سلطان صاحب... اگر آپ عزت دار آدمی ہیں تو اس بات کو گھر کی چار دیواری سے باہر نہ جانے دیں۔ اسی میں آپ کا فائدہ ہے ورنہ آپ کو بہت کچھ بتانا پڑے گا جو آپ کے مفاد میں نہیں ہوگا۔ آپ لمبے چکر میں آجائیں گے۔ کیوں میر شرافت علی؟" میں نے اُسے ایک جھٹکا دیا اور اس کا سر دیوار سے لگا۔
"بتاؤ انھیں... کہ ان کے حق میں کیا بہتر ہے۔" میں نے کہا۔
پیڈرو سر ہلانے لگا۔ "میں... خود نمٹ لوں گا ان سے تم دخل مت دو۔" وہ ایسا کہنے پر مجبور تھا۔ اگر وہ میرے بارے میں ایک بھی لفظ زبان سے نکالتا تو میں سلطان پر اس کی اصلیت عیاں کر دیتا۔ پیڈرو سمجھتا تھا کہ ہم کسی کے روکے سے رُکنے والے نہیں ہیں... ہم اُسے بھی مار سکتے ہیں اور سلطان کو بھی۔ اور کچھ نہ کریں تو سلطان کو یہ ضرور بتا سکتے ہیں کہ اس کا اصل نام پیڈرو ہے... وہ دلاور کا ساتھی ہے اور ایک غدار ہے جو اس کی صنعتی زمین کو اپنی اسلحہ ساز فیکٹری لگانے کے لیے استعمال کرے گا... اور وہ سب اسلحہ ملک کے دشمنوں کو فروخت کیا جائے گا۔
"لیکن... یہ تم کو مار دیں گے۔" بیگم پارہ چلائی۔ "تم انھیں روکو سلطان...!"
جیکی اور جونی ایک دم اپنے باپ کے دائیں بائیں آگئے "ہم اپنے اپنے مہمانوں کے ضامن ہیں... کیوں ڈیڈ؟"
سلطان نے سر ہلا لیا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ اس وقت بیوی کی عشوہ فروشی کا جادو بے اثر ہے اس کے مقابل جوان اولاد تھی، ان کی زندگی تھی۔ اس گھر کی عزت تھی اور اس کا مستقبل تھا... وہ مجبور ہو گیا تھا کہ جوش کے بجائے ہوش سے کام لے اور حالات کو زیادہ خراب ہونے سے بچا لے۔ وہ میر شرافت علی کو اپنا سالا سمجھتا تھا مگر سالے پر وہ اپنی اور بیٹوں کی زندگی قربان نہیں کر سکتا تھا... اگر انتخاب کا یہ حق کسی بھی شخص کو دیا جائے تو وہ مجبور ہو گا کہ اپنی انا کی شکست قبول کر لے۔ اگر پہلے ایسا نہیں ہوا تھا تو اب ہو رہا تھا کہ سلطان محمد خان اپنی حویلی میں اپنے ایک مہمان کو تحفظ کی ضمانت دے کر پیچھے ہٹ گیا تھا۔ بہت کچھ جو پہلے نہیں ہوا تھا اب ہو رہا تھا... اور آئندہ بھی ہو گا... وقت... قدریں... اصول... سب بدلتے ہیں۔ ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں...
سلطان کی بیوی اب بھی چلّا رہی تھی۔ جیکی اور جونی خوش تھے کہ معاملات بگڑ گئے اور پھر بات بنی تو یوں بنی کہ سلطان محمد خان اور میر شرافت علی کے درمیان بداعتمادی پیدا ہو گئی اور ان کے درمیان ہونے والے سودے کی خرابی یقینی ہو گئی۔ وہ یہی چاہتے تھے چنانچہ وہ میری مدد کر رہے تھے۔
"تم حوصلہ رکھو۔" سلطان نے اپنی بیوی سے کہا۔ "تمھارے بھائی کو کچھ نہیں ہو گا۔ میں کچھ نہیں ہونے دوں گا۔ میں ان کے ساتھ باہر تک جاؤں گا۔"
"ہم بھی باہر تک ساتھ جائیں گے۔" جیکی نے کہا۔
"اندر کوئی خون خرابا نہیں ہو گا۔" سلطان نے کہا۔ "کوئی گولی نہیں چلائے گا۔"
"کوئی ہمارا راستہ نہیں روکے گا... اپنی گھر والی کو بھی یہ بات سمجھا دو کہ تمھاری واپسی تک کچھ نہ کرے۔" میں نے کہا۔ "ہم وعدہ کرتے ہیں کہ نہ کسی کو ہمارے یہاں آنے کی خبر ہو گی نہ جانے کی۔"
"ٹھیک ہے... باہر دو گاڑیاں کھڑی ہوئی ہیں۔ ایک سفید رنگ کی بیوک ہے۔" سلطان نے کہا۔ "دوسری سیاہ رنگ کی کیڈلک... ایک میر شرافت علی کو لے جائے گی۔ دوسری تمھیں... ایک کو جان محمد ڈرائیو کرے گا۔ دوسرے کو شفیع محمد... اور باہر نکلنے کے بعد ایک دائیں طرف جائے گی اور دوسری بائیں طرف... دونوں گاڑیاں ٹھیک پانچویں میل پر تمھیں ڈراپ کر کے واپس آجائیں گی۔ اس وقت تم دونوں کے درمیان دس میل کا فاصلہ ہو گا۔"
"مجھے منظور ہے۔" میں نے کہا۔
"دونوں گاڑیوں میں ایک ایک مسلح محافظ بھی ہو گا... مشین گن کے ساتھ جو میرے بیٹوں کی حفاظت کرے گا۔" وہ بولا۔
"مجھے یہ بھی منظور ہے۔" میں نے کہا۔ "صرف آپ کی عزت کی خاطر میں میر شرافت علی جیسے دشمن کو چھوڑ رہا ہوں... اس سے پھر کبھی کہیں اور ملاقات ہو گی۔"
"چھوڑنے والا میں بھی نہیں ہوں تمھیں۔" پیڈرو کا حوصلہ لوٹ آیا۔ "نمٹ لوں گا جب وقت آئے گا۔"
سلطان کو پیڈرو کی طرف سے کوئی اندیشہ نہیں تھا کہ وہ اسے یا اس کے بیٹوں کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ جو محافظ بھیجا جا رہا تھا وہ اسی کی حفاظت کے لیے تھا لیکن میں اس لیے مطمئن تھا کہ جیکی یا جونی کی موجودگی میں پیڈرو اس محافظ کو ہماری گاڑی کے تعاقب پر مجبور نہیں کر سکے گا۔ کوٹھی کے اندر یا سڑک پر کسی قسم کی محاذ آرائی کا سوال ہی نہ تھا۔ پیڈرو کو روکنے کی صورت میں ہم خود بھی مصیبت میں پڑتے چنانچہ میں نے اس دشمنی سے دستبرداری قبول کر لی۔ آج کی رات مجھے دوسرے دشمن سے نمٹنا تھا۔ مظفر گڑھ ملتان سے دُور نہیں تھا اور وہاں کسی رانی کی حویلی میں نواب خسرو جمشید سے ملاقات زیادہ اہم تھی۔
دونوں کاریں ایک ساتھ روانہ ہوئیں۔ سلطان ہمارے ساتھ باہر تک آیا اور اس وقت تک کھڑا رہا جب تک کاریں گیٹ سے نہیں نکل گئیں۔ ہم سفید بیوک میں تھے اور اسے جیکی چلا رہا تھا۔ محافظ آگے اس کے ساتھ مشین گن لے کر بیٹھا تھا اور اسے سلطان نے بہت واضح احکامات دیے تھے۔ ان مہمانوں کو ٹھیک پانچ میل کے فاصلے پر اتار کے گاڑیاں واپس لے آؤ... جیکی یا جونی کے لیے خطرہ محسوس ہو تو بے دریغ جان پر کھیل جاؤ... مار دو اور مر جاؤ... بصورتِ دیگر خاموشی سے لوٹ آؤ۔
جیکی نے مجھے پانچویں میل پر ایک ایسی جگہ اتارا جہاں سے بس کا اڈّا بہت قریب تھا۔ جب میں نے اس کا شکریہ ادا کر کے اس سے مصافحہ کیا تو اس نے میرا ہاتھ دبایا۔ یہ شکریہ ادا کرنے کا ایک طریقہ تھا۔ وہ ساتھ بیٹھے ہوئے محافظ کی موجودگی میں کچھ بول نہیں سکتا تھا۔ کار واپس ہوئی اور چند سیکنڈ میں نظر سے اوجھل ہو گئی تو میں نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔
"اچھی لفٹ لی تھی تم نے۔" میں نے کہا۔
"مجھے الزام دے رہے ہو۔" موہنی چراغ پا ہو کے بولی... "میں نے کہا تھا کہ ان کے مہمان بنو؟"
"بڑے بُرے پھنسے تھے... مگر خیر... قسمت اچھی تھی کہ نکل بھی آئے... تم نے تو میر شرافت علی کو پہچان لیا ہو گا...؟" میں نے کہا۔
"ہاں... یہ وہی جعلی میجر تھا... مگر اس نے بھی تو مجھے پہچان لیا ہو گا۔" وہ بولی۔
میرے پاس ضائع کرنے کے لیے بالکل وقت نہیں تھا۔ حالات مجھے ایسے موڑ پر لے آئے تھے کہ ایک ساتھ دو پُرانے شکاری ایک ہی رات میں میرا شکار ہو سکتے تھے مگر مجھے ایک کا انتخاب کرنا پڑا۔ میں اگر چاہتا تو پیڈرو کو یوں نہ نکلنے دیتا لیکن میں جیکی اور جونی کے گھر میں خون خرابا نہیں چاہتا تھا۔ ان دونوں لڑکوں کی دوستی سے مجھے آگے چل کے زیادہ فائدہ ہو سکتا تھا۔ یہ ایک اتفاق تھا کہ وہ درمیان کی کڑی بن گئے اور مجھے دُہرا فائدہ حاصل ہوا۔ ایک طرف تو پیڈرو کی مُنہ بولی بہن کے بارے میں سنسنی خیز انکشافات ہوئے۔ دوسری طرف اسی بہانے جیکی اور جونی کا فائدہ الگ ہوا اور دلاور اینڈ کمپنی کا بنا بنایا کام بگڑ گیا۔ معلوم نہیں سلطان محمد خان کس لالچ

میں ان کو اپنا قطعۂ زمین بیچنے پر تیار ہو گیا تھا جس کی قیمت پچاس لاکھ کو بیکی اور بجوتی بہت کم سمجھتے تھے۔ ممکن ہے دلاور اینڈ کمپنی نے سلطان کو بھی اپنے "کاروبار" میں سلیپنگ پارٹنر بنا کے دس پندرہ فیصد منافع دینے کی بات کی ہو۔ بہ ظاہر سلطان انھیں اپنا پلاٹ بیچنے پر رضا مند نظر نہیں آتا تھا اور اپنی بیگم پارہ کے دباؤ میں یہ سودا کر رہا تھا۔

"اب کھڑے کیا سوچ رہے ہو؟" موہنی نے کہا۔ "کہیں وہ بدمعاش پیڈرو نہ آجائے۔"

میں چونکا۔ "وہ ادھر کیسے آسکتا ہے؟"

"اچھا تو پھر کھڑے رہو۔" موہنی چڑ کے بولی۔ "جب وہ آجائے تو اس سے پوچھ لینا کہ بھائی صاحب کیسے تشریف لائے؟"

میں ہنس پڑا۔ "گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کا رخ کرتا ہے۔"

"معلوم نہیں گیدڑ کون ہے۔" موہنی ٹھکائی سے بولی۔ "اس وقت تو سب ہی شہر میں ہیں۔"

"چلو پھر ہم شہر سے بھاگ جاتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن کیا بس کا سفر ہمارے شایانِ شان ہوگا؟"

"پتا نہیں... برطانوی شاہی بجرہ منگوا لو۔"

میں نے ایک طرف کرائے کی سوزوکی گاڑیوں کے ساتھ کاروں کی قطار دیکھی۔ یہ کوئی پارکنگ ایریا نہیں تھا، جہاں کسی کو چھوڑنے یا لینے کے لیے آنے والے گاڑیاں کھڑی کرتے ہیں۔ پھر ان کے ڈرائیور جس پُرامید نظر سے آنے جانے والے مسافروں کو دیکھ رہے تھے اس سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ وہ پرائیویٹ ٹیکسیاں ہیں۔ ابھی میں نے ایک سے ہی بات کی تھی کہ مجھے چار نے گھیر لیا۔ مظفر گڑھ تک جانے کے ایک نے چار سو مانگے۔

"چار سو... !" میں نے یوں کہا جیسے مجھے ہارٹ اٹیک ہو گیا ہے۔

"چلو جی تین سو دے دینا۔" دوسرے نے فوراً رعایت دی۔ پہلے والے نے اسے ملامت بھری نظروں سے دیکھا۔

"تین سو بھی بہت زیادہ ہیں۔" میں نے فریاد کی۔

"تو کیا تین روپے میں جانے کا خیال ہے؟" پہلے والا مایوس ہو کے چل پڑا۔ "میں تو کہتا ہوں پیدل چلے جاؤ۔"

"ہاں... تین روپے بھی بچ جائیں گے۔ جان مفت میں بنے گی۔" دوسرا بھی الگ ہو گیا۔

"بابا جی... ڈھائی سو میں چلتے ہو تو بات کرو۔" تیسرے نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

"دو سو۔" میں نے کہا۔ چوتھا کچھ تیار ہو رہا تھا کہ میں نے فوراً تیسرے سے بات پکی کرلی۔ دراصل وہ سب سے کمزور الحیثیم صورت تھا اور چوتھا کچھ پہلوان اور بدمعاش ٹائپ لگتا تھا۔

ایک گھنٹے بعد ہم مظفر گڑھ کے بازار میں اُتر گئے۔ پھر ہم نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ گفتگو میں سلطان محمد کا کوئی حوالہ آئے یا مظفر گڑھ میں تشریف آوری کا مقصد کسی کو معلوم ہو۔ مجھے اندیشہ تھا کہ پیڈرو بس کے اڈوں پر جا کے اور میرا حلیہ بتا کے معلوم کرنے کی کوشش کرے گا کہ میں کس طرف گیا ہوں۔ یہی کوشش وہ اسٹیشن پر بھی کر سکتا تھا۔ اُسے یقیناً پریشانی لاحق ہوگی کہ میں کے گھر تک کیسے پہنچ گیا اور وہ بھی موہنی کے ساتھ۔

رات کے دس بجے مظفر گڑھ کے بازار میں بہت کم رونق تھی۔ مشروبات یعنی لسی چائے اور شربت بیچنے والوں کے علاوہ مٹھائی کی دکانیں اور چند ہوٹل کھلے رہ گئے تھے۔ ایک ہوٹل پر سائن بورڈ پر اعلان کردیا گیا تھا کہ "یہاں شرفا کے طعام و قیام کا اعلیٰ انتظام ہے" اور اس کے ساتھ ہی فیملی روم کی سمت واضح کرنے کے لیے تیر کا نشان بنایا گیا تھا۔ میں نے موہنی کے ساتھ رات کا کھانا کھانے کا فیصلہ کیا۔

ہمارے داخل ہوتے ہی شرفا کا ایک جوڑا جو کیبن نمبر ایک کی پرائیویسی میں اس وقت کسی کی دخل اندازی کے امکانات سے بے نیاز تھا، چونک پڑا۔ موہنی کا رنگ لال پڑ گیا۔

"یہ کیا واہیات جگہ ہے؟" اس نے دو نمبر کیبن میں بیٹھ کر کہا۔

"کوئی جگہ خراب نہیں ہوتی... لوگ خراب ہوتے ہیں یا ان کے اعمال۔" میں نے ایک فلسفیانہ نظریہ پیش کیا۔ "اب اس کے برعکس اگر میں اس اسپتال کی مثال دوں جہاں تم نرس تھیں تو وہ جگہ اور تمہارا پیشہ بے حد قابلِ عزت سمجھے جاتے ہیں... مگر تم خود..."

"میں یہاں تمہاری گالیاں کھانے نہیں، کھانا کھانے آئی ہوں۔" وہ بولی۔

"سوری۔ کبھی کبھی میرے پیٹ میں سچ کا مروڑ اُٹھتا ہے تو غیر ضروری بات بھی زبان سے نکل جاتی ہے۔" میں نے کہا۔ اسی وقت ویٹر نمودار ہوا۔

میں اس انتظار میں تھا کہ اب وہ فر فر مینو پڑھنا شروع کرے گا جس کے کچھ الفاظ یقیناً میری سمجھ میں آجائیں گے مگر اس نے کہا "دال فرائی" اور موہنی کو گھورنے لگا۔

"آگے بھی بولو استاد۔" میں نے اس کے سامنے چٹکی بجا کے کہا۔

"آگے کچھ نہیں... سب ختم ہو گیا۔" وہ شرمندہ ہوئے بغیر بولا۔

"بس تو پھر پوچھنا کیسا... بسم اللہ..."

کھانا واجبی تھا مگر وہاں چائے بہت اچھی ملی... باہر سگریٹ بھی اچھے مل گئے۔ اس وقت تک بازار مزید ویران ہو چکا تھا۔ میں نے سگریٹ والے سے کہا۔ "بابو... یہ رانی کی حویلی کدھر ہے؟"

"رانی کی حویلی؟ اس وقت جاؤ گے؟" وہ میٹھا پان بناتے ہوئے بولا۔ پان میں نے موہنی کو دے دیا۔

"کیا وہاں جانے کے لیے وقت مقرر ہے؟" میں نے سادگی سے کہا۔

"نہیں... مگر تمہارے ساتھ زنانی ہے۔" وہ بولا۔

"کیا وہاں عورتوں کا جانا منع ہے؟"

"او یار... داڑھی سفید ہوگئی... عقل نہیں آئی۔" وہ جھلا کے بولا۔ "بابا وہ تین میل دور ہے۔ اُدھر سے گھوم کے جاؤ تو سیدھی سڑک وہاں جاتی ہے... مگر راستہ ویران ہے۔ جنگل پڑتا ہے بیچ میں۔"

"کیا جنگل میں شیر ہیں آدم خور؟" میں نے سہم کر کہا۔

"اُف... کیسے کیسے پاگل کے نیچے پڑتے ہیں دنیا...!"

"کیا میں نے غلط کہا؟ جنگل میں ڈاکو ہیں؟" میں نے کہا۔

"نہیں... کچھ نہیں... تمہارے لیے راستہ سجا رکھا ہے... آرائشی محرابیں بنا رکھی ہیں۔ جھنڈے لگا رکھے ہیں..." وہ چلا کے بولا۔ "جاؤ..."

میں سر ہلا کے چل پڑا... اگلے موڑ پر میں نے اس سیدھی سڑک کو دیکھا۔ اس کے دونوں جانب کچھ دُور تک مکانات کا سلسلہ تھا مگر اس کے بعد تاریکی اور ویرانی کے سوا کچھ نہیں تھا۔

"کیا اب تین میل پیدل چلنا ہوگا؟" موہنی نے کہا۔

"نہیں... میں نے برطانوی شاہی بجرہ منگوایا ہے۔" میں نے موہنی کو اسی کے الفاظ لوٹا دیے اور اچانک ایک بہت پُرانا گیت میری زبان پر آگیا جو میں اور محسن ایسے ہی مواقع پر گایا کرتے تھے۔ "چل چل چل رے نوجوان! اونچی تیری شان... دُور تیرا گاؤں اور تھکے پاؤں..." جہاں تک مجھے یاد پڑتا تھا، یہ فلم سکندرِ اعظم کا گانا تھا اور معلوم نہیں کس نے گایا تھا؟

جب میں نے مارچ شروع کیا تو میرا ساتھ دینے کے لیے موہنی کو تقریباً دوڑنا پڑا۔ "افوہ... یہ کیا مصیبت ہے...؟ ایسے دوڑاؤ گے مجھے۔"

"میں فرسٹ گیئر میں ہوں خاتون۔" میں نے کہا۔ "میری رفتار اس سے کم نہیں ہو سکتی۔"

"اچھا تو پھر جاؤ۔" وہ خالی سڑک پر دھرنا دے کر بیٹھ گئی۔ "واپسی پر مجھے یہیں سے لے لینا۔"

میں کوئی سو قدم گیا اور پُرامید رہا کہ بالآخر وہ دوڑتی ہوئی آئے گی۔ اس سنسان سڑک پر جہاں دونوں جانب درختوں کے سوا کچھ نہیں، وہ کب تک اکیلی بیٹھی رہے گی... مگر سو قدم پورے ہونے سے پہلے ہی مجھے مایوسی، خفت اور جھنجلاہٹ ہونے لگی، کیونکہ اب واپس جا کے اُسے ساتھ لانا ناگزیر ہوتا جا رہا تھا۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ پیچھے سڑک پر کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس نمودار ہوئیں۔ میں واپس ہوا تو تیز روشنی میں، میں نے موہنی کو سڑک سے اُٹھ کر ایک کنارے پر کھڑے ہوتے دیکھا... ابھی میں دس قدم ہی گیا تھا کہ گاڑی موہنی کے پاس پہنچ کے رک گئی۔

اچانک میری چھٹی حس نے مجھے ہوشیار کیا۔ اسی کے ساتھ میں نے موہنی کی چیخ بھی سُنی اور میں سرپٹ بھاگا۔ میرے پہنچنے تک دو بدمعاش موہنی سے لپٹ چکے تھے اور اسے کھینچ کر اپنی جیپ میں ڈالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر ایک نے موہنی کو چھوڑ دیا اور میری طرف لپکا۔ وہ خوب اچھا خاصا پلا ہوا سانڈ تھا۔ اس نے مجھے گالی دے کر مکا گھمایا۔ میں تھوڑا سا جھک گیا اور اس کا مکا میرے سر کے اوپر سے گزر گیا۔ وہ خود اپنے زور میں گھوم گیا۔ میں نے اس کی کمر پر لات ماری... وہ ایک جھٹکے سے آگے گیا اور ایک درخت کے تنے سے ٹکرا گیا... آخری وقت میں اس نے دونوں ہاتھ آگے کر لیے تھے، ورنہ اس کا مُنہ چپٹا ہو جاتا۔

جب وہ پلٹا تو مجھے اس کے ہاتھ میں خنجر نظر آیا جو اس نے ڈب میں سے نکالا تھا۔ خنجر کے پھل کی دُھندلی سی خونی چمک مجھے اندھیرے میں موت کی بھیانک مسکراہٹ لگی۔ اس نے بھیڑیے کی طرح غرا کے مجھے گالی دی اور ایک جست لگا کے مجھ پر وار کیا۔ میں نے پینترا بدلا اور اس کے خنجر والے ہاتھ کی کہنی پر کک ماری۔ خنجر اس کے ہاتھ سے طوطوں کی طرح اُڑ گیا اور وہ بُری طرح بلبلایا۔

اسی وقت میں نے موہنی کے چلانے کی آواز سُنی۔ اس نے صرف میرا نام پکارا تھا۔ بروقت اس کی طرف دیکھنے سے میں بچ گیا۔ دوسرے بدمعاش نے خنجر کے وار کو ناکام دیکھ کر پستول نکال لیا تھا۔ انھیں بالکل امید نہ تھی کہ صورت سے بڈھا نظر آنے والا کوئی شخص خالی ہاتھ ہونے کے باوجود دو جوانوں کے مقابلے پر اتر آئے گا۔

گولی کی آواز جنگل میں گونجی تو درختوں سے پرندے چیختے چلاتے اُڑے... مجھے صرف یہ احساس ہوا کہ گولی میرے بہت قریب سے گزر گئی ہے۔ پھر میں نے ایک فلائنگ کک ماری اور پستول سے فائر کرنے والا اُلٹ کر جیپ پر گرا۔ اس کا سر پائدان سے ٹکرا کے پھٹ گیا۔ وہ ذبح کیے جانے والے بکرے کی طرح چلایا اور اپنے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کے کھڑا ہوا۔ غالباً وہ سر سے بہنے والے خون کے فوارے کو روکنے کی احمقانہ

کوشش کر رہا تھا۔ کھڑا ہوتے ہی وہ لڑکھڑا کے آگے بڑھا اور مُنہ کے بل گرا۔

خنجر نکالنے والے نے اندازہ کر لیا تھا کہ بازی مات ہو گئی ہے۔ یہ بات ان کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو گی۔ انھوں نے تو سوچا ہو گا کہ بڈھا خنجر دیکھ کر ہی تھر تھر کانپنے لگے گا اور پھر بھی مقابلے پر آیا تو پستول اُسے بے ہوش کرنے کے لیے کافی ہو گا۔ اب بچ جانے والا فرار ہونا چاہتا تھا مگر اُسے ایک فکر تو جیپ کی تھی اور دوسری اپنے ساتھی کی۔ کسی ایک کو چھوڑ کر جانے کا مطلب تھا اپنا پتا چھوڑ جانا۔ معاملہ آگے گیا تو اس کا زخمی ساتھی دوسرے کے بارے میں خود بتا دے گا اور وہ مر گیا تب بھی جیپ کے نمبر سے پولیس سُراغ لگا لے گی۔

اس نے ایک آخری کوشش کے طور پر خنجر دوبارہ اُٹھا لیا لیکن مقابلے پر آنے کے بجائے اس نے خنجر موہنی کے پیچھے سے اس کی پشت پر رکھ دیا۔ "میں مار ڈالوں گا اسے۔" وہ دیوانوں کی طرح چلایا۔ "اس کا پیٹ پھاڑ دوں گا۔"

"تم اس کے بعد بھی زندہ بچ کے نہیں جا سکتے۔" میں نے سکون سے کہا اور ایک قدم آگے بڑھا۔

"میں کہتا ہوں رُک جاؤ۔" وہ چیخ کر بولا۔ مگر میں نے ایک ایک قدم اس کی جانب پیش قدمی جاری رکھی۔

"مار ڈالو اسے... انتظار کیوں کر رہے ہو میرا... میں تو بہر حال تم تک پہنچ ہی جاؤں گا... تم مجھ سے بچ کے کہاں جاؤ گے؟" میں نے کہا۔ "اور میرے ہاتھوں کو کیسے روکو گے... جو تمھاری گردن مروڑ سکتے ہیں۔ جیسے عورتیں دُھلا ہوا کپڑا نچوڑتی ہیں ایسے میں تمھارے جسم سے خون نچوڑ لوں گا۔"

وہ ایک دم سڑک پر سجدہ ریز ہو گیا۔ "مجھے معاف کر دو... میں شیطان کے بہکاوے میں آ گیا تھا... میری توبہ... میرے باپ کی توبہ۔" وہ دھاڑیں مار مار کے رونے لگا۔

میں نے اُسے گردن سے پکڑ کے اوپر اُٹھا لیا... وہ کسی مردہ چوہے کی طرح نظر آ رہا تھا اور تھر تھر کانپ رہا تھا۔ "دیکھو تمھارا بہادر ساتھی کیسے مرا پڑا ہے۔" میں نے کہا۔ "موت کبھی کبھی ایک خوبصورت عورت بن کے سامنے آتی ہے اور میرے جیسا ایک بڈھا فرشتہ اجل بن کے روح قبض کر لیتا ہے۔"

وہ ہاتھ جوڑنے لگا۔ "بابا جی... میری ماں مر جائے گی۔ اُس کا ایک ہی پتر ہوں میں... میری شادی ہونے والی ہے محرم کے بعد۔"

"اُس وقت تک تو تمھارا چہلم بھی ہو چکا ہو گا۔" میں نے کہا۔ "خدا نے ایک لڑکی کو تم جیسے شیطان کی بیوی بننے سے بچا لیا۔"

وہ بھوں بھوں کر کے رونے لگا۔ "آپ کہتے ہو تو میں اُس سے بھی شادی نہیں کروں گا۔"

مجھے بے اختیار ہنسی آئی۔ "پھر کیا اس سے کرو گے؟" میں نے موہنی کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ تو تمھیں بہت پسند آئی کہ تم عقل اور جذبات پر قابو نہ رکھ سکے تھے... ایک ... تم زندہ رہ سکتے ہو۔"

"میں سب کچھ کر سکتا ہوں جی... آپ حکم کریں۔"

"اپنے اس ساتھی کی لاش اُٹھا کے جیپ میں ڈالو..." میں نے کہا۔ "اور جیپ لے کر آگے چلو... ہمیں دو میل آگے رانی کی حویلی کے پاس چھوڑو اور جیپ لے کر واپس چلے جاؤ... نے دیکھ لیا ہے مگر تم خاموش رہو گے تو میں بھی کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ لاش کو جیسے چاہو ٹھکانے لگاؤ اور خود کو بچانے کے لیے کچھ بھی کرو۔"

وہ مجبور تھا کہ اپنا کیا سامنے آیا ہے تو بھگتے... اُس نے سڑک کے کنارے سے لاش اُٹھا کے آگے ڈالی۔ وہ خود ڈرائیور کی جگہ پر بیٹھا۔ میں اور موہنی پیچھے کی دو سیٹوں پر بیٹھ گئے جو آمنے سامنے بنائی گئی تھیں۔ تنگ سڑک بالکل تاریک تھی مگر ہموار تھی۔ میں نے اُسے حکم دیا کہ وہ ہیڈ لائٹس بند کر دے اور رفتار کم کر لے۔

"آپ... رانی کی حویلی میں جاؤ گے؟" وہ کچھ دیر بعد بولا۔

"ہاں... جب حویلی سو گز دُور رہ جائے تو گاڑی روک لینا۔"

"وہاں... کیا کام ہے جی آپ کو...؟"

"شاہِ جنات سے کوہ قاف کا ویزا لینا ہے۔" میں نے کہا۔ "تم چلو گے؟"

"وہ جی... اس وقت... کوئی نہیں جاتا وہاں۔" وہ بولا۔ جاں بخشی کے احسان کا بدلہ ادا کرنے کے لیے ہمیں مفت مشورہ دے رہا تھا۔ "اور جو جاتا ہے وہ تو واپس نہیں آتا۔"

"ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ہم بھی واپس نہیں آئیں گے۔" میں نے کہا۔ "مگر کیا تم کسی کا نام بتا سکتے ہو جو وہاں رات کے وقت گیا اور لوٹ کر نہیں آیا؟"

"ہاں جی... ایک تو فنتوش تھا۔ اس کا باپ پولیس انسپکٹر تھا اور وہ بھی ایسے ہی غائب ہو گیا تھا۔" وہ بولا۔

"کیا نام تھا اس کے باپ کا؟"

"احمد علی یا محمد علی... کچھ یاد نہیں۔" وہ بولا۔ "پرانی بات ہے۔"

"کتنی پرانی؟"

"اسے تو شاید سال سے اوپر ہو گیا... فنتوش کو۔" وہ بولا۔

"اور انسپکٹر صاحب کب اُدھر گئے تھے؟"

"فنتوش سے دو سال پہلے... بس وہ جوش میں آ گیا تھا کہ میں دیکھتا ہوں خود جا کے۔ اُس نے صرف سُنا تھا کہ باپ اُدھر گیا تھا مگر پولیس نے اس کی گمشدگی کی رپورٹ میں یہ نہیں لکھا تھا۔"

"اچھا اور کوئی؟"

"اور بہت سے ہیں... میں سب کو نہیں جانتا۔" وہ بولا۔ "ایک کنجری تھی بہت مشہور... لال پری کہلاتی تھی... لال کپڑے پہنتی تھی... ہونٹ لال... آنکھیں لال، گال بھی لال... اسے تین آدمی لے گئے تھے۔ وہ گاڑی تو بعد میں اسی جگہ مل گئی تھی... ایک فرلانگ پیچھے۔"

"گاڑی کیسی تھی؟"

"مجھے نہیں معلوم جی... پولیس تھانے میں رپورٹ موجود ہے۔ اس میں سب نمبر وغیرہ مل جائے گا۔" وہ بولا۔

"کیا رانی کی حویلی میں کوئی نہیں رہتا؟"

"سُنا ہے کوئی نہیں رہتا۔" وہ گاڑی روک کے بولا۔ "وہ سامنے ہے حویلی۔"

"اچھا تم کیا جانتے ہو اس حویلی کے بارے میں... اس کا مالک کون ہے؟" میں نے کہا۔

"کوئی ہندو تھا... وہ بھاگ گیا تو ایک جاگیردار نے لے لی تھی۔ یہ میں نے سُنا ہے جی... وہ بے اولاد تھا... پہلی بیوی کو طلاق دی... دوسری اولاد کے لیے کی تھی۔ وہ مر گئی... تیسری بھاگ گئی... پاگل ہو کے... سب بے اولاد ہیں۔ چوتھی کو اس نے خود مار دیا اور پھر خود کشی کر لی۔ اس کے بعد سے حویلی بند ہے... کچھ عرصہ ایک پیر صاحب کا ڈیرا رہا تھا... معلوم نہیں وہ کدھر گئے۔"

"اچھا... اب تم واپس جاؤ۔" میں نے کہا اور اچانک ریوالور نکال لیا۔ "تمھاری خیریت اسی میں ہے کہ اپنے آپ کو بچانے کی فکر کرو۔ اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو بھول جاؤ کہ تم ہم سے ملے بھی تھے... ورنہ یاد رکھو کہ میں تمھیں تلاش کر لوں گا اور تمھاری ماں کے سامنے تمھیں گولی مار دوں گا۔"

وہ سخت بدحواسی میں فرار ہوا۔ میں اس کے لیے انتہائی خطرناک بڈھا ثابت ہوا تھا۔ میں نے اس کے ایک ساتھی کو بڑی بے دردی سے قتل کر دیا تھا... خنجر اور پستول سے ذرا خوف زدہ نہیں ہوا تھا... آسیب زدگی کے سارے واقعات سُن کے بھی رانی کی حویلی میں جا رہا تھا... اور میرے پاس بھی ریوالور تھا جو میں نے آخری وقت تک چھپائے رکھا تھا۔ میرا وجود اس کے لیے کسی بھوت سے کم پُراسرار نہ تھا۔

"یہ ہوتا ہے خوب صورت ہونے کا نتیجہ۔" میں نے کہا۔

"تم بنا دو مجھے بدصورت۔" وہ بولی۔ "اپنے جیسا..."

میں نے پلٹ کر حویلی کی طرف دیکھا۔ "آؤ میرے ساتھ اس راستے پر قدم بڑھاؤ جس پر جا کے کوئی واپس نہیں آیا... کیسا ڈائیلاگ ہے؟"

"تم کیا واقعی... اندر جاؤ گے؟" وہ بولی۔

"میں اور تم سو فیصد اندر جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "اور اس میں کوئی شک یا مبالغے کی بات نہیں کہ یہاں ہمیں ایک خبیث جن ملے گا۔"

"کیا پہیلیوں میں بات کر رہے ہو...؟"

"سہیلی... یہ پہیلی نہیں حقیقت ہے۔" میں نے کہا۔ "اس جن کا نام ہے خسرو جمشید اور وہ نام کا نواب بھی ہے۔"

موہنی کے جسم کو ایک جھٹکا لگا... یہ جھٹکا میں نے اس لیے محسوس کیا کہ میں نے اس کی کلائی پکڑ رکھی تھی... اس نے اپنی کلائی چھڑا لی۔

"خسرو جمشید... تم مذاق کر رہے ہو۔" وہ اپنے خوف کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولی۔

"اس مذاق سے تمھیں کرنٹ کیوں لگا ہے؟" میں نے کہا۔ "کیا تم اُسے جانتی ہو...؟ وہ اندر موجود ہے۔"

"تم... غلط کہتے ہو...۔" وہ ایک قدم پیچھے ہٹی۔

"میں پاگل نہیں ہوں جو اس وقت یہاں آیا ہوں... میں ان بھوت پریت اور انسانوں کے غائب ہو جانے کی کہانیوں پر ایک فیصد بھی یقین نہیں رکھتا مگر لوگ کل سے کہنے لگیں گے کہ ایک بڈھا اور اس کی جوان خوب صورت بیٹی اُدھر گئے تھے جو لوٹ کر نہیں آئے۔ حالانکہ انھیں منع بھی کیا گیا تھا۔ آج رات کے بعد ہم واقعی یہاں نظر نہیں آئیں گے مگر یہ نواب خسرو جمشید تو دنیا ہی سے غائب ہو جائے گا۔ وہ کہیں بھی پھر نظر نہیں آئے گا۔"

"تم پاگل ہو... میں تمھارے ساتھ نہیں جاؤں گی۔"

میں نے ایک دم اس کی کلائی پھر پکڑ لی۔ "تمھارا تو باپ بھی جائے گا۔"

"چھوڑو مجھے۔" وہ چلائی مگر میں نے ایک دم اس کا مُنہ دبا دیا۔

"کیا بات ہے... تمھارا رویہ میرے لیے بے حد مشکوک اور پُراسرار ہو گیا ہے مس موہنی۔" میں نے کہا۔ "کس کا خوف ہے تمھیں... خسرو جمشید کا نام سننے سے پہلے تم کو کسی کا ڈر نہیں تھا۔ تم میرے ساتھ جن بھوتوں کے ڈیرے میں جانے کو تیار تھیں۔ ... تمھارے حلق سے اونچی آواز نکلی نا تو یہ ممکن ہے کہ وہ تمھاری ...ز ہو... میں تم کو ہر صورت میں اپنے ساتھ لے جاؤں ... خواہ مجھے تم کو خاموش رکھنے کے لیے تمھارا یہ خوب صورت

گلا ہی کیوں نہ دبانا پڑے۔"

میں نے اُسے چھوڑا تو وہ بُری طرح کانپ رہی تھی "مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنے بے رحم بھی ہو سکتے ہو... میرے ساتھ کیا تم واقعی حوصلہ رکھتے ہو مجھے قتل کرنے کا؟ میرا گلا گھونٹنے کا... اتنا لمبا سفر اسی لیے کیا تھا میں نے... اتنا انتظار اسی سلوک کے لیے کیا تھا میں نے؟ میں کہاں سے کہاں آ گئی تمہارے ساتھ..."
اس نے پھوٹ پھوٹ کے رونا شروع کیا۔

"مگر اب چند قدم چلنے کے لیے تیار نہیں... آخر کیوں؟"

"تم کیا سمجھتے ہو آخر...؟ یہی نا کہ میں دشمن کی ایجنٹ ہوں اور میرا کوئی خفیہ تعلق ہے خسرو جمشید سے... ہاں ہے... یہاں سب سے پہلے مجھے اسی کے حضور پیش کیا گیا تھا..... مگر وہ ایک جانور ہے... خطرناک پاگل جانور... مہذب نظر آنے والا وضعدار سمجھا جانے والا نواب خسرو جمشید ایک وحشی جنونی درندہ ہے۔ اور یہ بات پوچھنی ہے تو اُن سے پوچھو..."

"آئی ایم سوری..."

ایک طمانچہ میرے مُنہ پر یوں پڑا کہ میں بھونچکا رہ گیا... میرا خون کھولنے لگا۔

"میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ یہ الفاظ مت دُہرانا میرے سامنے۔ یہ گالی سے بدتر ہیں میرے لیے۔"

ایک لمحے کے لیے مجھے اشتعال کی شدید لہر نے اس کی گردن مروڑ دینے پر مجبور کیا مگر میں نے اس خواہش کو ملتوی کر دیا۔ اُس طمانچے کی قیمت ادا کرتے وقت تمھیں افسوس ہوگا موہنی' میں نے دل ہی دل میں کہا۔ میں وقت اور حالات سے مجبور نہ ہوتا تو اسی وقت اور اسی جگہ موہنی کو سزا دے سکتا تھا لیکن اب میں موہنی کو خسرو جمشید کے سامنے لے جانا چاہتا تھا۔ اُس نے خسرو جمشید کے بارے میں جو کچھ کہا تھا' وہ سچ ہو سکتا تھا مگر یہ موہنی کے خوف کا سبب نہیں تھا۔ اس وقت میں موہنی کے ساتھ تھا۔ وہ کہہ سکتی تھی کہ مجھے اس رات کے وحشیانہ سلوک کا بدلہ لینا ہے اور اس نام کے نواب کے مُنہ پر تھوکنا ہے... یا اس کے مُنہ پر طمانچہ مارنا ہے... میرے ساتھ اُسے کسی قسم کا خطرہ درپیش نہ تھا... وہ بالکل محفوظ تھی مگر پھر بھی ڈر رہی تھی۔ میں اس ڈر کی وجہ جاننا چاہتا تھا۔

"چلو اب غصہ تھوک دو۔" میں نے موہنی کو اپنے قریب کر کے کہا۔ "آخری بار معاف کر دو مجھے۔"

وہ میرے سینے پر سر رکھ کے سسکیاں بھرنے لگی "... کیا یہ بھی اس کی اداکاری ہے؟" میرے دماغ میں ایک سوال نے سر اُٹھایا۔ اس وقت میں جذباتی طور پر موہنی سے بہت دُور تھا۔ میرے دل میں محبت کے نہیں نفرت کے جذبات بھرے ہوئے تھے لیکن میں اس مرحلے پر بنا بنایا کھیل نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ اس وقت جب کہ موہنی مجھ پر اپنا اعتبار قائم کرنے میں تقریباً کامیاب ہو چکی تھی ایک بات ایسی ہو گئی تھی کہ میں پھر کھٹک گیا تھا اور اُسے مختلف نظر سے دیکھنے لگا تھا۔ اس نظر سے وہ مجھے پھر ایک انتہائی چالاک اور مکّار... ذہین عیّار انڈین ایجنٹ لگتی تھی جسے بطور خاص میری جذباتی کمزوری سے فائدہ اُٹھانے کے لیے بھیجا گیا تھا تاکہ وہ میری قربت حاصل کرے تو میرے سارے منصوبے اور ارادے بھی جان لے۔

دس پندرہ منٹ کے بعد موہنی پھر نارمل ہو گئی اور اس عورت کی طرح خوش نظر آنے لگی جسے اس کے محبوب نے ہاتھ جوڑ کے اور ناک رگڑ کے منایا ہو۔

رانی کی حویلی کی وسعت کا اندازہ قریب جا کے ہوا۔ باغ کے باغ سمیت شاید اس کا رقبہ سوا ایکڑ ہو گا۔ بیرونی چار دیواری دس فٹ بلند تھی مگر جگہ جگہ سے ٹوٹ رہی تھی اور اس میں شگاف ایک دروازہ تھا۔ مرکزی دروازہ تھوڑا سا بائیں جانب تھا۔ میں نے بالکل سامنے جا کے اندر جھانکنے سے گریز کیا... ہو سکتا تھا کہ گیٹ پر کوئی پہریدار موجود ہو جو مجھے دیکھتے ہی شور کر دے۔ بدبخت سکندر بخت کا نام بھی ان میں شامل ہو جائے جو رانی کی حویلی کی طرف گئے مگر لوٹ کر نہیں آئے۔

"تمھارے پاس ریوالور ہے نا؟" میں نے موہنی سے کہا۔

"ہاں... کیا تمھارے حوالے کر دوں؟" وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔

"نہیں... اسے تیار رکھو۔" میں نے سرگوشی میں کہا اور اس کا ہاتھ تھام کے ایک شگاف سے اندر داخل ہو گیا۔ چار دیواری کے اندر جھاڑ جھنکار قسم کا جنگل نما باغ تھا جو کسمپرسی کا شکار تھا... میں نے حویلی کی عمارت کو تقریباً سو گز کے فاصلے پر دیکھا۔

آگے قدم بڑھاتے ہوئے مجھے شکاری کتوں کا خیال آیا... اگر اندر کتے ہوتے تو اب تک بھونکنا شروع کر دیتے اور ہماری طرف دوڑے آ رہے ہوتے۔

عمارت کی ویرانی کو دیکھ کر میں شش و پنج میں پڑ گیا۔ کہیں اس خسرو جمشید کے ہمشکل نے جھوٹ بول کر مجھے بے وقوف تو نہیں بنایا تھا۔ مگر مرتے وقت آدمی جھوٹ نہیں بولتا۔ یہ بات تو قانون بھی تسلیم کرتا ہے جو ہر سچ کے لیے ثبوتِ شہادت مانگتا ہے... اندر آبادی کے آثار یکسر ناپید تھے اور حفاظتی انتظامات کی عدم موجودگی نے مجھے مزید شبہات میں مبتلا کیا۔ لوگ کہتے ہیں یہاں کوئی نہیں رہتا۔ ممکن ہے یہ ٹھیک ہی ہو۔ تو اب کبھی کبھار عیاشی کے لیے یہاں آ جاتا ہو۔ اس کے لیے حفاظتی انتظامات کی کیا ضرورت ہے۔ ہم میں سے کسی کے یہاں پہنچنے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا اور مقامی آبادی تو ویسے ہی اِدھر آنے سے گریز کرتی ہے۔ انھوں نے اِدھر آنے والوں کو قتل کر کے اور ان کی لاشیں غائب کر کے حویلی کے بارے میں خود دہشت پھیلا رکھی ہے۔

عمارت کے شمالی حصے کی سمت تین دروازے تھے اور تین کھڑکیاں تھیں۔ سب دروازے مضبوط شاہ بلوط کی لکڑی کے بنے ہوئے تھے اور مقفّل تھے۔ روایات کے مطابق برسوں سے مقفل لیکن وہ زنگ خوردہ تالے نہیں تھے۔ ساخت کے اعتبار سے بھی وہ زیادہ پُرانے نہیں تھے۔ میں نے تاریکی اور خاموشی میں ڈوبی ہوئی عمارت کا جائزہ لیا تو مجھے اس میں کوئی شک نہ رہا کہ عمارت کم سے کم پچاس سال پرانی ہے اور تقسیمِ ہند سے پہلے ہی تعمیر ہوئی تھی۔

پھر میں پیچھے گیا اور میں نے عمارت کو لمبائی کے رُخ دیکھا۔ باغ پیچھے بھی تھا اور تقریباً سو گز کے فاصلے سے گزرنے والی شکستہ چہار دیواری تک اسی طرح جنگل بن چکا تھا جیسے سامنے والے حصے میں... موہنی کچھ ڈری ہوئی تھی اور مجھ سے لگ کر چل رہی تھی۔

"مجھے تو یہاں کوئی نظر نہیں آتا۔" میں نے کہا۔

"وہ تو ہوں گے... شاہ جنات۔" موہنی نے کہا۔ "جن سے تمہیں دیا لینا تھا کوہ قاف کا۔"

"وہ تو میں نے اس لڑکے کو امپریس کرنے کی کوشش کی تھی۔" میں نے کہا۔ "ورنہ کیا وہ دیکھ نہیں سکتا تھا کہ کوہ قاف کی پری...!"

میرا جملہ خاموشی میں گونجنے والی ایک چیخ سے نامکمل رہ گیا۔ یہ چیخ کسی عورت کی تھی اور اس نے ایک لمحے کے لیے مجھے بھی دہلا دیا... موہنی تو مجھ سے چمٹ گئی اور مجھے باہر کی طرف کھینچنے لگی۔

"چلو کبیر... یہاں سے نکل چلو..."

میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے اُسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور آگے بڑھا۔ "یہ کسی چڑیل نے چیخ نہیں ماری تھی... کسی روح کی آواز نہیں تھی... یہ کسی عورت کی چیخ تھی... مگر سوال یہ ہے کہ آواز آئی کہاں سے تھی؟"

"یہاں کوئی نہیں ہے کبیر..."

"پہلے میں بھی یہی سمجھا تھا۔" میں نے کہا۔ "لیکن اب میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہاں کوئی ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔"

وہ بادلِ ناخواستہ میرے ساتھ آگے بڑھی۔ میں نے عمارت کو لمبائی کے رُخ طویل برآمدے کو طے کیا۔ اس کی لمبائی دگنی تھی اور مجھے بہت سے دروازے اور کھڑکیاں بند نظر آئے مگر وہ مقفل نہیں تھے۔ آخری حصے میں رُک کر میں نے پھر کان لگا کے کچھ سُننے کی کوشش کی مگر اب پھر وہی بے صدا آسیب تھا جو ہر سمت سے لپکتا محسوس ہوتا تھا۔

میں نے عمارت کی تیسری سائڈ کا جائزہ لیا۔ اس طرف کا نقشہ بھی مختلف نہیں تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ ادھر کے سارے دروازے کھڑکیاں اندر سے بند کیے گئے تھے۔ اس سے ایک ہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا کہ مخالف سمت میں تین کمرے زیرِ استعمال تھے اور وہاں تین تالوں کی موجودگی کا مطلب تھا کہ ان کی چابیاں تین افراد کے پاس ہیں۔

ابھی تک میں نے سامنے کے حصے کو نہیں دیکھا تھا۔ احتیاط کا تقاضا تھا کہ میں کسی کی نظر میں آئے بغیر عمارت تک پہنچ جاؤں اور پھر دیکھوں کہ اندر تک جانے کے لیے سب سے محفوظ راستہ کون سا ہے۔ میں اس بات کا بھی یقین کر لینا چاہتا تھا کہ وہاں کوئی محافظ یا پہریدار نہیں ہے۔

میرے کان ابھی تک اس ایک چیخ کی بازگشت کو سن رہے تھے جو خاموشی کے سمندر میں ایک پتھر کی طرح تھی۔ اس کا تموّج ختم ہو چکا تھا اور صرف تصوّر باقی رہ گیا تھا۔ میرے کان دوبارہ کسی آواز کے منتظر یہ لگے ہوئے تھے مگر خامشی کسی منجمد جھیل کی سطح بن گئی تھی۔

سامنے والے حصے میں آتے ہی میں ٹھٹک کر رک گیا۔ میں نے موہنی کی طرف دیکھا اور نظروں ہی نظروں میں سوال کیا کہ بولو... اب کیا کہتی ہو۔ وہ فریبِ سماعت بھی نہیں تھا اور بھوت پریت کی آواز بھی نہیں تھی۔ گھنی جھاڑیوں اور اُلجھی ہوئی عشق پیچاں کی پرانی بیلوں سے ڈھکے ہوئے ایک کنج کے تاریک سائے میں ایک کار کی چمک یوں محسوس ہوئی تھی جیسے غبار آلود آسمان میں ستاروں کی دمک... وہ ایک ایسی جگہ پہ کھڑی ہوئی تھی کہ جب تک کوئی بالکل سامنے نہ آتا اُسے دیکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ چار ستونوں پر جن کا درمیانی فاصلہ چالیس فٹ کے قریب تھا کسی زمانے میں لوہے کا جال ڈالا گیا ہو گا۔ اس کے اوپر اور چاروں طرف پھولوں کی سرسبز بیلیں چڑھائی گئی ہوں گی۔ اب یہ بیلیں گھنی شاخوں کی دیواریں بن چکی تھیں۔ اوپر بھی زنگ خوردہ جال ان کا وزن برداشت کرنے کے قابل نہ رہا تھا۔ چنانچہ ایک طرف سے کُھلے ہوئے اس کشادہ کمرے میں ہر سمت سے شاخیں اندر آ رہی تھیں... اوپر سے لٹک رہی تھیں اور ستونوں کے گرد لپٹ چکی تھیں۔

اس کا درمیانی حصہ اب بھی خالی تھا اور اوپر چھت کی بلندی جو پہلے پندرہ فٹ تھی اب شاخوں کی چھت کے جُھک

جانے کے بعد بھی دس فٹ سے زیادہ تھی۔ خسرو جمشید کی کار اسی کنجِ چمن میں کھڑی ہوئی تھی، جہاں پہلے اس کے اصل مالک نے برسات کی مہکتی پھواریں اور چودھویں شب کی چاندنی میں زندگی کی بہت سی خوب صورت شاموں اور پُرمسرت راتوں کے یادگار لمحے بسر کیے ہوں گے۔ سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ... نظیر اکبر آبادی نے میرے کان میں کہا۔

اچانک موہنی نے مجھے پیچھے کھینچ لیا۔ "تم نے کچھ دیکھا؟"

"میں بہت کچھ دیکھ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "تم بتاؤ تم نے کیا دیکھا؟"

"کار کے اندر... کوئی ہے..." وہ آہستہ سے بولی۔

میں نے دیوار کی اوٹ سے سر نکال کے غور سے دیکھا۔ ونڈ اسکرین کے پیچھے ایک ستارہ سا روشن ہوا اور بجھ گیا... کوئی کار کے اندر بیٹھا ہوا یا لیٹا ہوا سگریٹ پی رہا تھا۔ اگر اس کا چہرہ ہماری طرف ہوتا تو وہ یقیناً ہمیں دیکھ چکا ہوتا لیکن وہ سیٹ پر دراز تھا اور اس کی نظر عمارت کی طرف نہیں تھی۔ وہ مخالف سمت میں دیکھ رہا تھا۔ اگر وہ بیٹھا ہوا ہوتا تو اتنی دیر میں ایک بار تو سر گھماتا۔ میں نے اب زیادہ توجہ کے ساتھ سگریٹ کی برائے نام روشنی کو دیکھا۔ جب وہ کش لے کر سگریٹ ہٹاتا تھا تو اس کا ہاتھ سامنے نہیں جاتا تھا۔ چمک نیچے کی طرف ڈوب جاتی تھی۔ اس کا صاف مطلب یہی تھا کہ وہ سیٹ پر نیم دراز ہے اور اس کا سگریٹ والا ہاتھ سیٹ سے نیچے کی جانب لٹکا ہوا ہے۔

میں نے موہنی کو وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور خود دبے پاؤں آگے بڑھا۔ میرے اور کار کے درمیان شاید بیس فٹ کا فاصلہ تھا۔ کار کے شیشے بند نہ ہوتے تو وہ یقیناً میرے قدموں کے نیچے فریاد کرنے والے خشک پتوں کی آواز سُن لیتا۔ اس سے زیادہ احتیاط ناممکن تھی۔ میں برسوں سے بچھے ہوئے سوکھے پتوں پر پیر نہ رکھتا تو کہاں رکھتا۔ مجھے یہ ڈر بھی تھا کہ وہ کہیں اپنی پوزیشن نہ بدل لے۔ کار کے اندر آدمی زیادہ دیر تک ایک ہی پوز میں نہیں لیٹا رہ سکتا... یہ بھی ہو سکتا تھا کہ سگریٹ ختم ہو تو وہ اسے باہر پھینکنے کے لیے دروازہ کھولے۔

کار کے بالکل قریب پہنچ جانے کے بعد میں نے یوں محسوس کیا جیسے میں میدانِ جنگ میں دشمن کے مورچوں کے درمیان سے گزر آیا ہوں۔ اب میں زیادہ پُراعتماد تھا۔ میں پیچھے کی طرف سے گھوم کر گیا اور اسی سمت میں پہنچ گیا جدھر وہ دیکھ رہا تھا۔ لیکن میں فرش پر پیٹ کے بل رینگ رہا تھا اور اس کی نظروں سے محفوظ تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر ہاتھ مار کے ایک چھوٹا سا پتھر اُٹھایا اور کار کے دوسری جانب اُچھال دیا۔

حسبِ توقع وہ ایک دم باہر آیا۔ اس وقت تک میں کار کے نیچے رینگ چکا تھا۔ نیچے سے مجھے اس کے پاؤں نظر آ رہے تھے۔ وہ اپنی جگہ پر کھڑا ہوا اِدھر اُدھر دیکھ رہا ہوگا۔ ابھی وہ ہلا ہی تھا کہ میں نے دونوں ہاتھ بڑھا کے اس کے ٹخنوں سے ذرا اوپر جما دیے اور اسے ایک جھٹکے سے کھینچا تو ساتھ ہی خود بھی نیچے سے نکل آیا۔

وہ بُری طرح مُنہ کے بل گرا لیکن پلک جھپکتے ہی اس نے جھٹکا دے کر خود کو آزاد کرا لیا اور کروٹ لے کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے اُٹھنے کے انداز سے ہی میں سمجھ گیا کہ وہ تربیت یافتہ گوریلا ہے۔ اسے زیر کرنا آسان نہیں ہوگا۔ یہ احساس ہوتے ہی میرا جسم مستعد ہو گیا اور میرے ذہن نے اپنی تربیت کے سارے داؤ پیچ یاد کیے۔ ان میں کچھ انتہائی مہلک داؤ بھی تھے جو ایسے ہی وقت میں کام آتے تھے۔

میرے حریف نے ایک ایسا ہی داؤ آزمایا تھا۔ میری طرح وہ بھی کم سے کم وقت میں جنگ کو ختم کر دینا چاہتا تھا۔ فرق صرف اس بات سے پڑا کہ میں نے اس کی مہارتِ فن کا اندازہ کر لیا تھا جبکہ اسے میرے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا۔ میں نے بروقت خود کو بچایا اور پھر اتنی تیزی سے وہی داؤ آزمایا کہ میرے حریف کو حیران ہونے کا موقع تک نہ ملا... وہ زمین پر گرا اور آواز نکالے بغیر مر گیا۔

اب میں نے کار کے اندر جھانکا اور سب سے پہلے وہ مشین گن اُٹھالی جو اگلی سیٹ پر کھڑی ہوئی تھی۔ پھر میں نے کار کی چابیاں نکالیں اور پیچھے جا کے ڈِکی کھولی۔ اس میں ایک چھوٹا سا فریج بنا ہوا تھا اور فریج میں شراب کی سربستہ بوتلیں بھری ہوئی تھیں۔ میں نے موہنی کو ہاتھ سے اشارہ کیا اور وہ ایک دم اندھیرے کی اوٹ سے نکل آئی۔

"تم اب گاڑی میں بیٹھو۔" میں نے کہا۔ "میرے سوا جو بھی قریب آنے کی کوشش کرے اُسے بلاتکلف شوٹ کر دو۔ نتائج کی پروا کیے بغیر۔"

موہنی نے سر ہلایا۔ پہلے نیچے پڑی ہوئی لاش کو اور پھر میرے ہاتھ کی مشین گن کو دیکھا۔ "تم مجھے ساتھ نہیں رکھ سکتے؟"

"نہیں... باہر بھی تو کسی کو رہنا چاہیے۔" میں نے کہا۔

جب وہ کار میں بیٹھ گئی تو میں پھر برآمدے میں گیا لیکن اس مرتبہ میں نے سامنے والے حصّے کا جائزہ لیا۔ میں نے مشین گن کو فائر کرنے کی پوزیشن میں کر لیا تھا اور اس بات کے لیے بالکل تیار تھا کہ کوئی بھی میری جان لینے والا نظر آئے تو اُسے بھون کے رکھ دوں۔ ایک بار پھر میں اکیلا ہی دشمن کے حصار میں داخل ہو

چکا تھا اور ذہنی و جسمانی طور پر اتنا الرٹ تھا کہ میرے پانچوں حواس کے ساتھ چھٹی حس بھی پوری طرح بیدار تھی۔

میں نے وہ چیخ پھر سُنی۔ دبی دبی اور پُراذیت اور مجھے خسرو جمشید کے بارے میں موہنی کی بات یاد آئی۔ اس بار میں چونکا نہیں۔ آگے قدم بڑھاتے ہوئے میرے کانوں نے وہی فریادی پکار پھر سُنی۔ میں اندازہ کر چکا تھا کہ یہ آواز زمین کے اوپر سے نہیں بلکہ تہ خانے سے سنائی دے رہی ہے۔ مجھے اب تہ خانے تک جانے والے راستے کی تلاش تھی۔ ایک دروازے کے سامنے مجھے گولڈ لیف سگریٹ کی خالی ڈبیا پڑی نظر آئی۔ میں نے دروازے کو آہستہ سے دھکیلا... وہ کسی آواز کے بغیر کھُل گیا۔

میں نے خود کو مکمل تاریکی میں ڈوبا ہوا پایا۔ میں اپنے دائیں بائیں کچھ بھی نہیں دیکھ سکتا تھا... یہ بھی نہیں کہ جہاں میں کھڑا ہوا ہوں وہ کوئی کمرہ ہے یا راہداری۔ پھر میں نے سنبھل سنبھل کے قدم بڑھانا شروع کیا۔ کئی بار میرے قدموں نے کسی چیز کو چھُوا اور میں نے راستہ بدلا۔ پھر میں ایک دیوار سے جا لگا... دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے میں ایک دروازے کے خلا تک پہنچا اور دروازے سے گزر گیا۔

اسی وقت باہر کہیں ایک دروازہ کھُلا اور گھُپ اندھیرے میں تھوڑا سا اجالا پھیل گیا۔ میں نے خود کو ایک خالی کمرے میں دیکھا اور دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ کوئی میری طرف آ رہا تھا۔ چال سے میں نے اندازہ کیا کہ وہ کوئی فوجی ہے۔ وہ اپنے پیچھے دروازہ کھُلا چھوڑ کے نہیں آیا تھا۔ اس کے باوجود روشنی برقرار تھی مگر یہ روشنی کم زیادہ ہو رہی تھی... متحرک تھی اور اس کے ہلنے سے دیوار پر سائے بھی ہلتے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ شخص اپنے ہاتھ میں ٹارچ لائٹ لیے ہوئے ہے۔

جب روشنی دروازے تک پہنچی تو میں نے مشین گن کو نیچے رکھ دیا۔ وہ دروازے کے سامنے سے گزرنے لگا تھا کہ میں نے ایک جست میں اُسے پیچھے سے دبوچ لیا۔ اس سے پہلے کہ وہ خود کو چھڑانے کی جدّوجہد کرتا یا آواز نکالتا میں نے اس کے سر کو دائیں طرف جھٹکا دیا۔ اس کی گردن کا منکا خشک لکڑی کی طرح ٹوٹ گیا۔

ٹارچ لائٹ اس کے ہاتھ سے پہلے ہی گر گئی تھی مگر ٹوٹی نہیں تھی۔ میں نے اُسے اندر گھسیٹا اور ٹارچ لائٹ اُٹھالی۔ روشنی اس کے چہرے پر ڈالے بغیر ہی میں نے اُسے پہچان لیا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے میرے سامنے ایک لڑکی کے باپ کو اطمینان سے قتل کر دیا تھا۔ کیونکہ وہ اس کی محبت کی راہ میں حائل تھا۔ اس سپاہی نے میدانِ جنگ کے قواعد و ضوابط کو نظرانداز کر کے اس پیشے کو رسوا کیا تھا اور وہ... موہنی کے بیان کے مطابق... اُسے

دھکا دے کر فرار ہو گیا تھا۔ شک مجھے پہلے بھی تھا۔ اب اس کی شدت دوچند ہو گئی۔ غالباً خود موہنی نے اُسے فرار ہونے کا موقع فراہم کیا تھا ورنہ وہ یہاں نہ آتا... سرحد پار کرتا اور اپنی محبوبہ سے جا ملتا۔

ٹارچ لائٹ نے میرا کام آسان کر دیا۔ میں نے اس کی روشنی کے دائرے کو محدود رکھا اور اپنا راستہ تلاش کرنے لگا۔ اب میں خسرو جمشید کے جنگل میں پھنسی ہوئی اور اس کی بربریت کا شکار ہونے والی کسی لڑکی کی دردبھری چیخوں کو زیادہ واضح طور پر اور مسلسل سن رہا تھا۔ انہی چیخوں نے تہ خانے تک میری رہنمائی کی۔ ایک حیوان کسی بند دروازے کے پیچھے شراب کے نشے میں دھت ایسا شیطانی کھیل شروع کر چکا تھا۔ ایک حیوان میرے اندر بیدار ہو رہا تھا جو اس شیطان کے خون سے اپنی پیاس بجھانا چاہتا تھا۔

ایک زینہ مجھے تہ خانے تک لے گیا۔ زینے میں زیرو واٹ کے ایک بلب کی روشنی تھی جو ماحول کو زیادہ دہشت ناک بنا رہی تھی۔ یا شاید یہ میرے جذبات تھے جو اس پُرآسیب فضا میں سفاکی اور بے رحمی کی بُو سے برانگیختہ ہو رہے تھے۔ جہاں زینہ ختم ہوتا تھا، وہاں ایک محرابی دروازہ تھا۔ دروازہ آدھے اِنچ سے بھی کم کھُلا ہوا تھا۔ روشنی کی یہ لکیر بالکل سیدھی کھڑی ہوئی تھی اور باہر میرے پیروں کے نیچے لیٹی ہوئی تھی۔ آنکھیں بند کر کے میں نے خدا کو یاد کیا اور دروازے پر ایک لات ماری۔ اسی وقت میرے کانوں نے کسی گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سُنی۔ تجربے کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ آواز کسی مرسیڈیز کے ڈیزل انجن کی تھی۔ اور جس گاڑی میں، میں موہنی کو چھوڑ کے آیا تھا، وہ مرسیڈیز دو سو ڈی ماڈل تھی۔

ایک لڑکی نے چیخ مار کے خود کو بیڈ شیٹ کے نیچے روپوش کر لیا۔ میں نے اس کی صرف ایک جھلک ہی دیکھی۔ وہ جوان اور خوب صورت تھی۔ اس کے بال شانوں تک کٹے ہوئے تھے اور اس کے جسم کی چٹکی ہوئی چاندنی میں ایسے داغ نمایاں تھے جو مہذّب انسان کے اندر چھُپے ہوئے وحشی حیوان کی بربریت کا المناک افسانہ کہتے تھے۔

خسرو جمشید بھی ایک دم اُٹھا تھا مگر میرے ہاتھ میں پروانۂ اجل کو دیکھتے ہی وہ منجمد ہو گیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں وہی بے یقینی کی کیفیت دیکھی جو کسی بھی جوان، صحت مند اور زندگی کی بھرپور جدّوجہد میں حصّہ لینے والے کو بے سبب ہارٹ اٹیک سے مرتے وقت ہوتی ہے۔ ایک ایسے وقت میں جب خواہشوں کا ہجوم اور کامیابیوں کے سارے خوابوں کی تعبیر اپنی دسترس میں محسوس ہوتی ہو اور خوشیاں یوں زندگی میں بکھری ہوئی ہوں جیسے فصلِ بہار

میں پھولوں کی خوشبو... تو فرشتۂ اجل سے مڈبھیڑ کے امکانات کا کوئی تصوّر تک نہیں کرتا۔

خسرو جمشید کے لیے میرا آتنی دُور اور ایسے گمنام عشرت کدے میں یکلخت وارد ہو جانا ایسا ہی تھا۔ بالآخر اُسے یقین آ گیا کہ اس کی آنکھیں دھوکا نہیں دے رہی ہیں اور میرا پیکر اس کے خوف کا تراشا ہوا خیالی عفریت نہیں ہے۔

"تم..." اس نے بمشکل تمام کہا۔ اس میں شک، حیرت، خوف اور ناامیدی کے سارے جذبات عیاں تھے اور یہ ایک لفظ ایک سوال بھی تھا اور اعتراف بھی کہ سوال بے مقصد ہے۔

"ہاں قبلہ نواب صاحب۔" میں نے کہا۔ "یہ میں ہوں۔ آپ بھولے تو نہ ہوں گے مجھ کو... ایک مدت کے بعد ملے ہیں نا اس لیے آپ کچھ حیران اور غالباً پریشان بھی ہیں۔ مگر یہ ملاقات کبھی نہ کبھی ایسے بھی ہونی تھی سو آج ہو گئی... وہ کیا فرماتا ہے فلمی شاعر کہ ہم بھی اکیلے تم بھی اکیلے رات سہانی..."

"تم... یہاں کیسے پہنچے...؟" نواب نے بے خیالی میں ایک احمقانہ سوال کیا... اس سوال کے جواب سے اُسے کیا فرق پڑ سکتا تھا۔

میں نے کہا۔ "کود اتری محفل میں کوئی دھم سے نہ ہوگا... وہ کام کیا ہم نے جو رستم سے نہ ہوگا۔"

نواب نے اپنے کپڑوں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"نہیں جمشید..." میں نے آگے بڑھ کر اس کے کپڑے دُور اچھال دیے۔ "تم کو ان کی کیا ضرورت ہے... شیطان اور حیوان کا شرم و حیا سے کیا رشتہ۔ بے شک تم مہذّب لباس پہن کر دنیا کو دھوکا دیتے رہے ہو... مگر یہاں وہ دنیا کہاں ہے... یہاں تو صرف میں ہوں یا اوپر وہ ہے۔ خدا تو سب کچھ پہلے سے دیکھ رہا ہے اور سب جانتا ہے۔ میں اُس کا حقیر بندہ، تمھیں پہچانتا ضرور ہوں۔"

"ہاں... ہم ایک ہی حمام میں ہیں۔" جمشید نے تلخی سے کہا۔

"مگر میں ننگا نہیں ہوں جمشید..." میں نے کہا۔ "میں تو یوں سمجھ لو کہ وہ غسّال ہوں جو تمھاری میت نہلانے آیا ہو۔"

"مجھے قتل کرنے کے علاوہ تم کیا کر سکتے ہو سکندر بخت۔" جمشید نے کہا۔ "غالباً تمھارے بارے میں یہ بات غلط ہے کہ تم ایک بہادر دشمن ہو۔"

"ہر دشمن بہادر ہوتا ہے جمشید... بہادر نہ ہو تو دشمنی کیسے بھائے۔"

"مگر مشین گن کے ساتھ ایک نہتّے آدمی کو مار دینے میں کون سی بہادری ہے۔" وہ بولا۔

"میرے جذبات سے کھیلنے کی فضول کوشش مت کرو..." میں نے کہا۔ "میں ایسی باتوں سے متاثر ہو کے یہ نہیں کروں گا کہ ایک مشین گن تمھاری طرف بڑھا کے کہوں کہ آؤ... اب مقابلہ ہو جائے نہیں... میں دشمن کو ایک فیصد رعایت دینے کا قائل نہیں... یہ تو وقت کا کھیل ہے... ہر کھیل میں وقفہ آتا ہے جب سائڈ بدل جاتی ہے۔ اب تک تم اُس طرف تھے جدھر سارے فوائد تم کو حاصل رہے۔ تم نے کچھ پوائنٹ زیادہ حاصل کر لیے تھے، مگر گیم تم نے جیتا نہیں تھا۔"

"اور تم سمجھتے ہو کہ تم اب یہ گیم جیت لو گے؟"

"ہاں... تمھارے اور میرے درمیان آج یہ بازی ختم ہو جائے گی... یہ فیصلہ ہو جائے گا کہ کون شکاری تھا اور کون شکار رہا..." میں نے کہا۔

جمشید نے افسوس کے انداز میں سر ہلایا۔ "تم نڈر... ذہین اور اصول پرست تھے سکندر... تم سب کچھ کر سکتے تھے۔ اگر تم چاہتے تو تمھارا شمار چند انتہائی خوش قسمت افراد میں ہوتا جو دولت کو گھر کی باندی بنا کر رکھتے ہیں اور جب چاہیں ارب کھرب بنا لیتے ہیں۔ تم سیاست میں قدم رکھتے تو شاید اس ملک کے صدر منتخب ہو جاتے۔ مگر تمھیں ہمیشہ اندازوں کی غلطی نے دھوکا دیا کیونکہ تم ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی کا شکار رہے ہو۔ اور تم نے زندگی کے راستوں پر چلتے ہوئے صرف بلندی کی طرف دیکھا۔ یہ خیال نہیں رکھا کہ نشیب اچانک آ سکتا ہے... تم روشنی میں چلتے رہے اور اندھیرے کو بھول گئے۔ تمھاری خوش فہمیوں نے تمھیں ہمیشہ منزل سے دُور رکھا۔"

"مجھے یہ تقریر پسند آئی۔" میں نے کہا۔ "پہلی بار میں نے تم کو ایک پیراگراف بولتے سنا ہے، ورنہ تم ہمیشہ مختصر جملے بولتے تھے۔ یا پھر بالکل نہیں بولتے تھے... کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم مجھے اپنے آئینے میں میری صورت کیوں دکھا رہے ہو؟"

"اس لیے کہ تمھیں کامیابی پر غرور کے نشے نے یہاں تک تو پہنچا دیا۔ مگر اپنی فطری خامی کے باعث تم نے واپسی کے راستوں کی فکر نہیں کی۔" وہ اب خاصا پُراعتماد نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"یہ تم نے ٹھیک کہا۔ میں کبھی واپسی یا پسپائی کی نہیں سوچتا۔" میں نے کہا۔ "میں ہر ساحل پر اترتے ہی اپنی کشتیاں جلا دیتا ہوں۔ تم نے کبھی ایسا نہیں کیا چنانچہ تم ہر بار ہزیمت اُٹھا کے بھی بحفاظت نکل جاتے تھے۔ تم نے ایم آر ایس کا نام تو سُنا ہوگا۔"

وہ طنزیہ لیکن تمسخرانہ انداز میں مسکرایا۔

"اس قوت کا وجود دنیا میں ازل سے تھی اور ابد تک رہے گا۔ موٹو کچھ ایسا ہی ہے کہ مرنے سے شہید اور زندہ رہ جانے سے غازی۔"

"بہت جلد تم شہادت کا اعزاز حاصل کرو گے... تمھارے خود ساختہ اصول اور پیمانے... خود فریبی کے سہارے... سب نابختہ شعور کی پیداوار ہیں... تم حبّ الوطنی... دوستی... قربانی اور ایثار... بہادری، شرافت اور انسانیت کی سب صفات کو اپنی ذات سے منسوب کر کے خود ہی خوش ہو جاتے ہو... مجھے مار کے تم کہو گے کہ جہنّم رسید ہوا۔ تمھارے لیے چند سرپھرے کہیں گے کہ وطن کا جیالا اپنے فرض کی ادائیگی میں شہید ہوا۔" جمشید نے کہا۔ "مگر یہ صرف الفاظ کا فرق ہے۔"

"یہ ایمان اور ایقان کا فرق بھی ہے جمشید... مگر اسے تم نہیں سمجھ سکتے۔" میں نے کہا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ "لیکن رات بھر میں یہ فرق میں تمھیں اچھی طرح سمجھا دوں گا... ابھی تو تاریخ بھی نہیں بدلی... میں کہہ سکتا ہوں کہ کل تک ہمارے پاس بہت وقت ہے۔ صبح چھ بجے میں چلا جاؤں گا۔"

"صبح چھ بجے۔" وہ زبردستی ہنسا۔ "تم صرف آدھے گھنٹے بعد کوشش کر کے دیکھنا... تمھیں سارے راستے بند ملیں گے سکندر... مجھے معلوم ہے کہ تم اعتبار نہیں کرو گے... یہ کہو گے کہ میں تمھیں بیوقوف بنا کے مہلت حاصل کر رہا ہوں... لیکن..." اس نے وال کلاک کی طرف دیکھا۔ "ایک آدمی اب سے دس منٹ بعد یہاں پہنچے گا۔ اس کے ساتھ اور لوگ بھی ہوں گے..."

"تم کسی فوجی کی بات تو نہیں کر رہے ہو؟" میں نے بے نیازی سے سگریٹ جلا کے کہا۔ "غالباً انڈین آرمی کا ایک جونیئر آفیسر۔"

"تم نے اُسے جاتے ہوئے دیکھا تھا؟"

"ہاں... جب جہنّم میں تمھاری اس سے ملاقات ہو تو یہ پوچھنا کہ آخر تمھاری گردن کیسے ٹوٹ گئی؟" میں نے کہا۔

"تو تم نے اسے مار دیا۔" جمشید ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا... اب تک ہم نے جتنی گفتگو کی ہے، وہ سب نشر ہو چکی ہے... انھوں نے سب سن لیا ہوگا۔"

میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ میں ایک بے احتیاطی کا مرتکب ہوا تھا۔ مجھے اندر آتے ہی پہلے یہ دیکھ لینا چاہیے تھا کہ کہیں کوئی خفیہ مائکروفون تو نہیں ہے۔ ایسی دور افتادہ جگہ پر خسرو جمشید اپنے ساتھیوں سے بالکل کٹ کے رہنے کی غلطی کیسے کر سکتا ہے۔ اس کے پاس ٹیلیفون تو نہیں ہے مگر رابطے کا کوئی ذریعہ ضرور ہوگا۔ ہنگامی صورت حال میں پیغام دینے اور پیغام وصول کرنے کے لیے اس عشرت کدے میں کسی ٹرانسمیٹر کی موجودگی کو بعید از امکان نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔

میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ "اُٹھو... تم بھی... اور تم بھی۔" میں نے لڑکی کے جسم پر ایک ہلکی سی ٹھوکر لگائی۔ اس نے پھر ایک ہسٹریا زدہ چیخ ماری۔ لیکن میں نے اسے نیچے گھسیٹ لیا۔ خسرو جمشید کا ہاتھ ایک بیڈ سائڈ ٹیبل کی طرف بڑھا ہی تھا کہ میں نے اس کے سر پر مُکا مارا۔ وہ چکرا گیا۔ اس کی شیطانی کھوپڑی میں اس کا مغز ہل گیا ہوگا۔ میں نے اُسے بالوں سے پکڑ کے جھٹکا دیا اور نیچے گرا لیا۔

"دونوں اُلٹے لیٹ جاؤ۔" میں نے کہا۔ "یہاں نہیں۔ آگے کھسک کر دیوار کے قریب جاؤ۔"

"چلو... کوئی بات نہیں..." جمشید نے لڑکی کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "ابھی اس کی بات مان لو... پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

میں نے پہلے تکیوں کے نیچے دیکھا۔ صرف جمشید کے تکیے کے نیچے ایک ریوالور تھا۔ میں نے اُسے خالی کر کے گولیاں دُور پھینک دیں۔ پھر میں نے بیڈ سائڈ ٹیبل کو کھولا۔ اس کے اوپر والے خانے میں دوسرا ریوالور تھا۔ میں نے اُسے بھی خالی کر دیا۔ نیچے والے بڑے خانے کا پٹ کھولتے ہی میں چونک پڑا۔ اس کے اندر روشنی ہو گئی تھی بالکل اسی طرح جیسے کار یا فریج کا دروازہ کھلتے ہی لائٹ جلنے سے ہوتی ہے۔ میں نے ایک بار پھر چھوٹے سے پٹ کو بند کیا اور کھولا... لائٹ کا سوئچ اُسی سے منسلک تھا۔

اندر ایک ٹیلیفون نما آلہ رکھا تھا۔ اس میں ڈائل بھی تھا لیکن ڈائل کے علاوہ کچھ بٹن تھے۔ ان میں سے ایک پر 'پاور' لکھا ہوا تھا اور یہ پُش بٹن تھا جو اس وقت دبا ہوا تھا۔ دوسرے پر 'کوڈ' لکھا ہوا تھا اور تیسرے پر 'ڈی کوڈ'۔ باقی دو بٹن والیوم اور ڈائریکشن کے تھے۔ اس ٹیلیفون سے منسلک تار پیچھے سے نکل کے بیڈ کے نیچے چلا گیا تھا اور غالباً باہر کسی انٹینا سے منسلک تھا۔ یہ موٹا تار تھا جس کے اندر دو یا تین تار بھی ہو سکتے تھے۔ غالباً دوسرا تار کسی بیٹری سے یا اے سی اڈاپٹر سے ملا ہوا تھا۔

میں نے پاور کو آف کیا اور ریسیور اُٹھا لیا۔ اس میں عام فون جیسی ڈائل ٹون آ رہی تھی۔ میں نے مظفر گڑھ میں چند دکانوں کے سائن بورڈز پر چار عدد والے فون نمبر دیکھے تھے۔ میں نے ایک نمبر ڈائل کیا۔ کہیں دور گھنٹی بجنے لگی۔ پھر کسی نے ریسیور اٹھا کے کہا۔ "ہیلو۔"

میں نے کہا۔ "چوہدری صاحب مبارک ہو۔ بھوری بھینس کے بچّا ہوا ہے۔" اور ریسیور رکھ دیا۔ میرا خیال غلط ثابت ہو گیا تھا کہ یہاں کوئی فون نہیں ہے لیکن یہ مخصوص قسم کا فون تھا۔ میں نے پاور کا بٹن پھر دبایا اور ریسیور اُٹھا لیا۔ اس میں صرف سرسراہٹ سنائی دینے لگی۔ عام ٹیلی فون جیسی ڈائل ٹون کی جگہ ایک بہت ہلکی سیٹی باقی رہ گئی۔ یوں لگتا تھا جیسے کہیں تیز ہوا شاخوں سے گزر رہی ہے۔ جمشید اور اس عورت نے دیوار تک کا فاصلہ طے کر لیا تھا۔ وہ کوئی بازاری عورت تھی۔ آج پہلی بار اسے اپنی آبرو کے بدلے پیسہ نہیں ملا تھا۔ اپنے اور خریدار کے نامۂ اعمال میں درج سب گناہوں کی سزا مل رہی تھی، وہ بُری طرح رو رہی تھی اور جمشید کو گالیاں دے رہی تھی جس کی وجہ سے وہ بھی مصیبت میں پڑی۔

میں نے 'کوڈ' کا بٹن دبایا تو سرسراہٹ ختم ہو گئی اور کچھ

عجیب سا شور سنائی دینے لگا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے دو عورتیں قینچی کی طرح زبان چلا رہی ہیں اور لڑ رہی ہیں مگر ایک چینی زبان بول رہی ہے تو دوسری عربی۔ درمیان میں کوئی طبلہ بجا رہا ہے اور شاید کچن میں ایک بچہ برتن گرا رہا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ دوسری طرف سے کوئی پیغام تو دیا جا رہا ہے لیکن وہ کسی مشینی نظام کے ذریعے ناقابلِ فہم بن گیا ہے۔ میں نے 'ڈی کوڈ' کا بٹن دبا دیا اور یکلخت سارا شور ختم ہو گیا۔ کسی نے چلّانا شروع کیا۔

"ہیلو... یہ کیا ہے...؟ نواب جمشید... جواب کیوں نہیں دیتے تم... ہیلو... ہیلو... واٹ دی ہیل... یہ کون عورت شور کر رہی ہے... کیا تم پاگل ہو گئے ہو...؟ اسٹاپ دس نان سنس۔"

اچانک میں نے ایک ریڈیو ڈراما پیش کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے ریسیور کو بیڈ پر رکھا اور ذرا دور سے چلّا کے کہا۔

"میجر... دیکھو باہر سب طرف سے کور کر لیا ہے نا؟"

پھر میں چند قدم پیچھے گیا اور میں نے آواز بدل کے کہا "یس سر۔"

"واٹ یس سر۔" میں نے آگے آ کے پھر کرنل کی آواز میں کہا۔

"اچھی طرح کیموفلاج کر دو سب کو...."

"وہ میں نے دیکھ لیا ہے سر۔" میں نے پیچھے ہو کے کہا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" جمشید نے چیخ کر کہا۔ وہ میری چالاکی کو سمجھ گیا تھا۔

"اوہ شٹ اپ!" میں نے کرنل کی آواز میں دہاڑ کے کہا۔ "ابھی تو میں نے صرف کپڑے اتارے ہیں تمہارے... کیا تم چاہتے ہو کہ میں تمہاری کھال بھی اتار لوں... یو ایڈیٹ..." میرے شور میں جمشید کی آواز دب گئی جو بتانا چاہتا تھا کہ یہ سب دھوکا ہے اور میری چال ہے۔

"جاؤ... میرا منہ مت دیکھو..."

"یس سر..." یہ بات میں نے میجر کی آواز میں کہی۔ "آپ فکر نہ کریں... ان میں سے کوئی بچ کے نہیں جائے گا۔"

"کل الوری سن آف اے بچ..." میں نے دہاڑ کر کہا اور پھر کہا "یہ کیا ہے... وائرلیس فون... اوہ گاڈ...! تم سب اندھے ہو... کسی نے نہیں دیکھا..." میں نے قریب جاتے ہوئے کہا — میں نے یہ ظاہر کیا تھا کہ میں دوسری طرف کی گفتگو بالکل نہیں سن رہا ہوں۔ فون بند کرنے سے پہلے میں نے ریسیور سے کان لگائے تو مجھے دو افراد کے بولنے کی آواز سنائی دی۔

یہ کیا ہوا... یہ تو کوئی گڑبڑ ہو گئی؟"

کون ہے یہ کرنل...؟

"پاکستان آرمی کا لگتا ہے۔"

"باپ رے باپ... اور کون ہے...؟"

"اور ایک میجر... انھوں نے سب طرف سے گھیر لیا ہے۔"

یہ کیسے ہو سکتا ہے...؟"

"ہو گیا ہے پاگل کے بچے..."

"پھر اب کیا کریں... ان کو سگنل دیں...؟"

"کیسے سگنل دیں... وہ راستے میں ہوں گے..."

"مارے جائیں گے چاروں..."

"یہ فون کس نے ملایا تھا...؟"

"میرا خیال ہے کہ نواب نے کوشش کی تھی... کامیاب نہیں ہوا..."

"وہ اندر تک پہنچ گئے ہیں۔"

ہاں... انھوں نے نواب کو مار پیٹا ہے... اور اُسے بھی... شانتا کو..."

"شانتا گئی چولھے میں... اور نواب گیا بھاڑ میں... پر چار آدمی تو گئے... مارے گئے۔"

"مارے جائیں تو فکر نہیں... پکڑے نہ جائیں..."

"یار اسے تو بند کر..."

فون ڈیڈ ہو گیا... وہ دونوں کون تھے اور کہاں سے بات کر رہے تھے، یہ معلوم کرنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ میں صرف اندازہ کر سکتا تھا کہ وہ دس پندرہ میل کی رینج میں ہوں گے کیونکہ نواب نے کہا تھا کہ بیس منٹ میں اس کے مددگار پہنچ جائیں گے۔ اس ٹیلیفون کے ساتھ مختصر فاصلے کا وائرلیس ٹرانسمیٹر تھا اور جیسے ہی پاور کا سوئچ آن کیا جاتا تھا، یہ عام ٹیلیفون ایک وائرلیس ریسیور بھی بن جاتا تھا جو شاید اے ایم بینڈ پر کام کرتا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ عام لائن پر کوئی بھی یہ گفتگو نہیں سن سکتا تھا۔ اگر کوئی سنتا تو اُسے وہی شور سنائی دیتا جو میں نے سنا تھا۔ اس کو ڈی کوڈ کرنا صرف اسی فون پر ممکن تھا اور ایسے ہی دوسرے فون پر دوسری طرف دو آدمی بات کر رہے تھے۔ وہ دونوں سخت پریشان لگتے تھے اور یہ میرے ڈرامے کے کامیاب ہونے کے حق میں ایک دلیل تھی۔ مگر میں نے اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا کہ ڈراما وہ بھی کر سکتے ہیں اور ممکن ہے ان کی پریشانی کا یہ تاثر ایک فریب ہو۔ تاہم مجھے ایک کارآمد بات ضرور معلوم ہو گئی تھی۔ کہیں سے چار آدمی نواب خسرو جمشید کے ایس اوالیس پر مدد کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔

نواب خسرو جمشید بزدل ہی نہیں، بے وقوف بھی تھا ورنہ وہ چلّا چلّا کے کہہ سکتا تھا کہ یہاں کوئی کرنل نہیں اور نہ ہی آس پاس پاکستانی فوج نے مورچے سنبھالے ہیں لیکن وہ سمجھتا تھا کہ ایسی غلطی اس کے حق میں فوری ہلاکت کا سبب بن سکتی ہے۔ خدا کے

سوا اسے مرنے سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا مگر وہ اپنی دانست میں احتیاط سے کام لے کر وقت گزارنا چاہتا تھا۔ امید کا دامن ہمیشہ وقت کے ساتھ بندھا رہتا ہے یہاں تک کہ تختۂ دار کی سمت رواں مجرم بھی دمِ آخر تک کسی معجزے کے رونما ہونے کی امید رکھتا ہے۔ شاید... شاید اچانک کوئی قاصد آ جائے... کوئی فون آ جائے... کہ سزائے موت پر عمل درآمد منسوخ کر دیا گیا ہے یا ملتوی کر دیا گیا ہے... کسی خاص تقریب کے سلسلے میں تمام موت کی سزا پانے والے قیدیوں کی سزائے موت کو عمر قید میں بدل دیا گیا ہے۔

اسی امید نے خسرو جمشید کو مجبور کیا کہ وہ میری فرمانبرداری کرے اور کوئی ایسی بات نہ ہونے دے جو میرے جذبات میں اشتعال کا باعث بنے۔

وہ عورت ہسٹریا میں تقریباً پاگل ہو چکی تھی۔ نہ صرف یہ کہ اس نے جمشید کو ننگی گالیاں دیں بلکہ اس کے منع کرنے پر اُسے تو چانٹا مارا اور اس کے بال کھینچے۔ جمشید پہلے ہی احساسِ ذلت و شرمساری سے سر اٹھانے کے قابل نہ رہا تھا اور اس کی بے بسی کے جذبات کا لاوا اندر ہی اندر پک رہا تھا۔ اس کا بس چلتا تو اس تذلیل کے جرم میں کوڑے مار مار کے میری کھال اُدھیڑ دیتا اور میں غلطی سے بھی اس کے قریب خالی ہاتھ پہنچ جاتا تو وہ میرا گلا ضرور گھونٹ دیتا... یا اس کی کوشش ضرور کرتا۔

مگر یہ اس کی خواہش تھی اور خواہش پر کس کا بس چلتا ہے؟ خسرو جمشید اچھی طرح سمجھتا تھا کہ میرے ہاتھ میں کچھ نہ ہو تب بھی میں اس جیسے دس کو قریب نہ پھٹکنے دوں اور ایک ایک کر کے سب کو لمبا لٹا دوں... چنانچہ جب اس کے اعصاب پر دباؤ ناقابلِ برداشت ہو گیا اور اس کسبی نے بھی اُسے ذلیل کرنا جاری رکھا تو نواب کے جذبات کا آتش فشاں پھٹ گیا۔

"کُتیا... بھونکے چلی جا رہی ہے... دو کوڑی کی رنڈی..."

اس نے ایک دم اسے گردن سے دبوچ لیا۔ شاید تصور میں اس نے میری گردن دبا لی تھی اور یہ احساس بھی اس کے زخمِ رسوائی کا مرہم نہ سہی درد کم کرنے کی دوا تو تھا۔

میں نے اس عورت کی ساری بکواس کو غیر اہم سمجھتے ہوئے نظر انداز کیا تھا... وہ نواب صاحب کو ذلیل کر رہی تھی تو گویا میرا ہی ایک کام کر رہی تھی۔ مجھے اس کو منع کرنے کی کیا ضرورت تھی... اگر وہ مجھ سے کچھ کہتی تو شاید میں بھی اُسے کچھ کہتا۔

مجھے اس کی 'فصاحت و بلاغت' پر حیرانی ضرور تھی۔ وہ کوئی جاہل عورت نظر نہیں آتی تھی خصوصاً اپنے تراشے اور سیٹ کیے ہوئے بالوں سے... مگر یہ سارے انداز نمائشی تھے۔ اندر سے وہ ایک تھرڈ ریٹ طوائف تھی۔ اس کا جسم ہی بے حیا نہیں تھا بلکہ جذبات و احساسات بھی فحش تھے۔ پھر فحش الفاظ کی کیا اہمیت رہ جاتی ہے۔ آج تک اُس نے اپنے اطوار پر تہذیب و شائستگی یا سوشل ایٹی کیٹس... کا پردہ ڈال رکھا تھا تو موت کے خوف نے وہ بے وجود پردہ ہٹا دیا تھا۔

جب خسرو جمشید نے مشتعل ہو کے اس کی گردن دبوچی تو وہ ہوش میں نہیں تھا۔ میں نے عورت کو چیختے سُنا اور اسے جمشید کے مضبوط ہاتھوں کی گرفت میں ایسے پھڑکتے بھی دیکھا جیسے شکاری باز کے پنجے میں کوئی چڑیا پھڑپھڑاتی ہے۔ میں اسے بچانے کے لیے آگے بڑھا اور رُک گیا۔ آخر مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں ایک گنہگار کے ہاتھوں دوسرے گنہگار کو قتل ہونے سے روکوں۔ جبکہ ہر اعتبار سے واجب القتل دونوں ہی تھے۔ عورت کا قانون کی نظر میں جرم کوئی نہ تھا، تب بھی مذہب اُسے سنگسار کرنے کا حکم دیتا تھا اور خسرو جمشید کے دامن پر تو اتنے بے گناہ لہو کے داغ تھے کہ ہر داغ پر اسے ہر روز پھانسی دی جاتی تو اسے ہزاروں بار مرنا پڑتا۔

میں نے جمشید کو موقع دیا کہ وہ کرۂ ارض پر سے ایک گنہگار کے بوجھ کو کم کر دے۔ معلوم نہیں یہ خدا کے نزدیک اس کی نیکی شمار ہوگی یا ایک اور گناہ... حقیقت کو دیکھا جائے تو جمشید نے کسی اصلاحی جذبے سے مغلوب ہو کے ایک طوائف کا قتل نہیں کیا تھا۔ اس نے ذاتی عداوت میں اسے مار دیا تھا۔

چند منٹ میں وہ مر گئی اور اس کا ساکت جسم کھلی آنکھوں سے مجھے گھورنے لگا۔ یوں جیسے وہ اپنی موت کا الزام مجھے دے رہی ہو کہ یہ سب تمہارا قصور تھا۔ نہ تم آتے نہ موت آتی... لیکن میں نے اپنے ضمیر پر بھی یہ الزام قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس جنگ میں اب تک بہت سے بے گناہ بھی مارے گئے تھے پھر ایک گنہگار عورت کا کیا ہے؟

آہستہ آہستہ خسرو جمشید پر حقیقت آشکار ہونے لگی کہ غصے میں اُس نے کیا کر دیا ہے۔

"تم نے ایک قتل اور کر دیا ہے مرنے سے پہلے۔" میں نے اس کو ذہنی اذیت دینے کے لیے کہا۔

وہ کچھ نہیں بولا۔ اس کی نظریں خلا میں دیکھتی رہیں۔

"تم نے سُن ہی لیا ہوگا... جو کچھ میں نے کہا تھا۔"

"تمہارے کہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ بے وقوف نہیں ہیں۔" خسرو جمشید نے کہا۔

میں نے کہا "میرا بھی یہی خیال تھا... مگر اب نہیں ہے۔ مسٹر نواب صاحب... یہ کون لوگ تھے؟"

"جب وہ آئیں تو انہی سے پوچھ لینا۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ نہیں آ رہے ہیں جمشید... میں

تمھیں یقین کرنے پر مجبور نہیں کرتا... تم ان کا انتظار کرتے رہو۔ تم نے دس منٹ کہا تھا نا... ایک گھنٹا کافی ہے تمھیں ؟"

" ایک گھنٹے کے بعد کیا ہوگا ؟" وہ تلخی سے بولا۔

" ایک گھنٹے کے بعد میں پھر آؤں گا۔" میں نے کہا۔" اس وقت حالات بدل چکے ہوں گے... ابھی تو تمھیں یقین ہے کہ کوئی تمھیں بچالے گا۔ جب اس کی امید بھی نہیں رہے گی تو میں دیکھوں گا کہ تمھارا رویہ کیا ہے۔"

جمشید نے سر اُٹھا کے پُر امید نظروں سے میری طرف دیکھا " پھر تم کیا کرو گے ؟"

" تمھارا مطلب ہے کہ کیا میں تمھاری جاں بخشی کردوں گا ؟... تو یہ وعدہ کرنا بہت مشکل ہے... ہاں مخصوص حالات میں تمھارا کیس ایم آر ایس کی جیوری کے سامنے رحم کی درخواست کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے اور اگر تم اپنی افادیت ثابت کرسکے... یہ یقین دلانے میں کامیاب رہے کہ تم نے پرانے ساتھیوں کو چھوڑ دیا ہے، ماضی کی غلطیوں سے توبہ کرنے کے بعد آئندہ کے لیے بھی تائب ہو گئے ہو اور اس کا قرض ادا کر سکتے ہو...!"

" کس قسم کا کفارہ ؟"

" یہی کہ تم آئندہ ہمارے ساتھ تعاون کرو... تم بہت کچھ جانتے ہو کیونکہ اب تم ملاور کے دستِ راست تھے۔ ڈی سلوا کی موت کے بعد... اس کا دوسرا بازو سراج تھا۔ تم ہمیں کارآمد معلومات فراہم کر سکتے ہو... اور تصدیق کے بعد وہ معلومات درست ثابت ہوں گی تو ممکن ہے تمھاری زندگی تمھیں بخش دی جائے... ظاہر ہے کہ پھر تم دھوبی کے کُتّے بن جاؤ گے۔ تمھارے لیے دونوں راستے بند ہوں گے... مگر تیسرا راستہ کھلا ہوا ہوگا... تم واپس ولایت جا سکتے ہو... جہاں تم برسوں رہے ہو... لیکن اسے میرا وعدہ مت سمجھنا۔ یہ تو دوسروں کی مرضی پر منحصر ہے۔ اگر تم نے ہمارے دشمنوں کے بارے میں ہر بات بتا دی تو اس ذخیرۂ معلومات کے بدلے تمھاری جان کا سودا ہوسکتا ہے بشرطیکہ معلومات مستند... مکمل اور اہم ہوں... ظاہر ہے تم کو اپنے ساتھیوں سے غداری کرنی ہوگی... مگر غداری ایک بار کی جائے یا دس بار... برابر ہے۔ یہ تمھارے مسلک میں اور فطرت میں شامل ہے۔ ورنہ آدمی ایک بار بھی غداری کرنے پر موت کو ترجیح دیتا ہے۔ تم زندگی کو ترجیح دیتے ہو اس لیے غداری کرو گے تو یہ تمھاری اپنی نظر میں عقل مندی ہوگی جس سے تمھاری جان بچ جائے گی۔ ورنہ تو تم جانتے ہی ہو، آدمی سے معلومات ایسے نچوڑی جا سکتی ہیں جیسے گنّے میں سے رس نکالا جاتا ہے... ایک بار... پھر دُہرا کرکے... پھر تیسری بار مزید دُہرا کرکے جب گنّے کو مشین سے گزارا جاتا ہے تو آخر میں صرف پھوک رہ جاتا ہے۔ دونوں انتخاب تمھارے ہیں... غداری کرو یا دوستوں سے یا دشمنوں کے ہاتھوں پھوک ہو جاؤ گے۔"

یہ سب بکواس تھی... میں صرف جمشید کو ذہنی طور پر ... دے رہا تھا۔ ہر غدار اور بے ضمیر آدمی بزدل ہوتا ہے اور زندگی سے اتنا پیار کرتا ہے کہ غیرت و حمیت، عزت آبرو، شرم و حیا اور ... انسانیت کے سارے جذبوں کو قربان کرنا گوارا کرتا ہے... جیسی زندگی جمشید گزار رہا تھا۔ بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست شراب اور شباب میں ڈوبی ہوئی عشرت کی وہ زندگی جو دولت کی فراوانی سے حاصل ہوئی تھی۔ جس میں دنیا ہی جنت تھی... اسے خسرو جمشید کیسے آسانی سے ختم ہونے دیتا۔ یہی سوچ کے میں نے اس کو تھوڑا سا بریں واش کیا تھا تاکہ وہ کسی قسم کی مزاحمت کے بغیر دلاور اینڈ کمپنی کے سارے راز اُگل دے۔

میں نے گھڑی دیکھی تو دس منٹ گزر چکے تھے۔ مجھے اب یہ فیصلہ کرنا تھا کہ میں کیا حکمتِ عملی اختیار کروں۔ اس کمرے میں ... اُن چار افراد کا انتظار کروں جو جمشید کی مدد کے لیے روانہ ہو چکے تھے اور جن کو واپس بلانے کے معاملے میں دوسری طرف کے لوگ بے بس نظر آتے تھے۔ وہ اب پہنچنے ہی والے ہوں گے۔ کمرے کے اندر رہ کر میں زیادہ محفوظ تھا اور ان چاروں کو اندر آتے ہی شوٹ کرسکتا تھا۔

لیکن میں جانتا تھا کہ ایک ساتھ وہ چاروں اندر آنے کی حماقت نہیں کریں گے۔ ان میں سے کوئی ایک اندر آئے گا اور باقی تین باہر محاصرہ قائم کریں گے۔ جیسے ہی ایک مارا گیا، باقی تین چوکس ہو جائیں گے اور خود اندر آنے کے بجائے مجھے باہر نکالنے کی کوشش کریں گے۔ وہ باہر رہ کے آزاد تھے اور امداد بھی حاصل کرسکتے تھے... اندر صرف ایک مشین گن پر میں کب تک انحصار کرسکتا تھا ؟

چنانچہ دوسری صورت یہ تھی کہ میں نواب کو کہیں باندھ کر ڈال جاؤں اور خود باہر نکل کے مورچا بندی کرلوں۔ تیسری صورت یہ تھی کہ میں نواب کے ساتھ فرار ہو جاؤں۔ لیکن اس آخری صورت میں مسئلہ یہ تھا کہ ہم شہر سے بہت دُور تھے اور میرے پاس وہ گاڑی بھی نہیں رہی تھی جو جمشید کی ملکیت تھی۔ اس کی دو مرسیڈیز کاریں ہم تباہ کرچکے تھے اور یہ تیسری مونی رکال کے لے گئی تھی۔ وہ مرسیڈیز گاڑیوں کا شوقین معلوم ہوتا تھا اور اس اعتبار سے واقعی نواب تھا۔ مجھے مونی پر تاؤ دکھانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ وہ ناگن بالآخر خود کو ناقابلِ اعتماد ثابت کرکے نکل گئی تھی۔ اس نے میرا قرب حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کرلی تھی لیکن پھر ایک ایسا مرحلہ آگیا کہ اس کے ارادے خاک میں ملنے کے آثار پیدا ہو گئے۔ کوئی ایسی وجہ تھی کہ وہ خسرو جمشید کا سامنا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے مجھے مطمئن کرنے کے لیے ایک کہانی بھی سنادی تھی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ... قائل بھی ہوگیا تھا مگر حقیقت کچھ اور تھی... موقع ... طور پر میں ... اس نے گاڑی کو ہاٹ وائر یعنی سیلف کے تار ملا کے اسٹارٹ ... تے ہی بھاگ گئی۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے اور جس عورت کو ... خصوصی ایجنٹ کی تربیت دے کر ایسے مشن پر بھیجا گیا ہو اس کے ... لیے تو طیارہ ہائی جیک کرلینا بھی مشکل نہ ہوتا۔

" جمشید... تم کیا پسند کرو گے ؟" میں نے کہا۔" اسی حالت میں میرے ساتھ جنگل میں مارچ کرتا... رضاکارانہ طور پر ہاتھ پیر بندھوا کے اور مُنہ بند کرا کے بے ہوش ہوتا... یا ناک آؤٹ ہو کے لیٹنا...؟"

" میں دوسرا طریقہ پسند کروں گا... اگر تم واقعی میری پسند کو اہمیت دینے کے معاملے میں سیریس ہو..."

" اس کا تو ابھی پتا چل جائے گا۔" میں نے کہا اور مشین گن ایک طرف رکھ دی... خسرو جمشید نے میرے حکم پر ایک پردہ پھاڑا اور اس میں سے چھ ساڑھے چھ فٹ لمبی پٹیاں پھاڑیں۔ پھر وہ بیڈ پر لیٹ گیا۔ ہاتھ پیر بالکل سیدھے کرکے اور میں نے اُسے ڈھانپتے ہوئے بیڈ شیٹ اس کے گرد لپیٹ دی۔ پھر میں نے ساری پٹیاں جوڑ کے ایک لمبی رسّی بنائی اور اُسے پیروں کی طرف سے لپیٹنا شروع کیا۔ نائلون کے پردوں کی پٹیاں خاصی مضبوط تھیں۔ جمشید کسی مُردے کی طرح پڑا ہوا تھا چنانچہ جب اس کے پورے جسم پر پٹیاں لپٹ گئیں تو وہ بالکل اہرامِ مصر سے نکل ہوئی کسی فرعون کی ممی نظر آنے لگا۔ میں نے اس بات کا اطمینان کرلیا تھا کہ ہلنے جُلانے سے کوئی بل ڈھیلا نہ ہو اور جمشید اپنے ہاتھ ہلانا بھی چاہے تو نہ ہلا سکے۔

اس کام میں میرے دس منٹ صرف ہو گئے۔ اب مجھے باہر کی فکر لاحق ہونے لگی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس عمارت کے اندر محصور ہو جاؤں اور مقابلہ کیے بغیر دشمن کے ہاتھ لگ جاؤں۔

خسرو جمشید کے مُنہ میں کپڑا ٹھونس کے میں نے اس کو کندھے پر اٹھالیا اور اُسے باتھ روم میں لے گیا لیکن وہاں ایسی کوئی جگہ نہ تھی جہاں میں اُسے چھپا سکتا یا باندھ کے رکھ سکتا۔ مجبوراً میں نے اس کے بوجھ کو واپس کمرے میں پہنچایا اور بیڈ کے سرہانے کی جانب نیچے ڈال دیا۔ وہ دیوار اور بیڈ کی درمیانی جگہ میں پھنس گیا اور میں نے اُسے پیروں کی طرف سے ایک پلنگ کے ساتھ باندھ دیا۔ دوسری طرف سے میں نے اس کے گلے میں رسّی کا ایسا پھندا بنا کے ڈالا کہ وہ اُٹھنے ... کی کوشش کرتا تو پھندا ٹائٹ ہو جاتا اور وہ زور لگا کے ... ہلتا تو خود کو پھانسی لگا لیتا۔

مجھے امید تو نہیں تھی کہ نیچے تہ خانے تک آنے والے ایک عورت کی لاش دیکھنے کے بعد جمشید کو کمرے میں تلاش کریں۔ یہ ہوسکتا تھا کہ وہ کمرے میں اِدھر اُدھر نگاہ ڈالیں یا باتھ روم میں جھانک لیں۔ اس وقت نواب گردن اور سر ہلا کے بیڈ کو کھینچ سکتا تھا تاکہ وہ متوجہ ہو جائیں۔ بصورتِ دیگر اس بات کا امکان نہیں تھا کہ وہ نواب کو ایسے تلاش کریں جیسے کوئی گم ہو جانے والی جوتی تلاش کرتا ہے۔

" اب تم سیدھے لیٹے رہو گے تو زندہ رہو گے۔" میں نے پھر مشین گن اُٹھا کے کہا۔" ہل جُل کے خودکشی کرنا چاہو تو تمھاری مرضی... یہاں آکے کسی نے تم کو بچا لیا تب بھی باہر تمھاری لاش ہی جائے گی۔ میں حویلی کے اندر ہی ہوں... میں بھی دیکھ لوں کہ تمھارے جاں نثار تمھیں بچانے کے لیے آتے ہیں یا نہیں۔ آئیں گے تو میں ان کا استقبال کروں گا اور تمھیں معلوم ہو جائے گا۔" میں نے مناسب سمجھا کہ ٹیلیفون ریسیور کو بھی مشین گن کا بٹ مار کے توڑ ڈالوں... پھر میں سیڑھیاں چڑھ کے باہر نکل گیا... ٹارچ لائٹ میرے ہاتھ میں تھی۔ حویلی سے نکل کے میں نے اُسے بجھا دیا اور ایسی جگہ رکھ دیا جہاں سے پھر اُسے آسانی کے ساتھ اُٹھایا جا سکے۔ یہ عمارت ایک منزلہ تھی اور چھت پر چاروں طرف ایک ایسی منڈیر بنی ہوئی تھی جیسی عموماً قلعوں پر نظر آتی ہے۔ چاروں کونوں پر چار بُرج سے تھے۔

اوپر پہنچنے کے لیے زینہ ابھی تک مجھے نظر نہیں آیا تھا۔ تلاش کرنے پر چھت تک جانے کا راستہ مل ہی جاتا لیکن چھت بھی حرکت پذیری کو محدود کردیتی تھی۔ بے شک چھت پر چڑھ کے میں دُور تک دیکھ سکتا تھا اور اگر مورچا قائم کرلیتا تو سامنے سے آنے والوں کو نشانہ بھی بنا سکتا تھا مگر یہ یقین نہیں تھا کہ وہ سامنے سے ہی آئیں۔ وہ چار سمتوں سے بھی آسکتے تھے۔ میں چاروں طرف سے ان کا راستہ کیسے روکتا ؟

میں نے کھلے باغ کی پناہ کو بہتر سمجھا۔ صدر دروازے تک جانے والا راستہ اس بات کی نشاندہی کرتا تھا کہ اِدھر سے آمدورفت ہوتی ہے۔ اندھیرے میں بھی جھک کر دیکھنے سے مجھے ٹائروں کے نشانات نظر آگئے۔ گیٹ سے سڑک تھوڑا سا بائیں طرف گھوم کر جاتی تھی اور پھر اس سیدھی سڑک سے مل جاتی تھی، جس پر چل کے ہم یہاں تک پہنچے تھے۔

میں نے صدر دروازے سے باہر آکے خود کو جھاڑیوں کے پیچھے محفوظ رکھتے ہوئے چلنا شروع کیا۔ تقریباً سو گز چلنے کے بعد پھر موڑ آگیا۔ یہ جگہ مجھے دفاعی نقطۂ نظر سے مناسب ترین لگی۔ وہ سڑک کی طرف سے بھی آسکتے تھے مگر یہ ممکن تھا کہ وہ گیٹ سے داخل ہونے سے گریز کریں۔ میں خود بھی فصیل کے ایک شگاف سے گزر کے اندر گیا تھا۔ اگر وہ عقل اور احتیاط سے کام لیں گے تو چار

مختلف سمتوں سے اندر جائیں گے۔۔۔اور یہاں بیٹھ کے میں کم سے کم دو افراد کو دیکھ سکوں گا کہ وہ کہاں سے داخل ہوئے ہیں۔ مجھے ان چاروں کو ایک ہی راؤنڈ میں بھون دینے کا موقع بھی مل سکتا تھا بشرطیکہ وہ چاروں میرے سامنے ایک گاڑی سے اتریں یا گاڑی کو گیٹ کی طرف لے جائیں۔

ابھی میں نے صحیح پوزیشن بھی نہیں لی تھی کہ میرے کانوں نے دُور سے آنے والی گاڑی کی آواز سُنی۔ میں نے غور کیا کہ یہ آواز کس قسم کی گاڑی کی ہوسکتی ہے۔ کاریں تو عموماً بے آواز ہوتی ہیں۔ جیپ کے، مرسیڈیز کے اور فاکس ویگن کے انجن کی آواز جُدا ہونے کے سبب پہچانی جاسکتی ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ قریب ہونے والی یہ آواز سب سے جُدا تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی کار کے سائیلنسر میں سوراخ ہے اور کار سیکنڈ گیئر میں پندرہ بیس میل کی رفتار سے چل رہی ہے یا اس سے بھی آہستہ۔

کار کے آہستہ چلنے کا سبب سمجھ میں آتا تھا۔ اس کی ہیڈ لائٹس بجھادی گئی تھیں۔ اندھیری رات میں جنگل کے درمیان سے گزرنے والی تاریک سڑک کو دیکھنا مشکل کام تھا۔ یہ کام وہی کر سکتا تھا جس کی نظر بھی تیز ہو اور جسے اس سڑک پر آتے جانے کا کچھ تجربہ بھی ہو۔۔۔ یہ معلوم ہو کہ سڑک پر اچانک کوئی موڑ نہیں آتا۔ کوئی کھڈا نہیں ہے اور کوئی رُکاوٹ نہیں ہے۔ گاڑی اگر پکّی سڑک سے ذرا نیچے اتر بھی جائے گی تو کوئی نقصان نہیں ہوگا اور اگر رفتار کم ہوگی تو یہ معلوم ہوتے ہی اُسے واپس سڑک پر لانا مشکل نہ ہوگا۔ مجھے اور موہنی کو یہاں تک پہنچانے والا اس راستے سے واقف تھا۔ اس کی جگہ میں گاڑی چلا رہا ہوتا تو یہ کام میرے لیے آسان نہ ہوتا۔

سڑک کے درمیان میں ٹھہر کے میں نے آواز کی سمت میں دیکھا، جو اب خاصی واضح تھی۔ انھوں نے پارکنگ لائٹس تک بجھا رکھی تھیں اور میرے اندازے کے مطابق اب بھی وہ دو فرلانگ دور تھے مگر آواز سے لگتا تھا کہ وہ چند گز کے فاصلے پر موجود ہیں۔ میرے ذہن میں اس آواز کو سُن کے بکتر بند گاڑی کا خیال آتا تھا لیکن اس علاقے میں بکتر بند گاڑی لے کر آنے کی غلطی وہ کیسے کر سکتے ہیں۔ جو خالص فوجی استعمال کی گاڑی ہے۔ یہ تو ایسا ہی ہوگا جیسے ٹینک لے کر چڑھائی کرنا۔ یہ کوئی سرحدی علاقہ نہیں تھا جہاں اس قسم کی کاروائی ممکن ہو۔

پھر اچانک بات میری سمجھ میں آگئی۔ وہ ٹریکٹر پر آرہے تھے۔ اس علاقے میں کسی کا بھی رات کے وقت ٹریکٹر پر پھرنا شک پیدا نہیں کرسکتا۔۔۔ مگر کیا یہ ضروری ہے کہ ٹریکٹر پر وہی ہوں؟

ابھی میں انہی خیالات میں اُلجھا ہوا تھا کہ انجن بند ہوگیا اور رات کے سکوت میں جیسے ٹھہراؤ آگیا۔ میں لپک کے ایک [illegible] پر ہوگیا، یہ اچھا ہی ہوا کیونکہ اسی وقت ٹریکٹر کی لائٹس جل [illegible] گئیں۔ اگر میں سامنے ہوتا تو وہ مجھے دیکھ لیتے۔ اور شاید لڑ[illegible] شروع ہوجاتی۔ یہ لڑائی کم اور شکار زیادہ ہوتا، جس میں بیک وقت پانچ افراد شکاری اور شکار کی حیثیت سے حقیقی [illegible] کس کو تلاش کرسکتا ہے اور بے خبری میں گولی مار سکتا ہے یہ [illegible] سے زیادہ بخت کے یاور ہونے پر منحصر ہوتا۔

آہستہ آہستہ میں نے سڑک پر آگے بڑھنا شروع کیا۔ میں [illegible] سی سڑک سے دس گز دُور درختوں کی قطار کے پیچھے چل رہا تھا۔ میں ان کے زیادہ سے زیادہ قریب ہوجانا چاہتا تھا۔ ہمارے درمیان [illegible] کم ہونے لگا تھا۔ ان کے قدموں کی چاپ میں صاف سُن رہا تھا مگر وہ اکٹھے چل رہے تھے۔ چنانچہ میرے قدموں کی آہٹ انھیں محسوس نہیں ہوسکتی تھی۔ اس کے علاوہ انھیں یہ خیال بھی نہیں [illegible] کہ کوئی ان کی طرف آسکتا ہے۔ اگر وہ کوئی سرسراہٹ سُن بھی پاتے تو اُسے جنگل کے کسی جانور کی حرکت سمجھتے۔

"بس۔۔۔ یہاں رُک جاؤ۔" کسی نے انگریزی میں کہا۔

میں خود بھی رُک گیا۔ اب میں نے اپنی ساری توجہ اُن کی گفتگو پر مرتکز کردی۔

"تم سب نے نقشہ سمجھ لیا ہے؟" اسی شخص نے کہا، وہ کوئی بنگالی تھا۔

"آہو جی۔۔۔ ہُن دستو اگاں۔۔۔"

"سوار جی۔" بنگالی نے خفگی سے کہا۔ "یہ کیا ہے۔۔۔ تم نے کیا کہا ہے؟"

"میں نے عرض کی سرکار کہ حکم کریں۔۔۔"

"تو یہ بات تم انگریزی میں نہیں کہہ سکتے؟ تم جانتے ہو کہ باقی سب تمھاری بھاشا نہیں سمجھتے۔"

"او جناب۔۔۔ اتنی انگریزی آتی تو ہم بھی لفٹین ہوتے۔"

"تم بہت نان سیریس رہتے ہو ہر وقت۔۔۔ مجھے تمھاری [illegible] کرنی پڑے گی۔۔۔ انگریزی نہیں آتی تو اُردو بولو۔" بنگالی گرم ہوگیا۔

"چلیں جانے دیں سر۔" کسی اور نے کہا۔ "آپ تو جانتے [illegible] اس کی عادت۔۔۔"

"اچھا دیکھو۔ سامنے سے کوئی نہیں جائے گا۔" بنگالی [illegible]

"سوائے میرے۔۔۔ مگر میری بات اور ہے۔۔۔ سردار جی۔۔۔ تم [illegible] پر پہنچنے کے لیے پیچھے سے راستہ بناؤ گے اور اوپر سے ہی [illegible] کرو گے۔"

"فکر نیش جناب عالی۔۔۔ پہنچ گیا میں کوٹھے تے۔"

"باقی دو کو مشرق اور مغرب کی طرف سے جانا ہے۔۔۔ ہوشیاری سے معلوم نہیں وہ کدھر چھپے ہوئے ہوں۔" وہ بولا۔

"ہمارا تو خیال ہے کہ وہ سب اندر ہوگا۔" چوتھا شخص شاید مدراسی تھا۔

"تم اپنا خیال اپنے ساتھ رکھو۔۔۔ کام آئے گا۔۔۔" بنگالی نے کہا۔ "اب جاؤ۔۔۔ بکھر جاؤ۔"

وہ مجھ سے پچاس ساٹھ فٹ دُور تھے اور میرے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ میں ایک دم ان پر برسٹ مار کے سب کو ختم کردوں۔۔۔ ایک راؤنڈ چلا دینے کے بعد میں بھی خالی ہاتھ رہ جاتا اور اگر ان میں سے ایک بھی بچ جاتا تو وہ مجھے نہ چھوڑتا۔ دو بچ جاتے تو میں دو طرف سے فائرنگ کی زد میں آجاتا اور وہ مجھے چھلنی کر دیتے۔ میرے لیے ضروری تھا کہ میں ان سے فرداً فرداً نمٹوں۔

میں نے ان کے جنگل میں گھسنے کی سرسراہٹ سُنی۔۔۔ ویسے پاؤں میں نے بھی واپسی اختیار کی۔ ان کی حکمتِ عملی سمجھنے کے بعد میرے لیے اپنا لائحۂ عمل مرتب کرنا آسان ہوگیا تھا۔

سب سے پہلے میں بنگالی کو خوش آمدید کہہ سکتا تھا جو غالباً بہادری میں برتری ثابت کرنے کے لیے سامنے سے اندر داخل ہونا چاہتا تھا۔ میں واپس سڑک کے موڑ تک گیا اور انتظار کرنے لگا۔ چند منٹ کے بعد میں نے محسوس کیا کہ کوئی اِدھر ہی آرہا ہے۔ یہ بنگالی ہی ہوسکتا تھا۔ سوال یہ تھا کہ کیا وہ گیٹ سے گزرے گا؟ نہیں۔۔۔ وہ اتنا بے وقوف نہیں ہوسکتا۔

میں نے سڑک پار کی اور فصیل کے اس حصّے کی طرف گیا جس کے شگاف سے ہم اندر گئے تھے۔ یہ شگاف تقریباً سڑک کی سیدھ میں تھا۔ اندر جا کے میں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو مجھے نیم کا ایک درخت فصیل کے اوپر سے باہر تک پھیلا ہوا دکھائی دیا۔

میں نے مشین گن نیچے رکھ دی اور پیڑ پر چڑھ گیا۔۔۔ یہ کام آسان نہیں تھا۔ اس کا تنا بہت موٹا تھا اور اس پر موٹے موٹے لال چیونٹے چل رہے تھے۔ انھوں نے کئی بار میرے ہاتھوں پر کاٹا۔ چند چیونٹے میرے بازو پر چلنے لگے اور آستین میں داخل ہوگئے۔ انھوں نے میری بغل میں کاٹا۔ میں برداشت نہ کرتا تو کیا کرتا۔۔۔ فصیل پر پہنچنے والی ایک شاخ پر رُک کے میں نے ان چیونٹوں کو اندر ہی مسل دیا جو میرے شانے کا گوشت کھانے لگے تھے۔ ان کے نظر نہ آنے والے دانتوں کی اذیت کسی نوکِ خار کی رگڑ سے کم نہ تھی۔

فصیل پر اترنے کے بعد میں نے اس پر لیٹ کر آٹھ دس فٹ کا سفر بھی بڑی اذیت میں کیا کیونکہ اس پر بھی وہی لال چیونٹے موجود تھے۔ مجھے یہ ڈر بھی تھا کہ بوسیدہ فصیل کا کوئی حصّہ گر نہ جائے۔ بالآخر میں شگاف کے عین اوپر پہنچ گیا۔ یہ سب سے خطرناک جگہ تھی۔ دس فٹ بلند فصیل میں نیچے پانچ فٹ کا خلا پیدا ہوگیا تھا۔ اوپر ایک پُل سا رہ گیا تھا اور صاف ظاہر تھا کہ یہ پرانی بے سہارا اینٹوں کا پانچ فٹ لمبا ٹکڑا خود اپنے وزن سے بھی گر سکتا تھا جس پر میں نے اپنے وزن کا اضافہ کر دیا تھا۔

میں نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھا تو مجھے ایک سائے کی خفیف سی حرکت محسوس ہوئی۔ میں چوکنا ہوگیا۔ یہ بنگالی تھا جو سرتاپا سیاہ لباس میں آگے بڑھ رہا تھا۔ کسی سیاہ چیتے کی طرح۔ عیاری سے اور بے آواز قدموں سے چلتا ہوا۔۔۔ وہ درختوں کے تنوں کے پیچھے پناہ لیتا ہوا بڑھ رہا تھا۔ میں سانس روکے اس کا انتظار کرتا رہا۔ ابھی تک مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ کدھر جائے گا لیکن میں ایسی پوزیشن میں تھا کہ اس کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھ سکتا تھا۔

جب وہ سیدھا شگاف کی طرف لپکا تو میں نے اطمینان کا گہرا سانس بھی روک لیا۔ میں نے اس شکستہ فصیل کی معلق اینٹوں پر ٹھہر کے خود اپنے لیے بہت بڑا رسک لیا تھا۔ میں اینٹوں سمیت گرتا تو ملبے میں میری ہڈی پسلیوں کا چُورا ہوجاتا۔ لیکن خدا نے مجھے بچائے رکھا تھا اور میری محنت رائیگاں نہیں گئی تھی۔

بنگالی نے شگاف کے اندر قدم رکھا ہی تھا کہ میں نے پیروں کو سمیٹا۔ ہاتھوں کے بل پر خود کو اٹھایا اور بنگالی پر یوں جست لگائی کہ وہ میرے جسم کے نیچے دب گیا۔ خود بخود میرے ہاتھ اس کے سر اور ٹھوڑی پر جم گئے۔ ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت میں بائیں ہاتھ سے ٹھوڑی پکڑ کے میں نے سر کو دائیں ہاتھ سے جھٹکا دیا اور بنگالی کی گردن یوں گھوم گئی، جیسے سر اور دھڑ کے درمیان کوئی ہڈی تھی ہی نہیں۔۔۔ ہڈی کے ٹوٹنے کی آواز تو خود اس کے کانوں نے بھی سُنی ہوگی۔

تیس سیکنڈ بعد میں کھڑا ہوگیا۔ بنگالی کا جسم اب بھی ہل رہا تھا لیکن جسم کا دماغ سے رشتہ ختم ہوگیا تھا، چنانچہ اس کا احساس مرچکا تھا اور جسم مر رہا تھا۔ میں نے اس کی جامہ تلاشی لی اور حسبِ توقع مجھے اس کے پاس سے کچھ نہیں ملا۔ اس کی اسٹین گن میں نے ایک کندھے پر ڈالی اور اپنی مشین گن دونوں ہاتھوں میں تھام کے میں حویلی کی طرف بھاگا۔۔۔ ہر قسم کی احتیاط کو نظر انداز کرتے ہوئے۔ مجھے معلوم تھا کہ باقی تین ابھی دُور ہوں گے۔ انھیں تھوڑا سا گھوم کر آنا تھا۔ سب سے کم فاصلہ جنوب کی طرف سے آنے والے کو طے کرنا تھا۔ تقریباً دگنا فاصلہ شمالی سمت سے داخل ہونے والے کو درپیش تھا۔ سوار جی کا چکر لمبا تھا کیونکہ ان کو عقبی حصّے تک پہنچنا تھا مگر میں نے پہلے انہی سے ملاقات کا فیصلہ کیا۔

چھت تک پہنچنے کا راستہ تلاش کرنے میں وہ ٹارچ لائٹ بہت کارآمد ثابت ہوئی۔ میں نے وہ دروازہ بند کردیا جس سے

میں اندر گیا تھا اور ٹارچ لائٹ کی مدد سے مختلف کموں سے گزرا جو سب ویران پڑے ہوئے تھے۔ لوگ اُسے آسیب زدہ حویلی سمجھتے تھے تو حق بجانب تھے۔ اس کو رکھنے والوں نے عمداً ویران رکھا تھا اور اس سے بھوت پریت کی خوں آشامی کی داستانیں منسوب کی تھیں۔ خسرو جمشید ایک اسمگلر تھا۔ اس نے رانی کی حویلی کو اپنا ایک ٹھکانا بھی بنا رکھا تھا اور عشرت کدہ بھی مگر جو کچھ تھا' وہ زیرِ زمین تھا۔ کوئی شامت کا مارا اوپر آ پہنچتا تھا تو اس کی خبر نیچے مل جاتی تھی۔ اسے مار کے آس پاس ہی کہیں گاڑ دیا جاتا تھا اور معلوم نہیں اب تک کتنے بے گناہ ان تسکاری بھوتوں کا نشانہ بن چکے تھے۔

زینہ مجھے عقبی حصے میں ملا۔ اوپر تک جانے والی سیڑھیاں بھی ٹوٹ رہی تھیں لیکن میں احتیاط سے قدم رکھتا ہوا چھت تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ مجھے امید تھی کہ سوار جی بھی پہلے زینہ ضرور تلاش کریں گے مگر سکھ تو سکھ ہے۔ اس کا کیا بھروسا کہ واہ گرو کا خالصہ کہے اور اُڑ کے اوپر پہنچنے کی کوشش کرے۔

لیکن سردار جی نے تو میرے بارہ بجا دیے۔ نیچے حویلی کے کسی گھنٹے نے بارہ کے گجر بجانا شروع کیے ہی تھے کہ مجھے ایک منڈیر پر اُبھرنے والا سر دکھائی دیا جو اندھیرے میں سیاہ گولے کی طرح اُبھرا اور غروب ہو گیا۔ میں دیوار کے سائے میں لیٹ کر ساکت ہو گیا۔ سر پھر اوپر آیا اور اس مرتبہ قائم رہا۔ اوپر آنے والا اب چھت کا جائزہ لے رہا تھا اور میں حیران تھا کہ آنے کا یہ کون سا راستہ ہے۔ مجھے بعد میں پتا چلا کہ وہ ایک ڈرین پائپ کے سہارے چڑھ کے اوپر آئے تھے۔

میں نے سر کے بعد دھڑ کو منڈیر پر نمودار ہوتے دیکھا' پھر ایک سایہ چھت پر اُتر آیا۔ آہستہ آہستہ دبے پاؤں اس نے منڈیر کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کیا۔ میں چوکس ہو گیا کیونکہ اس کا رُخ اسی سمت میں تھا' جدھر میں دبکا پڑا ہوا تھا۔ بے شک' وہ دُور سے اندھیرے میں میرے خدوخال کو عمارت کے خاکے سے جُدا نہیں دیکھ سکتا تھا مگر قریب آتے ہی وہ دیوار اور آدمی کے فرق کو محسوس کر لیتا۔

میں نے اِدھر اُدھر ہاتھ مارا تو پلاسٹر کا ایک اُکھڑا ہوا ٹکڑا میری گرفت میں آ گیا۔ اُسے میں نے ہاتھ کو کم سے کم حرکت دیے بغیر یوں اُچھالا کہ وہ مخالف سمت میں کُھلی چھت پر گرا۔ سوار جی ایک دم گھوم گئے اور ان کی اسٹین گن کا رُخ بدل گیا۔ وہ چند سیکنڈ تک اسی پوز میں منتظر رہے کہ کچھ ہو یا کوئی سامنے آئے۔

میں بھی چند سیکنڈ کی مہلت ہی چاہتا تھا' جس میں میرے لیے کھڑا ہونا ممکن ہو۔ سوار جی کے اور میرے درمیان بیس فٹ کا فاصلہ ہو گا۔ یہ فاصلہ اس وقت بہت زیادہ ہو جاتا ہے جب حریف اپنے ہاتھ میں اسٹین گن لیے فائر کھول دینے کے لیے تیار کھڑا ہو۔

میں نے اپنی مشین گن کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا سردار جی نے پلٹ کے دیکھا۔ گولیوں کا ایک برسٹ آیا مگر وہ غوطہ مار کے نکل چکا تھا۔ چھت سے اڑنے والی سیمنٹ میرے چہرے سے ٹکرائیں۔ پھر میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

فضا دوسری بار مشین گن کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھی... نے ایک بھیانک چیخ بلند کی اور وہ اُچھلا تو اس کے ہاتھ بھی اوپر اٹھ گئے۔ اس کی مشین گن ایک دھماکے سے ... کی چھت پر گری۔ وہ خود منڈیر کے قریب پہنچ چکا تھا اچھلنے کے بعد وہ نیچے آیا تو اس کا آدھا دھڑ منڈیر پر لٹک گیا۔ اس نے کرب کے ساتھ ایک بل کھایا تو اس کی ٹانگیں تھوڑا سا اوپر اٹھ گئیں۔ وہ منڈیر پر سے غائب ہو گیا۔ اس کی لاش حویلی کے سامنے والے حصے میں تقریباً اٹھارہ فٹ کی بلندی سے گری۔

اسی وقت تیسرا شخص شامتِ اعمال کے باعث سامنے آ گیا... وہ جنوب کی طرف سے اندر پہنچ چکا تھا اور دوسروں کی طرح بہت مطمئن تھا کہ وہ سب کی آنکھوں میں دھول جھونکنے میں کامیاب رہا۔ محاصرہ قائم کرنے والی پاکستانی فوج کے کسی ... نے اُسے نہیں دیکھا۔

جب سکھ فوجی میری چلائی ہوئی گولیوں سے زخمی ہو کر اُچھلا تھا تو اس کی پگڑی گر گئی تھی۔ جب وہ نیچے گرا تو تیسرا شخص نے یہ سمجھا کہ شاید سردار جی نے چھت پر موجود دشمن پر فائر کیے تھے مگر دشمن بچ گیا اور اس نے جان بچانے کے لیے کود کر پر سے چھلانگ مار دی ہے۔ تیسرا شخص دُور نہیں تھا مگر اندھیرے میں اس کی نظر دھوکا دے گئی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ سوار جی کے سر پر پگڑی نہیں تھی اور بغیر پگڑی کے کودنے والا اس کے نزدیک دشمن ہی ہو سکتا تھا۔ اس نے بھی نیچے گرتی ہوئی لاش پر ایک راؤنڈ چلا دیا۔

مرے کو مارے شاہ مدار۔ یہ شاہ مدار اپنی جلد بازی پر پشیمان ہوا ہو گا مگر جنگ کے میدان میں غلطی یا غلط فہمی ہی شکست کے اسباب پیدا کرتی ہے۔ لاش پر گولیاں برسانے والے کو تاسف کے سوا کچھ نہ ملا ہو گا لیکن مجھے اس کی صحیح پوزیشن کا سراغ مل گیا۔ اب میں عجلت پسندی کا مظاہرہ کرتا تو مشین گن کا رُخ اس کی سمت رکھتے ہوئے فائر کھول دیتا لیکن میرے سامنے کوئی نہیں تھا۔ وہ گھاس اور جھاڑیوں میں روپوش تھا۔ میری کوشش کی کامیابی اور ناکامی کے امکانات ففٹی ففٹی تھے۔ اُدھر میری پوزیشن ایسی نہیں تھی کہ میں چانس لے سکوں۔ میں نے سر کو جھکا کے اور گھٹنوں کے بل دوڑتے ہوئے فصیل...

... وھے گیا۔ کنگورا دو فٹ چوڑا اور اونچا تھا۔ اوپر سے اس فصیل کا باہر ... نیچے محرابی تھی چنانچہ دو کنگوروں کے درمیان جہاں ان کی قوس ... وہاں تھوڑا سا خلا آ جاتا تھا۔ اس خلا سے میں نیچے بھی ... اگر وہ تیسرا آدمی اپنی جائے پناہ سے نکلتا تو میں اسے ... قدم بھی نہ چلنے دیتا اور اوپر ہی سے اس کے جسم میں باقی ماندہ گولیاں پیوست کر دیتا۔ لیکن وہ اپنی کمین گاہ سے باہر نہیں آیا۔ چھت کے آخری حصے میں پہنچ کے میں نے نیچے جھانکا۔ سکھ اسی طرف سے آیا تھا۔ اب میں اسی شخص کی تقلید کر رہا تھا جس کے بارے میں میرا خیال تھا کہ اس کی عقل سکھوں والی ہو گی... میں نے وہ ڈرین پائپ تلاش کیا جو لوہے کا تھا لیکن زنگ کا بنا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

پانچ منٹ بعد میں نے قدم زمین پر رکھے اور دیوار کے ساتھ چلتا ہوا کونے تک گیا۔ مجھے یقین تھا کہ اب تک شمال کی طرف سے داخل ہونے والا چوتھا شخص بھی پہنچ چکا ہو گا مگر میں نے اُسے نظرانداز کر دیا۔ میری ساری توجہ فی الحال اُس تیسرے شخص پر تھی جو ابھی تک سامنے کی لمبی گھاس میں لیٹا ہوا تھا یا بیٹھا ہوا تھا۔ فوری طور پر مجھے ایسی کوئی ترکیب نہ سوجھی جو اُسے باہر نکالنے میں مؤثر ثابت ہوتی۔ میرے لیے انتظار کے سوا چارہ نہ تھا۔

پانچ منٹ... دس منٹ۔ پھر پندرہ منٹ گزر گئے... میں اسی سمت میں نظر جمائے بیٹھا رہا جہاں میرے خیال میں دشمن چھپا ہوا تھا۔ لیکن اس وقت جب میں مایوس ہو کے یہ سوچنے لگا تھا کہ کہیں میں ایک مفروضے کو حقیقت سمجھے تو نہیں بیٹھا ہوں' دشمن نے اپنی موجودگی کا سراغ دے دیا۔ اُسے میں صرف اس کی بدبختی کہہ سکتا ہوں کہ وہاں دم سادھ کر بیٹھے بیٹھے اسے اچانک چھینک آ گئی... کہنے والے ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ عشق مشک ... چھپائے نہیں چھپتے۔ اس نے کوشش ضرور کی ہو گی کہ غلط وقت اور غلط جگہ پر نازل ہونے والی چھینک کو روک لے مگر ناک نے وفا نہ کی۔

اس نے چھینک کو دونوں ہاتھوں کی پناہ میں اور گھٹنوں میں مُردے کر دبایا ہو گا یا آواز کو کم سے کم رکھنے کی کوئی دوسری تدبیر یقیناً کی ہو گی۔ پھر بھی میں نے وہ آواز سُن لی۔ اب میرے لیے نشانہ لینا زیادہ آسان ہو گیا۔ کامیابی کی سو فیصد ضمانت اب بھی نہ تھی لیکن مجھے یہ احساس پریشان کر رہا تھا کہ میں ساری رات یہاں بیٹھ کے نہیں گزار سکتا۔ میں نے اللہ کا نام لیا اور اپنے اندازے پر بھروسا کرتے ہوئے مشین گن کا رُخ صحیح سمت میں کیا اور پورا راؤنڈ چلا دیا۔ مشین گن کو تھوڑا سا دائیں بائیں حرکت دیتے ہوئے میں نے تقریباً پانچ چھ گز میں گولیاں برسائیں۔

جب میں نے اس کی دردناک چیخ اور نزع کے کرب کی صدا سُنی تو مجھے یقین آیا کہ میرا نشانہ خطا نہیں گیا اور میں اپنی جگہ سے نکل کے بھاگا... میرا رُخ اب باہر کی طرف تھا۔ مجھے یقین تھا کہ چوتھا شخص فائرنگ کی آواز سن چکا ہو گا اور جب اپنے ساتھیوں کی لاشیں دیکھے گا۔ تہ خانے میں جا کے نواب کو غیر موجود پائے گا مگر اُسے نواب کے ساتھ دادِ عیش دینے والی طوائف کی لاش ملے گی پھر وہ دیکھے گا کہ کار غائب ہے اور ٹرانسمیٹر فون ٹوٹا ہوا ہے تو وہ یہی نتیجہ اخذ کرے گا کہ ہم نواب کو اغوا کر کے نکال لے گئے یا اُسے پاکستانی فوجی گرفتار کر کے لے گئے۔ پھر وہ وہاں سے فرار میں ہی عافیت سمجھے گا۔

سیدھی سڑک پر میں نے پیچھے دیکھے بغیر اپنا سفر جاری رکھا لیکن آتنی احتیاط ضرور کی کہ سڑک سے ہٹ کے چلوں مبادا کوئی اور گاڑی نمودار ہو جائے۔ مجھے یہ اندیشہ بھی تھا کہ کہیں ان کے ساتھ پانچواں شخص ڈرائیور نہ ہو۔

ٹیکن ٹریکٹر لاوارث کھڑا ہوا تھا۔ اُسے سڑک سے کچھ فاصلے پر درختوں کے پیچھے چھپانے...... کی واجبی سی کوشش کی گئی تھی۔ اس سڑک پر سے اس وقت گزرنے والا کون تھا جس کا اُنھیں خطر ہوتا مگر میری نظر دونوں جانب دیکھ رہی تھی۔ میں نے اسے فوراً دیکھ لیا۔ اس لیے بھی کہ ٹریکٹر کا رنگ زرد تھا۔

میں اب رانی کی حویلی سے تقریباً آدھا میل کے فاصلے پر تھا۔ ٹریکٹر کے پیچھے والے حصے سے ٹیک لگا کے میں نے بنگالی کی اسٹین گن کا بار اپنے شانے سے اُتارا اور زمین پر پیر پھیلا کے بیٹھ گیا۔ بے اختیار میرا ہاتھ سگریٹ کی طلب میں جیب کی طرف گیا مگر میرے پاس نہ سگریٹ تھی اور نہ ماچس۔

میں نے ٹریکٹر پر چڑھ کے سامنے والے خانے کی تلاشی لی۔ پھر پیچھے دیکھا تو مجھے ایک تھرماس پڑا ہوا نظر آیا۔ اس میں گرم کافی تھی۔ یہ خدا کی دین تھی اور بقولِ شاعر کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے۔ سگریٹ تو نہیں ملی مگر کافی مل گئی جس کی طلب اِن حالات میں یوں دب گئی تھی جیسے غربت میں سوکھی روٹی میسر نہ ہو تو عشق بھی نہیں سوجھتا۔

میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور مزے لے لے کر کافی کے دو مگ خالی کر دیے۔ تھرماس میں اتنی ہی کافی تھی۔ خالی تھرماس کو میں نے جنگل کی طرف اچھال دیا۔ اس نعمتِ غیر مترقبہ نے میرے حوصلے اور میری جسمانی توانائی کے گراف کو میرے ارادوں سے بھی بلند کر دیا۔ رات کا ایک بج گیا... پھر ڈیڑھ بج گیا۔ انتظار میرے اعصاب پر اثر انداز ہونے لگا اور میرے ذہن میں نئے اندیشے

بیدار ہو گئے۔ کہیں وہ چوتھا شخص کسی اور طرف سے تو نہیں نکل گیا۔

میں نے ایک ٹیلیفون ٹرانسمیٹر کو تباہ کر دیا تھا۔ لیکن وہ کسی اور طرح بھی تو اپنا پیغام آگے پہنچا سکتا ہے۔ مزید کمک طلب کر سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کوئی پورٹیبل واکی ٹاکی ہوا... مگر نہیں... اس کے ساتھیوں کی گفتگو فون پر سننے کے بعد یہ معلوم ہو چکا تھا کہ وہ روانہ ہو جانے والوں کو واپس نہیں بلا سکتے۔ ان کے پاس واکی ٹاکی ہوتا تو وہ رابطہ قائم نہ کر لیتے؟ مگر کیا اس عمارت میں دوسرا فون نہیں ہو سکتا؟

اچانک میں نے باتوں کی آواز سنی۔ میں ایک دم کھڑا ہو گیا۔ کم سے کم دو افراد رانی کی حویلی کی طرف سے آ رہے تھے۔ جیسے جیسے وہ قریب آتے گئے ان کے الفاظ واضح ہونے لگے۔ ان میں سے ایک خسرو جمشید تھا جو دوسرے شخص کو اپنے ساتھ ہونے والی ساری زیادتی کا احوال سناتے ہوئے سخت مشتعل تھا۔ اس نے کسی نہ کسی طرح خود کو آزاد کر لیا تھا یا وہ تہ خانے میں پہنچ جانے والے چوتھے شخص کو متوجہ کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا جو اُسے رہا کر کے اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ خسرو جمشید نے اسے بتا دیا ہو گا کہ آس پاس کوئی پاکستانی فوج نہیں، اور نہ وہاں کوئی کرنل نجر پہنچا تھا۔ وہ سب میرا ڈراما تھا۔

میں نے چوتھے شخص کے ساتھ نواب کی تشریف آوری کے امکان کو نظر انداز نہیں کیا تھا۔ وہ اب بالکل بے خوف تھے کیونکہ ان کو کسی کا ڈر نہیں رہا تھا نہ پاکستانی فوج کی موجودگی کا اور نہ میرا۔ شاید میرے بارے میں انھوں نے فرض کر لیا تھا کہ میں چار افراد کا مقابلہ نہ کر سکا اور جان بچا کے نکل گیا۔

وہ سیدھے ٹریکٹر کی طرف آ رہے تھے۔ میں سانس روکے کھڑا رہا اور آفاتِ ناگہانی سے محفوظ رہنے کی دعا مانگتا رہا کہ مجھے چھینک نہ آئے، اچانک کوئی سانپ نمودار نہ ہو جائے یا کوئی اُڑنے والا کیڑا میری ناک کو ڈنک مارنے کے لیے پسند نہ کر لے۔

جب وہ ٹریکٹر پر چڑھ گئے اور ان پر میری موجودگی کا راز افشا نہ ہوا تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ خسرو جمشید اب لباس بدل چکا تھا۔ اس کا ساتھی ویسے تو دیہاتی لباس میں تھا مگر وہ انگریزی بول رہا تھا اور اپنے لب و لہجے سے بنگالی لگتا تھا۔

وہ نواب پر برہم تھا۔ "تم بھی ویسے ہی نواب ہو جو شطرنج کی ایک بازی پر سلطنت ہار دیتے ہیں اور پیشہ ور طوائفوں کے ناز و انداز پر اور پیشہ ور قصیدہ گو شاعروں پر زر و جواہر نچھاور کرتے کرتے خود فقیر ہو گئے۔"

"تم حد سے بڑھ رہے ہو... میں ایک ذمے دار آدمی ہوں۔" جمشید نے گرم ہو کے کہا۔

"ذمے دار... مائی فُٹ... تم شراب کے نشے میں [...] ہوئے تھے اور اُس طوائف نے تمھیں عقل و ہوش سے بیگانہ [...] تھا۔ ورنہ کیا یہ ممکن تھا کہ دشمن یوں سر پر آ پہنچتا؟"

"یہ تو میں بھی نہیں سمجھ پایا۔" جمشید نے دبے ہوئے [...] کہا۔ "کہ آخر وہ کمینہ وہاں پہنچا کیسے... کس نے اسے [...] اس جگہ کا؟"

"ہوشیار لوگ سب معلوم کر لیتے ہیں... خصوصاً جب [...] معلوم ہو کہ حریف کو تو اپنا ہوش نہیں۔"

"عزیز میاں! اس جگہ کا علم میرے سوا کسی کو نہیں تھا۔" [...] نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔

"یہ بھی تمھاری غلطی تھی۔" وہ بولا۔ "اگر تمھارا آدمی ہمارے [...] نہ پہنچتا تو ہم تمھاری مدد کے لیے کیسے آتے... کیا فرشتے مجھے [...] دکھاتے؟ اور نواب صاحب... کیا سکندر بخت کو بھی تمھارے یہاں ملنے کی خبر فرشتوں نے پہنچائی تھی؟ اگر تمھارے سوا کسی کو معلوم نہیں تھا تو اس راستے پر وہ کیسے آ گیا... تم جھوٹ بول رہے ہو مجھ سے..."

"ایک آدمی اور تھا۔" نواب نے کہا۔ "میرا شوفر... جو میرا سیکرٹری بھی تھا اور محافظ بھی۔"

"وہی جو تمھارے میک اپ میں ڈبل رول کرتا تھا...؟" عزیز تمسخر اڑانے کے انداز میں بولا۔

"ہاں..."

"اس وقت کہاں ہے وہ؟" عزیز میاں نے کہا۔

"وہ سات نمبر کیمپ کی طرف گیا تھا۔" نواب نے کہا۔

"وہی جو تباہ کر دیا گیا تھا؟"

"ہاں۔"

"وہاں اب کیا تھا؟" عزیز میاں بولا۔ وہ دونوں ٹریکٹر [...] بیٹھے ہوئے یوں باتیں کر رہے تھے جیسے انھیں کسی کا انتظار ہو۔

"میں نے اُسے نہیں کہا تھا۔ میں نے تو منع کیا تھا مگر یہ حکم دینے والوں کو میری گاڑی اور شوفر دونوں درکار تھے۔" جمشید نے کہا۔

"بس تو پھر اس پہ فاتحہ پڑھ لو۔" عزیز میاں نے کہا۔ "اگر اس جگہ کا پتا دو ہی آدمی جانتے تھے تو شک کی کون سی گنجائش رہ جاتی ہے کہ سکندر بخت کو اسی نے سب بتایا... اور ظاہر ہے اپنی خوشی سے... بہ رضا و رغبت نہیں بتایا۔"

"اگر وہ مارا گیا تو میں... انھیں معاف نہیں کروں گا۔"

"کسے معاف نہیں کرو گے؟" عزیز میاں نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

"جنھوں نے اُسے زبردستی بھیجا تھا... یہ جانتے ہوئے بھی کہ سکندر بخت اور اس کے ساتھی وہیں موجود ہیں۔ اُسی [...]تے ہیں... وہ اتنی تباہی پھیلا چکے تھے۔ ان کو زندہ گرفتار کرنے کا سوچنا پاگل پن تھا اور دیکھ لو اس کا نتیجہ... صرف ایک بچ کے واپس پہنچا تھا... وہ بھی موہنی کی وجہ سے... جو ایک عورت تھی۔"

"میں نے اس کی لاش بھی دیکھ لی ہے۔"

"کیا تمھیں معلوم ہے کہ اس نے اپنے کرنل کو خود گولی مار دی تھی؟"

"واٹ نان سنس...!"

"یہ بات خود اس نے مجھے بتائی تھی۔" جمشید نے کہا۔

"کیا اُن کے درمیان دشمنی تھی؟"

"ہاں... تم کہہ سکتے ہو... دشمنی کی وجہ ایک لڑکی تھی جو کرنل کی بیٹی تھی اور کرنل اس کی شادی کے معاملے میں اپنے رویے میں ایک سوت کی لچک پیدا کرنے پر تیار نہ تھا۔ کرنل زندہ رہتا تو..."

"پھر تو ٹھیک ہی ہوا کہ وہ مارا گیا... ورنہ اس کا کورٹ مارشل ہوتا تو اُسے فائرنگ اسکواڈ کے سامنے مرنا پڑتا... حد ہے بدمعاشی کی... ڈسپلن اور مورال کوئی چیز ہی نہیں رہا... ایک لڑکی کے لیے اپنے باس کو... اتنے سینئر افسر کو قتل کر دینا بہت سنگین جرم تھا۔" عزیز میاں اب بے حد مشتعل تھا۔ "مگر میں پھر کہوں گا نواب صاحب کہ یہ سب آپ کی کوتاہی کا نتیجہ ہے۔"

"اس نے میرے باڈی گارڈ کو قتل کر دیا تھا..."

"باڈی گارڈ!" عزیز میاں نے حقارت سے کہا۔ "جیسی روح ویسے ہی فرشتے... وہ بھی دُھت پڑا ہو گا... شراب کے نشے میں یا چرس کا دم لگا کے۔ معلوم نہیں تم جیسے آدمی کو قابلِ اعتماد کیوں سمجھ لیا گیا... میری رائے میں تم اس قسم کی ذمے داری کے لیے بالکل نااہل ہو۔"

"تم یہ بھول رہے ہو عزیز میاں کہ میری تو عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں۔" جمشید ایک دم غصے میں قابو سے باہر ہو گیا۔ "تم عدم سے وجود میں بھی نہیں آئے تھے، جب میں نے اسلحے سے بھری ہوئی کشتی مجاہدوں کو پہنچائی تھی۔ وہ تحریکِ خلافت کا دور تھا۔"

"پھر اب آپ مجاہدوں کے ساتھ کیوں نہیں ہیں؟" عزیز میاں شرمندگی مٹانے کے لیے بولا۔ "کشتی نے رُخ کیوں بدل دیا ہے؟"

"وقت بدل گیا ہے میاں... اور جب وقت بدلتا ہے تو قدریں بدل جاتی ہیں۔ شرافت کے پیمانے بدل جاتے ہیں۔ انسانوں کی نظریں اور ان کے دل بدل جاتے ہیں۔" نواب خسرو جمشید نے تلخی سے کہا۔ "کیا ملا تھا مجاہدوں کو... تحریکِ خلافت میں جان دینے والوں... اور..."

"اور کیا... تم تقسیم کی بات کرتے ہوئے ڈرتے ہو؟"

"نہیں... ڈرتا نہیں... لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد میری آنکھیں کھل گئیں۔ کون نہیں جانتا ان کی شہادت کے پیچھے کار فرما عوامل کو... اس حادثے نے مجھے... دل برداشتہ کر دیا۔ میں نے کہا میاں جمشید یہ اصول اور نظریات سب کتابی باتیں اور جذباتی نعرے اب ختم ہوئے، اب لوٹ کھسوٹ کا دور ہے... تم اسے منفی سوچ کہہ سکتے ہو مگر جب صرف پیسہ ہی عزت کا پیمانہ بن جائے اور حرام حلال... جائز ناجائز کی تفریق مٹ جائے... اور قانون مذاق ہو جائے تو سوچ سیدھی کیسے رہ سکتی ہے... یہ ٹھیک ہے کہ اب بھی سیدھی سوچ رکھنے والے موجود ہیں... اور میرا دشمن ہے تو کیا، میں سکندر بخت کو صحیح سوچ رکھنے والے مثالی انسان کی طرح پیش کر سکتا ہوں۔ میں کمزور تھا کہ بھٹک گیا اور میں بھی دونوں ہاتھوں سے پیسہ کمانے والوں میں شامل ہو گیا... میں سمجھتا ہوں کہ میں گھاٹے میں نہیں رہا... خصوصاً جب میں ان کی کسمپرسی اور حالتِ زار دیکھتا ہوں... جو بدستور وضعداری نبھا رہے ہیں تو مجھے کوئی شک نہیں رہتا کہ میں نے جو کیا ٹھیک کیا۔"

"میرا خیال ہے کہ بنگالی بھی مارا گیا ہو گا۔" عزیز میاں نے کہا۔ "ہم کب تک انتظار کریں اس کی واپسی کا؟"

"اس کی لاش تو نظر نہیں آئی۔"

"ہاں... مگر اتنی دیر میں وہ دس بار اندر جا کے واپس آ سکتا تھا۔"

"چلو عزیز میاں اب یہ ٹھکانا بھی چھوٹا۔" جمشید نے ایک سرد آہ بھر کے کہا۔ "لگتا ہے کہ اب ہم پر زمین تنگ ہو گئی ہے۔ کہیں سر چھپانے کا ٹھکانا بھی نہ رہے تو آدمی کہاں جائے... کیوں کر جیے۔"

یہ خسرو جمشید کی شخصیت کا وہ روپ تھا جو پہلی بار میرے سامنے آیا تھا۔ مجھے افسوس ہوا کہ اس کی ہوس پرست لالچی فطرت نے اُسے اتنی جلدی سیدھے راستے سے بھٹکا دیا۔ اگر اس کے خیالات اور نظریات میں استقامت ہوتی تو وہ... پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ کے عقیدے سے منحرف نہ ہوتا۔

میں نے پہلے فیصلہ کیا تھا کہ ٹریکٹر پر چڑھ جاؤں اور عزیز میاں کو مار کے جمشید کو اپنے ہمراہ لے جاؤں لیکن پھر مجھے عقل

نے روک لیا۔ میں نے ان کے ساتھ جانے کا فیصلہ کیا۔ اس کے لیے جگہ میں نے پہلے ہی منتخب کرلی تھی۔ جب ٹریکٹر اسٹارٹ ہوا تو میں پیچھے پیر لٹکا کے بیٹھ گیا۔

ٹریکٹر نے موڑ کاٹا اور واپس مظفر گڑھ جانے والی سڑک پر دوڑنے لگا۔ اس کا دوڑنا ایسا ہی تھا جیسے اونٹ کا دوڑنا۔ مجھے بہت ہچکولے لگ رہے تھے اور جب اچانک ٹریکٹر کچی زمین پر سیدھے ہاتھ کی طرف مڑ گیا تو میرے لیے توازن برقرار رکھنا ایک مشکل کام ثابت ہوا۔ ایک طرف مجھے اسٹین گن کو سنبھالنا تھا تو دوسری طرف خود کو۔ کئی بار اسٹین گن ٹریکٹر کی باڈی پر لگی مگر ٹریکٹر کے چلنے سے اتنا شور ہو رہا تھا کہ آگے بیٹھے ہوئے عزیز میاں اور جمشید نے کچھ نہیں سُنا۔

عزیز میاں یقیناً مشرقی پاکستان کے علیحدگی پسند عناصر کا ایجنٹ تھا اور بھارتی ایجنٹوں کے ساتھ مل کے کام کر رہا تھا۔ اگر میرا اندازہ درست تھا تو ان کے بیس کیمپ میں بس اب دو ہی آدمی تھے۔ جن کی گفتگو میں نے وائرلیس فون پر سُنی تھی۔ تیسرا عزیز میاں تھا۔ چنانچہ میرے لیے پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی۔ میں ان تینوں کو فنا کرسکتا تھا۔

ٹریکٹر تقریباً ڈیڑھ گھنٹے چلتا رہا۔ جنگل کے راستوں پر کئی بار دائیں بائیں مڑنے سے میں صحیح سمت بھی بھول گیا۔ پھر میں نے اوپر آسمان کی طرف دیکھا تو قطب ستارے نے میری مدد کی۔ رات کے دو بجے ٹریکٹر اچانک رُک گیا۔ اس کے پہیوں کے سامنے کوئی منڈیر آگئی تھی۔ جھٹکا لگا تو میں اچھل کے نیچے جا پڑا اور چونکہ انجن بند ہوگیا تھا اس لیے عزیز میاں نے وہ آواز سُن لی جو اسٹین گن کے گرنے سے پیدا ہوئی تھی۔

میں ایک دم اُٹھا اور میں نے اپنا ہاتھ اسٹین گن کی طرف بڑھایا لیکن اتنی دیر میں عزیز میاں نیچے اتر کے اپنا ریوالور نکال چکا تھا۔ اس نے فائر کیا اور میں غوطہ مار کے ٹریکٹر کے بڑے پہیے کے پیچھے ہوگیا۔ ٹریکٹر نہ ہوتا تو مجھے دوسری گولی سے بچنے کے لیے جائے پناہ نہ ملتی۔ تاہم عزیز میاں کو تیسری گولی چلانے کی مہلت نہ ملی۔ میں نے ایک دم سامنے آکے فائر کھول دیا اور کم سے کم نصف درجن گولیاں اس کے جسم کے پار ہوگئیں۔

وہ خیمہ میں نے بعد میں دیکھا جس کے اندر سے دو افراد فائرنگ کی آواز سُن کے دوڑتے ہوئے نکلے تھے۔ وہ بھی اس فائرنگ کی زد میں آگئے۔ میں نے اسٹین گن کا رُخ بدل کے انھیں موقع ہی نہیں دیا کہ وہ مجھ پر گولی چلا سکتے۔ ان کے ریوالور ہاتھوں میں ہی رہ گئے اور وہ خاک اور خون میں لوٹنے لگے۔

خسرو جمشید کود کے خیمے میں جا گھسا تھا۔

"اندر جو بھی ہے باہر آجائے۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "... بھون کے رکھ دوں گا۔"

صرف خسرو جمشید اپنے ہاتھ سر پر رکھے نمودار ہوا۔ "اور کوئی نہیں ہے۔" وہ بولا۔

"یہ میں خود دیکھ لوں گا۔" میں نے کہا۔ "میں تم پر اعتبار نہیں کرسکتا۔"

اس خونریزی نے جمشید کو سخت دہشت زدہ کر دیا۔ "دیکھو سکندر بخت! مجھے مت مارو۔" وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ "تم نے جو کہا تھا، میں وہی کروں گا... میں تم کو سب بتا دوں گا..."

"کیا بتا دوں گا؟" میں نے اسٹین گن کا رُخ اس کی طرف کر دیا۔

"جو کچھ مجھے معلوم ہے... جو تم پوچھو گے۔" وہ ہکلایا۔

"اندر کیا ہے... اسلحے کے علاوہ...؟"

"اندر اسلحہ نہیں ہے۔" وہ بولا۔ "صرف وائرلیس سیٹ ہے۔"

"اچھا... تو یوں کرو۔" میں نے کہا۔ "یہ سب لاشیں کے اندر ڈالو... پھر اس خیمے کو آگ لگا دو۔"

"آگ لگا دوں!"

"ہاں... ٹریکٹر کے لیے ڈیزل تو ہوگا؟" میں نے کہا۔ "اندر باہر چھڑک کے دیا سلائی دکھا دو... اور خود یہاں آکے جگہ کھڑے ہو جاؤ۔ میں یہاں سے بیس گز دُور تمھارا نشانہ لے کے لیٹ جاتا ہوں۔"

"وہ... دراصل... مجھے بالکل صحیح اندازہ نہیں..." خسرو جمشید کی حالت غیر ہوگئی... "ممکن ہے کچھ اسلحہ ہو... کا مجھے علم نہ ہو۔"

"تمھارا علم کتنا محدود ہے... یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں نواب کے کُطفے۔" میں نے کہا۔ "تم مجھے دھوکا نہیں دے سکتے۔ اندر چلو، مجھ سے آگے۔"

نواب نے تعمیل کی اور پلٹ کے اس خیمے میں داخل ہوا جو خاصا کشادہ تھا... اندر ایک طرف زمین پر ترپال بچھی ہوئی تھی۔ یہ اُن کے سونے کی جگہ تھی۔ دوسری طرف کچھ کھانے پینے کا بندوبست تھا اور تیسری جانب وائرلیس ریسیور رکھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ٹرانسمیٹر بھی تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان لوگوں کا رابطہ دُور دُور تک شاید سارے پاکستان میں پھیلے ہوئے ایجنٹوں اور بھارت تک ہوگا۔ یہ ٹرانسمیٹر ریڈیو کاربیٹری سے آپریٹ ہوتا تھا۔

اس جگہ مجھے لکڑی کا ایک صندوق نظر آیا۔ یہ اسلحے کا ہوا تھا۔ ڈھکن کھول کر دیکھتے ہی مجھے مشین گن کے راؤنڈ، دستی بم اور دو ڈائنامائیٹ نظر آئے۔

"اسے باہر لے جاؤ۔" میں نے جمشید کو حکم دیا۔

"میں اسے اُٹھا نہیں سکتا۔" وہ بولا۔

"تم اسے گھسیٹ کر تو لے جاسکتے ہو۔" میں نے کہا۔

مجھے ڈیزل آئل کے دو ٹن خیمے کے باہر ملے۔ لکڑی کے صندوق میں سے دستی بم اور ڈائنامائیٹ نکال کے میں نے ٹریکٹر کے ٹول باکس میں ڈال دیے۔ صندوق کو میں نے پھر خیمے میں پہنچا دیا۔ خسرو جمشید نے میری ہدایات کے مطابق سارا ڈیزل آئل خیمے پر اور لاشوں پر چھڑک دیا۔ میں نے ایک کاغذ جلا کے خیمے کے پاس پھینکا اور ٹریکٹر پر چڑھ گیا۔ خیمے کے کینوس نے آگ پکڑ لی تھی۔ خسرو جمشید جھلاہٹ میں میرے ساتھ بیٹھا اور میں نے ٹریکٹر اسٹارٹ کر کے واپس موڑ لیا۔

سو گز کے فاصلے سے میں نے اس خیمے کو ایک الاؤ کی طرح روشن دیکھا جس کے شعلے تیس چالیس فٹ اوپر تک اُٹھ رہے تھے۔ اس آگ سے کچھ بھی نہیں بچ سکتا تھا۔ یہ تین لاشوں کا جنازہ تھا۔ پیغام رسانی کے مرکز کی تباہی تھی اور دشمن کے ایک اہم ہوتے مگر اہم بیس کیمپ کا خاتمہ تھا۔ اچانک رات کی خاموشی کو مشین گن کی گولیوں کے پھٹنے کی آواز نے منتشر کر دیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ پٹاخے ہیں جو کسی جشنِ مسرت میں مسلسل چلائے جا رہے ہیں۔ بے شک، یہ میرے لیے تو ایک جشنِ مسرت تھا۔

میری نگاہ پھر گھڑی پر پہنچی۔ یہ نصف شب کے بعد یا آغازِ صبح سے پہلے کی گھڑی تھی۔ رات کے ڈھائی بج چکے تھے اور اب مجھے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ خسرو جمشید کا کیا کروں اور خود کدھر جاؤں۔ ایک خیال یہ تھا کہ میں واپس جا کے اس آسیب کا خاتمہ کر دوں جو نواب کی حویلی سے منسوب تھا۔ جب حویلی ہی کھنڈر بن جائے گی تو پرانی باتیں قصے کہانیاں ہو جائیں گی اور فراموش کر دی جائیں گی۔

لیکن یہ کوئی ایسا مقصد نہیں تھا جس کے لیے میں اپنے قیمتی وقت کا ایک حصہ ضائع کرتا۔ میں نے واپس مظفر گڑھ جانے والی سڑک کا رُخ کیا۔ نواب بالکل خاموش اور دل گرفتہ بیٹھا تھا۔ اس کو اپنی ہار کا شاید اتنا غم نہ تھا، جتنا اپنی رسوائی کا... ظاہر ہے اس نے اپنے جارحانہ عزائم کو خیرباد کہہ دیا تھا مگر میں کسی دھوکے میں آنے والا نہیں تھا۔ میرے ذہن کا ایک حصہ اپنے مسائل میں الجھا ہوا تھا تو دوسرا نواب کی طرف سے ہوشیار تھا۔ ابھی تک مجھے موہنی کا خیال بھی نہیں بھولا تھا... اگر وہ مجھے بیوقوف بنانے کے مقصد میں ناکامی کا یقین آجانے کے بعد اپنی مرضی سے چلی گئی تھی تو یہ بات یقینی تھی کہ وہ لوٹ کر انہی کے پاس گئی ہوگی جن کی وہ آلۂ کار تھی۔ وہ کسی اور وجہ سے فرار ہوئی تھی تب بھی اس کی واپسی کی امید نہیں کی جاسکتی تھی مگر یہ امید کی جاسکتی تھی کہ وہ میرے بارے میں دشمنوں کو ساری معلومات فراہم کردے گی اور وہ اسی کے مطابق نئی حکمتِ عملی اختیار کریں گے۔ وہ چالاک عورت تھی۔ کار کو چابی کے بغیر لے جاسکتی تھی، اور مرسیڈیز جیسی گاڑی میں دُور یا نزدیک کے فاصلوں کی کوئی اہمیت نہیں۔ وہ سارے راستوں سے واقف تھی اور کہیں بھی پہنچ سکتی تھی۔

اپنی اعتماد کر لینے کی بے وقوفی یا کمزوری پر اب جھنجھلاہٹ بے سود تھی۔ میں اس دغاباز عورت کے خلاف اشتعال اور انتقام کے جذبات کا شکار ہو رہا تھا، جس نے بچپن کی معصوم یادوں کے حوالے سے میرا جذباتی استیصال کیا تھا۔ وہ مجھے مل جائے تو...

اچانک ٹریکٹر کی ہیڈ لائٹس نے سڑک کے درمیان ایک حصے کو روشن کیا اور مجھے وہاں ایک ڈھیر سا نظر آیا۔ چند سیکنڈ میں ڈھیر نے کسی انسانی جسم کی شکل اختیار کرلی اور جب میں نے بیس گز کے فاصلے سے دیکھا تو مجھے وہ جسم کسی عورت کا نظر آیا۔

ایک سنسنی خیز اندیشے نے لہو کو میری رگوں میں سرد کر دیا، میں ٹریکٹر روک کے نیچے اترا۔

"یہ تو کوئی عورت ہے۔" جمشید بولا۔

"تم نیچے آؤ۔" میں نے سختی سے کہا۔

جمشید نیچے اتر کر کھڑا ہوگیا۔ "تم ڈرتے ہو مجھ سے؟"

میں نے اس کے مُنہ پر ایک جھانپڑ رسید کیا۔ "شیطان سے ڈرنا چاہیے۔"

"جب میں وعدہ کرچکا ہوں..." وہ گال پر ہاتھ رکھ کے دُکھی اور مجروح لہجے میں بولا۔

"میں تمھارے وعدے پر اعتبار کرنا نہیں چاہتا۔" میں نے کہا۔ "ہاتھ اوپر اُٹھاؤ۔"

جمشید نے تعمیل کی اور میں نے اس کی تلاشی لے کر ایک ریوالور برآمد کیا جو اس کی شیروانی کے اندر کُرتے کے نیچے دبا ہوا تھا۔

"اب یہ بات ہرگز مت بھولنا کہ تمھاری چالاکی یا بہادری ضرور تمھاری جان لے گی۔ میں ایک سیکنڈ کی مہلت دیے بغیر تمھاری گردن مروڑ دوں گا... تم اچھی طرح جانتے ہو مجھے۔"

اس کو ساتھ لے کر میں چند قدم آگے گیا۔ جھک کر دیکھنے پر میرا اندیشہ ایک بھیانک حقیقت میں ڈھل گیا۔ وہ عورت موہنی ہی تھی جو سڑک پر یوں چت پڑی ہوئی تھی کہ اس کا...... جسم لہو سے داغدار تھا۔ اس کے ہاتھ پیر بڑے عجیب انداز میں

پھیلے ہوئے تھے۔ کسی نے انتقامی جذبات سے مغلوب ہو کے اُسے درندگی کا نشانہ بنایا تھا۔

مَیں نے جُھک کر اس کی نبض دیکھی۔ نبض کی رفتار کم تھی اور بے قاعدہ تھی سینے میں دل کی دھڑکن بھی محسوس ہوتی تھی۔ اس کے جسم پر گہری خراشیں تھیں۔ ایسی ہی خراشیں موہنی کے چہرے پر بھی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے اسے کسی نوکیلے ناخن رکھنے والے وحشی جانور نے نوچا کھسوٹا ہے۔ موہنی کے بال اُلجھے ہوئے اور گرد آلود تھے اور اس کے جسم پر بھی مٹی کے ساتھ خس و خاشاک نظر آ رہے تھے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ اُسے سڑک سے دُور جنگل میں لے جا کر ہوس کا نشانہ بنانے کے بعد سڑک پر پھینک دیا گیا تھا۔

ہر مہذب انسان کا خون ایسے نظارے پر کھولنے لگتا ہے۔ میں بھول گیا کہ موہنی نے میرے ساتھ کیا کِیا تھا۔ مَیں صرف یہ سوچنے لگا کہ اس کے ساتھ ایسا وحشیانہ سلوک کس نے کیا ہے؟

"کیا موہنی زندہ ہے؟" جمشید نے کہا۔

مَیں نے سر اُٹھا کے اُسے دیکھا۔ "تم جانتے ہو اس عورت کو؟"

"ہاں... یہ ایک خوب صورت اور خطرناک عورت تھی۔"

"تمھارے لیے ہر عورت صرف عورت ہوتی ہے... اسے تم خطرناک کیوں کہتے ہو؟"

"اس نے مجھ سے تمھارے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔" جمشید نے کہا۔

"کس قسم کی معلومات؟"

"یہی کہ تم ان معاملات میں کیسے ملوّث ہو گئے... تمھارا ٹھکانا کہاں ہے... اور یہ کہ تمھاری کوئی تصویر مل سکتی ہے جس میں تمھاری اصل صورت ہو۔" جمشید بولا۔ "مجھے شک ہوا کہ یہ سب پوچھنے کا مقصد کیا ہے اور پھر مَیں نے موہنی کے بارے میں مفصل رپورٹ مانگی۔"

"پھر... تمھیں کیا معلوم ہوا؟"

"یہی... کہ یہ لڑکی اور تم بچپن میں اکٹھے تھے۔" جمشید بولا۔

"تم نے موہنی سے نہیں پوچھا تھا؟"

"بعد میں پوچھا تھا... اور اسی رات بے خبری میں موہنی نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔" جمشید نے کہا۔ "اس نے مجھ پر خنجر سے وار کیا لیکن مَیں بچ گیا۔ میرے شانے پر معمولی سا زخم آیا۔ مگر یہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی تھی۔"

وجہ مجھے معلوم ہو گئی تھی کہ موہنی کیوں جمشید کا سامنا کرنے سے گریزاں تھی لیکن میں نے کہا۔ "موہنی نے مجھے بتایا تھا کہ خود تم نے بھی اس کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا تھا۔ تم نے ہوس کے ساتھ اسے جسمانی تشدد کا نشانہ بھی بنایا تھا۔"

جمشید نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یہ خاموشی ہی اعتراف تھا۔

"چلو اسے اُٹھاؤ۔" مَیں نے کہا۔

"کیا تم اسے اسپتال لے جاؤ گے؟"

"اسے بچانے کے لیے مَیں سب کچھ کروں گا۔"

ہم دونوں نے موہنی کو اُٹھایا اور ٹریکٹر تک لے آئے۔ مسئلہ اس کے لباس کا تھا۔ مَیں نے جمشید سے کہا کہ وہ اپنی شیروانی اتار دے۔ جمشید نے اس میں تامل نہیں کیا اور مَیں نے موہنی کو شیروانی پہنا دی ـــــــ خسرو جمشید صرف کرتے شلوار میں خود کو یوں سمیٹ رہا تھا جیسے عورت بھیگے کپڑوں میں سمٹنے کی کوشش کرتی ہے۔ وہ شیروانی کے بغیر باہر نکلنے کا عادی نہ تھا۔

میرے ذہن میں اب دوسرا سوال گردش کر رہا تھا۔ اس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ قیاس یہ کہتا تھا کہ موہنی کو انھوں نے ہی سزا دی ہے جن کے ساتھ وہ غداری کی مرتکب ہوئی تھی۔ وہ پیچ بچ میری خاطر انھیں چھوڑ چکی تھی۔ وہ آئے اور اسے اغوا کر کے لے گئے۔ گاڑی کے روانہ ہونے کی آواز تو مَیں نے بھی سُنی تھی۔

لیکن اس خیال کو عقل دو وجوہات کی بنا پر تسلیم نہیں کرتی تھی۔ ایک تو یہ کہ رانی کی حویلی تک آنے والے صرف اسے کیوں لے گئے جبکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ مَیں بھی وہیں ہوں۔ دوسری بات یہ تھی کہ غداری کے جرم کی سزا یہ نہیں ہوا کرتی۔ یہ تو کوئی سزا ہی نہ تھی۔ موہنی ایک ایسی عورت تھی جس کے پاس آبرو کا خزانہ لٹانے کے لیے بچا ہی نہ تھا۔ اس کی آبرو لینا موہنی کے لیے ذہنی اذیت کا سبب بھی نہیں بن سکتا تھا۔ غداری کی سزا دینے والے اُسے عبرتناک موت دیتے۔ انتہائی اذیت کے ساتھ۔

اچانک مجھے ایک اور خیال آیا۔ مَیں نے چاروں طرف دیکھا اور میری نظر نے اس مقام کو پہچان لیا جہاں رانی کی حویلی جاتے ہوئے میرے ہاتھوں سے ایک بدمعاش مارا گیا تھا۔ یہ بالکل وہی جگہ تھی۔ اس خیال نے مجھ پر سب کچھ روزِ روشن کی طرح عیاں کر دیا۔ موہنی سے اس شخص نے انتقام لیا تھا جو اپنے ساتھی کی لاش واپس لے گیا تھا۔ وہ بعد میں اکیلا یا کسی ساتھی کے ساتھ رانی کی حویلی پہنچا۔ موہنی اُسے کار میں مل گئی۔ چابیاں بھی کار میں تھیں۔ وہ زبردستی موہنی کو لے گئے اور عین اس مقام پر اسے بے آبرو کر کے چھوڑ گئے جہاں اس کی وجہ سے ان کا ایک ساتھی مارا گیا تھا۔ وہ موہنی کو میرے لیے درسِ عبرت بنا کے اسی راستے پر گئے جس پر مجھے واپس آنا تھا۔

اب میرے ذہن میں کوئی اُلجھن نہ رہی۔ مَیں نے موہنی کو ٹریکٹر کے پیچھے والے حصے میں ڈالا جہاں وہ آرام سے تو نہ تھی لیکن ٹریکٹر میں کوئی جگہ ہی نہیں تھی۔

مظفر گڑھ اب زیادہ دُور نہیں تھا۔ حالات کے وقت کسی مشکل تھا۔ اگر مَیں اسے سرکاری اسپتال لے جاتا تو ڈاکٹروں کے سوالات کا کیا جواب دیتا کہ یہ عورت کون ہے اور اس کی یہ حالت کیسے ہوئی ہے؟ یہ شیروانی کیوں پہنے ہوئے ہے اور تم کون ہو، جو اسے ٹریکٹر میں ڈال کے لائے ہو۔ ہم جھوٹ بول سکتے تھے کہ ہم اسے نہیں جانتے۔ یہ اسی حالت میں ملی تھی اور ہم اسے اٹھا لائے ہیں۔ مگر ڈاکٹر لوگ بے وقوف نہیں ہوتے۔ وہ پولیس کو ضرور بلاتے۔

"کیا تم اکثر یہاں آتے رہتے ہو؟" مَیں نے جمشید سے کہا۔

"اکثر... ہاں... دو مہینے میں ایک بار۔" وہ بولا۔

"تمھاری ضروریات کے لیے تو سب سے قریبی بازار مظفر گڑھ ہی ہے۔"

"مَیں اپنی ضروریات کا سامان خود نہیں خریدتا۔" وہ بولا۔

"وہ لڑکی تمھارے ساتھ ہی آئی تھی؟"

"نہیں... مظفر گڑھ کا ایک زمیندار میرا جاننے والا ہے اسی نے بھیجا تھا۔"

"کسی مزارع کی بیوی یا بیٹی ہو گی؟" مَیں نے نفرت سے کہا۔

"وہ اپنی مرضی سے آئی تھی... دو ہزار تو اس کا شوہر پورے سال میں نہ کماتا... وہ اپاہج ہے۔"

"گویا تم ازراہِ ہمدردی اس کی مدد کر رہے تھے۔ کون ہے تمھارا وہ زمیندار دوست؟" مَیں نے کہا۔

"اس کی بات چھوڑو... تم ڈاکٹر کی تلاش میں ہو نا؟ مَیں تم کو ایک ڈاکٹر کے گھر لے جا سکتا ہوں۔" وہ بولا۔ "اسے مطمئن کرنا تمھارا کام ہے۔ اگر وہ انکار کر دے...؟"

"وہ انکار نہیں کرے گا۔" مَیں نے اسٹین گن اُٹھا کے پھر رکھ دی۔ "اور تم بھی مت بھولنا یہ بات کہ مَیں ایک قتل کر سکتا ہوں تو دس بھی کر سکتا ہوں۔ لیکن یہ آخری راستہ ہے۔ پہلا راستہ نقد ہونے کا ہو گا۔"

خسرو جمشید نے سر ہلایا اور میری راہنمائی کرنے لگا۔

"کیا تمھیں یاد ہے کہ میرے پاس چار دستی بم بھی ہیں؟" مَیں نے کہا۔

"کیا تم انھیں استعمال کرنا چاہتے ہو؟"

"یہ تم پر منحصر ہے۔ مَیں راستوں سے ناواقف ہوں۔ مجھے اپنے بھٹکنے پر لے جاؤ گے تو مَیں چاروں دستی بم استعمال کروں گا۔" مَیں نے کہا۔

ڈاکٹر کا گھر ایک اسپتال کی چار دیواری میں تھا۔ جمشید نے مجھے بتایا کہ یہ سرکاری اسپتال ہے۔ ڈاکٹر کے گھر کا ایک دروازہ باہر کی جانب تھا چنانچہ ہمیں مین گیٹ سے اسپتال میں داخل نہیں ہونا پڑا۔ جمشید نے دستک دی تو کسی بوڑھے نے دروازہ کھولا جو حلیے سے نوکر نظر آتا تھا۔

"کیا بات ہے... کیوں دروازہ توڑ رہے ہو؟" وہ بولا۔

"ہمیں ڈاکٹر صاحب سے کام ہے۔" مَیں نے کہا۔

"چلو چلو... صبح اسپتال آنا۔" وہ ہمیں جھڑک کر بولا، اور دروازہ بند کرنے لگا۔ مَیں نے دروازے کو دھکا دیا تو بڈھا پیچھے جا گرا اور چلّانے لگا۔ پھر میرے ہاتھ میں اسٹین گن دیکھ کر چپ ہو گیا۔ اندر سے ایک جوان آدمی نائٹ سوٹ میں نمودار ہوا۔ اس نے ایک نظر مجھے اور پھر اپنے نوکر کو دیکھا۔ "کیا چاہیے تم لوگوں کو؟ مَیں اکیلا رہتا ہوں... نہ زیور ہے میرے پاس..."

"ہمیں ایک مریض کا علاج کرانا ہے ڈاکٹر صاحب۔ انتخاب تمھارے ہاتھ میں ہے۔" مَیں نے کہا اور جیب میں سے ہزار روپے کے نوٹ... نکال کے نیچے پھینک دیے۔ "یہ ہے تمھارا معاوضہ... اور اگر یہ قبول نہیں تو پھر..."

"مریض کہاں ہے؟" ڈاکٹر نے سکون سے کہا۔ وہ سمجھدار آدمی تھا۔

"باہر... تم اس کے بارے میں کوئی سوال نہیں کرو گے۔ وہ ایک عورت ہے۔" مَیں نے کہا۔

"تمھاری کیا لگتی ہے؟" اس نے ہم دونوں کی طرف دیکھا۔

"کچھ نہیں... ہم اسے راستے سے اٹھا کے لائے ہیں لیکن ہماری یہ بات کوئی نہیں مانے گا اور ہم پولیس کے چکّر میں نہیں پڑنا چاہتے۔" مَیں نے کہا۔

"کیا وہ بہت زخمی ہے؟"

"تم دیکھ لو گے..." مَیں نے کہا۔

"ٹھہرو... اگر خنجر یا گولی کا زخم ہے تو مَیں مجبور ہوں۔ میرے پاس گھر میں آلاتِ جرّاحی نہیں ہیں۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "آپریشن نہیں کر سکتا۔"

"اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔" مَیں نے کہا۔

"ٹھیک ہے... اسے اندر لے آؤ۔" وہ بولا۔ پھر اس نے اپنے نوکر کو اشارہ کیا کہ وہ نوٹوں کی گڈی اُٹھا لے۔

"تم ہمارے ساتھ چلو گے۔" مَیں نے کہا۔

موہنی کو جمشید نے اٹھایا اور اندر لے گیا۔ ڈاکٹر سے زیادہ ڈاکٹر کا نوکر ایک عورت کو صرف شیروانی میں ملبوس دیکھ کر حیران

ہوا مگر ڈاکٹر نے اُسے خاموش رہنے کا حکم دیا تھا۔ ڈاکٹر کی ہدایات کے مطابق وہ پانی اُبال کے لایا۔ اس میں دوا ملا کے ڈاکٹر نے موہنی کا جسم صاف کیا اور پھر اُسے ایک انجکشن لگا دیا۔

" اس کی حالت تشویشناک نہیں ہے۔" وہ بولا۔" ابھی تو یہ سوتی رہے گی۔ لیکن جب اُٹھے گی تو بالکل ٹھیک ہو گی... اس کی یہ حالت کس نے کی تھی؟"

" اس کے ذمّے دار ہم نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔" ہم اسے سڑک کے درمیان میں پڑا ہوا چھوڑ کے نہیں آسکتے تھے۔"

" کیا تم اسے ساتھ لے جاؤ گے؟ جب کہ تم اسے جانتے نہیں۔"

" ہم اس سے پوچھ لیں گے۔" میں نے کہا۔" آپ کی مدد کا بہت شکریہ مگر کیا آپ ایک کام اور کر سکتے ہیں؟ اس کے لیے زنانہ کپڑوں کا ایک جوڑا چاہیے۔ ہم اس کی قیمت الگ دیں گے۔ آپ نے کہا تھا کہ آپ اکیلے رہتے ہیں۔"

" ہاں... اب میں اکیلا ہوں۔" وہ خلا میں دیکھنے لگا۔" لیکن تمھیں اس عورت کے لیے کپڑے مل جائیں گے۔" پھر اُس نے اپنے نوکر کی طرف دیکھا اور بولا۔" جاؤ... دو جوڑے لے آؤ بیگم صاحبہ کے۔"

" بیگم صاحبہ؟" میں نے کہا۔" آپ شادی شدہ ہیں؟"

" میں شادی شدہ تھا۔" وہ بولا۔

" پھر... کیا خدانخواستہ... ان کے اور آپ کے درمیان علیحدگی ہو گئی ہے؟" میں نے کہا۔

اس نے ایک گہری سانس لی۔" یہی سمجھو... میں اس دنیا میں ہوں اور وہ دوسری دنیا میں۔"

" آئی ایم سوری۔" میں نے بے اختیار کہا۔

ڈاکٹر نے چونک کر مجھے دیکھا۔ میرے لہجے نے میرے تعلیم یافتہ ہونے کا راز فاش کر دیا تھا۔ نوکر دو خاصے قیمتی اور نئے جوڑے لے آیا۔ میں نے ان میں سے ایک موہنی کو پہنا دیا۔ اس وقت میں نے دیکھا تو نوکر کی آنکھوں میں مجھے خاموش آنسو نظر آئے۔

" ان کے پیسے انھیں واپس کر دو۔" ڈاکٹر نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ نوکر نے خاموشی سے نوٹوں کی گڈی میری طرف بڑھا دی۔

" یہ کیا ڈاکٹر صاحب؟" میں نے کہا۔

" میری بیوی کو تم جیسے دو بدمعاش اغوا کر کے لے گئے تھے وہ اسی طرح بندوق لے کر آئے تھے۔" وہ بولا۔" یہ یہاں کی بات نہیں ہے۔ ہمارے ہنی مون کی بات ہے۔ ہم مری اور نتھیا گلی کے درمیان ایک کاٹیج میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اور اسے صبح کچھ لوگ ایسی ہی حالت میں اُٹھا کے لائے تھے۔ وہ زندہ تھی... میں نے اسی طرح اس کی دیکھ بھال کی۔ اسے انجکشن دے کر سلا دیا۔ مجھے خیال

تھا تو صرف اُن سے انتقام لینے کا... اپنی بیوی سے تو ... تھا کہ میں اس کو بچا نہ سکا تھا۔ وہ مجھے مار کے ... تھے۔ میری نظر میں وہ اتنی ہی پاکدامن تھی جتنی شادی ... تھی۔ مگر جب وہ ہوش میں آئی تو میرے لیے ایک ... کے نکل گئی۔ اس پر صرف ایک جملہ لکھا ہوا تھا۔' اب ... قابل نہیں رہی۔' اُس کی لاش تین دن بعد ملی تھی... وہ ... نتھیا گلی کے پہاڑوں میں دفن ہے۔"

" مجھے معاف کر دینا ڈاکٹر... میں تم کو اپنی مجبوری ... سکتا۔" میں نے انگریزی میں کہا۔" ورنہ تمھیں اندازہ ہو ... تم سے زیادہ مظلوم ہوں۔ ظلم کسی پیمانے سے نہیں ... احساس کی شدت کی پیمائش کرنے والا آلہ ابھی ایجاد نہیں ... پھر بھی یہ سچ ہے کہ ہم سب اپنے اپنے دُکھ کے ساتھ ... مجبور ہیں۔ ظالم نظر آنے والے بھی بعض اوقات بہت ... ہوتے ہیں۔"

وہ کچھ نہیں بولا۔ ایک بار پھر جمشید نے موہنی کو ... میں نے دروازہ کھولا اور باہر آ گیا۔ ہمارے پیچھے دروا... گیا۔ لیکن مجھے ایک اور خیال نے پلٹ کر پھر دستک ... مجبور کر دیا۔ اس مرتبہ خود ڈاکٹر آیا۔

" ڈاکٹر صاحب... میں نے جو کچھ کیا..."

" اسے بھول جاؤ... ان حالات میں شاید میرا بھی ... یہی ہوتا۔"

" میں نے آپ کا شکریہ بھی ادا نہیں کیا..."

" میں سمجھتا ہوں تمھاری ذہنی کیفیت کو۔" وہ میرے کند... پر تھپکی دے کر بولا۔" میں نے کچھ نہیں کیا، محض آدھے ... نیند گنوانے کے سوا۔"

" میں کچھ اور کہنا چاہتا تھا۔" میں نے کہا۔" کیا آپ ا... کے رہنے والے ہیں؟"

" ہاں... سوائے اس زمانے کے جب میں میڈیکل کا ... کرنے کے لیے ملتان میں تھا۔ میری زندگی کے چوبیس سال ... شہر میں گزرے ہیں۔" وہ بولا۔

" پھر تو آپ کو بہت لوگ جانتے ہوں گے... اور آپ بہت سے لوگوں کو پہچانتے ہوں گے۔" میں نے کہا۔" مجھے ... آدمی کی تلاش ہے۔"

" اس کا نام پتا؟" وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔" صرف حلیہ بتا سکتا ہوں ... کا نمبر... وہ ایک جیپ تھی... نیلے رنگ کی... انیس ... کا ملٹری ماڈل جس میں آگے بہت سی اضافی لائٹس اور ...

... ہوئی ہیں۔ دونوں جانب چمکنے والے زرد رنگ کی ... ہیں۔"

" ... کیوں تلاش کر رہے ہو تم اسے؟" وہ بولا۔

" مجھے اس سے... ایک حساب برابر کرنا ہے۔" میں نے کہا۔

" اپنی بیوی کا؟" وہ بولا۔

" یہ میری بیوی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

" مجھ سے جھوٹ کیوں بولتے ہو؟" وہ بولا۔" مجھے معلوم ہے کہ ... پولیس کے پاس کیوں نہیں جا رہے ہو... تم نے سرکاری اسپتال ... سے رجوع کیوں نہیں کیا اور ایک ڈاکٹر کو اسٹین گن سے دہشت زدہ ... رسالدار ایک ہزار روپے کا لالچ دے کر اپنا کام کیوں نکالا... تم ... ڈرتے ہو بعد کی رسوائی سے... بدنامی کے افسانوں... لوگوں ... کانا پھوسی کی بدنامی سے... اور ان باتوں سے..."

" میں کسی اور سے ڈرتا ہوں یا نہیں۔" میں نے کہا۔" یہ الگ بات ہے... مگر آپ سے جھوٹ بول کے مجھے کیا ملے گا... اگر یہ میری بیوی ہوتی تو میں تسلیم کرتا... یہ بھی مانتا کہ اس کی آبرو لوٹنے والوں نے میرے دل سے اس کی محبت نہیں چھینی۔ انھوں نے جسم برباد کیا تو کیا ہوا۔ وفا، محبت اور رفاقت کے جذبات ... ظلم کا شکار نہیں ہوتے۔ اعتماد تو ایک احساس کا نام ہے۔ آپ نے بھی تو یہی کہا تھا ابھی کہ بیوی آپ کے لیے پہلے کی طرح پاکدامن تھی... مگر وہ خود اپنی ذلت کے احساس سے نجات حاصل نہ کر سکی تھی۔ اور احساس کے عذاب سے بچنے کے لیے اس نے قیدِ حیات سے نجات پا لی تھی۔ میں اس عورت سے جذباتی وابستگی نہیں رکھتا۔

... تو صرف جاننا چاہتا ہوں کہ وہ کون ہے جو انسان کا لباس پہنے پھر رہا ہے مگر اندر سے ایک درندہ ہے... اگر میں نے اسے ختم نہ کیا تو کل وہ پھر کسی کو شکار کرے گا۔ قانون اس کو سزا نہیں دے سکتا۔ ایسے سارے شکاری خود کو بہت محفوظ سمجھتے ہیں اور ان کا حوصلہ بڑھ جاتا ہے جب ان پر آنچ تک نہیں آتی۔"

" اور تم یہ کام کرو گے... جو قانون کے بس کا نہیں... تم کیا خدائی فوجدار ہو؟" وہ بولا۔

" بس ایسا ہی سمجھ لیں... جہاں میرے دل کو... میری عقل کو اور میرے ضمیر کو مجرم کے مجرم ہونے کا یقین آ جائے، وہاں میں مُنصف کے فرائض بھی سنبھال لیتا ہوں اور مُنصف کے بھی... اور پھر فیصلہ سناتے ہی اپیل کا حق دیے بغیر سزا پر عملدرآمد کرتا ہوں۔"

" میرا خیال ہے کہ تم پاگل... اور جنونی ہو..."

" ہاں... مگر اب یہ بتاؤ کہ تم میری مدد کرو گے یا میں جاؤں؟" میں نے بے رحمی سے کہا۔" میں تم سے نظامِ انصاف اور اس کی خوبیوں خامیوں پر ساری رات بحث نہیں کر سکتا۔"

" وہ ایک بہت بااثر شخص کا بیٹا ہے۔"

" میں صرف اس کا نام پتا جاننا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

" اس کے شجرۂ نسب اور اس کے خاندان کی شوکت و عظمت سے مجھے کوئی سروکار نہیں۔"

" وہ رانا اوّل خان کا بیٹا ہے۔ رانا قمرالدین عرف قمرو... ان کی کوٹھی 'اوّل ہاؤس' ملتان جانے والی سڑک پر ہے مگر تم وہاں گھس نہیں سکتے۔" وہ بولا۔" لیکن تم اسے بلوا سکتے ہو۔" وہ کچھ سوچ کے بولا۔

" کہاں بلوا سکتا ہوں؟" میں نے کہا۔" اور میرے بلانے سے وہ آئے گا کیوں...؟"

" اس کے ہر بُرے کام میں شریک اور بُرے وقت میں کام آنے والا نیو ایمپائر ہوٹل کا مالک جیکب ہے۔ وہ تمھیں ہوٹل کی انیکسی میں مل سکتا ہے... اور جیسے تم نے مجھ سے طبّی امداد حاصل کی... ایسے ہی تم اس سے قمرو کو فون کرا سکتے ہو۔"

میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔" تھینک یو ڈاکٹر... تم نے جتنی مدد کی ہے وہ سب مجھ پر احسان ہے۔"

" میری ایک درخواست ہے... کبھی کسی سے ذکر مت کرنا کہ میں نے تمھارے ساتھ کوئی نیکی کی تھی۔" وہ بولا۔

" فارگیٹ اِٹ... ہم کبھی ملے ہی نہیں۔"

" اور آئندہ بھی نہیں ملیں گے۔" اس نے پھر دروازہ بند کر دیا۔

جمشید کی حالت موہنی کو اُٹھا کے کھڑے رہنے سے غیر ہو رہی تھی۔ ہم گلی کے آخر تک آئے اور میں نے پھر ٹریکٹر کو اسٹارٹ کیا۔ وقت اب بہت کم رہ گیا تھا اور میں صبح کا اجالا پھیلنے سے پہلے اس علاقے سے نکل جانا چاہتا تھا۔ اس کے لیے ٹریکٹر کا سفر بہت سُست رفتار عمل تھا۔ مجھے ایک گاڑی کی ضرورت کا احساس شدّت سے ہونے لگا تھا۔

گاڑی مجھے ایک فرلانگ چلنے کے بعد مل گئی۔ وہ سفید رنگ کی فاکس ویگن تھی جو ایک گھر کے سامنے چُپ چاپ اور تنہا کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے نیچے اُتر کے اس کے دروازے میں مختلف چابیاں آزمائیں جو ٹریکٹر کی اگنیشن کے ساتھ ایک ہی چین میں بندھی ہوئی تھیں۔ ایک چابی کام کر گئی اور دروازہ کھل گیا... بیشتر گاڑیوں کے دروازے آسانی سے کھولے جا سکتے ہیں خصوصاً ان چابیوں سے جن کے کنارے گھِسے ہوئے ہوں، خواہ چابیاں کسی سیف کی ہوں یا دراز کی۔

میں نے جمشید کو ایک رسّی دی، جو ٹریکٹر کے پچھلے حصّے میں پڑی ہوئی تھی۔ اس نے میری ہدایت کے مطابق فاکس ویگن کے

لگا پھر کو ٹریکٹر کے پچھلے حصے کے ساتھ باندھ دیا۔ میں نے کار کو نیوٹرل کیا اور دروازہ آہستہ سے بند کر کے پھر ٹریکٹر پر چڑھ گیا۔ میں فاکس ویگن کو یہاں اسٹارٹ کرتا تو اس کا انجن مالکوں کو سوتے سے جگا دیتا۔ یہ سب کام پانچ منٹ میں ہو گیا۔

فاکس ویگن کو میں ٹو کر کے ایک فرلانگ تک لے گیا۔ پھر وہ رسّی توڑ گئی جو ٹریکٹر کے ساتھ بندھی ہوئی تھی۔ میں نے جلدی سے مونی کو فاکس ویگن کی پچھلی سیٹ پر ڈالا۔ آگے والا بونٹ کھول کے اس میں اپنی اسٹین گن اور وہ سب اسلحہ رکھا جو مجھے دشمن کے کیمپ سے ملا تھا۔ جس چابی سے دروازہ کھولا تھا اسی سے پچھلے انجن کا بونٹ بھی کھل گیا اور میں نے جمشید کو سمجھایا کہ اسے سیلف کے کون سے تاروں کو ملانا ہے تاکہ گاڑی اسٹارٹ ہو جائے۔ میں تو ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔ جمشید ابھی تک انتہائی فرماں برداری کا ثبوت دے رہا تھا۔ اس نے تاروں کو ملایا ہی تھا کہ انجن اسٹارٹ ہو گیا۔ اس کی ٹیوننگ بہت عمدہ تھی۔

نواب کے بیٹھتے ہی میں نے گاڑی بڑھا دی۔ یہ نئی گاڑی تھی۔ انیس سو ستر سنٹر میں پہلی مرتبہ بارہ وولٹ بیٹری کا ماڈل۔ اس کا انجن روایتی طور پر بے حد طاقتور تھا اور اس کا پک اپ مثالی تھا۔ لیکن جو خوبی فاکس ویگن کو دوسری گاڑیوں پر ممتاز کرتی ہے وہ اس کا ائیر کولڈ انجن ہے۔ اسے میں کراچی سے پشاور اور پشاور سے کراچی نان اسٹاپ لے جاتا تب بھی فرق کوئی نہ پڑتا کیونکہ اس میں ریڈی ایٹر تو ہوتا ہی نہیں جس میں پانی ڈالنا پڑے۔

صرف آدھے منٹ میں گاڑی کی رفتار ساٹھ میل سے تجاوز کر چکی تھی اور چوڑے وھیل بیس کے باعث اس کی روڈ گرپ بڑھ گئی تھی۔ میں اسے اسّی نوّے میل کی رفتار پر بھی دوڑا سکتا تھا لیکن میں نے غیر ضروری عجلت سے گریز کیا۔

ابھی ساڑھے چار بجے تھے گویا صبح ہونے میں کم سے کم ایک گھنٹا باقی تھا اور ساڑھے چھ بجے سے پہلے کار کے مالکوں کو چوری کا علم نہیں ہو سکتا تھا۔ کار والے عموماً سحر خیز نہیں ہوتے اور کوئی بھی آنکھ کھلتے ہی باہر جا کے گاڑی کی خیریت معلوم نہیں کرتا۔

نیو ایمپائر ہوٹل کا نیون سائن مجھے اتفاق سے نظر آ گیا ورنہ میں کسی سے پتا پوچھتا۔ سڑک پر تو کوئی تھا ہی نہیں یہاں تک کہ مجھے گشت کرنے والی پولیس بھی دکھائی نہ دی۔ نسرین جمشید کی بے بسی دیدنی تھی۔ شاید زندگی میں کبھی اس نے خود کو اتنا اکیلا محسوس نہیں کیا ہو گا۔ وہ خالی ہاتھ تھا اور اس کے کسی ساتھی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے اور کس کے ساتھ ہے۔ وہ سمجھتا تھا کہ دنیا میں کوئی اس کا بدترین جانی دشمن ہو سکتا ہے تو وہ میں ہوں اور مجھ سے مقابلے کا یا فرار کا خیال اس کے ذہن میں آ ہی نہیں سکتا تھا

چنانچہ اس نے خود کو میرے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا اور بقول ... منحصر مرنے پر ہو جس کی امید۔ نا امیدی اس کی دیکھا چاہیے۔ ... اب ہوش میں آنے لگی تھی۔ یہ بڑی امید افزا بات تھی۔

نیو ایمپائر ہوٹل کی انیکسی اس کے آفس سے متصل ... طرف تھی۔ راستہ ایک ہی تھا۔ گیٹ کیپر نے ہمیں نئے آنے والے مہمان کی طرح سیلوٹ جھاڑ کے خوش آمدید کہا لیکن جب ... کو آفس کے پورچ میں نہیں روکا بلکہ مخالف سمت میں موڑ لیا ... دوڑتا ہوا ہمارے پیچھے آیا۔

"ریسپشن ادھر ہے صاب۔" وہ بولا۔

"ہمیں معلوم ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم جیکب صاحب سے ... آئے ہیں کراچی سے... ان کے دوست ہیں۔"

"اوہ... ماف کرنا صاب... ہمارا تو فرض ہے بتانا ... نے کال بیل خود ہی دبا دی۔" ادھر جیکب صاب کا والد صاب ... ہمشیرہ صاحبہ خیریت سے ہے؟"

"ہاں... ایک خیریت سے ہے... دوسرا نہیں ہے ... نے گول مول جواب دیا۔ "ٹھیک ہے اب تم جاؤ... جیکب ... گیا ہے۔"

چوکیدار سلام کر کے لوٹ گیا تو دروازہ کھلا۔ ایک ... قد مگر گٹھے ہوئے جسم والے شخص نے مجھے غور سے دیکھا۔ ... کے گہرے سانولے رنگ کے چہرے پر جیکب کے پرانے ... تھے۔ ماتھے پر دائیں اور بائیں ابرو کے اوپر بڑے تناسب سے ... ہوئے زخموں کے دو ایک جیسے نشانات تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ زخم نہیں ہیں آرائش کے لیے کسی ماہر جرّاح نے ناپ تول کے ... چاند سے بنا دیے ہیں۔ مجموعی طور پر وہ کرخت نقوش اور جارحانہ تیوروں سے غنڈہ لگتا تھا اور بدصورت نظر آتا تھا۔

"یس...؟" اس نے پھاڑ کھانے والے انداز میں کہا۔

"ہم کراچی سے آئے ہیں۔" میں نے انگریزی میں کہا۔

"ہوٹل کا راستہ دوسری طرف ہے۔" وہ غرّایا۔

"مجھے تمھاری بہن نے بھیجا ہے۔"

"الزبتھ نے... اب کیا ہو گیا؟" وہ بدستور دروازے ... کھڑا رہا۔

"بات تمھارے والد کی ہے۔" میں نے کہا۔

"لک ہیر... تم اگر اس کے نامہ بر بن کے آئے ہو۔ اور ... پیغام لائے ہو کہ اس بڈھے شرابی کو پھر قرض خواہوں نے مارا ہے تو ... طرف سے کورا جواب سمجھو۔" وہ دروازہ بند کرنے لگا۔

"مسٹر جیکب... تمھارا باپ مر سکتا ہے۔" میں نے دروازے میں ٹانگ اڑا دی۔

"پھر کیا ہوا... ایک دن تو یہ ہونا ہے... اور جو کل ہونا ہے وہ آج ہو جائے تو مجھے خوشی ہو گی۔" وہ بولا۔ "یہ پیر ہٹاؤ دروازے میں سے۔"

"وہ زخمی نہیں ہے... وہ ہماری تحویل میں ہے۔" میں نے ... تم صرف دس ہزار کی خاطر یتیم کہلانا پسند نہیں کرو گے مسٹر جیکب...؟"

"میں پیدائشی یتیم ہونا بہت پسند کرتا... اور بن باپ کا ہونا بھی قبول کرتا۔" وہ بولا۔ "مگر کیا تم مجھے دھمکی دینے آئے ہو کہ میں نے دس ہزار نہ دیے تو تم اسے قتل کر دو گے؟"

"بات تو تم نے سمجھ لی ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن ہم چائے کے ایک کپ پر بات کر سکتے ہیں... آخر ہم کراچی سے آئے ہیں۔"

"چائے پینی ہے تو ہوٹل میں جاؤ۔ میں فون کر دوں گا... مگر ... نے مجھے سمجھا دو یہ چکر کیا ہے۔ الزبتھ بیچ میں کہاں سے آ گئی؟"

"اس نے کہا تھا کہ میں دس ہزار دوں گی... مگر وہ اپنے ... وعدے سے پھر گئی اور اس نے ہمیں تمھارے پاس بھیج دیا۔ اب اگر تم نے ضامن بننے والی بہن کا خیال نہ کیا تو ہمیں لوٹ کر اسی کے پاس جانا پڑے گا۔ تمھارے لیے وہ ایک اچھی بہن ہے... ہمارے لیے اچھی عورت۔" میں نے ہونٹوں پر زبان پھیر کے کہا۔

جیکب نے ایک گالی دے کر مجھ پر حملہ کیا۔ میں یہی چاہتا تھا۔ دوسرے لمحے میں اسے اندر لے گیا۔ اس کی گردن میرے بائیں بازو کی گرفت میں تھی اور پیچھے سے میں نے اس کی کمر کے ساتھ ریوالور لگا دیا تھا۔ جمشید میرے پیچھے آیا اور اس نے دروازہ بند کر دیا۔

"مسٹر جیکب، ہم نے سب بکواس کی تھی۔" میں نے کہا۔ "نہ ہم کراچی سے آئے ہیں اور نہ تمھاری بہن کو یا والد کو جانتے ہیں۔ ہم پیشہ ور قسم کے قاتل ہیں اور ہمیں کسی کے قتل پر مامور کیا گیا ہے مگر وہ شخص تم نہیں ہو۔" میں نے اسے چھوڑ دیا۔

"پھر... پھر کون ہے وہ...؟" جیکب نے ہانپتے ہوئے کہا اور ایک میز پر ٹک گیا۔

"قمرو..." میں نے کہا۔ "رانا اوّل خان کا بیٹا۔"

"تمھیں اس کو قتل کرنے کا ٹھیکا کس نے دیا ہے؟"

"ہم اُس کا نام نہیں بتائیں گے۔"

"یہ تو بتا سکتے ہو کہ اس کام کا معاوضہ تمھیں کیا ملے گا؟" وہ بولا۔

"ہاں... ہمیں پچیس ہزار ایڈوانس دیے گئے ہیں۔" میں نے کہا۔

"پچیس ہزار...؟" جیکب کی سٹی گم ہو گئی۔ "فرض کرو میں ... اگر ہم تم کو تیس ہزار دیں... کہ اسے قتل کر دو... جس نے تمھیں بھیجا ہے۔"

"پہلی بات تو یہ کہ ہم صرف پانچ ہزار کی خاطر بدعہدی نہیں کریں گے۔" میں نے کہا۔ "حالانکہ ہم غیر جانبدار ہیں۔ نہ کسی کے دوست ہیں اور نہ دشمن... پھر بھی تم ہمیں خریدنا چاہو تو معقول آفر دو..."

"کتنی معقول؟"

"دگنی تو ہو... پچاس ہزار۔" میں نے کہا۔

"آل رائٹ... میں قمرو کو بلاتا ہوں۔" وہ بولا۔ "ممکن ہے یہ سودا ہو جائے... ایک بات اور بتاؤ... قتل تم قمرو کو کرنے آئے تھے تو میرا دروازہ بجا کے مجھے کیوں جگایا؟"

"ہم براہِ راست قمرو کے گھر نہیں جا سکتے تھے۔" میں نے کہا۔

"تم اسے... یہاں قتل کرو گے؟" جیکب کا رنگ اُڑ گیا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "ہم اسے اپنے ساتھ لے جائیں گے... تم پر کوئی الزام نہیں آئے گا۔"

"ٹھیک ہے... میں اسے فون کرتا ہوں۔" وہ بولا۔

"تمھاری گفتگو ہم بھی سنیں گے۔" میں نے کہا۔

"تم کیسے سن سکتے ہو؟"

"زیادہ چالاک مت بنو... تمھارے پاس ایکس ٹینشن ہو گی... یا پھر ہینڈ فری فون ہو گا۔" میں نے کہا۔

جیکب کا منہ لٹک گیا۔ اس نے دوسرے کمرے سے ایک فون کے ذریعے ریسیور اٹھائے بغیر نمبر ملایا۔ اس کے چھوٹے سے اسپیکر میں مجھے دوسری طرف بجنے والی گھنٹی صاف سنائی دی۔ تقریباً دو منٹ کے بعد کسی نے ریسیور اٹھا کے ہیلو کہا۔

"قمرو... میں جیکب ہوں۔"

"جیکب... ابے اتنی رات کو! کیا بات ہے؟" قمرو کی آواز آئی۔

"یار تو فوراً آ جا... کسی کو بتائے بغیر..."

"خیریت تو ہے نا... ہوا کیا ہے آخر...؟" قمرو نے پریشانی سے کہا۔

"خیریت بالکل نہیں ہے... میں فون پر نہیں بتا سکتا۔"

"یار... کہیں اس لڑکی کا معاملہ تو نہیں ہے؟" قمرو کچھ سوچ کے بولا۔ "جسے ہم نے..."

"یہی سمجھ لے... پولیس بیٹھی ہے میرے پاس۔"

"کون آیا ہے؟ کوئی انسپکٹر؟ مجھے نام بتا اس کا..." قمرو نے اپنے باپ کے اثر و رسوخ کے غرور میں کہا۔

"ڈی ایس پی آیا ہے ملتان سے... معاملہ ابھی ختم نہ ہوا تو لمبا ہو جائے گا... وہ بڑی پارٹی تھی یار..." جیکب نے کہا۔

"کتنے میں ختم ہو جائے گا؟"

"کم از کم پچاس تیرے۔" جیکب نے کہا۔ "پچاس میرے..."

"ایک لاکھ؟"

"یار وہ لڑکی مرگئی ہے... اور ملیں مروایا تیری جیب نے۔ سارا زمانہ پہچانتا ہے اُسے۔" جیکب نے خفگی سے کہا۔

"تیرے پاس ہیں پچاس ہزار؟"

"نکالنے پڑیں گے قمرو... میں تو تباہ ہو جاؤں گا۔ میرا بزنس ہے۔"

"اچھا میں ابھی آتا ہوں... دس پندرہ منٹ میں۔"

"خالی ہاتھ مت آنا..."

"نہیں... خالی ہاتھ نہیں آؤں گا۔ رانا صاحب کی سیف خالی کروں گا..." وہ بولا۔ "میرے پاس اس وقت اتنی رقم کہاں۔"

"تو تجوری کھولے گا... چابی ہے تیرے پاس؟"

"نہیں... رانا صاحب سو رہے ہیں۔ انھیں نخلہ سنگھاتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے... مگر دیکھ... کسی کو پتا نہ چلے کہ تو باہر کہیں گیا ہے... سب یہی سمجھتے رہیں کہ تو کمرے میں سویا ہوا ہے۔"

"تو فکر مت کر... میں بے وقوف نہیں ہوں تیری طرح۔"

خود کو عقل مند قرار دینے والا اپنے ایک کمینے اور خود غرض دوست کے ہاتھوں بے وقوف بن چکا تھا۔ وہ دوست کبھی نہ تھے۔ وہ بدمعاشی کے ساتھی تھے۔ وہ خلوص اور ایثار کا جذبہ ان کے درمیان کہاں سے آتا جو بے غرض دوستی کی جان ہوتا ہے۔ جیکب نے اپنی جان بچانے کے لیے قمرو کو ہمارے ہاتھ بیچ دیا۔ اس نے پچاس ہزار کا مطالبہ بھی قمرو کی نفتے داری بنا دیا۔ بعد میں وہ قمرو سے کہہ سکتا تھا کہ میں نے تو تیری جان بچالی، ورنہ تیرے ساتھ وہ مجھے بھی مار ڈالتے... میں جھوٹ نہ بولتا تو کیا کرتا؟

لیکن اس سے ایک بے وقوفی بھی سرزد ہوئی تھی۔ اس نے قمرو کو قائل کرنے کے لیے ایک سچ کا سہارا لیا تھا اور ہمارے سامنے ایک جرم کا اقرار کر لیا تھا اس جرم میں وہ خود بھی برابر کا شریک رہا تھا لیکن یہ بات نہیں جانتا تھا کہ ہم کسی کے ایجنٹ نہیں ہیں بلکہ قمرو کو اسی جرم کی سزا دینے آئے ہیں۔

"ابھی تمھیں پچاس ہزار مل جائیں گے۔" وہ بولا۔ "مجھے امید ہے کہ تم وعدے کے مطابق کام کرو گے۔"

"ہم نے ابھی تک تو کوئی وعدہ نہیں کیا۔" میں نے کہا۔

"کیا تم نے کہا نہیں ہے کہ پچاس ہزار لے کر تم قمرو کے دشمن کو ٹھکانے لگا دو گے؟" وہ چلانے لگا۔

"بات آہستہ کرو... میں نے صرف یہ کہا تھا کہ تم ہمیں خریدنا چاہو تو معقول آفر دو... میں نے یہ بھی کہا تھا کہ ہم بدعہدی نہیں کرتے۔"

"اس کا کیا مطلب تھا آخر؟"

"ہم قمرو کو قتل کیے بغیر واپس چلے جائیں گے... یہ مطلب کیسے نکال لیا تم نے؟" میں نے کہا۔ "ایک کام کا معاوضہ ایک شخص نے دیا ہے۔ دوسرے کام کا معاوضہ تم دے رہے ہو... ہم دونوں کام کریں گے۔ پہلے قمرو کو ماریں گے... پھر اس کو بھی ماردیں گے۔"

غصے اور بے بسی سے جیکب کا چہرہ لال پڑ گیا... ایکدم فون کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر میں نے تار کھینچ دیا۔ ٹیلی فون اس کے ساتھ ہی آگیا۔ میں نے اسے ...

"تم... دھوکے باز... بے ایمان ہو۔" جیکب ...

"اور تمھاری اپنے بارے میں کیا رائے ہے... تم بہت ... باضمیر اور نیک چلن ہو؟" میں نے کہا۔ "یہ کس لڑکی کا ذکر ... تھے تم؟"

"تم کو اس سے مطلب نہیں ہونا چاہیے..."

میں نے اتنی تیزی سے آگے بڑھ کر اس کے پیٹ پر ... ماری کہ وہ ہل بھی نہ سکا۔ درد کی شدت سے بلبلایا اور پیٹ پکڑ کر دُہرا ہوگیا۔ میں نے اس کی پسلیوں پر دوسری کِک ماری تو وہ ... گر گیا۔

"میرا تعلق ہے اس لڑکی سے مسٹر جیکب۔" میں ... تم نے قمرو سے ٹھیک کہا تھا... وہ بڑی پارٹی تھی... خرید سکتا ہے نہ کسی کے باپ کا اثر ورسوخ دبا سکتا ہے۔" ... اُسے نیچے سے اُٹھا لیا۔ "یہ تم نے ہمارا کام آسان کر دیا۔ ورنہ ... قمرو سے ہی پوچھنا پڑتا کہ دوسرا کون تھا... تو اب خسرو جمشید ... خسرو جمشید اصل نام سے مخاطب کیے جانے پر چونک ...

"جاؤ... اس لڑکی کو لے آؤ۔" میں نے کہا۔ "میں دروازے میں سے دیکھ رہا ہوں۔" یہ بات کہنے کا مطلب یہ تھا کہ موقع سے فائدہ مت اٹھانا اور یہ مت سمجھنا کہ میں جیکب سے نمٹ رہا ہوں تو تمھاری طرف سے غافل ہوں اور تم موہنی سمیت گاڑی لے کر فرار ہو سکتے ہو۔

جیکب سخت خوفزدہ تھا اور فرش پر زخمی کتے کی طرح پڑا ہوا تھا۔ میں نے ریوالور کا رُخ اس کی طرف رکھا اور دروازے تک ... گیا۔ خسرو جمشید نے کار تک پہنچ کے میری طرف دیکھا اور پھر دروازہ کھول کے اندر جھک گیا۔ اگر موہنی بے ہوش ہوتی تو خسرو جمشید کو دو... دروازوں والی گاڑی میں سے اُسے نکالنے کے لیے خاصی محنت کرنی پڑتی لیکن موہنی ہوش میں آچکی تھی اور شاید اس نے ہمیں دروازے پر جیکب سے باتیں کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اب بھی یہ اندیشہ تھا کہ کہیں وہ خسرو جمشید کو دیکھ کر چلانے نہ لگے اور اس کے ساتھ آنے سے انکار نہ کر دے۔ میں نے پورا ... کھول کے خود کو نمایاں کیا اور موہنی کو ہاتھ ہلا کے بلایا۔ اسی وقت جیکب نے مجھے غافل سمجھنے کی غلطی کی۔ وہ ایک جست لگا کے آیا تاکہ مجھے دھکا دے کر باہر کر دے اور پھر مدد کے لیے شور ...

... مگر میں نے گھوم کر اس کی ٹھوڑی کے نیچے بھرپور کِک رسید کی۔ وہ اُلٹ کر پیچھے گیا اور نیچے گرا تو اس کا سر صوفے کے بازو ... پر لگا۔

میں نے موہنی کو کار سے نکل کے اور آہستہ آہستہ چل کے آتے دیکھا۔ خسرو جمشید اس کے پیچھے کسی نوکر کی طرح چل رہا تھا۔ وہ میری طرف آئی تو میں نے اُسے ہاتھ تھام کے اندر کھینچ لیا۔

"کیا حال ہے اب طبیعت کا؟" میں نے مسکرا کے کہا۔

"ٹھیک ہوں۔" وہ کمزور لہجے میں بولی۔ "مگر یہ..." شاید وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ یہ کون سی جگہ ہے اور ہم یہاں کیا کر رہے ہیں؟ خسرو جمشید کیوں ہمارے ساتھ ہے اور ہم بچھڑ کے پھر کیسے مل گئے ہیں... مگر وہ کچھ نہ پوچھ سکی۔ اس کی نگاہ نے جیکب کو دیکھ لیا اور ایک چیخ مار کے وہ مجھ سے لپٹ گئی۔

"موہنی... دیکھو ذرا حوصلے سے کام لو۔" میں نے اُسے تسلی دیتے ہوئے اس کے شانے پر تھپکی دی۔ "تمھارے ساتھ جو ہونا تھا ہو چکا... اب دیکھو کہ ایم آر ایس کی عدالتِ انصاف مجرموں کو کیا سزا دیتی ہے۔ دوسرا مجرم بھی آتا ہی ہوگا۔" میں نے اسے ایک صوفے پر بٹھا دیا۔

دوسرے مجرم نے آنے میں دیر نہیں لگائی۔ میں نے باہر سے کسی گاڑی کے رُکنے کی آواز سنی۔ پھر قمرو کھلے دروازے سے سیدھا اندر آگیا۔ میں دروازے کے پیچھے ہوگیا تھا۔ قمرو کے گزرتے ہی میں نے لات مار کے دروازہ بند کر دیا۔ قمرو چونک کے پلٹا۔

اس کی حالت تو جیکب کو فرش پر بے ہوش اور موہنی کو صوفے پر بیٹھا دیکھ کر ہی غیر ہوگئی تھی۔ میری شکل دیکھتے ہی اس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔

"سامنے والی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو جاؤ۔" میں نے اُسے ریوالور کے اشارے سے حکم دیا۔

"تم... کیا سمجھتے ہو؟"

میں نے آگے بڑھ کے اُسے اُٹھایا اور سر کے اوپر لے جا کر دیوار پر پھینک دیا۔ "میں تو سب سمجھتا ہوں مگر تم میری بات نہیں سمجھے تھے۔" میں نے کہا۔ "تم یہ سمجھے تھے کہ ایک کمزور عورت پر ظلم توڑ کے تم نے انتقام لے لیا ہے لیکن مجھ سے انتقام لینے کا حوصلہ نہیں تھا تم میں؟ چلو اب سیدھے کھڑے ہو جاؤ۔"

قمرو بڑی مشکل سے اُٹھا اور دیوار کے ساتھ لگ گیا۔

"تم شاید یہ بھی سمجھتے تھے کہ تم قانون کی دسترس سے باہر ہو کیونکہ تمھارے پاس باپ کی دولت اور اثر ورسوخ کی طاقت ہے۔ کیا خیال ہے رانا صاحب کو بھی منگوا لیں؟ سزا تو اس باپ کو بھی ملنی چاہیے جس نے تم جیسی اولاد پیدا کی اور پھر اس کی تربیت میں اپنی فرعونیت کا انداز پیدا کیا۔ وہ بھی بھولا ہوا ہے کہ ہر فرعون کے لیے خدا نے ایک موسیٰ بھیجنے کا سلسلہ ختم نہیں کیا۔ تم سے بڑا مجرم تمھارا باپ ہے مگر میرے پاس وقت کم ہے۔ اس کے غرور کو شکست دینے کوئی اور آئے گا۔ ابھی تو اس کے لیے یہی سزا کافی ہے کہ وہ جوان اولاد کو قبر میں اتارے اور اپنے وقت کا انتظار کرے۔"

قمرو چلانے لگا۔ "خدا کے لیے مجھے معاف کر دو... میں اس عورت کے پاؤں پکڑ سکتا ہوں۔"

میں نے بالوں سے پکڑ کے اس کا سر دیوار پر مارا۔ "چیخنے چلانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ تمھاری مدد کے لیے کوئی نہیں آسکتا۔ اور آگیا تو وہ بھی مارا جائے گا۔"

یہ بات غلط نہیں تھی۔ جیکب اکیلا رہتا تھا۔ اس کے گھر میں کوئی نوکر بھی نہیں تھا کیونکہ ہوٹل اس کا اپنا تھا اور اس کے سارے ملازم اسی کے ملازم تھے جو دن میں گھر کی صفائی بھی کر جاتے ہوں گے۔ اس کا کھانا پینا سب ہوٹل میں تھا یہاں تک کہ چائے کافی بھی وہ صرف بیل بجا کے طلب کر سکتا تھا۔

اب سوا پانچ بج رہے تھے۔ جیکب پھر ہوش میں آگیا تھا۔ میں نے اُسے بھی گھسیٹ کر قمرو کے ساتھ کھڑا کر دیا۔

"موہنی... تم ان دونوں کو پہچانتی ہو نا؟" میں نے کہا۔

"ان کی شکلیں میں کیسے بھول سکتی ہوں۔" موہنی لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

"تم دونوں اس عورت کو جانتے ہو؟" میں نے کہا۔ "کیا تم اپنے ہر جرم کا اقبال کرتے ہو؟"

انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور اس امید میں سر ہلا کے اقرار کیا کہ شاید یوں وہ مجھ سے کچھ رعایت حاصل کر لیں گے۔

"میں ایم آر ایس کے ایک منصف کی حیثیت سے تم دونوں کو موت کی سزا دیتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "کیونکہ تم اس ملک کے قانون کو دھوکا دے سکتے ہو اور کبھی اس کی گرفت میں نہیں آسکتے۔"

موت کا یقین آتے ہی ان کی حالت دیوانوں جیسی ہوگئی۔ انھوں نے ایک ساتھ مجھ پر حملہ کیا۔ قمرو آگے تھا۔ میں نے کراٹے کا وہی مہلک وار استعمال کیا جو گردن توڑ دیتا ہے۔ آدھے راستے میں قمرو لڑھک گیا۔ جیکب اس کے باوجود بڑھتا رہا۔ ایک منٹ بعد وہ بھی مر چکا تھا۔ میں نے قمرو کی دونوں جیبوں میں سے پچاس ہزار روپے نکال لیے۔ اس کے علاوہ مجھے جیکب کے کمرے کی تلاشی لینے پر ایک میز کی دراز سے مزید ایک لاکھ روپے ملے۔ اس کے تکیے کے نیچے سائیلنسر لگا ہوا ایک ریوالور بھی تھا۔ یہ ایک

کارآمد چیز تھی۔ میں نے اپنے ہاتھ کا ریوالور موہنی کے ہاتھ میں دے دیا اور یہ قیمتی ریوالور جیب میں ڈال لیا۔

"اب ہمیں چلنا چاہیے۔" میں نے کہا۔ "تم چل کے دوسری گاڑی میں بیٹھو۔۔۔ پیچھے والی سیٹ پر۔۔۔ چابیاں غالباً اسی میں لگی ہوئی ہیں۔"

"تم کیوں نہیں آتے؟" موہنی نے کہا۔

"میں آتا ہوں۔۔۔ ان لاشوں کو چھپا دوں۔" میں نے کہا۔ "جمشید تم بھی جاؤ۔۔۔ اور آگے بیٹھو۔ موہنی! ڈرنے کی بالکل ضرورت نہیں۔۔۔ اگر تمہارا دل چاہے تو نواب صاحب کے سر میں سوراخ کر دینا اس کے لیے نواب صاحب کی کسی غلط حرکت کا جواز پیش کرنا قطعی ضروری نہیں ہوگا۔"

ان کے جاتے ہی میں نے دونوں لاشوں کو گھسیٹ کر باتھ روم میں بند کیا۔ یہ دو کمروں پر مشتمل انیکسی ہوٹل کے وی آئی پی سوئٹ کی طرح تھی۔ اس کے ایک کمرے کو بیڈ روم کے طور پر اور دوسرے کو مہمانوں کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ ایک لاؤنج نما جگہ پر گول میز کے گرد چار کرسیاں کھانے کے لیے لگا دی گئی تھیں لیکن کچن کوئی نہیں تھا۔ میز کی دراز سے مجھے دروازوں کو مقفل کرنے والی چابیاں بھی ملی تھیں۔ ان میں سے ایک باہر والے دروازے کی تھی۔ میں نے جیکب کا ایک لباس بدلا اور اپنی وگ اتار کے پھینک دی۔ جب میں نے باہر کے دروازے کو لاک کیا تو افق پر صبح صادق کی سپیدی نمودار ہو چلی تھی۔ لیکن کار کے اندر بند شیشوں کے پیچھے اتنا اندھیرا تھا کہ کسی کی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ قمرو ایک نئی مزدا میں آیا تھا۔ یہ پندرہ سو سی سی کی گاڑی ان دنوں بہت مقبول ہو رہی تھی۔ اور جب میں نے اُسے دیکھا تو اس کی ظاہری خوب صورتی نے مجھے متاثر کیا۔

موہنی بڑی ہوشیاری سے خسرو جمشید کو سنبھالے ہوئے تھی۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کے دیکھا تو حسبِ توقع مجھے کار کی چابیاں اگنیشن سوئچ میں جھولتی نظر آئیں۔ قمرو اور جیکب گہرے یار تھے۔ ہوٹل کے احاطے میں قمرو اپنی گاڑی کو اتنا ہی محفوظ سمجھتا تھا جتنا اپنے گیراج میں چنانچہ وہ چابیاں نکالنے اور گاڑی کو لاک کرنے کی تکلیف نہیں کرتا تھا۔

میں نے شیشے چڑھا کے کار اسٹارٹ کی اور گیٹ پر کھڑے ہوئے چوکیدار کے سیلوٹ کو نظرانداز کرتا ہوا نکل گیا۔ چوکیدار کو نظر کچھ نہیں آیا تھا۔ اس نے قمرو کو آتے ہوئے دیکھا تھا۔ اب اس نے فرض کر لیا اور مطمئن ہو گیا کہ جانے والا بھی قمرو ہی تھا۔ اس سے پہلے کراچی سے آنے والے مہمان ابھی تک جیکب صاحب کے گھر میں موجود تھے، کیونکہ ان کی سفید فاکس ویگن باہر موجود تھی۔

مین روڈ پر آتے ہی میں نے گاڑی کی برق رفتاری آزمانے ویگن کی طرح یہ گاڑی ایک دم تو اسپیڈ نہیں پکڑتی تھی لیکن اس کی حدِ رفتار فاکس ویگن سے زیادہ تھی۔ یہ زیادہ خاموش بھی تھی اور سبک رفتار بھی۔ ملتان تک میں نے رفتار کو اسی میل کے درمیان رکھا اور شہر سے بھی گزرا تو یہ رفتار چالیس میل کے درمیان رہی۔ صبح کے ساڑھے چھ بجے ملتان کی سڑکیں آباد ہو چکی تھیں لیکن پھر بھی خالی خالی لگتی تھیں۔ میں نے گنجان آباد علاقے سے گریز کیا۔ اور باہر باہر سے نکلنے کی کوشش کی۔ موہنی نے میری ہدایت پر ایک جنرل اسٹور سے خاصا بڑا تولیہ خریدا اور پھر اس سے چند قدم کے فاصلے پر واقع ریسٹورنٹ میں گئی جو ایک بہت اچھے ہوٹل کے گراؤنڈ فلور پر تھا۔ میں نے اسے کافی سینڈوچ اور سگریٹ لانے کو کہا تھا اور یہ سمجھا دیا تھا کہ اسے کہاں آنا ہے۔ پھر میں کار کو سیدھا لے گیا اور ایک میل آگے ویران مزار کے پیچھے روک دیا۔

اب میں نے صورتِ حال پر غور کیا میرے پاس ڈیڑھ لاکھ نقد تھے۔ اگر صبح صبح کا وقت نہ ہوتا تو میں ملتان سے کوئی دوسری کار خرید لیتا مگر کاروں کے شوروم دس گیارہ بجے سے پہلے کہاں کھلتے ہیں۔ میں جانتا تھا کہ فوری طور پر میرے لیے خطرے کی کوئی بات نہیں۔ جیکب معمول کے مطابق بھی دس بجے سے پہلے ہوٹل نہیں پہنچتا ہوگا۔ چوکیدار شاید منیجر کو بتا دے گا کہ رات کو کراچی سے کچھ مہمان آئے تھے۔ یہ بات شک پیدا کر دے گی کہ آخر جیکب صاحب نے مہمانوں کے لیے چائے کافی ناشتا کچھ نہیں منگوایا۔ مگر شک کی تصدیق میں وقت لگے گا۔ پولیس کو رپورٹ کرنے اور دروازہ توڑ کے اندر داخل ہوتے تک دوپہر گزر جائے گی۔ دوپہر کے بعد مجھے اس کار کی ضرورت بھی نہیں رہے گی اور جہاں یہ کار ہوگی وہاں پولیس کا خیال بھی نہیں پہنچ سکے گا۔ جب انھیں خبر پہنچے گی تو یہ بات دو چار دن پرانی ہو چکی ہوگی۔ شہر میں سنسنی پھیلی ہوئی ہوگی کہ دونوں دوست قمرو اور جیکب کس کے ہاتھوں مارے گئے اور کیوں مارے گئے۔ سوائے مظفرگڑھ کے ایک ڈاکٹر ملک کے یہ معمّا کوئی حل نہ کر سکے گا مگر وہ تو ہم سے کبھی ملا ہی نہیں۔ ہم اس علاقے میں اجنبی تھے۔ پولیس فاکس ویگن کے مالک کو پکڑ لے گی اور وہ کار کی چوری کی رپورٹ پیش کر دے گا۔ وہ بھی کوئی ایرا غیرا تو ہوگا نہیں کہ پولیس زبردستی دُہرے قتل کا الزام اس پر دھر دے۔ یہ بھی ثابت ہو جائے گا کہ اس کا کبھی قمرو یا جیکب سے کوئی تعلق نہیں رہا اور خلقِ بالآخر تسلیم کرے گی کہ بُرے اعمال کا انجام بُرا ہی ہو سکتا تھا۔ محاورے بہت سے ہیں۔ سو سنار کی تو ایک لوہار کی۔ سو دن چور کے تو ایک دن کوتوال کا۔ ان میں ترمیم کی جا سکتی ہے کہ سو دن ظالم کے تو ایک دن مظلوم کا کسی نے سب کا حساب برابر کر دیا۔ رانا دل خان پولیس پر دباؤ ڈالیں گے اور 'نامعلوم قاتل' کے خلاف پہلے بھی جانے والی رپورٹ سے مطمئن نہیں ہوں گے مگر اس سے پہلے بھی ہوتا رہا تھا جب مدعی کمزور تھے اور کمتر درجے کے لوگ تھے جو رانا صاحب کی طاقت کے مقابل آنے کی ہمت نہیں رکھتے تھے۔ خیر۔۔۔ اب اپنی بلا سے کچھ بھی ہو۔ اندھے انصاف کی اندھی لاٹھی کو عقل کے اندھے جیسے چاہیں گھمائیں۔

ایک بار پھر موہنی پر میرا اعتماد بحال ہو گیا تھا لیکن خسرو جمشید کے بارے میں ابھی تک میں نے کچھ طے نہیں کیا تھا۔ رات سے اب تک وہ شدید اعصابی دباؤ کا شکار رہا تھا۔ اگر وہ دلاور کی طرح ذہین اور عیار ہوتا یا بیڈرو کی طرح خونخوار تو اتنی دیر تک پالتو کتے کی طرح دُم دبا کے ساتھ ساتھ نہ چلتا رہتا۔ وہ دلاور اینڈ کمپنی کا سب سے کمزور پارٹنر تھا۔ ذہنی اور جسمانی طور پر۔۔۔ مالی طور پر شاید وہ سب سے مضبوط حیثیت کا مالک تھا۔ چنانچہ اس کی اہمیت مسلّم تھی۔

ایک رکشا سڑک پر رکا تو میں نے کار سے نکل کے دیکھا یہ موہنی ہی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ میں تھرماس اٹھا رکھا تھا اور دوسرے میں ایک بیگ۔ وہ رکشا والے کو پیسے دے رہی تھی اور میں رکشا والے کی صورت پر حیرانی کے آثار دیکھ سکتا تھا۔۔۔ موہنی جیسی لڑکی کا صبح دم ایسے ویرانے میں اتر جانا جہاں سڑک کے دونوں جانب صرف شہرِ خموشاں تھا اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ وہ مجھے بھی بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔

موہنی سب کچھ لے آئی تھی۔ لیکن میں نے وہاں مزید رکنا مناسب نہ سمجھا۔ مجھے رکشا والے کی مشکوک نظروں نے مجبور کر دیا تھا کہ میں کسی محفوظ تر مقام کا انتخاب کروں۔ قبرستان کے ختم ہوتے ہی ایک باغ آ گیا جس میں آم کے گھنے درخت تھے۔ اس کی نیم پختہ چار دیواری کے صرف آثار باقی رہ گئے تھے۔ یہ جگہ آرام کے لیے بہت اچھی تھی۔ میں کار کو ایک کچے راستے سے اندر لے گیا۔ اس کے آخری حصے میں ایک چھوٹی سی ہٹ بنی ہوئی تھی۔ کار کی آواز سُن کے ایک مظلوم صورت بوڑھا بڑی بدحواسی میں باہر نکلا آیا۔

"بابا! ہم مسافر ہیں۔" میں نے کہا۔ "کراچی سے پشاور جا رہے ہیں۔ تم اجازت دو تو تھوڑی دیر یہاں رُک کے آرام کر لیں۔"

"جی آیاں نوں۔" وہ سینے پر ہاتھ رکھ کے بولا۔ "جب تک آپ کا دل چاہے آرام کرو۔۔۔ نواب صاحب تو خود بڑے مہمان نواز ہیں۔ ان کا مہمان خانہ کبھی خالی نہیں رہتا۔"

"کون نواب صاحب؟" میں نے کہا۔

"یہی جن کا باغ ہے۔۔۔ میں تو مالی ہوں ان کا۔۔" وہ بولا۔

"دروازے کھلے ہیں۔ اندر کسی چیز کی کمی ہو تو حکم کرنا۔"

اندر واقعی کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ پُرتکلف بیڈ۔۔۔ صوفے اور کشن۔۔۔ اشیائے خورد و نوش سے بھرے ہوئے فریج اور ڈیپ فریزر۔۔۔ شاہانہ طرز کے باتھ روم۔ آسائش کا کون سا سامان تھا جو وہاں نہیں تھا۔ رات بھر کے تھکا دینے والے سفر کی مشکلات کے بعد یہ فارم ہاؤس کسی صحرا میں اچانک آ جانے والے نخلستان کی طرح راحت افزا ثابت ہوا۔

میں نے وہاں کچھ دیر رُکنے کا فیصلہ کیا۔ اپنا سائیلنسر لگا ہوا ریوالور موہنی کے ہاتھ میں دے کر میں نے باتھ روم کا رُخ کیا۔ وہاں گرم اور ٹھنڈے پانی کی لائن تھی۔ شاور اور ٹب تھے اور صاف ستھرے تولیے لٹک رہے تھے۔ کیبنٹ میں صابن شیمپو اور پوڈر ٹائلٹ کی شیشیاں رکھی ہوئی تھیں۔ اگرچہ موسم سرد نہیں تھا مگر میں نے جسم کی تکان دُور کرنے کے لیے گرم پانی سے دیر تک غسل کیا اور بہت تازہ دم ہو کے باہر نکلا۔

بیس منٹ بعد موہنی آئی تو میں اُسے دیکھ کر مبہوت رہ گیا۔ غسل نے اس کا رنگ روپ ہی بدل دیا تھا۔ نہ جانے کب سے اس نے مُنہ نہیں دھویا تھا اور بال نہیں سنوارے تھے۔ اس نے وہی جوڑا پہنا تھا جو مظفرگڑھ کے ڈاکٹر کی سابق بیوی پہنتی ہوگی۔ مگر کیا وہ بھی اس لباس میں اتنی ہی جاذبِ نظر اور دلکش لگتی ہوگی۔ میں نے سوچا۔ مگر یہ لباس کا نہیں موہنی کے حُسن کا نیا انداز تھا جس نے مجھے مسحور کر دیا تھا۔

وہ میری نظر کو سمجھ کے شرمائی، مسکرائی اور میرے مقابل بیٹھ گئی۔ "ایسے کیوں دیکھ رہے ہو؟"

"اور کیسے دیکھوں؟" میں نے کہا۔

موہنی کا رنگ خوشی اور حیا سے گلابی ہو گیا اور اس کے موتی جیسے دانت مسکراہٹ سے جگمگانے لگے۔

"ناشتا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔" اس نے میری توجہ ناشتے کی طرف دلائی۔

"میں تو ناشتا شروع کرنے ہی والا تھا۔" میں نے کہا۔

"پھر انتظار کیوں کیا؟"

"لیڈیز فرسٹ میڈم۔" میں نے کہا۔ پھر مجھے جمشید کا خیال آیا جو ابھی تک سامنے والے صوفے پر پتھر کے بُت کی طرح بے حس و حرکت بیٹھا ہوا تھا۔ شاید اتنے تعاون کے بعد وہ ہم سے رعایت کی امید رکھتا تھا لیکن میں اس شخص کے ساتھ کوئی نیکی کیسے کر سکتا تھا جس کا وجود بدی سے عبارت تھا۔ وہ اب تک زندہ تھا تو صرف اس لیے کہ میں نے ہوش سے کام لیا تھا۔

"کیا تم مجھے غسل کی اجازت نہیں دو گے؟" جمشید نے کہا۔

"تم اب ایک ہی بار غسل کرو گے۔۔۔ تدفین سے پہلے۔۔۔

بشرطیکہ زمین نے تمہیں قبول کیا۔" میں نے کہا۔ "تمہیں یقیناً بھوک بھی لگی ہو گی... مگر جمشید... تم اب ایک قیدی ہو۔"

"میں نے تم سے پوری طرح تعاون کیا ہے... اور آئندہ..."

"آئندہ کے بارے میں ابھی تک میں نے کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا کہ تمہیں کس کے حوالے کروں۔" میں نے کہا۔ "ملٹری انٹیلی جنس کے... ایم آر ایس کے یا حضرت عزرائیلؑ کے۔"

وہ مجھے گھورتا رہا اور اپنے ہونٹ کاٹتا رہا۔ موہنی کی اس کی طرف پیٹھ تھی۔ جب میں نے مزے لے لے کر سینڈوچ کھانا اور کافی پینا شروع کیا تو جمشید نے اپنی نظر پھیر لی۔ ناشتے کے بعد میں نے سگریٹ سلگا کے صوفے پر پاؤں پھیلا دیے۔

"تم جا کے بیڈروم میں سو جاؤ۔" میں نے موہنی سے کہا۔ "اگر کسی نے مداخلت نہ کی تو ہم رات تک یہاں قیام کریں گے۔"

"میرا تو دل چاہتا ہے کہ اسی قیام میں عمر گزر جائے... کیسی اچھی پُرسکون اور پُرآسائش جگہ ہے۔" موہنی ایک زہر شکن انگڑائی لے کر بولی اور مسکرائی۔

میں نے اس کی آنکھوں کے پیغام کو سمجھا اور نظر انداز کر دیا۔ زندگی کی راہ میں بہت سے نظر فریب دھوکے ہیں مگر سفر ابھی جاری ہے۔ ہم ایسی خواہشوں کے جال میں نہیں پھنس سکتے۔ وہ بیڈروم میں چلی گئی۔ اسے میرے طرزِ عمل نے مایوس کیا تھا۔

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو میں چونک پڑا۔

موہنی پھر دروازے میں نمودار ہوئی۔ "کیا کروں؟ ریسیور اٹھا لوں؟"

"نہیں... مالی کو بلاؤ..." میں نے کہا لیکن مالی شاید باہر برآمدے میں ہی بیٹھا تھا فوراً اندر آ گیا۔ میں نے موہنی کو اپنی جگہ بٹھایا اور خود اندر چلا گیا۔

"یہ مالک کا فون ہو گا جی۔" مالی نے کہا۔

"تم نے ابھی تک ان کا نام نہیں بتایا۔" میں نے کہا۔

"سلطان صاحب ہیں جی اس کے مالک۔" مالی نے ریسیور اٹھاتے ہوئے کہا۔ "ہیلو... سلام چھوٹے صاحب... نہیں صاحب... وہ ادھر تو نہیں آئے ابھی تک..." اور ریسیور رکھ دیا۔

"کون ہیں یہ چھوٹے صاحب؟" میں نے کہا۔ "جیکی یا جونی؟"

"آپ جانتے ہیں انھیں؟" مالی نے کہا۔

"نمبر بتاؤ مجھے ان کا۔" میں نے فون اپنی طرف کر کے کہا۔

اسی وقت میں نے فائر کی آواز سُنی... سائلنسر نے آواز کو بہت کم کر دیا تھا مگر جب بیچ میں صرف ایک دروازہ حائل ہو تو تھوڑی آواز بھی بہت محسوس ہوتی ہے۔

"میں تیری پول کھول دوں گا... فاحشہ..." نواب نے چیخ کر کہا اور اس کے منہ سے غلیظ گالیاں اُبلنے لگیں۔

"تم نے پھر حرکت کی تو میرا نشانہ خطا نہیں ہو گا۔" یہ موہنی کی پُرسکون آواز تھی۔ مالی کا رنگ لاش کی طرح سفید تھا۔ لیکن میں نے یہ ظاہر کیا جیسے کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوئی۔

"کیا تم اونچا سنتے ہو؟" میں نے سختی سے کہا۔ "سلطان کے بیٹے میرے دوست ہیں۔ جیکی یا جونی کا نمبر پوچھا تھا میں نے۔"

"جی... جی صاحب... میں ملا دیتا ہوں..." مالی نے ہوئے کہا۔

"تم کو بھونکنے کی اجازت ہے۔" موہنی نے کہا۔ "لیکن اس سے تمہیں کچھ حاصل نہیں ہو گا۔"

"تیری اصلیت تو آ جائے گی اس کے سامنے۔" نواب بولا۔

"میں اسے چوبیس سال پہلے بھی جانتی تھی۔ اور چوبیس سال پہلے میں اور وہ ایک ہی گھر میں تھے۔" موہنی نے کہا۔ "تم اُسے کیا بتاؤ گے...؟"

مالی نے ریسیور مجھے تھما دیا۔ اس کا ہاتھ لرز رہا تھا۔

"کون جیکی...؟" میں نے کہا۔ "کیا حال ہے...؟"

"میں نے پہچانا نہیں۔" جیکی کنفیوز ہو کے بولا۔

"تمہارے اس پلاٹ کا چکر تو ختم کرا دیا تھا میں نے..."

"تم... !" جیکی حیران ہو کے بولا۔ "کہاں سے بات کر رہے ہو؟"

"بھئی میں پھر تمہارا مہمان ہوں۔" میں نے کہا۔ "تمہارے فارم ہاؤس میں رکا ہوں ایک دن کے لیے... یہ بتاؤ آج ادھر کوئی آئے گا؟"

"کیا مطلب؟ آنے کو کوئی بھی آ سکتا ہے۔"

"میں چاہتا تھا... میرا مطلب ہے کوئی ایسا بندوبست کرو کہ مجھے پورا دن مل جائے... کوئی مداخلت نہ کرے۔" میں نے کہا۔

"تم رات کو بھی رُک سکتے ہو۔ کوئی نہیں آئے گا ادھر..."

"مگر میں تم سے ملنا چاہتا ہوں... ابھی... مجھے تم سے ایک کام ہے۔" میں نے کہا۔

"میں ایک گھنٹے میں آتا ہوں... جونی کو ساتھ لاؤں؟"

"ضرور لاؤ۔" میں نے کہا۔ "لیکن پہلے اپنے اس مالی کو سمجھا دو کہ ہمیں مہمان سمجھے۔"

"ٹیلی فون اسے دو... کیا اُس نے کوئی بدتمیزی کی ہے؟"

"نہیں... مگر میں چاہتا ہوں کہ وہ دخل در معقولات نہ کرے۔" میں نے کہا۔

"کیا تم اکیلے ہو؟" وہ بولا۔

"نہیں... میرے ساتھ وہی ہے... جو تھی۔" میں نے کہا۔

"اچھا اچھا..." وہ معنی خیز انداز میں ہنسا۔ "عیش کرو۔ کوئی مخل نہیں ہو گا... مگر یہ تو بتاؤ کہ تم ہمارے فارم پر کیسے پہنچ گئے تھے؟"

"مجھے کہاں معلوم تھا کہ یہ تمہارا فارم ہے... میں تو بس ایسے ہی ایک جگہ دیکھ کے رک گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "سوچا تھا کہ کوئی مالی یا چوکیدار ہو گا تو اسے خوش کر دیں گے... تمہارا فون آیا تو پتا چلا۔"

معلوم نہیں جیکی نے مالی سے کیا کہا، مگر اس کا رنگ اُڑ گیا۔ وہ جی حضور... جی سرکار کہتا رہا اور پھر ریسیور رکھ کے پوچھنے لگا کہ مجھ سے کون سی گستاخی ہو گئی تھی؟ میرے اور جیکی کے درمیان ساری گفتگو انگریزی میں ہوئی تھی چنانچہ مالی کچھ بھی نہیں سمجھ پایا تھا... میں نے اسے تسلی دی کہ ایسی کوئی بات نہیں، وہ باہر بیٹھے اور جب چھوٹے مالک آئیں تو بتا دے۔

موہنی سونے کے لیے لیٹ گئی تو میں پھر جمشید کے سامنے جا بیٹھا۔

"میں کسی بھی جگہ تمہیں پکڑوا سکتا تھا۔" وہ اچانک بولا۔

"اسی جگہ تم مارے بھی جاتے اور تمہاری یہ حرکت خودکشی کہلاتی۔" میں نے کہا۔

"دیکھو سکندر... میرا بچپن ناز و نعم میں گزرا تھا اور اس کے بعد سے اب تک میری زندگی عیش و عشرت میں بسر ہوئی ہے۔" وہ بولا۔ "میں نے سختی کبھی نہیں دیکھی۔ میں دلاور کے کاروبار میں ایک سلیپنگ پارٹنر تھا۔ اس کے لیے سرمایہ میں نے فراہم کیا تھا لیکن میں نے صاف بتا دیا تھا کہ میں عملاً کچھ نہیں کر سکتا... کوئی رسک نہیں لے سکتا۔ قتل خونریزی تو دُور کی بات ہے میں گرفتاری سے بھی ڈرتا ہوں۔"

"تم اس پیسے سے کوئی جائز کاروبار نہیں کر سکتے تھے؟"

"کر سکتا تھا... لیکن اس میں منافع کم ہوتا ہے، دوڑ دھوپ زیادہ کرنی پڑتی ہے۔" جمشید نے کہا۔ "دلاور نے مجھے سو فیصد منافع کا یقین دلایا تھا... سو فیصد ماہانہ... جو کسی کاروبار میں ناقابلِ تصور ہے... یہاں تک کہ اسمگلنگ... منشیات کے دھندے یا بردہ فروشی جیسے کاروبار میں بھی ممکن نہیں۔ دلاور کے پاس بزنس پروپوزل تھا... پارٹی تھی اور انتظامی امور سے نمٹنے کی صلاحیت تھی۔ اس نے مجھے یہ ضمانت بھی دی کہ مجھے کچھ نہیں کرنا ہو گا... لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ میری حیثیت صفر ہو گی۔ مجھے مشورہ دینے اور ان کے نفع نقصان اور کاروبار کی پوزیشن معلوم کرنے اور ان کی ہر میٹنگ میں شرکت کا حق حاصل رہے گا۔"

"اور تمہارا سرمایہ... کیا تمہیں یہ حق حاصل تھا کہ جب چاہو الگ ہو جاؤ؟"

"ایسا تو کسی بھی کاروبار میں ممکن نہیں اور جب کاروبار اطمینان بخش طور پر چل رہا ہو تو ایسا کون چاہے گا۔" جمشید نے کہا۔

"تم نے کتنا سرمایہ فراہم کیا تھا؟"

"ابتدا میں بیس لاکھ۔"

"کیا ایک مہینے بعد وہ چالیس لاکھ ہو گئے تھے؟" میں نے کہا۔

"نہیں... لیکن تیس لاکھ ہو گئے تھے۔"

"گویا تمہیں دس لاکھ کا منافع ادا کر دیا گیا تھا...؟"

"معاہدے کے مطابق کاروبار کا آغاز ہونے کے تیسرے ماہ سے منافع کی تقسیم شروع ہوئی تھی۔ تیسرے مہینے کے بعد یہ شرح برقرار رہی۔"

"لیکن یہ سو فیصد ماہانہ منافع تو نہیں تھا۔"

"ہاں... مگر پچاس فیصد ماہانہ بھی بہت زیادہ ہوتا ہے۔ چونکہ مجھے فوری طور پر ضرورت نہیں تھی اس لیے میں نے منافع کی دو اقساط وصول کرنے کے بجائے سرمائے میں شامل کر دیں۔ اس طرح میں چالیس لاکھ کا پارٹنر بن گیا۔ بعد میں مجھے اوسطاً پندرہ سے بیس لاکھ ماہانہ ملتے رہے... اور اب بھی مل رہے ہیں۔"

"پندرہ لاکھ تو پچاس فیصد سے بھی کم ہو گئے۔"

"وہ... دراصل میرا خیال ہے کہ ابتدا میں دلاور نے کچھ مبالغے اور کچھ غلط بیانی سے کام لیا تھا۔ سو فیصد ماہانہ منافع ممکن نہیں تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دلاور اور سراج وغیرہ مل کے ڈنڈی مار جاتے ہوں۔ خود زیادہ وصول کرتے ہوں۔ مجھے کم دیتے ہوں۔ مگر میں اسے ہی بہت سمجھتا ہوں کہ مجھے کچھ کیے بغیر پندرہ بیس لاکھ ہر مہینے مل جاتے ہیں۔ دو چار لاکھ کم کے لیے جھگڑا کیا کرنا۔ اور کسی کاروبار میں تو دس فیصد ماہانہ بھی نہیں ملتے۔ میرا خرچ پانچ سات لاکھ روپے ہوتا ہے۔ باقی جمع ہو رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ہمیشہ چلنے والا کاروبار نہیں ہے۔"

"تمہارا سرمایہ ملک میں ہی ہے؟"

"نہیں... سب کی طرح میں نے بھی اپنا پیسہ سوئٹزرلینڈ میں محفوظ کیا ہے۔" جمشید بولا۔

"ڈی سلوا بھی ایک پارٹنر تھا؟" میں نے کہا۔

"ہاں... دس فیصد کی حد تک۔" جمشید نے کہا۔

"اس نے بھی سوئٹزرلینڈ میں دولت جمع کی ہو گی۔ وہ کس کے کام آئے گی جب خود اس کے کام نہ آئی۔" میں نے کہا۔ "دلاور، سراج اور سیڈرو بھی پارٹنر ہیں؟"

"پارٹنر تو سب ہیں... ذمے داریوں کی نوعیت کے اعتبار سے سب کے کام الگ ہیں اور انھیں جو منافع ملتا ہے وہ ان کے فرائض کی اہمیت کے تناسب سے ملتا ہے۔" جمشید نے کہا۔

"ہر ایک کا نقد سرمایہ کتنا تھا؟"

" دلاور کا پانچ لاکھ... سراج کا ایک لاکھ۔ مگر دلاور سارے رسک کور کرتا تھا اور سامنے رہتا تھا۔ کل منافع میں سے چالیس فیصد میرا ہوتا تھا، دلاور کا پچیس فیصد۔ سراج کا پندرہ فیصد۔ اخراجات نکلنے کے بعد۔"
" اور باقی دس فیصد؟"
" وہ دوسرے ماتحت مددگاروں کا۔ پہلے یہ ڈی سلوا کو ملتا تھا۔ پھر یہی دس فیصد تقسیم ہونے لگا۔ پانچ فیصد پیڈرو کو مل جاتا ہے اور باقی دوسروں کو۔"
"گویا پیڈرو پارٹنر نہیں ہے؟"
" معاہدے میں اس کا نام پارٹنر کی حیثیت سے شامل نہیں ہے۔ اسے دس ہزار روپے ماہانہ دیے جاتے تھے۔ ڈی سلوا کے مرنے کے بعد جب پانچ فیصد ملنے لگے تو اب بیس پچیس ہزار ہو جاتے ہیں۔ ویسے وہ ملازم ہے۔ دلاور کے رویے نے اسے سر چڑھا رکھا ہے۔" جمشید نے کہا۔
"کیا تم یہ نہیں جانتے کہ ایک غیر قانونی معاہدے کی قانونی حیثیت کچھ نہیں ہوتی؟" میں نے کہا۔ "مثلاً اسی کاروبار کی مثال لو۔ اگر دلاور تمھارا پیسہ ہضم کر جائے تو تم اس کے خلاف کسی عدالت میں دعویٰ دائر نہیں کر سکتے... تم لاکھ کہو کہ میں کچھ نہیں کرتا تھا مگر شریکِ جرم سمجھے جاؤ گے اور اندر ہو جاؤ گے۔"
"تم کہہ سکتے ہو کہ میں کاہل ہوں اور بزدل ہوں۔ لیکن میں احمق نہیں ہوں۔" وہ بولا۔ "میرا پیسہ اپنے سرمائے کی حد تک محفوظ ہے۔ دلاور کی فیکٹری میرے پاس رہن ہے اور مورٹ گیج پیپرز عدالتی اسٹامپ اور رجسٹری کے ساتھ میرے بینکرز کی تحویل میں ہیں۔"
" ایم ڈبلیو ڈی کمپلیکس... تمھارے پاس رہن ہے؟" اس انکشاف نے مجھے سُن کر دیا۔ غصے نفرت اور انتقام کی پرانی آگ پھر میرے لہو کو تیزاب کرنے لگی۔ "کیا حق حاصل تھا اس کمینے کو... کہ میری اور میرے باپ کی جائداد کو رہن رکھے؟" میں نے ایک دم خسرو جمشید کو دبوچ لیا اور اسے دیوانہ وار مارنے لگا۔ وہ لڑنے بھڑنے والا آدمی نہیں تھا۔
وہ چلانے لگا: "سکندر... مجھے مت مارو... مجھے چھوڑ دو۔ میں مجرم ضرور ہوں۔ لیکن میں نے تمھیں نقصان نہیں پہنچایا۔"
میں نے اُسے صوفے پر پھینک دیا۔ اس کے کپڑے پھٹ گئے تھے اور خون اس کی ناک سے اور ہونٹوں سے بہہ رہا تھا۔ موہنی نے بیچ کے دروازے سے جھانک کر دیکھا اور لوٹ گئی۔ مالی نے اندر آنے کی ہمت ہی نہیں کی۔
" مجھے مار کے... تمھیں کچھ نہیں ملے گا..." خسرو جمشید بڑی مشکل سے اُٹھا اور اس نے کرتے کے دامن سے ہونٹ صاف کیے۔ "جو کچھ میں تم کو بتا سکتا ہوں، تم کسی سے بھی نہیں پوچھ سکتے۔ میں نے تو صرف پیسہ دیا تھا۔ تم مجھے ہوس پرست اور لالچی کہہ سکتے ہو... میں خود بھی تسلیم کرتا ہوں کہ میں عیاش اور بدکردار ہوں۔ لیکن براہِ راست میں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا کہ تم مجھے..."
" بکواس بند کرو کتے کے بچے۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "وہ شخص بھی قاتل کہلاتا ہے جو کسی کے ہاتھ میں خنجر دیتا ہے... یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس سے کسی کا گلا کاٹا جائے گا۔ کیا تم کو معلوم نہیں تھا کہ اس کارخانے کا دلاور اکیلا مالک نہیں ہے؟"
"پہلے وہ اکیلا مالک نہیں تھا۔ تمھارے والد اور میر شرافت علی بھی اس کے مالک تھے۔" جمشید نے کہا۔ "مگر... اس نے دو آدمی کاٹ دیے۔ تمھارے والد کو راستے سے ہٹا دیا اور میر شرافت علی کو مروا دیا۔ اس کے بعد تو مالک وہی تھا۔ میر شرافت علی لاوارث تھا اور لاولد تھا۔ تم اپنے باپ کے اکلوتے وارث تھے۔ تم کو اسی لیے بلایا گیا تھا کہ حصہ دے کر الگ کر دیا جائے۔ اور اگر تم نے کاروبار میں شرکت پر رضامندی کا اظہار کرو تو تمھارا بھی حصہ مقرر کر دیا جائے۔ مگر فیکٹری تو دلاور پہلے ہی رہن رکھ چکا تھا۔ اگر حقِ وراثت کا مقدمہ چلتا تو یہ بات سامنے آجاتی۔ مگر تمھارا رویہ دیکھتے ہوئے ایسا انتظام کر لیا گیا کہ تم عدالت میں پیش ہی نہ ہو سکو... اور دیکھ لو کہ آج تمھاری کیا پوزیشن ہے۔"
"تم اپنی پوزیشن دیکھو تو اب خسرو جمشید... کہ تمھارے پیسے نے تمھیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔" میں نے کہا۔ "کیا تم کو یقین ہے کہ وہ سب پیسہ جو تم نے سوئٹزرلینڈ کے کسی بینک میں جمع کیا ہے۔ یا میری فیکٹری کے رہن رکھے جانے کے کاغذات... دلاور اور سراج... یہ سب مل کے تمھیں بچا سکتے ہیں... میں تو اپنا حق حاصل کر ہی لوں گا۔"
"تمھارے لیے میری زندگی میری موت سے زیادہ کارآمد ہوگی سکندر۔"
" لیکن پھر تمھاری زندگی ان کے حق میں موت بن جائے گی جو آج تمھارے پارٹنر ہیں۔" میں نے کہا۔ "تم یہ پُل صراط عبور نہیں کر سکو گے جمشید... میرے ہاتھوں نہ مارے گئے تو تم ان کے ہاتھوں ضرور مارے جاؤ گے... ابھی میری نظر میں غدار ہو... پھر ان کی نظر میں بھی غدار ٹھہرو گے۔"
" ان کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دو۔" جمشید نے کہا۔ "جب میں نے اس کاروبار میں قدم رکھا تھا تو صرف منافع نہیں دیکھا تھا۔ میں نے خطرات کو بھی سمجھ لیا تھا اور پہلے دن سے میں صرف اپنا دفاع مضبوط کر رہا ہوں۔ میرا اکاؤنٹ سوئٹزرلینڈ میں نہیں ہے وہاں تو سب ہی جانتے ہیں اور انھیں تلاش بھی کیا جا سکتا ہے۔ میں نے ایک ایسے ملک کا انتخاب کیا تھا جہاں ان کے تصور کی رسائی بھی نہیں ہوگی۔ وہاں میں نے اتنی دولت سے سرمایہ کاری کی ہے کہ مجھے اس ملک کی معیشت اور سیاست میں اہم مقام حاصل ہے۔ میں وہاں کا وی آئی پی ہوں مگر میرا اصل نام، میری اصل شہریت... یہ سب انھیں بھی معلوم نہیں... میں جب چاہوں جس جہاز سے چاہوں وہاں جا سکتا ہوں۔ مہینے میں ایک بار جاتا بھی ہوں۔ وہاں یہ سمجھا جاتا ہے کہ میں کاروباری دورے پر ہوں یا پھر اپنے سوئٹزرلینڈ کے محل میں مقیم ہوں... حالانکہ میرا سوئٹزرلینڈ میں کوئی جھونپڑا تک نہیں ہے۔ میں تمھیں ایک پیش کش کرتا ہوں... تم مجھے نکل جانے دو۔ میں ایسا پکا انتظام کر جاؤں گا کہ تمھارا حق تمھیں مل جائے۔ تم ایم ڈبلیو ڈی کمپلیکس کے مالک بن جاؤ گے۔"
" مجھے بے وقوف مت بناؤ جمشید۔" میں نے برہمی سے کہا۔ "اوّل تو وہ ایم ڈبلیو ڈی کمپلیکس رہا ہی نہیں۔ وہ سُور کا بچہ دلاور وہاں اسپتال بنا رہا ہے۔ وزیر ہوسپٹل۔"
" پھر کیا ہوا۔ رہن کے کاغذات میں یہ شق شامل ہے کہ اس زمین پر موجودہ عمارت میں اضافہ ترمیم یا ردّوبدل کیا جا سکے گا لیکن وہ پراپرٹی بدستور میرے پاس رہن رہے گی۔"
" دلاور تمھارے منہ پر بیس لاکھ مار سکتا ہے۔"
" اسے کیا ضرورت ہے بیس لاکھ میں ایک ایسی پراپرٹی چھڑانے کی جس پر اس کا قانونی حق چیلنج ہو چکا ہے۔ وہ خود بھی یہاں ناقابلِ انتقال جائداد نہیں رکھ سکتا۔ اس کا اپنا کوئی گھر نہیں... وہ کرائے کے مکان بدلتا رہتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کبھی اسے اچانک بھاگنا پڑا تو وہ جائداد اُٹھا کے نہیں لے جا سکے گا۔ اس کے کام وہی پیسہ آئے گا جو باہر محفوظ ہے۔ یہاں تو کسی بنک میں ذاتی پیسہ بھی اتنا ہی رکھتا ہے جو وقتِ ضرورت کام آجائے۔ بیس لاکھ وہ باہر سے منگوا کے ادائیں کرے گا کہ رہن رکھی ہوئی جائداد کو چھڑائے۔ وہ تو اس سے سیاسی فائدہ اُٹھانا چاہتا ہے تاکہ خود محفوظ رہے۔ میں اس رہن نامے کو تمھارے نام منتقل کر دیتا ہوں... یہ کیسے ہوگا... اس معاملے میں تم اپنے وکیلوں سے مشورہ کر سکتے ہو... تمھارے دوست بہترین وکیل ہیں۔ اس طرح تم مستقبل میں تعمیر ہونے والے وزیر اسپتال کے مالک خود بخود بن جاؤ گے۔"
" مگر میں قانونی کارروائی کے لیے کسی عدالت میں نہیں حاضر ہو سکتا۔" میں نے کہا۔
" اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ابھی وہ جائداد یعنی وزیر اسپتال میرے نام رہن ہے... میں تمھارے دوست اور وکیل عبدالودود منظر کو اپنا اٹارنی بنا کے اسے مکمل اختیارات دے سکتا ہوں۔ دلاور عملاً اس جگہ سے دستبردار ہو چکا ہے۔ تمھارا دوست تمھاری واپسی تک اس اسپتال کو اپنی ٹرسٹی شپ میں چلا سکتا ہے۔"
" اس کے لیے تم کو بھی تو عدالت میں حاضر ہونا پڑے گا۔"
جمشید نے نفی میں سر ہلایا۔ "میرے قانونی مشیر میری ہدایات پر یہ کام کر لیں گے... وزیر اسپتال تمھارا ہو جائے گا... تم کہو گے تو میں اس کی تکمیل کے لیے پیسہ بھی فراہم کر دوں گا۔"
" اور کیا دلاور اینڈ کمپنی تمھیں ایسا کرنے دے گی؟ کیا انھیں معلوم نہیں ہو جائے گا کہ تم منحرف ہو گئے ہو؟"
" انھیں فوراً معلوم ہو جائے گا... مگر وہ میرا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔ وہ میرے قانونی مشیروں کو یا تمھارے وکیل دوست کو کیسے منع کر سکتے ہیں۔ اس کام میں ایک دو مہینے لگ جائیں گے۔ اس عرصے میں تم مجھے اپنی قید میں رکھو گے اور میری حفاظت کرو گے۔ جب ساری قانونی کارروائی تمھارے اطمینان کے مطابق پوری ہو جائے اور اسپتال بھی مکمل ہو جائے تو تم مجھے خاموشی سے باہر نکل جانے کا موقع دینا۔ اس سے زیادہ میں تم سے کچھ نہیں چاہتا۔ بس تم مجھے رہا کر دینا کہ جہاں تمھارا جی چاہے جاؤ۔ میں بھیس بدل کے جاؤں یا نام بدل کے... تم کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں... میں کئی نام... کئی پاسپورٹ استعمال کروں گا اور کئی مختلف جہاز بدل کے بالآخر اپنی پناہ گاہ تک پہنچ جاؤں گا۔"
اس کی بات نے مجھے کشمکش میں ڈال دیا۔ اب تک میرے ذہن میں ایک فیصد بھی شبہ نہیں تھا کہ مجھے خسرو جمشید کے ساتھ کیا سلوک کرنا ہے۔ مسئلہ وہی انتخاب کا تھا کہ میں اُسے سزا دینے کا اختیار اپنے پاس رکھوں... اسے غالب اور محسن کے سپرد کر دوں یا میجر سلطان کے حوالے کروں۔ ہر صورت میں وہ سزا اس کا مقدر تھی جو غدار کو ملنی چاہیے۔
اس کی پہلی بات کو میں مسترد کر سکتا تھا کہ اس نے براہِ راست مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ نہ وہ میرے والد کے قتل میں شریک تھا نہ کسی اور کے۔ نہ اس نے تباہ کاری و خونریزی کے کسی منصوبے میں شرکت کی اور نہ اس کا مقصد ملک دشمنی تھا۔ اس کے پیشِ نظر تو منافع تھا جو اتنا بڑا تھا کہ کسی دوسرے ذریعے سے حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ ویسے تو سب ہی ملک دشمن ہیں۔ اسمگلر بھی، منشیات فروش بھی... ذخیرہ اندوز بھی، رشوت خور اور ٹیکس چور بھی سرکاری املاک کو نقصان پہنچانے والا بھی۔ کسی بھی ٹرین کے باتھ روم سے شیشہ یا ایک بلب چرانے والا بھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ خسرو جمشید نے جانتے بوجھتے اپنا سرمایہ ان لوگوں کے حوالے کیا جو ملک توڑنے کے درپے تھے۔

دوسری بات کا تعلق میری ذات سے تھا۔ جو چیز مجھے سر توڑ کوشش کے باوجود نہیں ملی تھی۔ میرا قانونی حق ہونے کے باوجود مجھے نہیں ملی تھی اور اپنا سب کچھ گنوا کے بھی نہیں ملی تھی وہ اچانک ایک معمولی سی شرط پر مجھے دی جا رہی تھی۔ اگر وہ میرا سرمایہ تھا جو غصب کر لیا گیا تھا تو غاصبوں کا ایک ساتھی مجھے وہ سرمایہ اس پروا جب الادا سود سمیت لوٹا رہا تھا۔ اگر میں نے ذہنی و جسمانی اذیت برداشت کی تھی تو اس کا بھی نہ تلافی مجھے مل رہا تھا۔ وہ اس طرح کہ ایک کارخانے کی جگہ مجھے ایک مکمل اسپتال کی پیشکش تھی۔ کارخانہ صرف فولاد کو پرزوں میں ڈھالتا تھا مگر اسپتال دکھی اور بیمار انسانوں کے لیے امید شفا فراہم کرتا تھا۔ کارخانہ صرف مادی فوائد حاصل کرنے کا ذریعہ تھا لیکن وزیر خان کے نام پر تعمیر ہونے والا اسپتال ایک صدقہ جاریہ ثابت ہو سکتا تھا۔ میں اس اسپتال کو غریبوں کے مفت علاج کے لیے کھول سکتا تھا اور اس کی اپنی آمدنی سے چلا سکتا تھا۔

جب میرا ذہن ڈانواں ڈول ہونے لگا تو مجھے ایک اور خیال بھی آیا۔ گزشتہ روز میں نے جب اسٹیشن ویگن کو ایک مرسڈیز سے ٹکرا کے خسرو جمشید کے ڈبل کو ہلاک کر دیا تھا اس شخص نے یہ تسلیم کیا تھا کہ وہ خسرو جمشید نہیں ہے ورنہ مجھے کبھی اس کا پتا نہ چلتا۔

اسی نے مجھے بتایا تھا کہ اصل خسرو جمشید کہاں ملے گا۔

اگر کسی طرح یہ مشہور اور ثابت کر دیا جائے کہ وہی اصل خسرو جمشید تھا تو دلاور یا سراج کیسے تصدیق کر سکتے ہیں کہ حقیقت کیا تھی جسے میں نے بدل دیا۔ اس طرح ایک دو مہینے خسرو جمشید کو قید میں رکھنا کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ وہ اپنی مرضی سے قید میں رہے گا۔ اپنی جان بچانے کے لیے اور جب قانونی معاملات میری مرضی کے مطابق طے پا جائیں گے۔ یعنی عبدالودود منظر تصدیق کرے گا کہ اب قانونی طور پر کوئی سقم نہیں اور وہ وزیر خان اسپتال کا مہتمم و منتظم ہے، اس کے پاس اسپتال کی تکمیل کے لیے خسرو جمشید کی فراہم کردہ رقم ہے اور قانونی اختیار ہے۔ تو کسی بھی رات خسرو جمشید کو رہا کیا جا سکتا ہے۔ وہ اپنی سزا جلاوطنی کی صورت میں بھگتے گا۔ گمنامی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوگا۔ کسی ایسے ملک میں جہاں وہ خود بھی اپنے لیے اجنبی ہوگا۔ وہ مالی طور پر آسودہ ہوگا مگر پیسہ صرف جسم کو آسودہ کرتا ہے۔ جذباتی رشتے اور محبتوں کے سائے جو روح کی تلاش مٹاتے ہیں، خریدے نہیں جا سکتے۔ ایک پوری زندگی گزار کے مرنے والے کے لیے ایک بھی آنکھ سے وہ قطرۂ اشک نہ ٹپکے جس میں جدائی کا درد ہو اور دل کا لہو شامل ہو تو کیا مر کے بھی روح کو قرار مل سکتا ہے۔ پھر خسرو جمشید اپنے سب جرائم کا، اپنے تمام گناہوں کا اعتراف کرتے ہوئے خود ہی یہ سزا بھگتنے کو تیار ہے۔ جرمانہ ادا کرنے کو تیار ہے اور غداری کے جرم میں دوسرے فریق کی سزا [illegible] مول لینے کو تیار ہے تو مجھے کیا؟

ایک ہارن نے میرے خیالات کو منتشر کر دیا۔ میں [illegible] دیر سے خسرو جمشید کو گھور رہا تھا اور وہ دیکھ رہا تھا کہ [illegible] اس کی پیشکش نے میرے پتھر دل کو پگھلانا شروع کر دیا [illegible] کا اندازہ مجھے اس کی صورت پر امید کے اجالے سے ہو [illegible] جواب اتنا ہی زیادہ ہو چکا تھا جتنی صبح کے مقابلے [illegible] کی دھوپ۔

جیکی اور جونی ایک ساتھ اندر آئے۔ وہ دونوں بڑے جوشیلے جوان تھے انھوں نے 'ہائے' کہہ کے مجھ سے [illegible] کیا اور پھر خسرو جمشید سے۔

"اچھا ہوا تم پھر آ گئے۔" جیکی بولا۔ "ہمیں تو موقع ہی نہیں ملا تھا اس دن کہ تم سے کچھ کہہ سکیں۔۔۔ یو ڈڈ سو ویل۔۔۔"

"تمھاری ایکٹنگ!" جونی بولا۔ "سپرب۔۔۔"

"ہم سے تو بات نہیں بنی تھی۔" جیکی بولا۔ "بلکہ میں تو بے وقوفی پر پشیمان تھا کہ سوچے سمجھے بغیر کیا کہہ دیا۔"

"لیکن تم نے جس طرح بگڑی بات بنائی۔۔۔ میں تو مان گیا۔ ورنہ تم اگر تہ خانے میں پہنچا دیے جاتے تو معلوم ہے کیا ہوتا؟"

جونی نے کہا۔

"کیا ہوتا۔۔۔؟" میں نے ہنس کے کہا۔

"تمھاری روح بھی اندر ہی قید رہتی اور چمگادڑ کی طرح اندھیرے میں چکر لگاتی رہتی۔" جونی نے کہا۔ "اور تمھارا ڈھانچا۔۔۔ خیر چھوڑو۔۔۔"

"ہاں۔۔۔ جو ہوا ٹھیک ہوا اور اچھا ہوا۔" میں نے کہا۔ "یہ بتاؤ تم نے اس خبیث کو کہاں چھوڑا تھا؟"

"پانچ میل سے بھی آگے۔۔۔ اس نے بہت شور مچایا۔ لالچ دیا اور دھمکی دی۔۔۔ میں نے کہا کہ میں خلاف اصول بات نہیں کر سکتا اور وہی کروں گا جس کا مجھے حکم ہے۔۔۔ ورنہ واپس گھر لے جاؤں گا۔"

"وہ کیا چاہتا تھا؟" میں نے کہا۔

"ظاہر ہے تمھارا تعاقب کرنا چاہتا تھا۔" جیکی بولا۔

"بعد میں کیا ہوا؟" میں نے کہا "جب تم گھر پہنچے۔"

"اس وقت تک سب کچھ ہو چکا تھا۔" جیکی نے کہا۔ "بیگم پارہ کہرام مچا کے خاموش ہو چکی تھیں اور ڈیڈ اعلان کر چکے تھے کہ وہ اپنا فیصلہ نہیں بدلیں گے۔"

"خواہ بیگم پارہ روٹھے اور روٹھ کے گھر سے جائے یا دنیا سے جائے۔" جونی قہقہہ مار کے ہنسا۔ "ڈیڈ کو یقین ہو گیا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔"

"دال میں کالا ہی کالا تھا۔۔۔ سفیدی کا نام بھی نہیں تھا۔ تمھارے ڈیڈ نے درست فیصلہ کر کے خود کو بہت بڑی پریشانی سے بچا لیا۔" میں نے کہا۔

"یار تم۔۔۔ میرا خیال ہے۔" جیکی سگریٹ جلا کے بولا۔ "کہ تم جینیس ہو۔ نظر آتے ہو۔۔۔ ایم آئی رائٹ؟"

"تھینکس۔" میں نے کہا۔

"تم نے کچھ کھایا پیا۔۔۔ یہاں سب کچھ ہے۔۔۔ بلیک ڈاگ تک۔۔۔"

"تھینک یو۔۔۔ میں چائے کافی سے آگے نہیں سوچتا۔" میں نے کہا۔

"آل رائٹ۔۔۔ ناؤ کم ٹو دی پوائنٹ۔" جیکی بولا۔ "تم نے کیوں بلایا تھا ہمیں؟"

"تم سے ایک کام تھا۔" میں نے کہا۔

"ہم سب کچھ کر سکتے ہیں۔" جونی نے سینے پر ہاتھ مار کے کہا۔

"ایسا نہیں کہنا چاہیے۔ یہ بہت بڑا بول ہے۔" میں نے کہا۔ "آدمی کہہ سکتا ہے کہ وہ اپنی پوری کوشش کرے گا۔"

"او کے۔۔۔ او کے۔۔۔" جونی نے کہا۔ "مسٹر فلاسفر تم بولو کہ کام کیا ہے۔۔۔ تم سے مجھے کچھ عقیدت ہو گئی ہے۔"

"عقیدت۔۔۔ یہ تو بہت بڑا لفظ ہے۔" میں نے کہا۔

"یس عقیدت۔" وہ بولا۔ "ہم نے کیا سوچا تھا۔۔۔ اور پھر تم نے بدلے میں کیا کیا۔۔۔ جو ہم نہیں کر پائے تھے، وہ تم نے یوں کر دیا۔" وہ چٹکی بجا کے بولا۔

"میرا کام چٹکی بجاتے میں نہیں ہوگا۔ یہ مشکل اور لمبا کام ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن ناممکن نہیں ہے۔"

"کیا کسی کو قتل کرنا ہے؟" جیکی رازدارانہ لہجے میں میری طرف جھکا۔

"فرض کرو یہ بھی کرنا پڑے بعد میں۔" میں نے کہا۔ "ویسے تو میں دوستوں کو آزمائش میں نہیں ڈالتا۔ قتل کی نوبت آئی تو میں خود ہی معاملات سنبھال لوں گا۔"

"اب بتاؤ بھی کہ بات کیا ہے؟" جونی نے بے صبری سے کہا۔

"تم نے اس شخص کو پہلے کبھی دیکھا ہے؟" میں نے جمشید کی طرف اشارہ کیا۔

ان دونوں نے ایک ساتھ نفی میں سر ہلایا۔

"یہ میرا جانی دشمن ہے۔" میں نے مختصراً کہا۔

وہ دونوں دم بخود رہ گئے۔

"اور اسی طرح میں اس کا جانی دشمن ہوں۔" میں نے کہا۔ "یہ بہت پرانی دشمنی ہے اور میرے جذبات کا تم اندازہ نہیں کر سکتے۔ اگر میں اس کے ٹکڑے کر سکتا، پھر ان ٹکڑوں کو قیمہ کرنے والی مشین میں ڈال سکتا اور اس قیمے کو کتوں اور چیلوں کے سامنے پھینک سکتا، تب بھی میری تسلی نہیں ہوتی۔"

جیکی نے منہ گول کر کے سیٹی بجائی اور آنکھیں پھیلا کے خوف اور حیرت کا اظہار کیا۔

"پھر تم نے یہ نیک کام کیوں نہیں کیا؟" جونی بولا۔ "ویسے تم چاہتے ہو کہ یہ کام یہاں ہو اور کوئی نہ دیکھے۔۔۔ تو سمجھ لو کہ دنیا اندھی ہو گئی ہے۔ چاروں طرف اونچی دیوار ہے اور رات کا وقت ہے۔ چنانچہ سوائے خدا کے کسی کو علم نہیں ہو سکتا۔"

جیکی نے کہا۔ "یس۔۔۔ یہ جو مالی ہے نا۔۔۔ سمجھ لو کہ یہ اندھا، گونگا اور بہرا ہے۔"

جونی نے دونوں انگلیاں منہ میں زبان کے نیچے ڈال کے ایک تیز سیٹی بجائی۔۔۔ مالی دروازے میں نمودار ہو گیا۔ جونی میری طرف دیکھ کے مسکرایا۔ "اتنی جلدی تو الہ دین کے چراغ کا جن بھی حاضر نہیں ہوتا ہوگا۔" مالی دانت نکالنے لگا۔

"چاچا خواہ مخواہ۔۔۔ یہ ہمارے دوست ہیں۔" جیکی بولا۔

"جی حضور۔۔۔ مجھے معلوم ہے۔" مالی نے کہا۔

"تمھیں اور کیا معلوم ہے؟" جیکی نے کہا۔ "جو کچھ معلوم ہے، وہ سب ان کو بتاؤ۔"

مالی گڑبڑا گیا۔ "آپ۔۔۔ پوچھیں مالک۔۔۔"

"اچھا تو یہ بتاؤ کہ اس باغ میں ہمارے کتنے دشمن اور بدخواہ دفن ہیں؟" جیکی نے کہا۔

"جی۔۔۔ کیا بتاؤں۔۔۔ ہوں گے پچاس۔۔۔"

"ویری گڈ۔۔۔ اچھا یہ صحیح جواب ہے۔" جیکی بولا۔ "تم بتا سکتے ہو کہ کون کہاں دفن ہے؟ اوپر سے تو پتا نہیں چلتا۔"

"مگر میں بتا سکتا ہوں جناب عالی۔"

"اچھا۔۔۔ اور کتنی جگہ ہے؟"

"جگہ بہت ہے حضور۔" مالی نے پریشان ہو کے کہا۔ شاید اس قسم کے سوالات اس سے پہلے نہیں کیے گئے تھے۔

"گولڈن جوبلی کی تیاری کر دو۔" جیکی بولا۔

"کس چیز کی سرکار۔۔۔؟" مالی نے ہاتھ جوڑ کے کہا۔

"ہاف سنچری کی۔" جونی بولا اور ہنس پڑا۔

"میں سمجھا نہیں چھوٹے سرکار۔" مالی بدستور ہاتھ جوڑے کھڑا رہا۔

"چاچا خواہ مخواہ۔۔۔ پچاسویں بندے کی جگہ دیکھ لو۔ اب سمجھ آ گئی ہے تو جاؤ۔" جیکی نے کہا۔

جب مالی چلا گیا تو جونی نے فخر سے میری طرف دیکھا۔ "اس

کی تیسری نسل بھی ہماری غلام ہے۔ اس کا باپ ہمارے دادا کا ملی تھا اس کا بیٹا ہمارا شوفر ہے۔ یہ تین نسلوں کے راز دار ہیں اور وہ سب ایسے ہی راز ہیں۔"

میرا دماغ چکرا گیا۔ یہ کیسے لوگ تھے جو بیسویں صدی کے مہذب قانون کے پابند اور ترقی یافتہ معاشرے میں اپنی بے نام حکومت چلا رہے تھے۔ جہاں قوانین ان کے اپنے تھے اور ان کی رعایا آج بھی ان کے حکم سے سرتابی کی جرأت نہیں رکھتی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ سندھ اور پنجاب ہی نہیں سرحد اور بلوچستان میں بھی جاگیردار... وڈیرے اور پیر... قبائلی سردار اور سابق ریاستوں کے والی اپنے اپنے علاقے میں ایک مطلق العنان حکمراں ہیں جو متضاد صفات رکھتے ہیں۔ وہی بادشاہوں کے مزاج والی جس کے بارے میں شیخ سعدیؒ نے فارسی میں کہا کہ کبھی گالی پر خلعت دے سکتے ہیں تو کبھی سلام پر سزا۔ وہ سخی اور فیاض بھی ہیں مگر جبر و استیصال کے پیکر بھی... ملک کے قانون کی عملداری ان کے علاقوں کی سرحد تک ہے... آگے ان کا اپنا حکم چلتا ہے۔ ساری رعایا اس حکم کو نعوذ باللہ۔ خدا کے حکم سے بڑھ کر سمجھنے پر مجبور رہتی ہے۔ ان کے اپنے قید خانے ہیں اور ان کی دی ہوئی سزا کے خلاف اپیل صرف داورِ محشر کے حضور دائر کی جا سکتی ہے۔

یہاں میرے سامنے دو ایسے لڑکے بیٹھے ہوئے تھے جو تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود اسی مطلق العنان حاکمانہ ذہنیت کے وارث تھے۔ یہ اپنے دشمنوں کو بھی معاف نہیں کرتے تھے اور بدخواہوں کو بھی اُدو ان کو لوحِ جہاں سے حرفِ مکرر کی طرح مٹا دیتے تھے اور کوئی احساسِ جرم و ندامت ان کے ضمیر کو پریشان نہیں کرتا تھا۔ وہ خوش باش اور عیش کوش تھے۔ یاروں کے یار بھی تھے۔ دولت ان کے گھر کی باندی تھی اور دنیا ان کے لیے صرف عیاشی کے لیے بنائی گئی تھی۔ انھیں دنیا کی سیاست، ادب، ثقافت اور تاریخ و تمدن، تہذیب کے ارتقا اور علوم و فنون سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ دنیا میں جو کچھ ان کی زندگی کے عیش و آرام میں اضافے کے لیے بازار میں دستیاب ہوتا تھا ان کی قوتِ خرید میں ہوتا تھا اور یہی غرور اُن کے لیے کافی تھا۔

میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ مجھے تائیدِ ایزدی سے ان کی حمایت حاصل ہو گئی۔ حالات موافق نہ ہوتے تو مجھے ان کی دشمنی ملتی، جو ملاور اینڈ کمپنی کی دشمنی سے اتنی زیادہ تباہ کن اور ہلاکت خیز ہوتی جتنا ایک عام بم کے مقابلے میں ایٹم بم ہوتا ہے۔ خسرو جمشید نے بچاسویں بندے والی بات سمجھ لی تھی اور وہ خاصا ڈرا ہوا لگتا تھا۔

میں نے ان دونوں جوان، پارے کی طرح مضطرب، قوت سے بھرپور اور طاقت پر مغرور نوجوانوں کے جذبات سے کھیلنے کا فیصلہ کیا۔

"یہ بتاؤ جب تم لوگ کسی کو دوست کہتے ہو تو یہ کس لحظ کی بات ہوتی ہے یا تم دوستی نباہتے بھی ہو؟"

"ہم خاندانی لوگ ہیں... ایسی گالی ہم نہیں سنتے کہ کوئی ہم پر بدعہدی کا طعنہ دے، بے غیرت سمجھے یا بزدل کہے۔" جیکی نے کہا۔

"جب دوست کہہ دیا تو پھر جان دینا یا جان لینا برابر ہے۔ جتنی آسانی سے ہم تمھارے دشمن کی جان لے سکتے ہیں اتنی ہی آسانی سے اپنی جان بھی دے سکتے ہیں۔ ہمارے آبا و اجداد نے بارہا یہ ثابت کیا ہے اور وقت آیا تو ہم ان کی روحوں کو شرمندہ نہیں ہونے دیں گے۔" جونی بولا۔

"تو پھر ملاؤ ہاتھ۔" میں نے کہا۔ "میں کسی بہت اونچے خاندان سے تعلق کا دعویٰ تو نہیں رکھتا مگر میں بھی مرد ہوں... ویسا ہی مرد جیسے تم ہو۔ شجرۂ نسب کے سوا میری صفات وہی ہیں جو تمھاری اور وقت آیا تو تم دیکھو گے کہ میں نے صرف تمھاری برابری کے لیے ایسا نہیں کہا تھا۔ اب میں تم کو اس مسئلے کے بارے میں بتاتا ہوں۔"

جیکی نے پھر منہ میں انگلیاں ڈال کے سیٹی بجائی... مالی کے نمودار ہوتے ہی اس نے کہا۔ "ان دونوں سے کہو جو گاڑی میں بیٹھے ہیں کہ اندر کوئی نہ آنے پائے۔"

"جی سرکار۔" مالی جانے لگا۔

"اور سنو۔" جیکی بولا۔ "ابھی تو کافی لاؤ... مگر ایک گھنٹے بعد، ہم اور ہمارے مہمان کھانا کھائیں گے۔"

"ایک گھنٹے بعد؟" مالی پریشان ہونے لگا۔

"چاچا خواہ مخواہ... کھانا منگوا لو... گاڑی میں جا کے لے آؤ۔" جیکی بولا۔

"یہ شخص..." میں نے مالی کے جانے کے بعد سوچ سوچ کر کہنا شروع کیا۔ "خسرو جمشید ہے۔ یہ نام کا نواب ہے مگر اس کا باپ واقعی نواب تھا۔ میرا باپ ایک صنعت کار تھا۔ وہ مر چکا ہے بلکہ جب میں برطانیہ میں تعلیم حاصل کر رہا تھا تو اسے ایک سازش کے تحت مار دیا گیا۔ لیکن یہ قتل ثابت نہیں ہو سکا۔"

"یہی تو مشکل ہے... سب عدالتی قانون کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ارے یار، جب تمھیں یقین تھا تو پھر داد فریاد کی کیا ضرورت تھی۔" جیکی نے کہا۔

"میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں پڑھا لکھا بزدل آدمی ہوں... جو قانون کی بالادستی پر یقین رکھتا ہے۔ اس لیے کہ میرے پاس وہ طاقت نہیں جو تمھیں حاصل ہے۔" میں نے محتاط لہجے میں کہا۔ "وزیر خان کا سب سرمایہ اور جائداد... کوٹھی اور کارخانہ چھن گیا۔ اور کچھ ایسے حالات تھے یا میرے مرحوم والد کی غلطی تھی کہ مجھے معلوم نہ ہو سکا... مجھے واپس آنے کے بعد سب پتا چلا۔"

"پھر تم نے اپنے حق کے لیے عدالت میں درخواست دی؟" جونی نے طنز سے کہا۔

"نہیں... اس کا کوئی فائدہ نہ تھا۔" میں نے کہا۔ "قانونی طور پر مجھے کچھ نہیں مل سکتا تھا۔ میرے والد کے خلاف سازش کرنے والوں نے مجھے بھی سازش میں الجھا لیا اور میرے خلاف متعدد جھوٹے مقدمات بنا دیے گئے۔ مجھے فرار اور روپوش ہونا پڑا۔"

"کون ہیں وہ لوگ...؟ مجھے بتاؤ۔" جیکی نے میز پر مُکا مارا۔

"جوش میں مت آؤ... میں بتا رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "ان لوگوں نے مجھے پیش کش کی کہ میں ان کے ناجائز کاروبار میں شریک ہو جاؤں۔ وہ اسمگلر تھے اور مجھے اپنا ایجنٹ بنانا چاہتے تھے۔ میں نے انکار کر دیا اور صرف اپنا حق مانگا۔ یعنی فیکٹری کی ملکیت مانگی۔ وہ پیسہ مانگا جو میرے والد سے چھین لیا گیا تھا اور کوٹھی، کار وغیرہ جو ان کے پاس تھی... ان کے انکار سے دشمنی کا آغاز ہوا۔ میرے ساتھ بھی دو چار دوست تھے۔ انھوں نے میری مدد کی۔ نتیجہ یہ کہ آج ایک بہت بڑا دشمن ہمارا قیدی ہے اور ہماری شرائط پر جاں بخشی چاہتا ہے۔"

جیکی اور جونی نے نفرت سے جمشید کی طرف دیکھا۔

"اور وہ شرائط کیا ہیں؟"

"جہاں میرا کارخانہ تھا... یعنی میرے والد کا... وہ جگہ اس شخص کے پاس بیس لاکھ میں رہن رکھ دی گئی تھی۔" میں نے کہا۔ "رہن رکھنے والے اسلحے کے اسمگلر تھے اور مشرقی پاکستان کے تخریب کار علیحدگی پسندوں کو اسلحہ بیچتے تھے۔ انھوں نے فیکٹری میں بھی اسلحہ بنانا شروع کر دیا تھا۔"

"کس قسم کی فیکٹری تھی تمھارے والد کی؟"

"زرعی مشینری کے پُرزے اور آلات بنانے کی..." میں نے کہا۔ "اس میں ریوالور اور پستول بننے لگے۔ جب راز افشا ہونے لگا تو اس جگہ کو رہن رکھ کے مشینوں کو منتقل کر دیا گیا اور فیکٹری گرا دی گئی۔ اس کی جگہ ایک اسپتال بنانے کا اعلان کر دیا گیا... غریبوں کے لیے... ظاہر ہے یہ سب رائے عامہ کو گمراہ کرنے اور پبلک کو دھوکا دینے کی کوشش تھی۔ اب سنو کہ کس طرح تم ان لوگوں کے چکر میں پڑنے سے بال بال بچ گئے۔ جو مشینیں اسلحہ بناتی تھیں وہ فیکٹری سے ہٹائی گئیں تو ان کے لیے متبادل جگہ کی تلاش کا مرحلہ آیا اور انھوں نے ایک عورت کو تمھارے والد کے پیچھے لگا دیا۔ اپنے ایک ایجنٹ کے ذریعے... کہ وہ تمھارا صنعتی پلاٹ حاصل کر لیں تاکہ یہ مشینیں وہاں لگائی جائیں۔"

"اوہ مائی گاڈ...!" جیکی نے سر پر ہاتھ مارا۔ "اتنا بڑا دھوکا۔ میں ڈیڈ کو بتاؤں گا۔"

"میں اس کو شوٹ کر دوں گا۔" جونی نے کہا۔

"دیکھو... تم وہی کرو گے جو میں کہوں گا... اس سے زیادہ کرو گے تو نقصان مجھے ہو گا۔" میں نے کہا۔ "وہ معاملہ تو ختم ہو گیا اب اُس کی بات ہی مت کرو... ہاں وہ دوبارہ کوشش کرے تو یہ سب اپنے ڈیڈ کو بتا دینا... ابھی تو میرا مسئلہ کچھ اور ہے۔ اب یہ شخص میرے قبضے میں ہے۔ میں اس کو قتل کرنے کے لیے یہاں لایا تھا مگر اس نے خود ہی اپنی جان کے بدلے ایک سودا کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں سودا کر لوں مگر میں ایک مفرور مجرم ہوں اور مجھ پر بہت سے جھوٹے مقدمات قائم ہیں۔ میں قانونی معاملات طے کرنے کے لیے عدالت میں حاضر ہوا تو عدالت مجھ سے پہلے میرے جرائم کا حساب پوچھے گی۔ جو اسپتال میری فیکٹری کی جگہ بن رہا ہے جمشید وہ اسپتال مجھے دینے پر تیار ہے۔ اس کے وکیل میرے وکیل سے مل کر سارے معاملات طے کریں گے۔ یہ شخص اسپتال کی عمارت اور ساز و سامان کے لیے سرمایہ بھی فراہم کرے گا۔ زیرِ تکمیل عمارت کا قبضہ میرا دوست اور وکیل عبدالودود منتظر لے گا۔ وہ خود تم سے ملنے آئے گا۔ اسپتال کے مکمل ہونے میں تو شاید سال چھ مہینے لگ جائیں۔ اس کی لاگت کا جتنا تخمینہ ہے اتنی رقم خسرو جمشید کے اکاؤنٹ سے عبدالودود منتظر کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر ہو جائے گی تو پھر تکمیل کا کوئی مسئلہ نہیں رہے گا۔ جب تک منتقلی کے قانونی معاملات پوری طرح طے نہیں ہو جاتے تم اس شخص کو اپنی تحویل میں رکھو گے... سب سے چھپا کے... کیا تم یہ کام کر سکتے ہو؟"

جیکی مسکرایا۔ "کتنے سال رکھنا ہے؟"

"زیادہ سے زیادہ دو ماہ۔" میں نے کہا۔ "تم اس کے اور میرے وکیلوں سے ملاقات بھی خود ہی کر لو گے لیکن اس طرح کہ کسی کو بھی معلوم نہ ہو... خصوصاً اس کے وکیل کو بالکل پتا نہ چلے کہ تم کون ہو اور تم نے جمشید کو کہاں قید کر رکھا ہے... تم جمشید سے پوچھ کر اس کے وکیل کو بلواؤ... یا اس کی فون پر بات کرا دو۔ انھیں آنکھوں پر پٹی باندھ کے لاؤ یا کسی بند گاڑی میں۔ اصل بات یہ ہے کہ سارا کام ختم ہونے تک جمشید کی موجودگی صیغۂ راز میں رہے اور جب تک میرا وکیل کلیئرنس نہ دے تب تک اسے چھوڑا نہ جائے۔ اگر بعد میں یہ کسی بھی معاملے میں بدعہدی کرے تو تمھیں ہر طرح کا اختیار ہے۔ جس طرح چاہو یہ کام کراؤ۔

اور بالفرضِ محال کام کسی صورت نہ بنتا ہو یا اندیشہ ہو کہ یہ بھاگ جائے گا یا اس کو چھڑانے والے چھڑا کر لے جائیں گے... تو پھر اس کے ساتھ وہی کرنا جو آج تک تم نے اپنے دشمنوں اور بدخواہوں کے ساتھ کیا ہے۔ مختصر بات یہ کہ تمھیں میرا کام کرانا ہے۔ جمشید تمھاری تحویل میں ہے اور کام کیسے ہوگا، یہ بتانے کے لیے میرا وکیل خود تم سے رابطہ رکھے گا۔ کیا اتنا کافی ہے؟"

"یہ بہت کافی ہے۔" جیکی بولا۔ "آج سے دو مہینے کے اندر وہ اسپتال تمھارا ہوگا۔ اس کی تکمیل کی ضمانت کے ساتھ... ہم یہ ذمے داری قبول کرتے ہیں۔"

"اگر ایسا نہ ہوا تو دو ماہ کے بعد تم کو اس کی لاش مل جائے گی۔ ٹکڑے کرنے کے آلات اور قیمہ کرنے کی مشین کے ساتھ، چیل، کوّے اور کتے بھی ہم فراہم کریں گے۔" جونی نے کہا۔

"تم نے مجھے بہت بڑے بوجھ سے آزاد کر دیا ہے۔" میں نے کہا۔

"تم نے اپنے خلاف مقدمات کے بارے میں نہیں بتایا... ہم صفائی کے گواہ وغیرہ پیش کرنے کا ٹھیکا بھی لے سکتے ہیں۔" جیکی بولا۔

"اس کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔ "تفصیلات میں پھر کبھی بتاؤں گا... وہ غیر ضروری ہیں۔"

"یہ تو ضروری ہے کہ ہمیں تمھارا نام معلوم ہو... اصل نام۔"

"ہاں... دوست مجھے سکندر بخت کے نام سے جانتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"سکندر بخت!" ان دونوں نے ایک ساتھ چلّا کے کہا "اوہ نو..."

"اوہ یس۔" میں نے مسکرا کے کہا۔ "میں اب شیطان کی طرح مشہور ہوں۔"

"اوہ مائی گڈنس... تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ تمھیں تو ہم ایسے جانتے ہیں جیسے... جیسے رابن ہڈ کو۔" جیکی بولا۔ اسے اردو کی کسی داستان کا کردار فوراً یاد نہ آیا۔

"تمھارے بارے میں ہم بہت کچھ پڑھتے رہے ہیں... تم تو ہیرو ہو، ایک دم ہیرو۔" جونی بولا۔ "مائی گاڈ! لو آر لائک سپرمین۔"

"میں سپرمین ہوتا تو یہ دنیاوی مشکلات کیا تھیں۔" میں نے ہنس کے کہا۔ "مشکل تو یہی ہے کہ میں ایک عام آدمی ہوں۔ بہت معمولی سا حقیر اور کمزور... جسے کامل اعتقاد ہے تو خدا کی ذات پر اور اس کے قادرِ مطلق ہونے پر... چنانچہ میں جو کچھ کرتا ہوں، انجام کی پروا کیے بغیر کرتا ہوں... انجام تو صرف وہ جانتا ہے... پھر میں کیوں ڈروں... جو ہونا ہے وہ تو ہوگا۔"

"مگر... تم نے تو دھاک بٹھا رکھی ہے... میں نے سنا ہے کہ تم نے دشمنوں کے بہت سے قلعے فتح کیے ہیں جہاں ان کی فوج تھی... تم نے سب کو تہس نہس کر دیا۔ ان کے ٹینک اور توپیں تمھارا کچھ نہ بگاڑ سکیں اور تم نے سب کا خانہ خراب کر دیا۔"

مجھے بے اختیار ہنسی آئی۔ میں نے سنا تھا کہ زیب داستان کے لیے لوگ بڑھا بھی دیتے ہیں مگر آج تجربہ ہوا کہ داستان جب ہوتی ہے تو ایک زبان سے دوسری زبان تک پہنچتے پہنچتے حقیقت کا عنصر کتنی تیزی سے کم ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ حقیقت غائب ہو جاتی ہے اور صرف افسانہ رہ جاتا ہے۔ یہ ہم سب کی کمزوری ہے کہ ہم حقیقت سے داستان کو زیادہ دلچسپ اور دلکش بناتے ہیں۔ ہمیں سپرمین اور ٹارزن جیسے افسانوی کردار اپیل کرتے ہیں اور ہم ہیرو ورشپ، کے عادی ہیں۔ ہر شخص کے ذہن میں اس کے تصوراتی ہیرو کا ایک خاکہ ہوتا ہے کبھی ایکٹر... کبھی کرکٹر اور کبھی آرٹسٹ یا سیاسی لیڈر... ہر صورت میں وہ غیر معمولی صفات اور اعلیٰ ترین اوصاف کا حامل ہوتا ہے۔

"تم کیسی باتیں کرتے ہو۔" میں نے کہا۔ "ارے بھائی میں کچھ بھی نہیں... تم جیسا آدمی ہوں۔ میں نے ایسا کوئی کارنامہ سرانجام نہیں دیا اور نہ یہ ممکن ہے کہ ایک آدمی ایک فوج کو شکست دے سکے۔ یہ تو ایسی فلموں میں ہوتا ہے جس پر اب بچے بھی ہنستے ہیں۔"

"وہ دراصل... سنا بہت کچھ ہے تمھارے بارے میں اور اخباروں میں تمھارا نام بھی دیکھا ہے۔" جیکی جھینپ کر بولا۔

"آخر کوئی تو وجہ ہوگی؟" جونی نے تائید کی۔

"یہ ٹھیک ہے کہ مجھے چند ملک دشمن عناصر کا پتا چلا ہے۔ اور میں نے ان کے ایک دو ٹھکانے بھی تباہ کیے ہیں لیکن میں اکیلا نہیں تھا۔ میرے ساتھ میرے دوست بھی تھے... میرے کچھ ساتھی تھے۔"

"اوہ یس... وہ ایک نام یاد آیا ہے مجھے محسن..."

"بالکل ٹھیک۔" جیکی نے چٹکی بجا کے کہا۔ "اور ایک لڑکی ہے... بالکل صوفیہ لارین... ویری بیوٹی فل۔ جو تمھاری سویٹ ہارٹ ہے... کیا نام ہے اس کا...؟"

"رابعہ... رابعہ..." جونی نے فوراً کہا۔ "واٹ اے ونڈرفل گرل...!"

"مگر... وہ لڑکی... جو اس دن تمھارے ساتھ تھی۔" جیکی نے سوچ کر کہا۔ "وہ کون تھی... وہ رابعہ تو نہیں تھی... یہ رابعہ کیا پرانا اور آرتھوڈوکس نام ہے۔ وائی ڈونٹ یو کال ہر روبی؟"

"گلاب کو کسی بھی نام سے پکارو، وہ گلاب ہی رہتا ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں... وہ کچھ ایسا ہی شیکسپیئر نے کہا تھا کہ نام میں کیا رکھا ہے۔ ہماری ایک ٹیچر تھی جیفٹ کالج میں... شی واز کریزی اباؤٹ شیکسپیئر۔" جیکی بولا۔ "ویسے تمھاری جگہ میں ہوتا تو اسے روبی کہتا۔"

"میں رابعہ پسند کرتا ہوں... کیونکہ میں رابعہ کو پسند کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"یہ تم نے کیا بھیس بدل رکھا ہے؟" جیکی بولا۔ "تمھاری اصل صورت تو کچھ رچرڈ برٹن سے ملتی جلتی ہے۔"

"اوہ نو... جان وائن سے..." جونی نے کہا اور ان کے درمیان زبردست تکرار شروع ہوئی۔

"پلیز... پلیز..." میں نے کہا۔ "نہ میری صورت رچرڈ برٹن سے ملتی ہے نہ جان وائن سے... میری صورت صرف اپنے آپ سے ملتی ہے۔"

جیکی نے سر ہلایا۔ "تم واقعی فلاسفر بھی ہو... مجھے تو بالکل یقین نہیں آتا کہ یہ تم ہو... میں سچ بتاؤں... میں تم جیسا بننا چاہتا ہوں... لیکن بن نہیں سکتا۔" اس نے ایک سرد آہ بھری۔

"کیوں نہیں بن سکتے؟" میں نے کہا۔

"اس لیے کہ میں جان محمد عرف جیکی ہوں۔" وہ بولا۔

"جیکی... مجھے کچھ یاد آ رہا ہے۔" جونی نے کہا۔ "تقریباً ایک مہینہ پہلے ڈیڈ کی اس سے بحث ہوئی تھی۔ ڈیڈ نے اخبار میں تمھاری کسی پریس کانفرنس کا حال پڑھا تھا۔ تم نے دو ڈاکو پکڑے تھے۔ اور شاید کوئی قلعہ بھی فتح کیا تھا۔"

"قلعہ نہیں... ایک اسلحہ خانہ تباہ کیا تھا۔" میں نے کہا۔

"ڈیڈ نے تمھاری بہت تعریف کی اور کہا کہ ملک اور قوم کو ایسے ہی جوانوں کی ضرورت ہے۔" جونی بولا۔ "اور معلوم نہیں کیوں وہ چڑ گیا۔ ہمارے ڈیڈ کی وائف نمبر ٹو کا برادر انچیف۔ اس نے کہا کہ یہ سب اخبار والوں کا ڈراما ہے، ورنہ وہ ایک قاتل اور ڈاکو ہے جیل سے بھاگا ہوا مجرم ہے اور پھر ان کے درمیان خوب بحث ہوئی تھی۔ اب میں سمجھ رہا ہوں کہ ایسا کیوں ہوا تھا۔"

"میں بھی سمجھ رہا ہوں۔" جیکی نے سر ہلایا۔ "وہ تمھارا ایک دشمن تھا اور یہی وجہ تھی کہ تم دونوں جب ہمارے گھر میں ملے تو تم نے ایک دوسرے کی جان لینے کی کوشش کی۔"

"تم ٹھیک سمجھے ہو... اور سب جانتے ہو اس لیے تمھیں کچھ سمجھانے کی ضرورت نہیں رہی۔" میں نے کہا۔ "میں تم پر پورا بھروسا کرتے ہوئے ایک کام تمھیں سونپ رہا ہوں۔"

"اس کے علاوہ کچھ بتاؤ... تمھیں کسی چیز کی ضرورت ہے؟" جیکی بولا۔

"کسی بھی وقت... دن رات کی پروا کیے بغیر..." جونی نے کہا۔ "تم ہمیں بلا سکتے ہو... ہمارے پاس آ سکتے ہو... ہمیں فون کر سکتے ہو... یہ جگہ تو دیکھ ہی لی ہے تم نے... تم کو یہاں کوئی نہیں دیکھ سکتا... تم یہاں رہ سکتے ہو کیونکہ ڈیڈ بھی ادھر نہیں آتے۔"

"اور آ بھی جائیں تو کیا... ہی از یور فین ٹو۔"

میں ہنسنے لگا۔ "مجھے ان کی دعائیں چاہئیں... مگر دوستو! ابھی تم اس بات کو سیکرٹ رکھو گے... یوں سمجھ لو کہ ہم ملے ہی نہیں... یہ ایک طرح سے میری بہت بڑی مدد ہوگی کہ تمھاری مورل سپورٹ حاصل ہے مجھے... یہ جگہ... تمھارا فون نمبر سب میرے ہمارے ہیں... اگر مجھے ضرورت پڑے گی تو میں ضرور آؤں گا یا کال کروں گا... لیکن فی الحال اپنے جذبات کو قابو میں رکھو اور کسی سے کچھ مت کہو... اگر یہ کام کر دیا تم نے... جو میں نے تمھیں سونپا ہے... تو یہ ایک احسان ہوگا مجھ پر..."

مالی نے دروازے کو انگلی سے بجایا۔ "کھانا حاضر ہے مالک۔"

"لے آؤ۔" جیکی نے کہا۔ مالی ایک ٹرالی دھکیلتا ہوا لایا۔ اس میں اوپر نیچے درمیان کی تینوں ٹرے کھانوں سے بھری ہوئی تھیں۔ ایسے کھانوں کی مدت سے میں نے خوشبو تک نہیں سونگھی تھی۔

"یہ سب... اتنے کم وقت میں کہاں سے اکٹھا ہو گیا...؟" میں نے کہا۔

"میرے نوکر جانتے ہیں کہ کہاں سے کون سی چیز لانی ہے۔" جیکی نے فخر سے بتایا اور پھر تفصیل سے بتانے لگا کہ مرغ بریانی کس ہوٹل کی ہے اور مرغ قورمہ کس ہوٹل کا ہے... اب چونکہ صورت حال یکسر تبدیل ہو گئی تھی، اس لیے میں نے خسرو جمشید کو بھی کھانے کی اجازت دی مگر اُسے الگ بٹھایا۔ میرے لیے اس شخص کے ساتھ ایک ہی میز پر بیٹھ کے کھانے کا خیال ہی اذیت ناک تھا جسے میں اپنا بدترین دشمن سمجھتا تھا۔

"واٹ اباؤٹ دیٹ گرل؟" جیکی کھاتے کھاتے بولا۔

"وہ سو رہی ہے... بہت تھکی ہوئی تھی۔" میں نے کہا۔

"لیکن وہ ہے کون؟"

"ابھی میں خود نہیں جانتا... کہ وہ دوست ہے یا دشمن۔" میں نے کہا۔

"پھر اُسے ساتھ کیوں لیے پھر رہے ہو؟" جیکی بولا۔

"تمھیں کیوں اعتراض ہے اگر وہ ایک گرل فرینڈ ساتھ رکھتا ہے۔" جونی بولا۔

میں مسکرایا۔ "ہے تو وہ گرل فرینڈ... لیکن صرف زبانی جمع خرچ تک... ہم ایک دوسرے کو بچپن سے جانتے ہیں۔"

"کمال ہے... پھر بھی کہتے ہو کہ..."

"ہاں... دراصل وہ سرحد پار سے آئی ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ کہتی ہے صرف میرے لیے... مجھے شک ہے کہ جاسوسی کے لیے... وہ ہندو بھی ہے۔"

"پھر تو تمہارا شک جائز ہے۔" جیکی بولا۔

"شک بالکل غلط ہے۔" جونی نے کہا۔ "یہ بچپن کی محبت ہے اور ناخالص ہو ہی نہیں سکتی۔"

"تم کیا جانو... تمھیں کس سے محبت تھی بچپن میں یا ایسی کون سی لڑکی ہے..."

"میں نے ناولوں میں پڑھا ہے... فلموں میں دیکھا ہے۔" جونی بولا۔

"وہ سب بکواس ہے... میں جانتا ہوں۔"

"تم کچھ نہیں جانتے۔"

"میں تم سے بڑا ہوں... دس منٹ۔" جیکی نے میز پر مکا مارا۔

"تم دونوں بالغ ہو کے بھی بچے ہو۔" میں نے ان کی جنگ پھر ختم کی۔ "میں اس عورت کو بھی فی الحال چھوڑ کے جا رہا ہوں۔"

جیکی کا ہاتھ رک گیا۔ "ہمارے پاس؟"

"ہاں... کیا تم سے [illegible] رکھ سکتے؟" میں نے کہا۔

"لیکن کیا وہ رہے گی؟"

"اسے رہنا پڑے گا... قید میں رکھنا ضروری نہیں... بس اس سے کہہ دینا کہ میں واپس آؤں گا اور وہ میرا انتظار کرے۔"

"لیکن... شی از ویری بیوٹی فل..." جیکی نے بے بسی سے کہا۔

"اور ہم... اگر امانت میں خیانت ہو گئی تو... دوستی کا نام بدنام ہو جائے گا۔" جونی بولا۔

"نہیں ہو گا..." میں نے اسے آنکھ ماری۔ "وہ تمہاری اچھی گرل فرینڈ ثابت ہو گی۔ اس کے عیش و آرام کا خیال رکھنا اور اسے کمپنی دینا... ڈے اینڈ نائٹ... پھر وہ کہیں نہیں جائے گی... اور جانا چاہے تو جانے مت دینا... کچھ ایسا بندوبست کرنا کہ اُسے احساس نہ ہو کہ وہ قید میں ہے لیکن وہ بھاگنے نہ پائے۔ میں بہت جلد واپس آؤں گا... شاید ایک ہفتے بعد تو اسے لے جاؤں گا۔" میں ایک دم اُٹھ کھڑا ہوا۔ "اب میں جا رہا ہوں۔"

وہ پھر دم بخود رہ گئے۔ "یہ کیا ہوا بیٹھے بیٹھے؟"

"میں جلدی میں ہوں۔" میں نے کہا۔ "قسمت کو تم سے ملانا تھا اس لیے یہاں آ گیا تھا... میری منزل کچھ اور ہے۔"

"تمھیں... پیسہ وغیرہ تو نہیں چاہیے؟"

"تمھیں پیسے کی ضرورت ہے تو مجھے بتاؤ۔ میں اپنی قسمت آزمانے جا رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "ڈیڑھ لاکھ ہیں میرے پاس۔"

"اب تم کہاں جاؤ گے؟"

"میں یہاں نہیں بتا سکتا۔" میں نے کہا۔ "باہر آؤ... اور اپنے دونوں محافظوں کو بلاؤ کہ وہ یہاں نظر رکھیں... تم دونوں کو میرے ساتھ چلنا ہو گا... شہر تک..."

جیکی اور جونی بھی کھانے سے فارغ ہو چکے تھے۔ جیکی نے منہ میں انگلی ڈال کے سیٹی بجائی اور جب مالی نمودار ہوا تو اسے حکم دیا کہ دونوں میں سے ایک محافظ کو بُلا لے۔

"تم لوگ سب سمجھ گئے ہو نا؟" میں نے باہر آ کے کہا۔ "میں کراچی جا رہا ہوں... وہاں سے میں تم کو فون کرتا رہوں گا... یہ معلوم کرنے کے لیے کہ پروگریس کیا ہے... اور سب ٹھیک ہو رہا ہے یا نہیں۔"

"اپنے اس مشکل نام والے وکیل کو بھی سمجھا دینا۔" جیکی بولا۔

"تم اسے صرف منظر کہہ سکتے ہو۔" میں نے کہا۔ "وہ تم کو فون کرے گا۔"

"یہ گاڑی تمہاری ہے؟" جیکی بولا۔

"نہیں... تم اسے لے جاؤ... اور کسی بھی سڑک پر یا پولیس اسٹیشن کے سامنے چھوڑ دو... یہ میں نے چوری کی تھی۔" میں نے کہا۔ "پولیس خود اسے منظر گڑھ پہنچا دے گی..........."

"ایک بات اور... تم کو اپنی دوسری ماں کی طرف سے ہوشیار رہنا ہو گا۔" میں نے کہا۔ "کیونکہ وہ خسرو جمشید کی بہن ہے۔"

وہ اُچھل پڑے۔ "بہن... یہ کیا ہے... ہر پانچ منٹ کے بعد تم ایک ایٹم بم گرا دیتے ہو۔"

"وہ خسرو جمشید کی حقیقی بہن ہے۔" میں نے کہا۔ "جب تم جمشید کو قید میں رکھو گے تو وہ ایک پرابلم ہو گی... میرا مطلب ہے اسی گھر میں اگر بہن بھی ہو گی تو تمہارا کام زیادہ مشکل ہو جائے گا۔"

"مشکل تو ہو جائے گا... لیکن ہم ہینڈل کر لیں گے۔" جیکی نے فیصلہ کُن لہجے میں کہا۔ "تم مطمئن رہو۔"

"جونی... تم میرے ساتھ چلو۔" میں نے کہا۔ "مجھے ملتان سے ایک کار خریدنی ہے... کار یا جیپ۔ پچاس ساٹھ ہزار تک جو کراچی تک سفر کے قابل ہو۔ اس کی رجسٹری وغیرہ سب بوگس نام سے ہونی چاہیے... تاکہ میں محفوظ رہوں۔"

"نو پرابلم..." جونی نے چٹکی بجا کے کہا۔ "تم کار لو اور جاؤ۔ باقی کام مجھ پر چھوڑ دو... ایک گھنٹے میں پیپرز مل جائیں گے۔"

جونی نے واقعی ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔ میں نے دیکھا کہ ہر جگہ اسے لوگ جانتے تھے۔ یہ اثر و رسوخ کی بات تھی۔ پیسے کی یا ذاتی تعلق کی۔ مگر ملتان میں اس کے بہت دوست تھے۔ نیچے سے اوپر تک وہ ہر کام کرا سکتا تھا۔ وہ شام تک میرے ساتھ رہا اور اس نے میرے بہت سے ایسے کام کیے جو میں اکیلا نہیں کر سکتا تھا۔

اس بار مجھے ایک اوپل سیلکارڈ ملی جو چھیاسٹھ کا ماڈل تھی اور اس کا اُنیس سو سی سی کا انجن بے حد طاقتور اور سبک خرام تھا۔ یہ لگژری کار تھی اور بے شک مجھے کچھ مہنگی بھی پڑی لیکن جونی نے مجھے مجبور کر دیا اور کچھ میں خود بھی اس پر عاشق ہو گیا۔ اس کی ہیڈ لائٹس چوکور تھیں اور پیچھے کی لائٹس بالکل گول۔ آدھے دائرے میں بریک وِنٹ اور انڈی کیٹر... دوسرے کے آدھے دائرے میں بیک لائٹ اور پارکنگ لائٹ۔ اس کی ڈکی بھی بڑی تھی اور پیچھے والی سیٹ بھی۔ جونی نے رجسٹریشن کے کاغذات میں میرا نام آغا سعادت علی خان گردیزی لکھوایا اور اس پر اپنا پتا دیا۔ اس نے کہا کہ ایسی ویسی کوئی بات ہو گی تو ہم یہاں نمٹ لیں گے۔ اس نام سے تم ہمارے فیملی ممبر ثابت ہوتے ہو۔

جونی کی مدد سے ہی مجھے ڈرائیونگ لائسنس بھی ملا جس پر میرا یہی نام تھا لیکن تصویر قدرے مختلف تھی۔ میں جونی کے سوٹ میں تھا۔ اس نے مجھے اپنے دو سوٹ دے دیے تھے اور کچھ کپڑے میں نے بازار سے بھی خرید لیے تھے۔ بہترین سوٹ ٹائی سنہرے فریم کے چشمے اور گنجے سر کے ساتھ میں ایک مل اونر بزنس ایگزیکٹو یا سیکرٹری کے لیول کا بگ باس نظر آتا تھا۔ مجھے روکنے یا چیک کرنے کی ہمت کرنے سے پہلے ڈی ایس پی کے عہدے کا پولیس افسر بھی دوبار سوچتا۔

شام کو میں نے جونی کو خدا حافظ کہا۔ اس وقفے میں جب وہ میرے ساتھ تھا میں نے اُسے بہت کچھ سمجھا دیا تھا جو پہلے نہ سمجھا سکا تھا۔ اب ان دونوں پر میرا اعتماد قائم ہو چکا تھا اور میں مطمئن تھا کہ ایک طرف سے ذمے داری اور پریشانی کا بوجھ بھی کم ہوا اور ایک مسئلہ بھی حل ہو گیا۔

رات کے نو بجے میں نے کار کو عین اس مقام پر روک لیا جہاں میں نے ایک جھاڑی میں دو سوٹ کیس پھینکے تھے۔ اس تنگ سڑک پر اب نہ اسٹیشن ویگن تھی اور نہ خسرو جمشید کی مرسیڈیز مگر دونوں سوٹ کیس وہیں پڑے ہوئے تھے۔

میں نے دونوں سوٹ کیس ڈکی میں ڈالے اور کچھ دیر اس منظر کے تصور میں گم رہا جس کے ٹکڑے اسی سڑک پر یہاں سے وہاں تک بکھرے ہوئے تھے۔ ٹریننگ کیمپ سے جہاں تخریب کار خود اپنے پھیلائے ہوئے دام اجل کا شکار ہو گئے تھے، اس مقام تک جہاں میں نے اور موہنی نے چھپ کر ایک رات بسر کی تھی اور آخری خونی جھڑپ تک جس میں خسرو جمشید کا ہم صورت مارا گیا تھا۔ اب یہاں کوئی نہیں تھا۔

میں نے گاڑی کا رُخ موڑا اور واپس اسی راستے پر روانہ ہو گیا۔ آگے ایک طویل رات کا سفر تھا جس میں میرے ساتھ صرف میری یادیں تھیں اور سوچیں تھیں اور میرے اندیشے تھے۔ کیا جیکی اور جونی وہ سب کچھ کر لیں گے جو میں نے ان کو سمجھایا ہے۔ خسرو جمشید یا اس کی بہن ان کے ارادوں کی شکست کا سبب تو نہیں بن جائیں گے۔ موہنی کا ردِعمل کیا ہو گا؟ میں اُسے کچھ بتائے بغیر بھاگ آیا تھا۔ دراصل میں اس کو ساتھ رکھنے کے اعصابی دباؤ اور ذہنی انتشار سے بچنا چاہتا تھا۔ رابعہ کی تلاش میں میرے ساتھ رابعہ کے خیال کی رفاقت اور اس کی چاہت اور اس کے جمالِ دل نشیں کا تصور بہت تھا۔

مجھے بہت سے کام بھی کرنے تھے۔ ان میں سرفہرست عبدالودود منظر کو فون کرنا تھا اور اسے تمام صورتِ احوال سے آگاہ کرنا تھا۔ اُسے یہ بتانا تھا کہ اگر محسن یا غالب میں سے کوئی اس سے رابطہ قائم کرے تو انھیں میری خیریت سے مطلع کر دے۔ مجھے شہلا کی خیریت بھی دریافت کرنی تھی اور اس سے پوچھنا تھا کہ رابعہ، نازو یا اکرام شیخ میں سے تو کسی کا کوئی پیغام نہیں ملا۔

صبح میں حیدرآباد میں تھا۔ رات بھر کی ڈرائیونگ نے مجھے جسمانی طور پر بہت تھکا دیا تھا۔ اس سے گزشتہ رات بھی میں نہیں سویا تھا اور اگر رابعہ کی کشش نہ ہوتی تو میں دوسری رات جاگ کر ڈرائیونگ کا خطرہ مول نہ لیتا۔ لیکن جیسے جیسے فاصلہ کم ہو رہا تھا میرے ذہن سے سب کچھ فراموش ہو رہا تھا اور رابعہ جو کہیں دشتِ خیال کی وسعتوں میں گم تھی اپنے قرب کی خوشبو سے میرے قلب و نظر کو مہکانے لگی تھی۔ یادِ ماضی کا ہر نقش جاگ اٹھا تھا اور ایک خواب بن گیا تھا۔ اس خواب کی تعبیر میری دسترس میں ہونے لگی تھی۔ قریب آتی جا رہی تھی۔ خواہش میں رنگِ جنوں شامل ہونے لگا تھا۔

حیدرآباد میں مجھے سفر ملتوی کرنا پڑا۔ میں نے محسوس کیا کہ میری جسمانی توانائی کا گراف زیرو پر آ گیا ہے۔ کئی بار میری آنکھیں خود بخود بند ہوئیں اور پھر میری چھٹی حس نے مجھے جھنجوڑ دیا۔ میں نے خود کو مستعد رکھنے کی کوشش میں ناکام پایا۔ میرا جسم میرے ذہن کے [illegible] نہیں رہا تھا اور ایسی حالت میں کار چلانا حادثے کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔

میں نے ایک ہوٹل میں دن بھر قیام کا فیصلہ کیا۔ رات اس اعتبار سے محفوظ رہی تھی کہ مجھے کسی نے روکا نہیں تھا۔ جہاں کہیں بھی چیک پوسٹ آئی تھی میں نے اپنی رفتار اس حد تک کم کر لی تھی کہ دیکھنے والے مجھے ایک معزز شخصیت کے روپ میں دیکھ لیں۔ انھوں نے مجھ سے تعرض نہیں کیا تھا۔ میں انھیں کسی بھی پہلو سے مشکوک نظر نہیں آیا تھا۔ اُلٹا وہ مجھے روکنے سے بھی اس لیے گریز کرتے رہے کہ عموماً ایسی فرض شناسی کا صلہ خرابی کے سوا کچھ نہیں ملتا۔

ایک بیل بوائے میرے دونوں سوٹ کیس اُٹھا کے [illegible]

وی آئی پی سوئٹ میں لے گیا جو اتفاق سے صبح ہی خالی ہوا تھا۔

میں نے غسل کے بعد ناشتا روم سروس سے طلب کیا اور ناشتے کے بعد سو کر اٹھا تو لنچ کا وقت گزر چکا تھا۔ شام کے پانچ بج رہے تھے چنانچہ میں نے پھر کافی اور سینڈوچ طلب کیے۔

مجھے رات کو پھر سفر کرنا تھا اور میرا ارادہ تھا کہ آٹھ بجے روانہ ہو جاؤں تو دس بجے تک کراچی پہنچ جاؤں گا۔ جسم مزید آرام کا متقاضی تھا تو دل تاخیر کا روادار نہ تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ میں رات بھر سو کے صبح چھ بجے روانہ ہو جاؤں اور صبح کے آٹھ بجے کراچی پہنچ جاؤں۔ یوں میں بالکل تازہ دم پہنچوں گا تو مجھے پورا دن ملے گا۔ رابعہ، نازو یا اکرام شیخ کا پتا چلانا آسان نہ ہوگا۔ اس کا تو مجھے اندازہ تھا ہزاروں جھگیوں میں رہنے والے لاکھوں افراد میں سے کسی لاوارث اور گمنام شخص کو تلاش کیا جا سکتا تھا مگر جو روپوش ہوا اس کا پتا کون بتائے گا۔

دروازے پر دستک سُن کے میں نے کہا "یس"۔ اور روم سروس کا ویٹر کافی کے ساتھ کلب سینڈوچ کی پلیٹ رکھ گیا۔ اسی ٹرے میں اخبار بھی تھا۔ اوپر کے صفحے کو میں نے سینڈوچ اٹھاتے ہوئے اور کافی پیتے ہوئے سرسری نظروں سے دیکھا۔ اس پر بین الاقوامی اور اہم ملکی خبریں تھیں۔ مشرقی پاکستان کی خانہ جنگی کے ابتر ہوتے ہوئے حالات کی تفصیل پڑھنے سے میں نے عمداً گریز کیا۔

یہ کراچی سے آنے والا اخبار تھا۔ اندر کا پہلا صفحہ شہر کی مقامی خبروں کے لیے وقف تھا۔ دلچسپ خبریں باکس میں لگائی گئی تھیں۔ ایسی ہی ایک خبر نے مجھے متوجہ کر لیا۔ یہ چند سطروں کی خبر تھی مگر میں نے اُسے پڑھا تو میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ کافی کا مگ میرے ہاتھ میں تھا۔ جب گرم کافی میرے کپڑوں پر گری تو میں چونکا۔ اس خبر نے میرے ہوش گم کر دیے تھے اور میں نے محسوس کیا کہ میرے دل کی دھڑکن میں طوفانی شدّت آ گئی ہے۔ پسینے کی نمی جو میرے ماتھے پر نمودار ہوئی تھی اب میرے جسم پر ٹھنڈک بن کے پھیل رہی تھی۔ خوف بن کے میری ریڑھ کی ہڈی میں اتر رہی تھی۔

خبر میں بتایا گیا تھا کہ ایک نوجوان اور خوب صورت لڑکی جس کو بندرگاہ کے علاقے سے مردانہ لباس میں گھومتے ہوئے گرفتار کیا گیا تھا، بار بر پولیس کی تحویل سے فرار ہو گئی۔ ہمارے نمائندے کی اطلاع کے مطابق اس نے اپنی حفاظت پر مامور دو پولیس والوں کو زخمی کر دیا۔ ڈیوٹی پر موجود ایک اے ایس آئی کو اسی کے ریوالور کی ضرب سے بے ہوش کر دیا اور شکایت درج کرانے کے لیے آنے والے ایک تاجر سے اس کی گاڑی چھین لی جسے اس نے فرار کے لیے استعمال کیا۔ دونوں پولیس والوں کو بازو اور ٹانگوں کے فریکچر کے باعث ہسپتال میں داخل کر لیا گیا ہے۔ ڈی ایس پی بار بر نے غفلت برتنے کے الزام میں تھانے کے متعلقہ عملے کو معطل کر دیا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ لڑکی کسی خطرناک تخریب کار گروہ کی رکن ہو سکتی ہے۔ پولیس اسے سرگرمی سے تلاش کر رہی ہے۔ مزید سنسنی خیز انکشافات کی توقع ہے۔

خبر پڑھ کر مجھ پر چودہ طبق روشن ہو گئے۔ یہ ایک ایسی خبر تھی جسے محدود حلقے میں مقامی خبروں کے درمیان جگہ ملی تھی۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ اس خبر کو لاہور یا راولپنڈی کے اخبارات نے بھی شائع کیا ہو۔ وہاں کی مقامی خبروں کے لیے دوسرے سنسنی خیز واقعات ہوں گے۔ چنانچہ محسن یا غالب اور میرے دوسرے ساتھیوں کو اس خبر کی تفصیلات معلوم ہونے کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا لیکن یہ ہو سکتا تھا کہ کراچی کے دوسرے اخبارات دیکھنے سے مجھے اضافی معلومات حاصل ہو جائیں۔ ہر اخبار کا نمائندہ اپنے وسائل رکھتا ہے اور کسی خبر کی تہ تک پہنچنے کے لیے کتنی محنت کرتا ہے اس کا انحصار اس کی ذاتی دلچسپی اور لگن پر ہوتا ہے۔

مجھے ذرا بھی شبہ نہ تھا کہ وہ آفت کی پرکالہ جس نے اس سنسنی خیز خبر کو جنم دیا، نازو کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتی تھی۔ خبر میں اس کا نام تو نہیں تھا مگر ہر سطر پکار پکار کے کہتی تھی کہ کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں تو وہ نازو ہے۔ اس نے ہمارے اونگھتے سونگھتے غیر حاضر دماغ اور سلو موشن میں حرکت کرتے والے پولیس والوں کو بتا دیا کہ بجلی کیسے کوندتی ہے اور جس پر گرتی ہے، اُسے کتنا بے دست و پا چھوڑ جاتی ہے۔

اس منظر کے تصوّر سے ہی مجھے ہنسی آئی جب پولیس کے لٹھ مار اکڑ خاں قسم کے جوانوں پر انکشاف ہوا ہوگا کہ 'سوہنا منڈا' تو درحقیقت البھڑ مٹیار ہے۔ اور اس ناقابلِ اعتبار تبدیلیٔ جنس کے کیس پر ان کی عقل دنگ ہو گی تو نازو کے حسنِ قیامت خیز نے ان کے دل پر چھری پھیر دی ہو گی۔ نتیجہ یہ کہ وہ اپنی قسمت پر الگ رشک کر رہے ہوں گے جس نے ان کے ہاتھوں میں ایسا دل کو خوش کرنے والا کیس دیا اور سب بار بار [illegible] کے لیے بے قرار ہوں گے۔ پھر اچانک انھوں نے وہ دیکھا ہوگا جو ان کے تصوّر میں بھی نہ ہوگا اور جب ہوش آیا ہوگا تو نظر آئے بھی وہ گئے بھی وہ ختم فساد ہو گیا۔ کی داستانِ عبرت بنے پڑے ہوں گے۔ نازو ایک جادوگر تھی جو تماشا دکھاتے وقت ناظرین کی توجہ ایک طرف مرتکز کرتا ہے تو دوسری طرف ہاتھ کی وہ صفائی دکھاتا ہے جو بالکل ناممکن اور جادو کا کرشمہ لگتی ہے۔ نازو بھی بے حد عیاری اور بھولپن سے سب کو اپنے حسنِ بے مثال، اپنی نزاکت و رعنائی اور قاتل اداؤں کے جال میں بے بس کرنے کی اہل تھی اور جب وہ دیکھتی تھی

سب بیٹا طاہر ہو گئے ہیں تو وہ یوں حرکت میں آتی تھی کہ اس کی تیزی کو نہ آنکھ دیکھ پاتی تھی اور نہ عقل سمجھ پاتی تھی۔ سب نے اُسے ایک دھان پان کمزور سی لڑکی، صنفِ نازک یا ناقص العقل عورت جان کے اس کی طرف سے غافل ہونے کی غلطی کی ہوگی اور یہ سوچ کر مطمئن ہو گئے ہوں گے کہ اتنے شیر دل سو مام مردوں کے درمیان سے ایک لڑکی نکل کے کہاں جا سکتی ہے۔ پھر اُسے عورت ذات ہونے کا فائدہ بھی ملا ہوگا اس کے ساتھ تھانے میں وہ سلوک نہیں کیا گیا ہوگا جو ہر نئے مہمان کے ساتھ روایتی طور پر استقبال کے لیے کیا جاتا ہے اور یہ احساس دلانے کے لیے کیا جاتا ہے کہ جناب اس مطلق العنان حکومت کی حدود میں قدم رکھ چکے ہیں جہاں دنیا کے قانون یا خوفِ خدا وغیرہ کا کوئی کام نہیں۔ ہاں کام ہے تو جرم کا یا کسی کے نام کا 'رشوت یا سفارش کا' جیسا کام ویسے دام سفارش کے لیے اتنا ہی بڑا نام ہو تو آرام ہی آرام ورنہ جینا حرام اور مرنا ایک الزام۔

نازو کے متعلق بہت کچھ اخبار کی اس مختصر خبر میں نہیں تھا۔ نازو کو یہ کراسے بندرگاہ کے علاقے سے کیوں گرفتار کیا گیا تھا۔ بندرگاہ کا حوالہ بھی اسے نازو ثابت کرتا تھا کیونکہ میری آخری اطلاعات کے مطابق نازو اور اکرام شیخ دونوں وہیں سرگرمِ عمل پائے گئے تھے۔ خبر میں اکرام شیخ کا تذکرہ بھی نہیں تھا۔ اس نے اپنی بہن کی رہائی میں کوئی کردار تو ادا نہیں کیا تھا مگر یہ ناممکن تھا کہ وہ قرب و جوار میں موجود نہ رہا ہو۔ وہ گرفتاری کے وقت نہ ہوا تو بعد میں تھانے کے آس پاس ہی منڈلا رہا ہوگا۔ تاہم میں اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتا تھا کہ اکرام شیخ نے کسی خطرناک مشن پر اسے ہمراہ رکھنا مناسب نہ سمجھا ہو یا وہ کسی معمولی سے کام کو اکیلا ہی نمٹانے چلا گیا ہو۔

نازو کا مردانہ حلیے میں پھرنا ایک دلچسپ بات تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ بہن نے مکمل طور پر خود کو ایم آر ایس کے مشن کے لیے وقف کر دیا ہے اور اپنے ساتھ بھائی کو بھی شامل کر لیا ہے۔ انہیں ہمارے بارے میں کوئی اطلاع تھی یا نہیں وہ دوسروں سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کر چکے تھے یا نہیں اور انھیں ہمارے پروگرام کا علم تھا یا نہیں، ان سوالات کا جواب وہ خود ہی دے سکتے تھے۔ تاہم ایک بات واضح تھی۔

نازو اور اکرام نے اپنا علیحدہ محاذ کھول رکھا تھا۔ انھوں نے شہزاد سب سے کٹ کر اور ایم آر ایس کے مرکز سے جدا ہو کے رہنمائی رہنمائی سے قبول نہیں کیا تھا اور نہ انھیں کوئی شوق تھا کہ وہ کسی سے مدد لیے بغیر کوئی کارنامہ سرانجام دینے کا اعزاز حاصل کریں۔ وہ حالات کے گرداب میں پھنس گئے تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی بہت بڑے محاذِ جنگ پر ایک بٹالین دشمنوں کے علاقے میں محصور ہو

جائے تو اپنی بقا کے لیے ہائی کمان کی پالیسی اور ان کے مشوروں اور ان کی ہدایات کے بغیر بھی لڑائی جاری رکھے، اپنی اسٹریٹجی بھی خود مرتب کرے اور اپنے وسائل پر انحصار کو ناگزیر جان لے۔

خبر میں نازو کا نام بھی نہیں تھا۔ پولیس والے اور کچھ پوچھیں نہ پوچھیں نام اور شجرۂ نسب ضرور پوچھتے ہیں۔ یہ جاننے کے لیے کہ اسامی کیسی ہے کڑک دیسی مرغی ان کے دڑبوں کی زینت بڑھاتی ہے اور جوتا کاری کی مشق میں کام آتی ہے۔ ولایتی مرغی کو وہ انڈے دیتے رہنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اور سونے کا انڈا دینے والی مرغی ایک وی آئی پی ہوتی ہے۔ چنانچہ زیرِ تفتیش مجرموں کی درجہ بندی کی جائے تو آوارہ گردی کے الزام میں دھرے جانے والے لاوارث یا لڑائی جھگڑے میں اور پولیس کی شان میں گستاخی کے مرتکب ہونے والے پہلی قسم کے مجرم سمجھے جا سکتے ہیں۔ چور اور گرہ کٹ دوسری قسم کے جو انھیں باقاعدہ نذرانے پیش کرتے رہتے ہیں اور ڈاکو تیسری قسم کے۔ ان سے لاکھوں کا مال ملنے کی توقع ہوتی ہے۔ جب گورنمنٹ زیادہ انکم ٹیکس دینے والوں کو معزز اور مراعات یافتہ طبقے میں شمار کرتی ہے تو پولیس انھیں کیوں نہ سمجھے جو زیادہ مال دیتے ہوں۔

نازو کے بارے میں یہ پہلی اطلاع لہو گرمانے والی تھی۔ اس سے نازو کا پتا تو نہیں ملتا تھا مگر یہ امید ضرور ملتی تھی کہ اب وہ بے نام داستاں نہیں رہی۔ کسی نہ کسی ذریعے، حوالے سے اسے کراچی میں ڈھونڈ نکالنا مشکل تو ہوگا مگر بہت مشکل نہیں ہوگا۔۔۔ میں ہوٹل کے کمرے میں چکر کاٹتے ہوئے سخت مضطرب تھا۔ رابعہ کا خیال پس منظر میں چلا گیا تھا لیکن آہستہ آہستہ خبر کی سنسنی خیزی کا اثر کم ہوا تو وہ بھی احساس کے فوکس میں اُبھرنے لگی۔ یہ بالکل یک نہ شد دو شد والا کیس تھا۔ میں رابعہ اور صرف رابعہ کی جستجو میں آیا تھا اور اس مقصد کے حصول سے پہلے کوئی مقصد نہ تھا۔

اب میں سوچنے پر مجبور تھا کہ کسے پہلے تلاش کروں۔ رابعہ جہاں بھی تھی خیریت سے تھی اور دوری کے احساس اور جدائی کے غم کے سوا اسے کوئی دکھ نہ تھا۔ اس نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ آرام سے ہے اور مجھے اس کی طرف سے بالکل بے فکر رہنا چاہیے۔ یہ جدائی ایک وقتی مجبوری ہے اور ناگزیر ہے جس کا سبب جاننا بھی ضروری نہیں لیکن نازو پریشانی میں مبتلا تھی۔ میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کا بھائی اکرام بھی اس کے ساتھ ہے یا خدانخواستہ۔۔۔

اس خدانخواستہ کے آگے بہت سے پریشان کرنے والے اور ڈرانے والے خیالات کا سلسلہ تھا۔ کہیں وہ دشمنوں کے قبضے میں تو نہیں، کہیں وہ اپنوں کی قید میں تو نہیں، کہیں وہ زخمی تو نہیں۔۔۔ کہیں وہ مارا تو نہیں گیا۔ میں ایسی کوئی بات سوچتا تو

نہیں چاہتا تھا مگر سورج کے سامنے دیوار کھڑی کرنے کا کوئی طریقہ مجھے نہیں آتا تھا چنانچہ یہ وحشت زدہ کرنے والے خیالات بھی بدروحوں کی طرح مجھ سے چمٹے ہوئے تھے۔

بالآخر میں نے فیصلہ کیا کہ پہلے مجھے نازو کا ہی سراغ لگانا چاہیے۔ جب وہ مل جائے گی تو رابعہ بھی مل جائے گی۔ نازو مجھے خود اس سے ملا دے گی۔ اس کام میں وہ میری بہترین معاون ثابت ہو گی۔ اکرام شیخ، میں اور نازو مل گئے تو ایسے ہوں گے جیسے آرمی ایئرفورس اور نیوی کی متحدہ قوت اور ہماری مشترکہ جدوجہد رابعہ کو آزاد کرانے میں زیادہ مؤثر کردار ادا کر سکے گی۔

یہ فیصلہ کرنے کے بعد میں نے روم سروس سے رابطہ قائم کیا۔

"یس سر" مستعد نوجوان نے کہا۔

"مجھے آج کے اخبارات چاہئیں۔" میں نے کہا۔

"اخبار آپ کے کمرے میں موجود ہے سر۔"

"میں نے جمع کا صیغہ استعمال کیا تھا۔" میں نے رکھائی سے کہا۔ بڑے لوگوں کی طرح۔ "اس کا مطلب ہے کہ تمام اخبارات۔"

"تمام اخبارات؟"

"ہاں... وہ سب جو کراچی سے یا حیدرآباد سے شائع ہوتے ہیں۔ صبح کے بھی اور شام کے بھی۔ انگریزی، اردو، سندھی، گجراتی اور اگر لاطینی عبرانی اور ڈچ زبان کے ہوں تو وہ بھی۔" میں نے ریسیور رکھ دیا۔ دوسری طرف ریسیور تھام کر ہونقوں کی طرح بیٹھے ہوئے شخص نے یقیناً دل میں کہا ہو گا کہ یہ سالے پیسے والے خبطی کیوں ہو جاتے ہیں۔ بس ہر چیز خرید کر حاضر کر دو، خواہ وہ کام کی ہو یا نہ ہو اور ملے یا نہ ملے۔

اخبارات کے لیے مجھے تقریباً ایک گھنٹا انتظار کرنا پڑا۔ انتظامیہ نے اس پریشان کن مطالبے کو پورا کرنے کے لیے خصوصی انتظام کیا ہو گا اور کسی پڑھے لکھے بندے کو کسی بڑے نیوز ایجنٹ کے پاس بھیجا ہو گا۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر وہ شخص اپنے مشن سے کامیاب لوٹا اور تقریباً دس پونڈ اخبارات اور رسائل کے وزن سے ہانپتا کانپتا حاضر ہوا۔

"سب مل گئے سر،" وہ بولا۔ "بس عبرانی کا نہیں ملا۔"

حیران ہونے کے باوجود میں نے اُسے سو کا نوٹ انعام میں دیا تو اس کے ماتھے کا پسینہ اور جسم کی تھکن کا معاوضہ ادا ہو گیا۔ وہ سچ مچ غیر ملکی زبانوں کے پرانے اخبارات بھی اُٹھا لایا تھا۔ ملکی اخباروں میں بھی سندھی اور گجراتی روزنامے میرے لیے بے کار تھے۔ میں نے صبح کراچی سے شائع ہونے والے پانچ اردو کے اور دو انگریزی کے اخبارات الگ کیے۔ شام کے چار اخبارات جو سنسنی خیز خبروں کی توانائی سے چلتے ہیں، میں نے پہلے دیکھے۔ مجھے اپنے مقصد میں خاصی کامیابی ہوئی۔

شام کے ایک اخبار نے اس کار کی تصویر شائع کی تھی۔ پولیس کو جیکسن کے علاقے سے لاوارث کھڑی ہوئی مل گئی تھی۔ اس کار کو 'خوفناک حسینہ' نے فرار کے لیے استعمال کیا تھا۔ تصویر میں کار کا نمبر تک واضح تھا مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی اطلاع تھی کہ کار سے پولیس کو اس لڑکی کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ وہ اپنے فنگر پرنٹ تک صاف کر گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی کار کے مالک کی تصویر تھی اور بیان تھا۔ اس نے فریاد کی تھی کہ وہ اپنے گھر پڑھنے والے ایک لڑکے کی رپورٹ درج کرانے گیا تھا مگر تھانے میں جا کے اور لُٹ گیا اور اب پولیس اُسے زبردستی اس کیس میں ملوث کر کے مزید لوٹنا چاہتی ہے۔ پولیس نے روایات کے مطابق یہ مؤقف اختیار کر لیا تھا کہ کار والا ابھی اس حیرت انگیز مارکہ انگیز زیرو زیرو سیون کے زنانہ ایڈیشن کی مدد کے لیے بروقت کار کر باہر موجود پایا گیا تھا چنانچہ وہ اس کا ساتھی ہے اور نہیں تو ثابت کرے ورنہ عدالت کا فیصلہ ہونے تک صبر کرے یا کچھ دے کر کے پھر اپنی کار لے جائے۔

دوسرے شام کے اخبار نے ان کی تصویر شائع کی تھی جو سول اسپتال کے آرتھوپیڈک وارڈ میں دیکھو مجھے جو دیدہ عبرت نگاہ ہو' کی تصویر بنے لیٹے ہوئے تھے۔ یہ وہی دونوں کانسٹیبل تھے جو نازو کے نازک ہاتھوں سے اپنے مردانہ ہاتھ تڑوا بیٹھے تھے۔ تصویر سے تو یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ ٹوٹ پھوٹ زیادہ ہوئی ہے۔ کسی کی ایک ایک ٹانگ بھی پلستر میں بندھی ہوئی اور اوپر اُٹھی ہوئی تھی۔ وہ سخت شعلہ بار نظروں سے کیمرے کو گھور رہے تھے اور مجبور نہ ہوتے تو ان کی رسوائی کو مشتہر کرنے والوں کو ضرور دیتے۔ سب انسپکٹر کی تصویر صرف ایک اخبار میں تھی جس میں اس کے سر پر پٹی رکھائی گئی تھی۔ تاہم اس نے کسی قسم کا بیان دینے سے انکار کر دیا تھا۔

شام کے تقریباً سب ہی اخبارات نے یہ اطلاع دی تھی کہ پولیس کی ایک خصوصی ٹیم ایک ڈی ایس پی کی قیادت میں تشکیل دی گئی ہے جو مفرور ملزمہ کا سراغ لگائے گی۔ اس کے ساتھ ہی وہ روایتی جملے تھے کہ تمام تھانوں کو چوکس کر دیا گیا ہے اور شہر سے باہر جانے والی سڑکوں کی ناکا بندی جاری ہے۔ پبلک ان جملوں کا کوئی اثر قبول نہیں کرتی تھی کیونکہ عملاً یہ سب کاغذی کارروائی کے سوا کچھ نہیں ہوتا تھا۔

شام کے اخبارات رکھ کے میں نے صبح کے اخبارات دیکھنا شروع کیا اور ایک اخبار کے نمائندۂ خصوصی کی رپورٹ نے چونکا دیا۔

اس نے یقیناً بھاگ دوڑ اور عرق ریزی کی تھی یا پھر اندرونِ خانہ اس کے لنک بہت گہرے اور مضبوط تھے۔ اس نے غیر معمولی لیکن باوثوق ذرائع سے ایک خصوصی اسٹوری دی تھی۔ اس کے بیان کے مطابق تقریباً دو ہفتے قبل بندرگاہ کے علاقے میں ایک غیر ملکی جہاز راں کمپنی کے عملے کے چند ارکان نے دو افراد کو اغوا کرنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ یہ دونوں افراد مرد اور عورت تھے اور بعض عینی شاہدوں کے کہنے کے مطابق ہم شکل بھی تھے۔ ان دونوں نے اپنے اغوا کی کوشش کو بالکل اسی انداز میں ناکام بنا دیا تھا جیسے گزشتہ روز ایک نوجوان نے اپنی گرفتاری کی کوشش کو ناکام بنا دیا۔ اس نے جوڈو کراٹے میں اپنی حیرت انگیز مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے 'صنفِ نازک' کے بارے میں پائی جانے والی ساری خوش فہمی بھی رفع کر دی کیونکہ وہ نوجوان ایک لڑکی تھی۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ جس وقت اس نوجوان کو گرفتار کیا گیا، اس وقت بھی وہ اپنے دوسرے ساتھی کے ساتھ ایک غیر ملکی جہاز پر سوار ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے پینٹ اور ڈھیلی شرٹ پہن رکھی تھی اور سر پر ملاحوں والی ٹوپی لگا رکھی تھی۔ مبینہ طور پر اسے جہاز کے سیکنڈ آفیسر نے شناخت کیا اور پکڑ کر پولیس کے حوالے کرنے کی کوشش کی مگر اس کوشش میں وہ اپنی کالر بون تڑوا بیٹھا۔ لڑکی کا ساتھی جس کے بارے میں اب یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ وہ بھی کوئی لڑکی ہو گی، جائے واردات سے غائب ہونے میں کامیاب رہی تاہم جہاز کے دیگر عملے کی مدد سے اس لڑکی پر قابو پا لیا گیا اور اسے باہر پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔ جہاز کے کپتان کی طرف سے کوئی رپورٹ درج نہیں کرائی گئی ہے۔ کپتان نے نامہ نگار کے کسی بھی سوال کا جواب دینے سے انکار کیا اور اسے اس سیکنڈ آفیسر سے ملنے کی اجازت بھی نہیں دی گئی جس نے لڑکی کو شناخت کیا تھا اور چند لوگوں نے اسے چلا کر گالی دینے کے بعد یہ کہتے بھی سُنا تھا کہ 'تم پھر آ گئے ہمارا بیڑا غرق کرنے'۔ کپتان نے اس بیان کی صحت سے بھی انکار کیا۔ مذکورہ مال بردار جہاز کراچی سے بمبئی، کولمبو، مدراس اور کلکتہ کے راستے برما تک چکر لگاتا ہے۔ اس کا کپتان ایس کے سیٹھی انڈین نیشنل ہے اور سیکنڈ آفیسر مرشد میاں مشرقی پاکستان سے تعلق رکھتا ہے۔ جہاز کا باقی عملہ سنگاپور اور فلپائن سے لیا گیا ہے اور جہاز کی رجسٹریشن پانامہ کی ہے۔

جھٹلانے والے تو کھلی آنکھ سے پہچانی جانے والی حقیقت کو بھی جھٹلا سکتے ہیں اور کسی بھی سچ سے منکر ہو سکتے ہیں۔ چند باتوں کو جہاز کے عملے نے غلط قرار دیا تھا اور کچھ باتوں کو پولیس نے مگر ایک کائیاں رپورٹر نے خود کو محفوظ رکھتے ہوئے سارے ہنگامے کا الزام کر دیا تھا۔ دروغ برگردنِ راوی کہہ دینے سے الزام کسی پر نہیں آتا۔

اس بیان کی صداقت کو کلی طور پر تسلیم کرنے والا شاید میں دوسرا شخص تھا۔ پہلا تو وہی رپورٹر تھا جو نہ جانے کیسے محرم درونِ میخانہ ثابت ہوا تھا اور اندر کی خبر کو اغوا کر کے باہر لے آیا تھا۔ ایک کامیاب رپورٹر کی طرح اس نے یہ کام دو طرح سے کیا ہو گا۔ ایک طریقہ مال خرچ کرنے کا ہے۔ اس نے عملے کے کسی غیر اہم سمجھے جانے والے مگر سب کچھ سمجھنے والے خلاصی قسم کے رکن کو خرید لیا۔ دوسرا طریقہ جان ہتھیلی پر رکھ کے شیر کی کچھار میں گھسنے کا ہے۔ ممکن ہے وہ بھیس بدل کر جہاز پر پہنچنے میں کامیاب رہا ہو اور جاسوسی کر کے کامیابی سے لوٹ آیا ہو۔ بہرصورت اس رپورٹر نے ایک کارنامہ سرانجام دیا تھا اور میں یہ سوچنے پر مجبور تھا کہ کیا اس طرح اس نے اپنی جان کے لیے حقیقی خطرے کا سامان پیدا نہیں کیا ہے؟ یہ ضرورت سے زیادہ جان لینے والوں کی جان لینے والے لوگ وہی تھے جنھوں نے نازو اور اکرام شیخ کو اغوا کرنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ وہ انھیں پہچانتے تھے ورنہ وہ ایسا کیوں کہتے کہ تم پھر آ گئے ہو ہمارا بیڑا غرق کرنے۔ ظاہر ہے کم سے کم ایک بار ان کا بیڑا غرق ہو چکا تھا اور وہ بیڑا غرق کرنے والوں سے مل چکے تھے۔

ایک بات جو یہ سراغ رساں نامہ نگار بھی نہیں جانتا تھا، وہ میں جانتا تھا۔ میرے پاس نازو اور اکرام کی طرف سے ملنے والی آخری خبر یہ تھی کہ وہ کسی کارگو شپ پر چڑھ کر کہیں نکل گئے ہیں اور اس شپ پر جو سامان لادا گیا تھا اس میں وہ اسلحے کے سارے کریٹ تھے جن پر شہر کا نام 'الڈ دیبیٹ سٹی' اور ملک کا نام 'دسبی دانیا' تحریر تھا۔ ہم اس سے پہلے ہی معلوم کر چکے تھے کہ دنیا کے نقشے میں اس نام کا نہ کوئی شہر ہے اور نہ ملک۔ الڈ دیبیٹ درحقیقت ہائی بلڈ پریشر کے مرض میں استعمال ہونے والی ایک دوا کا برانڈ نام تھا اور 'دسبی دانیا' روسی زبان میں وہی معنی رکھتا ہے جو اُردو میں الوداع یا خدا حافظ۔ ہم نے یہ معلومات آگے ارسال کر دی تھیں اور ہم نے سُنا تھا کہ وہ جہاز راستے میں غرق ہو گیا تھا جو یہ مال لے کر روانہ ہوا تھا۔ صرف ایک کریٹ کسی کی غلطی سے رہ گیا تھا جو بعد میں پولیس اور حفاظتی عملے نے اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔

سیکنڈ انجینئر کے ردِعمل سے میں یہ اندازہ کر سکتا تھا کہ نازو اور اکرام شیخ ہی اس اسلحہ بردار جہاز کو غرق کرنے کے ذمے دار تھے۔ جیسے نازو اور اکرام بچ گئے تھے ایسے ہی غالباً مرشد میاں بچ گئے تھے اور اب دوسرے جہاز پر تھے کہ انھوں نے پھر بیڑا غرق کرنے والوں کو دیکھ لیا۔ باقی عملہ خاموش تھا اور یہ ان بھائیوں کی بدقسمتی تھی کہ ان میں ایک صورت آشنا غدار نکل آیا۔ ظاہر ہے نازو اس کی کالر بون توڑ کے نہ نکلتی تو اس کی گردن توڑ کے

نکلتی۔ اُسے روکنا اتنا آسان نہیں تھا۔ تمام چیزوں کے تناظر میں یہ سمجھا جا سکتا تھا کہ دونوں بہن بھائیوں کو اغوا کرنے کی کوشش کا مقصد یہی تھا کہ انھیں بیٹیاں غرق کرنے کے جرم میں سزائے موت دی جائے۔

میں نے گھڑی دیکھی۔ اصولاً مجھے یہاں سے روانہ ہو جانا چاہیے تھا لیکن میں نے بدلے ہوئے حالات کے تقاضوں کے مطابق نئے سرے سے منصوبہ بندی کی۔ میں یہ چاہتا تھا کہ کراچی پہنچنے کے بعد اس رپورٹر سے ملوں جو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ باخبر تھا اور اپنے پیشے کے ساتھ جاں نثاری کی حد تک مخلص بھی۔ ایسا شخص کسی بھی وطن دوست کا ساتھی بن سکتا تھا لیکن کسی غدار کے ہاتھوں کسی قیمت پر نہیں بک سکتا تھا۔ اس بات کی بھی خاصی امید تھی کہ وہ میرے نام نامی سے بخوبی واقف ہوگا اور میرے کارہائے نمایاں کے باعث اپنے دل میں میرے لیے ستائش کے ویسے ہی جذبات بھی رکھتا ہوگا، جیسے آج تک مجھے بہت سے نادیدہ دوستوں اور محافظوں کے ملنے والوں کے دل میں محسوس ہوئے تھے۔ انہی میں ایک نابینا خلیفہ بنڈت تھا۔ (خدا کرے محسن اور غالب نے اُسے اپنی دکان واپس دلوا دی ہو) دوسرا میجر سلطان تھا۔ تیسرا ایک ڈاکٹر تھا تو چوتھا ایک کیفے کا مالک۔ یہ لوگ زندگی کے ہر طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور ہر جگہ موجود تھے مگر کسی کے دوستانہ جذبے پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لینے کی غلطی میں نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے آپریٹر سے کہا کہ وہ لاہور کا ایک نمبر ملا دے۔ یہ نمبر عبدالودود منظر کے گھر کا تھا۔ دس منٹ بعد فون کی گھنٹی بجی تو میں نے منظر کی آواز سنی۔ پس منظر میں اس کی اولاد نے ایک ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔

"کون بول رہا ہے؟" میں نے ڈانٹ کر کہا۔

"ارے بھائی... تم کو کس سے بات کرنی ہے... میں منظر بول رہا ہوں۔"

"کیا فائدہ ایسے بولنے کا اُلو کے پٹھے۔" میں نے اپنی اصل آواز میں کہا۔ "نقار خانے میں طوطی کی آواز بالکل سنائی نہیں دے رہی ہے۔"

منظر چلّانے لگا۔ "ابے تو... دنیا میں میری تباہی کے ذمے دار... کہاں سے بول رہا ہے تو...؟"

"اپنے خوش گفتار خوب صورت مُنہ سے۔" میں نے کہا۔

"ابے کیوں بول رہا ہے آخر... میں تو سمجھا تھا کہ اللہ نے بچالیا اس آواز سے جو میری شامت کو پکارتی ہے۔" وہ بولا۔ "ابے نکلو یہاں سے کتے کے بچو... تمھارے باپ کا فون آیا ہے۔"

میں قہقہہ مار کے ہنسا۔ "تیری بیوی تو اس الزام سے خوش ہو گی مگر میں اس ٹیم کی قیادت سنبھالنے سے انکار کرتا ہوں۔"

"دیکھیں گے... دیکھیں گے بیٹا... جب تمھاری پِٹائی میں اترے گی نا تب پتا چلے گا۔ ابھی تو خالی پچ پر اکیلے دوڑ رہے ہو... دیکھ تو اب جلدی سے بک دے کہ تو نے کیوں فون کیا ہے مجھے... کون سا نیا خیال آیا ہے تجھے میرے درجن بھر جگر گوشوں کو یتیم کرنے کا اور میری اکلوتی گھر والی کے سر سے میرا سایہ اُٹھانے کا..."

"یار تو بزدل ہوتا جا رہا ہے... حالانکہ تیری تو اب پوری فوج ہے۔" میں نے کہا۔ "فکر سے ہلکان مت ہو... یہ بتا ملتان سے کسی نے فون کیا ہے تجھے؟"

"ہاں... دن میں آیا تھا۔ میری بیوی بہت ناراض تھی۔ کوئی لوفر تھے۔ پوچھنے لگے کہ یہ منظر ایڈووکیٹ کا میرٹھی ہوم ہے؟"

میں ہنس پڑا۔ "بڑے شریر ہیں وہ دونوں۔"

"شریر؟ ابے وہ خبیث کہنے لگے کہ تم کون ہو... مسز منظر کی سویٹ ہارٹ سیکریٹری یا نرسری؟" منظر چلّانے لگا۔ "ظاہر ہے میری بیوی نے انھیں اپنی مادری زبان میں بتایا کہ وہ کون ہے۔"

"یار وہ پھر فون کریں گے۔ ایک پراپرٹی کی ڈیل ہے جس میں انھیں تیری مدد درکار ہے۔" میں نے اصل معاملے کو فی الحال گول کر دیا۔

"اچھا... بہت بڑی ڈیل ہے کیا؟"

"ہاں یار... نواب ابنِ نواب ابنِ نواب ہیں... سات پشتوں سے بھی آگے تک۔" میں نے کہا۔ "یہاں کے کسی زیرِ تعمیر ہسپتال کی بات کریں گے... ان کا کام میرا کام سمجھ کے کر دینا۔"

"تیرے کیا لگتے ہیں وہ؟" منظر کے لہجے میں شبہ آگیا۔

"کچھ نہیں... تو میرا کیا لگتا ہے یار! لیجہ میری کیا لگتی ہے۔ ظاہر ہے کچھ نہیں۔" میں نے کہا۔

منظر نے مجھے گالیاں دینی شروع کی ہی تھیں کہ غالباً اس کی بیوی آگئی۔ وہ ایک دم مہذب اور شریف آدمی بن گیا۔ "صحیح بات بتا..."

"یار میں کراچی جا رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اکیلا ہوں۔"

"کیوں... وہ سب ساتھ چھوڑ گئے... یاجوج ماجوج!"

"نہیں... وہ ایک سرکس میں کام کر رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "تو گولی مار سب کو۔"

"ایک بار سامنے تو آئیں وہ۔" منظر دانت پیس کر بولا۔

"کراچی میں ایک رپورٹر ہے افتخار عارف۔" میں نے کہا۔ "اس کے اخبار کا فون نمبر نوٹ کر... وہ اس وقت مل جائے گا۔ اس سے پوچھنا کہ وہ میرے بارے میں کیا رائے رکھتا ہے اور..."

"رائے تو میں بتا سکتا ہوں..."

"بیچ میں مت بول... اس سے پوچھنا کہ اگر میں اس کے پاس مدد کے لیے جاؤں... ایک مشن کے سلسلے میں... تو کیا وہ میری خاطر کچھ کر سکے گا؟"

"ہاں... وہ پولیس کو فون کر سکے گا کہ آئیے اور انھیں لے جائیے جن کے بغیر دنیا میں خاصے لوگ سکون سے رہ سکتے ہیں۔"

"میں پھر فون کروں گا... آدھے گھنٹے میں..." میں نے اس کی بکواس کو نظر انداز کر کے ریسیور رکھ دیا۔

پھر میں آدھے گھنٹے تک ٹہلتا رہا۔ اس خواہش کو دبانے کے لیے کہ میں انکل ضامن رضوی کے گھر فون کروں اور شہلا سے بات کروں۔ اس خواہش سے لڑنا بہت مشکل کام تھا۔ بے شک جبری ریٹائرمنٹ کے بعد انکل رضوی کے جذبات میں تبدیلی ضرور آئی ہوگی مگر پھر بھی ان سے کیسے بات کروں گا میں... اور اگر فون آنٹی نے اٹھا لیا؟ وہ تو رونا شروع کر دیں گی۔ ان کے آنسوؤں کا جواب کیا دوں گا میں؟ خود شہلا نے کہہ دیا "ہیلو" تو کیا میرے حلق سے آواز نکلے گی؟ اگر میں نے اس کی خیریت دریافت کی تو وہ بے ہوش ہو جائے گی... میری آواز سنتے ہی... اس کی جسمانی حالت ایسی نہیں ہے کہ وہ کسی قسم کے جذباتی صدمے کی متحمل ہو سکے۔ بفرضِ محال اس نے ہسٹریا میں چلانا شروع کر دیا کہ سکندر بھائی... لوٹ آئیے خدا کے لیے... یا رابعہ کے بارے میں کوئی حوصلہ شکن اطلاع دے دی۔ محسن کے بارے میں کچھ بتا دیا۔ وہ کہے گی بتائیے آپ کہاں ہیں... آپ کو میری قسم... رابعہ کی قسم... جھوٹ مت بولیے گا... نہیں... میں یہ رسک نہیں لے سکتا۔ میں نے فیصلہ کیا۔

کلاک نے ایک گھنٹا بجا کے رات کے ساڑھے آٹھ بجنے کا اعلان کیا تو میں چونکا۔ میں نے پھر فون اٹھا کے آپریٹر سے کہا کہ پرانا نمبر ملا دے۔ اس مرتبہ لائن فوراً مل گئی۔ لیکن ہیلو اس کی بیوی نے اُٹھا لیا تھا۔ مجھے آواز بدل کے بات کرنی پڑی۔

"سلام چچی جان..."

"چچی جان... کہاں فون کیا ہے آپ نے... کون ہیں آپ؟"

"لیجیے... آپ بھی یہ پوچھ رہی ہیں کہ میں کون ہوں؟... چچی جان میں آپ کا سب سے خوب صورت بھتیجا ہوں... اشفاق الحق قاسمی عرف قفس قرول باغوی... کیا یہ منظر ایڈووکیٹ کا گھر نہیں ہے؟"

"ہے تو... میں بلاتی ہوں۔" وہ گڑبڑا کے بولی... بار بار حلق سے قاف کی آواز نکالنے سے میرا گلا دُکھنے لگا تھا۔

"کون ہے بے؟" منظر نے ایک منٹ کے بعد کہا۔

"حضرت عزرائیل کا افسر بکارِ خاص۔" میں نے کہا۔

"کاش وہ آپ کو اسی وقت بلالیں۔" منظر ہنس کے بولا۔ "میری بیوی کے ساتھ ایک دن میں دوسرا کیس ہوا ہے..."

"ڈلیوری کا...؟ مبارک ہو..."

"ابے ٹیلی فون پر چھیڑنے کا... وہ لڑکیوں کی طرح شرماتے ہوئے جھوٹا غصہ دکھا رہی ہے۔" منظر بولا۔ "یعنی شتر غمزے..."

"میرا کام ہوا؟"

"ہاں... کچھ ہوا..." وہ بولا۔ "بہت چالاک شخص ہے وہ... کہنے لگا کہ کیا ثبوت ہے تمھارے پاس کہ تم وہی ہو جو خود کو ظاہر کر رہے ہو؟"

"تو نے کیا ظاہر کیا تھا خود کو؟"

"ابے ظاہر کیا... اور باطن کیا۔" وہ بگڑ کے بولا۔ "میں جو ہوں، بس وہی ہوں... اور یہی میں نے اس سے کہا تو وہ بولا کہ اچھا اپنا نمبر بتاؤ اور فون رکھ دو۔ پھر اس نے مجھے رنگ کیا اور کہنے لگا کہ اب ٹھیک ہے مسٹر منظر... تم مکمل رازداری کی گارنٹی کے ساتھ کوئی بھی بات کہہ سکتے ہو... وہ بات مجھ سے منکر نکیر بھی نہیں پوچھ سکتے۔ تب میں نے تمھارا ذکر کیا اور کہا کہ وہ کراچی میں ہے اور تم سے کہاں مل سکتا ہے؟ وہ تو یار! ایسا پُرجوش عقیدت مند ہے تیرا کہ میرے پیچھے پڑ گیا اور بولا کہ اپنے دوست سے کہو آج ہی ملے۔ وہ رات گیارہ بجے کے بعد ڈیوٹی سے فارغ ہوتا ہے اور اکیلا رہتا ہے۔ مارٹن روڈ پر جو سرکاری کوارٹر ہیں نا۔"

"ہوں گے بھائی... مجھے کیا معلوم۔" میں نے کہا۔

"اچھا تو اس کا پتا نوٹ کر لے۔ وہ جہانگیر روڈ ویسٹ کے کوارٹرز میں رہتا ہے... الف سات سو بیس... اس کے نام الاٹ نہیں ہے، کرائے پر لے رکھا ہے۔"

"کوئی ٹیلی فون وغیرہ بھی ہے؟"

"یہ تو... میں نے نہیں پوچھا۔" منظر بولا۔ "اور اس نے بھی نہیں بتایا۔"

"تو نے کیا کہا تھا... کس سلسلے میں ملاقات کرنی چاہتا ہوں میں؟" میں نے کہا۔

"وہی جو تو نے کہا تھا... اپنی طرف سے میں کچھ اور کیسے کہہ دیتا۔" منظر بولا۔ "بیٹا میں تو کہتا ہوں اب بھی وقت ہے۔ اس چکر سے نکل آ۔ حالات دن بدن خراب ہوتے جا رہے ہیں۔"

"کس کے لیے؟ میرے لیے یا ملک کے لیے؟" میں نے کہا۔

"ظاہر ہے ملک کے لیے... وہی تیرے حالات بھی ہیں۔" منظر نے کہا۔ "کچھ لوگ تو ملک کے حالات میں اس لیے ٹانگ اڑاتے ہیں کہ ان کے سامنے کوئی تعمیری مقصد ہوتا ہے۔"

وہ کچھ بن جاتے ہیں یا کچھ حاصل کر لیتے ہیں۔ تو صرف گنوا رہا ہے اور وہ بھی بے مقصد... ایک جان ہے تیری جس پر بہت ناز ہے تجھے۔"

"ہاں، رالعہ پر بہت ناز ہے مجھے۔ وہی تو میری جان ہے۔" میں نے کہا۔ "باقی رہی مقصد کی بات تو یار میں سیاستدان نہیں ہوں اور نہ میں نے کچھ بننے یا حاصل کرنے کی خاطر اپنی جان مصیبت میں ڈالی ہے۔ تجھ سے بہتر کون جانتا ہے کہ اس دلدل میں قدم میں نے اپنی مرضی سے نہیں رکھا تھا۔ مجھے اس میں پھینک دیا گیا تھا لیکن خدا جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔ اُسے مجھ سے ایک کام لینا تھا جو میں کر رہا ہوں۔ ممکن ہے تیرے لیے یہ مقصد تعمیری نہ ہو کیونکہ اس کاروبار میں اپنے لیے میں نہ کوئی کوٹھی تعمیر کر رہا ہوں نہ کارخانہ... مگر تعمیر کا دوسرا انداز تخریب میں بھی ہے جسے میں دیکھ سکتا ہوں۔"

"یار تو سیریس ہو گیا... ہم تو جانتے ہیں سب کہ تو کتنا بڑا کام کر رہا ہے۔" منظر بولا۔ "ہم تو بیل ہیں بھائی۔ کولھو کے بیل جو ایک محدود دائرے سے باہر نکل ہی نہیں سکتے اور کچھ دیکھ بھی نہیں سکتے اور محسوس بھی نہیں کرتے۔ یا زندگی کی گاڑی کو کھینچنے والے بیل جو سالی بہت او ور لوڈ ہو گئی ہے... یہ بتا دوسرے کیسے ہیں؟"

"سب ٹھیک ہیں... اتنی لمبی ٹرنک کال نہیں کر سکتا کہ فرداً فرداً سب کا احوال سناؤں... تو بتا شہلا کیسی ہے۔ اور انکل..."

"انکل تو بس گوشہ نشین ہو گئے ہیں۔ ایک اسکول چلا رہے ہیں آجکل۔" وہ بولا۔ "ان کی فراغت سے تو واقف ہے تو... وقت گزارنے کے علاوہ قوم کی خدمت کا جذبہ ان میں بھی خدا نے کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ کہتے ہیں کہ خدا کا شکر ہے جس نے مجھے ایک جہنم سے نکال کر معصوم فرشتوں کی اس جنّت میں بھیج دیا۔ سارے شہر کے اندیشوں سے آزاد ہو گئے۔ وہ خود ایڈ منسٹریٹر ہیں اور ان کی بیگم ہیڈ مسٹریس۔"

"گزر اوقات کیسی ہو رہی ہے؟"

"وہ تو کہتے ہیں کہ پہلے سے بہتر۔" منظر نے کہا۔ "تو بات کر لے۔"

"نہیں یار... ابھی ہمت نہیں ہے مجھ میں۔" میں نے کہا۔ "شہلا کی کوئی خبر ہے۔"

"ہاں... مزے میں ہے۔" وہ بولا۔ "فون کرتی رہتی ہے۔"

"آجکل فون کرنے میں خطرہ تو کوئی نہیں؟"

"نہیں... سراج نے تو کوشش کی تھی کہ میرے اور انکل رضوی کے گھر کو آبزرویشن پر رکھا جائے۔ مگر رضوی صاحب کی اعلیٰ حکام کی نظر میں بہت عزت ہے۔ اور مجھ سے قانونی کارروائی کا ڈر تھا اس لیے اس کی ایک نہیں چلی۔"

"اور میرے کیس؟"

"کیس بنتے رہیں گے اور چلتے رہیں گے... جب تک تو پکڑا نہیں جاتا سب ٹھیک ہے۔" وہ بولا۔ "اب کیسوں سے کیا ڈرنا... خود مجھے نہیں معلوم کہ کتنے ہیں... رالعہ کی فرم کو میں نے سنبھال لیا ہے اور کام بہت بڑھ گیا ہے۔"

"اچھا یار... جو کچھ تو نے کیا اس کے لیے بھی اور جو کرے گا اس کے لیے بھی شکریہ... محسن کا بھی فون آئے تو اُسے کہہ دینا کہ میری فکر نہ کرے... اپنا کام جاری رکھے۔ میں واپسی پر زیادہ دن نہیں لگاؤں گا۔ آگے اللہ کی مرضی کیونکہ حالات پر میرا کوئی اختیار نہیں، ہاں... یہ بھی بتا دینا کہ نازو اور اکرم کراچی میں ہیں۔"

"تجھے معلوم ہے چوہدری دلاور صوبائی اسمبلی کے لیے کھڑا ہو رہا ہے۔" منظر نے اچانک یاد کر کے کہا۔ "اپنی پارٹی کا تو بس نام ہے، سارا کھیل پیسے کا ہے۔ کسی ایڈورٹائزنگ فرم کو اپنی کنویسنگ کا ٹھیکا دیا ہے۔"

"اس کی کنویسنگ تو میں کروں گا۔" میں نے کہا۔ "ذرا وقت آنے دے۔ انتخابات میں اس جیسے کھڑے ہوتے ہی ہیں۔ صوبائی اسمبلی میں پہنچنے سے پہلے اسے قبر میں نہ لٹا دیا تو سکندر نام نہیں۔ اچھا خدا حافظ۔"

مجھے اچانک احساس ہو گیا تھا کہ میں نے روانی میں اپنا نام دے دیا ہے۔ ٹیلی فون لائن پر محفوظ گفتگو میں بھی خدشات ہوتے ہیں کہ کراس ٹاک سے غیر متعلقہ شخص سب سن لے گا ورنہ آپریٹر تو دونوں کی سنتا ہی ہے۔ یہ ہوٹل ذرا معیاری تھا اور میں ایک وی آئی پی کی حیثیت سے یہاں مقیم تھا، چنانچہ آپریٹر سے اس بدتمیزی اور بدتہذیبی کی امید نہیں تھی کہ وہ میری گفتگو سنے گا۔ وہ دن رات نمبر ملاتے رہتے ہیں اور اس عمل کی بیزار کن یکسانیت میں ان کے تجسس کا جذبہ اس طرح باقی نہیں رہتا، جیسے گورکن کے لیے کسی مرنے والے کے لواحقین سے ہمدردی کا جذبہ۔

منظر سے میری گفتگو بھی ایک روح افزا ٹانک ثابت ہوئی اور اس نے میرے خیالات کے انتشار کو بہت حد تک کم بھی کیا۔ اب میں زیادہ اطمینانِ قلب اور یکسوئی کے ساتھ اپنے مشن کے اگلے مرحلے پر روانہ ہو سکتا تھا۔ رات میری محافظ و معاون تھی اور اب یہ پہلے سے زیادہ ضروری ہو گیا تھا کہ میں اسی رات سے فائدہ اٹھاؤں۔ اس سے اگلی رات کا کیا بھروسا کہ ستاروں کی چال بدل جائے اور میرا پھینکا ہوا پانسا پلٹ جائے۔

ایک گھنٹے بعد میں کراچی کی جانب رواں تھا۔ میرے بل میں

ہوٹل کے کرائے کے برابر ہی ٹرنک کال کے چارجز شامل ہو گئے تھے مجھے اخراجات کی فکر نہیں تھی۔ گڑبڑ یہ ہوئی تھی کہ ہوٹل کے قواعد و ضوابط کے مطابق میرے سوئٹ نمبر کے فون سے ملائی جانے والی دونوں کالوں میں منظر کے ٹیلی فون نمبر کا اندراج ہو گیا تھا۔ ویسے تو یہ بہت دُور کی بات تھی کہ کوئی اس طرح مجھے تلاش کرے۔ بخصوصاً ان حالات میں جبکہ میں نے ہوٹل میں اپنا نام وغیرہ سب غلط لکھوایا تھا اور ہوٹل والے میرے حلیے کو یاد رکھنے کے پابند نہیں تھے۔

رات کے ساڑھے گیارہ بجے میں کراچی پہنچا۔ سپر ہائی وے پر ایک جگہ بلند و بالا گیٹ سے بنے ہوئے تھے۔ یہ ٹول پلازا تھا۔ گویا کراچی کی میونسپل حدود کے آغاز کی علامت۔ دونوں جانب قطاروں میں کاریں ٹرک اور بسیں محصول ادا کر کے ٹکٹ لیتے جا رہے تھے اور نکلتے جا رہے تھے۔ مجھ سے آگے ایک ٹرک تھا۔ معلوم نہیں کیا ہوا کہ اس ٹرک کو روک لیا گیا۔ غالباً کسی کی مخبری کے باعث بالین دین کے چکر میں کوئی جھگڑا پڑ گیا تھا۔ اگلا نمبر میرا تھا۔ کسٹم انٹیلی جنس کی وردی میں ایک افسر میری طرف بڑھا۔

"آپ بھی نیچے اتر آئیں۔ گاڑی سائڈ پر لگا لیں۔"

"مگر کیوں؟" میں نے پُرسکون رہتے ہوئے متانت سے کہا۔

"اس لیے کہ ہمیں اس ٹرک کو روکنے کے احکامات ملے ہیں۔" وہ بولا۔ "چلیں دیر مت کریں۔ ٹریفک بلاک ہو جائے گا۔"

"واٹ نان سنس... احکامات ٹرک کے لیے ہیں تو اُسے روکو... مجھے روکنے کا تو کسی نے نہیں کہا ہے۔" میں نے کار کو ایک کنارے پر کر لیا۔

"کہا تو کسی نے نہیں ہے۔" وہ پھر میرے سامنے آ گیا۔ "مگر ٹرک تو آپ کا ہی ہے۔"

"ٹرک میرا ہے؟" میں نے برہمی سے کہا۔ "کون اُلّو کا پٹھا کہتا ہے... کیا یہ تمھاری اپنی منطق ہے کہ جو کار اس ٹرک کے پیچھے ہو گی وہی ٹرک کا مالک ہو گا۔"

"ایسا وہ ڈرائیور کہتا ہے جو ٹرک چلا رہا ہے۔" کسٹم والا متاثر ہوئے بغیر بولا۔

"وہ بکواس کرتا ہے۔" مجھے اب واقعی طیش آنے لگا تھا۔

"تو آپ نیچے اتر کے یہ بات اس کے سامنے کہہ دیں... اور ثابت کر دیں۔" اس نے اچانک ہاتھ بڑھا کے چابی نکال لی۔

"چابی واپس وہیں لگا دو، مسٹر کسٹم افسر۔" میں نے لہجے کو شریفانہ انداز میں خطرناک بنا کے کہا۔ "تم نہیں جانتے..."

"میں اپنے اختیارات کو جانتا ہوں... اور مجھے اس ٹرک کے علاوہ تمھاری کار کو بھی ضبط کرنے کا اختیار حاصل ہے۔" وہ متاثر ہوئے بغیر بولا۔

میں نے دیکھا کہ وہاں اس ٹرک پر چھاپا مارنے والی پولیس پارٹی نے اپنے مخصوص انداز میں ناکا بندی کی تھی اور اب ان کا کام پورا ہو گیا تھا تو وہ خاصے بافراغت انداز میں کھڑے تھے۔ ان میں سے بیشتر ٹرک کو گھیرے ہوئے تھے اور اپنی رائفلوں کو حسبِ عادت لاٹھی کے طور پر سہارے کے لیے استعمال کر رہے تھے۔

"او کے... لیکن کیا تم ایک منٹ میرے پاس بیٹھ کے اس سارے معاملے کی وضاحت نہیں سُن سکتے۔" میں نے معنی خیز انداز میں مسکرا کر کہا۔

"میں خود زبردستی کا قائل نہیں۔" وہ بھی معنی خیز طور پر مسکرایا۔ اور میری مسکراہٹ اگر سوال تھی تو اس کی مسکراہٹ میں جواب پوشیدہ تھا۔ میں نے پوچھا تھا کہ کیا ہم کچھ لو اور کچھ دو کے زرّیں اصول پر عمل نہیں کر سکتے اور اس نے جواب دیا تھا کہ بے شک عقل مند وہی ہوتے ہیں جو اپنا فائدہ دیکھتے ہیں۔ میں نے دروازہ کھولا اور وہ میرے ساتھ بیٹھنے کی غلطی کر بیٹھا۔

"کیا ہے اس ٹرک میں؟" میں نے کہا۔

وہ بگڑ گیا۔ "میرا خیال تھا... کہ تم بات ختم کرنا چاہتے ہو۔"

"تمھارا خیال غلط نہیں تھا۔ مگر مجھے پتا تو چلے کہ بات شروع ہی کیوں ہوئی تھی۔" میں نے کہا۔ "اور تم کیوں بضد ہو مجھ سے منوانے پر کہ وہ میرا ہی ٹرک ہے؟"

اس نے باہر نکلنے کی کوشش کی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "اتنا غصّہ بھی اچھا نہیں ہوتا۔" میں نے کہا اور جیکب کے کمرے سے ملنے والا ریوالور نکال لیا۔ "اس چیز کو پہچانتے ہو... اسے سائلنسر کہتے ہیں۔ اگر کوئی شور مچانا چاہے تو یہ خاموشی سے اُسے خاموش کر دیتا ہے۔"

کسٹم انسپکٹر کا رنگ اُڑ گیا۔ "اور اس کے بعد... تمھارا کیا خیال ہے کہ تم اپنے ٹرک سمیت فرار ہو جاؤ گے؟"

"ٹرک جائے بھاڑ میں۔" میں نے کہا۔ "میں خود تو فرار ہو سکتا ہوں... تمھاری لاش لے کر۔"

"کیا واقعی... وہ تمھارا ٹرک نہیں ہے؟" پہلی بار اس کا اعتماد متزلزل ہوا۔

"تمھیں نام معلوم ہے میرا؟"

"تم ملتان سے آئے ہو نا؟" وہ بولا۔

"مخبری کرنے والے نے میرا کیا نام بتایا تھا؟" میں نے کہا۔

"جان محمد عرف جونی۔" وہ بولا۔ "تم وہاں کے ایک بااثر شخص سلطان محمد خان کے بیٹے ہو؟"

"اچھا!" میں نے حیرت سے کہا۔ "اور ٹرک میں کیا ہے؟"

"غیر قانونی طور پر ملک میں لایا جانے والا اسلحہ۔" وہ بولا۔ "کچھ روسی ساخت کا... کچھ بھارت میں بنا ہوا۔"

"کیا یہ اسلحہ میں مشرقی پاکستان کے علیحدگی پسندوں کو فروخت کرتا ہوں؟" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

"اس کا جواب تم خود جانتے ہو۔" وہ بولا۔

"کیا تم نے اسلحہ برآمد کر لیا ہے؟"

"اس میں کیا دیر لگتی ہے۔" وہ بولا۔ "اصل بات یہ ہے کہ ڈرائیور نے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا ہے... مگر اس کا کہنا ہے کہ وہ مجبور تھا۔ ملک اس کے پیچھے سائے کی طرح لگے ہوئے ہیں اور اسے مار ڈالیں گے۔"

"پیچھے والی گاڑی میں تمہارا اسمگلر ہوتا تو تم کیا کرتے؟"

"ڈرائیور میرے اسمگلر کو نہیں جانتا مگر تمہیں جانتا ہے۔"

میں نے اپنے شناختی کاغذات نکال لیے۔ ان میں گاڑی کی رجسٹریشن کے کاغذات بھی تھے۔ "تم دیکھ سکتے ہو کہ میں کون ہوں۔" اس نے کاغذات کو گاڑی کے اندر کی لائٹ جلا کے غور سے دیکھا اور مجھے واپس کر دیے۔ "یہ جعلی بھی ہو سکتے ہیں۔"

"بالکل ہو سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن جان محمد عرف جونی دو نہیں ہو سکتے۔ اس ڈرائیور کا کیا نام ہے؟"

"دریا خان۔"

"تم اسے مجھ سے ملوا سکتے ہو؟" میں نے کہا۔

"تم اس سے مل سکتے ہو... چیک پوسٹ پر۔" وہ بولا۔

"ٹھیک ہے... میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں اس ڈرائیور سے چند سوالات کروں گا۔ اس دوران میں تم بالکل خاموش بیٹھے رہو گے اور ایسی کوئی حرکت نہیں کرو گے جس سے تمہاری جان اور یہ عہدہ جائے۔ جان ہے تو جہان ہے اور یہ عہدہ ہے تو اس جہان میں کیش ہی نہیں ہے بلکہ عیش ہی عیش ہے۔ بعد میں مجھے پھانسی بھی ہو جائے تو تمہیں یہ قیمتی زندگی نہیں مل سکتی۔"

اس نے سر ہلایا۔ بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔ وہ مجھے ایک مختصر سے کمرے میں لے گیا جو دو دروازوں کے بیچ میں تھا۔ وہاں ٹرک ڈرائیور ایک کونے میں مرغا بنا ہوا تھا۔ دو پولیس والے بڑی بے نیازی سے باہر دیکھ رہے تھے۔ اپنے افسر کو دیکھتے ہی انھوں نے کرسیاں خالی کر دیں اور دونوں جانب کے دروازوں پہ اٹینشن ہو گئے۔

"چل سیدھا ہو جا... گُڈ مڑدے پُتر۔" ایک سپاہی نے کہا۔ مرغا سیدھا ہو کے آدمی بن گیا۔ وہ بے عزتی کا عادی اور خاصا سخت جان مجرم نظر آتا تھا۔ اس نے مجھ سے نظر نہیں ملائی۔

"میری طرف دیکھو۔" میں نے کہا۔ "کیا میں جان محمد ہوں؟"

اس نے نظر اُٹھا کر اقرار میں سر ہلایا۔

"یہ بات کہنے پر تم کو کس نے مجبور کیا تھا...؟" میں نے کہا۔

"کسی نے نہیں... میں وہی کہہ رہا ہوں جو... سچ ہے۔"

"تم نے جان محمد عرف جونی کو دیکھا ہے کبھی؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا مگر میں دیکھ رہا تھا کہ اس کا کھوکھلا اعتماد بھی ختم ہونے لگا ہے۔ وہ کچھ نروس ہو رہا تھا۔

"اس کا حلیہ بیان کرو ذرا۔" میں نے کہا۔

"آپ سامنے کھڑے ہو جی... حلیہ کیا بتاؤں۔" وہ بولا۔

"آپ کا یہ فون ڈائریکٹ ڈائلنگ پر ہے؟" میں نے کسٹم انسپکٹر سے کہا۔ "ذرا ملتان ملائیں۔ سلطان محمد خان کے گھر کا نمبر میں دیتا ہوں۔ اس سے پوچھو کہ جونی کہاں ہے؟"

"تمہارا دیا ہوا نمبر تو کسی کا بھی ہو سکتا ہے... جو ریسیور اٹھائے گا کہہ دے گا کہ میں سلطان محمد خان ہوں اور جونی تو میرے سامنے بیٹھا ہوا ہے۔"

"ذہانت کی بات کی تم نے۔" میں نے کہا۔ "چلو وہاں کے ڈپٹی کمشنر یا علاقہ ڈی ایس پی کا نمبر ملاؤ... دونوں تصدیق کر کے دس منٹ میں جواب دے سکتے ہیں۔ ڈی سی آفس دائیں طرف سے چوتھی کوٹھی ہے یا شاید پانچویں۔ ڈی ایس پی کا دفتر سامنے ہے۔ دونوں ذاتی طور پر سلطان محمد خان کو بھی جانتے ہیں اور جونی کو بھی۔"

کسٹم انسپکٹر کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر ڈرائیور کی حالت نے اُسے شک میں ڈال دیا۔ ڈرائیور کا رنگ فق ہو گیا تھا۔ کسٹم افسر نے نمبر ڈائل کیا۔ آدھی رات کے وقت لائن آسانی سے مل گئی۔

"کیا دفتر اس وقت بند نہیں ہوں گے؟"

"ڈی ایس پی کا آفس اور تھانہ ایک ہی عمارت میں ہیں۔" میں نے کہا۔

"پھر تھانے والوں سے ہی کیوں نہ کہہ دیا جائے۔" کسٹم انسپکٹر نے لائن کاٹ دی۔ "وہ بھی تو تصدیق کر سکتے ہیں۔"

"ہاں... تصدیق تو آدھا ملتان کر سکتا ہے۔"

"اتنی رات گئے۔ سلطان محمد خان کو ڈسٹرب کرنا..."

"کمال ہے... ان کے بیٹے جونی کو اسلحے کی اسمگلنگ کے سنگین جرم میں گرفتار کیا جا رہا ہے... تم کو ان کی نیند خراب ہونے کا ڈر ہے... اگر تم نے انھیں بتائے بغیر ایسا کیا تو زیادہ خرابی ہو گی۔"

کسٹم افسر نے کسی سے پوچھ کے تھانے کا نمبر ملایا۔ "کون؟ اچھا خود ایس ایچ او صاحب ہیں... دیکھیں سر... ہم نے ایک بندہ پکڑا ہے کراچی میں جو خود کو سلطان محمد خان کا بیٹا کہتا ہے۔ وہ اسلحے سے بھرے ہوئے ٹرک کے ساتھ پکڑا گیا ہے... جان محمد عرف جونی نام بتاتا ہے... کیا... ابھی آپ کے پاس تھا... کتنی دیر پہلے؟ ایک گھنٹا ہوا... ہاں جی... بالکل... یہ ہے کوئی جعلساز... ذرا مہربانی کر کے مجھے کچھ حلیہ بتا دیں اس لڑکے جان محمد کا..." پھر وہ بہت دیر تک ہاں جی، ہاں جی کرتا رہا... بالآخر اس نے ریسیور رکھ دیا۔

"آئی ایم سوری... اس کتے کے بچے نے جھوٹ بول کے آپ کو بھی ملوث کرنا چاہا تھا۔" کسٹم افسر نے ڈرائیور کو گھور کے کہا۔

"میں بھی جاننا چاہتا ہوں کہ اس نے مجھے کیوں جان محمد کہا۔"

"آپ مجھے اور اسے پولیس اسٹیشن لے چلو۔" ڈرائیور بے خوفی سے بولا۔

یکلخت مجھ پر اس سازش کے محرکات واضح ہو گئے۔ اس کا مقصد مجھے تھانے پہنچانا تھا۔ یہاں بھی سب کی موجودگی میں اپنی زبان سے میں نے جان محمد جونی ولد سلطان محمد خان سے تعلق تسلیم کر لیا تھا اور تھانے پہنچ کر بھی میں اپنی بات پر قائم رہتا کہ میں جان محمد عرف جونی نہیں ہوں۔ ظاہر ہے تصدیق اور تفتیش کے مرحلے پورے ہونے سے قبل ہی یہ معلوم ہو جاتا کہ میں کون ہوں...؟ لے جانے والے ڈرائیور کو لے جاتے یا وہ خود ہی اپنی بے گناہی ثابت کر کے رخصت ہو جاتا۔ تلاشی لینے پر ٹرک سے ایک گولی بھی نہ ملتی تو اسے روکنے کا جواز باقی نہ رہتا مگر میں دھر لیا جاتا۔ کسی نے بہت ہوشیاری سے جال بچھایا تھا اور کوشش کی تھی کہ ایک تیر سے دو شکار ہو جائیں۔ یعنی سکندر بخت تو پکڑا ہی جائے اس کے ساتھ میں جان محمد بھی مصیبت میں گرفتار ہو جائے کہ وہ میرا ساتھی تھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ یہ پیڈرو کے علاوہ کسی کی سازش نہیں ہو گی۔ اسے ہی جونی اور جیکی پر غصہ تھا جنھوں نے مجھے بیچ میں لا کے اس کا بنا بنایا کام بگاڑ دیا تھا۔ وہ تھوڑی بہت سزا انھیں بھی دینا چاہتا تھا۔ زیادہ کا امکان اس لیے نہیں تھا کہ پیڈرو سے زیادہ سلطان محمد خان کے نام کا سکہ چلتا تھا۔ ان کے بیٹے کو کسی سازش میں کوئی ملوث نہیں کر سکتا تھا۔

"تھانے تو اب سب کو ہی جانا پڑے گا۔" کسٹم انسپکٹر نے فون رکھ کے کہا۔ "ملتان کے تھانے والوں نے کہا ہے کہ وہ صبح ہی تصدیق کر کے بتا سکتے ہیں... رات کو سلطان صاحب کو نہیں جگا سکتے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "میں آپ کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوں... کیا آپ میرے ساتھ میری گاڑی میں چلیں گے؟"

کسٹم انسپکٹر تذبذب کا شکار ہو گیا۔ اسے معلوم تھا کہ میرے ہاں کس قسم کا ریوالور ہے ورنہ وہ مجھے گرفتار کرتے اور میری جامہ تلاشی لینے کا حکم دیتا... شاید وہ ڈرتا تھا کہ میں مرنے مارنے پر تُل جاؤں اور اس سمیت دو چار آدمی ٹھنڈے نہ کر دوں۔ وہ میرے ساتھ ہرگز نہیں بیٹھنا چاہتا تھا۔

"تم... آپ ہمارے ساتھ جیپ میں چلیں۔"

میں نے صاف انکار کر دیا۔ "یعنی میں اپنی کار کو یہاں چھوڑ جاؤں... آپ کے پاس چابیاں ہیں تو آپ ڈرائیو کریں۔ یا مجھے ڈرائیو کرنے دیں۔"

"آپ کے ساتھ دو سپاہی جائیں گے... اور ٹرک ڈرائیور جائے گا۔" کسٹم انسپکٹر نے فیصلہ کیا۔ "میں جیپ میں ٹرک کے پیچھے آؤں گا۔"

اس کے فیصلے نے مجھے خوش کیا۔ اس نے میرے لیے بہت سی مشکلات کا خاتمہ کر دیا تھا۔ میں ابھی طے نہیں کر پایا تھا کہ تھانے پہنچنے سے پہلے اس کسٹم انسپکٹر سے کیسے گلو خلاصی ہو گی اور ڈرائیور کس طرح میرے قبضے میں آئے گا۔

"آپ کے پاس... کوئی ہتھیار ہے تو...؟"

"میرے پاس کوئی اسلحہ نہیں ہے۔" میں نے کسٹم انسپکٹر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔

"مجھے تلاشی لینی ہو گی..."

"میرا خیال ہے کہ تم ایسی حماقت نہیں کرو گے۔" میں نے سرد سفاک لہجے میں یوں کہا کہ میرے لہجے سے نتائج کی دھمکی واضح ہو جائے اور یہ بات صرف کسٹم انسپکٹر سمجھ سکے جو میرے نشانے پر تھا اور ابھی میرے الفاظ بھولا نہیں تھا۔ میں چند قدم پیچھے ہٹ گیا تھا چنانچہ وہ کسی ماتحت کو بھی اشارہ نہیں کر سکتا تھا کہ مجھے دبوچ لے۔ بالآخر اس نے اپنی جان بچاتے ہوئے مجھے دو سروں کے سپرد کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے ٹرک پکڑ لیا تھا اور بحفاظت تھانے بھی پہنچا دیا تھا۔ دوسرے اگر کسی غفلت کے مرتکب ہوتے ہیں تو وہ قصوروار نہیں۔

ٹرک ڈرائیور کو میرے ساتھ بٹھانے کی سرکاری وجہ یہ بتائی گئی کہ بصورت دیگر وہ ٹرک سمیت فرار ہونے کی کوشش کرے گا۔ حالانکہ ٹرک کوئی جیٹ طیارہ نہیں کہ پولیس کی جیپ کو چھوڑ کے اُڑن چھو ہو جائے۔ دو کانسٹیبل جن کے پاس وہی بھاری بھرکم بندوقیں تھیں جو زمانہ قبل از آزادی کی یاد دلاتی تھیں، اس کے دائیں بائیں بیٹھ گئے۔ ایک نائک جس کی مونچھیں پہلے ہی بہت نمایاں تھیں مگر وہ انھیں بقول شاعر مشرق۔ گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر... عادتاً مروڑتا تھا اور مالش پالش کرتا رہتا تھا، اسے میرے ساتھ آگے بٹھایا گیا۔ یقیناً اسے زیادہ ذمے دار سمجھتے ہوئے زیادہ مستعد رہنے کی تاکید کی گئی ہو گی۔

جیپ اویل کے دو ہزار سی سی کے انجن نے انگڑائی لی اور کار نے کابلی کے مارے ہوئے محافظوں کے خیال میں سپر

سانگ رفتار کیڑی تو وہ تھوڑے سے ہراساں ہوئے۔

"سر جی... اپنی سپیڈ..." نائک بولا۔ "گڈی اُکٹ جائے گی تو آپ کا... نقصان ہو جائے گا۔"

"میرے نقصان کی فکر مت کرو۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "میں دوسری کار خرید لوں گا۔" اور رفتار مزید بڑھا دی۔ "تم ڈر تو نہیں رہے ہو نا؟"

"نہیں مگر وہ... اچھا تھا اُن کو بھی ساتھ رکھتے۔" نائک بولا۔

"وہ اور ہم ایک ساتھ کیسے چل سکتے ہیں... خرگوش اور کچھوے کی رفتار برابر تو نہیں ہو سکتی نا...؟" میں نے کہا۔ "اس کے علاوہ اگر اس گاڑی کو پچاس میل فی گھنٹا کی رفتار سے کم پر چلایا جائے تو اس کے انجن کا سیریبرل ہیمرج ہو جاتا ہے۔"

"کیا... سیریبرل کیا...؟"

"وہ ہوتی ہے ایک خرابی۔" میں نے کہا۔ "جو مین جائنٹس کی کم رفتار سے ہیپی ٹائمس توڑ دیتی ہے۔"

نائک بھونچکا بیٹھا تھا۔ میں نے خالص طبی اصطلاحات کا استعمال کیا تھا... وہ اَن پڑھ آدمی... اُسے کیا معلوم کہ سیریبرل ہیمرج تو دماغ کی رگ پھٹنے کو کہتے ہیں۔

"خیر میں رفتار کم کر لیتا ہوں..." میں نے کہا۔ "جانا تو ہم سب کو ایک ہی جگہ ہے... بالآخر..."

وہ سمجھ نہ سکا کہ یہ بات میں نے دنیائے فانی کا نقشہ بیان کرنے کے لیے کی ہے یا میری مراد تھانے سے ہے۔ آگے مسلسل اندھیرا تھا اور میں حیران تھا کہ کراچی کا نام و نشان نہیں مگر ٹول پلازا والوں نے محصول وصول کر لیا ہے۔ ایک میل کے بعد میں نے کلچ دبا کے ایک دم چھوڑا۔ نائک کو زبردست جھٹکا لگا اور اس کا سر ڈیش بورڈ سے ٹکرایا۔ میں نے ایسے ہی دو تین جھٹکے دیے... پھر کلچ دبائے بغیر گیئر بدلنے کی کوشش کی تو گیئر بکس میں سے رگڑ کی ایک خوفناک آواز سنائی دی۔

"یہ کیا ہوا؟" نائک گھبرا کے بولا۔

"وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔" میں نے گاڑی روک دی۔ اس کا بونٹ کھولا اور جھک کر اگنیشن کوائل کا ایک تار الگ کر دیا۔ نائک میرے ساتھ ہی اترا تھا۔ میں نے پھر اپنی جگہ بیٹھ کے گاڑی کو اسٹارٹ کرنے کا ڈراما کیا لیکن مجھے معلوم تھا کہ اب انجن گھومتا رہے گا مگر اسٹارٹ نہیں ہوگا۔ دو چار مرتبہ کی ناکام کوشش کے بعد میں نے جھلاہٹ اور جھنجلاہٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے پھر بونٹ کھولا اور تار لگا دیا۔ نائک کو پھر میرے ساتھ اترنا چڑھنا پڑا۔

"اپنے بندوں سے کہو کہ تھوڑا سا دھکا لگائیں۔" میں نے نائک کو مخاطب کیا۔

"گڈی اسٹارٹ ہو جائے گی؟" اس نے متذبذب لہجے میں کہا۔

"یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے... اس کے حکم کے بغیر پتا بھی نہیں ہلتا... یہ تو بہت بڑی گاڑی ہے۔" میں نے کہا۔ "بندہ کوشش ضرور کر سکتا ہے۔"

نائک قائل ہو گیا کہ کائنات کا نظام ایسے ہی چل رہا ہے۔ اس نے دونوں ماتحتوں سے کہا۔ "شادا بھئی جوانو... ذرا زور لگاؤ ہاں گڈی نو... ذرا جان لگا کے۔"

رائفلیں رکھ کے دونوں کانسٹیبل نیچے اترے۔ کار میں بیٹھ کر دھکا لگوانے کا لطف دھکا لگانے کے ذلت آمیز کام سے غارت ہو گیا تھا مگر آرڈر از آرڈر۔ انھوں نے دروازے بند کر دیے اور پیچھے سے گاڑی کو دھکیلنے لگے۔ آگے بیٹھے ہوئے نائک نے فوراً راڈار سے پیچھے بیٹھے ہوئے اصل مجرم کو زد میں لے لیا۔ اس کے خیال کے مطابق وہی فارغ بیٹھا تھا اور دروازہ کھول کر بھاگ نکلنے کی کوشش کر سکتا تھا... میں گاڑی چھوڑ کے کہاں جا سکتا تھا۔

پھر یہ ہوا کہ میں نے بیک ویو مرر میں ٹرک اور جیپ کو دیکھا۔ ان کی ہیڈ لائٹس آگے پیچھے ہونے سے چار بھی نظر آتی تھیں مگر اونچائی کے فرق سے اندازہ ہوتا کہ اب آگے جیپ ہے یا ٹرک۔ میں نے ایک دم چابی گھما کے انجن اسٹارٹ کیا اور کلچ چھوڑ دیا۔ گاڑی سیکنڈ گیئر میں تھی۔ ریس دیتے ہی جمپ لگا کے آگے بڑھی۔ پیچھے سے دھکا لگانے والے یقیناً منہ کے بل گرے ہوں گے... اور کچی سڑک پر سجدہ کرنے سے ان کو نجات مل گئی ہو تو ممکن تھا۔ میں نے پلک جھپکنے میں نائک کے سر پر بائیں ہاتھ کی کہنی ماری اور ضرب اس کی کنپٹی پر ٹھیک جا کر پڑی۔ وہ سر موڑ کے نہ بیٹھا ہوتا تو میرا کام اتنا آسان نہ ہوتا۔

پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ڈرائیور کے کچھ سمجھنے سے پہلے میں نے ایمرجنسی بریک لگا دیے۔ وہ ایک جھٹکے سے آگے آیا اور میں نے گھوم کر اس کے سر پر مُکا مارا۔ اس کا سر دروازے کی سائڈ سے لگا۔ کار رک گئی تھی، چنانچہ میں نے فوراً ریوالور نکال لیا۔ ڈرائیور سخت جان تھا اور مجھ پر حملہ کرنے کے لیے اُٹھا ہی تھا کہ ریوالور کا دستہ اس کے سر پر پڑا... وہ پھر وہیں گر گیا۔

میں نے اطمینان کا سانس لیا اور جھٹکا لے کر بند ہو جانے والی گاڑی کو آگے بڑھانے کے لیے اسٹارٹ کیا۔ سو گز کے فاصلے سے میں نے پیچھے رہ جانے والے سپاہیوں کی رائفلیں سڑک پر گرا دیں۔ مجرمانہ غفلت کے جرم میں رائفلیں گنوا دینے کا سنگین جرم بھی شامل ہو جاتا تو وہ کہیں کے نہ رہتے۔ اب وہ آگے آئیں گے تو انھیں اپنا اسلحہ ضرور مل جائے گا۔

زور مجرمان ملیں یا نہ ملیں۔

دس منٹ بعد میں نے خود کو کراچی کے کسی مضافاتی علاقے میں پایا۔ آدھی رات کے بعد وہاں سناٹا اور ہُو کا عالم تھا۔ مجھے بتانے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ ایک گشتی پولیس کی گاڑی ضرور نظر آئی تھی لیکن میں ان سے ایک سوال کرتا تو وہ مجھ سے دو سوال ضرور کرتے۔ ایک وردی پوش نائک کے بارے میں جو آگے اوندھا پڑا ہوا تھا اور دوسرا پیچھے گرے ہوئے شخص کے بارے میں۔ نائک کو میں نے وہیں ایک جگہ ڈراپ کر دیا۔ معلوم نہیں وہ کون سی جگہ تھی جہاں مجھے ایک سائیکل والا نظر آیا۔ اس نے مجھے مطلع کیا کہ "بھیا... یہ فیڈرل بی ایریا ہے۔ ادھر بلاک سولہ ہے۔ اُدھر سترہ... تمھیں کہاں جانا ہے؟"

"جہانگیر روڈ ویسٹ۔" میں نے کہا۔

"اچھا تو بھیا تم یوں کرو کہ اللہ کا نام لے کر سیدھے چلے جاؤ... مڑ کر مت دیکھنا... بس یہی سڑک تم کو لے جاوے گی۔ لالو کھیت سے گزر و گے نا تو سیدھے ہاتھ پر سرکاری کوارٹر ہیں۔ تین ہٹی کے چوک کے بعد۔"

"اندازاً کتنا فاصلہ ہوگا؟"

"فاصلہ... وہ تو میں نے کبھی ناپا نہیں... مگر ہاں... تم یہ سمجھو بھیا... کہ پہلا چوک عائشہ منزل... دوسرا کریم آباد... اس کے بعد تیسرا دس نمبر..."

"یہاں چوک بھی دس نمبری ہوتے ہیں؟"

بھیا نے دانت نکالے۔ "دس نمبر لالو کھیت کا تیسرا چوک۔ چوتھا ڈاک خانے کی چورنگی... بس اس کے بعد تین ہٹی کی چورنگی..."

بلاشبہ اس نے میری بہترین رہنمائی کی تھی۔ میں نے چار ایک راؤنڈ اباؤٹ عبور کیے۔ سب پر چار سڑکیں ایک ساتھ ملتی تھیں۔ پانچواں راؤنڈ اباؤٹ آتے ہی میں نے کوارٹر دیکھ لیے جو اپنی یکسانیت سے سرکاری طرزِ تعمیر کی بدصورتی کا نمونہ تھے۔

تین ہٹی کے چوک پر نسبتاً کچھ رونق تھی اور ایک آدھ ہوٹل بھی کھلا ہوا تھا مگر میں نے رُکنا مناسب نہیں سمجھا۔ میرا خیال تھا کہ میں افتخار عارف کا کوارٹر آسانی سے تلاش کر لوں گا۔ سب کوارٹر قطاروں میں ہیں اور نمبر سب پر ہیں تو کسی سے پوچھنا کیا۔ میرا اندازہ فوراً غلط ہو گیا جب نمبر چیپ کرنے لگے۔ مشکل یہ تھی کہ ہر طرف اندھیرا تھا اور کوارٹروں کے اندر بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہو کے پڑے تھے۔ سب نیند میں تھے اور کسی کو نیند میں جگانا بدتہذیبی تو تھی ہی، بدبختی بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ اس شاندار کار کے بارے میں کوئی ایک مہینے بعد بھی بتا سکتا تھا کہ اس کار نگ کیا تھا اور اس کو چلانے والا کون تھا اور کہاں گیا تھا؟

یہ اندھے کے ہاتھ بیٹر لگ جانے والی بات تھی کہ اچانک مجھے سات سو دس کا ہندسہ دکھائی دے گیا۔ اس پر ایف جی لکھا تو کچھ نہیں لکھا ہوا تھا مگر میں نے گاڑی روک دی۔ اس قطار میں دس کوارٹر تھے۔ گویا اگلی قطار یا پچھلی قطار میں کونے والا کوارٹر... میں پیدل چل کے آگے گیا تو مجھے سات سو کا عدد نظر آیا اور اس کے ساتھ ہی بجھا بجھا الیف بھی۔ اب شک کی کوئی بات نہیں رہی تھی۔ پیچھے والی قطار کے پہلے کوارٹر کو غور سے دیکھنے کے لیے میں دروازے تک گیا اور اس پر چاک سے لکھے ہوئے نمبر کو پڑھنے میں کامیاب رہا۔

پچھلی سیٹ پر پڑے ہوئے ڈرائیور کے ابھی ہوش میں آنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ شاید وہ خود ہوش میں آ ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کے لیے تھوڑی بہت طبی امداد ضروری تھی۔ میں نے کار کے شیشے چڑھا کے دروازے لاک کیے اور پیچھے کی طرف گیا۔ کوارٹر کا نقشہ سمجھ لینے کے بعد میں نے صحن کی سات آٹھ فٹ اونچی دیوار کے اوپر سے اندر کودنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں دروازہ بجا کے کسی کو جگانا نہیں چاہتا تھا۔

میں نے ریوالور کو دانتوں میں دبایا اور خود کو ہاتھوں کے زور پر اونچا اُٹھا کے دیوار کے اوپر سے گزر گیا۔ میں ایک اندھیرے صحن میں اترا مگر کراچی کا آسمان اتنا سیاہ نہیں تھا کہ میں کچھ نہ دیکھ پاتا۔ یہ ملگجا سا اندھیرا تھا جیسے خالص اندھیرے میں دس فیصد اجالے کی ملاوٹ کر دی گئی ہو۔ صحن کے بعد برآمدہ تھا اور پھر دائیں بائیں دو کابک نما خانے... ان میں سے ایک کچن ثابت ہوا۔ سامنے دو کمرے تھے اور دونوں کے دروازے کھلے پڑے تھے۔

میں نے ایک کمرے میں قدم رکھا ہی تھا کہ کھٹ سے سوئچ آن ہوا اور میں نے خود کو سو واٹ کے بلب کے نیچے ایک عجیب چیز کے روبرو پایا۔ وہ تھا تو تیس بتیس سال کا جوان آدمی مگر اس نے اپنی جوانی کا وہی حشر کر رکھا تھا جو گدھا زعفران کا کر سکتا ہے۔ اس کے بال لمبے الجھے ہوئے اور خشک تھے۔ اس نے موٹے شیشے والی بھاری فریم کی عینک لگا رکھی تھی اور غالباً یہ داڑھی نہیں تھی بلکہ ہفتے بھر میں بڑھ جانے والی شیو تھی جس نے اس کی شانِ قلندری کو دوبالا کر دیا تھا۔ وہ ایک ایسی پتلون پہنے ہوئے تھے جسے پاجامہ کہنا بھی غلط ہوتا۔ جب وہ سلی ہوگی تو یقیناً صاف ہوگی اور درزی نے اس پر استری بھی کر کے دی ہوگی، مگر وہ کچھ اس اصول کا قائل معلوم ہوتا تھا کہ لباس جب پھٹ جائے تو بدل لو... دھونے، استری کرنے کا روگ کیا پالنا۔ ایسی ہی حالت

قیمص کی بھی تھی۔

"جی؟" وہ بولا۔ "کیسے تشریف لانا ہوا؟"

"آپ... افتخار عارف ہیں؟" میں نے کہا۔

"اور ہم کیا لگتے ہیں بھلا... وہ کسوٹی والے عارف افتخار؟" وہ کھی کر کے ہنسا مگر اس کی ہنسی کی آواز نہیں آئی۔ "بھئی ہم آپ کے لیے چشم براہ تھے... کیا تھے؟"

"چشم براہ..." میں نے کہا۔

"جی... اور بس اچانک آپ آگئے... بھلا کیسے؟ وہ جو کہا ہے نا شاعر نے کہ جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر مصافحہ کیا۔ "آپ سکندرِ اعظم ہیں نا جو اکیلے دنیا کو فتح کرنے نکلے ہیں... بڑا غلغلہ ہے جناب آپ کا... آج ایک عجیب شخص نے ہمیں مطلع کیا کہ آپ نے ہمیں منتخب کیا ہے میزبانی کے لیے۔ ہم نے کہا واہ... چشم ما روشن دلِ ما شاد... غریب خانہ ہے موجود ہر بلا کے لیے۔"

"ایک بلا اور بھی ہے میرے ساتھ۔" میں نے کہا۔ "باہر میری کار میں پڑی ہے... اجازت ہو تو اندر لے آؤں؟"

"اجازت؟" وہ پھر کھی کر کے ہنسا۔ اس کی ہنسی اندر تو جاتی تھی مگر پھر کہیں حلق سے نیچے اتر کے گم ہو جاتی تھی۔ "ارے بھائی، یہاں کس سے اجازت لینی ہے۔ فقیر کا ڈیرا ہے۔ جس کا جی چاہے آئے جائے۔ نہ چور پر قدغن نہ ملک الموت پر پابندی۔"

میں پریشان ہو گیا... میرے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ اتنا ہوشیار رپورٹر ایسا باتونی اور مجنوں صفت ہو گا کہ میرا دماغ چاٹ جائے گا۔ میں اب دروازہ اندر سے کھول کے گیا اور بے ہوش ڈرائیور کو اندر اٹھا لایا۔ کوارٹر میں کچھ بھی نہیں تھا۔ غالب نے اپنے وقت میں کہا تھا کہ دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا۔ آج کا یہ صحافی بھی اس گھر میں اپنی ویرانی کے ساتھ رہتا تھا اور اپنی فقیری میں بھی شاہی کے احساس سے سمجھوتا کیے ہوئے تھا۔ دیواروں پہ گرد تھی اور جالے تھے یا میلے کپڑے لٹکے ہوئے تھے۔ دونوں کمروں میں ایک ایک چارپائی پڑی ہوئی تھی۔ ان پر میلے بستر تھے... باقی سب جگہ کتابوں اور رسالوں کے ڈھیر تھے... فرش پر... الماریوں میں... ریک پر... جو بات عجیب لگتی تھی یہ تھی کہ سب رسالے اخبار بڑی ترتیب اور سلیقے کے ساتھ رکھے گئے تھے جبکہ گھر یا اس کے مکین کو دیکھ کر ترتیب اور سلیقہ بے معنی الفاظ لگتے تھے۔

میں نے ڈرائیور کو ایک چارپائی پر ڈال دیا۔

"یہ تمہارا ساتھی ہے؟" وہ بولا

"نہیں... یہ بھی ایک دشمن ہے۔" میں نے کہا۔ "جب ہوش میں آئے گا تو اس سے کچھ پوچھیں گے... ابھی تو مجھے دو مسائل درپیش ہیں۔ ایک تو باہر جو میری گاڑی کھڑی ہے اسے روپوش کرنا ہے۔ کیونکہ پولیس میرے تعاقب میں ہے۔"

وہ ہنسا۔ "جہاں گاڑی کھڑی ہے وہ بہترین جگہ ہے... کیا ہے؟"

"بہترین جگہ۔" میں نے کہا۔ "مگر..."

"یہ غریب کلرکوں کی بستی ہے۔ کاروں والے ادھر نہیں رہتے چنانچہ کسی کار کو تلاش کرنے یہاں کون آسکتا ہے... اور پھر پولیس ہماری... ماشا اللہ... اس سے کیا ڈرنا۔ اب دوسرے مسئلے پر آجاؤ۔"

"دوسرا مسئلہ ہے پیٹ کا۔" میں نے مسکرا کے کہا۔ "میں نے شام کے بعد سے کچھ نہیں کھایا... تم کیا کھاتے ہو؟"

"ہم تو بھائی جو ملے وہ کھاتے ہیں۔ کبھی قوم کا غم... کبھی پبلک کی گالیاں، کبھی ایڈیٹر صاحب کی جھاڑ... مگر یہ سب تمہارے ہضم کرنے کی چیزیں نہیں ہیں۔ جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو اس گھر میں ایک بھی بیوی نہیں ہے... نہ کبھی ہوگی شاید... چنانچہ سیلف سروس چلتی ہے... تم یہ سوٹ بوٹ اتارو... ویگ اتارو... ہم بناتے ہیں کافی جس کے ہم اسپیشلسٹ ہیں کیا ہیں؟"

"اسپیشلسٹ۔" میں نے مجبوراً جواب دیا۔

"باسی ڈبل روٹی چلے گی؟" وہ بولا۔

"چلے گی کیا دوڑے گی۔" میں نے کہا۔ "مگر کافی بلیک۔"

"ظاہر ہے بلیک ہی ملے گی۔ ہم دودھ ویسے بھی نہ ڈالتے دیتے۔" وہ بولا۔

"یعنی سب کے لیے ایک نسخہ؟" میں نے کہا۔

"بالکل ایک... چائے یا کافی میں تو دودھ ڈالنے کی بات ہی نہیں... جسے دودھ کا شوق ہو باہر جا کے دکان سے پی آئے۔" وہ بولا۔

جب وہ کافی بنانے کے عمل میں مصروف تھا تو میں پھر باہر گیا اور گاڑی میں سے دونوں سوٹ کیس باری باری اٹھا لایا۔ ان میں سے ایک میں کچھ کپڑے بھی تھے۔ دو فوجی وردیوں کے ساتھ میں نے غداروں کے ٹریننگ کیمپ سے چند عام استعمال کے کپڑے بھی اٹھا لیے تھے جو نہ معلوم کس کے تھے۔ کسی بے غیرت پاکستانی کے یا بھارتی دشمن کے... ان میں ایک استعمال شدہ سلیپنگ سوٹ بھی تھا جو میرے کام آگیا۔ موہنی کے کپڑوں کو دیکھ کر مجھے اس کا خیال آیا۔ معلوم نہیں وہ کیا سوچتی ہوگی۔ میرے یوں خاموشی سے غائب ہو جانے پر اس نے سمجھ لیا ہوگا کہ میں اس پر ابھی تک اعتماد نہیں کرتا۔ اعتماد کرنا آسان بھی نہ تھا... بچپن کے جذبات اور اس کی فیملی کے احسانات اپنی جگہ مگر اب حالات بہت مختلف تھے اور سرحد کے اس پار دشمنوں کے ساتھ آنے والا میرا بھائی بھی ہوتا تو قابلِ اعتبار نہ ہوتا۔

اچانک مجھے "کھی" کی آواز سنائی دی جو چند سیکنڈ میں غائب ہو گئی۔ یہ جنابِ افتخار عارف تھے جو... نسوانی کپڑوں کو میرے ہاتھ میں دیکھ کر ہنسے تھے۔

"پہن لیں... کچھ بھی پہن لیں۔" وہ کافی کے مگ ایک میز پر رکھ کے بولے۔ "رات کا وقت ہے اور ہمارے سوا کون دیکھ رہا ہے... اور اگر ہم سے بھی شرم آتی ہے تو ہم عینک اتار کے رکھ دیتے ہیں..."

"یہ کپڑے میرے نہیں ہیں۔" میں نے خفت سے کہا۔

"اچھا تو پھر اُن کے ہوں گے... جو ان کے اندر نہیں ہیں۔ مگر کہا ہے شاعر نے کہ۔ یہ چند روزہ جدائی تو کوئی بات نہیں۔"

میں جاتے جاتے رک گیا۔ ایک بہت بھولی بسری یاد نے میرا راستہ روک لیا۔ ایک بار جب میں پسِ دیوارِ زنداں اپنی مایوسی کے اندھیروں میں اور پُر خوف خیالوں کی بند گلیوں میں بھٹک رہا تھا تو فیض کے یہی دو شعر کسی کے دستِ عنایت نے امید کی روشنی دکھانے کے لیے بھیجے تھے۔ فضائے کنجِ زنداں کو اس دلنواز بند و بست نے زلفِ یار کی صورت مہکا دیا تھا، اور میں پھر کبھی اس خیال سے نہیں ڈرا تھا کہ جدا ہیں آج اگر ہم تو کل بہم ہوں گے یا نہیں۔

وہ میرے چہرے سے میرے جذبات کو پڑھنے میں مصروف تھا اور میرے بارے میں کوئی اندازہ رکھتا تھا تو یہ دیکھ رہا تھا کہ وہ کس حد تک صحیح یا غلط تھا۔ وہ صورت سے خبطی اور باتوں سے جھکی نظر آنے والا شخص اپنی ذات کے گرد دُہرا خول رکھتا تھا۔ وہ بے وقوف نظر آنے کی اور بے وقوف بننے کی پوری کوشش کرتا تھا لیکن یہی اس کی عیاری اور ہوشیاری تھی جس سے وہ دوسروں کو بے وقوف بنانے میں کامیاب رہتا تھا۔ شاید یہی اس کی کامیابی کا راز تھا۔ لوگ اُسے احمق اور بے ضرر سمجھتے ہوئے وہ سب بتا دیتے تھے جو اپنے آپ کو عقلِ کُل اور طرم خان سمجھنے والے رپورٹر جھک مار کے بھی معلوم نہیں کر پاتے تھے۔ یہ پیشہ ہی ایسا ہے کہ اس میں کامیاب وہی ہے جو خبریں نکال لائے خواہ انھیں رازداری رکھنے والوں نے سات پردوں میں چھپا کے رکھا ہو۔ اس کا ہر حرف خود اپنی صداقت کا شاہد ہو اور مکمل ہو۔ سچائی کی تہ تک پہنچنے کے لیے ہر شخص اپنی عقل ذہانت اور ہمت کے مطابق راستہ بناتا ہے لیکن افتخار ان میں سے نہیں تھا جن کا راستہ روکا جا سکے کیونکہ وہ نیچے ہی نیچے سے سرنگ بنا کے اپنا راستہ نکالتا تھا اور اسی خفیہ راستے سے سچ کو اغوا کر کے لے جاتا تھا۔

نازو کے بارے میں اس کی رپورٹ یہی ثابت کرتی تھی اور بعد کے حالات نے میرے خیال کی تصدیق کی۔

جب میں کپڑے بدل کے آیا تو وہ ڈھیلی چارپائی پر آلتی پالتی مارے بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے تمام دیواروں پر چسپاں رنگین تصاویر کی جانب اشارہ کر کے کہا۔

"کیا یہاں کوئی شریف آدمی نہیں آتا؟"

وہ ہنسا۔ "شریف آدمی ہم سے ملنے نہیں آتے۔ انھی سے ملنے آتے ہیں۔ خصوصاً اس وقت جب انھیں بے کیف اور بلیک اینڈ وائٹ خوابوں کی شکایت لاحق ہو۔"

"میرے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟" میں نے مگ اٹھا کے فرش پر دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"سب جانتے ہیں ہم... اور جو نہیں جانتے وہ پوچھ لیں گے مگر آپ فرمائیں کہ کسی تعارف کے بغیر آپ ہمارے پاس کیوں تشریف لے آئے۔ کیا لے آئے؟"

"تشریف!" میں نے جھلا کے کہا۔ "یہ کیا فضول عادت ہے تمہاری؟"

وہ ہنسنے لگا۔ "ضروری نہیں کہ تم میری بات دُہراؤ... فرض کرو یہاں میں نہ ملتا پولیس ملتی۔"

"میں ایسی بات فرض کر سکتا تو تم سے رابطہ ہی قائم نہ کرتا۔ تم جیسا آدمی سب کچھ کر سکتا ہے مگر کسی کے اعتماد کو دھوکا نہیں دے سکتا۔" میں نے کہا۔

"تمہارا اندازہ غلط بھی ہو سکتا تھا۔"

"نہیں... تمہاری رپورٹ دیکھنے کے بعد میں سمجھ گیا تھا کہ تم صرف سچ بول سکتے ہو۔ اور سچائی کو سمجھتے ہو... مجھے اپنی سچائی پر بھروسا تھا۔ چنانچہ مجھے معلوم ہوا کہ تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو تو مجھے کوئی ڈر نہ رہا۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ مجھے تم سے نازو کے بارے میں معلوم کرنا تھا۔"

"آں؟" وہ اُلّو کی طرح گول گول دیدے گھما کے مجھے دیکھنے لگا۔ "یہ کیا چیز ہے؟"

"وہی لڑکی جس کے بارے میں تم نے سب سے الگ رپورٹ دی تھی۔"

"تم جانتے ہو اُسے؟" اس کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔

"ہاں... اور مجھے اسی کی تلاش ہے۔" میں نے کہا۔ "اس کا اصل نام نائلہ بیگم ہے۔ اس کا ساتھی ڈبل ایس آئی شیخ ہے۔ جو رشتے میں اس کا بڑا بھائی بھی ہے۔"

"ڈبل ایس آئی ہم نے آج تک نہیں دیکھا۔"

"وہ پولیس میں سب انسپکٹر تھا۔ سب انسپکٹر سید اکرام شیخ۔

چنانچہ میں اُسے ڈبل ایس آئی شیخ کہتا تھا۔ کچھ بہن کی وجہ سے اور کچھ فرض شناسی کے چکر میں اُسے پولیس کی نوکری کو ترک کرنا پڑا۔ حالانکہ وہ خدمت خلق کے جذبے سے بھرپور دل کے ساتھ اس پیشے سے وابستہ ہوا تھا... وہ دونوں ہمارے ساتھی ہیں۔"

"ہمیں ذرا تفصیل سے سمجھاؤ۔" وہ بولا۔

میں نے باسی ڈبل روٹی پانی کے ساتھ نگل لی تھی اور اب کافی کا لطف اُٹھا رہا تھا۔ سگریٹ سلگا کے میں نے اُسے تفصیل سے بتایا۔ اپنے بارے میں... محسن اور رابعہ کے بارے میں... شہلا اور نازو، اکرام شیخ اور غالب کے بارے میں۔ ظاہر ہے اس میں دلاور اینڈ کمپنی کا ذکر بھی تفصیل سے آیا... وہ بیچ بیچ میں سوالات کرتا گیا۔ میں نے غیر اہم تفصیلات سے گریز کیا اور وقت بچایا۔ پھر بھی صبح ہوگئی۔ اس نے دوسری بار کافی بنائی اور ایک گولی نگل لی۔

"یہ کیا دوا تھی؟" میں نے کہا۔

"یہ نیند بھگانے کی گولی تھی... کھاؤ گے؟" وہ بولا۔

"نہیں... میں مسلسل جاگتے رہنے کی بہت مشق کر چکا ہوں۔"

"ہم تو نائٹ برڈ ہیں نا..." وہ بولا۔ "دن چڑھتے ہی نیند طاری ہونے لگتی ہے... میں ذرا مستعد رہنا چاہتا ہوں۔"

"یہ گاڑی میرے لیے ایک مسئلہ ہے۔" میں نے کہا۔ "اسے غائب کرنے کی کوئی صورت ہے؟"

"کئی صورتیں ہیں۔" وہ بولا۔ "ایک تو یہ ہے کہ اسے شیر شاہ کے سرجنوں کے سپرد کر دیا جائے۔"

"کون شیر شاہ... سودی؟"

"شیر شاہ ایک ایسا میوزیم ہے جس کی نظیر دنیا میں شاید کہیں نہ ہو۔" وہ بولا۔ "پرانی گاڑیوں کے پرزے وہاں کوڑیوں کے مول بکتے ہیں۔ کسی بھی ملک کی کسی بھی گاڑی کے کسی بھی ماڈل کی بات کرو اور کوئی بھی پرزہ مانگو... وہ حاضر کر دیں گے... ویسے تم آٹو پارٹس کی ساری مارکیٹ چھان مارو تو نہیں ملے گا۔ یہ پرزے اسکریپ کی صورت میں جہاز بھر بھر کے لائے جاتے ہیں، اور بعض پرزے تو ایسی گاڑیوں کے ہوتے ہیں جو دوسری جنگ عظیم کے بعد بننا بند ہوگئی تھیں۔ جیسے ماہر قصاب زندہ گائے کو دیکھتے دیکھتے بوٹی بوٹی کر دیتا ہے ایسے ہی شیر شاہ کے ڈیلر نئی پرانی ہر کار کا پرزہ پرزہ یوں الگ کرتے ہیں کہ کار واقعی غائب ہو جاتی ہے۔ کوئی سالم گاڑی اگر چوری ہو جائے تو شیر شاہ کے چند سرجن ایسے بھی ہیں جو دو گھنٹے میں گاڑی کا سراغ تک باقی نہیں چھوڑتے وہ مشکوک گاڑیاں خریدتے بھی تول کر ہیں۔ چنانچہ انھیں بالکل نئی گاڑی کو ختم کرتے ہوئے کوئی افسوس نہیں ہوتا۔ پھر ڈیش بورڈ کہیں گیا... دروازے کہیں... ٹائر اور اسٹیئرنگ الگ... انجن کہیں اور... عموماً بعد میں اس پر نیا نمبر ڈال کے بیچ دیا جاتا ہے۔ کسی ضرورت مند کو۔"

"مجھے ایسی گاڑی کا یہ حشر منظور نہیں۔"

"تو پھر دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس کا رنگ بدلوا لیا جائے اور کوئی نیا نمبر لگوا لیا جائے... انجن پر بھی اور چیسس پر بھی۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ "کیا یہ بھی ممکن ہے؟"

"ناممکن یہاں کچھ نہیں۔ نیا رجسٹریشن نمبر بھی مل سکتا ہے۔" وہ بولا۔

"لیکن کاغذات میں کچھ اور ہوگا تو...؟"

وہ ہنس پڑا۔ "کاغذات کا کیا ہے... اس کے مطابق ہو جائیں گے۔"

"نہیں بھائی... مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"تو پھر تیسری صورت یہ ہے کہ اسے فروخت کر دیا جائے سیکرٹ سروس کے ذریعے۔" وہ بولا۔ "جہاں چوری کی گاڑیاں خریدی جاتی ہیں اور غیر علاقے میں پہنچا دی جاتی ہیں... اب مالک چاہے تو پولیس کے ساتھ جائے۔ تاوان ادا کرے اور گاڑی لے آئے ورنہ کوئی اور لے جائے گا... بس وہ قیمت کم لگاتے ہیں... تقریباً ایک تہائی... دو تہائی پیر بیچ دیتے ہیں... تقریباً دس ہزار مل جائیں گے تمھیں۔"

"تمھارا رابطہ ہے ان سے؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔

"ہاں... شہر میں رہ کے شہر سے رابطہ تو رکھنا ہی پڑتا ہے۔" وہ بولا۔

"بس تو یہ ٹھیک ہے... اسے بکوا دو... میں دوسری گاڑی لے لوں گا۔" میں نے کہا۔

"بہت پیسہ ہے تمھارے پاس؟" وہ بولا۔

"ہاں... اتنا کہ خود مجھے اندازہ نہیں۔" میں نے کہا۔ "صندوق بھرے پڑے ہیں۔"

"کیا یار تم ڈاکے بھی ڈالتے ہو؟" وہ ہنسنے لگا۔

"یہ مذاق کی بات نہیں۔" میں نے کہا۔ "تم دیکھ لیتے ہو۔" باری باری میں نے اُسے دونوں باکس کھول کے دکھائے تو اس کی صورت پر بارہ بج گئے۔

"یہ سب مالِ غنیمت ہے... دشمن سے لوٹا ہوا مال۔" میں نے کہا اور یہ دستاویزات۔ جعلسازی کا سامان... جعلی مہریں لیٹر پیڈ اور یہ سب پاسپورٹ..."

"بھائی... تم تو بہت خطرناک آدمی ہو۔" وہ بولا۔ "یہ سب ساتھ لیے پھرتے ہو؟"

"اور کیا کروں..." میں نے کہا۔ "کسی بینک کے لاکر میں رکھوا دوں؟"

"یہی کرنا پڑے گا۔" وہ بولا۔ "ورنہ یہاں وہ بم گرا دیں گے۔"

"انھیں کیا معلوم...؟"

"دشمن کو سب معلوم ہو جاتا ہے میاں سکندرِ اعظم... ان [illegible] والے اور ہمارے ففتھ کالم کے لوگ مل کے کام کر [illegible] ہیں اس وقت... کوئی پتا نہیں چلتا کہ اپنوں میں کتنے ایسے ہیں [illegible] پرانے ہو چکے ہیں۔ دو قومی نظریے سے پھر چکے ہیں اور سونار بنگلہ کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ خواہ اس کی تعبیر کتنی ہی بھیانک کیوں نہ ہو۔ یہاں سرکاری دفاتر میں، سیکریٹریٹ میں، پرائیویٹ اداروں میں بنگال کے رہنے والوں کا ایمان ڈانواں ڈول ہو رہا ہے... شیخ مجیب اور اس جیسے دوسرے سیاسی بازیگروں نے ان کے جذبات سے کھیلنے کے لیے استحصال کا نعرہ بلند کیا ہے۔ یہ شور مچا رکھا ہے کہ مغربی حصے کی حکومت ہے اور مشرقی حصہ محکوم ہے۔ آمدنی ان کی ہے اور کھا جاتے ہیں ہم مغربی پاکستان والے۔ وہاں آبادی کی کثرت کوئی نئی بات نہیں ہے۔ شرح آبادی میں کمی کے سارے پراجیکٹ فیل ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے غربت کم نہیں ہو سکتی۔ معاشی اور سیاسی استحصال کا نعرہ پڑھے لکھے جاہلوں کو گمراہ کر چکا ہے۔ یہاں تمام بنگالی مشرقی [illegible] جانے کے لیے تیار بیٹھے ہیں اور ان کی وفاداری غیر یقینی ہو [illegible] ہے۔ شاید اُلٹی دشمنی کے جذبات میں ڈھل چکی ہے۔ معلوم نہیں [illegible] کہاں کس کس جگہ سے وہ حکومت کی انتظامی صلاحیت کو نقصان پہنچا رہے ہیں اور مخاصمانہ رویے کے باعث دشمن کے عزائم کا ساتھ دے رہے ہیں... اوپر سے کچھ پتا نہیں چلتا کہ کتنے وفادار رہیں گے اور کتنے نہیں۔ قواعد و ضوابط کی بات ہے نا۔ انھیں کسی بھی محکمے میں کسی سیٹ سے کیسے ہٹایا جا سکتا ہے اور ان سے کیسے کہا جا سکتا ہے کہ کسی فائل کو ہاتھ مت لگاؤ... وہ ٹاپ سیکرٹ فائلوں تک اپروچ رکھتے ہیں اور انھیں منع کرنا ناممکن ہے۔ سب پر نظر بھی نہیں رکھی جا سکتی۔ خود میرے آس پاس ان کوارٹروں میں بنگالی بھرے پڑے ہیں۔ [illegible] معلوم ہے کہ وہ رات کو چھپ کے کہیں اکٹھے ہوتے ہیں۔ کبھی ایک کے گھر کبھی دوسرے کے۔ اور مجیب الرحمان کے خیالات پر بحث کرتے ہیں... بیشتر حمایت میں ہوتے ہیں مگر انھیں یہاں سے کیسے نکالا جا سکتا ہے۔ جب تک کہ وہ خود جانے کی بات نہ کریں یا قول و فعل سے غدار ثابت نہ ہوں۔"

جب وہ بول رہا تھا تو میں نے ایک مختلف آدمی کو دیکھا۔ زیرک... دور اندیش نگاہیں رکھنے والا... باریک بین... منطقی سوچ کا مالک... سچا پاکستانی اور کٹر قوم پرست... غیر جذباتی اور مخلص۔

"تم جن سے لڑ رہے ہو نا... وہ تو سامنے کے دشمن ہیں۔" وہ کچھ دیر بعد بولا۔ "زیادہ خطرناک یہ ہیں جو ابھی تک وفاداری کا اور دوستی کا ماسک چڑھائے بیٹھے ہیں... حقیقی جذبات پر مصلحت کا پردہ ڈالے خاموشی سے وقت کا انتظار کر رہے ہیں۔ اور تذبذب کا شکار ہیں... اگر حالات نے موافقت کا انداز اختیار کیا تو... واہ واہ... یہ فوراً بوریا بستر سمیٹ لیں گے اور جاتے جاتے اپنے انتقامی جذبات کی تسکین کے لیے جتنا نقصان کرنے کی پوزیشن میں ہوں گے ضرور کریں گے... ان کی کھوپڑی میں بیٹھ گئی ہے نا کہ مغربی پاکستان نے ان پر اب تک بہت ظلم کیا... انگریز آقاؤں سے بھی بُرا... اپنی دانست میں وہ ہم سے ایک جنگِ آزادی لڑ رہے ہیں... اور تم تو جانتے ہو کہ انھیں تھپکی دینے والے اور لڑانے کے لیے اسلحہ دینے والے ہاتھ کس کے ہیں... میں کیا بہت سے لوگ یہ سب جانتے ہیں مگر کوئی کیا کر سکتا ہے۔ اب یہاں کی مثال لو۔ جن بنگالیوں کو یہ کوارٹر الاٹ ہیں وہ جاتے وقت کسی کو ہینڈ اوور کر کے نہ گئے تو کیا ہوگا... ویسے تو انھیں باقاعدہ اسٹیٹ آفس سے کلیئرنس لے کر اور کوارٹر باقاعدہ حوالے کر کے جانا چاہیے لیکن بہت سے فرار ہو رہے ہیں... راتوں رات... ہوائی جہاز سے، بحری جہاز سے بمبئی اور سری لنکا کے راستے... نیپال کے راستے۔ معلوم ہے وہ کیا کر رہے ہیں... وہ پنکھے تک آثار کے کباڑیوں کو دے رہے ہیں... کھڑکی دروازے تک بیچ رہے ہیں۔ کون پکڑے گا انھیں، نقصان تو سرکاری ہے... خیر... یہ تو لمبی بات ہے اور شاید اس میں تمھارے لیے بھی نئی بات کوئی نہ ہو۔"

"سرکاری دفاتر میں کام کرنے والوں کے ففتھ کالم کا ذکر کر کے تم نے میرے ذہن میں زیادہ بڑے خطرے کا احساس پیدا کر دیا ہے۔" میں نے کہا۔ "ان حالات میں تو میرا یہاں رہنا ایسا ہی ہے جیسے بھارتی ایجنٹوں کے درمیان رہنا... تم مجھے کہیں اور منتقل نہیں کر سکتے؟"

وہ کچھ دیر سوچتا رہا اور ٹہلتا رہا۔ پھر اس نے چٹکی بجائی۔ اور گھڑی میں وقت دیکھا۔ "ابھی ساڑھے چھ بجے ہیں۔ بابو لوگ سات بجے کے قریب گھروں سے نکلتے ہیں۔ یہ وقت ہمارے نکلنے کے لیے بہت اچھا ہے... تمھارا یہ قیدی مر تو نہیں جائے گا؟"

"امید تو نہیں... مر گیا تو مجھے صرف یہ افسوس ہوگا کہ اس سے کچھ پوچھنا تھا، وہ نہ پوچھ سکا۔" میں نے کہا۔

"تو اسے لپیٹو ایک چادر میں اور لے جاؤ... میں دونوں سوٹ کیس لاتا ہوں۔" وہ بولا۔ "[illegible] سوٹ کیس اٹھا لو۔"

اس نے حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کیا۔ ایک منٹ میں اس نے چادر ڈال کے ڈرائیور کو لپیٹا اور کندھے پر ڈال لیا۔ وہ چھ فٹ کا خاصا صحت مند آدمی تھا مگر اپنے حلیے سے اس نے خود کو بیمار بنا رکھا تھا۔

"تم... ایسے ہی چلو گے؟"

"اور کیا ڈرائی کلینر کے پاس سے نیا سوٹ لا کے پہنیں گے ہم؟ ارے میاں ہمارا نائٹ سوٹ... ڈے سوٹ۔ ڈنر سوٹ سب ایک ہے۔" وہ بولا۔ "اور تم بھی یہ نخرے چھوڑ دو۔"

"کیا مطلب... اسی نائٹ سوٹ میں؟"

"ہاں بھائی... فرض کرلو کہ رات ہے۔" وہ بولا۔ "کسی کو کیا کہ تم اپنے دماغ میں دن کو رات فرض کیے جا رہے ہو۔"

پانچ منٹ میں اس نے دروازے کو مقفل کیا اور ہم گاڑی تک جا پہنچے۔ اس نے سوٹ کیس ڈکی میں رکھوائے اور بے ہوش ڈرائیور کو پچھلی سیٹ پر ڈال دیا۔ میں نے چپّل اور نائٹ سوٹ میں پہلی بار کراچی جیسے بڑے اور ماڈرن شہر کی سڑکوں پر ڈرائیونگ شروع کی۔ مجھے حیرت ہوئی جب کسی نے مجھے گھور کے بھی نہیں دیکھا۔ غالباً ہمارا اپنا احساس ہمیں زیادہ پریشان رکھتا ہے کہ ہم کیسے نظر آ رہے ہیں۔ پتلون کی کریز... قمیص کے کالر کا داغ۔ ٹائی کی بھدّی ناٹ... ان سب کا خیال صرف ہمیں اندر ہی اندر شرمندہ کرتا ہے، ورنہ دوسروں کو نہ ان کی پروا ہوتی ہے نہ خبر... سب اپنے اپنے کام سے اپنے اپنے راستے پر جا رہے تھے اور کوئی کسی کے لباس پر غور نہیں کر رہا تھا۔ شاید میں صرف نیکر پہن کے بھی گاڑی چلاتا تو کچھ نہ ہوتا۔ کوئی دیکھتا بھی تو خود رک کر اور میرا راستہ روک کے مجھے شرمندہ کرنے کے لیے وقت ضائع نہ کرتا۔ زیادہ سے زیادہ دل میں کہتا کہ کیسے کیسے پاگل کے نیچے کاریں لیے پھر رہے ہیں... اور بس...

مجھے کراچی کی سڑکوں کا کوئی تجربہ نہیں تھا مگر میرا میزبان رننگ کمنٹری کرتا جا رہا تھا۔ قائدِ اعظم کے مزار کو مکمل دیکھ کر میں تھوڑا سا جذباتی ہو گیا تھا۔ "یہ کام بھی ہو ہی گیا بائیس سال میں۔"

"ہاں... ہم سلو موشن میں سوچتے اور کام کرنے لگے ہیں۔ اور قوتِ فیصلہ اور قوتِ عمل دونوں سے محروم ہو گئے ہیں۔" وہ بولا۔ "ایک وہ چینی ہیں... جناتی قوم... ہمارے بعد آزاد ہوئے تھے... سنتے ہیں تو یقین نہیں آتا کہ انھوں نے وہ کام دنوں میں کیے جو ہم نے سالوں میں کیے۔ آئین توڑے سو توڑے اب ملک کو توڑنے کے درپے ہیں۔ ہم جب بابائے قوم کے مزار کے سامنے سے گزرتے ہیں تو خود کو شرمندہ محسوس کرتے ہیں۔ کئی بار سوچا مگر ہمت نہیں پڑتی اندر جا کے فاتحہ پڑھنے کی۔ یہی خیال

آتا ہے جو ہمارے چچا غالب کو آیا تھا۔ کہ کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالب؟ ہم کیا منہ دکھائیں قائدِ اعظم کو۔ پاکستان کا یہ حشر کر کے...

"یہاں سے بائیں جانب موڑ لو... یہ وکٹوریہ روڈ ہے۔"

"ایک بات کہوں... بُرا تو نہیں مانو گے؟" میں نے کہا۔

"ہم جانتے ہیں تم کیا کہو گے... بُرا کیا ماننا۔" وہ ٹھنڈا سانس بھر کے بولا۔ "ہم بکواسی ہیں۔"

"نہیں... آپ صورت سے احمق نظر آتے ہیں۔ یا نظر آنے کی کوشش کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن حقیقت کے برعکس ہے۔"

"آپ اپنی صورت پر مت اترائیں زیادہ۔" وہ ... کے بولا۔ "ہم بتائیں گے آپ کو کہ آدھے شہر کی لڑکیاں اسی صورت پر فریفتہ ہیں۔"

"اور باقی آدھے شہر کی؟" میں نے ہنس کر کہا۔

"وہ اس قابل نہیں ہیں کہ ہم انھیں شمار کریں۔" وہ بولا۔ "وہ بس دیکھنے میں لڑکیاں نظر آتی ہیں... یہ فوارہ دیکھ رہے ہو؟"

"نہیں... ایک ستارہ نما چیز دیکھ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"یہ میوزیکل فاؤنٹین تھا۔" وہ بولا۔ "جب صدر آئزن ہاور نے پاکستان کا دورہ کیا تھا تو بنایا گیا تھا۔ اب صرف فوارہ ہے میوزک کسی نے نکال لی ہے یا ختم ہو گئی ہے۔"

ٹرال ہیٹر والول سے اس نے مجھے دائیں طرف چلنے کو کہا۔ وہاں کھڑے ہوئے سنتری نے افتخار کو سلام کیا۔

"یہ تمھیں پہچانتا ہے؟"

"ہمیں نہ جانے کتنے لوگ پہچانتے ہیں۔" وہ بولا۔

"پھر تو یہ اچھا نہیں ہوا۔" میں نے کہا۔ "اس نے تمھیں میرے ساتھ ادھر جاتے دیکھ لیا۔"

"یہ ہمیں ہر جگہ آتے جاتے دیکھتا ہے۔ کبھی نہیں روکتا۔"

"میرا مطلب تھا اس نے یہ کار دیکھ لی ہے۔"

"وہ ہر روز ہزاروں کاریں دیکھتا ہے... اور ان میں فرق نہیں بتا سکتا کہ کون سی فوکس ویگن تھی اور کون سی اوپل... دونوں میں اتنا ہی فرق ہے جتنا خر میں اور خرگوش میں۔"

"لیکن وہ رنگ اور حلیہ بتا سکتا ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ... کیسے بتا سکتا ہے... اور بتا سکتا ہے تو کیا ہم انکار نہیں کر سکتے۔" وہ جھلا کے بولا۔ "اس کے مقابلے میں تو ہماری ہی مانی جائے گی... ہم یہاں سے گزرے ہی نہیں کیونکہ ہم اس وقت سوئے ہوتے ہیں... سارا زمانہ جانتا ہے۔

یہ پل ہے۔ اس کے بعد کوئینز روڈ کے ڈرم ٹائپ بنگلے ہیں۔ ان میں زیادہ تر نیوی کے افسر رہتے ہیں مگر بہت سے خالی پڑے ہیں۔ حالانکہ الاٹ ہو چکے ہیں۔ ڈی ٹائپ ہیں جو افسران کو ملتے ہیں مگر وہ ان گول ٹین کی چھت والے بیرک نما کوارٹروں سے جان چھڑاتے ہیں۔ کوشش کرتے ہیں کہ گارڈن روڈ یا لارنس روڈ کی طرف چلے جائیں... نہ جا سکیں تو کرائے پر اٹھا دیتے ہیں۔ میرے پاس ایک بیرک کی چابی ہے۔"

"وہ کس کے نام الاٹ تھی؟"

"ہے ایک چھوٹا سا لاوارث محکمے کا افسر۔"

"یہ سڑک آگے کہاں جاتی ہے؟" میں نے کہا۔

"کیماڑی کی طرف... مگر تم اسی جگہ سے موڑ لو۔" وہ بولا۔

بیرک میں تالا ضرور لگایا گیا ہو گا مگر اُسے کسی زمانہ بدمعاش فیملی نے توڑ کر اندر ڈیرا ڈال لیا تھا۔ کار سے افتخار کو اترتا دیکھ کے وہ بدحواس ہو گئے۔ افتخار نے ان پر گرجنا شروع کیا۔ "باپ کی جاگیر ہے۔ سالے چور اُچکے... کیسے گھسے تم لوگ اندر اور وہ جو سامان تھا اندر ایک لاکھ کا وہ کہاں ہے؟ ابھی بلاتا ہوں پولیس کو۔ تمھاری روح تک قبض ہو جائے گی۔"

وہ افراتفری میں ہونقوں بچے اور گدڑیاں سمیٹ کر فرار ہوئے تو میں نے ایک ایسی عمارت دیکھی جس کے اوپر نیم دائرے سے ٹین کی چھت منڈھ دی گئی تھی۔ نیچے دیواریں کھڑی کر کے اور خانے بنائے گئے تھے۔ ٹین کی چھت کے نیچے گتّے اور ... کی جو چھت بنائی گئی تھی وہ اُدھڑ چکی تھی۔ دیواروں پر سوئچ پڑے تھے اور صرف دو ہولڈر اس قابل تھے کہ ان میں بلب لگائے جا سکیں۔ بے حد قدیم پنکھوں کو میں نے ریگولیٹر کی مدد سے چلایا تب مجھے کرنٹ لگا۔ افتخار "کھی" کر کے ہنسا۔

"میرا خیال ہے کہ پہلے گاڑی کو اندر کر دوں۔" میں نے خفت سے کہا۔

"گیراج باہر ہے۔" وہ بولا۔ مجھے حیرت ہوئی ... باہر جاتی ایک گیراج نما نیچی چھت والا کمرا تھا۔ اس کے پٹ بند تھے میں نے اُسے کھولا تو انکشاف ہوا کہ اندر ایک فقیر کا ڈیرا ہے۔ وہ غالباً ڈیوٹی پر جا چکا تھا۔ اس کا سارا کاٹھ کباڑ باہر پھینک کے میں نے گاڑی کو اندر داخل کیا۔ لمبی چوڑی کار نے پورے گیراج کو گھیر لیا اور دائیں بائیں صرف اتنی ہی جگہ باقی رہتی کہ دروازے کھولے جا سکیں۔ فقیر کے اسباب میں ٹین کا ایک کورا گھڑا بھی تھا۔ اس میں اوپر تک نوٹ ہی نوٹ ٹھونس کر بھرے گئے تھے۔

"یہ تمھارے لیے بہت محفوظ جگہ ہے۔" افتخار نے کہا۔ "تم اگر ایسی ویسی حرکت نہ کرو... تو..."

"ایسی ویسی حرکت سے تمھاری مراد ہے شراب پی کر غل غپاڑا اور عاشقی معشوقی...؟"

"نہیں... تم اپنی مجاہدانہ سرگرمیوں کو ایسی ویسی حرکت میں شمار کر سکتے ہو۔ جیسے جہاں مار دھاڑ ہونے لگے گولیاں چلیں اور بم پھینکے جائیں تو کیا ہو گا؟" افتخار نے کہا۔ "بس گمنام رہو جب تک رہنا ہے... ایسے کہ نہ کسی کو آنے کا پتا چلے نہ جانے کا... یہاں کوئی کسی سے سروکار نہیں رکھتا۔ کس نی پر سد کہ بھیا کون ہو۔"

"یہ ایک بڑا کام ہو گیا۔" میں نے کہا۔ "باقی مسائل میں حل کر لوں گا جن کا تعلق میری ذات سے ہے۔ مثلاً کھانے پینے اور سونے کا بندوبست... اصل کام جن کے لیے میں یہاں آیا ہوں وہ ہیں۔ پہلا کام ہے نازو کی تلاش... اس کے بعد الجبر کی... بڑا مسئلہ یہ ہے کہ رات کو تم مصروف ہوتے ہو اور دن تمھیں سونے کے لیے چاہیے۔ میرے معمولات اس کے برعکس ہوں گے... عام طور پر... چنانچہ اس تلاش میں تم میرا ساتھ نہیں دے سکو گے۔"

"یہ تو ہے۔" وہ سر کھجا کے بولا۔ "پھر بھی میرے لیے جو کام ہو وہ ضرور بتانا... میرے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔"

"ایک کام تو یہ کرو کہ مجھے کوئی گاڑی لے دو۔ ابھی راستے میں مجھے شو روم نظر آئے تھے۔ وہ سب پرانی گاڑیاں تھیں نا؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "پانچ ہزار سے پانچ لاکھ تک کی کار مل سکتی ہے۔"

"میں نے ایک دو جگہ زرد نمبر پلیٹ والی گاڑیاں دیکھی ہیں۔" میں نے کہا۔ "وہ ڈپلومیٹک مشن کی ہیں؟"

"ہاں... کونسلیٹ بہت ہیں یہاں۔"

"مجھے ایسی ہی گاڑی لا دو۔ ڈپلومیٹک نمبر پلیٹ والی۔"

"تم ذرا بھی ڈپلومیٹ نہیں لگتے۔" وہ مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھ کے بولا۔

"میں فرنچ پر عبور رکھتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "تھوڑی بہت جرمن بھی سمجھ اور بول لیتا ہوں... رہی شکل تو وہ میں کبھی ایک نہیں رکھتا۔ مجھے کسی ایکسپرٹ میک اپ مین کی خدمات درکار ہیں۔ تاکہ میں بے خوف و خطر پھر سکوں۔ تم نے دیکھا ہو گا کہ ایک سوٹ کیس میں جعلی دستاویزات کی فیکٹری بند ہے۔ بے شک وہ سارے جعلی پاسپورٹ ہیں مگر جب تک میں باہر جانے کے لیے کسی ہوائی جہاز یا بحری جہاز پر سوار ہونے کی کوشش نہیں کروں گا، اسے کون غور سے دیکھے گا۔ شہر کے اندر جو پولیس ہے وہ اصلی نقلی کے فرق کو سمجھ ہی نہیں سکتی۔ وہ تو بس میری شناخت کا ذریعہ ہو گا... اور مقامی پولیس سے محفوظ رہنے کا وسیلہ... میرے دشمن بھی مجھے نظر انداز کرتے رہیں گے اور میں سب کے درمیان رہ کے بھی سب

سے الگ رہوں گا... مجھے بندرگاہ کے علاقے میں بھی رہنا ہو گا... دو چار دن تو کم سے کم... اور وہ خطرناک جگہ ہو گی میرے لیے۔"

"ابھی کیا پروگرام ہے؟" وہ بولا "میں رات کے وقت آؤں گا تو گاڑی بھی لے آؤں گا اور میک اپ کرنے والے کو بھی۔"

"یہاں لاؤ گے اُسے؟" میں نے کہا۔

"اچھا تمھیں لے چلوں گا اس کے پاس۔" وہ بولا۔

"ابھی میں تمھارے ساتھ واپس چلوں گا۔" میں نے کہا "میرا بھوک سے بُرا حال ہے... تم چاہو تو سو جانا... میں ذرا اس بندے سے کچھ پوچھوں گا۔"

"میرے کوارٹر میں...؟"

"اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کے رکھوں گا۔" میں نے کہا "ابھی تو بے ہوش ہے اور مجھے تشویش ہو رہی ہے کہ ہوش میں نہ آیا تو کیا ہو گا۔ کوئی ڈاکٹر ہے بھروسے کے قابل؟"

"سب ہو جائے گا... یہ مر گیا تو اس کی تدفین بھی ہو جائے گی... تم کہو گے تو پوسٹ مارٹم بھی ہو جائے گا۔" وہ بولا۔

اچھا تو پھر تم ایک ٹیکسی لے آؤ... ہم واپس چلتے ہیں۔

ل مقصد اس کار کو چھپانا تھا اور ایک ٹھکانا حاصل کرنا تھا۔ میں خود کو بہت محفوظ سمجھ رہا تھا۔ کسٹم انسپکٹر اور پولیس کی رپورٹ پر میرا حلیہ اور کار کا نمبر مشتہر کرنے والے مجھے آسانی سے تلاش نہیں کر سکتے تھے۔ میں شہر میں خاموشی سے وارد ہونا چاہتا تھا لیکن نہ جانے کیسے تستاری میرے پیچھے لگ گئے اور نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے ایک معرکہ سر کرنا پڑا۔ وہ ٹرک کس کا تھا اور کہاں گیا وہ شاید اب اس کا پتا افتخار عارف بھی نہ چلا سکے مگر ٹرک کے مالکان یقیناً شہر میں اپنے کارندوں کو چوکس کر دیں گے کہ شکار نکل گیا۔ میرا گمان کہتا تھا کہ ڈرائیور اس بدمعاش حاجی عبداللہ کا کتا ہو سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ایک کلینر بھی ہو گا... وہ اس واردات کی پوری رپورٹ آگے پہنچائے گا۔

افتخار عارف نے راستے میں ایک جگہ ٹیکسی روکی۔ یہ اس کے کسی جاننے والے ڈاکٹر کا گھر تھا۔ وہ بھی نوجوان ڈاکٹر تھا اور افتخار سے خاصا بے تکلف تھا۔ اس نے ڈرائیور کو باہر آ کے ٹیکسی میں ہی دیکھا... وہ پچھلی سیٹ پر بے سُدھ پڑا ہوا تھا۔

"کیا ہوا تھا... آخر گرا کیسے...؟" ڈاکٹر نے اس کی نبض دیکھی۔

"کیا میں گر کے بتاؤں... یا تمھیں گرا کے دکھاؤں... یہاں کوئی زینہ ہے؟"

یہ چوٹ...؟ ڈاکٹر نے سر پر ایک جگہ اُبھار دیکھ کر مشتبہ لہجے میں کہا "نیچے کوئی کنکر پتھر تھا؟"

"کنکریٹ... سانڈ کا پتھر ہوتا ہے... اور پتھر لس سانڈ کا ہو تو کنکر شمار ہوتا ہے؟" وہ بولا۔

ایسے بھی... اس کے سر میں یہ چوٹ کیسی ہے؟"

بیوی نے مجھے چمٹا کھینچ کے مارا تھا۔ اس نے اپنا سر آگے کر دیا۔ تو سراغ رسانی چھوڑ، علاج کر۔"

"اس کیس میں آبزرویشن ضروری ہے۔" ڈاکٹر نے کہا "خیر میں ایک انجکشن دے رہا ہوں... اگر اُلٹیاں نہیں آ رہی ہیں تو ممکن ہے یہ ہیمرج نہ ہو۔ کن کشن کا اثر ہو... جھٹکے سے مغز ہل جاتا ہے۔ دو تین گھنٹے میں ہوش نہ آیا تو پھر ہسپتال لے جانا پڑے گا۔ سر کا ای ای جی کرانے کے لیے۔"

وہ اندر گیا اور پھر باہر آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک سرنج تھی۔ اس نے ڈرائیور کے بازو میں سوئی اتار دی۔

"یہ دوائیں لے لینا۔" اس نے ایک پرچی افتخار کو تھما دی۔

"تیری منگیتر کا کیا حال ہے؟" افتخار ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے بولا۔

"اسے فون مت کیا کر... وہ تیرے جال میں نہیں پھنسے گی۔"

"میں اسے اغوا کر کے بھی لے جا سکتا ہوں... مگر سوچتا ہوں جلدی کیا ہے، تیری شادی کے بعد سہی۔" افتخار نے کہا۔

"اپنی شادی سے پہلے میں تجھے سانڈ کا انجکشن لگا دوں گا... یا لگوا دوں گا... ویسے میں سکھیا دے دوں گا۔" ڈاکٹر بولا۔ اور واپس گھر میں گھس گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور دم بخود بیٹھا تھا۔

افتخار نے اُسے ڈانٹا "تم چلو گے اب یا میں دھکا دوں؟"

★★★
★★★

ہم دونوں ٹرک ڈرائیور کو اُٹھا کے اندر لے گئے اور ایک پلنگ پر لٹا دیا۔

"اس کے ہوش میں آنے سے پہلے مجھے نہا دھو لینا چاہیے اور تمھیں ناشتا وغیرہ تیار کر لینا چاہیے۔" میں نے کہا۔

"میں ناشتے کا عادی نہیں ہوں۔ عموماً لنچ ہی کرتا ہوں، مگر تمھارے لیے پوری چھولے لا دیتا ہوں۔" وہ بولا۔

"ایک بات تو بتاؤ۔" میں نے کہا "جب میں آیا تھا تو تمھارا اندازِ گفتگو... طور طریقہ سب مختلف تھا۔"

وہ ہنسا "دو دن سے میں یہی رول کر رہا تھا۔ ایک خبطی شخص کا... جو شاعر بھی ہے۔ تمھاری نازو کے بارے میں جو رپورٹ میں نے حاصل کی، وہ بھیس بدل کے حاصل کی تھی۔ ایک کسٹم آفیسر ہیں جو بڑے شاعر پرست بنتے ہیں۔ ان کے توسط سے ممنوعہ علاقوں تک پہنچا اور اب تم سے کیا چھپانا۔ ایک بنگالی کسٹم افسر اور اس جہاز کے کپتان کا لنک بھی دریافت کر لیا۔"

"اس جہاز کا نام کیا ہے؟"

"ایس ایس کرانتی تھرڈ۔" وہ بولا۔

"ابھی بندرگاہ میں موجود ہے؟"

"ہاں... ایک ہفتے بعد سیل کرے گا۔" وہ بولا "تم اس کے چکر میں مت پڑنا... میرا کیس بھی خراب کر دو گے۔ میں اس بنگالی کو رنگے ہاتھوں پکڑوانے کے لیے جال پھیلا چکا ہوں۔ وہ کلیئرنس میں مدد دیتا ہے۔"

"کس چیز کی کلیئرنس میں؟"

"غالباً اسلحہ... کریٹ پر تو لکھا ہوتا ہے کہ ٹوٹنے والا سامان۔ اور وہ سارے نشانات بنے ہوتے ہیں۔ تیر کا اور چھتری کا۔ یعنی بارش سے بچائیے اور سیدھا رکھیے۔ ہُک مت استعمال کیجیے۔"

میں نے فقط سر ہلایا اور نہانے کے لیے غسل خانے میں گھس گیا۔ وہاں شاور وغیرہ کچھ نہیں تھا۔ مجھے بالٹی اور مگ استعمال کرنا پڑے۔ میں نہا کے فارغ ہوا تو افتخار ناشتے کا بندوبست کر چکا تھا۔ ناشتے کے بعد وہ باہر نکل گیا اور میں سگریٹ سلگا کے ٹرک ڈرائیور کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنے لگا۔ انجکشن کے اثرات ظاہر ہونے لگے تھے اور وہ ہاتھ پیر ہلا کے اوں آں کر رہا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور پھر ہاتھوں کو کمر کے پیچھے کر کے باندھ دیا تاکہ وہ پٹی نہ ہٹا سکے۔

ایک گھنٹے بعد وہ اس حد تک ہوش میں آ چکا تھا کہ میں نے اُسے سہارا دے کر بٹھایا اور ایک مگ سیاہ کافی زبردستی پلا دی۔ اس دوران میں آواز بدل کے اسے تسلی دیتا رہا کہ وہ بالکل پریشان نہ ہو۔ اسے واپس کراچی پہنچا دیا جائے گا۔

"لیکن... میں ہوں کہاں؟"

"تم حیدرآباد میں ہو..." میں نے کہا "تمھیں کچھ یاد ہے تمھارے ساتھ کیا ہوا تھا؟"

اس نے رک رک کے وہی بتایا جو ہوا تھا۔

"وہ کون تھا جس نے تمھارے سر پر ریوالور مارا تھا؟"

"مجھے نہیں معلوم... مجھ سے تو بس یہ کہا گیا تھا کہ... تم کو پولیس پکڑے گی... ڈرنا نہیں... وہ تم کو روکے رکھیں گے۔ پھر تمھارے پیچھے ایک کار آ جائے گی... کہہ دینا وہ ٹرک کا مالک ہے۔ اسے بھگا لے جائیں تو تم بھی چلے جانا... تمھیں کچھ نہیں ہو گا۔"

"کس نے کہا تھا یہ سب؟"

"وہ حاجی صاحب کا خاص آدمی ہے۔" وہ بولا۔

"مکرانی ٹائپ... کانوں میں مُندریاں پہنتا ہے؟" میں نے کہا۔

"ہاں جی... آپ جانتے ہو اسے؟"

"ہاں... وہ تمھیں کہاں ملا تھا؟"

"ملتان میں جی۔"

"اور تم نے یہ سب کیوں کیا؟ ڈر کی وجہ سے یا لالچ میں؟"

"دونوں ہی باتیں ہیں جناب۔"

میں نے محسوس کیا کہ وہ سخت ڈرا ہوا ہے۔ شاید اس نے ایسے کام پہلے کبھی نہیں کیے تھے اور اسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ اس کا انجام کیا ہو گا۔ مجھے اس پہ ذرا بھی تشدد نہیں کرنا پڑا۔ وہ خود ہی سب کچھ بتا رہا تھا۔ ساری سازش پیڈرو کی تھی... وہ ملتان سے میرے پیچھے لگا رہا۔ میرے غائب ہو جانے کے بعد اس نے بیکی اور جونی پر نظر رکھی اور مظفر گڑھ سے واپسی پر جب میں نے دوبارہ ان سے رابطہ قائم کیا تو پیڈرو کی محنت ٹھکانے لگی۔ اس نے وہیں دیکھ لیا ہو گا کہ مجھے کون سی کار فراہم کی گئی ہے۔ یا اسے یہ بات بعد میں پتا چلی ہو گی۔ سلطان محمد خان کے بیٹے ملتان میں اپنی پہچان رکھتے ہیں۔ کسی کار ڈیلر نے تصدیق کر دی ہو گی کہ آج ان کے ایک صاحبزادے نے فلاں کار خریدی ہے۔ میرے اچانک حیدرآباد میں رُک جانے سے اس کے پلان میں خلل پڑا ہو گا مگر دوسری رات وہ کامیاب رہا۔

"تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ... میں آ رہا ہوں؟"

"ہم ٹول پلازا سے ایک میل پیچھے کھڑے تھے جی۔" وہ بولا۔

"ہم کون؟"

"میں اور وہ... استاد پیڈرو نام ہے، شاید اس کا... صرف ایک بار حاجی صاحب کے منہ سے سُنا تھا۔"

"تم نے ٹھیک سُنا تھا۔" میں نے کہا۔

"اچانک اس نے کہا کہ گاڑی آ گئی... تم اب ٹرک لے کر جاؤ... اور پھر وہ خود اُتر گیا۔"

"اُتر کے کہاں گیا؟"

"اپنی کار میں واپس حیدرآباد۔" ڈرائیور نے کہا۔

"ٹرک میں تم کیا لائے تھے؟"

"سبزیاں اور پھل۔" وہ بولا۔

"تمھیں یقین ہے کہ اس میں اسلحہ نہیں تھا؟"

"ہو گا جی... یا نہیں ہو گا... مجھے کیا معلوم...؟"

"وہ تم پہ بھروسا کرتے تھے... تم ان کے وفادار اور نمک خوار تھے۔" میں نے کہا "تم اعتبار کے قابل نہ ہوتے تو نہ وہ ٹرک تمھارے سپرد کرتے اور نہ تم سے ایسا کام کرنے کو کہتے۔"

"مجھے معلوم ہے جی۔"

"پھر یہ تم کیا کر رہے ہو... سب کو بتا رہے ہو... کیا تمھیں واپس نہیں جانا ہے۔" میں نے کہا۔ "تمھیں ڈر نہیں ہے جان کا؟"

"میں نے کون سی ایسی بات بتائی ہے... جو پیڈرو نے کہا تھا وہ میں نے کیا۔ وہ جانے اور حاجی صاحب جانیں...

یہاں جو کچھ ہوا تھا، وہ میری غلطی سے تو نہیں ہوا تھا۔ ویسے بھی یہ میرا آخری پھیرا تھا۔"

"کیا مطلب؟"

"میں واپس نہیں جا رہا ہوں۔" وہ بولا۔ "میں تو پھنس گیا تھا لیکن وہاں سے نکلنا آسان نہیں تھا... اب میں کراچی جاؤں گا۔ وہاں میرے بھائی کا گھر ہے۔ اس نے میرے لیے ویزے کا بندوبست کر لیا ہے۔"

"کس ملک کے لیے؟"

"سوڈان کے لیے... وہ خود بھی وہیں ہے۔ میں نے آپ کو اس لیے سچ بتا دیا ہے جناب کہ آپ مجھے مار و نہیں... میں آپ کا دشمن نہیں ہوں... میں مجبور تھا... میری غلطی کو معاف کر دو۔" وہ ایک دم رونے لگا۔

"اچھا... رونے کی ضرورت نہیں... میں تصدیق کروں گا تمہارے بھائی کے گھر سے... اگر یہ سب جھوٹ نہ ہوا تو تم جا سکو گے۔" میں نے کہا۔

میرا یہ خیال غلط ثابت ہو گیا تھا کہ میری ملتان میں موجودگی کا کسی کو علم نہیں... پیڈرو نے میرا سراغ لگا لیا تھا۔ چنانچہ اب مجھے یہ فکر بھی لاحق ہو رہی تھی کہ ان کا کیا ہو گا جنھیں میں جونی کی تحویل میں چھوڑ آیا تھا۔ کیا وہ موتی اور نواب خسرو جمشید کی حفاظت کر لیں گے؟

"تم اپنے بھائی کے گھر کا پتا بتاؤ۔" میں نے کہا۔

"کراچی میں اس کی بیوی کا گھر ہے... وہ اپنے بھائی کے ساتھ رہتی ہے۔" وہ بولا۔

"کہاں؟ مکان نمبر گلی نمبر...؟"

"جیکب لائن میں جھگی ہے جی۔" وہ بولا۔ "آپ نظامی روڈ سے اندر جائیں۔"

"یہ نظامی روڈ کہاں ہے؟"

"نظامی روڈ کا نہیں پتا جی آپ کو!" وہ قدرے حیران ہوا۔ "پرانی نمائش کے چوک سے اُلٹے ہاتھ کو جو سڑک اندر جا رہی ہے... گونگے بہروں کے اسکول کے سامنے سے... وہی تو ہے نظامی روڈ... آگے جا کے بریگیڈ تھانے کے قریب ایک کوارٹر کے ساتھ ہی جھگی ہے۔"

"کوارٹر کا کیا نمبر ہے؟"

"وہ تو مجھے معلوم نہیں... میں سیدھا جھگی تک پہنچ جاتا ہوں، آپ پانی والے کو پوچھ لینا۔ میرے بھائی کا سالا ہے۔ اُسے سب جانتے ہیں۔" وہ بولا۔

مگر میں اس کی بہت کم سُن رہا تھا اور اپنے خیالوں میں زیادہ کھویا ہوا تھا۔ اگر پیڈرو نے جیکی یا جونی کا پیچھا کر کے میرا پتا چلایا ہو گا تو اس بات کا امکان بھی پیدا ہو جاتا تھا کہ وہ فارم ہاؤس میں موتی اور خسرو جمشید کی موجودگی کے راز سے بھی واقف ہو جائے۔ وہ موتی کو مار ڈالے گا۔ خیر اس کا مرنا کیا اور جینا کیا، خود میں ابھی تک طے نہیں کر سکا تھا کہ اس کا کیا کروں۔ مگر وہ خسرو جمشید کو لے گئے تو میرا سارا معاملہ چوپٹ۔ اس نے جو وعدہ کیا تھا، وہ وزیر ہسپتال کی تعمیر اور رہن نامہ میرے وکیل کے نام کر دے گا اور ہسپتال کی تکمیل کے لیے ضروری سرمایہ بھی فراہم کرے گا۔ یہ سودا تو ہونے سے پہلے ہی ختم ہو جائے گا۔

اس خیال نے مجھے اتنا مضطرب کیا کہ میں ٹرک ڈرائیور کو وہیں چھوڑ کے جانے کی سوچنے لگا۔ کہیں نہ کہیں سے مجھے ملتان فون کر کے صورتِ حالات کا پتا کرنا تھا۔ جیکی اور جونی کو خبردار کرنا تھا۔ لوکل کال ہوتی تو میں کہیں سے بھی کر سکتا تھا مگر ٹرنک کال کے لیے مجھے ٹیلی فون ڈیپارٹمنٹ کے کسی پی سی او تک جانا ہو گا... رات کو کراچی کے قریب آ کے واپس لوٹنے والا پیڈرو اگر ابھی تک ملتان نہیں پہنچا ہو گا تو پہنچنے ہی والا ہو گا۔

میں نے ابھی تک ڈرائیور کے صرف ہاتھ باندھے تھے۔ اب میں نے اس کے پیر بھی چارپائی کے ساتھ باندھ دیے۔ اس کے لیے میں نے چارپائی کو ٹائٹ رکھنے والی رسّی بھی استعمال کی۔ اس کے مُنہ میں کپڑا ٹھونس کے میں نے اُسے تاکید کی کہ وہ فرار ہونے کی کوشش بھی نہ کرے، ورنہ وہ مارا جائے گا اور پہنچانے والے اُسے سوڈان نہیں قبرستان پہنچا دیں گے۔

ڈھونڈنے پر مجھے وہاں ایک ہی تالا ملا۔ افتخار کمرے کے کسی دروازے کو مقفل نہیں کرتا تھا۔ کہیں جاتے وقت وہ باہر کے دروازے میں بھی اس لیے تالا ڈال دیتا تھا کہ ملاقات کے لیے آنے والوں کو اس کی عدم موجودگی کی خبر دے سکے۔ کسی چور کے لیے تالا ایک دعوت نامہ ہوتا ہے لیکن پاکستان کے اس نامور مگر غریب صحافی کے گھر میں آ کے چور بھی شرمندہ ہوتا جہاں... سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں والی بات تھی... زیادہ سے زیادہ وہ فلپس کا ایک بینڈ کا ریڈیو لے جا سکتا تھا جس کی قیمت سو سوا سو روپے تھی۔ باقی میلے کپڑے تھے۔ میلے برتن تھے اور چور کے نقطۂ نظر سے باقی جو کچھ تھا، وہ کئی من ردّی تھی... یہ ردّی ہی اس پڑھے لکھے آدمی کا سرمایۂ افتخار تھی۔ ذریعۂ معاش تھی اور شوق کا سامان تھی۔ دنیا بھر کے مختلف اخبارات و رسائل اور ان کے تراشے، خصوصی مضامین، حوالے اور جائزے۔ اس کی یہ ذاتی لائبریری اس نے نہ جانے کتنے برسوں تک مسلسل جستجو اور جدوجہد کے بعد بنائی تھی۔

میں اپنا سوٹ پہن کے اور دروازے کو باہر سے تالا لگا کے نکل گیا۔ مین روڈ کوئی ایک فرلانگ دُور تھی... دونوں جانب ایک سے بنے ہوئے ایف اور ای ٹائپ کوارٹر تھے۔ طبقاتی تقسیم کی ایک بنیاد معاشی خوشحالی یا بدحالی ہے۔ نچلا طبقہ... نچلا متوسط طبقہ... متوسط طبقہ... اور بالائی طبقہ... سرکاری قواعد و ضوابط میں یہ تقسیم اسکیل اور گریڈ کے حساب سے الگ چلتی ہے اور تنخواہ کے فرق کے حساب سے الگ... پونے تین سو سے نیچے والے کو ایف ٹائپ۔ چار سو تک والے کو ای ٹائپ... ساڑھے سات سو تک لینے والے کو ڈی ٹائپ... اس سے اوپر سی ٹائپ۔ چنانچہ پرانا کلرک اور نیا افسر ڈی ٹائپ میں یوں ساتھ ساتھ رہتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا، محمود و ایاز آج بھی ایک صف میں ہیں۔ عملاً ایسا نہیں تھا۔ گریڈ سترہ کے افسر کا پڑوسی گریڈ گیارہ کا اسسٹنٹ ہے تو ان کے درمیان چھ گریڈوں کا فاصلہ ہے وہ پڑوسی کی حیثیت سے برابر کیسے ہو سکتے ہیں۔ ہمسائے ماں جائے کیسے ہو سکتے ہیں؟ ان سب اخلاقی و مذہبی تعلیمات پر کیسے عمل کر سکتے ہیں جن سے گریڈ کا فرق ہی نہ رہے۔ افسران کو یہ رہائشی فارمولا سخت ناپسند تھا۔ وہ تو چاہتے تھے کہ سیدھا سیدھا طریقہ یہ ہو کہ کلاس ون گزیٹڈ افسر کو سی کلاس۔ کلاس ٹو کو ڈی کلاس۔ اس کے نیچے بھی گریڈ کے حساب سے... آقا اور غلام میں مساوات کی تلقین کرنے والے مذہب کے پیروکار انگریز کے بنائے ہوئے قوانین کے اب تک اسیر تھے جس کی پالیسی ہی یہ تھی کہ تقسیم کرواؤ حکومت کرو... علامہ فرماتے ہیں تو فرماتے رہیں کہ کیوں حاکم و محکوم میں حائل رہیں پردے۔ حضرت عمر فاروقؓ کے اپنے غلام کے ساتھ سلوک کی مثال بچوں کو پڑھانے کے لیے اچھی ہے۔

بڑی سڑک پر آ کے میں رک گیا۔ ٹریفک کا ایک سیلِ رواں تھا جو میری نگاہوں کے سامنے سے گزرتا جا رہا تھا... مجھے اپنے بائیں ہاتھ پر ایک بینک کی شاخ دکھائی دی۔ اس کے ساتھ ہی گورنمنٹ کا یوٹیلٹی اسٹور تھا۔ ایک جگہ ... ہی نہیں تھا دوسری جگہ خراب تھا۔ انکار کا ایک تماشا ... بھی ہے۔

"دیکھیے مجھے ایک بہت ضروری کال کرنی ہے ملتان۔"

"آپ صدر چلے جائیں... یا پھر ادھر عزیز آباد۔"

"میں کراچی کی سڑکوں سے بالکل ناواقف ہوں... یہ بتا دیں کہ کون سی جگہ زیادہ آسانی ہو گی؟" میں نے کہا۔

"آسانی تو تیسری جگہ ہو گی۔" وہ بولا۔ "میکلوڈ روڈ پر چلے جائیں ٹیلی گراف ہاؤس۔"

تقریباً پون گھنٹا میں نے کسی سواری کے انتظار میں گزار دیا۔ اوّل تو کوئی رکشا ٹیکسی خالی گزر رہی ہی نہیں۔ جو گزر رہے تھے، وہ مخالف سمت میں جانے کا اشارہ کر کے پوچھتے تھے کہ بھئی ہم تو ادھر جا رہے ہیں۔ چلنا ہے تو چلو ورنہ خدا حافظ! اپنی بے بسی پر تاؤ کھانا بھی بے کار تھا۔ غالباً یہی افراطِ زر ہے کہ پیسہ جیب میں ہو مگر چیز نہ ملے۔ بسوں کا یہ حال تھا کہ لوگ دروازوں کھڑکیوں سے چمٹ کر لٹکے ہوئے تھے اور میں حیران پریشان یہ دیکھ رہا تھا کہ ان میں سے ایک بھی ٹپک کر نیچے نہیں گرتا۔

مجھے ولایت یاد آیا... وہاں سرِ راہ کھڑے ہوئے عورت یا مرد کو لفٹ مانگنے کے لیے صرف انگوٹھے سے اشارہ کرنا کافی ہوتا ہے۔ ورنہ کوئی نہ کوئی خود ہی رک کر پوچھ لیتا ہے کہ کیا بات ہے؟ یہاں کاریں زن زن گزرتی جا رہی تھیں۔ میں نے دل کڑا کر کے دو چار کو اشارہ بھی دیا مگر نتیجہ صفر رہا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میں اسی جگہ بے ہوش ہو کے گر جاؤں تب بھی کوئی رُکے گا نہیں... لندن میں آدمی سڑک پر گر جائے یا بیٹھ جائے تو سب رک جائیں گے۔ چند منٹ میں ایمبولینس تک موجود۔ یہ احساس مجھے الگ پریشان کر رہا تھا کہ میرا سرِ عام اپنی نمائش کرنا خطرے کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ نہ جانے کتنے لوگ جو مجھے پہچانتے ہیں میری تلاش میں ہیں۔

پھر ایک معجزہ رونما ہوا۔ ایک ٹیکسی میرے قریب سے گزری اور چند قدم کے فاصلے پر رک گئی... میں اس کی طرف لپکا۔

"بھائی... مجھے ایک بہت ضروری کام سے وہاں جانا ہے... ٹیلی فون ہاؤس... میکلوڈ روڈ پر کہیں ہے... میں سو روپے دوں گا تمھیں۔" میں نے کہا۔

"بیٹھو..." ٹیکسی ڈرائیور نے پلٹ کر دیکھے بغیر بڑی نخوت سے کہا جیسے میری درخواست کو شرفِ قبولیت بخش کے اس نے مجھ پر احسان کیا ہو۔

"عجیب شہر ہے۔" میں نے ماتھے سے پسینہ صاف کر کے کہا۔ "آدمی مرتا ہو تو مر جائے... کوئی اسے ہسپتال لے جانے کے لیے راضی نہیں ہو گا۔ لے جائیں گے تو اپنی مرضی سے جدھر وہ جا رہے ہیں... کوئی اخلاق نہیں کوئی قانون نہیں۔ بھئی میں اپنی مرضی سے وہاں جاؤں گا جہاں مجھے جانا ہے۔ پیسے پورے دوں گا بلکہ زیادہ ہی دوں گا۔" میں اتنا برہم تھا کہ میں نے دل کا بخار نکالنے کے لیے ٹیکسی ڈرائیور کو ہدف بنائے بغیر ایک پُرمذمت تقریر جاری رکھی۔

"تمھارے پاس بہت پیسہ ہے؟" ٹیکسی ڈرائیور بولا۔

"بہت... کیا مطلب؟" میں نے چونک کر کہا۔ "اور ہے تو تمھیں کیا؟"

"دن میں سو سو کے کتنے نوٹ تقسیم کرتے ہو... اپنی گاڑی کیوں نہیں خرید لیتے؟"

مجھے اس کے مشورے اور رویّے دونوں پر غصہ آیا مگر میں نے کہا۔ "یہی کروں گا... مگر ذرا فرصت تو ملے... ایک دوست نے کہا ہے... شام تک وہ کرپی دے گا کسی نہ کسی گاڑی کا بندوبست۔"

"جیب میں پیسے ہیں تو انتظار کیسا... یہ ٹیکسی خرید لو۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ "یہ ٹیکسی... تمھارا مطلب ہے ٹیکسی چلاؤں میں؟" میں نے کہا۔

"ٹیکسی بھی کار ہی ہوتی ہے۔" وہ بولا۔ "ذرا رنگ مختلف ہوتا ہے... چار پیسے بھی کما لو گے چلتے پھرتے۔"

"تھینک یو... جس دن یہ پیشہ اختیار کرنے کا سوچا اس دن تمھیں بتادوں گا۔" میں نے کہا۔ شہر ہی نہیں یہاں کے رہنے والے بھی عجیب تھے۔ رکشا میں ہوتا تو وہ کہتا رکشا خرید لو۔ بس میں جاتا تو وہ بس برائے فروخت پیش کر دیتا۔

"یہ ٹیلی گراف ہاؤس ہے۔ ٹیلی فون ہاؤس نہیں ہے۔ وہ دیکھ لو اوپر لکھا ہوا ہے۔" اس نے ٹیکسی ایک پختہ فرش والے احاطے میں روک دی۔ میں نے سو کا نوٹ اس کی طرف پھینکا اور اندر چلا گیا۔ وہاں ٹیلی فون کرنے والے ایک انار سو بیمار والا سین پیش کر رہے تھے۔ ایک بوتھ لیڈیز کے لیے تھا۔ دوسرا لوکل کال کے لیے۔ دو فون خراب تھے۔ باقی دو کے لیے دو قطاریں تھیں۔ ایک کال بک کرانے والوں کی... ایک اپنی باری کا انتظار کرنے والوں کی... لیکن اس مشکل کا کوئی حل نہیں تھا، چنانچہ میں صبر و ضبط کی پریکٹس کرتا رہا۔

جب بالآخر میری باری آئی تو کھڑے کھڑے میری ٹانگیں اکڑ چکی تھیں۔ "کون... جیکی...؟"

"نہیں... میں جونی بول رہا ہوں... تم سکندر..."

"ہاں... دیکھو وقت کم ہے... یہ بتاؤ وہاں سب خیریت ہے نا... میرے پیچھے تو اس خبیث نے آدمی لگا دیے تھے۔" میں نے کہا۔

"یہاں بھی گڑبڑ ہو جاتی... خدا نے بچا لیا ہمیں... رات کو نہ جانے کتنے لوگوں نے فارم ہاؤس پر حملہ کیا تھا۔ باقاعدہ اسٹین گن اور دستی بم لے کر آئے تھے وہ لوگ۔"

"اوہ مائی گاڈ... پھر کیا ہوا؟"

"ہم وہاں نہیں تھے۔" جونی بولا۔ "تمھاری امانت کو ہم نے منتقل کر دیا تھا... اپنے تہ خانے میں... لیکن وہ لڑکی؟"

"اُسے کیا ہوا...؟"

"حملہ آور اسے لے گئے یا... وہ اندر ہی جل کے راکھ ہو گئی۔ بے چارہ مالی سب سے پہلے نشانہ بنا... فارم ہاؤس اب ایک ملبے کا ڈھیر ہے اور ابھی تک تو پولیس کو کچھ نہیں ملا ہے... موہنی کی

لاش بھی نہیں ملی... ڈیڈ بہت پریشان ہیں کیونکہ ان کا دشمن کوئی نہیں... انھوں نے کوٹھی کے چاروں طرف گارڈ کھڑے کر دیے ہیں... میں اور جیکی بالکل باہر نہیں نکل سکتے۔ گارڈ ساتھ لیے بغیر۔"

"تمھارا فون تو ٹیپ نہیں ہو رہا ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم...!" وہ بہت نروس ہو رہا تھا۔

میرا دل بیٹھ گیا۔ "اچھا... اب جو ہوا سو ہوا... میری وجہ سے تم پر یہ آفت آئی۔"

"اوہ نو... ہم نے تمھیں..."

"شٹ اپ... ذرا سوچ سمجھ کے بات کرو۔" میں نے کہا۔ "تم اس شخص کو اپنے گھر سے شفٹ کر دو۔ کسی محفوظ مقام پر۔"

"ہمارے تہ خانے سے زیادہ محفوظ مقام کوئی نہیں۔"

"تم سمجھتے کیوں نہیں... دشمن بھی تو اندر ہیں... گولی مار ڈالے گا اسے... جب تک ہمارا کام نہ ہو جائے اس کا زندہ رہنا ضروری ہے۔"

"پانچ منٹ ختم ہو گئے۔" کسی کرخت آواز والے آپریٹر نے کہا اور لائن کاٹ دی۔

"ہیلو... ہیلو... ٹائم بڑھا دو..." میں نے کریڈل کو بار بار دبا کے کہا مگر لائن ڈیڈ ہو چکی تھی... میرے باہر آنے سے پہلے گھنٹی پھر بجی۔

"تاندلیانوالہ سے بات کریں... گلاب دین۔"

"گلاب دین۔" کاؤنٹر پر سے کسی نے چلّا کے کہا۔ "چل بھئی تیری باری..."

میں سخت اشتعال کے عالم میں باہر نکلا۔ "آخر یہ کیا بیہودگی ہے... ابھی تو میں بات کر رہا تھا۔"

"آپ کے پانچ منٹ ہو گئے تھے۔" بکنگ کلرک بولا۔

"میں نے کب کہا تھا کہ مجھے پانچ منٹ بات کرنی ہے؟"

"تو کیا آدھا گھنٹا بات کرنی تھی؟" وہ سر اٹھائے بغیر بولا۔

"یہ میری مرضی... آدھا گھنٹا بات کروں یا ایک گھنٹا۔" میں نے غصے سے کہا۔ "پیسے مجھے دینے تھے۔"

"یہ پبلک کال آفس ہے... آپ اپنا فون لگوالیں۔" اس نے مجھے مشورہ دیا۔ میں نے اس کے جھانپڑ مار کے اسے کرسی سمیت لڑھکانے کی خواہش پر بڑی مشکل سے قابو پایا اور پیر پٹختا ہوا باہر کی طرف چل پڑا... بہت سے لوگ میرے چراغ پا ہونے سے محظوظ ہوئے۔ ایک اجنبی شہر میں خود کو بے بس اور سب کے لیے باعثِ تفریح سمجھنا بہت ناخوشگوار تجربہ تھا۔

نامکمل گفتگو کے باعث میرے اضطراب اور تشویش میں اضافہ ہو گیا تھا۔ ایک عجیب بے یقینی کی سی کیفیت تھی۔ جونی کا

یقین غلط بھی ہو سکتا تھا اور جیسے ان کے فارم ہاؤس پر حملہ ہوا تھا ویسے ہی حملہ کرنے والے ان کے محافظوں کی فوج کو شکست دے کر کوٹھی میں بھی داخل ہو سکتے تھے اور خسرو جمشید کو چھڑا کر لے جا سکتے تھے۔ اس جنگ و جدل میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ باپ مارا جائے یا دونوں بیٹے مارے جائیں۔ صرف اور صرف میری وجہ سے۔ یہ بڑا سنگین احساسِ جرم تھا جس سے نجات حاصل کرنے کی صورت کوئی نہیں تھی۔ میں صرف خواہش کر سکتا تھا اور دعا کر سکتا تھا کہ اللہ ان دونوں جوانوں کو بچائے جو ابھی خود کو بچانے کا ہنر نہیں جانتے اور یہ نہیں جانتے کہ ان کے مقابل کتنے خطرناک شکاری ہیں۔

موہنی کی طرف سے میری فکر اپنی جگہ تھی۔ اگر اس کی لاش نہیں ملی تو اس کا صاف مطلب یہی نکالا جا سکتا ہے کہ اسے کوئی لے گیا یا وہ خود جان بچا کے فرار ہو گئی۔ مگر فرار ہوتی تو وہ سلطان محمد خان کی پناہ گاہ کا رخ کرتی۔ اسے کون لے جا سکتا ہے؟

اس سوال کے ذہن میں آتے ہی میرے لیے اندیشوں کا نیا باب کھل گیا۔ کہیں اسے وہی درندے تو نہیں لے گئے جن سے میں نے اس کی بے آبروئی کا انتقام لیا تھا۔ ان کے بھی تو ساتھی ہوں گے جن کو میں نے منصف بن کے سزائے موت دی تھی۔ ایک چھوٹے سے علاقے میں کسی گاڑی کی نقل و حرکت کا سراغ لگانا ممکن نہیں۔ انھوں نے لوگوں سے پوچھ لیا ہو گا۔ جہاں سے انھیں ٹریکٹر ملا ہو گا وہیں سے معلوم ہوا ہو گا کہ ایک فاکس ویگن چوری ہوئی ہے۔ فاکس ویگن کو اسٹارٹ کرنے کے لیے میں اسے ٹریکٹر کے پیچھے باندھ کر دور لے گیا تھا... اور پھر؟ ہاں... میں نے وہ رسی ٹریکٹر سے بندھی ہوئی چھوڑ دی تھی۔ انھوں نے پولیس سے مدد لی ہو گی۔ اپنے کتے چھوڑ دیے ہوں گے اور معلوم ہو گیا ہو گا کہ فاکس ویگن ملتان میں کہاں کہاں سے گزری تھی اور بالآخر کہاں گئی تھی۔ یا پھر جونی اور جیکی میں سے کوئی اسے واپس چھوڑنے گیا ہو گا تو پکڑا گیا ہو گا... مگر وہ سلطان محمد خان کا بیٹا تھا۔ اس پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا تھا... مگر اس کے ذریعے سے معلوم کرنے والوں نے پتا چلا لیا ہو گا کہ میں کہاں ہوں۔ نوکروں سے پوچھا جا سکتا ہے کہ مہمان کون ہیں... کتنے ہیں اور کیسے ہیں... یہ ثابت ہو جانے کے بعد کہ میں گھر کے اندر نہیں ہوں دوسرے ٹھکانوں کی تلاشی لی جا سکتی ہے۔ بڑی آسانی سے ان کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ وہ فاکس ویگن اس باغ میں کھڑی رہی تھی۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میں نکل گیا تھا۔ صرف موہنی ہی ان کے ہاتھ لگی۔ مگر اس کے ساتھ کون تھا... جیکی یا جونی؟ خسرو جمشید کو انھوں نے اپنے تہ خانے میں منتقل کر دیا تھا۔ اکیلی موہنی کو وہاں نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ اس کے ساتھ یقیناً کوئی ہو گا۔ حملہ آوروں نے کہا ہو گا کہ دیکھو جیکی یا جونی... تم سے ہماری کوئی دشمنی نہیں۔ اور ہم

سلطان محمد خان سے دشمنی مول لیتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں۔ مگر اس عورت کو اور اس کے ساتھی کو ہم نہیں چھوڑیں گے۔ اس نے ہمارے باس کو مار ڈالا... ہمارے یار کو مار ڈالا۔ لعنت ہماری یاری پر اور نمک خواری پر اگر ہم ان کے خون کا بدلہ نہ لے سکے... جیکی یا جونی کچھ نہ کر سکے ہوں گے... انھیں اپنی جان بھی عزیز تھی اور عزت بھی... وہ باپ کی طرف سے بھی ڈرے ہوں گے کہ اُسے معلوم ہو گیا تو کیا ہو گا۔ چنانچہ انھوں نے موہنی کو ان کے حوالے کیا اور خود نکل گئے۔ بعد میں فارم ہاؤس تباہ کیا گیا اور مالی کو گولی مار دی گئی۔ اب موہنی ان کے چنگل میں ہو گی اور وہ ہر انسانیت سوز طریقے سے اُسے ایذا پہنچا کے پوچھیں گے کہ بتاؤ وہ ہیرو کہاں گیا؟ وہ کچھ جانتی ہی نہیں تو انھیں کیا بتائے گی۔ اس کی موت کی اذیت بہت طویل ہو گی۔ شاید اس وقت بھی وہ کسی ناقابلِ برداشت اور رسوا کُن آزار میں مبتلا ہو گی۔

میرے خدا...! میں کیا کروں... میں کچھ بھی تو نہیں کر سکتا۔ اگر ایسا ہی ہے جیسا میں نے سمجھا ہے تو موہنی کی موت کو آسان کر دے۔ آبرومندانہ سہی۔

معلوم نہیں کب سے میں برآمدے کی سیڑھیوں پر کھڑا ہوا اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا۔ کسی نے کیا دیکھا اور کیا سمجھا۔ مجھے اس کی پروا ہی نہ تھی۔ اچانک ایک ٹیکسی گھوم کر میرے سامنے آ گئی۔ میں نے بے خیالی میں دیکھا اور چونک پڑا۔ یہ وہی ٹیکسی تھی۔ دُور سے گیٹ کیپر نے سیٹی بجائی۔ "او پاگل کا بچہ... ادھر کہاں لے جاتا ہے ٹیکسی۔"

"بیٹھو..." اس ٹیکسی ڈرائیور نے کہا اور میں دروازہ کھول کے بیٹھ گیا... ٹیکسی نے پھر راؤنڈ لیا اور گیٹ سے گزری تو گیٹ کیپر اور ڈرائیور کے درمیان ایک دوسرے کو خونخوار نظروں سے گھورنے کا مقابلہ ہوا۔

"کیا آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟" ٹیکسی ڈرائیور بولا۔

میں چونک پڑا۔ "کیا ہوا ہے مجھے؟"

"صورت سے تو یہ لگتا ہے کہ ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ کیا ہسپتال لے چلوں؟"

"فضول باتیں مت کرو۔ مجھے واپس جانا ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ تم اتنی دیر سے کیوں کھڑے ہوئے تھے؟"

"مجھے معلوم تھا کہ آپ کو یہاں پھر ٹیکسی نہیں ملے گی۔ اس سے پھر آپ کا بلڈ پریشر ہائی ہو جائے گا۔ آپ پھر اس شہر کو۔ یہاں کے ٹیکسی والوں کو اور رہنے والوں کو گالیاں دیں گے۔ جب کوئی پہلی بار کسی پنڈ سے یہاں وارد ہوتا ہے تو اس کی ایسی ہی حالت ہوتی ہے۔"

" میں تم کو... کسی پنڈ سے آیا ہوا... پینڈو لگتا ہوں؟" میں نے برہمی سے کہا۔

" سوٹ تو اب دیہاتی بھی پہنتے ہیں۔" وہ بولا " خیر... پنڈ سے نہیں آئے ہیں آپ تو پھر لاہور سے آئے ہیں۔"

" تم ضرورت سے زیادہ ہوشیار بنتے ہو اور ہوتے ہو۔" میں نے کہا۔" ورنہ تم اچھے آدمی ہو کہ تم نے میری ضرورت کو سمجھا۔ تم پڑھے لکھے بھی لگتے ہو مجھے۔"

" میں نے مائکروبیالوجی میں ڈاکٹریٹ کی ہے۔" وہ بولا۔

" اور ٹیکسی چلا رہے ہو؟" میں نے کہا۔" بے وقوف بناتے ہو مجھے۔ ابھی بے روزگاری کا مسئلہ اتنا شدید نہیں ہوا۔"

" مجھے ٹیکسی چلانے کا شوق ہے آپ کو اعتراض ہے؟" وہ بولا۔" اس میں آمدنی بھی زیادہ ہے۔ میں لیکچرار بنتا تو اتنا نہ کماتا۔"

" بندۂ خدا... عزت بھی کوئی چیز ہے۔"

" پنڈ سے آنے والے عزت کے ایسے ہی تصورات رکھتے ہیں۔ ورنہ شہر میں عزت ہے اس کی جس کے پاس تین کاف ہوں۔" وہ بولا۔

" تین کاف... تین حرف تو سُنتے تھے۔"

" کار... کوٹھی... کیش۔" وہ بولا۔" اس شہر میں عزت کا معیار پیسہ ہے... سمجھے؟"

" سمجھ گیا... مگر میں پنڈ سے نہیں آیا ہوں۔ میں نے چار سال لندن میں گزارے ہیں۔" میں نے کہا۔" اور تم غلط کہتے ہو کہ تم نے مائکروبیالوجی میں ڈاکٹریٹ کی ہے... تم کو چیلنج کرتا ہوں کہ اسے ثابت کرو۔"

" او کے... اُدھر جمشید روڈ کوارٹر تھانے چلتے ہیں۔"

" تھانے... کیا مطلب؟" میں نے گھبرا کے کہا۔" یعنی وہاں تم مجھ سے زبردستی منواؤ گے؟"

" نہیں... وہاں میرے بھائی کا سالا ہے... ڈی ایس پی۔"

" لعنت بھیجو اس پر... میں مانتا ہوں کہ تم ڈبل پی ایچ ڈی ہو۔" میں نے کہا۔" مائکروبیالوجی میں بھی اور بکواسولوجی میں بھی۔"

ایسے عجیب ٹیکسی ڈرائیور سے اپنے ملک میں میرا پہلی بار واسطہ پڑا تھا۔ لندن اور پیرس کے تجربات پرانی بات تھے۔ وہاں ایک سے ایک دلچسپ کردار [illegible] مگر یہاں اس ٹیکسی ڈرائیور نے جہاں میرے ساتھ شرافت برتی [illegible] وہیں میرے ساتھ وہ رویّہ بھی اختیار کیا تھا جو ایک چالاک شہری کسی سادہ لوح دیہاتی کے ساتھ اختیار کر سکتا ہے... میرا خون کھولنے لگا۔ یعنی حسد ہو گئی۔ میں نے سارا یورپ دیکھا جو اس نے خواب میں نہیں دیکھا ہوگا... یہ مجھے پینڈو سمجھنے پر بضد ہے اور خواہ مخواہ منوانا چاہتا ہے کہ وہ مائکروبیالوجی میں پی ایچ ڈی ہے... چالاک اور عیار بنتا ہے اُلّو کا پٹھا۔

" وہیں گرا دوں... میرا مطلب ہے ڈراپ کر دوں جہاں سے اُٹھایا تھا۔" ٹیکسی ڈرائیور بولا۔" یا اور کہیں جانا ہے؟"

" تھوڑا سا آگے... بینک کے پاس سے بائیں جانب۔" میں نے سو کا ایک اور نوٹ نکال کے طے کیا کہ چلو جان چھوٹی اس ڈرائیور سے... شام تک گاڑی کا بندوبست ہو ہی جائے گا۔

" ایک نوٹ اور سیٹھ۔" اس نے ٹیکسی روک کے کہا۔

" کیا؟ دو سو والیسی کے۔" میں اترتے اترتے رُک گیا۔ اسی وقت میری نظر نے افتخار عارف کے دروازے پر لگے ہوئے مجمع کو دیکھا۔ کم سے کم دس افراد کھلے دروازے کے سامنے کھڑے اندر جھانک رہے تھے اور میری نگاہ نے ان کے چہروں پر تجسس آمیز خوف کی تحریر بھی دیکھ لی۔ میری چھٹی حس ایک دم "خطرہ... خطرہ" چلّانے لگی۔

" دیکھو... ایک منٹ ٹھہرو۔" میں نے قطعی بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔" ہو سکتا ہے مجھے... پھر جانا پڑے۔ یہ سو روپے لو۔"

میں نیچے اتر کے چند قدم گیا۔ پھر میں نے پولیس کے سائرن کی آواز سُنی اور فوراً پلٹ کر ٹیکسی کے پیچھے ہو گیا۔ دو انسپکٹر موٹر سائیکلوں پر میری طرف دیکھے بغیر گزر گئے۔ پھر ایک جیپ گزری جس میں چار سپاہی تھے۔ دروازے کے سامنے کھڑے ہوئے لوگ ایک دم الگ ہو گئے۔ جو عقل مند تھے انھوں نے کھسکنا شروع کیا۔ ایک بنیان اور دھوتی والا بنگالی میرے پاس سے گزرا۔

" کیا ہوا ہے یہاں...؟" میں نے اسے روک لیا۔

" کتل... کھون... مرڈر..." وہ وحشت زدہ لہجے میں بولا۔

" یہاں تو کوئی اخبار والا رہتا تھا؟"

بنگالی نے سر ہلایا۔" اس کو مار دیا کوئی شالا لوگ۔" وہ بازو چھڑا کے بھاگ گیا۔ میرا جسم خوف سے کانپنے لگا اور ٹھنڈا پسینہ میرے جسم پر پانی کا ریلا بن کے بہنے لگا۔ افتخار عارف کو مار دیا؟ کسی نے؟ اس ٹیکسی ڈرائیور نے؟ یا اس نے خود کو آزاد کرا لیا اور پھر حاجی کے کسی ٹھکانے پر جا پہنچا جہاں وہ ٹرک موجود ہوگا... وہاں سے جو لوگ بھیجے گئے ان کو میں تو نہیں ملا۔

اچانک کسی نے میرا بازو پکڑ کے کھینچا۔" تم یہاں رہتے ہو؟" میں نے پلٹ کے ٹیکسی ڈرائیور کو دیکھا اور اقرار میں سر ہلایا۔" کل رات ہی تو آیا تھا۔"

" اس سے پہلے تم نہیں جانتے تھے اسے؟"

" نہیں... مجھے کسی نے کہا تھا کہ... تم اس کے پاس ٹھہر سکتے ہو۔ افتخار عارف نام تھا اس کا۔" میں نے کھوکھلے لہجے میں کہا۔" ایک اچھا اخباری رپورٹر تھا۔"

" مجھے معلوم ہے۔" ٹیکسی ڈرائیور بولا۔" میرا مشورہ ہے کہ تم فوراً یہاں سے رفو چکر ہو جاؤ... ورنہ سب سے پہلے تم پر شک کیا جائے گا اور اس معاملے میں پولیس آئیں بائیں شائیں نہیں کر سکتی کیونکہ پریس، پبلک اور انتظامیہ سب کا دباؤ ہوگا۔"

میں پھر چونکا۔ کیا اس شہر کے ٹیکسی ڈرائیور بھی اتنے مخلص اور دُور اندیش ہو سکتے ہیں؟

" بیٹھو..." اس نے ایک بار پھر تحکمانہ انداز میں کہا اور دروازہ کھول دیا۔ میں سوچے سمجھے بغیر بیٹھ گیا۔ اس نے ٹیکسی کو ریورس کرنے کے بجائے سیدھا نکال لیا اور معلوم نہیں کوارٹروں کے درمیان سے گزرتا ہوا کیسے ایک سڑک پر آ نکلا جہاں بالکل سامنے ناولٹی سینما تھا۔

افتخار کی موت کے صدمے نے مجھے ذہنی طور پر جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ میری جستجو میں آنے والوں کا مقابلہ کرتے ہوئے مارا گیا تھا... یا شاید جب وہ ناکامی کے بعد واپس جا رہے تھے تو افتخار نے انھیں دیکھ لیا اور انھوں نے کسی عینی شاہد کو زندہ چھوڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس شہر میں بھی جو لاہور سے ساڑھے سات سو میل دُور تھا شکاری میرے تعاقب میں سائے کی طرح آئے تھے اور عدم تحفظ کا وہ احساس جو وقتی طور پر مٹ گیا تھا ایک بار پھر پوری شدت کے ساتھ جاگ اُٹھا تھا۔

ٹیکسی اچانک رک گئی۔ ڈرائیور نیچے اتر گیا۔

" کیا بات ہے؟" میں نے تشویش سے کہا۔

" میں ابھی آتا ہوں۔" وہ بولا اور میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی کوارٹروں میں غائب ہو گیا... وہ ٹیکسی کی چابیاں بھی لگی ہوئی چھوڑ گیا تھا لیکن مجھے ڈرائیور کے رویّے نے حیرت اور تجسس میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس میں کوئی بات ایسی تھی جو ڈرائیوروں میں نہیں ہوتی۔ اس کے بات کرنے کا انداز... اس کا رویّہ... اس کا اظہارِ اعتماد... تعاون کا جذبہ... یہ سب کیا تھا اور کیوں تھا؟ میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ اس ڈرائیور کا میرے ساتھ رہنا بے مقصد نہیں ہے۔ وہ خود ہی مجھے دیکھ کر رُکا تھا اس نے ایک گھنٹے تک ٹیلیگراف آفس میں میرا انتظار بھی کیا تھا، حالانکہ میں نے اسے رُکنے کو نہیں کہا تھا۔ اس ایک گھنٹے میں دو سواریاں اُٹھا سکتا تھا۔ لیکن اس نے مجھ سے سو پہلے وصول کر لیے تھے۔ یہ اندازہ کر لیا تھا کہ بڑا بے وقوف، ضرورت مند، مجبور اور پیسے والی اسامی ہوں۔ وہ ایک مردم شناس اور ہوشیار شخص تھا۔ اس نے چونکا دینے والی باتوں سے خود کو ایک غیر معمولی شخصیت ثابت کیا اور مجھ سے مزید دو سو روپے اینٹھ لیے... وہ بدستور میرا ساتھ دے رہا تھا۔ ظاہر ہے یہ نیاز مندانہ جذبہ بے غرض نہیں تھا۔ اب وہ مجھ سے پانچ سو مانگے گا کہ آپ کو خطرے سے نکال لایا، ورنہ آپ تو وہیں دھر لیے جاتے۔ وہ مجھے بلیک میل بھی کر سکتا ہے۔ کمال ہے کہ وہ اتنا باخبر بھی ہے۔ اسے معلوم تھا کہ اس کوارٹر میں ایک صحافی رہتا تھا، ہر ٹیکسی ڈرائیور شہر کے ہر صحافی کا پتا ٹھکانا جانتا ہو، یہ ناممکن سی بات تھی... پھر کیا اس کا افتخار عارف سے کوئی تعلق تھا؟

میں خیالات کی کھینچا تانی میں اعصابی کشیدگی کا شکار رہتا اور کسی بھی نتیجے پر پہنچنے سے قاصر تھا۔ صرف قیاس کی بنیاد پر تو حتمی فیصلہ صادر نہیں کیا جا سکتا کہ جو کچھ ہوا اور ہو رہا ہے، وہ کیوں ہو رہا ہے؟ ملتان میں جو خونی ڈراما کھیلا جا رہا ہے اس کی اصل کہانی کیا ہے۔ افتخار عارف کے مارے جانے کی اصل وجہ کیا ہے۔ اس ٹیکسی ڈرائیور کے اصل عزائم کیا ہیں؟

وہ اچانک ایک کوارٹر کی اوٹ سے نمودار ہوا۔ اس کا چہرہ متفکر تھا اور ماتھے کی ہر شکن کسی الجھن کی عکاسی کرتی تھی۔ مجھ سے کچھ کہے بغیر اس نے ٹیکسی اسٹارٹ کر دی۔ میں سوچ میں پڑ گیا... ابھی تک میں نے اس کی صورت کو غور سے نہیں دیکھا تھا۔ یہ عام نفسیاتی مسئلہ ہے ہم کسی ریسٹورنٹ میں ویٹر کا... سڑک پر ٹریفک کانسٹیبل کا... ٹرین میں ٹکٹ چیکر کا اور ٹیکسی ڈرائیور کا چہرہ دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ صرف اس کی وردی کو دیکھتے ہیں اور اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ آرڈر دیتے وقت ویٹر پر نہیں، مینو پر نگاہیں رکھتے ہیں... یا باتیں کرتے کرتے کہہ دیتے ہیں، چائے لاؤ۔ وہ چائے رکھ جاتا ہے۔ پھر برتن اُٹھا لیتا ہے اور بل لے جاتا ہے مگر اس کی طرف غور سے دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ ہم ٹکٹ چیکر کو ٹکٹ تھما دیتے ہیں اور جب وہ پنچ کر دیتا ہے تو واپس لے کر باہر دیکھنے لگتے ہیں۔ ٹیکسی میں بیٹھ کے صرف اتنا کہتے ہیں کہ مقررہ جگہ چلو اور پھر اپنے خیالوں میں یا باہر کے منظر میں یا اپنی باتوں میں گم ہو جاتے ہیں اور منزل پر پہنچ گئے تو میٹر کو دیکھتے ہیں اور کرایہ ڈرائیور کے ہاتھ پر رکھ دیتے ہیں۔ اس کی صورت دیکھے بغیر۔

میرے ساتھ یہی ہوا تھا۔ جب ٹیکسی رُکی تھی، تو میں نے صرف ٹیکسی کو دیکھا تھا۔ ٹیکسی میں بیٹھ کے میں نے خود کو اس سے متعارف نہیں کرایا تھا اور اس سے تعارف حاصل کر کے ہاتھ نہیں ملایا تھا... ویسے دو اجنبی ایک مشترک دوست کے ساتھ مل جائیں تو پہلے رسمی تعارف ہوتا ہے۔ میں نے ٹیکسی ملنے پر ایک تو پریشانی سے نجات ملنے کی تسکین محسوس کی تھی۔ پھر میں اس شہر کے بیہودہ ٹریفک کے نظام پر تھا رہا تھا۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور کا لباس دیکھا تھا۔ اس کی بکواس بھی سُنی تھی اور اس کا مناسب جواب بھی دیا تھا لیکن اس کی صورت کو اہمیت نہیں دی تھی۔ میں پیچھے والی سیٹ پر تھا اور مجھے بیک ویو مرر میں بھی اس کا چہرہ صرف ٹوپی کی حد تک

نظر آرہا تھا۔

اب مجھے اس کا چہرہ دیکھ کر عجیب سی پریشانی لاحق ہو گئی۔ اس چہرے کے کچھ نقوش میرے لاشعور کے کسی گمنام حصے میں محفوظ تھے لیکن ان سے اصل چہرے کا تصور کرنا محال تھا۔ یہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے آدمی کو کسی کوڑے کے ڈھیر میں سے کسی کتاب کے چند صفحات مل جائیں۔ مثلاً ساتواں صفحہ... ایک سو دسواں صفحہ... دو سو چھبیسواں صفحہ... اسے خیال تو آئے گا کہ یہ کسی پڑھی ہوئی کتاب کے صفحات ہیں مگر سیکڑوں ہزاروں پڑھی ہوئی کتابوں میں سے تین صفحوں کو دیکھ کر اصل کتاب کا نام یاد کرنا یقیناً ناممکن ہوگا۔

"بات سنو... تم کون ہو؟" میں نے کہا۔ "نام کیا ہے تمہارا؟"

"میرے نام کو گولی مارو... یہ بتاؤ کہ وہ شخص کون تھا جو اس کوارٹر میں بندھا پڑا تھا؟"

اگر وہ اچانک پلٹ کے مجھ پر فائر کر دیتا تب بھی میں اتنا نہ اچھلتا۔ "کیا؟... تم...؟"

"میں وہیں گیا تھا۔" وہ بولا۔ "پولیس کو ایک شخص چارپائی سے بندھا ہوا ملا۔ اس کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے اور آنکھوں پر بھی پٹی تھی۔ اس کا منہ کپڑا ٹھونس کے بند کر دیا گیا تھا۔ اس نے کہا ہے کہ یہ تمہاری حرکت تھی۔"

"وہ... بکواس... جھوٹ۔" میں نے گڑبڑا کے کہا اور پھر ایک دم ریوالور نکال لیا۔ "مجھے پہلے ہی شک ہو رہا تھا تم پر... مگر تم مجھے اپنی مرضی سے کہیں نہیں لے جا سکتے... تم کیا سمجھتے ہو، میں پینڈو ہوں؟ عقل سے پیدل ہوں؟ مجھے بہت پہلے شک ہو گیا تھا کہ تم میرے پیچھے بلا وجہ نہیں پڑے ہوئے ہو۔"

"میں اپنی بات پر قائم ہوں۔" وہ متاثر ہوئے بغیر بولا۔ "تم پینڈو ہو اور عقل کے دشمن بھی... یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟"

"ریوالور... اور اس میں سائیلنسر بھی لگا ہوا ہے۔" میں نے کہا۔

"پہلے کبھی چلایا ہے؟" وہ بولا۔ "اور اس کا کیا ثبوت کہ یہ اصلی ہے۔"

غصے سے میرا بُرا حال ہو گیا۔ میں نے چلّا کے کہا۔ "یہ اصلی ہے یا نہیں اس کا پتا تمہیں اس وقت چلے گا جب تم فوت ہو جاؤ گے اور تمہاری کھوپڑی کے سوراخ سے تمہارا سب بھوسہ باہر آجائے گا... میں نے ریوالور... مشین گن... دستی بم... توپ ٹینک، راکٹ، ایٹم بم سب چلائے ہیں۔"

"یہ بتاؤ جانا کہاں ہے؟" وہ بے نیازی سے بولا۔

"کونسٹر روڈ... وہاں میں تم سے پوچھوں گا..."

"ریوالور جیب میں رکھ لو..." وہ بولا۔ "راستے میں کسی نے یہ ڈراما دیکھ لیا تو خواہ مخواہ نئی پریشانی پیدا ہوگی..."

میرا سارا غصہ ایسے ختم ہو گیا جیسے پنکچر ہوتے ہی ٹائر کی ہوا ختم ہو جاتی ہے۔ میں نے ریوالور جیب میں رکھ لیا اور سر کو نشست کی پشت سے لگا کے لمبے گہرے سانس لینے لگا، تاکہ میں پُرسکون ہو جاؤں اور میرا دماغ ٹھنڈا ہو جائے۔ وقفے وقفے سے میں باہر بھی دیکھتا رہا کہ ٹیکسی کس راستے پر جا رہی ہے۔ چونکہ صبح افتخار عارف نے راستے پر رننگ کمنٹری کی تھی اس لیے دوبارہ انہی مقامات سے گزرتے ہوئے مجھے خاصا اطمینان حاصل ہوا کہ ٹیکسی ڈرائیور مجھے غلط سمت میں نہیں لے جا رہا ہے اور میرے کراچی میں نووارد پینڈو ہونے کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھا رہا ہے۔

کونسٹر روڈ تک پہنچتے ہوئے میں کافی حد تک نارمل ہو گیا تھا اور سب سے پہلے اس ٹیکسی ڈرائیور پر یہ ثابت کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا کہ میرے سامنے وہ طفلِ مکتب ہے گھسیارا ہے یا گدھا ہے۔ اب مجھے یقین آنے لگا تھا کہ وہ دشمنوں کا ایجنٹ بہرحال نہیں ہے اور اگر میں صحیح طرح سے ہینڈل کروں تو اسے دوست بنا سکتا ہوں۔

ٹیکسی جب بیرک کے سامنے رکی تو میں نے پھر ریوالور نکال لیا اور اُسے کہا۔ "اندر چلو۔"

"پہلے آپ۔" وہ بولا۔ اور میں نے اُسے گردن سے پکڑ کے اندر دھکیل دیا۔ اس کی ٹوپی گرد آلود فرش پر گر گئی۔ وہ اُسے اُٹھانے کے لیے جھکا لیکن اچانک اس نے میرا ریوالور والا ہاتھ پکڑ کے ایک جھٹکا دیا اور ہاتھ مروڑ کے مجھے پلٹ دیا۔ میں اس کے لیے قطعی تیار نہ تھا، چنانچہ میں نے ریوالور کو اپنی گرفت سے نکل کر دُور گرتے دیکھا اور خود کو فرشِ خاک پر لیٹا ہوا پایا۔ اس سے پہلے کہ میں اُٹھتا ریوالور اُس نے اُٹھا لیا۔

"اب بتاؤ کہ تم کون ہو مسٹر سکندر بخت۔" وہ بولا۔

میں اپنی جگہ پر منجمد ہو گیا... میری آنکھیں اس پر مرتکز ہو گئیں۔ اس کی ٹوپی سٹ جانے سے گھنے سیاہ بال نمودار ہو گئے تھے اور صورت سے آشنائی کا احساس پہلے سے زیادہ پُرآزار خلش بن گیا تھا۔

"مجھے معلوم ہو گیا تھا۔" میں نے کہا۔

"تمہیں کچھ نہیں معلوم... تم ایک پینڈو ہو... عقل کے بھی اندھے ہو اور آنکھوں کے بھی..." اس نے اچانک آواز بدل کے کہا۔ "اُلّو کے پٹھے ہو تم اور گدھے ہو۔"

مجھے یوں لگا جیسے کسی نے مجھے راکٹ پر بٹھا کے فائر کر دیا ہو۔

"اکرام... اکرام شیخ... سالے ڈبل ایس آئی۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "ڈبل کراس کر رہا تھا مجھے... تیری تو..."

وہ مجھ سے لپٹ گیا... اس نے مجھے بہت مُکّے مارے اور بہت گالیاں دیں اور کئی بار پینڈو کہا۔ میں ہنستا رہا اور روتا رہا۔ اپنی عقل پر... قدرت کے اس احسان پر... تائیدِ ایزدی کے اس اظہار پر... اس اتفاق پر... ہم فرش پر بیٹھ کے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ "سکندرِ اعظم کی اولاد۔" اُس نے بالآخر کہا۔

"یار تو نے... پہچان لیا تھا مجھے... کیسے پہچان لیا تھا؟" میں نے کہا۔ "یہ تو کمال ہو گیا۔"

"اپنے پولیس مین رہا ہوں... وہ بھی ایسا ویسا نہیں۔ بالکل انکل رضوی کا شاگرد۔" وہ بولا۔ "میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تو ایسے کراچی کی سڑک پر کھڑا ہوا مل جائے گا۔"

"بس یار... ملنا تھا مقدر میں... ایک گھنٹے سے کھڑا ہوا تھا اور کوئی سالا لفٹ نہیں دے رہا تھا۔" میں نے کہا۔

"حد ہے حماقت کی۔" وہ بولا۔ "بھائی آپ ایک بے مثال قومی شہرت رکھتے ہیں اور چشم بددور... یہاں آتے ہی آپ اپنے ساتھ سارے مصائب بھی سمیٹ لائے ہیں۔"

"یار ساری باتیں چھوڑ... پہلے نازو کے بارے میں بتا۔"

"کیا بتاؤں... خود میں اُسے تلاش کر رہا ہوں دو دن سے۔"

وہ ایک دم رنجیدہ ہو گیا۔ "حرام ہے جو رات بھر آنکھ بھی لگی ہو۔"

"کیوں یار... نازو جیسی لڑکی کے لیے فکرمند ہونے کی تو ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔ "وہ خود تلاش کر لے گی تجھے... اپنی حفاظت وہ خود کر سکتی ہے۔"

"تو نے افتخار عارف کی رپورٹ ضرور پڑھی ہوگی؟"

"ہاں... اور میں اس کے پاس کیوں پہنچا تھا۔" میں نے کہا۔

"اسی رپورٹ نے مروا دیا اُسے۔" وہ بولا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ وہ اس کیس میں خطرناک حد تک گُھس چکا تھا اور اتنا آگے چلا گیا تھا کہ..." اس نے افسوس سے نفی میں سر ہلایا۔ "اس کا وجود ان کے لیے ایک خطرہ بن گیا تھا۔"

"مجھے تو اس نے کچھ نہیں بتایا۔"

"تجھے کیوں بتاتا... یہ سب معلومات جو اس نے حاصل کر لی تھیں ابھی اس کے دماغ میں جمع ہو رہی تھیں۔ وہ ثبوت جمع کر رہا تھا اور شہادتیں حاصل کر رہا تھا... اس کا فیچر تو ایک ڈھونگ تھا صرف یہ دکھانے کے لیے کہ وہ سطحی معلومات حاصل کرنے میں کامیاب رہا ہے۔ مگر جاننے والے جان چکے تھے کہ وہ اپنے پیشہ ورانہ فرائض کی حدود سے بہت آگے بڑھ گیا ہے۔ اس نے بہت اعلیٰ سطح پر وزارتِ دفاع کے اسسٹنٹ سیکرٹری یا ڈپٹی سیکرٹری کی سطح کے کسی افسر سے کہا تھا کہ وہ ملک دشمنی میں ملوث چند سرکاری افسران کی سرگرمیوں کے بارے میں براہِ راست انٹرسروسز انٹیلی جنس کے چیف سے بات کرنا چاہتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ بات لیک آؤٹ ہو گئی۔"

"تجھے کیسے معلوم ہوا؟"

"اسی نے بتایا تھا کہ یار کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے۔ میں اُسے روز گھر سے آفس لے جاتا تھا اور رات دو بجے آفس سے گھر لاتا تھا۔ اس کو معلوم نہیں تھا کہ وہ اسسٹنٹ سیکرٹری یا ڈپٹی سیکرٹری خود بھی بنگالی ہے۔ اس کے نام سے وہ دھوکا کھا گیا، پھر کسی نے اسے غلط اطلاع بھی دی کہ وہ ذاتی طور پر جانتا ہے۔ اور وہ افسر راولپنڈی کا رہنے والا ہے... اسے جانتے بوجھتے گمراہ کیا گیا اور آئی ایس آئی کے چیف تک تو بات پہنچی نہیں۔ اس کے قاتلوں تک پہنچ گئی۔"

"یار کیا اس نے غلطی نہیں کی... مطلب یہ کہ وہ ایک صحافی تھا۔ اسے گمراہ کرنا آسان تو نہیں تھا۔ اس نے کیوں مان لی وہ بات تصدیق کیے بغیر؟"

اکرام نے ایک آہ بھری۔ "اگر تو مجھ سے کہے کہ محسن بھروسے کے قابل ہے تو کیا میں تصدیق ضروری سمجھوں گا؟ وہ اعتماد کے خنجر سے مارا گیا جو اپنے ہی کسی دوست نے اس کی پیٹھ میں گھونپا۔ مگر خیر میں بھی پولیس والا ہوں۔ مجھے تھوڑا بہت اندازہ تو ہے کہ وہ کون تھا جس پر وہ بھروسا کرتا تھا... میرے علاوہ۔ میں تفتیش کر رہا ہوں... اور اگلے چوبیس گھنٹوں میں ملزم میری گرفت میں ہوگا۔"

"میں تو سمجھا تھا کہ افتخار ان کے ہاتھوں مارا گیا جو مجھے قتل کرنے آئے تھے۔" میں نے کہا۔ "کیا اس ڈرائیور کو پولیس لے گئی؟"

"ہاں... ابھی اس کا بیان نہیں ہوا۔" اکرام بولا۔ "ظاہر ہے اس نے قاتلوں کو دیکھا تو نہیں ہوگا مگر ان کی باتیں تو سنی ہوں گی۔ سنا ہے پہلے اس نے کچھ اونگی بونگی باتیں کی تھیں۔ کہتا تھا کہ میں حیدرآباد میں ہوں۔ پولیس نے دو ہاتھ مارے تو نشہ اتر گیا۔"

"وہ نشے میں نہیں تھا۔ یہ بات میں نے اس کے دماغ میں ڈالی تھی۔" میں نے کہا پھر میں نے اسے گزشتہ رات سے اب تک کے سارے واقعات سنا دیے۔

"شکاری یہاں بھی تیرے پیچھے ہیں اور تو سینہ تان کے پھر رہا ہے کہ آ بیل مجھے مار۔" وہ بولا۔

"بس یار... بھول چوک ہو جاتی ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ اتنا بڑا شہر ہے۔"

"جلسے میں مل گیا تھا... ایسے کیا کوئی اور نہیں مل سکتا تھا؟"

"مل سکتا تھا... مگر میں کیا کرتا... میرے لیے بہت ضروری

ہوگیا تھا کہ میں ملتان فون کروں۔" میں نے کہا۔

" ملتان کی اسٹوری کیا ہے؟"

" کوئی ایک اسٹوری نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "و... سے گی تو سناؤں گا۔ تو پہلے یہ بتا ٹیکسی کس کی ہے؟"

" میری اپنی... اسی کی آڑ میں تو بچا ہوا ہوں... تھوڑا سا میک اپ کرلیا ہے۔" وہ بولا۔ "بالوں کا اسٹائل وہ نہیں رہا۔ یہ عینک بس فریبِ نظر ہے۔"

" اور ڈیرا کہاں ڈال رکھا ہے؟"

" مسافروں کے ٹھکانے بدلتے رہتے ہیں۔" وہ بولا۔ "ایک ہفتے پہلے بھٹہ ویلج میں تھے... کیماڑی کی طرف۔ پھر نازو کے ساتھ ایکسیڈنٹ ہوگیا۔"

" تو بھی ساتھ تھا؟"

" ہاں یار... اب یہ تو بس شامتِ اعمال ہی تھی نا کہ اس جہاز پر ایک غرق شدہ جہاز کا آدمی نکل آیا اور اس خبیث کی نظر اتنی تیز تھی کہ اس نے ہمیں پہچان بھی لیا۔" وہ بولا۔ "میں تو نکل گیا تھا مگر نازو کو تاڑ لیا اس نے۔ اس کے لیے مردوں جیسے کام کرنا تو آسان ہے مگر مرد بننا ذرا مشکل ہے... بس وہیں گڑبڑ ہو گئی۔ جب اسے پولیس لے گئی تو مجھے بڑی غیرت اور شرم آئی کہ میں کیسا بھائی ہوں۔"

" اگر وہ خود نہ نکل پاتی تو آپ کیا توپ چلاتے؟"

" کچھ نہ کچھ تو کرتا... رشوت کی توپ چلاتا۔" وہ بولا۔ "کیونکہ اس کے خلاف جہاز والوں نے کوئی رپورٹ نہیں لکھوائی تھی۔ پھر جب وہ خود ہی نکل گئی تو اب تک مجھے بھی نہیں ملی۔"

" کیوں؟ اپنے ٹھکانے پر کیوں نہیں پہنچی وہ؟"

" وہ دراصل... گڑبڑ یہ ہوئی کہ ہم نے ایک ہفتہ قبل اپنا گھر بدلنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ وہاں کے لوگوں کو ایک مولوی نے بھڑکانا شروع کردیا تھا کہ یہ ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ جو اس کا بھائی ہے وہ غالباً کوئی عورت ہے جسے وہ بھگا لایا ہے۔ ہمارے گھر آنا کوئی نہیں تھا اور ہم بھی کسی کے گھر نہیں جاتے تھے۔ مگر ایک رات کیا ہوا کہ شراب کے نشے میں کوئی متوڑا کی لانچ پر کام کرنے والا ہمارے گھر میں گھس گیا... غلطی سے... اس نے نازو کو زنانہ کپڑوں میں دیکھ لیا۔"

" کیا وہ روز میک اپ بدلتی تھی؟"

" نہیں یار... اس روز سالگرہ تھی اس کی۔ بس میں جذباتی ہوگیا اور میں نے کہا کہ چلو کہیں باہر مل کے مناتے ہیں... کسی ٹاپ کلاس ہوٹل میں... وہ اس کے لیے تیار ہوئی تھی۔ میں نے اس شرابی کو دھکے دے کر نکال دیا مگر باہر ایک مولوی صاحب عشاء کی نماز پڑھ کے آرہے تھے۔ انھوں نے شرابی کو للکارنا شروع کیا تو وہ بکارنے لگا کہ سب مجھے ہی کہتے ہو۔ اسے نہیں کہتے جس نے... "جس نے کیا؟"

اکرام کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ "کہنے لگا کہ یہ جو کوہ قاف کی پری چرا لایا ہے سالا ٹیکسی ڈرائیور... مولوی صاحب پہلے تو سمجھے کہ وہ نشے میں بک رہا ہے۔ مگر اسی وقت نازو اور میں ٹیکسی میں بیٹھ کر نکلے تو مولوی صاحب کی عقل خبط ہوگئی۔ انھوں نے محلہ اکٹھا کرلیا۔ رات بارہ بجے ہم آئے تو دروازے پر مجمع۔ میں نے کہا کہ آپ لوگ ہوش میں رہ کے بات کریں... یہ میری سگی چھوٹی بہن ہے۔ آج ہی لاہور سے آئی ہے۔ مگر کوئی ماننے کو تیار نہ تھا۔ مولوی صاحب ہمیں مسجد میں لے گئے۔ ہم سے کلمہ پڑھوا کے قرآن اٹھوایا گیا۔ ہم نے اٹھا لیا اور وہی کہا جو سچ تھا۔ اس وقت تو مولوی صاحب کی پٹائی ہوتے ہوتے رہ گئی۔ مگر اس کے بعد دو تین دن تک نازو کو اصل زنانہ روپ میں محلے کی خواتین سے ملنا پڑا اور گھر میں رہنا پڑا اور ہمیں دس جھوٹ بولنے پڑے۔ پھر میں نے دوسرا گھر تلاش کرلیا... لیاری میں... اور نازو کو بھی بتا دیا مگر جس دن نازو پکڑی گئی اسی دن کچھ لوگوں نے ہمارا سامان باہر رکھ دیا۔ معلوم ہوا کہ مالک مکان جعلی تھا اور اصل مالک مکان تو ایک کانسٹیبل ہے... میرا خیال ہے کہ ان دونوں نے مل کر یہ دھندا چلا رکھا ہے یعنی ایک کسی ضرورت مند کو گھیر لاتا ہے اور اس سے دو چار ہزار ایڈوانس وصول کرلیتا ہے۔ پھر کانسٹیبل وردی پہن کر آجاتا ہے اور تھانے کی ترڑی دیتا ہے۔ کرائے دار کا سامان باہر رکھ دیا جاتا ہے۔ اور یہ سلسلہ ایسے ہی چلتا ہے... اب تو سوچا یار... کہ میں خود ایک سابق ایس آئی... مجھے ایک کانسٹیبل نے ہاتھ مار کے باہر کردیا۔ میری مجبوری یہ تھی کہ تھانے نہیں جا سکتا تھا اور کسی پولیس والے کے مکان میں نہیں رہ سکتا تھا چنانچہ میں نے خاموشی سے سامان اٹھا لیا اور پھر جو گھر ملا وہ ادھر دھوبی گھاٹ کی طرف ہے... مگر اس کا نازو کو پتا نہیں۔"

" وہ پہنچی ہوگی اس کانسٹیبل کے مکان پر؟" میں نے تشویش سے کہا۔ "تو نے معلوم کیا؟"

" ہاں... وہ پہنچی تھی۔" اکرام بولا۔ "اسے کسی نے بتا دیا کہ مکان تو پھر خالی ہے۔ وہ فوراً واپس چلی گئی۔ رکشا میں آئی تھی۔ اب کل سے ٹیکسی لیے پھر رہا ہوں کیونکہ وہ میری ٹیکسی ہی تلاش کرے گی۔"

" تو یہاں کیسے گھسا ہوا ہے؟"

میں نے اسے مختصراً بتایا اور گیراج کھول کے کار بھی دکھائی۔ ہم دونوں نے مل کے گاڑی کو اچھی طرح صاف کیا تاکہ اس پر کہیں بھی کوئی فنگر پرنٹ نہ رہے۔ پھر دونوں سوٹ کیس ٹیکسی میں رکھے۔ میں دولت مند فقیر کا خزانہ لے جانے کے موڈ میں نہیں تھا مگر اکرام شیخ نے کہا کہ ایسے دھوکے باز حاجتمندوں کو یہ سزا تو ملنی ہی چاہیے۔ اس نے نوٹوں سے بھرا ہوا گھڑا بھی ڈکی میں ڈال دیا اور گیراج کا دروازہ بند کردیا۔

" اب فوری طور پر تو اس کار کے دریافت ہونے کا امکان نہیں ہے۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "کبھی رات کو پھر آئیں گے تو اس کا کریاکرم کردیں گے۔"

" یار اکرام..." میں نے ٹیکسی کے روانہ ہونے کے بعد کہا۔ "تو نے ایک سوال نہیں پوچھا۔"

" پوچھوں گا بھی نہیں کہ تو کیوں آیا ہے؟ یہ بتا اتنی دیر سے کیوں آیا ہے؟" اکرام نے کہا۔ "ہم تو انتظار کرتے کرتے مایوس ہو چلے تھے۔ ایک سفر پر گئے تھے۔ پندرہ دن بعد لوٹے تو اس نئی پریشانی میں پڑ گئے کہ کہیں درمیان میں تو آکے تو نہیں لوٹ گیا؟"

" تم کسی بحری جہاز میں نکل گئے تھے؟"

" ہاں... اسے ڈبو دیا... خود بال بال بچے۔ مچھلیوں کی خوراک بنتے سے۔" وہ بولا۔ "چوبیس گھنٹے ایک تختے کے سہارے پر پانی میں غوطے کھاتے رہے۔ پھر ایک ماہی گیروں کی کشتی نے بچا لیا۔"

" تم لوگ منظر کو فون کرسکتے تھے۔" میں نے برہمی سے کہا۔ "یا نازو فون کرسکتی تھی شہلا کو۔"

" کئی بار کوشش کی... کبھی منظر نہیں ملا، کبھی لائن نہیں ملی۔" وہ بولا۔ "شہلا کو ٹرائی ہی نہیں کیا۔ ایس ایس پی صاحب سے ڈر لگتا تھا۔"

" آخر رابعہ نے بھی تو فون پر بات کی تھی۔"

" بالآخر... زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا۔" وہ ہنسا۔ "تمھیں معلوم ہے کہ وہ کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

اکرام نے نفی میں سر ہلایا۔ "نازو نے ایک بار اسے دیکھا تھا کسی لانچ پر۔"

" وہ فون نمبر میرے پاس لکھا ہوا ہے۔" میں نے کہا۔ "میرا مطلب ہے کہ مجھے یاد ہے۔ میں ایک شخص دوست محمد کو بھی جانتا ہوں۔ وہ انجینئر ہے۔ فری لانسر قسم کا... ملازم کسی کا نہیں مگر اسے کوئی بھی لے جا سکتا ہے۔"

" اس کا کیا تعلق ہے رابعہ سے؟"

" کوئی تعلق ضرور ہے۔" میں نے کہا۔ "اس نے رابعہ کو چھپا رکھا ہے یا قید کر رکھا ہے... رابعہ نے صاف نہیں بتایا... جانتے بوجھتے یا مجبوری کے تحت کچھ چھپاتی رہی۔ ایک طرف کہتی تھی کہ میری بالکل فکر مت کرو۔ میں خیریت سے ہوں۔ دوسری طرف کہتی تھی کہ میں آ نہیں سکتی اور اپنا پتا بھی نہیں بتا سکتی۔"

" اتنا کافی ہے۔" اکرام بولا۔ "ہم اسے بھی ڈھونڈ نکالیں گے مگر ایسے نہیں... یہ صورت نہیں چلے گی۔"

" میں نے آج ہی صبح افتخار سے کہا تھا کہ مجھے کسی میک اپ مین کے پاس لے چلے... میں فریج جانتا ہوں۔ کسی شوروم سے ایک پرانی ڈپلومیٹک نمبر کی کار دلا دے۔"

" ڈپلومیٹ کے بچے... یہ سب نہیں چلے گا... خود کو نمایاں کرنا بے وقوفی ہے... ایسا حلیہ بناؤ کہ ہزاروں میں شامل ہوسکو... مثلاً میں ٹیکسی ڈرائیور ہوں تو ہر جگہ آنے جانے میں کوئی دشواری نہیں... کیا ضرورت ہے کار کی جو پہچانی جائے... یہ ٹیکسی بھی تو کار ہے۔"

" یہ آپ نے صبح بھی فرمایا تھا کہ ٹیکسی بھی کار ہوتی ہے بس رنگ کا فرق ہوتا ہے۔" میں نے دانت نکال کے کہا۔ "مگر آپ نے درست فرمایا... کیا خیال ہے میں گدھا بن جاؤں... کراچی میں بہت گدھے ہیں۔"

" ویسے تو بندرگاہ... ڈاکیارڈ اور فش ہاربر کے علاقے میں سیکڑوں کشتیوں لانچوں اور بحری جہازوں سے بلا مبالغہ لاکھوں افراد کا روزگار وابستہ ہے۔" اکرام نے کہا۔ "ان میں خالص ٹیکنیکل نیچر کا کام کرنے والے بھی ہیں۔ مثلاً انجینئرز اور ریڈیو آفیسر نیوی گیٹر وغیرہ لیکن سیکڑوں دوسرے پیشے بھی ہیں۔ مال بردار مزدور سے لے کر ماہی گیر تک ہر پیشے میں ہزاروں لوگ ہیں۔"

" تمھارے خیال میں مجھے فشنگ کرنی چاہیے۔ ڈور اور بنسی لے کر؟" میں نے کہا۔

" ابھی تم مچھلی پکڑنے اسے فروخت کرنے محفوظ کرنے اور ایکسپورٹ کرنے کی پوری انڈسٹری کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔ اس ایک پیشے میں کتنے افراد یہ کام کررہے ہیں۔ میں نے کسی اعداد و شمار کے ماہر سے تو نہیں پوچھا مگر میرا خیال ہے کہ یہ تعداد لاکھوں تک ضرور پہنچتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ تمھارے لیے سب سے مناسب پیشے وہ ہیں جن میں تم چھپ کر رہ سکتے ہو اور بلا روک ٹوک ہر جگہ جا سکتے ہو۔ ایک تو تم ماہی گیر بن سکتے ہو۔ ایک چھوٹی سی کشتی ہو تمھاری لانچ ہو یا فشنگ ٹرالر۔ تم کراچی کے پورے ساحل پر اور کھلے سمندر میں جہاں چاہو جاؤ جب چاہو جاؤ۔ دن رات کی کوئی قید نہیں۔ بے شک کسٹم اور نیوی کی پولیس چیک کرلیتی ہے مگر وہ کسی بھی ماہی گیر کو کچھ نہیں کہتے۔ ان کی نظر اسمگلنگ میں ملوث لانچوں پر رہتی ہے... تم بلوچی یا مکرانی کا روپ دھار کے ماہی گیروں کے حلیے میں مزے سے گھومو۔ رابعہ کو

تلاش کرو یا "ایس ایس کراتی تھرڈ۔" پر نظر رکھو۔۔۔تم کسی کی نظر میں نہیں آؤ گے۔"

"میں اس تجویز کی افادیت کا قائل ہوتا جارہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"اب سوال یہ ہے کہ تمھارے لیے کیا مناسب ہے۔ تو میرا خیال ہے کہ تم ایک انجن والی چھوٹی لانچ لے سکو تو سب سے بہتر۔ ورنہ وہی بادبانی کشتی اور مچھیروں کا جال۔ تم کشتی پر ہی گھر بسا سکتے ہو۔ اور آباد کر سکتے ہو۔ ایک خاتون جو ہائی کورٹ کی نامور وکیل تھیں ایک مچھیرن کے روپ میں۔"

"بالکل فلمی آئیڈیا ہے۔ سُپر ہٹ فلم بن سکتی ہے۔" میں نے کہا۔ "فلم میں رومانی سین بھی آسکتے ہیں۔ کھلا سمندر۔۔۔ چاند۔۔۔ لہروں کی سرگم اور کوئی دوگانا از قسم۔ میں ترا چاند تو مری چاندنی۔"

"دوسرا پیشہ ہے مزدوری کا۔" اکرام نے گاڑی چلاتے ہوئے اپنی سنجیدگی میں فرق نہیں آنے دیا۔ "مزدور بھی سیکڑوں قسم کے ہیں۔ ہر قسم کے جہاز لانچ یا کشتی پر سامان چڑھانے اور اتارنے والے۔ سامان کو اندر سے باہر اور باہر سے اندر پہنچانے والے۔ لوڈر اور ہیلپر۔۔۔ یہ کام بغیر سرمایہ خرچ کیے ہو سکتا ہے اور اس پیشے میں بھی آدمی کو کھلی چھٹی مل جاتی ہے کہ وہ جہاں چاہے جائے اور جو چاہے کرے۔ بس اُسے کسی ایجنٹ کے ذریعے مزدوری کا حق ملتا ہے۔ جو اس سے بھتّا وصول کرتا ہے اور آگے سب میں تقسیم کرتا ہے۔ بندرگاہ میں جتنے اچھے بُرے کام ہیں۔ جائز اور ناجائز دھندے ہیں اتنے ہی لوگ بھی ہیں جو قواعد و ضوابط میں رعایت برتتے، آنکھیں بند رکھتے اور ہر قسم کا اپنا اوسی دینے کا معاوضہ وصول کرتے ہیں۔"

"تو اتنے کم وقت میں بندرگاہ پر ایک اتھارٹی ہو گیا ہے۔ بہت ریسرچ کی ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن یہ مزدوری والا کام کچھ مشکل اور ذرا شان کے خلاف نہیں ہے؟"

"اس میں خلافِ شان وہ غیر قانونی اور ناجائز کام ہیں جو کرنے بھی پڑتے ہیں اور کرانے بھی پڑتے ہیں۔" اکرام بولا۔ "ورنہ مزدوری اگر صرف مزدوری ہو تو اتنا ہی قابلِ احترام پیشہ ہے جتنا کوئی اور پیشہ۔"

"میرا خیال ہے کہ لانچ یا کشتی والا آئیڈیا چلے گا۔"

"اب میری رائے پوچھو تو میں کشتی کے حق میں ہوں۔" وہ بولا۔ "کسی مچھلی پکڑنے والی بادبانی کشتی کا مشاہدہ کرو۔ اس میں پندرہ بیس یا درجن بھی بسایا جا سکتا ہے۔۔۔ یا ماہا کا۔۔۔ یا کسی اور کمپنی کا۔۔۔ جو اتارا بھی آسانی سے جاتا ہے۔ بادبانی کشتی میں فائدہ یہ ہے کہ اس میں ایک ٹیم کام کر سکتی ہے۔ تین چار افراد کی۔ جال پھینکنے اور کھینچنے والے۔ بادبان چڑھانے اور اتارنے والے۔ پیٹنے والے۔ مرمت کرنے والے اور مچھلیاں ساحل تک لانے والے۔ وہ کشتی پر ہی رہتے ہیں چنانچہ ان کے پاس تھوڑا بہت اپنا سامان بھی ہوتا ہے۔ اور اس سارے کاٹھ کباڑ میں اسلحہ بڑی آسانی سے چھپایا جا سکتا ہے۔۔۔ دو چار مشین گنیں اور دس بیس دستی بم تو پتا بھی نہیں چلتے۔۔۔ حلیہ اور صورت مچھیروں جیسی ہو تو آپ کسی بھی جہاز کے قریب سے گزر جائیں۔ کوئی نظر اٹھا کے نہیں دیکھے گا۔"

"مجھے فلم "گنز آف نیوران" کا منظر یاد آرہا ہے، جس میں انتھونی کوئن اور ڈیوڈ نیون اور شاید گیری کوپر تھے۔ وہ بھی ماہی گیر بنے ہوئے تھے اور جب دشمن کی ایک لانچ نے انھیں روکا جس پر جرمن خفیہ پولیس کے مسلح ارکان تھے تو وہ تینوں بے حد غربت زدہ ماہی گیر بنے جال مرمت کر رہے تھے مگر جال کے نیچے مشین گن اور دستی بم لیے بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے جرمنوں کا پلک جھپکنے میں ملبہ کر دیا تھا۔ یار، یہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"پریشان مت ہو۔۔۔ کراچی میں رہے گا تو فاصلوں کا عادی ہو جائے گا۔" اکرام بولا۔ "یہاں دس پندرہ میل اِدھر اُدھر لیے ہی ہیں، جیسے لاہور میں دو چار میل۔۔۔ ویسے اب ہم پہنچ گئے ہیں۔"

میرے دائیں جانب ایک ندی یا نالہ سا تھا جس کے نشیب میں ایک عجیب منظر تھا۔ دُور دُور تک ہزاروں دُھلے ہوئے کپڑے سوکھ رہے تھے اور ندی کے بیچ میں ایک نیم پختہ ٹوٹے پھوٹے راستے پر سے ٹریفک آجا رہی تھی۔ اس کے پار میں ایک قبرستان کے آثار دیکھ سکتا تھا۔ بائیں جانب عجیب خستہ حال گھر تھے اور ٹیڑھی میڑھی گلیاں تھیں۔ سڑک پر ہر چار قدم کے بعد ایک اسپیڈ بریکر سا آجاتا تھا۔ اکرام نے بتایا کہ یہاں ہر شخص اپنے گھر کے سامنے اپنی مرضی کے مطابق اونچا نیچا۔۔۔ سیمنٹ یا پتھر کا اسپیڈ بریکر بنانے یا نالی کھودنے کا اختیار رکھتا ہے اور یوں ہر گاڑی کی لائف تو آدھی رہ جاتی ہے مگر اسپیڈ بریکر بنانے والوں کو یقین ہے کہ اس طرح وہ تیز رفتاری کے سبب ہونے والے حادثات کو ختم کر سکتے ہیں۔

ٹیکسی کو اس نے ایک گلی میں موڑا۔۔۔ پھر دوسری میں۔۔۔ پھر تیسری اور چوتھی۔۔۔ دائیں بائیں کچے پکے مکان۔ سیمنٹ یا ٹین کی چادروں کی چھتیں۔۔۔ درمیان میں بہتی ہوئی نالی اور نالی کو حسبِ توفیق جسمانی اخراج سے مزید گندا کرتے ہوئے بچے۔ جو ٹیکسی کے پیچھے دوڑتے تھے اور اس سے لٹکنے کی بھی کوشش کرتے تھے۔ اکرام بہت محتاط بھی تھا اور اس نے محبت بھرے لہجے میں بچوں کو متعدد بار کتّے کی طرح دھتکارا اور گالیاں دیں۔ سختی یا نفرت سے یہ کام لیا جاتا تو بچوں کے والدین مار مار کے اکرام کا فوٹو بگاڑ دیتے۔ روم میں ایسا ہی کرو جیسا رومن کرتے ہیں۔

یہاں ایک ہی شہر کے مختلف حصّوں میں رہنے کے ادب آداب اور طور طریقے جدا تھے۔ کلفٹن اور ڈیفنس میں۔۔۔ لالو کھیت میں۔ لیاری میں یا کھارادر میں الگ الگ اندازِ زندگی اور جدا جدا طرزِ بود و باش ہے۔

بالآخر ٹیکسی ایک جگہ رک گئی۔ یہ دو مکانوں کے درمیان اندر کی طرف ایک کھانچا سا تھا جو کسی کھوکھے کی موجودگی سے پیدا ہوا تھا۔ اس طرح تنگ گلی بلاک نہیں ہوئی۔ اکرام نے ایک دروازے کی کنڈی کھولی جس میں نمبر والا تالا لگا ہوا تھا۔ اس سے سیدھا گزرنے کی کوشش کا نتیجہ یہ نکلا کہ میرا سر دہلیز پر لگا۔ اندر صحن بھی برائے نام تھا۔۔۔ اگر میں لانگ جمپ لگاتا تو کمرے کے بند دروازے کو توڑتا ہوا اندر جا گرتا۔

یہ دو کمروں کا گھر تھا۔ دونوں کمرے تاریک تھے اور ان میں وہی بُو تھی جو مقبرۂ جہانگیر کے غیر آباد اور ویران حجروں کی یاد دلاتی تھی جہاں اکرام مختصر ترین اسبابِ زندگی کے ساتھ رہنے پر مجبور تھا۔ چنانچہ دو کمروں میں دو ہی چارپائیاں تھیں۔ لوہے کے پائپ والے فریم سے بنی ہوئی جن کو چوڑیاں گھما کے کھولا بھی جا سکتا تھا۔ ایک اسٹیل کی میز تھی اور اسٹیل کی دو فولڈنگ کرسیاں۔ ایک ٹیبل فین دونوں کمروں میں موجود تھا اور دونوں کمروں کی دیواروں پر جو تختے لگے ہوئے تھے ان پر ذاتی ضرورت کا الگ الگ سامان رکھا ہوا تھا۔ اکرام کا صندوق اس کے پلنگ بلکہ لکڑی کے تخت کے نیچے تھا اور نازو کا صندوق نازو کے تخت کے نیچے۔

اکرام نے میرے دونوں سوٹ کیسوں کو بھی اسی طرح دو کمروں میں تقسیم کر دیا اور دونوں تختوں کے نیچے سوٹ کیس بھی روپوش ہو گئے۔ کوئی تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس غریب بستی کے اس خستہ حال گھر میں کتنا دھماکا خیز مواد جمع ہے اور کتنے لاکھ کی کرنسی موجود ہے جو اسی ملک کے دشمنوں کا عطیہ ہے۔ میں نے اکرام کو بتایا کہ کار میں کچھ گولہ بارود بھی ہے تو اس نے کہا کہ اگلے پھیرے میں وہ بھی لے آئیں گے۔

"یہ بڑا اچھا ہوا کہ زیادہ لوگوں نے تیرے سوٹ بوٹ پر شک کی نظریں نہیں ڈالیں۔" اکرام بولا۔ "اب یہ لباسِ افرنگ بدل ڈال۔ اور میں تجھے ایک خلعتِ فاخرہ عطا کرتا ہوں۔ وہ زیب تن کر۔"

اس کی عطا کردہ خلعتِ فاخرہ ایک میلی سفید شلوار اور ڈھیلی ڈھالی سفید قمیص پر مشتمل تھی جو غالباً کسی فٹ پاتھ پر سے ریڈی میڈ خریدی گئی تھی۔ میں نے اس کے چپل پہنے اور ایک گول ٹوپی سر پر رکھی۔ پھر ہم کھانے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ اس وقت تین بجنے والے تھے۔ پھر بھی اکرام شیخ مجھے صدر لے گیا۔

"تجھے بمبئی کی مسالے والی بریانی کھلاتے ہیں۔" وہ بولا۔ "یہ کراچی کا تین نمبر تحفہ ہے۔"

"دو نمبر اور ایک نمبر کیا ہیں؟"

"ایک نمبر ہے تماری جو ہر طبقے، ہر کلاس، ہر محلّے اور بازار میں ہر قیمت پر ملتی ہے۔" وہ بولا۔ "دوسرے نمبر پر ہے حلیم۔"

چار بج رہے تھے چنانچہ بھوک سے میرا حال خراب تھا۔ مجھے بریانی بہت اچھی لگی۔ میں کھانے میں محو تھا کہ مجھے اچانک اکرام کی حالت میں رونما ہونے والے جذباتی تغیر نے متوجہ کیا۔ وہ اداس ہو گیا تھا اور اس نے کھانا چھوڑ دیا تھا۔

"کیا ہوا؟" میں نے کہا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "کچھ نہیں یار۔"

میں سمجھ گیا کہ اُسے نازو یاد آگئی ہے۔ "دیکھ۔۔۔ اس طرح عورتوں کی طرح ذرا ذرا سی بات پر ملول ہونے اور دل کو رنجیدہ کرنے سے تو کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا۔ نازو کہیں نہیں جا سکتی۔ وہ ہمیں ضرور ملے گی۔ بس وہ اپنے جرم کی سنگینی کے پیشِ نظر مجبور ہے کہ بالکل روپوش رہے۔ دو چار دن میں یہ معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے گا تو وہ بھی ایسے ہی گھومتے پھرتے مل جائے گی جیسے میں ملا تھا۔"

"بس یار۔۔۔ ایسے ہی جب اس کا خیال آتا ہے نا تو عقل کی ساری تسلیاں بے کار ثابت ہوتی ہیں۔ یہی سوچنے لگتا ہوں کہ نہ جانے اس وقت وہ کہاں ہوگی۔ کس حال میں ہوگی؟ اس نے کچھ کھایا پیا ہوگا یا نہیں۔۔۔ اور خدانخواستہ۔۔۔ خدانخواستہ۔۔۔" وہ پلیٹ رکھ کے اور مُنہ چھپا کے رونے لگا۔

نوالہ میرے حلق میں اٹک گیا، میری بھوک مر گئی اور میں نے بھی اپنی پلیٹ ایک طرف رکھ دی۔ "یار کہیں مرد اس طرح روتے ہیں اور نازو جیسی بہن کا بھائی جو خود بھی ایک باحوصلہ اور نڈر پولیس افسر رہا ہو۔"

"اس کا اور میرا اب دنیا میں اور کوئی نہیں رہا نا۔" وہ آنسو صاف کر کے بولا۔ "ماں باپ تھے تو ایک پہلے سے دل کا مریض تھا۔ اسے دنیا والوں کی انگشت نمائی نے نہ جینے دیا۔ دوسرے کے لیے یہ صدمہ ناقابلِ برداشت ثابت ہوا۔ مجھے اس گھر کی خانہ ویرانی کے تصوّر سے ندامت بھی ہوتی ہے اور وحشت بھی۔"

"ایک گھر میرا بھی تھا اکرام۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "اور اب بھی ہے۔۔۔ اس کی خانہ ویرانی مجھے بھی لہو رُلاتی ہے۔ گھر غالب کا بھی تھا، جو اَب ایک اُجڑا دیار ہے۔۔۔ محض ایک کھنڈر۔ گھر تو بنتے ہیں، بستے ہیں، اُجڑ جاتے ہیں اور مٹ جاتے ہیں مگر

پھران کی جگہ نئے گھر بنتے ہیں اور نئی خوشیوں کے ساتھ آباد ہوتے ہیں۔ جیسے خزاں میں سارے پتے درختوں سے جھڑ جاتے ہیں اور پھول مرجھا جاتے ہیں۔ مگر بہار پھر آتی ہے... نئے... زیادہ شوخ اور زیادہ حسین رنگ لے کر۔ ہم سب آج بے گھر ہیں مگر ہم سب کے خوابوں اور خیالوں کا گھر تو آباد ہے۔ ایک دن اس کی تعبیر بھی حقیقت کا روپ دھار لے گی۔ اسی دن کے لیے ہماری جدوجہد جاری ہے۔ ہم اسی گھر کو بنانے اور بچانے کے لیے تو لڑ رہے ہیں... وقت سے... اپنی خوشیوں کے دشمنوں سے... ان خواہشوں سے جو ہمارا راستہ روکتی ہیں۔ ان خود غرض جذبوں سے جو ہمیں آج کی جھوٹی خوشیوں، عارضی مسرتوں اور دلچسپیوں کی طرف بلاتے ہیں۔ وہ وقت میری جان بہت دور نہیں ہے۔ جب محسن اور شہلا کا ایک گھر ہوگا۔ میرا اور رابعہ کا ایک گھر ہوگا... نازو کا ایک گھر ہوگا...“

وہ کچھ دیر بعد بولا۔ ”غالب کا کیا حال ہے؟ اس کا تو میں نے پوچھا ہی نہیں۔“

”سب اسی طرح اپنی امیدوں اور جذبوں کے ساتھ جی رہے ہیں اور آگے بڑھ رہے ہیں... جیسے میں...“ میں نے دل میں تیسرے گھر کی تکمیل کی خوشی کو محسوس کیا۔ نازو کے گھر کے ساتھ ہی اکرام نے غالب کا ذکر کر کے لاشعوری طور پر مجھے بتلا دیا تھا کہ وہ غالب کا ہی گھر ہوگا... یہ بہت بڑی تبدیلی تھی۔ ایک وقت تھا کہ اکرام میرے خلاف صفِ دشمناں میں شامل تھا، بلاشبہ اس کی دشمنی میں ذاتی عداوت کے جذبات شامل نہ تھے۔ وہ اصول پرستی اور فرض شناسی کے تقاضے تھے جنھوں نے مجھے اور اسے ایک دوسرے کے مقابل رکھا تھا اور اس حد تک دور کر دیا تھا کہ ہم اپنی دوستی کو بھول کر جان کی دشمنی مول لے بیٹھے تھے۔ مگر پھر اس دنیا کے دوغلے موقع پرست لالچی اور بے ضمیر لوگ اکرام کے بھی دشمن ہو گئے اور بدعنوان رشوت خور اور بدکردار پولیس افسروں نے اس کے کانٹے کی طرح کھٹکنے والے وجود کو نکال باہر کیا۔ اب بھی وہ اصولی بنیادوں پر میرا ساتھی تھا۔ وہ میرے دشمنوں کا دشمن تھا اور اس نے تسلیم کر لیا تھا کہ ہمارا اندازِ جنگ ہی مؤثر اور حقیقت پسندانہ ہے۔ اس نے چھوٹی بہن کی محافظت کے لیے بھی ہم سے اتحاد کر لیا تھا اور یہ تازہ ترین خوشخبری تھی کہ اس نے غالب کا رشتہ بھی منظور کر لیا تھا۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ نازو کے ساتھ غالب کا نام سننا بھی گوارا نہ کرتا۔ مگر نازو کے جذبات اور غالب کے خلوص کو دیکھتے ہوئے اس نے اپنی غلطی تسلیم کر لی تھی اور یہ مان لیا تھا کہ ان کی محبت بھی اتنی ہی معصوم اور نیک ہے جتنی ہم سب کے صادق جذبوں کی بے غرضی۔

”ڈبل ایس آئی اکرام شیخ کس نام سے ٹیکسی چلاتا ہے؟“ میں نے اس کو موڈ صحیح کرنے کے لیے کہا۔

”ڈرائیونگ لائسنس پر میں امیر خان ولد کبیر خان ہوں۔“ وہ مسکرایا۔

میں ہنس پڑا۔ ”منکہ مسمّی کبیر خان ولد وزیر خان کیا عرض کروں، یہ عزت افزائی ہے آپ کی کہ مجھے والد ماجد کے منصب پر فائز کیا۔“

”کیا لوگ وقت پڑنے پر گدھے کو بھی باپ نہیں بناتے؟“ وہ بولا۔

”بادشاہ خان ولد شہنشاہ خان رکھتے میں کیا حرج تھا؟“

”آپ نے میری ٹیکسی کے پیچھے لکھا ہوا شعر نہیں پڑھا۔“ اکرام نے کہا۔

”پیچھے تو لکھا ہوا ہے، بچو یار تنگ نہ کر۔“

”اس کے نیچے۔“ اکرام بولا۔ ”میں دل کا بادشاہ ہوں لیکن دھکے کھا رہا ہوں۔ رالز رائس کی جگہ دیکھو ڈاٹسن چلا رہا ہوں۔“

ہم دونوں ہنسنے لگے۔ ”یہ ٹرانسپورٹ بلاشبہ مصوری اور شاعری کے نمونے میں سارا دن دیکھتا رہا ہوں... یہاں سب کا ذوق بہت اعلیٰ ہے کیا ٹیکسی رکشا اور کیا ٹرک اور بس... ایسی ایسی محیر العقول تصویریں نظر آتی ہیں کہ مصور کے تخیل پر رشک آتا ہے... آج ہی میں نے ایک ٹرک کے پیچھے ایک سہانا منظر دیکھا کہ دریا پہاڑوں سے گزر کے شاداب جنگل سے گزر رہا ہے اور دریا کے کنارے شیر اور بکری ایک ساتھ پانی پی رہے ہیں۔ اس کے نیچے لکھا ہوا تھا ’انصاف اور قانون‘۔“

”خیالی دنیاؤں کے تصوراتی ماحول میں رہنے والے مظلوم لوگ اور کیا کریں۔“ اکرام بولا۔ ”جو دنیا میں نہیں ہے، وہ مصور کے موئے قلم میں تو ہے... اس کی تصویر تو دیکھی جا سکتی ہے اور دکھائی بھی جا سکتی ہے۔“

”حقیقی انصاف اور قانون کا تماشا کار افتخار عارف کا خون ہے۔“ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”اس شہر میں جو مہذب پڑھے لکھے لوگوں کا شہر ہے... پیسے والوں کا شہر ہے۔ حکومت کس کی ہے؟“

”میرا ایک نام اور کام اس سے الگ بھی ہے۔“ اکرام شیخ نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کبھی کبھی میں پرانی پولیس کی وردی پہن لیتا ہوں۔ میرے پاس دو وردیاں تھیں۔ کسی شناختی کارڈ کے بغیر وہ وردی بے اختیار ہوتی ہے۔ لیکن میرا شناختی کارڈ بھی ہے۔“

”کیا استعفا دیتے وقت وہ واپس نہیں کرنا پڑتا؟“

”ایک بار میرا اصل شناختی کارڈ کھو گیا تھا۔“ وہ بولا۔ ”میں نے قاعدے ضابطے کے مطابق رپورٹ لکھوائی اور وارننگ بھی دی گئی مجھے [illegible] کے بعد ڈپلی کیٹ بنا دیا گیا۔ تین چار [illegible] اصلی کارڈ گھر ہی میں مل گیا۔ وہ درازوں کے [illegible] اب میں تو رپورٹ لکھوا چکا تھا کہ فلاں بس [illegible] فلاں مقام پر کسی نے میری جیب کاٹ [illegible] ہی شناختی کارڈ بھی چلا گیا۔ ایسا کرنا ضروری تھا۔“

”یہ قواعد و ضوابط بھی آدمی کو کتنا جھوٹ بولنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”ہاں یار... اگر میں سچ بولتا کہ وہ مل نہیں رہا ہے... سارا گھر چھان مارا اور غالباً میں کہیں رکھ کے بھول گیا ہوں۔ تو یہ سنگین غفلت کا کیس بنتا۔ میں نے الزام ایک نامعلوم جیب تراش پر رکھا اور بچ گیا۔ اصل کارڈ ملنے کے بعد میں کیسے جا کے کہتا کہ جناب وہ رپورٹ جھوٹی تھی۔ میں نے اسے پڑا رہنے دیا۔ جب استعفا دینے کا وقت آیا تو وہ ڈپلی کیٹ واپس کر دیا گیا۔ اصل میرے پاس رہا اور اب کام آ رہا ہے۔ اب تک صرف دو بار میں نے وردی پہن کے اور اس شناختی کارڈ کی مدد سے فائدہ اٹھایا ہے۔ وہ پنجاب پولیس کا کارڈ ہے مگر ایک صوبے کے افسر دوسرے صوبے کے شہروں میں جاتے رہتے ہیں۔ کبھی ملزم کا پیچھا کرنے کبھی چھاپا مارنے... کبھی اسپیشل ٹیم کے ساتھ۔ یہاں مجھے کوئی پہلے بھی نہیں جانتا تھا۔ چنانچہ کسی کو معلوم نہیں کہ سب انسپکٹر اکرام شیخ نے استعفا دے دیا ہے۔“

”مگر خطرہ تو ہے۔“

”اسی لیے کبھی کبھار استعمال کر لیتا ہوں جب اس کے بغیر کام نہ نکلتا ہو۔“ وہ بولا۔

ہمارے آس پاس بہت سے لوگ ہر قسم کی گاڑیوں میں بیٹھے ہوئے بریانی کھا رہے تھے اور یہ سب گاڑیاں آڑی ترچھی ایک کچے میدان میں کھڑی ہوئی تھیں۔ اب کھانے کا وقت گزر چکا تھا چنانچہ بہت کم گاڑیاں رہ گئی تھیں۔ اکرام شیخ نے میری معلومات میں اضافے کے لیے بتایا کہ دوپہر اور رات کو کھانے کے وقت یہاں گھمسان کا رن پڑتا ہے اور گاڑی کھڑی کرنے کو جگہ نہیں ملتی۔ بظاہر وہ ایک جھگی نما ہوٹل تھا مگر اکرام شیخ نے کہا کہ اس کی صبح سے آدھی رات تک کی سیل کا اندازہ کرنا بھی مشکل ہے۔ منافع ہزاروں میں سمجھا جا سکتا ہے۔

”سب قدرت کے کھیل ہیں۔“ اکرام نے گھڑے میں سے نوٹ نکال کے استری کرنا شروع کیے اور بل وصول کرنے کے لیے کھڑے ہوئے ویٹر کی آنکھیں حیرت سے پھٹنے لگیں۔ ایسا شاید کبھی نہ ہوا ہوگا کہ کوئی پانی پینے کے مٹکے میں نوٹ بھر کے لائے اور اسی میں سے ادائیگی کرے۔ جب بینک نہیں تھے تب بھی لوگ پیسہ گھڑوں میں بہرحال نہیں رکھتے تھے، تجوریوں میں اور الماریوں میں رکھتے تھے۔ اب تو کراچی میں گھڑا بھر نوٹ لے کر پھرنا گویا چوروں اور ڈاکوؤں کو اپنے پیچھے لگانے کے مترادف تھا۔ اکرام نے ویٹر کو دس روپے ٹپ میں دیے۔

”مالِ مفت دلِ بے رحم۔“ میں نے کہا۔ ”پہلے کبھی اتنی ٹپ دی تھی؟“

اکرام ہنسا۔ ”دوسرا محاورہ ہے کہ خدا شکر خورے کو ہی شکر دیتا ہے۔ اس سالے فقیر نے جمع کیا اور عیش ہم کر رہے ہیں۔ کیونکہ سب چیزوں کی طرح خوشی اور عیش اگر کسی کی تقدیر میں نہ ہوں تو وہ تمام عمر ترستا رہتا ہے اور روتا رہتا ہے۔ میں نے ایسے لکھ پتی کیا کروڑ پتی کنجوس دیکھے ہیں جو دوا دارو کے لیے سرکاری شفاخانے میں جاتے ہیں اور حلیے سے بھنگی نظر آتے ہیں۔ بس وہی بات ہے کہ پیسہ تو خدا نے دیا مگر مقدر میں خوشی نہیں لکھی اور آرام نہیں لکھا۔“

”اس گھڑے میں کتنی دولت ہوگی... اندازاً۔“

”میرا خیال ہے کہ پچاس ہزار سے نیچے۔“ میں نے کہا۔

”ہوگئی شرط...“ اکرام بولا۔ ”میں کہتا ہوں کہ پچاس ہزار سے اوپر۔“

”شرط کیا ہے؟“

”شرط؟“ وہ سوچ کے بولا۔ ”دو منٹ تک مرغا بن کے تین بار کہنا ہے کہ میں کاٹھ کا الو ہوں۔“

ہم وہاں سے روانہ ہو رہے تھے جب ایک ٹیکسی ہمارے قریب آ کے رکی اور اس میں سے ایک کانسٹیبل اترا۔ ایک اے ایس آئی اور ایک کانسٹیبل اندر بیٹھے رہے۔ ان کے ساتھ کوئی ملزم بھی تھا جس کی ہتھکڑیاں کھول دی گئی تھیں۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ ملزم کے خرچ پر بریانی سے پیٹ کے تندور میں آگ بھرنے آئے تھے اور اس کے بدلے ملزم کو یہ غیر قانونی رعایت دے رہے تھے۔

”یہ اسی تھانے کے بندے ہیں۔“ اکرام نے کہا۔ ”جو صبح ملے تھے۔ افتخار عارف کے قتل کی ابتدائی تفتیش کے لیے۔“

میں نے چونک کر ادھر دیکھا۔ میری نظر ملزم پر گئی، اور میرے ذہن کو الیکٹرک شاک سا لگا۔ یہ وہی ٹرک ڈرائیور تھا۔

”اکرام... بھاگ یہاں [illegible] چل جل۔“ میں نے کہا۔

اکرام ذہین آدمی تھا۔ [illegible] اور میری صورت کے تاثر نے اسے وہ سب سمجھا دیا جو میں زبان سے نہ کہہ سکا تھا۔ اس نے ایک دم ٹیکسی ریورس میں لی۔ مگر اتنی دیر میں ٹرک ڈرائیور

مجھے دیکھ چکا تھا۔ اُس نے چلّا کے کچھ کہا اور پھر دیوانہ وار اس کے پیچھے دوڑا۔ ٹیکسی ڈرائیور بریانی لینے گیا ہوا تھا۔ ایک کانسٹیبل رسماً باہر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کی رائفل اندر ہی رکھی ہوئی تھی۔ پچھلی سیٹ پر دوسرا کانسٹیبل موجود تھا مگر وہ بھی بڑے سکون سے بریانی کا انتظار کر رہا تھا جس کی خوشبو اس کی اشتہا کو بڑھا رہی ہو گی۔ ایک سب انسپکٹر یا اے ایس آئی آگے تھا مگر وہ نیم غنودگی کی کیفیت میں سر کو پیچھے ہیڈ ریسٹ پر رکھے بیٹھا ہوا تھا۔

ملزم کے ایک دم نکل بھاگنے سے یقیناً ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے ہوں گے۔ ایسا ہوتا ہی رہتا ہے کہ کوئی پولیس پارٹی کسی ملزم کو رشتے داروں سے ملوانے یا ناشتا کرانے اور کھانا کھلانے کے لیے لے گئی۔ اس رعایت کی رشتے داروں کی طرف سے بھاری رشوت الگ ملتی ہے اور اچھا کھانے میں وہ برابر کے شریک ہوتے ہیں، مگر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ملزم ہتھکڑی سمیت بھاگ جاتے ہیں یا ہائی جیک کر لیے جاتے ہیں۔ بعض اوقات بہت تگڑی رشوت پر ہائی جیکنگ کا ڈراما بھی رچایا جاتا ہے اور ظاہر کیا جاتا ہے کہ محافظوں کو حملہ کر کے بے بس کر دیا گیا تھا۔ مجرمانہ غفلت میں معطل ہونے والے کانسٹیبل عارضی طور پر معطل ہو جاتے ہیں اور دو چار مہینے فارغ رہتے ہیں تو آرام کرتے ہیں۔ پھر بحال کر دیے جاتے ہیں۔ بنک بیلنس میں بیس پچیس ہزار بڑھ جاتے ہیں۔

اس وقت یہ صورتِ حال نہیں تھی۔ معاملہ ایک معروف صحافی کے قتل کا تھا۔ بھاگنے والا کس لیے بھاگا تھا، یہ کسی نے نہیں دیکھا۔ سب نے یہی سمجھا کہ سب سے اہم شخص جسے ضرورت پڑنے پر مجرم ثابت کر کے لٹکایا بھی جا سکتا تھا، ہاتھ سے نکل گیا۔ پولیس والے اپنی تاریخی رائفلیں اٹھائے دوڑے ہوں گے۔ ان کے افسرِ اعلیٰ کی غنودگی یکلخت کافور ہو گئی ہو گی۔ اس نے سب سے پہلے ریوالور نکال کے فائر کیا۔

ہماری ٹیکسی اتنی دیر میں بہت دُور جا چکی تھی۔ میں نے سر گھما کے پیچھے والے شیشے میں سے دیکھا تو ٹرک ڈرائیور اچھل کے زمین پر گرا تھا۔ میں نے اس کے سر سے پھوٹتے والا خون کا فوارہ بھی دیکھا۔ یہ پولیس کی کوتاہ اندیشی تھی یا ایک دانستہ حرکت کہ انھوں نے تعاقب کر کے اسے گرفتار کرنے کی بالکل کوشش نہیں کی۔ وہ اگر سوچ سمجھ کے فائر کرتے تو ملزم کی ٹانگ کو نشانہ بناتے۔

لیکن پیچیدہ اور گلے پڑنے والے کیس یوں بھی ختم کیے جاتے ہیں۔ عرفِ عام میں پولیس مقابلے کے ذریعے۔ انھوں نے اچھی طرح دیکھ بھال کے سر کا نشانہ لیا۔ اب اس واردات کی تفتیش ہو گی تو حقیقت بیان کرنے والے گواہ بہت... وہ لاش کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں گے تاکہ خود پولیس پر تو الزام نہ آئے کہ انھوں نے مجرم کو کھلا چھوڑ رکھا تھا۔ اس کے بعد اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے ایک مشترکہ مؤقف اختیار کیا جا سکتا ہے کہ ملزم کے ساتھی وہیں موجود تھے۔ ان کی شہ پر ملزم نے ہتھکڑیوں سمیت فرار ہونا چاہا اور اس کے ساتھیوں نے فائرنگ کی مگر وہ ملزم کو لے جا نہ سکے اور خود فرار ہو گئے۔ یہ ثابت کرنے کے لیے یہ واقعہ بالکل ایسے ہی پیش آیا تھا، وہ دس گواہ حاضر کر دیں گے۔ بریانی کھانے والے تو گئے۔ رہ گئے وہاں کے نوکر، بیرے تو ان کی کیا مجال کہ پولیس کی مرضی کے مطابق بیان نہ دیں۔ یہاں تو یہ بھی ہوتا ہے کہ گواہوں سے سادہ کاغذ پر دستخط لے لیے جاتے ہیں اور پولیس اپنی مرضی کے مطابق بیان بعد میں لکھ لیتی ہے۔ دیدہ دلیری کی انتہا اس وقت ہوئی تھی جب لاہور ہائی کورٹ کے ایک جج کے سامنے کوئی فائل پیش کر دی گئی تھی جس میں ایسے ہی دستخط شدہ سادے کاغذ بھی لگے رہ گئے تھے۔

"یہ تو بہت بُرا ہوا یار۔" اکرام بولا۔

"فکر مت کرو... اس نے ہمارا نمبر نہیں دیکھا تھا۔" میں نے کہا۔ "اور دیکھا بھی ہو گا تو اُسے موقع کہاں ملا کہ کسی کو بتا سکتا۔"

"کس قدر سفاک اور بے رحم لوگوں کے ہاتھ میں قانون کا اختیار اور اسلحہ دے دیا گیا ہے۔" اکرام شیخ نے نفرت سے کہا۔

"اسے مروایا گیا ہے دوست!" میں نے کہا۔ "وہ نااہل ثابت ہوا تھا اور دشمن کے قابو میں آ گیا تھا۔ اس نے بہت کچھ بتا بھی دیا تھا۔"

"ہم آج رات افتخار عارف کے گھر چلیں گے۔"

"گھر؟ اس قبرستان میں جہاں وہ دفن کیا جائے گا؟" میں نے دل میں اُٹھنے والی ٹیس کو دبا لیا۔

"نہیں... اسی گھر میں جہاں وہ مارا گیا تھا۔" اکرام نے کہا۔

"میں سوچ رہا تھا کہ بندرگاہ کی طرف جاؤں۔ دوست محمد سے ملنے۔"

"وہاں بھی چلے جائیں گے۔" اکرام نے کہا۔ "رات کے وقت یا کل... پہلے یہ کام ضروری ہے۔"

"وہاں کون جانے دے گا ہمیں؟"

"میں پولیس انسپکٹر کی حیثیت سے جاؤں گا۔" وہ بولا۔ "مجھے امید ہے کہ وہاں سے کچھ ضرور ملے گا۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "لے جانے والے وہ سب لے گئے ہوں گے۔ وہ اتنے بے وقوف نہیں تھے کہ افتخار عارف کو مار گئے ہوں اور لے کر کچھ نہ گئے ہوں۔"

"ایک چانس یہ بھی ہے کہ انھیں موقع نہ ملا ہو۔ وہ اچانک آ گیا ہو اور انھیں فرار ہونا پڑا ہو۔" اکرام نے کہا۔ "میں خود کو ایک تفتیشی افسر ظاہر کر کے اندر جاؤں گا اور اطمینان سے رات بھر تلاشی لوں گا... باہر ایک سپاہی ہو گا یا دو ہوں گے۔ وہ مداخلت نہیں کریں گے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ سارا مواد میرے ہاتھ لگ جائے جو افتخار عارف نے اکٹھا کیا تھا اور جو وہ آئی ایس آئی کے حوالے کرنا چاہتا تھا۔"

"ٹھیک ہے... کوشش کر لینے میں کوئی حرج نہیں... کیا یہ پتا نہیں چلایا جا سکتا کہ وہ ٹرک کہاں گیا؟"

"مشکل ہے۔" اکرام نے کہا۔ "ممکن ہے ٹرک واپس جا چکا ہو۔"

"مجھے اس کا نمبر یاد ہے۔"

"نمبر کچھ نہیں ہوتا۔ راستے میں چار بار بدل دیا جاتا ہے۔ کیا تو نے خود کو کسٹم انسپکٹر ظاہر کرنے والے کا نام پوچھا تھا؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "مجھے خیال نہیں رہا۔"

"پڑھے لکھے بھی کیسی جہالت کا ثبوت دیتے ہیں۔" وہ بولا۔ "بابا! پولیس والا ہو یا کسٹم انسپکٹر... میٹر ریڈر ہو یا ٹیلی فون کا لائن مین... پہلے اس کا شناختی کارڈ تو دیکھنا چاہیے۔ اس احمقانہ روش کے نتیجے میں روز وارداتیں ہوتی ہیں۔ بدمعاش گھر میں گھس کر سب کچھ لے جاتے ہیں۔ بعض اوقات گھر والیوں کی عزت بھی۔ مگر عورتوں کو کیا کہیے کوئی جیب تم جیسے ہر ایرے غیرے کو کوتوال مان لیتے ہیں... محض اس کے کہنے پر۔"

"یار! کہا نا کہ غلطی ہو گئی۔ اب ایک بات میری بھی سُن۔ اس اخبار میں جہاں افتخار عارف تھا۔ اس کا کوئی دوست تلاش کرنا چاہیے۔ ویسے تو صحافی سب آپس میں دوست ہوتے ہیں مگر سب قابلِ اعتبار نہیں ہوتے۔ پریس کلب سے معلوم ہو سکے تو ہم اس شخص کا تعاون حاصل کر سکتے ہیں اور اسے افتخار کے قتل کے بارے میں بہت کچھ بتا سکتے ہیں۔"

"اصولی طور پر تو یہ اچھی تجویز ہے۔" اکرام نے کہا۔ "مگر جناب! پہلی بات تو یہ کہ کسی کے قابلِ اعتبار ہونے کا کیسے پتا چلے گا؟ پھر یہ معاملہ ایسا ہے کہ افتخار کے انجام سے سب ڈرے ہوئے ہوں گے۔ ہر صحافی جینز بانڈ نہیں ہوتا... شاید جان ہتھیلی پر رکھ کے افتخار عارف کے نقشِ قدم پر چلنے کی ہمت اس شخص میں نہ ہو... اگر پریس کلب چلنا ہے تو چلو... یہاں سے زیادہ دُور نہیں ہے۔ انگل روڈ پر ہے۔"

"مگر میں اور تم وہاں داخلے کا حق نہیں رکھتے۔"

"ایک ویٹر سے تعارف ہے۔ میں اس کی بیوی کو ہسپتال لے گیا تھا۔" اکرام بولا۔ "اس کی عدم موجودگی میں ہی اُسے داخل بھی کرا دیا تھا اور پھر پریس کلب جا کے اُسے باپ بننے کی مبارک باد بھی دی تھی۔ وہ بہت احسان مند ہوا تھا۔"

"بس تو پھر چلو..." میں نے کہا۔

پریس کلب کے احاطے میں اس وقت آٹھ دس کاریں کھڑی ہوئی تھیں مگر لوگ اندر تھے۔ صرف ایک میز پر ایک خاتون اور دو حضرات چائے پی رہے تھے مگر انھوں نے صرف ٹیکسی کو دیکھا اور فرض کیا کہ اس میں بھی انہی کا کوئی ہم پیشہ اندر آیا ہو گا۔ اکرام عقبی حصے سے اندر گیا اور چند منٹ کے بعد اس ویٹر کے ساتھ نمودار ہوا۔ وہ دونوں ایک کونے میں کھڑے باتیں کرتے رہے۔ ویٹر نے میری طرف بھی دیکھا اور غالباً اکرام کو کھینچ کر اصرار کیا کہ اپنے مہمان کے ساتھ چائے پیے۔ اکرام نے اس کے ہاتھ پر تھپکی دی اور لوٹ آیا۔

"قاضی کے گھر کے چوہے بھی اتنے سیانے نہیں ہوتے ہوں گے جتنے پریس کلب کے ویٹر باخبر ہوتے ہیں۔" اکرام نے پھر ٹیکسی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ "سب کی سنتے ہیں نا۔"

"کوئی خاص بات معلوم ہوئی؟"

"ہاں... افتخار عارف کی ایک بہن ہے۔ اس کا شوہر اسے پی پی میں ہے۔" اکرام ٹیکسی کو ریورس میں گیٹ تک لے گیا۔

"اور ایک بہت قریبی دوست جو اکثر اس کے ساتھ نظر آتا تھا آج کل شوبزنس کے ایک پرچے کا ایڈیٹر ہے۔ پہلے اسی کے ساتھ تھا۔"

"ویری گڈ... اگر یہ کام کے لوگ ثابت ہوئے تو ہم افتخار عارف کا کیس ایسے ختم نہیں ہونے دیں گے۔" میں نے کہا۔ "کہ قاتل وہ ٹرک ڈرائیور تھا جو فرار ہونے کی کوشش میں مارا گیا۔ اب کیسا پرچا اور کیسا چالان... عدالت بھی پھانسی ہی دیتی نا۔"

"جذباتی مت بنو... پولیس کے لیے سب کام آسان ہیں۔ تُو اگر یہ سمجھتا ہے کہ ان کو مشکل میں ڈال دے گا تو یہ تیری بھول ہے۔ تو خود اپنے لیے مشکل پیدا کرے گا... اپنے اصل مقصد سے ہٹ جائے گا۔" اکرام شیخ نے کہا۔

میرا بھٹکا ہوا ذہن راہِ راست پر آ گیا۔ واقعی میرا مشن پولیس کے محکمے کی اصلاح تو نہیں ہے۔ مجھے رابعہ کو تلاش کرنا ہے۔ اکرام کے ساتھ نازو کو ڈھونڈنا ہے۔ پھر دیکھنا ہے کہ یہاں کتنے شکاری ہیں اور اس شکار گاہ میں ان کو کیسے گھیرا جا سکتا ہے؟

"میرے پاس ایک ٹیلی فون نمبر ہے۔" میں نے کہا۔ "جس پر میری رابعہ سے بات ہوئی تھی۔ کیا یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ نمبر کس کا ہے؟"

"میرے خیال میں یہ کوئی مشکل بات نہیں۔" اکرام نے کہا۔ "کوئی بھی فون آپریٹر بتا سکتا ہے۔۔۔ یا بتا سکتی ہے؟"

"بتا سکتی ہے ایک آپریٹر۔" اکرام مجھے آنکھ مار کے مسکرایا۔

"اگر میں پیار سے پوچھوں۔"

"یہ تو بہت مشکل کام ہے۔" میں نے کہا۔ "میں تو نہیں کر سکتا اگر وہ کوئی بدصورت لڑکی نما چیز ہو۔"

"وہ لڑکی ہے۔ ایک غریب کلرک کی۔" اکرام بولا۔ "جو مجبوری کی وجہ سے نوکری کر رہی ہے۔ اس شہر کی ہزاروں لڑکیوں کی طرح وہ بھی مردوں کے درمیان خود کو ایسے محسوس کرتی ہے جیسے بھیڑ کے بھیڑیوں کے درمیان بکھیر۔۔۔ مگر ابھی تک وہ خود کو بچا رہی ہے۔"

"کیا آپ بھی۔۔۔؟"

"نہیں۔۔۔ میں وہ ہیرو ہوں جو عموماً وقت پر نمودار ہو کے لڑکی کو پریشان کرنے والوں کا دھڑن تختہ کر دیتا ہے۔" وہ بولا۔ "اگر میں مدد نہ کرتا تو وہ اغوا ہو جاتی۔۔۔ پھر یہ ہو سکتا تھا کہ میں خود اُسے اپنی ٹیکسی میں اغوا کر کے لے جاتا۔ وہ تو بے ہوش تھی۔ مگر میں نے اسے گھر پہنچایا اور اس کے باپ کو بہت ڈانٹا کہ جوان لڑکیوں کو گھر سے بھیجتے ہی کیوں ہو۔ جانتے ہو دنیا کیسی ہے۔ پھر اس نے مجھے عملاً روتے ہوئے بتایا کہ کس طرح ایک افسر کے ذاتی عناد کی بنا پر اس کو ریٹائر کیا گیا اور اب دو سال سے وہ چکر لگا رہا ہے لے جی پی آر کے مگر آفس والے سروس بک اور متعلقہ ریکارڈ ہی نہیں بھیج رہے ہیں۔ سب اسی افسر کی کارستانی ہے۔ وہ خود تو اب دفتر میں گھس بھی نہیں سکتا۔۔۔ مجبوراً بیٹی کی کمائی کھا رہا ہے۔"

"اچھا رومانٹک اسٹارٹ ہے۔" میں نے کہا۔

"اس کے بعد سُن۔" اکرام بولا۔ "میں نے اس سے کہا کہ آئندہ جب رات کو ڈیوٹی ختم ہو تو مجھے بتا دے۔ میں آ کے لے جایا کروں گا۔۔۔ اور جناب یوں میں اس کی عزت کے محافظ کی حیثیت سے اپنا اخلاقی فرض اب بھی ادا کرتا ہوں۔"

"اخلاقی فرض۔۔۔ یہ فرمائیے کہ عشق کس مرحلے پر ہے۔ دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔۔۔ یا ابھی تک ون وے ٹریفک ہے؟"

"ون وے ٹریفک شروع سے تھی اور رہے گی۔ اس کی تو منگنی بھی ہو چکی ہے۔ اپنے کسی پھوپی زاد سے۔" وہ بولا۔ "بس وہ دبئی سے آیا تو۔۔۔ دی اینڈ۔" اس نے ٹیکسی روک دی اور کسی ایکسچینج میں گھس گیا۔

"یہ نمبر۔۔۔ کس نے دیا تھا تجھے؟" اس نے واپس آ کے پُرتشویش لہجے میں کہا۔

"کیوں۔۔۔ خیریت تو ہے نا؟"

"ابھی تک تو نظر آ رہی ہے۔۔۔ آگے کا پتا نہیں۔ نمبر سیٹھ چاند بھائی موٹا والا کا ہے۔" وہ بولا۔

اس نام نے مجھے محظوظ کیا۔ "سیٹھ سورج بھائی چھوٹا والا۔"

"یہ مذاق کی بات نہیں۔۔۔ چاند بھائی شہر کا نامی گرامی اسمگلر اور بدمعاش ہے۔" اکرام نے کہا۔ "یہ اس کے گھر کا نمبر ہے۔"

"تجھے۔۔۔ غلط تو نہیں بتایا اس نے۔۔۔؟"

"یہ نمبر لکھ کے تو نے ہی دیا تھا نا؟" اکرام نے ایک چٹ مجھے تھما دی۔ "اب فون کر کے پوچھ لے۔"

میرا دماغ چکرا گیا۔ اب مغرب کا وقت ہو گیا تھا۔ اکرام نے ٹیکسی کا رُخ اپنے گھر کی طرف موڑا۔ اس نے میرے فضول سوالات کے معقول جوابات تک نہیں دیے اور صاف کہا کہ چاند بھائی کے گھر جانے سے بہتر ہے کہ تو لائن حاضر ہو جا۔ بعد میں اس نے میرے جذبات کو دیکھتے ہوئے سوچنے اور مناسب کارروائی کرنے کا وعدہ کیا۔

ہم جب واپس ہوئے تو ہر طرف اندھیرا تھا۔ ٹیکسی کو ہم نے سڑک پر ہی چھوڑ دیا تھا۔ جب اکرام شیخ پہلے کی طرح سب انسپکٹر بن گیا تو میں نے گلی میں جھانک کر "آل کلیئر" کا سگنل دیا اور وہ باہر آ گیا تو میں نے تالا لگا دیا۔ پھر میں اس کے ساتھ کسی زیرِ حراست ملزم کی طرح چلنے لگا۔

جہانگیر روڈ ویسٹ کے اس کوارٹر میں بھی اندھیرا تھا۔۔۔ موت کا بے حس۔۔۔ سرد، سفاک اور آسیب زدہ اندھیرا جس میں افتخار عارف سے مختصر رفاقت کی یادیں گم ہو گئی تھیں۔۔۔ باہر پہرا بھی کوئی نہیں تھا مگر پولیس نے مجسٹریٹ کی موجودگی میں کوارٹر کو سربمہر کر دیا تھا۔ پھر رات وہ وقت تھا جب ٹی وی پر شوکت صدیقی کے ناول پر مبنی سیریل "خدا کی بستی" پیش کیا جاتا تھا اور اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا۔ سڑکیں اور گلیاں کچھ سنسان لگتی تھیں اور گھروں کی کھلی کھڑکیوں کے سامنے اور دکانوں کے سامنے لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ یوں کھڑے نظر آتے تھے جیسے انھیں ہپناٹائز کر دیا گیا ہو۔

کسی نے ہمیں کوارٹر کی دیوار پھاند کے اندر داخل ہوتے نہیں دیکھا تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ ہم ایک سنگین جرم کے مرتکب ہو رہے تھے لیکن میں اکرام کا ساتھ دینے پر مجبور تھا۔ ابھی ہم صحن میں اترے ہی تھے کہ اندھیرے سے ایک سایہ برآمد ہوا اور کسی نے کہا۔ "آئیے۔۔۔ تشریف لائیے۔۔۔ مجھے معلوم تھا کہ آپ یہاں ضرور آئیں گے۔۔۔ مگر یہ آپ کے ساتھ کون ہے؟"

میں اور اکرام اپنی جگہ پر منجمد ہو گئے۔ اس کا اور میرا ہاتھ اپنے اپنے ریوالور کی طرف بڑھا اور رُک گیا۔

وہ آواز میرے لیے بالکل اجنبی تھی اور شاید اکرام کے لیے بھی۔

"کون ہو تم۔۔۔؟" اکرام شیخ نے حواس برقرار رکھتے ہوئے کسی حقیقی پولیس افسر کی طرح سوال کیا۔

وہ شخص جو اندھیرے میں صرف ایک سایہ لگتا تھا، اپنے ہاتھ میں ریوالور لیے کھڑا تھا اور اس کی بیرل کی غیر معمولی طوالت بتاتی تھی کہ ریوالور میں سائلنسر کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اس نے اکرام کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

"کیا تمھیں معلوم نہیں کہ یہ گھر پولیس کی تحویل میں ہے؟ پھر تم نے جرأت کیسے کی اس طرح اندر داخل ہونے کی؟" اکرام شیخ نے گرج کے کہا۔

اندھیرے سے دو اور سائے پیدا ہوئے اور پہلے شخص کے دائیں بائیں سے آگے بڑھے۔

"اپنے ہاتھ اوپر رکھنا سورما۔" پہلے والے شخص نے کہا۔ "ورنہ تمھیں بھی پتا نہیں چلے گا کہ تمھارے شریر نے کب تمھاری آتما کا ساتھ چھوڑا۔"

"شریر؟ آتما؟" میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ ہندی کے ایسے الفاظ تو اردو میں اور بھی بہت ہیں جیسے پریم اور شانتی۔۔۔ دھرتی اور آکاش یا دکھ سکھ جو عام لوگ بھی استعمال کر لیتے ہیں مگر جسم اور روح کی جگہ شریر اور آتما وہی استعمال کرے گا جو ہندی بولتا ہو۔

"مگر یاد رکھو میں۔" میں نے ایک دم ریوالور نکال لیا۔ "تم اتنی آسانی سے ہمیں نہیں پکڑ سکتے۔۔۔ ہم مرتے مرتے تمھیں بھی مار دیں گے۔"

اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ میرے لیے ناقابلِ یقین تھا۔ میں نے سائلنسر میں دب جانے والی گولی کی آواز سُنی اور ریوالور میرے ہاتھ سے ایسے اُڑ گیا جیسے ہاتھوں کے طوطے اُڑ جاتے ہیں۔ دنیا میں ایک سے بڑھ کر ایک ماہر نشانے باز موجود ہیں۔ جن کے سامنے میں طفلِ مکتب ہوں۔۔۔ یہ حقیقت مجھے بادلِ ناخواستہ تسلیم کرنی پڑی کیونکہ اس شخص نے اپنی جگہ سے حرکت کیے بغیر اندھیرے میں اندازے سے گولی چلائی تھی اور کمال یہ کیا تھا کہ میرے ہاتھ پر خراش بھی نہیں آنے دی تھی۔ تاہم دونوں آگے بڑھنے والے گوریلے لگ گئے تھے۔ وہ اندھیرے میں سیاہ بھوت نظر آتے تھے۔ اپنے چھ فٹ سے زیادہ نکلتے ہوئے قد اور توانا جسموں کے باوجود وہ اس شخص کے حکم کے غلام تھے جو دبلا پتلا اور پستہ قامت تھا۔ مگر وجہ پُرسکون اور متحمل مزاج اور ٹھنڈے دماغ والا۔

"تم کیا سمجھتے ہو کہ ہمیں یہاں سے لے جاؤ گے؟" اکرام شیخ نے کہا۔ "باہر پولیس کا پہرا ہے۔"

"اپنا ریوالور دے دو۔" پہلے شخص نے کہا۔ ابھی تک نہ وہ اکرام شیخ کے لہجے سے متاثر ہوا تھا اور نہ اس نے یہ ضروری سمجھا تھا کہ اس کی کسی بھی بات کا جواب دے۔

"دے دو یار۔۔۔ کچھ مانگنے والے کو انکار نہیں کرنا چاہیے۔۔۔" میں نے اکرام سے کہا۔ "یہی ہماری شان ہے۔۔۔ جو دل مانگے اسے دل دے دو، جو جاں مانگے اُسے جاں۔۔۔ یہ تو صرف ریوالور مانگ رہے ہیں۔۔۔ ڈراما فیل ہو گیا اپنا۔"

"تم نے ٹھیک سمجھا۔" پہلا شخص بولا۔ "اپنے ساتھی کو بھی سمجھا دو کہ ہمارا راستہ روکنے والا کوئی نہیں ہے۔۔۔ ان دونوں پولیس والوں کی لاشیں اندر پڑی ہیں جو باہر پہرا دے رہے تھے۔"

اکرام شیخ نے اپنا ریوالور ان کی طرف اچھال دیا۔۔۔ وہ ریوالور کسی کے ہاتھ میں بھی دے سکتا تھا یا نیچے ڈال سکتا تھا لیکن اس نے بڑی ذہانت کا ثبوت دیا۔ اس کی حرکت کسی بہترین ہاکی ٹیم کے بہترین فارورڈ کے پاس کی طرح تھی جس سے کوئی بہترین فارورڈ پورا فائدہ اٹھا کے گول کر سکتا تھا۔

ایک گوریلا جو نسبتاً قریب تھا، یہ سمجھا کہ اکرام نے ریوالور کو حکم دینے والے پر کھینچ مارا ہے۔ وہ ایک دم اسے کیچ کرنے کے لیے بائیں جانب جھکا اور ایک سیکنڈ کے لیے اپنے ساتھی کے سامنے آ گیا۔ میں نے اس سیکنڈ کے مختصر وقفے میں دائیں ٹانگ کو مشینی انداز میں حرکت دی اور میری لک اس کے پیٹ پر [illegible] پسٹن کی طرح بھرپور قوت کے ساتھ لگی۔ [illegible] اپنے ساتھی پر گرا۔ ابھی اس کا جسم تیر کا بھی [illegible] کہ فوراً [illegible] لک ماری اور اس کے دو [illegible] پیچھے کھڑے ہوئے پہلے شخص پر گرانا چاہا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ لک اُسے پڑ جاتی تو وہ دونوں ایک ہی وار سے شکار ہو جاتے لیکن یہاں مجھے میرے اندازوں اور میری توقعات کی خود فریبی نے شکست دی۔

میرا حریف عام آدمی نہیں تھا، جو لڑتا تو ہے مگر لڑنا نہیں جانتا۔۔۔ وہ فنِ حرب سے پوری طرح واقف تھا اور میں یہ کہوں کہ میں سیر تھا تو وہ سوا سیر۔۔۔ تو یہ غلط نہ ہوگا۔ اس نے میرے وار کو ناکام بنانے کے لیے غوطہ مارا اور جب میں سطحِ زمین کے متوازی اُڑتا ہوا اس کے اوپر سے گزرا تو اس نے حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے پیٹ دیا۔

میں منہ کے بل فرش پر گرا اور پھر نہ اُٹھ سکا کیونکہ اس نے آرم لاک لگا کے مجھے بے بس کر دیا تھا۔ گردن اُٹھا کے میں نے اکرام کو دیکھا۔۔۔ وہ دوسرے گوریلے کی گرفت میں بے بسی سے مچل رہا تھا اور خود کو آزاد کرانے کی مضحکہ خیز کوشش کر رہا تھا۔

"ان دونوں کو اندر لے آؤ۔" پہلے والے شخص نے کہا اور کوئی آہٹ کیے بغیر پلٹ گیا۔ اس نے ایک بند کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر غائب ہو گیا۔

جو شخص مجھ پہ سوار تھا اس نے مجھے ایک جھٹکے سے اٹھایا اور میرے دونوں ہاتھوں کو بغل کے نیچے سے اپنے ہاتھوں میں اس طرح جکڑ لیا کہ میں گردن تک نہیں ہلا سکتا تھا۔ وہ میرے پیچھے مجھ سے چپکا ہوا تھا اور اس نے میرے لیے ٹانگوں کو پچھلی طرف دولتی کے انداز میں چلانا بھی ناممکن کر دیا تھا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ میں اناڑی نہیں ہوں۔ وہ خود ایک ماہر کھلاڑی تھا۔ چنانچہ اس نے دفاعی انداز اختیار کرتے ہوئے میرے لیے جارحیت کے امکانات کو صفر کر دیا تھا۔

کمرے کے اندر پہنچ کے مجھے ان دونوں سپاہیوں کی لاشیں نظر آئیں جو ابتدائی تفتیش مکمل نہ ہونے کے باعث جائے واردات کی نگرانی پہ مامور تھے۔ ان پیشہ ور قاتلوں کے سامنے ان بے چاروں کی کیا اوقات تھی۔ وہ تو اپنی دقیانوسی رائفلوں کے ساتھ ایک ضابطے کی کارروائی پوری کر رہے تھے اور کسی بھی حملہ آور سے مقابلے کے لیے آئے ہی نہیں تھے۔

اسی کمرے میں صبح میں نے افتخار عارف کو زندگی کی بھرپور توانائی اور امیدوں کے ساتھ زندہ دیکھا تھا۔ اب شاید اس کی انصاف طلب لاش کسی مردہ نہلانے کی متعفن فضا میں فرشِ خاک پر پڑی تھی اور اسے کسی قسم کی ضابطے کی کارروائی سے کوئی سروکار نہ تھا... پوسٹ مارٹم... تفتیش کے مرحلے... سراغ رسانی۔ پکڑ دھکڑ... تجہیز و تکفین... تعزیتی پیغامات اور خراجِ تحسین پیش کرنے والے بیانات...... شہیدِ وطن کا خطاب دینے کی لفاظی۔ یہ سب ہمیشہ ایسے ہی ہوتا ہے اور اس سے کسی کو ذرا بھی فرق نہیں پڑتا... نہ مرنے والوں کو... نہ مارنے والوں کو... نہ زندہ رہ جانے والوں کو جو کاروبار کو حسبِ سابق چلاتے ہیں۔

کمرے میں روشنی تھی... انھوں نے سڑک کی جانب کھلنے والی دونوں کھڑکیوں کے شیشوں پر کالا رنگ پھیر دیا تھا... یہ رنگ بھی نہیں تھا، تارکول تھا جس کی بو کمرے میں محسوس تھی۔

مجھے اور اکرام شیخ کو دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑا کر دیا گیا۔ کسی نے ہمارے دونوں ہاتھوں کو ملا کے کلائیوں میں ایک ہتھکڑی ڈال دی۔ مقابلے میں ہماری تین چالوں کو انھوں نے ناکام کر دیا تھا۔ اکرام شیخ کی وردی اور پولیس کے لہجے میں رعب ڈالنے کی کوشش... ریوالور سے انھیں ہتھیار ڈالنے پہ مجبور کرنے کی کوشش اور پھر... مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی۔ کے مقولے پہ عمل کرنے کی کوشش... وہ کسی پریشانی یا دشواری کے بغیر ہم پر غالب رہے تھے۔ اب آخری کوشش ہم یہ کر سکتے تھے کہ گلا پھاڑ کے چلانے لگیں لیکن ایسے خطرناک دشمنوں سے کچھ بعید نہ تھا کہ ہمارا گلا پھاڑ دیں کہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری... ہماری عمر... بہ شرطِ زندگی... ایسے گزرے کہ کوئی ہمیں بانس سمجھے نہ کوئی بانسری۔

"آج سے پہلے میں نے تم کو کبھی نہیں دیکھا۔" میں نے شگفتہ لہجے میں کہا۔

"تم نے ابھی بہت کچھ نہیں دیکھا... لیکن بہت جلد دیکھو گے۔" دبلا پتلا... صورت سے ہی ہندو نظر آنے والا باس بولا۔

"تھینک یو..." میں نے کہا۔ "میں ایک تو تاج محل دیکھنا چاہتا ہوں چاندنی رات میں... اس کے علاوہ قطب مینار کے اوپر سے اونٹ کو دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ کتنا بڑا لگتا ہے۔"

"بولتے رہو... اور کیا دیکھنا چاہتے ہو؟"

"اور... اور تمھاری چتا کے جلنے کا منظر۔" میں نے کہا۔ "ان دو آدم خوروں کی لڑائی... جیسے کتے اور سور کی لڑائی ہوتی ہے۔ یہ جانور تمھارے دیش کے کس حصے میں ملتے ہیں شری...؟"

"تم مجھے ڈیڈی کہہ سکتے ہو۔" وہ چالاکی سے اپنے غصے کو پی گیا۔ "تم نے اپنا تعارف نہیں کرایا۔"

"اسے جانتے ہو تم؟" میں نے کہا۔ "کمال ہے... پھر تو تمھیں میرے بارے میں بھی معلوم ہونا چاہیے... میں ببن میاں کے خلیرے بھائی کی سالی کا نندوئی ہوں... میرے چچا سسر کے سمدھی ان کے ماموں کے سالے تھے۔"

اس کے ماتھے پر ناگواری کی ایک شکن نمودار ہوئی۔ "تمھارا نام ببن میاں ہے۔" اس نے اکرام شیخ سے پوچھا۔ "وردی پہ اکرام شیخ لکھے پھر رہے ہو!"

میں مایوس ہونے لگا تھا کہ میری فضول بکواس سے کوئی فائدہ نہیں ہو رہا ہے... لیکن اچانک مجھے ایک معمولی سی کامیابی ہوئی۔ میں نے سخت شرمندہ ہو کے اکرام کی طرف دیکھا۔ "یار غلطی ہو گئی۔"

اکرام شیخ نے مجھے خونی نظروں سے گھورا۔ "اسی لیے میں تمھیں ساتھ نہیں لا رہا تھا کہ تم بھونکنے سے باز نہیں آؤ گے... اب کہتے ہو غلطی ہو گئی جب..."

"ببن میاں... نام تو ہم معلوم کر ہی لیتے... نام کی اتنی اہمیت بھی نہیں ہے۔" دبلے پتلے شخص نے خشک لہجے میں کہا۔ "تمھارا کام خطرناک تھا جس کے لیے ہمیں اپنا کام چھوڑ کے آنا پڑا... ہم اوش یہ سمجھ رہے ہو گے کہ میں تمھیں قتل کر دوں گا یا تم کو مارنے سے پہلے تم سے کچھ پوچھوں گا... نہیں... یہ میرا کام نہیں ہے۔ مجھے تو خاص طور پر صرف اس لیے بھیجا گیا تھا کہ تمھیں اور اس سندری کو شاید تمھاری پتنی ہے..."

"نابکار..." میں نے چیخ کر کہا۔ "وہ ہماری اہلیہ ہیں۔"

وہ مسکرانے لگا۔ "کون؟"

"ببن میاں کی ہمشیرہ شبو..." میں نے کہا۔

"چلو مان لیتے ہیں کہ اس کا نام شبو ہے۔" وہ بولا۔ "تم اپنا بھی کوئی اچھا سا نام بتا دیتے۔"

"تم نے بتایا تھا اپنا نام؟" میں نے کہا۔

"میرا نام رمیش چوپڑہ ہے۔" اس نے ایک سگریٹ جلائی اور کرسی پہ بیٹھ گیا۔ "اور میں نہ کسی کا دوست ہوں اور نہ دشمن۔ تم اوش سمجھ رہے ہو گے کہ میرا سمبندھ بھارت کی سینا سے ہو گا یا کمانڈوز سے... نہیں... میرا سمبندھ تو را سے بھی نہیں ہے اور سب سے ہے... میں سب کے کام آتا ہوں اور اپنے کام کی منہ مانگی قیمت لیتا ہوں... میں انٹرنیشنل سٹیزن ہوں... ہر ملک کا پاسپورٹ رکھتا ہوں... نام بھی بدلتا رہتا ہوں... لیکن جب کسی کام کی ہامی بھر لیتا ہوں تو وہ ہو جاتا ہے۔ وہ کام ایسا ہوتا ہے جو کوئی اور نہیں کر سکتا... یا کرتا ہے تو... بہت نقصان اٹھاتا ہے اور بڑی کٹھنائی مول لیتا ہے... تم اگر چاہو تو بیٹھ سکتے ہو۔"

میں نے اکرام کی طرف دیکھ کے سر ہلایا اور ہم دیوار کے ساتھ سرکتے ہوئے زمین پر بیٹھ گئے۔

"میں نے بارہ بجے کا سمے دیا تھا۔" وہ بولتا تھا تو یوں لگتا تھا جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہو۔ "بارہ بجے میں تم کو ان کے حوالے کر دوں گا جن سے میں نے ایک لاکھ روپے لیے تھے اور وعدہ کیا تھا کہ چوبیس گھنٹے میں یہ کام ہو جائے گا۔ ان کو یقین تو نہیں تھا... مگر میرا پہلے کا ریکارڈ ایسا ہی ہے کہ وہ خاموش ہو گئے۔"

"وہ کون؟"

"وہی... بھارت سرکار کے نمک خوار..." وہ بولا۔ "بھارت ماتا کے سپوت... وہ مجھ سے چڑتے ہیں مگر میرے سامنے بول نہیں سکتے... جانتے ہیں نا کہ مجھے کس نے بھیجا ہے... مجھے بھارتی سینا کے ایک اعلیٰ افسر نے بلوایا تھا... ہند سرکار کو پھر میری ضرورت تھی۔"

"تم کیا ہو آخر مسٹر رمیش؟" میں نے کہا۔ "کوئی عظیم جاسوس، بین الاقوامی دہشت گرد کارلوس جیسے...؟"

"میں کچھ بھی نہیں ہوں... بس کبھی کبھی ایسا ہی ٹھیکا لے لیتا ہوں۔" رمیش چوپڑہ نے کہا۔ "دو بار سرکار نے مجھے ڈاکو پکڑنے کے لیے بلایا۔ انھوں نے اتر پردیش اور مہاراشٹر کے علاقے میں سب کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ پولیس، فوج اور خفیہ پولیس سب جھک مار رہے تھے۔ دس لاکھ کا انعام تھا، ان کو زندہ یا مردہ پیش کرنے کا مگر سال بھر میں کوئی سامنے نہ آیا... اور انھوں نے سرکار کا ایک کروڑ روپیہ لوٹ لیا اور نہ جانے کتنے گاؤں جلا دیے۔ سیکڑوں قتل کر چکے تھے وہ لوگ... میں نے پچیس لاکھ مانگے۔ رقم میں ہمیشہ ایڈوانس وصول کرتا ہوں... ایک مہینے کی مہلت مانگی۔ اتر پردیش والا ڈاکو تو میرے ساتھ ہی پکڑا گیا اور ہم دونوں کو ایک ہی دن پھانسی بھی ہوئی۔"

"مجھے بھی دو بار پھانسی ہو چکی ہے۔" میں نے کہا۔

وہ مسکرایا۔ "پھانسی کا ڈراما سرکار نے رچایا تھا... ظاہر ہے کہ لاش صرف اس کی باہر آئی... میں باہر آیا تو دوسرے ڈاکو کی بلی ہو گئی... اس کے بھی پچیس لاکھ ملے تھے مگر وہ زندہ نہیں ملا... بہر حال میں نے اس کی لاش پیش کر دی تھی۔ پہلے میں چھوٹے ٹھیکے بھی لیتا تھا۔ کسی اپوزیشن لیڈر کو قتل کرنا، اپوزیشن کے جلسوں اور جلوسوں کا بندوبست کرنا اور پھر ان میں بم کا دھماکا کرنا... کسی کے خلاف اسکینڈل کھڑا کرنے کے لیے کسی نہیلا کو ساتھ ملانا اور پھر ان کی بلیو فلم سرکار کے حوالے کر دینا۔ اب یہ دھندے بہت سے لوگ کرنے لگے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ میرا آخری مشن ہے۔ اس کے بعد میں کہیں چلا جاؤں گا۔ اتنا پیسہ جمع ہو گیا ہے بابر کہ اب کچھ کرنے کو دل نہیں چاہتا... سوائے عیش کے۔"

"یہ سب باتیں تم ہمیں کیوں سنا رہے ہو؟"

"بس ایسے ہی... وقت گزارنے کے لیے... تم نے تعارف کرانے کو کہا تھا، نا۔"

"تعارف کے بعد لوگ رسماً کہتے ہیں کہ مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔" میں نے کہا۔

"لیکن تم ایسا نہیں کہہ سکتے۔"

"کیوں نہیں کہہ سکتا؟" میں نے کہا۔

اس لیے کہ یہ سراسر جھوٹ ہو گا۔" وہ بولا۔

"لوگ بھی عموماً جھوٹ ہی کہتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہمارے زمانے کے ادب آداب میں بھی منافقت کا رنگ آ گیا ہے۔ لیکن میں تمھاری صاف گوئی سے متاثر ہوا..."

"یہ بھی جھوٹ ہے۔" اس نے میری بات کاٹ دی۔

"میں سمجھتا ہوں کہ خوشامد سے تمھیں خوش کر کے میں اپنے لیے کوئی رعایت حاصل نہیں کر سکتا۔" میں نے کہا۔ "اس لیے میں نقد سودے کی بات کرتا ہوں۔"

"کیا تم سودا کرنے کی پوزیشن میں ہو؟" وہ مسکرایا۔

"جو شخص... اس کے جذبات یا اس کا ایمان اور ضمیر برائے فروخت ہوں... اس سے کوئی بھی شخص سودا کرنے کی پوزیشن میں رہتا ہے جس کے پاس معاوضہ ادا کرنے کی طاقت ہو۔" میں نے کہا۔ "یہ میرا ایک خاص زاویۂ نگاہ ہے۔ تم اس سے اختلاف

کرسکتے ہو... کہ تم بھی ایک طوائف ہو۔"

وہ ہنس پڑا۔ "واٹ اے فنّی تھنگ ٹو سے

یس... طوائف کا لفظ تو عورت کی ذات اور پیشے سے منسوب ہوگیا ہے۔" میں نے کہا۔ "صرف اس لیے کہ وہ خود کو بیچتی ہے۔ کسی ضابطۂ اخلاق پر یقین نہیں رکھتی اور کسی کی وفادار نہیں ہوتی سوائے اس کے جو اسے خرید سکے... غور کرو کیا یہ تینوں صفات تمھاری ذات میں موجود نہیں ہیں۔"

وہ سنجیدہ ہوگیا۔ اُسے یکلخت اپنی نظر میں وہ عزت، وقعت اور اہمیت حاصل نہیں رہی تھی جو اس کی طاقت تھی۔ جس پر اُسے غرور تھا

"گویا تم مجھے خریدنا چاہتے ہو؟" وہ بولا۔

"ہاں... تم خریداروں کے درمیان فرق تو نہیں رکھتے نا۔ کالے گورے کا... ہندوستانی یا پاکستانی کا؟"

"وِل یو پلیز شٹ اپ...!"

"تم کس قسم کے پروفیشنل ہو... صاف کیوں نہیں کہتے کہ تم ایک مقامی سطح پر طاقت حاصل کرلینے والے بدمعاش ہو... تم نے کارلوس کا نام ضرور سنا ہوگا... اس کی خدمات ہر حکومت حاصل کرسکتی ہے... کوئی بھی صنعت کار... اسمگلر یا ڈالر کنگ حاصل کرسکتا ہے... اپنے حریف کے خلاف... تم کو بھی اس کی سطح پر آکے غیر جذباتی انداز میں کام کرنا چاہیے... نوبت... مذہب... ملک اور نسل... سیاسی نظریات اور اخلاقیات کو بالائے طاق رکھ کے... بزنس از بزنس... دیٹ از آل۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" اس نے لاجواب ہو کے کہا۔

"یہی کہ کسی نے تم کو میری گرفتاری پر مامور کیا۔ اس کی ایک قیمت ادا کی۔ تم نے کیوں اور کیسے کا کوئی سوال نہیں کیا... یہی کام میں تم سے لینا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب تو بہت صاف ہے اور تم جیسے ذہین آدمی کو [illegible] لینا چاہیے۔ میں تم کو پانچ لاکھ زیادہ آفر کرتا ہوں۔" میں نے کہا

"کس بات کے...؟"

"جس نے تمھیں یہاں بھیجا اور معاوضہ ادا کیا۔" میں نے کہا۔ "کہ مجھے [illegible] یا مردہ پیش کرو... میں تم سے کنٹریکٹ کرتا ہوں کہ اسے [illegible] کے سامنے زندہ یا مردہ پیش کرو... اور جتنا معاوضہ اس نے تم کو دیا ہے... میں اس سے پانچ لاکھ زیادہ دیتا ہوں۔"

"کیا تم پاگل ہوگئے ہو؟"

"کیوں... اس میں کون سی پاگل پن کی بات ہے؟" میں نے کہا۔ "پانچ کم ہیں تو دس لاکھ کرلو... مگر دیٹ از دی لمٹ۔"

"کہاں سے لاؤ گے تم اتنی رقم؟" وہ مجھے گھورنے لگا۔

"یہ سوچنا تمھارا کام نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "میں تم کو نقد رقم ادا کروں گا۔"

"مگر یہ اب کیسے ہوسکتا ہے... کہ میں دونوں پارٹیز سے کنٹریکٹ کرلوں؟" وہ جھلّا کے بولا۔

"ہو کیوں نہیں سکتا... تم پہلا کنٹریکٹ کینسل کردو۔ ظاہر ہے ہر معاہدہ کسی بھی وقت کینسل ہوسکتا ہے۔"

"مگر دونوں فریقوں کی رضامندی سے۔" وہ بولا۔

"دوسرا فریق تمھارا کیا بگاڑ سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "تم کہہ سکتے ہو کہ سوری... سکندر بخت ہاتھ سے نکل گیا۔ اور اس کا سراغ نہیں مل رہا ہے کہ ماؤنٹ ایورسٹ پر چڑھ کے بیٹھ گیا ہے یا بحرالکاہل کی تہ میں... اور تم ایمانداری سے ان کا دیا ہوا معاوضہ واپس کرسکتے ہو۔"

"ڈیم اِٹ... یہ ایمانداری کا نہیں... میری گڈوِل کا معاملہ ہے۔" وہ چلّا کے بولا۔ "تم چاہتے ہو کہ پہلے میں اپنی ناکامی اور نااہلی کا اعتراف کروں... صرف دس لاکھ کے منافع کی خاطر اپنی ساری گڈوِل قربان کردوں؟ آئندہ کیا ہوگا یہ جانتے ہو... لوگ مجھے کنٹریکٹ دیتے ہوئے تذبذب کا شکار رہیں گے۔ آج تک وہ کہتے ہیں کہ میرے کنٹریکٹ میں ناکامی کا لفظ شامل نہیں ہوتا۔ یہ شق ہی نہیں ہوتی کہ میں ناکام رہا تو کیا ہوگا۔ ایک ناکامی جو میری پہلی ناکامی ہوگی کا اتنا چرچا ہوگا کہ میری مارکیٹ خراب ہوجائے گی... اس کے علاوہ... کیا تم انھیں بے وقوف سمجھتے ہو کہ وہ میرے کہے کو سچ مان لیں گے۔ انھیں بالآخر معلوم ہوجائے گا کہ تم نہ ماؤنٹ ایورسٹ پر بیٹھے ہو نہ بحرالکاہل کی تہ میں... پھر وہ سمجھیں گے کہ میں نے ان کے اعتماد کو دھوکا دیا۔ شاید تم سے مل گیا۔ پھر کیا وہ مجھے معاف کریں گے؟"

اب میں لاجواب ہوگیا۔ "تم نے ہی ریٹائرمنٹ کی بات کی تھی... اس آخری کنٹریکٹ میں تم دس لاکھ زیادہ لے کر فائدے میں رہتے۔"

"یو فول... میں تمام عمر افسوس کرتا... کہ صرف دس لاکھ کے لیے میں نے اپنے کیریر کو ناکامی پر ختم کیا۔ اسکواش، کرکٹ، باکسنگ، ہر اسپورٹ... چیمپئن اپنے عروج پر ریٹائر ہوجاتا ہے تو مرتے دم تک اس احساس سے مطمئن رہتا ہے کہ کسی نے اُسے شکست نہیں دی تھی۔ دوسرا وہ ہوتا ہے جو اس حقیقت کو نہیں سمجھتا کہ دنیا کے میدان میں ہر شخص کسی بھی وقت اچانک نمودار ہوجانے والے نئے چیلنج کے سامنے سرنگوں ہوسکتا ہے۔ لافانی کوئی چیز نہیں ہے... نہ طاقت نہ حسن نہ ملکیت... نہ

خود آدمی۔" وہ ایک دم چُپ ہوگیا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ میری بات سے مشتعل ہوگیا ہے اور چلانے لگا ہے حالانکہ وہ آسانی سے صرف ایک لفظ "نو" کہہ کے بھی بات ختم کرسکتا تھا۔ خاموش رہ کے بھی اور انکار میں گردن ہلا کے بھی۔

اس نے اپنی گھڑی دیکھی... پھر ایک جماہی لی۔ "وقت [illegible] ہوگیا ہے۔"

"ابھی دس منٹ باقی ہیں۔" میں نے کہا۔

وہ تلخی سے مسکرایا۔ "مجھے معلوم ہے۔"

"ایک منٹ میں بھی بہت کچھ ہوتا رہا ہے۔" میں نے کہا۔ "بروٹس نے سیزر کے خنجر گھونپ دیا۔ نور جہاں نے ایک کبوتر چھوڑ کے شہنشاہ ہند کو تسخیر کرلیا۔ ایٹم بم نے ایک شہر کے ایک [illegible] ایک [illegible] عظیم ختم کردی۔"

"یہاں ایک منٹ میں تم بازی پلٹ دو گے؟" وہ طنزاً بولا۔

"میں نہ سہی... قدرت تو بہت کچھ کرسکتی ہے۔" میں نے کہا۔ "مثلاً اچانک زلزلہ آجائے اور یہ چھت تم پر آگرے۔ یا تمھارا ہارٹ فیل ہوجائے۔"

لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ باہر ایک کار کا ہارن سنائی دیا اور وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے اس کے چہرے پر اطمینان کی اور خوشی کی مسکراہٹ دیکھی۔

"میں اپنا آخری معاہدہ پورا کرنے میں کامیاب رہا مسٹر سکندر بخت اور اب میں چلتے چلتے ایک بات کا اعتراف کروں۔ اس میں میرے لیے شرمندگی کی بات نہیں... تم یقیناً مجھ پر برتری رکھتے تھے۔ ہر اعتبار سے... اور میرا سب سے مشکل اور طاقتور شکار ثابت ہوئے۔ اس خیال میں میرے لیے ہمیشہ فخر کی بات ہوگی۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی شکاری فخر سے کہتا ہے کہ اس نے جو آخری آدم خور شیر مارا وہ سب سے خطرناک تھا۔"

ہارن باہر سے پھر سنائی دیا۔

"ان سے کہو کہ اندر آجائیں۔" وہ گوریلوں میں سے ایک سے مخاطب ہو کے بولا۔ "تاکہ میری ذمے داری ختم ہو۔"

ایک گوریلا دروازے سے باہر گیا۔

"تمھاری آفر بہت اچھی تھی۔" وہ بولا۔ "مگر کاش تم مجھ سے پہلے ملے ہوتے... پھر سہی... اس پیشے میں بھی ایک موول رٹائرمنٹ تو ہوتی ہے نا۔"

باہر جانے والے گوریلے کے ساتھ ایک شخص اندر آگیا۔

"کیوں ہارن بجا رہے تھے باہر سے... اندر آتے ہوئے ڈر لگتا ہے؟"

"ڈر کی بات نہیں... میں اکیلا تھا۔" اندر آنے والے نے برہمی سے کہا۔ "گاڑی چھوڑنا نہیں چاہتا تھا... تمھیں کیا پریشانی تھی کہ باہر نہیں آسکتے تھے؟"

"مجھ سے بات طے ہوئی تھی کہ تم لوگ اندر آکے انھیں خود اپنی تحویل میں لوگے۔" وہ بولا۔

"میں نے بتایا نا کہ میں اکیلا تھا۔" نووارد بولا۔ "کسی اور کو کیسے ساتھ لاتا... دو یہ... دو محافظ جو چار کے برابر جگہ گھیرتے ہیں... میں اور تم..."

"میں تمھارے ساتھ نہیں جا رہا ہوں... میری کار الگ ہوگی۔"

"آئی ڈونٹ تھنک دی کرنل وِل لائک دیٹ۔" نووارد نے ناگواری سے کہا۔ "میرا خیال ہے کرنل یہ پسند نہیں کرے گا۔"

"آئی ڈونٹ کیئر اباؤٹ یور کرنل۔ (مجھے تمھارے کرنل کی پروا نہیں) اور کیپٹن... اگر اس نے تمھیں بھیج دیا تو یقیناً اس کو تم پر اعتماد ہوگا... ورنہ وہ خود آسکتا تھا۔ اس نے [illegible] کہ وہ خود آئے گا... ناؤ اِٹ اِز یور ہیڈ ایک" (اب یہ [illegible] دردِ سر ہے!)

کیپٹن نے اسے خون آشام نظروں سے دیکھا مگر وہ چھوٹا سا اور مختصر سا آدمی انتہائی اعتماد کے ساتھ چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتا باہر چلا گیا۔ اس کے ہاتھ میں اسلحہ بھی نہیں تھا اور اس کے مقابلے میں کیپٹن بہت زیادہ جسمانی طاقت کا مالک تھا، مگر وہ غالباً اس شخص کے پس منظر سے ذہنی طور پر خائف تھا کہ اس نے ریوالور ہاتھ میں ہونے کے باوجود اس کا راستہ نہیں روکا۔

"چلو... ان دونوں کو زیور پہنادو۔" کیپٹن نے ایک ہتھکڑی نیچے پھینک دی۔ گوریلے نہ جانے کس نسل اور قوم کے تھے اور کیا زبان بولتے تھے مگر انھوں نے کیپٹن کی بات سمجھ لی۔ نوجوان کیپٹن سفید شلوار قمیص میں تھا اور اس کی مونچھیں تلوار مارکہ تھیں۔ راہ چلتے کسی نے اُسے غور سے بھی نہیں دیکھا ہوگا... یہ خیال کسی کو کیسے آسکتا تھا کہ وہ انڈین آرمی کا کیپٹن... ایک دشمن اور تخریب کار ہے۔

اکرام شیخ اس تمام عرصے میں بالکل خاموش اور متفکر رہا تھا۔ اسے اپنی نہیں بہن کی فکر تھی... اب وہ کہاں جائے گی اور بھائی کو کہاں تلاش کرے گی، کب تک تلاش کرے گی؟ یہ تو کبھی نہ چھوڑنے والے لوگ تھے اور معلوم نہیں اسے کس گمنام سرزمین کے کس زیرِ زمین تہ خانے میں قید کرنے کے لیے لے جانا چاہتے تھے۔ شاعر نے تو شبِ ہجراں کے بارے میں کہا تھا کہ تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کرلے۔ ہم تو کل خوابِ عدم میں شبِ ہجراں ہوں گے... مگر یہ نازو کے تصور سے مخاطب ہو کے بھی کہا جاسکتا تھا

دونوں گوریلوں نے ہمیں یوں دبوچ لیا جیسے بلی اپنے پنجوں میں چوہے کو دبوچتی ہے... بے شک میں دو منٹ میں ان کی گردن توڑنے پر قادر تھا لیکن بے سبب خودکشی کو میں نے کبھی جائز نہیں سمجھا تھا۔ لڑنا اگر جان بچانے کے لیے ہو تو جائز ہے۔ جان لینے کے لیے بھی لڑنا ایک مقصد رکھتا ہے مگر حرام موت مرنے کے لیے لڑنا پاگل پن ہے۔ میرے سامنے جو تلوار مار کہ مونچھوں والا کیپٹن کھڑا تھا اس کے ہاتھ میں اب وہی سائیلنسر لگا ہوا ریوالور تھا جو وہ چھوٹا سا آدمی جاتے جاتے اسے تھما گیا تھا۔ اس سے قبل بھی کیپٹن کے ہاتھ میں ریوالور تھا اور اس پر سائیلنسر بھی تھا۔ مگر اپنے ریوالور سے مارا جانا مزید افسوسناک ہوتا... اپنی جوتی اور اپنا ہی سر۔

ہتھکڑی میں ہم دونوں کو ایسے باندھا گیا کہ پہلو بہ پہلو کھڑے ہوئے میرا دایاں ہاتھ اور اکرام کا بایاں ہاتھ ایک ہو گیا۔ پھر انھوں نے مخالف سمتوں کے بازو یکجا کیے یعنی میرا بایاں ہاتھ اور اکرام کا دایاں ہاتھ۔ یہ بھی خاصا مشکل پوز تھا۔ مگر وہ تھوڑی سی عقل سے کام لیتے تو ہم دونوں کی پشت ملا کے آسانی سے دونوں کے سیدھے اور اُلٹے ہاتھ جوڑ دیتے۔ کیپٹن نے دہاڑ کر ان سے جلدی کرنے کو کہا اور انھوں نے نہ جانے کہاں سے دو کالے کپڑے کے رومال برآمد کیے۔ ایک رومال میری آنکھوں پر آ گیا تو دنیا میری نظر سے اوجھل ہو گئی۔ میں نے فرض کیا کہ یہی اکرام شیخ کے ساتھ ہوا ہو گا۔

میری توقع کے مطابق آخری کام یہ ہوا کہ میرے لبوں پر مہرِ خموشی ثبت کر دی گئی یعنی بہت سخت چپکنے والے ٹیپ لگا کے مجھے شٹ اپ کر دیا گیا۔ تاہم وہ میرے خیالوں کو شٹ اپ نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے زبانِ خاموشی میں فیض کا شعر پڑھا۔ ’زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے... ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے...‘ اور اپنے دل کو شاد کیا۔

یہ ایک عادت سی ہو گئی تھی کہ بدترین حالات میں بھی جب ناامیدی کے سوا کچھ نہیں رہتا تھا‘ دل کسی گمنام امید کی کرن کو تلاش کرتا رہتا تھا اور پُرسکون رہتا تھا۔ اسے کچھ بھی کہا جا سکتا ہے۔ ایمان بالغیب... یقینِ محکم... اعتقادِ کامل حد سے بڑھی ہوئی رجائیت۔

”اب چلو...“ کپتان نے غرّا کے کہا۔ اُسے غرّانے کا شوق تھا۔ ”مُنہ کیا دیکھ رہے ہو میل۔“

دونوں حکم کے غلام فوراً حرکت میں آ گئے... انھوں نے مجھے دھکیلنا اور گھسیٹنا شروع کیا۔ میں نے بالکل مزاحمت نہیں کی... ہم دروازے سے گزرے... پھر کسی نے دروازہ بند کر دیا۔

”ان دونوں کو پیچھے ڈالو... احمق...“ کیپٹن نے دانت پیس کے کہا۔ ”ایک دائیں طرف بیٹھو... تم اِدھر دوسرے دروازے سے اندر جاؤ... نہیں ہے جگہ تو بناؤ... سوّر کے بچے... کس نے کہا تھا اتنا پھیلنے کو... چلو وقت ضائع مت کرو... آگے آؤ۔“

ایک سوّر کا بچہ آگے والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ یہ ناممکن تھا کہ ہم دونوں کے ساتھ وہ دونوں بھی پیچھے کی ایک سیٹ پر بیٹھ سکتے... میں خود کو بہت مضحکہ خیز اور تکلیف دہ پوزیشن میں محسوس کر رہا تھا۔ میرا بایاں ہاتھ شانے پر سے مڑ کے درد کرنے لگا تھا اور میں تقریباً اکرام کے اوپر پڑا ہوا تھا۔ ہم آدھے سیٹ پر تھے اور آدھے سیٹ سے نیچے اور اپنی ٹانگیں چلا کے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ اگر میرے ہاتھوں کی رسائی ہوتی تو میں دروازہ کھولنے والے ہینڈل کو گھماتا اور کسی بہت زیادہ ٹریفک والی سڑک پر دروازہ پورا کھول دیتا۔ اس بات کے خاصے امکانات تھے کہ کوئی دوسری گاڑی اچانک گھس جاتی اور دروازے کو آگے یا پیچھے سے ٹکر مارتی اور دروازہ ٹوٹ کے سڑک پر گرتا۔ دوسری گاڑی والا اپنے نقصان پر روتا اور اس گاڑی کو ہرگز نہ جانے دیتا جس کے ڈرائیور کی مجرمانہ غلطی سے دروازہ کھلا اور حادثہ ہوا۔ شاید اتنی ٹریفک میں وہ فرار نہ ہو پاتا اور جب بہت سی گاڑیاں رُک جاتیں اور بہت سے لوگ آ جاتے، تو وہ دیکھتے کہ پیچھے والی سیٹ پر تو عجیب فلمی صورتِ حال ہے۔

مگر یہ سب میں نے صرف تصوّر میں دیکھا... ایک منٹ سے بھی کم وقت میں... عملاً میں ہاتھ ہلا بھی نہ سکا... میں نے دل کو تسلی دی کہ میرا پلان ویسے بھی کامیاب نہ ہوتا... عام طور پر ایسی گاڑیوں کے اندر سے ہینڈل نکال لیے جاتے ہیں۔ مزید یہ کہ ایک گوریلا تو ہمارے ساتھ ہی تشریف فرما تھا اور دوسرا اگلی سیٹ پر کوئی سا دور تھا۔

”اوہ مائی گاڈ!“ کیپٹن نے اچانک چلا کے کہا۔ معلوم نہیں کس بات پر... پھر دروازہ بند ہوا اور کار کا انجن اسٹارٹ ہوا۔ انجن کی آواز پر میں نے غور کیا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ شیورلیٹ امپالا یا ڈاج ڈارٹ گاڑی تھی۔ دونوں پُرآسائش‘ طاقتور اور قیمتی امریکن گاڑیاں تھیں۔ دونوں طبقۂ امرا یا ڈپلومیٹ قسم کے لوگ رکھتے تھے۔ ہمیں لے جانے والے دوسری کیٹگری کے لوگ تھے جو ایک ڈپلومیسی کے مشن پر تھے۔

گاڑی چلی تو ایسی آواز آئی جیسے کچی سڑک پر بیل گاڑی چلے... گڑگڑاہٹ کے چند لڑکھڑاتے قدم چلنے کے بعد گاڑی رُک گئی۔ کیپٹن نے ایک بار پھر غرّا کے ”اوہ مائی گاڈ“ کہا اور نیچے اتر گیا۔ میں نے اس کی جھنجلاہٹ پر ایک خاموش قہقہہ مارا۔ کم از کم ایک ٹائر فلیٹ ہو گیا تھا‘ مگر گاڑی کسی طرف بھی جھکی ہوئی نہ تھی چنانچہ یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ کون سا ٹائر فلیٹ ہوا ہے۔ اس سے یہ بھی فرض کیا جا سکتا تھا کہ دونوں اگلے یا دونوں پچھلے ٹائروں کی ہوا نکل گئی ہے۔ پھر اسے اتفاقیہ پنکچر ہونا نہیں سمجھا جا سکتا تھا... میرا دل ایک دم پُرامید ہو گیا... شاید ایسا ہی ہو... شاید کسی نے عمداً ہوا نکالی ہو... ایک ٹائر تو بدلا جا سکتا ہے... دو نہیں بدلے جا سکتے... مگر ایسا کون کر سکتا ہے؟

میں نے کیپٹن کی آواز سُنی... اس نے دروازہ کھولا اور اندر آ بیٹھا۔ ”تم دونوں... جانور...“ اُس نے حکم کے غلاموں کو بڑی روانی سے گالیاں دیں۔ میرا دل اس خوشخبری سے باغ باغ ہو گیا کہ دو نہیں کسی نے چاروں ٹائروں کی ہوا نکال دی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ خود کیپٹن نے کار کو لیول میں محسوس کیا... اسے اندھیرے میں کار کسی طرف سے بھی جھکی ہوئی نہیں لگی۔ کار اپنی جگہ پر ہی موجود تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ کھڑی ہوئی نہیں تھی‘ بیٹھی ہوئی تھی۔

”یہ سب اس باسٹرڈ کی وجہ سے ہوا... اینڈ ویٹ ڈیم فول آف اے کرنل...“ اس نے سخت اشتعال اور پریشانی میں کہا۔ ”وہ خود آتا تو یہ نہ ہوتا... لیکن اس کو تو زیادہ خیال تھا اپنی اس ماں کا...!“ وہ شاید کرنل کی کسی آشنا کا حوالہ دے رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اب اس کی خود کلامی میں خوف بھی شامل ہو رہا تھا۔

”یہ... بچوں کی شرارت نہیں ہو سکتی... یہ سازش ہے...“ وہ بولا اور پھر ہم سے مخاطب ہوا۔ ”دیکھو... میں تم دونوں کو شوٹ کر دوں گا... اور کار کو آگ لگا دوں گا... ایک اور فائر سے... یہی کرنا چاہیے مجھے... پٹرول ٹینک... یس... چلو تم دونوں ...نکلو... تمھاری... دفع ہو جاؤ... مگر نہیں... ٹھہرو... میں بات کرتا ہوں پہلے... اس کرنل کی تو...“ وہ اب دنیا بھر کو ماں بہن کی گالیاں دے رہا تھا۔ ”میں اکیلا کیا کروں...؟“ اس نے شاید کار میں کوئی وائرلیس ٹرانسمیٹر آن کیا اور مائیکرو فون پر بولنے لگا۔ ”ہیلو... تھری ٹو تھری... ہیلو... نائن ون نائن ہیئر... ڈو یو ریڈ می!“ وہ چلّانے لگا۔ پھر گالیوں پر آ گیا... کیونکہ اسے کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔

اب وہ گھبراہٹ میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اس نے باہر نکل کے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ آس پاس دوسرے سرکاری کوارٹروں میں رہنے والے جو کولھو کے بیل کی طرح زندگی کو محدود معمولات کے دائرے میں گزارنے کے عادی ہو چکے تھے‘ صبح پھر نوکری پر جانے کی تیاری کر کے سو چکے تھے۔ اس کا اندازہ میں نے اس سکوت سے لگایا جس میں کبھی کبھار کسی بچے کے رونے کی آواز کے سوا کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔ یہ اس کیپٹن کی خوش قسمتی تھی کہ وہ کوارٹر کونے کا آخری کوارٹر تھا اور اس کی چوڑائی کے رُخ کھڑی ہوئی کار کسی حد تک چھپی ہوئی تھی۔

”اے... تم اِدھر آؤ...“ اس نے غالباً کسی گوریے کو حکم دیا۔ ”ایک ٹائر بدلو... پھر دوسرے کو پٹرول پمپ تک لے جاؤ... اِدھر جہانگیر روڈ پر‘ تین ہٹی سے پہلے پٹرول پمپ ہے... اس میں ہوا بھروا کے لاؤ... اُسے لگاؤ اور دوسرے کو لے جاؤ۔ پنکچر کسی میں نہیں ہو گا... یہ کسی نے جان بوجھ کر ہوا نکالی ہے... اچھا رُکو۔“

وہ ایک اچھے فوجی افسر کی صفات سے محروم تھا اور غالباً سفارش پر یا جذباتی طبیعت رکھنے کے باعث یہاں بھیج دیا گیا تھا۔ اس کی قوتِ فیصلہ ذرا سی آزمائش میں ختم ہو گئی تھی۔ وہ کنفیوژن میں مبتلا تھا اور ڈرا ہوا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ اپنے کسی نادیدہ دشمن کو ہر طرف تلاش کر رہا ہو گا اور خود کو ایک نظر نہ آنے والے پُرخطر حصار میں گھرا ہوا پلکے تردس ہو گا۔

وہ تین ٹائروں میں ہوا بھروا کے کام چلا سکتا تھا اور یہ تین چکر اس حکم کے غلام کے لیے آدھے گھنٹے کی بیگار تھے مگر کیپٹن صرف ایک محافظ کے ساتھ رہ جانے کے خیال سے بھی ڈرتا تھا۔ اس کے ذہن میں یقیناً یہ خیال بھی آیا ہو گا کہ وہ کسی دوسری جگہ سے فون کر کے امداد حاصل کر لے مگر اتنی رات گئے کسی کال آفس کا کھلا ملنا مشکل تھا۔ پھر یہ رازداری کا معاملہ بھی تھا‘ ورنہ وہ کسی گھر کا فون استعمال کر لیتا۔ اس نے ٹیکسی میں جانے کا بھی سوچا ہو گا۔ مگر کوئی ٹیکسی والا اس حالت میں دو قیدی لے جانے پر راضی نہ ہوتا... وہ سمجھتا کہ اغوا کی اس واردات میں اس کی ٹیکسی کا نمبر بھی آ جائے۔ وہ ہمیں ان دو گوریلوں کی تحویل میں دے کر اکیلا ٹیکسی لے کر جاتا اور اپنے عیاش کرنل سے دوسری گاڑی لے کر آتا تو اتنی دیر میں نہ جانے کیا ہو جاتا... دونوں حکم کے غلام عقل سے بھی پیدل تھے اور غالباً بول نہیں سکتے تھے۔ وہ گونگے تھے یا ان کی زبانیں کاٹ دی گئی تھیں۔

آخر میں اس نے یہی کیا۔ اس نے محافظوں میں سے ایک کو دُور لے جا کر کچھ ہدایات دیں اور محافظ تو لوٹ آیا مگر کیپٹن کی آواز سنائی نہ دی تو پانچ منٹ بعد مجھے اس کی عدم موجودگی کا یقین آنے لگا۔ وہ ایسا شخص ہی نہ تھا‘ جو پانچ منٹ چپ رہ سکے۔

وہ ایک سوال جو میرے ذہن میں گردش کر رہا تھا‘ اکرام کے ذہن میں بھی ہو گا کہ یہ خفیہ کارروائی کس نے کی؟ یقیناً

کوئی وہیں موجود تھا جو سب بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے موقع پاتے ہی کام دکھا دیا۔ مگر وہ تھا کون جو ابھی تک سامنے نہیں آیا تھا؟ وہ ہمارا دشمن نہیں ہو سکتا تھا جس نے ہمارے دشمن کا کام خراب کیا۔ اس کا یقیناً کوئی نیک مقصد تھا۔ اگر ایسا تھا تو پھر وہ انتظار کیوں کر رہا تھا؟

اسی وقت ایک معمولی سا دھماکا ہوا... کسی نے کار کے پچھلے حصے میں شیشے پر چھوٹا سا پتھر پھینکا تھا۔ پتھر بہت بڑا ہوتا تو ونڈ اسکرین بکھر جاتا اور کنکر ہوتا تو آواز اتنی بڑی نہ ہوتی۔ محافظوں میں سے ایک فوراً باہر نکلا۔ دوسرے نے ریوالور کی نال میرے سر پر لگا دی... یہ بڑا خطرناک لمحہ تھا۔ خوف اور اعصابی کشیدگی کی اس کیفیت میں گولی بلا ارادہ بھی چل سکتی تھی۔

میں نے سانس روک کے خدا کے حضور ایک دعا ارسال کی جس میں کہا گیا تھا کہ فنا و بقا پر اختیار رکھنے والے معبود... تیری رضا پہ مرنا تو سب کا مقدر ہے اور ایمان ہے۔ مگر اس موت کو حادثاتی نہ بنا... ہمیں موقع دے کہ ہم جان دیں تو کسی مقصد کی خاطر... مارے جائیں تو لڑتے ہوئے... یوں بے بسی کی حالت میں نہیں۔

پہلا گوریلا لوٹ کر نہیں آیا... میرے دل کی دھڑکن اتنی تیز ہوگئی کہ میں کسی اسٹیتھسکوپ کے بغیر شمار کرنے لگا۔ ایک... دو تین... چار... مگر یہ گنتی سو تک پہنچنے سے پہلے ہی گڑبڑ ہو گئی... عام حالت میں دل فی منٹ بہتر بار دھڑکتا ہے تو اس وقت شاید دگنی رفتار سے دھڑک رہا تھا لیکن گھڑی پر نظر رکھے بغیر وقت کا حساب رکھنا ناممکن ہو گیا تھا کیونکہ ہر سیکنڈ ایک منٹ کے برابر اور ہر منٹ ایک گھنٹے کے برابر یا اس سے بھی زیادہ لمبا ہو چکا تھا۔

بالآخر کسی نے ڈکی کھولی اور دو نمبر گوریلے نے بے اختیار سر گھما کے دیکھا۔ اس کے ریوالور کی نال میری پیشانی پر نہیں رہی تو مجھے کچھ سکون نصیب ہوا۔ میرے اضطراب اور بے چینی میں بہرحال اضافہ ہو گیا کیونکہ نہ میں دیکھ سکتا تھا کہ پیچھے کیا ہو رہا ہے اور نہ پوچھ سکتا تھا کہ ماجرا کیا ہے؟

میں اور اکرام ایک دوسرے سے بڑے غلط انداز میں منسلک تھے اور وہ زنجیر شاید ٹارزن بھی نہیں توڑ سکتا تھا جس نے ہمیں باندھ رکھا تھا۔ ویسے میں اندھا دھند کارروائی کرتا تو گوریلے کو سر سے ٹکر مارتا یا دونوں پیر اٹھا کے اس کے سر، منہ یا سینے پر مارتا۔ مگر یہ اندھیرے میں تیر چلانے کے مترادف تھا۔ اس میں جینے مرنے کے امکانات ففٹی ففٹی تھے۔

ڈکی کھولی ضرور گئی تھی لیکن ابھی تک بند نہیں کی گئی تھی۔ میں آواز پر کان لگائے بیٹھا تھا اور منتظر تھا کہ اور کوئی آواز ... اپنی پہچان دے۔ سب سے بڑا مسئلہ وقت کا تھا جو ... اعصاب کو شکست دینے پر تُلا ہوا تھا۔

بالآخر دوسرے گوریلے کو خدا نے حماقت کی راہ دکھائی ... عاقبت نااندیشی کی توفیق عطا کی... وہ آزمائش میں ... مدد ... کرنے والوں کے لیے فوج نہیں بھیجتا۔ ایسے اسباب پیدا کر دیتا ہے کہ باطل کے پرستاروں کی عقل گھاس چرنے چلی جاتی ہے اور ان کی آنکھوں پر گمراہی اور ناآگہی کا پردہ پڑ جاتا ہے۔

دوسرے گوریلے نے یہ سمجھتے ہوئے کہ ہم پھر سے ... سکتے کار سے باہر قدم رنجہ فرمایا۔ اس کے ساتھ ہی ایک ... آواز آئی جیسے مکان کی دوسری منزل سے بھینس نیچے گری ہو۔ ایک ہاتھ نے میرے منہ سے ٹیپ کھینچ دیا اور اس عمل میں وہ ہاتھ میرے لبوں پر اپنا لمس چھوڑ گیا۔ اس لمس میں نزاکت اور نرمی تھی۔

"نازو..." میں نے کہا مگر میرے حلق سے جو آواز نکلی وہ اتنی عجیب تھی کہ میں خود حیران ہوا۔ حیران میں اس بات پر بھی ہوا کہ یہ لفظ میری زبان سے نکلنے سے پہلے دل میرے سینے سے کیوں نہیں نکل گیا۔ حیرانی مجھے اپنی عقل پر بھی ہوئی کہ یہ نام میری زبان پر آنے سے پہلے میرے دماغ میں کیوں نہیں آیا۔

غالباً مجھ سے پہلے ہی اکرام شیخ نے بھی تڑپ کر نازو کا نام لیا تھا... بھائی نے بہن کے ہاتھوں کی خوشبو کو پہچان لیا تھا۔ ہم دونوں نے بیک وقت اُٹھنا چاہا۔

"آہستہ... آہستہ... آرام سے..." نازو نے سرگوشی میں کہا۔ "شور مت مچاؤ..."

"نازو... یہ تو ہے... یا میرے کان دھوکا دے رہے ہیں مجھے؟" اکرام شیخ رونے کے قریب ہو گیا۔

نازو کے ہاتھ نے میری پٹی کھینچ کر سر کے اوپر سے گزار دی اور میں نے اس سراپا ناز کو چند انچ کے فاصلے سے دیکھا جب وہ اکرام شیخ کی آنکھوں پر سے پٹی اتار رہی تھی۔

"اب تم کہو گے کہ آنکھیں دھوکا دے رہی ہیں۔" وہ بولی۔

"تو... تو یہاں کیسے... اور تو... ٹھیک ہے نا؟" اکرام شیخ بولا۔ میں اُسے خاموشی سے دیکھتا رہا۔ وہ بس کنڈیکٹر یا ٹیکسی ڈرائیور کی یونیفارم میں تھی۔ سر پر آگے تک سایہ کرنے والی کیپ، میلی خاکی بشرٹ جس میں چار جیبوں کے علاوہ درجن بھر فالتو بٹن تھے۔ خاکی پتلون... یہ سب کپڑے اس کو بہت ڈھیلے تھے، لیکن اسی وجہ سے وہ اپنی نسوانیت کو چھپانے میں کامیاب تھی۔

"میں سب بعد میں بتاؤں گی..." وہ بولی: "تم دونوں باہر نکلو پہلے۔ میں ٹیکسی لے کر آتی ہوں تمھاری۔"

ہم دونوں ایک منٹ بعد اس گاڑی سے باہر آ چکے تھے اور قریب کے ایک درخت کی اوٹ میں کھڑے ہو گئے تھے۔

"یار... یہ تیری بہن آخر چیز کیا ہے؟" میں نے کہا۔ "عورت ہے کہ چھلاوہ؟"

"پتا نہیں یار..." اکرام شیخ بولا۔ "اس معاملے میں خود میری بے مشکوک ہوگی... میں دنیا کا واحد بھائی ہوں جو اپنی بہن کے بارے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ انسان ہے یا جن بھوت۔"

"مجھے شک ہو گیا تھا۔" میں نے کہا۔

"اب تو میں بھی کہہ سکتا ہوں۔" اکرام شیخ نے کہا۔

"نہیں یار... دیکھ نا یہاں اور کون ہے؟" میں نے کہا۔

نازو اسی وقت ٹیکسی لے کر نمودار ہوئی۔ ہم درخت کی اوٹ سے نکلے اور ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر گر گئے۔ نازو ہنسی۔

"ابھی یہ بندی آپ دونوں کو جدا کرنے سے قاصر ہے۔" وہ بولی۔

"ارے بابا! مار دا ایک کراٹے کا ہاتھ۔" اکرام نے کہا۔

"وہ میں مار چکی... دو بھینسے جیسی موٹی گردنیں ابھی ابھی توڑی ہیں۔" وہ ٹیکسی چلاتے ہوئے بولی۔

"اور تمھاری کلائی نہیں ٹوٹی۔" میں نے کہا۔ "غضب خدا کا!"

"تم کلائی کی بات کرتے ہو۔" وہ ٹیکسی کو جہانگیر روڈ پر لے آئی۔ "میرا وار غلط پڑ جاتا تو وہ مجھے توڑ دیتے ... کر دیتے۔ مگر فکر مت کرو... میں چابی لے آئی ہوں... ان کے پاس تھی۔"

"لیکن میں نے انھیں دیکھا نہیں۔"

"ایک ڈکی میں پڑا ہے۔" وہ بولی۔ "دوسرے کو گاڑی کے نیچے کھسکا دیا تھا... یہ بتاؤ جانا کہاں ہے؟ چلو پہلے تمھیں آزاد کر دوں۔"

"کہاں جانا ہے؟" اکرام شیخ نے میری طرف دیکھا۔

"کہاں جانا ہے؟" میں نے کہا۔ "جہاں سب کو جانا ہے۔"

"کیا مجھے بھی جانا ہے؟" نازو نے ٹیکسی روکی اور ہم دونوں کی ہتھکڑی کھول دی۔

"یار اس حالت میں ہم وہاں نہیں جا سکتے۔ اپنے ڈیرے پر..." اکرام شیخ بولا۔ نازو نے پھر ٹیکسی اسٹارٹ کر دی۔

"تو پھر میٹروپول چلو۔" میں نے کہا اور اپنی کلائی کو ملنے لگا۔ "فضول باتوں کے لیے یہی وقت ہے یار۔"

"یہ فضول بات نہیں ہے۔" میں نے اُسے چیلنج کیا۔ "ہم بڑی مشکل سے ادھر ہی گئے تھے۔" ہتھکڑی میں نے سیٹ کے نیچے ڈال دی۔

اکرام شیخ کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ "اچھا... تیرے اس ٹھکانے پر..."

"ہاں..." میں نے کہا۔ "جہاں میری کار کھڑی ہے۔"

"وہاں وہ فقیر بادشاہ ملیں گے۔" اکرام شیخ بولا۔

"کوئی بات نہیں... ان کا گھڑا محفوظ ہے... ہم نے اس میں سے صرف بریانی ہی تو کھائی ہے۔" میں نے کہا۔

"تمھاری کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔" نازو نے کہا۔ "کار... فقیر... گھڑا... بریانی..."

"تم نے راستہ پوچھا تھا عزیزہ..." میں نے کہا۔ "کیا تم کراچی کے راستوں سے واقف ہو؟"

"کافی حد تک..."

"تو پھر کوئنز روڈ چلو۔" میں نے کہا۔ "سیدھا راستہ ہے۔"

"نازو... تو کہاں رہی؟"

"چھوڑو بھیا۔" وہ ہنسی۔ "میں جہاں بھی رہی خیریت سے رہی۔"

"میں بہت پریشان رہا۔"

"اس میں میرا کیا قصور ہے؟" وہ معصومیت سے بولی۔

"اور کیا میرا قصور ہے؟" اکرام شیخ گرم ہو گیا۔ "قسمت اچھی تھی کہ تھانے سے نکل آئی۔"

"میری قسمت تو بس ایسی ہی ہے۔" وہ بولی۔ "جیسی تھی... خراب قسمت ان کی تھی جو اب اسپتال میں لیٹے ہوئے ہیں اور کسی کو منہ دکھاتے ہوئے شرماتے ہیں۔"

"تم یہاں کیسے آ گئیں؟" میں نے کہا۔ "میرا مطلب ہے کیا کوئی الہام ہوا تھا؟"

وہ ہنسی۔ "پہلے یہ بتاؤ کہ رابعہ کیسی ہے؟"

"رابعہ بہت اچھی ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ تو مجھے معلوم ہے۔" وہ شوخی سے بولی۔ "میرا مطلب تھا کہ خیریت سے ہے نا... محسن، شہلا، غالب سب کہاں ہیں؟"

"اسی دنیا میں ہیں ابھی۔" میں نے کہا۔ "بس میرے ساتھ کوئی نہیں ہے۔"

"کیوں؟"

"اس کیوں کا جواب بہت لمبا ہے۔" میں نے کہا۔ "فرصت ملے گی تو دوں گا... تم نے میرے سوال کا جواب گول کر دیا۔"

"بات یہ ہے مجاہدینِ اسلام۔" نازو نے کہا۔ "کہ خدا نے مجھے تھوڑی بہت کارآمد عقل دی ہے... میں حساب لگا کے آئی تھی۔"

"کون سا حساب... ستاروں کا یا قسمت کی لکیروں کا؟"

"نہیں... حالات اور واقعات کا حساب..." وہ بولی۔ "بھیا کو تو جیکب لائن والے گھر سے رخصت کر دیا گیا تھا... مجھے اس بدمعاش کانسٹیبل سے بھی حساب برابر کرنا ہے۔"

"چل چھوڑ... سارے زمانے سے حساب برابر نہیں کرتے۔" اکرام شیخ نے خفگی سے کہا۔ وہ ابھی تک اپنی کلائی رگڑ رہا تھا۔

"کیسے چھوڑ دوں... میں نے تو انھیں وارننگ بھجوا دی ہے۔ ان دونوں ٹھگوں کو۔" نازو نے ہنس کے کہا۔

"کیسی وارننگ؟"

"یہی کہ آئندہ را احتیاط..." وہ بولی۔ "لوگوں کو بے وقوف بنا کے جتنا لوٹا وہ معاف... مگر یہ آخری واردات تھی۔"

"ہوں... تیرا کیا خیال ہے کہ وہ باز آ جائیں گے؟" اکرام نے کہا۔

"نہیں... مجھے معلوم ہے کہ وہ یہ دھندا جاری رکھیں گے۔" نازو بولی۔ "ایک بدمعاش ایڈوانس وصول کر کے مکان کرائے پر اٹھائے گا... پھر مالک مکان کانسٹیبل پہنچ جائے گا کہ مکان تو میرا ہے... ٹریس پاس کرنے کے جرم میں بند کرانے کی دھمکی دے گا اور سامان باہر رکھ دے گا... انھوں نے میری وارننگ کو ہنس کے ٹال دیا ہوگا۔"

"اور تو کیا کرے گی؟"

"میں نے وارننگ میں کہا تھا کہ پھر ایسا ہوا تو ان کا علاج معالجے پر اتنا ہی خرچ ہو جائے گا، جتنا وہ ایڈوانس لیں گے۔" نازو نے کہا۔ "جو تکلیف اٹھائیں گے وہ بونس ہیں... اس سے اگلی بار یہ حرکت کی تو انھیں باقی عمر ایک بیساکھی کے سہارے پر چلنا پڑے گا... تیسری بار بھی باز نہ آنے کی صورت میں دو بیساکھیوں پر پھریں گے۔ انھوں نے سمجھا ہوگا کہ کسی پاگل نے مذاق نہیں کیا تو کسی دل جلے نے دھمکی دے کر اپنے دل کو خوش کیا ہے۔"

"کوئی ضرورت نہیں..."

"ضرورت ہے بھیا۔ خرابی جہاں نظر آئے اسے ٹھیک نہ کرنے سے خرابی بڑھتی ہے۔" وہ بولی۔ "اور پھر یہ کام تو فرصت کا شغل ہے..."

"شغل کی بچی... اب میں تجھے گھر میں بند کر کے بٹھاؤں گا۔" نازو ہنسی... "برقع بھی پہنا دو گے شٹل کاک ٹائپ... لو میرا ولیج آ گیا اب بتاؤ کدھر؟"

"سیدھے ہاتھ... پل کراس کر کے بائیں جانب ہٹس بنی ہوئی ہیں... جیسے ڈرم کو آدھا کر کے لمبائی کے رخ رکھ دیا گیا ہو۔"

"میں نے دیکھی ہیں۔" وہ بولی۔

میری ہدایات کے مطابق اس نے ٹیکسی کو روکا۔ بیرک میں گھپ اندھیرا تھا۔ سید ماچس کی روشنی میں اکرام شیخ نے لٹکتے تاروں والا سوئچ بورڈ تلاش کیا اور لکڑی کے ایک بوسیدہ گرد آلود تختے پر کھڑے ہو کر اس نے بجلی کا جھٹکا کھائے بغیر ایک بلب کو جلانے کا کامیاب تجربہ کیا۔ اس پوری لق و دق بیرک کے لیے دو سو واٹ کا تنہا بلب ایسے ہی تھا جیسے وحشت کے لیے ایک ادھورا اجالا۔ اس کسا جالے میں ہم فقط ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے اور ٹکرائے بغیر گھوم پھر سکتے تھے۔

میں نے گیراج کے دروازے کی جھری سے جھانک کر دیکھا تو کار اپنی جگہ کھڑی تھی۔ وہ وطلت مند فقیر کہیں نہ تھا جس کے دنیاوی اسباب اور مال و متاع کو ہم شریف لٹیرے لے گئے تھے۔

میں واپس بیرک میں گیا تو دونوں بھائی بہن تقریباً ایک سے لباس میں اطمینان سے زمین پر آلتی پالتی مارے بیٹھے ہوئے تھے اور اس بات سے قطعی بے نیاز تھے کہ فرش پر دھول کی کتنی موٹی تہ ہے... مجھے ان دونوں میں خاصی مشابہت کا احساس ہوا... جو پہلے اتنی شدت سے نہیں ہوا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ نازو ہمیشہ طرحدار قسم کے فیشن ایبل لباس میں 'رنگ پیراہن کا خوشبو زلف لہرانے کا نام' کی عملی تصویر بنی پھرتی تھی اور اکرام شیخ اس کے برعکس پولیس کی وردی میں رہتا تھا جس سے بے رحمی اور سفاکی کا تصور منسوب ہو گیا ہے۔ اس وقت ان کے درمیان احساس کا تضاد مشابہت کے احساس کو دبا دیتا تھا۔

"میں تیسری بار اپنے سوال کا جواب مانگتا ہوں۔" میں نے بیٹھنے کے لیے جگہ دیکھتے ہوئے کہا۔

نازو نے ایک دم میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے وہیں بٹھا دیا جہاں میں کھڑا تھا۔ اکرام شیخ ہنسنے لگا۔

"شروع کر دی خوامخواہ کی زور آزمائی۔" میں نے خفت سے ہاتھ جھاڑ کے کہا۔ "میں لڑکیوں سے نہیں لڑتا۔"

"شادی کے بعد بیوی سے تو لڑو گے؟" وہ ہنسی۔

"لڑکی اور بیوی میں اتنا ہی فرق ہے جتنا بیسن اور پکوڑے میں یا چاول اور بریانی میں۔" میں نے کہا۔ "اب بتاؤ۔"

"میں شام سے وہاں ڈیرا ڈالے بیٹھی تھی۔" نازو نے اچانک اپنی بات شروع کر دی۔ "مجھے معلوم تھا کہ تم وہاں ضرور آؤ گے۔"

"یہ کیسے فرض کر لیا تھا تو نے؟" اکرام شیخ بولا۔

"یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ ایک رپورٹر میرے بارے میں اتنی مفصل رپورٹ چھاپ دے اور تم اس سے نہ ملو...

"مگر جب میں وہاں گئی تو اس کا دروازہ مقفل تھا۔ دوسری بار شام کو پہنچی تو... صورتِ حال بہت بدل چکی تھی۔ وہ بے چارہ قتل ہو چکا تھا۔ یہ تو میں سمجھ گئی تھی کہ اس کی رپورٹ پر کچھ لوگ برہم ہوئے۔ غالباً وہ اور بھی بہت کچھ جان چکا تھا یا اسے قتل کرنے والوں کو اندیشہ تھا کہ جان لے گا... وہ جیمز بانڈ بننے کے چکر میں مارا گیا... میں تو خود اس سے ملنا چاہتی تھی۔ وہ ہمارے لیے بہت کام کا آدمی ثابت ہو سکتا تھا۔"

"کیا تم نے ہمیں آتے نہیں دیکھا تھا؟" میں نے کہا۔

"دیکھا تھا۔" وہ ہنسی۔ "تم لوگ آئے اور پولیس کا مجمع دیکھ کر بھاگ گئے... میں ذرا دور تھی۔ لیکن میں نے اپنے سکندر صاحب کو دیکھ لیا تھا۔" اس نے میرا نام دلاور کے لہجے میں لیا۔

"کہاں سے دیکھ لیا تھا؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔ "میں نے کیوں نہیں دیکھا؟"

"تم دیکھ بھی نہیں سکتے تھے۔" وہ بولی۔ "میں ایک خالی کوارٹر کے اندر چھپی ہوئی تھی۔ اس کے برآمدے کی جالیوں کے پیچھے سے جھانک رہی تھی۔ پہلے تو میں نے سوچا تھا کہ پچھلی طرف سے دروازہ کھول کے نکل آؤں مگر پھر میں نے کہا کہ اب تو شک کی بات ہی نہیں رہی۔ تم لوگ یقیناً پھر آؤ گے خصوصاً ہمارے بھیا کے اندر جو پولیس مین ابھی تک آن ڈیوٹی ہے وہ ضرور انھیں کھینچ لائے گا... چور کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟"

"چوری سے جائے، ہیرا پھیری سے نہ جائے۔" میں نے کہا۔

وہ پھر ہنسی۔ "تو پولیس مین کے بارے میں کہہ سکتے ہیں کہ وردی اور پیٹی سے جائے مگر تفتیش سے نہ جائے... اپنے بھائی کی عادت اور فطرت کو مجھ سے بہتر کون جانتا ہے... میں وہیں جمی رہی... پولیس کے جانے کے بعد بھی... پھر مغرب کے بعد وہ لوگ آئے... اور ڈیوٹی پر بیٹھے ہوئے دونوں پولیس والوں کے مارے جانے کا سارا ڈراما میں نے دیکھا۔ اس وقت مجھے بہت افسوس ہوا کہ میرے پاس مووی کیمرا نہیں تھا، ورنہ میں پوری فلم بنا لیتی اور ان کے فرشتوں کو علم نہ ہوتا... خیر! جب وہ اندر چلے گئے اور باہر نکلے ہی نہیں تو میں نے صورتِ حالات کا جائزہ لینے کا فیصلہ کیا... اور دیوار کے اوپر سے اندر جھانکنے میں کامیاب ہو گئی... وہ لوگ اندر کچھ بھی نہیں کر رہے تھے سوائے انتظار کے اور ظاہر ہے کہ وہ تمھارا ہی انتظار کر رہے تھے۔"

"پھر بھی تم نے ہمیں باہر نہیں روکا؟" میں نے کہا۔

"میں ضرور روک لیتی... بس ایک منٹ کا فرق پڑ گیا۔" وہ بولی۔ "میں نے واپس اسی کوارٹر میں جا کے پوزیشن سنبھالی۔ میرا خیال تھا کہ جیسے ہی تم آؤ گے میں جالی کے پیچھے سے تم کو آواز دے کر بلا لوں گی اور پھر ہم تینوں مل کے کچھ کریں گے۔ لیکن ہوا یہ کہ میں گھوم کر پیچھے کی طرف سے کوارٹر میں گئی اور اتنی دیر میں تم دونوں نے خود کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیا۔ جب میں نے دیکھا تو تم اندر جا رہے تھے اور تمھیں متوجہ کرنے کا وقت نکل چکا تھا۔ ظاہر ہے، پھر میں کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے باہر آ کے بھیا کی ٹیکسی دیکھی اور اس کی چابی نکالی۔"

"چابی کیا اسی میں لگی چھوڑ دی تھی تم نے؟" میں نے اکرام شیخ سے کہا۔

"نہیں... یہ دوسری چابی کی بات کر رہی ہے۔" اکرام شیخ بولا۔ "میں ڈپلی کیٹ چابی گھر پر نہیں رکھتا۔ گاڑی کے نیچے چیسس پر پلاسٹک کی تھیلی میں لپیٹ کر تار سے باندھ رکھی ہے کہ کبھی ضرورت پڑے تو گھر نہ جانا پڑے۔"

"مجھے تو معلوم تھا نا کہ چابی کہاں ہوگی۔" نازو نے دیوار کا سہارا لے کر پیر پھیلا دیے۔ "اس چابی سے میں نے ڈگی کھول کے دیکھا تو اس میں دو سوٹ کیس تھے۔ حیرت ہے مجھے اس گھڑے پر ہوئی جس میں نوٹ بھرے ہوئے تھے... یہ کوئی نیا فیشن ہے؟"

میں نے اسے فقیر صاحب کے بارے میں بتایا۔ "معلوم نہیں اس پر کیا گزری... کہیں ہارٹ فیل نہ ہو گیا ہو بے چارے کا۔"

"یار ہارٹ فیل ہوتا ہے کنگلوں کا... جن کو امید نہیں ہوتی کہ پھر اتنا پیسہ کہاں سے آئے گا۔" اکرام شیخ بولا۔ "اس نے تو تہیہ کر لیا ہوگا کہ ڈبل شفٹ میں سخی لوگوں کو لوٹے گا۔"

"میرا خیال ہے کہ وہ تھانے گیا ہوگا۔" میں نے کہا۔ "اور وہاں پولیس نے اسے بند کر دیا ہوگا کہ سالے فقیر بنا پھرتا ہے اور بات کرتا ہے ایک گھڑا نوٹوں کی... بتا باقی خزانہ کہاں دبا رکھا ہے... پولیس کو تو خدا موقع دے کمائی کا... وہ مار مار کے چپٹا کر دیں گے۔"

"سچ ہے بابا۔" ایک آواز آئی اور ہم سب چونک کر کھڑے ہو گئے... ایک جھاڑ جھنکاڑ داڑھی اور الجھے بالوں والا فقیر لڑکھڑاتا ہوا اندر آیا اور فرش پر سیدھا لیٹ گیا۔ اس نے ہمارے ریوالور کی طرف دیکھا تک نہیں۔ اس کا کتھئی رنگ کا چغہ کئی جگہ سے پھٹا ہوا تھا اور وہ لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔

"کیا سچ ہے بابا؟" میں نے نازو اور اکرام کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"دیکھ لو... مار مار کے چپٹا کر دیا ہے ہمیں یا نہیں۔" وہ کراہ کے بولا۔ "یا میرے مولا... کیسا زمانہ آ گیا ہے... فقیر کی بددعا سے بھی کوئی نہیں ڈرتا۔"

"تم فقیر کہاں ہو... سیٹھ ہو..." میں نے ہنس کر کہا۔

وہ ایک دم اٹھ بیٹھا۔ "تم... تم ہی تو نہیں ہو وہ چور..." پھر اس نے ریوالور دیکھا اور اس کی حالت غیر ہو گئی۔ "یہ... یہ اصلی لگتا ہے ہمیں... یا اللہ... ڈاکوؤں کے ہاتھوں مقدر میں موت لکھی تھی تو جوتے کھانے کے لیے تھانے کیوں بھیجا... آہ... کیا کوٹا ہے ظالموں نے۔"

نازو کو بے اختیار ہنسی آئی۔ "کسی نے لوٹا کسی نے کوٹا۔ تم پر تو بڑا ظلم ہوا بابا... چلو اللہ تمھاری مغفرت کرے۔"

" اور اللہ تمھاری مغفرت نہ کرے۔" وہ چیخا۔ "تم نے فقیر کا مال کھایا ہو... دیکھو میری خون پسینے کی کمائی واپس کردو مجھے۔"

" یہ خون پسینہ کہاں سے آگیا اس کمائی میں...؟" میں نے اُسے ڈانٹ کر کہا۔ "ہاتھ پھیلانے کے سوا کچھ کیا ہے تم نے؟"

" ارے بابا... سمجھو... عقل کی بات کرو... ہاتھ پھیلانا کیا آسان کام ہے...؟" وہ سر پکڑ کے بولا۔ "تم پھیلا سکتے ہو کسی کے سامنے ہاتھ؟ سارا دن فٹ پاتھ پر دھوپ میں بیٹھ سکتے ہو؟ اس میں پسینہ نہیں بہے گا تو کیا... کیا... کوکا کولا بہے گا... اور خون... یہ دیکھو... میری ناک سے... میرے دانتوں سے... پتا نہیں کہاں کہاں سے خون بہہ رہا ہے... اتنی مار کھا سکتے ہو تم؟ اور وہ بھی اس رستم کی اولاد کے ہاتھ سے... جو تیرہ نمبر کا پھر مارتا ہے تو چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں۔"

ہم سب کو بے ساختہ ہنسی آئی... وہ بہت اچھا ڈراما آرٹسٹ تھا لیکن اس کے ساتھ ہی میں یہ سوچنے پر بھی مجبور تھا کہ وہ ان پڑھ نہیں ہے۔ اس کی گفتگو سے یہی ظاہر ہوتا تھا۔

" ہے تو واقعی مشکل کام..." میں نے کہا۔ "کب سے کر رہے ہو؟"

" کیوں بتاؤں تمھیں؟ کیا پتا تم کون ہو..." وہ ایک دم محتاط ہو گیا۔ "انکم ٹیکس افسر یا... نہیں... تم تو چور ہو..."

" ہم چور نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ ہمارا ہی کوارٹر تھا جس میں تم یوں ڈیرا ڈالے بیٹھے تھے۔"

" ارے تو بابا فقیر سے کہہ دیتے گیٹ آؤٹ... فقیر ڈیرا اٹھا لیتا... اس کا گھڑا کیوں اٹھا لیا؟" وہ فریاد کے انداز میں بولا۔

" چلو بھول جاؤ گھڑے کو..." نازو نے کہا۔

" بھول جاؤں؟" اس نے ایک دلخراش چیخ ماری... "آہ... تم کیا جانو بی بی... کتنے ارمانوں سے وہ گھڑا بھرا تھا... دوسری بار..."

" دوسری بار!"

" ہاں... پہلی بار ڈاکو لے گئے تھے... خدا نے ان کا بیڑا غرق کیا۔" وہ بولا۔ "ان کی لانچ ڈوب گئی... میرا گھڑا بھی ڈوب گیا، چالیس ہزار..." وہ ایک دم چپ ہو گیا

" اور اس دوسرے گھڑے میں کتنے تھے؟"

" تھے؟" وہ اُچھلا۔ "تھے کا کیا مطلب؟ ہیں نا۔" وہ چلایا۔

" چلو ہیں سہی۔" نازو نے کہا۔ "کتنے ہیں؟"

" تم... تم نے نہیں گنے؟" وہ [illegible] میں بولا۔

" نہیں... بس پچیس روپے خرچ کیے ہیں... [illegible]" میں نے کہا۔

" جاؤ معاف کیا... پنج فقیر کی طرف سے راہِ خدا میں..." وہ بولا۔ "مگر میرا گھڑا...؟"

" گھڑا مل جائے گا... پہلے یہ بتاؤ کہ تم بھیک کیوں مانگتے ہو؟ کام کیوں نہیں کرتے... ڈرو نہیں ہم سے... ہم دوست ہیں تمھارے؟"

" کیا تھا کام بھی۔" وہ آہ بھر کے بولا۔ "بڑے پاپڑ بیلے... ایمانداری سے زندہ رہنے کے لیے... مگر کام ملا نہیں... ملا تو ہم سے ہوا نہیں... وہ سب ایسے ہی کام تھے... ایمان فروشی کے... یا اس کام میں عزت نہیں تھی... آخر میں نے سب کچھ چھوڑ دیا... عزت ایمان... شرم دھیا۔ پھر یہ کام شروع کر دیا۔ اللہ کا فضل ہے... اب اچھی آمدنی ہے۔ کلرک کیا افسر بھی نہیں کما سکتے اتنا... اگر حرام نہ لیں۔"

" تم تو پڑھے لکھے لگتے ہو...؟"

" ہاں بابا... بی اے کیا تھا [illegible] میں۔" وہ آہ بھر کے بولا۔ "جب نہ نوکری ملی نہ آگے داخلہ ملا... جوتیاں گھس گئیں، فاقوں کی نوبت آگئی... ماں باپ سرکاری اسپتال میں مر گئے... تو ہم نے بھی دنیا پر لعنت بھیج دی... کیونکہ دنیا ہم پر بہت پہلے لعنت بھیج چکی تھی۔ اب ہم کسی کے نہیں... کوئی ہمارا نہیں... بس پیسہ یار ہے اور پیسہ ہی رشتے دار ہے... یہی باپ ہے یہی بیٹا..."

ہم سب دم بخود بیٹھے رہے۔

" لیکن اس پیسے کا فائدہ؟" نازو نے کہا۔ "مطلب یہ کہ نہ گھر بار... نہ بیوی بچے..."

وہ تلخی سے ہنسا۔ "ارے بی بی... یہ گھر نہیں ہے کیا...؟ یہاں سے چلے جائیں گے تو کہیں بھی ڈیرا جما لیں گے... ہمارے گھر اپنے ہیں... بیوی بچوں کا جھمیلا کون پالے... کھاتے ہیں پیتے ہیں موج اڑاتے ہیں۔"

" تم جیسے فقیر کو... میرا مطلب ہے کہ..."

" میں سمجھ گیا بی بی... دنیا آدمی کے ظاہر کو دیکھتی ہے تو میرا بھی ظاہر یہ نہیں ہے۔" وہ بولا۔ "سب کے ظاہر اور باطن الگ ہو گئے ہیں... سب کے چہرے اصلی نہیں ہیں... میں بھی بھیس بنا کے پھر رہا ہوں فقیروں کا..."

" بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب... تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "کچھ تماشا ہمیں بھی دکھاؤ۔"

" میرا گھڑا واپس کر دو گے نا... تم شریف لوگ لگتے ہو..." وہ بولا۔ "گھڑا ہمارے پاس ہے... ایک ایک پیسہ تمھارا تمھیں مل جائے گا۔" نازو کو اچانک اس سے غیر معمولی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔

" تو پھر دیکھو تماشا..." وہ بولا اور اس نے اپنے سر کے اوپر سے وگ ہٹا دی... نیچے اس کے بال سیاہ اور چمکدار تھے... پھر اس نے داڑھی اتاری اور اس کا کلین شیو چہرہ سامنے آگیا۔ یہ تبدیلی ہم سب کے لیے ناقابلِ یقین تھی۔ بالکل جادو کی طرح وہ اپنی شخصیت بدل رہا تھا۔ اس نے چغہ کھینچا اور کینچلی کی طرح اتار دیا... اس کے نیچے وہ سرخ رنگ کی ٹی شرٹ اور پینٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس نے چغے سے منہ کو رگڑ رگڑ کر صاف کیے... وہ سب داغ دھبے غائب ہو گئے جو زخم اور خون کے نشان لگتے تھے... اب ہمارے سامنے ایک اسمارٹ جوان آدمی کھڑا تھا۔

" اوہ مائی گاڈ...!" میں نے کہا۔

" تم نے دیکھا میرا اصل روپ؟ کیسا ہے؟" وہ بولا۔ "رات کو میں اس طرح پھرتا ہوں... اس حلیے میں کون روک سکتا ہے مجھے... کہیں بھی جانے سے۔ اب میں دن رات میں دو الگ الگ شخصیتوں کا مالک ہوں مگر دنیا اسے ایک سمجھتی ہے۔ حالانکہ دنیا میں ہر شخص ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس کی شخصیت کے کم سے کم دو روپ ہوتے ہیں ورنہ تین بھی اور چار بھی... یہ ڈراما سب کرتے ہیں۔ وفادار شوہر سے لے کر باوفا بیوی تک... ایک دوسرے کی دوسری شخصیت کا علم نہیں ہوتا۔ جو بے وفا ہوتی ہے یا عیاش ہوتی ہے۔ ایماندار نظر آنے والا سب سے بڑا ایمان فروش ہو سکتا ہے... کیا حاکم کیا محکوم... کیا کلرک کیا افسر... عوام اور سیاستداں... تاجر اور آجر... سب میری طرح ہیں۔ ایک اڈا میرا ہے۔ میں نے دس ہزار میں لیا ہے... وہاں کوئی نہیں بیٹھ سکتا۔ ایسے ہی سب کے اڈے ہیں... سیاستداں کا اڈا اس کی پارٹی ہے تو ڈاکٹر کا اڈا اس کا کلینک... لیڈر بھی گولی دیتے ہیں عوام کو... ڈاکٹر اسپرین کی گولی دے کر سو روپے فیس لے لیتے ہیں۔ دو روپے کا انجکشن لگا کے [illegible] رکھوا لیتے ہیں۔ مریض کچھ نہیں جانتا... موٹر مکینک بھی یہی کرتا ہے... پھر میں کیا غلط کرتا ہوں؟ کسی کو دھوکا دے کر نقصان تو نہیں پہنچاتا... بس جھوٹ بولتا ہوں... وہ بھی بطور... جس کے دل پر اثر کرتا ہے وہ دیتا ہے جس کا دل پتھر ہے وہ بھاڑ میں جائے... میں کسی سے زبردستی تو نہیں لیتا۔ ڈاکٹر اور مکینک... پولیس مین اور انکم ٹیکس افسر... کسٹم انسپکٹر [illegible] انسپکٹر اور جج کے [illegible] اپنی خوشی سے دیتے ہیں... اور کم سے کم یہ تسکین تو دے جاتے ہیں کہ انھوں نے کارِ ثواب کیا... اپنے نامۂ اعمال میں ایک نیکی لکھوا لی۔"

" تم بہت... خطرناک آدمی ہو۔" میں نے کہا۔ "کیونکہ تم ضرورت سے زیادہ سچ بولتے ہو... تم معاشرے کے باغی ہو۔"

" تم نے جھوٹ بولا تھا ہم سے۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "کہ تم تھانے میں پٹ کر آئے ہو۔"

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "میں نے گاڑی دیکھ لی تھی۔ مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ کوارٹر کے اصل مالک آگئے ہیں۔ میں تمھارے انتظار میں تھا۔"

" کب سے ہماری باتیں سن رہے تھے؟" میں نے کہا۔

" ڈرو نہیں... میں بھی دشمن نہیں ہوں۔" وہ بولا۔ "دوست ہوں..."

یہ ہمارے ہی الفاظ تھے جو اس نے ہمارے خلاف استعمال کیے... نازو اتنی حیران پریشان بیٹھی تھی کہ پلک نہیں جھپکا رہی تھی۔

" اس شخص پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔" اکرام نے کہا۔

" کیوں... ایسی کیا بات کی ہے میں نے؟" وہ بولا۔ "میں نے تو پوچھے بغیر ہی تم کو اپنے بارے میں سب بتا دیا۔ تھوڑا سا ڈراما ضرور کیا تھا میں نے... مگر وہ ضروری تھا... ورنہ اپنا گھڑا تو میں نے ٹیکسی میں رکھا ہوا دیکھ لیا تھا۔"

" پھر تم نے نکالا کیوں نہیں؟ دروازہ تو کھلا ہوا تھا۔"

" میں شک میں پڑ گیا تھا۔ تم لوگ چور ڈاکو ہوتے تو واپس یہاں کیوں آتے۔" وہ بولا۔ "میں صرف تم لوگوں کی صورت دیکھنا چاہتا تھا اور جب میں نے اس آدمی کو دیکھا۔" اس نے میری طرف انگلی اٹھا کے کہا۔ "تو میں اندر آگیا۔"

" تم... جانتے تھے... کہ میں کون ہوں؟" میں نے بڑی مشکل سے کہا۔

" ہاں... تم کو بھلا کون نہیں جانتا... تم [illegible] ہو... یہ دونوں یقیناً تمھارے ساتھی محسن اور شہلا ہوں گے۔" وہ بولا۔

ہم سب یوں بیٹھے رہے جیسے سب پر بجلی گر پڑی ہو۔

" یہ محسن... اور شہلا نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔

اس نے جیب میں سے گولڈ فلیک کا پیکٹ نکالا۔ "لو پیو اور بے غم ہو جاؤ... نہیں... چرس وغیرہ نہیں ہے اس میں۔"

" میرے سگریٹ... ہیں میرے پاس۔" میں نے کہا اور اکرام شیخ کی طرف دیکھا۔ اس نے میری نظر کے سوال کو سمجھ لیا کیونکہ یہی سوال خود اس کی اور نازو کی نگاہ میں بھی تھا۔ اب کیا کرنا چاہیے۔ اس آدمی پر اعتبار کرتے ہوئے اسے زندہ رہنے کا موقع دینا چاہیے یا اسے مار دینا چاہیے۔ بلاشبہ وہ بے حد عیار اور ڈرامے

باز آدمی تھا۔ اس کا کیا بھروسا اگر وہ اعتماد حاصل کر کے اپنی جان بچالے اور ہمیں پولیس کے حوالے کر دے۔

تمھارے دل میں شکوک جنم لے رہے ہیں۔" وہ سگریٹ کا ایک کش لے کر بولا۔ "تمھاری پوزیشن ہی ایسی ہے مگر میں پھر تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ میں تمھارا خیر خواہ ہوں... بدخواہ ہوتا تو خاموشی سے واپس نہ لوٹ جاتا اور پولیس کے ساتھ نہ آتا... مجھے ایک لاکھ کا انعام مل سکتا تھا۔ تمھیں تو پتا بھی نہ چلتا کہ میں کب آیا اور کب گیا... خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے تمھیں... اور میرا شکریہ بھی کہ میں نے ایک لاکھ کو ایک پیسے کے برابر نہیں سمجھا... میں بتا چکا ہوں نا کہ میں ایمان فروش بہرحال نہیں ہوں۔"

اس کی بات نے ایک دم ہم سب کو قائل کر لیا... میں نے اطمینان کی گہری سانس لی اور اکرام شیخ نے بھی... ہم نے ریوالور جیب میں ڈال لیے... نازو پھر دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھ گئی۔

"تم کیا جانتے ہو میرے بارے میں؟" میں نے کہا۔

"وہ سب جو اخباروں میں آچکا ہے... میں اخبار ضرور پڑھتا ہوں اور بہت تفصیل سے۔" وہ بولا۔ "پہلے مجھے یقین نہیں آیا تھا کہ یہ تم ہو... پھر میں بہت خوش ہوا کہ خدا نے مجھے تم سے ملوایا۔ ویسے معاف کرنا تم اتنے عقل مند ہو نہیں جتنے مشہور ہو گئے ہو۔ ایک تو تمھارا حلیہ صاف چغلی کھاتا ہے کہ تم کون ہو۔ میری طرح اور بھی لوگ تم کو پہچان سکتے ہیں۔ بیشتر لوگ تمھارے طرف دار ہوں گے... مگر پولیس بھی تو ہے... تم آخر کیا سمجھتے ہو... کراچی کی پولیس کو کچھ معلوم نہیں؟ یا وہ اندھے ہیں؟ اور تم سب کو بے وقوف بھی سمجھتے ہو... فرض کرو میری جگہ ایک جاہل فقیر ہوتا تو کیا وہ مان لیتا کہ تم ہی اس کوارٹر کے مالک ہو؟ مالک ایسے رہتے ہیں اور یوں ریوالور نکال کے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کیوں مسٹر محسن؟"

"میں محسن نہیں ہوں۔" اکرام شیخ نے تند لہجے میں کہا۔

"اور میں شہلا نہیں ہوں۔" نازو نے بھی کہا۔ "ہم دونوں بہن بھائی ہیں۔"

اس نے نازو کو غور سے دیکھا اور سر پر ہاتھ مارا۔ "ہم بھی کیا زبردست عقل کے اندھے ہیں۔ تم تو وہی ہو... ناڈیا..."

"کیا بکواس ہے یہ؟" اکرام شیخ نے گرم ہو کے کہا۔

"معاف کرنا بھائی صاحب... وہ ایک ایکٹریس تھی نا... مارو دھاڑ سے بھرپور جس کا نام ناڈیا تھا۔" وہ بولا۔ "تمھاری اس بہن کی تو پوری اسٹوری پڑھی تھی میں نے... کمال ہے کہ میرا دماغ اُدھر نہیں گیا... اب میں سب سمجھ گیا۔ تم اس کے دوسرے ساتھی ہو

جس کا افتخار عارف نے اپنی رپورٹ میں ذکر کیا تھا کہ وہ بھاگ گیا۔"

اکرام شیخ ریوالور نکال کے اُٹھا ہی تھا کہ میں نے اُسے روک دیا۔

"ٹھہر و یار... یہ آدمی دشمن نہیں ہے تو اسے دشمن بنانے کی کیا ضرورت ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم اسے دوست بنا سکتے ہیں۔"

"ایسے ہر ایک کو دوست بناتے رہے تو مارے جاؤ گے۔" اکرام شیخ نے برہمی سے کہا۔ "یہ پولیس کا مخبر بھی ہو سکتا ہے۔"

"مخبر ہوتا تو کب کی مخبری کر چکا ہوتا۔" وہ بھی تیز لہجے میں بولا۔ "اور اس وقت تم سب حوالات میں بند ہوتے۔"

"یہ ٹھیک کہہ رہا ہے بھیا۔" نازو نے بھی تائید کی۔

"خاک ٹھیک کہہ رہا ہے... ابھی تک نام تو بتایا نہیں اس نے اپنا۔" اکرام شیخ نے کہا مگر اب وہ ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔

"میرا نام۔" وہ طنز سے ہنسا۔ "تم مان لو گے اگر میں کہوں کہ میرا اصل نام جو ماں باپ نے رکھا تھا رزاق تھا... وہ مجھے راجو کہتے تھے مگر میں نے بعد میں اسے راجا کر لیا... دن میں تو یہ نام میرے کام نہیں آتا۔ مگر رات کو میرے دوست مجھے راجا کہتے ہیں... میرا ایک حلقہ ہے جس میں چند عیاش اور اوباش رئیس زادے شامل ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ میں کوئی اسمگلر ہوں یا کسی بین الاقوامی گروہ کا رکن ہوں۔ کیونکہ میری شخصیت بہت پُراسرار ہے۔ میں نے کبھی کسی کو اپنا ٹھکانا نہیں بتایا۔ کبھی کبھی میں انھیں میٹروپول میں مل جاتا ہوں۔ جب بھی شراب کباب کا پروگرام ہوتا ہے۔ ان کی گرل فرینڈز بھی آتی ہیں۔ اور میں انھیں مرعوب رکھتا ہوں... کہ میں سنگاپور اور ہانگ کانگ گیا ہوا تھا... اب چار دن میں یورپ کی طرف جانا ہے۔ پھر میں غائب ہو جاتا ہوں... ان کی کاروں کو سڑک پر سے گزرتے دیکھتا رہتا ہوں... ایک بار تو انہی میں سے ایک نے اپنی گرل فرینڈ کو امپریس کرنے کے لیے میرے کشکول میں سو کا نوٹ ڈال دیا تھا۔

"تمھاری کوئی گرل فرینڈ نہیں بنی؟" میں نے کہا۔

"گرل فرینڈ...؟" وہ ایک دم سنجیدہ اور کچھ اداس ہو گیا۔ "نہیں، میں یہ روگ نہیں پالتا... کسی کو پانے کا... وہ سب ایسی ہی ہوتی ہیں... آدمی انھیں خرید تو سکتا ہے۔ ان سے محبت نہیں کر سکتا... مگر... میرا خیال ہے... کہ یہ موضوع کچھ مناسب نہیں۔" اس نے نازو کی طرف دیکھا جو نظر جھکائے فرش کی گرد پر انگلی سے کچھ لکھ رہی تھی... میں نے دیکھا تو اس نے "شیر" کا لفظ لکھا تھا۔

پہلے میں حیران ہوا کہ ایسے ماحول میں نازو کو شیر کہاں سے یاد آ گیا جب کہ گرد و نواح میں بلی تک موجود نہ تھی مگر آدمی کا ذہن... اک معمّا ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا... اس کی بھول بھلیوں

میں سیدھا راستہ نہیں ملتا اور خیالات کا سلسلہ کتنا ہی بے ربط کیوں نہ ہو۔ ایک خیال کی کڑی دوسرے خیال سے منسلک رہتی ہے۔ ربطِ باہمی کو تلاش کرنا ہی تو تحلیلِ نفسی کے ماہرین کا ہی کام ہے مگر اس وقت اچانک مجھ پر اس لفظ کے پردے میں پوشیدہ مفہوم واضح ہو گیا۔ شیر کے وہی معنی تھے جو اسد کے ہوتے ہیں۔ اور اسد نام تھا اسد اللہ خاں غالب کا جنھوں نے ابتدا میں اپنا تخلص اسد بھی کیا مگر شہرتِ دوام اپنے دوسرے تخلص غالب سے پائی۔

نازو نے سر اٹھا کے مجھے دیکھا... پھر میری نظروں کے تعاقب میں اس لفظ کو دیکھا جو اس نے غیر شعوری طور پر لکھ کر گویا رازِ دل آشکارا کر دیا تھا۔ پھر اس نے سمجھ لیا کہ میں سمجھ گیا ہوں اور اس کی چوری اکرام نے چاہے نہ پکڑی ہو مگر میں نے پکڑ لی ہے۔ لاشعور کا جذبہ روپ بدل کے غلطی سے میرے سامنے آ گیا تھا... وہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ شیر... شیر میں کیا ہے... شیر ایک جانور ہے۔ وہ کبوتر بھی لکھ سکتی تھی۔ لگڑبگھا بھی لکھ سکتی تھی۔ مگر وہ جانتی تھی کہ میں نہیں مانوں گا... یہ شیر ایک جذبہ تھا... ایک نام تھا... ایک یاد تھی اور ایک خلش خاموش تھی۔ اس نے اعترافِ جرم یوں کیا کہ شیر کے لفظ کو "شیرنی" کر دیا۔

"کیا سوچ رہے ہو یار؟" اکرام نے کہا۔

میں چونکا۔ "سوچنے کے لیے اب کیا رہ گیا ہے... تم بتاؤ کیا کرنا ہے؟"

"میں بتا چکا ہوں... میرا ووٹ خلاف ہے۔" وہ بولا۔

"میرا ووٹ تمھارے خلاف ہے۔" میں نے کہا۔

ہم دونوں کی نظر نازو کی طرف اُٹھی۔ اس نے اپنے نام کو مٹا دیا اور مسکرائی۔ "میں غیر جانبدار ہوں۔"

"اوکے... مسٹر راجا... تم کیا کہتے ہو؟" میں نے کہا۔

"میں کیا کہوں... تم سے کہنے کا کوئی فائدہ ہی نہیں... تم وہی کرو گے جو تمھارے دل میں آئے گا۔" وہ بولا۔ "تمھاری جگہ میں ہوتا تو میں بھی اسی مشکل سے دوچار ہوتا۔ اتنی آسانی سے کسی پر اعتبار نہ کرتا... ایک مقصد کو یقیناً ایک آدمی کے لیے داؤ پر نہیں لگایا جا سکتا۔ ایک آدمی کو ایک مقصد پر البتہ قربان کیا جا سکتا ہے خواہ وہ آدمی دوست ہی کیوں نہ ہو۔"

"چلو ٹاس کر لو۔" نازو نے غیر سنجیدگی سے کہا۔

میں نے برہمی سے اس کی طرف دیکھا۔ "کیا زندگی اور موت کے فیصلے کو ایک سکے پر چھوڑا جا سکتا ہے... عقل و شعور... غور و فکر... انصاف اور احتیاط... یہ سب بے معنی الفاظ ہیں؟ ایسا ہی ہو تو پھر گناہ گار اور بے گناہ کا فیصلہ چند سیکنڈ میں ہو

جایا کرے۔ عدالتوں میں گواہ، شہادت، ثبوت اور جرح سب کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ جج کٹہرے میں کھڑے ہوئے مجرم سے کہے کہ مانگو، ہیڈ یا ٹیل، اگر سکہ الٹا گر جائے تو ملزم کا فیصلہ ہو گیا۔ وہ مجرم ہے۔ اس نے ہیڈ مانگا۔ ہیڈ نہیں آیا، اس کا سر قلم کر دو۔"

"میرا... یہ مطلب نہیں تھا۔" نازو نے میرے گھورنے سے اور راجا کی پُرملامت نظروں سے گھبرا کے کہا

"میں اسے اپنے رسک پر چھوڑتا ہوں۔" میں نے کہا "مگر ہم اس پر نظر رکھیں گے۔"

"تھینک یو مسٹر جسٹس سکندرِ اعظم۔" وہ بولا۔ "فی الحال میں سونا چاہتا ہوں... کیا مجھے اجازت ہے کہ میں باہر جا کے کپڑے بدل آؤں۔ اور اپنا بستر اُٹھا لاؤں۔ میرے بیڈ روم میں تو آپ کی کار سو رہی ہے۔"

"ٹھیک ہے تم سو جاؤ..." اکرام اُٹھ کھڑا ہوا۔ "میں تمھارے ساتھ چلوں گا۔"

وہ دونوں باہر چلے گئے تو نازو نے کہا۔ "میرا ووٹ تمھاری طرف تھا... مگر..."

"مگر دوسری طرف بھائی تھا۔" میں نے طنز سے کہا۔ "اس لیے تم نے سیاست سے کام لیا۔ یعنی منافقت سے کام لیا... سچ کہنے سے گریز کیا... اتنی بزدل ہو تم... شیرنی۔"

اس کا رنگ لال پڑ گیا۔ "کیا غالب مجھے یاد کرتا ہے؟" اس نے نظر جھکا کے کہا۔

"ہاں... جب اس کے جوڑ درد کرنے لگتے ہیں تو تمھیں دعا دیتا ہے۔" میں نے کہا۔

"جوڑوں میں درد ہوتا ہے؟" اس نے مایوسی سے کہا۔

"میرا مطلب تھا کہ جب دل میں درد اُٹھتا ہے تنہائی کا۔" میں نے کہا۔ "نازو، وہ تمھیں بہت چاہتا ہے اور چاہت بڑا عجیب جذبہ ہے۔ اسے ہر شخص نہیں سمجھ سکتا۔ جس کے دل میں کسی کی چاہ نہ رہی ہو... وہ نہیں جان سکتا کہ چاہت کیا ہوتی ہے۔"

"میں جانتی ہوں... میں نے دیکھا ہے... بلعہ کو کس طرح چاہتے ہو۔" وہ دیوار پر نظر جما کے بولی

"تم بھی غالب کو چاہتی ہو؟"

"معلوم نہیں... ابھی میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتی۔"

"جھوٹ مت بولو میرے سامنے۔" میں نے کہا۔ "ابھی تم نے کیا لکھا تھا؟"

"وہ... بس ایک خیال تھا۔"

"گویا تمھیں اس کا خیال آتا ہے؟" میں نے کہا۔ "اکثر آتا ہے"

جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا؟ یا جب تم محفل میں بھی تنہا ہو جاتی ہو۔"

وہ گھٹنوں پر سر جھکائے نیچے گرد آلود فرش کو دیکھتی رہی اور اس کا چہرہ بالکل سپاٹ رہا... اس نے خیالوں کے کسی عکس کو چہرے تک آنے ہی نہیں دیا... پھر اکرام آگیا اور راجا آگیا... راجا نے ایک کونے میں بستر سا بچھایا اور اس پر دراز ہو گیا... وہ اب پاجامے اور بنیان میں تھا۔ اس نے ہاتھ سر کے نیچے رکھا اور دو منٹ میں سو گیا۔ کچھ لوگ جو ذہنی اعصاب کی کش مکش کا شکار نہیں ہوتے وہ خوش قسمت ہوتے ہیں کہ آنکھیں بند کرتے ہیں اور خوابوں کی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں۔

"یار یہ سو گیا... اتنی جلدی؟" اکرام نے مشکوک لہجے میں کہا۔

"تم پولیس والے ہو... چیک کر لو کہ مکر کر رہا ہے یا سچ مچ سو گیا ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر سو گیا ہے تو اندازہ ہو جائے گا کہ اس کے دماغ میں کوئی خلفشار نہیں... جھوٹا اور خوف کا مارا ہوا پریشان آدمی اتنی جلدی سکون سے نہیں سو سکتا۔"

اکرام نے سر ہلایا... اٹھ کر راجا کے قریب گیا اور ایک منٹ سے بھی کم وقت میں لوٹ آیا۔ "میں قائل ہونے لگا ہوں تمھاری نظر کا..." وہ بولا۔ دُور بسی کے گھر میں کلاک نے رات کے دو بجائے۔

"کیا ہم یونہی بیٹھے رہیں گے رات بھر؟" نازو نے کہا۔

"سونے کے لیے بیڈ روم حاضر ہے... بیڈ کے بغیر۔" میں نے کہا۔

"نیند تو مجھے نہیں آرہی ہے... لیکن بھوک بہت سخت لگی ہے۔" نازو نے کہا۔ "شام سے یہ وقت ہو گیا..."

"تو چلو... اسٹیشن چلتے ہیں... کینٹ اسٹیشن کے آس پاس بہت سے ہوٹل ہیں۔" اکرام نے کہا۔ "جو رات بھر کھلے رہتے ہیں۔"

"چائے کے لیے تو میں ایسے ہی تڑپ رہا ہوں جیسے ماہیٔ بے آب۔"

"مگر راجا صاحب کا کیا ہوگا؟"

"دیکھو... نو رسک نو گیم۔" میں نے کہا۔ "ہم بڑی آسانی سے آزما سکتے ہیں کہ راجا کس حد تک ہمارے ساتھ مخلص ہے۔ اگر واپسی پر بھی وہ ہمیں ایسے ہی سوتا ہوا ملا تو پھر سارا معاملہ صاف ہو جائے گا۔"

اکرام نے کچھ دیر سوچا اور پھر سر ہلا دیا... ہم تینوں دبے پاؤں باہر نکل گئے اور اپنے پیچھے دروازہ کھلا چھوڑ گئے۔ اکرام نے گاڑی اسٹارٹ کی تو نازو اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ میں ریوالور لیے بیرک کی اوٹ میں کھڑا رہا۔ ٹیکسی کا انجن غرایا اور میں نے ٹیکسی کو جاتے ہوئے دیکھا۔

پانچ منٹ بعد ٹیکسی واپس آئی۔ اس وقت تک میں مستعد کھڑا رہا تھا۔ اگر راجا ٹیکسی کے جانے کی آواز سنتا اور اس کے دل میں کوئی غلط خیال ہوتا تو وہ اس مہلت سے فوراً فائدہ اٹھاتا، مگر خود اکرام نے بھی دیکھ لیا کہ وہ اسی طرح سو رہا تھا۔

نازو نے راستے میں ہمیں وہ بات بتائی جو راجا کی مداخلت کے باعث ادھوری رہ گئی تھی۔ اس نے ہمیں بے بس دیکھ کر براہ راست دخل اندازی سے گریز کیا تھا۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہمیں جو گاڑی لے جانے کے لیے آئی تھی اس میں صرف ایک کیپٹن ہی آیا تھا۔ اگر اس کا کرنل بھی ساتھ آتا تو پھر نازو کو چاروں ٹائر فلیٹ کرنے کا موقع نہ ملتا۔ کرنل نے غالباً یہ سمجھا تھا کہ اب افرادی قوت کا کوئی مسئلہ نہیں رہا... قیدی حراست میں ہیں اور انھیں پکڑنے والا وہ شکاری ہے جس کے جال سے کوئی آج تک بچ کے نہیں نکلا۔ جب کیپٹن کو اندر جانا پڑا تو نازو نے چاروں ٹیوبوں کے والو نکال دیے۔ اس کے لیے نازو کو پٹرول پمپ تک جانا پڑا تھا، مگر وہ ٹیکسی میں گئی اور پانچ منٹ میں واپس آگئی۔ اس نے والو کھولنے والے ننھے سے اوزار کے لیے دس روپے جمع کرائے اور "ابھی واپس لاتا ہوں" کہہ کے بھاگ آئی۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا جب اسے واپسی پر کار اپنی جگہ ملی۔ والو اوپنر کے بغیر چار ٹائروں کی ہوا نکالنا بہت لمبا عمل ہوتا اور کوئی نہ کوئی اسے دیکھ لیتا۔ والو اوپنر سے اس نے یہ کام پانچ منٹ میں کر لیا اور پھر چھپ کر انتظار کرنے لگی۔ پہلا گوریلا اس وقت مارا گیا جب وہ ٹائر بدلنے کے لیے ڈکی میں سے جیک نکال رہا تھا۔ نازو نے جو کار کے نیچے دبکی ہوئی تھی خاموشی سے باہر نکل کے اور اس کے پیچھے جا کے گردن پر ہاتھ مارا تو وہیں گر گیا۔ ڈکی کھلی رہ گئی چنانچہ سر گھما کے دیکھنے پر دوسرے گوریلے کو پیچھے کچھ دکھائی نہ دیا۔ وہ دھماکا سن کے باہر نکلا تھا کہ نازو کے نازک ہاتھ کی ضرب نے اس کی گردن بھی توڑ دی۔ وہ گرا تو نازو نے اسے گاڑی کے نیچے دھکیل دیا۔

ٹیکسی اب کینٹ اسٹیشن پہنچ گئی تھی۔ وہاں کا ماحول تقریباً ویسا ہی تھا جیسا لاہور ریلوے اسٹیشن کے باہر کا۔ دو تین دوسرے درجے کے ہوٹلوں کے ساتھ متعدد تیسرے درجے کے ہوٹل بھی نظر آرہے تھے۔ ان کی پرانی عمارتیں بے رنگ اور غلیظ نظر آتی تھیں اندر کمرے تاریک لگتے تھے۔ ہر ہوٹل کے نیچے ایک چائے خانہ نما ریسٹورنٹ تھا، جہاں ہر قسم کی مخلوق بھری ہوئی تھی... عام لوگ... ڈرائیور... قلی... دلال... مکینک... بے گھر لوگ... اس وقت کوئی گاڑی نہیں جاتی تھی چنانچہ اسٹیشن کی طرف کا علاقہ ویران پڑا تھا۔

اکرام نے ایک ریسٹورنٹ کے باہر گاڑی روک لی۔ وہاں شیشے کے ایک دروازے پر فیملی روم بھی لکھا ہوا تھا مگر مشکل یہ تھی کہ نازو بالکل "فیملی" نظر نہیں آتی تھی اور ہم ہال میں سب کے درمیان بیٹھنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ اکرام آرڈر دینے چلا گیا۔

"تم نے اپنا یہ کیا حال بنا رکھا ہے نازو؟" میں نے کہا۔

"میں نے نہیں... تقدیر نے یہ حال بنایا ہے۔" وہ خود کو دیکھ کر مسکرائی۔

"تم نے اپنے بال بھی کٹوا دیے ہیں؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "ٹوپی کے نیچے ہیں۔"

"تمھارے تو... بہت لمبے اور گھنے بال تھے۔" میں نے کہا۔

"میں نے ترشوا لیے تھے۔" وہ بولی۔ "مجبوری تھی۔"

"غالب تمھیں ان کپڑوں میں دیکھ لے تو..."

"تو کیا؟ بھول جائے نازو کو..." وہ بولی۔

"تم نے غلط سمجھا... وہ ایسا آدمی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر خدانخواستہ تم گنجی ہو جاؤ... کانی یا لنگڑی لولی ہو جاؤ... تب بھی اسے فرق نہیں پڑے گا... خدا نہ کرے تم بدصورت ہو جاؤ..."

"کوس کیوں رہے ہو۔" وہ بولی۔ "میں تو خود ہی تمھارے اور رابعہ کے درمیان سے نکل گئی ہوں۔"

اسی وقت اکرام آگیا۔ اس کے ساتھ ایک "باہر والا" تھا جو چائے کی ٹرے لایا تھا۔ اس میں چائے کے ساتھ نہایت فضول ٹھنڈے اور سخت سموسے اور کچھ کیک پیس تھے۔ میں نے بڑی مشکل سے ایک کیک پیس چائے کے ساتھ نگلا ورنہ وہ آٹے کی طرح میرے حلق میں چپک گیا تھا۔ نازو نے کمال کیا کہ سارے سموسے صاف کر دیے۔ پھر کیک پیس کھا گئی۔

"یار یہ اتنا کھاتی ہے... جاتا کہاں ہے؟" اکرام شیخ بولا۔

"کھاتی نہیں... رزق ضائع کرتی ہے۔" میں نے کہا۔ "کوئی اور کھائے تو پھول کر کپا ہو جائے۔ یہ وہی ہڈی پر چمڑی۔"

"بابا جلتے کیوں ہو... تم بھی کھاؤ..." وہ بولی۔ "اللہ کی مہربانی ہے... تم بھی ہیں اونچے بھی رہتے ہیں۔"

"نازو... وہ تبت کیپٹن کدھر گیا تھا؟"

"کون تبتی کیپٹن...؟" وہ سڑ سڑ کرکے چائے پینے لگی۔

"وہی جو کار لے کر آیا تھا... وہ ایک ہندو کیپٹن تھا۔"

"پھر وہ گیا نرک میں..." نازو نے چائے ختم کرکے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ وہ روانہ ہوا تو میں سمجھ گئی کہ اب یہ دوسری گاڑی لائے گا۔" نازو نے کہا۔ "میں اس کے انتظار میں کھڑی ہوئی تھی۔ تیسری لائن کے کوارٹر کی اوٹ میں... وہاں ایک گٹر کھلا ہوا تھا۔ وہ وہاں سے گزرا تو میں نے ٹانگ اڑا دی۔ وہ منہ کے بل گرا اور بس پھر میں نے اُسے دو منٹ میں گٹر کے اندر ڈال دیا۔ وہ مرا نہیں تھا۔ بے ہوش ہوا تھا میرے وار سے... مگر میں نے دیکھا کہ وہ گٹر میں اُلٹا گرا تھا۔ اور سر کے بل آدھا کیچڑ میں دھنس گیا تھا... البتہ ایک آدمی کے نکل جانے کا افسوس ہے۔"

"اس چھوٹے سے آدمی کی بات کر رہی ہو؟"

"ہاں... اس کے باہر آتے ہی کہیں سے ایک گاڑی آگئی۔ زرد رنگ کی اور وہ اس میں بیٹھ کے چلا گیا... واپس اُدھر ہی جدھر سے گاڑی آئی تھی... میرا خیال ہے کہ اس نے وائرلیس پر بات کی تو ڈرائیور کار لے آیا تھا۔ اور سیدھا اس کے کہنے پر گھما کے الٹے راستے سے لے گیا... وہ سیدھے راستے سے جاتا تب بھی میں اس کو روک نہیں سکتی تھی۔"

"یہ ٹھیک ہے مس نازو... اس کا راستہ روکنا شاید تمھارے بس کی بات بھی نہیں تھی۔" میں نے کہا۔ "وہ ایک بہت خطرناک آدمی تھا... تم نے گاڑی کا نمبر وغیرہ دیکھا تھا؟"

نازو نے نفی میں سر ہلایا۔ "نمبر یا تو تھا ہی نہیں یا مجھے اندھیرے میں دکھائی نہیں دیا۔" وہ بولی۔

"ہوتا بھی تو بوگس ہوتا۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "گاڑی کون سی تھی؟"

"اسکوڈا... چار سال پرانی۔" وہ بولی۔

"پیلی اسکوڈا؟" میں نے حیرانی سے کہا۔ "تم نے اس شہر میں کتنی گاڑیاں دیکھی ہیں... جن کا رنگ پیلا ہو؟"

"اسکوڈا تو ایک بھی نہیں۔" وہ بولی۔

"پھر وہ کچا رنگ کرا کے لایا ہوگا... ایسا رنگ جو دھونے سے اتر جائے۔" میں نے کہا۔ "وہ بہت چالاک آدمی تھا... وہ پیلے رنگ کی اسکوڈا تمھیں پھر کہیں نظر نہیں آئے گی اور شاید وہ شخص بھی پھر نہیں ملے گا... یہ اس کا آخری مشن تھا۔ آخری کامیاب مشن۔" میں نے نازو کو اس سے ہونے والی گفتگو کا خلاصہ بتا دیا۔

"میرا خیال ہے کہ اس نے اپنے آخری مشن میں ڈنڈی ماری۔ یعنی تمھیں جانتے بوجھتے رعایت دی ہے؟"

"نہیں... اس نے مجھے کوئی رعایت نہیں دی۔ معاہدہ مجھے زندہ یا مردہ ان کے حوالے کرنے کا تھا۔" میں نے کہا۔ "اگر وہ ذاتی طور پر میرا دشمن ہوتا تب مجھے گولی مار کے میری لاش ان کے

حوالے کرتا... یہ کام زیادہ آسان تھا۔ مگر وہ شخص کسی کا دوست یا دشمن نہیں تھا۔ ڈنڈاڈی اس نے مال حوالے کرتے وقت یوں ری کہ خود مجھے لے کر نہیں گیا۔ ان سے کہا کہ آؤ اور مال لے جاؤ۔ غالباً تجارتی نوعیت کے بین الاقوامی معاہدے بھی ایسے ہی ہوتے ہیں... ایک تو یہ کہ مال کی قیمت ادا کر دی اور بیچنے والا فارغ... خریدار چاہے تو بحری جہاز سے لے جائے، ہوائی جہاز سے یا سر پر اُٹھا لے... کسٹم فرائٹ سب وہ خود ادا کرے... دوسری یہ کہ بیچنے والا مال کو خریدار کے گودام یا دروازے تک پہنچانے کے سارے رسک اور اخراجات کا ذمے دار ہو۔ میرے سلسلے میں بھی معاہدہ غالباً یہی ہوا تھا کہ مجھے ان کے حوالے کیا جائے گا۔ وہ اڑ گیا کہ حوالے تو میں کر رہا ہوں مگر جہاں مال ہے، وہاں آ جاؤ... کیپٹن اسی پہ مشتعل تھا۔ لیکن وہ بول نہیں سکتا تھا۔ اسے تو کرنل کے حکم کی تعمیل میں آنا پڑا تھا... اب کیپٹن تو مارا گیا... کرنل جوابدہی کرتا پھرے... وہ شخص دوبارہ کسی کے ہاتھ آنے والا نہیں ہے۔"

"لوگ کہتے ہیں دنیا بہت چھوٹی سی جگہ ہے۔" اکرام بولا۔

"ہاں... فاصلے سمٹ گئے ہیں... ایک ہی پیشے میں رہ کے وہی لوگ ہر جگہ بار بار ملتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "جیسے ایک محلّے کے لوگ... مگر وہ شخص اپنی پرانی شخصیت کو اپنے ماضی کے ساتھ دفن کر دے گا۔ پھر وہ دوسرا آدمی ہو گا۔ ایک نئی زندگی کے ساتھ نئی دنیا میں نووارد۔"

"میری خواہش ہو گی کہ وہ پھر ملے۔" نازو نے اچانک کہا۔

"تمھاری خواہشات ایک بے لگام، پاگل اور اندھے گھوڑے کی طرح ہوتی ہیں جو بحرِ ظلمات میں دوڑ رہا ہو۔" میں نے کہا۔

اکرام شیخ میری بات پر بہت خوش ہوا۔

"بہت تنگ کر رکھا تھا اس نے مجھے... میں بولتا نہیں تھا... کچھ لحاظ کر جاتا تھا۔" وہ چائے کے برتن لے جاتے ہوئے بولا۔

نازو اس کے جانے کے بعد منہ پھلا کے بیٹھی رہی۔

"میرا مطلب یہ تھا مس نازو..."

"مطلب وطلب کچھ نہیں... تم خود ایک بے لگام، پاگل اور اندھے گھوڑے ہو جو بحرِ ظلمات میں دوڑ رہے ہو... وہ بھی ریورس گیئر میں۔" وہ چلّا کے بولی۔ "بلکہ تم گھوڑے بھی نہیں ہو... اس سے ملتی جلتی چیز ہو۔"

میں بے اختیار ہنس پڑا۔ "او کے... میں گدھا ہوں... میں مانتا ہوں، مگر تم بھی مان لو۔"

"کیا مان لوں؟" وہ مصالحت آمیز لہجے میں بولی۔

"کچھ بھی مان لو... جو تمھارا جی چاہے۔" میں نے کہا۔ "مثلاً یہ کہ زمین گول نہیں ہے... اور گدھے کے سر پر سینگ ہوتے ہیں۔"

وہ ہنسنے لگی۔

واپسی پر صبح کے چار بجے ہم نے راجا کو اسی حالت میں سوتا ہوا پایا۔ اکرام کسی مسافر خانے سے پرانے گدّے خرید لایا تھا جو ہم نے نیچے بچھائے اور سو گئے۔ تھکن سے سب ہی بے حال تھے چنانچہ ہم دس بجے اس وقت اُٹھے جب راجا نے ہمیں بیدار کیا۔ وہ پھر اپنے لباسِ فقیری کو وگ سمیت پہن چکا تھا۔

"فقیر ڈیوٹی پر جاتا ہے بابا... تم بے فکرے لوگ سوتے رہو مگر من کی آنکھیں کھول کے۔" وہ بولا۔ "کہیں دنیا تمھیں ابدی نیند نہ سلا دے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے آنکھیں مل کے کہا۔ "تم بھیک مانگنے جا رہے ہو؟"

"اونہوں... صبح صبح بدشگونی کر دی۔" وہ بولا۔ "ارے بابا! فقیر تو دنیا کی سخاوت آزمانے جاتا ہے۔ یہ دیکھنے جاتا ہے کہ لوگوں کے دل چھوٹے اور ہاتھ تنگ تو نہیں ہوئے۔ تم سکوں کے بدلے ثواب بانٹنے کو بھیک مانگنا کہتے ہو... ہاتھ کا میل لے کر ثواب دینا۔"

"بیٹھو یہاں۔" میں نے اُسے ہاتھ پکڑ کے ایک جھٹکا دیا۔

"یا میرے مولا۔" وہ کندھا پکڑ کے بولا۔ "فقیروں کو کن شہ زوروں سے بھڑا دیا۔"

"تم آج سے بھیک مانگنے نہیں جاؤ گے... سُنا تم نے... خود کو اور ہمیں بے وقوف مت بناؤ۔" میں نے کہا۔ "جو کچھ تم کرتے ہو، وہ بھیک مانگنے کے سوا کچھ نہیں ہے۔"

اکرام میری آواز پر اُٹھ بیٹھا۔ "یہ کیا شور و غوغا ہے؟"

"صبح صبح فقیر کے پیٹ پر لات پڑی ہے اس لیے بلبلا رہا ہے۔" راجا نے کہا۔ "روزی کا ایک وسیلہ ہے... بلکہ تھا۔"

"سنو... تمھاری اوسط یومیہ آمدنی کیا ہے؟" اکرام بولا۔

"دو سو... کبھی تین سو... عید، بقر عید، محرم پر چار پانچ سو... ماہانہ نہیں... روزانہ..." وہ بولا۔

"اچھا ہم تمھیں دو سو روپے روز دیں گے۔" اکرام بولا۔ "پھر تو یہ کام چھوڑ دو گے؟"

"تم کتنے دن دو گے بابا! دو چار دن دو گے، پانچویں دن دھتکار دو گے کہ مفت خورے... جا دفع ہو..."

"نہیں... ایسا نہیں ہو گا۔" میں نے اُسے یقین دلایا۔ "تم ہمارے ساتھ رہو گے... ہمارے لیے کام کرو گے... بے شک تمھیں کام کرنے کی عادت نہیں رہی ہو گی... مگر وہ دلچسپ کام ہیں۔ یہ کلرکی نہیں ہے، تجارت نہیں ہے اور ایمان فروشی نہیں ہے۔"

اس کا چہرہ ایک دم روشن ہو گیا۔ "تم لوگ... اپنے ساتھ کر لو گے مجھے؟ میں ایک ناکارہ آدمی ہوں۔"

"تم کارآمد ہو جاؤ گے... تمھاری ذہنی اور جسمانی صلاحیت سے دنیا نے فائدہ نہیں اُٹھایا اور تم نے امید کا دامن چھوڑ دیا۔ حوصلہ ہار گئے... بے حسی، بے اعتمادی اور بے یقینی کا یہ زنگ بہت جلد اُتر جائے گا... اور ایک دن تم خود محسوس کرو گے کہ پیسہ تو ہاتھ کے میل سے بھی بدتر ہے۔ اور وہ دہری زندگی جو تم گزارتے رہے سوائے تمھارے دوسرے کسی کے لیے نہیں تھی جو صرف تمھیں خوشی دے سکتی تھی۔ وہ بھی سچی اور خالص نہیں... خیرات میں ملنے والی... بے غیرتی کے احساس سے سمجھوتا کر کے ملنے والی۔"

راجا کا چہرہ سپاٹ ہو گیا... جیسے سینما کا خالی اسکرین۔

"دیکھو... میں ایک ضرورت کے تحت ایسا کر رہا ہوں۔" اس نے کہا۔ "جو میں... یہاں نہیں بتا سکتا۔"

میں اُسے بازو سے پکڑ کے ایک طرف لے گیا۔ "ایسی کون سی بات ہے جو تم سب کے سامنے نہیں کر سکتے؟"

"سب کے سامنے کیا... میں تم سے بھی نہیں کر سکتا۔ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔" وہ بولا۔

"تم کو کتنا پیسہ چاہیے... بولو۔" میں نے کہا۔ "ایک لاکھ... دو لاکھ... دس لاکھ..."

"چاہیے تو مجھے پانچ لاکھ۔" وہ بولا۔

"تو پھر ایسا کرتے ہیں... میں تم کو اسلحہ فراہم کرتا ہوں۔ تم کسی بنک کو لوٹ لو۔" میں نے کہا۔ "بہادری کا کام کرو... جو بے غیرتی کے کام سے بہتر ہے... اور بزدل ہو تو اس لڑکی کو ساتھ لے جاؤ... یہ تمھارا کام کر دے گی۔"

وہ شرمندہ اور خجل میرے ساتھ آیا اور زمین پر بیٹھ گیا۔ نازو اُسے دیکھ کر مسکرائی۔

"راجا جی... کیا راج پاٹ چلا گیا۔" نازو نے کہا۔ "یہ آدمی بہت خطرناک ہے... دیتا کچھ نہیں اور سب کچھ لے لیتا ہے۔ زندگی بھر کے لیے اپنا قیدی بنا لیتا ہے۔"

"مسٹر راجا... ہم یہ رسک نہیں لے سکتے... کہ تمھیں جانے دیں۔"

"ارے تو کون کمبخت جا رہا ہے بابا۔" وہ زمین پر پیر پسکر کے بولا اور اس نے وگ اُتار کے زمین پر دے ماری۔ "مگر یہ بتاؤ کہ کیا تم لوگ واقعی سیریس ہو... میں کچھ کر سکتا ہوں تمھارے لیے؟"

"تم بہت کچھ کرو گے۔" میں نے اُسے تسلّی دی۔ "لیکن بھیک نہیں مانگو گے... لاؤ یہ لباس مجھے دے دو... آج سے یہ کام میرا..."

وہ چونکا۔ "تمھیں... یعنی تم بھیک مانگو گے؟"

"ہاں... تمھارے مقابلے میں مجھے اس لباس کی زیادہ ضرورت ہے راجا جی۔" میں نے کہا۔

ہم نے بیرک کا دروازہ بند کرنے سے پہلے بستر سمیٹ کر کونے میں رکھ دیے... پھر ہم یوں نکلے کہ راجا کے روپ میں بھکاری میں بنا ہوا تھا اور نازو نے موہنی کے کپڑے پہن لیے تھے۔ میں نے اُسے یہ بھی بتا دیا تھا کہ موہنی کون تھی۔ مجھ سے کہاں اور کیسے ملی تھی اور پھر کیسے لاپتا ہو گئی تھی۔ اُس نے جانتے بوجھتے بہت سے غیر ضروری سوالات کیے مثلاً یہ کہ بچپن سے اب تک موہنی کے جذبات نہیں بدلے تھے تو میرے کیوں بدل گئے تھے۔ اور نتیجہ وہی اخذ کیا کہ مرد کی ذات میں وفا نہیں... اکرام شیخ نے بھی اختصار کے ساتھ وہ سب واقعات سُنے تھے جو اُن کی عدم موجودگی میں پیش آئے تھے اور ہم سب سے کچھ فاصلے پر راجا بے وقوف بنا بیٹھا رہا تھا۔ ابھی تک نہ ہم نے اسے شریکِ راز کیا تھا اور نہ پوری طرح واضح کیا تھا کہ ہم اُسے کس حد تک قابلِ اعتماد سمجھتے ہیں اور اس سے کیا کام لینا چاہتے ہیں۔ وہ خود کو ابھی تک ہماری قید میں محسوس کر رہا تھا اور کچھ مایوس نظر آتا تھا۔

جب نازو نے لباس اور حلیہ بدلا تو راجا کی عقل خبط ہو گئی، وہ نازو کے بارے میں پڑھ چکا تھا کہ وہ بھاگنے سے کس طرح محافظوں کی ہڈیاں توڑ کے فرار ہوئی تھی۔ جب اس نے نازو کو دیکھا تھا تو وہ میلے گرد آلود خاکی رنگ کے بدوضع مردانہ کپڑوں میں تھی اور اس کے حسن کی تمام آب و تاب اسی طرح محسوس نہیں ہوتی تھی جیسے کیچڑ میں پڑے ہوئے ہیرے کی چمک... جب نازو نے نہا دھو کے موہنی کے کپڑے پہنے... جو اُسے کچھ ڈھیلے تھے۔ تو اس کا پیکرِ رعنائی اپنی تمام ساحرانہ قوت کے ساتھ سامنے آیا۔ راجا کی جگہ کوئی بھی مرد ہوتا تو اس کا متاثر نہ ہونا محال تھا۔

میں اور نازو اب شناخت کے خطرے سے کافی محفوظ ہو گئے تھے۔ راجا کے فقیرانہ لباس نے مجھے یکسر بدل دیا تھا اور کسی دشواری کے بغیر میں اس قابل ہو گیا تھا کہ کراچی میں آزادانہ گھوم پھر سکوں... نازو کا حلیہ یہ تھا کہ وہ اب ایک معزز خاتون نظر آتی تھی اور کوئی بھی پولیس مین اس کی طرف راہ چلتے شک کی نظر بھی نہیں ڈال سکتا تھا... وہ اپنے بھائی کے ساتھ آ گئے تھی جو کسی ڈرائیور کی وردی میں گاڑی چلا رہا تھا۔

دوپہر بارہ بجے کے بعد ہم نے لنچ نما ناشتا کیا اور اتنا کھا لیا کہ پھر شام تک کھانے کی ضرورت سے بے نیاز ہو گئے۔

"اب تم تینوں کا پروگرام کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"تم الگ جا رہے ہو کہیں؟" اکرام نے پوچھا۔

ہاں... میں بندرگاہ کے علاقے میں دوست محمد کو اور اس کے ذریعے سے رالیعہ کو تلاش کروں گا۔" میں نے کہا۔

"کیا یہ مشکوک بات نہیں ہوگی؟" اکرام نے کہا۔ "اگر ایک فقیر بندرگاہ میں بھیک مانگتا پھرے تو کوئی نوٹ نہیں کرتا... مگر وہ کسی کا پتا پوچھتا پھرے تو یقیناً لوگوں کو حیرانی ہوتی ہے۔"

"حیران ہونے دو لوگوں کو..." میں نے کہا۔

"تم راجا کو ساتھ کیوں نہیں لے جاتے؟" اکرام نے کہا۔

"اسے کوئی نہیں جانتا۔"

"کچھ لوگ مجھے ضرور پہچانتے ہیں۔" وہ بولا۔

"ہاں... مگر وہ بندرگاہ کے علاقے میں تو نہیں ہوں گے۔"

اکرام نے کہا: "اور دن کے وقت...؟"

"دن کے وقت میرا ایک فقیر کے ساتھ پھرنا شک پیدا نہیں کرے گا؟" وہ بولا۔

"تم دونوں کا اکٹھے رہنا ضروری نہیں۔"

"راجا جی... مجھے ایک شخص کی تلاش ہے۔ اس کا نام دوست محمد ہے اور وہ ایک میرین انجینئر ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ کسی جہاز پر ملازم نہیں ہے۔ اس کی خدمات سب کے لیے وقف ہیں۔ لانچ سے لے کر تجارتی جہاز تک ہر جگہ اُسے بلا لیا جاتا ہے اور وہ خدمتِ خلق نہیں کرتا... معاوضہ لیتا ہے... اس کے پاس کوئی پرانی کار ہے جو بندرگاہ کے ہی علاقے میں کہیں کھڑی رہتی ہے۔"

"تمھیں کیا کام ہے اس سے؟" وہ بولا۔

"جب وہ ملے گا تو کام بھی بتا دوں گا۔" میں نے کہا۔ "ابھی تو ہم دونوں بندرگاہ کے علاقے میں پہنچ کر آگے پیچھے ہو جائیں گے۔ تم آگے رہو گے... لوگوں سے پوچھتے رہنا کہ دوست محمد کہاں ملے گا... میں تم پر نظر رکھوں گا اور بھیک مانگتا ہوا آگے بڑھتا جاؤں گا۔"

"مجھے روک دیا بھیک مانگنے سے... اب خود کرو گے یہ کام؟"

"یار کام تو کچھ اور ہے۔" میں نے ہنس کے کہا۔ "اس کے لیے بھیس بدلنا ضروری ہے... وہ کام ہو گیا تو پھر یہ کام بھی ختم۔"

راجا نے اقرار میں سر ہلایا۔ اکرام شیخ نے ہمیں بندرگاہ سے ایک فرلانگ دُور اُتار دیا۔

"اب تم دونوں گھر جاؤ گے؟" میں نے کہا۔

"ہاں... آج کے دن تو آرام ہی کریں گے۔"

"اگر ممکن ہو تو مظفر کو فون کرنا۔" میں نے کہا۔ "اس سے پوچھنا کہ ملتان کی کیا صورتِ حال ہے۔ جونی اور جیکی نے اس سے رابطہ قائم کیا ہے یا نہیں... اور ہاں... مجھے ایک ٹیلیفون چاہیے۔"

"کیا چاہیے؟" اکرام بھونچکا رہ گیا۔

"ٹیلی فون... وہ جو لائن مین لیے پھرتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"یار زو، میں کہاں سے لاؤں؟"

"دنیا میں ہر چیز ملتی ہے دوست... کبھی زر سے کبھی زور سے۔" میں نے کہا۔ "تمھارے پاس تو پولیس کی وردی ہے اور ایک شناختی کارڈ بھی ہے... تم ٹیلی فون کیا ٹیلی فون کے کھمبے تک کو گرفتار کر سکتے ہو۔"

اکرام ہنسا۔ "اچھا وہ جو... ایس ایس کرانتی تھرڈ کا نام لیا ہے نا...؟"

"ہاں... لیکن میں اس کے کپتان سے یا فرسٹ انجینئر سے بھیک مانگنے نہیں جا سکتا۔" میں نے کہا۔

"وہ جہاز دو تین دن میں روانہ ہوگا۔" اکرام نے کہا۔ "اس کے کارگو پر نظر رکھنا... اگر ممکن ہو... لیکن ذرا دُور رہ کے اور احتیاط کے ساتھ... وہ غافل نہیں ہیں... خصوصاً جب سے ان کا ایک جہاز ڈوبا ہے ان کے آدمی سادہ کپڑوں میں ہر جگہ موجود رہتے ہیں۔"

"میں رات کو گھر آ جاؤں گا... امید ہے اس وقت تک تمھارا وہ گھر وہیں ہوگا۔" میں نے کہا۔

جب ٹیکسی واپس چلی گئی تو میں اور راجا ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔

"تمھارا یہ ساتھی بہت شکی مزاج ہے۔" راجا نے شکوہ کیا۔

"وہ پولیس مین تھا پہلے... اور تم احتیاط کو شک سمجھ رہے ہو۔" میں نے کہا۔ "چند دن ساتھ رہو گے تو بہت کچھ جان لو گے اور ہمیں ایک بار سمجھ لو گے تو پھر کبھی غلط فہمی پیدا ہی نہیں ہوگی۔ میرا دل بہرحال تمھاری طرف سے صاف ہے۔"

"مجھے اپنا گھر اسے کرا بنا راستہ لینا چاہیے تھا۔" اس نے دل زدہ لہجے میں کہا۔ "بس میں جذباتی ہو گیا... میں تم سے ملنا چاہتا تھا اور اکثر سوچتا تھا کہ تمھارے لیے کچھ کروں... سوچتے سب ہیں۔ وہ سب نوجوان اور بوڑھے جو پاکستان کی سالمیت کو سب پر مقدم سمجھتے ہیں۔ مگر عمل کرنے کی توفیق خدا سب کو نہیں دیتا۔ کچھ لوگ بزدل ہوتے ہیں اور حالات کو بہانہ بنا لیتے ہیں... کچھ لوگوں کے لیے حالات واقعی سازگار نہیں ہوتے... میں اکیلا آدمی... اپنی جان کے سوا کسی کی فکر نہیں... آج تک جو کیا اپنی جان کے لیے کیا... وطن کے لیے کچھ نہیں کیا... حالانکہ وقت کا تقاضا ہے..." وہ ایک دم چُپ ہو گیا۔

"تم کو کس نے روکا ہے؟" میں نے کہا۔ "لیکن ایک بات بتاؤ... تم اتنی معقول باتیں کرتے ہو... پھر یہ کیسا کام کر رہے تھے تم؟"

"میں بچپن سے جھکی اور خبطی مشہور تھا۔" وہ بولا۔ "اُلٹے کام کرتا تھا... میری باتوں سے بھی سب پریشان ہوتے تھے کہ آخر یہ لڑکا بنے گا کیا... اور دیکھو میں کیا بنا؟ اس سے پہلے جو کچھ میں نے کیا اس کی تفصیل سنو تو حیران رہ جاؤ... اتنے پیشے اختیار کیے ہیں میں نے اور اتنے کام کیے ہیں... اتنے بھیس بدلے ہیں کہ اب بتاتے ہوئے بھی شرم آتی ہے... میں نے دیکھ لیا تھا کہ دنیا میں صرف پیسہ کام آتا ہے اور پیسہ آرام دیتا ہے اور عزت دیتا ہے۔ آج رات چل کے دیکھنا کہ میری کتنی عزت ہے... عزت دار کہلانے والوں میں... مگر یہ تو میں جانتا ہوں نا کہ نہ وہ عزت دار ہیں اور نہ میں ہوں... تو یہ گداگری کا پیشہ بھی بس ایک پیشہ تھا۔ پیسہ آسانی سے اور بے حساب ملتا تھا چنانچہ میں نے دن اور رات کو الگ کر دیا تھا اور اپنی شخصیت کے دو حصے کر دیے تھے۔"

"کیا تم... تمام عمر بھیک مانگتے رہتے... اور اسی طرح زندگی گزارنے کو کامیابی سمجھتے... کہ جتنا ملا عیاشی میں اُڑا دیا... تمھیں کبھی ضرورت نہیں پڑی جذباتی رشتوں کی؟" میں نے کہا۔

"جذباتی رشتے خریدے تو نہیں جا سکتے نا... ورنہ میں ماں باپ کے بعد بھائی بہن بنا لیتا۔ چاچے ماموں لے آتا۔" وہ بولا۔

"تم اس عمر کے جذبات سے بھی بیگانہ ہو؟ تم کو کسی سے محبت نہیں ہوئی کبھی؟"

"کئی بار ہوئی..." وہ بولا۔ "کئی دن رہی... کئی مہینے بھی چلی... میعادی بخار کی طرح۔"

"وہ محبت نہیں کہلاتی... میں اس محبت کی بات کر رہا ہوں جس میں آدمی خود کو کبھی خیالوں میں بھی تنہا محسوس نہیں کرتا۔ جس میں وہ سوتے جاگتے خواب دیکھتا ہے... اپنے گھر کے... اپنے بچوں کے اور اپنے بچوں کے بچوں کے..."

وہ خلا میں گھورتا رہا۔ اس نے میری بات کا جواب کوئی نہیں دیا مگر میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں اتر آنے والے سارے خواب وہی ہیں جو میرے اپنے خواب تھے۔ جو سب محبت کرنے والوں کے خواب ہوتے ہیں... جو اپنا وجود تسلیم کرا لیتے ہیں خواہ آدمی اپنی زبان سے اقرار نہ کرے اور مسلسل انکار کرتا جائے۔

"میں یہاں ایک لڑکی کے لیے آیا ہوں۔" میں نے کہا۔ "پہلے وہ میرا مقصدِ حیات تھی۔ پھر اس نے میرا ساتھ دیا اور ہم نے اپنی محبت کے سارے خوابوں کو مؤخر کر دیا... ہم ایک مشن پر ہیں... اس مشن کی کامیابی یا ناکامی میں ہماری [illegible] داؤ پر لگی ہوئی ہے... یا تو ہم دونوں نہیں ہوں گے... ہماری محبت کا کوئی افسانہ بھی نہیں ہوگا۔ یلغے جنوں یا شیریں فرہاد کے قصّے کی طرح... یا پھر یہ محبت ایک [illegible] حقیقت ہوگی۔ بشرطِ زندگی ہم اپنے سارے خوابوں کو عمل کر دیں گے اور زندگی کی آخری سانس تک خوشیاں سمیٹتے رہیں گے۔ ایک خوشی کے بیج سے دوسری خوشی کا نخلِ آرزو پھوٹے گا اور پھر اس میں کتنی خوشیوں کے پھول ہوں گے۔ پھر ان پھولوں پر کتنی رنگین اور خوب صورت تتلیاں آئیں گی جو..."

وہ مجھے غور سے دیکھتا رہا۔ "کیا تم شاعر بھی ہو؟"

میں ہنس پڑا۔ "ہر محبت کرنے والا خود شاعر بن جاتا ہے... محبت اسے آدمی سے عاشق اور عاشق سے شاعر بنا دیتی ہے۔"

"اور شاعر سے شوہر... پھر کیا ہوتا ہے؟" وہ بولا۔

"پھر وہی ہوتا ہے... جو تم جانتے ہو۔" میں نے کہا۔ "مجھے بتاؤ وہ کون ہے؟"

"وہ ایک یہودی کی بیٹی ہے۔" راجا ایک آہ بھر کے بولا۔

"یہودی کی بیٹی... کیا مطلب! اس کا باپ...؟"

"اس کا باپ ایک کمینہ، لالچی اور خبیث بڈھا ہے۔"

"اور اس کی بیٹی؟"

"اس کی بیٹی ایک بلینک چیک ہے... اس کے لیے" راجا نے کہا۔ "وہ اتنی خوب صورت ہے... اتنی خوب صورت ہے۔"

"میں سمجھ گیا..." میں نے کہا۔

"تم نہیں سمجھے... تم یہ سمجھے ہو کہ میں مجنوں ہوں تو لیلیٰ ہی میرے لیے دنیا کی سب سے بڑی خوب صورتی ہے۔" وہ بولا۔ "مگر میں دوسروں کی بات کر رہا ہوں۔ اس کے حسن کے خریداروں کی قطار بہت لمبی ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایک گوہرِ نایاب ہے... اس کا باپ ایک بردہ فروش ہے لیکن اس کی بیٹی کے لیے رشتے آتے ہیں کسٹم افسروں کے... آرمی آفیسرز کے۔ ڈاکٹروں کے... وہ بڈھا سب سمجھتا ہے چنانچہ وہ بولی بڑھاتا جا رہا ہے..."

"یعنی وہ نقد طلب کر رہا ہے؟"

"نہیں... مگر اس کی شرائط سخت سے سخت تر ہوتی جا رہی ہیں... وہ سب کو انکار کر رہا ہے... بہتر سے بہتر کی امید میں۔"

"اور تم کیا کر رہے ہو؟"

"میں اُسے اغوا کرنے کی سوچ رہا ہوں... یا اس کے باپ کو قتل کرنے کی۔" وہ بولا۔ "جانتے ہو گزشتہ سال اس خبیث نے [illegible] کیا... اس نے کہا۔ سالے نام رکھ لیا راجا [illegible] نام کا ج کچھ نہیں... مُنہ اُٹھا کے چلے آئے رشتہ مانگنے محبت کے نام پر... سالے محبت ہے تو اس کے لیے

کوٹھی بنا... کار لا... بنک بیلنس بنا... خالی خولی محبت فلموں میں چلتی ہے اُلو کے پٹھے... اپنے ساتھ میری بیٹی کو بھی خوار کرے گا... چل بھاگ..."

مجھے بے ساختہ ہنسی آئی۔" پھر تم بھاگ آئے۔"

"ہاں... مگر میں نے اس کے سامنے ایک تقریر کی... فلمی تقریر... میں نے کہا میں جا رہا ہوں... لیکن میں پھر آؤں گا اور بہت جلد آؤں گا... کوٹھی، کار کیش سب لاؤں گا اور اسے لے جاؤں گا... لیکن خیال رکھنا کہ وہ میری ہے... وہ کہنے لگا کہ تمھارے انتظار میں اسے کب تک بٹھائے رکھوں گا میں... میں نے کہا زیادہ نہیں... بس دو سال... اور اس نے شاید مجھے ٹالنے کے لیے کہا اچھا دو سال دیتا ہوں میں... دو سال کے اندر اندر گلشنِ اقبال میں کم سے کم دو سو چالیس گز کی کوٹھی ہو... کار ہو... ایک لاکھ نقد ہو... اسے یقین تھا کہ یہ کام میرے لیے ناممکن ہوگا، مگر وہ مجبور بھی تھا... اپنی بیٹی کی وجہ سے جو ہر رشتے کو مسترد کر رہی ہے... اس نے باپ کو صاف بتا دیا تھا کہ راجا سے شادی نہیں ہوئی تو پھر کسی سے نہیں ہوگی اور ہوگی تو اس گھر سے ڈولی نہیں میرا جنازہ اٹھے گا۔"

"یہ تو بہت عام فلمی ڈائیلاگ ہے۔" میں نے کہا۔" اس کے باپ پر کیا اثر ہوا ہوگا؟"

"وہ بھی فلمی باپ ہے... ایسے ہی ڈائیلاگ وہ بھی بولتا ہے کہ میں ٹکڑے کر دوں گا... گولی مار دوں گا یا مار لوں گا... دونوں اپنی اپنی جگہ اڑے ہوئے ہیں... میری بات نے دو سال کے لیے عارضی صلح کے امکانات پیدا کر دیے۔ اور اس نے یہ بات اپنی بیٹی سے کہی کہ وہ تیرا کنگلا راجا شراب کے نشے میں آیا تھا اور بڑے اونچے بول بول رہا تھا... پری جب مجھ سے ملی"

"پری؟ کوہ قاف کی پری؟" میں نے ہنس کے پوچھا۔

"اس کا نام پروین ہے... میں پری کہتا ہوں۔" وہ بولا۔ "پری نے کہا کہ یہ تم نے ابا سے کیا کہہ دیا ہے... میں نے سینے پر ہاتھ مار کے کہا کہ جو مناسب سمجھا سو کہا ہے۔ اس نے کہا تم واقعی نشے میں تھے... ایسی فضول بات کیوں کی تم نے... میں نے کہا کہ پری... یہ کوئی فضول بات نہیں... میں دو سال میں یہ سب کر کے نہ دکھا دوں تو میرا نام راجا نہیں باجا رکھ دینا۔ میں باہر جا رہا ہوں... ظاہر ہے وہ رونے پیٹنے لگی کہ کہاں جا رہے ہو۔ میں نے کہا دوبئی... اور اسے یقین دلانے میں کامیاب ہو گیا کہ میں واقعی سیریس ہوں اور مجھے دوبئی جانے کا بہترین چانس مل گیا ہے... اس نے مجھے بہت قسمیں دیں اپنے سر کی کہ دو سال سے زیادہ مت ٹھہرنا... لوگ جاتے ہیں تو پھر لوٹ کر نہیں آتے... پیسہ کمانے میں لگے رہتے ہیں... میں بھی محبت کا ایکسپرٹ ہوں... محبت سچی ہے، مگر سچ کے سہارے چلتی نہیں... بہت جھوٹ بھی بولنے پڑتے ہیں ان لڑکیوں کو مطمئن رکھنے کے لیے۔"

"گویا تم اب دوبئی میں ہو؟"

وہ چونکا۔" ہاں... میں دوبئی میں ہوں... وہاں میرا ایک دوست ہے۔ میں یہاں سے اُسے خط کا مضمون بھیجتا ہوں... اسے وہ لفافے میں ڈال کے پوسٹ کر دیتا ہے... اس یہودی کی بیٹی کے نام... ظاہر ہے خط باپ سنسر کرتا ہے... اس میں بھی خاصا جھوٹ ہوتا ہے مگر مستند کہ میری تنخواہ اب دو ہزار ریال ماہانہ بڑھ گئی ہے اور میں نے قسم پوری کرنے کے لیے پیٹ پر پتھر باندھ لیا ہے۔ کھجور کے پتے کھا کے اور سرکاری نلکے کا پانی پی کے گزارا کر رہا ہوں... اور یہ بھی ظاہر ہے کہ پری کا باپ خوش ہوتا ہوگا... وہ خود بھی ایسی ہی کفایت شعاری کا قائل ہے کہ بس چلے تو پارک میں گھاس چرے اور مفت میں کارپوریشن کا پانی پیے... اور پھر گائے کی طرح دودھ دے۔ اسے بیچے اور پیسہ جمع کرے۔"

ہنستے ہنستے میرا برا حال ہو گیا۔ اپنے سسر کے بارے میں کسی ہونے والے داماد کی رائے اتنی خراب بھی ہو سکتی ہے... یہ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مبالغے سے کام لے رہا ہے۔

"تم گزشتہ سال کے سلوک کی بات کر رہے تھے... یہ سوچا ہے تم نے کہ آئندہ سال کیا ہوگا؟" میں نے کہا۔

"آئندہ سال میری شادی ہوگی... پری سے..."

"مگر کیسے...؟ وہ دوبئی والی بات تو جھوٹ ہے۔" میں نے کہا۔

وہ ہنسنے لگا..." کمائی تو سچی ہے... آئندہ سال تک میں اپنی قسم پوری کر دوں گا۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔" اس ایک گھڑے میں کتنی رقم ہے؟"

"وہ ایک گھڑا ہے۔ ایسے چار گھڑے اور بھی ہیں۔" وہ اطمینان سے بولا۔" یہ تو اتفاق سے تمھارے ہاتھ لگ گیا، ورنہ میں اسے بھی دفن کر دیتا وہیں... جہاں چار گھڑے دفن ہیں... ہر گھڑے میں پچاس ہزار نقد موجود ہیں۔"

"تم مجھے پاگل کر دو گے۔" میں نے سر پکڑ کے کہا۔" بھیک مانگ کے اتنا اکٹھا کیا ہے تم نے؟ نہیں... میں نہیں مان سکتا۔"

"اچھا یہ ہو آج آزما لو..." وہ بولا۔" ہاتھ کنگن کو آرسی کیا... شرط یہ ہے کہ جہاں میں کہوں وہاں کھڑے ہو کے مانگو۔ مثلاً شام کے وقت جناح ہسپتال میں گھس جاؤ... جب ملاقاتیوں کے آنے کا وقت ہوتا ہے۔ یہ ذرا مشکل کام ہے کیونکہ گداگروں کا داخلہ ممنوع ہے۔ تم کسی کے آگے ہاتھ مت پھیلاؤ... پھر کوئی تم کو کیسے پکڑے گا۔ آپریشن تھیٹر دیکھے ہیں تم نے؟ نیورو سرجری کے تھیٹر کے باہر کھڑے ہو جاؤ... ڈاکٹر جمعہ اس کا نگراں ہے اور بہت سخت آدمی ہے۔ وہاں جو آپریشن ہوتے ہیں گھنٹوں چلتے ہیں اور ان میں ففٹی ففٹی چانس ہوتے ہیں مریض کے مرنے یا بچنے کے... لواحقین باہر سخت بدحواسی کے عالم میں دست بدعا رہتے ہیں... تم جیسے ہی دیکھو کہ اسپتال کے عملے کا کوئی فرد نہیں دیکھ رہا ہے... فوراً کسی عورت کے سامنے جا کے کہو... اپنے پیارے کی زندگی کا صدقہ دے۔ اور یہ ملٹی پرپز جملہ ہے۔ اس میں تم مائی یا بہن کا لفظ استعمال کر سکتے ہو... یہ دیکھ لو کہ کون عورت زیادہ رو رہی ہے... پھر اس جملے کا اثر دیکھو... وہاں وہ سب صدقہ خیرات کرنے کے موڈ میں ہوتے ہیں... لینے والا کوئی نہیں ہوتا... آزما لو کہ وہ سو سو کے نوٹ یوں دیتے ہیں جیسے ایک کا نوٹ... تم کو ہزار بھی مل سکتے ہیں... کسی اہلکار سے معاملہ پکا کر لو۔ آدھے اس کے آدھے تمھارے... ہر روز نئے مریض ہوں گے اور نئے صدقہ دینے والے۔ انتہائی نگہداشت کا یونٹ بھی ایسی ہی جگہ ہے۔"

ایک لمحے کے لیے مجھے خیال آیا کہ میں راجا کا گلا گھونٹ دوں... کتنی جذباتی بے حسی کے ساتھ وہ لوگوں کا جذباتی استیصال کر رہا تھا اور صدقے کے بدلے ان کو جھوٹی دعاؤں کی تسلی دے رہا تھا۔

"دیکھو... تم مشتعل ہو رہے ہو۔" وہ بولا۔" مگر میں مجبور ہوں اس کمینگی پر... میں پری کو نہیں چھوڑ سکتا۔ اغوا اور قتل کی بات تو کر سکتا ہوں مگر ایسا کر نہیں سکتا... میرا ٹارگٹ پانچ لاکھ ہے۔"

"اور اس میں سے تم کتنے جمع کر چکے ہو اب تک؟" میں نے غصے کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"ڈھائی لاکھ۔" وہ بولا۔" اگلے سال..."

"تم اگلے سال کی بات کرتے ہو... اب اگر تم نے یہ بدمعاشی نہ چھوڑی تو میں تمھارا وہ حشر کروں گا..."

"سکندر صاحب! میں بہت برا آدمی ہوں... مگر میں سب سے برا آدمی نہیں ہوں... میں غلط ذرائع اختیار کرتا رہا... یہ غیر اخلاقی ذرائع تھے... لوگ تو غیر قانونی ذرائع اختیار کرتے ہیں۔ چوری، ڈکیتی اور اسمگلنگ سے پیسہ جمع کرتے ہیں۔ کسی مقصد کے بغیر یا کسی ناجائز مقصد کے لیے... ملک میں تفرقہ پھیلانے کے لیے... لاشوں کی سیاست کے لیے... شراب اور شباب پر لٹانے کے لیے... میرا مقصد تو نیک ہے نا... جب میں او کچھ نہیں کر سکتا... تو پھر کیا کروں...!"

"بکواس بند کرو اپنی..." میں نے کہا۔" آج رات کو تمھیں ڈھائی لاکھ مل جائیں گے۔"

"کہاں سے مل جائیں گے؟"

"میں دوں گا تمھیں..." میں نے کہا۔" اور تم کل ہی ایک خط ڈالو گے، اس یہودی کے نام... کہ تم واپس وطن آ رہے ہو... وہ سب لے کر جس کا تم نے وعدہ کیا تھا... تم کوٹھی خریدو گے... کار خریدو گے اور ایک لاکھ کا بیلنس اُسے دکھا دو گے... مگر اس کے بعد تمھارے پاس جو ایک سال بچے گا وہ میرے پاس گروی رہے گا..."

"میں سمجھا نہیں۔"

"تم شادی ایک سال کے بعد کرو گے... یہ ایک سال تم مجھے دو گے اور اپنے وطن کو دو گے... اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے۔"

"لیکن... اس ایک سال میں اس یہودی نے... پری کی شادی کسی اور سے کر دی تو؟"

"تم فکر مت کرو... اس کا انتظام بھی میں کروں گا... پری تمھاری رہے گی... میں صرف ایک بار اُس کے باپ کو سمجھانے جاؤں گا... پھر دیکھنا وہ سمجھتا ہے یا نہیں..." میں نے کہا۔ "مجھے بہت افسوس ہے کہ تم مجھے ایک سال کی تاخیر سے ملے۔ ورنہ یہ سب نہ ہوتا جو تم نے کیا... مجھے تو شرم آتی ہے یہ سوچ کر۔"

"بے شرم بننا آسان نہیں تھا... مگر میں شرم کرتا تو محبت کی دکان بند ہو جاتی... پری کو کالا دیو لے جاتا یا کانا جن..."

"چلو چھوڑو... آؤ اندر چلیں۔" میں نے کہا۔" باقی بات رات کو کریں گے۔"

"تم واقعی مجھے ڈھائی لاکھ دو گے... بے سبب؟" وہ بولا۔" میرا دماغ خراب کیوں کرتے ہو؟"

"تمھارا دماغ پہلے سے خراب ہے۔" میں نے کہا۔" اور میں تم کو ڈھائی لاکھ بے سبب نہیں دے رہا ہوں... تم کو سیدھے راستے پر لانے اور محبت پر اختیار کے لیے دے رہا ہوں... مجبوری نے تم کو منفی سوچ دے دی تھی۔ تم کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ تم محبت میں اندھے ہو کر کدھر جا رہے ہو... میں تم کو روشنی دے رہا ہوں۔"

وہ کچھ نہیں بولا اور سامنے دیکھتا رہا۔ اس بینچ پر ہم دونوں بظاہر ایک دوسرے سے بے تعلق بیٹھے ہوئے تھے اور بینچ ایک فٹ پاتھ کے آخری حصے میں لگی ہوئی تھی۔ اس کے بعد جنگلا سا تھا جس کے اندر ڈرم اور کریٹ ٹوٹی پھوٹی مشنری

پلانے ٹماٹر اور زمانے بھر کا کاٹھ کباڑ بھرا ہوا تھا۔

"چلو اب چلیں۔" میں نے کہا۔ "تم اس علاقے سے واقف ہو نا...؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "اگر دوست محمد مل جائے تو...؟"

"تو تم رک جانا..." میں نے کہا۔ "میں تم سے دس بیس قدم پیچھے رہ کر بھیک بھی مانگتا رہوں گا اور تم پر بھی نگاہ رکھوں گا۔"

میں اس کے پیچھے دس قدم کے فاصلے سے روانہ ہوا... وہ جس دروازے سے گزرا اس میں سے بیک وقت بہت سے لوگ آجا رہے تھے... ان میں مزدور قلی بھی تھے اور سامان لانے لے جانے میں مدد کرنے والے بھی... کلیئرنگ فارورڈنگ ایجنٹ... انشورنس ایجنٹ... اسمگل ہو کر آنے والے سامان کی تاک میں پھرنے والے۔ بازار مارکیٹوں کے دلال بھی... آدھے دام پر ہر مال نکال لینے والے بھی... خفیہ راستوں کے ماہر بھی اور چور دروازوں پر متعین چوروں کے نمائندے بھی... یہ ایک ایسی دنیا تھی جہاں اکثریت تین طرح کے افراد پر مشتمل تھی۔ ایک لوٹنے والوں کی... دوسری لٹنے والوں کی اور تیسری دلالوں کی جو لوگوں کو فائدے کی بات سمجھاتے تھے اور سمجھدار لوگ اپنا نقصان نہیں کرتے تھے... کچھ لو اور کچھ دو کے اصول پر عمل کرتے تھے۔ اس سے نقصان حکومت کو ہوتا تھا۔ اس درآمد کنندہ کو ہوتا تھا، جو جائز طریقے پر مال امپورٹ کرتا تھا اور حکومت کو سارے واجبات ادا کرتا تھا۔ یہ کسمپرسی کی دنیا تھی جہاں اپنی ذات سے وابستہ مفاد کے سوا کوئی کچھ نہیں دیکھ رہا تھا۔

مجھے بھی کسی نے نہیں دیکھا... بھیک مانگنا واقعی مشکل کام تھا۔ معلوم نہیں مجبور آدمی کس طرح دستِ سوال دراز کرتا ہے اور اس کے لیے کتنی بار وہ اپنی عزتِ نفس کو قتل کرتا ہے۔ جو کچھ میں کر رہا تھا وہ عزتِ نفس کا نہیں اپنے تحفظ کا مسئلہ تھا... مجھے چھپ کر سب کے درمیان رہنا تھا اور کھلی آنکھوں سے سب کچھ دیکھتے رہنا تھا... یہ سراغرسانی کا مشن بھی تھا۔ مجھے بیک وقت ملک دشمنوں کی مشتبہ سرگرمیوں پر بھی نظر رکھنی تھی اور رابعہ کو بھی تلاش کرنا تھا... اپنے فقیرانہ لباس کے باعث میں بہت غیر نمایاں ہو گیا تھا۔ وہاں نہ جانے کتنے گداگر مجھ سے زیادہ پھٹے پرانے کپڑوں میں مظلومیت کی تصویر بنے درد مند دل رکھنے والوں کو متوجہ کرنے کے لیے رقت آمیز پیرائے میں... خدا رسول کے واسطے دے کر... اپنے دکھ اور مصائب کی جھوٹی کہانیاں سنا رہے تھے اور پیسہ کھینچ رہے تھے۔ ان کے زخم مصنوعی تھے... ان پر خون نہیں تھا، لال رنگ تھا... ان کا کوڑھ مصنوعی تھا بس ان کی آواز میں مظلومیت کی پکار اصلی لگتی تھی۔ اس فن سے ان کا معاش وابستہ تھا، چنانچہ وہ اپنا سارا کمالِ فن اپنی آواز کو زیادہ سے زیادہ دردناک بنانے میں صرف کر رہے تھے اور ایسی ایسی باتیں گھڑ رہے تھے کہ حساس دل رکھنے والے کا ہاتھ خود بخود جیب میں چلا جائے۔

پہلے چند قدم میں خاموش چلتا رہا... پھر میں نے جھک کر ایک ٹوٹا ہوا بانس اٹھا لیا جو غالباً کسی فرش صاف کرنے والے برش کا باقی ماندہ حصہ تھا اور بے کار سمجھ کے پھینک دیا گیا تھا۔ اس کو لاٹھی بنا کے میں نے تھوڑا سا جھک کر چلنا شروع کیا۔ میں نے ایک موٹی توند والے ادھیڑ عمر کے سیٹھ ٹائپ شخص کو اپنے قریب سے گزرتا دیکھا۔ "اے بابا۔" میں نے اس کی واسکٹ پکڑ لی۔ "دے جا کچھ..."

"کیا دے جاؤں... یہ واسکٹ؟" اس نے واسکٹ چھڑالی۔

میں پھر اس کے پیچھے چل پڑا۔ "اللہ تجھے کینسر سے بچائے۔ تیرا ہارٹ فیل نہ ہو... تو کسی بس کے نیچے آکے نہ مرے۔"

وہ شخص ایک دم خوفزدہ ہو گیا۔ "یہ لو..." اس نے اپنی واسکٹ میں سے سو کا نوٹ نکالا اور میرے ہاتھ میں تھما دیا۔

"اب اللہ کرے کہ یہ سب تیرے دشمنوں کے ساتھ ہو۔" میں نے دعا دی۔ "سو روپے میں تو بچ گیا بچہ... اب ذرا اپنے دشمنوں کو بھیج دے... یا ان کا نام پتا بتا دے۔ فون نمبر بتا دے۔"

"کیا مطلب؟" اس کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

"انھیں بھی تو ایسی ہی دعا کی ضرورت پڑ سکتی ہے بابا۔" میں نے کہا۔

"یہی دعا تم ان کے لیے بھی کرو گے؟"

"کیوں نہیں کریں گے بابا... فقیر کا تو کام ہی دعا دینا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ زیادہ سخی ہوں... دو سو روپے والی دعا لیں... جو زیادہ پاور فل ہوتی ہے... پانچ سو والی اسپیشل بددعا لیں تیرے خلاف کیونکہ وہ تیرے دشمن ہیں... آگے اللہ کی مرضی... فقیر کی دعا سنے یا بددعا۔"

اس شخص کا غصہ اور بے بسی کی حالت دیکھ کر مجھے بے اختیار ہنسی آنے والی تھی لیکن وہ جلدی میں تھا اور جو سو کا نوٹ میں اندر والے کھیسے میں ڈال چکا تھا، وہ واپس نہیں ہو سکتا تھا... وہ مجھے گھورتا ہوا اور بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔ میں نے اسے اچھا سبق دیا تھا۔ اپنے حق میں کسی اوٹ پٹانگ مجذوب دعا کرانے والے اور دشمن کے لیے تباہی مانگنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ ان کا وہ دشمن بھی تو یہ سب کچھ... دعائیں اور بددعائیں، تعویذ گنڈے... جادو ٹونے... سفلی عمل اور اگر یہ تقدیر کے فیصلے یوں بدلنے لگیں تو کاتبِ تقدیر کا نوشتہ

حرف غلط ہو جائے۔

راجا آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ میں نے ایک برقع پوش عورت سے دس روپے ٹھگے... صرف اس دعا پر کہ اللہ تجھے سوکن سے بچائے اور ساس سے نجات دلائے۔ پھر اچانک ایک مونچھوں والے نے مجھے لات ماری... میں منہ کے بل گرنے سے بچا۔

"تو کون ہے بے؟ کس کا آدمی ہے۔"

"کیا تو آدمی نہیں ہے بچے... ہم تو اللہ کے بندے ہیں۔" میں نے اسے غور سے دیکھ کر کہا۔ وہ بھاری بھرکم جسم، لمبی مونچھوں والا کرخت صورت شخص کوئی بدمعاش تھا۔ اس نے مجھے گلے سے دبوچ لیا۔

"چکر بازی کرتا ہے..." اس نے مجھے ایک گالی دی۔ "کس کی اجازت سے آیا ہے یہاں کمائی کرنے...؟ سالے ہڈی پسلی ایک کر دوں گا... جانتا نہیں یہ میرا علاقہ ہے۔"

"ارے معاف کر دو استاد۔" میں نے گڑگڑا کے کہا۔ "بھول ہو گئی ہم سے کہ تم سے لائسنس نہیں لیا۔"

اس نے مجھے چھوڑ دیا۔ "کہاں سے آیا ہے؟"

"حیدرآباد سے استاد۔" میں نے کہا۔ "اڈا ختم ہو گیا تھا۔"

"دیکھ... ہم سے ہیرا پھیری نہیں چلے گی۔" وہ بولا۔ "یہ کراچی ہے کراچی... نکال پچیس روپے۔"

"پچیس روپے؟... یہ تو بہت زیادہ ہیں۔"

"زیادہ ہیں تو باہر نکل..." وہ بولا۔ "باہر کھڑے رہنے کے بھی دس روپے دینے پڑیں گے۔"

"کس کو... تمھیں؟"

"نہیں... وہ دوسرا ٹھیکیدار ہے۔" وہ بولا۔ "یہاں فائدے میں رہے گا... آج دو جہاز لگ رہے ہیں۔"

"مگر استاد ابھی تو دیہاڑی شروع ہوئی ہے۔"

"یہ کراچی ہے کراچی... یہاں ادھار نہیں چلتا بیٹا۔" وہ بولا۔ "پہلے صبح آتے ہی بھتا دے دو... پھر شام تک بے خوف پھرو... جو ملے تمھاری قسمت کا، وہ تمھارا... سات بجے باہر..."

"سات بجے کیوں استاد؟"

"سات بجے کے بعد دوسرے ٹھیکیدار کے آدمی آجاتے ہیں۔ تو حیدرآباد سے نیا آیا ہے اس لیے بتا رہا ہوں۔" وہ بولا۔

"اچھا..." میں نے پچیس روپے نکال کے اسے تھمائے۔ "کیا میں شام کی شفٹ میں نہیں جا سکتا؟"

"وہ تیری مرضی... پچاس روپے لگتے ہیں۔" وہ بولا۔ "رات سے صبح تک۔"

"رات کے ڈبل کیوں؟"

"ابے ساری کمائی تو رات کو ہی ہوتی ہے... مگر یہ اچھی بات نہیں ہے... فیصلہ کر لے آج کہ دن میں رہے گا یا رات کو۔" وہ جاتے جاتے بولا۔ "اپنی اور اس کی بست لگتی ہے۔"

جب وہ چلا گیا تو میں راجا کے پیچھے بھاگا۔ وہ بہت دور نکل گیا تھا اور مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں بھیڑ بھاڑ میں اسے گم نہ کر دوں۔ فقیروں کے ٹھیکیدار سے ملاقات کا تجربہ میرے لیے نیا تھا۔ راجا ایک لانچ کے کسی ملازم سے بات کر رہا تھا۔

"کچھ پتا چلا؟" میں نے کہا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "دوست محمد تو یہاں بہت ہیں مگر ان میں ملینگ کوئی نہیں ہے۔"

"یار، ایک شخص نے مجھ سے پچیس روپے رکھوا لیے... بڑا بدمعاش بن رہا تھا۔"

"ٹھیکیدار ہو گا اس علاقے کا۔"

"کیا مطلب... میں بھیک بھی نہیں مانگ سکتا یہاں؟"

"نہیں... یہاں بھتا سب کو دینا پڑتا ہے... تو خوانچہ لگا یا ریڑھی... بھیک مانگ یا مزدوری کر... جس پتھارے دار کا علاقہ ہے، وہ اپنا حصہ وصول کیے بغیر تجھے گھسنے نہیں دے گا۔" وہ بولا۔

"مزدور کی مزدوری میں سے بھی حصہ بٹاتے ہیں وہ؟"

"مزدوری ملتی ہی ان کے ذریعے ہے۔" وہ بولا۔

"یہ پتھارے دار کیا ہوتا ہے؟"

"مڈل مین... وہ سب کو ان کا حصہ پہنچاتا ہے۔ پولیس کو... بندرگاہ کے ان مہربان حکام کو جو فقیروں کو اندر آنے دیتے ہیں... نیچے سے اوپر تک سب کو خوش تو رکھنا ہی پڑتا ہے۔ پتھارے دار پچیس میں سے دس اپنے پاس رکھے گا۔ باقی پندرہ دوسروں میں تقسیم کرے گا۔"

"جو باتیں تم مجھے بتا رہے ہو، کیا یہ دوسرے نہیں جانتے؟"

"کیوں نہیں جانتے۔" راجا نے کہا۔ "پریس اور پبلک کی آواز کوئی نہیں سنتا... اپنی اپنی کمائی کے وسیلے یہ لوگ کیسے بند کر سکتے ہیں... ابھی تم دن بھر پھر کے دیکھو... کیسے دلچسپ تجربات ہوں گے... یہ بتاؤ کمائی کتنی ہوئی؟"

"ایک سو دس روپے منفی پچیس روپے۔" میں نے کہا۔

وہ حیران نظر آنے لگا۔ "اتنی سی دیر میں ایک سو دس مل گئے؟"

"دینے والے کی مرضی۔" میں نے اوپر انگلی اٹھا کے کہا۔

شام تک ہمیں دوست محمد کی تلاش میں کوئی خاص کامیابی

حاصل نہیں ہوئی۔ ایک شخص سے صرف اتنا معلوم ہوا کہ اس قسم کا ایک آدمی ہے تو سہی مگر وہ کہاں ملے گا... یہ کوئی نہیں بتا سکتا... میں نے تقریباً پانچ سو روپے کمائے۔ آدمی کی صورت اس کا حلیہ اور پریشانی دیکھ کر حسبِ ضرورت دعا دی، شام تک میں تھک گیا اور ایک جگہ بیٹھنے پر مجبور ہو گیا۔

"حق اللہ..." میں نے نعرہ لگایا۔ "جو دے اُسے خدا دو بئی کا ویزا دے... جو نہ دے اس کا جہاز گر جائے۔"

ایک نوجوان چلتے چلتے واپس آگیا۔ اُس نے مجھے دس روپے دیے اور کہا۔ "بابا... بس دعا کرو آج ویزا مل جائے کل سو دوں گا اگر یہ دعا قبول ہو گئی... السلام علیکم..."

"اللہ کرے تیری چھت تجھ پر نہ گرے۔" میں نے ایک فیملی کو جاتے ہوئے دیکھ کر صدا لگائی۔ "تجھے کرنٹ نہ لگے۔ تیرے بچوں کو خسرہ نہ ہو... خناق اور کالی کھانسی نہ ہو... کسی کو پاگل کتا نہ کاٹے۔" عورت رک گئی۔ اس نے بڑی عقیدت کے ساتھ مجھے دس روپے نذر کیے۔ اس کا شوہر ٹر ٹر کرتا رہا کہ یہ سب فراڈی لوگ ہیں، ورتم آجاتی ہو ان کی باتوں میں... اتنی مضبوط چھت ہے... گر کیسے سکتی ہے۔ اور بچوں کو تو ہم نے سارے ٹیکے لگوائے ہیں... یہ مجھے پاگل کتا کہہ رہا ہے۔"

مگر عورت کی سوچ جذباتی اور غیر منطقی ہوتی ہے اور اس کی محبّت تحفظ مانگتی ہے۔ خواہ وہ کہیں سے بھی ملے... کسی جھوٹے آسرے سے یا تسلی کے دو بولوں سے۔

مجھے کچھ ناخوشگوار تجربات بھی ہوئے... بہت سے لوگوں نے مجھے دھتکارا۔ چند ایک نے گالیوں سے نوازا اور شرمندہ کرنے کی کوشش بھی کی کہ ہٹے کٹے مشٹنڈے ہو... کام کیوں نہیں کرتے... میں نے جواب میں کہا کہ جاؤ بابا تم کام کرو۔ فقیر کا ٹائم مت ضائع کرو۔ پھر ایک پولیس والا آگیا۔ اس نے مجھے شوقیہ ایک ڈنڈا رسید کیا اور مجھ سے دس روپے مانگے۔

"بابا صبح سے تو دیے ہیں پچیس روپے۔" میں نے فریاد کی۔

"نکال دس روپے۔" وہ آنکھیں نکال کے غرّایا۔ "ورنہ ابھی چرس برآمد کر لوں گا۔"

میں نے اسے بادلِ ناخواستہ دس روپے دیے۔

"سگریٹ نکال۔" وہ مطمئن ہو کے میرے پاس ہی ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔ "ایک نمبر ہے کہ دو نمبر..."

"میں سگریٹ نہیں پیتا۔" میں نے کہا۔ اس کی بات میری سمجھ میں بالکل نہیں آئی تھی۔

"او نہ پی میاں... پلیں تو دے۔" وہ جھلا کے بولا۔ کیا عجیب بات ہے... جو سگریٹ نہ پیتے ہوں وہ بھی پلانے کے لیے ضرور اپنے پاس رکھیں۔ میں نے سوچ کر کہا۔ "آج بچی نہیں۔"

سپاہی کا مُنہ لٹک گیا۔ "باہر سے جہاز آیا ہے نا... ایک نمبر کی پانچ میں بک گئی... دو نمبر کی تین روپے میں... اچھا... اِدھر دیکھتا ہوں۔" وہ ہاتھ سے اشارہ کر کے بولا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ ایک نمبر اور دو نمبر سگریٹوں کے نشئے ہیں۔ اندر فقیر بھی یہ دھندا کرتے ہیں۔ ممکن ہے قلی بھی کرتے ہوں... وہ جاتے جاتے واپس لوٹ آیا۔

"تو نیا آدمی ہے... ایک کام کرے گا؟"

"کیسا کام؟" میں نے کہا۔ "کوئی فائدے کا کام ہے؟"

"پانچ سو مل سکتے ہیں۔" وہ بولا۔ "سو میرے ہوں گے۔"

"اچھا... کام کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"صبح اکیاسی نمبر ملے گا تجھے۔"

"اکیاسی نمبر کیا؟"

"او پاگل دے پتر... اکاسی نمبر قلی اور کیا۔" کانسٹیبل خفا ہو کے بولا۔ "اس کے ساتھ ایک گورا ہو گا۔"

"گھوڑا... کیسا گھوڑا... کالا یا سفید...؟"

سپاہی نے مجھے ایک ڈنڈا رسید کیا۔ "گھوڑا نہیں گورا... ولایت کا رہنے والا... وہ تجھے ایک سگریٹ کی ڈبّی دے گا... بگلہ مارکہ وہ اپنے ساتھ اندر لے آنا۔ اندر بیاسی نمبر تجھ سے ڈبّی لے کر پانچ سو دے گا۔ ڈبّی کھولنی نہیں ہے۔ میرے دو پتّے ہوں گے۔"

اکیاسی بیاسی... بگلہ مارکہ سگریٹ... دو پتّے... میری عقل چکرا گئی۔ لیکن میں نے اس معمّے کو حل کر لیا۔ سگریٹ کے پیکٹ میں یقیناً چرس یا کوئی ایسی ہی چیز ہو گی... جو کوئی گورا امریکی، برطانوی... فرانسیسی اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہو گا۔ اس کے لیے کسٹم کی چیک پوسٹ سے گزرنے کا عمل خطرناک تھا۔ تلاشی میں چرس برآمد ہو سکتی تھی۔ پھر اُسے کسٹم والوں سے سودا کرنا پڑتا جو شاید پانچ ہزار مانگتے۔ ایک فقیر کے ذریعے اس کا کام پانچ سو میں ہو رہا تھا۔ کسٹم والے پرانے فقیروں کو بھی پہچانتے ہوں گے جو یہ کام کر کے ان کا حق مارتے ہوں گے... مگر میں نیا تھا۔ ایک پولیس مین کے ذریعے اکیاسی بیاسی نمبر کے قلیوں سے معاملات طے کرتے تھے۔ اس میں پولیس والے کا حصّہ دو سو روپے تھا۔ سو سو کے دو نوٹ... شاید سو وہ خود رکھے گا اور سو دونوں قلیوں میں بانٹ دے گا۔

میرا خون کھولنے لگا... یہ کیسے لوگ تھے جو سو پچاس روپے کے لیے ملک کے قانون کو دھوکا دے رہے تھے... معلوم نہیں ایسے کتنے لوگ تھے۔ کہاں کہاں موجود تھے جو دونوں

ہاتھوں سے قومی خزانے کا مال اپنی جیبوں میں ڈال رہے تھے۔ یہ سب ملک دشمن اور غدّار لوگ تھے جو فقیر اور محنت کش مزدور اور پولیس مین کا روپ دھارے پھر رہے تھے... بے شک سب ایسے نہیں تھے مگر بدنام تو سب ہی ہو رہے تھے۔ کون کہہ سکتا تھا کہ ان میں شریف، فرض شناس اور محبِّ وطن کتنے ہیں۔ آٹے میں نمک کے برابر یا نمک میں آٹے کے برابر۔

سات بج گئے تھے اور گداگری کے "قواعد و ضوابط" کے مطابق مجھے دوسری شفٹ والوں کے لیے جگہ خالی کرنی تھی۔ راجا کی بات اب مجھے درست نظر آرہی تھی... یہ سارے کالے دھندے رات کی تاریکی میں زیادہ بے باکی سے ہوتے ہوں گے... رات کی کمائی عورت کھائے تو فاحشہ... کسبی، طوائف... اور یہ جو اکیاسی بیاسی نمبر لگائے پھر رہے ہیں، پولیس کی پیٹی باندھے پھر رہے ہیں... کالی رات کی ساری سیاہی اپنے چہرے پر مل رہے ہیں... یہ کیا ہیں؟ کیا یہ طوائف سے زیادہ قابلِ نفرت، بدکردار اور ذلیل نہیں؟

میں نے راجا کو بتا دیا تھا کہ میرا اس کے ساتھ رہنا ممکن نہیں... ایک بیچارے سپاسدار اور ایک پولیس مین کے علاوہ بھی بہت سے لوگوں نے میرا راستہ روکا تھا اور اس عرصے میں راجا دو بار میری نظر سے اوجھل ہوا تھا۔ دو بار میں نے اُسے تلاش کر لیا تھا مگر تیسری بار میں نے طے کر لیا تھا کہ اس کی اور میری ملاقات کہاں ہو گی۔ اس کے نہ آنے سے مجھے کچھ تشویش لاحق ہونے لگی تھی۔ ایک خیال تو یہی تھا کہ مجھے رات کی گداگری کا ٹھیکے دار نہ پکڑے۔ پچاس روپے کی کوئی بات نہیں تھی۔ لیکن یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ وہ مجھے کان سے پکڑ کے باہر کر دے اور کہے کہ میں نے فی الحال ریکروٹمنٹ بند کر رکھی ہے اور نئے فقیر کی کوئی ویکنسی نہیں ہے۔

وہ خیال جسے میں بار بار جھٹک دیتا تھا، راجا پر میرے اعتماد کی بنیادوں کو ہلاتا تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ فرار ہو جائے۔ مگر وہ فرار ہونے والا آدمی ہوتا تو میرے ساتھ ہی کیوں آتا۔ گزشتہ رات ہی بھاگ جاتا۔ وہ اپنے بارے میں کوئی بات ہی نہ کرتا۔ اس کا گھر ابھی اکرام شیخ کے پاس تھا، مگر وہ پیسے کی پروا کہاں کرتا ہے۔ اس کے پاس دو لاکھ مدفون پڑے ہیں اور اسے وہ تمام ٹھکانے معلوم ہیں، وہ سب گُر آتے ہیں جن سے دولت حاصل کرنا ممکن ہے۔ مجھے بار بار حیرت ہوتی تھی کہ کیا ایک پڑھا لکھا شریف آدمی محبت میں اتنا مجبور بھی ہو سکتا ہے کہ رسوائی تک قبول کرے، خود اپنی نظر میں گرنا قبول کرے، اپنی عزّتِ نفس کو بھول جائے۔ اصل بات وہی ہے

کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا... پہلے عشق کے جو کلاسیکی افسانے مشہور ہوئے ان میں عاشقوں نے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ کیا مجنوں فقیر بن کے لیلیٰ کے در پر سوالی نہیں ہوا تھا۔ کیا فرہاد نے پہاڑ سے دودھ کی نہر نکالنے کا ناممکن ٹھیکا نہیں لیا تھا؟ ایک صاحب وہ تھے کہ انھوں نے اپنی ران کے کباب بنا کے محبوبہ کو ارسال کر دیے تھے، حالانکہ محبوبہ قطعی آدم خور نہیں تھی۔ پھر راجہ نے پانچ لاکھ جمع کرنے کی شرط قبول کر لی اور اس کے لیے یہ راستہ اختیار کر لیا تو اسے عشق کے سوا کیا سمجھا جائے گا۔

راجا کی آمد نے میرے خیالات کا تسلسل ختم کر دیا۔

"بھائی سکندر... وہ مل گیا۔" اس نے مسرّت سے اعلان کیا۔

میں نے گھبرا کے اِدھر اُدھر دیکھا۔ "میرا نام لینا قطعی ضروری نہیں بلکہ بے وقوفی ہے۔"

"سوری... وہ جو دوست محمّد ہے نا... وہ ایک لانچ پر کام کر رہا تھا۔" راجا نے کہا۔ "لانچ کو لڑائی کرنے کے لیے گئے ہیں... رات تک آئیں گے واپس۔"

"کون سی لانچ ہے... نام نمبر...؟"

"نام تو اس کا ہے 'دل جانی'۔ پچپن ہارس پاور کے انجن والی لانچ ہے۔" راجا نے کہا۔ "مالک کا نام بھی دوست محمّد ہے۔"

"یا مظہر العجائب... وہ بھی دوست محمّد ہے؟" میں نے کہا۔

"ہاں... مگر مالک کا پورا نام دوست محمّد پردیسی ہے۔" راجا نے کہا۔ "اور وہ جو تمھارا دوست محمّد ہے نا... وہ بس دوست محمّد ہے۔"

"تو کچھ اندازہ ہے ان کی واپسی کب تک ہو گی؟"

"نہیں... نیا انجن بنایا ہے... معلوم نہیں کتنی دُور تک لے جاتے ہیں مگر چار گھنٹے سے پہلے واپسی کا کوئی امکان نہیں۔ رفتار کم ہو گی اور راستے میں خرابی نہ ہوئی تو وہ دو گھنٹے سیدھا جا کے لوٹیں گے۔"

"کیا وہ ابھی گئے ہیں؟" میں نے کہا۔

"ابھی دس منٹ پہلے۔" راجا نے کہا۔ "ذرا سی دیر ہو گئی ورنہ ان سے ملاقات ہو جاتی۔"

"اچھا... تو پھر تم جاؤ۔" میں نے کہا۔ "میں انتظار کروں گا۔"

"یہاں انتظار کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ فش ہاربر پہ جائیں گے واپسی پر۔" راجا نے کہا۔

"اچھا تو پھر تم نکلو، میں بھی آتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اسی بینچ کے پاس جہاں ہم بیٹھے رہے تھے۔"

راجا نے سر ہلایا اور روانہ ہو گیا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ کسی نے ہم پر شک نہیں کیا تھا۔ دیکھنے والوں نے یہی سمجھا ہو گا

کہ ہے کوئی فقیروں سے عقیدت رکھنے والا۔ میں اٹھنے ہی والا تھا کہ ایک حواس باختہ مریل سا شخص میرے سامنے آ بیٹھا۔

بابا جی... آج تو مہربانی کرو۔" اس نے کوئی چیز میری مٹھی میں دبا دی۔ میں نے کھول کے دیکھا تو وہ سو کا نوٹ تھا جسے اس نے بالکل تعویذ بنالیا تھا۔

"کیا مانگتا ہے بچے؟" میں نے آنکھیں بند کر کے اور جھوم کر کہا۔

"ایک نمبر... جو تقدیر بدل دے۔" وہ میرے پیر دبانے لگا۔ "اب تو کچھ نہیں رہا... سب ہار گیا ہوں۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ سٹے کا نمبر پوچھ رہا ہے۔ "سیدھا ہو جا۔" میں نے گرج کے کہا۔ "الف ہو جا۔" میں نے انگلی اٹھا کے کہا۔ "ورنہ پچھتائے گا۔"

اس نے خوشی سے چیخ ماری۔ "ایک نمبر میں سمجھ گیا بابا جی۔"

"تو نہیں سمجھا سؤر کے بچے... تیری سمجھ دانی ٹھیک ہوتی تو بہت پہلے ہی سمجھ جاتا تو۔" میں نے کہا۔

اس کا چہرہ مایوسی کی تصویر بن گیا۔ "ایک نمبر نہیں تو پھر؟"

میں نے اپنا دایاں ہاتھ اسے دکھایا۔ "یہ دیکھ۔" اور پھر تھپڑ اس کے منہ پر مارا۔ وہ لڑکھڑایا اور سنبھل گیا۔

"پانچ نمبر۔" وہ پھر خوشی سے چلایا۔

"یہ بھی دیکھ۔" میں نے بایاں ہاتھ اٹھا کے کہا اور دوسرا تھپڑ اس کے دائیں گال پر پڑا۔ "اب کیا خیال ہے؟"

"اب میں بالکل سمجھ گیا... دس نمبر..." اس نے میرے ہاتھ چومے اور اپنے گال سہلانے لگا۔

"ہاں... دس نمبر ہے۔" میں نے کہا اور اٹھ کے چل پڑا...

میں جانتا تھا کہ ایسے لوگ کیسے کیسے طریقوں سے تقدیر بدل دینے والا نمبر نکالتے ہیں۔ اگر میں اس کے دو لاتیں رسید کر دیتا تو وہ سمجھتا کہ دو نمبر... یہ جھوٹے خوابوں کے پیچھے بھاگنے والے اور اپنا سب کچھ جھوٹی امیدوں پر ہارنے والے۔ انھیں کوئی کیسے سمجھائے کہ تقدیر تو کسی کے تابع نہیں... مگر تدبیر کا اختیار خدا نے بندے کو دیا ہے اور اس کے لیے عقل و شعور کی دولت سے نوازا ہے۔

باہر راجا میرے انتظار میں ٹہل رہا تھا۔ میں نے کباڑ خانے کی دیوار پھاند کر اپنا لباس بدلا۔ فقیری چغے کے نیچے میرے اپنے کپڑے بالکل ٹھیک تھے۔ وگ اور داڑھی مونچھیں اتار کے میں نے یہ سب اسباب ایک پرانے اخبار میں لپیٹا اور باہر آ گیا۔

"یہ تم نے... حلیہ کیوں بدل لیا؟" راجا پریشان ہو کے بولا۔

"یار ان پیڑوں کی بو میرے لیے ناقابل برداشت ہو رہی تھی۔" میں نے کہا۔ "اس کے علاوہ ایک فقیر تمھارے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھتا تو یہ بھی عجیب لگتا اور ہم اکرام کے گھر بھی اسی حلیے میں پہنچتے تو..."

"اکرام کون ہے... وہی جسے میں محسن سمجھا تھا؟"

"ہاں... ڈبل ایس آئی شیخ۔" میں نے کہا اور ہم دونوں فٹ پاتھ پر چلنے لگے۔ میں نے اسے اکرام شیخ اور ناز کے بارے میں تفصیلی معلومات فراہم کرنے میں کوئی حرج نہ سمجھا۔ اب رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ چنانچہ ہم سڑک سے ہٹ کر چلتے ہوئے بالکل محفوظ تھے۔ وہاں کوئی رکشا یا ٹیکسی خالی بھی نہیں آ رہے تھے چنانچہ ہم چلتے رہے۔ ایک گھنٹے تک اور چلتے چلتے ناردرن پہنچے۔ اس ایک گھنٹے میں راجا کو ہم سب کے متعلق وہ باتیں بھی معلوم ہو گئیں جو اخباروں سے معلوم نہیں ہو سکتی تھیں۔

"یار میں تو تھک گیا ہوں۔" راجا نے کہا۔ "چلو چائے پیتے ہیں۔"

"کافی نہیں مل سکتی کہیں؟" میں نے کہا۔

راجا نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہاں سارے ایرانی ہوٹل ہیں۔"

ایرانی ہوٹل کراچی کی اصطلاح میں ایک مخصوص فضا رکھنے والے ریسٹورنٹ ہیں۔ جس ہال نما کمرے میں ہم جا کے بیٹھے وہاں ہر میز کے گرد چار کرسیاں تھیں۔ یہ کرسیاں بہت ہلکی تھیں اور غالباً بید کی لکڑی سے بنائی گئی تھیں یا ان کی سیٹ پر پلائی ووڈ تھی اور گول پشت والا حصہ بید کا تھا۔ چار کرسیوں کے درمیان ماربل ٹاپ میز تھی جس پر سلور کا جگ اور مگ رکھے تھے اور میل سے چمک رہے تھے۔ اندر بھانت بھانت کے لوگ کرسیوں کے اوپر پاؤں رکھے سڑپ سڑپ چائے پی رہے تھے، سموسے کھا رہے تھے اور زور زور سے باتیں کر رہے تھے۔ ایک ویٹر نے بڑی پھرتی سے گیلا کپڑا ٹیبل ٹاپ پر مارا۔

"دو دودھ پتی۔" راجا نے کہا۔ "ڈبل... اور سموسے۔"

"یہ کیا منگوا لیا تم نے... ہم چائے پینے آئے تھے۔" میں نے کہا۔

"ابھی پی لو گے تو معلوم ہو جائے گا کہ میں نے چائے ہی منگوائی تھی۔" راجا بولا۔ میں نے ریسٹورنٹ کا جائزہ لیا۔ وسیع و عریض کاؤنٹر کے پیچھے ایک سرخ و سفید اور موٹا تازہ شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے پیچھے دیوار پر ملکہ فرح دیبا اور شاہ ایران کی تصویر ایک فریم میں لگی ہوئی تھی۔ باقی دیوار پر لکڑی اور شیشے کی الماریاں بنی ہوئی تھیں اور ان میں جنرل اسٹور کا تقریباً سب سامان موجود تھا۔ بسکٹ، پاؤڈر اور ٹوتھ پیسٹ سے لے کر شو پالش تک۔

یہ بھی ایرانی ہوٹلوں کا خاصہ ہے... پنجاب یا سرحد میں ریسٹورنٹ صرف چائے لسی یا کھانے کے لیے ہوتے ہیں۔ ایرانی ہوٹل بیک وقت ریسٹورنٹ اور جنرل اسٹور ہوتے ہیں۔ بیشتر لوگ سنگل چائے پی رہے تھے۔ ایک ہی ساسر کے آدھے بھرے ہوئے کپ کے لیے وہ صرف چار آنے دیتے تھے اور پھر ان کی مرضی وہ جب تک چاہیں بیٹھے رہیں۔ بیرا ان کے سامنے بل لا کے نہیں رکھے گا کہ چلیے صاحب جگہ خالی کیجیے۔ کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا شخص بار بار ایک لرزہ خیز گھنٹی بجا کے کسی ویٹر کو متوجہ کرتا تھا... ویٹر کہیں بھی ہو کاؤنٹر کی طرف دیکھتا ہے اور اگر اس گاہک کو موجود پاتا ہے جس کو اس نے سرو کیا تھا تو بانگ دہل اعلان کرتا ہے۔ "کھایا پیا کچھ نہیں گلاس توڑا بارہ آنہ۔" یہ لطیفہ بہت عام ہے۔ بیرا ہر گاہک کا بل یوں چیخ کر بتاتا ہے کہ کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا مالک شور و غل کے باوجود صاف سن لے۔

ویٹر نے دھڑام سے درمیان میں چائے کے دو کپ رکھے۔ ایک پیرچ میں دو سموسے اور دوسری میں چٹنی رکھی اور غائب ہو گیا۔ میں نے چائے کو غور سے دیکھا۔ اس کا رنگ بالکل رابعہ کے رنگ کی طرح تھا۔ کھلتا ہوا سنہری مائل سفید۔ یہ ایک خوش ذائقہ گاڑھا میٹھا اور گرم مشروب تھا اور اسی تعریف پر پورا اترتا تھا کہ ایک دوشیزہ کے لبوں کی طرح... اس میں گرمی بھی ہے مٹھاس بھی ہے۔ مگر میں نے اسے چائے ماننے سے انکار کر دیا۔ راجا نے مجھے اس دل پسند مشروب کی تیاری کا فارمولا بتایا جس کے مطابق دودھ میں چائے کی پتی ڈال کے اتنی دیر ابالا جاتا ہے کہ پتی گل جائے۔ پھر چینی ڈال کے جوش دیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ مکسچر سے شیرے کی مہک آنے لگے۔ چائے کی دوسری قسم "کڑک" تھی۔ اس میں دودھ کم اور پتی زیادہ ڈالی جاتی تھی اور اس کا ذائقہ تلخ سمجھا جاتا تھا — عموماً یہ تلچھٹ ہوتی تھی۔ چائے کے تیار کنندگان صبح سے شام تک حسب ضرورت ایک سماوار یا پتیلے میں وقفے وقفے سے چورا چائے اور پانی ڈال کے ابالتے رہتے تھے اور سارا دن اوپر سے جوشاندہ نکال نکال کے گاہکوں کو پلاتے رہتے تھے۔ ممکن ہے دن میں ایک دو بار جب برتن میں نیچے چائے کی پتی اتنی بھر جاتی ہو کر پانی ڈالنے کی گنجائش نہ رہتی ہو تو اسے خالی کیا جاتا ہو۔ عام طور پر صبح ڈالی جانے والی پتی تازہ دم پتی کے ساتھ ایسے ہی ابلتی رہتی تھی جیسے جہنم میں نئے پرانے گنہگار ایک ساتھ جلیں گے۔

"یار میں نے تمھارا کیا بگاڑا تھا آخر... کہ تم نے مجھ پردیسی کے ساتھ یہ دھوکا کیا؟" میں نے مظلوم آواز بنا کے کہا۔

راجا بھونچکا رہ گیا۔ "دھوکا... تمھارے ساتھ؟"

"ہاں میرے ساتھ... تم نے کہا تھا کہ چائے پلاؤں گا... اس میں چائے کہاں ہے؟" میں نے کہا۔ "یہ تو کچھ مائع قسم کی ربڑی ہے۔"

راجا ہنسنے لگا۔ "اچھا میں چائے منگاتا ہوں۔"

اس نے پھر ویٹر کو چیخ کر متوجہ کیا اور اسے ایک "اسپیشل" لانے کو کہا۔ ویٹر نے سر ہلایا اور غائب ہو گیا۔ دوسری مرتبہ وہ ایک ٹرے کے ساتھ حاضر ہوا۔ اس میں چائے کے تمام اجزائے ترکیبی الگ الگ پائے جاتے تھے مثلاً قہوہ... دودھ اور چینی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس شہر میں چائے بھی ملتی ہے۔

جب میں سموسے کو توڑ کے نگلنے کی مشق کر رہا تھا تو میری نظر بھٹک گئی۔ ہم سے کچھ فاصلے پر ایک شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ دو اجنبی تھے۔ پہلے شخص کی میری طرف پیٹھ تھی لیکن میں اس کا سائڈ پوز دیکھ کر اسے پہچان گیا تھا۔ یہ وہی چکرباز ڈرائیور تھا، جو افتخار عارف کے کوارٹر سے فرار ہو گیا تھا۔

میں ایک دم کرسی سے اٹھا۔ "راجا... تو ادھر آ جا۔"

راجا نے مجھ سے کرسی بدل لی۔ "اس کرسی میں کھٹمل ہیں کیا...؟ کراچی میں رہنا ہے تو..."

"یار پیچھے ایک شخص بیٹھا ہے۔"

"تمھارے پیچھے دس اشخاص بیٹھے ہیں۔" راجا نے کہا۔

"وہ جس نے دھاری دار واسکٹ پہن رکھی ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ... ہاں... اس کے ساتھ والے نے قراقلی ٹوپی لگا رکھی ہے۔"

"ساتھ والے کو گولی مارو۔" میں نے کہا۔

"پستول تمھارے پاس ہے۔" راجا نے کہا۔ "مگر خیر... لاؤ۔"

"راجا... یہ مذاق کی بات نہیں۔ اس آدمی کا پتا کرنا ہے۔ کیا نام ہے اس کا اور کہاں رہتا ہے۔ یہ ایک خطرناک گروہ کا آدمی ہے اور غالباً اسی نے افتخار عارف کا قتل کیا ہے۔ اس نے یا اس کے کسی ساتھی نے۔ یہ مجھے پہچانتا ہے۔" میں نے کہا۔ "تمھیں نہیں جانتا۔"

"تم کیا چاہتے ہو... میں اس کے پیچھے لگ جاؤں... نہیں دوست... میں اس مرحلے پر فوت ہونا نہیں چاہتا جب کہ میں نے عشق کا آدھا امتحان پاس کر لیا ہے۔" وہ بولا۔

"یار عقل اور ہمت سے کام لو... دور رہ کے دیکھو... یا قریب جا کے ان کی باتیں سنو۔" میں نے کہا۔ "شاید کسی کا نام معلوم ہو جائے... انتظار کرو باہر... شاید یہ کسی کار میں آئے ہوں تو کار کا نمبر پتا چل جائے... میں جا رہا ہوں۔"

"اگر تم نے وہ فقیری لباس نہ بدلا ہوتا تو تمھیں کسی کا ڈر نہ ہوتا اور تم خود یہ کام کر لیتے۔" راجا نے مجبوراً سر ہلایا... میں سیدھا دروازے کی طرف بڑھا اور باہر نکل کے پان سگریٹ کی ایک دکان پر رک گیا۔ سگریٹ کا پیکٹ خرید کے میں سائن بورڈ کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ میں دوسری سگریٹ سلگا

رہا تھا کہ وہ تینوں نمودار ہوئے اور مخالف سمت میں فٹ پاتھ پر چلنے لگے۔ ان کے پیچھے راجا نمودار ہوا۔ اس کی نظریں مجھے تلاش کر رہی تھیں۔

"کچھ پتا چلا۔" میں نے اس کے قریب جا کے کہا۔

وہ اچھل پڑا۔ "ہاں... اس کے بارے میں تو نہیں مگر وہ جو قراقلی ٹوپی والا تھا نا... اس کا نام سیٹھ اکبر ہے۔ ویٹر اور منیجر سب اسے جانتے ہیں۔ وہ یہاں آتا رہتا ہے۔"

"اچھا؟ پھر میں آیا ایک منٹ میں۔" میں نے کہا اور لوٹ کر ریسٹورنٹ میں چلا گیا۔ میں نے کاؤنٹر کے پاس رک کر ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں پر ایک نظر ڈالی اور پھر منیجر کے پاس چلا گیا۔

"وہ... سیٹھ اکبر نہیں آیا؟"

"آیا تھا... چلا گیا..." منیجر نے مختصراً کہا اور اپنے کام میں مصروف رہا... وہ مختلف درازوں میں سے سکے نوٹ اور ٹوکن نکال کے گاہکوں اور ویٹروں کو دے رہا تھا۔

میں نے سر پہ ہاتھ مارا۔ "اپن کو یہی ڈر تھا... تھوڑا دیری ہو گیا، پر اپن کیا کرے... سالا ٹرین اتنا لیٹ تھا۔"

"کام کا بات کرو بابو... سیٹھ اکبر کو ملنے کا مانگتا ہے؟" بے حد مشینی انداز میں کام کرنے والے منیجر نے پوچھا۔

میں نے سر ہلایا۔ "سیٹھ اکبر کا بوت نقصان ہو جائیں گا۔"

منیجر نے کھٹاک سے ایک دراز کھولی، ایک پرچی اور بال پوائنٹ نکال کے کچھ لکھا۔ کچھ کہے بغیر اس نے پرچی مجھے تھما دی اور وہ بے حد کرخت آواز والی گھنٹی دبا دی جو بالکل فائر الارم کی طرح تھی۔ میں پرچی کو دیکھتا ہوا باہر آ گیا۔ اس پر لکھا ہوا تھا: "میٹھی بائی بلڈنگ، حاجیانی لین... کھارادر... تیسرا مالا۔"

راجا نے مجھے سمجھایا کہ یہ مکمل پتا ہے۔ ہم کھارادر کے علاقے سے دُور نہیں تھے۔ حاجیانی لین کو تلاش کر سکتے تھے اور پھر آسانی سے میٹھی بائی بلڈنگ تک پہنچ سکتے تھے۔ میں نے خود کو راجا کے سپرد کیا۔ بقول فلمی شاعر 'ماجھی میری قسمت کے جی چاہے جہاں لے چل...' میں خود اس بیکراں شہر کے جغرافیے سے بالکل بھی واقف نہیں تھا۔

راجا ایک ماہر سراغ رساں ثابت ہوا۔ اس نے پرانے شہر کی پُرپیچ گلیوں میں مختلف افراد سے انہی کی زبان میں رہنمائی حاصل کی اور حاجیانی لین تلاش کر لی۔ اس تلاش میں ہم وزیر مینشن کے سامنے سے بھی گزرے جو قائدِ اعظم کی جائے پیدائش تھی اور اب ایک قومی یادگار۔ اس وقت عمارت بند تھی چنانچہ میں نے اس کے در و بام کو جذباتی وابستگی کے ساتھ دیکھا اور ایک عجیب احساس سے دوچار ہوا۔ میں نے اس شخص کا مزار بھی ایسے ہی گزرتے گزرتے دیکھا جسے قوم نے بابائے قوم کا خطاب دیا تھا۔ اب میں اس جگہ کھڑا تھا جہاں پیدا ہونے والے ایک بچے نے انگریزوں کے خلاف آزادی کی ناقابلِ فراموش جنگ لڑی تھی۔ ایک قوم کی رہنمائی کی تھی اور بالآخر ان کو ایک ملک دے کر تاریخ میں لاثانی و لافانی مقام حاصل کر لیا تھا۔ یہی اس شخص کا مشن تھا جس کے پورا ہونے کے بعد وہ بس ایک سال جیا۔ اس نے کہا کہ لو... پاکستان تمھیں میں نے خدا کی مدد سے اپنی زندگی میں ہی بنا کے دے دیا۔ اب اسے تم سنبھالو۔

مگر کیا ہم اسے سنبھال سکے تھے؟ آج کے دن تک ہم نے بابائے قوم کے ساتھ کیے ہوئے کسی وعدے کو پورا کیا تھا؟ ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کی تھی؟ یہ گھر ایک عظیم زندگی کا نقطۂ آغاز تھا تو وہ مزار اسی زندگی کے عظیم خواب کی تکمیل کی علامت مگر بابائے قوم کی قوم اس کے بتائے ہوئے راستے سے بھٹک گئی تھی۔ ملک کے اندر ملک کی جڑیں کھودنے والے اور اس کی بنیادوں کو کمزور کرنے والے عناصر اتنے طاقتور ہو گئے تھے کہ ایک ملک کے دو حصے کرنا چاہتے تھے۔ وہ مذہب کی مشترک اساس کو بھول کر زبان اور جغرافیائی محلِ وقوع کے اختلافات کی سیاست میں الجھ گئے تھے۔ اتحاد، یقینِ محکم اور تنظیم کے تین اصول بھول کر چھ نکات کے نعرے لگا رہے تھے۔

راجا نے مجھے کھینچا تو میں چونکا۔ "یہاں پھر کبھی آئیں گے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "مجھے حوصلہ نہیں پڑتا... ڈر لگتا ہے کہ میں نے ان دیواروں کے اندر قدم رکھا تو مجھے قائدِ اعظم مل جائیں گے۔ اور وہ مجھ سے کہیں گے ویل مسٹر سکندر بخت۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے... ممکن ہے وہ یہی بات دوسروں سے بھی پوچھتے ہوں۔ کوئی جواب دے سکتا ہے اس سوال کا؟"

"تم بہت جذباتی آدمی ہو۔"

"تم غلط کہہ رہے ہو۔ میں بہت پریکٹکل آدمی ہوں۔" میں نے کہا۔ "ایسا نہ ہوتا تو میں اپنی ذات کی حد سے آتنا آگے نہ بڑھتا۔ میں انہی جذبات پر قناعت کر لیتا جو رابعہ کے لیے میرے دل میں تھے۔ اور اس میں اپنا گھر بساتا اور دس کروڑ مسلمانوں کے اس گھر کے غم میں خوار نہ ہوتا جسے ہم پاکستان کہتے ہیں۔ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان ایک جسم کے دو بازو ہیں۔ دونوں بازو بھی الگ ہوتے ہیں۔ مگر وہ ایک دوسرے سے تو برسرِپیکار نہیں ہوتے۔ دایاں ہاتھ کبھی بائیں ہاتھ سے نہیں کہتا کہ میں مظلوم ہوں... یا افضل ہوں... اور اس جسم سے الگ ہونا چاہتا ہوں۔"

میٹھی بائی بلڈنگ پانچ منزلہ عمارت تھی جس میں فلیٹوں کی تعداد کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مجھے تو بس لاتعداد بالکونیاں نظر آئیں جن میں بچے، کپڑے، فالتو سامان، ٹی وی کے انٹینا سب کچھ بھرا ہوا تھا۔ یہ جگہ کی کمی کا مسئلہ تھا کہ شہر اب اوپر اٹھنے لگا تھا۔ لوگ مرکز سے دُور نہیں جانا چاہتے تھے تاکہ آمدورفت کے مسائل سے بچ سکیں، چنانچہ عمارات کی بلندی بڑھ رہی تھی۔ ایسا صرف شہر کے وسطی کاروباری علاقے میں تھا۔ مضافات کی پوش آبادیوں میں دو ہزار اور چار ہزار گز پر محیط کوٹھیاں بھی بن رہی تھیں۔

"کیا خیال ہے۔ چوتھے مالے پر چلیں؟" راجا نے کہا۔

"چلو... مگر وہ قراقلی ٹوپی والا سیٹھ اکبر مل گیا تو کیا کہو گے اس سے؟" میں نے کہا۔ "میں تو اس کے سامنے جا نہیں سکتا۔"

"کیوں نہیں جا سکتے؟ کیا ہر شخص تمھیں پہچانتا ہے؟"

"لگتا تو ایسا ہی ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر وہ ہر شخص میں شمار نہیں ہوتا۔ وہ ایک مخصوص گروہ کا آدمی ہے اور اس گروہ نے صرف میری تصویریں ہی نہیں میری آواز کے ٹیپ تک پھیلا دیے ہیں تاکہ میں بھیس بدلوں تو آواز سے پکڑا جاؤں۔"

"اچھا... میں جاتا ہوں۔" وہ بولا۔ "پہلے تو اس کے فلیٹ کا نمبر دیکھ آؤں۔"

"ہاں... اگر وہ اندر ہو تو اس سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ نہ ہو تو پوچھ لینا کہ صبح وہ کہاں ملے گا۔"

"کس سے پوچھوں؟"

"گھر میں... اس کی بیوی ہو سکتی ہے... بچے ہو سکتے ہیں، ورنہ آس پاس کے لوگ ہوں گے۔"

"اور انھوں نے پوچھا کہ تم کیوں پوچھ رہے ہو... پھر؟"

"پھر میرا سر۔" میں نے جھنجھلا کے کہا۔ "کیا میں تم کو بولنا بھی سکھاؤں... ویسے تو بہت باتیں کرتے ہو۔"

وہ سر کھجاتا ہوا پرانے زینے پر چڑھ گیا، اور میں ایک تخت کے پاس کھڑا ہو گیا جہاں چار نوجوان تاش کھیل رہے تھے اور چار پانچ تماشائی ان کے مشیر بنے ہوئے تھے۔ یہاں کوئی میری صورت پر غور کرنے والا نہیں ہو سکتا تھا۔ مجھے کھیل میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں نے شروع سے بازی دیکھی ہوتی تو اور بات تھی۔

اچانک کھیل کا میدان جنگ کا میدان بن گیا۔ ایک شخص نے اپنے پتے پھینک دیے۔ "پتا رکھ کے کاٹتا ہے۔"

"کون... کہتا ہے...؟" فریقِ ثانی نے ایک اچھی سی گالی دے کر کہا۔ تیسرے نے چیخ کر کہا۔ "پتے دکھاؤ۔"

یہ چوتھا جو اصل مجرم تھا، فوراً اس پر حملہ آور ہوا... پلک جھپکتے میں انھوں نے ایک دوسرے کو مکے مارنے شروع کیے اور ایک دوسرے کے کپڑے پھاڑ دیے۔ دو تماش بین حق پرست واقع ہوئے تھے۔ انھوں نے علَمِ صداقت بلند کرتے ہوئے جہاد میں شرکت کی اور خاصے پٹے۔ ایک تو بہت ہی منحنی سا بانس نما شخص تھا۔ جب اس کے پیٹ میں کسی نے سر سے ٹکر ماری تو وہ مجھ پر آ گرا۔ میں نے اُسے فوراً واپس کر دیا مگر اس کا نقصان یہ ہوا کہ دوسری ٹکر نے مجھے چت کر دیا۔ ٹکر مارنے والا بیل نہیں تھا مگر بُل فائٹنگ میں بُل کا پارٹ ادا کر سکتا تھا۔

راجا نے آ کے مجھے اٹھایا۔ "یہ کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں... معمولی سا معرکۂ حق و باطل تھا۔" میں نے کہا اور اس کے ساتھ چل پڑا۔ باقی لوگ پھر کھیل جاری رکھنے پر متفق ہو گئے تھے اور متنازعہ بازی منسوخ کر دی گئی تھی۔

"وہ تیرہ نمبر فلیٹ میں رہتا ہے۔" راجا نے مجھے مطلع کیا۔ "مگر اس وقت موجود نہیں ہے۔ اس کے بیوی بچے یہاں نہیں رہتے۔"

"پھر کہاں رہتے ہیں؟"

"کیا یہ بھی معلوم کرنا تھا؟" راجا نے کہا۔

"نہیں... مگر یہ بات کس نے بتائی تمھیں؟"

"ایک پڑوسی نے... میں تالا دیکھ کر لوٹ رہا تھا کہ وہ آ گیا۔ میں نے پوچھ لیا کہ اکبر سیٹھ کہاں ملے گا۔ اس نے کہا ابھی تو پتا نہیں۔ صبح آفس میں ملے گا۔ اس کا آفس آگرہ تاج کالونی سے آگے ہے۔ جہاں سب ٹرک اسٹینڈ ہیں۔ وہ آر لے والا اینڈ کمپنی کا منیجر ہے۔"

"آر لے والا؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔ "نہ آر لے سنز نہ آر لے برادرز... یہ کیا بات ہوئی!"

"باپ کاروبار کرتا اور بیٹے شریک ہوتے تو نام آر لے سنز ہوتا... یہاں معاملہ اُلٹا لگتا ہے۔" راجا بولا۔ "کہ بیٹوں نے کاروبار شروع کیا اور والد ماجد کو اخلاقاً پارٹنر بنا لیا مثلاً رشید عزیز اینڈ کمپنی کو رشید عزیز والا اینڈ کمپنی کر لیا، یا مختصراً آر لے والا اینڈ کمپنی۔"

"ایسی اوٹ پٹانگ حرکت کرتے میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔"

"آئندہ تم ایسا نہیں کہہ سکو گے۔" راجا ہنسا۔ "یہ کراچی ہے پیارے کراچی۔"

"کیا یہ بتانا ضروری سمجھا جاتا ہے؟ جسے دیکھو یہی کہتا نظر آتا ہے۔" میں نے کہا۔ "میں بھی جانتا ہوں کہ یہ ٹمبکٹو یا کھٹمنڈو نہیں ہے۔"

"لاہور والے بھی تو کہتے ہیں کہ لہور لہور ہے۔" راجا بولا اور اس کی دلیل نے مجھے لاجواب کر دیا۔ غالباً ہر شخص اپنے

ملک، اپنے شہر، اپنے قصبے، گاؤں، محلے اور گھر سب پر ناز کرنے کا حق رکھتا ہے۔

میں نے آرائے والا اینڈ کمپنی کے معاملے کو شعور سے لاشعور میں منتقل کیا اور کلائی کی گھڑی دیکھ کر واپسی کی فکر میں مبتلا ہو گیا۔ رات کے سوا نو بج چکے تھے۔ اکرام شیخ اور نازو یقیناً ہمارے انتظار میں پریشان ہو رہے ہوں گے۔

میکلوڈ روڈ پر اسٹیٹ بنک آف انڈیا کی پرانی عمارت کے سامنے راجا نے ایک ٹیکسی روک لی... دھوبی گھاٹ کا سن کے ڈرائیور نے بُرا سا منہ بنایا مگر اس سے پہلے کہ وہ انکار کرتا، میں دروازہ کھول کے اندر بیٹھ گیا۔

"میں اُدھر نہیں جا رہا ہوں۔" ڈرائیور برافروختہ ہو کے بولا۔

"مگر ہمیں تو اُدھر ہی جانا ہے۔" میں نے کہا۔ "اور ہم تمھیں بھی لے کر جائیں گے۔"

"اڑی کرتا ہے۔" مکرانی ڈرائیور نے پلٹ کر کہا۔ "ابھی پھر بولتا ہوں کہ اتر جاؤ نہیں تو پھوٹو بگاڑ دیں گا۔"

"یہ ہماری شانِ مردانگی کے خلاف ہوگا۔" میں نے کہا۔ "آخر تم ٹیکسی کس کے لیے چلا رہے ہو... لوگوں کے فوٹو بگاڑنے کے لیے؟"

"اُدھر سے واپسی کا سواری نہیں ملتا۔" میرے لہجے نے اُسے کچھ ٹھنڈا کیا۔ "نقصان ہوتا ہے۔"

"نقصان کا یہ کاروبار تم اپنی مرضی سے کر رہے ہو... نہیں کر سکتے تو چھوڑ دو... کوئی اور دھندا کرو۔" میں نے برہمی سے کہا۔

راجا نے میرا پیر دبایا۔ "چلو یار... تم کو دس رپے زیادہ دیں گے۔"

"میٹر سے پندرہ روپے اوپر لیں گا۔" اُس نے فیصلہ سنایا اور روانہ ہو گیا۔

"یہ کیا طریقہ ہے آخر۔" میں نے راجا سے کہا۔

"یہ کراچی ہے پیارے کراچی۔" راجا نے مجھے آنکھ مار کے کہا۔ "ابھی تم تماشا دیکھو۔"

راجا نے اچانک مکرانی سے اسی کی زبان میں دوستانہ گفتگو شروع کی۔ راجا کراچی کی پیدائش تھا اور اسی شہر کی ٹھوکریں کھا کے پلا بڑھا تھا۔ اسے گجراتی اور بروہی دونوں زبانیں آتی تھیں۔ دیکھتے دیکھتے فضا بدل گئی۔ ٹیکسی ڈرائیور دانت نکالنے لگا۔ پھر انھوں نے زور زور سے ہنسنا شروع کیا۔ راجا نے ڈرائیور سے سگریٹ لی۔ اس کے پیکٹ میں دو قسم کے سگریٹ تھے۔ راجا نے چرس والا سگریٹ منتخب کیا۔ مگر پھر پیچھے کی سیٹ پر ہاتھ نیچے لے جا کر مجھ سے بدل لیا۔ وہ ڈرائیور پر ظاہر کرتا رہا کہ وہ بھی چرس والا سگریٹ پی رہا ہے... نتیجہ یہ کہ جب ہم نے دھوبی گھاٹ کے موڑ پر ٹیکسی رکوائی تو ڈرائیور نے ہم دونوں سے ہاتھ ملایا اور کرایہ لیے بغیر واپس چلا گیا۔ بعد میں راجا نے بتایا کہ ہم زبان ہونے کے علاوہ اس نے خود کو ہم پیشہ بھی ثابت کر دیا تھا۔ یہ کہا تھا کہ اس کی اپنی ٹیکسی ہے مگر وہ تھانے میں بند ہے کیونکہ اس کی ٹکر سے ایک ٹریفک سارجنٹ کی موٹر سائیکل گر گئی تھی۔

نازو گھر پر اکیلی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ پھٹ پڑی۔ "آ گئے سکندرِ اعظم ثانی... میں تو سمجھی تھی کہ اب بندرگاہ فتح کر کے ہی آؤ گے۔ لیکن صورت سے لگتا ہے کہ..."

"خبردار جو صورت کو کچھ کہا۔ لاکھوں میں ایک پائی ہے۔" میں نے چارپائی پر گر کے کہا۔ "غالب نہیں ہوں میں۔"

"بھیا تمھارے لیے سخت پریشان تھے۔" نازو کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

"اور تم... تم پریشان نہیں تھیں؟" میں نے کہا۔ "صورت سے تو ایسا لگتا ہے..."

"خبردار جو صورت کو کچھ کہا۔" وہ چیخ کے بولی۔ "لاکھوں میں ایک پائی ہے... رابعہ نہیں ہوں میں۔"

میرے ساتھ راجا بھی ہنسنے لگا۔ اس سے پہلے وہ اپنے گھڑے کو گھور رہا تھا جو ایک کونے میں رکھا ہوا تھا... اسی وقت اکرام شیخ آ گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کا رنگ بھی کچھ اُڑا ہوا ہے۔

"کیا بات ہے۔" میں نے کہا۔ "یہاں بھی نوٹس مل گیا ہے کیا؟"

اکرام شیخ مسکرایا۔ "نہیں یار... تم سناؤ آج کیا کرتے رہے؟"

"جھک مارتے رہے۔" میں نے کہا اور انھیں خیرات کی کمائی کرنے سے پولیس کے ڈنڈے کھانے اور دوست محمد کے علاوہ اکبر سیٹھ سے ملنے تک کے سب واقعات سنا دیے۔ نازو اور اس کا بھائی ہنستے رہے لیکن مجھے پھر احساس ہوا کہ ان کی ہنسی زبردستی کی ہے۔

"اکرام... تو کیا چھپا رہا ہے مجھ سے... اور کیوں چھپا رہا ہے؟" میں نے کہا۔ "وقت کم ہے اس لیے فوراً بتا دے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں یار۔" اکرام نے کہا۔ "چلو کھانے کے لیے ہاتھ منہ دھو ڈالو... آج ایک عجیب واقعہ پیش آیا ہے۔"

"وہ کیا؟"

"آج نازو نے کھانا پکایا ہے۔" وہ رونی شکل بنا کے بولا۔ "اور ہم سب کو وہی کھانا ہے۔"

"پھر تو منہ دھونے کی بجائے میں وضو کر لوں... اور اللہ سے اپنے گناہ تو بخشوا لوں۔" میں نے کہا۔

"میں ہر اشتعال انگیزی کو نظر انداز کرنے کا فیصلہ کر چکی ہوں اور دل شکستہ ہو کے رونے والی بھی نہیں ہوں۔" وہ بولی۔

دسترخوان پر بیٹھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ نازو واقعی خانہ داری میں صفر ہے۔ اس نے جو چیز مٹر پلاؤ کے نام سے ایجاد کی تھی وہ اتنی خشک اور بدمزہ تھی کہ میں اور اکرام ٹھنڈی آہیں بھرتے رہے اور پانی کے ساتھ نوالے حلق سے اتارتے رہے۔ راجا کا حال ہم دونوں سے بھی ابتر تھا۔

"مٹر اور چاول جو ہمارے معدے کے تالاب میں تیر رہے ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "جب پانی بخارات بن کے اُڑ جائے گا تو مٹر چاول ایسے رہ جائیں گے جیسے کنکر پتھر۔"

"اور جب ہم حرکت کریں گے تو ہمارے پیٹ میں سے ایسی آواز آئی گی جیسے ہم آدمی نہیں جھنجھنے ہیں۔" اکرام بولا۔

نازو کا چہرہ سرخ ہوا مگر وہ غصے کو پی گئی۔

"مرغ قورمے کے لیے پلاسٹک کی مرغی اچھی رہتی ہے۔" میں نے کہا۔ "اب یہ ٹانگ دیکھیے۔ اسے آپ دس بار شوربے میں ڈال کے دس مہمانوں کے سامنے رکھ سکتے ہیں۔"

"ویسے لگتی بالکل اصلی ہے۔" اکرام نے کہا۔ "نفسیاتی اطمینان ضرور حاصل ہوتا ہے کہ ہم چکن قورمہ کھا رہے ہیں۔"

جب کھیر لائی گئی تو حالات بگڑ گئے۔ اکرام نے اُسے دودھ چینی چاول کا زیاں قرار دیا۔ "محکمہ خوراک کو فتنے دار افراد کے خلاف ایکشن لینا چاہیے۔ جو دونوں کو ضائع کرتے ہیں۔ کھانے کو بھی اور... کھانے والے کو بھی... یہ کھیر ہے کہ تیر ہے جو کلیجے میں جا کے لگتا ہے۔"

"یہ ٹیڑھی کھیر ہے۔" میں نے کہا۔ "اسے کھا کے آدمی ٹیڑھا ہو جاتا ہے۔ کتے کی دُم کی طرح... پھر اسے بارہ برس تک نلکی میں ڈال کے رکھنا پڑتا ہے۔"

"کسے... کھیر کو...؟"

"نہیں... کھیر پکانے والے کو۔" میں نے کہا۔

اس کے بعد نازو کا حوصلہ جواب دے گیا۔ "تم سب بدتمیز جنگلی اور چڑیا گھر میں رکھنے کے لائق جانور ہو... تم کو انسانوں والی یہ خوراک راس نہیں آسکتی۔" اس نے دسترخوان کا ایک کونا پکڑا اور سارے برتن اُلٹ دیے۔ راجا بے چارہ نازو کو سمجھتا نہیں تھا۔ اس نے کہا۔ "ارے... دیکھیے۔" اور دوسرے لمحے وہ ہوا میں دو قلابازیاں کھاتا کونے میں جا گرا... اکرام شیخ بڑا بھائی تھا، اور نازو میری طرف ہاتھ بڑھاتی تو خود وہاں نظر آتی جہاں اکرام لیٹا ہوا کراہ رہا تھا، چنانچہ نزلہ بر عضوِ ضعیف... اس کے غصے کا نشانہ راجا بن گیا جس نے مصالحت کنندہ کے فرائض سنبھالنے کی کوشش کی تھی۔

آدھے گھنٹے بعد جب ہم اپنی ہنسی پر قابو پا نے، نازو کو منانے اور راجا کو تسلی دینے میں کامیاب ہوئے تو میں نے گھڑی دیکھی۔

"اب مجھے واپس جانا ہے... فش ہاربر..." میں نے کہا۔ "دل جانی سے ملنے۔"

"میں تجھے لے چلتا ہوں۔" اکرام شیخ اُٹھ کھڑا ہوا۔

"میں بھی چلتا ہوں۔" راجا بولا۔

"کوئی ضرورت نہیں۔" میں نے اسے ڈانٹ کے کہا۔

وہ نروس ہونے لگا... اسے یہ بات عجیب سی لگ رہی تھی کہ ہم اُسے نازو کے ساتھ گھر میں اکیلا چھوڑ کے جا رہے تھے۔ مگر یہ بات ہم ہی سمجھ سکتے تھے کہ نازو کو کسی سے خطرہ لاحق نہیں... خصوصاً راجا جیسے نوجوان سے... اس کے علاوہ میں راجا کو اتنا ہی قابلِ اعتماد سمجھنے لگا تھا جتنا اپنے دوسرے ساتھیوں کو۔

"تم نازو کا خیال رکھو گے۔" اکرام شیخ نے کہا۔

"مگر... میرا خیال کون رکھے گا؟" وہ ایسے مظلوم لہجے میں بولا کہ مجھے غالب یاد آ گیا... وہ نازو کو چھیڑتا تھا۔ جانتا تھا کہ اس چھیڑ خانی کا انجام کیا ہوگا مگر اس کی چاہت کا انداز نہیں بدلتا تھا۔

"نازو بی بی... تم راجا جی کو بریف کرو۔" میں نے کہا۔ "انھیں ایم آر ایس کے موضوع پر ایک مکمل معلوماتی لیکچر دو... اور ہاں مسٹر راجا میں نے تم سے ایک وعدہ کیا تھا۔"

اکرام دوسرے کمرے میں ٹیکسی ڈرائیور کی وردی پہن رہا تھا۔ میں نے تخت کے نیچے سے سوٹ کیس نکالا اور کھول کے راجا کے سامنے کر دیا۔ "پانچ لاکھ پورے کرنے کے لیے تم اس میں سے جتنی رقم چاہو لے لو... ڈھائی لاکھ سے زیادہ کی ضرورت پڑے تب بھی کوئی حرج نہیں۔" میں نے سوٹ کیس کو ایسے ہی کھلا چھوڑ دیا۔ راجا سکتے کے عالم میں کھڑا رہا۔

"یہ جعلی نوٹ نہیں ہیں راجا جی..."

"میں... میں یہ رقم نہیں لوں گا۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

"تمھارا تو باپ بھی لے گا۔" میں نے کہا اور اکرام کے ساتھ باہر نکل گیا۔

"یہ کیا ڈراما ہو رہا تھا۔" اکرام نے کہا۔

"راجا جی ایک کوہ قاف کی پری کے چکر میں ہیں۔ پری ایک لالچی دیو کی قید میں ہے... اس کی شرط ہے کہ پانچ لاکھ لاؤ اور پری کو لے جاؤ... راجا اسی لیے بھیک مانگتا تھا..."

چوری، ڈکیتی اور اسمگلنگ کرتے ہوئے ڈرتا تھا۔ ویسے پری کا اصلی نام پروین ہے۔"

" ایک اور مریضِ عشق۔" اکرام نے سر پر ہاتھ مارا۔" یہ ایم آر ایس تو جانباز عاشقوں کی انجمن بنتی جا رہی ہے۔"

" اسی لیے تمھاری ممبر شپ آنریری ہے... مکمل رکنیت حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ تم بھی کسی کے عشق میں پاگل ہو جاؤ... اتنے پاگل کہ... خیر مثال میں کیا دوں۔ تم تو پاگلوں میں گھرے ہوئے ہو۔"

" ابھی وہ لڑکی پیدا نہیں ہوئی جو مجھے پاگل کر سکے۔"

" ترمیم... وہ لڑکی دریافت نہیں ہوئی۔" میں نے کہا۔" پیدا تو ہو چکی ہے اور جوان بھی ہو چکی ہے۔ بس اس کے تمھارے سامنے آنے کی دیر ہے... پھر دیکھنا... ہم بھی دیکھیں گے، دنیا بھی دیکھے گی۔"

اکرام نے ٹیکسی اسٹارٹ کی۔" یار... وہ آج میں نے تمھارے وکیل دوست سے بات کی تھی۔"

" اچھا... ہو گئی بات...؟" میں نے دلچسپی سے کہا۔" کیا خبر ہے؟"

" خبر... اچھی بھی اور بُری بھی۔" وہ بولا۔" میں نے نازو سے بھی ذکر نہیں کیا ہے ابھی تک... اُسے شک بہرحال ہو گیا ہے۔"

" بُری خبر پہلے سناؤ۔" میں نے مضطرب لہجے میں کہا۔

" تمھارا وہ سرکس پلان ختم ہو گیا۔" اکرام نے کہا۔" محسن نے منظر کو فون پر بتایا کہ صرف وہ اور جولی بچے ہیں۔"

خوف کے عفریت نے مجھے یوں جکڑ لیا کہ میرا دل درد سے کراہنے لگا۔" یہ... تم کیا کہہ رہے ہو؟"

" انھوں نے رات کے وقت حملہ کیا تھا۔" اکرام نے کہا۔" کسی کو معلوم نہیں کہ وہ کتنے آدمی تھے۔ دھماکا ٹریلر کے اندر ہوا۔ اس کے پرخچے اُڑ گئے... اللہ بچانے والا ہے۔ محسن کچھ دیر پہلے ہی جولی کو اپنے ساتھ لے کر ڈاکٹر کے پاس گیا تھا.. جولی کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔"

" اور... وہ..." آواز میرے حلق میں پھنس گئی۔

اس کا مجھے بھی بہت رنج ہے۔" اکرام شیخ نے کہا " ہمارا استاد ٹیڈی ہمارے مشن پر قربان ہو گیا... شہید ہو گیا۔"

ٹیڈی مر گیا... استاد ٹیڈی مر گیا... وہ شخص جو نیک محمد تھا... وہ مر گیا... وہ شخص جس نے زندگی کی غلط روش کو صرف اس لیے ترک کر دیا تھا کہ وہ اپنے وطن کے دشمنوں کے خلاف جنگ میں ہمارا ساتھ دینا چاہتا تھا۔ وہ استاد ٹیڈی جو ایک محدود حلقے میں بدمعاش سمجھا جاتا تھا۔ احساسِ محرومی کا مارا ہوا۔ جب اسے ہم سے عزت ملی... محبت ملی اور پیار ملا تو اس کے اندر کا انسان جاگ اُٹھا۔ وہ دریا دل ٹیڈی جو یاروں کا یار تھا اس یاری پر اپنا سب کچھ قربان کرتا آیا تھا۔ شہلا کا مُنہ بولا بھائی رابعہ کا بھائی... سب کو بھائیوں سے زیادہ چاہنے والا... سب سے زیادہ سختی جھیلنے والا... وہ مر گیا؟ ٹکڑے ٹکڑے ہو کے وطن کی مٹی میں مل گیا۔ اس کی خاک پر بکھر گیا۔ ہر فصلِ بہاریں نئے شگوفوں کی خوشبو میں شامل ہونے کے لیے... نئے پھولوں کے رنگ میں نکھرنے کے لیے... ہمیشہ زندہ رہنے کے لیے۔ تم ان کو مردہ مت کہو کیونکہ وہ شہید ہی تو ہیں جو زندہ رہتے ہیں... اپنی دوستی کی یادوں... قربانیوں اور خلوص کی نشانیوں کے ساتھ۔

میں نے محسوس کیا کہ میں رو رہا ہوں... ٹیکسی اب فش ہاربر کے باہر کھڑی ہوئی تھی اور اکرام شیخ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے مجھے تسلی دے رہا تھا... حوصلہ رکھنے کی تلقین کر رہا تھا۔

" اس کے ساتھ... ایک اور بہادر آدمی بھی تھا۔" میں نے آنسو پونچھ کے کہا۔

" ہاں... شیر علی نام تھا اس کا۔" اکرام شیخ نے کہا۔" وہ بھی شہید ہو گیا... جولیا..."

" جولیا کو کیا ہوا...؟" میں نے اکرام کے اچانک خاموشی اختیار کرنے پر چونک کے کہا۔" بول یار... جولیا کے لیے تو نے کہا تھا کہ وہ زندہ ہے۔"

" ہاں... اسے کچھ نہیں ہوا۔" اکرام شیخ نے کہا۔" مگر وہ اب ہمارے ساتھ نہیں ہے۔ محسن اُسے ڈاکٹر کے پاس لے گیا تھا۔ وہاں اس پر ایک عجیب انکشاف ہوا... وہ ماں بننے والی تھی۔"

میرے دماغ کو بجلی کا جھٹکا سا لگا۔" ماں بننے والی تھی... یہ کیسے ہو سکتا ہے...؟ ڈاکٹر کو غلط فہمی ہوئی ہوگی۔"

" محسن کا بھی یہی خیال تھا... مگر ڈاکٹر نے کہا کہ اس میں کوئی شک کی بات ہی نہیں۔" اکرام نے کہا۔" محسن واپسی پر اس سے نہیں بولا... جولیا نے خود ہی بات کی... اور کہا کہ محسن بھائی... آپ کو تو سب معلوم ہو ہی گیا ہے... میں نے آپ کے اعتماد کو دھوکا دیا... میں گنہگار ہوں... مجھے جانے دیں... محسن نے اُسے مارا اور پوچھا کہ اسے شیر علی سے محبت ہو گئی تھی تو کیا وہ الّو کا پٹھا شادی کے لیے نہیں کہہ سکتا تھا میں انکار کبھی نہ کرتا... میں ہوتا بھی کون ہوں انکار کرنے والا... مگر اب میں اسے نہیں چھوڑوں گا... یہ سب باتیں ایسی میں ہوئی تھیں جب محسن نے شیر علی کو گالیاں دیں... جولیا اس کے پیروں سے لپٹ گئی۔"

" وہ شیر علی کو پسند کرنے لگی تھی... مجھے بھی معلوم ہے۔" میں نے کہا۔

" اس نے محسن کو بتایا کہ چوری چھپے وہ شادی کر چکے ہیں۔ وہ شیر علی کے سامنے کلمہ پڑھ کے مسلمان ہو گئی تھی۔" اکرام نے کہا۔" نکاح کا بندوبست خود شیر علی نے کیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ ابھی وہ الگ رہیں گے... مگر شاید ایسا ممکن نہ ہوا۔ ہر آدمی کا نفس ایک شکاری ہے جو گھات میں رہتا ہے... اس نے کسی جذباتی کمزوری کے لمحے سے فائدہ اُٹھا لیا ہوگا... جولیا کی وضاحت سے محسن مطمئن نہیں ہوا تھا۔ وہ شیر علی کو سزا ضرور دینا چاہتا تھا... مگر وہ واپس پہنچے تو ٹریلر جل چکا تھا۔ وہ شہر سے پالیس میل آگے جنگل میں کھڑے ہوئے تھے۔ ٹریلر میں ریچھ اور بندر کا تماشا دکھانے والے بھی جل کے مر گئے... جانوروں سمیت... کسی کے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ٹریلر کے جو ٹکڑے اِدھر اُدھر بکھرے تھے ان سے جنگل میں بھی آگ پھیل گئی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر جولیا کا دماغ الٹ گیا۔ وہ شیر علی پکارتی ہوئی بھاگی۔ محسن نے اُسے روک تو لیا مگر صرف جل کر خاک ہونے سے... صدمے سے ہونے والی دماغی خرابی کو وہ نہیں روک سکتا تھا۔"

" اوہ مائی گاڈ..." میں نے کراہ کے کہا۔" کچھ لوگ کتنے بدقسمت پیدا ہوتے ہیں... کتنے مظلوم رہتے ہیں اور کتنی قابلِ رحم زندگی گزارتے ہیں۔ اس لڑکی کو موت کے مُنہ سے چھین کر لانے کے لیے ہم سب نے کیا نہیں کیا تھا۔ مگر کتنی مختصر تھی زندگی کی یہ خوشی... باپ تو پہلے ہی نہیں تھا۔ ماں اس کی نظروں کے سامنے ماری گئی... اور اب یہ ستم کہ سہاگن بنتے ہی بیوگی ملی۔ ماں بننے کی خوشخبری نے اس کا سہاگ اجاڑ دیا... اب کہاں ہے وہ؟"

" جہاں اُسے ہونا چاہیے؟" اکرام شیخ نے کہا۔

" تمھارا مطلب ہے پاگل خانے میں؟"

اکرام نے اقرار میں سر ہلایا۔" محسن اُسے کسی نہ کسی طرح منظر کے گھر لے جانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ مگر اس کی حالت ایسی نہیں تھی... کہ منظر اُسے رکھ سکتا۔ مجبوراً اُسے اسپتال منتقل کیا اور انھوں نے چند دن اپنے پاس رکھ کے پاگل خانے بھیج دیا۔ منظر نے کہا تو ہے کہ اس کا خیال رکھا جائے اور بہتر علاج ... وہ سارا خرچ دے گا اور اسے دیکھنے کے لیے آتا رہے گا..."

" کیا اس کی کیفیت جنونی ہے؟"

" نہیں... وہ بس گم صم بیٹھی رہتی ہے... نہ بولتی ہے نہ کچھ سُنتی ہے... کھانا پڑا رہتا ہے... جب بھوک لگتی ہے تو کھا لیتی ہے... جب نیند پر قابو نہیں رہتا تو گر کے سو جاتی ہے۔ بالکل ایک زندہ لاش ہو گئی ہے... ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ شفایابی کے امکانات معدوم نہیں ہیں مگر سال دو سال لگ سکتے ہیں۔"

" سال دو سال... اور اس عرصے میں..."

" ہاں... اس عرصے میں وہ ماں بھی بنے گی... وہیں۔" اکرام نے کہا۔" یہ ہو سکتا ہے کہ بچے کی ولادت یکلخت اس کو احساس کی دنیا میں واپس لے آئے۔ ڈاکٹر اسی چانس پر انحصار کر رہے ہیں۔ غالب کے والد کا کوئی ڈاکٹر دوست ہے۔ غالباً جولیا کو اس کے گھر پہنچانے کی بات ہو گئی ہے۔ انکل ضامن زیدی کی کوشش سے۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔" کیا یہ بات شہلا کو بتائی گئی ہے؟"

" نہیں... وہ اسپتال میں تھی..."

" تھی کا مطلب کہ اب نہیں ہے؟"

نہیں... زچہ و بچہ خیریت سے ہیں۔" اکرام مسکرایا۔" یہی دوسری اچھی خبر تھی۔"

" کیا... ٹیڈی نے اُسے دیکھا تھا؟" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔

" کسے؟ شہلا کو؟ اس کے بچے کے ساتھ؟" اکرام نے کہا۔" ہاں وہ اسی دن اسپتال گیا تھا... سب کے منع کرنے کے باوجود وہ بہت خوش تھا کہ میں ماموں بن گیا۔"

مجھے یاد ہے۔" ایک بار پھر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے کہ کس طرح ایک دن وہ اور غالب اس بات پر ... کہ میں بچے کا ماموں ہوں... نام میں رکھوں گا ... تھا کہ وہ چچا ہے اور یہ اس کا حق ہے۔"

... اس کا نام ٹیپو رکھا ... ہی رکھا تھا۔" اکرام بولا۔

" چلو اس کی ایک آرزو تو پوری ہو گئی..."

" اب تم چاہو تو گھر جاؤ..."

اکرام نے نفی میں سر ہلایا۔" میں تمھارے ساتھ رہوں گا۔"

فش ہاربر کے علاقے میں مچھلیوں کی باس ہوا ہی میں نہیں زمین کی مٹی اور در و دیوار میں بھی رچ بس گئی تھی... ایک عجیب سی نم آلودہ فضا میں سمندر کی دنیا آباد تھی... ماہی گیر... ان کے خاندان ... ماہی گیری کے ٹھیکیدار... ان کے ایجنٹ

مزدوری کرنے والے، جال اور بادبان مرمت کرنے والے۔ انجن مکینک... سرکاری محکمے کے اہلکار... سب مصروفِ کار تھے۔ ہر سائز اور شکل و صورت کی سینکڑوں کشتیاں اور لانچیں روانہ ہو رہی تھیں: دل جانی" ابھی واپس نہیں آئی تھی۔

"یہ سب رات بھر مچھلی پکڑیں گے۔ اور صبح دم لوٹیں گے۔" اکرام شیخ نے بتایا۔ "لیکن ان کی واپسی سے پہلے ہی ہر کشتی، لانچ کا آکشن ہو جائے گا۔"

"کیا مطلب، کل دوسرے لوگ ہر کشتی اور لانچ خرید لیں گے؟"

اکرام ہنسا۔ "نیلام ان مچھلیوں کا ہوگا جو ہر کشتی اور لانچ لے کر واپس لوٹے گی۔"

"پھر واپسی سے پہلے نیلام کیسے ہوگا؟ کسی کو کیا معلوم کون خالی ہاتھ آئے گا اور کون کتنی مچھلی لائے گا؟"

"یہی تو نیلام میں بولی لگانے والوں کا کمال ہے کہ وہ کبھی گھاٹے کا سودا نہیں کرتے۔" اکرام بولا۔ "جب وہ بولی لگاتے ہیں تو ان کی پوزیشن وہی ہوتی ہے جو ریس کے گھوڑے پر رقم لگانے والوں کی ہوتی ہے جو جانتے ہیں کہ گھوڑا کس نسل کا ہے، اس سے پہلے کتنی بار جیت چکا ہے... جوکی کون ہے اور جوکی کا ریکارڈ کیسا ہے۔ یہ لوگ بھی جانتے ہیں کہ کون سی کشتی یا لانچ کدھر گئی ہے اور اس موسم میں وہاں کس قسم کی مچھلی آتی ہے۔ جھینگے ملتے ہیں یا کیکڑے تو کہاں ملتے ہیں۔ اس کشتی یا لانچ کا عملہ یعنی ماہی گیر کون ہیں۔ ان کا ساز و سامان کیسا ہے اور تجربہ کتنا ہے... پھر یہ کہ اس سے پہلے وہ اوسطاً کتنی اور کس قسم کی مچھلی لاتے رہے ہیں۔ یہ سب ذہن میں رکھتے ہوئے وہ بولی لگاتے ہیں... اور جیسا کہ کسی بھی نظام میں ہوتا ہے۔ بولی لگانے والوں کے درمیان بھی ایک اجارہ دارانہ رجحان ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ مچھلی ضائع ہو جانے والی چیز ہے۔ اسے اسٹور نہیں کیا جا سکتا... اور خریدار وہی محدود لوگ ہیں۔ وہ ایک حد سے آگے نہیں جاتے اور عموماً آپس میں طے کر لیتے ہیں کہ تم فلاں لانچ کی بولی اتنی لگاؤ اور لے لو... مگر فلاں لانچ میری... سارا منافع تو یہی ٹھیکیدار اٹھاتے ہیں۔ ماہی گیر غریب کو تو شب بھر کی بیداری اور محنت کا پورا صلہ تک نہیں ملتا۔"

"یہ استحصالی نظام تو ہر جگہ موجود ہے۔" میں نے افسوس سے سر ہلایا۔

"آج کل غیر ملکی ٹرالر ہماری حدود میں گھس آتے ہیں۔ روسی اور بھارتی ٹرالر بین الاقوامی سمندر سے ہمارے سمندر میں آ کے مچھلیاں پکڑتے ہیں اور وہ جدید ترین آلات سے لیس جہاز ہوتے ہیں، ظاہر ہے اس سے چھوٹے ماہی گیر متاثر ہوتے ہیں، انھیں کم مچھلی ملتی ہے۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "جب نیوی یا کسٹم پولیس کی لانچ آتی ہے، تو وہ بھاگ جاتے ہیں۔ پانی میں دیوار تو اٹھائی نہیں جا سکتی۔"

"کیا وہ صرف مچھلیاں پکڑتے ہیں؟" میں نے اس مسئلے کو اپنے طور پر دوسرے زاویے سے دیکھا۔

"مچھلیوں کے ساتھ تو جال میں سب ہی پکڑے جاتے ہیں، ہر قسم کی سمندری مخلوق..."

"میرا مطلب تھا کہ کیا وہ مچھلیاں پکڑنے کے سوا کوئی کام نہیں کرتے۔" میں نے کہا۔ "کر تو سکتے ہیں نا؟"

"ہاں... کرنے کو سب کچھ کر سکتے ہیں۔" اکرام شیخ میری بات کو سمجھتے ہوئے بولا۔ ہم دونوں ایک وسیع شیڈ کے اندر ٹہل رہے تھے۔

"رات کے وقت سمندر میں کون دیکھتا ہے کہ کس نے کس سے کیا لیا اور کسی کو کیا دیا۔" میں نے کہا۔ "ہماری سمندری حدود کہاں تک ہیں؟"

"غالباً دو سو میل تک..."

"پھر تو یہ بہت آسان ہے۔" میں نے کہا۔ "کہ ہماری کوئی ماہی گیری کی لانچ اسلحہ لے کر جائے۔ مقررہ وقت پر کوئی ٹرالر یہ دیکھتے ہوئے کہ دیکھنے والا کوئی نہیں ہے ہماری حدود میں داخل ہو جائے۔ دو چار میل اندر یا باہر کا فرق کیسے پتا چلے گا۔"

"ہاں... گھنٹے دو گھنٹے تک لانچ اور ٹرالر ساتھ ساتھ سفر کرتے رہیں تب بھی کسی کو اعتراض نہیں ہوگا... اور اگر خطرہ دیکھا تو دونوں واپس اپنی اپنی سرحد میں۔ بھارتی اور روسی ٹرالر پکڑے بھی جاتے ہیں مگر پھر ڈپلومیٹک سطح پر بات چیت کے ذریعے چھڑا لیے جاتے ہیں... یا ایک تیسری پارٹی سمندر میں موجود رہتی ہے جو ان کے سودے میں اپنا کمیشن وصول کرتی ہے اور انھیں کلیئر کر دیتی ہے۔"

"اس تیسری پارٹی کو ہی ففتھ کالم بھی کہتے ہیں... گھر کا بھیدی بھی جو لنکا ڈھاتا ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ دوست نما دشمن جو پیٹھ پیچھے سے وار کرتا ہے۔"

"او بھائی... کون پوچھتا پڑا تھا دل جانی کو؟" ایک مکرانی نے چلا کے کہا۔ "وہ آگیا ہے دل جانی۔"

"کدھر... کہاں...؟" میں اور اکرام اس کی طرف لپکے۔

"وہ ہری پیلی لائٹ والا لانچ نئیں ہے۔" مکرانی نے انگلی کے اشارے سے بتایا۔

میں اور اکرام شیخ واپس ہوئے اور اس برتھ تک گئے جہاں سے گزر کے دل جانی کا عملہ واپس آ رہا تھا۔ آگے پیچھے چار آدمی کسی بات پر بحث یا لڑائی میں مصروف تھے

"او بابا... ہم بولتا پڑا ہے کہ انجن ایک دم ٹھاٹ ہے۔ تمہاری بات نہیں مانتا۔"

"تمہاری بات ملنے گا استاد... مگر وہ گڑگڑ کا آواز پہلے ں تھا۔"

"وہ ٹھیک ہو جائے گا... وہ پسٹن کا آواز نہیں ہے۔ شافٹ جب چالو ہوئیں گا تو آواز ختم ہو جائیں گا... نہیں ے تو ہم کو بولو... تمہارا پیسہ واپس... ہم مکینک ہے کوئی ے باز نہیں ہے۔"

"لفڑے باز تم کو کون بول سکتا ہے استاد... تم تو خالی ین ناراض ہوتا پڑا ہے... یہ لو آٹھ سو روپے۔"

استاد کہلانے والے نے نوٹ گنے بغیر اپنی نیلی ڈانگری کی ب جیب میں ٹھونس لیے اور ایک طرف چل پڑا۔ اکرام شیخ ں کے پیچھے گیا۔

"یہ دوست محمد ہے؟" میں نے آٹھ سو دینے والے ے پوچھا۔

"ہم ہی دوست محمد ہے۔" وہ بولا۔

"مگر تم دوست محمد پردیسی ہے؟"

"ایک دم ٹھیک... تم کون ہے؟ ہم کو کیسے جانتا ہے؟" وہ ہاتھ ملا کے بولا۔ تقریباً پینتالیس سال کے اس فاکش شخص کا پنجہ ایک فولادی شکنجہ تھا۔

"مجھے کسی نے بتایا تھا کہ تم لانچ فروخت کر رہے ہو؟" ں نے کہا۔

"کون بولا تھا؟ یہ لانچ بیچ دے گا ہم تو پھر خود کیا کرے گا؟" موڈ خراب ہو گیا۔ "ڈوری ڈال کے مچھلی پکڑے گا کیا؟"

کے دونوں ساتھی قہقہہ مار کے ہنسے۔ "جادو نی بابا۔ سی نے تم کو الو بنایا ہے۔"

"ایک دم چریا ہے۔" دوسرا بولا۔

دوست محمد پردیسی گرم ہو گیا۔ "ارے چلو ادھر سے... لک کرنا پڑا ہے... جب ہم بات کرتا ہے کسی شریف دی سے تو بیچ میں کیوں ٹانگ اڑاتا ہے۔ ابھی ماریں گا چاٹ یسا..."

دونوں ماتحت فوراً غائب ہو گئے۔ میں نے دوست محمد پردیسی سے معذرت کی۔ اس نے دوستانہ طریقے پر مجھے بتایا کہ فلاں فلاں لانچ بیچنے کی بات چل رہی ہے مگر میں ناواقف لگتا ہوں اس لیے دلالوں سے بچوں اور فلاں لانچ کے مالک سے براہِ راست بات کروں۔ اس کو یقین تھا کہ میں کوئی اسمگلر ہوں یا اس کا ایجنٹ اور لانچ کو دوبئی سے مال لانے کے لیے استعمال کروں گا... اس یقین کی وجہ یہ تھی کہ میں صورت سے ماہی گیر بالکل نہیں لگتا تھا۔

میں دوست محمد پردیسی سے پیچھا چھڑا کے بھاگا۔ فش ہاربر کے باہر میں نے اکرام کو جا لیا... وہ دوست محمد کو گھیرے کھڑا ہوا تھا۔

"لو... وہ آگیا میرا دوست۔" اکرام نے کہا۔

ایک بار پھر میں نے کہا۔ "تم دوست محمد ہو نا میرن انجینئر؟"

وہ ایک خشک مزاج بوڑھا آدمی تھا۔ میں نے اس کی عمر کا اندازہ پچپن ساٹھ سال کے درمیان کیا۔ اس عمر میں بھی وہ قابلِ رشک صحت کا مالک تھا۔ یہ لوگ سمندر کی کھلی فضا میں رہتے تھے اور محنت مشقت کی زندگی گزارتے تھے۔ ان کی سب سے اہم غذا سمندری مخلوق تھی۔ مچھلی، جھینگے اور کیکڑے۔ کیکڑے کا سوپ کراچی کے ہر چینی ریستوراں میں بڑے تکلف اور اہتمام کے ساتھ ملتا تھا اور ایک مہنگی ڈش تھا۔ اسی طرح فرائیڈ پراون ایک پسندیدہ ڈش تھی۔ لیکن سمندر کی دنیا کے لوگ یہی چیزیں دن رات کھاتے تھے۔ پکا کے، بھون کے یا ابال کے۔ مزدورت

پرطی۔ یہ کچی مچھلی بھی وہ کراہیت کے کسی احساس کے بغیر کھا جاتے تھے۔ یہ پروٹین اور معدنیات سے بھرپور غذا ان کے جسم کو توانا رکھتی تھی۔ وہ وٹامن ست اور وٹامن کی کمی کا شکار نہیں ہوتے تھے۔ چنانچہ ان کی آنکھیں روشن اور معدہ درست رہتا تھی۔ ممکن ہے وہ بڑھاپے میں وٹامن بی کی کمی محسوس کرتے ہوں۔ مگر اس سمندری آب و ہوا کی دنیا میں پپیتا بھی بکثرت استعمال ہوتا تھا۔ اور لائم جوس بھی، چنانچہ وہ بیمار نہیں ہوتے تھے اور طویل عمر پاتے تھے

دوست محمد... میں تم سے ملنے کے لیے بہت دور سے آیا ہوں۔" میں نے تمہید باندھی

"کہاں سے آئے ہو؟" وہ حیران ہوتے بولا۔

"یہیں سے۔" میں نے کہا۔ خلافِ توقع وہ چونکا نہیں۔ "میں نے تم کو پہلے کبھی دیکھا نہیں..." وہ بولا۔ "کیا نام ہے تمہارا؟"

"کیا ہم کہیں اکیلے میں بیٹھ کے بات نہیں کر سکتے؟" میں نے کہا۔

"یہاں کیا ہے؟" وہ بولا۔ "اچھا آؤ۔ ہوٹل میں بیٹھتے ہیں۔"

"ہوٹل میں نہیں۔" میں نے کہا۔ "تمہارے گھر..."

"میرا گھر...!" وہ ایک کھٹارا کار کی طرف بڑھتے بڑھتے رک گیا۔ "میرا تو کوئی گھر نہیں ہے۔"

"یہ کار تمہاری ہی ہے نا؟" میں نے کہا۔ "اس میں بیٹھ کے تم کہاں جا رہے تھے؟"

"شہر کی طرف... کسی ہوٹل میں رات گزارنے کے لیے۔"

"کیا میں تمہارے ساتھ چل سکتا ہوں... ہم راستے میں بات کرلیں گے۔"

"کوئی ضرورت نہیں... یہاں بات کرو" وہ ایک دم جیسے بگڑ گیا۔

"دوست محمد... میرا نام سکندر بخت ہے۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

وہ میری صورت دیکھتا رہا۔ "اچھا... آگے بولو۔"

"میں رابعہ سے ملنے... اسے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آیا ہوں۔" میں نے کہا اور اِدھر اُدھر دیکھ کر یقین کر لیا کہ میری بات سننے والا کوئی نہیں ہے۔ دوست محمد کی کار ایک پرانے شیڈ کی اوٹ میں کھڑی ہوئی تھی۔

"تو لے جاؤ... مجھ سے کیوں پوچھتے ہو... میں کیا باپ ہوں رابعہ کا، اور یہ رابعہ کون ہے آخر...؟"

"دوست محمد... ایسے بات بگڑ جائے گی... تم رابعہ کو جانتے ہو۔" میں نے پُرسکون رہتے ہوئے کہا۔

"رابعہ؟" وہ سوچنے لگا۔ "تم اس کی بات تو نہیں کر رہے ہو... نور محمد کی بیوی کی؟ تم کو گولی مار دے گا وہ۔"

"لاحول ولا قوۃ... میں کسی کی بیوی کو بھگا کے نہیں لے جانا چاہتا۔ میں جس رابعہ کی بات کر رہا ہوں... وہ کسی کی بیوی نہیں ہے۔"

"اور تو کسی رابعہ کو نہیں جانتا میں۔"

میرا حوصلہ جواب دینے لگا۔ "بکواس کرتے ہو تم... میں رابعہ قاری کی بات کر رہا ہوں۔" میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کے رابعہ کی ایک تصویر نکالی۔ "اس رابعہ کی جو تمہارے ساتھ رہتی ہے۔"

دوست محمد نے تصویر لے کر روشنی کے رخ دیکھی۔ میں اس کی صورت کو غور سے دیکھتا رہا۔ لیکن مجھے دوست محمد کے چہرے پر الجھن اور حیرانی کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آیا... اس نے تصویر مجھے واپس کر دی۔

"ہم قسم کھا کے بولتا ہے کہ ہم نے اس لڑکی کو کبھی نہیں دیکھا... تم بولتا ہے یہ ہمارے ساتھ رہتا ہے۔"

دوست محمد نے اپنی زبان کے ساتھ اپنا لہجہ بھی بدل لیا تھا۔ شک پیدا کرنے کے لیے یہی چیز کافی تھی۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور ریوالور نکال لیا۔ "دوست محمد... تم کو بتانا ہی پڑے گا کہ رابعہ کہاں ہے... چلو اپنی گاڑی میں بیٹھو..." دوسرے ہاتھ سے میں نے اکرام کو اشارہ کیا کہ وہ جائے۔

دوست محمد کا رنگ اُڑ گیا تھا۔ وہ کچھ دیر ساکت و صامت کھڑا رہا اور پھر کار میں بیٹھ گیا۔ اس کے دروازے مقفل نہیں تھے یہ رائٹ ہینڈ ڈرائیو گاڑی تھی چنانچہ میں اس کے دائیں جانب والی سیٹ پر بیٹھا۔

"یہ دھکا اسٹارٹ گاڑی ہے۔" دوست محمد ہونٹوں پر زبان پھیر کے بولا۔ اور اسی وقت مجھے احساس ہوا کہ اس کار میں ہم دونوں کے علاوہ بھی کوئی موجود ہے۔ میں نے پلٹ کے دیکھا اور ریوالور میرے ہاتھ میں ناچنے لگا۔ مجھے یوں لگا جیسے یہ حقیقت نہیں خواب ہے۔ کسی دشواری کے بغیر دوست محمد نے ریوالور میرے ہاتھ سے چھین لیا۔ میں نے اس کی مذاق اُڑانے والی ہنسی کی آواز سنی۔

ساتھ دو خطرناک قسم کے ریوالور میری جانب یوں اٹھے ہوئے تھے کہ میرے لیے حرکت کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ وہ ہاتھ کس کے تھے جو ریوالور لیے خاموشی سے ایک کھٹارا گاڑی کی پچھلی ہوئی گرد آلود سیٹ پر براجمان تھے، یہ میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔

انھوں نے نقاب پوشی کا آسان اور سستا طریقہ اختیار کیا تھا جو ولایت کے قانون شکن عناصر میں بہت مقبول تھا لیکن یہاں میں نے دیکھا تھا کہ چہرہ چھپانے کے لیے لوگ چادر یا پگڑی جیسی چیز کو ڈھاٹے باندھنے کے لیے استعمال کرتے تھے جو خاصا مشکل اور الجھن پیدا کرنے والا طریقہ تھا۔

عقبی سیٹ پر دونوں حضرات نے بڑے سائز کی سیاہ نائلون کی جرابوں کا ایک جوڑا استعمال کیا تھا۔ ایک جراب کو ایک نے کھینچ کر سر پر چڑھا لیا تھا اور دوسرے نے دوسری جراب کو سر کے سائز میں تھوڑا بہت فرق ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ نائلون کی جراب میں لچک بہت زیادہ ہوتی ہے۔

اب ان دونوں کے سر دو سیاہ رنگ کے گولے سے نظر آتے تھے۔ چہرے کے نقوش بالکل غائب ہو گئے تھے۔ صرف ناک کا ابھار تھا جو محسوس ہوتا تھا، ورنہ جرابیں ان کی گردن سے بھی نیچے تک آگئی تھیں۔ آنکھوں کی جگہ دو چھوٹے چھوٹے سوراخ تھے جن میں سے وہ یقیناً مجھے گھور رہے تھے۔

ان کے ماسک ہی نہیں کپڑے بھی کالے تھے اور یہی وجہ تھی کہ میں انھیں گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے نہ دیکھ سکا تھا۔ مجھے امید بھی نہیں تھی کہ اس چھکڑے میں جو دُور سے متروکہ املاک لگتا تھا کوئی میرے انتظار میں ہو سکتا ہے۔

"یہ کیا مذاق ہے بابا؟" میں نے فقیرانہ لہجے میں کہا۔ "فقیروں کی طرف توپوں کا رُخ کر کے کیا ملے گا۔ کشکول میں کچھ ڈالو گے تو ثواب پاؤ گے۔"

"سائیں سکندر... یہ ڈراما ابھی چھوڑ دو۔" دوست محمد نے کہا۔ "پہلے تو ذرا نیچے اترو اور دھکا لگاؤ گاڑی کو۔"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کے کہا۔ "اچھا... فقیر سے دھکا لگواؤ گے تو دنیا میں دھکے کھاؤ گے۔" اور نیچے اتر گیا۔ ایک نقاب پوش بھی میرے ساتھ اتر آیا۔

"ویسے تو تم اکیلے ہی کافی تھے۔" میں نے اس کے ڈیل ڈول کو اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ "مگر کیا تمھیں یقین ہے کہ اس ضعیف و ناتواں گاڑی میں دم ہے؟"

"نہیں ہے تو دم ڈالو سائیں۔" دوست محمد بڑے خوشگوار موڈ میں بولا۔ "کوئی وظیفہ پڑھ کے پھونک مارو کہ یہ راکٹ بن جائے۔"

نقاب پوش نے اب ریوالور پتلون میں اُڑس لیا تھا... غالباً وہ میرے بارے میں تفصیلی معلومات نہیں رکھتے تھے ورنہ ایسا رسک نہ لیتے۔ میں اپنے ساتھ دھکا لگانے والے کو دس سیکنڈ میں ناکارہ بنا کے اس کا ریوالور حاصل کر سکتا تھا لیکن مجھے ایک حیرت آمیز تجسّس نے روک لیا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ یہ کون لوگ ہیں اور کس قسم کے لوگ ہیں۔ رابعہ نے تو کہا تھا کہ دوست محمد کے ساتھ وہ بالکل محفوظ ہے لیکن میرے ساتھ دوست محمد کا رویّہ ذرا بھی دوستانہ نہیں تھا۔

مجھے یہ اطمینان بھی حاصل تھا کہ میں اکیلا نہیں ہوں۔ اکرام کہیں نہ کہیں سے سب دیکھ رہا تھا اور یہ ناممکن تھا کہ وہ ہمارا پیچھا نہ کرے۔ وہ ایک انتہائی ذہین اور مستعد پولیس افسر رہا تھا چنانچہ مجھے اغوا کرنے والے اس کی آنکھوں میں دھول نہیں جھونک سکتے تھے۔

نقاب پوش نے اور میں نے مل کر گاڑی کو تھوڑا سا دھکا دیا تو گیئر میں پڑتے ہی اس نے جھٹکے سے ایک ہچکی لی اور اس کا انجن اسٹارٹ ہو گیا... اور کیوں نہ ہوتا۔ کار کا مالک ابھی پچیس ہارس پاور والی لانچ کے ڈیزل انجن کو ٹھیک کر کے لوٹا تھا۔ اس کے لیے کار کا یہ چھوٹا سا انجن ایک کھلونا تھا۔

میں نے اطمینان کا سانس لے کر ہاتھ جھاڑے۔ "سارا زور میں نے لگایا... تم خاصے حرام خور ہو۔"

نقاب پوش نے حلق سے حقے جیسی آواز نکالی... جو غصّے کے اظہار کا ایک انداز تھی۔ کسی بے چہرہ آدمی سے بات کرنا بڑا عجیب لگتا تھا۔

"میں تمہاری صورت دیکھنے کے لیے بے چین ہوں۔" میں نے کہا۔ "تم یا تو بہت بدصورت ہو کہ چہرہ نہیں دکھاتے... یا اتنے خوب صورت ہو کہ نظر لگ جانے سے ڈرتے ہو۔"

"ابھی چلو سائیں۔" دوست محمد نے جھلّا کے کہا۔ "اس سے کیا پوچھ رہے ہو... جو پوچھنا ہے ہم سے پوچھنا۔"

میں پھر آگے بیٹھ گیا۔ "سیٹھ چاند بھائی کا کیا حال ہے؟" میں نے بے نیازی کا انداز برقرار رکھتے ہوئے اچانک کہا۔

دوست محمد چونکا۔ "تم کیا جانتے ہو، اس کے بارے میں؟"

میں نے ایک مصنوعی قہقہہ مارا۔ "وہ اپنا یار ہے... اپنا نیکر بدل بھائی ہے۔"

"نیکر بدل بھائی؟" دوست محمد نے کہا۔

"ہاں! جیسے دوپٹہ بدل کے عورتیں بہنیں بن جاتی ہیں۔"

میں نے کہا: "میں اور تمہارا سیٹھ چاند بھائی موٹا والا بچپن میں نیکر بدل کے بھائی بن گئے تھے۔ پہلے وہ اتنا موٹا نہیں تھا کہ میں اسے موٹا بھائی کہتا۔ اب تو سنا ہے کھا کھا کے سؤر ہو گیا ہے۔ ہم تو چندا کہتے تھے۔ اب چاند نکل آئی ہے تو چاند بھائی ہو گیا۔ ایک نہ ایک دن سب کو گنجا ہونا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے تم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے ہو ملنگ سائیں۔" دوست محمد نے اطمینان کی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

ابھی تک ہمارا راستہ وہی تھا جس پر چل کے میں اور اکرام یہاں تک پہنچے تھے۔ پھر نہ جانے کہاں سے راستہ بدل گیا۔ ابھی مجھے کراچی آئے جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے تھے۔ مجھے سب سڑکیں ایک جیسی لگ رہی تھیں۔ دونوں جانب کارخانے تھے۔ کچھ رات کے وقت غیر آباد تھے... کچھ میں زندگی کے آثار محسوس ہوتے تھے۔ سڑکیں سنسان تھیں۔ کبھی کبھار کوئی ٹرک مال سے بھرا ہوا گزر جاتا تھا۔

"دوست محمد... تم مجھے اغوا کر کے کہاں لے جا رہے ہو۔ اور کیوں لے جا رہے ہو؟" میں نے کہا۔

"آرام سے بیٹھو۔ ابھی سب معلوم ہو جائیں گا۔"

"اس سیٹ پر آرام سے کوئی کیسے بیٹھ سکتا ہے جس کے اسپرنگ نکلے ہوئے ہیں اور جس میں کھٹمل اگ رہے ہیں۔ لیکن یہ جو دو موت کے فرشتے پیچھے بیٹھے ہیں، یہ مجھے پاگل لگتے ہیں۔ ان سے خطرہ ہے کہ خواہ مخواہ مجھے گولی نہ مار دیں۔"

"یہ پاگل نہیں ہیں۔" دوست محمد میرا تمسخر اڑانے کے انداز میں بولا۔

"پاگل نہ ہوتے تو جراب کو پیروں میں پہنتے... سر پہ نہ پہنتے۔ یہ ضرور پاؤں پر پگڑی باندھتے ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "ویسے یہ اپنا چاند بھائی کیسا آدمی ہے؟ تم تو جانتے ہو۔"

وہ پھر چونکا۔ "معلوم ہو جائیں گا تمھیں بھی۔"

"ہاں... ویسے میرا خیال ہے کہ اچھا ہی ہو گا۔" میں نے اظہارِ خیال کیا۔ "ورنہ رابعہ اس کے پاس کیوں ٹھہرتی... اور خیریت سے کیوں ہوتی۔"

"تم چپ نہیں بیٹھ سکتے!"

"نہیں دوست... یہ ایک بیماری ہے۔" میں نے کہا۔ "ایک بیماری ہوتی ہے جوع البقر... آدمی ہر وقت کھاتا رہتا ہے۔ رعشے کی بیماری میں ہر وقت ہلتا رہتا ہے۔ ایسے ہی میری زبان خراب ہو گئی ہے۔ اللہ کا شکر ہے دماغ خراب نہیں ہوا۔ زبان چلتی رہے تو کوئی حرج نہیں۔ دماغ چل جائے تو..."

"خدا کے لیے چپ کرو، ورنہ ہمارا دماغ گھوم جائیں گا۔" دوست محمد نے دہاڑ کے کہا۔

میں صرف یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ میرے دشمن ہیں تو کتنے خطرناک ہیں۔ لیکن وہ مجھے برداشت کر رہے تھے تو اس سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ خود کچھ بھی نہیں ہیں... نہ دوست ہیں نہ دشمن... وہ مجھے کہیں لے جا کے پیش کر دینے پر مامور تھے۔ غالباً سیٹھ چاند بھائی کی خدمت میں۔

اور میرا یہ قیاس کچھ دیر بعد حقیقت میں بدل گیا۔ گاڑی نے ایک موڑ کاٹا تو سامنے اندھیرے آسمان کے نیم روشن پس منظر میں کالے پہاڑوں کی لکیر سی نظر آنے لگی جو دائیں بائیں پھیلی ہوئی تھی اور لہروں کی طرح نشیب و فراز رکھتی تھی۔

"لو... ہم مری آ گئے۔" میں نے خوش ہو کے کہا۔ "بہت اچھا سیزن ہے۔"

"یہ منگھو پیر کا پہاڑ ہے۔" دوست محمد بولا۔

"کون سا پیر!" میں نے حیران ہو کے کہا۔ "اور یہ پہاڑ انھوں نے خریدا تھا یا بنایا تھا؟"

"پیر سائیں کے بارے میں تم بکواس کریں گا تو ہم گولی مار دیں گا تم کو..." دوست محمد مشتعل ہو گیا... "اور بول دیں گا سیٹھ کو کہ سالا بھاگتا تھا۔"

"معاف کرنا دوست، دوست محمد۔" میں نے خجالت سے کہا۔ "میرا مقصد تمھارے جذبات کو مجروح کرنا نہیں تھا... حقیقت یہ ہے کہ میں ایک بے علم، بے بصیرت اور بے فیض شخص ہوں۔"

"ادھر پیر سائیں کا مزار پر جا کے دیکھو۔" وہ میری معذرت سے مطمئن ہو گیا۔ "کتنا خلقِ خدا آتا ہے۔ گرم پانی نکلتا ہے پہاڑ سے اور اس میں جو نہاتا ہے اس کا ہر بیماری ٹھیک ہو جاتا ہے۔ خارش ہو، داد، چنبل، کوڑھ... اور ادھر پیر صاحب کا تابعدار مگرمچھ ہے۔ سب ان کو کھانے کو دیتا ہے۔ وہ کسی کو کچھ نہیں بولتا۔"

"ایک مگرمچھ ہے؟"

"نہیں... بہت ہے۔" وہ بولا اور گاڑی کو اچانک ایک گیٹ کی جانب موڑ لیا جو کھلا ہوا تھا۔ اس ویران علاقے میں یہ واحد کوٹھی نہیں تھی۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے سے یہاں اور بھی کوٹھیاں بنی ہوئی تھیں اور زیرِ تعمیر کوٹھیوں کی تعداد دیکھ کے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ زیرِ تعمیر کوئی نئی آبادی ہے جہاں سب متمول لوگ رہیں گے۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ناظم آباد کا علاقہ تھا۔

مختصر سا راستہ طے کر کے کار رک گئی۔ اس کے سامنے

ایک اور کار پہلے سے موجود تھی۔ اندر باہر بہت سی خوب صورت لائٹس روشن تھیں مگر عقبی حصے کی کھڑکیاں تاریک تھیں اور ان کے باہر نکلے ہوئے ونڈو ایئر کنڈیشنر رات کی خاموشی میں زیادہ ہی آواز دیتے محسوس ہو رہے تھے۔

میرے حساب سے وہ کوٹھی ایک کنال کی تھی۔ یہ لاہور کا حساب تھا۔ ابھی تک میں کراچی کے مربع گز والے پیمانے سے آشنا نہیں ہوا تھا۔ تاہم میرا اندازہ زیادہ غلط بھی نہیں ثابت ہوا۔ وہ چھ سو گز کا پلاٹ تھا۔

برآمدے میں منقش پیتل اور کرسٹل کی آب و تاب رکھنے والا ایک فانوس معلق تھا۔ گاڑی رکنے کی آواز سنتے ہی اندر کا ایک دروازہ کھلا اور ساڑھے چھ فٹ قد کا بے حد توانا جسم والا ایک پٹھان چوکیدار برآمد ہوا۔ شملۂ دستار کے ساتھ اس کی مجموعی بلندی ساڑھے سات فٹ بنتی تھی۔ اس نے گھیردار شلوار کے اوپر قمیص واسکٹ اور واسکٹ پر کارتوسوں کی نمائشی بیلٹ سجا رکھی تھی۔ نمائشی اس لیے کہ اس بیلٹ سے دہشت کا تاثر تو قائم ہوتا تھا مگر وہ پرانے وقتوں کے فیشن کی چیز تھی۔ جو اسلحہ اس کے کندھے پر بیلٹ سے لٹک رہا تھا وہ بہت جدید تھا۔ اس میں کارتوس استعمال نہیں ہوتے تھے۔

"السلام علیکم۔" میں نے پٹھان چوکیدار سے پُرجوش مصافحہ کیا جیسے ہم پرانے بچھڑے ہوئے دوست ہیں۔ "منگا حال دے؟"

"پخیر راغلے۔" پٹھان نے خوش اخلاقی سے ہاتھ ملایا اور پشتو بولا۔ "راشا... ما سرا راشا۔"

اتنی پشتو مجھے نہیں آتی تھی مگر ہاتھ کے اشارے سے میں سمجھ گیا کہ وہ مجھ سے اندر چلنے کی درخواست کر رہا ہے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ منکر نکیر غائب ہو چکے تھے جو مجھے یہاں تک لائے تھے۔

پٹھان چوکیدار دروازہ کھول کے منتظر تھا کہ میں اندر جاؤں۔ اس نے کہا۔ "سے گورئے؟" جس کا میں خاک مطلب نہیں سمجھا چنانچہ میں نے نفی میں سر ہلایا اور اندر چلا گیا۔ دوست محمد میرے ساتھ رہا اور میری زبان دانی پر متحیر نظر آتا رہا۔

اندازِ آرائش کی شان و شوکت پر اب میں حیران نہیں ہوتا۔ یہ سب لوگ جو ناجائز اور لامحدود ذرائع آمدنی رکھتے تھے، اپنی دولت مندی کی نمائش میں ایک دوسرے پر سبقت لے جا کے خوش ہوتے تھے اس لیے ان کے ذوقِ جمال کو قابلِ ستائش نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔

"استا کتسا ئے دلتہ۔" چوکیدار اب مجھے باقاعدہ اپنا ہم زبان سمجھ کے مادری زبان میں گفتگو پہ آمادہ تھا۔ ایک بار پھر میں نے ہاتھ کے اشارے سے سمجھ لیا کہ وہ مجھے تشریف رکھنے کو کہہ رہا ہے اس کے ہاتھ کا اشارہ ایک صوفے کی طرف تھا۔

صوفے پر بیٹھ کے میں نے بہت عجیب محسوس کیا کیونکہ میرے جسم پر وہی لباسِ فقیری تھا جو راجا کی یونیفارم سمجھا جا سکتا ہے۔ یونیفارم بھی ڈیوٹی کے وقت پہنی جاتی ہے اور راجا بھی یہ کپڑے ڈیوٹی پر ہی زیب تن کرتا تھا۔ لیکن میں ایک انتہائی بیش قیمت سامان سے سجے ہوئے بے حد قیمتی آرام دہ اور امپورٹڈ صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ صرف اس لیے کہ میں فقیر نہیں تھا۔ اصل فقیر اس لباس میں شاید گیٹ سے اندر قدم رکھتا تو پٹتا۔

دوست محمد میرے دائیں ہاتھ پر بیٹھ گیا اور مجھے گھورنے لگا۔ میں نے سینٹر ٹیبل پر رکھے ہوئے سنہرے میوزیکل باکس کا بٹن دبایا۔ اس میں جلترنگ سی بجنے لگی اور ایک سگریٹ باہر آ گیا۔ میں نے سگریٹ نکالا تو موسیقی بند ہو گئی۔ باکس سے منسلک لائٹر ایک سنہرے رنگ کا مجسمہ تھا جو امریکی "مجسمۂ آزادی" کی طرح مشعل اٹھائے ہوئے تھا۔ دراصل یہ اسی کا نمونہ تھا... میں نے دوسرا بٹن دبایا تو مشعل روشن ہو گئی۔ میں نے سگریٹ جلا کے بٹن چھوڑا تو مشعل بجھ گئی۔ میرے خیال میں وہ دونوں چیزیں خالص سونے کی بنی ہوئی تھیں۔ میرے غریب وطن کا عام شہری جس نے اپنے گاؤں یا اپنے قصبے اور اپنے شہر کی گلی سے آگے کی دنیا نہیں دیکھی یہ تصور بھی نہیں کر سکتا کہ دولت مندی کی انتہا کہاں ہے اور اس کو خرچ کرنے کے لیے انھیں کیا کیا جتن کرنے پڑتے ہیں جن کے پاس یہ دولت اسی طرح پھیل رہی ہے جیسے ناقابلِ علاج کینسر پھیلتا ہے۔ میں نے فرانس میں ہزاروں ڈالر کی پرفیوم کی ننھی سی شیشی دیکھی تھی تو میں حیران ہوا تھا۔ پھر میں نے سوئٹزرلینڈ میں خالص سونے کے بنے ہوئے شیونگ سیٹ دیکھے جن کے خصوصی پلاٹینم کے بلیڈ تھے اور گھڑیاں دیکھیں جن میں ہندسوں کی جگہ بیش قیمت ہیرے جڑے گئے تھے۔ جرمنی میں آرڈر پر بننے والی وہ کاریں دیکھیں جن کی باڈی سونے کی ہوتی تھی تو لائننگ خالص پلاٹینم کی تو میں نے حیران ہونا چھوڑ دیا۔ اسی زمانے میں ایک پرنس فرانس میں کار کے حادثے میں مارے گئے تھے۔ موصوف کے ساتھ ایک بے حد حسین فرانسیسی نژاد ماڈل گرل تھی۔ وہ بھی اس حادثے میں ہلاک ہوئی۔ اس کے دو جوتوں میں سے ایک جوتا ملا تو معلوم ہوا کہ اس میں ڈھائی لاکھ ڈالر یا پونڈ کے جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ دوسرا جوتا لے کر کوئی جائے واردات سے فرار ہو گیا۔ غالباً اس کی سات نسلیں خوشحال ہو گئی ہوں گی اس جوتے کے طفیل...

یہاں مسجدوں سے جوتے چُرانے والے پکڑے جاتے ہیں۔

میرے خیالوں کو ایک شخص کی آمد نے منتشر کر دیا۔ وہ چالیس بیالیس سال کا آدمی تھا جس کی شخصیت کو پُرکشش کہا جاسکتا تھا۔ اس کے بال گھنے سیاہ تھے مگر کنپٹیوں پر سفیدی نمودار ہوگئی تھی۔ اس کا چہرہ صحت مند اور دوستانہ جذبات کی مسکراہٹ سے روشن تھا۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں بھی ذہانت کی چمک تھی، لیکن سب سے عجیب بات یہ تھی کہ وہ اپنے ہی گھر کے ڈرائنگ روم میں مجھ سے ملنے کے لیے بہترین سوٹ اور ٹائی کے ساتھ آیا تھا... یا تو وہ اس رکھ رکھاؤ کا عادی تھا یا کہیں جانے کے لیے تیار ہوا تھا۔

"مسٹر سکندر بخت..." اس نے ہاتھ ملا کے کہا۔ "کیا پیو گے یا کھاؤ گے...؟ نو تکلف۔"

"اگر کوئی پرابلم نہ ہو۔" میں نے سوچ کے کہا۔ "تو میں کافی کے ساتھ چکن اینڈ ایگ سینڈوچ کھاؤں گا... بلیک کافی۔"

"نو پرابلم..." اس نے کہا اور صوفے کی سائڈ پر لگے ہوئے ایک بٹن کو دبایا۔ اس کے دوسرے بٹن اسٹریو میوزک سسٹم کے تھے۔

"یس سر!" صوفے کی پشت سے آواز آئی۔

"کافی بلیک... سینڈوچز..." اس نے مختصراً کہا اور بٹن چھوڑ دیا۔ میں نے بالکل کسی فرسٹ کلاس ریسٹورنٹ کے کسٹمر کی طرح آرڈر دیا تھا اور اس نے ہیڈ ویٹر کی طرح تعمیل کی تھی۔ میں نے یہ اعتراض بدتہذیبی سمجھا کہ اس نے صرف سینڈوچ کیوں کہا۔ دوست محمد کے لیے میرا اعتماد اور انداز باعثِ حیرت ثابت ہو رہا تھا۔

ابھی تک میں طے نہیں کر پایا تھا کہ وہ کون ہے۔ سیٹھ چاند بھائی موٹا والا تو بہت بڑا اسمگلر تھا لیکن اپنے نام اور حلیے سے وہ ایسا نہیں ہوسکتا تھا چنانچہ مجھے پوچھنا پڑا۔

"آپ تو مجھے جانتے ہیں... مگر..."

"میں سیٹھ چاند بھائی موٹا والا ہوں۔" اس نے سوال کا مطلب سمجھ کے اور مسکرا کے کہا۔

میں دم بخود رہ گیا۔ "آپ کو اپنا نام پہلی فرصت میں بدل لینا چاہیے۔ اس سے بڑا دھوکا ہوتا ہے۔"

"نام میں کیا رکھا ہے مسٹر سکندر بخت۔" وہ بولا۔ "آخر تم بھی تو شیر خان تھے... اور معلوم نہیں آج کل کیا ہو... مجھے تو یہ بھی معلوم ہے کہ یہ تمھارا حلیہ نہیں ہے... تم نام اور حلیے دونوں بدلنے کے ماہر ہو۔"

"میں یہ تسلیم کرلیتا ہوں کہ میرے بارے میں تمھاری معلومات مکمل ہوں گی۔" میں نے کہا۔

"وہ کیوں؟"

"تم جیسے لوگوں کے وسائل سی آئی اے یا کے جی بی سے کم نہیں ہوتے اور ہم جیسے تو دنیا میں بس جھک مار رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ورنہ یہ دنیا تو درحقیقت آپ جیسے گنے چنے لوگوں کی ملکیت ہے۔ اصل میں تو اپنی مرضی سے اور خوشی سے آپ ہی کی کلاس زندگی گزارتی ہے۔ باقی سب جینے پر مجبور ہیں۔"

"میں اس سے اتفاق کرتا ہوں۔" وہ غیر جذباتی لہجے میں بولا۔ "کیا تم تقدیر کے فلسفے کو نہیں مانتے؟"

میں گڑبڑا گیا۔ "میرے ماننے یا نہ ماننے سے..."

"میں مانتا ہوں۔" اس نے میری بات بڑے اعتماد سے کاٹ دی۔ "ہر شخص کو دنیا میں وہی ملتا ہے جو اس کے مقدر میں ہو۔ اچھے بُرے کا معیار بھی بدلتا ہے، جائز ناجائز کا بھی۔ اس سے مجھے کوئی غرض نہیں کہ تم یا کوئی اور مجھے کیا سمجھتا ہے اور میرے اعمال، میرے انجام اور میری عاقبت کے بارے میں کیا رائے یا فتویٰ دیتا ہے۔ آئی آل وان دی پریزنٹ۔ ماضی سے میں سروکار نہیں رکھتا اور مستقبل کے خیال سے پریشان نہیں ہوتا۔"

"تم نے جتنا مجھے حیران کیا ہے اس سے زیادہ متاثر کیا ہے۔ یہ اچھی بات ہے کہ تم سچ بولتے ہو اور سچ کو مانتے ہو۔ میں منافقوں سے سخت نفرت کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اب کیا ہم اصل بات کریں؟"

"ٹیک اِٹ ایزی۔" وہ بولا۔ "جلدی کیا ہے؟"

اس سے پہلے کہ میں جلدی کا سبب بتاتا ایک لڑکی ٹرالی کو بڑی نزاکت سے دھکیلتی ہوئی میرے سامنے لے آئی... بہت خوب صورت اور جوان لڑکی تھی لیکن وہ انڈین یا پاکستانی نہیں تھی۔ وہ یورپین یا یوریشین نسل کی لڑکی تھی جس نے ریشمی چوڑی دار پاجامہ قمیص سوٹ کے ساتھ پہن رکھا تھا اور بڑے سلیقے سے دوپٹا بھی دونوں شانوں پر ڈال رکھا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں چوڑیاں تھیں اور آنکھوں میں سرمہ تھا۔ میں احتراماً کھڑا ہونے ہی لگا تھا کہ چاند بھائی نے کہا۔

"پلیز سِٹ ڈاؤن... شی از اونلی اے میڈ۔" (تشریف رکھیے... یہ تو ایک معمولی خادمہ ہے۔)

خجالت اور حیرت سے میرا بُرا حال ہوگیا۔ "میں... میں سمجھا تھا کہ یہ تمھاری مسز ہوں گی۔"

لڑکی نے جو جھک کر کافی انڈیل رہی تھی ایک ادائے ناز سے اپنے سنہرے ریشمی بال ہٹائے اور مجھے بڑی عجیب نظروں سے دیکھا۔ اس کی نیلی آنکھوں میں دُکھ بھی تھا، حسرت بھی تھی... کہ اے کاش ایسا ہی ہوتا جیسا تم نے کہا۔ اور میرے لیے ملامت بھی تھی کہ تم نے ایسا کیوں سمجھا جو میری مزید تذلیل کا سبب بنا۔

چاند بھائی نے خندۂ استہزا کے سوا میری بات کا جواب کچھ نہیں دیا۔ جب وہ کافی رکھ کے چلی گئی تو اس نے کہا۔

"میرے پاس گھریلو کام کاج کرنے والی سب خادمائیں امپورٹڈ ہیں۔ ایک انگلش... دو فرنچ... ایک ڈچ۔"

"یہ آپ اس کلاس کی نمائندگی کر رہے ہیں جو دیسی ہوا میں بھی مجبوراً سانس لیتی ہے ورنہ ان کے لیے فضا، سورج کی روشنی اور وہ مٹی تک امپورٹ ہو جس میں ان کو ملنا ہے، یا اپنے کمپلکس کی تشہیر کر رہے ہیں؟" میں نے تلخ طنزیہ لہجے میں کہا۔

"یس... مجھے ایک کمپلکس ہے۔ مگر وہ کلاس کمپلکس نہیں ہے۔" وہ بولا۔ "میں ان سفید چمڑی والوں کی منڈی سے غلام اور کنیزیں حاصل کرتا ہوں۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ نوآبادیاتی نظام ختم ہو جانے کے بعد بھی رنگ دار غلاموں کی خرید و فروخت کر رہے ہیں۔ کھلے بندوں۔ انھوں نے افریقہ کو اپنی منڈی بنا رکھا ہے اور ایشیا کے پسماندہ ممالک کو بھی وہ سب گھٹیا کام جو یہ ہم سے لیتے رہے ہیں اور لیتے ہیں، میں ان سے لیتا ہوں... اور جو تذلیل آمیز رویّہ ان کا رہا ہے، وہی میں بھی روا رکھتا ہوں۔ وہ کالوں سے نفرت کرتے ہیں، میں گوروں سے نفرت کرتا ہوں... کیا اس میں کوئی برائی ہے؟"

میں ہکا بکا بیٹھا تھا۔ "برائی... ہاں... برائی تو برائی ہی رہے گی... نفرت کرنا یا تعصب رکھنا ایک برائی ہے۔"

"ہوگی۔" وہ بے پروائی سے بولا۔ "میں ایسی اخلاقیات میں نہیں پڑتا اور تمھیں یہ بھی بتاؤں... میں ان کی نسل کو خراب کر رہا ہوں... جیسے انھوں نے یہاں اینگلو انڈین کلاس پیدا کی۔ یہ ایک انتقامی ردِعمل ہے... ویری پرسنل۔"

میں نے حیرانی سے سر ہلایا۔ "ایک زمانہ تھا۔ جب میں لندن میں زیرِتعلیم تھا... تو میرا طرزِعمل بھی یہی تھا۔ یہی رویّہ تھا لیکن وہ ناپختہ شعور کا دَور تھا۔"

"مجھے معلوم ہے۔" وہ بولا۔ "پلیز، کھانا جاری رکھو۔"

"تم یہ سب مجھے کیوں بتا رہے ہو؟"

"میں نہیں چاہتا کہ تم میرے بارے میں کوئی غلط تاثر قائم کرو۔" وہ سگریٹ سلگا کے بولا۔ "یہ سمجھو کہ میں نے اس بہانے ایک حرم آباد کرلیا ہے اور انتقام کے پس پردہ عیاشی مقصود ہے۔ اس کے لیے مجھے بہانے کرنے کی تو ضرورت ہی نہیں تھی۔ میں یورپ کے ہر ملک میں رہتا ہوں اور کوئی پارسا نہیں ہوں۔ شرافت کا دعویٰ تک نہیں کرتا... تم نے چوکیدار کو دیکھا؟ وہ پاکستانی ہے اور میں اسے بہت زیادہ عزت دیتا ہوں۔ وہ میرا دوست اور باڈی گارڈ ہے۔ میری پرسنل سیکریٹری کوئی نہیں۔ میں نے شادی بھی نہیں کی کیونکہ پھر میں صرف ایک بیوی سے وفاداری کے ضابطۂ اخلاق کا پابند ہو جاتا جو میرے لیے ناممکن تھا۔ میں اسے فریب دیتا... وہ مجھے فریب دیتی اور یہ بھی مجھ سے برداشت نہ ہوتا۔"

دوست محمد بالکل خاموش بیٹھا ہوا تھا اور اس نے کافی بھی نہیں پی تھی بلکہ مجھے بلیک کافی پیتا دیکھ کے ایسا بُرا منہ بنایا تھا جیسے یہ تلخ مشروب اس کے حلق میں اتر رہا ہے۔

میں جاننا چاہتا تھا کہ مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے اور وہ نقاب پوش کون تھے۔ چاند بھائی اتنا بڑا اسمگلر ہے اور بہت خطرناک سمجھا جاتا ہے تو اس کی شخصیت میں یہ تضاد کیوں ہے۔ وہ اچھا خاصا تعلیم یافتہ، مہذب اور بااصول آدمی بھی تھا اور دوسری طرف اخلاق اور قانون اور مذہب میں جرم و گناہ کا درجہ رکھنے والے ہر فعل میں بھی ملوث تھا۔ اس کو پیسے کی کمی نہیں تھی۔ پھر وہ اسمگلنگ ہی کیوں کرتا تھا۔ میں اس سے رابعہ کے بارے میں بھی پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ لیکن اس کی باتوں نے مجھے مطمئن کر دیا تھا کہ ذاتی سطح پر وہ میرا دشمن نہیں دوست ہے چنانچہ میں یہ بھی جاننا چاہتا تھا کہ دوستی کے ان جذبات کی بنیاد تو مشترک نہیں ہے؟ بالکل اسی طرح جیسے نسلی تعصب کے خلاف اس کے اور میرے رویّے میں ایک قدر مشترک تھی۔

"کیا تم شادی کے قائل ہی نہیں... میرا مطلب ہے ایک روایتی فیملی انسٹی ٹیوشن کے؟" میں نے کہا۔ "ہر دولت مند کو ایک وارث کی ضرورت تو پڑتی ہے۔"

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "بہت جلد میں شادی کروں گا۔ اور کسی بہت معزز اور شریف گھر کی لڑکی سے... مڈل کلاس میں اخلاق و کردار... عصمت و عفت کا اور شوہر پرستی کا جو تصور ہے اس میں بڑی کشش ہے میرے لیے۔ میری بیوی اسی طبقے کی روایات کے مطابق رہنے والی بیوی ہوگی۔ اور تم نے ٹھیک کہا۔ مجھے ایک وارث کی ضرورت نہ ہوتی تو میں بیوی کے چکر میں نہ پڑتا۔ ایک مظلوم و بے زبان اللہ میاں کی گائے قسم کی ذہین چندے آفتاب چندے ماہتاب اور سلیقہ شعار لڑکی کو اس محل میں قید کر کے ڈالنا مجھے پسند تو نہیں لیکن مجبوری ہے۔ اور اتفاق ہے کہ انھی دنوں میں ایک لڑکی ملی بھی ہے۔"

"تمھاری زبان اور تمھارا لہجہ..." میں نے کہا۔ "تمھارے

نام سے کوئی نسبت نہیں رکھتا۔"

"یہ میرا کاروباری نام ہے۔" وہ بولا۔ "بالکل اسی طرح جیسے اداکاروں کے فلمی نام ہوتے ہیں اور لکھنے والوں کے قلمی نام ہوتے ہیں۔ اصل نام کچھ اور ہوتا ہے۔" وہ بولا "تم تو سمجھتے ہو نا کہ جیسے فلمی دنیا میں 'کمار' بہت چلتا ہے۔ دلیپ کمار... اشوک کمار' کشور کمار' منوج کمار۔ یہاں تک کہ ہمارے ملک میں سنتوش کمار... تو یہاں ایسے کاروباری نام بہت مقبول ہیں۔ گڈوِل رکھتے ہیں اور کامیابی کی ضمانت فراہم کرتے ہیں۔"

"اب تو خیر تم پاکستانی ہو میری طرح... لیکن تمھارا تعلق کس شہر سے ہے؟" میں نے کہا "یہ ایک ایسا سوال ہے جس سے میں بھی چڑتا ہوں۔ لیکن میں ابھی تک تمھارے بیک گراؤنڈ کا تعین نہیں کر سکا۔"

"میرا بیک گراؤنڈ۔" وہ سوچ کے بولا۔ "میرا کوئی بیک گراؤنڈ نہیں۔ میری ایک ماں تھی۔ میں نے اُسے دیکھا نہیں۔ یقیناً کوئی باپ بھی ہوگا۔ اُسے بھی میں نہیں جانتا... ممکن ہے وہ دونوں زندہ ہوں... یا نہ ہوں... میری پرورش کانونٹ میں ہوئی۔ اُسے تم عیسائی مشن کا یتیم خانہ کہہ سکتے ہو۔ جہاں لاوارث بچے قبول کیے جاتے ہیں اور انھیں تربیت کے لیے بہترین ماحول فراہم کیا جاتا ہے۔ یہی ایک فرق ہے ہمارے اور ان کے یتیم خانوں میں۔ وہ ہر بچے کو معصوم فرشتہ سمجھ کے رکھتے ہیں اور اسے ایک راسخ العقیدہ کرسچن بنا دیتے ہیں جو اسلام سے ہی نہیں مسلمانوں سے بھی نفرت کرتا ہے۔ ان کی تعلیمات سے' عقائد سے' روایات سے...۔"

اس نے اُٹھ کر ٹہلتے ہوئے اچانک گھڑی دیکھی اور کہا۔ "دوست محمد... تم جاؤ' آرام کرو۔ تم سے صبح ملاقات ہوگی۔" اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور کچھ نوٹ نکال کے اُسے تھما دیے۔ "معاف کرنا باتوں میں دیر ہوگئی۔"

"اپنا بہت ٹیم خراب ہوا صاحب۔" دوست محمد نے ناگواری سے کہا۔ "آپ لوگوں کا بات اپنی سمجھ میں نہیں آتا۔"

چاند بھائی ہنسا۔ "سوری یار' تم بور ہوتے رہے... اچھا دیکھو اگر کوئی باہر ہے...؟"

"ایک ٹیکسی والا پیچھے آیا تھا۔" دوست محمد نے کہا۔

"اسے کہو گھر جائے۔" چاند بھائی نے کہا۔

"وہ میرا دوست ہے۔" میں نے احتجاج کیا۔

"تو ہمارا کب دشمن ہے۔" چاند بھائی بولا۔ "اسے کہنا کہ فکر نہ کرے... سب خیریت ہے۔"

میں کچھ کہتے کہتے چُپ ہو گیا۔ دوست محمد بڑبڑاتا ہوا نکل گیا۔

"اچھا آدمی ہے۔ ذرا خبطی ہو گیا ہے اس عمر میں۔" چاند بھائی بولا۔

"کیا ہم سب خبطی نہیں ہوتے؟" میں نے کہا "خبط کی نوعیت جدا ہو سکتی ہے... لیکن تم اور میں اپنے اپنے خبط کا شکار ضرور ہیں۔"

"تم یہ کپڑے بدل لو۔" وہ بولا۔ "میں ایک گھنٹے بعد واپس آؤں گا... اگر تم سونا چاہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ورنہ ہم رات کو بات کریں گے۔" اس نے پھر بٹن دبا دیا۔

"جانے سے پہلے مجھے رابعہ کے بارے میں تو بتا دو۔" میں نے کہا۔ "وہ کہاں ہے؟"

لیکن اس نے میری بات کے جواب کو ضروری نہیں سمجھا۔ اور اس لڑکی سے مخاطب ہو گیا جو کال بیل پر اندر آ کے اور سر جھکا کے کھڑی ہو گئی تھی۔ یہ پہلے والی لڑکی نہیں تھی لیکن اپنے حسن و شباب کی غارت گری میں اس سے کسی طور کم نہ تھی۔ اس کے بال بھی بھورے تھے اور آنکھیں بھی بھوری تھیں۔ لباس اس نے بھی کنیزوں والا پہن رکھا تھا۔ یہ خیال مجھے اچانک آیا کہ چاند بھائی نے عمداً انھیں شاہی دور کی کنیزوں والا لباس دے کر ان کی حیثیت کے ظاہر کو بھی بدل ڈالا ہے۔ اگر ان کے اختیار میں ہوتا تو وہ یورپ کی ماڈل گرل نظر آنے کے لیے وہ لباس پہننا پسند کرتیں جو کم سے کم لباس ہو اور زیادہ سے زیادہ فیشن۔ اس نے پہلی کنیز کو نام سے نہیں پکارا تھا مگر اس لڑکی کو اس نے 'مرجانہ' کہہ کے مخاطب کیا اور اس سے فرانسیسی زبان میں بات کی۔ یہیں وہ مار کھا گیا۔ اس نے میرے بارے میں بہت کچھ سنا' پڑھا اور معلوم کیا تھا لیکن ان سب معلومات جو اسے حاصل ہوئیں' میری 'مصروفیات' سے تعلق تھا۔ کوئی کیسے بتا سکتا تھا کہ سکندر بخت فرنچ بھی سمجھتا ہے۔ صرف محسن ہی وہ شخص تھا جس کے ساتھ میری فرنچ میں گفتگو ہوتی تھی لیکن وہ بھی ہر جگہ نہیں۔ خاص مواقع پر جب رازداری کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ ہم فرنچ میں وہ کہہ دیتے تھے جو انگریزی یا اُردو میں نہیں کہہ سکتے تھے۔

اس نے مرجانہ سے کہا۔ "یہ میرا مہمان ہے چنانچہ اس کی خاطر تواضع میں کسی قسم کی کوتاہی یا کمی ہوئی تو میں ہنٹر سے تمھاری کھال اُدھیڑ دوں گا' سفید فام کتیا... تم اس کو ناراض نہیں کرو گی خواہ یہ تم سے جان مانگے... جسم کے بعد"

"آپ مطمئن رہیں جناب۔" لڑکی نے ایسے عاجزانہ ملائم لہجے میں کہا کہ مجھے اس کے انکسار میں شدید ترین نفرت کے زہر کی تلخی اور اس کے لہجے کی نرمی میں وہ کاٹ محسوس ہوئی جو بلیڈ کی دھار میں ہوتی ہے۔ خود چاند بھائی نے گفتگو کا جو لہجہ اختیار کیا تھا وہ بے حد شریفانہ اور مہذب تھا۔ اگر میں فرنچ نہ سمجھتا تو مجھے معلوم ہی نہ ہوتا کہ اتنی نرمی سے وہ کتنی سخت بات کہہ گیا۔

"اور ہاں۔" اس نے دروازے کا رُخ کرتے ہوئے مسکرا کے کہا۔ "اگر یہ کوئی سوال کرے۔ خصوصاً اس عورت کے بارے میں جو کل شام بھی یہاں آئی تھی' میں اس کا نام لینا ضروری نہیں سمجھتا' یہاں بہت عورتیں آتی ہیں مگر میں تم سے جس عورت کی بات کر رہا ہوں' وہ عام عورت نہیں ہے۔ یہ بات تم جانتی ہو۔"

"میں جانتی ہوں جناب...۔"

"تم اُسے کچھ نہیں بتاؤ گی... اگر تم نے بتایا تو مجھے معلوم ہو جائے گا اور پھر تمھیں اندازہ نہیں کہ تمھارے ساتھ یا مارسیلز میں کسی اور کے ساتھ کیا ہو سکتا ہے۔"

میں نے لاتعلقی کا انداز برقرار رکھتے ہوئے کن انکھیوں سے اس لڑکی کو دیکھا۔ آخری دھمکی پر اس کا رنگ اڑ گیا تھا اور نہ جانے کیوں میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ لڑکی کا وجود خوف کی سرد لہر سے کانپ اُٹھا ہے۔ مارسیلز میں کون تھا جس کا حوالہ یوں دیا گیا؟ میں نے سوچا۔ کیا چاند بھائی کے ہاتھ اتنے لمبے ہیں کہ سات سمندر پار کسی کی گردن تک پہنچ جاتے ہیں؟ اور یہ سب لڑکیاں جو کنیزیں بنی ہوئی ہیں، درحقیقت خوف کی اسیر ہیں۔ چاند بھائی ان سے انتقام لے رہا ہے یا انھیں بلیک میل کر رہا ہے؟ ان کو اس نے سفید غلام زادیوں کی طرح اپنی دولت سے خریدا ہے یا طاقت سے دبوچ رکھا ہے؟

جب وہ چلا گیا تو میں نے سر کو جھٹکا اور گویا فضول خیالات کو جھٹک دیا۔ چاند بھائی یقیناً ایب نارمل تھا' نفسیاتی مریض تھا۔ ایک جینئس اگر منفی سوچ اختیار کرے تو بہت بڑا مجرم یا دہشت گرد بھی بن سکتا ہے۔ لیکن مجھے کیا پڑی ہے کہ میں اس پاگل آدمی کے پاگل پن کے اسباب اور نتائج کے چکر میں پڑوں۔ اتنی فرصت کہاں ہے میرے پاس کہ ان کنیزوں کے بارے میں سوچوں اور ان سے جذباتی ہمدردی کا اظہار کروں۔ مجھے اپنے کام سے کام رکھنا چاہیے۔ چاند بھائی یقیناً خطرناک آدمی بھی تھا۔ میں اس سے دشمنی مول لے کر کیا کروں گا یہی کیا غنیمت نہیں کہ یہاں میرے ساتھ اس کا رویہ دوستانہ ہے۔ اور اب مجھے اسی دوستانہ رویے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے رابعہ سے ملنا ہے اور کسی طرح اسے نکال کے لے جانا ہے۔

"کیا آپ میرے ساتھ آنا پسند کریں گے۔" اس لڑکی نے انگریزی میں کہا۔

"اوہ یس مرجانہ۔" میں نے چونک کر کہا۔ "کیا میں بہت دیر سے تم کو گھور رہا تھا؟ کوئی بات نہیں... تم ہو ہی ایسی چیز مگر گھورنے سے تمھارے حُسن کی آب و تاب کو کیا نقصان پہنچ سکتا ہے؟ اگر کوئی چاند کو گھورتا ہے تو کیا چاندنی میں فرق آتا ہے؟"

وہ مجھے پلکیں جھپکا کے دیکھتی رہی۔ غالباً وہ زیادہ انگریزی نہیں سمجھتی تھی اور میں نے تو شاعری کی ٹانگ توڑ دی تھی۔ تاہم جو بات ہر عورت ہر زبان میں سمجھ لیتی ہے' خواہ وہ عبرانی ہو یا گورمکھی۔ وہ اس نے بھی سمجھ لی۔ یہ حسن کی توصیف و ستائش کی زبان تھی جس کو سمجھنے کے بعد اس کے عارض پھر تازہ گلابوں کی مہک دینے لگے تھے۔

وہ مجھے ایک خواب گاہ میں لے گئی۔ یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ وہ خوابگاہ میرے جیسے فقیروں کے لیے نہیں بادشاہوں کے لائق تھی۔ دنیا کے سب سے اعلیٰ فائیو اسٹار ہوٹل کا سب سے اچھا کمرا بھی اس کی شان و شوکت کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

"یہ باتھ روم ہے۔ اس کے ساتھ ڈریسنگ روم ہے۔ اگر آپ کو میری مدد کی ضرورت ہو تو...۔"

"نہیں... وہ تو جب میں بہت چھوٹا تھا نا' تب اماں نہلاتی تھیں۔" میں نے گھبرا کے کہا۔ "اب میں خود نہا سکتا ہوں اور کپڑے بھی بدل سکتا ہوں۔"

وہ ہنس پڑی۔ "تم فقیر کیوں بنے ہوئے ہو؟"

"تم کنیز کیوں بنی ہوئی ہو مرجانہ؟" میں نے کہا۔

اس نے خوف زدہ ہو کے اِدھر اُدھر دیکھا۔ "اس بٹن کو آپ مجھے بلانے کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔" اس نے میری بات گول کرتے ہوئے کہا۔ میں سمجھ گیا کہ اس کمرے میں ہونے والی گفتگو کہیں سُنی یا ریکارڈ کی جا سکتی ہے۔

"کیا کبھی کسی نے تمھیں بتایا ہے کہ مرجانہ کون تھی؟"

"میری جوانا... یہ غالباً ایک نشہ ہوتا ہے۔" وہ بولی۔

"میری جوانا نہیں... مرجانہ...۔" میں نے کہا۔ "ویسے تو تم بھی نشے ہو... مگر اصل مرجانہ ایک کنیز تھی... علی بابا کی...۔"

"کون علی بابا؟"

"وہی... قاسم کا بھائی۔" میں نے کہا۔ "مرجانہ نے اپنی ذہانت سے چالیس چور ہلاک کیے تھے۔ یعنی جو کام علی بابا کے بس کا نہیں تھا' وہ مرجانہ نے کر دکھایا... اور... خیر یہ کہانی تو بہت لمبی ہے اور تم سُن کے کیا کرو گی... دوبارہ سوچنے پر میں محسوس کرتا ہوں کہ مجھے تمھاری... اور تمھاری مدد کی اشد

ضرورت محسوس ہو رہی ہے اور میں تمہارے پہلے سوال کا دوسرا جواب یوں دیتا ہوں کہ... یس... اِف یو پلیز۔" میں نے اُسے انگلی کے اشارے سے قریب بلایا اور پھر ہونٹوں پر انگلی رکھ کے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

میں نے فقیری چغہ اتار دیا تھا۔ نیچے میرے اپنے کپڑے تھے جو اتنے بُرے نہیں تھے کہ میں انھیں بھی اتار پھینکتا میں نے باتھ روم کا دروازہ کھولا اور زور سے کہا۔ "آج لُطف آئے گا ٹرکش باتھ کا۔" اور اُسے اندر کھینچ لیا۔

"ڈرو نہیں۔" میں نے سرگوشی میں فرنچ بولتے ہوئے کہا۔ اور دروازہ بند کر کے شاور چلا دیا۔

اس کی آنکھوں میں حیرت کے ساتھ خوف بھی شامل رہا۔

"کیا ہماری گفتگو کوئی سُن رہا ہے؟" میں نے اُس کے کان میں کہا۔

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "تم... تم کیا چاہتے ہو؟"

"مجھے بہت دُکھ ہوا تھا۔" میں نے کہا۔ "جس لہجے میں اس کتّے کے نیچے نے تم سے بات کی تھی۔ آخر وہ کیا سمجھتا ہے خود کو۔ اسے خواتین سے بات کرنے کی تمیز نہیں۔"

"پلیز... ایسی باتیں مت کریں یہاں۔" وہ رونے کے قریب ہو گئی۔

"تم کیوں ڈرتی ہو اس سے؟" میں نے کہا۔

"اس سے سب ڈرتے ہیں... تم بھی ڈرو۔"

مارسیلز میں تمہارا کون ہے؟" میں نے کہا۔

"سب... میرے گھر والے... ماں باپ... دو بہنیں... ایک بھائی... اور منگیتر... ہماری شادی ہونے والی تھی۔"

"دیکھو... خدا کے لیے ہسٹریا میں مبتلا مت ہو جانا۔" میں نے کہا۔ "اپنے آپ کو سنبھالو... تم سے ہمدردی کر کے میں تمہیں نقصان پہنچانا نہیں چاہتا۔"

"فرانس میں ہی نہیں، پورے یورپ میں اس کے مراسم مافیا کے ایجنٹوں سے ہیں۔" وہ آنسو پی کے رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

"اور ان کے ذریعے...؟"

"ان کے ذریعے اس نے مجھے... میرے خاندان کو... سب کو بلیک میل کیا اور مجھے ایک سال کے لیے یہاں لے آیا... اپنی کنیز بنا کے... وہ ذلت دینے کے لیے جس کا میں سوچ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن میں یہ وقت صبر و شکر سے کاٹ رہی ہوں... دوسری سب لڑکیوں کی طرح... تاکہ باقی لوگ محفوظ رہیں اور میں واپس جا کے شادی کر سکوں۔ اگر میں نے احتجاج کیا... یا بغاوت کی... تو بہت بُرا ہو گا... یہ میں جانتی ہوں...

یہی وجہ ہے کہ میں ہنٹر کی مار بھی برداشت کر جاتی ہوں... کیا تم دیکھو گے اس مہذب وحشی کا انتقام؟" وہ ایک دم پلٹی۔

"نہیں... پلیز... میں نہیں دیکھ سکتا۔" میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ "دیکھ لیا تو بھول نہیں سکوں گا۔"

"ایک لڑکی یہ سب برداشت نہیں کر سکی تھی۔ ایک دن اس کا حوصلہ جواب دے گیا۔ اس نے مزاحمت کی اور... حملہ کر دیا۔ اس کی لاش دیکھی تھی میں نے بھی۔" اس کا وجود لرزنے لگا۔

"کیا تمہاری عزت محفوظ ہے؟" میں نے الفاظ کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کے کیا۔

"ہاں... یہی ایک اچھی بات ہے۔ وہ صرف غلامی کی ذلت دیتا ہے اور بس...۔" وہ بولی۔ "کچھ لڑکیاں تو اسے بھی تذلیل سمجھتی ہیں کہ وہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کے بھی نہیں دیکھتا۔ مرد کی نظر سے دیکھتا ہی نہیں... حالانکہ وہ سب خوب صورت اور پُرکشش ہوتی ہیں۔ ان کو ایک سال قیدِ بامشقت کاٹنی پڑتی ہے۔ پھر ان کی جگہ دوسری آ جاتی ہیں۔"

"میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟" میں نے کہا۔

"کچھ نہیں... کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔" وہ بولی۔ "آٹھ مہینے گزر گئے ہیں۔ باقی چار بھی گزر جائیں گے۔"

"تمہارا یہ ظالم آقا ابھی کس عورت کی بات کر رہا تھا؟" میں نے اچانک سوال کر دیا۔

وہ چونکی لیکن خاموش رہی۔

"میں نے وہ ہدایات بھی سُنی تھیں۔ جو اس نے تمہیں دی تھیں۔" میں نے کہا۔

"پھر تو تمہیں مجھ سے یہ سوال کرنا ہی نہیں چاہیے تھا۔"

"دراصل... ایک اتنی ہی بڑی مجبوری میری بھی ہے۔" میں نے الفاظ کو چبا چبا کے کہا۔ "جتنی بڑی تمہاری... بس فرق سیکس کا ہے۔"

"مجبوری کی بھی سیکس ہوتی ہے؟"

"ہاں... کیوں نہیں ہوتی۔" میں نے کہا۔ "مثلاً تمہاری مجبوری مذکّر ہے اور میری مؤنث۔ وہ تمہارا منگیتر ہے جس کی خاطر تم اپنی سب سے بڑی چیز قربان کر رہی ہو... یعنی عزّتِ نفس... اور وہ میری منگیتر ہے جس کی خاطر میں یہ بھیس بدل کے گھومتا پھرتا یہاں تک آ پہنچا ہوں۔ مجھے شک نہیں، یقین ہے کہ وہ بھی یہیں قید ہے۔"

"اگر ہے تو تم اسے لے جا نہیں سکتے...۔"

"وہ کہتی ہے کہ... ہم دونوں کے لیے انتظار اور جدائی جھیلنا بالکل ناممکن ہے... ہم یا تو ایک ساتھ جی سکتے ہیں ورنہ اکٹھے مر سکتے ہیں... ہمارے لیے ایک ہی بات ہے... ہم زندہ رہ کر ہی ایک دوسرے کو چاہنے پر مجبور نہیں ہیں۔"

"یہ کیا بات ہوئی...؟ زندہ نہ رہنے کی صورت میں چاہت کہاں رہتی ہے؟" وہ بولی۔

رہتی ہے... یہی تو بات ہے جو تم مغرب والے نہیں سمجھتے۔ یہاں مشرق کی عاشقانہ روایات میں محبّت صرف جسم کی ہی نہیں ہوتی، روح کی بھی ہوتی ہے اور اس دنیا میں جسم کا وجود نہ رہے تو دوسری دنیا میں روحیں مل جاتی ہیں۔ اس عقیدے میں ہمارے لیے بہت سکون کا سامان ہے۔ چنانچہ ہم مر جانا پسند کرتے ہیں لیکن جدائی قبول نہیں کرتے۔" میں نے اسے ایک خود ساختہ نظریاتی فلسفے سے قائل کیا۔

"کیا یہ آواگون کا فلسفہ ہے؟" وہ کنفیوز ہو کے بولی۔

"لاحول ولاقوۃ... نہیں، وہ تو ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ روح کے سات جنم ہوتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور اس کا ایک مضحکہ خیز پہلو یہ بھی ہے کہ جسم سے ایک بار نکل جانے والی روح دوبارہ دنیا میں آتی ہے تو ضروری نہیں کہ اسی زمانے میں آئے یا اسی مقام کی پابند ہو... روح سو سال بعد کسی اور کے قالب میں نمودار ہو سکتی ہے۔ اس عقیدے کے مطابق تو یہ ہے کہ اس سال کی مس یونیورس فوت ہو جائے تو اس کی روح اگلے جنم میں ٹمبکٹو کے چڑیا گھر کے خرگوش میں ہو سکتی ہے یا افریقہ کے کسی آدم خور قبیلے کے سردار کے جسم میں بھی مل سکتی ہے۔ کچھ ایسی ہی خرافات ہیں۔ ہم تو روح کی ابدیت کے قائل ہیں... خیر... تم یہ سمجھ لو کہ مجھے میری محبوبہ نہ ملی تو میں یہیں اسی گھر میں تمہارے سامنے اپنا گلا کاٹ لوں گا۔ کسی بلیڈ سے یا کچن کی چھری سے... اور وہ اس گھر میں ہوئی تو اسی وقت وہ بھی تن سے اپنا سر دیوار پر مارے گی یا دونوں انگلیاں بجلی کے پلگ میں ڈال کے کھڑی ہو جائے گی اور ایسے ہی لرزتے ہوئے اللہ کو پیاری ہو جائے گی جیسے تم لرز رہی ہو... دونوں خون تمہاری وجہ سے ہوں گے۔ اس دُہرے قتل کے الزام میں تم کو دنیا کی کسی عدالت سے تو سزا نہیں ہو گی لیکن تمہارا ضمیر تمام عمر تم کو قاتل کہے گا۔"

"یہ... کس مصیبت میں ڈال دیا ہے تم نے مجھے...؟ کسی اور سے پوچھ لو... میں نہیں بتا سکتی۔"

"چلو، اتنا ہی بتا دو کہ کیا اس کا نام رابعہ ہے؟"

وہ خاموش باتھ روم کی دیوار سے پشت لگائے کھڑی رہی، اور میں اس کے اوپر یوں جھکا رہا کہ میرے دونوں ہاتھ دیوار پر تھے اور وہ تقریباً میری گرفت میں تھی۔ اگرچہ میرے اور اس کے جسم کے درمیان شرعی فاصلہ تھا مگر میں اس کے بدن سے پھوٹتے والی خوشبو کی ہیجان انگیزی کو محسوس کر سکتا تھا اور اس کے قرب کی آنچ کی تابکار شعاعوں سے محفوظ نہ تھا۔

"آل رائٹ۔" میں نے اس کے سکوت سے تنگ آ کے نفسیاتی راؤنڈ نمبر ون ختم کر دیا اور الگ ہو گیا۔ "مت بتاؤ... لیکن یاد رکھو کہ جو شخص مرنے پر تیار ہو، وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ وہ پاگل بھی ہو سکتا ہے اور... اور شرافت، اخلاقیات اور نیکی بدی کی تمیز کھو دے تو کہہ سکتا ہے کہ سب کی ایسی تیسی۔ جب ہم نہیں تو زمانہ نہیں... محبّت اور جنگ میں سب جائز ہے۔ یہ فلسفہ تو تمہارے ماحول میں بھی قبولیت کی سند رکھتا ہے۔ میں وہ سب چاند بھائی کو بتا دوں گا جو تم اب تک مجھے بتا چکی ہو... تاکہ تم بھی دوسری دنیا میں ہمارے ساتھ چلو۔"

ایک لمحے کے لیے مجھے یوں لگا جیسے وہ بے ہوش ہو کے دھڑام سے غسل خانے کے فرش پر گر جائے گی۔ اس نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا اور لمبے لمبے سانس لینے لگی۔

"تم... بلیک میل کر رہے ہو مجھے؟"

"یس... جس حد تک میں جا سکتا ہوں ضرور جاؤں گا... مجھے کسی کی پروا نہیں۔" میں نے کہا۔ "جب تمہیں اپنی فکر ہے اور مجھ پر اعتماد نہیں۔"

"پلیز... ایسا مت کرنا... یقین کرو، میں کسی رابعہ کو نہیں جانتی، ورنہ ضرور بتا دیتی۔" اس کے کانپتے ہونٹوں نے سرگوشی کی اور اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرتے رہے۔

"اچھا وہ عورت کون تھی جو کل شام آئی تھی۔ اس نے نام لینے سے گریز کیا تھا اور کہا تھا کہ تم سمجھتی ہو۔"

"وہ... اس عورت سے شادی کرنے والا ہے۔ میں نے سُنا ہے... وہ کوئی انڈین ہے... بہت خوب صورت اور ایسی گریس فُل کہ میں نے ایسی عورت نہیں دیکھی۔ نہ فلموں میں نہ تصویروں میں... اور وہ بہت خوش گفتار... مہذّب اور نیک ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ کوئی انڈین پرنسس ہے...۔"

وہ بولتی جا رہی تھی لیکن میں کچھ نہیں سن رہا تھا۔ میرے ذہن میں ہونے والے پہلے دھماکے نے ہی میرے خیالات کی دنیا کو تہ و بالا کر دیا تھا۔ میں نے ایک دم اسے شانوں سے پکڑ لیا۔ میرے ہاتھوں کی وحشیانہ گرفت اتنی سخت تھی کہ اُس کی چیخ نکل گئی۔

"چھوڑو... چھوڑو مجھے... تم پاگل ہو رہے ہو۔" وہ چلائی۔ لیکن یہ ایسی بات تھی جو "خطرناک" نہیں تھی۔ اگر کوئی سنتا تو باتھ روم میں میری زیادتی کے خلاف اس احتجاج پہ

صرف مسکراتا۔

"نہیں... میں نہیں چھوڑوں گا تمھیں۔" میں نے بھی بلند آواز میں کہا مگر اسے چھوڑ دیا۔

"دیکھو اچھی لڑکی۔" میں نے بہت نرمی سے سرگوشی میں اس کی منت سماجت کی۔ "مجھ پر رحم کرو... میں تم سے زیادتی کی معافی مانگتا ہوں... بس مجھے رابعہ کے بارے میں بتا دو... یہ یقین دلا دو کہ وہ عورت رابعہ نہیں تھی جو کل شام آئی تھی۔ جس کا چاند بھائی نے حوالہ دیا تھا۔"

"میں یسوع مسیح کو گواہ بنا کے کہتی ہوں... کہ میں اس کے نام سے واقف نہیں۔" وہ روتے ہوئے بولی۔ "لیکن میں تمھیں بتا سکتی ہوں کہ اس لڑکی کی شکل و صورت کیسی تھی... مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں سے آئی تھی... اور لوٹ کر کہاں گئی۔ میں نے تو کوئی گاڑی بھی نہیں دیکھی تھی۔"

"تم بتاؤ کہ وہ کیسی تھی... اس کی آنکھیں... اس کے بال... اس کے لب... ناک نقشہ... قد و قامت' لباس... یہ سب تو دیکھا ہو گا تم نے...؟"

اس نے سوچ سوچ کے اور یاد کر کے مجھے خاصی تفصیل فراہم کی مگر اس سے میرا ذہنی خلفشار کم نہیں ہوا۔ یہ رابعہ ہو بھی سکتی تھی اور نہیں بھی... دراصل رابعہ کے خدوخال میں کوئی بات منفرد تھی تو وہ اس کے حسن کی تمکنت اور ساحرانہ قوت تھی۔ اس کی آنکھوں کا رنگ یا بالوں کا رنگ اور چہرے کی ساخت اور اس کے حسن کا بیان ہوتا تو یہ کسی کی بات بھی ہو سکتی تھی۔ کوئی اسے اپنی چشم تصور سے مینا کماری سمجھتا تو کوئی نیلو... کوئی جنت کی حور کہتا تو کوئی کوہ قاف کی پری۔

اب وقت بہت کم رہ گیا تھا اور میں کچھ معلوم نہیں کر سکا تھا۔ یہ سوچ کے میرا دماغ پھٹنے لگتا تھا کہ چاند بھائی کے دماغ میں رابعہ سے شادی کا خیال ہے۔ میں اسے صفائی میں ایک لفظ کہنے کا موقع دیے بغیر قتل کر دینے کی سوچتا تھا۔ پھر عقل کی دیوار سامنے آ جاتی تھی۔ "پاگل مت بنو... وہ رابعہ نہیں ہو سکتی... اور کیا رابعہ ایسا کر سکتی ہے... مر سکتی ہے... جیسا کہ تم نے ابھی کہا تھا... مگر سر تسلیم خم نہیں کر سکتی۔ دیکھو... سوچو... سمجھو... حالات کا جائزہ لو... حقیقت اور اصلیت تلاش کرو!"

"تم جاؤ..." میں نے ایک دم اسے بازو سے پکڑ کے دروازے کی طرف کھینچا۔

"جاتی ہوں... مگر..."

"میں نہیں بتاؤں گا... میں اتنا کمینہ آدمی نہیں ہوں۔"

میں نے دروازہ بند کر دیا اور ٹھنڈے پانی کی دھار کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ آہستہ آہستہ میرا ابلتا ہوا خون ٹھنڈا پڑنے لگا اور میرے دماغ سے اٹھنے والا شکوک و سوسوں اور اندیشوں کا دھواں چھٹ گیا۔ میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت لوٹ آئی۔

ایک گھنٹے بعد چاند بھائی واپس آیا تو میں نہا دھو کے تازہ دم ہو چکا تھا اور کپڑے بھی بدل چکا تھا۔ وہاں ہر شخص کے لیے ہر وقت کی ضرورت کے مطابق ہر سائز کے لباس سے وارڈ روب بھرا ہوا تھا۔ دوسرے وارڈ روب میں زنانہ ملبوسات تھے اور یہ سب اہتمام مہمانداری تھا۔ اس کے بار ہر طرح کے مہمان آتے ہی رہتے ہوں گے۔

میں نے آرام کے لیے ایک پاجامہ سوٹ اور گاؤن منتخب کر لیا تھا کیونکہ طے شدہ طور پر مجھے رات بھر تو یہاں رکنا ہی تھا۔ اس کے بعد کہیں جانا ہو گا تو کہاں جانا ہو گا میں نہیں جانتا تھا۔ نازو اور اکرام کی طرف سے اب مجھے تشویش لاحق نہیں رہی تھی۔ اکرام شیخ میرے تعاقب میں آیا تھا اور میری طرح خوش فہمی کا شکار وہ بھی ہو گا کہ دیکھنے والا کوئی نہیں۔ مگر اسے ٹوٹ کر لیا گیا تھا اور چاند بھائی کے احکامات کے مطابق واپس بھی کر دیا گیا تھا۔

چاند بھائی سیدھا میرے کمرے میں آیا اور مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر وہی دوستانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"تم بہت بہتر نظر آ رہے ہو۔" اس نے کہا اور ایک صوفے میں دھنس گیا۔ "مجھے ایک بزنس اپائنٹمنٹ کے سلسلے میں جانا پڑا۔"

میں نے خود کو بالکل نارمل رکھا۔ "کیا اب تم فارغ ہو؟"

"ہاں... ڈنر تک..." اس نے گھڑی دیکھی۔ "اس کے بعد پھر شاید تمھیں ایک گھنٹا انتظار کرنا پڑے۔"

"تم بہت مصروف آدمی ہو... اور بہت بدنام بھی۔ میں نے دیکھا ہے کہ لوگ تمھارے نام سے ڈرتے ہیں۔"

"کون لوگ؟"

"وہی جو تمھارے کاروبار سے منسوب ہیں۔"

"اور تم انھیں بھی جانتے ہو۔" اس کا لہجہ میرا مذاق اڑاتا تھا۔

"نہیں... مگر جیسا کہ میں نے سنا ہے؟" میں نے کہا۔

"کس سے سنا ہے آخر؟ تم تو ابھی کراچی پہنچے ہو۔ اتنے کم وقت میں تم کراچی جیسے بڑے شہر کے نیک نام اور بدنام لوگوں سے واقف ہو گئے؟" وہ بولا۔ "یہ تو میں جانتا ہوں کہ میری یہ شہرت یا بدنامی لاہور تک ابھی نہیں پہنچی۔"

"تمھارا مطلب ہے کہ میرا یقین بے بنیاد ہے؟" میں نے جھنجلا کے کہا۔ "کیا یہ بات غلط ہے؟"

"نہیں... وہ بات کیسے غلط ہو سکتی ہے جسے میں نے خود ایک سچ ثابت کیا ہے۔" وہ بولا۔ "دراصل یہ پبلسٹی کا زمانہ ہے۔ سیاست کی طرح تجارت میں بھی شہرت ہونی چاہیے۔ اچھا کاروبار ہو تو اچھی اور برا ہو تو بری... بہت اچھی یا بہت بری۔ میرا اپنا ایک پبلسٹی بیورو ہے سمجھ لو... جو ایسی خبریں پھیلاتا ہے جن سے میری دہشت قائم رہے۔ میرے کاروبار میں اس آدمی کو سپر مین مشہور ہونا چاہیے لیکن منفی انداز میں... یعنی یہ کہ وہ ناقابل تسخیر ہے' تباہ کن ہے اور معاف نہیں کرتا۔ جلاد صفت ہے اور آدمی کی جان کی اتنی بھی پروا نہیں کرتا جتنی..."

"کیا تم واقعی ایسے ہو؟"

"تمھارا کیا اندازہ ہے؟" اس نے الٹا مجھ سے سوال کر دیا۔

"میرا خیال ہے کہ تم ایبنارمل ہو... ایک ایول جینیئس... تم مثبت راہ اختیار کرتے تو شاید اس ملک کے وزیر اعظم بھی بن سکتے تھے اور فلم لائن میں جاتے تو دلیپ کمار سے زیادہ شہرت پاتے۔ کوئی بھی فیلڈ تمھارے لیے لامحدود کامیابیوں کا ضامن ہو سکتا تھا مگر تم نے یہ فیلڈ منتخب کر لیا۔ تم انتقامی ردعمل میں صرف دشمنوں کے دشمن نہیں رہے۔ بلکہ انسانوں کے دشمن بن گئے اور اگر میں کہوں کہ انسانیت کے دشمن ہو گئے تو شاید غلط نہ ہو... تھوڑے بہت ابنارمل ہم سب ہوتے ہیں' تھوڑے بہت اذیت پسند بھی — مگر تم انتہا پر ہو۔ حالانکہ دیکھا جائے تو اس مرحلے پر تمھیں کوئی ضرورت نہیں ہے کہ تم برے آدمی ہی رہو... تم راستہ بدلنے پر بھی قادر ہو۔ جو آدمی دنیا کو شکست دے سکتا ہے وہ خود پر بھی فتح حاصل کر سکتا ہے... تم نے دنیا کو سرنگوں کر دیا۔ میری مراد ان قوتوں سے ہے جو اخلاقی' مذہبی... معاشرتی یا قانونی عدل کے ضابطے مرتب کرتی ہیں۔ طاقت — دولت اور شہرت... سب تم نے دنیا سے چھین لیا۔ اب کیا رہ گیا ہے جس کے لیے تم جدوجہد کر رہے ہو؟ تم نے اندھیرے کی منزل کا سفر طے کر لیا۔ کیا اب تمھیں یہ خیال نہیں آتا کہ روشنی کی سمت بھی چلنا چاہیے دیکھنا چاہیے کہ میں اپنی قوت تسخیر پر غلط ناز تو نہیں کرتا؟"

معلوم نہیں میں کیوں اتنا بول گیا اور کیسے بول گیا۔ اس سے زیادہ تعجب مجھے چاند بھائی پر ہوا جو بڑے سکون سے سب سنتا رہا اور سگریٹ کے کش لیتے ہوئے مجھے غور سے دیکھتا رہا۔ اس کے انداز و اطوار میں خفگی یا برہمی... غیر سنجیدگی اور لاتعلقی محسوس ہوتی تو میں چپ ہو جاتا۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ وہ بہت غور سے میری بات سن رہا ہے اور سمجھ رہا ہے۔ اس نے مجھے موقع فراہم کیا کہ میں اس کے بارے میں اپنے حقیقی جذبات کا اظہار کر سکوں۔

"مسٹر سکندر بخت۔" اس نے خاموشی کے مختصر وقفے کے بعد کہا۔ "میں لوگوں سے بے تکلف نہیں ہوتا۔ میرے دوست نہیں ہیں۔ سب کاروباری تعلقات رکھنے والے لوگ ہیں جن کے مفادات مجھ سے وابستہ ہیں۔ باقی خوشامدی' مفت خورے' ملازم اور کارکن وغیرہ ہیں۔ میں سب کو جانتا اور پہچانتا ہوں۔ ان میں اچھے لوگ بھی ہیں مثلاً دوست محمد... میں اسے کھرا اور صاف گو سمجھتا ہوں چنانچہ اس کی بات کا برا نہیں مانتا... اور بھی کچھ لوگ ہیں جن کے مشورے کو میں اہمیت دیتا ہوں۔ مگر ان میں سے کوئی دوست نہیں ہے۔ وہ وقت جب میں دوست بنا سکتا تھا ضائع ہو گیا۔ دوستی کے جذبے کی بنیادیں اس دور میں رکھی جاتی ہیں تو پائدار ہوتی ہیں جب آدمی مفادات کا مطلب تک نہیں جانتا۔ لیکن جیسا کہ میں نے تمھیں بتایا تھا۔ میری پرورش میرے دشمنوں نے کی تھی۔ اس وقت میں انھیں دوست سمجھتا تھا۔ وہ شفیق اور مہربان تھے۔ نیک دل اور نیک نیت بھی لگتے تھے۔ لیکن جب مجھے ان کے عزائم کا اندازہ ہوا اور اپنی ذات کے بارے میں ان حقائق کا پتا چلا جو ذہن کے لیے ناقابل قبول تھے تو میرا ذہن باغی ہو گیا۔ میں عام بچہ نہیں تھا جس کے ذہن کو وہ غلام بنا لیتے۔ جیسے ہپناٹائز کرنے والا صرف اسی کو معمول بنا سکتا ہے جو ذہنی طور پر مطیع ہونے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ قدرت نے مجھے ایک ایسا دماغ دیا تھا کہ میری برین واشنگ ممکن ہی نہیں تھی۔ پڑھ لکھ کے میں زیادہ منطقی اور... زیادہ باغی ہو گیا۔ میں نے تاریخ پڑھی اور تاریخ کے اوراق میں سفید فام قوموں کے استحصال کا سبق پڑھا تو مجھ پر خود بخود چودہ طبق روشن ہو گئے۔ ادھر میرے ماضی کا زہر میرے خون میں انتقام کی آگ بھرتا رہا۔ کچھ کریدنے اور تحقیق کرنے سے میرے سامنے وہ حقائق آئے جو مجھے پاگل کرنے کے لیے کافی تھے۔ مثلاً مجھے معلوم ہوا کہ میرا باپ ایک انگریز فوجی افسر تھا جس نے میری ماں سے شادی کی یا شادی کا ڈھونگ رچایا۔ تین سال اس کے ساتھ رہا اور انیس سو اٹھائیس میں واپس برطانیہ چلا گیا جب میں ایک سال کا تھا' اور میری ماں کو بتائے بغیر۔ وہ کوئی لیفٹیننٹ بریڈلے تھا۔ اس سے زیادہ میری ماں نہیں جانتی تھی... یا اسے کسی نے بتایا نہیں۔ وہ انگریز افسروں کے پاس جاتی رہی۔ انھوں نے بریڈلے کی طرف داری کی اور میری ماں کو دھتکارتے بھی

رہے... اور چمکا رتے بھی رہے کیونکہ وہ بہت خوب صورت تھی۔ غالباً میں اسی کا عکس ہوں۔ وہ انگلستان جانے کی استطاعت نہیں رکھتی تھی اور جاتی بھی تو بریڈلے کو کہاں تلاش کرتی۔ وہ اپنے بارے میں کچھ بھی تو بتا کے نہیں گیا تھا اور جو بتا گیا تھا وہ غلط تھا۔ ایسا شخص انگلستان میں میری ماں کے ساتھ کیا سلوک کرتا۔ بالفرضِ محال وہ پہنچ جاتی اور اس کا گریبان تھام لیتی' ہندوستانی عورت کی طرح روتی پیٹتی فریاد کرتی کہ تم تو میرا سہاگ ہو' میری مانگ کی افشاں ہو اور ماتھے کا سیندور ہو تو وہ اسے لِک مارتا کہ غلام زادی... تو حرام خور بھی ہے کہ میرے دامن پر داغ لگاتی ہے اور وہ متعصب حاکم لوگوں کا نفرت کرنے والا معاشرہ بھی اُسے ٹھوکریں مارتا...

قصہ مختصر... وہ مجھے ایک رات کانونٹ کے دروازے پر چھوڑ کے غائب ہو گئی۔ وہ مختلف فوجی افسروں کی داشتہ رہی اور پھر گم ہو گئی۔ یہ اپنی سوانح عمری میں نے برسوں میں بڑی محنت سے مرتب کی ہے۔ میں نے بریڈلے کا سراغ لگا لیا تھا لیکن وہ دوسری جنگِ عظیم میں نازی فوجیوں کا قیدی بن کے انتہائی عبرتناک موت سے دوچار ہو چکا تھا۔ غالباً اشوانز کے کیمپ میں اور اس کے ماں باپ مر چکے تھے۔ اس کی یونٹ کے پرانے فوجی افسر مجھے ملے... مگر وہ ریٹائرڈ لائف گزار رہے تھے اور سب کچھ بھول چکے تھے۔ انھیں جنگِ عظیم اور ہندوستانی سیاست کے اور فوجی کیریئر کے اہم واقعات تو یاد تھے مگر ایک انڈین عورت نہیں۔ ہزاروں خوب صورت عورتوں سے ہزاروں افسروں کے مراسم تھے۔ جن سے انھوں نے شادیاں بھی کی تھیں' شادی کے نام پر دھوکے بھی دیے تھے' بیوی بچوں کو چھوڑ کے لوٹ بھی گئے تھے... سوری۔ بریڈلے کی اس وائف کے بارے میں اب کیا بتایا جا سکتا ہے کہ وہ بعد میں کس کے ساتھ تھی! ایسے تمام حوصلہ شکن جوابات سُن کے بھی میں نے ہمت نہیں ہاری اور بالآخر تین افراد کو تلاش کرنے میں کامیاب رہا' جنھوں نے اعتراف کیا کہ ہاں ایک ایسی عورت تھی تو سہی۔ بس وہ بریڈلے کو تلاش کرتی رہتی تھی۔ بعد میں ہم نے اسے سپورٹ کیا۔ میں سپورٹ کا مطلب سمجھتا تھا۔ ان تینوں کو میں نے قتل کر دیا۔ لیکن یہ تو بہت بعد کی بات ہے۔ اس سے بہت پہلے جب میں بیس سال کا تھا اور اس کانونٹ میں جہاں میری تعلیم و تربیت مکمل ہوئی تھی اور یہ امید کی جا رہی تھی کہ میں ایک اچھا کرسچین بن کے تبلیغ کرنے والوں کے مشن کا نام روشن کروں گا' میں نے خاموشی سے ان لوگوں کو ٹھکانے لگانا شروع کیا جن کو میں پہلے ہی منتخب کر چکا تھا کہ وہ اصل دشمن ہیں۔ اس کانونٹ کی مدرسپیریر انتہا پسند نہیں تھی اور تمام مذاہب کو قابلِ احترام قرار دیتی تھی۔ مذہب اختیار کرنے کے معاملے میں فرد کی آزادی کے حق کو بھی تسلیم کرتی تھی چنانچہ میں نے اُسے چھوڑ دیا لیکن ایک اور نن تھی جو صرف اور صرف مسلمانوں کی اور اسلام کی دشمن تھی۔ اُس نے مجھے یہ سمجھانے کی پوری کوشش کی کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے اور مسلمان ایک بربریت پسند مذہب کے پیروکار ہیں — ادھر میں نے چھپ چھپ کے تاریخ اسلام سے آگاہی حاصل کر لی تھی اور اسلامی عقائد کے خلاف اس کے پرچار کا مجھ پر اُلٹا اثر ہو رہا تھا۔ مائنڈ یو... اس وقت جنگِ عظیم جاری تھی جب وہ نن مجھے اپنے مذہب اور اپنی قومیت سے منحرف کرنے کی کوشش میں مصروف تھی۔ مجھے بہت افسوس کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ میرے بہت سے ساتھی اس کی تبلیغی شرانگیزی کا شکار ہو کے کرسچین بنے اور مسلمانوں کے خلاف مشنری سرگرمیوں میں شامل ہو گئے۔ دوسرا ایک پادری تھا۔ وہ یہی کام بڑی نرمی اور متانت سے کرتا تھا جیسے کوئی زہر کی گولی کو مٹھائی میں لپیٹ کر حلق سے اتار دے۔ تیسرا ایک ہندو تھا جو عیسائی ہونے کے بعد 'ڈاکٹر آف ڈیوانٹی' کی ڈگری تک حاصل کر چکا تھا۔ اس کا نام ہربرٹ جے رام تھا اور وہ صرف مذہبی بنیادوں پر نہیں سیاسی نظریات کی بنا پر بھی مسلمانوں کا دشمن تھا۔ ان تینوں کی مجھ سے اکثر بحث چلتی تھی۔ باقی بے چارے بحث کرنے کے قابل ہی نہیں تھے۔ میں ظاہر یہ کرتا تھا کہ مجھے صرف جستجو ہے اور میں تجسس کا شکار ہوں تو زیادہ جاننے کے لیے... وہ مزید زہر افشانی کرتے تھے۔ میں حقائق سے موازنہ کرتا رہتا تھا مگر ان سے مُنہ پر کچھ نہیں کہتا تھا۔ وہیں سے میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میں بھی اپنی قوم' اپنے وطن اور اپنے مذہب کے لیے کچھ کروں' اسی جذبے کے ساتھ جیسے یہ تین افراد کارِ ثواب سمجھ کے کر رہے تھے۔ انگریزوں کا عموماً ہندوستانیوں کے ساتھ جو رویہ تھا' اس کی گواہ تاریخ ہے۔ مشنری جو کچھ کر رہی تھی اس کو میں نے بھگتا تھا اور یہی وہ عوامل تھے جنھوں نے مجھے باغیانہ انتقامی اور تخریبی جذبات میں مبتلا کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ بہت دیر ہو گئی ہے۔ اور مجھے فوراً کچھ کرنا چاہیے۔ دلائل سے میں ان کے عقائد اور مشن کو تبدیل نہیں کر سکتا تھا چنانچہ میں نے راست اقدام کیا۔ اس زمانے میں مسلم قوم پرستی کی تحریک عروج پر تھی۔ انگریز رختِ سفر باندھ رہے تھے۔ جنگ ختم ہو چکی تھی اور عبوری حکومت کے انتخابات میں مسلم لیگ نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ میں نے ایک فہرست بنائی اور اس کے مطابق اپنی جنگ شروع کی۔ وہ جنگ جس کے لیے میں کئی سال سے ذہنی تیاری میں مصروف تھا۔ سب سے پہلے میں ہربرٹ جے رام سے ملا۔ وہ ایک مشن کالج میں پڑھا رہا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا اور مجھ سے پوچھنے لگا کہ عیسائیت کے فروغ کے لیے میری کوششیں کس حد تک بار آور ہو رہی ہیں؟ وہ مجھے ہوسٹل میں اپنے کمرے میں لے گیا۔ اسی کمرے سے تیسرے دن اس کی لاش برآمد ہوئی۔ جب لاش کی بُو مقفل دروازے سے باہر پہنچی... پھر میں نے اس نن کو ختم کیا اور پھر اس پادری کو... میں نے اُسے شربت میں زہر ملا کے پلا دیا۔ وہ بھی تو یہی کرتا تھا... پھر میں مسلم لیگ کے رضاکاروں میں شامل ہو گیا اور جلسوں جلوسوں میں شرکت کے لیے وہاں بھی گیا جہاں میری فہرست کے مطابق دیگر ملزم اپنی مجرمانہ تبلیغ کا زہر پھیلا رہے تھے۔ سات مختلف افراد انتہائی پُراسرار حالات میں مارے گئے۔ ان میں تین مسلمان تھے... سابق مسلمان... اور چار ہندو... دو ڈاکٹر تھے جو مشن اسپتالوں میں جسم کے ساتھ 'روح' کو شفا دینے میں مصروف تھے۔ باقی ٹیچر یا لیکچرر تھے۔ ظاہر ہے' ایک مخصوص ادارے سے تعلق رکھنے والے' مشن کے لیے قابلِ فخر خدمات انجام دینے والوں کی اموات کا سلسلہ پوشیدہ نہیں رہ سکتا تھا لیکن اس سے پہلے کہ میں پکڑا جاتا یا مارا جاتا' میں پاکستان بھاگ آیا۔ یہاں میں نے اپنی زندگی کے دوسرے مشن کا آغاز کیا یعنی اپنی ماں کے ساتھ ظلم اور زیادتی کرنے والوں کو تلاش کرنا اور انھیں وہ سزا دینا جس کے وہ مستحق تھے۔ اس دوسرے مشن میں بہت سے دلچسپ واقعات بھی پیش آئے۔ وہ سب سنانے بیٹھ گیا تو رات گزر جائے گی مگر بات ختم نہیں ہوگی۔ صرف دو واقعات سناتا ہوں۔ برطانیہ میں جو تین افراد میرے ہاتھوں مارے گئے تھے انھوں نے مرنے سے پہلے واضح الفاظ میں اعتراف کر لیا تھا کہ انھوں نے بریڈلے کے جرم کو چھپایا... اسے تحفظ فراہم کیا اور میری ماں کو اپنے ساتھ رکھا مگر بریڈلے تک پہنچانے کے لیے نہیں۔ اس کام میں میرے چھ سال صرف ہوئے تھے۔ سب سے پہلے مارا جانے والا رائل ائیر فورس کا ایک ونگ کمانڈر نیلسن تھا۔ وہ رنگون اور کلکتہ پہ جاپانیوں کی بمباری کے قصّے یوں سناتا تھا جیسے انھیں مار بھگانے والا وہی ایک آدمی تھا۔ میں نے اس سے دوستی کی۔ اس کی سب سے چھوٹی بیٹی کو پھانسا۔ اس سے سول میرج کی اور جب مجھے یقین ہو گیا کہ اب وہ دن آنے والا ہے تو میں نے ایک دن دونوں کو اکٹھا بٹھا کے اور کمرا بند کر کے بتا دیا کہ میں کون ہوں' اور میں نے یہ کس لیے کیا تھا۔ میں نے ونگ کمانڈر نیلسن کو پنکھے سے لٹکا کے پھانسی دی اور اس کی بیٹی کو بے ہوش چھوڑ کے فرانس بھاگ گیا۔ وہاں سے واپس پاکستان آیا اور دو سال بعد پھر برطانیہ پہنچا تو ایک بدلا ہوا شخص تھا۔ نام صورت اور حلیے سے مجھے کوئی پہچان ہی نہیں سکتا تھا۔ میرا دوسرا شکار ایک آرمی آفیسر کیپٹن گاڈرڈ تھا۔ اس کے ساتھ بھی میں نے بالکل وہی کیا جو ونگ کمانڈر نیلسن کے ساتھ کیا تھا۔ اس کی بڑی بیٹی بلاشبہ بہت حسین تھی اور مجھ سے محبت بھی کرتی تھی۔ لیکن محبت تو میری ماں بھی بریڈلے سے کرتی تھی اور وہ بھی بہت خوب صورت تھی۔ تیسری بار میں انگلینڈ گیا تو میں نے میجر ہربرٹ کی بیٹی سے شادی کی اور چھ ماہ بعد اس کے باپ کو اس کی نظروں کے سامنے پھانسی دے کر لوٹ آیا۔ ان سب پر میں نے واضح کر دیا تھا کہ ان کو میں انہی کے سکّوں میں ادائیگی کرنے آیا تھا۔ انگریزی کے اس محاورے کا مطلب تم سمجھتے ہو گے۔ اب تم سوچ رہے ہو گے کہ یہ سب اتنا آسان تو نہیں ہو سکتا کہ ایک ہندوستانی وہاں جائے' کسی مغرور اور متعصب انگریز کی حسین و جمیل لڑکی کو پھانسے' اس سے شادی کرے' پھر اُسے پھانسی دے اور بھاگ آئے۔ تم جانتے ہو یہ میرے لیے کیوں آسان ہوا؟ میرے یوریشین بلڈ کی وجہ سے اور میرے کانونٹ کے بیک گراؤنڈ کی وجہ سے۔ میں انگریز کے لہجے میں انگریزی بولتا تھا' انگریز نظر آتا تھا' انگریزوں کے رسم و رواج اور مذہبی عقائد سے واقف تھا' چنانچہ میں نے جب بھی شادی کی تو خود کو خالص انگریز ثابت کر کے کی... تم دیکھ سکتے ہو کہ انگریز بننا میرے لیے مشکل نہیں... ورنہ یہ تو ناممکن تھا کہ کسی ہندوستانی پر کوئی خالص انگریز شریف زادی فریفتہ ہو جاتی تو اس کا باپ شادی کی اجازت بھی دے دیتا۔ وہ بیٹی کو بھی گولی مار دیتا۔ نتیجہ یہ کہ اسکاٹ لینڈ یارڈ والے کسی ہندوستانی پاکستانی کو نہیں ایک انگریز نوجوان کو تلاش کرتے رہے جس کے تین مختلف نام تھے۔ تین مختلف اور مستند حوالے تھے جو بعد میں بوگس ثابت ہوئے۔ انھوں نے بالآخر اسے ایک جنسی دیوانے کا فعل قرار دیا مگر تینوں قتل دو دو سال کے وقفے سے ہوئے جب لوگ پرانے کیس کو بھول چکے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ آج برطانیہ میں کہیں میرے تین جوان بیٹے لاولد پھر رہے ہوں گے میری خواہش تھی کہ ان کی مائیں بھی جسم فروشی پر مجبور ہوں لیکن اس معاشرے میں کنواری ماں اور بن باپ کے بچے کے ساتھ وہ سلوک نہیں ہوتا جو یہاں ہوتا ہے۔ اُلٹا وہ سب کی ہمدردی کے مستحق ٹھہرے جو میرے انتقام کا

نشانہ بنے تھے۔ میرے انتقامی مشن کا تیسرا دور یہ ہے جو ابھی ختم نہیں ہوا۔ تم کہہ سکتے ہو کہ میں پاگل ہوں... ٹھیک ہے... میں پاگل ہوں... میں قانون کی نظر میں مجرم ہوں کیونکہ میں جو کچھ کر رہا ہوں خلافِ قانون ہے لیکن اس سے مجھے تسکین حاصل ہوتی ہے... کیا یہی تم بھی نہیں کر رہے ہو؟ کیا تمھاری پوزیشن بھی بالکل ایسی نہیں ہے؟ میں ان سفید فام اقوام کی نسلوں کو تباہ کر رہا ہوں جنھوں نے ڈیڑھ سو سال میں حکومت کے نام پر افریقی اور ایشیائی ملکوں کو لوٹا، ان کی عورتوں کو مالِ غنیمت سمجھا، ان کے وسائل پر قبضہ کیا اور وہاں اپنے دورِ استبداد کی اتنی نشانیاں چھوڑ گئے کہ شاید ہماری آزادی ادھوری رہ گئی۔ ہماری اقدار... ہماری تہذیب... ہمارا مزاج سب بدل گئے۔ ان کا نظامِ انصاف، نظامِ حکومت اور نظامِ زندگی سب باقی ہیں۔ انھوں نے ہمارے معاشرے، قوم اور ملک کو خراب کیا۔ اب میں پوری کوشش کر رہا ہوں کہ وہاں منشیات کا زہر پھیلاؤں اور ان کو اخلاقی اور روحانی طور پر تباہ کر دوں۔ ان کا پیسہ یہاں لاؤں جیسے وہ ہندوستان سے سب کچھ لوٹ کر لے گئے۔ برطانوی، فرانسیسی اور ڈچ۔ یہ تینوں ہی زیادہ استعمار پسند اقوام تھیں۔ آج میری سرگرمیوں کا مرکز یہی تینوں ممالک ہیں۔ میں وہاں کی ان گنت لڑکیاں غلام بنا کے لا چکا ہوں اور مڈل ایسٹ کی منڈی میں بیچ چکا ہوں۔ ان گنت لڑکیوں کو جسم فروشی کی راہ پر لگا چکا ہوں اور ان ملکوں کی دولت کو اپنے ملک میں کھینچ رہا ہوں اور یہ دولت ایک طرف تو ملک کی صنعتی ترقی میں کام آ رہی ہے، بے روزگاری کم کر رہی ہے اور پیداوار بڑھا رہی ہے لیکن دوسری طرف خود میری دولت میں اضافہ کر رہی ہے۔ کیا تم یقین کرو گے کہ ہر سال میں اپنی آمدنی کا دو تہائی حصہ بانٹ دیتا ہوں...، میں اسلامک مشن... دینی مدارس، اسلامی تاریخ و تہذیب پر ریسرچ، اسپتالوں، اسکولوں اور فلاحی اداروں میں تقسیم کرتا ہوں۔ بالکل گمنام رہتے ہوئے۔ میں نے لاکھوں روپے کی گرانٹس مختص کر رکھی ہیں، ان اداروں کے لیے جن کے بارے میں خود میں مطمئن ہوں کہ وہاں کوئی غبن اور ہیرا پھیری نہیں ہے۔ ان میں یتیم خانے اور محتاج گھر بھی شامل ہیں۔ میں صحیح تعداد تو نہیں بتا سکتا کہ میں نے کتنے مستحق طلبا کو باہر بھجوانے اور اعلیٰ تعلیم دلوانے کے اخراجات برداشت کیے، کتنی غریب لڑکیوں کے لیے جہیز فراہم کیا، کتنے مریضوں کو اپنے خرچ پر باہر بھیجا اور خدا نے انھیں شفا دی۔ اب وہ صحت مند ہیں اور محنت کر کے اپنے اپنے کنبے کی کفالت کر رہے ہیں لیکن تم پہلے آدمی ہو جس کے سامنے میں یہ اعترافات کر رہا ہوں۔ چاند بھائی موٹا والا ایک بہت خطرناک اسمگلر مشہور ہے۔ لیکن وہ ایک فرضی کردار ہے۔ وہ میں نہیں ہوں اور یہ سب میں کسی مقصد کے بغیر کر رہا ہوں۔ تم کہو گے کہ یہ کیا بات ہوئی۔ مقصد کے بغیر بھی کوئی کام ہوتا ہے؟ میری مراد کسی صلے کی تمنا سے ہے۔ نہ ہی نیک نامی خریدنا چاہتا ہوں نہ ثواب کمانے کی فکر میں ہوں۔ میں ایک مجرم گنہگار قاتل اور ذہنی شخص ہوں یہ میں جانتا ہوں لیکن میں نے جو کیا اپنی تسکین کے لیے کیا۔ اچھا کیا یا برا کیا۔ اس سے مجھے غرض نہیں۔ آگے اس کی مرضی، مجھے بخشے یا نہ بخشے۔ اب ایک آخری سوال رہ جاتا ہے کہ میں نے یہ سب تمھیں کیوں بتایا جو کسی کو معلوم نہیں۔ تو اس کا جواب میں کھانے کے بعد دوں گا۔"

میرے ذہن کی کیفیت بڑی عجیب تھی۔ میں عملاً قوتِ فیصلہ سے محروم ہو چکا تھا اور یہ طے کرنے سے قاصر تھا کہ اس شخص کو کیا سمجھوں۔ دیوانہ یا فرزانہ... مجرم یا بے قصور۔ اس نے دنیا کے ساتھ وہی کیا تھا جو دنیا نے اس کے ساتھ کیا تھا... غالب نے کہا تھا کہ "ڈرتا ہوں آدمی سے کہ مردم گزیدہ ہوں"۔ وہ بھی انسانوں کا کاٹا ہوا تھا مگر وہ ڈرنے والا نہیں تھا۔ اس نے پلٹ کر ان انسانوں کو کاٹنا شروع کر دیا تھا جو کٹتے تھے یا بچ رہے تھے۔ اس کی منطق نرالی تھی مگر میں اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا تھا کہ میری اپنی پوزیشن اس سے مختلف نہیں تھی۔ ہم الگ اس لیے تھے کہ ہمارے وقت کے درمیان فاصلے تھے ورنہ راستہ تو میرا بھی وہی تھا۔ وہ انتہا پسند تھا لیکن ایسا میں نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس کے نزدیک میں بھی انتہا پسند تھا۔ اعتدال کا راستہ اختیار کرنا، مصالحت یا مفاہمت اس کے لیے بھی اتنی ہی ناممکن تھی جتنی میرے لیے اور اگر وہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا تو اس کے نامۂ اعمال میں گناہ سے زیادہ ثواب تھے۔ مگر اس کا فیصلہ تو خدا کے سوا کوئی کر ہی نہیں سکتا تھا۔

کھانا بہت اچھا تھا اور کھانے کا ماحول بھی بہت اچھا تھا لیکن مجھ سے کچھ نہیں کھایا گیا۔ ایک نہیں ہزاروں سوالات تھے جو میرے سینے کا بوجھ بنے ہوئے تھے۔ ان کے وزن سے میرا دم گھٹ رہا تھا اور میں ایک سوال کے جواب کو دوسرے سوال سے متصادم پاتا تھا۔

کھانے کے بعد وہ پھر غائب ہو گیا اور مجھے ایک گھنٹے کی تنہائی میں بہت کچھ سوچنے کا موقع ملا لیکن سب سوالوں کی بنیاد وہی ایک سوال تھا کہ آخر یہ سب اعترافات میرے سامنے کیوں؟ یہ اپنی داستانِ حیات سنانے کا، اپنے جرائم اور اپنی نیکیاں گنوانے کا مقصد کیا ہے۔ کیا فائدہ ہے اس کا یا میرا اس میں؟

باتوں سے آشنا ذہین، منطقی سوچ رکھنے والا، مہذب اور اعلیٰ تعلیم یافتہ نظر آنے والا، اچھائی اور برائی کو سمجھنے کی صلاحیت رکھنے والا، ہر اعتبار سے کامیاب۔ ایسے ماحول میں کیسے زندہ ہے... یہ کنیزیں، ان کے ساتھ اس کا سلوک، غلام زادیوں کی خرید و فروخت، منشیات کا دھندا، نسلیں خراب کرنے کا مشن، یہ انتقام ہے یا پاگل پن؟ میں تو اسے خطرناک قسم کا پاگل پن ہی کہوں گا حالانکہ وہ کسی کے لیے ذرا بھی پاگل اور خطرناک نہیں۔ مگر جو آدمی صرف نفرت کر سکتا ہو جس کے دل میں محبت نہ ہو... مگر یہ میں کیسے کہہ سکتا ہوں۔ آخر اُسے احساس تو ہے کہ لوگ دُکھی ہیں، غریب ہیں، پریشان ہیں اور وہ ان کے لیے سب کچھ کر رہا ہے۔ کیا یہ انسانیت کی محبت نہیں ہے؟ نہیں... وہ مانتا ہے کہ یہ سب وہ اپنی ذات کی تسکین کے لیے کرتا ہے... اسے صرف اپنے آپ سے محبت ہے اور وہ جو کچھ کرتا ہے صرف اپنے لیے کرتا ہے۔ وطن، قوم، مذہب کے حوالے خود فریبی ہیں۔

جب وہ آیا تو میں کمرے میں چکر لگاتے ہوئے سگریٹ کا پورا پیکٹ پھونک چکا تھا۔

"سوری... مجھے پھر جانا پڑا۔" وہ بیٹھ گیا۔ "کافی پیو گے؟"

"ہاں... اور تم اب میرے سوالوں کے جواب دو گے۔" میں نے کہا۔ "ورنہ میں بھی پاگل ہو جاؤں گا۔"

"کچھ لوگوں کے نزدیک تم پاگل ہی ہو۔" وہ ہنسنے لگا۔

"وہ لوگ یہاں نہیں ہیں... یہاں تم ہو اور میں ہوں۔" میں نے کہا۔ "تم میرے بارے میں سب کچھ جانتے تھے... میں نے صرف سیٹھ چاند بھائی موٹا والا کا نام سنا تھا... مگر وہ تم نہیں ہو... تم نے خود بتا دیا کہ تم کون ہو... اور یہ بھی اعتراف کر لیا کہ جو کچھ تم نے مجھے بتایا ہے وہ آج تک کسی اور کو نہیں بتایا۔ اگر یہ جھوٹ نہیں ہے تو پھر یہ بتاؤ کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟"

"مجھے معلوم تھا کہ سب سے اہم یہی سوال ہے۔" وہ بولا اور اس نے انٹرکام پر کافی کے لیے کہا۔

"ہاں... پہلے میرے نزدیک زیادہ اہم ایک اور بات تھی، مگر اب اس کی حیثیت ثانوی ہو گئی ہے۔" میں نے کہا۔

"مسٹر سکندر بخت" وہ سگریٹ جلا کے اطمینان سے بیٹھ گیا۔ "میں سوچ رہا ہوں کہ اب انتقام کا سلسلہ ختم کر دوں کیونکہ اب اس میں تسکین کا سامان نہیں رہا۔ جب سے میں نے تمہارا نام سنا تھا اور مجھے معلوم ہوا تھا کہ تم چوہدری دلاور کے خلاف جنگ لڑ رہے ہو، مجھے تمہاری ذات سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ میں نے تمہارے بارے میں مفصل معلومات حاصل کرنے کے بعد محسوس کیا کہ میرے خیالات بدل رہے ہیں اور اب مجھے اپنے انتقام کے مشن کو جاری رکھنے کا جواز بہت کمزور نظر آنے لگا۔"

"تم چوہدری دلاور کو کیسے جانتے تھے؟"

"کاروباری حریف ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔" وہ سادگی سے بولا۔

"چوہدری دلاور... تمہارا حریف؟"

"ہاں... صرف کاروبار کی حد تک۔" وہ بولا۔ "اس نے میر شرافت علی کے ساتھ مل کے منشیات کی منڈی میں اپنے قدم جمائے... اس نے میرے دست راست کو کھینچ لیا نواب خسرو جمشید کو۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ "تم... ان سب سے واقف ہو؟"

"میں نے کہا نا کہ اس کاروبار میں وہ بھی شامل تھا۔ اس کا مقصد منافع کمانا تھا۔ منافع میں بھی کما رہا تھا لیکن میری سوچ ذرا مختلف تھی۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ چوہدری دلاور کو سزا دوں اور نواب خسرو جمشید کو ٹھکانے لگا دوں۔ یہ کام چٹکی بجاتے میں ہو سکتا تھا۔ پھر میں نے سوچا کہ کیا فائدہ... کام تو ہم ایک ہی کر رہے ہیں اور مجھے کون سا نقصان ہو رہا ہے۔ چنانچہ میں نے دونوں پر لعنت بھیجی اور اپنے کام میں لگا رہا۔ پھر اچانک تمہاری اور چوہدری دلاور کی دشمنی کی خبریں آنے لگیں اور میں نے صرف دلاور کا نام سن کے دلچسپی لی۔ تمہیں تو میں نام سے بھی نہیں جانتا تھا۔ میں کئی بار لاہور گیا اور مختلف لوگوں سے ملا تو مجھے پتا چلا کہ دلاور نے نیا دھندا شروع کر دیا ہے اور وہ ملک دشمن عناصر کو اسلحہ بیچ رہا ہے۔ پھر معلوم ہوا کہ تمہارے اور اس کے درمیان اصولی جنگ چھڑ گئی ہے اور تم نے کوئی تنظیم بنا لی ہے... ملک دشمنوں، تخریب کاروں اور علیحدگی پسندوں کے خلاف لڑنے کے لیے... میری دلچسپی بڑھ گئی۔ میں نے تمہارے بارے میں مفصل معلومات حاصل کرنے کے لیے اپنے وسائل کا استعمال کیا تو بہت سی نئی باتیں سامنے آئیں۔ اب میرے پاس ایک مکمل فائل ہے جس میں تمام اخبارات کی خبریں ہیں۔ تمہارے خلاف درج کیے جانے والے سارے مقدمات کی تفصیل ہے۔ تمہارے سب ساتھیوں کے بارے میں بنیادی معلومات ہیں۔ اس ریسرچ کے نتیجے میں مجھ پر بہت

سے انکشافات ہوئے۔ ایک یہ کہ تمہارا مشن بھی انتقامی ہے۔ تم بھی اتنے ہی جذباتی ہو جتنا میں تھا۔ تم بھی مظلوم ہو۔ تمہارے پیش نظر بھی قومی اور ملکی مفادات ہیں۔ تم نے بھی قتل سمیت وہ تمام جرم کیے ہیں، جو میں نے کیے تھے۔ پھر میں نے فرق پر غور کیا تو فرق بہت واضح تھا۔ تم دولت نہیں کما رہے تھے، دولت سے عیش نہیں کر رہے تھے۔ تمہارے پیش نظر حصولِ دولت کا مقصد تھا ہی نہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تم نے ذاتی انتقام کے جذبات سے شروع ہونے والی جنگ کو ایک غیر ذاتی جدوجہد میں بدل دیا تھا جو ایک مثبت پہلو رکھتی تھی۔ ایسا میں نہیں کر سکا تھا۔ میں ابھی تک اپنی ماں کے ساتھ ہونے والے مظالم کا انتقام لے رہا تھا۔ یہیں سے میری سوچ بدلی۔ میں نے سوچا کہ کیا میں ایسا کر سکتا ہوں کہ اس جنگ کو ختم کر دوں جو میں نے انگریزوں اور تمام استعماری قوتوں کے خلاف شروع کی تھی اور جس کا واحد مقصد اب انہیں زیادہ سے زیادہ ذلیل کرنا اور نقصان پہنچانا رہ گیا تھا۔ میں اپنی توانائی، صلاحیت اور وسائل سے اس دوسری جنگ میں شامل ہو سکتا ہوں جو زیادہ اہم ہے۔ اپنے ہی ملک کے غداروں کے خلاف... آہستہ آہستہ مجھے یہ کام بہت معمولی اور... گھٹیا نظر آنے لگا کہ میں بے بس اور کمزور لڑکیوں کی زندگیاں تباہ کروں، انہیں خریدوں اور بیچوں، ان پر ظلم روا رکھوں... حالانکہ مجرم وہ نہیں ہیں۔ ظلم میری ماں کے ساتھ ہوا تھا، تو میں اس طرح انتقام کے ذریعے ظلم کو ختم نہیں کر رہا ہوں... ظلم کو پھیلا رہا ہوں۔"

"پھر تم نے کیا قدم اٹھایا... ہم صرف سوچا اور سوچ کے رہ گئے۔ یہ جو ماحول میں دیکھ رہا ہوں... یہ کنیزیں اور ان کے ساتھ تمہارا سلوک اور اندازِ تخاطب..." میں نے کہا۔

وہ چونکا۔ "تم سُن رہے تھے... اور... سمجھ رہے تھے؟"

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ "میں فرنچ جانتا ہوں۔"

وہ کچھ دیر صدمے کی حالت میں بیٹھا رہا۔ "اس کا مطلب ہے تمہارے بارے میں میری معلومات نامکمل تھیں۔"

"کوئی بھی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ مکمل معلومات رکھتا ہے۔ خود اپنے بارے میں وہ سب نہیں جانتا۔" میں نے کہا۔ "علم کے کمال اور کامل ہونے میں بہت فرق ہے۔"

"خیر... وہ تو میں خود ہی بتا رہا ہوں... کہ میں یہ سب کھیل ختم کر رہا ہوں۔" وہ بولا۔ "میں ان سب کو واپس بھیج دوں گا اور... اس کاروبار سے بھی دستبردار ہو جاؤں گا۔"

"کیا تم احساسِ جرم کی خلش زیادہ محسوس کرنے لگے ہو؟"

"کچھ بھی کہہ لو... ہر آدمی کی زندگی میں ایک وقت ایسا ضرور آتا ہے جب وہ بہت سی چیزوں کو اور زندگی کے مفہوم کو مختلف انداز سے دیکھنے لگتا ہے۔" وہ بولا۔ "کیا تمہاری زندگی میں ایسا ہی موڑ نہیں آیا تھا جب تم نے اچانک محسوس کیا تھا کہ وہ سب بے معنی ہو گیا ہے... جو تم کر رہے تھے... اور پھر تم نے اس انقلاب کو قبول کر لیا تھا؟"

"ہاں... ایسا ہوا تھا۔" میں نے سوچ کے کہا۔ "لندن سے واپس آ کے میں نے اس تبدیلی کو ناگزیر سمجھتے ہوئے قبول کیا تھا ورنہ اس سے پہلے میری زندگی یکسر مختلف تھی۔"

"میں ابھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچا تھا۔" وہ بولا۔ "لیکن پھر ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے فیصلہ آسان کر دیا۔ چوہدری دلاور کے کچھ لوگوں نے میری ایک لانچ پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ معلوم نہیں غلط فہمی کی بنا پر یا عمداً۔ لانچ کے عملے نے مقابلہ کیا اور حملہ کرنے والوں میں سے کچھ مارے گئے، کچھ سمندر میں کود کر فرار ہونے میں کامیاب ہوئے۔ جس لانچ پر وہ خود آئے تھے وہ ہم نے پکڑ لی۔ اس میں اسلحہ تھا اور ایک لڑکی تھی۔ لڑکی کو نکال لینے کے بعد لانچ غرق کر دی گئی۔ مجھے یہ سب معلوم ہوا تو میں نے کہا کہ لڑکی کو یہاں لاؤ۔ دراصل اسی لڑکی نے مجھے بتایا کہ وہ دلاور کے آدمی تھے اور ان کی لانچ کے بارے میں اندیشہ تھا کہ ڈوب جائے گی۔ معلوم نہیں اس میں کیا نقص پیدا ہو گیا تھا۔ عملے نے طے کیا کہ وہ کسی دوسری لانچ پر قبضہ کر لیں۔ میں نے اس معاملے میں دلاور سے بات کی... بہت سخت لہجے میں کہ میں نے پہلے تمہیں معاف کر دیا تھا جب تم خسرو جمشید کو لے گئے تھے لیکن یہ کیا حرکت ہے؟ اس نے معافی مانگی اور کہا کہ وہ جرمانہ یا ہرجانہ ادا کرنے کے لیے تیار ہے۔ میں نے کہا کہ وہ کون لوگ تھے، انہیں میرے حوالے کرو۔ وہ اس پر رضامند نہیں ہوا اور اصرار کرتا رہا کہ غلطی بھی انسان سے ہی ہوتی ہے اور یہ کافی ہے کہ وہ معافی بھی مانگ رہا ہے اور اگر نقصان ہوا ہے تو وہ بھی پورا کرنے کو تیار ہے۔ میں نے کہا کہ چلو ٹھیک ہے۔ میرے دو آدمی مارے گئے تھے، وہ واپس لا دو تو بات ختم... ورنہ سزا میں خود دوں گا اصل مجرموں کو۔ اس نے فون بند کر دیا۔ پھر میں نے رات کو اس لڑکی سے مزید بات کی، وہ لڑکی رابعہ تھی۔"

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات نویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں

جاسوسی ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ

شکاری

نواں حصہ

شکاری

نئی سوچ نیا رنگ نیا لہجہ نیا آہنگ
احمد اقبال کے شہپارہ شبنم فشاں قلم سے

معاشرے کے اُن ناسوروں کی رُوداد جو گوشت و پوست سے گزر کر انسانی ذہنیوں میں اُتر رہے تھے۔ ایک کفن بردوش نوجوان کی کہانی جس کے شب و روز موت کی بستی میں گزر رہے تھے۔ جلتے دن سُلگتی راتیں آس و یاس، خوف و ہراس، تلخ حقائق، شیریں خواب

یہ اتنا بڑا دھماکا تھا کہ میں اچھل پڑا۔ "رابعہ؟"

"ہاں... وہ رابعہ تھی۔" چاند بھائی مسکرایا۔ "اس نے مجھے بہت کچھ بتایا۔ تمہارے بارے میں اور دلاور کے بارے میں۔ جب میں نے اسے یقین دلا دیا کہ وہ محفوظ ہے اور میں تمہارے بارے میں پہلے ہی بہت کچھ جانتا ہوں، تو اس نے کچھ نہیں چھپایا..."

"پہلے مجھے رابعہ کے بارے میں بتاؤ۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ میرے دل میں جذبات کا آتش فشاں یکلخت اُبل پڑا تھا۔

"اور کیا بتاؤں؟" چاند بھائی نے حیرانی سے کہا۔

"یہی کہ اب وہ کہاں ہے؟"

"اب؟... یہ میں کیسے بتا سکتا ہوں؟" وہ بولا۔

"کیوں... کیوں نہیں بتا سکتے؟" میں نے چلّا کے کہا۔ "مجھے تو معلوم تھا کہ وہ یہاں ہے... میں اسی کے لیے آیا تھا۔ تم سے ملنے نہیں... اس نے تمہارے ہی گھر سے فون کیا تھا۔ یہ نمبر میرے پاس نہ ہوتا تو میں کیسے پہنچتا؟"

"یہ تو ٹھیک ہے کہ اس نے یہاں سے تمھیں فون کیا تھا مگر اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ وہ اب بھی یہاں ہے!"

میں نے ایک دم جست لگا کے اسے دبوچ لیا۔ "دیکھو، مجھ سے چکر بازی کی باتیں مت کرو... یہ ٹھیک ہے کہ میں خالی ہاتھ ہوں اور تم مسلح ہو... تمہارے قلعے میں تمہارے محافظ ہیں اور میں ان کی قید میں ہوں۔ مگر یہ بھی سمجھ لو کہ تمہارے اور موت کے درمیان میرے ہاتھ کی صرف ایک حرکت حائل ہے۔"

وہ اسی طرح پُرسکون رہا۔ "میں جانتا ہوں کہ تم کراٹے کے ماہر بھی ہو... میری گردن توڑ سکتے ہو لیکن اس سے حقیقت تو نہیں بدلے گی۔ تمھیں رابعہ نہیں ملے گی... میری جان پہلے جائے گی اور تمہاری بعد میں... اس کے بعد کیا ہوگا...؟ جب رابعہ کو معلوم ہوگا کہ تم نے سوچے سمجھے بغیر خود کو ایک دوست کی حمایت سے اور زندگی سے محروم کر لیا تو وہ خود کیسے زندہ رہے گی؟ تمہارے ساتھی کتنے مایوس ہوں گے اور تمہارا مشن ادھورا رہ جائے گا۔ تم دلاور کے لیے میدان کھلا چھوڑ دو گے؟"

اس نے آہستہ سے میرا ہاتھ اپنے گریبان سے الگ کر دیا اور میں جو شدّتِ جذبات میں پاگل ہو رہا تھا آہستہ آہستہ ہوش میں آ گیا۔

"بیٹھو آرام سے اور میری پوری بات سنو۔" وہ بولا۔

میں پھر بیٹھ گیا۔ اسی کے ساتھ والے صوفے پر گر گیا۔

"آئی ایم سوری..." میں نے کہا۔ "یہ میرے اعصاب کا قصور ہے۔"
"میں تو بالکل ہی بھول گیا باتوں میں۔" اس نے سر ہلا کے کہا۔ "کافی؟" اس نے ایک بٹن دبا کے کہا۔

کیا رابعہ واقعی یہاں نہیں ہے؟" میں نے مایوسی سے کہا۔ "تمھیں معلوم تو ہوگا کہ وہ کہاں ہے؟"

چاند بھائی نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ یہاں رہی تھی... تین ہفتے اور میں نے اُسے زبردستی روک کے رکھا تھا کیونکہ اس کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ دلاور کے آدمی اسے کہیں لے جا رہے تھے بس یہ اس کی اور تمھاری خوش قسمتی تھی کہ قدرت نے اسے میرے پاس پہنچا دیا۔ میں نے اسے تین ہفتے تک بہترین طبی امداد فراہم کی اور آرام کرنے سے وہ بہت جلد ٹھیک ہو گئی۔ وہ بھی نروس بریک ڈاؤن کا شکار تھی۔ اس نے کئی بار بھاگنے کی کوشش کی لیکن یہاں سے کوئی کیسے نکل سکتا ہے۔ میں نے اسے سمجھا دیا کہ جب تک میں خود مطمئن ہو کے اسے اجازت نہیں دوں گا وہ نہیں جا سکے گی۔ خیر آہستہ آہستہ اس نے یہ بات سمجھ لی کہ میں اس کا مددگار ہوں اور تمھارے دشمن کا دشمن ہوں چنانچہ تمھارے لیے بہت کچھ کر سکتا ہوں۔ تیسرے ہفتے میں اس نے مجھے تمھاری اور اپنی زندگی کے بارے میں بتایا۔ پھر اس تنظیم کے بارے میں بتایا جس میں تم چند دوست شامل ہو... محسن اور غالب... ٹیڈی... میں سب کے بارے میں پوچھتا رہا اور اس نے کچھ نہیں چھپایا۔ میں اس لڑکی سے بہت زیادہ متاثر ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسی لڑکی میری نظر سے پہلے کبھی گزری ہی نہیں تھی۔ یہ جسمانی خوب صورتی کی بات نہیں۔ اس کی شخصیت میں جو حسن تھا وہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔"

میں نے اچانک محسوس کیا کہ تعریف کے اس انداز میں چاہت کے جذبات کا رنگ شامل ہے۔ حسد کی آگ میرے وجود کو جلانے لگی۔ شکوک کے سانپ میرے ذہن میں کلبلانے لگے۔

"تیسرے ہفتے میں ہی اس نے تمھیں ٹیلی فون کیا تھا جب تم نے اس سے بات کی تھی۔"

"چاند بھائی... اس کی باتوں نے ہی مجھے شک میں ڈال دیا تھا کہ وہ کچھ چھپا رہی ہے۔"

"ہاں... میں نے اُسے کہا تھا کہ میرے بارے میں فی الحال کوئی بات نہ کرے۔"

"تم جھوٹ بکتے ہو!" میں نے چیخ کر کہا۔ "اس نے دوست محمد کا حوالہ دیا تھا... آخر کیوں؟"

"مجھے نہیں معلوم۔" وہ بولا۔ "جب وہ بات کر رہی تھی تو میں موجود نہیں تھا۔ ان دنوں میں فرانس میں تھا۔"

"میں نہیں مان سکتا۔ آخر اس نے تین ہفتے بعد کیوں فون کیا تھا۔ کیا اس سے پہلے رابعہ کو یہ خیال نہیں آیا تھا کہ اُسے اپنی خیریت سے کسی نہ کسی کو آگاہ کر دینا چاہیے... مجھے نہ سہی... منظر کو... وہ دوست ہے ہمارا اور ایک وکیل ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔"

"وہ انکل رضوی کے گھر شہلا کو بھی بتا سکتی تھی۔"

"ہاں... لیکن اس کی حالت ایسی کہاں تھی۔" وہ بولا۔

"یہ بھی جھوٹ ہے۔ وہ بالکل پاگل ہوتی تب بھی میرا نام نہیں بھول سکتی تھی اور... اور مجھ سے ملے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔" میں نے کہا۔

"یہ ٹھیک ہے کہ پاگل پن کی حالت میں اس نے فرار ہونے کی کوشش کی تھی اور سوائے سکندر کے کسی کا نام تک نہیں لیتی تھی، مگر پھر ڈاکٹروں نے اُسے سکون آور انجکشن دے کر سلائے رکھا اور دو ہفتے تک اسے خود اپنی خبر نہ رہی... جب وہ آہستہ آہستہ صحت یاب ہوئی تو میں نے اسے یقین دلایا کہ سکندر بخت بالکل محفوظ ہے اور اس سے رابطے کا کوئی ذریعہ ہے تو بتاؤ، میں بات کرا دیتا ہوں۔ اس نے مجھے ایک فون نمبر دیا اور تمھاری اس سے بات ہو گئی۔ لیکن جیسا کہ میں نے کہا... میں یہاں تھا ہی نہیں۔ میں نے کچھ نہیں سنا کہ اس نے تم سے کیا کہا اور تم نے اس سے کیا کہا۔"

"تمھارے جھوٹ میں مجھے بدنیتی شامل نظر آتی ہے سیٹھ چاند بھائی۔" میں نے کہا۔ "کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی یہاں سے فون کرے اور تمھیں خبر نہ ہو۔ یہاں ہر کال کو مانیٹر کرنے والے ہوں گے اور ٹیپ کرنے والے ہوں گے۔ انھوں نے تمھیں بتا دیا ہوگا۔"

"نہیں... ایسی کوئی بات نہیں... تم بتاؤ کہ اس نے کیا کہا تھا؟" وہ بولا۔ "اس نے میرے ذاتی فون کو استعمال کیا تھا۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا... اور فرض کر لیا کہ وہ سچ بول رہا ہے۔ ورنہ بحث سے کچھ حاصل نہ ہوتا۔ میں نے اسے بتا دیا کہ رابعہ سے میری فون پر کیا گفتگو ہوئی تھی۔

"میرا خیال ہے کہ اس نے جانتے بوجھتے تم کو اندھیرے میں رکھنا پسند کیا۔" اس نے میری بات سن کے کہا۔

"کیوں... وہ ایسا کیوں کرے گی؟"

"ممکن ہے اس کا مقصد تمھیں محفوظ رکھنا ہو۔ غیر ضروری پریشانی سے بھی اور خطرے سے بھی۔" وہ بولا۔ "یہاں سے وہ تین ہفتے بعد چلی گئی تھی اور اس نے یہی کہا تھا کہ میں واپس جاؤں گی۔"

"اور تم نے اُسے جانے دیا؟"

"میں اسے کیسے روکتا... وہ سمجھنے لگی تھی کہ میں نے بھی اُسے قید کر رکھا ہے۔" وہ بولا۔ "اور میری نیت ٹھیک نہیں ہے۔"

ایک کنیز نے دستک دی اور پھر کافی رکھ کے چلی گئی۔
وہ کافی بنانے لگا۔

"اگر میں یہ سچ مان لوں۔" میں نے کہا۔ "تو پھر... تم نے کس عورت کے بارے میں ہدایات دی تھیں کہ اس کے متعلق مجھے کچھ نہ بتایا جائے جو کل شام آئی تھی۔ تم نے اپنی کنیز کو دھمکی دی تھی کہ مجھے کچھ بتایا تو مارسیلز میں اس کی فیملی تک محفوظ نہیں رہے گی۔ اور تم اس سے بھی انکار نہیں کر سکتے کہ وہ کوئی پاکستانی لڑکی ہے، انتہائی خوب صورت اور گریس فل۔ بقول تمھارے شخصیت کے حسن کی دلکشی رکھنے والی... گورا رنگ... گلابی ہاتھ... سیاہ بڑی بڑی آنکھیں اور لمبے کالے بال... ساڑھے پانچ فٹ قد اور ایک سو تیس پونڈ وزن... وہ اسے کوئی انڈین پرنسس سمجھی تھی۔"

"اوہ... تو اس نے بتا دیا تمھیں...!" وہ کافی مجھے تھما کے بولا۔ "مجھے یہی ڈر تھا کیونکہ تم بہت چالاک ہو اور وہ بہرحال ایک لڑکی ہے۔ لاکھ مجھ سے ڈرتی ہو مگر ہے تو احمق۔"

"اب تم اس کے ساتھ وہی کرو گے جو تم نے کہا تھا... تم اس سفید فام کتیا کی کھال اُدھیڑ دو گے، اس کے ماں باپ اور منگیتر تک کسی کو نہیں بخشو گے۔ قصور میرا ہے۔ میں نے اسے باتوں سے بے وقوف بنایا تھا۔ فرانسیسی بول کے اس کے جذبات کو کریدا تھا اور ہمدردی حاصل کر کے سچ اگلوا لیا تھا۔"

"میں اسے کوئی سزا نہیں دوں گا۔" وہ بولا۔ "کیونکہ الزام تم نے قبول کر لیا ہے۔ تاہم اُسے غلط فہمی ہوئی۔ ان یورپی اقوام کے دماغ میں تو ہمارے بارے میں ایسے ہی خیالات بھرے ہوئے ہیں کہ یہاں یا تو ہر شخص راجا مہاراجا ہوتا ہے جو ہاتھی پر پھرتا ہے یا سپیرا جو گلے میں بین اور پٹاری میں سانپ رکھتا ہے۔ ان کے نزدیک ہم ایک کالی بدصورت قوم ہیں۔ خوبصورتی صرف ان کی میراث ہے اور یہاں کوئی گریس فل خوب صورت عورت ہے تو وہ پرنسس ہے۔ حالانکہ یہاں جو مجھ سے ملنے آتی ہیں وہ سب کسی پرنسس سے کم نہیں ہوتیں... سب پاکستانی اور اعلیٰ خاندانوں کی عورتیں ہوتی ہیں۔"

میں لاجواب ہو گیا لیکن میرے ذہن کا شک دُور نہیں ہوا۔ میں اس کو دلیل سے ہی قائل کر سکتا تھا۔ زبردستی یہ بات نہیں منوا سکتا تھا کہ وہ رابعہ کے بارے میں مجھے گمراہ اور بے خبر رکھنا چاہتا ہے۔

"اچھا... تم نے مجھے اٹھوایا کیوں تھا... وہ کون نقاب پوش تھے جو مجھے یہاں لائے تھے؟" میں نے کہا۔

"میرے آدمی تھے... اور مقصد تم سے ملاقات کرنا تھا۔"

"انھیں کیا الہام ہوا تھا کہ میں دوست محمد کی کھٹارا گاڑی میں ملوں گا!" میں نے کہا۔

"تم دوست محمد کو پوچھتے پھر رہے تھے۔ دوست محمد کو ڈر تھا کہ اسے دلاور کے آدمی تلاش کر رہے ہیں کیونکہ اس لانچ والے واقعے کے بعد جس میں میرے دو آدمی مارے گئے تھے، میں نے دلاور سے صاف کہہ دیا تھا کہ اب وہ خود کو محفوظ نہ سمجھے۔ چودھری دلاور جانتا ہے کہ میں کون ہوں اور کتنے لمبے ہاتھ رکھتا ہوں۔ دوست محمد میرا خاص آدمی ہے۔ اس کی حفاظت کے لیے میں نے دو آدمی چھوڑ رکھے تھے جو اس پر نظر رکھتے تھے... کی گاڑی میں وہی موجود تھے اور تم آ گئے تو وہ تمھیں بھی یہاں لے آئے... اچھا... رات بہت ہو گئی ہے۔ باقی باتیں صبح ہوں گی۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "شب بخیر۔"

اس کے جانے کے بعد میں بے بسی اور مایوسی کے عالم میں بہت دیر تک جاگتا رہا۔ اب مجھے چاند بھائی میں قطعی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ میں اس کی حمایت بھی نہیں چاہتا تھا۔ پہلے لامحدود وسائل کے ساتھ وہ یقیناً دلاور کے مقابلے میں ہمارا زبردست اتحادی ثابت ہو سکتا تھا لیکن میرے خیالوں میں تو رابعہ بسی ہوئی تھی جس کی تلاش مجھے یہاں لائی تھی... باقی... اتفاقات کا سلسلہ تھا جس نے مجھے افتخار عارف سے...... پھر اکرام شیخ سے اور بالآخر نازو سے ملوا دیا تھا اور یہاں پہنچا دیا تھا۔

اب مجھے ایسا لگتا تھا کہ میں راستہ تلاش کرتے کرتے اچانک کسی بند گلی کے آخری سرے پر پہنچ گیا ہوں جہاں آگے جانے کا کوئی راستہ نہیں۔ صرف واپسی ممکن ہے۔ دوست محمد جا چکا تھا اور اس سے مزید کچھ پوچھا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ چاند بھائی کی ایک بات میرے دل کو لگی تھی کہ شاید رابعہ نے مجھے پریشانی اور خطرات سے دُور رکھنے کے لیے جھوٹ کا سہارا لیا ہو۔

لیکن پھر یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ وہ یہاں سے کہاں گئی تھی؟ اس نے واپس جانے کی بات کی تھی مگر واپس نہیں پہنچی تھی تو پھر کہاں چلی گئی تھی۔ یہاں تو اس کے لیے کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں وہ رہ سکتی ہو۔ کوئی گھر ایسا نہیں تھا جہاں وہ پناہ لے سکتی ہو اور اسے ضرورت بھی کیا تھی کہ وہ ہم سب سے دُور رہے۔

کہتے ہیں کہ خطرات اور پریشانیاں انسان کی ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کے لیے امتحان کا درجہ رکھتی ہیں اور امتحان درپیش ہو تو اس کی استعداد اور کارکردگی غیر معمولی ہو جاتی ہے۔ شاید اس وقت بھی ایسا ہی ہوا۔ مجھے ایک ایسا خیال آیا کہ میں بھونچکا رہ گیا... یہ ہو سکتا ہے کہ رابعہ واپس چلی گئی ہو لیکن مجھ سے نہ ملی ہو۔ وہ لاہور میں ہی ہو۔ انکل رضوی کی پناہ میں یا منظر کے گھر میں۔ عمداً اس نے خود کو اس مشن سے الگ رکھا ہو

جس میں وہ میرا ساتھ دیتی تو میری پریشانیوں میں اضافہ ہوتا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی محبت میرے پاؤں کی زنجیر ہے اور بعض اوقات میں اس محبت میں اپنے فرض کو غیر اہم سمجھنے لگتا ہوں۔ ایسا ہونا تو نہیں چاہیے لیکن آدمی جذبات سے لاتعلق بھی تو نہیں رہ سکتا۔ شاید یہی سوچ کے اس نے خود کو الگ کر لیا کہ یوں وہ میری زیادہ مدد کر سکتی ہے۔ اس نے میرے ذہنی سکون اور اطمینان کے لیے اس بات کا یقین دلا دیا کہ وہ بالکل محفوظ اور خوش ہے لیکن مجھے منع بھی کر دیا کہ میں اُسے تلاش نہ کروں۔ اس نے اپنی مجبوری بیان بھی نہیں کی اور ظاہر بھی کر دی۔ اس کے لیے دوست محمد کا نام لے کر رابعہ نے ایک ایسا جھوٹ بولا جس پر میں یقین نہیں کر سکتا تھا۔ تاہم اسے توقع نہیں ہو گی کہ میں سالہا سال مجنوں بن کے اس کو تلاش کرتا ہوا دوست محمد تک جا پہنچوں گا۔ اس نے مجھے بے وقوف بنایا۔ وہ لاکھوں ہی تھی۔ شہلا یا منظر نے اس کی مدد کی اور مجھے بے خبر رکھا۔ لیکن کیا خود رابعہ کے لیے ممکن ہے کہ وہ اتنی لمبی جدائی کی سزا کاٹ سکے؟

ایسے ہی متضاد خیالات کی کشمکش آخر شب تک جاری رہی۔ پھر مجھے نیند نے آ لیا اور میں بے سکونی کی نیند میں بار بار چونک کر جاگتا رہا۔ ایسے ہی ایک بار میری آنکھ کھلی تو مجھے یوں لگا جیسے میرے قریب رکھے ہوئے فون کی گھنٹی صرف ایک بار بجی ہے۔ یہ ہلکی سی ٹن کی آواز تھی۔ جیسے کوئی ایک ہی لائن سے ملے ہوئے دوسرے فون کا ریسیور اٹھا لے۔

میں نے اٹھ کے فون کو غور سے دیکھا۔ اس میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ میں نے ریسیور اُٹھا کے کان سے لگا لیا۔

"نہیں... میں نے اُسے یقین دلا دیا ہے۔" وہ آواز سیٹھ چاند بھائی کی تھی۔

"وہ آسانی سے یقین کرنے والا آدمی نہیں ہے۔" یہ آواز سُن کر میرا دل دھڑکنا بھول گیا کیونکہ یہ رابعہ کی آواز تھی۔

"تمھاری خاطر میں نے اُسے یہ بھی یقین دلا دیا ہے کہ دلاور کے خلاف میں اس کی ہر طرح سے مدد کر سکتا ہوں۔" وہ بولا۔

"میری خاطر...؟" وہ تلخی سے بولی۔

"اور کس کی خاطر... تم تو جانتی ہو کہ دلاور سے میرا کوئی تعلق نہیں بلکہ میں تو اس کے نام سے بھی ناواقف تھا۔ پھر بھی میں نے وہ کہانی سنا دی کہ کس طرح اس نے خسرو جمشید کو توڑ لیا تھا اور رلائج والا واقعہ بھی سنا دیا۔"

"اور تمھیں یقین ہے کہ وہ قائل ہو گیا ہے؟"

"قائل نہ ہونے کی وجہ کوئی نہیں۔" چاند بھائی نے کہا۔

"یہ بھی اس نے مان لیا کہ تم یہاں کیسے آئی تھیں۔ لیکن اس بارے میں ابھی تک وہ شک کا شکار ہے کہ تم یہاں نہیں ہو۔"

"میں نے کہا تھا نا... وہ نہیں مانے گا۔"

"تم اس کی فکر مت کرو... میں اسے مطمئن کر کے بھیج دوں گا۔ لیکن رابعہ اس کے بعد تو کوئی شرط باقی نہیں رہے گی نا... میں اس کی پوری مدد کروں گا۔ اس کی حفاظت بھی کروں گا۔ میرے سارے وسائل اس کے لیے وقف ہوں گے۔ میں سامنے آئے بغیر اس کو وہ سب کچھ فراہم کرتا رہوں گا جس کی اُسے ضرورت ہو گی۔"

"سامنے آتے ہوئے ڈرتے ہو!"

"میں بتا چکا ہوں کتنی بار کہ یہ ایک سیاسی جنگ ہے اور میرا کسی قسم کی سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔ میں ایک کاروباری آدمی ہوں۔ جواب تک غلط کاروبار میں ملوث تھا، غلط راستے پر بھٹک رہا تھا۔ صرف تمھارے لیے میں نے وہ سب کچھ چھوڑ دینا منظور کیا۔ اپنی زندگی کو بدل دینا قبول کیا۔ تمھاری ہر شرط میں نے پوری کر دی۔"

"تم نے صرف وعدہ کیا ہے اور جواب میں، میں نے بھی وعدہ ہی کیا ہے۔" رابعہ نے کہا۔

"تم دیکھ لو گی... میں ایک شریف آدمی بن جاؤں گا۔ میں ان سب کنیزوں کو رخصت کر دوں گا... اپنی سابقہ روش ترک کر دوں گا۔ ویسا ہی کروں گا جیسا تم چاہتی ہو۔"

"پھر تم بھی دیکھ لو گے کہ میں وعدے پر قائم ہوں۔"

"لیکن ایسے صرف وعدوں پر کب تک گزر ہو گی... میں زیادہ دن انتظار نہیں کر سکتا۔ تم مجھے ٹال تو نہیں رہی ہو... یہ نہ ہو کہ میری قوتِ برداشت جواب دے جائے۔" وہ بولا۔ "تم جانتی ہو کہ میں آج تک کسی عورت کے سامنے... اس کے لیے اتنا مجبور نہیں ہوا۔ میری اس مجبوری سے فائدہ مت اُٹھاؤ۔"

"آخر تم کیا چاہتے ہو؟" رابعہ نے بے بسی سے کہا۔

"ایک تاریخ... اس ہفتے یا اس مہینے یا اس سال میں۔ لیکن کوئی حد ضرور ہونی چاہیے۔"

"ابھی سے میں... تاریخ کیسے دوں؟"

"کس کا ڈر ہے اب تمھیں... کس بات کا شک ہے۔ جو تم نے چاہا وہ میں نے کیا۔ کچھ اور کہہ کے دیکھو۔"

"ابھی سے گھبرا گئے... ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں۔"

"لیکن یہ امتحاں ہی تو زندگی نہیں ہو سکتے۔" وہ بولا۔

"ایک بادشاہ نے تاج و تخت ٹھکرا دیا تھا۔ یہ قصے کہانیوں کی بات نہیں ہے۔ وہ انگلستان کا بادشاہ تھا۔"

"میں جانتا ہوں... تم ایڈورڈ ہشتم کی بات کر رہی ہو، اور مسز سمپسن کی جو ایک بیوہ تھی۔" وہ بولا۔

"تم بھی ٹھکرا سکتے ہو اپنی اس سلطنت کو... جس کے تم بے تاج بادشاہ ہو۔" رابعہ نے غیر سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"نہیں... میں تم سے جھوٹ کیوں بولوں... میں تمھارے ساتھ جنگل کی خاک چھاننے نہیں جا سکتا اور کسی جھونپڑے میں نہیں رہ سکتا۔ لیکن یہ وعدہ کر سکتا ہوں کہ اپنا سب کچھ تمھارے سپرد کر سکتا ہوں۔ تمھیں اختیار ہو گا کہ جیسے چاہو رہو... جہاں چاہو رہو... یہ روپیہ پیسہ جس کاروبار میں چاہو لگا دو۔ غیر مشروط طور پر میں تمھیں شریکِ حیات ہی نہیں بزنس پارٹنر بھی بنا سکتا ہوں اور مشترکہ طور پر تم اس سب کی مالک بن سکتی ہو جو میرا ہے۔"

"ابھی تم نے کہا تھا کہ اپنا سب کچھ دے سکتے ہو!"

"ہاں! جو میرا ہے وہ تمھارا... اور جو تمھارا ہے وہ میرا۔ قانونی طور پر۔" وہ بولا۔ "جب تک ہم ایک دوسرے کے ہیں۔"

"کیا تمھارے ذہن میں یہ خیال بھی ہے؟"

"ہاں... زر اور زن مل کے بہت بڑی طاقت بن جاتے ہیں۔ ابھی تم کو اندازہ نہیں ہے میری دولت کا... اس کے لیے میں نے جدوجہد کر کے ایک عمر گنوا دی ہے۔ میں قربانی ضرور دے رہا ہوں لیکن پاگل نہیں ہوا ہوں۔ میں سازش کے امکانات کو ختم کرنا چاہتا ہوں جو کوئی بھی اتنی دولت کے لیے کر سکتا ہے۔ میں بے وقوف بننا نہیں چاہتا، اس لیے معاہدے میں یہ بات واضح ہے کہ تمھیں اس دولت پر اختیار میری زندگی تک حاصل رہے گا۔ جس مقصد کے لیے تم یہ اختیار چاہتی ہو، وہ بدلے گا نہیں اور اگر میں نہ رہا تو جو کچھ میرا اور تمھارا ہے، وہ ہماری اولاد کی ملکیت ہو جائے گا۔ تمھارا اپنا کچھ نہیں ہو گا۔ تم ان کے ساتھ ماں بن کے رہو گی تو کوئی فرق نہیں پڑے گا... مگر تم نے کسی اور کو اپنایا تو ظاہر ہے تمھیں اس کی بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔"

"اگر ہم اولاد سے محروم رہے تو..."

"یہ ناممکن ہے... میں اس معاملے میں ماہرین سے... میرا مطلب ہے میڈیکل ایکسپرٹس کی رائے لے چکا ہوں... جو متفقہ طور پر ایک ہی ہے۔ ہم دونوں میں والدین بننے کی صلاحیت ہے... اب بتاؤ؟"

"کیا بتاؤں...؟"

"یہی کہ ہم کب ایک ہوں گے؟"

"جب مجھے مکمل یقین اور اطمینان حاصل ہو جائے گا۔" وہ بولی۔ "اور اس کا انحصار تمھاری کوششوں پر ہے۔"

"ٹھیک ہے..." وہ ایک سرد آہ بھر کے بولا۔ "میں تمھیں جبر اور زبردستی سے حاصل کرنا نہیں چاہتا۔"

لائن کٹ گئی لیکن میں کسی مفلوج آدمی کی طرح ریسیور لیے بیٹھا رہا۔ مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ جو کچھ میں نے سنا ہے وہ خواب میں نہیں سُنا ہے۔ رابعہ میری نہیں رہی۔ اس نے مجھے چھوڑ دیا ہے... اپنے آپ کو گروی رکھ دیا ہے... میرے نام پر... نہیں... ایسا ممکن ہی نہیں... وہ مجبور ہے... اس کے سامنے دوسرا کوئی راستہ نہیں رہا... اس اسمگلر... دولت اور طاقت رکھنے والے... خود کو دنیا کی ہر چیز کے حصول پر قادر سمجھنے والے نے رابعہ کو خرید لیا ہے۔ اس نے کہا ہو گا کہ تمھارے سامنے دو راستے ہیں۔ یا مجھے قبول کر لو اور یہ سب تمھارا ہے۔ بصورتِ دیگر سکندر بھی تمھارے پاس نہیں رہے گا۔ میں اُسے چیونٹی کی طرح مسل دوں گا۔ ابھی اس نے صرف دلاور کو دیکھا ہے اور دلاور جیسے میری ٹھوکروں میں رہتے ہیں... تم اسے چھوڑ دو، تو میں وہ سب چھوڑ دیتا ہوں جو تمھارے نزدیک معیوب اور قابلِ اعتراض ہے۔ میں سکندر کے تحفظ اور اس کی ہر ممکن مدد کا وعدہ بھی کرتا ہوں... اور رابعہ نے محبت کے لیے خود کو قربان کرنے کا سودا کر لیا۔

لیکن میں ایسا نہیں ہونے دوں گا... یہ یکطرفہ سودا کیسے ہو سکتا ہے۔ رابعہ کی زندگی پر میرا بھی حق ہے۔ رابعہ اکیلی یہ فیصلہ نہیں کر سکتی... مجھے اس کی قربانی کے طفیل ملنے والی حمایت نہیں چاہیے۔ میں لعنت بھیجتا ہوں اس تحفظ کی ضمانت پر جو مجھے اپنی محبت کی قیمت میں ملے۔ میں مر سکتا ہوں اور مار سکتا ہوں رابعہ کو بھی... مگر ایسی زندگی قبول نہیں کر سکتا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں کانپ رہا ہوں اور میرا دورانِ خون سر کی جانب بڑھ گیا ہے۔ میرا چہرہ تپ رہا تھا اور کانوں کی لویں سرخ ہو گئی تھیں۔ میری مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں اور میں جنون میں مبتلا ہو رہا تھا۔ رابعہ ایسا نہیں کر سکتی۔ کوئی اس کی مجبوری سے فائدہ اُٹھا کے اس سے محبت کا سودا نہیں کر سکتا۔ میں اس کی مجبوری کو بھی ختم کر دوں گا اور ایسی مجبوری پیدا کرنے والے کو بھی۔

میں کسی آتش فشاں کے لاوے کی طرح ایک تباہ کن قوت بن کے اس کمرے سے باہر آیا۔

"یس سر؟" ایک انگریز لڑکی نے مسکرا کے کہا جو سیدھی میری طرف آ رہی تھی۔

"کہاں ہے وہ تمھارا مالک... ؟" میں نے چیخ کر کہا۔ "وہ شیطان زادہ؟"

"آپ سیٹھ چاند بھائی کو پوچھ رہے ہیں سر؟" اُس نے

شائستہ نرم لہجے میں اور رواں انگریزی میں کہا۔
"ہاں... مجھے بتاؤ ورنہ میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔" میں نے اسے یوں دبوچا کہ اس کے حلق سے ایک چیخ بلند ہوئی۔
"وہ... وہ یہاں نہیں ہیں سر..." وہ گھٹی گھٹی آواز میں بولی۔ "باہر ہیں۔"
"جھوٹ... جھوٹ... جھوٹ..." میں نے چلاتے ہوئے اس کی گردن کو اپنے ہاتھوں کے شکنجے میں کس لیا۔ "وہ ابھی یہاں تھا۔ ابھی اس نے کسی کمرے کے کسی فون پر بات ختم کی ہے۔"
"سر... پلیز... وہ چلے گئے تھے... صبح کی فلائٹ سے لندن چلے گئے تھے۔" وہ چلائی اور تڑپی۔ "مجھے یہی معلوم ہے۔"
"اچھا... میں خود دیکھ لوں گا۔" میں نے اُسے ایک طرف پھینکا اور دیوانہ وار ایک بند دروازے کو ٹکر ماری... دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں اندر جا گرا... میرے اُٹھنے سے پہلے کسی نے میرے سر پر ڈنڈا مارا۔ میری نظروں کے سامنے اندھیرے کا ایک لمحہ آیا۔ میں اسی میں ڈوب گیا۔
جب میں پھر ہوش میں آیا تو وہ میرے سامنے تھا لیکن میں رسیوں سے جکڑا ہوا تھا۔ میرے دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں اور پیروں میں بیڑیاں... میری گردن میں جو طوق تھا اس کا ایک حلقہ دیوار میں منسلک کڑے کے ساتھ مقفل تھا۔ وہ کمرا اسی گھر کا تھا یا کسی دوسرے گھر کا... یہ میں نہیں جان سکتا تھا۔ مجھے تو یہ بھی علم نہیں تھا کہ میں کتنی دیر بے ہوش رہا تھا۔ اس ویران کمرے میں صرف ایک کرسی تھی۔ وہ اسی پر بیٹھا ہوا تھا۔
مجھے ہوش میں آتا دیکھ کے وہ مسکرایا۔ "تم نے دیکھا سکندر بخت کہ وقت بدل گیا... تمہاری اپنی بے وقوفی کے باعث۔"
"وقت پہلے بھی بدلا ہے... میں وقت سے نہیں ڈرتا... کتے... ذلیل، شیطان!" میں نے کمزوری کے باوجود چلا کے کہا۔ "تو مجھ سے میری رابعہ کو نہیں چھین سکتا۔"
"میں نے رابعہ کو چھینا نہیں... میں چھین سکتا تھا... مگر اس بار میں نے ایسا نہیں کیا۔" وہ بولا۔ "دنیا کی کوئی عورت میری دسترس سے باہر نہیں رہی... اور نہ ہے... لیکن اس مرتبہ بات کچھ مختلف تھی کہ میں نے خود کو مجبور اور بے بس محسوس کیا۔ میں نے رابعہ کو طاقت یا دولت سے حاصل نہیں کیا... میں نے اس کا دل جیتا ہے۔"
"اپنی دولت دے کر... تو کیا سمجھتا ہے کہ وہ بکاؤ مال ہے؟"
"سر دست میں اس بحث میں نہیں پڑتا کہ بکاؤ مال کیا ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے مسٹر سکندر بخت کہ اس نے کسی لالچ یا دباؤ کے بغیر یہ فیصلہ کیا۔"
"بکواس کرتے ہو تم... بکتے ہو... جھوٹ بولتے ہو!" میں نے چیخ کر کہا۔ "اس نے محبت کو مجبوری سمجھ لیا کیونکہ وہ تمہاری قید میں تھی۔ اس کے پاس چوائس نہیں تھی۔"
"چوائس...؟" وہ بولا۔ "چوائس تو میں نے اسے اوپن دی تھی۔ میں نے اس کا راستہ نہیں روکا... کوئی شرط عائد نہیں کی۔ شرائط اس نے رکھیں جو میں نے قبول کر لیں۔ حقیقت یہ ہے سکندر کہ اس کے جذبات بدل گئے تھے۔"
"تم میرے پاس ہوتے... اور میں آزاد ہوتا تو میں تمہارے منہ پر تھوک دیتا... اور تم اُسے چاٹتے۔"
"تمہارا ذہن اس حقیقت کو قبول کر لے گا لیکن ایک دم نہیں۔ کیونکہ یہ صدمہ غیر متوقع اور ناقابلِ برداشت ہے۔ لیکن آج نہیں تو کل حقیقت خود اپنا وجود تسلیم کرائے گی اور سامنے آجائے گی۔" وہ بولا۔ "تم آدمی کو آخر کیا سمجھتے ہو؟ کمپیوٹر؟ کہ جو کچھ اس میں ڈال دیا گیا وہ بدلے گا نہیں؟ جذبات کیا کمپیوٹر کے اعداد و شمار ہوتے ہیں؟ وقت اور حالات کے ساتھ آدمی کے خیالات، جذبات اور احساسات سب بدلتے ہیں۔ تصورات اور نظریات میں تبدیلی آتی ہے۔ ایسے ہی محبت کا مفہوم بدلتا ہے۔"
"محبت کبھی نہیں بدلتی۔"
وہ قہقہہ مار کے ہنسا۔ "ایک زمانے میں تم فوزیہ پر مرتے تھے۔ جو محسن کی بہن تھی۔"
مجھے یوں لگا جیسے اس نے زناٹے سے میرے منہ پر تھپڑ مار دیا ہے... اور اس تھپڑ کی اذیت جسمانی نہیں تھی۔ اس نے میرے دل میں وہ خنجر اتار دیا تھا جسے خود میں نے آب دی تھی۔
"مجھ سے نہیں... اپنے آپ سے پوچھو... پوری ایمانداری کے ساتھ کہ کیا اس وقت فوزیہ کے لیے تمہارے جذبات کی نوعیت اور شدت وہی نہیں تھی... جو آج رابعہ کے لیے ہے؟ وہ بھی محبت ہی تھی نا... تم اسے ہوس تو نہیں کہو گے۔" وہ مجھ پر انگارے برساتا رہا۔ "آج تم فوزیہ کو یاد بھی نہیں کرتے... وہ اپنے گھر میں شاد اور آباد ہے اور تمہارا کوئی رقیب اس کے بچوں کا باپ بن چکا ہے مگر تم اس رقیب کے خلاف دل میں کوئی رقابت کا جذبہ تک نہیں رکھتے۔ آخر یہ تبدیلی کیسے آئی... تم کہو گے وقت کے ساتھ... میں بھی اتفاق کروں گا کہ یہ وقت ہی تھا جس نے تمہاری محبت کا رُخ بدل دیا۔ تم فوزیہ کے تھے، پھر رابعہ کے ہو گئے۔ آج اگر یہی رابعہ کے ساتھ ہوا ہے تو تمہیں ناممکن کیوں لگتا ہے... بھئی یہ کسی اور کی زندگی کا تجربہ یا حادثہ تو نہیں۔ تمہاری اپنی زندگی کا واقعہ ہے۔ جب تک تم نے رابعہ کو نہیں دیکھا تھا تم فوزیہ کے لیے عاشقی کے سارے سچے دعوے رکھتے تھے۔ پھر وہ حرفِ غلط ہو گئے۔ یہی میں کہتا ہوں کہ جب تک میں رابعہ سے نہیں ملا تھا، وہ تم کو چاہتی تھی۔ دیوانہ وار چاہتی تھی۔ اتنا چاہتی تھی کہ اس نے تمہاری خاطر اپنا گھر بار... اپنا کیریئر... اپنا مستقبل سب کچھ تباہ کر لیا اور ان راستوں پر تمہارا ساتھ دیا جن پر کوئی دوسری لڑکی اتنی استقامت کے ساتھ نہیں چل سکتی تھی اور مجھ سے ملاقات نہ ہوتی تو سب کچھ ویسے ہی رہتا مگر اب ایسا نہیں رہا تو یہ تقدیر کا فیصلہ ہے۔ میں خود پہلی بار محبت سے آشنا ہوا ہوں... رابعہ کے لیے تو یہ ویسا ہی موڑ ہے...."
"میں... میں نہیں مان سکتا..." میں اذیت سے چیخا جو اس بے رحم سچ کے خلاف نزع کے عذاب سے کم نہ تھی۔
"ہاں... ابھی تم نہیں مانو گے۔ اس لیے کہ تم ہوش میں نہیں ہو اور یہ نقصان اتنا بڑا ہے کہ تمہارا دماغ اسے برداشت کرنے کے قابل نہیں۔ غیر متوقع حادثات ایسے ہی ہوتے ہیں... مگر دیکھو فوزیہ بھی تو زندہ ہے اور خوش بھی ہے اب... دراصل خوشی بھی حالات کا ایک سانچا ہے جس میں ہم بالآخر سما جاتے ہیں۔ ایک بات اور بتا دوں۔ رابعہ کے جذبات کا رُخ بدلنے میں تمہارے حالات کو بہت دخل رہا۔ یعنی لاشعوری طور پر اس نے جب مجھے پسند کیا تو دراصل اس نے میرے حالات میں بھی عافیت اور مستقبل کا یقین دیکھا جو اُسے تمہارے ساتھ نہیں ملا۔ عورت ذات کے لیے میرے دل میں کوئی اچھے خیالات نہیں لیکن رابعہ ایک الگ عورت تھی۔ اس میں وفادار رہنے کی صلاحیت تھی۔ مگر لامحدود صلاحیت کوئی نہیں رکھتا۔ میں یہ دعویٰ غلط نہیں کرتا کہ بیشتر عورتیں مجھ پر دولت کی وجہ سے فریفتہ ہوتی ہیں... مگر ایسی بھی کم نہیں جو میری شخصیت اور وجاہت پر مرمٹتی ہیں۔ تم غیر جانبداری سے مقابلہ نہیں کر سکتے۔ کسی تیسرے فریق سے فیصلہ لو... عورت ہو تو بہتر ہے... کہ ہم دونوں میں سے کون زیادہ پُرکشش ہے... دولت کے بغیر... میں جا سکتا ہوں کہ فیصلہ میرے حق میں ہوگا۔ رابعہ کو ابھی ایک پناہ کی ضرورت تھی۔ یہ پناہ میں نے فراہم کر دی۔ میرے جذبات حقیقی تھے۔ جذبات تمہارے بھی حقیقی تھے... مگر اضافی چیز میری دولت اور اس سے حاصل ہونے والی خوشی تھی۔ جس کے لیے وہ ترس رہی تھی۔"
"اگر یہ سب کچھ رابعہ مجھ سے کہہ دے... میرے سامنے آ کے... تو میں مان لوں گا..." میں نے اس کا تمسخر اُڑانے کے انداز میں کہا۔
"کہہ تو دے گی... لیکن سامنے آ کے نہیں۔" وہ کچھ دیر سوچ کے بولا۔
"ہاں... تم مجھے کوئی ٹیپ سنوا دو گے جو پہلے سے حاصل کر لیا گیا ہوگا۔"
"نہیں... تم اس سے براہِ راست بات کرو گے۔" وہ بولا۔
"اس وقت جب تم یا کوئی اور اس کے سر پر پستول لیے کھڑا ہوگا یا اسے کہا جائے گا کہ اگر تم نے ہماری مرضی کے خلاف ایک لفظ بھی کہا تو سکندر سے آخری گفتگو سمجھ لینا۔"
"نہیں... یہ بھی نہیں... میں جبر کر سکتا تھا مگر میں نے نہیں کیا اور اس لیے نہیں کیا کہ وہ کوئی نئی بات نہ ہوتی۔ اس بار جو نئی بات ہوئی ہے، وہ محبت ہے۔ اسی محبت کے لیے میں سب کچھ کر رہا ہوں... تمہارے لیے بھی اور اس کے لیے بھی۔ میں ابھی اور اسی وقت تم سے اس کی براہِ راست بات کراؤں گا لیکن ٹیلی فون پر... تم جو چاہو، اس سے پوچھ لینا اور جس طرح چاہو اپنی تسلی کر لینا... وہ تمہارا ساتھ چھوڑ چکی ہے اپنی مرضی سے۔" اس نے بالکل فلمی انداز میں تالی بجائی اور ایک شخص اندر آگیا۔ "ٹیلی فون لاؤ۔"
آزمائش کا یہ دوسرا مرحلہ زیادہ کٹھن تھا لیکن یہ آتشِ نمرود میں کود پڑنے کا چیلنج تھا۔ میرا عشق اگر خام ہوتا تو محوِ تماشائے لبِ بام رہتا لیکن مجھے رابعہ کے عشق پر اتنا ہی یقین تھا جتنا آتشِ نمرود کو گلزار بنانے کے لیے ضروری ہوتا ہے، چنانچہ میں نے بے خوفی سے کہا۔
"اگر یہ تمہارا جھوٹ نکلا تو مجھے کیا سزا ملے گی؟"
وہ مسکرایا۔ "کیا میں تم سے ڈرتا ہوں؟ جھوٹ آدمی لالچ میں بولتا ہے یا خوف کے باعث... مجھے تم سے لالچ بھلا کیا ہوگا... کیا ہے جو میری پہنچ سے باہر ہو... تم کو سزا دینی ہوتی تو میں تمہیں کبھی یہاں نہ بلاتا... تمہیں اپنی زندگی کی کہانی نہ سناتا، جس سے میں شریف زادہ ثابت نہیں ہوتا۔ میں رابعہ کو کہیں باہر بھجوا دیتا اور تم ساری عمر سر کھپاتے رہتے مگر اس کا سراغ بھی نہ پاتے... یہ تو اچھا ہے کہ تم مطمئن ہو کے جاؤ۔ تمہارے دل میں کوئی خلش یا آزار نہ رہے۔"
وہی شخص عام قسم کے ریموٹ کنٹرول والا فون اٹھا لایا
"ان کے ہاتھ کھول دو۔" چاند بھائی نے حکم دیا۔
میرے ہاتھ کھول دیے گئے۔
"تم اس فون کو چیک کر سکتے ہو۔" وہ بولا۔ "اس میں کوئی ٹرک نہیں ہے۔ تم کراچی کا کوئی بھی نمبر ملا کے دیکھو۔"

"کراچی کا تو میرے پاس ایک ہی نمبر تھا اور وہ تمھارا نمبر نکلا۔" میں نے فون لے لیا جو پانچ انچ چوڑا اور آٹھ انچ کے قریب لمبا تھا۔ ڈائل کرنے والے پش بٹن اس کے وسط میں تھے۔

اس کا ایک سرا اسپیکر تھا اور دوسرا ریسیور۔ مجھے فون پکڑانے والے نے انٹینا کو پہلے ہی کھینچ کے تقریباً دو فٹ باہر کر دیا تھا۔

"کیا میں ڈائریکٹری منگواؤں؟" وہ بولا۔ "سوائے پولیس اور اخبار کے تم کہیں بھی فون کر سکتے ہو... چلو ایک دو نمبر میں تمھیں دیتا ہوں، ایک ہوٹل میٹروپول کا ہے، دوسرا پی آئی اے کا۔"

میں نے دونوں نمبر ملائے۔ نمبر بھی ٹھیک تھے اور فون بھی صحیح کام کر رہا تھا۔ "اب بتاؤ رابعہ سے کس نمبر پر بات کروں؟"

وہ مسکرایا۔ "اِدھر لاؤ میں نمبر ملا دیتا ہوں۔"

ریسیور مجھ سے لیتے ہوئے ایک وقت ایسا بھی آیا جب وہ میرے ہاتھوں کی رسائی میں تھا اور میں چاہتا تو اس کی گردن پکڑ سکتا تھا یا ہاتھ مار کے توڑ سکتا تھا مگر میں نے صرف اس خیال سے ایسا نہیں کیا کہ پھر میرے زندہ بچ کے جانے کا تصور بھی محال ہوتا اور دامنِ امید جو زندگی کی آخری سانس سے بھی

بندھا رہتا ہے میرے ہاتھ سے نکل جاتا۔ ابھی مشروط طور پر زندہ رہنے کی سبیل تو تھی اور یارِ زندہ صحبت باقی... ابھی نہ سہی پھر کبھی پھر کہیں رابعہ کا اس دنیا میں مل جانا بعید از قیاس تو نہ تھا۔

وہ مجھے نمبر بتانا نہیں چاہتا تھا اور مجھے یقین تھا وہ نمبر رابعہ کا ہوگا ہی نہیں مگر اس نے نمبر ملاتے ہی ریسیور پھر مجھے پکڑا دیا۔ دوسری طرف گھنٹی بج رہی تھی۔ ادھر میرے دل نے بے قابو ہونا شروع کیا۔ کیا ابھی یہ پیچ و خم کانوں میں وہ صدائے نغمہ ساز اترے گی؟ ریسیور کے مشینی حلق سے اسی راحتِ جاں کی آواز آئے گی جس کے لبِ گویا کا ہر لفظ جراحتِ دل کا مداوا ہوتا ہے۔ وہ مجھ سے بات کرے گی اور ہجر کے فاصلے کو اور دردِ فرقت کو سمیٹ دے گی؟

میں گن رہا تھا اور مایوس ہو رہا تھا... ساتویں گھنٹی پر بھی کوئی ریسیور اٹھانے نہیں آیا تھا۔

"ممکن ہے وہ آرام کر رہی ہو۔" چاند بھائی بولا

اسی وقت گھنٹی بند ہو گئی۔ "ہیلو۔" رابعہ نے اپنے مخصوص دلنشین انداز میں یوں کہا کہ میرا بے قرار دل تڑپ کے

اچھلا۔ ایک بار تو جذبات نے مجھے اتنا مغلوب کر لیا کہ بے قابو ہو کے میں نے چلانے کا سوچا اور یہ پوچھنے کی خواہش

ایک موجِ بلاخیز کی طرح اٹھی کہ رابعہ... تمھیں کچھ خبر ہے کہ میں کہاں ہوں... کس حال میں ہوں اور جہاں ہوں وہاں کیوں ہوں؟ یہ صرف تمھاری چاہت کا الزام ہی تو ہے کہ میرے گلے میں طوق اور پیروں میں زنجیر ہے۔

مگر میں نے ہوش سے کام لیا کہ کہیں یہ وقت کا نصف لمحہ بھی مجھ سے نہ چھن جائے جو نصف ملاقات کا پیامبر ہے۔

"ہیلو..." رابعہ نے پھر کہا۔ "کون ہے؟"

"تم ہی بتاؤ... میں کون ہوں۔" میں نے بمشکل تمام کہا لیکن میری آواز فرطِ جذبات سے اتنی بدلی ہوئی تھی کہ خود مجھے اجنبی لگی۔

"معاف کیجیے... ایسے میں کچھ نہیں بتا سکتی۔" اس نے اجنبی لہجے میں بے رخی سے کہا۔ "آخر کون ہیں آپ؟"

"پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے۔" میں نے اب لہجے کو نارمل کر لیا۔ "کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا۔" میں نے آہ بھری۔ اس کے بعد کوئی شک و شبہے کی گنجائش نہ رہی تھی... میری آواز وہی تھی جو رابعہ کے لیے ناآشنا نہ تھی اور میں نے شعر میں بھی غالب کے حوالے سے بہت کچھ واضح کر دیا تھا۔

لیکن مجھے پہلا صدمہ ہوا جب اس نے کنفیوز ہو کے کہا۔ "آپ کو شرم آنی چاہیے... ٹیلی فون پر لوگوں کو پریشان کرتے ہوئے۔"

"رابعہ... میں سکندر ہوں۔" میں نے صدمے سے سنبھل کے کہا۔

خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا... چشمِ تصور سے میں نے بہت کچھ دیکھا اور خیالوں میں بہت کچھ محسوس کیا۔

"رابعہ... خاموش کیوں ہو... بولتی کیوں نہیں؟"

"تم... یہاں کیوں آئے ہو سکندر؟" اس نے کہا۔

"کیا یہ بھی پوچھنا ضروری ہے؟ ظاہر ہے تمھارے لیے۔"

"لیکن میں نے تو تمھیں منع کیا تھا۔"

"میں مجبور تھا رابعہ۔" میں نے کہا۔

"تمھیں میری مجبوری کو بھی سمجھنا چاہیے۔" اس نے قدرے بے رخی کے ساتھ کہا۔

"تمھیں کیا مجبوری لاحق ہے؟" میں نے کہا۔ "تم نے پہلے بھی مجھے کچھ نہیں بتایا تھا... کس نے روک رکھا تھا تمھیں... اور اب کیا تم کسی کی قید میں ہو... کہ...؟"

"میں کسی کی قید میں نہیں ہوں..." رابعہ نے میری بات کاٹ دی۔

"پھر کیا تم اپنی مرضی سے یہاں ہو؟"

"یہی سمجھ لو۔" وہ مختصراً بولی اور مجھے اس کے لہجے سے رکھائی اور بیزاری کا احساس ہوا۔

"میں یقین نہیں کر سکتا... تم پر یقیناً کوئی دباؤ ہے۔ تم کسی

کے خوف سے یا دھمکی سے ڈر کے ایسا کہنے پر مجبور ہو۔"

"میں نے بتایا نا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے... تم مانو یا نہ مانو... تمھاری مرضی..." وہ بولی۔ "بہتر ہوگا کہ تم واپس چلے جاؤ۔"

"واپس چلا جاؤں؟" میں نے مشتعل ہو کے کہا۔ "یہاں تک آ کے تم سے ملے بغیر لوٹ جاؤں!"

"مجھ سے ملنا بالکل ضروری نہیں... بات ہو گئی... اور کیا چاہیے... تم کو تو آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔"

"یہ... تم کہہ رہی ہو... مجھے یقین نہیں آتا رابعہ۔"

"اس میں یقین نہ کرنے کی کون سی بات ہے سکندر... ان حالات میں یہ مشکل ہو گیا ہے کہ میں تمھارے ساتھ رہوں... تمھاری ذمے داریوں میں خلل پڑتا ہے۔ تمھیں میری حفاظت بھی کرنی پڑتی ہے۔ مجھے بھی مشکلات سے نکالنا پڑتا ہے... اور جیسا کہ تم خود تسلیم کرتے ہو... تمھارا مشن میں نہیں ہوں... پاکستان کی سلامتی ہے۔"

"وہ تو ہے... مگر تمھارے بغیر نہیں رابعہ۔"

"میں مجبور ہوں سکندر... حالات..."

"حالات تو وہی ہیں۔" میں نے برہمی سے کہا۔ "کون سی ایسی تبدیلی آئی ہے حالات میں؟"

"یہی تو... تمھیں سمجھنا چاہیے۔" وہ بولی۔ "حالات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی... اور مجھے امید بھی نظر نہیں آتی کہ مستقبل قریب میں تم مجھے وہ سب کچھ دے سکو جس کی خاطر میں نے اب تک تمھارا ساتھ دیا تھا اور... سب کچھ گنوا کے بھی ہمت نہیں ہاری تھی۔"

"اور اب... تم ہمت ہار گئی ہو..." میں نے ڈوبتے دل کے ساتھ کہا۔

"ہاں سکندر... دیکھو میں ایک عورت ہوں۔ میری زندگی کے یہ دن عمر کا سب سے خوب صورت حصہ تھے جو میں نے تمھاری نذر کیے۔ لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ میں ساری عمر صرف امیدوں اور خوابوں کے پیچھے بھاگتے گزار دوں۔ اپنے جذبات کو اور ارمانوں کو تسلیوں پر زندہ رکھوں کہ بہت جلد آلام و مصائب کا یہ دور تمام ہو جائے گا اور ہم اپنا گھر آباد کر سکیں گے۔ اس سے زیادہ دکھ اٹھانے کا حوصلہ مجھ میں نہیں ہے سکندر... تم اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ میں نے بہت مصائب جھیلے... بہت قربانیاں دیں اور بہت سختی برداشت کی... اب میں تھک گئی ہوں... میں تو چاہتی تھی کہ تم میرا سہارا ہو۔ لیکن الٹا مجھے تم کو سہارا دینا پڑ رہا ہے... تم کہہ سکتے ہو کہ میں نے اپنی شکست مان لی ہے اور اس مشن میں تمھاری ہمسفر بن کے تمھارے

ساتھ نہیں چل سکتی۔ مجھے معلوم ہے کہ تمھارے سامنے زیادہ بڑا مقصد ہے۔ ایک رابعہ کے نہ ہونے سے تم کو فرق نہیں پڑنا چاہیے۔"

"یہ تم کہہ رہی ہو... تم میرا ساتھ چھوڑ رہی ہو!" میں نے چیخ کے کہا۔

"یہی سمجھ لو... تم مجھے بے وفا کہو یا بزدل لیکن حقیقت یہ ہے کہ نہ میں بزدل تھی اور نہ بے وفا۔ بس میرا حوصلہ لامحدود نہیں تھا جیسا کہ تم نے سمجھ لیا تھا۔" وہ بولی۔ "جس حد تک میں تمھارے ساتھ چل سکتی تھی، چلتی رہی۔ اب میں تھک گئی ہوں۔ مجھے یہیں چھوڑ دو اور جاؤ۔ تمھیں تو بہت آگے جانا ہے... تمھارے مقاصد اور تمھارے عزائم بہت بلند ہیں۔ ایک عورت کی طلب کو تمھاری راہ میں حائل نہیں ہونا چاہیے۔ جب تم کامیاب لوٹو گے تو تمھیں ہر قدم پر ایک رابعہ دیدہ و دل فرشِ راہ کیے ملے گی۔"

"مجھے کوئی دوسری رابعہ نہیں چاہیے۔" میں نے دیوانہ وار چلا کے کہا۔ "مجھے تمھاری ضرورت ہے۔"

"لیکن تمھیں میری ضرورت نہیں ہے۔ تمھاری زندگی میں، تمھارے مقاصدِ حیات میں اور تمھارے جذبات میں میری حیثیت اب تک ثانوی رہی ہے اور آئندہ بھی رہے گی... تمھاری ضروریات اور ترجیحات میں میرا نمبر بہت بعد میں آتا ہے۔"

"خدا کے لیے ایسا مت کہو رابعہ... تم سے زیادہ میرے لیے کوئی چیز اہم نہیں۔" میں نے کہا۔

"خود کو دھوکا دینے سے کیا فائدہ سکندر... اب تک جو وقت ساتھ گزرا ہے اس میں میرا وجود تو خواب فردا تھا۔ آج کے غم مختلف ہیں۔" وہ تلخی سے بولی۔ "اور تمھیں ساتھ دینے والوں کی کیا کمی ہے محسن اور غالب تمھارے دوست ہیں اور سب سے بڑھ کر نازو ہے... کیا کمی ہے اس میں... کیا خامی ہے اس کے جذبات میں؟"

"مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی رابعہ کہ تم اس حد تک گر جاؤ گی۔" میں نے چراغ پا ہو کے کہا۔ "نازو کا یوں ذکر کرتے ہوئے تم کو شرم نہیں آتی!"

"شرم نازو کو نہیں آتی تو مجھے کیوں آئے۔ کیا نہیں کیا اس نے تمھارے لیے... بھائی تک کو تو گولی مار دی تھی۔"

"یہ تم نہیں بول رہی ہو۔ اس اندازِ گفتگو کے پیچھے کچھ اور ہے... تم کبھی ایسی نہ تھیں..." میں نے دل شکستگی کے دکھ میں ڈوب کے کہا۔

"تم خود فریبی میں مبتلا رہنا چاہتے ہو تو رہو۔ لیکن اتنی بات

صاف ہے کہ میں اب تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی۔"

"اس... عیش و عشرت کی زندگی کے لیے... تم نے محبت کو بیچ دیا... خوار کر دیا مجھے... میری زندگی برباد کر دی تم نے... بے غیرت... بے حیا... فاحشہ...!" میں نے چلانا شروع کیا۔

"تم مجھے جتنی گالیاں دو گے وہ اپنے آپ کو ہی دو گے۔" رابعہ نے تلخ لہجے میں کہا۔ "کیا سمجھتے تھے آخر تم مجھے؟ میں عورت ہوں یا چٹان؟ میرے جذبات اور احساسات... میرے ارمان... میری خواہشیں... ان سب کے قتل کو تم محبت کہتے ہو!"

"رابعہ... پلیز... ایک بار مجھ سے مل لو... میری سن لو، پھر جو فیصلہ چاہو کر لینا۔" میں نے منت کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں سکندر... ملنے کی نہ اب اہمیت ہے نہ ضرورت۔ تم حالات کا اب بہتر طور پر مقابلہ کر سکو گے... میرے بغیر۔"

"تمہارا مطلب ہے تمہارے اس خریدار کی دولت سے اور اس کی حمایت سے؟ تو میں لعنت بھیجتا ہوں اس کی صورت پر اور اس کی حمایت پر... میں اس حرامزادے کو قتل کر دوں گا رابعہ۔ تم نے کیا سمجھا ہے مجھے... رابعہ... رابعہ..."

لیکن دوسری طرف رابعہ ریسیور رکھ چکی تھی۔ میں نے اپنے ہاتھ کا ریسیور اٹھا کے زمین پر دے مارا۔ اس کے ٹکڑے منتشر ہو گئے۔

چاند بھائی اس تمام عرصے میں صرف مسکرا رہا تھا۔ وہ اب بھی مسکرا رہا تھا۔

"اگر ایک ریسیور توڑ کے تمہیں تسکین حاصل ہوئی ہے تو میں ایسا ہی دوسرا منگوا دیتا ہوں۔" وہ بولا۔

میں نے اُسے ایک سے ایک گندی گالی دی اور بار بار کہا کہ میں اُسے چھوڑوں گا نہیں... جواب میں اس نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔ پھر وہ مجھے پابہ زنجیر کرنے کا حکم دے کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے کچھ دیر بعد جب میری ذہنی کیفیت کسی خطرناک پاگل سے کم نہ تھی، وہی شخص اندر آیا جو ٹیلی فون لے کر آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک رومال تھا۔ اس میں سے امونیا جیسی تیز مہک اُٹھ رہی تھی جس نے میرے حواس پر یلغار کی۔ میرے جسم نے جھٹکا لیا اور زنجیر کی جھنکار سنائی دی۔ یہ احساس کی سرحد تھی۔ اس کے آگے کچھ نہیں تھا۔

دوبارہ آنکھیں کھولنے پر میری نظروں میں اندھیرا اجالا یوں جلنے بجھنے لگے جیسے کسی شریر بچے نے روشنی کا سوئچ آن آف کرنے کا کھیل بنا لیا ہے۔ پھر روشنی ٹھہرنے لگی اور اندھیرے کے وقفے کم ہونے لگے مگر ایک نیا تماشا یہ شروع ہو گیا کہ میرے چاروں طرف ہر چیز گھومنے لگی۔ کبھی یوں لگتا تھا جیسے میں جکڑا ہوا جھولے میں بیٹھا اڑتا ہوا جا رہا ہوں تو کبھی یوں محسوس ہوتا کہ دنیا تو ساکت ہے لیکن وہ بیڈ گردش میں ہے جس پر میں دراز ہوں۔

اس دائرے کی گردش کے دوران میں مجھے کچھ اجنبی اور کچھ مانوس چہرے جھلک دکھاتے رہے اور غائب ہوتے رہے۔ ان میں ایک چہرہ چاند بھائی کا تھا تو دوسرا محسن کا... اور اس کیفیت میں بھی میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ کیونکہ ان دونوں کا ایک ہی جگہ اور ایک ہی وقت میں نظر آنا محال تھا۔

پھر آوازوں نے میری سماعت کو سب سے پہلے ہوشیار کیا۔ میں نے پہلے محسن کی آواز سنی۔ وہ مجھے پکار رہا تھا۔

"سکندر... ہوش میں آ بیٹے... اب چھوڑ یہ مکر... ہم مانتے ہیں تو اچھی ایکٹنگ کر رہا ہے۔"

پھر اکرام شیخ نے کہا۔ "جب برداشت نہیں ہوتی تو اتنی پیتے کیوں ہو بھائی؟ ملکے کا پانی پی لیا کرو۔ اس سے نشہ نہیں ہوتا۔"

اور نازو بولی: "کمال ہے... آپ دونوں مذاق کر رہے ہیں۔"

"اور کیا کریں؟" اکرام شیخ نے اُسے ڈانٹا۔ "اب تک دل نہیں بھرا تیرا رونے سے... چل جا کافی لا۔"

"ہاں... مردہ زندہ ہو رہا ہے۔" محسن نے تائید کی۔ "اب وہ فلمی سوال کرنے ہی والا ہے کہ... میں کہاں ہوں؟" اس نے مریل لہجے میں روتی آواز بنا کے کہا۔

"اور ہم اسے بتائیں گے کہ آپ عالم ارواح میں ہیں..."

"نہیں یار... کسی کو دھوکے میں کیوں رکھیں... صاف کہیں گے کہ آپ جہنم میں ہیں۔" محسن بولا۔ "آپ کے مطلب کی جگہ ہے۔"

میرا شعور اب جاگ چکا تھا لیکن مجھ میں کسی بات کا جواب دینے کی ہمت نہیں تھی۔ ایک تو میرا سر درد کی شدت سے تڑخ رہا تھا۔ پھر میری زبان تھی جو خشک ہو کے تالو سے جا لگی تھی۔ تاہم یہ سوچ کے حیران ہو رہا تھا کہ میں نے جو کچھ دیکھا تھا اور سنا تھا، وہ کیا ایک ڈراؤنا خواب تھا؟ میرا کراچی جانا، وہاں اکرام اور نازو سے ملاقات، افتخار عارف کا قتل... چاند بھائی سے دوست محمد کے ذریعے ملاقات اور رابعہ کی بے وفائی کا صدمہ۔

لیکن ابھی میری سوچ میں بھول تھا۔ ورنہ میں حقیقت کو خواب نہ سمجھتا اور اتنا ضرور سوچتا کہ کیا میں پھر گزرے ہوئے اس وقت میں پہنچ گیا ہوں جب ہم سب اکٹھے تھے۔

نازو کافی لائی جو بے حد تلخ اور گرم تھی۔ یہ دوا میرے حلق سے اسی طرح اتاری گئی جیسے بیمار بھینس کے حلق سے دیسی مرکبات کا مکسچر اتارا جاتا ہے... اثر بہت جلد ہوا۔ چند منٹ میں بے یقینی کی دھند چھٹ گئی اور میرے ذہن نے واقعات کو ترتیب کے ساتھ وقت کی زنجیر میں جوڑ لیا۔

"محسن!" میں نے کہا۔ "ایک سگریٹ دے مجھے۔"

"کیا... بگلا مار کر برس والا... یار اکٹ....؟" محسن نے کہا مگر ایک سگریٹ جلا کے میرے منہ سے لگا دیا۔

"تو کب آیا؟" میں نے کہا۔

"اسے تیئس برس پہلے کی بات ہے۔" محسن نے ایک سرد آہ بھر کے کہا۔ "موسم برشگال کی ایک طوفانی رات میں جب آدھی دنیا سورج کے اِدھر تھی اور آدھی اُدھر۔ اس حقیر فقیر پر تقصیر نے عدم سے وجود کا سفر کیا۔"

"بکواس مت کر... تو لاہور سے کب آیا؟" میں نے کہا۔

"پہلے تو پوچھ کہ میں یہاں کیسے آیا؟" محسن بولا۔

"اچھا بھائی... پہلے یہی بتا دے۔" میں نے کہا۔

"تو ہمیں سڑک کے کنارے پڑا ہوا ملا تھا۔" محسن بولا۔ "جب میں بہت چھوٹا تھا... کوئی دس بارہ کلو کا... تو میری ماں بھی مجھے اس سوال کا یہی جواب دیتی تھی... کہ میں سڑک کے کنارے پڑا ملا تھا۔"

"میں بتاتی ہوں آپ کو۔" نازو نے میرا سر دباتے ہوئے محسن کو گھورا۔ "اکرام بھائی نے لاہور فون کیا تھا۔ وہاں سے ان کے آنے کی خبر ملی۔ اکرام بھائی ٹرین کے ٹائم پر گئے اور انھیں ٹیکسی میں یہاں لے آئے مگر آپ کے بارے میں یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ آپ سڑک کے کنارے بے ہوش پڑے تھے۔"

میں ہمت کر کے بیٹھ گیا۔ "تمہیں تو انھوں نے واپس کر دیا تھا۔"

"ہاں... مجھ سے دوست محمد نے کہا کہ تم جاؤ، تمہارا دوست مزے میں ہے۔" اکرام شیخ بولا۔ "فکر کی کوئی بات نہیں... میں نے کہا کہ اگر ایسا ہی ہے تو مجھے اس سے ملوا دو۔ صرف ایک منٹ کے لیے... پھر میں چلا جاؤں گا... وہ کہنے لگا کہ بابا اس کا آرڈر نہیں ہے... کاہے کو پھڈا کرتا ہے مفت میں۔ تمہارا یار اپنی ماشوق سے بات کرتا پڑا ہے... کیا تو واقعی رابعہ کے ساتھ تھا؟"

رابعہ کے نام سے میرے دل میں ایک سلگتا ہوا تیر پیوست ہو گیا۔ "رابعہ... کون رابعہ؟" میں نے بے خیالی میں کہا۔

ان سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور مسکرا دیئے۔

"جس رابعہ کی تم بات کر رہے ہو نا..." میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "وہ اب نہیں ہے... کہیں نہیں ہے۔"

یکلخت ان تینوں کی مسکراہٹ کافور ہو گئی۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" نازو سب سے پہلے چلائی۔ "نہیں ہے کا کیا مطلب؟"

"نہیں ہے کا مطلب یہی کہ اب وہ رابعہ نہیں رہی جسے تم پوچھ رہے ہو... جس کی تلاش مجھے یہاں لائی تھی... جو نہیں ہے وہ نہیں ہے اور ہماری تمہاری زندگی ایسی ہی ہے کہ اس میں لوگ آتے ہیں اور پھر ہمیشہ کے لیے چلے جاتے ہیں۔ کبھی لوٹ کر نہ آنے کے لیے... صرف ان کی یاد رہ جاتی ہے... پھر وہ بھی ساتھ چھوڑ دیتی ہے اور وقت ہمیں کھینچ کر آگے لے جاتا ہے۔"

محسن اور اکرام شیخ کا چہرہ بے جان ہو گیا تھا... نازو بے اختیار رونے لگی۔ ان سب نے میری بات کا وہی مطلب نکالا تھا جو نکالا جا سکتا تھا۔ میں نے نہیں کہا تھا کہ وہ مر گئی مگر انھوں نے یہی سمجھا تو غلط نہیں سمجھا... اور میرے لیے سب سے زیادہ آسان یہی تھا کہ میں فسانۂ دل کو یوں مختصر کر دوں۔ ورنہ میں وہ سب بتاتا جو میرے دل پر بیتی تو بتا نہ پاتا۔

"یہ... یہ سب کیسے ہوا سکندر؟" محسن نے طویل خاموشی کے بعد ہمت کر کے کہا۔

"کیا کیسے ہوا؟" میں نے کہا۔ "مجھ سے کیا پوچھتے ہو... جب ہیروشیما پر ایٹم بم پھٹا تھا تو کسی نے یہ سوال مرنے والوں سے کیا تھا؟ کوئی کرتا تو وہ کیا بتاتے؟ ہاں، وہ جو زندہ رہے تھے وہی بتا سکتے تھے کہ یہ سب کیسے ہوا تھا۔ تم نے ٹیڈی کی لاش سے پوچھا تھا کہ دوست... یہ کیسے ہوا... اس نے کیا جواب دیا تھا؟"

بڑی خاموشی سے محسن باہر چلا گیا۔ اکرام شیخ دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا رہا۔ نازو میرے سرہانے بیٹھی روتی رہی اور مجھے نہ رونے کی تلقین کرتی رہی۔ ہمت سے کام لینے کو کہتی رہی۔ بے ہمت لڑکی! وہ کیا جانے ہمت اور حوصلہ کسے کہتے ہیں۔ وہ میری جگہ ہوتی... وہ سب سنتی جو رابعہ نے مجھ سے کہا اور جو جھوٹ نہیں تھا، تب میں دیکھتا اس کا یہ سچ سننے کا حوصلہ... ایسے تو سب ہی صبر جمیل کی بات کر لیتے ہیں۔ رسم دنیا نباہنے کے لیے مگر کیا الفاظ کسی کے دکھ کا مداوا ہوتے ہیں۔ یہ تو میں ہی ہوں کہ میں نے دل کو پتھر کر لیا اور وہ کہہ دیا جو شاید میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

محسن پھر آیا تو اس کے ساتھ ایک اجنبی تھا... اسے دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ وہ ڈاکٹر ہے۔

"اس شخص سے کہہ دو کہ چلا جائے۔" میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "ورنہ میں خود اسے باہر پھینک دوں گا۔"

ڈاکٹر کے قدم رک گئے۔ "پلیز..."

"پلیز کے بچے... اب تم کہو گے کہ تم نہیں جانتے کہ تمہیں آرام اور سکون کی ضرورت ہے اور پھر مجھے کوئی سکون آور انجکشن گھونپ دو گے... گیٹ آؤٹ... میں کہتا ہوں دفع ہو جاؤ مجھے نہیں ہے ضرورت اس مصنوعی سکون کی۔"

ڈاکٹر بڑی گھبراہٹ میں واپس ہوا۔ نازو میرے بازو سے تقریباً لٹک گئی۔ "سکندر بھائی... خدا کے لیے..."

"چوپ..." میں نے اُسے جھٹک دیا۔ "تیرا بھائی ہے اکرام شیخ میں نہیں... وہ کہتی تھی۔" میں نے رابعہ کے الفاظ دہرانے کی کوشش کی لیکن میرے حلق میں پھندا لگ گیا۔ وہ بات میں دُہرا بھی نہیں سکتا تھا... باہر محسن غالباً ڈاکٹر کو قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں خطرناک قسم کا پاگل ہرگز نہیں ہوں۔

"محسن..." میں نے چلاّ کے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب کو آمدہ لے آ... مجھے سُلا دیں... ہمیشہ کے لیے۔" اور بستر پہ آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ میں نے ایک منٹ بعد انجکشن کی سوئی کی چبھن بھی محسوس کی لیکن میں نے آنکھیں نہیں کھولیں... دھیرے دھیرے میرا جسم ڈھیلا پڑنے لگا۔ میرے خیالات کے گرداب میں رابعہ کا چہرہ ڈوبنے اور اُبھرنے لگا۔ اس چہرے کے ہزار روپ تھے... ہزار جلوے تھے... سب دل نشین... سب نظر فریب... سب یادوں کے نقش... سب سراب۔

تیسرے دن میں بالکل فٹ ہو گیا۔ یہ تین دن میں نے سوتے جاگتے گزارے... میں نے محسن کے علاوہ غالب کو بھی دیکھا۔ ان دونوں کے اداس چہرے بھی دیکھے۔ ان کی سرگوشیاں بھی سنیں۔ نازو کے آنسو بھی محسوس کیے جو کبھی کبھی تیزاب کے جھلسا دینے والے گرم قطروں کی طرح میرے ماتھے پر یا میرے ہاتھ پر ٹپک جاتے تھے۔ میں نے ان کی باتیں بھی سنیں جو وہ مرحوم خواجہ نیک محمد... عرف خوجی... عرف استاد ٹیڈی کے لیے کرتے تھے اور رابعہ کے لیے کرتے تھے... جو تھی مگر اب نہیں تھی... جب میرے لیے نہیں تھی تو ان کے لیے کہاں سے ہوتی۔

جب میں فٹ ہو گیا تو میں نے خود ہی کہا۔ "دوستو انھیں رونے سے کیا جو ہمارے ساتھ نہیں۔ کیا یہ کم ہے کہ ہم ساتھ ہیں؟ کون جانے کل کس کو بچھڑنا ہے۔ آج کے دن کو اور اس لمحے کو غنیمت جانو اور انھیں بھول جاؤ... بھولنا تو پڑتا ہے۔ پھر کل کا کام آج ہی کیوں نہ کر لیں۔ دُکھ کی مدّت کو کم کیوں نہ کر لیں اور آنے والے دن کی کیوں فکر نہ کریں کیونکہ وقت کے ساتھ ہم بھی حرکت میں ہیں اور ماضی میں نہیں ٹھہر سکتے۔ ہمیں مستقبل میں سفر کرنا ہی پڑے گا۔"

وہ سب حیران رہ گئے لیکن انھوں نے میری بات مان لی۔ انھوں نے مجھے تفصیل سے بتایا کہ استاد ٹیڈی کی موت کس طرح اچانک واقع ہوئی۔ چوہدری دلاور اینڈ کمپنی نے تاڑ لیا تھا کہ سرکس کی آڑ میں کیا تماشا ہونے والا ہے۔ میں نے جولی کے متعلق پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ وہ ڈاکٹر لطیف کے گھر میں ہے جہاں رابعہ بھی رہی تھی۔ انکل رضوی اس کو دیکھنے جاتے ہیں مگر اس کی حالت میں ابھی تک کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ وہ عملاً زندگی کے احساس سے ناتا توڑ بیٹھی ہے اور اب امید کی واحد کرن وہ بچہ ہے جو اس پاگل عورت کو مامتا کے جذبے سے بھر دے اور اس کا پاگل پن دُور کر دے۔

میں نے انھیں خسرو جمشید، جیکی اور جونی کے بارے میں بتایا اور یہ بھی بتایا کہ زیب النساء کی ایک بہن ملتان میں ہے۔

غالب مسکرانے لگا۔ "وہ اس کی ماں ہے۔ تم نواب سلطان کی تیسری بیوی کی بات کر رہے ہو نا؟"

"تیسری... امیرے علم کے مطابق وہ دوسری تھی... مگر خیر... تیسری بھی ہو سکتی ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ زیب النساء کی ماں ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"کیا مطلب زیب النسا کی ماں نہیں ہو سکتی؟" محسن بولا۔ "یہ تو سُنا تھا کہ فلاں کا باپ نہیں... مگر ماں تو ان کی بھی ہوتی ہے جن کے باپ نہیں ہوتے۔"

"میرا مطلب تھا کہ وہ بڑی نہیں لگتی تھی۔"

"ہاں یہ کہو کہ تمھاری نظر نے اس کی عمر کا غلط اندازہ کیا... ایسا ہو جاتا ہے۔" غالب نے کہا۔ "جب میری عبدالودود منظر سے بات ہوئی تب مجھے یہ پتا چلا کہ خسرو جمشید سے تمھارا کیا معاہدہ ہوا ہے۔"

"اس معاہدے کی پیش رفت کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"منظر بھائی نے کارروائی تو بڑی تیز رفتاری سے شروع کی ہے اور دلاور بہت پریشان ہے کیونکہ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ اس نے تو سیاسی مقاصد کے استعمال کے لیے اسپتال کی تعمیر کا اعلان کر دیا تھا۔ اسپتال کا منصوبہ پہلے کھٹائی میں پڑا۔ اب خسرو جمشید وہ سب زمین تمھیں دے رہا ہے اور کاغذات جو اس کے پاس رہن نامے کی صورت میں موجود تھے عدالت کی تحویل میں جا چکے ہیں۔ تمھارے والد کی وہ فیکٹری تو تمھیں نہیں مل سکی۔ مگر اللہ جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔ ساری برائی چوہدری دلاور کے کھاتے میں گئی۔ تمھیں اس کی جگہ بنا بنایا اسپتال مل جائے گا... اس کا ثواب تم کماؤ گے... ابھی ٹرانسفر کے معاملات چل رہے ہیں۔ تعمیر کا سلسلہ بعد کی بات ہے۔ اس کے لیے بھی خسرو جمشید نے تمھارے اکاؤنٹ میں فنڈ ٹرانسفر کر دیے ہیں۔ فکسڈ ڈیپازٹ کی صورت میں چار لاکھ کی رقم ہے۔ جب یہ سب معاملات طے ہو جائیں گے اور دلاور اینڈ کمپنی کا حشر نشر ہو جائے گا، تب ہم اسپتال کا سنگ بنیاد رکھیں گے۔ ابھی رکھا تو وہ اکھاڑ پھینکے گا۔ اسپتال کو بھی اُڑا دے گا لیکن زمین کو وہ نہیں اُڑا سکتا۔ اس کی سب سے بڑی مجبوری یہ ہے کہ اسے نواب خسرو جمشید کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کہ وہ ہے کہاں؟"

"کہاں ہے وہ؟" میں نے کہا۔

"جیکی اور جونی کی قید میں۔" غالب نے کہا۔ "میں نے اپنے تمام وسائل اور تعلقات کی مدد سے اس کا سراغ لگا لیا تھا اور جیکی، جونی سے مل کے سب حالات بھی معلوم کر لیے تھے۔"

"انھوں نے بتا دیا تمھیں؟"

غالب ہنسا۔ "ارے یار وہ لونڈے ہیں۔ ہم انھیں چٹکیوں میں اُڑا دیں... بنتے ہیں بہت ہوشیار مگر ہیں گدھے... تاہم اچھے گدھے ہیں اور کام کے گدھے ہیں... تم سے بہت متاثر ہیں اور تمھیں بالکل ڈیوڈ جینسن (DAVID JENSON) کا حقیقی روپ سمجھتے ہیں۔"

ڈیوڈ جینسن اس زمانے کی مقبول ترین انگلش فلم سیریز 'فیوجیٹو' کا مرکزی کردار ادا کر رہا تھا۔ اس کہانی کی ایک سو نو اقساط دکھائی گئی تھیں اور 'فیوجیٹو' یعنی مفرور ایک ایسا ڈاکٹر تھا جس نے اپنی بیوی کو قتل کرنے والے کی ایک جھلک دیکھی تھی مگر قتل کے الزام میں وہ خود پکڑا گیا اور تمام واقعاتی شہادتیں اس کے خلاف تھیں۔ کسی نہ کسی طرح وہ پولیس کی تحویل سے نکل بھاگا اور اس نے اپنی بیوی کے اصل قاتل کو تلاش کرنا اپنی زندگی کا مشن بنا لیا۔ ہر جگہ پولیس اس کے پیچھے رہی اور وہ مختلف بھیس بدل کے، آگے آگے بھاگتا رہا لیکن اس نامعلوم قاتل کو بھی تلاش کرتا رہا تاکہ ایک طرف تو اس سے انتقام لے سکے اور دوسری طرف اپنی بے گناہی کا ثبوت فراہم کر سکے۔ ڈیوڈ جینسن ایک ڈاکٹر بنا تھا یعنی وہ بھی ایک تعلیم یافتہ آدمی تھا۔ اس اعتبار سے واقعی میری زندگی کی کہانی اور اس ٹی وی سیریل کے واقعات میں خاصی مماثلت تھی۔ فرق تھا تو صرف یہ کہ میری کہانی کا آغاز اپنے والد کے نامعلوم قاتل کی تلاش سے شروع ہوا تھا اور اس کے بعد حالات نے مجھے بھی کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔

'فیوجیٹو' سے میرا موازنہ ایک فطری ردِّعمل تھا۔ خصوصاً جیکی اور جونی جیسے نوجوانوں کے لیے جو اس حقیقی زندگی سے بہت قریب نظر آنے والے ٹی وی سیریل کو بڑی والہانہ دلچسپی سے دیکھ رہے تھے اور میرا خیال ہے کہ ٹی وی نے پھر کبھی ایسا کوئی فلم سیریل پیش نہیں کیا جو اتنا طویل عرصہ چلا ہو اور جس نے عملاً لوگوں کو دیوانہ کر دیا ہو۔

"تو وہ مجھے فیوجیٹو سمجھتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"کیا غلط سمجھتے ہیں؟" غالب نے سوال کیا۔ "اچھا ہے نا کہ بُرا نہیں سمجھتے۔ ان سے مجھے اور بھی مفید معلومات حاصل ہوئیں۔ مثلاً یہی اپنی زیب النسا کی والدہ کے بارے میں۔"

"اپنی زیب النسا؟" محسن نے کھنکار کے کہا۔ "دوبارہ کہنا ذرا تاکہ تمھیں اپنی اوقات یاد دلائی جائے۔"

نازو کا رنگ ذرا سی دیر کے لیے گلابی ہوا۔

غالب نے دانتوں کی نمائش کی۔ "تو مجھے پٹوانے کی مذموم سازش کرتا ہے شہلا کے میاں... جورو کے غلام... زن مرید... وغیرہ وغیرہ..."

"آپ کچھ اور فرما رہے تھے۔ غالباً کوئی انکشاف۔" میں نے کہا۔

"جی فرماتا ہوں۔" غالب بولا۔ "قصہ کچھ یوں ہے کہ نواب خسرو جمشید کے دادا مرحوم ایک وضعدار آدمی تھے۔"

"خسرو جمشید تو آدمی کا بچہ نہیں لگتا!" محسن بولا۔

"مگر وہ آدمی تھے۔" غالب بضد رہا۔ "ان کی دو ہی اولادیں ہوئیں۔ ایک نوعمر لڑکا تھا جو خسرو جمشید کا باپ تھا... چھوٹی لڑکی تھی مہرالنسأ جو دس برس کے وقفے سے پیدا ہوئی تھی۔ اس کی ماں مہرالنسأ کی پیدائش کے وقت مرگئی تھی۔ وہ چھوٹی تھی چنانچہ لاڈلی تھی۔ نوابزادی بھی تھی۔ لیکن سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس کے حُسنِ بے مثال نے دھوم مچا دی تھی۔ نواب زادی کے پرستاروں کی تعداد بڑھتی گئی اور بالآخر ایک ایسا شخص اس دُرِشہوار کو لے گیا جو حسب نسب اور مالی حیثیت کے اعتبار سے نواب مرحوم کی جوتیاں اُٹھانے والوں کے برابر تھا۔ کم سے کم وہ ایسا ہی سمجھتے تھے مگر وہ ایک دلکش مرد اور حرفوں کا بنا ہوا آدمی تھا۔ اس نے تو دولت کے لالچ میں مہرالنسأ سے شادی رچائی تھی مگر نواب مرحوم نے روایت اور وضعداری کے تقاضے پورے کرتے ہوئے اسے عاق کر دیا اور وہ بعد میں اسی طرح خوار ہوئی جیسے گھروں سے نکلنے والی لڑکیاں ہوتی ہیں۔ وہ ناتجربہ کار بھی تھی۔ عام لڑکیوں کی طرح اس نے دنیا کو دیکھا ہی نہیں تھا مگر دنیا نے اُسے دیکھا تھا اور اس کے پرستار بڑھ بڑھ کے آگے آتے رہے کہ غم کیسا... ہمارے دل کا مکان خالی ہے۔ یوں مکاں بے مکاں ہوتی وہ بالآخر ان دنوں نواب سلطان محمد خاں آف ملتان کی حویلی میں ہے۔ اس کا رابطہ استاد بیدِ رو سے کیسے ہوا، یہ کوئی نہیں جانتا لیکن مہرالنسأ کے روابط کی وسعت کو دیکھتے ہوئے اسے کوئی عجیب بات نہیں سمجھا جا سکتا۔ اصل بات یہ ہے کہ اس نے پہلے یا دوسرے تیسرے کسی شوہر کی واحد

اولاد کو ایک دن خاموشی سے خسرو جمشید کے دروازے پر ایک خط کے ساتھ چھوڑا اور فرار ہو گئی۔ جمشید نے مجبوراً اس کی پرورش کی۔ اور یوں زیب النساء نے خسرو جمشید کے زیرِ سایہ ہوش سنبھالا۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ خسرو جمشید زیب النساء کا ماموں زاد بھائی ہے۔" میں نے کہا۔

"اس کا بالکل یہی مطلب ہے۔" غالب نے کہا "اور اس کا دوسرا مطلب یہ بھی ہے کہ وہ عورت جو سلطان محمد خاں کی بیوی ہے خسرو جمشید کی پھوپھی ہے لیکن ان کے درمیان جو رشتہ اٹھارہ بیس سال پہلے ٹوٹا تھا وہ پھر جوڑا نہیں جا سکا۔ خسرو جمشید نے اُسے خبردار کر دیا تھا کہ وہ اب اپنے آپ کو اس خاندان سے بے تعلق سمجھے... اور بیٹی کو بھی بھول جائے چنانچہ زیب النساء نہیں جانتی کہ اس کی ماں زندہ ہے۔"

"یہ تم اتنے یقین کے ساتھ کیسے کہہ سکتے ہو؟" نازو بولی۔

"اس لیے کہ زیب النساء نے کبھی ماں کا حوالہ دیا ہی نہیں۔" محسن بولا۔ "پھر خسرو جمشید اس قسم کا آدمی تھا کہ اس نے باپ کے زمانے کے احکامات منسوخ کرتے ہوئے اس عورت کو رعایت نہیں دی ہو گی، جو اُن کے خاندان کے نام پر ایک بدنما داغ بنی تھی۔ خود زیب النساء بھی ایسے عیاش اور بدکردار ماموں زاد بھائی کے ساتھ کیوں رہتی اگر اسے علم ہوتا کہ ماں موجود ہے۔ سلطان محمد خاں کا گھر بہرحال خسرو جمشید کے گھر سے بہتر تھا۔"

"یار اکرام شیخ... تم چاند بھائی موٹا والا کے بارے میں کیا جانتے ہو؟" میں نے کہا۔

"جو کچھ میں جانتا تھا وہ میں بتا چکا ہوں۔"

"میرا خیال ہے کہ تم کچھ بھی نہیں جانتے۔" میں نے کہا۔ "شاید کوئی کچھ بھی نہیں جانتا... کیونکہ وہ صرف ایک نام ہے۔ ایک ایسا نام جو ایک مخصوص کاروبار میں اس کی ساکھ کو قائم رکھتا ہے۔ پس پردہ جو شخص ہے وہ چاند بھائی موٹا والا نہیں ہو سکتا... وہ ایک بالکل مختلف اور منفرد شخصیت ہے۔"

"یہ نتیجہ تم نے کیسے اخذ کیا؟" اکرام شیخ بولا۔

میں نے اس سوال کے جواب میں وہ سب کچھ بتا دیا جو سیٹھ چاند بھائی موٹا والا نے مجھے بتایا تھا۔ ذہنی صدمے کے ایک پاگل کر دینے والے عارضی دور سے گزر کے میں نے زندگی سے سمجھوتا کر لیا تھا اور ایک غیر جذباتی انداز اختیار کرتے ہوئے میں نے ہر زہر کا پیالہ شکر لیتے ہوئے پینا قبول کر لیا تھا۔ میں نے انھیں رابعہ کے بارے میں بھی بتا دیا۔ پہلے وہ جو چاند بھائی نے رابعہ کے متعلق کہا تھا، پھر وہ جو رابعہ نے مجھ سے براہِ راست کہا تھا۔ وہ سب ایسے گُم سُم اور دم بخود بیٹھے رہے جیسے یہ حقیقت نہیں طلسم ہوشربا کی کہانی ہے جس میں دلچسپی کے لیے تو بہت کچھ ہے مگر یقین کرنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔

ابھی تک سب یہی سمجھے بیٹھے تھے کہ رابعہ ہلاک کر دی گئی ہے۔ اس نئی صورتِ حالات کی تصویر نے رابعہ کو پھر زندہ کر دیا مگر یوں کہ سوائے بے یقینی کے احساس کے کچھ باقی نہ رہا۔ میری طرح پہلے وہ بھی سمجھے کہ یہ فریبِ سماعت ہے اور جو کچھ وہ سن رہے ہیں وہ غلط ہے اور بے بنیاد ہے۔ کیونکہ ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا تھا لیکن ایسا ہو چکا تھا اور جب میں نے اُسے مان لیا تھا تو وہ کیسے نہ مانتے۔

بہت دیر چپ رہنے کے بعد محسن نے کہا "کیا تجھے یقین ہے کہ رابعہ پر کوئی دباؤ نہیں تھا؟"

"یہ وضاحت میں کر چکا ہوں۔"

"اور وہ آواز رابعہ کی ہی تھی؟"

"کیا کسی اور کی آواز کو میں رابعہ کی آواز مان سکتا ہوں؟ تو کسی کی آواز کو شہلا کی آواز سمجھ سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ تو ایسا ہی ہو گا جیسے میں کسی اور کو محسن یا غالب مان لوں۔"

"یار... وہ ٹیپ بھی تو ہو سکتا ہے۔" غالب نے کہا "جو پہلے بھر لیا ہو گا۔"

"تمہارا دماغ خراب ہے۔" میں نے کہا "وہ یک طرفہ بیان نہیں پڑھ رہی تھی۔ جو سوالات میں نے کیے وہ کسی فلمی یا سیاسی انٹرویو کے سوالات نہیں تھے جن میں پوچھا جاتا ہے کہ آپ کا پسندیدہ مشغلہ کیا ہے؟ آپ کو کون سا شاعر پسند ہے... کون سا رنگ اچھا لگتا ہے۔ اور ان متوقع سوالات کے جوابات پہلے سے حاصل کر کے مجھے رابعہ کی آواز میں ٹیپ سنوا دیا جاتا۔ ہماری گفتگو بالمشافہ تو نہیں تھی لیکن ایسی ہی تھی جیسے وہ میرے سامنے ہو۔ میں نے اُسے اور اس نے مجھے نام سے مخاطب کیا۔ ہمارے درمیان بحث ہوئی... پھر تلخ کلامی اور آخر میں... آخر میں میں نے اُسے گالیاں دیں... جب میں صدمے کی شدت سے ذہنی توازن کھو بیٹھا تھا۔"

وہ پھر کچھ دیر گُم سُم افسردہ و ملول اور غصّے میں بھرے بیٹھے رہے۔ پھر محسن نے ہی کہا۔

"یار... اس کا تو یہی مطلب ہے کہ دنیا میں محبت اور اعتماد کوئی چیز ہی نہیں رہی... کل کو شہلا بھی مجھے چھوڑ سکتی ہے۔"

"ایک حادثے کی بنیاد پر یہ نتیجہ اخذ کرنا پاگل پن ہو گا کہ اب ایسے ہی حادثات میں دنیا تباہ ہو جائے گی۔" میں نے کہا۔ "ہر عورت رابعہ نہیں ہو سکتی... یہ پہلے بھی سچ تھا... اور آج جب کہ حالات برعکس ہیں تب بھی درست ہے۔"

"اور تم اسے... بھول جاؤ گے؟" نازو نے کہا۔

"بی بی میں اُسے بھول چکا ہوں۔" میں نے دل پہ پتھر رکھ کے کہا۔

"جھوٹ... تم خود سے کیوں جھوٹ بولتے ہو؟"

"جھوٹ کیا ہے اس میں؟" میں نے کہا۔ "آئینے جھوٹ نہیں بولتے اور رابعہ نے صرف آئینہ دکھا کے مجھے سچ کے وجود کا اقرار کرنے پر مجبور کر دیا۔ میں کیسے تردید کر سکتا ہوں کہ مجھے فوزیہ سے محبت نہیں تھی... اور اتنی ہی محبت نہیں تھی... یہ بات محسن جانتا ہے۔ پھر میں نے اپنی محبت بدل لی۔ اس کا تو صاف مطلب یہی ہوا ناکہ محبت ایک تغیر پذیر جذبہ ہے۔ اس میں مرد اور عورت کی تخصیص کیسی... جو میں نے کیا وہی رابعہ نے کیا تو کوئی ناممکن واقعہ پیش نہیں آیا۔ اس نے ایک شخص کو پسند کر لیا جو مجھ سے بہتر تھا... اس کی نظر میں... تم اس تبدیلی کو اپنی نظر سے دیکھ رہے ہو... میں اس سے گلہ نہیں کر سکتا کہ اس کے لیے مر بھی نہیں سکتا اور اپنے مشن سے بھی دستبردار نہیں ہو سکتا۔ میرے لیے اسے نوشتۂ تقدیر سمجھ کے قبول کرنا زیادہ آسان ہے۔ میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ اس طرح قدرت نے مجھے وہی سزا دی جو میں نے فوزیہ کو دی تھی۔ پھر مجھے کرنا بھی وہی چاہیے جو فوزیہ نے کیا یعنی حالات سے سمجھوتا کر کے خوش رہنا چاہیے۔"

"میرا دماغ تو کام نہیں کرتا۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "اگر یہ سب سچ ہے تو پھر...!"

"خاموش کیوں ہو گئے؟" میں نے تلخی سے کہا۔

"بہت سی باتیں میری سمجھ میں نہیں آئیں۔" اکرام شیخ نے سوچ کے کہا۔ "مثلاً یہ کہ اس دن جب میں تمہارے تعاقب میں گیا تھا اور دُور سے دیکھ رہا تھا تو مجھے یقین تھا کہ مجھے کسی نے نہیں دیکھا لیکن میرا یقین اس وقت غلط ثابت ہوا جب دوست محمد نے خود مجھ سے آ کے کہا کہ جاؤ بھائی... تمہارا دوست مزے میں ہے۔ رابعہ کے ساتھ عیش کر رہا ہے... اور... اور اس نے بڑے معنی خیز انداز میں... لوفروں کی طرح مجھے آنکھ بھی ماری تھی... میں برداشت کر گیا اور جب واپس آنے لگا۔ تو دوست محمد میری ہی ٹیکسی میں بیٹھ گیا تھا۔"

"کیوں؟ اس کی اپنی گاڑی جو تھی۔" میں نے کہا۔

"یہی تو وہ بات ہے۔" اکرام شیخ بولا۔ "اس نے کہا کہ مجھے بندرگاہ پہنچا دو۔ میں نے کہا کہ تمہاری گاڑی کیا ہوئی... تو اس نے جواب دیا کہ وہ رابعہ لے جائے گی... کیا مطلب ہوا اس کا آخر؟ کیا رابعہ وہیں موجود تھی لیکن وہاں رہتی نہیں تھی۔ اسے کہیں اور جانا تھا۔ مگر جانا تھا تو وہاں گاڑیوں کی کمی نہیں تھی۔ اس کا وہ خبیث عاشق ذرا اسے مرسیڈیز کا نیا ماڈل پیش کر سکتا تھا۔ وہ پھر بھی اس کھٹارا گاڑی میں گئی... یا گئی ہو گی۔ دوسری بات یہ کہ دوست محمد واقعی بندرگاہ گیا... جبکہ میرا خیال تھا کہ وہ میرے ساتھ جائے گا اور میرا گھر دیکھنے پر اصرار کرے گا۔ بندرگاہ پہنچ کے اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور مجھے کرایہ بھی دیا... زبردستی... اور پھر غائب ہو گیا... ایسا غائب ہوا کہ پھر نظر نہیں آیا... تین دن سے میں اس کے بارے میں پوچھتا پھر رہا ہوں مگر نہ کسی نے اُسے دیکھا ہے نہ کسی کو معلوم ہے کہ وہ کہاں ہو گا۔"

"تم کو وہیں جانا چاہیے تھا... چاند بھائی کی کوٹھی پر۔"

اکرام طنز سے ہنسا۔ "تم مجھے اتنا کوتاہ اندیش سمجھتے ہو؟ بھائی میں پولیس مین کا دماغ اب بھی رکھتا ہوں، عہدہ نہیں رہا تو کیا ہوا۔ میں وہاں بھی گیا تھا اور سب سے بڑا شاک مجھے وہیں لگا۔ اس کوٹھی میں کوئی نہیں تھا۔"

ہم سب ایک ساتھ چونکے۔

"تمہارا مطلب ہے وہ چاند بھائی موٹا والا نہیں تھا۔" میں نے کہا۔ "میں بتا چکا ہوں کہ وہ ایک فرضی اور کاغذی کردار ہے۔"

"وہاں کوئی نہیں تھا۔" اکرام شیخ نے اپنی بات پر اصرار کیا اور میز پر مُکا مارا۔ "کوئی آدم نہ آدم زاد... کوٹھی خالی پڑی ہوئی تھی۔ اس میں سامان تک نہیں تھا... میں نے بند کھڑکیوں کے شیشوں میں سے جھانک کر دیکھا تو فرش اور دیواریں سپاٹ تھیں... بالکل اسی طرح جیسے کسی نئے مکان کے در و دیوار جس میں ابھی مکین نے قدم تک نہ رکھا ہو۔ اندر ایک تنکا تک نہیں تھا۔ جب میں کوٹھی کے ہر کمرے میں جھانک رہا تھا تو ایک پٹھان چوکیدار آ گیا۔ اس نے مجھے للکارا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ کوٹھی کب سے خالی ہے۔ وہ کہنے لگا کہ تم کو کرائے پر لینی ہے تو مجھ سے بات کرو۔ عجیب الٹی کھوپڑی کا آدمی تھا۔ میں نے کہا کہ بھائی میں اس کوٹھی کا سرونٹ کوارٹر بھی کرائے پر نہیں لے سکتا... مجھے تو ان سے ملنا تھا جو یہاں آئے تھے۔ وہ کہنے لگا کہ ملنے کا یہ کون سا طریقہ ہے کہ تم کھڑکیوں میں سے جھانک رہے ہو... تم کو شرم آنی چاہیے۔ اندر عورتیں ہوں تو پھر... یہ شریف لوگوں کا علاقہ ہے۔ میں نے معافی مانگی اور کہا کہ چلو غلطی ہوئی۔ اب بتا دو کہ یہاں کون تھا اور وہ کہاں گیا۔ اس نے پھر بھی مجھے ٹالا اور کہا کہ تھا کوئی کرائے دار۔ ہمیں نہیں معلوم کہ کون تھا اور کیا کرتا تھا اور کہاں چلا گیا...۔ اس کے بعد مزید بات کرنے کی گنجائش نہ رہی اور میں واپس آ

گیا۔ اپنی ٹیکسی کو میں نے کوٹھی کے سامنے ہی روکا تھا اور آس پاس کا جائزہ لینے کے لیے ظاہر یہ کیا تھا کہ ٹیکسی خراب ہو گئی ہے۔ جب مجھے یقین آگیا کہ مجھے کوئی نہیں دیکھ رہا ہے تو میں پیچھے کی طرف سے گیا تھا اور دروازے بند دیکھ کے حیران ہوا تھا۔ کوٹھی ویسے بھی ویران نظر آتی تھی۔ جھانک کر دیکھنے سے اس کی بے سروسامانی بھی عیاں ہو گئی۔"

"یہ کب کی بات ہے؟" میں نے کہا۔

"کل کی۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "اور میرا..."

"تم نے ہمیں بھی کچھ نہیں بتایا۔" نازو نے احتجاج کیا۔

"میں بتانے والا تھا لیکن اس کے بعد اور کچھ واقعات پیش آئے جو پُراسرار سمجھے جا سکتے ہیں۔" اکرام شیخ بولا۔ "میں بندرگاہ گیا اور دوست محمد کو تلاش کیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ ان معاملات پر یقیناً روشنی ڈال سکتا ہے۔ عام طور پر وہ آسانی سے مل جاتا تھا۔ کوئی نہ کوئی اس کے بارے میں ضرور بتا دیتا تھا کہ وہ کہاں ملے گا یا کب ملے گا لیکن کل تو مجھے بڑی حیرت ہوئی جب الٹا لوگ مجھ سے کہنے لگے کہ تم اسے دیکھو تو فلاں فلاں کو بتا دینا۔ وہ اسے تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ وہ کئی دن سے لاپتا ہے۔ میں مایوس ہو کے واپس آگیا۔ لیکن سب سے بڑا شاک ابھی باقی تھا۔ واپسی پر میں نے اپنی ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر ایک مُہر بند لفافہ دیکھا۔"

اس کی خاموشی سب کے اعصاب پر اثر انداز ہونے لگی۔

"کیا ہے بھیا۔!" نازو نے بگڑ کے کہا۔ "سسپنس پیدا کر رہے ہو خواہ مخواہ... کیا تھا اس لفافے میں!"

"تیرے لیے کچھ نہیں تھا۔" اکرام شیخ نے کہا۔

"پھر کس کے لیے تھا؟" غالب نے کہا۔

"اور کیا تھا؟" میں نے کہا۔

"بتاتا ہوں... بتاتا ہوں۔" وہ بولا۔ "بے صبرے کیوں ہوتے ہو۔ وہ خط سکندر بخت کے نام تھا۔ میرا مطلب ہے لفافے پر سکندر بخت کا نام تھا۔ خط تو میں نے پڑھا نہیں کیونکہ اس پر لکھا ہوا تھا۔ صرف کے ٹو کے لیے..."

"یہ مذاق کرنے کا بہت بھونڈا طریقہ ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ مذاق نہیں ہے۔"

"پھر کے ٹو کا کیا مطلب ہوا۔" غالب بولا۔ "کسی نے قراقرم کی چوٹی کے ٹو کے نام خط لکھا تھا کہ مجھ سے شادی کر لو۔"

"مرزا غالب کے بھتیجے... تم ایسا ہی بے تکا مطلب نکال سکتے ہو۔ کیونکہ تمھاری عقل پولیس مین کی عقل نہیں ہے۔"

یہ غلط فہمی ہے تمھاری کہ پولیس مین کے پاس بھی عقل ہوتی ہے۔" غالب نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "اس کے پاس صرف تیرہ نمبر کا جوتا ہوتا ہے۔"

"کاش وہ میرے پاس ہوتا... تو آپ کی عقل ٹھکانے آجاتی۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "میں تم سے منوا کے چھوڑتا کہ تمھاری محدود عقل کے لیے یہ معما بہت مشکل تھا لیکن میں نے اس کا مطلب نکال لیا۔ یہ خط سکندر بخت کے لیے تھا جس کا دوسرا نام کبیر خاں بھی ہے۔ ڈبل کے یعنی کے ٹو۔"

غالب پر گھڑوں پانی پڑ گیا اور نازو نے غالب کو فخر سے دیکھا کہ اسی عقل پر افلاطون بنتے ہو۔ غالب نے سر جھکا لیا۔

"کہاں ہے وہ خط؟" میں نے بے چینی سے کہا۔

اکرام شیخ نے جیب میں سے دہرا کیا ہوا بند لفافہ نکالا اور میرے سامنے ڈال دیا۔ یہ ڈاک کا عام استعمال ہونے والا لفافہ تھا لیکن اس کا اندازِ تحریر عام نہیں تھا۔ یہ رابعہ کی تحریر تھی جسے میں پہچانتا تھا۔ میرا دل یوں دھڑکا جیسے پھر نہ دھڑکے گا۔ میں لفافے کو گھورتا رہا۔ آخر کیا ہوگا اس میں؟ یہی کہ اب کہنے کو کچھ بھی نہیں... پھر میں نے خود سے کہا کہ دل ناامید تو نہیں ناکام ہی تو ہے... اور خط کو کھول لیا اس میں فیض کی ایک نظم کا اقتباس تھا۔

گر آج تجھ سے جُدا ہیں تو کل بہم ہوں گے
یہ رات بھر کی جدائی تو کوئی بات نہیں
گر آج اوج پہ ہے طالعِ رقیب تو کیا!
یہ چار دن کی خدائی تو کوئی بات نہیں
جو تجھ سے عہدِ وفا استوار رکھتے ہیں
علاجِ گردشِ لیل و نہار رکھتے ہیں

یہ ایک مختصر سے سادہ کاغذ پر بے نام تحریر اسی کے ہاتھ کی تھی جس نے مجھے یکلخت زندگی کی طرف لوٹا دیا اور مجھے وہی امید... وہی امنگ، وہی ارمانوں کی تندی، وہی جذبات کی تپش اور وہی احساس کی آرزومندی عطا کر دی جو رابعہ کے نام سے اور اس کے تصور سے اور اس کی چاہت سے منسوب تھی۔ تحریر اس کی نہ ہوتی اور اس پر تاریخ نئی نہ ہوتی تو میں سمجھتا کہ یہ پرانا خواب ہے۔ بالکل یہی پیغام مجھے رابعہ نے جیل خانے میں اس وقت بھیجا تھا جب میں زندگی سے مایوس تھا اور اتنا اکیلا تھا کہ خود اپنی ذات کے اعتماد سے محروم ہو چکا تھا۔ اس وقت رابعہ نے جو کچھ کیا، وہی آج بھی کیا تھا اور وہ جانتی تھی کہ کوئی توضیح کوئی توجیہہ اس سے زیادہ مکمل اور قائل کرنے والی نہیں ہو سکتی۔ اس نے آخری شعر کا اضافہ کر کے وہ سب کہہ دیا تھا، جو اتنا تھا کہ اس کے سہارے میں ناامیدی سے دُور رہ کے تمام عمر انتظار کر سکتا تھا۔

میری ظاہری حالت میں تغیر پوشیدہ رہنے والی بات نہیں تھی۔ ایسے وقت میں جبکہ مایوسی کی انتہا کو پہنچ کے میرا احساس بھی منجمد ہو چکا تھا اور اپنے دل سے اس محبت کے نقش کو کھرچ کے مٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔ یوں جیسے فنکار اپنے سب سے عظیم شاہکار کو اپنے ہاتھوں سے فنا کر دینے کی سعیٔ لاحاصل میں مصروف ہو۔ یہ چند سطروں کا خط لفظِ کُن فیکون سے کم نہ تھا اور کوئی شخص کسی حرفِ تسلی سے کسی دلیل سے اور کسی بیانِ علمی سے مجھے وہ یقین نہیں لوٹا سکتا تھا جو اس مختصر ترین نامۂ محبت نے دے دیا۔

"تم نے... اس خط کو اب تک چھپائے رکھا؟" میں نے بالآخر فرطِ خوشی سے مرتعش آواز میں کہا۔ "یہ رابعہ کا خط ہے۔"

"میں پہلے سے کیسے جان سکتا تھا۔" اکرام شیخ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اور پھر جناب کی حالت ایسی کہاں تھی۔"

"جھوٹ... تمھیں معلوم تھا کہ یہ خط کسی اور کا نہیں ہو سکتا۔"

"مجھے شک ضرور ہوا تھا مگر میں رابعہ کی تحریر کو نہیں پہچانتا۔ یہ تو مجھے محسن نے بتایا۔" وہ بولا۔

"پھر ہم نے اُسے کھولا اور پڑھا۔" محسن نے ڈھٹائی سے کہا۔

"حالانکہ پرائی بہو بیٹیوں کے خط پڑھنا مشرق کا قاعدہ نہیں۔" غالب نے اتفاق کیا۔ "مگر ہم شرفا ہیں کب۔"

"پھر کون ہیں آپ؟" نازو نے کہا۔

غالب نے اسکی طرف دیکھا، آہ بھری اور بولا۔ "ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے۔" پہلا مصرع اس نے نہیں پڑھا مگر نازو نے سمجھ لیا اور وہ مُنہ پھیر کے مسکرانے لگی۔

"اب تو یقین آگیا تجھے کہ خواب تھا جو کچھ تو نے دیکھا، جو بھی سنا افسانہ تھا؟" محسن بولا۔

"نہیں... نہ وہ خواب تھا اور نہ افسانہ... مگر ہاں... میں جس یقین سے محروم ہو گیا تھا، وہ مجھے مل گیا ہے۔ کچھ نہ کچھ دال میں کالا ضرور تھا۔ رابعہ نے جو کچھ کہا، وہ کسی مقصد کے تحت کہا۔ یا کسی ایسی مجبوری کے تحت کہا جس کا اظہار بھی ممکن نہیں تھا۔ اشارے کنائے میں بھی وہ نہیں بتا سکتی تھی کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے۔"

"کیا کر رہی ہے؟ سیٹھ چاند بھائی موٹا والا سے شادی؟" محسن نے ہنس کے کہا۔ "آخر کیسے مان لیا تیرے دل نے کہ ایسا ممکن ہے؟"

میں شرمندہ ہو گیا۔ "میری جگہ تُو ہوتا... تو شاید تُو بھی مان لیتا۔ کبھی کبھی عشق کو عقل کے ہاتھوں شکست بھی ہو جاتی ہے۔"

ڈوب مر بحیرۂ مُردار میں... رابعہ کو معلوم ہوا کہ تیرا جذبۂ عشق ابھی تک خام ہے تو اسے کتنا دُکھ ہوگا... اسے دیکھ کہ کسی نہ کسی طرح اپنا پیغام پہنچا ہی دیا۔"

"وہ مر جائے گی... بہت آسانی سے۔" غالب نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ "لیکن کسی اور کی نہیں ہو گی۔ وہ رابعہ نہیں اس کی مجبوری بول رہی تھی اور اس مجبوری میں بھی یقیناً ہمارا مفاد وابستہ تھا۔ اب تو صاف سمجھا دیا ہے اس نے کہ مایوس مت ہونا۔"

"تمھیں یہ خط... میرا مطلب ہے ٹیکسی میں یہ خط پہنچا کیسے؟" میں نے کہا۔

"میں کچھ نہیں بتا سکتا۔" اکرام شیخ بولا۔ "ممکن ہے یہ خط کسی نے اس وقت اندر ڈال دیا ہو جب میں اس خالی کوٹھی میں جھانک رہا تھا۔ یہ چوکیدار کا کام بھی ہو سکتا ہے۔ رابعہ نے جانے سے پہلے کسی طرح اُسے راضی کر لیا ہو۔ سمجھا دیا ہو کہ پھر کوئی آئے تو اسے یہ پیغام دے دے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ خط دوست محمد ٹیکسی میں چھوڑ گیا ہو۔ وہ پیچھے والی سیٹ پر بیٹھا تھا اور جب وہ اتر کر چلا گیا تھا تو میں نے سیٹ کو دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔"

میں اچھل پڑا... "یہ... یہ اسی کی حرکت ہو گی... اسی لیے وہ ایک فضول سا بہانہ کر کے ٹیکسی میں بیٹھا تھا... وہ رابعہ کا ہمدرد ہے... لیکن وہ اس سیٹھ چاند بھائی سے بھی ڈرتا ہو گا۔"

"خیر جو بھی ہے... اب تو اپنے دل سے سارے اندیشے نکال دے اور سمجھ لے کہ رابعہ صرف تیری ہے اور تیری رہے گی۔ اور یقین رکھ کہ تم دونوں کا ملاپ ضرور ہوگا۔ اس دنیا میں یا پھر اُس دنیا میں۔" محسن بولا۔

"بکواس مت کر... خود تو اسی دنیا میں عیش کر گیا۔ ہمارے لیے دوسری دنیا کی بات کرتا ہے۔" غالب نے کہا۔

"میرے کہنے کا مقصد یہ تھا، دل شکستہ ہجر کے مارے ہوئے قابلِ رحم دوستو۔" محسن نے بیک وقت مجھے اور غالب کو مخاطب کیا۔ "کہ فی الحال محبت کو بھول جاؤ کیونکہ فرض ہمیں پکار رہا ہے۔"

"اچھا ڈائیلاگ ہے۔" غالب نے سر ہلا کے کہا۔

"یہ ڈائیلاگ نہیں ہے... خطرے کی گھنٹی بجا رہا ہوں میں۔ بلکہ گھنٹا بجا رہا ہوں تاکہ تم جاگو اور کمر کس لو۔" محسن بولا۔ "معلوم ہے کل جب میں دوست محمد کو تلاش کر رہا تھا تو میں نے کسے دیکھا؟"

ہم سب سیریس ہو گئے۔ ہمارے چہرے سوالیہ نشان بن گئے۔ "میں نے چوہدری دلاور اور پیڈرو دونوں کو دیکھا۔" محسن بولا۔

"اور وہ بھی یوں کہ خود بال بال بچا۔ اس ٹیکسی ڈرائیور کی وردی والی ٹوپی نے بچا لیا، ورنہ وہ تو ایک دم سامنے آ گئے تھے۔ میں ایک دم نہیں پلٹ سکتا تھا لیکن چند قدم چل کے میں واپس ہوا تو وہ کافی دور نکل گئے تھے۔ میں نے دلاور کو ایک کار میں بیٹھ کے جاتے دیکھا۔ وہ سلیٹی رنگ کی ٹویوٹا تھی۔ اس کا نمبر میں نہیں دیکھ سکا۔ پیڈرو واپس آیا اور اتفاق سے اس وقت راجا بھی میرے ساتھ تھا چنانچہ اس نے سیٹھ اکبر کو پہچان لیا۔ پیڈرو اس کے ساتھ ایس ایس کرانتی تھرڈ، پر گیا۔ ایک اور شخص بھی ان کے ساتھ تھا۔ راجا نے بتایا کہ تم نے ان دونوں کو ٹاور کے کسی ہوٹل میں چائے پیتے ہوئے ایک ساتھ دیکھا تھا۔ سیٹھ اکبر کو اور اس کے ساتھی کو۔"

"وہ... وہی خبیث ڈرائیور تھا جس نے مجھے گرفتار کروانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔" میں نے کہا۔ "مگر وہ ایک جھوٹ بول کے اور میری عدم موجودگی میں کسی طرح خود کو آزاد کر کے نکل گیا تھا۔ اسی کی وجہ سے افتخار عارف مارا گیا تھا۔ خیر پھر کیا ہوا؟"

"پھر کچھ نہیں ہوا۔" محسن بولا۔ "وہ تینوں ایس ایس کرانتی تھرڈ نام کی اس لانچ پر چلے گئے جسے تم چھوٹا موٹا مال بردار بحری جہاز بھی کہہ سکتے ہو... ہم منہ دیکھتے رہ گئے۔"

"کس کا؟" غالب بولا۔

"ایک دوسرے کا اور کس کا!" محسن بولا۔

"بڑا دردناک واقعہ ہے۔" غالب نے آہ بھر کے کہا اور نازو مسکرائی۔

"راجا ابھی تک وہیں ہے۔" محسن نے اپنی بات جاری رکھی۔ "اپنی خلعتِ فقیری پہنے بیٹھا ہے۔ کمائی بھی کر رہا ہے اور ان پر نظر بھی رکھے ہوئے ہے۔"

"ڈبل شفٹ کا بھتا دینا پڑا ہو گا اسے۔" میں نے کہا۔ "مگر محسن میاں... یہ کوئی دانش مندی کا ثبوت نہیں دیا تم نے۔ کیا ضروری ہے کہ وہ اسی راستے سے واپس آئیں؟"

"ایک بچے کے باپ ہو گئے مگر عقل نہیں آئی۔" اکرام شیخ بولا۔

میں چونکا۔ "یار محسن... بچے کی بات تو میں بالکل ہی بھول گیا تھا۔ تجھے مبارکباد تک نہیں دی۔"

"اس نے کون سی مٹھائی کھلا دی ہے۔" اکرام بولا۔

"یار، میں بال بچوں والا ہو گیا ہوں... خرچہ بڑھ گیا ہے میرا۔ مٹھائی بالکل افورڈ نہیں کر سکتا۔" محسن مظلوم صورت بنا کے بولا۔ "مٹھائی تم لوگ کھلاؤ مجھے۔"

"یار وہ ہے کیسا؟" میں نے کہا۔ "صورت کیسی ہے؟"

"ابھی تو بندر کے بچے جیسی ہے۔" محسن بولا۔ "ویسے پتا یہ جانا ہے کہ کس پر گیا ہے۔"

"خدا کرے تیری صورت پر نہ جائے۔" غالب بولا۔

"جب تیرا ہو گا تو میں کہوں گا کہ تیری سیرت پر نہ جائے۔" اس نے لڑنا شروع کیا۔ "تیری صورت پر جائے سالے لنگور کے۔"

"چلو بس کرو۔" نازو نے دونوں کو ڈانٹا۔ "ذرا خیال کرو سکندر کو آرام کی ضرورت ہے... بہت باتیں ہو گئیں۔ اب کھانا کھاؤ اور سو جاؤ... ورنہ سکندر کو سونے دو۔"

"یار تو اپنی بیماری مجھے نہیں دے سکتا۔" غالب نے میرے کان میں کہا۔ مگر نازو کے تیور دیکھ کے پیچھے ہٹ گیا۔ نازو نے گزشتہ تین دن میری تیمارداری میں یوں گزارے تھے کہ میں نے اسے جب بھی دیکھا جاگتا دیکھا۔ اس نے گلوکوز اور دواؤں سے اسپیشل سوپ تک سب خود پلایا اور یہ میری جینے کی خواہش سے زیادہ اس کی کوشش کا نتیجہ تھا، تین دن بعد میں پھر فٹ ہو گیا۔

"میں تو اب جاتا ہوں راجا کی خبر لینے۔" اکرام شیخ بولا۔ "سکندر کی بات نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ وہ دوسری طرف سے بھی نکل سکتے ہیں۔"

"دوسری طرف یعنی سمندر کی طرف سے؟"

"ہاں... لانچ سے اتر کے کسی کشتی میں بیٹھیں اور میل بھر دور جا کے اتر جائیں۔" اکرام شیخ بولا۔ "ہمیں کیا معلوم انھیں شک ہو گیا ہو۔ چوہدری دلاور بہت کائیاں آدمی ہے اور راجا کا اب تک نہ آنا بھی یہ ظاہر کرتا ہے کہ معاملہ گڑبڑ ہے وہ اتنی دیر کیا کریں گے ایک لانچ پر بیٹھ کے... میں کھا لوں گا کہیں کھانا۔ ابھی مجھے بھوک بھی نہیں ہے۔"

وہ چلا گیا تو ہم نے کھانا کھایا اور اس دوران میں محسن وہی باتیں کرتا رہا۔ ایک بیٹے کے بارے میں جو اس کا بیٹا تھا یا ٹیڈی اور جولی کے بارے میں۔ ڈاکٹر لطیف کے گھر میں جولی یقیناً محفوظ تھی لیکن اس کی زندگی کے المیے نے مجھے پھر سوچنے پر مجبور کر دیا کہ کیا وہ لڑکی زندگی میں کبھی خوشی نہیں دیکھے گی۔ آخر ایسا کون سا گناہ کیا ہے اس نے کہ قسمت نے اسے صرف دکھ دیے ہیں اب تک۔ ٹیڈی کا تو معاملہ ہی مختلف تھا۔ اس کی یاد سے درد کے ان گنت نشتر روح میں پیوست ہو جاتے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کی موت کی خبر بھی غلط ہے اور وہ ابھی تک زندہ ہے۔ اس اعتبار سے وہ واقعی زندہ تھا کہ وہ شہید تھا اور شہید کبھی مرتے نہیں۔

نازو نے مجھے زبردستی سلا دیا۔ وہ اکیلی عورت اس گھر کی منتظم تھی۔ قطع نظر اس کے کہ اس کا گھر میں رہنے والے چار افراد سے کیا رشتہ ہے اور اس رشتے کی جذباتی نوعیت کیا ہے۔ وہ اکرام کی سگی بہن تھی تو غالب کے لیے غزل اور حسنِ غزل۔ مجھ پر وہ بیک وقت بہن، ماں اور بیوی کی طرح مہربان تھی... اور میری دیکھ بھال اور تیمارداری اسی طرح کر رہی تھی۔ حالانکہ نہ میں اس کا بھائی تھا، نہ شوہر اور نہ بیٹا... مگر جذبات کے رشتوں کی نیک نیتی اور اعتماد کے خلوص کے اعتبار سے وہ محسن کی بھی سب کچھ تھی۔ اور دنیا والوں کے نقطۂ نظر سے کسی کی کچھ نہیں لگتی تھی۔ مگر ایک گھر میں اس نے سب کو اپنا اپنا مقام دے دیا تھا اور اسی کے اعتبار سے سب کے لیے وہ سب کچھ کر رہی تھی جو صرف ایک عورت کر سکتی تھی۔ جب وہ مردانہ لباس میں مردوں کی طرح پھر رہی تھی تو ان امورِ خانہ داری کے بارے میں سوچتی بھی نہیں تھی جن کے بارے میں اب وہ ہمہ وقت فکرمند رہتی تھی۔ اس کی انتظامی حاکمیت کو سب بلا چون و چرا قبول کرتے تھے کیونکہ اسی سے یہ گھر بھی گھر تھا۔

معلوم نہیں کس وقت میری آنکھ کھلی تو میں نے غالب اور محسن کو نوٹوں کی گڈیاں بنانے میں مصروف دیکھا۔ وہ ایک جیسے نوٹوں کو الگ کر کے شمار کرتے جا رہے تھے اور سو سو نوٹوں کی شکل میں گن کر رہے تھے۔ نازو ایک کاپی پنسل لیے بیٹھی ہوئی تھی... اور پنسل کو مسواک کی طرح چبا رہی تھی۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے جھک کر ایک گڈی اٹھائی اور دوسرے ڈھیر میں شامل کر دی۔ "ہوش میں نہیں ہو کیا؟"

غالب نے نظر اٹھا کے اسے دیکھا اور دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔ "نہیں... اور میں ہوش میں آنا بھی نہیں چاہتا... جب تک تم سامنے ہو۔"

دوسرے لمحے وہی ہوا جو پہلے بھی ہوتا تھا۔ غالب حد سے بڑھ گیا تھا۔ نازو کو بھی یاد آ گیا کہ ایسی علامات ظاہر ہونے لگیں تو علاج کیا ہوتا ہے۔ اس نے غالب کو ایک جھٹکے سے کلائی پکڑ کے کھینچا اور اچھال دیا۔ غالب نے ایک قلابازی کھائی اور بھد سے زمین پر گرا۔

"اب آ گیا ہوش؟" نازو نے کہا اور محسن بے اختیار ہنسا۔

"نہیں..." غالب نے پھر انہی نظروں سے دیکھا۔ "کس کو شکوہ ہے گر شوق کے سلسلے... ہجر کی قتل گاہوں سے سب جا ملے۔ نارسائی اگر اپنی تقدیر تھی... تیری الفت تو اپنی ہی تدبیر تھی۔"

میں خاموشی سے دیکھتا رہا کہ نازو اب کیا کرتی ہے۔

"اور سنو گی؟ یا پہلے دادِ سخن دو گی؟" غالب نے کہا۔ "ذرا مشکل شعر ہے۔ گر فکرِ زخم کی تو خطاوار ہیں کہ ہم... کیوں محوِ مدحِ خوبیِ تیغِ ادا نہ تھے۔ تم سن رہی ہو خاموشی سے؟ میں تو انتظار میں ہوں۔"

یکلخت نازو کو احساس ہوا کہ میں اور محسن اسے دیکھ رہے ہیں اور غالب نے سرِعام اس کے عشق کا اعلان کر دیا ہے۔ اسے چیلنج کر دیا ہے کہ اب وہ کچھ نہیں کر سکتی کیونکہ اس کو سب منظور ہے۔ وہ ایک دم اٹھی۔

"ڈھیٹ ہو گئے ہو تم تو۔" اس نے کاپی پنسل پھینک کے کہا اور دوسرے کمرے میں بھاگ گئی۔ محسن کے ساتھ میں بھی قہقہہ مار کے ہنسا اور غالب اطمینان سے اٹھ کے پھر وہیں آ بیٹھا۔

"الو کی پٹھی... سمجھتی تھی کہ ہم بے زبان ہیں۔" غالب نے کہا۔ "کچھ کہہ ہی نہیں سکتے۔"

"گالی مت دو... ورنہ بہت ماروں گی آ کے۔" نازو نے دوسرے کمرے سے چلا کے کہا۔

"ہم تو پہلے ہی مر چکے ہیں جاناں... اور کیا مارو گی۔" غالب نے خالص فلمی انداز میں جواب دیا۔ "دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے۔"

"چپ یار۔" محسن نے اسے ڈانٹا۔ "یہ کیا بدتمیزی پر اتر آیا ہے۔"

"اسے کچھ نہیں کہتے۔ کتنی تمیزداری کا مظاہرہ کرتی ہے۔" غالب نے کہا۔ "میں تو اب یہی کروں گا... اس کے بھائی کے سامنے سے..."

"چل چل... نوٹ گن... مجنوں کی اولاد۔" محسن نے کہا۔

"یہ نوٹ کیوں گنے جا رہے ہیں؟" میں نے کہا۔

"ایک لانچ کا سودا ہو گیا ہے۔ ادائیگی کرنی ہے شام تک۔" محسن نے کہا۔

"اکرام نہیں آیا ابھی تک؟"

"میاں، تم سو رہے تھے لمبی تان کے... اور خاصے غیر شریفانہ خواب بھی دیکھ رہے تھے غالباً۔" محسن بولا۔ "تمھیں کیا پتا کہ یہاں کیا ہو گیا؟"

میں اٹھ بیٹھا۔ "کیا ہو گیا؟"

"راجا نے ایک بہت سنسنی خیز انکشاف کیا ہے۔" محسن بولا۔ "وہ رات بھر وہیں بیٹھا رہا تھا... رات دو بجے تمھارا آفیشل رقیبِ روسیاہ آیا۔"

"جو تم سے زیادہ ہینڈسم ہیرو ہے۔" غالب نے لقمہ دیا۔

"اور وہ بھی لانچ پر چلا گیا۔ پھر وہ اور پیڈرو صبح چار بجے

واپس ہوئے اور ایک ساتھ چلے گئے۔ اکرام نے پتا لگایا ہے کہ 'ایس ایس کرانتی تھرڈ' پر کل سامان لادا جائے گا۔" محسن بولا۔

"کیا سامان لادا جائے گا؟" میں نے پوچھا۔

"یہی ٹافیاں اور چاکلیٹ' بسکٹ اور مٹھائی' رس گلے وغیرہ۔" محسن نے کہا۔

مجھے اپنے سوال کے بے تکے پن کا احساس ہوا۔ "یہ اطلاع مصدّقہ ہے؟"

"نہیں... محض ایک افواہ ہے جو شہر میں پھیل گئی ہے۔" محسن نے بھنّا کے کہا۔ "کیا ضروری ہے کہ سب احمقانہ سوالات آپ ہی کریں؟"

"چل تو بھی کر لے ایک سوال۔" میں نے جھینپ کر کہا۔

"جواب دینا پڑے گا۔" محسن نے کہا۔ "ہاں یا نہیں میں۔"

"یہ غلط بات ہے۔" میں نے احتجاج کیا۔ "یہی بات عدالت کے کسی فاضل جج نے ایک گواہ سے کہی تھی کہ سوال کا جواب ہاں یا نہیں میں دو تو گواہ نے کہا تھا کہ جناب والا۔ کیا آپ ایسا کر سکتے ہیں اور جج صاحب سے صرف ایک سوال کیا تھا... کیا آپ کی بیوی اب بھی آپ کو جھاڑو سے مارتی ہے؟"

محسن ہنسنے لگا۔ "ایسا سوال نہیں ہوگا جس سے تیری عزت پر حرف آئے۔ سوال یہ ہے مسٹر کے ٹو کہ آپ رابعہ کے لیے یہاں اپنے دن آہیں بھرتے اور راتیں تارے گنتے گزاریں گے یا ہمارے ساتھ چلیں گے؟"

"ہمیں امید تھی برخوردار کہ تمہارا سوال احمقانہ ہی ہوگا۔" میں نے اطمینان کا اظہار کیا۔ "آہیں بھرنے اور تارے گننے کا پارٹ ٹائم جاب تو تمہارے ساتھ رہ کے بھی کیا جا سکتا ہے... جیسے سرکاری افسر اپنے سب ہی کام دفتری اوقات میں کرتے ہیں مگر آپ لوگ... میرا مطلب ہے ہم لوگ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟"

"بھاڑ جھونکنے۔" محسن نے کہا۔ "جھک مارنے۔"

"حسبِ معمول۔" غالب نے سر ہلا کے تائید کی۔ "یہ کتنے ہو گئے بھائی... اے میاں اکاؤنٹ افسر صاحب۔" اس نے ہانک لگائی۔

نازو پھر نمودار ہوئی اور کاپی پنسل لے کر بیٹھ گئی۔ "دو لاکھ بیالیس ہزار ہو گئے تھے۔"

"ٹوٹل غلط ہے... پھر حساب کرو۔" غالب نے کہا۔

"تم بھی نوٹ پھر گنو۔" نازو نے چیں بہ جبیں ہو کے کہا۔

"چلو تم دونوں ڈسمس... اُدھر جا کے لڑو... یاد دو گانے گاؤ۔" محسن بولا۔ "تو اُٹھ بھائی عاشق... یہ پانچ دس اور سو کے نوٹوں کے الگ الگ ڈھیر ہیں۔"

میں ان کے پاس جا بیٹھا۔ "کل کتنی رقم چاہیے؟"

"سوا لاکھ۔" محسن بولا۔ "یار تو بڑا خوش قسمت ہے کہ تجھے رقیب بھی ایسا شاندار ملا۔ لانچ اسی کا تحفہ ہے۔"

"سوا لاکھ میں تحفہ خرید رہے ہو؟" میں نے کہا۔

"اصلی قیمت تو دگنی ہوگی... مگر اس کا پیغام تھا کہ رابعہ کے کہنے پر اس نے ایک لانچ کا بندوبست کیا ہے۔ میں پھر وہ آتا ہوں۔ رابعہ کے کہنے پر۔"

"ہم یہ لانچ نہیں لیں گے۔" میں نے گرم ہو کے کہا۔

"ہم یہ لانچ لے چکے ہیں۔" محسن بولا۔

"یہ جانتے ہوئے بھی کہ... کہ وہ تو دا ایک شکاری ہے!" میں نے برہمی سے کہا۔

"جس نے رابعہ کو شکار کر لیا ہے۔" غالب بولا۔

"خواہ مخواہ رابعہ کو بیچ میں مت لاؤ۔" میں نے کہا۔ "وہ پیڈرو اور اکبر سیٹھ کے ساتھ دیکھا گیا تھا... اس لانچ پر... کیا نام ہے اس کا؟"

"ایس ایس کرانتی تھرڈ۔" غالب نے کہا۔

"ہاں... اسی لیے ہم نے سودا کیا ہے۔" وہ بولا۔ "شکاری سمجھتا ہے کہ ہم اس کے جال میں پھنس چکے ہیں۔ بیڑہ غرق ہو تو اس کا۔"

"اور ہم کیا ساتھ نہیں ڈوبیں گے؟" میں نے کہا۔

"ہمیں رابعہ کی سیکرٹ سروس کے ذریعے دوسرا پیغام ملا ہے کہ لانچ کے کریو کیبن میں دونوں جانب سیٹوں کے نیچے ٹائم بم ہیں جو تختہ اکھاڑنے سے نظر آئیں گے۔"

"یار یہ رابعہ کیا کر رہی ہے۔" غالب نے افسوس سے سر ہلایا۔

"اچھا ہی کر رہی ہے ہمارے لیے۔" محسن بولا۔

"خود اپنے حق میں وہ بہت بُرا کر رہی ہے۔ یہ ڈبل گیم وہ جاری نہیں رکھ سکتی۔" غالب نے کہا۔ "کہ چاہے کے ٹو اور چاہت کا اظہار کرے ماؤنٹ ایورسٹ سے... سوچو ذرا وہ کس کو بے وقوف بنا رہی ہے۔"

"یہ کیا تم لوگوں نے میرا نام بگاڑ دیا ہے!" میں نے جھلا کے کہا۔

"سیکرٹ سروس والوں کے اور ہم جیسے گروہوں میں اس قسم کے نام بہت اچھے لگتے ہیں... ایکس تھری... ایم فائیو۔ یہ نام تو خود میں نے پڑھے ہیں۔ کے ٹو تو آپ کے اصل نام کا مخفف ہے اور آئندہ ہم تمہیں اسی نام سے پکاریں گے۔ تم ہماری زبان کیسے پکڑو گے۔" محسن نے کہا۔ "اے بی بی... سو رہی ہو کیا!

"تین لاکھ دس ہزار..." نازو نے چونک کے کہا۔ وہ واقعی اُونگھ رہی تھی۔ "اب کتنا رہ گیا ہے۔ میرے دماغ میں تو اعداد و شمار بھر گئے ہیں۔"

"اچھا ہے۔ جو سے سے بہتر ہیں۔" غالب بولا۔ "ایک شعر..."

"سُنا کے دیکھو ذرا۔" نازو نے کاپی پنسل رکھ دی۔ "پہلے وہ جگہ بتا دو جہاں تم اترنا پسند کرو گے۔"

"یار کیا مصیبت ہے۔" غالب بڑبڑایا۔ "اب کیا شاعری بھی شجرِ ممنوعہ ہو گئی ہے۔" اس کی بات بہت ذو معنی تھی مگر نازو نہیں سمجھی۔

یہ میرے سوٹ کیس سے ملنے والی رقم تھی جو دشمنوں نے اسی ملک کے غدّاروں سے حاصل کی تھی چنانچہ اس کا انہی کے خلاف بہترین استعمال کیا جا سکتا تھا۔ نصف رقم الگ کر لینے کے بعد باقی رقم کو پھر سوٹ کیس میں ڈال دیا گیا۔ اس کے اوپر کچھ ڈالنے کا فیصلہ مؤخر کر دیا گیا۔ رقم کسی شپنگ ایجنٹ کے ذریعے ادا کی جانی تھی جس نے تمام ضروری دستاویزات کے ساتھ لانچ کو ہماری جائز ملکیت بنانے کے لیے چند گھنٹے کی مہلت طلب کی تھی اور اس کام کے پانچ ہزار مانگے تھے۔ بصورتِ دیگر ہم خود یہ کام کرتے تو اس میں ایک مہینہ بھی لگ سکتا تھا اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ بنا بنایا کام بگڑ جائے۔ پانچ ہزار میں سامنے آئے بغیر یہ کام کرا لینا بہتر تھا۔

غالب کا سوال ابھی تک میرے ذہن میں گشت کر رہا تھا۔ کیا واقعی رابعہ جو محض ایک خوب صورت عورت ہے ایک مکّار اور عیّار و چالاک اور پُر فریب نفسیاتی مریض اور خطرناک قسم کے بین الاقوامی مجرم کے ساتھ ڈبل کراس کر سکتی ہے؟ وہ خود وکیل ہے اور اس کی ذہانت میں بھی شبہ نہیں مگر جس آدمی کا دین ایمان' اصول اور ضمیر کچھ نہ ہو اس کے ساتھ یہ کھیل کھیلنا جان جوکھوں کا کام ہے... خود کو محفوظ رکھنے کے لیے اس نے یہ ڈراما کیا ہو تاکہ وہ سکندر کا ساتھ دیتے دیتے تنگ آ گئی ہے اور مزید سختیاں جھیلنے کا حوصلہ نہیں رکھتی چنانچہ وہ اس کا ساتھ چھوڑ کے چاند بھائی سے شادی کر لے گی... وہ یقیناً چاند بھائی کو اپنے حُسن اور ذہانت سے ہپناٹائز بھی کر سکتی ہے اور جس شخص نے عورت کو ہمیشہ غلام زادی یا دل بہلانے کا کھلونا سمجھا اسے اتنا مجبور بھی کر سکتی ہے کہ وہ اس کے اشارۂ ابرو پر ناچنے لگے۔ وہ ہمیں مہلت فراہم کرنے کے لیے سوچنے کی مہلت بھی لے سکتی ہے۔

لیکن دوسری طرف وہ ہم سے رابطہ رکھ کے اور ہمیں چاند بھائی کے خفیہ منصوبوں سے آگاہ کر کے کتنا بڑا خطرہ مول لے رہی ہے... کیا یہ بات وہ سمجھتی ہے اور اس کے نتائج کی سنگینی کا اندازہ کر سکتی ہے؟ اس نے ایک پیغام مجھے بھجوا دیا تھا کہ غم نہ کرنا... میں کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔ کیا یہ کافی نہ تھا کہ اس نے دوسرا پیغام بھجوا دیا۔ پیغام رساں کتنا بھی معتبر کیوں نہ ہو چاند بھائی جیسے شخص کی نظر سے گھر کا بھیدی کیسے چھپا رہ سکتا ہے۔ اور جس دن اسے معلوم ہوا کہ وہ عورت جس کی خاطر وہ بہت کچھ تج دینے کو تیار تھا' وہی اسے بے وقوف بنا رہی تھی تو اس کا ردِ عمل دیوانگی کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ کچھ اس کے ماضی کا زہر ہے کچھ اپنی انا کی تسکین کے لیے عزت' دولت' طاقت حاصل کر لینے کا غرور... اور پھر اپنی شخصی دلکشی سے ہر عورت کو قابلِ تسخیر سمجھنے کا یقین جو اس انکشاف کے ساتھ ہی شکست سے دوچار ہوگا کہ شاید سب عورتیں ایسے ہی اسے بے وقوف بناتی رہی ہیں۔ اس کی انا پر یہ ضربِ کاری لگانے کی رابعہ کو بہت سخت سزا ملے گی۔

چاند بھائی نے مجھے اعتماد میں لینے سے پہلے تھوڑا سا سچ بولا تھا' جو اپنے وجود میں آنے کی گھناؤنی داستان اور ایک نفرت بھرے ماحول میں پرورش پا کے انتقامی ردِ عمل کے طور پر انگریز قوم کو 'خراب' کرنے والی بات بھی سچ تھی۔ مگر اس کے بعد دلاور سے دشمنی کی کہانی بے بنیاد تھی۔ ظاہر ہے' وہ سچ سے آغاز نہ کرتا تو مجھے جھوٹ پر بھی یقین کیسے دلاتا۔ یہ ایک نفسیاتی حربہ تھا جو اس نے رابعہ پر بھی آزمایا ہوگا۔ رابعہ نے ثابت کر دیا کہ وہ کتنی ذہین ہے۔ اس نے بھی سچ اور جھوٹ کو الگ الگ کر کے دیکھ لیا اور پھر خود بڑی ہوشیاری سے ایک جھوٹ بولا۔ اس طرح کہ وہ یقین کر سکے۔ اس نے ایک عورت کی حیثیت سے اس کی کمزوری کو اپنی شہ زوری بنا لیا اور اس میں کسی حد تک کامیاب بھی رہی۔

لیکن اب وہ جو کچھ کر رہی تھی وہ بارود خانے میں بیٹھ کر آگ سے کھیلنے کے مترادف تھا۔ مجھے بڑی شدّت سے احساس ہوا کہ اس سے رابطے کی صورت نہ ہونے کے باعث یہ بات میں اسے سمجھا نہیں سکتا۔ یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ آئندہ کوئی پیغام نہ بھیجے۔ ہم سے رابطے کی کوشش بھی نہ کرے۔ سچ مچ یہ ظاہر کرے کہ وہ مجھے بھول جانے کی کوشش کر رہی ہے۔ میرا نام بھی اس کی زبان پر نہیں آنا چاہیے۔

میں اپنی سوچوں میں گم تھا کہ شک کے ایک زہریلے سانپ نے پھن اٹھایا اور مجھے ڈس لیا۔ اگر یہ میرا مفروضہ ہوا؟ رابعہ نے مجھے سچ مچ چھوڑ دیا اور اسے اپنا لیا تو؟ آخر وہ گوشت پوست کے اعصاب رکھنے والی عورت ہی تو ہے۔ اس کے

اعصاب جواب بھی دے سکتے ہیں۔ خصوصاً ایسے حالات میں صرف الزام بےوفائی قبول کرکے وہ سب کچھ پاسکتی ہو۔ زندگی کی ہر راحت، ہر نعمت، ہر آسائش اور مصائب و آلام کی اس آزمائش بھری زندگی کا آسیب اس کا پیچھا بھی چھوڑ سکتا ہو۔ کوئی انسان فرشتہ نہیں ہوسکتا کہ سوفیصد 'نوش پروف' ہونے کا دعوے رکھے اور اتنا 'مزاحمت پروف' ہو کہ اس کے خیالات اور جذبات میں تغیر کی ایک فیصد گنجائش بھی بعید از امکان ہو۔

اس ایک فیصد کا امکان ہی میرے دل کی خلش بڑھانے کے لیے کافی تھا لیکن اس خلش کا درماں میرے امکاں میں نہ تھا۔ میں اس کے سوا کچھ نہیں کرسکتا تھا کہ پُرامید رہنے کی کوشش کروں اور اپنے مشن کی تکمیل میں دل و جان کی بازی لگا دوں۔ اس بات کی پروا کیے بغیر کہ کامیابی کی صورت میں واپسی پر مجھے انعام میں وہ ملے گی یا زندگی کی آخری ساعت تک محرومی کی سزا۔

اکرام شیخ شام کو ذرا سی دیر کے لیے آیا اور رقم لے کر چلا گیا۔ ہمارے کسی سوال کا جواب اس نے نہیں دیا۔ وہ خاصا پریشان لگتا تھا لیکن کسی کو اس پریشانی کے بارے میں بتانے کے لیے تیار نہ تھا۔ لانچ کے بارے میں ہم نے جتنے سوالات کیے ان کا مختصر جواب یہی ہوسکتا تھا کہ خود دیکھ لینا، اس نے صرف ایک کام کی بات کہی کہ اب ایس ایس کراتی تھرڈ، شاید دو دن بعد جائے گی۔ اس پر لدا جانے والا مال ابھی تک نہیں پہنچا ہے

غالب اور محسن اپنی پلاننگ مکمل کرچکے تھے۔ ہم سب کو ماہی گیروں کی حیثیت سے سفر کرنا تھا۔ ہم چار مرد اور ایک عورت نازو اور پلان آف ایکشن تقریباً 'گنز آف نیوارون' والا... ہم ماہی گیروں کی ایک فیملی ہوں گے جو اسی لانچ پر رہتی ہے، اور جس کا گھر خشکی پر نہیں سطح آب پر ہے۔ راجا اس سلسلے میں ضروری سامان کا بندوبست کررہا تھا۔ ہمارے ملبوسات سے ماہی گیری میں کام آنے والے تمام اسباب تک ہر چیز کی فراہمی اس کے ذمے تھی اور اسے بطورِ خاص تاکید کردی گئی تھی کہ وہ کوئی چیز بالکل نئی نہ لائے جس سے شبہ پیدا ہو کہ ہم نقلی ماہی گیر ہیں، اصلی نہیں۔

جو اسلحہ میں اپنے ساتھ لایا تھا اس میں چار دستی بم تھے اور دو ڈائنا مائیٹ... ایک اسٹین گن تھی اور سائیلنسر والا ایک ریوالور... یہ سب تخریب کاروں کے کیمپ سے حاصل ہونے والے اسلحے کے ساتھ ایک سوٹ کیس میں بند پڑا ہوا تھا لیکن اسے ہرگز اپنے ساتھ نہیں لے جایا جاسکتا تھا کہ کہیں بھی چیکنگ ہو تو ہم پکڑے جائیں۔ اس مسئلے کا حل ابھی تک کسی کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

"کیا یہ کرنسی ساتھ لے جانی ضروری ہے؟" غالب نے کہا۔

ہاں... اوّل تو اپنے ہی علاقے میں راستے کی ہر رکاوٹ کو صرف یہ ہاتھ کا میل دُور کرے گا۔" میں نے کہا۔ "پھر اگر ہم پہنچ بھی گئے تو فارن ایکسچینج نے کام دے گا۔ بلیک میں ڈالر یا انڈین کرنسی لینے کے لیے یہ نوٹ بھی نہ ہوئے تو کام کیسے چلے گا۔"

"کیا کسی کو معلوم ہے کہ ایس ایس کراتی تھرڈ کی منزل کیا ہے۔" محسن نے کہا۔

"مجھے تو نہیں معلوم۔" اکرام شیخ نے سر کھجا کے کہا۔ "مال بردار جہاز بمبئی، کولمبو یا کلکتے جاسکتا ہے۔"

"ثابت کرو۔" محسن بولا اور نوٹ واپس رکھنے لگا۔

"لاحول ولا قوۃ۔" غالب نے کہا۔ "کامن سینس کی بات ہے یہ تو... تخریب کاروں اور علیحدگی پسندوں تک یہ اسلحہ لے جانے کے لیے بھارت کا راستہ ہی اختیار کیا جاسکتا ہے۔"

"یہ کامن نان سینس ہے۔" محسن نے کہا اور مجھ سے مخاطب ہوگیا۔ "تمھیں معلوم ہے؟"

"مجھے... مجھے کیسے معلوم ہوسکتا ہے!" میں نے حیرانی سے کہا۔

"گویا تم سب اپنے جاہل ہونے کا اقرار کرتے ہو؟" وہ بولا، اور افسوس سے سر ہلانے لگا۔ "میں اکیلا عاقل و بالغ..."

"تم اب ابوجہل ہوگئے ہو۔" غالب نے بھنّا کے کہا۔ "کیونکہ وہ جو تمھاری اولاد ہے نا... وہ ابھی بالکل جاہل اَن پڑھ ہے بالغ تم کبھی نہیں ہوگے۔"

مجھے معلوم ہے کہ وہ جہاز کہاں جائے گا۔" محسن نے دانت نکال کے کہا۔ "وہ جہاز چٹاگانگ جائے گا... لیکن میں کیوں بتاؤں تم لوگوں کو۔"

"مت بتاؤ..." میں نے کہا۔ "اس لیے کہ ہم صرف تمھاری معلومات کو غلط کرنے کے لیے جہاز کو چٹاگانگ نہیں جانے دیں گے۔ خواہ اسے تھانے لے جانا پڑے۔"

"تھانہ ایک جگہ ہے بھارت میں... مگر بندرگاہ نہیں ہے۔" محسن نے کہا۔

"ہم بندرگاہ بھی بنادیں گے اسے۔" غالب نے کہا۔

"ہاں... جہاں اتنے بندر اکٹھے ہوں گے وہی جگہ بندرگاہ تو بن ہی جائے گی۔" محسن بولا۔

اکرام شیخ اور راجا ایک ساتھ آئے۔ پہلے میں نے ٹیکسی کے دروازے بند ہونے کی آواز سُنی، پھر وہ دونوں کسی بات پر ہنسے اور میں نے دروازہ کھول کے دیکھا تو ایک لمحے کے لیے مجھے اپنی نظر پر دھوکے کا گمان ہوا۔ پھر میرا ذہن ماؤف ہونے لگا۔ ان کے درمیان ایک عورت سر جھکائے آرہی تھی لو

کم روشنی ہونے کے باوجود میں دیکھ سکتا تھا کہ وہ عورت موہنی ہے۔ میرے کچھ کہنے سے پہلے وہ اندر آچکی تھی۔ غالب اور محسن نے اُسے پہلی بار دیکھا تھا لیکن وہ میری نظر کو دیکھ رہے تھے اور شاید اندازہ کرنے کی کوشش کررہے تھے کہ پاکستانی کپڑوں میں سوفیصد مسلمان نظر آنے والی یہ خوب صورت لڑکی کون ہوسکتی ہے۔

موہنی کے ساتھ اکرام شیخ اور محسن بھی مجرمانہ خاموشی کے ساتھ کھڑے رہے۔ انھیں بھی میرے جذبات کا اندازہ ہوگیا تھا۔ پھر اندر سے نازو نے جھانک کر دیکھا کہ یہ غیر معمولی سکوت کس طوفان کا پیشِ خیمہ ہے۔ ہم خاموش بیٹھنے والے لوگ نہیں تھے۔

"تم...؟" میں نے بمشکل تمام اپنے جذبات پر قابو پا کے کہا۔ "تم زندہ ہو؟"

"تم نے تو چاہا تھا کہ میں مرجاؤں۔" موہنی نے آہستہ سے کہا۔

"بکواس بند کرو... زندگی اور موت میرے خدا اور تمھارے بھگوان کے ہاتھ میں ہے۔" میں نے برہمی سے کہا۔ "مگر یہاں کیوں آئی ہو تم؟" پھر میں اکرام شیخ اور محسن پر برس پڑا۔

"مجھ سے پوچھے بغیر... مشورہ کیے بغیر... اس عورت کو یہاں لا کے تم نے..."

"آہستہ بول یار۔" محسن نے مجھے کندھے پر تھپکی دی۔

"غصّے ہونے سے کیا ہوگا... بیٹھ کے بات کرلیتے ہیں۔" غالب نے بھی اس کی تائید کی۔ "اب آ تو گئی ہے... اور زندہ بھی ہے۔"

"زندہ ہے تو ماردو۔" میں نے کہا۔ "ورنہ ہم سب مارے جائیں گے... سب بتا چکا ہوں میں تم لوگوں کو کہ یہ عورت نہیں..." میں ایک دم رُک گیا۔ میں اسے طوائف کہنا چاہتا تھا مگر یہ گالی بے محل تھی اور نازو کی موجودگی میں ضروری تھا کہ میں تہذیب کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑوں۔

"یہ دشمن کی ایجنٹ تھی... ہے۔" میں نے اپنے غصے کو ایک گہری سانس کے ساتھ خارج کردیا۔ "کیا تم نہیں جانتے؟"

"میں جانتا ہوں کہ یہ تمھارے بچپن کی پہلی یاد ہے۔" محسن یکلخت اس کی طرفداری پر اُتر آیا۔ "اس کا اعتراف تم بھی کرتے ہو... یہ پہلے کیا تھی اور اب کیا ہے... اس کا فیصلہ عقل سے بھی کیا جاسکتا ہے اور وقت خود بھی بتادے گا... مگر تم خود بھی یقین کے ساتھ کوئی بات نہیں کہہ سکتے۔ جو کچھ تم نے بتایا تھا اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ تم بیک وقت اعتماد بھی کرتے تھے اور دل میں شک بھی رکھتے تھے۔"

ہاں... اور یہی سب ساری خرابی کی بنیاد ہے۔" میں نے کہا۔

"تو ہم نے غلطی کی اسے یہاں لا کے؟" اکرام شیخ نے افسوس کے ساتھ کہا۔

"اور کیا نیکی کی ہے؟" میں نے کہا۔ "تم تو کچھ اور کرنے گئے تھے... اسے کہاں سے لے آئے... میں نہیں مان سکتا کہ یہ راہ چلتے مل گئی اور تمھارے ساتھ ہولی... تم میں سے کسی نے اسے نہیں دیکھا تھا۔"

سکندر بادشاہ... ایک عورت سے اتنا ڈرتے ہو تم۔ یہ تو ہمیں معلوم نہیں تھا۔" راجا بولا۔

"تمھیں ابھی کچھ نہیں معلوم... نہ عورت کے بارے میں نہ اس عورت کے بارے میں... نہ میرے بارے میں کہ میں ڈرتا ہوں تو کیوں اور نہیں ڈرتا تو کیوں۔" میرا پارہ پھر چڑھ گیا۔

"اچھا تو پھر نکالو اپنا وہی سائیلنسر والا ریوالور۔" راجا نے سنجیدہ رہتے ہوئے کہا۔ "اور ڈرتے نہیں ہو تو اس عورت کو گولی ماردو... ہم میں سے کسی کو افسوس نہیں ہوگا۔"

"بلکہ اس طرح ہماری غلطی کا کفارہ ادا ہوجائے گا۔" اکرام نے کہا۔ "جو ہم سے نادانستگی میں ہوگئی۔"

"نہیں... تم یہ نہیں کہہ سکتے۔ تم سب جانتے تھے۔"

"ہم وہ جانتے تھے جو تم نے ہمیں بتایا تھا۔" اکرام شیخ نے برہمی سے کہا۔ "اور کم سے کم میرے نزدیک وہ بہت کافی تھا یہ یقین دلانے کے لیے کہ... جس عورت نے اتنی قربانی دی، اتنی مشکل زندگی گزاری اور اتنا لمبا سفر طے کیا... اور جس حد تک تمھارا ساتھ دیا، وہ تمھاری اور ہماری دشمن ہوسکتی ہے۔ میری عقل ناقص ہوگی۔ مگر میں تم سے اختلاف کرتا ہوں سکندر۔"

اکرام شیخ کی بات نے گویا سب کو زبان دے دی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ان سب کے خیالات میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ وہ سب یہ سمجھتے تھے کہ میں زیادتی کررہا ہوں اور عدم اعتماد میں حد سے بڑھ چکا ہوں۔ غالب اور محسن بھی ہم نوا تھے۔ یہاں تک کہ نازو بھی غیر جانبدار نہیں رہی تھی۔ ریوالور جو محسن نے میرے ہاتھ میں تھما دیا تھا میری کمزوری بن گیا... ایک طرف میں تھا۔ میرے مقابل موہنی نقشِ دیوار بنی کھڑی تھی... جیسے عدالت کے کٹہرے میں مجرم کھڑا ہوتا ہے۔ جیوری کے ارکان میرے اپنے ساتھی تھے جو اُسے بے قصور قرار دینے پر مصر تھے لیکن موہنی پھر بھی سہمی ہوئی، افسردہ اور دل شکستہ مظلوم اور احساسِ جرم سے مغلوب کھڑی ہوئی تھی... پھر خاموشی کا ایک مختصر وقفہ آیا جس میں موہنی کا حوصلہ جواب دے گیا۔

کیا ہوگیا اب تمھیں؟" وہ چلائی۔ "چلاؤ گولی مجھ پر۔ ماردو

مجھے... انکار کردو مجھے پہچاننے سے... کہہ دو کہ میں کوئی احسان نہیں مانتا نہ اس کے باپ کا اور نہ اس عورت کے ہندو خاندان کی قربانی کا۔ مجھے بدکردار اور بدچلن کہو۔ آبرو باختہ کہو۔ مگر خدا کے لیے دشمن کی ایجنٹ مت کہو۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہوگی اگر تم مجھے قتل کرکے گاڑ دو۔ کون ہے میرا والی وارث جو تم سے پوچھے بھی۔ آج تک تو کوئی آیا نہیں... ایک بھائی کا رشتہ تھا۔ اسے خود تم نے بعد میں ختم کیا۔ تم سے پہلے میں ختم کرچکی تھی۔" اس نے زاروقطار رونا شروع کیا۔

نازو ایک دم آگے بڑھی۔ "مت رو موہنی... کوئی کچھ نہیں کہے گا تمھیں۔" اس نے موہنی کے سر کو اپنے سینے سے لگالیا۔

"میں... میں موہنی بھی نہیں رہی اب۔" وہ روتے روتے بولی۔ "میں نے اپنا نام مذہب سب بدل لیا ہے... اب میں رضیہ سلطانہ ہوں... میں نے کلمہ پڑھا ہے ملتان میں ایک مولوی صاحب کے ہاتھ پر۔ وہ ایک مسجد کے امام ہیں۔ نہیں یقین تو معلوم کرلو... میں نے ان کو کچھ نہیں بتایا... سوائے اس کے... کہ میں پہلے ہندو تھی اور اب اسلام قبول کرنا چاہتی ہوں... اپنی مرضی سے... کسی کے لیے نہیں... صرف اپنے لیے... کوئی گواہ نہیں میرا سوائے ان کے اور چند نمازیوں کے۔ جن کو میں نہیں جانتی... مگر وہ... میں بتا سکتی ہوں، وہ مسجد کہاں ہے۔"

"اس کی کوئی ضرورت نہیں۔" نازو نے کہا۔ "تم آؤ میرے ساتھ... ہاتھ منہ دھولو... پھر بات کریں گے ہم سب آرام سے بیٹھ کے... کھانا کھاکے..." وہ اسے کسی بچی کی طرح دوسرے کمرے میں لے گئی، جو گھر سے نکل گئی ہو اور پھر لوٹ کے ماں کے پاس آگئی ہو۔ اس نے ایسا کیوں کیا تھا۔ دنیا نے اس کے ساتھ کیا کیا تھا اور کیوں کیا تھا۔ اسے واپس آنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ سب سوالات ابھی نہیں کیے جاسکتے تھے۔

آہستہ آہستہ ہم سب بیٹھ گئے۔ محسن اور غالب چپ تھے، مگر شرمندہ نہیں تھے۔ اکرام شیخ شرمندہ نظر آتا تھا لیکن راجا کے لبوں کی بے نام سی مسکراہٹ میری بے بسی کا مذاق اڑاتی محسوس ہوتی تھی۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں پریشان بھی تھا، شرمندہ بھی، مشتعل بھی اور مطمئن بھی... مطمئن اس احساس سے کہ باقی سب نے موہنی کو وہ نہیں سمجھا تھا، جو میں سمجھتا تھا۔ شاید قصور میری ہی سوچ کا تھا۔ وہ سب تو غلط نہیں ہوسکتے تھے۔

"چلو اب... جو ہونا تھا ہوگیا۔" میں نے کہا۔ "اب اتنا تو بتادو کہ یہ بلا نازل کیسے ہوگئی۔"

"ہمیں تو خود بھی کچھ معلوم نہیں تھا۔" اکرام شیخ بولا۔ "میں نے لاہور فون کیا تھا... تمھارے دوست منظر کو... اس کو ایک تو یہ بتانا تھا کہ شاید دو چار دن بعد ہم کو کہیں جانا پڑے۔ غالب اور محسن کے پہنچ جانے کی اطلاع دینی تھی۔ شہلا کی اور اس کے بچے کی خیریت معلوم کرنی تھی۔ مجھے ایک جگہ سے فون کرنے کا موقع مل گیا تھا۔"

"کہاں سے فون کیا تھا؟"

"اسی شپنگ ایجنٹ کے آفس سے جس کے ذریعے لانچ کا سودا ہوا ہے۔" اکرام شیخ بولا۔ "وہ مجھے کچھ دیر کے لیے آفس میں اکیلا چھوڑ کے چلا گیا تھا۔ میں نے لاہور فون گھما دیا۔ سننے والا کوئی نہیں تھا اس لیے اطمینان سے بات ہوئی۔"

"میرے کربال بچے مجھے دعا کہتے ہیں نا؟" محسن بولا۔

"ہاں... بیوی نے کہا ہے کہ دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو۔ بچہ خیر سے بالغ ہوگیا ہے اور تعلیم بالغاں کا وہی کورس پڑھ رہا ہے جو سب پڑھتے ہیں۔" اکرام شیخ بولا۔

"یار یہ بھی کوئی وقت ہے مذاق کا۔" میں نے کہا۔

"سوری یار... منظر نے ایک کام کی بات تو یہ بتائی کہ وہ زمین جس پر ایم ڈبلیو ڈی کمپلیکس تھا اور جس پر دلاور نے وزیر اسپتال تعمیر کرنے کے منصوبے کا اعلان کیا تھا، نواب خسرو جمشید کی مہربانی سے..."

"مہربانی کیسی... اس نے اپنی جان کا سودا کیا تھا۔" میں نے کہا۔

"بہرحال، اس زمین کے حقوق ملکیت کے کاغذات عدالت میں داخل کردیے گئے ہیں۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "اور فیصلہ ہونے تک خود منظر مختارِ عام کی حیثیت سے بھی تمام معاملات کا نگراں ہوگا۔ جمشید نے حسب وعدہ پانچ لاکھ روپے اسپتال کی تعمیر کے فنڈ میں منتقل کردیے ہیں اور وزیر ہوسپٹل ٹرسٹ کے سے یہ اکاؤنٹ انکل رضوی آپریٹ کریں گے۔ مشترکہ طور پر منظر کے ساتھ۔"

"یہ تو بڑی اچھی خبر ہے۔" میرا موڈ ایک دم ٹھیک ہوگیا۔

"دوسری بات اس نے یہ کی تھی کہ کیا خسرو جمشید کو چھوڑ دیا جائے۔"

"ابھی سے چھوڑ دیا جائے!" میں نے نفی میں سرہلایا۔

"ملتان سے جیکی یا جونی نے فون کیا تھا کہ اس کو قید خانے میں رکھنے کی ذمے داری بہت سخت ہے۔ کیونکہ اسی گھر میں جمشید کی پھوپی رہتی ہے۔ بے شک ان دونوں کے درمیان رشتہ منقطع ہوچکا ہے لیکن قانونی کارروائی سے جذبات کا کیا

تعلق۔ خصوصاً پھوپی بھتیجے کا معاملہ ذرا مختلف ہوتا ہے۔ جمشید نے تو پھوپی کی صورت بھی دیکھنا کبھی گوارا نہیں کیا مگر پھوپی اسے بھتیجا ہی سمجھتی ہے اور یہ بھی جانتی ہے کہ اس بھتیجے نے اس کی بیٹی کو بڑے ناز و نعمت کے ساتھ پال پوس کے جوان کیا ہے جس کا باپ بننے کو کوئی تیار نہیں تھا۔ یہ خسرو جمشید کا بہت بڑا احسان ہے اس پر... یہ ہوسکتا ہے کہ اسے پتا چلے اور موقع ملے تو وہ اپنے محسن بھتیجے کو بچانے کے لیے سب کچھ کرگزرے۔"

"تم نے پھر کیا کہا؟"

"میں کیا کہتا۔ منظر نے بھی یہی جواب دیا تھا کہ پہلے یہاں کے سب معاملات نمٹ جانے دو... یہ نہ ہو کہ وہ باہر نکلتے ہی منحرف ہوجائے اور ہم اس کا کچھ نہ بگاڑ سکیں۔ جب اس کی ضرورت نہیں رہے گی اور اس کا باہر آنا کسی خطرے کا موجب نہیں رہے گا تو ہم اسے نکال دیں گے۔ اس ملک سے باہر۔ اگر اسے اپنے ذاتی جیل خانے میں رکھنا مشکل ہورہا ہے تو کسی دوسری جگہ شفٹ کردیا جائے۔"

"یہ بالکل صحیح جواب دیا منظر نے۔" میں نے کہا۔ "پھر انھوں نے کیا کہا؟"

"انھوں نے کہا کہ ٹھیک ہے... ایسا ہی ہوگا... یعنی جب تک قانونی مسائل ختم نہیں ہوتے اور ہم کلیئرنس نہیں دیتے، وہ جمشید کو بطورِ امانت رکھیں گے... خواہ کہیں بھی رکھیں۔" اکرام نے کہا۔

"چلو یہ فکر تو نہیں رہی۔" میں نے کہا۔

"اس کے بعد عبدالودود منظر نے ایک عورت کی بات کی جو اپنا نام رضیہ سلطانہ بتاتی ہے... اور آپ سب لوگوں سے ملنے کے لیے کراچی پہنچ چکی ہے۔ ظاہر ہے میں نے کہا کہ وہ سکندر بخت کے ساتھ تھی اور تم جانو یا نہ جانو... وہ تمھارے بارے میں مکمل معلومات رکھتی ہے۔ تم سب کو جانتی ہے۔ اسی طرح جیسے تم لوگ ایک دوسرے کو جانتے ہو۔ وہ دو دن منظر کے گھر میں رہی تھی اور انکل رضوی سے بھی ملی تھی۔"

"ظاہر ہے شہلا سے بھی ملی ہوگی۔" محسن بولا۔

"ہاں... اور خود انکل رضوی نے اس سے تفصیلی انٹرویو لیا جسے پولیس کی زبان میں تفتیش کہتے ہیں۔" اکرام بولا۔ "مگر وہ اب پولیس میں نہیں ہیں نا... وہ بھی مطمئن تھے۔ انھوں نے منظر سے کہا کہ پتا معلوم ہے تو اسے بتادو۔ منظر نے کہا کہ پتا تو میں بھی نہیں جانتا مگر کسی کا فون آیا تو اسے بتادوں گا۔ رضیہ سلطانہ یعنی موہنی اسی دن کراچی روانہ ہوگئی اور اس نے صدر کے ایک ہوٹل کا نام لیا کہ اس کے بارے میں وہاں سے پوچھا جاسکتا ہے۔"

"اور تم چل پڑے ہوٹل کی جانب؟" میں نے کہا۔

"ظاہر ہے۔ تجسس تو ہمیں بھی تھا کہ یہ تو نے کون سی نئی رضیہ سلطانہ دریافت کرلی جس کی ہمیں بھی خبر نہیں۔ مگر میں کچھ کچھ سمجھ رہا تھا۔ مجھے شک تھا کہ یہ موہنی نہ ہو حالانکہ اس کے بارے میں واقعاتی شہادت سے تو ثابت ہوتا تھا کہ وہ جل کے مرچکی ہے مگر اس کا ثبوت نہیں ملا تھا اور یہ کوئی ناممکن بات نہیں تھی کہ وہ جان بچا کے پہلے ہی نکل گئی ہو یا قدرت نے اسے بچالیا ہو... اسے معجزہ تو نہیں مگر اتفاق کہا جاسکتا ہے۔ چنانچہ میں ہوٹل پہنچا تو کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے ایک شخص نے رضیہ سلطانہ کے نام پر مجھے غور سے دیکھا اور کہا کہ میں انتظار کروں۔ میں وہیں ان کے ڈائننگ ہال میں بیٹھ گیا۔ کچھ دیر میں چائے آگئی، پھر وہ خود لوٹ آیا اور اس نے مجھ سے مخصوص سوالات کیے۔ مثلاً یہ کہ کیا میں جانتا ہوں کہ رضیہ سلطانہ کہاں سے آئی ہے؟ اور اسے کس نے بھیجا ہے۔ میں نے دونوں سوالوں کے درست جوابات دیے تو وہ مجھے اوپر ایک کمرے میں لے گئے۔ وہاں موہنی موجود تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے موہنی ہونے کا یقین مجھے یہاں پہنچنے سے پہلے ہی آچکا تھا جب منیجر چلا گیا... وہ شخص منیجر تھا... تو میں نے رضیہ سلطانہ سے بات کی۔ اس کے جوابات سے میرے شکوک دور ہوگئے اور... میں اسے یہاں لے آیا۔ بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ میں اسے بندرگاہ لے گیا جہاں مجھے راجا سے ملنا تھا۔ پھر ہم سب یہاں آگئے۔"

"سوال یہ ہے کہ اب کیا ہوگا؟" میں نے کہا۔ "میں کوئی ذمے داری نہیں لے سکتا۔ کوئی ضمانت نہیں دے سکتا کہ یہ موہنی واقعی رضیہ سلطانہ بن گئی ہے۔ یا اس نے کوئی چال چلی ہے۔"

"اوّل تو تم سے کوئی ضمانت مانگ نہیں رہا ہے اور نہ اسے تمھاری ذمے داری سمجھتا ہے یہاں ہر ذمے داری مشترک ہے۔" غالب نے کہا۔ "ہم سب مل کے کوئی فیصلہ کریں گے۔"

"پھر یہ کہ اس نے پہلے تیرے ساتھ کون سی چال چلی ہے۔" محسن بولا۔ "اب تک کتنی بار وہ خود کو مخلص ثابت کرچکی ہے۔ اسے ان گنت مواقع ملے تھے جب وہ تیرا بیڑا غرق کرسکتی تھی مگر اس نے تیرے ساتھ ڈوب جانا منظور کیا۔"

"میں کسی کے ساتھ ڈوبنے کے لیے تیار نہیں۔" میں نے کہا۔ "سوائے رابعہ کے..."

"ہم اس آگ کے دریا کی بات نہیں کررہے ہیں جس میں آپ کو ڈوب کے جانا ہے۔" غالب نے کہا۔ "اپنے مشن کی بات

کر رہے ہیں۔"

"تم اسے ساتھ رکھنے کے حق میں ہو؟" میں نے ان سب کی طرف باری باری دیکھا۔ سوائے راجا کے سب کے چہروں پر اقرار کی تحریر تھی۔

راجا نے کہا: "میں رائے شماری میں حصہ نہیں لے رہا ہوں کیونکہ ابھی میں نے ممبر شپ کے لیے کوالیفائی نہیں کیا ہے۔"

"اس میں کتنا رسک ہے؟" میں نے کہنا شروع کیا۔

"رسک تو اوّل تا آخر ہے۔ ہر قدم پر ہے... ہر وقت ہمارے ساتھ ہے۔ ہمارے وجود سے منسوب ہے۔" غالب نے کہا: "مگر رضیہ سلطانہ کے نام سے مجھے امید منسوب نظر آتی ہے۔"

"کیسی امید...؟"

"وہ ہمیں گائیڈ کر سکتی ہے... وہ بتا سکتی ہے جو ہم نہیں جانتے۔"

"وہ دوسروں کو بھی بہت کچھ بتا سکتی ہے، جو وہ نہیں جانتے۔" میں نے کہا: "تمہیں معلوم ہے وہ کس قماش کی عورت ہے۔ اس کے سوا کوئی عورت اکیلی اس ہوٹل کے کمرے میں نہیں ٹھہر سکتی تھی... مگر اس سے تو منیجر نے کچھ بھی چارج نہیں کیا ہوگا۔"

"ہم اس کے ذاتی کردار پر بحث نہیں کر رہے ہیں۔"

"ذاتی کردار ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ وہ آئینہ ہوتا ہے جس میں کسی کا عکس دیکھتے ہوئے ہم آئندہ کے بارے میں جان سکتے ہیں۔ تم یقین کے ساتھ کیسے کہہ سکتے ہو کہ ان دو دنوں میں جب وہ ہوٹل میں تھی، اس نے کسی سے رابطہ قائم نہیں کیا... یا کسی نے اس سے رابطہ قائم نہیں کیا۔"

ان سب کو سانپ سونگھ گیا۔

"تمہیں کیا معلوم کہ ہوٹل سے بندرگاہ تک اور یہاں تک کوئی تمہارے پیچھے نہیں آیا۔"

"خیر اب میں اتنا بے وقوف بھی نہیں ہوں۔" اکرام شیخ نے کہا: "کوئی آتا اور مجھے پتا نہ چلتا... یہ کیسے ممکن ہے... میری آنکھیں پیچھے بھی ہیں۔"

"یہی تو مشکل ہے۔" میں نے کہا: "یہ حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی ہی مروا دیتی ہے۔ تم بے وقوف نہیں ہو تو کیا شکاری بے وقوف ہیں؟ وہ بھی تو چال چلنے سے پہلے سوچتے ہوں گے۔ تم کہتے ہو تمہاری آنکھیں پیچھے بھی ہیں۔"

"ہر اچھے پولیس مین کی ہوتی ہیں۔" وہ بولا۔

"اور یہ بات ہر اچھا مجرم جانتا ہے۔" میں نے کہا: "چنانچہ وہ پیچھا کرتے وقت یہ بات نہیں بھولتا۔ یہ تو بعد میں پتا چلتا ہے کہ کس کا اعتماد برحق تھا۔ یہ بتاؤ تم اسے لانچ پر تو نہیں لے گئے تھے؟"

اکرام شیخ کی صورت پر بارہ بج گئے: "میں... میں نے کہا نا کہ مجھے راجا سے ملنا تھا..."

"یہ تم سے غلطی نہیں بے وقوفی ہو گئی دوست۔" غالب نے متفکر ہو کے کہا: "تم اسے باہر چھوڑ کے بھی جا سکتے تھے۔"

"ہاں۔ وہ کچھ دیر تمہارا انتظار کر لیتی۔" محسن بولا۔

میں نے اس دروازے کی طرف دیکھا جسے نازو نے عمداً بند کر دیا تھا: "دیکھو دوستو... یہ ہماری سلامتی کا نہیں، ہماری ناکامی یا کامیابی کا مسئلہ ہے۔ اسے ہم شک یا رسک کی نذر نہیں کر سکتے۔ اب ہونی... یا رضیہ سلطانہ آ ہی گئی ہے تو اسے ہم اپنی بے وقوفی، غلطی یا بد قسمتی کہہ کے بری الذمہ نہیں ہو سکتے... ہمیں مشترکہ طور پر اس معاملے میں ایک رائے ہو کے کوئی لائحہ عمل طے کرنا ہوگا۔ اور پھر جو سب کا فیصلہ ہوگا، وہ مجھے بھی منظور ہوگا... فی الحال میری ایک بات سب کو ماننی ہوگی۔"

ایک بار پھر ان سب کے چہرے سوالیہ نشان بن گئے۔

"رضیہ سلطانہ نہیں رہے گی۔" میں نے کہا: "ہم اسے کسی اہم فیصلے میں شامل نہیں کریں گے اور اس پر نظر رکھیں گے۔ اگر کوئی کسی وقت بھی اس کی طرف سے مشکوک ہوتا ہے یا خطرہ محسوس کرتا ہے تو اسے یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ... اسے شوٹ کر دے۔ اس سے کوئی باز پرس نہیں ہوگی کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ ظاہر ہے ہر شخص کا ذہن کسی فیصلے پر پہنچنے کے لیے منطقی اسباب رکھتا ہے کوئی اُسے بلاوجہ قتل نہیں کرے گا۔ صرف شک کی بنیاد پر بھی نہیں کرے گا۔ بلکہ ایسا اسی صورت میں کرے گا جب یہ ناگزیر ہوگا۔"

"مجھے... بلکہ شاید کسی کو اس سے اختلاف نہیں ہو سکتا۔" محسن نے کچھ دیر بعد دوسروں کی طرف دیکھ کے کہا: "مگر ایک بات رہ گئی۔ رضیہ اگر ساتھ نہیں جائے گی تو کہاں جائے گی۔ میرا مطلب ہے یہاں رہے گی تو کہاں رہے گی اور کس کے ساتھ رہے گی؟"

"ویسے تو یہ سوچنا ہمارا دردِ سر نہیں... مگر ہم اسے تنہا چھوڑنے کا رسک بھی مول نہیں لے سکتے۔" میں نے کہا: "وہ ہم میں سے کسی کے ساتھ رہے گی۔"

"بالفاظ دیگر... ہم میں سے کوئی اس کے ساتھ رہے گا۔ اس کی نگرانی کے لیے... اس کا جیلر بن کے۔" اکرام شیخ نے کہا۔

"تم نے اچھا کیا جو صاف بات کہہ دی۔"

"سوال یہ ہے کہ وہ جیلر کون ہوگا اور جیل کہاں ہوگی۔" اکرام شیخ نے کہا: "اور قیدی کے ساتھ جیلر کتنے دن اندر رہے گا؟"

"جیل تو اب یہی ہے۔" میں نے کہا: "رہا سوال یہ کہ جیلر کون ہوگا۔ تو شاید ہم میں سے کوئی بھی اس کے لیے تیار نہیں ہوگا اس کا فیصلہ قرعہ اندازی کے سوا کسی دوسرے طریقے سے ممکن ہی نہیں۔ قرعہ جس کے نام نکلے گا، وہ یا تو ہم سے الگ ہو جائے گا، اُس مشن سے الگ ہو جائے گا یا اپنی ڈیوٹی بلا چون و چرا قبول کرے گا۔"

کسی نے میری بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ اس میں وہ بھی اختلاف یا اتفاق کی گنجائش نکالنے سے قاصر تھے اور میں بھی جذبات کی بنیاد پر کسی کے لیے رعایت کی گنجائش نکالنے سے قاصر تھا۔ شاید کچھ سوچ کے وہ کچھ کہتے لیکن نازو نے اس کی مہلت نہ دی۔

"حضرات اور حضرات۔" اس نے دھڑ سے دروازہ کھول کے اعلان کیا: "ڈنر کے لیے پاؤں سمیٹ لیجیے۔"

"کیا سلیقے کا اعلان ہے۔" غالب نے تاسف سے سر ہلا کے کہا: "شرفا سے کہا جاتا ہے کہ ماحضر تناول فرمانے کے لیے ہاتھ دھو لیجیے۔"

"آپ لوگ شرفا ہوتے تو ایسا ہی کہا جاتا۔" نازو بولی۔

"چل سیدھا ہو جا... کیوں کھانے سے پہلے ورزش کھانا چاہتا ہے۔" محسن نے اپنے پیر سمیٹ لیے۔ ہم سب دیوار سے ٹیک لگا کے پیر پھیلائے بیٹھے تھے چنانچہ نازو کا اعلان غلط نہیں تھا۔

کھانا ایک ناخوشگوار خاموش فضا کی رسمی کارروائی ثابت ہوا جس میں ہر شخص نے دوسرے کا دل رکھنے کے لیے زبردستی کچھ کھایا۔ مذاق پھیکے اور بے محل رہے اور مسکرانے کی کوشش بھی مصنوعی لگی۔ اجنبیت کے احساس نے ہمارے درمیان اعصابی کشیدگی پیدا کر دی تھی چنانچہ سب نے خاموشی میں ہی عافیت جانی... موہنی جو بقول اس کے رضیہ سلطانہ بن چکی تھی، اب نارمل تھی... یہ نازو کی دلجوئی کا کمال تھا یا اس کے اعصاب ہی ہر صدمے کا اثر عارضی طور پر قبول کرتے تھے۔

نازو نے ذہانت سے کام لیا اور موہنی کے ساتھ سونے کے لیے چلی گئی۔ اس طرح ہمیں وہ باتیں کرنے کا موقع ملا جو ہم اب تک نہیں کر سکے تھے۔

"لانچ کے معاملات طے ہو گئے نا؟" محسن نے کہا۔

اکرام شیخ نے اقرار میں سر ہلایا۔

"اور وہ کام جو تمہارے سپرد کیا گیا تھا؟"

راجا بڑے انہماک سے کان میں ماچس کی تیلی گھما رہا تھا: "فقیر نے تو اپنا کام کر لیا۔ سارا مال لانچ پر پہنچا دیا۔ انشاءاللہ تمہیں کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہوگی۔ سوائے چراغ الٰہ دین کے۔ وہ نہیں ملا۔" اس نے ایک دردناک سرد آہ بھری۔

"مل جاتا تو کیا کرتے؟" غالب نے پوچھا۔

"میں... اسے اٹھوا لیتا... اپنی پری کو۔" وہ بولا: "ظاہر ہے پری کو جن ہی اٹھا کے لا سکتا ہے۔"

"اس قبیلے میں سب جن بھوت ہیں... یا پریاں ہیں؟" غالب نے کہا: "جس کا نام خواہ مخواہ ایم آر ایس پڑ گیا ہے۔"

"ایم آر ایس؟" راجا نے تیلی کے سرے کو غور سے دیکھا۔

"مائٹ از رائٹ سوسائٹی۔" محسن نے وضاحت کی۔

"اس کے بانی ارکان میں یہ خاکسار... محسن... رابعہ اور سکندر شامل تھے اور اتفاق سے ان کے نام کے ابتدائی حروف بھی یہی بنتے ہیں۔"

"ایم آر ایس۔" راجا نے دُہرایا: "اس کا نام تو ایل بی ایس بھی ہو سکتا تھا۔ لاٹھی اینڈ بھینس سوسائٹی۔"

"یہ بہت فری ہو گیا ہے۔" محسن نے مجھے مخاطب کیا۔

"رابعہ کو کیا کہہ رہا ہے۔"

"یار یہ تم نے جس پری کو شیشے میں اتارا ہے۔" غالب نے کہا: "یعنی وہ یہودی کی بیٹی... کیا وہ بھی بلینک چیک مانگتی ہے؟"

"اس کے لیے تو میں بلینک چیک ہوں۔" راجا بولا: "مگر وہ اپنے ظالم باپ کی قید میں ہے۔"

"پھر میں نہیں مانتا اسے عشق۔" غالب نے سر ہلایا: "ایسے ون وے ٹریفک والے عشق سے تو ہم بارہا گزرے۔ ایک بار الزبتھ ٹیلر سے ہوا، پھر صوفیہ لارین اور بریژیت باردو سے بیک وقت۔ عشق کی تو اصل تعریف وہی ہے کہ دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔"

"آگ تو برابر ہے۔"

"خاک برابر ہے... برابر ہوتی تو سب کچھ جلا ڈالتی اور اس کو نہ مقفل دروازے روک سکتے نہ پتھر کی دیواریں اور نہ آہنی زنجیریں..."

"چلو چلو... وہ لڑکی ہے... ٹارزن کا زنانہ ایڈیشن نہیں ہے۔" راجا نے بُرا مان کے کہا۔

"اچھا تو تم جن بن کے اسے نکال لاؤ... دراصل یہ جو چراغ الٰہ دین کہلاتا ہے نا... یہ آدمی کا یقین ہے۔ جو دل میں جوت جگاتا ہے تو آدمی سب کچھ کر گزرتا ہے... جو شاید جن بھی نہیں کر سکتے۔ وہ ڈیوک آف ونڈسر کی طرح تاجِ برطانیہ کو ٹھکرا سکتا

ہے۔ ایک فاتح کی طرح ماؤنٹ ایورسٹ پر کھڑا ہو سکتا ہے اور نیل آرمسٹرونگ کی طرح چاند پر قدم رکھ سکتا ہے۔ تم ایک لڑکی کو نکال کے نہیں لا سکتے۔"

"نہیں... میں ایسا نہیں کر سکتا... اب تو میں وہی کروں گا جو اس کے باپ سے وعدہ کیا ہے۔" وہ بولا اور لمبا لیٹ گیا۔ "شب بخیر۔"

"میاں ڈبل ایس آئی۔" میں نے کہا۔ "کیا خیال ہے چلیں؟"

"کہاں چلیں؟ اس وقت آدھی رات کو؟"

"چلتے ہو تو چمن کو چلیے کہتے ہیں کہ بہاراں ہے۔" غالب نے کہا۔ "شب بخیر۔" وہ فوراً آنکھیں بند کر کے لمبا ہو گیا۔ "اس وقت تو میں فرشتۂ اجل کے ساتھ بھی نہ جاؤں۔"

"چلو ہم چلتے ہیں۔" میں نے اکرام شیخ سے کہا۔ "میں اس لانچ کو اور دیگر انتظامات کو ایک نظر دیکھ لوں۔"

"یہ کام صبح بھی ہو سکتا ہے۔" اکرام شیخ نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

"صبح اگر انھوں نے لوڈنگ شروع کر دی۔" میں نے کہا۔

"چل یار۔" محسن نے اسے اٹھا لیا۔ "نیند ویسے بھی نہیں آتی اب تو..."

"ہم دونوں ہی الو ہو گئے ہیں۔" میں نے کہا۔

"سچ کہا آپ نے... مگر میں تو الو کا پٹھا نہیں ہوں... مجھے کیوں ساتھ گھسیٹتے ہو۔" اکرام شیخ بولا۔

"تم ہمارے شوفر ہو۔" محسن نے اُسے باہر کھینچ لیا اور غالب کے ایک لات رسید کی: "حکمت کر مرد ے۔ اُٹھ اور اندر سے دروازہ بند کر لے۔"

"تم جاؤ اس مردہ خانے سے۔ ہم کر لیں گے اپنا کریا کرم —" غالب نے بھنا کے کہا۔

بندرگاہ کے علاقے میں رات کی رونق بھی دن سے کم نہ تھی۔ ہم اکرام شیخ کے پیچھے چلتے گئے۔ وہی جانتا تھا کہ اس سمندر کی سطح پر تیرنے والی ہزاروں کشتیوں اور لانچوں، موٹر بوٹس اور بحری جہازوں کے درمیان وہ لانچ کہاں ہے جسے ہم اپنی ملکیت سمجھ سکتے ہیں۔"

"وہ... ادھر... ایس ایس کراتی تھرڈ ہے۔" اکرام شیخ نے انگلی سے اشارہ کیا۔

"وہ... وہ کدھر... ادھر تو مجھے ایک سوا ایک جہاز نظر آ رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "یار نومولود کا نام کیا ہے؟ میری مراد اس لانچ سے ہے۔"

"ماہین۔" اکرام شیخ بولا۔ "اس کا ماہی سے کوئی تعلق نہیں نہ جن ماہی سے... نہ ماہی بے آب سے۔"

"پھر اس کا مطلب کیا ہے آخر؟" محسن بولا۔

"مطلب کیا... بس رجسٹرڈ ہے اس نام سے۔" اکرام شیخ نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے... روشنی کی کرن۔" میں نے کہا۔ "تم لوگ عربی فارسی میں میری طرح عالم فاضل ہوتے تو سمجھ لیتے۔"

"پھر تو یہ... بہت حوصلہ افزا، بہت نیک نام ہے۔" محسن بولا۔

ہم اب نسبتاً کم آباد اور تاریک حصے میں تھے اور اکرام شیخ سے دس بار کہہ چکا تھا کہ بس اب دس قدم کی بات ہے۔ پھر اس وقت جب میں تنگ آ کے دس قدم اور دس میل کا فرق پوچھنے ہی والا تھا، اکرام شیخ نے ایک لانچ کی طرف اشارہ کیا اور کہا۔

"وہ ہے ہماری روشنی کی کرن۔ ماہین۔"

ہم چند سیکنڈ خاموش کھڑے اس لانچ کو دیکھتے رہے جو تاریک سمندر کے متلاطم سینے پر ساکت نظر آتی تھی کیونکہ اب بھی اس کے اور ہمارے درمیان کئی سو فٹ کا فاصلہ حائل تھا۔ ایک چھوٹی سی کشتی نے جس کو ایک مرد اور عورت چپو سے چلا رہے تھے، ہمیں لانچ تک پہنچایا۔ وہ دونوں محنتی بڈھا اور بڑھیا آدھی رات کے وقت دس روپے کی کمائی پر بہت خوش خوش واپس لوٹ گئے۔ باری باری ہم سب لانچ پر چڑھے اور اکرام شیخ نے ہماری رہنمائی کی۔ یہ پرانی لانچ تھی اور اس کے عرشے پر ماہی گیری کے جال ہی نہیں اور بھی بہت کاٹھ کباڑ پڑا ہوا تھا۔ اس ماحول میں مچھلیوں کی بو سب پر حاوی تھی اور سمندر کی شناخت کا ایک حصہ تھی۔ میں احتیاط سے قدم اٹھاتا نیچے اترا جہاں اکرام شیخ کے کہنے کے مطابق دو کیبن تھے۔

اس وقت دونوں میں اندھیرا تھا۔ ابھی میں نے روشنی کے لیے جیب سے لائٹر نکالا بھی نہیں تھا کہ ہر طرف سے تیز روشنی کے دھاروں نے یلغار کی۔ میری آنکھیں چندھیا گئیں لیکن اندھا ہونے سے پہلے میں نے پولیس کی وردی دیکھ لی تھی۔ پھر کسی نے بنگالی زبان میں کچھ کہا جو میری سمجھ میں نہیں آیا۔

معلوم نہیں وہ کیا بات تھی جس نے مجھے شک میں مبتلا کیا کہ یہ سارا کھیل غلط ہے، دھوکا ہے اور جعل سازی ہے۔

"کون ہو تم لوگ؟" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "اور میری لانچ پر کیا کر رہے ہو؟"

مجھ پر تین جانب سے روشنی کی یلغار ہو رہی تھی۔ ایک لائٹ وسط میں تھی اور دو میرے دائیں بائیں — میرے سوال کا جواب دینے کے لیے بیچ والی سرچ لائٹ کے پیچھے چھپا ہوا شخص آگے آ گیا اور اسے دیکھتے ہی میرے شبہات کی تصدیق ہو گئی۔ وہ شاید پانچ فٹ قد کا سوکھا سا آدمی تھا جس کو طاقت ور بنانے والا ایک ریوالور تھا۔ یہ ریوالور اس نے یوں میرے دل کا نشانہ لیتے ہوئے اٹھا رکھا تھا جیسے وہ گولی چلانے ہی والا ہے۔

اس ریوالور کے بغیر وہ کچھ نہیں تھا۔ ہم تینوں میں سے کوئی بھی اسے اٹھا کے سمندر میں پھینک سکتا تھا۔ اس کے کندھے کے نشانات اسے ایس پی ظاہر کرتے تھے لیکن میں نے افسر تو کیا مغربی پاکستان کی پولیس میں اتنے لائٹ ویٹ اور ریپ ٹیبل قسم کے کانسٹیبل تک نہیں دیکھے تھے۔

پھر وہ بات بھی واضح ہو گئی جو میرے ذہن میں اولین شک کا سبب بنی تھی۔ جو وردی ان سب نے پہن رکھی تھی، وہ پولیس کو موسم سرما میں دی جاتی تھی جب کہ یہ گرمیوں کا موسم تھا۔ ان کے بہروپ میں یہ بنیادی خامی ان کی کوتاہ بینی کا ثبوت تھی۔ جو اپنے کام میں ماہر ہوتے ہیں، وہ ایسی غلطی نہیں کرتے۔

"اپنا ہاتھ اوپر اٹھاؤ مسٹر۔" اس نے بنگالی لہجے میں اردو کا آملیٹ بناتے ہوئے کہا۔

"ہم خالی ہاتھ آئے ہیں۔" محسن نے کہا۔

"ہم دیکھے گا — ہاتھ اٹھاؤ شالا۔" بنگالی نے ڈانٹ کر کہا۔

"تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔" میں نے غرّا کر کہا۔

"دے گا۔ تم کو بھی جواب دے گا۔" بنگالی نے کہا۔ "ایسا جواب دے گا کہ تم سوال بھول جائے گا۔ ابھی ہاتھ اوپر کرو۔"

"اگر میں نہ کروں تو؟" میں نے کہا۔

بنگالی کی شکل بجو سے ملتی تھی اور اس کی آنکھیں سانپ کی آنکھوں سے مشابہ تھیں۔ مجھے گھورتے ہوئے اس نے اپنی ایک جیب میں ہاتھ ڈالا اور سائیلنسر نکال لیا۔

"ہم تم کو گولی مار دے گا۔" وہ سائیلنسر کو ریوالور کے اوپر فٹ کرتے ہوئے بولا۔

"اس کے بعد کیا ہو گا؟" میں نے بے خوفی سے اس کا تمسخر اڑانے کے انداز میں کہا۔ "تم میری لاش کو سمندر میں پھینک دو گے۔ میرے باقی دو ساتھیوں کو بھی مار ڈالو گے لیکن پھر تم خود یہاں سے کیسے جاؤ گے؟"

"تمہارا لاش لے کر۔" وہ بولا۔

"اور تمہارا کیا خیال ہے کہ میرے ساتھی تم کو اتنی آسانی سے جانے دیں گے؟" میں نے کہا۔ "جو باہر موجود ہیں۔"

وہ فلمی ولن کی طرح ہنسا مگر اس کا فطری انداز ہی ایک کامیڈین کا تھا۔ "باہر شالا تمہارا باپ ہے؟" وہ بولا۔

"گھوش دادا — پیچھے سے کسی نے کہا۔" اس کا تیسرا ساتھی کہاں ہے؟"

"ہاں دادا — باہر یہ تین تھے تو اندر دو کیسے رہ گئے؟" یہ سوال کسی اور نے اٹھایا۔

اس سوال پر میں چونک پڑتا تو بنی ہوئی بات بگڑ جاتی چنانچہ میں نے یہ ظاہر کیا جیسے میں سب جانتا ہوں۔ درحقیقت یہ تو میرے لیے بھی ایک انکشاف تھا کہ ہم دو ہیں۔ محسن نے تو بات کی تھی اور اپنی موجودگی ثابت کر دی تھی چنانچہ یہ صاف ظاہر تھا کہ اکرام شیخ غائب ہے۔

اکرام شیخ کی ذہانت اور مستعدی ہمارے کام آئی تھی۔ شاید اندر قدم رکھتے ہی جب اس نے مجھے کسی نادیدہ دشمن کے روبرو پایا تو لمحے کے سویں یا ہزارویں حصے میں اس کے ذہن نے خطرے کو بھانپ لیا اور ایک خودکار جسمانی ردِعمل کی برق رفتار کارکردگی کا مظاہرہ اس نے یوں کیا کہ اگلا قدم جو آگے اٹھ چکا تھا اسے پیچھے ہٹا لیا۔ دشمن سامنے تھا اور راستہ آگے سے بند تھا۔ اس سے پہلے کہ واپسی بھی ممکن نہ رہتی، وہ پلٹ گیا اور اندھیرے میں کسی سائے کی طرح تحلیل ہو گیا۔

گھوش دادا ایک دم نروس ہو گیا اور اپنے ساتھیوں پر برس پڑا۔ وہ بنگالی میں لڑ رہے تھے اور میں صرف اندازہ کر سکتا تھا کہ وہ ایک دوسرے کو اس کوتاہی کا ذمے دار ٹھہرا رہے ہیں۔

اکرام شیخ کے بہ حفاظت فرار ہو جانے کا اثر میرے مورال پر بہت اچھا پڑا تھا۔ میرا خوف زائل ہو گیا تھا اور اب مجھے موقع کا انتظار تھا، جب میں ان تینوں کو باری باری واصلِ جہنم کر سکوں۔

گھوش دادا نے چلا کے کسی کو آواز دی۔ اندر سے کسی نے بنگالی میں کچھ کہا۔ چند منٹ بعد میں نے گرڑ گرڑ کی آواز سنی۔ کوئی لانچ کو اسٹارٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" میں نے کہا۔ "تم لانچ کو چوری کر کے لے جا رہے ہو؟"

"اور ہمیں بھی اغوا کر رہے ہو؟" محسن نے کہا۔ "بڑے افسوس کی بات ہے۔ تم صورت سے تو بہت بڑے بدمعاش لگتے ہو۔ بڑے بدمعاش ایسے چھوٹے کام نہیں کرتے۔"

"ہاں ___ یہ جو اتنے بڑے بڑے جہاز کھڑے ہوئے ہیں، ہر قسم کے مال سے بھرے ہوئے۔" میں نے کہا۔ "ان میں سے کوئی لے جاتے۔"

"کسی صنعت کار کو یا اس کی فیملی کے کسی فرد کو اٹھاتے۔ تو منہ مانگی رقم ملتی ___" محسن بولا۔ "نیلو یا رانی کو لے جاتے اور عیش کرتے۔"

"بکواس مت کرو۔"

"ہم سچ کہہ رہے ہیں۔" محسن بولا۔ "ہمارے لیے تو سو روپے مانگ کر بھی پچھتاؤ گے ___ ہمارے دوست بھی وہ ہیں جن کے پاس صرف خلوص ہے۔ پیسہ نہیں ہے ___ ساڑھے پانچ روپے بھی نہیں دیں گے، ہم دونوں کے۔"

"اس سے تو اچھا تھا کہ تم میرے ماموں کو اٹھا لیتے۔ میں ان کے بدلے تمہیں سوا سو تک دے سکتا تھا۔" میں نے کہا۔

ہماری خوش فہمی اور خوش گفتاری اس وقت ختم ہوئی، جب لانچ کا انجن اسٹارٹ ہوتے ہی کسی نے پیچھے سے مجھے دھکا دیا ___ دھکا محسن کو بھی دیا گیا تھا۔ ہم دونوں سامنے دیکھ رہے تھے اور پیچھے سے کسی خطرے کا خیال تک ہمارے ذہن میں نہ تھا۔ نتیجہ یہ کہ ہم دونوں منہ کے بل گرے۔ اس کے ساتھ ہی ہم پر ایک جال گرا۔ یہ ماہی گیری کا جال تھا جو راجا ہی لایا ہوگا۔ اس سے پہلے کہ ہم مچھلیاں پکڑتے، ہم خود اس میں پکڑے گئے تھے۔ لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا ___ اس صورتِ حال کی بہترین تفسیر یہی تھی۔

لانچ چل پڑی تھی۔ اس کے ہچکولے متلاطم سمندر کے سفر کا پتا دیتے تھے، اِس سفر کے لیے ہم نے بڑی محنت اور منصوبہ بندی کی تھی مگر وقتِ سفر آیا تو یوں کہ ہم بالکل تیار نہ تھے اور اب تو یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ نشانِ راہ کیا ہے اور منزل کیا ہے۔

جال کی ڈوری کھینچنے والے یہ کام یقیناً اچھی طرح کر سکتے تھے ___ میں اور محسن یک جان دو قالب ہو گئے۔ ایک گٹھری سی بن گئے۔ اپنے طور پر ہم دونوں نے ہی ہاتھ پیر مار کے اس تنگ سے تنگ تر ہونے والے لچک دار پنجرے سے رہائی کی بے سود کوشش کی۔ ان نائلون کی ڈوریوں سے بنے ہوئے جال کے کسی پھندے کو توڑنا یا کاٹنا ممکن ہی نہیں تھا۔

وہ روشنیاں گل ہو گئیں اور جال سے منسلک مضبوط رسّی کو کسی نے گھسیٹنا شروع کیا۔ ہم دونوں لانچ کے فرش پر اُچھلتے، رگڑ کی خراشوں اور چوٹوں کے درد کو برداشت کرتے اور لڑھکتے ہوئے دس پندرہ فٹ گئے، پھر ایک دروازہ کھلا اور بند ہو گیا۔ ہم گھپ اندھیرے اور خاموشی کے حصار میں پڑے رہ گئے۔

باہر سطحِ آب پہ ایسی بہت سی لانچیں اور کشتیاں رواں تھیں اور سمندر کے ساحل کی دُنیا میں بھی وہی ہنگامۂ کاروبار تھا۔ جائز اور ناجائز دھندے جاری تھے اور دُنیا مال کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ مال دو ___ مال لو ___ مال لاؤ اور لے جاؤ ___ اِدھر کا مال اُدھر کرنے میں چور سے کوتوال تک سب مستعد اور سرگرداں تھے اور یہ کوئی بھی نہیں جاننا چاہتا تھا کہ اس شب کے پردے کے پیچھے کیا ہو رہا ہے جو نہیں ہونا چاہیے ___ اور کیوں ہو رہا ہے۔

امید کا دامن صرف اکرام شیخ سے بندھا ہوا تھا۔

"ابے یار ___ یہ تیرا گھٹنا۔۔۔" محسن نے کہا۔ "میری پسلیاں توڑ رہا ہے ___ پرے کر اسے ___"

"تیری کہنی کے نیچے میری ناک چپٹی ہو گئی ہے۔" میں نے احتجاجاً کہا ___ "اور تو جانتا ہے تیرا ایک ہاتھ کتنی غلط جگہ پہ ہے؟"

"پھر میں کیا کروں یار ___؟"

"آپ ذرا دور ہوں ___ بلکہ دفع ہوں ___" میں نے کہا۔

اس کے ساتھ ہی میں نے رہائی کی واجبی سی کوشش کی۔ کسی امید کے بغیر ___ لیکن مجھے جال کو ڈھیلا ہوتے دیکھ کر خوشی ہوئی۔ اس کی رسّی کھلی چھوڑ دی گئی تھی ___ چند منٹ میں ہم دونوں آزاد ہو گئے۔

لانچ اب خاصی رفتار سے سفر کر رہی تھی۔ میں نے ہاتھ آگے کی طرف پھیلا کے چلنا شروع کیا۔ چار قدم کے فاصلے پہ دیوار آ گئی۔ میں نے اس کی سطح پہ کسی لائٹ کے سوئچ کی تلاش میں ہاتھ پھیرنا شروع کیا۔ اسی وقت محسن چلّایا۔

"کیا ہوا ___؟" میں نے کہا۔

"صدمہ ___ برقی صدمہ ___" محسن نے کہا۔ "تار کھلے پڑے تھے۔"

"یہ کون سی ٹیم آ گئی میدان میں؟" میں نے کہا۔ "گھوش دادا کا نام پہلے تو کبھی نہیں سنا ___"

"یہ بو کیسی ہے؟" محسن نے گہری سانس لے کر سُوں سُوں کرتے ہوئے کہا۔ "امونیا ___" وہ چلّایا۔

اسی وقت امونیا کی تیز چبھنے والی بُو نے میرے دماغ کو جھٹکا دیا۔ "سانس روک لے ___" میں نے چلّا کے کہا۔ "اور دیکھ کدھر سے آ رہی ہے یہ زہریلی ہوا ___"

میں نے نیچے جھک کر فرش کے ساتھ ساتھ گھٹنوں کے بل چلتے ہوئے ہر کونے کو ٹٹولا اور شاید یہی محسن بھی کر رہا تھا ___ پھر میں نے اوپر ہتھیلی پہ کسی سوراخ سے آنے والی ہوا کو محسوس کرنا چاہا مگر مجھے ناکامی ہوئی۔ بُو بہت آہستہ آہستہ پھیل رہی تھی اور میرے لیے سانس لینا ناممکن ہو گیا تھا ___ مجھے ایسا لگتا تھا کہ دباؤ سے میرے پھیپھڑے پھٹ جائیں گے۔ جب قوتِ برداشت جواب دے گئی تو میرے جسم نے خود ہی امونیا کو اندر کھینچ لیا۔ میں نے متلی محسوس کی اور مجھے اپنا وجود کسی بگولے کی زد میں آ جانے والے سوکھے پتے کی طرح گھومتا ہوا اور اوپر اٹھتا ہوا محسوس ہوا ___ جیسے سگریٹ کا دھواں فضا میں تحلیل ہوتا ہے، ایسے ہی میں آہستہ آہستہ بے وجود ہو گیا۔

پھر مجھے ہوش آیا تو لانچ چل رہی تھی یا شاید گرداب میں گھوم رہی تھی۔ ایک روشنی تھی جو بار بار کسی دُور کے ستارے کی طرح جھلک دکھا کے غائب ہو جاتی تھی۔ میں نے اس کیفیت سے نبرد آزما ہونے کی جد و جہد جاری رکھی اور اس میں کامیاب بھی رہا۔ بالآخر میرا ذہن صورتِ حالات کو کسی حد تک سمجھنے لگا۔

میں کسی اجنبی جگہ پہ تھا۔ یہ ایک خالی کمرا تھا، جس کے فرش پر مجھ سے قریب ہی محسن پڑا ہوا تھا اور اس سے چند فٹ کے فاصلے پہ اکرام شیخ ___ زمین ٹھنڈی تھی اور بند کمرے میں نمی کے ساتھ نیم تاریک فضا تھی۔ اس نمی میں شامل مخصوص بُو نے مجھے سمندر یاد دلایا ___ پھر میرے کانوں نے بھی سمندر کی گونجتی ہوئی سرسراہٹ سنی جو لہروں کے تصادم سے پیدا ہو رہی تھی۔

یک لخت مجھے یاد آ گیا کہ اس کمرے سے پہلے میں سمندر میں ایک لانچ پر تھا۔ اس لانچ پر کیا ہوا تھا؟ ہاں ___ محسن اور میں جال میں پکڑے گئے تھے اور پھر کسی نے لانچ کے ہر طرف سے بند کیبن میں امونیا گیس چھوڑ دی تھی ___ امونیا ایک زہریلی گیس تھی جو ہمیں ہلاک بھی کر سکتی تھی۔ اس کی زیادہ مقدار ہماری سانسوں کے ساتھ جسم میں شامل ہو جاتی تو ہم یقیناً مر جاتے ___ لیکن ہم زندہ تھے۔ جس کا یہ مطلب تھا کہ ہم زندہ رکھے گئے تھے۔ ہمیں مارنا ہی مقصود ہوتا تو وہ کیبن کو امونیا سے بھر دیتے اور ہماری بے ہوشی خود بخود موت کی نیند میں بدل جاتی۔

ذہن بیدار ہوا تو مجھے اکرام شیخ کو دیکھ کر بھی حیرانی ہوئی ___ وہ تو نکل گیا تھا ___ صرف میں اور محسن پکڑے گئے تھے۔ پھر وہ یہاں کیسے آیا ___

میں دونوں ہاتھوں کے بل پر اٹھا اور کچھ دیر سر تھام کے بیٹھا رہا جو مجھے اپنے کندھوں پہ ایک ڈولتی ہوئی چٹان لگتا تھا۔ سر کے اندر بھی درد کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا اور یہ ویسا درد نہیں تھا جو اسپرین کی دو گولیاں نگل لینے سے ٹھیک ہو جاتا تھا۔ یہ عجیب سا درد تھا جس کا مرکز کہیں سر کے اندر تھا۔ اس مرکز سے درد کی ایک لہر سی اٹھتی تھی اور سر کی دیواروں سے یوں ٹکراتی تھی جیسے ساحل کی چٹانوں سے موجیں ٹکراتی ہیں۔

اس وقت جب میں کمرے کا جائزہ لے رہا تھا، میں نے محسن کی آواز سنی۔ وہ شہلا کا نام لے رہا تھا اور اپنے بیٹے کو یاد کر رہا تھا ___ ناامیدی کے صحراؤں میں بھٹکنے والا مسافر خوب صورت جذبوں کے سراب میں گم تھا۔

"محسن ___" میں نے اس کے شانے کو ہلایا۔ پھر اکرام شیخ کو جھنجوڑا لیکن وہ ابھی ہوش کی منزل سے دُور تھے۔ یہاں میں ان کو جلد ہوش میں لانے کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ کمرا صرف چار دیواروں کا حصار تھا جس میں ایک ہی دروازہ تھا اور سمندر کی جانب جو ... روشن دان تھا، وہ فرش سے دس فٹ اوپر تھا ___ ایک مربع فٹ کے اس روشن دان میں بھی زنگ خوردہ لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں، لوہے کو سمندر کی نمکین ہوا چاٹ رہی تھی ___ کیا ہم انھیں توڑ سکیں گے؟ میں نے سر اٹھا کے روشنی کے اس چھوٹے سے ٹکڑے کو دیکھا جس سے آسمان دکھائی دیتا تھا۔ بادل اس کے سامنے سے اڑتے ہوئے نکلتے چلے رہے تھے۔

باہر سمندر کے شور میں بھی سناٹا شامل تھا۔ ایک اعصاب شکن سکوت تھا جو اپنے وجود سے احساس کو جمود میں مبتلا کرتا تھا۔ میں نے بہت دھیان سے سنا مگر مجھے اور کوئی آواز سنائی نہ دی ___ نہ کسی پرندے کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ ___ نہ کسی چڑیا، مینا یا طوطے کے چہچہانے کی آواز ___ کہیں کوئی کتا نہیں بھونک رہا تھا۔ کوئی بچہ نہیں رو رہا تھا ___ کوئی مشین نہیں چل رہی تھی ___ موٹر سائیکل، تانگہ، بس یا ٹرک، کسی کی حرکت کو محسوس تک نہیں کیا جا سکتا تھا اور یہی احساس خلا، کا اور منجمد وقت کا تصور پیدا کرتا تھا ___ مرنے سے پہلے اور دفن ہو جانے سے پہلے آدمی اس دُنیا میں کہاں اتنا تنہا ہو سکتا ہے۔

میں نے گھبرا کر پھر محسن کو ہلایا ___ "محسن ... یار اٹھ ... ہوش میں آ ___"

وہ ہوش میں آ چکا تھا۔ "میں ... اٹھ نہیں سکتا ___ ہر چیز گھوم رہی ہے ..... میرا سر ... بس بھی لٹو کی طرح گھوم رہا ہے یار۔"

تنہائی کا آسیب ختم ہو گیا تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ میرا دل دھڑک رہا تھا۔ نبض چل رہی تھی ___ محسن کے دل کی طرح اور اس کی نبض کی طرح ___ اکرام شیخ کے دل کی طرح ___ ہم سب کے جسموں میں خون رواں تھا ___ اس کی گردش بھی حرکت کا تواتر تھی اور یہ زندگی کا یقین دینے والی خوشی تھی۔

میں نے محسن کو سہارا دے کر بٹھا دیا۔ "آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گا ___ پہلے مجھے بھی ایسے ہی لگتا تھا۔"

محسن نے خود کو پیچھے گھسیٹا اور دیوار سے ٹیک لگا لی ___ یہ

ہم کہاں آگئے ؟"

"سمندر کے قریب کوئی جگہ ہے۔" میں نے کہا۔ "اس کمرے میں ہمارے ساتھ اکرام شیخ بھی ہے۔"

محسن نے آنکھیں کھول کے دیکھا۔ "وہ.... وہ تو بھاگ گیا تھا؟"

"شاید وہ ــــ بھاگ نہیں سکا تھا۔" میں نے کہا۔ "اسے باہر ہی پکڑ لیا گیا ہو گا ــ باہر بھی کچھ لوگ ضرور تھے ــــ ورنہ پیچھے سے ہمیں کون دھکا دے سکتا تھا ؟"

"ہاں ــــ ایسا ہی ہوا ہو گا۔" محسن بولا۔ "مجھے متلی ہو رہی ہے۔"

"متلی تو مجھے بھی ہو رہی ہے ... وہ امونیا گیس تھی نا ؟"

"ہاں.... کیا پانی نہیں ہے یہاں ؟"

"ہے ....باہر ایک سمندر ہے ــ" میں نے کہا۔ "اندر کچھ نہیں ہے، ان دیواروں کے سوا ــ"

"یہ گھر ہے .... ؟"

"پتا نہیں ــــ ایک کمرا بھی ہو سکتا ہے۔" میں نے چھت کی جانب روشن دان کو دیکھا۔

"اور.... ہمارے سوا یہاں کوئی نہیں ؟"

"ابھی تک تو میں نے کسی کی آواز نہیں سنی ــ" میں نے کہا۔

"کیا .... وہ ہمیں .... اس لیے یہاں چھوڑ گئے ہیں کہ .... ہم بھوک کے پہلے سے مر جائیں ــــ؟" محسن نے نفی میں سر ہلایا ــ "کوئی نہ کوئی ضرور آئے گا ــ"

"ہاں ــــ ہمیں مارنا ہوتا تو ــــ وہیں مار دیتے ....۔" میں نے اس کی تائید کی ــ "زیادہ امونیا گیس دے کر ــ"

"وہ کون ــــ لوگ تھے یار ــــ ؟"

"گھوش دادا ..... وہ تو کوئی ہندو بنگالی تھا ۔ اس کے ساتھی تو میں نے بھی نہیں دیکھے ــ" میں نے کہا۔

"انھیں کس نے بھیجا ہو گا ــ ؟"

"ہمارے دشمن کا کوئی ایک نام تو نہیں ہے ــــ دِلاور بھی ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "درمیان کے لوگ بھی ہو سکتے ہیں، جو علیٰحدگی پسند عناصر کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور ان کو اسلحے کی فراہمی کے لیے راستہ، وسائل، تربیت کی سہولت اور ہر قسم کی امداد فراہم کرتے ہیں ــــ یا پھر مشرقی بازو کے غدّار عناصر کی .... قیادت کرنے والے ہو سکتے ہیں ــ"

"مجھے تو یہ .... تیسرے گروہ کے ارکان لگتے تھے۔" محسن بولا۔

"ہاں ــــ گھوش دادا ایک بنگالی نام ہے ــ" میں نے کہا۔ "ہم تو جانتے ہیں کہ مشرقی پاکستان کو الگ کرانے کی کوششوں میں بنگال کے ہندو تاجر کا ذہن اور سرمایہ سب سے اہم کردار ادا کر رہا ہے ــــ ہم ان کی راہ میں روڑے اٹکانے والے لوگ ہیں۔"

"ظاہر ہے ــــ ہم نے جتنا اسلحہ .... اسلحہ خانے اور ان تخریب کاروں کے ٹھکانے تباہ کیے ــــ وہ انھی کا نقصان تھا جو اس شورش کی پُشت پناہی کرتے ہیں۔"

"خیر یار، دشمن کوئی بھی ہو ــــ سوال یہ ہے کہ ہم کیا کریں گے؟" میں نے کہا۔

"ہم کیا کر سکتے ہیں ؟" محسن نے مایوسی سے کہا۔ "سوائے اِنتظار کرنے کے ــــ کوئی نہ کوئی تو آئے گا ــ فصلِ گُل آئے یا اجل آئے ــ"

"کیا تجھ میں ہمت ہے ؟"

"کیسی ہمت ــــ کیا سر سے ٹکّر مار کے دیوار گرا دوں ؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا ــ "یہ نیک کام تُو کر ــ"

"یار، ایسے لیٹے رہنے سے تو کچھ نہیں ہو گا ــ یاد کر، ہم نے کیسی کیسی شجاعت اور ہمت کی داستانیں پڑھی تھیں اور فلمیں.... دیکھی تھیں ــــ جو حقیقی واقعات پر مبنی تھیں ــــ اور جن میں ــ قیدخانوں سے فرار ہونے والوں نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا تھا۔"

"میں نے تو کہا ہے آپ سے کہ بسم اللہ ــــ نعرۂ تکبیر کے ساتھ حملہ کیجیے اور دیوار سے گزر جائیے ــــ" محسن بولا۔

"میں اس روشن دان سے جھانک کر دیکھنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا ــ "کچھ پتا تو چلے کہ ہم کہاں ہیں ــ کیا تو ایک طاقت وَر مُرغا بن کے مجھے بلند مقام عطا کر سکتا ہے ــ"

"جی نہیں ــــ ابھی تو میں خودی کو بھی بلند نہیں کر سکتا۔"

"اچھا تو میں مُرغا بنتا ہوں ــــ تو مجھے گدھا سمجھتے ہوئے سوار ہو اور باہر جو نظر آئے بیان کر ــ" میں نے کہا۔

"یہ ہو سکتا ہے ــــ" محسن نے کہا۔

میں گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کے رکوع کی حالت میں کھڑا ہوا اور محسن خاصی کوشش کے بعد میری پیٹھ پر قدم جمانے میں کامیاب رہا ــــ اس کا چہرہ عین روشن دان تک پہنچ گیا۔

"اب کچھ بول نا یار ــــ ؟" میں نے بوجھ سے دَب کے کہا۔

"کیا بولوں ــــ" محسن نے کہا ــــ "باہر کچھ بھی نہیں ہے ــ موسم بڑا سُہانا ہے ــ نکھرے ہُوئے نیلے آسمان کی فضائے بسیط میں بادل .....؟"

میں سیدھا ہوا تو محسن سلاخیں پکڑ کے لٹک گیا ورنہ وہ نیچے گرتا ــــ اب وہ فرش سے دو فٹ اوپر لٹکا ہوا تھا ــ اس نے آہستہ سے سلاخوں کو چھوڑا اور نیچے آ گیا۔

"میں بالکل صحیح رپورٹ دے رہا ہوں ــــ" محسن نے کہا۔

"میں نے موسم کی رپورٹ سننے کے لیے تیرے ناپاک قدموں کو اپنی پُشت مبارک پر جگہ نہیں دی تھی ــ" میں نے کہا۔

"اور باہر جو کچھ ہے، وہ بے کار ہے ــ ایک سمندر ہے خاصے فاصلے پر ــــ کوئی فرلانگ دور ــــ معلوم نہیں کون سا سمندر ہے ۔ میں اس کا نام پوچھنے ہی والا تھا ــــ سمندر میں پانی ہے ــــ پانی میں نمک کچھ زیادہ پڑ گیا ہے ــــ اُوپر ایک دو پرندے بلاوجہ اُڑ رہے تھے ۔ ان میں ایک شاید بگلا تھا یا بگلی تھی ــــ دُوسرا مرغابا تھا یا مرغابی تھی ۔ بہت دُور ایک دو بحری جہاز جا رہے تھے یا آ رہے تھے ــــ ہاں ــــ ایک مچھلی بھی تھی جو پانی میں اچھل رہی تھی ـ"

"بس ــــ یا اور کچھ ــ ؟" میں نے کہا۔

"اور کیا ــــ یہاں سے ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ تو نظر آنے سے رہی ـ"

"آس پاس کوئی عمارت نہیں ؟"

محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "ابھی تو نہیں ہے ۔ لیکن ایک دن میں اس ساحل پر اپنا بیچ ہاؤس بناؤں گا۔"

"یہ قیدخانہ کیسا ہے ؟" میں نے کہا۔

"ہمارا ویٹنگ روم ــــ ڈرائنگ روم اور بیڈ روم ــ جو کچھ عرصے بعد مشترکہ مزارِ شریف کہلائے گا۔"

"یار محسن، خدا کے لیے .... یہ کیا مذاق ہے ؟"

"یہ ایک سنگین حقیقت ہے۔" محسن بولا۔ "کہ جہاں ہم ہیں وہاں کسی کے خیال کی رسائی بھی ممکن نہیں ۔ دائیں بائیں کچھ دکھائی نہیں دیتا مگر یہ جگہ کسی چٹان پر ہے ۔ ذرا فاصلے پہ دونوں طرف ایسی ہی کئی چٹانیں ہیں۔"

"روشندان کی سلاخوں کو خاصا زنگ لگا ہوا ہے ۔ کیا انھیں توڑا نہیں جا سکتا ــــ یا نکالا نہیں جا سکتا۔"

"توڑا بھی جا سکتا ہے اور نکالا بھی جا سکتا ہے ۔ بشرطیکہ مناسب آلات و اَوزار فراہم ہوں ــ" محسن بولا۔ "ڈرل مشین اور بجلی کی آری ــــ لوہا کاٹنے والی ــــ خالی ہاتھوں سے تو صرف دُعا مانگی جا سکتی ہے کہ اللہ ناممکن کو ممکن کر دے ــ وہی نکال سکتا ہے ہمیں یہاں سے یا پھر دشمن ہی وہی ــ جو لائے تھے، وہ لے جا بھی سکتے ہیں۔"

"بکواس مت کر ــ" میں نے چڑ کے کہا۔ "ہمارے دوست بھی تو باہر ہیں ــ غالب اور راجا ..... اور نازو ــ"

"انھیں کیا فرشتے خبر دیں گے ہمارے بارے میں۔"

"تُو مایوسی کی باتیں کیوں کر رہا ہے ــــ ہم زیادہ سخت امتحانات سے گزر چکے ہیں۔" میں نے کہا۔

"تو پھر رونے کی بجائے لسوڑنے کی کیا ضرورت ہے ــ جو ہوتا ہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا ــ" محسن بولا۔

اچانک اکرام شیخ اٹھ کے بیٹھ گیا۔ "اس بار.... بُرے پھنسے یار ــ"

"آپ بقائمی ہوش و حواس لیٹے ہوئے ہماری گفتگو سن رہے تھے ؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔

"تم لوگوں نے میری .... طرف ــــ دیکھا ہی نہیں ــــ میں تو دیکھ رہا تھا۔" اکرام شیخ بولا ــ "جب .... تم باہر جھانک.. رہے تھے ــ"

"تم ہمارے ساتھ کیسے آ گئے تھانے دار صاحب ؟" محسن بولا۔

"تمھارا ساتھ نہ ہوتا تو تھانے داری بھی رہتی ــ" وہ بولا۔ "لیکن کوئی بدقسمتی سے بھاگ کر کہاں جا سکتا ہے ــــ میں نے روکا بھی تھا کہ یہ کوئی وقت نہیں ہے ــــ لانچ صبح بھی دیکھی جا سکتی تھی۔"

"یہ تو میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔" محسن بولا۔

"تم تو بچ کے نکل گئے تھے شیخ جی ــ" میں نے کہا۔

"بس خیال ہے تمھارا ــــ" وہ بولا۔ "میں بھاگ کے کہاں جا سکتا تھا ــــ اس وقت اتنا ہی موقع ملا تھا کہ لیٹ جاؤں ــ آگے سمندر تھا .... تیرنا آتا تو کُود بھی جاتا۔"

"کیا ڈوبنا بھی نہیں آتا ــــ ؟" محسن نے سوال کیا۔

"ڈوبنا آتا ہے ــــ" وہ بولا۔ "تمھارے ساتھ رہ کے یہی سیکھا ہے کہ خود تو ڈوبے ہیں صنم، تم کو بھی لے ڈوبیں گے۔"

"یا میرے مولا ــــ پولیس والا شعر پڑھ رہا ہے۔" محسن بولا۔ "کیا زمانہ آ گیا ہے۔"

"میں ایک کیبن میں جا چھپا تھا۔" شیخ نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ "مجھے کچھ معلوم تو تھا نہیں کہ کدھر کیا ہے ــــ بس جو پہلا دروازہ سامنے آیا اسے دھکّا دیا ــــ اتفاق سے وہ بند نہیں تھا ۔ میں اندر چلا گیا تو مجھے وہ لانچ کے ناخدا کا کمرا لگا ــــ کچھ صاف ستھرا اور وَیل فرنشڈ ــــ اس میں میز کُرسیاں تھیں اور ایک بیڈ تھا ــ تختہ تھا ــــ میں اس کے نیچے گھُس گیا ــــ میرے پیچھے پیچھے وہاں وہ سب آ گئے۔"

"وہ سب کون ؟"

"وہ سب جو پولیس کی وردی میں تھے۔"

"مگر وہ پولیس کے آدمی نہیں تھے۔" میں نے کہا۔

"یہ تو میں بھی سمجھ گیا تھا ــــ" محسن نے کہا۔ "ان کی سڑی ہوئی والی وردی دیکھ کر جو انھوں نے گرمی میں پہن رکھی تھی۔"

"ان میں ایک تو ایس پی بنا ہوا تھا۔" اکرام شیخ نے کہا۔

"گھوش دادا۔" میں نے کہا۔

"ہاں ــــ اس کو تو انھوں نے وہیں مار دیا تھا۔" اکرام شیخ

نے کہا۔ "میں نیچے سے سب دیکھ اور سن رہا تھا ـــ غالباً گھوش دادا کے سپرد کوئی ایک کام کیا گیا تھا، جس کا اسے نصف معاوضہ پہلے ادا کر دیا گیا تھا۔"

"وہ کیا کام تھا؟"

"اس کا پتا نہیں چل سکا۔" شیخ نے کہا۔ "جب اس نے وہ کام کر لیا تو معاہدہ کرنے والوں نے اس کے سپرد دوسرا کام کر دیا، وہ مجبور تھا کہ دوسرا کام بھی کرے ـــ اس کی نوعیت واضح نہیں ہو سکی اور یہ تیسرا کام ہمارے بارے میں مخبری یا ہماری شناخت کا تھا، جو اس سے جبراً لیا گیا ـــ اسے بلیک میل کر کے۔"

"ایسے کاموں میں تو یہی ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔

"اب شاید وہ کچھ اور چاہتے تھے۔" اکرام شیخ بولا۔ "وہ چلانے لگا کہ یہ بدعہدی ہے ـــ اب وہ اور کچھ نہیں کرے گا۔ بس اسے باقی رقم دے دی جائے تاکہ وہ گھر جا سکے ـــ وہ اپنی فیملی کے لیے بھی پریشان تھا، جو مشرقی پاکستان کے حالات میں غیر محفوظ ہو گئی تھی ـــ بس اسی پر جھگڑا بڑھا ـــ وہ سب اس کو مزید بلیک میل کرنا چاہتے تھے اور اس کی قوتِ برداشت ختم ہو چکی تھی۔ ظاہر ہے اس کی پوری زندگی صرف آدھا معاوضہ دے کر خریدنے والوں کی، یہ کبھی نیت ہی نہیں تھی کہ اسے باقی رقم بھی دیں ـــ وہ تو دیکھ رہے تھے کہ وہ کہاں تک اور کس حد تک کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔ انھوں نے اب تک اسے ڈرا دھمکا کے ہی کام نکالا تھا ـــ لیکن جب انتہا ہو گئی تو انھوں نے وہی کیا جس کا فیصلہ وہ... بہت پہلے کر چکے تھے ـــ کاش، وہ احمق یہ بات اس دلدل میں قدم رکھنے سے پہلے ہی سمجھ لیتا۔ بات بہت بڑھ گئی تو انھوں نے اسے مارا ـــ اور اسے صاف بتا دیا کہ اس راستے پر قدم رکھنے والے واپس نہیں جاتے ـــ مجھے اس بے چارے پر بہت ترس آیا کیونکہ وہ واقعی بہت بے وقوف تھا ـــ تم نے دیکھا کہ اس نے ایس پی کی وردی بھی پہن لی تھی ـــ گرمیوں کے موسم میں موسم سرما والی وردی۔ اس سے کام لینے والے چالاک تھے اور اسے مارتے ہوئے اس کا بہت مذاق اڑا رہے تھے ـــ ایک نے کہا کہ تیری گھر والی خوبصورت ہے، تو فکر مت کر اس کی ـــ اسے ایک نہیں اکٹھے چار خصم مل جائیں گے اور تجھ سے ہزار درجہ بہتر ـــ وہ ان کی منت سماجت کرتا رہا ـــ ان کے آگے ہاتھ جوڑتا رہا ـــ اسے ان سب کی نیت کا اندازہ ہو چکا تھا ـــ اور وہ بہت سفاک قسم کے لوگ تھے۔ مارنے سے پہلے، وہ اس کی موت سے کھیل رہے تھے۔ ایک اپنا ریوالور بار بار نکالتا تھا اور نشانہ یوں لیتا تھا جیسے گولی چلا دے گا مگر پھر جیب میں ڈال کر نئی بات چھیڑ دیتا تھا۔ باقی تین اسے ٹھوکروں سے مار رہے تھے ـــ وہ ان کے مقابلے میں کمزور بھی تھا ـــ وہ کتے کی طرح پٹتا رہا اور..... میں تو بیڈ کے نیچے تھا نا مگر اندھیرے میں تھا ـــ میں دیکھ سکتا تھا کہ اس کی کیا حالت ہو گئی ہے ـــ اس کی پسلیاں سب ٹوٹ گئی ہوں گی۔ اس کی ناک اور منہ سے خون نکل رہا تھا اور..... بالآخر وہ مر گیا..... ایک بھیانک موت ـــ مجھے وہ منظر نہیں بھولتا۔"

"وہ چاروں کون تھے ـــ میرا مطلب ہے کس کے آدمی تھے وہ ...؟"

"یہ مجھے معلوم نہیں ہو سکا۔ وہ سب آپس میں ایسی کوئی بات کرتے تو پتا چلتا ـــ لیکن میرا خیال ہے کہ وہ وہاں سے آئے تھے۔ مشرقی بنگال سے ـــ یا کلکتہ سے۔" اکرام شیخ بولا۔ "کیونکہ کچھ دیر بعد وہاں ایک اور شخص آ گیا تھا۔ اس نے کہا کہ اب تو ٹھیک ہے نا ـــ اور انھوں نے خاصی ناراضگی کا اظہار کیا کہ ٹھیک تو ہے مگر سب ٹھیک کیسے ہو گیا ـــ باقی لوگ کدھر ہیں ـــ اس نے کہا کہ وہ بھی آئیں گے۔"

"اس کی مراد..... غالب سے ہو گی ـــ؟" محسن بولا۔

"ہاں ـــ راجا کو وہ کیا جانیں ـــ ابھی اسے ہمارے ساتھ چند ہی دن تو ہوئے تھے۔" اکرام شیخ بولا۔

"شاید وہ استاد ٹیڈی....."

"نہیں ـــ دشمن کو اتنا بے خبر نہیں سمجھنا چاہیے۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "مگر ہاں ـــ نازو ان میں شامل ہو سکتی ہے جن کا وہ انتظار کر رہے تھے ـــ آخر میں آنے والا انھیں اطمینان دلا رہا تھا کہ وہ بے فکر ہو کے مال اٹھائیں ـــ اب خطرہ نہیں رہا اور اس نے اپنا کمیشن بھی مانگا تھا مگر وہ اڑ گئے کہ پہلے راستہ بالکل صاف ہونا چاہیے ـــ ایسا نہ ہو کہ پھر بیڑا غرق ہو جائے۔"

"تم کیسے پکڑے گئے؟"

"بس ـــ شامتِ اعمال۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "پانچواں شخص اپنے کمیشن کی رقم بڑھانا چاہتا تھا اور ایڈوانس مانگ رہا تھا اس نے کہہ دیا کہ چل کے خود دیکھ لو ـــ ان دونوں کی لاشیں پڑی ہیں۔ اس پر وہ اچھلے کہ دونوں کیوں ـــ تینوں کیوں نہیں ـــ تیسرا کدھر گیا ـــ ان کے درمیان تھوڑی سی تکرار اس بات پر ہوئی کہ لانچ پر آنے والے دو تھے۔ لیکن انھوں نے منوا لیا کہ تین آئے تھے۔ نتیجہ یہ کہ تلاش شروع ہوئی اور اچھا ہوا کہ مجھے وہیں دریافت نہیں کیا گیا ورنہ وہیں جان سے مار دیتے۔ وہ باہر گئے تو میں بھی نکل بھاگا اور پہلے کمرے میں واپس آ گیا ـــ وہاں تم دونوں الٹے پڑے تھے ـــ لیکن زندہ تھے ـــ وہ اچانک آ گئے اور انھوں نے مجھے وہیں پکڑ لیا ـــ شاید اسی سے تمھاری جان بھی بچ گئی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور تازہ ہوا ایک طرف سے ایسے آ رہی تھی، جیسے سرنگ میں سے گزر کے آ رہی ہو ـــ ہمیں تو وہ مردہ مان ہی چکے تھے۔ انھوں نے مجھے گھیر لیا ـــ مقابلہ بے سود تھا ـــ ایک نے میرے سر پر ریوالور کا دستہ مارا ـــ چوٹ تو خاصی آئی تھی لیکن میں... بے ہوش نہیں ہوا تھا ـــ میں تو ایسے ہی گر گیا اور ساکت ہو گیا۔ انھوں نے کہا، چلو چھوڑو اسے بھی اور نکلو یہاں سے ورنہ انہی کے ساتھ لیٹنا پڑے گا ـــ اس وقت بھی کیبن میں امونیا کی تیز بو بھری ہوئی تھی ـــ وہ فوراً دروازہ بند کر کے نکل گئے ـــ مگر کچھ چوٹ کا اثر تھا اور کچھ امونیا کا ـــ جب میں نے اٹھنا چاہا تو چکرا کے گر گیا۔"

"پھر ہم سب فوت کیوں نہیں ہوئے؟" میں نے کہا۔

"ہاں ـــ امونیا کے اثر سے تو ہمیں مر جانا چاہیے تھا۔" محسن نے تائید کی۔

"میرا خیال ہے کہ امونیا کی مقدار ناکافی تھی۔" میں نے کہا۔ "اگر ہم ایک ساتھ اس کیبن میں بند ہو جاتے اور پھر دروازہ کوئی نہ کھولتا تو شاید زندہ نہ بچتے ـــ ممکن ہے لانچ پر امونیا کا ایک ہی سلنڈر لایا گیا ہو ـــ اور اس کی گیس کھول کے وہ مطمئن ہو گئے ہوں کہ بس ہمارا کام تو تمام ہوا ـــ اکرام شیخ نے دروازہ کھولا تو امونیا نکل گئی اور تازہ ہوا نے اس کی جگہ لے لی۔ بو تو رہی ہو گی مگر گیس اتنی نہیں رہی ہو گی، جو مہلک ثابت ہوتی۔"

"یہ سب بحث بے مقصد ہے۔" محسن بولا۔ "سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ انھوں نے اتنا تردد کیوں کیا ـــ مارنا ہی تھا تو امونیا گیس کا سلنڈر لانے کا چکر چلانے کی کیا ضرورت تھی ـــ تین گولیاں مارنا آسان تھا اور سستا طریقہ تھا۔"

"ممکن ہے وہ فائر کی آواز سے ڈرتے ہوں۔"

"چلو یہ بھی مانا ـــ مگر اس وقت جب ہم دونوں بے ہوش پڑے ہوئے تھے، انھوں نے ہمیں سمندر میں کیوں نہیں پھینک دیا؟" محسن بولا۔ "ہم سمندر کی مخلوق کا رزق ہو جاتے ـــ یہی اکرام شیخ کے ساتھ بھی کیا جاتا تو قصہ ختم ہو جاتا۔"

"میرا خیال ہے کہ وہ پروفیشنل لوگ نہیں تھے ـــ پروفیشنل سے میری مراد ہے پیشہ ور قاتل ـــ تخریب کار ـــ یا کمانڈوز، ... وہ تاجر قسم کے ایسے افراد تھے جو موجودہ سیاسی صورتِ حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کالا دھن سمیٹ رہے ہیں ـــ سرمایہ انہی کا ہے جو سیاست میں کام آ رہا ہے ... انھیں اپنے منافع سے غرض ہے ـــ اس سے نہیں کہ سیاست کیا ہے ـــ اسلحہ کس کے ہاتھ میں پہنچ رہا ہے اور کیوں پہنچ رہا ہے ـــ مختصراً یہ کہ دوسری سائیڈ کے چوہدری دلاور اینڈ کمپنی ـــ ان سے کمیشن اور ایڈوانس کی بات کرنے والا یہاں کا آدمی تھا۔"

"تم نے دیکھا تھا اسے؟" میں نے کہا۔

"ہاں ـــ مگر وہ ان میں سے کوئی نہیں تھا ـــ دلاور کے ان ساتھیوں میں سے جن کو ہم جانتے ہیں۔"

"پھر بھی ـــ حلیہ تو بتا۔" میں نے کہا۔

جب اکرام شیخ نے اس کا حلیہ تفصیل سے بتایا تو میں سمجھ گیا۔ "وہ خود حاجی عبداللہ تھا۔"

"حاجی عبداللہ ـــ؟"

"ہاں ـــ تم نے نہیں دیکھا اسے ـــ اس کی فرم لاہور میں ہے، جو حاجی عبداللہ اینڈ کمپنی کے نام سے بزنس کرتی ہے ـــ بظاہر تازہ پھل، سبزیاں اور انڈے، مچھلی وغیرہ کے امپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار ہے لیکن درپردہ وہی ہے جو دلاور سے اسلحہ لیتا ہے اور اسے آگے پہنچاتا ہے ـــ اپنے ٹرکوں میں ـــ ظاہر ہے، وہ اس کا کمیشن وصول کرتا ہے ـــ دلاور اینڈ کمپنی کچھ اسلحہ بناتی ہے اور کچھ اسمگل کرتی ہے ـــ حاجی عبداللہ اینڈ سنز اس کی ترسیل کے ذمے دار ہیں ـــ ٹرانسپورٹر ہیں ـــ دلاور کے پاس اپنے ٹرک تو ہیں نہیں اور وہ کسی گڈز فارورڈنگ ایجنسی کے ذریعے مال بھیجنے میں خطرہ محسوس کرتا ہے ـــ یہ نام کا حاجی جو دراصل پاجی کہلانے کا مستحق ہے، اسے بہترین کور فراہم کر رہا ہے۔ کوئی اس پر شک کر ہی نہیں سکتا ـــ اس کا سارا کاروبار بڑی خاموشی سے لاہور کے ایک غیر کاروباری علاقے میں ہو رہا ہے ـــ لاہور سے ہزاروں ٹرک روز کراچی آتے ہیں ـــ ان میں دو چار ٹرک اس کے بھی آتے ہوں گے ـــ اوپر انڈوں کی پیٹیاں ـــ پھلوں کے کریٹ ـــ نیچے گولہ بارود ـــ ہم خود بھی ایک ٹرک پکڑ چکے ہیں۔ اس کے دو بیٹے بھی اس کام میں باپ کے مددگار ہیں ـــ وہ اپنی داڑھی ـــ اپنے حلیے ـــ نام اور اندازِ گفتگو سے بڑا... دھوکا دیتا ہے ـــ ایسا متقی، پرہیزگار اور صاحبِ ایمان نظر آتا ہے کہ کسی کا دھیان اس کے کالے کرتوتوں کی طرف جا ہی نہیں سکتا۔"

"تم نے مجھے اس کے بارے میں کچھ بتایا ہی نہیں تھا۔"

"وہ بعد میں ملا تھا ـــ جب تم اور نازو کراچی آ چکے تھے۔" میں نے کہا۔

"اگر وہ تم دونوں کو پہچانتا تھا تو ـــ پھر اس کے علم میں یہ بھی ہو گا کہ تمھارا وجود اس کے لیے اور اس کے کاروبار کے لیے کتنا خطرناک ثابت ہو چکا ہے۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "اس کے باوجود حاجی عبداللہ نے تمھیں زندہ رکھا ـــ آخر کیوں؟ اور اس نے باقی لوگوں کو یہ جھوٹا یقین کیوں دلایا کہ ہم سے اب کوئی خطرہ لاحق نہیں رہا ـــ؟"

"شاید وہ باقی سب کو بھی ٹریپ کرنا چاہتا ہے ــــ وہ ہمیں یہاں بند کر گیا اور لانچ کو واپس لے گیا ــــ" میں نے کہا۔ "اس امید میں کہ جو پیچھے رہ گئے ہیں، وہ ہماری تلاش میں وہیں پہنچ جائیں گے، جہاں لانچ کھڑی تھی ــــ لانچ انھیں وہیں ملے گی ــــ وہ ایسے گرفتار ہو جائیں گے، جیسے چوہے دان میں چوہا پھنس جاتا ہے ــــ"

"یہ تو ٹھیک کہہ رہا ہے ــــ" محسن نے تشویش سے کہا۔ "وہ تو واقعی پکڑے جائیں گے ــــ"

"اور اسی جگہ لائے جائیں گے ــــ" میں نے کہا۔ "حاجی ہم سب کو اپنی موت آپ مرنے کے لیے اس ویرانے میں چھوڑ جائے گا جہاں کسی کے آنے کا امکان نہیں ــــ وہ خود ہمارے خون سے ہاتھ نہیں رنگنا چاہتا ہو گا ــــ"

"تاکہ کہنے کو کہہ سکے کہ اس نے کسی کو قتل نہیں کیا۔" محسن نے تلخی سے کہا۔ "وہ تو سب کو فلاں جگہ چھوڑ آیا تھا ــــ آگے اللہ کی جو مرضی ــــ وہ بھوک کے پیاسے مر گئے اور چیختے چلاتے رہے مگر ان کی مدد کے لیے کوئی نہ آیا تو ظاہر ہے ان کی قضا آ گئی تھی ــــ قضا تو آدمی کو وہیں پہنچا دیتی ہے جہاں فرشتۂ اجل کو حکم ہوتا ہے کہ ان کی روح قبض کرے ــــ اور قضا نہ آئی ہو تو سب کچھ ہو جاتا ہے ــــ کوئی بھی وسیلہ ان کی مدد کے لیے پہنچ جاتا ہے ــــ تائیدِ غیبی حاصل ہو جاتی ہے.... کوئی معجزہ رونما ہو جاتا ہے ــــ"

"ہاں ــــ وہ ایسا ہی آدمی ہے ــــ ایک مذہبی فراڈ ــــ جو اس قسم کی تاویلوں سے اپنے ضمیر کو بھی دھوکا دیتا ہے اور خدا کو بھی، مگر دنیا میں معتبر بنا رہتا ہے ــــ" میں نے کہا۔ "خبیث.... شیطان جس نے فرشتے کا روپ دھار لیا ہے ــــ دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے ــــ"

"ایسے لوگ ہی زیادہ خطرناک ہوتے ہیں ــــ" اکرام شیخ بولا۔

بولتے بولتے ہم سب تھک گئے تھے لیکن اور ہم کر بھی کیا سکتے تھے ــــ ہمارے جسم توانائی سے محروم تھے اور ہم خالی ہاتھ تھے ہمیں یہاں قید کرنے والوں نے ہمارے تن پر کپڑے چھوڑ کر بڑی مہربانی کی تھی، ورنہ وہ چاہتے تو یہ بھی اتار لیتے ــــ اب میرے حلق میں کانٹے سے پڑنے لگے تھے اور میری زبان خشک ہو کے اکڑ رہی تھی۔ میرے خیالات کا ارتکاز ختم ہونے لگا تھا ــــ بات کرتے ہوئے بار بار مجھے احساس کے سراب متوجہ کر لیتے تھے ــــ ایک بار مجھے یوں لگا جیسے کہیں پانی کی دھار گر رہی ہے۔

"محسن! کیا تو.... سن رہا ہے ــــ یہ آواز؟"

"کیسی آواز ــــ؟" وہ بولا۔

"کہیں کوئی نل کھلا رہ گیا ہے ــــ پانی بہ رہا ہے ــــ"

"نہیں یار ــــ یہ.... یہ تو کچھ ایسی آواز ہے جیسے پتھر کی تنگ چٹان کے درمیان سے پانی کا چشمہ گزر رہا ہو ــــ"

"یہ خیالوں کے سراب ہیں محسن ــــ"

"ہاں ــــ ابھی مجھے بھی ایسا لگا تھا جیسے کہیں کوئی تنور میں روٹیاں لگا رہا ہے ــــ" اکرام شیخ نے کہا۔ "بڑی سوندھی.... اشتہا انگیز اور پاگل کرنے والی خوشبو تھی ــــ گرم گرم..... روٹیوں کی ــــ"

سب کی کیفیت ایک سی تھی ــــ مجھے ناممکن چیزوں کی خواہش بہکاتی تھی ــــ میرے تصور میں خوشبو جاگ اٹھتی تھی ــــ ابلتی کافی کی ــــ مہکتی چائے کی ــــ اعلیٰ قسم کے تمباکو کے دھوئیں کی۔ مجھے مینو یاد آتے تھے ــــ دال روٹی سے مغلئی اور چینی کھانوں تک سب کی مہک جدا تھی ــــ

"یارو.... کیا باہر رات ہو رہی ہے؟" خاموشی کے بہت لمبے وقفے کے بعد اکرام شیخ بولا۔

میں نے چونک کر گھٹنوں پر سے سر اٹھایا ــــ "ہاں روشن دان بھی غائب ہو گیا ہے ــــ"

"تم دونوں بھی غائب ہو گئے ہو ــــ" محسن بولا۔ "اندھیرے میں گھل گئے ہو ــــ"

"اس بند دروازے کے ادھر کیا ہے؟"

"دروازہ کھول کر دیکھ لو ــــ" محسن نے مجھے مشورہ دیا۔

"کیا..... ہم سب مل کے ایک دروازہ نہیں توڑ سکتے؟"

"میں تو ایک پاپڑ بھی نہیں توڑ سکتا ــــ" اکرام شیخ نے کہا۔

"یار حد ہو گئی ــــ" میں نے ہنس کے کہا۔ "ہم نے دستک بھی نہیں دی ــــ بھئی ادھر کوئی تو ہو گا ــــ"

"کون ہو گا ــــ؟"

"یار ادھر بیوی ہے میری ــــ" محسن نے کہا۔ "شہلا ہے اور وہ بچے کو دودھ پلا رہی ہے ــــ اسی نے دروازہ بند کر دیا ہے ــــ"

"دودھ کیا ہوتا ہے ــــ؟" میں نے سوال کیا۔ "دود کو، دودِ چراغِ محفل ــــ دود کہتے ہیں دھوئیں کو ــــ تیری بیوی دھواں پلا رہی ہے تیری اولاد کو ــــ"

"اسموکر ہے وہ باپ کی طرح ــــ" محسن نے کہا۔

"یار ــــ خدا کے لیے حواس بحال رکھو ــــ" اکرام شیخ نے کہا۔ "ہوش سے کام لو ــــ ایسے تو صبح تک تم بالکل ہی پاگل ہو جاؤ گے ــــ"

میں اور محسن ہنسنے لگے ــــ "سالے تھانے دار ــــ پاگل خانے میں بند کرانا چاہتا ہے ہمیں ــــ" میں نے کہا ــــ "تو خود پاگل ہے۔" محسن نے قہقہہ مار کے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ "پاگل تھانے دار۔"

میں نے بیٹھی ہوئی آواز میں گانے کی کوشش کی ــــ "تھانے دار جی.... تھانے.... دار جی ــــ آگ لگ گئی ــــ اندر بار جی ــــ"

"سنو ــــ" اکرام شیخ چلایا۔ "دیکھو کوئی آ رہا ہے ــــ تم جیپ کی آواز سن رہے ہو ــــ؟"

"پاگل تھانے دار ــــ" میں نے نعرہ لگایا۔

"اس کے باپ نے خالی جیپ بھیجی ہے.... اس کے سسر نے ٹرک بھیجا ہے، پلاؤ بھر کے ــــ دوسرے ٹرک میں قورمہ ہے ــــ تیسرے میں کباب، اس کا سسر اچھا آدمی ہے ــــ گڈ مین دی لائیٹن ــــ"

اکرام شیخ ہمیں خاموش کرانے کی کوشش کرتا رہا ــــ ہم اس پر ہنستے رہے اور اپنی مضحکہ خیز آوازوں میں اس کا مذاق اڑاتے رہے ــــ اس نیم دیوانگی کی کیفیت کے بہت سے اسباب تھے ــــ امونیا گیس کے مضر اثرات ــــ بھوک، پیاس کی نقاہت ــــ تاریکی کے آسیب ــــ سناٹے میں گونجنے والا سمندر کے پھنکارنے کا شور ــــ ناامیدی اور بے بسی کا اعصاب کو شکست دینے والا احساس اور موت کے خوف کا سرد بازو جو شکنجے کی طرح دل کو دبا تا ہے ــــ دبائے جاتا ہے ــــ

یک لخت سراب کے ان گنت سپنولیوں کو حقیقت کے ایک اژدھے نے نگل لیا ــــ جیپ کے انجن کی غراہٹ نے ہمیں چپ کر دیا ــــ جیپ رک گئی تھی ــــ میں اور محسن ایک ساتھ دروازے کی طرف دوڑے۔

"کوئی آیا ہے ــــ" میں نے چیخ کر کہا۔

"کون ہے ــــ؟" محسن نے دروازہ پیٹنا شروع کیا۔ "کوئی ہے ــــ؟"

باہر کسی نے قفل میں چابی لگائی ــــ پھر کنڈی کھٹاک سے کھلی اور دروازہ اندر کی طرف کھلا تو میں اور محسن پیچھے فرش پر جا گرے۔ پس منظر میں ایک تیز روشنی تھی اور دروازے کے فریم سے حاجی عبداللہ کا بھاری بھرکم اور وسیع و عریض وجود گزر رہا تھا۔

"السلام علیکم..... یا اہل القبور ــــ" حاجی نے بڑی قرأت کے ساتھ اور طنزیہ انداز میں کہا۔

"لعنت تجھ پر خدا کی ــــ مردود ــــ شیطان ــــ" میں نے جواب میں کہا ــــ "اور ان پر جو تجھ سے منسوب ہوئے ــــ"

"عذاب نازل ہو تجھ پر اور تیری آل اولاد پر ــــ دنیا و آخرت میں ــــ" محسن نے میری تقلید کی۔

حاجی کے پیچھے دو آدم خور قسم کے دیوزاد نمودار ہوئے... انھوں نے کندھوں پر بوریاں سی اٹھا رکھی تھیں۔ اس بوجھ کو انھوں نے یوں اتار پھینکا، جیسے انھیں پہلے سے ہدایات مل چکی تھیں کہ انھیں کب کیا کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے ــــ معلوم نہیں وہ کس علاقے کے رہنے والے تھے ــــ میں نے تو ان کے ساڑھے چھ فٹ قد ــــ لوہے کے سانچے میں ڈھلے ہوئے بدن اور باڈی بلڈرز جیسے پٹھوں کو دیکھا ــــ ان کے کالے سیاہ چہروں کو دیکھا جن پر غالباً سیاہی مل دی گئی تھی ــــ انھوں نے کمر سے ایک لنگوٹ سا کپڑا لپیٹ رکھا تھا چنانچہ ڈرامائی تاثر بہت مکمل تھا اور وہ ایسے حبشی غلام نظر آ رہے تھے، جو اپنے آقا کی زبان کے سوا کوئی زبان نہ سمجھتے ہوں اور اس کے اشارے کے سوا کچھ نہ دیکھتے ہوں۔ وہ مالک کے کہنے تو مار دیں اور مرنے کا اشارہ دے تو مر جائیں۔

میرے قریب آ کر گھرنے والے غالب اور راجا تھے۔ میری توقع کے عین مطابق وہ بھی یہاں پہنچ گئے تھے۔

دونوں غلام دروازہ بند کر کے اور ہاتھ اپنے کالی چٹان جیسے سینوں پر باندھ کے دروازے کے قریب کھڑے ہو گئے۔

حاجی عبداللہ نے ہمارے اشتعال انگیز جوابات پر کچھ نہیں کیا تھا ــــ سوائے زور سے کھنکار کے تھوکنے کے ــــ

"بھئی یہ آئے تھے تمھیں تلاش کرتے ہوئے ــــ" اس نے کسی سے مخاطب ہوئے بغیر کہا ــــ "ہم نے کہا کہ چلو میاں! ہم تمھیں ملوا دیتے ہیں ــــ بچھڑے ہوؤں کو ملانے کا بڑا.... اجر ہے ــــ"

"تم شیطان کے بندے ہو ــــ وہی اجر دے گا تمھیں ایسے شیطانی اعمال کا ــــ" میں نے کہا۔

"اللہ سے تو امید ہے کہ تمھیں دنیا و عقبیٰ میں اس سے بھی زیادہ ذلیل و خوار کرے گا ــــ"

"مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے ــــ" اس نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیر کے کہا ــــ "ہم تو میاں توبہ بھی کرتے رہتے ہیں اللہ سے ــــ اور وہ بڑا غفور الرحیم ہے ــــ خیر کہو.... کیسی گزر رہی ہے تمھاری احباب کے ساتھ ــــ؟ بہت غرور ہو گیا تھا تم کو اپنی طاقت کا ــــ بڑے بلند بانگ دعوے کرتے پھرتے تھے، جیسے دنیا میں تمھارا سکہ چلتا ہے.... اور خدا کی خدائی سے بڑھ کے چلتا ہے ــــ نعوذ باللہ ــــ شداد کی طرح تم بھی کوئی جنت بنانے کی سوچتے تھے ــــ فرعون سے زیادہ رعونت رکھتے تھے اور نمرود سے بڑھ کر شقاوت کا مظاہرہ کرتے تھے ــــ"

میں اور محسن ابھی تک غالب اور راجا کی حالت دیکھ رہے تھے چنانچہ اسے بکواس کرنے کا موقع مل گیا ــــ وہ بولتا رہا لیکن ہماری طرف سے غافل نہیں ہوا ــــ اس نے خود کو دور رکھا اور ایک دیوالور ہاتھ میں تھامے اس فاصلے کے درمیان کھڑا رہا جو دو... دیواروں کے وسط میں تھا ــــ مین دروازے کے سامنے اور پیچھے دونوں حبشی دیوزاد غلاموں کی جانب پُشت کیے ــــ

غالب کی نبض کی رفتار معمول پر تھی اور اس پر سے بے ہوشی کا اثر ختم ہوتا محسوس ہو رہا تھا مگر راجا کی حالت قدرے ابتر تھی تاہم تشویشناک نہیں تھی ــــ بظاہر ان دونوں کے جسم پر تشدد کے آثار نہیں تھے ــــ

ان کی طرف سے مطمئن ہو کے میں نے حاجی کی طرف دیکھا جو مسلسل بول رہا تھا اور کچھ اس طرح جیسے وہ بڑا نیکی کرنے والا اور خدا ترس آدمی ہے۔

" اپنا بھونکنا بند کر ــــ کُتّے کی اولاد ــــ" میں نے کہا " اور دفع ہو جا یہاں سے ــــ نہ ہماری زندگی اور موت تیرے ہاتھ میں ہے اور نہ تقدیر ــــ ہمیں مرنا ہو گا تو ہم راضی بہ رضا ہیں ــــ تجھ سے رحم کی بھیک مانگنے والے پر لعنت ــــ ہم کیا ہیں اور کیا نہیں ہیں، یہ ہمارا خدا جانتا ہے ــــ اور وہ نیتوں سے بھی واقف ہے، اس لیے تو الفاظ سے ہمیں اور خود کو دھوکا مت دے ــــ"

" دیکھو میاں سکندرِ اعظم ــــ" وہ متاثر ہوئے بغیر اپنی... پاٹ دار آواز میں بولا ــــ" اللہ تعالیٰ نے انسان کو نطق اور عقل عطا کی ہے ــــ اسی سے وہ اشرف المخلوقات ہوا ــــ اس عقل کو جذبات کی طغیانی میں بہا دینے سے تمھیں کچھ نہیں ملے گا ــــ تم کو ابتدا میں چوہدری دلاور سے عناد تھا ــــ ایک ذاتی سبب تھا اس کا جو ہماری سمجھ میں آتا ہے ــــ اس نے تمھارے والد.... اللہ ان کی مغفرت کرے ... "

میں نے اسے ایک ناقابلِ بیان گالی دی ــــ" ان کو تیرے غلیظ لبوں سے کسی دُعا کی ضرورت نہیں ہے ــــ"

" تاہم ــــ ان کے کاروبار کے وارث بلا شبہ تم تھے ــــ" وہ بولا اور اس نے پیٹ پر ہاتھ پھیر کے ایک لمبی گرج دار ڈکار لی ــــ" شرعاً مرحوم کی جملہ جائیدادِ منقولہ و غیر منقولہ پر تمھارا حق بنتا تھا ــــ دلاور نے یقیناً محسن کُش ہونے کا ثبوت دیا اور غاصب ہونے کا بھی ــــ تم نے اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی نہیں کی اور براہِ راست اس سے تصادم کی راہ اختیار کی ــــ یہ تمھاری پریشانیوں میں اضافے کا سبب بنا اور تم متعدد قانونی معاملات میں ملوّث کر دیے گئے ــــ یہ سب غلط تھا ــــ ہم جانتے ہیں کہ تم کوئی اخلاقی مجرم نہیں ہو ــــ تاہم تم دیکھو کہ تمھارے جذباتی فیصلوں سے کتنے لوگوں کو پریشانی ہوئی ــــ"

مجھ میں جسمانی طور پر طاقت کا فقدان تھا اور میں اچھی طرح سمجھتا تھا کہ میں حاجی کو مغلوب نہیں کر سکتا ــــ جب وہ خدا کا نام لیتا تھا اور شرع کی بات کرتا تھا ــــ مذہبی انسان کا لہجہ اختیار کرتا تھا اور علمِ دین کے حوالے سے دلائل دیتا تھا تو اشتعال سے میرے جسم کا رُواں رُواں سلگنے لگتا تھا ــــ میں جانتا تھا کہ وہ ایسا عادت اور ضرورت کے تحت کرتا ہے، ورنہ کیا وہ خود اپنے بارے میں نہیں جانتا کہ ابلیس کا نام اس جیسے لوگوں کے اعمال سے زندہ ہے ــــ

اس کے باوجود ایک وقت آیا کہ میرے اعصاب جواب دے گئے ــــ اس سے پہلے میں نے سوچا تھا کہ اسے بھونکنے دوں ــــ جواب میں کچھ کہنا بے سُود تھا ــــ اُسے گالیاں دینے کا کوئی فائدہ نہیں تھا اور اس پر چیخنا چلّانا بے مقصد تھا ــــ اس سے بحث بے مصرف تھی اور اس کے خلاف احتجاج بے کار ــــ میں اور محسن خاموش رہنے پر مجبور تھے ــــ اکرام شیخ نے بھی سر کو گھٹنوں میں دے کر یہی طے کیا تھا کہ سنی اَن سنی کر دے ــــ

مگر میرے جذبات ایک ایسی آگ کی طرح تھے جو دبائے نہ دبتی ہو اور شعلے سرد پڑتے ہوں تو اشتعال کا ایک جھونکا انھیں پھر بھڑکا دیتا ہو ــــ ایسے ہی کسی مشتعل کر دینے والے لمحے سے شکست کھا کے میں اس پر حملہ آور ہوا ــــ گالیاں میرے مُنہ سے یوں نکلیں جیسے آتش فشاں سے لاوا بہتا ہے۔

حاجی کے پیچھے کھڑے ہوئے دونوں غلام ایک دم حرکت میں آئے ــــ ان میں سے ایک نے ہاتھ گھما کے میرے سر پر مُکّا مارا اور میں گھوم کے واپس آیا ــــ محسن نے مجھے نہ سنبھالا ہوتا تو میں دیوار سے جا ٹکراتا ــــ

" یہ کیا بے وقوفی کر رہا ہے سکندر ــــ" محسن نے مجھے اپنی گود میں لٹا لیا ــــ مجھے اوپر چھت کسی چکّی کے پاٹ کی طرح گھومتی ہوئی محسوس ہوئی ــــ میرے کانوں میں سائیں سائیں ہوتی رہی۔ میرا جسم کانپتا رہا ــــ میرے ہونٹوں سے گالیاں ٹوٹ ٹوٹ کر نکلتی رہیں ــــ

" یار حوصلہ رکھ ــــ بکنے دے اسے ــــ" اکرام شیخ نے میرے کان میں سرگوشی کی ــــ اس کا لہجہ بہت دُکھی تھا۔

" ... ہم تو یہ کہتے ہیں بھئی کہ ہمارے اور تمھارے بیچ میں تو عناد کا سبب کوئی بھی نہیں ــــ ہم تو ایک عرصے تک ایک دوسرے کے نام سے بھی آشنا نہیں تھے ــــ اور ملاقات تو خیر حال ہی کی بات ہے ــــ" یہ اسی کی آواز تھی جو میرے کانوں تک پہنچتی رہی۔

" ...... ہمارے کاروباری معاملات میں دخل اندازی کسی طور پر مناسب نہ تھی ــــ میاں ہم اپنا کام کرتے ہیں ــــ اِدھر کا مال اُدھر پہنچا دیا ــــ اور اُدھر کا اِدھر ــــ اپنا حقِ محنت وصول کیا اور اللہ اللہ خیر صلّا ــــ اب کون بُرائی کرتا ہے اور کس کے ساتھ کرتا ہے ــــ کیا کرتا ہے اور کیوں کرتا ہے ــــ اس سے ہمیں سروکار نہیں ــــ بُرائی اس کے اعمال میں لکھی جائے گی، جو بُرائی کرے گا ــــ"

" پھر تو حاجی صاحب . . . آپ بہت سے دوسرے کام بھی کر سکتے ہیں ــــ" محسن بولا۔

" مثلاً ــــ؟"

" مثلاً یہ کہ اپنی بہو بیٹیوں کو ایک کوٹھا لے دیں ــــ وہاں وہ پیشہ کرنے لگیں تو گناہ گار وہ ــــ پیسہ آپ کو دیں تو آپ پر حلال ــــ"

میرا دل خوش ہو گیا کیونکہ حاجی کا چہرہ ذرا سی دیر کے لیے متغیّر ہو گیا تھا ــــ لیکن وہ بڑا عیّار اور مکر و فریب سے پُر انسان تھا جو ناجائز کو جائز اور حرام کو حلال قرار دینے کے فن میں ماہر تھا۔

" تم نے ٹھیک کہا میاں ــــ ہم بھی سمجھتے ہیں کہ بُرا نہ کوٹھا ہوتا ہے نہ کوٹھی ــــ" وہ داڑھی پر ہاتھ پھیر کے بولا۔ " سب نیت اور مقصد سے ہوتا ہے ــــ طوائف بھی نہ چاہے تو اسے کون جسم فروشی پر مجبور کر سکتا ہے ــــ بُرائی بھی ایک خود اختیاری فعل ہے ــــ"

" چلیں، ایک سچ تو بولا آپ نے کہ شیطان کی پیروی آپ اپنی مرضی سے کر رہے ہیں ــــ" محسن بولا۔

" ہم صرف کاروبار کر رہے ہیں میاں ــــ بُرا تم سمجھتے ہو اس لئے تو یہ تمھاری نظر کا قصور ہے ــــ" وہ بولا ــــ" ہماری طرح کتنے لوگ اسلحہ فروخت کر رہے ہیں ــــ حکومت کا لائسنس ہے اُن کے پاس ــــ لیکن کیا وہ ذمّے دار ہیں اس خون خرابے کے ــــ ڈکیتی یا اغوا، کی وارادت کے جو اس اسلحے کے زور پر کی جائے ؟ ایک شخص شکار کے لیے رائفل لے یا ذاتی حفاظت کے لیے پستول ــــ اور بعد میں ڈاکو بن جائے تو اسلحہ فروش کا کیا گناہ ــــ بازار میں چھُری چاقو ــــ خنجر کلہاڑی سب فروخت ہو رہے ہیں اور عام گھروں میں بھی دستیاب ہیں ــــ ان سے کیا قتل نہیں کیے جاتے ــــ؟ بلکہ شاید اعداد و شمار نکالے جائیں تو خنجر یا کلہاڑی سے کیے جانے والے قتل زیادہ ہوں گے جو دیہات میں ہوتے ہیں ــــ زر، زمین اور زن کے فساد میں جو عورتیں بیوہ ہوئیں یا جو بچے یتیم ہوئے، کیا اس کے ذمّے دار خنجر، کلہاڑی اور لوٹے کے بنانے والے اور بیچنے والے ہوں گے اور کیا یہ گناہ ان کے نامۂ اعمال میں درج ہوں گے ــــ یقیناً نہیں۔ پھر ہمارا کاروبار کیسے ناجائز ہو گیا ــــ؟ میاں، دلاور ہمیں ایک بندوق دیتا ہے ــــ یا اسلحے کا ایک ٹرک بھر کے دیتا ہے اور کہتا ہے کہ کراچی میں فلاں کو پہنچا دو ــــ ہم نے اُجرت لی اور مال پہنچا دیا ــــ دوسرے مال کی طرح ــــ اب فلاں کون ہے ــــ اس سے ہمیں کیا ــــ وہ زید، بکر کوئی بھی ہو ــــ ہم کیا پہلے چوہدری دلاور سے کہیں کہ وہ فلاں کی شرافت اور نیک چلنی کا سرٹیفکیٹ دے، اور حلف اٹھائے کہ وہ مذکورہ مال سے خلقِ خدا میں فتنہ و فساد کو عام نہیں کرے گا ــــ"

" او یار حاجی ــــ خدا کے لیے یہ بکواس بند کرو اور یہاں سے دفع ہو جاؤ ــــ تم ایسی باتوں سے کسے بے وقوف بنا رہے ہو آخر ؟ خود تو تم اتنے بے وقوف ہو نہیں، ورنہ یہ سارا .... بدمعاشی کا دھندا کیسے چلاتے ــــ ہمیں بھی بے وقوف سمجھتے تو اتنی تکلیف نہ اٹھاتے ہمارے لیے ــــ اپنی شرافت اور نیک چلنی کے ثبوت تو اپنے ساتھ لائے ہو تم ــــ" اس نے غالب اور پھر راجا کی طرف اشارا کیا۔

" لو میاں ــــ اس میں بھی صریحاً غلط فہمی ہوئی تمھیں ــــ" اس نے پوری قرأت کے ساتھ کہا ــــ" ہم تو سب کی بھلائی کے لیے یہاں آ گئے ــــ تمھارے دوستوں کو بھی لے آئے ــــ یہ تمھارے بغیر بہت بے قرار تھے ــــ یہاں تم کو چین نہیں ہو گا اِن کے بغیر ــــ ہم نے کیا بُرا کیا، اگر سب کو اکٹھا کر دیا ــــ اب میاں، تم یہ سمجھو کہ انھیں ہم نے مارا ہے یا ان کی بے ہوشی میں ہمارا ہاتھ ہے ــــ تو استغفر اللہ ــــ ہم نے ان کو اسی حالت میں پایا تھا اور ہم سے کہا گیا کہ انھیں فلاں جگہ پہنچا دو، تو ہم نے کہا ــــ چلو ہم پہنچا دیتے ہیں ــــ"

" ہاں ــــ ڈلیوری کے لیے تو تم ہر وقت تیار ہو ــــ" محسن نے اس کی وسیع توند کو گھُور کے کہا ــــ" کسی کا بھی ہو ــــ وہ مال ــــ"

" دراصل . . . ہم خود بھی چاہتے تھے کہ یہ معاملات طے ہو جائیں ــــ جس میں سب کا نقصان ہو رہا ہے ــــ" وہ خوش دلی سے مسکرایا ــــ" پہلے ایک دو بار چوہدری صاحب .... اپنے چوہدری دلاور نے کوشش کی تھی ــــ اور خاصی معقول پیشکش تھی ان کی ماشاء اللہ، لیکن آپ لوگ مانتے نہیں ــــ اب میاں،

وہ کیا کہتے ہیں کہ ہاتھی لڑیں تو پس جاتے ہیں حشرات الارض۔ مطلب یہ کہ ہمارا نقصان ہونے لگا، درمیان میں رہنے سے... خوامخواہ ـــ"

وہ کچھ دیر کے لیے رُکا اور اُس نے پلٹ کے ایک غلام سے کچھ کہا ـــ وہ دروازہ کھول کے باہر نکل گیا ـــ میں نے راہداری کی ایک جھلک سی دیکھی جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کوئی چھوٹا سا مکان ہے ـــ راہداری کے آخر میں بھی ایک دروازہ تھا جو کھلا ہوا تھا اور اس میں سے مجھے وہ جیپ نظر آئی جو پورچ میں یا سامنے کے کھلے حصّے میں کھڑی ہوئی تھی۔

"اب یہ ہمارے لیے تو گویا ایک مسئلہ بن گیا میاں محسن!" اس نے پہلی بار محسن کو نام لے کر مخاطب کیا ـــ "کاروباری مسائل کو ابھی تم نہیں سمجھتے برخوردار ـــ ہم کیا مال لائیں جب مال کے آگے جانے والے راستے میں تمھارے احباب حائل ہوں ـــ ابھی کچھ عرصہ قبل ایک مال بردار جہاز آپ لوگوں میں سے ہی کسی نے غرق کیا تھا ـــ"

"وہ تو انشاء اللہ آئندہ بھی کریں گے ـــ" میں نے قرأت سے جواب دیا۔

حاجی ہنسا ـــ "جزاک اللہ ـــ حسِ مزاح خوب عطا ہوئی ہے تمھیں برخوردار ـــ میاں جیو گے تو کچھ کرو گے نا، یا عالمِ ارواح میں پہنچ کے بھی یہی فتنہ و فساد پھیلاؤ گے ـــ؟"

"اس کے بعد ہم زیادہ تباہ کُن ہو جائیں گے ـــ" میں نے کہا۔ "بھوت بن کے چمٹ جائیں گے تمھاری برادری کو ـــ ایک ایک کو پاگل کتّے کی طرح ہلاک کریں گے ـــ ایک جہاز کیا چیز ہے ـــ ہم تمھارا بیڑا ہی غرق کر دیں گے۔"

"چلو چھوڑو مذاق ـــ" وہ بولا۔ "ہم تو آئے تھے مطلب کی بات کرنے ـــ کہ اب بھی یہ معاملات طے ہو سکتے ہیں۔ کچھ لو اور کچھ دو کی بنیاد پر ـــ حال ہی میں ایک تجارتی وفد کے ارکان اس مسئلے پر گفت و شنید کے لیے پہنچے ہیں ـــ"

"اس وفد کی ہم تک رہنمائی کرنے والے آپ کے والد گھوش دادا تو نہیں تھے ؟" محسن نے کہا۔ "ہم مل چکے ہیں اس چوہے سے ـــ حیرت ہوتی ہے کہ اس نے تم جیسا سؤر کیسے پیدا کیا۔"

"تم حد سے بڑھ رہے ہو میاں ـــ ہم تمھاری زبان کی اس غلاظت کو برداشت کر رہے ہیں۔"

"کیونکہ تم غلاظت کی پیداوار.... غلاظت میں رہنے والے اور مجسّم غلاظت ہو۔" میں نے کہا۔

وہ پھر پی گیا ـــ "ہم سے چوہدری دلاور نے کہا ہے کہ ان سب کو ایک بار پھر سمجھا دو ـــ کہ باز آجائیں اور اس زندگی کی قدر کریں ـــ خودکشی کو اللہ تبارک تعالیٰ نے حرام موت سے تعبیر فرمایا ہے ـــ اور جو کچھ تم لوگ کر رہے ہو وہ صریحاً خودکشی کے مترادف ہے۔ ہم اس جگہ تم سب کو اکٹھا کر رہے ہیں تاکہ سب مل کے کچھ سوچو اور مشورے سے طے کرو کہ مفادِ باہمی یہ بہتر نہیں ہے کہ تم اس آخری موقع سے فائدہ اٹھاؤ ـــ سوچنے کے لیے تمھیں بہت مہلت ملے گی ـــ جب تک تمھارا دل چاہے سوچو ـــ لیکن اس ہفتے کے اختتام تک طے کر لو ـــ گویا سات دن ہیں ـــ خدا نے چاہا تو اس ہفتے کے اختتام تک تمھارے کچھ احباب کو بھی یہاں لے آئیں گے ـــ"

محسن نے قہقہہ مارا ـــ "کہاں کہاں سے جمع کرو گے ؟ وہ تو یہاں سے وہاں تک ہر جگہ موجود ہیں ـــ"

"کہاں .... سے کہاں تک ؟" حاجی کا چہرہ ایک سوالیہ نشان بن گیا۔

"جہاں سے بھی تمھارا گزر ہے ـــ ہر راستے پر وہ تمھیں ایسے ملیں گے کہ کھلی آنکھوں سے روزِ روشن میں تمھارے سامنے ہوں گے مگر تم انھیں دیکھ نہ پاؤ گے ـــ ان کی موجودگی کا ثبوت تمھیں ملتا رہے گا ـــ ہر جگہ ـــ تم کیا سمجھتے ہو، ہم صرف تم جیسے افراد ہیں، پاگل کے بچے ـــ؟ اتنا بڑا کام ہم کب سے کر رہے ہیں تو کیا یہی آٹھ دس لوگ ہیں جن کے نام تمھارا چوہدری دلاور جانتا ہے ـــ اس کے تو فرشتوں کو بھی خبر نہیں کہ اب ہم کتنی بڑی قوت ہیں ـــ لاہور سے تم کراچی تک آگئے ـــ تم نے دیکھا ہوگا کہ ہم ہر جگہ تھے ـــ یہاں سے آگے بھی تم دیکھ لو گے ہو ـــ ہم سمندر میں بھی ملے تھے ـــ صرف ایک جہاز کے ڈوبنے سے ہی تم بدحواس ہوگئے ـــ ابھی دیکھو اور کتنے سفینے ڈوبتے ہیں ـــ تم نے کبھی پوچھا اس غدّارِ اعظم چوہدری دلاور سے کہ ہم نے کتنے اسلحہ خانے اب تک تباہ کیے ہیں ـــ کتنے ٹرک جو اسلحے سے بھرے ہوئے تھے، اغوا کیے اور تباہ کر ڈالے ـــ ہم اپنے دشمن کو پہچانتے ہیں ـــ ایک حصّے میں تو دلاور کے ساتھی ہیں ـــ دوسرے درمیان کے لوگ ہیں ـــ تم جیسے ـــ تیسرے گھوش دادا کی طرف ہیں ـــ ہم سے کوئی چھپا ہوا نہیں ـــ اور جو چھپا ہوا ہے، وہ بھی کب تک چھپا رہے گا ـــ ان سمندروں سے آگے بھی ہم ہیں ـــ تم کس کس کو خرید و گے کس کس سے سودا کرو گے ؟ ـــ یہ تو ہزاروں کی بات ہے ـــ ہزاروں کفن بردوش وطن پرست مجاہدوں میں سے صرف ایک کو خریدنے کے لیے بھی وہ سب دولت ناکافی ہے جو تم نے اور تمھارے باپ چوہدری دلاور نے اکٹھی کی ہے ـــ تم کیا سودا کرو گے ہم سے ؟"

میرا دل چاہا کہ بے اختیار محسن کا مُنہ چوم لوں ـــ اس نے ہم سب کے جذبات کی ترجمانی کا حق ادا کر دیا تھا ـــ ایک ایسے وقت میں جب کہ ہم اس قابل نہ تھے ـــ یہی نہیں ـــ اس نے اپنی ذہانت سے کام لیتے ہوئے حاجی عبداللہ کے مصنوعی اعتماد کی بنیادیں ہلا دی تھیں ـــ اسے اپنے اعتماد سے پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا ـــ یہ پریشانی اس کی صورت پر اس کی خباثت سے زیادہ نمایاں ہوگئی تھی ـــ

چونکہ حاجی سُن رہا تھا اس لیے محسن بولتا رہا اور اس نے جو مُنہ میں آیا کہا مگر بے ربط نہیں کہا اور بے مقصد نہیں کہا ـــ وہ حاجی کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گیا کہ ہم واقعی یہاں سے وہاں تک ہیں اور ہمارے ساتھی، مددگار اور حامی ہزاروں ہیں جو اُن کی تباہی کے مشن میں آئندہ بھی سرگرمِ عمل رہیں گے ـــ ہمارے زندہ رہنے یا نہ رہنے سے معاملات طے نہیں ہوں گے ـــ

اسی وقت حبشی لوٹ آیا ـــ اس کے ہاتھ میں دو بنڈل تھے اور ایک بالٹی تھی ـــ

"لو میاں ـــ ہم تو خیر سگالی کے جذبات کا یوں اظہار کرتے ہیں کہ ـــ" اس نے ایک بنڈل زمین پر رکھ کے ہماری طرف دھکیل دیا ـــ "اس میں کچھ اشیائے خورد و نوش ہیں... اللہ تعالیٰ ہمارے درمیان افہام و تفہیم کا جذبہ پیدا کرے ـــ ہم نے سب کچھ فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔"

"کیا تم رازق اور رزّاق ہونے کا دعویٰ کر رہے ہو ؟"

"استغفراللہ ـــ ہم تو بس وسیلہ ہیں ـــ" وہ کانوں کو ہاتھ لگا کے بولا ـــ "اس میں سگریٹ اور کافی .... ادویات وغیرہ ہیں ـــ اور یہ پانی ہے ـــ خوراک کا یہ ذخیرہ تمھیں ہفتہ بھر چل جانا چاہیے ـــ اس کے بعد فی امان اللہ ـــ ہم سے شاید اس دارِ فانی میں ملاقات نہ ہو۔"

"یہ بالٹی ذرا آگے رکھوا دیں ـــ" محسن نے کہا۔ "یا مجھے اجازت دیں کہ میں ....."

"ہاں میاں ـــ جاؤ ـــ پیو شوق سے پانی ـــ پیاس لگی ہوگی سب کو ـــ انھیں بھی پلاؤ ـــ" حاجی نے محسن کے عاجزانہ اندازِ گفتگو سے متاثر ہو کے کہا۔

محسن آہستہ آہستہ آگے بڑھا ـــ اس نے پانی کی بالٹی اٹھائی ـــ میری اور اکرام شیخ کی نظر بھی اس پر تھی اور خود حاجی عبداللہ بھی زیادہ چوکنّا نظر آنے لگا تھا ـــ اس نے ریوالور کو بالکل تیار کر لیا تھا اور اپنے گوریلوں کو بھی اشارے سے کچھ سمجھایا تھا۔ وہ بھی اپنی خون آشامی کا مظاہرہ کرنے کے لیے مستعد ہو گئے تھے۔

میرا خیال پہلے یہ تھا کہ محسن مجھے موقع فراہم کرنا چاہتا ہے کہ حاجی کی نظر چُوکے تو میں اس پر جست لگا دوں اور اس کے ہاتھ سے ریوالور چھین لوں ـــ مگر ایک تو حاجی کسی طرف سے بھی غافل نہیں تھا ـــ دوسرے مجھ میں جست لگانے کی تو کیا... اٹھنے کی بھی ہمت نہیں تھی ـــ مجھے یقین تھا کہ ٹھنڈے شفاف پانی کا نظارہ بھی میری نظر کی پیاس بجھا سکتا ہے ـــ یہ پانی نہیں آبِ حیات تھا جس کا ایک گھونٹ مجھے ہی نہیں ہم سب کو زندگی کی نوید دے سکتا تھا کیونکہ ہم سب کی حالت اس مسافر سے بدتر تھی جو بے آب و گیاہ صحرا کے پا پیادہ سفر میں کئی دن پیاسا رہا ہو۔

جب محسن نے بالٹی اٹھا لی تو میرا خیال بدل گیا ـــ شاید وہ بالٹی اٹھا کے پانی حاجی پر پھینک دے گا ـــ اس کے مُنہ پر اُچھال دے گا ـــ اسے بھی بھگو دے گا اور اس کے اسلحے کو بھی بیکار کر دے گا ـــ میں محسن کو چلّا کے خبردار کرنا چاہتا تھا کہ وہ ایسا نہ کرے ـــ یہ آسان کام نہیں تھا ـــ بالٹی کو اوپر اٹھانے... دوسرے ہاتھ سے تھامنے ـــ اس کا رُخ حاجی کی طرف کرنے اور پھر پانی اس پر پھینکنے کا عمل انتہائی تیز رفتاری سے کیا جاتا تب بھی اس میں دس سیکنڈ تو صرف ہوتے ـــ اس کے برعکس صرف ایک سیکنڈ میں حاجی عبداللہ ٹریگر دبا دیتا اور دوسرا سیکنڈ شروع ہونے سے پہلے گولی یقیناً محسن کے دل میں جگہ بنا لیتی۔ اپنی موجودہ حالت میں محسن اس تیز رفتاری پر قادر بھی نہیں تھا۔

چنانچہ مجھے بڑی طمانیت آمیز مسرت اور غرور آمیز سکون کے جذبات نے قہقہہ لگانے پر مجبور کر دیا، جب محسن نے بڑے اطمینان اور اعتماد کے ساتھ پانی کی بالٹی کو وہیں فرش پر الٹ کے خالی کر دیا ـــ اور جب پانی اس فرش کی مٹی میں بہنے لگا تو محسن نے اس پر تھوک دیا اور اس کے بہتے دھارے پر چلتا ہوا لوٹ آیا ـــ

"اللہ مجھے معاف کرے ـــ" محسن نے کہا۔ "پانی اس کی نعمت ہے جس کی میں نے تحقیر کی ـــ مگر وہ جانتا ہے کہ میری نیّت تمھارے خیر سگالی کے جذبات کی تحقیر کے سوا کچھ نہ تھی ـــ حاجی عبداللہ ـــ اگر یہ گناہ اتنا بڑا نہ ہوتا تو میں اس پر پیشاب کر دیتا ـــ" محسن نے زمین پر رکھے ہوئے بنڈل کی طرف اشارہ کیا ـــ "لیکن یہ رزق ہے جس کی تذلیل میں نہیں کر سکتا ـــ تم سمجھ لو کہ میں نے عملاً نہ سہی ـــ اصطلاحاً ایسا ہی کیا ـــ اب تم اسے لے جاؤ ـــ یا چھوڑ جاؤ ـــ تمھاری مرضی ـــ ہفتے کیا، مہینے بھر بعد بھی تم

آؤ گے نا تو یہ سامانِ خورد و نوش ۔۔۔ تمہاری خیرات میں ملنے والے سگریٹ اور کافی سب اسی جگہ، ایسے ہی پڑے ہوئے ہوں گے ۔۔۔ ممکن ہے ساتھ ہی ہماری لاشیں بھی پڑی ہوں ۔۔۔ مگر حاجی ۔۔۔ اس کو اچھی طرح دیکھ کر جاؤ ۔۔۔ اس خوراک کے ذخیرے میں سے ایک ذرّہ کم نہ ہوگا۔"

احساسِ تذلیل سے حاجی کا چہرہ سُرخ ہو گیا اور ایک لمحے کے لیے تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس پر جنون سوار ہو گیا تو وہ ہم سب کو ایک ہی بار میں ختم کر دے گا ۔۔۔ اس کا ریوالور ہم پر خالی ہو جائے گا تب بھی اس کا اشتعال باقی رہے گا۔

لیکن حاجی میں غیرت کا جذبہ بہت پہلے کمزور پڑ چکا تھا۔ عزّتِ نفس اور حمیت کے اعلیٰ جذبات کا تعلق آدمی کی پوری زندگی اور اس کی شخصیت کے ہر رنگ سے ہوتا ہے ۔۔۔ جو شخص ذاتی اصولوں اخلاقی قدروں کا رد یا اور معمولاتِ حیات میں بے ضمیری قبول کرتا ہو وہ عزّت و ذلّت کو فنا و بقا کا مسئلہ کیسے بنا سکتا ہے۔ نہ وہ عزّت سے جی سکتا ہے اور نہ عزّت کے لیے مر سکتا ہے چنانچہ حاجی نے خود پہ قابو پا لیا اور اپنی بے غیرت مسکراہٹ سے ہمیں یہ تاثر دینے کی کوشش کرنے لگا کہ وہ کتنا متحمل مزاج ہے۔

"میاں ۔۔۔ تم نے بہت چاہا کہ ہم طیش میں آجائیں مگر برخوردار ۔۔۔ ہم نے بھی یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے ہیں۔ ہم تم جیسے بچّوں کے کھیل سمجھتے ہیں ۔۔۔ تمہارا دل مرنے کو چاہتا ہے تو ہم تمہیں کیسے روک سکتے ہیں ۔۔۔ ہم جاتے ہیں مگر تمہیں بتانا ضروری ہے کہ ہم کیا پیغام لائے تھے۔"

"تمہارے لیے ضروری ہے تو بکو ۔۔۔ ویسے ہم سُننا بھی نہیں چاہتے پاجی کی اولاد ۔۔۔" میں نے کہا۔ "اپنا نام بدل لے حاجی عبداللہ ۔۔۔ پاجی عبدالشیطان ولد ابو ابلیس رکھ لے۔"

"بس یا کچھ اور ۔۔۔؟" اس نے خون آشام نظروں سے مجھے گھور کے اور خون کے گھونٹ پی کر کہا۔ "ہم یہ ایک چیز یہاں چھوڑ کے جائیں گے ۔۔۔" اس نے اپنی جیب میں سے ایک چھوٹا پاکٹ سائز ریڈیو نکالا اور زمین پر رکھ دیا ....

"انشاءاللہ تمہارے باقی ماندہ دوست بھی تم سے آملیں گے ۔۔۔ ان میں خواتین بھی ہوں گی۔"

"ماشاءاللہ ۔۔۔ آپ کی تو بیٹیاں جوان ہی ہوں گی۔ ضرور بھیجیے ۔۔۔ ہم تنہا لوگ ہیں ۔۔۔" میں نے کہا۔

"تمہاری یہ زبان ہم انگاروں سے جلا دیتے ۔۔۔" اس نے پھر سُرخ ہو کے کہا ۔۔۔ "تمہارے حلق میں اتنی ہی گولیاں اتار دیتے جتنی اس ریوالور میں ہیں ۔۔۔ لیکن ۔۔"

"لیکن ہم بے غیرت ہیں اور ہمیں پیسہ زیادہ عزیز ہے" میں نے جملہ مکمل کیا۔

"..... ہم مفاہمت اور مصالحت کے لیے آئے تھے ہماری طرف سے اور دوسروں کی طرف سے پیش کش بہت وا[illegible] ہے ۔۔۔ تم سب اکٹھا ہو جانے کے بعد سوچ لو کہ تمہیں کہاں [illegible] ہے ۔۔۔ تمہیں وہیں پہنچا دیا جائے گا ۔۔۔ اس دنیا میں کوئی [illegible] ہو یا پھر دوسری دُنیا میں ۔۔۔ تم جتنا مانگو گے، دیا جائے گا [illegible] مجموعی رقم ایک ارب سے زیادہ نہ ہو۔"

وہ اپنی بات جلد از جلد ختم کر کے نکل جانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے جیب میں سے ایک کاغذ نکالا۔ "اس پر سارا [illegible] اور تمام تفصیلات لکھی ہوئی ہیں۔"

محسن نے اسے کاغذ کے استعمال کے بارے میں ایک خاصا عام فہم مگر گندہ مشورہ دیا۔

"یہ ریڈیو نہیں ۔۔۔ ٹرانسمیٹر ہے ۔۔۔ اس کے ذریعے تم جب چاہو ہم سے بات کر سکتے ہو ۔۔۔ لیکن نہ کچھ اور سن سکتے ہو نہ کسی اور کے لیے کوئی پیغام نشر کر سکتے ہو ۔۔۔" اس نے نیچے جُھک کر ریڈیو اٹھایا ۔۔۔ ابھی وہ سیدھا بھی نہیں ہوا تھا کہ اس کے پیچھے ایک دھماکا ہوا۔

یہ دھماکا نہیں تھا ۔۔۔ کسی نے دروازے کو باہر سے کنڈی لگائی تھی مگر اس کی آواز خالی کمرے کے سکوت میں اسی طرح گونجی ۔۔۔ حاجی ایک دم چونک کے پلٹا ۔۔۔ اس کے دونوں محافظ گوریلے بھی بے اختیار دیکھنے پر مجبور ہو گئے۔ یہ جسم کا ایک فطری اور غیر ارادی ردِّ عمل تھا۔

میں نے اس ایک لمحے میں وہ قوت کہاں سے حاصل کی جس نے مجھے ایک جست میں اٹھا کے پیروں پہ کھڑا کر دیا اور حاجی عبداللہ تک پہنچا دیا ۔۔۔ اس کا جواب میں آج بھی نہیں دے سکتا ۔۔۔ میرا خیال کوئی معنی نہیں رکھتا ۔۔۔ یہ ایک آفاقی حقیقت ہے کہ زندگی کو موت کے رُوبرو پا کے ہر ذی حیات مقابلے کے لیے جسم میں پوشیدہ توانائی کے اس ذخیرے کو بروئے کار لاتا ہے جو قدرت نے ایسے ہی مواقع کے لیے رکھا ہے۔ یہ ریزرو انرجی ملتی ہے تو بلی بھی شیر بن کے حملہ کرتی ہے اور آدمی وہ کر گزرتا ہے جس کی وہ اپنی ذات سے توقع بھی نہیں رکھتا ۔۔۔ وہ سُپر مین بن جاتا ہے۔ اس کے لیے میڈیکل سائنس کی باقاعدہ وضاحت ہے جس کو پیش کرنا یہاں غیر ضروری ہے۔ میں اسے تائیدِ ایزدی کہتا ہوں ۔۔۔

اس تائیدِ ایزدی نے مجھے حاجی پر بھرپور حملے کے قابل

کیا اور اس سے پہلے کہ وہ پلٹ کے خود حفاظتی کے لیے کچھ کرتا، میں نے کراٹے میں اپنی مہارت کا صرف ایک ہی مظاہرہ کیا۔ وہ کٹے ہوئے درخت کے تنے کی طرح فرش پر گرا تو اس کے ہاتھ سے چھوٹنے والا ریوالور پھسل کر دور گیا ۔۔۔ میں نے محسن اور اکرام شیخ کو ایک ساتھ اس کی طرف لپکتے دیکھا۔ اکرام شیخ نسبتاً قریب تھا ۔۔۔ وہ ریوالور حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔

"بس ۔۔۔" اس نے چیخ کر کہا۔ "رُک جاؤ۔"

یہ آخری الفاظ اس نے ایک غلام سے کہے تھے جو اتنی دیر میں بہت آگے بڑھ چکا تھا ۔۔۔ جب گولی چلنے کی سنسناہٹ ہوئی تو میرا دل خوشی سے بھر گیا ۔۔۔ معلوم نہیں کیسے... ایک بار پھر پانسا پلٹ گیا تھا۔

"مار دے ۔۔۔ اسے بھی مار دے ۔۔۔" یہ محسن کی آواز تھی جو میں نے سُنی۔

پہلا غلام ایک بھیانک چیخ مار کے زمین پر گر چکا تھا اور کسی خونخوار درندے کی طرح حلق سے بھیانک آوازیں نکال رہا تھا۔ اکرام کی چلائی ہوئی گولی کہیں اس کے مُنہ پر لگی تھی کیونکہ اس کا چہرہ ہی لہولہان تھا اور وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا مُنہ نوچ رہا تھا۔ جیسے اس طرح وہ اپنی اذیت کو نوچ کر پھینک دینا چاہتا ہے جو کسی ظالم جان لیوا خونی کیکڑے کی طرح اس کے چہرے پر پنجے گاڑ چکی ہو۔

اب میں بہتر پوزیشن میں تھا اور دیکھ سکتا تھا کہ مجموعی طور پر صورتِ حال پوری طرح ہمارے قبضے میں ہے... دوسرا غلام دیوانہ وار اکرام شیخ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جب اس نے اپنے ساتھی کو گرتے اور موت کے کرب میں چلّاتے دیکھا۔ اس کا رُخ محسن کی طرف تھا چنانچہ محسن نے اکرام شیخ سے کہا تھا کہ اسے بھی شوٹ کر دے تو یہ مطالبہ جائز اور بروقت تھا۔ محسن یقیناً اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ جسمانی طاقت میں اس گوریلے کا مقابلہ کر سکتا ۔۔۔ جو اپنے ہاتھ پھیلائے اس کو گھیرتا ہوا دیوار کی طرف لے جا رہا تھا ۔۔۔ پل بھر کے توقف کے بعد وہ پھر محسن کی طرف بڑھا اور اس نے اپنے لمبے مضبوط بازو آگے بڑھائے ۔۔۔ وہ محسن کی گردن کو اپنے ہاتھوں کی گرفت میں لینا چاہتا تھا ۔۔۔ محسن پیچھے ہٹنے کی کوشش میں دیوار سے جا لگا تھا اور اس کے لیے دونوں جانب سے نکلنا بھی اتنا ہی مشکل تھا جتنا مزید پسپا ہونا ۔۔۔ چنانچہ اس نے اکرام شیخ .... کو آواز دیتے ہوئے خود کو بچانے کی آخری کوشش یہ کی کہ وہ دیوار کے ساتھ ساتھ پیچھے سرک گیا۔

محسن کا اچانک بیٹھ جانا اس کے لیے زندگی کی دُہری ضمانت بن گیا ۔۔۔ اس نے اپنی گردن کو اس انسان نما بن مانس کے قاتل پنجوں سے بچا لیا ۔۔۔ محسن نے خود کو اس گولی سے بھی بچا لیا جو اکرام شیخ نے اسے بچانے کے لیے چلائی تھی ۔۔۔ گولی کا نشانہ اس گوریلے کا سر تھا مگر تھوڑے سے فرق کے باعث یہ گولی اس کی گردن کی پشت پر لگی اور گردن کے سامنے والے حصّے میں سوراخ کرتی ہوئی دیوار سے ٹکرائی۔

یہ اکرام شیخ کی غیر ارادی غلطی تھی ۔۔۔ اس نے محسن کی آواز پر گھوم کے فائر کیا تھا۔ سوچنے کی مہلت ملتی تو وہ سر کے بجائے کمر کا نشانہ نہ لیتا ۔۔۔ گلے میں سوراخ کر کے پار ہو جانے والی گولی محسن کو بھی لگ سکتی تھی ۔۔۔ اگر وہ گوریلے کے بازوؤں کی قید سے نکلنے کے لیے غوطہ مار کے نیچے نہ ہو جاتا۔

دوسرے غلام کا سر گولی کی ضرب سے دیوار پہ لگا۔ پھر وہ ایک لرزہ خیز چیخ مار کے واپس آیا اور کمر کے بل فرش پہ گرا ۔۔۔ اس کے دونوں ہاتھ اب اپنی ہی گردن پہ تھے۔ جو خون کا فوّارہ اس کے حلق سے چھوٹا تھا، اس کی دھار محسن پہ گری جو دیوار سے ٹیک لگائے فرش پہ بیٹھا ہوا اوپر دیکھ رہا تھا۔

اب میں دروازے کی طرف بڑھا۔ "یہ ... یہ کون تھا یار ۔۔۔ جس نے باہر سے کنڈی لگا دی تھی؟"

اکرام شیخ ابھی تک سکتے کی سی حالت میں کھڑا ہوا تھا اور دونوں دم توڑتے ہوئے غلاموں کی آخری پُر اذیت آوازیں سن رہا تھا ۔۔۔ وہ کسی زخمی درندے کی طرح تڑپتے ہوئے اور فرش پر لوٹتے ہوئے اپنے لہو کو ہر طرف پھیلا رہے تھے مگر اب ان کے جسم میں قوّت کا سرچشمہ خشک ہونے لگا تھا ۔۔۔ وہ ایک ہی جگہ پہ الٹے پڑے ہوئے زلزلے کی سی کیفیت میں ہل رہے تھے اور نزع کے کرب میں موت کی انگڑائیاں لے رہے تھے ۔۔۔ اب میں دیکھ سکتا تھا کہ پہلی گولی نے اپنے شکار کے جبڑے میں سوراخ کیا تھا اور شاید اوپر تالو سے گزر کے دماغ میں گھس گئی تھی ۔۔۔ وہ اپنے مُنہ سے خون اگل رہا تھا ۔۔۔

میں نے دروازہ بجایا ۔۔۔ اس پر اپنے دونوں ہاتھ مارے اور چلّایا ۔۔۔ "کوئی ہے؟"

"آخر ایسا کس نے کیا تھا ۔۔۔؟" محسن نے اپنی قمیص اتار کے چہرے سے خون صاف کیا ۔۔۔ اس نے ایک ابکائی لی۔

"ایک نازو ہی تو باہر ہماری امّید ہے ۔۔۔" میں نے کہا اور دروازے کو ہلانے کی کوشش کی مگر وہ بہت مضبوطی

سے جا ہوا تھا ۔۔۔ میں نے اس پر مُکّے مارے اور پھر چلّایا۔ "کوئی ہے باہر ۔۔۔ ؟"

"باہر کوئی ہوتا تو ضرور جواب دیتا۔" اکرام شیخ نے ایک گہرا سانس لے کر کہا اور ریوالور کو جیب میں رکھ لیا۔ "اور نازو یہاں کیسے پہنچ سکتی ہے۔"

"مگر یار ۔۔۔ کسی نے تو کنڈی لگائی ہی تھی ۔۔۔ وہ جن بھوت تو ہو نہیں سکتے۔"

"یار، یہ ..... اس خون کی بُو مجھے پاگل کر دے گی۔" محسن نے ایک کونے میں قے کی اور اپنی قمیص کو دیوانہ وار مُنہ پر رگڑنے لگا۔

اسی وقت حاجی اٹھ بیٹھا ۔۔۔ اس کی زبان اب بند تھی لیکن اس کی آنکھیں اب بھی بول رہی تھیں ۔۔۔ میں ایک دم پلٹا اور میں نے چند قدم دوڑ کے اس کے سر پر ایسے کِک ماری جیسے وہ سر نہیں تھا، فٹ بال تھی اور میں وہ پلیئر تھا جسے ایک پنیلٹی ملی تھی۔

حاجی بلبلایا ۔۔۔ "یا اللہ" اور زمین پر لڑھک گیا۔

"ابلیس کو یاد کر ..." میں نے اسے ایک گندی گالی دی۔ "جس کے راستے پر تُو چلتا رہا ۔۔۔ اور یہاں تک پہنچا۔ ابھی تک بھونک رہا ہے کُتّے ؟"

"میں ... میاں ... میں نے کیا کیا ہے۔" وہ فرش پر پڑا ہوا ہانپتا رہا اور اس کا پیٹ کسی مشک کی طرح اوپر نیچے ہوتا رہا۔

"تو اب بھی بھونک رہا ہے ۔۔۔ اپنی آنکھوں سے" میں نے پے در پے اس کی پسلیوں میں ٹھوکریں ماریں۔

"آں ....." وہ بُری طرح بلبلایا۔ "میں ..... مر جاؤں گا ۔۔۔"

"اتنی آسانی سے نہیں مرے گا تُو ۔۔۔ تیری جان تو میں قطرہ قطرہ نچوڑوں گا ۔۔۔ تیرے اس حرام گوشت کا ریشہ ریشہ الگ کروں گا ۔۔۔ پھر تیری ہڈیوں کے ٹکڑے کروں گا ۔۔۔" میں نے دیوانہ وار اسے مارنا جاری رکھا۔ پھر میں تھک کے گر پڑا ۔۔۔ میرے جسم کی ریزرو توانائی ختم ہو چکی تھی۔

"کیا ... کسی نے گولی چلنے کی آواز بھی [illegible] سنی ؟" اکرام شیخ نے مایوسی سے کہا۔

"اس پر سائیلنسر ہے نا ۔۔۔" محسن نے کہا۔ "سننے والا کوئی ہے بھی نہیں ۔۔۔ شاید وہ اسی کا کوئی ساتھی تھا۔ اسے ہم سے ہمدردی تھی یا حاجی سے دشمنی ۔۔۔ کہ وہ کنڈی

لگا کے بھاگ گیا ۔۔۔ وہ اندر نہیں آ سکتا تھا۔"

"حاجی اپنے دشمن کے ساتھ یہاں آتا ؟"

"میرا مطلب تھا ۔۔۔ کوئی وفادار ۔۔۔ جس کے دل میں کسی بات پر عناد تھا .... کوئی کینہ پرور جو دل میں بُغض کو دبائے موقع کے انتظار میں تھا۔" محسن بولا۔

مگر اسی وقت کنڈی کھٹاک سے کھلی ۔۔۔ ہم ایک ساتھ گھوم گئے ۔۔۔ دروازہ اب بھی بند تھا ۔۔۔ پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

میں نے اکرام شیخ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اس نے ریوالور ہاتھ میں رکھتے ہوئے اقرار میں سر ہلایا جو اشارہ تھا کہ آگے بڑھو ۔۔۔ میں تمہارے پیچھے ہوں ۔۔۔ میں نے محتاط رہتے ہوئے پیش قدمی کی اور پھر .. لات مار کے دروازہ کھول دیا۔

کوریڈور خالی پڑا تھا ۔۔۔ اس کے بعد والا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا اور میں بالکل آخر تک دیکھ سکتا تھا۔ جہاں پہلے میں نے ایک جیپ دیکھی تھی وہاں اب کچھ بھی نہیں تھا۔ میں اور اکرام شیخ آگے پیچھے باہر تک آئے۔

"یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے ۔۔۔" میں نے باہر آ کے کہا۔

"کنڈی کیا خود بخود بند ہوئی اور خود بخود کھل گئی۔ یہ تو مجھے جادو لگتا ہے ۔۔۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "کنڈی ریموٹ کنٹرولڈ تو نہیں ہو سکتی۔"

"اور جن بھوت بھلا ہمارے معاملات میں کیوں دخل دینے لگے۔"

وہ کوریڈور بہت مختصر تھا۔ اس میں دونوں جانب دو دو دروازے تھے۔ آخری یعنی پانچواں دروازہ باہر کی جانب کھلتا تھا جس میں سے مجھے دُور تک پھیلے ہوئے سمندری نباتات نظر آ رہے تھے ۔۔۔ یہ آبی پودے بہت گھنے تھے اور ان کے درمیان کہیں کہیں جھلک دکھانے والا پانی یہ ظاہر کرتا تھا کہ اس پورے حصّے میں دلدل جیسی زمین ہو گی ۔۔۔ اس سمندری جنگل سے پہلے ریت کی خشک پٹی تھی اور پھر ایک پتلی سی سڑک جس کے دوسرے کنارے پر بھی ریت تھی ۔۔۔ خشک اور بھربھری ۔۔۔ ہوا نے اس ریت کو سڑک پر بھی پھیلا دیا تھا۔ جیپ شاید اسی سڑک پر نظر آئی تھی مگر اب وہاں تاحدِ نگاہ کوئی نہ تھا ۔۔۔ سڑک کو میں نے دائیں اور بائیں جانب ایک کالی لکیر کی طرح پھیلا ہوا دیکھا۔

"یہ سینڈز پٹ کا آخری حصّہ ہے ۔۔۔" اکرام شیخ نے بالآخر اعلان کیا ۔۔۔ "یہ کوئی ہٹ ہے۔"

مجھے اب ان ہٹس کی ایک طویل قطار نظر آ رہی تھی جو ساحلِ سمندر کے ساتھ ساتھ پھیلی ہوئی تھیں ۔۔۔ "یہ جگہ شہر سے کتنی دُور ہے ؟"

"شہر کے کس مقام سے ؟" اکرام شیخ نے کہا۔ "شہر کسی ایک جگہ کا نام تو نہیں ہے۔"

"ہمارے گھر سے کیا فاصلہ ہو گا ؟"

"شاید دس میل ۔۔۔ کیونکہ ہم اسی طرف والے حصّے میں ہیں ۔۔۔ شہر کا دوسرا حصّہ پچیس تیس میل کے فاصلے پر ہی ہو گا۔" اکرام شیخ نے کہا ۔۔۔ وہ ٹیکسی لے کر پھرتے ہوئے کراچی کے جغرافیے کو سمجھ چکا تھا اور فاصلوں کے بارے میں اس کے فیصلے کو چیلنج کرنا میرے لیے محال تھا۔

"اب فوراً یہاں سے نکلنے کی کرنی چاہیے۔" میں نے کہا۔ "یہ بعد میں سوچیں گے کہ وہ فرشتۂ غیب کون تھا ... جس نے ہمیں رہائی دلانے میں بنیادی کردار ادا کیا۔"

"یہاں سے پیدل ہی جانا پڑے گا ۔۔۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "ممکن ہے آگے کسی ہٹ میں کوئی رات گزارنے آیا ہو۔ ہمیں کچھ کھانے پینے کو مل جائے۔"

"کھانے کو ہمارے پاس ہے ۔۔۔ اب وہ ہم پر حرام نہیں رہا ۔۔۔" میں نے کہا۔

"اب کیا ہو گیا ہے ؟"

"پہلے وہ دشمن کی خیرات تھی ۔۔۔ اب مالِ غنیمت ہے۔ وہ حق ہے جو ہم نے لڑ کے حاصل کیا ہے ۔۔۔ مالِ غنیمت حلال ہوتا ہے۔"

"میرا دل نہیں چاہتا ۔۔۔ جو کچھ محسن نے کہا تھا ..."

"اس وقت حالات مختلف تھے ۔۔۔ ہم اپنی عزتِ نفس کے بدلے ایسی خیرات قبول نہیں کر سکتے تھے ۔۔۔ ورنہ وہ تو خدا کا دیا ہوا رزق ہے ۔۔۔ پاک صاف اور زندگی بخش۔" میں نے کہا ۔۔۔ "اسے ٹھکرانا اب کفرانِ نعمت ہو گا۔"

ہم واپس ہوئے ۔۔۔ واپسی پر میں نے سیدھے ہاتھ کا ایک دروازہ کھول کے اندر جھانکا۔ اندر گھُپ اندھیرے کے سوا کچھ نہ تھا ۔۔۔ پھر میں نے بائیں طرف دیکھا ۔۔۔ وہ بھی کسی ویران مزار کی طرح تاریک تھا۔ اگلے دونوں دروازے بھی ہاتھ لگاتے ہی کھل گئے ۔۔۔ اگر ہمارے پاس روشنی ہوتی تو ہم تفصیل سے جائزہ لیتے۔ بالکل بے خیالی میں آخری دروازے سے اندر جھانک کے میں پلٹا ہی تھا کہ کسی نے دروازے

کی اوٹ سے ٹانگ اڑائی اور میں ایک دم مُنہ کے بل گِر گیا۔

اکرام شیخ نے یہی سمجھا تھا کہ میں ٹھوکر کھا کے گِرا ہوں ۔۔۔ وہ مجھے اٹھانے کے لیے جُھکا ۔۔۔ اسی وقت آواز آئی ۔۔۔

"ہینڈز اپ ..... ہتھیار ڈال دو۔"

اکرام شیخ اچھل پڑا اور اس نے سوچے سمجھے بغیر ریوالور گِرا دیا ۔۔۔ پھر اسے اپنی حماقت کا احساس ہوا ۔۔۔ میں بھی اِتنی دیر میں کھڑا ہو گیا تھا ۔۔۔

"تم آ کوکی بچّی ۔۔۔" میں نے بے اختیار کہا اور اُسے اندھیرے میں سے باہر کھینچ لیا ۔۔۔ "باہر نکل ۔۔۔"

اکرام شیخ کا خفّت، غصّے، خوشی اور حیرانی سے بُرا حال ہو گیا۔ "اِتنی دیر سے پریشان کر رکھا ہے ۔۔۔" وہ جھینپ کر برہمی سے بولا۔

نازو کا ہنستے ہنستے بُرا حال ہو رہا تھا ۔۔۔ اس نے خشک لکڑی کا ڈنڈا اندر پھینک دیا۔ "دونوں بہت ہوشیار ہو بھئی ۔۔۔ مان گئے۔"

"مجھے تو شک تھا ....." میں نے کہا۔

محسن دروازے میں لائٹ کے ساتھ نمودار ہوا ۔۔۔ "مجھے یقین تھا۔"

"اور میں نے تو کہا تھا ....." اکرام شیخ بولا۔

"چلو چلو ۔۔۔" نازو بولی ۔۔۔ "اب تو یہی کہو گے سب لیکن اتنی دیر سے میں سن رہی ہوں ۔۔۔ کسی نے نام لے کے پکارا مجھے ۔۔۔ ؟"

اکرام شیخ نے اسے بے اِختیار گلے لگا لیا ۔۔۔ "مجھے تو واقعی شرمندہ کر دیا تُو نے ۔۔۔"

"ہم شرمندہ نہیں ہو سکتے۔" محسن نے اِعلان کیا۔ "کیونکہ ہم بے شرم لوگ ہیں۔"

"میں تو شرم سے واٹر واٹر ہو رہا ہوں ۔۔۔" میں نے کہا۔ "یہ دن بھی دیکھنا تھا کہ اس زندگی کے لیے ایک عورت ہمیں زیرِ بارِ احسان کرے۔"

"پھر کیا ہمیں ڈوب مرنا چاہیے ؟" محسن بولا۔

"ایسی بھی کیا جلدی یار ۔۔۔" میں نے کہا۔ "پہلے تو یہاں سے نکلنے کی سوچو ۔۔۔ پھر ڈوبنے یا ڈبونے کی بات کریں گے۔"

"ہاں ۔۔۔ غالب سے بھی پوچھ لیں گے ۔۔۔" محسن بولا۔

"وہ ابھی بے ہوش ہے۔"

"ابھی تو ڈوب سکتا ہے ۔۔۔ بعد میں کہے گا کہ میں اکیلا نہیں ڈوبوں گا ۔۔۔ وہ شعر پڑھے گا ۔۔۔ کہ ہم تو ڈوبے ہیں صنم... تم کو بھی لے ڈوبیں گے ۔۔۔" میں نے کہا اور نازو نے احتجاجی انداز میں مارچ کیا تو میں اور محسن ایک ساتھ ہنسے۔

یہ زندگی کی خوشی تھی اور موت کے منہ سے بچ نکلنے کا اطمینان تھا جس نے ہمیں طاقت بھی عطا کردی تھی اور اس بھوک پیاس کے احساس کو بھی مٹا دیا تھا جس کی شدت نے ہمارے حواس مختل کر رکھے تھے۔

اندر کا نقشہ دیکھ کے نازو ٹھٹکی ۔۔۔ وہ ٹیکسی ڈرائیور کی وردی میں تھی اور اگرچہ بالوں کو اس نے حسبِ سابق اپنی کیپ کے اندر محصور کرلیا تھا مگر پھر بھی اس کی نسوانیت کا تمام حسن یوں چھلکا پڑتا تھا کہ... کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے ۔۔۔ حاجی کی عقل تو اسے دیکھ کر ہی خبط ہوگئی تھی۔

نازو نے فرش پر پھیلے ہوئے خون کو دیکھا اور پھر دو سیاہ فام دیوزادوں کی لاشوں کو ۔۔۔ ویران کمرا اس پورٹیبل سرچ لائٹ کی روشنی میں زیادہ بھیانک نظر آنے لگا تھا ۔۔۔ یہ بحری جہازوں پر استعمال ہونے والی واٹر پروف قسم کی بھاری بھرکم لائٹ تھی جسے طوفان اور بارش میں بھی روشن رکھا جاسکتا تھا اور سگنل دینے کے لیے لہرایا جاسکتا تھا۔

غالب ہوش میں آچکا تھا اور وحشت زدہ نظروں سے اپنے چاروں طرف پھیلے ہوئے ۔۔۔ روشنی میں چمک دینے والے منجمد خون کے سرخ رنگ کو دیکھ رہا تھا اور ان لاشوں کو دیکھ رہا تھا جن کے درمیان وہ خود بھی لیٹا ہوا تھا۔ پھر اس کی نظر ہم پر رکی اور وہ چند سیکنڈ پلک جھپکائے بغیر نازو کو دیکھتا رہا۔

"آگیا ہوش مرزا غالب کے بوتنے؟" محسن نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرا کے کہا۔

"اب ہوش کا سامان جو ہوگیا ہے۔" میں نے کہا۔

غالب اٹھ بیٹھا اور اپنے سر کو دبانے لگا ۔۔۔ نازو اس کے پاس بیٹھ گئی ۔۔۔ "ایسے کیا دیدے گھما رہے ہو ۔۔۔ کیا دیکھ رہے ہو؟"

"میں...؟" غالب نے کراہ کے کہا "جدھر دیکھتا ہوں ...ادھر تو ہی تو ہے ۔۔۔"

"ہاں ۔۔۔ مثلاً یہ ۔۔۔" میں نے ایک سیاہ فام کی طرف اشارہ کیا۔ پھر دوسرے کی طرف ۔۔۔ "اور یہ ۔۔۔" میں نے حاجی کی طرف دیکھ کے کہا جو گوشت کا ایک بدوضع ٹکڑا لگ رہا تھا ۔۔۔ "یہ سب نازو کی طرح ہی تو ہیں ۔۔۔"

"چلو اٹھو۔" نازو نے غالب کا ہاتھ تھام لیا۔ میں نے محسوس کیا کہ غالب کی حالت پہ اس کی آنکھوں میں ا[...] دل کا درد اتر آیا ہے ۔۔۔ وہ ہم سب کی موجودگی کو نظر[انداز] کرتے ہوئے اور کسی کی بات کی پروا نہ کرتے ہوئے صر[ف] اس سے ہمدردی کر رہی تھی ۔۔۔ غالب نے اس کے ہاتھ کو آہستہ سے تھپکا اور مسکرایا۔

'کیا یہ لڑکی سچ مچ غالب سے اتنی محبت کرنے [لگی] ہے؟' میں نے حیرت، مسرت اور طمانیت کے ساتھ سوچا۔ 'بالکل پیار کیا تو ڈرنا کیا والی ۔۔۔ اسے نہ ہمارا خیال ہے [نہ] بھائی کی موجودگی کا۔'

"میں ٹھیک ہوں ۔۔۔" غالب نے کہا اور راجا کو دیکھا جو ابھی تک ویسے ہی ساکت پڑا ہوا تھا۔

"نازو ۔۔۔ تو آئی کیسے تھی؟" اکرام شیخ بولا۔

"تمھاری ٹیکسی میں ۔۔۔" وہ بولی "اسے میں نے [کہیں] پیچھے چھوڑ دیا تھا ۔۔۔ باقی راستہ پیدل چل کے یہاں تک [آئی] تو مجھے پھر وہ جیپ نظر آگئی ۔۔۔ گھر چل کے باقی با[تیں] بتاؤں گی ۔۔۔ کہ یہاں تک میں پہنچی تو کیسے؟"

"اب وہ جیپ کہاں ہے؟"

نازو نے ہاتھ سے اس سمت میں اشارہ کیا جدھر سمندری نباتات نے دلدل سی بنا دی تھی ۔۔۔ "اس میں غرق ہوگئی۔"

"لیکن ۔۔۔ ہم نے تو کوئی آواز نہیں سنی تھی... [اس] کے جانے کی ۔۔۔" میں نے کہا۔

"میں نے اسے اسٹارٹ نہیں کیا تھا۔" وہ بولی۔ "نیوٹرل گیئر میں ڈال کے چھوڑ دیا تھا ۔۔۔ جیپ یہاں ڈھلان پر کھڑی ہوئی تھی ۔۔۔ ہینڈ بریک چھوڑتے ہی الٹی واپس گئی او[ر] سڑک کے پار نکل کے پانی میں اتر گئی ۔۔۔ جھاڑیوں کے [بیچ] چلی گئی ۔۔۔"

"اچھا اب تو جا ۔۔۔ اپنی ٹیکسی لے آ۔" اکرام شیخ نے کہا ۔۔۔ "کتنی دور ہے یہاں سے ۔۔۔؟"

"ہوگی کوئی دو فرلانگ دور ۔۔۔" نازو بولی "کیا میں اکیلی جاؤں؟"

"آئی بھی تو اکیلی تھی ۔۔۔" اکرام شیخ نے کہا "تب ڈر نہیں لگا تھا ۔۔۔؟"

مجھے بڑی حیرت اور خوشی ہوئی جب غالب کھڑا ہو گیا ۔۔۔ "میں چلتا ہوں تمھارے ساتھ ۔۔۔ چلو۔"

نازو نے تھوڑے سے تذبذب کا مظاہرہ کیا ۔۔۔ ایک نظر بھائی کی طرف دیکھا اور پھر سر ہلا دیا ۔۔۔ اس نے پلٹ کے دروازے کی طرف چلنا شروع کیا تو غالب یوں آگے بڑھا جیسے سچ مچ وہ نازو کا محافظ بن کے جا رہا ہے ۔۔۔ اس کے قدم ذرا نہیں لڑکھڑائے اور اس کی چال پُراعتماد رہی۔ محبت آدمی کی کتنی بڑی طاقت بن جاتی ہے ۔۔۔ میں نے انھیں باہر رات کے اندھیرے میں دو سایوں کی طرح گم ہوتے دیکھ کر سوچا ۔۔۔ نہ میں نے اور نہ محسن نے اس رفاقت پر کوئی تبصرہ کیا اور نہ اکرام شیخ نے کسی ردِعمل کا اظہار کیا۔

"اب کیوں نہ ہم اتنی دیر میں کچھ پیٹ پوجا کرلیں۔" میں نے بنڈل کھولتے ہوئے کہا ۔۔۔ "حاجی عبداللہ صاحب اتنے خلوص اور محبت کے ساتھ ہماری دعوت کے لیے کتنی دور آئے تھے۔"

اکرام شیخ نے وہ پاکٹ ٹرانسمیٹر اٹھایا اور اس کی ساخت پہ غور کرنے لگا ۔۔۔ "اب یہ حاجی صاحب کے کام آئے گا۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا ۔۔۔ "ان کے کام کوئی نہیں آئے گا۔"

"پہلے راجا کو کچھ دو یار ۔۔۔" اکرام شیخ نے کہا۔

اس پیکٹ میں جو گتے کا خاصا بڑا کارٹن تھا... بہت کچھ تھا ۔۔۔ بلاشبہ حاجی نے ہمارے لیے آخری طعام کا انتظام کرنے میں بخل سے کام نہیں لیا تھا مگر بیشتر چیزیں ہم ابھی نہیں کھا سکتے تھے ۔۔۔ مسلسل فاقے کے بعد ہمارے معدے کی حالت پتلی تھی ۔۔۔ ہم لوگ مرغن کھانے پر ٹوٹ پڑتے تو فوری ری ایکشن ہوتا اور شاید ہم جتنا کھاتے وہ سب الٹی کر دیتے ۔۔۔ میں نے احتیاط کے ساتھ بسکٹوں کا ایک پیکٹ کھولا اور پھر وہ تھرمس جس میں کافی ابھی تک گرم تھی ۔۔۔ ایک بسکٹ کو کترتے ہوئے میں نے سارا ڈبہ نگل جانے کی خواہش کو بے مہار نہیں ہونے دیا لیکن کافی کی مہک نے میری قوتِ ارادی کو خاصی زک پہنچائی ۔۔۔ میں نے ایک گھونٹ بھر لیا ۔۔۔ پھر مجھے اپنی خود غرضانہ خواہش پر شرم آئی۔

میں کافی کا مگ لے کر راجا کے پاس پہنچا ۔۔۔ میں نے اور اکرام شیخ نے خاصی کوشش کے بعد اس کے حلق سے چند گھونٹ گرم کافی کے اتار دیے ۔۔۔ اس کا حلق یقیناً جلا ہوگا مگر یہ علاج فوری طور پر کارگر ثابت ہوا۔ چند منٹ میں راجا نے آنکھیں کھول دیں ۔۔۔ محسن اس عرصے میں حاجی سے مخاطب رہا اور اسے دہشت زدہ کرنے کا فریضہ بخوبی سرانجام دیتا رہا ۔۔۔ ریوالور اس کے ہاتھ میں دے دیا گیا تھا چنانچہ ہم بالکل بے فکر ہوگئے تھے۔

"تم نے دیکھا حاجی ۔۔۔ یہ قدرت کے فیصلے میں دخل دینے کا نتیجہ ہے کہ اب تم وہاں ہو جہاں ہم تھے ۔۔۔" محسن نے کہا۔ "تم نے سوچا تھا کہ ہمیں یہاں چھوڑ کے واپس لوٹ جاؤ گے مگر قدرت نے اس کے بالکل برعکس طے کر رکھا تھا ۔۔۔ چنانچہ اب ہم چلے جائیں گے اور تم یہاں بالکل اکیلے رہ جاؤ گے ۔۔۔ ہم تو تین تھے اور دوست تھے ۔۔۔ خدا کی ذات پر پورا بھروسا رکھتے تھے کہ وہ ضرور مدد کرے گا ۔۔۔ تم شیطان سے واقف ہو ۔۔۔ وہ ایسے ہی مرواتا ہے اور ایسی جگہ لے جا کر مارتا ہے جہاں کوئی ساتھ دینے والا نہ ہو ۔۔۔ ابھی تم دیکھنا ۔۔۔ تمھارا سایہ بھی ساتھ چھوڑ جائے گا کیونکہ یہ لائٹ تو ہم لے جائیں گے ۔۔۔ تمھیں اندھیرے میں سایہ کہاں ملے گا ... ہاں یہ دو لاشیں ضرور ہوں گی تمھارے ساتھ ۔۔۔ انہی سے باتیں کرنا ۔۔۔ زندگی میں یہ تم سے خوف زدہ رہتے تھے۔ اتنے کہ تمھارے اشارے پہ مر گئے مگر حکم سے سرتابی کی جرأت نہ کرسکے ۔۔۔ مرنے کے بعد تم ان سے کیسے ڈر سکتے ہو.... اور یہ تمھیں کیسے ڈرا سکتے ہیں ۔۔۔ لیکن میں تمھیں بتاتا ہوں کہ تم انھی کے خوف سے مر جاؤ گے ۔۔۔ بھوک پیاس سے نہیں مرو گے ۔۔۔ تمھارے جسم پر کتنی چربی ہے ۔۔۔ ایک من تو ہوگی ۔۔۔ یہ چربی تمھیں خاصا سہارا دے سکتی ہے ۔۔۔ تم گھلتے رہتے اور یہ چربی بطور ذخیرہ توانائی استعمال کرتے رہتے ۔۔۔ مگر تم جیسا بھاری بھرکم آدمی بھوک ذرا مشکل سے ہی برداشت کرتا ہے ۔۔۔ اتنے بڑے پیٹ کے جہنم میں جتنا ایندھن ڈالو کم ہوگا ۔۔۔ کل تک یہ خون بو دینے لگے گا ۔۔۔ سڑنے لگے گا ۔۔۔ پھر یہ لاشیں چوبیس گھنٹے میں خراب ہوں گی۔ تو ان کے پیٹ پھول جائیں گے ۔۔۔ اڑتالیس گھنٹے کے اندر اندر ان کے پیٹ پھٹ جائیں گے اور ساری آلائش باہر آجائے گی ۔۔۔ اس کی بو کیسی ہوگی ۔۔۔ اس کا تم ابھی اندازہ نہیں کرسکتے ۔۔۔ اگر تم ہوش میں رہے تو دیکھو گے کہ لاشوں میں کیڑے کلبلا رہے ہیں اور گوشت گھل رہا ہے ....."

حاجی بت بنا سب سن رہا تھا ۔۔۔ وہ جانتا تھا کہ ہم سے کچھ کہنا، رحم مانگنا یا رعایت طلب کرنا بے سود ہے ۔۔۔ محسن کی باتوں نے اس کا رہا سہا حوصلہ ختم کر دیا ۔۔۔ وہ ایک دم

بلبلایا اور دہاڑیں مار کے رونے لگا ــــ
"یا اللہ ــــ میرے گناہ معاف کر ــــ" وہ چلّایا۔
"ارے حاجی ــــ تم یہ کیا کر رہے ہو ــــ" محسن بولا ــــ
"کیسے گناہ اور کس کے گناہ ــــ تم نے کیا کہا تھا یہاں آنے کے بعد ــــ کہ تم تو نیکی اور خیر سگالی کے جذبات سے مغلوب ہو کے آ گئے ہو ــــ تم نے آتے وقت سلام بھی کیا تھا ہمیں ــــ ہم جاتے وقت سلام کا جواب دیں گے۔"
میں اور اکرام شیخ اس کی کوشش سے لُطف اندوز ہوتے رہے ــــ آہستہ آہستہ بسکٹ کھاتے رہے اور ایک ہی مگ سے باری باری کافی کے گھونٹ بھرتے رہے ــــ اس سُست رفتار عمل نے ہمارے جسم میں توانائی کو رفتہ رفتہ بحال کرنا شروع کیا۔ پھر میں نے ایک سگریٹ جلائی اور خود محسن کی جگہ جا بیٹھا ــــ
"حاجی ــــ تم ہمارے ساتھ جانا چاہتے ہو تو اس کی چند شرائط ہیں ــــ" میں نے کہا۔
"وہ کیا شرائط ہیں ــــ؟" حاجی نے روتے ہوئے کہا۔ اس حالت میں وہ بہت مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔
"ایک تو یہ کہ تم ہمیں اپنا ٹھکانا بتا دو۔" میں نے کہا۔
"میرا یہاں کوئی ٹھکانا نہیں ــــ"
"اچھا تو وہ ٹھکانا بتا دو جہاں تم مال پہنچاتے تھے"
"وہ بھی مجھے معلوم نہیں ــــ کراچی پہنچتے ہی کوئی ٹرک اپنے چارج پر لے لیتا تھا ــــ اور کہیں لے جاتا تھا" وہ بولا ــــ "ٹرک کوئی اور واپس لاہور پہنچاتا تھا۔"
"بہت خُوب ــــ کتنے بے خبر اور معصوم آدمی ہو تم ــــ"
"آدمی نہیں ــــ معصوم گدھے ــــ بے خبر سُوّر ــــ" محسن بولا۔
"یہاں کس نے بھیجا تھا تمھیں ــــ؟" میں نے کہا ــــ "ایک ارب روپے کی پیش کش کے ساتھ ــــ اس شرائط نامے کے ساتھ ــــ ہمارے دو ساتھیوں کو تمھارے حوالے کس نے کیا تھا ــــ؟ تم کو بہت کچھ بتانا ہوگا حاجی ــــ ایک سو ایک سوالوں کے جواب دو گے تو اپنی ایک جان بچا سکو گے ــــ تم کبھی تھانے گئے ہو ــــ؟"
"لا ... لاحول ولا قوۃ ــــ"
"کبھی سی آئی اے کی تحویل میں رہے ہو ــــ؟" میں نے کہا۔
"خدا نہ کرے ــــ"
"شاہی قلعے کا ٹارچر سیل دیکھا ہے ــــ؟ اس کے بارے میں سنا تو ضرور ہوگا ــــ؟" میں نے کہا ــــ "فرض کرو تم کو اس سے زیادہ پُرعذاب جگہ پہنچا دیا جائے؟"
"ایسی کون سی جگہ ہے ــــ" وہ سہم کے بولا۔
"ایم آر ایس کا تفتیشی مرکز ــــ" میں نے کہا۔ "وہاں سے ہم ایک سو ایک غلط سوال بھی کریں گے تو تم ایک سو دو صحیح جواب دو گے ــــ قبر سے تمھارا ڈھانچہ نکال کے لایا جائے تو وہ بھی بولے گا۔"
باہر ایک کار آ کے رُکی ــــ "ناز د آ گئی ــــ" اکرام شیخ نے کہا ــــ "اب کیا کرنا ہے؟"
"تم لوگ واپس جاؤ ــــ" میں نے کہا۔
"اور تم ــــ؟"
"میں صبح تک یہیں ہوں ــــ" میں نے کہا۔ "باقی سب لوگوں کو گھر چھوڑ دو اور تم اکیلے ٹیکسی لے کر واپس آؤ ــــ ہم اس گناہ کی بوری کو ڈھو کے لے جائیں گے ــــ"
"کہاں لے جائیں گے؟"
"یہ بعد میں طے کریں گے ــــ" میں نے کہا۔ "ابھی رات کا وقت ہے اور اندھیرا ہے ــــ تم لوگ بحفاظت گھر پہنچ سکتے ہو ــــ سب کے کپڑوں پر ــــ یا جہاں بھی خون کے داغ ہیں ــــ وہ اِس وقت نظر نہیں آئیں گے۔"
کسی بات پر ناز د کھِل کھِلا کر ہنسی ــــ پھر غالب بھی ہنسا اور وہ دونوں اندر آ گئے ــــ غالب نے بھی تھوڑا بہت کھایا پیا ــــ پھر وہ مجھے حاجی کے ساتھ چھوڑ کر چلے گئے۔ جاتے وقت انھوں نے دروازہ بند کر دیا اور سلاخ ایک کونے میں رکھ دی۔
"ہاں جی ــــ" میں نے حاجی کا ایک ہاتھ تھام کے کہا۔ "پھر کیا خیال ہے ــــ" میں نے اس کی ایک انگلی کو آہستہ سے جھٹکا دیا۔
حاجی نے چیخ ماری ــــ اس کی انگلی کی ہڈی دو جگہ سے ٹوٹ گئی تھی ــــ "یا اللہ ــــ ان جلّادوں سے پناہ دے مجھے ــــ" وہ ہاتھ کو زور زور سے جھٹکنے لگا۔
"جلّاد ــــ ہم جلّاد ہیں ــــ" میں نے اس کا ہاتھ پھر پکڑ لیا اور اس نے تھوڑی سی زور آزمائی کی تو میں نے کھڑے ہو کے اسے یوں کھینچا کہ وہ زمین سے اوپر اٹھ گیا۔ میں نے اس کا بازو اپنے گھٹنے کو تھوڑا سا اُوپر اٹھا کے رکھا اور پھر جھٹکا دیا تو کہنی سے اوپر بازو کی ہڈی ٹوٹنے کی آواز صاف سنائی دی اور حاجی پلٹ کے دوسری طرف جا گرا۔ وہ اب درد سے تڑپ رہا تھا اور بُری طرح بلبلا رہا تھا۔

دُوسری بار میں نے اس کا دُوسرا بازو توڑا۔
"تم نے دیکھا حاجی ــــ وقت کتنی جلدی بدل گیا اور تمھارے لیے دُنیا میں اعمال کی سزا کا دن آ پہنچا" میں نے کہا۔
حاجی بُری طرح چیخ رہا تھا ــــ اس کے دونوں بازو ناکارہ ہو کے لٹک رہے تھے اور وہ انھیں سنبھالنے کی بے سود کوشش میں مصروف تھا۔
"یا میرے اللہ ــــ میری توبہ ــــ میاں ہمیں معاف کر دو ــــ خدا اور رسولؐ کا واسطہ تمھیں ــــ ہم سے غلطی ہوئی ــــ جرم ہوا ــــ گناہ ہوا ــــ ہم بہت گناہ گار ہیں ــــ"
"تمھارے گناہوں کی سزا کا وقت ابھی نہیں آیا ــــ تمھارے جرائم کی سزا بھی تمھیں قانون ہی دے سکتا ہے ــــ" میں نے کہا۔ "میں تو صرف اپنے معاملات طے کر رہا ہوں ــــ تم معاملات طے کرنے آئے تھے نا ــــ؟ تمھارا اپنا طریقۂ کار تھا ــــ میرا طریقہ یہی ہے ــــ چند شرائط تم نے میرے سامنے رکھی تھیں ــــ میں نے بھی چند شرائط رکھی ہیں۔ مگر میری طرف سے تمھیں ایک ہفتے کی مہلت نہیں مل سکتی ــــ ابھی اور اسی وقت میرے سوالات کے جواب دو تو تم پُر اذیّت موت سے بچ سکتے ہو، وَرنہ ابھی تو کچھ بھی نہیں ہوا ہے ــــ کیا تم یہ جانتے ہو کہ انسان کے جسم میں کُل کتنی ہڈیاں ہوتی ہیں؟ غالباً ــــ دو سو چھبیس یا دو سو چالیس ــــ ان سب کو دو پر تقسیم کرنے سے کیا حاصل ہوگا ــــ؟ تمھارا ایک عبرت آموز وُجود۔" میں نے اس کا ایک ٹوٹا ہوا ہاتھ تھام لیا اور آہستہ سے جھٹکا دیا ــــ وہ چیخ مار کے اُچھلا۔
"ارے میں مر گیا ــــ ظالم ــــ شقی القلب ....."
میں نے اس ہاتھ کی دو انگلیاں پہلے توڑ دی تھیں۔
اب میں نے تیسری انگلی توڑی ــــ "یہ بڑا مؤثر طریقہ ہے جو ابھی ہماری پولیس نے بھی اختیار نہیں کیا ــــ دراصل ان کو جواب بھی دینا پڑ جاتا ہے کہ ٹوٹ پھوٹ کیسے ہوئی ــــ ہمیں جواب کسی کو نہیں دینا اس لیے ہم سب کچھ کرتے آئے ہیں ــــ اور یہ حقیقت ہے کہ پولیس کے تھانے سی آئی اے کے ٹارچر سیل اور شاہی قلعے کے عقوبت خانوں میں کسی ملزم کے ساتھ اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں ہوتا جو ہم کسی ملزم کے ساتھ کرتے ہیں ــــ اب یا تو وہ مر جاتا ہے ــــ مر جائے تو ہم اس کی لاش کے ٹکڑے کتّوں کو ڈال دیتے ہیں ــــ ہڈیاں تک باقی نہ رہیں تو سُراغ کیسا ــــ؟"
حاجی اپنا ہاتھ چھڑا بھی نہیں سکتا تھا اور اس کا بیل کی طرح ڈکرانا مجھ پر بالکل اثر نہیں کر رہا تھا ــــ میں اپنے سوال دُہراتا رہا اور اس کی ایک ایک انگلی توڑتا رہا۔
مگر وہ عجیب آدمی تھا کہ چیختا دہاڑتا رہا ــــ تڑپتا رہا۔ خدا رسولؐ کے واسطے دے کر رحم کی بھیک مانگتا رہا اور اپنے ساتھ مجھے بھی گالیاں دیتا رہا مگر اس نے کسی سوال کے جواب میں کوئی کام کی بات نہیں بتائی ــــ اس کی ضد نے میرے اِشتعال کو ہوا دی ــــ میں نے اس کے دوسرے ہاتھ کی انگلیاں بھی توڑ دیں ــــ پھر وہ بے ہوش ہو گیا ــــ اس نے اتنی اذیت برداشت کر لی ــــ یہی کمال تھا۔
اکرام شیخ تقریباً دو گھنٹے بعد لوٹ کر آیا۔
"اسے کیا ہوا ــــ؟" وہ فرش پر پڑے ہوئے حاجی کو دیکھ کر بولا۔
"کچھ نہیں ــــ میں ذرا تفتیش کر رہا تھا"
"کوئی کام کی بات معلوم ہوئی؟"
میں نے نفی میں سر ہلایا ــــ "اب اس کا کیا کریں؟"
"میرا تو خیال ہے کہ یہیں چھوڑ جائیں اسے" شیخ نے کہا۔
"ہاں ــــ مجھے لگتا ہے کہ یہ کچھ نہیں بتائے گا ــــ بلاوجہ اس لاش کو اٹھائے پھرنے سے کوئی فائدہ نہیں" میں نے کہا۔ "یہ دونوں طرف سے ڈرتا ہے ــــ اگر بتاتا ہے تو دلاور اینڈ کمپنی الگ سزا دے گی ــــ گھوش دادا پارٹی اس سے بدتر سزا دے گی ــــ اس کے کاروبار اور خاندان کا نام و نشان تک مٹ جائے گا"
"دوسروں کے لیے ــــ اور خود اس کے لیے ــــ باقی زندگی میں اب کیا رہ گیا ہے ــــ؟" شیخ نے کہا۔
"وہ آئیں اور اسے ہمارا جواب سمجھ کے لے جائیں"
"تو وہ ٹرانسمیٹر لایا ہے؟"
"ہاں ــــ وہ تو میری جیب میں ہی ہے" اکرام شیخ نے کہا۔
"اِدھر لا ــــ مجھے دے ــــ" میں نے کہا۔
اکرام شیخ نے ٹرانسمیٹر میرے حوالے کر دیا ــــ میں نے اس کو غور سے دیکھا لیکن اس کی بناوٹ میں کوئی پیچیدگی نہیں تھی ــــ اس میں صرف ایک ہی بٹن تھا ــــ میں نے اُسے دَبا کے آن کیا ــــ اس کے چھوٹے سے اسپیکر میں سے کھر کھر سنائی دینے لگی۔
"ہیلو ..... ہیلو ــــ" میں نے کہا۔
"ہیلو ــــ" اسپیکر سے ایک اجنبی آواز سنائی دی۔
"جو کچھ تم کو کہنا ہے کہہ دو ــــ"

"تم کون بول رہے ہو؟" میں نے کہا مگر دُوسری طرف خاموشی رہی ــــ

"میرا خیال ہے کہ دوسری طرف سے کوئی بھی بات نہیں کر رہا ہے اور اب کوئی جواب نہیں ملے گا۔" شیخ نے کہا۔

میں سمجھ گیا۔ ہماری آواز کے سگنل کو ریسیو کرتے ہی کہیں کوئی ٹیپ ریکارڈر آن ہو گیا تھا اور اس کے ٹیپ پر ایک جواب پہلے سے ریکارڈ تھا جو ہمیں مل چکا تھا۔ باہر اس قسم کے فون عام ہیں جن میں آپ اسی طرح کیسٹ رفٹ کر کے جا سکتے ہیں۔ آپ کی عدم موجودگی میں جیسے ہی کوئی کال آئے گی، ٹیپ چل پڑے گی، ٹیپ پر آپ اپنا یا کسی کی آواز میں کوئی بھی جواب ریکارڈ کر کے چھوڑ سکتے ہیں مثلاً کال کرنے والے کو اس قسم کا جواب مل سکتا ہے کہ آپ رات کو دس بجے کے بعد کال کیجیے یا کوئی پیغام ہے تو ریکارڈ کرا دیجیے۔ اپنا نام اور پتا یا فون نمبر بھی دے دیجیے۔ یا یہ کہ آپ اس وقت فلاں نمبر پر ان سے رابطہ قائم کر سکتے ہیں جہاں وہ ڈنر پر فیملی کے ساتھ شریک ہیں۔

یہ بھی 'جواب دینے والی مشین' تھی یا اس قسم کے ٹیلی فون 'آنسرنگ مشین' کہلاتے ہیں۔

"پیغام یہ ہے کہ ہم نے ساری شرائط منظور کر لی ہیں اور ہم سے فوراً رابطہ قائم کیا جائے۔" میں نے کہا۔

"اتنا کافی ہے۔" شیخ نے کہا۔

میں نے ٹرانسمیٹر بند کر دیا۔ "وہ آواز تو پہچان ہی لیں گے۔"

"بس اب نکلنے میں دیر کرنا خطرناک ہوگا۔" شیخ بولا۔ "کیا پتا وہ قریب ہی کسی ہٹ میں موجود ہوں۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا اور ہم ہر چیز کو جوں کی توں چھوڑ کر باہر آ گئے۔ صرف ٹرانسمیٹر کو میں نے اپنے ساتھ ہی رکھا کیونکہ یہ فریق ثانی سے پھر رابطے میں معاون ثابت ہو سکتا تھا۔

اکرام شیخ کی ٹیکسی دیوار کی اوٹ میں کھڑی ہوئی تھی۔ واپسی پر اس نے دوسرا نسبتاً لمبا راستہ اختیار کیا اور ہم ٹیکسی میں سیدھے نکل گئے۔ یہ سڑک بڑے پیچ و خم کے بعد منوڑہ کے جزیرے تک پہنچتی تھی۔ مشکل صرف یہ تھی کہ اس راستے نیوی کے جوان چیک پوسٹ پر آنے جانے والی گاڑیوں کے نمبر نوٹ کرتے تھے اور یہ بات نہ اکرام شیخ کو معلوم تھی اور نہ مجھے۔ نتیجہ یہ کہ ہمیں آدھے گھنٹے بعد واپس آنا پڑا۔ چیک پوسٹ والوں نے بتایا کہ دن میں پرائیویٹ کاریں پاس کے ساتھ اندر جا سکتی ہیں مگر انھیں واپسی پر چیک آؤٹ کرنا پڑتا ہے۔ رات کے وقت ٹیکسی کی اجازت تو بالکل نہیں دی جا سکتی۔ عام پبلک کے لیے کیماڑی کی طرف سے سمندری راستہ تھا۔

واپس آتے ہوئے میں نے اُفق پر صبح کے ستارے کو روشن دیکھا۔ میں نے رابعہ کو یاد کیا جس کی محبت کا نقش میرے دل میں زیادہ روشن تھا لیکن اس کا تصور میرے احساس کے لیے ایک سزا بن گیا۔ کہاں ہو گی؟ سو رہی ہو گی یا جاگ رہی ہو گی؟ کس کے ساتھ ہو گی؟ میرے خیال کے ساتھ یا... درد کا ایک نشتر چبھونے والا خیال مجھے تڑپا گیا، نہیں، وہ سب جھوٹ تھا جو مصلحت کے تحت بولا گیا تھا۔ وہ نہ تو بے وفائی نہیں کی، ہار نہیں مانی، وہ کسی کی نہیں ہو سکتی۔ اس نے کہہ دیا تھا کہ وہ میری ہے اور میری ہی رہے گی۔

"کس سوچ میں گم ہے بھائی۔" شیخ نے ٹیکسی کو ایک شکستہ ہٹ کے کھنڈر میں روک لیا۔ "سامنے دیکھ کیا ہو رہا ہے۔"

میں نے چونک کے دیکھا۔ "کیا ہو رہا ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ وہ حاجی کو لینے پہنچ گئے ہیں۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "ابھی ابھی ایک کار کی ہیڈ لائٹس بند ہوئی ہیں اور غالباً اس ہٹ کے سامنے..."

"پھر کیا کرنا ہے یہاں رک کے؟" میں نے کہا۔

"اور کیا کریں! سیدھے ان کے سامنے سے گزر جائیں تاکہ وہ اچھی طرح دیکھ لیں۔" شیخ نے طنزاً کہا۔

"ہم تو انھیں دیکھ ہی سکتے ہیں، اگر کوشش کریں۔" میں نے کہا۔

"کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں۔" شیخ نے کہا اور میرے ساتھ اُتر آیا۔ ہم نے سمندر کے ساحل کی طرف ریت پر دوڑنا شروع کیا۔ ہم اس جگہ سے دو تین فرلانگ کے فاصلے پر تھے۔ آدھا فاصلہ طے کر کے رفتار کم کی اور ساحل سے ہٹ کے پھر ویران ہٹس کی آڑ میں آگے بڑھنے لگے تھے۔

"میں نہ کہتا تھا کہ وہ زیادہ دُور نہیں ہو سکتے۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "اتنے چھوٹے ٹرانسمیٹر کی رینج زیادہ نہیں ہو سکتی۔"

"یہ بھی اچھا ہوا کہ ہم نے واپسی کے لیے سیدھا راستہ اختیار نہ کیا ورنہ وہ ہمیں راستے میں ہی روک لیتے۔ منوڑہ کی طرف جا کے لوٹنے میں بھی قدرت کی مصلحت پوشیدہ تھی۔"

"اس مصلحت کو سمجھنے کے لیے خدا نے مجھے عقل عطا کی۔"

"ایسے دعوے مت کر، کہیں پھر نہ پکڑے جائیں۔" میں نے کہا۔

"میں نے واپسی پر ہیڈ لائٹس اسی لیے بند رکھی تھیں کہ مجھے کسی نے خبردار رہنے کا مشورہ دیا تھا۔" وہ بولا۔

اب ہم اسی ہٹ کے عقب میں پہنچ گئے تھے مگر ہمیں کچھ دیر ہو گئی تھی۔ میں نے سامنے والے حصے سے ایک کار کے روانہ ہونے کی آواز سنی۔ میرے دوڑ کے سامنے آنے تک کار دُور جا چکی تھی۔ اس کی بتیاں تک آف تھیں۔ پھر بھی مجھے شک گزرا کہ یہ پیلے رنگ کی ٹیوٹا کرونا تھی۔ کار کا نمبر یا رنگ تو دیکھا ہی نہیں جا سکتا تھا لیکن گاڑی کی ساخت کچھ واضح تھی۔

"وہ حاجی کو لے گئے۔" میں نے قدرے ملال کے ساتھ کہا۔

"کیا پتا لے گئے یا مار گئے۔ ہمیں اندر جھانک کر دیکھنا تو چاہیے۔" میں نے کہا۔

اس بار ہم نے پچھلی طرف سے راستہ تلاش کیا مگر ادھر سارے کھڑکی دروازے بند تھے۔ پھر میں نے ہٹ کے دائیں جانب اور اکرام شیخ نے بائیں جانب چلنا شروع کیا۔ ایک کمرے کا روشن دان میں نے دریافت کیا جہاں کھڑکی ہوئی مگر سمندری ہوا میں گل کے چوکھٹ نکل گیا تھا یا اسے کوئی ضرورت مند اپنی ہٹ میں لگانے کے لیے نکال لے گیا تھا۔ اس خلا سے گزر کے میں کمرے میں پہنچا اور پھر کمرے کی تاریک ویرانی سے گزر کر دروازے تک، راہداری میں کھلنے والے دروازے کے پٹ کسی نے بند نہیں کیے تھے۔ اس سے جھانک کر دیکھنے پر مجھے باہر اور اندر صرف خاموشی اور تاریکی محسوس ہوئی۔

اکرام شیخ کو اپنے پیچھے پا کے میرا حوصلہ بڑھا اور میں نے آگے جانے کا خطرہ مول لینے کا فیصلہ کیا۔ ریوالور شیخ کے ہاتھ میں تھا اور میں اس سے دو قدم پیچھے کسی بھی حملہ آور سے نمٹنے کے لیے بالکل تیار تھا۔ مگر وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ صرف لاشیں چھوڑ گئے تھے اور ان کا منظر خون جب میں نے ماچس سے تیلی جلا کے دیکھا تو مجھے ہر چیز ویسی ہی دکھائی دی جیسی گھنٹا بھر پہلے تھی۔ فرش پر تھرمس، کھانے پینے کی اشیا کا ڈھیر اور مالش ہوئی بالٹی بھی ویسے ہی پڑی تھی۔ صرف حاجی کا شکستہ و خستہ جسم اٹھا لیا گیا تھا۔

ہم مایوس ہوئے اور خالی سڑک پر پیدل چلتے ہوئے پھر ٹیکسی تک پہنچے۔

"کیا جانے سے پہلے ہم انھیں کوئی اور پیغام نہیں دے سکتے؟" اکرام شیخ نے کہا۔ "بعد میں تو یہ ٹرانسمیٹر بے کار ہو جائے گا۔"

"کیوں بے کار ہو جائے گا؟"

"اس لیے کہ پیغام موصول کرنے والا اسی علاقے میں ایک میل کے اندر کہیں موجود تھا، شاید ابھی ہو۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "پھر ہم بھی یہاں سے نکل جائیں گے اور وہ بھی بے مقصد تو نہیں بیٹھے رہیں گے۔"

میں نے تائید میں سر ہلایا۔ "اور کیا کہنا ہے؟"

"لا مجھے دے ٹرانسمیٹر۔" اکرام شیخ نے کہا اور ٹرانسمیٹر کو آن کر کے بولنے لگا۔ "ہیلو۔"

ایک بار پھر دوسری طرف سے ٹیپ نے جواب دُہرایا۔ "اب پیغام یہ ہے کہ حاجی کو دیکھو اور عبرت پکڑو۔ یہی ہمارا جواب ہے۔ ہم سے جو سودا کرنے آئے گا ایسے ہی واپس بھیجا جائے گا۔ ہمیں افسوس ہے کہ حاجی کے ہاتھ نہیں توڑے۔ خیر 'یار زندہ صحبت باقی۔' پھر ملے تو ٹانگیں بھی توڑ دیں گے۔ ہم بکنے والے لوگ نہ تھے اور نہ ہیں۔ ایک ارب یا ایک کھرب میں کوئی ہم سے ایک اصول نہیں خرید سکتا۔ دیگر شرائط کا جواب یہ ہے کہ ہم سب اکٹھے ہی زندہ ہیں اور مریں گے تو اکٹھے لیکن اسی وطن کی مٹی میں دفن ہونے کے لیے۔ زندگی کے لیے ہم جلا وطنی قبول نہیں کر سکتے۔ خدا کی تائید پر ہمیں پہلے بھی بھروسا تھا اور آئندہ بھی کوئی ناکامی ہمارے یقین کو متزلزل نہیں کر سکتی۔ ہم آزاد ہیں اور ہمارا وطن بھی چند غداروں کی کوشش سے آزادی سے محروم نہیں ہو سکتا۔ آخری شرط خسرو جمشید کی تھی، اسے ہم خود چھوڑ دیں گے لیکن اس وقت جب ہم سے کیے گئے معاہدے کی تکمیل ہو جائے گی۔ اس کے بعد وہ تمہارے پاس آئے، کہیں اور جائے یا جہنم میں، ہمیں سروکار نہیں۔ ہم چوہدری دلاور اور سراج سے عبداللہ اور گھوش دادا جیسے وطن دشمنوں تک سب کو چیلنج کر چکے ہیں اور اب ہماری طاقت پہلے سے ہزار گنا ہے اور یہ حق کی قوت ہے جسے باطل کبھی شکست نہیں دے سکتا۔ فقط ایم آر ایس۔"

"جوشِ خطابت میں آپ زیادہ ہی بول گئے مگر۔" میں نے کہا۔ "اب چلیے۔"

"کہاں چلیے۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ راستہ کھلا ملے گا آپ کو؟" اکرام شیخ نے ٹرانسمیٹر جیب میں رکھ لیا۔ "وہ منتظر ہوں گے وہیں کہ ہم گزریں تو وہ ہمارا استقبال کر سکیں۔"

"کہاں منتظر ہوں گے؟"

"جہاں انھیں پیغام ملا تھا۔ ایک میل کے دائرے میں یا اس سے بھی کم۔ بہت نزدیک کسی دوسری ہٹ میں۔ دائرہ چاروں طرف کہاں تک ہوگا۔ ایک جانب سمندر ہے، دوسری جانب یہ آبی پودوں سے بھرا ہوا دلدلی جنگل، تیسری سمت سے ہم آئے ہیں، چوتھی سمت وہی رہ جاتا ہے جدھر واپسی کا راستہ ہے۔"

"ہم قائل ہوئے لیکن تھانیدار صاحب، ہم یہاں بھی تو قیام نہیں فرما سکتے۔"

"کچھ دیر انتظار تو فرما سکتے ہیں۔ شاید اس دوسرے پیغام کو وصول کرنے کے بعد وہ پھر ہماری تلاش میں نکلیں۔ وہ بھی یا دائیں طرف جا سکتے ہیں یا پھر ادھر آ سکتے ہیں۔ آگے پیچھے تو وہی جنگل اور سمندر ہے۔"

"وہ ادھر آئے تو ہم کیا کریں گے؟"

"ہم چھپ کر دیکھیں گے۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "ٹیکسی تو انھیں کھنڈر میں دکھائی ہی نہیں دے گی۔ ہم کسی دوسری جگہ سے ان پر نظر رکھ سکتے ہیں۔"

رات کے وقت تمام ہٹس سنسان پڑی تھیں۔ وہ چوکیدار بھی نہیں تھے جو دن میں پھرتے رہتے ہیں کہ کوئی پکنک منانے والی پارٹی بلا اجازت یا ان سے سودا کیے بغیر کسی ہٹ پر قابض نہ ہو جائے۔ میں اور شیخ دونوں ایک ہٹ پر چڑھ گئے جس کا زینہ ہی سلامت تھا۔ باقی ہٹ گر چکی تھی۔ شیخ کا خیال بہت جلد درست ثابت ہوا۔ ابھی دس ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ وہ کار جس پر مجھے پیلے رنگ کی گاڑی ہونے کا شک گزرا تھا، بڑی تیزی سے آئی۔ عین اس کھنڈر کے مقابل رکی اور

اس کے چاروں دروازے ایک ساتھ کھلے۔ اس میں سے چار ایک سے سیاہ ہیولے برآمد ہوئے۔

"وہ اسی علاقے میں ہیں، ادھر ہی ہیں" یہ آواز واضح طور پر سنی سنی ہوئی تھی لیکن مجھے اس کا نام یاد نہ آیا۔

"تم سب باری باری ہر ہٹ میں دیکھو" اس شخص نے پھر حکم دیا "اور جلدی کرو۔ ہم رات نہیں لگا سکتے"

"پیر استاد۔ ابھی دیکھو نی۔ ادھر تو بہت ہٹ ہے"

"بکواس اور کام شروع کرو" دوسرے شخص نے غرا کے کہا اور میں نے پیڈرو کی آواز کو فوراً پہچان لیا۔

ایک لمحے کے لیے میرے دل میں ان سب کو شوٹ کر دینے کی خواہش پیدا ہوئی۔ وہ چار تھے۔ ہمارے پاس جو ریوالور تھا اس میں بھی چار گولیاں تھیں لیکن ہمارے حریف کھلی جگہ پر تھے اور ان کے پاس وافر اسلحہ تھا۔ کم سے کم دو کو میں نے سب مشین گن سے مسلح دیکھا۔ میں نشانہ خطا نہ کرتا تو شاید دو کو مار سکتا تھا۔ باقی دو یقیناً بھاگ کے جان بچا لیتے اور ہماری طرح مورچا بند ہو جاتے۔ پھر وہ دو طرف سے آسکتے تھے اور ہم ایک ریوالور کی دو بچی ہوئی گولیوں سے اس محاذ پر دونوں جانب نہیں لڑ سکتے تھے۔

ان میں سے ہر ایک نے ہر ہٹ میں جا کے دیکھا۔ ایک اس کھنڈر کی طرف بھی آیا جس کی دیوار پر ہم چوکی بنائے بیٹھے تھے مگر اس دیوار سے منسلک زینے کے سوا وہاں کوئی جگہ تھی ہی نہیں جہاں وہ ہمیں تلاش کرتا۔ وہ واپس چلا گیا ورنہ میں تیار تھا کہ وہ اوپر کا رخ کرے تو اسے آڑے ہاتھوں لوں۔ محاورے کے مطابق نہیں بلکہ کراٹے کے داؤ پیچ کے حساب سے۔

دس منٹ میں وہ پھر گاڑی میں اکٹھے ہوئے اور واپس چلے گئے۔ نہ جانے کیوں انھوں نے آگے جانے کی ضرورت محسوس نہیں کی، شاید ان کے پاس سگنل ریسیو کرنے کے وہ آلات تھے جو سمت اور فاصلے کا تعین بھی کر دیتے تھے۔

"یہ دھوکا بھی ہو سکتا ہے" شیخ نے میری تھیوری سن کے کہا "کہ جیسے ہی ہم مطمئن ہو کے نکلیں، پکڑ لیے جائیں"

"اچھا بھائی، بیٹھے رہتے ہیں اسی کھنڈر میں الو کی طرح، صبح تو ہونے والی ہے" میں نے صبحِ کاذب کے غائب ہونے والے آثار دیکھ کے کہا "یہاں سے طلوعِ آفتاب کا نظارہ کیا خوب ہوگا"

"سالوں کو ٹیکسی بھی دکھائی نہیں دی" شیخ بولا "اللہ نے ان کو اندھا کر دیا ہوگا"

"نہیں دوست، یہ وہی بات ہے، شکاری ہمیں بے خوف کر کے اس جائے پناہ سے خود نکل آنے کی ترغیب دے رہے ہیں۔

انھوں نے ٹیکسی دیکھ لی لیکن انجان بن کے لوٹ گئے" شیخ بولا "اب ہمیں کوئی اور طریقہ اختیار کرنا ہوگا"

"ہم ایسا کرتے ہیں کہ بائی ایئر نکل جاتے ہیں" میں نے کہا "دیکھتے رہ جائیں منہ اٹھا کے"

لیکن اکرام شیخ کا تربیت یافتہ پولیس مین ہونا ہی کام آیا۔ نیچے اترنے کے بعد اس نے واپس اسی سمت میں مارچ شروع کیا جدھر منوڑہ تھا۔

"ایک بار تو نیوی کی پولیس نے شرافت سے ہمیں سمجھا کر واپس کر دیا تھا" میں نے کہا "اب پیدل گئے تو وہ کہیں گے ایسے بے وقوف بناتے ہو۔ اگلی بار سائیکل پر آؤ گے۔ پھر اونٹ پر، گدھے پر۔ اندر گھسنا چاہتے ہو"

اکرام شیخ اچانک رک گیا "یہاں سے ہم لفٹ لیں گے"

"ویری گڈ۔ اتنی کاریں گزر رہی ہیں، کسی کو روکو"

مگر اکرام شیخ بددل ہو کے ہمت ہارنے والا نہیں تھا۔ وہ دور سے خالی سڑک کو گھورتا رہا۔ اب افق پر روشنی نمایاں ہو رہی تھی اور صبحِ صادق کا اجالا اترنے لگا تھا۔ فضا میں نمی اور خنکی بھی بڑھ گئی تھی۔ وسیع آبی پودوں سے ڈھکے ہوئے قطعہ سمندر کے اوپر دھواں سا رہا تھا۔ اچانک اس خاموشی کو کسی قریب آتی ہوئی بھاری گاڑی کی آواز نے ختم کر دیا۔ شیخ فوراً چلنے لگا۔ پھر ادھر ہی سے جدھر سے ہم آئے تھے منٹ کے بعد ایک ٹرک نمودار ہوا۔ یہ نیوی کا بھاری ٹرک تھا۔

ٹرک جب بالکل قریب آ گیا تو شیخ نے زور زور سے ہاتھ ہلانا شروع کیا۔ ڈرائیور نے بریک لگائے اور سر باہر نکالا۔

"کہاں جانا ہے رے تم کو؟"

"بڑی مہربانی سائیں آپ کی۔ ہم کو ادھر پھاٹک کے باہر چھوڑ دو۔ ادھر سے ہم کو بس مل جائے گی"

"لیکن تم لوگ کون ہو؟ اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"ٹیکسی ڈرائیور ہیں سائیں!" شیخ نے سندھی ڈرائیور سے خوشامدانہ لہجے میں کہا "رات کو سواری لائے تھے جی۔ ادھر ہم سے گاڑی چھین کے بھاگ گیا وہ سب بدمعاش، ابھی جائیں گا پولیس کو"

"اچھا اچھا، چڑھو پیچھے" دردِ دل رکھنے والے ڈرائیور نے کہا "پر اپنا مکھڑا نیچے رکھنا بابا، کوئی دیکھے نہیں"

حسبِ ہدایت ہم پیچھے والے کھلے حصے میں یوں لیٹ گئے کہ سڑک پر کھڑا ہوا کوئی شخص بھی ہمیں نہیں دیکھ سکتا تھا مگر لیٹ کر ہم دونوں جانب کی درزوں سے جھانکتے رہے۔ پیچھے کا جو حصہ کھل کر گر جاتا تھا۔ اس کے اور سائیڈوں کے درمیان جھری باقی تھی اور وہ حصہ فٹ نہ ہونے کے باعث کھڑکھڑا رہا تھا۔

ابھی ہم ایک میل بھی نہ گئے تھے کہ میں نے سڑک کے بائیں کنارے پیڈرو کی گاڑی دیکھ لی۔ وہ گاڑی کے اندر بیٹھا ہوا تھا اور اس کا سر اسٹیئرنگ پر تھا۔ غالباً رات بھر جاگنے کے بعد اس پر تھکن طاری تھی۔ دوسرا شخص کار کا سہارا لیے ہاتھ باندھے بیزار کھڑا سامنے دیکھ رہا تھا۔ انھوں نے نیوی کے ایک خالی ٹرک کو بالکل قابلِ توجہ نہیں سمجھا تھا۔

اکرام شیخ نے مجھے مطلع کیا "وہ ادھر کھڑے ہوئے ہیں"

"پیڈرو اس طرف کار میں تھا" میں نے اسے بتایا۔

"رات کو یہ کالے کپڑوں میں تھے" شیخ بولا۔

"اب تو شریفانہ لباس میں نظر آ رہے تھے" میں نے کہا۔

"وہ ہمارے لیے چشم براہ تھے، اب تو یقین آیا؟"

"میں.... تو خود ہی یقین دلا رہا تھا...." میں نے ڈھٹائی سے کہا۔

شیخ نے جیب سے وہی پاکٹ سائز ٹرانسمیٹر نکالا "اب کیا ارادہ ہے؟" میں نے کہا "انہیں پیچھے بلانے کا؟"

شیخ مسکرایا "چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد"

میں نے سر پکڑ لیا "خدا کے لیے آپ صحیح شعر نہ پڑھا کریں۔ یہ کسی پولیس مین یا سابق پولیس افسر کو زیب نہیں دیتا کہ وہ اعلیٰ ذوق کا مظاہرہ کرے اور شعر ٹھیک پڑھے"

"اچھا میں اسے غلط کر دیتا ہوں۔ چھیڑ خوبانی سے چلی جائے غالب۔ اب کیا خیال ہے؟" پھر ٹرانسمیٹر آن کر کے بولا۔

"سنو احمقو! عقل کے اندھو! الو کے پٹھو!" اس نے زیادہ سے زیادہ سنگین گالیوں کا اضافہ کیا "ہم نے تمہیں دیکھا مگر تم ہمیں نہ دیکھ سکے۔ ہم جنات کی طرح غائب ہونا بھی جانتے ہیں۔ جب تک تمہارا دل چاہے جھک مارو۔ یہ ہمارا آخری پیغام ہے، تم ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے"

آگے نیوی کے ٹرک کا ڈرائیور کچھ بھی سننے سے قاصر تھا کیونکہ ایک تو ہمارے درمیان پارٹیشن حائل تھی۔ پھر انجن کا شور اس کے زیادہ قریب تھا اور ٹرک کی باڈی خستہ حال سڑک پر جھٹکوں کے باعث مسلسل بج رہی تھی۔

"اب اس کا تو کوئی مصرف نہیں رہا"

"نہیں، آپ خطاب جاری رکھیں" میں نے کہا "آپ کی جان کے دشمن یقیناً محظوظ ہوں گے"

"آپ کو میرا بولنا شاید برا لگا" اکرام شیخ نے کہا "لیجیے آپ بھی شوق فرمایئے، کچھ بھی سنایئے، غزل، گیت، ماہیا، ٹپہ"

میں نے ٹرانسمیٹر ہاتھ میں لے کے ایک ہاتھ کان پر رکھا اور تان لگائی "میٹوں نئے چلے بابلا وے"

آگے سے ڈرائیور نے چلا کے کہا "اوئے چپ کر کے بیٹھو"

"اچھا جی" میں نے چلا کے جواب دیا اور ٹرانسمیٹر کو باہر اچھال دیا۔ وہ سڑک کے کنارے ریت پر گرا۔ ٹرک اس وقت موڑ کاٹ رہا تھا کہ مجھے اپنے پیچھے ایک جھونپڑی ریسٹورنٹ نظر آیا جس کی ساری رونق بھی پروپرائٹر اور منیجر سے لے کر ویٹر تک تمام فرائض سرانجام دینے والے فردِ واحد تک محدود تھی۔ وہ ایک بالٹی لے کر نکلے تھے کہ ٹرانسمیٹر ان کے قدموں میں آکر گرا۔ میں نے اسے حیران ہوتے دیکھا۔

میں نے ہاتھ ہلا کے نیک خواہشات کا اظہار کیا اور گویا اسے اجازت دی کہ وہ ہمارا تحفہ قبول کر سکتا ہے۔ اس نے تو یہی سمجھا ہوگا کہ ہم پاگل ہیں جو اچھے بھلے ریڈیو کو باہر پھینک گئے۔ عام آدمی کیسے جان سکتا تھا کہ وہ ریڈیو نہیں ٹرانسمیٹر ہے۔

"بہت خوش ہے کہ صبح صبح کیا چیز مل ہے" میں نے کہا۔

"ہاں، اصلی خوشی اسے کچھ دیر بعد ملے گی" اکرام شیخ بولا "جب پیڈرو اجنبی آوازیں سن کے گاڑی دوڑاتا ہوا آئے گا اور پوچھے گا کہ یہ.... کون بکواس کر رہا تھا اور وہ چیز کہاں ہے؟"

ٹرک نے ہمیں دس منٹ کے بعد پھاٹک سے آگے اتار دیا۔ پھاٹک دراصل سینڈز پٹ جانے والے راستے پر ایک ٹریفک بیریئر تھا، جہاں ہر گاڑی والے کو ٹول ٹیکس دینا پڑتا تھا۔ کار ہو یا ٹیکسی، ٹرک ہو یا بس سامان کے ریٹ جدا تھے مگر ٹول ٹیکس جمع کرنے والے ٹھیکیدار کے کارکن کسی کو ٹکٹ لیے بغیر آگے نہیں جانے دیتے تھے اور واپسی میں بھی یہ ٹکٹ دکھا کے ثابت کرنا پڑتا تھا کہ وہ ٹیکس ادا کر گئے تھے لیکن یہ نیوی کا ٹرک تھا جس پر اس پابندی کا اطلاق نہیں ہوتا تھا۔

ہم نے ڈرائیور سے ہاتھ ملا کے اس کا شکریہ ادا کیا اور اس نے مزید ہمدردی کا اظہار یوں کیا کہ ہمیں قریب ترین پولیس چوکی کا پتا بتایا اور امید ظاہر کی کہ ہمیں ٹیکسی مل جائے گی۔ وہاں ایک چھوٹا سا بازار تھا اور شہر سے آنے والی بس کا آخری اسٹاپ بھی۔ ایک بس روانگی کے لیے مزید مسافروں کے انتظار میں تیار کھڑی تھی۔

ہم نے جلدی جلدی دو کپ گرما گرم چائے جیسا مشروب نوش کیا اور پھر بس میں بیٹھ گئے۔ ابھی بس روانہ بھی.... نہیں ہوئی تھی کہ ہم نے پیڈرو کی گاڑی کو قریب سے گزرتے دیکھا۔ اس کی رفتار بہت زیادہ تھی۔ ایک سائیکل سوار نے بمشکل تمام خود کو بچا لیا مگر اس کوشش میں وہ سائیکل سمیت گرا۔ کچھ لوگ اس پر ہنسنے لگے۔ اس نے سائیکل کو اور خود کو اٹھانے کے بعد نامعلوم کمینے کتے کار ڈرائیور کو گالی دی اور پھر پیڈل مارتا روانہ ہو گیا۔

"یہ لوگ نیوی کے ٹرک کے تعاقب میں گئے ہیں" میں نے اکرام شیخ سے کہا۔

اس نے تائید میں سر ہلایا "ہاں، اس جھونپڑی ریسٹورنٹ والے نے بتا دیا ہوگا کہ اس کی طرف تحفہ کیسے ارسال کیا گیا تھا اور تحفہ پھینکنے والے کون تھے؟"

"بہت جلد آ پہنچے یہ شکاری ہمارے تعاقب میں۔"

"ہاں، بال بال بچے ہیں ہم۔" اکرام شیخ بولا۔

"دراصل وہ آپ کی تقریر سنتے ہی چل پڑے ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "انہیں فوراً پتا چل گیا ہو گا ہم پیچھے نہیں ہیں، آگے نکل گئے ہیں۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ وہ واپس بھی آئیں گے۔ ٹرک ڈرائیور انہیں بتلوے گا کہ اس نے ہمیں کہاں اتارا تھا۔"

"اور ہم نے اسے کیا کہانی سنائی تھی۔"

اتفاق رائے سے ہم اترنے ہی والے تھے کہ بس کا ہانٹ نمودار ہوا جو بانس کی طرح خشک اور پتلا تھا مگر اس نے ڈیپ کا ر ہیئر اسٹائل بنا رکھا تھا اور آنکھوں میں سرمے کی سلائی باہر تک پھیری تھی۔ اس کی آنکھیں بیک وقت سرخ و سیاہ ہو رہی تھیں اور وہ بلاوجہ آبدیدہ نظر آتا تھا۔ اس نے گنگناتے ہوئے اپنے مقابل شیشے کو ملاحظہ کیا جس میں تمام مسافران کرام کا عکس دکھائی دیتا تھا اور کنڈکٹر کی ڈبل ہے استاد۔ سنتے ہی روانہ ہو گیا۔

کنڈکٹر نے جو استاد کے ڈبل سے بھی زیادہ تھا، دو بار بس کی باڈی پر بھی ہاتھ مارا۔ یہ سنگل ڈبل کا سگنل کراچی کی بسوں میں ایسے ہی استعمال ہوتا ہے جیسے ٹرین میں گاڑی روکنے کے لیے لال جھنڈی اور روانگی کا اشارہ دینے کے لیے سبز جھنڈی استعمال ہوتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ٹرین میں ہر مسافر جھنڈی نہیں دیتا مگر یہاں بس میں ہر مسافر بس رکوانے کے لیے مروجہ طریقے کے مطابق دھڑ سے بس کی چھت پر یا دروازے پر ہاتھ مارتا ہے۔ دھماکا آگے پائلٹ تک پہنچتا ہے تو وہ آنے والے اسٹاپ پر یا کسی بھی نامناسب جگہ پر بس روک لیتا ہے۔ مسافر اترتے وقت خود دو بار ہاتھ نہ مار جانے تو دیگر مسافر یہ خدمت رضاکارانہ طور پر کرتے ہیں یا پھر کنڈکٹر۔ کراچی میں نووارد کے لیے یہ تماشا ذرا عجیب ہوتا ہے۔ وہ چلاتا شور مچاتا ہے کہ بس روکو اور کنڈکٹر اسے الزام دیتے ہیں کہ بابا روکنا تھا تو ایک ہاتھ مارنا تھا۔ دو ہاتھ مار کے ڈرائیور کو کیا بولتے ہو۔ بس اسٹاپ کراچی میں ایک بے وقعت چیز ہے۔

"بہت جلد وہ واپس آئیں گے۔" اکرام شیخ نے مجھے یاد دلایا۔

"اپنی سری اندر رکھیے۔"

"وہ دوسری جانب سے گزریں گے۔" میں نے کہا۔ "آپ نگاہ روبرو رکھیے۔"

کار سامنے سے آئی اور اس کی رفتار کچھ کم ہوئی۔ غالباً وہ... مسافران بے بس میں ہمیں تلاش کر رہے تھے مگر بس میں مسافر کوٹ کوٹ کر بھرے گئے تھے کوئی ان کے سر گنتا اور پھر پیر شمار کر کے حساب سے فارمولے سے مسافروں کی صحیح تعداد معلوم کرنے کی کوشش کرتا تو جواب حیران کن ہوتا مثلاً ساڑھے باون مسافر جن میں کوئی تین ٹانگ والا مسافر بھی ہے یا ستر سر اور ایک سو اڑتیس ٹانگیں۔ اب آپ سوچتے رہیے کہ کس کے دو سر ہیں یا کون دو ٹانگوں کے بغیر کھڑا ہے۔ پھر یہ کیسے ٹکٹ چیکر رہ ہماری اشکال کو گزرتے ہوئے شناخت کر لیتا۔

کار گزر گئی تو میں نے اٹھ کر غلغلہ بلند کیا۔ "ارے گر گیا... گر گیا۔"

"کون... کون گر گیا؟" ایک ساتھ بہت سے بے بس مسافروں نے کہا۔ وہ باہر جھانک کر نہیں دیکھ سکتے تھے کیونکہ وہ ایک دوسرے سے چپکے ہوئے تھے یا ایک دوسرے میں فٹ تھے۔ کوئی کسی کا بازو تو کوئی کسی کی ٹانگوں میں۔

"وہ میرا پرس گر گیا۔" میں نے چلا کے کہا۔ "روکو گاڑی" کنڈکٹر نے فوراً ایمرجنسی کا اعلان کیا۔ دو بار بس کی چھت کو مکے مارے اور بس... ہم دونوں نے دروازے تک یوں سفر کیا جیسے مچھلی دریا کے تیز دھارے کے خلاف جائے مالآخر ہمیں باہر دھکیل دیا گیا۔ بس جس کے اندر اور باہر کھڑکی دروازوں سے بھی چپکے ہوئے تھے چار نئے مسافروں کو لے کر روانہ ہو گئی۔ وہ بس کو اچانک رکتا دیکھ کر دوڑتے ہوئے آئے تھے پھر پتا نہیں کیسے اندر گم ہو گئے تھے۔

"میری پسلیاں تو بج گئیں۔" اکرام شیخ نے سینے پر ہاتھ مار کے گہری سانس لے کر کہا۔

"میری چال کچھ ٹیڑھی معلوم ہو رہی ہے شاید۔" میں نے ہاتھ ہلا کے کہا۔ "آخر یہ سب کچھ کیوں ہوتا ہے یہاں؟"

"کیا ہوتا ہے؟" اکرام شیخ نے چلتے ہوئے کہا۔

"یہی کہ صبح شام مسافروں کو بسوں میں اس طرح پیک کرنا اور باہر معلق رکھنا۔ ٹرانسپورٹ والے نہ سہی انسدادِ بے رحمی حیوانات والے ہی کچھ کریں۔" میں نے کہا۔

"انجمن انسدادِ بے رحمی حیوانِ ناطق ابھی نہیں بنی۔" شیخ بولا۔

"یہ راستہ کدھر جاتا ہے؟" میں نے بغلی سڑک کی جانب اشارہ کیا۔

"مقامِ جنت کو نقطۂ بہشت کی طرف۔ یہاں والے اسے لوٹنے کے شوق میں پیرا ڈائز پوائنٹ کہتے ہیں۔"

"کیا ہم شہر تک پیدل جائیں گے؟" میں نے کہا۔

"تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا۔ اڑ کے چلا جا۔" اکرام شیخ نے کہا مگر ایک ٹیکسی اسی وقت ہمارے پیچھے سے نمودار ہوئی۔ ٹیکسی ڈرائیور واپسی کی سواری نہ ملنے پر خاصا دل شکستہ تھا چنانچہ ہم نے اسے روکا تو اس کی باچھیں کھل گئیں۔ پھر اس نے ہمارا حلیہ دیکھا۔

"جیب میں بھاڑا ہے؟" وہ بولا۔

"بھاڑ میں گیا بھاڑا۔" میں نے ریوالور نکال کے کہا۔

"یہ... یہ کیا بدمعاشی ہے، ٹیکسی چھیننا چاہتے ہو میری؟" اس کی حالت غیر ہو گئی مگر اس نے ٹیکسی اسٹارٹ کر دی۔

"نہیں... اتنے بہادر ہوتے ہم تو اپنی ٹیکسی بچا لیتے۔" میں نے ریوالور جیب میں رکھ کے کہا۔

"ہاں، وہ ہماری ٹیکسی چھین کر لے جاتے۔" اکرام شیخ روتی آواز میں بولا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے مشکوک نظروں سے ہمیں دیکھا۔ اس نے اگو ہمیں نشے میں سمجھا تو جائز سمجھا لیکن اکرام شیخ نے اسے خاصے دردناک لہجے میں بتایا کہ کس طرح اسے چند شرفا نظر آنے والے سینڈ ہینڈ سے گئے تھے مگر وہ ڈاکو تھے، اسے ٹیکسی سے اتار کے پیدل کر گئے۔

"کمال ہے یار۔" ٹیکسی ڈرائیور بولا۔ "تم نے اس وقت ریوالور کیوں نہیں نکالا، کیا تو پ تھی ان کے پاس؟"

"نہیں، ریوالور تو نکالا تھا مگر وہ ہنسنے لگے۔"

"کیا! ریوالور دیکھ کے ہنسنے لگے؟"

"ہاں، ریوالور نقلی ہے نا۔ ایسے ہی اپنی حفاظت کے لیے ساتھ رکھتے ہیں۔ تم تو جانتے ہو کیسی کیسی جگہ جانا پڑتا ہے۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے اتفاق کیا۔ "ہاں جانا تو پڑتا ہے مگر میں اصل ریوالور رکھتا ہوں۔" اس نے گلوز کمپارٹمنٹ میں کاغذات کے نیچے سے ریوالور نکال کے دکھایا۔ "اصل تو یہ بھی لگتا ہے۔"

"ہاں، مگر وہ پہچان گئے کہ نقلی ہے۔"

"اب تم کیا کرو گے؟" ٹیکسی ڈرائیور نے اپنے ہم پیشہ سے اظہارِ ہمدردی کیا۔

"کچھ اور چلاؤں گا، گدھا گاڑی یا اونٹ گاڑی۔"

"تم قسطوں پر لے لو نا یار۔ وہ ٹیکسی تو اب ملنے سے رہی۔ رپورٹ ضرور لکھوا دو مگر فائدہ کوئی نہیں۔" اس نے کہا۔ "لسبیلہ چوک پر بہت لوگ قسطوں پر ٹیکسی رکشا دیتے ہیں۔ خود میں نے ایسے ہی لی تھی۔"

"اپنی ٹیکسی نہ چھوڑ گے ہمیں؟" اکرام شیخ بولا۔

ٹیکسی والے نے چونک کے پیچھے دیکھا۔ "یہ بہت مہنگی ہے۔ چوالیس ہزار لگ چکے ہیں مگر تمہیں دے دوں گا پینتالیس میں۔ تمہارا بہت نقصان ہوا ہے۔"

گھر کے قریب اترنے تک ہمارے درمیان دوستانہ مراسم استوار ہو چکے تھے۔ اس نے نہ صرف یہ کہ ہم کو کرایہ معاف کر دیا جو ہماری جیب میں تو نہیں تھا مگر ہم گلی میں گھر سے لا سکتے تھے، ہم نے اپنا پتا ٹھکانا بھی بتلایا کہ ٹیکسی کی بات کرنا ہو تو آ جانا۔

"یہ کیا حرکت تھی؟" میں نے ٹیکسی کے جانے کے بعد کہا۔

"ٹیکسی تو لینا ہی پڑے گی دوست۔" اکرام شیخ بولا۔

"اور وہ جو وہاں چھوڑ آئے ہیں؟"

"اس پر پڑھ لو فاتحہ۔ شکاری جب دیکھیں گے کہ شکار تو نکل گیا اور الٹا انہی کو شکار کر گیا تو اپنا سارا بے بسی کا غصہ اس ٹیکسی کو آگ لگا کے اتاریں گے۔ اس ٹیکسی کو لانے کے لیے ہمارا جانا گویا پھر خود کو گرفتاری کے لیے پیش کرنا ہے۔ ہمارے دشمن بھی یہ بات سمجھتے ہوں گے کہ ہم اتنے بیوقوف نہیں... جتنا جھنجلاہٹ کا بدلہ ٹیکسی سے ہی لے سکتے ہیں۔"

گھر کا دروازہ بند تھا اور اندر خلافِ معمول خاموشی تھی۔ اکرام شیخ نے دستک دی تو نازو نے دیوار کے قریب آ کے کہا۔ "کون ہے؟"

"کوئی بھی نہیں۔" میں نے کہا۔

"میں نہیں جانتی اس نام کے کسی آدمی کو۔" نازو نے کہا مگر دروازہ کھول دیا۔ "آئیے مسٹر کوئی نہیں۔"

"یہاں تو واقعی کوئی نہیں۔" اکرام شیخ نے اندر جا کے کہا۔

"کیا میں آپ کو نظر نہیں آ رہی ہوں؟" نازو نے تشویش سے کہا۔

"مگر میں جو دوسری چیزیں جمع کرا گیا تھا۔ محسن، راجا اور غالب نام کی۔" اکرام شیخ نے کہا۔

"وہ سب کام سے گئے ہیں۔" نازو نے کہا۔ "اور کہہ گئے ہیں کہ باقی سب حضرات بھی فوراً آ جائیں۔"

"گویا تم نہیں جاؤ گی؟"

"میں بھی حضرات میں شامل ہوں، میری وردی..."

"ملی بی جیسے جہاز کے بغیر پائلٹ نہیں ہوتا ایسے ہی ٹیکسی کے بغیر ڈرائیور نہیں ہوتا۔" میں نے کہا۔

"کیوں، ٹیکسی کہاں گئی؟" وہ بولی۔

"بس، بچھڑ گئی ہم سے۔ جیسے اور بہت سے بچھڑے۔" میں نے کہا۔

"اللہ تمہیں صبرِ جمیل عطا کرے۔ فی الحال۔"

"پھر تم لوگ کیسے آئے ہو؟"

"ٹیکسی میں اور کس میں۔" میں نے اسے ڈانٹ کر کہا۔

"اوہ، کیا مصیبت ہے، تم اس طرح بات نہیں کر سکتے۔ پہلے ہی دیر ہو گئی ہے۔ وہ سب انتظار کر رہے ہوں گے۔" نازو نے چراغ پا ہو کے کہا۔

دو منٹ میں اکرام شیخ نے اسے سب بتا دیا۔ "وہ کہاں گئے ہیں سب؟"

"کوئنز روڈ، راجا کے ٹھکانے پر۔" نازو نے کہا۔ "اور کہاں جاتے۔"

"اچھا اب تو یہ کپڑے بدل لے۔ یہاں سے ہم ایسے نہیں نکل سکتے۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "ٹیکسی ساتھ آتی تو یہ وردی چل جاتی۔"

نازو نے اپنے کپڑے بدلے اور ہمارے ساتھ روانہ ہوئی تو پھر وہی پہانی نازو تھی اور اپنے اصل روپ میں نازو وہ ساحرانہ مقناطیسی قوت تھی جس کے خلاف عقل کی مزاحمت بے وجود ہو جاتی تھی اسے ایک بار دیکھنے کے بعد پھر نہ دیکھنے کا عہد کرنے والے کو شکست تسلیم کرنا پڑتی تھی۔ وہ ایک ایسی برق تپاں تھی جس کا نظارہ نگاہوں کو خیرہ کر دیتا تھا۔ ایک ایسا شعلۂ بے حجاب تھی جس کے مقابل کسی کا خرمنِ ہوش محفوظ نہ تھا۔ میں نے خود کو اس کے طلسم کا اسیر ہونے سے بڑی مشکل سے بچایا تھا اور میری کامیابی درحقیقت رابعہ کے عشق کی کامیابی تھی جو زیادہ بڑی قوت تھا لیکن اس کے باوجود جب بھی نازو ادائے حسن کی ساری قاتل معصومیت کے ساتھ جلوہ نما

ہوتی تھی تو میں پل بھر کے لیے مسحور ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ اسے میری کمزوری سے زیادہ میرے ذوقِ جمال کی کمزوری سمجھا جانا چاہیے۔ اس سے میرے عشق پر تہمت نہیں آتی تھی۔ ستائشِ حسن و محبت الگ الگ جذبات کی کیفیات ہیں۔ رابعہ کے بارے میں غیر جانبدار رہتے ہوئے میں یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ دنیا کی سب سے خوبصورت عورت تھی مگر مجھے محبت صرف اسی سے تھی اور محبت کی خوبصورتی میں مجھے اس کا ہمسر واقعی کوئی نظر نہ آتا تھا لیکن محبت کے جذبات کی عینک کے بغیر دیکھنے والوں کے لیے نازو یقیناً رابعہ سے بہت زیادہ حسین تھی۔ اور بھی ہوں گی جو نازو سے زیادہ حسین ہوں گی۔ ایک تو زیب النسا ہی تھی مگر یہ تو ایک محدود سی دنیا کا موازنہ حسن تھا۔ ساری کائنات کے حسن کو دیکھتے ہوئے سب سے زیادہ حسین عورت کا تصور اتنا ہی محال تھا جتنا خود کائنات کی وسعت کا تصور۔

راہ چلتے میں نے لوگوں کو ٹھٹک کر یوں رکتے دیکھا جیسے وہ کسی جادو نگری کی شاہزادی کو دیکھ کے پتھر ہو گئے ہوں۔ ایسا اکثر ہوتا تھا۔ اکرام شیخ اس ردِعمل کا عادی ہو گیا تھا چنانچہ وہ انجان بن جاتا تھا مگر مجھے حیرت ہوتی تھی جب خود نازو بھی انجان نظر آتی تھی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک عورت اپنے حسن کی قوتِ تسخیر سے واقف نہ ہو اور ادائے حسن کی معصوم غارت گری کا اندازہ نہ رکھتی ہو۔

خود دیکھنے والے کہاں سمجھ سکتے تھے کہ وہ صرف ایک مثالی مرقع حسن ہی نہیں ایک ایسی بجلی بھی ہے جسے چھونے کی ناپاک جسارت کرنے والا ایک جھٹکے میں چت ہو جائے گا۔ اس وقت بھی چلتے چلتے ایک ناخوشگوار چھوٹا سا واقعہ پیش آیا مگر اس سے صورتِ حالات میں بڑی تبدیلی آئی۔

ابھی ہم گلی سے سڑک پر ہی پہنچے تھے کہ سامنے سے ایک شخص بڑی تیزی میں آیا اور نازو سے ٹکرا گیا۔ نازو بچنے کی کوشش کے باوجود گر گئی اور بھائی کی مدد سے فوراً کھڑی بھی ہو گئی۔ یہ صرف حادثہ ہوتا تو ہم معذرت کی توقع بھی نہ رکھتے اور دامن بچا کے نکل جاتے مگر جب میں نے دیکھا تو ٹکر مارنے والا شخص بڑی اشتعال انگیز بے شرمی سے ہنس رہا تھا۔

وہ اگر کوئی بڑا بدمعاش نہیں تھا تو اپنے طرزِ عمل سے ایسا ثابت کرنے پر تلا ہوا تھا۔ وہ بہت لمبا چوڑا اور طاقتور تھا۔ اس کی مونچھیں اس کی بدمعاشی کا سائن بورڈ بنی ہوئی تھیں اور اس کی ہنسی چیلنج دیتی تھی۔ مزید یہ کہ تین اسی جیسے پیچھے کھڑے دانت نکال رہے تھے اور ان کی مکروہ صورتوں پر بھی بدمعاشی کا اشتہار تھا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے غصے کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"تو بتاؤں کیا بات ہے؟" وہ میرا مسخر اُڑانے والے انداز میں بولا اور آگے بڑھ گیا۔ "یہ عیاشی کی جگہ سمجھ رکھی ہے نا تم نے؟"

"چلو چھوڑو، نکل چلو یہاں سے" نازو نے میرے تیور دیکھ کے کہا۔ میں نے غصے کو ایک گہری سانس کے ساتھ خارج کر دیا۔

"ہمارا راستہ چھوڑ دو" میں نے نرمی سے کہا۔

"پہلے بات پوچھی ہے تو بات سن لے" وہ اور آگے آیا اور اس کے تینوں ساتھی گلی میں پھیل کے کھڑے ہو گئے "کہاں سے لایا ہے یہ چیز...... ولایتی مال ہے ایک دم"

میرے دماغ کا فیوز بھک سے اُڑ گیا۔ میں نے اس کے پیٹ میں ایک بھرپور مکا مارا۔ یقیناً ضرب اس کے وہم و گمان سے زیادہ تھی کہ اس کا منہ کھلا اور پل بھر کے لیے اس کا سانس رُک گیا۔ وہ بے اختیار آگے جھکا اور میں نے اس کی تھوڑی پر گھٹنا یوں مارا کہ اس کے جبڑے اور دانت ہل گئے ہوں گے۔ وہ اوپر اٹھا ہی تھا کہ میں نے اس کی گردن کو بغل میں دبوچ لیا اور اسے ایک جھٹکے سے یوں اٹھایا کہ اس کے پیر اکھڑ گئے۔ پھر میں نے اسے ایک چکر دیا اور دیوار پر دے مارا۔ یہ سب شاید پانچ سیکنڈ میں ہو گیا۔ میں نے اس کے ناک اور منہ سے خون بہتا دیکھا۔

لیکن اتنی دیر میں تین دوسرے بدمعاشوں نے جو اپنے استاد کے پیچھے تھے خنجر نکال لیے۔ میں نے اکرام شیخ کو ایک ہاتھ سے اپنے پیچھے کر لیا اور دونوں پیر پھیلا کے قدم زمین پر گاڑ لیے۔ ہاتھ کے اشارے سے میں نے تینوں کو اپنی طرف بلایا۔

ان میں سے دو مجھ پر حملہ آور ہوئے۔ ان کے لبوں سے جو کچھ نکل رہا تھا وہ صرف گندگی تھی۔

آگے رہنے والا زیادہ پھرتیلا تھا۔ اس نے پیشہ ورانہ مہارت کے ساتھ خنجر کا وار کیا تھا لیکن میں جھوک دے گیا اور اپنی لات گھما کے اس کی کہنی پر نیچے سے ماری۔ اس کا بازو اوپر اٹھا اور خنجر ہوا میں اُڑتا نظر آیا۔ اس کی کہنی کا جوڑ ضرور ٹوٹ گیا ہوگا............ کیونکہ وہ بڑی اذیت سے بلبلایا۔ اس نے فوری طور پر پسپائی اختیار کرنے کا سوچا تھا مگر پیچھے اس کا دوسرا ساتھی تھا۔ وہ مجھ پر حملہ کر چکا تھا لیکن ذرا سے فرق کے باعث خنجر کا یہ وار اس نے اپنے ہی ساتھی پر کیا۔ خنجر کی دھار نے شانے پر سے اس کی گردن کاٹ دی — وہ دہشت زدہ ہو کے چلایا اور اس نے کٹی ہوئی گردن کو سیدھا رکھنے کے لیے دونوں ہاتھوں کی گرفت میں لے لیا۔

غلطی سے اپنے ساتھی پر قاتلانہ حملہ کرنے والا پاگل ہو گیا اور چیخ کر گالی دیتے ہوئے اس نے مجھ پر جست لگائی۔ چند سیکنڈ کے وقفے سے وہ بھی فضا میں بلند ہوا اور پھر نیچے آیا تو میری لات پڑنے سے دیوار کی طرف گیا لیکن درمیان میں بجلی کا کھمبا تھا، اس کا سر ٹن سے کھمبے پر لگا۔

اس جدوجہد کو ناکامی سے دوچار ہوتا دیکھ کے تین اور بدمعاش نہ جانے کہاں سے ٹپک پڑے۔ میں نے دیکھا کہ آس پاس افراتفری پھیل گئی ہے۔ ایک ہوٹل میں بیٹھے ہوئے پٹھان اور مکرانی اُٹھ اُٹھ کے بھاگ رہے ہیں۔ راہ چلتے لوگ رُک گئے ہیں اور گلی کے آخری حصے میں مجمع اکٹھا ہونے سے ہمارا راستہ بالکل ہی رک گیا ہے۔

نئے حملہ آور بھی اسی گروہ کے ارکان ہوں گے۔ انھوں نے میری طاقت اور پھرتی تو دیکھ لی تھی اور سمجھ گئے تھے کہ اگر وہ برورلڑائی ہوگی تو ان کا حشر بھی مختلف نہیں ہوگا۔ چنانچہ انھوں نے حکمتِ عملی بدلتے ہوئے میری کمزوری سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ وہ نازو پر حملہ آور ہوئے۔

ان کا خیال تھا کہ وہ نازو کو دبوچ لیں گے تو میں بھی بے بس ہو جاؤں گا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ نازو کسی طرح بھی اس جھگڑے میں ملوث ہو جو ایک شخص کے غیر ارادی قتل سے بہت سنگین صورت اختیار کر گیا تھا۔ لوگوں کی چیخ و پکار سے میں نے اندازہ کر لیا تھا کہ جس شخص کی گردن کٹی تھی وہ مر گیا ہے یا مر رہا ہے۔ اب میں جلد از جلد اس جگہ سے نکل جانا چاہتا تھا ورنہ مجھے اندیشہ تھا کہ دس پندرہ منٹ بعد پولیس آ جائے گی اور پولیس نہ آئی تب بھی ایک مشتعل ہجوم ہم پر یلغار کر دے گا اور ہمارے لیے فرار کے سارے راستے بند کر دے گا۔ ان سب کا یہی خیال تھا کہ ہم دولت مند لوگ ہیں جنہوں نے اس علاقے کو عیاشی کے اڈے کے طور پر منتخب کر رکھا تھا۔

نازو خود بھی حالات کی نزاکت کو سمجھتی تھی چنانچہ اسے مقابلے پر آنا پڑا۔ صرف ایک شخص میری طرف آیا تھا جسے میں نے پہلے والوں کی طرح ٹھکانے لگا دیا لیکن میں نے دیکھا کہ اتنی ہی دیر میں نازو نے انہیں بتا دیا ہے جو اسے ایک نازک کمزور عورت سمجھنے کی غلطی کرتے ہوئے بہت آگے بڑھ گئے تھے۔ ان میں سے ایک کو اس نے کلائی سے پکڑ کے اٹھایا اور یوں گھمایا کہ اس کا دوسرا ساتھی بھی لپیٹ میں آ گیا۔ پھر اس نے کلائی چھوڑ دی اور وہ شخص سیدھا کھمبے پر جا کے لگا۔ دوسرا شخص نازو کے بجلی کی طرح چلتے ہوئے ہاتھوں اور پیروں کی زد میں آ گیا اور کئی جگہ سے ٹوٹ کے گرا۔

مجمع جو پہلے مشتعل تھا، اب دم بخود خوفزدہ اور حیرت سے آنکھیں پھاڑے کھڑا تھا۔ یہ جنگ شاید دس منٹ بھی جاری نہیں رہی جس میں ایک تو یقیناً مارا گیا تھا اور باقی بُری طرح مجروح ہوئے تھے یا بے ہوش پڑے تھے۔ ان میں سے چار میرا شکار تھے، دو کو نازو نے ٹھنڈا کیا تھا۔ یہ بہت بڑی واردات تھی جس نے سارے علاقے میں سنسنی پھیلا دی تھی۔ پیچھے گلی میں مکان کی چھت پر سے عورتیں چیخ رہی تھیں اور آگے ٹریفک جام ہو رہا تھا۔ دکاندار دکانوں کو تالے لگا رہے تھے تاکہ وہ گواہی میں نہ پکڑے جائیں۔ ہوٹل والا کرسیاں میزیں سمیٹ کر چولہے بجھا رہا تھا اور خود بھی فرار ہونے کی فکر میں تھا۔

اچانک اکرام شیخ نے ریوالور نکال لیا "ہٹ جاؤ سامنے سے سب" اس نے دھاڑ کے کہا "ورنہ بھون کے رکھ دوں گا"

لوگ سر پر پاؤں رکھ کر بدحواسی کے عالم میں دوڑے اور ہمارے لیے تھوڑا سا راستہ بن گیا۔ میں نے نازو کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا اور سامنے آنے والے کئی افراد کو دائیں بائیں گرایا پھر ہم نے خود کو سڑک پر پایا۔

کچھ لوگ ہمارے پیچھے دوڑے مگر شیخ نے ایک ہوائی فائر کیا تو وہ رک گئے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ابھی تک پولیس نہیں آئی۔ ہم نے سڑک کو عبور کرتے ہوئے ایک کار کو دیکھا جو سیدھی ہماری طرف آ رہی تھی۔ میں سڑک کے بیچ میں ٹھہر گیا۔ کار والے نے زبردست بریک لگائے پھر بھی فاصلہ کم تھا۔ میں پیچھے نہ ہٹتا تو ٹکر سے گر جاتا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" صورتِ حال سے ناواقف گاڑی والے نے چیخ کے کہا۔

"نیچے اُتر کے دیکھو" میں نے اسے کالر سے پکڑ کے کھینچ لیا۔ "سب معلوم ہو جائے گا"

اکرام شیخ اور نازو اتنی دیر میں پچھلے دروازے کھول کے بیٹھ چکے تھے۔ کار والا سڑک پر گرا اور پھر اٹھ کے آگے آیا تو میں نے اس کے ایک مکا پوری قوت سے رسید کیا۔ وہ الٹ کر اس منڈیر پہ گرا جو سڑک کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کے لیے بنائی گئی تھی۔ اس کے پھر اُٹھنے سے پہلے میں گاڑی اسٹارٹ کر چکا تھا۔

میں نے اندھا دھند گاڑی کو بھگایا اور اس جگہ سے دُور نکل جانے کی کوشش میں ایک گدھا گاڑی سے ٹکرایا۔ دو موٹر سائیکل سوار جو سڑک کے گاڑی چلانے کا سنسنی خیز تجربہ کر رہے تھے خود گاڑی سے ٹکرا کے گرے اور نہ جانے کتنے پیدل چلنے والوں نے بھاگ کے اپنی جان اس طوفان بدوش گاڑی سے بچائی۔

بالآخر ہم محفوظ علاقے میں پہنچ گئے جہاں سڑکیں غیر آباد تھیں اور دونوں جانب کوٹھیاں بھی خاموشی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

"یہ کون سی جگہ ہے؟" میں نے کہا اور گاڑی روک دی۔

"شرف آباد" اکرام شیخ نے کہا۔ سارا راستہ ہم خاموش رہے تھے۔ اس ناخوشگوار واقعے پر سب کا ایک سا احساسِ تاسف و پریشانی قائم تھا۔

گاڑی کو وہیں چھوڑ کے ہم نے شاہراہِ لیاقت تک پیدل سفر کیا۔

"یہ بہت بُرا ہوا" میں نے کسی سے مخاطب ہوئے بغیر کہا۔

"اپنی شامت کے وہ خود ذمے دار بنے" اکرام شیخ بولا "ہم نے بہت ضبط سے کام لیا تھا اور بہت کوشش تھی کہ جھگڑا نہ ہو"

"ان لوگوں کے ذہن میں کتنی غلاظت بھری ہوئی تھی۔ کیا ان کے گھروں میں..." نازو کچھ کہتے کہتے رُک گئی۔

"ماں بہن بیٹی بہو سب ان کے گھروں میں بھی ہوتی ہیں" میں نے اس کی بات سمجھ لی "مگر یہ غلاظت انہیں گھر سے نہیں ملتی۔ باہر کی دنیا دیتی ہے، ماحول دیتا ہے اور یہ غلط راستے پر چلتے جاتے ہیں حتیٰ کہ ایک دن وہی ہوتا ہے جو آج ہوا ہے"

"اب ہم لوٹ کر وہاں نہیں جا سکتے" نازو نے افسوس سے کہا۔

"ظاہر ہے اب پولیس آئے گی، لوگوں کے بیانات لے گی اور معلوم کرے گی کہ ہم کہاں رہتے تھے۔ وہاں سے ان کو بہت کچھ مل جائے گا۔ میرے دونوں سوٹ کیس جن میں اسلحہ تھا اور بہت کچھ تھا:

"وہ سب خوش قسمتی سے نکل گیا" نازو نے کہا۔

میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"وہ لوگ جاتے وقت ساتھ لے گئے تھے"

"کیوں؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔

"پتا نہیں، محسن کا اصرار تھا۔ اس نے کہا کہ میری ساتویں حس کہتی ہے کہ اس قسم کا سامان یہاں نہیں ہونا چاہیے"

پریشانی کے باوجود میں مسکرایا "اس کی ساتویں حس اور میری چھٹی حس میں کبھی اختلاف نہیں ہوا۔ میں جب بھی کہتا تھا کہ میری چھٹی حس کیا بتا رہی ہے تو وہ فوراً اپنی ساتویں حس سے تائید کر دیتا تھا"

نازو مسکرانے لگی "آج غالب نے آٹھویں حس ایجاد کر لی۔ وہ محسن کے سامنے اینٹھ گیا کہ یہ میری آٹھویں حس نہ جانے کب سے کہہ رہی ہے۔ خیر پھر وہ متفق ہو گئے کہ اس اسباب کو وہیں اس گاڑی کے ساتھ چھپا دیں۔ وہاں کوئی نہیں پہنچتا"

میں نے اطمینان کا سانس لیا "چلو یہ اچھا ہوا"

"اچھا تو کم ہوا خرابی زیادہ ہوئی" اکرام شیخ بولا "اب کل خبریں چھپ جائیں گی تصویروں کے ساتھ"

"تصویر کس نے لی؟" میں نے کہا۔

"تم تو مصروف تھے مار دھاڑ میں، تمہیں پتا نہیں چلا"

"مگر وہاں کون تھا؟"

"مجھے کیا معلوم؟ میں تو فلیش لائٹ پر چونکا تھا" اکرام شیخ نے کہا "مجھے میں تصویر اُتارنے والا دکھائی نہیں دیا"

ایک ہی تصویر اتاری تھی یا..."

"دو فلیش تو ہوئے تھے" اکرام شیخ بولا۔

میں نے سر پہ ہاتھ مارا "اسے کہتے ہیں بلاوجہ کی شامتِ اعمال۔ وہ خود بھی مرے، ہمیں بھی مروا دیا۔ میرا خیال ہے کوئی اخباری نمائندہ گزر رہا ہوگا ادھر سے۔ اسے بہترین خبر مل گئی۔ اب وہ کڑی سے کڑی ملائیں گے اور خبر آئے گی کہ تھانے سے مار دھاڑ کر کے فرار ہو جانے والی حسینہ کا ایک اور سنسنی خیز کارنامہ۔ شیخ تو اس معرکے میں شریک ہی نہیں تھا۔ میری اور تمہاری تصویر اس نے اتار لی۔ تمہارا ریکارڈ تو زیادہ پرانا نہیں۔ میرا ریکارڈ بھی وہ نکال ہی لیں گے"

شاہراہِ لیاقت تک پہنچنے سے پہلے ہی ہمیں ایک ٹیکسی مل گئی اور بیس منٹ بعد ہم کوئنز روڈ کی بیرکس کے قریب پرانے حاجی کیمپ پر اُتر گئے۔ یہاں سے وہ جگہ چند منٹ کی پیدل مسافت پر تھی جو مجھے مختار نے انتہائی سنفرت کر کے دکھائی تھی اور جہاں ہماری راجا سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔

راستے میں بات کرنے کا کوئی موقع نہیں ملا تھا اور ابھی تک بہت سی باتیں جواب طلب تھیں مثلاً یہ کہ نازو کس طرح حاجی عبدالرحمان کا تعاقب کرنے میں کامیاب ہوئی تھی۔ ہماری لانچ اب کہاں ہے اور شکاری اب کیا کر رہے ہیں۔ چوہدری دلاور اور جانو بھائی کے گروپ اور اسلحہ لے جانے والے جہاز "ایس ایس کرانتی تھرڈ" کی روانگی کے بارے میں معلومات کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا جس کے بارے میں اطمینان سے بیٹھ کے ہی بات کی جا سکتی تھی۔

تھکن اور بھوک سے بھی میرا بُرا حال تھا اور تازہ ترین واردات کے بعد میں فوری طور پر سکون کے چند گھنٹے سو کے بھی گزارنا چاہتا تھا۔ ہمارا قید ہونا ہی کم آفت نہ تھا کہ رہائی ملتے ہی نئی آفت آ پڑی جس نے میرے اعصاب کو مزید متاثر کیا۔

وہ تینوں بیرک کے اندر ایک قطار میں دیوار سے ٹیک لگائے اور گرد آلود فرش پر پیر پھیلائے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے پھیلے ہوئے اسباب خورد و نوش کو دیکھ کے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ دعوت اُڑا چکے ہیں۔ موہنی سب سے الگ دوسرے کنارے پر سو رہی تھی۔

"آ گئے شہزادہ، بڑی کرپا کی" محسن نے سگریٹ کا دھواں چھوڑ کے کہا "ہم تو سمجھے تھے، کیا سمجھے تھے بھئی؟"

"یہی کہ اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں" غالب نے کہا "ویسے تو آپ حضرات و خواتین کی سنجیدہ صورت دیکھ کے ہنسی آتی ہے"

"ہم سنجیدہ نہیں رنجیدہ ہیں" میں نے محسن کو ڈانٹتے ہوئے کہا اور اس کے مقابل بیٹھ گیا "اکیلے زہر مار کر لیا"

"نہیں یار، تمہارا نام لے کے پہلے نیاز دی تھی" محسن بولا "اور یہ بھی کہا تھا فاتحہ کے بعد کہ اے خدا یہ سب ان کے نام کا صدقہ سمجھ کے قبول فرما" غالب نے کہا "مگر تم لوگ تو لوٹ آئے خیریت سے"

"اور کیا نہ آتے؟" نازو نے جھلا کے کہا "یہ نہیں پوچھتے کہ بعد میں کیا ہوا اور کیا نہیں ہوا؟"

"وہ تو ہمیں معلوم ہے" غالب نے کہا "تم کوئی گُل کھلائے بنا رہ ہی نہیں سکتے"

میں نے بلاتکلف بچا ہوا کھانا اپنی طرف کھینچ لیا "آج ہم نے وہ کیا ہے جو طارق نے اندلس کے ساحل پر کیا تھا۔ موہنی نے کچھ کھایا؟"

"ہاں، مگر تم کو اندلس جانے کا مشورہ کس نے دیا تھا۔ سیدھے گھر بھی جا سکتے تھے۔ کیا ساری کشتیاں جلا دیں؟" غالب نے کہا۔

میں نے اقرار میں سر ہلایا "واپسی کی اب کوئی صورت نہیں... مرزا غالب" میں نے کہا "نکل آئے وہاں سے یہی بہت سمجھو۔"

ہیڈلائن تھی۔ تفصیلات کے لیے انتظار فرمائیے"

کھانے سے فراغت کے بعد میں تو سگریٹ جلا کے لمبا لیٹ گیا اور اکرام شیخ نے مختصراً سارا واقعہ سنانے کی کوشش کی تھی مگر پھر اسے طیش آ گیا اور اس نے خاصا دھواں دھار بیان دیا۔

"چلو یار، جان بچی سو لاکھوں پائے" محسن نے کہا۔

"ہاں، نہیں جائیں گے وہاں۔ ایک دن ایسا آئے گا کہ کہیں بھی جانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ سوائے بڑے گھر کے اور یا پھر وہیں جہاں سب کو جانا ہے"

"تم ہوتے وہاں تو..." نازو نے غصے سے کہا "بہت چہک رہے ہو یہاں بول رہے ہو"

"دیکھو بی بی! ہم تو تمہارے بھلے کو کہتے ہیں۔ یہ جو تم نے طور طریقے اپنائے ہیں نا، مار دھاڑ اور اٹھا پٹخ کے۔ ان کا انجام معلوم ہے کیا ہوگا؟" غالب نے کہا۔

"ہاں، میں دیکھ رہا ہوں دوست کہ تمہارا مستقبل نہایت مخدوش، لنگڑا لولا اور لوٹا پھوٹا ہے" میں نے کہا "تم کو ابھی سے ایک وہیل چیئر اور دو بیساکھیاں تو خرید ہی لینا چاہئیں"

"اور حادثاتی موت کا بیمہ تو فوراً کرا لینا چاہیے" محسن نے میری حمایت میں کہا۔

"احتیاطاً ایک کتبے پر یہ لکھوا کے رکھ لو۔ قتلِ عاشق کسی معشوق سے کچھ دُور نہ تھا۔ پر ترے عہد سے آگے تو یہ دستور نہ تھا"

نازو اور غالب دونوں کا خفت سے بُرا حال ہو گیا۔ اکرام شیخ نے ان کی یوں مدد کی کہ فوراً موضوع بدل دیا۔

"کسی کو معلوم ہے اس لانچ کے بارے میں؟"

"مجھے معلوم ہے" نازو نے کہا "لانچ اب وہاں نہیں ہے جہاں تھی"

"لاحول ولا قوۃ... پھر کہاں ہے؟"

"یہ تو مجھے نہیں معلوم" وہ بولی "ان دونوں سے پوچھنا جو رشتے سے ان کے گئے تھے۔ راجا جی اور اپنے مرزا غالب"

"اپنے مرزا غالب آ ہم۔ چلو اچھا ہوا تم نے ہمیں غیر ڈیکلیئر کر دیا" میں بولا۔

"بھئی سب تو اپنے نہیں ہو سکتے نا" محسن نے مجھے ٹوکا۔

"ہم سے ایک غلطی ہوئی" غالب نے فوراً بات گول کر دی۔

"صرف ایک غلطی" میں نے کہا "آپ ایسی غلطی کی طرف تو اشارہ نہیں کر رہے ہیں جو جوانی میں سب کرتے ہیں"

"بھاڑ میں جائیں آپ سب" غالب اٹھ کھڑا ہوا "آپ سے پہلے میں جاتا ہوں" وہ واک آؤٹ کر گیا "خبردار جو کوئی میرے پیچھے آیا"

میں نے ایسی سوالیہ نظروں سے نازو کی طرف دیکھا کہ وہ خود ہی مطلب سمجھ لے۔ اس کا رنگ لال پڑ گیا۔

"بہت زیادتی کرتے ہیں آپ لوگ بھی" وہ رونے کے قریب ہو گئی تھی۔

"آج تک تمہیں روتے نہیں دیکھا۔ کتنی عجیب بات ہے"

"بالکل، ورنہ لڑکیاں تو ذرا ذرا سی بات پر رونے کی ایسی ماہر ہوتی ہیں کہ خیر چھوڑو، یہ بتاؤ اُس حاجی کا کیا بنا؟"

"آملیٹ" میں نے بتایا۔

"کیا معلوم ہوا؟ کوئی کام کی بات؟"

"یہی تو افسوس ہے" میں نے نفی میں سر ہلایا "اگر زندہ رہا تو تمام عمر روبوٹ کی طرح اپنے ہاتھ استعمال کرے گا۔ سالے نے کچھ نہیں بتایا"

"اب کہاں ہے؟"

"انہی کے پاس" میں نے کہا "جن کا وہ ایجنٹ تھا۔ راجا تم بہت گم صُم بیٹھے ہو۔ کیسا لگا یہ پہلا تجربہ؟"

"یہ گُم ہوگا اسی یہودی کی بیٹی کے تصور میں"

"حق ہے" راجا نے آہ بھر کے کہا "کاش میں اپنی داستانِ شجاعت اسے سنا سکتا اور یقین تو خیر وہ نہ کرتی مگر اس کے باپ کو ضرور پریشانی لاحق ہو جاتی کہ یہ سالا کنگلا عاشق تو بڑا پاٹے خاں ہو گیا ہے"

"ڈیئر پاٹے خاں! تمہارے ساتھ لانچ پر کیا ہوا تھا؟"

"ہونا کیا تھا، ہم تمہیں تلاش کرتے ہوئے گئے تھے۔ میں نے تو غالب سے کہا تھا کہ گڑبڑ کی کیا بات ہے"

"ہاں، مرتے ہیں تو مر جائیں، جہنم میں جائیں"

"یار کمال ہے" راجا نے خفگی سے کہا "ہر بات کا الٹا مطلب نکال لیتے ہو۔ میں نے تو جب لانچ کو وہیں موجود دیکھا تو کہا تھا کہ ظاہر ہے سب خیریت ہے۔ وہ لوگ کسی اور کام سے کہیں گئے ہوں گے۔ غالب نے اصرار کیا کہ لانچ پر جا کے دیکھنا چاہیے۔ غالب آگے تھا اسی کے سر پہ پہلے ڈنڈا پڑا۔ میں تو بھاگ گیا تھا مگر پیچھے ایک اور فرشتۂ اجل موجود تھا۔ اس نے مجھے دبوچ لیا اور بس ہم بھی وہیں پہنچ گئے"

"اور نازو... وہ دُور کھڑی تماشا دیکھتی رہی؟"

"اس نے بلاشبہ ثابت کیا کہ عورت ذات ناقص العقل نہیں ہوتی" راجا بولا "ویسے وہ یہودی کی بیٹی تو ہے۔ نازو کے بارے میں ہمیں بھی علم نہیں تھا کہ ہمارے پیچھے آئی ہے۔ وہ لانچ پہ نظر رکھے ہماری واپسی کی منتظر تھی کہ اس نے پیڈرو کو اور حاجی کو ایک ساتھ دیکھ لیا۔ پیڈرو لانچ پہ گیا تو واپس نہیں آیا اور لانچ روانہ ہو گئی۔ نازو اس حاجی کے پیچھے لگ گئی۔ اکرام شیخ کی ٹیکسی باہر موجود تھی۔ اس نے ڈپلی کیٹ چابی استعمال کی اور حاجی کی گاڑی کا تعاقب کیا۔ وہ حاجی پانی پینے کے بعد سیٹھ اکبر کے گھر گیا اور نازو نیچے انتظار کرتی رہی۔ حاجی واپس آیا تو اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ دونوں سیاہ فام تھے۔ نازو کا کہنا ہے کہ اس وقت وہ حبشی نہیں لگتے تھے۔ سیاہی وغیرہ انہوں نے بعد میں مُنہ پر ملی ہوگی۔

حاجی کی گاڑی جہاں بھی گئی. نازو نے تعاقب کیا اور یوں وہ اس جگہ تک آ پہنچی۔"

"آفرین ہے تم پر مس نازلی" میں نے کہا "کہ تم نے پہلی بار عقل سے کام لیا ورنہ تو ہمیشہ مرنے مارنے پر تلی رہتی ہو"

"سخت احسان فراموش ہو تم سب" نازو نے بگڑ کے کہا "جان بچالی ہے سب کی میں نے"

"وہ تو خیر اچھا کیا تم نے" میں نے کہا "مگر کیا یہ باہر سے کنڈہ لگانا تمہاری نادانی نہیں تھی"

"اور کیا کرتی میں؟ خود بھی اندر آجاتی، خالی ہاتھ"

"خالی ہاتھ کیوں، اس قسم کے حالات میں تو ہلکا پھلکا اسلحہ ساتھ رکھنا چاہیے مثلاً توپ اور ٹینک"

"میرے پاس کچھ نہیں تھا، میں نے بہتر سمجھا کہ اسے بھی وہیں بند کر دوں۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اندر کی پوزیشن کیا ہے۔ ایک دو سے میں خالی ہاتھ بھی نمٹ لیتی مگر یہ ممکن تھا کہ اس سے تمہیں نقصان ہو جاتا۔ ایسی صورت میں کہ وہ خود بھی قید ہو گیا تھا، یا اس کے ساتھی آتے اسے چھڑانے کے لیے یا وہ اندر تم لوگوں سے صلح صفائی کرتا اپنی جان بچانے کے لیے. یا خود بھی مرنا قبول کرتا۔ میں باہر منتظر تھی کہ کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا۔ مجھے وہ ایک بزدل آدمی لگتا تھا، بزدل اور کمینہ۔ میں یہ بھی سمجھ گئی تھی کہ وہ تم سے کوئی سودا کرے گا"

"یہ آپ نے کیسے سمجھ لیا تھا؟"

"وہ کھانے پینے کا سامان لایا تھا نا" نازو بولی "ظاہر ہے یہ عنایت بے سبب نہیں تھی"

"اگر وہ ہمیں مار دیتے اور دروازہ توڑ کے نکل جاتے؟"

"دروازہ آسانی سے ٹوٹنے والا نہیں تھا" وہ بولی "وہ نکل کیسے جاتے، میں جو باہر موجود تھی۔ ان دو غلاموں پر اچانک ٹوٹ پڑتی تو انہیں مقابلے کا موقع بھی نہ ملتا۔ حاجی تو بس گوشت کا پہاڑ تھا ایک لات پڑتی تو لیٹ جاتا"

"اور اگر ان کے ساتھی آجاتے؟"

"گزرتے تو میرے سامنے ہی سے" وہ بولی "کسی ایک پر قابو پا کے اسلحہ حاصل کر لیتی۔ یہ تو مجھے اندازہ تھا کہ یہاں فوج کی پوری بٹالین تو آنے سے رہی۔ آئے تو ایک دو ہی آئیں گے"

میں نے تعریفی انداز میں سر ہلایا "تمہارے اندازے غلط بھی ہو سکتے تھے مگر ہوئے نہیں۔ مجھے یہ فائدہ ہوا کہ دروازہ بند ہونے کی آواز پر وہ بے اختیار پلٹ گئے۔ ان کی توجہ ہم پر سے ہٹ گئی اور بس۔ میں نے موقعے سے فائدہ اٹھالیا"

غالب جو علامتی واک آؤٹ کے بعد ایوان میں لوٹ آیا تھا، نازو کو قابلِ ستائش نظروں سے دیکھتا رہا۔ اکرام شیخ نہ جانے کب باتیں سنتے ہوئے سو گیا تھا۔ محسن اونگھ رہا تھا۔ میں نے بھی کچھ دیر سو جانا بہتر سمجھا۔

موہنی کے قریب جا کے نازو بھی سو گئی تھی۔

جب میں جاگا تو بیرک میں تاریکی تھی۔ کھلے دروازے سے آنے والے مدھم اجالے میں مجھے سوئچ بورڈ نظر آیا تو میں نے لائٹ جلانے کی کوشش کی اور بورڈ کے ایک ٹوٹے ہوئے سوئچ کو بھی آن کرنا چاہا تو مجھے کرنٹ لگا۔

"اللہ۔" میں نے نعرہ مارا۔

نازو سب سے پہلے گھبرا کے اٹھی "کیا ہوا؟" پھر غالب اٹھ بیٹھا میں نے لائٹ جلاتے ہوئے کہا "کہاں کیا ہوا؟ کہیں بھی تو کچھ نہیں ہوا"

نازو نے غالب کی طرف دیکھا "کچھ تو ہوا تھا"

"ہوا نہیں ہو رہا ہے" میں نے کہا "اور جو کچھ ہو رہا ہے وہ میرے سامنے ہو رہا ہے، دن دہاڑے ہو رہا ہے۔ تم دونوں خواب بھی ایک جیسے دیکھ رہے تھے۔ اٹھے بھی ساتھ ہی، اب آنکھیں چار کرتے ہو۔ آخر یہ کیا ہے؟"

محسن نے آنکھیں کھول کے پھر بند کر لیں اور بولا "وہ اپنے حال سے تجھے آگاہ کیا کرے۔ جو سانس بھی نہ لے سکے وہ آہ کیا کرے"

"پھر چالو ہو گیا ریکارڈ" نازو نے کہا۔ پھر اس کی نگاہ دروازے کی طرف گئی "یہ وہ کیا ہے؟"

میں نے کھلے دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں ایک لفافہ پڑا ہوا تھا میں اسے اٹھانے لپکا۔ یہ سادہ مگر بند لفافہ تھا۔ اس کے اندر سے ایک مختصر سی تحریر پر مشتمل کاغذ کا پرزہ نکلا۔ اسے دیکھتے ہی میرے دل نے رابعہ کا نام لیا اور قلابازی کھائی۔ رابعہ نے لکھا تھا۔

'میری فکر نہ کرنا۔ اپنا کام کرو۔ رات ایک بجے سبزی منڈی میں ٹرک نمبر کے اے آر بہتر تہتر پر نظر رکھو۔ لانچ مل جائے گی'

"ہاہاہا۔۔ ہو ہو" میں نے چیخ ماری۔ ایک قلابازی کھائی اور پھر کھڑا ہو گیا۔ موہنی نے مجھے بڑی عجیب نظروں سے دیکھا مگر خاموش رہی۔

"اسے کیا ہوا؟" غالب بولا۔

"میرا خیال ہے، لفافے میں جن تھا" محسن نے تشویش سے کہا

"لفافے میں جن؟" موہنی نے پہلی دفعہ لب کھولے۔

"ہاں، جیسے پہلے بوتل میں بند کیے جاتے تھے جس نے بھی کھولا اس کی شامت" محسن بولا۔

غالب نے کہا "مجھے تو عشق کا بھوت نظر آتا ہے"

"آپ نے صحیح جان لیا پیر و مرشد" میں نے کہا اور وہ پرزہ غالب کو تھما دیا۔ ان سب نے بے حد اشتیاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے غالب کے قریب جا کے اسے دیکھا اور پھر ایک دوسرے سے چھین کے پڑھا۔

"یہ آیا کہاں سے؟"

"جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔ جب ہم سوئے تھے تو دروازہ بند تھا۔

پھر کسی نے دروازہ کھولا اور خط یہاں ڈال دیا مگر اتنا قریب آ کے کون لوٹ گیا؟" غالب بولا۔

"نامہ بر ہم سے مل کے پیغام زبانی بھی دے سکتا تھا" میں نے حسرت سے کہا

"چلو چھوڑو بحث" محسن نے کہا "یہ دیکھو کہ تحریر کس کی ہے کہیں یہ کوئی دھوکا تو نہیں"

"تحریر کے بارے میں تو میں اپنے دل کی جانب سے بیانِ حلفی داخل کر سکتا ہوں" میں نے مسرت سے کہا "کہ اس میں کوئی دھوکا نہیں"

"دل کے نام پر بہت دھوکے کھائے ہیں تم نے مسٹر سکندرِ اعظم عرف کے ٹو" محسن بولا "اس بات کی ضمانت کون دے گا کہ تحریر زبردستی حاصل نہیں کی گئی ہے"

"اگر ایسا ہوتا تو میرا دل گواہی نہ دیتا" میں نے کہا "اور تم بھی تو سوچو کر جو ہمیں دھوکے سے رات ایک بجے سبزی منڈی بلانا چاہتا تھا، اس نے ہمیں اسی جگہ کیوں نہیں پکڑ لیا۔ ہم تو سوئے پڑے تھے"

"تیری بات دل کو لگی چیف کے ٹو" محسن بولا "جو بھی یہ اطلاع دینے آیا وہ دشمن نہیں تھا"

"دوست تھا تو اس نے کیسے جانا کہ ہم یہاں ہوں گے؟"

"ٹیلی پیتھی سے" غالب نے بڑے یقین سے کہا "کیونکہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے"

"سوال یہ ہے کہ کیا اس اطلاع کو درست تسلیم کرتے ہوئے ہم کوئی قدم اٹھائیں گے" اکرام شیخ نے کہا۔

"ہم اسے نظر انداز کیسے کر سکتے ہیں" راجا نے کہا "یہ کام بھی آسان نہیں ہے، ہم سب کو مل کے کرنا ہوگا کیونکہ آدھی رات کے بعد سبزی منڈی میں بلا مبالغہ سیکڑوں ٹرک آتے جاتے ہیں۔ کوئی آدمی سب پر نظر نہیں رکھ سکتا۔ سب کو مختلف راستوں پہ پوزیشن سنبھالنا ہوگی"

"یہ تو گڑبڑ ہے" محسن بولا "فرض کرو ایک نے ٹرک کا نمبر نوٹ کر لیا تو وہ کیا کرے گا۔ اکیلا اس کے پیچھے جائے گا تو دوسروں کو کیسے مطلع کرے گا۔ ہمارے پاس ایک دوسرے سے رابطہ رکھنے کے لیے انٹر کام تو ہے نہیں"

"تمہاری یہ... کیا کہوں میں اسے" محسن بولا "اس کو یہ بھی تو بتانا تھا کہ ٹرک آئے گا یا جائے گا، بس نمبر لکھ دیا۔ ایک جملہ اور لکھتے ہوئے کیا انگلیاں ٹوٹتی تھیں"

"اب کیا معلوم رابعہ نے اتنا بھی کیسے لکھا۔ وہ کسی ریسٹ ہاؤس میں تو مقیم ہے نہیں" غالب نے کہا "اس میں بھی خطرہ ہوگا اور پھر ممکن ہے نامہ بر انتظار نہ کر سکتا ہو۔ اس نے تار کی زبان میں وہ سب لکھ دیا جو ضروری تھا اور اسے تھما دیا"

"او کے ہم ٹرک پر نظر رکھیں گے مگر اس کا تعاقب کرنا پڑا تو کیسے کریں گے" میں نے کہا "فرض کرو ہم یہ گاڑی نکالنے کا خطرہ بھی مول لیتے ہیں"

"اب اتنا خطرہ نہیں رہا۔ پولیس بھول چکی ہوگی اس کیس کو۔" محسن بولا۔

"پھر بھی دوسری گاڑی تو ہونی چاہیے۔ چار آدمی اگر چار سمتوں میں جانا چاہیں تو جا سکیں۔ یہ نہ ہو کہ تین کو ٹرک کے پیچھے دوڑ لگانا پڑے"

"ہم سینڈز پٹ سے وہ ٹیکسی واپس لانے کی کوشش تو کر سکتے ہیں" اکرام شیخ بولا "اگر راجا جائے"

"میرا تو باپ بھی نہ جائے" راجا نے کان پکڑ کے کہا۔

"ہم بھی ساتھ چلیں گے یار" میں نے چٹکی بجا کے کہا "اس گاڑی میں۔ اگر ٹیکسی نظر آگئی صحیح سالم تو کام بن جائے گا"

"اور وہاں وہ چشم براہ ہوئے تو؟"

"ان کی تو ایسی تیسی، ہم کیا خالی ہاتھ جائیں گے؟" میں نے کہا "جتنا اسلحہ ہے سب لے جائیں گے"

"حاضر اسٹاک میں چار دستی بم بھی ہیں علاوہ ایک اسٹین گن کے" محسن نے اتفاق کیا "ٹیکسی ملی تو دو اس میں واپس آئیں گے دو کار میں"

"اور دو گاڑیاں چار راستوں پر نظر رکھنے کے لیے کافی ہو سکتی ہیں" راجا نے کہا۔

"وہ کیسے؟ آدھی آدھی گاڑی دی جائے گی سب کو؟"

"نہیں، وہ دو طرفہ سڑک ہے" راجا نے کہا "جو ٹرک وہاں سبزی پھل وغیرہ لاتے ہیں، سب نیشنل ہائی وے کی طرف سے آتے ہیں نیو ٹاؤن کی طرف سے کوئی نہیں آتا۔ ایک چوک دوسری طرف بھی ہے، جہاں سے ایک راستہ نیشنل اسٹیڈیم کی طرف جاتا ہے۔ حسن اسکوائر ملتا ہے جہاں"

"ہم اس جغرافیے سے ناواقف ہیں" میں نے کہا۔

"میں سمجھ گیا" اکرام شیخ نے کہا۔

"دونوں گاڑیاں اس چوک سے ذرا آگے کھڑی ہوں۔ ایک جانے والی سڑک پہ، ایک آنے والی سڑک پر۔ تو یہ ناممکن ہے کہ ٹرک وہاں سے گزرے اور دکھائی نہ دے۔ ہر گاڑی میں دو افراد ہوں۔ دونوں پارٹیاں مسلح ہوں"

"ترکیب پسند آئی" میں نے کہا "اب یہ کس حد تک قابلِ عمل ہے، اس کا پتا رات کو ہی چلے گا۔ فی الحال تو میں فریش اپ ہونے کے موڈ میں ہوں"

"میں بھی نہا دھو کے کپڑے بدلنا چاہتا ہوں" غالب بولا۔

"میں بلیک کافی کے ساتھ کلب سینڈوچ کھانا چاہتا ہوں اور پھر ڈنر کرنا چاہتا ہوں"

سب ہو جائے گا... سب ہو جائے گا" میں نے انہیں تسلی دی "نلکا باہر ہے، باری باری جا کے نہاؤ۔ پھر میں گیراج سے

گاڑی نکالتا ہوں اور ہم سب نکلتے ہیں اپنے اپنے اوسان پورے کر لے۔"

اوپل ریکارڈ جو میں نے ملتان سے خریدی تھی، گرد و غبار سے کیں اور چھت میں آباد پرندوں کی غلاظت کے باعث پہچانی بھی نہ جاتی تھی۔ اس کے کاغذات محفوظ تھے جن میں میرا نام سعادت علی خان گویزی لکھا ہوا تھا اور اس کے ساتھ جو ڈرائیونگ لائسنس تھا اس میں بھی یہی نام درج تھا۔

ٹینک میں کافی پیٹرول تھا لیکن عرصۂ دراز سے بند رہنے کی وجہ سے لائن خشک ہو گئی تھی۔ مجھے گاڑی کو دھکیل کر باہر لانا پڑا۔ اسٹارٹ کرنے کی کوشش سے پہلے میں نے اس کو بڑی محبت سے دھویا اور چمکا دیا۔ یہ ایک بہت شاندار لگژری سیڈان تھی جو مرسیڈیز تو نہ تھی مگر اس سے مقابلہ کر سکتی تھی۔

ایئر کلینر ہٹا کے میں نے منہ سے پیٹرول کھینچا اور جب پیٹرول منہ میں بھر گیا تو کاربوریٹر میں پیٹرول سے کلی کر دی۔ راجا، غالب اور محسن نے اسے دھکا لگایا۔ پہلی کوشش میں انجن ڈیڈ رہا۔ بیٹری میں بالکل جان نہیں رہی تھی۔ انھوں نے پھر کوشش کی اور گاڑی نے تھوڑی سی اسپیڈ پکڑی تو انجن غرایا مگر بند ہو گیا۔

"شاباش... شاباش، بس ایک بار اور جوانو!" میں نے کہا مگر وہ ہانپ رہے تھے کیونکہ وہ بہت بھاری گاڑی تھی۔ مجھے گاڑی کو اور اس کے موجد کو اور تقدیر کو تھوڑا سا کوسنے کے بعد وہ پھر پیچھے متحد ہو کے اپنی قوت صرف کرنے لگے۔ اس مرتبہ گاڑی اسٹارٹ ہو گئی۔ میں نے خوشی کا ایک نعرہ لگایا اور گاڑی کو ریس دیتا رہا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ انجن پھر نہ رک جائے۔ اتنا عرصہ کھڑی رہنے والی گاڑی کی ٹیوننگ ٹھیک نہیں رہ سکتی تھی۔

وہ تیار ہو کے لوٹے تو نازو نے آگے والی سیٹ پر قبضہ کیا جو ہی کیٹس کے مطابق جائز تھا۔ تینوں حضرات نے پہلے ضروری سامان ڈکی میں رکھنے پر اصرار کیا۔

"ڈکی کھولنے کے لیے مجھے گاڑی بند کرنا پڑے گی۔"

"تو کر دو، پوچھنے کی کیا بات ہے۔" غالب نے کہا۔

"تمہاری مرضی، تم ہی پھر دھکا لگاؤ گے۔ بیٹری اتنی سی دیر میں چارج نہیں ہوتی۔" میں نے باہر آ کے کہا۔ "راجا اور موہنی کہاں ہیں؟"

"دھکا اب آپ لگائیں چیف کے ٹو۔" محسن بولا۔ "گاڑی اسٹارٹ ہو گئی ہے۔ راجا اور موہنی نہیں جا رہے، ہم نے بہت کہا۔"

انہوں نے دونوں سوٹ کیس ڈکی میں ڈالے۔ پھر میں نے بسم اللہ پڑھ کے اگنیشن میں چابی لگائی اور رکتے رکتے انجن اسٹارٹ ہو گیا تو میں نے قہقہہ مارا۔

"بڑے آئے مجھ سے دھکا لگوانے والے۔ ابے، آخر ہماری گاڑی ہے، ہماری فرمانبردار ہے، وفادار ہے۔ اتنی خوب صورت اور سبک رفتار ہے۔"

"یہ آپ کس کا ذکر کر رہے ہیں گاڑی کا یا بیوی کا؟" محسن نے کہا۔ "اور بیوی کا تو کس کی بیوی کا؟"

"آپ کی بیوی ان تمام صفات سے محروم ہے۔ برا مت ماننا۔" غالب نے کہا۔ "ہم جھوٹ نہیں بول سکتے۔"

"نہ جھوٹ نہ سچ، تم بول کیسے سکتے ہو۔ بندر کیا جانے ادرک کا سواد۔" محسن نے کہا۔

"تم خود کو بندر اور بیوی کو ادرک تسلیم کرتے ہو تو میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔" غالب نے کہا۔

"اب تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ تم نے سرِعام بے عزت کیا ہمیں اب فیصلہ ڈوئیل سے ہوگا۔" محسن بولا۔ "ایک دستی بم ہم ماریں گے ایک تم مارو گے۔ دس قدم مخالف سمت میں چل کر۔ قاعدے کے مطابق۔"

"لیکن ماریں گے کس پہ؟" غالب بولا۔

"کسی پر مار دیں گے مثلاً یہ راجا اپنے سسر کو وہاں لا کے کھڑا کر دے۔" محسن نے کہا۔ "اور ڈوئیل ہوگا تمہاری شادی کے بعد۔"

"چلو چلو۔" راجا نے کہا۔ "میرا ہی سسر ملا ہے تمہیں۔"

"ہاں یار، ہم سب بے سسر لوگ ہیں۔" محسن نے دردناک لہجے میں کہا۔

نازو ہنستی رہی، میں بھی ہنستا رہا اور گاڑی نے رات کا سفر جاری رکھا۔ ہم نے دل کھول کے سیر کی۔ بے خوفی سے ہر اچھی جگہ گئے اور رات کے دس بجے سینڈز پٹ کے لیے روانہ ہوئے تو سب اتنے خوش تھے کہ اداس ہو گئے تھے۔ انہیں یاد کر کے جو ہمارے ساتھ نہیں تھے ان میں رابعہ تھی اور شملا تھی اور استاد ٹیڈی تھا جو اپنی جگہ خلا چھوڑ گیا تھا۔

"موہنی کا تو خیر موڈ خراب ہے۔" محسن نے اچانک کہا۔ "مگر یہ راجا..."

"موڈ کیوں خراب ہے؟" میں نے اس کی بات کاٹ کے کہا۔

"تمہارے رویّے کی وجہ سے، راجا بھی اسی لیے نہیں آیا۔"

"یہ ایک مثلث بنتی ہے۔ موہنی کا موڈ خراب ہے میری وجہ سے اور راجا کا موڈ خراب ہو گیا موہنی کی وجہ سے۔" میں نے کہا۔ "یہ کیا بات ہوئی؟"

"پیچھے رکنا چاہتے تھے اپنے تھانیدار صاحب۔" محسن بولا۔ "کیونکہ موہنی کسی صورت ساتھ آنے پر تیار نہ تھی۔ انہیں تو ہم نے کھینچ لیا مگر ان کی وجہ سے راجا رک گیا کہ موہنی اکیلی کیسے رہے گی۔ ویسے بھی کہہ رہا تھا کہ فقیر کا دل بھر گیا ہے بابا ان اچھے ہوٹلوں کے کھانے سے۔"

خلافِ امید مجھے ٹیکسی اسی کھنڈر کے درمیان بالکل اسی حالت میں کھڑی نظر آئی جیسے ہم نے اسے چھوڑا تھا۔ یہ ناممکن تھا کہ پیڈرو کے ساتھ آنے والوں کو ٹیکسی دکھائی نہ دی ہو۔ انھوں نے تمام جگہ کی تلاش کی تھی۔ امکان اس بات کا تھا کہ وہ زیادہ دور نہیں آئے اور اس چار دیواری پر مشتمل بے چھت والے کھنڈر تک پہنچنے سے قبل ہی واپس چلے گئے یا انھوں نے زیادہ مستعدی نہیں دکھائی اور صرف انھی ہٹس میں ہمیں تلاش کیا جہاں چھپنے کی جگہ تھی۔

تاہم میرے ذہن نے دوسرے امکان کو بھی مسترد نہیں کیا کہ ٹیکسی کو دیکھ لینے کے باوجود انھوں نے اسے نقصان پہنچانے سے گریز کیا۔ اس امید میں کہ شاید ہم ٹیکسی کو واپس لے جانے کے لیے آئیں گے۔ اگر ایسا ہی تھا تو ہم نے انہیں مایوس نہیں کیا تھا اور یہ ہو سکتا تھا کہ وہ کہیں چھپ کر ہمیں دیکھ رہے ہوں اور خوش ہو رہے ہوں، اس شکاری کی طرح جو اپنے شکار کو دام کے قریب آتے دیکھتا ہے تو سمجھتا ہے کہ انتظار جھیلنے کی جدوجہد رائیگاں نہیں گئی۔

محسن نے میرے خیال سے اتفاق کیا اور ہم پیدل تو اس مقام سے سیدھے بہت آگے تک چلے گئے اور پھر واپس ہوئے تو گاڑی کو ہم نے ایک نئی تعمیر شدہ ہٹ کے عقب میں کھڑا کر دیا۔ ہمارا خیال تھا کہ جو کیس والا مترنم ہو گا مگر وہ سویا ہوا تھا یا موجود ہی نہیں تھا۔

تقریباً پون میل کا فاصلہ ہم نے الگ الگ رہ کے طے کیا۔ میں اور اکرام شیخ سمندر کے ساحل کی جانب سے گئے۔ محسن اور غالب نے سڑک کا راستہ اختیار کیا۔ نازو کار میں ہی موجود تھی مگر اس نے واضح کر دیا کہ ہم ایک گھنٹے میں نہ لوٹے تو وہ بھی نکل کھڑی ہو گی۔

"یار سکندر۔" اکرام شیخ نے رات کے سمندر کی گھن گرج میں کہا۔ "ایک بات پوچھوں؟"

"صرف ایک بات؟"

"تم موہنی کو رضیہ سلطانہ کیوں نہیں کہتے؟"

"اس لیے کہ میں اسے رضیہ سلطانہ نہیں سمجھتا۔" میں نے کہا۔

"مگر وہ کہتی ہے۔"

"وہ کہتی ہے نا۔" میں نے شیخ کی بات کاٹ دی۔ "وہ کچھ بھی کہہ سکتی ہے اور میں ہر سنی سنائی بات پر آمنّا و صدقنا کہنے کا قائل نہیں۔"

"تم ضرورت سے زیادہ وہمی اور شکّی ہو۔"

"یہ میرے حالات کا تقاضا ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر تم کچھ اس پر ضرورت سے زیادہ مائل بہ کرم ہو، آخر کیوں؟"

"اس کیوں کا جواب کون دے سکتا ہے۔" وہ بولا۔ "تم نے دیکھا کہ محض ہمارا اعتماد حاصل نہ ہونے کے باعث وہ سب کے درمیان رہ کے بھی خود کو اکیلا محسوس کرتی ہے۔"

"بن بلائے مہمان کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔"

"نہیں دوست، تم اس سے الرجک ہو گئے ہو خواہ مخواہ۔"

"خواہ مخواہ نہیں۔ اس کا کردار ایسا ہی رہا ہے۔" میں نے کہا۔

"رہا ہے کیا مطلب؟ میرا کردار پہلے کیا رہا ہے اور اب کیا ہے۔ شملا پہلے کیا تھی مگر اب کیا ہے۔ اُسے کوئی شریف زادی مانتا تھا مگر تم نے مانا اور اب وہ سب نام نہاد شریف زادیوں سے ارفع ہے۔ ان سب سے بڑھ کر استاد ٹیڈی کی مثال ہے، خدا اسے جنت نصیب کرے، کیا وہ ایک بدمعاش نہیں تھا۔ دوسرے تو خیر ایسا سمجھتے ہی تھے مگر وہ خود بھی اپنی بدمعاشی پر ناز کرتا تھا۔ استاد ٹیڈی اس دور کا نام تھا۔ جو باقی تھا مگر کیا اس کا وہ کردار باقی رہا؟"

میں لاجواب ہو گیا۔ "تم موہنی کی وکالت کیوں کر رہے ہو؟"

"اس لیے کہ اس کے ساتھ بہت ہتک آمیز بلکہ ذلت آمیز سلوک ہو رہا ہے صرف تمہاری وجہ سے۔"

"میں نے کسی کو منع تو نہیں کیا۔"

"منع نہ کرنے سے کیا ہونا ہے، تمہارے جذبات کا رخ دیکھتے ہوئے دوسرے بھی اس کے ساتھ حوصلہ شکن رویّہ اختیار کرنے پر مجبور ہیں۔ وہ جب سے آئی ہے تنہا ہے۔ صرف نازو اس سے بات کر لیتی ہے باقی سب تو اس کی طرف نظر اٹھا کے دیکھتے تک نہیں۔"

"تم تو دیکھتے ہو نا، اسی لیے یہ سب جانتے ہو۔"

"ہاں، میں دیکھ رہا ہوں اور محسوس کر رہا ہوں کہ وہ اپنی ہر کوشش میں ناکام ہو جانے کے بےحساب مایوسی اور دل شکستگی کا شکار ہے اور اس نے نازو سے کہا بھی ہے کہ میری تو ساری زندگی ضائع ہی ہو گئی۔ میں نے جذبات کے اندھے کنویں میں چھلانگ لگا دی اور اپنا سب کچھ ہار دیا۔ میں اپنوں سے جدا ہو گئی۔ سب رشتوں سے محروم ہو گئی۔ اپنوں کی نگاہ میں غیر ٹھہری اور آخر میں کیا ملا! جن کو اپنا جانا انھوں نے مجھے اپنانے سے انکار کر دیا۔"

"تم خود سوچو یار۔ میں اس کی خاطر رابعہ کو چھوڑ دوں! یہ کوئی گھر بدلنے کی بات تو نہیں ہے کہ میں محبت بدل لوں۔"

"وہ کب تم سے کچھ مانگ رہی ہے۔ اس نے رابعہ اور تمہارے تعلق کی حقیقت کو ایک ناقابلِ شکست سچائی جان کے بھی تسلیم کر لیا ہے۔ وہ تو صرف اعتبار مانگتی ہے۔ اسے صدمہ ہے کہ تم اس سے نفرت کرتے ہو۔ اس کی صورت دیکھنا اور اس کے وجود کو برداشت کرنے کے روادار نہیں اور یہ سراسر ظلم ہے۔ اس نے نازو سے کہا تھا کہ اب زندہ رہ کے بھی کیا کرنا ہے۔ مجھے تو مر جانا چاہیے اتنی ذلت اٹھانے کے بعد اور آہستہ آہستہ اس کا یہ خیال راسخ ہوتا جا رہا ہے۔ جانتے ہو میں کیوں تمہارے ساتھ آ گیا اور راجا کیوں نہیں آیا؟"

"کیا راجا اسے جذباتی سہارا دینے کے لیے کوئی رومان پرور ڈراما کرے گا؟" میں نے طنز کیا۔ "اسے یقین دلائے گا کہ کوئی اسے ضرور چاہتا ہے جس کی خاطر اسے زندہ رہنا ہو گا۔"

وہ ہمارے ساتھ آنے پر کسی صورت رضامند نہ تھی اور مجھے اس کے انکار سے کچھ خوف آیا۔ میری چھٹی حس سمجھ رہی ہے۔"

"چھٹی حس میری ہے، ساتویں محسن کی اور آٹھویں غالب کی۔" میں نے کہا۔

"چلو میری نویں حس کا کرشمہ سمجھ لو اسے کہ مجھے خطرہ محسوس ہوا۔"

"کس قسم کا خطرہ؟"

"یہ خطرہ کہ ہماری عدم موجودگی میں وہ کچھ کر گزرے گی۔"

"تو پھر راجا کیا کرے گا؟" میں نے کہا۔ "اسے یقین دلائے گا کہ پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ۔ ایک نہ ایک دن سکندر رمتا را ہو جائے گا، اگر تمہاری محبت سچی ہے۔"

"وہ اسے یقین دلائے گا کہ میں اسے چاہتا ہوں۔"

میں اچھل پڑا۔ "تم... تم غلط کہہ رہے ہو۔ میرا مطلب ہے کہ صرف اسے سہارا دینے کے لیے جھوٹ موٹ کی چاہت کا اقرار کرنا چاہتے ہو۔"

"میں صرف چاہت کا اقرار کرنا چاہتا ہوں۔" وہ بولا۔ "کیا چاہت جھوٹی بھی ہوتی ہے، مجھے اس کا تجربہ نہیں۔"

میں حیرانی سے اسے دیکھتا رہا۔ "تھانیدار صاحب! کیا تمہاری عقل گھاس چرنے چلی گئی ہے؟"

"کیا عشق میں سب کی عقل گھاس چرنے نہیں چلی جاتی؟"

"مگر دوست، تم اسے... میرا مطلب ہے کہ جمعہ جمعہ آٹھ دن ہی ہوئے ہیں۔" میں نے کہا۔

"محبت تو ایک نگاہ میں ہو جاتی ہے۔" وہ بولا۔

"لو ایٹ فرسٹ سائٹ۔" میں نے غیر سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "تم اس کے قائل معلوم نہیں ہوتے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "محبت کا جذبہ دل میں ننھی آرزو کی طرح پھوٹتا ہے، اپنے وجود کا احساس دلاتا ہے مگر اسے بڑھ کر تناور درخت بننے کے لیے اور اپنی جڑیں روح کی گہرائی تک گاڑنے کے لیے سازگار حالات، جذبات اور احساسات کی مطابقت اور خیالات کی ہم آہنگی، مزاج اور طبائع کی یکسانیت، ایک دوسرے کو سمجھنے کی مہلت اور خود کو سمجھانے کے مواقع۔ ان سب کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ دل کا معاملہ ہے مگر عقل اگر رہنما نہ ہو تو محبت فلمی ضرور ہو سکتی ہے، حقیقی اور دائمی اور مکمل نہیں ہوتی۔"

"آپ بجا فرماتے ہیں۔" شیخ نے کہا۔ "چونکہ آپ کے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ اس لیے آپ نے فرض کر لیا ہے کہ ایسا کہیں بھی نہیں ہوتا اور ہو ہی نہیں سکتا حالانکہ دنیا اس حقیقت کو مانتی اور جانتی ہے کہ بس اک نگاہ میں ہوتا ہے فیصلہ دل کا۔"

"شعر! پھر شعر! یار تھانیدار صاحب: خدا کے لیے تم تو شاعری کو بخشش دو۔"

"تم مذاق اڑا سکتے ہو میرا۔" اکرام شیخ آزردہ ہو گیا۔ "مگر میں جانتا ہوں....."

"کیا جانتے ہو؟" میں نے کہا۔ "یہی کہ تم کچھ نہیں جانتے۔"

"تم جانتے ہو نا کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے؟"

"ہاں، ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔

"تو میں بھی جان چکا ہوں کہ..."

میں چلتے چلتے رک گیا۔ "کہ وہ بھی تمہیں چاہنے لگی ہے؟"

"میں نے یہی جاننے کے لیے راجا سے کہا تھا اور راجا اسی لیے پیچھے ٹھہر گیا۔"

"وہ عدالتِ عشق میں تمہارا مؤکل ہے، تمہاری پیروی کرے گا۔" میں نے کہا۔ "اچھا وکیل منتخب کیا ہے تم نے، ایک زبردست ایکٹر ہے وہ۔"

"وہ ایک ایسا عاشق ہے، جس کے عشق کو تم سب پاگل پن کہتے ہو کیونکہ جو کچھ اس نے محبت کی خاطر کیا، وہ تم کبھی نہیں کر سکتے تھے نہ تم، نہ محسن، نہ کوئی اور۔"

اس نے عمداً غالب کا نام نہیں لیا۔ "اچھا، اگر یہ خیالات ہیں تمہارے تو میری دعائیں اور نیک تمنائیں تمہارے ساتھ ہیں۔"

"اس کی ضرورت موہنی کو زیادہ ہے۔"

"اس کے لیے بھی۔ کوشش کروں گا کہ میرے جذبات وہ رہیں جو اب ہیں اور دریں حالات کہ تم اس پر فریفتہ ہو، میں مجبور ہوں۔"

"کوئی مجبوری نہیں تمہیں۔" وہ بولا۔ "تم موہنی پر اعتماد نہیں کر سکتے تو تمہاری مرضی۔ ہم تمہارے راستے سے ہٹ جائیں گے۔"

"ہم! یہ جمع کا صیغہ؟"

"ہاں، میں موہنی سے شادی کر لوں گا اور واپس چلا جاؤں گا۔ پھر ہماری دعائیں اور نیک تمنائیں تمہارے ساتھ ہوں گی۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ "یار اکرام شیخ! عقل کے ناخن لو۔ تم اس انتہا تک جانے کی سوچ رہے ہو!"

"میں مجبور ہوں۔" اس نے میرے الفاظ لوٹاتے ہوئے کہا۔

"کوئی مجبوری نہیں تمہیں، تم جا سکتے ہو۔"

اس کا چہرہ اتر گیا۔ شاید اسے مجھ سے دو ٹوک فیصلے کی امید نہیں تھی۔

"مگر ہمارے ساتھ۔" میں نے جملہ مکمل کیا۔ "ہمارے اعتماد کے ساتھ۔ ہمیں تمہاری ضرورت ہے، تمہاری نیک تمناؤں کی اور دعاؤں کی نہیں تھانیدار صاحب۔" میں نے اس کی کمر پر ایک مکا مارا۔ اس کا چہرہ دمکنے لگا۔

اچانک رات کی خاموشی کو ایک فائر کی آواز نے منتشر کر دیا۔ میں نے ایک سائے کو اس ہٹ سے لپکتے دیکھا جس کے سامنے ہم کھڑے ہوئے تھے۔ اس کے بعد دو ہٹس چھوڑ کے وہ کھنڈر تھا جس میں ٹیکسی کھڑی ہوئی تھی۔

بے اختیار میں اور اکرام شیخ اسی طرف لپکے۔ بھاگنے والا سڑک کی

طرف رواں تھا اور اس کی چال اجنبی تھی۔ ریوالور میں نے بھی نکال لیا تھا اور اکرام شیخ نے بھی۔ یکلخت آگے دوڑنے والا پلٹا۔ ایک ساتھ ہم دونوں نے ساحل کی ریت پر گر کے قلابازی کھائی اور پھر اٹھ کھڑے ہوئے۔ فائر ہم پر ہی کیا گیا تھا۔ بھاگنے والا ہم سے تقریباً سو گز آگے تھا لیکن دھند میں لپٹی ہوئی چاندنی میں اس کی صورت کے خدوخال واضح نہ ہوتے تھے۔ پھر کسی اور سمت سے غالب یا محسن نے گولی چلائی اور بے تحاشا دوڑنے والا منہ کے بل گر گیا۔ اس کے دوبارہ اٹھنے میں کچھ وقت لگا اور اتنی دیر میں ہم اس کے بہت قریب جا پہنچے۔

اب وہ دوڑنے کے قابل ہی نہیں رہا تھا کیونکہ گولی اس کے پاؤں میں لگی تھی۔ وہ ایک پرانی فاکس ویگن تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا جو بظاہر لاوارث کھڑی نظر آتی تھی مگر ایسی بہت سی گاڑیاں ہٹس کے باہر موجود تھیں۔ ان کے مالک اپنے اپنے عشرت کدوں کی روشنی بجھائے خواب بستہ تھے یا خواب میں جی رہے تھے۔

اب میں نے اسے پہچان لیا تھا۔ یہ وہی ڈرائیور تھا جس نے کراچی پہنچتے ہی مجھے گرفتار کرانا چاہا تھا مگر بدقسمتی کے باعث وہ خود گرفتار ہو گیا تھا۔ اسی نے فرار ہو جانے کے بعد افتخار کو قتل کرنے والوں کی رہنمائی کی تھی اور وہ بعد میں مجھے سیٹھ اکبر کے ساتھ بھی نظر آیا تھا۔ وہ حاجی عبداللہ کا ملازم تھا اور اپنے آقا کے اعتماد پر پورا اترا تھا شاید اسی اعتماد کی وجہ سے اس کو یہاں چھوڑا گیا تھا کہ وہ مجھے جانتا تھا اور میرے ساتھیوں کو بھی۔

"رک جاؤ۔" غالب نے چلا کے کہا۔ "ورنہ دوسری گولی سے کھوپڑی اڑا دوں گا۔"

نشانے کی مہارت میں غالب ہم سب میں فوقیت رکھتا تھا مگر یہ بات جان بچا کے فرار ہونے والا نہیں جانتا تھا۔ اس نے آخری کوشش کی اور فاکس ویگن کا دروازہ بھی کھول لیا۔ وہ بلاشبہ زبردست قوتِ برداشت کا مالک تھا کہ ایک زخمی ٹانگ کے ساتھ بھی دوڑتا رہا اور مقابلہ بھی کرتا رہا۔

اب یہ ناممکن تھا کہ وہ فوراً فرار ہو سکتا۔ دروازہ کھول کے گاڑی میں پہنچنے اور اسے اسٹارٹ کرنے کے عمل میں وقت لگتا تھا۔ اس نے ہمیں دور رکھنے کی آخری کوشش کی اور پھر فائر کیا لیکن اس حالت میں کہ وہ حواس باختہ تھا، محصور ہو چکا تھا اور زخمی تھا، اس کا نشانہ کیسے درست ہو سکتا تھا۔

میں نے اسے جا لیا۔ اکرام شیخ میرے ساتھ تھا۔ پھر غالب اور محسن ایک دیوار کے اوپر سے کودے اور انھوں نے دوسری طرف سے محاصرہ کر لیا۔

"تم وہی خبیث ہو نا۔" میں نے اس کا ہاتھ تھام کے جھٹکا دیا تو ریوالور نیچے گر گیا۔ "تم سے تو مجھے پرانا حساب برابر کرنا ہے۔" میں نے اسے باہر کھینچ لیا۔

"یہ اچانک کیسے بھاگ نکلا؟" اکرام شیخ نے کہا۔

"ہم اس کے سر پہ پہنچ گئے تھے۔" غالب نے کہا۔ "یہ ٹیکسی کے انجن میں کچھ کر رہا تھا۔ اس نے آہٹ سن لی۔"

"تم نے دیکھا، ٹیکسی میں کیا فٹ کیا ہے اس نے؟"

"ابھی چل کے دیکھ لیتے ہیں۔" غالب نے کہا۔ "اسی کے ساتھ۔"

"بم فٹ کیا ہوگا اور کیا۔" محسن بولا۔

زخمی ڈرائیور اپنی شکست تسلیم کر چکا تھا۔ اس نے خود کو چھڑانے یا مقابلہ کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ جب میں نے اسے دھکیلا تو وہ لنگڑاتا ہوا آگے چلنے لگا۔ اکرام شیخ اور محسن ہم سے آگے نکل گئے۔

"میں اس پر پٹی باندھ لوں۔" اس نے کچھ اور چلنے کے بعد کہا۔ اب اس کے زخم سے کافی خون بہہ چکا تھا اور وہ اس کی تکلیف بھی محسوس کر رہا تھا۔ میں نے اسے جیب میں سے رومال نکال کر دیا جسے اس نے دو بار بل دے کر ٹانگ پر باندھ لیا۔ گولی اس کی پنڈلی کے نچلے حصے پر لگی تھی مگر اس نے صرف گوشت ادھیڑا تھا۔ ہڈی بچ گئی تھی ورنہ وہ چلنا تو درکنار سیدھا کھڑا ہونے کے قابل بھی نہ رہتا۔

سامنے سے ہم نے نازو کو آتے دیکھا۔ فائرنگ کی آواز پر وہ پریشانی کے عالم میں دوڑتی آ رہی تھی۔ "کیا ہوا؟ تم ٹھیک تو ہو نا؟"

"ہاں، سب ٹھیک ہیں۔"

"سوائے میرے۔" غالب نے کہا۔ "میرا حال خراب ہے۔"

"ٹھیک کر دوں میں تمہارا حال اور مزاج۔" نازو نے کہا۔

"لاحول ولا قوۃ یعنی تم پر تو بھوت سوار رہتا ہے ہر وقت۔"

"تم اپنے آپ کو بھوت کہہ رہے ہو یا اپنے خیال کو۔" میں نے کہا۔

"یہ دل لگی خاک دل سے راہ ہوتی ہے۔" غالب بولا۔ "ہم مرے جاتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ حال اچھا ہے۔ الٹا مارنے پر کمربستہ ہیں۔ یعنی میں کہہ رہا ہوں کہ حال خراب ہے تو کم سے کم پوچھو کہ کیوں؟"

"وجہ معلوم ہے مجھے۔" نازو ٹھنک کے بولی۔ "موسم کا اثر ہوگا، پھر یا ماحول کا۔"

"جی نہیں، یہ معدے پر کھانے کا اثر ہے۔" غالب نے خفگی سے کہا۔ "پیٹ میں خانہ جنگی کے سے آثار ہیں۔"

"چلو کوئی بات نہیں، سمندر قریب ہے۔" میں نے کہا۔

"تھوڑا کھانا تھا نا۔" نازو بولی۔ "کتنے دن کا راشن بھرا تھا؟"

"تمہیں کیا، مجھے اب ہیضہ ہو گیا ہے۔ صبح تک میں فوت ہو جاؤں گا۔" غالب نے کہا۔

"انشاءاللہ۔" نازو نے کہا۔ "اس کا مطلب ہے اگر اللہ نے چاہا۔ نہ چاہا تو ظاہر ہے کچھ نہیں ہوگا کسی کے چاہنے سے۔"

"تم چاہتی ہو کہ میں مر جاؤں۔" غالب نے چیلنج کے انداز میں

کہا۔ "احمق سمجھ رکھا ہے مجھے۔۔۔ میں تم پر مرتا ہوں اس لیے مر نہیں سکتا۔"

"میرے ساتھ بھی نہیں" نازو ہنس پڑی۔

"تم مرنے والوں میں نہیں، مارنے والوں میں ہو مگر پھر بھی تم اچانک سنجیدہ ہو گئی ہو تو میں بھی تیار ہوں۔ سن دو ہزار پچاس میں تمہارے ساتھ مرنے کو۔"

"یعنی اسّی سال بعد۔ اتنے تھوڑے سے دن جی کر کیا کریں گے؟" نازو نے طنز سے کہا۔

"بہت سے کام ہیں۔ کالے پیلے لال" غالب آہ بھر کے بولا۔ "مثلاً بیٹیوں نواسیوں کے ہاتھ پیلے کرنے ہوں گے اور بیٹوں پوتوں کا منہ کالا کرنا ہوگا۔ پھر حج کی سعادت سے سرخ رو ہوں گے۔"

"غالب کے بچے!" نازو چلائی۔

"ہاں ہاں، غالب ہی کے بچے ہوں گے اور ان کے بچوں کے بچے" غالب نے کہا "بس تم ہاں۔۔!"

اس سے پہلے کہ ساحل سمندر پر چاندنی رات میں غالب کو تارے نظر آتے ہم نے اکرام شیخ کو دوڑ کر اپنی طرف آتے دیکھا۔ محسن اس کے پیچھے تھا۔

"خدا نے بچا لیا یار" اکرام شیخ بولا "ورنہ آج ہم شہید ہوتے۔"

"یہ دیکھو" محسن نے مجھے ایک چیز دکھاتے ہوئے کہا جسے میں نے فوراً شناخت کر لیا۔ "یہ ڈائنا مائیٹ اسٹک لگا رہا تھا۔"

"انجن میں ڈائنا مائیٹ لگایا تھا اس نے" اکرام شیخ نے جذبات سے مغلوب ہو کے ملزم کے ایک جھانپڑ مار دیا۔

"کنکشن ملایا گیا تھا اگنیشن سوئچ سے۔ ادھر چابی گھمائی ادھر قصہ تمت بالخیر" محسن نے کہا۔

"میاں محسن شیروانی" میں نے کہا "یہ لوگ اتنے احمق تو نہیں ہو سکتے کہ صرف ڈائنا مائیٹ لگانے کا کام آخری وقت کا التوا میں رکھتے جو کام پہلے بھی ہو سکتا تھا، اس کے لیے ضروری نہیں تھا کہ کوئی ہماری تشریف آوری کے انتظار میں بیٹھا رہے۔ یہ وقت کا مسئلہ تھا۔"

"تیرا مطلب ہے کوئی ٹائم بم؟"

ابھی میں نے اقرار میں گردن ہی نہیں ہلائی تھی کہ اس کھنڈر میں دھماکا ہوا جس میں ٹیکسی کھڑی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ہم منہ کے بل گر گئے۔ یہ ایک غیر ارادی حفاظتی نوعیت کا ردِ عمل تھا۔ ہم اگر قریب ہوتے تو شاید دھماکے سے اڑنے والے سنگریزے ہم پر بھی گرتے لیکن ایک تو بم زیادہ طاقت ور نہیں تھا ـــ صرف ایک گاڑی کو تباہ کرنے کے لیے تھا۔ اس سے کھنڈر کی دیواریں بھی گریں لیکن ہم محفوظ رہے۔ خصوصاً محسن اور اکرام شیخ جو اپنی دریافت پر بہت خوش یہ خبر سنانے آگے چلے آئے تھے۔ وہ ہمارے پہنچنے کا انتظار کرتے تو اسی کھنڈر میں دفن ہو جاتے۔

اُٹھنے کے بعد چند سیکنڈ تک ہم سب بولنے کے قابل نہ تھے اور اس گرد کے بادل کو دیکھ رہے تھے۔ جو رفتہ رفتہ سمٹنے لگا تھا۔

"اگر ہم اس کے قریب نہ جاتے" غالب نے بالآخر کہا "تو سب ہو گئے تھے مرحوم۔ نہ کہیں جنازہ اٹھتا نہ کوئی مزار ہوتا۔"

"اکیلی نازو رہ جاتی سب کی دعائے مغفرت کے لیے" محسن نے کہا۔ اسی وقت سامنے سے ڈبل ریکارڈ نمودار ہوئی جو کسی اندھے دیو کی طرح ہماری طرف بڑھ رہی تھی۔

"بھاگو" میں نے چلاّ کے کہا "جان بچاؤ اپنی" لیکن میرے خبردار کرنے سے پہلے ہی سب کو احساس ہو گیا تھا کہ وہ تیزی سے بڑھتی ہوئی موت کی زد میں ہیں۔ محسن اور اکرام شیخ نے ایک جست لگائی اور قریبی ہٹ کے پیچھے ہو گئے۔ غالب نے نازو کو اس وقت اٹھایا تھا جب دہشت نے اسے مفلوج کر دیا تھا۔ وہ اسے اٹھا کے بھاگا مگر منہ کے بل گر گیا۔

اور اس وقت اچانک میری چھٹی حس نے مجھے سب سمجھا دیا۔ وہ شخص جو اس وقت میری گاڑی پر قابض تھا اور اسٹیرنگ پر میری جگہ بیٹھا ہوا تھا ہم سب کا دشمن ضرور تھا لیکن وہ ہم سب کو قتل کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ وہ صرف ایک شخص کو مارنا چاہتا تھا جو ہماری قید میں تھا اور ان کے لیے باعثِ خطرہ ہو گیا تھا۔

میں نے ڈرائیور کو بالکل آخری وقت میں کھینچ کر دھکا دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں بھی خشک ریت پر گرا جو سڑک کے کنارے بچھی ہوئی تھی۔ میں نے ڈبل ریکارڈ کو چند انچ کے فاصلے سے ایک دیوہیکل پرندے کے سائے کی طرح گزرتے دیکھا وہ ڈرائیور جو اب ہماری قید میں تھا اذیت سے چلایا۔

گاڑی گزر چکی تھی جب میں نے سر اُٹھا کے اس کے عقبی حصے کا نشانہ لیا اور فائر کیا۔ خدا کو میری لاج رکھنا منظور نہیں تھا۔ نشانہ خطا ہو گیا مگر اس کے فوراً بعد ہونے والے فائر نے میری آرزو پوری کر دی۔ گاڑی کا ایک پچھلا ٹائر برسٹ ہو گیا۔ یہ کارنامہ غالب ہی سر انجام دے سکتا تھا۔

گاڑی کسی شرابی کی طرح لڑکھڑائی اور رُک گئی۔ اس میں سے دو افراد ایک دم دونوں جانب کے دروازے کھول کر نکلے اور ادھر بھاگے جہاں ایک کھٹارا فاکس ویگن کھڑی ہوئی تھی۔ ہمارے قیدی نے بھی اس فاکس ویگن تک پہنچ کے فرار ہونا چاہا تھا۔

بڑی افراتفری میں انھوں نے پے در پے کئی فائر کیے۔ ان کا مقصد صرف ہماری پیش قدمی کو روکنا تھا۔ وہ ہمیں دیکھ نہیں سکتے تھے تو نشانہ کیسے لے سکتے تھے۔ جب وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ گئے تو میں سر جھکا کے بھاگا۔ درمیان میں ہماری ڈبل ریکارڈ تھی چنانچہ وہ مجھے حرکت کرتا نہ دیکھ سکے۔ ادھر فاکس ویگن فوراً اسٹارٹ نہیں ہوئی۔ میں نے اپنی کار کی سائڈ میں رہتے ہوئے کھلے دروازے سے اندر ہاتھ ڈالا اور اپنی سیٹ کے نیچے سے ایک دستی بم نکال لیا۔

فاکس ویگن کا انجن ایک دم غرّایا اور گاڑی آگے بڑھی۔ میں نے دستی بم کی پن کوشش سے کھینچ کر نکالا اور پھر فاکس ویگن کے پیچھے دوڑتے ہوئے اچھال دیا۔ میرے زمین پر گرتے ہی دھماکا ہوا اور میں نے سر اٹھا کے دیکھا تو جہاں فاکس ویگن تھی وہاں اب کچھ نہیں تھا سوائے ایک ٹوٹے ہوئے، جلے ہوئے اور جلتے ہوئے کار کے ادھورے ڈھانچے کے۔ میں تیزی سے اٹھا اور واپس دوڑا۔ مجھے معلوم تھا کہ اتنا بڑا دھماکا سب کو متوجہ کرے گا۔ فاکس ویگن ہماری کار سے تقریباً سو گز آگے جا کے تباہ ہوئی تھی۔

غالب دوڑتا ہوا میری طرف آیا "تم زندہ ہو نا؟"

"نہیں، پہلے یہ بتاؤ کہ وہ زندہ ہے؟" میں نے کہا۔

"ہاں، گاڑی کا ایک پہیہ اس کی ٹانگ پر سے گزر گیا تھا جو پہلے ہی زخمی تھی" غالب بولا "ٹانگ ٹوٹ گئی۔ باقی سب خیریت ہے۔"

"شیخ سے کہو اسے اٹھا کے کہیں پیچھے لے جائے کسی بھی ہٹ میں اور اس کا منہ بند رکھے" میں نے کہا "باقی سب یہاں آجاؤ ہم ایک فیملی ہیں۔ ہم تفریح کے لیے آئے تھے اور واپس جا رہے تھے کہ ہمارے سامنے والی کار دھماکے سے پھٹ گئی۔ نہیں، ہماری گاڑی کا ایک ٹائر فلیٹ ہو گیا تھا۔ ہم اسے بدل رہے تھے کہ یہ کار گزری اور آگے جا کے بوم کر ایک دم پھٹ گئی۔"

چند منٹ بعد نازو کار میں آگے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی موجودگی ہماری شرافت اور ہمارے معتبر ہونے کی سند بن گئی۔ جو لوگ وہاں جمع ہوئے انہوں نے ہمیں ایک فیملی مان لیا۔ غالب اور محسن تو ٹائر بدل رہے تھے۔ میں نے اور محسن نے درجن بھر افراد کو فرنچ بول کے پریشان کیا۔ ان میں سے زیادہ تعداد چوکیداروں کی تھی۔ دو صاحب بہادران بھی پریشان ہو کے نکل آئے تھے۔ نازو نے ان کی سہولت کی خاطر ہمارے جوابات کا اردو میں ترجمہ کیا اور بتلایا کہ ہم فرنچ ڈپلومیٹک مشن کے ارکان ہیں اور باقی ہم تینوں ایک ہی فیملی ہیں۔

"میرا مشورہ ہے کہ آپ لوگ یہاں سے فوراً چلے جائیں" نازو نے سب لوگوں کو رائے دی "ابھی کچھ دیر میں پولیس آجائے گی۔ آپ لوگ خواہ مخواہ گواہی کے چکر میں پھنس جائیں گے۔"

بیشتر لوگوں نے اس مشورے پر عمل کرتے ہوئے کھسک جانا ہی بہتر سمجھا مگر ایک شخص نے کہا "آپ لوگ تو چشم دید گواہ ہیں۔"

"ہماری کوئی بات نہیں، پولیس ہمیں پریشان نہیں کر سکتی کیونکہ ہمیں سفارتی تحفظ حاصل ہے" نازو نے کہا۔

آخری شخص بھی قائل ہوا اور اس کے روانہ ہوتے ہی ہم نے بھی دیر نہیں کی۔ اسپیئر وہیل لگایا جا چکا تھا۔ چند منٹ بعد ہم اس مقام سے ایک میل دُور جا چکے تھے۔

"ابھی اکرام شیخ تو یہیں ہے" محسن بولا "اور۔۔۔!"

"ہم ابھی واپس جائیں گے تو شکوک پیدا ہوں گے" میں نے کہا "پھر وہ زخمی ڈرائیور ہمارے ساتھ ہوا اور راستے میں کسی نے چیک کر لیا تو وضاحت مشکل ہو جائے گی۔"

"یار کہیں وہ پھنس نہ جائے" غالب نے کہا "اسے ساتھ لے جانا ضروری ہے۔"

"اچھا" میں نے سب کے اصرار کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا اور گاڑی کو ایک پرائیوٹ کمپنی کی بہت خوبصورت ہٹ کی طرف موڑ لیا "میں، محسن اور غالب یہاں رُکتے ہیں۔ نازو جائے اور بھائی کو لے آئے۔"

"اکیلی نازو؟"

"ہاں، اسے جگہ تو معلوم ہے۔ اکیلی عورت کو اس وقت کون روکے گا۔ واپسی میں اس کے ساتھ شیخ ہوگا" میں نے کہا "اس سے کہنا کہ قیدی کو منہ بند کرکے ڈکی میں بند کرکے لائے۔"

وہ ہمیں اُتار گئی اور نازو نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کے گاڑی کو موڑ لیا۔ ہٹ کے اندر سے مغربی موسیقی کے ساتھ مردوں عورتوں کے ہنسنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں نے ایک دروازے پر دستک دی تو ایک گورا صرف انڈرویئر میں ملبوس نکلا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا اور برہمی کا اظہار کرتا میں نے فرفر بولنا شروع کر دیا اور فرنچ سن کے ایک دم اس کا چہرہ کھل اُٹھا۔ وہ خود بھی فرنچ تھا۔ میں نے اس سے معذرت کرتے ہوئے ایک فرضی نام لے کر پوچھا کہ موسیو فلاں یہاں موجود ہیں یا نہیں۔ ظاہر ہے موسیو فلاں وہاں نہیں تھے۔ میں نے اپنا تعارف ایک فرنچ آرٹسٹ کی حیثیت سے کرایا تھا اور چونکہ ہم برطانیہ میں قیام کے دوران اکثر فرانس کا دورہ کرتے رہتے تھے اس لیے وہاں کے تاریخ جغرافیے سے بخوبی واقف تھے۔

ہم نے غالب کو بطور مترجم متعارف کرایا۔ اندر چند خواتین بھی موجود تھیں ــ مرد تو خیر انڈرویئر میں تھے ہی خواتین کا لباس بھی دو حصوں میں تقسیم ہو کے ذرا کم محسوس ہوتا تھا۔ انہوں نے ایک آرٹسٹ سے مل کے خاصی خوشی کا اظہار کیا۔ فرانسیسی قوم مصوری کے معاملے میں انتہائی خوش ذوق ہے۔ انہوں نے ہمیں اس اتفاقیہ ملاقات پر "ٹوسٹ" میں بھی شریک کرنا چاہا مگر ہم نے معذرت کر لی۔

"ہمیں افسوس ہے کہ ہم مخل ہوئے" میں نے کہا "وہ بھی کچھ ایسی ہی ہٹ تھی۔"

"دراصل ہم رات کو آئے تھے۔ اب تلاش کر لیں گے" محسن بولا۔

"آپ لوگ چاہیں تو رات کو یہاں ٹھہر سکتے ہیں" ایک ایسی خاتون نے کہا کہ میں عام حالات میں کہتا "چشمِ ما روشن دلِ ما شاد" مگر اب میں نے کہا۔

"یہ بہت ضروری ہے کہ ہم اپنے دوست سے ابھی ملیں۔ صبح ہمیں ایک ساتھ واپس جانا ہے اور وہ بدمعاش نہ جانے کس کے ساتھ یہاں

چھپا بیٹھا ہے یا لیٹا ہے۔" میں نے کہا۔

خواتین میری بات پر محظوظ ہوئیں۔ میری نگاہ گھڑی پر تھی اور کان آواز پر تھے۔ دس منٹ میں نازو کو واپس آجانا چاہیے، زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ اور اب بارہ منٹ ہوگئے تھے۔ چنانچہ ان سے رخصت لے کر ہم پھر باہر نکل آئے۔ مقصد صرف روپوش رہنا تھا جو پورا ہوچکا تھا۔

میں نے سامنے سے کار کی ہیڈلائٹس کو دیکھا اور ادھر ہی چلنا شروع کردیا۔ اب رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے اور ہمارے لیے بارہ بجے تک سبزی منڈی پہنچنا بھی ضروری تھا تاکہ ٹرک نمبر کے لسے آر بہتر تمتر ہماری نظر سے اوجھل ہوکے نہ گزر جائے۔

گاڑی بہت تیزی سے ہماری طرف آرہی تھی اور مجھے ایک فیصد بھی شبہ نہیں تھا کہ یہ ہماری کار نہیں ہوگی۔ بالکل آخری وقت میں جب میں نے دیکھا تو وہ پولیس کی جیپ تھی۔ ہمارے پاس آکے جیپ رکی اور اس میں سے ایک انسپکٹر کے ساتھ دو کانسٹیبل کود کے اترے۔

حلیے سے ہم دونوں ہپی اسٹائل کے لوفر اور آوارہ گرد نظر آتے تھے۔ چنانچہ انسپکٹر نے ہم سے وہی اندازِ گفتگو اختیار کیا جو وہ اپنے لاوارث ہم وطنوں کے ساتھ اختیار کرتا تھا تو اس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی اور اس نے پولیس کی فرعونیت اور بدتہذیبی کا نمونہ پیش کرنے کی روایت پر عمل کیا تو یہ بھی باعثِ حیرت نہیں ہوسکتا تھا۔

اس نے اترتے ہی کہا "کون ہو تم ...؟" اور اس سے پہلے کہ ہم جواب دیتے، اس نے اپنے دستِ اختیار سے ہمیں ایک ایک ڈنڈا رسید کیا اور اپنے ماتحتوں کو حکم دیا۔ "ڈالو ان دونوں کو ہتھکڑی لگا کے گاڑی میں..." ہم سب کے لیے اس نے ایک ہی گالی کو کافی سمجھا۔

"لیکن، ہمارا قصور تھانیدار صاحب!" غالب نے فریادی لہجے میں کہا۔ وہ ذرا فاصلے پر تھا، اس لیے تھانیدار کی ضربِ کلیم سے محفوظ رہا۔

"قصور بھی پتا چلے گا بچو... بہت وارداتیں ہو رہی تھیں یہاں، آج ہاتھ آئے ہو نا۔" اس نے غالب کو گردن سے دبوچ کے کھینچ لیا۔

دور سے میں نے دوسری گاڑی کی ہیڈلائٹس کو دیکھا اور فوراً فیصلہ کرلیا کہ مجھے کیا کرنا ہوگا۔ میں اپنی کار، نازو اور ایک زخمی قیدی کے ساتھ تھانے جانے کا خطرہ مول لے ہی نہیں سکتا تھا۔

دو کانسٹیبل میری طرف بڑھے تو انھیں میری طرف سے مزاحمت کا بالکل اندیشہ نہیں تھا۔ ہماری مظلومیت کے پیشِ نظر وہ ہم سے کسی جارحیت کے ارتکاب کی توقع نہیں رکھتے تھے۔ میں بھی ان کے قریب آنے کا انتظار کرتا رہا اور جب میں نے دیکھا کہ

اب میرے ہاتھ ان کی گردن تک پہنچ سکتے ہیں تو میں نے بیک وقت دونوں ہاتھوں سے ان کی گردنیں دبوچیں اور پلک جھپکتے میں ان کے سروں کو آپس میں اتنی قوت سے ٹکرایا کہ وہ نیچے گرنے سے پہلے ہی انٹا غفیل ہوگئے۔ سروں کے تصادم سے پیدا ہونے والی آواز ایسی ہی تھی جیسے کوئی ناریل کو فرش پر مار کے توڑنے کی کوشش کرے۔

دونوں کانسٹیبلوں کی مجاہدانہ بلائے پران کا افسر جو زیکا وہ نا کو قصور پوچھنے کی سزا کا بیعانہ دینا چاہتا تھا۔ ماتحتوں کی دل خراش صدا سن کے وہ چونکا۔ اس نے ریوالور نکالا ضرور تھا، مگر صرف ہمیں خوف زدہ اور خبردار کرنے کے لیے۔ عام طور پر قانون کے ہاتھ میں اسلحہ دیکھ کر ہی پبلک پر دہشت طاری ہوجاتی ہے اور تاوقتیکہ مقابل پر خطرناک اسلحے سے لیس مجرم نہ ہوں، پولیس ہاتھ اور زبان کی طاقت کو کافی سمجھتی ہے۔

میری لات پڑتے ہی تھانیدار کے ہاتھ سے ریوالور ایسے اڑ گیا جیسے ماتحتوں کو فرش پر ... دیکھ کر اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے تھے۔ میں نے اسے بولنے کا موقع بھی نہیں دیا اور اس کے منہ پر مکا مارا۔ اس کا سر جیپ کی باڈی سے لگا۔ اور یہ ضرب بھی اتنی شدید ثابت ہوئی کہ وہ آہستہ آہستہ نیچے پھسل گیا۔

کار اتنی دیر میں قریب آکے رک چکی تھی۔ نازو نے ہیڈلائٹس کی روشنی میں جنگ و جدل کا منظر دیکھ لیا تھا۔

"یہ کیا ہوا؟" وہ نیچے اترتے ہی بولی۔ "اتنی سی دیر میں؟"

"ہم نے کچھ نہیں کیا۔" غالب نے معصومیت سے کہا۔ "یہ خود ہی ہم سے پٹنے آئے تھے۔"

"ہمیں اپنے ساتھ لے جانے پر اصرار کر رہے تھے۔" محسن بولا۔

اکرام شیخ نے نیچے آکے صورتِ حال کا مطالعہ کیا۔ "اب جلدی سے فیصلہ کرو، ان کا کیا کرنا ہے۔ یہیں چھوڑ کے جانا ہے انھیں یا ساتھ رکھنا ہے؟"

"چھوڑ تو جائیں گے انھیں... مگر ایسے نہیں۔" محسن بولا۔ "ابھی ابھی میرے ذہن میں ایک لاجواب آئیڈیا آیا ہے۔"

"خواہ مخواہ آئیڈیا مت چرایا کرو۔" میں نے کہا۔ "یہ میں پہلے ہی طے کرچکا تھا کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔"

نازو واپس کار میں جا بیٹھی اور ہم نے کچھ رات کی تاریکی کے پردے سے فائدہ اٹھایا اور کچھ جیپ کی اوٹ سے۔ میں نے کانسٹیبل کی وردی پہنی، کیونکہ وہ میرے سائز کا تھا۔ دوسرے کانسٹیبل کی وردی محسن کو ذرا چھوٹی رہی۔ اپنے سابقہ تجربے کے باعث تھانیدار کی وردی اکرام شیخ کو عطا کی گئی۔

"مرزا غالب! افسوس کہ تم پولیس میں بھرتی نہیں ہوسکے۔" محسن نے کہا۔ "کسی اور محکمے میں کوشش کرو۔"

"فی الحال تم نازو کو لے کر جاؤ۔" میں نے کہا۔ "بارہ بجنے میں دس منٹ رہ گئے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ ٹرک نکل جائے۔"

نازو کے ساتھ جانے میں غالب کو بھلا کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ اس کی باچھیں کھل گئیں۔

"ہم نے تو اپنا جامہ بدل لیا ہے۔" محسن بولا۔ "تم ذرا شرافت کے جامے میں رہنا۔"

"اور آنکھیں کھلی رکھنا، ہوش و حواس پر قابو رکھنا۔" میں نے کہا۔ "یہ نہ ہو کہ سامنے سے ٹرک گزر جائے اور تم کہیں اور دیکھتے رہ جاؤ۔"

"ہم تو خیر جاتے ہیں۔" غالب نے کہا۔ "مگر تم لوگ...؟"

"ہم بھی آتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ذرا یہاں کے حالات ٹھیک کرکے۔"

جب کار نظر سے گزر گئی تو وہاں تین بے وردی پولیس والے رہ گئے اور تین جعلی پولیس والے۔ جو بے وردی تھے، انھیں اسی لباسِ قدرت میں سڑک کے کنارے تماشائے اہلِ نظر کے لیے نہیں چھوڑا جاسکتا تھا۔ چنانچہ ہم انھیں کندھوں پر ڈال کے ایک جھاڑیوں میں لے گئے۔ ان کی ہتھکڑیاں انہی کے ہاتھوں میں اس طرح ڈالیں کہ وہ آپس میں جڑ گئے۔ ہوش میں آنے کے بعد وہ ایک حلقہ بنا سکتے تھے مگر ایک ہاتھ کو دوسرے سے جدا نہیں کرسکتے تھے۔ ہر ہتھکڑی کے ساتھ ایک زنجیر بھی تھی جو عموماً ملزمان کو فرار سے روکنے کے لیے قانون کے محافظ اپنی بیلٹ سے جوڑ لیتے ہیں۔ اس زنجیر کو ہم نے تین مختلف سمتوں میں ایک دروازے کی دہلیز، ایک کھڑکی کی چوکھٹ اور ایک کونے سے باندھ دیا۔ اب وہ اٹھ بھی نہیں سکتے تھے۔

آخری کام انھیں خاموش رکھنے کا تھا۔ اس کے لیے ہم نے مروجہ دستور کے مطابق کپڑا تلاش کیا مگر جو چیز ہمیں اس جگہ دستیاب ہوئی وہ کپڑا نہیں، کپڑے کی بنی ہوئی تھی۔ زنانہ استعمال کے لیے مخصوص تھی۔

ٹھیک بارہ بجے ہم جیپ لے کر فرار ہوئے تو ہمیں سب سے زیادہ اس ٹرک کی فکر تھی۔ ابھی ہم آدھے گھنٹے سے پہلے کسی صورت اس جگہ نہیں پہنچ سکتے تھے جہاں ہمیں سڑک کے ایک طرف پوزیشن سنبھالنی تھی۔

جیپ کے علاوہ پولیس کا ایک ریوالور بھی ہمارے ہاتھ لگ گیا تھا۔ اب ہم تینوں مسلح تھے۔ ریوالور کے خالی راؤنڈ جیپ کے اندر سے ملے۔ ڈرائیونگ محسن کر رہا تھا اور اکرام شیخ اس کے ساتھ تھانیدار بنا بیٹھا تھا۔ مالِ غنیمت میں سے ساڑھے تین ہزار نقد اس کی جیب میں سے نکلے۔ میری اور محسن کی جیبوں میں سے علی الترتیب دو سو دس اور دو سو چالیس روپے برآمد ہوئے۔

"بے چاروں پر برا وقت آیا ہوا تھا۔" محسن بولا۔

"ہاں، کاروبار میں مندی کا رجحان تھا۔ ورنہ تھانیدار کی جیب سے صرف ساڑھے تین ہزار۔" اکرام شیخ نے افسوس سے سر ہلایا۔ "کیا خیال ہے؟ وہ صبح سے پہلے کچھ کرسکتے ہیں؟"

"ہاں، ہوش میں آسکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہمیں گالیاں دے سکتے ہیں دل ہی دل میں۔"

"مجھے کیوں؟ میں نے تو بڑی مروت کا مظاہرہ کیا تھا جب اس نے ڈنڈا مارا تب بھی خاموش رہا تھا۔" محسن بولا۔

"یار...! وہ بندہ مرگیا۔" اکرام شیخ نے اچانک کہا۔

"کون؟ وہ ڈرائیور؟" میں نے چونک کر کہا۔

"ہاں، میں نے اسے وہیں چھوڑ دیا۔"

"مگر وہ کیسے مرگیا، تم نے کچھ کیا تھا؟" محسن بولا۔

"ہاں، میں نے تفتیش کی تھی۔ فارغ تو نہیں بیٹھ سکتا تھا نا۔" اکرام شیخ بولا۔ "میں نے کچھ سوالات پوچھے تھے لیکن وہ جواب دینے پر آمادہ نہ ہوتا تھا۔"

"اسے معلوم نہیں تھا کہ تم تھانیداری میں ہر طریقۂ تفتیش کا عملی تجربہ حاصل کرچکے ہو۔ کیا تم نے مارا تھا اسے؟"

"نہیں، میں بس اس کے زخموں پر نمک چھڑکتا رہا۔ اور نمک چھڑکنے کے لیے زخم لگاتا رہا۔"

"نمک کہاں سے مل گیا؟"

اس نے حیرانی سے مجھے دیکھا۔ "کمال ہے یار۔ آخر نمک کہاں سے نکالا جاتا ہے، اسی سمندر سے۔ مجھے طریقہ معلوم نہیں تھا چنانچہ میں یہی پانی ڈالتا رہا۔ اچھا خاصا نمک ہوتا ہے اس میں۔ میری جیب میں ایک چھوٹا سا چاقو تھا، پاکٹ نائف۔ اس سے میں نے کھال چھیلنے کا کام کیا۔ سمندر کا پانی میں دو بوتلوں میں بھر لایا تھا۔ اس ہٹ میں شراب کی خالی بوتلیں بکھری پڑی تھیں۔"

"پھر کیا بتایا اس نے؟"

"صرف ایک بات کام کی بتائی۔ وہ بھی اس وقت جب میں نے اس کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ پر بحیرۂ عرب کا پانی ڈالا۔ اور اسے تھوڑا بہت ہلایا۔ اس نے مجھے بتادیا کہ لانچ کہاں ہوگی۔"

"یہ بتادیا اس نے؟" میں نے کہا۔

"ہاں، کورنگی کریک سے آٹھ نو میل دور جنوب کی طرف کوئی جگہ ہے جہاں چٹانیں ہیں۔ لانچ وہیں کہیں چھپائی گئی ہے۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟" میں نے مایوسی سے کہا۔ "اب ہم آٹھ نو میل جائیں اور چٹانوں سے سر ... ہے وہ کوئی محفوظ جگہ نہیں ہوگی۔ انہی لوگوں کا اڈا ہوگا۔ ان کا پہرا بھی ہوگا وہاں۔"

"ظاہر ہے تلاش بھی تو آسان نہیں ہوگی اور لاش کو بھی بلڈوز کر کے نکالنا پڑے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔" محسن بولا۔

"یہ کام بھی آج ہی ہو سکتا ہے۔ صبح ہونے سے پہلے۔ آج حالات موافق ہیں۔ پولیس کو چھاپا مارنے سے کون روک سکتا ہے۔ روکنے والا سامنے تو آئے گا۔" شیخ نے کہا۔

میں نے اس کی بات پر غور کرتے ہوئے کہا۔ "تھانیدار جی! بات تو تم نے پتے کی اور کھری کی ہے۔ ہم پولیس کی وردی میں چھاپا مارنے کے لیے جا سکتے ہیں،... لیکن..."

"لیکن کیا؟"

"لیکن یہ کہ ایسی جگہ پولیس نہیں جاتی۔ انھیں نہ جانے سے ہی فائدہ ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ "بڑے مجرموں کے ہاتھ بھی لمبے ہوتے ہیں۔ چنانچہ انھیں چھوٹے افسروں کی ضرورت سے زیادہ مستعدی اور فرض شناسی پسند نہیں آتی۔ وہ جیو اور جینے دو کی طرح کھاؤ اور کھانے دو، لوٹو اور لوٹنے دو کے اصول پر اشتراک کرتے ہیں۔ ہم نے چھاپا مارنے کا ڈراما کیا تو فوراً پہچان لیے جائیں گے کہ جعلی لوگ ہیں۔"

"کیوں؟ نئے نوجوان اور جوشیلے افسر کیا خرد ماغ نہیں ہوتے۔ جو شروع شروع میں قوم کی خدمت کے، ایمانداری کے اور ادائے فرض میں جان دینے کے جذبات رکھتے ہیں۔ بیشتر کچھ عرصہ بعد راہِ راست پہ آجاتے ہیں اور سمجھوتا کر لیتے ہیں کہ روم میں وہی کرنا چاہیے جو دمن کرتے ہیں۔ مگر کچھ ناقابلِ اصلاح قسم کے لوگ کتے کی دم سے زیادہ ٹیڑھے ثابت ہوتے ہیں۔ ایک مثال خود آپ کی ہے۔" محسن بولا۔

"آپ مجھے براہِ راست بھی کتے کی دم کہہ سکتے تھے۔" شیخ نے برہمی سے کہا۔ "میرے بھائی! کیا انکل رضوی دوسری مثال نہیں ہیں؟"

"دونوں مثالیں آؤٹ آف ڈیٹ ہیں۔ پرانے وقتوں کی بات ہے۔"

"مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ اب پولیس کے محکمے میں کوئی ایماندار، ملک کا وفادار و جاں نثار افسر نہیں رہا۔ نہیں، اب بھی بہت سے رضوی اور شیخ ہیں... وہ ہم انہی کا نمونہ بن کے جا سکتے ہیں۔" اکرام شیخ نے کہا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "انھیں خبر دینے والے پہلے ہی سے بتا دیتے ہیں کہ کوئی نیا افسر آیا ہے جو بہت بڑھ بڑھ کے بولتا ہے۔ اسے سیدھا کر لینا۔ مگر خیر... تم مجھ سے بہتر جانتے ہو۔ اگر چھاپے کے ڈرامے سے کام نکل جاتا ہے تو ہم تمھارے ساتھ ہیں۔"

"ہم ہر قسم کے مقابلے کے لیے تیار ہو کے جائیں گے۔ وہ پہلے تو معاملہ طے کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر اس میں ناکامی کا یقین آجائے تو آسانی سے راستہ نہیں دیتے۔"

"سب حالات اور وقت پر منحصر ہے۔" محسن نے کہا۔ "خیر آج رات ہمیں فرصت ملے نہ ملے، کہاں جانا پڑے۔"

میں نے گزرتے ہوئے سڑک کے دوسرے کنارے پر اس کار کو دیکھ لیا۔ غالب اس کے انجن کا بونٹ اٹھائے اس کے پیچھے یوں کھڑا تھا کہ وہ ہر گزرنے والی گاڑی کے پیچھے لکھا ہوا نمبر پڑھ سکتا تھا۔ کسی گاڑی کا ڈرائیور اسے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ نازو کار کے اندر تھی اور نظر نہیں آتی تھی۔ اس کے لیے پیچھے سے آنے والی ہر گاڑی کے نمبر کو سامنے سے پڑھنا آسان تھا۔ اس طرح وہ کوئی گاڑی مس نہیں کر رہے تھے اور شاید ہر گاڑی کے آگے پیچھے کے نمبروں کو ملا بھی رہے ہوں۔

غالب یا نازو میں سے کسی نے ہماری طرف نہیں دیکھا ہوگا، بلکہ کوشش کی ہوگی کہ ہم بھی انھیں نہ دیکھ پائیں۔ ان کے نزدیک تو یہ ایک پولیس کی جیپ تھی جس میں تین پولیس والے بھی تھے۔

"کیا خیال ہے؟ مرزا جی کا تھوڑا سا خون خشک کریں؟" محسن نے ہنس کے کہا۔

"ٹائم نہیں ہے، ورنہ ضرور کرتے۔" میں نے کہا۔ "اس وقت تو بھائی بہت اونچے اڑ رہے ہوں گے۔"

"ہاں، اسپرٹ بہت ہائی ہوگی۔" محسن بولا۔

میں نے گاڑی کو چوراہا کراس کرنے کے بعد ایک ہورڈنگ کے سائے میں روک لیا۔ "کمال کا آدمی ہے یہ بھی، بالکل چھپا رستم۔ اس کے گن آہستہ آہستہ کھلتے ہیں۔ پھر پتا چلتا ہے کہ شکل سے احمق اور باتوں سے اکو لگنے والا شخص کتنا ذہین ہے... کتنا بزدل نظر آتا ہے اور کتنا نڈر ہے اور کتنا کشادہ دل رکھتا ہے... کہ کسی بات کا برا مانتا ہی نہیں۔"

"کم سے کم میں مار نہیں کھا سکتا تھا کسی لڑکی سے... اور وہ بھی یوں کہ خود شامت کو دعوت دے کر۔" محسن بولا۔

"یار... ایک بات بتاؤ۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "میں تمھاری ہر بات سے اتفاق کرتا ہوں۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ نازو سے کتنی محبت کرتا ہے... لیکن پھر بھی، بعض اوقات ایک خلش پریشان کرتی ہے... آخر وہ بہن ہے میری، میرا لحاظ بھی بہت کرتی ہے اور خود میں دنیا سے نہیں ڈرتا۔ کیونکہ ہماری تو دنیا ہی الگ ہے۔ اس میں ہمارے سوا کون ہے جو اسے بدنام کر سکے۔"

"میں سمجھ گیا تمھاری بات دوست۔" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ "اس خلش کو دل سے نکال دو۔ غالب میں اور محسن میں یا پھر مجھ میں کیا فرق ہے آخر؟ ہم نے اس شخص کو بھی اعتبار کا اعتماد دیا تھا جسے زبانِ خلق اچھا نہیں کہتی تھی۔ اسے سمجھا کس نے تھا۔ قریب سے دیکھا کس نے تھا۔ صرف ہم تھے جنھوں نے اسے اپنا لیا تھا اور پھر وہ کیلے سے کیا ہو گیا تھا۔ دیکھ لو کہ وہ

ہم سب کو سرشار کر گیا۔ راہِ وفا میں جان دینے میں اسی نے پہل کی۔ ہم نے اس کے ساتھ رابعہ کو بھی چھوڑا... شہلا کو بھی چھوڑا اور کبھی یہ سوچنے کا گناہ نہیں کیا کہ وہ ہمارے اعتماد پر پورا نہیں اترے گا۔ وہ ایسا شخص تھا کہ خود بھی ایسا سوچنے سے پہلے مر جانا پسند کرتا۔ پھر تم غالب سے ڈرتے ہو؟"

"نہیں... ڈرتا تو شاید میں اپنے آپ سے ہوں۔ اس احساس سے آسیب سے ڈرتا ہوں کہ میں ایک جوان بہن کا بڑا بھائی ہوں۔ جو بہت خوبصورت بھی ہے..."

"عشق جب ایمان کا درجہ حاصل کر لیتا ہے دوست، تو پھر یہ ناممکن ہو جاتا ہے کہ برا خیال بھی دل میں آئے۔ جیسے عبادت کرتے ہوئے برائی کا خیال دل میں نہیں آسکتا۔ میں اور رابعہ کہاں کہاں ساتھ رہے۔ کیسے کیسے حالات کے امتحان سے گزرے۔ محسن اور شہلا اس کے گواہ ہیں۔ یہ خود بھی شادی سے پہلے شب و روز ساتھ رہے تھے۔"

"شادی کے بعد بچھڑ گئے۔" محسن نے ایک سرد آہ بھر کے کہا۔

اکرام شیخ ہنس پڑا۔ "ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں۔" اور پھر سیریس ہو گیا۔ "کیا یہ غالب شادی کرے گا نازو سے؟"

"اس کا تو باپ بھی کرے گا... اور شادی نازو سے نہیں کرے گا تو زندہ کیسے رہے گا۔" میں نے کہا۔

"ہاں، خود نازو اس کا جھٹکا کر دے گی۔" محسن بولا۔

"بعض اوقات... وہ مجھے کچھ نان سیریس... غیر ذمے دار سا لگتا ہے۔"

"یہی اس کی شخصیت کی گہرائی ہے کہ وہ زندگی کے بارے میں سطحی سا رویہ اختیار کیے رہتا ہے۔ بات محسن کی بھی ٹھیک ہے۔ کہ ابھی تو... چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد، والی بات ہے۔ دونوں تفریح لیتے ہیں مگر نازو اسے چھوڑنے والی نہیں ہے۔ تم تو جانتے ہو اپنی بہن کی فطرت کو، لیکن خود غالب کم نہیں۔ وہ بڑی آسانی سے جان لے بھی سکتا ہے اور دے بھی سکتا ہے۔ مگر نازو کو چھوڑ نہیں سکتا۔ ہم سب بڑے جنونی لوگ ہیں بھائی...!"

اس وقت رات کے ایک بج کر بیس منٹ ہوئے تھے جب وہ ٹرک اچانک ہمارے قریب سے گزرا۔ اس کا رخ سبزی منڈی کی طرف تھا چنانچہ وہ دوسری سڑک پر تھا مگر محسن کی تیز نظر نے نمبر پڑھ لیا۔

"یہ وہی ٹرک تھا۔" محسن نے پرجوش لہجے میں کہا۔

"میں تو نہیں دیکھ سکا اتنی دور سے۔" میں نے کہا۔

"میں نے دیکھ لیا۔" اکرام شیخ نے محسن کی تائید کی۔

اس کی تصدیق ایک منٹ بعد ہوئی جب وہ ٹرک چوک سے آگے ہماری کار کے قریب سے گزرا۔ کار ہم سے دو سو گز دور تھی، مگر ہم نے ٹرک کے گزرتے ہی اس کا بونٹ گرتے دیکھا۔ پھر غالب کا سایہ سا نظر آیا جو کار کے اندر غائب ہو گیا۔ کار کی ٹیل لائٹ روشن ہوئی۔

"وہ جا رہے ہیں اس کے پیچھے۔" محسن بولا۔

"انھیں جانے دو۔" میں نے کہا۔

"اور ہم یہیں کھڑے رہیں؟"

"ہم کیسے قریب جا سکتے ہیں یار... وہ پولیس کی جیپ دیکھتے ہی ہوشیار نہ ہو جائیں گے۔" میں نے کہا۔

"اکیلا غالب کیا کرے گا؟ اس کے ساتھ نازو بھی ہے۔ کبھی رات کے ڈیڑھ بجے کسی عورت کے ساتھ سبزی منڈی جاتا ہے کوئی...؟"

"غالب کو یہ تو معلوم ہونا چاہیے نا کہ ہم آگئے ہیں۔"

"ابھی ٹھہرو۔" میں نے کہا۔ "ٹرک سبزی منڈی کی طرف گیا ہے۔ اب دیکھو کہ وہاں مال اتارا جاتا ہے یا چڑھایا جاتا ہے۔"

"ٹرک تو اوپر تک بھرا ہوا تھا۔ کریٹ ہی کریٹ تھے۔"

"یہ تو میں نے بھی دیکھا تھا۔" میں نے کہا۔ "مگر کریٹ خالی تھے یا بھرے ہوئے، ان میں اوپر کیا تھا اور نیچے کیا؟ یہ تو ہم نہیں جانتے نا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ابھی اس میں واقعی پھل اور سبزیاں ہوں۔ مگر جب وہ واپس جائے تو اس پر دوسرے کریٹ لاد دیے جائیں۔ اس میں وقت لگے گا۔ اور اس عرصے میں غالب کو یقیناً ہماری طرف سے بھی تشویش لاحق رہے گی کہ ہم کہاں گئے اور ابھی تک پہنچے کیوں نہیں۔ وہ خود آئے گا یا نازو کو بھیجے گا۔"

تقریباً پندرہ منٹ بعد میرا خیال درست ثابت ہوا جب ایک کار نے راؤنڈ اباؤٹ سے سیدھا ہماری طرف رخ کیا اور اس کی ہیڈ لائٹس چند سیکنڈ کے لیے گھوم کر جیپ پر پڑیں۔ یہ ہماری اوپل ریکارڈ تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ میں غالب یا نازو کو آواز دے کر متوجہ کروں ورنہ وہ تو پولیس کی جیپ کو دیکھتے ہی زوم سے گزر جائیں گے، لیکن کار آہستہ آہستہ آئی اور ہم سے دس قدم کے فاصلے پر رک گئی۔ میں نے ونڈ اسکرین کے پیچھے نازو کا چہرہ دیکھا۔ پھر غالب دروازہ کھول کے اترا اور ہماری طرف آیا۔

"اس ٹرک سے مال اتارا جا رہا ہے۔" اس نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔ "اور وہ سیٹھ اکبر بھائی آڑھتی کا گودام ہے۔"

"نامعقول! پولیس والوں سے کیا اول فول بک رہا ہے۔ ڈرتا بھی نہیں ہم سے۔" محسن نے اسے ڈانٹ کے کہا۔

"تم تو سالے جنرل کی وردی میں بھی کارٹون لگو گے۔" غالب نے کہا۔ "چونکہ تم نے سالا تسلیم کر لیا ہے ہمیں، اس لیے ہم تمھیں معاف کرتے ہیں۔" محسن بولا۔

"کیا تم نے ہمیں دیکھ لیا تھا؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔

"ہاں، جب تم جیپ میں آئے تھے تو میں نے ایک جوکر کا نمونہ دیکھ لیا تھا۔" غالب نے کہا۔ اور محسن کی جانب اشارہ کیا۔

"قانون کے محافظوں کو مسخرہ کہتا ہے؟" محسن بولا۔

"تم اس وردی میں... جو ایک کانسٹیبل کی وردی ہے' ڈی آئی جی کی طرح اکڑے بیٹھے تھے۔" غالب نے کہا۔ "سارس کی طرح گردن گھما رہے تھے۔"

"میں اس میں پھنسا ہوا تھا۔" محسن نے اعتراف کیا۔

"تم واپس کیوں آگئے؟" اکرام شیخ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اور کیا کرتا؟ آپ کی ہمشیرہ کو اس وقت شاپنگ کے لیے سبزی منڈی کے اندر لے جاتا۔" غالب نے کہا۔

"... تے تو کون سے قلاش ہو جاتے، کدو کریلے خرید کے۔" محسن بولا۔

"یہ شاپنگ تم کرنا شہلا کے ساتھ، بلکہ ہنی مون بھی سبزی منڈی میں منانا۔" غالب نے اسے گھور کے کہا۔ "میں تو یہ بتانے آگیا تھا کہ واپسی میں وہ ٹرک ادھر سے ہی گزرے گا۔"

"کیا ٹرک نے خود بتایا ہے تمھیں؟" محسن نے پھر دخل دیا۔

"میں کار کو باہر روک کے خود اندر چلا گیا تھا۔" غالب نے اس کی اشتعال انگیزی کو نظر انداز کر دیا۔ "وہاں اس وقت گھمسان کا رن پڑ رہا ہے۔ شہر بھر کے سبزی فروش آگئے ہیں۔ ٹرک آرہے ہیں اور خالی ہو رہے ہیں۔ کسی کو کسی کی طرف دیکھنے کی فرصت نہیں ہے۔ میں اسی لیے کافی قریب چلا گیا تھا۔"

"ٹرک ڈرائیور کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اسے تو میں نہیں پہچانتا۔" غالب نے کہا۔ "وہ بہت چیخ چلا رہا تھا مزدوروں پر کہ سب حرام خور ہو۔ ایسے کام کرو گے تو رات بھر میں ٹرک خالی کرو گے کیا، پھر مال چڑھایا کس وقت جائے گا؟ دم نہیں رہا ہاتھوں میں تو ہٹ جاؤ، میں دوسرے مزدور لگا دیتا ہوں۔ بس میں اتنا ہی سن کے لوٹ آیا۔ نازو اکیلی تھی نا۔"

"اور آپ کو بہت خیال تھا اس کی حفاظت کا۔" محسن نے اسے چھیڑنا جاری رکھا۔ "حالانکہ اسے آپ کی حفاظت کے لیے بھیجا گیا تھا۔"

"ب میں اکیلا جا رہا ہوں۔" غالب نے غرا کے کہا۔

"جانا تو سب کو اکیلے ہی ہے۔" محسن نے ایک سرد آہ بھر کے کہا۔

"تم اکیلے نہیں جاؤ گے۔ ہم چاروں تمھیں لے کر جائیں گے۔" غالب نے جاتے جاتے کہا۔

"مرزا جی! زیادہ بہادر مت بننا۔ دور سے ہی دیکھتے رہنا تاکہ واپس بھی آسکو۔" محسن نے چلا کے کہا۔ "دو ٹانگوں پر۔"

جب وہ چلا گیا تو میں نے ایک خیال ظاہر کیا کہ نازو کو واپس گھر بھیج دیا جائے تاکہ وہ راجا اور موہنی کو ہمارے بارے میں بتا سکے۔ محسن نے اس سے اختلاف کیا۔

"ہم تو پولیس والے بن کے چھاپا ماریں گے۔ ... تو کوئی ہونا چاہیے جو ناکامی کی صورت میں مدد کو آسکے۔"

نازو اب بھی ہم سے کچھ فاصلے پر کار میں ہی بیٹھی ہو... غالباً ہماری پولیس کی وردیوں کو دیکھتے ہوئے اس نے ہم... رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ آدھی رات کے بعد کسی لڑکی کا ... میں نظر آنا خواہ مخواہ کا تجسس پیدا کرتا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ کوئی ... فارغ ہو کر لوٹنے والا اخباری کارکن یہ منظر دیکھے تو ... پر تل جائے۔

"میرا خیال ہے شیخ صاحب کہ تم اس کے پاس چلے جاؤ..." نے کہا۔ "اور پچھلی سیٹ پر لیٹ جاؤ یا ذرا غیر نمایاں رہتے ہو... اس کے ساتھ رہو۔ ابھی ہمیں کافی دیر رکنا ہو گا۔"

"ہاں، ٹرک خالی ہونے اور پھر لوڈ ہونے میں دو تین ... تو لگیں گے۔" محسن نے کہا۔

"... ہوتی رہے گی۔" میں نے کہا۔ "یہاں تو ہم ... ہیں..."

"... مجھے تمھارے ساتھ جانا ہے..."

"جاؤ! جب ... جائے گا تب ہی ہم جائیں ... اور اس کے ساتھ ساتھ تو نہیں جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "غالب ... وہ ہم جاتے ..."

اکرام شیخ نے سر ہلایا۔ "کیوں نہ میں اسے کہہ دوں کہ ... جائے، دو تین گھنٹے آرام کر لے۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے۔ دروازے اندر سے لاک کر لے ... پچھلی سیٹ پر لیٹ جائے۔" محسن بولا۔

"اگر کسی نے دیکھا کار میں جھانک کے تو...؟"

"کیوں دیکھے گا کوئی۔ اور بھی تو کاریں کھڑی ہیں۔" ...

"ہاں، اور یہ کار سڑک سے ہٹ کے ایسی جگہ پارک ... ہے کہ شک کی کوئی بات نہیں۔ بلاوجہ کوئی سڑک سے ... جا کے، اندر جھانکے گا۔" اکرام شیخ بولا۔ "میں اسے یہی سمجھا کے ... اس کا ہم میں سے کسی کے ساتھ نظر آنا بالکل نامناسب ہو گا۔"

"اچھا، تم آجاؤ تو پھر چلتے ہیں کچھ ترام کھانے پینے۔" ...

"یہ کیا بکواس فرما رہے ہیں آپ؟" میں نے کہا۔ ... کیوں غالب ہے؟"

"اچھا... یہ بات ہے، میں بتاؤں گا غالب کو ... کہ آپ اس کے بارے میں کیا پوچھ رہے تھے۔ وہ خود جواب ..."

"دو تین گھنٹے ... انتظار میں ٹرک کو گھورتے رہنا تو بہت ... کام ہے۔" میں نے کہا۔ "کیوں نہ کہیں جا کے چائے پی آئیں ..."

"میں نے بھی یہی کہا تھا، مگر وہ پولیس کی بات تھی جو ... اس وردی کے باوجود نہیں سمجھے۔"

"میں سمجھ گیا۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تیرا مطلب ..."

مفت میں کھا پی آئیں؟ نہیں یار! ہم اچھے پولیس والے ہیں۔ ہم قیمت ادا کریں گے۔"

میاں سکندرِ اعظم! جب ایک گشت کرنے والی پولیس پارٹی کا تھانیدار کسی کو شرفِ میزبانی بخشتا ہے تو میزبان کے لیے اس سے قیمت وصول کرنا ممکن ہی نہیں رہتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس نے یہ جسارت کی تو اسے اگلے دن بھاری قیمت چکانا پڑے گی۔"

اکرام شیخ واپس آیا تو اس نے گھڑی دیکھی۔ "رات کے دو بجے ہیں۔ جمشید روڈ پر ہوٹل کھلے ہوں گے۔"

"یہ جمشید روڈ کہاں ہے اور کتنی دور ہے؟"

"زیادہ نہیں، یہاں سے تین میل۔" وہ بولا۔ "وہاں رات بھر بسیں مرمت ہوتی ہیں۔"

"صرف بسیں؟"

"زیادہ تر بسیں۔ کیونکہ مالکان انھیں صبح پھر سڑک پر لانا چاہتے ہیں۔ تاہم دوسری گاڑیوں کو بھی انکار کوئی نہیں کرتا۔ شہر میں وہی ایک جگہ ہے جہاں رات کو ہر قسم کے میکینک اور گاڑیوں کے اسپیئر پارٹس سب مل جاتے ہیں۔" اکرام شیخ نے جیپ اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

"بہتر ہو گا اگر ہم تین بجے تک لوٹ آئیں۔"

"راستے میں نیو ٹاؤن پولیس اسٹیشن پڑتا ہے۔" اکرام شیخ نے کہا۔

"پھر کیا ہوا؟" میں نے کہا۔

"انھیں ابھی کچھ معلوم نہیں ہو گا۔" محسن بولا۔ "اصل بندے صبح تک نہ جانے کب رہا ہوں گے؟"

"ایسے تو شاید رہا بھی نہ ہوں۔ نہ وہ کسی کو مدد کے لیے پکار سکتے ہیں، نہ خود آزاد ہو سکتے ہیں اور نہ وہاں سے کسی گزرنے والے کو خیال آسکتا ہے کہ اندر کوئی قید ہو گا۔"

"ایسے تو وہ مر بھی سکتے ہیں۔" اکرام شیخ بولا۔

"نہیں، ہم انھیں مرنے نہیں دیں گے۔" میں نے کہا۔ "ذرا اس مشن سے فارغ ہو لیں، پھر خود ہی فون کر کے کسی پولیس اسٹیشن کو بتا دیں گے کہ جاؤ فلاں جگہ سے اپنی چیزیں اٹھا لو۔"

جمشید روڈ پر واقعی بڑی گہما گہمی تھی اور رات جاگ رہی تھی۔ سیکڑوں میکینک، درجنوں بسوں، ٹرکوں کی ہر قسم کی مرمت میں مصروف تھے۔ ان میں انجن کا کام کرنے والے سے لے کر آٹو الیکٹریشن، ریڈی ایٹر اور سائلنسر بنانے والے تک سب ہی شامل تھے۔ انھی کے دم سے وہ ہوٹل آباد تھے، جن میں ڈرائیور کلینر حضرات کے علاوہ بھی بہت سے لوگ بے وجہ بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ کراچی میں چائے بے وجہ پینے کی رسم عام ہے۔ معلوم نہیں یہ کون لوگ تھے جو اس وقت گھر کے آرام سے محروم تھے۔ کوئی کام بھی نہیں کر رہے تھے اور کوئی کام کی بات بھی نہیں کر رہے تھے۔ وقت ان پر اتنا گراں کیوں ہے کہ یہ پہلے دن کو کاٹتے ہیں، پھر رات کو کاٹتے ہیں اور پھر بھی یہ سلسلہ تو روز و شب سلامت ہے۔

حسبِ توقع ایرانی ہوٹل میں نائٹ شفٹ کے منیجر یا پروپرائٹر نے کہا۔ "کیا بات کرتا ہے ابھی آپ تھانیدار صاحب ہم آپ کا، یہ ہوٹل آپ کا، آپ سے ہم پیسے لیوے گا؟"

"ہاں، ہم چائے کے پورے پیسے دیں گے۔"

"ابھی ایسا بات مت بولو نی تھانیدار صاحب! ایسا پہلے کبھی ہوا ہے۔ آپ نیا ہے، ہم سمجھ گیا۔ ہم تو روز ادھر ہوتا ہے جب پولیس پارٹی آتا ہے۔" وہ بولا۔ "اکھا رات ڈیوٹی کرتا ہمارے لیے تو ہم چائے پانی کا پیسہ لیں گا؟"

"دیکھو یار! فضول وقت مت ضائع کرو ہمارا۔" اکرام شیخ نے دس کا نوٹ کاؤنٹر پر ڈال دیا اور چل پڑا۔ "اس میں سے جتنے پیسے بنتے ہیں رکھو۔"

"اے مائی باپ!" منیجر چلایا۔ "ایسا ظلم مت کرو نی۔ ہم پیسہ لیتا ہے، لیکن دس روپیہ کدھر سے ہو گیا۔ تین روپیہ کی جگہ دس لیں گا تو تم ہی ہم کو بلیک میں پکڑیں گا۔ بابا! اپنا باقی سات روپیہ لو اور ہم کو معافی دو۔ ہم سمجھا تم بھی ویسا ہی ہے۔"

سات روپے لے کر ہم نکلے ہی تھے کہ وہاں ایک اور جیپ آکے رکی اور اس میں سے اترنے والی پولیس پارٹی اپنے مخصوص حاکمانہ غرور کے ساتھ ریسٹورنٹ میں داخل ہو گئی۔ ہم سمجھ گئے کہ یہ اصل لوگ ہیں جو ہر روز ہوٹل کو شرفِ مہمانی بخشتے ہیں۔

"ابھی ساری تھانیداری اتر جاتی تیری۔" محسن نے اکرام شیخ کی طرف دیکھ کر کہا۔ "اصل نقلی کا فرق ہی نہیں، آٹے دال کا بھاؤ بھی معلوم ہو جاتا۔"

اکرام شیخ نے بے وجود مونچھوں کو تاؤ دیا۔ "ابے یار! علاقے کے نہ سہی، دوسرے تھانیدار بھی تو ہو سکتے ہیں ہم۔"

"وہ علاقہ پوچھ لیتا پھر؟"

"کیوں پوچھ لیتا؟ اس .... قبیلے کا ایک فرد دوسرے کی طرف انگلی نہیں اٹھاتا۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "آخر میں تھانیداری کا پرانا تجربہ رکھتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ جب یہ وردی پہننے والا خود کو قانون کا محافظ سمجھنے کے بجائے قانون کا ٹھیکیدار سمجھنے لگتا ہے تو پھر گویا ایک حمام والی بات ہو جاتی ہے۔ شہر اپنا ہے اور شہر میں رہنے والے اپنی رعیّت ہیں۔ رعایا کا مال اپنا مال ہے۔"

"اور ایک وہ تصوّر ہے پولیس مین کا، جو ہم نے برطانیہ میں دیکھا تھا۔" میں نے افسوس سے سر ہلایا۔

"ہاں، وہاں وہ حقیقی معنوں میں عوام کے خادم ہیں۔" محسن بولا۔

"ولایت کی بات یہاں مت کیا کرو، جو وہاں ہے وہ یہاں نہیں ہے۔

مگر جو یہاں ہے، کیا وہ سب وہاں ہے؟" اکرام شیخ بولا۔
"مثلاً لاہور کے آلو چھولے، کراچی کا حبشی حلوہ، نہاری اور شکار پور کا اچار۔ سڑکوں بازاروں یہاں تک کہ اسپتالوں کی دیواروں پر پیک کے داغ اور اسکولوں کی دیواروں پر حکیموں کے اشتہار۔"
"کیوں مشرقی تہذیب کی روایات میں کوئی خوبی نہیں؟ ہماری سب اقدار فرسودہ اور آؤٹ آف ڈیٹ ہوگئی ہیں۔ ہم جو عورت کی عزت و حرمت اور آبرو کی تقدیس پر فخر کرتے ہیں، رشتوں کی تقدیس کو مانتے ہیں..."
"بجا ارشاد، لیکن ہم ماضی پرست ہیں۔ مستقبل کی طرف دیکھتے ہیں تو صرف خوابوں کی صورت میں، وہ ہماری اچھی باتیں لے کر شرمندہ نہیں ہوتے، ہم ان کی خرابیاں سمیٹ کر فخر کرنے لگے ہیں کہ ہم ترقی یافتہ ہوگئے ہیں۔ اُس معاشرے کا ڈسپلن، ان کی اصول پرستی، ہر شعبے میں پرفیکشن حاصل کرنے کا جذبہ، اور بھی تو بہت کچھ ہے جس کا ہم ذکر ہی نہیں کرتے تاکہ ہماری اپنی خامیاں نمایاں نہ ہوں۔ بس بات کرتے ہیں تو ان کے معاشرے میں جنسی بے راہ روی کی، ذرائع ابلاغ میں عریانیت اور فحاشی کے فروغ کی۔ شرحِ طلاق میں اور کنواری ماؤں کی تعداد میں اضافے کی۔ اور خوش ہو جاتے ہیں کہ صاحب ہم تو فرشتے ہیں ان کے مقابلے میں، ان کی تعلیمی، اقتصادی اور صنعتی ترقی..."
"بس بھائی بس..." اکرام شیخ نے کہا۔ "میں ہارا اور آپ جیتے۔"
"افسوس ہوتا ہے یار۔" میں نے گہرا سانس لے کر کہا۔ "جب میں اس ملک کی تاریخ پڑھتا ہوں۔ دو عشروں کی بھی کیا تاریخ ہے کہ اس پر تاریخ بھی شرمائے۔ اتنے کم وقت میں وہ جذبہ کہاں گیا جس نے ایک ملک کی تخلیق کی تھی، وہ لوگ کہاں گئے جو... میرِ کارواں تھے۔ منزل انھیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے۔ کیوں کہنا پڑا یہ سردار نشتر مرحوم کو؟ کیا کیا ہم نے لیاقت علی خان کو شہید کرنے کے بعد۔ قانون اور آئین ہی نہیں، اسلامی اقدار اور اخلاقی تعلیمات تک کو بھلا دیا، زمانہ اگر یہ کہے کہ ہم نے حکومت تو حاصل کر لی مگر ہم حکومت چلانے کے اہل نہ تھے۔ ہماری وفاداریاں کتنی بار تبدیل ہوئیں، محض سیاسی شعبدہ گروں کے باعث، پھر مارشل لا لگا۔ پھر ایک عجیب سی آئینی حکومت کا ڈراما چلا۔ جمہوریت کے نام پر جو انتخابات کا ڈھونگ رچایا گیا اس میں مادرِ ملت جیسی ہستی کو بھی صرف شرمندگی ملی اس قوم سے۔ اور اب دیکھو کیا ہو رہا ہے۔ کوئی پوچھے کہ یہ کیوں ہو رہا ہے تو کیا جواب دیں گے ہم یا اربابِ اقتدار، سیاست داں اور دانشور؟"
"حکومتی پریس نوٹ نہیں، تاریخ بالآخر ہر سوال کا جواب دیتی ہے۔"
"تاریخ صرف بیس سال میں نہیں بنتی۔" میں نے کہا۔ "مغلیہ دورِ حکومت میں اکبر اور اورنگ زیب نے تقریباً نصف صدی تک حکومت کی۔ انچاس سال اکبر کے اور انچاس سال اورنگ زیب حکمران رہا۔ اس دور میں بھی کبھی بنگال کا صوبیدار بغاوت کر دیتا تھا تو کبھی دکن کا۔ پچیس سال دکن میں بیٹھا رہا۔ بیس سال تو کچھ بھی نہیں۔ خدانخواستہ اندر اور باہر کے دشمن اس ملک کو ختم کرنے میں کامیاب ہوگئے تو تاریخ میں کیا لکھا جائے گا؟ صرف یہ کہ بیسویں صدی کے وسط میں کچھ عرصہ مشرقی اور مغربی مسلم اکثریت والے صوبوں نے قائم کر لی تھی جو بدنظمی اور انتشار کے باعث چل نہ سکی۔ اس سے کچھ نہیں مغلوں کے کارنامے تو تاریخ کی زینت ہیں۔ ہم نے کون سا سرانجام دیا ہے ابھی تک، جس کا تذکرہ بھی کرے گا کوئی مورخ؟ اور ملکوں کی تاریخ اور تہذیب کے دو صدیوں میں مرتب ہو"
"تو قنوطی ہو رہا ہے۔ یہ ملک قائم رہنے کے لیے بنا ہے کتنی بھی کوشش کر لیں، اگلی صدی کیا، اس کے بعد آنے والی بھی ہماری ہیں۔" محسن نے کہا۔
"ایسا ہونا تو فطری ہے۔" میں نے کہا۔ "تو دیکھ کہ اس ملک کے خلاف آج کتنے مخالف عناصر سرگرمِ عمل ہیں۔ چوہدری دلاور اس کا نمائندہ ہے جس کا ایمان پیسہ ہو گیا ہے خواہ وہ کسی بھی ناجائز سے آئے اور یہ لوگ اپنی ذات کے مفاد پر ملک و قوم کیا ساری کو بھی قربان کر سکتے ہیں۔ ایس ایس پی سراج اس بااختیار مگر بدکردار اور جرائم پرور انتظامیہ کا نمائندہ ہے جو ہر قانون کو عوام کے تحفظ کے لیے نہیں، انھیں لوٹنے اور بے بس کرنے کے لیے کر رہا ہے اور حاجی عبداللہ تیسرے طبقے کا نمائندہ ہے جو مذہب کا لبادہ اوڑھ کے بے خبر لوگوں کو دھوکا دیتا ہے، مذہب کے نام کا استحصال کرتا ہے اور اپنے شیطانی عزائم کی تکمیل میں لگا رہتا ہے۔ یہ سب مل کے قومیت کے جذبات کی، ملک کی سلامتی کی اور اخلاقی و مذہبی اقدار کی جڑیں کھوکھلی کر رہے ہیں، ضمیر بیچ رہے ہیں اور خرید رہے ہیں۔"
گاڑی رک گئی تھی اور وہ سب خاموش تھے کیونکہ میں نے کو پھر سب کا اعترافِ جرم بنا دیا تھا۔
"کیا یہاں صرف شکاری رہ گئے ہیں؟" محسن نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔ "وہ جو انسانوں کی شرافت اور نیکی کے شکاری ہیں، سچائی اور ایمانداری کے شکاری، انسانی ضمیر کے شکاری، قانون اور انصاف کے شکاری۔ جو سب اپنے اپنے جال پھیلا رہے ہیں اور شکنجے پے بھر رہے ہیں کیا ہم ایک جنگل میں ہیں جہاں جنگل کے قانون کی حکمرانی ہے، طاقتور زندہ رہ سکتا ہے کمزور کے لیے صرف موت ہے؟"
"اسی لیے تو ہم بھی ایم آر ایس بنانے پر مجبور ہوئے کہ اگر از رائٹ تو پھر ٹھیک ہے۔ ہم بھی جی کر دکھائیں گے۔ کسی سے جینے کا حق مانگنے کا زمانہ نہیں رہا تو ہم یہ حق چھین لیں گے۔ ڈارون نے تو بہت پہلے یہ بتا دیا تھا کہ ازل سے آج تک بقا کی جنگ میں وہی بچا ہے جس نے وقت اور حالات کی تبدیلی کے ساتھ بدل جانے کی صلاحیت حاصل کی۔ ڈینوسار ختم ہو گئے، ہاتھی اور شیر کی نسل معدوم ہو رہی ہے۔ مگر کاکروچ پینتیس کروڑ سال سے زندہ ہے، کیونکہ وہ پانی میں بھی زندہ رہنا جانتا ہے اور خشکی میں بھی، اُڑ بھی سکتا ہے تیر بھی سکتا ہے اور رینگ بھی سکتا ہے۔ اندھیرے اُجالے یا سخت سردی یا سخت گرمی میں سب کچھ کھا کے زندہ رہنا جانتا ہے۔ دنیا میں سیاسی اور معاشی طور پر وہی قوم باقی رہے گی جو وقت کے خلاف جنگ میں بھرپور قوت کے ساتھ شریک ہوگی۔ قدیم قبائل، قدیم تہذیب، رسم اور رواج سب مٹ رہے ہیں۔ سائنسی اور صنعتی ترقی کے لیے اپنی طاقت اور صلاحیت کو پوری طرح بروئے کار لانے کی صلاحیت رکھنے والے سپر پاور بن رہے ہیں۔"
میں اور محسن بول رہے تھے۔ اکرام شیخ اسٹیئرنگ پر سر رکھ کے سو گیا تھا۔ اس کا احساس ہمیں اپنی خاموشی سے ہوا۔
"یار، یہ تھا نیدار تو بیچ و بیچ سو گیا۔" محسن بولا۔
"کمال ہے، سنا تو تھا کہ نیند سولی پر بھی آ جاتی ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر اسٹیئرنگ وھیل پر..."
محسن نے ایک دھاگے کو بل دے کے اس کی ناک میں گھمایا تو وہ ہڑبڑا کے اٹھا۔
"یہ کیا بدتمیزی ہے؟"
"یہ کیا شرافت ہے؟" محسن بولا۔ "تم سونے آئے ہو؟"
"کون کم بخت سو رہا تھا؟" وہ جھلا کے بولا۔
"سابق ڈبل ایس آئی۔" میں نے کہا۔
"کیا وقت ہو گیا ہے؟" وہ جھینپ کے بولا۔
"ساڑھے تین۔" میں نے گھڑی کو روشنی کے رُخ کیا۔ شاید اسٹریٹ لائٹ منعکس ہو کے نازو تک پہنچی۔ میں نے دور کھڑی ہوئی کار میں بھی ایک جگنو سا چمکتا دیکھا۔ میں نے اپنی کلائی کو پھر گھما کے سامنے کیا۔ نازو نے پھر اسی طرح سگنل دیا۔
"یار، تیری بہن سگریٹ پی رہی ہے۔" میں نے کہا۔
"یہ کیا بکواس ہے؟"
"دیکھ لے تو۔" میں نے کہا۔ "جب وہ کش لیتی ہے تو چنگاری کی روشنی نظر آتی ہے۔"
محسن اور اکرام شیخ نے غور سے کار کے ونڈ اسکرین سے پیچھے دیکھا۔
"یہ کیا ہے یار!" محسن بولا۔ "اگر سگریٹ نہیں ہے تو...؟"
"تم لوگ پاگل ہو، نازو سگریٹ پیے گی؟" اکرام شیخ خفا ہونے لگا۔
"خواتین سگریٹ پی سکتی ہیں، اور پیتی ہیں۔" محسن بولا۔
"کہیں چرس کی لت تو نہیں پڑ گئی اسے۔" میں نے کہا۔ "پچھلے دنوں خاصی آزاد رہی ہے وہ اور اچھے ماحول میں بھی نہیں رہی۔ یہ کراچی کا شہر ایسا ہی ہے۔"
اکرام شیخ آگ بگولا ہو کے جیپ سے اترا اور کار تک گیا۔ میں نے محسن کو بتایا کہ اس چمک کا راز کیا ہے۔
"میں نے دیکھ لیا تھا۔" محسن بولا۔ "تو رسٹ واچ سے راکٹ سگنل دے رہا تھا۔" اور قہقہہ مار کے ہنسا۔ جب شیخ واپس آیا تب بھی ہم ہنس رہے تھے۔ وہ خفت سے دانت نکالتا رہا۔ آس پاس کا سارا علاقہ غیر آباد، تاریک اور سنسان تھا۔
اکرام شیخ نے ہمیں بتایا تھا کہ آگے گلشنِ اقبال ہے جو خوش حال لوگوں کی بستی ہے، مگر ابھی وہاں آبادی بہت کم ہے اور ترقیاتی کام جاری ہیں۔ یہ یونیورسٹی روڈ تھی جو تاحدِ نظر تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی اس پر نہ اسٹریٹ لائٹس تھیں اور نہ دونوں جانب آبادی کے آثار تھے۔ ایک ویرانہ تھا جس کا نام گلشن رکھ دیا گیا تھا۔ اسی ویرانے میں مزید پانچ چھ میل کے فاصلے پر کراچی یونیورسٹی کا نیا کیمپس تھا۔ رات کے وقت اس سڑک پر کسی قسم کی ٹریفک نہیں رہتی تھی، نہ بس نہ کوئی اور سواری۔ گلشنِ اقبال میں رہنے والا کوئی شخص اپنی کار میں گزرتا تھا تو پتلی سی خستہ حال سڑک پر رفتار زیادہ رکھتا تھا اور کسی کو لفٹ نہیں دیتا تھا کیونکہ سنسان سڑک پر لٹیرے متعدد وارداتیں کر چکے تھے۔
ٹرک اچانک نمودار ہوا مگر راؤنڈ اباؤٹ سے سیدھا آنے کے بجائے وہ اسٹیڈیم کی طرف جانے والی سڑک پر گھوم گیا۔ ہمیں بالکل پتا نہ چلتا اگر نازو ایک بار لائٹ جلا کے آف نہ کرتی۔
"یہ کیا کہنا چاہتی ہے بھائی؟" محسن نے کہا۔
"میں جا کے پوچھتا ہوں۔" اکرام شیخ بولا۔ مگر اتنی دیر میں نازو بھی نیچے اتر کے ہماری طرف آنے کے لیے روانہ ہو چکی تھی۔
"تم لوگ سو رہے ہو کیا؟" نازو نے قریب آ کے کہا۔ "ٹرک گزر گیا اور تمھیں پتا نہیں چلا۔"
"ٹرک گزر گیا؟" میں نے اور محسن نے ایک ساتھ کہا۔
"ادھر مُڑ گیا۔" نازو بولی۔ "میں نے پہچان لیا تھا۔"
"کیا پہچان لیا تھا؟" محسن نے کہا۔
"سب ٹرک ایک سے لگتے ہیں۔" اکرام شیخ نے کہا۔
"اُف، اس کا نمبر بھی دیکھ لیا تھا۔" نازو نے اپنے سر پہ ہاتھ مار کے کہا۔ "لے آر، الکتر بہتر۔"
"مگر وہ ادھر کیوں مُڑ گیا؟" میں نے کہا۔
"یہ اسی سے پوچھ لو جا کے، ٹرک ڈرائیور سے۔"
"اور وہ تمھارا... غالب عرف مغلوب کہاں گیا۔ اسے بھی وہ کدو کریلوں کے ساتھ لے گئے؟" محسن بولا۔
"ہاں، وہ کیوں نہیں آیا ابھی تک؟"

"یہ بھی اسی سے پوچھ لینا۔" نازو چڑ کے بولی۔ "اب جاؤ گے یا یہیں کھڑے بولتے رہو گے۔"

"جاتے ہیں بی بی۔ مگر ایسا تو نہیں کر سکتے ناکہ بالکل اس کے پیچھے سائے کی طرح لگ جائیں۔" میں نے کہا۔

"اور وہ نکل گیا کسی اور طرف تو...؟" نازو نے کہا مگر اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ اندھیرے میں سے ایک سایہ دوڑتا ہوا نمودار ہوا۔ یہ غالب تھا۔

"کیا ہوا؟ کھڑے کیوں ہو؟"

"صرف نازو کھڑی ہوئی ہے، ہم جیپ میں بیٹھے ہوئے ہیں۔"

"لاحول ولا... تم نے ٹرک مس کر دیا کیا؟"

"ہم نے تو کر دیا تھا مگر مس نازو نے مس نہیں کیا۔" محسن بولا۔

"یہ ہمیں ٹرک کے تعاقب میں جانے پر اکسا رہی تھیں۔"

"ہم اب جاتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "تم اتنے ہی وقفے سے ہمارے پیچھے آؤ۔"

"مگر اس طرح کہ ہمیں پتا نہ چلے۔" اکرام شیخ نے جیپ کو اسٹارٹ کیا۔

"اس میں اوپر تک مال لادا گیا ہے۔" غالب نے کہا۔

"مال کا اندازہ نہیں ہوا؟"

"نہیں، مگر شک کی کوئی بات نہیں۔ سبزی یا پھل کے کریٹ اٹھانے والوں پر بھی میری نظر تھی۔ پندرہ بیس سیر کا وزن اٹھانا انھیں مشکل نہیں ہو رہا تھا۔ لیکن جب انھوں نے دوسرے کریٹ اٹھا کے رکھے تو ان کی حالت خراب ہو گئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کئی گنا وزن اٹھا رہے ہیں۔"

"مزدور ہی تھے؟"

"ہاں، میرا خیال ہے ان کے اپنے آدمی ہیں۔" غالب نے کہا۔

"روز یہی لوگ ہوتے ہیں۔ شاید انھیں منہ بند رکھنے اور کوئی سوال نہ کرنے کی اجرت زیادہ ملتی ہوگی۔ ورنہ وہ پوچھ سکتے ہیں کہ ان کریٹوں میں کیا لوہا بھرا ہوا ہے۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "پانچ منٹ ہو گئے، ٹرک اگلے چوراہے تک ہی پہنچا ہوگا۔" اور جیپ بڑھا دی۔

"اس کی رفتار کم تھی۔" محسن نے کہا۔

"وزن جو زیادہ تھا۔" میں نے اس کی تائید کی۔

"اگلا چوک اسٹیڈیم کے پاس ہے۔" اکرام شیخ نے ہیڈ لائٹس آف کر کے جیپ کو اس ویران اور اندھیری سڑک پر دوڑانا شروع کیا۔ "وہ داہنے ہاتھ ہی جائے گا۔"

"الٹے ہاتھ پر کیا ہے؟"

"حیدر آباد کا راستہ۔ لیکن کارساز روڈ سے وہ رخ بدل سکتا ہے۔"

"کارساز...؟ کیا وہاں کاریں بنتی ہیں؟" محسن نے کہا۔

"کارساز نیوی کا ایک ٹریننگ سینٹر ہے۔" اکرام شیخ نے کہا۔

"ٹیکسی ڈرائیوری کے پیشے نے تجھے اس شہر کے جغرافیے کا ماہر بنا دیا ہے۔" محسن نے اعتراف کیا۔

"ماہر؟ اس شہر میں چند مہینے سڑکوں پر پھرنے سے صرف سڑکوں کا اور مقامات کا پتا چلتا ہے۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "سارا کیا، ابھی آدھا شہر بھی نہیں دیکھا۔"

"سامنے دیکھو۔" میں نے کہا۔ کیونکہ جیپ سڑک کے کسی گڑھے سے گزرتے ہوئے اچھلی تھی۔

"مین ہول تھا کھلا ہوا۔" اکرام شیخ نے متانت سے کہا۔ "گزر گیا۔"

"ہم نہ گزر جائیں خیر سے۔" میں نے کہا۔

"وہ... ٹرک تو دائیں طرف مڑ گیا۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "اب کیا کروں؟" اور جیپ کو سیدھے ہاتھ کی طرف موڑ لیا۔

"ذرا رک جاؤ۔ یہ راستہ کدھر جاتا ہے؟" میں نے کہا۔

"یہ واپس وہیں۔ نیو ٹاؤن تھانے کی طرف جاتا ہے۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "ٹرک جہاں سے روانہ ہوا تھا اس مقام سے کوئی دو فرلانگ پر... اسی سڑک پر۔"

"یہ چکر کس لیے؟" محسن بولا۔ "دو فرلانگ واپس جانے کا ٹرک نے دو میل کا لمبا راستہ اختیار کیا ہے۔"

"آگے ٹرک کہاں جا سکتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بائیں ہاتھ پر... ہم بھی ادھر ہی گئے تھے چائے پینے۔ مگر میرا خیال ہے کہ ٹرک شہیدِ ملت روڈ پر جائے گا۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "وہاں سے سیدھا...... گورا قبرستان، کالا پل، پھر کورنگی روڈ پر۔"

"دیکھ بھائی! ہم اجنبی ہیں اس شہر میں۔ ایسے ناموں سے امپریس مت کر۔" محسن نے کہا۔ "بس ذرا فاصلے سے ان کا تعاقب رکھ... اور یہ بتا کہ انھیں روکنا ہو تو کہاں روکا جائے؟"

اکرام شیخ نے پھر جیپ اسٹارٹ کی۔ "اگر وہ کورنگی روڈ کی طرف جاتے ہیں تو آگے سب ویرانہ ہے۔ راستے میں کسی بھی جگہ ان کو روکا جا سکتا ہے۔"

"پیچھے والوں کا کچھ پتا ہے؟" میں نے پلٹ کے دیکھا۔

"ہاں، آ رہے ہیں وہ بھی۔" محسن نے تصدیق کی۔

اکرام شیخ کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ ٹرک اسی راستے پر جا رہا تھا جو اس کے ذہن میں تھا۔ ہم سے کافی پیچھے کار تھی جس کی چھوٹی لائٹیں جلتی تھیں اور بجھ جاتی تھیں۔ نازو ہمیں بتاتی تھی کہ وہ ہمارے ساتھ ہے مگر میرے نزدیک یہ ایک غلط حرکت تھی۔ ہم سے آگے جانے والے ٹرک کا ڈرائیور بھی بے وقوف نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس ٹرک پر جو مال ہے اور یہ مال پکڑا جائے تو پریشانی لاحق ہو سکتی ہے۔ وہ بھروسے کا آدمی ہوگا جو یہی کام ہر روز پوری ذمے داری کے ساتھ کرتا ہوگا۔ ہر روز نہ سہی جب بھی اسے یہ خدمت سونپی جاتی ہوگی وہ پوری طرح محتاط رہتے ہوئے اس مال کو منزلِ مقصود تک پہنچاتا ہوگا۔ وہ یقیناً آگے کی طرح پیچھے بھی نظر رکھتا ہوگا۔ وہ جلتی بجھتی لائٹ دیکھ سکتا تھا۔

شہیدِ ملت روڈ پر پہنچ کر ٹرک کی رفتار ایک دم بڑھ گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ مزید تاخیر سے نقصان ہوگا۔ غالباً ٹرک ڈرائیور نے ہمیں تعاقب کرتے دیکھ لیا تھا۔ میں نے محسن سے مشورہ کیا اور پھر ہم نے اتفاقِ رائے سے ٹرک کو روکنے کا فیصلہ کیا۔

اکرام شیخ نے ہیڈ لائٹس آن کرتے ہی جیپ کی رفتار بڑھا دی۔ فور وہیل ڈرائیو جیپ نے دس منٹ میں ٹرک کو جا لیا۔ یہ بالکل غیر آباد اور سنسان جگہ تھی۔ دائیں طرف مجھے پہاڑیاں سی نظر آ رہی تھیں اور بائیں جانب بہت بڑی کوٹھیاں رات کے آخری پہر میں غیر آباد لگتی تھیں۔

اکرام شیخ نے ٹرک کو بڑی ہوشیاری سے اوورٹیک کیا۔ میں نے اور محسن نے اپنے اپنے ریوالور نکال لیے تھے۔ جیپ نے آگے نکلتے ہی رفتار کم کی اور ٹرک کو اپنے پیچھے رہنے پر مجبور کر دیا۔ پھر شیخ نے ہاتھ باہر نکال کے اسے رکنے کا اشارہ کیا اور اسے ایک کنارے پر یوں روکا کہ جیپ اس کے سامنے آ گئی۔

میں اور محسن بڑی مستعدی سے چھلانگ مار کے نیچے اترے، اکرام شیخ افسرانہ تمکنت کے ساتھ آیا۔ ٹرک ڈرائیور نے دروازہ کھولے بغیر کھڑکی سے سر نکالا۔

"کیا بات ہے جناب عالی!" وہ عاجزی سے بولا۔ مگر اس عجز میں تمسخر اور طنز کا انداز واضح تھا۔ "حکم کرو۔"

"نیچے آؤ۔" اکرام شیخ نے غرا کے کہا۔ "حکم کے غلام۔"

"خیر ہووے سرکار دی۔" ٹرک ڈرائیور نیچے آیا۔ وہ ایک بھاری بدن اور لمبے قد والا شخص تھا جو پولیس کو دیکھ کر بالکل ہراساں نہیں ہوا تھا۔

"لو جی نیچے آ گئے۔" اس نے مونچھوں کو تاؤ دے کر کہا۔ "اب حکم کرو۔"

"اس ٹرک میں کیا ہے؟" اکرام شیخ نے کہا۔

"اس میں!" اس نے ٹرک کی طرف ایسے دیکھا جیسے وہ خود ٹرک کو دیکھ کر بہت حیران ہے۔ "بوت کچھ ہے جناب عالی...! انجن ہے، تے ٹائر..."

اسے زیادہ کچھ کہنے کا موقع نہیں ملا۔ خالص تھانیدارانہ انداز میں شیخ نے اس کو گالی دی اور اس کے منہ پر الٹے ہاتھ کا بھرپور چھاپڑ رسید کیا جس کی پٹاخے جیسی آواز رات کے سکوت میں کچھ زیادہ ہی محسوس ہوئی۔

اس شخص کی ساری ظرافت ختم ہو گئی۔ بے اختیار اس کا ایک ہاتھ گال پر گیا۔ اور دوسرا ڈاسکٹ کی طرف بڑھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اس کی آنکھیں جو پہلے چرس کے نشے میں لال لگتی تھیں اب بے عزتی کے احساس پر طیش سے انگارا ہو گئیں — میں نے ہاتھ سے اسے روک دیا۔

"سیدھا کھڑا رہ، افسر بات کر رہا ہے اور تو جیب میں ہاتھ ڈال رہا ہے۔" میں نے کہا۔

اس نے مجھے ایک گالی دی اور دانت پیس کر میری طرف بڑھا۔ "تیرے افسر سے تو میں بعد میں نمٹ لوں گا..."

میرے قریب آنا اسے مہنگا پڑا۔ میں نے بڑے سکون اور اطمینان کے ساتھ اسے کندھے پر سے اٹھا کے نیچے دے مارا۔ عرفِ عام اور پرانی کشتی کے فن کی اصطلاح میں یہ دھوبی پٹخا کہلاتا ہے۔

"سیدھا کھڑا ہو جوان۔" میں نے کہا۔ "افسر کھڑے ہیں اور تو لیٹا ہوا ہے گستاخ۔"

وہ آہستہ آہستہ کھڑا ہوا۔ "تم کو معلوم ہے یہ کس کا ٹرک ہے؟" اس نے خطرناک دھمکی دینے والے لہجے میں کہا۔

"ہاں، بیڈفورڈ کمپنی کا۔" محسن نے سر ہلایا۔ "افسر بھی یہ بات جانتے ہیں۔"

"تمھیں معلوم ہے اس کا مالک کون ہے؟" ڈرائیور غرایا۔

"میاں ہم سب کا، کائنات کی ہر چیز کا مالک اللہ ہے۔" میں نے انگلی اوپر اٹھا کے عین حاجی کے انداز میں کہا۔

وہ چونکا۔ "جب تم جانتے ہو تو پھر راستہ کیوں روکا ہے؟"

"کیا تم جانتے نہیں کہ پولیس کا یہی کام ہے۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "چیکنگ کرنا۔"

"دیکھو تھانیدار جی... مجھے نہیں معلوم تم کون ہو اور کہاں سے بیچ میں آ گئے ہو۔" ڈرائیور نے کہا۔ مگر اب اس کا لہجہ پہلے کی طرح غیر شریفانہ نہیں رہا تھا۔

"میرا نام اس وردی کی جیب پر لکھا ہوا ہے۔" اکرام شیخ بولا۔ "اور اس سے تم کو مطلب نہیں ہونا چاہیے کہ میں کہاں سے آیا ہوں۔"

"افسروں سے پوچھتا ہے کہ کہاں سے آئے ہو۔" میں نے اس کی گدی پر ہاتھ مارا۔ "پھر پوچھے گا کہ کہاں جاؤ گے؟"

اس نے قہر آلود نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "او تھانیدار! اپنے بندے کا ہاتھ روک لے ورنہ..."

"ورنہ تو مجھے دنبہ بنا دے گا۔ بندے اور دنبے میں صرف الفاظ کا الٹ پھیر ہے۔" میں نے اس کے ایک اور ہاتھ مارا مگر وہ بچ گیا۔

"تھانیدار...!" وہ چلایا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے... جب ہمارا

معاملہ تم سے طے ہو گیا ہے... حصہ پہنچ گیا ہے...“

”اوئے... اوئے... افسروں پر تہمت لگاتا ہے رشوت کی؟“ محسن نے اس کے لات رسید کی۔

”اور وہ بھی رشوت دیے بغیر۔“ میں نے اسے ٹانگ اڑا کے منہ کے بل گرا دیا۔ ورنہ وہ محسن پر حملہ کر دیتا۔

”چل اُٹھ بدبخت... خاک تیرے منہ میں۔“ میں نے کہا۔ ”تو افسروں کو دھمکی دیتا ہے۔“

”اپنا تُھوتھا صاف کر... اور ادب سے سیدھا کھڑا ہو الف کی طرح...“ محسن نے کہا۔

ڈرائیور کی آنکھوں میں شکوک کے سائے پہلی بار ابھرے۔ ”کون ہو آخر تم لوگ۔ نئے آئے ہو یہاں تو سمجھ لو کہ اس راستے پہ حاجی کے ٹرک کو روکنے کی ہمت پہلے کبھی کسی نے نہیں کی؟ پچھلے ہفتے تک یہاں دوسرا تھانیدار تھا۔“

”وہ تو گیا۔“ میں نے دعا کے انداز میں دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کے کہا۔ ”اب تم اپنی فکر کرو۔“ محسن نے میری تائید میں سر ہلایا۔

”پرانی باتیں بھول جاؤ۔“ اکرام شیخ نے اپنی متانت برقرار رکھی۔ ”یہ بتاؤ ٹرک میں کیا ہے..... ٹرک کہاں سے آیا ہے اور کہاں جا رہا ہے؟“

”تھانیدار صاحب!“ ڈرائیور نے محتاط ہو کے کہا۔ ”میں تو ملازم ہوں حاجی صاحب کا... لاہور سے پھل فروٹ کراچی لاتا ہوں۔“

”اور کراچی سے کیا لے جاتے ہو؟“ اکرام شیخ نے کہا۔

”یہ میں نہیں بتا سکتا۔“ وہ بولا۔ ”آپ اپنے افسروں سے بات کر لو... میں نام بتا دیتا ہوں...!“

اکرام شیخ نے اس کے دوسرا جھانپڑ زیادہ پھرتی کے ساتھ اور زیادہ قوت سے مارا۔ وہ لڑکھڑا گیا۔ ”میں نے کسی افسر کا نام نہیں پوچھا۔ ان کے نام میں جانتا ہوں۔ جو میں نے پوچھا ہے وہ بتاؤ۔“

”جنابِ عالی! ہم پر کیوں ناراض ہوتے ہیں۔“ اس کا لہجہ ایک دم خوشامدانہ ہو گیا۔ ”ہم تو آپ کے بھی خادم ہیں۔“

”فی الحال مجھے کسی نوکر کی ضرورت نہیں۔ سارا کام میں خود اپنے ہاتھ سے کر لیتا ہوں۔“ اکرام شیخ نے اسے ہاتھ دکھا کے کہا۔ ”اس ہاتھ سے۔“

”میری عرض تو سُنیں جناب! اگر کوئی اونچ نیچ ہو گئی ہے تو میرے کو معافی دیں۔“ وہ بولا۔ ”لاہور سے کراچی تک ہمارے ساتھ سب تعاون کرتے ہیں۔ یہاں بھی ایسی ویسی بات کبھی نہیں ہوئی۔ ہم تو سب کو راضی خوشی رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آپ بھی ناراضگی ختم کرو۔ مجھے اختیار تو نہیں، لیکن میں چاہتا ہوں... آپ بھی راضی خوشی جائیں۔ اور مجھے بھی جانے دیں۔ ہم آئندہ بھی کام آئیں گے آپ کے ہمیشہ، کیونکہ اب آپ سے واسطہ تو رہے گا۔ میں حاجی صا[حب کو] بول دوں گا کہ نیا افسر آیا تھا۔ اس کو خرچہ پانی دینا پڑا...“

”اوئے... اوئے... خرچہ پانی، رشوت۔“ محسن نے پھر لات ماری۔ ”ہمارے افسر کو...“

وہ اس لات کے لیے تیار نہیں تھا۔ کیونکہ وہ براہِ راست شیخ سے مخاطب تھا جو اس کی بات دلچسپی سے سن رہا تھا۔ وہ میری طرف آیا تو میں نے بھی لات مارنے میں کوئی [کسر] نہ سمجھا۔ ”اوئے، خانہ خراب، کھوتے... سیدھا تیر ہو جا نہیں [تو] بنا دوں گا۔“

”تھانیدار صاحب! یہ... تم منع کیوں نہیں کرتے...“ اس نے گالی کو لبوں پر روک لیا۔

”کتنا خرچہ پانی دے سکتے ہو تم، اس وقت۔“ شیخ نے [بڑی] نرمی سے پوچھا۔

”پہلی بار ہے ناجی۔“ وہ کچھ مطمئن ہوا۔ ”ابھی آپ پانچ[...] پھر ہر پھیرے کے آدھے...“

اکرام شیخ نے پھر تھپیڑ مار کے اسے حیران کر دیا۔ اس کا [خیال] تھا کہ اب تو مصالحت کے فارمولے نے اختلاف ختم کر دیا ہے۔

”اور یار! چلو تم بھی اتنے ہی لے لینا۔ جتنا وہ... لیتا تھا۔“ [وہ تیزی] سے بولا۔ ”ہر پھیرے کے پانچ۔“ اس نے ایک تھانیدار کو نام [اور] القاب سے بھی یاد کیا۔

”اسے تو میں بتا دوں گا کہ تم اس کو کیا کہہ رہے تھے۔“ اکرام [شیخ] نے کہا۔ ”ابھی تو صرف یہ معلوم کرنا ہے کہ ٹرک میں کیا ہے اور کہاں جا رہا ہے؟“

”یار! تم وہیں چل کے بات کر لو۔“ ڈرائیور نے مشتعل ہو[کر کہا]۔

”اوئے... اوئے... افسر کو یار بولا۔“ محسن نے اب پھر لات ماری۔ ”افسر کا یار افسر ہوتا ہے، کھوتے دے کھُر۔“

”ہاں، ہاں۔ پتا چل جائے گا کہ کس افسر کا کون افسر دو[ست ہے]۔“ وہ خون کے گھونٹ پی کے بولا۔ ”یہاں بہت کچھ کر سکتے ہو تم [کہ] اکیلا ہوں نا۔ وہاں چل کے ان سے پوچھنا جو کچھ پوچھنا ہے تمھا[رے] یار افسروں کو بھی بلالیں گے وہ۔“

”یہ بات تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ اکرام شیخ نے کہا۔ ”آخر بے چارہ ملازم ہی تو ہے۔ مالکوں سے بات کرنا چاہیے، چلو [پھر] چلتے ہیں۔ مگر یہ بتاؤ وہاں اس وقت کون ملے گا؟“ ”سیٹھ اکبر یا چاند [بھائی]۔“ ڈرائیور نے کہا۔ ”یہ تو جا کے ہی پتا چلے گا۔“

اکرام شیخ کا تیر نشانے پہ بیٹھا تھا۔ ڈرائیور مطمئن ہو گیا کہ [ان] مالکوں میں سے تین کو ضرور جانتے ہیں۔ لاہور کے حاجی عبد[...] کراچی کے اکبر سیٹھ اور چاند بھائی کو کسی حوالے کے بغیر وہ شک میں مبتلا ہو سکتا تھا۔ پھر ممکن ہے وہ ہمیں اپنے ٹھکانے تک نہ لے جاتا۔

”تمھارے ساتھ... وہ کلینر نہیں آیا؟“

”اس کو بخار ہو گیا تھا۔ میں نے کہا کہ تو ادھر لمبا پڑ جا۔ میں واپس آؤں گا تو ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گا۔“ وہ بولا۔

شیخ کا یہ سوال بھی ذہانت پر مبنی تھا۔ کوئی ٹرک ڈرائیور بغیر کلینر کے سفر نہیں کرتا۔

”چلو، پھر میں تمھارے ساتھ چلتا ہوں۔“

”میرے ساتھ۔“ وہ ایک دم گھبرا گیا۔ ”جیپ جو ہے آپ کی؟“

”جیپ میں یہ دونوں آئیں گے۔“ اکرام شیخ نے کہا اور ریوالور سے اشارہ کیا۔ ”چلو۔“

مگر ڈرائیور کھڑا رہا۔ اس کا چہرہ کسی اندرونی کشمکش اور کسی منصوبے کی ناکامی کے جذبات کا ترجمان ہو گیا تھا۔ وہ اپنے ہونٹوں کو دانتوں سے کاٹ رہا تھا۔ باری باری ہم سب کو دیکھ رہا تھا۔ اور کسی فیصلے پہ پہنچنے سے قاصر تھا۔

میں سمجھ گیا تھا کہ ’وہاں‘ لے جانے کا مقصد صرف دھوکا دینا تھا۔ وہ ٹرک میں بیٹھتا تو شاید ہمیں عدم آباد پہنچا دیتا۔ وہ تو اس خوش فہمی میں اُتر آیا تھا کہ خواہ مخواہ راستہ کاٹنے والوں کو حاجی کے نام سے اور بڑے افسروں کے حوالے سے یا نوٹ دکھا کے چلتا کر دے گا۔ یہ ذلت اٹھانے کا اس نے سوچا بھی نہ ہو گا۔ اب اپنی ہر کوشش میں ناکام ہو جانے کے بعد اس نے ہمیں وہ سزا دینے کا فیصلہ کیا تھا جس کے ہم مستحق تھے۔ یہ اسلحے کے کاروباری لوگ تھے جو راستے خرید کے چلتے تھے یا پھر راستے کی رکاوٹیں صاف کر دیتے تھے۔ زر سے یا زور سے۔

اگر وہ ٹرک میں بیٹھ کے چل پڑتا اور ہم اس کے پیچھے روانہ ہو جاتے تو موقع ملتے ہی وہ ہم پر دستی بم پھینک دیتا یا کسی مشین گن کا فائر کھول دیتا جو آگے احتیاطاً رکھی گئی ہو گی کسی خفیہ جگہ پر، مثلاً سیٹ کے نیچے۔ ہم نے تو اسے ریوالور تک نکالنے کا موقع نہیں دیا تھا۔

”یہ تو کھڑے کھڑے سو گیا سر جی!“ میں نے کہا۔

”اوئے... اوئے... افسروں کے سامنے سوتا ہے۔“ محسن نے اپنے مخصوص لہجے میں بولتے ہوئے لات چلائی۔

”اس کی تلاشی لو۔“ اکرام شیخ نے کہا۔

اس کے ساتھ ہی ڈرائیور کی قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ وہ ایک دم بھاگ کے ٹرک کی پناہ میں جانا چاہتا تھا تاکہ وہاں خود کو محفوظ رکھتے ہوئے ہم پر فائر کرے، مگر ہم بھی غافل کہاں تھے۔ اس بار محسن ایک دم بیٹھ گیا اور ڈرائیور اس کے اوپر سے گزرتے کی کوشش میں منہ کے بل گیا۔ میں نے اسے پھر اُٹھنے نہیں دیا۔

وہ طاقت ور آدمی تھا اور اس نے خود کو چھڑانے کی زبردست کوشش کی۔ وہ محسن کے بھی ایک لات مارنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس لات نے محسن کو کافی دور پہنچا دیا تھا، مگر اس کے بعد میں نے اپنا کام دکھایا اور اسے دو منٹ تک اچھالا گھمایا اور ٹرک پہ ملا۔ یہاں تک کہ وہ نیم جان ہو گیا اور بُری طرح ہانپنے لگا۔ اس میں گالیاں بکنے کا حوصلہ بھی نہ رہا۔ اکرام شیخ اور محسن ’واہ‘، سبحان اللہ اور مُکرّر کہتے رہے۔

محسن نے اس کی جامہ تلاشی میں دو ریوالور برآمد کیے جو بالکل نئے اور غیر ملکی ساخت کے تھے۔ ایک اس کی واسکٹ میں باہر والی جیب سے نکلا اور دوسرا شلوار کی ڈب میں سے۔

”تم... تم پولیس کے بندے نہیں ہو۔“ اس نے ہماری آپس کی گفتگو سن کے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

”حق ہے میاں۔“ میں نے کہا۔ ”مگر تم پر سچائی کا انکشاف بڑی مشکل سے ہوا۔ کافی محنت کرنا پڑی ہمیں۔“

”اور کافی مار کھانا پڑی تمھیں۔“ محسن بولا۔

”اسے ڈالو اپنی گاڑی میں۔“ اکرام شیخ نے کہا۔ ”اچھی طرح پیک کر کے۔“

”تم بچو گے نہیں، وہ معمولی لوگ نہیں ہیں جن کے ساتھ تم نے پنگا لیا ہے۔“ وہ چلّانے لگا۔

”اوئے... اوئے... افسروں سے بدتمیزی۔“ محسن نے اب بے خوف ہو کے اسے لات ماری۔

”پیکنگ کا سامان لا یار۔“ میں نے محسن سے کہا۔ ”اس لاتوں کے بھوت کے لیے۔“

محسن نے جیپ..... اور ٹرک میں سے تلاش کر کے ایک رسّی نکال لی۔ ڈرائیور نے مدد کے لیے چلّانے کی خاطر منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے اس میں ریوالور ڈال دیا۔

”آہستہ... منہ کیا زبان بھی مت ہلانا۔“ میں نے کہا۔ ”ورنہ گولی چل جائے گی۔ حلق میں سوراخ ہو جائے گا۔“

”پھر آواز دونوں طرف سے نکلے گی۔“ محسن نے کہا۔ ”آگے سے بھی پیچھے سے بھی۔“

ڈرائیور ساکت ہو گیا۔ محسن نے اس کو اکرام شیخ کے ساتھ مل کر یوں باندھا کہ وہ گٹھری بن گیا۔ پھر اس کا منہ کپڑا ٹھونس کے سیل کیا گیا۔ ہم نے اسے جیپ میں ڈالا اور ایک کانفرنس کی۔

”اب کیا کرنا ہے؟“ محسن بولا۔

”تم جاؤ۔ پیچھے کہیں نازو اور غالب کار روکے کھڑے ہوں گے۔ انھیں لے آؤ۔“ میں نے کہا۔

”اس کے بعد؟“

"اس کے بعد تم جاؤ اپنے راستے، ہم جائیں گے اپنے راستے۔ تم لے جاؤ ڈرائیور۔ ہم لے جاتے ہیں ٹرک۔" میں نے کہا۔

"اگر میں کہوں کہ تم لے جاؤ ڈرائیور اور ٹرک مجھے دے دو؟" محسن نے احتجاج کیا۔

"تو ہم کہیں گے شٹ اپ... تم ماتحت ہو۔" اکرام شیخ بولا۔

"ایسی کی تیسی تمہاری اور افسری کی..."

"اوئے... اوئے... افسر کو گالی دیتا ہے۔" میں نے محسن کے لہجے کی نقل اتاری۔ مگر لات کھانے سے پہلے وہ بھاگ گیا۔

میں نے اور اکرام شیخ نے ٹرک پر چڑھ کے کریٹ دیکھے۔ نیچے تک ہر کریٹ کو کھولنا ناممکن تھا۔ وھیل اسپنر اور ٹول بکس میں ملنے والے بڑے پیچ کس کی مدد سے میں نے چند کریٹ کے ڈھکنے ہٹائے۔ حسب توقع ان میں ہر قسم کا اسلحہ تھا۔ دو کریٹ ریوالوروں سے بھرے ہوئے تھے۔ دو میں غیر ملکی ساخت کے دستی بم تھے اور ایک میں بارودی سرنگیں۔

کار آگئی تو ہم نیچے اتر آئے۔ محسن نے اور اکرام شیخ نے ڈرائیور کو ڈگی میں ڈال دیا۔ غالب اور نازو نے مجھے مبارک باد دی۔

"تمھیں بھی مبارک ہو۔" میں نے مختلف لہجے میں کہا۔ "تھانیدار مان گیا ہے۔"

"کیا مان گیا ہے؟" غالب نے غور سے نازو کو دیکھ کر کہا۔

"وہی بات، جو نازو نے مجھ سے کہی تھی کہ... بھیا سے کرلینا۔"

"سکندر بھائی۔" نازو نے گھبرا کے پیچھے دیکھا۔ "ایسا جھوٹ۔"

"قسم خدا کی میں نے سچ بتایا تھا اسے، اور تمھیں بھی سچ بتا رہا ہوں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "اب تم لوگ جاؤ۔" میں نے محسن اور اکرام شیخ کو آتے دیکھ کر کہا۔

خوشی کے مارے غالب کی بتیسی بج رہی تھی۔ دوسری طرف نازو کی حالت بھی غیر تھی۔

"یہ... اسے کیا ہوگیا؟" محسن نے تشویش سے کہا۔

"یہ بیک وقت ہنسنے کی رونے کی اور کوئی موزوں شعر پڑھنے کی کوشش کر رہا ہے۔" میں نے کہا۔

"اور اسے؟" اکرام شیخ نے نازو کو دیکھا۔

"میں... میں پریشان ہوں آپ لوگوں سے۔" میرے کچھ کہنے سے قبل ہی نازو بول پڑی۔ "اب کہاں جا رہے ہو؟"

"بی بی! اکرام شیخ کو کراچی کے راستے معلوم ہیں۔ یہ میرے ساتھ رہے گا۔" میں نے کہا۔ "ہم صبح ہونے تک ٹرک کو سمندر میں ٹھنڈا کر کے لوٹ آئیں گے۔ تم اس قیدی سے جو معلومات حاصل کرنا چاہو کر لینا۔ یا کچھ نہ کرنا۔ راجا اور موہنی کو بتا دینا کہ سب خیریت ہے۔ اور خود بھی چین سے سو جانا۔"

"خاک سو جانا، اب ان آنکھوں میں نیند کہاں؟" غالب شوخ لہجے میں کہا۔

"مطلب یہ کہ صبح تو ہونے ہی والی ہے۔" نازو گھبرا کے بولی۔ "ہم چلتے ہیں تم دیر مت کرنا... اور ذرا احتیاط سے کام لینا۔"

"چل چل... بڑی آئی ہمیں نصیحت کرنے والی۔ تو کیا ہماری۔" اکرام شیخ نے اسے ڈانٹا۔

"بھیا! میں نے آپ کو شیطان تو نہیں کہا۔" وہ معصومیت سے بولی اور پھر ہنس پڑی۔ اس کی خوشی اور غالب کی خوشی کا رنگ ایک لگا۔ جیسے ایک ہی ٹہنی کے دو گلابوں کی خوشبو۔

جب کار واپس ہوگئی تو میں نے خدا کا نام لے کر ڈرائیونگ سیٹ پر جگہ لی اور اکرام شیخ میرے پاس بیٹھ گیا۔ ہم نے اپنے ریوالور محسن کو دے دیے تھے اور اب ہمارے پاس وہی دو ریوالور تھے جو ڈرائیور کے قبضے سے برآمد ہوئے تھے۔ میں نے ٹرک کو اسٹارٹ کیا اور اکرام شیخ نے اس کے ڈرائیونگ کیبن کی تلاشی لی۔

گلوز کمپارٹمنٹ میں کاغذات کے نیچے سے ایک اور ریوالور برآمد ہوا۔ اکرام شیخ نے صرف کاغذات جیب میں ٹھونسے اور ریوالور وہیں چھوڑ دیا۔

"اب کدھر سے چلنا ہے؟" میں نے کہا۔

"سیدھا جانا تو مناسب نہیں ہوگا۔" وہ سوچ کے بولا۔ "واپس چلو، کارساز کی طرف سے چلتے ہیں۔"

"تم نے سمندر دیکھا ہے؟" میں نے کہا۔

"کراچی میں سمندر کس نے نہیں دیکھا۔ اگر کسی نے نہیں دیکھا تو گویا وہ پیدا ہی نہیں ہوا۔" اکرام شیخ بولا۔ "جیسے لاہور والے کہتے ہیں کہ جنہے لہور نئیں ویکھیا او جمیا ای نئیں۔"

میں نے ٹرک کو ریورس میں لے کر موڑ کاٹا۔ "سمندر کا وہ سا علاقہ ہے جہاں سے ہم ٹرک کو براہ راست پانی میں غرق کر...

"کیا ٹرک کو بھی سپرد آب کرنا ضروری ہے؟"

"ٹرک کا ہم کیا کریں گے؟" میں نے کہا۔

"ٹرک ہمارے کام آسکتا ہے۔" اکرام شیخ بولا۔ "ہم اسے ٹریپ کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں۔ معلوم نہیں اسے کہاں پہنچنا تھا مگر صبح تک اس کی گمشدگی کا راز فاش ہو جائے گا اور صبح ہونے میں اب دیر ہی کتنی ہے؟"

"صبح ہو جائے گی ایک گھنٹے میں۔"

"ایک گھنٹے میں ہم یہ کارروائی مکمل نہیں کر سکتے۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں اپنا پلان بدل دینا چاہیے۔"

"کیا تبدیلی ہو سکتی ہے اب...؟"

"ہم واپس چلتے ہیں۔" اکرام شیخ نے کہا۔

"واپس کہاں...؟ سیٹھ اکبر کے پاس... کہ بھائی معاف کرنا، ہم غلطی سے آپ کا یہ مال سے بھرا ہوا ٹرک ہائی جیک کر کے لے گئے تھے۔ اب امانت لوٹانے آئے ہیں۔"

"یار! میں جو خطرہ محسوس کر رہا ہوں... وہ تیری نظر میں کیوں نہیں۔" اکرام شیخ بولا۔ "پہلے تو یہ دیکھ کہ ہم نے پہن کیا رکھا ہے۔ یہ پولیس کی وردی ہے۔ کیا پولیس والے اس قسم کے مال بردار ٹرک چلاتے ہیں؟"

"اوہ مائی گاڈ...!" میں نے کہا۔ "یہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔"

"اس وقت ہم کپڑے بدل بھی نہیں سکتے۔" وہ بولا۔ "اگر آگے کوئی پولیس پارٹی مل گئی تو معاملہ بگڑ جائے گا۔ ہم کیا جواب دیں گے انھیں۔ اگر یہ کہا کہ چھاپا مارا تھا اور یہ مال پکڑا ہے تو وہ پوچھیں گے کہ وہ بندے کہاں ہیں جو مال لائے تھے یا لے جا رہے تھے اور مال کیا ہے؟ ہم کسی سوال کا صحیح جواب نہیں دے سکتے۔ پھر یہ کہ ولی راولی می شناسد۔ پولیس والے کو پولیس والا ضرور پہچان لیتا ہے۔ مقامی پولیس کے افسر ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ میری تھانیداری کا جھوٹ تو فوراً کھل جائے گا۔"

"مگر یار...! یہ ٹرک واپس کہاں لے جائیں؟" میں نے قائل ہو کے ٹرک کو روک لیا۔

"اپنے گھر۔" اکرام شیخ نے کہا۔

"وہاں... اتنا بڑا ہاتھی چھپا سکتے ہیں ہم؟"

"بیرک بہت بڑی ہے اور خالی پڑی ہے۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "وہ تو جہازوں کا ہینگر ہے۔ ٹرک اس میں اندر جا سکتا ہے۔"

"مگر تھانیدار صاحب! اس کا دروازہ انسانوں کے گزرنے کے لیے بنایا گیا تھا۔" میں نے کہا۔

"پروا نہیں، تم ٹرک گزار دینا۔" وہ بولا۔ "دروازہ کیا چیز ہے۔"

"مگر دیوار بھی گرے گی۔" میں نے کہا۔

"گرنے دو۔" اکرام شیخ بولا۔

"دھماکا بھی ہوگا۔" میں نے کہا۔

"ہونے دو۔" اکرام شیخ اڑا رہا۔

"یار! کچھ عقل سے کام لو۔ وہ پوری بیرک گر سکتی ہے۔"

"نہیں، بیرک نہیں گر سکتی۔ اس کی بناوٹ ہی ایسی ہے۔ صرف سامنے والی دیوار میں شگاف ہوگا۔ دروازہ اور کھڑکی نکل جائیں گے اور اوپر والے شہتیر تک چنائی بھی کھل جائے گی، مگر وہ شہتیر کافی اونچا ہے۔ چھت اس جیسے کئی متوازی شہتیروں پر قائم ہے۔"

مزید بحث کرنے میں وقت ضائع ہوتا۔ میں نے اکرام شیخ کی تجویز قبول کرلی اور ٹرک کو اسی راستے پر ڈال دیا جس پر کچھ دیر پہلے ہماری کار گئی تھی۔

"آج سارا دن ہم ٹرک کو وہاں چھپائے رکھیں گے۔"

"وہ کیسے؟ لوگ تو ابھی آجائیں گے..." میں نے کہا۔

"ابھی لوگ سو رہے ہیں اور وہ شہری آبادی کا علاقہ نہیں ہے۔ بازار بھی نہیں ہے۔" اکرام شیخ بولا۔ "بعد میں ہم وضاحت کر سکتے ہیں کہ دیوار بوسیدہ تھی گر گئی۔"

"باقی دیواریں کیوں کھڑی ہیں...؟ وہ بھی تو بوسیدہ ہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ نہایت فضول وجہ ہے، مگر ایک صورت ایسی ہو سکتی ہے کہ کسی کو بھی شک نہ ہو۔ ہم کار کو ریورس میں لے کر ملبے کے قریب کھڑا کر سکتے ہیں اور یہ وضاحت کر سکتے ہیں کہ ہمارا ہی ایک نامعقول اور عاقبت نااندیش ساتھی جسے ڈرائیونگ نہیں آتی، گاڑی کو واپس لا رہا تھا۔ بدحواسی میں بریک دبانے کے بجائے اس نے ایکسیلیٹر دبا دیا۔ گاڑی دیوار سے ٹکرا گئی۔ اور انجام آپ کے سامنے ہے۔"

"ویری گڈ... اس طرح وہ صرف کار کو دیکھیں گے۔ ان کا دھیان ٹرک کی طرف جائے گا ہی نہیں۔"

"کیا وہاں رہنے والوں کی نظر اتنی کمزور ہے؟"

"یہ تو پتا نہیں، مگر ہم پردہ ڈال دیں گے نا۔" اکرام شیخ بولا۔

"اتنا بڑا پردہ کہاں سے آئے گا... اس وقت؟"

اکرام شیخ نے ہنس کے چٹکی بجائی۔ "یہی تو حاضر دماغی کہلاتی ہے۔ میاں یہ جو ترپال پڑی ہوئی ہے ٹرک کے اوپر۔ یہ کس کام آئے گی۔ اس سے بہتر پردہ کیا ہوگا؟"

"ہم قائل ہوئے۔" میں نے سر جھکا کے کہا۔ "میں اس تجویز کے حصہ اول سے کلی طور پر اتفاق کرتا ہوں۔ ہم ٹرک کو چھپا کے رکھیں گے آج... اس کے بعد...؟"

"رات کو میں دوسرا ٹرک لاؤں گا۔ کوئی بھی ٹرک جو شہر میں سامان لانے لے جانے کے لیے کرائے پر ملتے ہیں۔ یہ سب سامان ہم آج دن میں اتار کے باہر ڈھیر کر دیں گے اور اس کے اوپر بھی کچھ ڈال دیں گے۔ کوئی دوسری ترپال لے آئیں گے۔ رات کو ہم یہ مال دوسرے ٹرک میں لوڈ کر کے یہاں سے نکال لے جائیں گے اور سمندر میں غرق کر دیں گے۔"

"تاکہ وہ دوسرا ٹرک والا گواہ رہے۔"

"یار! کچھ خود بھی سوچا کرو۔ وہاں سے مال اٹھا کے ہم کسی دوسری جگہ اتار سکتے ہیں۔ شہر میں بہت گودام ہیں جو کرائے پر ملتے ہیں۔ میں اور راجا کوئی ایسا بندوبست کریں گے کہ وہ مال چھوٹی گاڑیوں میں تھوڑا تھوڑا کر کے کشتیوں کے ذریعے سمندر میں ڈبو دیا جائے۔ یا پھر ہم کوئی ٹرک حاصل کریں۔ خالی ٹرک۔ اس کے ڈرائیور کو دن بھر قید میں رکھیں اور یہ مال اس کے ٹرک میں ڈال کے ایسی جگہ پہنچا دیں جہاں اسے سپرد آب کیا جا سکے۔ اس کے لیے ایک

لانچ بہرحال درکار ہوگی۔ ہم اپنی لانچ کے واپس ملنے تک اس کارِخیر کو التوا میں رکھ سکتے ہیں۔ فرض کرو ہم سینڈز پٹ یا ہاکس بے کے ساحل پر کسی جگہ ٹرک لے جائیں اور وہاں سے دو چار پھیروں میں لانچ بھر بھر کے لے جائیں۔ سمندر میں ایک میل آگے تک اور مال کو سمندر میں غرق کر کے لوٹ آئیں۔ ٹرک اس ڈرائیور کے حوالے کریں اور معذرت کے ساتھ اسے دو چار ہزار اس کی تکلیف کے لیے پیش کر دیں اور رخصت کرتے ہوئے تاکید کر دیں کہ وہ اس واقعے کو بھول جائے اور خوش رہے۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن گھی اگر سیدھی انگلیوں سے نکلتا ہو تو ٹیڑھی انگلیاں کرنے سے فائدہ؟"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ آپ ایک پرانا ٹرک خرید لیں۔ کتنے میں ملے گا؟"

"تیس چالیس میں...."

"اس ٹرک کو اوپن لیٹر پہ خریدیں یعنی اس پہ خریدار کا نام نہ ہو، بس ٹرانسفر لیٹر ہو۔" میں نے کہا۔ "اسے حسبِ ضرورت ایک دو دن یا ہفتہ بھر استعمال میں رکھیں اور پھر یا تو اسی پارٹی کو واپس بیچ دیں، دو چار ہزار کم پہ یا کسی اور سے سودا کر لیں۔ ممکن ہے دو چار ہزار کا منافع ہو جائے۔ نہ کوئی خطرہ نہ کوئی پریشانی۔"

"چھیت کے ٹو... تمھاری کھوپڑی اے ون ہے۔" اکرام شیخ بولا۔

اب ہم کوئنز روڈ پر پہنچ گئے تھے۔ افق پہ صبح کی سفیدی نمودار ہو رہی تھی۔ بیرک سے کچھ فاصلے پہ میں نے ٹرک روک دیا اور اکرام شیخ باقی لوگوں کو خبردار کرنے گیا کہ ہٹ جاؤ سامنے سے، ہاتھی اندر آ رہا ہے۔

وہ دس منٹ بعد واپس آیا تو اس کے ساتھ غالب محسن اور راجا بھی تھے۔ وہ سب پریشان اور بدحواس ہو گئے تھے۔

"یہ تم لوگوں کو کیا سوجھی؟" غالب نے کہا۔

"ہٹ سامنے سے۔" میں نے کہا۔ "باتوں کے لیے وقت نہیں ہے۔ تم لوگ دھماکے کے اثرات سے نمٹنے کے لیے تیار رہو۔"

میں نے ٹرک آگے بڑھاتے ہوئے بیرک کا جائزہ لیا۔ بلاشبہ یہ وسعت اور بلندی کے اعتبار سے کسی چھوٹے جہاز کا ہینگر ہی لگتی تھی۔ میں ٹرک کو سیدھا وسطی دروازے تک لے گیا اور اس کی رفتار انتہائی کم رکھتے ہوئے آگے بڑھاتا رہا۔

دروازہ معمولی سے دھکے سے ٹوٹ کر اندر گرا۔ ایک دیو ہیکل ٹرک کے طاقتور انجن کے سامنے اس کی حیثیت ہی کیا تھی۔ میں نے ٹرک کو اور آگے بڑھایا، کھڑکی پہلے ہی نکل چکی تھی۔ اب اس کے آس پاس کی دیوار ہلی، پھر بلاک منہدم ہو گئے۔ یہ سارا ملبہ ٹرک کے
8 اگلے حصے پر گرا۔ اگر یہ پیچھے گرتا تو بارود کے اس ڈھیر میں ایک چنگاری بھی پیدا کر سکتا تھا پھر نہ ٹرک رہتا، نہ بیرک اور نہ ہم۔ دیوار کے گرنے سے دھماکا ضرور ہوا تھا، مگر آتنا... آس پاس کے دوسرے گھروں کی دیواریں ہلا دے... میں انجن کے غرانے کا شور بھی شامل ہو گیا تھا۔

"اب کیا دیر کر رہا ہے۔ جلدی سے آگے بڑھا ٹرک کو..." نے چلا کے کہا۔

"اس کے پیچھے... پہیوں کے نیچے سے ملبہ ہٹاؤ۔" میں... نکال کے کہا۔

غالب اور محسن ایک طرف جھک گئے۔ راجا اور اکرام... پیچھے والے دونوں پہیوں کے لیے راستہ بنایا۔ میں نے ٹرک... دی اور ایکسیلیریٹر دبا کے ایک دم کلچ چھوڑا۔ ٹرک نے زبر... جھٹکے سے آگے جمپ لگائی اور بیرک میں داخل ہو گیا۔

ایک تربیت یافتہ ٹیم کی طرح جو اس ڈرامے کی کئی بار... ریہرسل کر چکی ہو، وہ سب ایک ساتھ مصروفِ عمل ہو گئے... نے ٹرک کو چاروں طرف سے کور کرنے والے کینوس کے... پانچ منٹ میں اتار لیا۔ ترپال کے کناروں پہ پیتل کے گول... لگے ہوئے تھے۔ ترپال کو ٹائٹ رکھنے والی رسّی انھی میں... تھی اور اب یہی رسّی اور ترپال ایک پردہ قائم کرنے میں کام آ... سب نے مل کے اگلے پانچ منٹ میں ترپال کو چھت کے... پہ باندھ دیا اور اس کے نچلے حصّے کو بلاکوں سے دبا دیا۔ صرف... طرف مشکل سے دو فٹ چوڑا حصّہ کھلا رہنے دیا گیا جو دروازہ... جگہ اندر آنے جانے کے لیے تھا۔ ہم سب اب لباس بھی بدل... تھے۔ نازو نے باہر یہ کام کیا تھا کہ گیراج میں سے کار نکال... اور اسے الٹا چلاتی ہوئی ٹھیک اس جگہ تک لے آئی تھی جہا... کا ڈھیر تھا۔ گرد و غبار اب بیٹھ رہا تھا، مگر شکست و ریخت... کسی زلزلے کی تباہ کاری کے آثار سے کم نہ تھے۔

آس پاس رہنے والوں نے بھی دھماکا سنا تھا، لیکن ان کو... اٹھ کر کپڑے پہننے اور باہر آنے میں دس منٹ سے زیادہ ہی لگ... پھر یہ کہ سب نکلے ہی نہیں۔ طبعاً بے نیاز، بے زار اور کاہل... کے پھر سو گئے کہ چلو سب خیریت ہے، یہ زلزلہ نہیں تھا اور... دھماکا نہیں تھا۔ ہم محفوظ ہیں تو پھر فکر کیسی، بعد میں دیکھ لیں... کچھ عملاً گھوڑے گدھے سب بیچ کے سونے والے... گے جن کے کان پہ جوں تک نہ رینگی ہو گی۔

نتیجہ یہ کہ چار افراد جن میں دو ملازم اور دو غیر ملازم قسم... تھے، جائے واردات پہ پہنچے۔ وہاں نازو مجرم بنی کھڑی تھی... اسے ڈانٹ رہا تھا۔ "دیکھا اپنے شوق کا انجام۔ اب حکومت... تنخواہ میں سے سارا نقصان پورا کرے گی۔ خدا کا شکر ادا کرو... بیرک گر جاتی ہمارے اوپر یا یہ کار گر جاتی سب پچک گئے ہوتے، ورنہ بیرک کے اوپر..."

"چلو یار چھوڑو، بے وقوف لڑکی ہے۔" غالب نے کہا۔

"یار بے وقوف ہے یا پاگل بن ہے۔" محسن چلاّنے لگا۔

حاضرین میں سے ایک عظیم توند والا تھا جس کی بنیان اوپر کے حصّے کی نیکر معلوم ہوتی تھی۔ نیچے اس نے ایک دھاری دار پاجاما پہن رکھا تھا۔ اس نے مجھ سے رجوع کیا۔ اس کا ازار بند گھٹنوں تک لٹک رہا تھا۔

"یہ کیا ہو گیا جی؟"

"یہ بہن ہے ہماری، پاگل۔" میں نے افسرِ رابطہ کی طرح پریس ریلیز دیتے ہوئے کہا۔ "بہت شوق ہے کار چلانے کا، مگر کار بڑی ہے اور ذرا اس کو دیکھو، جھاڑو کا تنکا ہے۔"

"مگر اس وقت؟"

"ہاں، دن میں تو سب روکتے تھے نا۔ یہ اس وقت چابیاں لے کر شوق پورا کر رہی تھی، نئی کار ہے۔"

"ہاں، کار تو نئی ہے۔ بہت قیمتی بھی ہے۔" دوسرے صاحب نے حسد سے کہا۔ وہ غالباً اسی لیے سوکھ کر کانٹا ہو رہا تھا کہ اسے ساری دنیا سے رشک و حسد میں اپنا خون جلانے کا شوق تھا۔

"چلو خیریت گزری..." ایک ملازم ٹائپ شخص بولا۔ "ورنہ یہ بیرک..."

"یہ کیا، ہر بیرک ایسی ہی ہے۔" دھاری دار پاجامے والا بولا۔

"آپ نئے آئے ہیں؟" حسد سے سوکھ جانے والے نے کہا۔

"ہاں، ابھی چند دن ہوئے ہیں۔"

"کوئی نقصان تو نہیں ہوا؟" دوسرے ملازم نما شخص نے کہا۔

"نہیں، بہت فائدہ ہوا ہے۔" غالب نے غرا کے کہا۔

دوسری طرف اکرام شیخ بھی محسن کو ٹھنڈا کر رہا تھا۔ "بھائی جان، کیا ضرورت ہے رپورٹ کرنے کی، ہم اپنے خرچ سے دیوار بنا دیں گے۔ کھڑکی دروازے بھی لگ جائیں گے۔"

"یہی ٹھیک ہے بھائی صاحب۔" دھاری دار پاجامے والا بولا۔ "خواہ مخواہ سرکار کو بھی تکلیف دو گے۔ اسٹیٹ آفس والے دو کے چار لگائیں گے اور پھر ٹھیکا دیں گے کسی کو پوری بیرک گرانے کا۔ انھیں تو خدا موقع دے۔ وہ کہیں گے کہ بیرک ہی قابلِ استعمال نہیں رہی۔"

"حالانکہ قابلِ استعمال تو یہ کبھی نہیں تھیں۔" حاسد شخص بولا۔

"میاں کے انکوائری آفس والے تو ابھی آ جائیں گے۔" محسن نے تشویش سے کہا۔

"ابھی وہاں سے ایک اوورسیئر آئے گا۔ سو روپے رکھ دینا اس کے ہاتھ پہ۔ بہت ہیں۔" دھاری دار پاجامے والے نے اپنی توند پہ بنیان کو کھینچتے ہوئے کہا۔ وہ آدمی دل کا اچھا تھا۔

دس پندرہ منٹ میں ہم سب کو مطمئن کر کے رخصت کرنے میں کامیاب رہے۔

"کیسے احمق لوگ تھے۔" غالب نے ان کے جانے کے بعد کہا۔ "کسی نے یہ نہیں دیکھا کہ کار سے دیوار گری ہے تو کار پہ ڈینٹ تک نہیں آیا۔ اس کی تو ڈکی تباہ ہو جانا چاہیے تھی۔"

"خواتین کی موجودگی کے باعث وہ آگے نہیں آئے، ورنہ دیکھ لیتے۔" میں نے کہا۔

"اور احمق نہ آتے تو یہ جھوٹ کیسے چلتا۔ خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ چالاک لوگ نہیں آئے۔" محسن بولا۔

اندر پہنچ کر ہم نے اطمینان کا گہرا سانس لیا اور اس ٹرک کو دیکھا جو واقعی بیرک کے اندر پہنچ چکا تھا۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے کوئی چڑیا گھر سے ہاتھی چرا لے اور پھر اپنے ڈرائنگ روم میں باندھ دے مگر کسی کو معلوم نہ ہو۔ اس ٹرک میں انتہائی تباہ کن اسلحہ تھا جس کی مالیت لاکھوں تک پہنچتی ہو گی ___ یہ ان لوگوں کا مال تھا جو خود بھی بہت تباہ کن تھے اور ہم نے انھیں ایسی ٹڈز دی تھی کہ غصّے اور بے بسی میں وہ اژدہے کی طرح پھنکار رہے ہوں گے اور زخم خوردہ شیر کی طرح دہاڑ رہے ہوں گے اور یہ سوچ سوچ کے پریشان ہوں گے کہ سڑک پر سے اتنا بڑا ٹرک کیا جن اٹھا کے لے گئے۔ ٹرک سبزی منڈی سے روانہ ہوا اور غائب ہو گیا۔ ان کو شک ڈرائیور پہ بھی ہو گا کہ وہ ٹرک لے کر غائب ہو گیا مگر بہت کم۔ ڈرائیور پرانا نمک خوار تھا اور وہ ٹرک لے کے جائے گا بھی کہاں۔ اسلحے سے بھرا ہوا ٹرک اس کے کس کام کا۔ اس کا تو خریدار بھی کوئی نہیں ہو گا۔ سب جانتے ہیں کہ حاجی عبداللہ اور چوہدری دلاور، اکبر سیٹھ یا چاند بھائی کا مال ہضم نہیں کیا جا سکتا۔

ظاہر ہے ان کو صرف ہم پر شک ہو گا۔ وہ ہماری اور ٹرک کی تلاش میں سارے کراچی کو چھان ماریں گے، مگر کراچی بہت بڑا شہر ہے۔ ان کا ساتھ پولیس بھی دے گی اور ممکن ہے، وہ اس حد تک سراغ لگانے میں کامیاب ہو جائیں کہ ٹرک کے غائب ہونے سے پہلے سینڈز پٹ پہ تین پولیس والے غائب ہوئے تھے۔ جب وہ ملیں گے تو بہت سی کڑیاں مل جائیں گی۔ وہ بتا دیں گے کہ انھیں باندھ کر ڈال دینے والے اور ان کی جیپ لے جانے والے کس قسم کے لوگ تھے۔ شاید وہ فرانسیسی بھی بتا دیں کہ رات کو یہاں دو فرنچ بولنے والے آئے تھے جو خود کو فرانس کا آرٹسٹ کہتے تھے۔ اس سے تصدیق ہو جائے گی کہ یہ میں اور محسن تھے۔ پھر ان کو پولیس کی جیپ اسٹیڈیم کے پاس کھڑی ہوئی ملے گی تو وہ سمجھ لیں گے کہ اسی جیپ میں پولیس کی وردی پہن کر آنے والے محسن اور سکندر ان کا ٹرک لے گئے۔ انھیں یہ بھی معلوم تھا

کہ محسن اور سکندر سینڈز پٹ کی ایک ہٹ میں قید تھے، جہاں وہ حاجی عبداللہ کو چکنا چور کر کے چھوڑ گئے تھے اور نیوی کے ایک ٹرک میں چھپ کر فرار ہو گئے تھے اور پولیس کی گشتی پارٹی بھی وہیں غائب ہوئی تھی۔ تاہم جو سوال ان کی عقل کو خبط رکھے گا، یہ ہوگا کہ ٹرک اب کہاں ہے کہ اس کا کوئی سراغ تک باقی نہیں۔

ہم سب فرش پر بیٹھے ٹرک کو دیکھ رہے تھے اور خوشی کے ساتھ حیرانی اور پریشانی کے ملے جلے جذبات کا شکار تھے۔ میں نے موہنی سے کہا کہ وہ چائے بنا کر لائے۔ بہت عرصے بعد میں نے اس سے براہِ راست بات کی تھی اور ایک فرمائش کی تھی۔ اس کا مرجھایا ہوا چہرہ ایک دم کھل اٹھا۔

"یہ اکرام شیخ کی فرمائش ہے۔" محسن نے کہا۔

موہنی جاتے جاتے ذرا سی دیر کے لیے پلٹی اور اس نے اکرام شیخ کو غور سے دیکھا۔ "تم تو پھر چائے نہیں پیو گے۔"

"میں... میں نے... میں نے کچھ نہیں کہا۔" اکرام شیخ نے بوکھلا کے کہا۔ "سب پییں گے چائے تو..." موہنی ہنسی اور چلی گئی۔

"مگر تمہارے طفیل۔" راجا نے بھی اصرار کیا۔ "ہمارا کون ہے یہاں بابا جو فقیر کو..."

"سالے، فقیر کی اولاد..." میں نے کہا۔ "ہم سب سے زیادہ دولت مند ہے تو... تیرا تو سسر بھی ہے، ہم سب بے سسر ہیں۔"

"اس کا سسر بھی پیسے والا ہے۔" محسن نے کہا۔ "یہودی۔"

"یارو، وہ میری پری کا ابا ہے۔ اسے کچھ مت کہو۔" راجا نے آہ بھر کے کہا۔ "مجھے پیسے کا کتا بھی پیارا ہے۔"

"راجا، ہوش میں آجا۔" محسن بولا۔ "ایسا عشق تیرا بجا دے گا باجا۔ تو اپنے سسر کو کھا جا۔"

غالب بے اختیار ہنسا۔ "کیا خوب فرمایا۔ آزاد شاعری میں تو نے بالکل صحیح جذبات کی عکاسی کی ہے۔"

"کس کے صحیح جذبات؟" راجا نے کہا۔

"ہم سب کے۔" میں نے کہا۔ "ہم ایسے نامعقول عشق کے سخت خلاف ہیں۔ یہ تو بالکل جن اور پری کا عشق ہے جس کا انسانوں کی دنیا سے تعلق ہی معلوم نہیں ہوتا۔"

"میری مانو تو ہم سے سبق لو، اپنے سسر کا دماغ درست کر دو۔"

"وہ کیسے...؟ میرا مطلب ہے دماغ تو میرا خراب ہے۔"

"وہ ہم ٹھیک کر لیں گے۔" غالب نے کہا۔ "تم ایسا کرو کہ اپنے چاروں مدفون گھڑے نکالو جن میں تمہاری کمائی..."

"خون پسینے کی کمائی۔" راجا نے تصحیح کی۔

"خون پسینے کی کمائی بھری ہوئی ہے۔ یہ گھڑے اپنے سسر کے سر پر پھوڑ دو۔ اس کا بھی سارا خون پسینہ بہہ جائے۔" غالب نے اپنی بات جاری رکھی۔ "پری کے مارو ایک جھانپڑ کہ الو کی بچی، ساتھ، ورنہ میں کرتا ہوں نیلو سے شادی۔"

سب بہت عرصے بعد بہت ہنسے۔ رات بھر کی تو اعصابی کشیدگی ذرا سی گپ شپ میں دور ہو گئی۔

پھر میں نے کہا۔ "میاں اکرام شیخ! اللہ تمہاری عمر دراز کرے، ذرا بتاؤ تو سہی کہ کیا سوچ کے ہم یہ چیز یہاں لائے ہیں؟"

"ہاں، یہ عشق سے زیادہ تباہ کن چیز ہے۔" غالب نے۔۔۔

اکرام شیخ نے انھیں اپنے پروگرام سے آگاہ کیا۔ اتنی دیر میں موہنی چائے بنا لائی تھی۔ اس نے ناشتے کے ڈبے سے کچھ بسکٹ پیش کیے تو ہم سب چر گئے۔ اس دوران میں اکرام نے اپنا پورا پلان واضح کر دیا۔

"فرض کرو، ہم نے یہ سب کر لیا۔ اسلحہ غرق کر دیا۔ ٹرک اور پھر بیچ دیا۔" غالب نے سب سن کے کہا۔ "اس کے بعد کس کام آئے گا۔ اسے ٹریپ کے طور پر کیسے استعمال کیا جا۔۔۔"

"ہم اسے کسی بھی جگہ چھوڑ دیں گے اور پھر نگرانی کریں گے۔ دیکھتے رہیں گے کہ اسے کون لینے آتا ہے اور کہاں لے کے جا۔۔۔ اس عرصے میں ٹرک ڈرائیور سے بھی تو کچھ معلوم ہو گا۔"

"ہاں۔" میں نے چونک کر کہا۔ "وہ ہے کہاں؟"

"حوالات میں۔" محسن نے گیراج کی طرف اشارہ کیا۔ "۔۔۔ دن میں کسی وقت تفتیش کریں گے۔"

"وہ آدمی خطرناک لگتا ہے۔"

"ہاں، بھونکنے والا کتا ہے۔ کاٹتا نہیں۔" شیخ بولا۔ "۔۔۔ دیکھا نہیں تھا کتنی جلدی اس کا لہجہ شریفانہ بھیر عاجزانہ اور پھر۔۔۔ ہو گیا تھا۔"

"وہ دیکھنے ہی دیکھنے کا ہے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "تم نے اس ڈرائیور کو بھی۔۔۔ تھا جس کے زخموں پر نمک چھڑک کے تم نے کوشش کی تھی۔۔۔ ہو جائے۔ وہ مر گیا مگر اس نے کچھ بتایا نہیں، حالانکہ وہ پہلے زخمی تھا۔ اسی طرح عبداللہ خاموش رہا۔"

"خاموش رہا؟ اس نے تو سب سے زیادہ بکواس کی تھی اور بعد میں بڑا چیخا اور چلایا تھا۔ بہت گالیاں دی تھیں..."

"پھر بھی کچھ قبول نہیں کیا تھا۔" میں نے کہا۔ "حاجی عبداللہ۔۔۔ قلعہ ہے۔ اس کا کوئی حصار کمزور نہیں ہوتا۔"

"چلو، دیکھ لیں گے۔" غالب نے کہا۔ "ابھی تو بتاؤ کہ آج کیا۔۔۔"

"مجھے تو کم سے کم ایک خواب دیکھنا ہے بہت پرائیویٹ قسم۔۔۔"

محسن نے ملبلاتے ہوئے کہا۔ "تم سب تو ہو چھڑے چھانٹ۔ تم۔۔۔ جانتا، اللہ میاں سے ناتا۔"

سنی اس کی بات، سالا شادی شدہ ہو کے ہم سب غیر شادی شدہ خواتین و حضرات کے ساتھ کیسا سلوک کر رہا ہے۔" غالب نے کہا۔ "جیسے ہم خانہ بدوش بلکہ خانہ خراب ہیں۔"

"حالانکہ تم نے کبھی نہیں کہا کہ تو شوہر ہے۔ امورِ خانہ داری کیوں نہیں سنبھالتا؟" میں نے کہا۔ "جا کے جوتیاں سیدھی کر بیوی کی، بچوں کے پوتڑے دھو، برتن مانجھ، اور پھر کہہ: بیوی میں تیرا غلام۔ نکمیں کھول لو۔"

"یہ میں نے بالکل نہیں کہا تھا نکاح کے وقت۔" محسن نے آنکھیں کھول کے احتجاج کیا۔ "تم لوگ کھو گئے۔"

"تجھے ضرورت ہی نہیں تھی کہنے کی۔ تو پہلے ہی خود کو زن مرید، زر خرید غلام اور کفش بردار ثابت کر چکا تھا۔ اور تیری صورت بھی ایسی ہی ہے۔" میں نے کہا۔

"تم سب جلتے ہو۔" محسن نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور پھیر سو گیا۔

"ایسے نہیں چلے گا شوہرِ خاں۔" شیخ بولا۔ اس نے غالب کو آنکھ سے اشارہ کیا اور وہ دونوں پھرتی سے اٹھے۔ محسن کو اس وقت خبر ہوئی جب انھوں نے اسے اٹھا لیا۔ ایک نے ٹانگوں سے پکڑ کے اور دوسرے نے ہاتھوں سے۔ وہ شور مچاتا رہا، لیکن میں نے اور راجا نے بھی غالب اور شیخ کی مدد کی ورنہ وہ خود کو چھڑا لیتا۔ ہم اسے باہر لے گئے اور نل کے نیچے رکھ کے ٹونٹی کھول دی۔

"ابے یار... لوگ دیکھیں گے۔" اس نے ہلڑ مچایا۔ "سارے کپڑے بھیگ گئے۔"

"اب سوئے گا؟"

"نہیں، میرے باپ کی توبہ... جو کبھی بھی سونے کا نام لوں۔"

جب ہم اندر آئے تو نازو اور موہنی زور زور سے ہنس رہی تھیں۔ پردے کی اوٹ سے انھوں نے بھی یہ تماشا دیکھا تھا مگر محسن اندر آتے ہی پھر لیٹ گیا۔

"پھر وہی... ابھی کیا کہا تھا؟"

"آچھیں۔" محسن نے مصنوعی چھینک ماری۔ "کیا کہا تھا یہی نا کہ کبھی سونے کا نام نہیں لوں گا۔ سونا مجھے خریدنا بھی نہیں ہے۔ مگر سونے کا نام لینا ہی پڑا تو اسے گولڈ کہوں گا۔ غالباً مجھے ڈبل نمونیا تو ہو چکا۔"

"ایک چھینک پہلے آئے تو یہ ڈبل نمونیا کی نشانی ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں وصیت فوراً کر دینی چاہیے۔" شیخ بولا۔ "تیرے پاس دنیا میں تھا کیا؟"

"ایک بیوی بچے کے سوا۔" غالب نے رنجیدہ لہجے میں کہا۔ "تیرے بعد انھیں خیرات میں دے دیں؟"

"چلو چلو، بس کرو۔" نازو نے دخل دینا اب ضروری سمجھا۔ "بہت دیر سے سب ایک ہی کے پیچھے پڑے ہوئے ہو۔"

غالب فوراً پیچھے ہٹ گیا۔ "لو، میں تو باز آگیا بلکہ میں خود بھی سو جاتا ہوں۔"

"سالے...! مجھے کہتا تھا زن مرید۔" محسن نے قہقہہ مارا۔

"زن مرید تو ہم بھی ہیں میاں، ماشاءاللہ۔" میں نے حاجی کے لہجے میں کہا۔ "ہم بھی خوابِ خر کے مزے لیتے ہیں..."

"خوابِ خر...؟"

"معاف کرنا، گوش پرنٹ ہونے سے رہ گیا۔"

"اچھا تو میں جاتا ہوں۔" راجا نے کہا۔ "میں تو رات بھر سو کے اٹھا ہوں۔ دیکھتا ہوں کسی ٹرک کی بات بن جائے۔"

"اللہ تیرا بھلا کرے بابا۔" میں نے کہا۔ "مگر دیکھ، ٹرک کے لیے بھیک مانگنے مت بیٹھ جانا۔ عادت پڑ چکی ہے تجھے۔"

"یا خیرات میں ٹرک مت مانگنا۔" محسن نے کہا۔ "لوگ خیرات میں گالی تک نہیں دیتے یہاں۔"

"اچھا تو نکالو پچاس ہزار روپے۔"

"اپنے اس یہودی سسر سے لے لو نا یار۔" محسن نے کہا۔

"ہاں، قرض لے لو بھاری سود پر۔" غالب نے تائید کی۔ "بعد میں مکر جانا۔ وہ صدمے سے مر جائے گا۔ تمہارا راستہ صاف ہو جائے گا۔"

"تم اسے یوں بھی تو قتل کر سکتے ہو۔" میں نے کہا۔

"مشورہ تو اچھا ہے۔" راجا سوچ کے بولا۔ "شادی کے بعد ہی کروں گا۔ ابھی تو میں نے دمڑی مانگی تو وہ چمڑی اتار لے گا میری۔"

"اچھا تو پھر لے لو کہیں سے بھی۔" میں نے کہا۔ "تمہارے اتنے گھڑے دفن پڑے ہیں، ایک گھڑا نکال لو۔"

مجھے بڑی حیرانی ہوئی جب اس نے کہا۔ "اچھا، اگر تم کہتے ہو تو، مگر یار بعد میں مجھے پورے کر دینا۔ میں وعدہ کر چکا ہوں۔ تم نے اس گھڑے میں سے صرف بریانی ہی کھائی تھی نا؟"

"ارے یار...! تم تو سیریس ہو گئے۔"

"نہیں... اگر تمہارے پاس پیسے نہیں ہیں تو کوئی بات نہیں۔" راجا بولا۔ "پہلی ضرورت بھی تو تمہاری ہے... اور اب تک یہ پیسہ اسی لیے محفوظ رہا کہ تم نے اسے مالِ غنیمت نہیں سمجھا تھا۔"

"نازو بی بی!" میں نے کہا۔ "اس فقیر کو پچاس ہزار روپے خیرات میں دے دو۔ ہم ابھی ایسے کنگال بھی نہیں ہوئے کہ خیرات لینے لگیں۔"

"ہاتھ سب پھیلاتے ہیں۔ خدا کے علاوہ دنیا میں بھی سب کو کسی نہ کسی سے کچھ مانگنا پڑتا ہے۔" وہ فلسفیانہ لہجے میں بولا۔ "ہم سب بھکاری ہیں۔ ابراہیم جلیس نے وہ کتاب لکھی تھی نا۔ چالیس کروڑ بھکاری۔ ہندوستان کی آبادی اس وقت چالیس کروڑ ہی تھی۔ اس کو پڑھو گے تو تم بھی مانو گے

کہ تم بھی شکاری نہیں بھکاری ہو۔"

میں حیران رہ گیا "تم نے... وہ کتاب بھی پڑھی ہے؟"

"ہاں، پڑھ لکھ کے ہی تو دکھ اٹھائے ہیں سارے۔ اَن پڑھ کو صرف اپنی ذات کا غم ہوتا ہے۔ پڑھا لکھا سارے جہاں کا درد اپنے جگر میں لیے پھرتا ہے۔ فلاں ملک میں یہ ہوگیا، فلاں کالا قانون ہے۔ نسل پرستی باعثِ شرم ہے۔ اقوام متحدہ ڈراما ہے، یہ سب وہی سوچتا ہے اور ایسی ہزاروں باتیں۔" راجا نے کہا۔

"اچھا اب سنو میرے فلسفی دانشور فقیر عاشق دوست۔ تم کو ایک تو ٹرک کا سودا کرنا ہے، ہو سکے تو آج ہی فائنل کرلینا پھر تم کو ایک چکر ادھر کا بھی لگانا ہوگا، بندرگاہ کا، یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ بحری جہاز 'ایس ایس کلاتی' تھر ڈ کھڑا ہے یا نہیں۔"

"وہ تو کھڑا ہی رہے گا۔ اس کا مال جو یہاں پڑا ہے۔" راجا نے کہا۔

"ذرا معلوم تو کرنا کہ وہاں کیا ہلچل ہے؟"

"گویا میں اپنی یونیفارم میں جاؤں۔" وہ بولا۔ "فقیر بن کے؟"

"یہ کام کرنے کے لیے تم کچھ بھی پہنو..."

"یا کچھ بھی نہ پہنو۔" محسن نے ایک آنکھ کھول کے کہا۔

"تم اٹھ گئے سو کے؟ خواب دیکھ لیا؟"

"ابھی تو خواب کا ٹریلر دیکھا ہے۔" وہ بولا۔ "اصل خواب اب شروع ہوگا۔ ذرا آہستہ بات کرو، سمجھے، نو ڈسٹربنس۔"

نازو نے ایک پیکٹ سا لا کے راجا کو تھما دیا۔ "پورے پچاس ہزار ہیں۔"

"اگر کسی لانچ یا کشتی والے سے بات ہو جائے جو رات کو ایک خفیہ کام میں ہماری مدد کر سکے۔" میں نے کہا۔ "تو اس سے جگہ اور وقت طے کرلینا۔ یہ لوگ سب کچھ کرتے ہوں گے۔"

"ہاں، سب ہی لوگ سب کچھ کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں، اگر پیسہ ملے۔" راجا نے کہا۔ "میرا مطلب ہے دوسرے پیشے میں بھی۔ یہاں بھی میں جانتا ہوں کہ کون کون غلط کام کر سکتا ہے یا کرا سکتا ہے۔ یہ کراچی کے ساحل پر رات کو کہاں کہاں جاتے ہیں، کیسا کیسا مال اتارتے ہیں اور ساحل تک پہنچاتے ہیں، یہ سب کو معلوم ہے۔ جیسے ٹرک والے نوّے فیصد جائز کام کرتے ہیں تو دس فیصد ہیرا پھیری والے کام بھی کرتے ہیں۔"

"تم ماشاء اللہ سمجھ دار ہو۔ یہ معاملہ میں تم پر چھوڑتا ہوں، کیونکہ تم بندرگاہ کے حالات اور معمولات سے واقف ہو اور کراچی میں رہتے ہو اس لیے کراچی کے لوگوں کو جانتے ہو۔ اپنے مطلب کے آدمی سے پکا سودا کرلو۔ آج ہی رات کے لیے۔"

"معاوضہ وہ زیادہ لیتے ہیں۔"

"دے دینا یار۔ تم خود جانتے ہو کہ ہمارا کام کیا ہے اور اسی کے مطابق بات کرنا۔" میں نے کہا۔ "اصل مسئلہ رازداری کا ہے یہ مت بتانا کہ کام کیا ہے۔"

"میں مال اتارنے کی بات کروں گا۔" راجا بولا۔ "یہ نہیں [illegible] گا کہ کہاں سے اٹھانا ہے اور کہاں لے جانا ہے۔ یہ تو اسے [illegible] پر پتا چلے گا کہ الٹا کام ہے یعنی مال ساحل سے سمندر تک [illegible] مگر اس نے کل یا پرسوں کسی کو بتا دیا تو؟"

"بتانے دو۔" میں نے کہا۔ "اس سے کیا ہے ہیں کیا۔ یہ سب [illegible] ایک بار غرق ہو گیا تو سمجھو ناکارہ ہو گیا۔"

"اور... اگر وہ پھر نکالنے پہنچ گئے؟"

"مشکل ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن تمہاری احتیاط پسندی [illegible] میاں۔ ہم ایسا کریں گے کہ صبح کسی ذمے دار آدمی کو ٹیلی فون کر کے [illegible] مثلاً کسی اخبار والے کو، وہ خبر لگا دے کہ اسمگلروں نے رات فلاں جگہ [illegible] ذخیرہ پانی میں ڈبو دیا ہے۔ وہ چاہے تو خبر لگانے سے پہلے تصدیق کر [illegible] نیوی والے باقی معاملات کو سنبھال لیں گے۔ واپسی میں ہمارے [illegible] کپڑے لے آنا، ایسے جو کچھ مختلف ہوں۔"

راجا نے سر ہلایا اور اپنا فقیری لباس زیبِ تن کرنے باتھ روم میں چلا گیا۔ دس منٹ بعد وہ باہر نکلا تو میں حیران رہ گیا۔ اس نے صورت بگاڑنے اور حالت کو قابلِ رحم بنانے کے کام میں [illegible] مہارت کا مظاہرہ کیا تھا۔

"کمال ہے یار، اتنی جلدی تم نے یہ سب کر لیا۔"

"سب پریکٹس کی بات ہے۔" وہ مسکرایا۔ "ابھی تو یہ مال [illegible] میں ساتھ لے جا رہا ہوں۔"

"اس میں کیا ہے؟"

"ہلدی مسالہ، لال کتھا اور مہندی، اور ایسی ہی چیزوں کا [illegible]" وہ بولا۔ "ٹانگ پر زخم یا ناسور بنانے کے کام آتا ہے۔"

اس کے جانے کے بعد میں نے کہا۔ "کمال کا آدمی ہے [illegible] کیسا بھیس بدلتا ہے۔"

"ہاں، کچھ لوگ بھیس بدل سکتے ہیں اور پھر بھی پہچانے [illegible] ہیں۔" موہنی نے میرے قریب سے کہا۔ "کچھ اپنی اصلیت [illegible] تب بھی کوئی انھیں نہیں پہچانتا۔"

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا مگر جواب میں [illegible] کچھ کہنے سے پہلے کوئی باہر شور کرنے لگا۔ محسن، غالب اور [illegible] واقعی سو چکے تھے۔ مجبوراً میں باہر نکلا۔

میں نے ایک منحنی سے داڑھی والے کو دیکھا جو ایسے [illegible] ہوا تھا جیسے اسے کلف لگا کے دھوپ میں سکھانے کے لیے [illegible]

"یہ ہنگامہ آپ برپا کر رہے تھے؟" میں نے سکون سے کہا۔

"اجی، حد ہو گئی یعنی آپ نے گورنمنٹ پراپرٹی کا [illegible] یہ سرکاری اکوموڈیشن ہے، افسر رہتے ہیں یہاں۔" وہ چلانے لگا۔

"اپنے اسپیکر کا والیوم کم کرو۔" میں نے اسے انگریزی میں ڈانٹا۔ "مجھے یہ سب کیا بتا رہے ہو؟ کیا میں افسر نہیں لگتا صورت سے۔ خانساماں یا چپراسی لگتا ہوں؟"

اس کا کلف اتر گیا۔ "وہ... دراصل پوچھنا یہ تھا کہ آپ نے گرائی ہے یہ دیوار...؟"

"اگر کوئی اور ہے اس شہر میں جو طرّم خان ہونے کا دعوے دار ہو۔" میں نے کہا۔ "تو اسے لے آؤ، وہ ایسی ہی دوسری دیوار گرا کے دکھا دے مجھے تو تمھیں ایک لاکھ انعام۔"

وہ بوکھلا گیا۔ "جی... میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا... میں تو دیکھیے نا... یہاں انکوائری آفس میں ہوتا ہوں... فقط ایک کلرک..."

"ڈانٹ تو تم مجھے گورنر کی طرح رہے تھے۔ یہ دیکھے بغیر کہ جو تمھارے سامنے کھڑا ہے وہ گورنر تو نہیں مگر گورنر سیکریٹریٹ کا سیکشن افسر ہے۔" میں نے کہا۔

اس کی حالت غیر ہو گئی۔ "میں... معافی چاہتا ہوں... دراصل یہ کام ہے میرا... غالباً کار ٹکرا گئی آپ کی۔"

"یہ تم پہلے بھی دیکھ رہے تھے یا اب نظر آئی ہے کار، جب دن میں تارے بھی نظر آنے لگے ہیں۔" میں نے کہا۔ "جاؤ اور اپنے اس اوورسیئر کو بھیج دو۔ یا تم کرو گے بات؟"

"حضور، ہم بھی خادم ہیں آپ کے۔ ہم سے کریں بات، کیونکہ اوورسیئر صاحب بھی تو ہم سے ہی کہیں گے کہ رپورٹ لاؤ... لمبا ہو جائے گا معاملہ۔ آپ کے لیے بھی اور ہمارے لیے بھی۔ میں آج کل میں سب ٹھیک کرا دوں گا۔ انکوائری آفس میں سب ہے، راج مزدور، سیمنٹ، ریت اور کھڑکی دروازے، آپ فکر ہی نہ کریں۔"

"اور فکر نہ کرنے کے لیے کتنے دوں؟" میں نے مسکرا کے کہا۔

"وہ... وہ خرچ دیکھ لیں آپ۔" اس نے سر کھجایا۔ "آپ کرائیں گے تو ہزار لگ جائیں گے، ہم آدھے میں کرا دیں گے۔"

"وہ کیسے؟ تم جادو جانتے ہو کیا؟" میں نے کہا۔

وہ دانت نکالنے لگا۔ یہ بے شرمی اور بے غیرتی کی ہنسی تھی، جو آدمی اپنی ذلت چھپانے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ "ہمارے پاس تو سب ہے ناجی... دیکھ بھال کے لیے، گورنمنٹ نے دے رکھا ہے۔"

پہلے میں نے اسے حکومت کے مال کو یوں مالِ غنیمت سمجھ کے استعمال کرنے پہ شرمندہ کرنے کا سوچا۔ پھر سوچا کہ اسے پورے ایک ہزار دے دوں اور کہوں کہ خبردار جو سرکاری مال لگایا، بازار سے لاؤ سب کچھ، مگر پھر اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ ہزار لے کر بھی وہ یہ کام سرکاری خرچ پر ہی کرتا۔ چنانچہ میں نے اسے پانچ سو بخشش دیے۔ یہ بخشش لینے کے بعد اس نے مجھے سلام کیا اور کہا کہ میں گاڑی ہٹا لوں تاکہ کام آج ہی شروع ہو جائے۔ مگر میں نے کہا کہ وہ پریشان نہ ہو، گاڑی تو ہٹ جائے گی، لیکن کام کل یا پرسوں ہونا چاہیے۔ اس نے مجھے دوسرا سلام کیا۔

"حضور...!" وہ جاتے جاتے رُکا۔ "ایک عرض تھی۔"

"میں اوورسیئر سے کچھ نہ کہوں۔" میں نے کہا۔

وہ خفت سے مسکرایا۔ "نہیں، ان کو تو بتانا ہی پڑے گا۔"

"اچھا میں کہہ دوں گا کہ چار سو دیے تھے۔" میں نے کہا۔

"آپ سمجھ دار آدمی ہیں۔ اللہ آپ کو..."

"اللہ کو بیچ میں مت لاؤ۔ ہم دونوں نے یہ کام اللہ کو خوش رکھنے کے لیے نہیں کیا ہے کہ وہ ہمیں خوش رکھے۔ اس میں خُدا کی ناراضی کے سوا کچھ نہیں، اس لیے جاؤ۔ سمجھو کہ ہم دونوں مجبور تھے اس لیے خُدا ہمارے گناہ کو معاف کرے۔"

وہ بڑی عجلت میں مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتا ہوا چلا گیا۔ پردے کے پیچھے میں نے نازو کو دیکھا۔

"یہ کیا عادت ہے؟ کیا اتنا بولنا ضروری تھا؟" وہ کمر پہ ہاتھ رکھ کے بولی۔ "وہ بگڑ جاتا تو۔"

"تم غلط آدمی کو ڈانٹ رہی ہو۔" میں نے غالب کی طرف اشارہ کیا۔ "میں بہرا ہوں۔ تمھاری وہ سنے گا جب اُٹھے گا۔"

"اگر اٹھا تو؟" غالب نے یوں کہا جیسے وہ نیند میں بڑبڑایا ہے۔

"سب ایک سے ایک مکّار۔" میں نے کہا۔ "کچھ پتا نہیں چلتا، کون سو رہا ہے کون جاگ رہا ہے اور کون مر گیا ہے۔"

"مجھے تم سے کچھ بات کرنی تھی۔" موہنی نے مجھے ہنستے دیکھ کر کہا۔

"مجھے معلوم ہے تم کیا کہو گی۔" میں نے کہا۔ "میں سو کے اٹھوں گا تو جواب دوں گا، یا سوتے میں دے دوں گا غالب کی طرح۔"

"اتنی نیند آرہی ہے؟"

"تم تو سوئی ہو نا رات کو۔" میں نے کہا۔ "ہم جھک مارنے گئے ہوئے تھے اور ہم اُلّو نہیں ہیں۔"

"میں ہوں اُلّو۔" نازو نے کہا۔ "مجھے بالکل نیند نہیں آرہی ہے، تم میرے ساتھ باتیں کرو۔"

"ذرا دور جا کے۔ ہماری سمع خراشی نہ ہو۔" میں نے کہا۔ "موہنی کو یہ بھی بتا دینا کہ تم رات کو تین چار گھنٹے کار میں سوئی تھیں۔"

"تم مجھے موہنی کب تک کہتے رہو گے؟"

"گلاب کا نام بدلا نہیں جا سکتا۔" میں نے کہا۔ "اور بقول عقلمندوں کے، گلاب کو جس نام سے بھی پکارو، گلاب ہی رہے گا۔"

یہ ذو معنی بات تھی۔ میں موہنی سے یہ بھی نہیں کہنا چاہتا تھا کہ میرا ذہن اسے رضیہ سلطانہ تسلیم نہیں کرتا اور یہ اقرار کر کے بھی مجرم بننا نہیں چاہتا کہ موہنی کے نام سے میرے بچپن کی یادیں وابستہ ہیں۔ چنانچہ انتخاب میں نے موہنی پر چھوڑ دیا کہ وہ جو چاہے سمجھے۔ جو مطلب چاہے نکالے۔ پھر میں سو گیا اور میری نیند اتنی گہری تھی

کہ میں نے خواب کوئی نہیں دیکھا۔

میں شاید شام تک سوتا رہتا، مگر تین بجے کے قریب مجھے نازو نے جگا دیا۔

"کھانا زندگی کے لیے بہت ضروری ہے۔" اس نے مجھے اطلاع دی۔

"مینو کیا ہے؟" میں نے اٹھتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا۔

"آپ آرڈر دیں، وہی چیز حاضر کر دی جائے گی۔" وہ بولی۔

"چکن کارن سوپ، فرائیڈ پران، شامی کباب، فروٹ کسٹرڈ اور کافی۔" میں نے کہا۔

"بالکل ملے گا، تاریخ نوٹ کرلیں۔ آج ہی کے دن دو سال بعد۔" نازو نے کہا۔ "فی الحال تو دال چاول حاضر ہیں۔"

"اور اسے تم کھانا کہتی ہو۔" میں اسے دیکھتا رہا۔ "اس کے لیے جگانا ضروری تھا؟ اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی۔"

"اچھا تو طائرِ لاہوتی پھر سو جا۔" نازو نے کہا۔ "جنت کی ہوا کھا۔"

مگر اب دوبارہ سونے کا اس لیے بھی سوال نہ تھا کہ خود میرا بھوک سے بُرا حال ہونے لگا تھا اور دال چاول کی خوشبو مجھے قورمے بریانی کی خوشبو سے زیادہ اشتہا انگیز محسوس ہو رہی تھی۔

غسل اور کھانے سے فراغت کے بعد میں نے گیراج کا رُخ کیا جہاں میرا ایک حوالاتی ملزم کسمپرسی کے عالم میں پڑا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا تو اسے تیز بخار تھا، مگر اس کے علاوہ تشویش کی بات کوئی نہ تھی۔ میں نے زبردستی اسے اسپرین دی اور اس کے لیے چائے بنوائی۔

"تم نے... مجھے کیوں بند کر رکھا ہے؟" وہ بولا۔ "میں تمھیں کچھ بھی نہیں بتاؤں گا... مر جاؤں گا..."

میں نے تعریفی انداز میں سر ہلایا۔ "تم بہادر آدمی ہو۔ کیا پہلے کبھی تمھیں مرنے کا اتفاق ہوا ہے۔ یہ مذاق نہیں ہے۔ دراصل تم نے آج تک لوگوں کو مرتے دیکھا ہے۔ طبعی موت اور حادثاتی موت کے علاوہ، کبھی گولی سے اور کبھی خنجر سے۔ ممکن ہے خود بھی قتل کیے ہوں لیکن ہم یہ سمجھتے ہیں کہ مرنا تو واقعی آسان ہے اور موت کو اسی لیے نجات دہندہ کہا جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں جینا کبھی کبھی بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ اتنا مشکل کہ آدمی موت کے لیے روتا ہے، گڑگڑاتا ہے، ہاتھ جوڑ کے منت سماجت کرتا ہے اور دُعا مانگتا ہے، مگر موت تو اپنے وقت پہ ہی آتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ تمھارے لیے وہ وقت ابھی دور ہے۔ اس سے بہت پہلے تمھارے خیالات بدل چکے ہوں گے۔"

اس کی صورت پر ذرا سی دیر کے لیے ایک تاریک سایہ سا آ کے گزر گیا۔ "میرے پاس تمھیں بتانے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔"

"ڈاکو گھر میں ڈاکا ڈالنے آتے ہیں تو انھیں آسانی سے کوئی کچھ نہیں دیتا۔ پہلے تو سب یہی کہتے ہیں کہ ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہے مگر عموماً وہ نکلوا لیتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"تم خود کو ڈاکو سمجھتے ہو...؟"

"اور تم کیا ہمیں شریف آدمی سمجھتے ہو...؟" میں نے طنز سے کہا۔ "یہ غلطی ہم کرتے تو حاجی جیسے نورانی چہرے لباسِ درویشی اور ریش رکھنے والے کو مردِ پارسا، خدا ترس اور نیکوکار مان لیتے۔ ظاہر پر نہ جاؤ۔ ہم اور وہ ایک ہی میدان کے کھلاڑی ہیں۔ فرق صرف سمت کا ہے، یعنی منزل کا اور مقصد کا ہے۔"

"مگر میں... میں تو تمھارے مقابلے پر نہیں ہوں۔ اس کھیل میں مجھے کیوں مرواتے ہو...؟"

"کبھی شطرنج کا کھیل دیکھا ہے تم نے۔ اس میں پیادے سب سے زیادہ اور آگے ہوتے ہیں۔ پہلے وہی مرتے ہیں۔ بادشاہ تک پہنچنے سے پہلے فیل اور گھوڑے اور وزیر سب مارے جاتے ہیں۔ جب ہاتھی لڑتے ہیں تو حشرات الارض مرتے ہیں۔ سُپر پاورز ٹکرائیں تو وہ مخلوق جان گنواتی ہے جس کے پاس گنوانے کے لیے اور کچھ ہی نہیں۔ نہ مال و متاع، نہ عزت و آبرو۔ نہ خوشیوں کے خزانے۔ کیا یہ بات تم نہیں جانتے تھے...؟ تم اتنے نادان تو نہیں ہو۔" میں نے کہا۔

"وہ مجھے مار ڈالیں گے۔"

"ہاں۔ بصورتِ دیگر ہم تمھیں مار ڈالیں گے۔" میں نے کہا۔ "انتخاب خود تم نے کیا تھا ورنہ تم کسی اور پیشے میں بھی جا سکتے تھے جہاں یہ خطرے نہ ہوتے۔ مگر اب انتخاب تمھارے ہاتھ میں نہیں رہا۔ یہ بات تو تم جانتے ہو کہ تم جن سے غداری کرو گے وہ کبھی تمھیں معاف نہیں کریں گے، تمھاری مجبوری حالات کا کوئی عذر نہیں سنیں گے۔ یہ ساری دنیا کا قاعدہ ہے۔ ہاں، دشمنوں سے تم رعایت حاصل کر سکتے ہو۔ خود کو اس کا مستحق ثابت کر دو تو یہ ہو سکتا ہے کہ ہم تمھیں آزاد کر دیں۔ آگے تمھاری زندگی ہے۔ تم خود اسے بچانے کی کوشش کر سکتے ہو۔"

"تم غلط کہتے ہو... تم بھی آخر میں مار دو گے مجھے۔"

"تم ضمانت طلب کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہو۔ نہ میں قسم کھاؤں گا، نہ حلف نامہ داخل کروں گا۔" میں نے کہا۔ "اعتبار کرو یا نہ کرو۔ تمھاری مرضی۔"

"میرے بیوی بچوں کا دنیا میں کوئی نہیں۔"

"دنیا میں نہیں جن کا کوئی ان کا خدا ہے۔" میں نے کہا۔ "اور اگر تمھارے اعمال کی سزا انھیں بھی کاٹنی ہے تو کوئی کیا کر سکتا ہے۔ یہ کوئی انسانیت کا پہلا واقعہ تو نہیں ہوگا کہ تمھارے بچے یتیم خانوں اور فٹ پاتھوں پر، بدکاروں اور خرکاروں کے ٹھکانوں پہ پہنچ جائیں۔ تمھاری بیوی بھی جوان ہوگی ابھی تو..."

وہ جیلا جیلا کے مجھے گالیاں دینے لگا۔ میری باتوں نے اسے وحشت میں مبتلا کر دیا تھا۔ "یہ سب تمھاری اولاد کے ساتھ ہو۔ تمھاری بیوی کے ساتھ۔ ماں بہنوں کے ساتھ ہو۔"

میں ہنس پڑا۔ "نہ میرے بچے ہیں، نہ بیوی ہے۔ ماں بہنیں تو پیدا بھی نہیں تھیں۔" پھر بات کرتے کرتے میں نے اس کے منہ پر تابڑ توڑ مُکے مارنے یہاں تک کہ اس کی ناک سے اور اس کے منہ سے خون ٹپکنے لگا۔

"وہ ٹرک لے کر کہاں جا رہے تھے تم؟"

اس نے مجھے کوئی جواب نہیں دیا اور زمین پہ پڑا ہانپتا رہا۔ میں نے اپنا سوال دُہرایا اور جب اس کی خاموشی ختم نہیں ہوئی تو میں نے اسے پھر باندھ دیا۔ اس مرتبہ میں نے اس کے منہ میں پہلے کپڑا ٹھونسا۔ پھر اس کے دونوں پاؤں ایک ساتھ باندھ کے رسّی کو گیراج کی چھت کے ایک ہُک سے گزار دیا۔ جب میں نے رسّی کو کھینچا تو وہ زمین سے اٹھ گیا اور اُلٹا لٹک گیا۔ اس کے دونوں ہاتھوں کو میں نے اسی رسّی سے کمر کے پیچھے کس دیا اور باقی رسّی اس کی دونوں ٹانگوں پہ ٹخنوں سے گھٹنوں تک لپیٹ دی۔ اب وہ ایک لاش کی طرح اُلٹا لٹکا جھول رہا تھا۔

میں نے اس کے منہ سے کپڑا نکال کے کہا۔ "یہ آخری موقع ہے تمھارے لیے..."

"بچاؤ... بچاؤ... کوئی ہے۔" وہ پاگلوں کی طرح چیخنے لگا تو میں نے کپڑا پھر اس کے منہ میں ٹھونس دیا اور باہر نکل گیا۔ گاڑی ابھی تک ملبے کے قریب کھڑی ہوئی تھی۔ اسے میں نے نازو سے چابی لے کر آگے بڑھایا اور گیراج اور بیرک کے درمیان فٹ کر دیا۔

"یہ کیا کر رہے ہو تم؟" نازو نے باہر آ کے پوچھا۔

"میں بہت کچھ کر رہا ہوں بیک وقت۔ تمھیں دیکھ رہا ہوں اور..."

"وہ کیوں چلا رہا تھا...؟" نازو نے میری بات کاٹ دی۔

"کون چلا رہا تھا...؟ میں نے تو کچھ نہیں سُنا۔ تم کیوں چلا رہی ہو؟"

"باہر سب نے سُنا ہوگا۔"

"باہر کہاں، بیرونِ ملک، ہماری شارٹ ویو نشریات مڈل ایسٹ تک میں سُنائی نہیں دیتیں..." میں نے کار کو لاک کر کے ڈکی کھولی۔

"مجھے اختلاج ہوتا ہے سکندر۔"

"خمیرۂ ابریشم حکیم ارشد والا کھایا کرو۔ نہار منہ شیشہ مت دیکھا کرو۔" میں نے ڈکی میں سے گاڑی کو اٹھانے والا جیک اور ہینڈل نکال لیا۔ "اور غالب سے رجوع کرو۔ اس کی شاعری مفرّحِ قلب ہے۔"

وہ پیر پٹختی اندر چلی گئی۔ میرے لہجے کی سرد مہری سے اس نے سمجھ لیا تھا کہ میں وہی کروں گا جو میرے دل میں ہے اور اس کی اپیل بے سود ہے۔ محسن غالب اور اکرام شیخ ابھی تک سو رہے تھے جو بڑی حیرانی کی بات تھی۔ میں واپس گیراج میں پہنچا تو وہ جھٹکے لے رہا تھا اور خود کو اوپر اٹھانے کی احمقانہ کوشش میں مصروف تھا۔ ہاتھوں کی مدد کے بغیر وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ کامل سکون اور اطمینان کے ساتھ میں نے جیک اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان فٹ کر دیا، گھٹنوں سے ذرا اوپر جہاں میں نے اضافی رسّی لپیٹی تھی۔

جیک میں ہینڈل لگا کے میں نے اسے تھوڑا سا گھمایا تو جیک دائیں بائیں پھیلنے لگا۔ اس کی رانوں کے درمیان خاصا گوشت تھا جس میں جیک دونوں طرف سختی سے پھنس چکا تھا۔ میں نے ہینڈل کو کچھ اور چکر دیے۔ وہ تڑپنے کے انداز میں اُچھلنے لگا۔ نیچے دونوں گھٹنے اتنی مضبوطی سے بندھے ہوئے تھے کہ رسّی نہیں ٹوٹ سکتی تھی۔ جیک اس کے گوشت میں گڑ گیا تھا۔ گھٹنے کے اوپر بندھی ہوئی رسّیاں بھی اتنی ٹائٹ ہو چکی تھیں کہ یقیناً گوشت کو کاٹ رہی ہوں گی لیکن جیک ابھی آدھا بھی نہیں کھلا تھا۔ وہ سخت اذیت میں تھا۔ گھٹنوں سے اوپر اس کی ٹانگیں ٹیڑھی ہو رہی تھیں اور اوپر نیچے کے جوڑ جام ہو چکے تھے۔ اس کی کمر اور ریڑھ کی ہڈی کے مُہرے تک اس پھیلاؤ سے کھنچ رہے ہوں گے۔ اسے سر کے بل لٹکے ہوئے بھی دس منٹ تو ہو گئے تھے۔ خون کی گردش نیچے کی طرف بڑھ جانے سے اس کا چہرہ لال پڑ گیا تھا اور آنکھیں حلقوں سے اُبل رہی تھیں۔ اس کی گردن اور چہرے پر بہنے والا پسینہ بھی آنکھوں میں جا رہا تھا اور درد کی شدت سے اس کے جو آنسو نکلے تھے وہ پیشانی پر لکیریں بناتے بالوں کو سیراب کر رہے تھے۔

"کیا خیال ہے اب؟" میں نے کہا۔ "کچھ یاد آیا کہ تم وہ ٹرک لے کر کہاں جا رہے تھے؟"

اسے جواب کا موقع دینے کے لیے میں نے پھر کپڑا منہ سے نکالا تو اس نے ایک دہشت ناک آواز نکالی۔ "ہائے... ارے میں مر گیا... اللہ مجھے معاف کر..."

میں نے اس کا منہ پھر بند کر دیا اور جیک کو مزید دو بار گھمایا۔ وہ ذبح کیے ہوئے جانور کی طرح تڑپنے لگا۔ میں نے آہستہ آہستہ جیک کو گھمانا جاری رکھا۔ اب ایک ایک ملی میٹر کا فرق اس کے جسم کی قوتِ برداشت سے باہر ہونے لگا تھا۔ اگر وہ اپنی ضد جاری رکھتا اور میں جیک کو پورا کھول دیتا تو اس کی رانوں کی ہڈی درمیان سے ٹوٹ جاتی یا کمر کے نیچے سے اس کے جوڑ الگ ہو جاتے اور ٹانگیں گوشت چر جانے سے الگ ہو جاتیں۔

اچانک وہ ساکت ہو گیا۔ وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ اپنی تمام قوتِ ارادی کو بروئے کار لانے کے باوجود اس کا جسم اذیت کی اس انتہا سے آگے اس کے احساس کا ساتھ نہ دے سکا تھا۔ بے ہوشی ایک ایسی کمیں گاہ ہے جہاں احساس اور اعصاب دونوں کو وقتی طور پر پناہ مل جاتی ہے تاکہ وہ توانائی کی کمک حاصل کریں اور درپیش اذیت کا مقابلہ جاری رکھیں، تا آنکہ موت ان کی شکست کا اعلان نہ کر دے۔

میں نے اسے نیچے اتارا اور فرش پہ ڈال کے باہر چلا گیا۔ مزاحمت

کی قوت کا سب سے مضبوط حصار توڑا جا چکا تھا۔ آگے صرف یہ دیکھنا تھا کہ غنیم کی طاقت سے اس کا جذبہ زیادہ قوی تو نہیں۔ جذبہ بعض اوقات ناقابلِ تسخیر ثابت ہوتا ہے۔ طاقت پر فتح کچھ نہیں دیتی۔ احساسِ پشیمانی اور جھنجلاہٹ کے سوا۔

میں دس منٹ تک باہر ٹہلتا رہا اور سگریٹ پیتا رہا۔ یہ ایسا وقت تھا کہ ملازمت پیشہ لوگ واپس نہیں لوٹے تھے اور ان کے بیوی بچوں کو فراغت حاصل تھی۔ نچلے درجے کے افسروں کی بیگمات سو رہی تھیں یا فلم کے میٹنی شو دیکھنے گئی ہوئی تھیں یا شاپنگ کے لیے۔ ان کی اولاد اگر ساتھ نہیں تھی تو بلند آواز میں راک این رول یا جاز میوزک سن رہی تھی۔ نوکر بہت کم گھروں میں تھے اور ہر بیرک کا دوسری بیرک سے درمیانی فاصلہ بھی سو گز ضرور تھا۔

چنانچہ میں نے اندازہ لگایا کہ ڈرائیور کی چیخ و پکار کسی کو ڈسٹرب نہیں کر سکتی۔ اگر ایسا ہوتا تو اب تک کوئی نہ کوئی آ کے پوچھتا۔ مگر یہاں اپنی ذات، اپنے گھر، اپنی مصروفیات اور اپنے مفادات کی محدود دنیا میں رہنے والے لوگ خود غرضی کی حد تک دوسروں کے وجود کو نظرانداز کرنا جانتے تھے۔

دس منٹ بعد میں پھر اندر گیا۔ میں نے جیک کو ڈھیلا کیا اور اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے تو وہ ہوش میں آ گیا۔

"تم تو بہت کم ہمت نکلے یار۔" میں نے کہا۔

"خدا کے لیے... مجھے... مار دو... میری جان لے لو۔"

میں نے قہقہہ مارا۔ "دیکھا۔ میں نے کہا تھا نا کہ بہت جلد تم موت مانگنے لگو گے۔ مرنا بہت مشکل ہو گا، اس کا تمھیں اندازہ نہیں تھا حالانکہ تمھیں سمجھ لینا چاہیے کہ میں تمھارا دشمن ہوں۔ میں تمھیں کوئی آسانی فراہم نہیں کر سکتا۔ کیا تم میرے سوال کا جواب دو گے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں... مر جاؤں گا... تو کم سے کم میرے بیوی بچوں کے گزارے کا بندوبست کر دیں گے وہ۔"

میں طنز سے ہنسا۔ "افسوس! یہ حاجی ٹائپ لوگ کیسے کیسے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں اپنا کام نکالنے کے لیے اور کیسے گھرے ہوتے ہیں جو ان کی فطرت کو سمجھتے ہیں اور پھر بھی ان پر اعتبار کرتے ہیں۔ اس نے یقیناً کہا ہو گا کہ کبھی ایسی ویسی بات ہوئی تو تمھارے خاندان کو مکمل تحفظ ملے گا۔ کبھی کوئی مالی پریشانی نہیں ہو گی۔ مگر جب تم قبر میں پڑے ہو گے تو یہ کیسے جانو گے کہ وہ جھوٹ تھا۔ اگر حاجی تم سے زیادہ چالاک نہ ہوتا تو تم سے یہ کام کیوں لیتا۔ اب میں کیا بتاؤں تمھیں کہ خود حاجی کس حال میں ہے۔ میں تم کو پانچ منٹ دیتا ہوں۔"

میں پانچ منٹ تک اندر ہی ٹہلتا رہا۔

"میں تمھیں ایک رعایت دینے کی سوچ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

اس کا چہرہ تھوڑی سی امید سے روشن ہوا۔

"میں تمھیں انتخاب کا حق دے رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "جو تم کہو میں وہی کروں گا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ میں تمھیں پھر الٹا لٹکا دوں اور سر کے نیچے دو فٹ پر دہکتی ہوئی کوئلوں کی انگیٹھی رکھ دوں۔ ایسی صورت میں تمھارا مغز پہلے فرائی ہو گا، باقی جسم بعد میں۔ یا میں تم کو پانی کے ڈرم میں راڈ ہیٹر کے ساتھ ڈال دوں۔ آہستہ آہستہ پانی گرم ہو گا یہاں تک کہ ابلنے لگے گا۔ اس سے پہلے ہی تمھارا سوپ بن چکا ہو گا اور تمھارا گوشت گل جائے گا۔ تیسری صورت یہ ہے کہ میں اس جیک کے درمیان تمھارے ہاتھ پھنسا کے جیک کو بند کر دوں اور تمھارے ہاتھوں کی ساری ہڈیاں چور چور کر دوں۔ پھر پیروں کی۔ بعد میں تم زندہ تو رہو گے مگر ایسے کہ ٹخنوں سے نیچے پیر ہوں گے نہ کلائی کے بعد ہاتھ...۔"

"تم... ایسے مجھے ڈرا کے کچھ نہیں پوچھ سکتے۔"

"تیسرا مرحلہ سب سے سخت ہو گا۔" میں نے کہا۔ "جب تمھارے بیوی بچوں کو لے آئیں گے اور جو کچھ تمھارے ساتھ ہوا ان کے ساتھ ہو گا۔ تم صرف تماشا دیکھو گے۔"

"تم... ان تک نہیں پہنچ سکتے...۔" وہ چیخ کر بولا اور مجھے ایک سے ایک غلیظ گالی دینے لگا۔

"ہم اگر تمھارے اس نام کے حاجی۔ تمھارے چوہدری ولاور اور چاند بھائی کی ٹکر کے شکاری نہ ہوتے تو کب کے ہار چکے ہوتے مگر جو کچھ وہ کر سکتے ہیں، ہم ان سے زیادہ کر سکتے ہیں۔"

سب سے آسان طریقہ دہکتے کوئلوں کی انگیٹھی والا تھا مگر اس کے لیے دونوں چیزیں خرید کے لانا ضروری تھا چنانچہ میں نے طے کیا کہ بازار جانا ہی پڑا تو میں صرف راڈ ہیٹر خرید لاؤں گا اور آدھے گھنٹے بعد مجھے ایسا ہی کرنا پڑا۔

راڈ ہیٹر اور تار دونوں مجھے حاجی کیمپ کی ایک دکان سے مل گئے۔ میں آدھے گھنٹے میں واپس آ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ طریقہ نفسیاتی طور پر مؤثر ثابت ہو گا۔ اس پر عمل کرنے کے لیے مجھے کچھ سوچنا پڑا۔ پھر میں ایسا انتظام کرنے میں کامیاب ہو گیا جس سے مطلوبہ نتائج حاصل ہو سکیں۔

بیرک کے عقب میں تارکول کے ڈرم میں نے پہلے ہی دیکھے تھے۔ ایک ڈرم کو میں لڑھکا کے گیراج تک لایا۔ اکا دکا گزرنے والوں نے مجھے ٹوکنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ یہ گورنمنٹ کا مال تھا۔ کسی کی ذاتی ملکیت ہوتی تو مجھے کوئی ان اٹھانے دیتا۔

میں نے ڈرم کو پانی سے بھر دیا اور پھر ڈرائیور کو اٹھا کے اس میں ڈال دیا۔ وہ میری نیت بھانپ کے بہت اچھلا کودا مگر اس میں جسمانی طور پر مدافعت کی قوت بہت کم رہ گئی تھی۔ میں نے اسے گردن تک ڈرم میں غرق کر دیا لیکن اس کے بازو ڈرم سے باہر رکھے۔ ان بازوؤں کو ڈرم کی بیرونی سطح کے ساتھ لگا کے میں نے وہی رسی بہت مضبوطی سے یوں لپیٹی کہ وہ چاہتا تب بھی کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے لیے بیٹھنا بھی مشکل تھا اور جتنی اذیت اس کی ٹانگوں نے جھیلی تھی اس کے بعد یہ پوز انتہائی تکلیف دہ تھا۔

مجھے اندیشہ تھا کہ وہ سر سے راڈ ہیٹر گرا دے گا چنانچہ میں نے اس کی گردن کے گرد بھی ایک حلقہ سا بنایا اور اسے پیچھے کی طرف کر دیا اتنا کہ اس کی گردن ڈرم کے کنارے پر ٹک گئی۔

اس کے بعد میں نے راڈ ہیٹر لگا دیا۔ اس کا ایک حصہ ڈرم کے کنارے پر ٹھہر گیا مگر پانی میں ڈوبا رہا۔ تار کا دوسرا حصہ میں نے پلگ میں لگا دیا۔ سوئچ آن کرتے ہی راڈ ہیٹر کے اوپر پانی کی سطح پر بلبلے بننے لگے۔

"اب تمھارے پاس زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹا ہے۔" میں نے اس کے سامنے ٹھہر کے گھڑی دیکھی۔ "ممکن ہے اتنا وقت بھی نہ لگے کیونکہ تمھارے جسم کے برابر پانی اس ڈرم میں سے خارج ہو گیا ہے۔ پینتالیس گیلن کا ڈرم پورا بھرا ہو تو گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں پانی ابلتا ہے۔ تم چالیس منٹ ہی سمجھو۔ پانی گرم ہونے لگا ہے۔ آہستہ آہستہ اس کی تپش تمھارے ہاتھ محسوس کریں گے۔ ڈرم کی بیرونی سطح پر اور تمھاری بغلوں کے نیچے ڈرم کے کنارے تپش دیں گے۔ ہر پانچ منٹ کے بعد میں تم سے اپنے سوال کا جواب مانگنے کے لیے آؤں گا۔ یہ تو تم نے دیکھ ہی لیا ہے کہ تمھارا چیخنا چلانا بے کار ہے۔ یہاں دور دور تک سننے والا کوئی نہیں ہے... میرے سوا۔"

وہ دہشت سے لرز رہا تھا اور میں اس کی صورت پر بھیانک موت کے تصور سے پھیل جانے والے خوف کو بھی دیکھ سکتا تھا۔

میں نے پانی میں انگلی ڈال کے ہلائی۔ "نہیں۔ ابھی کچھ نہیں ہوا۔ بعد میں درجۂ حرارت تیزی سے بڑھے گا۔ افسوس کی بات ہے کہ حاجی نے تمھیں خودکشی کی سہولت بھی فراہم نہیں کی۔ حالانکہ وہ تو جانتا ہو گا کہ ایسا وقت کسی پر بھی آ سکتا ہے۔ کسی بھی جگہ۔ پہلے دو چار کیس ایسے ہوئے کہ جو کچھ بتانا نہیں چاہتے تھے وہ جیت گئے۔ انھوں نے کوئی کیپسول نگل لیا۔ یا دانت میں پوشیدہ پوٹاشیم سائنائڈ کھا کے جان چھڑا لی۔ تمھارے پاس ایسی کوئی چیز نہیں ہوتی تو اب تک تم سکون سے مر چکے ہوتے۔ دراصل موت کچھ نہیں۔ ایک لمحہ بھی ہو سکتا ہے جو آدمی کو یہاں سے وہاں پہنچا دے۔ مگر جب یہ لمحہ پھیل کر ایک گھنٹا یا ایک دن یا ایک ماہ و سال پر محیط ہو جائے تو موت کا سفر عذاب بن جاتا ہے۔ پانچ منٹ ہو گئے۔ کیا اب تم بتاؤ گے کہ تم ٹرک کہاں لے جا رہے تھے؟"

اس نے سر کو نفی میں جنبش نہیں دی۔

"دراصل سوال صرف ایک نہیں ہے۔ چار پانچ سوال بنیادی اہمیت کے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اب تم ابل کے اور گل کے یخنی بننے سے پہلے بیس منٹ کے اندر جواب دے دو تو اچھا ہے۔ کبھی تم نے کسی کو زندہ ابلتے دیکھا ہے؟ زندہ مرغی کو بھی ابالیں تو وہ کتنا شور کرے گی اور کتنا تڑپے گی۔"

میں نے پھر پانی کو چیک کیا۔ "ہاں۔ اب کچھ گرم ہوا ہے۔ خود میں نے ایسا نظارہ کبھی نہیں دیکھا۔ عام آدمی دیکھ بھی نہیں سکتا۔ وہ خود بے ہوش ہو جائے گا مگر میرا دل بہت سخت ہے۔ پتھر سے بھی زیادہ۔ تھا تو نہیں مگر زمانے نے کر دیا۔ میں سب کچھ دیکھ سکتا ہوں۔ یہ بالکل نیا تجربہ ہو گا میرے لیے۔ سنسنی خیز اور دلچسپ۔ جب تم اچھلو گے۔ تڑپو گے۔ پھر تمھارا گوشت پھول جائے گا۔ پھٹ جائے گا۔ پانی میں خون شامل ہو جائے گا۔ تمھارا اپنا خون۔ پھر اسی میں تمھارا سب بول و براز مل جائے گا۔ یہ سب تم سونگھو گے یا نہیں، اس کا مجھے بھی پتا نہیں۔ بہرحال میں تم کو تمھاری موت کے بعد بھی ابالتا رہوں گا، یہ دیکھنے کے لیے کہ انسان کا جسم کیسے رنگ بدلتا ہے۔ تمھارا پیٹ پھٹا تو دل گردے اور کلیجی، سب باہر آئیں گے۔"

میں نے محسوس کیا کہ میرا لیکچر اس کو نفسیاتی طور پر مارنے میں مؤثر کردار ادا کر رہا ہے۔ وہ پاگل ہو رہا تھا اور سر کو ادھر سے ادھر پٹخ رہا تھا۔ وہ چلا بھی نہیں سکتا تھا۔ پانی سے باہر بھی نہیں آ سکتا تھا اور پانی کو گرم ہونے سے بھی نہیں روک سکتا تھا۔ وہ مرنا مشکل نہیں سمجھتا تھا، اس لیے مرنا چاہتا تھا مگر اب وہ خود کو مرتے دیکھ رہا تھا تو اس کے حواس جواب دے گئے تھے۔

میں نے تیسری بار سوال پوچھا تو پانی کافی گرم ہو چکا تھا۔ میں نے اس کے منہ سے کپڑا نکالا تو وہ دہاڑیں مار مار کے رونے لگا۔

"میں بتاؤں گا۔ سب بتاؤں گا۔ خدا کے لیے مجھے اس طرح مت مارو۔ مجھے نکالو۔ اللہ! مجھے معاف کر دے۔ میری اماں... ارے نکال...۔"

"ابھی نہیں۔ پہلے جواب دو میرے سوال کا۔" میں نے اس کی تمام گالیوں کو نظرانداز کر دیا۔ "ٹرک لے کر کہاں جا رہے تھے؟"

"بندرگاہ۔" وہ چلایا۔ "ارے آگ... پانی... میں جل گیا... ہائے پانی پلاؤ۔"

"بندرگاہ میں کہاں۔ کس کے پاس؟" میں نے سکون سے کہا۔

"کسی... جہاز پر چڑھانے کے لیے۔" اس نے ایک بھیانک چیخ ماری۔

"اس جہاز کا نام کرانتی تھرڈ ہے؟"

"ہاں... ایسے پیاس... پانی... آگ لگ گئی...۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔" میں نے کہا۔ "سچ بولو تو میں سوئچ آف کر دیتا ہوں۔ ٹرک کہاں لے جا رہے تھے؟"

"گودام... گودام... گودام...۔" وہ چیخنے لگا۔ میں نے سوئچ آف

کردیا۔ اس سے فوری طور پر فرق تو نہیں پڑا مگر اسے کچھ نفسیاتی سکون ملا۔ "گودام کہاں ہے؟"

"پہلے... نکالو مجھے... ٹھنڈا پانی..."

میں نے سوئچ پھر آن کر دیا۔ "گودام کہاں ہے؟"

وہ بُری طرح بلبلایا۔ "ماری پور... منگھو پیر... ارے میں مر جاؤں گا ظالم شیطان... میں بتا رہا ہوں... بتا رہا ہوں۔"

میں نے پھر سوئچ آف کر دیا۔ "گودام کس کا ہے؟"

"دلاور... اکبر... آہ... ہائے... ارے تیری..." اس نے پھر مجھے گالیاں دینی شروع کر دیں۔

"چاند بھائی کا بھی تعلق ہے؟"

"ہاں... وہ بھی آتا ہے... ہائے... یا اللہ... اللہ... اللہ..."

"لانچ کہاں ہے؟" میں نے دل کڑا کر کے کہا۔

"نہیں... نہیں معلوم... مجھے..."

"رابعہ کہاں ہے؟" میں نے آخری سوال کیا۔

"نہیں... ما... لو... م" وہ بے ہوش ہو گیا۔

میں نے رسّی کھول کے اسے باہر نکالا اور زمین پر ڈال دیا۔ پانی ڈرم میں بہت نیچے اتر گیا۔ ابھی پانی کے اُبلنے کا مرحلہ تو نہیں آیا تھا مگر میں سمجھتا ہوں کہ اتنے تیز گرم پانی سے نہانا بھی ناممکن تھا۔ اس میں غرق رہنے کے لیے دو چار منٹ بھی بہت تھے۔ اس نے تو دس منٹ گزارے تھے جو اس کی جسمانی قوتِ برداشت کے غیر معمولی ہونے کا ثبوت تھے۔

میں نے اس کے اوپر ٹھنڈے پانی کی بالٹی اُلٹ دی۔ اس نے تڑپ کے ایک گہری سانس لی۔ اس کا جسم کرب میں اینٹھنے لگا اور مجھے خیال آیا کہ کہیں میں نے ایک دم اس پر ٹھنڈا پانی ڈال کے غلطی تو نہیں کی۔ مجھے چاہیے تھا کہ اسے آہستہ آہستہ ٹھنڈا ہونے دیتا۔ کہیں شدید ردِّعمل سے وہ مر نہ جائے۔

مگر وہ زندہ رہا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ ہوش میں بھی آگیا اور ڈرم کو دیکھ کر چلّانے لگا۔ "مجھے مت ڈالو اس میں۔"

میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "نہیں ڈالوں گا۔ تم میرے باقی سوالوں کا جواب دو گے تو بچ جاؤ گے۔"

مگر وہ مزید سوالات کے جواب دینے کی پوزیشن میں تھا ہی نہیں۔ وہ ذہنی توازن کھو چکا تھا اور ہذیان بک رہا تھا۔ مجبوراً میں نے اسے باندھا اور کمبل ڈال کے لٹا دیا۔ اس کا جسم کمبل کے نیچے بھی لرزتا رہا۔ ہنتا رہا۔ اس سے مجھے خاصی تشویش ہو گئی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ گودام کا مکمل پتا بتائے بغیر مرے۔

میں بیرک میں واپس پہنچا تو نازو کانوں میں روئی ڈالے اور پھر دوپٹہ لپیٹے دونوں کنپٹیوں کے درمیان سر دبائے لیٹی ہوئی تھی۔ معلوم نہیں کب وہ میرے طریقۂ تفتیش کا معائنہ کرنے آئی تھی اور دہشت زدہ ہو گئی تھی۔

"مجھے... مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم اتنے سفاک اور سنگدل بھی ہو۔" وہ مجھے دیکھتے ہی چلّائی۔

"آج معلوم ہو گیا نا۔" میں نے کہا۔ "نازو بی بی! تم تو بہت بہادر بنتی تھیں۔ چھکے چھڑا دیتی تھیں دشمنوں کے اپنے انھی نازک ہاتھوں کی طاقت سے۔ مگر مجھے بھی معلوم نہیں تھا کہ تم اتنی کمزور ہو۔"

موہنی نے مسکرا کے کہا۔ "میں تو بہت دیر سے سمجھا رہی ہوں۔"

"مجھے نہیں، اس درندے کو سمجھاؤ۔" نازو نے میری طرف انگلی اُٹھا کے کہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"ہر انسان کے اندر ایک درندہ ہے۔ سب درندے ایک سے طاقتور نہیں ہوتے۔ کتے اور شیر میں بہت فرق ہے۔ ورنہ دیکھا جائے تو ہم سب گوشت خور حیوان ہیں۔ ایک دوسرے کو مار کے کھا جانے والے۔ چوہا اور بلّی۔ کتا اور بھیڑیا۔ چیتا اور انسان۔ اور جو طاقتور ہوتا ہے وہ کمزور کو کھا جاتا ہے۔ تم نے جنگ کو کیا کھیل سمجھا تھا؟ جو ڈو کراٹے کی طرح۔ اس میں تو یہ سب ہوتا ہے اور آئندہ بھی ہو گا۔ اس سے زیادہ ہو گا۔"

میری بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ غالب پردہ ہٹا کے اندر آگیا اور اس وقت ایک عجیب بات ہوئی۔ نازو جو شدید ہسٹریا کے عالم میں کانپ رہی تھی اور رو رہی تھی، ایک دم دوڑ کے اُٹھی اور غالب اسے نہ سنبھالتا تو وہ نیچے گر جاتی۔

"اسے... اسے کیا ہوا؟" غالب بھونچکا رہ گیا اور نازو کی طرف دیکھنے لگا جو اس کے بازوؤں میں جھول رہی تھی۔ "نازو...!"

"اسے تمہارے مضبوط سہارے کی ضرورت تھی۔ کمزور عورت ہے نا۔" میں نے کہا۔

غالب اسے دونوں ہاتھوں میں اُٹھا کے لے آیا اور فرش پر بچھے ہوئے بستر پر لٹا دیا۔ "تم نے کچھ کہا تھا؟"

"اس سے تو نہیں کہا تھا۔" میں نے کہا۔ "کچھ معلومات حاصل کر رہا تھا اپنے قیدی سے۔ اعصاب اس کے جواب دے گئے۔"

"میں ڈاکٹر کو لاتا ہوں۔" غالب باہر جانے کے لیے لپکا۔ میں نے اسے اتنا سیریس اور اتنا پریشان کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"ایک منٹ۔ مریض دو ہیں۔" میں نے کہا۔ "ایک یہ خاتون اور دوسرا حوالاتی۔ اسے بھی دیکھ لے۔ محسن اور اکرام کہاں ہیں؟"

"میں کیا کروں گا دیکھ کے۔"

"اس کی حالت دیکھ لے۔ اگر ضرورت تو بھی محسوس کرتا ہو۔ پھر جس ڈاکٹر کو لائے اس سے سوچ سمجھ کے بات کرنا۔"

"وہ تم خود کر لینا۔" وہ باہر جاتے ہوئے بولا۔ "میں تو نازو کے لیے کسی کو لاتا ہوں۔ محسن اور شیخ کھارادر گئے ہیں۔"

وہ بہت غصّے میں بھی تھا اور مجھے اس سے دوسروں کے بارے میں کچھ پوچھنے کا موقع بھی نہیں ملا۔ میں لوٹ کر گیراج میں گیا تو کمبل کے نیچے مجھے کوئی حرکت دکھائی نہ دی۔ میں نے کمبل ہٹا کے دیکھا۔ وہ ڈاکٹر کی ضرورت سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میں احساسِ جرم و پشیمانی میں مبتلا ہوا مگر پھر میں نے خود کو قائل کیا کہ اس نے اپنی ضد پہ اپنی جان دی۔ میں تو نہیں چاہتا تھا کہ اس کی جان لوں۔ مجھے اس سے معلومات تو بہرحال حاصل کرنی تھیں۔

ڈاکٹر نے مریضہ کو کم اور گرد و پیش کو دیکھنے میں زیادہ دلچسپی لی۔ اسے کچھ حیرت تھی کہ ہم وہاں کس قسم کے حالات میں رہتے ہیں۔

"یہ آپ کی کیا لگتی ہیں؟" اس نے غالب سے براہِ راست پوچھا۔

"سب کچھ اور کچھ نہیں۔" غالب نے کہا۔ "کیا آپ مرض کی تشخیص کے لیے لواحقین سے مریض کا رشتہ بھی پوچھتے ہیں؟"

ڈاکٹر شرمندہ ہو گیا۔ "آئی ایم سوری۔ اگر آپ کو برا لگا۔"

"مجھے اچھا لگا۔" غالب نے کہا۔

"کوئی خاص بات نہیں۔" وہ بولا۔ "اٹ از جسٹ اے میٹر آف شاک کوئی خاص بات ہوئی تھی کیا؟"

"ہاں اور نہیں۔" غالب نے کہا۔ "سوال جواب آپ خود کر رہے ہیں۔ خاص بات کیا ہوتی ہے بائی دا وے؟"

ڈاکٹر مسکرانے لگا۔ "یہ تو منحصر ہے۔ میرا مطلب ہے کہ کچھ لوگوں کے لیے بڑی سے بڑی ٹریجڈی خاص بات نہیں اور کوئی چاہے تو رائی کا پہاڑ بنا لے۔"

"میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں۔" غالب نے کہا۔ "خواتین اس دوسرے نکتۂ فکر سے تعلق رکھتی ہیں۔"

ڈاکٹر نے نسخہ لکھتے ہوئے کہا۔ "آپ پڑھے لکھے لوگ نظر آتے ہیں۔" اس نے یہ بات انگریزی میں کہی۔

"آپ بھی نظر آتے ہیں۔" غالب نے خوش اخلاقی سے کہا۔

ڈاکٹر نے برا نہیں مانا۔ "پڑھے لکھے لوگ ایسے ماحول میں نہیں رہتے۔"

"آپ نسخے میں کوئی اچھا سا ماحول بھی لکھ دیں۔ ہم خرید لائیں گے۔" غالب نے انگریزی میں جواب دیا۔

میں نے غالب کا پیر دبایا۔ مقصد اسے غیر ضروری باتوں سے روکنا تھا۔ میری اس حرکت کو ڈاکٹر نے دلچسپی سے دیکھا۔

"میں آپ لوگوں کی مجبوری کو سمجھتا ہوں۔" وہ نسخہ دینے کے بعد بھی کھڑا رہا۔

"مجبوری؟ مجبوری کیسی؟" میں نے کہا۔

"یہی کہ آپ لوگ گلبرگ میں کوٹھی کرائے پر لے کر نہیں رہ سکتے کسی فرسٹ کلاس ہوٹل میں قیام نہیں کر سکتے۔ کیا یہ مجبوری نہیں ہے؟"

"مجبوری کے اس معیار پر ملک کے ننانوے فیصد لوگ پورے اترتے ہیں اور اس طرح تو شاید وہ بھی خود کو مجبور کہیں گے جو گلبرگ میں چار کنال کی کوٹھی، چار کاروں اور ملازموں کی فوج کے ساتھ رہتے ہیں۔ ان میں ایسے مجبور بھی ہوں گے جو کہتے ہوں گے کہ ہم مجبور نہ ہوتے تو سوئٹزرلینڈ میں رہتے۔" میں نے کہا۔

ڈاکٹر ہنس پڑا۔ "میرا حوالہ مالی مجبوری کی طرف نہیں تھا۔"

"پھر...؟"

"آپ لوگ کہیں بھی رہیں گے نمایاں ہوں گے۔" وہ بولا۔

میں نے اور غالب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"یہاں آپ کی موجودگی سے کوئی واقف نہیں۔ یہ تو لاوارث قسم کی سرکاری رہائش گاہ ہے، جہاں کوئی کسی سے سروکار نہیں رکھتا۔ اور اس لیے رہتا ہے کہ رہنے کو دوسری جگہ نہیں۔ پھر بھی یہاں افسر ٹائپ لوگ رہتے ہیں اور اندر سے میں نے ان ... ہیں۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"یو آر رائٹ......" میں نے کہا۔ "یہ ہمیں الاٹ نہیں ہوا۔"

"ایک دوست نے رہنے کو دے دیا ہے۔" غالب بولا۔ "ہم نے یہاں ناجائز طور پر قبضہ نہیں کیا۔"

"میں آپ لوگوں کو اس سے بہتر جگہ پیش کر سکتا ہوں، اگر آپ مجھے اعتماد کے قابل جانیں۔" وہ بولا۔ "ایسے تو فقیر بھی نہیں رہتے۔ یہاں اندھیرا، گرد اور نمی سب کچھ ہے۔ کوئی فرنیچر نہیں اور بیڈ نہیں۔ میرا مقصد آپ لوگوں کی... بدحالی کا مذاق اڑانا نہیں ہے۔ میں تو جھگیوں میں بھی جاتا ہوں۔ کیا آپ لوگ جانتے ہیں جھگی کیا ہوتی ہے؟"

"جی... کراچی میں جھگی تو ایک سمبل ہے..."

"مگر کیا آپ کسی جھگی کے اندر گئے ہیں؟" وہ بولا۔ "جہاں لکڑیوں اور بانس، ٹین اور تختوں، پرانے اخباروں اور گتّے کے ڈبّوں، بوریوں اور کینوس کے ٹکڑوں۔ یہ سب بلڈنگ میٹریل ہے اور اس سے جو کمرا بنایا جاتا ہے اس میں آدمی سیدھا کھڑا نہیں ہو سکتا۔ نیچے مٹی ہوتی ہے۔ بعض اوقات صرف دس بائی دس کے حجرے میں دس افراد رہتے ہیں۔ کیسے... یہ حساب آپ لگا کے بتائیں کہ ایک مربع فٹ جگہ ایک آدمی کو کیسے کافی ہوتی ہے۔ وہاں وہ پیدا ہوتا ہے۔ موقع ملے تو پڑھتا ہے۔ سوتا ہے۔ شادی کرتا ہے۔ بچے پیدا کرتا ہے اور ان کی شادیاں کرتا ہے اور مرتا ہے۔"

"یہ سب آپ ہمیں کیوں بتا رہے ہیں؟"

اس نے ایک گہری سانس لی۔" آئی ڈونٹ نو۔ شاید اس لیے کہ میں بھی ایسی ہی ایک جھگی میں پیدا ہوا تھا۔ بٹ آئی واز لکی کہ میرے ماں باپ مر گئے اور جھگی پر میرے ظالم چچا نے قبضہ کر لیا۔ مجھے اس کے سلوک کی وجہ سے وہاں سے نکلنا پڑا۔ ورنہ ماحول کا تو میں عادی تھا۔ کیا میں بیٹھ سکتا ہوں؟"

" ضرور... اگر کوئی جگہ بیٹھنے کی ہے تو ضرور تشریف رکھیے۔" میں نے کہا۔

وہ اطمینان سے نیچے بیٹھ گیا" خدا کی زمین سے بہتر انسان کے لیے کون سی جگہ ہو سکتی ہے۔ میں اسی مٹی کے فرش پر پیدا ہوا تھا۔ اسی میں مر کے سو جاؤں گا۔ اس سے میرا رشتہ ماں کی گود سے زیادہ مضبوط اور دائمی ہے۔" وہ بولا

میں اور غالب اس فلسفی ڈاکٹر کی گفتگو پہ حیران بھی تھے اور پریشان بھی۔

" میں آپ کے لیے چائے یا کافی بھی لا سکتا ہوں۔"

" ضرور۔ مگر فیس میں سے پیسے تو نہیں کاٹو گے؟" وہ بولا اور ہنس پڑا۔" کیا میں سگریٹ پی سکتا ہوں؟"

" شیور۔" میں نے کہا اور اپنا پیکٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔ میرے اشارے پر موہنی خود ہی کافی بنانے چلی گئی تھی۔

" کیا آپ بالکل فارغ ہیں ڈاکٹر صاحب؟" غالب نے کہا۔" آپ کی پریکٹس بالکل نہیں چلتی؟"

" اتنی دیر میں کم سے کم دس مریض دیکھ لیتا میں۔ میں رات اور دن کے چوبیس گھنٹے کام کرتا ہوں۔"

" سوتے کس وقت ہیں پھر؟"

" جب بھی موقع ملے۔ سات آٹھ گھنٹے سونا تو پڑتا ہی ہے خواہ قسطوں میں سونا پڑے۔" وہ بولا۔

" پھر بھی کار نہیں ہے آپ کے پاس۔ آپ نے کہا تھا کہ میں غریب آدمی ہوں۔" غالب نے طنز سے کہا۔

" اس میں طنز کی کوئی بات نہیں۔ فی الحقیقت ایسا ہی ہے۔"

" کراچی میں وہ ڈاکٹر جو دن رات کی پروا کیے بغیر کمانے میں لگا ہوا ہو...!"

تصحیح... یہ میں نے نہیں کہا۔ میں نے کہا ہے کہ میں دن رات کام کرتا ہوں۔" وہ بولا

" خدمت خلق؟"

" ہاں... مجھے تم جیسے مریض ہی ملتے ہیں۔" وہ بولا۔" فیس نہ دینے والے۔"

" ہم تو فیس دیں گے۔"

" میں نہیں لوں گا۔" وہ بولا۔" مجھے معلوم ہے کہ تم دے سکتے ہو۔ باقی لوگوں کی بات اور ہے۔ وہ دے ہی نہیں سکتے۔ اکثر اوقات تو انھیں دوا بھی دینی پڑ جاتی ہے مگر میرے پاس کافی اسٹاک تو پڑا رہتا ہے جو میڈیکل ریپ چھوڑ جاتے ہیں۔ ہزار دو ہزار فیس ملتی ہے ماہانہ پانچ پانچ دس دس روپے کی صورت میں۔ وہ بھی میں دواؤں پر خرچ کر دیتا ہوں۔ یہ تو اتفاق ہے کہ میں تم کو مل گیا۔ ورنہ میں ادھر نہ آتا ہوں، نہ رہتا ہوں۔ میں لیاری میں رہتا ہوں، تم لیاری ضرور دیکھنا۔"

" یہ مجھے راہ چلتے مل گئے تھے۔" غالب نے میری طرف دیکھ کے کہا۔" حلیے سے ڈاکٹر نظر آتے تھے۔ میں ساتھ لے آیا۔"

" تمھیں معلوم ہے میں کس نام سے مشہور ہوں؟ اصل نام تو تمھیں میں جانتا ہوں۔ یا میری بیوی کو اور چند دوست احباب کو معلوم ہے۔ مجھے ڈاکٹر جھگی والا کہتے ہیں۔ یہاں پاپڑ والا۔ لڈو والا۔ جوتے والا۔ یہ نام بہت مقبول ہیں۔"

" کیا تم ابھی جھگی میں رہتے ہو؟ ابھی تک؟"

" نہیں۔ میں ایک کوٹھی میں رہتا ہوں لیکن وہ میری نہیں، میری بیوی کی ہے۔" وہ بولا۔" میرا کلینک صبح کے وقت لیاری میں اور شام کو اورنگی میں ہوتا ہے۔ شام کو بیوی بھی میرے ساتھ کام کرتی ہے۔"

" وہ بھی ڈاکٹر ہو گی؟" میں نے کہا۔

" تم نے ٹھیک اندازہ کیا۔" وہ بولا۔" وہ بھی ڈاکٹر ہے۔ میری کلاس فیلو تھی۔ صبح وہ ایک سرکاری اسپتال میں ملازمت کرتی ہے۔ میری اینڈ پیرسی سینٹر۔"

" کتنی تنخواہ ملتی ہے اسے؟ یہ ہے تو ذاتی سا سوال۔"

" میں غلط لفظ استعمال کر گیا۔ وہ کام کرتی ہے وہاں۔ ملازمت نہیں اور یہ بھی سوشل سروس ہے۔" وہ بولا۔

" خوب۔ میاں بیوی دونوں سوشل سروس کر رہے ہو۔ فیس نہیں لیتے۔ دوا خود دیتے ہو۔ پھر یہ کوٹھی؟"

" کوٹھی کیا، کار بھی ہے میرے پاس۔ ہمارے پاس۔ مگر وہ بیوی کے پاس رہتی ہے۔ وہ عورت ہے نا، ہر جگہ بس، رکشا یا ٹیکسی میں نہیں جا سکتی۔ ہمارے دو بچے ہیں اور دو ملازم۔" وہ بولا۔

" اور تم غریب آدمی ہو؟" میں نے کہا۔

" ہاں۔ ذاتی طور پر ڈاکٹر جھگی والا غریب آدمی ہے۔ کراچی کے معیار پر۔" وہ بولا۔" یوسی، جب میں جھگی سے نکلا تو قسمت میرے ساتھ تھی۔ اس کا مجھے علم نہیں تھا کہ میں خوش قسمت پیدا ہوا تھا اور خوش قسمتی کا ایک حادثہ بھی میری خوش قسمتی کے باعث پیش آیا۔ ماں باپ ہی مر دل کا ایک شخص تیم خانے سے لے گیا۔ خاصی اسٹوری ہے ذرا سی تو مجھے ایک... وہ آدمی لاولد، دولت مند اور نیک تھا۔ اسے میں اچھا لگا۔ پھر میری... جب میں نے پڑھنا شروع کیا اور اس کا نام روشن کیا تو وہ اپنے آپ کو بھی خوش قسمت کہنے لگا۔ میری بیوی اسی کی بیٹی ہے۔ ہم شروع سے آخر تک ساتھ رہے ہے۔ میٹرک ایک ساتھ کیا۔ کالج میں الگ ہوئے مگر میڈیکل کالج میں پھر مل گئے۔ ہم ایک ساتھ ڈاکٹر بنے اور اتنی طویل رفاقت کے بعد یہ ناممکن تھا کہ ہم جدا ہو سکتے۔ ہم ایک دوسرے کا عکس ہو گئے تھے چنانچہ ہماری شادی ہو گئی اور جب میرا وہ باپ مر اجس نے پیدا کرنے کے سوا میرے لیے سب کچھ کیا تھا۔ تو وہ ہمارے لیے لاکھوں چھوڑ گیا۔ وہ بہت بڑا بزنس مین تھا۔ ہم نے اس کے بزنس کو کروڑوں کے ساتھ بیچ دیا کیونکہ ہم تو اسے چلانے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے تھے۔ یہ سب رقم جو شاید اسی لاکھ سے اوپر ہی تھی، فکسڈ ڈیپازٹ کرا دی گئی۔ اس کا سود ہی بہت ہوتا ہے۔ ہم ہر ماہ ضرورت کے مطابق دس بیس ہزار، پچاس ہزار یا ایک لاکھ تک نکلواتے رہے ہیں۔ تھک جاتے ہیں تو سال میں ایک بار مری جاتے ہیں۔ دو بار یورپ بھی ہو آئے ہیں۔ وہ رقم اب ایک کروڑ سے زیادہ ہو چکی ہے۔ مطلب یہ کہ جتنا ہم نے خرچ کیا وہ اس سود کی آمدنی سے کم رہا جو ہمارے حساب میں جمع ہوتا تھا۔ تم اگر کہو کہ سود حرام ہے تو پھر ہم وہی حرام کھاتے ہیں۔ ہمیں کمانے کی نہ ضرورت ہے نہ عادت۔ جو کام ہم میاں بیوی صبح سے رات تک کرتے ہیں اور رات کو بھی انکار نہیں کرتے، وہ ہماری ضرورت بھی ہے اور عادت بھی۔ ہمیں مزید پیسہ نہیں چاہیے لیکن سکون، اطمینان اور خوشی، اس کے بغیر ہم نہیں رہ سکتے۔ یا رہ سکتے ہیں؟ مسٹر سکندر بخت؟"

میں اچھل پڑا۔ شک تو مجھے ہو گیا تھا مگر سوال اس نے ایسے وقت میں اچانک کیا جب میں اس کے لیے بالکل تیار نہیں تھا اور سوچ رہا تھا کہ کیا میں نے اپنی زندگی میں اس سے زیادہ خوش قسمت شخص دیکھا ہے، یا کبھی دیکھوں گا اور اس جوڑے سے زیادہ اچھا جوڑا کہاں ہو گا۔ ان سے زیادہ جنتی کون ہو گا اور وہ حرام کی بات کر رہا تھا۔ اس کے رزق سے زیادہ رزق حلال کسے ملتا ہے؟ بیسویں صدی میں کراچی جیسے شہر میں بھی ایسے لوگ ہیں۔ کوئی لاکھ کہے کہ نہیں ہیں مگر دنیا میں فرشتے بستے ہیں۔ کیا ڈاکٹر اور کیا مزدور۔ ہر پیشے میں۔ ہر ملک قوم۔ شہر اور بستی میں۔ وہ ہیں جن کے نام سے نیکی زندہ ہے۔

" تمھارے دوست کو تو میں نہیں جانتا۔ مگر تمھیں دیکھتے ہی میں پہچان گیا تھا اور میں نے جو وقت یہاں صرف کیا وہ میرے لیے بہت قیمتی تھا۔ نہ جانے کتنے مجھے غیر موجود پا کے مایوس لوٹے ہوں گے۔ کچھ دوسرے ڈاکٹروں کے پاس گئے ہوں گے اور انھیں بھاری فیس دی ہو گی۔ خدا نہ کرے کہ اس مختصر غیر حاضری کے وقفے میں کوئی مرا ہو۔ مگر میں یہاں صرف اس لیے رک گیا تھا مسٹر سکندر کہ تمھارے اور میرے مشن میں کوئی فرق نہیں۔ بس کام کا انداز جدا ہے اور نوعیت جدا ہے۔ ایک آدمی ملک و قوم سے بیماری دور کرتا ہے۔ دوسرا جہالت مٹاتا ہے۔ تیسرا اسے غداروں سے پاک کرتا ہے۔ کیا وہ ایک مشترکہ مقصد نہیں رکھتے؟ اور اسی لیے میں نے یہ سب تمھیں بتایا اور تمھیں ایک پیشکش کی کہ میں تم کو بہتر جگہ فراہم کر سکتا ہوں۔ زیادہ محفوظ اور آرام دہ۔"

" اگر تم۔ ہمارے بارے میں سب جانتے ہو۔" میں نے بالآخر کہا۔" تو تمھیں یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ ہم یہاں آرام کرنے کے لیے نہیں آئے ہیں۔"

" ٹھیک۔ مگر یہاں تم بیمار ہو گئے پھر؟ تم کو فٹ رہنا ہے اور تندرست رہنا ہے۔ صحت مند آدمی ہی ذمے داریوں سے نمٹ سکتا ہے۔ بیمار تو خود ایک ذمے داری بن جاتا ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم سب تندرست نہیں ہو۔ ناقص خوراک۔ کم آرامی۔ تھکن اور اعصابی کشیدگی۔ ان سب کا اثر تمھاری صورتوں سے ظاہر ہے۔"

" اور اس جگہ رہنے سے یہ اثر ختم ہو جائے گا؟ تمھیں کیا معلوم ہمارا یہاں قیام کتنے دن کا ہے۔"

" جتنے دن بھی ہوں۔" وہ بولا۔

اس نے پھر بیگ سے اپنا پیڈ نکالا اور اس پر کچھ لکھنے لگا۔ پھر کاغذ الگ کر کے اس نے مجھے تھما دیا۔" یہ ہے ایک پتا۔ جا کے دیکھو۔ پسند آئے تو مجھ سے چابی لے جانا۔ میرا پتا اور فون نمبر اوپر درج ہے۔"

میں نے وہ پرزہ لے لیا۔ اس پر ڈاکٹر کا نام انوار احمد خان لکھا ہوا تھا۔

" تم کسی وقت بھی آ سکتے ہو بے خوف و خطر۔" وہ بولا۔" ہم عموماً آدھی رات تک ضرور گھر پہنچ جاتے ہیں۔ کلینک تو دس بجے سے پہلے ہی بند کرتے ہیں مگر اس کے بعد دعوتیں بہت ہوتی ہیں۔"

" تم زیادہ دعوتیں کھانے والے تو نہیں لگتے۔" میں نے کہا۔

" دعوت میں جانا ضروری ہوتا ہے، کھانا نہیں۔ یوسی، ہم تو دونوں ہی ڈاکٹر ہیں۔ سخت ڈسپلن کے قائل ہیں خوراک کے معاملے میں۔ کبھی کبھی کی کوئی بات نہیں۔ جس دن کہیں دعوت نہ ہوا اس دن باہر کھاتے ہیں۔ خوب بد پرہیزی کرتے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ ہمیں مدعو کرنے والے بھی وہی ہیں۔ جھگی والے۔ ان کے خلوص میں زبردستی کو بہت دخل ہوتا ہے۔ یہ بات ہم پہلے نہیں کہتے تھے۔ اب واضح کر دیتے ہیں کہ ہم آئیں گے صرف اس شرط پر کہ ہمیں کھانے کے معاملے میں کوئی مجبور نہیں کرے گا۔ ہم روز پلاؤ زردے تو نہیں کھا سکتے اور ان کو سمجھا بھی نہیں سکتے چنانچہ ہم ایک ہی بہانہ رکھتے ہیں کہ ہم رات کو کھانا نہیں کھاتے۔ پھل کھا لیتے ہیں۔ لوگ مایوس تو بہت ہوتے ہیں، جب ہم ایک سیب یا ایک کیلا کھا کے اجازت

لیتے ہیں، مگر لائف از لائک دیٹ۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تم سب کو ملٹی وٹامن کی ضرورت بھی ہے۔ جو تم کو بلاناغہ کھانے چاہئیں۔" وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

"ابھی آپ نے ہم سب کو دیکھا کہاں ہے۔" میں نے اس سے پُرجوش مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھ لوں گا۔" وہ بولا۔" ایک گھنٹا ہو گیا مجھے ...!"

"چلیں میں آپ کو چھوڑ آؤں۔" میں نے کہا۔" وہ کار میری ہی ہے...!"

"بہت قیمتی کار ہے۔" وہ بولا۔" مگر میں تمھارے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ اس میں تمھارے لیے رسک ہے۔ تھینک یو۔ میں چلا جاؤں گا۔ مل جائے گی کوئی ٹیکسی۔" اس نے مجھ سے مصافحہ کیا۔

"میں مرزا غالب ہوں۔" غالب نے کہا۔" اب تعارف کرا رہا ہوں۔ بوقتِ رُخصت۔"

ڈاکٹر نے اس سے بھی ہاتھ ملایا۔" غالباً تم صحافی تھے۔"

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو ہماری کیس ہسٹری بھی معلوم ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔ مجھے خاصی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی کچھ خبروں سے۔ اخبار کا میں کیڑا ہوں۔"

"یہی وجہ ہے۔ اس سے پہلے جو بھی ملے ہیں وہ خبروں کے ذریعے ہم سے متعارف تھے۔ اور پتا نہیں کیا بات ہے، سب اتنی ہی دلچسپی سے خبروں میں ہماری جستجو کرتے رہے تھے اور سب دوست تھے۔"

"کوئی تمھارا دشمن ہو بھی کیسے سکتا ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔" جب تک کہ وہ خود ملک کا دشمن نہ ہو۔ ہر پاکستانی فخر کر سکتا ہے۔ تمھارے کارناموں پر۔ دعا کر سکتا ہے تمھاری کامیابی کے لیے اور اگر تم سے ملے تو ناز کر سکتا ہے اپنی خوش قسمتی پر۔"

"یہ بہت زیادہ ہو گیا۔" میں نے کہا۔" ہم کیا اور ہماری بساط کیا۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ لوگوں کے جذبے اور لوگوں کی دعائیں کام آتی ہیں۔ دشمن واقعی آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں اس لیے ہم پہچانے جانے سے ڈرتے ضرور ہیں مگر ایسا بھی نہیں کہ گھر سے نہ نکلیں۔ میرا خیال ہے سیکڑوں ہزاروں نے کہیں نہ کہیں ہمیں پہچانا ہو گا مگر دیکھ کے گزر گئے ہوں گے۔"

"سی یو اگین۔" اس نے کہا اور باہر نکل گیا۔ میں اور غالب اسے سڑک پر پورے اعتماد کے ساتھ جاتا دیکھتے رہے۔ زبان سے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ ہمارے جذبات اور احساسات مشترک تھے۔

"میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر انوار کی پیشکش قبول کرنے میں فائدہ ہے۔" غالب نے کہا۔

"کیا فائدہ ہے؟" میں اس کے سامنے بیٹھ گیا۔" یہی کہ ہم کچھ آرام سے رہیں گے۔ جان بنائیں گے۔"

"نہیں۔ ایک اور پہلو بھی ہے اس مسئلے کا۔" غالب نے کہا۔ "اگر آج رات خواتین کو یہاں سے نکال کے کسی محفوظ مقام پر پہنچا دیا جائے تو بہتر ہے۔ کیونکہ ہمیں ایک ٹرک سے سامان اُتار کے دوسرے ٹرک پر لوڈ کرنے میں پوری رات بھی لگ سکتی ہے۔ بہت سے لوگ یہ کارروائی دیکھیں گے۔ ان میں سے کوئی اگر کل آئے تو اسے یہاں کوئی نہیں ملنا چاہیے۔"

"میں تجویز کی افادیت کا قائل ہوا۔"

"کیا معلوم حاجی کے آدمی ہی دیکھ لیں۔ وہ شہر بھر میں تلاش کرتے پھر رہے ہوں گے کہ ٹرک کہاں گیا۔" غالب نے کہا۔" اگر وہ آ پہنچے ہماری روانگی سے قبل۔ تو مقابلہ ہو گا۔ ظاہر ہے ہم ٹرک تو لے جانے نہیں دیں گے۔"

میں نے بات سمجھتے ہوئے سر ہلایا۔" ٹرک پہ فائرنگ ہی کافی ہو گی۔ مگر اتنا بڑا بارود کا ذخیرہ آس پاس بھی تباہی پھیلا دے گا۔"

"اگر چارہ کوئی نہ رہا۔ تو پھر یہی کریں گے۔ ہم خود کون سے بچے ہوں گے۔" غالب نے کہا۔" لیکن ہم بھاگ سکتے ہیں۔ اس وقت اہلِ خانہ اور اسبابِ خانہ کے ساتھ نکلنا محال ہو گا۔"

محسن اور اکرام شیخ سے پہلے راجا آ گیا۔ باہر ایک ٹرک آ کے رُکا پھر وہ اچانک نمودار ہوا۔ اب وہ اپنے فقیری لباس میں نہیں تھا۔ ہم دونوں ایک ساتھ باہر لپکے۔

"ٹرک مل گیا؟"

"سب مل جاتا ہے بابا دنیا کے بازار میں۔" وہ بولا۔

"کتنے میں ملا؟" میں نے ٹرک کو تعریفی نظروں سے دیکھا۔

"چالیس میں... پینتالیس میں سودا بھی کر آیا ہوں۔ بیعانہ بھی دے آیا ہوں پانچ ہزار۔" راجا نے ایک سوٹ کیس زمین پر پھینک دیا۔ "اور تم سب کے دنیاوی کفن بھی لے آیا ہوں۔"

"آفرین ہے تجھ پر راجا۔" میں نے اس کو شاباش دینے کے لیے خاصا مارا۔" پانچ ہزار کا منافع اپنی شادی کے اکاؤنٹ میں ڈال دے۔"

"ٹرک کب اس کے حوالے کرنا ہے، خریدار کے؟"

"میں نے ایک دن کی مہلت لی ہے۔ کل شام کو باقی ادائیگی ہو گی اور پن لیٹر پڑا ادھر آیا اُدھر گیا۔" راجا نے کہا۔

ہم پھر اندر آ گئے۔" اور کشتی یا لانچ کی بات ہوئی؟"

"ہاں۔ پہلے مجھے کچھ کھلاؤ پلاؤ۔ میری ٹانگیں دباؤ۔ آج میں بہت خوار ہوا۔ تم سب مزے سے سوتے رہے۔" وہ دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھ گیا۔

"ہم کل رات خوار ہوئے تھے۔ وہ یاد نہیں۔" غالب نے کہا۔

"کشتی سے کام نہیں بنتا تھا۔" وہ بولا۔" ایک لانچ والے سے پانچ ہزار میں بات ہو گئی۔"

"کہاں ملے گا وہ؟ اور کس وقت؟"

"جگہ مجھے معلوم ہے۔ وقت رات کے دو بجے کا ہے۔" راجا نے کہا۔" اس وقت چھ بجے ہیں۔"

"گویا چھ گھنٹے ہیں ہمارے پاس..."

"چھ کیوں۔ آٹھ گھنٹے ہیں۔" غالب نے کہا۔

"دو گھنٹے جانے کے رکھو مرزا جی۔ تین گھنٹے میں آپ کو ٹرک خالی کرنا ہے اور تین گھنٹے میں لوڈ کرنا ہے۔"

"یہ... تو بہت مشکل کام ہے۔" غالب نے کہا۔

"باقی دو مشٹنڈے کہاں ہیں؟" راجا بولا۔

"وہ بھی آ جاتے ہیں ابھی۔" میں نے کہا۔" میرا خیال ہے اکبر سیٹھ کا گھر دیکھنے گئے ہوں گے۔"

"خیال کیا مطلب۔ تم سے کہہ کے نہیں گئے؟"

"میں اس وقت تفتیش کر رہا تھا۔" میں نے کہا۔" ذرا پہلے اُٹھ گیا تھا۔ باقی پتا نہیں کب اُٹھے اور کب کھانا کھا کے نکل گئے۔"

"اس نے کچھ بتایا؟" غالب بولا۔

مجھے جو کچھ معلوم ہوا تھا وہ میں نے انھیں بتا دیا۔ مجھے یہ بھی بتانا پڑا کہ نازو کی بے ہوشی کا سبب کیا تھا۔ جب نازو کی بات ہوئی تو راجا کو ڈاکٹر انوار کے بارے میں بھی بتانا ضروری ہو گیا۔

"اب تم ایسا کرو راجا۔" غالب نے کہا۔" کہ گاڑی میں دونوں کو لے جاؤ۔ اور اپنا سامان بھی لے جاؤ۔"

"یہ ہے پتا اس ڈاکٹر کا۔" میں نے کاغذ کا پُرزہ اسے تھما دیا۔

"ہم کل کسی بھی وقت پہنچ جائیں گے۔"

راجا نے پتا غور سے دیکھا۔" میں تو خیر چلا جاؤں گا۔ تم لوگ بعد میں وہاں کیسے جاؤ گے۔ جہاں لانچ والے سے ملنے کو کہا ہے؟"

"ہم یہاں تمھاری واپسی کا انتظار کریں گے۔" غالب نے کہا۔

"اور یہ جو لوڈ اَن لوڈ کرنے کا کام ہے نا، یہ ہم خود کیوں کریں؟" میں نے کہا۔" میں سڑک پار کر کے جاتا ہوں اور مزدور لے آتا ہوں۔"

"یہ ٹھیک ہے۔ ہمیں تھکنے سے بچنا چاہیے۔"

میں اپنے ساتھ چار مزدور لے کر لوٹا۔ وہ بوجھ اُٹھانے اور محنت مشقت کرنے کے عادی تھے۔ میری واپسی تک نازو اور مونی نے بھی روانگی کی تیاری مکمل کر لی تھی۔

مزدوروں نے اپنا کام شروع کر دیا۔ ان کو اُجرت سے سروکار تھا۔ میں نے کہا تھا کہ کام دو گھنٹے میں ختم کر لیا تو دُگنے پیسے دوں گا۔ اب وہ دوڑ دوڑ کے ٹرک کے اندر سے کریٹ اتار رہے تھے۔ کندھوں پر رکھ کے لے جا رہے تھے اور دوسرے ٹرک پر چڑھا رہے تھے۔

اکرام شیخ اور محسن آدھے گھنٹے بعد آئے۔ راجا دس منٹ بعد ہی کار روانہ ہو گیا تھا۔ محسن نے بتایا کہ سیٹھ اکبر کے فلیٹ میں گزشتہ رات قتل ہو گیا۔ کچھ لوگ رات کے وقت آئے اور سیٹھ اکبر سمیت اس کے سارے خاندان کو مار گئے۔ وہاں تہلکہ مچا ہوا تھا۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ یہ کارروائی کس دشمن کی ہے۔

"لیکن ہم جانتے ہیں۔" میں نے کہا۔" ہم پولیس کو ان کا نام بھی بتا سکتے ہیں۔ یہ بھی بتا سکتے ہیں کہ قتل کیوں ہوا تھا۔ ٹرک اب کہاں ہے اور ٹرک ڈرائیور کہاں ہے۔"

محسن نے نفی میں سر ہلایا۔" اس کا کیا فائدہ۔ پولیس فوراً ٹرک پر قبضہ کرے گی اور انھیں پہنچا دے گی۔ ہم کسی اخبار والے کو غالب کے ذریعے یہ اسٹوری مفت فراہم کریں گے۔"

"مجھے تو معاف رکھو۔ جانتے بوجھتے میں اپنے کسی صحافی برادری کے آدمی کو اس جان لیوا خبر میں اُلجھانا نہیں چاہتا۔" غالب بولا۔

"یار صحافی کا مشن اور کیا ہوتا ہے۔ خبر کا کھوج لگانا اور سچ کی تہ تک جانا۔ پھر اس سچ کو جوں کا توں عوام کے سامنے پیش کر دینا ہر ثبوت کے ساتھ۔"

"اور پھر مارے جانا۔" غالب نے کہا۔

"ضروری تو نہیں کہ ہر بار کوئی افتخار مارا جائے۔ وہ ہر صحافی کو اور ہر پولیس مین کو قتل نہیں کر سکتے۔" میں نے کہا۔" اگر کوئی ایسا اخبار ہو جو خبر دے مگر حوالہ شائع نہ کرے۔ خبر کا ذریعہ نہ بتائے۔ تو وہ اخبار کا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔"

"ہاں... یہ ہو سکتا ہے۔" غالب نے سوچ کے کہا۔

ٹرک رات کے دس بجے لوڈ ہو گیا تو ہم نے مزدوروں کو خوش کر کے رُخصت کیا۔ انھیں شکوہ تھا کہ مال کا وزن بہت تھا۔ ان کی تو کمر ٹوٹ گئی ہے۔ ایک قلی نے پوچھا بھی تھا کہ آخر اس میں کیا ہے۔ وہ دوسروں سے زیادہ متجسس اور چالاک لگتا تھا۔ میں نے اسے سمجھا دیا کہ اس میں نٹ بولٹ اور مشینوں کے پُرزے ہیں۔

اُس وقت تک راجا بھی لوٹ آیا تھا۔

"کیا اب ہمارے یہاں رُکنے کی ضرورت ہے؟" مزدوروں کے جانے کے بعد میں نے کہا۔

"ابھی تو دس بجے ہیں۔" محسن نے کہا۔" ہم ابھی سے روانہ ہو گئے تو گیارہ ساڑھے گیارہ بجے وہاں پہنچ جائیں گے اور لانچ آئے گی دو بجے۔"

"لانچ کے آنے سے پہلے ہم مال اتار کے ساحل پر رکھ لیں تو اچھا ہے۔ ٹرک وہاں نظر ہی نہ آئے۔"

"وہ راستہ کیسا ہے؟"

"آخری حصہ بہت دشوار گزار ہے۔" راجا نے کہا۔" ٹرک آخر تک نہیں جا سکتا۔ چٹانیں ایک فرلانگ تک پھیلی ہوئی ہیں۔"

"تو کیا یہ کریٹ ہمیں ایک فرلانگ تک اُٹھا کے بھی لے جانے ہوں گے؟" محسن نے روتی آواز میں کہا۔

"یہ میرا اندازہ ہے۔ فرلانگ میں نے اندازے سے بتایا

ہے اگر دو فرلانگ ہو تو مجھے معاف کر دینا۔" راجا بولا۔
"اللہ ہم سب کو معاف کرے۔" محسن نے سرد آہ بھر کے کہا۔ "بارِ گناہ کیا کم تھا کہ دنیا میں یہ بوجھ ڈھونے کی سزا بھی ملی۔"
"صبح تک کام سے فارغ ہوں گے تو سب کی چال بدل چکی ہو گی۔" غالب نے یقین دلایا۔ "کوئی دائیں طرف سے جھکا ہوا ہو گا تو کوئی بائیں طرف سے۔ سب کا ایک شانہ اونچا ہو گا دوسرا نیچا۔"
"کوٹ پہنیں گے تو ایک آستین لمبی ہو گی ایک چھوٹی۔"
"چلو وہ تو جب ہو گا تب ہو گا۔" میں نے کہا۔ "ابھی تو نکلو یہاں سے۔ یہ کام مزدوروں نے دو گھنٹے میں نمٹا لیا ہے تو ہم سے چار گھنٹے میں ہی ہو گا۔"
"اس دوسرے ٹرک کا کیا کریں؟"
"کچھ نہیں۔ اسے اگر ہم یہیں چھوڑ دیں؟" غالب بولا۔
"چھوڑ دیتے، اگر ہم نے یہ دیوار نہ گرائی ہوتی۔" میں نے کہا۔ "اب تو وہ خبیث انکوائری آفس کا کلرک ہمارے بارے میں بہت کچھ بتا دے گا۔ لوگوں نے ہماری کار بھی دیکھی تھی۔ کیا پتا کسی کو نمبر یاد رہ جائے۔ اسے بھی یہاں سے لے چلو۔ مع ڈرائیور۔"
میں نے ڈرائیور کی لاش گیراج سے اٹھائی اور ٹرک میں لا کے ڈال دی۔ ہم سب نے اپنے لباس بدل لیے تھے اور اپنے موجودہ حلیے میں سندھی نظر آتے تھے۔ ہمارے سروں پر مخصوص سندھی ٹوپیاں تھیں اور کندھوں پر اجرکیں ـــــ خامی صرف ایک تھی کہ ہم سندھی نہیں بول سکتے تھے مگر ہمیں فی الحال کسی سے بات کرنی بھی نہیں تھی۔ دھوکا صرف ان کی نظر کو دینا تھا جو شاید یہاں بھی ہماری تلاش میں ہمہ وقت سرگرداں تھے۔
عرصۂ دراز سے ہم نے شیو نہیں بنائی تھی چنانچہ ہم سب باریش ہو گئے تھے۔ میری داڑھی کی زرخیزی دوسروں کے مقابلے میں زیادہ تھی اور اس کا رنگ بھی میرے بالوں کی طرح بھورا تھا۔ غالب کی داڑھی سب سے مختصر تھی۔ راجا کلین شیو تھا اور اس نے اپنا فقیری لباس ترک نہیں کیا تھا۔ اس لباس میں وہ ہر جگہ ایک بے ضرر فقیر کی حیثیت سے پہچانا جاتا تھا۔
"میں خالی ٹرک لے کر پیچھے آتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "تم لوگ دوسرے ٹرک میں آگے چلو۔"
"ٹرک نکلے گا کیسے ریورس میں؟" محسن نے کہا۔
"ہم لوگ انھی ہاتھوں سے ملبہ ہٹا کے راستہ بنائیں گے۔" غالب نے افسوس سے سر ہلایا۔ "یہ قلم اٹھانے والے ہاتھ تھے ـــ جنھوں نے تلوار اٹھائی تھی۔ اب یہ ہاتھ کیا اٹھائیں گے۔ بلاک، پتھر، گولہ بارود۔"
"آ... ہم... ایک چیز اور اٹھائی تھی آپ نے۔" میں نے کھنکار کے کہا۔ "اس کا تذکرہ بھی فرمائیے۔"
"کون سی چیز؟" غالب نے بے خیالی میں کہا۔
"اچھی چیز تھی۔ مگر بے ہوش تھی۔" میں نے اس کے کان میں کہا۔
وہ دانت نکالنے لگا۔ "کیا نصیب پائے ہیں ـــ ایک وہ وقت تھا۔"
"وہ وقت میری جان بہت دور نہیں ہے۔" میں نے فیض کا مصرع مختلف معنی میں پڑھ کے کہا۔ "اب چلو۔"
ٹرک کے لیے واپسی کا راستہ بنانے اور اس کی ترپالیں اتار کے اپنے ٹرک پر ڈالنے میں مزید آدھا گھنٹا صرف ہوا۔ ہم نکلے تو پونے گیارہ بج رہے تھے۔ غالب اور محسن پچھلے حصے میں سامان کے اوپر بیٹھے تھے اور میں محسن کو ہیر گاتے سن رہا تھا۔ یہ ڈائریکشن کی غلطی تھی، اسے سندھی شاعری کا انتخاب کرنا چاہیے تھا، اگر گانا ضروری تھا۔
گیارہ بجے ہم نے خالی ٹرک کو ایک دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا جو محمود آباد کے علاقے میں جگہ گھیرنے کے لیے اٹھائی گئی تھی۔ یہاں کسی کا محض ٹرک کو دیکھنے کے لیے آنا اور لاش دریافت کرنا اتفاق ہو سکتا تھا ورنہ ایسے سیکڑوں ہزاروں ٹرک ہر جگہ کھڑے نظر آتے تھے اور کسی کو ایک ٹرک سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے تا وقتیکہ وہ اس کا اپنا ٹرک نہ ہو۔
اب میں بھی محسن اور غالب کے ساتھ زمین کی سطح سے بارہ فٹ اوپر تشریف رکھنے پر مجبور رہا کیونکہ آگے راجا اپنے استاد ڈرائیور اکرام شیخ کا کلینر بنا بیٹھا ہوا تھا۔
"کیسا موسم ہے اتنی بلندی پر؟" محسن نے کہا۔
"اونٹ پر بیٹھ کے بھی ایسا ہی محسوس ہوتا ہو گا۔ کہ آدمی باقی دنیا کے مقابلے میں کتنا سربلند ہو گیا ہے۔" غالب نے کہا۔
"چیف کے ٹو۔" محسن نے کہا۔ "تفتیش سے حاصل ہونے والی معلومات میں کسی پیر کا نام آیا تھا؟"
"منگھو پیر کا نام آیا تھا اور اس نے ماری پور کا نام بھی لیا تھا۔" میں نے کہا۔ "کیا اس کا یہ مطلب نکالا جائے کہ ان کے دو گودام ہیں۔"
"تعدادِ ازدواج کی طرح گودام رکھنے پر کوئی پابندی نہیں ہے میاں۔" محسن نے کہا۔ "دو چار چھ۔ جتنے وہ چاہیں رکھ سکتے ہیں۔"
"صرف ماری پور... یا منگھو پیر سے تو کچھ پتا نہیں چلتا۔ ہم کیسے تلاش کر سکتے ہیں۔"
"اس کے لیے تو وہی طریقہ اختیار کرنا ہو گا۔ یعنی ٹرک پر نظر رکھی جائے اور جو اسے لے جانے کے لیے آئے ہم اس کے ساتھ ہو لیں کہ ماجھی میری قسمت کے جی چاہے جہاں لے چل۔" محسن نے پھر گانا شروع کیا۔
"کچھ ساز ایسے ہوتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "پتا نہیں چلتا کہ آواز کدھر سے نکل رہی ہے۔"
"یہ طنبورا بھی ایسا ہی ہے۔" غالب نے مجھ سے اتفاق کیا۔

"رات گیارہ بجے اگر طنبورا خالی ہو گا تو اس میں سے ایسی ہی آواز نکلے گی۔" محسن بولا۔
"تو نے میرے دل کی کہی۔ بلکہ پیٹ کی کہی۔" میں نے کہا۔ "کیا ہمارا پائلٹ کہیں اسٹاپ اوور کرے گا؟"
"ہاں۔ کرنا تو چاہیے۔ آخر وہ بھی انسان ہے۔" محسن بولا۔ "پہلے تھانیدار تھا تو کیا ہوا۔ بھوکا تو وہ بھی ہے۔"
"اگر اس نے فرض کو بھوک پر ترجیح دی اور چلتا گیا تو کیا ہم بھوکے پیٹ مزدوری کریں گے۔" غالب نے کہا۔ "اسے کہو کہ رکے۔"
"کیسے کہوں؟" محسن بولا۔ "آگے اتنا شور ہے اور اتنی بلندی سے کون سنتا ہے فغانِ درویش۔"
"ہم درویش کو پائلٹ کے کان تک پہنچا سکتے ہیں۔" غالب نے کہا۔
محسن ٹرک پر کیبن کے قریب ہو کے جھکا اور ہم نے اس کا ایک ایک پیر پکڑ لیا۔ آہستہ آہستہ ہم ڈھیل دیتے گئے اور محسن الٹا لٹکا ہوا نیچے کی طرف بڑھتا گیا۔
اس نے چیخ کے کہا۔ "ابے سابق تھانیدار۔" اور پھر قہقہہ مار کے ہنسا۔ ٹرک تھوڑا سا لہرایا۔ میرا خیال ہے کہ اکرام شیخ اپنے کان کے قریب یہ نعرہ سن کے اچھلا ہو گا اور پھر ایک سر کو معلق دیکھ کر۔ پھر محسن نے شور مچانا شروع کیا کہ اسے اوپر کھینچا جائے۔
"نہیں۔ ایسے ہی ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔
"اوپر جگہ نہیں ہے۔" غالب نے کہا۔ "ویسے بھی تم اچھے لگ رہے ہو اس پوز میں۔ دنیا کو نئے زاویے سے دیکھنے میں بھی لطف آ رہا ہو گا۔"
محسن، غالب کو کوسنے اور چیخنے چلانے لگا۔
"الٹی کھوپڑی کے۔ زیادہ شور کیا تو ہم چھوڑ دیں گے۔" غالب نے کہا۔
"اچھا اچھا۔ پکڑے رہو میرے پیر۔" محسن بولا۔ "بلکہ میرے تلوے چاٹو۔"
ٹرک رک گیا، سامنے چراغاں سا ہو رہا تھا۔
"یہ کیا ہو رہا ہے؟" اکرام شیخ نے ہمیں نیچے اتر کے ڈانٹنا شروع کیا۔ "خواہ مخواہ سب کو متوجہ کر دو گے۔"
"سب کون؟"
"سامنے ایک چائے خانہ ہے۔" اکرام شیخ بولا۔ اس نے محسن کو اتار لیا۔
"جہاں یہ چراغاں ہو رہا ہے۔" میں نے حیران ہو کے کہا۔ "یہ تو مجھے کوئی سی سی اسٹار ہوٹل لگ رہا ہے۔"
"یہ آئل ریفائنری ہے۔" وہ بولا۔ "شاید اسی کے ملازم یہاں نائٹ شفٹ کے لیے آتے جاتے ہوئے چائے پیتے ہوں گے۔"
اکرام شیخ کا خیال درست تھا۔ اس ایک کمرے کے کیفے ڈلی روڈ سائڈ میں سب کچھ تھا، سوائے کھانے کے۔ مجبوراً ہم نے بیکری کی مختلف مصنوعات چبائیں۔ ان کے نام جدا تھے اور شکل و صورت دیکھ کے نہیں رکھے گئے تھے مثلاً جسے کیک رس کا خطاب ملا تھا اس میں نہ کیک تھا اور نہ رس۔ ذائقہ سب کا ایک سا تھا۔ اس غذا پر ہم نے بہت سا گرم مشروب انڈیلا جسے چائے سمجھنا مشکل تھا مگر وقت بڑا بے رحم استاد ہے، جو سمجھا دیتا ہے کہ جہاں کچھ نہ ہو وہاں کیا اچھا اور کیا برا۔
ریسٹورنٹ کا مجہول سا مالک ہماری بے مقصد گفتگو اور بے وجہ ہنسی پر حیران تھا۔
"تم لوگ کیا کرتے ہو؟" اس نے سوچ کے پوچھا۔
"ہم سب کچھ کرتے ہیں۔ اچھے کام بھی اور برے کام بھی۔" محسن نے کہا۔
"اس وقت ٹرک لے کر ادھر کہاں جا رہے ہو؟ آدھی رات کو۔" وہ بولا۔
"کسی نے بلایا ہے۔" محسن شرما کے بولا۔
"صاف بتاؤ نا چاچا کو۔" غالب نے کہا۔ "اسے بلایا ہے ایک لڑکی نے ملاقات کے لیے۔"
بڈھا دم بخود رہ گیا۔ "اس وقت؟ اور تم لوگ؟"
"ہم اس کے باڈی گارڈ ہیں۔" میں نے کہا۔ "راستہ ذرا خطرناک ہے نا۔ بے چارہ ڈرتا تھا۔"
"مگر وہ لڑکی۔ پاگل ہے کیا؟"
"نہیں... وہ بہت سیانی ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ اس کو لے کر نکل جائے گی۔ دبئی کی طرف۔"
"ہم تو بس سی آف کرنے جا رہے ہیں۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "واپسی میں یہ ہمارے ساتھ نہیں ہو گا۔"
"اس کا باپ بڑا ظالم ہے۔ کئی بار اسے گولی مار چکا ہے۔" غالب نے کہا۔
"کئی بار...؟" بڈھے نے مشکوک لہجے میں کہا۔
"ہاں۔ نشانہ ذرا خراب ہے اس لیے یہ بچ گیا۔ دوسرے مارے گئے۔" غالب نے کہا۔ "جو اس کے ساتھ تھے۔"
"تم بے وقوف بنا رہے ہو مجھے۔" بڈھا خفا ہو گیا۔ "تم تو مجھے اسمگلر لگتے ہو۔"
"واہ چاچا۔" میں نے کہا۔ "تم تو بہت سمجھدار ہو۔ ہم واقعی اسمگلر ہیں۔" میں نے کہا۔
"اس ٹرک میں سونا بھرا ہوا ہے۔" محسن نے کہا۔ "لو گے؟"
"دو روپے سیر۔" میں نے کہا۔
ہم بڈھے کو زیادہ ناراض کر کے رخصت ہوئے۔ اس میں

شک نہیں کہ وہ بڈھا تھا اور بے وقوف بھی لگتا تھا لیکن وہ ایسی جگہ بیٹھا ہوا تھا جہاں سے وہ آتے جاتے ہر ٹرک کو دیکھتا تھا اور شاید جانتا تھا کہ اس وقت ادھر جانے والے کون ہوتے ہیں۔

"یہ بڈھا مروا نہ دے" غالب نے کہا۔ شک ہو گیا تھا اسے"

"اس کے پاس کیا ٹیلی فون تھا" میں نے کہا۔ "وہ کسی کو کیسے اطلاع دے سکتا ہے"

"اس کے علاوہ۔ اگر وہ جانتا ہے کہ اس وقت اسمگلر ہی ادھر جاتے ہیں" محسن بولا۔ "تو یہ بات بھی وہ اچھی طرح سمجھتا ہوگا کہ اسمگلر کیسے لوگ ہوتے ہیں۔ وہ ان سے روز دشمنی مول لیتا تو کب کا یہاں سے اُٹھ چکا ہوتا۔ اس کا بے ضرر ہونا ہی اس کے وجود کی ضمانت ہے۔ سب جانتے ہوں گے کہ بڈھا خبطی ہے مگر اپنے کام سے کام رکھتا ہے"

"ہاں۔ آخر اسے ہوٹل بھی تو چلانا ہے"

باقی سفر ایسے کٹا کہ خود مجھے سمت کا اندازہ نہ رہا۔ آگے اکرام شیخ پائلٹ کے فرائض انجام دے رہا تھا تو راجا نوی گیٹر کے۔ وہ اس کی ہدایات کے مطابق راستہ اختیار کر رہا تھا۔ اب سمندر کے قرب کا ثبوت ہوا کی مہک دیتی تھی اور اس سمندری ہوا میں نمی کا تناسب بڑھتا جا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد سمندر کے پھنکارنے کی گونج بھی سنائی دینے لگی۔ جھٹکوں سے ہمارا برا حال تھا۔ ٹرک کے پہیے ریت پر آگے بڑھتے تھے تو پیچھے گہری نالیاں بناتے تھے اور انجن کو زیادہ زور لگانا پڑتا تھا۔ راجا نے کہا تو تھا کہ یہ جگہ محفوظ ہے مگر ہم اس وقت تک مطمئن نہیں ہو سکتے تھے جب تک بحفاظت سفر کا اختتام نہ ہو جائے۔ یہ علاقہ اسمگلروں کا آپریشنل ایریا تھا۔ یہاں چھاپے بھی مارے جاتے ہوں گے۔ چھاپے مارنے کے ڈرامے بھی کیے جاتے ہوں گے۔ پولیس مقابلے بھی منعقد ہوتے ہوں گے۔ ابھی کیا معلوم وہ لانچ والا بھروسے کے قابل تھا یا نہیں۔ وہ ڈبل ایجنٹ بھی ہو سکتا تھا۔ ادھر پارٹی سے بات کرے ادھر پولیس کو مطلع کر دے۔

بالآخر ٹرک رک گیا اور ہم جو سمندر کی موجوں پر بکھری ہوئی چاندنی سے روشن لہروں کے کھیل میں گم تھے چونک کر نیچے اترے۔ ہمارے دائیں بائیں چٹانوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا اور جب میں نے راجا کے ساتھ جا کے دیکھا تو سمندر جگہ جگہ ان چٹانوں کے اندر تک پہنچ رہا تھا۔ موجیں جھاگ اڑاتی آتی تھیں اور چٹانوں کے خلا میں بھر جاتی تھیں۔

ایک نسبتاً بلند چٹان پر رک کے راجا نے سیٹی بجائی۔ اپنی دو انگلیاں منہ میں ڈال کے۔ یہ مہارت کا کام تھا جو میں نہیں کر سکتا تھا۔ جواب میں ویسی ہی سیٹی دوبارہ سنائی دی۔

"آگیا ہے وہ" راجا نے خوش ہو کے کہا۔ "ہم زیادہ دور نہیں ہیں" اس نے پھر سیٹی سگنل دیا۔ جواب پھر پہلے کی طرح ملا۔ راجا وقفے وقفے سے بتا رہا کہ ہم کس سمت میں ہیں اور جوابی سگنل سے مجھے اندازہ

ہوتا رہا کہ درمیانی فاصلہ کم ہونے لگا ہے۔ بالآخر ایک ... چٹان کی اوٹ سے نکلا اور ہماری طرف آگیا۔

ہمیں ٹرک کو مزید آدھا میل آگے لے جانا پڑا۔ لانچ ... والا مکرانی ہماری رہنمائی کے لیے آگے پیدل چل رہا تھا۔ ہم بھی پیدل ... کیونکہ ٹرک کی رفتار بہت کم تھی۔ ٹرک اب راجا چلا رہا تھا ... اکرام شیخ ٹرک کے دائیں جانب پچاس گز پیچھے چل رہے تھے ... غالب اتنے ہی فاصلے سے دوسری طرف تھے اور ہم سے بھی پچاس ... دور تھے۔

ریت پر چلنا ایک دشوار کام تھا۔ ریوالور ہم سب کے ... میں تھے۔ ذہنی طور پر ہم سب ہر قسم کی صورتِ حالات سے نمٹنے کے لیے تیار تھے۔ اس وقت اچانک حاجی کے گرگے آ جاتے یا پولیس نمودار ہو جاتی تو ہم سب کا ردِعمل یکساں ہوتا۔ ہم وہیں ریت پر ... اور فائر کھول دیتے۔ ہمارا نشانہ ٹرک ہوتا۔ ظاہر ہے اس کے ... ہماری جنگ ختم ہو جاتی کیونکہ ہم ختم ہو جاتے۔

مگر ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ راجا نے انتخاب میں غلطی نہیں کی تھی۔ وہ مکرانی قابلِ اعتبار تھا۔ زیادہ خوشی ہمیں اس وقت ہوئی جب ہم نے لانچ کو دو چٹانوں کے درمیان پایا۔ ٹرک سے اس کا ... سو گز بھی نہیں تھا اور اس کے دونوں طرف چٹانوں کا سلسلہ ایک ... حصار فراہم کرتا تھا۔

ٹرک سے پہلا کریٹ اتار کے میں نے لانچ تک کا فاصلہ پانچ ... میں طے کیا۔ اس وزن کے ساتھ مجھے یہ فاصلہ واقعی دو فرلانگ ... اگر فاصلہ دو فرلانگ ہوتا تو شاید مجھے دو میل لگتا۔ میں نے محسوس کیا ... ٹرک سے کریٹ اتارنا، کندھے پہ لاد کے جانا اور پھر لانچ پر ... آسان کام نہیں ہوگا۔

لیکن لانچ پر قدم رکھتے ہی مجھے ایک خوشگوار حیرت کا سامنا ... یہ ہماری لانچ تھی۔

"راجا!" میں نے خوشی سے چلا کے کہا۔ "یہ تو وہی لانچ ہے۔ ہماری لانچ"

راجا دانت نکالنے لگا۔ "اچھا؟ مجھے معلوم نہیں تھا"

میں نے اس کی کمر میں مکا مارا۔ "یہ بات تو نے اب تک چھپائی تھی؟"

"ہاں یار۔ میں نے سوچا تم کو ایک دم سرپرائز دوں۔ تم کو ... خوشی حاصل ہو" وہ بولا۔ ...

"تو مجھے چار مار لینا" میں نے کہا۔ "مگر یہ بتا کہ..."

"مجھے بندرگاہ پر دوست محمد مل گیا تھا۔ اس نے مجھے اشارے ... سے پیچھے آنے کو کہا۔ پہلے تو میں سمجھا نہیں مگر اس نے چند قدم ... پھر پیچھے دیکھا اور بہت واضح انداز میں گردن کے اشارے سے ... بلایا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے بہت دور تک گیا۔ ایک جگہ رک کے ...

نے مجھے اپنے ساتھ سنڈاس میں بند کر لیا"

"کس چیز میں بند کر لیا؟"

"ٹائلٹ۔ باتھ روم۔ لیٹرین۔ لیوٹری" راجا نے جھلا کے کہا۔ "سب ایک ہی چیز کے نام ہیں۔ وہاں اس نے مجھ سے دو باتیں کہیں۔ ایک یہ کہ لانچ رات کو کہاں ملے گی۔ وہ ہماری تلاش میں تھا"

"اور دوسری بات؟" میں نے دھڑکتے دل کو سنبھال کے کہا۔

"دوسری بات؟ وہ تو میں بھول گیا" راجا نے معصومیت سے کہا۔

"تیری یادداشت ٹھیک کروں؟" میں نے اس کی گردن دبوچ لی۔

"آہ... ارے فقیر کو مارتا ہے بدبخت" وہ چلایا۔ "مجھے یاد آگیا"

میں نے اسے چھوڑ دیا۔ "رابعہ کے بارے میں کچھ کہا ہوگا؟"

"ہاں۔ کہا تو تھا" وہ گردن ہلا کے بولا۔ "تمہاری زور آزمائی میں دماغ سے نکل گیا۔ پکڑ کے لاتا ہوں" وہ ایک دم بھاگا۔

"یہ کیا حرام خوری کر رہے ہو تم دونوں؟" محسن نے چلانا شروع کیا۔ "ایک ہی پھیرے میں مر گئے"

اکرام شیخ اور غالب ہمارے پاس سے گزرے۔ ہم دونوں دوڑتے ہوئے ان کے پاس سے گزر گئے۔ ٹرک کے پاس پہنچ کے میں نے اسے پھر پکڑ لیا۔

"محسن بھائی! بچاؤ" راجا چلایا۔ "ایک تو میں لانچ واپس لے آیا ہوں۔ تمہاری والی لانچ"

"ہماری لانچ! یہ ہماری لانچ ہے؟" محسن نے ٹرک پہ سے چھلانگ ماری۔ وہ کریٹ اتارنے پر مامور تھا۔

"ہاں۔ اور تمہارا یہ چیف کے ٹو مجھے قتل کرنا چاہتا ہے" راجا نے اس کے پیچھے پناہ لے لی۔ "میں نے صرف رابعہ کا نام لیا تھا کہ اس پر دورہ پڑ گیا"

محسن غوطہ مار کے نکل گیا اور راجا پکڑا گیا۔

"استاد! ابھی کتنی بار بولوں کہ رابعہ مزے میں ہے۔ اس نے بولا ہے کہ میری فکر مت کرو" راجا چلانے لگا۔

میں نے اسے چھوڑ دیا۔ "بس۔ یہی کہا ہے؟"

"اس نے نہیں۔ دوست محمد نے کہا ہے کہ رابعہ کا فکر ... نا"

"تم نے پوچھا نہیں کہ وہ ہے کہاں؟"

"پوچھا تھا بابا۔ مگر وہ گرم ہو گیا کہ تم کو کیا۔ ابھی شکل گم کرو" راجا نے کہا۔ "اور خود گم ہو گیا اپنی شکل کے ساتھ"

میں نے ایک گہری یاد بھری سانس لی اور پھر کریٹ اٹھا کے چل پڑا۔ تجھ سے اے دشمنِ جاں تیرا خیال اچھا ہے۔ آ تو جاتا ہے مجھے تسلی دینے کے لیے۔ مگر تسلی صرف خیال سے ممکن ہوتی تو پھر کیا تھا۔

لانچ پہلی بار بھر کے روانہ ہوئی تو صبح کے تین بجے تھے۔ آدھا ٹرک خالی ہو گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ صرف دو پھیرے کافی ہوں گے۔ اپنی لانچ واپس مل جانے کے خیال نے سب کو ایسی خوشی دی تھی

کہ سب کا حوصلہ دو چند ہو گیا تھا۔ پہلے راؤنڈ میں راجا کے سوا سب ساتھ گئے۔ راجا ٹرک پر موجود رہا۔

تقریباً دو میل کا فاصلہ ہم نے بیس منٹ میں طے کیا۔ پھر میں نے مکرانی ناخدا سے کہا کہ وہ ایک فرلانگ کے دائرے میں واپسی کا چکر شروع کرے۔ وقفے وقفے سے ہم سب کریٹ پانی میں گراتے گئے۔ ہر بار پانی اچھلتا تھا تو ہمارے کپڑے بھیگ جاتے تھے اور چھینٹے منہ پر آتے تھے مگر یہ کھیل بڑا دلچسپ تھا۔ واپسی کے سفر کا ایک میل پورا ہونے تک ہم نے لانچ کو خالی کر دیا تھا۔ اسلحے کا یہ سارا ذخیرہ سمندر میں ایک میل کے دائرے میں پھیل گیا تھا اور سیکڑوں فٹ کی گہرائی میں جا کے بیٹھ گیا تھا۔

دوسرے راؤنڈ میں ٹرک کا باقی سامان ہم نے تھوڑے سے مختلف زاویے پر چلتے ہوئے سپردِ آب کیا اور واپس لوٹے تو صبح کے ساڑھے چار بج چکے تھے۔ مکرانی نے ہمیں بتایا کہ لانچ اسی جگہ رہے گی اور وہ ہر رات یہاں ملے گا۔ ہم نے اس سے دوستوں کی طرح ہاتھ ملایا اور روانہ ہوئے۔

واپسی میں ہم پھر انہی مقامات سے گزرے تو ایک بار پھر فتحمندی کے مسرت آمیز غرور میں مبتلا تھے۔ ہم نے تباہ کن اسلحے کا ایک بہت بڑا ذخیرہ دشمن کی آنکھوں میں دھول جھونک کے یوں غائب کیا تھا کہ اسے وہ ابھی تک زمین آسمان کے درمیان تلاش کر رہے تھے جبکہ ان کا مال سمندر نگل چکا تھا۔ ان کے لیے مالی نقصان کے علاوہ اپنے مقاصد کے حصول میں ناکامی کا صدمہ الگ تھا۔ نہ جانے کہاں تخریب کار اس کھیپ کے پہنچنے کا انتظار کر رہے تھے اور اُمید لگائے بیٹھے تھے کہ وہ بہت جلد ایک اور کامیابی حاصل کریں گے۔ ایک اور محبِ وطن عوام کی بستی کا نشان مٹا دیں گے۔ ایک اور شاہراہ کو کاٹ دیں گے یا وطن پرست افواج کے خلاف ایک مورچا فتح کر لیں گے۔ لیکن اب کچھ نہیں ہوگا۔ ہم یہ نہیں جانتے تھے کہ اسلحہ کہاں پہنچتا مگر ہم اندازہ کر سکتے تھے کہ اتنے بڑے ڈھیر سے کتنی انسانی زندگیوں کو ختم کیا جا سکتا تھا۔ خدا نے ہمیں توفیق دی تھی کہ ہم انھیں بچا لیں۔ سیکڑوں بچوں کی یتیمی اور سیکڑوں عورتوں کی بیوگی۔ سیکڑوں ماؤں کے سینے کی ماتا اور سیکڑوں جوان بیٹوں کی زندگی جو والدین کے بڑھاپے کی لاٹھی تھی، موت کے منحوس سایوں سے محفوظ ہو گئی تھی۔

صبح کاذب کے اُجالے میں ہم محمود آباد سے گزرے جہاں حاجی عبداللہ اینڈ کمپنی کا ٹرک ڈرائیور کی لاش کے ساتھ موجود تھا۔

"کیا اس ٹرک کو اسی جگہ چھوڑنا ٹھیک ہوگا؟" محسن بولا۔

"کیا ہرج ہے؟" میں نے کہا۔

"یہاں ہم اس پر کیسے نگاہ رکھیں گے؟" محسن نے کہا۔ "اس کے علاوہ کسی نے لاش دیکھ لی تو معاملہ پولیس کے ہاتھ میں چلا جائے گا"

"یہ تو ٹھیک ہے" غالب نے کہا۔ "ابھی کچھ دیر میں دھوپ نکلے

گی تو دوپہر تک لاش کی بو خود سب کو متوجہ کرے گی۔"

"چلو پھر اسے لے چلتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "لاش کو کہیں اور ڈراپ کر دیتے ہیں۔ اچھا ہے اسے پولیس لے جائے اور انہیں بھی پتا چل جائے۔ حاجی کی اولاد کو۔ تم مجھے آمادہ دو۔"

میں نے ٹرک اسٹارٹ کیا تو غالب دوڑتا ہوا آیا اور میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ دونوں ٹرک آگے پیچھے چلنے لگے۔

"کل... تم نے ایک بات کی تھی۔" غالب نے کہا۔

"میرا خیال ہے کل میں سارا دن بولتا رہا تھا۔ بہت سی باتیں کی تھیں۔"

"نازو کے اور میرے بارے میں۔ تھانیدار نے کس قسم کے خیالات کا اظہار کیا تھا؟"

میں سوچ میں پڑ گیا۔ "مجھے افسوس ہے دوست۔ اس کی رائے بہت خراب ہے تمہارے بارے میں۔ تم نازو کا خیال چھوڑ دو کسی اور سے دل لگاؤ۔"

"مثلاً رابعہ سے۔" وہ بولا۔

"نہیں۔ اچھے نیک کاموں میں دل لگاؤ۔ عاقبت کی فکر کرو۔ یہ عشق تمہارے بس کی بات نہیں۔" میں نے کہا۔ "تمہارا سالا تھانیدار بھی یہی کہتا ہے کہ بعد میں کیا ہو گا۔ فرض کرو وہ جہیز میں ایک اسٹریچر، بیساکھی اور وہیل چیئر سب کچھ دے تب بھی کیا ہو گا۔ اس کی چند شرائط ہیں۔"

"وہ کیا شرائط ہیں؟"

"ایک تو تم بلیک بیلٹ لے لو۔" میں نے کہا۔

"وہ پانچ سات کی ملتی ہے۔ کالے رنگ کی بیلٹ پہلے تھی میرے پاس۔"

"پھر یہ کہ تم کسی ہڈیوں کے ڈاکٹر سے کنٹریکٹ کر لو۔ ماہانہ یا فی درجن ہڈیوں کی بنیاد پر۔" میں نے کہا۔ "یا اپنی ساری ہڈیاں شادی سے پہلے نکلوا دو۔ کیچوے کی طرح ہو جاؤ۔"

"بس یا کچھ اور۔ یہ شرط تو نہیں ہے کہ بیوی کو ہاتھ بھی مت لگانا؟"

میں ہنسنے لگا۔ "نہیں۔ یہ شرط نہیں ہے۔"

"بس تو باقی سب شرائط مجھے منظور ہیں۔" غالب نے کہا اور منہ پر ہاتھ رکھ کے ایسی آواز نکالی جیسی کسان اپنے کھیتوں سے جانور بھگانے کے لیے نکالتے ہیں۔

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ تمہارا سالا کس کے عشق میں مبتلا ہو رہا ہے؟" میں نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے۔ وہ موہنی پر مر مٹا ہے۔"

"کمال ہے! تجھے کیسے معلوم ہوا؟"

"بھائی جب چاند نکلتا ہے تو سب کو نظر آتا ہے۔ دیکھ وہ اگلی پارٹی کیا سگنل دے رہی ہے۔"

آگے والے ٹرک میں سے محسن ہاتھ ہلا کے کچھ کہہ رہا تھا۔ میں نے ٹرک کو سائڈ میں روک لیا۔ سڑکوں پر اب ٹریفک رواں ہو گیا تھا۔

اسٹریٹ لائٹس بجھ گئی تھیں اور مشرق کے افق پر سنہرا اجالا پھیلا ہوا تھا۔

"اس ٹرک کو ہم ساتھ لے جائیں گے؟" محسن نے کہا۔

"کہاں لے جائیں گے؟"

"وہیں جہاں اب ہمیں رہنا ہے۔ جہاں رات کو راجا صاحب خواتین کو چھوڑ کر آئے تھے۔" محسن نے کہا۔ "تم اب لاش کو کہیں گرانے کا موقع دیکھ کر۔ ہم ذرا آگے جا کے انتظار کرتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے اس کے پیچھے جاتے ہوئے کہا۔ "زیادہ فاصلہ زیادہ مت رکھنا۔ مجھے تو راستے بھی نہیں معلوم۔"

اگلے موڑ پر میں نے ڈرائیور کی لاش کو پلک جھپکتے میں اٹھا کر باہر گرا دیا۔ یہ سڑک ویران تو نہیں تھی مگر پیچھے مجھے دوسری کوئی گاڑی نظر نہ آئی تو میں نے اس وقفے سے فائدہ اٹھایا۔ ڈرائیو نگ اب وہ کر رہا تھا۔ اس نے میرے اشارے پر اسپیڈ بڑھا دی۔

آگے والے ٹرک پر نظر رکھے ہوئے ہم جب پھر رکے تو دن کافی اوپر آ گیا تھا۔ یہ کوئی نئی آباد ہونے والی بستی تھی۔

"ٹرک اس دیوار سے لگا کے روک دو اور ہمارے ساتھ آ جاؤ۔" اکرام شیخ نے سر نکال کے کہا۔

میں نے اس زیرِ تعمیر گھر کو دیکھا جس کی تعمیر کا کام نہ جانے کب سے رکا ہوا تھا۔ غالب نے ٹرک کو اس کے سامنے کھڑا کر دیا تو میں کود کے نیچے اتر گیا۔ ہم نے چابیاں ٹرک میں لگی چھوڑیں اور آگے والے ٹرک پر سوار ہو گئے۔ ٹرک سیدھا گیا پھر گھوم کے واپس آیا اور ایک خالی پلاٹ پر ٹھہر گیا۔

"کیا یہ۔ ہم وہیں نہیں آ گئے؟" میں نے کہا۔

"ہاں... بس ایک گلی کا فرق ہے۔" اکرام شیخ بولا۔

"براہِ راست ہم بیچ سے گزر کے ایک منٹ میں بھی یہاں آ سکتے تھے۔" راجا نے کہا۔ "لیکن احتیاط اچھی چیز ہے۔"

وہ شاید نو دس مرلے کا مکان تھا۔ راجا نے میرے اندازے کی تصحیح کی اور بتایا کہ یہ دو سو مربع گز کا مکان ہے۔

"یہاں مرلے اور کنال نہیں چلتے۔"

"گویا یہ آٹھ مرلے پر بنا ہوا ہے۔" میں اپنی بات پر قائم رہا۔

یہ مکان دیکھنے میں کوٹھی لگتا تھا۔ اس کا نقشہ باہر سے بہت خوبصورت تھا اور بظاہر یہ نو تعمیر شدہ مکان تھا۔ ہم ایک بہت بڑے پھاٹک سے گزر کے اندر داخل ہوئے۔ یہ پورچ کا گیٹ تھا اور ہماری کار اندر بہت محفوظ کھڑی ہوئی تھی۔ پورچ کی چھت کے اوپر ایک اوپن ٹیرس یا گیلری سی بنی ہوئی تھی۔

اندر تین کمرے یا بیڈ روم تھے۔ سب میں موزیک فلور تھا اور ہر ایک کا رنگ بھی جدا تھا مگر وہ سب خالی پڑے ہوئے تھے۔ وال ٹو وال کا ڈیزائن سب جگہ ایک سا تھا۔ چوتھا بڑا کمرا ڈرائنگ روم تھا جس کے وسط میں ایک چھوٹا سا فانوس تھا اور اس کے دونوں طرف دو بیچ آویزاں تھے۔ چاروں دیواروں پر جو لائٹس تھیں ان کا اور فانوس کا ڈیزائن بھی باقی گھر کی لائٹس جیسا ہی تھا۔

"وہ دونوں کہاں ہیں؟" میں نے پورا گھر دیکھ لینے کے بعد کہا۔

"کون دونوں؟" راجا معصوم بن گیا۔

"آپ کی چھوٹی اور بڑی باجی۔" میں نے کہا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں اکلوتا تھا۔"

"اب اکلوتا بھی نہیں رہنا چاہتا شاید؟" محسن نے اسے پکڑ لیا۔ "بول کیسے بتلائے گا۔ سو پیاز اور سو جوتے کھا کے؟"

راجا نے اقرار میں سر ہلایا۔ "پیاز دو سو منگوا لینا احتیاطاً کم نہ پڑ جائیں۔ میں پہلے پیاز کھاؤں گا۔"

"ہم پہلے جوتے کھلائیں گے۔" میں نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "نازو اور موہنی کہاں ہیں؟"

"وہ... اچھا... وہ تو سامنے والے گھر میں ہیں۔ یہ بات پوچھ رہے تھے تم؟" راجا نے کہا۔ "آرام سے پوچھ لیتے شرفا کی طرح۔"

"سامنے... وہاں کون ہے؟" محسن نے اسے چھوڑ دیا۔

"مجھے کیا معلوم۔" وہ پھر اکڑ گیا۔ "ہوں گی ان کی یا تمہاری کوئی خالہ پھوپی۔ میں ابھی تم سب کے میکے سسرال والوں کو کہاں جانتا ہوں۔"

اس بار میں نے راجا کو یوں دبوچ لیا کہ اس کی گردن میری بغل میں پھنس گئی۔

"محسن! سب کے بارے میں بتلا دے اسے۔"

محسن نے اس کی بغل میں گدگدی شروع کی۔ "ایک تو ہے میری خالہ کی ممانی۔ دوسری میری ممانی کی خالہ۔ اور ان کی بیٹی بیاہی گئی سکندر کی پھوپی کے بیٹے سے۔"

راجا اچھلتا رہا اور چلاتا رہا۔ "ابے مر گیا۔ چھوڑو مجھے بھوت کے بچو۔" اور ہنستے ہنستے وہ چیخیں بھی مارتا رہا۔ "ارے بتاتا ہوں یار۔"

"کیا مصیبت ہے یہ۔ پڑوس کے لوگ کیا کہیں گے کہ کون پاگل آ گئے ہیں۔" غالب نے خفگی سے کہا۔ "اتنی چیخ و پکار سنیں گے تو آ جائیں گے پوچھنے۔"

اکرام نے بھی کہا۔ "آتے ہی اتنا ہنگامہ۔"

میں نے راجا کو چھوڑ دیا۔ "یہ خ... ...ے کا آنے والوں کو۔"

راجا نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "کوئی نہیں آئے گا یہاں۔ فکر مت کرو۔ یہاں بھوت رہتے ہیں۔ ہم سے پہلے بھی۔"

"پھر بکواس۔"

"نہیں...۔" وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ "یہ ایک آسیب زدہ مکان ہے۔ سارے علاقے میں مشہور ہے۔ اسی لیے خالی پڑا تھا۔"

"تمہیں کس نے بتایا؟"

"میں جب نازو اور موہنی کو لے کر آیا تھا۔ تو سامنے سے ایک بڑی بی نے سر نکال کے دیکھا تھا اور پوچھا تھا کہ ہم کون ہیں۔ میں نے بتا دیا کہ شریف لوگ ہیں اور کرائے دار ہیں۔ انھوں نے کہا شریف تو نظر آ رہے ہو مگر بیوی بچوں کے ساتھ رہنا ہے تو کوئی دوسرا مکان لے لو۔ کرائے پر بہت مکان ملتے ہیں یہاں تم سستا دیکھ کے لے رہے ہو۔ اصل بات تمہیں معلوم نہیں۔ چنانچہ موہنی اور نازو کو میں نے ان کے ساتھ بھیج دیا کہ اصل بات معلوم کریں۔ اور خود واپس چلا گیا۔"

"انھیں وہیں چھوڑ کے آ گئے تھے؟" میں نے کہا۔

"اور کیا کرتے۔ بڑی بی نے خود کہا کہ میاں تم جاؤ۔ باقی سامان لے آؤ۔ بچیاں یہاں رہیں گی۔"

"بچیاں؟" میں نے طنز سے کہا۔ "بڑی بی کو صرف دو بچیاں ہی اتنی اچھی کیوں لگیں۔ تم سے کہہ دیا کہ دفع ہو جاؤ۔"

"ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے دو بیٹوں کے لیے رشتہ تلاش کر رہی ہوں۔" راجا نے کہا۔ "اللہ نے گھر بیٹھے بھیج دیا۔"

"چلو یار، پہلے باقی مکان دیکھ لو۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "پھر بلوا لیں گے انھیں بھی۔"

ہم سب زینے کے راستے اوپر گئے۔ کھلی چھت پر صرف ایک کمرا بنا ہوا تھا۔ اس کمرے میں بھی کچھ نہیں تھا۔ باہر کے رخ کھلنے والی کھڑکی... میں شیشہ لگا ہوا تھا اور شیشے سے دیکھنے پر گرد و نواح کا سارا علاقہ نظر آتا تھا۔ ہمارا ٹرک کوئی سو گز دور کھڑا ہوا تھا۔

"یہ آسیب کا چکر کیا ہے؟" غالب نے کہا۔

"ایسے چکر ہر جگہ ہوتے ہیں۔" راجا نے کہا۔ "معلوم نہیں کیسے یہ مکان بدنام ہو گیا۔ نہ اسے کوئی خریدتا ہے نہ کرائے پر لیتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ ساتھ والے گھر میں بھی کوئی نہیں رہتا۔ دائیں طرف والا مکان دو مہینے سے خالی ہے۔ بائیں طرف ابھی چند دن پہلے کوئی آیا ہے مگر وہ بھی جانے کی سوچ رہا ہے۔ اس کی بیوی ڈرتی ہے۔"

"کون ہے؟"

"کوئی سرکاری ملازم ہے۔ پشاور سے ٹرانسفر ہو کے آیا ہے۔ سرسری سی ملاقات ہوئی تھی۔" راجا نے کہا۔ "بہت پریشان تھا۔"

"چلو اس سے ملتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اسے سمجھاتے ہیں کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔"

ہمارا پڑوسی الفت خاں بہت نیک اور مہمان نواز آدمی ثابت ہوا۔ اس نے ہمیں خاصی خفت کے ساتھ اس کمرے میں بٹھایا جس میں صرف دو کرسیاں تھیں اور ایک دری بچھی ہوئی تھی۔

"غریب آدمی ہوں جی...۔" وہ بولا۔ "فرنیچر ابھی خریدا نہیں ہے۔"

ہم سب جوتے اتار کے اطمینان سے دری پر بیٹھ گئے۔ میں فرش پر پیر پھیلا کے اور دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھ گیا۔

"ہم خود غریب آدمی ہیں اور زمین کو ترجیح دیتے ہیں۔" محسن نے کہا۔

"ویسے بھی فرنیچر کا خلوص سے کوئی تعلق نہیں۔" غالب بولا۔

ہماری باتوں نے اسے کچھ مطمئن کیا۔ اپنی گھر والی کو اس نے دروازے سے جھانک کر چائے بنانے کا حکم دیا اور پھر خود بھی ہمارے پاس بیٹھ گیا۔

"آپ لوگوں کے آنے سے میرا مسئلہ حل ہو جائے گا جی ورنہ میں تو..." اس نے افسوس سے سر ہلایا۔ "نوکری چھوڑتا اور کیا کرتا۔ واپس جا کے کیا کرتا؟ یہ بھی نہیں سوچا تھا۔"

"ایسی کیا بات ہے؟" میں نے کہا۔

"بات کیا جی۔ عورت ذات کی عقل۔" وہ بولا۔ "ابھی جب میں تبدیل ہو کے آیا تو ایک مہینہ پھرتا رہا۔ الامان۔ اتنا کرایہ مکان کا کہ ساری تنخواہ دے کے بھی ایسا مکان نہ ملتا۔ ایک کمرے کا مکان لینا بھی مشکل تھا۔ آدھی تنخواہ نکل جاتی۔ اللہ نے سبب بنایا تو یہ مکان ملا۔ صرف سو روپیہ کرایہ۔ میں نے پہلے تو شکر کیا۔ پھر میرے کو شک پڑا۔ میں نے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ تو مالک مکان بولا کہ خان! صاف بات یہ ہے کہ پڑوس کے گھر میں جن بھوت ہیں۔ میں نے کہا کہ اس گھر میں تو نہیں ہیں نا۔ وہ بولا کہ کیا کروں جو کرائے دار آتا ہے اسے لوگ ڈرا دیتے ہیں۔ باتیں سنا سنا کے۔ میں نے کہا کہ آپ خود کیوں نہیں رہتے ادھر۔ وہ کہنے لگا کہ میری بیوی بھی تو عورت ہے۔ کہتی ہے کہ میرے بچّوں کو اور مجھے معاف کرو۔ خود جا کے رہو وہاں۔ مالک مکان نے کہا کہ سو روپے کرایہ نہیں ہے۔ کرایہ تو پانچ سو ہوتا مگر خالی مکان کا میں کیا کروں۔ اس کے لیے کوئی چوکیدار رکھوں تو سو روپے پلّے سے دوں۔ بس جی میں نے کہا کہ آپ بے غم ہو جاؤ۔ ہم رہیں گے ادھر۔ کوئی کچھ بھی کہے اور ہم کسی جن بھوت سے نہیں ڈرتے۔ کلمہ گو مسلمان ہیں ہ۔"

ابھی اس کا بیان جاری ہی تھا کہ اندر والا دروازہ بجا۔ اس کے ساتھ چوڑیوں کی جھنکار سی آئی۔ الفت خاں اٹھا اور چائے کی ٹرے لے کر واپس آ گیا۔

"ابھی جناب! میں پشاور گیا اور اپنی بیوی کو ادھر لایا تو میں نے اسے کچھ نہیں بتایا تھا کہ کراچی میں کتنے کرائے ہیں اور یہ مکان سستا کیوں ملا ہے۔ میں نے تو کہا کہ کراچی بہت اچھی جگہ ہے۔ مکان بہت اچھے ہیں اور کرائے بہت کم۔ لیکن جناب! یہ جھوٹ دو دن بھی نہیں چلا۔" وہ چائے بناتے ہوئے مسکرانے لگا۔ "اِدھر اُدھر کی عورتوں نے میری بیوی کو سب بتا دیا کہ ساتھ والے مکان میں جنّات ہیں۔ بدروحیں اور بھوت ہیں اور معلوم نہیں کیا قصّے کہانی سنائے۔ بس جی اس نے تو رونا شروع کر دیا۔ میں نے بہت سمجھایا کہ یہ سب باتیں مشہور ہو جاتی ہیں، حقیقت کچھ نہیں ہوتی۔ وہ کہنے لگی کہ سارا محلّہ پاگل ہے اور تم افلاطون ہو۔ اس کو میں کیسے سمجھاتا۔ وہ رات کو سوتی نہیں۔ خواہ مخواہ ڈرتی ہے۔ چیخیں مارتی ہے۔ مجھے تو ڈر تھا کہ میں نے ضد کی اور زبردستی کی تو وہ پاگل ہو جائے گی۔ آپ چائے پیو نا جی۔"

"ہاں۔ پی رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

"بس جی میں نے بولا اسے کہ نیک بخت! واپس ٹرانسفر تو نہیں

سکتا۔" وہ بولا۔ "بہت کوشش کی تب بھی سال چھ مہینے [illegible] جائیں گے۔ آخر نوکری ہے۔ اگر یہاں نہیں رہنا تو میں استع[illegible] اور ہم واپس پشاور چلتے ہیں مگر پہلے مجھے یہ بتا دو کہ پشا[ور] کیا کریں گے؟ اس کا خیال تھا کہ میں اس کے ماں باپ [illegible] گا۔ میں نے کہا کہ یہ خیال نکال دو دل سے۔ الفت خاں [illegible] وہ گھر داماد بنے۔ کراچی میں کرائے کا مکان اچھا ہو تو [illegible] کے برابر کرایہ ہوتا ہے۔ اس کا کیا فائدہ کہ کمائیں اور مالک [کو] دیں۔ خود فاقے کریں گے کیا اور اگر سو دو سو کا مکان لینا [illegible] نہیں ہو گا، جھگّی ہو گی۔ یا کسی کوارٹر کا ایک کمرا ہو گا۔ بجلی [illegible] پانی گلی میں سے بھر کے خود لانا۔ وہ بھی اس وقت جب آئے [illegible] اور لالٹین۔ میرا خیال تھا کہ وہ ڈر جائے گی۔ اتنا شاندار مکان [چھوڑ] جانے کا ارادہ بدل دے گی۔ مگر جناب! وہ کہنے لگی کہ ٹھیک [ہے] جھگّی میں انسان ہوں گے نا آس پاس۔ جن بھوت تو نہیں [illegible] پر اللہ بڑا کارساز ہے۔ اس نے آپ کو بھیج دیا۔"

"مگر۔ ہم نے تو۔ میرا مطلب ہے اس سے تمہارا مسئلہ [حل] ہو گیا؟"

"وہ ایسے جی۔" الفت خاں بولا۔ "کہ میں نے اسے [illegible] دیکھو۔ ان کے ساتھ بھی عورتیں ہیں اور تم تو پڑوس میں رہنے [سے ڈرتی] ہو۔ وہ جن بھوتوں کے ساتھ رہنے آئی ہیں، اس لیے کہ [illegible] عورتیں ہیں۔ بے وقوف نہیں ہیں۔ انھیں سب معلوم ہے مگر [وہ] نہیں ڈرتے۔"

میں نے محسن نے اور غالب نے ایک دوسرے کو [illegible] نظروں سے دیکھا۔ کیا واقعی ایسا ہے۔ یعنی ہم ڈرتے نہیں [illegible] اور ہم ان کے وجود کو تسلیم کریں یا نہ کریں۔ نازو اور موہنی کا [illegible] میں کیا ردِ عمل ہو گا؟ بڑی بی کی باتیں سننے کے بعد بھی وہ [illegible]

"تو جی اس بات نے میری گھر والی کو قائل کیا۔" الفت [خاں نے] اپنا بیان جاری رکھا۔ "اب اگر آپ لوگ رہیں گے ادھر تو [illegible] گے۔ میری نوکری بھی رہے گی اور میری بیوی کا وہم بھی دور [ہو جائے گا]"

"ہاں... اگر ہم رہے۔" میں نے کہا۔ "تو بھلا سب کا [illegible] کا بھی۔ وہ کہہ سکے گا کہ کوئی آسیب وغیرہ نہیں تھا۔ نہ جن [illegible] یہ سب خواہ مخواہ مشہور ہو گیا تھا۔"

"ظاہر ہے اس سے تمھارے مالک مکان کو بھی فائدہ [ہو گا] کا نتیجہ تمھارے حق میں اچھا نہیں نکلے گا۔" محسن نے سوچ کر [کہا]

"وہ کیسے جی؟"

"وہ ایسے کہ جب آسیب کا چکّر نہیں رہے گا تو اس مکان [کے کرائے] والے بہت ہوں گے۔ ابھی تو ان تینوں مکانوں کے کرائے [دار] ہی نہیں۔ یا ملتے ہیں تو بھاگ جاتے ہیں۔"

"یا بھگا دیے جاتے ہیں؟" غالب نے یوں کہا جیسے

غور طلب سوال ہو۔

"جو بھی ہو۔" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "مگر ظاہر ہے، پھر کرایہ تو یہ نہیں رہے گا۔ مالک مکان کو دو تین سو یا چار پانچ سو ملیں گے تو وہ کہے گا کہ الفت خاں! اپنا بندوبست کرو۔"

الفت خاں کا چہرہ اتر گیا۔ "یہ تو آپ نے سچ کہا۔"

"تم فکر مت کرو۔" میں نے کہا۔ "ہم آسیب کے قصّے سناتے رہیں گے۔ تمھارے مالک مکان کو بھی۔ اور محلّے والوں کو بھی۔"

"بس تم اپنی بیوی کو سمجھا دینا کہ یہ سب ڈراما ہمارے فائدے کے لیے ہو گا۔" محسن بولا۔

"وہ تو ابھی بھی ڈر رہی تھی کہ کون چیخ رہا ہے۔"

"وہ میں ہنس رہا تھا۔ میرے ہنسنے کا ایسا ہی انداز ہے۔" راجا نے کہا۔

"ہم کبھی کبھی آدھی رات کو اسی طرح چیخ و پکار مچا کے تھوڑا سا ہنگامہ کریں گے۔ صبح کوئی کہانی سنا دیں گے کہ رات کو ایک جن سے لڑائی ہو گئی تھی۔ وہ شاہِ جنّات کا داماد تھا۔" میں نے کہا۔

"ویسے یہ آسیب کا سلسلہ شروع کہاں سے ہوا تھا؟" غالب بولا۔

"واللہ اعلم جی۔" الفت خاں مسکرایا۔ "ہم نے تو بس سنا ہے لوگوں سے۔ کوئی کچھ بولتا ہے، کوئی کچھ۔ ادھر پشاور میں جناب ڈبگری بازار کے اندر بھی ایک مکان ہے۔"

"ایسے مکان ہر شہر میں مل جاتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"آگے ایک بڈھا حاد کا نہ دار ہے۔" الفت خاں بولا۔ "پرچون کا دکان ہے۔ اس نے بولا کہ خان! ادھر سے چلا جاؤ ورنہ نقصان ہو گا۔ ہم بولا کہ یار! اللہ مالک ہے۔ اس کے حکم کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس نے بتایا کہ ادھر کوئی قبر تھا۔"

"مجھے بھی یہی شک تھا۔" اکرام شیخ نے کہا۔

"کس کی قبر تھی؟ کسی بزرگ کی؟"

"کوئی ملنگ تھا جی۔" [illegible] پڑا رہتا تھا۔ ننگ دھڑنگ۔ کبھی کبھی رات کو، جمعرات کی رات کو چادر اوڑھ کے اگربتی جلا کے بیٹھ جاتا تھا۔ کہتا تھا قوالی سنو۔ لوگ جمع ہو جاتے تھے۔ کسی کو کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔ وہ نعرے مارتا تھا۔ اللہ ہو۔ اللہ ہو۔ اور سر دھنتا تھا ایسے جیسے سچ مچ قوالی ہو رہی ہو۔ لوگ کہتے تھے کہ فرشتے قوالی کرتے ہیں اس لیے عام آدمی نہیں سنتے۔ یہ بات مشہور ہو گئی۔ ہر جمعرات کو لوگ نذر نیاز لانے لگے۔ رات بھر اس کے آس پاس چپ کھڑے خاموش قوالی سنتے رہتے تھے۔ وہ اکیلا جھومتا رہتا تھا۔ پھر ایک جمعرات کو ایسا ہوا کہ وہ چادر لمبی تان کے سو گیا۔ لوگ آئے کہ قوالی ہو گی۔ نذرانے حلوا اور مٹھائی اور ہار لائے مگر وہ تو سو رہا تھا۔ اس نے سب لوگوں کو گالیاں دیں اور بھگا دیا کہ جاؤ، آج کوئی نہیں آئے گا۔ لوگ چلے گئے۔ صبح دیکھا تو وہ مر چکا تھا۔ معلوم نہیں کس نے مشورہ دیا کہ اسے یہیں دفنا دو۔ کے ڈی اے کا پلاٹ تھا اور مالک معلوم نہیں کہاں تھا۔ لوگوں

نے کسی سے پوچھے بغیر اس کو وہیں دفنا دیا اور قبر پر پھولوں کی چادر چڑھا دی۔ پھر کئی مہینے تو ہر جمعرات کو قوالی ہوتی رہی۔ آخر مالک کو پتا چلا تو وہ روتا پیٹتا آیا۔ لوگوں نے اسے مار کے بھگا دیا مگر وہ کسی بہت بڑے پولیس افسر کا پی اے تھا۔ اس نے درخواست دی اور جناب پھر سرکاری کارروائی ہوئی۔ کے ڈی اے والے آئے اور انھوں نے لاش نکال لی۔ پلاٹ کا قبضہ مالک کو دیا اور اس لاش کو کہیں لے جا کر دفنا دیا۔ مالک نے فوراً تعمیر شروع کر دی مگر بنیادیں کھودتے ہوئے ایک مزدور مارا گیا۔ اس کے ساتھی نے اسے قتل کر دیا اور بنیادوں میں ہی دفن کر دیا۔ اس کے اوپر کنکریٹ پڑ گیا تو کسی طرح پولیس کو معلوم ہوا۔ وہ پھر آئے اور انھوں نے دیوار گرا دی۔ بنیادیں کھودیں اور لاش نکال لی۔ چھ مہینے بعد مالک مکان مر گیا۔ اس کے بھائی نے پھر کام شروع کرایا۔"

"مالک مکان کیسے مر گیا؟"

"وہ چھت پر سے گر گیا تھا۔" الفت خاں بولا۔ "واللہ اعلم جناب۔ کہتے ہیں اس کی بیوی نے اسے دھکّا دیا تھا۔ وہ بہت خوبصورت تھی اور اس کا شوہر جس افسر کا پی اے تھا، اسی کی نظر تھی اس پر۔ اس لیے کچھ ہوا نہیں۔ مرنے والے کا بھائی بہت بدمعاش تھا۔ اس نے بھابی سے کہا کہ مجھے سب معلوم ہے۔ بہتر ہے کہ مجھ سے شادی کر لو۔ تو جناب! اس طرح یہ مکان بنا۔ مگر اور بھی بہت سی باتیں ہیں۔ اس لعنتی عورت کے تنا سانے اس کے دوسرے شوہر کے ساتھ مل کر عورت کو مروا دیا۔ سنا ہے عورت اس پولیس افسر کو بلیک میل کرتی تھی۔ اس کا دوسرا شوہر راستہ دکھاتا تھا کہ جاؤ اس سے دس ہزار لے آؤ۔ وہ مجبور تھی۔ پولیس افسر بھی مجبور تھا مگر پولیس افسر کبھی مجبور نہیں ہوتا جی۔ اس نے عورت کو ٹھکانے لگوایا اور اس کے قتل کا الزام لگوا دیا دوسرے شوہر پر۔ جو اس کے پہلے شوہر کا بے غیرت بھائی تھا۔ اسے بھی پھانسی لگ گئی۔ یہ مکان اس وقت تک پورا ہو گیا تھا مگر اسی پیسے سے جو عورت ناجائز طور پر وصول کرتی تھی۔ مکان کسی کو نہیں ملا۔ وارث اب اسی عورت کا بھائی ہے۔"

"اس کی اولاد کوئی نہیں تھی؟"

"ایک لڑکا تھا۔ اسے ماموں لے گیا تھا۔" الفت خاں بولا۔ "مگر ماموں بھی بدنیت تھا۔ اس نے بھانجے کے ساتھ بہت برا سلوک کیا۔ تاکہ وہ بھاگ جائے۔ وہ کہاں تک ذلت اور ظلم برداشت کرتا۔ اس نے ایک دن ماموں کو چاقو مار دیا۔ ماموں مرنے سے تو بچ گیا مگر وہ لڑکا بورسٹل جیل بھیج دیا گیا۔ بچّوں کی جیل۔ وہاں ایک سے ایک بدمعاش لڑکا ملا اسے۔ اندر ہی اس نے کوئی قتل کر دیا۔ اب وہ پتا نہیں کب باہر نکلے گا۔ ابھی تو ماما ہی مالک ہے۔ کرایہ بھی وہی لے جاتا ہے۔ مجبوری ہے کہ بیچ نہیں سکتا۔"

"چلو ابھی تو تم رہو سو روپے ماہانہ پر۔" میں نے کہا۔ "اور جن بھوت جو ہمارے ساتھ ہیں ان سے ہم نمٹ لیں گے۔"

"یہ سب باتیں کمزور ذہن کے لوگ مشہور کر دیتے ہیں اور بات سے بات نکلتی ہے تو افسانے بن جاتے ہیں۔" محسن نے کہا۔

"ہاں۔ یہاں کراچی میں جہاں اب امریکی قونصلیٹ آفس ہے اور لائبریری ہے۔" راجا نے کہا۔ "اس کے بارے میں کتنی باتیں مشہور تھیں۔"

"کیا باتیں مشہور تھیں؟" شیخ نے دلچسپی سے پوچھا۔

"یہ کہانی اخباروں میں بھی آئی تھی۔" راجا نے کہا۔ "سنا ہے یہاں پہلے' پرانی عمارت سے پہلے کوئی بیرک تھی۔ اس میں چار فوجی رہتے تھے۔ انھوں نے ایک ہی خواب دیکھا۔ معلوم نہیں ایک بار یا کئی بار۔ کوئی فقیر خواب میں ان سے کہتا تھا کہ آگ' ہوا' پانی' خاک۔ بعد میں ایک ہوائی جہاز کے حادثے میں ہلاک ہوا۔ دوسرا سمندر میں غرق ہوا۔ تیسرا لالٹین جلا کے پڑھ رہا تھا کہ لالٹین الٹ گئی اور وہ کوئی جھونپڑا یا لکڑی کا مکان تھا جو آگ کی لپیٹ میں آگیا۔ وہ جل کے مر گیا۔ چوتھا زلزلے میں زندہ دفن ہوا۔ پھر وہ جگہ کسی پارسی نے خریدی تھی اور اس نے نئی عمارت تو بنوائی مگر اسے رہنا نصیب نہ ہوا۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے بیٹے کو بچانے کی کوشش میں اس کی دوسری منزل سے گر کے ہلاک ہوا۔ کچھ مزدور بھی پُراسرار حالات میں مرے۔ نتیجہ یہ کہ جگہ آسیب زدہ مشہور ہوگئی اور برسوں ویران پڑی رہی۔"

"یہ جگہ ہے کہاں؟" محسن نے پوچھا۔

"فریئر ہال کے بالکل سامنے۔ اب تو بہت شاندار عمارت بنی ہے۔ جب امریکی حکومت نے یہ جگہ خریدی تو ویران پڑی ہوئی تھی۔ انھوں نے سستا سودا کر لیا کیونکہ اور کوئی یہ جگہ لیتا نہیں تھا۔ ظاہر ہے وہ توہم پرست لوگ نہیں ہیں مگر پھر بھی ایک دلچسپ حادثہ پیش آگیا۔ جس دن اس کا افتتاح ہوا اسی دن کوئی افسر باتھ روم میں لاک ہوگیا۔ اسے تالا توڑ کے نکالا گیا۔ یہ خبر بھی اخبار میں آئی تھی۔ پرانے توہم پرستوں نے تو اسے بھی آسیب کا اثر ہی کہا تھا۔ مگر کیسا آسیب اور کہاں کا آسیب۔ اب جا کے دیکھو وہاں کتنی رونق ہے اور وہ جگہ کتنی آباد ہے۔"

"کیا وہاں بھی کوئی پیر فقیر دفن تھا؟"

"مجھے کچھ یاد نہیں۔ پرانی بات ہے۔" راجا بولا۔ "مگر غالباً یہ چکر بھی تھا۔"

"اچھا اب ہم چلتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"یہ تو آپ لوگوں نے بتایا ہی نہیں کہ... کہ آپ سب کیا کرتے ہیں؟" الفت خاں بولا۔

"ہم سب کوئی غلط کام نہیں کرتے۔" میں نے ہنس کے کہا۔ "آپ بے فکر رہیں۔ ورنہ ایسی جگہ اسمگلر اور ڈاکو بھی لے لیتے ہیں۔"

"نہیں... میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" وہ شرمندہ ہوگیا۔

"اب آپ کے ساتھ رہیں گے تو سب معلوم ہو جائے گا۔" محسن نے کہا۔ "کہ کون کیا کرتا ہے۔"

ہم بات گول کرنے میں کامیاب رہے اور باہر ...
میں کسی نے ابھی الفت خاں کو اپنا نام بھی نہیں بتایا تھا۔ ہمیں آسیب زدہ مکان کی ہسٹری معلوم ہوگئی تھی اور یہ بات ... آگئی تھی کہ ڈاکٹر انوار احمد خاں نے کیوں اس جگہ کو ہمارے لیے موزوں قرار دیا تھا۔

"جاؤ یار! اب تو بلا لو انھیں۔" میں نے اپنے گھر کے اندر خواتین کو غیر حاضر پا کے کہا۔

"بڑی بی نے کیا انھیں ضبط کر لیا ہے۔ بطور ضمانت؟" ... نے کہا۔

"کس چیز کی ضمانت؟"

"ہماری نیک چلنی کی ضمانت۔" غالب بولا۔ "جو پولیس ہماری ... سے لیتی ہے۔ بدمعاشوں سے نہیں لیتی۔"

راجا کچھ دیر بعد واپس آیا تو پریشان تھا۔

"یار! وہ تو کہتی ہیں کہ لڑکیاں جا چکی ہیں۔ بہت دیر ہوئی ... گئے ہوئے۔" راجا نے کہا۔

"پوچھا نہیں کس کے ساتھ گئی تھیں؟"

"پوچھا تھا۔ بڑی بی نے کہا کہ وہ خود ہی چلی گئی تھیں۔ ... کرنا ہے۔" راجا بولا۔ "دیکھ لو کہیں اوپر تو نہیں چڑھی ہوئی ہیں؟"

"ایسے تو سارے محلے کو عاشق بنا لیں گی اپنا۔ ہمیں یہاں ... رہنا ہے۔" محسن نے خفگی سے کہا۔

"زمانہ آیا ہے بے حجابی کا' عام دیدارِ یار ہوگا۔" غالب ...

ہم نے اوپر جا کے دیکھا مگر وہ اوپر بھی نہیں تھیں۔ ... نیچے آ کے دیکھا مگر وہ کہیں ہوتیں تو دکھتیں ... جا سکتی تھیں۔ ... کے کہنے کے مطابق تو انھوں نے دونوں کو گھر میں داخل ہوتے ...

"تم کوئی ایسی جگہ سوچ سکتے ہو۔ جہاں وہ ... جا سکتی ہوں؟" میں نے کسی کو مخاطب کیے ... جواب سب دے سکتے تھے۔ جو ایک ہی ہوتا اور ... تھا۔ غالب نے نفی میں سر ہلا دیا۔

محسن نے کہا۔ "یوں اچانک...!"

"اور ہمیں بتائے بغیر۔" شیخ نے کہا۔

"یہ کتنی دیر پہلے کی بات ہے' وہ جو سامنے والی بڑی ... ان کا کہنا کیا ہے' اندازاً کتنی دیر ہوئی ہوگی؟"

"چل انھی سے پوچھ لیتے ہیں۔" محسن بولا۔

تشویش سب کو ایک سی تھی اور میرا خیال ہے کہ ... سب کو صاف محسوس ہو رہی تھی مگر قبل از وقت کوئی منہ ... نکالنا نہیں چاہتا تھا جو حوصلہ شکن ہو اور مایوسی کا سبب بنے۔

بڑی بی نہ جانے کیوں دروازے کا آدھا پٹ کھولے ... رہی تھیں۔ ہم نے قریب جا کے سلام کیا۔

"اسے یوں چھوڑ دو!" انھوں نے پان کی پیک کونے کے اندر ہی گھونٹتے ہوئے کہا۔ "مل گئیں چھوریاں؟"

"کہاں خالہ۔ مل گئی ہوتیں تو پھر آپ سے پوچھنے کیوں آتے۔" میں نے کہا۔

"اے لو... میں تو بتا چکی... اور کیا بتاؤں۔"

"جی۔ صرف اتنا بتا دیں کہ... کہ کیا آپ نے خود دیکھا تھا انھیں؟ سامنے والے گھر کے اندر جاتے ہوئے۔" میں نے کہا۔

"اے اور کیا۔ میں تو یہاں کھڑی رہی۔ میں نے کہا موا زمانہ خراب ہے۔ اور محلے پر تو اللہ کی پھٹکار۔ جو لچا لفنگا ہے وہ آسیلا ہے۔" انھوں نے بالآخر ان کے جملہ اجزا کے محلول کی ایک پچکاری گلی میں ماری۔ "نئی جگہ ہو تو آدمی ویسے بھی ڈرتا ہے۔ سو میں نے کہا کہ چھوریاں اندر چلی جاویں۔ پھر دروازہ بند کروں گی... اور میں نے بتا بھی دیا تھا کہ فکر نہ کرنا۔ میں کھڑی ہوں۔ کوئی بات ہو تو آواز دے لینا۔ پھر جب انھوں نے دروازہ بند کر لیا۔ میں نے تاکید کی تھی کہ جب تک تمھارے گھر والے نہ آویں بند ہی رکھنا...!"

"خالہ! یہ کتنی دیر پہلے کی بات ہے' اندازاً؟" میں نے بڑی بی کی نان اسٹاپ ٹرین روکتے ہوئے کہا۔

"یہ... کوئی گھنٹا بھر تو ہوگیا۔" انھوں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "اے ہاں۔ اتنا وخت تو ہوگیا۔ میں نے نماز پڑھی۔ پھر خیر سے دانہ ڈالا مرغیوں کو..." انھوں نے چند اور کام گنائے جس سے ثابت ہوا کہ یہ غالباً کم سے کم ایک گھنٹا پہلے کی بات ضرور ہے۔

"اے شکلیں کیوں اُتری ہوئی ہیں۔ کیا کوئی ایسی ویسی بات ہے؟" خالہ نے کہا۔ "چھوریاں گھر میں نہیں ہیں کیا؟"

"گھر میں تو نہیں ہیں۔ لیکن ایسی ویسی بات کوئی نہیں' شاید پاس پڑوس..."

"نا بیٹا۔ میں نے تو منع کیا تھا۔ اگر کوئی بلائے تو جانا مت۔ یہاں کے بارے میں تم کیا جانو۔ کون موا دل میں کیا رکھتا ہے اور کس سے ملنا اچھا ہے..."

"یا نازو بازار چلی گئی ہوں گی۔" محسن نے اچانک اپنے لہجے میں یقین پیدا کیا۔ "اپنے بھائی کے ساتھ۔"

"ہاں... کہہ تو رہی تھیں کہ بہت کچھ لانا ہے۔ گھر کا سودا سلف۔" ممکنے محسن کی نیت بھانپ لی۔

"ٹھیک ہے خالہ۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ ہم تو بس ایسے ہی پوچھنے آ گئے تھے۔" محسن بولا۔

"اے بیٹا! میرا تو کلیجا دھک دھک کر رہا ہے۔ چھوریاں آجاویں تو ضرور بتانا۔ ورنہ ہول اُٹھتے رہیں گے مجھے۔" خالہ نے کہا۔ "اور ان کو بھی ذرا سمجھانا... ایسے جانا تھا تو مجھے ہی بتا جاتیں۔"

"نادان چھوریاں ہیں نا خالہ۔" میں نے کہا۔

"اسی لیے تو بولوں ہوں۔" خالہ نے میری بات پکڑ لی۔ "تو میں چالاک آج کل کی لڑکیوں جیسی تو میں کاہے کو فکر کرتی۔ مگر اللہ بُری نظر سے بچاوے۔ دونوں اِتی معصوم اور بھولی بھالی ہیں ابھی۔"

"وہ... خیر... اتنی نادان بھی نہیں۔" میں نے کہا۔

"ماشاء اللہ سے۔" محسن بولا۔ "ہوشیار ہیں۔"

ہم فوراً واپس ہو لیے۔ گھر پہنچنے تک ہم نے نہ پلٹ کے دیکھا اور نہ کوئی بات کی۔ مجھے یقین تھا کہ خالہ اب ہمیں اسی طرح دیکھ رہی ہوں گی جیسے وہ نازو اور موہنی کو دیکھتی رہی تھیں۔ گھر کا دروازہ بند کرتے وقت میں نے دیکھا تو... وہ واقعی دروازے کی اوٹ سے جھانک رہی تھیں۔

ہماری صورت دیکھتے ہی باقی تینوں حضرات کے چہرے بھی اتر گئے۔ ہم کچھ دیر خاموش کھڑے رہے۔

پھر غالب نے کہا۔ "مجھے دال میں کالا نظر آتا ہے۔"

"سفید کسے نظر آ رہا ہے؟" میں نے کہا۔

"ہم نے بڑی بی سے تو چھپا لیا کہ وہ غائب ہوگئی ہیں۔" محسن بولا۔ "درنہ آتے ہی مشکوک حالات پیدا کرنا ہمارے حق میں اچھا نہ ہوتا۔"

"اور مکان کے آسیب زدہ ہونے پر یقین رکھنے والے شام تک قائل ہو جاتے کہ یہ سب جنات نے کیا۔"

"فوراً پھیل جاتی بات کہ نئے کرائے دار آئے تھے۔ آئے دیر نہیں ہوئی تھی کہ جن بھوت انھیں اُٹھا لے گئے۔ گھر کی دو لڑکیوں کو۔" میں نے کہا۔ "گمنام رہنے کی خواہش دھری رہ جاتی۔ شام تک تو اتنی شہرت ہو جاتی کہ اخبار والے انٹرویو لینے آجاتے۔"

"سوال یہ ہے کہ اب کیا کریں؟ صرف انتظار...!"

"انتظار کے لیے امید ضروری ہے۔" غالب نے کہا۔ "اور میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ان کا آنا مرضی کی بات نہیں۔ جیسے ان کا نہ جانا ان کی مرضی کی بات نہیں تھا۔ ہماری عدم موجودگی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے کسی نے انھیں اغوا کر لیا۔"

"ہاں۔ ورنہ انھیں کہاں جانا تھا۔"

"غلطی ہم سے ہوئی۔ کوئی ہمارے تعاقب میں رہا اور ہمیں خبر نہ ہو سکی۔"

"پھر اب کیا کریں؟ یہ بھی تو کہو۔" غالب نے جھنجلا کے کہا۔ "صرف قیاس آرائیوں سے اور باتوں سے تو کچھ ہوگا نہیں۔"

"تم بتاؤ کیا کریں؟" محسن نے کہا۔ "کہاں تلاش کرنے جائیں انھیں؟"

"ہاں۔ یہ تو معلوم ہے کہ انھیں جبراً کون لے گیا ہوگا۔ جو کچھ بھی ہوا ہوگا اچانک اور بے خبری میں ہوا ہوگا ورنہ نازو آسانی سے قابو میں آنے والی لڑکی نہیں ہے۔ وہ طاقت میں اس سے زیادہ ہوں گے۔ یا انھوں نے موقع ہی نہیں دیا ہوگا کہ وہ اپنے دفاع میں کچھ کر سکیں۔" اکرام شیخ بولا۔

"حیرت کی بات ہے کہ کسی نے دیکھا نہیں۔"

"یہ کوئی حیرت کی بات نہیں۔ باہر ہے کون دیکھنے والا۔ ایک گاڑی خاموشی سے آکھڑی ہو تو دو لڑکیوں کو دروازے سے باہر لے جاکر کار میں ڈالنے کے لیے دو منٹ بھی بہت ہوتے ہیں اور گاڑی ایک بار چل پڑے تو پھر کسی کو گاڑی کے سوا کیا نظر آسکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"تم لوگ بیٹھو۔ میں ذرا سراغ رسانی کا عملی مظاہرہ کرتا ہوں۔ پولیس کی نوکری میں کچھ تو سیکھا ہی تھا۔" اکرام شیخ اٹھ کھڑا ہوا۔

دس منٹ بعد اس نے متعدد اہم انکشافات کیے جو ناقابلِ تردید نتائج پر مبنی تھے۔ نمبر ایک یہ کہ عین دروازے کے قریب دائیں اور بائیں جانب کچھ اجنبی جوتوں کے نشانات تھے۔ اس نے باری باری ہم سب کے جوتوں کے سول دیکھے۔ سب کے سول سادہ تھے اور گھسے ہوئے تھے لیکن فرش پر گرد کی تہ میں دو پرنٹ نئے محسوس ہوتے تھے۔ دونوں مردانہ جوتوں کے نشانات تھے۔ ایک پر چھوٹے چھوٹے گول حلقے سے بنے ہوئے تھے۔ دوسرے کے سول پر متوازی لہریں سی تھیں۔ جیسے اردو میں آٹھ کے ہندسے کو ملا کے لکھا جائے۔ یہ لکیریں بہت صاف تھیں جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ نئے جوتے کا سول ہے۔ شیخ نے اسے ٹائر سول والی پشاوری چپل قرار دیا۔ ہم نے اس کی رائے کو چیلنج نہیں کیا کیونکہ سب میں وہی ایک پیشہ ور شخص تھا جس کو سراغ لگانے کا عملی تجربہ تھا۔ اس نے خاصے یقین کے ساتھ کہا کہ اندر صرف دو افراد تھے۔ پھر اس نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کے فرش کو زیادہ غور سے دیکھا اور دوسرا نتیجہ اخذ کیا کہ کشمکش یا مزاحمت کی نوبت ہی نہیں آئی۔ ورنہ جوتوں کے بے ترتیب آڑے ترچھے نشانات ہوتے۔ دروازے کے دونوں طرف آخری کونے تک گرد کی تہ اسی طرح ہموار تھی۔

"اگر مزاحمت کا موقع ملتا۔ تو مقابلہ ہوتا اور ایک طرف دونوں عورتیں ہوں تو یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی کی ایک چوڑی بھی نہ ٹوٹے۔ جب کوئی کسی پر حملہ کرتا ہے تو بے خبری میں مارا جانے والا بھی غیر ارادی طور پر اپنے دفاع میں ہاتھ اٹھاتا ہے۔ اگر ان پر وار کیا جاتا تو وہ بھی ہاتھ سے روکنے کی کوشش کرتیں۔ وار ہاتھ پر پڑتا تب بھی بہت سی چوڑیاں شہید ہوتیں اور اگر کوئی پہلے ان کو کلائی پکڑ کے بے بس کرتا تب بھی مگر ایسا نہیں ہوا۔ یہاں ایک بھی چوڑی کا ٹکڑا نہیں ہے۔"

"نازو نے زرد چوڑیاں پہن رکھی تھیں۔" غالب نے کہا۔ میں نے اور محسن نے اسے گھور کے دیکھا۔ وہ خاصا خفیف ہوا۔

"اور موہنی کی چوڑیوں کا رنگ کیا تھا؟" میں نے کہا۔

"وہ... غالباً سفید اور کالا۔" وہ مزید بوکھلایا کیونکہ یہ بات غلط تھی۔ اس کی نظر میں تو صرف نازو کی کلائی کا اور اس کی چوڑیوں کے رنگ کا منظر سمایا ہوا تھا۔

"موہنی نے ہرے رنگ کی چوڑیاں پہن رکھی تھیں۔" محسن نے اطمینان سے کہا۔

"یار رنگ سے کیا فرق پڑتا ہے جو تم لوگ..." شیخ جھلا کے بولا۔ "یہاں درجن بھر رنگ کے ٹکڑے... بات تھی۔ جب ہر سے چوڑی کا ایک بھی ٹکڑا نہیں ... اور ثابت ہوتا ہے۔"

"یہ کہ انھیں ایک دم ناک آؤٹ کر دیا گیا۔ سر... پر رومال وغیرہ رکھ کے بے ہوش کر دیا گیا۔" میں نے کہا۔ "... پر آکے رک جانے والی کسی کار میں انھیں ڈال کے غائب... ہمیں باہر سراغ تلاش کر کے اس نظریے کی تصدیق نہیں..."

"میں اب یہی سوچ رہا تھا کہ ان دو اجنبی جوتوں کے ... دیکھوں۔" شیخ نے کہا۔ "لیکن اب اس سے زیادہ ضروری یہ ... ہم میں سے کوئی ان کے ٹرک پر نظر رکھے کیونکہ ہم یہ فرض کر ... نازو اور موہنی کو وہی لوگ لے گئے ہیں اور وہ ہمارے تعاقب ... تو پھر صاف ظاہر ہے کہ انھیں اب تک سب کچھ معلوم ہو ... اپنا ٹرک ابھی لے جا سکتے ہیں اور ہمارا ابھی۔ کار بھی لے جا ... سب کو تباہ کرنا چاہیں تو یہ بھی کر سکتے ہیں۔ مگر صاف ظاہر ... بارگین کریں گے۔"

میں نے اس کی تائید کی۔ "ہاں۔ اگر ہمیں مارنا مقصود ... کچھ دیر انتظار کر لیتے۔"

"آپ لوگ امید کے ہر پہلو کو نظر انداز کر رہے ہیں۔" ... نے کہا۔ "کیا ان کے یہاں تک آپہنچنے کی کوئی اور صورت نہیں ہو سکتی ... امکان ہے تو صرف یہ کہ انھوں نے ہمارا تعاقب کیا۔"

"دیگر امکانات پر آپ روشنی ڈالیے۔"

"بابا روشنی کیا ڈالیں ہم۔ تم ایک بہت اہم بات بھول ... ہو۔ اور وہ یہ کہ ہم نے دونوں لڑکیوں کو پہلے ارسال کر دیا ... ہمارے ساتھ نہیں آئی تھیں کہ کسی نے ہمارا پیچھا کیا اور یہاں ... انھیں لے گیا۔ میں اس امکان کو بھی اتنا ہی اہم سمجھتا ہوں ... انھیں کار میں یہاں آتے وقت دیکھا۔ راستے میں سڑک پر ... جتنی گاڑیاں تھیں، ان میں کوئی گاڑی ایسی بھی تھی جس میں کوئی ... موجود تھا۔ یہ اس کی خوش قسمتی اور ہماری بد قسمتی کہ اتفاق ... نظر نے تینوں میں سے کسی کو شناخت کر لیا۔ یا موہنی کو۔ یا ... کار چلانے والے کو۔ اگر نازو کو پہچانا یا ڈرائیور کو۔ پھر تو ... ہے کہ وہ دلاور اینڈ کمپنی، عبداللہ اینڈ سنز یا چاند بھائی ... کا آدمی تھا۔ یا آدمی تھے۔ وہ کار کے پیچھے لگ گئے اور جب ... اکیلی رہ گئیں تو انھیں لے گئے لیکن ایک صورت حال اور ... فرض کرو کسی نے صرف موہنی کو دیکھا۔ موہنی شروع سے ہمارے ... نہیں۔ وہ بھی ہمارے دشمن ہیں مگر براہ راست ان سے ... بہت بعد میں شروع ہوئی۔ وہ تیسرے فریق ہیں جن کے ... موہنی تھی۔ پھر اس نے سائڈ بدل لی۔ اپنوں کی نظر میں غدار ہو گئی اور ... انھی میں سے کسی نے موہنی کو دیکھ لیا۔ یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں؟ ظاہر ہے ... ہم ان سب سے واقف نہیں۔ وہ باہر کے آدمی ہیں جو ہمارے ملک میں گھس آئے ہیں اور اندر کے غداروں کی مدد سے اپنی تخریبی کارروائیوں میں مصروف ہیں۔"

"شیخ صاحب! کیا فرماتے ہیں آپ بیچ اس مسئلے کے؟" میں نے کہا۔ "یہ غالب کا بچہ آپ سے زیادہ دور کی کوڑی لایا ہے۔"

"یہ دور کی کوڑی نہیں۔ خاصی عقلمندی کی بات ہے۔" شیخ نے خفت کے بغیر تسلیم کیا۔ "ہمارے ساتھ شامل ہو کے موہنی نے خود کو بہت سے نادیدہ دشمنوں کی نظر میں سزاوار بنا لیا ہے، غداری کے جرم کی ہر سزا کا۔ نازو سے زیادہ سنگین جرم موہنی کا سمجھا جائے گا، اگر لے دشمن کے ایجنٹ لے گئے ہیں۔"

"ملاحظہ ہو۔ میں ایک اور امکان عرض کرتا ہوں۔" غالب نے یوں کہا جیسے کہہ رہا ہو کہ شعر عرض کرتا ہوں۔ "نازو کی تلاش یہاں پولیس کو بھی ہے۔ جو ان کے درندے چودھری کر چکی ہے وہ بھی تھانے میں اور فرار ہو کے گویا ان مردان جواں پیشہ کی غیرت پر انی پاپوش مار گئی ہے۔ پولیس ہر چوراہے پر کھڑی ہے۔ ہر جگہ گھوم رہی ہے۔ نازو فی الحال انھیں سب سے زیادہ مطلوب ہے تاکہ وہ اس کو بہادری کا مزہ چکھا سکیں ـــ گیہوں کے ساتھ گھن پس جاتے ہیں۔ موہنی ساتھ تھی تو جو نازو کا مقدر وہ اس کا۔"

غالب نے سب کو کنفیوژن میں ڈال دیا۔ پہلے سب متفق تھے کہ انھیں شکاری لے گئے۔ اس نے تردید کی گنجائش نہ چھوڑی کہ شکاری لازماً وہ نہیں ہو سکتے جن پر ہم شک کرتے ہیں۔ دوسری اور تیسری قسم کے شکاری بھی نظر انداز نہیں کیے جا سکتے۔

"ایک بار پھر وہی سوال اٹھتا ہے۔" خاموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد محسن بولا۔ "کہ ہم کیا کریں؟ کچھ نہ کریں کیونکہ ہمیں کچھ معلوم نہیں۔"

"ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔" راجا بولا۔

"لیکن جیسا کہ میں نے کہا، ٹرک کو مت بھولو۔ ایک جال پھیلایا ہے ہم نے۔" اکرام شیخ بولا۔ "اس جال پر نظر رکھو۔ یہ نہ ہو شکار اس میں گرفتار ہو اور جال سمیت بھاگ جائے۔"

"اور ہم یہاں صرف انتظار کریں؟"

"انتظار کس بات کا؟ کہ وہ آئیں اور ہمیں بھی لے جائیں یا مار جائیں؟" شمسہ نے کہا۔ "ایک خونریز جنگ لڑی جائے یہاں اور ہم محصور ہو کے رہ جائیں۔ ان حالات میں ہمیں فوراً منتشر ہو جانا چاہیے اور یہاں سے تو نکل ہی جانا چاہیے۔"

"او کے۔ میری سنو۔" میں نے کہا۔ "دروازہ بند ہے نا؟"

"بند ہے۔" محسن بولا۔

"باہر جھانک کے دیکھو۔ آگے پیچھے سب ٹھیک ہے نا؟"

"سب ٹھیک ہے۔" محسن نے تصدیق کی۔

"بس تو دروازے کو بند ہی رہنے دو۔ اندر سے کنڈی مت لگاؤ۔" میں نے کہا۔ "کوئی آنا چاہے تو خاموشی سے آئے۔ تم اور غالب۔" میں نے محسن کی طرف اشارہ کیا۔ "چھت پر پوزیشن سنبھالو۔ ایک آگے نظر رکھے گا دوسرا پیچھے۔ ظاہر ہے دائیں بائیں سے کوئی نہیں آسکتا۔ راجا! تم اپنا کام دکھاؤ اور یاد رکھو اس کھیل میں سب سے اہم اور خطرناک کردار تمھارا ہے۔ تم اپنا فقیری لباس پہن کے جاؤ اور ٹرک کے قریب موجود رہو۔ یہ فیصلہ تم خود کر سکتے ہو کہ تمھارا وہاں ایک ہی جگہ قیام مناسب ہوگا یا چلتے پھرتے رہنا۔"

"یا میرے مولا۔ دنیا سے کنوارا مت اٹھانا۔ نہ مجھے نہ میری پری کو۔" وہ منہ اٹھا کے بولا۔

"جلدی کرو۔ لباس بدلو اور جاؤ۔"

"دس منٹ تو دو یار رخصتی کے۔" وہ بولا۔

"ہاں۔ دس منٹ میں۔ محسن! تو ذرا پھر سامنے خالہ کے پاس جا۔" میں نے کہا۔ "ایک تو انھیں اطمینان سے بتا نا کہ چھوریاں اندر ہی تھیں۔ ذرا چھپ گئی تھیں ہمیں ڈرانے کے لیے۔ پھر ان سے ہتھوڑی اور کیلیں مانگنا۔ لمبی اور پتلی کیلیں ہوں تو کام بن جائے گا۔ یہاں لکڑی کے بہت ٹکڑے پڑے ہیں۔"

محسن کو وضاحت کی ضرورت ہی نہیں پیش آئی۔ وہ میرا مطلب سمجھ کے فوراً نکل گیا۔ راجا بھی فقیرانہ لباس اور حلیہ بدلنے کے لیے دوسرے کمرے میں چلا گیا تھا۔

"اب رہ گئے میں اور تم شیخ صاحب۔" میں نے کہا۔ "تو ہم مسلح ہو کے ساتھ والے گھر میں کودتے ہیں۔ ایک طرف تو ہمارا یار الفت خاں ہے۔ دوسری طرف کا مکان بھی خالی ہے۔ ہم چھت سے چھت پر جا سکتے ہیں۔"

"یہ راجا تو سالا مانگ کے بھی کھائے گا۔ ہم لوگ کیا بھوکے پیٹ پہرا دیں گے چھتوں پر؟"

"کم سے کم رات ہونے تک تو فاقہ ہوگا۔" میں نے کہا۔ "اور میری چھٹی حس بتاتی ہے کہ رات سے پہلے ہی کچھ ہوگا۔"

"اچھا یا برا؟"

"امید اچھے کی رکھنی چاہیے۔ برائی کے لیے راضی بہ رضا رہنا چاہیے کہ جو اس کی مرضی۔" میں نے کہا۔

"حیرت ہے کہ میری چھٹی حس بھی یہی عرض کر رہی ہے آج۔" غالب نے کہا۔ "کہ کوئی پیغام ضرور ملے گا۔ یا غیبی اشارہ ملے گا۔ چنانچہ میں تمھاری حکمتِ عملی سے اتفاق کرتا ہوں چیف کے لُو۔ ہمیں انتظار کرنا چاہیے صبر اور حوصلے کے ساتھ۔"

"اور بھو کا بھی رہنا چاہیے پیاسا بھی رہنا چاہیے، یہ تو نہیں کہتی نا چھٹی حس۔" شیخ بولا۔ "میں کہتا ہوں جب راجا باہر جا ہی رہا ہے تو کچھ ہمیں بھی دے جائے۔ ایک پھیرا لگا کے ادھر کا اور جو ملے اندر پھینک جائے۔"

"وہ راجا کی مرضی۔" میں نے کہا۔ "مگر راجا کو ہم زیادہ دیر نہیں

بھیج سکتے کھانے کے لیے۔"

"ارے بابا' فقیر کے لیے ہر دَر کھلا ہے۔" راجا ایک فقیر بن کے لنگڑاتا ہوا نمودار ہوا۔ اس کی حالت قابلِ رحم نظر آتی تھی۔" جو ملے گا فقیر کے بعد تم بھی کھا لینا۔ بچا کھچا... اچھا۔"

"ایک منٹ ٹھہرو۔" میں نے کہا۔"محسن کو آنے دو۔"

محسن ہتھوڑی کو مگدر کی طرح گھماتا اور کیلیں مٹھی میں دبائے نمودار ہوا۔" اپنے جھوریاں بڑی شریر ہیں۔" وہ خالہ کے انداز میں نقل اتار کے بولا۔

میں نے اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے لکڑی کے ٹکڑوں میں سے دو اٹھا لیے۔ یہ ٹکڑے کھڑکی دروازے بناتے وقت کاٹ چھانٹ میں بچے ہوں گے' جو بے مصرف سمجھ کے چھوڑ دیے گئے تھے کہ مکان کی صفائی ہوگی تو یہ کوڑا بھی اٹھا لیا جائے گا۔

آدھے انچ موٹے ٹکڑوں میں سے دو انچ لمبی کیل پوری گزر کے بھی ڈیڑھ انچ بلند رہی۔ اب ان ٹکڑوں کو فرش پر سیدھا رکھا جاتا تو کیل کا نوکیلا حصّہ اوپر اٹھا رہتا ــــ ٹائروں کو پنکچر کرنے کے لیے یہ نسخہ ہم پہلے بھی آزما چکے تھے لیکن راجا کو مجھے ترکیب استعمال پھر سمجھانا پڑی۔

"ان میں سے ایک کو تم پیچھے والے ٹائروں کے عین نیچے اس طرح فٹ کرو گے کہ ٹرک چلے تو کیل ٹائر میں گھس جائے۔ ٹرک میں پچھلی طرف چار پہیے ہوتے ہیں۔ دو ایک طرف' دو دوسری طرف' چنانچہ کسی ایک ٹائر کے فلیٹ ہونے سے زیادہ فرق نہیں پڑتا۔ ٹرک دوسرے ٹائر پر چلتا رہتا ہے۔ اس لیے یہ دو ٹکڑے ایک ہی جانب کے دو ٹائروں کو پنکچر کرنے کے لیے ہیں۔ بہتر ہوگا کہ تم پیچھے بھی وہ سائڈ منتخب کرو جو ڈرائیور کے بائیں ہاتھ پہ ہوتی ہے۔ ڈرائیور دائیں طرف آگے بیٹھتا ہے۔ اس کے بالکل پیچھے والے دونوں پہیّوں کو چھوڑ دو۔ دوسری طرف کے پہیّوں کو پنکچر کرو۔ اگرچہ اس بات کا امکان بہت کم ہے کہ... ڈرائیور کچھ چیک کرے مگر اس کی نظر اتفاق سے پڑ سکتی ہے۔ جہاں میں بتا رہا ہوں وہاں اس کی نگاہ نہیں جا سکتی۔ لکڑی کے یہ ٹکڑے بالکل نئے اور چمکیلے ہیں۔ ان کو تھوڑا سا میلا کر دینا یا ان پر تھوڑی سی مٹی ڈال دینا۔"

"اس کو اُردو میں کہتے ہیں دامِ ہم رنگِ زمیں۔" غالب نے کہا۔

"یہ اُردو نہیں فارسی ہے۔" محسن نے اس کی تردید کی۔

"تم لڑنے دو انھیں۔" میں نے کہا۔" میری بات دھیان سے سنو۔ اگر کوئی ٹرک لے جانے کے لیے آئے گا تو تمھیں فوراً معلوم ہو جائے گا کیونکہ تم وہیں کہیں آس پاس موجود ہو گے۔ لیکن تمھارے پاس ہمیں فوراً مطلع کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ مطلب یہ کہ نہ تم اس ٹرک لے جانے والے کو روک سکتے ہو نہ ہمیں فون کر سکتے ہو۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ اس کی روانگی کو مؤخر کر دیا جائے۔ ٹائر پنکچر ہوں گے تو اسے بدلنے بھی پڑیں گے۔ تم اتنی دیر میں ہمیں اطلاع دینے کے لیے آ سکتے ہو ــــ باقی کارروائی پھر ہم کر سکتے ہیں۔ اب جاؤ۔"

"اللہ تمھارا بھلا کرے بابا۔ فقیر کو خالی پیٹ گھر سے نکا..." راجا نے جاتے ہوئے کہا۔

"ابے راجا! دیکھ' ہر در پر صدا دیتا جا اور جو کھانے... اس میں سے کچھ ہمارے لیے بھی لے آنا۔" محسن بولا۔

"فقیر پہلے خود لنچ کرے گا۔ ویسے آج شب برات ہے... سے حلوا ہی ملے گا۔" وہ بولا اور باہر نکل گیا۔

"آج شب برات ہے؟" میں نے حیرانی اور افسوس... عجیب بات ہے کہ ہمیں یاد نہیں تھا۔"

"یاد آتا بھی تو ہم کون سا حلوا پکا لیتے۔"

"حلوا تو بہانہ ہے خوشی منانے کا۔ مگر دیکھو یار' ہم... میں الجھے ہیں کہ نہ دین کی خبر ہے نہ دنیا کی۔" میں نے کہا۔" جن... ہیں وہاں حلوے پکائے جائیں گے طرح طرح کے۔ بچے آتش... گے اور موم بتیاں جلائیں گے۔ بڑے قبرستانوں کا رُخ کریں... ' زندگی اور رحمت و برکت کے لیے عبادت کریں گے۔ خدا... بجا لائیں گے جس نے انھیں اپنی ہر نعمت سے نوازنے کے... پر نظرِ کرم کی۔ ہم کچھ نہیں کریں گے۔ خدا ہی قبول کرے جو ہم...

"اس کا احسان ہے کہ ہم آج تک ناکامی سے نہیں ڈرے... بچیں۔" محسن بولا۔

"جب ہمارے گھر ہوں گے۔" غالب بولا اور پھر چپ...

"جب!" میں نے کہا۔" مگر یار و' مایوس اور اداس... سے کیا حاصل۔ چلو شیخ صاحب' ہم اپنا مورچا سنبھالیں۔"

اکرام شیخ نے سر ہلایا اور میرا ساتھ دیا۔ ہم دونوں او... ساتھ والے گھر کی چھت پر اتر گئے۔ دونوں چھتیں ملی ہوئی... انھیں جدا کرنے والی دیوار مشکل سے چھ فٹ اونچی تھی۔

یہ بھی نیا مکان تھا اور توہم پرست لوگوں کی خام... آباد نہ ہو سکا تھا۔ ہم نیچے جا کے بھی دیکھ سکتے تھے لیکن اس کا... نہ ہوتا۔ خالی مکان میں ویرانی کے سوا دیکھنے کو کیا ملتا۔ میں... کے حصار کے ساتھ گھوم کے دیکھا۔ گلی کی سمت دیوار چار فٹ... چنانچہ ہم میں سے ایک آسانی سے اُدھر نگاہ رکھ سکتا تھا... بائیں جانب مکانوں کا سلسلہ تھا اور پیچھے والے حصے میں... اسے عموماً گندی گلی کہا جاتا ہے کیونکہ خواتین اسے گندا رکھنے کی... کوشش کرتی ہیں اور جتنا بھی کوڑا کرکٹ ہو وہ بلاتکلف در... کے باہر پھینک دیتی ہیں' خواہ وہ گلی کے وسط میں گرے... اوپر۔ رہی سہی کسر صفائی نہ کرنے والے پوری کرتے ہیں۔ چنا... واقعی گندی رہتی ہے۔

"میرا خیال ہے کہ اس طرف سے شاید ہی کوئی آئے..."

میں نے اس کے خیال کی تردید نہیں کی۔" ہاں۔ اتنا کوڑا ہے اور پانی بھرا ہوا ہے۔"

"بہتر ہوگا کہ ایک سامنے گلی کو دیکھے۔ دوسرا ساتھ والی چھت پہ اپنے ساتھیوں کو۔ خدانخواستہ وہ کسی مشکل میں پڑیں تو ہم ان کی مدد کر سکیں۔"

ساتھ والی چھت پہ غالب اور محسن نے بھی پوزیشن سنبھال لی تھی۔ ہم میں سے کوئی بھی یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ کیا ہوگا۔ کوئی ہمارے لیے پیغام لے کر آئے گا یا گاڑی بھر کے مسلح افراد کو ساتھ لائے گا۔

ٹرک صرف ایک گلی کے فرق سے اور اس جگہ سے سو گز دور کھڑا ہوا تھا مگر ہم میں سے کوئی اسے براہِ راست نہیں دیکھ سکتا تھا۔ درمیان میں پچھلی گلی کے مکانات حائل تھے جو دو منزلہ تھے۔ ایک منزلہ ہوتے تو شاید ٹرک کی نگرانی ہم دور رہ کے بھی کر لیتے۔

"یار شیخ! تم پریشان نہیں ہو؟" میں نے کہا۔

"پریشان تو ہوں۔ مگر واویلا نہیں کر رہا ہوں۔" وہ بولا۔" پریشانی کا اظہار اگر میں رو پیٹ کے اور شور مچا کے کروں تو اس سے مجھے یا تمھیں کیا ملے گا؟"

"میرا دل گواہی دیتا ہے کہ نازو اور موہنی کے بارے میں کوئی اطلاع ضرور آئے گی۔ خواہ کسی کی طرف سے بھی آئے۔" میں نے کہا۔

"یہی خیال تو مجھے بھی اطمینان دیتا ہے۔" وہ بولا۔

"نازو غیر معمولی ذہانت اور ہمت کی مالک ہے۔" میں نے کہا۔

"پھر بھی ہے تو وہ لڑکی۔"

"ہاں۔ لڑکی ہونا بعض اوقات کتنا غلط ہو جاتا ہے۔ مرد اتنا بے بس نہیں ہوتا۔" میں نے کہا۔

"پھر بھی ان لڑکیوں نے ہمارا ساتھ دینے میں کمی تو نہیں کی۔ رابعہ تو سرِ فہرست ہے۔ مگر نازو کے علاوہ شہلا نے بھی بہت دُکھ جھیلے۔ کیتھرین نے زندگی لڑتے ہوئے گزار دی اور جولی ابھی تک لڑ رہی ہے۔"

"ہاں۔ وہ دُہری جنگ لڑ رہی ہے۔ اس کی ماں نے بھی دُہری جنگ لڑی۔ ایک محبت کی جنگ تھی جس میں اس نے بہرام دادا کا ساتھ دیا' سخت ترین حالات میں۔ دوسری نفرت کی جنگ تھی جس میں وہ پہلے بہرام دادا کے شانہ بشانہ لڑی' اس کے دشمنوں سے۔ پھر ہمارے دشمنوں سے۔ وہ ایک بہادر عورت تھی۔ جولی اس سے زیادہ بہادر ثابت ہوئی۔ اس نے موت کے خلاف جنگ لڑی اور جیتی۔ نتیجہ اس نے ہمارا ساتھ دیا۔ آخری جنگ محبت کی تھی جس میں وہ ہار گئی۔ اس کے اعصاب اتنے مضبوط نہ تھے کہ وہ اس سے زیادہ حالات کا مقابلہ کر سکتی۔ مگر مجھے امید ہے کہ ایک دن وہ پھر ٹھیک ہو کے ہمارے ساتھ آ ملے گی۔"

"تم موہنی کی بات نہیں کرتے۔ آخر کیوں؟" شیخ نے اچانک کہا۔

"میں... کر سکتا ہوں۔" میں نے ٹپٹا کے کہا۔" مگر چلو اس کی بات تم کرو۔"

"میں اس کی کیا بات کروں۔" وہ مایوسی سے بولا۔" وہ تو پاگل ہے تمھارے پیچھے۔ کوئی لڑکی وہ سب کچھ نہیں کر سکتی' جو موہنی نے تمھاری خاطر کیا۔ کتنا طویل سفر طے کیا اس نے اور یہ سفر آسان بھی نہیں تھا۔"

"ہر مسافر کو منزلِ مراد نہیں ملتی۔ یا صرف چاہنے سے مل جاتی ہے؟ خواہ جذبہ کتنا ہی صادق کیوں نہ ہو۔" میں نے کہا۔

"تم تو وہی بات کہہ رہے ہو اپنے الفاظ میں کہ وصالِ یار فقط آرزو کی بات نہیں۔" شیخ نے کہا۔" مگر یہاں خواہش کے ساتھ جدّوجہد بھی کی ہے اس نے' جان کی بازی لگا کے۔"

"دیکھو دوست! یہ ہو سکتا ہے کہ جدّوجہد اور محنت سے آدمی چاند ستاروں کو تسخیر کرے۔ ذرّے کا جگر پاش کرے اور اس سے خورشید کی ضو پیدا کرے۔ مگر یہ جو کسی کے دل میں محبت پیدا کرنے والی بات ہے نا' یہ مختلف ہے۔"

"وہی فلسفہ کہ محبت کی نہیں جاتی' ہو جاتی ہے۔"

"کیا تم اسے غلط کہہ سکتے ہو؟" میں نے اس کے سینے پر انگلی رکھ کے کہا۔" زمانے کی نہیں' اپنی بات کرو۔"

"اپنی میں کیا بات کروں۔ وہ تو مجھ سے بات بھی بس مروّت میں کر لیتی ہے۔" وہ مایوس لہجے میں بولا۔" ہاں تمھاری بات ہو تو وہ مسلسل بولتی ہے۔ اپنے اور تمھارے بچپن کے ان گنت واقعات۔ چھوٹی چھوٹی باتیں۔ لڑائی جھگڑوں کے قصے۔ روٹھنے منانے اور کبھی پھر بات نہ کرنے کی سوگند کھا کے خود ہی بات کرنے کے واقعات' میں تو حیران ہوتا ہوں کہ اسے اتنی پرانی باتیں اتنی تفصیل سے کیسے یاد ہیں' جیسے یہ کل کی بات ہو۔"

"کیا تمھیں اپنا بچپن یاد نہیں؟"

"یاد تو ہے لیکن یادوں کے نقوش بہت دُھندلے اور مٹے مٹے سے ہیں۔ ادھورے ہیں۔" وہ بولا۔" موہنی کی طرح نہیں۔ جیسے چھوٹی سے چھوٹی بات یاد ہے۔ مثلاً یہ کہ تمھیں کیا پسند تھا اور کیا ناپسند۔"

"کیا پسند تھا مجھے؟"

"تمھیں... ایک تو گاجر کا حلوا۔ جو اس کی ماتا جی بناتی تھیں اور تل کے لڈو۔ جو اس کی خالہ بنا کے بھیجتی تھیں گاؤں سے... ایک بار تم نے اسے مجبور کیا تھا کہ ماس کھاؤ۔ تم اس کے لیے مرغی کی ٹانگ لے گئے تھے۔ اس نے کہا کہ یہ ہم نہیں کھاتے۔ تم اَڑ گئے تھے کہ آج کھاؤ۔ اس نے کہا کہ ہمارے دھرم میں یہ پاپ ہے۔ تو تم نے کہا کہ ایک پاپ کر لو میری خاطر۔ اور بھی تو بہت پاپ کیے ہوں گے تم نے یا آج تک کوئی پاپ ہی نہیں کیا؟ اور اس دلیل سے قائل ہو کے اس نے تمھارے سامنے اقرار کیا کہ پاپ تو پہلے بھی کیے ہیں مثلاً ایک دفعہ ماتا جی کے

سامنے رام اور سیتا جی کے بارے میں کوئی بہت غلط سوال کیا تھا۔ اور ایک بار ایک چونی چرائی تھی۔ چرائی تو نہیں تھی، مندر میں ملی تھی، جو اس نے چپکے سے اٹھا کے مٹھی میں دبالی تھی۔ تو ظاہر ہے کہ بھگوان کے گھر میں چوری ہی کی تھی۔ یہ سب سن کے تم نے کہا کہ جب تم اتنے بڑے بڑے پاپ کر چکی ہو تو یہ ایک چھوٹی سی مرغی کی ٹانگ کھا کے کیا مر جاؤ گی؟"

"اچھا... پھر؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"پھر اس نے تمہاری خاطر ماس کھالیا تھا۔" وہ بولا۔ "اور تمھیں اپنی قسم دی تھی کہ کسی کو بتانا نہیں۔ مگر تم نے شان بگھاری دوسروں کے سامنے کہ میں نے کیا تیر مارا ہے۔ دھرم بھرشٹ کر دیا اس موہنی کی بچی کا۔ پھر موہنی کی پٹائی ہوئی تھی اور اس نے تم سے ایک ہفتہ بولنا بند رکھا تھا۔"

"یار، خدا کی قسم مجھے کچھ یاد نہیں۔ خیر پھر کیا ہوا تھا؟"

"پھر تم نے اسے منالیا تھا۔" وہ بولا۔ "اور وہ مان گئی تھی۔ یہ تو ایک واقعہ ہے۔ کبھی موہنی سے سنو۔ اسے کتنے واقعات یاد ہیں۔ ایک بار جب تم کسی بیری پر چڑھ رہے تھے اس کے لیے بیر توڑنے، تو تمہاری نیکر پھٹ گئی تھی اور جب وہ ہنسنے لگی تو تم نے بیر نہیں توڑے۔ نیچے اتر کے اس کی ٹھکائی لگائی اور اس کی قمیص جیسی بھی پھاڑ دی۔ پھر اس نے تمھیں مارا، یعنی مارنے کی کوشش کی کہ نیکر کے بدلے قمیص پھاڑی تھی تو پھر مارا کیوں اور نیکر کیا میں نے پھاڑی تھی؟"

مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ "بچپن کا زمانہ بھی کیا خوب ہوتا ہے یار۔ آدمی کے بس میں ہو تو وہ ہمیشہ بچہ ہی رہے۔"

"یہ تم اب کہتے ہو۔ بچپن کے دور سے گزر کے جوان ہونے کا شوق کتنا ہوتا ہے! ہر بچہ چاہتا ہے کہ بس میں راتوں رات بڑا ہو جاؤں۔"

"تمھیں اپنا بچپن یاد نہیں آتا؟"

"کہانا، یاد تو آتا ہے۔ لیکن میرے بچپن میں کچھ بھی نہیں تھا جس کا نقش اتنا گہرا ہوتا۔ میرا کسی موہنی سے کسی قسم کا تعلق نہیں رہا، جیسے تمہارا رہا تھا۔ اب تم بھی تو کہتے ہو کہ مجھے یہ سب یاد نہیں۔ موہنی کو اس لیے یاد ہے کہ اس کے جذبات کے نقوش بہت پائیدار تھے اور گہرے تھے۔ نہ مٹنے والے ـــــ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ یہ کیسے یاد رکھ سکتی تھی کہ اسکول جاتے وقت تمہاری جیب میں ایک کنگھا ہوتا تھا جو نیلے رنگ کا تھا اور تم نے وہ کنگھا موہنی کو اس کی سالگرہ پہ تحفے میں دیا تھا۔ آج بیس سال کے بعد بھی وہ کنگھا اس کے پرس میں ہے۔ کیا تم یقین کرو گے؟"

میں بے یقینی اور شرمندگی کی کیفیت میں بیٹھا رہا۔ "میں نے تو اس کی کوئی چیز... اس طرح سنبھال کے نہیں رکھی۔ کیا اس نے مجھے کچھ دیا تھا؟ دیا تو ہو گا۔"

"ہاں۔ اس نے ہمیشہ ہر وہ چیز تمہارے لیے بچا کے رکھی، جو اسے کہیں سے بھی ملی۔" وہ بولا۔ "لیکن اس کی ایک بات نے تو مجھے اتنا جذباتی کر دیا تھا کہ... کہ مجھے غصہ آ گیا تھا تم پر، تمہارے... اور سنگدل پر۔"

"وہ کیا بات تھی؟"

"تمھیں یاد پڑتا ہے کچھ۔ فسادات کا زمانہ؟"

"ہاں۔ وہ سب زخم تو مندمل ہو گئے لیکن ان کے نشان بھی میرے دل پر ہیں۔ میری ایک بہن نے عزت بچانے کو کنوئیں میں چھلانگ مار دی تھی اور..."

"مجھے معلوم ہے۔" شیخ نے کہا۔ "اس کے بعد شرما جی تم کو لے گئے تھے۔ وہاں کچھ حالات بگڑے تو تم کو کہیں اور بھیج دیا، موہنی کے کسی ماما کے گھر۔"

"ہاں۔ وہ بڑا خبیث تھا۔ میں اس کے پاس ٹھہرا نہیں۔"

"جب تم جا رہے تھے تو معلوم ہے موہنی نے کیا کیا تھا؟"

"کیا... بہت روئی ہو گی..." میں نے کہا۔ "کہ ہو گی کوئی بچپن کی بات کہ میں بھی جاؤں گی۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "یار سکندر، تم بڑے ہی خوش نصیب بھی ہو اور انتہائی بدبخت بھی۔ تم کو کتنی محبت ملی اور کیسے اچھے لوگ ملے..."

"لیکن میں نے جو گنوایا؟" میں نے برہمی سے کہا۔

"ہاں... اسی سے تو تمہاری بدبختی ثابت ہوتی ہے۔ دراصل کہ رابعہ تم کو اسی طرح ملی تھی، جیسے موہنی ملی تھی کہ تم اسے بھول گئے، مگر وہ تم کو نہیں بھولی تھی اور جب پھر ملی تو اس نے تمھیں جیت کر پھر اپنا لیا۔ اس کے باوجود کہ وہ شادی کر چکی تھی اور شادی کے بعد مرد کی ذات سے متنفر ہو چکی تھی۔ اس نے تمھیں دیکھا تو اس کے اندر کی عورت پھر انگڑائی لے کر جاگ اٹھی۔ وہ جو صرف ایک کامیاب وکیل تھی، اپنے دل کے خلاف مقدمہ ہار گئی۔ وہ دل کو کسی دلیل سے قائل نہ کر سکی اور تم بھی کہہ سکتے ہو کہ وہ آئی، اس نے دیکھا اور اس نے فتح کر لیا۔"

"ہاں۔ میں ایسا ہی کہہ سکتا ہوں۔"

"موہنی بدقسمت رہی کہ اسے تم تک پہنچنے میں ذرا دیر ہو گئی۔ تم پہلے ہی کسی کے ہو چکے تھے۔ ورنہ جہاں تک محبت کی شدت اور جذبات کی حدت کا تعلق ہے تو وہ رابعہ سے کم نہ تھی۔ شاید زیادہ ہی ہو گی اس کی چاہت۔ اگر کوئی ان دونوں کی محبت کو غیر جانبدارانہ، غیر جذباتی انداز میں کسی انصاف کی ترازو میں تول سکے۔ لیکن یہ ناممکن ہے۔ نہ ایسی کوئی ترازو ہے۔ نہ ایسی غیر جانبداری کا مظاہرہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ میرا خیال ہے۔"

"میں تمہارے خیال کو غلط نہیں کہتا۔" میں نے کہا۔ "مگر دوست مجھے بتاؤ میں کیا کروں جو یہ کیسے ممکن ہے کہ رابعہ کی جگہ اسے دے دوں۔ اور وہ پاگل لڑکی یہ بات سمجھتی کیوں نہیں؟"

"وہ بہت اچھی طرح سمجھتی ہے اور اسی لیے وہ تم سے کچھ نہیں چاہتی، کچھ نہیں مانگتی۔ اس نے کسی قسم کی توقعات وابستہ نہیں کی ہیں۔" شیخ نے کہا۔ "لیکن تم بھی خدا کے لیے کچھ تو مروت میں ہی ایسی بے رخی کا مظاہرہ مت کیا کرو۔ اسے محبت نہ دو مگر نفرت سے تو مت دیکھو۔ اسے دشمن تو نہ سمجھو۔"

"بہت تگڑا وکیل کیا ہے اس نے۔" میں نے کہا۔ "تم وہ بات بھول گئے، جس پر تم کو بہت طیش آیا تھا۔"

"ہاں... موہنی نے اپنی ماں سے آٹھ آنے لیے۔ پھر آٹھ آنے باپ سے مانگے۔ الگ الگ وقت میں۔ چار آنے اس کے پاس وہ تھے جو اسے بھگوان کے مندر میں ملے تھے۔ اس نے سوا روپیہ ایک لال رنگ کے کپڑے میں سی کر تمہارے بازو پر امام ضامن باندھا تھا۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ "اس نے... امام ضامن باندھا تھا؟"

"ہاں دوست۔ اس نے سب سے چوری چھپے یہ کام کیا تھا۔ اور کہا تھا، بھگوان تمہاری رکھشا کریں۔ اس پر تم نے کہا تھا کہ الو کی پٹھی تمہارے بھگوان کا امام ضامن سے کیا تعلق۔ وہ رونے لگی تھی کہ اچھا پھر کیا کہوں اور تم نے اسے سمجھایا تھا کہ امام ضامن باندھتے وقت کیا کہا جاتا ہے۔ اس نے وہی دہرا دیا تھا۔ تم سوچو ذرا یار کہ سوا روپیہ اس زمانے میں کیا تھا۔ شاید بیس روپے کے نوٹ سے بھی زیادہ۔ معلوم نہیں کیسے کیسے حوالوں سے اس نے یہ سرمایہ فراہم کیا۔ صرف تمھیں تحفظ فراہم کر کے اپنے دل کو مطمئن کرنے کے لیے۔ اور تم نے اسے کیا سمجھا؟"

"صرف سوا روپیہ۔" میں نے ندامت سے کہا۔ "میں نے اسے سنبھال کے نہیں رکھا۔ صدقہ بھی نہیں کیا۔ اس کے ماما کے گھر میں مجھے جیب خرچ کون دیتا۔ اس زمانے میں وہ سوا روپیہ میرے کام آیا تاہم میں اپنی کمینگی کا اعتراف کرتا ہوں۔ وہ جذبات کا ایک خزانہ تھا جس کی اگر میں قدر کرتا۔ تو وہ امام ضامن آج بھی میرے پاس ہوتا۔ آخر ایک بدصورت کنگھے کے مقابلے میں تو وہ ایسا ہی تھا جیسے، پھٹے ہوئے، بے مصرف ہو جانے والے کپڑے کے چیتھڑے کے مقابلے میں ایک خوبصورت جائے نماز۔ لیکن ساری بات جذبات کی تھی۔ جو ایک طرف کچھ اور تھے اور دوسری طرف کچھ اور۔"

"اور یہ صورت حال اب بھی ہے۔" شیخ نے کہا۔

"ہاں میں اس سے انکار نہیں کرتا۔"

"مگر اب تم بچے نہیں ہو۔ تم جذبات کی قدر نہ کرو۔ جذبات کی بے حرمتی سے تو بچ سکتے ہو۔" شیخ نے کہا۔ "مسیحائی تمہارے اختیار میں نہ سہی تم یہ تو کر سکتے ہو کہ نئے زخم نہ دو۔ اس کے ساتھ تمہارا رویہ بعض اوقات توہین آمیز ہو جاتا ہے۔ اور توہین بھی اسے منظور ہے مگر زیادہ دکھی وہ اس بات پر ہے کہ تم ابھی تک عدم اعتماد کا شکار ہو۔ یہ سمجھتے ہو کہ وہ ایکٹنگ کرتی ہے۔ کیونکہ وہ ہندو تھی۔"

"تھی کیا مطلب؟ اب بھی ہو گی۔"

"یہی تو زیادتی ہے تمہاری۔" شیخ گرم ہو گیا۔ "تم اعتماد کیوں نہیں کرتے اس کی بات پر۔ اس نے بتایا تو ہے کہ وہ اسلام قبول کر چکی ہے اور تم کہو گے تو وہ تمہارے سامنے پھر کرے گی۔ جہاں تم کہو گے۔ جیسے تم کہو گے۔ تم اسے موہنی ہی کہتے ہو۔"

"دراصل، یہ رضیہ سلطانہ والا نام۔ میں موہنی کے نام کی جگہ نہیں لے سکتا۔ وہ ایک مسلمان حکمران تھی۔"

"تاریخ کے حوالے سے بات کرتے ہو تو یہ بھی کہو کہ وہ کس کی محبت میں گرفتار ہوئی تھی اور اس جرم الفت کی اسے کیا سزا ملی تھی۔ نام سے کیا ہوتا ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ نام خود عقیدت کے جذبات کا مظہر بن سکتا ہے۔ بہت پیارا نام ہے یہ بھی۔"

"اب پھر بات وہی جذبات کی آ گئی۔ تم کو یہ نام اس لیے پیارا لگتا ہے کہ وہ تم کو پیاری لگتی ہے۔" میں نے کہا۔ "تم اس سے پیار کرتے ہو؟"

"پیار کرنا کیا ہوتا ہے۔ یہ تو ایک عجیب سی خلش ہے۔ یا جذبات کی فسوں کاری ہے۔ نظر کی کرشمہ سازی ہے یا دل کی وحشت ہے۔" وہ بولا۔

"اوہ مائی گڈنس۔" میں نے سر پہ ہاتھ مارا۔ "آج تک سنا تھا کہ محبت آدمی کو شاعر بنا دیتی ہے۔ آج دیکھ لیا کہ محبت نے ایک تھانیدار کو شاعر بنا دیا۔"

"بھاڑ میں گئی تھانیداری بھی اور شاعری بھی، جب حاصل کچھ نہیں۔" وہ بولا۔ "وہ تمہاری محبت سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں، خواہ تم اسے دھتکارتے رہو۔ ادھر میں ایک نمبر کا گدھا کہ دن رات اور کچھ سوچتا ہی نہیں۔ خواب بھی دیکھتا ہوں تو اس کے۔ مجھے ڈر لگتا ہے کہ یہ جنون بڑھا تو میں پاگل نہ ہو جاؤں۔"

"معاف کیجیے گا جناب۔ آپ پاگل تو ہو چکے ہیں لیکن ابھی خود یہ بات تسلیم نہیں کرتے۔" میں نے کہا۔ "آثار دوسروں کو صاف نظر آتے ہیں۔"

"یار سکندر، میں کیا کروں جو کچھ بتاؤ نا مجھے۔"

"میں کیا بتاؤں یار۔ میرے پاس کوئی گیدڑ سنگی ہے۔ یا کسی باکمال ہمہ صفت پیر کا پتا ہے جو ملٹی پرپز تعویذ دیتے ہیں اور جن کے دیواری اشتہاروں میں لکھا ہوا نظر آتا ہے کہ محبوب آپ کے قدموں میں۔" میں نے کہا۔ "میں نے نہ محبت اور عاشقی کی سند دینے کے لیے کوئی یونیورسٹی کھول رکھی ہے کہ وہاں سے آپ فارغ التحصیل ہو کے نکلیں تو کلاس ون عاشق کی پوسٹ آپ کو فوراً مل جائے اور آپ جس پر نظر ڈالیں، وہ آپ کی ہو جائے۔"

"تم اڑاتے رہو مذاق میرا۔ میں یہ تو کر نہیں سکتا کہ اپنے ... بات

کا رُخ بدل دوں۔" وہ برا مان گیا۔" آئندہ تم سے اس موضوع پر بات نہیں کر دں گا۔"

"پھر کس سے کرو گے۔ محسن اور غالب سے، وہ تو مجھ سے بھی بڑے بدمعاش ہیں۔" میں نے کہا۔" ناطقہ بند کر دیں گے۔"

"ارے یار جو چاہیں بند کریں۔ میں بھی قسم کھا کے کہتا ہوں کہ ایک نہ ایک دن اسے اپنا بنا کے چھوڑوں گا آخر عورت ہے کوئی پتھر کی مورت تو نہیں ہے۔ کب تک اثر نہیں ہو گا۔"

"مجھے بہت سے دردناک اشعار یاد آرہے ہیں۔ جن میں کچھ یوں کہا گیا ہے کہ بہت دیر کی مہرباں آتے آتے۔ اور مری نمازِ جنازہ پڑھائی غیروں نے۔ مرے تھے جن کے لیے وہ رہے وضو کرتے۔ فانی بدایونی کے دیوان سے استفادہ کروں تو..."

وہ میری بات نہیں سُن رہا تھا بلکہ خاصا ناراض ہو چکا تھا لیکن اس سے پہلے کہ میں اسے مناتا اور کہتا کہ یار یہ سب مذاق ہے اور چلتا رہتا ہے۔ میں نے ایک بچے کو بہت مشتبہ انداز میں ڈرتے ڈرتے دروازے کے پاس آتے دیکھا۔ اوپر سے اسے محسن دیکھ رہا تھا۔ وہ کوئی بارہ سال کا بچہ تھا جس کا خیال تھا کہ اسے کوئی نہیں دیکھ رہا ہے اس نے مٹھی میں کوئی چیز دبا رکھی تھی۔

چونکہ دونوں گھر ملے ہوئے تھے اس لیے میرے اور محسن کے درمیان مشکل سے دس فٹ کا فاصلہ تھا۔

"ہیلو!" محسن نے اوپر ہی سے کہا۔

بچہ بُری طرح چونکا اور اس نے سہم کر اوپر دیکھا بیک وقت اس نے دو گھروں کی چھت پر سے چار آنکھوں کو نگراں پایا۔

"کیا بات ہے بیٹا!" محسن نے انتہائی دوستانہ شفیق اور نرم لہجے میں مسکرا کر کہا۔

"کوئی کام ہے؟" اس نے چند سیکنڈ کے وقفے سے پھر پوچھا۔ کیوں کہ بچہ اچانک پکڑے جانے سے نروس ہو گیا تھا۔ وہ کبھی مجھے دیکھتا تھا تو کبھی محسن کو۔ غالباً وہ میری دلچسپی کا سبب سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس نے بمشکل تمام اقرار میں سر ہلایا۔

"اچھا تو اندر آجاؤ، شاباش۔ دروازہ کھلا ہوا ہے۔"

بچے نے انکار میں سر ہلایا۔" ماماجی... آپ نیچے آجائیں۔"

"ٹھیک ہے بھئی۔ ہم آجاتے ہیں۔" محسن نے کہا۔ میں بے نیازانہ انداز میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ مجھے اس معاملے سے کوئی دلچسپی نہیں اور یہ محض اتفاق تھا کہ میں بھی گلی کا نظارہ کرنے میں مصروف تھا۔

میں نے محسن کے باہر نکلنے تک بچے کی صورت پر تذبذب کے آثار دیکھے۔ کیا وہ سوچ رہا ہے کہ اس مہلت سے فائدہ اٹھا کے بھاگ جائے؟ اسے یقیناً کسی نے بھیجا تھا اور وہ لالچ میں آگیا تھا۔ اسے بھیجنے والوں نے انعام دینے کا وعدہ کیا ہو گا یا ممکن ہے انعام پیشگی دے دیا ہو مگر ساتھ ہی سمجھا[...] ان کے بارے میں کچھ نہ بتائے۔ وہ الفائے عہد[...] کیوں کہ وہ ایک کام کرنے کا معاوضہ وصول کر چکا[...] غالباً اتنی سمجھ ضرور رکھتا تھا کہ یہ کام اس کے نزدیک[...] کام تھا۔ غلط نہ ہوتا تو وہ خود نہ کر لیتے۔

محسن کے رویے نے اس کا خوف کچھ کم کر[...] پہلے تو وہ چوروں کی طرح پکڑے جانے سے سہم[...]

"ہاں۔ اب بتاؤ، کیا کام ہے مجھ سے؟ مگر[...] کہ تم کون ہو؟" محسن اس کے قریب سیڑھیوں پر جا[...] گیا۔" میں تو تمھیں جانتا نہیں۔"

"میں... یہیں رہتا ہوں۔" اس نے ہاتھ کو گھما[...] ہلا کے کہا جس سے کوئی سمت واضح نہیں ہوتی تھی[...] اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔

"یہ... دینا تھا آپ کو..." اس نے مٹھی کھول[...] محسن کے سامنے پھیلا دی۔

محسن نے ہتھیلی پر سے تعویز کی طرح تہ کیا ہوا کاغذ[...]

لڑکا بھاگنے ہی کو تھا کہ محسن نے اسے پکڑ لیا۔

"یہ مجھے دینا تھا؟" محسن نے کہا۔" کیوں... بھئی[...] جانتا نہیں۔ کیا تم جانتے ہو مجھے؟"

لڑکے نے اقرار میں سر ہلایا۔

"کیسے جانتے ہو؟ میں تو آج ہی آیا ہوں ا[...] بھلا نام بتاؤ میرا۔" محسن نے کہا۔

"ماماجی... مجھے جانے دیں۔"

"بیٹا، ڈرتے کیوں ہو۔" محسن نے اس کے کند[...] تھپکی دی۔" میں آدمی ہوں۔ تمھارے ابا جیسا۔"

"میرے ابا جیسے... وہ تو مر چکے ہیں۔"

محسن کی مثال غلط ہونے کا اثر الٹا ہو گیا تھا۔[...] "کرنا مجھے معلوم نہیں تھا۔ میرا مطلب تھا کہ میں ویسا ہی آد[...] جیسے سب ہوتے ہیں۔ میں بھوت وغیرہ نہیں ہوں۔ بھ[...] نہیں ہوتے۔"

"آپ... بھوت نہیں ہیں؟" وہ بے یقینی سے ب[...]

محسن ہنسا۔" تم تو اتنے سمجھ دار اور بہادر بچے[...] سی کلاس میں پڑھتے ہو؟"

"جی... پانچویں میں... چھٹی میں جاؤں گا اب[...]"

"واہ... اتنی چھوٹی سی عمر میں؟" محسن نے کہا۔" کیا[...] تھا تم نے اپنا۔ فیکا... رفیق...؟"

بچہ اس کے چکر میں آگیا۔" مگر میں نے تو نام نہیں بتایا تھا!"

"بیٹی رفیق، نام کو چھوڑو، یہ بتاؤ کہ تم کو یہ رقعہ کس نے دیا تھا؟"

"میں... انھیں نہیں جانتا ماماجی... مجھے جانے دیں۔"

"چلے جانا۔ میں ماروں گا تو نہیں تمھیں۔ تم نے ایک اچھا کام کیا ہے۔ تم کو تو انعام ملنا چاہیے۔" اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر دس کا ایک نوٹ نکالا۔" یہ میں تمھیں دوں تو تم کیا لاؤ گے؟"

"جوتے۔" وہ دس کے نوٹ کو دیکھنے لگا۔" اور ایک بستہ۔ دونوں پھٹ گئے ہیں۔"

"انھوں نے بھی تو پیسے دیے ہوں گے جن کا تم رقعہ لائے ہو۔" محسن نے کہا۔" ان کا کیا کرو گے؟"

"آپ... آپ کو کیسے معلوم!" لڑکے کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔" کہ انھوں نے پچاس روپے دیے ہیں؟"

وہ معصوم تھا اور خوف نے اس کی عقل کو مفلوج کر دیا تھا چنانچہ وہ اَن کہی باتوں کا اقرار کر رہا تھا اور خود ہی وہ سب بتا رہا تھا جو بتانا نہیں چاہتا تھا۔

"پچاس روپے تو بہت ہوتے ہیں۔" محسن نے کہا۔" کیا تم یہ اپنی ماں کو دو گے؟"

اس نے پھر نفی میں سر ہلایا۔" اسکول کی فیس دوں گا اور پھر نام لکھوا لوں گا۔ میرا نام کٹ گیا تھا۔"

"کیوں... ماں فیس نہیں دیتی تھی؟"

"کیسے دیتی۔ اس کے پاس پیسے نہیں تھے۔" وہ بولا۔

محسن نے کچھ سوچ کے کہا۔" اور آئندہ پھر ایسا ہوا تو تم کیا کرو گے؟"

"اگلے سال سے میری فیس معاف ہو جائے گی۔" وہ بولا۔" ماسٹر صاحب نے وعدہ کیا ہے۔ اب میں جاؤں؟"

"تم بالکل میرے بیٹے جیسے ہو۔ بالکل اتنے ہی بڑے اور تمھاری صورت بھی اس سے بہت ملتی ہے۔" محسن نے بالکل صحیح طریقہ اختیار کیا تھا۔ حالاں کہ اس نے بچوں کی نفسیات پر کتاب کوئی نہیں پڑھی تھی۔

"اس کا کیا نام ہے جی؟" اس نے بے اختیار پوچھا۔

"اس کا نام ہے... شیدا... محمد رشید۔" محسن نے کہا۔" وہ بھی اب چھٹی میں جائے گا۔ تم آتے رہنا جب بھی موقع ملے۔ اور اگر تمھاری ماں اجازت دے، تو تم ہمارے چھوٹے موٹے کام کر دیا کرو، بازار سے روٹی لا دی، خط ڈال آئے، ہم برتن صاف نہیں کرائیں گے تم سے، جوتے پالش نہیں کرائیں گے۔ یہ سب تو ہم خود کر سکتے ہیں... پھر بھی بہت سے کام ہیں جن میں تم ہماری مدد کر سکتے ہو۔ اس کے ہم سو روپے ماہانہ دیں گے۔"

"سو روپے!" لڑکے نے بے یقینی سے کہا۔

محسن نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔" ہاں۔ دراصل میں چاہتا ہوں کہ تمھاری مدد کروں... بغیر کام کے سو روپے دوں گا تو تمھاری ماں منع کر دے گی، اور تم بھی نہیں لو گے۔ کام کے بغیر پیسے ملے تو وہ خیرات ہو جاتا ہے نا۔ اب یہ بتاؤ کہ تم اور کیا کر سکتے ہو؟"

"میں... سب کر سکتا ہوں جناب۔" لڑکا اب بے خوف ہو کے بولنے لگا۔" چائے بھی بنا لیتا ہوں، اور برتن دھونے میں بھی کیا ہے۔ آپ دھو سکتے ہیں تو میں بھی دھو سکتا ہوں۔"

"تم یہاں ڈرو گے نہیں؟" محسن نے کہا۔" لوگ تو کہتے ہیں کہ یہاں بھوت رہتے ہیں۔ مگر وہ بے وقوف لوگ ہیں، اب آخر ہم بھی تو آئے ہیں یہاں آج ہی، اور یہاں رہیں گے۔ بھوت کا باپ بھی آیا تو مار مار کے اَلّو بنا دیں گے۔"

لڑکا ہنسنے لگا۔" میری ماں بھی کہتی ہے کہ بھوت وغیرہ کچھ نہیں ہوتے سب وہم کی بات ہے۔"

"تو گویا یہ ماں کی تربیت کا نتیجہ تھا کہ وہ اتنی جلدی قائل ہو گیا تھا۔" میں نے سوچا۔

"ان لوگوں نے یہ رقعہ دیتے وقت کہا ہو گا کہ ہمارے بارے میں کچھ نہ بتانا۔" محسن نے بچے کا اعتماد حاصل کر لینے کے بعد کہا۔" کیا کہا تھا انھوں نے؟"

"انھوں نے... انھوں نے کہا تھا کہ یہ رقعہ اس گھر میں ڈال دو جس میں بھوت رہتے ہیں۔" وہ بولا۔" یہ ذرا مشکل کام ہے مگر تم کر لو گے۔ اور ہم اس کام کے پچاس روپے دیں گے۔ میں نے پچاس روپے کی بات سنتے ہی ہامی بھر لی... انھوں نے کہا کہ تم کو کچھ بھی نہیں کرنا ہے، بس دروازے کے نیچے سے رقعہ اندر کھسکا کے بھاگ جانا۔"

"بس... اور بھی کچھ کہا ہو گا!"

"ماماجی... انھوں نے کہا تھا کہ... اگر کوئی نکل آئے تو اسے کچھ مت بتانا ہمارے بارے میں۔ کہنا کہ ایک لمبے تپلے سوٹ والے آدمی نے دیا تھا۔"

"گویا انھوں نے کہا تھا کہ جھوٹ بول دینا۔"

"جی... وہ تو موٹے تازے دُنبے تھے دونوں۔ ان میں سے ایک گاڑی میں بیٹھا رہا تھا دوسرا نیچے اترا تھا۔"

"گاڑی کیسی تھی۔ نئی یا پرانی؟"

"نئی ہی تھی۔ لمبی سی۔" وہ سوچ کے بولا۔

"اور اس کا رنگ کیسا تھا؟"
"رنگ؟" لڑکا سوچ میں پڑ گیا "کچھ کالا نیلا۔"
"سلیٹی تو نہیں تھا؟" محسن نے کہا۔
"ہاں جی... بالکل... سلیٹی تھا" لڑکا بولا "مجھے یاد آ گیا۔"
"سلیٹی رنگ یاد آ گیا؟"
"ہاں جی... وہ گانا ہے نا، لٹھے دی چادر اُتے سلیٹی رنگ ماہیا... یہ میری کلاس کا ایک لڑکا سناتا ہے۔ بہت اچھا گاتا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا تھا تو اس نے بتایا تھا کہ سلیٹی رنگ کیسا ہوتا ہے۔"

محسن بہت ذہانت سے تفتیش کر رہا تھا، اور بہت کامیاب تھا۔ اگر وہ بچے سے کار کا میک، ماڈل یا نمبر پوچھتا تو شاید کچھ بھی معلوم نہ کر پاتا۔

"اچھا رفیق! ان میں سے ایک کے بال ایسے تھے جیسے کہ کمرانیوں کے ہوتے ہیں" محسن نے کہا "اور اس نے کان میں سونے کی بالیاں پہن رکھی تھیں۔"

لڑکا بھونچکا رہ گیا "کیا... آپ اوپر سے دیکھ رہے تھے؟"
"اوپر سے؟" محسن نے کہا "اوپر سے میں کیسے دیکھ سکتا تھا۔ تم سے ان کی بات گلی میں تو نہیں ہوئی تھی۔"
"ہاں، بات تو ادھر موڑ سے بھی آگے، دوسری گلی کے پیچھے ہوئی تھی" لڑکے نے اقرار کیا "پھر آپ کو...؟"
"وہ بھئی، ان کے ایک پیغام کا انتظار تھا ہمیں" محسن نے کہا "ان کے سوا کون آ سکتا تھا۔ خیر اب تم جاؤ۔ ڈرنا بالکل نہیں۔ سیدھے گھر جاؤ۔ اگر وہ پھر ملیں اور پوچھیں کہ رقعہ ڈال دیا تھا، تو کہنا، ڈال دیا تھا، اور بس۔"
"یہ نہ بتاؤں کہ آپ ملے تھے؟"
"کیا ضرورت ہے اس کی" محسن نے کہا "وہ مطمئن ہو جائیں گے اس جواب سے۔ یہ لو دس روپے... اور اپنی ماں سے کہہ دینا کہ تم کو کام بھی مل گیا ہے۔ تم شام کو کام کرو گے اور دن میں پڑھو گے۔ یہ بھی بتا دینا کہ کام کیا ہے... اور اسے پھر بھی شک ہو تو ہمارے پاس لے آنا۔ ہم اسے مطمئن کر دیں گے۔ جاؤ اب شاباش۔"

جب وہ دروازہ بند کر کے اندر آیا تو ہم سب ایک دم نیچے لپکے۔ محسن کو باتیں کرتا دیکھ کے غالب اور اکرام شیخ بھی اوپر منڈیر سے لگ کے بیٹھ گئے تھے۔ میں نے انھیں سر نکال کر جھانکنے سے منع کر دیا تھا۔

"استاد پیڈرو کے ساتھ کوئی آیا تھا" محسن نے اعلان کیا۔ کیوں کہ وہ رقعہ پڑھ چکا تھا "پیغام میرے اور سکندر کے نام ہے اور اس پر صرف اتنا لکھا ہے کہ ہم رات کو سٹی ریلوے اسٹیشن پر قلی نمبر تین سو دو سے ملیں، اور امید ہے یاد رہے گا۔"

"قلی نمبر تین سو دو؟"
"پیغام صرف ایک سطر کا ہے" محسن نے رقعہ بڑھا دیا۔

پینسل سے لکھی ہوئی ایک سطر سے کچھ ظاہر نہیں... اسکاٹ لینڈ یارڈ والے بھی اس ایک جملے سے کوئی... لگانے کی کوشش کرتے تو ناکام رہتے۔

"اب آپ دونوں جائیں اپنی اپنی ڈیوٹی پر" میں نے اور اکرام شیخ سے کہا "شیخ تم ٹرک پر نگاہ رکھو، غالب... بھی دیکھو اور شیخ پر بھی نظر رکھو۔ یہ کام ہم دونوں کا ہے... بات کر لیتے ہیں، پھر تمھیں بھی بتا دیں گے۔"

"مارے گئے آج تو" شیخ نے ٹھنڈی سانس بھر... "آنتوں میں اتنا دم بھی نہیں رہا کہ قل ہو اللہ پڑھ سکیں۔"
"اور میرے پیٹ میں دوڑنے والے چوہے تھک... سے بے ہوش ہو چکے ہیں" غالب نے اس کی تائید کی۔
"لیکن ڈیوٹی از ڈیوٹی" شیخ بولا۔
"چیف کے ٹو کا حکم از حکم" غالب نے کہا۔ پھر وہ... اوپر چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی دروازے پر دستک ہوئی... عادتاً ہم نے ریوالور نکال لیے "کون ہے؟" محسن...
"فقیر ہے بابا۔ اللہ کے نام پر کچھ دینے آیا ہے" ... آواز سنائی دی۔

محسن نے لپک کے دروازہ کھولا "آئیے آئیے... کرایا آپ نے۔ ہم تو مایوس ہو چلے تھے۔"
"خوش آمدید" میں نے کہا "اس وقت تمھارا اللہ... لانا ایک مبارک فعل ہے۔"

چند منٹ بعد ہم فقیری دسترخوان سے شاہی دم... نعمتیں لوٹ رہے تھے۔ شب برات کی وجہ سے سب نے... کے خیرات دی تھی۔ ایک چادر کی جھولی میں راجا نے انواع و... کے حلوے جمع کیے تھے اور خیرات دینے والوں سے کاش... کے سب حلوہ جات کو الگ الگ رکھنے میں کامیاب ہو... کبھی محسن مجھ سے کہتا تھا۔ یار، یہ چنے کی دال کا حلوہ دیکھا... ہے۔ کبھی میں غالب کو متوجہ کرتا تھا۔ یار، یہ مونگ کی دال کا... چکھ ذرا۔ اللہ نے ہر عورت کے ہاتھ میں الگ مزہ بھی رکھا...
"اور عورت وہی کامیاب بیوی بنتی ہے جو ایک چیز... ندیدے شوہر کو اچھا کھلا کے خوش کر دے۔"
"سب مرد ایسے ہی شوہر ہوتے ہیں۔"
"جبھی تو انگریز کہتے ہیں کہ مرد کے دل کا راستہ اس کے معدے سے گزرتا ہے۔"
"اتنے عقلمند نہ ہوتے تو ہم ان کی تقلید کیوں کرتے!"

بہت سے حلوے مسترد ہوئے۔ ان شوہروں کے حق میں تعزیت کی قرارداد منظور کی گئی جن کی بیویاں ایسے بدمزہ حلوے پکانی میں۔ جب حلوے کا یہ حال ہے تو پھر کدو کریلوں کا ذائقہ کتنا خراب ہوتا ہوگا جو وہ پکاتی ہوں گی اور شوہر مظلوم کھاتے ہوں گے۔

بالآخر سب کے پیٹ اور سب کی نیت دونوں بھر گئے، غالب نے کہا "اب مجھ پر غنودگی کا غلبہ ہے۔ جو حلوے کی وجہ سے ہے۔"

"پھر کیا کریں۔ حلوہ نکال لیں تمھاری اوجھڑی میں سے؟" میں نے کہا "سونے کی اجازت تو ہم دے نہیں سکتے۔ چلو اوپر واپس۔"
"اچھا سنگدل چیف کے ٹو" شیخ نے آہ بھر کے کہا "چلا لو حکم اپنا۔ اللہ ہمارا بدلہ لے گا۔"
"ہاں۔ ایک دن تم عورت کی غلامی کرو گے۔ اس کے حکم پہ سر کے بل کھڑے ہو کے سات سلام کرو گے۔ بندر کی طرح ناچو گے۔"
"اس کی جوتیاں اٹھاؤ گے، بلکہ چاٹو گے" محسن بولا۔
"اب جاتے ہو اوپر یا..." میں بھنا کے اٹھا۔
وہ دونوں بھاگ گئے۔
"یار محسن!" میں نے ایک سگریٹ جلا کے لمبا کش لیا "نیند تو مجھے بھی آ رہی ہے۔ سچی بات ہے۔"
"میرا خیال ہے آپ سب اکٹھے لیٹ جائیں۔ میں سب کی نیند بھگانے کا وہی طریقہ اختیار کرتا ہوں۔"
"ارکے... خفا مت ہو" میں نے کہا "یہ بتا چائے مل سکتی ہے؟"
"ہاں، میں فون کرتا ہوں میٹروپول" محسن بولا "مجھے معلوم ہوتا کہ حلوے کے یہ نقصانات ہیں تو تمھیں چکھنے بھی نہ دیتا۔ یعنی حد ہے کہ آپ کو نہ ان دونوں کو، کسی کو نازو اور موہنی کا خیال ہی نہیں کہ وہ کہاں ہیں۔ ایک کو بہن کی فکر نہیں، دوسرے کو محبوبہ کی۔"
"وہ جہاں بھی ہیں، اب ہمیں ان کو لینے جانا ہے" میں نے کہا۔
"یہ قلی نمبر تین سو دو کہاں سے آ گیا بیچ میں؟"
"کسی نہ کسی کو تو آنا ہی تھا" میں نے کہا "اور مجھے کچھ شبہ ہے کہ یہ ان میں سے نہ ہو جن کو ہم لائے تھے۔"
"ہاں، یہ عین ممکن ہے لیکن اس سے ایک بات بالکل صاف نہیں ہوتی۔"
"وہ کیا؟" میں نے کہا۔
"یہ کہ اغوا کرنے والوں نے کس کو پہچانا؟ نازو کو یا موہنی کو، یا اس قلی کے ذریعے ہمیں؟"
"میرا خیال ہے انھوں نے نازو کو دیکھا اور یہاں تک آ پہنچے، اور مزید معلومات انھیں... نازو سے حاصل ہوئیں۔"

محسن کا چہرہ تاریک ہو گیا "یہ کیسے ممکن ہے۔ نازو کچھ بتانے والی نہیں ہے۔"
"ہے تو ایک لڑکی ہی نا" میں نے کہا "لیکن میں ایک دوسری عورت کو بھی ذہن میں رکھتا ہوں۔ ممکن ہے موہنی نے ایسا کیا ہو۔"
"مجھے اس سے بھی یہ امید نہیں..."
"پھر کیا انھیں فرشتے بتا گئے؟"
"دیکھ یار! انھوں نے صرف نازو کو دیکھ کر گاڑی کا تعاقب کیا اور شاید اس وقت دیکھنے والا ایک تھا۔ کہ وہ سب کو زبردستی نہ لے جا سکا مگر اس نے جگہ دیکھ لی۔ اگر وہ طاقت میں زیادہ ہوتے تو اکرام شیخ کو بھی لے جاتے مگر وہ بیک وقت نازو، اس کے بھائی اور موہنی کا مقابلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے، یا روہاڑ نہیں چاہتے تھے چنانچہ انھوں نے خاموشی سے موقع کا انتظار کیا۔ اب انھیں کیا ضرورت ہے یہاں آ کے محاذ آرائی کی! انھوں نے ہمیں طلب کر لیا ہے۔ اور انھیں یقین ہے کہ کچے دھاگے سے چلے آئیں گے سرکار بندھے" محسن نے کہا۔
"پھر بھی قلی نمبر تین سو دو کا معمّا تو ابھی تک حل نہیں ہوا۔"
"بھئی، ان کے ایجنٹ تو ہر جگہ ہیں" محسن نے کہا "کیا پتا وہ ان قلیوں میں شامل رہا ہو جنھوں نے ٹرک کو لوڈ ان لوڈ کیا۔ یا کوئی اور قلی ہے جس نے یہ بات سُنی اور اسے عجیب لگی۔ وہ ریلوے اسٹیشن پر چاند بھائی اکبر بھائی اینڈ کمپنی کا مال اتارنے چڑھانے والا آدمی ہوگا۔ اس نے بات آگے پہنچا دی۔"
"خیر... جو ہوگا پتا چل جائے گا۔ یہ بتا اب ہم جائیں گے کیسے...؟"
"ویسے ہی جیسے میں نے کہا، کچے دھاگے سے بندھے۔"
"یار میرا مطلب تھا کہ... کیا کوئی ہمارے پیچھے آئے گا؟" میں نے کہا "یہ دیکھنے کے لیے کہ ہم بالآخر کہاں پہنچتے ہیں۔"
"آنا تو چاہیے مگر وہ بھی دیکھ رہے ہوں گے کہ ہم اکیلے جاتے ہیں یا باڈی گارڈ لے کر۔ اکرام شیخ تجربہ کار آدمی ہے، وہ ہم پر نظر رکھ سکتا ہے" محسن نے کہا "راجا اپنا کام کرے یعنی ٹرک کی نگرانی کرے اور اگر کوئی آئے..."
"کوئی آیا تو وہ اکیلا کیا کرے گا؟" میں نے کہا "شیخ کو اس کے ساتھ رہنے دو......... بہتر ہوگا اگر وہ ٹرک کا پیچھا کرے اور دوسرا ٹھکانہ دریافت کرے، ہم اکٹھے نہیں

جاستے؛ الگ الگ جاتے ہیں، آگے پیچھے۔"

"انھوں نے دونوں کو بلایا ہے۔"

"ان کے بلانے سے کیا ہوتا ہے۔ ہم ان کے باپ کے نوکر ہیں کہ ہر حکم مانتے جائیں۔" میں نے کہا۔ "میں اکیلا جا کے اس قلی نمبر تین سو دو سے ملتا ہوں۔ تیرے لیے میں کہہ سکتا ہوں کہ... بیمار ہو گیا تھا... یا یہ کہ گھر پر تھا ہی نہیں۔ معلوم نہیں کہاں نکل گیا۔ چنانچہ میں حاضر ہوں۔ تو یہ کر سکتا ہے کہ باہر کسی ٹیکسی والے سے معاملہ طے کر لے اور باہر انتظار کر۔ یہ بات تو یقینی ہے کہ وہ مجھے کسی گاڑی میں لے جائیں گے اور ان کی گاڑی پارکنگ ایریا میں ہی ہوگی اور اگر ایسا نہ ہوا...؟"

"کیا مطلب؟ وہ تجھے پیدل لے جائیں گے؟" محسن بولا۔

"نہیں، ریلوے اسٹیشن کے پیچھے دوسری جانب جہاں ہمارا ٹھکانا تھا، وہ ادھر سے بھی آ سکتے ہیں اور جا سکتے ہیں۔ کالے پُل کی طرف سے جہاں مال اُتارا جاتا ہے، ادھر سے ٹرک اندر آ جاتے ہیں تو گاڑی بھی آ سکتی ہے۔ وہ مجھے ریلوے لائن عبور کرا کے لے جائیں اور تو ادھر کار پارکنگ ایریا میں جھک مارتا رہ جائے۔"

"اچھا یہ بھی رات کو ہی طے کریں گے۔" محسن بولا۔

رات تک کچھ بھی نہیں ہوا۔ ہم نے وقفے وقفے سے راجا کی آواز سُنی۔ وہ اپنا کام پیشہ ورانہ مہارت کے ساتھ سر انجام دے رہا تھا۔ رات کا اندھیرا پھیلا تو ہمارا بھی چھت پر کوئی کام نہ رہا۔ کیوں کہ اب ہم گلی میں دور سے آنے والے کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔

نیچے عجیب بے سر و سامانی اور خانہ ویرانی تھی۔ وہ مکان سچ مُچ کا آسیب زدہ نظر آنے لگا تھا۔ اور یہ صرف اسی وجہ سے تھا کہ گھر سے گھر کی رونق چھِن گئی تھی۔ نازو اور موہنی کی عدم موجودگی نے ہمیں گھر کے اندر بے گھر ہونے کے احساس کی اذیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ عورت کے وجود سے گھر کی تکمیل ہوتی ہے اور اس کی فضا میں حسنِ سلیقہ اور تہذیب آتی ہے۔ وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ۔ اس وجود کا رشتے سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ ماں بہن یا بیٹی بھی ہو سکتی ہے جو ایک گھر میں رہنے والوں کے درمیان جذباتی رشتوں کو استحکام عطا کرتی ہے۔ گھر میں سکون و راحت کا اہتمام کرتی ہے اور اسے سرائے سے مختلف بناتی ہے۔ ایک ایسا حصار جس میں داخل ہو کے آدمی کو تحفظ کا احساس ملتا ہے اور اپنائیت کی خوشبو ملتی ہے۔

یہ خلش سب کے دل میں نوکِ خار کی طرح باعثِ آزار بنی ہوئی تھی کہ نازو اور موہنی ہماری ذرا سی غفلت کا شکار ہوئیں، ہم نے ان کی حفاظت کے لیے کچھ نہیں کیا اور مطمئن ہو گئے کہ

وہ اپنی خود محافظ ہیں۔ ہر حادثے اور ہر ناگہانی اُفتاد کا یہ احساس فطری ہے۔ ذہن میں آنے والا ہر خیال ... ہے۔ کہ کاش ایسا نہ کیا ہوتا۔ یا ایسا کیا ہوتا۔

یہ اب انھیں ساتھ لے جانے والوں کی ... ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔ اس سے پہلے وہ ... ساتھ جو کچھ کر چکے تھے وہ ہم بھولے نہیں تھے۔ اب ... کی مدد خدا کرے۔ کہیں انھوں نے...

"یارو... کچھ کہو۔ کچھ بولو۔" غالب نے کہا۔ "... رات باقی ہے۔"

"کہنے سننے کو کچھ بھی تو نہیں۔" میں نے کہا۔

"کیا ہم اس ویرانے میں اس فرشِ خاک پر ... بیٹھے ہوئے بدروحیں نظر نہیں آتے؟" شیخ بولا۔

"کم سے کم روشنی ہی کر دو۔" غالب بولا۔

"روشنی تو ہے۔ ایک بلب سے چراغاں تو نہیں ..." محسن نے کہا۔

"قصہ باغ و بہار کے چار درویش کچھ ایسے ہی ... ملے ہوں گے۔" غالب نے کہا۔ "انھیں بھی رات کاٹنا ..."

"اگر یہ حادثہ نہ ہوتا تو اب تک ہم اس گھر ..." میں نے کہا۔ "تھوڑا بہت سنبھال لیتے۔ کچھ سامان لے ... چولھا جلتا۔"

"اور ہر گھر کی طرح..." محسن بولا۔

"ہمارے اپنے پرانے بچپن کے گھروں کی طرح۔" میں ... کی بات کاٹ دی۔ "شبِ برات کا حلوا پکانے کی ... مہک گھر میں بھر جاتی۔ جو کام ہم پانچ مرد نہیں کر سکے ... عورت کر لیتی۔"

"ہم استاد ٹیڈی کی روح کو ایصالِ ثواب کے ... دیتے۔" محسن بولا۔

"اس کے لیے حلوا کیا ضروری ہے۔ آؤ اس کو ... اور اس کی مغفرت مانگیں۔" میں نے کہا۔ "وہ ہم میں سے ... اب نہیں ہے۔"

"اگلی شبِ برات پر ہم سب ہوں، یہ دُعا کریں ..."

دُعا کے بعد ہم سب چُپ؛ اداس اور مایوس بیٹھے ... رسمِ دنیا ہے کہ کسی کے سوگ میں ایک منٹ کے لیے ... اختیار کی جاتی ہے۔ ہم نے رسماً کچھ نہیں کیا مگر یہ خاموشی ... اسی کی یاد میں تھی۔ پھر ان سب کی یاد میں تھی جو ہمارے ... تھے۔ خون کے رشتوں سے یا خلوص کے رشتوں سے ... دم تک راہِ وفا میں ثابت قدم رہے۔ اَن گنت چہرے ... جو تصور کے پردے پر اُبھرے۔ ایک بار میں بچپن میں ...

قبرستان گیا تھا۔ وہ بھی شبِ برات تھی۔ لوگ قبروں کے ساتھ قبرستان گیا تھا۔ چاروں طرف بیٹھے تلاوت کر رہے تھے۔ موم سرہانے اور چاروں طرف بیٹھے تلاوت کر رہے تھے۔ موم بتیاں جلا رہے تھے اور اگر بتیاں سُلگا رہے تھے۔ ابا نے کہا تھا کہ آج کی رات روحیں عالمِ بالا سے لوٹ کر آتی ہیں اور دیکھتی ہیں کہ ان کی یاد کس کس کے دل میں ہے اور یہ بھی دیکھتی ہیں کہ ان میں سے کون کون آئندہ سال بھلا دیے جانے والوں میں شامل ہوگا۔ آج مجھے پھر یوں لگا جیسے میں کسی قبرستان میں موجود ہوں اور میرے گرد روحوں کا اجتماع ہے اور عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے۔

ہمارے اس مراقبے کو دروازے پر راجا کی دستک نے ختم کیا۔ دستک کے ساتھ ہی سب اچھل کے کھڑے ہو گئے تھے اور ایک ہی چابی سے چلنے والے کھلونوں کی طرح سب نے ریوالور بھی نکال لیے تھے۔ پھر راجا کی آواز آئی۔

"ارے بابا کھولو۔ کیا بھوت بن چکے ہو سب؟"

"بھوتنی کے۔" محسن نے دروازہ کھول کے کہا۔ "تیری آواز کو کیا ہوا؟"

وہ ایک دم اندر آ گیا۔ "یار... وہ آ گیا۔"

"کون... کوئی ٹرک لینے آ گیا؟" میں نے کہا۔

راجا نے اقرار میں سر ہلایا۔ "وہ پہیہ بدل رہا تھا جب میں گزرا۔ ابھی دو چار منٹ پہلے۔ میں نے اور کچھ نہیں دیکھا کہ کون تھا اور کیسا تھا۔"

"چلو تو پھر تم جاؤ۔ تم اور شیخ۔" میں نے کہا۔

"اسی حلیے میں؟"

"حلیے کی بات نہیں۔" میں نے کہا۔ "جیسے ہی وہ ٹرک اسٹارٹ کرنے لگے، اسے قابو کر لو۔" میں نے کہا۔ "اگر اس کا کوئی ساتھی آس پاس چھُپا ہوا ہوگا تو ضرور سامنے آئے گا۔ اس سے تو نہ اُمنٹ لینا اور چڑھ جانا اور پھر اللہ کا نام لے کر۔"

"یعنی سُولی پر۔ رام بھلی کریں گے۔ یہی مطلب ہے نا تمھارا؟" راجا نے کہا۔

"یار، یہ شیخ بہت زبردست پولیس والا ہے۔ یہ ایکشن فلم ڈائریکٹ کرے گا۔" محسن بولا۔ "تم اس کی ہدایات پر عمل کرنا اور بجائے اس کے کہ وہ تمھیں کہیں اپنی مرضی سے لے جائے، تم اس کو وہیں لے جانا جہاں اسے جانا تھا۔ یا کم سے کم وہ جگہ دیکھ لینا اور پھر لوٹ آنا۔ ٹرک اور ڈرائیور سمیت۔ غالب یہیں رہے گا۔"

"اجازت ہو تو چھت پر جا کے لیٹ جاؤں؟" وہ بولا۔ "نیچے کیا بھوتوں سے ڈر لگتا ہے؟"

"وہ بھی ہے۔ دراصل بھوتوں کی میں نے بہت دل آزاری

کی ہے۔ انھیں کبھی تسلیم نہیں کیا۔ اسرائیل کی طرح۔ آج اگر وہ سامنے آ کے خود کو تسلیم کرانے پر تُل گئے، تو ظاہر ہے صبح تک میں خود ان کے قبیلے میں شامل ہو جاؤں گا۔ مزید یہ کہ آسمان روشن ہے۔ میں صبح یا واپسی پر آپ لوگوں کو بتا سکوں گا کہ رات تاروں کا ٹوٹنا کیا تھا۔"

"تم آزاد اور خود مختار ہو۔ آج کی رات بھوتوں سے لڑو یا گپ لڑاؤ۔ اختر شماری کرو یا آہ و زاری۔" میں نے کہا۔ "ہم سب تو جا رہے ہیں کام سے۔"

"... ہم بھی آدمی تھے کام کے۔" غالب آہ بھر کے بولا۔

راجا اور شیخ تو فوراً چلے گئے۔ میں اور محسن کچھ دیر بعد روانہ ہوئے۔ ہم دونوں نے احتیاطاً دو دو ریوالور رکھے تھے کہ ایک جامہ تلاشی میں فوراً برآمد ہو جائے تو شاید دوسرا کام آ جائے۔ اگرچہ اس کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا، پھر بھی دل کے خوش رکھنے کو ہر خیال اچھا تھا۔

"خوش فہمی کا فائدہ کوئی نہیں۔" محسن نے کہا۔ "وہ نئے شکاری نہیں ہیں کہ دھوکا کھا جائیں۔ ہر صورت میں وہ ہمیں پہچان لیں گے۔"

"صورت بدلنے کی بھی ضرورت نہیں۔ انھوں نے کب کہا ہے کہ میک اَپ کر کے آنا۔" میں نے تسلیم کیا۔ "اصل مسئلہ وہی ہے کہ تو مجھ پر کیسے نظر رکھے گا۔"

"لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔" محسن بولا۔ "یہ فارمولا کیسا رہے گا؟"

"میں ناقص العقل کچھ سمجھا نہیں آپ کی بات۔"

"کیوں نہ میں قلی نمبر تین سو چار بن جاؤں۔"

"ایک ضابطۂ فوجداری کی دفعہ قتل تو دوسری غیر ارادی قتل؛ مجھے یہ فارمولا پسند آیا نورِ چشم۔ آخر تم ہو کس کے شاگرد۔"

"خدا کا شکر ہے کہ آپ کا نہیں۔" وہ بولا۔ "اب میں آگے چلتا ہوں۔ کسی قلی سے معاملہ تو کرنا پڑے گا نا۔"

"کیوں نہ پہلے آخری طعام کر لیں؟" میں نے کہا۔ "جو ہم کئی بار کر چکے ہیں۔"

اسٹیشن کے باہر ایک پُر ہجوم ایرانی ہوٹل کے فیملی روم میں بیٹھ کے ہم نے "انڈا کری" اور "فش مسالہ" طلب کیا اور پھر اسے کھانے پر بھی مجبور ہوئے کیونکہ پیٹ میں ایندھن بھرنا ضروری تھا۔ کیا معلوم آگے سوپیا زاد رسوجتے کھانے پڑیں اور روز کھانے پڑیں۔ چائے اور سگریٹ پی کے ہم گویا اپنے مشن پر جانے کے لیے تیار ہو گئے۔

محسن نے مجھے آدھا گھنٹا بعد آنے کو کہا تھا۔ میں نے وہ آدھا گھنٹا چائے کے کپ کو گھورتے گزارا۔ چائے درحقیقت

"دودھ پتی" تھی چنانچہ اس کی سطح پر ایک جھلّی سی بننے لگی پھر اس میں جھرّیاں پڑنے لگیں۔ اس میں دو مکھیاں ڈوب کے مریں۔ میرا سگریٹ کا پیکٹ خالی ہو گیا۔ ساتھ والے کیبن میں سچ مچ ایک "فیملی" آ گئی جس میں صرف دو ارکان تھے۔ ایک "خریدار" قسم کا شوہر اور دوسری برائے فروخت قسم کی "بیوی"۔ ان کے مکالمے مجھے صاف سنائی دے رہے تھے جو اتنے ہیجان انگیز تھے کہ مجھے اٹھنا پڑا۔

میں ٹہلتا ہوا ریلوے اسٹیشن کی طرف گیا۔ اس کے پہلے حصّے میں درجہ سوم یعنی تھرڈ کلاس مسافروں کے لیے ٹکٹ گھر اور ویٹنگ روم وغیرہ تھے۔ اس حصّے کو دیکھ کر آدمی کی بے بسی کا شدّت سے احساس ہوتا تھا کہ وہ اُڑ نہیں سکتا۔ اُڑ سکتا تو ریلوے کا محتاج کیوں ہوتا اور ریلوے اس کے ساتھ ایسا سلوک کیوں کرتی جیسے وہ سفر کے لیے ٹکٹ خرید کر خوار ہونے آیا ہو۔

دوسرے حصّے کے حالات قدرے بہتر تھے جہاں کاریں صف بستہ تھیں اور پولیس والے ٹیکسی ڈرائیوروں سے بھتا وصول کرنے میں بے حد مستعد تھے۔ نتیجہ یہ کہ ٹیکسی والے مسافروں کو لوٹنے میں بے حد مستعدی دکھا رہے تھے اور یہ بھی مجبوری کی بات تھی۔ جو اپنی کاروں کے مالک تھے انھیں کون لوٹ سکتا تھا۔ وہ تو خود عموماً لوٹنے والوں میں سے ہی ہوتے تھے۔

محسن نے بالکل میرے پیچھے آ کے بدلی ہوئی آواز میں کہا۔ "خیبر میل صاب؟" جو بڑا مناسب سوال تھا اور ہر قلی کرتا تھا۔ مطلب اس کا کچھ یوں نکلتا تھا کہ خیبر میل جانے کے لیے تیار ہے مگر آپ کو برتھ یا سیٹ نہیں ملی ہے۔ کیوں کہ قطار میں لگ کے ڈسپلن کا مظاہرہ کرنے والوں کو برتھ سیٹ کبھی نہیں ملتی۔ تو پروا نہیں، آیئے ہم آپ کا مسئلہ حل کرتے ہیں۔ ریزرویشن کا ایک متبادل اور متوازی نظام قلی چلاتے ہیں جو زیادہ فعال اور بہتر ہوتا ہے۔

میں نے پلٹ کر دیکھے بغیر کہا "نہیں... مجھے نہیں جانا۔"

"نہیں کیسے۔ تمھارا تو باپ بھی جائے گا خیبر میل پر۔"

پھر میں نے گھوم کے دیکھا۔ محسن قلی کی مکمل وردی میں تھا اور آسانی سے شناخت نہیں کیا جا سکتا تھا۔

"میرا نمبر ہے دو سو تین۔" وہ بولا اور واپس چلا گیا۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے کوئی بھی قلی کسی مسافر نظر آنے والے شخص کے پاس اپنا سوال لے کر جائے اور جواب پر اپنا منہ لے کر لوٹ جائے۔

مگر تین سو دو کے بجائے دو سو تین کا ہندسہ میری زندگی میں ایٹم بم کے دوسرے دھماکے کی طرح گونجا۔ میری زندگی کا رخ بدل کے مجھے آلام و مصائب کی اس راہ پر ڈالنے کے ذمّے دار یہی دو ہندسے تھے۔ اس کہانی کا آغاز اسی طرح ہوا تھا کہ میں کمرا نمبر دو سو تین میں جانے کے بجائے تین سو دو میں [illegible] گیا تھا۔ یہ بہت پرانی بات تھی جب میں انگلینڈ میں تھا جہاں مجھے فوما نجو نام کے ایک مخلص انسان نے [illegible] خطرے کا سگنل دیا تھا اور مجھے میری بے خبری پر طعون [illegible] کیا تھا۔

قلی نمبر تین سو دو کا انتخاب تو ایک خاص مقصد کے لیے کیا گیا تھا اور ممکن ہے یہ نمبر بھی ایک وارننگ کا درجہ رکھتا ہو کہ ہمارے ساتھ ہوشیاری مت برتنا ورنہ نتیجہ تم [illegible] گا۔ تمھارا، ناز وادر موہنی کا۔ یا سب کا۔ مگر یہ قدرت کی [illegible] ستم ظریفی تھی کہ محسن کو جس قلی کی وردی ملی اس کا نمبر [illegible] تین تھا۔

پلیٹ فارم پر ریڈ شرٹ والے درجنوں افراد سامان اٹھائے پھر رہے تھے یا ٹولیوں کی شکل میں فارغ [illegible] کھڑے تھے۔ میں سب کے نمبر خاموشی سے دیکھتا گیا۔ مجھے کوئی [illegible] نہیں تھی اور ملاقات کا کوئی وقت طے نہیں تھا چنانچہ میں کسی کی مدد کے بغیر بھی اسے تلاش کر سکتا تھا۔

آدھے گھنٹے بعد جب خیبر میل جا چکی تھی اور پلیٹ فارم خالی ہو چکا تھا، میں اپنی تلاش میں ناکام تھا۔ میں نے ان گنت نمبر پڑھے تھے جو ہر قلی کی آستین پر پیتل کے بیج کی صورت میں اور قمیص کے پیچھے کالے رنگ سے لکھے ہوئے تھے۔ بعض نمبر میں نے کئی بار دیکھے اور کئی بار مجھ سے وہ سوال بھی پوچھا گیا جو ہر پریشان حال اور مخبوط الحواس نظر آنے والے سے پوچھا جا رہا تھا جیسے جگہ درکار تھی۔

بالآخر میں نے ایک بینچ پر دراز قلی سے رجوع کیا جو بڑی فراغت سے لیٹا ہوا بیڑی پی رہا تھا۔ میں نے اپنا سوال دوسری بار دہرایا۔ تیسری مرتبہ چلّا کے پوچھا۔ اس پر ایک اور قلی نمودار ہوا۔

"یہ تو ڈورا ہے جی۔ کیا بات ہے؟" وہ بولا۔

"مجھے معلوم یہ کرنا تھا بھائی کہ قلی نمبر تین سو دو کہاں ہے؟"

"تین سو دو؟ کیا کام ہے؟" وہ ایک دم محتاط ہو گیا۔

"کام تمھیں کیا بتاؤں۔" میں نے کہا۔

"آپ کا... کوئی سامان شامان گواچ گیا ہے؟"

"نہیں بھائی۔ سامان ہے کہاں جو گم ہو۔" میں نے کہا۔ "مجھے اس سے ملنا تھا۔"

"کیا نام ہے اس کا؟" وہ بولا۔

"نام... تو مجھے معلوم نہیں۔" میں نے کہا۔

وہ پھر شکوک میں مبتلا ہو گیا۔ اسے یقین آنے لگا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ حقیقت یہی ہو گی کہ وہ میرا سوٹ کیس وغیرہ لے کر بھیڑ میں کھو گیا ہو گا۔ مجھے صرف نمبر یاد ہے اور میں اسے پکڑوانے کی فکر میں ہوں۔

"ایسے بتا نہیں چلتا جی۔" وہ رکھائی سے جواب دے کر چلتا بنا۔

یہ مسئلہ کئی بار پیدا ہوا۔ بالکل اسی طرح ہر قلی نے اپنے ساتھی قلی کو بچانے کے لیے مجھ سے تعاون نہیں کیا۔ میں پریشان ہو گیا۔ آخر میں اسے کہاں تلاش کروں جب کہ کوئی اس کا پتا بتانے پر تیار نہیں اور میرے پاس کوئی ایسا آلہ نہیں کہ اسے خود ڈھونڈ نکالوں۔

اپنا مسئلہ میں نے قلی نمبر دو سو تین کے سامنے بھی رکھا جس نے مجھے کنگ رابرٹ بروس اور مکڑی ..... والی کہانی کے حوالے سے "ٹرائی ٹرائی اگین" کہا اور ایک شعر سنا کے چل پڑا۔ ظاہر ہے اسے میں گالی دینے کے سوا کیا کر سکتا تھا۔

اللہ نے میری شکل ایک ٹکٹ کلکٹر قسم کا فرشتہ بھیج کے آسان کی۔ اس نے میرے سوال کے جواب میں پیک کو مہارت سے منہ میں گھماتے ہوئے کہا۔

"میاں، وہ ادھر ہو گا۔ اس کی بات کر رہے ہو نا بڈھے کی۔ کیا بھلا سا نام ہے اس کا۔ ہاں، چاچو کی۔"

"بالکل جناب... چاچو سے ہی ملنا ہے مجھے۔ لیکن ادھر کا مطلب ذرا واضح کر دیں۔"

بزرگ نظر آنے والے اور منہ کو پان چھالیہ وغیرہ پیسنے کی مشین کے طور پر استعمال کرنے والے فرشتے نے کہا۔ "ادھر پیچھے بیڑی روم ہے، وہاں لیٹا ہو گا۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے کل سے۔"

"پھر یہ کیا بات ہے کہ اس کے ساتھی قلی بھی اس کے بارے میں کچھ بتانے کو تیار نہیں ہیں؟"

"وہ... بس میاں، آدمی ایسا ہی ہے وہ سب سے الگ اور کچھ پاگل، اور پُراسرار۔"

"پُراسرار قلی؟"

"ہاں... یہ جو نمبر ہے نا اس کا۔ بس یوں سمجھو کہ ٹھیک ہی ملا ہے اسے۔ کہتے ہیں خود ٹھیکیدار نے دیا تھا یا اس نے لیا تھا اپنی مرضی سے کیوں کہ وہ قتل کی چودہ سال جیل کاٹ چکا ہے۔" وہ بولے اور پھر پیک اگلنے کے لیے پلیٹ فارم کے کنارے کی طرف لپکے کیوں کہ اب پیک کا سمندر ان کے کوزۂ لب سے چھلکنے کو تھا۔

میں نے بیڑی روم تلاش کیا اور سیدھا اندر چلا گیا۔ اندر کوئی بھی نہیں تھا۔ مختلف قسم کے کاٹھ کباڑ فرنیچر اور دیگر اسباب کے پیچھے ایک اور دروازہ نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس میں بھی جھانک لینا مناسب سمجھا۔

اندر ایک بینچ لگی ہوئی تھی جس پر کوئی کروٹ لیے سو رہا تھا۔ اس کا چہرہ بینچ کی پشت کی جانب تھا۔ میں ٹھٹک کے رُکا۔ میں نے اسے متوجہ کرنے کے لیے کھنکھارا۔ پھر کھانس کے دیکھا۔ پھر اسے باقاعدہ "چاچو" کہہ کے مخاطب کیا مگر وہ نیند میں تھا۔ کیا اسے علم نہیں تھا کہ سکندرِ اعظم آج اسے تلاش کرتا ہوا آئے گا، میں نے سوچا اور آگے بڑھ کے اسے تھوڑا سا ہلایا۔

وہ بینچ کے بالکل کنارے پر تھا میرے ہلاتے ہی وہ نیچے گر گیا اور میں بے اختیار پیچھے ہٹا کیوں کہ اس کا گرنا کسی زندہ انسان کے گرنے سے بالکل مختلف تھا وہ ایک لاش کی طرح گرا تھا۔ اس نے سنبھلنے کی کوشش میں ہاتھ پیر تک نہیں ہلائے تھے۔ ایک خنجر اس کے پہلو میں پیوست تھا اور اس میں کوئی شک کی بات نہیں تھی کہ وہ مر چکا تھا لیکن اسے مرے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ اس کا جسم جب میں نے چھوا تو گرم تھا۔ شاید انھی میں سے اسے کوئی مار گیا تھا جن سے میں اس کے بارے میں پوچھتا پھر رہا تھا۔

میں نے ایک دم پلٹ کے بھاگنے کا سوچا لیکن اتنی دیر میں کوئی اندر آ گیا تھا۔ یہ کوئی ریلوے کا ملازم تھا۔

"تم... کون ہو تم۔ یہاں کیا کر رہے ہو؟" وہ بولا پھر اس کی نظر نیچے پڑی ہوئی لاش پر گئی۔ "یہ... یہ کیا ہوا۔ تم نے مار دیا اسے۔ قتل کر دیا!"

"سنو۔ چلاّؤ نہیں۔ میں نے نہیں مارا اسے۔"

"پھر کس نے مارا ہے... خون... خون... ارے پکڑو اسے کوئی۔" وہ دروازے میں کھڑا ہو کے چیخنے لگا۔ چند سیکنڈ میں اس نے میرے لیے وضاحت اور فرار دونوں کو ناممکن بنا دیا۔ دروازے کے سامنے ایک مجمع لگ گیا۔ پھر ریلوے پولیس آ گئی۔ مجھے باقاعدہ گرفتار کر لیا گیا۔

میں نے کسی قسم کی مزاحمت نہیں کی اور اس بات پر خدا کا شکر بھی ادا کیا کہ پبلک نے قانون کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے خود مجھے سزا دینے کے مروّجہ طریقے پر عمل نہیں کیا۔ نہ جانے کیوں، مجھے پریشانی نہیں ہوئی۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے یہ سب طے شدہ تھا اور یہ سب ڈراما ہے۔ قلی نمبر تین سو دو کچھ بھی نہیں تھا۔ فقط ایک نمبر تھا۔ جیسے سٹے کا نمبر یا ہوٹل کے کمرے کا نمبر۔ میں اس سے زندگی میں نہیں مل سکتا تھا۔ دستِ قضا نے اس کا انتخاب کر لیا تھا اور یہ نمبر قاتلوں کو فراہم کر دیا تھا۔ انھوں نے یہ نمبر مجھے دے دیا اور اب میں اس نمبر کی بدولت قتل کے جرم میں پکڑا

جاچکا تھا لیکن یہ سب مجھے بحفاظت لے جانے کا انتظام تھا اور اس لیے کیا گیا تھا کہ میری مدد کرنے والے مداخلت نہ کرسکیں۔ یہاں سے مجھے وہیں پہنچا دیا جائے گا جہاں نازو اور موہنی ہیں۔ یا تو پولیس کو خریدا جاچکا ہے یا پھر یہ پولیس بھی انہی کی ہے۔ لوگ تو صرف وردی دیکھتے ہیں۔ اب بظاہر وہ مجھے تھانے لے جارہے تھے مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ انھوں نے لاش چھوڑ دی تھی۔

پولیس جب کہیں قتل کی واردات کے بعد تفتیش کے لیے جاتی ہے تو یہ طریقہ اختیار نہیں کرتی، صرف ملزم کو لے جائے اور باقی معاملات خدا کے سپرد کر جائے۔ وہ جائے واردات کا نقشہ بناتے ہیں، سراغ تلاش کرتے ہیں اور فنگر پرنٹ وغیرہ حاصل کرنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں، سب کے بیانات لے کر کسی نہ کسی کو مشتبہ افراد میں شامل بھی ضرور کرتے ہیں اور لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے ضرور بھجواتے ہیں۔

یہاں یہ سب نہیں ہوا تھا۔ دوسروں نے اس کوتاہی کو نوٹ کیا تھا یا نہیں، میں بہرحال سمجھ گیا تھا کہ اصل مقصد تو مجھے یہاں سے نکال کر لے جانا ہے اور یہی ہوا۔ ابھی ماسٹیشن سے باہر آتے ہی مجھے تھانے پہنچانے کے لیے گاڑی لائی گئی۔ مجھے ہتھکڑی تو لگائی گئی تھی جو اصلی تھی مگر اس کا مقصد غالباً مجھے ہاتھوں کے استعمال سے روکنا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ میرے ہاتھ ان کی گورنا شاہی بندوق سے زیادہ ہلاکت خیز ہیں۔

لیکن گاڑی اصلی پولیس کی گاڑی نہیں تھی۔ مجھے اسی سلیٹی رنگ کی ٹویوٹا کرونا میں بٹھا دیا گیا جسے میں اچھی طرح پہچانتا تھا۔ میرے ساتھ باہر تک آنے والے دونوں پولیس مین وہیں سے رخصت ہوگئے۔ غالباً ان کا انعام انھیں پہلے ہی دیا جاچکا تھا یا حسابِ دوستاں در دل والی بات تھی کہ بندہ مل گیا تو انعام بھی ضرور ملے گا مگر شرط یہ ہے کہ گڑبڑ کوئی نہ ہو۔

گڑبڑ کوئی نہیں ہوئی تھی۔ ممکن ہے وہ واپس چلے گئے ہوں اور لاش کو اٹھوا کر مردہ خانے پہنچا دیا گیا ہو۔ لاوارث قرار دے کر کیس درج کیے بغیر فائل ہو جاتے۔ پبلک کے سامنے تو قانون نے اپنا کردار صحیح ادا کیا تھا۔

اب میں دو افراد کے درمیان بیٹھا ہوا تھا جو میرے لیے اجنبی تھے۔ ان کے چہرے سخت اور مکروہ تھے اور وہ بڑے بدمعاش نظر آنے کی اچھی کوشش کر رہے تھے اور ڈرائیور کا چہرہ میں نے ابھی تک نہیں دیکھا تھا لیکن اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص کو پہچان کے میرا خون پھر اُبلنے لگا

تھا کیوں کہ جتنی نفرت میں اس ایک شخص سے کرتا کسی اور سے نہیں کرتا تھا۔ یہ میرے لیے دنیا میں شیطان کا مادی روپ تھا اور مجھ پر دنیا کے سارے عذاب ... ذات سے شروع ہوئے تھے۔ یہ استاد پیڈرو تھا۔

خلافِ معمول وہ چپ تھا۔ اس نے مجھے گالیاں دیں، ذلیل نہیں کیا اور مارا پیٹا نہیں۔ اس نے صرف ایک ... پلٹ کے مجھے دیکھا تو میں نے اس کی آنکھوں میں ... اور نفرت کی آگ دیکھی، اور بڑی مشکل سے اس پر ... خواہش پر قابو پایا۔ میں بہت بے بس تھا اور منزل تک ... سے پہلے ہی قتل ہونا نہیں چاہتا تھا۔ میرے سامنے ... طور پر ایک مشن تھا۔ نازو اور موہنی کو چھڑانے کا ... کرسکوں گا یا نہیں اور کیا تو کیسے کروں گا اس بارے میں ... تک میرے ذہن نے کوئی لائحہ عمل مرتب نہیں کیا تھا۔

پھر بھی میں چپ نہ رہ سکا۔ میں نے کہا "آج گتا ... نہیں رہا ہے؟"

پیڈرو نے میری طرف دیکھا تک نہیں۔

"ہائے، کیا مجبوری ہے" میں نے کہا "جس مالک کی خوشی کے لیے خود گتا دم ہلاتا پھرتا ہے وہی اسے زبان بھی ... مرضی سے نہیں ہلانے دیتا۔"

اب پیڈرو نے تڑپ کے مجھے دیکھا۔

"اگر تم چپ کر کے بیٹھو تو تمہارے اور ہمارے حق میں بہتر ہوگا۔" کار چلانے والے نے کہا "بلاوجہ کی مارپیٹ یا کسی قسم کا خون خرابا ہمارے پروگرام میں شامل نہیں ہے لیکن اشتعال انگیزی کروگے تو معاملہ میرے بس کا بھی نہیں رہے گا۔"

اس کا پُراعتماد انداز ظاہر کرتا تھا کہ وہ حکم دینے والوں میں شامل ہے، تعمیلِ حکم کرنے والوں میں نہیں۔

"تم مجھے کہاں لے جارہے ہو؟"

"ابھی کچھ دیر میں تم خود ہی جان لوگے۔" وہ بولا۔

"کم سے کم راستہ تو بتاتے جاؤ۔ میں ایک اجنبی ہوں۔"

"سڑکوں کے نام جان کے کیا کروگے۔ اور اجنبی ... کیسے رکھوگے؟ میں سڑکوں کے نام ایجاد بھی کرسکتا ہوں۔"

"تم اپنا باپ ایجاد کرسکتے ہو۔" میں نے کہا "میں مانتا ہوں مگر تمھیں جانتا نہیں۔ کیا ہم پہلے کبھی ملے ہیں؟ نہیں بتاتے؟ چلو مت بتاؤ۔ یہ تو بتادو کہ کیا تم قتل کردوگے مجھے، خیر کردو۔ شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن۔"

"تم اکیلے کیوں آئے ہو؟"

"ہر شخص دنیا میں اکیلا ہی آتا ہے۔ تمھارے ساتھ ...

آیا تھا؟"

وہ خاموش رہا۔

"یہ جو ہمارے ساتھ بیٹھا ہے نا، یہ اکیلا نہیں آیا تھا دنیا میں۔ اس کے ساتھ شیطان بھی تھا۔ اس کے اندر۔" میں نے کہا۔

اس بار پیڈرو نے ہاتھ گھمایا مگر میں نے سر نیچے کرلیا۔ مکا میرے ساتھ والے کے لگا۔ اس نے یا اس کے ساتھی نے میرے سر پر کوئی چیز دے ماری۔ غالباً ریوالور کا بٹ۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی اور ناکام رہا۔ وار اتنا سخت تھا کہ میں ایک دم تاریکی اور خاموشی کے سمندر میں ڈوب گیا۔

دوبارہ آنکھ کھول کر دیکھنے پر مجھے ایک بیڈ روم دکھائی دیا۔ بیڈ پر میں لیٹا ہوا تھا اور میرے آس پاس کوئی بھی نہیں تھا۔ منظر جو پہلے دھندلا تھا آہستہ آہستہ صاف ہوتا گیا۔ مجھے دوسرا اسباب نظر آیا جس میں وارڈ روب، ڈریسنگ ٹیبل، قالین اور پردے سب شامل تھے۔ ہر چیز نئی اور قیمتی تھی لیکن سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ تھی کہ میرے ہاتھ آزاد تھے۔

اپنے سامنے مجھے ایک کلاک دکھائی دیا جو رکا ہوا تھا یا روک دیا گیا تھا۔ اس کی سوئیاں منطبق ہو کے بارہ بجا رہی تھیں، چاروں دیواروں پر روشن فینسی لائٹس سے یہ پتا ضرور چلتا تھا کہ ابھی رات باقی ہے۔ میرے ہاتھ کی کلائی کی گھڑی بھی جامہ تلاشی میں اتار لی گئی تھی۔ دونوں ریوالور تو ظاہر ہے پہلے نکالے گئے ہوں گے۔

حساب کتاب کچھ غلط ہو گیا تھا۔ محسن شاید میرے تعاقب میں نہیں آسکا تھا۔ یا آیا تھا تو معلوم نہیں اس کے ساتھ کیا ہوا۔ وہ جگہ دیکھ کے لوٹ گیا۔ پکڑا گیا یا واپس کردیا گیا، مگر واپس کرنے کا کیا سوال جب کہ اسے بھی میرے ساتھ ہی بلایا گیا تھا۔

میرے سر میں شدید درد تھا۔ یہ چوٹ کا اثر تھا۔ میں آہستہ سے بیڈ پر سے اترا اور ایک دروازے کی طرف بڑھا۔ یہ دروازہ باہر سے مقفل تھا۔ دوسرا دروازہ بھی مجھے مقفل ملا۔ تیسرا دروازہ باتھ روم میں کھل گیا۔ اس میں تولیہ، صابن اور ضرورت کا سارا سامان تھا۔ معلوم نہیں وہاں کس کے کپڑے لٹکے ہوئے تھے مگر ایک زنانہ جوڑے پر مجھے شبہ ہوا کہ وہ موہنی کا ہے۔ ابھی تک میں نے کہیں سے کوئی آواز نہیں سنی تھی۔ اپنی حالت درست کرنے کے لیے میں نے غسل کا فیصلہ کیا۔ جب میں باہر ڈریسنگ ٹیبل میں خود کو دیکھ کر بال بنا رہا تھا تو میرے پیچھے والا دروازہ کھلا اور چوہدری دلاور ایک دم اندر آگیا۔

"خیر سے میک اپ ہو رہا ہے۔ اپنے سکندر صاحب۔" وہ خوش اخلاقی سے بولا۔ "میں جی!"

"نہیں، میں ویسے ہی بہت ہینڈسم ہوں۔" میں نے کہا۔ "بس سوچا کہ موقع ہے تو غسل کرلوں۔ تم لوگوں کا کیا بھروسا جو غسل کے بغیر تجہیز و تکفین کردو۔ ویسے شہید کو ضرورت تو نہیں ہوتی۔"

"یار اپنے سکندر صاحب! تم ذرا نہیں بدلے، ویسے ہی جوکر ہو۔" وہ بولا۔

"تمھاری صورت اب سُور سے زیادہ ملنے لگی ہے۔" میں نے کہا۔ "اور باپ بیٹے کی صورت میں مشابہت تو فطری بات ہے۔"

"کمال ہے! ابھی تک تم نے کسی کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا حالاں کہ وہ۔ کیا نام ہے ان کا؟ ہاں، شیروانی صاحب۔ وہ تو بڑا اردلا ڈال رہے ہیں کہ لڑکیاں کہاں ہیں۔"

"اچھا۔ یعنی وہ لڑکیوں کے چکر میں پڑ گیا؟ حالاں کہ شادی ہوگئی ہے اس کی۔" میں نے کہا۔

"تم نہیں ملوگے ان سے۔" وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ "اپنی نازو سے اور مس موہنی سے۔ وہ کیا کہتے ہیں اپنے سکندر صاحب۔ تم ہو بڑے فنکار، کیا جادو کردیتے ہو لڑکیوں پر؟"

"انہی سے پوچھ لیتے، جہاں اتنی دوسری باتیں معلوم کرلی تھیں۔" میں نے کہا۔ "چوہدری دلاور! تمھارے ساتھ سب سے بڑی زیادتی نام کی ہے۔ فارسی میں کہتے ہیں ایک بات۔"

"ہاں، مجھے معلوم ہے... تم بتا چکے ہو پہلے بھی۔" وہ بولا "میرا نام بزدل خاں ہونا چاہیے تھا۔ تمھارے حساب سے تمھاری بہادری تو ثابت ہے۔ لیکن آج اور دیکھ لیتے ہیں۔"

میں اپنی ظاہری بے نیازی کا اور بے فکری کا انداز برقرار رکھنے کی کوشش میں پوری طرح کامیاب نہیں تھا اور ہوتا بھی کیسے، مجھے محسن، نازو اور موہنی تینوں کے بارے میں تشویش اندر سے کھا رہی تھی۔ دلاور کے ساتھ دوسرے کمرے کی طرف جاتے ہوئے مجھے موقع ملا تھا کہ میں آسانی سے اس کی گردن توڑ دیتا لیکن وہ جانتا تھا کہ میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں اور اس کے اعتماد کو دیکھتے ہوئے میں اندازہ کرسکتا تھا کہ آزاد ہونے کے باوجود میں کس حد تک اسیر ہوں۔

اس نے دوسرے کمرے کا دروازہ کھولا اور مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ اندر قدم رکھتے ہی مجھ پر بجلی سی گری جس نے مجھے مفلوج کردیا۔ چوہدری دلاور ہمیشہ ایسے شاک دینے کا عادی تھا۔ وہ کسی بھی صورتِ حال کو ڈرامائی رنگ دے کر ایک نفسیاتی برتری حاصل کرلیتا تھا۔

میرے بالکل سامنے ایک کرسی پر نواب خسرو جمشید بیٹھا ہوا مجھے گھور رہا تھا۔ پلک جھپکائے بغیر، وہ پلک

جھپکا بھی نہیں سکتا تھا کیوں کہ وہ زندہ نہیں تھا۔ کرسی پر اس کی لاش بیٹھی ہوئی تھی۔

دلاور کے قہقہے پر میں چونکا۔ "کیوں جی — اپنے سکندر صاحب آپ کے تو ہوش گم ہو گئے ہیں۔"

"تو تم نے اسے مار ہی دیا۔" میں نے کہا۔ "مجھے اسی کا ڈر تھا اور خود مرنے والا بھی جانتا تھا۔"

"کیا جانتا تھا۔" دلاور نے کہا۔ "یہی نا کہ غدار کی سزا موت کے سوا کچھ نہیں ہو سکتی۔ پھر اس نے ایسا کیوں کیا؟"

"یعنی مجھے میرا حق کیوں دیا؟" میں نے کہا۔ "حالاں کہ تم نہ پہلے اس جگہ کے مالک تھے اور نہ اب۔ جہاں تم اسپتال بنوا کے سیاسی فوائد حاصل کرنا چاہتے تھے۔"

"اس پر میرے سیاسی مستقبل کا انحصار تھا۔ اسے کیا حق حاصل تھا کہ وہ جگہ تمھیں دے؟"

"دلاور! یہ مت بھولو کہ تم نے وہ جگہ رہن رکھی تھی اور اس کے بدلے خسرو جمشید سے پیسہ لیا تھا....." میں نے کہا۔

"پیسہ اسے میں کسی بھی وقت دے سکتا تھا۔ اس نے کبھی مانگا ہی نہیں — کاروبار کے نفع نقصان میں ہم برابر کے شریک تھے مگر سیاست میں ایک داؤ میں نے لگایا تھا جو اس مارِ آستین کی وجہ سے میں ہارا۔" وہ اب مشتعل ہو رہا تھا۔

"ابھی ہارے تو نہیں ہو۔" میں نے کہا۔ "جو پیسہ تم خسرو جمشید کو دیتے، اب وہی پیسہ دوسری جگہ زمین خریدنے پر خرچ کر دو۔ اسپتال تو بن جائے گا، خواہ کہیں اور بنے۔"

"پوچھو اب اس سے کہ اسے کیا ملا میرا ساتھ چھوڑ کر۔ کیا تم اسے بچا سکے؟" وہ اشتعال میں بولتا گیا۔ "یہ بڑے محفوظ قلعے کے تہ خانے میں چھپا بیٹھا تھا۔ بڑا سخت پہرا تھا وہاں اور وہ دونوں لونڈے، اس نواب کی اولاد۔ وہ کیا سمجھتے تھے کہ ان کی مرضی کے بغیر پرندہ وہاں پر نہیں مار سکتا! میں نے انھیں بھی کتے کے پلّوں کی طرح مار دیا۔ میرے ہاتھ کتنے لمبے ہیں، یہ انھیں اندازہ نہیں تھا اپنے سکندر صاحب۔"

جیکی اور جونی مارے گئے! یہ اطلاع میرے لیے بڑی اندوہناک تھی۔ وہ نوجوان تھے، کھلنڈرے تھے، عیاش طبع امیر زادے تھے اور بڑے شوقین مزاج تھے۔ ان ساری خرابیوں میں مبتلا تھے جو دولت اور جوانی کے ایک ساتھ ہو جانے کا نتیجہ تھیں مگر وہ غدار اور وطن فروش نہیں تھے۔ وہ پاکبازی کا دعوا نہیں رکھتے تھے مگر دل میں وطن کے لیے محبت کا وہ جذبہ رکھتے تھے کہ وہ بے خطر آتشِ نمرود میں بھی کود پڑے۔ اگر وہ چاہتے تو آسانی سے مجھے شکاری کتوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتے اور میری خاطر کوئی خطرہ مول نہ لیتے لیکن ان جیالوں نے اس جنگ میں میرا ساتھ دیا اور جان کی بازی لگا دی۔

"شاید تمھیں یقین نہیں آ رہا ہو گا۔" دلاور بولا۔

"یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے دلاور۔" میں نے کہا۔ "جب گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کا رُخ کرتا ہے۔ خسرو جمشید کو اس کی موت وہاں لے گئی۔ جو ایک طرح سے اس کا اپنا ہی گھر تھا۔ اس میں تمھارے لمبے ہاتھوں کا نہیں اس عورت کا ہاتھ ہو گا جو خسرو جمشید کے باپ کی سوتیلی بہن تھی۔ جیکی اور جونی کی سوتیلی ماں۔ نواب سلطان کی بیوی جو پہلے صرف سیکرٹری یا داشتہ تھی اور جو بدقسمتی سے زیب النسا کی حقیقی ماں تھی۔"

"بہت وسیع معلومات ہیں تمھاری۔" دلاور نے کہا۔

"جب مجھے یہ بات معلوم ہوئی تھی کہ پیڈرو کا وہاں آنا جانا ہے اور وہ ایک صنعتی پلاٹ کی خریداری کے لیے سلطان محمد خاں پر دباؤ ڈال رہا ہے۔ تو میں سمجھ گیا تھا کہ اب اس گھر کی خیر نہیں۔ میں نے تو کہا تھا کہ اسے وہاں سے منتقل کر دو لیکن وقت کو کون ٹال سکتا ہے۔ اور پھر خسرو جمشید کے نامۂ اعمال میں مزید گناہوں کے اندراج کی گنجائش بھی تو نہیں رہی تھی۔ قدرت کو یہ بابِ گناہ بہرحال ختم کرنا تھا۔"

دلاور ہنسا۔ "تم اپنی افلاطونی تاویل سے اسے شہید کا درجہ نہیں دے سکتے۔ ایسے لوگ اسی طرح کتّے کی موت مارے جاتے ہیں۔"

"یہ تم اپنے انجام کی پیش گوئی کر رہے ہو؟"

"انجام کی کسے پروا ہوتی ہے اپنے سکندر صاحب۔ جو آگ سے کھیلتے ہیں وہ جل جانے سے نہیں ڈرتے۔" وہ بولا۔

"ایک کھیل میں کھیل رہا ہوں تو دوسرا تم کھیل رہے ہو۔ ایم آر اے کے نام سے کل تم مارے جاؤ اور دنیا کہے اللہ کو پیارا ہوا۔ اور میں مارا جاؤں تو کہے جہنم رسید ہوا۔ اس سے کیا فرق پڑے گا مجھے یا تمھیں۔ خسرو جمشید کو بھی ایک موقع ملا تھا۔ وہ چاہتا تو زندہ رہتا اور پھر ہمارے ساتھ آ جاتا تو ہم اس کی ایک غلطی کو مجبوری سمجھ کے معاف کر دیتے۔ مگر اس نے وہ موقع گنوا دیا۔ تم سمجھ رہے ہو گے کہ اسے میں نے مارا ہے؟ نہیں، اسے خود زیب النسا کی ماں نے قتل کیا۔ اس نے صرف ایک شرط رکھی تھی۔ خسرو جمشید وہ شرط پوری کر دیتا تو کچھ نہ ہوتا۔ اس نے کہا تھا کہ زیب النسا کی شادی پیڈرو سے کر دو۔ زیب النسا اس کی کیا لگتی تھی؟ سگی بھانجی بھی نہیں تھی۔ باپ کی سوتیلی بہن کی لڑکی تھی۔ وہ اس کا سوتیلا ماموں تھا۔ اس نے کہا ٹھیک ہے۔ میں خود زیب النسا سے بات کرتا ہوں، ویسے تو وہ ماننے کی نہیں۔ یہاں میں یہ بتا دوں کہ جیکی اور جونی تہ خانے میں ہی مارے گئے تھے، پیڈرو کے ہاتھوں۔ اور ان کا باپ صدمے سے مر گیا تھا۔ وہ پہلے ہی دل کا مریض تھا۔ اس کی موت کا الزام کسی پر نہیں آتا۔ زیب النسا کی ماں اس تمام دولت اور جائیداد کی وارث ہو چکی تھی جو..... سلطان محمد خاں کی ملکیت تھی۔ اس میں وہ پلاٹ بھی شامل ہے جس کا سودا تم نے رکوا دیا تھا۔"

"بہت اچھا پلان تھا تمھارا۔" میں نے کہا۔ "تم پرانے شکاری ہو۔ تم نے نعیش، ثبوت، گواہ سب مہیا کر لیے ہوں گے جن سے ثابت ہو جاتا کہ جیکی اور جونی کی قاتل وہی ہے۔ زیب النسا کی ماں، اور بالواسطہ طور پر شوہر کی موت کی بھی۔ پھر تم نے اس سے کہا ہو گا کہ کوئی بات نہیں، ہم تمھیں بچا لیں گے۔ پھانسی کا پھندا تمھارے گلے میں نہیں پڑنے دیں گے۔ حویلی کے اندر سارے گواہ اپنے ہیں اور سب ثبوت ابھی ہمارے قبضے میں ہیں۔ باہر کا کوئی آدمی کچھ نہیں جانتا کہ حویلی کے اندر کیا ہوا۔ لیکن زندگی منظور ہے تو ایک کام کرنا ہو گا۔ زیب النسا کی شادی پیڈرو سے کرانی ہو گی۔ اور اس عورت نے جو تمام عمر زندہ رہنے کے لیے خود کو بھی فروخت کرتی رہی تھی، اس نے بیٹی کو بھی بیچ دینے میں کوئی حرج نہیں سمجھا لیکن میرا خیال ہے کہ اس بے وقوف عورت نے تمھاری چال کو نہیں سمجھا۔ ایک بار زیب النسا کی شادی استاد پیڈرو سے ہو جاتی تو وہ سب دولت جائیداد کسے ملتی؟ اصل وارث جیکی اور جونی تھے۔ وہ قتل ہو گئے۔ باپ صدمے سے مر گیا۔ ماموں کو تم مار دیتے اور پھر ماں کے خلاف ثبوت، گواہ پیش کر کے اسے تختۂ دار تک پہنچا دیتے۔ زیب النسا واحد وارث بچتی جو پیڈرو کی بیوی ہو جاتی۔ یہ اسکیم ناکام کیسے ہو گئی؟"

"آج پھر میں تمھاری ذہانت کا اعتراف کرتا ہوں۔ بے شک تم نے قیاس آرائی کی، مگر حقیقت بیان کر دی۔" دلاور بولا۔ "یہ سب بالکل اسی طرح ہوا تھا اور ہوتا۔ شاید خسرو جمشید بھی سمجھ چکا تھا کہ آگے کیا ہو گا۔ اس نے زندگی کو داؤ پر لگا کے ہم سے جھوٹ بولا۔ جب ہم نے اسے فون فراہم کر دیا تو اس نے زیب النسا سے بات کی۔ پہلے اسے بتاتا رہا کہ بالکل خیریت ہے، فکر مت کرنا۔ میری پھر اچانک اس نے چیخ کر کہا۔ زیب النسا! بھاگ جاؤ اس گھر سے۔ کہیں بھی پناہ لے لو ورنہ یہ تمھاری شادی پیڈرو سے کر دیں گے۔ اغوا کر لیں گے تمھیں۔۔۔ بس اتنا ہی کہا تھا اس نے کہ زیب النسا کی ماں نے اسے گولی مار دی۔"

"چلو، خسرو جمشید نے زندگی میں ایک تو نیکی کی۔ خدا بڑا غفور الرحیم ہے۔ اس کی رحمت سے کچھ بعید نہیں کہ اسی نیکی پر خسرو جمشید کی مغفرت ہو جائے۔" میں نے کہا۔ "میں محسوس کرتا ہوں دلاور کہ بنیادی طور پر وہ بُرا آدمی نہیں تھا۔ عیاش ضرور تھا مگر وطن فروش اسے تم نے بنایا۔ وہ غلط لوگوں میں گھر گیا تھا اور دولت جو اس کی عیاشی کے لیے کم پڑنے لگی تھی، اسے تمھارے ساتھ رہنے سے پھر ملنے لگی۔"

"چلو دفع کرو اس ذکر کو اپنے سکندر صاحب۔ جو مر گئے ان سے ہمیں کیا لینا دینا۔ ہیں جی؟" دلاور نے کہا۔ "اب تو بات کرو اپنی۔ ان کی جو زندہ ہیں۔ نازو، رضیہ سلطانہ اور محسن کی۔ ان کی زندگی بچانا تمھارے اختیار میں ہے۔"

"نہیں، میں ایسا دعوا کروں تو کافر۔" میں نے کانوں کو ہاتھ لگا کے کہا۔ "مارنا یا بچانا صرف خدا کے ہاتھ میں ہے۔"

"مجھے رابعہ کے نہ ملنے کا افسوس ہے، ورنہ تم سے سودا کرنا مشکل نہ ہوتا۔" وہ بولا۔

"تم ابھی تک مجھے سمجھے نہیں دلاور۔" میں نے کہا۔ "میں سودا کرنے والوں میں سے نہیں ہوں اور تم سے تو خیر سودے پر بات بھی نہیں ہو سکتی۔"

"میرے مطالبات پورے کرنا تمھارے لیے کوئی مشکل کام نہیں۔" دلاور نے میری بات کو نظرانداز کر دیا۔ "ایک تو مجھے بتا دو کہ زیب النسا کہاں ہے۔ دوسرے وہ ٹرک واپس کر دو۔ اس پر میرا سارا کاروبار داؤ پر لگا ہوا ہے۔ وہ سب نقصان مجھے پورا کرنا پڑا تو میں... قلاش ہو جاؤں گا۔"

میں خوشی سے مسکرایا۔ "کوئی بات نہیں۔ سیاست میں تو کود ہی پڑے ہو۔ وزیر بھی ہو جاؤ گے۔"

"میری بات سنو۔" اس نے بڑی پھرتی سے میرے سر پر مُکّا مارا جس کے لیے میں بالکل تیار نہ تھا۔ میں نیچے گر گیا اور تیزی سے اٹھا لیکن وہ اپنی جگہ بدل چکا تھا۔

"وہیں کھڑے رہو۔" اس نے مجھے حکم دیا۔ "اور یہ مت سمجھو کہ میں اکیلا ہوں۔ جو کچھ یہاں ہو رہا ہے وہ بہت سے لوگ سُن رہے ہیں اور دیکھ رہے ہیں۔ یقین نہیں تو میری طرف ایک قدم بڑھا کے دیکھو۔"

لیکن اس کی نوبت نہیں آئی۔ ایک ساتھ چاروں طرف کے دروازے کھلے اور چار افراد اندر آ گئے۔ ان میں سے دو مسلح تھے۔ سب کے چہروں پر ماسک تھے۔

انھیں دیکھ کر جو خیال بے اختیار میرے دل میں آیا وہ بھوتوں کا تھا کیوں کہ انھوں نے بہت ڈراؤنے ماسک پہن رکھے تھے۔ یہ بدصورت، خون آشام کریہہ بھوتوں کے چہرے تھے جو گتّے پر رنگ روغن کر کے بنائے گئے تھے اور بازار میں عام ملتے تھے۔ ان سے بچے کھیلتے تھے اور انھیں چہرے

کے سامنے پہننے کے لیے صرف ایک ربر بینڈ کام آتا تھا جو سر کے پیچھے سے گزرتا تھا اور ماسک کو اصل چہرے کے ساتھ چپکائے رکھتا تھا اوپر والے حصے کے دو سوراخوں میں سے آنکھوں کی پتلیاں متحرک نظر آتی تھیں لیکن ان کا باقی چہرہ چھپا ہوا تھا۔ انھوں نے سر تا پا ایک جیسا چست لباس پہن رکھا تھا جو بالکل سیاہ تھا۔

نہ جانے کیوں میرا ذہن اس آسیب زدہ مشہور ہو جانے والے گھر کی طرف چلا گیا جہاں سے نازندا اور موہنی کو اغوا کیا گیا تھا وہاں بھی لوگوں نے بھوت دیکھے تھے۔ کہیں یہ وہی بھوت تو نہیں تھے!

دو مسلح افراد کے ہاتھوں میں سائلنسر والے ریوالور تھے۔ ان کا رُخ میری طرف تھا۔ باقی دو فری اسٹائل باکسنگ یا جوڈو کراٹے کے چیمپئن معلوم ہوتے تھے کیوں کہ وہ خطرناک انداز میں دفاعی پوزیشن اختیار کیے میری طرف بڑھ رہے تھے۔

دلاور کے اشارے پر وہ رُک گئے۔ اس کے دوسرے اشارے پر وہ واپس انھی دروازوں کے پیچھے غائب ہو گئے جن میں سے وہ اندر آئے تھے۔ یہ ایک ڈرامائی انٹری تھی اور اس ڈرامے کا ہدایت کار چوہدری دلاور تھا جو ایسے مناظر پیش کرنے میں ماہر تھا۔

"میں تمھیں سوچنے کے لیے چوبیس گھنٹے کی مہلت دوں گا۔" وہ بولا۔ "امید ہے کہ اس وقفے میں تمھارا دماغ ٹھنڈا ہو جائے گا اور تم اپنے نفع نقصان کو بھی سمجھ لو گے۔ میرے پہلے مطالبے کو پورا کرنے سے تمھارا کچھ نہیں جاتا۔ صرف یہ بتا دو کہ زیب النساء کہاں ہے۔ وہ تمھارے ساتھیوں میں شامل نہیں۔ تمھارے ایک سابق دشمن کی عزیزہ ہے۔"

"پہلی بات تو یہ اپنے چوہدری دلاور صاحب، کہ دشمن کا کوئی عزیز میرا دشمن نہیں۔" میں نے کہا۔ "میں تمھارے بیوی بچوں سے تمھارے بداعمال کا انتقام نہیں لے سکتا۔ دوسری بات یہ کہ جب دشمن دنیا سے ہی اٹھ جائے تو میں اس کا معاملہ یوم جزا پر چھوڑ دیتا ہوں اور اسے گالی تک دینا گوارا نہیں کرتا۔ تیسری اور آخری بات یہ ہے کہ میں کسی بھی لڑکی کو کسی بھی شرط پر تمھارے حوالے نہیں کر سکتا۔ اگر زیب النساء کا پتا مجھے معلوم ہوتا یا وہ میرے پاس آجاتی تو یہ ناممکن تھا کہ تم اسے مجھ سے چھین سکو۔ اس کی اور رابعہ کی یا کسی بھی لڑکی کی عزت میرے لیے ایک سی ہے۔ اس معاملے کو تو بالکل بھول جاؤ۔"

وہ کچھ دیر ہاتھ باندھے ٹہلتا رہا۔ "اگر میں اس مطالبے سے دستبردار ہو جاؤں۔ ویسے تو اس سے صرف پیڈرو کا مفاد ہی وابستہ نہیں۔ مگر میں رعایت دے سکتا ہوں تمھیں۔"

"تمھارا دوسرا مطالبہ بھی میرے لیے اتنا ہی ناقابلِ قبول ہے۔" میں نے کہا۔ "میں اس ٹرک کو سمندر میں غرق کر چکا ہوں۔"

"تم جھوٹ کیوں بول رہے ہو؟ پہلے تو تم منہ پر صاف بات کرتے نہیں ڈرتے تھے!"

"میں اب بھی صاف بتا رہا ہوں تمھیں۔ آج کل میں تمھیں اس کا ثبوت مل جائے گا۔" میں نے کہا۔

"تم ٹرک ڈرائیور کی لاش کی بات کر رہے ہو نا؟"

"کیا وہ مل گئی ہے تمھیں؟"

"ہاں۔ مگر لاش نے یہ بات نہیں بتائی مجھے اپنے سکندر صاحب۔" وہ طنز سے بولا۔

"پھر تو تمھیں ٹرک بھی مل گیا ہو گا؟"

"ہاں۔ خالی ٹرک بھی قریب ہی سے ملا تھا۔ مگر اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ وہ سارا اسلحہ تم سمندر میں پھینک چکے ہو۔" وہ بولا۔ "اسے تم نے کہیں منتقل کر دیا ہو گا۔"

"میں نے اسے سمندر کی تہ میں منتقل کر دیا ہے۔"

وہ میرے قریب آگیا۔ فکرمندی اس کی صورت سے عیاں تھی، وہ مجھے پہلی بار خوف زدہ بھی لگا۔

"کہاں؟" اس نے میرا کالر پکڑ کے مجھے جھنجوڑا۔ "کہاں پھینکا ہے تم نے وہ سب؟"

"بحیرۂ عرب میں۔" میں نے کہا اور ایک جھٹکے سے اسے الگ کر دیا۔ "کیا اب یہ بھی بتاؤں کہ بحیرۂ عرب کہاں ہے؟"

"بکواس بند کر دو۔ جوکر کی اولاد۔" اس نے دہاڑ کے کہا۔ "تم مجھے وہ جگہ بتاؤ گے جہاں تم نے وہ سب اسباب ڈبویا۔ میں تم کو وہیں لے کر جاؤں گا۔ اور تم نشاندہی کرو گے۔"

"کیسے بھئی؟" میں نے کہا۔ "سمندر پر یہ نقشے میں تو انگلی رکھی جا سکتی ہے۔ مگر ویسے سمندر خاصا بڑا ہوتا ہے اور اس پر کوئی ایسی نشانی بھی نہیں ہوتی جیسی...."

"تم اندازے سے بتاؤ گے۔ وہ کون سا ساحل تھا۔ وہ جگہ ساحل سے کتنی دور تھی؟" وہ بولا۔ "میں وعدہ کرتا ہوں...."

"وعدے کو مارو گولی۔ یہ بتاؤ پہلے کہ جو اسلحہ سمندر کی تہ میں پڑا ہے وہ تمھارے کس کام کا؟ اس کے لیے اتنی پریشانی کس لیے کیا کرو گے اسے نکال کے؟"

"تم.... تم نہیں جانتے۔" وہ سر پر ہاتھ رکھ کے بولا اور میں نے دیکھا کہ اس کے ماتھے پر پسینہ چمک رہا ہے۔ "تم کچھ نہیں جانتے۔ بس تم مجھے اتنا بتا دو کہ یہ جھوٹ ہے اور سچ ہے تو مجھے وہاں لے چلو۔ میں اور کچھ نہیں مانگتا تم سے۔ میں تم کو بھی چھوڑ دوں گا، تمھارے ساتھیوں کو بھی۔ یہ ذاتی نقصان کا معاملہ ہے۔ اس سے میں تباہ ہو جاؤں گا۔"

میں ہکا بکا رہ گیا۔ چوہدری دلاور کو پہلے بھی بارہا ناکامی اور شکست کا سامنا ہوا تھا لیکن اس کی حالت ایسی کبھی نہ ہوئی تھی کہ وہ رونے پر آجائے اور منت سماجت کرنے لگے۔ ہم نے ان کے اسلحے کے متعدد ذخائر تباہ کیے تھے۔ وہاں کئی ٹرک اسلحہ تھا لیکن اس سے دلاور اتنا متاثر نہیں ہوا تھا۔ اس نے نقصان کو برداشت کیا تھا اور ہر بار پہلے سے زیادہ خون آشامی کے ساتھ ہمارے مقابلے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ یہ کچھ اور بات تھی۔ ذاتی نقصان تو وہ بھی تھا۔ پھر آج وہ کس ذاتی نقصان پر تباہ ہو جانے کی بات کر رہا تھا!

"دلاور...." میں نے اچانک کہا۔ "اس ٹرک میں کیا تھا؟"

"اسلحہ.... تم جانتے ہو۔" اس نے اعتماد سے خالی کھوکھلے لہجے میں کہا۔

"اسلحے کے علاوہ کیا تھا؟ سونا؟"

وہ اچھلا تو نہیں لیکن اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا تھا اور تیر نشانے پر لگا تھا۔

"کتنا سونا تھا اس میں۔ اور کیا وہ سب تمھارا تھا؟"

"میرا.... میرا تو نہیں تھا مگر جن کا تھا.... وہ مجھ سے وصول کر لیں گے۔ ذمے دار تو میں تھا۔"

"اچھا۔ تو اب تم نے وہاں سونا بھیجنا شروع کر دیا تھا۔ اسلحہ مہنگا پڑتا ہے۔ بھاری ہوتا ہے۔ جگہ گھیرتا ہے۔ لیکن سونا تو کرنسی ہے۔ بین الاقوامی منڈی کی کرنسی۔" میں نے کہا۔ "مجھے اپنی عقل پر ماتم کرنا چاہیے کہ یہ موٹی سی بات پہلے میرے دماغ میں کیوں نہیں آئی۔ تم تو ڈالر بھی بھیجتے ہو گے۔ کرنسی بھی اسمگل کرتے ہو گے لیکن سب سے جعلی نوٹ چھاپ کے بھیجتے ہو۔ تاکہ تخریب کار اور غدار علیحدگی پسند اپنی مرضی سے جو چاہیں خریدیں...."

"نقلی نوٹ چھاپنے کا روگ ہم نے نہیں پالا۔" دلاور بولا۔ "اصل میں بھیجا تھا۔ ڈالر اور پونڈ۔ یہ شخص لندن کے راستے پہنچاتا تھا۔" اس نے خسرو جمشید کی لاش کی طرف اشارہ کیا۔

"اور اسی لیے اپنا ڈبل ساتھ رکھتا تھا۔" میں اس انکشاف پر ابھی تک دم بخود تھا۔ "ایک یہاں موجود رہتا ہو گا۔ دوسرا اسی پاسپورٹ پر لندن آتا جاتا ہو گا۔ کبھی اصلی خسرو جمشید تو کبھی نقلی خسرو جمشید۔ وہی لندن کی بین الاقوامی مارکیٹ کے بھاؤ پر سونا بھی خریدتا ہو گا۔"

دلاور نے نفی میں سر ہلایا۔ "سونا کراچی سے اکبر بھائی کے ذریعے جاتا تھا۔ لانچ یا بحری جہاز سے لایا جاتا تھا اور دوسرے راستے سے آگے چلا جاتا تھا۔ لے جانے والے کراچی میں ڈیلیوری لیتے تھے۔"

"تم رضاکارانہ طور پر اپنے کاروباری معاملات کے راز افشا کر رہے ہو۔" میں نے کہا۔

"یہ کوئی راز نہیں۔ تمھیں معلوم ہو بھی جائے تو تم کیا کر سکتے ہو؟ راستہ بند کرا سکتے ہو یا سپلائی رکوا سکتے ہو؟ تمھارے تو فرشتوں کو خبر نہیں تھی اب تک۔ بس میں تمھارے چکر میں آگیا تھا کیوں کہ تم نے میرے کارخانے میں اسلحہ بنتا دیکھ لیا تھا۔ اب تو وہ کارخانہ بھی وہاں نہیں رہا۔ باقی معاملات تمھاری دسترس سے باہر ہیں۔"

"میں مانتا ہوں کہ ہم کچھ بھی نہیں۔ اور اب تک ہم نے جو کچھ کیا تائیدِ ایزدی تھا۔ ہم اس پورے سیٹ اپ کو ختم کیسے کر سکتے تھے۔ یہ تو ایک سیاسی سازش کا میدانِ جنگ ہے جس کا کوئی ایک محاذ اور کوئی ایک فریق نہیں۔ شاید ہم نے اس سازش کی ناکامی میں اتنا بھی نہیں کیا جتنا ایک چیونٹی کسی پہاڑ کو ہلانے کے لیے کر سکتی ہے۔ پھر بھی ہم مطمئن ہیں کہ ہم نے اپنا فرض ادا کیا اور اس میں کوتاہی نہیں کی۔ ہم نے پہلے بھی اعتراف کیا ہے کہ نہ ہم حکومت ہیں نہ فوج۔ نہ کوئی سیاسی تنظیم اور نہ لبریشن آرمی۔ ہم تو چند سر پھرے ہیں جو وطن دشمنوں کے صرف ایک ٹولے کے پیچھے لگے ہوئے ہیں جیسے جنگِ عظیم میں ایک بٹالین کا مقابلہ دشمن کی کسی دوسری بٹالین سے ہو۔ ایسی ہزاروں رجمنٹیں، بریگیڈ اور ڈویژن دنیا بھر میں سیکڑوں جگہ پھیلے ہوئے تھے اور سب برسرِ پیکار تھے، پھر بھی کوئی ایک چھوٹی سی بٹالین کا کسی چھوٹے سے مورچے پر جنگ کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔"

"بند کرو اپنا یہ.... لیکچر۔" وہ چیخ کے بولا۔ "میری بات کا جواب دو۔ مجھ سے تعاون کرو گے یا نہیں۔ اس جنگ میں تم نے کیا تیر مارے ہیں اس سے مجھے غرض نہیں۔ مجھے پہلے بھی اپنے ذاتی منافع سے غرض تھی، اب بھی میں اپنا نقصان نہیں چاہتا۔ میں نے تم کو ہمیشہ اچھی سے اچھی آفر دی۔ تمھاری ہر بات ماننے پر رضامندی کا اظہار کیا۔ تمھارا حق تمھیں پیش کرنا چاہا۔ صرف اس لیے کہ تم اپنے دل سے میری خلاف دشمنی کے جذبات کو نکال دو۔"

"یہ کیسے ممکن ہے دلاور، جب تم میرے وطن کے دشمن ہو تو میرے بھی دشمن ہو۔ ذاتی دشمنی تو میں بھول گیا تم

میرے باپ کے قاتل تھے مگر قانون تم پر ہاتھ نہیں ڈال سکا۔ یہ انصاف میں نے خدا پر چھوڑا۔ اب ہم سب ایک طرف ہیں، جو محبِ وطن ہیں۔ ان میں حکومت، فوج، سیاستدان، ...... مرد، عورتیں، بچے، سب پاکستانی شامل ہیں، دوسری طرف تم ہو اور تمھارے ضمیر فروش، وطن دشمن اور غدار ساتھی ہیں جو صرف پیسے کے لیے آزادی کا اور آزاد انسانوں کے جذبۂ حُبّ الوطنی کا سودا کر رہے ہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں تم کو معاف کر دوں! جب تک تم دوسری طرف ہو میں تمھارا دشمن نمبر ایک ہوں، ہاں تم ادھر آ جاؤ۔ ہماری طرف تو...."

"سکندر! میں آخری بار کہتا ہوں۔ میرے اعصاب اس سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتے۔" وہ دیوانہ وار چلّانے لگا۔ "مجھے بتا دو، وہ سونا تم نے سمندر میں کہاں ڈالا تھا؟"

"تم نے ابھی کہا تھا کہ سونا اکبر سیٹھ بھیجتا تھا۔"

"یہ لاٹ غلطی سے لاہور پہنچ گئی تھی۔ میں نے اسے واپس بھجوانے کی ذمّے داری قبول کی تھی۔ حاجی عبداللہ کے تو صرف ٹرک ہیں۔ مال تو میں نے لوڈ کرایا تھا۔" وہ بولا۔ "وہ ایک کروڑ مالیت کا سونا ہے۔ اتنے تو میرے سارے اثاثے بھی نہیں ہیں۔" دلاور نے کہا۔

"تمھارے کون سے اثاثے؟" میں نے کہا۔ "جو یہاں ہیں؟ یا وہ جو باہر ہیں.... سوئٹزر لینڈ کے بنکوں میں؟"

یکلخت دلاور کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ اس کی صورت پر ایک سفّاک بے رحمی کی خونی چمک آ گئی۔

"تم بتاؤ گے سکندر۔ یہ کام تم نے اکیلے نہیں کیا ہو گا۔ تم نہیں بتاؤ گے تو دوسرے تم کو مرتا دیکھ کے بتائیں گے یا تم انھیں مرتا دیکھ کے بتاؤ گے۔ تمھیں اس کے لیے وقت ملے گا، اتنا وقت ملے گا کہ تم سوچ سکو۔ سمجھ سکو۔ دیکھ سکو کہ موت کتنی بھیانک اذیت کے ساتھ آتی ہے۔"

میں مسکراتا رہا۔ "تم پہلے بھی کئی بار اپنے سارے شیطانی حربے آزما چکے ہو۔ اور ناکام رہے ہو۔"

اس نے تالی بجائی۔ وہی چاروں بھوت نمودار ہو گئے۔

"وہ دوسری لاش بھی یہاں لا کے ڈال دو۔" دلاور نے حکم دیا۔ "دونوں کے کپڑے اتار کے اُلٹا لٹکا دو۔"

چاروں بھوتوں کے چہرے ڈھکنے والے لوٹ گئے۔ ان کے ساتھ دلاور بھی نکل گیا۔ میں خسرو جمشید کی اکڑی ہوئی لاش کے ساتھ یہ سوچتا رہ گیا کہ دلاور کی بات کا مطلب کیا ہو سکتا ہے، یہ دوسری لاش کس کی ہو گی اور مجھے اُلٹا لٹکانے کے بجائے لاشوں کو اُلٹا لٹکانے کا چکر کیا ہے؟

بھوت جب پھر آئے تو انھوں نے ٹرک ڈرائیور کی لاش اُٹھا رکھی تھی۔ اس کے دونوں پیر جوڑ کے مضبوطی سے باندھ دیے گئے تھے۔ ان میں سے ایک نے رسّی کا دوسرا سرا مہارت سے گھما کے اوپر پھینکا۔ یقیناً اس نے کافی مشق کی ہو گی پھر بھی چھٹی ساتویں کوشش سے پہلے وہ رسّی کو اس ہُک پر ڈالنے میں کامیاب نہ ہو سکا جو چھت میں پنکھا لگانے کے لیے نصب کیا گیا ہو گا۔ رسّی کا کنارا جیسے ہی اس میں سے نکل کے نیچے آیا، اس نے اچھل کے پکڑ لیا اور زور لگا کے نیچے کی طرف کھینچنے لگا۔ نتیجہ یہ کہ ڈرائیور کی بے لباس لاش کے پیر اُٹھے، پھر ٹانگیں اور پھر جسم زمین سے بلند ہوا — اس کی لاش خالی کمرے میں فرش سے چار فٹ کی بلندی پر معلّق ہو کے جھولنے لگی۔

اتنی دیر میں دوسرے بھوت نے خسرو جمشید کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا۔ اس کے لیے رسّی وہ ہمراہ لایا تھا۔ اس نے خسرو جمشید کے سارے کپڑے اتار پھینکے۔ پھر اس کے ٹخنے باندھے اور چند منٹ بعد اسے بھی دوسرے ہُک سے یوں لٹکا دیا جیسے قصائی کی دکان پر ذبح کیے ہوئے بکرے نظر آتے ہیں۔

دو مسلح بھوت اس ساری کارروائی سے بے نیاز مجھ پر نشانہ لیے کھڑے رہے۔ یہ تھا تو کوئی شیطانی چکر لیکن میرا دماغ ابھی تک دلاور کی اسکیم کو سمجھ نہیں پایا تھا۔ لاشیں لٹکانے والے ذرا سی دیر کے لیے باہر گئے اور پھر لوٹے تو ان کے پاس بہت بڑے بڑے بلب تھے۔ شاید پانچ سو یا ہزار واٹ کے۔ ان میں سے ایک رکوع کی حالت میں گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کے جھک گیا۔ دوسرا اس پر چڑھا اور اس نے ایک وال لائٹ کا شیڈ ہٹا دیا۔ اس میں سو واٹ کا بلب تھا۔ اس کی جگہ بڑا بلب نصب کیا ہی وہ اتر آیا۔ باری باری اس نے چاروں دیواروں پر ہزار ہزار واٹ کے بلب روشن کیے۔ اب ان پر کوئی شیڈ نہیں تھا، چنانچہ کمرا چار ہزار واٹ کی چکا چوند پیدا کرنے والی روشنی میں ایک نیا بھیانک منظر پیش کر رہا تھا اور میں کسی انجانے خوف میں مبتلا ہونے لگا تھا۔ کیوں کہ میں اس سارے انتظام کا کچھ مطلب سمجھنے لگا تھا۔

چار ہزار واٹ کے بلبوں کی صرف روشنی ہی تیز نہیں ہوتی ان کی حرارت بھی اتنی ہی ہوتی ہے جتنی ہزار واٹ کے چار ہیٹروں کی۔ اس سے کمرے کا درجۂ حرارت بڑھ جانا لازمی تھا۔ چند گھنٹوں میں یہ حرارت بند کمرے کو اتنا گرم کر سکتی تھی کہ میرا بدن پانی کی طرح بہنے لگے۔ مگر دوسری طرف یہی حرارت لاشوں کے سڑنے کے عمل کو بھی تیز کر دے گی۔ جسم میں پانی کی کمی ہو گی۔ پیاس سے میرا حلق خشک ہو جائے گا۔ ایک طرف یہ اذیت بڑھے گی تو دوسری طرف لاشوں کا تعفّن بڑھے گا۔ چوبیس گھنٹے تو بہت ہوتے ہیں، شاید چھ آٹھ گھنٹے میں ہی لاشوں کی بُو سے اور جسم میں پانی کی کمی سے میرا نروس بریک ڈاؤن ہو جائے گا۔

باہر سے عجیب سا شور سنائی دیا۔ کوئی لوہے کی بھاری بھرکم چیز کھینچ کر اندر لا رہا تھا۔ ایک دروازہ کھلا اور وہی دونوں لوہے کا ایک پنجرہ گھسیٹتے ہوئے اندر آئے۔ یہ موٹی سلاخوں سے نیا بنا ہوا پنجرہ چار فٹ اونچا تھا۔ اس کی چوڑائی ہر طرف سے ڈیڑھ پونے دو فٹ ہو گی۔ میرا دل کانپنے لگا۔ کیا اس پنجرے میں وہ مجھے بند کریں گے، جس میں نہ بیٹھنا ممکن ہے نہ سیدھا کھڑا ہونا۔ وہ اب پنجرے کو ایک دروازے کی مضبوط چوکھٹ کے ساتھ زنجیر سے منسلک کر رہے تھے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے چوکھٹ میں پہلے ہی کُنڈے لگا رکھے تھے جو اَب تک میں نے نہیں دیکھے تھے۔

ایک بار پھر وہ واپس گئے اور دوسرا پنجرہ لے آئے۔ کمرے کے چار دروازے تھے۔ انھوں نے ہر دروازے سے ایک پنجرہ باندھ دیا۔ اس پنجرے کی سلاخوں کو۔ زنجیر کو یا چوکھٹ کو صرف ٹارزن ہی توڑ سکتا تھا۔ وہ جو اس میں کسی جانور کی طرح بند ہو وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

حسبِ توقع انھوں نے مجھے اشارہ کیا۔ میں اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ وہ آگے بڑھے۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ کسی چوہے کی طرح پنجرے میں بند ہونے نہیں جاؤں گا اور انھوں نے میرے تیور بھانپ لیے تھے۔ کسی پروفیشنل فائٹر کی طرح وہ میرے آگے پیچھے ایک دائرے میں گھومنے لگے اور ان کی نظریں مجھ پر جمی رہیں۔ کئی بار انھوں نے حملہ کرنے کا دھوکا دیا مگر حملہ نہیں کیا۔ بالکل محسوس نہ ہونے والے طریقے پر وہ اپنا گھیرا تنگ کر رہے تھے۔ دونوں مسلح افراد بھی اب قریب آ گئے تھے۔ مجھے چاروں طرف سے اپنا دفاع کرنا تھا جو پیشہ ور لوگوں کے سامنے ایک مشکل کام تھا۔

پھر یہی ہوا کہ ان میں سے ایک نے مجھ پر ریوالور مارنے کے لیے جست لگائی مگر یہ صرف ایک ایکٹ تھا۔ اسی وقت دونوں افراد جو خالی ہاتھ تھے مجھ سے چمٹ گئے اور ان کی گرفت اتنی سخت اور مضبوط تھی کہ میری مزاحمت رائیگاں گئی۔ انھوں نے مجھے گھسیٹا اور سر جھکا کے پنجرے میں ڈال دیا۔ اس کی ایک سائڈ بند ہوئی اور میں اندر مقفل ہو گیا۔

یہ سخت اذیت دہ پوزیشن تھی، میں دائیں بائیں بھی نہیں گھوم سکتا تھا۔ اونچا نہیں ہو سکتا تھا اور میرے گھٹنے یوں مُڑ گئے تھے کہ سامنے کی سلاخوں سے جا لگے تھے مگر میں بیٹھنے سے قاصر تھا۔ اس پوزیشن میں میری گردن، کمر اور ٹانگیں صرف ایک گھنٹے میں مفلوج ہو سکتے تھے اور یہ ایک گھنٹا شدید درد کو برداشت کرنے کا تھا۔ ابھی تک میں نے حوصلہ نہیں ہارا تھا اور کسی سے کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ صرف حکم کے غلام تھے اور میرا ان پر چیخنا چلّانا یا ان کو گالیاں دینا اور ان سے کچھ پوچھنے کی کوشش کرنا سب بے کار تھا۔ میری جان تو باقی تین خالی پنجروں کو دیکھ دیکھ کر ہی نکلی جا رہی تھی کیوں کہ اب مجھے کوئی شک نہیں تھا کہ ان میں کسے لا کے بند کیا جائے گا۔

سب سے پہلے وہ محسن کو لائے۔ اس نے مجھے دیکھا۔ ذرا سی دیر کے لیے رُکا مگر پھر دھکے سے آگے گیا۔ وہ میرے دائیں ہاتھ والے پنجرے میں بند ہوا۔

"محسن! حوصلہ مت ہارنا۔" میں نے کہا۔

"ہماری تو کوئی بات نہیں یار۔" وہ بولا مگر اس کا لہجہ انتہائی شکست خوردہ تھا۔ "مگر...." وہ آگے کچھ نہ کہہ سکا، کیوں کہ تیسرے پنجرے میں بند کرنے کے لیے وہ نازو کو لے آئے تھے۔

وہ چیخ چلّا نہیں رہی تھی لیکن خود کو چھڑانے کے لیے سخت مزاحمت کر رہی تھی۔ اسے قابو میں رکھنا کسی جوان اور جنگلی شیرنی کو زندہ گرفتار کرنے سے زیادہ مشکل کام تھا مگر شکاری بھی نئے نہیں تھے۔ ہر شکار کے بارے میں ان کی معلومات مکمل تھیں اور اسی مناسبت سے انھیں تربیت بھی دی گئی ہو گی کہ اپنی تمام کوشش کے باوجود نازو خود کو رہا کرانے میں ناکام تھی۔

اس کمرے میں آتے ہی نازو نے پہلے مجھے اور پھر محسن کو دیکھا تو اس کی ساری مزاحمت ختم ہو گئی۔ اس کے اشتعال پر حیا غالب آ گئی۔ یہ اس کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ ہم کبھی اسے یوں بھی دیکھیں گے۔ شکاری اسے بالآخر پنجرے میں ڈال کے تالا لگانے میں کامیاب ہو گئے۔

اب ہم سب کی پوزیشن بہت عجیب تھی۔ ہم ایک دوسرے سے بات کرتے بھی تو کیسے کرتے۔ ہماری تو نظر بھی نہیں اٹھتی تھی۔ یہ جسمانی عذاب سے زیادہ ذہنی اذیت کا ایک انسانیت سوز تجربہ تھا۔ خود مجھے ایک بار یہ تجربہ ہو چکا تھا اور رابعہ بھی یہ تذلیل برداشت کر چکی تھی مگر محسن اور نازو کے ساتھ ایسا پہلی بار ہو رہا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ آدمی کی عزّتِ نفس کو ختم کرنے، اسے اپنی ہی نظر میں حقیر و ذلیل کرنے اور اس کی قوتِ مدافعت کو صفر کرنے کا یہ سب سے موثر نفسیاتی حربہ ہے....... غیروں کے سامنے تھوڑی بہت مدافعت کی قوّت باقی رہتی ہے

مگر سامنے اپنے ہی ہوں تو آدمی چاہتا ہے کہ پگھل کے پانی بن جائے اور زمین میں جذب ہو جائے۔

موہنی نے سب سے زیادہ ہنگامہ کیا۔ اگر میں یہ کہوں کہ حالات نے اسے احساسِ شرم و حیا کو بحالتِ مجبوری بالائے طاق رکھنا سکھا دیا تھا تو غلط نہ ہوگا۔ اس نے میرے سامنے تسلیم کیا تھا کہ وہ جسم فروش تو نہیں ہے مگر حصولِ مقصد کے لیے اس نے اپنے جسم کی قربانی سے کبھی دریغ نہیں کیا۔

"یہ سب کیا ہے سکندر، محسن" اس نے پنجرے کو جھنجوڑنا شروع کیا اور چیخ چیخ کر ہمیں مخاطب کرنے لگی۔ اس کی زور آزمائی سے لوہے کا پنجرہ زمین پر ڈولنے لگا مگر زنجیر نے اسے گرنے نہیں دیا۔ اس کے ہنگامے نے ہمارے احساس کے زخموں میں انگارے بھر دیے۔ میں نے خود کو بہت حقیر اور بے بس، شکست خوردہ اور کسی چڑیا گھر کے جانور سے بھی زیادہ تکلیف دہ حالت میں پایا۔

"موہنی!" میں نے بالآخر ہمت سے کام لے کر اسے ڈانٹا۔ "یہ کیا کر رہی ہو، کیا ہوگا اس شور ہنگامے کا اثر، کیا وہ تمھیں چھوڑ دیں گے۔ انھیں ترس آجائے گا تم پر، یا تم سلاخیں توڑ کے نکل جاؤ گی؟"

"مگر ایسا کیوں ہو رہا ہے؟" وہ دہاڑیں مار مار کے رونے لگی۔ "میرا قصور کیا ہے؟"

"تم صرف اپنے بارے میں سوچ رہی ہو" میں نے طنز سے کہا۔ "حالاں کہ جو کچھ ہو رہا ہے سب کے ساتھ ہو رہا ہے۔ مگر تمھیں یہ خیال بھی ہے کہ تم نے سائڈ بدل کے غلطی کی۔ ہم تو ایک مقصد کے لیے سب برداشت کر رہے ہیں۔ تم بے مقصد مر رہی ہو۔"

"ایسا مت کہو۔ خدا کے لیے... تم تو مت کہو، تم جانتے ہو کہ میں نے اپنا مقصد تمھیں بنا لیا تھا۔ سائڈ بدلی تھی تو تمھارے لیے، میں تو زیادہ مظلوم ہوں، تمھیں اطمینان تو حاصل ہے، مجھے امید کا سہارا بھی نہیں، تمھیں میرا ذرا خیال نہیں۔ تم میرے بارے میں سوچتے تک نہیں، تم نفرت کرتے ہو مجھ سے۔" وہ شدید ہسٹریا میں اپنا سر پنجرے پر مار رہی تھی۔

دلاور آہستہ سے اندر آگیا۔ اس کے لبوں پہ ایک شیطانی مسکراہٹ تھی۔

"واہ جی واہ۔ اپنے سکندر صاحب" وہ بولا۔ "کتنے اچھے لگ رہے ہو آپ اس ڈرائنگ روم میں۔ کوئی تکلیف تو نہیں ہے نا؟"

میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا۔

"بولو اب کیا خیال ہے؟ میں آخری بار آیا ہوں" وہ بولا۔ "میں چلا گیا تو پھر آؤں گا کل۔ اس وقت تک تم میں سے کوئی بھی مرے گا نہیں۔ اگر ذہنی و جسمانی طور پہ ناکارہ ہو جائے تو الگ بات ہے۔"

"تم میرا جواب سن چکے ہو" میں نے بمشکل تمام کہا۔

"تمھیں کچھ اندازہ ہے کہ اس کے بعد کیا ہونے والا ہے؟" وہ بولا۔ "ابھی میرے جانے کے بعد ایک قصائی آئے گا، وہ تمھارے سامنے ان دونوں کی کھال کھینچے گا۔ وہ اس کام کا ... ہے۔ تم نے بکرے ذبح کرنے والوں کو کھال اتارتے دیکھا ہے، یہ کام بھی ایسے ہی ہوگا۔ پوری کھال کھینچنے کے لیے سر کاٹے ... گے۔ میں نے حکم دیا ہے کہ نواب صاحب کا سر مس نازو کے پنجرے میں باہر کی طرف لٹکا دیا جائے اور اس ڈرائیور کا سر ... خاتون کے سامنے۔ کہو تو اندر ڈال دیا جائے۔ میرے خیال میں یہ بہتر رہے گا۔" وہ بڑے مکروہ شیطانی انداز میں ہنسا۔

اس نے ایک نظر ہم سب کا جائزہ لیا۔ "ایسا منظر تم نے پہلے کبھی دیکھا ہے جانے سکندر صاحب۔ تم نے تو ولایت بھی دیکھی ہے اور وہاں فلمیں بھی بہت دیکھی ہوں گی۔"

اس نے تالی بجائی، یہ محض ایک ڈرامائی حرکت تھی۔ وہ آواز دے کر بھی کسی کو بلا سکتا تھا۔ مگر اس طرح وہ اپنی ... اور حاکمیت کا مظاہرہ کرتا تھا اور یہ تاثر دیتا تھا کہ یہاں ہر کچھ ہوتا ہے اس کے اشارے پر ہوتا ہے۔ اس مرتبہ جو شخص اندر آیا اسے میں نے پہلے بھی دیکھا تھا۔ وہ کار چلا کے لایا تھا، اب اس کے کندھے پر ایک موی کیمرا تھا۔

آہستہ آہستہ کیمرے کو فوکس کرتے ہوئے اور ایک نیم دائرے میں حرکت دیتے ہوئے اس نے وہ منظر فلم بند کیا جس میں انسانیت کی تذلیل کا بدترین تماشا نظر آتا تھا اور ... کس حد تک گر سکتا ہے اور گرایا جا سکتا ہے، بعد میں یہ فلم ... کا ثبوت ہوگی۔

"تمھیں معلوم ہے یہ کھال اتروانے کا تجربہ میں کس لیے کر رہا ہوں؟" دلاور بولا۔ "اس سے لاش جلد سڑنے لگے گی۔ تم خود اندازہ کر سکتے ہو کہ جب یہ کمرا گرم ہو کے بھٹی بنے گا تو کیا ہو ... ابھی مجھے صحیح آدمی ملا نہیں، لیکن مل گیا تو میں کھال میں بھس بھروا کے یہاں رکھوا دوں گا۔ بے سر کے دو پتلے جو خود اپنے ... کو ملنے والی سزا کا تماشا دیکھیں گے۔ یہ لاشیں سڑنے لگیں گی تو ان کے پیٹ پھٹ جائیں گے اور سارا بول و براز نکلے گا ... ہی گرے گا۔ اس کی بو بھی کمرے میں ہی رہے گی۔ اگر تم بتا دو کہ زیب النسا کہاں ہے اور وہ مال تم نے کہاں ڈالا ہے تو میں سب کو ابھی اسی وقت چھوڑ دوں گا اور تم جہاں کہو گے پہنچا دوں گا۔ تم مجھے وہاں لے جاؤ گے جہاں تم نے میرا مال سوائے تمھارے ... ڈبویا ہے۔"

"رہنے دو دلاور۔ نہ تم اتنے احمق ہو کہ میری بات کسی ثبوت کے بغیر مان لو، نہ میں تم پر اعتبار کرنے والا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں تم کو غلط جگہ بھی لے جا سکتا ہوں۔ یا نہیں لے جا سکتا؟ پھر تم سب کو پہلے سے کیوں چھوڑ دو گے؟ اور اگر میں فرض کر لوں کہ سارا مال برآمد ہو جانے کے بعد تم وعدے پر قائم رہو گے، تو مجھ سے بڑا بے وقوف کون ہوگا۔"

"میں اس لیے کہہ رہا تھا کہ ابھی معاملات پر میرا اختیار ہے سکندرِ اعظم صاحب" وہ بولا۔ "شام کو یا کل صبح میں آؤں گا تو اپنے ساتھ دوسرے لوگ بھی آئیں گے۔ ان میں سے کچھ لوگوں کو تم جانتے ہو، کچھ کو نہیں جانتے۔ پھر میری نہیں چلے گی۔"

"میں بتاتی ہوں۔ میں بتاؤں گی" موہنی نے چیختے ہوئے کہا۔ "مجھے اپنے ساتھ لے چلو، میں سب بتا دوں گی۔"

دلاور نے ایک قہقہہ لگایا۔ "بے شرم، بے غیرت۔ دھوبی کی کتیا۔ تو کیا بتائے گی جب تجھے کچھ معلوم ہی نہیں۔ بے وقوف بنانا کسی اور کو۔ انھیں جو میرے ساتھ آئیں گے، تجھے لے جانے کے لیے۔ وہ تیرے اپنے لوگ ہوں گے جو تیری وفاداری سے بہت خوش ہیں۔"

موہنی نے ایک احمقانہ کوشش کی تھی، شاید اس نے سوچا ہوگا کہ جیسے وہ اب تک .... اپنا کام نکالتی آئی ہے ایسے ہی دلاور کو بھی رام کر لے گی۔ مگر دلاور کو وہ کہاں جانتی تھی کہ وہ کیسا مکار ہے۔

دلاور واپس چلا گیا۔ وہ کچھ مایوس نظر آتا تھا۔ اسے امید ہوگی کہ ایسے دہشت ناک حالات میں اور آگے کے حالات کا خیال میری یا محسن کی قوتِ مزاحمت کی شکست کے لیے کافی ہوگا۔ ایسا نہیں ہوا تو اس نے اپنے شیطانی منصوبے کو آگے بڑھانے کا فیصلہ کیا۔ اس کے جاتے ہی دو نئے بھوت آگئے۔

وہ صرف انڈر ویئر پہنے ہوئے تھے اور ان کے کالے جسم پسینے یا تیل سے چمک رہے تھے۔ ہدایات کے مطابق انھوں نے تیز دھار والی لمبی لمبی پتلی چھریوں کو آپس میں رگڑنا شروع کر دیا ... کمرے میں لٹکی ہوئی لاشوں کو گھوم پھر کے دیکھنے لگے۔ وہ طریقہ ... آدم خور قبائل کے انداز میں ایک وحشیانہ خوشی کا اظہار بھی کر رہے تھے جیسے یہ عمل ان کے لیے ایک بہت دل خوش کن تجربہ ہے۔

پھر ان میں سے ایک نازو کی طرف گیا۔ اس نے ایک خنجر ... اک پنجرے میں ڈالی اور نازو کے جسم کی نازک کھال پہ رکھ دی۔ نازو نے ایک دلخراش چیخ ماری۔ پہلے تو میں یہ سمجھا کہ اس نے نوکِ خنجر کو نازو کی پسلیوں میں اتار دیا ہے۔ میں بے اختیار تڑپا اور میں نے اسے چیخ کے گالی دی۔ وہ قہقہہ مار کے میری طرف آیا۔

دوسرا کچھ موہنی سے چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا اور وہ بُری طرح چلا رہی تھی۔ پنجرے کے اندر اچھل رہی تھی اور پنجرے کی گڑگڑاہٹ میں یہ اعصاب شکن چیخ پکار اور ان قصابوں کے قہقہے، یہ سب ایک ناقابلِ بیان ڈراؤنے خواب کا حصہ لگتے تھے۔ اب محسن بھی چلا رہا تھا اور پنجرے کو یوں ہلا رہا تھا جیسے اسے توڑ دے گا۔ جنون اور پاگل پن کے ابتدائی آثار ظاہر ہونے لگے تھے، حالاں کہ ابھی صرف ابتدا تھی۔ کیا ہم کھال اتارے جانے کا منظر دیکھ سکیں گے۔ اور اس کے بعد کے چند گھنٹوں کا عذاب جھیل سکیں گے جو بیک وقت جسمانی اور روحانی ہوگا؟

میں نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اس سے زیادہ میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں اپنے کان بند نہیں کر سکتا تھا ورنہ نازو اور موہنی کی دلخراش چیخوں سے بچ جاتا۔ میں اپنی ناک بند نہیں کر سکتا تھا کہ جب اس کمرے میں انسانی گوشت کے سڑنے کی بو بھر جائے اور لاش کے ڈی کمپوز ہونے سے پیدا ہونے والی عفونت بھر جائے تو میں اسے اپنی قوتِ شامہ پر اثر انداز ہونے سے روک سکوں۔

ان حالات میں خدا کے بعد دنیا میں کسی سے مدد حاصل ہونے کی امید تھی تو وہ شیخ اور راجا کی ذات تھی۔ وہ دونوں ٹرک کے ساتھ نکل گئے ہوں گے۔ اب آگے کیا ہوا؟ ٹرک ڈرائیور انھیں لے گیا یا وہ ٹرک ڈرائیور کو؟ اس کا یہاں پتا نہیں چل سکتا تھا۔ ان امکانات کو یکسر مسترد بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ اس ٹرک میں یہاں آجائیں اور کچھ کر سکیں۔ تاہم یہ حالات کی روشن تصویر نہیں تھی۔ زیادہ امکان اسی بات کا تھا کہ وہ آئیں تو ہماری طرح پنجروں میں قید ہو جائیں۔

کمرے میں اب مکمل سکوت تھا۔ نازو اور موہنی غالباً بے ہوش ہو گئی تھیں۔ ان کے حق میں بے ہوشی ایک نعمت تھی، سارا عذاب تو احساس دیتا ہے۔ اب وہ کچھ نہیں دیکھیں گی کچھ نہیں سنیں گی اور کچھ محسوس نہیں کریں گی۔ بے ہوشی ایک زیادہ گہری نیند ہے، نیند سے تو آدمی خود بھی جاگ اٹھتا ہے اور اسے جگایا بھی جا سکتا ہے مگر بے ہوشی کا حصار زیادہ مضبوط ہوتا ہے جو دفاع کو اور جسم کو زیادہ سے زیادہ تحفظ فراہم کرتا ہے۔ باہر ایک کار کا انجن غرایا۔ پھر کار چلی گئی۔ خاموشی اور گہری ہو گئی۔ میں ابھی تک ہوش میں تھا۔ شاید محسن بھی ہوش میں تھا اور میری طرح وہ

بھی آنکھیں بند کیے سوچ رہا ہوگا کہ ان حالات میں کیا ہوسکتا ہے؟ بالفرضِ محال ہم دلاور کو وہ جگہ بتا دیتے جہاں ہم نے اس کا مال غرق کیا تھا تب بھی دوسری بات جس کا خود ہمیں علم نہ تھا کیسے بتائی جاسکتی تھی۔ زیب النساء یقیناً فرار ہوگئی تھی مگر فرار ہو کے کہاں گئی تھی؟ ہمارے لیے اس بارے میں قیاس آرائی کی بنیاد پر بھی کوئی نتیجہ اخذ کرنا ممکن نہیں تھا۔

وقت کا ایک ایک لمحہ احساس پر چرکے لگاتا گزر رہا تھا اور میرے عذاب میں اضافہ ہونے لگا تھا۔ میں ان آوازوں کو سن رہا تھا جو دونوں درندہ صفت قصاب کھال اتارتے ہوئے نکال رہے تھے۔ ان کا مقصد آوازوں کے ذریعے ہمارے دماغ میں وہ تصور قائم کرنا تھا جسے ہماری آنکھوں نے دیکھنے سے انکار کر دیا تھا۔

پھر مجھے ایسا لگا جیسے میرے چاروں طرف اندھیرا اچھل گیا ہے۔ شاید یہی بے ہوشی ہے، میں نے سوچا۔ مگر اسی وقت وہ دونوں قصائی چلانے لگے جو اپنے ہی ہم جنس کی کھال اتارتے ہوئے اتنی اذیت بھی محسوس نہیں کر رہے تھے جتنی بکروں کی کھال کھینچتے وقت محسوس کرتے ہوں گے۔

"ابے یہ کون ہے۔ کس نے آف کی ہے لائٹ؟"

"کیا فیوز اڑ گیا ہے۔۔؟" دوسرا چلایا۔

اور تب میں نے محسوس کیا کہ اندھیرا حقیقی ہے۔ ایک ساتھ وہ چاروں بلب بجھ گئے ہیں جن کی چندھیا دینے والی روشنی اور حرارت برداشت سے باہر ہونے لگی تھی۔ صرف آدھے گھنٹے میں میرا جسم پسینے میں شرابور ہوگیا تھا اور پیاس سے میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔

گھپ اندھیرے میں دروازہ کھلا اور بند ہوگیا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکا۔ کیا خدا نے ہماری سن لی تھی؟ کیا واقعی راجا اور شیخ ادھر آگئے اور انھوں نے صورتِ حال کو سنبھال لیا؟ مگر یہ ناممکن تھا کہ اتنے کم وقت میں وہ سیدھے یہاں پہنچ جائیں۔ کوئی ان کا راستہ بھی نہ روکے۔

دونوں قصاب بدحواس ہوگئے تھے۔ میں نے ان میں سے ایک کے حلق سے نکلنے والی بھیانک کراہ سنی۔ پھر کوئی جسم فرش پر بڑی آواز کے ساتھ گرا۔ دوسرا چلانے لگا۔

"کون ہے؟ ابے تو کہاں ہے؟ بولتا کیوں نہیں؟ کیا ہوا ہے تجھے؟ خود کو چھری مار لی ہے کیا؟" اس کی آواز بھی ایکدم بند ہوگئی۔ وہ بلبلایا اور میں نے تاریکی میں اس کے کالے وجود کو بھی فرش پر گرتے دیکھا۔ ان کے ساتھ کیا ہوا تھا اور کیوں ہوا تھا میں نے محسن کو آواز دی۔

"تو ٹھیک ہے نا محسن؟"

"ہاں، ابھی تک تو بہت خیریت ہے۔" وہ بولا۔ "۔۔۔ کیسا تھا؟"

اندھیرے میں قدموں کی چاپ میرے نزدیک آئی۔۔۔ میرے پنجرے کے قفل کو ہلا کے دیکھا۔ میری نظر ایک سایے۔۔۔ ٹھہر گئی جو کوئی واضح شکل نہیں رکھتا تھا۔

"تم۔۔۔ کون ہو تم؟" میں نے کہا۔

"فرشتۂ غیب۔" غالب نے سرگوشی میں کہا۔ "۔۔۔ حکم سے اسی طرح آتا ہے۔"

میرا دل ایک بے پایاں خوشی سے بھر گیا۔ "۔۔۔ مگر بہت کم کہ تم لوگ یہاں پہنچ جاؤ گے۔"

"بھائی ہم تو پہلے ہی آجاتے۔ مگر ہم دلاور اور۔۔۔ جانے کا انتظار کرتے رہے۔" غالب نے کہا۔

"میں نے تم سے گھر بیٹھ کے رہنے کو کہا تھا۔" میں نے۔۔۔

"ہاں۔ مگر دل نہیں مانا۔" وہ بولا۔ "کبھی کبھی دل کی ماننا۔۔۔ اچھا ہوتا ہے۔ میں محسن کے پیچھے لگ گیا تھا۔"

"مگر تم اکیلے اندر آ پہنچے! کسی نے روکا نہیں؟"

"روکا تھا۔ ایک نے نہیں، دو نے۔" غالب بولا۔ "میں نے۔۔۔ دونوں کو ٹھکانے لگا دیا۔ دونوں کو مار دیا۔"

"میں نے تو کوئی آواز نہیں سنی۔۔۔"

"میں نے انھیں آواز نکالنے ہی نہیں دی۔" غالب بولا۔ "۔۔۔ خیال ہے کہ اب اندر اور کوئی نہیں ہے۔"

"پہلے تالا توڑو یار، میرے گھٹنے، میری کمر اور گردن۔۔۔ ٹیڑھے ہو رہے ہیں۔"

"چابی تو مجھے ملی نہیں۔" غالب نے کہا۔ "کیا خیال ہے گو۔۔۔ اڑا دوں؟"

"چابی نہیں ملی۔۔۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ وہ ساتھ لے گئے۔۔۔ پھر اندر کوئی اور بھی ہے۔"

"باہر دو بھوت پھر رہے تھے۔ انھیں میں نے ریوالور کے۔۔۔ دستے سے ناک آؤٹ کیا اور پھر ان کی گردن دبا دی۔ ان کے۔۔۔ جو ریوالور تھے وہ اب میرے پاس ہیں۔"

"پھر کاہے کا ڈر۔" میں نے کہا۔ "ایک مجھے دے اور۔۔۔ کو گولی مار۔ اس کے بعد ہم دونوں نمٹ لیں گے سب۔۔۔"

غالب نے پنجرے کی سلاخوں میں ریوالور مجھے تھمایا۔۔۔ قفل ٹٹول کے فائر کیا۔ اس کی آواز بند کمرے میں بم کا دھماکا۔۔۔ گونجی، لیکن اس کے ساتھ ہی دروازہ کھل گیا اور میں باہر آگیا۔۔۔ پنجرے سے باہر آنا ایک نئی زندگی پانے سے کم نہیں تھا۔۔۔ مجھے اپنے پیروں پر سیدھا کھڑا ہونے میں کچھ دیر لگی۔

"یہ لائٹ کیوں آف کی تھی تو نے؟"

"میں نے نہیں کی تھی۔" وہ بولا۔ "لائٹ تو خود ہی بند ہوئی تھی۔ میرا خیال ہے اس علاقے کی بجلی چلی گئی ہے۔"

"پھر تو شبہے کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ صرف تائیدِ ایزدی ہے۔ بچانے والے کا ہاتھ ہے۔" میں نے کہا۔

"میں آدھا گھنٹا پہلے پہنچا تھا۔" وہ بولا۔ "پہلے میں نے چاروں طرف سے گھوم پھر کر دیکھا۔ پھر پچھلی طرف سے اندر آیا۔ اور آنکھ مچولی کھیلتا رہا، ان کی نظروں سے اوجھل رہنے کے لیے۔ مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ اس کمرے میں کچھ ہو رہا ہے۔ موقع ملتے ہی میں نے ایک دروازے کی درز سے جھانک کے دیکھا۔۔۔ سب دیکھ لیا تھا میں نے۔"

"یہ اندھیرا غنیمت ہے۔" میں نے کہا۔ "چل دوسروں کو بھی نکال لیں۔"

ایک ایک گولی سے ہم نے باقی تین پنجروں کے تالے توڑ دیے۔ محسن سب سے پہلے باہر آیا اور غالب کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔ جب وہ لوٹا تو اس نے ایک بھوت کا لباس پہن لیا تھا، سوائے نقاب کے۔ اب ہم ایک سے تین ہوگئے تھے اور اس میں کوئی شک نہیں رہا تھا کہ اس قید خانے میں اور کوئی نہیں۔ ہمارے لیے دلاور چار محافظ چھوڑ گیا تھا۔ ان میں سے دو مسلح تھے اور وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہ چار افراد ناکافی ہوں گے۔ اس نے تو ہمیں اس طرح بند کیا تھا کہ وہ کسی کو بھی چھوڑ کے نہ جاتا تب بھی ہماری رہائی ممکن نہ تھی۔

"یہ جگہ کون سی ہے مرزا جی!" میں نے کہا۔

"منگھوپیر کا علاقہ ہے۔ ایک الگ مکان ہے کسی پہاڑی پر بنا ہوا۔" غالب نے کہا۔

"تم موہنی کو اٹھا لو۔" میں نے غالب سے کہا۔ "محسن اسے اٹھا لے گا، نازو کو۔ میں تمھیں راستہ بتاتا ہوں۔"

"راستہ مجھے بھی معلوم ہے۔"

"گھر کے اندر ہی ایک بیڈروم ہے۔ اس کے ساتھ والے باتھ روم میں موہنی کے اپنے کپڑے موجود ہیں۔" میں نے کہا۔ "نازو کے بھی کہیں مل جائیں گے۔ نہ ملے تو مردانہ کپڑے بھی چلیں گے۔"

"اس اندھیرے میں تو کچھ نظر نہیں آتا۔ نہ ماچس ہے نہ موم بتی۔" غالب نے کہا۔

"اچھا ہے، ہم اندھیرے میں ہی نکل جاتیں۔"

"ان لڑکیوں کو کیسے۔۔۔ ہیں گے، یہ تو بے ہوش ہیں۔"

"۔۔۔ آنے کا انتظار کریں۔" میں نے کہا۔ "ان کے ہوش میں آنے سے پہلے وہ آگئے تو؟"

"نہیں، وہ چار چھ گھنٹے سے پہلے نہیں آئیں گے۔"

"بس تو پھر ٹھیک ہے۔" محسن نے کہا۔ "ہم اطمینان سے۔۔۔"

بجلی ایک دم آگئی۔ ہم سب اس وقت کسی کمرے میں تھے۔ روشنی ہوتے ہی میں نے اس خواب گاہ کو پہچان لیا۔ دلاور اسی بیڈروم میں میرے پاس آیا تھا۔ اس وقت صورتِ حال بڑی عجیب اور افسوس ناک تھی لیکن ایمرجنسی میں جو کچھ کرنا تھا ہمیں ہی کرنا تھا۔ چنانچہ میں باتھ روم سے موہنی کے کپڑے لایا۔ غالب نے ایک اور کمرے سے نازو کے کپڑے تلاش کیے۔ پھر ہم نے انھیں جیسے تیسے وہ کپڑے پہنائے اور ایک ہی بیڈ پر لٹا دیا۔ پھر ان کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنے لگے۔

"چچا غالب! تم نے آج بہادری کا وہ کارنامہ سرانجام دیا ہے کہ یہ زمانہ ہوتا انگریزوں کا۔" میں نے کہا۔ "اور میں ہوتا تاجِ برطانیہ کا مالک۔ تو تمھیں وکٹوریہ کراس دیتا۔"

"میں ہوتا تو وکٹوریہ الگ دیتا، کراس الگ۔" محسن نے کہا۔

"وکٹوریہ میری وہ کلاس فیلو تھی جس پر میں تین بار عاشق ہوا تھا اور کسی کے حصے میں یہ اعزاز نہیں آیا۔ کراس تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ صلیب کو کہتے ہیں۔"

"یار جب اوکھلی میں دیا سر تو پھر موصل کا کیا ڈر۔" غالب نے کہا۔ "اب تو ہم یہاں قابض ہیں اور اتنے بے بس بھی نہیں ہیں کہ وہ اچانک آجائیں تو ہم مقابلہ بھی نہ کر سکیں۔"

"پھر کیا چاہتے ہیں آپ؟"

"میں اور محسن ذرا دشمن کے قلعے کا جائزہ لیتے ہیں۔" وہ بولا۔

"ہاں، یہ گھر ہے تو اس میں ایک کچن بھی ہوگا۔ اور کچن میں کم سے کم چائے بنانے کے آلات و اسباب ضرور ہوں گے انھوں نے گھر کو فرنش کیا ہوگا۔ تو پوری طرح کیا ہوگا۔" محسن بولا۔

"ٹھیک ہے، تم دونوں جاؤ۔" میں نے کہا۔ "لیکن ایک خانساماں ہوگا۔ دوسرا محافظ۔ جو محافظ ہوگا اسے کچھ دوسرے کام بھی کرنا ہیں۔"

"چائے میں بنا کے لاتا ہوں۔ میں کچھ اور کرنے کے قابل نہیں ہوں۔" محسن نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں سیکیورٹی کے انتظامات مکمل کرتا ہوں۔" غالب نے کہا۔

وہ دونوں نکل گئے تو میں نے بیڈروم کو چیک کیا۔ اس کے دو دروازے اندر سے کنڈی لگا کے بند کیے۔ کھڑکی کے پٹ دیکھے اور پردے برابر کیے۔ پھر بیڈ سائیڈ ٹیبل کی درازوں کو کھولا۔ اس میں ایک طرف نیچے والے حصے میں ٹیلی فون رکھا ہوا تھا۔ اس کا تار نہ جانے کس سمت سے آیا تھا کہ ابھی تک کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ میں نے

اس کا رسیور اٹھا کے نیچے رکھ دیا۔ اوپر والی دراز میں چند زیورات پڑے ہوئے تھے جو نہ موہنی کے تھے نہ نازو کے۔ میں نے انھیں اٹھا کے دیکھا۔ ایک نیکلس، ایک جوڑی بُندے اور چار چوڑیاں نہ جانے کس کی تھیں اور جس کی تھیں وہ نہ جانے کس دنیا میں تھی اور کس حال میں تھی۔

"دوسری طرف والی بیڈ سائیڈ ٹیبل کے نیچے والے خانے میں فحش تصاویر کا ایک البم تھا اسے میں نے سرسری نظر سے دیکھا اور واپس وہیں رکھ دیا۔ اوپر والی دراز میں مجھے مطلوبہ اشیا مل گئیں۔ یہاں رہنے والے یا تفریح اور عیاشی کے لیے آنے والے ہر قسم کی ادویات کے عادی تھے۔ اس میں اسپرین سے لے کر خواب آور اور شباب آور ہر طرح کی گولیاں تھیں۔

غالب پہلے لوٹ آیا۔ "میں نے اس کمرے کو بند کر دیا ہے۔" وہ کرسی پر گر کر لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ "میری طبیعت خراب ہو رہی ہے اس منظر کو دیکھ کر۔"

"اگر یہ لڑکیاں دیکھ لیتیں تو کیا ہوتا؟" میں نے تشویش سے کہا۔ "ان کا بے ہوش ہو جانا اور پھر لائٹ بند ہو جانا اچھا رہا۔"

"یار... آدمی کی زندگی بھی کیا طُرفہ تماشا ہے۔" غالب نے قنوطی لہجے میں کہا۔ "یہ جو شخص آدھے جسم کی اُدھڑی ہوئی کھال کے ساتھ اُلٹا لٹکا ہوا ہے، ایک نواب تھا...... لاکھوں کروڑوں میں کھیلتا تھا۔ ایک سے ایک اچھی کار اور داشتہ رکھتا تھا مگر اس کے ساتھ جو لٹکا ہوا ہے، وہ فقط ایک ڈرائیور تھا۔ دونوں نے زندگی کا سفر کہاں سے شروع کیا۔ کس کس راہ سے گزرے اور ملے تو کہاں آ کے ملے اور کیسے ملے۔ کاش میں دنیا کو یہ نظارۂ عبرت دکھا سکتا۔ ان سب کو جو عیش و نشاط کی محفلوں میں شراب و شباب کے پیمانے چھلکا رہے ہیں۔ دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹ رہے ہیں اور دولت کو ہی زندگی کی طاقت سمجھ رہے ہیں اور عزت سمجھ رہے ہیں۔ کیا ان سے وہ مفلسی میں مرنے والا چپراسی اچھا نہیں جس کا جنازہ اٹھا تو اسے رونے والے بیٹے، بہو، نواسے، پوتے، دوست اور محلے دار سبھی تھے۔ جس کو کفن بھی ملا اور مدفن بھی، جس کے لیے دعا مانگنے والے ہاتھ بھی بہت تھے کہ خدا اس کی مغفرت کرے اور بعد میں اچھے لفظوں میں یاد کرنے والے بھی۔"

میں نے اسے بولنے دیا۔ کیونکہ یہی اس کا علاج تھا۔ وہ اپنی آنکھوں سے ایک ہیبت ناک منظر دیکھ کے آیا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ پُرسکون ہو گیا۔ پھر بھی میں نے دراز میں ملنے والی ادویات میں سے ویلیم ٹین کی ایک گولی اسے دی اور ایک خود نگل لی۔ یہی سب کچھ میں نے بھی دیکھا تھا اور میرے اعصاب کو بھی پُرسکون رکھنے کے لیے سکون آور دوا کی اتنی مقدار کم سے کم ضروری تھی۔

محسن چائے کی ٹرالی کو دھکیلتا ہوا لایا۔ اس میں ... کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا۔ کلاک نے رات کے دو بجائے ... نے موہنی کو ہوش میں لانے کے لیے اور غالب نے نازو کو ... بحال کرنے کے لیے ان کے چہروں پر چھینٹے مارے۔ ان ... کو تھپکی دی بلکہ زور زور سے چانٹے مارے۔ آہستہ آہستہ موہنی کا ... جسم کانپنے لگا۔ اور وہ سسکیاں لینے لگی۔ جیسے جیسے ہوش ... قریب آئی اس کی بے چینی بڑھی۔ وہ سر کو تکیے پر اِدھر اُدھر جھٹکنے لگی۔ اور ہاتھ چلانے لگی۔ میں نے اس کے ہاتھ ...

"چھوڑ دو... چھوڑ دو مجھے... مجھے سب منظور ہے جو تم کہو گے میں مانوں گی... دیکھو... دیکھو میں ایک عورت ... میں کوئی جانور نہیں ہوں... بھیڑ بکری نہیں ہوں... مجھے ... مت لٹکاؤ..." اس کی آواز بلند ہوتی گئی۔ پھر اس نے ایک ... ماری اور آنکھیں کھول کے مجھے دیکھا۔ دوسرے لمحے وہ مجھ ... چمٹی کہ مجھے خود کو چھڑانا دشوار ہو گیا۔

"رضیہ..." میں نے پہلی بار اسے موہنی کہنے سے گریز ... "میری طرف دیکھو رضیہ! تمھارے ساتھ ہوں میں، تم بالکل محفوظ ہو، خطرے کی اب کوئی بات نہیں رہی... ہوش میں آؤ ..."

جب وہ بالآخر خود کو سنبھالنے کے قابل ہوئی اور ... خود کو سنبھالا تو محسن کی ہنسی نے مجھے خفّت میں مبتلا کر دیا۔

"آج تو عیش ہو گئے ہیں بھئی اپنے سکندر صاحب اور مرزا ... تمھاری تو آنکھ کا پانی مر گیا ہے۔ دونوں کی آنکھوں کا یعنی کیا ... پیش کر رہے تھے آپ دونوں۔" اس نے البم کو تہ کر کے واپس دراز میں رکھا۔ نہ جانے کب اس نے البم نکالا تھا۔ مجھے بالکل خبر نہیں ہوئی تھی۔

"تم تو سالے دُہرے مزے لے رہے تھے۔ سنسر بورڈ ... اولاد۔" میں نے کہا۔

"حالانکہ شرافت کا تقاضا تو یہ تھا کہ آپ آنکھیں بند کر لیتے ..." غالب نے کہا۔ "یہ کوئی رومانٹک سین نہیں تھا۔ میڈیکل کیس ... جس میں کچھ بلکہ خاصے جذبات شامل ہو گئے تھے۔" محسن ... بدستور ہنستا رہا۔ "بہت بدمعاش ہو تم دونوں، بلکہ چار دونوں ... ڈراما کر رہے تھے۔"

نازو کو اور موہنی کو کچھ احساس ضرور تھا کہ انھوں نے کیا ... مگر وہ محسن کی بات سے زیادہ متاثر نظر نہیں آتی تھیں۔ خوف ... بھی ان کے اعصاب پر سوار تھا اور وہ دہشت زدہ نظروں ... اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے خود کو یقین دلا رہی تھیں کہ یہ سب ... نہیں ہے۔ بھیانک خواب ... وہ تھا جو انھوں نے دیکھا تھا۔ ... پینے اور دوا کھانے ...

"باہر کا انتظام تو ٹھیک ہے نا؟" محسن بولا۔

"ہاں، اندر آنے کے لیے دو گیٹ تھے۔ ایک تو شاید ہمیشہ بند رہتا ہے۔ دوسرا میں نے بند کر دیا۔" غالب نے کہا۔ "اسی طرح گھر میں آنے کا ایک راستہ تو پیچھے کی طرف ہے، جو میں نے استعمال کیا تھا۔ دوسرا سامنے ہے۔ سامنے والا گیٹ مقفل ہے۔ کوئی کچن کی طرف سے آئے گا تو ہمیں معلوم ہو جائے گا۔"

"وہ کیسے؟ کال بیل دے گا کیا؟"

"وہ بیل کی طرح چلّائے گا۔" غالب نے کہا۔ "میں نے الیکٹرک ڈسٹر کا تار الگ کر کے دروازے سے لگا دیا ہے۔ دروازہ فلائی پروف ہے یعنی اس میں لوہے کی جالی ہے۔ جو بھی ہاتھ لگائے گا کرنٹ نوٹس فرمائے گا۔ کیا جینئس ہوں میں بھی چیف کے لٹو۔"

"میں اب جاننا چاہتا ہوں مرزا جی کہ تم فرشتۂ غیب بن کے کیسے نازل ہوئے؟" محسن نے کہا۔

"اور میں بحیثیت چیف کے لٹو جاننا چاہتا ہوں کہ تم نے حکم عدولی کیوں کی؟" میں نے کہا۔

"یار! میری چھٹی حس..."

"چھٹی حس میری ہے۔" میں نے اسے ٹوک دیا۔

"ساتویں میری ہے۔ خیال رہے۔" محسن نے کہا۔

"اچھا اچھا۔ تو دوستو میری آٹھویں حس نے مجھے مجبور کیا کہ اٹھ باندھ کمر کیا ڈرتا ہے۔" غالب نے کہا۔ "یہاں بیٹھ کے بھوتوں کو شرفِ ملاقات بخشنے سے کیا حاصل۔ سب مردانِ با صفا جہاد پہ لگے ہوئے ہیں۔ اور تو یہاں چھپا بیٹھا ہے۔ تف ہے تجھ پر۔"

"یہ تیری آٹھویں حس نے میرے دل کی بات کہی۔"

"بس میں نکل کھڑا ہوا۔" وہ بولا۔ "ایک خیال میرے دل میں سما گیا تھا کہ تم دونوں ہی نہ پکڑے جاؤ اور اپنی عقلمندی کے چکر میں آ جاؤ۔ میں نے محسن کو بھی قلی کے بھیس میں دیکھا۔ باہر اتفاق سے میں نے وہ کار دیکھ لی۔ سلیٹی رنگ کی ٹویوٹا کرونا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ یہاں کیوں لائی گئی ہے۔ انھوں نے پارکنگ لاٹ کا آخری حصہ منتخب کیا تھا، جہاں نسبتاً تاریکی تھی۔ میں کار کے پیچھے جا کھڑا ہوا اور موقع کا انتظار کرنے لگا۔ کار کا ڈرائیور وہیں موجود تھا اور بظاہر ہلنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ لیکن وہ دو منٹ کے لیے کہیں گیا۔ سگریٹ لینے یا پان کھانے، یا باتھ روم۔ بس اتنی دیر میں میں نے ایک تار کے ٹکڑے کی مدد سے ڈکی کھول لی۔ تار میں پہلے ہی تلاش کر چکا تھا۔ ڈرائیور کے واپس آنے سے پہلے میں ڈکی کے اندر تھا۔ اور ڈکی کو اندر کھینچ کے بند کر چکا تھا۔"

"اسے عقلمندی تو نہیں کہا جا سکتا۔ اگر کوئی دیکھ لیتا؟"

نل کا مسئلہ بہرحال نہیں تھا۔" غالب نے کہا۔ "کہ میں محوِ تماشائے لبِ بام رہتا۔"

"اگر وہ وہاں سے نہ ٹلتا تو؟"

"تو میں کچھ نہ کچھ ضرور کرتا۔" غالب نے کہا۔ "ٹیکسی لے کر پیچھے آتا۔ جہاں موقع پاتا وہاں دونوں پیچھے والے ٹائر برسٹ کر دیتا۔ مثلاً کسی پُرہجوم چوک کے ٹریفک سگنل پر۔"

"اور ٹیکسی ڈرائیور؟"

"میں اسے بھی برسٹ کر دیتا۔ آدمی جب مایوسی کی انتہا پر پہنچ کے مرنے مارنے پر اتر آئے تو کچھ نہیں دیکھتا۔ کچھ نہیں سوچتا۔ میں ایک ایک کو مار دیتا۔ جو بھی میرا راستہ روکتا، لیکن مجھے زیادہ فکر یہ تھی کہ کار نہ نکل جائے۔ ایک بار اسے روک لیتا تو پھر جانے نہ دیتا۔ ڈکی میں بند ہو کے میں انھی کے ساتھ یہاں پہنچ گیا۔"

"آفرین ہے مرزا غالب کے بھتیجے! وہ کام کیا تو نے جو رستم سے نہ ہو گا۔" میں نے کہا۔ "تو واقعی دھم سے آ کودا۔"

نازو نے کہا۔ "کیا اب یہیں رہنا ہے؟"

ہم نے چونک کے پیچھے دیکھا۔ "جو حکم ہو آپ کا؟" غالب سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "یہ گھر پسند نہیں تو شیشے کا گھر بنوا دوں۔ ماؤنٹ ایورسٹ پر سونے کا محل کھڑا کر دوں بحرالکاہل کی تہ میں؟"

"آج بدتمیزی معاف ہے۔" نازو کا رنگ گلابی ہو گیا۔

"صرف آج۔" غالب نے ایک پُرحسرت آہ بھری۔

"تمھاری طبیعت اب کیسی ہے رضیہ؟" میں نے کہا۔

اس کا چہرہ دمک اٹھا۔ "تم نے پوچھ لیا تو ٹھیک ہو گئی۔"

"آہم... وہ کیا شعر ہے کہ ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق۔" غالب نے کہا۔

"یار، یہ بہت خوش ہے آج۔" محسن قہقہہ مار کے بولا۔ "اسے کچھ کھانا پینا چاہیے۔"

"ہم نے کیا پوچھا تھا۔" نازو نے گھبرا کے کہا۔ "اگر قسمت نے بچا لیا ہے..."

"لے بھائی، آج سے تیرا نام قسمت ہے۔" محسن بولا۔

میں نے تائید میں سر ہلایا۔ "بچایا تو غالب نے ہے بی بی۔"

"اُفوہ تم دونوں کی زبان..." نازو جھلا کے بولی۔ "ہر جگہ چلنے لگتی ہے۔ میں کہتی ہوں یہاں سے نکل چلو اسی وقت۔"

"باہر اندھیری رات ہے، سنسان راستہ ہے، راستے پر بھوت اور چڑیلیں ڈانس کر رہے ہیں، شہر یہاں سے دس میل دور ہے اور ہم کو مشرق مغرب کا پتا نہیں۔"

"پتا باہر نکل کے چلے گا۔" نازو نے کہا۔ "اگر اس وقت یہاں کوئی نہیں ہے تو وقت ضائع کرنے کا فائدہ؟"

"اب ہم مقابلہ کر سکتے ہیں۔"

"مگر بلا مقابلہ نکل جائیں تو اچھا ہے نا؟" نازو نے کہا۔ اور بالآخر ہم سب کو قائل کر لیا۔ نازو اور موہنی نے بستروں کی چادریں یوں لپیٹ لیں، جیسے پردہ دار خواتین لپیٹتی ہیں۔ ہم سب پچھلی طرف سے باہر نکلے۔ محسن نے بے خیالی میں دروازے پر ہاتھ رکھا اور کہا: "ہا... ہاہ..."

جب ہم سب نے ہنسنا شروع کیا تو اس نے تار کو الگ کیا۔

"میں برقی صدمے سے فوت بھی ہو سکتا تھا۔ دانت نکالنے کی تو اس میں کوئی بات نہیں۔" وہ بولا۔

غیرت مند تو ہر صدمے سے مر جاتے ہیں۔ وہ الیکٹرک ہو یا نہ ہو۔" میں نے کہا۔

"ہاں، مثلاً میں۔" غالب نے کہا۔ "مرگیا صدمۂ یک جنبش لب سے غالب۔ مثال تمہارے سامنے موجود ہے۔"

باہر ایک عجیب ویرانی تھی۔ ہم عقبی حصے کی ایک دیوار پھاند کر باہر آئے تو بہت دور کتے بھونک رہے تھے۔ کہیں ایک اُلّو بھی بولا۔ جس پر غالب نے محسن سے پوچھا کہ اس نے کچھ کہا ہے؟

"ہاں، میں نے پوچھا تھا کہ کیا تم اسی کے پٹھے ہو؟" محسن بولا۔

یہ علاقہ انتہائی ویران تھا۔ مکان خال خال تھے اور ہنوز غیر آباد تھے۔ ترقیاتی کام ابھی جاری تھے۔ بجلی کے پول تھے مگر اسٹریٹ لائٹ نہیں تھی۔ پول سے گھروں تک جانے والی لائن بھی کسی کسی کے گھر پر نظر آتی تھی۔ گلیاں بھی کچی تھیں اور سیوریج لائن ڈالنے کے لیے کھدائی ہو رہی تھی۔ آوارہ کتے ہر طرف پھر رہے تھے اور ان میں سے چند ایک واجبی طور پر بھونکے بھی۔ خواتین ڈر کے ہماری آڑ میں آگئیں۔ ہم نے انھیں یاد دلایا۔ کہ بھونکنے والے کتے نہیں کاٹتے۔ ڈرنا ہے تو ان سے ڈرو جو شرفا کی طرح چپ بیٹھے ہیں مگر ان کو اس دلیل نے مطمئن نہیں کیا۔ تھوڑی سی جستجو کے بعد ہم نے ایک سڑک دریافت کی۔

"معلوم نہیں یہ سڑک کدھر جاتی ہے۔" میں نے چلتے چلتے کہا...

"اس معاملے میں استاد امام دین گجراتی کا ایک شعر ہے۔" غالب نے کہا۔ "جو انٹرنیشل ہے اور ہر جگہ کے لیے استعمال ہو سکتا ہے۔ کرو غور یہ سڑک۔ یہ سڑک سیدھی کراچی جاتی ہے

اور پھر واپس بھی لوٹ آتی ہے"

"یہ استاد نے جلال پور جٹاں کے بارے میں کہا تھا۔" محسن نے اس ترمیم پر احتجاج کیا۔

"شعر بین الاقوامی ہے۔ آپ کسی بھی شہر کا نام فٹ کر سکتے ہیں۔" غالب نے کہا۔

نازو نے کہا۔ "وہ ہے نارتھ اسٹار قطبی ستارہ۔"

"وہ جو چمک رہا ہے۔" غالب منہ اٹھا کے بولا۔

"اور نظر بھی آرہا ہے۔" محسن نے بھی ایک احمقانہ بات کی۔ نازو نے ان کی بے ہودگی کو نظر انداز کر دیا۔ "سکندر بھائی! ادھر شمال ہے۔"

"کمال ہے پہلے ادھر جنوب تھا میرے دائیں ہاتھ پر۔" غالب نے سر ہلایا۔ "ابھی کل کی بات ہے۔"

"یہ جادو ہے بھیا۔" محسن نے اس کا ساتھ دیا۔ "کل میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ سویا تو مشرق اُلٹے ہاتھ پر، جاگا تو سیدھے ہاتھ پر۔"

"آہ ہا۔" میں نے ٹھنڈی سانس بھر کے کہا۔ "دھوکا تو سارے ہی دیتے ہیں بھیا۔ اب یہ جو قطبی ستارہ ہے، کل جب ہم آرہے تھے تو دائیں ہاتھ پہ تھا۔ اب جا رہے ہیں تو بائیں طرف آگیا ہے۔ بدمعاش۔"

نازو کا موڈ خراب ہو گیا۔ "سب ایک تھیلی کے چٹے بٹے ہیں کسی سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔"

موہنی برابر ہنس رہی تھی اور اس سے نازو کا مزاج مزید برہم ہو رہا تھا۔

"ان سے پوچھو کر ان کے تھوبڑے کدھر تھے؟" نازو بولی۔

ہم چلتے جا رہے تھے اور کچھ معلوم نہیں تھا کہ کدھر جا رہے ہیں۔ ایک پُر عذاب جہنم سے نکل کر ہم اپنے اعصاب پر پڑنے والے بُرے اثرات سے اسی طرح نجات حاصل کر سکتے تھے کہ کچھ ہنسی مذاق کریں۔ اور جو بیتی اس کی بات ہی نہ کریں۔ اگر ہم خاموش رہتے تو ہمارا دماغ سوچتا اور سوچوں پر وقت کے آسیب کا سایہ ہوتا جس سے ہم ابھی گزر کے آئے تھے۔

"کیا ہم واپس وہیں جائیں گے؟" محسن نے اچانک کہا۔

"اور کہاں جا سکتے ہیں ہم؟" میں نے کہا۔

"اور وہاں پھر یہی شکاری منتظر ملے تو؟"

"میری عقل کہتی ہے کہ وہ پھر وہاں نہیں آئیں گے۔" میں نے سوچ کے جواب دیا۔ "ان کا خیال ہو گا کہ جہاں سے ہم ایک دفعہ بچ گئے تھے، وہاں دوبارہ جانے کی غلطی نہیں کریں گے۔ ہم خوفزدہ ہو کے کہیں اور پناہ لیں گے۔"

"یہ ایک نفسیاتی فائدہ ہو سکتا ہے ہمیں۔" غالب نے کہا۔ "اس کے علاوہ دو سُور ما جو ٹرک کے ساتھ گئے تھے وہ بھی تو وہیں آئیں گے۔ ہم کہیں اور چلے گئے تو ان کا ہم سے رابطہ کیسے ہو گا؟"

"میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ اگر ہم وہاں قلعہ بند ہو جائیں تو یہ ناممکن ہے کہ وہ باقاعدہ حملہ کر کے ہمیں گرفتار کر سکیں۔ انھیں سخت مقابلہ کرنا پڑے گا اور ہمارے لیے فرار کے راستے بھی کھلے ہوں گے۔ ہم پیچھے سے یا دائیں بائیں کسی گھر...

سڑک تا حدِ نظر پھیلا...

تھا۔ اور کتنی دور تک پیدل جانا تھا۔ صبح کے ساڑھے تین بجے تھے ایک ڈیڑھ گھنٹے سے پہلے تو کسی قسم کی سواری ملنے کی امید بھی نہیں تھی۔ کسی دودھ لے جانے والی گاڑی کے آنے کی اور نہ اخبار لانے والوں کی گاڑی کی۔ ادھر ابھی پولیس نے گشت شروع نہیں کیا تھا۔ آبادی نہ ہونے کے سبب ابھی تک چور ڈاکو اور پولیس کے اتحادِ ثلاثہ نے اپنی توجہ زیادہ خوشحال اور آباد علاقوں پر مرتکز کر رکھی تھی۔ پھر رات کو یہاں وہ ضرورت کے تحت آتے جاتے لوگ بھی نہیں ملتے تھے جن کو آوارہ گردی میں چالان کی دھمکی دے کر ان سے کچھ نکلوایا جا سکے۔

ایک گھنٹے بعد سب کا یہ حال ہو گیا کہ رُک کر دم لینے کے سوا چارہ نہ رہا۔

"کون کہتا ہے کہ مارننگ واک اچھی چیز ہے؟" محسن بولا۔

"میرے گھٹنے کی چوڑیاں گراریاں سب ڈھیلی پڑ گئی ہیں۔" غالب بولا۔

"دماغ کی چولوں کے ساتھ ہی ٹائٹ کروا لینا۔" نازو نے کہا۔

"مرزا جی! لعنت ہے تمہاری مردانگی پر۔ تمھیں پاگل کہہ دیا۔" محسن نے اشتعال انگیزی کی۔

مگر غالب نے دانت نکال کے کہا۔ "ہاں دیوانہ ہوں میں۔ ان سے پوچھو کس کا۔"

نازو کی بات اُلٹ کر اس پر آگئی۔ اچھا ہوا کہ شیخ نہیں تھا ایسے مواقع پر اس کی پوزیشن بڑی عجیب ہو جاتی تھی۔ اگر وہ فراخدل اور مخلص نہ ہوتا تو اس قسم کے مذاق کا بھی بُرا مانتا مگر اس نے ایک حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا۔ اور مطمئن ہو چکا تھا۔

سڑک پر اسی سمت سے ایک لائٹ نمودار ہوئی۔ کوئی کار ہماری طرف آرہی تھی۔ وہ خیال جو ابھی تک مجھے نہیں آیا تھا، وحی کی طرح نازل ہوا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔

"یہ وہی لوگ نہ ہوں۔" میں نے کہا۔

"کیا کرنا ہے پھر؟" محسن بولا۔ "راستہ روکنا ہے۔"

"نہیں چھپ جاؤ سب لوگ۔" میں نے کہا۔

چند سیکنڈ میں ہم درختوں اور جھاڑیوں کے پیچھے گم ہو گئے۔ جب کار سامنے سے گزری تو اسے پہچاننے میں کسی کو دشواری نہیں ہوئی۔ یہ چوہدری ولاور اور بیڈ رو کی کار تھی۔ جب اس کی ٹیل لائٹ بھی غائب ہو گئیں تو ہم اپنی پناہ گاہوں سے نکل آئے۔

"اس نے ہمیں دھوکا دینے کی کوشش ضرور کی تھی۔ خبیث۔" محسن نے خواتین کی موجودگی کا احترام کرتے ہوئے ایک بے ضرر سی گالی پر اکتفا کیا۔

"یہ تو کہہ گیا تھا کہ صبح یا کل شام کو آؤں گا۔" محسن بولا۔

"ہاں، مگر دیکھ لو صرف تین گھنٹے بعد واپس جا رہا ہے۔"

"اور اب ایک گھنٹے سے بھی کم وقت میں واپس بھی آئے گا——

ایک اور شکست کا زخم لے کر۔" غالب نے کہا۔ "اگر ہم اسی طرح صراطِ مستقیم پر چلتے رہے تو مارے جائیں گے۔"

"خیر اب ہم اتنے بے وقوف بھی نہیں ہیں۔" محسن نے کہا۔

"پھر اب کیا کریں؟ چلتے رہیں اسی راہِ پُرخطر پر یا ان کے لوٹ جانے کا انتظار کریں؟"

"میرا خیال ہے کہ وہ لوٹنے میں دیر نہیں کریں گے۔" محسن نے کہا۔ "ہم انتظار کر لیتے ہیں۔"

"وہ لوٹ کے کہاں جائیں گے؟" نازو نے کہا۔

"لوٹ کے بدھو کہاں جاتے ہیں؟" غالب بولا۔

"وہ بدھو نہیں ہیں تمھاری طرح۔" نازو نے جھلا کے کہا۔

"امید تو یہی ہے کہ وہ واپس اس جگہ نہیں جائیں گے، لیکن میں چانس لینا نہیں چاہتا۔" میں نے کہا۔ "ایسا نہ ہو کہ وہ وہاں پہنچ جائیں، وہاں راجا جی اور شیخ صاحب آئے بیٹھے ہوں۔ وہ دھر لیے جائیں۔"

"پھر تو یہ ہے کہ ہمیں جلد از جلد واپس پہنچنا چاہیے۔"

ایک بار پھر ہم سڑک پر چلنے لگے۔ مگر اب ہم پیچھے بھی دیکھتے جا رہے تھے۔ ابھی ہم نے آدھے میل کا فاصلہ ہی طے کیا ہو گا کہ سڑک پر روشنی جھلملائی۔ ہم بے اختیار دائیں بائیں تقسیم ہو گئے۔

"یہ کار نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "کوئی ٹرک ہے یا بس ہے۔"

"ہاں، لائٹس کافی اونچی ہیں..." محسن نے میرے خیال کی تائید کی...

"پھر کیا کرنا ہے۔ بولو... روکیں اسے؟"

"رِسک ہے..."

"نو رِسک نو گیم۔" میں نے سڑک کے درمیان آ کے کہا۔ اور قریب آتی ہوئی گاڑی کی تیز روشنی میں آگیا۔ میں نے اوپر نیچے ہاتھ ہلانا شروع کیا۔ یہ ایک ٹرک تھا جس نے آخری وقت تک رفتار کم نہیں کی۔ اگر میں اس سے زیادہ مستقل مزاج نہ ہوتا تو جان بچانے کے لیے چھلانگ مار کے ایک طرف ہو جاتا اور پھر وہ رُکے بغیر گزر جاتا، لیکن اب اسے پوری قوت صرف کر کے بریک لگانے پڑے۔ یہ دودھ لے جانے والوں کا ٹرک تھا۔ ڈرائیور نے سر نکال کے مجھے لال لال آنکھیں دکھائیں۔

"اوئے پاگل! مرن دی صلاح اے..."

"بھائی، تیری بڑی مہربانی۔" میں نے بھی پنجابی میں کہا۔ "سانوں شہر لے چل۔ رستے وِچ جتھے وی کوئی ہور گڈی ملے گی اُسی اُتر جاواں گے۔ ایتھے تے کجھ وی نئیں اے۔"

"مگر یار! جگہ کتھے اے ساڈے کول، سب دودھ دے ڈبے بھرے ہوئے نے۔" وہ اب کچھ نرم پڑ گیا۔

"خیر اے۔" میں نے کہا۔ "اسی کر لواں گے گزارا۔" میں نے کہا۔

اور باقی سب کو آواز دی "آجاؤ بھئی آجاؤ۔"

عورتوں کو دیکھ کے وہ چونکا "زنانیاں وی ہیں تواڈے نال۔ خیر ہوئے تواڈی۔ ایناں نوں کتھے بٹھاؤ گے ڈبیاں وچ۔"

وہ آدمی دل کا بُرا نہیں تھا۔ عورتوں کے لیے اس نے آگے جگہ بنائی اور اپنے اسسٹنٹ کو حکم دیا کہ وہ پیچھے جائے اور ہمارے ساتھ دودھ کے ڈرمز پر تشریف رکھے۔

یہ ایک بہت مشکل سفر تھا۔ ڈرمز کے بیچ میں بہت کم جگہ تھی۔ میرا ایک پیر ڈرم کے ایک طرف تھا تو دوسرا کسی دوسرے ڈرم کے پاس۔ ڈرم ہلتے تھے تو میری ٹانگیں بھی ہلتی تھیں۔ ہم ڈرم کے اوپر بیٹھ سکتے تھے، مگر یہ رزق کے اوپر بیٹھنا ہمیں منظور نہ تھا۔ خدا خدا کر کے ہم ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں تین چار رکشا کھڑے تھے۔ یہ کوئی کچی آبادی تھی اور رکشا والے شاید وہیں رہتے تھے۔ وہ ہر روز کی طرح تلاشِ معاش کے لیے روانہ ہونے کی تیاری کر رہے تھے۔ دودھ والے نے ہمیں وہاں اتار دیا۔ اور ہمارے شکریے کے جواب میں حقّے کی طرح گڑگڑایا "ٹھیک اے ٹھیک اے شکریے دا اُتّر۔" وہ بولا پھر وہ ٹرک کو بھگا کے لے گیا۔

"اسے کیا ہو گیا؟" میں نے کہا۔

"کچھ نہیں!" نازو نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ذرا تمیز سکھائی تھی اسے۔ اسی کا بُرا مان گیا شاید۔"

"نازو نے کہہ دیا تھا کہ ذرا ٹرک روک کے نیچے اترو اور پھر ہاتھ لگا کے دکھاؤ۔" موہنی بولی "مرد کے بچے ہو تو پیروں پہ کھڑے ہو کے دکھانا۔ پھر میں تم سے شادی کر لوں گی۔"

"تم بھی کیا ہر ایک کے منہ لگتی ہو۔" غالب خفا ہونے لگا۔

"منہ وہ لگ رہا تھا۔ فری ہو رہا تھا خواہ مخواہ۔" نازو نے بھی خفگی سے جواب دیا۔

"وہ اتار دیتا راستے میں تو؟"

"پھر خود پیدل آتا۔" میں نے کہا۔ "ابھی تو بدتمیزی کی کچھ سزا نہیں ملی، سزا میں دیتا۔"

دو رکشے جن سے محسن مذاکرات کرنے میں کامیاب رہا تھا، بوہنی کے لیے ہمارے قریب آ کے رُکے۔ ایک نے اضافی سواری کے لیے اضافی پانچ روپے مانگے تھے۔ فاصلے کا کرایہ دونوں نے ڈبل سے بھی زیادہ چارج کیا تھا اور بیس بیس پہ راضی ہوئے تھے۔

"دن کا آغاز ہی بے ایمانی سے کرتے ہیں یہ لوگ۔" محسن نے کہا۔ جو اس دھاندلی پہ خوش نہیں تھا۔

"یہ کیا، سب موقع سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ضرورت کی قیمت لیتے ہیں اور مجبوری کی۔"

ہم گھر سے دو فرلانگ دور اترے مگر الگ الگ گلیوں میں۔ جب رکشے لوٹ گئے تو ہم نے باقی مسافت بھی اسی طرح طے کی یعنی متوازی گلیوں میں چلتے رہے۔ تب اُفق پر صبح کے آثار نمایاں ہو چلے تھے۔ پہلے میں نے اپنے ہمسائے الفت خاں کے گھر کی چھت سے اپنے گھر میں اترنے کی سوچا۔ پھر یہ ارادہ بدل دیا۔ الفت خاں سو رہا ہوگا اور جاگ گیا تب بھی شک میں مزید مبتلا ہوگا۔ سامنے سے دروازے پر دستک دینا دور اندیشی کے تقاضوں کے خلاف تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ دروازہ چوہدری دلاور کھولے اور کہے "آؤ جی! اپنے سکندر صاحب! بسم اللہ، بس آپ کا ہی انتظار تھا۔ باقی اپنے اعجاز اور شیخ صاحب تو یوں سمجھو کہ تیار بیٹھے ہیں۔"

پچھلی گلی میں کوئی نہیں تھا۔ میں نے ڈرین پائپ پر چڑھ کے صحن میں اترنے اور پھر چھت پر جانے کا فیصلہ کیا۔ اوپر پہنچ کے مجھے اندازہ ہوا کہ صحن اور زینے کے درمیان ایک دروازہ بھی ہے جو مقفل ہے۔ تاہم قفل علامتی قسم کا تھا اور شرفا کے لیے لگایا گیا تھا۔ چوروں کی طرح آنے والے کا راستہ ایک قفل کیسے روک سکتا تھا۔ مجھے خالی گھر کے صحن میں صرف ایک پتھر ہی ملا۔ اس کی ایک ضرب نے قفل کو شکست دے دی۔ تاہم اس سے دھما کا خاصا بڑا ہوا۔ گلی کا دروازہ اندر سے کھولتے ہی باقی سب بھی میرے پیچھے آ گئے تھے مگر میں زینے کے راستے چھت پر پہنچا اور پھر دیوار پھاند کے اپنی چھت پر بہ آوازِ بلند کودا۔ میرا مقصد توجہ حاصل کرنا تھا۔ راجا اور شیخ نیچے ہوں گے تو وہ بھی چونک کر اوپر آئیں گے۔ دلاور اینڈ کمپنی کا گھر پر قبضہ ہوگا تو ان کا نمائندہ تفتیش کے لیے پہنچے گا۔ محسن، غالب، نازو اور موہنی درمیانی دیوار کے اوپر سے جھانکتے رہے۔ میں نے خود کو پانی کی ٹنکی کے پیچھے چھپا لیا۔ کیونکہ نیچے سے کوئی دبے پاؤں اوپر آ رہا تھا۔ میں اس وقت تک سامنے نہیں آیا جب تک میں نے راجا کی آواز نہیں سن لی۔ "شیخ صاحب بلی کودی ہو گی۔"

"بلی نہیں، اونٹ کودا تھا۔" شیخ نے کہا۔

"ہاتھ اٹھا لو اوپر۔" میں نے سائیڈ سے آواز بدل کے کہا۔

وہ دونوں چونکے اور ایک دم پلٹے۔

"سنا نہیں، ریوالور چھوڑ دو، گرا دو یہیں، ہاتھوں کو آہستہ آہستہ اوپر اٹھاؤ۔" میں نے کہا۔ "جس نے پھرتی دکھائی وہ گیا۔"

انھوں نے تعمیل کی۔ مجھے ان کی صورتیں دیکھ کر ہنسی روکنا مشکل ہو رہا تھا، چنانچہ میں نے کہا "اب بتاؤ ہمیں بلی کس نے کہا تھا اور اونٹ کس نے؟"

میری اصل آواز سنتے ہی ان کی حالت مزید غیر ہوئی۔ میں نے سامنے آ کے ہنسنا شروع کیا اور دوسری طرف سے باقی سب کود کود کر آئے اور بھی کمی کرنے لگے۔

"اٹھا لو، اٹھا لو اپنی اپنی توپ۔" نازو نے کہا۔ "پھر کبھی کام آئیں گی۔"

"تو اس لڑکی کا خیال ہے کہ ہم سچ مچ ڈر گئے تھے۔" شیخ نے ریوالور اٹھا کے کہا۔

"حالانکہ ہم بھی ڈراما کر رہے تھے۔" راجا نے اس کی تقلید کی۔

"بس تھانیدار جی، دیکھ لیا ہم نے ڈراما۔" محسن بولا "پتلون تو خراب نہیں ہوئی آپ کی۔"

"تم نے فقیروں کو مکھنا دیا۔ اللہ تمھیں چکّر میں ڈالے۔" راجا بولا۔ وہ بعد میں بھی نہایت ڈھٹائی سے اس بیان پر قائم رہے کہ انھوں نے میری آواز پہچان لی تھی، بلکہ اس خیال سے کہ میرا ڈراما فیل نہ ہو انھوں نے تعاون کیا ورنہ... اس ورنہ کے بعد وہ سب جو ان کی حالت کے چشم دید گواہ تھے ان کا ناطقہ بند کر دیتے تھے اور انھیں بولنے نہیں دیتے تھے۔

جب ہم نیچے پہنچ گئے تو دونوں لڑکیوں نے کچن کا رُخ کیا۔ اکرام شیخ اور راجا نے ناشتے کی حد تک تمام ضروری سامان فراہم کر دیا تھا۔ ناشتا ہی سب سے اہم ضرورت تھا اور اس کے بعد آرام۔ ہم رات بھر جاگے ہی نہیں تھے، شدید ترین ذہنی و جسمانی عذاب سے گزرے تھے اور پھر کئی میل پیدل چلے تھے۔

ناشتا تیار ہونے تک ہم نے اکرام شیخ اور راجا کو وہ سب بتایا جو ہمارے ساتھ ہوا تھا۔ اکرام شیخ دم بخود بیٹھا تھا، مگر راجا کی تو خوف سے بتیسی بج رہی تھی۔ اس نے کہا بھی کہ میں لاشوں کے لٹکائے جانے اور ان کی کھال اتارنے کا نقشہ اتنی تفصیل سے نہ کھینچوں لیکن اکرام شیخ تفصیل سے سب کچھ سننا چاہتا تھا۔ غالب بار بار آداب بجا لاتا ہوں، کہتا رہا جیسے کسی مشاعرے میں اسے ہر شعر پر داد مل رہی ہو۔ داد اسے واقعی مل رہی تھی کہ اس نے حاضر دماغی اور غیر معمولی جرأت کا مظاہرہ کیا۔ ورنہ ہم اس بار بچ کر نہیں آ سکتے تھے۔

"تم نے چاروں کی جان بچائی۔ باری باری ہم چاروں تم کو شاباش دیں گے۔" محسن نے کہا اور اس کی کمر پر کئی ہاتھ مارے۔

"صرف چار... میں نے تو جانے کتنے لوگوں کو بچا لیا۔ ذرا شمار کرو، کم سے کم ایک شوہر، تین ہونے والے شوہر، دو ہونے والی بیویاں، ایک کی سگی بہن، دو بچپن کے دوست، اس کے علاوہ ایم آر ایس کے چار چوہے جو پنجروں میں بند تھے اور ان کا سرغنہ چیف کے تُو... یہ سب کتنے افراد ہوئے؟"

"کوئی بھی گنے سب شاباش دیں گے تمھیں۔" میں نے کہا۔ اور اس کی کمر کو مزید کوٹا۔ نازو نے بروقت دخل اندازی سے اس کی جان بچائی۔

"مت لے بس کرو، مر جائے گا بے چارہ شاعر۔" اس نے چلّا کر کہا۔

"مرنے دو، یہ کوئی محسن ہے۔" میں نے کہا۔

"میں نے کب کہا ہے کہ محسن ہے۔" اس نے ناشتے کے دوران میں رکھا۔

"ابھی تو کہا ہے کہ مر جائے گا بے چارہ شوہر۔" میں نے کہا۔

"سکندر بھائی!" نازو نے ہونٹ کاٹ کر کہا "یہ بات محسن کہتا تو میں اسے بتاتی کہ غلط سنا اور غلط کہتا..."

"چلو چھوڑو، غلط ہے تو غلط سہی۔ کیا فرق ہے دونوں میں آخر غالب تو غالب ہی رہے گا۔" غالب نے کہا "ناشتا کرو۔"

ناشتا ہدیوں کی طرح کیا گیا۔ اس دوران میں پیڈرو اور دلاور کا ذکر بھی آیا۔ ان کی بے رحمی کا بھی کہ انھوں نے اپنے ہی ایک ساتھی کو یوں مارا۔ پیڈرو کی زیب النسا سے شادی کا تذکرہ بھی ہوا کتنی چالاکی سے انھوں نے سب کو اپنے راستے سے صاف کر دیا اور پھر جیکی اور جونی کے باپ نواب سلطان محمد خاں کی دولت و جائیداد پر ہاتھ صاف کرنے کا سوچا۔

"دولت کیا چیز ہے۔ اگر اس لڑکی زیب النسا کی زبردستی شادی کر دی جاتی..." نازو نے کہا "اس خطرناک مجرم اور سفاک شخص کے ساتھ تو کتنا ظلم ہوتا۔"

"میرا خیال ہے کہ خسرو جمشید نے ہوش سے کام نہیں لیا ورنہ وہ رضامندی کا اظہار کر دیتا۔" میں نے کہا "زیب النسا ایسی لڑکی نہیں ہے کہ کوئی مرضی کے خلاف اس سے شادی کر سکے۔ وہ ایسی صفائی سے پیڈرو کو ٹھکانے لگاتی کہ خود پیڈرو کو پتا نہ چلتا۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" محسن بولا۔ "خسرو جمشید جذباتی ہو گیا ورنہ عقل سے کام لیتا تو ہنسی خوشی ان کی تجویز کو قبول کرتا۔ اسے ضرور موقع مل جاتا کہ وہ خود پیڈرو کو شوٹ کر سکے۔"

"بس وہ جذباتی ہو گیا۔ یہ لڑکی اس کی بیٹی تو نہیں تھی مگر اس نے زیب النسا کو بیٹی کی طرح پالا تھا۔ وہ عیاش اور بدکردار تھا مگر زیب النسا کے لیے نہیں۔ زیب النسا کو اس نے شہزادیوں کی طرح رکھا تھا۔ پیڈرو سے اس کی شادی کا ذکر سنتے ہی اس کا دماغ الٹ گیا۔ وہ ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا لیکن وہ سمجھتا تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ زیب النسا کو بچانے کے لیے وہ اپنی جان پہ کھیل گیا۔"

"سوال یہ ہے کہ وہ گئی کہاں؟"

"وہ بہت ہوشیار لڑکی ہے۔ وہ سمجھ گئی ہو گی کہ اس کی زندگی کو کس سے خطرہ لاحق ہوگا۔ اور وہ خطرہ کس قسم کا ہوگا۔ وہ ایسی جگہ جا چھپی ہو گی کہ چوہدری دلاور اینڈ کمپنی اور اس کے فرشتے بھی اسے تلاش نہ کر سکیں۔"

"ایک بات اور بتا دوں۔" محسن نے کہا۔ "ابھی شاید اسے معلوم نہ ہو کہ اس کے ماموں خسرو جمشید پہ کیا بیتی۔ جس روز اسے معلوم ہوا کہ دلاور کے حکم پہ اسے اُلٹا لٹکا کے اس کی کھال کھینچی گئی تھی، اس

روز وہ اپنی پناہ گاہ سے نکل آئے گی، یہ قسم کھا کے کہ اسے حساب برابر کرنا ہے۔ ان سب کو ویسے ہی مارنا ہے جیسے انھوں نے خسرو جمشید کو مارا۔ تمھیں یاد ہوگا ایک بار اس نے... کچھ لوگوں سے بدلہ لیا تھا۔"

محسن نے خواتین کی موجودگی میں تفصیلات سے گریز کیا۔ مگر میں سمجھ گیا، یہ بات پرانی تھی۔ زیب النسا ایک رات ہمارے قبضے سے نکل بھاگی تھی اور پناہ لینے ایک ایسے گھر میں پہنچ گئی تھی، جہاں ایک عیاش سرکاری افسر اور اس کا دوست رہتے تھے انھوں نے زیب النسا کی یوں مدد کی تھی کہ اسے بے آبرو کر دیا تھا۔ بعد میں زیب النسا اسپتال سے فارغ ہو کر اپنے بھائی کے ساتھ دوبارہ وہیں پہنچی تھی اور انھیں قتل کر کے یوں واپس لوٹ آئی تھی کہ اسپتال والوں کو بھی اس کے آنے یا جانے کا علم نہیں ہوا تھا۔

"تم لوگ اس ٹرک کے ساتھ گئے تھے؟" محسن کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"ہاں، وہ کوئی مشکل کام ثابت نہیں ہوا۔" اکرام شیخ بولا۔ "وہ ٹائر بدل کے ٹرک میں بیٹھا ہی تھا کہ میں کشکول لے کر پہنچ گیا۔" راجا نے کہا۔ "اس نے جان چھڑانے کے لیے ایک روپیہ دیا۔ میں نے کہا، فقیر کا اصول ہے۔ پانچ کا نوٹ دے ورنہ پانچ منٹ میں تیرا دھڑن تختہ ہو جائے گا۔ اس نے مجھے ایک گالی دی جو میں بعد میں سناؤں گا اور دھکا دیا۔ اتنی دیر میں تھانیدار صاحب دوسری طرف سے ٹرک میں سوار ہو گئے۔"

"میں نے ریوالور اس کی گدی پہ رکھ دیا۔" اکرام شیخ نے کہا "اور اسے چلنے کو کہا۔ پہلے تو اس نے آئیں بائیں شائیں کی کہنے لگا کہاں چلوں۔ میں نے کہا، جہاں تم جا رہے تھے۔ وہ بولا تمھیں کیا معلوم کہ میں کہاں جا رہا تھا۔ میں نے کہا بیٹے ہم تمھارا ہی انتظار کر رہے تھے۔ جو ایک ٹرک غائب کر سکتے ہیں وہ تمھیں بھی غائب کر سکتے ہیں۔ وہ کوئی بزدل آدمی تھا۔ اسے صرف ٹرک لانے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ وہ ہاتھ جوڑنے لگا، مجھے مجبور مت کرو، وہ مار ڈالیں گے مجھے۔ میں نے کہا کہ ہم بچا سکتے ہیں اگر تم تعاون کرو۔ تعاون نہ کیا تو ہم بھی مار ڈالیں گے۔ اس وقت میرا پرانا شناختی کارڈ کام آیا۔ میں نے کہا کہ ہم پولیس والے ہیں چھپ کر نگرانی کر رہے تھے۔ یہ فقیر بھی سی آئی ڈی انسپکٹر ہے اور تمھارے ٹائر اس نے ہی پنکچر کیے تھے۔ تاکہ مجھے بلا کے لا سکے۔ اسے یقین آ گیا۔ وہ کہنے لگا کہ اور تو میں کچھ نہیں جانتا۔ مجھے یہ ٹرک ماری پور سے آگے ایک جگہ پہنچانا ہے۔ میں تمھیں وہاں تک لے جا سکتا ہوں لیکن پھر میں واپس کیسے آؤں گا۔ اور تم لوگ کیسے واپس آؤ گے۔ میں نے کہا کہ ہماری فکر مت کرو۔ ہم تمھیں بھی لے آئیں گے۔ وہ ٹرک سیدھا ماری پور روڈ پہ گیا۔ ساری پور ائیر فورس بیس سے گزر کر تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر اس نے ٹرک روک دیا اور سامنے ایک گودام کی طرف اشارہ کیا کہ وہ جگہ ہے پھر ایک دم بھاگ لگا کے بھاگ کھڑا ہوا۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ گولی چلا دوں پھر میں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ وہ واپس جا رہا تھا۔ اس نے ہماری بات مان لی تھی مگر ہمارے اس دعوے پر اعتبار نہیں کیا تھا کہ ہم اسے بچا لیں گے۔ اس نے خود ہی اپنی جان بچانے کے لیے جان کی بازی لگا دی، اس امید پر کہ ہم اب اسے گولی نہیں ماریں گے۔ میں نے سوچا کہ جو ہونا تھا ہو گیا ہماری اب کوئی ذمے داری نہیں رہی۔ جگہ میں نے دیکھ لی تھی۔ اس ٹرک کو میں نے وہیں چھوڑ دیا اور راجا کے ساتھ واپس آ گیا۔"

"راجا کہاں تھا؟"

"میں ٹرک کے روانہ ہوتے ہی پچھلے حصے میں سوار ہو گیا تھا۔" وہ بولا۔

"کیا یہ ضروری ہے کہ اس ٹرک ڈرائیور نے تمھیں صحیح بتایا ہو اور اصل گودام وہی ہو جس کی طرف اس نے اشارہ کیا تھا؟" میں نے کہا۔

"ہم تصدیق کر سکتے ہیں۔" اکرام شیخ نے کہا۔

"لیکن وہ کیا نتیجہ اخذ کریں گے اس سے؟" میں نے کہا۔ "ڈرائیور یہاں تک تو آیا اور پھر ٹرک چھوڑ کے غائب ہو گیا۔"

"اس سے ایک ہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔ یہ کہ کوئی ٹرک کے پیچھے تھا جو اسے یہاں روکنے میں کامیاب رہا۔ اور ٹرک ڈرائیور کو اغوا کر کے لے گیا۔" محسن بولا۔

"ان کا یہ سمجھنا بھی غلط نہیں ہوگا کہ اب ہم، جو ٹرک ڈرائیور کو اغوا کر کے لے گئے ہوں گے، اس سے تمام معلومات حاصل کر لیں گے۔" میں نے کہا۔ "ظاہر ہے اس کے بعد یا تو وہ گودام خالی کر دیں گے یا فوری طور پر شفٹ کر جائیں گے۔"

"اس امکان پر بھی نظر رکھو کہ جس ڈرائیور کو تم نے فرار کا موقع دیا، وہ تمھیں چکمہ دے گیا ہو اور گھوم پھر کے اپنے آقاؤں کی خدمت میں حاضر ہو جائے۔ اور اعترافِ جرم کر لے۔"

"اب جو ہوگا دیکھا جائے گا۔" میں نے کہا۔ "اور ابھی تو میں الیکشن کے موڈ میں نہیں ہوں۔ معلوم نہیں اب تک میں کیسے جاگ رہا ہوں۔"

"ممکن ہے آپ نیند میں باتیں کر رہے ہوں۔" غالب نے کہا۔

"لوگ نیند میں چلتے ہیں اور بھی بہت کچھ کرتے ہیں۔" محسن بولا۔

"دیکھو، یہاں سونا ٹھیک نہیں، نیند اور بے آرامی سے ہم بھی بُرا حال ہے۔" غالب نے کہا۔ "لیکن یہ جگہ کسی طرح بھی محفوظ نہیں ہے...."

"پھر کہاں جائیں؟ کسی ہوٹل میں؟"

"نہیں، فی الحال تو اپنے محسن کے پاس چلتے ہیں۔" غالب بولا۔

"بڑی مہربانی، اگر آپ میرے پاس تشریف نہ لائیں اپنے مرزا غالب صاحب!" محسن نے کہا۔

"میری مراد اس ڈاکٹر مجھگی والا سے تھی جس نے ہمیں یہ کھوت فراہم کیا تھا۔" غالب بولا۔ "اس نے یہ بھی تو کہا تھا کہ اس بنگلا کے پاس کوٹھی کار سب کچھ ہے۔ اس وقت میاں بیوی تو کلینک میں ہوں گے۔"

"کیا مطلب؟ اس کے گھر جا کے سو جائیں؟" محسن نے لیٹے ہوئے کہا۔ "پہلے اسے تلاش کریں، پھر اس سے اجازت لیں اور اس کے گھر جائیں.... نا بھائی! اتنی ہمت نہیں ہے اب۔"

"تو پھر باری باری سب کو سونا ہے اور سب کو پہرا دینا ہے۔" میں نے کہا۔

"تم لوگ سو جاؤ۔" شیخ نے کہا۔ "میں اور راجا تو رات کو سو لیے تھے۔"

"خاک سوئے تھے۔" راجا نے کہا۔ "خاک دھول میں پڑے کروٹیں لے رہے تھے۔ جب آنکھیں بند کرتا تھا بھوت نظر آنے لگتے تھے۔"

"اچھا!" نازو نے دلچسپی سے کہا۔ "کیسے تھے؟ میرا مطلب ہے کس کس کا بھوت دیکھا؟"

"ایک تو میرا سسر تھا.... یعنی وہ جو اس عہدے پر فائز ہوگا ایک دن۔" وہ بولا۔ "مجھے ڈرا رہا تھا کہ راجا تیرے راج پاٹ کی ایسی تیسی کر دوں گا۔ اگر تو نے پھر میری بیٹی کو اغوا کرنے کی یا بھگا لے جانے کی سوچا۔"

"کیا تم نے ایسا سوچا تھا؟" نازو متفکر ہو کے بولی۔

"اللہ دیکھو ناسوچ کو کیسے روکوں میں۔" راجا بولا۔ "اتنی ہمت کہاں ہے مجھ میں۔ بس سوچ کے رہ جاتا ہوں... اور سوچنے کو تو میں اس سے کہیں زیادہ سوچ لیتا ہوں، مثلاً یہ کہ پری کے باپ کو کس طرح فوت کروں کہ قتل کے الزام میں پکڑا نہ جاؤں۔"

"تیرا یہ کام ہم کر دیں گے۔" غالب نے ہاتھ جوڑ کے کہا۔ "ابھی تو ایک کام کر اپنی بکواس بند کر دے۔"

"تم سو جاؤ کان بند کر کے۔" نازو نے اسے گھور کے کہا۔ "ہم ضروری باتیں کر رہے ہیں۔"

"تو اس سالے پھلک منگے سے کیوں کر رہی ہو، مجھ سے کرو۔" غالب نے کہا۔ "مجھے بھی بہت ضروری معاملات طے کرنے ہیں۔"

اکرام شیخ اور راجا [illegible] چھت پر جا چکے تھے چنانچہ غالب تمھارے معاملات ہیں۔ تو سو جا ہے پری کے جن اور ہاں، تم ذرا رُخِ روشن ادھر کرو۔"

"لو کر لیا۔" نازو خلافِ توقع برہم نہیں ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ میں بھی سو چکا ہوں۔

"اب بولوں کہ تمھیں دیکھوں۔ تم دل کی زبان سمجھتی ہو؟"

نازو ہنسی۔ "میں بہت سی زبانیں نہیں سمجھتی، روس کی... چین کی...."

"یہ اپنا چیف کے تو کل رات کیا کہہ رہا تھا؟"

"کل رات کس وقت؟" وہ بولی۔

"کہہ رہا تھا نا کہ تمھارے بھیا سے بات کر لی ہے، تم نے کچھ کہا تھا؟"

"تمھارا دماغ خراب ہے۔ مذاق کو بھی نہیں سمجھتے۔ سکندر جھوٹ بول رہا تھا۔" نازو نے کہا۔ "میں نے کچھ نہیں کہا تھا۔"

"اچھا، تو پھر میں خود بات کر لوں؟" غالب بولا۔

میں آنکھیں بند کیے منتظر رہا کہ کب نازو کے ہاتھوں غالب کی شامت آتی ہے۔ وہ ضرورت سے زیادہ رومانٹک ہو رہا تھا لیکن مجھے حیرت ہوئی، جب نازو نے آہستہ سے کہا۔

"کوئی ضرورت نہیں۔ جو بات کرنی ہے مجھ سے کرو اور ہمت نہیں ہے تو سو جاؤ۔"

"فلمی زبان بولوں؟ مثلاً یہ کہ تمھاری مانگ کی افشاں کے لیے تارے توڑ کر لا سکتا ہوں اور آسمان کی خوبصورتی کا ستیاناس کر سکتا ہوں اور پہاڑ پہ سے کود سکتا ہوں، بشرطیکہ پہاڑ چھ فٹ سے زیادہ اونچا نہ ہو۔"

نازو ہنسنے لگی۔ میں نے خراٹے لینے شروع کیے تاکہ وہ میری طرف سے مطمئن ہو جائیں۔

"نازو! میں تمھارے عشق کے سمندر میں اسی طرح غرق ہو چکا ہوں جیسے ایک بار سوئمنگ پول میں ڈوب گیا تھا مجھے تیرنا نہیں آتا تھا، پھر کسی نے مجھے بچا لیا۔ مجھے محبت کرنا بھی نہیں آتا۔ اس بار تم بچا لو۔"

"محبت کرنا تو مجھے بھی نہیں آتا۔"

"تو پھر شادی کر لو مجھ سے۔" غالب نے ہمت کر کے کہہ دیا۔

نازو ہنسی۔ "اور بھی غم ہیں زمانے میں...."

"مگر یہ غم دائمی نہیں ہیں۔ ایک نہ ایک دن رابعہ اور سکندر بھی اپنا گھر بسا لیں گے۔ اس بھوت کو بھی پری مل جائے گی۔ مجھے تو اندیشہ ہے کہ تمھارا بھائی بھی...."

"مجھے معلوم ہے۔" وہ بولی۔

"تو پھر، صرف ہم؟" غالب نے کہا۔ "یعنی میں اور تم...."

"پھر ہم بھی اپنا گھر بسا لیں گے۔ اب سو جاؤ۔"

غالب نے ایک چیخ ماری۔ وہ خوشی سے پاگل ہو گیا تھا اور خود کو قابو میں نہ رکھ سکا۔ میں تو جاگ ہی رہا تھا، باقی سب بھی ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھے۔ چند سیکنڈ کے وقفے کے بعد میں نے نازو کو بھی اٹھتے دیکھا جو فوراً سوتی بن گئی تھی۔

"یہ کیا حرکت ہے، بلکہ بے ہودہ حرکت ہے؟" محسن بولا۔

"میں نے ایک ڈراؤنا خواب دیکھا تھا۔" غالب بولا۔

"تم دس ڈراؤنے خواب دیکھو ہماری بلا سے۔ چیخ ایک بھی مت مارو۔" محسن بھنا کے بولا۔ "لاحول ولاقوۃ۔ میں تو سمجھا کہ کسی بھوت نے گلا دبا دیا۔"

"ویسے کیا خواب تھا؟" میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"ایک... ایک بھوتنی تھی۔ زبردستی پیچھے پڑ گئی تھی کہ شادی کر لو مجھ سے۔" اس نے چوری چوری نازو کی طرف دیکھا۔ "عجیب بدشکل چیز تھی۔"

نازو کے ماتھے پر برہمی کی ہر شکن بتا رہی تھی کہ وہ اندر ہی اندر کتنا پیچ و تاب کھا رہی ہے۔

"اچھا موقع گنوا دیا۔" وہ بولی۔ "اب نظر آئے تو انکار مت کرنا، وہی ٹھیک رہے گی تمہارے لیے۔" وہ منہ پھیر کے سو گئی۔ راجا اور اکرام بھی چیخ پر نیچے آ گئے تھے لیکن بات کچھ بھی نہیں تھی اور بہت کچھ تھی، جو انھیں معلوم نہیں ہو سکتی تھی۔

شام کے وقت جب میں سو کے اٹھا تو مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ گھر میں میرے اور محسن کے علاوہ صرف راجا ہے۔

"باقی لوگ کہاں ہیں؟" میں نے محسن سے کہا۔

"دو کے بارے میں تو مجھے بھی معلوم نہیں۔" وہ بولا۔ "اکرام شیخ اور موہنی شاپنگ کے لیے گئے ہیں کار لے کر۔"

"اور اپنے مزاجی اور نازو؟"

"وہ بعد میں کہیں گئے لیکن کسی کو بتائے بغیر چپکے سے غائب ہو گئے۔ ہے نا زیادتی کی بات؟" محسن خفا ہو کے بولا۔ "میں ایک جینوئن شادی شدہ شخص، بیوی بچوں سے دور ہوں۔ تو بھی ہجر و فراق کے دن رات کاٹ رہا ہے اور یہ لوگ عشق کے زکام میں مبتلا ہیں۔"

"زکام کا ابھی تک کوئی علاج دریافت نہیں ہوا۔ دو چار دن میں خود ہی ٹھیک ہو جاتا ہے۔" میں نے کہا۔

"میں سب دیکھ رہا ہوں۔"

"تو اب دیکھنے کے سوا کیا کر سکتا ہے۔"

"میں شہلا سے بات کر سکتا ہوں۔" وہ بولا۔ "کتنے دن ہو گئے یار، اس کی ہمت کی داد دیتا ہوں میں کہ اکیلی ہے اور بڑی بہادری سے خوش بھی ہے، مطمئن بھی ہے، پُرامید بھی ہے۔ ظاہر ہے ایسا ہو نہیں سکتا۔ مگر مجھے اعتماد عطا کرنے کے لیے وہ کچھ ظاہر ہونے نہیں دیتی۔ میرا بیٹا بھی اب تو غوں غاں کرتا ہو گا۔"

"تو ایسا کر، ایک چکر لگا لے لاہور کا۔"

"نہیں یار، میں ڈرتا ہوں۔ اس کے بعد میری مشکلات میں اضافہ ہو جائے گا اور شہلا کی مشکلات میں بھی۔" وہ بولا۔

"اچھا تو چل فون پر بات کر لے اس سے۔" میں نے کہا۔

ہم جانے لگے تو راجا نے کہا کہ وہ اس بھوت بنگلے میں نہیں رہ سکتا۔ مجھے رہ رہ کر رضیہ اور شیخ کا خیال آ رہا تھا۔ کار نہ لے جانا کوئی عقلمندی نہیں تھی۔ یہ کار پہلے بھی دیکھی جا چکی تھی، پھر خطرہ مول لینے سے کیا حاصل؟ آدھے راستے میں راجا نے اجازت لے لی کہ وہ گھنٹے میں لوٹ آئے گا۔

"میں ذرا اپنی پری کو دیکھ آؤں اور اس کے باپ کو یقین دلا دوں کہ اب تھوڑے دن کی بات ہے۔" وہ بولا۔

مجھے شدت سے رابعہ کی یاد آئی۔ کاش کسی طرح میں اس سے بات کر سکتا! مگر اس کا کوئی پتا ٹھکانا نہیں تھا۔ راجا کے چلے جانے کے بعد میں اور محسن رہ گئے تو ہم نے پہلے کہیں بیٹھ کے چائے پینے کا فیصلہ کیا کیونکہ ابھی رات کا ...ھیرا پوری طرح پھیلا نہیں تھا۔

"کیفے گرینڈ" ایک بہت خوبصورت اور پُرسکون قسم کا ریسٹورنٹ تھا جو میٹروپول کی عظیم الشان عمارت کے سامنے واقع تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی پہلے تو مکمل اندھیرے میں کچھ دکھائی نہ دیا، سوائے ان مدھم روشنیوں کے جو چھت سے معلق تھیں اور دیواروں پر نصب تھیں۔ چند سیکنڈ میں میری آنکھیں تاریکی میں دیکھنے کے قابل ہو گئیں تو میں نے ریسٹورنٹ کے اندر ڈیکوریشن کو دیکھا۔ اس کی دیواروں پر سرخ وال پیپر تھا اور ... کے منقش ڈیکوریشن پیس دیواروں پر آویزاں تھے۔ ہم سرخ قالین والے زینے سے اوپر گئے تو ماحول مزید طلسماتی ملا۔ محرابی دروازوں کے درمیان علیٰحدہ میزیں تھیں اور سب کے درمیان رہ کے بھی وہاں بیٹھنے والوں کو ایک پُرسکون پرائیویسی کا احساس ہوتا تھا۔ ایسی خوبصورت فضا میں نے لاہور کے کسی ریسٹورنٹ میں بھی نہیں دیکھی تھی۔

ان کی چائے اور کنفکشنری بھی بہت عمدہ تھی۔ ہم وہاں گھنٹا بھر بیٹھے رہے اور پھر باہر نکلے تو رات پوری طرح اپنا پَر پھیلا چکی تھی۔ ہمارے بالکل سامنے میٹروپول کی نچلی منزل کی دکانوں میں ایک کال آفس تھا۔ وہ ایک کیمسٹ شاپ میں تھا۔

"یہ کس کا نمبر ہے؟" ایک بوڑھے نے کہا جس کی ...

ساری دنیا کو شک

"ایس ایس پی صاحب رضوی کا ..."

... ہو گیا اور ... مجھے یوں لگا جیسے وہ ہماری گفتگو بھی ٹیپ کرے ... یا۔

... کوئی بات نہیں تھی۔

... حالانکہ ابھی ... محسن نے کہا۔ "اُف... ارے بھئی یہ کیا ہے۔ کون... شہلا یہ ... رونے دھونے میں وقت گزار دو گی کیا؟"

"بابا یہ ٹرنک کال ہے۔ آپ تو بولے تھے ایس ایس پی۔" بوڑھے نے مجھے مخاطب کیا اور سرگوشی میں بولا۔

"یہ بیٹی ہے اس کی۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "اس کی وائف نمبر ون۔"

نمبر ون پر وہ پھر تھوڑا سا چونکا مگر اس نے نمبر ٹو اور تھری کے بارے میں استفسار نہیں کیا۔ پندرہ منٹ بعد وہ تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ کال بہت لمبی ہو گئی تھی۔ اگر ہماری جیب میں اتنے پیسے نہ ہوئے یا بالکل ہی کچھ نہ ہوا تو وہ کیا کرے گا۔ اس کی تسلی کے لیے میں نے سو سو کے دو نوٹ کاؤنٹر پر ڈال دیے۔

بالآخر محسن نے ریسیور مجھے تھمایا۔ میں نے دیکھا کہ محسن کتنا اداس ہے۔ اس نے خود کو بڑی مشکل سے رونے سے روکا تھا۔ محرومی اس کی آنکھوں میں باقی تھی۔ شہلا سے میری رسمی سی بات ہوئی۔ اتفاق سے گھر پر اس کے سوا کوئی بھی نہیں تھا۔ انکل رضوی اپنی فیملی کے ساتھ کہیں گئے ہوئے تھے۔

"تم نے جولی کی بھی کوئی خبر لی؟" میں نے کہا۔

"انکل خود جاتے ہیں۔ میں بھی گئی تھی۔ وہ ڈاکٹر انکل کے گھر میں ہے۔"

"وہ تو ہے۔ حالت کیسی ہے اس کی؟"

"کوئی خاص فرق نہیں، لیکن ڈاکٹر انکل کا کہنا ہے کہ ماں بننے کے بعد وہ ٹھیک ہو گی۔ بچے کو ٹھیک رہنا چاہیے۔ وہ خود ماں کو سنبھال لے گا۔" وہ ہنسی۔

"کیا تمھیں معلوم ہے۔ زیب النسا کے ساتھ کیا ہوا؟"

"مجھے معلوم ہے کیا ہوا۔ اس کا فون آیا تھا مگر میں نے انکار کر دیا۔"

"کس بات سے انکار کر دیا؟"

"وہ ملنا چاہتی تھی مجھ سے۔" شہلا نے کہا۔

"میں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ بابا ملنے میں کیا تھا۔ وہ کھا تو نہ جاتی تمھیں۔"

"چھوڑیں اس کی بات۔ مجھے تو اس کی تصویر دیکھ کے حیرت ہوئی تھی۔"

"اس کی تصویر؟ کس سلسلے میں؟"

"سکندر بھائی! وہ فلم اسٹار بن گئی ہے۔ ایک پنجابی فلم میں آ رہی ہے۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہو تم! تمھیں یقین ہے کہ..."

"یقین نہ کرنے کی کون سی بات ہے۔ اس کا نام اور تصویر ایک ساتھ شائع ہوئے تھے۔ فلم کا نام اس وقت مجھے یاد نہیں آ رہا ہے۔ ایک بہت گھٹیا فلمیں بنانے والا پروڈیوسر ہے جس نے اسے سائن کیا ہے۔" شہلا نے کہا۔ "میں اس سے کیوں ملتی؟"

جو کچھ شہلا نے مجھے بتایا وہ میرے لیے قطعی ناقابلِ فہم تھا۔ مرحوم خسرو جمشید نے مرنے سے پہلے اسے کہا تھا کہ بھاگ جاؤ ورنہ وہ تمھاری شادی پیڈرو سے کر دیں گے اور زیب النساء بھاگ گئی تھی۔

لیکن یہ کیا بھاگنا ہوا... بھائی نے تو اسے روپوش ہو جانے کو کہا تھا اور وہ فلمی دنیا کے آسمان پر ستارا بن کے روشن ہو گئی۔ وہ کہیں بھی رہتی، خود کو غیر نمایاں رکھ سکتی تھی مگر فلم نگری میں کوئی کیسے گمنام رہ سکتا ہے۔ اس کو تو اسٹوڈیو کے دربان سے ڈائریکٹر تک اور فنکار سے پرستار تک سب جانتے ہیں کہ وہ کب، کس وقت اور کہاں ہے۔

"سکندر بھائی... وہ کہاں ہیں؟"

میں چونک کے ہنسا۔ "واہ... یہ ہوئی نا پروفیشنل بیویوں والی ادا... وہ... ارے پوچھو وہ الو کا پٹھا کہاں ہے۔ میرا غلام نام لینے سے سنا ہے نکاح ٹوٹ جاتا ہے مگر ایسے تو پوچھ سکتی ہو۔"

وہ ہنسنے لگی اور میں نے کہا۔ "وہ ڈبل الو کا پٹھا کیسا ہے؟"

"یہ ڈبل ایس آئی تو تھے ایک..."

"تھے کیا مطلب... ہیں۔ اور پتا ہے کس کے عشق میں فنا ہوئے ہیں؟ ایک کافر ادا کے... وہ پہلے کافر تھی یعنی خاص ہندو اور برہمن زادی تھی۔"

"تو اس نے... شیخ صاحب کے لیے اسلام قبول کر لیا؟" شہلا سخت حیران ہوئی۔

"ہے نا الٹی کھوپڑی تمھاری۔" میں نے کہا۔ "الٹا مطلب نکال لیا۔ بابا شیخ صاحب اس کے لیے دین ایمان، عقل و ہوش سب گنوا بیٹھے۔"

"اچھا! تو آپ موہنی کی بات کر رہے ہیں؟"

"کیا زبردست ذہانت کا ثبوت دیا ہے۔" میں نے کہا۔ "جیسے ایک تھانیدار نے چوری کی پوری واردات کے بارے میں تفتیش مکمل کرنے کے بعد کہا تھا کہ کام تو کسی چور کا لگتا ہے۔" میں نے کہا۔

محسن نے ریسیور مجھ سے چھین لیا۔ "منے کا کیا حال ہے؟ کچھ باتیں کرتا ہے؟"

فون کا مالک سخت بدحواس اور پریشان بیٹھا ہوا تھا کہ یہ کیس قسم کی گفتگو ہو رہی ہے، کس سے ہو رہی ہے اور کیوں ہو رہی ہے۔

اس نے اسلامی حلیے کو ختم کرنے کے لیے میں نے اسے مزید دو سو روپے پیش کیے۔ اس کے ہونٹوں پر ایک بیمانۂ بےزار اور بے کار قسم کی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

محسن کا چہرہ اچانک یوں چمکنے لگا جیسے کم وولٹیج پر جلنے والا بلب پوری وولٹیج سے جگمگانے لگے۔ وہ ایک روایتی جذباتی باپ کی طرح بولنے لگا اور احمقانہ آوازیں نکالنے لگا۔ بلی کی جو جیسے کی نقل اتار رہی ہو... یا مرغی کی جیسے مرگی کا دورہ پڑا ہو... اسے یقین تھا کہ اس کا اوّلین لختِ جگر دوسری طرف کھلکھلا کے ہنسا ہوگا۔

پھر اس کا مُنہ اتر گیا اور اس نے شہلا کو خدا حافظ کہہ کے ریسیور رکھ دیا۔ فون کے مالک نے حساب کتاب کی رسمی سی کوشش کی مگر میں نے کہا کہ حسابِ دوستاں درِ دل... باقی پھر کبھی آئے تو لے لیں گے اور نہ لیے تو نہ سہی۔

"کیا ہوا۔ برخوردار کی بات سُن کر تیری شکل سڑے ہوئے بینگن جیسی کیوں ہوگئی...؟" میں نے کہا۔

"کچھ نہیں یار!" وہ بولا۔

"کیا اس نے ڈانٹ دیا کہ فون پر یہ کیا بدتمیزی ہو رہی ہے؟ یا... ماشاء اللہ فرفر گالیاں دینے لگا ہے۔"

"ابے اس نے دو چار لفظ ہی سیکھے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "ممی کہنے لگا ہے ماں کو... ماما کہتا ہوگا انکل رضوی کو... منظر کو..."

"تجھے بھی ماما کہہ دیا۔" میں بے اختیار ہنسا۔

"یار جب پاپا یا ابا ساتھ ہوگا ہی نہیں تو وہ کہے گا کیسے؟" وہ جھینپ کر بولا۔ "سالا بار بار ماما جی... ماما جی کرتا رہا..."

"سالا...! تو نے اسے سالا کہہ دیا..." میں نے ہنسی سے بے حال ہوتے ہوئے کہا۔ "اس نے تجھے ماموں کہہ دیا... اب ذرا سوچ کہ کتنے رشتے گڑبڑ ہوں گے..."

"یار چھوڑ مذاق... یہ زیب النساء کے فلمی دنیا میں جانے کا کیا ذکر تھا...؟"

"وہ فلمی ہیروئن بن گئی ہے... بقول... شہلا نے اس نے خود تصویر دیکھی۔ فلم اور ڈائریکٹر کا نام اُسے یاد نہیں آیا... مگر وہ سو فیصد یقین کے ساتھ کہہ رہی تھی..."

"بھائی نے جان کی بازی لگا کے اُسے یہ مشورہ تو نہیں دیا تھا۔" محسن سوچ کے بولا۔

"وہ زندگی میں کبھی ایسا نہ ہونے دیتا... گولی مار دیتا بہن کو کیونکہ اس سے بہتر فلمی دنیا میں عورت کے مقام کو کس نے سمجھا ہوگا۔ جو خود ہوس کا شکاری تھا..." میں نے کہا... جو کچھ ہمیں معلوم ہوا تھا اپنے چوہدری دلاور صاحب سے معلوم ہوا تھا۔

"اور چوہدری صاحب ہمیشہ سچ نہیں بولتے..." محسن فوراً قائل ہوگیا۔ "لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کب جھوٹ بول رہے جھوٹ بول رہے ہیں۔ ان کے جھوٹ کی کوئی انتہا نہیں۔"

"ہاں... یاد ہے اس نے ایک بار ریاض کی سیٹ لگائی... پر کتنا انسانیت سوز تشدد کیا تھا۔" میں نے کہا۔ "لیکن نہ وہ قتل حقیقی تھا۔ نہ وہ لڑکی رابعہ تھی اور نہ اس کی دلخراش چیخ پکار۔"

"اس سے تو کیا ثابت کرنا چاہتا ہے، وہی جو میں سمجھا ہوں یا کچھ اور؟" محسن بولا۔

"تو کیا سمجھا ہے؟" میں نے آزمانے کے لیے پوچھا۔

"یہی کہ جس نواب خسرو جمشید کی لاش ہم نے دیکھی تھی وہ کوئی اور تھا۔"

میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔ "آپ تو دلوں کے بھید جانتے ہیں بابا جی..." میں نے عقیدت کے ساتھ کہا۔ "لگے ہاتھوں یہ بھی بتا دیں کہ پھر وہ کون تھا؟"

محسن نے میرے سر پر دستِ شفقت پھیرتے ہوئے کہا۔ "وہ نقلی نواب تھا بچہ... کیا تو نہیں جانتا کہ خسرو جمشید ہمیشہ اپنے ساتھ ایک ڈپلی کیٹ رکھتا تھا۔"

"مگر وہ تو ہمارے ہاتھوں فنا ہوا تھا۔"

"میک اپ ایک آرٹ ہے۔ کیا تو نے ایسی فلمیں نہیں دیکھیں جن میں ایک ہیرو نے تین یا چار رول کیے... چوہدری دلاور کے لیے کیا مشکل ہے... وہ ایک نہیں دس خسرو جمشید بنا سکتا ہے۔"

مگر میں اب کچھ اور سوچ رہا تھا اور محسن کی بات سن کے میرے ذہن میں قدرتی طور پہ یہ خیال آنا لازمی تھا کہ دلاور کی یہ اعصاب شکن ڈرامائی پیشکش جھوٹ پر مبنی تھی تو کیا جیکی اور جونی زندہ ہیں۔ ان کا باپ نواب سلطان محمد خاں زندہ ہے۔ زیب النساء کی ماں زندہ ہے اور کیا اصلی خسرو جمشید ابھی تک وہیں قید ہے جہاں ہم اسے چھوڑ کر آئے تھے؟

میں نے اپنے ذہن میں پیدا ہونے والے خیالات سے محسن کو آگاہ کیا۔

"بات جی کو لگتی بھی ہے اور نہیں بھی لگتی۔" وہ بولا۔

"یہ کیا بات ہوئی شیردانی صاحب؟"

"مطلب یہ کہ جو کچھ میری اور تمہاری ناقص عقل میں آیا ہے وہ ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی ہو سکتا۔"

"مطلب کہاں ہے اس بات میں؟" میں نے کہا۔ "یعنی نواب خسرو جمشید مر بھی سکتا ہے اور نہیں بھی مر سکتا۔ یہ سب جھوٹ بھی ہو سکتا ہے اور سچ بھی۔"

"سرِدست یقین کے ساتھ کیا کہا جا سکتا ہے بھائی کبیر۔" محسن نے آہ بھر کے کہا۔ "یہ تصدیق طلب امور ہیں اور ابھی تو ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ جب فرصت ہوگی تو تصدیق بھی کر لیں گے کہ دودھ کتنا پانی میں دودھ کتنا۔ جس کو کہتے ہیں دودھ کا دودھ پانی کا پانی کرنا تھا اف... پانی کا پانی کرنا ابھی تو واپس چلنے کی سوچ۔"

میں نے تائید میں سر ہلایا۔ "باقی سب لوگ واپس آ گئے ہوں گے تو ہماری جان کو رو رہے ہوں گے۔"

لیکن ہم واپس پہنچے تو گھر میں صرف غالب اور نازو موجود تھے وہ بھی یوں کہ فریقین کے درمیان جنگ بندی کے بعد والی کشیدگی موجود تھی۔

"باقی لوگ کہاں ہیں؟" میں نے غور سے نازو کی اور غالب کی صورتوں کو دیکھ کے کہا۔

ان میں سے کسی نے بھی میری بات کا جواب نہیں دیا۔ "چکر کیا ہے یہ؟" محسن نے ڈانٹ کر پوچھا۔ "دونوں بیک وقت بہرے ہوگئے ہو؟"

"مجھے نہیں معلوم۔" دونوں نے بیک وقت کہا اور پھر ایک دوسرے کو خون آشام نظروں سے گھور کر خفیف ہوگئے۔

"کیا معلوم نہیں۔ یعنی یہ کہ بہرے ہوگئے ہو؟"

"ہیں... مجھے نہیں معلوم بھائی سب کہاں ہیں۔" غالب نے کہا۔ "اس سے پوچھ لو۔"

مجھے بے اختیار ہنسی آئی۔ "تم دونوں تو ایک ساتھ گئے تھے۔ کیا ساتھ واپس نہیں آئے تھے؟" محسن نے غالب کی طرف دیکھ کر کہا۔ "صورت پر ماشاء اللہ محبت کا وہ نور ہے۔"

"بھاڑ میں گئی محبت۔ ایک تم نے کر لی وہی کافی ہے۔" غالب نے کہا۔ "میرے باپ کی توبہ۔ پھر کبھی نام بھی لوں محبت کا۔"

محسن نے قہقہہ مارا۔ "لگتا ہے آج پھر کچھ ہوگیا۔ وہی جو غالب نے کہا تھا۔ اصل غالب صاحب نے۔ کیا کہا تھا؟"

"انھوں نے کہا تھا کہ..." میں نے سوچ کے کہا۔ "ہاں کیا خوب کہا تھا۔ دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہ تھا۔"

"آہ... ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن۔" محسن نے یوں کہا جیسے نزع کے عالم میں ہو۔

"ویسے تھی کون وہ، جس نے غالب کی ہڈی پسلی ایک کر دی تھی؟" میں نے کہا۔

"نام؟ نام اس کا غالباً..." محسن نے سر کھجایا۔

"اس کا نام تھا۔ خونی بلا آفت کی پرکالہ۔ رستم کی بیٹی عرف..." غالب نے کہا۔

"خبردار جو کہیں میرا نام آیا۔" نازو نے بگڑ کے کہا۔

"آیا تو اب کیا کر لو گی۔ وہاں تو میں اکیلا تھا اور... تھا بھی شرافت کے موڈ میں۔" غالب نے دہاڑ کے کہا۔ "لحاظ کر گیا تمہارا۔ ایک چھانپڑ مار دیتا تو؟"

"ہاں۔ پھر تمہیں دس بار آتا بیس دفعہ کرنا پڑتا مجھے۔" محسن بولا۔

"اور اُٹھا کے بھی لانا پڑتا۔" میں نے تائید میں سر ہلایا۔ "اب ہمت ہے تو مار کے دیکھو۔"

مگر ان دونوں کی سرد جنگ پھر گرم ہوگئی تھی اور وہ ہماری سن ہی نہیں رہے تھے۔ ان کی یہ لڑائی بھی محبت کا انداز تھا جس سے ہم سب آشنا تھے۔ غالب کی بھی وہی بات تھی کہ اگر وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں۔

"چلو بس سیز فائر۔" محسن نے بیچ میں آ کے کہا۔

"ہاں بتاؤ کیا ہوا تھا؟" میں نے کہا۔

"انھوں نے ایک بہت گھٹیا اور بازاری جملہ بولا تھا۔" نازو نے برہمی سے کہا۔

"وہ ایک سپر ہٹ فلم کا ڈائلاگ تھا۔" غالب نے بگڑ کے کہا۔ "محمد علی نے بولا تھا زیبا کے لیے۔"

"تم محمد علی نہیں ہو۔"

"تم بھی زیبا نہیں ہو۔ اس کی جوتیوں کی خاک بھی نہیں ہو۔" ایک بار پھر ان کی لڑائی بند ہوئی تو غالب نے کہا۔

"یار کوئی حد ہے شرافت کی بھی۔ اٹھایا اور پھینک دیا۔ جیسے... جیسے میں آدمی نہیں۔ جوتا ہوں۔"

"جوتی، جوتی۔ تم پاؤں کی جوتی ہو۔" محسن بولا۔

"وہ پھینکا تھا میں نے۔" نازو بولی۔ "پھینکتی تو مال روڈ پر جا کے گرتے۔"

"پھینکا نہیں تھا تو... تو کیا پیار کیا تھا؟" غالب نے بگڑ کے کہا۔

"ذرا سا ہاتھ کیا لگا دیا۔"

"ذرا سا ہاتھ؟ غالب اُچھلا۔ مجھے زمین سے چھ فٹ اوپر تو اُڑا دیا تھا پتنگ کی طرح۔"

"تو اُڑتے رہتے۔ کس نے کہا تھا نیچے گرنے کو۔" محسن نے دخل اندازی کی۔

"گرنے سے کون سی ہڈی پسلی ٹوٹ گئی۔" نازو نے کہا۔ "بس ایک قلابازی وہ بھی سبزے پر..."

"خدا کے غضب سے ڈرو۔" غالب چراغ پا ہو کے بولا۔ "وہ ایک قلابازی تھی! پیچھے تک لڑھکتا ہوا گیا تھا میں۔"

"پھر کیا ہوا۔ کوئی خراش بھی آئی؟"

"خراش!" غالب نے طنز سے کہا۔ "گھر کے اندر تو ہاتھ چلتے ہی تھے باہر بھی چلنے لگے۔"

"تمہاری زبان جو چلنے لگتی ہے۔ بالکل قینچی کی طرح۔" محسن نے نازو کو بھڑکانے کے لیے کہا۔ "جس نے رکھی ہو۔"

"مگر پھر بھی یار، سرِعام یہ بے عزتی!" میں نے فوراً غالب کی طرفداری کی۔ "اتنا بے عزت بھی نہیں ہے یار ہمارا۔"

"چل یار۔ تو اب مار دے جھانپڑ۔" محسن بولا۔

"ہاں بالکل، جیسے بہادر شوہر ملتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"قسم خدا کی شملا ہوتی نا۔۔۔"

غالب نے ہمیں کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ "وہ تو نہیں ہے کیوں نہ میں آپ کے مار دوں ایک جھانپڑ۔"

"تمہیں میری قسم۔" نازو نے یک لخت لہجہ بدل لیا۔ "ضرور مارو اور ایک نہیں دو۔"

نازو کا قسم دینا غضب ہو گیا۔ غالب سچ مچ اسے جھانپڑ مارنے کے لیے اٹھا میں درمیان میں نہ آتا تو کشتی شروع ہو جاتی خواہ وہ لورا کشتی ہوتی۔

"آج تو بچ گیا سکندر کی وجہ سے۔" غالب نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "لیکن اب تو دو جھانپڑ فرض ہیں مجھ پر۔ ایک نہ ایک دن ضرور ماروں گا۔"

"اسی دن جواب میں تم چار جھانپڑ کھاؤ گے۔" محسن نے غیر موجود مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا۔

"اس کی پروا نہیں۔ تم دس مارنا مگر نازو کی قسم تو پوری کرنی ہے مجھے۔" غالب نے کہا۔ "کیوں نازو؟"

"چلو چھوڑو جی۔" نازو نے ایسی ادا سے کہا کہ میں دم بخود رہ گیا۔ "معاف کر دو بے چارے کو میری خاطر۔"

وہ دونوں ایک ہو گئے تھے اور ہماری جلتی پر تیل چھڑکنے والی سازش ناکام ہو گئی تھی جو ہم نے صرف تماشا دیکھنے کے لیے بنائی تھی۔ رات تک وہ ہمیں جلانے کے لیے لیلیٰ مجنوں بنے رہے۔

پھر نصف شب سے کچھ دیر قبل سب تشویش میں مبتلا ہونے لگے۔ ابھی تک نہ راجا لوٹ کر آیا تھا اور نہ شیخ جس کے ساتھ موہنی بھی تھی۔ راجا کی طرف سے ہمیں زیادہ پریشانی اس لیے نہیں ہوئی کہ وہ کسی خطرناک مقصد سے کسی غلط جگہ نہیں گیا تھا۔ وہ اپنی پری سے ملنے گیا تھا اور یہ ہو سکتا تھا کہ دید کی ساعتِ نایاب اسے تمام رات محوِ انتظار رکھے یا وہ اپنی پری کے کسی موہوم سے وعدۂ ملاقات کی امید میں تمام رات کوئے جاناں میں بسر کر دے لیکن شیخ اور موہنی کچھ بتا کے نہیں گئے تھے اور ان دونوں کے لیے شہر میں ہر ہر قدم پر خطرات درپیش تھے۔

نازو بالآخر سو گئی۔ محسن بھی اُسے سوتا دیکھ کے اونگھنے لگا اور پھر لمبا لیٹ گیا۔

"تم بھی سو جاؤ۔ وہ اب نہیں آنے والے۔" محسن نے کہا۔ "صبح آئیں گے۔"

میں نے یا غالب نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا لیکن میرے دل میں ایک بات تھی جو کانٹے کی طرح کھٹک رہی تھی۔ آدھے گھنٹے بعد میں نے کہا۔

"مرزا جی میرا خیال ہے کہ محسن نے ٹھیک ہی کہا تھا۔"

"مگر وہ رات بھر کہاں رہیں گے؟" غالب بولا۔

"راجا کے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس کے ٹھکانے ہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن موہنی۔ وہ شیخ کو کہیں بھی لے جا سکتی ہے۔"

"مثلاً جیل خانے۔"

"مثلاً کسی ہوٹل میں۔ ایک رات کے لیے۔" میں نے کہا۔ "وہ اسی قماش کی عورت ہے۔"

"ہو گی۔" غالب نے سوچ کے کہا۔ "مگر شیخ۔۔۔؟"

"شیخ کے نام پر تو بہت سے شعر یاد آ جاتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "مگر میں پڑھوں گا نہیں۔ بے شک اگرچہ شیخ مضبوط کردار کا آدمی تھا۔"

"تھا کیا مطلب؟"

"عشق نے اس کو نکما کر دیا۔ ورنہ وہ بھی آدمی تھا کام کا۔" میں شعر کو مناسب ترمیم کے ساتھ آہ بھر کے پڑھا۔ "جب عشق کا بھوت سر پر ہو اور محبوب خود قدموں میں آ گرے۔ بالکل اسی طرح جیسے دیواری اشتہار والے عامل دعوے کرتے ہیں۔ تو پھر کس کے ہوش سلامت رہ سکتے ہیں۔"

"لیکن وہ تم پر مرتی ہے۔"

"مرتی ہے!" میں نے طنزیہ اور تلخ لہجے میں کہا۔ "اس کی روح مجھ سے پیار کرتی ہے مگر اس کا جسم۔۔۔"

"تم دونوں پر تہمت لگا رہے ہو۔"

"تہمت نہیں یار۔ قیاس آرائی کر رہا ہوں عقل کی بنیاد پر۔ موہنی انتقاماً ایسا کر سکتی ہے، مجھے چڑانے کے لیے، جلانے کے لیے۔ اپنی بے بسی کا اظہار تو کرتے ہی ہیں سب، سب کا اپنا اپنا انداز ہے اور جہاں تک بے بسی کی بات ہے تو شیخ بھی بے بس ہے۔ وہ دیوانہ وار اس پر فدا ہے اور اگر موہنی ایک بار بھی اشارہ کر دے نا تو وہ خود کو بھول جائے۔ یہ عشق میں ناممکن تو نہیں ہوتا۔"

"ہاں۔ توضیح تو درست ہے۔ لیکن نہ جانے کیوں میرا دل اسے قبول نہیں کرتا۔" غالب نے کہا۔

"دل تو میرا بھی نہیں مانتا۔ میں دماغ کی بات کر رہا تھا۔"

"مجھے تو ڈر ہے کہ۔۔۔ وہ کسی مصیبت میں نہ پڑ گئے ہوں۔" غالب نے کہا۔

"یہ بھی ہو سکتا ہے لیکن ہم ان کی کیا مدد کریں اور کیسے کریں۔" میں نے کہا۔ "انھیں کہاں ڈھونڈنے جائیں؟"

"بس تو پھر سو جاؤ۔ صبح دیکھیں گے۔" غالب نے کہا اور تکیہ سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ میں نے اس کی تقلید کی اور ہر رات کی طرح آنکھیں بند کرتے ہی دل کا دریچہ روشن ہو گیا۔ اس دریچے سے رابعہ کے رخِ روشن کا جلوہ یوں نظر آتا تھا جیسے بے ابر آسمان پر چاند۔ ہر شب کی طرح سونے سے پہلے میں نے اس کے تصور

گلے شکوے، دردِ فراق اور غمِ ہجر کی باتیں، دوری اور مجبوری کے دُہرے عذاب کے قصے، امیدوں کے روشن افسانے یہ سب خیال کی بنا ہی تھیں جن سے جینے کے سارے بہانے منسوب تھے۔

صبح محسن نے مجھے جھنجوڑ کے جگایا۔ میں نے اُٹھتے ہی آنکھیں مل کے اِدھر اُدھر دیکھا۔ دن یقیناً بہت پہلے نکل آیا تھا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے کہا۔ "وہ لوگ آ گئے؟"

محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "صرف راجا آیا تھا۔ معلوم نہیں کب۔"

"کیا خاموشی سے آ کے لوٹ گیا؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ ایک پیغام چھوڑ گیا ہے۔" غالب نے میری طرف ایک لفافہ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اس میں سامنے آ کے بات کرنے کی ہمت نہیں تھی۔" محسن نے خفگی سے کہا اور اسے ایک گالی بھی دی۔ نازو کہیں کچن میں مصروف تھی چنانچہ سنسر کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

میں نے لفافے میں سے ایک خط نکالا۔ راجا نے لکھا تھا۔

"دوستو!

مجھے بہت شرمندگی ہے کہ میں فی الحال تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا۔ مجھے اپنی خود غرضی اور بزدلی یا کمینگی پر، تم جو چاہو سمجھو، دکھ بھی ہے۔ تمہاری صحبت میں وہ کے میں نے بہت کچھ سیکھا تھا اور بہت کچھ پایا تھا جو میں گم کر چکا تھا مثلاً اپنی عزتِ نفس۔۔۔ خودی اور خودداری۔ میں نے رشتوں کا احترام سیکھا اور محبت کے اعلیٰ ترین مفہوم سے آشنا ہوا تھا۔ میں نے یہ سیکھا تھا کہ محبت صرف ایک عورت کے لیے ایک مرد کی طلب کا نام ہی نہیں ہے، اس کے ہزار انداز ہیں اور سب سچے۔ تم جو حقیقی خون کے رشتوں سے نہ بھائی بہن ہو نہ کزن۔ انسانیت سے محبت کرتے ہو اور ان اخلاقی قدروں سے محبت کرتے ہو جن کو اپنا کر انسان بھی فرشتہ بن سکتا ہے۔ تمہارے دلوں میں کھوٹ نہیں، نگاہوں میں شک نہیں اور زبانوں پر منافقت نہیں۔ تم سب ایک قابلِ رشک خاندان ہو، ایک قابلِ فخر ٹیم ہو اور میں تمہاری حب الوطنی، انسان دوستی اور سرفروشی کے جذبات سے اتنا متاثر ہوا تھا کہ میں نے تم سا بننے کی بھرپور کوشش ضرور کی تھی۔

افسوس یہ ہے کہ تمہاری طرح میں اپنی مجبوریوں اور کمزوریوں کے جال سے نہ نکل سکا۔ صرف چاہنے سے تو سب کچھ نہیں ہوتا، کچھ صلاحیت بھی تو ہونی چاہیے۔ مجھ میں یہ صلاحیت نہیں تھی تو قصور میری فطرت کا ہے۔ ہر شخص کی فطرت جدا ہوتی ہے۔ میں مصائب اور سخت حالات سے نہیں گھبراتا۔ جان دینے سے بھی نہیں ڈرتا۔ اپنے وطن سے محبت بھی کرتا ہوں اور اس کے دشمنوں کو نیست و نابود کرنے کی خواہش بھی۔ مجھ میں قوتِ عمل یا قوتِ ارادی کی کمی بھی نہیں اور میں اس عظیم مقصد کے لیے سب کچھ قربان کر سکتا تھا سوائے اپنی محبت کے، سوائے پری کے کوئی میری راہ میں حائل نہیں ہو سکتا تھا اور کوئی مجھے روک نہیں سکتا تھا۔

تم مجھے جتنی گالیاں چاہو دو لیکن اپنی اس کمزوری کا میں پہلے بھی اعتراف کر چکا ہوں۔ تم نے اسی محبت میں میری دیوانگی دیکھی تھی۔ پری کے حصول کی خاطر میں نے اس کے باپ کی وہ شرط بھی منظور کر لی تھی جو میں کبھی پوری نہیں کر سکتا تھا لیکن میں نے اس کا بھی حل نکال لیا تھا جو کسی اور کے لیے ناممکن ہوتا۔ میں بہادر ہوتا تو ڈاکا ڈالتا اور ایک ہی بار میں دولت کا ڈھیر لگا دیتا لیکن اس کی مجھ میں ہمت نہیں تھی اور یہ بہرحال ایک جرم تھا جو میں نہیں کر سکتا تھا۔ اگر مجھے نوکری مل جاتی۔ میرا مطلب اس نوکری سے ہے جس میں آدمی سیکڑوں کی ماہانہ تنخواہ تو بطورِ زکوٰۃ لیتا ہے اور لاکھوں کما لیتا ہے۔ تب بھی شاید میں یہ کام نہ کر سکتا۔ چنانچہ میں نے جو طریقہ اختیار کیا اسے تم دیوانگی کہہ سکتے ہو لیکن میں اسے محبت کی مجبوری ہی کہوں گا۔۔۔

اب یہ بھی اس محبت کی مجبوری ہے جو مجھے تم سے جدا کر رہی ہے۔ کم سے کم وقتی طور پر، شاید پھر کبھی ہم ملیں تو میں تمہارے لیے اس سے زیادہ کر سکوں جو میں نے آج تک کیا۔ کل شام جب میں پری سے ملنے کے لیے گیا تو مجھے پتا چلا کہ اس کے باپ پر دل کا دورہ پڑا تھا اور وہ اسپتال میں ہے۔ میں اسپتال گیا تو اس کی حالت سے ڈاکٹر بھی مایوس ہو چکے تھے۔ یوں سمجھ لو کہ اس کا بالکل آخری وقت تھا۔ شاید قدرت کو یہی منظور تھا کہ میں ایسی فلمی قسم کی صورتِ حال سے دوچار ہو جاؤں کہ اس نے مجھے دیکھا تو کہنے لگا کہ بیٹا تم کہاں تھے؟ کل سے میری آنکھیں تمہارا راستہ دیکھ رہی ہیں اور میرا دم اسی لیے اٹکا ہوا ہے کہ میں اپنی زندگی میں اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں اور تم سے ان سب زیادتیوں کی معافی بھی مانگ لوں جو میں نے تمہاری

اور پروین کی محبت آزمانے کے لیے کی تھیں۔

میں بھونچکا رہ گیا۔ 'آزمانے کے لیے'

'ہاں بیٹا۔ زمانہ ہی ایسا ہے میں کیا کروں' وہ بولا۔ 'سب ہی محبت کے دعویدار بنے پھرتے ہیں اور پروین تو لاکھوں میں ایک ہے اور لاکھوں کی مالک بھی ہے حسن اور دولت دیکھ کر منڈلانے والے سب بدمعاش ثابت ہوئے۔ سوائے تمہارے۔ تم نے مجھے یقین دلا دیا کہ تم پروین کو صرف اسی کے لیے چاہتے ہو اور اس کے لیے سب کچھ کر سکتے ہو یہاں تک کہ فقیر بن کے بھیک بھی مانگ سکتے ہو'

میں پھر بھونچکا رہ گیا۔ 'یہ۔۔۔ آپ کو معلوم تھا'

وہ بڑی مشکل سے مسکرایا۔ 'جو بات سارے شہر میں مشہور ہو وہ مجھ سے کیسے چھپی رہ سکتی تھی بے وقوف۔'

'آپ یہ بھی جانتے تھے کہ میں دبئی نہیں ہوں؟'

'ہاں۔ مجھے سب پتا تھا' وہ بولا 'کہ تم کس طرح پری کی خاطر میری شرط پوری کرنے لگے ہو۔ بھیک مانگنا بہت مشکل کام ہے۔ چوری ڈکیتی سے بھی زیادہ مشکل۔ اس میں آدمی کو اپنی عزت بیچنی پڑتی ہے اور بے عزت بن کے ہاتھ پھیلانا پڑتا ہے مگر تم نے تو حد کر دی' ناممکن کو ممکن بنانے کے لیے۔ میں بہت پہلے قائل ہو چکا تھا کہ پری سے تمہاری محبت کا مقابلہ کوئی بھی نہیں کر سکتا۔ تم بڑے وقت پہ آئے۔ نہ آتے تو میرا مرنا اور مشکل ہو جاتا'

با دلِ ناخواستہ میں نے کہا' خدا آپ کا سایہ سلامت رکھے'

وہ بولا' اب کوئی فائدہ نہیں۔ پہلے ہی بہت دیر کر دی تھی میں نے۔ میں تم سے یہ بات بہت پہلے کہہ سکتا تھا لیکن تم تو میرے سامنے ہی نہیں آتے تھے۔ خیر' اب فوراً جاؤ اور بارات لے آؤ'

میں تیسری بار بھونچکا رہ گیا' بارات ۔۔۔ یہاں!'

'بارات سے میری مراد ہے وہی دو گواہ اور دو وکیل، قاضی اور تم خود' وہ بولا 'میں نے ڈاکٹروں سے بات کر لی ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ دس پندرہ منٹ کے لیے پانچ چھ افراد آ سکتے ہیں'

'آپ نے پروین سے بھی پوچھ لیا' میں نے کہا۔

'بے وقوف۔ یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات تھی' وہ بولا۔

اس وقت پری بیڈ کے دوسری جانب بیٹھی تھی اور زار و قطار رو رہی تھی۔ اس کا رونا برحق تھا۔ ایک تو اس کی رخصتی ہو رہی تھی۔ دوسری اس کے باپ کی۔ اور دونوں کی رخصتی کے حالات سخت ٹریجک تھے۔

میں نے اُسے رونے دیا اور وہاں سے دوڑا تو آدھے گھنٹے میں بارات پکڑ لایا۔ ان میں چار تو میرے وہ یار تھے جو مجھے پرنس کے نام سے جانتے تھے۔ انھی کی گاڑیاں تھیں جن میں ہم قاضی کو بھی اٹھا لائے حالانکہ وہ آن ڈیوٹی نہیں تھا۔ اس نے بہت شور مچایا کہ وہ عصر اور مغرب کے درمیان ہی نکاح پڑھاتا ہے اور خود بھی دل کا مریض ہے اس لیے امراضِ قلب کے اسپتال میں نکاح پڑھانے نہیں جا سکتا۔ کہیں نکاح کے دوران میں لڑکی کا باپ مر گیا تو نکاح ادھورا رہ جائے گا اور وہ خود بھی فوت ہو جائے گا۔ ہم نے اُسے پانچ سو روپے دیے مگر وہ نہیں مانا ۔۔۔ ہزار روپے میں اُس نے اوقاتِ نکاح میں تبدیلی منظور کی اور وعدہ کیا کہ پورا نکاح پڑھانے سے قبل مرنے والے کو کلمہ تک نہیں پڑھائے گا اور خود بھی فوت نہیں ہوگا۔

اب تم سوچ سکتے ہو کہ یہ کیسی شادی تھی۔ ایک طرف میلے کپڑوں میں منہ جھاڑ سر پہاڑ۔ شاید میں اُلٹا لکھ گیا۔ خیر۔ ایک ایسی دلہن بیٹھی تھی جو جھنگن زیادہ نظر آتی تھی۔ دوسری طرف ہونق باراتی اس دردناک منظر پر آبدیدہ بیٹھے تھے اور درمیان میں دولھا کا سسر سفرِ آخرت پہ روانہ ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ خیر جی قاف نکاح ایجاب و قبول سب ہو ۔ مجھے تو اندیشہ ہے کہ قاضی نے شارٹ ہینڈ میں نکاح پڑھا دیا ۔۔ دعا مانگ کے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہی بارات بھاگ گئی' قاضی سمیت۔ ان میں سے کوئی بھی دوسری رخصتی میں شرکت تک ٹھہرنے کے تیار نہ تھا۔ بہت سی نرسوں اور ڈاکٹروں نے یہ ایمرجنسی میں شادی خاصی دلچسپی سے دیکھی۔ مجھے افسوس رہا کہ تم سب شریک نہیں ہو سکے۔ کسی کا کچھ پتا ہوتا کہ وہ کہاں ملے گا تو میں تمہیں لانے کی کوشش بھی کرتا۔

میرا سسر شادی کی تقریب کے ختم ہوتے ہی فوت نہیں ہوا۔ اس نے بطورِ داماد میری تقرری کے بعد ایک مختصر مگر دردناک تقریر کی جس میں مجھے اس نے تفصیل سے کاروبار اور اپنے اثاثوں کے بارے میں بتایا اور کہا نہ پروین اب تیری ہے تو سب تیرا ہے ورنہ مجھے پروین سے زیادہ کاروبار کا خیال کرنا ہوگا۔

میں تو سمجھا تھا کہ فی الحال اُس نے مرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا ہے لیکن رات گیارہ بجے تیسرا اور آخری مہلک دورہ پڑا اور وہ سچ مچ اللہ کو پیارا ہو گیا۔ ظاہر ہے' مجھے اپنی دلہن کو بھی سنبھالنا پڑا اور میت کو بھی۔ میں دونوں کو ایک ہی گاڑی میں گھر لے گیا اور صبح مجھے اپنے سُسر کی تجہیز و تکفین کرنی ہو گی۔ اس کے سارے انتظامات ابھی باقی ہیں۔ تم خود سوچ سکتے ہو کہ شادی کے بعد میری پہلی رات کیسے گزرے گی۔ ابھی شاید سوئم کیا' چہلم تک اپنی شبِ عروسی نہ آئے مگر کوئی بات نہیں۔ پری اگر میری ہے تو اس کا ہر دکھ بھی میرا ہے اور میں صرف اپنی خوشی کو نہیں دیکھ سکتا' جہاں انتظار اور آزمائش کے اتنے سال گزرے' وہاں صبر سے یہ چند دن بھی گزر ہی جائیں گے۔ خوشی مجھے اس بات کی ہے کہ نہ مجھے سلیبس کا پتا تھا نہ ڈیٹ شیٹ ملی تھی مگر میں نے عشق کا وہ امتحان پاس کر لیا ہے جس کے بعد کوئی امتحان نہیں۔ سمجھ لو کر پی ایچ ڈی ہو گیا ہوں اچانک' عشق کے مضمون میں۔

تدفین کے بعد بھی مجھے وہ سب کام کرنے ہوں گے جو مرحوم سسر صاحب میرے سپرد کر گئے ہیں۔ مجھے اس کے کاروبار کو جاری رکھنا ہوگا۔ پروین کے لیے' جیسا کہ اس نے وصیت کرتے ہوئے کہا تھا۔۔ ورنہ اپنا کیا تھا۔ ہم تو فقیر لوگ تھے' فقیرانہ آئے صدا کر چلے۔ دولت ہمارے لیے کیا تھی۔ فقط پری کو شیشے میں اتارنے کا منتر۔ جب وہ مل گئی ایسے ہی' تو سمجھو ساری خدائی مل گئی۔ جو دولت ہاتھ پھیلا کے مانگی تھی وہ اب ہاتھ کا میل ہے لیکن یہ میل تمہارے کام آ سکتا ہے اس لیے میں اپنا سب کچھ چھوڑ کے تم سب سے ملے بغیر واپس جا رہا ہوں۔ تم سے ملتا تو تم روتے بھی اور مجھے ملتے بھی اور یہ گھڑے شاید میرے سر پر پھوٹتے۔ گالیاں جتنی چاہو دے لینا لیکن میرے اس حقیر تحفے کو ضرور قبول کر لینا۔ بے شک یہ خیرات ہے۔ ایک بھکاری راجا کا مال ہے لیکن اس میں میرا خلوص اور پری کی محبت شامل ہے جس کا کوئی بدل نہیں ہو سکتا۔ کوئی کروڑ پتی تمہیں دو کروڑ کا چیک کاٹ کر دے تب بھی میرے اس دو لاکھ کے مقابلے میں وہ بے وقعت ہے، کم قیمت ہے۔

[illegible]

ہمیشہ رہے گا۔ پیسہ یقیناً میرے تعاون کا بدل نہیں ہے لیکن یوں سمجھ لو کہ جس محبت کی خاطر میں نے دن رات محنت کر کے یہ خزانہ جمع کیا تھا وہی میں تم کو نذر کر رہا ہوں۔ یہ ایک مقصد کے لیے تھا مگر اب زیادہ عظیم مقصد کے لیے استعمال ہوگا تو مجھے خوشی ملے گی۔

میں تم سب کو ہر قسم کے خطرات سے دور رکھنا چاہتا ہوں اس لیے اپنا پتا چھوڑ کے نہیں جا رہا ہوں تاکہ تم جنازے یا تعزیت کے لیے آنا بھی چاہو تو نہ آ سکو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ سوئم کے بعد یہ پری کا جن تم سے ملنے آئے گا۔ اپنی پری کے ساتھ۔

بھکاری راجا۔"

خط پڑھ کے میں چپ چاپ بیٹھا رہا۔ مجھے یوں لگا جیسے راجا کا سسر نہیں مرا' راجا مر گیا ہے۔ کچھ ایسے ہی جذبات میرے اس وقت بھی تھے جب مجھے استاد ڈیڈی کی موت کی خبر ملی تھی مگر وہ ایسا صدمہ تھا جس نے میرے دل کا لہو کر دیا تھا۔ ڈیڈی نے بڑی بہادری کے ساتھ جامِ شہادت نوش کیا تھا۔ اس کے برعکس راجا نے بہت کمزوری کا مظاہرہ کرتے ہوئے خودکشی کر لی تھی۔ مجھے اس پر غصہ تھا۔

"اُلو کا پٹھا۔ پری کا بچہ۔ بھکاری کی اولاد۔" میں نے خط کو پھینک کے کہا "نہیں چاہیے ہمیں اس کا پیسہ۔"

"وہ قابلِ معافی ہے سکندر بھائی۔" نازو ناشتا لے کر اندر آئی۔

"کیونکہ وہ قابلِ رحم ہے۔" غالب نے کہا۔

"سب فضول باتیں ہیں۔ وہ بزدل اور خود غرض ۔۔۔"

"نہیں یار۔" محسن نے میری بات کاٹ دی۔ "اسے خود غرض مت کہہ۔ وہ مجبور تھا اور کمزور۔ جس حد تک وہ ہمارا ساتھ دے سکتا تھا اس نے دیا۔ اب یہ توقع رکھنا تو غلط ہوگا کہ سب غالب یا محسن یا سکندر بخت ہوں گے۔ آگے جو بھی ملیں گے وہ اتنے ہی ثابت قدم اور مستقل مزاج ہوں گے جتنے ہم ہیں۔ یا ڈیڈی تھا۔"

"چلیں غصہ چھوڑیں۔ ناشتا کریں۔" نازو نے کہا۔

"میرا موڈ نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے ایک کپ چائے کا دے دو بغیر دودھ کے۔"

"چل یار۔ اب نخرے مت کر۔ راجا نے ہمارے ساتھ کون سی بُرائی کی ہے جب تک ساتھ دے سکا دیا۔ جب اس قابل نہیں رہا تو صاف اپنی کمزوری کا اعتراف کر لیا۔ کوئی حیلہ بہانہ نہیں کیا۔ جھوٹ کو سچ بنانے کے لیے خوامخواہ دلائل نہیں دیے۔ لوگوں کی اپنی اپنی مجبوریاں ان کے راستے کی دیوار بن جاتی ہیں اور سب یہ دیواریں گرانے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔ تم نے رابعہ کو چھوڑ رکھا ہے اور محسن نے شہلا کو۔ تو ایسا سب نہیں کر سکتے۔"

کس وقت آیا تھا؟"

محسن نے نفی میں سر ہلایا۔"کسی کو پتا نہیں چلا۔"

"اور اس کے وہ خوابوں سے بھرے ہوئے گھڑے ہمیں دروازے کے باہر گلی میں رکھے ہوئے ملے۔" غالب نے کہا۔" انھیں وہ اندر کیسے لاتا۔ خط تو اُس نے دروازے کے نیچے سے کھسکا دیا۔"

"آئیے ناشتا کیجیے۔"

"یہ کیا ناشتے کی رٹ لگا رکھی ہے۔" میں نے چڑ کے کہا۔"تم کو بھائی کی کوئی فکر نہیں ہے؟"

"کیا فکر کرنے سے وہ آجائیں گے؟" نازو نے کہا۔"اگر آسکتے ہیں تو چلو تم ناشتا کرو، میں فکر کرتی ہوں۔"

"کیا عجیب جذبات ہیں تمہارے بھی!" میں نے ہار کے کہا۔

"چیف کے تو۔ وہ مرزا غالب کا سالا اب نہیں آنے والا۔" محسن بولا۔"وہ نکل گیا اس حبّت کافر کے ساتھ۔"

"اچھا کیا اگر نکل گیا تو۔ پہلے پولیس سے نکل گیا تھا۔ اب ایم آر ایس سے بھی نکل گیا۔" غالب نے کہا۔

"تم اسے اچھا سمجھتے ہو تو تم بھی نکل جاؤ۔" میں نے خفگی سے کہا۔"لعنت بھیجو اس مشن پر۔"

"تم بھی نکل جاؤ رابعہ کے پیچھے۔" محسن بولا۔"مسٹر سکندرِ اعظم۔"

"میں سمجھ رہا ہوں۔ کل تو نے شہلا سے بات کی، مرزا جی بھی گئے تھے ایک رومانٹک ایڈونچر پہ۔" میں نے تلخی سے کہا۔

"ایک وہ تھے، انھوں نے کہا تھا کہ ع گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا۔ یہ غالبِ ثانی ہیں جو مار کھا کے بے مزہ نہیں ہوئے۔"

"چلو بس بھی کرو۔" نازو نے سب کو ڈانٹا۔"صاف کیوں نہیں بتا دیتے سکندر بھائی کو۔ آخر کب تک چلے گا یہ مذاق؟"

میں نے غالب اور محسن کی طرف دیکھا جو نہایت ڈھٹائی سے ہنسی کر رہے تھے۔

"وہ کل آئے تھے سکندر بھائی۔" نازو نے کہا۔"جب ہم سب نکلے ہوئے تھے۔"

"پھر رکے کیوں نہیں؟"

"وہ جلدی میں تھے۔" نازو نے کہا۔"سامنے والی خالہ نے انھیں دیکھا۔ بھیا ٹیکسی چلا رہے تھے اور موہنی ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ یہ بات خالہ کو ذرا عجیب لگی۔ انھوں نے آواز دے کر موہنی کو بلا لیا اور پہلے تو جھاڑا کہ تم دونوں کل بغیر بتائے کہاں نکل گئی تھیں۔ چھوڑے پریشان پھر رہے تھے۔ موہنی نے بتا دیا تو کہنے لگیں کہ یہ کس کے ساتھ گھومتی پھر رہی ہو ٹیکسی میں؟"

"بڑی شکی مزاج بڑھیا ہے۔ بالکل ایس ایچ او بن گئی ہے۔" غالب

"یار، دل کی اچھی ہے بے چاری۔ پرانے وقتوں کی چیز ہے۔ ہمارا خیال رکھتی ہے تو صرف اس لیے کہ ہم نو وارد ہیں اس محلے میں اور ان کے مقابلے میں۔ چھوٹے چھوٹے ہیں۔" محسن ہنسنے لگا۔

"خیر آگے بتاؤ۔" میں نے کہا۔

"میں بتا رہی ہوں۔ آپ ناشتا کرتے رہیں۔"

"بس بابا اور نہیں کھایا جاتا۔" میں نے چائے پیتے ہوئے کہا۔

"پھر موہنی نے کیا کہا؟"

"اُس نے... اُس نے تو کہہ دیا کہ خالہ ٹیکسی اپنی ہی ہے اور جس کے ساتھ بیٹھی ہوں وہ بھی اپنا ہی ہے۔" نازو بولی۔

"وہ تو صاف بھی کہہ سکتی تھی کہ میرا گھر والا ہے۔"

"اور کیا کہتی پھر؟ یہ کہتی کہ میرا بوائے فرینڈ ہے یا بس میرا ایک چاہنے والا ہے۔" محسن جھلا کے بولا۔

"مگر وہ ٹیکسی۔ اس نے کہا تھا کہ اپنی ہے؟" میں نے خفت پر قابو پا کے کہا۔

"ہاں۔ ایسا لگتا ہے کہ اکرام بھیا نے پھر کوئی ٹیکسی لے لی ہے..." نازو بولی۔" ڈرائیونگ لائسنس وغیرہ تو ان کے پاس پہلے سے تھا۔ ٹیکسی ڈرائیوروں کی برادری کے علاوہ ٹریفک پولیس والے بھی انھیں جانتے پہچانتے ہیں۔ اس طرح وہ شہر میں زیادہ بے خوفی سے پھر سکتے ہیں۔"

"موہنی کے ساتھ۔" میں نے کہا۔

"یار کیا ہو گیا ہے تجھے۔ موہنی کمپلیکس بن گئی ہے تیرا کہ جہاں اس کا نام آیا اور تجھے شروع ہوئی تکلیف۔ ایسی کیا الرجی ہے اس سے کہ تیری سوچ تیری بات سب میں صرف تلخی اور نفرت آجاتی ہے؟" غالب نے غصے سے کہا۔"اب وہ ہمارے ساتھ ہے۔ ہم میں سے ایک ہے۔ ہمیں تو نظر نہیں آتی اس کی شرافت میں کوئی کمی۔ کم سے کم مجھے اس کا اور نازو کا رویّہ ایک سا لگتا ہے۔ ایسی ہی مجھے شہلا اور رابعہ بھی لگتی ہیں یعنی کیا قصور ہے اس کا؟"

"قصور اس کا یہ ہے کہ وہ سکندرِ اعظم کو فتح کرنے کی خوش فہمی میں گھر بار، اپنے پرائے، دین دھرم اور اپنا شہر ملک چھوڑ آئی اور مایوس یا دل شکستہ ہو کر بھی اُس نے خودکشی نہیں کی۔" محسن نے تلخی سے کہا۔"قصور اس کا یہ ہے کہ وہ ابھی اعتماد حاصل نہیں کر سکی۔ محبت تو دور کی بات ہے۔ محبت تو وہ مانگتی بھی نہیں۔"

"آئی ایم سوری یار۔" میں نے کہا۔"مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم لوگوں کے یہ جذبات ہوں گے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری وجہ سے تم لوگ اسے قبول کرنے پر مجبور ہو جاؤ۔ اور جب اس پر بھروسا کرنے لگو تو کوئی ناقابلِ تلافی نقصان ہو جائے جس کی ذمّے داری صرف مجھ پہ آئے۔"

...باتوں کو خارج کر دیجیے اپنی کھوپڑی سے ہم خود کو حالات کے تابع سمجھتے ہیں۔ دوستی اور ڈسپلن اپنی جگہ لیکن جہاں تم غلط بات کہو گے، ہم نہیں مانیں گے۔" غالب نے کہا۔"اگر جس دل ہی خدا نے ہمیں بھی عقل دی ہے۔ آنکھیں اور کان دیے ہیں۔ ہم بھی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور آدمی کی پہچان کر سکتے ہیں۔ موہنی ہو یا کوئی اور کسی کے حوالے سے ایم آر ایس میں شامل نہیں ہو سکتا۔ موہنی سو فی صد میرٹ پر آئی ہے اور ہم سب اُسے خوب پرکھ چکے ہیں۔ تم اسے نفرت کرو تو یہ تمہارا ذاتی فعل ہے لیکن ہمیں یہ پسند نہیں کہ اس کے ساتھ تمہارا رویّہ ایسا ہو جیسے اس کی پوزیشن مشکوک ہے یا کمتر ہے۔"

میں نے غالب کے سخت لہجے اور محسن کی تند و ترش باتوں کا بالکل بُرا نہیں مانا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ انھوں نے کھل کر مجھ سے اختلاف کیا اور دوستی کے جذبات یا مروّت میں حقیقت کی پردہ پوشی نہیں کی۔ انھوں نے ایک طرف مجھے میری کمزوری سے آگاہ کر دیا کہ موہنی میرا کمپلیکس بن گئی ہے تو دوسری طرف میرے سر سے ذمّے داری کا وہ بوجھ بھی اُتار دیا جو موہنی کی موجودگی کے باعث مجھے محسوس ہوتا تھا۔ اس خیال سے کہ وہ یہاں ہمارے درمیان موجود ہے تو صرف میری وجہ سے۔

خاموشی کے ایک ناخوشگوار وقفے کو نازو نے ختم کیا۔"مجھے یہ سب خالہ نے صبح بتایا۔ رات وہ ہمارا انتظار کرتے کرتے سو گئی تھیں۔ انھیں عشا کی نماز کے بعد ہی سو جانے کی عادت ہے۔"

"اور کیا بتایا انھوں نے؟" میں نے لہجے میں بشاشت پیدا کی۔

"وہ ایک پیغام دے گئے تھے۔" نازو نے کہا۔

"کیسا پیغام؟" میں نے نازو کی خاموشی سے کوئی مطلب اخذ کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔

نازو نے غالب کی طرف دیکھا۔"بتا دوں؟"

"واہ۔ کیا فرماں برداری ہے۔ ابھی سے۔" میں نے کہا۔"وہ اجازت دیں گے تو بتاؤں گی۔" میں نے زنانہ لہجے میں اس کی نقل اُتاری۔

محسن ہنس پڑا۔ نازو کا رنگ لال پڑ گیا۔

"چلو بتا دو۔" غالب نے یوں اکڑ کے کہا جیسے سچ مچ اس کی اجازت کے بغیر نازو کچھ نہیں بتائے گی۔"بیچارا کتنی منتیں کر رہا ہے۔"

"بھاڑ میں جاؤ تم سب۔ مت بتاؤ۔" میں نے کہا۔

"تمہاری مرضی ــــ" محسن بولا۔"پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی۔"

"بالله ہمارا تو کوئی تعلق ہے نہیں اس بات سے۔"

اب میں چونکا۔"صرف میرا تعلق ہے۔ کیا... کیا رابعہ...؟"

"جی! وہ رابعہ سے ملنے گئے ہیں۔" نازو بولی۔

"رابعہ سے ملنے گئے ہیں! مگر کہاں؟" میرا دل ایک دم تڑپا۔

کہہ سکتے تھے کہ جب ہم آئیں تو ہمیں بتا دیا جائے کہ رابعہ نے بلایا ہے اور وہ ادھر ہی جا رہے ہیں، ہم پریشان نہ ہوں۔"

"خالہ نے پوچھا نہیں کہ یہ رابعہ کون ہے؟"

"پوچھا تھا۔ بھیا نے کہا کہ میری پھوپھی زاد بہن ہے جو کیماڑی میں رہتی ہے۔" نازو ہنسنے لگی۔"موہنی نے خواہ مخواہ کہا کہ وہ میری بھی خالہ زاد بہن لگتی ہے۔ صبح مجھ سے خالہ پوچھ رہی تھیں کہ یہ کیسے ممکن ہے۔ اگر وہ دونوں میاں بیوی ہیں تو۔ میں نے بڑی مشکل سے ٹالا کہ سگی خالہ زاد نہیں ہے۔"

رشتے میں کیا چکر تھا، یہ تو میری سمجھ میں بھی نہیں آیا مگر رابعہ کے خیال سے وابستہ امید کا رشتہ یکلخت استوار ہو گیا۔ اس کے تصور کی ایک کرن بڑھ کے اجلی دھوپ بن گئی۔ انھیں رابعہ نے بلایا ہے۔ وائے بدنصیبی۔ میں ہوتا تو شاید اکرام شیخ کی جگہ میں جاتا۔ اس نے تو مجھے ہی بلایا ہوگا مگر میں تھا کہاں کہ پیغام مجھے ملتا۔"لیکن اکرام شیخ تک اس کا پیغام کیسے پہنچا؟"

میرے سوال کے جواب میں ان سب نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

"ہمیں اور کچھ نہیں معلوم۔ جتنا اکرام شیخ بتا گیا تھا وہ یہی تھا۔ ہم بھی صرف قیاس آرائی ہی کر سکتے ہیں۔ پوری بات وہ خود بتائیں گے۔"

"عجیب احمق آدمی ہے۔" میں نے جھنجلا کے کہا۔"آدھی نامکمل بات کی۔ یہ بھی تو بتا سکتا تھا کہ رابعہ نے کہاں بلایا ہے اور کیوں؟"

"یہ سب خالہ کو بتاتا؟" محسن نے حیرانی سے میری طرف دیکھا۔

"زبانی نہ بتاتا۔ لکھ کے دے جاتا۔ چند سطریں لکھنے میں کتنی دیر لگتی ہے۔" میں نے کہا۔

غالب نے کہا۔"بات دیر کی شاید نہ ہو۔ رازداری کی ہو۔ میرے خیال میں تو اس نے ٹھیک ہی کیا جو تحریر نہیں چھوڑی۔"

"چھوڑ دیتا تو کون سی قیامت ٹوٹ پڑتی؟"

"تمہیں کیا معلوم قیامت ٹوٹتی کہ نہیں۔" غالب نے کہا۔"خالہ کو خود تو پڑھنا آتا نہیں ہوگا۔ وہ بلاتیں کسی کو کہ بیٹا ذرا پڑھ تو سہی اس میں کیا ہے۔ وہ بات کی ٹوہ میں رہنے والی تجسس سے بھرپور اور سنسنی خیز قسم کی بڑھیا ہے جسے آفت کی پڑیا بھی کہا جا سکتا ہے۔"

"دراصل سکندر کو غم ہے کہ شیخ کی جگہ وہ کیوں نہیں جا سکا۔" محسن نے میرے دل کی بات کہہ دی۔

"میرے دماغ میں جو بات آئی ہے۔" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔"وہ ہے تو ایک مفروضہ لیکن منطقی اعتبار سے اس میں کوئی خامی نہیں نکالی جا سکتی۔ ذرا سوچو رابعہ کے پاس رابطے کا ذریعہ کیا ہے؟ وہی اپنا دوست مجید۔ وہ خود تو چاند بھائی کے کسی محل میں قید ہے۔"

"یہ بھی ایک مفروضہ ہے۔" محسن نے دخل اندازی کی۔

کہا۔ "لیکن اُس نے ہم سے دوست محمد کے ذریعے رابطہ پیدا کر لیا تھا۔"

"یہ بھی ایک مفروضہ ہے۔" محسن پھر بولا۔

"مفروضے کے بچے! گاڑی میں اس کا خط کیا فرشتے چھوڑ گئے تھے؟" میں نے بگڑ کے کہا۔ "اور بعد میں بھی دوست محمد ہی ۔ ۔ ۔"

"اچھا چلو مان لیا کہ اس نے پھر دوست محمد کے ذریعے پیغام بھیجا۔ تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے چیف کے لوٹ کہ اسے ہمارا پتا ٹھکانا کیسے معلوم ہوا۔ یہ کیسے پتا چلا کہ شیخ صاحب کہاں ملیں گے! اور اگر وہ پیغام بھیج سکتی تھی تو اس نے تمھیں کیوں نہیں بھیجا؟"

"میں بتاتا ہوں۔ تم سنو تو سہی میری بات۔ حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اکرام شیخ نے کسی خاص مقصد کے تحت ٹیکسی حاصل کی، خریدی یا کسی ٹیکسی ڈرائیور دوست سے مستعار لی۔ یہ خاص مقصد کیا ہو سکتا ہے؟"

"بندرگاہ کی صورت حال کا جائزہ لینا۔ یہ دیکھنا کہ وہ مال بردار جہاز ایس ایس کرانتی تھرڈ روانہ ہو گیا ہے یا ابھی تک لنگر انداز ہے۔" غالب نے کہا۔

"رائٹ۔ اب آپ نے کی ناعقل کی ایک بات۔ وہ اسی کا پتا چلانے بندرگاہ گیا ہوگا۔" میں نے کہا۔ "اس بحری جہاز پر دلاور کے ساتھ چاند بھائی کو دیکھا گیا تھا۔ پھر وہ اسلحہ جو اس پر روانہ کیا جانے والا تھا، ہم نے غرق کر دیا۔ اُس سے روانگی کے پروگرام میں ضرور دیر ہوگی۔"

"دلاور کے کہنے کے مطابق اس کھیپ میں اسلحہ کم اور سونا زیادہ تھا جو ہم نے سمندر میں ڈبو دی۔" محسن بولا۔

"مگر ایک بحری جہاز صرف ایک ٹرک کا مال لے کر نہیں جاتا۔ اُس پر سو پچاس ٹرک خالی کیے جا سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "سونا تو بہت کم جگہ گھیرتا ہے۔ صرف سونا ہوتا تو لانچ بھی بہت تھی مگر یہ جو اتنا بڑا بحری جہاز آیا ہے تو یہ خالی نہیں جائے گا۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ اسلحے کا گودام ملی پور سے آگے ہے۔"

"گودام کی موجودگی کا راز افشا ہو چکا ہے اور یہ بات ہمارے دشمنوں کو بھی معلوم ہو چکی ہے۔" غالب نے کہا۔

"رائٹ۔ ایسی صورت میں وہ گودام کو جلد از جلد خالی کریں گے بلکہ کر چکے ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "انھیں جیسے ہی اپنا ٹرک گودام کے قریب خالی کھڑا ہوا ملا ہوگا، وہ سمجھ گئے ہوں گے کہ خطرہ ان سے کتنا نزدیک آ گیا ہے اور وہ بے وقوف نہیں ہیں کہ پھر بھی وہیں اطمینان سے بیٹھے رہیں۔ انھوں نے فوری طور پر اسلحہ منتقل کیا ہوگا، خواہ کسی دوسرے گودام میں یا جہاز پر۔ مجھے اس دوسرے امکان میں زیادہ کشش محسوس ہوتی ہے۔"

"تیرا مطلب ہے کہ اپنے شیخ صاحب جو اچھے خاصے رومانس کے موڈ میں غالب عرضِ مدعا کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ باہر نکلے تو سب بھول گئے اور دوسرے چکر میں بندرگاہ جا پہنچے۔"

کیا معلوم وہ کیا سوچ کے گیا ہوگا۔" میں نے کہا۔ "لیکن یہ ہو سکتا ہے مُدعا کے لیے جگہ کی تو قید نہیں۔ وہ راہ چلتے یا ٹیکسی چلاتے سڑک پر، بندرگاہ کے علاقے میں بھی سب کچھ کہہ سکتا تھا۔ مگر میں سمجھتا ہوں، موہنی کو باہر ٹیکسی میں چھوڑ کے اندر گیا ہوگا۔ اکیلا۔ موہنی ساتھ ہوتی تو ہر نظر اس کی طرف اٹھتی۔ ٹیکسی ڈرائیور کی وردی میں وہ سب کے ساتھ ہوتے بھی سب کی نظروں سے اوجھل رہا اور پھر دوست محمد سامنے دیکھا یا اُس نے اتفاق سے دوست محمد کو دیکھ لیا جو اسی علاقے میں رہتا ہے اور پیغام اُسے دوست محمد نے ہی دیا۔"

"اس مفروضے کے دُرست ہونے کے امکانات اٹھتر اعشاریہ پانچ فیصد ہیں۔" محسن نے کہا۔

"اوں ہوں۔ اٹھاسی اعشاریہ دو فیصد۔" غالب نے کہا۔

"ثابت کرو۔" محسن نے اُسے گھور کے کہا۔ "میں نے تو حساب لگا کے بتایا تھا۔"

"پہلے تم ثابت کرو، میں نے تو حساب لگا کے بتایا تھا۔" اس نے محسن کی نقل نہایت اشتعال انگیز پیرائے میں اُتاری۔ "تم کیا جانو حساب کو جسے یہ معلوم نہیں کہ دو اور دو پانچ ہوتے ہیں یا تین۔"

"تمہیں معلوم ہے اپنا حساب۔ یوم حساب جب بے حساب جوتے پڑیں گے نا تب یاد آئے گا چھٹی کا دودھ۔"

"میں نے ساتویں دن سے دودھ پینا شروع کیا تھا۔"

"پہلے چھ دن تک کیا حقّے کا پانی پلایا گیا تھا۔" محسن بولا۔ "اسی لیے مزاج میں گرمی ہے اور حقّے کی طرح گڑگڑانے کی عادت ہے۔"

"اُف۔ بس کرو دونوں۔" نازو نے چلّا کے کہا۔ "کیا شور کر رہے ہو خواہ مخواہ۔"

"سوری میڈم۔" غالب نے دانت نکال کے کہا۔ "ہم تو لڑ بھی نہیں۔ کیوں شیروانی صاحب!"

"بجا ارشاد مرزا جی ۔۔ ہم تو کب سے چپ بیٹھے ہیں۔ غالباً خاتون کے کان بج رہے ہیں۔" محسن نے بھی کہا۔

میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ "میں جا رہا ہوں۔"

"اچھا بھیا۔ ہمارا تمہارا بس اتنا ہی ساتھ تھا۔" محسن نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "خیر سے سدھارو۔"

"جانا تو ایک دن سب کو ہے۔" غالب نے آہ بھری۔

"اور وہ آج ہی کا دن ہے۔" میں نے دہاڑ کے کہا۔ "ہم سب جا رہے ہیں ابھی اور اسی وقت۔ دس اِز این آرڈر۔"

"یس باس۔" محسن اُٹھ کھڑا ہوا۔

غالب نے مجھے سیلوٹ کیا۔ "یس سر۔ آپ حکم کریں۔"

"حکم یہ ہے کہ اپنا ٹرک یہاں لاؤ۔" میں نے کہا۔ "اس میں رکھو چادریں، گھڑے، گھر کا باقی ساز و سامان۔"

"کیا مطلب؟ یہاں سے بھی کوچ؟" نازو بولی۔

"ہاں۔ مجھے یہ جگہ اب بہت غیر محفوظ لگتی ہے۔ کیونکہ شکاری یہاں تک آ گئے تھے۔ وہ دوبارہ بھی آ سکتے ہیں۔"

"مگر... بھیا اور موہنی آئے تو؟"

"ہم ان کے لیے پیغام چھوڑ جائیں گے۔ جیسے وہ ہمارے لیے صرف پیغام چھوڑ گئے تھے۔" میں نے کہا۔ "جب تک ان سے ہمارا رابطہ نہیں ہو جاتا۔ ہم میں سے کوئی رات گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان اس جگہ ملے گا۔ وہ آج ملے تو کل ملیں گے۔"

"پیغام کس کے پاس چھوڑو گے۔ خالہ تو پہلے ہی شک میں مبتلا ہیں۔"

"پیغام براہ راست ملے گا۔" میں نے کہا۔ "تم چلنے کی تیاری کرو۔ پہلے ہم گودام دیکھیں گے، پھر ٹرک کو فروخت کریں گے اور جا کے دیکھیں گے کہ لانچ کس حال میں ہے۔ لانچ مل گئی تو اسی میں بندرگاہ پہنچ جائیں گے اور دوست محمد کو تلاش کریں گے۔"

"اور اللہ کو منظور ہوا تو فوراً پکڑے جائیں گے۔۔۔ کیونکہ ہماری اشکالِ نامبارک کو دوستوں سے زیادہ دشمن پہچانتے ہیں۔" محسن بولا۔

"ہم یہاں ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے نہیں رہ سکتے۔" میں نے کہا۔ "ہمیں زیب النساء کے بارے میں بھی معلوم کرنا ہے کہ کیا اس کے اداکارہ بن جانے کی خبر درست ہے اور اس میں کس حد تک صداقت ہے کہ جنگی اور جونی بھی مارے جا چکے ہیں۔۔۔ سلطان محمد خاں کے علاوہ میرا ذہن یہ سب قبول نہیں کرتا۔"

"ہم نے کب سے اخبار بھی تو نہیں دیکھا۔" محسن بولا۔

"اب دیکھ لیں گے لیکن پہلے یہاں سے نکلو۔ مشرقی پاکستان کے حالات دن بدن خراب ہوتے جا رہے ہیں۔ کل رات ہم نے ایک جگہ بی بی سی سنا تھا۔ اس نے خاصی تشویش ناک خبریں دی تھیں۔"

"بی بی سی تو ہم نے بھی سنا تھا۔" غالب نے کہا۔

"لوگ بہت زیادہ سننے لگے ہیں بی بی سی کی خبریں اور ان کا اُردو پروگرام۔" محسن بولا۔ "راہ چلتے ہر ہوٹل میں، ہر پان کی دکان پر مجمع نظر آتا ہے خبریں سننے والوں کا۔"

"اصل بات یہ ہے کہ لوگ سچ جاننا چاہتے ہیں اور اپنے ملکی ذرائع ابلاغ بہت غیر حقیقت پسندانہ سرکاری پریس نوٹ سنا رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ان حالات میں بی بی سی کی رپورٹ ہی مستند اور صحیح خبروں کی فراہمی کا ذریعہ رہ گئی ہے۔"

"ریڈیو پاکستان کے اور ٹی وی کے خبرنامے پبلک کے لیے کیسے ناقابلِ اعتبار ہو گئے ہیں، کیا یہ بات وہ نہیں جانتے جو خبریں گھڑتے اور سناتے ہیں؟"

"سب جانتے ہیں لیکن وہ کیا کریں۔ وہ حکم کے غلام ہیں۔" میں نے کہا۔ "انھیں نوکری کرنی ہے۔"

"یہ سب احمقانہ پالیسی ہے۔ اب جو کچھ مشرقی پاکستان میں ہو رہا ہے، اس پر خواہ مخواہ کے حقائق کا پردہ کیسے ڈالا جا سکتا ہے۔" غالب بولا۔ "جتنی خونریزی ہو رہی ہے، تعصب کے جذبات جس طرح بھڑکائے جا رہے ہیں اور بیرونی مداخلت سے جس طرح علیحدگی پسندی کے رجحانات کو ہوا دی جا رہی ہے۔ وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں بھئی آپ نہیں بتائیں گے تو دنیا بتا دے گی۔ ٹی وی پر تو مجبوری ہے کہ کسی دوسرے اسٹیشن کے پروگرام نہیں دیکھے جا سکتے۔"

"لاہور اور مضافات میں تو امرتسر دوردرشن اپنا کام کر رہا ہے۔"

"وہ ایک محدود سے حلقے پر رائے عامہ کو بالکل مخالف سمت میں گمراہ کرتا ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر ریڈیو پر تو بچہ بھی سوئی گھما کے سب سن لیتا ہے۔ وائس آف امریکا، بی بی سی، ریڈیو جرمنی اور ان کے علاوہ ماسکو۔ سب کے اتنے طاقت ور ٹرانسمیٹر ہیں کہ یہاں کی نشریات تو ملک کے اندر بھی موصول نہیں ہوتیں، وہ دنیا بھر میں صاف سنائی دیتے ہیں۔ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ سب جھوٹے ہیں۔ غلط بیانی کرتے ہیں؟"

"یہ اسی کا منفی ردِعمل ہے کہ اب عوام ان کے جھوٹ کو بھی سچ مان لیتے ہیں مگر اپنے سچ کو بھی سچ نہیں تسلیم کرتے۔"

باتیں کرتے ہوئے ہم سامان بھی لا لا کے دروازے کے قریب جمع کر رہے تھے۔ جب ضروری سامان آ گیا تو محسن ٹرک لینے چلا گیا۔ نازو خاصی مایوس، بیزار اور خفا تھی۔

"وہ بھی آئیں گے یہاں۔ پری اور جن۔" وہ بولی۔

"آئیں گے تو آنے دو۔" میں نے کہا۔ "خالہ کے پاس اپنا پتا چھوڑ جائیں۔ ہمیں فرصت ہوئی تو ان سے بھی مل لیں گے لیکن مس نازلی بیگم بہتر ہوگا کہ تم راجا کا نام ایم آر ایس کے رجسٹر سے کاٹ دو۔ وہ آیا بھی تو صرف معذرت کرنے آئے گا۔ وہ اب ہمارا ساتھ نہیں دے گا۔ اس نے دوسرے روگ پال لیے ہیں۔"

"شادی کرنا روگ پالنا ہوتا ہے؟"

"اس سے کون انکار کر سکتا ہے آج تک۔ تم دیکھ لو کہ صرف محسن نے شادی کی مگر اسے بیوی کو چھوڑنا پڑا۔ بیوی ایک دن ماں بن جاتی ہے اور رشتوں کی یہ زنجیر آدمی کو باندھ لیتی ہے۔ ہر شخص محسن نہیں ہوتا کہ دل پتھر کر لے اور ہر لڑکی شہلا نہیں ہوتی کہ یوں گزارا کر لے۔ پھر بھی اتنا فرق تو پڑ ہی گیا ہے کہ اب شہلا ہمارا ساتھ نہیں دے سکتی۔ شادی سے پہلے وہ بہت ایکٹو تھی۔ جولی کو دیکھو، شادی کر کے اسے کیا ملا؟"

"آپ کا مطلب ہے کہ ۔ ۔ ۔"

"نہیں۔ غصّے میں مت آؤ۔ شادی تو فرض ہے مگر اس فرض کے بعد جس سے ہم ابھی سبکدوش نہیں ہوئے۔" میں نے نازو کی بات کاٹ دی۔ "اصولی طور پر ایک بات طے ہے کہ ہم سب کو اس کام سے نمٹ کے اپنا اپنا گھر بسانے کے سوا کچھ نہیں کرنا ہے لیکن ایسا مت کرنا کہ کسی دن غالب بے چارے کو پکڑ کے کورٹ لے جاؤ اور کرلو سول میرج۔"

نازو کا چہرہ غصّے سے لال پڑ گیا۔ "میرا اتنا دماغ خراب نہیں ہے۔"

"پھر کتنا ہے؟" غالب نے اسے چھیڑا۔

"اور خراب تو وہ چیز ہوگی جو استعمال ہو۔" میں نے کہا۔

"جو چیز اپنے پاس ہی نہ ہو وہ استعمال بھی کیسے ہوگی؟" غالب نے مزید اشتعال انگیزی کی۔

نازو پیر پٹختی اندر چلی گئی۔ "ایم آر ایس نہیں یہ پاگل خانہ ہے پاگل خانہ۔ یہ ماٹ اِز رائٹ سوسائٹی نہیں۔ میڈ روگ (ROGUE یعنی لوفر) سوسائٹی ہے۔" اس کے بڑبڑانے کی آواز اندر سے آتی رہی۔ غالب بہت خوش تھا کہ گزشتہ شام کی سب کوفت دُور ہوگئی۔

جب ٹرک دروازے پر آگیا اور ہم نے تمام اسباب رکھ دیا تو وہ باہر نکلی اور آگے بیٹھنے ہی والی تھی کہ سامنے سے خالہ نے اسے آواز دے دی۔ یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ گلی محلّے کی ہر وقت نگرانی کرنے والی خالہ کو ہماری نقل مکانی کی خبر نہ ہوتی۔ میں نے اتنی دیر میں دروازہ مقفل کیا اور ایک کوئلے سے باہر کی دیوار کے صاف رنگ پر موٹے بچگانہ انداز میں لکھا۔ "۱۲-۱۱ پی ایم۔ کے ٹو۔"

اگرچہ یہ پیغام بہت نامکمل اور غیر واضح تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ اکرام شیخ اس کو دیکھے تو صحیح مطلب نکال لے گا۔ باقی لوگوں کے لیے جو یہاں سے گزرتے ہوئے اسے دیکھیں گے یہ ایک بے معنی تحریر ہوگی۔ کسی بچّے کی شرارت جو صرف دیوار کے صاف رنگ کو خراب کرنا چاہتا تھا۔

"یہ اچانک کوچ کا حکم صادر فرما دیا آپ نے۔" محسن بولا۔ "تو کچھ یہ بھی سوچا کہ اب کہاں بسیرا ہوگا؟"

"یہ سوچنے کے لیے دن پڑا ہے پورا۔" میں نے کہا۔

"خوب۔ کر کے سوچنا پہلے سکھوں تک محدود تھا۔ اب ہم بھی ان میں شامل ہیں کہ پہلے تو سامان اٹھالیا بعد میں سوچیں گے کہ کہاں جائیں۔ آخر ایسی کیا جلدی تھی؟"

"یار اپنے محسن خاں شیروانی وغیرہ۔" میں نے کہا۔ "اپنی جو چھٹی حس ہے نا۔ کچھ اس کا اشارہ تھا کہ بس چلو۔ حیرت ہے کہ تیری ساتویں حس سوتی پڑی ہے ورنہ عموماً دونوں کی ایک ہی آواز ہوتی ہے۔"

"اسی لیے تو میں اب تک خاموش تھا۔" محسن نے نازو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کہ کھلی میرے پیروں میں بھی ہونے لگی تھی۔"

"لیکن ہم ایسے تو نہیں پھر سکتے نا۔ دن دہاڑے۔"

"کچھ کرتے ہیں ابھی۔" میں نے اسٹیئرنگ پر انگلیاں بجھاکر کہا۔ "چہرے بدل لیتے ہیں۔ مگر یہ نازو اتنی لمبی بات کیوں کر رہی تھی خالہ کی جرح کی زد میں ہے۔" محسن بولا۔ "شیطان کی خالہ۔"

"ٹرک بھی اچھا خاصا چلتا پھرتا کمرا ہوتا ہے۔" غالب نے مجھے مطلع کیا۔

"اچھا!" محسن نے کہا۔ "یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"چار افراد اس میں لمبی تان کے سو سکتے ہیں۔"

"اچھا!" محسن نے پھر حیرت کا اظہار کیا۔ "اور پیر یا نیچے اور اس وقت جب ٹرک چل رہا ہو یا ساکت ہو؟"

غالب نے پھر اسے نظر انداز کر دیا۔ "ایک رات تو ہم اس میں بھی گزار سکتے ہیں۔"

"اچھا! کون سی رات؟"

"وہ کیا کہا ہے عقل مندوں نے کہ۔ جوابِ جاہلاں باشد خموشی۔" غالب نے امن پسندی کا مظاہرہ جاری رکھا۔

"اچھا! پھر تم کیوں بولے چلے جا رہے ہو۔ آخر مجھے دیکھو، میں خاموش ہوں۔ ایک لفظ بھی نکلا میری زبان سے؟" محسن بولا مگر اس کی شر انگیزی اکارت گئی۔ غالب لڑنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

"خدا توفیق دے عورتوں کو اختصار کے ساتھ گفتگو کرنے کی۔" میں نے بیزار ہو کے کہا۔ "خالہ بھانجی دونوں ایسے اطمینان سے کھڑی گفتگو کر رہی ہیں جیسے سب خیریت ہے اور فراغت ہی فراغت ہے۔"

"کیا خیال ہے؟ کان سے پکڑ کے لاؤں۔" محسن بولا۔

"کسے؟ خالہ کو؟" غالب نے کہا۔

"نہیں۔ شیطان کی خالہ کو۔" محسن بولا۔

"یار مرد ہو تو جاؤ اور اسے کان پکڑ کے لے آؤ۔" غالب نے چیلنج کیا۔

"اگر لے آیا تو؟"

"سات لکیریں نکالوں گا ناک سے فرش پر۔ ورنہ تم ہی کر دے گے سب کے سامنے۔" غالب نے کہا۔ "ہو گئی شرط۔"

"ہو گئی۔" محسن نے ہاتھ ملایا اور چل پڑا۔ "میں ابھی آیا ابھی۔"

"مارا گیا سالا۔ اس سے آسان کام تو جنگل کے شیر کو کان سے پکڑ کے لانا تھا۔" غالب بولا۔

لیکن میں محسن کو غالب سے زیادہ جانتا تھا۔ میرا خیال تھا وہ شرط جیت جائے گا۔ میں نے سوچا کہ محسن کی جگہ میں ہوتا تو کیا کرتا اور پھر میں نے جو دیکھا وہ کچھ زیادہ مختلف نہیں تھا۔

"ابھی آئے گا کراہتا ہوا۔ کمر پر ہاتھ رکھے ہوئے۔ وہ تو توڑ کے رکھ دے گی۔" غالب نے خود کو تسلی دینے کے انداز میں کہا۔ "کیونکہ وہ پہلوان کی قدمی کے انداز نے اُسے پریشان کر دیا تھا۔ وہ خود حیران ہو گا کہ محسن نے ایسی شرط کیسے لگالی جب کہ وہ نازو کو اچھی طرح جانتا ہے۔"

نازو کے پاس پہنچ کے محسن نے تقریباً ایک منٹ تو خالہ سے باادب بات کی۔ پھر اچانک نازو کا بایاں کان پکڑ لیا اور اسے یوں لے آیا جیسے شریر بچے کو سخت گیر باپ کسی سنگین شرارت پر گرفتار کر کے لائے۔ غالب کی حالت غیر ہوگئی۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

"مرزا تیار ہو جاؤ۔" میں نے قہقہہ مارا۔ "ناک گھسنے کے لیے۔"

"یار یہ سب سازش ہے میرے خلاف۔" غالب نے برہمی سے کہا۔ "دونوں مل گئے ہیں۔ یہ بے ایمانی ہے۔"

"محسن نے وہ کر دکھایا جو کہا تھا۔" مجھے اس کی صورت دیکھ دیکھ کر ہنسی آ رہی تھی۔ "مرزا جی! شرط لگانے سے پہلے سوچنا چاہیے۔ اب تمہاری عزت رہ جائے گی جب اسی کے سامنے زمین پر ناک رگڑو گے جس کے کل کو مجازی خدا بنو گے۔"

"شرط میں یہ نہیں تھا۔" غالب نے جھنجلا کے کہا۔

ظاہر ہے یہ وکیلوں والا نکتہ غالب نے اچھا نکالا تھا جب محسن نے قریب آ کے کہا۔ "چل نیچے اتر مرزا غالب کے چچے۔"

"ٹھیک ہے تم شرط جیت گئے۔" مرزا غالب نے سکون سے کہا۔ "مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ... وہ سب ابھی ہوگا۔"

"پھر کب ہوگا؟" محسن نے چلّا کے کہا۔ "بے ایمان!"

"بے ایمانی کیسی۔ کیا وقت اور مقام کی بات ہوئی تھی؟" غالب نے اپنی عزت بچانے کا مسئلہ حل کر لیا تھا۔

"سکندر! اس کی بدمعاشی دیکھی؟"

"تم شملا کی قسم کھا کے کہو کیا بات ہوئی تھی؟" غالب نے فاتحانہ انداز میں مسکرا کے نازو کی طرف دیکھا۔ "بھئی ہم لکیریں نکالیں گے ناک سے، یہ تو ہم مانتے ہیں۔ اب رہی جگہ کی بات تو وہ ہم آپس میں طے کر سکتے ہیں۔ یہ کام کسی فائیو اسٹار ہوٹل کے ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں ہو سکتا ہے جہاں وال ٹو وال کارپٹ ہو۔"

"بات زمین کی تھی۔"

"چلو زمین سہی۔ اب رہا وقت، تو یہ میری فرصت پر منحصر ہے جب مجھے فرصت ہوگی میں تمہیں تاریخ اور وقت سے مطلع کر دوں گا۔ تم آ جانا۔"

"تم کر رہے ہو نا بے ایمانی اور پھر کہتے ہو۔" نازو نے اپنی سازش تمام شرکت سے کوئی فائدہ نہ ہوتے دیکھ کر کہا۔

"تم چپ کرو جی۔ چھاج بولے سو بولے۔ چھلنی کیا بولے جس میں نو سو چھید۔" غالب اب بہت خوش تھا کہ اس نے دونوں کی امیدوں کو خاک میں ملا دیا۔ اب محسن کی نازو سے لڑائی شروع ہو جاتی مگر اسی وقت ایک ٹیکسی نمودار ہوئی۔ ٹیکسی ہمارے پاس آ کے رُکی... حسبِ توقع اس میں شیخ اور موہنی تھے۔

"خدا کا شکر ہے کہ تم مل گئے۔" شیخ نے کہا۔ "کہاں جا رہے تھے؟"

"جہاں سینگ سمائیں۔ مگر تم...؟"

"ہمیں چھوڑ کے جا رہے تھے؟" وہ بگڑ کے بولا۔

"وہ رہا تمہارے لیے پیغام۔" میں نے کہا۔

"اچھا۔ بعد میں بات کریں گے۔ ابھی تو چلو۔ یہ تو بہت ہی اچھا ہوا کہ تم مل گئے اور بالکل تیار ورنہ کچھ وقت تو تیاری میں لگ جاتا۔" شیخ نے کہا۔

"لیکن جانا کہاں ہے؟" میں نے اسے روکا۔

"تم لوگ جاؤ اور لانچ لے کر بندرگاہ کی طرف آؤ۔"

"اور تم کہاں جا رہے ہو؟"

"وہ لوگ گودام سے مال لے کر روانہ ہو چکے ہیں۔ کل رات ہی انہوں نے گودام خالی کر دیا تھا۔ ہم بھی ادھر ہی جا رہے ہیں۔"

"یہ سب تمہیں کس نے بتایا؟ رابعہ نے؟" محسن نے پوچھا۔

"رابعہ ملی تمہیں؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ وہ تو نہیں ملی مگر اس کا ایک نامہ بر مل گیا تھا۔ اب یہاں سے نکلو پہلے۔ پھر میں بتا دوں گا۔" شیخ نے ٹیکسی کا دروازہ بند کیا اور روانہ ہو گیا۔ میں نے بھی ٹرک کو اسٹارٹ کیا۔ نازو میرے ساتھ بیٹھی، غالب اور محسن دوڑ کے پچھلے حصّے میں سوار ہوئے۔ میں نے دیکھا کہ خالہ سخت مشکوک نظروں سے ہمیں گھور رہی تھیں اور ان کا شک میں مبتلا ہو جانا جائز تھا۔ ہم جس طرح آئے تھے، جس انداز سے رہے تھے اور اب جس عجلت میں جا رہے تھے وہ کسی طرح سے بھی سمجھ میں آنے والی بات نہیں تھی۔ شرفائ کے محلّے میں شرفائ یوں نہیں رہتے اور نہ اس طرح "ہی ہیو" کرتے ہیں۔

غنیمت یہ تھا کہ ابھی تک ہم صرف خالہ کی نظر میں مشتبہ ٹھہرے تھے۔ الفت خان کو کچھ معلوم نہیں ہوا تھا اور آس پاس کے رہنے والوں نے بھی کچھ نہیں دیکھا تھا۔ چند دن میں کسی کو بھی ہمارے بارے میں کچھ معلوم ہونے کی نوبت ہی نہیں آئی تھی یہ غیر آباد علاقہ تھا اور یہاں کے رہنے والے سب ہی اتنے مصروف تھے کہ صبح کے گئے رات کو آتے تھے اسی لیے ہم محفوظ بھی رہے جب محسن شرط جیتا تھا تو یہ منظر دیکھنے والا کوئی نہیں تھا سوائے ہمارے اور خالہ کے کسی اور جگہ یہ ناممکن تھا کہ محسن اسے سچ مچ کان سے پکڑ لاتا۔

تقریباً دو میل کے بعد ایک جگہ ایسی آئی جہاں شیخ نے ٹیکسی کو سائیڈ میں روک لیا۔ میں نے ٹرک کو اس کے پیچھے کھڑا کیا اور ہم سب اتر کر ٹیکسی میں گھس گئے۔ میں نے نازو کو موہنی کے ساتھ فٹ ہوتے

دیکھا اُس کے بیے موہنی کو جگہ بنانی پڑی اور کھسک کر شیخ کی طرف جانا پڑا۔ وہ پیچھے مڑ کے ہمیں کچھ بتانا چاہتا تھا چنانچہ وہ موہنی کے اتنے قریب آجانے سے کچھ خفیف ہوا۔ وہ تقریباً ایک جان دو قالب ہو رہے تھے اور شیخ کو شرم اس لیے آ رہی تھی کہ موہنی کو بالکل شرم نہیں آ رہی تھی۔ وہ تو مجھے خاصی خوش لگی اور میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تو مجھے وہ شعر یاد آیا۔ تری صبح کہہ رہی ہے تری رات کا فسانہ۔ شیخ کو یہ بھی خیال تھا کہ بس ساتھ ہے چنانچہ وہ نیچے اتر گیا۔

"کیا سب کا گھسنا ضروری تھا۔ ٹیکسی میں چار آدمی بیٹھتے ہیں۔" وہ بولا اور پچھلی سیٹ پر ہمارے ساتھ پھنس گیا۔

"ہو چن کیتھے گزاری آئی رات وے۔" محسن نے اپنی بے سُری آواز میں گانا شروع کیا۔

میں نے اس کی پسلی میں کہنی ماری۔ "بند کرو اپنا ریڈیو اسٹیشن۔"

"رابعہ کا پیغام مجھے دوست محمد نے دیا تھا۔" شیخ نے خفت سے بچنے کے لیے فوراً بات شروع کر دی۔ "ہم پورٹ کے علاقے میں پھر رہے تھے۔"

"گشت کر رہے تھے۔" محسن بولا۔ "یا مٹر گشتی کر رہے تھے۔"

"جھک مار رہے تھے۔" شیخ بولا۔ "پھر تمہیں کیا؟"

"آگے بولو۔ وہاں دوست محمد مل گیا۔" میں نے کہا۔ "پھر اُس نے کیا کہا؟"

"اس نے کہا کہ تم لوگ کدھر ہے۔ ہم دو دن سے تم کو ڈھونڈتا پڑا ہے۔" شیخ بولا۔ "پھر اُس نے رابعہ کا پیغام دیا۔ میں واپس آیا تو یہاں تم تھے ہی نہیں۔ سب جھک مارنے گئے ہوئے تھے۔"

"کیا پیغام میرے لیے تھا؟"

"اور کس کے لیے ہو سکتا تھا۔" شیخ بولا۔ "میں کہاں جاتا تم کو تلاش کرنے کے لیے۔ رات بارہ بجے کا وقت تھا ملاقات کے لیے۔"

"کہاں ملنے کے لیے کہا تھا اس نے؟"

"دوست محمد نے کہا تھا کہ وہ لے جائے گا۔" شیخ بولا۔ "اور ہم اس کی لانچ میں گئے تھے۔ بہت پرانی سی لانچ تھی اور اسے وہ خود چلا رہا تھا۔ ہم منوڑہ کی طرف گئے تھے معلوم نہیں ساحل پر وہ کون سی جگہ تھی۔ لائٹ ہاؤس وہاں سے کافی دور تھا۔ وہاں ایک اور سی لانچ نے قریب آ کے سگنل دیا۔ پھر وہ چھوٹی سی لانچ ساتھ آ کے رکی اور ہم اتر کے اس میں گئے۔ مجھے تمہارے نہ ملنے کا بہت افسوس تھا مگر جب مجھے پتا چلا کہ رابعہ نہیں آ سکی۔"

"کیوں نہیں آ سکی؟"

"میں نے پوچھا تھا مگر دوسری لانچ لے کر آنے والے نے کہا کہ یہ تو مجھ کو بھی نہیں معلوم۔ مجھے رقعہ پہنچانے کے لیے دیا گیا تھا۔" شیخ نے جیب ... کاغذ نکالا۔ اسے مجھ سے پہلے نازو نے جھپٹ لیا۔ پھر محسن نے ... آخر میں آئی۔

تحریر اسی کی تھی لیکن اس میں میرے لیے کچھ نہیں تھا۔ چند سطروں میں رابعہ نے وہی اطلاع دی تھی جو شیخ کے ذریعے مجھے مل چکی تھی۔ مجھے مایوسی ہوئی۔ رابعہ نے اپنی خیریت کے بارے میں بھی کچھ نہیں لکھا تھا کہ وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے اور اگر وہ آ نہیں سکتی تھی تو اس کا سبب کیا تھا۔ اس نے میرے نام اپنا سلام تک نہیں لکھا تھا۔

"تم نے اس رقعہ لانے والے شخص کو پہلے بھی کہیں دیکھا تھا؟" محسن نے پوچھا۔

"سچ بات تو یہ ہے کہ صورت دیکھی ہوئی لگی تھی مگر مجھے ابھی تک یاد نہیں آیا کہ کہاں اور کب دیکھی تھی۔" شیخ نے کہا۔ "اب تم لوگ بار سیدھے لانچ پر۔"

"لیکن اس ٹرک کا ہم کیا کریں؟"

"اسے رکھ لو سنبھال کے جیب میں۔" شیخ نے چڑھ کے کہا۔ "مسئلہ ٹرک کا نہیں ہے۔"

"ٹرک میں جو سامان ہے۔" غالب نے سوچتے ہوئے کہا۔ "خیر ہم خود فیصلہ کر لیں گے کہ کیا ساتھ رکھنا ہے اور کیا نہیں۔"

"یار یہ دوست محمد کا کردار عجیب پُراسرار سا نہیں ہے؟ وہ ایک طرف چاند بھائی جیسے خطرناک آدمی کا معتمدِ خاص ہے جو دلاور سے بھی رابطہ رکھتا ہے تو دوسری طرف وہ ہمارا بھی خیر خواہ ہے۔"

"تم نے کیسے جانا کہ چاند بھائی خطرناک آدمی ہے؟" غالب نے سوال کیا۔ "کم سے کم ہمارے لیے۔"

"کیا تم اسے شریف آدمی قرار دو گے؟"

"شریف آدمی کیا ہوتا ہے۔ کون کتنا شریف ہے۔ کم یا زیادہ اور شرافت کا معیار کیا ہے۔ یہ سب جھگڑے والی باتیں ہیں۔ اصل بات دیکھو کہ کیا چاند بھائی سے ہمیں کوئی نقصان ہوا؟"

"کیا یہ کم ہے کہ اس نے رابعہ کو قید کر رکھا ہے؟" میں نے غصے سے کہا۔

"کیا یہ قید ہے! جس میں وہ آزادانہ گفتگو کرتی ہے تم سے اور تمہیں پیغامات ارسال کر دیتی ہے؟"

"وہ آزاد ہوتی تو اس خبیث کے ساتھ رہتی؟ ظاہر ہے کہ یہ مجبوری اُس کی اسیری ہے۔" میں نے کہا۔

"ابھی تک رابعہ نے اقرار نہیں کیا ہے کہ وہ اسیری میں ہے اور ناخوش ہے۔" محسن نے محتاط لہجے میں کہا۔ "اس نے ہمیشہ یہ کہا ہے کہ وہ خیریت سے ہے اور فکر کی کوئی بات نہیں۔ ایک بار اس نے تم سے فون پر جو کچھ کہا تھا وہ بے حد تکلیف دہ تھا لیکن بعد میں اس نے اشارے سے وضاحت کر دی تھی کہ وہ سچ نہیں تھا۔"

"مگر اس نے یہ بھی نہیں کہا تھا کہ وہ جھوٹ تھا۔"

"اس کے کہنے کی بات کرتے ہو۔ تمہارا دل کیا کہتا ہے؟" محسن

... کہا۔ "کیا رابعہ ایسی ہے؟ وہ تم نے ہم سب سے ... ا ہے؟"

"تم لوگ یہ بحث بعد میں کرتے رہنا۔" شیخ نے ٹیکسی سے اترتے ... دیکھا۔

"بھیا!" نازو نے پہلی بار لب کھولے۔ "تم نے راجا جی کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا؟"

"وہ ... گھر پہ ... تو خیر نہیں تھا۔ کہاں ہے وہ؟"

"اپنی پری کے پاس۔ کل اس کی شادی ہو گئی۔"

شیخ دم بخود رہ گیا۔ پہلے اُس نے بے یقینی سے دیکھا۔ اس خیال سے کہ شاید وہ مذاق کر رہی ہو مگر ہم سب کے چہروں کا ایک سا تاثر دیکھ کے اس نے کہا۔ "یہ اچانک کیسے ہوا؟ تم لوگ گئے تھے؟"

"ہم کیسے جاتے؟ ہمیں تو ... کے خط سے پتا چلا۔" نازو نے کہا۔ "یہ ساتھ لے جاؤ اور راستے میں پڑھ لینا۔ سب معلوم ہو جائے گا۔"

"کوئی افسوسناک خبر ہے اس میں؟" اس نے لفافہ لے لیا۔

"صرف اتنی کہ راجا نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا۔" نازو نے ٹیکسی سے اترتے ہوئے کہا۔

شیخ نے لفافہ موہنی کو دے دیا۔ "میں گاڑی چلاتا ہوں تم پڑھ کے سناؤ۔ ایسی کیا بات ہے۔"

جب ٹیکسی چلی گئی تو ہم بھی ٹرک کی طرف لوٹے اور روانگی سے پہلے ایک ہنگامی نوعیت کی کانفرنس کی جس میں بہت سے مسائل زیرِ غور آئے۔ بیشتر مسائل کا حل ہمارے پاس نہیں تھا۔ یہ فیصلہ وقت ہی کر سکتا تھا کہ مستقبل میں ہمارا لائحہ عمل کیا ہونا چاہیے۔ پھر بھی ہم نے کچھ ضروری فیصلے کیے اور روانہ ہو گئے۔

لانچ کو آخری بار ہم نے کورنگی کریک سے کافی آگے ساحلی چٹانوں کے درمیان دیکھا تھا اور وہ سفر ہم نے رات کے وقت طے کیا تھا تاہم جیسے جیسے میں آگے بڑھتا گیا یادداشت نے میری راہنمائی کی اور بہت سی نشانیاں سنگِ میل بن گئیں۔ بالکل آخری حصے میں جہاں ویرانی کے سوا کچھ نہ تھا صحیح سمت اور جگہ کا تعین کرنے میں مجھے دشواری پیش آئی مگر اس کا حل میں نے یوں نکالا کہ ٹرک کو ایک ٹیلے کی اوٹ میں کھڑا کر دیا جہاں اسے صرف بیلی کاپٹر سے ہی دیکھا جا سکتا تھا۔

"میں اور محسن اب پیدل جا کے کسی بلند مقام سے دیکھتے ہیں کہ لانچ کہاں ہو سکتی ہے؟" میں نے کہا۔

"خالی ہاتھ مت جانا۔" محسن نے کہا۔ "کیونکہ وہ بات بالکل سچ ہے کہ سکندر جب گیا دنیا سے دونوں ہاتھ خالی تھے۔"

"کیوں بُری بات منہ سے نکالتے ہو۔" نازو نے اُسے ڈانٹا۔

"بابا وہ سکندرِ اعظم تھا۔ بہت پرانی بات ہے۔" محسن بولا۔ "لیکن نام اس کا بھی سکندر ہے اور ہر پرانی بات غلط نہیں ہوئی ہے۔"

[illegible]

دکھلائے۔ ان میں سے ایک میں نے اندر چھپا لیا۔

"تم آگے چلو۔" محسن نے کہا۔ "میں پیچھے رہ کے تم پر نظر رکھتا ہوں۔"

"تاکہ گولی لگے تو پہلے مجھے لگے۔" میں نے کہا۔ "آپ آگے ہوں شیرانی صاحب!"

"دیکھیے۔ بندہ ایک شادی شدہ شوہر ہے۔ ایک عدد منکوحہ اور ایک عدد اولادِ نرینہ رکھتا ہے۔" محسن بولا۔

"جو تجھے ماما کہتا ہے۔" غالب نے پیچھے سے کہا۔

"تُو نے زندگی میں سب کچھ کر لیا۔ میں نے ابھی کرنا ہے۔" میں نے محسن کو آگے دھکیلا۔

"اچھی زبردستی ہے کہ پہلے میں شہادت پاؤں۔" وہ بولا اور آگے چل پڑا۔

"تم دونوں بھی کام کرنا۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مت بیٹھے رہنا۔" میں نے چلتے چلتے پلٹ کے کہا۔ وہ واقعی آنکھیں چار کرنے میں مصروف تھے لیکن میری بات کا انھوں نے جانتے بوجھتے کوئی نوٹس نہیں لیا اور یوں دیکھتے رہے ایک دوسرے کو جیسے کسی فلم کے سین کی شوٹنگ میں مصروف ہوں جس میں ہیرو اور ہیروئن کی پہلی ملاقات کا منظر پیش کیا جا رہا ہو۔

ایک چٹان پر چڑھتے ہوئے جو ہمارے خیال میں واچ ٹاور کا کام دے سکتی تھی، محسن نے خاصی تیز رفتاری کا مظاہرہ کیا مگر پھر ایک کونا اس کے وزن سے ٹوٹ گیا۔ اگر میں نے اسے سنبھالا نہ ہوتا تو وہ واپس وہیں پہنچتا جہاں سے ہم چلے تھے اور اس کی ہڈی پسلی سلامت نہ رہتی۔ باقی راستہ ہم نے ساتھ ساتھ طے کیا۔

اوپر پہنچنے کے بعد میں نے دونوں جانب نگاہ کی۔ "یار، یہ تو خاصی گڑبڑ ہو گئی۔"

"ہاں۔ دونوں میں شرم و حیا نہیں رہی۔" محسن بولا۔ "اچھا موقع ملا ہے اور وہ بھی پورا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔"

"لاحول ولا قوۃ۔" میں نے محسن کا سر پکڑ کر گھمایا کیونکہ وہ نیچے غالب اور نازو کی طرف دیکھ رہا تھا۔ "من چہ می سرائم و طنبورہ من چہ می سراید۔ میں مشرق کی بات کر رہا ہوں۔ تو مغرب کی طرف دیکھ رہا ہے۔"

"مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب۔" محسن نے آہ بھر کے کہا۔

نازو اور غالب کچھ بھی نہیں کر رہے تھے سوائے اس کے کہ نازو ٹرک کے سائے میں بیٹھی ہوئی تھی، غالب ہاتھ باندھے کھڑا ہوا تھا اور اس سے نہ جانے کیا بات کر رہا تھا کہ وہ ہنس رہی تھی۔ یہ بھی ایک خوب صورت منظر تھا۔ اس کی طرح جو ہماری نظروں کے سامنے پھیلا ہوا تھا۔ تاحدِ نگاہ سمندر موجزن تھا اور اس پر اُجلی دھوپ جھلملا رہی تھی۔ دس گیارہ

کی نمی کے باعث ہمارے جسموں پر پسینے کے دھارے بہنے لگے تھے۔

"ابے یار۔ وہ اُدھر۔ وہ کیا ہے۔" محسن نے اچانک کہا۔ میں نے اس کی انگلی کے اشارے سے سمت کا تعین کیا۔ "کیا ہے؟"

"یہاں میری جگہ آ کے دیکھ۔"

میں نے محسن کی جگہ کھڑے ہو کے دیکھا تو مجھے بھی ایک چمک سی دکھائی دی۔ سورج کی روشنی کسی شیشے یا چمکیلی سطح سے منعکس ہو کر میری آنکھوں تک پہنچی تھی۔ یہ چمک ایک خاص زاویے سے ہی محسوس ہوتی تھی۔ تین فٹ کے فاصلے پر جہاں میں پہلے کھڑا ہوا تھا وہاں سے کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ یہ چمک بھی وقفے وقفے سے نظر آتی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ روشنی کو منعکس کرنے والی سطح متحرک ہے۔

"یہ ہماری لانچ ہو سکتی ہے۔" میں نے کہا۔ "اس کا ایک باہر کو نکلا ہوا کونا چمک رہا ہے۔"

"ہاں میرا بھی یہی خیال ہے۔ باقی لانچ چٹان کی اوٹ میں ہے۔" محسن نے کہا۔ "ہمارا اندازہ زیادہ غلط نہیں ہوا۔"

"ہاں بس دو میل کا فرق پڑا۔"

"دو میل؟" محسن بولا۔ "یہ دو فرلانگ کا فاصلہ ہوگا۔"

"ابھی پتا چل جائے گا۔" میں نے کہا۔ "پہاڑی علاقے میں اور صحرا میں فاصلے اسی طرح دھوکا دیتے ہیں۔"

فاصلے کی پیمائش تو ممکن ہی نہ تھی مگر جب ہم لانچ تک پہنچے تو ہماری حالت ایسی ہو رہی تھی جیسے ہم نے دس میل کا سفر کیا ہو۔ اس کی ایک وجہ تو راستے کی ناہمواری تھی۔ دوسری وجہ دھوپ اور فضا میں سو فیصد سے بھی زائد نمی کا تناسب۔ تاہم لانچ پر پہنچنے کے چند منٹ بعد ہماری تھکی دور ہو گئی۔

لانچ وہی تھی مگر اس کا ناخدا ہمارے استقبال کیلئے موجود نہ ہوتا تو ہم اسے شناخت نہ کر پاتے۔ ناخدا سے ہم پہلے بھی مل چکے تھے۔ اسے ہم نے پہچان لیا ورنہ لانچ کا سارا رنگ اب گہرا سرخ تھا جس پر اوپر کے کنارے کے ساتھ ساتھ جامنی رنگ کی پٹی تھی۔ اس پر مستول اور بادبان بھی نصب کر دیے گئے تھے جس سے اس کی بیرونی ساخت بالکل تبدیل ہو گئی تھی۔ دور سے دیکھنے والے کو یہ ایک بادبانی کشتی ہی نظر آتی جس کے عرشے پر بادبانوں کو پھیلانے سمیٹنے والے رسّے پڑے تھے اور ماہی گیری کے جال تھے۔ کچھ نئے اور کچھ پرانے۔ اس انتظام کا مقصد لانچ کو کیموفلاج کرنا تھا۔ اس کے پچیس ہارس پاور والے انجنوں پر پردہ ڈالا تھا۔ لانچ کے دونوں طرف لکھا ہوا نام بھی بدل کر "سنہری جل پری" رکھ دیا گیا تھا۔ آگے یہ نام پھر انگلش میں لکھا گیا تھا۔ "گولڈن مرمیڈ" حالانکہ لانچ میں کہیں کوئی چیز گولڈن نہیں تھی۔ تاہم مرمیڈ یا جل پری کے تصور میں خاصی رومانوی دلکشی تھی۔

کے بعد کہا۔ اس کے ہاتھ کھردرے اور فولاد کی گرفت رکھنے والے تھے۔ وہ چالیس سال کا یا کچھ کم کا جوان اور جفاکش آدمی تھا۔

"ہاں۔۔۔ ہم صرف ایک بار آئے تھے پہلے۔ اس لیے کچھ راستے سے بھٹک گئے۔" میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"وہ تو اچھا ہوا کہ ہم نے تمہیں پہچان لیا۔ ورنہ لانچ تو دوسری ہی ہے۔" محسن بولا۔

وہ ہنسا۔ "لانچ کا نقشہ بدلی کر دیا ہے ایک دم صاب لیکن آپ ہم کو کیسے پہچانا؟"

"ہم ایک بار تم سے مل چکے ہیں۔"

"وہ ہم نئیں تھا صاب۔" ناخدا ہماری غلط فہمی سے محظوظ ہوا تھا۔ "ہم تو ادھر آج ہی سویرے آیا تھا۔"

میں نے پریشانی سے کہا۔ "یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"ہم ٹھیک بولتا ہے صاب۔" ناخدا نے کہا۔ "وہ ہمارا بھائی تھا جو آپ سے ملا تھا۔ مگر وہ گونگا ہے۔ کیا آپ نے بات کیا تھا اس سے؟"

"نہیں۔۔۔ بات تو نہیں ہوئی تھی۔" میں نے کہا۔

"اس غریب کا زبان کاٹ دیا ظالم نے۔ اللہ اس کا خانہ خراب کرے اور اس کے خاندان میں جو بچہ پیدا ہو گونگا ہو۔" وہ بولا۔ اتنی سفاکانہ بد دعا نے میرا دل بھی دہلا دیا۔ "زبان کس نے کاٹ دی تھی؟"

"وہ تھا ایک حاجی پاجی۔ ہمارا تو یہ کام ہے۔ ہم سب کی خدمت کرتا ہے۔ پیسہ لیتا ہے تو جان کا خطرہ بھی مول لیتا ہے اور پکڑا جاتا ہے تو جیل بھی جاتا ہے۔ ہم کسی کو دھوکا کیسے دے سکتا ہے اور مخبری کرے گا تو بدنام ہو جائے گا۔ بدنام ہو گا تو دھندا کیسے کرے گا۔ ہم چپ چاپ کام کرتا ہے صاب۔ کسی سے کچھ پوچھتا نئیں اور کسی کو کچھ بتاتا نئیں۔ اس حاجی کا بیڑا غرق ہو۔ اس نے ہمارے بھائی پر جھوٹا الزام لگایا اور اس کا زبان کاٹ دیا۔ کسی دن ہم اُس کا زبان کاٹے گا۔ ہم نے قسم اُٹھایا ہے۔"

"تم حاجی عبداللہ کی بات کر رہے ہو؟" محسن بولا۔

"وہ حرموٹا تازہ سُوّر ہے۔ شیطان ہے مگر بات بات پہ نام لیتا ہے اللہ کا۔ سبحان اللہ۔ ماشاء اللہ۔" میں نے کہا۔

اس نے زور زور سے اقرار میں سر ہلایا۔ "آپ جانتا ہے اس کو؟ ہم کو بتاؤ وہ کدھر ملے گا۔"

"کہیں نہ کہیں وہ تمہیں بھی پھر ملے گا۔۔۔ لیکن۔۔۔" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ "کیا نام ہے تمہارا؟"

"کریم بلوچ۔" وہ بولا۔ "ہمارا بڑا بھائی رحیم بلوچ۔"

"کریم۔ ظالم اور شیطان جو قانون کی گرفت میں نہیں آتے انہیں اوپر والا پکڑتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اسی دنیا میں۔ تم انتقام کا خیال چھوڑ دو۔ تم دیکھو گے کہ خدا اس کو زیادہ سخت سزا دے گا۔ تم حاجی عبداللہ نہیں ہو۔ کریم بلوچ ہو۔ اگر کبھی کتا کاٹ لے تم کو، تو کیا تم کتے کو کاٹو گے؟ نہیں۔ تم کتے نہیں ہو اس لیے تم ایسا نہیں کرسکتے۔"

کریم بلوچ نے سر جھکا لیا۔ "آپ ٹھیک بولا صاب۔ ہم کبھی کبھی بہت غصے میں آجاتا ہے تو ایسی بات کرتا ہے۔"

"اچھا چلو اب ہمیں بتاؤ کہ لانچ پر اور کیا ہے؟ کیا کچھ بدلا گیا ہے؟" میں نے کہا۔

"سب ایک دم بدلی ہو گیا ہے صاب۔ کاغذ ماغذ۔ آپ سب دیکھ لو۔" وہ ہمارے آگے آگے چلنے لگا۔

کاغذات وغیرہ دیکھنے کا یہ وقت نہیں تھا اور ہم تفصیلی معائنہ کرنے بھی نہیں آئے تھے مگر ہم نے محسوس کیا کہ ایک جدید ترین لانچ کو قدیم بادبانی کشتی بنانے میں کسی نے بہت محنت اور ذہانت کا ثبوت دیا تھا۔ کھلے سمندر میں خطرہ نہ ہو تو لانچ پوری رفتار سے سطحِ آب پہ دونوں انجنوں کی طاقت سے دوڑ سکتی تھی۔ ورنہ انجن بند ہوں تو بادبان کھولے جاسکتے تھے اور کشتی ہوا کے زور پہ چلتی رہتی۔ نیچے والے حصے میں بھی بہت سے خفیہ خانے بنائے گئے تھے اور بہت کچھ فراہم کیا گیا تھا جو ہمارے مشن اور سفر کی ضروریات کے تقاضے پورے کرتا تھا۔

"یہ سب کس نے کیا ہے کریم؟" میں نے خوش ہو کے پوچھا۔

"رحیم بلوچ نے صاب۔ ہمارا بھائی نے۔"

"مگر اسے کس نے کہا تھا کہ لانچ کا حلیہ بدل دے؟"

"ہم کو نہیں معلوم صاب۔" وہ بولا۔ "ہم نے اس سے پوچھا نہیں اور اُس نے ہم کو بولا نہیں۔"

"حیرت ہے۔" میں نے محسن کی طرف دیکھ کر کہا۔

"مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی۔" محسن بولا۔

"کیوں؟"

"کوئی معشوق ہے پردۂ زنگاری میں اور میں جانتا ہوں وہ کون ہے؟"

"تیرا مطلب ہے۔۔۔"

"نام مت لینا اس کا۔ غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا۔"

"اچھا چل۔ انہیں اور اپنے اسباب کو لے آئیں۔" میں نے ہنس کے کہا۔

"یار اتنی دور تک ہم خود بڑی مشکل سے پہنچے تھے۔ سامان یہاں تک کیسے لا سکیں گے؟" محسن نے رونی آواز بنا کے کہا۔

"اچھا تو پھر یوں کرتے ہیں۔" ٹرک کو چلا کے یہاں تک لے آتے ہیں نا" میں نے کہا۔ "بلکہ اُڑا کے لے آتے ہیں اور یہ بھی مشکل ہے تو پھر سمندر کو کھینچ کر اُدھر لے جاتے ہیں ذرا قریب۔"

"سیدھی بات آپ کی اُلٹی کھوپڑی میں کیوں نہیں آتی آخر؟ کیا یہ لانچ ساحل کے ساتھ ساتھ وہاں نہیں پہنچ سکتی۔ جہاں سے فاصلہ کم ہو۔ کم سے کم۔" محسن بولا۔

"یہ بات تو عام آدمی کی عقل میں بھی آسکتی ہے۔" میں نے دانت نکال کے کہا۔ "چنانچہ تجھے سوجھ گئی۔ ہم اپنی خاص عقل خصوصی مواقع پر استعمال کرتے ہیں۔"

کریم بلوچ نے پہلے تو ہم سے ٹرک کا محلِ وقوع سمجھا کیونکہ ہم اسے ٹرک دکھا نہیں سکتے تھے۔ لیکن جغرافیے میں وہ کمزور تھا یا ہم جغرافیے کے ٹیچر اچھے نہیں تھے کہ بات اسے اپنے ساتھ لے جائے بنا نہ بنی۔ آدھے راستے میں ایک جگہ سے اُس نے ٹرک کی جھلک دیکھی اور پھر سر ہلانے لگا۔

"ہم نے دیکھ لیا۔" وہ بولا۔ "اب آپ جاؤ۔"

"ہاں ہاں۔ جاتے ہیں ہم۔" محسن بولا۔ "مگر تم۔۔۔"

"ہم بھی آتے ہیں۔" کریم بلوچ نے کہا۔ "تم ادھر ہی ٹھہرنا۔ ہم سب لے آئیں گے۔"

پھر وہ واپس چلا گیا اور محسن نے کہا۔ "اللہ بڑا کارساز ہے۔"

"وہ تو ہے۔ مگر اب غیر کوئی نہیں تو کیا اس کا نام لوں! جس نے بقول آپ کے۔ کیا ہے آج عجب دلنواز بندوبست۔" میں نے کہا۔

"اس کے سوا کون ہو سکتا ہے آخر یار۔" محسن میرے ساتھ چلنے لگا۔

"لیکن رابعہ اتنی بااختیار ہے تو پھر خود کو بے اختیار کیوں سمجھتی ہے؟" میں نے کہا۔

"یہ تو بہت مشکل سوال ہے۔" محسن سر کھجا کے بولا۔ "مگر میں کوشش کرتا ہوں جواب دینے کی۔ مجھے رابعہ کے دستِ حنائی کے پیچھے چاند بھائی کارفرما نظر آتا ہے۔"

"چاند بھائی!" میرا دل بجھ سا گیا۔

"ہاں۔ جسے حقائق تیرا رقیب ثابت کرتے ہیں۔ روسیاہ تو وہ ہے نہیں۔ گورا چٹا آدمی ہے۔ اس کے مقابلے میں آپ البتہ خاصے روسیاہ ہیں۔" محسن بولا۔

"تیرا مطلب ہے، وہ رابعہ کی خاطر یہ سب کر رہا ہے؟"

"میں نے عرض کیا نا کہ بظاہر درپردہ یہ حسن انتظام کسی اور کا بھی ہو سکتا ہے مثلاً دست محمد کا۔"

"ہاں۔ آدمی تو وہ بھی ہر فن مولا ہے۔ عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں۔" میں نے ہاتھ سے پیچھے پھیلے ہوئے سمندر کی طرف اشارہ کیا۔ "اس کے اسرار و رموز کو سمجھتا ہے اور ہمارے

سائل کو بھی جانتا ہے۔"

"جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں؟"

"کرو۔" میں نے کہا۔ "تمہاری جان ویسے بھی انکل رضوی کی امان میں ہے۔"

"یہ جو مس رابعہ قاری ایڈوکیٹ سابق' آپ کی محبوبۂ دلنواز ہیں نا' یہ کوئی ایسا کھیل کھیل رہی ہیں ہمارے ساتھ جس کی کوئی چال ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ ہم، تم اور چاند بھائی ایک طرف ہیں۔"

"ذرا سلیس اُردو میں سمجھاؤ۔"

"مجھے ایسا لگتا ہے کہ رابعہ اسے بس چکر دے رہی ہے۔ کوئی لمبا چکر۔ جیسا کہ الف لیلوی داستانوں میں سادہ لوح عاشقوں کو دیا جاتا تھا کہ عشق کو سچا ثابت کرو۔ انھیں کوئی آؤٹ آف کورس امتحانی پرچا تھما دیا جاتا تھا کہ ان سات سوالوں کے جواب لاؤ۔ حاتم طائی نے خاصی جھک ماری۔ فرہاد بے چارے کو پہاڑ کاٹنے کے لیے بھیج دیا اور دودھ کی نہر نکالنے کی شرط لگا دی۔ اور بھی بہت سے کیس ہیں۔"

"چاند بھائی کسی چکر میں پڑنے والا آدمی نہیں ہے۔"

"یہ ٹھیک ہے کہ اس سے بڑا چکر باز پیدا نہیں ہوا مگر برادر! دُنیا کی تاریخ ایسے عبرتناک واقعات سے بھری پڑی ہے کہ بڑے بڑے طُرّم خاں کسی کی ایک نگاہِ کرم کے لیے گھن چکر بن گئے اور تباہ ہوئے۔ سب کو چکر دینے والا چاند بھائی بھی بالآخر تقدیر کے ہاتھوں اس عشقِ بلاخیز کے چکر میں پڑا اور ایسا پڑا کہ اب رابعہ اس کو بندر کی طرح نچا رہی ہے اور ڈگڈگی کی طرح بجا رہی ہے اور شرط پر شرط عائد کرتی جا رہی ہے۔"

"کیسی شرط؟"

"یہی کہ مجھے جیتنا ہے تو پہلے یہ کرو۔ پھر وہ کرو۔ اور وہ گھن چکر سرِ تسلیم خم کرتا جا رہا ہے۔"

"وہ اتنا احمق نہیں ہے۔"

"اُف۔ یہی تو وہ نکتہ ہے جو میں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں کوڑھ مغز۔" محسن بولا۔ "سب سے بڑا افلاطون بھی جب اس چکر میں آجائے تو اس کی عقل گھٹنوں میں اُتر جاتی ہے پھر ٹخنوں میں آجاتی ہے اور عقل کے ساتھ وہ خود بھی گھاس چرنے چلا جاتا ہے۔ چاند بھائی گھاس کھا رہا ہے کیونکہ رابعہ اسے گھاس ڈال رہی ہے۔ ڈالتی جا رہی ہے، ہمارے لیے۔ ہمارے فائدے کے لیے اسے استعمال کر رہی ہے اور وہ ہو رہا ہے۔ اس لیے کہ وہ بے بس ہے۔ عورت اس کے لیے آج تک' رابعہ کے ملنے سے پہلے ایک ایسی چیز ہوگی، جو ہر جگہ' ہر وقت ہر بھاؤ پر

ملتی ہوگی۔ خریدی اور بیچی جا سکتی ہوگی' بدلی جا سکتی ہوگی تحفے میں دی جاتی ہوگی۔ مگر پھر وہ عورت اچانک سامنے آئی جس نے اس کی ساری خام خیالی دور کر دی۔ اور یہ بتایا کہ عورت کیا ہوتی ہے۔ ایسا ہٹلر کے ساتھ ہوا۔ نپولین کے ساتھ ہوا۔ جہانگیر کے ساتھ ہوا جو شہنشاہِ ہند تھا۔ ایڈورڈ ہشتم کے ساتھ ہوا جو شاہِ برطانیہ تھا۔"

میں نے سر ہلایا۔ "اگر میں اس نظریے کی صداقت تسلیم کرلوں تو بڑے بھائی۔ یہ کھیل کب تک چلے گا' انجام کیا ہوگا؟"

"چونکہ یہ فلمی اسٹوری نہیں ہے۔" محسن بولا۔ "اور اس کا اسکرپٹ بھی میرا نہیں' اوپر والے کا ہے' اس لیے صحیح جواب کیا دوں۔ انجام متوقع بھی ہو سکتا ہے اور غیر متوقع بھی۔ یہ ممکن ہے کہ ایک دن رابعہ اس مجنوں سے کہے کہ میری خاطر کیا کر سکتے ہو۔ وہ کہے کہ قطب مینار پر سے کود سکتا ہوں۔ پھر رابعہ کہے کہ اچھا تو دِلّی چلتے ہیں۔ اور وہ جائے دِلّی' قطب مینار پر چڑھے اور سچ مچ کود جائے نیچے۔ رابعہ کہے ویری گڈ تم واقعی سچّے عاشق تھے۔ اور پھر اپنے جھوٹے عاشق کا گھر آباد کرنے لوٹ آئے۔ بخیر و عافیت۔ یا۔۔۔"

"یا کیا؟" میں نے کہا۔

"یا اس کے برعکس، دوسرا انجام بہت افسوسناک بھی ہو سکتا ہے۔ اور وہ کچھ یوں کہ کسی دن اچانک چاند بھائی کی عقل ٹخنوں سے پھر سر کے بالائی حصّے میں پہنچ جائے اور اسے احساس ہو کہ عشق کے نام پر اس کے ساتھ رابعہ نے کیا سلوک کیا ہے۔ تو وہ انتقاماً۔۔۔"

"وہ سب کر گزرے جو اس کے دل میں ہو؟" میں نے بیزاری سے کہا۔ "تیرا دماغ خراب ہے۔"

"آپ نے سین کاٹ دیا۔" محسن بولا۔ "ابھی تو جملہ بھی پورا نہیں ہوا تھا۔ مجھے خیال ہے آپ کے جذبات کا چنانچہ آخری منظر کچھ ایسا ہو کہ جب رابعہ سارے راستے مسدود دیکھے اور دیکھے کہ کاٹھ کے اُلّو کو مزید اُلّو نہیں بنایا جا سکتا تو وہ ترکش کا آخری تیر استعمال کرے۔ جو یقیناً اس نے سنبھال کے رکھا ہوگا ایسی صورتِ حال کے لیے۔ رابعہ بھی ہے تو قاضی کے گھر کی بچّی میرا مطلب ہے سیانی تو ہے۔ آگ سے کھیل رہی ہوگی تو دامن کا خیال بھی ہوگا۔ وہ صاف بچ جائے گی۔ مر کے یا مار کے۔"

"میرا خیال ہے کہ میرا دماغ کام نہیں کر رہا ہے۔" میں نے پریشان ہو کر کہا۔ "اس معاملے میں۔"

"تو مت کام لے دماغ سے۔ ہم جو اپنا دماغ کرائے پر چلا رہے ہیں تیرے لیے۔ پھر تجھے فکر کرنے کی ضرورت؟

میں تیری تسلی کے لیے نہیں، یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ رابعہ کے دور رہنے اور اس اندازِ تغافل میں یہاں تک کہ تیرے ساتھ ہونے والی گفتگو میں' کوئی ایسی بات ہے جو ہم نہیں سمجھتے اور وہ بھی نہیں چاہتی کہ ہماری سمجھ میں آئے بالآخر وہ ہم سے آملے گی۔ جب وہ دیکھے گی کہ اب وہ چاند بھائی کو مزید استعمال نہیں کر سکتی۔"

"چاند بھائی کے استعمال ہونے والی بات سو فیصد تو غلط نہیں ہو سکتی۔ لیکن ایک امکان اور بھی تو ہے!"

"وہ کیا؟ ٹھہر، پہلے میں بتاتا ہوں۔ دوسرا امکان یہ ہے کہ چاند بھائی بظاہر ہمارا دُشمن ہو لیکن سامنے آئے بغیر ہماری مدد کر رہا ہو۔ اس کے بزنس پارٹنر وہی ہیں جو اصل شکاری ہیں۔ چوہدری دلاور اینڈ کمپنی اور دوسرے اسمگلر۔ اگر انھیں شک ہو جائے کہ چاند بھائی ہمارا مددگار بنا ہوا ہے تو نہ صرف یہ کہ چاند بھائی کا بزنس چوپٹ ہوگا بلکہ اس کی جان بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔ چنانچہ وہ ایک ڈراما کر رہا ہے اپنے چوہدری صاحب بہت بڑے ڈراما نویس، آرٹسٹ اور ڈائرکٹر ہیں مگر وہ ان کا باپ ہے۔ جیسا کہ اس کی باتوں سے اندازہ ہوا تھا۔ سب سے زیادہ غور طلب بات یہ تھی کہ چاند بھائی اسمگلر ہے لیکن غدّار نہیں ہے۔ وہ مجرم ضرور ہے مگر قانون کا' ملک کا دُشمن وہ بہرحال نہیں ہے۔ یہ اس نے واضح کر دیا تھا۔"

"اس نے تو یہ بھی کہا تھا کہ چوہدری دلاور سے اسے ایک قرض وصول کرنا ہے۔ خسرو جمشید کا۔" میں نے محسوس کیا کہ میرے دل پر لپٹ جانے والا مایوسی کا جالا ہٹ رہا ہے۔"

"ہاں۔ اور خسرو جمشید مارا جا چکا ہے۔"

"تو یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہے؟ کہ وہ اصلی خسرو جمشید ہی تھا؟" میں نے کہا۔

"ایک منٹ کے لیے فرض کرے کہ اسے چاند بھائی نے مارا۔ اس نے دلاور سے صاف بات کی کہ میرا مجرم میرے حوالے کر دو، پھر تمہارے اور میرے درمیان رنجش مٹ جائے گی۔ کس طرح اس نے دلاور کو اس بات کا یقین بھی دلا دیا کہ رابعہ اس کی قید میں ہے اور وہ خود بھی ہمارے خون کا پیاسا ہے۔" محسن نے کہا۔ "ہم نے چاند بھائی کو اور چوہدری دلاور کو اس بحری جہاز 'ایس ایس کرانتی' بھر ڈ ہ سے اترتے دیکھا تھا ایک ساتھ۔ میرے نظریے سے اس کی بھی وضاحت ہو جاتی ہے۔ فرض کرو وہ وہاں یہی بات کرنے گیا تھا۔ دلاور نے اس کی بات مان لی کیونکہ خسرو جمشید اس کے کام کا نہیں رہا تھا۔ بلکہ اس کے لیے بہت بڑے ذلّت آمیز نقصان کا سبب بن گیا تھا مگر ان

دنوں وہ اس کے قبضے میں تھا۔ اس نے خود مارنے کے بجائے خسرو جمشید کو چاند بھائی کے حوالے کر دیا۔ اس شرط پر کہ اسے مارنے کے بعد لاش واپس کر دی جائے۔ اپنے چوہدری صاحب کے لیے مردہ نواب خسرو جمشید بھی ایک مقصد کے حصول کا ذریعہ بن سکتا تھا۔ ان کے ایک ڈرامے میں مؤثر کردار ادا کر سکتا تھا۔ اور ایسا ہی ہوا۔"

میں نے محسن کو زبردستی پکڑ کے گلے لگایا اور اس کا مُنہ چوما۔ "خدا تجھے نظرِ بد سے بچائے۔"

"پہلے تو خدا مجھے تجھ سے بچائے۔" وہ چلّانے لگا۔

چونکہ اب ہم نازو اور غالب کے بہت قریب پہنچ چکے تھے اس لیے وہ ٹرک کی اوٹ سے دوڑتے ہوئے آئے۔

"کیا ہوا۔ اس لیمو کو کیوں نچوڑ رہے ہو؟" غالب بولا۔

"میں نے ایک عقل کی بات کی تھی۔۔۔" محسن نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"غلطی سے کر دی ہوگی بیٹے۔ غلطی کی سزا تو ملتی ہی ہے۔" غالب نے کہا۔

"غلطی کے بچّے۔" محسن نے کہا اور آگے بڑھا۔

"غلطی کے بچّے ہم سب ہیں۔ بادا آدم کی غلطی کے۔" غالب فوراً نازو کے پیچھے ہو گیا۔

"یار! اپنے شیروانی اچکن صاحب۔" میں نے کہا۔ "بات تو آپ کی ادھوری ہی رہ گئی۔"

"ابھی زندگی ادھوری رہ جاتی۔ بھاڑ میں گئی بات۔" وہ بولا۔

"یہ خسرو جمشید آخر اپنے چوہدری دلاور صاحب کو کیسے ملا؟"

"جیسے شامتِ اعمال کے باعث ہم تم سے ملے۔" محسن نے کہا۔ "جہاں وہ قید تھا' وہاں اس کی ایک بدکردار' عاق شدہ سوتیلی بہن تھی۔ ان کے درمیان کوئی رشتہ نہ تھا۔۔۔ مگر پھر بھی ایک رشتہ تھا۔ زیب النسا کا۔ خسرو جمشید نے اسے پال کے بڑا کیا تھا اور یہ بہت بڑا احسان تھا۔ زیب النسا کی ماں نے خسرو جمشید کو قید میں دریافت کیا اور اسے رہائی عطا کر کے اپنا قرض چکا دیا۔ اب یہ اس کی حرماں نصیبی کہ وہ قید خانے سے نکلا تو سولی پر چڑھ گیا۔ ممکن ہے وہ دلاور سے مصالحت یا مفاہمت کی امید لے کر آیا ہو' اپنی مجبوری کا عذر پیش کر کے کاروباری تعلقات استوار رکھنا چاہتا ہو۔ مگر تقدیر کا فیصلہ پہلے ہی ہو چکا تھا۔"

"یہ ہو سکتا ہے۔ بالکل ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "کہ باقی سب جھوٹ ہو۔ ہم ملتان فون کر کے معلوم کرلیں گے۔"

"یہ تم دونوں کیا الف لیلے سُنا رہے ہو؟" غالب نے کہا۔
"تم اپنی مثنوی زہرِ عشق پڑھ رہے تھے تو ہم نے پوچھا تھا؟" محسن نے نازو کی طرف اشارہ کرکے کہا۔
"وہ ہم نے بھی دیکھا ہے جناب؟" پیچھے سے آواز آئی۔ بیک وقت سب نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ "تم؟"
"کیا دیکھا ہے تم نے کریم بلوچ؟" میں نے کہا۔
"فلم زہرِ عشق سات بار؟" وہ بولا۔ "ابھی پھر آئے گا تو آٹھ بار دیکھے گا۔" اس کا مطلب تھا آٹھویں بار۔
مگر کریم بلوچ کی بات پر نازو ہنس پڑی۔ "آٹھ بار دیکھو گے۔ ہر روز یا مسلسل آٹھ شو؟"
"وہ جی۔ سات بار ہو گیا۔ اب آٹھ بار۔" کریم بلوچ نے دانت نکوستے ہوئے کہا۔ "ایسا ظالم گانا اس کا صاب"۔
کریم بلوچ ایک زندہ دل آدمی تھا۔ اس نے اپنی زندگی بھی جفاکشی میں گزاری تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے سب ضروری سامان لانچ میں منتقل کر دیا۔ چاروں گھوڑے پہلے ہی چھوڑے جا چکے تھے۔ ہماری عدم موجودگی میں غالب اور نازو نے کام کو کھیل بنا لیا تھا۔ انھوں نے باری باری ایک گھڑا جو راجا کی 'خون پسینے کی کمائی' سے بنا ہوا تھا، پچاس قدم کے فاصلے پر رکھا اور پھر اسے سنگسار کرتے رہے۔ گھڑے ٹوٹ کے بکھر گئے اور نوٹ ہوا سے اڑنے لگے تو وہ انھیں تتلیوں کی طرح پکڑنے کے لیے پیچھے بھاگتے رہے اور بالآخر سب رقم اسی سوٹ کیس میں منتقل کرنے میں کامیاب ہو گئے جو پہلے پورا بھرا ہوا تھا مگر اب خالی ہو چکا تھا۔ یہ سوٹ کیس دشمن کے ایک ٹھکانے سے حاصل ہونے والا مالِ غنیمت تھا جو ہمارے بہت کام آیا تھا۔ اب اس میں پھر ہمارے اندازے کے مطابق تین چار لاکھ ہو گئے تھے۔
اسلحے میں سے ہم نے دستی بم اپنے ساتھ رکھے اور دونوں ڈائنا مائٹ سمندر میں غرق کر دیے۔ اسٹین گن اور سائیلنسر والا واحد ریوالور، جو پہلے جیکب کی ملکیت تھا، میرے پاس رہتا تھا مگر میں نے غالب کے سپرد کر دیا۔ کیونکہ یہ خطا نشانے میں اس کی ہمسری کا دعویٰ کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ جعلی دستاویزات سے پُر سوٹ کیس کا بوجھ بہت تھا۔ فی الحال ہم نے اسے ایسے ہی رکھ لیا اور طے کیا کہ بعد میں غیر ضروری اسباب کی چھانٹی کی جائے گی۔ اسٹین گن بھی ایک ہی تھی جسے ہم نے ایک خفیہ خانے میں ڈال دیا۔ ایک ایسی جگہ جہاں سے اس کو وقتِ ضرورت آسانی سے اور فوراً نکال کر استعمال کیا جا سکے۔
"اب اس ٹرک کا کیا بنے گا؟"
"پیچھے رہ جانے والوں کا کیا بنتا ہے؟" غالب نے ایک فلسفیانہ بات کی۔ "تم کیوں اس کے غم میں جان گنواتے ہو؟"
"ہاں، مالِ حرام بود بجائے حرام رفت۔" میں نے کہا۔
"مالِ غنیمت کبھی مالِ حرام نہیں ہوتا۔" محسن بولا۔
"اس کو یہاں چھوڑ دینے میں حرج کیا ہے۔ فائدہ ہوگا ہے کچھ۔"
"وہ کیا؟"
"یہی کہ شکاری ہمارا سراغ لگاتے ہوئے یہاں تک پہنچ گئے تو غلط اندازے قائم کریں گے۔ مثلاً یہ کہ ہم سمندر کے راستے نکل گئے۔"
"اس کے اچھے خاصے پیسے مل سکتے ہیں۔" محسن نے افسوس سے سر ہلایا۔ "اکرام شیخ نے عقلمندی کی جو کار بیچ کے ٹیکسی لے لی۔"
"کار بیچ دی!" میں نے حیرانی سے کہا۔ "تجھے کس نے بتایا؟"
"موہنی نے بتایا۔" محسن بولا۔
"کام تو اچھا کیا۔ مگر۔ کار اس کے نام پر تو رجسٹرڈ نہیں تھی۔"
"پھر کس کے نام پر تھی؟" نازو بولی۔
"آغا سعادت علی خاں گردیزی کے۔" میں نے کہا۔ "یعنی بندہ خاکسار۔"
"تو میاں خاکسار۔ اس نے تمھارے دستخط کر دیے ہوں گے۔ تم اگر آغا سعادت علی خاں گردیزی بن سکتے ہو تو وہ کیوں نہیں بن سکتا؟" محسن بولا۔ "بروکر نے سب معاملات طے کروا دیے ہوں گے۔"
"ہاں۔ اسے تو دُہرا کمیشن ملا ہو گا۔" غالب نے کہا۔ "ایک تو کار بکوانے کا۔ دوسرے ٹیکسی دلوانے کا۔ ہر گاڑی صرف ایک دستخط پر فروخت ہوتی ہے، رجسٹر ہوتی ہے اور ٹرانسفر ہوتی ہے۔ دستخط ملنے چاہئیں۔"
"تھوڑا بہت فرق سکۂ رائج الوقت سے مٹایا جا سکتا ہے۔" محسن نے کہا۔
"میں تو سمجھا تھا کہ وہ دونوں بس آوارہ گردی کرنے نکلے ہیں۔" میں نے کہا۔
"انھوں نے خاصا کام کیا کل شام سے رات تک۔" نازو بولی۔
"کل ہم نے تو کچھ نہیں کیا۔" محسن بولا۔
"میں نے بہت بڑا کام کیا۔" غالب بولا۔
"کوئی جوئے شیر نکالی۔" میں نے ہنس کے کہا۔ "کیا کیا؟"
"میں نے۔ حسنِ بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا۔" غالب نے نازو کی طرف چوری چوری دیکھا جو ایک ..... آئینے میں خود کو دیکھ کر بال بنا رہی تھی۔ "کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کر دیا؟"
"اور اس کے بعد۔" محسن بولا۔ "اس نے مارا دھوبی پٹخا اور پٹرا کر دیا۔"
مجھے بے اختیار ہنسی آئی۔ حسرت موہانی کا شعر تو بہت برمحل تھا مگر تیسرا مصرع محسن نے نہ جانے کس شاعر کا لگایا تھا کہ غالب کے رومانٹک موڈ کا ستیاناس کر دیا۔
"ابھی چلے گا صاب؟" کریم بلوچ نے کہا۔
"ہاں بھئی۔ بالکل چلے گا۔" میں نے کہا۔ "مگر کہاں چلے گا؟"
"جدھر آپ بولے گا صاب۔" کریم بلوچ نے مستعدی سے کہا۔
"تمھاری یہ لانچ کہاں تک جا سکتی ہے؟" غالب نے ایک اچھا سوال کیا۔
"لانچ ایک دم ٹاپ ہے صاب۔ آپ بولیں گا تو ہم سمندر پار دبئی لے جائیں گا۔ بمبئی۔ کولمبو۔ سنگاپور۔ ہانگ کانگ بس بس۔ فی الحال تم کیماڑی چلو۔ دوست محمد کے پاس۔"
"دوست محمد!" وہ حیران ہو کے بولا۔ "وہ کون ہے؟"
"تم نہیں جانتے اسے؟" میں نے اسے غور سے دیکھا کیونکہ اس کی حیرانی مجھے اداکاری لگی تھی۔ "وہ جو لانچ ٹھیک کرتا ہے۔ مستری دوست محمد۔"
"ابھی آپ بولو وہ کدھر ہوئیں گا تو ہم ادھر چلیں گا۔" وہ بولا۔
یہ عجیب صورتِ حال تھی۔ ہمارا ناخدا سب راستوں سے واقف تھا مگر اس کی لاعلمی کے انداز میں کچھ ایسی بات تھی کہ کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے۔
"اچھا۔ تو پھر تم ساحل سے ذرا دور چلو۔ اس طرح کہ کوئی ہمیں دیکھ نہ سکے۔" میں نے کہا۔ "اور دیکھے تو پہچان نہ سکے۔"
"اس کا فکر مت کرو۔" وہ بولا۔ "لیکن آپ اپنا کچھ خیال کرو۔ اپنا حلیہ ملیہ بدلو۔"
"تمھارے خیال میں یہ کیوں ضروری ہے؟ تم کیا جانتے ہو ہمارے بارے میں؟" محسن نے کہا۔
"ہم کو بھائی رحیم بلوچ بولا صاب کہ وہ پاکستانی مجاہد لوگ ہے اور ادھر ملک میں خانہ خراب کا فرلوگ اپنا ایجنٹ بھیجا ہے تو ہم بولا صاب کہ ابھی ہم بھی جائے گا اور ادھر سب کا بیڑا غرق کریں گا جو ہمارا ملک کا بیڑا غرق کرنے کے واسطے آیا ہے۔ ابھی ہم ان کو جانتا نہیں صاب لیکن اللہ کا قسم آپ بولے گا تو ہم لگ جائیں گا لڑائی مڑائی کا واسطے۔ اپن مسلمان آدمی ہے صاب لڑنے سے نئیں ڈرتا۔ بے شک تم آزما لو۔ مرنا تو ہے سب کو جب وقت آتا ہے۔ پھر اچھا ہے نا اللہ شہادت دیوے اور ہم جنت میں جاوے۔ ہم تو بہت گناہ گار بندہ ہے صاب۔"
اس سادہ دل، سچے مسلمان، اچھے انسان اور پکے پاکستانی نوجوان کے جوشیلے جذبات نے ہم سب کو متاثر کیا۔
"تم تو بہت بہادر آدمی ہو کریم بلوچ۔" میں نے اس سے ہاتھ ملا کے کہا۔
"کدھر صاب۔ ہم تو اپنی گھر والی سے بھی ڈرتا ہے۔" وہ بولا۔
"یہ بتاؤ کہ تم کیا کچھ کر سکتے ہو۔" محسن نے ہنستے ہوئے کہا۔
"ہم سب کرتا ہے صاب۔ لانچ چلاتا ہے اور اس کو ٹھیک بھی کر لیتا ہے۔"
"نیوی گیشن۔ میرا مطلب ہے سمندری راستوں سے واقف ہو تم۔" میں نے کہا۔
"تھوڑا بوہت۔ ادھر سے بمبئی اور کولمبو کے راستے ہم مدراس بھی جا سکتا ہے۔ کلکتہ اور چاٹگام بھی۔ ہمارا استاد اسی راستے پر لے جاتا تھا ہم کو۔ صرف ایک بار دوبئی چلا گیا تھا ہم خود لانچ لے کر۔ استاد نے ہم کو گنجا کرا دیا۔" وہ بولا۔
"ویری گڈ۔" میں نے کہا۔
"کیا ویری گڈ صاب۔ ہمارا سر ایک دم آلو جیسا ہو گیا تھا۔ سب اس پر چپت مارتا تھا۔" وہ بولا۔
"وہ ... میں تعریف کر رہا تھا تمھاری۔ کہ تم اس راستے پر ہمارے ساتھ چل سکتے ہو۔ اور جہاں ہمیں جانا ہو وہاں لے جا سکتے ہو۔" میں نے فوراً وضاحت کی۔
"مقصد تمھارے استادِ محترم کے اقدام کی توثیق نہیں تھا۔"
اس کا منہ کھلا رہ گیا۔ "کیا نہیں تھا؟"
غالب نے کہا۔ "کچھ نہیں۔ استاد کون تھے تمھارے؟"
"دوست محمد۔" وہ بولا۔
ہم سب کا چونکنا ایک فطری امر تھا۔ "ابھی تو ... تم ظاہر کر رہے تھے کہ تم کسی دوست محمد کو نہیں جانتے۔"
"ہم ..." اس نے انگلیوں پر حساب لگا کے بتایا۔ "چار ... نہیں۔ پانچ دوست محمد کو جانتا صاب۔ اس میں باپ بھی ہے ہمارا۔"
"تو یہ کیا وہی مستری دوست محمد ہے؟" میں نے کہا۔
اس نے تائید میں سر ہلایا۔ "ہم اس کا شاگرد تھا۔ وہ کام کرتا تھا تو ہم مدد کرتا تھا۔ دیکھتا تھا۔ لانچ کا انجن بنانا ہم اس سے سیکھا۔ وہ بولتا تھا کریم بلوچ تیرا دماغ خراب ہو جائیں گا اگر تو نے پڑھنے کا کوشش کیا۔"
"تعلیم سے دماغ خراب ہوتا ہے؟" نازو بولی۔
"ہاں جی۔ تعلیم کے لیے دوسرا دماغ ہوتا ہے۔ ہمارا یہ

دماغ نٹ بولٹ اور پسٹن والا تھا۔" اس نے ہمیں سمجھانے کی کوشش کی۔ "جیسے ابھی گھوڑا ہوتا ہے۔ ریس کا گھوڑا اگر ٹانگے میں لگائیں گا تو خراب ہوئیں گا نا۔"

اپنی سیدھی سادی مثال سے اس نے ہم کو افتادِ طبع اور رجحان کا نظریہ سمجھا دیا تھا۔

"تو گویا تم نے یہ لانچ کی دیکھ بھال اور مرمت کا کام جلد سیکھ لیا۔ اب تم سب کر سکتے ہو؟"

"ایک دم سارا انجن کا آپریشن کر سکتا ہے صاب!" کریم بلوچ نے فخر سے کہا۔

"کیپٹن، نیوی گیٹر اور انجینئر۔ ان تینوں عہدوں کے لیے تمہارا تقرر کیا جاتا ہے۔" محسن نے کہا۔ "تم ہمارے لیے بہت کام کے آدمی ہو۔"

"آج سے خود کو ہمارا ساتھی سمجھو۔ ہم کو صاب نہیں، یار بولو کیونکہ ہم سب دوست ہیں۔" میں نے کہا۔ "کیا تمہارے یہاں کوئی ذاتی مسائل ہیں۔ بیوی بچوں کے۔ روپے پیسے کے۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "ہمارا ماں باپ ہے۔ وہ اس کا خیال رکھتا ہے۔ ہم تو بس بچوں کا باپ ہے۔" اس نے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔

"جب تم ہمارے ساتھ جاؤ گے۔ تو ہو سکتا ہے کافی عرصہ لوٹ کے گھر نہ جا سکو۔" میں نے کہا۔

"ہو سکتا ہے، ہم واپس ہی نہ آئے۔" وہ بولا۔ "ہم سب سمجھتا ہے صاب . . . یار، ہم اور آپ ایک ہی کشتی میں سوار ہے۔"

"تم کو بندوق چلانی آتی ہے؟"

"کون سا بندوق۔" اس نے شلوار کے نیچے سے ہاتھ ڈال کے دیسی ساخت کا ایک ریوالور برآمد کیا۔ "یہ ہے اپنے پاس یار۔ مگر کسی کو بولنا مت۔ ہم ادھر پشاور گیا تھا۔ درّے سے لایا تھا۔ ہمارا باپ تو جانتا ہے مگر ماں کو نہیں معلوم۔ اور بیوی کو بھی۔"

اس کی باتوں پر ہنسنے کی بہت گنجائش تھی مگر وہ جو کچھ کہہ رہا تھا طبعی سادگی اور خلوص میں کہہ رہا تھا۔

میں نے ریوالور کا معائنہ کیا۔ یہ کولٹ کو بر اعشاریہ اڑتیس کی بہترین نقل تھی۔ اور نقل اس حد تک اصل کے مطابق تھی کہ شاید کسی ماہرِ آتشیں اسلحہ کو آزمانے کے لیے دونوں پیش کیے جاتے تو ایک نظر میں کوئی فرق نہ بتا پاتا۔

"بہت عمدہ چیز ہے یہ۔" میں نے ریوالور محسن کے حوالے کیا۔ "اس کا استعمال کس حد تک جانتے ہو؟"

"چلانا آتا ہے صا . . . یار۔" وہ بولا۔

"وہ تو آتا ہو گا۔ مطلب یہ کہ نشانہ کیسا ہے تمہا

"نشانہ ایک دم فرسٹ کلاس۔ ایک دن ہم
کیا۔ دوسرے دن ایک پاگل کتے کو مار دیا۔ اس
جا کے۔ چھ فٹ کے فاصلے سے۔ بس تھوڑا سا فرق
ہم تو سر میں گولی مارا تھا۔ لگا پیٹ میں۔ خیر وہ گر گیا

ہم سب کو بے اختیار ہنسی آگئی۔ "اس کا مطلب
یہ ہے یار کہ تمہیں نشانے کی مشق کرانی ہو گی۔ بعض
سامنے سے گولی چلانی پڑتی ہے۔ اور چھ فٹ نہیں
یا سو فٹ کے فاصلے سے۔ فرق اتنا بھی نہیں پڑتا
جتنا دونوں آنکھوں میں ہوتا ہے۔ کہ سیدھی آنکھ کا نشانہ
جائے تو دوسری آنکھ کیا ناک پر بھی خراش نہ آئے۔"

"یہ . . . یہ تو بہت مشکل ہو گا صاب مگر سیکھے
کریم بلوچ نے کہا۔

"یہ ہے تمہارا استاد۔" میں نے کریم بلوچ کو غالب
متعارف کرایا۔ "ایسا زبردست نشانہ ہے کہ اڑتی چڑیا
گولی سے دوبارہ نشانہ بنا سکتا ہے۔"

کریم بلوچ اس بات کا مطلب کیا سمجھتا۔ وہ
حیرت آمیز احترام سے غالب کو دیکھتا رہا۔ پھر وہ لانچ اسٹا
کرنے کی ابتدائی تیاری میں مصروف ہو گیا۔ نیچے جا کے
بھی اپنے اسباب اور ضروریات کا از سرِ نو جائزہ لیا۔

نازو نے پرانے میلے زنانہ کپڑوں کا ایک انبار
جس میں چغہ نما بہت سے بلوچی اور سندھی لمبے لمبے
والے کرتے تھے اور مضحکہ خیز گھیر والی شلواریں تھیں
اور کچھ بڑی۔ ان کو وہ کسی بھی قسم کا حلیہ اختیار کرنے
پہن سکتی تھی اور غالباً وہ اسی مسئلے پر سوچ بچار کر
کہ اسے مچھیرن بننے کے لیے کیا کچھ درکار ہو گا۔ نینسی
شو میں ہم سب کے لیے اپنی اپنی صلاحیت کا مظاہرہ
ہوئے مچھیروں کی ایک عام غربت زدہ جاہل فیملی بنانا

محسن اور غالب نے مجھ سے اتفاق کیا کہ آج کا کام
پرا دوا ابھی کا کام بعد پر چھوڑنا عقلمندی نہیں۔ یہ نہ ہو
کیماڑی کے ساحل پر ہی پہچان کے دھر لیے جائیں
بھی ماہی گیروں کا لباس تلاش کیا۔ یقیناً یہ کسی کے حسن
کا کرشمہ تھا کہ ہمیں وہاں سب کچھ مل گیا جو اپنا حلیہ
لیے ضروری تھا۔ یہاں تک کہ ایک کباڑ خانے میں سے
ملی۔ یہ سفید بالوں کی وِگ کا پورا سیٹ تھا۔ داڑھی مونچھ
چہرے اور حلیے تو ہم نے اتنی بار بدلے تھے

میک اپ مین کے محتاج نہیں رہے تھے اور میک اپ
کا سامان یہاں بطورِ خاص فراہم کیا گیا تھا۔ باقی سامان بھی
ایسا تھا کہ یہ سچ مچ کسی ماہی گیروں کے خاندان کی وہ کشتی نظر
آتی تھی جس پر وہ رہتے بھی ہوں۔ مچھلی پکڑنے کے جال سے
لے کر چولہے اور کھانے پینے کے برتنوں تک ہر چیز پرانی تھی
اور کافی استعمال شدہ تھی۔ سونے کے لیے جو بستر تھے وہ گدڑیاں
کہے جا سکتے تھے۔ معلوم نہیں یہ کس کا اسباب تھا جو یہاں جمع
کیا گیا تھا۔ میرا ذہن رہ رہ کے دوست محمد کی طرف ہی جاتا تھا۔
وہی ایک ہوشیار آدمی تھا جو وسیع تعلقات اور وسائل پر
دسترس رکھتا تھا اور ہمارے حالات کے مطابق ہماری ضروریات
کے تقاضوں کو بھی سمجھتا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو کبیر خاں عرف چیف کے ٹو۔" محسن نے
میرے سامنے ایک پھٹی ہوئی دھوتی لہرا کے کہا۔ "ہم تو یہ لباس
زیب تن فرما رہے ہیں۔"

میں نے مرزا غالب کو دیکھا تو مجھے ہنسی آئی۔ اس نے
سر کے اوپر ایک پگڑی سی یوں باندھی تھی کہ سارے بال غائب
ہو گئے تھے اور بدن پر ایک کالے رنگ کی ڈھیلی واسکٹ
پہن لی تھی۔ واسکٹ کے نیچے صرف نیلے رنگ کی خستہ حال
شلوار تھی جس کو اڑس کے اس نے ٹخنوں سے کافی اونچا کر لیا
تھا لیکن سب سے زیادہ دلچسپ حرکت اس نے توے کی
کالک کو تیل کی مدد سے چہرے، ہاتھوں اور گردن پر اور جسم
کے سب نظر آنے والے حصوں پر پھیلا کے کی تھی۔ یہ رنگ
پکّا نہیں تھا تو اتنا کچّا بھی نہیں تھا کہ پانی لگنے سے اتر جائے۔
وہ ایک سیاہ فام ماہی گیر کے میک اپ میں اپنی مہارت
کا بھرپور استعمال کرنے میں کامیاب تھا۔

محسن کا لباس بھی خاندانی ماہی گیروں کے ماحول اور
حالات کے مطابق تھا۔

میں نے سفید بالوں کے وِگ کا سیٹ استعمال کیا
اور اس کام میں مجھے آدھا گھنٹا لگ گیا۔ لانچ کا ناخدا کریم بلوچ
اس عرصے میں دو بار نیچے آیا اور ہماری چہرہ گری سے محظوظ
ہوا۔ کسی نامعلوم سبب کے باعث وہ لانچ کو اسٹارٹ نہیں
کر سکا تھا مگر اس نے ہمیں مطلع کیا کہ وہ جنرل چیک اپ
میں مصروف ہے۔

"اب صورتِ حال یوں ہے میرے بچو۔" میں نے کسی
بوڑھے کی طرح پوپلی آواز میں کہا۔

"اب کیوں نہیں کہتے سؤر کے بچو۔" محسن بولا۔

"ہم ایک ماہی گیر خاندان ہیں۔" میں نے کہا۔ "جس کا
سربراہ میں ہوں۔ تم مجھے اپنا باپ، دادا، سسر قسم کی چیز مان سکتے ہو۔"

"میں اپنا قائم مقام سسر تسلیم کرتا ہوں۔" غالب نے کہا۔

"اور بیٹی نازو۔" میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

اس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ "یہ کیا بدمعاشی ہے۔ آپ دونوں مل کے تنگ کرتے ہیں مجھے۔"

"بابا، ایسے تو حقیقی بیوی بھی خفا نہیں ہوتی۔ یہ تو بس ڈراما ہے۔" غالب نے کہا۔ "تم چاہو تو کردار بدل لو۔ میں بن جاتا ہوں تمہاری گھر والی۔ صرف میک اپ ہی تو بدلنا پڑے گا۔"

"ویسے جنس بھی تو بدل جاتی ہے۔" محسن بولا۔ "میرا تو مشورہ ہے کہ تم حقیقی زندگی میں بھی گھر والی بن کے ٹھیک رہو گے کیونکہ تم نام کے تو غالب ہو۔ مگر ہو مغلوب۔"

"سنو سنو۔ اب لڑنا مت شروع کر دینا۔" میں نے کہا۔ "فرض کرو میں ضرورت پڑنے پر خود کو محسن کا باپ بتاؤں گا۔ تم میرے داماد۔ ہم سب مل کے رہتے ہیں اور سو پشت سے ہے پیشۂ آبا ماہی گیری۔"

"شعر وزن سے گر گیا۔" غالب نے اعتراض کیا۔

"وزن زیادہ ہو تو شاعر بھی گر جاتا ہے۔" محسن بولا۔

"شاعر تو ہاتھ لگنے سے بھی گر جاتا ہے۔" نازو بولی اور ہنسنے لگی۔

لانچ نے جھٹکا سا لیا اور ہچکولوں سے ہمیں اس کے متحرک ہونے کا یقین آیا۔

"ہم کوشش کریں گے کہ اس بحری جہاز کے جتنا قریب جا سکتے ہوں تو جائیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس طرح کہ انھیں شک نہ ہو۔ وہ روز دیکھتے رہتے ہوں گے کہ آس پاس کون سی کشتیاں اور لانچیں موجود رہتی ہیں۔"

"وہاں ہماری چیکنگ بھی ہو سکتی ہے۔ تم کاغذات وغیرہ دیکھ لو۔" محسن بولا۔

"یہ لانچ انجنوں کی طاقت سے آگے نہیں بڑھ رہی ہے؟" غالب نے خاموشی پر غور کرتے ہوئے کہا۔

"ابھی اس کا بادبانی کشتی نظر آنا ہی بہتر ہے۔ تھوڑے سے فاصلے کے لیے انجن چلا کے افشائے راز کیوں کریں۔" محسن نے کہا۔

"تم کیا سن رہی ہو۔ یہ مردانہ باتیں۔" غالب نے نازو کو ڈانٹ کے کہا جو بہت زیادہ ڈھیلے اور بے ہنگم لباس کے ڈھیر

میں اپنے نازک وجود کی ساری رعنائی کھو بیٹھی تھی۔

"چھیرانہ باتیں" محسن نے اس کی تصحیح کی۔

"تم جاؤ ہانڈی چولھا سنبھالو۔ دیکھو کھانے کو کیا ہے اور پینے کو کیا ہے" محسن بولا۔

"میرے لیے تو خیر یہی کافی ہے۔ خونِ دل پینے کو اور زخمِ جگر کھانے کو" غالب بولا۔ "مگر یہ باقی تو انسان ہیں"

نازو زیرِ لب بڑبڑاتی لانچ کے اس حصّے میں چلی گئی جسے اسبابِ خانہ داری کے باعث کچن قرار دیا جا سکتا تھا۔ ہم نے اب کاغذات کی چھانٹی کی۔

اس باکس میں ہر قسم کی دستاویزات تھیں جن کے بارے میں یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ نقلی ہیں یا اصلی مثلاً اس میں مختلف ملکوں کے خالی مگر دستخط شدہ اور مہر لگے ہوئے پاسپورٹ تھے۔ ہم نے اتفاق رائے سے سب کے لیے دو دو پاسپورٹ رکھے۔ ایک پاکستانی اور ایک بھارتی۔ یہ ضروری تھا کہ ہمارے پاکستانی پاسپورٹ یہیں مکمل کر لیے جائیں لیکن اس کے لیے تصاویر درکار تھیں۔ خوش قسمتی سے اس صندوق کی نچلی تہ سے ایک پولورائیڈ کیمرہ برآمد ہوا جو دس سیکنڈ میں تصویر بنا دیتا ہے۔ ... کے کیمرے تو اب بہت عام ہیں اور تفریحی مقامات پر پیشہ ور فوٹوگرافر لیے پھرتے ہیں کہ جو گھومنے پھرنے آئے اسے وہیں تصویر بنا کے دکھا دیں۔ نقصان صرف یہ ہوتا ہے کہ ایسے کیمرے براہِ راست فوٹو بناتے ہیں۔ ان کا نیگٹو نہیں ہوتا کہ بعد میں مزید کاپیاں بنانا ممکن ہو۔

ہم نے ایک دوسرے کی دو دو تصاویر آتاریں اور اپنے اپنے پاسپورٹ پر کاٹ کے لگا دیں۔ اس میں پوری تصویر کی جگہ نہیں تھی۔ صرف چہرہ چسپاں کیا جا سکتا تھا۔ یہ ضروری تھا کہ ہم تمام غیر ضروری سامان تلف کر دیں تاکہ کبھی کسی مرحلے پر تلاشی لینے والے آ جائیں تو انھیں ماہی گیری کی کشتی میں پولورائیڈ کیمرہ نہ ملے۔

"اب اسے بھی سپردِ آب کر دوں؟" غالب نے کہا۔ "میں نے آج تک سمندر میں کوئی کیمرہ نہیں پھینکا"

"میں نے بھی آج تک کوئی صحافی سمندر میں نہیں پھینکا" محسن نے کہا۔ "مگر پہلے تم اپنا شوق پورا کر لو"

"عقلمندو! ایک ایک اضافی تصویر تو رکھ لو۔ کیا پتا کہاں ضرورت پڑ جائے" نازو نے کہا۔

"یس۔ داشتہ آید بکار" محسن نے تائید کی۔

"میں صرف بیوی کا قائل ہوں۔ یہ جو دوسری چیز ہے نا، تو یہ عیاشی اور بدمعاشی ہے۔ تم کو شرم آنی چاہیے"

بمشکل تمام ایک ایک اضافی تصویر اتاری گئی۔ غالب نے معلوم نہیں محسن کے کان میں کیا کہا۔

وہ چلّانے لگا "بتاؤں نازو کو"

"کیا بتاؤ گے؟ میں نے تو نازو کی بات ہی نہیں کی" غالب بولا۔

"پھر کیا کہا تھا ابھی کہ . . .؟"

"میں نے کہا تھا کہ موسم ابر آلود ہے۔ یا شاید نہیں ہے" غالب نے اوپر آسمان کو دیکھ کر کہا۔ "کچھ موسم کا ذکر تھا"

صاف ظاہر تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ محسن نے بعد میں مجھے بتایا کہ اس نے نازو کے ساتھ ایک فلمی رومانٹک پوز میں تصویر بنوانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا جو اتنی فلمی تھی کہ سنسر سے کبھی پاس نہ ہوتی۔

"یہ پاسپورٹ بعد میں مکمل کریں گے" غالب نے کہا۔

"بعد کا مطلب ہے کہ آج رات" محسن بولا۔

"ہاں۔ کیا پتا کل جانا پڑے" میں نے تائید کی۔

"پاکستانی پاسپورٹ پر انڈین ویزا آفس کی مہر وغیرہ سب موجود ہے۔ صرف تاریخ ڈالنی ہے۔ پھر شاید ہم تین مہینے تو انڈیا میں قانونی طور پر رہ سکتے ہیں"

"زیادہ قیام کی ضرورت پیش آ گئی تو؟"

"تو ظاہر ہے اس کی میعاد بڑھوانی ہو گی" میں نے کہا۔ "اگر ہم بھارت میں ہوئے تو اس کے لیے وزارتِ داخلہ سے رجوع کرنا ہو گا"

"وہ جعلی پاسپورٹ کو پہچان کے ہمیں پکڑ لیں گے" غالب نے کہا۔ "اور بہ واپسی ڈاک ارسال کر دیں گے!"

"گویا انڈین ویزا آفس کی مہر بھی رکھیں" غالب بولا۔

"نہیں۔ انڈیا میں اگر ویزے کی مدّت ختم ہو گئی۔ تو ہم وہاں بھی پکڑیں گے کسی ایجنٹ کو۔ ایجنٹ ہر جگہ ہوتے ہیں اور وہ سب کام کرتے ہیں جو آپ خود نہ کر سکیں۔ انڈیا اور پاکستان کا تو حال بھی ایک ہی ہے" میں نے کہا۔

"اور یہ بھارتی پاسپورٹ کس لیے ہیں؟" نازو بولی۔

"انھیں بھی چھپا کے رکھو" میں نے کہا۔ "یہ انڈیا میں بھی کام آ سکتے ہیں اور مشرقی پاکستان میں بھی۔ جہاں پاکستان کے حامی ہوں وہاں ہم پاکستانی۔ جہاں بنگلہ دیش کا خواب دیکھنے والے ہوں وہاں ہم بھارتی"

"مجھے ڈر لگتا ہے یار کہ کہیں یہ خواب حقیقت ہی نہ بن جائے" غالب نے کہا۔

"بعض اوقات یہ اندیشہ تو مجھے بھی پریشان کرتا ہے" نازو نے کہا۔ "اور اس کا سبب ہماری بیورو کریسی کا رویّہ ہے۔ جنھوں نے مشرقی پاکستان کو ایک غلام کالونی جیسا درجہ دے رکھا ہے۔ عوام کی بات مختلف ہے۔ وہ سب ایک ہیں مگر اربابِ اقتدار ہی ان میں کسی حد تک احساسِ محرومی پیدا کرنے کے ذمّے دار ہیں"

"یہ زیادہ غلط بھی نہیں۔ اوّل تو یہی کہ بلحاظِ آبادی وہ بڑا صوبہ ہے۔ مگر اس کے حقوق زیادہ نہیں۔ انگریزی جو ہمارے سابق آقاؤں کی اور دورِ غلامی کی یادگار ہے۔ اسے قومی زبان کا درجہ حاصل ہے۔ بچّے کو پہلی سے بی۔ اے تک لازماً پڑھائی جاتی ہے۔ پھر بنگالی زبان کیوں نہیں پڑھائی جاتی جبکہ بنگالی ادب کسی طرح بھی اردو ادب سے کم نہیں"

"ایک اعتبار سے تو وہ برتری کا دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ادب میں ملنے والا واحد نوبل پرائز ایک بنگالی شاعر ٹیگور کو ملا ہے۔ اس کی کتاب گیتا نجلی پر" غالب نے کہا۔

"پھر یہ کہ اکثریت کی زبان کے علاوہ اکثریت کی حکومت میں کیا شرکت ہے" میں نے کہا۔ "وہ شکایت کرتے ہیں تو جائز کرتے ہیں کہ سب کچھ تو مغربی پاکستان میں ہے۔ دارالحکومت، اسمبلی، سپریم کورٹ، تینوں افواج کے ہیڈ کوارٹر، پی آئی اے اور بینکوں کے مرکزی دفاتر۔ سیکرٹریٹ۔ وہاں کیا ہے سوائے صوبائی اور علاقائی دفاتر کے"

"اس کے علاوہ یہ بیوروکریسی عوام کے ذہن میں بھی ایک بہت منفی رجحان کی ذمّے دار ہے۔ مثلاً بنگالی بابو۔ بھوکا بنگالی۔ مچھلی بھات کھانے والا۔ یہ سب بڑے تحقیر آمیز انداز میں بولا جاتا ہے۔ انھیں ایک بزدل۔ کمزور اور نااہل، یہاں تک کہ غیر محبِّ وطن کہہ دیا جاتا ہے۔ ان کی ثقافت کو ہندو ثقافت سمجھا جاتا ہے"

"حالانکہ یہاں کون سی مسلم ثقافت ہے" نازو بھی بولی۔

"بی بی! ثقافت کا مذہب سے نہیں، جغرافیائی حالات اور معاشرے سے تعلق ہوتا ہے۔ جب ہندو عورتیں پردہ کرتی ہیں یا ہندو کرسچین سب عید مناتے ہیں تو اس کا تعلق مذہب سے نہیں رہتا اس ملک کی ثقافت سے اور تہذیب سے ہو جاتا ہے" غالب بولا۔

"چلو چھوڑو یہ فضول بحث" نازو بولی۔

"یہ بحث فضول نہیں۔ حقائق ہیں جن کو ہم نظرانداز کرتے آئے ہیں۔ ان کو تسلیم کرنے میں سلامتی ہے ورنہ کبوتر کی طرح آنکھیں بند کیے ہم کب تک خوش فہمی میں مبتلا رہیں گے کہ خطرہ کوئی نہیں۔ پھر بھی عزیزہ! تمھاری خواہش کے احترام میں ہم اس موضوع پر مزید بات نہیں کرتے" محسن نے کہا۔

"کیونکہ یہ ہیں عقل کی باتیں" غالب نے کہا۔

"تم نے مجھے یا عورت کو ناقص العقل کہا تو میں تمھیں ناقص الجسم کر کے سمندر میں پھینک دوں گی" نازو برہمی سے بولی۔

"ضرور ضرور" محسن بولا۔ "نیک کام میں دیر کیسی"

نازو نے خلافِ توقع ایک دم پلٹ کے محسن کو اٹھایا اور سمندر میں پھینک دیا۔ ظاہر ہے غالب کا دل باغ باغ ہو گیا اور اس نے بے اختیار ہنسنا شروع کیا۔

"آفرین ہے تم پر اے نازنین . . ."

بات ابھی پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ غالب بھی اڑتا نظر آیا اور سمندر میں محسن کے قریب جا گرا۔ وہ دونوں تیر کے لانچ پر پہنچے تو ایک دوسرے سے لڑائی جاری تھی۔

"اور ہنسو دوسروں پر"

"تم نے ہی نیک کام کا مشورہ دیا تھا" غالب بولا۔ "کیسی رہی نیکی . . . وگے تو خود گر و گے"

"تم ہی گر دگے اس میں" محسن بولا۔ "اور یہ گڑھا نہیں سمندر ہے جو میں نے نہیں کھودا"

"تم نے تو گھاس کھودی ہے تمام عمر"

میں اور نازو ان کے شرابور جسم اور پانی سے تر کپڑوں میں جھڑپ کا مزہ لیتے رہے۔ لانچ ہوا کے زور پر رینگتی رہی۔ ہم کیماڑی پہنچے تو شام ہو چلی تھی۔ سب غیر ضروری سامان ہم بحیرۂ عرب میں ڈال چکے تھے۔ کرنسی ابھی چھپا دی گئی تھی کہ شاید یہاں ضرورت پڑے۔ آگے کے لیے ہم نے یہی طے کیا تھا کہ جہاں بھی ہوں گے اپنے وسائل پیدا کریں گے۔ جب حالتِ جنگ میں ہوں گے اور دارالحرب میں تو جائز کیا اور ناجائز کیا۔

کشتی۔ یا لانچ۔ ابھی ساحل سے دور ہی تھی کہ ہمیں پہلے کسٹم حکام نے چیک کیا اور مطمئن ہو کے چلے گئے۔ پھر نیول پولیس والوں نے۔ یہ معمول کی کارروائی تھی۔ ہم جیسے لاتعداد مچھیروں کے گھر اور گھرانے سمندر کی دنیا میں آباد تھے اور ہم بھی اس کا حصّہ بن چکے تھے۔

کریم بلوچ کا تمام وقت کشتی کو صحیح سمت میں رواں رکھنے میں صرف ہوا تھا۔ ساحل پر جہاں کشتیوں اور لانچوں کا اژدہام تھا، سامنے کسی نے بلوچی میں کچھ کہا۔ مخاطب دوسری لانچ پر تھا مگر دونوں کے درمیان فاصلہ دو گز بھی نہ تھا۔ جواب میں کریم نے انکار کیا مگر پھر بھی بات ختم نہیں ہوئی۔

"آپ برا نہ مانیں صاب" وہ بولا۔ "تو ہم ایک کام کرے گا۔ تھوڑا فائدہ ہو ئیں گا ہمارا"

"کیا کام ہے" میں نے کہا۔

"اُدھر ایک جہاز پر سے کچھ مال اُٹھانا ہے"۔ وہ بولا۔"ہم خود اس مال کو باہر نکالے گا۔ آپ فکر مت کرو۔"

"کیا مال ہے ؟ اسمگلنگ کا؟"

"اور کیا صاب۔ اِدھر کیا آلو بھنڈی ملے گا۔" وہ بولا۔

"کتنا فائدہ ہوگا تمھارا؟"

"ہزار بھی ہو سکتا ہے۔"

"تم ہم سے ہزار لے لو لیکن کوئی خطرے کا اور غلط کام مت کرو۔"

"خطرہ کیسا صاب! یہی دھندا ہے اپنا روز کا۔ جس کو موقع ملتا ہے کر لیتا ہے۔ ایسے ہم آپ سے ہزار کیا دو ہزار بھی لے گا تو۔۔۔ اچھی بات نئیں ہوگا۔"

"اور یہ اچھی بات ہے؟" میں نے حیرانی سے کہا۔ لیکن وہ اس کام کا عادی تھا اور جیسے رشوت لینے والا جائز یا ناجائز آمدنی کے بارے میں سوچتا بھی نہیں ایسے ہی وہ بھی غلط کام کا مختلف مفہوم رکھتا تھا۔ اس کے نزدیک یہ صرف دھندا تھا۔

وہ مال بردار جہاز زیادہ بڑا نہیں تھا۔ جب لانچ اس کے قریب لنگر انداز ہوئی تو میں نے عرشے پر چند غیر ملکیوں کو ریلنگ کا سہارا لیے ساحل کا نظارہ کرتے دیکھا۔ ان کے ہاتھوں میں جام تھے اور وہ صرف نیکر پہنے کھڑے تھے۔ ان کے ساتھ جو خواتین تھیں وہ بلا لحاظِ عمر ایک سے لباس کے خلاصے میں ملبوس تھیں۔

"میں اس وقت چونکا جب ایک مرد نے کہا"میرا خیال ہے کہ یہی وہ شخص ہے۔" وہ فرانسیسی بول رہا تھا۔

دوسرے نے فرنچ میں کہا"کیا یہ بھروسے کے قابل ہوگا؟"

"اگر یہ وہی آدمی ہے۔" پہلے بھوری داڑھی والے شخص نے کریم بلوچ کو غور سے دیکھا۔

"اس کے ساتھ یہ گندا بوڑھا شخص کون ہے ؟ اس کا باپ ؟" ایک ادھیڑ عمر عورت نے حقارت سے مُنہ بنا کے کہا۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" دوسرا ہنسا۔"مگر وہ جو گندے کپڑوں میں ایک عورت ہے' اس کے بارے میں یقیناً میں بہت کچھ کہہ سکتا ہوں۔"

"تم ہر جوان عورت کے بارے میں بہت کچھ کہہ سکتے ہو اپنی گندی زبان میں۔" نوجوان عورت نے افسوس سے [illegible] کے کہا۔ "آخر اس معاملے میں تمھارا ذوقِ جمال کیوں مرجاتا ہے؟"

"اوہ ڈیئر۔ حسد کی آنکھ سے مت دیکھو۔ اس کے میلے کپڑوں میں بھی دمکنے والے خوب صورت چہرے کو دیکھو۔ میں غیر جانبدار شخص کی حیثیت سے غیر جذباتی تبصرہ کر رہا ہوں۔"

"ایسا کرنے کی صلاحیت تم میں نہیں ہے۔"

کریم بلوچ نے کشتی کو اب جہاز کے ساتھ ملا دیا تھا۔ بھوری داڑھی والے نے پلٹ کر کسی کو آواز دی۔ اندر سے ایک سوکھا سڑا [illegible] پوش مولوی برآمد ہوا۔

"سام دو مایاں۔" بھوری داڑھی والا خفگی سے بولا۔"گوا وسے [illegible] تہیں چاہیے۔"

"جی۔ وہ ہم آ گئے۔" اُس شخص نے کہا جس کا نام غالباً صمد ہوگا۔ عبدالصمد مگر وہ صمدو میاں کہلاتا تھا۔" ہمارے صاحب ذرا نماز پڑھ رہے تھے۔"

"یہ کیا کہہ رہا ہے؟"

بھوری داڑھی والے نے کہا۔" اس کا وہ بدبخت آقا اپنی آخری عبادت میں مصروف ہے۔"

"ابھی سے آخری کیوں۔ ابھی شاید وہ رات کو اور اس سے پہلے سورج غروب ہونے کے بعد بھی دو بار خدا سے جنّت مانگے گا۔" دوسرا شخص ہنسا۔

"اوہ تو میں اتنا وقت نہیں دے سکتا۔" بھوری داڑھی والے نے کہا۔" اسے جو دُعا مانگنی ہے' مانگ لے ابھی۔"

ان الفاظ پر میرا اور محسن کا چونکنا ایک قدرتی ردِعمل ہوتا مگر ہم اپنے اس کردار میں صرف لاعلمی اور جہالت کا مظاہرہ کر سکتے تھے اور یہ ظاہر کر سکتے تھے کہ ہم کچھ نہیں سمجھے۔

بدبخت آقا پانچ منٹ کے بعد نمودار ہوا تو میں اُسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ مرچنٹ نیوی کی یونیفارم میں تھا لیکن چہرے مُہرے سے پاکستانی ہی لگتا تھا۔

"صمدو میاں! تم جاؤ اندر۔" اس نے تحکمانہ انداز میں کہا اور پھر بنگالی پر آگیا۔ صمدو سر ہلاتا رہا اور پھر اندر چلا گیا۔

"اس سے اُردو میں بات کرو۔" بھوری داڑھی والا برہمی سے بولا جو شاید یہی زبان سمجھتا تھا۔

"سوری۔ میں عادتاً بولنے لگتا ہوں بنگالی۔" بدبخت آقا نے فرانسیسی میں کہا۔

"تو اپنی عادت بدلو۔" دوسرے نے فرنچ میں کہا۔"میں صرف یہ کہہ رہا تھا۔۔۔"

"لعنت بھیجو اس پر جو تم کہہ رہے تھے۔" بھوری داڑھی والا بولا۔" یہ جو [illegible] ہے اپنی فیملی کے ساتھ آیا ہے یہ وہ آدمی تو نہیں ہے۔ اس سے بات کرو۔"

"اور مسٹر روپ کمار! یہ مت بھولنا کہ سب رِسک تمھارے ہیں۔ سب فائدے ہمارے۔ یہ گیم تم اپنے لیے کھیل رہے ہو۔۔۔ ہمارے لیے نہیں۔"

"میں اپنی ذمے داری کو سمجھتا ہوں جناب۔" مرچنٹ نیوی کے اس افسر نے کہا جس کو رُوپ کمار کہہ کے مخاطب کیا گیا تھا۔ پھر وہ کریم بلوچ سے مخاطب ہوگیا۔

"اے۔۔۔ تم کیا مانگتا۔۔۔؟"

"صاب! وہ سامان لینے کو آیا ہے ہم۔۔۔"

"تو یہ سب لوگ کس کا واسطے لایا ہے؟" رُوپ کمار نے غصّے سے، ہم سب کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ سب اپنے گھر والے ہیں صاب۔ اسی کشتی پر رہتے ہیں ۔۔۔" کریم بلوچ نے عاجزی سے کہا۔" ان کو کہاں چھوڑتا۔"

"ہم نہیں جانتا تم کو۔ بھاگ جاؤ ادھر سے۔"

"ہم رحیم بلوچ کا چھوٹا بھائی ہے صاب۔" کریم بلوچ نے عاجزی سے کہا۔" وہ بیمار پڑ گیا تو اس نے مجھے بھیج دیا۔"

"کیا ثبوت ہے کہ تم بھائی ہے اس کا؟"

"صاب اور کسی کو وہ بات کیسے معلوم ہو سکتی ہے۔ جو صرف مجھے معلوم ہے کہ مجھے کیا لے جانا ہے اور کہاں لے جانا ہے؟ اور اس کا معاوضہ کیا ہوگا۔" کریم بلوچ نے کہا۔" لیکن یہ بات میں اوپر آ کے بتا سکتا ہوں۔ ان سب کے سامنے نئیں۔"

اس بات کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ رُوپ کمار نے بھوری داڑھی والے سے فرنچ میں بات شروع کی۔" آدمی تو اپنا ہی ہے اور مجھے بھروسے کے قابل لگتا ہے۔ اس کے ساتھ فیملی ہے اس کی مگر انھیں بھی سامان کے متعلق کچھ نہیں معلوم۔ وہ کہتا ہے کہ اسے اوپر بُلا کے تصدیق کر لی جائے۔"

"ٹھیک ہے۔ تم اسے بلاؤ اور پھر اس کے ساتھ ہی دفع ہو جاؤ۔" بھوری داڑھی والے نے کہا۔

اوپر سے ایک رسّی کی سیڑھی لٹکائی گئی جس کو پکڑ کے کریم بلوچ جہاز کے عرشے پر پہنچ گیا۔ دونوں خواتین جو ماں بیٹی یا ساس بہو بھی ہو سکتی تھیں اور کسی رشتے کے بغیر بھی' جوان اور بوڑھے مردوں کی ہمسفر ساتھی تھیں' اب اندر جا چکی تھیں۔

"یار محسن! یہ معاملہ گڑبڑ ہے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں۔ میں نے سب سُنا۔" محسن بہ ظاہر جال کو پھیلا کے اس کے پھندے چیک کرتا رہا۔" یہ روپ کمار کیا کر رہا ہے یہاں؟"

"غداری۔" میں نے کہا۔" اس نے ہماری مرچنٹ نیوی کے افسروں کا لباس پہن رکھا ہے۔"

"اسے واقعی رات سے پہلے سزائے موت ہو جانی چاہیے یعنی کتنے افسوس کا مقام ہے کہ ہم نے ہندو ہونے کے باوجود اس کے ساتھ اچھوتوں والا سلوک نہیں کیا۔ اچھے کیریئر کی راہ میں اس کے مذہب کو حائل نہیں ہونے دیا اور سب کے ساتھ ترقی کرنے کے مواقع فراہم کیے۔ ہماری معاشرے میں عزت کے ساتھ رہا لیکن وقت بدلا تو اس نے نمک حرام ثابت کیا خود کو۔" محسن نے یہ ساری بات اچھی اداکاری کے ساتھ کی۔ ظاہر ہم یہی کرتے رہے کہ ہم جال کو چیک کر رہے ہیں اور ہماری گفتگو بھی اسی بارے میں ہے۔

غالب جو پہلے کچھ نہیں سمجھا تھا' ہماری بات پر چونکا ہوا اور ہمارے قریب ہی یوں گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گیا جیسے وہ بیمار ہے یا زمانے سے بے زار ہے۔ اس نے ایک بار سر اٹھایا اور چیخ کر نازو سے کہا۔

"ادھر نخرے دکھاتی پھر رہی ہے سب کو۔ چل نیچے۔"

اور نازو نے چیخ کے کہا" میں نیچے چلی جاؤں تاکہ تو دیکھتا رہے اس میم کو جسے شرم نہیں آتی نیکر پہنتے۔"

"جاتی ہے یا۔۔۔" غالب جارحانہ انداز میں اُٹھا اور نازو فوراً وہاں سے فرار ہوگئی۔ غالب پھر گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گیا۔ اس ایک ایکٹ کے مختصر ترین ڈرامے نے ہمارے کرداروں میں حقیقت کا رنگ بھر دیا۔ روپ کمار سے غیر ملکیوں کی گفتگو میں چند سیکنڈ کا وقفہ آگیا تھا۔ روپ کمار مسکرایا۔ پھر اُس نے" میاں بیوی" کے جھگڑے کا سبب بتایا تو عورتیں بھی کھلکھلا کے ہنس پڑیں۔

"ایسے ہی لڑتے رہتے ہیں یہ صاب۔ اس کا گھر والا ہے چرسی' نشہ کرتا ہے صاب۔" کریم بلوچ نے کہا۔

"اس سالے رُوپ کمار کو دیکھو۔ کیسا فراڈ کر رہا ہے۔ داڑھی لگا رکھی ہے اس نے اور خود کو مسلمان ظاہر کرتا ہے۔" غالب سر اُٹھائے بغیر بڑبڑایا۔" ابھی نماز پڑھ رہا تھا۔"

"نام روپ کمار اور نماز!"

"ارے یار' یہ غیر ملکی کیا جانیں ناموں کے فرق کو۔ کیا ہم انگلش ناموں سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ برطانوی ہے یا فرانسیسی یا امریکن۔ اور رومن کیتھولک ہے یا پروٹسٹنٹ ہے۔"

"یہ دونوں فرانسیسی کیا چکّر چلا رہے ہیں؟" محسن بولا۔

"ابھی معلوم ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔" روپ کمار جائے گا تو ہمارے ساتھ ہی۔"

اسی وقت کریم بلوچ عرشے پر نمودار ہوا۔ اُس نے چیخ کر ہمیں متوجہ کیا۔" بابا" اسے اوپر بھیج' بھاری سامان ہے۔"

"میں نے غالب کے لات ماری۔" اٹھ چرسی' کوئی کام کر۔"

غالب نے سر اٹھایا۔" تو خود چلا جا نا۔ مجھے سونے دے۔"

"اچھا۔ مر۔۔۔" میں نے اُسے کوسنے کے انداز میں گالی دیتے ہوئے کہا۔" جو کرے گا تیرا بھائی کرے گا۔"

محسن نے میرے اشارے کا مطلب سمجھ لیا اور رسّی کی سیڑھی سے اوپر جانے کے لیے دھوتی کسنے لگا۔

"میں اس کو بہت ترجیح دوں گا۔ اگر یہ بدبخت غدار آدمی

واپس ہی نہ آئے۔" بھوری داڑھی والا بولا۔"اس کی کشتی ڈوب جائے۔"
"لیکن وہ واپس آئے گا۔" نوجوان بولا۔"تم اُسے کیسے مارو گے؟"
"مارنے کے طریقے تمھیں نہیں آتے؟" بھوری داڑھی والا طنزیہ انداز میں بولا۔"کیا تمھیں معلوم ہے اس سودے میں ہمیں کتنا فائدہ ہوا؟"
"ہاں تم نے ہی بتایا تھا کہ ہم بیس ہزار ڈالر زیادہ وصول کرنے میں کامیاب رہے۔"
"لیکن کیا تم یہ جانتے ہو کہ اس شخص نے اتنا پیسہ کیسے دیا اور کیوں دیا؟"
"ہمیں سروکار تو نہیں ہونا چاہیے ایسی باتوں سے مگر پھر بھی۔ کیا تم جانتے ہو؟"
"ہاں۔ ان کے مُلک میں خانہ جنگی چل رہی ہے۔ ایک صوبے کی جنگ ہو رہی ہے دوسرے صوبے سے۔"
"یہ تو مجھے معلوم ہے۔"
"دونوں کے درمیان ایک دشمن ملک ہے جو اس جنگ سے پورا فائدہ اُٹھا رہا ہے۔"
"دشمن ہو گا تو فائدہ کیوں نہیں اُٹھائے گا اور نقصان کیوں نہیں پہنچائے گا؟"
"دِس مین، یہ خود کو مسلم ظاہر کرتا ہے مگر میں جانتا ہوں کہ مسلم نہیں ہے بلکہ ہندو ہے۔" بھوری داڑھی والا بولا۔"اس احمق کو سوچنا چاہیے تھا کہ جب میں ان کی زبان سے واقف ہوں۔ تو تھوڑا بہت کلچر کو بھی جانتا ہوں گا۔"
"تم کو اس معاملے میں پڑنا نہیں چاہیے تھا۔ یہ خطرناک معاملہ بھی ہو سکتا ہے۔"
"میں نے زندگی میں زیادہ خطرناک کام کیے ہیں۔"
"کیے ہوں گے اور بچتے بھی رہے ہو گے، اسی لیے تم میں یہ اعتماد پیدا ہوا کہ تم خطرات کو نظر انداز کرنے لگے ہو۔" جوان آدمی نسبتاً زیادہ دور اندیش تھا۔"مگر یہ ایک ملک کا نہیں، عالمی سیاست کا مسئلہ ہے اور ہم خواہ مخواہ کسی ایک فریق کا ساتھ دینے کے مجرم بنے...."
"مجرم وہ ہوتا ہے جو پکڑا جائے۔ ہم سامانِ تجارت لاتے رہتے ہیں۔ ہماری گڈ وِل بہت اچھی ہے۔ مالک ہم پر اتنا بھروسا کرتے ہیں کہ خدانخواستہ ہم پر الزام آئے تو وہ یقین نہیں کریں گے اور کیا بھی تو ہمیں ہی بچائیں گے۔"
"مجھے بیس ہزار ڈالر اتنے زیادہ نہیں لگتے کہ میں اپنی زندگی کو داؤ پر لگاؤں۔"
"مجھے بیس ہزار ڈالر کم نہیں لگتے۔ ان سے ساری زندگی بہتر گزر سکتی ہے۔ تم نہ چاہو تو نہ لو۔" بھوری داڑھی والے نے نوجوان کا تمسخر اُڑانے کے انداز میں کہا۔"مگر مجھے معلوم ہے کہ تم کو بھی اچھے ہنی مون کے لیے پیسہ چاہیے۔"
کریم بلوچ کے ساتھ اسی وقت محسن ایک بھاری بنڈل اٹھائے ہوئے نمودار ہوا۔ یہ گتّے کا ایک باکس تھا جس کے چاروں طرف ٹیپ سے تری پیسٹ دی گئی تھی۔ ڈبّے پر مختلف بین الاقوامی نشانات تھے۔ بمدھا سکھنے کے لیے تیر کا نشان۔ بارش اور پانی سے بچانے کے لیے چھتری۔ اس پر شیشے کا نازک جام ظاہر کرتا تھا کہ اندر ٹوٹ پھوٹ جانے والی کوئی شے ہے۔ ڈبّے پر ہک استعمال نہ کرنے کی ہدایت بھی درج تھی۔ اتنا ہی بڑا باکس کریم بلوچ کے پاس تھا۔ صمد و میاں دھوتی سنبھالے سنبھالے دوسرا ڈبّا لیے آئے جو اُن کے اپنے وزن سے دُگنا ہو گا چنانچہ وہ کسی شرابی کی طرح ڈگمگا رہے تھے۔ روپ کمار آخر میں آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بریف کیس تھا جس کو اس نے کلائی کے ساتھ ہتھکڑی کے ذریعے جوڑ لیا تھا۔ اس نے باری باری ان دونوں سے ہاتھ ملایا جو عرشے پر کھڑے صرف پی رہے تھے۔
"تم تو ایسے جا رہے ہو جیسے واپس نہیں آؤ گے۔" نوجوان بولا
"میں آؤں گا۔ ابھی دو تین گھنٹے میں۔" وہ بولا۔"بس میں چاہتا ہوں، یہ ڈلیوری میرے سامنے ہو جائے۔"
"خدا کرے ڈلیوری کسی پریشانی کے بغیر ہو جائے۔" نوجوان شوخ لہجے میں بولا اور ہنسا۔
محسن اب رسّی کی سیڑھی سے نیچے اُتر آیا تھا۔ اُس نے کبھی مزدوری نہیں کی تھی لہٰذا اس بوجھ کو اُتار کر لانے میں اُسے سخت مشقّت کرنا پڑی۔ صمد و میاں آخری وقت میں تقریباً لڑھک گئے تھے مگر میں نے انھیں سنبھال لیا۔ اس کے بعد آنے والا روپ کمار بنگالی زبان میں چلّانے لگا۔ مطلب تو میری سمجھ میں بھی نہیں آیا لیکن اندازہ سب کی طرح میں نے بھی کر لیا کہ وہ نہ ہونے والے نقصان پر خفا ہو رہا تھا جو صمد و میاں کے گرنے کی صورت میں ہو جاتا۔
"ابھی سامان نیچے رکھوا و رچلو۔" روپ کمار نے حکم دیا اور اکڑ کر آگے چلنے لگا۔ کریم بلوچ انھیں نیچے لے گیا۔ چند منٹ کے وقفے سے میں نے غالب کو اشارہ کیا اور وہ نیچے اتر گیا۔ میں چند قدم پیچھے گیا۔
"تم کیا دیکھتا ہے؟" روپ کمار نے غالب سے کہا۔
"اللہ کی قدرت کو۔" غالب نے کسی صوفی کی طرح کہا۔"جس نے اُلّو بنایا اور پھر اس کا پٹھّا۔" باری باری اس کی نگاہ روپ کمار اور صمد و میاں پر گئی۔
"کیا بکواس کرتا ہے۔" روپ کمار کا پارہ چڑھ گیا۔
"چھوڑیں مولانا صاحب۔" میں نے کہا۔" یہ نشے میں ہے۔

آپ کی طرح۔"
وہ اچھلا۔" ہماری طرح؟ ہم نشے میں ہے؟ بڈھا! تم خود نشے میں ہے۔"
"ہم سب نشے میں ہیں۔" میں نے کہا لیکن اس بار فرنسیسی میں۔" کسی کو شراب کا نشہ ہے تو کسی کو دولت کا۔ اقتدار کا اور حسن کا یا جوانی کا۔ چنانچہ مولوی روپ کمار...."
وہ بجلی گرنے سے مفلوج ہو جانے والے شخص کی طرح پہلے ... پھر اُس نے دائیں ہاتھ کو تیزی سے حرکت دینی چاہی مگر ... بالکل پیچھے نازو کھڑی تھی۔
"اے مولوی!" اس نے ایک دم روپ کمار کی کلائی پہ ہاتھ مار دیا۔" ... دے اندر کے مال کو اندر۔ ہم خود نکال لیں گے سب۔"
روپ کمار بلبلایا مگر نازو اتنی دیر میں اس کی جیب میں ہاتھ ڈال چکی تھی۔ اس نے خود کو بچانے کی کوشش میں ہتھکڑی اور بریف کیس والے ہاتھ سے نازو پر وار کرنا چاہا مگر ... نے اس کی ٹانگوں پر ایک لات ماری۔ اس کے دونوں قدم اُکھڑ گئے اور وہ زوردار آواز سے لانچ کے فرش پر گرا۔
کریم بلوچ نے اتنی دیر میں لانچ آگے بڑھا دی تھی اور اس کے دونوں انجن گرج رہے تھے۔ روپ کمار نے چلّانے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے اپنا پاؤں جوتے سمیت اس کے منہ پر جما دیا۔ وہ تڑپا مگر اُٹھ نہ سکا۔ نازو نے اس کی جیب سے برآمد ہونے والا ریوالور اسے دکھایا۔
"یہ کیا ہے صوفی جی؟ شہادت حاصل کرنے کا آلہ؟"
"وہ دھوتی پوش کدھر ہے؟" مجھے اچانک صمد و میاں کا خیال آیا۔
"وہ رضاکارانہ طور پر بے ہوش ہو گیا ہے۔" محسن بولا۔
"غلط۔ میں نے اس کے سر پر مُکّا مارا تھا۔" غالب نے اُسے مطلع کیا۔
"تم کریم بلوچ پر نظر رکھو۔" میں نے محسن سے کہا۔" کہ وہ کدھر جا رہا ہے۔"
"... نے ہمیں تو کچھ نہیں بتایا تھا۔" غالب بولا۔
"وہ کیا بتاتا تم خود بتاؤ۔ اس لیے معلوم ہوا کہ ہم نے برطانیہ میں تھوڑی بہت فرنچ سیکھ لی تھی۔ یہاں کون جانتا ہے فرنچ اور انجینئرنگ کسی ... پر تو وہ شک کر ہی نہیں سکتے تھے اس لیے ... وہ اطمینان سے گفتگو میں مصروف رہے۔" میں نے پیر ہٹا لیا اور ... کو کھڑے ہو جانے کا اشارہ کیا۔
وہ ... آستین سے صاف کرتا اٹھا۔ اس کے سامنے والے دو دانت ... رہے تھے اور ناک سے خون جاری تھا۔
"تم... کون لوگ ہے؟" وہ بمشکل تمام بولا۔
"پہلے آپ تعارف کرا دیں اپنا۔" غالب نے کہا۔"خلاصہ سب سے پہلے تو اپنا اصل نام بتائیں۔ اصل ولدیت کی شاید آپ کو خبر نہ ہو۔"
وہ کچھ دیر کشمکش، درد اور خوف میں مبتلا کھڑا رہا۔
"پھر یہ بتائیں ان ڈبّوں میں کیا ہے؟ کس کے لیے ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔" غالب بولا۔
"اور یہ بریف کیس؟" نازو نے کہا۔
"ارے او ناجو۔" غالب نے کسی اُجڈ دیہاتی کی طرح چلّا کے کہا۔" جانو کا لاکُ بریف کیس کی بچی.... ٹر ٹر کرے جائے ہے یہاں۔"
"تو کا کیا اپنے سر پہ مارے گا گالب کے پڑپوتے۔" نازو نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔
"ارے! ہاتھ کاٹوں گا اس کا، چور ہے نا یہ۔" غالب نے کہا۔" یہ بریف کیس بھی تو ایسے ہی کھُلے گا۔"
"دیکھو۔ خدا کے لیے...." روپ کمار بولا۔
میرا ہاتھ اتنی تیزی سے گھوما کہ روپ کمار دیکھ بھی نہ سکا۔ وہ بھرپور تھپڑ کی آواز کے ساتھ ہی نیچے گر گیا۔ اسی وقت لانچ کے انجن بند ہوئے۔
"خبردار جو خدا کا لفظ استعمال کیا۔ بھگوان، پرماتما، رام کچھ بھی کہو۔" میں نے کہا۔
وہ درمیان کا آدمی تھا جس کا مقصد کسی بھی سودے سے اپنا کمیشن وصول کرنا ہوتا ہے۔ اس میں پیشہ ورانہ سپاہی کا جذبہ نہیں تھا اور جذباتی مزاحمت کی صلاحیت بھی نہیں تھی۔ اس نے ہمیں پہلے نصف رقم بطور رشوت پیش کی اور مزید مار کھائی تو بہت جلد اس نے سب کچھ بتا دیا۔
ڈبّے کے اندر لانگ رینج اور شارٹ ویو ٹرانسمیٹرز تھے، سائیکلو اسٹائل مشین تھی جس پر شرانگیز مواد چھاپ کے تقسیم کیا جاتا اور "ڈی کوڈ" کرنے والی مشین تھی جسے صرف سائفر ایکسپرٹ ہی آپریٹ کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ چھوٹے چھوٹے خطرناک آلات تھے۔ جو باہر ہی سے اسمگل کیے جا سکتے تھے۔ مثلاً ٹائم فیوز۔ پاکٹ واکی ٹاکی۔ خفیہ مقامات پر نصب ہونے والے مائک جن کو "بگ" کہتے ہیں۔ یہ سب ایک تیسرے ملک کی معرفت مشرقی پاکستان بھجوائے جا رہے تھے لیکن اس کھیپ کو بھیجنے کے لیے پاکستان کی بندرگاہ استعمال کی جا رہی تھی اور اس کام میں مدد کرنے والے وہی غدار تھے جنھوں نے غیروں کی طرح کبھی اس ملک کے وجود اور اس کی نظریاتی اساس کو دل سے تسلیم نہیں کیا تھا۔
صمد و میاں جب ہوش میں آیا تو مرغِ بسمل کی طرح قدموں میں لوٹنے لگا۔" ہم کو معاف کر دو غلطی کیا ہم۔ ہم سوٗر۔ ہمارا باپ گدّھا۔ ہم تو...

کرتا ہے۔"

وہ ایک انتہائی گرا ہوا آدمی تھا جس میں خودی نام کی چیز تھی ہی نہیں۔ اس کے نزدیک خود کو اور ماں باپ کو گالیاں دینا اور ہاتھ پیر جوڑ کے جان بچانے کی کوشش کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ یہاں تک کہ رونا بھی اس کے اختیار میں تھا۔ کوئی اور ہوتا تو اس کی حالت اور اس کی گریہ وزاری دیکھ کر پسیج جاتا مگر ہم نے تفریحاً اس کو نازو کے سپرد کر دیا۔

نازو نے پہلے تو اسے اپنی مشاقی کے کرشمے دکھا کے خاصا دہشت زدہ کیا پھر اس پر واضح کیا کہ وہ صمدو میاں کا بھی اسی طرح چورا کر سکتی ہے جیسے خشک سوتوں کو مٹھی میں دبایا جائے تو وہ چور چور ہو جاتی ہیں پھر وہ اسے اوپر لے گئی تاکہ اس سے علیحدگی میں معلومات حاصل کر سکے۔

محسن نے باری باری ڈبے کھولنے شروع کیے۔ ان میں بیشتر اشیا فرانس اور جرمنی کی بنی ہوئی تھیں۔ میں نے اسے تاکید کی کہ وہ محتاط رہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی باکس میں ایسا بم ہو جو کھولتے ہی پھٹ جائے۔

غالب اوپر سے آیا تو ہنس رہا تھا۔ "اس صمدو میاں کو دیکھ کے بے اختیار میاں خوجی کا کردار یاد آتا ہے۔"

"اپنا یار بھی تو تھا استاد ٹیڈی جسے ہم مذاق میں میاں خوجی کہتے تھے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

نازو نے اسے بادبان والے مستول کے ساتھ الٹا لٹکا رکھا ہے۔ بالکل مُردہ چوہے کی طرح جھول رہا ہے۔" غالب بولا۔

"اسے کرنے دو اپنا کام۔" میں نے کہا۔ "یہ بتاؤ ہم ہیں کہاں؟"

"ساحل سے کافی دور۔ میرا خیال ہے چار پانچ میل کے فاصلے پر۔ قریب میں کوئی جہاز یا لانچ نہیں ہے۔"

"کریم بلوچ نے کیا بتایا؟"

"کوئی خاص بات نہیں۔" غالب نے کہا۔ "یہ کام اس کے بھائی نے لیا تھا مگر وہ سچ مچ بیمار ہو گیا۔ اس نے دوسرے ساتھی سے کہا کہ وہ کچھ کمانا چاہے تو موقع ہے لیکن کام آسان نہیں ہے۔ اس میں خطرہ بھی ہے۔ اس شخص نے پہلے تو ہامی بھر لی مگر بعد میں ڈر گیا اور ابھی جب ہم آ رہے تھے تو اس نے کریم بلوچ سے کہا کہ وہ رحیم بلوچ کا کام نہیں کر سکتا۔ کریم کو کچھ معلوم نہیں تھا چنانچہ اس نے پوچھا کیا کام ہے۔ دو ہزار روپے ملنے کی سن کر وہ تیار ہو گیا۔"

"کہاں لے جانا تھا اسے یہ مال؟"

"اسے خود معلوم نہیں، یہ تو مال کے ساتھ جانے والا شخص بتاتا مگر جب ہم نے اسے پکڑ لیا تو کریم بلوچ کھٹک گیا۔ اسے جہاز پر محسن نے بھی اشاروں میں سمجھا دیا تھا کہ معاملہ گڑبڑ ہے چنانچہ وہ اپنا کام کرے اور ہم کچھ بھی کریں وہ خاموش رہے۔"

"لیکن کھلے سمندر میں وہ اب کدھر رواں ہے؟"

"کہیں نہیں۔ بس وہ بندرگاہ کے علاقے سے نکال لایا ہے اور احکامات کا منتظر ہے۔" غالب نے کہا۔

"اسے دو ہزار دلوا دو۔" محسن بولا۔ "اور کہو کہ فی الحال کشتی کو یہیں رکھے۔ زیادہ دور بھی نہ جائے اور چلتا بھی رہے۔"

"وہ میں نے سمجھا دیا ہے۔ وہ خود بھی سمجھ دار ہے۔ کہہ رہا تھا کہ بیگم صاحب کو بولو یہ تماشا نیچے کریں۔"

"بات تو ٹھیک تھی اس کی۔ دور سے بھی کوئی دیکھ سکتا ہے اگر اس نے دوربین لگا رکھی ہو۔" محسن بولا۔ "تم نے سمجھایا ہے؟"

"نہیں۔" غالب دانت نکال کے بولا۔ "میں نے کہا کہ جب میں نیچے چلا جاؤں تو تم خود جا کے بات کرنا اور کہنا کہ آپ کے [illegible] منع فرما گئے ہیں۔"

"کیوں بے چارے کریم کو خواہ مخواہ پٹواؤ گے۔" محسن بولا۔

روپ کمار اب ادھ موا ہو چکا تھا۔ اس نے ابھی یہ نہیں بتایا تھا کہ اسے مال کس کے سپرد کرنا تھا۔

"دیکھو روپ کمار! پانچ منٹ میں فیصلہ کر لو۔" میں نے کہا۔ "تم یہ سب کس کے لیے لے جا رہے تھے؟"

"مجھ سے ایک شخص نے بندرگاہ پر ملاقات کے لیے کہا تھا۔" وہ فرانسیسی میں بولا۔

"اس کا نام... حلیہ...؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ اس نے کہا تھا کہ وہ خود مجھے پہچان لے گا۔"

"بندرگاہ تو میلوں میں پھیلی ہوئی ہے!"

"اس نے دو نمبر برتھ کے آفس کے پاس آنے کو کہا تھا۔"

میں نے ایک بار پھر پولیس اسٹائل میں پھینٹی لگائی جس کے بعد وہ کھڑا ہونے کے قابل بھی نہیں رہا۔

"تم دو نمبر برتھ سے بہت دور تھے اور تم نے کشتی والے سے کہا بھی نہیں تھا کہ دو نمبر برتھ کی طرف جانا ہے۔" میں نے کہا۔

"تم... تم نے مجھے موقع ہی کب دیا۔" وہ بولا۔

"کیا اب ہم دو نمبر برتھ کے آفس کی طرف چلیں؟" میں نے [illegible]

"ہم یہ حلیہ تبدیل کر لیتے ہیں۔ ورنہ اس کی بھی ضرورت نہیں۔ ہم دور سے تم پر نظر رکھیں گے۔ دور کا مطلب ہے چند گز کے فاصلے سے۔ وہاں ہم جیسے تو سیکڑوں پھر رہے ہوں گے۔ تم کو جاننے والا قریب آئے گا تو تم اس سے ہاتھ ملا کے صرف یہ کہنا کہ آپ کا [illegible] گیا ہے۔ باقی کام ہمارا۔"

"وہ مجھے مار ڈالیں گے۔"

"ہم بھی تمھیں مار ڈالیں گے۔" میں نے کہا۔ "تعاون کرو گے تو تھوڑا سا جینے کا موقع بھی دیں گے تمھیں۔ تیرنا تو آتا ہو گا؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔

"تو ہم تمھیں ساحل سے پانچ میل دور لے جا کر پانی میں پھینک دیں گے۔ آگے جو تمھاری قسمت۔ تم تیر کر ساحل تک پہنچ جاؤ یا کوئی بچا لے۔ دوسری صورت میں کوئی چانس نہیں۔ ہم تمھیں مار کے سمندر میں ڈال دیں گے۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ اس کشتی والے سے کہو دو نمبر برتھ پر چلے۔" روپ کمار بولا۔

"یہ بریف کیس ہمارے حوالے کر دو۔" محسن نے کہا۔

"یہ... یہ غلط ہے۔ تمھارے اور ہمارے درمیان ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔" وہ [illegible] لہجے میں بولا۔ "[illegible] جان کا خطرہ مول لیا ہے۔"

"کیا تم واقعی چاہتے ہو کہ ہم تمھاری کلائی کاٹ دیں؟" میں نے [illegible] سے کہا۔ محسن نے چولھے کے قریب پڑی ہوئی چھری مجھے پیش کی۔

"کیا ہے اس میں آخر؟ وہی بیس ہزار ڈالر۔" میں نے کہا۔ اور روپ کمار کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "میں آخری موقع دیتا ہوں۔"

"اس کی چابی نہیں ہے میرے پاس۔" وہ چلانے لگا۔ "میں خود بھی اس کو توڑ کے الگ کرتا۔ تم بھی ایسا کر سکتے ہو۔"

مجھے اس پر یقین آ گیا۔ زنجیر کو کاٹنا مشکل کام تھا۔ میں نے بریف کیس کو توڑنے کے لیے محسن سے کوئی بندوبست کرنے کو کہا۔ محسن ایک سلاخ اٹھا کے لایا۔ عام بریف کیس اس کی چند ضربات سے ٹوٹ جاتا مگر یہ ماہر کا بنا ہوا سیمسونائٹ کا بریف کیس تھا۔ میں نے روپ کمار کو نیچے لٹا کے دبا رکھا تھا۔ غالب نے اس کا ہاتھ دبا رکھا تھا۔ محسن نے بریف کیس کے تالے پر وار کیے تو اس کے انجر پنجر ڈھیلے پڑ گئے پھر بریف کیس کھل گیا۔

اندر بیس ہزار ڈالر کے نوٹ نہیں تھے۔ پرانے اخبار میں لپٹی ہوئی کوئی چیز تھی، جس کے گرد مضبوطی سے مچھلیاں پکڑنے میں استعمال ہونے والی ڈوری لپیٹی گئی تھی۔ اس پیکٹ کی موٹائی ایک انچ سے کچھ کم اور لمبائی چوڑائی بریف کیس کی اندرونی سطح کے برابر تھی اور یہ پیکٹ پلاسٹک کے لفافے میں رکھا گیا تھا۔ ظاہر ہے، اس احتیاط کا مقصد نوٹوں کو نمی سے بچانا ہی ہو سکتا تھا مگر حیرت ہمیں اس وقت ہوئی جب محسن نے وہ پیکٹ کھولا۔ اس کے اندر چاکلیٹ کے پیکٹ تھے، جو اوپر سے دبا کے دیکھنے پر نوٹوں کی گڈی ہی محسوس ہوتے تھے۔

روپ کمار کی تو آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ اس کے ساتھ دھوکا ہوا تھا اور اب اسے یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ اعتماد کرنے کا انجام ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ اس نے دیکھے بغیر بریف کیس لے لیا تھا اور مان لیا تھا کہ اس میں وعدے کے مطابق دی جانے والی رقم ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا سبق تھا جو قدرت نے اسے سکھلایا۔ ایک قوم نے اس پر اعتماد کیا تھا مگر اس نے قوم کو دھوکا دیا۔ دوسری قوم کے صرف دو افراد نے اس کے اعتماد کی ایسی تیسی کر دی۔ چاہ کن را چاہ درپیش۔

جب ہم نے ہنسنا شروع کیا تو وہ پاگل ہو گیا۔ اس نے چیخ چیخ کر ان بدمعاشوں کو گالیاں دینی شروع کر دیں جو ایک مہذب قوم کے افراد تھے اور اپنی دیانت داری، اصول پرستی اور لین دین میں نیک نیتی کے لیے مشہور تھے۔ اس معاشرے سے تعلق رکھتے تھے جہاں سپر اسٹور میں سیلف سروس تھی اور بچہ بھی یہ نہیں کرتا تھا کہ ایک ٹافی بغیر قیمت ادا کیے منہ میں ڈال لے۔ خواہ کوئی دیکھنے والا ہو یا نہ ہو۔ جہاں اخبار فٹ پاتھ پر رکھ دیے جاتے تھے اور لوگ پیسے رکھ کے اپنی مرضی کا اخبار اٹھا لیتے تھے۔ یہ بعید از قیاس سمجھا جاتا تھا کہ کوئی پیسے اٹھا لے یا اخبار مفت میں لے جائے۔ جہاں ملاوٹ کا تصور نہیں تھا اور کریڈٹ کارڈ، چیک، ادھار سب نقد کی طرح اعتماد کے ساتھ قبول کیے جاتے تھے۔

"اسے کہتے ہیں جیسے کو تیسا۔ روپ کمار، تم نے سب کو دھوکا دیا۔ ملک و قوم کو۔ مذہب کو اور خدا کو یا اپنے بھگوان کو۔ اپنے ضمیر کو۔ اور تقدیر نے تمھیں کہاں لا کے دھوکا دیا۔ جہاں تم دھوبی کے کتے سے بھی بدتر ہو گئے۔ نہ تم ادھر کے رہے نہ ادھر کے۔ کیا کمایا تم نے، سب کچھ تو گنوا دیا؟"

غالب نے اسے اٹھایا۔ "تم کچھ تلافی بہرحال کر سکتے ہو، اگر ہم سے تعاون کرو۔"

"ہاں کم سے کم زندگی بچا سکتے ہو۔" محسن نے کہا۔

"ان سے بدلہ لے سکتے ہو۔ جنھوں نے تم کو دھوکا دیا اور اس کام میں ہم تمھاری مدد کریں گے کیونکہ وہ ہمارے بھی دشمن ثابت ہو چکے ہیں۔" میں نے کہا۔

"ممکن ہے تمھیں ڈوبی ہوئی رقم مل جائے۔" غالب نے کہا۔

"پھر تم خود ڈوبنے سے بچ جاؤ اور کہیں چھپ چھپا کے نکل جاؤ۔"

"یہ چانس مفت میں پڑے گا تم کو روپ کمار۔"

"اور تم وعدہ کرتے ہو کہ مجھے مارو گے نہیں؟" وہ کچھ پُرامید نظر آنے لگا۔

"ہم اپنے ہاتھ تمھارے ناپاک غدار خون سے رنگنے کے بجائے تمھیں سمندر کے سپرد کر دیں گے۔ اب یہ سمندر کی مرضی کہ وہ تم کو نگل لے یا غلاظت سمجھ کے اگل دے۔" محسن نے کہا۔

"ہم وعدے کے مطابق تم کو پانچ میل دور سمندر میں زندہ سلامت پھینک دیں گے۔ شرط وہی ہے کہ تم اس شخص کی نشاندہی کر دو جس کے حوالے تمھیں یہ مال کرنا تھا۔"

"ٹھیک ہے۔ مجھے منظور ہے۔" وہ بولا۔

"کریم سے کہو واپس چلے۔" میں نے غالب کو اشارہ کیا۔ وہ

پلٹا ہی تھا کہ اوپر سے نازو ہاتھ جھاڑتی اُتری۔

"کیا ہوا؟" غالب نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ خدا نہ کرے کہ مجھے کچھ ہو۔" وہ بولی۔

"صمدو میاں...؟"

"وہ اللہ میاں کے پاس چلے گئے۔" نازو نے یوں سرسری لہجے میں کہا جیسے یہ کوئی قابلِ ذکر بات ہی نہیں تھی۔

"یعنی اسے اتنی آسانی سے مار دیا!" غالب خفا ہونے لگا۔

"میں نے نہیں مارا۔ وہ خود مرگیا۔ اس کی قضا آگئی تھی۔"

"نازو کے روپ میں۔" غالب بولا۔

"میں نے تو اُسے تھوڑا سا جھٹکا تھا۔" نازو برہمی سے بولی۔ "مجھے کیا معلوم تھا کہ اس کی گردن گوندے چپکی ہوئی ہے۔"

"چلو جو ہوا سو ہوا۔ اب کہاں ہے وہ؟ وہیں لٹکا ہوا ہے پھانسی پر؟" میں نے کہا۔

نازو نے نفی میں سرہلایا۔ "پھینک دیا میں نے سمندر میں۔"

یہ سب گفتگو سن کے روپ کمار کی حالت مزید غیر ہوئی۔ بعد میں جب میں خود کریم سے یہ کہنے کے لیے اوپر گیا کہ اب ہمیں لوٹ کر بندرگاہ کی طرف جانا ہے تو میں نے صمدو میاں کو عرشے پر لیٹا ہوا دیکھا۔ نازو نے اس پر ایک ترپال ڈال دی تھی۔ ترپال کے نیچے وہ ایسے بندھا پڑا تھا کہ صرف سانس لے سکتا تھا مگر اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ اس نے روپ کمار کو نفسیاتی طور پر دہشت زدہ کرنے کے لیے اچھا ڈراما کیا تھا۔

میں نے کریم بلوچ کو اپنی پوری اسکیم سمجھائی۔ اس کے مطابق ہم تین نمبر برتھ کے قریب پہنچے۔ میں نے اپنا ماہی گیری والا لباس برقرار رکھا اور کریم بلوچ نے ہمیں ایک چھوٹی سی کشتی میں منتقل کردیا جس میں مشکل سے چار افراد کے لیے جگہ تھی۔ کریم اس کشتی کو چپوؤں کی مدد سے چلا کے دو نمبر برتھ کی طرف لے گیا اور ایک ایسی جگہ کھڑا کردیا جو دو بہت بڑی کشتیوں کے درمیان تھی۔ اگر موجوں سے وہ کشتیاں آپس میں ٹکرا جاتیں تو اس ننھی کشتی کے ٹکڑے ہو جاتے۔

"اب تم آگے چلو۔" میں نے روپ کمار سے کہا۔ "اور یہ بات ذہن میں رکھو کہ تمھارا ایک غلط قدم تمھیں پرلوک پہنچا دے گا۔ تم نے کوئی بھی ایسی حرکت کی جس پر مجھے شبہ ہوا کہ تم چالاکی سے کام لے رہے ہو اور تم نے کسی کو اشارہ کیا ہے تو بھلو یہ شک بھی تمھاری موت کا سبب بن سکتا ہے۔"

"میں ان دونوں سُوّر کے بچّوں کو سزا دیے بغیر مرنا نہیں چاہتا۔" وہ بولا۔ "میں انھیں قتل کردوں گا۔"

کچھ ایسے ہی خیالات کا اظہار وہ بھوری داڑھی والا غیر ملکی بھی کرچکا تھا۔ شاید اسے اندازہ تھا کہ دھوکے کا پتا چلتے ہی وہ آگ بگولا ہو کے واپس آئے گا۔

دو نمبر برتھ کے آفس سے کچھ فاصلے پر میں اور محسن مگر گئے [illegible] زمین پر بیٹھ گیا۔ میں نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ میں نشے میں ہوں مگر وہاں بھاگم بھاگ اور افراتفری کی کیفیت تھی۔ اس پر کون غور کرتا کہ یہ بڈھا یہاں کیوں بیٹھا ہے۔ شاید میں مر بھی جاتا تو کوئی متوجہ نہ ہوتا چنانچہ میں اطمینان سے بیٹھ کے سگریٹ پینے لگا۔

محسن آفس کے پیچھے تھا اور ہم دونوں چار پانچ گز کے فاصلے سے روپ کمار پر نظر رکھے ہوئے تھے جو دروازے کے سامنے ٹہل رہا تھا۔ اب رات ہوچکی تھی لیکن آفس کے سامنے کافی روشنی تھی۔

ابھی پانچ منٹ بھی نہیں ہوئے تھے کہ ایک معزز صورت شخص روپ کمار کی طرف بڑھا۔ اس نے سفید قمیص اور کالی پتلون پہن رکھی تھی۔ وہ پچپن ساٹھ سال کا آدمی تھا جس کے سر کے بال درمیان سے غائب ہوچکے تھے۔

"یہ کیا مصیبت ہے۔" اس نے روپ کمار کو ڈانٹنا شروع کردیا۔ "میں ایک گھنٹے سے تمھارے انتظار میں ٹہل رہا ہوں۔"

"انتظار تو کرنا پڑ جاتا ہے ایسے معاملات میں۔" روپ کمار خفگی سے بولا۔ "نہ جہاز میرے باپ کا تھا۔"

"خیر چھوڑو۔ مال کہاں ہے؟"

"مال کشتی پر ہے۔ کشتی ادھر ہے۔" روپ کمار نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "تم رقم لائے ہو؟"

نووارد نے سرہلایا اور ایک کاغذ اسے پکڑا دیا۔

"یہ کیا ہے؟"

"یہ بنک ڈرافٹ ہے کلکتہ کے سٹی بنک کا۔ میں نقد نہیں لاسکتا تھا۔"

"اسے ڈاک سے بھجوا دو میرے گھر کے پتے پر۔" روپ کمار نے بنک ڈرافٹ دیکھا اور واپس کردیا۔ "میری بیوی کیش کرا لے گی۔"

"مجھے تمھارے گھر کا پتا نہیں معلوم۔ مگر خیر۔ میں معلوم کرلوں گا۔" نووارد بولا۔ "اب چلو۔"

وہ دونوں جیسے ہی واپس ہوئے، میں اور محسن ان کے پیچھے ہولیے۔ نووارد نے دو ایک بار پلٹ کے دیکھا مگر وہ ہمیں پہچان نہ سکا اور نہ ہی یہ سمجھ سکا کہ ہم اس کے پیچھے آرہے ہیں۔ وہاں بیشتر لوگ ہمارے جیسے حلیے میں ہر طرف پھیلے ہوئے تھے۔

ٹھیک وقت پر جب روپ کمار نام کے اس بدصورت شخص نے اجنبی کے ساتھ کشتی میں قدم رکھا ہم ساتھ کی طرح ساتھ کود گئے۔ چھوٹی سی کشتی لہروں میں کچھ ڈگمگائی مگر اس کے دونوں جانب بہت اونچی اونچی کشتیوں کی دیواریں تھیں چنانچہ اس کا توازن بگڑنے نہ پایا۔

اس سے پہلے کہ اجنبی کچھ کرتا یا کہتا، میں نے اسے ناک آؤٹ کردیا۔ یہ سوال و جواب یا مار دھاڑ کے لیے قطعی ناموزوں جگہ تھی۔ وہ حلق پھاڑ کے مدد کے لیے پکارنے لگتا تو ہر سمت سے لوگ بھاگے ہوئے آتے اور ہمارا وہاں سے بھاگنا ناممکن ہوجاتا۔

"کریم! کشتی کو فوراً نکالو۔"

"نکال رہا ہے صاب۔" کریم نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "یہ زندہ ہے کہ مرگیا؟"

"فکر مت کرو، مر بھی گیا تو قتل کا الزام تم پر نہیں آئے گا۔" محسن نے کہا اور نیچے بیٹھ کر نووارد کی تلاشی لینے لگا۔ اس کے پاس سے صرف ایک ہی کاغذ نکلا۔ یہ وہی بنک ڈرافٹ تھا۔

"دو لاکھ روپیہ!" میں نے حیرت سے کہا۔ "روپ کمار! تم تو پچھلی بھی کھا رہے تھے اور دودھ بھی۔ ادھر سے بھی مال بٹور رہے تھے اور ادھر سے بھی۔"

"دیکھو، یہ رقم میری فیملی کو جانے دو۔" وہ منت کرتے ہوئے بولا۔

میں نے نفی میں سرہلایا۔ "یہ پاکستان کا پیسہ ہے اور مجھے کیا معلوم کہ یہ تمھاری فیملی کو ملے گا تو وہ اس کا کیا کریں گے... اسے تخریب کاروں کو پہنچا دیں گے!"

"وہ ایسے نہیں ہیں۔ انھیں کچھ نہیں معلوم۔"

"خاندان کا سربراہ غلطی کرتا ہے تو سزا خاندان ہی کو کاٹنی پڑتی ہے۔" میں نے کہا۔ "چور، ڈاکو یا قاتل خود تو لٹک کے دنیا سے روپوش ہوجاتے ہیں، پسماندگان کو دُنیا و عاقبت میں کیا ملتا ہے سوائے خانہ خرابی اور رسوائی کے۔"

میں نے وہ بنک ڈرافٹ پھاڑ کے پُرزہ پُرزہ کردیا۔ روپ کمار بھوں بھوں کرکے رونے لگا۔

"اتنے کم ہمت ہو یار تو اس پیشے میں ہی کیوں آئے تھے؟ یہاں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔" محسن بولا۔

"زندگی رہی تو ان کے لیے پھر کما لو گے لیکن ایسے مت کمانا۔ ایسے جو کچھ ملتا ہے، وہ کچھ دیتا نہیں بلکہ جان یا آبرو لے لیتا ہے۔" [illegible] نے کہا۔ "اب ہم کافی دور آگئے ہیں۔ کیوں نہ تم سے آخری سوال [illegible]"

"ہاں۔ یہ کون تھا؟" میں نے کشتی میں اُلٹے پڑے ہوئے شخص کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ تھا یہ بھی غدار [illegible] اپنا سابق ہموطن کہتے ہوئے اپنی بے عزتی محسوس کرتا ہوں۔ [illegible] نسل کا کتّا تھا۔"

"مگر میں نے کہا تھا نا کہ میں نہیں جانتا اسے۔"

میں نے اس کے مُنہ پر اُلٹے ہاتھ کا تھپّڑ مارا۔ "اس نے جس لہجے میں بات کی تھی اور جو بات کی تھی وہ ہم نے سنی تھی۔ تم نے اُسے کہا تھا کہ رقم میرے گھر بھجوا دو۔ تم راہ چلتے کسی اجنبی سے ایسا کہو گے؟ یا ہم سے کہو گے ایسی بات؟ اگر یہ معلوم ہو تمھیں کہ ہم تمھارے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔"

"اور جواب میں اس نے کہا تھا کہ میں معلوم کرلوں گا تمھاری بیوی کا پتا۔"

روپ کمار گال سہلاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ "یہ ایک سرکاری افسر تھا۔ وزارتِ داخلہ کا ایک سیکشن آفیسر۔"

روپ کمار نے اس کا نام بھی بتایا تھا مگر یہاں میں عمداً اس کا ذکر نہیں کررہا ہوں۔

"تھا کیا مطلب؟"

"اسے ہٹا دیا گیا تھا۔ کیا تم جانتے نہیں کہ بنگالی افسران کو کلیدی عہدوں پر نہ رکھنے کی پالیسی پر عمل ہورہا ہے۔ ٹاپ سیکرٹ فائلیں وغیرہ ان سے لے لی گئی ہیں۔"

"یہ ایک دانش مندانہ پالیسی ہے۔ جب تک دوست دشمن اور اپنے پرائے کی پہچان نہ ہوجائے، احتیاط بہتر ہے۔ خیر، یہ بتاؤ کہ تم اسے کب سے جانتے ہو اور تمھارے درمیان رابطہ کیسے ہوا؟" میں نے کہا۔

"میں عوامی لیگ کا پرانا کارکن ہوں۔ مجھے اوپر سے حکم ملا تھا کہ کراچی جاؤں۔ یہ شخص مجھے اسی جگہ ملا تھا اور اس نے مجھے یہ کام کرنے کو کہا تھا یعنی یہ مال لے جانے کی ذمّے داری میری تھی۔"

"اور تم یہ مال لے کر کیسے جاتے؟"

"ایک اور بحری جہاز جانے کے لیے تیار کھڑا ہے۔" وہ بولا۔

"ایس ایس کرانتی تھرڈ۔" میں نے سرہلایا۔

وہ ایک لمحے کے لیے پتھر ہوگیا۔ "یہ... تم کو...!"

"کسی نے نہیں۔" میں نے کہا۔ "بس الہام ہوا ہے مجھ پر۔ ابھی ابھی تم کہہ سکتے ہو کہ میری چھٹی حس جاسوس بھی ہے۔"

"میری ساتویں حس اس کی پارٹنر ہے۔" محسن بولا۔

"اور میری آٹھویں حس بھی۔" غالب نے کہا۔

چونکہ تمام ضروری معلومات حاصل کی جاچکی تھیں، اس لیے روپ کمار کا وجود ہمارے لیے بے مصرف ہوگیا تھا۔ ہم اپنی لانچ نما کشتی کے قریب بھی پہنچ چکے تھے۔ میں اور محسن بے ہوش پڑے ہوئے شخص کو اٹھا کے اوپر لے گئے۔ غالب نے روپ کمار کو لانچ پر پہنچایا۔

"اری او نازو!" غالب نے گلا پھاڑ کے کہا۔ "دیکھ تو سہی کون آیا ہے۔"

نازو غصّے میں اوپر آئی۔ "اُٹھا لایا پھر میرے کسی سسر کو۔ گالب کے پوتے۔"

"چپ کر نہیں تو..." غالب نے دہاڑ کے کہا۔

"نہیں تو کیا۔ جب جا دے ہے اپنی مُردار شکل والی کوئی چیز لے آوے ہے"۔ وہ بیرا تختی نیچے چلی گئی۔ یہ چھیڑ چھاڑ کے بہانے مستقبل کے ایک رول کی ریہرسل بھی تھی۔

"اب وقت آگیا ہے مسٹر روپ بہروپ کمار کہ ہم تم سے کیا ہوا وعدہ پورا کریں"۔ میں نے ہاتھ مل کے کہا۔ "یعنی تمھیں اس سمندر میں پھینک دیں"۔

"تم مجھے اس کشتی میں پہنچانے کی رعایت نہیں دو گے؟" وہ لجاجت سے بولا۔ "اس حالت میں میرے لیے تیرنا مشکل ہوگا"۔

"تو مت تیرنا۔ نیچے جا کے لیٹ جانا"۔ غالب نے اسے مشورہ دیا۔

"ہم تو سب کچھ معاہدے کے مطابق کریں گے"۔ میں نے کہا اور محسن کو اشارہ کیا۔ "ذرا ان کو پیک کرنے کے لیے کچھ لاؤ"۔

وہ اُچھلا۔ "کیا۔۔۔ مجھے پیک کر دو گے تم!"

"ہاں۔ اس طرح تم پانی سے محفوظ رہو گے۔ زنگ نہیں لگے گا تمھیں"۔ میں نے کہا۔

"اور ویسے بھی آدمی مٹی کا پُتلا ہے کہیں تم مٹی کی طرح پانی میں گھل نہ جاؤ"۔ غالب نے کہا۔

"تم مجھے مارنا چاہتے ہو۔ یہ بدعہدی ہے"۔ وہ خوف سے کانپنے لگا۔ اس نے دوڑ کر لانچ عبور کرنے کی کوشش کی مگر ہم سب مستعد تھے۔ محسن نے ٹانگ آگے بڑھائی اور وہ مُنہ کے بل گرا۔

"یہ ہے ان کا کفن۔ واٹر پروف"۔ محسن نے پلاسٹک کی ایک بڑی سی تھیلی پیش کی۔ "گارنٹی قیامت تک"۔

روپ کمار دہاڑیں مار مار کے رونے لگا۔ "خدا کے لیے مجھے بخش دو۔ جانے دو۔ میں نے تعاون کیا تمھارے ساتھ۔ تم نے تو وعدہ کیا تھا۔۔۔"

"میں نے اس کے ایک لگ رسید کی"۔ ہم وعدے کے مطابق ہی تمھیں سمندر میں پھینک رہے ہیں اور خود قتل نہیں کر رہے ہیں۔ رہی بخشنے کی بات تو وہ ہم سے مت کرو۔ بخشنے والا کوئی اور ہے"۔

"اور یہ تو جنگ کی بات ہے۔ ہم اور تم دُشمن تھے، کوئی دوست یا بزنس پارٹنر نہیں"۔ محسن نے فرنچ جاری رکھی۔ "دغا تو تمھیں وہ بھی دے گئے جن سے تم نے بزنس کیا تھا"۔

"وہ چاکلیٹ بھی ساتھ ہی پیک کر دو"۔ غالب بولا۔ "نیچے جا کے کھاتے رہیں گے یا وھیل کے پیٹ میں پہنچ کے کھالیں گے"۔

"دُشمن کے وعدے پر اعتبار کرنے والا سب سے بڑا احمق۔ ہم کسی دوست سے وعدہ کرتے تو جان دے کر نبھاتے۔ مگر یہ تو بس ایک جنگی حکمتِ عملی تھی جو ہم نے اختیار کی۔ جنگ کی حکمتِ عملی میں دُشمن کو دھوکے میں رکھنا اور اچانک ختم کر دینا عقلمندی اور ذہانت کی دلیل سمجھا جاتا ہے۔ اخلاقی جرم نہیں"۔

"تم دُشمن ہو۔ غدار ہو"۔ محسن بولا۔ "اور یہ دنیا کی عدالت نہیں ہے جہاں تم بے مصرف دلائل سے بچ سکو"۔

"یہ ایم آر ایس کی عدالت ہے جو تمھیں سزائے موت دیتی ہے"۔ میں نے کسی جج کی طرح فیصلہ سنایا۔

اس کے ساتھ ہی ہم نے اسے پکڑا اور توڑ مروڑ کے پلاسٹک کی تھیلی میں ڈالنے کی کوشش کی مگر وہ مزاحمت کرتا رہا، ہمیں گالیاں دیتا رہا اور چیختا رہا۔ سمندر کے شور میں اس کی سننے والا ہمارے سوا کون تھا۔ بالآخر ہم نے اسے باندھ کے تھیلی میں ڈالا اور تھیلی کا مُنہ بند کر دیا۔ اُس کی آخری دہشت بھری نظریں مجھے آج بھی یاد ہیں۔

"گڈ بائی مسٹر روپ کمار"۔ میں نے کہا۔ "بون وائج"۔

محسن اور غالب نے تھیلی کو کونوں سے پکڑ کے اُٹھایا۔ دو بار جُھلایا اور سمندر میں پھینک دیا۔ وہ لانچ سے کوئی چار گز دور پانی میں ایک چھپاکے سے گرا اور غائب ہو گیا۔

"مزید خس کم جہاں مزید پاک"۔ غالب بولا۔

اس کے بعد ہم نے وہ سب سامان توڑ پھوڑ کے سمندر میں ڈالا جو روپ کمار کی معرفت آگے جانے والا تھا۔ بھاری ٹرانسپورٹر، سائفر مشین اور ڈی کوڈنگ مشین کے علاوہ جدید سائیکلو اسٹائل مشین ہمارے لیے بے کار تھے۔ چھوٹی چیزیں ہم نے سنبھال کے رکھ لیں جن میں دو واکی ٹاکی تھے اور دو خفیہ طور پر نصب کیے جانے والے ایف ایم مائکرو فون جو ایک کلومیٹر کی رینج میں کام کر سکتے تھے۔

غالب کے بروقت دانش مندانہ مشورے سے اصل پیکنگ کو محفوظ رکھا گیا اور اس میں فالتو اشیا بھر کے واپس یوں بند کر دیا گیا کہ کسی کو شک ہی نہ ہو۔ نازو نے ہماری عدم موجودگی میں کھانا پکا لیا تھا۔ جب وہ کھانا سامنے آیا تو ہماری بھوک اُڑ گئی۔

"یہ کیا ہے؟" غالب نے غرّا کے کہا۔

"تمھیں کیا نظر آ رہا ہے؟" نازو نے بھی غرّا کے کہا۔ "کھانا ہے تو کھاؤ ورنہ بھوکے رہو"۔

"صبر کر بھائی"۔ محسن بولا۔ "اور شکر کر کہ تیرے مقدر میں سوپیاز اور سو جوتے نہیں تھے۔ ورنہ وہ بھی کھانے پڑتے"۔

"یہ اس سے کم تو نہیں"۔ غالب نے کہا۔ "یعنی دال بھات!"

"بوت مزے کا ہے صاب"۔ کریم بلوچ نے کہا جو ندیدوں کی طرح چاولوں پر دال ڈالتا جا رہا تھا اور ہاتھوں سے اس ملغوبے کے گولے بنا بنا کے حلق سے اُتار رہا تھا۔

"شپ پر یہی راشن ہے اور یہی چلے گا"۔ نازو نے بتایا۔

"ہم مچھلی بھی پکڑے گا صاب۔ چاول کے ساتھ کھائے گا تو بوت مزہ دے گا"۔ کریم بلوچ نے کہا۔

"محترمہ نازلی بیگم صاحبہ"۔ غالب نے بڑے ادب اور خلوص کے ساتھ کہا۔ "ناگوارِ خاطر نہ ہو تو اس حقیر فقیر بندۂ بے تقصیر کو آگاہ فرمایئے کہ بعد از طعام سیاہ قہوہ ملکِ چین مع قندِ ہند کی جگہ آبِ بحیرۂ عرب تو نہیں پیش کیا جائے گا"۔

کریم بلوچ کا مُنہ کھلا رہ گیا۔ "یہ کون سا زبان ہے صاب"۔

"یہ وہ زبان ہے دوست جو ہم بھول چکے ہیں"۔ میں نے کہا۔

ظاہر ہے لانچ پر جو انتظام تھا وہ سفر کے لیے اور ایمرجنسی کے لیے تھا چنانچہ جس نے بھی پلاننگ کی تھی اس نے ڈرائی راشن رکھا تھا۔ نازو نے بتایا کہ چاولوں کی تو ڈھائی من والی بوری ہے۔ آدھی بوری دال ہے اور آدھی بوری میں چنے ہیں جو اُبال کے کھائے جاتے ہیں۔ نمک مرچ، مصالحہ۔ دودھ، چینی، پتّی سب خشک چیزیں تھیں جن کو اسٹور کرنا آسان تھا۔

چائے پینے سے وہ کوفت دور ہوئی جو بدمزہ دال اور چاول کھا کے پیدا ہوئی تھی۔ دال چاول بُری چیز نہیں اور بھوک میں تو سب اچھا لگتا ہے مگر مشکل یہ تھی کہ نازو کو امورِ خانہ داری کے سوا سب کچھ آتا تھا۔ خصوصاً کھانا پکانے میں وہ صفر تھی۔

"آج تو خیر معاف کیا"۔ غالب نے کھانے کے بعد پیٹ پکڑ کے اداکاری کی۔ "لیکن کل سے کچن میں قدم بھی رکھا تو۔۔۔"

"تو کیا؟" نازو آستین چڑھا کے بولی۔

"تو کچھ نہیں"۔ غالب نے کہا۔ "ہم سمجھ لیں گے عزیزہ کہ یہ لانچ نہیں، سی کلاس جیل ہے اور تم ایک ظالم جیلر ہو"۔

"اچھا ہوتا اگر کھانے سے پہلے تم نے چاولوں کو تھوڑا سا پکا لیا ہوتا"۔ محسن بولا۔

"تمھارا کیا مطلب ہے، پانی میں ڈال کے رکھ دیے تھے تمھارے سامنے؟"

"لگتا تو ایسا ہی ہے، جوں کے توں پیٹ میں پڑے ہیں۔ پانی اوپر، دال چاول نیچے"۔ میں نے بھی کہا۔

"حرکت کرتے ہیں تو آواز نہیں آتی تمھیں۔ پیٹ میں ایسے بج رہے ہیں جیسے جھنجھنے میں کنکر"۔

میں خود کو بالکل ایک بجنے والا جھنجھنا محسوس کر رہا ہوں"۔

نازو بھنّا کے اُٹھی۔ "کل سے خود پکاؤ کھاؤ یا پھر کرو فاقے۔ بھاڑ میں جاؤ سب میری طرف سے"۔

غالب قہقہہ مار کے ہنسا۔ "بھاڑ میں اتنے لوگوں کے لیے جگہ کہاں ہوگی۔ آپ تشریف لے جائیں تو۔۔۔"

مگر نازو اپنے کیبن میں دروازہ دھڑ سے مار کے بند ہو گئی تھی اور ہم سب کا ہنس ہنس کے بُرا حال تھا۔

کریم بلوچ نے اچانک کہا۔ "صاب! یہ کشتی واپس کرنا ہے"۔

"پھر صاب۔ تم سے کہا تھا کہ ہم یار ہیں"۔ میں نے اسے ڈانٹ کر کہا۔ "کشتی ابھی ایک گھنٹے میں واپس کرتے ہیں"۔

"ابھی کہیں جانا ہے؟" کریم بلوچ نے کہا۔

"ہاں۔ بس چلتے ہیں"۔ میں نے کہا۔ "مرزا جی تم یہاں ٹھہرو"۔

"انھیں مناؤ"۔ محسن بولا۔ "بڑا مزہ اس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر"۔

"وہ خود منائے گی مجھے۔ یہ زن مُریدی جو تو کرتا ہے نا یہ مجھے مت سکھا"۔ غالب نے کہا۔

"زن مُریدی بہتر ہے زن غلامی سے"۔ محسن بولا۔ "کوئی زر خرید غلاموں کو بھی آج کل یوں نہیں مارتا"۔

"وہ اس کی محبت کا اپنا انداز ہے"۔ غالب جھینپ کر بولا۔

"ہاں۔ ہر طرف سے ٹیڑھا ترچھا اور چپٹا کر دیا ہے۔ آدمی کم اور لوٹا زیادہ نظر آتا ہے۔ وہ بھی بیت الخلا کا"۔

"بیت الخلا تیرے دماغ میں ہے جبھی تو اولاد تک نے ماما جی کہہ دیا۔ باپ کہتے شرم آتی ہوگی اسے"۔

میں نے یہ جنگ بند کرانے کے بعد انھیں بتایا کہ اب ہمارے سفر کا مقصد کیا ہے۔ دس منٹ بعد ہم سب اس کے لیے یوں تیار ہو کے نکلے کہ سب نے کپڑے اُتار دیے اور لنگوٹ کس لیے تھے۔ نازو ہماری کھٹ پٹ سُن کے نکلی اور ہمیں بھوتوں کی طرح انڈرویئر میں ملبوس دیکھ کے پہلے تو جھجک کے رُکی پھر خود ہنسی پر قابو نہ رکھ سکی۔

"کیا سوئمنگ کا پروگرام ہے؟"

"اری او ناجو کی بچی"۔ غالب نے پھر اکھڑ لہجے میں چلّا کے کہا۔ "کیا کھی کھی کر رہی ہے بے شرم۔ چل اندر۔ ہم جا رہے ہیں کہیں"۔

"تو واپس آ جا گالب کے پوتے۔ پھر کھبر لوں گی تیری"۔ نازو نے جواب دیا اور پھر ہمیں عرشے پر سے کشتی میں جاتا دیکھتی رہی۔ میں نے اسے تاکید کی کہ اپنا خیال رکھے جو ایک فضول سی، بے مقصد بات تھی۔ وہ ہر طرح سے اپنا خیال رکھنے کی اہل تھی۔

کشتی، رات کی خاموشی میں آگے بڑھتی گئی۔ یہ ایک اندھیری رات تھی اور سمندر قدرے پُرسکون تھا پھر بھی اس چھوٹی سی کشتی کے لیے سفر ایک مشکل مرحلہ تھا۔ اس سے بھی زیادہ مشکل مرحلہ اپنی رازداری برقرار رکھنے کا تھا۔ اگر چاندنی ہوتی تو یہ کام ناممکن ہو جاتا۔

جس بار ہم جہاز کے قریب پہنچے تو عرشے پر تاریکی تھی۔۔۔ احتیاطاً ہم نے دوسری طرف بھی جا کے دیکھا۔ نیچے کسی کیبن میں سے موسیقی کا شور لہروں کی سرسراہٹ میں شامل ہو رہا تھا اور عورتوں کی ہذیانی ہنسی ان کی مدہوشی کی خبر دے رہی تھی۔ ہمارے

قرب و جوار میں دوسرے جہاز بھی تھے لیکن ایک دوسرے سے خاصے محفوظ فاصلے پر لنگر انداز تھے۔

کشتی جب جہاز کے ساتھ لگی تو ہلکی سی آواز پیدا ہوئی ہم سب سانس روکے منتظر رہے پھر کوئی عرشے پر آیا۔ اس نے چاروں طرف دیکھنے کے بعد ہی چلّا کے پوچھا ہو۔ "کون ہے؟"

میں نے اس آواز کو شناخت کر لیا۔ یہ بھوری داڑھی والا تھا۔ ہم اس کی متلاشی نظروں سے اس لیے محفوظ رہے کہ بحری جہاز بہت بڑا تھا اور اوپر ایک سائبان کی طرح پھیلا ہوا لگتا تھا اس کے نیچے یہ چھوٹی سی کشتی اندھیرے کی پناہ میں آگئی تھی۔

تقریباً دس منٹ کے بعد میں نے کشتی میں سے رسّی اُٹھا کے پھندا بنایا اور اوپر پھینکا۔ مسلسل کئی بار کوشش میں ناکام رہنے کے باوجود میں نے ہمت نہیں ہاری تھی لیکن پھر ہوا یہ کہ کریم بلوچ کو میری نااہلی پہ ترس آگیا۔

"ادھر لاؤ صاب۔" وہ سرگوشی میں بولا۔ "ہم کو دو۔"

"پھر صاب بولا مجھے۔" میں نے اسے بلا وجہ ڈانٹ کے رسّا تھما دیا۔

اس وقت مجھے خاصی شرمندگی ہوئی جب کریم بلوچ نے پہلی ہی کوشش میں ... کہیں ... کیا۔ اس نے ایک جھٹکا دے کر رسّی کی مضبوطی کو آزمایا اور پھر بولا۔

"ابھی اللہ کا نام لے کر چڑھ جاؤ۔"

"ٹھیک ہے۔ جب ہم اوپر چڑھ جائیں تو تم بھی اللہ کا نام لے کر روانہ ہو جاؤ۔" میں نے کہا۔

"آپ کو چھوڑ کر؟"

"ہاں۔ ہماری فکر مت کرو۔ ہم آجائیں گے۔" میں نے کہا۔ "تم یہ کشتی لے کر جلد از جلد دور چلے جاؤ۔"

باری باری میں اور محسن اور پھر غالب اوپر پہنچ گئے۔ جہاز کا عرشہ خالی پڑا تھا۔ ہم دبے پاؤں آگے بڑھے اور نیچے جانے کا راستہ تلاش کرنے لگے۔ ریوالور ہم نے پلاسٹک کی تھیلی میں ڈال کے کمر کے ساتھ بیلٹ کی طرح باندھ لیے تھے۔ واحد اضافی چیز جو میرے پاس تھی وہ ایک دستی بم تھا۔

نیچے جانے والا راستہ تلاش کرنے میں ہمیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ یہ ایک تنگ سا آہنی زینہ تھا جس کے دونوں جانب دیوار تھی۔ مدھم روشنی میں ہمیں ایک راہداری سی نظر آئی ہیں اور محسن غالب کو وہیں چھوڑ کے آگے بڑھے۔ جہاں سے غالب دونوں جانب نگاہ رکھ سکتا تھا۔ اوپر سے آنے والے راستے پر بھی اور راہداری پر بھی۔

راہداری بھی تنگ اور مختصر تھی موسیقی اور شراب کے نشے میں ڈوبے ہوئے لوگوں کی دیوانگی آمیز باتیں اب صاف سنائی دے رہی تھیں۔

"وہ... وہ کالا انڈین۔ واپس نہیں آیا۔"

بھوری داڑھی والا پاگلوں کی طرح ہنسنے لگا۔ "اس نے یہ کام خود کر لیا۔ خود کو ہلاک کرنے کا۔"

"وہ صدمے سے مر گیا ہوگا۔" ایک عورت نے کہا۔

"سوچو کیا ہوا ہوگا۔ جب اُس نے بریف کیس کھولا ہوگا..."

پھر وہ چیخ چیخ کر ہنسنے لگا۔ دوسرے اس کے ساتھ شامل ہو...

میں نے محسن کو اشارہ کیا اور ایک لات مار کے میں نے ... کھول دیا۔ ہم دونوں جب ایک ساتھ اندر داخل ہوئے تو ایک لمحے کے لیے وہ سب پتھر ہو گئے۔ انھوں نے اپنے بے ترتیب اور برائے نام لباس اور اپنے پوز کچھ بدلنے کی کوشش نہیں کی... کی خلوت میں شرم و حیا نام کی تو چیز ہی نہیں تھی مگر اب رنگ محفل... تو ان کا نشہ ہرن ہو گیا۔

"تم... کون ہو تم؟" بھوری داڑھی والا ہکلایا۔

"ہمیں روپ کمار کی روح نے بھیجا ہے۔ حساب برابر کرنے کے لیے۔" میں نے فرنچ میں کہا۔

"اس کا حساب تو ہم نے برابر کر دیا۔" محسن نے بھی فرنچ میں کہا۔ "اب تمھاری باری ہے۔"

"تم نے بیس ہزار ڈالر تو بچا لیے۔ اب خود کو کیسے بچاؤ گے؟" میں نے کہا۔

ان کے لیے یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ آدھی رات کو یوں ننگ دھڑنگ ان کی خلوت گاہ میں گھس آنے والے اور حلیے سے خطرناک ڈاکو نظر آنے والے انھی کی زبان میں بات کریں گے۔ انگریزی جاننے والے تو یہاں بہت تھے مگر فرنچ۔ ان کی صورت پر حیرت کی تحریر اور خوف کے جذبات، محفل نشاط کا ادھورا رہ جانے والا نشہ، نفرت، بے بسی اور اشتعال کے سب رنگ ایک بھیانک نقشہ پیش کر رہے تھے۔

"لیکن ہمارا قصور؟" بھوری داڑھی والا بولا۔

"تم نے غداروں کی مدد کی۔" میں نے کہا۔ "ہمارے ملک کے دشمنوں کے ہاتھ مضبوط کیے۔"

"اور یہ سب تم نے جانتے بوجھتے کیا۔" محسن نے کہا۔

"اپنی آخری دُعا مانگ لو۔" میں نے کہا۔

عورتوں نے ہسٹریا میں چیخ ماری۔ "یہ... یہ ہم ... کرنے آئے ہیں۔"

"سوری، خواتین!" میں نے کہا۔ "آپ کو محض ان کی ہم نشینی کی سزا مل رہی ہے۔ اپنے گناہوں کی نہیں۔"

"خدا کے لیے ہمیں جانے دو۔ ہمارا ان سے کوئی تعلق نہیں۔"

نوجوان عورت چیخنے لگی۔

"کسی تعلق کے بغیر آپ ان کے ساتھ اکیلی اتنی دور آگئی تھیں خاتون!" محسن نے طنز سے کہا۔ "یہ عجیب بات ہے کہ اچھے وقت میں کبھی بُرے وقت کی کوئی نہیں سوچتا جو بغیر بتائے آتا ہے۔"

"تاہم ایک صورت ہو سکتی ہے۔" میں نے کچھ سوچ کے کہا۔

"دیکھو تم دہشت پسند معلوم ہوتے ہو مجھے۔" بھوری داڑھی والا بولا۔

میں نے ریوالور محسن کو تھمایا اور اسے اپنے قریب بلایا۔ "میری صورت کو غور سے دیکھو کر۔" میں نے کہا۔ "دہشت پسند اور حریت پسند میں کیا فرق ہوتا ہے؟"

"او کے... او کے۔" میں نے غلط لفظ استعمال کیا اس کا افسوس ہے مجھے۔" اس نے اپنا اعتماد برقرار رکھنے میں کمی نہیں آنے دی۔ "جو میرا مطلب تھا وہ کچھ اور تھا۔ میں تم کو بہت اچھی پیش کش کرنے والا تھا۔ تم کچھ بھی مانگ سکتے ہو۔"

میرا ہاتھ بڑی تیزی سے حرکت میں آیا۔ میرا مُکّا اس کی ٹھوڑی کے نیچے یوں پڑا کہ اُس کے دانت ہل گئے ہوں گے۔ وہ اُلٹ کے پیچھے گرا تو میں نے کالر کھینچ کے اسے پھر اٹھا لیا۔ اُس نے اُٹھتے اُٹھتے مجھ پہ میرا ہی وار آزمایا اور بلا شبہ میری ٹھوڑی کے نیچے پڑنے والے کو فولادی مُکّا کہا جا سکتا تھا۔ میں بھی ایک جھٹکے سے پیچھے گیا۔

"رک جاؤ خبیث کے بچے۔" محسن نے ایک ہوائی فائر کر دیا۔ اوپر چھت تھی جس سے ایک فانوس معلّق تھا۔ یہ ایک اتفاق تھا کہ گولی فانوس کو سہارا دینے والے حصّے پر لگی۔ ادھر خواتین نے ایک دل خراش چیخ ماری ادھر فانوس نیچے آیا اور جوان آدمی کے سر پر گرا۔ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اس کی محبوبۂ دل نواز نے دوسری چیخ ماری اور نسبتاً زیادہ عمر کی عورت کے کندھے سے چمٹ گئی۔

بھوری داڑھی والا جو پھر مجھ پر حملہ کرنے کی سوچ رہا تھا رک گیا۔ اس کی نظر اپنے ساتھی پر جم گئی۔

"میرا خیال ہے کہ تم نے اسے مار ڈالا ہے۔" وہ بولا۔

"میں نے یا فانوس نے؟" محسن تمسخر اُڑانے کے انداز میں بولا۔

"اس کی گردن ٹوٹ گئی ہے۔" بھوری داڑھی والا بولا۔

"تم اپنی گردن بچاؤ۔" محسن بولا۔

"تم نے ابھی ایک پیش کش کی تھی۔" میں نے کہا۔ "بات یہ ہے کہ میں خیرات میں کچھ لینا پسند نہیں کرتا۔ خیرات میں تمھارے ساتھ ... سکتا ہے لیکن اس کے لیے تم کو چند شرائط پوری کرنا ہوں گی۔"

"کیا شرائط لیے ہو؟" وہ بولا۔ "اگر تمھیں اپنی تحریک کے لیے روپیہ پیسہ، اسلحہ یا کچھ اور چاہیے تو بولو۔ ہم نہ تمھارے دشمن ہیں نہ ان کے دوست۔ جن کے خلاف تم لڑ رہے ہو۔ ہم تمھارے لیے بھی وہی کر سکتے ہیں جو ان کے لیے کیا۔"

"تم بزنس کرنا چاہتے ہو لیکن ہم بزنس مین نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔ "میں تمھاری جاں بخشی کر سکتا ہوں اگر تم چند سوالات کے جوابات بالکل ٹھیک دے سکو۔"

وہ متوقع نظروں سے مجھے دیکھتا رہا۔

"ایک تو یہ بتاؤ کہ آج سے پہلے تم کیا کچھ لاتے ہو؟ کب سے لا رہے ہو اور کس کے لیے؟"

"میں تیسری بار آیا ہوں۔" وہ بولا۔ "ہر مرتبہ مجھے ایک نیا آدمی ملتا ہے جو نئی لسٹ دیتا ہے۔"

"گزشتہ بار تم کس سے ملے تھے؟"

"ظاہر ہے انھوں نے خود کو متعارف نہیں کرایا تھا اور کرایا بھی تھا تو ان کا تعارف درست نہیں ہو سکتا۔" وہ بولا۔ "...تاہم اتنا میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان میں بنگالی تاجر تھے اور کچھ تمھارے اپنے سرکاری محکموں کے حکام۔ ففتھ کالم کے لوگ۔"

"اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ ففتھ کالم سے تعلق رکھتے ہیں، تم نے ان سے بزنس کیا۔ ایک ملک کے عوام کی آزادی اور ملک کی سلامتی کے خلاف کام کرنے والوں کی مدد کی۔"

"مدد! یہ بزنس تھا۔"

"اگر کوئی تم سے کہے کہ میں آرک بشپ کو یا پاپائے روم کو قتل کرنا چاہتا ہوں، کوئین پر بم پھینکنا چاہتا ہوں اور تم اس کام میں میری مدد کرو۔ تو تم مدد کرو گے؟ پیسہ لے کر اسے ہتھیار فراہم کرو گے؟" میں نے کہا۔

وہ خاموش کھڑا رہا۔ اس کی خاموشی ہی میرے سوال کا جواب تھی اور اعترافِ جرم بھی۔ وہ بھی دہرے معیاروں کی دنیا کا آدمی تھا۔ آزادیٔ اظہار، احترامِ آدمیت، جمہوری عقائد و نظریات، انسانی اخوت اور ایسے ہی بہت سے دلکش الفاظ اس وقت اپنے معنی کھو بیٹھتے ہیں جب ان کا اطلاق اپنے دشمنوں پر، محکوم اقوام پر اور مخالف و متصادم اصولوں پر ہو۔

"تم نے ایک جرم کا اقرار کیا کہ کسی بھی ملک کی بقا اور اس ملک کے عوام کی آزادی کے خلاف کام کرنے والوں کی مدد کرنا غداروں کا ساتھ دینے کے مترادف ہے۔" میں نے کہا۔

"میں نے۔ یہ نہیں کہا۔" اس نے احتجاج کیا۔

"تمھارے جہاز پر اور کیا آیا تھا؟" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "اور جہاز ... ہے؟"

"ہم اسلحہ بھی لائے تھے۔" بھوری داڑھی والے نے جھوٹ

کو بے فائدہ سمجھتے ہوئے کہا۔ "وہ پہلے ہی جا چکا تھا۔ جہاز کے عملے کے باقی ارکان ٹھہر گئے ہوئے ہیں۔"

"کچھ اسلحہ ہمیں بھی چاہیے" میں نے کہا۔

"کس قسم کا؟" بھوری داڑھی والا بولا۔

"ہمارے پاس یہ ایک ہی دستی بم ہے۔" میں نے کہا۔

"سوری۔ اس وقت تو نہیں لیکن اگلے پھیرے میں تم جتنے دستی بم مانگو گے فراہم کر دیے جائیں گے۔"

"اتنا وقت نہیں ہے ہمارے پاس۔"

"فوری طور پر تو میں کچھ خودکار رائفلیں، مشین گن کے راؤنڈز!!"

"میں نے نفی میں سر ہلایا۔" یہ ہم خود بھی تلاشی لے کر سمیٹ لیں گے۔"

"میں ایک خاص آئٹم دے سکتا ہوں۔ ویری اسپیشل۔ جس کی بات ابھی چل رہی ہے مگر مجھے معلوم ہے کہ کل تک وہ منہ مانگی قیمت دیں گے تاہم یہ مت سمجھنا کہ تم اسے آسانی سے تلاش کر لو گے۔"

"وہ کیا چیز ہے آخر؟"

"ٹائم بم چین ری ایکشن ڈیوائس کے ساتھ۔ مقررہ وقت پر پہلا دھماکا ہوتا ہے پھر وقفے وقفے سے دوسرے چھ دھماکے ہوتے ہیں۔ درمیانی وقفہ تم خود سیٹ کر سکتے ہو جو پانچ سے پچپن منٹ تک ہو سکتا ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔" میں نے جان بوجھ کے اپنی کم عقلی کا اظہار کیا۔

"فرض کرو تم کسی پل پر یا کسی ٹرین میں یہ بم نصب کرتے ہو۔ اتنے فاصلے سے کہ پل یا ٹرین مکمل طور پر تباہ ہو جائیں۔ اس کے لیے تم بارہ بجے کا وقت رکھتے ہو تو پہلا دھماکا بارہ بجے ہو گا۔ اس کے بعد کے وقت کو تقسیم کر لو۔ دھماکے پانچ پانچ منٹ بعد بھی ہو سکتے ہیں۔ دس دس منٹ بعد بھی۔" وہ بولا۔

"یہ اچھی چیز ہے۔ کیا تم ہمیں دکھا سکتے ہو؟"

"پہلے تم کو وعدہ کرنا ہو گا کہ اس کے بعد تم چلے جاؤ گے۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"میں کیسے اعتبار کر لوں؟"

"قرآن ہماری مقدس کتاب ہے۔ ہم اس کی قسم نہیں کھاتے اور کھالیں تو پھر جان دے کر بھی قسم پوری کرتے ہیں۔ میں اُسی کی قسم کھا کے کہتا ہوں کہ میں تحفہ لے کر اور تمہارا شکریہ ادا کر کے خاموشی سے لوٹ جاؤں گا۔"

اس نے سر ہلایا اور مجھے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ میں نے باقی سب کو محسن کی نگرانی میں چھوڑا اور اس کے ساتھ ایک تہ خانے جیسی جگہ میں گیا۔ وہاں اُس نے فرش کا ایک خفیہ خانہ کھولا۔ اس میں ڈالر اور پونڈ یوں بھرے ہوئے تھے جیسے کاغذ ٹھونس ٹھونس کے بھرے جائیں۔ میں اس دولت کی مجموعی مالیت کا اندازہ نہ کر سکا جس سے لہو کی بُو آتی تھی۔ ان گنت، انجانے بے گناہ لوگوں کے لہو کی جو ایسے ہی لوگوں کی ہوسِ زر میں مارے گئے۔

اس تہ خانے میں سے بھوری داڑھی والے نے خاصی محنت سے گتے کا ایک ڈبا نکالا۔ پھر دوسرا نسبتاً چھوٹا ڈبا برآمد کیا۔

"یہ کم از کم دس لاکھ دلوا سکتا تھا مجھے لیکن میں زندگی بچانے کے لیے دس لاکھ چھوڑ رہا ہوں۔" وہ بولا۔

"تم عقل مند آدمی ہو۔" میں نے طنز سے کہا۔

وہ دونوں ڈبے لے کر اوپر آیا۔ اس نے مجھے سمجھایا کہ انھیں کس طرح جوڑا جا سکتا ہے۔ یہ بہت آسان کام تھا۔ اُس کی بات محسن نے بھی سمجھ لی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ میں وعدے کے مطابق جا رہا ہوں۔" میں نے اس سے ہاتھ ملا کے کہا۔ "تمھیں قتل کیے بغیر۔"

"لیکن میں نہیں جا رہا ہوں۔" محسن بولا۔ اور اس نے آگے بڑھ کے دونوں ڈبے اُٹھا لیے۔ "کیونکہ نہ میں نے قسم کھائی تھی اور نہ تم سے کوئی وعدہ کیا تھا۔"

"تم... بدمعاش۔ دھوکے باز۔" بھوری داڑھی والا چلّانے لگا۔

"تم نے ٹرین کا ذکر کیا اور پُل کا ذکر کیا۔ اپنے جہاز کو تم نے کیوں نظر انداز کر دیا؟" محسن بولا۔ "ہم اس کا تجربہ اسی جہاز پر کیوں نہ کر لیں۔"

"میں تو جا رہا ہوں۔ میں قسم توڑنے کا گناہ نہیں کر سکتا اور صرف ایک لائف بوٹ لے کر جا رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"اب تم خود ٹائلٹ میں رضا کارانہ طور پر بند ہونا پسند کرو گے یا...؟" محسن نے جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔

میں سیٹی بجاتا ہوا اوپر آ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ اب باقی کام محسن اور غالب کریں گے۔ جہاز کے عرشے کی ریلنگ سے لائف بوٹس بندھی ہوئی تھیں اور ان میں ہوا بھی بھری ہوئی تھی۔ میں نے ایک لائف بوٹ کھولی اور سمندر میں پھینک دی پھر میں نے بھی پانی میں چھلانگ مار دی۔

چپّو لائف بوٹ کے کنارے پر بندھے ہوئے تھے۔ ان کی مدد سے لائف بوٹ کو تقریباً سو گز دور لے گیا۔ اب آدھی سے زیادہ رات گزر چکی تھی۔ سمندر کے نیم روشن، سیاہ آسمان اور کالے پانی کے صحرا پر ان گنت ستارے روشن تھے جن کا عکس متحرک نظر آتا تھا۔ یہ سب کشتیوں، لانچوں اور دیوپیکر بڑے بڑے بحری جہازوں کی روشنیاں تھیں۔

بم کتنی طاقت کا تھا، اس کا مجھے اندازہ نہیں ہو سکتا تھا لیکن خوشی مجھے اس بات کی تھی کہ میری چال کامیاب رہی اور صیاد خود اپنے دام میں ... [illegible] ... ہو گیا ... [illegible] ... تقدیر کو ... [illegible] ... کا غلام سمجھنے والے، دولت کو راستہ اور منزل بتانے والے وقت کے کسی اندھے موڑ پر اچانک جان دیتے ہیں۔ زعم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے۔

پہلا دھماکا بیس منٹ بعد بھی نہیں ہوا تھا لیکن اس سے مجھے تشویش نہیں تھی۔ محسن کو دھماکوں کا سلسلہ بحری جہاز کے طول و عرض میں پھیلانا تھا اور اس طرح کہ چین ری ایکشن ختم ہو تو سب ختم ہو چکا ہو۔ اس کے لیے وہ صحیح جگہ کا انتخاب بھی کرے گا اور پورے جہاز کو گھوم پھر کر دیکھنے میں وقت تو لگتا ہی ہے۔

پانی میں چپّو چلانے کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ یہ کریم بلوچ تھا جو اپنی چھوٹی سی کشتی گھسیٹتا ہوا میرے قریب آ گیا تھا۔

"کون ہے؟" میں نے اس کے تاریک سائے کو دیکھ کر ریوالور کا رُخ ادھر ہی کر دیا۔

"ہم کریم بلوچ ہے صاب!"

"کریم! تم گئے نہیں؟" میں نے اس وقت کہا جب دونوں کشتیاں مل چکی تھیں۔

"نہیں صاب۔ ہم سب طرف گھومتا تھا۔ دیکھتا تھا آپ کو۔" کریم بلوچ نے کہا۔ "دوسرا صاب لوگ کدھر ہے؟"

اسی وقت پہلا زوردار دھماکا ہوا۔ کریم بلوچ اچھل پڑا۔ "یہ... یہ تو اسی جہاز پر!"

"ہاں کریم۔" میں نے کہا۔ "لیکن فکر کی کوئی بات نہیں، وہ بھی آتے ہی ہوں گے۔"

جہاز کے ایک حصّے میں آگ بھڑک اٹھی تھی اور اس نے پہلے دھماکے پر جو ہچکولے کھائے تھے اس نے سمندر میں بھی تموّج پیدا کر دیا تھا۔ سو گز کے فاصلے پر ہم نے ان لہروں کو کشتی سے ٹکراتے محسوس کیا۔ میری نگاہ اب درمیانی فاصلے پر تھی جس میں مجھے دو سیاہ متحرک دھبے سے دکھائی دے رہے تھے۔ یہ غالب اور محسن تھے جو تیرتے ہوئے ہماری طرف آ رہے تھے۔

دوسرا دھماکا پانچ منٹ بعد ہوا۔ جہاز کا کچھ اور حصہ آگ کی لپیٹ میں آ گیا۔ اس کی حرارت سے متاثر ہونے والے خودکار الارم بجنے لگے۔

جیسے ہی وہ قریب آئے، میں نے ہاتھ بڑھا کے محسن اور غالب کو اوپر کھینچ لیا پھر تیسرا دھماکا ہوا اور یکلخت جیسے پورا جہاز جلنے لگا۔ نارنجی شعلے بلند ہوئے تو ان کا عکس پانی میں اُتر آیا۔

"اب فوراً نکل چلو یہاں سے۔" محسن نے کہا۔ "ورنہ ہم بھی چکر میں پڑ جائیں گے۔ نیول پولیس اور پورٹ کا آگ بجھانے کا عملہ ایمرجنسی کے اعلان کے ساتھ ہی حرکت میں آ چکا ... ہو گا۔"

غالب کو تیرنا نہیں آتا تھا چنانچہ اسے بھی محسن ہی گھسیٹ کر لایا تھا تاہم لائف جیکٹ دونوں نے پہن لی تھی، اس لیے وہ ڈوب نہیں سکتے تھے۔ جہاز کی طرف سے آنے والی لہریں بھی ان کو ہماری جانب دھکیلتی رہی تھیں۔

آدھے گھنٹے تک دونوں کشتیاں ساتھ ساتھ چلتی رہیں۔ کریم بلوچ نے وہ کشتی واپس کی جو اُس نے کرائے پر لی تھی۔ ہم نے اس کا کرایہ سو روپے ادا کیا اور پھر لائف بوٹ میں کریم بلوچ کو لے کر اپنی کشتی نما لانچ کی طرف روانہ ہو گئے۔

نازو عرشے پر سے جہاز کے جلنے کا منظر دیکھ رہی تھی اور بہت خوش تھی۔

"کاش میرے پاس مووی کیمرا ہوتا!" اس نے کہا۔

"پھر کیا ہوتا؟" غالب نے چڑ کے کہا۔

"ایسا منظر میں نے آج تک نہیں دیکھا۔"

"لیجیے کسی کی جان گئی آپ کی ہنسی ٹھہری۔" غالب نے کہا۔ "ہم مرتے مرتے بچے۔ جان ہتھیلی پر رکھ کے گئے تھے۔ اس کی کوئی بات ہی نہیں۔"

"کیا بات کروں اس کی۔ ٹھیک ٹھاک واپس آ گئے ہو۔ اللہ کا شکر ادا کرو۔" نازو نے کہا۔

"میں ٹھیک ٹھاک واپس نہ آتا تو کیا ہوتا؟"

"میں تمھارے لیے مغفرت کی دعا کرتی جیسے میں نے دو نفل پڑھ کے تمھاری سلامتی کے لیے دعا کی تھی۔"

"تم نے نفل پڑھے تھے میرے لیے؟" غالب نے ایک چیخ ماری۔ ایک قلابازی کھائی اور دوڑتا ہوا نیچے چلا گیا۔

"صرف تمھارے لیے نہیں، تم سب کے لیے۔" نازو نے چلّا کے کہا مگر یہ بات غالب نے سنی ہی نہیں۔

ہم پھر لباس بدل کے اوپر پہنچے تو پورا آسمان سُرخ ہو رہا تھا اور بندرگاہ کی طرف خاصی گہما گہمی دکھائی دیتی تھی لیکن یہ سب بے سود تھا۔ محسن نے ایک ماہر شکاری کی طرح دھماکوں کا جال پھیلا دیا تھا۔ چھ دھماکے ہو چکے تھے اور جہاز اب اپنی شعلہ فشانی کے ساتھ یوں سمندر میں غروب ہو رہا تھا کہ یہ منظر واقعی فلم پر محفوظ کرنے کے قابل تھا۔ وہ ایک آتش فشاں تھا جسے بالآخر بحیرۂ عرب کی دوخار گہرائی نے نگل لیا۔

ایک گھنٹے بعد رات کے اندھیرے کی حکمرانی پھر قائم ہو گئی۔ غالب اتنی دیر میں نازو کو خاصے مبالغے اور رنگ آمیزی کے ساتھ اپنی داستانِ شجاعت سنا چکا تھا اور اس کی بات سے یہی ثابت ہوتا تھا کہ سب اُس نے اکیلے ہی کیا۔ میں اور محسن تو بس احمقوں کی

طرح کھٹتے رہے۔ ہم نے اسکے اندا... پہ کوئی تبجاتہ نہیں...
ان سے ہماری کوئی نقصان نہیں ... تھا۔ غالب ایک عاشق...
اپنی ... کو متاثر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایسا کون نہیں کرتا۔

جب کھیل ختم ہو گیا تو مجھے نیند کا غلبہ محسوس ہوا۔ ہم دونوں یعنی میں اور محسن نیچے اتر گئے۔ وہ دونوں یعنی نازو اور غالب عرشے پر بیٹھے رہے۔

"یار، وہ اپنے سابق تھانیدار سے ملاقات نہیں ہوئی۔" محسن نے میرے قریب والے تختے پر لیٹ کر کہا۔

"وہ آیا تو ہوگا مگر ہم کیسے ملتے اس سے؟" میں نے کہا۔ "وقت کم تھا۔"

"کیا اس بحری جہاز کی تباہی سے وہ چوکنے نہیں ہو جائیں گے؟" محسن نے کہا۔

"وہ یقیناً سمجھ جائیں گے کہ جہاز تباہ کیوں ہوا اور کس نے تباہ کیا۔"

"پھر کیا اس کے بعد وہ حفاظتی اقدامات زیادہ سخت نہیں کریں گے؟" محسن نے کہا۔ "اور ایس ایس کرانتی تھرڈ کو جلد از جلد نکال کر لے جانے کی کوشش نہیں کریں گے؟"

"کیوں نہیں کریں گے مگر ہم بھی تو سوتے نہیں رہیں گے۔" میں نے جھلا کے کہا۔ "ابھی تو مجھے سونے دو۔"

"سوجا سوجا۔ تجھے خواب دیکھنا ہوگا نا؟" محسن بولا۔

"تجھے کس نے منع کیا ہے خواب دیکھنے سے؟"

"شریف شوہر ایسے خواب نہیں دیکھتے۔ جیسے تو دیکھے گا۔"

"نہ تو شریف ہے اور نہ شوہر۔ تو جورو کا غلام ہے۔ اب بولے گا تو ماروں گا۔" میں نے کہا۔

ظاہر ہے، اس کے بعد محسن کو بولنے سے کون روک سکتا تھا۔ اس نے ایک بے سرو پا تقریر کی جس کے دوران ہی نیند نے مجھے آلیا۔ معلوم نہیں میں کتنی دیر سویا تھا کہ ایک دھماکے نے مجھے تختے سے نیچے لڑھکا دیا۔

میں نے گھپ اندھیرے میں اجنبی آوازیں سن کے محسن کو پکارا لیکن محسن وہاں نہیں تھا۔ میرے کانوں سے نازو کی چیخ ٹکرائی۔ میں دروازے کی طرف لپکا ہی تھا کہ میرے سر پر کوئی بھاری چیز لگی۔ نیم بے ہوشی کے عالم میں مجھے دو مضبوط ہاتھوں نے دونوں طرف سے پکڑا اور گھسیٹ لیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میرے سر کے اندر بھی ہتھوڑے سے چل رہے تھے۔ اور باہر بھی۔ آہستہ آہستہ آوازوں کا فرق مجھ... واضح ہونے لگا... کی آوازیں لکڑی... کے... کیلیں ٹھونکنے کی تھیں اور میں اس لکڑی کے باکس کے اندر بند کیا جا رہا تھا۔

یہ سمجھ میں نہ آنے والی بات تھی۔ مجھے اس طرح صندوق میں کون بند کر سکتا ہے! کیا وہ شکاری تھے جو ... لگ کے لانچ پر آنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ انھوں نے ... سب کے ساتھ گرفتار کر لیا تھا اور اب ہمارے ساتھ اس سے بھی بدتر سلوک ہونے والا تھا جو ہم نے رو... کے ساتھ کیا تھا۔ اسے ہم نے پلاسٹک کی تھیلی میں پیک کر کے سمندر میں ڈالا تھا۔ ہمیں باقاعدہ تابوت میں ڈال کر عدم آباد پہنچایا جا رہا تھا۔

اس آخری خیال نے مجھے شک میں ڈال دیا۔ عدم آباد پہنچانا مقصود ہوتا تو وہ اتنی زحمت کیوں اٹھاتے۔ تابوت وغیرہ کا تکلف بالکل بے مقصد تھا۔ وہ ہمیں اسی بے ہوشی میں سپرد آب کر دیتے تو کافی تھا۔

میں اٹھ بیٹھا اور تب مجھے اس بات پر بھی حیرانی ہوئی کہ میں آزاد تھا۔ نہ میرے ہاتھ پیر باندھے گئے تھے اور نہ میرا منہ بند کرنے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ پھر یہ سب کیا تھا۔

میں نے کھڑا ہونے کی کوشش کی اور دھڑام سے گرا۔ مجھے چکر آگیا تھا اور نقاہت کے باعث میں متحرک و متلاطم فرش پر اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا تھا۔ اس سے مجھے اتنا اندازہ تو ہو گیا کہ میں کسی لانچ یا جہاز پر ہوں۔

میں نے ادھر ادھر ہاتھ پھیلا کے دیکھا تو یہ بھی واضح ہوا کہ وہ باکس ہرگز نہیں تھا۔ کوئی چھوٹا سا کیبن تھا اور ہتھوڑے سے ٹھونکنے پیٹنے کی ساری آوازیں اس کی بیرونی سطح سے میرے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔

میں نے یاد کیا کہ اس کیبن میں پہنچنے سے پہلے میں کہاں تھا۔ ہاں... میں اور محسن لانچ میں نیچے سونے کے لیے آگئے تھے۔ غالب اور نازو کو اوپر عرشے ہی پر بیٹھا چھوڑ کے۔ پھر... پھر میں سو گیا تھا اور ایک دھماکے سے جاگا تھا۔ میرے سر پہ کوئی چیز لگی تھی۔

میں دوسری بار ہمت کر کے اٹھا اور کیبن کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ یہ مشکل سے چھ فٹ لمبا چوڑا اور اتنا ہی اونچا کیبن تھا۔ اس کی چھت میرے سر سے دو انچ ہی اوپر تھی۔ اچانک میرے ہاتھوں نے دروازے کے قبضے کو محسوس کیا۔ پھر ہینڈل میری گرفت میں آگیا۔ میں نے اسے کھینچا تو دروازہ کھل گیا۔

ایک لمحے کے لیے مجھے اپنی آنکھوں پہ یقین نہ آیا۔ باہر دن کا اجالا تھا اور مجھ تک یہ روشنی اوپر سے آرہی تھی۔ روشنی کے ساتھ میں وہ آوازیں بھی سن سکتا تھا جو میرے لیے اجنبی نہیں تھیں۔

آوازیں ساری مونس و غمخوار تھیں، مہربان اور دلنواز آوازیں تھیں۔ محسن کی اور غالب کی۔ پھر نازو کی ہنسی کی جلترنگ پھوٹی اور میرے وجود کا سارا درد ایک بے پایاں مسرت کے احساس سے بھر گیا۔ یہ ہونے کے علاوہ میں اپنی ہی لانچ پہ تھا اور اپنوں ہی میں تھا۔ میرا سر ہی نہیں، شانے اور کمر بھی درد سے ٹوٹ رہے تھے۔ مگر ایک بھیانک خواب کا حوصلہ شکن آسیب ختم ہو چکا تھا۔

چوبی دیوار کا سہارا لے کر میں نے آنکھیں بند کر لیں اور اس خدائے رحیم کا شکر ادا کیا جو زندگی دیتا ہے اور اس کی حفاظت کا حوصلہ اور اسے رواں دواں رکھنے کی خواہش اور اس سے مستفید ہونے کے لیے امید کا وسیلہ بھی فراہم کرتا ہے۔

یہ لانچ کے بالکل آخری حصے میں واقع مختصر سا اسٹور تھا۔ جس میں کریم بلوچ نے اپنا بیڈ روم بنا لیا تھا۔ اب میں دیواروں پہ چسپاں رنگین فلمی و غیر فلمی تصاویر بھی دیکھ سکتا تھا۔ اس میٹریس کو بھی جس پر میں دراز تھا اور چند دوسری ذاتی استعمال کی چیزوں کو بھی۔

میں نے زینے پہ قدم رکھ کر اوپر چڑھنے کی کوشش کی تو مجھے پھر چکر سا آیا۔ میں نے دیوار کا سہارا لے کر محسن کو آواز دی۔ بیک وقت میں نے بہت سے دوڑتے قدموں کی صدا سنی۔ پھر زینے کے اوپر والے روشن حصے میں محسن کا ہیولا نمودار ہوا۔ وہ تیزی سے نیچے آیا۔ اس کے پیچھے غالب تھا۔

"اٹھ گیا نیند پوری کر کے؟" محسن نے مجھے سہارا دے کر کہا۔ "کیا دیکھا خواب میں؟"

"یار... بڑا ڈراؤنا خواب تھا۔" میں نے سر تھام کے کہا۔

"شادی سے پہلے تو ڈراؤنے خواب نہیں آتے۔" محسن نے کسی ڈاکٹر کی طرح سر ہلایا۔ "یہ غالباً چوٹ کا اثر ہے۔"

"اسے اندر لے جا کے لٹانا زیادہ ضروری ہے۔" غالب بولا۔

"نہیں، میں ٹھیک ہوں۔" میں نے کہا۔ "مجھے اوپر... کھلی ہوا میں لے چلو۔"

"پہلے تمھارا میڈیکل چیک اپ تو ہو جائے۔" محسن بولا۔ "اگر تم نارمل ہو یا نہیں، تمھاری یادداشت تو گم نہیں ہوئی؟"

"یہ کیا فضول باتیں شروع کر دی ہیں۔" نازو نے کہا۔

"ایسا اکثر ہوتا ہے فلموں میں۔ چوٹ نمبر وَن سے یادداشت چلی جاتی ہے۔ فلم کے آخر میں چوٹ نمبر دو سے واپس آتی ہے۔" محسن بولا۔ "تو اگر یہ ضروری ہوا...؟"

غالب نے مجھے دوسری طرف سے سہارا دیا۔ میں قدم قدم اوپر بڑھنے لگا جہاں نازو کا روشن مسکراتا چہرہ ایک آفتاب تھا۔

"کیا ضروری ہوا؟"

"کہ چوٹ نمبر دو لگانا۔ اس کے لیے وہ لکڑی کا فیملی سائز ہتھوڑا ہے۔" محسن بولا۔

"کیوں نہ وہ میں تمھارے سر پر استعمال کروں۔" غالب بولا۔ "تاکہ تمھاری یادداشت گم ہو جائے، پھر تمھاری شکل گم ہو جائے۔"

عرشے پر پہنچ کے میں نے خود کو بہت بہتر محسوس کیا۔

"ہاں تو چیف کے ٹو!" محسن نے مجھے آرام سے بٹھا کے کہا۔ "تم کو کچھ یاد ہے کہ تم پچھلے جنم میں کیا تھے؟"

"حافظے سے پہلے نظر ٹیسٹ کرو۔" غالب بولا۔ "ادھر اوپر دیکھیے! اپنے سکندرِ اعظم صاحب! یہ سورج ہے یا چاند، کچھ نظر آرہا ہے؟"

"مجھے دن میں تارے نظر آرہے ہیں۔" میں نے زبردستی مسکرا کے کہا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ مجھے چیئر اپ کرنے کے لیے یہ مذاق کر رہے تھے، مگر نازو پر یہ بھی گراں گزر رہا تھا۔

"آپ انھیں بولنے دیں۔ میں ابھی بلیک کافی لے کر آتی ہوں۔" نازو نے کہا۔ وہ میرے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھی ہوئی تھی۔ اور اس کی صورت پر تھکن کے آثار عیاں تھے۔ جب وہ اٹھی تو میں نے اس کی آنکھوں کے حلقوں کو بھی دیکھا جو بے خوابی کا نتیجہ تھے اور میں نے ایک جھلک اس نمی کی بھی دیکھی جو ان آنکھوں میں اتر آئی تھی۔ یہ آنکھوں تک آکے لوٹ جانے والے آنسو دو متضاد جذباتی کیفیات کی عکاسی کرتے تھے۔ ان میں احساس کا درد بھی تھا اور جذبات کی سرخوشی بھی۔ انھی متصادم جذبات کے توازن کی قوت نے اشکوں کو چھلکنے نہیں دیا۔

محسن نے میرے قریب بیٹھ کے مجھے ایک سگریٹ پیش کی۔ غالب نے سگریٹ چھین کے پانی میں پھینک دی۔ "ہوش آیا نہیں ابھی اور نشہ پہلے شروع ہو گیا۔ دھواں دھار۔"

"ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں۔" محسن نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کے کہا۔ "بندر کیا جانے ادرک کا سواد اور گدھا کیا جانے زعفران کا بھاؤ۔ اسی طرح کہا جا سکتا ہے کہ غالب کیا جانے سگریٹ کا لطف۔"

"یار یہ ہوا کیا تھا آخر؟" میں نے ان کی لڑائی کو آغاز سے قبل ہی روک دیا۔

"کیسے کیا ہوا تھا اور کہاں کیا ہوا تھا؟" محسن بولا۔

"مجھے کیا ہوا تھا۔ ہماری لانچ میں وہ دھماکا کیسا تھا؟" میں نے اس کے بائیکاٹ کے انداز کو نظر انداز کر دیا۔

"ایک ماہی گیری کا جہاز جس کی نظر خاصی کمزور تھی اور جو عینک لگائے بغیر آگیا تھا۔" غالب نے کہا۔ "وہ ہمیں نہ دیکھ سکا۔"

"اس کی قریب کی اور دور کی نظر غالب سے بھی زیادہ کمزور تھی۔" محسن نے کہا۔

"یا شاید اس کے انجن میں غلطی سے ڈیزل اور پٹرول کی بجائے شراب ڈال دی گئی تھی۔ وہ محسن کی طرح چل رہا تھا۔"
غالب نے فوراً بدلہ لے لیا۔ "تصادم سے نقصان تو زیادہ نہیں ہوا۔ آواز واقعی ایسے آئی تھی جیسے بم کا دھماکا ہوا ہو۔"
"تم دونوں بلکہ تینوں اس وقت کہاں تھے؟ میرا مطلب ہے تمھیں کچھ نہیں ہوا۔"
"جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔" محسن بولا۔ "مجھے نیند نہیں آ رہی تھی چنانچہ میں ایک فلم دیکھنے چلا گیا۔"
"فلم دیکھنے! آدھی رات کو۔" میں نے حیرانی سے کہا۔
"ہاں، پاکیزہ محبت کی ہر لازوال کہانی کا نیا ایڈیشن۔ لیلیٰ مجنوں اور رومیو جولیٹ کے بعد پاکستان کا تاریخ ساز رومانس۔"
"یہ ایک بہت گھٹیا حرکت کی تھی آپ نے۔"
"ہاں، کی تھی۔ ہمت تھی تو کچھ بگاڑ لیتے میرا۔" محسن نے ڈھٹائی سے کہا۔ "کمال ہے! اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔"
"چوری ہم نے کی، تم نے چوری چوری باتیں سنیں ہماری۔" غالب نے مسکرا کے کہا۔
"تم ایسی باتیں کیوں کر رہے تھے جو میں چوری چوری سننے پر مجبور ہوا۔" محسن بدستور ڈھیٹ بنا رہا۔
"ہم ایسی کوئی بات نہیں کر رہے تھے۔"
"تو پھر غصہ کس بات کا؟ اگر میں نے کچھ سُن لیا۔ کہو تو چند اقتباسات پیش کروں۔ چیئرمین سنسر بورڈ کے سامنے۔"
اسی وقت نازو کافی کے مگ لیے نمودار ہوئی۔
"ہاں، ہاں، ضرور پیش کرو۔" غالب نے کہا۔ "ہو جائے فیصلہ اسی وقت۔"
"کس بات کا فیصلہ؟" نازو نے کہا جسے نزع کا سبب معلوم ہی نہیں تھا لیکن غالب کو اب کون روک سکتا تھا۔
"بولو، اب چُپ کیوں ہو گئے۔ بھیگی بلی کیوں بن گئے ابھی شیر کی طرح غرّا رہے تھے۔" غالب نے کہا۔
"ارے بھئی، ہم ڈرتے تھوڑی ہیں کسی سے۔" محسن نے چالاکی سے کہا۔ "منہ پر صاف بات کہتے ہیں۔ یہی تو کہا تھا نا میں نے کہ تم کسی طرح بھی نازو کے لائق نہیں۔ کہاں تم کہاں وہ۔ تم گدھے اور وہ زعفران، تم بندر اور وہ ادرک۔"
"جھوٹ... جھوٹ۔" غالب نے شور مچایا۔ "یہ کہا تھا...؟"
"اب وہ بھی بتا دوں جو تم نے نازو کی فطرت کے بارے میں کہا تھا کہ صورت کو میں کیا کروں، جب وہ بات بات پر بھینس کی طرح ٹکساری ہے اور دولتی چلاتی ہے کس کی طرح..."
نازو نے گھور کے غالب کو دیکھا اور سخت برہمی کا اظہار کرتی ہوئی اٹھی۔ "یہ بات ہے؟"
"ارے نازو!" غالب اس کے پیچھے دوڑا۔ "یہ اُلو کا پٹھا بکواس کرتا ہے... قسم خُدا کی۔"
"یہ بھی بتا دینا کہ تم نے کہا تھا بعد میں گن گن کے بدلے لوں گا۔ پاؤں کی جوتی بنا کے رکھوں گا اور ہر سال..." بات ختم ہونے سے پہلے ہی اسے ہنسی آ گئی کیونکہ غالب اور نازو محسن کی غلط بیانی سے بھٹن گئی تھی۔ اور غالب سے اب بات نہیں بن رہی تھی۔
"ابھی اسے دو ہاتھ مار کے سمندر میں پھینک دے تو پیسے وصول ہو جائیں۔" محسن نے ہاتھ مل کے خوشی سے کہا۔
میں نے کہا۔ "تو واقعی چھپ کے باتیں سننے گیا تھا تو ان کی..."
"اب میں اتنا گرا ہوا بھی نہیں ہوں۔" محسن سنجیدہ ہو گیا۔ "وہ تو اتفاق ہے کہ میں اوپر جا رہا تھا۔ اب ناک کر کے تو جا نہیں سکتا تھا۔ اور یہ بھی نہیں پوچھ سکتا تھا کہ مے آئی کم اِن لیڈیز اینڈ جنٹلمین۔" وہ ہاتھ کھڑا کر کے بولا۔ "میں نے زینے میں رک کر سوچا کہ پہلے دیکھ لوں۔ یہ دونوں ہیں کہاں... اور کس موڈ میں ہیں، اسی وقت غالب اوپر سے نیچے آیا۔ اس کے پیچھے نازو بھی بدحواس آ رہی تھی۔ دراصل انھوں نے دیکھ لیا تھا کہ کوئی جہاز سیدھا ہماری طرف آ رہا ہے۔ یہ دونوں ہمیں بتانے کے لیے لپکے تھے۔ غالب نے پہلے مجھے دیکھ لیا۔ اس وقت تو چُپ رہا۔ بعد میں ہوئی یہ بات۔ جو غالب نے ابھی کی تھی۔"
"میں تو سوتے میں نیچے گرا۔ اور اس وقت میری عجیب ذہنی کیفیت تھی۔" میں نے کہا۔ "کچھ اجنبی آوازیں سنیں میں نے اور میں نے دیکھا تو اندر اندھیر اگھپ۔ میں نے تمھیں آواز دی۔"
"ہاں، میں نے سنی تھی آواز۔ میں اور غالب فوراً پہنچ بھی گئے تھے۔"
"میرے سر پہ نہ جانے کیا لگا تھا۔ غالباً اوپر سامان کے شیلف پر سے کوئی چیز گری تھی مگر نیند اور... اس ذہنی کیفیت میں مجھے تو ایسا لگا جیسے کسی نے میرے سر پہ وار کیا ہو۔ پھر شاید تم دونوں نے ہی مجھے سنبھالا تھا... تو میں سمجھا کہ پکڑا گیا اور غالباً شکاری آ پہنچے۔"
"لانچ تو بس اُلٹتے اُلٹتے رہ گئی۔ حالانکہ تصادم تو برائے نام ہی تھا۔ تصادم ہوتا تو لانچ کے پرخچے اڑ جاتے۔ جہاز نے صرف مس کیا تھا۔ سامنے والے حصے کو چُھوا تھا۔ اس کے ناخدا نے آخری وقت میں کوشش کی تھی ہمیں بچانے کی۔ اس کے عرشے پر جو لوگ کھڑے ہوئے تھے وہ سب ماہی گیر تھے روسی ٹ...

جیسے وہ لوگ تھے۔ انھوں نے دیکھ لیا تھا کہ ٹکر ہوئی ہے، پہلے تو وہ چلائے اور پھر ایک دم کود پڑے سمندر میں اور دو تو لانچ ... تیر کے۔ وہ مدد کے لیے آئے تھے کہ نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔ خیر ہم سے تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ کریم بلوچ نے انھیں اپنی زبان میں خوب سنائیں اور ٹرالر کے ناخدا کو خود آ کے معافی مانگنی پڑی۔ کریم بلوچ نقصانات کی تلافی کا مطالبہ کر رہا تھا۔ وہ بات ہم نے ختم کرا دی۔ چنانچہ معاملہ بڑھا نہیں اور وہ چلے گئے لیکن ایک اچھی بات یہ ہوئی کہ فشنگ ٹرالر پاکستانی نہیں تھا۔ غیر ملکی تھا۔"
"یہاں... ہمارے سمندر میں؟"
"یہ تو ہو رہا ہے۔ اجازت کے بغیر بھی بھارتی اور روسی مچھلی پکڑنے والے جہاز ہماری حدود میں آ جاتے ہیں۔ خطرہ دیکھتے ہیں تو بھاگ بھی جاتے ہیں۔ سمندر میں سب چلتا ہے۔ ممکن ہے ہمارے ماہی گیر بھی آگے نکل جاتے ہوں۔"
"ہاں، دونوں طرف پکڑ دھکڑ بھی ہوتی رہتی ہے۔ ایک دوسرے کی لانچیں ضبط کر لیتے ہیں۔ ماہی گیر بھی گرفتار ہو جاتے ہیں۔ پھر ایسے ہی خاموشی سے تبادلہ بھی ہو جاتا ہے۔" میں نے کہا۔
"اس روسی فشنگ ٹرالر کا کارکن عملہ مقامی تھا — جو ایک بہت غلط بات ہے۔" محسن بولا۔ "انجانے میں یہ لوگ ان کی مدد کر دیتے ہیں۔ محض پیسے کی خاطر۔ جو کوئی خیرسگالی کے مشن پہ نہیں آتے اور ہمارے دوست بھی نہیں ہوتے۔"
"یہ تو ہے۔" میں نے کہا۔ "سنا ہے ان فشنگ ٹرالرز کے ذریعے جاسوسی ہوتی ہے۔ ان پر حساس آلات نصب ہوتے ہیں۔"
"ہاں، اس کے خلاف باقاعدہ احتجاج بھی کیا گیا ہے۔ یہ ہمارے ماہی گیروں کی روزی بھی خراب کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کے پاس ماہی گیری کے جدید ترین طریقے ہیں۔ وہ سب مچھلیاں سمیٹ لیتے ہیں اور بچی کھچی ہمارے حصے میں آتی ہیں۔"
"کیا اسی لیے وہ فشنگ ٹرالر بلیک آؤٹ میں آ رہا تھا۔" نازو نے کہا۔
"ظاہر ہے چور تو اندھیرے میں ہی آتا ہے۔" محسن بولا۔ "اچھی بات صرف یہ ہوئی کہ ٹرالر پہ جو ڈاکٹر تھا، دیکھنے میں وہ ڈاکٹر نہیں لگتا تھا مگر اس نے فوراً تمھیں دیکھ لیا اور اپنے میڈیکل بیگ سے نکال کے کوئی انجکشن بھی لگا دیا۔ وہ لوگ اس صورتِ حال سے تھوڑا سا پریشان بھی ہو گئے تھے۔ کریم بلوچ نے ہنگامے نے انھیں مزید نروس کیا۔ انھوں نے مجھے سمجھایا کہ ہارٹ کا عارضی اثر ہے۔"
"تجھے سمجھایا، کسی مترجم کے ذریعے۔"
"نہیں، مترجم کہاں سے آتا۔"
"تو پھر تو نے روسی کیسے سمجھ لی؟"
"یار عقل سے کام لے۔ وہ یہاں کے لوگوں سے کام لیتے ہیں اور جاسوسی وغیرہ بھی کرتے ہیں۔ یہ سب کام اس وقت تک کیسے ممکن ہیں جب تک وہ یہاں کی بولی سمجھتے نہ ہوں۔ اور بولتے نہ ہوں۔ مجھے تو وہ سب ...... کے جی بی کے ٹرینڈ ایجنٹ لگے تھے۔ اس نے اردو میں بات کی۔ لہجہ تو صاف نہیں تھا مگر ان کی اُردو خاصی رواں تھی۔ اس نے مجھے تسلی دینے کے لیے کچھ زیادہ ہی وضاحت کر دی کہ دیکھو دماغ ایک جھلی میں ہوتا ہے۔ بعض اوقات چوٹ سے ہیمرج ہو جاتا ہے۔ مگر اس کی علامات واضح ہوتی ہیں۔ یہ صدمے کا معمولی اثر ہے۔ اس میں جھلی کے اندر مغز ہل جاتا ہے۔ ممکن ہے ہوش آنے کے بعد بھی کچھ اثرات باقی رہیں۔ مثلاً بے وجہ آوازیں سنائی دیں یا متلی وغیرہ محسوس ہو، تو فکر کی بات نہیں۔ یہ اثرات خود بہ خود زائل ہو جائیں گے۔ اس نے کافی مقدار میں دوائیں بھی دی تھیں۔"
"اور میں نے وہ روسی دوائیں کھائیں ہیں؟"
"ہاں۔ وہ پوچھ رہا تھا کہ انجکشن لگا سکتے ہو۔ نازو نے کہا کہ میں تربیت یافتہ نرس ہوں۔" محسن بولا۔ "میں تو اس انکشاف سے بھونچکا رہ گیا۔ آج تک اس لڑکی نے ہمیں تو بتایا نہیں تھا۔ اس نے نازو کو سرنج دی اور انجکشن دیا کہ چھ گھنٹے بعد لگا دینا۔ اس نے صبح آٹھ بجے لگایا تھا۔ ابھی دو باقی ہیں۔"
"اب ان کی ضرورت نہیں رہی۔"
"نازو اکیلی ہی رات بھر جاگتی رہی اور تمھارے سرہانے بیٹھی رہی۔ حالانکہ ہم نے کہا تھا کہ باری باری جاگ لیں گے۔ کریم بلوچ نے کہا تھا کہ تمھیں آخری حصے میں شفٹ کر دینا چاہیے۔ سامنے والے حصے میں کچھ مرمت کا مسئلہ تھا۔" محسن بولا۔
"اور معلوم ہے، ابھی ہوش آنے پر میں کیا سمجھا؟ میں سمجھا کہ مجھے کسی صندوق میں بند کر دیا گیا ہے اور اس میں باہر سے کیلیں ٹھونکی جا رہی ہیں۔" میں نے ہنس کے کہا۔ "لا اب سگریٹ دے۔"
محسن نے دو سگریٹیں جلائیں اور ایک مجھے دی۔ "ہوش تو جناب کو صبح فجر کے وقت ہی آ گیا تھا۔ کیا یہ بات جانتے ہیں آپ؟"
"نہیں!" میں نے حیرانی سے کہا۔
"آپ نے خاصی نامعقولیت کا ثبوت دیا۔ ڈاکٹر نے ٹھیک کہا تھا کہ آپ کو آوازیں سنائی دیں گی۔" محسن بولا۔ "آپ یکطرفہ گفتگو فرماتے رہے رابعہ سے جیسے ٹیلی فون پہ بات کر

رہے ہوں۔ یہ مجھے نازو نے بتایا۔ بڑے جذباتی انداز میں:
"اس میں نامعقولیت کیا ہے؟"
"نامعقولیت یہ ہے کہ آپ نازو کو رالعبہ سمجھ کے اپنے عشق کا وہ بخار نکالتے رہے، بلکہ بخارات نکالتے رہے جو آپ کے لاشعور وغیرہ میں بھر گئے تھے۔ نازو سمجھ دار لڑکی ہے۔ وہ رالعبہ بن کے بولتی رہی۔"
میں بھونچکا رہ گیا۔ "اس نے بتایا ہے؟"
"ہم خود سنتے رہے۔ میں اور غالب۔"
"کمال ہے۔ مجھے احساس تو خیر نہیں تھا۔ مگر یاد بھی نہیں آرہا ہے۔ خواب بھی یاد تو آجاتا ہے۔ کیا کچھ کہہ ڈالا تھا میں نے؟"
دوبارہ شوٹنگ کے لیے نازو کو نہ بلالوں" محسن نے کہا۔
"وہ آرہی ہے شوٹنگ کے لیے تجھے شوٹ کرے گی۔
سب سے پہلے" غالب نے قریب آ کے کہا۔ اس کا منہ سوجا ہوا تھا۔
"یار آپ نے بُرا تو نہیں مانا" محسن نے نادم لہجے میں کہا۔
"بُرا ماننے کی تو بات ہی ہے۔"
"بس کیا کریں۔ عادت سے مجبور ہیں ہم بھی۔ منہ سے خود بہ خود پھر نکل جاتا ہے" محسن بولا۔
ان کے درمیان تعلقات مزید کشیدہ ہوگئے۔ غالب نے جواب میں ایک خاصی ناقابلِ اشاعت بات کہی، پھر وہاں سے اٹھ گیا۔ اور عرشے پہ سے سمندر کو دیکھتا...
"مجھے ایک شک ہوتا ہے" محسن نے کچھ دیر بعد کہا۔
"کس پہ، غالب پہ؟ کہ کہیں سمندر میں چھلانگ نہ مار دے۔"
"نہیں یار، اسے تیرنا کہاں آتا ہے" محسن بولا۔ "وہ تو خودکشی کا ڈراما تک نہیں کرسکتا۔ اس کے علاوہ سچی بات تو یہ ہے کہ نازو اس کے پیچھے کود جائے گی اور اسے ایسے نکال لائے گی جیسے دودھ میں سے مکھی نکالتے ہیں۔"
"یہ نازو نے نرسنگ کا کورس کب کیا؟"
"وہ کہتی ہے کہ کالج میں نرسنگ میرا ایک مضمون تھا۔ میں کیا ہر ایک کو بتاتی پھروں کہ اب تک کیا پڑھا ہے" محسن بولا۔
"شک کی کیا بات کر رہا تھا تو؟"
"شک مجھے یہ ہے کہ وہ فشنگ ٹرالر جانتے بوجھتے ہماری لانچ سے ٹکرایا تھا" محسن نے کہا۔ "آج کل کے جدید بحری جہازوں پہ رہنمائی کے لیے جو آلات نصب ہوتے ہیں، وہ اندھیرے میں بھی اسی طرح راستہ دکھاتے ہیں جس طرح طوفان میں۔"
میں نے تائید میں سر ہلایا۔ "کیا وہ ہمیں غرق کرنا چاہتے تھے؟"
"یہ تو بہت آسان تھا" محسن بولا۔ "وہ ہمارے اوپر سے گزر کے جاسکتے تھے۔ اس ٹرالر کے مقابلے میں ہماری لانچ ایسے ہی تھی جیسے روڈ رولر کے مقابلے میں کسی بچے کی ٹرائی سائیکل۔"
"پھر کیا مقصد تھا ان کا؟"
"ہمارے بارے میں، اور تمام مشتبہ محسوس ہونے والی کشتیوں اور لانچوں کا جائزہ لینا" محسن نے کہا۔ "اگر وہ ایسے ہی آتا جاتا ہم کہاں آنے دیتے۔ شاید کوئی بھی اجازت نہیں دے گا... جہاز کی غرقابی کے بعد، جس پر روپ کمار کے بھوری... ماموں معہ اہل و عیال موجود تھے، ہمارے دشمن پریشان ہوں گے... چور کی داڑھی میں تنکا۔ بلاوجہ کوئی کسی جہاز کو غرق نہیں کرتا... کسی حادثے کا نتیجہ بھی نہیں تھی۔ یکے بعد دیگرے چھ دھماکے ہوئے تھے اور جائے واردات پہ جائے بغیر ہی سمجھنے والے سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ تخریبی کارروائی تھی۔"
"اور پھر وہ مین ری ایکشن ڈیوائس" میں نے کہا۔ "اس کا... تو ایک ہی پارٹی سے ہو رہا تھا۔ کیا تو نے کوئی ایسی بات نوٹ کی تھی؟"
"ہاں، اس روسی ڈاکٹر کے ساتھ دو کمپاؤنڈر یا ماتحت قسم کے جو کارٹون آئے تھے، وہ روسی نہیں تھے۔ ان میں سے ایک کا لہجہ واضح طور پہ جنوبی ہند کا تھا۔ وہ صورت شکل کی خونخوار... انداز سے بھی کمانڈو ٹائپ لگتا تھا۔ دوسرا غالباً بنگالی تھا اور وہ چند منٹ کے لیے غائب ہوگیا تھا۔"
"تیرا مطلب ہے کہ وہ بھوت تھا؟"
"نہیں، وہ بہت چالاک آدمی تھا" محسن نے کہا۔ "بالکل گمنام اور روپوش رہنے والا۔ ایسا شخص جو کوشش کرتا ہے کہ وہ کہیں بھی نمایاں نہ ہو۔ اس کی موجودگی بالکل محسوس نہ کی جائے۔ اس کے حلیے میں، بات چیت کے انداز میں کوئی بات ایسی نہ ہو جو اسے کسی بھی طرح نمایاں کرے۔ انٹیلی جنس میں ایسے لوگ بہت کامیاب رہتے ہیں اور میرا خیال ہے کہ وہ انٹیلی جنس کا ہی آدمی تھا۔"
"کس ملک کی انٹیلی جنس کا؟"
"ظاہر ہے ہمارا نہیں ہوسکتا" محسن بولا۔ "وہ الگ ا... تفتیش کر رہے ہیں۔ ایک پولیس لانچ ہم سے بھی پوچھ گچھ کرنے آئی تھی۔"
"کس وقت؟"
"ابھی کوئی دو گھنٹے قبل" محسن بولا۔ "ہم نے انتظام اور... کو ہی کرلیا تھا۔ میں نے اپنے شبہے کا اظہار ان روسیوں کے جانے کے بعد ہی کر دیا تھا کیونکہ وہ جو حاضر غائب شخص تھا نازو کو... پاتے ہی کھسک گیا تھا۔ اس وقت وہ روسی ڈاکٹر مجھے انجکشن لگا رہا تھا اور ہم سب اس کی طرف متوجہ تھے۔ اسی وقت وہ غائب ہوا اور غالباً نیچے کا چکر لگا آیا۔ میں نے جب اسے غور سے...

پایا۔ تو فوراً غالب کو متوجہ کیا۔ غالب نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ کچھ دیر اسے سمجھانے میں لگی اور بس اتنی دیر میں وہ پھر آگیا جن کی طرح۔ میں نے پوچھا کہ تم کہاں چلے گئے تھے تو صاف مُکر گیا کہ میں تو یہیں تھا۔"
"یہ بات خطرناک بھی ثابت ہوسکتی ہے" میں نے کہا۔ "کیا اس شخص کے رویے سے یا صورت سے کسی قسم کے شک کا اظہار ہوتا تھا؟"
"اتنا احمق ہوتا تو کامیاب ایجنٹ بن سکتا تھا؟ تاہم ایک بات ہے میرے اطمینان کے لیے" محسن بولا۔ "اگر انھیں ذرا بھی شک ہوتا تو وہ ہمیں مہلت نہ دیتے۔ ہم تیار تو تھے ان سے نمٹنے کے لیے مگر وہ لوٹ کر بھی تو نہیں آئے۔ اب تو ہوگئے چار گھنٹے۔"
میں نے تائید میں سر ہلایا۔ "کریم بلوچ کا بندوبست اچھا تھا۔ وہ ہمیں ماہی گیر ہی سمجھے ہوں گے۔ پھر بھی کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ یہ لانچ جو کل سے اسی جگہ موجود ہے، دو چار دن دسہی، کم از کم ایک دن تو یہاں نظر نہ آئے۔"
"اب لانچ کہاں جائے گی؟" محسن بولا۔ "ہم تو بس یوں سمجھ لے کہ کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب تیار بیٹھے ہیں۔"
"کیوں نہ ہم معلوم کریں کہ روانگی کا شیڈول کیا ہے اور اگر پھر وقت ہو تو اپنے یار اکرام شیخ کا اور موہنی کا سراغ بھی لگائیں۔"
"دونوں کام مشکل ہیں۔ ہمیں کون بتائے گا کہ ایس ایس کرانتی ٹھیک کب روانہ ہو رہا ہے۔ وہ تو اچانک، خاموشی سے اور رازداری کے ساتھ نکلنے کی کوشش کریں گے۔"
"اس کے لیے تو رات ہی کا وقت موزوں ترین ہوتا ہے۔" نُما نے کہا۔
"پھر ایسا کرتے ہیں کہ لانچ کو کریم بلوچ کے حوالے کرتے ہیں۔ وہ آج بیچ بیچ ایک پھیرا لگائے اور کچھ مچھلیاں وغیرہ پکڑ لائے۔ اپنے ساتھ لیلیٰ مجنوں کو لے جائے اور گہرے سمندر کی سیر کرا لائے۔ میں اور تو چلتے ہیں ساحل کی طرف۔"
"اسی حلیے میں؟"
"کیا حرج ہے، یہ اکثریت کا حلیہ ہے" محسن بولا۔ "مزدور، قلی سب کا۔"
غالب نے ہماری تجویز کو جزوی طور پہ قبول کیا۔ اس نے کہا۔ "لانچ چلی ہی جائے تو اچھا ہے۔ مگر میں تمھارے ساتھ جاؤں گا۔"
"پھر نازو کیا اکیلی رہے گی لانچ پہ؟"
"اکیلی رہے گی تو کیا اسے شارک اور وہیل کھا جائیں گی؟" غلبہ نے کہا۔ "کوئی سمندری بلا چمٹ جائے گی اس سے۔ وہ تو خود بلا ہے چمٹ جائے۔ اور شارک وہیل کے تو دو ہاتھ مارے تو ان کے جبڑے حلق سے اتار دے۔"
یہ سب کچھ نازو کو سنانے کے لیے تھا جو ظاہری بے نیازی سے دوسری جانب کھڑی ہوئی سمندر کو دیکھ رہی تھی۔
"بے شک وہ اپنی حفاظت کرسکتی ہے۔ مگر تم کو کیا اعتراض ہے اس کے ساتھ جانے میں؟" میں نے کہا۔
"یہ خود اپنی حفاظت جو نہیں کرسکتا۔ ڈرتا ہے سالا کہ کوئی بچانے والا بھی نہیں ہوگا" محسن نے اسے طیش دلانے کے لیے کہا۔ "میں کہتا ہوں تم ایسی بات ہی مت کرنا۔ بلکہ سرے سے بات ہی مت کرنا بیٹھ جانا لانچ کے اس کنارے پر مشرق کی طرف منہ کرکے۔"
"مگر میں جانا ہی نہیں چاہتا۔"
"مرزا! یہ تم دل سے کہہ رہے ہو، ذرا نازو کے سر پہ ہاتھ رکھو، اور قسم کھا کے کہو۔" محسن بولا۔
نازو کے سر پہ ہاتھ رکھنا بپھری ہوئی شیرنی کی دُم پکڑنے سے زیادہ مشکل کام تھا۔ "فضول بکواس مت کرو۔ میں نے کہہ دیا نا کہ تمھارے ساتھ جاؤں گا۔"
"دیکھتا ہوں میں کہ کیسے جاتے ہو۔"
"چلو نازو سے پوچھ لیتے ہیں۔"
"میں کچھ نہیں سُن رہی ہوں۔" اس نے ہماری طرف دیکھے بغیر کہا۔
"سچ کہہ رہی ہو نا کہ تم کچھ نہیں سُن رہی ہو۔" غالب نے کہا۔ "پھر ٹھیک ہے۔ میں آپ لوگوں کے بے حد اصرار پہ چلا جاتا ہوں۔ سر سے کفن باندھ کے۔ یوں بھی دوستوں کا دل توڑنا اچھا نہیں لگتا مجھے۔ تمھارا کیا خیال ہے نازو! ہم ان کے ساتھ کیوں جائیں؟"
"میں اب بھی کچھ نہیں سن رہی ہوں۔"
میں اور محسن ہنس پڑے... "دراصل یہ کوئی ایسا کام نہیں ہے جس کے لیے سب کا ایک ساتھ جانا ضروری ہو۔ میں اور محسن بندرگاہ کے علاقے کا ایک چکر لگا کے اور کچھ سن گن لے کر آتے ہیں۔ مغرب تک تم بھی لوٹ آنا۔"
"اس بھروسے پہ مت رہنا۔ ہمارا کیا پتا۔ لوٹ کر ہی نہ آئیں۔ کیوں بھئی نازو۔" غالب نے پھر کہا۔
"کتنی بار کہوں کہ میں کچھ نہیں سن رہی ہوں۔" اس نے اب بھی ہماری طرف نہیں دیکھا۔ مگر اسے جو کہنا تھا وہ ہم نے سمجھ لیا تھا۔
کریم بلوچ اس تمام عرصے میں نہ جانے کہاں غائب رہا تھا۔ غالب نے اس کو تلاش کے بعد ایک گمنام گوشے میں دریافت کیا۔ جہاں وہ کاٹھ کباڑ کے ایک ڈھیر میں سو رہا تھا۔ یہ تو اس کو جگانے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ نشے میں ہے۔ وہ مدہوش نہیں تھا اور بات سن کے سمجھنے اور جواب دینے کے قابل بھی تھا مگر وہ سیدھا کھڑا

نہیں ہو سکتا تھا۔ اور ایسے جھوم رہا تھا جیسے اس کے پیروں کے نیچے زمین ہل رہی ہو۔ بے شک سمندر کے سینے پر تلاطم ایک مسلسل عمل ہے اور سکوت جو زمین پر محسوس ہوتا ہے اس کا سطحِ آب پر کوئی تصور نہیں مگر وہ سمندر کا باسی تھا اور ایک مختصر عرصے میں اگر ہم اس حرکت کے عادی ہونے لگے تھے۔ تو کریم بلوچ کے لیے یہ کوئی غیر معمولی بات ہی نہ تھی۔

غالب نے اسے میرے سامنے ایک ملزم کی طرح پیش کیا۔

"تم پیتے ہو کریم! کیا پیتے ہو؟"

"اپن کیا... کیا پئیں گا صاب۔ وسکی مسکی تو کبھی مقدر سے مل جاتی ہے۔ ورنہ اپنا دیسی شراب ہے۔" وہ ہچکی لے کر بولا۔ "آپ نئیں پی سکتا۔"

میں اس کے منہ پر تھپڑ مارتے مارتے رہ گیا۔ "شرم آنی چاہیے تمھیں۔ خود کو مسلمان سمجھتے ہو یا نہیں۔"

اس نے دونوں کانوں کو ہاتھ لگایا۔ "اپن بوہت گناہ گار ہے صاب۔ پر مسلمان ہے۔"

"کیسے مسلمان ہو؟ کیا تمھیں نہیں معلوم کہ یہ چیز ہم پر حرام کر دی گئی ہے۔"

"مالوم ہے... مالوم ہے صاب... پر کیا کرے..."

"اگر معلوم ہے اور پھر بھی پیتے ہو تو یہ کرو کہ سب حرام چیزوں کو حلال کر لو۔ لحم خنزیر بھی کھاؤ، لیکن خود کو مسلمان کہنا چھوڑ دو۔ ورنہ ہم تمھیں چھوڑ دیں گے۔ ہم ایک ہندو یا کسی بھی غیر مسلم کو نا خدا رکھ سکتے ہیں اور اس کی پینے کی عادت کو قبول کر سکتے ہیں، لیکن یہ نہیں کر سکتے کہ کوئی خود کو ہمارا ہم مذہب بھی کہے اور پھر وہ کام بھی کرے جس کی ممانعت ہے تو ہم اسے کچھ نہ کہیں۔"

وہ سر جھکائے سنتا رہا۔ "آپ حق بولتا صاب، بالکل سچا بات کرتا مگر... ہم بوہت لاچار اور مجبور ہے۔ ادھر سمندر میں آدمی اندر سے خالی ہو جاتا۔ اس کا سینے میں پانی بھر جاتا اور پیٹ میں گیس۔"

"خوب، تو یہ تم دوا کے طور پر استعمال کرتے ہو؟" میں نے طنز سے کہا۔ "تمھارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تم پیو گے نہیں تو مر جاؤ گے۔"

"بالکل مر جائے گا صاب، ایک دم مر جائے گا۔"

"اچھا۔ ہم دیکھیں گے۔" میں نے کہا۔ "نہ ہم مرنے دیں گے تم کو اور نہ شراب پینے دیں گے۔"

"آپ ہم کو مارو صاب۔ ہم کو بند کر دو کمرا میں، باندھ کے ڈال دو۔" وہ بولا۔ "ہمارا باپ بھی ایسا کرتا تھا۔ آپ بوہت اچھا کریں گا صاب، اگر ہمارا یہ خبیث عادت چھڑا دیں گا۔"

"جاؤ دفع ہو جاؤ۔ ہم کو بلایا تھا کام کے لیے، مگر تم کسی کام کے نہیں۔"

"کام آپ بولو صاب، کام ہم کرے گا۔" وہ سینے پر ہاتھ مار کے بولا۔

"خاک کام کرے گا، بیڑا غرق کرے گا۔" میں نے کہا۔ "اس حالت میں کشتی چلا سکتے ہو تم؟"

"کیوں نہیں صاب! ایسا کیا بات ہے۔ یہ تو ہمیشہ کرتا ہے ہم بھی اور دوسرا سب لوگ بھی۔ تھوڑا سا پئی کے تو جان آ جاتا ہے۔ ابھی ہم نے زیادہ کدھر پیا ہے۔ زیادہ ملے گا تو پیے گا۔ پھر ہم ایسا کا نئیں ہوئیں گا۔"

میں نے محسوس کیا کہ وہ غلط نہیں کہہ رہا ہے۔ ممکن ہے پہلے اس نے شوقیہ پی ہو، پھر یہ عادت بن گئی ہو۔ اب یہ عادت ایک مجبوری بھی اور ضرورت بھی۔ شراب اس کے جسمانی نظام کا ایک حصہ بن چکی تھی اور اعصاب کو کنٹرول کرنے لگی تھی۔ اس کے بغیر وہ ناکارہ ہو جاتا تھا۔ ایسا میں نے ٹرک ڈرائیوروں کے بارے میں سنا تھا کہ وہ ٹرک ڈرائیور جو اپنی قوتِ برداشت سے زیادہ محنت کرتے ہیں اور دن کے بعد رات کو بھی ڈیوٹی کرتے ہیں وہ چرس کو ایک مسکن اعصاب دوا کے طور پر استعمال کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔

"تم لانچ چلا لو گے؟" میں نے کہا۔

"آپ ٹرائی کرو صاب! بولو تو سوئی کے ناکے سے لانچ گزار کے دکھلائے۔" وہ بولا۔ "کریم بلوچ کا دماغ ایک دم ٹھیک ہے۔"

میں نے غالب کی طرف دیکھا۔ "کیوں مرزا جی؟"

"ہم جو ڈوبیں گے صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے۔" اس نے نازو کی طرف دیکھ کے کریم بلوچ سے بات کی۔ "اور بقول شاعر کے جب پیار کیا تو ڈرنا کیا۔"

نازو نے اس بار سچ مچ ایسا ظاہر کیا جیسے وہ کچھ نہیں سن رہی ہے۔

کریم بلوچ نے اپنے پیشہ ورانہ دعوے کو سچ ثابت کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ اس نے بڑی مہارت کے ساتھ لانچ کو بندرگاہ کے علاقے میں ایک ایسی جگہ پہنچایا جہاں سے فش ہاربر کا علاقہ دور نہیں تھا۔ لیکن یہاں سمندری ٹریفک کسی نظم و ضبط کی پابند نہیں تھی۔ اور اس جگہ چھوٹی بڑی ماہی گیری کی کشتیاں اور لانچیں ہی تھیں جن کی تعداد کا کوئی شمار نہ تھا۔ جہاز یہاں سے بہت دور تھے۔ اس علاقے کا اگر موازنہ کیا جاتا تو جو فرق وکٹوریہ روڈ کی ٹریفک اور چاکیواڑہ کی ٹریفک میں محسوس کیا جا سکتا تھا، وہی بندرگاہ اور فش ہاربر کے علاقے میں بھی نمایاں تھا۔

"ہم گیارہ بجے کے بعد لانچ لے کر اسی جگہ آئیں گے۔" غالب نے کہا۔ "نہیں یاد رہے گی نا یہ جگہ؟" میں نے کہا۔

"ہم تو آ جائیں گے، مگر تم واپسی مت بھول جانا۔" محسن بولا۔

جب لانچ واپس چلی گئی تو ہم ہجوم میں شامل ہو گئے۔ جو بدحواس منتشر اور مخلوط، بے لحاظ اور منہ زور قوت تھی۔ ہر سمت رواں اور ہر لمحہ مصروفِ عمل۔ اچانک کسی نے چلا کے کچھ کہا اور میرا کندھا پکڑ کے ہلایا۔

"اوئے، اٹھا یہ۔"

میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ کوسٹ گارڈ کا آدمی تھا۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے کہا اور اس کریٹ کی طرف دیکھا جو زمین پر رکھا ہوا تھا۔

"کیا ہے! تجھے کیا۔ مزدوری کرنا ہے تیرا کام یا سوال کرنا؟" وہ گرج کے بولا۔ غلطی اس نے گالی دے کر کی۔

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔ "گالی پھر مت دینا سمجھے۔ رہی مزدوری کی بات تو پہلے بتاؤ اُجرت کیا ملے گی؟"

"اجرت؟" صدمے اور غصے سے اس کا بُرا حال ہو گیا۔ "تیری اتنی ہمت کہ ہم سے مزدوری مانگتا ہے۔ ابے معلوم ہے یہ کیا ہے اور کس کا مال ہے۔ مجسٹریٹ صاحب کی گاڑی کھڑی ہے باہر۔"

"حدیث شریف ہے کہ کام کرانے سے پہلے مزدور سے اس کی اُجرت طے کر لو۔" میں نے کہا۔ "اس کو اٹھا کر باہر لے جانے کے سو روپے ہوں گے۔ باہر مجسٹریٹ صاحب کی گدھا گاڑی تک جانا ہو یا کمشنر صاحب کی بیل گاڑی تک۔"

اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا مگر نہ جانے کیوں وہ میرے تیور دیکھ کر بہک گیا۔ اس نے محسن سے رجوع کیا۔

"یہ شاید نشے میں ہے۔ چل تو اٹھا۔"

"کیا یہ شراب کا کریٹ ہے؟" محسن نے کہا۔

"ہاں ہاں، ولایتی شراب ہے۔ ذرا سنبھال کے اٹھانا۔"

محسن نے مجھے آنکھ ماری اور کریٹ اٹھا لیا۔ دو قدم چلا اور جب اس نے دیکھا کہ سامان اٹھوانے والا مطمئن ہو کے آگے بڑھ گیا ہے، تو اس نے کریٹ کو اٹھایا اور زمین پر دے مارا۔ بوتلوں کے پھٹنے سے کئی چھوٹے دھماکے ہوئے جو مل کر ایک بڑا دھماکا بن گئے۔ کوسٹ گارڈ کا سپاہی ایسے اچھلا جیسے اس کے پیچھے کسی نے پٹاخہ پھینک دیا ہو۔

میں اور محسن بھاگے۔ وہ سیٹی بجاتا ہوا ہمارے تعاقب میں دوڑا۔ ہم نے راستہ بنانے کے لیے کئی افراد کو چت کیا۔ اتنی دیر میں کوسٹ گارڈ کے سپاہی نے اپنے کسی دوسرے ساتھی کو بھی بلا لیا تھا۔ اور وہ سرپٹ ہمارے پیچھے بھاگے چلے آ رہے تھے۔

وہ مسلح نہیں تھے اور اس علاقے میں ان کی مدد کے لیے پولیس بھی نہیں تھی، مگر انھیں وردی... کے اختیار پر غرور تھا۔ وہ دوسروں سے بھی چلا چلا کے ہمیں پکڑنے کا کہہ رہے تھے۔ مگر اوّل تو وہاں شور میں ان کی سنتا ہی کوئی نہیں تھا۔ جس نے سنی اور ہمارا راستہ روکنے کی کوشش کی، اسے ہم نے اِدھر اُدھر پھینک دیا۔

ایک فرلانگ کی ریس ایک نسبتاً ویران علاقے میں ختم ہوئی۔ ہم ایک گودام نما بیرک میں گھس گئے۔ جس میں فرش سے چھت تک بوریاں بھری پڑی تھیں۔ یہ بوریاں قطاروں میں رکھی گئی تھیں چنانچہ گودام کے اندر گلیاں سی بن گئی تھیں۔

"اُدھر... تو اُدھر دیکھ۔ میں اِدھر سے جاتا ہوں۔" ہمارے تعاقب میں آنے والے نے کہا۔ "سالے بچ کر جائیں گے کہاں۔ اتنا نقصان کر دیا۔ میں جواب کیا دوں گا مجسٹریٹ صاحب کو۔ وہ تو مجھ کو ہی ڈک دیں گے۔" وہ اکیلا ہی غصے میں بڑبڑاتا چلا آ رہا تھا کہ میں نے اسے دبوچ لیا۔ اس کی آواز بند ہو گئی۔ اس کے کان سے ذرا نیچے ہاتھ مار کے میں نے اسے بے حس کر دیا۔

"اب تو اسے سنبھال۔" میں نے کہا۔ "میں دوسرے کو پکڑتا ہوں۔"

دوسرا ایک منٹ کے بعد میرے ہاتھ آ گیا۔ وہ بوریوں کی دیواروں سے بنی ہوئی گلیوں میں ٹہلتا ہوا آ رہا تھا۔ چونکہ وہ نقصان کے لیے مجسٹریٹ صاحب کو جواب دہ نہیں تھا، اس لیے وہ زیادہ مستعد بھی نہیں تھا۔

"یار، یہاں اتنے بڑے گودام کا والی وارث کوئی نہیں؟" محسن نے کوسٹ گارڈ کی وردی میں نمودار ہو کے کہا۔

"اے بھائی، ابھی پردہ ہے۔" میں نے کہا۔ "ویسے بھی قاعدہ شرفا کا دستک دے کر آنے کا ہے۔"

"دستک دی تھی میں نے ایک بوری پر۔" محسن بولا۔ "معاف کیجیے گا۔ یہ وردی آپ کو توند کا سائز دیکھ کر پہننی چاہیے تھی۔"

"عموماً ایسی کنگ سائز توند مالِ حرام کا ٹریڈ مارک ہوتی ہے۔" میں نے ڈھیلی شرٹ کو ٹائٹ باندھتے ہوئے کہا۔

"کوئی چوکیدار قاعدے قانون کے مطابق یہاں رکھا ضرور گیا ہو گا۔"

"ہاں، مگر رواج اور فیشن کے مطابق وہ چائے پینے چلا گیا ہو گا یا کسی افسر کے کام سے گیا ہو گا۔ اس کے گھر پر بچے کھلا رہا ہو گا یا ممکن ہے کہیں دہی بھلے کی ریڑھی لگائے بزنس کر رہا ہو۔"

"ہاں، یہاں کیا ہے جو کوئی لے جائے گا۔ ان بوریوں میں چاول ہیں۔ سوا دو من کی بوری، کوئی کیسے کرے گا چوری۔"

"بات یہ ہے کہ قوم کو بڑی رغبت ہوتی جا رہی ہے حرام خوری

"اور کام چوری سے۔" میں نے کہا۔ "جب تک اوپر کوئی دیکھنے والا نہ ہو، کام نہیں ہوتا۔"

"اور پھر نگرانی کرنے والے پر ایک اور نگران رکھنا پڑتا ہے۔" محسن نے مجھ سے اتفاق کیا۔ "وہ بھی فرض پورا نہیں کرتے۔ مجبوری نبھاتے ہیں۔"

"اور میں نے تو ایسے ایسے باکمال لوگ دیکھے ہیں کہ بیک وقت دو جگہ نوکری کرتے ہیں۔ دونوں جگہ سے تنخواہ لیتے ہیں، مگر کام ایک کا بھی پورا نہیں کرتے۔"

ہم دونوں گودام کے عقبی راستے سے باہر نکل رہے تھے کہ ہمیں کسی کے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی..... وہ ادھر ہی آ رہے تھے چنانچہ میں اور محسن دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے۔

"آپ نمونہ بے شک دیکھ لیں۔ اصل کرنل باسمتی ہوگا۔ اور ایکسپورٹ کوالٹی۔"

دوسرا شخص پیچھے پیچھے اندر آ گیا۔ "پچھلی بار بھی تم نے یہی بولا تھا۔"

"میں نے... بات میں نے کی تھی لیکن تم کو سپلائی میں نے نہیں دی تھی۔" پہلا شخص غالباً چوکیدار تھا۔ "تمھارا مال کتنے بجے آئے گا؟"

"دس بجے کے بعد۔ میں خود بھی آؤں گا ساتھ اور پیسے بھی اسی وقت دوں گا۔"

"یہ غلط ہے۔ آدھی رقم ابھی دو۔ بوری پر اپنا نشان لگا دو اور نشان دیکھ کر لے جاؤ، میں یہیں ملوں گا۔"

"کیوں، رات تک ڈیوٹی دو گے؟"

"دیکھو سیٹھ صاحب! بُرا مت ماننا۔ ہمیں تو مروا دیا تھا پہلی بار کسی نے... میں آپ کا نام نہیں لیتا، لیکن کوئی... اپنا مال تو دیکھ کر لے گیا اور بیچ میں دس بوریاں بھوسے کی بھی رکھ گیا سو بوری مال میں۔"

"میں بے ایمانی کا کام نہیں کرتا۔ تم دیکھ لینا، سب میں وہی جوشی چاول ہوگا۔"

"جوشی کا ٹوٹا۔"

"ہاں ہاں، وہی تھا میرا مطلب۔ ٹوٹا ہی ہوگا مگر صاف۔" سیٹھ نے جیب سے نوٹ نکالے۔ "یہ لو ابھی دو سو رکھو۔"

"اور باقی تین؟"

"رات کو مال لگانے کے بعد۔" سیٹھ نے جیب میں سے ایک موٹا سا مارکر نکالا۔ ایک پتلی سی چھُری نما چیز پہلے ہی اس کے ہاتھ میں تھی۔ یہ چھری اس نے ایک بوری میں گھونپ دی۔ اس کی نوکیلی تیز دھار ٹیوب میں کچھ چاول آ گئے۔ سیٹھ نے انھیں ہتھیلی پہ ڈال کے رگڑا، پھونکا اور سونگھ کے سر ہلایا۔ پھر اس نے بوری پر ایک خاص نشان ایسی جگہ لگا دیا جہاں وہ ایک نظر میں دکھائی نہ دے۔

"اب دوسرا لاٹ آ گئے والا لو۔ سب ایک جگہ کا مال ہے، اٹھاؤ۔" چوکیدار نے کہا۔ وہ آگے بڑھ گئے۔

ہم باہر نکل آئے۔ ابھی ابھی ہم نے ایک بڑے اور ایک چھوٹے ڈاکو کو مل کر اس ملک کی عزت لوٹتے دیکھا تھا۔ اس کے نام کی ساکھ لوٹتے دیکھا تھا۔ اور اس کا خزانہ لوٹتے دیکھنا۔ یہ سب باہر بھیجا جانے والا اعلیٰ قسم کا چاول تھا اور ایک معمولی چوکیدار نے کسی بیوپاری کے ساتھ مل کر پانچ سو روپے میں اپنا ضمیر، ایمان سب کچھ بیچ دیا تھا۔ اس اعلیٰ قسم کے باسمتی چاول کی لاٹ میں، جو ہزاروں بوریوں پر مشتمل تھی، سو بوریاں تبدیل کی جا رہی تھیں، ان کی جگہ گھٹیا قسم کے موٹے چاول رکھے جا رہے تھے۔ مال میں اس خورد برد کا پتا کسی کو نہیں چلے گا۔ پھر بھی سب کو پتا ہوگا کہ لاٹ سو فیصد وہ نہیں جو پاس کی گئی تھی۔ مال کسی جہاز پر لد جائے گا اور جب بیرونِ ملک کسی امپورٹر کے پاس جائے گا تو وہ اس بے ایمانی پر پوری پاکستانی قوم کو بے ایمان کہے گا۔ پوری تاجر برادری کو چور قرار دے گا۔ یہ نقصان تو برداشت کرے گا مگر اپنی زبان سے بتلائے ملک کی ساکھ کو اور تجارت کو کتنا نقصان پہنچائے گا۔ وہ خود تو سو بوری خراب چاول لے کر تباہ نہیں ہوگا مگر پاکستان کے بہترین چاول کی مارکیٹ کو تباہ کرنے کے لیے یہ مثال دس برآمد کرنے والوں کے سامنے رکھے گا۔ ایسے چور جو چاول کی جگہ دس بوری بھوسا بھیجتے ہیں، آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں، مگر غلطی ایک فرد کرتا ہے تو سزا پوری قوم کو بھگتنا پڑتی ہے۔

"تو نے دیکھا اور سنا؟" محسن نے کافی دور آ کے کہا۔

"ہاں، اور مجھے اپنی بے بسی پر افسوس ہوا۔" میں نے کہا۔ "کہ ہم ان کو پکڑ نہ سکے۔"

"پکڑ لیتے تو ان کا کیا بگاڑ لیتے۔ وہ صاف مکر جاتے کہ ایسی تو کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔" محسن بولا۔

"پانچ سو چوکیدار کو ملے تو چاول لے جانے والے کو پانچ ہزار تو ملیں گے۔" میں نے کہا۔ "اور ایسے کاروبار میں تو بھاگتے چور کی لنگوٹی والی بات ہے۔ پانچ سو دے کر ہزار بنا لے تب بھی ٹھیک ہے۔ کاروبار میں اپنا ایمان ہی گیا نا۔"

"ایک چوکیدار پانچ سو روز کماتا ہوگا۔"

"نہیں، شاید اسے پچاس ہی ملتے ہوں۔ اس میں سے وہ سب کو ان کا حصہ پہنچاتا ہوگا۔ جو شریکِ راز ہوتے ہیں اور اپنے کی دیوار بن سکتے ہیں۔ جو جتنا بڑا عہدہ رکھتا ہے، اتنا ہی بڑا اپنا حصہ وصول کرتا ہے۔"

"اور کبھی پکڑا نہیں جاتا۔ اگر کبھی پکڑا جائے گا تو یہی سب سے نیچے والا۔"

"بس یار! اسی لیے میں نے اسے معاف کر دیا۔" میں نے کہا۔ "پہلے خیال آیا تھا مجھے کہ ان دونوں کو ٹھکانے لگا دوں۔ یہ بھی تو ملک کے دشمن تھے۔ ان کا جرم بھی تو غداری سے کم سنگین نہیں۔ لیکن میں نے سوچا کہ یہ میرے مشن کا حصہ نہیں، اور مجھے ایک وقت میں ایک ہی کام سے کام رکھنا چاہیے۔ یہ تو یہاں سب کر رہے ہیں اور ہر روز کر رہے ہیں۔ میں انھیں سزائے موت دیتا تو جائز ہوتا، مگر اس سے فرق کیا پڑتا؟"

"ہاں، فرق پڑتا چوکیدار کے خاندان کو، اس کے بیوی بچوں کو۔ ایک گھر کی آمدنی کا ذریعہ ختم ہو جاتا۔ ایک عورت کا شوہر نہ رہتا، چند بچوں کا باپ نہ رہتا۔ خرابی اپنی جگہ رہتی۔ اس کی جگہ دوسرا کون سا فرشتہ آتا۔"

"یہ تو میرے نزدیک برائی کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لینے والی بات ہے۔ اور برائی کو نہ روکنا کیا برائی نہیں ہوتی۔ جب برائی کو ہم نے دیکھا نہیں، اس کی تو ہم پر اخلاقی ذمے داری بھی عائد نہیں ہوتی۔ مگر جیسے ہم راہ چلتے سڑک پر پتھر پڑا دیکھتے ہیں تو ہٹا دیتے ہیں پھر آگے چل پڑتے ہیں۔"

"تیرا مطلب ہے انھیں سزا ہونی چاہیے؟"

"ہاں، سزا تو مجرم کو ہونی چاہیے۔ خصوصاً ان کو جو کسی قانون کی گرفت میں نہیں آتے۔ کیونکہ قانون کے سامنے ان کو لے جانے کے لیے ثبوت، شہادت، گواہ کچھ نہیں ملتا۔ لیکن جو اپنی آنکھوں سے جرم سرزد ہوتا دیکھے اسے تو تامل نہیں کرنا چاہیے۔ اس میں شک کی تو بات ہی نہیں تھی کہ وہ بھی غدار اور وطن دشمن تھے۔"

"ہاں، تھے تو سہی۔"

"رہی ان کے خاندان کی بات، تو بھائی کیا وہ نہیں جانتے کہ جس دن وہ گرفت میں آئیں گے تو نقصان کس کا ہوگا۔ سزا تو ہر ڈاکو اور قاتل کے خاندان کو ملتی ہے۔ ہر طرح، وہ رسوا بھی ہوتے ہیں، دکھ بھی جھیلتے ہیں اور ان کا انجام باعثِ عبرت بھی ہوتا ہے۔ مگر کیا ایسا نہیں ہونا چاہیے؟ ایسا ضرور ہونا چاہیے۔ اس کے لیے رحم دلی اور درگزر کے جذبات رکھنا غلط ہوگا۔ جب ایک خاندان اپنے سربراہ کی غلطی سے تباہ ہوتا ہے تو دوسرے خاندان کا رشتے دار دیکھتا ہے اور سوچتا بھی ہے۔"

"اچھا تو پھر ٹھیک ہے۔" محسن نے کہا۔ "ہم انھیں رنگے ہاتھوں پکڑیں گے۔ عین ارتکابِ جرم کے وقت اور سب کچھ وہیں ہو جائے گا۔ گرفتاری، مقدمے کی سماعت، فیصلہ اور سزا پر عمل درآمد۔ ابھی تو ہم کوسٹ گارڈ کی وردی میں ہیں، اس لیے منصف نہیں بن سکتے۔"

"بہر حال، یہ بتاؤ کہ کیا ہم جہاز پر جا سکتے ہیں؟" میں نے کہا۔ "اس وردی کے ساتھ ہم اتنے بااختیار ہیں؟"

محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ ہم سے زیادہ بااختیار ہیں۔ وہ ہمیں روک دیں تو ہم زبردستی جہاز پر قدم رنجہ نہیں فرما سکتے۔ اور پھر ان کے تو تعلقات بھی اوپر والوں سے ہوں گے۔ ہمارے افسروں سے۔"

"پھر یہ وردی کیا صرف حلیے بدلنے کے لیے ہے؟"

"نہیں، ہم اس وردی کے ساتھ بہت سے مقاماتِ ممنوعہ تک جا سکتے ہیں۔ اور وہ معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ جو ایک ماہی گیر یا مزدور حاصل نہیں کر سکتا۔ زیادہ آسانی سے اور اعتماد کے ساتھ گھوم پھر سکتے ہیں۔ اندر باہر آتے جاتے کوئی ہمیں چیک نہیں کرے گا۔"

"تو چل پہلے باہر۔ اپنے ٹیکسی ڈرائیور تھانیدار کا پتا کرتے ہیں۔"

"کس سے پتا کرتے ہیں؟"

"اس کے ہم پیشہ لوگوں سے۔" میں نے کہا۔ "ٹیکسی والے جو کسی مخصوص علاقے میں نظر آتے ہیں، ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔"

باہر ایک قطار میں چھ ٹیکسیاں موجود تھیں۔ ان میں سے دو کے ڈرائیور بھی سیٹ پر موجود تھے مگر وہ شیخ کے بارے میں کچھ نہ بتا سکے۔ باقی ایک ایرانی ہوٹل میں دوپہر کا کھانا کھاتے ہوئے ملے۔ ہوٹل کے اندر قدم رکھتے ہی جب کھانوں کی خوشبو نے یلغار کی تو ہماری بھوک بھی ایک دم جاگ اٹھی۔ میں اور محسن ایک ایسی میز پر بیٹھ گئے جہاں دو ٹیکسی ڈرائیور نظر آنے والے پہلے سے موجود تھے۔ ہم نے اخلاقاً بھی ان سے اجازت نہیں لی۔ ایرانی ہوٹلوں میں ایک ٹیبل پر ایک آدمی کا اصول نہیں چلتا۔ خصوصاً اس وقت جب رش ہو۔ دونوں ٹیکسی والوں نے ایک نظر ہماری وردی کو دیکھا۔ جو ان کی وردی سے زیادہ مختلف نہیں تھی اور پھر کھانے میں اور پھر باتوں میں مصروف ہو گئے۔

کھانے کا آرڈر محسن نے دیا۔ میں بظاہر دوسری طرف دیکھتا رہا۔ لیکن میرے کان ان کی گفتگو پر لگے رہے جن کے بارے میں ہمارا خیال تھا کہ ٹیکسی ڈرائیور ہیں۔ ہمارا خیال درست تھا۔

"یار، ان سے پوچھ لیں۔" میں نے بہ آواز بلند کہا۔ ٹیکسی ڈرائیوروں نے چونک کے مجھے دیکھا۔

"یار، آپ لوگ ٹیکسی چلاتے ہو؟" محسن بولا۔

"ہاں، چلاتے ہیں۔ پھر؟" ایک نے بڑے جارحانہ انداز میں پوچھا۔ غالباً اسے شک ہو گیا تھا کہ ہم بھی پولیس کی طرح ان سے غلط قسم کی توقعات وابستہ کر بیٹھے ہیں۔

"پھر یہ کہ ہمیں ایک دوست کے بارے میں بتاؤ۔ وہ بھی ٹیکسی چلاتا ہے۔" میں نے مسکرا کے کہا۔

"کس کا دوست، تمہارا کہ ہمارا؟"

"اگر ہمارا دوست ہوگا تو کیا تمہارا دشمن ہوگا؟" محسن بولا۔ "تمہارا ساتھی ڈرائیور ہے آخر وہ بھی۔"

"نام کیا ہے اس کا؟" جارحانہ لہجہ رکھنے والا نرم پڑ گیا۔

میں نے اکرام شیخ کا نام بتایا۔ تو وہ دونوں نفی میں سر ہلانے لگے۔

"نمبر یاد ہے ٹیکسی کا؟" دوسرا ڈرائیور بولا۔

"نمبر... پہلے تو یاد تھا۔" میں نے سر کھجا کے کہا۔ "مگر ابھی حال ہی میں اس نے نئی ٹیکسی لی ہے۔ عموماً اسی علاقے میں رہتا ہے۔"

"نئی ٹیکسی... ابھی کل پرسوں۔" پہلا ڈرائیور چونکا۔

"ہاں، کل پرسوں ہی کی بات ہے۔" محسن بولا۔

"اس کے ساتھ شاید ایک لڑکی بھی دیکھی ہو تم نے۔" میں نے کہا۔

وہ دونوں مسکرائے اور پھر ہنسنے لگے۔ "لڑکی کی بات پہلے کرتے نا۔ ہم کیا سب بتا دیتے۔ بڑا ظالم ہاتھ مارا ہے۔"

"بالکل نیلو ہے نیلو۔ ساتھ لیے پھرتا ہے سب کو جلانے کے لیے۔" دوسرا بولا۔ "مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں وہ پکڑا نہ گیا ہو۔"

"کیوں پکڑا گیا ہو؟" میں نے کہا۔

"پکڑا تو جانا ہی ہے۔ کہیں سے کسی اچھے گھر کی لڑکی اغوا کر لایا ہے اور اپنے یار نے شادی بھی کر لی ہے اس سے۔"

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ اپنی بیوی کو نہ بھگا کے لایا ہے اور نہ اغوا کر کے۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "ماننے والی بات نہیں ہے بھیا۔ وہ الگ ہی چیز ہے۔ اوپر کا مال ہے اوپر کا۔"

"جب ہی تو اِتراتا پھر رہا ہے۔ سب کے سامنے ڈرائیور سے نمائش کرتا ہے۔" دوسرے نے یوں کہا کہ اس کے لہجے سے حسد کا سب زہر چھلکنے لگا۔ "بیوی کوئی پری ہو تب بھی ایسے کون لاتا ہے ہر جگہ اپنے ساتھ۔"

"اور کیا، آخر ہماری بھی گھر والی ہے۔ قسم اللہ کی ہم اس مینا کماری پر اتنے عاشق نہیں تھے، جتنے اب تین لونڈوں کی ماں پر ہیں۔" پہلے والے نے اتفاق کیا۔

"یار، چھوڑو تم کیا بات لے بیٹھے۔ وہ تو میرج ہے۔ لڑکی نے اسے پسند کر لیا تھا۔ باپ نے بڑا زور لگایا پیسے کا لالچ بھی دیا۔ مگر ہمارا یار بھی نہیں مانا۔ اور وہ بھی جان دینے پر تل گئی۔"

"ہم کو اتنا معلوم ہے مگر یہ نہیں معلوم تھا کہ تمہارا یار یہاں رہتا ہے۔" پہلے ڈرائیور نے کہا۔

"گھر بدل لیا ہے اس نے۔ پہلے اکیلا تھا تو ایک کمرے میں کسی کے ساتھ رہتا تھا۔" میں نے کہا۔ "اب پتا نہیں کہاں گھر لیا ہے۔ ہم تو باہر تھے۔"

"کراچی سے باہر ڈیوٹی لگ گئی تھی۔" محسن نے مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"کل تو وہ شام کو بھی آیا تھا۔ رات کو بھی۔" پہلے والے نے سوچ کے کہا۔ "اس کے بعد میں نے نہیں دیکھا۔"

"میں نے دیکھا تھا آج صبح۔" دوسرا بولا۔ "اور ایک کے ساتھ نہیں، دو کے ساتھ۔"

"دو کے ساتھ۔ کیا مطلب؟"

"مطلب یہ ہے کہ ایک تو گھر والی ہے، دوسری آدھی گھر والی، اس کی سالی۔" دوسرا آنکھ مار کے بولا۔

"کوئی اور لڑکی بھی ساتھ تھی؟" میں نے شدید حیرت کے ردِ عمل کو چھپا کے پوچھا۔

"ہاں۔ میں نے کہا کہ بھئی خوب عیش ہو رہی ہے۔ چپڑی اور دو دو۔ تو کہنے لگا بھئی سالی ہے میری۔ میں نے کہا کہ وہ بھی تو آدھی گھر والی ہوتی ہے۔ بس اس بات پہ گرم ہو گیا۔ حالانکہ یہ تو مذاق کی بات تھی۔ اور کون سی میری اپنی بات تھی۔ دنیا کہتی ہے وہ ہم نے بھی کہہ دیا۔"

"پھر؟ چلا گیا وہ؟"

"ہاں، معلوم نہیں کس چکر میں ہے۔ دھندا تو کرتا نہیں۔ گھوم پھر کے یہاں کیوں آتا ہے؟" پہلے والا ڈرائیور بولا۔ "نئی شادی کی ہے اور فرض کرو سالی بھی ساتھ ہے۔ تو سالی یہ کون سی سیر کرنے کی جگہ ہے۔ اُدھر جائے نا کلفٹن کی طرف یا ہل پارک۔"

"وہاں بھی جاتا ہوگا۔" میں نے اس کا شک رفع کرنے کی کوشش کی۔

"یہاں وہ کسی ہیرا پھیری کے چکر میں ہے۔" دوسرے ڈرائیور نے کہا۔ "کوئی معاملہ ہے ضرور۔"

"کیسا معاملہ؟"

"یہی مال وال کا۔ یہاں اور کیا ہوتا ہے۔ وہ آتا ہے اندر جاتا ہے ایک چکر لگانے کے لیے۔ سواری تو لیتا نہیں جیسے آتا ہے ویسے ہی لوٹ جاتا ہے۔"

"اچھا، ہم اب جاتے ہیں۔" میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "وہ پھر نظر آئے نا تو اس سے کہنا کہ تمہارا دوست کرا کرم خان تم کو تلاش کر رہا تھا۔"

"کون... کیا نام بتایا؟"

"کرا کرم خان۔ میرا نام ہے۔" میں نے کہا۔

"عجیب نام ہے۔"

"بس ماں باپ نے رکھ دیا تھا۔" میں نے کہا۔ "نام تو نام ہوتا ہے۔ کیسا بھی ہو۔ میں رات دس بجے کے بعد اسی جگہ ملوں گا۔"

"کرا کرم تو ایک پہاڑ ہے۔"

"ہاں، ہمارے ملک کی سب سے بلند چوٹی۔" میں نے اس کے دماغ میں بٹھانے کے لیے کہا۔

"اسے تو کے ٹو بھی کہتے ہیں۔" دوسرا ڈرائیور بولا۔

"ہاں، مگر میں پہاڑ نہیں بندہ ہوں۔" میں نے مذاق میں بات ختم کی اور ہم سب تقریباً ایک ساتھ باہر آ گئے۔ دونوں ٹیکسی ڈرائیور ہم سے پہلے کھانے سے فارغ ہو چکے تھے لیکن جب بات شروع ہوئی تو وہ بھی بیٹھے رہے۔

"یہ کرا کرم خان کی خوب سوجھی۔" محسن بولا۔

"بس ایسے ہی خیال آ گیا کہ تم لوگ مذاق میں چیف کے ٹو کہتے ہو۔ کیونکہ میرے اصل نام میں کبیر خان میں دو کے آتے ہیں تو میں نے سوچا کہ کے ٹو کا اصل نام تو کرا کرم بھی ہے۔"

"شیخ سمجھ جائے گا۔" محسن نے یقین سے کہا۔

"ہاں، بالکل سمجھ جائے گا۔" میں نے کہا۔ "مگر بھائی! تو مجھے یہ آدھی گھر والی کا معما سمجھا۔"

"وہ تو میں خود نہیں سمجھا۔ اس سالے شیخ نے ایک سالی کہاں سے ایجاد کر لی۔" محسن سوچ کے بولا۔ "کون ہے وہ؟"

"موہنی کی بہن تو تھی ہی نہیں اور ہوتی بھی تو یہاں کیوں ہوتی؟" میں نے کہا۔ "راہ چلتے تو کوئی لڑکی بیٹھ نہیں سکتی۔ وہ لفٹ لے گی تو کسی کار والے سے۔ جس ٹیکسی میں پہلے ہی ایک خوبصورت لڑکی موجود ہو..."

"یار، وہ جن کی پری، مگر وہ اکیلی کیوں آئے گی۔ اگر راجا بھی ساتھ ہوتا تو ہم کہہ سکتے تھے کہ وہ ملنے آئے ہوں گے۔"

"آئے تو وہ ہم سے ہی ملنے کے لیے تھے۔ شیخ صرف ہمارے لیے چکر لگا رہا ہے اور اپنی پوزیشن مشتبہ بنا رہا ہے۔"

"اگر یہ فرض کریں کہ اس نے کسی لڑکی کو پریشان دیکھا اور ٹیکسی میں بٹھا لیا۔ تو بھی بات نہیں بنتی۔ وہ لڑکی یہاں کیوں آئی۔ اور شیخ کہہ سکتا تھا کہ مسافر ہے۔ اس نے سالی کہا اور آدھی گھر والی کے حوالے پر گرم ہو گیا۔"

"وہ رابعہ... رابعہ بھی تو ہو سکتی ہے۔"

میرا دل میرے قدموں کے ساتھ رک گیا۔ "میں یہ بات کہنے سے گریز کر رہا تھا۔ لیکن تو کیوں ڈر رہا تھا؟"

"میں سوچ رہا تھا کہ کہیں تو پٹ سے گر کے بے ہوش نہ ہو جائے۔"

"وہ رابعہ نہیں ہو سکتی۔" میں نے کہا۔

"کیوں نہیں ہو سکتی؟" محسن نے کہا۔ "ہونے کو دنیا میں کیا نہیں ہوتا؟"

"محسن! وہ رابعہ نہیں ہو سکتی۔ وہ... وہ کیسے آ سکتی ہے اور آ جائے تو پھر لوٹ کے کیسے جا سکتی ہے۔ اگر اسے معلوم ہو جائے کہ میں یہاں ہوں۔ وہ رابعہ نہیں ہو سکتی۔"

"اچھا اچھا... چلا مت، وہ رابعہ نہیں ہوگی۔" محسن گھبرا کے بولا۔ "تو بتا دے مجھے کہ وہ کون تھی۔"

"ایسے فرض کرنے کو ہم فرض کر سکتے ہیں کہ وہ تھی زیب النساء۔"

محسن نے ایک دم میرا کندھا پکڑ لیا۔ "ہاں، یہ ممکن ہے، عین ممکن ہے کہ وہ زیب النساء ہو۔"

میں ہنس پڑا۔ "پاگل ہوا ہے۔ وہ لاہور میں ہے اور اب ایک فلم اسٹار ہے۔ رات کو اگر وہ ملا تو معلوم ہو جائے گا۔ ابھی تو ہم..."

ایک موٹا کالا چیچک رو شخص اچانک ہمارے سامنے آ گیا۔ "اے، اِدھر آؤ۔" اس نے نہایت بدتمیزی سے کہا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے کہا۔

"مجسٹریٹ صاحب بلاتا ہے گاڑی میں۔" وہ غرا کے بولا۔

"اس کا کریٹ کدھر ہے؟"

"مجسٹریٹ صاحب کا کریٹ؟ وہ کریٹ میں رہتا ہے؟"

"بکواس بند کرو، تم کو دھسکی کا کریٹ نہیں ملا۔ کسٹم انسپکٹر ایک گھنٹہ پہلے بتا گیا تھا۔"

"کیا بتا گیا تھا؟" محسن نے نرمی سے کہا۔

"تمہارے بارے میں۔ اِدھر اور کون ہے کوسٹ گارڈ کا آدمی تمہارے سوا؟"

"دو تو میں نے بھی دیکھے تھے۔" میں نے جان چھڑانے کے لیے سوچ کے کہا۔ "کسی گاڑی میں۔ ہاں، ایسی ہی گاڑی تھی، مگر لال رنگ تھا اس کا۔ اس میں دو لمبی لمبی مونچھوں والے بیٹھے تھے۔"

"کیا؟" وہ چلایا۔ "کسی اور کو بیچ دیا۔ تم چلو مجسٹریٹ صاحب کو بتاؤ۔ ان دونوں کو بند کرانا پڑے گا۔"

"چلو، ہاتھ چھوڑو میرا۔ تمہارے مجسٹریٹ صاحب کے باپ کا نوکر نہیں ہوں میں۔" میں نے درشتی سے کہا۔ اور محسن کو اپنے ساتھ کھینچ کر لے گیا۔ یہ معاملہ یک لخت سنگین صورت اختیار کرنے والا تھا۔ کالا چیچک رو شخص جتنی دیر میں مجسٹریٹ کو 'غبن' کی اطلاع دینے گیا، ہم بھیڑ میں شامل ہو کے اندر پہنچ گئے۔

دلاور کو پہلے میں نے دیکھا۔ اگر ہم فوراً ہی نہ رک جاتے تو شاید اس سے ٹکرا جاتے۔ وہ بڑی تیزی سے کہیں جا رہا تھا۔ اور اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ایس پی سراج بھی تھا جو سادہ کپڑوں میں تھا۔ اسے ہم نے بہت عرصے کے بعد دیکھا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ موٹا ہو گیا تھا اور اس کی صورت پر خباثت بھی پہلے سے زیادہ برسنے لگی تھی۔

"یہ سراج یہاں کیسے؟" محسن نے ان کے گزر جانے کے بعد کہا۔

"اس کا آنا بے مقصد نہیں ہو سکتا۔"

"مقصد بھی معلوم کر لیں گے جیسے اپنے شیخ صاحب کے بارے میں معلوم کر لیا۔"

"وہ ہماری تلاش میں نہ جانے کہاں کہاں پہنچا ہو گا۔ ممکن ہے وہاں جا پہنچے، جہاں ہم اپنی ایک نشانی لاوارث ٹرک چھوڑ آئے ہیں کہ اگر کوئی ہماری اگلی منزل کا سراغ لگانا چاہے تو آگے بس تاحدِ نگاہ سمندر کے سوا کچھ نہ ملے۔"

دلاور اور سراج کسی معاملے پر بحث میں ایک دوسرے سے اُلجھے ہوئے تھے اور بظاہر اختلافِ رائے کا شکار تھے۔ وہ زور زور سے نفی میں گردن ہلاتے تھے اور ہاتھ چلا کے اصرار یا انکار کرتے تھے تو اس سے ان کی برہمی ظاہر ہوتی تھی۔ وہ بہت تیز بھی چل رہے تھے۔ ہم اگر ان کے نزدیک ہو جاتے تو گفتگو سن سکتے تھے۔ مگر اس میں خطرہ زیادہ تھا، کیونکہ وہ بھی محتاط تھے اور ان کی نظریں ہر سمت میں دیکھ رہی تھیں۔ وہ تھے بھی عیّاری اور چالاکی میں شیطان سے دو قدم آگے۔ ابھی تو ان کی نگاہ صرف آشنا ناآشنا کو دیکھ رہی تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی دوست دشمن کا فرق بتلانے والی حس جاگ اٹھتی۔ ہمارے اور ان کے درمیان عداوت کا رشتہ اتنا پرانا ہو گیا تھا کہ اب ظاہری روپ کچھ بھی ہو، ہم ایک دوسرے کو پہچان سکتے تھے۔

تقریباً آدھے میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہمیں کوئی شبہ نہ رہا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔

"ایس ایس کرانتی تھرڈ" ہمیں سو گز کے فاصلے سے نظر آ گیا تھا۔

"یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔" محسن نے مایوسی سے کہا۔ "یہ جہاز پر چڑھ جائیں گے۔ ہم نیچے کھڑے رہ جائیں گے احمقوں کی طرح۔"

"پھر دانش مندی کا ثبوت یوں دیتے ہیں کہ ہم بھی چڑھ جاتے ہیں ان کے پیچھے۔ رام بھلی کریں گے۔" میں نے کہا۔

"اور فی الفور شہید ہو جاتے ہیں۔ نیک کام میں دیر کیسی؟" محسن بولا۔ "یا پھر یہیں سے لوٹ جاتے ہیں۔"

"کیا ہم کسی بہانے سے اوپر نہیں جا سکتے؟"

"جا تو سکتے ہیں، واپس نہیں آ سکتے۔" محسن بولا۔

"کچھ سوچ یار۔ کیا ساری عقل شہلا کے پاس رکھوا کے آیا تھا۔ تھوڑی بہت گزارے کے لیے اپنے پاس بھی تو رکھی ہو گی۔"

سراج اور دلاور ایک کشتی میں اتر گئے۔ چھوٹی سی کشتی انھیں آگے گہرے سمندر تک لے گئی۔ عین جہاز کے نیچے پہنچ کے انھوں نے وہ سیڑھی پکڑ لی جو اوپر سے نیچے کی طرف آویزاں کی گئی تھی اور آہستہ آہستہ اوپر چڑھنے لگے۔ اوپر انھیں خوش آمدید کہنے کے لیے ایک فرنچ کٹ داڑھی والا بھاری بھرکم شخص موجود تھا، جس نے سفید وردی پہن رکھی تھی۔

ہم دور سے دیکھتے رہنے کے سوا کر بھی کیا سکتے تھے۔ کسی عام جہاز پر ہم کسی بھی بہانے چڑھ جاتے تو معذرت کر کے لوٹ آتے یا دھکے کھا کے۔ مگر یہاں تو صاف موت کے منہ میں جانے والی بات تھی۔ یہ موت کا جال تھا اور وہ موت کے فرشتے تھے جو موت کے اسباب کا ذخیرہ کر رہے تھے۔ نادانستگی میں بھی ان کے قریب جانے کی غلطی کرنے والا لوٹ کر نہیں آ سکتا تھا۔

"کم از کم ایک دوربین ہی ہوتی ہمارے پاس۔" محسن بولا۔

"اور کوئی ایسا آلہ ہوتا جس سے ہم ان کے درمیان ہونے والی باتوں کو اس شور سے الگ کر کے سن سکتے۔" میں نے کہا۔

"مجھے لگتا ہے کہ یہ انتظامات پر آخری نگاہ ڈالنے آئے ہوں گے۔"

"سراج اس نقصان کی اطلاع پا کے آیا ہو گا جو ایک بحری جہاز پر آتش زدگی کے نتیجے میں ہوا۔ پس پشت انھیں اس واردات میں ایم آر ایس ہی کارفرما نظر آئی ہو گی۔ سراج ہے پولیس کا آدمی بلکہ اعلیٰ افسر۔ تفتیش کرنے یا کرانے کے لیے لاہور سے یہاں آنا اس کے لیے مشکل نہیں۔ وہ خود کو کسی بھی خصوصی ٹیم کا سربراہ بنوا سکتا ہے جو کسی خاص ملزم کی تلاش میں کراچی آئے اور تفتیش کے نام پر دو چار دن رک سکے۔ یہاں اسی کے ساتھی پولیس افسر ہوں گے۔ وہ ان پر دباؤ ڈال سکتا ہے کہ سارا شک ہماری پُراسرار مجرمانہ سرگرمیوں کی جانب منتقل کر دے۔ انھیں یقین دلا دے کہ یہ ہمارا ہی گروہ ہے جو بندرگاہ کے علاقے میں موجود ہے اور ضرورت اس بات کی ہے کہ پولیس اپنے سارے وسائل بروئے کار لا کے ہمیں تلاش کرے۔"

محسن میری بات بھی سن رہا تھا اور ان تینوں کو بھی دیکھ رہا تھا جو ابھی تک عرشے پر کھڑے بحث کر رہے تھے۔

"ابے ادھر دیکھ۔" محسن نے اچانک کہا۔

میں نے دیکھا تو سفید وردی والا گر رہا تھا۔ سراج اس کو سنبھال چکا تھا مگر صاف ظاہر تھا کہ وہ بے ہوش ہے۔

"اسے کیا ہوا؟"

"سراج نے ہاتھ مارا تھا۔" محسن نے کہا۔

"خالی ہاتھ؟" میں نے کہا۔

"ہاں... لیکن بہت اچانک وار کیا تھا اور بہت سخت۔" محسن نے کہا۔ "تو نے نہیں دیکھا، مگر میں دیکھ رہا تھا۔ میرا خیال ہے سراج نے اسے مار دیا۔"

"کیا مطلب... وہ بے ہوش نہیں ہے۔"

"میرا اندازہ اتنی دور سے غلط بھی ہو سکتا ہے، لیکن اتنی طاقت سے کوئی میری گردن پر یوں ہاتھ مار دیتا۔ بالکل بے خبری میں، تو میری گردن ضرور ٹوٹ جاتی۔" محسن بولا۔

"گردن پر... کہاں وار کیا تھا؟"

"سامنے... بالکل سامنے ہتھیلی ایسے ماری تھی۔" محسن نے اپنی ہتھیلی کو میرے حلق پر چھری کی طرح رکھ کے بتایا۔

"پھر تو بے ہوش ہو گا۔" میں نے کہا۔

وہ کشتی جس میں دلاور اور سراج بیٹھ کر گئے تھے ابھی تک وہیں کھڑی تھی۔ اس کو چلانے والا پندرہ سولہ سال کا لڑکا صرف نیکر پہنے ہوئے تھا۔ اور اس نے کشتی کو جہاز کے ایک ہک سے باندھ دیا تھا۔ تاکہ لہریں اسے دور نہ لے جائیں۔ وہ واضح احکامات کے تحت ان کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔

سراج اور دلاور نے بے ہوش نظر والے بھاری بھرکم شخص کو اوپر سے نیچے لانے کے لیے ایک اور شخص کی مدد حاصل کی جو اچانک دوڑتا ہوا آیا تھا۔ وہ بھی سفید وردی میں تھا مگر ماتحت عملے کا رکن نظر آتا تھا۔ شاید اس نے بھی اتنا ہی دیکھا تھا جتنا میں نے۔ اس نے سراج کو قاتلانہ حملہ کرتے نہیں دیکھا تھا۔ ظاہر ہے اسے مطمئن کرنا مشکل نہیں تھا۔ وہ کہہ سکتے تھے کہ معلوم نہیں کیا ہوا۔ باتیں کرتے کرتے اچانک حالت بگڑ گئی۔ غالباً ہارٹ اٹیک ہو گیا۔ یہ ایک عام فہم وجہ بنتی تھی۔

وہ لوگ بے ہوش شخص کو کشتی میں اتار لائے اور کشتی فوراً ساحل کی طرف روانہ ہو گئی۔ کشتی چلانے والا لڑکا خاصا پریشان لگتا تھا۔ اور بار بار پیچھے مڑ کے دیکھتا تھا۔ عملے کا وہ رکن جو ساتھ آیا تھا کچھ فرسٹ ایڈ وغیرہ دینے کی کوشش میں مصروف تھا۔

"یہ کون ہو سکتا ہے یار؟"

"کوئی ایسا شخص جو نااہل یا کوتاہ اندیش ثابت ہوا یا جس نے اعتماد کو دھوکا دیا۔" میں نے کہا۔ "اور نقصان کا موجب ہوا۔"

"کشتی تو آگے جا رہی ہے۔"

"ہم ساحل کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔" میں نے کہا۔

مگر ساحل کے ساتھ ساتھ چلنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ درمیان میں سیکڑوں چھوٹی بڑی کشتیاں حائل تھیں جن کی اوٹ میں وہ کشتی بار بار نظر سے اوجھل ہو جاتی تھی۔ پھر ہمارا راستہ روکنے والے بھی کم نہ تھے۔ ہم منہ سمندر کی طرف کر کے چلتے تھے تو سلوٹ سے ہمیں کوئی ٹکر مار دیتا تھا۔ یا ہم کسی میں گھس جاتے تھے اور اگر ہم کوسٹ گارڈ کی وردی میں نہ ہوتے تو صرف باتیں نہ سنتے، گالیاں بھی سنتے۔ کشتی کو نگاہ میں رکھنے کی اس کوشش میں ہی محسن نے ایک تھال الٹ دیا۔ جس میں کوئی اُبلے ہوئے چھولوں پر نمک مرچ اور پیاز ٹماٹر سجائے بیٹھا تھا۔ اس نے دُہائی تو یوں دی جیسے وہ ہمیشہ کے لیے اقتصادی طور پر دیوالیہ ہو گیا ہو۔ مگر اسے پچاس کا ایک نوٹ مل گیا تو اس نے کہا۔ "اللہ آپ کا بھلا کرے۔" اور بکھرے ہوئے چھولوں کو پھر سمیٹنے لگا۔ جو دیکھ رہے تھے وہ نہیں خریدتے تو نہ خریدیں۔ دوسرے آ جائیں گے جو اسی خاک میں مل جانے والے چھولوں کو شرفِ قبولیت عطا کریں گے۔ وہ دل میں ضرور کہہ رہا ہو گا کہ یوں تھال کو ٹھوکر مار کے پچاس کا نوٹ دے جانے والے روز آئیں تو تقدیر نہ بدل جائے۔

"یار یہ اس کو کہاں لے جا رہے ہیں؟" محسن نے چلتے چلتے پوچھا۔

"انہی سے پوچھ لے بھائی۔" میں نے کہا۔ "میں تو خود انہی کے ساتھ جا رہا ہوں۔"

اسی وقت کشتی نے رُخ بدلا۔ اور گہرے پانی سے ساحل کی طرف آنے لگی۔ میں اور محسن ایک دیوار سے ٹیک لگا کے کھڑے ہو گئے جہاں سے ہم کشتی پر نظر رکھ سکتے تھے، مگر وہ ہمیں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ یہاں رش کچھ کم تھا۔ ذرا آگے ایسی عمارات دکھائی دے رہی تھیں جن پر دفتر ہونے کا گمان ہوتا تھا۔ درمیان میں لوہے کا جنگلا تھا اور ایک خستہ حال تپلی سی سڑک تھی۔

کشتی ہمارے قریب مشکل سے پندرہ گز کے فاصلے پر آ کر رکی اور سراج ہی سب سے پہلے اترا۔

"جلدی کرو، تم کو معلوم ہو گا کہ فون کہاں ہے۔" وہ بولا۔

"فون کسے کرنا ہے؟"

"بے وقوف، ایمبولینس بلوالو، اسپتال فون کرو۔"

"ایمبولینس یہاں کیسے آ سکتی ہے۔" جواب دینے والا وہی ماتحت عملے کا رکن تھا۔ "فون کرنے کا فائدہ؟"

"فائدے کے بچے۔ اسٹریچر تو لے آئیں گے وہ۔" سراج کے بجائے اب دلاور نے برہمی سے کہا۔

"کوئی ضرورت نہیں اس کی۔ وہ سامنے اسپتال ہے۔ میں انھیں خود اٹھا لیتا ہوں۔"

بیک وقت سراج اور دلاور کی صورت پر مایوسی اور

جھنجلاہٹ کے آثار عیاں ہوئے۔ شاید وہ اس صورت حالات کی امید نہیں رکھتے تھے کہ ایک وفادار ان کو خاطر میں نہیں لائے گا اور اپنے افسر کی طرف سے اتنی تشویش میں بھی مبتلا ہو جائے گا۔ معلوم نہیں دلاور اور سراج کے دل میں کیا تھا۔ وہ اس شخص کو مار کے سمندر میں گرا دیتے، لیکن ایک شخص نے دیکھ لیا۔ اس نے مارنے والے ہاتھ کو نہیں دیکھا تھا، لیکن اسے شک ہو گیا تھا یا کوئی اور بات تھی کہ سنبھالنے کے لیے اس نے اپنا ہاتھ بھی بڑھا دیا۔ اگر وہ ساتھ نہ آتا تو کیا ہوتا؟ ممکن ہے دلاور اور سراج اسے اسپتال پہنچانے کے بجائے عدم آباد پہنچا دیتے۔ ان کی کوفت سے تو یہی اندازہ ہوتا تھا کہ انھیں اپنی اسکیم اس دخل در معقولات کے باعث فیل ہو جانے کا افسوس ہے۔

بہت سے لوگ ایک بے ہوش شخص کے بارے میں خوامخواہ کے تجسّس کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ کون ہے، کیسے بے ہوش ہوا، بے ہوش ہے یا مر گیا ہے۔ حالت نازک تو نہیں ہے۔ سراج نے ان سب کو خالص پولیس اسٹائل کی ڈانٹ پلا کے بھگا دیا۔ صرف دلاور اور سراج اس شخص کے ساتھ گئے جو طبّی امداد کی جلد از جلد فراہمی کو یقینی بنانے میں پیش پیش تھا۔ وہ آگے چل نہیں رہا تھا، تقریباً دوڑ رہا تھا۔ سراج اور دلاور کافی پیچھے سر جوڑے کچھ رازدارانہ مشورہ کرتے ہوئے چل رہے تھے۔

جب وہ کافی دور نکل گئے تو میں نے محسن کو اشارہ کیا۔ ”اگر تو نے ٹھیک دیکھا تھا اور مارنے والا سراج ہی تھا تو میرا خیال ہے کہ وہ اسپتال نہیں جائیں گے۔“

”مگر وہ اسپتال جا رہے ہیں۔“ محسن نے کہا۔

”وہ اسپتال کی طرف جا رہے ہیں۔“ میں نے تصحیح کی۔ ”اندر پہنچ کے یا دروازے کے باہر ہی سے وہ لوٹ جائیں گے۔“

”مگر کیوں؟“

”اس لیے کہ ایسا نہ کرنے کی صورت میں وہ اپنی پوزیشن کو مشکوک بنا لیں گے۔“ میں نے کہا۔ ”وہ کسی ڈاکٹر کو بے وقوف بنانے کے لیے یہ نہیں کہہ سکتے کہ اسے ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ ڈاکٹر تو فوراً یہ بتا دے گا کہ اٹیک کہاں ہوا ہے؟“

”اور تیرا کیا خیال ہے؟“

”اور کس بارے میں؟“ میں نے کہا۔

”ڈاکٹر اسے بچا لیں گے یا نہیں؟“

”ڈاکٹر کا تو کام ہی جان بچانا ہوتا ہے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ آگے کون ملتا ہے۔ ڈاکٹر یا اسی نام کا قاتل۔“

”اسپتالوں میں قاتل نہیں ہوتے۔“

”قاتل ہر جگہ مل جاتے ہیں۔ دی اور طوائف دونوں ؑ رنوں

کے نام ہیں۔ لاکھوں میں ایک بیوی اسی طرح طوائف ثابت ہوتی ہے جیسے لاکھوں میں ایک طوائف فطرتاً اچھی بیوی ثابت ہو جاتی ہے۔ کبھی کرائے کے قاتل بھی جان بچا لیتے ہیں اور...“

”اور کبھی جان بچانے والے کرائے کے قاتل بن جاتے ہیں۔ تیری دلیل نے مجھے لاجواب کیا۔“ محسن بولا۔

وہ سب لوگ سڑک پار کر کے ایک دو منزلہ عمارت میں داخل ہو گئے تھے جس کے باہر اسپتال ہونے کی کوئی ظاہری علامت نہ تھی۔ نہ اس پر اسپتال کا نام تھا اور نہ ریڈ کراس کا نشان۔ نہ باہر کوئی ایمبولینس موجود تھی اور نہ بیماروں کا ہجوم تھا۔

”یہ کوئی لوکل اسپتال ہے۔“ محسن بولا۔ ”کسی خاص محکمے کا یا علاقے کا۔“

”یہاں طبّی سہولیات بھی محدود ہوں گی۔“ میں نے غور کرتے ہوئے کہا۔ ”عملہ بھی کم ہو گا۔“

ہم نے دروازے سے اندر جھانک کے دیکھا تو مریض کو ایک اسٹریچر پر لٹایا جا چکا تھا۔ ایک میلی وردی اور بیزار صورت والا نرسنگ اردلی اسے بادل ناخواستہ دھکیلتا ہوا لے گیا۔ اس نے ماتحت کو روکنے کی واجبی سی ناکام کوشش بھی کی۔

”وہ دونوں کہاں گئے؟“ محسن بولا۔

”اِدھر سے داخل ہوئے اور اُدھر سے نکل گئے۔“ میں نے کہا مگر میری بات کی تردید فوراً ہو گئی، جب سراج اور دلاور بائیں جانب کے ایک کمرے سے برآمد ہوئے اور بالکل سامنے والے دروازے کو کھول کے اندر چلے گئے۔ ان کے بالکل پیچھے ایک دبلا پتلا اور ضرورت سے زیادہ طویل قامت شخص آیا جو اپنے گاؤن اور اسٹیتھسکوپ سے ڈاکٹر سمجھا جا سکتا تھا۔

یہ موقع اچھا تھا۔ میں اور محسن لپک کے اندر چلے گئے اور سوچے سمجھے بغیر اس کمرے میں گھس گئے جس میں سے ڈاکٹر نکلا تھا۔ اس کمرے کے اسباب سے بھی یہی ثابت ہوتا تھا کہ کمرا کسی ڈاکٹر کا ہے۔ ایک میز پر بلڈ پریشر کی پیمائش کرنے والا آلہ اور اسپرٹ والی روئی میں تھرمامیٹر رکھا ہوا تھا۔ گھومنے والی کرسی کے پیچھے ایک پرانا رنگین چارٹ تھا جس میں انسانی ڈھانچے کو ایک شفاف انسان کی صورت میں پیش کیا گیا تھا تاکہ اس کے اندرونی اور بیرونی اعضا مختلف رنگوں میں واضح نظر آئیں۔

باہر کسی نے چلّانا شروع کیا۔ وہ انگریزی میں خفا ہو رہا تھا۔ ”کون ہے یہاں ذمے دار، ڈاکٹر ہے یا نہیں؟“

میں نے اس ماتحت کی آواز پہچان لی جو اپنے افسر کو خود کندھوں پر ڈال کے دوڑتا ہوا یہاں تک پہنچا تھا۔ اب شاید مریض کو دیکھنے کوئی نہیں پہنچا تھا تو وہ تاخیر پر مشتعل تھا۔

”میں ڈاکٹر ہوں، لیکن تم کون ہو؟“

”میں اس مریض کے ساتھ ہوں۔“

”مریض کے ساتھ کسی کو آنے کی اجازت نہیں۔ تم جانتے نہیں یہ اسپتال ہے۔ ایسے چلّا رہے ہو۔“ ڈاکٹر نے چلّا کے کہا۔

”تم اور کیا کر رہے ہو۔ اور تم ڈاکٹر ہو تو یہاں کیوں چھپے بیٹھے ہو۔ چل کے اسے دیکھتے کیوں نہیں؟“

”میں یہاں چھپا بیٹھا ہوں۔“ ڈاکٹر بھپٹ پڑا۔ ”آئی سے گیٹ آؤٹ، ورنہ میں دوسرا طریقہ اختیار کروں گا تمھیں نکلوانے کا۔ مجھے اپنا کام معلوم ہے۔ یہاں صرف ایک ہی مریض نہیں ہے۔ ویسے تم بھی مجھے ذہنی مریض لگتے ہو۔“

”یہ ایک ایمرجنسی کا کیس ہے۔“

”یہ فیصلہ کرنا بھی میرا کام ہے کہ کسے ایمرجنسی میں امداد کی ضرورت ہے۔ اور کسے پہلے دیکھنا چاہیے۔“ ڈاکٹر کی آواز کرخت اور پتلی تھی چنانچہ وہ غصّے میں چلّاتے ہوئے مضحکہ خیز لگتا تھا۔ ”اب خیریت سے باہر چلے جاؤ۔“

”او کے۔ او کے۔ لیکن میں باہر موجود ہوں، اور اگر ایسی ویسی کوئی بات ہوئی...“

”مت دھمکی دو مجھے۔“ ڈاکٹر نے دہاڑ کے کہا۔ پھر خاموشی چھا گئی اور ایک دروازہ بند ہوا۔

”میری چھٹی حس کہتی ہے کہ ڈاکٹر کو خریدا جا رہا ہے۔“

”میری ساتویں حس فرماتی ہے کہ ڈاکٹر بک چکا ہے۔ بہت بھاری قیمت پر۔“ محسن نے کہا۔

”اب وہ اطمینان سے اپنا پرائیویٹ کلینک کھولے گا اور اس سرکاری نوکری پر لعنت بھیجے گا جہاں کوئی پرائیویٹ مریض نہیں آتا۔ تنخواہ کم ملتی ہے چنانچہ دوائیں بیچنا پڑتی ہیں۔ بوگس بل سائن کرنا پڑتے ہیں۔ ہر روز تھوڑا تھوڑا ضمیر بیچنے سے بہتر ہے کہ ایک ہی دن بھاری قیمت پر اسے انسانیت کی دکان سے اٹھا کے شیطان کے ہاتھ بیچ دیا جائے۔

”پھر ہم جاتے ہیں۔“ میں نے سراج کی آواز سنی۔ ”اور اپنے ڈاکٹر صاحب! باتیں آپ نے دو ہی یاد رکھنی ہیں۔ ایک تو یہ کہ آپ نے کبھی ہمیں اس دنیا میں نہیں دیکھا، ہیں جی، اور دوسری...“

”میں سمجھ گیا۔ آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔“

”اوجی، ہم نے اپنی فکر تو آپ کو دے دی ہے۔ اپنے ڈاکٹر صاحب!“ چوہدری دلاور بولا۔ ”بس خیال رہے کہ یہ لین دین ہے لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔ آپ کو یاد ہیں۔“ دلاور کی آواز معدوم ہو گئی۔

میں نے محسن کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اس نے اقرار میں سر ہلایا اور ہم نے ایک ساتھ اپنے اپنے ریوالور نکال لیے۔ پھر ہم بیک وقت باہر آ گئے۔ بائیں جانب والے دروازے سے سراج اور دلاور نکلے ہی تھے اور ڈاکٹر اب گاؤن کی جیبوں ہاتھ ڈالے بائیں طرف جا رہا تھا۔ آہٹ پر وہ پلٹا اور اپنی جگہ منجمد ہو گیا۔

”کون ہو تم لوگ؟“ اس نے بہ مشکل تمام کہا۔

”پہلے تم بتاؤ۔“ میں نے قریب جا کے کہا۔ ”بلکہ تم کون ہو؟ ڈاکٹر یا قاتل؟“

”اور کیا بننا چاہو گے؟ مقتول و مرحوم یا...؟“ محسن نے کہا۔

”کیا بکواس ہے یہ؟“ وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔

”ہم مذاق کر رہے تھے۔“ میں نے کہا اور ریوالور جیب میں رکھ لیا۔ ”ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ آپ اب ایک سیکنڈ بھی ضائع کیے بغیر اس کیس کو دیکھ لیں۔“

محسن نے بھی اپنا ریوالور جیب میں رکھ لیا۔ ”جسے آپ ایمرجنسی سمجھنے پر تیار نہیں مگر ہم جانتے ہیں کہ وہ ایمرجنسی کا کیس ہے۔“

”اس پر قاتلانہ حملہ ہو چکا ہے ایک بار۔“ میں نے کہا۔

”دوسرا حملہ ایک ڈاکٹر کی طرف سے نہیں ہونا چاہیے۔“ محسن بولا۔

ڈاکٹر نے کہا۔ ”شٹ اپ۔“

میں نے اسے ایک دم پکڑ لیا اور گھسیٹ کر کمرے میں لے گیا۔ میں نے اس کا ایک ہاتھ موڑا تو وہ خود ہی پلٹ گیا تھا۔ دوسرا ہاتھ میں نے پیچھے سے... اس کے منہ پر رکھ دیا۔ محسن کے دروازہ بند کرتے ہی میں نے ڈاکٹر کو میز پر پھینک دیا۔

”کتنے پیسوں میں سودا کیا ہے اس قتل کا؟“ میں نے کہا۔

”تم... تم لوگوں کو ضرور غلط فہمی ہوئی ہے۔“ وہ ہکلا کے بولا۔ ”میں ڈاکٹر ہوں۔“

”ہم بھی چاہتے ہیں کہ تم ڈاکٹر ہی رہو۔“ محسن بولا۔ ”اور سمجھ لو کہ اگر وہ آدمی مر گیا تو تم بھی زندہ نہیں رہو گے۔“

”ذرا اپنی تلاشی تو دو۔“ میں نے کہا۔ ”جلدی کرو۔“

”تلاشی، لیکن کیوں؟“

”سوالات میں وقت ضائع مت کرو۔“ میں نے اسے پھر کھڑا کر دیا اور اس کی جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔ ”یہ ریوالور تو دیکھنے دکھانے کے تھے۔ اصل موت تو ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ خالی ہاتھوں میں۔“

”یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟“ ڈاکٹر اب سخت خوفزدہ تھا۔

”محسن یہ کرسی اٹھا کے لا۔“ میں نے تلاشی لینے کا عمل جاری رکھتے ہوئے کہا۔ اور بالآخر اندر کی جیب سے ایک چیک نکالتے

میں کامیاب رہا۔ اس پر ایک لاکھ کی رقم لکھی ہوئی تھی۔

ڈاکٹر کا رنگ فق ہو گیا۔ "یہ... انھوں نے بھی زبردستی کی تھی۔ انہوں نے کہا...."

"اگر تم نے اسے نہ مارا تو ہم تمھیں مار دیں گے۔ ورنہ یہ لو ایک لاکھ اور سب کچھ بھول جاؤ۔ مثلاً یہ کہ وہ یہاں آئے تھے۔"

محسن نے مجھے کرسی پیش کی۔ میں نے اسے تول کے اٹھایا۔ اور ہوا میں اچھالا۔ کرسی جب نیچے آ رہی تھی تو میں نے اس پر ہاتھ مارا۔ لکڑی کی کرسی کے ٹکڑے ہو گئے۔

"اب تم خود کو اس کرسی کی جگہ فرض کر کے جواب دو کہ کیا کرو گے۔ موت تو برحق ہے۔ یہ چیک بھی جھوٹا نہیں ہے۔"

"میں... میں وعدہ کرتا ہوں... اسے بچا لوں گا۔" ڈاکٹر نے کانپتے ہوئے کہا۔

"بس تو پھر چلو۔ ایک آدمی جسے تم نے ابھی باہر نکال دیا تھا اسے بھی بلا لو۔" محسن نے کہا۔ "کرسی کی قیمت ہم ادا کر دیں گے۔"

میں نے چیک کو پرزے پرزے کر دیا۔ "جب وہ پھر آئیں تو تم ان سے یہ سب کہہ دینا۔ اول تو وہ پوچھیں گے نہیں، مگر پوچھیں تو ہمارا نام بھی بتا دینا۔ سکندر اور محسن۔ پھر وہ تم کو کچھ نہیں کہیں گے۔ تم پر یقین بھی یقین لیں گے۔ اب چلو۔"

ڈاکٹر کو میں اپنے ساتھ لے گیا۔ اس مُردہ گھر جیسے ویران اسپتال میں ایک وارڈ بھی تھا، لیکن مریض کوئی نہیں تھا۔ اس کے ایک بیڈ پر وہ شخص بہ دستور بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے اس کا باقاعدہ معائنہ شروع کیا۔

"پریشانی کی کوئی بات نہیں۔" وہ عادتاً ایک جملہ بولا۔

"پریشانی اگر ہو گی تو تمھیں۔ یہ بات ذہن میں رکھو۔" میں نے کہا۔

"نہیں... وہ... میں ابھی انجکشن لگاتا ہوں۔ آدھے گھنٹے میں یہ آپ کے ساتھ جانے کے قابل ہو جائیں گے۔" وہ بولا۔

محسن اس کے ماتحت کے ساتھ اندر آیا۔

"میرا نام شاہ جمیل ہے۔" وہ بولا۔ "میں اس شپ پر نیا ہوں۔"

"آپ کچھ بتا سکتے ہیں... یہ سب کیوں ہوا؟" میں نے کہا۔

"جی، میں نے کچھ نہیں دیکھا۔ مجھے تو انھوں نے بتایا کہ ان کو مارنے کی کوشش کی گئی تھی اور آپ لوگ اتفاق سے وہاں موجود تھے۔" شاہ جمیل بولا۔

"میں یعنی ہم دونوں۔ بس ایسے ہی ڈیوٹی پر گشت کر رہے تھے۔ میرے ساتھی کی نظر پڑ گئی۔" میں نے کہا۔

"اتنی دور سے، کمال ہے۔" وہ بولا۔ "لیکن میں بالکل نہیں بتا سکتا کہ اگر انھوں نے ایسا کیا تو کیوں؟"

"کیا آپ ان دونوں کو نہیں جانتے؟"

شاہ جمیل نے نفی میں سر ہلایا۔ "آپ جانتے ہیں؟"

"جانتے تو ہم بھی نہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن آپ کا جذبہ دیکھتے ہوئے ہم صرف یہ بتا سکتے ہیں کہ ان کی جان کو خطرہ لاحق رہے گا۔ یہاں سے جانے کے بعد بھی۔ آج تو آپ نے انھیں بچا لیا، لیکن آئندہ خدا ہی بچا سکتا ہے۔"

"آج بھی خُدا نے ہی بچایا۔ میں نے تو کچھ نہیں کیا۔"

"آپ نے یہ کیا کہ ساتھ آ گئے ورنہ انھیں یہاں پہنچنا بھی نصیب نہ ہوتا۔" میں نے کہا۔ "اب آپ ان کو ساتھ لیے بغیر نہیں جائیں گے اور ہر وقت ان پر نظر رکھیں گے۔ یہ کون ہیں ویسے؟"

"یہ جہاز کے فرسٹ آفیسر۔ قدیر الدین۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ آپ لوگ مجھ سے زیادہ ان کے بارے میں کیسے جانتے ہیں کہ ان کی جان کو خطرہ لاحق ہے۔ نام تو آپ لوگوں کو معلوم نہیں، مگر اور بہت کچھ معلوم ہے۔ مجھے تو شک ہے کہ آپ انھیں بھی جانتے ہیں۔"

"میرا تو خیال تھا کہ تم ہمارا نام سنتے ہی اچھل پڑو گے۔ تم نے تو ہمیں بہت مایوس کیا۔"

"اس نام میں ایسی کیا بات ہے۔"

"چلو چھوڑو، جب تم کو دنیا کی خبر ہی نہیں۔" میں نے کہا۔ "تم آدمی فرض شناس ہو اور وفادار ہو۔ اس جہاز پر کیسے آ گئے؟"

"یہ بھی عجیب سوال ہے۔" وہ بولا۔ "کیا اس شخص کو یہاں نہیں آنا چاہیے جس کی ذات میں یہ خرابیاں ہوں۔"

"شاید میرا سوال غلط ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ ایک غیر ملکی جہاز ہے اور تم پاکستانی ہو۔"

"بہت سے پاکستانی غیر ملکی جہازوں پر، غیر ملکی اداروں میں، یہاں تک کہ غیر ممالک میں کام کرتے ہیں۔" وہ بولا۔

"یہ بھی ٹھیک کہا تم نے۔"

"مزید یہ کہ میں پاکستانی نہیں ہوں۔ میں انڈین نیشنل ہوں۔ بھارت کا رہنے والا مسلمان۔ جیسے شاہ جمیل صاحب ہیں۔"

میں چکرا گیا۔ "مگر تم یہ جانتے تھے کہ یہاں ایک اسپتال ہے۔ حالانکہ یہ بات عام طور پر سب کو معلوم نہیں۔ یہاں کہیں لکھا ہوا بھی نہیں ہے کہ یہ اسپتال ہے۔"

"اور درحقیقت اسے اسپتال کہنا بھی زیادتی ہے۔" محسن نے ڈاکٹر کی طرف دیکھ کر کہا جو انجکشن لگا کے گم صم کھڑا ہوا تھا۔ "یہ ایک بوچڑ خانہ ہے۔"

"یہ ایک خیراتی اسپتال ہے۔" ڈاکٹر نے تلخ لہجے میں کہا۔

...ٹرسٹ سے چلتا تھا۔ ٹرسٹ کو چلانے والے اصل ...ن کے چیتے ہیں۔ اب جو ہے تمھارے سامنے ہے۔ ...تنخواہ ادا ہوتی ہے۔"

"تم پھر بھی یہاں بیٹھے ہو کہ آئے کوئی بدبخت آتا اور تمھارے ...ر کر دے۔" میں نے طنز سے کہا۔

"...جیسے کہ آج آ گیا تھا۔" محسن بولا۔

"مجھے ایک بات بتاؤ۔ کیا تم واقعی سند یافتہ ڈاکٹر ہو؟ ...رکھتے ہو۔" میں نے اس کی صورت پر برسنے والی ...جرم کی تحریر کو پڑھنے کی کوشش کی۔

"...رہا۔ "پہلے یہاں مریض بھی آتے تھے۔"

"یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے میں ڈسپنسر تھا۔" وہ بولا۔ "مجھے انھوں نے ...کام چلاؤ۔ تنخواہ وہی ملے گی جو ڈاکٹر لیتا تھا۔ وہ تو پہلے ہی ...نکل گیا تھا۔ جو مجھے جانتے تھے وہ مجھ سے علاج کیوں ...اور کہیں مجھے اتنی تنخواہ نہیں ملتی۔"

"چنانچہ تم بھی لوٹ مار میں شریک ہو گئے۔ کاغذ پر اسپتال ...چلتے رہے۔ ناؤ کاغذ کی سدا چلتی نہیں تو کاغذی اسپتال کیسے ...چل سکتا تھا۔ مگر تم حسابات پورے رکھتے ہو گے۔ یہ دکھاتے ...ہو گے کہ سیکڑوں مریض ہر روز آتے ہیں۔ وارڈ بھرا رہتا ہے۔ ...کے لیے دوائیں مہیا نہیں۔ خوراک، بستر، چادر، فرنیچر اور ...دیکھ بھال کے سب اخراجات ہوتے ہیں۔ کوئی اسے فراڈ ...ثابت نہیں کر سکتا۔ تم غیر قانونی کام بھی کرتے ہو گے۔ نسخوں ...نسخہ دوا سے مہلک زہر تک لکھ کر دینے کے لیے اسپتال ...لیٹر پیڈ اور مُہر استعمال کرتے ہو گے۔ بوگس میڈیکل سرٹیفکیٹ ...جاری کرتے ہو گے۔ شاید لمبی چھٹی کے خواہش مندوں کو اسپتال ...میں داخل دکھا دیتے ہو گے اور... ممکن ہے ڈیتھ سرٹیفکیٹ ...جاری کیا ہو کسی کو۔ انشورنس کی رقم وصول کرنے کے لیے اور قتل ...کیے ہوں۔ ان بچوں کو جن کا وجود ہی معاشرے سے زیادہ ...کی عزت کا ناسور بن جاتا۔" میں اب سخت مشتعل ہو چلا تھا۔

"تمھاری خاموشی ظاہر کرتی ہے کہ تم نے یہ سب کیا ...ہے۔" محسن نے نفرت سے کہا۔ "آج تم اس آخری حد سے بھی ...گزر جاتے۔"

"تم میری مجبوری کو نہیں سمجھ سکتے۔"

میں نے اس کے ایک چھانپڑ دیا۔ "لالچ کو نام دیتے ...مجبوری کا۔ تم کو چاہیے پیسہ، زندہ رہنے کے لیے نہیں، عیاشی ...کے لیے، بدمعاشی کے لیے۔ جو تمھیں جائز ذرائع سے نہیں مل ...سکتا تھا۔"

احساسِ ذلت سے اس کا چہرہ سُرخ پڑ گیا۔ "اور سب کیا کر رہے ہیں۔ تم خود کیا کر رہے ہو؟ یوں ریوالور لے کر اسپتالوں میں مار پیٹ کرنے اور قانون کو ہاتھ میں لینے کا حق کس نے دیا ہے تمھیں؟"

"یہ حق خود ہم نے حاصل کیا ہے، مگر اپنے لیے نہیں۔"

"ہونہہ۔" وہ بولا۔ "تم خدمتِ خلق کے لیے بدمعاشی کرتے ہو۔ ڈاکا ڈالتے ہو گے تو زکوٰۃ دینے کے لیے۔ تمھیں حساب لینے والا کوئی نہیں ملا ابھی تک۔ اس لیے تم خدائی فوجدار بن گئے ہو۔"

"ہمارا حساب صاف ہے۔" میں نے اپنا ہاتھ روک لیا۔ "اور اسی نے ہمیں خدائی فوجدار بننے کی ہمت دی۔ اب تم تھوڑا سا حساب اور دو۔ ان دونوں کو تم کب سے جانتے تھے اور کیسے جانتے تھے؟"

"میں... نہیں... کون دونوں؟ کس کی بات کر رہے ہو تم؟" وہ اپنی گھبراہٹ چھپانے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔

"انھوں نے تو یہی سبق پڑھایا تھا تمھیں جو تم مجھے سُنا رہے ہو۔" میں نے کہا۔ "مگر تم اچھی طرح جانتے ہو، میں کس کی بات کر رہا ہوں۔"

"وہ... وہ پہلی بار آئے تھے۔"

میں نے اس کے دوسرا چھانپڑ مارا۔ "اور تم نے ان سے چیک لے لیا۔ اتنا اعتماد تھا تمھیں ان پر۔"

صورتِ حال اس ماتحت کے لیے بہت پریشان کُن ہو گئی تھا جو اپنے فرسٹ آفیسر کی جان بچانے میں پیش پیش تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ دونوں کون تھے جن پر ہم نے قاتلانہ حملے کا الزام لگایا تھا۔ ہم کوسٹ گارڈ کی وردی میں تھے لیکن ہمارا رویہ دہشت پسندانہ تھا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے آخر؟" اس نے اچانک درمیان میں آ کے کہا۔ "کیا چاہتے ہو تم لوگ؟"

"ابھی میں یہ چاہتا ہوں کہ تم ایک طرف ہٹ جاؤ۔" میں نے نرمی سے کہا۔

"مگر میں چاہتا ہوں کہ تم اس معاملے کو ختم کرو، اور جاؤ۔ میں تمھاری مدد کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔" وہ سخت لہجے میں بولا۔

"تمھیں کچھ معلوم نہیں۔"

"میں جاننا بھی نہیں چاہتا۔ تم کوئی بہت غلط قسم کے آدمی ہو۔ مگر میں جھگڑے میں نہیں پڑوں گا۔ بہتر ہو گا اگر تم چلے جاؤ۔"

"ورنہ تم کیا کرو گے؟"

"میں پولیس کو بلاؤں گا اور تمھیں ان کے حوالے کر دوں گا جو کچھ میں نے سنا ہے اور دیکھا ہے سب بتا دوں گا۔" وہ قد اور جسامت میں مجھ سے زیادہ تھا، اس لیے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا رہا۔

میں اسے کوئی نقصان نہ پہنچاتا۔ زیادہ سے زیادہ میں اس کو کچھ فاصلے پر پھینک دیتا اور محسن سے کہتا کہ اسے قریب نہ آنے دے۔ وہ جانتا تھا کہ ہم مسلح ہیں اور اس قسم کا ردِ عمل خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے مگر وہ خود کو غیر ملکی ہونے کے ناطے سفارتی تحفظ میں محسوس کرتا تھا اس کا خیال ہو گا کہ سفارتی عملے کے ساتھ مار پیٹ کی ہمت ہم کر ہی نہیں سکتے۔

لیکن اس سے پہلے کہ میں یہ غلط فہمی دور کرتا "ڈاکٹر" بن کے دنیا کو دھوکا دینے والے اس بے ضمیر مجرم اور قاتل نے موقع سے فائدہ اٹھانا چاہا اور اپنی تذلیل کا بدلہ لینے کی کوشش کی۔ اس نے بڑی تیزی سے گھوم کر اپنے پیچھے سے کوئی چیز اٹھالی۔ اور مجھ پر دیوانہ وار حملہ کیا۔

یہ صرف پاگل پن تھا۔ انتہائی ذلت کے احساس اور اشتعال نے اسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ کچھ ضرور کرے۔ اس کو معلوم تھا کہ وہیں دروازے کے پیچھے کوئی لوہے کا پائپ پڑا ہوا ہے۔ اس نے پائپ کو لاٹھی کی طرح گھمایا، مگر اس کی حرکت کو سب سے پہلے محسن نے اور پھر میں نے نوٹ کر لیا تھا۔

محسن نے دو قدم پیچھے ہٹ کے ریوالور نکال لیا اور میں بھی غوطہ مار گیا لیکن میرے سامنے کھڑا ہوا شخص کچھ نہ دیکھ سکا اور پائپ کا بھرپور وار اپنی متحرک قوت کے ساتھ اس کے سر پر لگا۔ اس کی کھوپڑی کی ہڈی ٹوٹنے کی آواز صاف سنائی دی۔ پھر وہ نیچے گر گیا۔ اور دشمن میرے سامنے آگیا۔ وہ چھ فٹ لمبے پائپ کو پھر نہ اٹھا سکا۔

میں نے اس کے ہاتھ پر ٹھوکر ماری اور اس کی کلائی کی ہڈی ضرور ٹوٹ گئی ہو گی کہ وہ بلبلایا۔ پائپ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گرا۔ میں نے اسے دوسری لات پیٹ پر رسید کی۔ اور جب وہ جھکا تو اگلی ٹھوکر اس کی گردن پر لگی۔ اس نے ہاتھ پھیلا کے ایک بار منہ کھولا۔ اور سانس لینے کی ناکام کوشش کی۔ پھر وہ سیدھا منہ کے بل آیا۔ اور فرش پر گر کر ساکت ہو گیا۔

میں نے اب اس شخص کو دیکھا جس نے مجھ پر کیے جانے والے وار کی سزا قبول کی تھی۔ خون اور اس کے سر کا مغز مل کے فرش پر بہہ رہے تھے اور وہ کھلی آنکھوں سے مجھے گھور رہا تھا۔ یوں جیسے اب بھی کہہ رہا ہو کہ دیکھا۔ میں ٹھیک کہہ رہا تھا نا۔ تم بہت غلط قسم کے آدمی ہو۔

میری طرح محسن بھی اس غیر متوقع خونی ڈرامے سے کچھ پریشان ہو گیا تھا۔ ہم ابھی سکتے کے عالم میں کھڑے ہوئے تھے کہ باہر سے اچانک اندر آجانے والے نرسنگ اردلی نے چیخ کر کہا۔

"خون... ارے کوئی دوڑو رے"

محسن نے لپک کے اسے پکڑا۔ اور اندر کھینچ کر ... بند کر دیا۔

مگر اسی وقت میں نے اپنے پیچھے سے آواز سنی ... چھوڑ دو اسے بھی۔ اور سب سیدھے کھڑے ہو جاؤ ... کہ میرے ہاتھ میں ریوالور ہے اور میری انگلی ٹرائیگر پر ...

"مسٹر شاہد جمیل" میں نے بے فکر کہا "یہ دو خون بھی ہوئے۔ نہ اس میں ہمارے ارادے کو دخل تھا اور نہ نیت ..."

"مجھے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں" وہ بولا "میں نے کچھ اپنے کانوں سے سُنا اور تھوڑا بہت آنکھوں سے دیکھا ..."

"کیا دیکھا؟ یہی کہ میں نے دونوں کو مارا؟"

"کم سے کم ایک کو تو تم نے ضرور مارا ہے۔ اس ..."

"اپنے دفاع میں... جو کوئی جُرم نہیں۔"

"میں نہ فردِ جُرم عائد کر رہا ہوں۔ نہ مجھے اس کا اختیار ..." وہ بولا "میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم ہاتھ اٹھا کے آہستہ آہستہ چلتے ہوئے دیوار تک جاؤ، پھر احتیاط سے منہ میری طرف کر کے کھڑے ہو جاؤ۔"

"آپ ہم سے ہتھیار ڈالنے کو نہیں کہیں گے" محسن بولا۔

"نہیں، ہاتھ نیچے مت لانا، ورنہ مجھے غلط فہمی ہو جائے گی کہ تم ریوالور کے نشانے میں اپنی تیزی اور مہارت آزمانا چاہتے ہو نہ میں مرنا چاہتا ہوں اور نہ ایسے ہی بلا سبب دو خون کرنے کے موڈ میں ہوں۔" شاہد جمیل نے کہا۔

"یہ ایک معقول بات ہے۔" میں نے کہا اور محسن کی طرف دیکھا۔ ہم نے ویسا ہی کیا جیسا کہا گیا تھا۔

"اب مجھے بتاؤ کہ یہ سب کیا معاملہ ہے؟" وہ بولا "تم کون ہو؟ ان معاملات میں دخل در معقولات کا مقصد کیا ہے؟"

"آپ نے ان سے پوچھا تھا؟" میں نے سوچ کے کہا "کہ وہ کون ہیں جو آپ کے جہاز پر چڑھ گئے تھے، کسی قانونی اختیار کے بغیر۔ دیکھیے نا، ہر ایک کو تو کسی بھی غیر ملکی جہاز پر جانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔"

"اور آپ کو تو ڈپلومیٹک امیونٹی حاصل ہو گی۔ یہ بہت سنگین معاملہ بن سکتا ہے۔" محسن بولا "آپ اسے سفارتی یا حکومتی سطح پر اٹھا سکتے ہیں کہ آپ کو قتل کرنے کی کوشش کی گئی۔"

"آپ کو فوراً پولیس کو طلب کر کے رپورٹ دینا چاہیے اس واردات کی۔" میں نے کہا "اپنے سفارت خانے کو مطلع کرنا چاہیے اور ان دونوں بدمعاشوں کا نام بھی بتا دینا چاہیے۔"

"یہ کیا بکواس ہے؟ کون بدمعاش؟ مجھ پر کسی نے قاتلانہ حملہ نہیں کیا۔" وہ بالآخر ہم دونوں سے مخاطب ہوا۔

... لگتا ہے ہماری نظر نے غلط دیکھا ہو۔"

"ہاں، دھوکا ہو جاتا ہے آدمی کو" محسن نے میری تائید کی۔ "ہم نے کچھ فاصلے سے سارا منظر دیکھا تھا۔ جیسے کوئی سینما میں فلم کو سب سے پیچھے والی سیٹ پر بیٹھ کے دیکھے۔"

"مگر وہ فلم نہیں تھی یار! تم نے غلط مثال دی۔"

"بیوٹی فلم تھی" محسن نے اصرار کیا "وہ ایکٹر بھی اچھے تھے۔ ایکٹر تو اپنے شاہد جمیل صاحب بھی اچھے ہیں۔ کیا خیال ہے؟" ... میں ... دلاور کے لہجے میں کہا۔

"شٹ اپ" اس نے چلا کے کہا "کیا... ہر ایک کے ... لینے لگتے ہو تم... دوسرے کو موقع ہی نہیں دیتے۔ کیا ... تھا تم نے؟"

"ہم نے دو افراد کو دیکھا تھا۔ وہ ایک کشتی میں سوار ہو کے ... بحری جہاز پر گئے۔ وہاں بالکل آپ کی شکل و صورت کا ایک ... تھا اس سے نہ جانے کیا بحث کرتے رہے پھر ان میں سے ایک نے ... سے آیا تھا، یہاں وار کیا۔"

"... ہوں" ذرا نیچے، دو سوت نیچے" محسن بولا۔

"میں ٹھیک بتا رہا ہوں" میں نے اسے ڈانٹ کے کہا۔ "... سوت کا فرق نہیں۔"

"اس نے یہاں ہاتھ مارا تھا" اس نے میری گردن پر ہاتھ مارا۔ "یہاں مارا تھا" میں نے جوابی کارروائی کی۔

"اُف..... پاگل ہو تم دونوں یا مجھے پاگل کرنا چاہتے ہو" ... شاہد جمیل نے اپنا سر پکڑ لیا اور بستر پر بیٹھ گیا۔

"کیا ہم بھی بیٹھ جائیں" میں نے معصومیت سے کہا۔

"یا لیٹ جائیں، ان کے ساتھ" محسن نے کہا۔

"خدا کے لیے مجھے بخش دو۔ یہ بتا دو کہ تم کون ہو۔ ان دونوں کو کیسے جانتے ہو؟"

"کون دونوں؟" میں نے ہکا بکا ہو کے محسن کی طرف دیکھا۔

"یہ منکر نکیر کا پوچھ رہے ہوں گے" محسن بولا۔

"کیا پتا یاجوج ماجوج کے بارے میں..."

"میں اس حرام زادے سراج اور اس کے باپ دلاور کے ... پوچھ رہا ہوں۔ اب ٹھیک ہے؟" شاہد جمیل نے دونوں ... سر پٹک کے کہا۔

"اچھا، وہ دونوں" میں نے گھڑے جیسا سر ہلایا "تو آپ ... مانتے ہیں کہ انھوں نے آپ کو قتل کرنا چاہا تھا۔"

"اور اجازت دیتے ہیں کہ ہم ہاتھ نیچے کر لیں۔"

... نے اقرار میں سر ہلایا اور ہمیں گھورتا رہا۔

"میرا خیال اور مشورہ ہے۔" میں نے کہا "کہ اب ہم کو یہاں سے چلے ہی جانا چاہیے۔"

"اور اس ڈسپنسر کو کیسے ڈسپنس کریں" محسن بولا "کہ ڈسپنسر جو نیم مُردہ سا زمین پر بیٹھا ہوا تھا اپنا ذکر سُن کر چونکا۔

"اب اسپتال میں تو ڈسپنسر کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہی۔ کیونکہ وہ جو بیچتے تھے دوا مُے دل۔"

"وہ خود ڈسپنسر تھے" محسن بولا "لیکن مجبوراً ڈاکٹر بنے تھے۔ یہ شخص بھی شاید اسپتال کا چپراسی دھوبی ہو گا جو مجبور تھا ڈسپنسر بننے پر۔"

"اس کی بھی چھٹی کر دیں" میں نے کہا "بانس، بانسری اور بانسری نواز، سب ختم۔ نہ اسپتال نہ مریض نہ ڈاکٹر نہ کمپاؤنڈر۔"

"خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔ مجھے مت مارو۔ میں وہی کروں گا جو تم کہو گے۔" وہ زار و قطار رونے لگا "کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔ میری زبان کاٹ دینا اگر ایک لفظ بھی نکلے۔"

"مگر وہ کاٹنا زیادہ آسان رہتا ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں، زبان ساتھ ہی آجاتی ہے۔" محسن نے کہا۔

وہ پھر دہشت زدہ ہو کے چلایا اور ہمارے قدموں میں لوٹنے لگا۔ میں نے لات مار کے اسے دور پھینکا۔

"تم اپنی جان بچانے کے لیے کیا کر سکتے ہو؟ ہمارے لیے؟" میں نے سوال کیا۔

"آپ حکم کریں۔ جو نہ مانے وہ کُتا، اس کا باپ کُتا۔"

"بس بس، زیادہ بھونکنے کی ضرورت نہیں" محسن بولا "ہم نے تمھاری ولدیت نہیں پوچھی۔"

"یہ بتاؤ کہ اسپتال میں وردی تو ہو گی، ایسی ہی اور نرسوں کے استعمال کی۔"

"ہاں جی، گودام میں سب بھرا پڑا ہے۔"

"تم دو سفید وردیاں لاؤ، نرسنگ کی" میں نے کہا "دو لیڈیز کے لیے اور دو حضرات کے لیے۔ جاؤ۔"

محسن نے میری بات سمجھنے کے انداز میں سر ہلایا اور اسے ساتھ لے گیا۔

"اب جناب، شاہد جمیل صاحب!" میں نے کہا "آپ مختصراً یہ بتائیں کہ سراج اور دلاور سے آپ کو کیا اختلاف تھا۔ اور کیوں؟ غلط بیانی کریں گے تو مجھے معلوم ہو جائے گا۔ اس بحری جہاز 'ایس ایس کرانتی' پر جو کچھ ہوا سب مجھے پہلے سے معلوم ہے۔ آپ اس پر فرسٹ آفیسر کی حیثیت سے نئے آئے ہیں۔"

"ہاں، اور مجھے بہت سے لوگوں کی مخالفت کے باوجود یہاں بھیجا گیا۔"

"مخالفت کرنے والے کون لوگ تھے؟" میں نے کہا۔

"مجھے نہیں معلوم۔ بس مجھے پہلے فون پر کہا گیا کہ میں انکار کر دوں مگر میں نے مجبوری کا اظہار کیا۔ ایک تو میں بے روزگار تھا۔ یہ نئی نوکری میں کیسے چھوڑ دیتا۔ پھر یہ کہ مرضی تو مالکوں کی چلتی ہے۔ وہ چاہیں تو مجھے دوسرے جہاز پر بھیج دیں۔ انھوں نے کہا کہ یہ سب چھوڑو۔ تم انکار کر دو۔ تمھیں دوسری نوکری مل جائے گی اور اس سے بہتر۔ میں نے کہا کہ یہ کیا فضول بات ہے۔ تم فون پر بات کر رہے ہو۔ مجھے کیا معلوم کہ مذاق کر رہے ہو یا مجھ سے دشمنی۔ بات کرنی ہے تو سامنے آ کے کرو۔ مجھے بتاؤ کہ وہ دوسری نوکری کہاں ہے اور کس طرح بہتر ہے۔ ممکن ہے وہ تمھارے نقطۂ نظر سے بہتر ہو۔ میں قبول نہ کروں۔ وہ بولا کہ نوکری میں آدمی کیا دیکھتا ہے؟ تنخواہ اور مراعات۔ تم کو دگنی تنخواہ ملے گی۔ میں نے کہا کس بات کی؟ اگر اسمگلنگ کرنے کی ملے گی تو میں دس گنا پر بھی لعنت بھیج دوں گا۔ اور یہیں رہنے کو ترجیح دوں گا۔ اس پر فون بند ہو گیا۔ پھر کوئی میرے گھر میں خط ڈال گیا۔ اس میں پھر وہی مطالبہ تھا۔ اور دھمکی بھی تھی کہ میرے خاندان کو میری ضد کا خمیازہ بھگتنا پڑا تو ایسا میری حماقت کے باعث ہوگا۔ میں نے سیٹھ کو بتا دیا۔ جو شپنگ کمپنی کا مالک ہے۔ اس نے پولیس کو مطلع کر دیا۔ اور مجھے کہا کہ تم جاؤ۔ دیکھو یہ لفڑا کیا ہے۔ سالا کون ہے جو اپن کا جہاز پر اپنا آدمی کو ایسے تڑی دیتا ہے۔ اس کے بعد میں نے اپنی فیملی کو تو ایک ایسی جگہ بھیج دیا۔ جہاں وہ محفوظ رہیں گے اور خود جہاز پر آ گیا۔ اس پر کچھ عجیب اور پراسرار واقعات ضرور پیش آئے، لیکن میں نے غیر ضروری تجسس کا مظاہرہ نہیں کیا۔ ذمّے داری تو سب کپتان کی ہوتی ہے۔ مگر ابھی چند دن پہلے خود کپتان نے مجھے بلایا۔ اور کہا کہ وہ میرے فائدے کی ایک بات کرنا چاہتا ہے۔ اس نے کہا کہ یہاں سے کچھ مال جائے گا۔ اس کا ریکارڈ کوئی نہیں ہوگا۔ معاوضہ وہاں ملے گا اور ہمارے ہی پاس رہے گا۔"

"اور تم نے پھر انکار کر دیا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"میں اس قسم کی بے ایمانی میں شریک نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ تو صاف ظاہر تھا کہ وہ مال کس قسم کا ہوگا۔ کپتان مجھے اسمگلنگ کے معاملے میں شریکِ جرم بنانا چاہتا تھا۔ یہ ناممکن تھا کہ وہ جہاز پر کوئی غلط چیز لے جاتا اور مجھے پتا نہ چلتا۔ جہاز کے عملے کے کسی بھی فرد کے بارے میں آپ فرض نہیں کر سکتے کہ جو کچھ جہاز پر ہو گا وہ اس سے بے خبر رہے گا۔ کپتان نے مجھے بتایا کہ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ ہر پھیرے میں کچھ مال اُدھر سے آتا ہے اور کچھ اِدھر سے جاتا ہے۔ جو باقاعدہ امپورٹ ایکسپورٹ کے ضوابط کے مطابق نہیں بھیجا جاتا۔ اس کا معاوضہ ہی اصل چیز ہے۔ ورنہ خالی پہلی نوکری کی تنخواہ سے کیا ہوتا ہے۔ سب اس منافع میں اپنی حیثیت کے مطابق شریک ہوتے ہیں۔ مطلب یہ کہ تنخواہ نہیں ہوتا کیونکہ مرتبہ سب کا برابر نہیں اور ذمّے داری کا رِسک برابر نہیں۔ قصہ مختصر۔ وہ مجھے دس فیصد پیش کر رہا تھا پھر پندرہ پر آ کے رُک گیا۔ اس نے واضح کیا کہ یہ پندرہ فیصد ساڑھے سات لاکھ ہوں گے۔ میں سوچ لوں اور پھر فیصلہ کروں لیکن یہ نہ بھولوں کہ انکار کی صورت میں میرے لیے پریشان کن مسائل بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس دھمکی نے مجھے ہوشیار کر دیا۔ جو دھمکیاں مجھے پہلے دی گئی تھیں، وہ میرے ذہن میں تھیں۔ میں سمجھ گیا کہ کپتان اور جہاز کا عملہ سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں اور ایک ہی گروہ کے آلۂ کار ہیں۔ میں وہیں انکار کرتا تو معاملہ بگڑ جاتا۔ چنانچہ میں نے رات بھر کی مہلت مانگی اور صبح کہہ دیا کہ ساڑھے سات تو نہیں، دس لاکھ میں مجھے منظور ہے۔ کپتان خبیث شاید پہلے سے یہ جانتا تھا کہ میرا جواب کیا ہوگا۔ وہ ہنسنے لگا کہ بس اتنی ہی ہمت تھی۔ میرا تو خیال تھا کہ تم پندرہ پر اڑ جاؤ گے اور بارہ پر مان جاؤ گے۔ خیر دو لاکھ میری طرف سے۔ میں نے بے حد خوشی کا اظہار کیا۔ میرا اصل مقصد کچھ اور تھا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کون لوگ ہیں جو میرے جیسے بے وقعت آدمی کو ایک ہی پھیرے میں صرف خاموشی کی قیمت کے طور پر بارہ لاکھ دے رہے ہیں۔ وہ یقیناً بہت بڑے اسمگلر ہوں گے۔ اگر وہ ایک کروڑ کی رشوت دے کر مال بھیجتے ہوں گے تو کم سے کم دو کروڑ تو خود بھی کماتے ہوں گے اور جس مال پر دو کروڑ ملیں وہ دس کروڑ مالیت کا تو ہوگا۔ ویسے تو جہاز پر ہر قسم کا تجارتی سامان آتا جاتا ہے، کم قیمت بھی اور بیش قیمت بھی، لیکن جو اسمگلنگ ہی کروڑوں کی کرتے ہوں، وہ کیا مال بھیجتے ہیں، میں یہ بھی جاننا چاہتا تھا۔ کپتان کو مطمئن کرنے کے لیے میں نے اس اندیشے کا اظہار بھی کیا کہ کہیں مالکوں کو معلوم نہ ہو جائے۔ میری نئی نوکری ہے۔ اس پر کپتان ہنسنے لگا۔ پھر کہنے لگا کہ یار تمھارے بال سفید ہونے کے قریب ہیں۔ لوگ تو کہتے ہیں کہ بارہ برس دلّی میں رہے کیا بھاڑ جھونکا۔ میں پوچھتا ہوں کہ بارہ برس سمندر میں رہے کیا جھک ماری۔ ہمارے بابا یہ سیٹھ لوگ سب پرانے پاپی ہیں۔ اسی حمام میں ہیں جس میں ہم ہیں اور باقی سب ننگے ہیں۔ انھیں معلوم نہیں ہوگا تو اور کسے معلوم ہوگا۔ یہ ہم سے بھی پہلے اس دھندے میں پڑے تھے اور عمر گزار دی دھکے کھاتے اور یہی کام کرتے تب کہیں جا کے اپنی شپنگ کمپنی کے مالک بنے ہیں۔ یہ سارے جہاز کوئی کاروبار کر کے نہیں خریدے۔ جائز ناجائز کے چکر میں پڑے رہتے تو اپنا بیڑا خود غرق کر لیتے۔ آج وہ چین سے ملک میں ہیں تو ہم یہ کام کر رہے ہیں۔ کل کو ہم بھی ایک جہاز خرید لیں گے ... شپنگ کمپنی کی بنیاد ڈال دیں گے۔ پھر ایک سے دو اور دو سے ... بہتے دیر نہیں لگتی۔ اس کے بعد میں ان کے لیے قابلِ اعتبار ... انھوں نے مجھے دلاور سے اور سراج سے ملوایا۔"

"... اس نام سے تعارف کرایا تھا؟"

"ہاں۔ مجھے بتایا گیا کہ چودہری دلاور بہت بڑے صنعتکار ... اور سراج صاحب پولیس کے اعلیٰ افسر ہیں۔"

"ان کے علاوہ بھی کوئی آیا کبھی جہاز پر؟"

"ہاں، ایک بہت پلا ہوا موٹا تازہ سیٹھ تھا۔ حاجی عبداللہ ... ایک شخص جو سب سے زیادہ منحوس صورت کا تھا، وہ استاد ... کے نام سے مشہور تھا۔ جو سب سے زیادہ اسمارٹ آدمی ... وہ چاند بھائی تھا۔"

"وہ بھی آتا ہے جہاز پر؟"

"ہاں، ایک بار تو اکیلا آیا تھا۔ دوسری بار ایک بہت خوبصورت ... کے ساتھ آیا تھا۔" شاہد جمیل نے کہا۔

"چاند بھائی ... کسی عورت کے ساتھ ...؟" میں نے یکلخت ... کی دھڑکن میں اضطراب کی لہر اُٹھتی محسوس کی۔ "کچھ اس کا ... حلیہ بتاؤ۔"

"حلیہ ...؟" وہ سوچتے ہوئے بولا۔

"حلیہ یا نام اگر تم نے سنا ہو۔" میں نے کہا۔

"نام تو اس نے نہیں لیا۔ بس ڈارلنگ ڈارلنگ کہہ کے ... اسے مخاطب کرتا رہا۔" شاہد جمیل نے کہا۔ "اس عورت نے خاصی ... بے زاری کا اظہار کیا۔ چاند بھائی نے کہا کہ تم دس منٹ بیٹھو۔ کافی ... پلا کر میں آتا ہوں۔ وہ کپتان کے کیبن میں بیٹھی رہی۔ اس عرصے میں کپتان اور چاند بھائی کی میٹنگ ہوئی۔"

"میں اس عورت کا حلیہ جاننا چاہتا ہوں۔"

"حلیہ ... وہ تھی تو اٹھائیس سال کی ... میرا مطلب ہے کہ ... نہیں تھی۔ دیکھنے میں ضرور کم عمر لگتی تھی۔ مگر اس کے انداز و ... اطوار میں ایک نزاکت بھی تھی ... اور کچھ شہزادیوں جیسی بات تھی۔ ... وہ تمھاری ایک فلم اسٹار ہے۔"

"زیبا؟" میں نے سانس روک کے کہا۔

اس کی صورت پر حیرانی کے آثار نمودار ہوئے۔ "ہاں زیبا ... سمجھ لو۔ بہت زیادہ مشابہت تھی اس کی صورت میں ..."

"ہاں، وہ رابعہ تھی۔ اس کا نام لینے کی ضرورت نہیں، میں نے اسے جان لیا۔ بہت پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔ دل کے آئینے میں ... تصویرِ یار، تم نے آئینے کو روبرو کر دیا۔ اب میں یہ بھی بتا سکتا ہوں ... اس کے لب و رخسار پر کسی شاعر نے غزل میں کیا کہا ہے اور سایۂ گیسوئے شب تاب پر کس شاعر نے نظم لکھی ہے۔ اس کی چال کی وارفتگی میں کیا ہے اور خیال کی وابستگی میں کیا نہیں ہے، جس سے روشن ہے دل کی انجمن ..."

"تم اسے بھی جانتے ہو؟" شاہد جمیل نے کہا۔

اور میں نے کہا "نہیں، میں رابعہ کو نہیں جانتا۔"

"کون رابعہ؟" وہ بولا۔ "میں نے تو کسی رابعہ کا نام نہیں لیا۔"

میں نے فوراً خود کو سنبھال لیا کیونکہ اب محسن بھی اس شخص کے ساتھ واپس آ گیا تھا اور اس نے بہت سا اسباب اٹھا رکھا تھا۔

"خیر، بات تھی اس اختلاف کی جو تمھارے اور ان لوگوں کے درمیان پیدا ہوا۔"

"ہاں، جب مجھے سب معلوم ہو گیا ..."

"کیا معلوم ہو گیا؟" میں نے کہا۔ "یہ کہ سامان کیا ہے؟"

"ہاں، یہی معلوم ہونا باقی تھا۔"

"کیا سامان تھا؟" میں نے پوچھا۔

"یہ میں تم کو کیسے بتا سکتا ہوں۔" وہ بولا۔

"چلو، میں بتا دیتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "وہ اسلحہ تھا، ہر قسم کا۔ ملکی و غیر ملکی۔ ریوالور اور مشین گن، بندوقیں اور رائفلیں۔ دستی بم اور ڈائنا مائٹ۔"

اس کا رنگ اُڑ گیا۔ "تم ...؟"

"ابھی میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ ہم سے کچھ پوشیدہ نہیں۔ ہم بہت عرصے سے ان لوگوں پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ ان کی سب نقل و حرکت دیکھ رہے تھے۔"

"کیا تم خفیہ پولیس کے آدمی ہو؟"

"ایسے بہت سے ملکی و غیر ملکی بین الاقوامی ادارے ہیں۔" میں نے گول مول بات کی۔ "تم ہمارے وسائل اور ہماری پہنچ کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ اس مرتبہ ہم اپنا دائرہ بہت تنگ کر چکے تھے۔ ایس ایس کرانتی بچ کر نکل نہیں سکتا تھا۔"

"دیکھو، میں نے سب بتا دیا کہ میں اس گروہ میں شامل نہیں ہوں۔ بلکہ اُلٹا ان سے میری خواہ مخواہ کی دشمنی ہو گئی تھی۔" وہ بولا۔ "میں نے ایک خاص مقصد کے تحت ان کا ساتھ دینا منظور کیا تھا۔"

"اور جب تمھیں معلوم ہو گیا کہ وہ کون لوگ ہیں اور کیا کر رہے ہیں، پھر تم نے کیا کیا؟" میں نے کہا۔

"میں نے کراچی میں کونسلیٹ آفس سے رابطہ قائم کیا اور وہاں کسی ذمّے دار افسر سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے یہ بھی کہا کہ میں اپنی آمد کو خفیہ رکھنا چاہتا ہوں اور یہ بھی چاہتا ہوں کہ مجھے تحفظ فراہم کیا جائے۔ انھوں نے اس کا وعدہ کیا اور پرسوں

شام کو ایک کار مجھے باہر سے کونسلیٹ آفس لے گئی۔ وہاں انھوں نے شناخت کے بعد مجھے ایک کمرے میں پہنچا دیا۔ ایک شخص نے خود کو سین گپتا کے نام سے متعارف کرایا۔ اور کہا کہ میں اطمینان اور اعتماد کے ساتھ اسے سب کچھ بتا سکتا ہوں۔ میں نے کہا کہ آپ بھی اپنی شناخت کرا دیں تو مجھے ڈر نہ رہے کہ میں نے غلط آدمی کو کچھ نہیں بتایا ہے۔ سین گپتا نے کہا کہ کیا میرا کونسلیٹ جنرل کے آفس میں ہونا کافی نہیں۔ اور اگر اس کے باوجود میں مطمئن نہیں تو مجھ پر کوئی پابندی نہیں۔ میں اپنی مرضی سے آیا تھا، اپنی مرضی سے جا بھی سکتا ہوں۔ مجبوراً میں نے اسی کو سب بتا دیا۔ یہ بھی کہ اسلحہ غالباً مشرقی بنگال کی خانہ جنگی میں استعمال ہوگا اور یہ بہت خطرناک سیاسی معاملہ ہے جس میں بھارت کی حکومت کے ملوث ہونے کا نتیجہ بدنامی اور کشیدگی کی صورت میں نکل سکتا ہے اور حزبِ اختلاف اس مسئلے پر حکومت کے خلاف ہنگامہ کھڑا کر سکتی ہے وغیرہ وغیرہ۔

سین گپتا نام کے اس شخص نے میری پوری بات سنی۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے احساس ہوا کہ اس کی خاموشی میں کوئی معنی پنہاں ہیں۔ وہ میری سن رہا ہے تو صرف اس لیے کہ وہ انکار نہیں کر سکتا۔ مجھے اس کے لبوں پر ایک بے معنی قسم کی مسکراہٹ کا شبہ بھی ہوا تاہم اس نے ساری بات سننے کے بعد مجھ سے اتفاق کیا کہ یہ معاملہ بہت سنگین ہے اور وہ اسلام آباد میں سفیر سے رابطہ قائم کر کے ہدایات حاصل کرے گا۔ اور اب مجھے بالکل فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔

لیکن اسی رات جب میں واپس جہاز پر پہنچا تو کپتان کا رویّہ مجھے بدلا ہوا لگا۔ اس نے پہلے تو سختی سے پوچھا کہ میں اسے مطلع کیے بغیر کہاں گیا تھا، لیکن جب میں نے بھی کہا کہ میں تو بندرگاہ کی حدود سے ہی نہیں نکلا تو وہ مجھے گھورتا رہا اور چپ ہو گیا۔ کل صبح اس نے مجھے اپنے کیبن میں طلب کیا۔ میں وہاں گیا تو مجھے انڈین آرمی کا ایک لیفٹیننٹ کرنل ملا۔ اس نے میرے ساتھ سخت نامناسب رویّہ اختیار کیا۔ پہلے تو اس نے کہا کہ وہ میرا دماغ درست کرنے آیا ہے۔ جب میں نے کہا کہ مسٹر لیفٹیننٹ کرنل اس شپ پر میں فرسٹ آفیسر ہوں، اس لیے حفظِ مراتب کے مطابق بات کرو۔ اس پر وہ کہنے لگا کہ مجھے سیاسی معاملات میں دخل اندازی سے گریز کرنا چاہیے اور اپنے کام سے کام رکھنا چاہیے دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ غلط ہو رہا ہے یا اچھا ہو رہا ہے تو میری مرضی سے نہیں ہو رہا ہے۔ بالآخر اشارے کنائے میں اس نے واضح کیا کہ مجھے وہی کرنا ہوگا جو کپتان کہے گا۔ جائز اور ناجائز کا میں ذمّے دار نہیں ہوں۔ جب بات بڑھی تو اس نے کہا کہ جہاز پر اسلحہ جائے یا سبزی، اور یہ اسلحہ مشرقی بنگال جائے یا قطبِ جنوبی، میں اپنا منہ بند رکھوں ورنہ... اس نے ورنہ کے بعد کچھ نہیں کہا اور جہاز کے کیبن سے نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد کپتان سے میری جھڑپ ہوئی اور بس مارپیٹ ہوتے ہوتے رہ گئی۔ میں نے اسے صاف بتا دیا کہ میں بارہ لاکھ پر لعنت بھیجتا ہوں۔ میں اس کی رپورٹ ضرور کروں گا۔ یہاں نہ کر سکا تو بمبئی پہنچ کے پولیس کو، وزارتِ دفاع کے حکّام کو۔ اور اس نے کہا کہ ہاں ضرور کرنا، اگر بمبئی پہنچ جاؤ۔ میں نے کہا کہ ابھی تو مجھے شہر جانا ہے۔ اس نے مجھے جانے دینے سے انکار کیا تو میں نے کہا کہ میرا کام تمھیں مطلع کرنا تھا، اب میں دیکھتا ہوں کہ تم میرا راستہ کیسے روکتے ہو۔ اس نے سخت برہمی کی کیفیت میں کہا کہ جاؤ جاؤ انڈین کونسلیٹ کے دفتر جانا ہے ضرور جاؤ۔ وہاں مسٹر سین گپتا تمھارا ہی انتظار کر رہے ہیں۔ اس کی بات سن کر ہی میں شک میں پڑ گیا تھا لیکن میں نہ جاتا تب بھی بات نہ بنتی۔ میں خاصا مایوس گیا اور مایوس ہی لوٹا۔ وہاں کوئی بھی اس نام کا افسر نہیں تھا، کم از کم گیٹ پر روک کے مجھے یہی بتایا گیا۔ شاید میں اندر جا سکتا تو اسے تلاش بھی کر لیتا۔ اور دیکھ لیتا تو پہچان بھی جاتا کہ سین گپتا بن کے مجھ سے کون ملا تھا۔ کیونکہ تھا وہ بہرحال اندر ہی کا آدمی۔

میں واپس آیا تو کپتان نے پھر مجھے خاصا ذلیل کیا۔ وہ مجھ پر ہنستا رہا کہ کیا ہوا۔ گپتا صاحب نے کیا کیا۔ میرا خیال ہے کہ وہ ملے ہی نہیں ہوں گے۔ دروازے پہ سے ہی ٹال دیا ہوگا۔ ایسے پاگل کے بچے روز پہنچ جائیں اندر وقت ضائع کرنے تو کام کیسے ہو۔ مجھے اب کوئی شک نہیں رہا تھا کہ کپتان کا کونسلیٹ سے رابطہ ہے۔ اور بالواسطہ طور پر وہ اس غیر قانونی کام میں اکیلا نہیں ہے۔ کچھ دیر کے بعد وہ دونوں آ گئے۔ چوہدری دلاور اور سراج۔ یہ سب باتیں انھیں بھی معلوم ہو گئی تھیں۔ اور وہ خاصے پریشان تھے۔ میں نے انھیں جہاز پر آگے جانے کی اجازت دینے سے بھی منع کر دیا تھا کیونکہ کپتان نشے میں دھت اپنے کمرے میں سویا پڑا تھا۔ اس انکار کا جو نتیجہ نکلا وہ تم نے بھی دیکھا۔"

خاموشی کا ایک طویل محسوس ہونے والا مختصر وقفہ آیا۔ پھر میں نے کہا۔

"مسٹر شاہد جمیل! کیا اسلحہ جہاز پر موجود ہے؟"

"ہاں، اسلحہ میری عدم موجودگی میں لوڈ کر دیا گیا تھا۔"

"اور یہ جہاز کب روانہ ہوگا؟"

"شاید آج ہی رات۔ بارہ بجے کے بعد کسی وقت، یا کل۔"

"آپ کے علاوہ عملے کے دیگر ارکان کی تعداد کیا ہے؟"

"ابھی میں سب سے نہیں ملا۔ چھ سات افراد سے ملاقات ہوئی ہے۔" شاہد جمیل نے کہا۔ "وہ سب ماتحت عملے میں فنی نوعیت کے کام کرنے والے لوگ ہیں۔ اوپر جو افسران ہیں وہ بہت کم

دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی آمد و رفت کا کوئی وقت مقرر نہیں۔"

"کہاں آتے جاتے رہتے ہیں وہ لوگ؟"

"میں کیسے بتا سکتا ہوں؟" شاہد جمیل بولا۔ "شہر اتنا بڑا ہے۔ میں ان کا تعاقب تو نہیں کرتا، لیکن یہ ہو سکتا ہے..."

"کیا ہو سکتا ہے؟" میں نے اس کے اچانک خاموش ہو جانے پر کہا۔

"کچھ نہیں" وہ بولا۔ "بس شک ہے میرا کہ وہ بھی وہیں جاتے ہوں گے۔ جہاں سے ملنے والے آتے ہیں۔ مجھے تو سب پُراسرار اور خطرناک قسم کے لوگ لگتے ہیں۔"

"اچھا... اب آپ ایسا کریں" میں نے سوچ کے کہا۔ "کہ واپس جہاز پر لوٹ جائیں۔"

"تاکہ وہ مجھے مار ڈالیں" وہ نفی میں سر ہلانے لگا۔ "ایک بار وہ اپنی کوشش میں ناکام ہو گئے تھے کیونکہ آپ لوگ اچانک پہنچ گئے تھے۔ دوسری بار..."

"آپ اگر واپس نہیں جائیں گے تو کیا کریں گے؟"

"میں... میں روپوش ہو جاؤں گا" وہ بولا۔

"کیا مطلب؟ لوٹ کر ہی نہیں جائیں گے" محسن بولا۔

"آپ کے بیوی بچے وہیں ہیں۔ انہی کے قبضے میں" میں نے کہا۔ "وہ کب تک چھپے رہ سکتے ہیں؟"

"میں ان کو لے آؤں گا" وہ بولا۔ "میرے وسائل بھی ہیں اور تعلقات بھی۔"

"کیسے لائیں گے آخر؟"

"بہت راستے ہیں۔ یہ بھی ایک کاروبار ہے جو ہر جگہ جاری ہے۔ لوگوں کو سرحدیں پار کرانے کا" وہ بولا۔ "ایک ملک سے دوسرے ملک پہنچانے کا۔ دنیا بھر میں ایسے منظم گروہ ہیں جو آپ کو کہیں بھی پہنچا سکتے ہیں۔"

"لیکن اس سے پہلے ہی..."

اس نے پھر نفی میں سر ہلایا۔ "اتنی جلدی ان کا سراغ لگانا مشکل ہے۔ میں نے بتا دیا تھا بیوی کو کہ مجھے کس قسم کی دھمکیاں موصول ہو رہی ہیں اور یہ معاملات ایسے ہیں جن میں پولیس یا قانون عموماً بے بس ثابت ہوتے ہیں۔ مدد خدا کرتا ہے یا پھر بندے کو اس کی توفیق دیتا ہے کہ وہ خود ہمّت کرے۔ میری بیوی بہت ہوشیار اور ہمّت والی ہے۔ وہ نکل آئے گی۔ جیسے ہی اس کو میرا پیغام ملے گا وہ کوئی راستہ بنا لے گی۔ اس کے مددگار بھی ہیں، میرے دوست اور ہمدرد۔"

"اور اس کے بعد آپ یہیں رہیں گے؟"

"ہاں، میں پاکستان کی شہریت لے لوں گا۔ ظاہر ہے یہ کام بھی مجھے رازداری سے کرنا ہوگا۔ ورنہ جو دشمن ہو جائیں گے۔ وہ یہاں بھی مجھے تلاش کر کے مار دیں گے۔ ان کی نظر میں میرا جرم غدّاری ہوگا جس کی یہی سزا ہوتی ہے۔ یہاں بھی میں چھپ کے اور شخصیت بدل کے ہی رہ سکتا ہوں اور یہاں سے آگے نکل سکتا ہوں۔ اب تک بھارت میں انٹیلی جنس نے میری فائل کھول دی ہوگی کہ میں بھروسے کے قابل نہیں رہا۔ اور میرا وجود قومی سلامتی کے مفاد میں نہیں ہے۔"

"یہ تو بہت گمبھیر مسئلہ ہو گیا" میں نے کہا۔ "لیکن مجھے ایک بات تو بتائیں۔ یہ سیاسی اختلاف اپنی جگہ۔ آپ نہیں چاہتے کہ آپ کا ملک پاکستان کے داخلی انتشار سے فائدہ اٹھائے اور اس علیحدگی پسندی کی تحریک میں باغی قوتوں کا ساتھ دے یا ان کی حوصلہ افزائی کرے۔ آپ جیسے کروڑوں ہوں گے مگر وہ پھر بھی اس اختلاف کی بنا پر ترکِ وطن نہیں کریں گے۔ اپنی قومیّت نہیں بدلیں گے۔"

"قومیّت!" وہ بولا۔ "شہریت اور قومیت کو ایک ہی تو نہیں سمجھا جا سکتا۔ پاکستان کی بنیاد ہے دو قومی نظریہ۔ جو یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمان ایک الگ قوم ہیں اور ہندو الگ۔ میں بھارتی شہری ضرور ہوں، لیکن میں مسلمان قوم کا فرد ہوں۔"

"اس دو قومی نظریے کو تم آج تسلیم کر رہے ہو!" محسن نے طنز سے کہا۔ "جب ترکِ وطن اور ہجرت کا وقت تھا تو تم نے وہیں رہنے کو ترجیح دی۔ تم نے مسلمان قوم کے لیے وطن کو قبول نہیں کیا۔ آج بیس بائیس سال بعد حالات نے تمھیں مجبور کر دیا ہے کہ تم اس دو قومی نظریے کی پناہ میں جلاوطنی اختیار کرو۔ بہت دیر کی مہرباں آتے آتے۔ اب تو تمھاری اگلی نسل جوان ہو گی۔ کیا وہ دھوبی کے کُتّے نہیں ہو گئے؟"

"ہاں، تم سب کچھ کہہ سکتے ہو" وہ تلخی سے بولا۔ "کیونکہ تم یہاں عزتِ نفس کے ساتھ زندہ ہو اور یہاں حاکم ہو۔ ہم وہاں محکوم ہیں۔ دوسرے درجے کے شہری ہیں۔ معاشرے میں قانون تو ہمیں برابر کے حقوق دیتا ہے کیونکہ آئین سیکولر ہے، مگر آئین اور قانون کتابیں ہیں۔ معاشرہ ان کتابوں سے نہیں روایات سے اور صدیوں کے طبقاتی تعصبات سے اور تہذیبی اقدار سے اور مذہبی ترجیحات سے چلتا ہے۔ قانون اور آئین سے تو حکومت چلتی ہے اور عدالتی نظام چلتا ہے۔ گلی محلّے میں اور گھروں میں آئین اور قانون کی نہیں معاشرے کے ٹھیکیداروں کی حکومت ہوتی ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کو معاف نہیں کیا۔"

"کس بات پہ؟ کیا جرم ہے مسلمانوں کا؟"

"اس سے بڑا جرم کیا ہو سکتا ہے کہ وہ صدیوں حاکم رہے۔ ہندو تو انھیں غاصب اور حملہ آور کہتے ہیں جو افغانستان اور ایران سے آئے۔ اور انھوں نے اس ملک پر انگریزوں کی طرح تسلط حاصل کر لیا۔ ہندو تو دونوں کے محکوم رہے اور انگریز کے دور میں بھی مسلمان ہی تھے جن کے جذبۂ حُرّیت پسندی میں کمی نہیں آئی۔ جنھوں نے غلامی کو کبھی ذہنی طور پر تسلیم نہیں کیا۔ انگریز بھی انھی کو خطرناک اور باغی سمجھتے تھے۔ آج ہندو حاکم ہے تو مسلمان سے تاریخ کا انتقام لینا چاہتا ہے۔"

"کاش، یہ بات تم نے پہلے سمجھ لی ہوتی۔"

"تم اسے انسانی اندازوں کی غلطی کہہ سکتے ہو۔" وہ بولا۔ "بے وقوفی سمجھ سکتے ہو کہ وہ ہندو ذہنیت کا اندازہ نہ کر سکے ان کی میٹھی میٹھی باتوں میں آ گئے۔ ہندو مسلم بھائی بھائی کے نعرے کے فریب میں آ گئے۔ اور جب احساس ہوا کہ ہندوؤں نے نہ انھیں گھر کا چھوڑا ہے نہ گھاٹ کا، تو واقعی بہت دیر ہو چکی تھی۔ اب سرحدیں بند ہیں، ہم ادھر آنا بھی چاہیں تو نہیں آ سکتے اور ہماری اگلی نسل بے وطن ہے۔ ایسے دوراہے پر کھڑی ہے جہاں دونوں راستوں کی منزل کوئی نہیں، جائیں تو کہاں جائیں؟"

"تم سب مسلمانوں پر وہی الزام عائد کر رہے ہو، جو وہاں زبانِ خلق عائد کرتی ہے۔ کہ مسلمان تو دل سے پاکستان کا ہمنوا ہے۔ وہ بھارت میں پاکستان کا ففتھ کالم ہے جس کی جذباتی وابستگی مسلمانوں کے ساتھ ہے جو وقت پڑنے پر بھارت کے خلاف لڑے گا۔"

"نہیں، میں نے یہ نہیں کہا۔ میں ایک صورتِ حال کو بیان کر رہا ہوں۔ اس میں مجھ جیسے لوگوں کے لیے کون سا راستہ رہ جاتا ہے جو میں زندہ رہنے کے لیے عزتِ نفس کے ساتھ جینے کے لیے اختیار کر سکوں۔ اب تو پاکستان میں بھی ہمارے لیے جگہ نہیں رہی۔ یہاں ہر نظر میں طنز کی وہی بات ہو گی، جو تمھاری زبان پر ہے۔ سب مُنہ سے نہ کہیں، دل میں تو کہیں گے ناکہ خیر سے بُدھو گھر کو آئے۔ پہلے کیوں نہ آ گئے، ہم جب آئے تھے؟ اس لیے کہ قربانی دینا پڑتی یا ہجرت کے مصائب جھیلنے پڑتے۔ رشتے ناتے بدلنے پڑتے۔ نئے وطن کی تعمیر میں خون پسینہ ایک کرنا پڑتا۔ اب ہم خود غرض اور مطلبی سمجھے جائیں گے۔ کہ پہلے جان و مال بچا کے بیٹھے رہے۔ جب یہاں سب ٹھیک ہو گیا۔ مسلمانوں کا یہ ملک جس کے بارے میں ہندو پریس اور سیاستدان سب یہ کہتے نہیں تھکتے تھے کہ پاکستان قائم نہیں رہ سکتا۔ آزمائش اور ابتلا کے دور سے گزر کے خوشحالی اور استحکام کی راہ پر گامزن ہو گیا۔ یہاں مسلمانوں کی حکومت قائم ہو گئی۔ تو اب چلے آ رہے ہیں کہ ہمیں بھی جگہ دو۔ جو بُرے وقت میں ساتھ نہ رہے وہ اچھے وقت میں ساتھی بننا چاہے تو یہی ہوتا ہے۔"

"خیر، تم کچھ زیادہ ہی قنوطی ہو۔ پاکستان کے مسلمان ایسے تنگ نظر پرور نہیں ہیں۔ وہ آج بھی تم کو گلے لگائیں گے اور دل میں بسا لیں گے۔ کیونکہ ملک چھوٹا سہی مگر ان کا دل بڑا ہے۔ صبح کا بھولا شام کو گھر آ گیا، چلو خیر سے آیا تو سہی۔ دیر آید درست آید۔"

"میں بہت پہلے فیصلہ کر چکا تھا۔" وہ بولا۔ "کہ مجھے یہاں نہیں رہنا۔ میں پاکستان نہ جا سکا تو برطانیہ کی شہریت لوں گا۔ کینیڈا چلا جاؤں گا۔ میرے بچے اب جوان ہیں اور ان کے لیے وہاں ایک طرف کامیابی کے مواقع محدود ہیں۔ دوسری طرف وہ اقلیت کے احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیے گئے ہیں۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ ہم مان لیتے ہیں کہ تم اب ہجرت کے لیے تیار تھے، مگر اس میں جو خطرات تمھارے لیے پہلے سے موجود ہیں ان سے تم کیسے نمٹو گے؟" محسن نے کہا۔

"میں سمجھتا ہوں کہ تمھارا کوئی جذباتی فیصلہ تمھارے ہی خلاف جا سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ بہتر ہو گا کہ تم عقل سے کام لو۔"

"صاف بتاؤ کہ تمھارے ذہن میں کیا ہے؟"

"تم واپس جاؤ۔ جہاز پر تمھیں پھر وہی لوگ ملیں گے۔ سب سے پہلے تو کپتان ہو گا۔ کیا نام ہے اس کا؟"

"مصرا۔ آر آر مصرا۔"

"آر آر سے کیا بنتا ہے؟" محسن نے کہا۔

"رگھو بت رائے۔"

"وہ تم کو زندہ پا کے بہت حیران اور مشتعل ہو گا۔" میں نے کہا۔ "لیکن اب تم کو کایا کلپ کا مظاہرہ کرنا ہے۔ اس کو بتانا ہے اور یقین دلانا ہے کہ تمھارا دماغ درست ہو گیا ہے۔ تم ڈر گئے ہو۔ موت کی منزل تک جا کے لوٹ آنے کے بعد تم کو زندگی کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو گیا ہے اور تم جینا چاہتے ہو۔ اس کے لیے تم سب کچھ کرو گے۔ وہ تمھاری جذباتی حماقت تھی کہ تم نے اصول کی بنیاد پر دخل در معقولات کیا.... اور سرکشی پر آمادہ ہوئے۔ تم معافی مانگو گے اور شرمندگی کا اظہار کرو گے۔ وہ بہت چالاک لوگ ہیں۔ انھیں آسانی سے بے وقوف نہیں بنایا جا سکتا۔ اس کے لیے تم کو بہت اچھی اداکاری کرنا ہو گی۔ اور معقول جواز فراہم کرنا ہو گا۔ جواز تمھارے پاس ہے، تمھارا خاندان۔ اکیلا آدمی نتائج سے بے پروا ہوتا ہے مگر رشتوں کی زنجیر میں بندھا ہوا آدمی تو بہت بے بس ہوتا ہے۔ سب سے زیادہ وہ جس عذاب سے ڈرتا ہے وہ اپنے پیاروں کا عذاب ہے۔ انھیں وہ صرف خوشی دینا چاہتا ہے، دُکھ نہیں۔ دُکھ وہ اپنے لیے قبول کر سکتا ہے۔ تم کمزوری کو بنیاد بنا سکتے ہو اور ان سے وعدہ لے سکتے ہو کہ تمھارے بیوی بچوں کو کچھ نہیں ہونا چاہیے، پھر تم ان کے لیے سب کچھ کرو گے۔ اسی خیال نے تمھیں پسپائی پر مجبور کیا اور تم ان کے سامنے خود کو، اپنے اصولوں کو اور اپنے ضمیر کو، سب قربان کرنے کے لیے لوٹ آئے ہو۔"

اس نے کچھ دیر کے بعد سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے۔ میں ایسا ہی کروں گا، مگر اس کے بعد؟"

"اس کے بعد تم ہماری مدد کرو گے۔" میں نے کہا۔

"تمھاری میں کیا مدد کروں، اور کیسے؟" وہ بولا۔ "اب یہ معاملہ صاف ہو گیا ہے اور تم سے کوئی پردہ نہیں رہا۔ تو میں بھی بتا دیتا ہوں کہ... کہ میں نے تمھیں پہچان لیا تھا... میں جانتا ہوں کہ تم کون ہو۔ تم سکندر اور محسن ہو۔"

"تم نے تو جھوٹ بولا تھا، مگر ہم نے اسے سچ نہیں مانا تھا۔ یہ ممکن ہے کہ دوست اور دشمن سب ہمیں پہچانتے ہیں۔ شکاری کتّے ہم سے واقف ہیں۔ ہمارا سایہ تک ان کے لیے اجنبی نہیں۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ تمھیں خبر تک نہ ہو۔" میں نے کہا۔

"ہمارے بارے میں تو شاید اب کوئی سیل کام کر رہا ہو گا۔" محسن بولا۔ "جس کا کام ہمارے بارے میں ہر اطلاع، خبر یا افواہ سب کا ریکارڈ رکھنا ہے۔ ہمارے سب ساتھیوں کے بارے میں تفصیلی معلومات، ہمارے سابقہ حلیے، دستیاب تصاویر، جرائم کی فہرست، عزائم کی فہرست، ماضی کے کرتوت، کارناموں کی تمام تفصیلات، انھوں نے تو ہماری آواز کے ٹیپ تک محفوظ کر لیے ہیں۔ تاکہ ہم حلیے بدل لیں تو آواز سے پہچانے جائیں۔"

"میں نے پہلے تمھیں آواز سے ہی شناخت کیا تھا۔" شاہد جمیل نے اعتراف کیا۔

"ہمیں یہاں بہت دیر ہو گئی ہے۔" محسن بولا۔

"ہاں، لیکن ہم یہاں محفوظ بھی ہیں۔" میں نے کہا۔

"کیا یہاں کسی کے آنے کا امکان نہیں؟"

"اس حصے میں اور کوئی نہیں آتا۔" کمپاؤنڈر نے سعادتمندانہ طور پر اطلاع دی۔

"یہ جھوٹ ہے یا سچ؟"

"جھوٹ ہوا تو سب سے پہلے گولی تمھارے مغز کے پرخچے اڑا دے گی۔" محسن نے کہا۔ "دوسرے اور ہم سب بعد میں نمٹ لیں گے۔"

"دلاور اور سراج تصدیق کرنے کے لیے ضرور آئیں گے کہ ان کا کام ہوا یا نہیں۔" میں نے کہا۔

"بہتر ہو گا اگر تم مزید وقت ضائع کیے بغیر جہاز پر پہنچ جاؤ۔ تاکہ وہ ادھر نہ آئیں۔" محسن نے مشورہ دیا۔ "تم کہہ دینا کہ ڈاکٹر تمھارے ہاتھوں نہیں مارا گیا۔ اسے جہاز کے ہی ایک آدمی نے مارا جو تمھارے ساتھ آیا تھا۔ اور جسے شک ہو گیا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ اس نے بعد میں ڈاکٹر سے سختی کے ساتھ پوچھا۔ اور پھر ڈاکٹر کو مار ڈالا۔ اسی مقابلے میں وہ خود بھی ہلاک ہوا۔"

"پھر بھی وہ کہیں گے کہ تمھاری واپسی میں اتنی دیر کیوں ہوئی؟" شاہد جمیل نے کہا۔

"اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ تمھارا ماتحت تمھارے ہوش میں آنے کا منتظر تھا۔ تمھیں دیر سے ہوش آیا اور ہوش میں آنے کے بعد ہی تم نے اس اندیشے کا اظہار کیا کہ تمھاری جان کو خطرہ لاحق ہے۔ اور تمھیں یہاں قتل کرنے کے لیے لایا گیا ہے۔ تمھارے ماتحت اور ڈاکٹر میں تلخ کلامی ہوئی اور پھر لڑائی۔ تم نے اپنے ماتحت کا ساتھ دیا۔ لیکن یہ دوسری زندگی پا کے تم کو موت کا یقین آیا۔ تم نے ان دونوں کو مرتے دیکھا اور یہ موت اتنی بھیانک تھی کہ تمھارے خیالات میں ایک انقلاب آ گیا۔ تم نے سوچا کہ اب ان دونوں کے خاندانوں کا کیا ہو گا۔ پھر تم نے اپنے خاندان کے بارے میں سوچا کہ یہاں تمھاری لاش پڑی ہوتی تو ان پر کیا بیتتی، اور اسی خیال نے تمھارے دل و دماغ کو ہلا دیا۔ تم اب ہر قسم کا تعاون کو تیار کرنے کو تیار ہو۔"

"یہ بہت خطرناک کام ہے۔ اگر انھوں نے نہ مانا، یہ کہا کہ ہمیں کوئی ضرورت نہیں تمھارے تعاون کی، تعاون کرنے والے اور بہت ہیں پھر میں کیا کروں گا؟"

"یہ کام تو تم کو کرنا ہے شاہد جمیل۔ اس کے بغیر تمھارے لیے کوئی بچاؤ کا راستہ نہیں، ابھی تم ادھر نہیں ہو۔ بعد میں تم ادھر بھی نہیں آ سکو گے۔ کام مشکل ضرور ہے مگر ناممکن نہیں ہے۔ تم کو بہرصورت اپنے عہدِ وفاداری کی تجدید کرنا ہے۔ اب شام ہو گئی ہے۔ کچھ دیر میں اندھیرا پھیل جائے گا۔ رات کو ہم جہاز پر پہنچ جائیں گے۔"

"تم... تم کیسے آؤ گے؟"

"یہ تم بتاؤ، ہم کس طرف سے آئیں۔ کب آئیں اور کیسے آئیں؟"

وہ نفی میں سر ہلانے لگا۔ "یہ ناممکن ہے، بالکل ناممکن ہے جب تک جہاز یہاں کھڑا ہوا ہے۔"

"اچھا اگر ہم جہاز کی روانگی کے بعد آنا چاہیں تو؟"

"بعد میں کہاں؟ بمبئی میں؟" وہ بولا۔

"نہیں، فرض کرو، ہم راستے میں سوار ہونا چاہیں۔" میں نے کہا۔

"تم بحری راستوں سے واقف ہو؟"

"نہیں، مگر تم سمجھا سکتے ہو۔" میں نے کہا۔ "کہ جہاز کا راستہ کیا ہے اور کس وقت جہاز کہاں ہوگا؟"

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ "اگر جہاز آج رات لنگر اٹھا دیتا ہے، جس کا خاصا امکان ہے۔ تو صبح تین اور چار بجے کے درمیان ہم گہرے سمندر میں شاید سو میل دور ہوں گے۔ تم میں کوئی بھی تو نیوی گیٹر نہیں، ورنہ میں بالکل صحیح جگہ بتا دیتا۔ خیر۔"

"تم نقشہ بنا سکتے ہو؟" میں نے کہا۔

"ہاں، نقشے پہ بتا سکتا ہوں۔" وہ بولا۔ "دو چار میل اِدھر اُدھر، کس وقت ہم کہاں ہوں گے۔"

"تو نقشہ بنا دو۔"

"اسے سمجھو گے کیسے؟" وہ بولا۔

"سمجھنے والے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم جہاز تک پہنچ جائیں گے۔ اس کے بعد تم ہماری کیا مدد کر سکتے ہو کہ ہم جہاز کے اوپر پہنچ جائیں۔"

"یہ صریحاً خودکشی ہوگی۔ اوپر آ کے۔"

"ہمارا کام ہم پہ چھوڑ دو۔" میں نے کہا۔

"میں تمھاری کوئی مدد کر سکتا ہوں... تو صرف یہ کہ ایک سیڑھی لٹکا دوں، ایسی جگہ پہ جہاں کسی کی تم پہ نظر نہ پڑے اور تم اوپر چڑھ سکو۔ اوپر تمھیں کوئی عرشے پر مل جائے یا نیچے پہنچ کے تم پھنس جاؤ۔ تو..."

"تم نقشہ بنا دو۔" میں نے ڈاکٹر کی میز سے ایک کاغذ پنسل اٹھا کے اسے تھمائی۔

جو نقشہ اس نے بنایا وہ واقعی ہماری سمجھ میں نہیں آ سکتا تھا اس میں خطوط ایک دوسرے کو کراس کرتے تھے۔ زاویے ظاہر کرنے والی ڈگری کی علامتیں تھیں اور سمت بتانے والے نشانات تھے، کراس اور تیر تھے۔ وقت بتانے والی سوئیاں بھی تیر کی طرح تھیں۔

"یہ لو، اگر کوئی اس کو پڑھ لے گا تو اس کے لیے ہماری پوزیشن کو لوکیٹ کرنا مشکل نہیں ہوگا۔" وہ بولا۔ "لیکن میں ایک بات واضح کر دوں۔ جہاز پہ حفاظتی انتظامات بہت سخت ہیں۔ تم دونوں ایسے پکڑے جاؤ گے..."

"جیسے چوہے دان میں بلی پکڑی جاتی ہے۔"

"یہ مذاق کی بات نہیں۔ خود کار الارم اور خود متحرک ہو جانے والے ٹریپ۔ اور بہت کچھ ہے جو خود مجھے بھی معلوم نہیں۔"

"ہمارا معاملہ ہم پہ اور ہمارے خدا پہ چھوڑ دو۔ تاہم یہ سمجھ لو کہ ہم دو نہیں ہوں گے۔"

"پھر کیا فوج لے کر آؤ گے؟"

"کم سے کم چار آدمی ہوں گے۔" میں نے کہا۔

"چار!" وہ بولا۔ "چالیس ہوں تو شاید کچھ کرنے کی پوزیشن میں ہوں۔ چار تو خودکشی ہی کر سکتے ہیں۔"

"اور بھی بہت کچھ کر سکتے ہیں۔"

"مثلاً؟ ابھی تک تو میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ جہاز پر آنے کا مقصد کیا ہے؟ تم کسی بحری جہاز کو ہائی جیک تو نہیں کر سکتے۔"

"اسے غرق تو کر سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

وہ بھونچکا رہ گیا۔ "تم اسے تباہ کرو گے؟"

"ہاں، تمھیں معلوم نہیں کہ ایک جہاز ہم پہلے ڈبو چکے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اس پہ بھی اسلحہ تھا۔"

"وہ اتفاق سے ہو گیا۔ کسی کو اندیشہ نہیں تھا کہ سمندر میں ایسی واردات ممکن ہے۔ اب وہ پوری طرح تیار ہیں۔" شاہد جمیل بولا۔

"ہم بھی زیادہ تیار ہیں۔" میں نے کہا۔ "اس بار کوئی اتفاق نہیں ہوگا۔ ایک پلان ہوگا جس کے تحت ساری کارروائی ہوگی۔"

وہ انکار میں سر ہلانے لگا۔ "کوئی پلان کامیاب کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ جہاز ایک ناقابلِ تسخیر قلعہ ہے۔"

"اس میں ایک شگاف پڑ چکا ہے۔" محسن نے کہا۔ "تم ہمارے لیے ایک شگاف ہو۔ قلعے کے حصار کو توڑنا واقعی مشکل ہوتا ہے، مگر اندر داخل ہو جانے کا راستہ مل جائے تو گویا آدھی فتح حاصل ہو جاتی ہے۔"

"دیکھو، میرا ایک مشورہ ہے۔" وہ کچھ سوچ کے بولا۔ "اگر کوئی لڑکی ہو تمھارے ساتھ۔ کوئی عورت جو نرس کا کام کر سکتی ہو۔"

میں نے اور محسن نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ "اگر ہو تو؟"

"جہاز پر ڈاکٹر بھنڈی ہے۔ اصل نام تو بھنڈاری ہے، مگر اس کی چڑ ہے بھنڈی۔" شاہد جمیل نے کہا۔ "اس کے ساتھ جو نرس آئی تھی وہ بھاگ گئی ہے۔"

"بھاگ گئی ہے، کہاں؟"

"پتا نہیں، سنا ہے یہاں کسی کے ساتھ اس کی قلمی دوستی ہوئی۔ پھر وہ دوستی ایک ملاقات کے بعد عشق بن گئی۔ لڑکا یہاں سے جا نہیں سکتا تھا۔ کسی ایسے محکمے میں ملازم تھا کہ پاسپورٹ پہ ویزا نہ ملتا۔ چنانچہ وہ آ گئی اور ظاہر ہے اب وہ کہیں ہنی مون منا رہے ہوں گے۔ کپتان بہت خفا تھا ڈاکٹر پہ کہ یہ سب تمھاری وجہ سے ہوا۔ تم خود اپنی مرضی سے لے کر آئے تھے اسے۔ اب خود ہی بھگتو۔ میں نرس کہاں سے لاؤں۔"

"فرض کرو، ہم کسی نرس کو بھیج دیں؟"

"وہ اتنی آسانی سے نہیں رکھ لیں گے۔ پاکستانی نرس پر وہ اعتبار کر سکتے ہیں۔"

"اور اگر وہ انڈین نرس ہو، میرا مطلب ہے انڈین نیشنل ہو۔ بھارت کی مصدقہ شہری۔ بھارتی پاسپورٹ رکھنے والی۔"

"پھر... پھر ممکن ہے وہ کونسلیٹ سے پوچھیں، لیکن وہ ڈاکٹر بھنڈاری کے پاس پہنچنے میں کامیاب ہو جائے تو یہ ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر کی مشکل آسان ہو جائے۔ وہ کپتان سے کہے کہ میں نے انتظام کر لیا ہے دوسری نرس کا۔ اور اس کی ذمے داری قبول کرے۔ ڈاکٹر کے معاملے میں کپتان اپنی اتھارٹی زیادہ استعمال نہیں کرتا۔ وجہ یہ بھی ہے کہ وہ جہاز کے مالک کا چھوٹا بھائی ہے۔"

"بہر حال، تو پھر سمجھو کہ ایک نرس آج پہنچ جائے گی۔ لیکن اس کے ساتھ کوئی مرد ہو، اس کا شوہر ہو، پھر؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"شوہر بھی بھارتی شہری ہو۔ وہ بھی بیوی کے ساتھ جہاز پہ کوئی بھی نوکری کرنا چاہے۔ گھٹیا سے گھٹیا کام بھی کرے گا۔"

"میں یقین کے ساتھ کیا کہوں۔ ممکن ہے اس کا کام بھی بن جائے۔ مگر اس کا چانس بھی ہے کہ دونوں تصدیق پہ پکڑے جائیں۔"

"یہ چانس تو لینا ہی پڑے گا۔ تم صرف اتنا کرو کہ ڈاکٹر بھنڈاری سے ذکر کرو کہ کوئی نرس آئے گی اپنے شوہر کے ساتھ۔ وہ بھارتی شہری ہیں۔"

"ہندو ہیں کہ مسلمان؟"

"کرسچین۔" میں نے کہا۔ "وہ بھارت سے آئے تھے۔ یہاں سے ان کو دبئی جانا تھا۔ کسی ایجنٹ کے چکر میں پڑ گئے اور سب گنوا بیٹھے۔ ویزا کی مدت گزر گئی۔ اب قانونی طور پہ واپس جانے کا راستہ کوئی نہیں۔ پہلے یہاں کی گورنمنٹ پکڑ کے بند کرے گی، پھر واپس گئے تو بھارت کی جیل میں۔ ان کی مدد کی جا سکتی ہے۔"

"ڈاکٹر پوچھے گا کہ تمھیں کیوں دلچسپی ہے؟"

"تم بتا سکتے ہو کہ نرس بہت دلچسپ ہے اور خود ڈاکٹر کے لیے خاصی دلچسپی کے اسباب رکھتی ہے۔ وہ آدمی کیسا ہے؟"

"آدمی... میرے تمھارے جیسا۔ کچھ زیادہ شوقین مزاج تو ہوتا ہی ہے پیسے والا۔"

"بس تو یہ چکر چل جائے گا۔ وہ خود ڈاکٹر کو چکر میں ڈال دے گی۔" میں نے کہا۔

"مجھے نام تو بتا دو ان کے۔"

"لڑکی کا نام ہے الزبتھ۔ لز کہتے ہیں سب اور شوہر کا نام ہے چارلس عرف چارلی۔" میں نے کہا۔

"میں کوشش کرتا ہوں۔ اسے رات بارہ بجے سے پہلے بھیج دو۔ رسک ان کا اپنا۔"

"رسک یقیناً ان کا۔ اگر وہ جہاز پہ پہنچ گئے تو پھر تمھارا رسک بھی ان کا۔ وہ سب کر لیں گے۔ تمھیں کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔" میں نے کہا۔

اب شام گزر چکی تھی۔ باہر اندھیرا پھیل رہا تھا۔ میں نے شاہد جمیل سے کہا کہ وہ جائے۔ اس نے جاتے وقت ہم سے ہاتھ ملا کے گڈ لک کہا، مگر خود اپنی گڈ لک کے بارے میں وہ مشکوک تھا۔

ہم نے اس کے جانے کے بعد اپنے لباس بدلے۔ کوسٹ گارڈ کی وردی ہمیں مشکلات میں مبتلا کر سکتی تھی۔ میل نرسنگ بوائے کی وردی میں ہمارا حلیہ بدل گیا۔ پھر میں نے اس پلان میں تھوڑی سی ترمیم کی اور خود ڈاکٹر بن گیا۔ ڈاکٹر بننے کے لیے مجھے کسی ایم بی بی ایس کی ڈگری کی ضرورت نہیں پڑی۔ میں نے گلے میں ایک اسٹیتھسکوپ ڈال لیا اور ہاتھ میں بلڈ پریشر چیک کرنے والا آلہ اٹھا لیا۔ میں نے سفید کی جگہ کالی پتلون پہن لی جو اسپتال کے سابق ڈسپنسر ڈاکٹر نے پہن رکھی تھی۔ خود کو زیادہ چھپانے کے لیے ہم نے منہ پہ وہ رومال نما کپڑا بھی باندھ لیا جو عموماً ڈاکٹر آپریشن تھیٹر میں باندھتے ہیں۔

بیرک نما اسپتال میں اب ویران تاریکی اور خاموشی کا راج تھا اور دو لاشیں تھیں جو بساطِ وقت کے پٹے ہوئے مُہروں کی طرح پڑی تھیں۔ کمپاؤنڈر جس نے خود کو اور والد ماجد کو کتا کہا تھا، چُپ چاپ بڑا امید اور خوف زدہ نظروں سے ہماری تیاری کو دیکھ رہا تھا۔ ابھی تک اسے یقین نہ تھا کہ ہم اسے بخش چکے ہیں۔

"تم ہمارے ساتھ چلو گے۔" میں نے اپنی تیاری مکمل ہونے کے بعد کہا۔

"میں... مگر کہاں؟"

"ہمیں ایک مریض کی ضرورت ہے۔" میں نے کہا۔ "تم کو کچھ دیر رول کرنا ہوگا۔ ہم تمھارا آپریشن نہیں کریں گے۔"

"پوسٹ مارٹم بھی نہیں کریں گے۔" محسن نے اسے یقین دلایا۔

ظاہر ہے وہ آسانی سے ماننے والا نہیں تھا۔ جب اس نے احتجاج اور مزاحمت کی تو مجھے اس کو اصلی مریض بنانے کے لیے ناک آؤٹ کرنا پڑا۔ پھر ہم نے اسے اسٹریچر پہ ڈال کے چادر سے ڈھک دیا۔ ہم نے اس کی چادر کے نیچے ایک ٹیوب لگا دی جس کا دوسرا سرا گلوکوز کی بوتل سے ملا ہوا تھا۔ دوسری طرف سے خون دینے کے لیے ہمیں سرخ روشنائی کو پانی میں حل کر کے کام چلانا پڑا۔ رات کے وقت کون تھا جو پانی یا خون کے

فرق کو دیکھ سکتا۔ ایک جانب سے محسن نے خون کی بوتل تھام لی، دوسری طرف سے میں نے گلوکوز کی تھیلی پکڑ لی۔

جب ہم اسٹریچر کو آہستہ آہستہ دھکیلتے ہوئے نکلے تو یہ منظر بہت حقیقی اور دردناک ہو گیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی مریض کو آپریشن تھیٹر سے نازک حالت میں کہیں منتقل کیا جا رہا ہو۔ لوگ ہمارے لیے خود راستہ چھوڑ دیتے تھے۔

"یار! اس طنبورے کو کہاں لے جانا ہے؟" محسن نے منہ بند کرنے والے کپڑے کے نیچے سے گڑگڑا کے کہا۔

"ابھی تو اسے ساتھ ہی رکھنا پڑے گا۔" میں نے اسی طرح جواب دیا۔ "ورنہ طنبورے نے بجنا شروع کر دیا تو سب کچھ بتا دے گا۔"

"ہاں، ہم سے غلطی ہوئی۔ طنبورے کے سامنے ساری بات کرتے رہے۔ طنبورہ سب جانتا ہے۔" محسن بولا۔ "سب سے اچھا ہوتا کہ طنبورے کو وہیں لٹا دیتے۔ جہاں تانپورہ لیٹا ہوا ہے۔"

تانپورے سے محسن کی مراد اس جعلی ڈاکٹر سے تھی۔

"اب کچھ نہیں ہو سکتا۔" میں نے کہا۔ "جب تک ہمارا مشن پورا نہ ہو جائے، طنبورے کو ساتھ ہی رکھنا پڑے گا۔"

"یہ تو مشکل ہو جائے گا۔ کیوں نہ اسے بھی ٹھنڈا کر دیں سمندر میں۔" محسن بولا۔ "جیسے تعزیے ٹھنڈے کرتے ہیں۔"

"یہ طنبورہ ہے، تعزیہ نہیں۔"

طنبورہ جو سب کچھ سُن رہا تھا تھوڑا سا تڑپا۔ اس کا مقصد احتجاج کرنا تھا یا فریاد کرنا تھا، لیکن ہم نے اسے مریض کا ایسا ماڈل بنایا تھا کہ وہ چاہتا بھی تو نہ خود حرکت کر سکتا تھا اور نہ لبوں کو حرکت دے سکتا تھا۔

ہم اسٹریچر سمیت باہر آ گئے۔ اس وقت رات کے آٹھ بج کر دس منٹ ہوئے تھے۔ ہم نے اکرام شیخ کے لیے ایک پیغام چھوڑا تھا مگر اس میں وقتِ ملاقات دس بجے رکھا تھا۔ لیکن یہ ہو سکتا تھا کہ شیخ کو وہ پیغام ہی نہ ملے۔

"اب یہ کیسے معلوم کیا جائے کہ ان ٹیکسی ڈرائیوروں سے اکرام شیخ کی ملاقات ہوئی یا نہیں۔" محسن بولا۔

"ملاقات تو ہوئی ہو گی۔ وہ دن میں تین تین چکر لگا رہا تھا۔" میں نے کہا۔ "تو جا کے دیکھ، معلوم کر۔"

"کیا دیکھوں؟ اور کیا معلوم کروں؟" محسن بولا۔ "وہ دونوں ٹیکسی ڈرائیور ابھی تک وہیں ہوں گے کیا؟"

"کسی اور سے پوچھ۔ ٹیکسی نمبر کا حوالہ دے کر۔"

"یار! دن میں ہم کچھ اور تھے، اب کچھ اور ہیں۔ یہ بات شک نہ پیدا کر دے۔"

"یار، پیدا ہونے دے شک۔" میں نے جھلا کے کہا۔ "نہیں تو اس مریض کے ساتھ تو ٹھہر، میں جاتا ہوں۔ پر ذرا عجیب سا لگے گا کہ ڈاکٹر صاحب ٹیکسی ڈرائیوروں سے گپ لگا رہے ہیں اور کمپاؤنڈر مریض سے ایک طرف کھڑا ہے۔"

"اچھا بھائی۔ یہاں بھی آپ ہی باس۔" محسن جلتے بھنتے بولا۔ "مجھے معلوم ہوتا تو میں ڈاکٹر کی وردی پہن لیتا۔"

"وردی کی بات نہیں، صورت کا مسئلہ بھی ہے عزیزم! روز آئینہ دیکھتے ہو۔"

"میں نہیں دیکھتا۔"

"ہاں، اس لیے نہیں دیکھتے کہ تم کو اپنے مقابل ایک انتہائی بلکہ شرمناک چہرہ دکھائی دیتا ہے۔" میں نے کہا۔ "ہاں میرے جیسا خوبصورت چہرہ ہوتا تمہارا بھی تو..."

مگر وہ میری بات سنے بغیر جا چکا تھا۔ میں ایک درخت کے سائے میں جہاں نسبتاً اندھیرا تھا اور لوگوں کی آمد و رفت بھی زیادہ نہیں تھی، اسٹریچر کے ساتھ کھڑا رہا۔ طنبورہ یعنی مریض میری طرف التجا آمیز نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کے ہونٹوں پر لگا ہوا ٹیپ ہٹا دیا۔ لیکن اسے خبردار کرنے کے بعد کہ حلق سے چیخ یا مدد کی پکار نہ نکلے، ورنہ اس سے پہلے کہ کوئی مدد کے لیے پہنچے، وہ اللہ کو پیارا ہو چکا ہو گا اور میں ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے سب کو مطمئن کر دوں گا کہ مریض نے عالمِ نزع میں آخری چیخ ماری تھی۔ اس کی حالت ہی ایسی تھی۔

"میں... میں وعدہ کر چکا ہوں۔ پھر تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟" طنبورے نے دردناک لہجے میں کہا۔ "میرے بیوی بچے پریشان ہوں گے۔"

"ان سے زیادہ پریشان ہم ہوں گے، اگر ہم نے تمھیں آزاد چھوڑ دیا۔ ہم جیتی ہوئی بازی ہارنے کا رسک نہیں لے سکتے۔"

اچانک ایک ٹیکسی زوم سے میرے قریب آ کے رُکی۔ میں نے فوراً طنبورے کو سیل کر دیا۔ ٹیکسی کے نمبر سے پہلے میری نظر نے شیخ کو دیکھا اور اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے محسن کو۔

"تم دونوں..." شیخ نے ایک طویل قصیدے کا آغاز کسی تمہید کے بغیر کر دیا جس میں ہمیں مختلف ناپاک اور ناپسندیدہ جانوروں سے منسوب کیا گیا تھا اور غیر پارلیمانی زبان میں خطاب کیا گیا تھا۔

"کمپاؤنڈر! مریض کو ٹیکسی میں شفٹ کرو۔" میں نے حکم دیا۔

"زندہ یا مردہ؟" محسن نے کہا۔ "پورا یا آدھا؟"

"جیسے تمہارا دل چاہے۔ جگہ نہ ہو تو پٹرول ٹینک میں ڈال دو۔" میں نے کہا۔

"یار! ہم کو شرم آنا چاہیے۔"

"ہاں یار۔" میں نے آہ بھر کے کہا۔ "مگر کیا کریں، نہیں

نا ہم کو آتی ہے؟"

"میں نے کیا کیا ہے۔ خوار پھر رہا ہوں تمہاری تلاش میں۔"

"جھوٹ بولتا ہے تھانیدار کے بچے۔ ہمیں سب معلوم ہے، ...پیچھے پھر رہا ہے۔ یک نہ شد دو شد۔" میں نے کہا۔ "ایک تو ...تھی، یہ دوسری کہاں سے آ گئی؟ پورا لچا اندر بنے گھوم رہے ہو ...کے ساتھ۔ آدمی شادیاں چار کر سکتا ہے۔ بیک وقت دو ...نہیں کر سکتا۔"

...دو دانت نکالنے لگا۔ "اب تو ایک بھی نہیں۔ وہ دوسری ...امانت تھی کسی کی۔"

"امانت تھی! کس کی امانت تھی؟"

"اپنے ایک دوست تھے۔ کبیر خاں عرف سکندر بخت۔ ...کے عشق میں سر سے کفن باندھ کے نکلی تھی۔ میرا مطلب ہے ...زیب بہن کے۔"

"شیخ! کون تھی وہ زیب النساء؟"

"سبحان اللہ۔ گویا آپ کو یہ خوش فہمی بھی ہے کہ زیب النساء آپ پر مرتی ہے۔ اور آپ کے لیے مر سکتی ہے۔" شیخ ہنسا۔

"پھر بتا نا یار، بڑے بھائی، میرے باپ۔ تیرے ساتھ ...ناز کے علاوہ کون تھی؟"

"رابعہ۔" شیخ بولا۔

مجھے پھر یوں لگا جیسے شیخ نے اچانک ریوالور نکال کے میرے کان میں فائر کر دیا ہو۔ دھماکے سے میرا دماغ ہل گیا اور کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی۔ پھر میں نے اس کو کندھوں سے پکڑ لیا۔

"رابعہ آئی تھی۔ جھوٹ تو نہیں بول رہا ہے میرے ساتھ۔ ...کہاں ہے وہ؟" میں نے مضطرب لہجے میں کہا۔

"وہ چلی گئی واپس۔" شیخ نے سنجیدہ ہو کے کہا، مگر خود کو چھڑانے کی کوشش نہیں کی۔ "اسے ایک موقع ملا تھا۔ اس نے ایک ملازمہ کو شریکِ راز کیا۔ ملازمہ نے اپنی ماں کو بلایا۔ وہ جس برقعے میں آئی تھی، رابعہ پہن کے نکل آئی۔"

"نکل آئی! کہاں سے نکل آئی؟ کیا وہ کسی قید خانے میں تھی؟"

"قید خانہ وہ ہے بھی، اور نہیں بھی۔" شیخ نے کہا۔ "مگر یہ بات ...نے خود کہی کہ اس کے فرار کا راز افشا ہو گیا تو اس سے ہمیں بہت نقصان ہو گا۔"

"کس قسم کا نقصان؟"

"نقصان تو نقصان ہی ہوتا ہے۔ جیسا بھی ہو اور رابعہ کیا ...نہیں۔ کیا تم نہیں جانتے اس لفظ کا مطلب؟"

"یار! تو وہ واپس کیوں چلی گئی۔ تم نے جانے کیوں دیا اسے؟"

میں نے شیخ کو جھنجوڑ کے کہا۔

"بھیا، میرے کندھے مت ہلا۔ جوڑ نکل گئے تو ٹیکسی کون چلائے گا۔" شیخ نے کہا۔ "رابعہ کے پاس صرف دو گھنٹے تھے جو اس نے میری اور پھر تیری تلاش میں صرف کر دیے۔"

"دو گھنٹے کے لیے کیوں آئی تھی وہ؟"

"اس سے زیادہ وقت نہیں تھا اس کے پاس۔" شیخ نے کہا۔ "اس نے اپنی مجبوری بتا دی اور ہم سمجھ گئے۔"

"میں نہیں مانتا کسی مجبوری کو۔"

"نہ مانو، لیکن حقیقت اس سے نہیں بدلے گی۔ اس نے یہی کہا تھا کہ فی الحال وہ جہاں ہے وہیں رہے گی۔ اور اس کا وہاں رہنا ہمارے بہترین مفاد میں ہے۔ اسے ہم سب کی خیریت معلوم ہوتی رہتی ہے۔ اور ہمیں بھی اس کی طرف سے بالکل بے فکر رہنا چاہیے۔ تمہارے لیے خصوصی پیغام تھا کہ آزمائش کے اس مختصر دور میں وہی وظیفہ آپ کی مشکل کشائی کرے گا جو کچھ یوں ہے کہ... خدا ہیں آج اگر ہم تو کل ہم ہوں گے۔"

"کل؟" میں نے تلخی سے کہا۔ "کس نے دیکھی ہے کل اور ہم تو تب ہوں گے جب ہم ہوں گے۔"

"اس کا جواب بھی کسی نے دیا ہے۔ کہ ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہو گا۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا یار، کہ اس نے ہمارے ساتھ یہ کیا کھیل شروع کر دیا ہے اور کیوں؟ اس کا فائدہ؟"

"فائدہ وہ یقیناً سمجھتی ہے۔"

"خود ہی سمجھتی ہے۔ مجھے، تمھیں، ہم سب کو بھی تو سمجھائے۔"

"وہ کہتی ہے کہ تم کو خود سمجھ لینا چاہیے اور ابھی نہیں سمجھے تو وقت سمجھا دے گا کہ میری مجبوری کوئی عذر نہیں اور یہ عذر کوئی مجبوری نہیں۔ اب اسے میں تیری بد قسمتی کہوں یا یہ کہوں کہ ہو گی اس میں بھی کوئی پوشیدہ مصلحت تقدیر کی۔ کہ دوبارہ وہ تجھ سے ملنے آئی اور ملا اسے میں۔"

"ایسی باتیں مجھے بہت مایوس کرتی ہیں یار۔ نارسائی اگر اپنی تقدیر ہو اور نہ امید ہو نہ انتظار۔ تو پھر آدمی دوسرے سہارے، دوسری پناہیں تلاش کر لیتا ہے۔" میں نے کہا۔ "جبر کا فلسفہ اختیار کرتا ہے اور تقدیر کے سامنے تدبیر کی بے چارگی کو تسلیم کر لیتا ہے، دل کو بہلا لیتا ہے کہ ہو گی اس میں بھی کوئی خدا کی مصلحت۔ مگر جب تقدیر یہ کھیل شروع کر دے۔ دامنِ امید ہاتھ میں آئے اور نکل جائے اور دل میں اگلی ملاقات کا، آنے والے وقت کے کسی مہربان لمحے کا اور آتشِ شوق کا فروزاں رہنے کا یہ سلسلہ نہ تمام ہوتا ہے اور نہ..."

"بس بس، زیادہ لمبی جذباتی تقریر کے لیے وقت نہیں ہے ہمارے پاس۔" مجھے نے مجھے ڈانٹ کر کہا "خواہ مخواہ ہم پر بھی رقّت طاری ہو رہی ہے۔ تیری وہ کافر ادا کافرہ کدھر ہے؟"

"اسے ساتھ لیے پھرتا تھا تو سب کو کھٹکتی تھی۔ میں نے اسے ایک گھر میں ڈال دیا۔"

"یہ کہہ کہ اپنے گھر میں ڈال لیا جہنمی!" محسن نے بڑی قرأت کے ساتھ کہا۔ اور اپنی غیر موجود داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔

"یہ گھر کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

"ابھی تو ڈاکٹر جھگّی والا کے گھر چھوڑ دیا ہے۔ وہاں وہ محفوظ رہے گی۔ کچھ ان کے خدمتِ خلق والے کام میں ہاتھ بٹائے گی تو خود کو اکیلا بھی محسوس نہیں کرے گی۔"

میں نے اسٹریچر کے نیچے ہاتھ ڈالا۔ اور ایک وردی برآمد کی۔ "یہ اسے دے دینا۔ نرس کی وردی پہن لے گی تو..."

شیخ احمقوں کی طرح دیکھنے لگا۔ "یہ... وردی، کیا تمھیں کسی نے بتا دیا تھا؟"

"نہیں، یہ ہم نے کشف و کرامت کی طاقت سے جان لیا تھا اپنے شیخ صاحب!" محسن بولا۔

"تم نے یہ کیا سوانگ رچایا ہے۔ ایک ڈاکٹر بنا ہوا ہے تو دوسرا کمپاؤنڈر۔ ایک مریض اٹھا لائے ہو اور میرے سر منڈھ دیا ہے۔ یہ سب کیا ہے آخر؟ تم کسی اسپتال میں جا گھسے تھے؟" شیخ نے خاصے یقین کے ساتھ کہا۔

محسن نے اس سے ہاتھ ملایا۔ "تیری عقل میں آ ہی گئی یہ بات۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تو ابھی تک آدمی ہے۔ ٹھیک ٹھاک۔"

"پہلے کیا گدھا تھا؟" شیخ نے کہا۔

"معلوم نہیں، ہم نے تو جب دیکھا تو تھانیدار تھا۔ پھر ہماری صحبت میں رہ کے آدمی بن گیا تھا۔ اس کے بعد عاشق ہو گیا تھا۔"

"ابھی فضول باتوں کا وقت نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ ٹھیک ہے کہ ہم ایک اسپتال لوٹ لائے ہیں۔ یہ مریض بھی وہیں بنایا۔ اب اسے کہیں بہ حفاظت رکھنا ہے۔"

"بہ حفاظت رکھنا ہے۔" شیخ پریشان ہو کے بولا۔ "کب تک۔ اور کہاں رکھوں گا میں اسے؟"

"یہ سوچنا تیرا کام ہے۔" محسن بولا۔ "زمین کے اوپر جگہ نہ ملے تو کوئی حرج نہیں، زمین کے نیچے گاڑ دینا۔ ہماری طرف سے کوئی اعتراض نہیں۔ یا پھر اس وقت تک نہ چھوڑنا جب تک اخبار میں 'ایس ایس کرانتی تھرڈ' کے غرق ہونے کی خبر نہ آ جائے۔"

"ایسی خبریں کون دیتا ہے اخبار میں؟"

"اب تو یہاں بندرگاہ کے علاقے سے تو مل جاتی ہے یہ کسی کشتی کے پیندے میں سوراخ ہونے کی خبر تو ہے نہیں بلکہ خاصے بڑے بحری جہاز کی غرقابی کا معاملہ ہے جو دھماکے سے تباہ ہوگا۔ یہ بات چھپی نہیں رہ سکتی جیسے ہی یہ معلوم ہو مریض کو ڈسچارج کر دینا کہ جہاں چاہے جائے۔"

"ویسے ایک گھر ہے اس کا۔" میں نے کہا۔ "اگر ممکن ہو تو وہاں پیغام بھجوا دینا کہ طنبورہ خیریت سے ہے۔"

"طنبورہ؟"

"ہاں بھئی، ہم اس کے بجنے سے ڈرتے ہیں۔ یہ نہ بجے گا تو ہمارا مشن فیل ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔

"کیا تم لوگ جا رہے ہو؟ آج ہی؟"

"آج بھی جا سکتے ہیں، ورنہ کل۔" محسن بولا۔ "اب تو بھی اد دیکھ، شرفا کے طریقے اختیار کر رہیں دیکھ۔ شرعی طریقے سے نکاح پڑھوا دیا اور پھر گھر میں ڈالا۔ عاقبت کی فکر کر جہنمی سابق تھانیدار۔"

"بات سنو، وہ نازو کہاں ہے؟" شیخ بولا۔

"وہ ٹھیک ہے۔ ہمارے ساتھ جا رہی ہے۔" میں نے کہا۔

"تم ذرا لاہور فون کرتے رہنا۔ اپنے یار منظر کو اور انکل رضوی کے گھر۔"

"میں نے لاہور فون کیا تھا۔ زیب النساء کے بارے میں معلوم کرنے کے لیے۔" شیخ چلتے چلتے رُک گیا۔

"پھر... کیا معلوم ہوا؟" میں نے کہا۔

"یہی کہ وہ سب جھوٹ بھی تھا اور سچ بھی۔" شیخ نے کہا۔

"پہلے جھوٹ اور سچ کی تعریف بتا دیجیے۔" محسن بولا۔

"سچ یہ تھا کہ خسرو جمشید کے ساتھ وہی ہوا جو ہم نے دیکھا تھا وہ نواب سلطان محمد خاں کی حویلی میں دریافت ہو گیا۔ دریافت کرنے والی اسی کی بہن تھی۔"

"سوتیلی بہن۔ زیب النساء کی ماں۔" محسن نے تصحیح کی۔

"مجھے معلوم ہے۔" شیخ نے اسے گھورا۔ "بیگی اور جوانی مار ڈالتے، لیکن سلطان محمد خاں بیچ میں پڑ گئے۔ تعلق تو کوئی نہیں تھا، بھائی بہن کے درمیان مگر خسرو جمشید نے ایک احسان کو واسطہ دیا کہ میں نے تمھاری بیٹی کو زندگی دی۔ تم اس کے بدلے مجھے زندہ رہنے کا موقع دو۔"

"گویا ہمارا خیال ٹھیک ہی تھا۔"

"بس وہاں سے نکلنے کے بعد خسرو جمشید پر کیا بیتی یہ بھی کوئی نہیں جانتا۔ ہم بھی قیاس آرائی ہی کر سکتے ہیں کہ وہ دلدار کے پاس گیا تو دلدار نسا نے معاف نہیں کیا۔ تاہم وہ بات الگ

ثابت ہوئی۔ زیب النساء کے فلم اسٹار بننے کی۔"

"محسن، تیری بیوی کو یہ سابق تھانیدار تیرے منہ پر چھوٹا کہہ" میں نے کہا۔

"اسے میں نے ابھی قتل کر دیا تو اس طنبورے کو کون لے جائے" محسن بولا۔ "پھر کبھی سہی۔"

"تیری جورو کا قصور نہیں ہے اس میں۔ وہ زیب النساء بڑی چالاک ہے۔ اس نے کسی فرضی رپورٹر کے ذریعے تصویر اور انٹرویو سب شائع کرائے تھے اور اس رسالے کو شائع کرانے کا معاوضہ بھی اتنا ہی ادا کیا تھا، جتنا اشتہار دینے کا بنتا تھا۔ دو صفحے کا انٹرویو تھا، مگر درحقیقت زیب النساء نے صفحے بک کیے اپنا اشتہار خود دینے کے لیے اور جو کچھ شائع کرایا اس کے آخر میں لکھ بھی دیا کہ اشتہار، مگر یہ آخری لفظ کسی نے نہیں پڑھا۔ ایڈیٹر تو بری الذمہ ہو گیا۔ اشتہار میں کوئی کیا لکھتا ہے اور کیا بتاتا ہے، یہ اس کی ذمے داری نہیں۔ خود اشتہار دینے والے کی ذمے داری ہوتی ہے۔"

"لیکن زیب النساء نے ایسا کیوں کیا؟"

"بس اسے ہی کہتے ہیں آنکھوں میں دھول جھونکنا۔ سب نے توجہ ایک طرف کر دی۔ تلاش کرنے والے اسے نگار خانوں میں اور فلمی دنیا کے مراکز میں تلاش کرتے رہے۔ نامہ نگاروں سے لے کر ہدایت کاروں تک سے پوچھتے رہے۔"

"اور جس رسالے میں وہ انٹرویو چھپا تھا۔"

"اس کے ایڈیٹر نے تو صاف بتا دیا کہ لڑکی خود آئی تھی اور اس کے ساتھ کوئی رپورٹر تھا۔ وہ اپنا اشتہار خود دینا چاہتی تھی تو اس نے چھاپ دیا۔"

"یہ سب تجھے کیسے معلوم ہوا؟"

"شہلا سے۔" شیخ نے کہا۔

"اسے کیوں فون کیا تھا؟" محسن دہاڑ کے بولا۔ "پرائی بیویوں کو فون کرتا ہے۔ نابکار۔"

"اس سے تو بس یہ پوچھنا تھا کہ تمھارا نام نہاد شوہر کہاں ہے۔ اس کی کچھ خیر خبر ہے کہ زندہ ہے تو کہاں روپوش ہے۔ ظاہر ہے اسے بھی علم نہیں تھا۔ اس نے کہا کہ ابھی تو فون کیا تھا ان دونوں نے، دو دن ہوئے۔ اس سے مزید بات ہوئی تو پتا چلا کہ... زیب النساء وہاں پہنچی تھی۔ انکل رضوی کے گھر۔"

"انکل رضوی کے گھر، وہ کس لیے؟"

"شہلا سے ملنا ہی تھا ایک مقصد۔ ہمارے بارے میں معلوم کرنا چاہتی تھی کہ ہم کہاں ہیں۔ شہلا نے وہی کہا جو حقیقت تھی کہ مجھے نہیں معلوم۔ کبھی وہ خود فون کر لیتے ہیں۔ اس نے سمجھا کہ شہلا ٹال رہی ہے۔ پھر شہلا نے پوچھا کہ اسے ہم سے کیا کام پڑ گیا۔ تو... زیب النساء نے سب بتا دیا۔ یہ کہا کہ وہ کراچی پہنچ جاتی تو اچھا تھا۔ شہلا نے کہا کہ پھر کسی نے رابطہ قائم کیا تو پوچھ لوں گی۔"

"پھر تم نے بتایا؟"

"ہاں، میں نے ڈاکٹر جھگّی والا کا نام بتا دیا تھا۔"

"یہ کب کی بات ہے؟" محسن بولا۔

"کل کی... کل دوپہر کی، تمھارا بھانجا بھی ٹھیک تھا۔"

"میرا بھانجا!"

"ہاں، وہ اُلّو کا پٹھا جو تجھے بھی ماما کہتا ہے۔" شیخ نے کہا۔

محسن کو سخت خفّت اٹھانا پڑی۔ ہمارے سر سے ایک بار تو اُتر گیا تھا۔ اب ہمیں رات گیارہ بجے سے پہلے غالب اور نازو کو ڈاکٹر بھنڈاری عرف بھنڈی کے پاس بھیجنا تھا۔ لیکن اس سے پہلے بھی ایک چھوٹا سا کام تھا جو ہمیں دس بجے نمٹانا تھا۔ ابھی سوا نو بجے تھے۔ میں نے محسن سے مشورہ کیا اور ہم شیخ کے ساتھ ہی ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔

وقت کم تھا چنانچہ ہم نے ایک اعلیٰ درجے کے ریستوران میں کھانا کھاتے ہوئے اور پھر جلدی جلدی کافی حلق میں انڈیلتے ہوئے اکرام شیخ کو ان واقعات سے آگاہ کیا جو ہمارے ساتھ پیش آئے تھے۔ پھر وہ ہمیں واپس چھوڑ گیا۔

رات کے دس بج کر پانچ منٹ پر ہم پھر اس گودام میں داخل ہوئے جہاں سے ہم کوسٹ گارڈ کی وردی پہن کر نکلے تھے اور انھیں بے وردی چھوڑ گئے تھے جو اس کے مالک تھے۔ ہماری عدم موجودگی میں اگر کوئی کارروائی ہوئی تھی تو وہ ختم ہو چکی تھی۔ ان دونوں کو ایک دو گھنٹے کے بعد ہوش آیا ہوگا تو وہ اپنی حالت دیکھ کر شرمائے ہوں گے مگر شرمانے کے بعد چیخے چلّائے بھی ہوں گے اور انھوں نے لازماً پولیس کو رپورٹ بھی کی ہوگی۔ ہماری بے حد مستعد پولیس نے ضابطے کی کارروائی کی ہوگی اور اپنی تفتیش بھی جس کے نتیجے میں کچھ معلوم نہیں ہوا ہوگا۔

گودام میں داخل ہوتے وقت میرے اور محسن کے خیالات تقریباً ایک سے تھے۔

"یہاں تو اب بھی کوئی نہیں۔" محسن نے آہستہ سے میرے کان میں کہا۔

"یا ہے تو ہمیں دکھائی نہیں دے رہا ہے... جو دن کے اجالے میں نظر نہیں آیا تھا وہ رات کے اندھیرے میں کیسے نظر آئے گا۔"

"کہیں پولیس نے اندھیرے میں کوئی جال تو نہیں پھیلا رکھا ہوگا۔" محسن بولا۔

ہم دونوں چھت تک رکھی ہوئی بوریوں کی دیوار کے پیچھے کھڑے ہو گئے۔ میں نے جیب سے وہ پین ٹارچ نکالی جو ہم واپسی میں خرید کے لائے تھے۔

"مجھے تو صرف جالے نظر آ رہے ہیں کڑیوں کے۔ جال تو کوئی نہیں ہے۔" میں نے کہا اور محسن کے ساتھ ان بوریوں کو تلاش کرنے لگا جن پر ایک چور سیٹھ نے ایک چور چوکیدار کے سامنے دستخط کیے تھے۔ ساری بوریاں ایک جگہ پر موجود تھیں جن کا مطلب تھا کہ ابھی تک گاہک اور خریدار نہیں آئے۔

ان کا انتظار ہمیں زیادہ دیر نہیں کرنا پڑا۔ بیرک کے اس حصے کی طرف جدھر سے ہم اندر آئے تھے، تیز روشنی اندر آئی اور گھوم کے نکل گئی۔ بالکل کسی گردش کرنے والی سرچ لائٹ کی طرح۔ اس کے ساتھ ٹرک کے انجن کی آواز قریب آنے لگی۔ میں نے تھوڑا سا سر نکال کے دیکھا تو ٹرک اُلٹا آ رہا تھا آہستہ آہستہ۔ اس کی ٹیل لائٹس بھی اب بند کر دی گئی تھیں۔

ٹرک کو گودام کے پلیٹ فارم جیسے کنارے سے ملا دیا گیا۔ عقبی حصے میں چند قدم پیچھے چوکیدار تھا جو ٹرک ڈرائیور کو ہدایات دے رہا تھا۔

"آنے دو اور پیچھے، بالکل ملا دو... اور پیچھے۔"

ٹرک ڈرائیور آگے اپنے کیبن کی کھڑکی سے منہ نکالے ان ہدایات سے زیادہ اپنی عقل اور مہارت پر اعتماد کرتے ہوئے ٹرک کو ریورس گیئر میں چبوترے سے ملانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب ٹرک بند ہو گیا تو آگے والے حصے سے خریدار اُتر کے آیا۔ پچھلے حصے کو کھول کے چار مزدور بھی باہر نکل آئے۔

"فٹافٹ کام کرو سیٹھ صاحب۔" چوکیدار بولا۔

"چلو بھئی شاباش، فٹافٹ کام ختم کرو۔" سیٹھ صاحب نے ہدایات کو حکم کے انداز میں مزدوروں تک پہنچا دیا۔

"آپ بوریاں چیک کر لیں۔"

"چیک کیے بغیر میں ایک بھی بوری نہیں اٹھاؤں گا۔" سیٹھ نے کہا۔

"مزدور صرف حکم کے غلام تھے۔ انھوں نے ایک ایک بوری اتار کے گودام میں رکھی اور پہلے سے نشان زدہ بوریاں اٹھانے لگ گئے۔ ٹوٹل وہی رہا۔ جہاں سے ایک بوری چاول اٹھاتے گئے وہاں ویسی ہی دوسری بوری آ گئی۔ جو فرق چاولوں کی کوالٹی میں آیا" وہ نظر آنے والا نہیں تھا۔

"اب کیا کرنا ہے؟ یہ تو سات آدمی ہو گئے۔" محسن نے سرگوشی کی۔ "چار مزدور، ایک ڈرائیور۔"

"مجرم تو وہ بھی ہیں، مگر ان کے جرم کی سنگینی اس لیے کم ہو جاتی ہے کہ وہ مجبور ہیں۔" میں نے کہا۔ "ان کو جانے دو۔"

"جانے دیں چوری کے مال کے ساتھ؟"

"ہاں، جرم تو تب ہی بنے گا جب مال چوری ہو جائے گا اور گودام سے نکل جائے گا۔" میں نے کہا۔

"مگر مال کے ساتھ ہی مجرم بھی نکل جائیں گے۔"

"ہم انھیں نہیں نکلنے دیں گے۔" میں نے کہا۔

ایک ایک کر کے انھوں نے سب بوریاں تبدیل کر دیں۔ اس کام میں انھوں نے حیرت انگیز پھرتی دکھائی اور بس منٹ میں فارغ ہو گئے۔ چاروں مزدوروں نے ٹرک کے پچھلے حصے کو بند کرنے والا تختہ اٹھایا۔ اور ٹرک ڈرائیور اپنی جگہ جا بیٹھا۔

چوکیدار اور سیٹھ حساب کتاب برابر کرنے کے لیے ذرا ایک دیوار کی اوٹ ہو گئے۔

"تین سو تم کو پہلے مل گئے تھے۔"

"ہاں، دو سو اور..."

چوکیدار نے اتنا ہی کہا تھا کہ میں نے اس کا منہ پیچھے دبا کے ریوالور اس کی گُدّی پر رکھ دیا۔ یہی محسن نے اس سیٹھ کے ساتھ کیا۔

"ٹرک ڈرائیور سے کہو جائے۔" محسن نے کہا۔

سیٹھ کا چہرہ میری طرف تھا۔ میں نے کہا۔ "تم یہ ریوالور دیکھ رہے ہو تا، یہ اصلی ہے۔"

"اور یہ اس سے بھی زیادہ اصلی ہے۔" محسن نے ریوالور گردن پر دبا کے کہا۔ "گولی بھی اصلی ہے۔"

"میری گولی تمھاری پیشانی میں سوراخ کرے گی۔"

"اور میری گولی گردن میں۔" محسن بولا۔

"اگر تم اپنے ساتھ پانچ دوسرے افراد کو بھی موت کی دعوت دینا چاہتے ہو تو انھیں مدد کے لیے بلا لینا ورنہ ان سے صرف اتنا کہنا کہ وہ جائیں، تم بعد میں آ جاؤ گے۔"

"حساب کتاب کر کے۔" محسن نے کہا۔

سیٹھ صرف سیٹھ تھا۔ اس کے پاس یقیناً بہت پیسہ ہو گا مگر ہر مجرم کی طرح وہ گرفتار ہوتے ہی کانپنے لگا تھا کیونکہ اس میں نہ اخلاقی جرأت تھی نہ مقابلے کی ہمت۔ محسن نے جب اس کے منہ پر سے ہاتھ ہٹایا تو میں نے اپنا ریوالور اس کے سامنے لہرایا۔ اس نے بڑی مشکل سے حلق میں پھنسی ہوئی آواز نکالی۔

"کیا بولتا ہے سیٹھ؟" ڈرائیور نے انجن اسٹارٹ کرنے کے بعد کہا۔

"میں... کہہ رہا ہوں کہ تم جاؤ، میں آ جاؤں گا۔"

"کیسے آئے گا؟"

"ٹیکسی میں آ جاؤں گا۔ تم سب چلو۔"

"اچھا سیٹھ، تمھارا مرضی ٹیکسی میں آؤ یا راکٹ میں۔" ڈرائیور نے کہا اور اس کے ساتھ ہی انجن کو گیئر میں ڈال دیا۔ انجن غرایا اور ٹیل لائٹس روشن ہوئیں پھر اس کا گودام سے فاصلہ بڑھنے لگا۔ اور آواز کم ہوتی گئی۔

میں نے چوکیدار کو گھما کے دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز۔

"تم... کون ہو تم لوگ۔" چوکیدار نے ہمت کر کے کہا۔

"اچھا سوال ہے۔" میں نے سر ہلایا۔ "انھیں بتاؤ بھئی کہ ہم کون ہیں۔"

"ہم خدائی فوجدار ہیں۔" محسن نے کہا۔

"انھیں یہ بھی بتا دو کہ یہ کون ہیں۔" میں نے کہا۔

"تم دونوں چور ہی نہیں، ملک اور قوم کے دشمن بھی ہو۔" محسن نے کہا۔ "ہم نے تمھاری ساری کارروائی خود دیکھی، شروع سے آخر تک۔ ہم اس واردات کے چشم دید گواہ ہیں۔"

"تم... کس کارروائی کی بات کر رہے ہو؟" سیٹھ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ "کیا ثبوت ہے؟"

میں نے اس کے منہ پر مُکا مارا۔ اس کا سر دیوار سے لگا۔

"جب آدمی خود دیکھتا ہے تو اسے یقین کے لیے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں پڑتی۔" میں نے کہا۔ "یہ تم بھی جانتے ہو کہ تمھارا جرم کیا ہے۔ ہم نے تمھیں دن میں بوریوں پر نشان لگاتے ہوئے اور تین سو روپے بطور ایڈوانس دیتے بھی دیکھا تھا۔"

"اور باقی کارروائی ابھی دیکھی ہے۔" محسن بولا۔

"اب تم خود کو ہماری عدالتِ انصاف کے کٹہرے میں ایک مجرم سمجھو۔ تم پر مقدمے کی سماعت شروع کی جاتی ہے۔"

"کیسی عدالت؟" چوکیدار بولا۔

"تم کون ہوتے ہو مقدمہ چلانے والے؟"

"یہ ایم آر ایس کی عدالت ہے جو ملک دشمن سرگرمیوں میں حصہ لینے والوں کو سزا دینے کے خصوصی اختیارات رکھتی ہے۔" میں نے کہا۔

"ایم آر ایس... کیا تم پاگل ہو...؟"

"ایم آر ایس کی عدالت تم کو ملک و قوم کا دشمن اور غدار ثابت کر چکی ہے۔ تم نے ذاتی منفعت کے لیے ملک کی تجارتی ساکھ کو داؤ پر لگایا..... پاکستان کی معیشت کو نقصان پہنچایا۔ کاروباری دنیا میں پاکستان کو بدنام کیا۔ چوری اور غبن کیا۔" میں نے کہا۔

"کون کہتا ہے؟" سیٹھ کی زبان لڑکھڑا گئی۔

"یہ ہم جانتے ہیں اور تم اس سے انکار نہیں کر سکتے۔ اس عدالت میں ہم خود مدعی ہیں، خود گواہ، خود وکیلِ استغاثہ اور منصف۔ یہ دنیا کی عدالت نہیں ہے جہاں سب الگ ہوتے ہیں اور وہ مستحق نہ ہوں تو مجرم بھی بچ جاتے ہیں۔"

"ہم جلاد بھی ہیں اور سزا پر عملدرآمد کرنے والے بھی۔" محسن نے اضافہ کیا۔

"یہ عدالت تم کو سزائے موت دیتی ہے۔ اس فیصلے کے خلاف یومِ حشر سے پہلے کہیں کوئی اپیل نہیں۔ ٹھیک تیس سیکنڈ کے بعد سزائے موت پر عملدرآمد ہو گا۔ اس وقفے میں تم چاہو تو کلمہ پڑھ سکتے ہو۔ توبہ کا وقت تو گزر چکا۔ آخری وقت میں کی جانے والی توبہ ویسے بھی قبول نہیں ہوتی۔"

"نہیں۔" سیٹھ اور چوکیدار ایک ساتھ چلائے۔

"تم... تم قتل کرنا چاہتے ہو، مجھے۔" سیٹھ کی آواز لرزنے لگی۔ وہ خود بھی بے ہوش ہونے کے قریب ہو گیا۔

"اگر تم نے کوئی ایسا سنگین جرم نہ کیا ہوتا تو بلاشبہ یہ قتل ہوتا۔" محسن نے کہا۔ "لیکن تم مجرم ہو۔"

"سزا دینا عدالت کا کام ہے۔ ہر شخص..."

"ہم اصولِ قانون کے مطابق انصاف کر رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اصول یہ ہے کہ دس مجرم اگر ناکافی ثبوت اور گواہی نہ ملنے کے باعث سزا سے بچ جائیں تو یہ بہتر ہے لیکن کسی ایک بے گناہ کو غلط ثبوت اور جھوٹی گواہی پر سزا ملے، ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ ہم اپنے ضمیر اور یقین کے مطابق تمھیں وہی سزا دے رہے ہیں جس کے تم مستحق ہو۔ جو قانون میں تمھارے جیسے ہر مجرم کے لیے درج بھی ہے۔"

"مگر افسوس ناک بات یہ ہے کہ قانون کی عدالت تک تم کو نہیں لے جایا جا سکتا۔" محسن بولا۔ "اگر ہم ایسی غلطی کرنے کو انصاف کا تقاضا سمجھ لیں تو یہ گویا تم کو بچ نکلنے کا موقع فراہم کرنے کے مترادف ہو گا۔ تم اپنے اس چوری کے مال سے کوئی بہت بڑا وکیل کر لو گے۔ جو اپنی قانونی موشگافیوں سے عدالت میں تمھارے جرم کو تمھاری بے گناہی میں بدل دے گا۔ تم گواہ خرید سکتے ہو اور ثبوت مٹا سکتے ہو۔ یہاں تک کہ گواہوں کو اور ان کے پورے خاندانوں کو مٹا سکتے ہو۔ اس لیے تمھارا فیصلہ یہاں ہوا تو بالکل ٹھیک ہوا۔"

اب چوکیدار چلانے لگا۔ خدا رسول کے واسطے دے کر جان بخشی کے لیے ہاتھ پاؤں جوڑنے لگا۔

"تمھاری رحم کی اپیل مسترد کی جاتی ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر تم پیشہ ور چور ہوتے تو تم کو رعایت دی جا سکتی تھی مگر

تم چوکیدار تھے، نگراں تھے، محافظ تھے۔ تم ہی چور بن گئے۔ اگر ایسا ہونے لگے کہ جس پر اعتماد کیا جائے وہی دغاباز ثابت ہو تو پھر یہ دنیا کا کاروبار کیسے چلے؟"

"حضور... ! میرے بیوی بچّے۔"

"ہاں، ایسے موقع پر ہمیشہ بیوی بچّے یاد آتے ہیں۔ اس وقت کے اچانک آجانے سے پہلے تو صرف یہ یاد رہتا ہے کہ کتنا مال اپنی جیب میں آسکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ یاد نہیں آتا کہ اگر کبھی وہ شاخ ہی نہ رہی جس پر آشیانہ تھا تو وہ کہاں جائیں گے اور ان کا کیا بنے گا۔"

"خیر، تم ان کی فکر مت کرو۔ بہت مال جمع کر لیا ہوگا تم نے۔ تھا تو وہ حرام کا مال جو حرام ہی جاتا ہے، مگر اپنی جان کی قربانی دے کر تم اسے ان کے لیے حلال بنا دو گے۔ ظاہر ہے ان کا تو اس میں قصور نہیں تھا۔" محسن بولا۔

"تمھاری بیوی کا تھوڑا بہت قصور ہے۔ اسے یقیناً علم ہوگا کہ تمھاری اصل آمدنی کیا ہے۔ وہ آمدنی سے بڑھ کے خرچ کرتے وقت نہ تم سے سوال کرتی تھی نہ اپنے آپ سے کہ یہ آیا کہاں سے اور کیسے آیا۔ ظاہر ہے کہ وہ جواب جانتی تھی مگر کیا کبھی اس نے تم کو ٹوکا؟ نہیں ٹوکا ہوگا۔ عورت کی ذات میں نمود و نمائش کا جذبہ زیادہ ہے۔ دوسروں سے حسد زیادہ ہے۔ اسے اچھے کپڑے ملیں ہوں گے۔ زیور ملے ہوں گے تو اس نے انجام کے بارے میں سوچنے سے بھی گریز کیا ہوگا۔ سزا کی مستحق وہ بھی ہے کیونکہ وہ چاہتی تو پہلے ہی دن تمھیں روک سکتی تھی۔ کہہ سکتی تھی کہ اسے جائز آمدنی میں روکھی سوکھی منظور ہے۔ بیوی یا کوئی بھی عورت، مرد کو جب چاہے جیسا چاہے بنا سکتی ہے۔"

"اس لیے اب ان کا معاملہ خُدا پر چھوڑ دو۔ وہ سب کو رزق دینے والا ہے۔ زندہ رکھنا اور مارنا اسی کے اختیار کی بات ہے۔ تم بیوی بچّوں کو خدا کی امان میں دو۔"

میں نے محسوس کیا کہ ان کے لیے موت کے انتظار کی اذیت کا وقفہ غیر ضروری طور پر طویل ہو گیا ہے۔ خود ہمارے پاس وقت کم تھا چنانچہ میں نے اچانک گولی کو آزاد کر دیا۔ تقریباً اسی کے ساتھ ہی محسن نے بھی فائر کیا۔ گولیاں ان کے سروں میں اتر گئیں۔ وہ نیچے گرے اور تڑپنے لگے، مگر مجھے معلوم تھا کہ اب یہ کوئی اذیت نہیں۔ اذیت تو احساس سے ہوتی ہے۔ احساس رکھنے والا دماغ پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔

دھماکہ اس بیرک میں ایسے گونجا تھا کہ ہمارے کانوں میں بھی بازگشت کی سائیں سائیں ہو رہی تھی، لیکن ہم نے اپنا کام ختم کرنے کے بعد فرار ہونے میں دیر نہیں کی۔ ہم مخالف

سمت کے دروازے سے باہر آگئے اور ایک سائبان کے نیچے تاریک گوشے میں کھڑے ہو گئے۔

فائر کی آواز پر نہ جانے کہاں کہاں سے لوگ نکل کے بھاگتے چلے آرہے تھے۔ ہم نے چند منٹ انتظار کیا اور پھر انہی لوگوں میں شامل ہو گئے۔ وہ ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ یہ کیسا دھماکا تھا۔ فائر کہاں ہوئے تھے۔ جب وہاں کافی لوگ پہنچ گئے تو ہم اطمینان سے چلتے ہوئے نکل گئے۔ کسی نے بھی ایک کمپاؤنڈر اور دوسرے ڈاکٹر نظر آنے والے شخص کو مشکوک نہیں سمجھا۔ وہاں ایسے بھی بہت تھے جو اپنے کام سے آجا رہے تھے اور کسی سنسنی خیز قسم کی واردات میں دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔

جائے واردات سے فرار ہونے کے بعد ہمارے لیے فوری مسئلہ اپنی لانچ پر پہنچنے کا تھا۔ میں اور محسن صحیح سمت پر چلتے گئے۔ ہم اب اس علاقے کے جغرافیے سے کافی حد تک واقف ہو چکے ہیں۔

"اس ملک میں بھی کیا کچھ نہیں ہو رہا ہے۔" محسن نے چلتے چلتے افسوس سے سر ہلایا۔ "لوگوں نے ایک ٹرسٹ کے تحت چلنے والے اسپتال کو بھی نہیں بخشا۔ جس نے ٹرسٹ قائم کیا تھا اور اس کی آمدنی کو اسپتال کے لیے وقف کیا تھا، اس نے تو صدقہ جاریہ کا ثواب کمایا تھا۔ لوٹنے والے یہ بھی نہیں سوچتے کہ وہ کسے لوٹ رہے ہیں۔"

"ہاں، یہی تو المیہ ہے۔ ارے بھائی لوٹنا ہے تو کسی جوئے خانے یا شراب خانے کو لوٹو۔ کسی اسمگلر کے مالِ حرام سے بھرے ہوئے گودام کو لوٹو۔ ایک ٹرسٹ کا پیسہ خورد بُرد کرنا تو گناہ بھی ہے، جرم بھی۔"

"اور وہاں ڈاکٹر کی جگہ کمپاؤنڈر کام کر رہا تھا۔"

"خاک کام کر رہا تھا۔ ڈاکٹر تو انسانیت کی خدمت کرتے ہیں۔ وہ انسانیت کش شخص تو ڈاکٹری کے پیشے کو بدنام کرنے والوں میں شامل تھا۔" میں نے کہا۔

"یہاں گودام لوٹنے والے کون ہیں؟ وہی جو اس کی حفاظت پر مامور ہیں۔" محسن سخت جذباتی ہو رہا تھا۔

"اور ان کا ایمان خریدنے والے ہیں سیٹھ بیوپاری۔ جن کے پاس مالِ حرام پہلے ہی کم نہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ بھی کیا نفسیاتی مسئلہ ہے یار۔ آدمی اچھی اچھی چیزیں جمع کرتا ہے۔ بُری چیزوں سے چھٹکارا پانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ اُلٹا کر رہے ہیں۔ مالِ حرام اکٹھا کر رہے ہیں۔ ایک تو ہوتی ہے ضرورت جو آدمی سے سب کچھ کراتی ہے۔ مرد سے چوری اور عورت سے پیشہ۔ مگر ایک بار مجبوری کے تحت چوری کرنے کے

بعد آدمی پکڑا نہ جائے تو اسے کوشش کرنا چاہیے کہ وہ پھر جرم نہ کرے۔ جو مل گیا ہے اسی سے چھوٹا موٹا کام کر لے۔ کاروبار کرے۔ مگر نہیں، وہ مسلسل چوریاں کرتا ہے۔ پھر ڈاکے کے راستے لگتا ہے۔ بنک لوٹنے لگتا ہے۔"

"یہی تو ساری خرابی ہے۔ لوگ رشوت لیتے ہیں۔ بھئی ایک کوٹھی بن گئی۔ ایک عالی شان کار آگئی۔ ایک لاکھ بنک میں جمع ہیں۔ اب تو بس کرو، اس کے بعد تو ایمانداری سے کام کرو۔ زندگی میں ایک بار غلطی گناہ یا جرم سرزد ہوا۔ باقی عمر تو ہے اس کا کفّارہ ادا کرنے کے لیے۔ کوئی نیکی کا کام بھی تو کر لو۔ شاید اسی کے طفیل تم بخشے جاؤ۔"

"نہیں یار، نیکی تو یہاں کسی کو سوجھتی ہی نہیں۔ اگر کروڑ پتی ہے تو ارب پتی بننا چاہتا ہے۔ ایک کروڑ سے دو کروڑ بنانا ہے مگر اس میں سے ایک لاکھ کسی اسپتال یا اسکول کو نہیں دیتا۔ کسی مستحق کو دینے کا سوچتا تک نہیں۔"

"چھوڑ یار، دل دُکھی ہوتا ہے ایسی باتوں سے۔ اگر میں سب کے سامنے یہ بات کہوں تو پتا نہیں کیا ہو۔ مجھ پر غدار ہونے کا الزام آجائے۔ مجھے کافر قرار دے دیا جائے۔ مگر بعض اوقات مجھے احساس ہوتا ہے کہ یہ ملک کسی کا نہیں، نہ میرا نہ تیرا۔ قائدِ اعظم اور قائدِ ملت نے تو اسے ایسا نہیں چھوڑا تھا، جیسا یہ اب ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس کے مالک نہیں ہیں۔ مالک کوئی اور ہے جو ہم میں سے نہیں۔ بلکہ ہمارا دشمن ہے۔ ہم انتقاماً اسے نقصان پہنچا کے تسکین حاصل کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"یار، یہی وہ جگہ ہے نا، جہاں لانچ کو موجود ہونا چاہیے!" محسن نے کچھ دیر بعد اچانک رُک کے کہا۔

میں نے غور سے گرد و پیش پر نگاہ ڈالی۔ "ہاں خیال تو میرا بھی یہی ہے، مگر ایسی کوئی نشانی میرے ذہن میں نہیں رہی۔"

محسن نے تائید میں سر ہلایا۔ "ہر جگہ ایک سی لگتی ہے۔"

ہمارے سامنے تاریک سمندر کے سینے پر ساحل کے ساتھ ساتھ سیکڑوں چھوٹی بڑی کشتیاں موجود تھیں۔ ان میں سے بیشتر اندھیرے میں صرف ایک تاریک سایہ لگتی تھیں لیکن کسی کسی کشتی پر چراغ کا برائے نام سا اجالا نظر آرہا تھا۔ پس منظر میں سمندر کا پانی بھی کالا محسوس ہوتا تھا اور آسمان قدرے روشن نظر آتا تھا۔

"ہو سکتا ہے کہ یہ وہ جگہ نہ ہو۔"

"تھوڑا سا آگے اور چل کے دیکھ لیتے ہیں۔" محسن بولا۔ "ممکن ہے واپسی پر وہ جگہ انھیں خالی نہ ملی ہو۔ پیچھے تو ہم نے دیکھ لیا ہے۔"

"آخر وہ بھی تو ہمیں تلاش کر رہے ہوں گے۔ ہم انھیں نہ دیکھ پائے تو وہ دیکھ لیں گے۔"

اسی وقت میری کمر پر ایک پتھر آ کے لگا۔ میں نے بے اختیار گھوم کے دیکھا۔ پتھر کے گرنے سے جو آواز پیدا ہوئی، اس نے محسن کو بھی متوجہ کیا۔

"پتا نہیں، کون خبیث تھا۔" میں نے کہا۔

"وہی ہوگا مرزا غالب کا بھتیجا اور کون...." محسن نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا لیکن ہمارے سامنے تاحدِ نگاہ سمندر تھا جس کے متلاطم پانی میں رات کی سیاہی گھل گئی تھی۔ اور دھندلا آسمان تھا جس کے ستارے اوجھل تھے۔ نیچے ساحل کے ساتھ ساتھ سیکڑوں چھوٹی بڑی کشتیاں ساکت نظر آتی تھیں۔ بیشتر کشتیوں پر اندھیرے کے سوا کچھ نہیں تھا لیکن چند کشتیوں پر چراغوں کا مدھم اُجالا یہ ظاہر کرتا تھا کہ اس کشتی کے سمندری گھر میں کسی خاندان کا بسیرا ہے۔ ہماری لانچ انھی کے درمیان کہیں موجود تھی، مگر غالب اور نازو نے اسے یوں کیموفلاج کر دیا تھا کہ ہم اسے تلاش نہ کر سکے۔

جو پتھر مجھے مارا گیا تھا وہ بہت چھوٹا تھا اور لگا بھی میری کمر پر تھا، چنانچہ مجھے چوٹ نہیں آئی تھی، لیکن دوسرا پتھر جو محسن کے سر پر لگا زیادہ پڑا تھا۔ اس نے بے اختیار گالی دی۔

"ابے... سامنے آ بھوت کے بچّے۔"

"تو ہی ہٹ جا نا درمیان میں سے، کیوں کھڑا ہے ہمارے نشانے کی راہ میں؟" کسی نے ڈانٹ کر کہا۔ "نامعقول۔" بے شک اس نے لہجہ اور آواز بدل کے بات کی تھی مگر میں نے سر اُٹھا کے دیکھا تو مرزا غالب خاصی بلندی پر تشریف فرما تھے۔ دیوار کے ساتھ ساتھ اوپر لکڑی کے خالی کریٹ رکھے گئے تھے۔ ان میں کیا تھا اور کون لایا تھا؟ جو کچھ لایا گیا تھا وہ کہاں گیا اور یہ خالی کریٹ یہاں کیسے رہ گئے؟ ان سوالات کا جواب دینے والا کوئی نہیں تھا۔ ظاہر ہے یہ کریٹ کسی کی ملکیت نہیں تھے۔ راستہ صاف اور کھلا رکھنے کے لیے انھیں دیوار کے ساتھ ڈھیر کر دیا گیا تھا۔ غالب انھی کے اوپر دراز تھا اور پہلو کے بَل کہنی کے سہارے اپنے ہاتھ سر کے نیچے رکھے تیسرا پتھر ہاتھ میں تول رہا تھا۔

"ذرا اوپر تشریف نہیں لے جا سکتے آپ؟" محسن نے بھنا کے کہا۔ "یا میں پہنچاؤں آپ کو؟" اس نے ایک کریٹ کو تھوڑا سا ہلایا۔

"دیکھ، ایسے تو میں گروں گا تجھ پر اور تو جائے گا وہاں۔" غالب نے کہا۔ "اے بستی کے مکین، ہم خود آجاتے ہیں عرش سے فرش پر۔"

"یہ نہایت گری ہوئی حرکت تھی۔" محسن بولا۔ "اوپر بیٹھ کر شرفا کو سنگسار کرنا۔"

"وہ یار..." غالب نیچے اتر کے بولا۔ "اوّل تو تم شرفا نہیں، دوسرے یہ کہ قصور میرا نہیں۔ معلوم نہیں وہاں کس نے پتھر رکھے تھے اور کیوں رکھے تھے؟"

"وہ پتھر نہیں، ڈھیلے تھے۔" محسن نے کہا۔ "اور تو نے ان کا ناجائز استعمال کیا۔ جا اپنے ناپاک ہاتھ دھو۔"

مجھے بے اختیار ہنسی آئی۔ کیونکہ غالب سخت خفیف ہوا تھا۔ وہ پتھر ہی تھے ڈھیلے نہیں تھے، مگر اس نے غیر ارادی طور پر اپنے ہاتھوں کو یوں دیکھا تھا جیسے وہ واقعی ناپاک ہو گئے ہیں...

"تم لوگوں نے بہت دیر کی۔"

"اب مزید دیر کی گنجائش نہیں۔" میں نے کہا۔ "لانچ کہاں ہے؟"

"نازو کی تحویل میں... اُدھر۔" غالب نے اشارہ کیا۔ "یہاں پارکنگ کی جگہ نہیں تھی۔ تم لوگوں نے یہ کیسا بھیس بدل رکھا ہے؟"

"سب بتا دیں گے بعد میں۔" میں نے کہا۔ "ابھی وقت بہت کم ہے، تم دونوں کو جانا ہے۔"

غالب چلتے چلتے رُک گیا۔ "مجھے... اور محسن کو؟"

"نہیں، تمھیں اور نازو کو۔" میں نے اسے آگے کھینچ لیا۔

"اب کہاں جانا ہے؟ سارا دن تو جھک مارتے رہے ہیں۔"

"یہ تو کہہ رہا ہے؟" محسن نے اسے حیرانی سے دیکھا۔ "ہم نے تو ایک سنہرا موقع فراہم کیا تھا تجھے۔ سمندر میں پکنک معہ رومانس کے لیے پورا دن تھا۔ تو ایک ہی دن میں بیزار ہو گیا۔"

"لعنت تم پر مرزا غالب! اس کے ساتھ پوری زندگی کیسے گزارو گے۔" میں نے اسے مزید شرمندہ کیا۔

"یار، تم لوگ سمجھے نہیں، بلکہ غلط سمجھے۔ دن تو بڑا اچھا اور خوبصورت تھا۔" غالب نے سر کھجا کے کہا۔ "اور تم سب کی طرف سے بے فکری ہوتی تو یادگار ہو جاتا۔ مگر اس کے اور میرے دماغ میں تم سب کا خیال گھسا ہوا تھا اور اعصاب پر تمھاری سلامتی کا خیال سوار تھا۔ رومانس کے موڈ کی تو ایسی کی تیسی ہو گئی۔ اُلٹا شرمندگی کا احساس غالب رہا کہ تم سب تو خطرات اور اندیشوں سے دوچار ہو اور ہم کر رہے ہیں عشق۔"

"کیا عشق کیا جاتا ہے؟"

"بالکل کیا جاتا ہے۔ سوچ سمجھ کے اور بہ قائمی ہوش و حواس کیا جاتا ہے۔" غالب نے کہا۔ "تم دیکھنا کہ فرصت کشاکشِ غمِ دوراں سے گر ملی تو ہم تمھیں عشق کر کے دکھائیں گے۔ ایسا کہ دُنیا دنگ رہ جائے گی۔ فلمی عشق بھی اس کے مقابل بازیچۂ اطفال نظر آئے گا۔ اور پھر تم جیسے کم ہمت، کم عقل اور کم ظرف رشک اور حسد سے جل کے مر جائیں گے۔ کہ کاش ہم نے بھی یوں عشق کیا ہوتا۔"

"چُپ سالے۔ عاشق آپ آج ہیں نازو پر اور عشق کریں گے کل۔" محسن نے اسے ڈانٹ کر کہا۔

"کسی پر عاشق ہونا اور اس سے عشق کرنا الگ الگ کام ہیں۔ ایک کے لیے مقام اور وقت کی شرط نہیں۔ دوسرے کام میں عقل و نظر، دل و دماغ، جسم اور روح سب کام آتے ہیں..."

"یار، لانچ کہاں ہے؟" میں نے جھنجلا کے کہا۔

"وہ سامنے... کیا تمھیں نازو دکھائی نہیں دیتی؟" غالب نے کہا۔ "اُدھر دیکھو۔"

"مجھے تو ایک مستول سا دکھائی دیتا ہے۔"

"وہ مجھے روشنی کے مینار کی طرح نظر آ رہی ہے۔ صبح کے ستارے کی طرح دکھائی دے رہی ہے۔ میری نظر سے دیکھو، اور اندھے ہو تو میرے پیچھے آؤ۔" اس نے ایک کشتی پر چھلانگ لگائی، پھر دوسری پر۔ چھ مختلف کشتیوں سے گزر کے ہم بالآخر لانچ پر پہنچے تو نازو کہیں نہ تھی۔

"کہاں ہے وہ تیرا روشنی کا مینار؟" محسن نے غالب کے لات رسید کی۔ "صبح کا ستارا۔ اُلّو بنا رہا تھا ہمیں۔"

"یار، تم واقعی اندھے ہو۔" غالب نے کپڑے جھاڑ کے کہا۔ "وہ دیکھو نیچے کمرے میں سو رہی ہے۔ کس ادائے ناز سے..."

نازو اسی وقت اوپر آ گئی۔ شاید اس نے ہمارے گفتگو کرنے کی آواز سُن لی تھی۔ فرمودۂ غالب پھر غلط ہو گیا۔

"واقعی تمھاری نظر سے دیکھتے ہم تو..." محسن نے پھر اس کے لات رسید کرنے کی کوشش کی، مگر غالب بچ گیا۔

"فتور تمھاری عقل میں بھی ہے نگاہ میں بھی، چنانچہ تصوّر میں تم جو دیکھتے ہو وہ بھی غلط ہو جاتا ہے۔" میں نے ہنس کے کہا۔

"آ گئے آپ لوگ خیر سے۔" نازو نے کہا۔

"ہم تو خیر آ گئے مگر اب تم سدھارو پیا سنگ۔" محسن

نے کہا۔

"یہ تم کو کیا ہو گیا ہے۔ جب گئے تھے تو..."

"مریض تھے، مرضِ عشق میں مبتلا تھے۔" محسن نے اس کی بات کاٹ دی۔ "اب مسیحا نظر آتے ہیں۔ یہ پل پل رنگ بدلتی دُنیا ہے عزیزہ!"

میں نے اسے دو نرسوں کی یونیفارم تھما دی۔ "جاؤ تم بھی وہی ہو جاؤ جو ہم ہیں۔ تمھیں نرسنگ آتی ہے نا؟ یہ پہن لو۔"

"نہیں، مجھے کچھ نہیں آتا۔" وہ بگڑ کے بولی۔ "اور یہ وردی میں اس وقت تک نہیں پہنوں گی جب تک مجھے بتاؤ گے نہیں کہ کیا ڈراما ہے۔"

"ڈراما بہت زبردست ہے۔" میں نے کہا۔ "تم کو نرس بن کر اس جہاز پر جانا ہے۔"

"ایس ایس کرانتی تھرڈ پر۔" محسن نے کہا۔

"اکیلے جانا ہے؟"

"نہیں، یہ دوسری وردی غالب کے لیے ہے۔ جو ابھی اس ناچیز کے جسم پر سج رہی ہے۔" محسن بولا۔ "یہ میری اٹرن بہن کے تمھارے ساتھ جائے گا۔"

"چلو چلو، میں نہیں جا رہی ہوں کہیں بھی اور غالب کے ساتھ تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" نازو نے کہا۔

"عزیزہ! مانا کہ تم شرم و حیا کی پُتلی ہو اور دُبلی پتلی بھی ہو۔" محسن اسے چھیڑنے کے موڈ میں تھا۔ "اور ہماری مشرقی تہذیب کی اخلاقی روایات میں کسی نامحرم کے ساتھ رہنا سخت معیوب ہے، بلکہ گناہِ کبیرہ ہے۔ مگر تمھیں جانا پڑے گا۔ تم دونوں میاں بیوی کو۔"

"محسن تمھارا ڈبکی لگانے کو دل چاہ رہا ہے۔" نازو نے اسے پکڑنے کی کوشش کی لیکن وہ میرے پیچھے آ گیا۔

"نازو پلیز،" میں نے کہا۔ "یہ مذاق کی بات نہیں ہے، تم کو ایسے ہی جانا ہے۔ میاں بیوی بن کے۔ پہلے میری بات سُن لو۔ جہاز پر ایک ڈاکٹر ہے۔ ڈاکٹر بھنڈاری..."

"اسے کبھی غلطی سے بھی بھنڈی مت کہنا۔" محسن بولا۔ "یہ اس کی چڑ بن گئی ہے۔ لیڈی فنگر۔"

"ڈاکٹر بھنڈاری کے ساتھ ایک نرس آئی تھی، لیکن وہ یہاں آ کے رُوپوش ہو گئی۔ سُنا ہے وہ کسی سے شادی کے لیے ہی فرار ہو کے آئی تھی۔"

"اب تم اس کے برعکس کرو، یعنی شادی کر کے یہاں سے فرار ہو جاؤ اور جہاز پر پہنچ جاؤ۔" محسن بولا۔

"تم مت بولو بیچ میں۔" نازو نے کہا۔

"بات میں نے شروع کی تھی۔ سکندر بیچ میں بول رہا ہے۔"

"یار، وقت کم ہے پہلے ہی۔ انھیں بارہ بجے پہنچنا تھا اور بارہ بج گئے ہیں۔" میں نے کہا۔ "نازو، ہم ساری بات کر کے آئے ہیں۔ اس جہاز پر ایک مسلمان افسر ہے... شاہ جمیل۔ ہم نے آج اس کی جان بچائی۔ یہ بھیس بدل کے اس کے بدلے وہ ہماری مدد کرے گا۔ تم کو جہاز پر پہنچنے کے بعد تحفظ بھی فراہم کرے گا۔ تم جا کے یہ کپڑے بدلو۔ میں اور محسن تمھارے لیے پاسپورٹ بناتے ہیں۔ تم بھارتی شہری بن کے جاؤ گے۔"

"ہندو بن کے؟"

"نہیں، تمھارا نام الزبتھ عرف لزا... غالب کا نام ہو گا چارلس، لیکن تم اسے پیار سے چارلی ڈارلنگ۔" محسن نے زنانہ آواز بنا کے کہا۔ "کیسے کہو گی بھلا؟ ایک بار کہہ کے بتاؤ۔"

"کیا یہ سب بہت ضروری ہے؟" نازو اب سنجیدہ تھی اور محسن کی شوخی پر خفا ہونا بھی بھول چکی تھی۔

"تمھیں خود کو ایک بہت خطرناک مشن کے لیے تیار کر لینا چاہیے۔" محسن بولا۔ "ہم سب طے کر آئے ہیں۔"

"سب طے کر لیا۔ مجھ سے پوچھے بغیر..."

"کیا تمھیں اب اتنا اختیار بھی حاصل نہیں..." میں نے کہا۔ "یہ تو ایک امتحان ہے، ذہانت کا، اداکاری کا اور بہادری کا۔ تم دشمن کے حصار میں داخل ہو کے خود کو کیسے بچاتی ہو۔ پھر کیسے ان کا اعتماد حاصل کرتی ہو، کیسے اپنا دفاع کرتی ہو؟ تم یہ سب کر سکتی ہو نازو! اسی لیے میں نے تم سے نہیں پوچھا۔"

"کیا ہم خالی ہاتھ جائیں گے؟" نازو نے کہا۔

"نہیں، توپ تم اُٹھا لینا۔ بم غالب کے سر پر رکھ دینا۔" محسن نے کہا۔

"ظاہر ہے تم لوگ اسلحہ نہیں لے جا سکتے۔" میں نے محسن کی بات کو نظر انداز کر دیا۔ "وہ تمھاری تلاشی لیں گے۔ لیکن بعد میں تمھارے لیے اسلحہ حاصل کرنا مشکل نہیں ہونا چاہیے۔ اس جہاز میں اسلحے کے سوا ہے کیا۔"

"اچھا، اگر ہم جہاز پر پہنچ گئے، پھر؟"

"پھر تم کو انتظار کرنا ہو گا جہاز کی روانگی کا، آنکھیں اور کان کھلے رکھنا ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "آج کی رات تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ اگر جہاز اچانک لنگر اٹھا دے تو گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ کل رات کو ہمارا انتظار کرنا۔"

"چوبیس گھنٹے بعد..."

"ہاں، ہمیں معلوم ہے کہ چوبیس گھنٹے بعد جہاز کہاں ہوگا۔" میں نے کہا۔ "ہم کسی بھی وقت تم سے دور نہیں ہوں گے۔ بے شک ہمارے درمیان اتنا فاصلہ ضرور ہوگا کہ جہاز پر سے کوئی بھی ہمیں نہ دیکھ سکے۔ دوربین لگا کے بھی۔ ہم اپنی پوزیشن بدلتے ہوئے تمہارے دائیں بائیں یا آگے پیچھے چلتے رہیں گے، دس بیس میل کے فرق سے۔ اور کل رات ٹھیک بارہ بجے جہاز پر آئیں گے۔"

"ضروری تو نہیں کہ ٹھیک بارہ بجے جہاز تمھیں کھڑا ہوا ملے۔" نازو نے کہا۔

"جہاز چل رہا ہوگا۔" میں نے کہا۔ "مگر آدھی رات کو یا اس کے بعد اندھیرے میں ہم کو دیکھنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ ہم جہاز کے جتنا قریب پہنچ سکے، پہنچنے کی کوشش کریں گے اور رسّی کی مدد سے اوپر چڑھنے کی بھی کوشش کریں گے۔ اب ہم اپنی کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوتے ہیں، اس کا انحصار آگے کے حالات پر ہوگا۔ اور تقدیر کی یاوری پر۔ ہمارا پورا مشن ناکامی کی نذر بھی ہو سکتا ہے۔ اور ایسی صورت میں ابتدا یوں بھی ہو سکتی ہے کہ تم جہاز پر قدم رکھو تو حالات یکسر مختلف ملیں۔ تمھارا استقبال شکاری کریں۔ میں بالکل واضح طور پر بتا دینا چاہتا ہوں کہ تم دونوں کو یہ کام کرنا ہے صرف اپنی ذمّے داری پر اور خدا کے بھروسے پر۔ اس میں کامیابی اور ناکامی کے بعد امکانات برابر ہیں۔ چنانچہ تمھیں اختیار ہے کہ انکار کر دو۔"

"میں ہر اختیار سے دستبردار ہو چکا ہوں۔" غالب نے نازو کی طرف دیکھ کے کہا۔

"پھر میں انکار کیسے کر سکتی ہوں؟" نازو نے کہا۔

صرف بیس منٹ میں محسن نے غالب کے لیے ایک مُصدّقہ بھارتی پاسپورٹ بنا دیا۔ اس پر غالب کی تصویر لگانے سے ویزا اسٹیمپ لگانے تک کے سارے مرحلے اس لیے آسان ہو گئے کہ تمام اسبابِ ضرورت پہلے سے ہمارے پاس موجود تھا۔ اتنی ہی دیر میں نازو کے لیے میں نے دوسرا پاسپورٹ بنا دیا۔ اندراجات کے مطابق نازو اب الزبتھ تھی۔ جیسے غیر ارادی طور پر میں نے اس کا پورا نام الزبتھ ٹیلر لکھ دیا، ایسے ہی محسن نے غالب کا پورا نام چارلس ڈارون لکھنے کی غلطی کی۔ یہ دو مشہور نام تھے اور ہمارے ذہن میں محفوظ تھے۔ ضرورت پڑی تو کسی شعوری کوشش کے بغیر یہی نام نوکِ قلم پر آ گئے۔

"یہ کچھ ٹھیک نہیں رہا۔" میں نے کہا۔

"نازو تو الزبتھ ٹیلر لگتی ہے۔" محسن بولا۔ "غلط کیا ہے؟"

"غالب تو چارلس ڈارون نہیں لگتا نا۔" میں نے کہا۔ "اور ایسے نام۔ خیر... اب کچھ نہیں ہو سکتا۔"

"ہاں۔ نام مشہور ہیں تو کیا۔ کسی کا نام پیٹنٹ رجسٹری کے تحت ممنوع تو نہیں۔" محسن بولا۔ "کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ ماں باپ کی غلطی یا۔ خواہش۔ نام ہم نے خود تو نہیں رکھا۔"

نازو اور غالب پوری تیاری کے ساتھ یوں نمودار ہوئے کہ ایک لمحے کے لیے تو میری نظر بھی ان پر ٹھہر گئی۔ یہ صرف لباس کی مماثلت نہیں تھی۔ اس وقفے میں انھوں نے اپنے درمیان وہ ذہنی ہم آہنگی بھی پیدا کر لی جو اس مشن کی تکمیل کے لیے ضروری تھی۔ جذباتی طور پر وہ ایک جان دو قالب تھے، اس میں تو کسی کو شک نہ تھا مگر اب وہ غیر جذباتی انداز میں ایک دوسرے کے لیے نہیں، ہمارے لیے اس مرحلے سے گزرنے کو تیار تھے جو طلبگارِ جاں بھی تھا اور تقاضائے آزمائش بھی کرتا تھا۔

میں نے ان سے کچھ بھی نہیں کہا۔ یہ بھی نہیں کہ اپنا خیال رکھنا۔ اور ہمارے لیے زندہ لوٹ آنا۔ یہ بھی نہیں کہ جاؤ تمھیں تقدیر کو سونپا۔ یہ بھی نہیں کہ جا تو رہے ہو۔ پھر ملو گے کب۔ اس جہان میں یا عرصۂ محشر میں۔

سخت بوجھل جذباتی فضا میں لانچ انھیں لے کر روانہ ہوئی۔ کریم بلوچ نے خلافِ معمول آج نشہ نہیں کیا تھا اور شاید اسی لیے آنکھیں کھولے گھٹنوں پر سر رکھے اُفق کو گھور رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ نیند میں ہوگا۔

"اسے سب بات تم خود ہی سمجھا دینا۔" میں نے غالب سے کہا۔ غالب نے سر ہلایا۔ "سمجھا دوں گا۔"

میں اور محسن نیچے اُتر گئے اور لانچ ہماری نظروں سے دور ہونے لگی۔ آہستہ آہستہ کریم بلوچ نے اس کو بادبانی کشتی کی طرح چلاتے ہوئے اس سمندری جنگل سے نکالا جس میں بظاہر کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا۔ دس منٹ بعد لانچ ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ میں اور محسن ساحل پر خاموش کھڑے رہ گئے۔

میرا دل کسی نامعلوم خوف کی خبر دیتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اپنی چھٹی حس کی بات محسن سے کر دوں اور پوچھوں کہ اس کی ساتویں حس کیا کہتی ہے۔ مگر میں ڈر گیا کہ کہیں وہ میرے خوف کی بنیاد دل کو استوار نہ کر دے۔

جب کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا تو میں چونک کر پلٹا اور پھر اپنی جگہ پر منجمد ہو گیا۔

میرے سامنے حاجی عبداللہ کا وسیع، بے ہنگم وجود کسی بد وضع چٹان کی طرح پھیلا ہوا تھا اور اس کے چہرے پر وہی بامعنی قسم کی پُرخباثت مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی جس کے ہزار مطلب نکالے جا سکتے تھے۔

"السلامُ علیکم و رحمتہ اللہ و برکاتہ۔" اس نے عادتاً قرأت کے ساتھ کہا اور اپنا دوسرا ہاتھ میری طرف مصافحے کے لیے آگے بڑھایا جس نے تسبیح بھی تھام رکھی تھی۔

میں نے اس کا وہ ہاتھ بھی کندھے پر سے جھٹک دیا جو کسی ریچھ کے پنجے کی طرح تھا۔ بھاری کھُردرا اور سخت۔

"میں تم پر جواب میں لعنت بھیجتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"شرعاً اور اخلاقاً یہ ایک فعلِ قبیح ہے میاں کہ تم پر ایک مسلمان خدا کی سلامتی بھیجے اور تم اس پر لعنت بھیجو۔" اس نے اپنی ندامت کو نیت کے پردے میں چھپا لیا۔

"اگر میں تم کو مسلمان سمجھتا تو ایسا ہرگز نہ کرتا۔" میں نے کہا۔

"اللہ تمھیں معاف کرے۔" اس نے خاصے افسوس کے ساتھ سر ہلایا۔

"اور اللہ تمھیں معاف نہ کرے۔" محسن نے کہا۔ "تمھارا انجام دنیا و عاقبت میں خراب ہو۔ یہ ہمارے دلی جذبات ہیں۔"

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ "ہم منافق نہیں ہیں، اس لیے زبان سے بھی وہی کہتے ہیں جو دل میں ہو۔ مگر خیر۔ تم بتاؤ...؟"

"ہم بتائیں!" وہ مسکرایا اور اس کی انگلیاں زیادہ تیزی سے موٹے دانوں والی تسبیح پر حرکت کرنے لگیں۔ "ارے میاں، بتانا تو تمھیں ہے بہت کچھ۔ پھر کیا خیال ہے چلیں؟"

"کہاں چلیں۔ اور کیوں چلیں؟" محسن بولا۔

"دیکھو برخوردار۔ حقائق سے چشم پوشی ان حالات میں محض خود فریبی ہوگی۔" اس نے گاڑھے لہجے میں اردو کے الفاظ کو بھی عربی تلفظ کے ساتھ ادا کیا۔ "اب تم ماشاءاللہ ذہین ہو۔ اتنا تو سمجھتے ہو گے کہ ہم یہاں تک آ گئے دعوت دینے تو تمھیں لے کر ہی جائیں گے۔ دادِ ضرور دو ہماری نگاہ کو جس نے تمھیں اتنے عرصے بعد اس لباس اور حلیے میں شناخت کیا۔"

"یہ بدبختی ہے ہماری۔ تمھاری نظر کا کمال نہیں۔" میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

مجھے دائیں جانب دس قدم کے فاصلے پر ایک سایہ سا دکھائی دیا جو دیوار کی تاریکی کا ایک حصّہ لگتا تھا۔ اس نے کمبل یا کھیس کی بکّل مار رکھی تھی اور اس کا چہرہ بھی سامنے نہیں تھا لیکن اس کا انداز واضح طور پر مشکوک تھا۔ جب میں اس کی طرف متوجہ تھا تو اس نے بکّل میں سے کوئی ریوالور یا آٹو میٹک مشین پستول قسم کی چیز نکالی جس کی نالی مجھے کچھ لمبی لگی۔

شاید اس کے اوپر سائلنسر لگایا گیا تھا۔ اس مہلک ہتھیار کی مجھے صرف ایک جھلک دکھائی گئی پھر اس کا ہاتھ بکّل میں غائب ہو گیا۔

دوسرا شخص قدرے احمق تھا کہ نمایاں طور پر جارحانہ انداز اختیار کیے بائیں ہاتھ کی جانب کھڑا ہوا تھا۔ جب میں نے اسے دیکھا تو اس نے پیر پھیلا کے اپنے بازو سینے پر باندھے اور چند سیکنڈ مجھے گھورتا رہا۔ پھر اس نے مونچھوں پر دو انگلیاں پھیر کے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ریوالور نکال لیا۔ ریوالور کو اس نے کاؤ بوائے اسٹائل میں اوپر اچھالا اور گھما کے ہوا ہی میں اس طرح پکڑ لیا کہ نالی کا رُخ بدستور میرے سینے کی جانب رہا۔ اپنی اس مہارت کے مظاہرے نے اسے بہت خوش کیا۔ اس نے یہ کمال دوسری بار دکھانے کی کوشش کی اور ناکام رہا۔ ریوالور نیچے گرا اس نے فوراً اسے اُٹھا لیا اور دوسری طرف دیکھنے لگا۔

"کیا سوچ رہے ہو میاں صاحبزادے۔" عبداللہ نے کھنکھار کے کہا۔

"میں سوچ رہا ہوں کہ کیوں نہ آپ کی دعوت کو مسترد کر دیا جائے۔" میں نے کہا۔

"اس سے کیا ہوگا؟" وہ مذاق اُڑاتے ہوئے بولا۔

"کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا۔ انشاءاللہ۔" محسن نے اس کی نقل اتاری۔ "مثلاً تمھارا انتقالِ پُرملال۔ پھر سوئم چہلم۔"

"مشکل ہے۔" میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "ان کے لیے تو وہی ہوگا کہ مر گئے مردود۔ ان کی فاتحہ نہ درود۔"

"چلو تم اپنا دل خوش رکھو۔" حاجی نے تسبیح گھماتے ہوئے دائیں بائیں دیکھا۔ "لیکن یہ بھی سمجھ لو کہ ہم یہاں تک صرف تمھارے لطیفوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے نہیں آئے ہیں۔ اچھا ہوگا اگر تم ہنسی خوشی چلو۔ اور میاں، سچّی بات یہ ہے کہ ہم بھی تم کو خوب جان گئے ہیں۔ تم ہو جوان اور جوشیلے آدمی۔ ہمارا تم سے کوئی مقابلہ نہیں چنانچہ مقابلے کے لیے ہم تم جیسے ہی دو چار آدمی لے آئے ہیں۔ وہ ہر طرف موجود ہیں۔"

"میں دیکھ رہا ہوں ان کو۔" میں نے کہا۔ "وہ بھی اپنے اسلحے کی طاقت مجھے دکھا چکے ہیں۔ مگر حاجی! کیا وہ تمھیں بچا سکتے ہیں؟ اگر میں ایک ہاتھ مار کے تمھاری یہ جنگلی سُوّر جیسی گردن توڑ دوں تو وہ کیا کریں گے؟ میرے جسم کو گولیوں سے چھلنی کر دیں گے؟ اس سے تمھاری لاش کو کیا فیض پہنچے گا؟"

"تم کوشش کر کے دیکھو..." حاجی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ مجھ سے خاصے محفوظ فاصلے پر کھڑا ہوا تھا اور میری طرف سے انتہائی محتاط بھی تھا۔ ایک بار میں تھوڑا سا آگے بڑھا تھا تو وہ اتنا ہی پیچھے ہٹ گیا تھا۔ وہ میرے قریب آنے کا خطرہ مول لیتے

ہوئے ڈر تا تھا معلوم نہیں اب اس نے کیا اشارہ کیا کہ ایک گولی میرے پیروں سے چند انچ کے فاصلے پر فرش سے ٹکرائی۔ میں نے فائر کی کوئی آواز نہیں سنی تھی لیکن میں نے دائیں جانب دیکھا تو وہ شخص جو سائے میں تھا اب روشنی میں آ کے مسکرا رہا تھا۔ جہاں گولی فرش سے ٹکرائی تھی وہاں سے سیمنٹ اکھڑ گیا تھا اور ایک ننھا سا گڑھا نمودار ہو گیا تھا۔

"دیکھو میاں برخوردار۔ ہمارے آنے کا مقصد مار دینا ہرگز نہیں ہے بلکہ ہم کچھ بات کرنا چاہتے ہیں جس میں دونوں کا فائدہ ہے۔"

"ہمارے مفادات مشترک کیسے ہو سکتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"ہو سکتے ہیں۔ مثلاً زندہ رہنا ہم دونوں کے مفاد میں ہے۔۔۔"

حاجی عبداللہ نے کہا۔ "تم چلو تو سہی۔ ایسا نہ ہو کہ وقت گزر جائے۔"

"وقت تو گزر ہی رہا ہے۔" میں نے بے خیالی میں کہا۔ دراصل میں گرد و پیش کا اور حالات کا جائزہ لے رہا تھا اور کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ بہ ظاہر عبداللہ کا پلہ بھاری تھا اور اس نے میرے لیے ہر طرف اپنا جال پھیلا دیا تھا۔ اس کا براہِ راست ہم تک آ جانا ہی یہ ثابت کرتا تھا کہ اسے کوئی ڈر نہیں اور کسی کی ذات سے کوئی خطرہ لاحق نہیں۔ نہ جانے وہ کب سے ہمارے تعاقب میں تھا اور ہمیں محصور کرنے کے لیے مناسب وقت کے انتظار میں تھا۔

حاجی نے میری بات پر نفی میں سر ہلایا۔ "اے بھائی تمہارا انتظار کر رہا ہے کوئی۔" وہ معنی خیز انداز میں ہنسا۔

میں چونکا۔ "کون انتظار کر رہا ہے؟"

"مجھ سے یہ سوال کیوں کرتے ہو۔ تمہارے دل کو جواب معلوم ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو تم یوں نہ چونکتے۔" وہ بولا۔

"حاجی! کیا تم رابعہ کے نامہ بر بن کے آئے ہو؟" میں نے تلخی سے کہا۔ "تم بچھڑے ہوئے دو محبت کرنے والوں کو ملوانے کا نیک کام کرنا چاہتے ہو۔ جزاک اللہ!"

"مجھے معلوم تھا کہ تم یقین نہیں کرو گے۔"

"تم اتنا احمق تو نہیں سمجھتے مجھے۔ تم جانتے ہو کہ میری جگہ دنیا کا سب سے بڑا گدھا بھی ہوتا تو تمہارے ایسے مذاق۔۔۔"

میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی جیسے ایک آتشیں سوئی میری گردن میں پیوست ہو گئی۔ اس کی چبھن بچھو کے ڈنک سے زیادہ تکلیف دہ تھی۔ بے اختیار میرا ہاتھ اپنی گردن کی طرف بڑھا مگر پھر نہ جانے کیا ہوا کہ میرے شانوں میں دم نہ رہا۔ میرا اوپر کا دھڑ چند سیکنڈ میں سن ہو گیا تھا۔ ہاتھ اوپر اٹھا اور بے جان ہو کے گرا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے لیے سانس لینا بھی ممکن نہیں رہا۔ بے اختیار میرا منہ کھل گیا اور پھر میری کوشش کے باوجود بند نہ ہوا۔

میرے جسم کا اوپر والا حصہ یکلخت بے وجود ہو گیا تھا۔ یہ بہت عجیب سی کیفیت تھی۔ میں سوچ سکتا تھا اور سمجھ سکتا تھا کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے لیکن جو خیال میرے دماغ میں آتا تھا وہ بہت مضحکہ خیز تھا۔ مجھے ایسا لگتا تھا کہ میرا جسم اوپر سے بخارات بن کے تحلیل ہوتا جا رہا ہے۔ میرا چہرہ اور دھڑ غائب ہو گئے ہیں اور صرف میری ٹانگیں باقی ہیں۔ جیسے کوئی برف کا آدمی اوپر سے پگھلنے لگے ایسے ہی میں اوپر سے نیچے کی طرف غائب ہو رہا تھا۔

آخری وقت میں میری ٹانگوں نے دماغ سے موصول ہونے والے حکم کی تعمیل میں حرکت کی کوشش کی مگر میں انتہائی بھدے پن سے لڑکھڑا کے آگے بڑھا اور گر گیا۔ میرا سر پختہ فرش سے ٹکرایا لیکن چوٹ یا درد کا احساس مفقود رہا۔ میری آنکھیں ابھی تک کھلی ہوئی تھیں۔ اپنے قریب ہی میں نے محسن کو دراز پایا۔ اس کی گردن میں ایک تیر پیوست تھا۔

یہ بہت چھوٹا سا تیر تھا۔ مشکل سے آٹھ انچ لمبا اور سوئی کی طرح پتلا، چمکتا ہوا اور نازک۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس بے بسی کی کیفیت میں جب اپنی مرضی سے میں پلک تک نہیں جھپک سکتا تھا، میرے دماغ کی سوچنے، حالات کا تجزیہ کرنے اور سمجھنے کی صلاحیت برقرار تھی۔ یقیناً یہ اسی تیر کا اثر تھا کہ میرا جسم بے حس و حرکت ہو گیا تھا۔ اسی تیر سے محسن کو بھی شکار کیا گیا تھا۔ تیر کی نوک پر کوئی سریع الاثر زہر تھا جس نے جسم کی حرکت پذیری کو ختم کر دیا تھا۔ باالفاظِ دیگر اس نے موٹر نروز بے کار ہو گئی تھیں اور اگرچہ دماغ اب بھی حکم دینے کی پوزیشن میں تھا لیکن تعمیل کرنے والے اعضا مفلوج ہو گئے تھے۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے کار کے پہیوں کو حرکت دینے والی راڈ ٹوٹ جائے تو انجن کتنا بھی زور لگائے مگر پہیے متحرک نہ ہوں اور گاڑی رک جائے۔

میرے ذہن میں یہ خواہش بھی موجود تھی کہ میں محسن کی گردن میں پیوست تیر کو نکال دوں تو ممکن ہے محسن اس شہزادی کی طرح جاگ اٹھے جسے الف لیلوی داستانوں کے جادوگر نے طلسماتی عمل سے کوئی کانٹا چبھو کر سلا دیا تھا اور پھر کوئی شہزادہ اِدھر آ نکلا تو اس نے کانٹا کھینچ لیا اور شہزادی جاگ اٹھی۔ یہ ایک فضول سا خیال تھا مگر خیال کو روکا تو نہیں جا سکتا۔ ایسا ہی ایک کانٹا میرے اپنے وجود میں پیوست تھا مگر میں اسے نکالنے سے قاصر تھا۔

میں نے ہر طرف سے لوگوں کو آتے دیکھا۔ وہ میرے ہمدرد اور مددگار نہیں تھے۔ وہ سب انھی کے گرگے تھے۔ ان میں سے دو شکاری میں نے دیکھ لیے تھے مگر باقی میرے گرد و نواح میں گھات لگائے بیٹھے تھے۔ جال وہ بہت دیر سے پھیلائے بیٹھے ہوں گے موقع ملتے ہی اور اشارہ پاتے ہی انھوں نے ہمیں ایسے ہی شکار کر لیا جیسے جنگل میں خطرناک جانوروں کو گولی مار کے ہلاک کیے بغیر پکڑا جاتا ہے۔

چند غیر متعلقہ افراد نے بھی قریب آ کر جاننا چاہا کہ دو اچھے خاصے صحت مند جوان آدمی کسی طرح ایک ساتھ بے ہوش ہو گئے یا اب دیکھا یا سنا کہ بیک وقت دو افراد پر مرگی یا دل کا دورہ پڑے یا دونوں پر آسیب کا اثر ہو جائے۔ ان غیر متعلقہ افراد کو دور سے ہی چلتا کر دیا گیا۔

"پھر بھی ہوا کیا؟" کسی نے بلند آواز میں کہا۔

"کہا نا کہ کچھ بھی نہیں ہوا۔" کوئی غرا کے بولا۔

"دو بندے کھڑے کھڑے لیٹ گئے۔ تم کہتے ہو کچھ بھی نہیں ہوا!" وہ شخص ایسے قائل ہونے والا نہیں تھا۔

"او بھائی! دونوں جھک کے کچھ اٹھا رہے تھے۔ سر ٹکرا گئے آپس میں۔ معمولی سی چوٹ کا اثر ہے۔" کوئی اور بولا۔ "ہم بھی ان کے ساتھی ہیں۔"

"یہ تمہارے ساتھ ہیں!"

"ہاں۔ ہم اسپتال لے جا رہے ہیں۔ چلو ہٹو، راستہ لو اپنا۔ ایسے تو مجمع لگ جائے گا۔"

میں سب کچھ سن رہا تھا اور دیکھنا بھی چاہتا تھا لیکن نہ میں سر گھما سکتا تھا اور نہ نظر۔ پھر یہ ہوا کہ کسی نے میری آنکھوں پر ہاتھ رکھا اور پلکوں کو بند کر دیا۔ بالکل اسی طرح جیسے نزع کے کرب سے گزر جانے والے کی بے جان آنکھوں کو بند کیا جاتا ہے۔ پھر میں نے چاہا کہ آنکھیں کھولوں مگر یہ میرے اختیار میں نہ تھا۔

ایک شخص نے مجھے کندھے پر اٹھا لیا اور میں جھومتا رہا جیسے بے ہوش ہوں حالانکہ میں پوری طرح ہوش میں تھا۔ ہوش اگر ایک ذہنی کیفیت کا نام ہے جس میں آدمی گرد و پیش سے باخبر رہتا ہے تو میرے حواس پوری طرح کام کر رہے تھے۔ مجھے اندھا یا معذور سمجھا جا سکتا تھا مگر کسی اندھے معذور کو بے خبر، بے حس یا بے ہوش کوئی نہیں کہتا۔

وہ چند منٹ کا وقفہ تھا جس میں مجھے لے جا کر کسی گاڑی میں ڈال دیا گیا۔ پھر میرے اوپر ہی محسن کو پھینکا گیا۔ راستے میں بھی بہت سے لوگوں نے سوال کیا کہ ہمیں کیا ہوا ہے اور ان کو مختصراً یہ جواب دیا گیا کہ ہمیں دورہ پڑ گیا ہے۔ جواب دینے والوں کو ہماری طرف سے قطعی اندیشہ نہ تھا کہ ہم ان کی تردید کر سکتے ہیں یا ہنگامہ آرائی۔

وہ کوئی خاصی بڑی کار تھی جس کی پچھلی سیٹ پر ہم دونوں اوپر تلے لیٹے پڑے ہوئے تھے۔ ایک سو ساٹھ پونڈ کے محسن کا وزن مجھے پریس کر رہا تھا اور میرے لیے سانس لینا بھی دشوار ہو رہا تھا مگر میں بے بس تھا۔ میں اسے اپنے اوپر سے نہیں ہٹا سکتا تھا۔

جب گاڑی چلی تو قدرت نے میری مدد کی۔ محسن کا جسم پہلے جھٹکے سے لڑھک گیا اور شاید آگے پیچھے کی سیٹوں کے درمیان گاڑی کے فرش پر منتقل ہو گیا۔ کار میں کم سے کم تین آدمی تھے۔ ان میں سے ایک کوئی گونگا ڈرائیور تھا۔ باقی دو میں بھی حاجی عبداللہ شامل نہیں تھا۔ اس کی آواز کو میں پہچانتا تھا۔

جب گاڑی روانہ ہوئی تو اس کے انجن کی آواز نے خود بتلایا کہ وہ مائکروبس تھی۔ فاکس ویگن کی مخصوص آواز سب سے پچھلی سیٹ پر واضح سنائی دیتی تھی کیونکہ اسی کے نیچے پندرہ سو سی سی کا طاقتور انجن تھا جو گاڑی کو آگے دھکیلتا تھا۔ یہ تین سیٹوں والی گاڑی تھی اور اس اعتبار سے محفوظ بھی تھی کہ دونوں سلائیڈ کرنے والے دروازے ہم سے کافی آگے تھے۔ درمیان میں سیٹوں کی دو قطاریں تھیں جن پر شاید وہ ٹانگ کو بیریر کی طرح پھیلائے بیٹھے ہوں گے کہ بفرضِ محال ہم ہوش میں آ کے فرار کی کوشش کریں تو ہم اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے۔ والی پوزیشن ہو۔

اچانک ایک دھماکا ہوا۔ میں نے شیشہ ٹوٹ کے بکھرنے کی آواز سنی۔

"گونگے۔۔۔!" اندر والے ایک شخص نے چیخ کر ڈرائیور کو گالی دی۔ "اندھا ہو گیا ہے۔۔۔!"

"اس گھٹیا کے بچے نے کام خراب کر دیا ہے۔" دوسرا کچھ پریشان ہو کے بولا۔

"میں اس کو چھوڑوں گا نہیں۔" پہلے والے نے پھر گونگے کو گالی دی۔ "پہلے ذرا اس بندے سے نمٹ لیں۔"

"تم ان سے نمٹو۔ میں اندر ہی ہوں۔"

"اندر مت آنے دینا کسی کو۔" پہلے نے کہا۔ "کوئی زبردستی دخل دے تو اس کی۔۔۔" وہ اپنی مادری زبان میں ہدایات دے کر اتر گیا۔

باہر خاصا شور مچا ہوا تھا۔ یقیناً گاڑی کسی دوسری گاڑی سے ٹکرا گئی تھی۔ اس میں گونگے کو قصوروار سمجھنا ایک جذباتی اور احمقانہ ردِعمل تھا۔ کوئی حادثہ کسی ایک فریق کی غلطی سے نہیں ہوتا۔ بعض اوقات غلطی سو فیصد دوسرے فریق کی ہوتی ہے۔ انتہائی محتاط اور ماہر ڈرائیور بھی اس اناڑی اور مہم جو یا روڈ سیفٹی کے سارے اصولوں کی پروا نہ کرنے والے کسی ڈرائیور سے خود کو کیسے بچا سکتا ہے جو نشے میں ہو یا سگنل توڑ کے نکلنے کو بہادری سمجھتا ہو یا ون وے ٹریفک کے خلاف گاڑی چلاتا نمودار ہو جائے۔

"کون ہے گاڑی کا مالک؟" کسی شخص نے چلا کے کہا۔ "نیچے آؤ۔ نواب کی اولاد۔"

"جو کہنا ہے ڈرائیور سے کہو۔" دوسرے شخص نے ایک منطقی جواب دیا۔ "گاڑی میں نہیں چلا رہا تھا۔"

مگر وہاں منطق کا نہیں آتش گیر جذبات کا دخل تھا۔ "اس سے پوچھیں جو کچھ بولتا ہی نہیں؟ گاڑی سے نہ پوچھ لیں۔"

"یہ ٹھیک ہے۔ ٹکر تو گاڑی نے ماری ہے۔" یہ بات کسی

تماشائی نے مزہ لیتے ہوئے کہی۔

"تم نیچے آؤ۔ دیکھو کیا حشر ہوا ہے میری کار کا۔" وہ شخص مزید مشتعل ہو کے بولا۔

"اندر مت آؤ۔" دوسرا شخص گرم ہو کے بولا۔ "جو کہنا ہے باہر سے کہو۔ جس کی گاڑی ہے وہ باہر موجود ہے۔"

باہر بہت سے لوگوں کے درمیان اس شخص کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی جو پہلے گاڑی کے اندر موجود تھا۔ غالباً وہ ایک دروازے سے اترا اور دوسری طرف سے کوئی اور آ گیا جو کار کے اندر تھا۔

اب ایک زبردست جنگ شروع ہوئی۔ گفتگو سے میں نے اندازہ کیا کہ کار میں کم سے کم چار افراد تھے۔ ان میں سے ایک گاڑی چلا رہا تھا اور حادثہ اسی کی غلطی سے ہوا تھا لیکن وہ دھونس، دھاندلی اور جھوٹ سے گونگے کو موردِ الزام ٹھہرانے پر بضد تھے۔ جرمن ساخت کی بے حد مضبوط باڈی والی مائکرو وبس کا کچھ نہیں بگڑا تھا کیونکہ اس کے سامنے والے حصے میں کچھ بھی نہیں تھا مگر دوسری ایک جاپانی کار تھی۔ اس کا بونٹ پچک گیا تھا۔ مڈگارڈ ٹوٹ گئے تھے۔ دونوں طرف کی لائٹس چورا ہو گئی تھیں۔ اسٹیئرنگ وھیل کی کی "قینچی" ٹیڑھی ہو گئی تھی اور انجن تو محفوظ رہا تھا مگر ریڈی ایٹر اور پنکھا ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے تھے۔ اس حالت میں گاڑی کو چلا کے نہیں "ٹو" کر کے لے جایا جا سکتا تھا۔ نقصان کا تخمینہ بہت زیادہ تھا اور کار والے بااثر لوگ تھے۔ ان میں سے ایک کسی ڈی ایس پی کا بھائی تھا۔ وہی گاڑی چلا رہا تھا اور زخمی بھی ہوا تھا چنانچہ سب سے زیادہ بدمعاشی بھی وہی دکھا رہا تھا۔ وہ اعلان کر چکا تھا کہ مائکرو وبس کا ڈرائیور اور گاڑی دونوں تھانے جائیں گے اور جب تک مالک کار کو اصل حالت میں لانے کے اخراجات کی رقم پیشگی ادا نہیں کرے گا وہ سب بند رہیں گے۔

یہ صورتِ حال غیر متوقع اور ان کے لیے انتہائی پریشان کن ثابت ہونے لگی تھی۔ غلطی ان کی تھی کہ وہ اکڑ گئے اور بدمعاشی میں مار پیٹ پر اتر آئے۔ نتیجہ یہ کہ وہ خاصے پٹے۔ مجمع کو انھوں نے غلط طرزِ عمل سے اپنے خلاف کر لیا تھا۔

گاڑی سے اترنے والے پہلے شخص نے دیکھا کہ صورتِ حالات ان کے خلاف ہونے لگی ہے تو اس نے ریوالور نکال لیا اور ایک ایک کو گولی مار دینے کی دھمکی دی۔

"بدمعاشی دکھاتے ہو۔" وہ چیخ کے بولا۔ "جب میں نے کہا ہے کہ سب نقصان پورا کر دوں گا۔"

"سب ایسا ہی کہتے ہیں۔" مخالف نے کہا۔ "مقصد تو ہوتا ہے جائے واردات سے فرار۔"

"ہاں۔ تاکہ بعد میں سب جھٹلا دیا جائے۔" دوسرے مخالف نے کہا۔ "ہم کہاں ثابت کرتے پھریں گے۔"

"اور یہ سب گواہ تو ابھی اِدھر اُدھر ہو جائیں گے۔" تیسرے مخالف نے کہا۔ "بعد میں کون آئے گا۔"

"سیدھی بات یہ ہے کہ فیصلہ اسی جگہ ہوگا۔"

"یہاں کیسے فیصلہ ہوگا؟" پہلا شکاری چلّا کے بولا۔

"ہو جائے گا اگر تم چاہو گے۔" کار ڈرائیور بولا۔ "میں بلا لیتا ہوں میکینک اور ڈینٹر پینٹر کو بھی۔"

"اس وقت کون آئے گا؟"

"تم فکر مت کرو۔ میں لاؤں گا مگر جو وہ کہے گا وہ تم کو دینا پڑے گا۔ نقد۔ ایک پیسہ کم نہیں لوں گا میں۔" کار والے نے کہا۔

"وہ تمھارا آدمی ہوگا۔ دو کے چار بتائے گا۔"

"چار بتائے یا دس۔ ادائیگی کیے بغیر تم جا نہیں سکتے۔"

"میں نہیں دوں گا تو کیا کر لوگے تم؟"

"میں... میں یہ کروں گا پہلے تو۔" کار والے نے شاید اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔ "میں تو تیری..."

اس کے بعد مار پیٹ ہوئی جو لوگوں کے بیچ میں آ جانے سے فوراً ختم بھی ہو گئی۔

"سب کو بند کرا دوں گا..." کار والا چیخ چیخ کر گالیاں دیتے ہوئے بولا۔ "ڈی ایس پی الطاف کا بھائی ہوں میں۔"

"ابے جا۔ دس ایس پی میرے باپ کے سالے ہیں..."

"پتا چلے گا بیٹا۔ جب گاڑی کے ساتھ تم بھی تھانے میں بند کیے جاؤ گے۔" کار کا مالک چیخ کر بولا۔ "روا اس اندر والے کو بھی نیچے۔ ان کی تو..."

"میں کہتا ہوں رک جاؤ... اور گاڑی ہٹالو سامنے سے۔" پہلے شکاری نے خطرناک لہجے میں "پیچھے ہٹو سب ورنہ میں۔ گولی مار دوں گا جو بھی قریب آیا۔"

"ریوالور۔ ریوالور نکالتا ہے۔ گولی مارنے کی دھمکی دیتا ہے۔" ڈی ایس پی کا بھائی آتش فشاں کی طرح گرجنے لگا۔ "چلا گولی تیری ہمت ہے تو پہلے مجھے مار۔ پھر ان سب کو۔ کس کس کو شوٹ کرے گا اور پھر جائے گا کہاں بچ کے؟"

ریوالور نکالنا ایک فاش غلطی ثابت ہوا۔ کسی بھی شخص کے لیے جس کے گرد ایک مجمع حصار بنائے کھڑا ہو یہ ناممکن ہے کہ وہ بزور سے راستہ بنا لے۔ ان لوگوں کے لیے اضافی مسئلہ گاڑی کو نکالنے کا تھا۔ حالات کو قابو سے باہر ہوتا دیکھ کے وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کھو بیٹھا تھا۔ اس میں پریشانی سے زیادہ خوف کا دخل تھا۔ حاجی عبداللہ نے انھیں قابلِ اعتماد سمجھتے ہوئے دو زندہ لاشوں کو ان کی تحویل میں دے دیا تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ مجھے اور محسن کو اس حالت میں کہیں بھی لے جانے میں نہ کوئی خطرہ تھا اور نہ کسی مشکل کا سامنا۔ وہ مسلح بھی تھے اور تجربے کار بھی مگر تقدیر کے شکاری نے ان کے لیے راستے میں ہی جال پھیلا رکھا تھا۔ وہ ہوشیاری سے بیچ کے نکل سکتے تھے۔ انھیں صرف نقصانات ہی پورے کرنے تھے جو چار یا پانچ ہزار سے زیادہ نہ ہوتے مگر خواہ مخواہ کی بدمعاشی میں انھوں نے مسئلے کو الجھایا اور خود بھی اتنے الجھ گئے کہ رہائی کی کوئی صورت نہ رہی۔ ان کی مزید بدقسمتی کہ فریقِ ثانی کمزور نہیں تھا۔ کسی ڈی ایس پی کا بھائی ہونا تو گویا ہر قسم کی بدمعاشی کا اجازت نامہ رکھنے کے مترادف تھا۔

تاہم یہ سب کچھ جو ہو رہا تھا میری دلی خواہش کے عین مطابق تھا اور میری دعاؤں کا اثر تھا یا محسن کی دعاؤں کا لیکن اب بند تاریک سرنگ کے آخری کنارے پر امید کی روشنی ضرور نظر آنے لگی تھی۔ اگر ہم اس بے حسی اور بے چارگی کی زنجیر سے نجات پا سکتے تو پھر عقل و ہوش کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے مسائل سے نمٹنے کی امید بھی کرتے۔

اچانک گاڑی کے قریب ہنگامہ ہوا۔ یہ شاید گاڑی پر قبضہ کرنے والوں اور مزاحمت کرنے والوں کے درمیان دست بدست جنگ کا نتیجہ تھا کہ خاصی مرصع گالیوں کے ساتھ ہاتھاپائی کا دوسرا راؤنڈ ہوا۔ گاڑی کا دروازہ دو بار کھولا اور بند کیا گیا اور نہ جانے کون کون اس سے ٹکرایا۔ بالآخر ایک فائر ہوا۔ اس کے ساتھ ہی چیخ و پکار مچ گئی۔ معلوم نہیں گاڑی کے اندر سے ہوائی فائر کیا گیا تھا یا کسی پر براہِ راست گولی چلائی گئی تھی۔ پکڑو۔ مارو کے شور میں کچھ پتا نہیں چلتا تھا کہ غالب کون ہے اور مغلوب کون! عام طور پر ہوائی فائر بھی مجمع کو منتشر کر دیتا ہے اور صرف تماشا دیکھنے والے تو جوتیاں بغل میں دبا کے یا وہیں چھوڑ کے بھاگ جاتے ہیں مگر یہ لوگ جو کار کے مالک اور مسافر تھے ہر قیمت پر اپنی غلطی کی سزا دوسرے کو دینے کا اختیار رکھتے تھے اور ایک ڈی ایس پی کی پشت پناہی نے ان کو وہ لاٹھی تھما دی تھی جس کے زور پر وہ کسی بھی بھینس کو بھینس والے کے ساتھ تھانے لے جا سکتے تھے۔ آگے تھانہ تو ان کی سلطنت تھا۔

یہ سب مشکل سے دس منٹ کا مار دھاڑ سے بھرپور ڈراما تھا جس کا انجام ہمارے دشمنوں کے حق میں برا ہوا۔ وہ نہتے کر دیے گئے اور گرفتار کر لیے گئے۔ ہر چند یہ گرفتاری بذریعہ پولیس باضابطہ طور پر عمل میں نہیں آئی تھی لیکن اگلا مرحلہ گرفتاری، ضابطۂ فوجداری اور جوتم کاری کا ہی تھا۔

جو لوگ اندر آئے ان میں سے کسی نے ہمیں بھی دیکھا۔

"اوئے۔ یہ دو ننگ تو پیچھے پڑے ہیں۔"

"انھی کے ساتھی..."

"اور کون ہوں گے۔ سالے کیسے مزے سے نشے میں مست لیٹے ہوئے ہیں۔" کوئی ہمارے بہت قریب آ کے بولا۔

"یہ نشے میں تو نہیں لگتے۔" کسی عقلمند نے سوچ کے کہا۔

"پھر کیا مر چکے ہیں۔ لاشیں پڑی ہیں؟"

"نبض دیکھو۔ آنکھیں کھول کے دیکھو۔" عقلمند نے کہا۔ "ہٹو میں دیکھتا ہوں۔"

ایک ہاتھ میرے ماتھے پر آیا اور انگوٹھے نے میری پلکوں کو اٹھایا۔ ایک آنکھ سے میں نے اپنے مقابل کسی دبلے پتلے، گھنی مونچھوں اور عینک والے شخص کو دیکھا۔ میری ایک آنکھ کھلی رہی۔ اس نے قدرے حیران ہو کے میری دوسری آنکھ کھولی۔ اب میں اس کے علاوہ دوسرے تین افراد کو بھی دیکھ سکتا جو سیٹ کے اوپر جھکے ہوئے مجھ پر غور کر رہے تھے۔ ان کے بال پریشان تھے اور کپڑے پھٹے ہوئے۔ ان کے چہروں پر خراشوں، نیلے اور نیل کے نشان بھی تھے۔ یہ جنگ و جدل کا شاخسانہ تھا۔

"یہ نہ نشے میں ہے۔ نہ بے ہوش۔" عینک والے نے میری نبض تھام لی۔

"پھر کیا ہے یار؟" ایک موٹے تازے شخص نے کہا۔ "ڈاکٹر تم ہو یا ہم ہیں۔"

"ان کو فوراً اسپتال لے جانا ضروری ہے۔" ڈاکٹر نے محسن کا معائنہ کرنے کے بعد کہا۔ "بڑی عجیب سی بات ہے..."

"کیا عجیب بات ہے...؟"

"غالباً انھیں... زہر دیا گیا ہے..." ڈاکٹر نے کہا۔

"زہر! کون سا زہر؟" بیک وقت دو افراد نے کہا۔ ڈاکٹر نے انھیں شرمندہ کرنے والی نظر سے دیکھا۔ "یہ میں ایسے ہی بتا دوں؟ صرف صورت دیکھ کر! سارے ٹیسٹ ہوں گے۔ پھر پتا چلے گا۔"

"یہ تو مر جائیں گے۔" تیسرے نے اظہارِ خیال کیا۔

"نہیں۔ مریں گے نہیں۔" ڈاکٹر نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "کوئی خطرناک زہر نہیں لگتا مجھے۔ نبض نارمل ہے۔ بس یہ لوگ سن پڑے ہیں جیسے انس تھیزیا میں ہوں۔"

"چلو ان سے تم نمٹو۔ ہم انھیں لے جاتے ہیں۔ کوئی لمبا چکر معلوم ہوتا ہے یہ۔" ایک شخص نے باہر کا رخ کیا۔

"وارداتی قسم کے لوگ ہیں۔" دوسرے نے اتفاق میں سر ہلایا۔ "تھانے میں سب پتا چل جائے گا۔"

"میں یہی گاڑی اسپتال لے جاؤں؟" ڈاکٹر نے کہا۔

"ہاں ہاں۔ لے جاؤ۔ تم سول اسپتال ہی جاؤ گے نا۔ پولیس ہوگی وہاں۔" پہلے والے نے کہا۔ "ان کو بتا دینا سب۔ پھر وہ جانیں۔"

یہ بڑی عجیب صورتِ حال ہوگئی تھی۔ آسمان سے گرکے کھجور میں اٹکنا اسی کو کہتے ہیں۔ پھر بھی کھجور میں اٹکنا بہتر تھا۔ آسمان سے سیدھے زمین پر گرتے تو بچنے کی امید نہ ہوتی کھجور سے توکسی نہ کسی صورت اترا جاسکتا تھا۔ اگر تقدیر دخل اندازی نہ کرتی تو حاجی کی تدبیر کامیاب ہوتی اور ہمارا انجام نہ جانے کیا ہوتا۔ انجام اب بھی غیر یقینی تھا۔ پولیس کو خود ہماری جستجو تھی لیکن ان کے ساتھ معاملہ طے ہو جاتا ہے۔ وہ اتنے چالاک اور عیار بھی نہیں ہوتے جتنا حاجی تھا۔ انھیں دھوکا بھی دیا جاسکتا تھا اور پیسہ بھی۔ اسپتال میں معمولی حیثیت کے پولیس والے بیگار کاٹتے ہیں اور مجرموں کی نگرانی کے سوا کچھ نہیں کرسکتے تفتیش کرنے والے بعد میں آتے ہیں، جب مجرم ٹھیک ہو جاتے ہیں اور وہی اصل لین دین کرتے ہیں۔ محافظ تھوڑی بہت رعایت دینے کا معاوضہ وصول کرلیتے ہیں۔

لیکن زیادہ خطرناک بات یہ تھی کہ حاجی عبداللہ سول اسپتال پہنچے اور ہمارا پتا چلالے۔ صبح تک اس کو حادثے کا علم ہو جانا لازمی تھا۔ اس نے مجھے اور محسن کو دو جانبازوں کے سپرد کر دیا تھا اور خود مطمئن ہو کے چلا گیا تھا۔ اس نے آگے دلاور یا سراج کو بھی بتا دیا ہوگا کہ دونوں مجاہد پکڑے گئے اور اب لائے جا رہے ہیں۔ وہ انتظار کریں گے مگر کتنی دیر؟ بالآخر وہ تشویش میں مبتلا ہوں گے اور خود جائیں گے یا کسی کو خبر لانے کے لیے روانہ کریں گے۔ ان کے جانباز تو تھانے میں مل ہی جائیں گے۔ انھیں یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ ایم آر ایس کے مجاہد کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔ پھر ان کا کام آسان ہو جائے گا۔ اسپتال کے اندر بھی سب کچھ ہوسکتا ہے۔ نچلے درجے کے ملازمین سے لے کر ڈاکٹروں کی سطح تک سو فیصد فرشتے نہیں ہوتے۔ چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کو ضرور معلوم ہوگا کہ اس اسپتال میں کس کا ضمیر پہلے بھی خریدا گیا تھا اور اب کون ہے جو مسیحا کے روپ میں قاتل بن سکتا ہے۔ ڈاکٹر یا نرس کے حلیے میں کوئی بھی کسی وارڈ میں جائے اور اعتماد کے ساتھ کسی بھی مریض کو ایک انجکشن لگا دے۔ جو مریض لب نہ ہلا سکتے ہوں ان سے تو ڈرنا ہی فضول بات ہے ـــ بعد میں تفتیش ہوتی ہے تو ہوتی رہے کہ کیا ہوا اور کیسے ہوا اور کیوں ہوا؟

گونگا ڈرائیور اور اس کے دونوں ساتھی لے جائے جا چکے تھے۔ میرے کانوں میں اب ان کی آواز نہیں آرہی تھی۔ شاید لوگ بھی تماشا ختم ہو جانے کے بعد منتشر ہو گئے تھے۔ معلوم نہیں وہ کیا جگہ تھی جہاں آدھی رات کے بعد بھی حادثہ ہوتے ہی مجمع لگ گیا تھا۔

گاڑی ایک دفعہ پھر اسٹارٹ ہوئی۔ ہم بدستور اپنی جگہ پڑے ہوئے تھے۔ فرق صرف یہ پڑا تھا کہ اب ہماری منزل بدل گئی تھی اور ہماری تقدیر نے ہمارے ساتھ یہ سنگین مذاق کیا تھا کہ ہمیں ناامیدی کے [illegible] ہم بھاڑ میں جا رہے تھے تو اب بھٹی میں اور یہ نہیں جانتے تھے کہ کون سی جگہ بدتر تھی۔

سول اسپتال میں مجھے اور محسن کو الگ الگ کمرے میں رکھا گیا۔ اس کے لیے ڈاکٹر کو خاصی پریشانی سے گزرنا پڑا۔ پہلے تو پولیس والے اس کی بات سمجھنے سے قاصر رہے۔

"آپ کہتے ہو حادثہ ہوا تھا۔ لیکن یہ بندہ تو زخمی بالکل نہیں ہے اور خیر سے آپ بھی بھلے چنگے لگتے ہو۔" ایک بیزار نظر کرنے والے اور بیزار کرنے والے انسپکٹر نے بیزاری سے کہا۔

"ہاں۔ حادثہ تو ہوا تھا مگر اب یہ ضروری نہیں کہ آدمی لہولہان ہو۔"

"اچھا اچھا... اندر کی چوٹ ہے۔ دونوں کے مغز میں..."

"او نہیں بابا۔ اندر باہر کی چوٹ نہیں ہے۔"

"پھر یہ کیا ہے؟ بندے تو لگتا ہے فوت ہو چکے ہیں۔ یہ مکر تو نہیں کر رہے ہیں؟" انسپکٹر نے مجھے غور سے دیکھا۔

"انسپکٹر! یہ... ایک زہر کا اثر ہے۔"

"زہر!" انسپکٹر نے اسے مشتبہ نظروں سے دیکھا۔ "اسے زہر دیا ہے کس نے؟ یار تم کہتے ہو میں ڈاکٹر ہوں۔ مجھے تو تم پاگل لگتے ہو یا نشے میں۔ کبھی کہتے ہو حادثہ ہوا ہے تو کبھی اقدام قتل۔"

"فضول باتیں مت کرو۔ یہ تمھاری سمجھ میں آنے والا کیس نہیں ہے کیونکہ تم ڈاکٹر نہیں ہو۔" ڈاکٹر گرم ہو کے بولا۔ "میں ان کو ایمرجنسی میں شفٹ کر رہا ہوں۔ تم کو اپنا آدمی بٹھانا ہے وہاں تو بٹھا دو۔"

"او میاں! تمھارا جہاں دل چاہے لے جاؤ۔ ہم تو بیٹھے ہیں کیس درج کرنے کے لیے۔ اگر بنتا ہے تو بولو ورنہ جان چھوڑو ہماری۔ نہ حادثہ ہے نہ خودکشی اور نہ اقدام قتل تو پھر ہمیں کیا اپنے گھر لے جاؤ تم۔" انسپکٹر نے ٹرٹراتے ہوئے کہا۔

"تم انھیں لے کے چلو ایمرجنسی میں۔" ڈاکٹر نے اسٹریچر کے ساتھ منتظر کھڑے ہوئے نرسنگ اسٹاف سے کہا۔

"کیا یہ ایمرجنسی کا کیس ہے؟" میڈیکل آفیسر نے کہا۔

"میرا تو یہی خیال ہے۔" ہمیں لانے والے نے طنز سے کہا۔ "تم خود بھی دیکھ سکتے ہو۔"

"میں سمجھتا ہوں ان کے فوری طور پر مر جانے کا کوئی امکان نہیں۔" میڈیکل آفیسر نے کہا۔ "جنرل میڈیکل وارڈ میں رکھا جاسکتا ہے۔"

"یہ ایک دلچسپ کیس ہے۔" ہمارے ساتھ آنے والا بولا۔

"اور خصوصی توجہ کا مستحق..."

"ان کے درمیان ایک خالص طبی نوعیت کی بحث شروع ہوئی جس کا کچھ حصہ میری سمجھ میں بھی آیا۔ میڈیکل آفیسر کا خیال تھا ہم نے کوئی نشہ کیا ہے جس کا اثر [illegible] ساتھ آنے والا اسے قائل کرنے میں ناکام رہا کہ یہ کسی غیر معمولی زہر کا اثر ہے۔

"او کے۔ اگر تم کو دلچسپی نہیں..."

"دلچسپی!" میڈیکل آفیسر نے تلخی سے کہا۔ "یہاں کون الو کا پٹھا کیس میں دلچسپی لینے کے لیے بیٹھا ہے۔ مجھے کون سی ریسرچ اور [illegible] کرنی ہے۔ یہ تو نوکری ہے جس کی لگی بندھی تنخواہ ملتی ہے۔ جب رات بھر ڈیوٹی دینی پڑتی ہے تو نوکری بھی بیگار بن جاتی ہے۔ تمھارا اپنا اسپتال ہے۔"

"تو میں انھیں لے جاؤں۔ تمھیں کوئی اعتراض نہیں؟"

"مجھے اعتراض کیوں ہونے لگا۔" میڈیکل آفیسر نے کہا۔ "یہاں [illegible] کیس ہی بہت ہیں۔ اتفاق ہے کہ تم سے اتنی بات کرنے کی فرصت مل گئی ورنہ ایک کے پیچھے دو آتے ہیں۔ ایک کو کسی نے [illegible] دیا ہے۔ دوسرے کو کسی نے گولی ماردی ہے۔ تیسرا گاڑی کے نیچے آگیا ہے۔ سب کو ایک دم دیکھو اور پھر ایسا معجزہ دکھاؤ کہ [illegible] قہقہہ مار کے اٹھ کھڑا ہو۔ ورنہ لواحقین اور ورثا لٹھ لیے [illegible] کہ ڈاکٹر کا سر پھاڑ دیں جو بے حس اور سنگدل ہے کہ اپنا کام اپنی مرضی سے کر رہا ہے۔ ذرا احساس نہیں کہ یہ کتنا سیریس کیس ہے۔ اب بتاؤ یار کہ ہمارے لیے تو سب کیس سیریس ہیں اور اگر ہر ایک کے لیے رونے پیٹنے لگیں لواحقین کے ساتھ تو... خیر۔ تم تو اپنا اسپتال چلا رہے ہو مزے سے..."

"ہمت مت ہارو کسی دن تم بھی..."

"ہونہہ۔ یہ سب پیسے کے کھیل ہیں۔ ہمارے مقدر میں تو سرکاری نوکری ہے۔ کبھی یہاں تو کبھی کسی تحصیل اسپتال میں۔" [illegible] سے بولا۔

"وہ سب میں نے بھی کیا تھا۔ اس مقام تک میں ایک دن نہیں پہنچا۔ دس سال بعد اس قابل ہوا تھا میں۔ خیر۔ میں چلتا ہوں۔ اب کوئی قانونی الجھن تو نہیں رہی نا؟"

"تمھارے لیے اب کیسی الجھن۔ تم نے اپنا فرض ادا کردیا۔ پولیس نے دلچسپی نہیں لی تو یہ ان کی مرضی۔"

"بس بعد میں کچھ نہ ہو۔"

"کچھ نہیں ہوگا بعد میں۔ پولیس کے ریکارڈ پر کچھ نہیں تو سمجھو یہاں آئے ہی نہیں کسی کے ساتھ۔" میڈیکل آفیسر نے کہا۔ "لو [illegible] ایک ساتھ دو کیس۔"

ایک بار پھر ہمیں باہر لایا گیا۔ باہر جانے کے لیے دوسرا [illegible] ڈاکٹر نے نرسنگ اسٹاف کو اپنی جیب سے دس دس روپے [illegible] انھیں خواہ مخواہ اسٹریچر اٹھا کے پھرنا پڑا تھا اور وہ بھی رات کے آخری پہر میں [illegible] تھکن [illegible] زیادہ تھا۔

مجھے اس وقت تھوڑا سا تعجب ہوا جب ڈاکٹر نے کہا۔ "یہ بات کسی کو معلوم نہ ہو۔"

"کون سی بات جناب؟" ایک نرسنگ اردلی بولا۔

"یہی کہ میں دو کیس لایا تھا اور پھر واپس لے گیا۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "تمھارے میڈیکل آفیسر..."

"ان کی بات سنی تھی ہم نے۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔ ہم کو کیا پڑی ہے کہ خلاف بیان دیں۔" ایک نے کہا۔

"ویسے تو پولیس اور میڈیکل افسر کی بات ہی مانی جاتی ہے ہم سے کون پوچھے گا۔" دوسرا بولا۔

"اور پوچھے بھی تو ہمیں کیا کہ آپ کا نام لیں اور لمبے چکر میں پڑ جائیں۔"

"ٹھیک ہے۔ اب تم ایک ٹیکسی لاؤ۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "اچھا تم ٹھہرو۔ میں خود کسی سے بات کرتا ہوں۔ رات کے وقت یہ لوگ بھی تو بلیک میل کرتے ہیں ضرورت مند کو۔"

اس کی بات سن کے میں ہکا بکا رہ گیا۔ وہ ہمیں اس ماکروبس میں بھی لے جاسکتا تھا جس میں لے کر آیا تھا لیکن وہ اس گاڑی کو یہیں چھوڑ کے جا رہا تھا۔ وہ ٹیکسی بھی خود لینے گیا تھا۔ شاید وہ کسی کو بتانا نہیں چاہتا تھا کہ ہمیں کہاں لے گیا۔ اس نے نرسنگ اسٹاف کو بھی خاموشی کا پابند کردیا تھا اور اس سے پہلے میڈیکل آفیسر کو بھی۔ وہ ایسا کیوں کر رہا تھا؟ سرکاری اجازت نامہ مل چکا تھا کہ وہ ہمارے کیس میں جتنی دلچسپی چاہے لے، سرکار کو قطعی اعتراض نہیں ہوگا مگر وہ رازداری کا اہتمام کر رہا تھا اور چاہتا تھا کہ ہمارے آنے اور جانے کی کسی کو بھی خبر نہ ملے۔ آخر کیوں؟

اس سوال کا جواب ایک امید تھی ـــ بے بسی کے صحرا میں ایک سراب۔ لاشعور کی سرگوشی تھی جو دل کی دھڑکن میں سنی جاسکتی تھی کہ شاید پھر رکھ لی میرے خدا نے مری بے کسی کی شرم اور اپنے دستِ غیب کے حسنِ انتظام سے ہمارے لیے پھر تحفظ کے اسباب پیدا کردیے۔ ناامیدی بھی کیا کیا خواب دکھلاتی ہے۔ کیسی کیسی تعبیریں مانگتی ہے۔

وہ ٹیکسی لے کر آیا تو ہم دونوں کو پچھلی سیٹ پر پھر پہلے کی طرح ڈال دیا گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور کچھ پریشان ہوگیا۔

"خو یہ کیا ہے یارا؟" وہ مجھے غور سے دیکھ کر بولا۔

"کچھ نہیں خان۔ یہ دونوں نشے میں ہیں۔"

"خو نشہ کرتی اے۔" اس نے دونوں کانوں کو ہاتھ لگا کے توبہ کی۔ "خانہ خراب کا بچہ۔ تمھارا کیا لگتی اے؟"

"بھائی ہیں دونوں۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "اسپتال پہنچا دیا تھا لوگوں نے۔ یہاں پولیس کے چکر میں آجاتے۔" وہ آگے بیٹھ کر بولا۔ "میں وقت پر پہنچ گیا۔"

"خو یارا۔ بُرا نئیں مانو۔ ایسا خانہ خراب بھائی اما را ب دے تو ا م خود اس کو پولیس کا حوالے کرے کہ اس کو چھتر مارو۔ اس کا چمڑی اتار دو مار مار کے۔ تم اس کو بچاتی اے۔" وہ ٹیکسی چلاتے ہوئے بولا۔

"کیا کریں خان۔ یہ بھی مجبوری ہے۔" ڈاکٹر نے ایک سرد آہ بھری۔

"کسی روز یہ مر جائیں گا ماڑا۔ پھر روئیں گا تم۔ ابھی ہم تم کو بتاتا اے۔ امارا بھی بھائی تھا۔ پھر خانہ خراب مارفین کا عادت پڑ گیا۔ انجکشن لگواتا تھا۔ ہم بوت مارا۔ بوت روکا اس کو۔ ایک ہی بھائی تھا امارا۔ ہم باپ تھا اس کا۔ ماں بھی ہم تھا۔ جب اس کو پولیس پکڑا۔ ہم بولا کہ ابھی اس کو ایسا مار لگاؤ کہ یہ سب نشہ مشہ بھول جائے۔"

"کیا نشے کے لیے تم پیسہ دیتے تھے؟ وہ کماتا تو نہیں تھا پھر!"

"او صاب۔ اُم بہت اُلو اے۔ امارا عقل میں ڈنڈا۔ اُم اس کو پیسہ دیتا تھا، جتنا وہ مانگتا تھا۔ یہ غلطی ضرور کیا اُم۔ مگر اُم کو کیا مالوم تھا۔ اُم سمجھا کالج کا یار دوست اے۔ خرچہ مرچہ تو کرنا پڑتا اے اودر سب کا ساتھ۔ چائے پیتا اے اور کھانا کھاتا اے۔ کتابوں کا اور کپڑا میڑا کا خرچہ کرتا اے۔ اُم بہت بے وقوفی کیا۔ وہ پیسہ لے کر نشہ کرتا تھا۔ جب اُم پیسہ دینا بند کیا۔ تو اس خانہ خراب نے سب بیچ دیا۔ اپنا کتاب۔ کپڑا۔ گھڑی۔ گھر کا سامان لے گیا وہ ایک دن۔ اُم سے بولا کہ چور آیا ہو گا۔ چور وہ خود تھا۔ اِدھر اُدھر سے چوری کرنے لگا تو پکڑا گیا۔ اُم سوچا کہ جیل میں ٹھیک ہو جائیں گا۔ اس کو چھ مہینہ جیل ہوا۔ لیکن صاب۔ اُدھر تو زیادہ ملتا تھا۔ اب اُم کیا بولے۔ اُم کو بہت شرم آتا اے۔ وہ نشہ کے لیے اپنا سب کچھ بیچ دیا۔ غیرت، ایمان، شرم سب مر گیا۔ وہ خانہ خراب خود زندہ رہا۔ باہر نکلا تو پکا بدمعاش ــ نشہ بازوں کا ساتھ ہو گیا۔ اُم کو چھوڑ کر چلا گیا۔ ابھی مالوم نہیں کدھر اے۔ زندہ اے کہ مر گیا۔ ہم کس سے پوچھے۔ کس سے فریاد کرے کہ امارا بیٹا، امارا بھائی اُم کو دے دو۔" وہ سخت جذباتی ہو گیا تھا۔

"خدا کرے وہ راہِ راست پر آجائے اور تمھیں مل جائے۔" ڈاکٹر نے رسمی اخلاق کے ساتھ ہمدردی کا مظاہرہ کیا۔

"اپنا بھائی کو بچاؤ صاب۔ بند کردو کسی کمرا میں تالا لگا کے ــ کسی کو مت جانے دو اس کا پاس۔ اس کا یار دوست آئیں گا۔ سب کو بولو وہ نئیں اے۔ بھاگ گیا۔ مر گیا۔ کچھ بھی بولو۔ ورنہ وہ اس کو پھر نشہ..."

"تم فکر مت کرو۔ میں سب ٹھیک کر لوں گا۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "اب تک مجھے بھی معلوم نہیں تھا۔ اب تو میں ان کو باندھ کر تہ خانے میں ڈال دوں گا۔ خواہ چھ مہینے باندھ کے رکھنا پڑے یا سال بھر۔ یا مجھے شہر چھوڑ کے جانا پڑے۔"

"ایک دم ٹھیک صاب۔ ان کو لے کر بھاگ جاؤ۔ کسی کو مت بتاؤ تم کدھر جاتا اے۔" پٹھان ڈرائیور مطمئن ہو گیا۔

"اچھا دیکھو۔ ادھر سے بائیں ہاتھ پر..."

اس نے پلٹ کے دیکھا۔ "بائیں ہاتھ پر! آپ تو بولا تھا..."

"وہ... دراصل میں نے ارادہ بدل دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ابھی ان کو گھر نہ لے جاؤں۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "یہ نہ ہو کہ وہ پہنچ جائیں جو ان کی تباہی کے ذمّے دار ہیں۔"

جب ٹیکسی رُکی تو ڈاکٹر نے اسے پچاس روپے دیے۔ ڈرائیور نے مجھے اور محسن کو اتار کے اندر پہنچانے میں ڈاکٹر کی مدد کی۔ یہ کوئی ایسا علاقہ تھا جہاں سب کوٹھیاں نئی اور شاندار تھیں۔ جس کوٹھی میں ہمیں لایا گیا تھا اس کے پورچ کی لائٹس جل رہی تھیں اور جب مجھے اندر لے جایا جا رہا تھا تو میں نے وہیں ایک بہت قیمتی کار بھی کھڑی ہوئی دیکھی۔ کوٹھی کے اندر مکمل خاموشی تھی۔

"خان! اب میں تم سے درخواست کروں گا کہ..."

"آپ بے غم ہو جاؤ۔ اُم کسی کو نئیں بتائے گا۔" ٹیکسی والے نے ڈاکٹر کی بات کاٹ کے کہا۔

"یہ ہو سکتا ہے کہ سول اسپتال کے باہر کسی نے تمھاری ٹیکسی کا نمبر نوٹ کر لیا ہو۔ وہ تم کو تلاش کر لیں اور تم سے معلوم کرنے آجائیں کہ انھیں تم کہاں لے گئے تھے۔" ڈاکٹر نے میری طرف اشارہ کیا۔

"اُم ادھر نئیں جائے گا صاب۔ اور کوئی آگیا تو اُم مر جائے گا مگر ادھر کا پتا نئیں بتائے گا۔"

"تم صاف انکار کر دینا کہ تم کسی کو نہیں لے گئے تھے۔"

"اُم قسم کھا کے بولے گا صاحب۔ اللہ ہم کو معاف کرے گا۔ اگر ہم جھوٹی قسم کھائے گا۔ کسی کا جان بچانے کا واسطے سب جائز اے۔ وہ غفور الرّحیم سب جانتا اے۔ اچھا۔" اس نے ہاتھ بڑھا کے مصافحہ کیا۔ "امارا بھائی کا واسطے دعا کرنا۔"

ٹیکسی ڈرائیور کے جاتے ہی ڈاکٹر مستعد ہو گیا۔ میں نے اسے باہر جھانکتے دیکھا۔ شاید وہ ٹیکسی کے نکل جانے کا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے اب اس کے بارے میں کوئی شبہ نہیں رہا تھا کہ کسی خاص مقصد کے تحت وہ ہمیں پولیس سے بچا لایا ہے۔ یہ مقصد ابھی تک واضح نہیں تھا لیکن میرا دل کہتا تھا کہ وہ ہماری مدد کر رہا ہے۔ حیرت کی بات صرف یہ تھی کہ اس نے یہ فیصلہ اتنی دیر سے کیوں کیا۔ وہ ہمیں اسپتال لے جانے کا پابند نہیں تھا۔ گاڑی اس کے ہاتھ میں تھی اور اسے دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ راستے سے ہی لوٹ آتا۔

چند منٹ کے بعد ہم پھر سفر کر رہے تھے۔ اس بار ڈاکٹر کی قیمتی کار میں جو مجھے پورچ میں کھڑی ہوئی نظر آئی تھی۔ صبح کاذب کا اجالا غالب آ رہا تھا جب ہم دوسری جگہ پہنچے۔

میں کراچی کے سارے علاقوں سے ایسے واقف نہیں تھا کہ دیکھتے ہی جگہ کو پہچان جاتا اور وہ بھی رات کے اندھیرے میں۔

خصوصاً ایسی حالت میں کہ میری نظر صرف سامنے دیکھ سکتی تھی اور وہ بھی اس وقت جب مجھے اٹھایا جاتا تھا۔ ورنہ میں ٹکٹکی باندھے خلا میں گھورتا رہتا تھا اور آوازیں سنتا رہتا تھا۔

یہ جگہ بھی پہلے والی جگہ سے بہت زیادہ مختلف نہیں تھی۔ فرق صرف نئے پُرانے کا تھا۔ یہاں بھی بڑی کوٹھیاں تھیں مگر وہ پہلے۔ شاید پندرہ بیس سال پہلے بنائی گئی تھیں۔ ان کی تعمیر میں قدامت کا رنگ بہت نمایاں تھا۔ مجھے ایک بیڈ روم میں پہنچانے کے بعد ڈاکٹر نے محسن کو بھی میرے ساتھ ہی ایک بہت بڑے بیڈ پر منتقل کر دیا۔ میں سیدھا لیٹا چھت کو گھور رہا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ محسن کسے دیکھ رہا تھا۔

"میں تھوڑی سی دیر کے لیے جا رہا ہوں۔" ڈاکٹر نے ہم دونوں کو مخاطب کر کے کہا۔ "تم لوگ سُن تو سکتے ہو نا میری بات؟ تمھاری آنکھیں دیکھ سکتی ہیں اور آنکھوں میں تمھارے خیالات اور جذبات کا رنگ بدلتا رہتا ہے۔ اس سے میں نے یہ اندازہ کیا ہے کہ تم دیکھنے اور سُننے کے ساتھ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم نہیں ہوئے ہو۔ جب میں واپس آؤں گا تو پھر تم سے بات ہو گی جب تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔ یہ کوئی تشویش کی بات نہیں۔"

وہ جانے کے لیے پلٹا اور پھر رُک گیا۔ "ہاں! ایک بات اور۔ یہاں تم بالکل محفوظ ہو۔ مجھے اپنا دشمن نہیں، دوست سمجھنا۔ میں دروازے کو تالا لگا کے جاؤں گا۔ یہ میری اپنی کوٹھی ہے اور اتفاق سے ان دنوں خالی تھی۔ یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ مجھے یہ کار واپس وہیں کھڑی کرنی ہو گی تاکہ کسی کو کچھ معلوم نہ ہو۔ میں تقریباً دو گھنٹے بعد آؤں گا۔ وہ میرے بڑے بھائی کا گھر ہے۔ آج کل میں وہیں مقیم ہوں کیونکہ میری بیوی اپنے میکے گئی ہوئی ہے۔ میں بھائی اور بھابی کے ساتھ ناشتا کروں گا۔ تاکہ انھیں بالکل شک نہ ہو۔ وہ سمجھیں کہ میں تو اپنے کمرے میں ہی سو رہا تھا۔"

جب وہ چلا گیا تو میں نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ ایک بار پھر قدرت کے مہربان ہاتھوں نے بساط وقت پر مُہروں کی چال بدل دی تھی۔ شکاری حاجی جو بڑے اہتمام کے ساتھ ناقابلِ شکست لشکر لے کر اور اپنی کامیابی کو یقینی بنانے کے سب سامان لے کر آیا تھا، کسی نامعلوم مقام پر کوفت اور جھنجلاہٹ میں مبتلا ہو گا۔ اپنی غیر متوقع ناکامی پر مشتعل ہو گا اور ان سب کو گالیاں دے رہا ہو گا جن کی غلطی سے حادثہ پیش آیا اور اس کا منصوبہ خاک میں مل گیا۔ وہ اپنے آدمی تو پولیس کی تحویل سے نکال کر لے جائے گا مگر اس کے بعد انھیں معاف نئیں کرے گا۔ جن کی کوتاہی سے بنا بنایا کھیل بگڑ گیا۔

حاجی عبداللہ اب کیا کرے گا؟ کیا وہ معلوم کرے گا کہ حادثے کے بعد مائکروبس کون لے گیا تھا۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ وہ ڈی ایس پی کا بھائی جس نے حادثے کے ذمّے دار گونگے ڈرائیور اور اس کے دو مسلح ساتھیوں کو تھانے پہنچایا تھا، خود ہی بتا دے گا کہ ایک ڈاکٹر اس مائکروبس کو سول اسپتال لے گیا تھا کیونکہ اس میں دو افراد تشویش ناک حالت میں بے ہوش پڑے ملے تھے۔

اس کے بعد حاجی عبداللہ سول اسپتال سے بہت کچھ معلوم کرلے گا۔ جب اسے مائکروبس وہاں ملے گی تو شک کی کوئی بات ہی نہیں رہے گی کہ ہمیں وہاں لایا گیا تھا۔ وہ عیار آدمی ہے اور اس کے لیے حقیقت کا کھوج لگانا کوئی مشکل کام نہیں ہو گا۔ وہ پتا چلا لے گا کہ ہمیں وہاں کون لایا تھا اور پھر اس ڈاکٹر کا سراغ مل جائے گا تو وہ کسی دشواری کے بغیر ہم تک آ پہنچے گا۔ ڈاکٹر ابھی حاجی عبداللہ۔ چوہدری دلاور ــ سراج اور اس جیسے کسی شکاری سے واقف نہیں اس لیے وہ مطمئن ہے مگر درحقیقت اس نے خود کو ان کا نشانہ بنا لیا ہے۔

میں نے محسوس کیا کہ میری اعصابی بے حسی میں کچھ کمی آگئی ہے۔ پلکیں تو میں بہت پہلے جھپکنے لگا تھا۔ اب تھوڑی سی کوشش سے میں نے نظر کو دائیں بائیں دیکھنے کے قابل کر لیا پھر اتنا ہوا کہ میں سر کو تکیے پر دائیں طرف گھمانے میں کامیاب رہا۔ جدھر محسن دراز تھا۔ وہ مجھ سے بہتر پوزیشن میں تھا۔ وہ میری طرف دیکھنے کے علاوہ مسکرا بھی رہا تھا۔ یہ مسکراہٹ بہت خفیف تھی۔ ہونٹوں کی معمولی سی حرکت۔ لیکن اس مسکراہٹ میں امید کا بھرپور اُجالا تھا اور عزم تھا حوصلہ نہ ہارنے کی تلقین تھی اور شکر گزاری کے جذبات تھے، اس ذاتِ والاصفات کے لیے جس کے تحفّظ کی چھتری ہماری ذات پر سایہ فگن رہتی تھی۔ ہر وقت اور ہر جگہ۔

سوال اب صرف وقت کا تھا۔ حاجی کتنی دیر میں معلوم کرتا ہے کہ اس کا پلان کس کی مداخلت کے باعث ناکامی سے دوچار ہوا اور وہ یہاں تک پہنچنے میں کتنا وقت لیتا ہے؟ ڈاکٹر نے دو گھنٹے بعد آنے کو کہا تھا۔ دو گھنٹے تو بہت زیادہ ہیں۔ اس کے بعد وہ اپنی چارہ گری سے ہمارے جسم کو اور اعصاب کو ذہن کی سوچ کے مطابق حرکت پذیری کی صلاحیت دے گا اور تب ہی ہم اس قابل ہوں گے کہ اسے تمام خطرات کی سنگینی سے آگاہ کر سکیں۔ اس نے یقیناً ہمیں پہچان لیا تھا۔ وہ ہماری مدد پر بھی آمادہ تھا لیکن وہ ہمارے تعاقب میں رہنے والے کسی شکاری کی سفّاکی، بے ضمیری اور خون آشامی سے واقف نہ تھا۔

ڈاکٹر کی واپسی کا انتظار ایک طویل، پُرعذاب اور صبر آزما عمل تھا۔ ہم جمود کی کیفیت میں پڑے رہنے اور ماضی و حال اور مستقبل کے اندیشوں سے اُلجھتے رہنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ مجھے نازو اور غالب کا خیال بھی آیا۔ معلوم نہیں، وہ اپنے مقصد میں کس حد تک کامیاب رہے۔ وہ جہاز پر پہنچے تو اپنی شناخت چھپا کے دشمنوں کا اعتماد حاصل کر سکے یا نہیں، ان کا مشن جان لیوا مرحلوں سے عبارت

تھا اور کامیابی صرف تقدیر کی یاوری پر منحصر تھی۔

جب باہر کا دروازہ کھلا تو میں چونکا اور بالکل غیر ارادی طور پر میں نے سر کو دوسری طرف گھما لیا۔ یہ لاشعور میں جاگزیں ایک خوف کا ردِعمل بھی تھا کہ جانے فصلِ گل آئی یا اجل آئی کیوں درِ زنداں کھلتا ہے۔ آنے والا کوئی بھی ہو سکتا تھا ابلیس و عزرائیل کا نمائندہ عبداللہ بھی اور دوستی کا نامہ بر مسیحا بھی۔

وہ اندر آیا تو ڈاکٹر کے مسکراتے چہرے کو دیکھ کر میرا اطمینان بحال ہوا۔

"تم بہت بہتر ہو۔" وہ خوش دلی سے بولا۔ "میں بھی ایک گھنٹے میں ہی لوٹ آیا۔ بھابی کو تو خیر خاک بھی پتا نہیں چلا، وہ سوئے پڑے رہے۔ بھابی کو شک ہوا تھا۔ انھوں نے پوچھا بھی کہ صبح صبح کار لے کر کہاں گئے تھے۔ میں نے کہا کہ تم نے خواب دیکھا ہو گا... کار اپنی جگہ پر موجود۔ میں اپنے کمرے میں موجود۔ مگر وہ بہت چالاک عورت ہے۔ کہنے لگی کہ ہاں، اب تو موجود ہو تم بھی، مگر بیچ میں نہ کار تھی نہ تم تھے۔ کس سے ملنے گئے تھے۔ شرم نہیں آتی۔ چار دن کے لیے بیوی گئی ہے میکے اور تم ہو گئے پھر شترِ بے مہار۔ میں نے بہتر سمجھا کہ اس الزام کو قبول کر لوں۔ ناشتا کرتے ہی بھاگ آیا کہ ایک ایمرجنسی آپریشن ہے۔ بھابی نے اس کا بھی یقین نہیں کیا ہو گا۔" وہ قہقہہ مار کے ہنسا۔

وہ اب شیو کر کے اور کپڑے بدل کے آیا تھا چنانچہ بہت بہتر لگ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ڈاکٹروں کا روایتی بیگ بھی تھا۔ ہمارے قریب بیٹھ کے اس نے پہلے سرسری سا معائنہ کیا پھر میری انگلی میں سوئی چبھو کے خون کا ایک قطرہ شیشے کے ٹکڑے پر اتار لیا۔ اس نے تین مختلف قسم کے بے رنگ محلول نکالے اور باری باری ایک ایک قطرہ ڈال کے خون کا معائنہ کرتا رہا۔ اس کے لیے وہ بیگ میں ایک چھوٹا سا مائکرواسکوپ بھی لایا تھا۔

اس مختصر سے ٹیسٹ سے فارغ ہوتے ہی اس نے پُراطمینان انداز میں سر ہلایا۔ "میرا اندازہ درست تھا۔" وہ بولا۔ "تم دونوں کے خون کا رزلٹ ایک ہی ہو گا۔"

ایک بیگ میں سے اس نے اپنی دوائیں نکالیں اور پہلا انجکشن مجھے لگا دیا۔ دوسرا انجکشن محسن کو لگا کے اس نے گھڑی دیکھی۔

شاید خود ڈاکٹر کو بھی خطرے کا احساس تھا کہ اندر آتے ہی اس نے دروازہ مقفل کر دیا تھا۔ اب اس نے ایک اور حرکت کی۔ وہ کھڑکی کھول کے باہر کود گیا۔ چند منٹ کے بعد میں نے سامنے والے دروازے پر کھٹ پٹ سُنی پھر وہ کھڑکی کے راستے ہی لوٹ آیا۔

"میں نے سامنے سے اتنا بڑا قفل لگا دیا ہے۔" اس نے ہاتھ سے قفل کی جسامت ظاہر کی۔

کھڑکی اندر سے بند کرنے کے بعد اس نے پردے برابر کیے۔ "میرا خیال ہے کہ اب کسی کو یہاں تمہاری موجودگی کا شک نہیں ہو سکتا۔ میں ذرا دوسرے دروازے اور کھڑکیاں چیک کر لوں اور چائے بھی بنا لاؤں۔ تم کو بھوک بھی لگی ہو گی۔ دیکھتا ہوں، فریج میں کیا ہے۔ آدھے گھنٹے میں تم کو ٹھیک ہو جانا چاہیے۔"

ڈاکٹر کی عمر تجربے کو دیکھتے ہوئے پینتیس سال سے کم نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن وہ اپنی جسمانی ساخت اور لباس کی وجہ سے چوبیس پچیس سال کا نوجوان نظر آتا تھا۔ وہ خوش رہنے والا یار باش اور باتونی انسان تھا۔ آدھی رات کے بعد وہ اپنے دوستوں کے ساتھ آوارہ گردی میں مصروف تھا۔ اسے پیسے کی کمی نہ تھی چنانچہ صحبت بھی اسے عیش پسندوں کی ملی تھی۔

آہستہ آہستہ میرا جسم زندگی کی حرکت پذیری سے آشنا ہونے لگا۔ یہ کیفیت بھی بہت عجیب تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میری رگوں میں لہو پھر دوڑنے لگا ہے۔ کبھی ایک ہی پوزیشن میں رہنے سے ہاتھ یا پیر سو جاتے ہیں تو دورانِ خون بحال ہوتے ہی ایک سنسناہٹ اور چبھن کا احساس ہوتا ہے۔ یہی حال میرے پورے بدن کا تھا۔

سب سے پہلے میں سر کو اور پھر ہاتھوں کو حرکت دینے کے قابل ہوا۔ میں نے ہاتھوں کے سہارے پر جسم کو اٹھانے کی کوشش کی اور ناکام رہا۔ محسن نے اپنا ہاتھ بڑھا کر میرے شانے پر رکھا تو میں چونکا اور اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ بےبسی کی قید سے رہائی کی اس گھڑی میں اس دوستانہ لمس نے جادو دکھایا۔ جواب میں میرا ہاتھ اس کی طرف بڑھا اور ہمارے ہاتھوں نے ایک دوسرے کی انگلیوں کے ساتھ تعلق قائم کر لیا۔ محبت، اعتماد اور رفاقت کے رشتوں کی استواری کا احساس وہ طاقت بن گیا جس نے ہمیشہ طاقت سے نبرد آزما ہونے کا یقین دیا تھا۔ اور ناممکن کو ممکن بنا دینے کی خواہش کو زندہ رکھا تھا۔

جب ڈاکٹر چائے کی ٹرے لے کر آیا تو ہم اس قابل ہو گئے تھے کہ اٹھ کے بیٹھ جائیں۔ ہمارے ہاتھوں اور جسمانی اعضا کی حرکت میں ابھی مستعدی نہیں آئی تھی۔ ہم سلوموشن میں ہر کام خاصی محنت سے کر رہے تھے۔ جب میں نے بولنا چاہا تو میری زبان لڑکھڑاتی رہی اور میرے حلق سے عجیب سی ناقابلِ فہم آواز نکلی۔

"ویری گڈ... ویری گڈ..." ڈاکٹر نے بشاشت سے کہا اور ٹرے کو ایک میز پر رکھ دیا۔ "میری تشخیص درست رہی۔ اب پانچ دس منٹ میں تم دونوں مجھ سے زیادہ چاق و چوبند ہو جاؤ گے۔"

اس نے اپنے میڈیکل بیگ میں سے دوسرا انجکشن نکالا۔ "عام طور پر دوا میں جادو کا اثر نہیں ہوتا۔ مگر زندہ رہنے کی خواہش اور جد وجہد ہو تو تاثیر یقیناً بڑھ جاتی ہے۔ یہ تم دونوں کی قوتِ ارادی کا کرشمہ ہے کہ صرف بیس منٹ میں تمھاری حالت اتنی بہتر ہو گئی۔ اب یہ دوسرا انجکشن عام طور پر ایک گھنٹے کے بعد لگایا جاتا ہے۔ یہ نظامِ اعصاب کو فوراً فعال بناتا ہے۔"

باری باری اس نے ہم دونوں کو وہ 'انٹروینس' انجکشن لگایا اور پھر کرسی کھینچ کر ہمارے قریب بیٹھ گیا۔

"یہ اچھا ہوا جو میری بیوی یہاں نہیں ہے۔" وہ سگریٹ جلا کے بولا۔ "وہ بہت شکی مزاج عورت ہے۔ ویسے تو ہر عورت ہوتی ہے، مگر وہ ہے ایک پولیس افسر کی بیٹی۔ کڑوا کریلا اگر نیم چڑھ جائے تو کیا ہوتا ہے!" وہ ہنسا۔

میں نے اور محسن نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ہمارے حق میں یہ اچھا نہ ہوتا اگر وہ پولیس افسر کی بیٹی ہمیں دیکھتے ہی سوال کرتی کہ یہ کون ہیں۔ انھیں اسپتال کیوں نہیں لے گئے، گھر پر کیوں اٹھا لائے ہو؟ اور ڈاکٹر صاحب کا جواب اسے مطمئن نہ کرتا یا وہ بغلیں جھانکتے نظر آتے تو وہ فوراً ریسیور اٹھا کر ابا حضور کو مطلع کرتی کہ میرے گھر میں دو مشکوک افراد موجود ہیں جو صورت سے ہی جرائم پیشہ لگتے ہیں اور ابا حضور آ جاتے اپنے سن ان لاء سے تفتیش کرنے تو؟

"آ... آپ... آپ کا... بو... بہت... شک... شکریہ۔" یہ بات محسن نے کی تھی۔ اس کی زبان تھوڑا سا اٹک رہی تھی۔ مگر وہ بولنے لگا تھا۔

"آ... آپ... نے... بچا لیا... ہمیں۔" میں نے بھی کوشش کی۔ کچھ ... ادا کرنے میں کامیاب رہا۔

اس کے بعد ڈاکٹر کی پیشین گوئی کے مطابق ہماری استعداد میں حیرت انگیز اضافہ ہوا۔ پانچ منٹ کے بعد ڈاکٹر نے تھرماس میں سے چائے انڈیل کر ہمیں دی تو ہمارے ہاتھوں کی گرفت مستحکم رہی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے محسوس ہوا کہ شاید میں سالی نہ تھام سکوں مگر میں نے ذہن کی ساری قوت کو ہاتھ کی طاقت پر مرتکز کر دیا۔

چائے کا پہلا گھونٹ لیتے ہی جیسے میری زبان کی اینٹھن بھی ختم ہو گئی۔ ڈاکٹر نے ہمارے سامنے بسکٹ کا اور پنیر کا ڈبا رکھا۔ اس نے معذرت کی کہ گھر میں اور کچھ نہیں تھا۔ انڈے ڈبل روٹی سب ختم ہو چکے تھے۔

میں نے پنیر کے دو ٹکڑے کھائے اور چار بسکٹ اور پھر چائے کا دوسرا کپ ختم کیا۔ ایک بار پھر میں نے خود کو زندہ، صحت مند اور چاق و چوبند محسوس کیا۔ مجھے وہ درمیانی وقفہ جب میں نہ زندوں میں تھا نہ مُردوں میں، نہ بے ہوش تھا اور نہ ہوش میں، بہت عجیب سا تجربہ لگا۔ کسی سائنس فکشن کے سین کی طرح جس میں انسانوں پر کوئی خلائی مخلوق حاوی آ جائے تو انھیں روبوٹ کی طرح ذہنی و جسمانی طور پر مفلوج کر دے۔

"کیا سگریٹ مل سکتی ہے؟" میں نے کہا۔

"ہاں، میں خود تو نہیں پیتا، مگر مہمانوں کے لیے رکھتا ہوں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

"یار سکندر، یہاں نہیں رکنا چاہیے ہمیں۔" محسن نے موقع پاتے ہی کہا۔ "وہ لوگ آ سکتے ہیں یہاں۔"

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ "ہم اس سے پہلے ہی نکل جائیں گے۔"

ڈاکٹر ایک سگریٹ باکس لے کر نمودار ہوا۔ "یہ ڈرائنگ روم میں رکھا رہتا ہے۔ بالکل تازہ تو نہیں ہیں۔"

"ڈاکٹر صاحب، سب سے بڑا احسان تو آپ کا یہی ہے کہ ہمیں اپنی زندگی اور اپنی آزادی پھر ملی۔" میں نے ایک سگریٹ اٹھاتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ خطرہ کیوں مول لیا آپ نے؟"

"خطرات سے کس کی زندگی خالی ہے؟ اگر ہے تو وہ کیا زندگی ہے؟" ڈاکٹر نے کہا۔

"کیا آپ نے پہچان لیا تھا ہمیں؟" میں نے کہا۔

"ہاں، مگر فوراً نہیں۔ جب میں نے تمھیں جائے حادثہ پر دیکھا تھا تو وہاں اندھیرا تھا۔ اور میں نے تمھاری صورت ... حالت پر غور کیا تھا۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "ہسپتال جاتے ہوئے مجھے خیال ضرور آیا تھا کہ تمھاری صورت دیکھی ہوئی کیوں لگتی ہے۔ سوال کا جواب کہیں میرے لاشعور میں محفوظ تھا اور فوراً سامنے نہیں آیا۔ سول اسپتال میں جب میں اس پولیس انسپکٹر سے بات کر رہا تھا تو یک لخت مجھے سب یاد آ گیا جو میں نے تمھارے بارے میں سن رکھا تھا۔ اس وقت

میں بہت پشیمان ہوا اور بہت گھبرایا کہ اب تم کو واپس کیسے لے جاؤں۔ بس قسمت مہربان تھی کہ دوسروں نے تمھیں شناخت نہیں کیا اور تمھیں ایمرجنسی کیس بھی نہیں سمجھا۔ مجھ سے دیر تو ہوئی۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ اس دیر سے کوئی نقصان نہیں ہوا۔ وہ کون لوگ تھے جو تمھیں لے جا رہے تھے؟"

"ظاہر ہے، وہ ہمارے اور اس ملک کے دشمن تھے۔ اور اب آپ کے بھی اتنے ہی خطرناک دشمن ہو گئے ہیں۔" محسن بولا۔

"آپ نے کوئی عقلمندی نہیں کی، وہ گاڑی وہاں چھوڑ کے۔" میں نے کہا۔ "اس گاڑی سے ہی وہ سب پتا چلا لیں گے کہ ہمیں کون لایا تھا اور کون لے گیا۔ یہ بھی معلوم کرلیں گے کہ کہاں لے گیا ہے۔"

"میں اور کیا کرتا... اس گاڑی کو یہاں کیسے لاتا۔ ٹیکسی میرے نزدیک زیادہ محفوظ ذریعہ تھی۔" وہ کچھ متفکر ہو کے بولا۔

"آپ نے بہت بڑا رسک لیا۔"

"سول اسپتال میں انھیں کوئی کچھ نہیں بتلائے گا۔" وہ بولا۔

"یہ آپ کی خوش فہمی ہے۔ وہ خطرناک شکاری کتے ہیں جو کسی کی بُو پالیں تو اسے کھوجتے ہوئے پاتال تک اور آکاش تک پہنچ سکتے ہیں۔ میرا مشورہ مانیں تو یہاں سے فوراً نکل جائیں اور کم از کم دو چار ہفتے روپوش رہیں۔"

"دو چار ہفتے؟" وہ تلخی سے بولا۔ "میں دو چار دن کے لیے بھی کہیں نہیں جا سکتا۔ میرا اسپتال ہے اور میری ذمے داریاں ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ میں اپنے کمشنر کو بتا دوں کہ مجھے کچھ لوگوں سے خطرہ ہے۔ وہ مجھے پولیس گارڈ فراہم کر دیں گے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "پولیس کیا اس گولی کا راستہ روک سکتی ہے جو کوئی کسی کی جان لینے کے لیے طویل فاصلے سے بھی چلا سکتا ہے؟" میں نے کہا۔ "تم ان کے مجرم ہو کیونکہ تم نے دخل در معقولات سے ان کا بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا ہے۔"

"میں کیا کرتا اس کے سوا۔ یہ تو ناممکن تھا کہ میں تمھیں چھوڑ کے بھاگ آتا۔ اپنی جان بچالیتا اور تمھاری جان کی پروا نہ کرتا۔ اب جو ہوگا دیکھا جائے گا۔" وہ بولا۔

"آپ نے اپنا نام ابھی تک نہیں بتایا۔" محسن نے کہا "اور ہم نے بھی نہیں پوچھا۔"

ڈاکٹر کو جواب دینے کے لیے مہلت نہیں ملی۔ باہر ایک گاڑی آ کے رکی۔ اس کے انجن کی آواز بند ہونے سے پہلے ہی میرے شکوک نے یقین کی صورت اختیار کر لی۔ گاڑی کا سلائیڈنگ ڈور بڑی آواز کے ساتھ بند ہوا اور کوٹھی کے اندر لگی ہوئی کال بیل مسلسل بجنے لگی۔

میں نے تیزی سے کھڑکی تک جا کے پردہ ہٹایا اور باہر جھانک کے دیکھا۔ یہ وہی مائیکرو بس تھی جو ڈاکٹر صاحب سول اسپتال کے باہر چھوڑ آئے تھے۔ ہمارے اندیشے بے بنیاد نہیں تھے۔ شکاری اس مائیکرو بس کو بہت جلد تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اور انھوں نے یہاں پہنچنے میں بھی دیر نہیں لگائی تھی۔

"ڈاکٹر صاحب!" میں نے پلٹ کے کہا۔ "آپ کے پاس کوئی اسلحہ ہے؟ ریوالور یا پستول..."

ڈاکٹر کا رنگ اڑ گیا تھا۔ اس نے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا۔ "مجھے کبھی ضرورت نہیں پڑی۔"

"اچھا، اب آپ دروازہ کھولیں۔" میں نے دیوار کے ساتھ پردے سے لگ کر کہا۔

"کتنے آدمی ہیں باہر؟" محسن نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر لوہے کی ایک راڈ اٹھالی جس کے درمیان میں بہت سخت اسپرنگ تھا۔ یہ ورزش میں کام آنے والی چیز تھی اور اسے دونوں ہاتھوں میں کناروں سے تھام کر موڑنا اور آہستہ آہستہ سیدھا کرنا بازوؤں کے پٹھوں کو قوت دیتا تھا۔

"سامنے ایک تو حاجی ہے۔ چار اس کے علاوہ ہیں۔ دو پیچھے کی طرف گئے ہیں۔" میں نے باہر جھانکتے ہوئے رننگ کمنٹری کی۔ "گویا چھ مسلح افراد ہیں۔ دو وہی ہیں جو رات کو ہمارے ساتھ تھے۔ ہاں، ساتواں وہ گونگا ڈرائیور ہے۔"

گھنٹی پھر بجی۔ کسی نے دروازے پر لات ماری یا کوئی اور چیز۔ یہ شیشم کی لکڑی کے مضبوط فریم والا دروازہ تھا۔ اگر شیشہ ہوتا تو وہ اسے توڑ کے خود ہی اندر سے کنڈی بھی کھول لیتے اور لاک بھی۔

"آپ ظاہر کریں کہ آپ سو رہے تھے۔" میں نے سرگوشی میں کہا۔

"کون ہے بھائی صبح صبح؟" ڈاکٹر نے نیند سے جاگنے والے کی طرح بیزار لہجے میں کہا۔

جواب میں پورچ کی طرف کھلنے والی کھڑکی کا شیشہ ایک چھناکے سے بکھر گیا۔ ڈاکٹر کا چہرہ خوف سے سفید پڑ گیا۔

"وہ... اِدھر سے نہیں آسکتے۔ کھڑکی میں لوہے کی گرل ہے۔" ڈاکٹر نے ہمیں تسلی دینے کی کوشش کی۔

"جاؤ، دروازہ کھولو۔" میں نے سخت لہجے میں کہا اور اسے دروازے کی طرف دھکیلا۔ "ہمت سے کام لو۔"

لیکن ڈاکٹر کی تسلی باتوں سے نہیں ہو سکتی تھی۔ اسے احساس تھا کہ وہ محصور ہو گیا ہے اور سات افراد جو خطرناک عزائم رکھتے ہیں، مسلح ہو کے اس کے گھر پر حملہ آور ہوئے ہیں۔

"میں... میں پولیس..." وہ پلٹ کے بھاگا اور فون کی طرف لپکا۔ اسی وقت ایک اور کھڑکی کے کئی شیشے ٹوٹے۔ وہ ان پر مشین گن یا ریوالور کے بٹ مار رہے تھے۔ اندر کی جانب گرل نہ ہوتی تو اتنی دیر میں وہ سب کمروں میں کود چکے ہوتے۔

"توڑ دو دروازے کو۔ ایسے باہر نہیں آئے گا کوئی بھی۔" یہ آواز حاجی کی تھی جو ٹوٹے ہوئے شیشوں سے گزر کے مجھ تک پہنچی۔

"ہیلو... ہیلو..." ڈاکٹر نے بدحواسی میں نمبر ملائے بغیر ریسیور اٹھا کے کہا۔

دوسرے کمرے میں ایک فائر کی آواز گونجی۔ پھر ایک زبردست دھماکا ہوا۔ اور مجھے یوں لگا جیسے کوئی بہت بڑا شیشے کا بنا ہوا فانوس چھت سے فرش پر گر کے پاش پاش ہو گیا ہے مگر یہ آواز ٹی وی کی ٹیوب پھٹنے سے پیدا ہوئی تھی۔ ان میں سے کسی نے گرل کے اندر ہاتھ ڈال کے ٹی وی کا نشانہ لیا تھا۔

"یہ... یہ تو کام نہیں کر رہا ہے۔" ڈاکٹر نے بدحواس ہو کے کہا۔ "فون کاٹ دیا ہے ان بدمعاشوں نے۔"

"نہ کاٹا ہوتا تب بھی کیا پولیس آجاتی۔ ایسے تو صرف الٰہ دین کے چراغ کا جن ہی آسکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اب خود کو بچاؤ۔ وہ ہر طرف سے اندر آنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

دروازہ ایک زبردست دھماکے سے ہلا۔ اس دھماکے نے دیواروں کو بھی مرتعش کر دیا۔ ڈاکٹر نے وحشت زدہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "تم... تم کیا کرو گے؟"

"اس الماری کے پیچھے جاؤ، بے وقوف۔ ورنہ وہ اندر داخل ہوتے ہی گولی مار دیں گے۔" میں نے دانت پیس کے کہا۔ "مجھے جو کرنا ہے میں کر لوں گا۔ تم کیوں مرتے ہو میری خاطر۔"

محسن نے اس کو بازو سے پکڑ کے کھینچا اور الماری میں ٹھونس کے پٹ برابر کر دیے۔ وہ خوف سے مفلوج ہو گیا تھا اور محسن اس کی مدد نہ کرتا تو وہ وہیں کھڑا کانپتا رہتا یا بے ہوش ہو کے گر جاتا۔

"اتنی دیر ایک دروازہ کھولنے میں..." حاجی نے سخت طیش میں کہا۔ "میں نے کہا تھا خواہ مخواہ گولی مت چلانا۔ اب منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ اس تالے کو نہیں توڑ سکتے گولی مار کے احمق۔ آس پاس والے سب سن چکے ہوں گے پہلے فائر کی آواز۔ کوئی بھی فون کر دے گا پولیس کو۔"

ایک اور دھماکے نے کمرے کو ہلا دیا۔ اس کے ساتھ ہی دروازہ کھلا اور ایک شخص تیزی سے اندر آیا۔ سیدھا جانے کے بجائے وہ دروازے کی طرف پلٹا۔ یہ حاجی کی ہدایات ہوں گی کہ بیل کی طرح مت گھسنا۔ خیال رکھنا کہ وہ دروازے کے پیچھے سے نہ دبوچ لیں۔

میں ایک دم غوطہ مار کے نکلا۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو اس گولی کا آسان ہدف بنتا جو مجھ سے چند فٹ کے فاصلے سے چلائی گئی تھی۔ گولی چلانے والے نے مجھے پردے کے پیچھے چھپا ہوا دیکھ لیا تھا۔ میرے بوٹ پردے کے نیچے سے صاف نظر آ رہے تھے۔

میں نے سر جھکا کے پیش قدمی کی اور اس شخص کی بیلٹ پر ہاتھ ڈال دیا جو دوسرا فائر کرنے کی پوزیشن لے رہا تھا۔ ایک جھٹکے سے وہ آگے آیا اور میری ڈھال بن گیا۔ دوسرا شخص اس کے پیچھے اسی لیے رکھا گیا تھا کہ غیر متوقع جوابی کارروائی کی صورت میں اسے بچا سکے۔ اس نے لمبی چھلانگ مار کے دوسرے زاویے سے میرا نشانہ لیا مگر میں گھوم گیا اور اس کی چلائی ہوئی گولی میری گرفت میں جدوجہد کرنے والے کی پیٹھ میں شانے کے قریب لگی۔ اس نے ایک دلخراش چیخ ماری اور اچھل کر نیچے گرا۔

میں اس کے ساتھ ہی گرا۔ اس کا ریوالور فضا میں بلند ہوا اور چھت کے پنکھے سے ٹکرا کے واپس آیا۔ میری ساری توجہ اس ریوالور کے حصول کی طرف تھی کیونکہ اب میں خود کو بچانے کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میرا دوسرا حریف خاصے فاصلے پر تھا اور مجھ پر دوسرا فائر کرنے کے لیے آزاد تھا۔ ساکت اور منجمد کھڑے رہنے کی صورت میں اگلی گولی سے بچنے کے امکانات صفر ہو جاتے تھے۔ میں نے جمپ لگا کے ریوالور کو پکڑنا چاہا مگر پنکھے سے ٹکرا کے ریوالور صوفے کے پیچھے چلا گیا۔ میں نے بھی جست لگائی اور صوفے کے پیچھے کود گیا۔

ریوالور اٹھاتے ہی میں نے رُخ بدلا۔ اور اپنے دوسرے حریف کو فرش پر چت دیکھا۔ میرے بچ جانے کا سبب میری پھرتی نہیں تھی۔ عین اس وقت جب دوسرا شکاری

مجھے شکار کرنے والا تھا۔ محسن نے پیچھے سے اس کے سر پر اسپرنگ والی وہ موٹی راڈ ماری جس کے دونوں کناروں پر گرز جیسی مٹھ بنی ہوئی تھی۔ اس کا سر پھٹا تو نہیں مگر ضرب کی شدت نے اسے وہیں ناک آؤٹ کر دیا۔

اب محسن بھی خالی ہاتھ نہیں رہا تھا۔ اس نے دو کمروں کے درمیانی دروازے کی دہلیز پہ مورچا بندی کر لی تھی۔ باہر سے حاجی اب اپنے نکمے، نااہل، حرام خوروں کو زیادہ ثقیل گالیوں سے نواز رہا تھا۔

محسن نے دروازے کی اوٹ سے جھانک کے دیکھا اور ایک فائر کیا۔ کوئی حملہ آور جو شاید کھڑکی کے سامنے تھا، نشانہ بن گیا۔ اس کی چیخ پر محسن نے میری طرف دیکھا اور مسکرا کے انگوٹھا بلند کیا۔ تین انگلیاں اٹھا کے میں نے آدھی جنگ جیت لینے کا مفہوم واضح کیا۔ چھ میں سے تین شکاری مارے جا چکے تھے۔

پھر صورتِ حال ڈرامائی طور پہ بدل گئی۔ کوٹھی میں اندر کی طرف دھماکا ہوا۔ محسن نے وہ مورچا چھوڑ دیا اور ایک فاش غلطی کی۔ ہمارے لیے یہی بہتر تھا کہ ہم انھیں سامنے آنے کا موقع دیتے۔ محسن نے مجھے اور میں نے محسن کو پوری طرح کور کر رکھا تھا۔ یہ ناممکن تھا کہ وہ اس کمرے میں داخل ہوئے بغیر ہمیں زندہ یا مردہ گرفتار کر سکتے۔ یہ مقابلہ تادیر جاری بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ گرد و نواح میں سب کوٹھیاں آباد تھیں۔ اور صبح کے نو بجے بیشتر لوگ بیدار ہو چکے تھے مگر گھروں سے نکلے نہیں تھے۔ یہاں دولت مند کاروباری ہی رہ سکتے تھے جو دفتری بابو نہیں ہوتے کہ سات بجے حاضری لگانے پہنچ جائیں۔ وہ سب جان چکے ہوں گے کہ ایک کوٹھی میں کیا خونی ڈراما ہو رہا ہے۔

لیکن محسن نے کامیابی کی توقعات کو اور امکانات کو ختم کر دیا۔ میں اسے قصور وار یوں نہیں سمجھتا کہ اس کا ردِعمل غیر ارادی اور فطری تھا۔ وہ سامنے جانا نہیں چاہتا تھا مگر شکاری جو کچن کی طرف سے داخل ہوئے تھے، اسے دو طرف سے محد... [illegible]

"یہ کھلونا نیچے پھینک..." کسی نے ساتھ والے کمرے میں آ کے کہا۔ "تم ہماری گولی کا... ستر روکے کھڑے ہو۔"

"تم مقابلہ نہیں کر سکتے۔" کسی اور نے کہا۔ "مقابلے کا کوئی فائدہ بھی نہیں۔ ہم تمھیں اسی طرح پھر پکڑ سکتے ہیں جیسے کل پکڑا تھا۔"

میں نے اندازہ کرنا چاہا کہ محسن کی پوزیشن کیا ہے اور اگر

میں صوفے کے پیچھے سے نکلوں تو کیا اس کی مدد کر سکتا ہوں؟ مگر جو کچھ ہو رہا تھا دوسرے کمرے میں ہو رہا تھا۔ اگر میں اس جگہ کو چھوڑتا تو عین ممکن تھا کہ محسن کی طرح ٹریپ ہو جاتا۔

"چلو میاں، ضد چھوڑو، ماشاء اللہ بہت بہادر ہو تم۔" یہ حاجی عبداللہ کی تمسخر اڑانے والی آواز تھی۔ "ہم نے تو تم سے یہ کل رات بھی کہا تھا کہ ہم خدانخواستہ دشمن نہیں ہیں تمھاری جان کے۔ ہمارا مقصد تھا کچھ معاملات کو بات چیت سے طے کرنا۔"

"میری زندگی کا بھی ایک مقصد یہ ہے کہ میں تیرا یہ ڈھول جیسا پیٹ پھاڑ دوں جس میں حرام کا مال دوزخ کی آگ کی طرح بھرا ہوا ہے اور تیری یہ زبان... آ... آہ۔"

محسن کی آہ نے مجھے تڑپا دیا۔ فائر کوئی نہیں ہوا تھا چنانچہ میں نے سمجھ لیا کہ اس کو پھر اسی زہریلے تیر کا نشانہ بنایا گیا ہو گا مگر چند لمحے بعد میں نے محسن کی زبان سے ایک شاندار گالی سنی۔ حاجی کی ہنسی نے واضح کیا کہ گالی اسی کے لیے تھی۔

میں صوفے کی پشت سے تھوڑا سا سر اٹھا کے دیکھ رہا تھا جب محسن دروازے میں نمودار ہوا۔ اس کے بالکل پیچھے کوئی کرائے کا گوریلا تھا جس نے محسن کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کے اس کے بازوؤں کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا اور اب محسن کو ڈھال بنا کے آگے دھکیل رہا تھا۔ محسن کی پیشانی زخمی تھی اور خون کی ایک لکیر اس کے رخسار تک آ گئی تھی۔

"چلو اب تم بھی سامنے آ جاؤ میاں شہزادے۔" حاجی نے مجھے مخاطب کیا۔ "ہم تمھیں ایک موقع دیتے ہیں۔"

"تم مجھے ایک موقع دو۔" محسن بولا۔ اس کے بعد محسن نے جو کچھ کہا وہ ناقابلِ اشاعت ہے۔

محسن دروازے کے فریم میں بے بس کھڑا ہوا تھا۔ جو شخص اس کے پیچھے تھا وہ میرے نشانے سے محفوظ تھا۔ محسن کی مزاحمت کا اس گوریلے پہ کوئی اثر نہیں ہوا۔ جسمانی طاقت میں بھی وہ محسن پہ بھاری تھا۔ اور وہ اس طاقت کے استعمال کا فن بھی جانتا تھا۔ اپنی تمام کوشش کے باوجود نہ محسن خود کو چھڑا سکا اور نہ اسے آگے لا سکا۔

پھر دروازے کی اوٹ سے ایک ہاتھ نمودار ہوا۔ اس ہاتھ میں ایک تیز چمکیلی دھار والا خنجر تھا۔ خنجر کی نوک نے عین اس جگہ کو چھوا جہاں سے محسن کا خون رِس رہا تھا۔ محسن نے سر کو پیچھے کرنا چاہا۔ اس کی یہ حرکت خود اس کو مہنگی پڑ جاتی مگر خنجر کی دھار آزمانے والا ہاتھ پیچھے...

"کیا تمھیں اس لہو کا نظارہ اچھا لگا؟ تمھارے دوست کا خون تو سفید نہیں ہے۔ شاید تمھارا خون سفید ہو گیا ہے۔ زیادہ انتظار نہیں کر سکتے برخوردار۔ تم ہمارا صبر آزما لو، ہم تمھارا ... دیکھتے ہیں۔"

خنجر کی نوک نے ایک دم محسن کی پیشانی پہ دوسری ... خراش ڈال دی۔ زخم گہرا نہیں تھا مگر کھال کے کٹ ... نے سے بھی لہو پھوٹ کر بہنے لگا۔ میں نے بہت کوشش ... کہ ادھر نہ دیکھوں اور دل کو مضبوط رکھوں لیکن نہ جانے ... وں میرے جسم پر ایک کمزوری سی غالب آنے لگی۔ میری ... ڑھ کی ہڈی میں عجیب سی ٹھنڈک اترنے لگی جس سے ... را بدن کانپنے لگا۔ پسینہ میرے ماتھے پر نمی بن کے نمودار ہوا۔

"محسن!" میں نے کراہ کے کہا اور صوفے کی پشت کو ... دونوں ہاتھوں سے تھام کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے ایک چکر سا آیا ... ور میں نے سر جھکا کے آنکھیں بند کر لیں۔ ریوالور نیچے گر گیا۔ ... صرف ایک لمحے کی بات تھی۔ دوسرے لمحے نے مجھے ... دشمن کا اسیر کر دیا۔ انھوں نے مجھے اسی طرح اپنی گرفت میں ... لے لیا جیسے گزشتہ شب لیا تھا۔ اس بار انھوں نے زہر ... میں بجھا ہوا تیر استعمال نہیں کیا۔ انھوں نے میرے حواس ... کو لہو کے رنگ سے شکست دی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ یہی ... وہ انمول لہو ہے جس کے ہر قطرے کو میں اپنی زندگی کے ... ماہ و سال سے عزیز تر جانتا ہوں۔

چند گھنٹوں کے فرق سے حالات کا سلسلہ وہیں سے شروع ہوا جہاں سے ستم ظریف تقدیر کی رخنہ اندازی کے ... باعث ٹوٹا تھا۔ جیسے چلتے چلتے فلم ٹوٹ جاتی ہے۔ آزادی ... اور خوش فہمیوں کے طلسم کا یہ وقفہ آٹھ دس گھنٹے سے زیادہ ... نہ تھا۔ اگر ہم چاہتے تو اس مہلت سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ... اور ہم یہ جانتے تھے کہ شکاری گھات میں ہیں۔ اس کے باوجود ... ہم نے اس جگہ اپنے قیام کو بے سبب طول دیا۔ ہم پر لازم ... تھا کہ جیسے ہی جسم کی کارکردگی اطمینان بخش ہوئی تھی، ہم یہاں ... سے فرار ہو جاتے۔ چائے ناشتا اور ڈاکٹر سے گفتگو کرنے ... میں جو وقت ضائع ہوا وہ ہمیں تحفظ کی سرحد تک پہنچا ... سکتا تھا۔

اس مائیکرو بس میں مجھے اور محسن کو الگ الگ بٹھایا ... گیا۔ جب گاڑی روانہ ہو رہی تھی تو میں نے ڈاکٹر کو دو ... نمبروں سے باہر آتے اور اس دیوار کو پھلانگتے دیکھا جو اس ... کی کوٹھی کو ساتھ والی کوٹھی سے جدا کرتی تھی۔

حاجی کے ایک محافظ نے ریوالور اٹھایا ہی تھا کہ حاجی

نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ "اب کوئی ضرورت نہیں۔ خونِ ناحق ہمارا شیوہ نہیں۔"

"وہ پولیس کو فون کرے گا۔"

"کرنے دو میاں، آخر اس کا خسر اتنا بڑا پولیس افسر ہے۔" حاجی نے طنز اور تمسخر آمیز لہجے میں کہا۔

محسن کے ہاتھ پیر انھوں نے پہلے ہی باندھ دیے تھے اور اب ایک شخص وہی خنجر اس کے حلق پہ آہستہ آہستہ پھیر رہا تھا۔ یوں جیسے اس کی دھار تیز کر رہا ہو۔ وہ بار بار میری طرف دیکھ کے مسکراتا تھا اور اس کی مسکراہٹ چیلنج کرتی تھی کہ ہمت ہے تو کچھ کر کے دکھاؤ۔ تم تو خالی ہاتھ بھی کشتوں کے پشتے لگا سکتے ہو۔

حاجی میرے سامنے دوسری سیٹ پہ براجمان تھا۔ ہم دونوں آگے پیچھے کی سیٹوں پہ تھے۔ ایک سیٹ مخالف سمت میں کھڑکی کے ساتھ تھی۔ اس پہ دوسرا شخص ایک نقلی نظر آنے والا پستول لیے بیٹھا ہوا تھا مگر مجھے اس کی نالی میں گولی کی جگہ وہی مفلوج کر دینے والا تیر دکھائی دے رہا تھا۔ چنانچہ میں مزاحمت بھول کے بے حس و حرکت بیٹھا ہوا تھا۔

"اب تم ماشاء اللہ اتنے سمجھ دار ہو۔" حاجی نے مجھے مخاطب کر کے کہا۔ "تمھیں شکر بجا لانا چاہیے اس ربِ کریم کا کہ اس نے تم کو عقل و شعور عطا کیا اور تم پر اپنا فضل و کرم رکھا۔ ورنہ آج یہ بھی ہو سکتا تھا کہ تمھیں وہ اخوان الشیاطین لے جاتے۔ دلاور اور سراج۔"

"تم بھی تو انھی میں سے ہو۔" میں نے کہا۔ "یا تم کوئی نیا ڈراما کرنا چاہتے ہو، مجھے یقین دلانے کے لیے کہ تمھارا اور ان کا تعلق باقی نہیں رہا۔"

"لعنت اللہ علی الکاذبین۔" اس نے بڑی قرأت کے ساتھ کہا۔ "ہم دروغ گوئی سے کام نہیں لیں گے۔ وہ ایک کاروباری تعلق ہے۔ دنیاوی معاملات میں افہام و تفہیم سے کام لینا پڑتا ہے۔ دین اور مسلک میں ان کے اور ہمارے درمیان بُعدِ قطبین ہے۔ ہم تم سے بھی ایک کاروباری معاملے میں مفاہمت چاہتے ہیں، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اگر تم دور اندیش اور دانش مند ہو برخوردار، تو ہم سے معاملہ کر کے فائدے میں رہو گے۔"

"تم جیسے ابلیس سے معاملہ کرنے والا فائدے میں کیسے رہ سکتا ہے؟" میں نے نفرت سے کہا۔

گاڑی ایک بہت وسیع اور صاف ستھری شاہراہ پر

سے گزر رہی تھی۔ میری نظر نے سڑک کے کنارے لگے ہوئے روڈ سائن پر "شہیدِ ملت روڈ" پڑھا۔ اس سڑک پر صرف گاڑیاں آجا رہی تھیں۔ پھر ایک بہت بڑا چوک آگیا جس پر ہر سمت سے پانچ چھ سڑکیں ملتی تھیں۔ اس چوک کے گرد گھوم کر گاڑی دوسری سڑک پر آئی تو مجھے سینٹرل جیل کی بلند دیوار اور واچ ٹاور نظر آئے۔ جیل کی دیوار کچھ دور ساتھ رہی پھر گاڑی ایک اور چوراہے سے سیدھے ہاتھ کی طرف گھوم گئی۔ میں نے چوک سے گزرتے ہی اپنے مقابل تھانہ نیو ٹاؤن کا بورڈ دیکھا۔ سیدھے ہاتھ پر مجھے چند کوٹھیاں دکھائی دیں۔ پھر لیاقت نیشنل لائبریری کی وسیع و عریض مگر ویران عمارت گزری اور اچانک ٹی وی اسٹیشن آگیا۔

"اس راستے کو پہچان لو۔" حاجی نے کہا۔ "ہم تم کو موقع فراہم کر رہے ہیں۔"

اس کے ہاتھ میں ایک تھرماس تھا۔ اس نے ڈبل کپ والے تھرماس کو کھولا۔ "برخوردار سکندرِ اعظم! یہ حقیقت ہے کہ ہمارا ارادہ تم کو نقصان پہنچانے کا بالکل نہیں ہے۔ حالانکہ تمھاری ذات سے ہمیں بارہا نقصان پہنچا۔ دلاور، سراج اور نواب خسرو جمشید سے تمھاری دشمنی کی نوعیت ذاتی اور سیاسی تھی۔ ہم سے تمھاری عداوت فی سبیل اللہ رہی۔ میاں، ہم کسی کی برائی بھلائی میں نہیں۔ اُدھر کا مال اِدھر کرتے ہیں، اِدھر کا اُدھر۔ سارے خطرات مول لیتے ہیں لیکن سوال کوئی نہیں کرتے۔"

اس منافق، دروغ گو اور دوغلے شخص کی مکاری پر میرا خون کھول رہا تھا۔ کتنی ڈھٹائی سے وہ خود کو تمام معاملات سے بے تعلق ثابت کر رہا تھا اور معصوم بن رہا تھا۔ اس شخص کی طرح جو دستِ قاتل میں خنجر تھمائے اور پھر کہے کہ بھئی قتل سے اور قاتل یا مقتول کے معاملات سے ہمیں کیا، کہ کس نے کسے مارا اور کیوں مارا۔ ہم تو کسی کی برائی بھلائی میں نہیں ہیں۔

گاڑی ایک کوٹھی کے کھلے پھاٹک سے اندر چلی گئی۔ گونگے ڈرائیور نے ایک گیراج کے باہر روکا۔ پھر وہ نیچے اترا اور گیراج کے شٹر میں پڑے ہوئے قفل کو کھولنے لگا۔ تھرماس رکھ کے حاجی نے اپنے چغے کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک پاکٹ سائز قرآن مجید نکال لیا۔ "لو میاں! ہمارے اور تمھارے بیچ اللہ کی یہ ضمانت۔" اس نے قرآن مجید کو دونوں ہاتھوں میں سنبھال کے چوما۔ "ہم اس کو گواہ بناتے ہیں کہ تمھارے اور ہمارے درمیان ایک بات اصولی طور پر طے ہوگئی تو ہم تمھیں کچھ نہیں کہیں گے۔ نہ تمھارے بارے میں کسی کو کچھ بتائیں گے۔ اور تم کو آزاد کر دیں گے کہ تم جہاں چاہو جاؤ۔" اس نے قرآن کو واپس جیب میں رکھ لیا اور پھر تھرماس اٹھالیا۔

"یہ لو، چائے پیو۔" اس نے پہلا بڑا مگ بھر کے اپنے لیے نکالا اور دوسرا مگ مجھے تھما دیا۔ یہ تھکن اور نقاہت بھی تھی اور میرے خیالات میں رونما ہونے والی تبدیلی بھی جس نے مجھے وہ کپ لینے پر مجبور کر دیا۔ حاجی نے قرآن اٹھا کے ایک وعدہ کیا تھا۔ وہ لاکھ عیار اور بے ضمیر سہی کوئی بھی مسلمان خواہ اخلاقی طور پر دیوالیہ ہو، عملاً قرآن کو ہاتھ میں لے کر جھوٹ بولتے ہوئے ڈرتا ہے۔ میں یہ بھی جاننا چاہتا تھا کہ حاجی کس معاملے پر بات کرنے کا خواہش مند ہے عقل کا تقاضا تھا کہ میں اس کی بات ضرور سنوں۔ بات کو ماننے یا مسترد کرنے کا اختیار کلی طور پر میرا اپنا تھا۔ اس طرح مجھے مہلت بھی مل رہی تھی اور وقت ہی میری سب سے بڑی ضرورت تھا۔ وقت مل جائے تو میں کچھ سوچ سکتا ہوں، کچھ کر سکتا ہوں۔

"بات بہت مختصر اور واضح ہے برخوردار۔ ہمیں یہ معلوم ہوا ہے کہ تم نے اور تمھارے ساتھیوں نے اسلحہ سمجھ کے سونے سے بھرے ہوئے ٹرک کو سمندر میں غرق کر دیا ہے۔ چوہدری دلاور بھی تم سے یہ معلوم کرنے میں ناکام رہا کہ سونا کہاں ہے۔ تم ہمیں وہ جگہ بتا دو۔ اگر سونا وہاں سے مل گیا تو ہم تمھیں اس بات کی ضمانت دیں گے کہ تمھیں اور تمھارے دوست محسن کو بہ حفاظت کہیں بھی پہنچا دیا جائے۔ ہم جو حلف اٹھا چکے ہیں اس پر قائم رہیں گے۔ بشرطیکہ تم ہمارے ساتھ دغا نہ کرو۔"

گونگے نے گیراج کا شٹر اوپر اٹھا دیا تھا۔ وہ مائیکرو ویگن کو سیدھا اندر لے گیا ۔۔۔ گیراج کی لمبائی اتنی تھی کہ اس میں دو گاڑیاں آگے پیچھے کھڑی کی جا سکتی تھیں۔ دوسری گاڑی پہلے ہی اس میں موجود تھی۔ مائیکرو ویگن کو پیچھے لگا کے گونگا پھر اترا اور اس نے شٹر گرا کے قفل اندر کی جانب لگا دیا۔ گیراج کے اندر ٹیوب لائٹ نہ ہوتی تو اندر اندھیرا ہو جاتا۔ حاجی نے چائے ختم کرلی تھی لیکن وہ بہ دستور اپنی جگہ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے محافظ کتے یا پالتو کتے بھی پوری طرح مستعد تھے۔ یہ اہتمام صاف ظاہر کرتا تھا کہ مائیکرو ویگن کو اسی گیراج میں چھوڑ دیا جائے گا جہاں سے کراچی کی ساری پولیس مل کے بھی اسے تلاش نہ کر سکے گی۔ آگے ہم جہاں بھی جائیں گے، دوسری شیورلٹ امپالا کار میں جائیں گے۔

حاجی کے حکم پر محسن کے زخموں کی مرہم پٹی بھی کر دی گئی تھی اور اس کے ہاتھ پیر بھی کھول دیے گئے تھے۔ محسن کو انھوں نے مجھ پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی ماں پر قابو پانے کے لیے اس کے کمزور شیر خوار بچے کو قبضے میں کر لے۔ میرے مقابلے میں محسن اس لیے کمزور تھا کہ وہ خالی ہاتھوں سے اپنا دفاع کرنا نہیں جانتا تھا اور میرے خالی ہاتھ اس لیے بے مصرف ہوگئے تھے کہ محسن میری جذباتی کمزوری تھا۔

میں نے چائے کا خالی مگ حاجی کے سامنے رکھ دیا۔ فیصلہ میں فوراً بھی سنا سکتا تھا مگر میں نے ظاہر کیا کہ ابھی میں سوچ رہا ہوں۔ حاجی نے مجھے اس کا موقع فراہم کیا اور میرے خالی کیے ہوئے کپ میں تھرماس کی بچی ہوئی چائے انڈیل کر محسن کی طرف بڑھا دی۔ پھر اس نے مجھے سگریٹ اور لائٹر پیش کیے۔

"یہ کوئی بڑی قیمت نہیں ہوگی، تمھاری زندگی اور آزادی کی۔" حاجی نے اپنی کامیابی کے امکانات روشن دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ بات ہمارے اور تمھارے سوا کسی کو معلوم نہیں ہوگی۔"

"دلاور کو بھی نہیں؟" میں نے سگریٹ کی پیشکش کو مسترد کرتے ہوئے کہا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ سگریٹ میں کوئی نشہ آور چیز نہ ڈال دی گئی ہو۔ چائے تو حاجی نے اسی تھرماس میں سے خود بھی ہمارے ساتھ پی تھی۔

"ہم سیدھی صاف بات سننا چاہتے ہیں۔" وہ بولا۔

"سیدھی صاف بات یہ ہے میاں حاجی۔" میں نے اسی کے لہجے میں کہا۔ "کہ تم کیا تمھارا سارا خاندان، تمھارے آبا و اجداد اور تمھاری آنے والی نسلیں، سب ہزار بار قرآن پر حلف اٹھا کے تمھارے قول کی ضامن ہوں تب بھی میں تم پر اعتبار کرنے والا نہیں، لیکن بہ فرضِ محال یہ ممکن ہوتا تب بھی تمھارے مطالبے پر کسی قسم کی مفاہمت کرنا اتنا ہی ناممکن ہوتا جتنا تمھارا اس کاروبار سے تائب ہو کے اپنا سب کچھ ملک و قوم کے لیے وقف کرنا یا ہمارا اس مشن کو چھوڑ کے تمھارے کاروبارِ وطن فروشی میں شریک ہو جانا۔"

حاجی کا چہرہ خفت اور غصے سے سرخ ہوگیا۔ "ہم جانتے تھے میاں کہ تم ہو گتے کی دُم۔ ہم نے کب کہا تھا کہ تم وہ سب چھوڑ دو جو تم کر رہے ہو۔ اس سونے کی کسی کو کانوں کان ... ہمیں صرف وہ جگہ دکھا دیتے۔"

"حاجی، تم واقعی چالاک احمق ہو۔" میں نے کہا۔ "کیا تم واقعی ہم سے یہ توقع رکھتے تھے کہ ہم وہ سونا تمھارے حوالے کر دیں گے اور اس کے بدلے تم سے اپنی زندگی کا سودا کریں گے۔ ہماری تو ایک جان ہے۔ اس سونے کی ہلاکت خیزی تو کسی ایٹم بم سے بھی زیادہ ہے۔ وہ سونا تمھارے ذریعے علیحدگی پسندوں، باغیوں اور تخریب کاروں تک پہنچے گا تو اس سے ہزاروں نہتے، بے گناہ اور محبِ وطن پاکستانی نوجوانوں، عورتوں اور بچوں کے لیے موت کا سامان بن جائے گا۔ وہ طاقت بن جائے گا جو دُنیا کے بازار میں سکۂ رائج الوقت ہے۔ ایک انٹرنیشنل کرنسی ہے جس کے بدلے میں گولیاں اور بم، بارودی سرنگیں اور راکٹ لانچر، ٹینک اڑانے والے ڈائنامائیٹ اور خودکار بندوقیں سب مل جائیں گے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ میں اپنے ہی ہم وطنوں کی موت کا یہ بلینک چیک تمھارے حوالے کر دوں۔ ان کو بچانے کی جدوجہد چھوڑ کے میں ان کے بے گناہ لہو کی تجارت کرنے لگوں؟"

حاجی نے میرے منہ پر اُلٹے ہاتھ کا چانٹا مارا۔ "بدبخت، ابھی تیرے جذبات کی سرکشی باقی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم نے ایک جھوٹا وعدہ کیا تھا۔"

"ملعون حاجی!" میں نے اس کے منہ پر تھوک دیا۔ "اللہ کی مقدس کتاب کو تو بخش دیتا۔"

اس نے کندھے پر پڑے ہوئے سبز رومال سے چہرہ صاف کیا اور بولا۔ "کس کافر نے قرآن پر حلف اٹھایا تھا۔ یہ دیکھو، یہی تھی نا وہ کتاب۔" اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کے وہی کتاب نکالی جس کو میں نے قرآن مجید مان لیا تھا۔ وہ درحقیقت گہرے سبز رنگ کی جلد والی ایک ڈائری تھی جس کے اوپر سنہرے حروف میں عربی رسم الخط میں ناشر کا نام لکھا ہوا تھا۔ اس کے زریں حاشیے کے وسط میں جو طغریٰ سا بنا ہوا تھا، اس میں بھی سال نو مبارک اس طرح لکھا ہوا تھا کہ نقش و نگار مبہم تھے اور عبارت ایک نظر میں پڑھی نہیں جاتی تھی۔ بلاشبہ اس ڈائری کو قرآن کے جیبی نسخے سے مشابہ بنانے والے کی شیطانی فطانت افسوس ناک تھی۔ شاید خود حاجی نے اس ڈائری کو اپنے شیطانی مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ بنانے والے نے تو ایک خوبصورت ڈائری ڈیزائن کی تھی۔ اور اس کے ذہن میں دور دور تک یہ خیال نہ ہوگا کہ وہ کسی گناہ کا مرتکب ہو رہا ہے۔ نہ اس نے سوچا ہوگا کہ مسلمانوں کے درمیان کوئی حاجی کہلانے والا ایسا حاجی بے دین بھی ہوگا جو اس ڈائری کا ناجائز استعمال یوں بھی

کرے گا۔

"ہزار بار لعنت ہو تم پر کہ تم نے اس کتابِ مقدس کے نام پر دُنیا کے سامنے ہزار بار حلف اٹھایا۔ اسے اپنا اعتبار قائم کرنے کے لیے استعمال کیا اور بدعہدی کرنے کے بعد خود کو یہ دھوکا دیا کہ تم نے کوئی گناہ نہیں کیا۔" میں نے ڈائری اس کے مُنہ پر کھینچ ماری۔

محسن بالکل خاموش تھا۔ شاید اسے شدت سے یہ احساس تھا کہ اس کی وجہ سے میں ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوا اور یہ اس کی کمزوری تھی جو میری کمزوری بنی ہوئی ہے۔

اچانک مجھے یوں لگا جیسے ٹیوب لائٹس کی روشنی مدھم پڑگئی ہے۔ اندھیرے میں ہر چیز دھندلا گئی۔ میں نے سر کو جھٹکا۔ روشنی ذرا سی دیر کے لیے پھر آئی۔ میں نے حاجی کے خباثت سے مسکراتے چہرے کو دیکھا۔ وہ چہرہ ساکت نہیں تھا۔ آہستہ آہستہ ایک دائرے میں حرکت کرنے لگا تھا پھر ایک چہرے کے کئی چہرے بن گئے۔ سب اس دائرے میں گھومنے لگے۔ میں آگے جھکا اور میرے کانوں نے حاجی کا مکروہ قہقہہ سنا۔ میں نے سر اٹھانا چاہا مگر سر کسی چٹان کی طرح بھاری تھا جو مجھے نیچے کھینچ رہی تھی۔

میرے ذہن میں آنے والا آخری خیال یہ تھا کہ حاجی نے دوبارہ مجھے زہر دے دیا ہے۔ اور یہ زہر یقیناً چائے میں تھا بے شک اس نے میرے لیے اسی تھرماس میں سے چائے انڈیلی تھی مگر کپ جُدا تھے اور زہر شاید میرے والے کپ کی سطح پر تھا جو چائے میں حل ہو گیا تھا۔

بے ہوشی کا یہ وقفہ کب ختم ہوا اور کتنی دیر جاری رہا اس کا اندازہ بھی میرے لیے مشکل ثابت ہوا۔ جہاں میں نے آنکھ کھولی وہاں رات کا اندھیرا تھا۔ متحرک اور زیر و زبر ہوتا اندھیرا۔ میں اس اندھیرے کے دریا کی متلاطم موجوں میں بہہ رہا تھا اور اوپر نیچے ہوتا نہ جانے کس سمت میں رواں تھا۔ میں نے کئی بار آنکھیں کھولیں اور پھر بند کر لیں، یہ سمجھ کر کہ تلاطم کا یہ فریب میرے حواس کی پیداوار ہے اور ابھی تک میں پوری طرح ہوش میں نہیں آیا ہوں۔

لیکن یہ سراب نہیں حقیقت تھی۔ میں ایک تاریک، ہموار سطح پر لیٹا ہوا تھا۔ گھپ اندھیرے میں میری نگاہ کچھ نہیں دیکھ سکتی تھی لیکن اس میں شک کی کوئی بات نہیں تھی کہ میں کسی بحری جہاز یا لانچ پر ہوں جو سمندر میں رواں ہے۔

میں نے آہستہ سے محسن کو پکارا۔ "محسن...!" مگر جواب صرف میری خاموشی نے دیا۔ یہ عجیب بات تھی کہ سمندر میں ہونے کے باوجود میں سمندر کی آواز سننے سے قاصر تھا اور وہ شور بھی مفقود تھا جو کسی لانچ یا بحری جہاز کے انجن سے پیدا ہوتا ہے۔

فرش پر ہاتھ پھیلا کے میں نے اندازہ کرنا چاہا کہ اس قید خانے میں محسن ہے یا نہیں۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ اس کی بے ہوشی ابھی باقی ہو۔ آہستہ آہستہ میں نے گھٹنوں کے بل چلتے ہوئے اور ہاتھوں کو اندھیرے میں پھیلاتے ہوئے اپنے زنداں کی وسعت کو دیکھا۔ پھر مجھے یہ احساس بھی ہوا کہ میرے جسم پر کوئی لباس نہیں۔ اس کمرے یا کیبن میں میرے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کی چاروں دیواریں سپاٹ تھیں اور ایک دیوار سے دوسری دیوار تک میرے اندازے کے مطابق آٹھ نو فٹ کا فاصلہ تھا۔ ڈولتے ہوئے فرش کی سطح پر کھڑا ہونا آسان نہ تھا مگر میں نے ایک دیوار کو تھام لیا۔ اور اپنا ہاتھ سر سے اوپر اٹھایا۔ چھت بھی میری دسترس میں تھی، فرش سے آٹھ نو فٹ اوپر، لیکن عجیب بات یہ تھی کہ لکڑی کے اس کیبن کی چھت شیشے جیسی تھی۔ اس کی چاروں دیواروں پر پلائی ووڈ کے پینل تھے، لمبی افقی لکیروں والے۔ اس کا فرش بھی لکڑی کا تھا۔ عموماً لانچوں اور بحری جہازوں میں لوہے سے زیادہ لکڑی کا استعمال کیا جاتا ہے، خصوصاً اندرونی حصّوں کی دیواروں کو موسمی اثرات سے محفوظ رکھنے کے لیے۔ پرانی، سال خوردہ سمندر کے پانی کی برداشت کر جانے والی لکڑی جو نمی کے زنگ اور دیمک وغیرہ سے متاثر نہیں ہوتی اور لوہے کے مقابلے میں ہلکی بھی ہوتی ہے۔

محسن اس قید خانے میں میرے ساتھ نہیں تھا۔ اسے علیحدہ رکھنے کی مصلحت وہی جانیں جو ہمیں یہاں لائے تھے۔ اور اب نہ جانے کہاں لے جا رہے تھے۔ ایک لمحے کے لیے مجھے یہ خیال بھی آیا کہ کہیں یہ "ایس ایس کرانتی کماری" تو نہیں۔ ناممکن کچھ بھی نہیں تھا۔ لیکن میں حاجی عبداللہ کے مطالبۂ زر کو [illegible] تھا تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

ہم نے سونے سے بھرا ہوا ٹرک کورنگی کے قریب سمندر میں غرق کیا تھا اور اس صدمے نے دلاور کو تقریباً پاگل کر دیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ دیوالیہ ہو جائے گا۔ اب حاجی عبداللہ اپنے طور پر اس سونے کی بازیابی چاہتا تھا۔ اور کسی طرح سراغ لگانے میں بھی کامیاب ہو گیا تھا۔ ہمارا اعتماد حاصل کرنے کی ایک کوشش میں ناکامی کے بعد وہ حوصلہ نہیں ہارا تھا۔ اتنا بڑا کھیل وہ اتنی جلدی کیسے ختم کر دیتا۔ وہ مالِ حرام پر غاصبانہ قبضے کا سنہرا خواب نہ جانے کب سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی تعبیر ہم دے سکتے تھے اور شاید اس نے دلاور اینڈ کمپنی کو بے خبر رکھتے ہوئے اپنے شکاری کتوں کو ہمارے تعاقب میں چھوڑ دیا تھا کہ جیسے بھی ممکن ہو، ان کا پتا چلاؤ اور دیکھو، خبردار! ان کو زندہ و سلامت بخیر و عافیت لانا ہے۔ کیونکہ وہی اس گمشدہ خزانے کی کلید ہیں۔ بردہ فروشی کے اس کاروبار میں کوئی کسی کا یار نہیں تھا اور ان کے درمیان کوئی اخلاقی یا اصولی معاہدہ اہمیت نہیں رکھتا تھا۔

کیبن کے اندر نہ سردی تھی اور نہ گرمی۔ اس میں کہیں نہ کہیں ہوا کے انخلا کا نظام بھی پوشیدہ تھا۔ اور تازہ ہوا کے لیے بھی کوئی راستہ ضرور تھا۔ شاید انھی لکڑی کی دیواروں کے ڈیزائن میں ہوا کی نالیاں ہوں یا کسی گوشے میں جالیاں ہوں۔ ہوا اوپر سے آتی ہو۔

مگر اوپر تو چکنی سطح تھی، سخت اور پالش کی ہوئی۔ میں نے اسے دوبارہ چھو کر دیکھنا چاہا۔ چھت میں سنگِ مرمر یا شیشہ چہ معنی دارد۔ چھت میرے ہاتھوں کی پہنچ سے چند انچ دور تھی۔ میں نے ایڑیوں پر بلند ہو کے اسے چھو لیا۔ اس بار مجھے قطعی شک نہ رہا کہ چھت میں شیشہ لگا ہوا ہے۔

میں اندھیرے کی پناہ میں تھا اور تنہا تھا، چنانچہ مجھے اپنے بے لباس ہونے کا احساس زیادہ پریشان نہیں کر رہا تھا۔ یہ ہمیشہ سے اسیر رکھنے والوں کا وتیرہ رہا ہے کہ اسیروں کو خود اپنی نظر سے گرا دو۔ ان کو جسمانی اذیت سے زیادہ ذہنی عذاب دو اور ان کو نفسیاتی طور پر شکست کے احساس سے دوچار رکھو۔ لباس ہر مہذب آدمی کے لیے عزتِ نفس کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ وہ لباس سے بھی اپنی شخصیت کا اظہار کرتا ہے اور اس کی ذات کی تکمیل لباس کے بغیر نہیں ہوتی۔ خلوت میں بھی وہ خود کو ادھورا سمجھتا ہے محفل میں یا سرِ بازار تو اس سے زیادہ ذلت کا تصور ہے نہیں کہ بیسویں صدی کے معاشرے میں انسانوں کو کسی جانور کی طرح پیش کر دیا جائے۔

یہی وجہ تھی کہ جب اس کیبن میں اچانک روشنی نے جھانکا تو میں چونک پڑا۔ اور پھر ایسے سمٹ گیا جیسے کسی نے میرے غسل کے دوران میں لات مار کے غسل خانے کا دروازہ توڑ دیا ہو۔ میں بے اختیار گھٹنوں میں سر دے کے اور دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھ گیا۔ روشنی اوپر سے اتری تھی۔ اسی شیشے کی چھت سے جسے میں نے محض چھت سمجھا تھا۔ اب وہ روشنی کا ایک مستطیل بن گئی تھی۔

آہستہ آہستہ میں نے سر اوپر اٹھا کے دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے میری آنکھوں کے سامنے کوندا سا لپکا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے بہت زیادہ قوت رکھنے والی بجلی کا جھٹکا میرے دماغ کو مفلوج کر گیا ہے۔ شاید پاگل خانے میں ان ذہنی مریضوں کو ایسی ہی اذیت ہوتی ہو گی .... جن کو سزا یا علاج کے لیے بجلی کے [illegible] جھٹکے دیے جاتے ہیں۔

ڈرتے ڈرتے میں نے پھر آنکھیں کھولیں اور اس بار خوف اور دہشت کے ساتھ شدتِ جذبات کی دیوانگی نے مجھے مغلوب کر لیا۔ میں دیوانہ وار چلایا۔ "رابعہ!"

شیشے کی شفاف، روشن چھت کے اوپر ایک اتنے ہی بڑے کمرے میں رابعہ کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے سامنے بیڈ تھا اور دائیں جانب مختصر سی سنگھار میز۔ اس نے پیروں کو بیڈ تک پھیلا لیا تھا۔ اور وہ بڑے انہماک سے گود میں رکھی ہوئی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ کمرے میں ایک دروازہ باہر جانے کے لیے تھا، جو بند تھا۔ دوسرا دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا اور شاید باتھ روم کا دروازہ تھا۔ رابعہ کے سیدھے ہاتھ پر سنگھار میز تھی جس کے اوپر ایک پورٹیبل ٹرانسسٹر ریڈیو بھی رکھا ہوا تھا۔ وہ کچھ کھا رہی تھی۔ پھر وہ کتاب رکھ کے اٹھی۔ اس نے میز پر رکھے ہوئے ریڈیو کو بند کیا۔ یا شاید اس کی آواز کم زیادہ کی۔ میں تو صرف مکمل خاموشی میں اس کو اور اس کی حرکات و سکنات کو ایسے دیکھ سکتا تھا جیسے سینما کے روشن پردے پر خاموش فلم چل رہی ہو۔ کوئی آواز میرے کانوں تک پہنچ ہی نہیں سکتی تھی۔

رابعہ نے باتھ روم کا دروازہ بند کیا جو [illegible] کی مسلسل حرکت کے باعث جھول رہا تھا۔ اور بار بار کھل جاتا تھا۔ اس نے ایک بار اسے آہستہ سے اور پھر زیادہ قوت سے اپنی طرف کھینچ کے بند کیا۔ دروازے کے یوں چوکھٹ سے ٹکرانے کی آواز کم نہ ہو گی مگر میں نے آہٹ تک نہ سنی۔ دروازے کی کنڈی شاید ٹوٹی ہوئی تھی کہ رابعہ نے دروازے کو اس کے حال پر چھوڑا اور مُنہ بناتی واپس آئی۔ کتاب درمیان سے کھلی ہوئی بیڈ پر الٹی رکھی تھی۔ پھر کرسی

پر بیٹھ کے اس نے کتاب اٹھائی اور مطالعے میں مصروف ہوگئی۔ اس کا دایاں ہاتھ بار بار کسی پلیٹ کی جانب جاتا تھا۔ نہ جانے وہ کیا چیز تھی جس کو وہ دانہ دانہ کر کے منہ میں ڈالتی جا رہی تھی۔

میں گردن اٹھائے محویت اور بے خودی کے عالم میں اسے گھورتا رہا۔ فراق کی کتنی پُرخار راہوں کی مسافت طے کر کے، ہجر کے کتنے دکھوں کے انگاروں پر چل کے، جدائی کی کتنی کٹھن ساعتوں کو جھیل کے میں یہاں تک آگیا تھا۔ صحرا صحرا بھٹکنے والے شہزادے نے یکلخت آنکھ کھولی تو خود کو اس جادو کے محل میں پایا جہاں اس کے خوابوں کی شہزادی خوابیدہ تھی۔ اب وہ اسے دیکھ رہا تھا لیکن اس کا وجود پتھر ہوگیا تھا۔ وہ ایک قدم آگے نہیں جا سکتا تھا۔

وہ میرے سامنے تھی۔ میرے اور اس کے درمیان دس فٹ کا فاصلہ بھی نہیں تھا۔ دس ماہ کی دوری میرے لیے دس صدیوں کے عذاب پر محیط تھی مگر اب اس کے اور میرے درمیان زنداں کی بے حس دیواریں حائل ہوگئی تھیں۔ میرے پیروں میں مجبوری کی زنجیر تھی۔ اپنی حالت پہ خجالت اور شرمساری تھی جس نے مجھے دیوانگی کا پیکر بنا رکھا تھا۔

یہ ایک خواب کا منظر تھا۔ ایسے بہت سے خواب میری یادوں کی البم میں سجے ہوئے تھے، جب اس نے اپنی دید سے میری ترسی ہوئی آنکھوں کی پیاس بجھائی تھی۔ آج پھر میں اسے دیکھ رہا تھا۔ یہ حقیقی رالعہ تھی۔ آرزو کے خواب کا پیکر نہیں تھی۔ مگر اس میں اور نقش خیال میں کیا فرق تھا۔ نہ یہ میرے اختیار میں نہ وہ خواہشوں کے حصار میں۔ میں صرف اس کے قرب کی آرزو کر سکتا تھا۔ اسے چھونا اس کے وجود کی مہک کو سمیٹنا اور اس کے پیار کی ٹھنڈک میں ڈوب کے اس آگ کو سرد کرنا جو میرے تن کے ویرانے میں بھڑک رہی تھی، ناممکن تھا۔

وہ آج بھی پہلے کی طرح تھی۔ نہیں، یہ تو وہ تصویر تھی جو دل کے آئینے میں ماہ و سال کی رنگ آمیزی سے محفوظ پڑی تھی۔ حقیقت کا عکس زیادہ نظر نواز تھا۔ دس ماہ میں اس کے حسن کی تابکاری اتنی ہی بڑھ گئی تھی جتنی دس دن میں نئے چاند کی روشنی بڑھ جاتی ہے۔ اس کے سراپا کی رعنائی میں نئی بہار کی روشنی جھلکتی تھی۔ جیسے ہر لمحہ گزرتے ہوئے اس کے حسن کو نکھار دے گیا ہو۔ وہ ہلکے زرد رنگ کی قمیص پہنے ہوئے تھی جس کے گول گلے سے اس کی گردن کی نازکی اور جلد کی سنہری رنگت عیاں تھی۔ آدھی آستین والی قمیص سے اس کے گدرائے ہوئے بازو، اس کی پُشت پر توجہ سے لہراتے گیسو اور اس زلف کی موہوم گھنی چھاؤں میں جھلملاتا ہوا آویزہ۔

اس کے جلوۂ ناز نے شوقِ دیدار کو بالآخر تمنا کی اس منزل تک پہنچا دیا جہاں اسے پانے کی دیوانگی میری عقل پر غالب آگئی۔ اب میں چاہتا تھا کہ اس شفاف سطح سے گزر کے اس تک پہنچ جاؤں۔ شیشے کی اس افقی دیوار کو ریزہ ریزہ کر کے اسے یوں کھینچ لوں کہ وہ خود بخود میری بانہوں میں آگرے۔ میں اس کی آواز سننا چاہتا تھا۔ اس سے وہ سب کہنا چاہتا تھا جو میرے دل میں غبار بن کے بھر گیا تھا۔ اب اسے دیکھا تو یہ غبار پھیلنے لگا۔ میرے سینے میں اس غبار آرزو کا دباؤ بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ ساری طنابیں ٹوٹ گئیں۔ ہر احساس مٹ گیا۔ سوائے اس کے عشق کی وارفتگی کے۔

"رالعہ!" میں نے کھڑے ہو کر اور چیخ کر کہا۔ "رالعہ ادھر دیکھو، میری طرف دیکھو رالعہ! تم سن رہی ہو میری آواز؟ کیوں نہیں سن رہی ہو؟ تمہارا دل تم سے کچھ نہیں کہتا کہ سنو یہ کون ہے جو اندر سے پکارتا ہے، دل کی دھڑکن میں بولتا ہے۔ رالعہ، یہ میں ہوں تمہارا اسکندر... رالعہ...! رالعہ...! رالعہ...!"

میں پاگلوں کی طرح چیخ چیخ کر اسے متوجہ کرنے کی بیکار کوشش کرتا رہا۔ وہ اسی سکون سے کتاب پر نظریں جمائے کرسی کی پشت کا سہارا لیے بیٹھی رہی۔ دیواروں نے میری آواز کو بھی قید کر لیا تھا۔ اس کے اندازِ بے نیازی نے میرے شوق کی دیوانگی کو اور بڑھا دیا۔ میں اوپر کی جانب اچھلنے لگا۔ میں اپنے اور اس کے درمیان اس بے وجود فصیل کو گرا دینا چاہتا تھا جو مجھے اس کے جمالِ شعلہ ساماں کی تابانی تو دیتی تھی مگر اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ میں اس شیشے کی شفاف چھت کو توڑنے کی کوشش میں اپنے خالی ہاتھوں کی قوت کو استعمال کرنا چاہتا تھا۔ مجھے اپنے ہاتھوں کی ضرب کاری پر بھروسا تھا۔ شیشہ کیا اگر اس کی جگہ اینٹ چونے کی دیوار بھی ہوتی تو میں اسے گرا دیتا۔ میرے شوق کی وحشت نے مجھے اس سے کہیں زیادہ طاقت عطا کر دی تھی، لیکن وائے بدنصیبی، نارسائی۔ میرے ہاتھ بمشکل لبِ بام تک پہنچتے تھے۔

میں نے ادھر اُدھر دوڑ کے دیواروں پر قدم جمائے اور چھت تک پہنچ کے شیشے پر مُکے مارنے چاہے، لیکن میری ساری کوشش رائیگاں گئی۔ میں اس جگہ تک بھی پہنچا جہاں وہ عین اوپر تھی اور میں اس کے پیروں کے گلابی تلوؤں سے صاف دیکھ سکتا تھا۔ میں نے جست لگائی مگر صرف ان قدموں کے نیچے کی سطح کو چھو سکا۔ میں اسے متوجہ کرنے کے لیے اپنا ہاتھ یا اپنا سر اس شیشے کی دیوار سے نہ ٹکرا سکا۔

بالآخر میں تھک کر گر گیا اور فرش پر گر کے ہانپنے لگا۔ میری آواز بیٹھ گئی تھی۔ اور میں پسینے میں شرابور تھا لیکن میری نظریں اسی پہ جمی ہوئی تھیں۔ اور میں اب بڑی دردمندی سے اسے پکار رہا تھا۔ کانوں سے نہ سہی، احساس سے تو میری آواز کو پہچانو، میرے قرب کو... جذبات کی زبان میں تو سمجھو۔ کہاں ہیں وہ سب جو کہتے ہیں کہ دل سے دل کو راہ ہوتی ہے۔ ٹیلی پیتھی اور خیالوں کی فریکوئنسی کے ایک ہو جانے کی باتیں کرنے والے۔ جو سیکڑوں ہزاروں میل کی دوری سے احساس کی ہم آہنگی پیدا ہو جانے کے معجزوں پر یقین رکھتے ہیں۔ یہاں میں اس کے اتنے قریب ہوں اور میرے وجود کا ذرہ ذرہ اسے پکارتا ہے مگر وہ نہیں سنتی، آخر کیوں؟ میرا عشق خام ہے یا اس کا دل ابھی تک دس ماہ کے ہجر کی مسافت پر احساس سے بیگانہ ہے؟

پھر مجھے خیال آیا کہ وہ اس شیشے کی زمین پر نظر کیوں نہیں ڈالتی جس پر اس کا نقش استوار ہے۔ یہ مانا کہ وہ روشنی میں ہے اور میں اندھیرے تہ خانے میں مقید ہوں، مگر پھر بھی کیا اسے کچھ نظر نہیں آتا۔ تھوڑی بہت روشنی تو اس کے قدموں کے نیچے بھی ہے۔ وہ مجھے واضح طور پہ نہ سہی میرا سایہ تو متحرک دیکھ سکتی ہے۔ کیا اسے معلوم نہیں کہ جہاں وہ ہے اس کے نیچے سمندر کی موجیں نہیں، ایک خلا ہے۔ ہاں یہی بات ہوگی۔ وہ صرف اوپر اور دائیں بائیں دیکھ سکتی ہے۔ اس کی حدِ نگاہ دیواروں تک ہے اور یہ شیشہ جو مجھے شفاف نظر آتا ہے، اسے ایک ٹھوس سطح کی طرح لگتا ہوگا۔

اس شیشے میں روشنی کا گزر یک طرفہ ہوگا۔ یہ پولرائزڈ گلاس ہوگا۔ وہ شیشہ جس میں سے نگاہ صرف ایک طرف دیکھتی ہے۔ دوسری طرف سے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ ایسا شیشہ بہت سی عمارات کی بیرونی ساخت میں استعمال ہوتا ہے۔ کھڑکیوں میں جو باہر کی طرف کھلتی ہیں اور بالکونیوں میں۔ ماؤنٹ ٹاپ اور ہل ٹاپ ریسٹورنٹ جہاں سے ہر طرف کا نظارہ کیا جا سکتا ہے، وہاں ایسے شیشوں کی دیواریں تحفظ فراہم کرتی ہیں۔ یہ احساس دیتی ہیں کہ باہر کی دنیا کی نظر انھیں نہیں دیکھ سکتی جو دنیا کے درمیان رہ کے بھی اپنی خلوت برقرار رکھنا چاہتے ہوں۔

یہ بڑا مایوس کن خیال تھا۔ پاگل کرنے والے جذبات کا پہلا طوفانی ریلا گزر چکا تھا۔ اب میں نے پھر خود کو سنبھالا اور صورتِ حالات کا جائزہ لیا۔ روشنی میں کمرے کے خدوخال بھی زیادہ واضح ہوگئے تھے۔ بظاہر دیواریں ایک سی تھیں اور کوئی جوڑ کسی دروازے کی نشاندہی نہیں کرتا تھا مگر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ میرا وجود کسی راستے کے بغیر اس زنداں میں پہنچ گیا ہو۔

میں نے دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پلائی وڈ کے ہر تختے کی لکیر کو غور سے دیکھا جو فرش سے چھت تک ایک دوسرے کے متوازی تھیں اور ان میں کہیں کوئی فرق نہیں تھا۔ اتنا تو میں نے معلوم کر لیا کہ انہی جھریوں میں وہ مسام ہیں جو تازہ ہوا کی فراہمی کے ضامن ہیں۔ پھر ایک جگہ مجھے لکڑی کی جھری نسبتاً چوڑی اور ناہموار سی محسوس ہوئی۔ میں نے اس تختے کو دبا کے دیکھا۔ تختہ نیچے سے اوپر تک ہل گیا۔ یہ ایک کونا تھا جس میں فرش سے چھت تک دو فٹ چوڑا دروازہ بڑی مہارت سے بنایا گیا تھا مگر مسلسل استعمال کے بعد تھوڑا سا فرق پڑ جانا تو لازمی تھا۔

اس دریافت نے مجھے کچھ خود اعتمادی عطا کی۔ میں نے دروازے پر زور زور سے ہاتھ مار کے چلانا شروع کیا۔ "حاجی، اُلو کے پٹھے، سؤر کے بچے، کُتے کی اولاد۔" میں نے کوئی جواب نہ پا کے دروازے پر زیادہ قوت سے مُکے مارے اور اسے زیادہ فحش گالیاں دیں، مگر میری یہ کوشش بھی لاحاصل رہی۔ ان لکڑی کی دیواروں کے پیچھے فولادی چادریں تھیں۔ لکڑی نے بدصورتی کو چھپایا تھا اور انسولیشن کی تھی۔

ایک بار پھر میں تھک کے لیٹ گیا۔ میرے سر کے اوپر وہی جادوئی منظر تھا۔ رالعہ کسی شہزادی کی طرح محوِ استراحت تھی۔ اس نے ایک تکیہ دُہرا کر کے اپنے سر کے نیچے رکھ لیا تھا۔ وہ اب کوئی کتاب نہیں پڑھ رہی تھی بلکہ صرف موسیقی سُن رہی تھی۔ اس کا اندازہ مجھے اس کے پیروں کی حرکت سے ہوا۔ وہ غیر ارادی طور پر کسی گیت کی لے اور تال کا ساتھ دے رہی تھی۔ رالعہ کا بیڈ ایک کنارے پر تھا۔ چنانچہ مخالف سمت کے گوشے سے ہی میں اس کو واضح طور پر دیکھ سکتا تھا۔ زیادہ قریب ہونے سے وہ آؤٹ آف فوکس ہونے لگتی تھی۔ ٹھیک اس کے بیڈ کے نیچے میں کچھ نہ دیکھ پاتا۔ چنانچہ میں دور دور سے اس کو گھورتا رہا۔ حیوانوں سے بدتر حالت میں... ایک حیوانِ ناطق ہونے کا دعویدار، جو رالعہ کا پرستار تھا، اس مختصر کمرے میں کسی پاگل

کُتّے کی طرح بند کر دیا گیا تھا۔
مجھے رابعہ کو دیکھ دیکھ کر طیش آنے لگا۔ کیسی بے فکری سے لیٹی گانے سن رہی ہے۔ اُلو کی پٹھی، ذرا اثر نہیں اس پر مجھ سے جُدائی کا۔ کوئی غم نہیں میرا۔ کوئی فکر نہیں کہ میں کہاں ہوں اور کس حال میں ہوں۔ چہرے پر کیا بشاشت اور تازگی ہے، جیسے تقدیر سے کوئی شکوہ نہیں۔ دن عید ہیں تو راتیں شب برات اور راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔
مجھے وہ وقت بھی یاد آیا جب رابعہ نے مجھے صاف بتا دیا تھا کہ وہ آزمائشوں کے اس سفر میں اور زیادہ ثابت قدم نہیں رہ سکتی۔ اور اپنی تمام عمر ایک خواب کی تعبیر کے سراب کا تعاقب کرتے نہیں گزار سکتی۔ کون جانے وہ دن آئے نہ آئے، جب ناامیدی اور خوف کے سایوں کی رات ڈھلے اور ارمانوں کی صبح کا سورج نکلے۔ اس نے مجھے صاف کہہ دیا تھا کہ میں اسے بھول جاؤں۔
بے شک اس کے بعد یہ وضاحت بھی کر دی تھی کہ وہ سب ایک ضرورت کے تحت اور ہمارے فائدے کے لیے کیا گیا تھا مگر اس کے بعد کیا ہوا؟ کیا اس نے مجھ سے ملنے کی کوئی کوشش کی۔ اس کے لیے کچھ بھی ناممکن نہیں تھا۔ کیونکہ وہ کسی کی قید میں نہیں تھی۔ وہ میرا سراغ بھی لگا سکتی تھی لیکن وہ مجھ سے بلکہ ہم سب سے دور رہی۔ اپنی مجبوری کو عذر بنا کے پیش کرتی رہی۔ حالانکہ ایسی کوئی مجبوری تھی ہی نہیں۔ اب سمجھ میں آتا ہے کہ وہ کیا مجبوری تھی۔ یہ پُرسکون، عیش کی زندگی اس کی مجبوری بن گئی تھی۔
اسے کیا پڑی تھی کہ ہمارے ساتھ در بہ در ہو، خطرات میں شریک رہے اور زندگی کا سب سے خوبصورت دور اس جدّوجہد کی نذر کر دے جس کا حاصل محض پریشانی اور خانہ خرابی ہو۔
دروازہ آہستہ سے کھلا تو میرے اشتعال انگیز خیالات کی رَو ٹوٹ گئی۔ یہ خیالات بھی مایوسی کی انتہا کا ردِّعمل تھے۔ اگر رابعہ مجھے مل جاتی تو میں سارے گلے شکوے بھول جاتا۔ میرے ذہن میں انتشار پیدا کرنے والا کوئی خیال ہی نہ آتا۔
اس وقت میں ذہنی عدمِ توازن کا شکار تھا، جب خاموشی سے عبداللہ اندر آ گیا۔ میں اسے دیکھتے ہی گالیاں بکتا ہوا اٹھا اور کسی باولے کُتّے کی طرح اس پر حملہ آور ہوا۔ اس کے ساتھ آنے والے دو ہٹے کٹے مشٹنڈے ملازموں نے مجھے دھکیل کر دور پھینک دیا۔ میں دیوار سے ٹکرا کے واپس آیا۔
"آؤ، سب سامنے آؤ۔ ایک ایک کو پُرزہ پُرزہ کر دوں تو میرا نام بھی سکندر بخت نہیں۔" میں نے جوڈو کراٹے کی پیشہ ورانہ مہارت کو بروئے کار لانے کی تیاری کی۔
"سکندر، کیا تم رابعہ سے ملو گے؟" حاجی نے نرمی سے کہا۔ میری نظر ایک دم اوپر گئی۔ رابعہ نے بال کھول لیے تھے اور وہ لباس بدلنے کی تیاری کر رہی تھی۔ حاجی کے سوال نے یکلخت میری ذہنی رَو کو پلٹ دیا تھا۔ کسی وحشی خونخوار حیوان سے میں ایک دم پالتو جانور بن گیا۔ میری تمام سرکشی کافور ہو گئی۔
"حاجی صاحب، آپ کو اللہ رسولؐ کا واسطہ۔" میں نے لجاجت سے کہا۔
"نہ میاں، نہ۔" حاجی نے تسبیح گھماتے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگا کے کہا۔ "یہ دُنیاوی معاملات ہیں۔ اللہ رسولؐ کو ان سے دور رکھو۔ یہاں نقد سودا ہوتا ہے۔ اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے۔"
"اچھا آپ جو کہیں گے، میں کروں گا۔ بس رابعہ مجھے دے دیں۔" میں نے اس کی منت کرتے ہوئے کہا۔
"بہت خوب!" حاجی نے طنز سے کہا۔ "اگر ہم کہیں کہ اپنا مسلک اور دین چھوڑ دو، اپنے اصول اور عقائد، نظریات اور وفاداریاں بدل لو۔"
"میں یہ سب کروں گا۔ میں قسم کھاتا ہوں۔"
"رہنے دو میاں۔ تم ابھی دیوانے نہیں ہوئے ہو، مگر دیوانگی کا کھیل خوب کھیلتے ہو۔" حاجی نے طنز سے کہا۔ "وہ کیا ... [illegible] فارسی میں کہ دیوانہ بکارِ خویش ہوشیار۔ تو تم ماشاءاللہ بڑے ہوشیار ہو، مگر ہم بھی اتنے گاؤدی نہیں ہیں جتنا تم نے سمجھ رکھا ہے۔ سیدھی صاف بات کرو۔ ہم تمھیں رابعہ سے ملوا دیں تو تم بتاؤ گے کہ وہ سونا کہاں ہے؟"
"میں بتاؤں گا۔" میں نے کہا۔
"چلو ٹھیک ہے۔ تمھارے اس عہد کو ہم بیعانہ سمجھ لیتے ہیں۔" حاجی نے کہا۔ [illegible] کو تم بیعانہ سمجھو۔ بعد میں تم نے بدعہدی کی تو سودا منسوخ۔ تم پھر کبھی اس سے نہیں مل سکو گے لیکن تم نے صحیح صحیح نشاندہی کی اور وہاں سے سونا مل گیا تو رابعہ کو تمھارے حوالے کر دیا جائے گا اور تم کو آزادی ہو گی کہ جہاں چاہو جاؤ۔ اچھی طرح سوچ سمجھ لو کہ تمھیں رابعہ کو جیتنا ہے یا ہارنا ہے۔ تمھارے لیے کس کی قیمت زیادہ ہے، رابعہ کی یا اس سونے کی؟"
میری ذہنی مزاحمت بہت پہلے ختم ہو چکی تھی۔ حاجی کی بات کا ایک ایک لفظ میرے دل پر نقش ہو گیا۔ اس وقت میں کچھ بھی نہیں تھا، سوائے اس سکندر کے جس کے لیے ساری کائنات کا محور ایک رابعہ کی ذات تھی۔ اور ساری دُنیا کو چھوڑ کے مجھے اس کی محبت مل جاتی تو میں سمجھتا کہ خدائی مل گئی۔
"میں تمھارا احسان مند رہوں گا۔ اس احسان کا بدلہ چکانے کے لیے جو وعدہ کروں گا، پورا کروں گا۔ تم مجھ سے قسم لے لو، حلف اٹھوا لو۔" میں نے کہا۔
"رابعہ کی قسم کھا سکتے ہو؟"
"میں رابعہ کے سر کی قسم کھا کے کہتا ہوں۔"
"رابعہ کی اور اپنی محبت کی قسم کھا کے کہو۔" وہ بولا۔
"میں اس محبت کی قسم کھاتا ہوں جو مجھے رابعہ سے ہے۔"
"اچھا، فی الحال ہم اتنا ہی کافی سمجھتے ہیں۔ تم اس ساتھ والے کمرے میں جا کے لباس بدل لو اور انتظار کرو۔"
میں نے بے یقینی کے ساتھ قدم بڑھائے۔ دروازے سے گزرتے ہی میں نے خود کو ایک نسبتاً روشن اور بہتر طور پر آراستہ کمرے میں پایا۔ اس میں آمنے سامنے کی دیواروں کے ساتھ دو دو فولڈنگ تختے تھے جن کو کھول کے بیڈ بنایا جا سکتا تھا۔ سرہانے کی طرف چار شیلف تھے۔ اور ان کے نیچے دراز نما خانے۔ ہر شیلف پر ذاتی استعمال کی اشیا رکھی ہوئی تھیں۔ شیونگ کا سامان، ٹوتھ برش اور کنگھے وغیرہ۔ غالباً نیچے کے خانوں میں انہی چار افراد کے کپڑے ہوں گے جو اس کمرے میں رہتے تھے۔ یہ ان کا سلیپنگ کوارٹر تھا۔
کچھ استعمال شدہ کپڑے کھونٹیوں پر بھی آویزاں تھے۔ میں نے ایک قمیص اتاری اور پہن لی۔ وہ مجھے تنگ تھی۔ بغل میں سے اس کی آستینوں کے ٹانکے ادھڑ گئے مگر میں نے پروا نہ کی۔ زین کی خاکی پتلون مجھے فٹ آ گئی۔ میں نے اطمینان اور سکون کا گہرا سانس [illegible] لباس بدلتے ہی میرے جذبات میں نمایاں تبدیلی آئی۔ میں نے خود کو پھر حیوان سے انسان کے روپ میں دیکھا تو میرے ذہن کا انتشار ختم ہونے لگا۔ میری عقل جو وقتی دیوانگی کے صحرا میں گم ہو گئی تھی، پھر میری رہنما ہوئی تو میں نے اپنی خود اعتمادی حاصل کرنے کی جدّوجہد کی۔
وہ سب ابھی تک دوسرے کمرے میں موجود تھے جہاں مجھے کسی جنگلی جانور کی طرح محبوس رکھا گیا تھا۔ معلوم نہیں وہ وہاں کیا کر رہے تھے۔ جلدی جلدی میں نے ان درازوں کو کھول کے دیکھا۔ ان میں صرف کپڑے تھے۔ میں نے کپڑوں کے نیچے ہاتھ مارا کہ شاید کہیں کوئی خنجر یا ریوالور دبا ہوا ہو، مگر مجھے مایوسی ہوئی۔ اس کمرے میں اگر کوئی چیز خطرناک سمجھی جا سکتی تھی تو وہ بلیڈ تھے۔ مگر بلیڈ سے آتشیں اسلحے کو ناکارہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔
میرے پیچھے آخری حصے کی دیوار میں ایک گول شیشے والا روشندان تھا جس میں سے سمندر، جھاگ اڑاتی موجیں، دن کا اُجالا اور سپاٹ آسمان دکھائی دیتا تھا۔ شیشہ پانی کے مسلسل بہتے دھاروں سے دھندلا پڑ گیا تھا۔ میں نے اس میں سے باہر کا منظر دیکھنا چاہا مگر میں کچھ نہ دیکھ سکا۔
پھر میں نے ساتھ والے کمرے کے کھلے دروازے سے جھانکا۔ اندر کوئی بھی نہیں تھا۔ یا مظہر العجائب! میں نے آنکھیں مل کے دیکھا۔ وہ تھے تو انسان ہی کے روپ میں مگر کیا وہ بھوت تھے کہ یوں غائب ہو گئے۔ حاجی عبداللہ جادوگر بھی ہے کہ سلیمانی ٹوپی سر پر رکھ کے نکل گیا۔ مجھے تو بڑی جستجو کے بعد ایک دروازہ ملا تھا۔ مگر اب صاف ظاہر تھا کہ اس خانۂ بے در میں دوسرا دروازہ بھی تھا اور وہ سب اس میں سے گزر گئے۔
میری نظر نے اوپر دیکھا۔ وہ منظر بھی بجھ گیا تھا جس میں رابعہ کے حسن کا ماہتاب روشن تھا۔ اب اوپر نیچے ایک سا اندھیرا تھا۔ میں نے اس کمرے کا جائزہ لیا جس میں اب مجھے رابعہ سے ملاقات کا انتظار تھا۔ کیا وہ سچ مچ مجھ سے ملے گی؟ اس سے پہلے بھی بارہا ایسا ہوا تھا کہ میں نے اس کی صرف آواز سنی اور اس کا تصوّر کیا یا وہ مجھ سے ملنے آئی اور مجھے تقدیر کی نارسائی نے ساعتِ دید سے محروم رکھا۔ پھر آج میں نے اسے یوں دیکھا جیسے میرا خواب مجسّم ہو گیا ہو یا میرے تصوّر کو زندگی مل گئی ہو۔ خواب اور حقیقت کے درمیان ایک شفاف پردہ ہی تو حائل تھا۔
میں نے بے چینی سے دھڑکتے دل کو بھی تصوّر میں اُلجھانا چاہا مگر اب دل یوں بہلنے والا نہ تھا۔ اس کی ہر دھڑکن رابعہ کی پکار بن گئی تھی۔ اشتیاق و اضطراب میں میرے اعصاب اتنے کشیدہ ہو چکے تھے کہ میرا وجود چٹخنے لگا تھا۔ میں نے ہر طرف سے بند کمرے کی دیواروں سے کان لگا کے کسی آہٹ کا انتظار کیا۔ واحد بند دروازے پر دستک دی۔
میں مایوس ہونے لگا تھا اور حاجی عبداللہ کی طرف سے میری بدگمانی میں ہر لحظہ اضافہ ہو رہا تھا۔ اس شیطان

لعین نے میرے ساتھ ایک جان لیوا مذاق کیا ہے، مجھے رابعہ کی ایک جھلک دکھا کے دیوانہ بنا دیا۔ اپنے جھوٹ کے جال میں گرفتار کر لیا۔ اس کا مقصد ہی میرا جذباتی استحصال تھا۔ ابھی وہ میری آتشِ شوق کو کچھ اور بھڑکائے گا۔ مجھے اور تڑپائے گا۔ مجھے امید اور ناامیدی کے عالمِ برزخ ۔۔۔ میں رکھے گا۔ یہاں تک کہ میں سچ مچ پاگل ہو جاؤں گا اور کتّے کی طرح اس کے اشاروں پہ دُم ہلانے لگوں گا۔

اچانک دروازہ کھلا اور رابعہ اندر آ گئی۔ اس نے دروازہ اپنے پیچھے بند کر دیا۔ میں پتھر کے بُت کی طرح کھڑا رہا اور پلک جھپکائے بغیر اسے دیکھتا رہا۔ اس نے اب سرتاپا سفید، ریشم جیسے کپڑے کی ساری باندھ لی تھی جس میں تارے سے جھلملاتے تھے۔ یہ لطیف اور رنگ، بادلوں اور دھوپ کی کرنوں سے بنا ہوا ملبوس تھا جس میں وہ بکھرے ہوئے سیاہ بالوں کے ساتھ کوئی آسمانی مخلوق لگتی تھی۔ یہ سب فریبِ نظر تھا۔ وہ فقط ایک نقشِ خیال تھی، جیسے بادل کا غبار۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہو سکندر؟" بالآخر اس نے پلکیں جھپکا کے کہا اور آہستہ آہستہ آگے آئی۔

"تم... وہی ہو، میرے خیال کا طلسم... میرے خواب کا عکس؟" میں نے کہا۔ "ابھی میں آنکھیں بند کروں گا تو تم غائب ہو جاؤ گی۔ ایسا کیوں کرتی ہو میرے ساتھ؟"

"سکندر!" رابعہ نے گلوگیر لہجے میں کہا اور میرا ہاتھ تھام لیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک کر میرے ہاتھ پر گرے۔ دو جلتے ہوئے انگارے، پگھلے ہوئے ستارے۔ یکلخت میں بے یقینی کے طلسم سے نکل آیا۔ حقیقت نے میرے حواس کو تہس نہس کر دیا۔ میں نے بے اختیار اسے کھینچ لیا۔ اور اپنے قریب کر لیا۔ شدّتِ جذبات میں اپنی زبان سے میں اس کے نام کا ورد کرنے کے سوا کچھ نہ کہہ سکا۔ میں نے اس کے ہاتھوں، اس کے بالوں اور اس کی آنکھوں میں رابعہ کو دیکھا۔ اس کی مہک کو تلاش کیا اور اس کے وجود کی ساری نرمی اور حلاوت اور مٹھاس اور لذّت کو اپنے وجود میں سمو لیا۔

"سکندر... سکندر! ہوش میں آؤ۔" اس نے کانپتے ہوئے اور روتے ہوئے کہا۔ اس کے ہاتھ میرے چہرے کو اور میرے بالوں کو اپنے لمس سے سیراب کرتے رہے۔ "دیکھو، ایسے کیوں روتے ہو۔ اتنے کم ہمّت تو نہیں تھے تم... یہ کیا پاگل پن ہے۔ میں تو تمھارے پاس ہی تھی، دور کب تھی تم سے۔ دن رات کے کون سے لمحے کو تم جدائی کا لمحہ کہتے ہو، میری کون سی سانس کو اپنے خیال سے الگ جانتے ہو...؟"

میں نے کچھ نہیں کہا تھا مگر وہ جانتی تھی کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ زبان خاموش تھی تو کیا۔ دل کی آواز تو اس دُنیا میں، اس کائنات میں گونج رہی تھی جس میں اور کچھ نہیں تھا، میرے اور اس کے سوا۔ اور میں نے کہا: "رابعہ! میں مرجانا چاہتا ہوں، اسی وقت، اسی جگہ، تمھاری بانہوں میں..."

رابعہ نے میرا چہرہ اٹھا کے کہا۔ "یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو سکندر! کیا ہم مرنے کے لیے جی رہے تھے۔ وہ طویل آزمائش کی مسافت جو ہم نے ایک ساتھ طے کی تھی..!"

"مگر تم نے مجھے چھوڑ دیا تھا۔ تم پھر چھوڑ جاؤ گی .... اور تمھارے بغیر مجھے یہ زندگی قبول نہیں۔" میں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ "ایسا کیوں کیا تھا تم نے رابعہ؟ بولو۔ کیا قصور تھا میرا کہ تم نے مجھے اکیلا چھوڑ دیا؟ کبھی سوچا تم نے کہ اگر اس دوری کا عذاب میری موت کا سبب بن جاتا..؟"

اس نے میرا منہ اپنے ہاتھ سے بند کر دیا۔ "اکیلے ہی مرجاتے، یہ بھلا کیسے ہو سکتا تھا۔ میں بھی اسی امید پہ زندہ تھی جس نے تمھیں راستہ دکھایا۔ اور حوصلہ دیا یہاں تک آنے کا۔"

"مگر اب میں صرف امید پر زندہ نہیں رہ سکتا۔ مجھے تمھارا ساتھ چاہیے۔ تمھاری رفاقت چاہیے، میں خوابوں کے آسرے پر اب نہیں جی سکتا۔ تمھارے خیالوں کے ساتھ اور تمھارے تصوّر کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی کسی مجبوری کو قبول نہیں کر سکتا۔ تمھیں کیا معلوم کہ وقت کے ہر لمحے کی زنجیر میں نے کس طرح کاٹی۔ دل کو کتنے فریب دیے کتنی جھوٹی امیدوں سے سمجھوتا کیا..!"

"تم یہ سب مجھے بتا رہے ہو!"

"ہاں، کیونکہ تم نے ہی مجھے مرنے بھی نہیں دیا۔ یہ تمھاری آرزو بھی تھی جس نے مجھے زندہ رکھا۔ کیا ملا تمھیں مجھ سے جدا ہو کے؟ کیوں قبول کیا تم نے یہ بن باس۔ مجھے اکیلا کیوں رکھا؟"

"وہ سب ایک مجبوری تھی سکندر... میں کیا بتاؤں۔" وہ ایک سرد آہ بھر کے بولی۔

"جھوٹ کوئی ایسی مجبوری نہیں ہوتی..."

"میں جھوٹ بول سکتی ہوں تم سے؟" اس نے افسردہ پلکیں اٹھا کے کہا۔ کالی آنکھوں میں پھر اُجلے موتی بننے لگے۔ "مرنا تو بہت آسان ہوتا میرے لیے مگر جینا بہت مشکل تھا۔ پھر بھی مجھے تمھارے لیے اور... تم سب کے لیے کچھ تو کرنا ہی تھا۔ میں نے اس مجبوری کو، سختیٔ حالات کو اور قیدِ تنہائی کو صرف اس لیے قبول کیا کہ.. تم سب زندگی اور کامیابی کے راستوں پر چلتے رہو!"

"تم چاند بھائی کی قید میں تھیں؟" میں نے اس کی پلکوں سے آنسو چُن لیے۔

رابعہ نے بلاؤز کے گلے میں سے ایک کاغذ کا پرچہ برآمد کیا اور خاموشی سے میرے سامنے کر دیا۔ اس پر لکھا ہوا تھا: "وہ سب سُن رہے ہیں۔ باتیں کرتے رہو، یہ بعد میں پڑھ لینا۔"

"ہاں... تم تو جانتے ہو وہ کس قماش کا آدمی ہے۔ وہ ایک ذہنی مریض ہے۔ ساری دُنیا کے خلاف انتقامی ردِّعمل میں مبتلا۔" اس نے کاغذ کو میری جیب میں ڈال دیا۔

"پھر تم یہاں کیسے آئیں؟" میں نے کہا۔

"مجھے حاجی عبداللہ نے رہائی دلائی۔ ایک شرط پر جو صرف تم پوری کر سکتے ہو۔" رابعہ نے کہا۔

"کون سی شرط؟"

"تم اس کی مدد کرو گے۔ میں نے اسے یقین دلا دیا تھا سکندر کہ تم میری خاطر سب کچھ کر سکتے ہو۔"

"تمھاری خاطر میں وطن کے دشمنوں کا ساتھ تو کبھی نہیں دوں گا۔ یہ تم جانتی ہو۔" میں نے برہمی سے کہا۔

رابعہ نے گھبرا کے ہونٹوں پہ انگلی رکھی پھر اس نے سرگوشی میں کہا: "کسی بات سے انکار مت کرنا۔"

"تم میرا مان بھی نہیں رکھو گے۔ مجھے نہیں معلوم وہ تم سے کس قسم کی مدد چاہتا ہے، مگر میں نے کہا تھا کہ تم مجھے انکار نہیں کر سکتے۔"

"دیکھو رابعہ! وہ چاہتا ہے کہ میں اسے وہ جگہ بتا دوں جہاں دلاور کا میں نے کئی من سونا غرق کیا تھا۔ ایک پورا ٹرک تھا جس میں اوپر اسلحہ تھا۔ ہم نے تو اسلحہ سمجھ کے ڈبویا تھا۔ اگر یہ معلوم ہوتا کہ نیچے سونا بھی ہے تو ہم نہ رکھ لیتے۔ ہمارے کام آتا وہ خزانہ، مگر خیر۔"

"حاجی عبداللہ اس سونے کو مشرقی پاکستان تو نہیں بھجوائے گا۔ اس سے وطن کے دشمنوں کی کوئی مدد نہیں کی جائے گی۔ جو دلاور کرنا چاہتا تھا۔" رابعہ نے کہا۔

"یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟"

"دیکھو، مجھے معلوم ہے۔ عبداللہ صرف ایک ٹرانسپورٹر ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ دلاور کا مال بھی بھیجتا رہا ہے۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ دلاور اینڈ کمپنی وہاں تخریب کاروں کو اسلحہ فراہم کرتی ہے لیکن معلوم ہوتا تب بھی اسے یوں براہِ راست وطن دشمن قرار نہیں دیا جا سکتا۔ وہ اپنا بزنس کیسے تباہ کرتا۔ اور پھر دلاور جیسے لوگوں سے دشمنی مول لینا بھی تو خطرے کی بات تھی۔"

"تم اس کی وکالت کر رہی ہو!"

"میں تم کو سیدھی، صاف بات سمجھا رہی ہوں کہ حاجی کی مدد کرنے سے تمھارے مشن کو نقصان نہیں ہوگا، نہ اس سے تمھارے دشمنوں کی مدد ہوتی ہے۔ حاجی تو اسے اپنی تحویل میں رکھے گا۔ یہ اس کی ذاتی ملکیت ہوگا۔ دلاور کو اس کی ہوا بھی نہیں لگنی چاہیے۔ ورنہ وہ حاجی کا دشمن ہو جائے گا۔ اپنے نقصان پر وہ پہلے ہی زخم خوردہ ناگ کی طرح تلملا رہا ہے۔"

"اچھا۔" میں نے بہ حالتِ مجبوری ہتھیار ڈالنے والے کی طرح کہا۔ "میں اب تم سے کیا کہوں کہ تم نے اچھا کیا یا بُرا۔ تم کہتی ہو اس سے دشمنوں کی مدد نہیں ہوگی لیکن کیا حاجی میرا دشمن نہیں ہے؟ تم نے کیوں مجھے اس کی مدد کا پابند کر دیا؟"

"تم انکار کر دو۔ میں واپس چلی جاؤں گی۔ مجھے جانا ہی پڑے گا۔" اس نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ "اور یہ تو قسمت نے ایک سبب بنا دیا تھا۔ ورنہ کیا میں اس شخص کی قید سے نکل سکتی تھی جو مجھ سے شادی کرنے کے لیے وقت اور حالات کے بدل جانے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے صاف کہا تھا مجھ سے کہ میں زبردستی نہیں کروں گا۔ ایک دن تقدیر خود تمھیں میرے حوالے کر دے گی۔ تمھارا وہ بانکا ہیرو جو سکندرِ اعظم بنا پھرتا ہے، اس کی زندگی کتنی ہوگی۔ خوش قسمتی پہ انحصار کرتا ہوا وہ کہاں تک جائے گا؟ ایک دن آئے گا جب قدرت کی طرف سے ملنے والا خوش بختی کا کوٹا پورا ہو جائے گا۔ پھر اس کے ساتھ وہی ہوگا جو سکندرِ اعظم کے ساتھ ہوا تھا۔ کہتے ہیں، اسے ایک مچھر نے شکست دے دی تھی۔ وہ دنیا فتح کر لیتا مگر اسے ملیریا ہو گیا۔ اور جسے کوئی غنیم چت نہ کر سکا تھا، کوئی سُورما اور جنگجو چت نہ کر سکا تھا، اسے ایک مچھر نے

چت کر دیا۔ پھر تم کیا کرو گی، اس کے سوگ میں کتنے دن آنسو بہاؤ گی؛ جب شیر افگن مارا گیا تھا تو نورجہاں نے بھی بہت رونا دھونا کیا تھا۔ اور شہنشاہِ ہند کی محبت کے خلاف تین سال تک مزاحمت کرتی رہی تھی۔ جہانگیر نے بھی کوئی زبردستی نہیں کی تھی۔ اس کی محبت نے بالآخر نورجہاں کی محبت کو جیت لیا تھا۔ ایسے ہی میں بھی ایک نہ ایک دن جیت لوں گا تمھیں۔ اب تک میں عورت کو حاصل کرتا آیا ہوں۔ خریدتا آیا ہوں اور چھینتا آیا ہوں مگر تمھاری بات مختلف ہے۔ تمھیں میں اپنی محبت سے جیت کر دکھاؤں گا۔"

یہ سب رابعہ نے اس وقت کہا جب میں اس کا دیا ہوا رقعہ جیب سے نکال کے پڑھ رہا تھا۔ وہ ہچکیاں لے کر روتی گئی اور بولتی گئی۔

رقعے میں جو رابعہ اپنے ساتھ لائی تھی، لکھا تھا۔

"مجھے معلوم ہے کہ یہ سب میں تمھیں زبانی نہیں بتا سکوں گی۔ مجھے اندیشہ ہے کہ ہماری گفتگو کا ایک ایک لفظ سنا جائے گا۔ حاجی ایک کمینہ اور ناقابلِ اعتبار شخص ہے۔ اس نے مجھے عملاً خریدا ہے۔ اس نے چاند بھائی سے وعدہ کیا ہے کہ جتنا سونا سمندر کی تہ سے برآمد ہوگا اس کا نصف اسے دے گا۔ وہ مجھے اسی مقصد کے تحت لایا ہے کہ میرے ذریعے تم پر نفسیاتی دباؤ ڈالا جائے۔ چاند بھائی کو اس پر بالکل اعتبار نہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ حاجی اپنی بات پر قائم رہنے والا آدمی نہیں ہے چنانچہ اس نے پورا بندوبست کر لیا ہے کہ وہ سونا حاجی کے ہاتھ نہ لگے۔ یہ ایک خطرناک کام ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ خزانہ ہاتھ لگتے ہی حاجی تم کو اور تمھارے ساتھ مجھے بھی ٹھکانے لگانے کی کوشش کرے۔ لیکن چاند بھائی نے ہمیں یقین دلایا ہے کہ وہ ہماری حفاظت کرے گا۔ اور اس مقصد کے لیے حاجی سے مقابلہ کرنا پڑا تو کرے گا۔

چاند بھائی کے دلاور سے پرانے کاروباری مراسم ہیں۔ خسرو جمشید ... کے ... تھا مگر وہ بعد میں چاند بھائی کے لیے مارِ آستین ثابت ہوا اور دلاور سے مل گیا۔ اس کا انجام تو تم نے دیکھ لیا۔ (مجھے چاند بھائی نے بتایا تھا۔) چاند بھائی سب کچھ ہے مگر ملک دشمن غداروں اور وطن کی سالمیت کو نقصان پہنچانے والوں کے ساتھ نہیں ہے۔ وہ دلاور اینڈ کمپنی کے اس کاروبار میں شامل نہیں۔ وہ اس کا مخالف ہے اور تمھارا محافظ و مددگار۔ مشکل یہ ہے کہ وہ کھل کر سامنے نہیں آ سکتا اور دلاور کی دشمنی مول نہیں لے سکتا۔ اس طرح اسے دُہرا نقصان ہو سکتا ہے۔ مالی نقصان بھی اور جانی نقصان بھی۔ ایک طرف اس کا کاروبار تباہ ہوگا تو دوسری طرف وہ ایم آر ایس کے لیے کچھ نہ کر پائے گا۔ اس نے دلاور کو یہی تاثر دیا ہے کہ ان کے درمیان مکمل اتحاد ہے اور وہ خود بھی سکندر کا دشمن ہے۔ چنانچہ اس نے مجھے قید کر رکھا ہے۔ اس کا مقصد میرے ذریعے تم تک پہنچنا ہے۔

اسے دلاور سے بہت کچھ معلوم ہوتا رہا ہے جو اس نے مجھے بتایا۔ اس کی معرفت مجھے تمھارے متعلق مفصل رپورٹ ملتی رہی ہے۔ جو کچھ میں نے کیا وہ ایک پالیسی کا حصہ تھا۔ دل سے چاند بھائی ہمارے ساتھ ہے۔ یہ بات شاید تمھیں ناقابلِ یقین لگے کہ اس جیسا چالاک، عیار اور زمانہ ساز شخص جو دنیا بھر میں اپنی دھاک بٹھا چکا ہے اور بڑے بڑے بدمعاشوں سے بڑا بدمعاش ہے، ایک کارِ خیر میں کیوں شریک ہے مگر یہ حقیقت ہے۔ ہمارے ساتھ اس ملک کے عوام ہیں۔ ان میں امیر، غریب، جاہل اور اعلیٰ تعلیم یافتہ، شریف اور بدمعاش سب ہیں۔ بدمعاش بھی قانون کا مجرم ہے مگر خود کو پاکستانی سمجھنا اور کہلوانا چاہتا ہے۔ وہ بھارت یا اسرائیل کا حامی نہیں ہو سکتا۔ اس کا مذہب اور اس کی قومیت کے جذبات ایک ہی رہتے ہیں۔

چاند بھائی میری حفاظت تمھاری امانت کی طرح کر رہا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اپنے لیے تو میں نے وہ سب کچھ، جو دل میں آیا کیا۔ اب یہ دل کہتا ہے کہ اس مجاہد کے لیے کچھ کر جو وطن کے دشمنوں کے خلاف جنگ لڑ رہا ہے۔ صرف اپنے عزم اور حوصلے، یقین اور جذبے کے ساتھ، وسائل نہ ہونے کے باوجود۔ تم نہیں جانتے مگر متعدد مواقع ایسے آئے جب تم چاند بھائی کی ... وقت مداخلت کے باعث مشکل میں نہیں پڑے۔ اس نے کئی بار تمھاری حفاظت کے لیے دلاور کو گمراہ کیا۔ اسے غلط اطلاعات فراہم کر دیں یا اس کے آدمیوں کو خود ٹھکانے لگوا دیا مگر نام تمھارا ہوا۔ مشکل یہی ہے کہ وہ سامنے آئے تو نقصان ہمارا بھی ہوتا ہے۔ ابھی تک وہ دلاور اینڈ کمپنی کو یقین دلانے میں کامیاب ہے کہ رابعہ جب تک ہمارے قبضے میں ہے، سکندر کچھ نہیں کر سکتا۔ ایک نہ ایک دن ہم اس کے ذریعے ایم آر ایس کو ختم ...نے میں بھی کامیاب ہو جائیں گے۔ یہ ایک سیکرٹ ...ن ہے۔ میرے عبداللہ کے ساتھ آنے کی دلاور کو ...نہیں، اس لیے مجھے واپس جانا ہوگا، چاند بھائی کے پاس۔ ...ی عبداللہ تو دلاور کی پیٹھ میں خنجر گھونپ رہا ہے مگر اسے ...لوم نہیں کہ چاہ کن را چاہ در پیش۔ چاند بھائی نے اس کا ...انتظام کر لیا ہے اور خدا نے چاہا تو تمھاری مدد سے ...دنان کالنے کا یہ کام مکمل ہوتے ہی حاجی عبداللہ کا کام ...ی تمام ہو جائے گا۔ وہ اسی طرح غائب ہو جائے گا جیسے ...ب ٹرک سونے کا غائب ہو گیا تھا۔ نہ دلاور کو اس ...ی کا پتا چل سکا تھا۔ نہ حاجی کے بارے میں معلوم ہوگا۔ ...یہ خطرناک کام ہے۔ اس میں فریقین کے درمیان ...تنیں اسلحے سے خطرناک جنگ بھی ممکن ہے۔ اپنی حفاظت ...نا اور میری طرف سے بے فکر رہنا۔ میں تمھارے ساتھ ...ہوں۔

اس کاغذ کو غائب کر دینا ممکن ہوا تو میں پھر تم سے ...رابطہ قائم کر دوں گی اور ہاں، محسن اسی لانچ پر ہے اور بالکل ...خیریت سے ہے۔ میرا اس سے کوئی رابطہ نہیں مگر میں ...نے اسے دور سے دیکھا تھا۔ وہ کمرے میں بیٹھا ہوا ...اشتا کر رہا تھا۔ اگر میں...."

شاید اور لکھنے کی اسے مہلت نہیں ملی تھی۔ میں ...نے کاغذ کو مٹھی میں دبا لیا تھا۔ میں رابعہ سے بہت کچھ ...کہنا چاہتا تھا لیکن اب نہیں کہہ سکتا تھا۔

"تم... اس چاند بھائی، حرام زادے سے کہہ دینا کہ ...دلاور کبھی نہیں آئے گا۔" میں نے رابعہ کی بات ختم ہوتے ...ہی دانت پیس کے کہا۔ "میں اتنی آسانی سے مرنے والا ...نہیں ہوں۔ مرا تو اسے لے کر مروں گا۔"

"خدا کے لیے ایسی باتیں ... کرو۔ تم کیا سمجھتے ہو ...کہ اس کی امیدیں پوری ہونے تک زندہ رہوں گی! ...زندہ رہے تو میں رہوں گی؟ ہم میں سے کون ہے جو تنہا ...جینے کی آرزو رکھتا ہے، لیکن ابھی مجبوری ہے۔ مجھے واپس ...جانا ہی پڑے گا۔"

"میں تم کو نہیں جانے دوں گا رابعہ۔"

"مجھے پانے کے لیے تم کو کچھ کرنا ہوگا سکندر۔ بتاؤ ...کرو گے؟"

"کروں گا، میں تمھاری قسم کھا کے کہتا ہوں کہ کروں ...گا۔ تم اس کمینے حاجی کو میری طرف سے یقین دلا دینا کہ وہ خود تو مجھے مجبور نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن اب میں مجبور ہوں۔" میں نے کہا اور اِدھر اُدھر دیکھا کہ اس کاغذ کے پرزے کو کہاں ضائع کروں، مگر وہاں ایسی کوئی جگہ نہیں تھی۔ نہ کھڑکی، نہ روشن دان نہ ٹائلٹ کا فلش۔ میں اسے پرزہ پرزہ کرتا تب بھی حاجی کو شک ہو جاتا۔ اسے جلاتا تو وہ اس کی راکھ دیکھ لیتا۔ رابعہ کے راز کو راز رکھنے اور اسے افشائے راز کے عذاب سے بچانے کے لیے میں نے اس کاغذ کے گولے کو منہ میں ڈال لیا۔ اور دانتوں سے چبانے لگا۔

"پاگل ہو گئے ہو کیا!" رابعہ نے کہا۔

"ہاں۔ کر دیا ہے تم نے۔" میں نے کاغذ کو لعابِ دہن کے ساتھ ملا کے چباتے ہوئے کہا۔

مجھے اس سے اور بھی سوالات کرنے تھے جو کسی بھی طرح براہِ راست نہیں کیے جا سکتے تھے۔ یہ نہ رابعہ کو معلوم ہو سکتا تھا اور نہ مجھے کہ دیواروں کے کان کہاں ہیں اور کتنے حساس ہیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ہم عین کسی پوشیدہ مائکروفون کے سامنے کھڑے ہوئے ہوں اور ہماری سرگوشی بھی سنی جا سکتی ہو۔

اِدھر اُدھر دیکھنے سے مجھے ان چار افراد کے ذاتی اسباب کا خیال آیا جو شیلف پر تھا اور الماریوں میں بند تھا۔ اس میں کوئی پینسل، قلم یا بال پوائنٹ ضرور ہوگا۔ اور میرا خیال درست تھا۔ مجھے ایک شیلف پر سے پینسل اور نوٹ بک دونوں مل گئے۔ میں نے نوٹ بک کا ایک صفحہ پھاڑ کے لکھا۔

"کیا تم مجھے یا محسن کو کسی قسم کا اسلحہ فراہم کر سکتی ہو؟"

رابعہ نے اسے پڑھا اور نفی میں جواب دینے کے لیے سر ہلاتے ہوئے کاغذ کی گولی بنا کے منہ میں رکھ لی۔

میں نے دوسرے کاغذ پر لکھا۔ "ہر سوال پر ایک کاغذ کا ٹکڑا کھانے سے ہاضمہ خراب ہوگا۔ بہتر ہوگا اگر تم یہ پاکٹ سائز ڈائری مجھے کھانے دو۔ مجھے ویسے بھی بھوک لگی ہوئی ہے اور بھوک میں نوٹ بک کیا رجسٹر تک کھایا جا سکتا ہے۔"

وہ تحریر کو پڑھ کے مسکرائی۔

پھر میں نے لکھا۔ "حاجی اور اس کے ساتھیوں کے پاس تو اسلحہ یقیناً ہوگا۔ اگر ہے تو کیا وہ تمھارے ہاتھ نہیں لگ سکتا؟"

اس نے پھر نفی میں سر کو دائیں بائیں ہلایا۔

میں نے پوچھا۔ "اس لانچ پر کُل کتنے افراد ہیں؟"

رابعہ نے مجھ سے پینسل لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور پھر اشاروں کی زبان میں جواب دینے کو ترجیح دی۔ اس نے مجھے دونوں

ہاتھوں کی دس انگلیاں دکھائیں۔

"یہ تو پوری فوج ہے۔" میں نے لکھا۔ "کیا یہ سب مسلح اور خطرناک لوگ ہیں؟"

رابعہ نے اقرار میں سر ہلایا۔

"کیا لانچ حاجی کی ہے اور کیا یہ اسمگلنگ میں استعمال ہوتی ہے؟"

رابعہ نے پھر اثبات میں جواب دیا۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں۔ اور کب سے سفر کر رہے ہیں؟"

اس بات کا جواب دینے کے لیے رابعہ نے مجھ سے پینسل اور نوٹ بک لے لی اور انتہائی شکستہ خط میں لکھا۔

"ہم ساحلِ مکران کے قریب ہیں لیکن اب واپس جا رہے ہیں۔" اس نے نوٹ بک مجھے تھما دی۔

میں نے صفحے کی پُشت پر لکھا۔ "تمھیں کچھ معلوم ہے کہ میں کب سے یہاں ہوں؟ میں بے ہوش پڑا تھا۔"

رابعہ نے لکھا۔ "کل سے۔ تم یہاں دوپہر کے وقت لائے گئے تھے۔ تم سو رہے تھے۔ خواب آور دوا کے اثر سے۔"

میں نے لکھا۔ "اس وقت کیا بجا ہے؟"

رابعہ نے لکھ کر جواب دیا۔ "صبح کے ساڑھے آٹھ بجے ہیں۔"

میں نے صفحہ پھاڑا اور اس کی گولی بنالی۔ اس تمام عرصے میں میرے جبڑے رابعہ کے خط کو پیسنے... مصروف رہے تھے اور اب کاغذ اتنا نرم ہو گیا تھا کہ میں اسے کسی معجون کی طرح نگل سکتا تھا۔ غالباً کسی عاشق نے اپنی محبوبہ کے نامۂ اُلفت کو اتنی رغبت اور محنت سے پہلے نوش نہیں فرمایا ہوگا۔

یہ معجونِ اُلفت میرے حلق میں پھنس گئی۔ میں نے ایک مُکا سینے پہ مارا اور گردن کو کئی بار جھٹکا۔ نامۂ محبت میرے معدے میں اُتر گیا۔ میں نے کامیابی اور فخر سے آنکھیں جھکا کے رابعہ پر واضح کیا کہ اس کا راز ہمیشہ کے لیے میرے سینے میں بلکہ اس سے بھی نیچے دفن ہو گیا۔ پھر میں نے معجونِ اُلفت کی دوسری گولی کھائی۔

پینسل میرے ہاتھ میں تھی اور میں اگلا سوال لکھنے ہی والا تھا کہ دروازہ دھڑام سے کھلا اور حاجی عبداللہ اندر آگیا۔ اس وقت مجھے نادانستگی میں سرزد ہونے والی ایک غلطی کا احساس ہوا۔ ہم تحریری گفتگو میں اتنے محو تھے کہ زبانی گفتگو بھول گئے تھے اور یہ خاموشی کا وقفہ شاید دو بچھڑے ہوئے محبت کرنے والوں کی ملاقات کا ریڈیو ڈراما سننے والوں کو غلط لگا تھا۔ ان کے ذہن میں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوا ہوگا کہ ہم باتیں نہیں کر رہے تو پھر خاموشی سے کیا کر رہے ہیں؟

حاجی نے مجھے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا مگر میں نے اپنی اعلیٰ اداکاری سے اس کے شکوک کی بنیاد کمزور کر دی۔

میں نے رابعہ سے کہا۔ "میں تمھیں محسن کے نام رقعہ دیتا ہوں۔"

رابعہ نے نفی میں سر ہلایا۔ "اوّل تو مجھے یقین نہیں کہ وہ بھی لانچ پر ہے۔ اور ہوتا تب بھی..." پھر وہ خاموش ہو گئی۔

"خیر سے بڑی دیر بعد بولے۔" حاجی نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"جی۔ ہمارا یہ ہے کہ کم بولتے ہیں۔ عقلمندوں کی طرح۔ مثلاً اُلّو جو کہ انگریز قوم کے نزدیک دانائی کا مظہر ہے، رات کو کبھی کبھار بولتا ہے مگر کُتے ہر وقت بھونکتے رہتے ہیں۔ اور قافلہ چلتا رہتا ہے۔" میں نے اس کو چکر دینے کے لیے کہا۔

"ماشاء اللہ۔ زبان پھر چلنے لگی ہے قینچی کی طرح۔ بیچ میں کیا ہو گیا تھا۔ کیوں چُپ تھے؟" وہ بولا۔

"اب کیا عرض کروں حاجی صاحب۔ آپ تو ماشاء اللہ سے خود دنیا دار، سمجھ دار، بدکردار ہیں۔" میں نے کہا۔ "ایسی خلوت آپ کو ملے گی تو آپ کیا کریں گے؟ صرف باتیں؟ اور وہ بھی اپنی... شریکِ حیات سے...؟"

"تم چلو باہر۔" حاجی نے رابعہ کو حکم دیا اور مجھ سے نوٹ بک لے لی۔ اس نے کاغذ کو روشنی کے رُخ کر کے دیکھا۔ پینسل کے دباؤ سے نیچے والے کاغذ پر بھی کچھ نقش بن گئے تھے مگر انھیں یوں نہیں پڑھا جا سکتا تھا۔ یہ کام کسی فنگر پرنٹ لیبارٹری میں ہی ممکن تھا۔ اس نے نوٹ بک کو خاصی ناگواری سے ایک طرف پھینک دیا۔ اسے شک ہو گیا تھا کہ ہم نے اس کے انتظامات کے باوجود پیغام رسانی کا ذریعہ پیدا کر لیا تھا۔

رابعہ کو حاجی کے ہمرکاب رہنے والے دو حکم کے غلام باہر لے گئے۔ ان کی جگہ دو نئے غلام آگئے۔ یہ سب غلام ایک سے کپڑے پہنتے تھے۔ سر سے پیر تک خاکی لباس۔ پی کیپ اور سیاہ چشمے۔ قد و قامت میں بھی وہ ایک سے تھے۔ حکم کی بجا آوری میں ان کی مشینی مستعدی خاصی تربیت اور ڈسپلن کی سختی کا نتیجہ لگتی تھی۔ وہ ایک سا اسلحہ رکھتے تھے اور ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہیں ہوتے تھے۔ اوپر نیچے ہوتی کشتی کے ہچکولوں سے میرا ڈرنا ایک قدرتی امر تھا۔ ان کی انگلی ٹرائیگر پر رہتی تھی اور خفیف سا جھٹکا لگنے سے میرا جھٹکا ہو سکتا تھا۔

"ہم نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ الحمدللہ۔" حاجی عبداللہ نے تسبیح گھماتے ہوئے کہا۔ "اب تمھارا کیا ارادہ ہے؟"

"آدمی کے ارادے سے کیا ہوتا ہے حاجی صاحب۔" میں نے سرد آہ بھر کے کہا۔ "وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔"

"پھر بھی۔ کچھ تو سوچا ہوگا تم نے؟"

"جی۔ سوچا تو ہے کہ بعد عقد اپنی منکوحہ کے ساتھ سعادتِ حجِ بیت اللہ حاصل کروں۔ آپ کی اعانت سے۔" میں نے کہا۔

"تمھاری یہ خواہش بھی ہم پوری کریں گے۔" حاجی نے ضبط سے کام لیا۔ "پہلے یہ بتاؤ کہ تم تعاون کرو گے ہم سے یا نہیں؟ تمھارے سوچنے کے لیے پورا دن پڑا ہے۔ رات تک ہم اسی علاقے میں ہوں گے جہاں تم نے سیکڑوں من سونا غرق کر دیا تھا۔ اگر تم نے صحیح مقام کی نشاندہی کر دی تو صبح ہونے سے پہلے تم کو ایک لائف بوٹ فراہم کر دی جائے گی۔ تم اپنے دوست محسن اور رابعہ کے ساتھ جا سکو گے۔"

"اور اگر میں نے ایسا نہ کیا۔ یا مجھ سے غلطی ہو گئی اس مقام کو پہچاننے میں۔ یا وہ سونا نہ ملا؟"

"سونا ہوگا تو ضرور ملے گا۔"

"دیکھیں نا جی۔ یہ سمندری پانی ہے۔ اس میں تو سالم بحری جہاز گُھل جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ سمندری مخلوق ہے۔ شارک اور وھیل ہیں۔ وہ سب کچھ کھا جاتی ہیں۔ آپ سیکڑوں من سونا ہضم کر سکتے ہو تو کیا وھیل نہیں کر سکتی؟"

"ہم تمھاری بذلہ سنجی سے محظوظ ہوتے۔ لیکن برخوردار، ہم اس وقت تمھاری شوخ گفتاری دیکھیں گے جب عدم تعاون کے نتائج سامنے آئیں گے۔ ہم رابعہ کو واپس بھیج دیں گے اور محسن کو کفن پہنا کے تمھارے حوالے کر دیں گے کہ اب اس کا مزار جہاں چاہو بناؤ۔ وہیں تمھارا مزار بھی بنا دیا جائے گا اور ہم رابعہ کو تمھاری ہر برسی پر وہاں فاتحہ خوانی کے لیے لائیں گے۔"

ایک لمحے کے لیے میرا دل خوف سے بھر گیا۔ الفاظ کتنے ہی جھوٹے کیوں نہ ہوں، اپنا مفہوم رکھتے ہیں اور تاثر رکھتے ہیں۔ جیسے فلمیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا لیکن وہ اپنے المیہ انجام سے دلوں کو بوجھل اور خواتین کو اشکبار کر دیتی ہیں۔ تصور نے مجھے جملے کے ساتھ ایک تصویر دکھائی جو حقیقی نہیں تھی لیکن اس سے بھی میں وقتی طور پر دہشت زدہ ہوا۔

"قبلہ حاجی صاحب!" میں نے کہا۔ "وقت بڑا بے رحم شاطر ہے اور آدمی کی نظر حال سے آگے نہیں دیکھتی۔ اسی لیے فارسی میں کہا جاتا ہے کہ تدبیر کند بندہ۔ تقدیر کند خندہ اور اردو میں ایک شاعر نے ایک لافانی قسم کے انٹرنیشنل شعر میں اس خیال کو یوں باندھا ہے کہ آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں۔ سامان سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو کیا معلوم کہ کل کی سحر ہونے تک کس پر کیا گزر رے۔ ممکن ہے یہ سب ایسے ہی ہو۔ مگر کردار بدل جائیں۔ مزار آپ کا بنے اور ہم ہر سال عرس پہ قوالی کریں۔"

حاجی کا چہرہ بگڑ گیا۔ اس کی آنکھیں انگارہ ہو گئیں اور وہ ریچھ کی طرح پھنکارنے لگا۔ لیکن اس نے فوراً ہی اپنی حالت پر قابو پالیا۔ اس نے پلٹ کے اپنے غلاموں سے کہا۔ "لے اسے ایک نمبر میں لے جاؤ۔" اور خود واک آؤٹ کر گیا۔

"یہ ایک نمبر کیا ہے بھئی۔ فرسٹ کلاس؟" میں نے خوش دلی سے کہا۔ "ہر بحری جہاز پر ہوتے ہیں فرسٹ کلاس مسافر۔"

"چلو۔" ایک حکم کے غلام نے غرا کے کہا۔

"اگر میں کہوں کہ تھینک یو۔ میں یہیں ٹھیک ہوں۔" میں نے کہا۔ دوسرے حکم کے غلام نے جیب میں سے وہی چھوٹا سا ریوالور نکالا جس سے بے حس کرنے والے زہریلے تیر فائر کیے جاتے تھے۔ اس نے ایک تیر لگا کے پستول کا رُخ میری طرف کیا۔

"اچھا بھائی۔ میں چلتا ہوں۔ مگر یہ فاؤل پلے ہے۔" میں نے باہر جاتے ہوئے کہا۔ انھوں نے مجھے ایسا کوئی موقع فراہم نہیں کیا جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں ان کا تیا پانچا کر سکتا یا ان سے ہتھیار چھین سکتا۔ حاجی عبداللہ نے اپنے حکم کے غلاموں کو میرے بارے میں بہت اچھی طرح بریفنگ کی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ میری تباہ کاری کی صلاحیت کیا ہے۔

ایک نمبر خود حاجی عبداللہ کا کیبن تھا اور جیسا کہ ایک کروڑ پتی اسمگلر اور لانچ کے مالک کے ذاتی استعمال کا کمرا ہونا چاہیے ویسا ہی پُرشوکت تھا۔ بہترین قالینوں اور پردوں سے آراستہ ایئرکنڈیشنڈ، پُرتکلف اور کشادہ۔ ایک کنارے پر خوبصورت اور آرام دہ ڈبل بیڈ تھا جس کے بالکل سامنے والی دیوار پر ٹی وی نصب تھا۔ کمرے کے چاروں کونوں میں رنگین شیڈ والے چار لیمپ روشن تھے جن سے سبز رنگ کا ٹھنڈا خواب ناک اُجالا بڑی نرمی سے پھیلتا تھا۔

دوسرے گوشے میں گول قالین پر صوفہ سیٹ لگا ہوا تھا اور درمیان میں ماربل ٹاپ والی گول میز پر میرے لیے ناشتا تیار تھا۔ ابھی میں اس خاطر مدارات اور اس حسنِ سلوک کے بارے میں حاجی تک شکریہ ارسال کرنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ دونوں حکم کے غلام اباؤٹ ٹرن ہو کے واپس ہو گئے۔ میں نے پلٹ کے دیکھا تو اسی دروازے سے رابعہ مسکراتی ہوئی اندر آرہی تھی۔

"اس عنایتِ خسروانہ کا مطلب؟" میں نے کہا۔ "آخری خواہش کی تکمیل؟"

"حاجی کے ذہن میں تو یہی ہوگا۔" رابعہ نے صوفے پہ بیٹھتے ہوئے کہا۔ "کیا تم پہلے غسل کرو گے؟"

"پہلے اور بعد میں کیا۔" میں نے کہا۔ "یہ کوئی جملۂ معترضہ تو نہیں ہے تمھارا۔"

رابعہ کا رنگ لال پڑ گیا۔ "اُتر گئے پٹری سے۔"

"بی بی رابعہ! یہ جو اپنا حاجی ہے۔ کیا یہ واقعی میری آخری خواہش پوری کر سکتا ہے؟" میں نے کہا۔

"کیا ہو گی وہ خواہش؟ بدتمیزی مت کرنا۔"

"لاحول ولاقوۃ۔ میں ایک شریف النفس، نجیب الطرفین، رقیق القلب قسم کا آدمی ہوں۔ آدمی کیا عاشق ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ وہ ذرا سی دیر کے لیے حاجی سے مولوی بن جائے۔ چار بندے پکڑ لائے۔ دو گواہ اور دو وکیل۔ نکاح پڑھانا تو آتا ہوگا اسے۔ نہیں تو میں خود پڑھ لوں گا، سیلف سروس۔"

"آپ بولتے رہیے۔ میں نے یہ کافی بنا کے رکھ دی ہے۔ اور یہ دیکھیے۔ میں ناشتا بھی شروع کر رہی ہوں۔" رابعہ نے کہا۔

میں اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ "کافی! مجھے تو سچ مچ ایسا لگ رہا ہے جیسے کل صبح سزائے موت ہونے والی ہے مجھے۔ مدت سے یہ منظر میں نے خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ کافی، سلائس، مکھن، آملیٹ، سگریٹ۔ اور تم۔ میرے اتنے قریب۔"

"تم بہت کمزور ہو گئے ہو۔" رابعہ نے کہا۔

"اور تم بہت زیادہ خوبصورت ہو گئی ہو۔ یہ ایک غیر جانبدارانہ غیر جذباتی اظہارِ حقیقت ہے اور اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ تمھاری زندگی خاصی فراغت میں گزری۔ تفکرات بھی چہروں پر اپنی تحریر چھوڑ جاتے ہیں لیکن تمھیں افزائشِ حسن کے تمام مواقع حاصل رہے۔ چاند بھائی نے تو تمھارے لیے پرسنل بیوٹی پارلر قائم کر دیا ہوگا۔"

رابعہ آزردہ ہو گئی۔ "تم طعنہ دے رہے ہو مجھے یا طنز کر رہے ہو مجھ پر۔"

"تم سے لڑنے کو دل چاہتا ہے۔" میں نے کہا۔ "ابھی تک تو خیر میں جذباتی ہو رہا تھا تم سے مل کر۔ لیکن وہ بات ابھی باقی ہے۔"

"کون سی بات؟" وہ تنک کر بولی۔

"یہ جو تم نے خود اختیاری ہجر و فراق...!"

"میرے اختیار میں کچھ نہیں تھا۔ میں بتا چکی ہوں کہ میں کل بھی اتنی ہی مجبور تھی جتنی آج ہوں۔"

"یہ غلط ہے۔ تم کوہ قاف سے اتر کے آ سکتی ہو تو کسی چھت سے اتر کے بھی فرار ہو سکتی ہو۔" میں نے میز پر مکا مار کے کہا۔ "اور تم میرے خوابوں میں آ سکتی ہو بغیر پوچھے۔"

"ناشتا کرو چپ چاپ۔" وہ بولی۔

محسن کوئی آہٹ کیے بغیر اندر آ گیا۔ "ہیلو! کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟"

"محسن!" میں نے بڑے جوش و خروش سے اس کی طرف دوڑ لگائی۔ "یار بس تیری ہی کمی تھی۔ آ میرے ساتھ آخری طعام کر۔"

"یہ سب کیا سلسلہ ہے؟" محسن نے کہا۔ "رابعہ! کیا تم حاجی عبداللہ کی چوتھی بیوی بن چکی ہو؟"

"یہ کیا گھٹیا مذاق ہے۔" رابعہ نے خفگی سے کہا۔

"میں نے تم کو کئی بار دیکھا۔ آتے جاتے۔ آزادانہ گھومتے پھرتے۔ اچھے سے اچھے کپڑوں میں۔ حاجی صاحب سے گفتگو کرتے اور سمندر کے سفر سے لطف اندوز ہوتے۔" محسن نے کہا۔

"اس کا یہ مطلب نکلتا ہے؟"

"حاجی جیسا پاجی کسی پر بے سبب مہربان نہیں ہوتا اور تم کو یہ وی آئی پی ٹریٹمنٹ مل رہا ہے تو آخر کس لیے؟" محسن کا لہجہ بہت تلخ تھا۔

"تم نے کون سے دکھ جھیلے ہیں یہاں...!"

"شاید یہ رعایت بھی تمھارے طفیل ملی ہوگی۔ تم نے کہا ہوگا حاجی صاحب سے کہ یہ میرے پرانے شناسا ہیں۔"

رابعہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "تم میری تذلیل کر رہے ہو۔"

"ہم بھی بہت ذلیل ہو چکے ہیں خاتون۔" محسن نے کہا۔

"ارے... تم سچ مچ لڑنے لگے۔" میں نے رابعہ کو ہاتھ پکڑ کے بٹھا دیا۔ "محسن! ہمارے اور حاجی کے درمیان سمجھوتہ ہو گیا ہے۔"

"یعنی ایم آر ایس اب دلاور اینڈ کمپنی میں ضم ہو گئی ہے اور...؟"

"فضول بکواس مت کر۔ سمجھوتہ صرف ایک مسئلے پر ہوا ہے جس کا تعلق ہماری آزادی سے ہے۔ ہم اپنی آزادی خرید لیں گے۔ حاجی نے اس کی ایک قیمت طلب کی تھی۔ میں نے وہ قیمت ادا کرنا منظور کر لیا۔"

"اور یہ قیمت کیا تھی؟" محسن کا لہجہ بہ دستور تلخ رہا۔

"ہم وہ سونا حاجی کے سپرد کر دیں گے جو ہم نے دلاور اینڈ کمپنی کا اسلحہ سمجھ کے سمندر میں غرق کر دیا تھا۔" میں نے کہا۔

"وہ سونا اب کہاں...!"

"وہیں جہاں ہونا چاہیے۔ مجھے معلوم ہے وہ جگہ۔"

محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ حکومت نے کب کا نکال لیا ہوگا۔ ہم نے کوسٹ گارڈز کو اطلاع دے دی تھی...!"

میں نے اسے آنکھ ماری۔ "انھیں کسی نے اطلاع نہیں دی تھی اور یہ بات آج رات ثابت ہو جائے گی۔ کل صبح ہم آزاد ہوں گے۔ میں، تم اور رابعہ۔"

"کہاں۔ عدم آباد جانے کے لیے؟"

"نہیں۔ حاجی نے وعدہ کیا ہے کہ ہمیں ایک لائف بوٹ فراہم کر دی جائے گی۔" میں نے بڑے جوش سے کہا۔

"تو... پاگل ہو گیا ہے۔ اس پر اعتبار کر رہا ہے۔ جو بچھو سے زیادہ ناقابلِ اعتبار ہے۔" محسن نے کچھ دیر بعد کہا۔

"میں یہ چانس لوں گا۔" میں نے کہا۔ "اگر آزادی نہ ملی تو موت ملے گی۔ ایک ساتھ مر جانا اچھا ہے۔"

"تو مر جا رابعہ کے ساتھ۔ میرے بیوی بچے ہیں۔ میں ان کو نہیں چھوڑ سکتا۔"

"تو ان کے پاس جا بھی نہیں سکتا۔ اور وہ تیرے پاس نہیں آ سکتے۔ میرے یا تیرے اختیار میں کیا ہے؟" میں نے کہا۔ "یہ لیل تو اب ختم ہی سمجھنا چاہیے۔ غالب اور نازو بھی نہیں رہے۔ رابعہ نے ساتھ چھوڑ دیا۔ ٹیڈی مر گیا۔ ہم تین بھی قید میں ہیں۔ کون جانے کل اس قید سے چھوٹیں گے یا قیدِ حیات سے۔"

ہمارے درمیان یہ فرضی لڑائی دوپہر تک جاری رہی۔ دوپہر کے کھانے کے بعد حاجی نے ہم سب کو الگ کر دیا۔ رات تک میں ایک ایسے کمرے میں بند رہا جس میں صرف ایک بیڈ تھا۔ مردہ بہ دست زندہ۔ میں اس قیدِ تنہائی پر احتجاج بھی نہیں کر سکتا تھا اور یہ مطالبہ بھی نہیں کر سکتا تھا کہ مجھے رابعہ کے ساتھ رکھا جائے یا محسن کے ساتھ۔ اسے اندیشہ تھا کہ ہم تینوں مل کے کوئی [illegible] انتظامات درہم برہم ہو جائیں اور اس کا بنا بنایا کھیل بگڑ جائے۔ ابھی تک وہ میری طرف سے تو مطمئن تھا کہ میں رابعہ کی خاطر اس سے تعاون کر رہا ہوں مگر محسن پر اس کا کوئی دباؤ نہیں تھا۔

میں نے اس فرصت میں نازو اور غالب کے بارے میں سوچا۔ معلوم نہیں ان پر اس جہاز کے اندر پہنچنے کے بعد کیا بیتی جو کسی طرح بھی دشمن کے قلعے سے کم نہ تھا۔ اگر وہ جہاز پر جگہ حاصل کرنے میں کامیاب رہے تو اب کہاں ہیں؟ کیا ایس ایس کرانتی تھرڈ روانہ ہو گیا۔ ہم نے تو کہا تھا کہ مقررہ وقت پر اور شاہد جمیل کے بنائے ہوئے نقشے کے مطابق ہم ان سے آ ملیں گے۔ انھوں نے ہمارا انتظار کیا ہوگا۔ اور ہمارے [illegible] ہوئی ہوگی۔ ان کو ہر قسم کے اندیشوں نے پریشان کر دیا ہوگا۔ اب ہم ان سے کیسے ملیں گے۔ اور کہاں ملیں گے!

اندیشہ مجھے آنے والی رات سے بھی تھا۔ اس رات کے دوران میں بہت کچھ ہو سکتا تھا۔ محسن نے ٹھیک کیا تھا۔ سونا تو اب وہاں نہیں ہوگا۔ ہم نے متعلقہ حکام تک اطلاع پہنچانے کا بندوبست کر لیا تھا۔ کسٹم والے یا ملٹری انٹیلی جنس والے وہاں سے ٹرک اور اسلحہ اور سونا سب لے جا چکے ہوں گے۔

حاجی کو عین وقت پر مایوسی ہوگی تو وہ کیا کرے گا! یہ ہو سکتا ہے کہ شدید اشتعال کی کیفیت میں وہ ہم سب کو شوٹ کر دے۔ کوئی سوال کیے بغیر اور وضاحت کا موقع دیے بغیر۔ یہ بھی ممکن ہے کہ چاند بھائی کے چھاپا مار دستے آ ئیں۔ یا آئیں تو حاجی کی فوج کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ مقابلہ کریں تو اس میں سب مارے جائیں۔ یہ کھلے سمندر کی جنگ تھی۔ اس کے خطرات اور مضمرات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کاش کوئی ایسی صورت ہوتی کہ ہم لڑے بھڑے بغیر نکل جاتے۔

لیکن حاجی کوئی چانس نہیں لے رہا تھا۔ اس کے حفاظتی انتظامات ایسے تھے کہ مجھے ابھی تک کسی کی غفلت یا غلطی سے فائدہ اٹھانے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ حالانکہ میری کوشش تھی کہ صرف ایک حکم کے غلام کو قابو کر لوں اور اس سے ہتھیار چھین لوں۔ ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا اسی صورت میں قابو کیا جا سکتا تھا کہ میرے پاس بھی کچھ ہو۔

مجھے وقت کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ اس کمرے میں ایک لائٹ نہ ہوتی تو مکمل اندھیرا ہوتا۔ لانچ اب کس سمت میں رواں تھی، یہ بھی میں نہیں جانتا تھا۔ میں نے کچھ وقت سو کے بھی گزارا اور اس وقت اٹھا جب حاجی نے مجھے بیدار کیا۔

"کیا وقت ہوا ہے؟" میں نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"رات کے ساڑھے نو بجے ہیں اور ہم تقریباً اس علاقے میں ہیں [illegible] تھا۔"

"یہ تمھیں کیا معلوم؟"

"وہ تھا تو کراچی کا ساحل اور کورنگی کریک کا علاقہ۔ ہم دس پندرہ میل کی پٹی کو کھنگال سکتے ہیں۔" وہ بولا۔ "بلکہ کھنگال چکے ہیں۔ ہمارے پاس سمندر کی تہ میں معدنیات کا پتا چلانے والے آلات ہیں اور اندھیرے میں فوٹوگرافی کا سامان بھی ہے۔ ساحل کے قریب تو ہمیں کچھ نہیں ملا تھا۔ زیادہ گہرے سمندر میں ہم گئے نہیں تھے کیونکہ اس وقت ہمارے پاس وہ ساز و سامان نہیں تھا جو ہم آج لائے ہیں۔"

"آج تم گہرے سمندر میں اترو گے۔ ویسے تو تمھارا ذاتی وزن بھی کافی ہے تمھیں تہ میں بٹھانے کے لیے۔ لیکن تم پیروں میں چکی کے پاٹ باندھ لو تو۔"

"یہ کام تم کرو گے برخوردار۔ غوطہ خوری کا لباس پہن کے۔" حاجی مسکرایا۔ "تم کہو گے تو ہم چکی کے پاٹ بھی فراہم کر دیں گے۔ کیمرہ تمھارے پاس ہوگا اور اس کی تصویر ہم اوپر دیکھیں گے۔ اگر ہمیں سونا نظر آ گیا تو ہم تمھیں نکال لیں گے۔"

"ورنہ؟" میں نے کہا۔ "آپ بھی آ جائیں گے؟"

"ورنہ یہ کہ جب صورِ اسرافیل پھونکا جائے تو تم اسی سمندر کی تہ سے اٹھ کے آ جانا۔" حاجی نے کہا۔

"ویری گڈ۔ میں نہا دھو کے پہنچوں گا میدانِ حشر میں۔ مگر حاجی صاحب! میں اکیلا اتروں گا؟ سنا ہے نیچے سمندری مخلوق بھی ہوتی ہے۔ اگر میں کسی وھیل کے کھلے منہ میں اتر گیا تب بھی یہ ممکن ہے کہ مجھے کوئی جل پری لے جائے۔"

"فکر مت کرو۔ ہم محسن کو تمھارے ساتھ بھیج رہے ہیں۔ تم بچپن سے ساتھ ہو نا۔ کبھی جدا نہیں ہوئے۔" حاجی نے کہا۔

اسی وقت ایک زبردست دھماکا ہوا اور مجھے یوں محسوس

ہوا جیسے لانچ کسی چٹان سے ٹکرا گئی ہے۔

حاجی میرے ساتھ ہی مُنہ کے بل گرا۔ میں نے باہر عجیب سا شور سُنا۔ بہت سے لوگ بیک وقت چلا رہے تھے۔ گرنے سے پہلے میرا سر سامنے والی دیوار سے ٹکرایا تھا۔ اس صدمے نے وقتی طور پر مجھے چکرا دیا۔ اگر میں سنبھل سکتا تو اس موقع سے پورا فائدہ اُٹھاتا مگر مجھے اُٹھنے میں دیر ہوئی۔ حاجی مجھ سے پہلے کھڑا ہو گیا تھا اور اس کے دونوں محافظ بھی اپنے قدم جما چکے تھے۔

"تم اس کا خیال رکھو" حاجی نے رومال سے چہرہ صاف کیا "ہم دیکھتے ہیں یہ کیسا شور ہے۔"

وہ پلٹا اور اس کے پیچھے کھڑے ہوئے دونوں حکم کے غلاموں نے اسے راستہ دیا۔ یہ پہلی غلطی تھی جو حاجی سے میرے معاملے میں سرزد ہوئی۔ اگر وہ چاہتا تو محافظوں کو اپنے ساتھ ہی لے جاتا اور دروازہ پہلے کی طرح باہر سے مقفل کر جاتا مگر اس کا ارادہ فوراً واپس آنے کا تھا۔

عین اس وقت جب وہ دونوں محافظوں کے درمیان اور کھلے دروازے کی سیدھ میں تھا، میں نے اس پر جست لگائی۔ فلائنگ کِک کا اس سے بہتر اور بھرپور استعمال میں نے پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔ اس کِک نے حاجی کو دروازے سے یوں باہر پھینکا کہ وہ توپ سے نکلے ہوئے گولے کی رفتار سے گیا اور مُنہ کے بل گرنے کے بعد بھی گھسٹتا ہوا چند گز کا فاصلہ طے کر کے ایک دیوار سے ٹکرا گیا۔

اندر دونوں محافظ بوکھلا گئے تھے۔ میں نے فلائنگ کِک مارنے سے پہلے ان کی پوزیشن کا بھی صحیح اندازہ کر لیا تھا۔ میرے دونوں ہاتھ اس وقت پھیلے ہوئے تھے جب میرے پاؤں حاجی کی پُشت سے ٹکرائے۔ دونوں محافظ میرے جہاز کے پروں کی طرح پھیلے ہوئے بازوؤں سے نہ بچ سکے۔ جب میں گرا تو وہ بھی دیوار سے ٹکرا کے گر چکے تھے۔

موقع ملتے ہی میری حیوانی جبلت، جسمانی صلاحیت اور پیشہ ورانہ مہارت ایک سہ فریقی قوت بن گئے۔ میں بجلی کی طرح اٹھا اور ابھی ایک محافظ سنبھلا بھی نہ تھا کہ میں نے پوری قوت کے ساتھ اس کی گردن پر کِک ماری۔ پھر اس کی طرف دیکھے بغیر میں تیزی سے پلٹا اور دوسرے کو گردن سے پکڑ کے کھینچ لیا۔ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ کے میرا نشانہ لے رہا تھا۔ جب میں نے اسے گھما کے فرش پر مارا تو اس کی گردن پر اپنی گرفت ڈھیلی نہیں کی۔ خود اپنے جسم کے وزن کی متحرک قوت نے اس کی گردن توڑ دی۔

اب میں پہلے والے محافظ کی طرف متوجہ ہوا۔ میری کِک اس کے نرخرے پر پڑی تھی۔ اس کی آواز ہی بند نہیں ہوئی تھی، سانس بھی رک گئی تھی۔ یہ مشکل سے تیس سیکنڈ کا عمل تھا جس نے حاجی کو ناک آؤٹ کیا اور اس کے دونوں محافظوں کو ان کے فرائض سے ہی نہیں بارِ زندگی سے بھی سبکدوش کر دیا۔ میں نے دروازے سے جھانک کر دیکھا تو حاجی عبداللہ اُٹھ کے فرار ہو رہا تھا۔ اس کی چال بہت مضحکہ خیز تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس نے خوب پی رکھی ہے۔ وہ چلا کے محافظوں کو پکار رہا تھا۔

میں نے دونوں مُردہ محافظوں کے ہتھیار قبضے میں کیے۔ ان کے آٹومیٹک ریوالور روسی ساخت کے تھے۔ یو گر مائن قسم کے گر جدید ترین اور دلاور اینڈ کمپنی کا عطیہ۔ ان میں سے ایک میں نے اپنے ہاتھ میں رکھا۔ ایک محافظ کے پاس سے مجھے زہریلے تیروں والا پستول بھی ملا۔ اس کی واسکٹ نما شرٹ کی اوپر والی جیب سے دو تیر بھی برآمد ہوئے جو میں نے اپنی جیب میں رکھ لیے۔

حاجی میری نظروں سے غائب ہو چکا تھا۔ میں کُھلے دروازے سے باہر آیا اور اس مختصر سی راہداری سے گزرا جس میں حاجی کچھ دیر پڑا رہا تھا۔ دائیں طرف اوپر جانے کا راستہ تھا۔ اوپر عجیب ہنگامہ برپا تھا۔ میں نے حاجی کو دیوانہ وار گالیاں بکتے سُنا۔ پھر اوپر سے پانی کا ایک ریلا آیا جس نے مجھے سر سے پیر تک بھگو دیا۔ میں نے رابعہ کے چیخنے کی آواز بھی سنی۔ وہ مجھے پُکار رہی تھی۔ لانچ میں گُھپ اندھیرا پھیل گیا تھا اور اوپر پہنچنے کے بعد بھی مجھے کچھ سُجھائی نہ دیا۔ میں صرف اتنا اندازہ کر سکا کہ لانچ غرق ہو رہی ہے۔

"محسن!" میں نے چلا کے کہا "رابعہ!"

"ادھر سکندر! ادھر آؤ" رابعہ کی ہذیانی، دہشت میں ڈوبی ہوئی چیخ نے مجھے دیوانہ کر دیا۔ میں ادھر لپکا جہاں سے یہ آواز آ رہی تھی۔ کسی نے مجھ پر فائر کیا۔ میں نے پلٹ کے گولی چلائی۔ ایک آدمی لانچ کے کنارے سے چیخ مار کے اچھلا اور پانی میں کود گیا۔ وہ آخری آدمی تھا جو وہاں موجود تھا۔ باقی سب سمندر میں چھلانگ لگا چکے تھے یا لائف بوٹ میں نکل گئے تھے۔

وہ ایک بند دروازہ تھا جس کا نصف سے زیادہ حصہ پانی میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہاں تک جاتے ہوئے خود میں سمندر کی بپھری ہوئی موجوں کی یلغار میں آ گیا۔ اندر سے رابعہ چیخ رہی تھی۔ باہر مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ سمندر کا نمکین پانی میرے مُنہ... آنکھوں اور میری ناک میں بھر گیا تھا۔

"دروازہ کھولو سکندر!" رابعہ نے چلا کے کہا۔ میں نے پورا زور لگا کے ہینڈل گھمایا اور دروازے کو پانی کے دباؤ کے خلاف دھکیلا۔

"رابعہ!" میں نے چلا کے کہا "کہاں ہو تم؟ باہر آؤ۔ ادھر میں نے دروازہ پکڑ رکھا ہے!"

آدھے کھلے ہوئے دروازے میں اس کا ہاتھ آگے آیا۔ میں نے ...ے کو گھٹنے سے دبایا اور اسے باہر کھینچا۔ ایک زبردست ...نے ہمیں تقریباً غرق کر دیا مگر دروازہ اس تھپیڑے سے کچھ ...ہوا اور رابعہ ایک دم باہر آ گئی مگر وہ اب بے ہوش تھی۔ ...نے گھٹنا ہٹایا تو دروازہ پانی کی قوت سے بند ہوا اور میں لڑکھڑا ...را۔ اب پانی کے ساتھ رابعہ بھی میرے اوپر تھی۔ میں نے ایک ...ی کوشش کی اور پانی سے باہر آ گیا۔

رابعہ کے وجود کو ایک ہاتھ سے کندھے پر سنبھال کے میں ...کنارے کی طرف چلنا شروع کیا۔ یہ لانچ کا وہ حصہ تھا جو اوپر اٹھا ...تھا اور پانی سے باہر رہ گیا تھا۔ میرے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل ...ہوا کہ لانچ کسی چٹان پر چڑھ گئی تھی اور الٹ چکی تھی۔ کوئی بڑی لہر ...بھی وقت اس کو چٹان کے کنارے سے لڑھکا سکتی تھی۔ ایسی ...رت میں رابعہ اور میں لانچ کے نیچے دب جاتے اور شاید ہمیں اوپر ...نے کا راستہ بھی نہ ملتا۔

رابعہ کا اور میرا مشترکہ وزن ڈھائی سو پونڈ سے بھی زیادہ بنتا ...تھا۔ ادھر لانچ ایسے زاویے سے چٹان پر اٹکی ہوئی تھی کہ ہر لہر اسے ...رہی تھی لیکن مجھے بھی اسی طرف جانا تھا۔ اگر میں آخری حصے تک ...پہنچ جاتا تو چٹان پر اترنے کی کوشش کر سکتا تھا مگر یہ بہت غیر یقینی تھا۔ ...مجھے ایسا لگتا تھا کہ آخری کنارا اتنا وزن برداشت نہ کر پائے گا اور لہر ...تھپیڑا آیا تو لانچ ہمارے ساتھ ہی اُلٹے گی۔

چٹان سے لہروں کے ٹکرانے کا شور اتنا زیادہ تھا کہ میں نے محسن ...کی آواز بہت دیر سے سُنی۔ پہلے مجھے شک ہوا کہ میرے کان بج رہے ...ہیں۔ پھر میں نے پلٹ کر دیکھا۔ نیچے گہرے پانی میں ایک سیاہ نقطہ سا ...دکھائی دے رہا تھا۔ یہ محسن تھا جو لہروں سے بھی نبرد آزما تھا اور مجھے ...ہاتھ ہلا کے متوجہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ معلوم نہیں یہ بھی میری ...چھٹی حس کا کمال تھا یا کچھ اور کہ میں نے محسن کی بات سمجھ لی۔ وہ مجھے اس ...طرف جانے سے روک رہا تھا۔

میں نے آگے بڑھنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس کنارے تک پہنچنے کی کوشش کرنا خودکشی کی کوشش کے مترادف تھا۔ لانچ اوپر اٹھتی ...تو یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ہم کسی دوسری چٹان پر گرتے اور پھر لانچ ہم پر ...گرتی تو ہماری ہڈیوں کا بھی سُرمہ ہو جاتا۔

اندھیرا زیادہ گہرا نہیں تھا۔ میں نے ایک ہاتھ سے چہرے ...کو صاف کیا اور آنکھیں پھاڑ کے دیکھا۔ میری آنکھوں میں جلن ہو رہی ...تھی لیکن میں ان کو کُھلی رکھنے پر مجبور تھا۔ محسن کا ہاتھ مجھے اپنی جانب ...بلاتا محسوس ہوا۔ میں نے گھٹنوں سے اوپر پانی میں لانچ کا کنارہ تلاش ...کیا۔ رابعہ کو مضبوطی سے کندھے پر سنبھالا اور پانی میں کود گیا۔

میں اس جگہ سے بہت دور گرا جہاں محسن موجود تھا لیکن یہ سبب میں نے بعد میں دیکھا۔ اس سے پہلے میں نے لانچ کو ایک اور دھماکے کے ساتھ پانی میں اُلٹتا دیکھا۔ میں نے جب اس کے کنارے پر قدم جما کے چھلانگ لگائی تھی تو اس کا توازن جھٹکے سے بگڑا تھا اور اس کا آخری حصہ چٹان پر سے پھسل گیا تھا۔

لانچ کے پانی میں گرنے سے ایک زبردست لہر اُٹھی جس نے مجھے دور اچھال دیا۔ میں نے جب پھر سطحِ آب پر آ کے دیکھا تو محسن مجھ سے چند گز کے فاصلے پر تھا۔ مجھے اب اپنی نہیں رابعہ کی فکر تھی، اس نے بے ہوشی کے عالم میں سمندر کی یلغار کا مقابلہ کیا تھا۔ معلوم نہیں کتنا پانی اس کی ناک اور اس کے مُنہ کے راستے پیٹ میں اتر چکا تھا۔ اسے ہوش میں لانے کے لیے ہمارا جلد از جلد خشکی پر پہنچنا ضروری تھا۔ محسن نے میرا ہاتھ پکڑ کے ساحل کی طرف تیرنا شروع کیا۔

"اسے کیا ہوا ہے؟" محسن نے چیخ کر پوچھا۔

"بے ہوش ہے ابھی تو" میں نے ہانپتے ہوئے بڑی مشکل سے جواب دیا "حاجی کہاں گیا؟"

"بھاگ گیا شاید" محسن نے اونچی آواز میں کہا "میں نے اس کی لائف بوٹ پر فائر کیا تھا۔ اس میں سوراخ ہو گیا تھا۔ ان سب کا اسلحہ... بھیگ کر بے کار ہو چکا تھا... ورنہ وہ مجھے مار ڈالتے۔"

"دو کو میں نے مار دیا تھا۔ بلکہ تین کو" میں نے کہا۔

"ایک میرے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ باقی سب نکل گئے حاجی کے ساتھ" وہ بولا۔

ساحل تک پہنچتے پہنچتے مجھ پر بھی تقریباً بے ہوشی طاری ہونے لگی تھی مگر محسن نے میری مدد کی۔ آخری چند گز میں نے قوتِ ارادی کے سہارے طے کیے۔ پانی کا زور اب ٹوٹ گیا تھا اور ساحل تک پہنچنے والی لہریں پیار سے تھپکی دیتی محسوس ہوتی تھیں۔

میں نے رابعہ کو ریت پر لٹا دیا اور خود اس کے برابر ہی لیٹ گیا۔ چند لمبے اور گہرے سانس لے کر جب میری توانائی کچھ بحال ہوئی تو میں نے رابعہ کو دیکھا۔ اس کی نبض کچھ سُست تھی لیکن یہ تشویش کی بات نہیں تھی۔ بے ہوشی میں سانس اور نبض دونوں کی رفتار دھیمی پڑ جاتی ہے۔

"اس کے پیٹ میں پانی تو نہیں گیا؟" محسن نے سوال کیا۔

"گیا ہوگا، مجھے معلوم نہیں" میں نے کہا "تجھے آتا ہے وہ عمل، پیٹ سے پانی نکالنے کا؟"

محسن نے اقرار میں سر ہلایا اور رابعہ کو اُلٹا لِٹا کے اس کی کمر پر دباؤ ڈالنے لگا۔ میں نے اس کی ہدایات کے مطابق رابعہ کو تھوڑا سا اوپر اٹھایا مگر اس سے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ رابعہ کے پیٹ میں غالباً اتنا پانی نہیں تھا کہ واپس نکل سکتا۔ محسن نے

اُسے پھر سیدھا لٹا دیا اور ہم نے اس کے پیروں کے تلوے اور ہاتھ رگڑنے شروع کیے۔

دس منٹ کے بعد ہماری محنت رنگ لائی اور رابعہ نے ہوں ہاں، کر کے تھوڑی سی حرکت کی۔ پھر وہ لمبے لمبے سانس لینے لگی اور بے چینی سے ہاتھ پیر مارنے لگی۔ اس کی بے ہوشی میں خوف کا عنصر شامل تھا۔ جب وہ لانچ کے اس کیبن میں بند ہو گئی تھی تو اُسے چڑھتا پانی ایک اندھی، بے رحم اور ناقابلِ شکست قوت محسوس ہوا ہوگا۔ سمندر کی ہلاکت خیز قوت کے مقابلے میں وہ تنہا تھی اور محصور تھی۔ اس کی فریاد و فغاں سے فرشتۂ اجل کی پیش قدمی رک جائے گی، اُس کا یقین ہر لمحے کے ساتھ ختم ہو رہا تھا۔ اور اسی بے بسی کی موت کا خوف اس کو بے ہوشی کی آغوش میں لے گیا تھا۔

اب ہوش کی منزل کی طرف لوٹتے ہوئے اس نے لاشعور کے نہاں خانوں میں دبکے ہوئے خوف کو پھر دیکھا اور اُسے اپنے وجود سے خارج کرنے کے لیے کمربستہ ہو گئی۔ اُس نے چلانا اور مجھے پکارنا شروع کیا۔

”سکندر... سکندر! مجھے بچاؤ... میں ڈوب جاؤں گی۔ مجھے نکالو...“ اس نے چلانا شروع کیا۔

میں نے اُسے زور زور سے جھنجوڑا۔ اس کے گالوں پر تھپڑ مارے۔ ”رابعہ... جانِ من... دیکھو میں تمھارے ساتھ ہوں۔ رابعہ ہوش میں آؤ... تم بالکل محفوظ ہو۔ میرے پاس ہو۔“

رابعہ نے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اور آنکھیں کھول کے کمزور لہجے میں کہا۔ ”تم... تم آ گئے سکندر۔“ پھر اُس نے مضبوطی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”مجھے چھوڑ کے مت جانا سمندر میں...“

”جان... میری طرف دیکھو... ادھر دیکھو۔ یہ محسن ہے... ہم ساحل پر ہیں... سمندر بہت دور ہے۔“

”نہیں... دیکھو سمندر کیسے پھنکار رہا ہے۔ یہ مجھے اور تمھیں نگل لے گا۔“ وہ کانپتے ہوئے بولی۔ ”وہ ذلیل حاجی ہمیں لے جائے گا۔“

”وہ غرق ہو گیا رابعہ۔ جہنم رسید ہوا۔ وہ اپنی لانچ کے ساتھ ہی ڈوب گیا۔“ میں نے کہا۔ ”اس سے ڈرنے کی کوئی بات نہیں رہی۔ خدا نے ہم سب کو بچا لیا ہے اور پھر ملا دیا ہے۔“

اُس نے باری باری مجھے اور محسن کو دیکھا اور ایک گہری، لمبی پُراطمینان سانس لی۔ پھر اُس نے آنکھیں بند کر کے خود کو نیند سے سپرد کر دیا۔

یار محسن، یہ سب کیسے ہوا؟ لانچ کا ناخدا اُس چٹان کو دیکھ نہیں سکا؟“ میں نے کہا۔ ”مجھے ایک معجزہ ہی لگتا ہے یہ قدرت کو ہمیں بچانا منظور تھا۔ اُس نے ناخدا کو اندھا کر دیا یا اُس کی راہ میں چٹان کھڑی کر دی۔“

”ایسی کوئی بات نہیں ہوئی سنت کبیر۔“ محسن بولا۔

”پھر... کیا کسی دوسری لانچ نے ٹکر مار دی...؟ میں سمجھ گیا۔ یہ چاند بھائی کا کام ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”اس کے آدمی...“

”اگر وہ آتے، تو اس وقت آتے جب حاجی عبداللہ سونا نکالنے میں مصروف ہو جاتا۔“ محسن نے میری بات کاٹ دی۔ ”کیا تجھے معلوم ہے کہ حاجی نے ہم دونوں کو سمندر میں اُلٹنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ہم تو نیچے ہی رہ جاتے۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ میں نے کہا۔

”یہ کارنامہ میں نے سرانجام دیا۔“ محسن فخر سے بولا۔ ”تنِ تنہا۔“

”کون سا کارنامہ...؟ کیا لانچ کو تُو نے چٹان پر چڑھا دیا تھا؟“ میں نے کہا۔ ”تیرے پاس کوئی پُراسرار قوت آ گئی تھی؟“

محسن نے اقرار میں سر ہلایا۔ ”اسے پُراسرار قوت ہی کہا جا سکتا ہے۔ مگر وہ طاقت میرے ہاتھ میں رابعہ نے دی تھی۔“

”رابعہ کے پاس ایسی کون سی قوت تھی؟“

”مجھے نہیں معلوم اس نے کہاں سے اور کیسے ایک چھوٹی سی شیشی کسی زہریلے سفوف کی حاصل کر لی تھی۔ وہ بہت زود اثر زہر تھا۔ میرا خیال ہے، وہی ان مفلوج کر دینے والے تیروں کی نوک پر لگایا جاتا ہوگا۔“

”ممکن ہے، اسے شیشی کہیں پڑی مل گئی ہو۔ وہ کسی سے زہر چھین تو نہیں سکتی تھی۔“ میں نے کہا۔

”ہاں، یہ تو اب رابعہ ہی بتا سکتی ہے۔ حاجی کے نمک خواروں میں کسی نمک حرام کی موجودگی کو بھی خارج از امکان تو نہیں سمجھا جا سکتا۔“ محسن بولا۔

”وہ ہماری مدد بھی کر سکتا تھا۔“

”مگر رابعہ ہم سے بہتر پوزیشن میں تھی۔ ہم قیدی تھے اور حاجی نے ہمیں بہت خطرناک قرار دیا ہوگا۔“ محسن بولا..... ”رابعہ سے کیا بعید، اُس نے بے وقوف بنایا ہو کسی کو۔ بھائی ان لڑکیوں کے پاس عشوہ و غمزہ و ادا کا جادو بھی تو ہوتا ہے۔“

”یہ تو ہے۔“ میں نے کہا۔ ”خیر۔“

”اس نے بڑی ہوشیاری سے کام کیا۔ اس کے کمرے میں فروٹ وغیرہ ہوں گے۔ وہ کیلوں کا ایک گچھا لے کر میری طرف آ گئی۔ دروازے پر ایک محافظ کھڑا تھا۔ اُس نے رابعہ کو روکا۔ رابعہ نے کہا کہ حاجی صاحب نے یہ کیلے دیے ہیں، اندر لے جانے کے لیے۔ تم دے دو۔ شک کی کیا بات ہے۔ چاہو تو چاشنی لے لو میری۔ وہ خود ایک کیلا کھا رہی تھی۔ ایک اُس نے محافظ کو دیا۔ لو تم بھی کھاؤ۔ باقی میری طرف دروازے سے ہی اچھال دیے۔ اور آگے چلی گئی۔ میں حیران تھا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ اتنی دیر میں محافظ نے کیلا چھیلا اور دو مُنہ مار کے نگل گیا۔ چھلکا اُس نے سمندر میں اچھال دیا۔ میں نے چار کیلے اُٹھائے تو درمیان میں چھوٹا سا کاغذ کا پُرزہ دکھائی دیا۔ اس پر لکھا تھا۔ ”محافظ نے کیلے میں زہر کھا لیا ہے۔ دوسرے کیلے میں شیشی ہے۔“ میں نے کاغذ تو فوراً مُٹھی میں چھپا لیا اور ایک ایک کیلا چھیلا۔ ان میں سے ایک کے درمیان وہ شیشی چھپی ہوئی تھی۔ میں نے محافظ سے کہا۔ لو۔ ایک اور کھاؤ۔ غالباً یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ میں نے باقی زہر دوسری شیشی میں انڈیل دیا تھا۔ وہ اندر آتے آتے رک گیا۔ غالباً اسے خیال آ گیا تھا کہ ایسا کرنا ٹھیک نہیں۔ کہیں یہ میری چال نہ ہو۔ محافظ بے چارے سخت ڈیوٹی دیتے ہیں اور یہ فروٹ وغیرہ ان کو کہاں ملتے ہیں۔ ایک کیلا تو اس نے وہیں کھڑے کھڑے اتنی صفائی سے نگلا تھا کہ کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ بس وہ اندر آیا اور مُنہ کے بل گرا۔ میں نے ایک دم دروازہ بند کر دیا۔ تین منٹ سے پہلے ہی زہر نے اثر دکھا دیا تھا۔ میں نے اُسے باتھ روم میں ڈالا۔ اس کے کپڑے پہنے اور اس کا اسلحہ لے کر نکل آیا۔ میں نے سیدھا ناخدا کے کیبن کا رُخ کیا۔ وہ مجھے پہلی نظر میں پہچاننے سے قاصر رہا۔ میں نے دو کیلے اس کے سامنے رکھ دیے اور واپس لوٹا۔ وہ دونوں کیلوں کو ندیدوں کی طرح نگل گیا۔ اس نے چلا کے پوچھا بھی کہ یہ کہاں سے آئے تو میں نے پیچھے مُڑ کر دیکھے بغیر کہا کہ حاجی صاحب نے دیے ہیں۔ صرف تین منٹ بعد وہ ہوا جو ایک حادثہ سمجھا گیا۔ ایک لاش اگر ناخدا کے فرائض سنبھالے گی تو پھر یہی ہوگا۔ میں بالکل تیار تھا۔ حادثہ ہوتے ہی میں نے رابعہ کو تلاش کیا۔ دو محافظ میرے ہاتھوں مارے گئے۔“

رابعہ نے کہا۔ ”اب ہم کہاں ہیں؟“

میں نے اور محسن نے چونک کے اُسے دیکھا۔ ”ان سے بہت دور اور محفوظ۔“ میں نے کہا۔

”تمھاری طبیعت اب کیسی ہے؟“

”ٹھیک ہے... سکندر۔ چلو ہم یہاں سے نکل جائیں۔“

”تم چل سکتی ہو؟“ میں نے کہا۔ اور اُسے سہارا دے کر کھڑا کیا۔

مجھے تھوڑا سا اندازہ تھا کہ ہم آبادی سے زیادہ دور نہیں ہوں گے۔ اگر ہم صحیح سمت میں چلتے رہے تو کسی نہ کسی گوٹھ تک ضرور جا پہنچیں گے۔ رابعہ اس خیال سے بہت خوفزدہ تھی کہ کہیں وہ لوگ بھی ساحل پر ہمارے تعاقب میں نہ پہنچ جائیں۔

ہمارے کپڑے بالکل بھیگے ہوئے تھے۔ میں نے بے مصرف ہو جانے والے ریوالور نکال کے پھینکے۔ میں زہریلے تیروں والا ریوالور بھی پھینکنے ہی والا تھا کہ ایک خیال نے مجھے روک لیا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ پانی میں بھیگنے سے زہر میں بجھے تیر دل کی صلاحیت میں فرق نہ آیا ہو۔ ضرورت پڑنے پر یہ چیز اپنی افادیت کسی ریوالور سے زیادہ ثابت کر سکتی تھی۔

ایک آبادی تک پہنچتے پہنچتے ہماری حالت تھکن سے مزید غیر ہو گئی۔ ریت اور ناہموار راستوں پر چلنا بہت مشکل کام تھا۔ وہ کوئی چھوٹا سا گوٹھ تھا جس میں بیشتر گھر کچے تھے اور ان میں مزدور یا ماہی گیر ہی آباد ہو سکتے تھے۔

”اگر کسی نے پوچھا تو ہم کیا کہیں گے؟“ محسن بولا۔

”ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہماری لانچ ڈوب گئی۔ وہ اگر چاہیں تو تصدیق کر لیں۔“ میں نے کہا۔ ”ایک عورت ہمارے ساتھ ہے۔ انھیں شک نہیں ہو سکتا۔“

گاؤں میں کُتے بھونک رہے تھے۔ ہم تنگ اور ٹیڑھی میڑھی گلیوں میں چلتے گئے۔ بالآخر ایک سفیدی کیا ہوا پکا مکان نظر آیا۔ اس کے ایک روشندان میں سے روشنی بھی باہر آ رہی تھی۔ میں نے رابعہ سے کہا کہ وہ دستک دے۔ اندر سے کوئی ضرور پوچھے گا کہ اتنی رات گئے آنے والا کون ہے اور جواب مرد کی آواز میں ملا تو ممکن ہے، وہ سمجھیں کہ ڈاکو آ گئے۔

تیسری دستک پر کوئی دروازے کے قریب آیا۔ کنڈی کھولنے سے پہلے کسی مرد نے کہا۔ ”کون ہے بھائی؟“

”ہم ہیں جی، مسافر۔“ رابعہ نے عاجزی سے کہا۔ ”کشتی ڈوب گئی ہماری۔“

وہ دروازہ کھول کے باہر آیا۔ لالٹین اُس کے ہاتھ میں تھی۔ اُس نے روشنی میں ہم سب کے چہرے غور سے دیکھے۔

”کشتی ڈوب گئی تمھاری، کہاں... تم مچھیرے تو نہیں لگتے؟“ اُس نے کہا۔

”ہم ماہی گیر نہیں ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”اور کشتی نہیں وہ لانچ تھی ہماری۔“

”لانچ؟“ وہ چونکا۔ ”تم... اسمگلر ہو؟“

”نہیں بھائی، ہم تو صرف رات گزارنا چاہتے ہیں یہاں۔ ہم بڑی مشکل سے ساحل تک پہنچے ہیں۔ کچھ کھایا پیا بھی نہیں

ہے۔" میں نے کہا۔

"اچھا۔ . . اچھا آجاؤ۔ کیا تمھیں معلوم ہے یہ کس کا گھر ہے؟" وہ بولا۔

میں نے اُسے غور سے دیکھا۔ وہ بھاری بھرکم جسم، کرخت چہرے اور گھنی مونچھوں والا شخص تھا۔ "اس سے ہمیں کیا فرق پڑتا ہے بھائی۔" رالعبہ نے کہا۔ "ہماری مدد کوئی بھی کرے۔"

"مدد تو میں کر رہا ہوں۔" وہ بولا۔ "لیکن میرے ساتھ کوئی چکر بازی مت کرنا۔ میں بہت خطرناک آدمی ہوں۔ تم نے نام ضرور سنا ہوگا میرا۔ شیش ناگ۔ ڈاکو شیش ناگ۔"

رالعبہ بے اختیار ایک قدم پیچھے ہٹ گئی مگر میں نے آگے بڑھ کے کہا۔ "ہمارے لیے تو تم صرف ایک محسن ہو۔"

وہ راستے سے ہٹ گیا۔ رالعبہ ڈرتے ڈرتے اس کے پاس سے گزری۔ پھر محسن اندر گیا۔ میں نے قدم آگے بڑھایا ہی تھا کہ مجھے اپنے پیچھے آوازیں سنائی دیں۔

"یہ بھی تمھارے ساتھی ہیں؟" شیش ناگ نے سوال کیا۔

میں نے پلٹ کے دیکھا۔ حاجی عبداللہ اپنے چار حکم کے غلاموں کے ساتھ اسی گھر کی جانب قدم بڑھا رہا تھا۔

"نہیں، یہ میرے ساتھی نہیں ہیں۔" میں نے اندر گھستے ہوئے کہا۔ "یہ دشمن ہیں ہمارے۔ ان کو اندر مت آنے دینا۔"

"یہ کیا چکر ہے؟" شیش ناگ غرا کے بولا۔

"کوئی چکر نہیں، ہم سب بتا دیں گے۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "لیکن دیکھو، ابھی تم بچا لو ہمیں۔"

"ہاں بھائی، آخر ہم پہلے تمھارے پاس آئے تھے۔ اب ہم تمھاری چھت کے نیچے ہیں۔ تمھاری پناہ میں ہیں۔" رالعبہ نے کہا۔

"تم اتنے بزدل تو نہیں ہو سکتے کہ اپنے مہمانوں کو ان کے دشمنوں کے حوالے کر دو۔ یا وہ تمھارے گھر میں گھس کے انھیں مار جائیں۔" محسن نے کہا۔

اس کو دلیلوں سے قائل نہیں کیا جا سکتا تھا اور اس کے ساتھ زبردستی کرنا ایک اور خطرناک دشمن پیدا کرنے کے مترادف تھا جو دوسرے خطرناک دشمن کے ساتھ مل جاتا تو ہم کہیں کے نہ رہتے۔ جذباتی اپیل اپنا کام کر گئی۔

"اوئے کس کی ماں نے جنا ہے ایسا لال جو شیش ناگ کے گھر میں قدم بھی رکھ سکے اس کی مرضی کے بغیر۔ تم چلو اندر۔" وہ پھنکار کے بولا۔

"خیال رکھنا یہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔" میں نے اندر جاتے ہوئے کہا لیکن میں اس دروازے سے چند قدم کے فاصلے پر صحن میں ٹھہر گیا۔ دروازہ ایک ڈیوڑھی کا تھا جس کے دائیں بائیں بھی کمرے تھے۔ اور پھر صحن کے چاروں طرف بھی۔

"کیا بات ہے؟" میں نے شیش ناگ کی آواز سنی۔

"میرا نام حاجی عبداللہ ہے۔ السّلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔" عادت کے مطابق حاجی نے قرأت کے ساتھ کہا۔

"وعلیکم السّلام۔ حاجی صاحب، حکم کرو۔"

"ابھی ہم نے یہاں تین افراد کو آتے دیکھا ہے۔ دو مرد ہیں اور ان کے ساتھ ایک خاتون۔"

"ضرور دیکھا ہوگا۔ آگے حکم کرو۔"

"وہ ہمارے مجرم ہیں، ہمارے ملازم ہیں۔"

"کبھی مجرم کہتے ہو کبھی ملازم . . . تم خود کیا ہو؟" شیش ناگ نے کہا۔

"میں ایک تاجر ہوں اور وہ میرے ملازم ہی تھے۔ مگر وہ غبن کر کے فرار ہوئے ہیں۔" حاجی نے وضاحت کی۔

"وہ فرار ہو کے یہاں کیسے آگئے اور تم ان کا پیچھا کرتے ہوئے سیدھے یہاں آپہنچے۔ تم تو پولیس کے بھی باپ ہو۔" وہ مذاق اڑاتے ہوئے بولا۔ "بڑے زبردست جاسوس ہو۔"

"دیکھو، بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ ہم ایک لانچ میں سفر کر رہے تھے کہ حادثہ پیش آگیا۔ ان تینوں نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور تجوری میں سے سب کچھ نکال کے فرار ہو گئے۔ یہ حادثہ ساحل کے بہت قریب پیش آیا تھا۔" حاجی نے کہا۔

"اچھا، تم ادھر ہی ٹھہرو، میں ان سے پوچھ لوں۔ کتنا مال تھا تمھارا؟" شیش ناگ نے کہا۔

"وہ سب کچھ ہوگا جو تجوری میں تھا۔ نقد روپیہ اور کچھ زیورات، ہیرے جواہرات۔" حاجی نے کہا۔ "لیکن وہ تمھارے سامنے قبول نہیں کریں گے۔ انھیں میرے حوالے کر دو۔ میں جانتا ہوں ایسے لوگوں سے پوچھ گچھ کرنے کا طریقہ۔"

"اوئے حاجی، تو ہمارے گھر کے بندوں پر الزام لگاتا ہے اور ہمیں بولتا ہے کہ ہم گدھے ہیں، اُلّو کے پٹھے ہیں۔ تو بہت بڑا عقلمند ہے۔ ہم تفتیش نہیں کر سکتے اور تو کر سکتا ہے۔" شیش ناگ نے برہمی سے کہا۔ "شیش ناگ ہے میرا نام۔"

"دیکھو، تم شیش ناگ ہو یا کوبرا، ہم تمھیں یہ بتا دیں

کہ وہ بہت خطرناک مجرم ہیں۔ انھوں نے چار آدمی بھی مار دیے ہمارے جو ان کو روکنا چاہتے تھے اور وہ اتنے احسان فراموش ہیں کہ تم انھیں پناہ دے کر پچھتاؤ گے۔ وہ تمھیں بھی مار ڈالیں گے۔" حاجی کی جھنجلاہٹ اب اشتعال کی کیفیت میں بدل رہی تھی۔

"ہوشیار اوئے جوانو۔" یہ صدا غالباً شیش ناگ نے اندر کی طرف منہ کر کے دی تھی۔ "ادھر آؤ ذرا میرے شیرو۔"

میں نے تقریباً ہر دروازے سے ایک شخص کو رائفل کے ساتھ باہر آتے دیکھا۔ ان میں سے دو تو شیش ناگ کی طرف جاتے ہوئے میرے سامنے سے گزرے۔ وہ سب جھاڑ جھنکار، سیاہ داڑھیوں اور بکھرے بالوں والے خونخوار لوگ تھے۔ ان میں سے ایک نے رک کر میری صورت کو غور سے دیکھا۔ پھر اس نے عجیب طرح سے سر ہلایا اور آگے چلا گیا۔

"خیر ہووے سردار۔"

"آؤ شیرو، ادھر خیال کرو۔ یہ بندے دہلیز سے آگے نہ آئیں میرے واپس آنے تک۔" شیش ناگ نے کہا۔

اس کے چار دوسرے ساتھی دائیں بائیں سے چھت پر چڑھ گئے تھے۔ اس کے لیے انھوں نے کوئی زینہ استعمال نہیں کیا تھا۔ میں نے اپنے قریب سے اوپر جانے والے دو افراد کی کارروائی کا دلچسپ مشاہدہ کیا۔ انھوں نے پہلے . . . . تو اپنی اپنی رائفلیں چھت پر پھینک دیں۔ پھر ایک نیچے جھکا اور دوسرا اس کے کندھوں پر چڑھ گیا۔ اس نے اطمینان سے اپنے ساتھی کے کاندھے پر قدم جمائے اور چھت پر ہاتھ ڈال کے اوپر پہنچ گیا۔ اوپر سے اس نے ایک کپڑا لٹکایا جو اس کی کمر سے بندھا ہوا تھا۔ دوسرے نے اسے پکڑا اور دیوار پر قدم رکھ کے اوپر کی طرف چلا گیا۔ یہ پیشہ ور ڈاکوؤں کا گروہ تھا اور وہ کسی بھی ہنگامی صورتِ حال سے نمٹنے کی تربیت، تجربہ اور صلاحیت رکھتے تھے۔ اوپر جانے والے چاروں افراد نے چھت کے کناروں پر مورچے سنبھال لیے ہوں گے اور دشمن ان کی زد میں ہوگا۔

شیش ناگ میرے سامنے نمودار ہوا۔ "تم نے سنا، وہ کیا بول رہا ہے؟"

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ "وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ تم ہماری تلاشی لے سکتے ہو۔ ہمارے پاس پھوٹی کوڑی تک نہیں۔"

"ہاں، میں تلاشی لوں گا۔" وہ بولا۔ "اس عورت کی بھی، کیا لگتی ہے وہ تمھاری؟"

"میری بیوی ہے وہ۔" میں نے کہا۔ "دوسرا میرا سالا ہے لیکن سردار، ایک عورت کی تلاشی؟"

"یہ کام ایک عورت ہی کرے گی۔" وہ بولا۔ "چلو میرے ساتھ، خبردار جو کوئی ایسی ویسی حرکت کی۔ تمھاری لاشیں بھی باہر نہیں جائیں گی۔ اسی احاطے میں دفن کرا دوں گا میں سب کو۔"

میں نے سر ہلایا اور اس کے پیچھے چلتا ہوا ساتھ والے کمرے میں گیا جہاں رالعبہ اور محسن پریشانی کے عالم میں کھڑے تھے۔ اس خالی کمرے میں بان کی ایک گھری چارپائی تھی اور دیوار پر طاقچے میں لالٹین رکھی ہوئی تھی۔ طاقچے کے اوپر کا حصہ بالکل کالا پڑ چکا تھا۔ مٹیالی دیواروں پر محسن اور رالعبہ کی پرچھائیاں بھی ساکت تھیں۔

شیش ناگ نے پہلے میری اور پھر محسن کی جامہ تلاشی لی۔ میں نے قطعی مزاحمت نہیں کی اور اپنا رویّہ بزدلی کی حد تک شریفانہ رکھا۔ اس مشکل صورتِ حال سے نکلنے کا سب سے آسان راستہ خود حاجی عبداللہ کے جھوٹ نے پیدا کر دیا تھا۔ اب حاجی کو بدنیت اور جھوٹا ثابت کر کے ہم اپنے میزبانوں کی مکمل حمایت حاصل کر سکتے تھے۔

رالعبہ کی باری آئی تو اس نے دروازے میں سے ہانک لگائی۔ "ناگ منی، او ناگ منی!"

'واہ' میں نے دل میں کہا۔ کیا نام ہیں اور کیا جوڑی ہے۔ ایک شیش ناگ، دوسری ناگ منی۔ تو مرا چاند میں تری چاندنی۔ کیا فلمی سچویشن ہے۔ ہیرو اور ہیروئن ایک سمندری طوفان اور تندئ بادِ مخالف سے لڑتے ہوئے ساحل تک پہنچتے ہیں تو ڈاکوؤں کے گروہ میں پھنس جاتے ہیں جہاں ڈاکو شیش ناگ اور اس کی بیوی . . . یا محبوبہ . . . ہے ناگ منی۔

ناگ منی چھم سے اندر آگئی۔ چھم سے اس لیے کہ اس نے پیروں میں چاندی کی پازیب پہن رکھی تھی۔۔۔ اس کا لباس دو حصوں پر مشتمل تھا۔ اوپر ایک چولی جو کھال سے چپکی ہوئی تھی اور اس کی کمر کے بالائی حصے پر ہی ختم ہو جاتی تھی۔ پھر پیٹ سے کافی نیچے کا حصہ تھا جسے منی اسکرٹ سے تشبیہ دی جا سکتی تھی۔ یہ گھگرا اس کی پنڈلیوں کے نصف حصے تک پہنچتا تھا۔ ماڈرن شرارے کو نیچے سے ڈیڑھ دو فٹ کاٹ دیا جائے تو کچھ ایسی ہی چیز بنے گی۔ یہ لباس شاید ارکانِ فلم سنسر بورڈ کے نزدیک غیر شرعی ہو

مگر یہ غیر روایتی نہیں تھا۔
وہ دلکش نقوش والی قدرے فربہی کی طرف مائل اور خاصے بے باک انداز و اطوار رکھنے والی گوری چٹی عورت تھی۔ اس کی چولی اور گھگھرے کا سرخ رنگ، انگلیوں میں پھنسی ہوئی سونے کی انگوٹھیاں، ہیرے کی لونگ اور شوخ رنگ کی لپ اسٹک اسے کوئی شریف عورت نہیں ثابت کرتے تھے۔ ممکن ہے وہ پہلے طوائف رہی ہو یا کسی طوائف کے ڈیرے پر رہی ہو اور شیش ناگ کے ساتھ بھاگ آئی ہو۔ طوائف اور ڈاکو ہمارے معاشرے کے دو بدنام، پُراسرار اور متنازعہ کردار ہیں جو فلمسازوں اور دانشوروں کے لیے دلچسپ مواد فراہم کرتے ہیں، جُرم و گناہ کے معاشرتی اور نفسیاتی عوامل کا تجزیہ کرنے کے لیے۔
"دیکھ، اس عورت کو ساتھ لے جا۔ اس کی تلاشی لے کر بتا مجھے، کیا مال ہے اس کے پاس۔"
ناگ منی نے رابعہ کو شانے سے پکڑ کے دھکیلا۔
"اندر چل۔"
"ارے ایسے نہیں، یہ مہمان ہیں۔" شیش ناگ نے اسے ڈانٹا مگر ملائمت سے۔
"یہ کیا طریقہ ہے؟" باہر سے حاجی نے چیخ کر کہا۔ "تم مجھے جانتے نہیں ابھی۔ میں اژدہا ہوں اژدہا۔"
"چپ کا کھڑا رہ صوفی۔" کسی نے کرخت لہجے میں جواب دیا۔ "خبردار! آگے مت آنا۔" یہ دھمکی غالباً کسی نے چھت پر سے دی تھی۔ "کھوپڑی اڑا دوں گا۔ اژدہے کی اولاد۔"
"سب سیدھے کھڑے رہو، الف کی طرح۔" یہ دوسری آواز بھی اوپر سے آئی تھی۔ اس کے بعد خاموشی ہوگئی۔ غالباً حاجی پر واضح ہوگیا تھا کہ وہ سامنے سے ہی نہیں بلکہ اوپر نیچے دائیں بائیں ہر طرف سے ڈاکوؤں میں گھر چکا ہے۔
ناگ منی پانچ منٹ بعد مٹک مٹک کر چلتی ہوئی آئی۔ اس کے پیچھے رابعہ تھی۔ قدرے خجل اور ناراض۔ غالباً اسے ناگ منی کا تلاشی لینے کا انداز پسند نہیں آیا تھا۔
"اس کے پاس مال ہے یہ۔" ناگ منی نے حقارت آمیز طنز کے ساتھ ایک انگوٹھی شیش ناگ کے ہاتھ پر رکھ دی۔ "بس... اچھی طرح دیکھا؟"
"میں نے تو دیکھ لیا۔ اب تو خود دیکھ لے۔" وہ بولی۔
شیش ناگ نے انگوٹھی کو میری طرف بڑھا دیا۔
"چلو تم جاؤ، آرام کرو۔ ناگ منی! ان کا خیال رکھنا، یہ مہمان خص
ہیں ہمارے۔"
"تم لوگ چلو، میں آتا ہوں۔" میں نے کہا۔ اور دیوار کی اوٹ تک ڈاکوؤں کے سردار کے ساتھ گیا۔
"بڈھے خبیث، داڑھی رکھ کے جھوٹ بولتا ہے۔ میں کہتا ہوں دفع ہو جا۔ چلا جا میرے دروازے کے سامنے سے۔" شیش ناگ نے غضب ناک لہجے میں کہا۔
"خیریت چاہتے ہو تو انھیں میرے حوالے کر دو، ورنہ..." یہ حاجی کی آواز تھی۔ اس کا جملہ ایک فائر کی آواز نے کاٹ دیا۔ کوئی دردناک آواز میں چلایا۔ اور زور زور سے کراہنے لگا۔
"اگر باقی تین کی بھی لاشیں لے جانی ہیں تو بتا دے۔ ورنہ ابھی وقت ہے۔ واپس لوٹ جا۔" شیش ناگ نے کہا۔
"جاتا ہوں لیکن یہ سمجھ لو کہ میں پھر آؤں گا۔ تمھاری تو میں اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔" حاجی نے دھاڑ کے کہا۔
"ابے جا بھوت کے سالے۔ یہ اینٹوں کی نہیں سیمنٹ کے بلاکوں کی دیواریں ہیں۔" شیش ناگ نے دو جملوں میں حاجی کو دو مرصع گالیاں دیتے ہوئے کہا۔ "پھر ادھر کا رُخ کیا نا تو داڑھی مونڈ کے ہاتھ میں دے دوں گا۔ شیش ناگ ہے میرا نام۔"
اس کے ساتھیوں نے شاید انھیں مزید خوفزدہ کرنے کے لیے ہوائی فائر کیے۔ پھر وہ اوپر سے دھم دھم کود گئے۔
"جاؤ ان کو رخصت کر کے آؤ۔" شیش ناگ نے کہا۔ چار ایک سی گھنی سیاہ داڑھیوں اور پٹکوں والے باہر نکل گئے۔
"آؤ میرے ساتھ۔" شیش ناگ نے خوفناک مونچھیں ہلا کے کہا۔ "میرے شیر اب ان کو بہت دور چھوڑ کے آئیں گے۔"
"تمھاری بہت مہربانی سردار۔" میں نے کہا۔ "یہ لوگ ہمیں پکڑ لیتے تو جان سے مار دیتے۔"
وہ مجھے آخری حصے کے ایک کمرے میں لے گیا۔ یہ ان کا مہمان خانہ معلوم ہوتا تھا۔ یہاں کھری چارپائیوں کے بجائے اسپرنگ کے گدوں والے بیڈ لگے ہوئے تھے۔ چاروں کونوں میں چار بیڈ تھے۔ دو دو بیڈز کے درمیان ایک میز تھی۔ اور درمیان میں دری بچھی ہوئی تھی۔ ایک بیڈ پر محسن بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اپنے گیلے اور پھٹے ہوئے خاکی رنگ کے کپڑے اتار دیے تھے۔ اب وہ گہرے جامنی رنگ کے ڈھیلے ڈھالے کرتے اور بہت زیادہ گھیر والی

ار میں ملبوس تھا۔ یہ شیش ناگ کے کسی ساتھی کے کپڑے ہو سکتے تھے۔
محسن اس لباس میں خاصا مطمئن تھا۔ پوزیشن رابعہ کی ب تھی۔ اس کو ناگ منی نے اپنے کپڑے دیے تھے۔ باس اسے پسند تھا یا شیش ناگ کو۔ ورنہ اس کے ں شلوار قمیص یا ساری ہوتی تو رابعہ کو چولی گھگھرانہ پہننا تا۔ ناگ منی شاید گہرے رنگ اس لیے استعمال کرتی ں کہ خود اس کا رنگ صاف تھا جو لال نیلے رنگوں میں دمکتا تھا۔ رابعہ کا رنگ اس سے بھی زیادہ اُجلا تھا۔ ادہ مختصر لباس میں جہاں جہاں سے اس کے بدن کا غیر ر حصہ دکھائی دیتا تھا، وہاں روشنی سی محسوس ہوتی تھی۔ ہد کے اس روپ نے میری نظروں کو خیرہ اور مجھے دم بخود دیا۔
وہ بہت سمٹی سمٹائی گھٹنوں پر سر رکھے بیٹھی ہوئی تھی ھے اپنی طرف متوجہ پا کے وہ اور لجائی۔ اگر سمندر کی ں کے تھپیڑوں میں اور ساحل تک پہنچنے کی جدوجہد ں اس کے کپڑے تار تار نہ ہوتے تو وہ اس لباس کو قبول نا نہ کرتی۔
"اب تم لوگ آرام کرو۔" شیش ناگ نے مونچھوں کو تاؤ یتے ہوئے رابعہ کو گھورا۔ "لیکن پہلے کچھ کھا پی لو۔ یہ کوئی ل نہیں ہے۔ تمھاری پسند کی چیز تو مل نہیں سکتی۔"
"سردار! کیوں شرمندہ کرتے ہو ہمیں۔" میں نے کہا۔ "صرف ہے مل جاتی تو کافی تھا۔"
"چائے بھی ملے گی۔ ناگ منی مہمانوں کی خاطر کرنا جانتی ہے۔" شیش ناگ نے کہا۔
"یہ ناگ منی... تمھاری...؟"
"بہن ہے میری۔" شیش ناگ نے کہا۔
میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میرے منہ سے کوئی غلط ات نہیں نکلی۔
"لیکن وہ صرف عورت نہیں۔ میرے بعد اس گروہ ں سب سے زیادہ خطرناک چیز ہے۔ ہر واردات میں ساتھ رہتی ہے اور میں سب سے زیادہ اس پر بھروسا کرتا ہوں۔ اس کی صورت پر مت جانا۔ وہ بڑے بڑے سورما دوں پر بھاری ہے۔ یہ جو میرے دوسرے ساتھی ہیں نا، ن کی نظر سے بڑے جیالے ہیں لیکن ناگ منی کے پاس قل بھی ہے ان سب سے زیادہ۔ اس کا نشانہ کبھی خطا ہیں ہوتا۔ میر [illegible] کی سردار بن سکتی ہے۔"
اپنی بہن کے بارے میں وہ فخر اور غرور سے بات کر رہا تھا لیکن مجھے یوں لگا جیسے وہ محسن کو اور مجھے خبردار کر رہا ہے کہ اس عورت کے بارے میں بُرا خیال بھی دل میں لانے سے گریز کریں۔ میں نے رابعہ کو دیکھا تو وہ مجھے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ شاید میں ضرورت سے زیادہ حیران، متجسس اور مرعوب نظر آرہا تھا۔
"چلو تم بھی اتنی دیر میں کپڑے بدل لو۔ یہ تو ابھی تک بھیگے ہوئے ہیں اور پھٹ بھی گئے ہیں۔" شیش ناگ نے کہا۔ "تم سے صبح بات ہوگی لیکن دیکھو، مہمان بن کے آئے ہو تو مہمان بن کے ہی رہنا۔ میرے ساتھ کوئی چکر مت چلانا۔ شیش ناگ ہے میرا نام۔"
یہ اس کا تکیہ کلام معلوم ہوتا تھا۔ اس سے یہ بھی پتا چلتا تھا کہ وہ اپنے نام اور اس نام سے منسوب کارناموں پر کتنا غرور رکھتا ہے۔ معلوم نہیں شیش ناگ ڈاکو کے گروہ کی کتنی دہشت تھی اور کہاں تک تھی۔ میں نے کبھی اس کا نام نہیں سنا تھا مگر میں نے مدت سے اخبار ہی کہاں دیکھا تھا۔ پہلے میں انگلستان میں تھا تو یہاں کے حالات سے صرف سیاست کی حد تک باخبر تھا۔ واپسی پر اپنے معاملات میں اُلجھ گیا اور اس عرصے میں اخبار دیکھا بھی تو صرف انھی خبروں کی تلاش میں جن کا تعلق ہم سے یا ہمارے دشمنوں سے ہو۔ ڈاکے، چوری اور سنسنی خیز جرائم کی خبروں میں آنے والے ناموں پر کسی نے توجہ نہیں دی۔
تاہم شیش ناگ اور ناگ منی دلچسپ کردار تھے۔ ان کا ماضی کیا تھا؟ اس بارے میں بہت کچھ قیاس آرائی کی جا سکتی تھی۔ میرے ذہن میں بہت سی فلموں، بہت سی داستانوں اور روایتوں کے کردار تھے۔ کچھ حقیقی کچھ الف لیلوی۔
جب میں کپڑے بدل کے آیا تو ناگ منی بڑے اسٹائل سے دیوار کا سہارا لیے، ہاتھ کمر کے پیچھے باندھے کھڑی ہوئی تھی۔ کھانا درمیان میں بچھی ہوئی دری پر رکھا تھا اور وہ رابعہ کا انٹرویو لے رہی تھی۔
"تم مجھے پڑھی لکھی لگتی ہو۔ کسی اچھے گھر کی ہو؟"
"ہاں، تمھارے بارے میں بھی میرا یہی خیال ہے۔" رابعہ نے کہا۔ اب وہ زیادہ پُراعتماد نظر آرہی تھی۔ اور بیڈ کے کنارے پر بیٹھی ہوئی اپنی ٹانگیں جھلا رہی تھی۔ "کیا تم ڈانسر ہو؟"
"میں ڈانسر بننا چاہتی تھی۔" ناگ منی کا چہرہ اس سوال پر ذرا سی دیر کے لیے دھندلا گیا۔ "تمھیں یہ خیال کیسے آیا؟"

"تمہارا یہ لباس دیکھ کر..."

ناگ منی ہنس پڑی۔" یہ تو ہمارا لباس ہے۔ ہمارے علاقے کا اور قبیلے کا۔ سب عورتیں پہنتی ہیں۔"

"میری بیوی پر یہ لباس کیسا لگ رہا ہے؟" میں نے کہا۔

رابعہ نے مجھے گھور کے دیکھا مگر کچھ بولی نہیں۔

"تمہاری بیوی بہت خوبصورت ہے۔" اس نے کہا۔ "اس کو اسکرٹ پہننا چاہیے۔ جیسا کہ میمیں پہنتی ہیں۔ ورنہ یہ بھی اچھا ہے۔"

رابعہ کا چہرہ گلابی پڑنے لگا۔ "خوبصورت تو تم بھی ہو۔"

"ہاں، مجھے معلوم ہے۔" وہ بولی۔ "مگر تمہارے برابر تو نہیں۔ یہ تمہارا شوہر کیا کرتا ہے؟"

"شوہر کیا کرتے ہیں؟" میں نے دری پر آلتی پالتی مار کے بیٹھتے ہوئے سوال کیا۔ "مگر تمھیں کیا معلوم۔"

"میرا مطلب تھا کہ تم کام کیا کرتے ہو؟" وہ بولی۔

محسن میرے پاس آ بیٹھا۔ "آپا جی، کب تک وہاں بیٹھی شرماتی رہو گی۔ دیکھو تمہارے بغیر یہ بھی لقمہ نہیں توڑ رہا ہے۔"

"میرے حلق سے کہاں اترے گا۔" میں نے سچے عاشق کی طرح کہا۔ "آجاؤ بیوی..."

رابعہ اندر ہی اندر کھولتی ہوئی اٹھی اور ہمارے درمیان آ بیٹھی۔

"بچے کتنے ہیں تمہارے؟" ناگ منی بولی۔

رابعہ کا رنگ اس کی آتشیں گلابی چولی جیسا ہونے لگا۔

"سات۔" میں نے کھانا نگلتے ہوئے کہا۔ "ابھی کچھ طے نہیں بارہ بھی ہو سکتے ہیں۔"

ناگ منی ہنسنے لگی۔ "مجھے لگتا ہے کہ تمہاری شادی ہی نہیں ہوئی ابھی۔ تم اس کے ساتھ بھاگ گئے ہو۔"

"یہ... تم نے کیسے اندازہ کیا؟" میں نے کہا۔

"تمہاری صورتیں دیکھ کر۔ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ یہ تمہاری بیوی ہوتی تو ایسی باتوں پر خفا نہ ہوتی اور ایسے نہ شرماتی۔" ناگ منی نے بڑی صفائی سے ہم دونوں کے تعلق کی حقیقت واضح کر دی۔ وہ واقعی ذہین تھی۔ اس کی مردم شناسی اور قوتِ مشاہدہ قابلِ تعریف تھی مگر مجھے ایک شعر یاد آیا جو اسی کیفیت کا آئینہ دار تھا۔ ع غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا۔ میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا۔ یہ رابعہ کا غمزۂ غماز تھا جس نے رابعہ کا راز افشا کر دیا۔

"وہ داڑھی والا جو رات کو بندوق لے کر تمہارے پیچھے آیا تھا، اس کا باپ ہوگا؟" ناگ منی نے اپنے ذہن میں واقعات کی مدد سے ایک فلمی کہانی کا اسکرپٹ تیار کر لیا۔

اس سے پہلے کہ میں ناگ منی کے خیال کی تائید کرتا، رابعہ نے کہا۔ "میرے والدین کا انتقال ہو چکا ہے۔"

"وہ میرا ماموں سسر تھا۔" میں نے فوراً دوسرا رشتہ ایجاد کر لیا۔ "وہ تو سچ مچ ہم سب کو دھائیں سے گولی مار دیتا حالانکہ خود اس نے یہی حرکت کی تھی جوانی میں۔ پہلے اپنی ہونے والی ساس کو لے بھاگا۔"

"بیٹی کو چھوڑ کے... ماں کے ساتھ؟"

"ماں سوتیلی تھی..." میں نے وضاحت کی۔

"اس کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی یہی کرتا۔" محسن بولا۔

ناگ منی نے اسے حیرانی سے دیکھا۔ "کیوں لڑکی میں کیا خرابی تھی؟"

"خرابی یہ تھی کہ... اس میں کوئی خوبی نہیں تھی۔" میں نے کہا۔ "اور سوتیلی ماں مجسمۂ حسن و خوبی تھی۔ بیٹی کی مثال یوں سمجھو جیسے کوئی جوان اور صحت مند بھینس۔ اور حاجی نے انتخاب کر لیا سُبک رفتار ہرنی کا تو کیا غلط کیا۔"

"وہ حاجی ہے؟" ناگ منی کی دلچسپی بڑھ گئی۔

"ہاں، تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ اب میں نے یہی کیا ہے تو دیکھ لو کیسا جانی دشمن ہو رہا ہے میرا۔" میں نے کہا۔

"کیا مطلب... تمہارا رشتہ بھی اس کی بیٹی سے ہونے والا تھا؟" ناگ منی دم بخود رہ گئی۔

میں نے فقط اقرار میں سر ہلایا۔ اور رابعہ کو پکڑ لیا۔ کیونکہ وہ احتجاجاً کھانا چھوڑ کے اٹھ رہی تھی۔ "ارے وہ نہیں آ سکتا یہاں۔ ڈرتی کیوں ہو کھانا کھاؤ۔"

"بہت کھا لیا میں نے۔" رابعہ بگڑ کے بولی اور ہاتھ چھڑا کے بیڈ پہ جا لیٹی۔

"تم نے اتنی جلدی یہ سب کچھ کیسے پکا لیا۔" محسن نے دسترخوان پر پھیلے ہوئے کھانے کو دیکھ کر تعریفی لہجے میں کہا۔ "جادو ہے تمہارے ہاتھوں میں تو۔ اور ذائقہ بھی کیا غضب کا ہے۔"

ناگ منی پھر ہنسی۔ "ابھی نہیں بنایا۔ شام کو تیار کیا تھا۔ آج دعوت تھی سب کی یہاں۔"

"کس خوشی میں؟" میں نے کہا۔ "کوئی بڑا ہاتھ مارا تھا؟"

"تم کیوں پوچھتے ہو۔" وہ محتاط ہو گئی۔ "تم مخبر تو نہیں ہو پولیس کے؟"

"کیا ہم صورت سے مخبر یا پولیس والے لگتے ہیں؟"
ن نے کہا۔

ناگ منی نے کچھ سوچ کے نفی میں سر ہلایا۔ "ایسا ہوتا
شیش ناگ کے مہمان نہ ہوتے۔ میرا بھائی بے وقوف
یں ہے۔ شیش ناگ ہے اس کا نام۔"

"تم بھی یاد دلاتی رہا کرو۔ ناگ منی ہے میرا نام۔" محسن بولا۔

ناگ منی مسکرائی۔ "یہ عادت ہے اس کی۔"

"تم نے کہا تھا کہ تم ڈانسر بننا چاہتی تھیں پھر یہ خیال
دل چھوڑ دیا؟" محسن نے کہا۔

"اب تم پوچھو گے کہ میں نے یہ کیا پیشہ اختیار کر لیا
ر میری جیسی لڑکی نے اب تک شادی کیوں نہیں کی؟"
ہ تیکھے لہجے میں بولی۔

"ہاں، یہ دوسری بات زیادہ اہم ہے۔" محسن بولا۔

"تم کرو گے مجھ سے شادی؟" وہ ہنسی اور برتن سمیٹنے لگی۔

"اگر تم کو اعتراض نہ ہو تو بات کروں تمہارے بھائی سے؟"

رابعہ نے سر اٹھا کے محسن کو ملامت آمیز نظروں سے دیکھا۔

"صبح کر لینا۔" ناگ منی نے جاتے جاتے کہا۔ "یہاں جتنے
یں سب ہی یہ چاہتے تھے مگر سب نااہل ثابت ہوئے۔
وئی بھی اس کی شرط پوری نہیں کر سکا ابھی تک۔"

جب وہ چلی گئی تو محسن نے کہا۔ "باپ رے باپ، آخر کیا شرط ہوگی اس قتالۂ عالم کو جیتنے کے لیے۔"

"ہوگی کوئی ایسی بات کہ... شاہ جنات کا سر کاٹ کے پیش کرو چوبیس گھنٹے میں یا کشمیر فتح کر کے دکھاؤ۔"

"محسن، شرم آنی چاہیے تمھیں۔" رابعہ نے کہا۔

"پہلے آتی تھی اب نہیں آتی۔" محسن بولا۔ "اور جب
م کو اتنی شرم آتی ہے تو پھر مجھے کیا ضرورت ہے بھلا
شرمیلا بننے کی۔"

"میں بھی تو بہت شرمیلا ہوں۔" میں نے شرما کے کہا۔ "اب بھلا ایسا لباس پہن سکتا ہوں میموں والا؟"

رابعہ نے تکیہ سر کے اوپر رکھا اور سو گئی۔ جب ناگ منی چائے لے کر آئی تو وہ بظاہر گہری نیند میں تھی۔

"بات سنو، وہ شرط تو یقیناً بہت مشکل ہوگی۔" محسن نے کہا۔ "تم ایسے ہی بھاگ چلو میرے ساتھ۔"

ناگ منی نے خلافِ توقع برہمی کا اظہار نہیں کیا۔ "میں شادی کروں گی کسی مرد سے۔" وہ ہنس کے بولی اور گھگھرا لہرا کے باہر نکل گئی۔

رابعہ نے سر اٹھا کے قہقہہ مارا۔ مجھے بھی بے اختیار
ہنسی آگئی

"اُلّو کی پٹھی۔" محسن نے خفت سے کہا۔ "بے حیا..."

"بس بھیا، وہ ایک شہلا ہی تھی بے وقوف جس نے تمھیں مان لیا شوہر۔" رابعہ نے بدلہ لینے کے لیے وار کیا۔ "کیسا آئینہ دکھایا آج اس نے۔ اب تم ان سے کہو، یہ جو تمہارے یارِ غار ہیں، ایم آر ایس کے کمانڈر انچیف، سکندرِ اعظم چیف کے ٹو۔ یہ بھی ناگ منی کے سوئمبر میں شریک ہو جائیں۔ اس کی ایک ہی تو شرط ہے، پوری کر دیں گے۔ وہ جو آخری بات تھی۔"

"میاں محسن خاں شیروانی۔" میں نے کہا۔ "آپ کی غیرت کو کیا ہوا۔ سب سن رہے ہیں آپ۔"

"خاتون آپ سے مخاطب ہیں۔" محسن بولا۔ "ہم نے اپنی غیرت وغیرہ سب حق مہر میں لکھ دی تھی۔ ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے۔"

شیش ناگ اچانک اندر آیا اور ہمیں ہنستا دیکھ کر حیران ہوا۔ پھر اس نے کہا۔ "ان کو میرے جوان شیر دو میل دور چھوڑ کے آئے ہیں۔ اب فکر کی کوئی بات نہیں شیش ناگ ہے میرا نام۔"

"سردار، میں نہیں چاہتا کہ تم بے خبری میں ہماری وجہ سے کسی مصیبت میں پڑ جاؤ۔" میں نے محتاط لہجے میں کہا۔ "ان کی طرف سے صرف اس لیے بے فکر ہونا غلطی ہوگی کہ انھیں تم نے دو میل دور پہنچا دیا ہے۔ وہ ایسے خطرناک لوگ ہیں کہ دو سو میل سے بھی دو گھنٹے میں واپس آ سکتے ہیں۔ میں تمہاری اور تمہارے شیروں کی بہادری پر شک نہیں کرتا لیکن جو تم کو دھمکی دے کر گئے ہیں، وہ بھیڑیے کی طرح سفاک اور عیار ہیں اور ان کی قوت بہت زیادہ ہے۔ ابھی تو انھیں زک اٹھانی پڑی لیکن اس کا مطلب یہ مت لینا کہ وہ ڈر کے بھاگ گئے۔"

"اچھا...؟" سردار نے سوچتے ہوئے کہا۔ "کون لوگ ہیں وہ... اسمگلر؟"

"یہ بات تو بہت لمبی ہے لیکن میں مختصراً بیان کرتا ہوں کہ وہ ملک کے دشمن ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور دشمنوں کے ساتھ مل کے انھیں اسلحہ فراہم کر رہے ہیں جو پاکستان کے دو ٹکڑے کرنا چاہتے ہیں۔ تمھیں تو معلوم ہوگا کہ مشرقی پاکستان میں کیا ہو رہا ہے؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور میرے پاس بیٹھ گیا۔ "یہ وہاں اسلحہ تقسیم کرتے ہیں؟"

"نہیں، یہ اسلحہ بیچتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "باہر سے اسمگل کرتے ہیں۔ کچھ ہمارے دشمن ملکوں سے حاصل کرتے

ہیں اور یہ اسلحہ باغیوں کے، تخریب کاروں کے اور علیحدگی پسندوں کے ہاتھ بیچتے ہیں۔ انھیں اسلحے کی ضرورت ہے اور یہ ان سے مُنہ مانگی قیمت وصول کر کے اپنے خزانے بھرتے ہیں۔ انھیں اس سے کوئی سروکار نہیں کہ باغی وہ اسلحہ کس کے خلاف استعمال کریں گے۔ ظاہر ہے وہ ہماری فوج سے لڑ رہے ہیں۔ مشرقی پاکستان میں تباہی پھیلا رہے ہیں۔ پل، بجلی گھر اور اہم تنصیبات تباہ کر رہے ہیں۔ اور انھیں مار رہے ہیں جو پاکستان کی سالمیت پر یقین رکھتے ہیں۔ جو پاکستان کو متحد رکھنا چاہتے ہیں۔ اب یوں سمجھو کہ مغربی پاکستان میں ایسے غداروں سے حکومت بھی نمٹ رہی ہے۔ ان کے ٹھکانوں کا پتا چلتا ہے تو پولیس، ملٹری اور خفیہ ادارے سب چھاپے مارتے ہیں۔ ایک ایسا ہی گروہ ہے جس میں یہ حاجی شامل ہے۔ نام بھی اس کا عبداللہ ہے یعنی اللہ کا بندہ۔"

"شریف نام رکھنے سے تو کوئی بھی شریف نہیں ہوتا۔" شیش ناگ نے ایک فلسفیانہ بات کی، مگر اس طرح مجھ پر یہ واضح کر دیا کہ کم سے کم حاجی کے معاملے میں وہ ہمارا ہم خیال ہے۔

"بالکل ٹھیک کہا تم نے سردار۔ اس حاجی کے کچھ اور بھی ساتھی ہیں۔" میں نے کہا۔ "وہ سب ہماری جان کے دشمن ہو رہے ہیں کیونکہ ہم نے انھیں بہت نقصان پہنچایا ہے۔ ان کے کاروبار کا بیڑا غرق کر دیا ہے۔ اسلحے کے بہت بڑے بڑے ذخیرے تباہ کر دیے ہیں اور ایسے بہت سے غدار، دشمن کے ایجنٹ اور اسمگلر قتل بھی کر دیے ہیں۔"

"ہم تینوں نے مل کر۔" شیش ناگ نے حیرانی اور بے یقینی سے مجھے، محسن کو اور پھر رابعہ کو دیکھا، جو اب پھر سوتی بن گئی تھی یا واقعی سو چکی تھی۔

"ہم تین ہی نہیں، اور بھی ساتھی ہیں ہمارے۔ پورے ملک میں ہر جگہ ہمارے حمایتی اور مددگار ہیں جن کی مدد کے باعث ہم اب تک زندہ ہیں اور جدوجہد کر رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "کل اسلحے سے بھرا ہوا ایک بحری جہاز کراچی کی بندرگاہ سے روانہ ہونے والا تھا۔ ہمارے دو ساتھی اس پر چڑھ گئے۔ رات کو ہم بھی پہنچ جاتے اور جہاز کو راستے میں ہی ڈبو دیتے لیکن ہمیں ان لوگوں نے پکڑ لیا۔ یہ ہمیں گرفتار کر کے لے جا رہے تھے کہ لانچ حادثے کا شکار ہو گئی۔ آگے آپ جانتے ہیں۔"

شیش ناگ اُٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس نے ایک بار زور سے "ہوں" کہا اور کئی بار سر ہلایا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کچھ سوچ رہا ہے۔ 'کیا یہ ڈاکو ہماری مدد کریں گے؟ کیا ڈاکو بھی محبِ وطن ہو سکتے ہیں؟ کیوں نہیں ہو سکتے' میں نے خود کو دلیل دی۔ 'چاند بھائی ایک اسمگلر ہے۔ وہ قانون کا مجرم ضرور ہے لیکن ملک کا دشمن نہیں ہے۔ وہ تو ان وطن دشمنوں کا بھی دشمن ہے۔ کوئی بھی مجرم، وہ چور، ڈاکو ہو یا قاتل، پاکستانی تو پیدائشی طور پہ ہے یا شعوری طور پہ۔ جیسے پہلے ہم سب انسان ہیں پھر مختلف ملکوں، نسلوں اور عقیدوں کے ماننے والے۔ حالات نے کچھ لوگوں کو قانون شکن بنا دیا لیکن ان کا یہ احساس کیسے مٹ سکتا ہے کہ وہ پاکستانی ہیں۔ جو چور یا ڈاکو اور قاتل ہو، وہ وطن سے اتنی ہی محبت کر سکتا ہے جتنی اپنے مال سے۔'

"اچھا بھئی، اب تم لوگ کیا چاہتے ہو؟ ہم تو ہیں ڈاکو اور شریف آدمی بن نہیں سکتے۔ شریفوں کی بستی میں نہیں رہ سکتے۔ اس لیے چھپ کر رہتے ہیں۔" شیش ناگ نے کہا۔ "ہم اگر کچھ مدد کر سکتے ہیں تمھاری تو بتاؤ، ارے آ جا تو بھی۔"

یہ آخری جملہ اس نے ناگ منی کو مخاطب کر کے کہا تھا جو نہ جانے کب دروازے میں آ کھڑی ہوئی تھی۔

"بھیّا، یہ جو کٹاری مونچھوں والا ہے نا۔" ناگ منی نے محسن کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ میرے سے بیاہ کر لے یا میرے ساتھ بھاگ چل۔"

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ خود محسن کا رنگ ایک لمحے کے لیے اُڑ گیا۔ بات مذاق کی تھی مگر مذاق جان لیوا ثابت ہو گا، یہ کس نے سوچا تھا۔ میں نے دیکھا کہ رابعہ بھی آنکھیں کھولے ڈاکو شیش ناگ کے ردِعمل کو دیکھ رہی ہے۔

جب وہ مونچھوں پر تاؤ دے کر ہنسا تو میری جان میں جان آئی۔ "باز نہیں آتی تو ہر ایک سے چھیڑ خانی کیے بغیر۔"

"ارے بھیّا، قسم لے لو۔۔"

"چل چھوڑ یہ باتیں، یہ مجاہد لوگ ہیں۔ جب ہم ڈاکو گھر نہیں بسا سکتے تو یہ کہاں سوچ سکتے ہیں بیاہ رچانے کی۔" وہ سنجیدہ ہو کے بولا۔ "وہ تو اچھا ہوا کہ ادھر آ گئے۔ ورنہ دشمن انھیں مار ڈالتے۔ یہ بتا پہرے پر کون ہے؟"

"دو جوان شیر ہیں۔" ناگ منی نے کہا۔

شیش ناگ نے [illegible] کیا۔

"ان سے کہنا ہوشیار رہیں۔ وہ واپس نہ آ جائیں اور دوسروں کو بھی سمجھا دینا یہ بات۔"

ناگ منی نے محسن کو مسکرا کے دیکھا اور باہر چلی گئی۔ محسن نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا ہو گا کہ ایک ڈاکو کے ہاتھوں مقتول نہیں ہوئے۔ بات مذاق میں ٹل گئی۔ شاید اس لیے بھی کہ میں اپنے بارے میں وضاحتی بیان جاری کر چکا تھا۔ ورنہ ڈاکو بھائی کی محبت جاگ اٹھتی تو شوقِ شہادت دھرا رہ جاتا۔ مرنا پڑتا ایک ڈاکو حسینہ سے مذاق کر کے۔

"اچھا بھئی شیر جوانو!" شیش ناگ بولا۔ "کیا چاہیے تمھیں، روپیہ پیسہ، لاکھ دو لاکھ تو ڈیرے پہ ہو گا، زیادہ کی ضرورت ہے تو۔۔۔"

"نہیں سردار، پیسہ ہمارے کس کام کا۔" میں نے کہا۔

"اچھا تو اسلحہ چاہیے؟" وہ بولا۔

"ہاں، اگر ایک ایک ریوالور مل جائے۔" میں نے کہا۔ "تو ہم اپنی کچھ حفاظت کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔"

"سب گولی چلا سکتے ہو، یہ شیرنی بھی؟" اس نے رابعہ کی طرف دیکھ کے کہا۔ وہ ہر بہادر مرد کو شیر اور عورت کو شیرنی کہنے کا عادی معلوم ہوتا تھا۔

"ہاں سردار، گولی کیا توپ کا گولا چلا سکتے ہیں سب۔"

"اور نشانہ کیسا ہے؟ خیر اچھا ہی ہو گا۔" وہ بولا۔ "صبح دیکھ لیں گے۔ ریوالور میں ابھی بھجواتا ہوں۔ تم نے اچھا کیا جو سب بتا دیا۔ اب وہ آتے ہیں تو آئیں۔ شیش ناگ ہے میرا نام۔"

جب وہ چلا گیا تو رابعہ اُٹھ بیٹھی۔ "سوا روپے کی نیاز دو۔ اور آئندہ کے لیے توبہ کرو۔" اس نے محسن کو چھیڑتے ہوئے کہا۔ "تمھارا کیا تھا۔ بیوہ تو شہلا ہوتی۔ کیا مزے سے کہہ دیا تھا 'بھاگ چلو میرے ساتھ'۔ اگر وہ مان جاتی تو؟"

"مان جاتی تو۔۔۔ کیا تھا۔ ہم شرعی چار کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد بھی دو آسامیاں خالی ہوتیں۔" محسن نے ڈھیٹ بن کے کہا۔

"ہاں، مگر اس کم بخت نے شرط لگا دی کہ بیاہ کروں گی تو کسی مرد سے۔" رابعہ نے پھر ہنسنا شروع کیا۔ "مردوں کی حالت دیکھ لی ابھی کیا ہو رہی تھی۔"

"عزیزہ! تم یہ بار بار سونے جاگنے کا ڈراما کیوں کر رہی ہو؟" میں نے کہا۔ "میرا موڈ ویسے ہی رومانٹک ہو رہا ہے۔ کیا خیال ہے سمندر کی طرف چلیں۔ کوئی فلمی دوگانا ہو جائے۔ تمھارا [illegible] جو کسی فلم میں نیلو کا تھا۔"

"بس تو پھر آنکھیں بند کر کے لیٹ جائیے اور نیلو کے ساتھ ہی رقص فرمایئے۔" رابعہ نے کہا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔

شیش ناگ جب آخری بار آیا تو اس کے پاس تین ریوالور تھے ۔۔۔ تینوں سروس ریوالور تھے ۔۔۔ جو مسلح افواج یا پولیس کے پاس ہی ہوتے ہیں۔۔۔۔۔۔ کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی کہ اسے یہ کیسے ملے۔ یا تو خود پولیس نے اسے بیچے ہوں گے اپنے مال خانے سے۔ وہ عموماً ڈاکوؤں سے بھرپور تعاون کرتے ہیں۔ یا شیش ناگ نے پولیس سے چھینے ہوں گے۔ اس نے ہمیں اضافی راؤنڈ بھی فراہم کیے۔۔۔۔ اور جب ہم نے انھیں لوڈ کیا تو وہ خاصی دلچسپی سے دیکھتا رہا۔

"ایک بات بتاؤ سردار۔" میں نے کہا۔ "اس بستی میں کون لوگ رہتے ہیں؟"

"یہی معمولی حیثیت کے غریب لوگ، ملے جلے۔"

"بستی میں اتنا ہنگامہ ہوا، فائر بھی ہوئے۔ کوئی نکلا نہیں اپنے گھر سے۔"

"کوئی نہیں نکلتا۔ سب اپنی جان بچاتے ہیں۔ گولی سے اور گواہی سے بھی۔ شیش ناگ ہے میرا نام۔ سب جانتے ہیں۔"

"اور تم اس کے باوجود یہاں بے خوفی سے رہتے ہو؟"

"ہاں، اُن میں سے کس کی مجال ہے کہ بولے میرے خلاف یا مخبری کرے۔" شیش ناگ بولا۔ "پولیس اس وقت چھاپا مارتی ہے جب ہم انھیں بتا دیتے ہیں کہ ہم جا رہے ہیں۔"

"یہ مکان کس کا ہے؟"

"یہ ایک پرائمری اسکول ہے۔ نہ کوئی پڑھنے والا ہے نہ کوئی پڑھانے والا۔ اپنے ایسے ہی ٹھکانے ہیں ہر جگہ۔"

مجھے تھوڑا سا دُکھ ہوا۔ اس قوم کے مستقبل سے کوئی کیسے خوش آئند امیدیں وابستہ کرے جہاں علم و آگہی کے ٹھکانے اتنے ویران ہوں کہ وہاں ڈاکوؤں کے اڈے بن جائیں۔ اس صحنِ گلشن میں بہار کیوں آئے گی جہاں ویرانوں کے باسی اُلّو بولتے ہوں۔ وطن کے وہ نونہال کہاں ہیں جن کو کل بہت بڑے چیلنج درپیش ہوں گے، بہت بڑی بڑی ذمے داریوں کا سامنا ہو گا۔ ان کے پاس علم کی روشنی نہیں ہو گی تو وہ اندھیروں میں بھٹکتے رہ جائیں گے۔ آج وہ گیراجوں میں اور لانچوں پر کام کر رہے ہیں۔ کاریں صاف کر رہے ہیں اور بھیک مانگ رہے ہیں۔

میں لیٹنے کے بعد خاصی دیر تک مایوسی کا شکار رہا۔ رشوت، بے ایمانی، غداری، وطن دشمنی، حاجی اور عبداللہ

جیسے نام رکھنے والوں کی منافقت اور ریاکاری، بے اصول سیاست، بے آئین مملکت، بے مقصد فوجی حکومت۔ تعصب اور نفرت۔ یہ سب کیا ہے اور کیوں ہے۔ کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟ مجھ سے شاعرِ مشرق نے سوال کیا۔

جواب میں کیا دیتا۔ جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ نہ ان کے پاس جنھوں نے قائدِ اعظم اور قائدِ ملت کے بعد ملک کا نظم و نسق سنبھالا اور اس کو تباہی کے اس کنارے تک پہنچا دیا جہاں اس کا وجود ہی خطرے میں پڑ گیا ہے۔ انھی خیالات کے گرداب میں ڈوبتا ابھرتا میں نہ جانے کب سو گیا۔ گہری نیند ایک ذہنی و جسمانی ضرورت تھی۔ تاکہ تھکن اور انتشار کی کیفیت ختم ہو جائے لیکن ذہن پر گردشِ حالات کے پُرآسیب سائے محیط تھے۔ ایک طرف نازو اور غالب کی پریشانی کا احساس تھا۔ تو دوسری طرف حاجی عبداللہ کا خوف اعصاب پر سوار تھا۔ اسے دُہری ناکامی کا صدمہ اٹھانا پڑا تھا۔ لانچ میں اس نے دلاور کو دغا دینے کی کوشش کی تھی اور چانمبھائی سے رابعہ کو لے آیا تھا۔ تاکہ مجھ سے سودا کرسکے۔ حاصل اسے کچھ نہ ہوا۔ اس کے منصوبوں پر قدرت نے پانی پھیر دیا' وہ بھی سمندر کا نمک ملا ہوا۔ اُس کی لانچ بھی غرق ہوئی۔ اس کے چار آدمی بھی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے اور وہ شیش ناگ جیسے ڈاکو کے ہاتھوں ذلت اٹھا کے پسپا ہوا۔ اتنے صدموں کے زخم اسے تب تک چین نہ لینے دیں گے جب تک کہ وہ اپنی ناکامی اور شکست کا انتقام نہیں لے گا۔

یہ میری چھٹی حس تھی یا اپنے حالات کے آئینے میں مستقبل کا عکس دیکھنے کی صلاحیت کہ میں خطرے کو قریب محسوس کرتا تھا اور یہ مطمئن نہیں تھا کہ اب مجھے تحفظ حاصل ہو گیا ہے۔ اسی احساس نے میرے ذہن کو نیند میں بھی مکمل بے خبری اور سکون سے دور رکھا یا یوں کہیں کہ میرا لاشعور جاگتا رہا۔ نتیجہ یہ کہ میں نے ڈراؤنے خوابوں کے ٹوٹے دیکھے اور کئی بار چونک کے اٹھا۔

رات باقی تھی ابھی جب میرے کانوں نے باہر سے آنے والی آوازوں میں خطرے کا اعلان سنا۔

شیش ناگ گرج رہا تھا۔"اوئے شاباش میرے جوان شیرو۔ کھا جاؤ ان گیدڑوں کو۔ ڈٹ جاؤ مقابلے پر، کسی کو نزدیک مت آنے دو۔"

میں ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ بے اختیار میرا ہاتھ اپنے ریوالور کی طرف گیا۔ اسی وقت پہلا فائر ہوا۔

رابعہ ایک چیخ مار کے اٹھ بیٹھی۔"یہ... کیا ہو رہا ہے؟"

محسن نسبتاً پُرسکون رہا۔"میرا خیال ہے حاجی صاحب قبلہ مجھے دولھا بنانے کے لیے بارات لے کر آئے ہیں۔ اسی خوشی میں یہ پٹاخے چھوڑے جا رہے ہیں۔ شاید ناگ منی مان گئی ہے۔"

"تم یہ اپنے پاس رکھو۔" میں نے ایک ریوالور رابعہ کے ہاتھ میں دیا۔

"تم کہاں جا رہے ہو؟" اس نے میرا بازو پکڑ لیا۔

"میں... بارات کا استقبال کرنے۔" میں نے مسکرا کے کہا۔

"میں ساتھ چلوں گی تمھارے۔" رابعہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کہاں ساتھ چلو گی؟" میں نے کہا۔"میں تو یہیں ہوں، ذرا باہر جا کے..."

میرا جملہ ایک زبردست دھماکے میں دب گیا۔ ذرا سی دیر کے لیے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اس پرائمری اسکول کے صحن میں کوئی بہت بڑا بم پھٹا ہے۔ دھماکے نے میرے کانوں کو سُن کر دیا تھا۔ زمین کا ارتعاش اتنا شدید تھا کہ عمارت کے دیوار و در بھی لرزنے لگے۔ اس کے ساتھ ہی عمارت کے منہدم ہونے کا شور اٹھا۔ رابعہ مجھ سے چمٹ گئی۔ میں نے اسے دھکیل دے کر الگ کیا۔ پھر میں نے دروازے سے باہر جھانک کے دیکھا۔

صحن میں گرد و غبار اور دھوئیں کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ چھت کے اوپر سے باہر کی طرف فائر کیے جا رہے تھے۔ اور باہر والے ان کا جواب دے رہے تھے۔ بستی کے مکین سخت دہشت کے عالم میں چیخ رہے تھے۔ اور شاید جان بچانے کے لیے فرار ہو رہے تھے۔

عمارت کا وہ حصہ جو میرے بائیں ہاتھ پر تھا مسمار ہو گیا تھا۔ حاجی نے فتح کو فوری اور یقینی بنانے کے لیے جنگ کی صحیح حکمتِ عملی اختیار کی تھی۔ یہ پرائمری اسکول ایک قلعے کی طرح محفوظ تھا جس پر حملہ کرنے والے کو شدید جانی نقصان اٹھانا پڑتا کیونکہ اندر والے محفوظ مورچوں میں تھے۔ اس نے پہلے حصار کو توڑا تاکہ وہ مزاحمت کا سامنا کیے بغیر اندر داخل ہو جائیں۔ اس کے لیے حاجی نے دستی بم استعمال کیا تھا یا ڈائنامائیٹ۔ اب ان کے لیے ایک راستہ کھل گیا تھا۔ لیکن ان کا حریف بدستور محصور تھا۔

میں نے ایک شخص کو مشین گن کے ساتھ دیوار کے ملبے پر نمودار ہوتے دیکھا۔ اس [illegible] چھلانگ ماری

ہی تھی کہ میں نے اس کا نشانہ لے کر فائر کیا۔ وہ ہوا میں ہی ہاتھ پھیلا کے اچھلا۔ اس کی مشین گن اُڑ کر دور گئی اور شاید ملبے کے ڈھیر پر گری۔ میں اندھیرے میں صاف نہ دیکھ سکا۔

محسن نے کمرے کے عقبی حصے کی کھڑکی کھول لی تھی' اس میں شیشے اس وقت ضرور لگائے گئے ہوں گے جب عمارت بنی ہو گی مگر اب عمارت کی زبوں حالی پکارتی تھی کہ میں ہوں اپنی شکست کی آواز۔ خالی پٹ کسی دھنسی ہوئی قبر کی طرح نظر آتے تھے۔ کنڈیاں مدت سے بند تھیں اور سمندری ہوا نے قبضوں اور ہینڈلوں کو بھی زنگ بنا دیا تھا۔ کنڈی کو کھولنا ناممکن تھا چنانچہ محسن نے کھڑکی کے پٹوں کو کھینچ کر توڑ دیا تھا۔ گلے ہوئے قبضے نکل جانے سے دونوں پٹ چوکھٹ سے نکل گئے تھے۔

"تم اس طرف سے نکل جاؤ۔" محسن نے رابعہ کا ہاتھ پکڑ کے کھینچ لیا۔

"چھوڑو مجھے۔" رابعہ نے برہمی سے کہا۔"میں ایسے اکیلے نہیں جاؤں گی۔"

"بے وقوفی کی بات مت کرو۔" میں نے برہمی سے کہا۔

"ہم بھی آئیں گے لیکن بعد میں۔ یہ ریوالور ہم نے اس لیے نہیں مانگے تھے کہ جب ضرورت پیش آئے تو ہم مقابلہ کیے بغیر فرار ہو جائیں۔"

"تم ان کا مقابلہ کرو گے... کیسے؟"

"جیسے شیش ناگ اور اس کے ساتھی کر رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

"اور ناگ منی کر رہی ہے۔" محسن بولا۔

"لیکن وہ ڈاکو ہیں۔ تم ان کی خاطر..."

"فضول باتیں مت کرو۔" میں نے رابعہ کو اٹھا کے کھڑکی سے باہر کر دیا۔"انھوں نے ہماری جان بچائی تھی۔ اب ہماری وجہ سے ان پر مصیبت آئی ہے تو ہم کچھ نہ کریں۔ تم جاؤ اور دیکھو' وہ سامنے جو کھجور کا درخت نظر آ رہا ہے اس کی سیدھ میں چلتی جاؤ۔ ہم آ جائیں گے، رُکنا مت جتنا دور نکل سکو نکل جانا۔"

"خدا کے لیے سکندر..." رابعہ نے روتے ہوئے کہا۔

"تمھیں میری قسم' جاؤ۔ مجھے کچھ نہیں ہو گا۔" میں نے کہا اور پلٹ کے دروازے کی طرف گیا۔ محسن مجھ سے پہلے نکل کر ساتھ والے کمرے میں پہنچ چکا تھا۔ میں نے اسے وہیں چھوڑا اور دوڑ کر صحن کو عبور کر گیا۔ معلوم نہیں کس [illegible] کتنے گز [illegible] ان آئیں جو میرے دائیں بائیں اور

آگے پیچھے سے گزریں۔ میرا رُخ اس کمرے کی طرف تھا جہاں رابعہ کو تلاشی کے لیے جانا پڑا تھا۔ وہ ناگ منی کا کمرا ہی ہو سکتا تھا۔ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ ناگ منی پیچھے والی کھڑکی میں مورچہ بنا کے بیٹھی ہوئی تھی اور کھڑکی کے نیچے کی تین فٹ اونچی دیوار اور دونوں جانب کی دیواروں کی پناہ میں رہتے ہوئے فائر کر رہی تھی۔

میرے ایک دھکے سے دروازہ ٹوٹا اور میں اندر داخل ہو گیا۔ ناگ منی ایک دم پلٹی۔

"ناگ منی!" میں نے چلا کے کہا۔"گولی مت چلانا۔"

"تم یہاں کیا لینے آئے ہو؟"

"میں تمھیں لینے آیا ہوں۔" میں نے کہا۔"تمھارا بھائی کہاں ہے؟"

"تم سمجھتے ہو میں اسے چھوڑ کے چلی جاؤں گی؟" اس نے نفرت اور حقارت سے کہا۔"میں اس کے ساتھ ہی مروں گی۔"

باہر سے شیش ناگ نے چلا کے کہا۔"شاباش ہے شیرو، کچا چبا جاؤ ان کو۔"

"سردار!" کسی نے چیخ کر کہا۔"ہمیں نکل جانا چاہیے۔ تین شیر مارے جا چکے ہیں۔"

"پھر کیا ہوا؟ میں تو زندہ ہوں۔ شیش ناگ ہے میرا نام۔" وہ چھت کے اوپر سے دہاڑا۔

ایک بار پھر گولیوں کی بوچھاڑ آئی۔ نہ جانے کون چیخ مار کے راہیِ ملکِ عدم ہوا۔ وقفے وقفے سے جوابی فائر ہوئے۔ باہر کوئی بڑے کرب میں چلایا۔ میں نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا۔ اندھیرے میں ایک پرچھائیں سی متحرک دکھائی دی۔ میں نے نشانہ لیا اور گولی چلا دی۔ وہ شخص گھوم کے آگے آیا اور چند قدم دوڑ کے گرا۔ اس کے ہاتھ میں ایک مشین گن تھی۔ میں نے کھڑکی سے چھلانگ لگائی۔ اور مشین گن اٹھانے لپکا۔

"اوئے پاگل کے بچے!" اوپر سے سردار نے چیخ کر کہا۔"اندر چلو۔" مگر میں مشین گن اٹھا چکا تھا جب میں نے ناگ منی کی چیخ سنی۔ اس نے اپنے بھائی کو آواز دی تھی۔ اوپر سے ایک گولی آئی جو شاید میرے کانوں کو چھوتی ہوئی گزری مگر اس کا نشانہ میں نہیں تھا۔ میرے پیچھے نمودار ہو جانے والا دشمن تھا جس کو ناگ منی نے دیکھ لیا تھا۔ شیش ناگ نے اسے نشانہ نہ بنایا ہوتا تو وہ مجھے مار دیتا۔ یہ سب میں نے مشین گن اٹھانے کے بعد دیکھا تھا۔ اندھیرے میں

کون کہاں چھپا ہوا تھا، یہ میں نے نہیں دیکھا۔ میں نے تو مشین گن کا رُخ دشمنوں کی طرف کیا اور ایک نصف دائرے میں پورا راؤنڈ چلا دیا۔ کم سے کم ایک آدمی اس اندھا دھند فائرنگ سے مارا گیا۔

قریب جا کے میں نے ناگ منی کا ہاتھ پکڑا اور اسے باہر کھینچ لیا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ مزاحمت کرے گی، چنانچہ میں نے خاصی قوت صرف کر کے جھٹکا دیا تھا۔ وہ قدم اُکھڑتے ہی کھڑکی سے یوں باہر آگئی جیسے اس کو کسی نے پیچھے سے اٹھا کے دھکیلا ہو۔ وہ کچی زمین پر گری لیکن میں نے اسے پھر پیروں پر کھڑا کر دیا۔

"اوپر... ہمیں اوپر جانا ہے۔" میں نے کہا اور اسے دیوار کے ساتھ لگا کے کھڑا کر دیا۔ وہ سمجھ گئی کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ اس بات کی پروا کیے بغیر کہ وہ ایک عورت ہے، میں نے اس کے ایک شانے پہ پاؤں پر رکھا اور اپنے وزن کو جھٹکا دے کر اوپر اٹھایا۔ میرا ہاتھ بلند ہوا اور چھت کی منڈیر پر جم گیا۔ تاہم میری اس کامیابی میں ناگ منی کی ثابت قدمی کو بہت دخل تھا۔ اگر اس کا توازن بگڑ جاتا تو میرا ہاتھ کہیں اور پڑتا اور میں خود کو سنبھال نہ پاتا۔ ناگ منی نے میرے ایک سو باسٹھ پونڈ وزن کو بھی برداشت کیا اور اس جھٹکے کو بھی جب میں نے اوپر کی جانب جست لگائی تھی۔ وہ بلاشبہ ایک سخت جان، مضبوط جسم، غیر معمولی ہمت اور فولادی اعصاب رکھنے والی عورت تھی۔

چھت پر پہنچتے ہی میں نے الٹا لیٹ کر ہاتھ نیچے کیا، ناگ منی نے اچھل کر میرا ہاتھ تھامنے کی کوشش کی، مگر ناکام رہی۔ میں اپنی قمیص اتار کر نیچے لٹکانے ہی والا تھا کہ وہ کھڑکی پر چڑھ گئی۔ اس نے چوکھٹ پر قدم جما کے ہاتھ اوپر بڑھایا اور میں نے اس کی کلائی تھام لی۔ یہ انتہائی خطرناک کام تھا کیونکہ جب وہ چوکھٹ پر کھڑی تھی تو دشمن کا بہترین ہدف تھی۔ کسی بھی سمت سے اس کا نشانہ لینا بہت آسان ہوتا۔

جب میں نے اسے کھینچا تو وہ تھوڑا سا جھولی۔ وہ صرف ایک ہاتھ کے سہارے پر معلق تھی۔ پھر اس نے ریوالور کو اوپر پھینکا۔ مجھے ایک جھٹکا سا لگا اور میں سر کے بل نیچے جاتے جاتے رہ گیا۔ اب ناگ منی نے دوسرے ہاتھ سے میری کلائی کو تھام لیا۔ میں نے اوپر کی جانب زور لگایا۔ اور ناگ منی نے دونوں پیر دیوار پہ جما دیے۔ میں پیچھے کھسکتا گیا اور وہ اوپر چلتی گئی۔ یہاں تک کہ اس کے ہاتھوں نے چھت کا کنارہ تھام لیا۔

یہ سب دو منٹ کا کھیل بھی نہیں تھا مگر دو منٹ کے ایک سو بیس سیکنڈ زندگی اور موت کی بے یقینی کے صحرا میں پھیلے ہوئے سراب تھے۔ آنے والا کون سا لمحہ دستِ اجل کے تصرف میں ہے؛ چالیسواں، سترواں، یا ایک سو بیسواں۔ میں نہیں جانتا تھا اور ناگ منی بھی نہیں جانتی تھی لیکن میری طرح وہ بھی جوا کھیلتی آئی تھی اور ہار سے ڈر کے ہمت ہار جانے والی نہیں تھی۔

ایک اور دھماکے نے مجھے اور ناگ منی کو تقریباً اوندھے منہ گرا دیا تھا مگر میں جھکا اور سنبھل کے اسے اپنے ساتھ کھینچتا ہوا آگے بڑھا۔ گرد اور دھوئیں کا دوسرا بادل اوپر اٹھا۔ میں نے بارود کی بُو کے ساتھ ایک کراہت انگیز اور اعصاب شکن بُو کو محسوس کیا۔ یہ گوشت کے جلنے کی بُو تھی۔ اس دستی بم کے ساتھ ہی کوئی انسانی وجود پُرزہ پُرزہ ہو کے جل گیا تھا۔

عمارت اب دو طرف سے کھنڈر بن چکی تھی۔ انگریزی حرف ایل کی شکل کا وہ حصہ ابھی سلامت تھا جس پر ہم موجود تھے مگر اس کی سلامتی بھی غیر یقینی ہو گئی تھی۔ اچانک میری نظر اس ملبے کی طرف اٹھی جو اب گردوغبار میں ایک بے ہنگم ڈھیر کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ ادھر سے ہی رابعہ نکل گئی تھی مگر اسے نکالنے والا محسن وہیں تھا۔ میں اسے چھوڑ کے ناگ منی کی طرف دوڑا تھا۔

"ناگ منی! تو جا نکل جا۔" شیش ناگ چلایا۔

"بھیا، تم زخمی ہو۔" ناگ منی اس سے لپٹ گئی۔

"نہیں..... یہ تو ایسے ہی معمولی سی خراش ہے، مگر تو جا۔" شیش ناگ نے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔

"گولی تمہاری ٹانگ میں لگی ہے۔ چلو تم بھی۔"

"ارے نہیں، میں نے پٹی باندھ لی ہے۔" شیش ناگ نے کہا۔ "میں ابھی نہیں جا سکتا۔"

"پھر کب جاؤ گے، سب تو مارے گئے۔" ناگ منی نے کہا۔ "تم اکیلے مقابلہ کرو گے؟"

"ہاں ہاں، کروں گا۔" وہ چیخ کر بولا۔ "شیش ناگ ہے میرا نام۔"

"تو میں بھی ناگ منی ہوں۔ تمہارا اور میرا خون ایک ہے کیونکہ ایک ہی ماں کا دودھ پیا ہے ہم نے۔" وہ بے خوفی سے بولی!

"ناگ منی، کیا میرے سب شیر... مارے گئے؟" شیش ناگ بڑے دکھی اور رنج... لہجے ... ... کسی رکی

...رسنائی نہیں دیتی۔"

"سردار، مجھے... یہ سب ہماری وجہ سے ہوا۔" میری ...آواز رندھ گئی۔ "ہم کچھ نہ کر سکے تمہارے لیے۔"

اُس نے سر کو اوپر نیچے ہلایا۔ "کر سکتے ہو تو یہ کرو کہ اس پاگل ...کو لے جاؤ یہاں سے۔ ابھی موقع ہے۔ میں ان کو روکوں گا۔ تم ...پیچھے سے جا سکتے ہو۔"

"میں نہیں جاؤں گی۔"

"جانا پڑے گا تجھے ناگ منی، میری شیرنی، شاباش... تو ...پریشان کیوں ہوتی ہے۔ میں بہت جلد پہنچ جاؤں گا تیرے ...پاس۔" شیش ناگ نے کہا۔ "صبح ہونے والی ہے۔ ایسا نہ ہو ...وہ آ جائیں۔"

"تم بھی چلو گے میرے ساتھ۔" ناگ منی اَڑ گئی۔

"ضد مت کرو۔ میں اُن کا راستہ روکوں گا۔" وہ بولا اور ...پھر مجھ سے مخاطب ہو گیا۔ "اُدھر... وہ کھجور کا درخت نظر ...آ رہا ہے نا؟ ادھر سے نکل جانا۔ سیدھے جانا۔ ساحل کی طرف ...وہاں چٹانیں ہیں۔ وہاں لانچ ہے ہماری۔ ناگ منی کو معلوم ہے، ...ابھی دشمن چھپے ہوئے ہیں۔ شاید ہماری خاموشی کو ہماری چال ...سمجھ رہے ہوں گے۔ ایسا تو ہوتا رہتا ہے۔ پہلے بھی میں اکیلا رہ ...گیا تھا۔ صرف ناگ منی کو بچا لیا تھا میں نے۔ پھر ہم نے دوسرا ...گروہ بنا لیا۔ صبح تک میں بھی پہنچ جاؤں گا۔ ہم نکل جائیں ...گے۔ میں اتنی آسانی سے مرنے والا نہیں۔ شیش ناگ ہے ...میرا نام۔"

میں نے ناگ منی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "چلو۔"

اُس نے میرے ہاتھ پہ ہاتھ مارا۔ "چھوڑو مجھے.. ...تم جاؤ۔"

"جاؤ، لے جاؤ اسے۔ زبردستی لے جاؤ اسے۔" ...شیش ناگ چلایا۔

ناگ منی نے پیچھے ہٹنے کی کوشش کی اور ریوالور اٹھایا ...مگر میں نے اُس کے ہاتھ پر کِک ماری۔ وہ زور سے چلائی۔ ...ریوالور اُس کے ہاتھ سے اُڑ کے نیچے چلا گیا۔

"کمینے۔ ذلیل کتے۔" وہ شیرنی مجھ پر حملہ آور ہوئی۔ میں ...نے اُس کو دو ہلکے سے ہاتھ رسید کیے اور نیچے گرنے سے پہلے ...سنبھال لیا۔

"اب میں نیچے جاتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "تم اسے اوپر ...سے پھینک دو اور پھر خود بھی کود جاؤ۔ میں سنبھال لوں گا۔"

شیش ناگ نے سر ہلایا اور میں نے چھت کے کنارے ... کر چھلانگ لگائی۔ میرے پیر کچی مٹی کی

نرم تہہ سے ٹکرائے۔ میں نے شیش ناگ کے سائے کو منڈیر پر نمودار ہوتے دیکھا۔ اُس کی ٹانگ میں لگنے والی گولی نے یقیناً اُس کی پنڈلی کی ہڈی کو توڑ دیا تھا اور اُس کا کافی خون ضائع ہو چکا تھا۔ وہ پھر بھی سیدھا کھڑا ہوا تھا۔ اُس نے ناگ منی کو دونوں ہاتھوں میں اٹھایا اور اُس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ پھر اس نے یہ بوجھ یوں میری طرف پھینک دیا جیسے اپنی امانت میرے سپرد کر دی ہو۔ میں نے ناگ منی کو دونوں بازوؤں میں جھیل لیا۔ وہ بے ہوش تھی اور بہرحال ایک جوان عورت تھی۔ کوشش کے باوجود میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ ہم دونوں گرے مگر چوٹ کسی کو نہیں آئی۔

"جلدی کرو سردار!" میں نے ہاتھ پھیلا کے کہا۔ "آ جاؤ تم بھی۔"

"تم اسے لے جاؤ۔" وہ بولا۔ "میں اوپر سے تمہاری حفاظت کروں گا۔ جب تک تم نکل نہیں جاتے، میں تمہارے راستے پہ نظر رکھوں گا۔ بس تم بستی سے نکل جاؤ۔ اس کے بعد خطرہ نہیں۔ پھر میں بھی آتا ہوں۔ جاؤ۔"

میں نے ناگ منی کو اٹھایا اور کندھے پر ڈال لیا۔

"اپنا نام تو بتاتے جاؤ۔" شیش ناگ نے کہا۔

"سکندر۔" میں نے پلٹ کر کہا مگر اور کچھ نہ بول سکا۔

میں نے ناگ منی کے بوجھ کے ساتھ دوڑنا شروع کیا۔ ابھی میں مشکل سے پچاس قدم گیا تھا کہ میں نے ایک فائر کی آواز سُنی، میرے پیچھے کوئی بلبلا کے چیخا۔ میں نے شیش ناگ کا قہقہہ سُنا۔ وہ ضرور پاگل ہو گیا تھا۔ اُسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اپنی ٹوٹی ہوئی ٹانگ کے ساتھ وہ جان بچا کے نہیں نکل سکتا۔

"شیش ناگ ہے میرا نام۔" وہ چلایا۔ میں نے پلٹ کے دیکھا اور اسی وقت دوسرا فائر ہوا۔ چھت کی منڈیر پر کھڑا ہوا شیش ناگ دونوں ہاتھ فضا میں بلند کر کے سرنگوں ہوا اور فضا میں تیرتا ہوا نیچے آیا۔ صبح کاذب کے اُجالے میں اس کی آخری آواز کی صرف بازگشت رہ گئی۔ شیش ناگ ہے میرا نام!

میں پھر اجنبی راستوں پر دوڑنے لگا۔ کھجور کا وہ درخت جیسے میرا راہ نما بن گیا تھا۔ یہ ایک گمنام اور لاوارث بستی تھی۔ جہاں نہ قانون کی عملداری تھی اور نہ سماجی اخلاق کے خود ساختہ ٹھیکے داروں کی ورنہ میں پکڑا جاتا کہ اس وقت اور اس حالت میں ایک جوان عورت کو یوں اٹھا کے کہاں لے جا رہے ہو۔ آگے صرف سمندر تھا جس کی لہروں کی صدا زمین اور آسمان کے درمیان ایک شور بن کے گونج رہی تھی۔

ساحلِ سمندر کی وجہ سے اندھیرا بھی دھند لکے کی طرح تھا اور میں کسی حد تک راستوں کے نشیب و فراز کو دیکھ سکتا تھا۔ پھر بھی میرے لیے سر جھکا کے دوڑنا ناممکن تھا۔ میں بُری طرح ہانپنے لگا تھا اور ایک ساتھ بہت سے اندیشوں کے عفریت میرے تعاقب میں تھے۔ میں نے کئی بار پلٹ کر بھی دیکھا کہ کہیں عبداللہ اور اُس کا خونی لشکر میرے تعاقب میں تو نہیں ہے۔ خوف اس طرح میرے اعصاب پر سوار تھا کہ مجھے اپنے پیچھے دوڑتے قدموں کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ ابھی تک میرے کانوں میں دھماکے ہو رہے تھے اور میں اس شخص کی آواز سن رہا تھا جو ڈاکو ضرور تھا مگر غدار نہیں تھا۔ اُس نے بھی مجھ پر جان کا قرض چھوڑ دیا تھا۔

آگے مجھے دونوں جانب چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں کے سوا کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ میری آنکھیں رابعہ کو تلاش کر رہی تھیں۔ اُسے میں نے بہت پہلے اسی سمت میں آنے کو کہا تھا۔ میں نے اُسے کئی جگہ رُک کر پکارا۔ اتنی بلند آواز میں کہ وہ سو پچاس گز کے دائرے میں کہیں بھی ہوتی تو میری پکار سُن سکتی تھی۔

عین کھجور کے درخت کے نیچے پہنچ کر میں نے ناگ منی کو نیچے لٹا دیا۔ اب سمندر زیادہ دُور نہیں تھا۔ میرے قدموں کے نیچے ٹھنڈی ریت تھی اور ناگ منی اس ریت کے نرم بستر پر بے سُدھ پڑی ہوئی تھی۔

"رابعہ!" میں نے مُنہ کے سامنے ہاتھ رکھ کے ہر سمت میں آواز دی۔ خاموشی اور سناٹے میں صرف سمندر کی پُر ہیبت سرسراہٹ کا جواب آیا۔ میں عجیب صورتِ حال سے دوچار ہو گیا تھا۔ گزشتہ شب ہم سب کی مشترکہ جدوجہد آزادی کی نوید بنی تھی۔ رابعہ نے بڑی حاضر دماغی سے کام لیا تھا اور محسن نے بڑی جرأت کا مظاہرہ کیا تھا کہ لانچ پر قبضہ کر لیا تھا۔ ایک حادثے کے باوجود ہم بچ کر ساحل تک پہنچنے میں کامیاب رہے تھے۔ شیش ناگ جیسے ڈاکو نے بھی ہمیں پناہ دے دی تھی مگر وہ سب تو جیسے رات کی بات تھی۔ رات گئی بات گئی۔ خواب تھا جو کچھ ہم نے دیکھا۔

مگر رابعہ کا یوں ہل کے بچھڑنا خواب نہیں تھا کہ میں اتنی آسانی سے فراموش کر دیتا۔ پھر ریت پر لیٹی ہوئی ناگ منی خواب نہیں تھی اور فرشتۂ اجل کا نامہ بَر بن کے پہنچنے والا عبداللہ خواب نہیں تھا۔ شیش ناگ کا مارا جانا خواب نہیں تھا۔

بہت دور اُفق پر نمودار ہونے والی سفیدی نے آمدِ سحر کا اعلان کیا۔ پرندوں نے آشیانوں میں چہچہانا شروع کیا۔ سمندر کی طرف سے آنے والی ہوا نمی سے بوجھل ہو گئی۔

اب میں کیا کروں؟ کدھر جاؤں؟ محسن ساتھ ہوتا تو اُسے یہاں ناگ منی کے پاس چھوڑتا اور خود رابعہ کی تلاش میں جاتا۔ اُن دونوں کے بارے میں کچھ تو معلوم ہونا چاہیے کہ اُن پر کیا بیتی؟ رابعہ تو شاید نکل گئی ہو۔ محسن... اس کا کیا بنا؟ وہ آخر ہی مقابلہ کر رہا تھا مگر وہ حصّہ دوسرے دستی بم سے منہدم ہو گیا تھا۔ کیا اس سے پہلے محسن وہاں سے نکل چکا تھا؟ وہ ملبے میں دفن ہوا یا زخمی حالت میں حاجی کے ہاتھ لگ گیا؟ میرا دل اندیشوں سے لرزنے لگا۔

"محسن!" میں نے دونوں ہاتھ مُنہ پر رکھ کے اور گلا پھاڑ کے آواز دی۔ "محسن!"

"کیا بات ہے؟" کسی نے یوں ڈانٹ کر کہا کہ میں اچھل پڑا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ جواب محسن کے سوا کون دے سکتا تھا مگر وہ مجھے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کے باوجود میرے سارے حوصلہ شکن خیالات اب بے وجود ہو گئے تھے اور اس آواز نے ہی مجھے نئی زندگی عطا کر دی تھی۔

"سامنے آ... بھوت کے بچے!" میں نے چلّا کر کہا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے۔ کسی کے آرام کا بھی خیال نہیں۔" محسن نے قریب کے ایک درخت پر سے کہا۔ "چڑیاں کوّے، جن بھوت سب ابھی سو رہے ہیں۔"

میں نے درخت کے نیچے جا کر دیکھا تو وہ ایک شاخ پر توازن قائم کیے دونوں پیر پھیلائے بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کی پشت اُس تنے سے لگی ہوئی تھی جس سے شاخ پھوٹی تھی۔

"اُلو کے پٹھے! میں کب سے پریشان ہو رہا ہوں۔"

"تقریباً سترہ منٹ سے۔" محسن نے گھڑی دیکھ کے کہا "جب آپ سرپٹ بھاگتے ہوئے پہنچے تھے۔ وہ بڑا دلفریب منظر تھا۔"

میں نے ایک نیچے جھکی ہوئی شاخ کو پکڑ کے زور سے ہلایا۔ محسن نے سنبھل کے شاخ کو پکڑا اور پھر بندر کی طرح نیچے لٹک گیا۔

"تو کب سے یہاں معلّق تھا؟" میں نے کہا۔

"چار بج کر چونتیس منٹ... یعنی تقریباً چوبیس منٹ سے۔" وہ پھر گھڑی دیکھ کر بولا۔

"گویا تو محاذِ جنگ سے فرار ہو گیا تھا۔" میں نے کہا۔

"میں اتنی دیر سے یہ سوچ سوچ کر دہل رہا ہوں کہ..."

"کہ میں اللہ کو پیارا ہو گیا۔" محسن ہنسا۔ "ابے ہم بہت ڈھیٹ چیز ہیں۔ میں نہایت بے جگری سے دادِ شجاعت دے رہا تھا اور کشتوں کے پشتے لگا دیتا...!"

"مگر یہ کہ پٹ... رخ... گئے تھے۔" میں نے کہا۔ "ذرا اپنا لباس بدلنے چلا آیا۔ بھگوڑے۔"

"نہیں یار۔ وہ تیری نورِ چشم مجھے بھگا کے لے گئی۔ جب تو نکلا تھا تیر کی طرح، تو لوٹ کر وہ پھر اندر آگئی۔ کہنے لگی کہ میں بھی جاتی ہوں۔ بہت برہم تھی کہ آخر یہ ناگ منی نے کون سا منتر پڑھ کے پھونک دیا کہ میرا مجنوں اس نئی لیلیٰ کی خاطر جاں بکف ہو گیا۔ عورت کی ذات کا تجھے پتا ہے کتنی شکی مزاج اور حاسد ہوتی ہے۔ خیر میں نے روکا اور اُسے زبردستی باہر لے گیا۔ میں نے کہا کہ دفع کرو سکندر کو۔ جان ہے تو جہان ہے اور بہت سکندر ملیں گے۔ یہاں تو ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔"

"بکواس بند کر اور یہ بتا کہ وہ اب کہاں ہے؟"

"وہ... میں نے تو کھینچ کر سمندر کے کنارے پہنچا دیا تھا اور یہ کہہ بھی دیا تھا کہ خبردار جو اِدھر اُدھر ہوئیں۔ جہاں بیٹھی ہو اسی جگہ بیٹھی رہنا۔ اب معلوم نہیں کہ وہ حسد اور رقابت میں پاگل ہو کے سمندر میں نہ اُتر گئی ہو۔ پھر میں تو آگیا تھا تیری تلاش میں۔" محسن نے کہا۔ "اس پر ہسٹریا کا اثر تھا۔ میں نے دو چھانپڑ مارے تھے آپ کی اجازت کے بغیر۔ اس کا دماغ درست ہو گیا تھا۔ دو آپ کے بھی مار دوں؟"

"چل اسے اٹھا۔" میں نے اسے گردن سے پکڑ لیا۔ "بڑے شوق سے کہا تھا نا کہ میرے ساتھ بھاگ چلو۔ میں لے آیا ہوں اُسے بھگا کے۔ یہاں تک لانے میں میری جان آدھی ہو گئی۔"

"اٹھاتا ہوں یار۔ مگر میں نے تو نیکی کی تھی تیرے ساتھ۔" محسن نے فریادی لہجے میں کہا۔ "اس کا یہ صلہ؟ شیش ناگ تو مجھے چھوڑے گا نہیں۔"

"وہ اب کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔" میں نے افسوس سے سر ہلا کے کہا۔ "اُس کا بھی کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

"وہ مارا گیا؟" محسن نے ناگ منی کو اٹھاتے ہوئے کہا۔ "اللہ مغفرت کرے اس کی۔"

"یہ ہمارے ساتھ نیکی کرنے کی سزا ملی اُسے۔" میں نے کہا۔

"بہت سبز قدم ہیں ہم لوگ۔" محسن بولا۔ "اس کے ساتھی؟"

"سب کام آ گئے۔" میں نے کہا۔ "وہ خبیث عبداللہ خدا کا قہر بن کے نازل ہوا تھا۔ اُسے اپنی ذلت اور شکست کا بھی صدمہ تھا اور اُن سب نقصانات کا بھی جو اُسے ہماری وجہ سے اٹھانے پڑے۔ وہ ہمیں نہیں، شیش ناگ کو تباہ کرنے آیا تھا جس کی وجہ سے اس کی کامیابی عین وقت پر ناکامی بن گئی تھی۔ ہمیں تو وہ پھر لے جاتا خزانے کا پتا پوچھنے کے لیے مگر ہم نکل آئے۔ اُس نے بعد میں دوسرا دستی بم پھینکا تھا۔"

"اتنا اسلحہ اور اتنے آدمی وہ کہاں سے لے آیا؟"

"اسلحے کی اُسے کیا کمی۔ شہر تک آنے جانے میں اُس کے تین چار گھنٹے صرف ہوئے۔ مجھے تو یقین تھا کہ وہ لوٹ کر آئے گا مگر اس یقین سے کیا ملا۔ بہتر ہوتا اگر ہم راتوں رات نکل آتے اور شیش ناگ کو بھی مجبور کر دیتے کہ اپنے سب ساتھیوں کے ساتھ نکل جائے۔"

"یہ تقدیر کے لکھے کی بات تھی۔ ایسا ہونا تھا۔ ہم تو حقیقت سے واقف ہیں، جو صبح تفتیش کے لیے آئیں گے وہ اس جنگ کو کس نظر سے دیکھیں گے؟ اخبار والے کیا بتائیں گے؟ یہی کہ خطرناک ڈاکو شیش ناگ اور اس کے ساتھی کسی دوسرے گروہ سے تصادم میں ہلاک ہو گئے۔ خبریں تو بنانے والے بنائیں گے۔ ممکن ہے اس واقعے کو یوں پیش کیا جائے کہ ڈاکو شیش ناگ اور اس کے ساتھی پولیس مقابلے میں مارے گئے۔ سارا کریڈٹ پولیس لے لے۔"

میں نے تائید میں سر ہلایا۔ "بالکل یہی ہوگا۔ کسی بڑے افسر کے خوشامدی انسپکٹر کو میڈل ملے گا اور ترقی ملے گی جس نے یہ خبر ملنے پر کہ ڈاکو شیش ناگ آج رات ڈاکا ڈالنے آئے گا، اس کا محاصرہ کیا یا اُس کا بڑی بہادری سے تعاقب کیا اور ایک خونریز مقابلے کے بعد گروہ کا خاتمہ کر دیا۔ حاجی کے جو ساتھی وہاں مارے گئے وہ بھی شیش ناگ کے ساتھی شمار ہوں گے اگر جاتے وقت حاجی اُن کی لاشیں سمیٹ کر نہ لے گیا۔"

سمندر اب میرے سامنے تھا۔ پانی کی متلاطم سطح میں شفق کا رنگ متحرک نظر آنے لگا تھا۔ سورج کا سنہرا گولا ابھی ابھی پانی سے اُبھرا تھا۔ آسمان پر اُجلے سفید پرندوں کی قطاریں اُڑتی جا رہی تھیں۔ بہت دور میں نے ایک لانچ اور ایک بادبانی کشتی دیکھی اور اس کے بہت پیچھے اُفق کی لکیر کے پاس بڑے بحری جہازوں کا سایہ سا نظر آنے لگا جو سب ساکت لگتے تھے۔

دائیں اور بائیں جانب چٹانوں کا طویل سلسلہ تھا۔ انہی چٹانوں پر کہیں رات کے اندھیرے میں وہ لانچ چڑھ گئی تھی جس کا ناخدا حادثے سے پہلے ہی مر چکا تھا مگر یہ بات حاجی کو کبھی معلوم نہیں ہو سکتی تھی۔ میری نظریں رابعہ کو تلاش کر رہی تھیں۔

"یار، کہاں ہے وہ؟"

"میرا خیال ہے کہ آیا تو میں صحیح سمت میں ہوں۔" محسن نے کہا اور ناگ منی کو ایک چٹان کے سائے میں ریت پر لٹا دیا۔ پھر اُس نے کھجور کے درخت کی طرف مُنہ کر کے دونوں ہاتھ یوں پھیلائے جیسے وہ گھڑی کی سوئیاں ہوں۔ یہ سمت کے تعیّن کا سب سے آسان اور صحیح طریقہ ہے۔ اُس نے کھجور کے درخت کو بارہ کا ہندسہ فرض کر لیا تھا۔

"بارہ بج کے بیس منٹ۔" اُس نے کہا۔ "جاتے وقت، واپسی میں میری سمت تھی۔ چھ بجنے میں دس منٹ، پانچ پچاس بارہ بیس۔ بالکل ٹھیک آیا ہوں میں۔"

"پھر رالعہ کہاں گئی؟"

"یہ تو رالعہ ہی بتا سکتی ہے۔" وہ بولا۔ "ہم اُسے تلاش کر سکتے ہیں اور نہ ملے تو پولیس کے پاس جا کے گمشدگی کی رپورٹ بہرحال لکھوا سکتے ہیں۔"

میں نے اُسے ہاتھ مارنے کی کوشش کی۔ "تیرے ہوش و حواس کی گمشدگی ہو جائے گی۔"

"یار! ایسی بھی کیا دیوانگی۔ بھیا عشق سچا ہے تو اُسے دل سے پکارو۔ کچے دھاگے سے چلی آئے گی سرکار بندھی۔ کیا کہتے ہیں وہ ظالم سماج کی دیواریں گرا کے سب زنجیریں توڑ کے، بحرِ ظلمات میں گھوڑے دوڑاتی یا خود دوڑتی ہوئی۔"

"رالعہ!" میں نے اُسے آواز دی۔

وہ ایک چٹان پر یوں نمودار ہوئی جیسے واقعی میری آواز پر آئی ہو۔ حالانکہ میری آواز تو سمندر کے شور میں گم ہو گئی تھی اور اس کے کانوں تک پہنچ ہی نہیں سکتی تھی مگر محسن کی بات کے جواب میں اُسے محبت کا کرشمہ قرار دیا جا سکتا تھا۔ وہ خاصا خفیف ہوا۔

"دیکھ، سالے زن مُرید، وہ آ گئی۔" میں نے کہا۔ "وہ کوہ قاف پر اپنے گھر میں ہوتی تو وہاں سے بھی پہنچ جاتی میری پکار پر۔"

"بجا ارشاد۔ اب تو سارے دعوے سچے آپ کے۔ بس ہم جھوٹے۔" محسن نے کہا۔

"تم نے بہت دیر کی۔" رالعہ نے میرے قریب آ کے کہا۔ اُس نے اپنے آنسو روک لیے تھے مگر سیلِ گریہ اس کی آنکھوں تک آیا ہوا تھا۔ اور بوجھل پلکوں کے پیچھے کالی آنکھوں میں اُداسی کا کاجل گہرا ہو گیا تھا۔

"ہمیں تو آئے ہوئے ہو گیا ایک گھنٹا۔" محسن نے اُسے ڈانٹنا شروع کیا۔ "دو گھنٹے سے تمھیں تلاش کر رہے ہیں۔ کہاں چلی گئی تھیں تم۔ بھائی ہمارا پاگل ہو گیا۔"

"میں اِدھر تھی۔ اس چٹان کے پیچھے۔ فجر کے وقت میں نے نماز پڑھی اور سورج کا انتظار کرتی رہی۔"

"یہ سورج کون ہے؟" محسن نے شکی مزاج شوہر کی طرح کہا۔

"امی کہتی تھیں کہ صبح نماز پڑھ کے جب سورج نکلے تو خدا سے کہو کہ خدا آج کا دن تیری عطا ہے۔ اب مجھے اپنی اماں میں رکھنا تاکہ میں کل کا دن دیکھوں۔ اور خدا اُن کی پہلے سنتا ہے جو زندگی کے معمولات اور دنیا کے کام شروع کرنے سے پہلے اس کی اماں مانگتے ہیں لیکن معلوم ہے آج میں نے خدا سے کیا کہا؟ میں نے کہا کہ اے خدا! سکندر کو اپنی اماں میں رکھنا۔ اسے پھر میرے پاس لے آنا۔ میری طاقت تیری ذات پر اعتماد ہے اور پھر میری محبت ہے۔" وہ محسن کی پروا کیے بغیر بولتی گئی۔

سنہرے آسمان کے اور سمندر کی شفق سے روشن افق کے پس منظر میں وہ اپنی سُرخ چولی گھگھرے اور حُسن کی تابناکی کے ساتھ اِس دنیا کی مخلوق نہیں لگتی تھی۔ وہ ابھی تک محبت کے الہامی جذبات کے طلسم میں گرفتار تھی اور صبح دم ساحلِ سمندر پر اس کا اور میرا وجود کسی ناممکن خواب کا ایک حصہ لگتا تھا۔

"بڑے افسوس کی بات ہے۔" محسن نے سر ہلا کے کہا۔ "کہ سارا کریڈٹ خود لے لیا۔ حالانکہ جان ہتھیلی پر رکھ کر میں گیا میدانِ کارزار سے، جہاں دنادن گولے چل رہے تھے اور فرشتۂ اجل مجھے پوچھتا پھر رہا تھا۔ تمھارے اس بالم ہرجائی کو میں ایسے نکال لایا جیسے جادوگر بوتل میں سے جن نکالتے ہیں۔ میرا مطلب ہے سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر۔ اب تم پوچھو کہ یہ بالم ہرجائی کیسے ہو گیا؟"

رالعہ مسکرائی۔ "تمھارا دوست ہے۔ جیسی روح ویسے فرشتے۔"

"یہ لو۔ شکریہ وغیرہ کچھ نہیں، اُلٹا الزام۔" محسن بولا۔ "ارے بابا اُدھر جا کے دیکھو۔ وہ تو میں پہنچ گیا وقت پر ورنہ اس وقت تم سر پکڑ کے روتیں۔ یہ نکل گیا تھا اس جادوگرنی کے ساتھ۔ میں نے رنگے ہاتھوں پکڑا۔ اسے ناگ منی کے ساتھ فرار ہوتے اور گرفتار کر کے یہاں لے آیا۔"

"ناگ منی کے ساتھ! کیا وہ بھی آئی ہے؟" رالعہ نے کہا۔ "کہاں ہے؟"

"دیکھا، سوت کا نام آتے ہی کیسی بے قراری۔"

"یہ تو میں بتاؤں گی شہلا کو کہ تم نے اس سے کیا کہا تھا۔" رالعہ نے میرے ساتھ چلتے چلتے کہا۔

میں نے کہا۔ "یہ میں [illegible]

دیا تھا۔"

ناگ منی آنکھیں کھولے آسمان کو تک رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ اٹھ بیٹھی۔

"تم کیوں لائے ہو مجھے یہاں؟" اُس نے ایک دم میری قمیص کا گریبان تھام لیا۔ "بھائی کہاں ہے میرا؟"

میں نے خود کو چھڑانے کی کوشش نہیں کی۔ "اُس نے ہی کہا تھا کہ ناگ منی کو لے جاؤ۔ میں بعد میں آؤں گا۔"

"پھر وہ آیا کیوں نہیں؟ تم سب نے اسے اکیلا چھوڑ دیا۔" اس نے مجھے، محسن اور رالعہ کو نفرت سے دیکھا۔ "تمھاری ہی خاطر تو اس نے اپنی جان کو خطرے میں ڈالا تھا۔"

"یہ اُس کا احسان ہے ہم پر جو ہم کبھی نہ اُتار پائیں گے۔ وہ بہادر آدمی تھا۔"

"تھا۔" ناگ منی چلّائی اور مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ لیکن کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح زبان سے نکل جانے والا لفظ واپس نہیں آتا۔

ہم تینوں ایک مجرمانہ خاموشی کے ساتھ سرنگوں ہو گئے۔

"بولو۔ بولتے کیوں نہیں اب۔" ناگ منی چیخنے لگی۔ "وہ مر گیا ہے نا۔ اور تم سب نامرد، بزدل، کمینے اس کی لاش کو بے گور و کفن چھوڑ کے بھاگ آئے۔"

میں نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے ورنہ وہ میرا مُنہ نوچ لیتی یا میرے کپڑے پھاڑ دیتی۔ اس کو قابو میں رکھنا کسی وحشی اور خوں آشام شیرنی کو زیرِ دام لانے سے زیادہ مشکل تھا۔ میں نے اپنی گرفت انتہائی سخت رکھی۔ اُس کی سب چوڑیاں چُور چُور ہو گئیں اور اُس کی کلائی میں کانچ کے ٹکڑے گڑ گئے۔ اُس نے میرے ہاتھوں پر کاٹنے کی کوشش کی۔ مجھے لاتیں ماریں اور ایسی گالیاں دیں جو عام حالات میں کوئی عورت نہیں دے سکتی لیکن ایک تو وہ ہوش میں نہیں تھی۔ دوسرے وہ ایسی گالیوں کو روزمرہ گفتگو میں سنتے رہنے کی عادی ہو چکی تھی۔

میں نے اُسے بُری طرح جھنجھوڑا۔ "ناگ منی! ہوش میں آؤ۔"

اُس نے مجھے مزید گندی گالیاں دیں۔ مشکل یہ تھی کہ میں اُسے رالعہ کے سپرد کرتا تو وہ رالعہ کو اٹھا کے پٹخ دیتی۔ خود محسن کو شاید اس سے باقاعدہ کشتی لڑنی پڑتی۔ اور ایسی مکسڈ ڈبل کشتی کا انجام اچھا نہ ہوتا۔ محسن کے ساتھ خود ناگ منی کے کپڑے پھٹ جاتے۔ اس کا موجودہ لباس ہی کسی حد تک ناکافی تھا۔ یہ بھی نہ رہتا تو ہم اسے کیسے ساتھ رکھتے۔ سرِدست ہمارے پاس نہ کوئی مردانہ جوڑا فالتو تھا اور نہ زنانہ۔

"میاں کبیر خاں! وہی روایتی علاج کرو اس کا۔" محسن نے مشورہ دیا۔ "جو میں نے کیا تھا۔ دو چھانپڑ۔"

رالعہ نے محسن کو غصیلی نظروں سے دیکھا لیکن بولی نہیں۔

میں نے مجبوری میں ایک ہاتھ چھوڑ کے ناگ منی کے گال پر ایک چانٹا مارا۔ اُس کو جھٹکا سا لگا اور اُس نے مجھے شعلہ فشاں نظروں سے دیکھا۔ میں نے اس کے دوسرے گال پر بھی چانٹا مارا۔ محسن کا تجویز کردہ نسخہ کام کر گیا۔ اس کی جدوجہد ختم ہو گئی لیکن پھر ایک دلچسپ بات ہوئی۔

محسن نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ "ناگ منی! دیکھو تم اکیلی نہیں ہو۔" اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

وہ ایک دم پلٹی اور روتی ہوئی محسن سے چمٹ گئی۔ اُس نے محسن کے کندھے سے لگ کے رونا شروع کیا۔ "نہیں، میں اکیلی رہ گئی ہوں۔ اس کے سوا کوئی سہارا نہیں تھا میرا۔ وہ میرا محافظ بھی تھا۔ اب تم محافظ بنو گے میرے؟ تم سہارا دو گے مجھے؟ بولو، چُپ کیوں ہو؟ صاف کیوں نہیں کہتے کہ ناگ منی تُو ڈکیت ہے، تو بدمعاش عورت ہے۔"

مجھے محسن کی قابلِ رحم حالت پر بہت ہنسی آ رہی تھی لیکن میں ضبط کرنے پر مجبور تھا۔

"ناگ منی، ایسی باتیں مت کرو۔" محسن نے عقل سے کام لیتے ہوئے ایک بہت مشکل جذباتی منظر میں اپنا رول بڑی خوبی سے نبھایا۔ "تم ہمارے ساتھ رہو گی۔ تم تو ایک بہادر عورت ہو۔ زندہ رہنا آتا ہے تمھیں۔ تم خود اپنا سہارا ہو۔ جو ہمارے دشمن تھے وہی اب تمھارے بھی دشمن ہیں۔ کیا تم ان سے بدلہ نہیں لو گی اپنے بھائی کے خون کا؟"

"میں انھیں چھوڑوں گی نہیں۔ . . اُن . . ." اُس نے محسن کے کندھے پر سے سر اٹھا کے چند گالیاں عبداللہ اینڈ سنز کو دیں جو نہایت مردانہ فصاحت و بلاغت کا نمونہ تھیں۔

محسن نے فوراً خود کو اس آتش فشاں قسم کی خطرناک عورت سے الگ کیا اور ایک گہری سانس لی۔ "چلو اب ہمیں بتاؤ کہ تمھاری لانچ کہاں ہے؟"

"پہلے میں اپنے بھائی کو دیکھوں گی۔" اُس نے آنسو پونچھ کر اپنے ہاتھوں کی کلائیوں کو دیکھا اور چٹکی سے پکڑ کے کانچ کا ایک ذرّہ کھینچ لیا۔ خون کا ایک اور قطرہ اس کی اُجلی جلد پر چمکنے لگا۔

"کیا کرو گی اُسے دیکھ کر۔ تمھیں اور دُکھ ہو گا؟"

"میں اس کو اپنے ساتھ لاؤں گی۔" اُس نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ "تم میری مدد نہیں کرو گے، دیکھو مجھے اس کو دفن کرنا ہے۔ میں اُس کی لاش کو ایسے ہی چھوڑ کے نہیں جا سکتی، اُس نے سب کچھ کیا میرے لیے۔ میں اتنا بھی نہ کروں کہ اُسے

ایک قبر بل جائے۔ سال کے سال میں پھول چڑھا سکوں۔"

"دیکھو ناگ منی! تمھاری اپنے بھائی کے لیے محبت اور عقیدت کے جذبات بہت قابلِ قدر ہیں۔ مگر جو تم چاہتی ہو وہ ممکن نہیں۔ اب تک بستی والے جو رات بھر گھروں میں دبکے رہے تھے، وہاں جمع ہو چکے ہوں گے۔ ممکن ہے پولیس آ چکی ہو یا آنے والی ہو یا اس خونی حاجی کے قاتل وہاں موجود ہوں۔ بہرصورت وہ لاش تم کو نہیں مل سکتی۔ اس کے برعکس یہ ہو سکتا ہے کہ تم پکڑی جاؤ۔ تمھارے ساتھ ہم بھی پکڑے جا... مارے جائیں۔ اس کے بعد قاتل تو بے فکر ہو جائیں گے کہ اب بدلہ لینے والا بھی کوئی نہیں رہا۔ کیا تمھارے بھائی کی رُوح تمھاری اس غلطی پر خوش ہوگی؟ نہیں، اس کو زیادہ تسکین تب ملے گی جب تمھارے ہاتھوں اُس کا قاتل جہنم رسید ہوگا۔ قبر تو اُسے ضرور ملے گی۔ یہاں تمھارے ہاتھوں نہ ملی تو سرکاری اہلکار اسے دفن کر دیں گے۔ مٹی تو مٹی ہے، جسم کی مٹی کسی بھی زمین میں ملے، مٹی کو فرق کیا پڑتا ہے۔ رہی یاد تو وہ دل میں رہتی ہے۔ یاد کبھی مٹی نہیں ہوتی۔ تم سال کے سال کیا ہر روز یاد پر پھول چڑھاؤ۔ اس سے بھی بڑھ کر کچھ کرنا چاہو تو اس کے لیے دعا کرو کہ خدا اُس کے گناہوں کو معاف کرے اور اُس پر آخرت آسان کرے۔ تم اسے ایصالِ ثواب کر سکتی ہو۔ اس کے بہت طریقے ہیں۔ ختم کراؤ یا صدقۂ جاریہ کے لیے کچھ کرو۔ ایک یتیم کی پرورش، ایک مسجد کی تعمیر، ایک بستی میں کنواں، ایک گھر میں روشنی۔ نیکی کے یہ سارے کام تمھاری دسترس میں ہیں۔"

ناگ منی غور سے سنتی رہی۔ ایسی باتیں اس سے پہلے کسی نے نہ کی ہوں گی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ متاثر ہوئی ہے۔ محسن نے پھر اپنی ذہانت کا ثبوت دیا تھا اور جذبات کے اندھے صحرا میں اکیلی بے سمت بھٹکنے والی بے بس لڑکی کا ہمدرد بن کے اس کی دست گیری کی تھی اور اُسے وہ راہ دکھا دی تھی جو اُس کے لیے امن و سکون اور عاقبت کی منزل کا نشان تھی۔

"کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟" محسن نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہا۔

ناگ منی اس کی آنکھوں میں آنکھوں ڈالے دیکھتی رہی۔ پھر اُس نے محسن کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ "تم ساتھ دو گے میرا؟ مجھے اُن سے بدلہ لینا ہے اور مجھے وہ سب کرنا ہے جو تم نے کہا۔"

میری طرف ناگ منی کی پشت تھی۔ منہ پر ہاتھ رکھ کر میں نے ہنسی کو دبا لیا اور رابعہ کے کان میں کہا۔ "مارا گیا یہ سالا۔ کمبل چمٹ گیا ہے اب اس سے۔"

"ابتدا بھی تو خود اسی کی طرف سے ہوئی تھی۔" رابعہ نے متفکر ہو کے کہا۔ ایک عورت ہونے کے ناتے غالباً وہ شہلا کے مرکزی کردار کے مقابل سائڈ ہیروئن کو برداشت نہیں کر سکی تھی۔ "ایسا مذاق بھی نہیں کرنا چاہیے۔"

"اب مذاق کہاں رہا یہ۔ بھائی محسن خاں اچکن کے لیے تو وہ شعر یاد آتا ہے کہ کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے۔" میں نے کہا۔ "آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟"

محسن نے گول گول آنکھیں گھما کے مجھے گھورا اور ناگ منی کے ہاتھ الگ کیے۔ "ہم سب تمھارے ساتھ ہیں۔ اب چلو، کہیں ایسا نہ ہو کہ سراغ رساں یا قاتل ہمیں تلاش کرتے ہوئے آ جائیں۔ ہم کو نکل جانا چاہیے۔ رابعہ! تم چلو ناگ منی کے ساتھ۔" محسن نے اپنی گلو خلاصی کرا لی۔

ناگ منی نے رابعہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ایک جیسے لباس میں ایک ساتھ چلتی ہوئی وہ سگی بہنوں کی طرح نظر آ رہی تھیں۔

"تو نے ایک بات دیکھی؟" محسن بولا۔

"میری گنہگار آنکھیں تو بہت کچھ دیکھ رہی ہیں۔" میں نے آہ بھر کے کہا۔

"رابعہ اور ناگ منی کی صورت میں بھی کتنی مماثلت ہے۔" محسن نے کہا۔

میں ٹھٹک کر رُک گیا۔ "واقعی، تو نے بھی غور کیا!"

"اِس کا مطلب ہے آپ پہلے ہی غور فرما چکے ہیں۔" محسن بولا۔

"ہاں، میں تو اُسی وقت چونکا تھا جب میں نے رابعہ کو اس لباس میں دیکھا تھا اور جب ناگ منی کھانا لے کر آئی تھی۔" میں نے کہا۔

"پھر تو میری مدد کر سکتا ہے۔ اسے بھی بھرتی کر لے ایک محبوبہ، ایک ایڈیشنل محبوبہ، یا قائم مقام محبوبہ، جیسے ہر محکمے میں سیکرٹری کے ساتھ ایڈیشنل سیکرٹری ہوتا ہے، اُنھی فرائض کی انجام دہی کے لیے اور جب سیکرٹری نہ ہو تو کام چلاتا ہے۔ اب یہ رابعہ تو ادھر اُدھر ہوتی ہی رہتی ہے۔ اس کی عدم موجودگی میں ناگ منی ترے دردِ فرقت۔۔۔"

"پہلے رابعہ کے لیے ایک ایڈیشنل سکندر کا انتظام کر دے۔" میں نے بھنا کے کہا۔ "بلکہ اس سے بھی پہلے شہلا کے لیے ایک قائم مقام شوہر کا، اپنے جیسا، جو تیری عدم موجودگی میں۔۔۔"

"یا اللہ یہ کیا مصیبت پڑ گئی میرے گلے۔ ایک تو میں ہوں اتنا ہینڈسم اور مردانہ وجاہت کا ایکسپورٹ کوالٹی نمونہ۔" محسن نے کہا۔ "بس تو اسے بھی خدا کی دین سمجھیے۔" میں نے کہا۔

"مجھے سخت اندیشہ لاحق ہے کہ یہ لڑکی میرے عشق میں مبتلا ہو جائے گی، شاید ہو چکی ہے اور عشق ہے ناقابلِ علاج مرض۔ میں اسے کیسے سمجھاؤں گا کہ میں باقاعدہ شوہر ہوں، بیوی بچے والا۔"

"بیوی تو خیر وہ ہے مگر بچے کی فکر کر۔ وہ تجھ کو سرِعام ماما جی کہتا ہے۔" میں نے کہا۔

"یار، میں ایک بزدل آدمی ہوں۔ تیری طرح مقابلہ نہیں کر سکتا ہر سمت سے یلغار کا۔ تو نے نازو کے عشق کو پسپا کیا اور اس طوفان کو غالب کی طرف موڑ دیا۔ پھر موہنی پاگل بگولے کی طرح نازل ہوئی تھی۔ اُس کی لپیٹ میں شیخ صاحب آ گئے اور تیری خوش قسمتی یہ رہی کہ رابعہ کبھی بدگمان نہیں ہوئی، ہو بھی نہیں سکتی، اس میں یہ صلاحیت ہی نہیں ہے۔"

"تھی، مگر اب ہماری محبت بدگمانیوں سے بالاتر ہے۔" میں نے کہا۔

"مگر شہلا تو ایسی نہیں ہے نا یار۔ وہ عام سی لڑکی اور عام سی بیوی ہے۔ اُس کے کانوں میں بھنک بھی پڑ گئی۔۔۔"

"اُسے کچھ پتا نہیں چل سکتا۔ ابھی تو یہ ایک ضرورت کا مسئلہ ہے۔" میں نے کہا۔ "اس لڑکی کو بے یار و مددگار تو نہیں چھوڑا جا سکتا۔ سب سے پہلے تو وہ پولیس کو مطلوب ہوگی اور اس کے ساتھ پولیس کے ہوس پرست، سفاک بھیڑیے کس قسم کا سلوک کریں گے، یہ بتانے کی ضرورت نہیں۔ اگر اپنی سابقہ زندگی میں وہ مجرم تھی تو ظاہر ہے اسے بھی مجبوریٔ حالات نے غلط راستوں پر ڈالا۔ وہ شوقیہ ڈکیت نہیں بنی ہوگی۔ پولیس کے ہاتھوں میں پڑ کر تو وہ ڈکیتی ہی نہیں عصمت فروشی بھی کرنے لگے گی۔ اُن کا طریقہ ہی ایسا ہے کہ وہ چھوٹے مجرم کو بڑا مجرم بنا دیتے ہیں۔"

"ہم اُسے ساتھ رکھیں گے؟"

"اگر ضروری ہوا یا اگر اُس نے چاہا تو۔" میں نے کہا۔ "زبردستی ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ وہ جانا چاہے گی تو اُسے کون روکے گا لیکن میرا خیال ہے کہ۔۔۔"

"یہ ہے ہماری لانچ۔" ناگ منی نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

میں نے محسن کی طرف دیکھا۔ "کیا تجھے کوئی لانچ نظر آ رہی ہے؟"

"ذرا نیچے تشریف لایئے۔" رابعہ نے کہا۔

میں نے اور محسن نے چٹان کے اوپر سے چھلانگ لگائی اور نیچے ریت پر اُترے۔ پھر میں نے وہ لانچ دیکھی جو چٹان کے عین نیچے سائے میں پوشیدہ تھی۔ اُسے لانچ کہنا بھی غلط تھا۔ یہ ایک چھوٹی سی موٹر بوٹ تھی جس میں 'یاماہا' کا ڈیزل انجن لگا ہوا تھا۔ وہ انجن جو اُٹھا کے پتوار کے ساتھ کشتی کے کنارے پر رکھ دیا جاتا ہے اور پھر اُٹھا لیا جاتا ہے۔

"کیا یہ چلتی بھی ہے؟" میں نے کہا۔ میرا مقصد ہرگز اس کا تمسخر اُڑانا نہیں تھا۔ موٹر بوٹ کی خستہ حالی سے ایسا ہی لگتا تھا کہ مدت سے وہیں کھڑی ہوئی ہے۔

"مجھے کیا معلوم؟ چلانے والے چلاتے ہی تھے۔" ناگ منی نے خفگی سے کہا۔

"اس کی کوئی چابی وغیرہ؟" میں نے سر کھجا کے کہا۔

"میرے پاس کچھ نہیں ہے۔"

"اچھا، میں دیکھتا ہوں۔" میں نے کہا اور چھلانگ مار کے ایک اور چٹان پر گیا۔ پانی کی ایک لہر پتھر سے ٹکرائی اور بوچھاڑ میرے چہرے تک آئی۔ محسن میرے پیچھے آیا اور ہم دونوں پانی میں اُتر گئے۔ چند منٹ کا فاصلہ ہم نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کے اور چٹانوں کا سہارا لے کر طے کیا۔ ہم موٹر بوٹ میں اُترے تو اوپر کر لینے کے باوجود ہماری شلواروں کے پائنچے اور قمیصوں کے دامن پانی سے بھیگ چکے تھے۔

"کیا آپ اسے اسٹارٹ کر لیں گے؟" محسن نے کہا۔ "اور اسٹارٹ کر لیا تو چلا لیں گے؟ اور چلا لیا تو۔۔۔"

"کوشش کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا۔"

"بہت کچھ نہیں ہو سکتا، مثلاً کتے کی دُم سیدھی نہیں ہو سکتی اور اونٹ کی کوئی کل۔" محسن بولا۔

"پہلے تو چیک کرو ڈیزل ہے یا نہیں، پھر آئل وغیرہ۔" میں نے کسی ماہر مکینک کی طرح کہا۔ "میں اس کے انجن پر غور کرتا ہوں کہ اسے بھی کار کے انجن کی طرح 'ہاٹ وائر' کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ ڈائریکٹ اگنیشن۔"

محسن نے اور میں نے صرف دس منٹ میں ثابت کیا کہ عقل واقعی بھینس سے بڑی ہوتی ہے۔ اس کی اور میری مشترکہ کوشش سے انجن اسٹارٹ ہو گیا۔

"کم آن لیڈیز۔ ایس ایس ناگ منی اپنے بحری سفر پر روانہ ہونے والی ہے۔" محسن نے اعلان کیا۔ خواتین نے ایک دوسرے کی طرف، پھر پانی کی طرف اور اپنے ملبوس کی طرف دیکھا۔ پانی میں قدم رکھے بغیر وہ موٹر بوٹ تک نہیں آ سکتی تھیں اور اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنے ہاف غرارے بھی اوپر

اُٹھائیں یا پھر خود کو ہماری تحویل میں دے دیں اور ہم انھیں ڈھو کر کشتی تک لائیں۔ انھوں نے دوسری صورتِ حال کے حق میں فیصلہ کیا۔ ایک بار پھر محسن کے لیے جذباتی خلفشار کے اسباب پیدا ہوئے جب ناگ منی اس پر پیرِ تسمہ پا کی طرح سوار ہوگئی۔ اس نے محسن کے کندھوں پر سواری کی، اس طرح کہ دونوں پاؤں آگے رہیں اور وہ محسن کا سر تھامے رہے۔ درحقیقت اس نے دونوں بازو محسن کی گردن میں حمائل رکھے۔ مَیں نے رابعہ کو خاصے شریفانہ طریقے سے گود میں اُٹھا لیا تھا۔ پھر بھی وہ شرمائی۔ اس کے برعکس ناگ منی سے زیادہ محسن شرمایا۔ ناگ منی کو کشتی میں اُتارنے کے بعد اُس نے زیرِ لب کہا۔ "لعنت ہے۔"

"کیا کہا؟" مَیں نے زور سے کہا۔ "پھر کہنا۔ . . ذرا۔"

"جی کچھ نہیں۔ کہتے تو وہ اُلو کے پٹھے شاعر قسم کے لوگ ہیں کہ گل بدن، گل پیرہن . . . غنچہ دہن، شیریں سخن، ناگ منی میں یہ سب صفات ہیں۔" محسن دانت پیس کے رابعہ سے مخاطب ہوگیا۔ ناگ منی کچھ فاصلے پر بیٹھ کے اپنے ہاتھ دھو رہی تھی۔

"اب میں ناخدا کے فرائض سنبھالتا ہوں، تم خدا کو یاد کرو۔" مَیں نے کہا اور محسن کو اشارہ کیا کہ کشتی کھول دے۔ محسن نے اس رسّی کو کھول دیا جو ایک چٹان کے نوکیلے کونے سے لپٹی ہوئی تھی۔

موٹر بوٹ چلانے کا کچھ تجربہ بہت پرانا تھا۔ اپنے قیامِ انگلستان کے دوران میں ہم ایک ٹیم تھے جو انگلش چینل میں کشتی رانی کے مقابلوں میں شریک ہوتے تھے۔ صرف ایک بار ہم تیسرے نمبر پر رہے تھے ورنہ عموماً پیچھے سے ہمارا نمبر دوسرا تیسرا رہتا تھا۔ اس میں ہر قسم کی کشتی سے واسطہ پڑتا تھا۔ اصل مقصد ہمیشہ کچھ اور ہوتا تھا۔ تعریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے، ہر ریس میں ہماری پارٹنر بدل جاتی تھی۔ ہمارا مقصد ہمیشہ انگریزوں کی ریس خراب کرنا رہا۔ ریس جیتنا نہیں۔

کچھ تجربہ حالیہ واقعات کا نتیجہ تھا۔ میں نے کریم بلوچ کو لانچ چلاتے دیکھا تھا اور اُس سے فطری تجسس کے باعث سوالات بھی کیے تھے۔ اب مَیں نے نیوی گیشن سنبھالی تو ابتداً میں مجھ سے وہی غلطیاں سرزد ہوئیں جو اناڑی ڈرائیور کرتا ہے لیکن مَیں نے موٹر بوٹ کا توازن قائم رکھا۔ چٹانوں سے دور آ کے مَیں نے رفتار میں اضافہ کیا تو موٹر بوٹ لہرا کے بے قابو ہونے لگی۔

"مَیں زِگ زیگ بھی چلا سکتا ہوں۔" مَیں نے رفتار کم کرنے کے بعد دانت نکال کے محسن سے کہا۔

"اچھا؟" محسن نے طنزاً کہا۔ "غوطہ کتنا گہرا مار سکتے ہیں آپ موٹر بوٹ کے ساتھ؟"

"میری حسِ ملّاحی کہتی ہے کہ ہم صحیح سمت میں جا رہے ہیں اور اگر کسی وھیل نے ہمیں نوٹس نہ کیا یا سمندری تھانیداروں نے نہ پکڑا تو ہم کیماڑی میں اپنی لانچ تک پہنچ جائیں گے۔" مَیں نے کہا۔

"امکانات تو لامحدود ہیں۔ ابھی حاجی عبداللہ ایک ایٹمی آبدوز کے ساتھ نمودار ہو اور ہم پر میزائل مارے یا چاند بھائی آجائیں کہ بھئی خوب ملے، کہاں تھے رات؟ اور یہ کہ آپ ہمیں سمندر کے نیچے کی طلسماتی دنیا دکھانے لے جائیے۔" محسن نے کہا۔

"محسن، ذرا اِدھر آؤ۔" ناگ منی نے آواز دے کر کہا۔ محسن اُچھل پڑا۔ "نام بھی معلوم ہوگیا میرا۔"

"دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔" مَیں نے اُسے یاد دلایا۔

"یہ سب تیری کبھی نہ ہونے والی جورو کی شرارت ہے۔" محسن بولا اور ناگ منی کے پاس چلا گیا۔ ناگ منی نے اُس کا ہاتھ پکڑ کے اپنے پاس بٹھا لیا۔ رابعہ ہنستی ہوئی میرے پاس آگئی۔

"تم نے اس سے بھی پوچھا نام؟" مَیں نے کہا

"ہاں، ابھی تک تو تعارف کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی تھی یا یوں سمجھو کہ موقع نہیں ملا تھا۔" رابعہ نے کہا۔

"میرا، اپنا اور سب کا نام پتا ولدیت سب درست بتا دیے نا؟"

"جب وہ ساتھ ہے تو اُس سے کچھ چھپانے کا فائدہ۔" رابعہ نے چیں بہ جبیں ہو کے کہا۔

"اُس سے بھی کچھ پوچھا، اصلی نام؟"

"بس نام ہی بتایا ہے ابھی تو۔" رابعہ بولی۔ "یہ شیش ناگ ...... تو گویا تخلص تھا۔" رابعہ نے کہا۔ "جیسے شاعری کے پیشے میں ہوتا ہے۔ بھائی کا نام مراد بخش تھا، خود اس کا نام گل بانو۔" وہ ہنسی۔ "محسن کے بارے میں پوچھ رہی تھی کہ ابھی تک اس کی شادی کیوں نہیں ہوئی۔ میں نے کہہ دیا کہ کیسے ہوتی، تم جیسی کوئی لڑکی جو نہیں ملی اُسے۔"

"اُف، مروا دیا اُس غریب کو۔" مَیں نے ماتھے پہ ہاتھ مارا۔ "بھُس میں چنگاری پھینک دی۔"

"معلوم ہے تمھارے بارے میں کیا کہہ رہی تھی؟" وہ پھر ہنسی۔

"احقر کو سخت اشتیاق ہے مس ناگ منی کے تبصرے کا۔"

"کہتی تھی کہ یہ مرد جو مونچھیں بھی صاف کر دیتے ہیں، ان کو شرم نہیں آتی۔ مونچھیں تو زیور ہوتی ہیں مرد کا۔"

"تو پھر اس کٹاری مونچھوں والے سے کیوں کہا تھا کہ مَیں تو شادی کروں گی کسی مرد سے۔" مَیں نے جل بھُن کے کہا۔

"محسن کو دیکھو، کتنا مظلوم نظر آنے کی کوشش کر رہا ہے۔" رابعہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یعنی ہے نہیں؟" مَیں نے کہا۔ "تمھاری یہ مس ناگ منی کیا اسی کے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھی آج کے دن تک اور یہ بھی خوب ہے کہ ابھی آدھے گھنٹے پہلے آپ کس قدر جذباتی ہو رہی تھیں اپنے بھیا کے بارے میں۔ اتنی سی دیر میں موڈ بدل کر رومانٹک بھی ہوگیا۔"

"خیر، اب ایسا بھی نہیں ہے۔ وہ بے چاری لپنے آپ کو ہمارے درمیان ایڈجسٹ کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔" رابعہ بولی۔ "اسے سہارے کی ضرورت تو ہے نا۔ . . اور عورت بے چاری . . ."

"آ ہا ہا۔ بے چاری۔" مَیں نے کہا۔

"ویسے ہے بہت ہمت والی لڑکی۔ اتنا بڑا سانحہ گزر گیا اُس پر۔ مَیں نے پوچھا تھا کہ تمھارے دوست، عزیز، رشتے دار کوئی تو ہوں گے۔ کہنے لگی، ڈکیت کا دوست کون ہوتا ہے، سب ہی دشمن ہوتے ہیں۔ رشتے دار ہوتے تو مَیں بھائی کے ساتھ زمانے میں کیوں خوار پھرتی۔ اس کو دُہرا غم تھا۔ ایک یہ کہ میرا گھر آباد نہ ہوا۔ وہ چاہتا تھا کہ میری شادی ہو کسی شریف آدمی سے، جہاں مَیں گھر کی چار دیواری میں شرافت کی زندگی گزاروں اور محفوظ رہوں مگر شریف آدمی مانگتے ہیں شریف زادی۔ مَیں نے کہا کہ پیسہ تو کم نہیں ہوگا اس کے پاس۔ شریف آدمی خرید کیوں نہیں لیا اس نے۔ ناگ منی کہنے لگی۔ ہاں، اچھے لڑکے بکاؤ بھی ہوتے ہیں مگر کسی ڈاکو کی بہن کے لیے نہیں۔ پھر تو نام کو بٹا لگانے کے ساتھ جان کی بازی لگانے والی بات ہو جاتی ہے۔ دوسرا غم یہ تھا اُسے کہ بعد میں میرا کیا بنے گا۔ وہ ہمیشہ کہتا تھا کہ ڈاکو کی زندگی تو اُدھار پر چلتی ہے .... وہ تقدیر سے ایک ایک دن اُدھار لیتا جاتا ہے اور آنے والے دن پر بھروسا نہیں کرتا۔ اُس کے سب ساتھی ڈاکو تھے۔ ان پر وہ بالکل اعتماد نہیں کرتا تھا۔ معلوم ہے، جب حملہ ہوا تو اُس نے بہن سے کیا کہا تھا؟"

مَیں نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

رابعہ نے کہا۔ "اُس نے کہا تھا کہ ناگ منی مجھے کچھ ہو جائے تو ان کے ساتھ نکل جانا۔ یہ کام کچھ بھی کرتے ہوں، لیکن یہ ہیں شریف اور خاندانی لوگ۔ شرافت تو چہروں پر نظر آجاتی ہے۔ یہ تیری حفاظت کر سکتے ہیں۔"

مجھے اُس کی موت کا منظر یاد آیا۔ شاید اسی لیے وہ بہت بے چین تھا اور مُصر تھا کہ ہم نکل جائیں۔ وہ خود بھی اگر چاہتا تو ہمارے ساتھ آسکتا تھا مگر اُس نے ہمارے سب خطرات مول لے لیے تھے اور اس راستے کی آخری وقت تک نگرانی کرتا رہا جس پر چل کے بہن کو عافیت اور تحفظ کی ضمانت ملتی تھی۔ وہ مطمئن تھا اور پُر اعتماد تھا۔

"کیا ہم اسی طرح سب کے سامنے جائیں گے؟" رابعہ نے اچانک سوال کر دیا۔

"اِس طرح کا مطلب؟" مَیں نے بے خیالی میں کہا۔

"یوں۔ . . میرا مطلب ہے دوپٹہ تک نہیں۔"

"سب احساس کی بات ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے خود کو میم فرض کر لو۔" مَیں نے کہا۔ "جب وہ ہم کالے غیر مہذب دیسی لوگوں کے درمیان ہوتی ہیں تو انھیں سب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھتے ہیں، بھوکی نظروں سے اور بے شرمی سے، مگر وہ اس سے زیادہ کیا کر سکتے ہیں۔ ایکسپوز تو وہ خود ہوتے ہیں۔"

"تم باہر باہر سے چلو نا۔ تاکہ کوئی نہ دیکھے۔ . ."

"مجھے کون سا شوق ہے تمھاری نمائش کا۔" مَیں نے کہا اور کیماڑی کے ساحل کو دیکھنے لگا۔ "اب ذرا تم ناگ منی کی دل جوئی اور اشک شوئی کرو۔ محسن کو یہاں بھیج دو تاکہ میری کچھ مدد کرے۔ مجھے اندازہ نہیں ہو رہا ہے کہ ہم کس سمت سے داخل ہو سکتے ہیں۔"

محسن روتا بسورتا آیا۔ "یار، یہ رابعہ نے مروا دیا مجھے۔"

مَیں نے اُسے ڈانٹا۔ "کیا ہوگیا ہے تجھے۔ اب بھول گیا وہ وقت جب ہفتے کے سات دن سات مختلف لڑکیوں کو ڈیٹ دیتے تھے ہم۔ اب ایک لڑکی نہیں سنبھالی جاتی۔ اگر تو اس کو جذباتی سہارا فراہم کرنے کے لیے اور اس میں خود اعتمادی پیدا کرنے کے لیے تھوڑا سا ناٹک کر لے گا تو کون سا تیری وفا پر حرف آجائے گا۔ اُسے محبت کی ضرورت ہے، پیار کی ضرورت ہے اور یہ ضرورت پوری کرنا ایک جان بچانے کے مترادف ہے۔ اس کا اجر ہے۔"

"مگر وہ بہت خطرناک چیز ہے۔ نازو کا زیادہ خونخوار اور بے باک ایڈیشن۔ وہ غالب کے ساتھ دل لگی میں دھول دھپا کر لیتی ہے ـــــ بتا رہی تھی کہ اب تک سات قتل کر چکی ہے، وہ آٹھواں بھی کر سکتی ہے کل۔ جب معلوم ہوگا کہ مَیں اُسے محبت کے نام پر دھوکا دے رہا تھا۔" محسن بولا۔

"ابے کل کی کل دیکھی جائے گی۔" مَیں نے کہا۔ "گرتے

ہیں شہسوار ہی میدانِ جنگ میں۔ قتل بھی مرد ہی ہوتے ہیں لیکن تو بالکل فکر مت کر۔ اس نے شہلا کو بیوہ کیا تو میں اسے بیوہ کردوں گا جب بھی یہ بیوی بنی۔"

"یعنی میں چڑھ جاؤں سولی پر ابھی تو۔ ۔ ۔ رام بھلی کریں گے۔" محسن نے جل کے کہا۔

"مجھے کچھ مشورہ دے۔ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ اسی موٹر بوٹ میں چکر لگا کے اپنی لانچ کو تلاش کریں یا کہیں لنگر انداز ہو جائیں پھر ہم میں سے ایک جائے۔" میں نے کہا۔

"ہم سب نہیں جا سکتے؟" محسن سوچ کے بولا۔

"نہیں۔ سب کی توجہ کا مرکز بن جائیں گے۔ خواتین نہ صرف یہ کہ خوب صورت ہیں بلکہ ان کا حسن جامے سے باہر ہوا جاتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر کچھ کرنسی ہاتھ میں ہوتی تو کوئی دوسری کشتی کرائے پر حاصل کر لیتے۔ یا ان کے لیے ملفوف ہونے کا بندوبست کرتے۔"

"یہ بھی تو معلوم نہیں کہ اب ہماری لانچ کہاں ہے؟"

"سارا بندرگاہ کا علاقہ دیکھنا پڑے گا۔" میں نے کہا۔

"نہیں، کریم بلوچ احمق نہیں ہے کہ بیچ میں گھس کے کھڑا ہو جائے۔" محسن بولا۔ "وہ اس طرف نہیں تو پھر دوسری طرف ہوگا۔"

"چل پھر اللہ پر بھروسا کرتے ہیں۔ اسی موٹر بوٹ میں جاتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "یہاں کوئی ایسی چیز نہیں۔ کوئی میلا کپڑا، چادر وغیرہ؟"

"ایک بستر لپٹا ہوا پڑا ہے شاید چادر ہو اس میں۔" محسن نے کہا۔

"بس تو یار ان کو لپیٹ دے کسی طرح۔ چادر نہ ملے تو بستر میں سے روئی نکال دے۔ اوپر نیچے کا حصہ الگ کر اور انھیں دے کہ اوڑھ کر بیٹھ جائیں۔ منہ سر لپیٹ کر لیٹ جائیں اس طرح کہ کوئی نہ دیکھے۔ ہم تو اس لباس میں بالکل غیر نمایاں ہیں۔" میں نے کہا۔

محسن نے خواتین کے حسن و شباب کو بہت جلد بدنمائی کے پردے میں چھپا دیا۔ وہ تابائی جمال جس پر نگاہ نہ ٹھہرتی تھی یوں دھندلا گئی، جیسے کوئی ایک خوب صورت تصویر کو اخباری کاغذ میں لپیٹ دے۔ محسن کی ہدایات کے مطابق وہ بڑے بڑے چار خانے والے بستر کے میلے کپڑے اوڑھ کر لیٹ گئیں۔

اب میں نے آہستہ آہستہ چلنا شروع کیا۔ میری ساری توجہ موٹر بوٹ کو بحفاظت اس علاقے کی سمندری ٹریفک سے گزارنے پر مرتکز تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کسی دوسری کشتی یا لانچ سے تصادم ہو تو ہنگامہ بڑھے اور کوئی قانونی پیچیدگی پیدا ہو۔ میری پوزیشن شہر کے رش میں ایک مسروقہ کار چلانے والے سے مختلف نہیں تھی۔

محسن نے بحری جہازوں، اسٹیمروں، لانچوں، فشنگ ٹرالروں اور کشتیوں کے جمِ غفیر پر نظر رکھی۔ اس دوران بہت سی کشتیاں اور موٹر بوٹس میرے قریب سے گزریں لیکن کسی نے بھی مجھے درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ وہاں کسی کو بھی فرصت نہ تھی کہ آتے جاتے لوگوں کے چہرے دیکھے۔ یہ سب چہرے تھے بھی ایک سے اور ان کے معمولات بھی مختلف نہ تھے۔ ایک کشتی لہراتی ہوئی میرے اتنے قریب سے گزری کہ دونوں کے درمیان چند انچ کا فاصلہ بھی نہیں رہا۔

"او ولی محمد! کچھ خیال کر دنی بابا۔" میں نے چلا کر کہا۔ دوسری کشتی والا جو بوتل منہ سے لگا کے دیسی شراب پی رہا تھا، قہقہہ مار کے ہنسا۔ "اڑے ہم کو ولی محمد بولتا ہے سالا نشے میں ہے، مجھ کو میرا باپ بناتا ہے نی۔" اس نے ایک ہچکی لی۔ کشتی تھوڑا سا لہرائی مگر گزر گئی۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

"یار وہ جہاز تو شاید نکل گیا۔" مجھے محسن نے مایوس لہجے میں مطلع کیا۔ "جہاں پہلے لنگر انداز تھا وہاں تو ہے نہیں۔"

"یہ تو برا ہوا۔" میں نے کہا۔ "کل رات غالب اور نازو نے انتظار کیا ہوگا ہمارا۔"

"نکل کے کتنی دور گیا ہوگا؟" محسن بولا۔ "کیا ہم اب اسے نہیں پکڑ سکتے۔"

"پکڑ تو سکتے ہیں لیکن پکڑے بھی جا سکتے ہیں۔ کل تو یہ معلوم تھا کہ کس وقت جہاز کہاں ملے گا۔ آج کی کیا خبر اور پھر جہاز پر پہنچنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ اوپر سے کوئی ہماری مدد نہ کرے۔" میں نے کہا۔

"اچھا، دیکھتے ہیں کہ اب ان بدلے ہوئے حالات میں کیا ہو سکتا ہے۔ ۔ ۔ وہ۔ ۔ ۔ وہ رہی ہماری لانچ۔" محسن نے انگلی اٹھا کے کہا۔

مجھے وہی خوشی ہوئی جو بھٹکے ہوئے مسافر کو منزل کا نشان مل جانے سے ہوتی ہے۔ چند منٹ بعد ہم لانچ کے قریب جا پہنچے۔ بالکل ساتھ ساتھ لگانے کی کوشش میں موٹر بوٹ نے لانچ کی سائیڈ سے رگڑ کھائی۔

کریم بلوچ غصے میں بکتا جھکتا اوپر آیا۔ "اوئے الو کا پٹھہ اندھا ہے کہ کانا۔" پھر اس نے غور سے دیکھا اور ہمیں پہچان لیا۔ "صاب! آپ آ گیا۔ ہم سے غلطی ہوا صاب! آپ کو الو کا پٹھا بولا۔ اندھا اور کانا بولا، ہم الو کا پٹھا، ہم اندھا۔ ۔"

"بس بس کریم بلوچ۔" میں نے انجن کا تار الگ کرتے ہوئے کہا۔ "کوئی نقصان نہیں ہوا۔"

"تم پھر پی رہے تھے؟" محسن نے اسے ڈانٹ کر کہا۔

"ابھی کیا کرے صاب۔ ہم کو فکر اندر سے کھاتا پڑا تھا۔ دیمک کا مافک۔" وہ بولا۔ "ہم اتنا غم کیا، رات کو الو کا مافک جاگتا تھا، سوچتا تھا صاب لوگ کو بھوت لے گیا یا عزرائیل صاب۔"

"تو غم غلط کرنے کے لیے پی رہے تھے تم۔" میں نے اس کی بات پر ہنس کے کہا۔ "چلو اب بند کرو یہ شغل جام و مینا۔"

"کیا؟ کیا بند کرے صاب؟" کریم بلوچ بوکھلا گیا۔

"کچھ نہیں۔ زبان بند کرو اور ان دو خواتین کو لے جاؤ۔" میں نے کہا۔

کریم بلوچ نے آنکھیں مل کے دیکھا۔ "کون۔ ۔ ۔ کدھر ہے خواتین صاب۔ آپ دو بولتا۔ ہم کو ایک بھی نظر نہیں آتا۔"

اس کی نگاہ میری طرف تھی، جب رابعہ اور ناگ منی چادر ہٹا کے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ محسن نے ان سے کہا تھا کہ گھر آ گیا۔

"کیا ہو گیا ہے تمھاری نظر کو کریم؟" میں نے اسے ڈانٹ کر کہا۔

اس نے پھر دیکھا تو اسے ایک سی دو خواتین نظر آئیں۔ اس نے پھر آنکھیں ملیں، زیرِ لب بڑبڑایا۔ "مغز پھر گیا ہے اپنا صاب۔ ایک کا دو نظر آتا ہے۔ کل ہم فلم دیکھا تھا نیلو کا۔ ابھی ہم کو دو نیلو دکھائی پڑتا ہے۔ ایک دم وہی، آپ ٹھیک بولا، ہم تو بوہت نشے میں ہے۔"

محسن نے باری باری رابعہ اور ناگ منی کو ہاتھ پکڑ کے موٹر بوٹ سے لانچ پر اترنے میں مدد دی۔

"ان کو نیچے نازو بی بی کے کیبن میں لے جاؤ۔" میں نے [illegible] کھڑے ہوئے کریم بلوچ سے کہا۔ پھر میں رابعہ سے مخاطب ہو گیا۔

"وہاں نازو کے کپڑے ہوں گے۔ یہ لباس ویسے تو بہت نظر نواز ہے مگر کہیں نظر نہ لگ جائے زمانے کی۔" میں نے کہا۔

ناگ منی یہ سب کچھ حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں رات بھر کی بے خوابی، تکان اور رنج و غم کے اثر سے بوجھل اور سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ کچھ خوف زدہ بھی تھی اور بے اطمینانی کا شکار بھی۔ ایک رات نے اس کی زندگی کا رخ بدل دیا تھا اور اس کی قوتِ فیصلہ مفلوج ہو گئی تھی۔ وہ طے کرنے سے قاصر تھی کہ ان لوگوں کے ساتھ اپنا مستقبل وابستہ کرکے اور خود کو کلی طور پر ان کے رحم و کرم پر چھوڑ کے اس نے اچھا کیا یا برا؟ جو کسی حد تک اس کے بھائی کی موت کے ذمے دار تھے۔ فیصلہ کا جھکاؤ کسی حد تک ہمارے حق میں تھا تو صرف اس لیے کہ ہم نے قاتلوں کے خلاف اس کا دفاع کیا تھا اسے بچانے کی پوری کوشش کی تھی اور ہم اپنے رویّے سے بدنیت یا بدکردار نظر نہیں آتے تھے۔

میں نے اور محسن نے عرشے پر بیٹھ کے ہی کریم بلوچ کا مختصر انٹرویو لیا۔ اس نے بتایا کہ نازو بی بی اور غالب صاب تو جہاز پر چلے گئے تھے اور اس کے بعد وہ بہت دیر تک ان کی واپسی کا انتظار کرتا رہا تھا مگر وہ صبح تک لوٹ کر نہیں آئے۔ انھوں نے سمجھا تو دیا تھا کہ وہ چلا جائے مگر وہ کچھ خوف زدہ اور پریشان تھا اور ان کی طرف سے متفکر تھا۔

"وہ جہاز تو چلا گیا۔"

"کدھر چلا گیا صاب؟" کریم بلوچ نے کہا۔ "ہم نے کل صبح میں دیکھا۔ دوپہر کو دیکھا تو معاملہ کچھ گڑبڑ تھا۔"

"کیا گڑبڑ معاملہ تھا؟"

"کوئی خرابی تھی اس میں۔ انجینئر لوگ آیا۔ ان کا ساتھ وہ بھی تھا، دوست محمد، وہ سب سارا دن کام کیا۔ پھر جہاز کو ادھر ورکشاپ میں لے گیا۔ ہم دوست محمد سے پوچھا۔ وہ بولا کہ دو انجن کا پسٹن ٹوٹ گیا۔ پتا نہیں کیسے ایک ساتھ ٹوٹ گیا۔ پسٹن ٹوٹنے والا چیز نہیں ہے۔ ابھی لمبا کام ہے۔ ادھر بمبئی سے کمپنی کا انجینئر آئیں گا پسٹن مسٹن ساتھ لے کر، لیکن صاب، ہم ایک اور بات مالوم کیا۔" وہ رازدارانہ لہجے میں بولا۔ "دوست محمد سے نہیں، ادھر شپ یارڈ میں اپنا سسر ہے۔"

"تمھاری تو ابھی شادی نہیں ہوئی۔ یہ سسر کہاں سے پیدا ہو گیا؟" میں نے کہا۔

"پیدا تو بوہت پہلے ہوا تھا صاب۔ پھر اس کا چھوکری پیدا ہوا۔" کریم بلوچ نے کہا۔ "ایک دم بمباٹ۔ اپن دیکھتا تو ایک بوتل کا نشہ ہوتا۔ اس کا ساتھ اپن کو شادی بنانے کو مانگتا۔ وہ بڈھا نہیں مانتا مگر ہم اس کو اتنا ماریں گا کہ اس کا تو باپ بھی مانیں گا۔"

مجھے ہنسی آئی۔ "مار مار کے اسے سسر بناؤ گے؟"

"اور کیا کریں گا صاب۔ ایسے نہیں مانتا وہ۔"

"اچھا تم کوئی خاص بات بتا رہے تھے۔" محسن نے کہا۔

"ہاں صاب، وہ ہمارا سسر کا جنوائی ہے نا۔"

"کریم! تم کیا بک رہے ہو۔ اپنے سسر کے داماد تو خود تم بنو گے۔"

کریم بلوچ نے نفی میں سر ہلا کے تردید کی۔ "نمبر ون وہ ہے صاب۔ ہم نمبر دو ہووے گا۔ اس کا ایک نمبر لڑکی کا ایک نمبر خصم۔ وہ یار ہو گیا اپنا۔ ہم بوہت رویا اس کے سامنے تو وہ بولا کہ کریم تیرا شادی میں کرائیں گا۔ تو پیسہ جمع کر اور میرے کو دے تاکہ میں بڈھا کو خوش کر دوں۔ ابھی صاب! ہم اس کو

بروبر دیتا ہر مہینے، کبھی ہر ہفتے۔"

"تم اسے پیسہ دے رہے ہو؟ کتنا دے چکے ہو اب تک؟"

"ہم سب لکھا ہے صاب، اپنا ڈائری میں۔" اس نے جیب میں سے پھٹے ہوئے اوراق والی نوٹ بک نکالی۔ "تم بھی دیکھو۔ ہم بے وقوف نہیں ہے۔"

"تین ہزار سات سو پچاس۔" میں نے کئی صفحات پر نمبروار لکھے ہوئے اندراجات کا آخری ٹوٹل دیکھا۔ "تم ایک نمبر کے بے وقوف اور گدھے ہو کریم۔ وہ ٹھگ رہا ہے تم کو۔ یہ سب تو خود تم نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہے۔ کیا ثبوت ہے تمہارے پاس کہ اُسے یہ رقم دی ہے تم نے؟"

"یار، کام کی بات تو سُن لو۔" محسن جھنجلا کے بولا۔

"ہم بے وقوف ہے، گدھا ہے۔" کریم بلوچ کا چہرہ اُتر گیا۔ "ایسا مت بولو صاب۔ ہم اُس کو ڈال دے گا اُسی مشین میں، جس میں وہ گنّا ڈالتا ہے اور رس نکالتا ہے۔ اس کا جوس پی جائے گا ہم۔"

"ہاں ہاں، پی جانا۔" میں نے کہا۔ "یہ بتاؤ پہلے کہ تم نے کیا خاص بات معلوم کی تھی؟"

"ابھی ایک اور جہاز بمبئی سے آئیں گا صاب۔ آج ادھر آئیں گا۔" کریم نے کہا۔ "ابھی یہ کنڈم جہاز کا سب مال اس پہ جائیں گا۔"

میں نے فرطِ مسرّت سے کریم بلوچ کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ "واہ استاد، کیا زبردست خبر دی ہے تم نے، ساری فکریں دور کر دیں۔ چلو اب اسی بات پہ آج سے تم اس بحری جہاز کے کپتان، کیپٹن کریم۔"

"کیپٹن کریم!" کریم بلوچ دم بخود رہ گیا۔

"اور وہ جو تمہارا سسر ہے، اس کی تو ایسی تیسی۔ ہم اسے راضی کریں گے اور یہ جو پیسہ تم برباد کر چکے ہو، یہ بھی دلوائیں گے تمھیں واپس۔" محسن نے اس کے دوسرے کندھے پر ہاتھ مارا۔ "لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ کھانے کو کیا ہے۔ ساڑھے تین منٹ بعد میرا دم نکل جائے گا بھوک سے۔"

"ساڑھے چار منٹ کے بعد میرا۔" میں نے کہا۔

کریم بلوچ نے فوری طور پر نیچے جا کر رابعہ کو کچن اور اسٹور سے متعارف کرایا اور پھر خود کھانے پینے کا سامان لینے کے لیے بھاگ گیا۔ اس کے واپس آنے تک ہم چائے کے دو دو کپ پی چکے تھے اور لیٹے لیٹے ہوئے سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہے تھے۔ مجھے کوئی تعجب نہیں ہوا جب ناگ منی نے بھی ہم سے لے کر سگریٹ جلائی اور کش لگانے لگی۔

نازو ذرا دُبلی پتلی تھی۔ اس کے کپڑے ان دونوں کے تھے، خاصے پھنس کر آئے۔ کہیں کہیں سے سلائی بھی اُدھڑی۔

رابعہ نے تو دو پٹہ لے کر کمی بیشی کو برابر کر لیا مگر ناگ منی خاصی بے پروائی سے پھرتی رہی۔ وہ جس قسم کے ماحول میں رہی تھی اس میں تہذیب و شائستگی اور نسوانیت کے ادب و آداب کا گزر نہ تھا۔ بھائی اُس کی عزّت کا محافظ ضرور تھا مگر وہ اس کو ماحول کے اثرات سے کیسے بچا سکتا تھا۔ اس کے کردار کے بارے میں کوئی فیصلہ صادر کرنا قبل از وقت ہوتا۔ مردانہ انداز میں سگریٹ نوشی کے علاوہ غصّے میں گندی گالیاں بکنا، نسوانیت کی شرم و حیا اور ستر پوشی کے انداز کو اہمیت نہ دینا بے باک گفتگو اور جارحانہ تیور سب انھی جرائم پیشہ افراد کی صحبت کا نتیجہ تھے۔ یہ اطوار ایک دن کیا ایک ہفتے میں بھی نہیں بدل سکتے تھے۔ اُسے شرمندہ یا مطعون کرنے کا اثر اُلٹا ہوتا اور پند و نصائح کے دفتر کھول دیے جاتے تو وہ ہماری صورتوں سے بھی بیزار ہو جاتی۔ یہ سب آہستہ آہستہ وقت کے ساتھ کیا جا سکتا تھا۔ ڈاکٹر بھی دوا کی مقدار کا تعین مرض کی نوعیت اور مریض کی حالت دیکھ کر ہی کرتے ہیں۔ سب دواؤں کا ڈھیر اُس کے حلق میں انڈیل دیا جائے تو ایک دن میں مرض ختم نہیں ہوگا، مریض ختم ہو جائے گا۔

مجھے نہ جانے کیوں اس لڑکی کے مستقبل سے تھوڑی سی دلچسپی ہو گئی تھی۔ جب میں نے اُس کی جان بچائی تھی تو یہ صرف اس کے بھائی کے احسان کا بدلہ ادا کرنے کی ایک کوشش تھی مگر بعد میں شیش ناگ نے جس اعتماد کا مظاہرہ کرتے ہوئے اُس کو میرے ساتھ روانہ کر دیا تھا، وہ میرے لیے ذمے داری کا ایک بوجھ بن گیا تھا۔ مجھے ناگ منی کی گفتگو سے اندازہ ہو گیا تھا کہ بھائی نے اُسے انتہائی مجبوری میں ساتھ رکھا تھا۔ کیونکہ دنیا میں اس کے لیے واقعی کوئی جائے پناہ نہیں تھی۔ اب یہ میرے لیے ممکن نہ تھا کہ میں ناگ منی کو اسی بے رحم دنیا کے رحم و کرم پر چھوڑ دوں جس کو ناگ منی کا بھائی لُوٹتا رہا۔ کیا موقع ملتے ہی دنیا اس کا بدلہ ناگ منی کو لُوٹ کر نہیں لے گی۔ اور لُٹانے کے لیے اس کے پاس کیا ہے! وہی عزّت جو عورت کی متاعِ حیات ہے۔ میں یہ کوشش ضرور کرنا چاہتا تھا کہ ناگ منی اپنے ماضی سے کٹ جائے اور اپنے مستقبل کے لیے وہ راستہ اختیار کرے جو عزّت و آبرو اور تحفظ یا عافیت کا راستہ ہو۔ البتہ وہ ہمارے ساتھ رہ کے ہی کر سکتی تھی اور ہماری زندگی کے اطوار اپنا کے بھی۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ ہم ناگ منی کو اپنائیں، اسے یقین اور اطمینان دیں کہ وہ ہمیں اپنا سمجھنے پر مجبور ہو اور پھر گل بالو بن جائے۔

کریم بلوچ آدھے گھنٹے میں لوٹ آیا۔ رابعہ نے اُس سے ڈبل روٹی، انڈے اور مکھن لے کر ناشتا تیار کیا جو ہم نے ساڑھے گیارہ بجے لنچ کے طور پر کھایا۔ ناگ منی شدید اعصابی تشدید کا شکار تھی۔ میں نے اُسے دو خواب آور گولیاں دیں جو اُس نے کوئی سوال کیے بغیر کھا لیں۔ میں نے رابعہ کو سمجھا دیا کہ اس کا خیال رکھے اور محسن کو سمجھایا کہ وہ دونوں کا خیال رکھے۔

"میں کریم بلوچ کے ساتھ جا رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "یہ معلوم کرنے کے لیے کہ نازو اور غالب کیا کر رہے ہیں؟"

"یہ کیسے معلوم ہوگا؟"

"اللہ کوئی سبیل پیدا کرے گا۔" میں نے کہا۔ "پہلے تصدیق ہو جائے کہ کیا واقعی 'ایس ایس کرانتی تھرڈ' سفر کے قابل نہیں رہا اور اس کی جگہ دوسرا جہاز یہ اسباب لے جائے گا۔"

"ایسی باتیں کون بتائے گا تجھے؟"

"ایسی باتیں چھپی نہیں رہتیں۔ بندرگاہ کے علاقے میں بہت سے لوگ جانتے ہوں گے۔ صرف اسباب کی نوعیت کو راز میں رکھا جائے گا۔" میں نے کہا۔ "یہ تو ممکن ہی نہیں کہ ایک بحری جہاز کا سامان رازداری سے دوسرے جہاز پر منتقل ہو جائے۔"

لانچ پر سے میں نے دو ریوالور لیے۔ ایک کو میں نے قمیص کے نیچے شلوار کے نیفے سے باندھا اور دوسرے کو جو نسبتاً چھوٹا تھا، جراب میں اُڑس لیا۔ جراب کے ساتھ مجھے بوٹ بھی پہننے پڑے۔ دوسری جراب میں سو سو کے نوٹوں کی ایک گڈی اُڑسنے کے بعد میں نے اپنا حلیہ تھوڑا سا بدلا۔ کریم بلوچ کے سستے اور گھٹیا پلاسٹک کے بنے ہوئے دھوپ کے چشمے اور اس کی بڑی سندھی وضع کی ٹوپی کے ساتھ اجرک اوڑھتے ہی میں ایک نظر میں پہچانے جانے کے خوف سے آزاد ہو گیا۔

"بیٹا کریم!" میں نے کہا۔ "سوری، کیپٹن کریم! یہ جو تمہارا ہم زلف ہے۔"

"کیا چیز صاب؟" وہ سمجھا کہ میں اُس سے حلیہ بدلنے کے لیے کچھ اور طلب کر رہا ہوں۔

"ارے یار... وہ تمہارے سسر کا جنوائی، اس کی بیٹی نمبر ایک کا خصم نمبر ایک، اُس کا نام کیا ہے؟"

"وہ... موشن میاں۔"

"کیا؟ موشن؟" میں نے کہا۔ "بمعنی حرکت؟ جلاب؟"

کریم اُڑا رہا۔ "یہی نام ہے اُس کا صاب۔ موشن میاں۔"

"اُس کے باپ کا نام جانتے ہو؟" محسن نے ہنستے ہوئے کہا۔

"نہیں صاب۔ اپن کو سارا فیملی کا نام تو نہیں معلوم۔" کریم بلوچ نے ہماری ہنسی پر خفّت سے کہا۔

"اچھا۔ کیا وہ بنگالی ہے؟" میں نے سوچ کے کہا۔

"جی صاب۔ اُس کا گھر والی بھی بنگالی ہے۔ بانشری۔"

"بانشری؟" میں نے کہا۔ "لاحول ولاقوۃ۔ شب شین شے، موشن اور بانشری۔ یار یہ بانسری تو کوئی نام نہ ہوا۔"

"ماف کرنا صاب۔ ہم بھول گیا۔ اُس کا نام تھا مُرلی۔ ہم اس کا مطلب پوچھا تھا۔"

"اوہ، مُرلی تو خیر بانسری ہوتی ہے مگر کیا وہ ہندو ہے؟" میں نے کہا۔ "تمہارے ششر کا نام کیا ہے، وہ شالا ششار ہے کیا! اور اش کی وہ بہاٹ لڑکی نمبر دد، وہ شتارنگی ہوگی۔"

کریم بلوچ اس مذاق کو نہیں سمجھا۔ "نئیں صاب، مُرلی کا باپ ہے چقندر اور دوسری جو میری گھر والی ہوگی اُس کو بولتا ہے مستری، جس کو آپ مکینک بولتا۔"

میں نے سر پر ہاتھ مارا۔ "کریم! تم نے سین شین سے سب کا بیڑا غرق کر دیا، یا وہ ہوگی مشتری اور تمہارے سسر کا نام غالباً جو گندر یا جگندر۔ مجھے یہ بتاؤ کہ اس موشن میاں سے مُرلی کا ملاپ کیسے ہو گیا؟ موشن میاں تو گویا محسن میاں ہوئے۔ وہ مسلمان ہوگا۔"

"ایک دم کلمہ گو، داڑھی دار، پانچ وقت کا نمازی ہے وہ صاب۔" کریم نے کہا۔ "مُرلی کو بولا کلمہ پڑھو پھر نکاح پڑھا۔"

"سبحان اللہ، کیا دیندار آدمی ہے۔ عاشق ہوا ایک کافر کی بیٹی پر۔ تم کو ٹھگ لیا۔ مجھے یہ موشن میاں مشکوک آدمی لگتا ہے۔ چلو آج اس سے مل لیں۔ اچھا موشن میاں، ہم جاتے ہیں۔" محسن سخت خفیف ہوا۔ اس کے نام کی یوں مٹی پلید کبھی نہ ہوئی تھی۔

کریم بلوچ نے موٹر بوٹ کو یوں دیکھا جیسے موت کے کنوئیں میں موٹر سائیکل چلانے والا سائیکل کو دیکھے۔ اُس نے ڈیزل اور آئل وغیرہ چیک کیا۔ ڈیزل کچھ کم تھا۔ وہ لانچ پر گیا اور وہاں سے دو گیلن کا ایک ڈبا اُٹھا لایا۔ پھر وہ موٹر بوٹ کو ریس کار کی طرح دوڑاتا ہوا لے گیا۔ مجھے یوں لگتا تھا کہ یہ ہلکی پھلکی کشتی اس رفتار پہ اُڑ جائے گی۔ اس کا انجن بے حد شور کر رہا تھا اور موٹر بوٹ لہروں کے ساتھ اُٹھتی تھی تو ہوا پر تیرتی محسوس ہوتی تھی۔ کریم بہت ترنگ میں تھا اور بار بار قہقہے لگا رہا تھا کسی وجہ کے بغیر۔

شپ یارڈ کے علاقے میں اُس نے مجھے دور سے 'ایس ایس کرانتی تھرڈ' کے گرد ایک چکر دیا۔ مجھے شک ہوا کہ عرشے پر نازو موجود ہے مگر دوربین کے بغیر میں اُسے صاف طور پر نہیں دیکھ سکتا تھا۔

"کیپٹن کریم! مجھے اچانک ایک بہت اچھی دوربین کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔" میں نے کہا۔

"ادھر سب ملتا ہے صاب۔ باہر کا سب چیز پہلے ادھر

ہی تو آتا ہے۔" وہ بولا۔

"کتنے میں ملے گی بہت اچھی دوربین؟"

"ابھی کیا بتاوے صاب۔ ہم لے آوے گا۔ آپ کو پسند آوے تو رکھنا اور پیسہ دینا۔" وہ بولا۔

"ٹھیک ہے۔ یہ تم بھی فیصلہ کر سکتے ہو کہ اچھی دوربین کیسی ہوتی ہے۔" میں نے اُسے پانچ سو روپے دیے۔" خود سودا کر لینا اور دوربین یہاں لا کے رکھ دینا۔"

موٹر بوٹ کو اُس نے ایک زنگ آلود لوہے کی سیڑھی کے ساتھ باندھ دیا۔ اسی کے ساتھ تین اور موٹر بوٹس بھی بندھی ہوئی تھیں۔ لہروں کے زور سے ڈولنے والی کشتیوں کو آپس میں ٹکرانے سے روکنے کے لیے ایک ساتھ ہی جوڑ کے باندھ دیا گیا تھا۔ یہ انتظام مفادِ باہمی کی ایک روایت تھا جس کے لیے کوئی کسی سے اجازت نہیں لیتا تھا۔ جسے جانا ہو، اپنی کشتی کھول کے الگ کرے اور لے جائے۔

موشن میاں کی گنے کا رس نکالنے والی مشین بڑی مصروف جگہ پر لگی ہوئی تھی۔ اس کے لیے 'این او سی' پولیس نے یا کسی پتھار یدار کے ایجنٹ نے جاری کیا ہوگا۔ ورنہ اس علاقے میں راستہ روک کے کون بیٹھ سکتا تھا اور براہِ راست پول سے بجلی کا کنکشن کیسے لے سکتا تھا۔ موشن میاں ایک عیّار اور مکار شخص تھا چنانچہ مجھے اس کی صورت بھی لومڑی جیسی لگی۔ وہ بے حد مختصر اور پورٹیبل قسم کی چیز تھا۔ چگی بکرا برانڈ داڑھی اور چٹائی کی گول ٹوپی پہنے۔ میلے بنیان کے نیچے لال' چار خانے کی لنگی باندھے وہ بڑی پھرتی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ میرے دیکھتے دیکھتے اُس نے چار گلاس بھر کے گاہکوں کو پکڑائے۔ دو سے پیسے لیے۔ اُن کے خالی ہو جانے والے گلاس بالٹی کے گندے پانی میں ڈبو کے نکالے' برف کوٹی اور گنے لگانے والے مدقوق چھوکرے کے ایک ہاتھ بھی رسید کیا۔

کریم بلوچ کو دیکھتے ہی وہ اُچھلا۔" شالا، تم فیر آگیا۔ ابھی تم کو بولتے کہ دھندا کے ٹیم میں مت آؤ۔ ہم بولتے کہ مستری کا باپ پیشہ مانگتا پیشہ۔ ۔ ۔"

"کتنا پیسہ اور چاہیے محسن میاں؟" میں نے اُس کے ساتھ لگ کر کہا۔ میرے اشارے پر کریم وہاں سے کھسک گیا۔ وہ چونکا۔" تم۔ ۔ ۔ اِدھر سے ہٹو، اُدھر جاؤ اُدھر۔ ۔ ہٹو۔"

"میں نے پوچھا ہے کہ اور کتنا مال چاہیے؟" میں نے مشین کی اوٹ میں رہتے ہوئے قمیص کو اوپر اٹھایا۔" تمھاری یہ سالی تو بہت مہنگی پڑ رہی ہے بے چارے کریم بلوچ کو۔ پونے چار ہزار تو لے چکے۔"

"کیا؟ کیا بولتا؟ ہم پونے چار ہجار لیا۔" موشن میاں پٹاخے کی طرح اُچھلا۔

"ہاں، یہ مشتری آخر ہے کتنے کی؟ کتنے میں بیچو گے اُسے؟" میں نے اطمینان سے ریوالور کو اوپر کھسکایا۔

وہ گاہکوں سے نمٹنے میں مصروف تھا اس لیے میری حرکت کو نہ دیکھ سکا۔" ہم۔ ۔ ۔ ہم بیچتا چھوکری لوگ کو؟ دلال بولتا تم ہم کو؟ شالا۔"

"تم ایسا کرو، مُرلی دے دو اسے۔ سیکنڈ ہینڈ چیز ہے نا۔ پونے چار میں۔"

اب اُس کا سوکھا سڑا وجود تھر تھر کانپنے لگا تھا مگر اسی وقت موشن میاں کی نظر نے میرے ہاتھ کی طرف اور پھر ریوالور کی طرف دیکھا۔ ایک دم اس کی موشن رک گئی اور وہ جام ہو گیا۔ اُس کی زبان بھی رُک گئی۔

"آواز مت نکالنا۔" میں نے اُس کے کان میں کہا۔" ورنہ میں گولی مار کے نکل جاؤں گا۔ تم ذرا اِدھر آؤ۔" میں نے اُسے کچھ دور بُلا لیا۔

"ک۔ ۔ ۔ک۔ ۔ ۔کو۔ ۔ ۔کون ہے تم؟"

"میں کریم بلوچ کا ماموں ہوں۔ قتل کے الزام میں جیل کے اندر تھا۔ دو دن پہلے باہر آیا ہوں۔" میں نے کہا۔" پھر بھی جا سکتا ہوں۔ اپنا تو آنا جانا لگا رہتا ہے۔"

"ہم۔ ۔ ۔ خدا پاک کا قسم ہے۔ ۔ ۔ ہم ایک پیشہ نہیں لیا۔ وہ شالا۔ ۔ ۔ مستری کا باپ چکندر۔" اُس نے جگندر کا نام ایسے لیا کہ چقندر ہی سنائی دیا۔" اس کو دیا۔"

"اچھا، جگندر کہاں ملے گا؟" میں نے کہا۔" پیسہ تو مجھے آج ہی وصول کرنا ہے۔ اُس سے یا تم سے، ورنہ ایک کو کڑچ کرنا ہے۔"

"کیا کرنا ہے؟" وہ بلبلایا۔" کڑ۔ ۔ ۔ کیچ۔"

"اوں ہوں۔ ۔ ۔ کڑچ۔" میں نے کہا۔" یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شام تک مشتری کا معاملہ طے ہو جائے کہ اس کی شادی کب ہو گی کریم بلوچ کے ساتھ۔ تاریخ چاہیے مجھے۔"

وہ زور زور سے سر ہلانے لگا۔" بنائے گا، بنائے گا، ابھی ہم سمجھ گیا۔ ہم سادی بنائے گا۔ چکندر کو بولیں گا۔"

"بالکل بولو۔ نئیں بولیں گا تو ہم تمھارا ابھی رس نکالیں گا اِدھر گنے کے ساتھ۔ مشین میں ڈالیں گا، پھر نکالیں گا، پھر ڈالیں گا۔ اور تمھارا جوس کریم بلوچ کا کُتا پیے گا۔" میں نے کہا۔

اس نے ایک دہشت زدہ چیخ ماری۔" ہم خدا پاک۔ ۔ ۔ کا قسم کھاتے۔ چکندر مانیں گا۔ نئیں مانیں گا تو ہم اس۔ ۔ ۔"

"تم اس کو پونے چار ہزار دو گے۔"

"ہم۔ ۔ ۔ ہم بولیں گا کہ مُرلی کو بھی لے جاؤ۔ ہم اس کو بھی طلاخ بولے۔ پھر وہ ڈر جائیں گا۔" موشن میاں نے بلیک میلنگ کے ذریعے اپنے ۔ ۔ ۔

یا تو مشتری کو کریم بلوچ کے نکاح میں دو، ورنہ پہلی بیٹی کو بھی لے جاؤ۔ مگر اُس نے پونے چار ہزار کی بات نہیں کی۔

"اور وہ پونے چار ہزار، وہ واپس کرو گے؟" میں نے ریوالور پر ہاتھ رکھا۔" اچھا چھوڑو۔ چوبیس گھنٹے دیتا ہوں میں تم کو۔ مشتری اور کریم کا رشتہ پکا کرا دو۔ یا سب رقم واپس کرو مع سود۔ ۔ ۔ ورنہ۔ ۔ ۔ کڑچ۔ ۔ ۔ اور دیکھو کسی سے بات کی میرے بارے میں تو مجھے پتا چل جائے گا۔ پھر مُرلی بھی کڑچ۔ ۔ ۔ تمھارے ۔ ۔ ۔"

۔ ۔ ۔ غیر حاضری سے موشن کا ۔ ۔ ۔ متاثر ہو رہی تھی۔ ۔ ۔ اسسٹنٹ چھوکرا بیک وقت گنے لگانے اور جوس فروخت کرنے کی کوشش میں ناکام تھا۔ وہاں شائقین کا رش بڑھتا جا رہا تھا۔ ۔ ۔ پھر کسی نے چلا کے کہا۔" او بنگالی!" اُس نے گالی کے ساتھ قومیت کو جوڑ دیا۔" اِدھر چل۔"

میں نے اُسے غور سے دیکھا اور موشن میاں کو اشارہ کیا کہ وہ جائے مگر میں خود بھی اُس کے ساتھ جا کھڑا ہوا۔ بنگالی کے ہاتھ پیر پھول گئے تھے۔ اُس نے جلدی جلدی میں ایک گلاس توڑا، ماتحت کے ایک ہاتھ کس کے مارا۔" شالا کام چور ہے۔ اتنا دیر کام نہیں چلا سکتا۔" پھر بے بسی سے میری طرف دیکھا کہ اب کیا چاہتے ہو، میری جان کیوں نہیں چھوڑتے۔ لیکن میری دلچسپی اس شخص میں بڑھ گئی تھی جو سفید وردی میں تھا مگر خود کو ٹل بلیک آؤٹ تھا۔ وہ چھ فٹ قد کا بھاری بھر کم آدمی اب مطالبہ کر رہا تھا کہ پہلے اسے بارہ گلاس ایک ڈول جیسے تھرماس میں ڈال کے دیے جائیں جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔

"اے بھیا! باری سے او باری سے۔" ایک خاکی وردی والے نے کہا جس کے کندھے پر کے پی ٹی کا بیج لگا ہوا تھا۔

"ایسی کی تیسی باری سے لینے والے کی۔" اس نے تھرماس کو ایک خطرناک ہتھیار کی طرح لہرایا۔

"ایسی کی تیسی تمھاری۔ ہم سب لوگ فالتو ہیں جو پہلے سے کھڑے ہیں۔" ایک باہمت شخص نے درجواب اُس غزل گالی دے کر کلمۂ حق ادا کیا۔ وہ بھی چھ فٹ قد کا مکرانی تھا مگر اپنے حریف کی طرح ہٹا کٹا نہیں تھا۔" چل پیچھے۔ ۔ ۔" پہلے والے شخص نے تھرماس گھمایا۔ مکرانی نے تھرماس پکڑ کر کھینچا۔ اس کا تسمہ ٹوٹ گیا۔ مکرانی نے تھرماس کو زمین پر دے مارا۔ تھرماس ایک دھماکے سے پھٹا اور اندر شیشے کی بوتل کا چورا ہو گیا۔ پہلے شخص نے پیشہ ور باکسرز کی طرح مکرانی کے لیفٹ پنچ مارنے کی کوشش کی۔ مکرانی کا طریقۂ جنگ قدرے مختلف تھا۔ اس نے بیل کی طرح سر سے ٹکر ماری اور اپنے حریف کو الٹ دیا۔ گنے کا رس پینے والے بھاگے۔ کچھ گلاس ۔ ۔ ۔ ان کو چھڑانے والے دو امن

پسند تھے۔ ایک کی عینک باکسر کے مکّے سے ٹوٹی۔ دوسرا عین اس وقت بیچ میں آگیا جب مکرانی دوسری بار ٹکّر مار رہا تھا۔ اس کے اعضائے رئیسہ کو خاصا نقصان پہنچا ہوگا۔

موشن میاں کو اب سچ مچ کے موشن لگ گئے تھے۔ وہ دھوتی پکڑ کے اچھل رہا تھا۔" ارے چھوڑو، بدماس۔ پکڑو۔ ۔ ۔ مارو۔ ۔ ۔ پولیس۔" معلوم نہیں وہ کس کا حامی تھا اور کس کا مخالف۔ دونوں فریق اب بُری طرح لڑ رہے تھے اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے نظر آتے تھے۔ پھر ایک دم نہ جانے کدھر سے پولیس آگئی۔ ایک سب انسپکٹر نے گزرتے گزرتے موٹر سائیکل روک لی۔

"اے۔ خبردار۔ چھوڑ دے۔" اس نے چیخ کر کہا۔" دونوں کو گولی مار دوں گا میں۔" اس وارننگ میں پولیس کی مادری زبان کے استعارے بھی شامل تھے۔ دونوں لڑنے والے الگ ہو گئے۔ ان کی ناک سے اور ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا اور ان کے کپڑے پھٹ چکے تھے۔

"چلو دونوں۔ ۔ ۔" انسپکٹر نے دونوں کو آگے دھکیلا۔

"خبردار" سفید وردی والا غرایا۔" میں خلاصی اسٹور داس ہوں۔ مجھے ہاتھ مت لگانا۔ میں بھارتی شہری ہوں۔"

انسپکٹر نے اس کے ایک جھانپڑ مارا۔" یہ سب اُدھر چل کے بتانا۔ تیری شہریت کی ماں۔ ۔ ۔"

"تم مجھے گرفتار نہیں کر سکتے۔" وہ چیخ کر بولا۔" میں اس جہاز پر ہوں۔ میرے کیپٹن سے بات کرو۔ کونسلیٹ سے بات کرو۔"

"کل سب کو بلالیں گے تھانے میں۔ رات بھر تو مہمان رہو ہمارے شریمان۔" سب انسپکٹر نے ایک ٹیکسی روک لی اور نقصِ امن کے دونوں مجرموں کو اس میں بٹھا دیا۔

"میں موٹر سائیکل پر پیچھے آرہا ہوں۔" وہ بولا۔" کسی نے بھاگنے کی کوشش کی تو گولی مار دوں گا۔"

ٹیکسی چلی گئی لیکن میں اس جہاز کو دیکھتا رہا جس کی طرف سفید وردی والے نے اشارہ کیا تھا۔ وہ "ایس ایس کرانتی بھرڈ" کا ملازم تھا۔ جاہل سب انسپکٹر نے اس پر اپنی لاقانونیت کا ہاتھ اٹھا کے اچھا نہیں کیا تھا۔ وہ معطل بھی ہو سکتا تھا مگر ابھی تو اس کی تھانیداری تھی۔ کل بھی جب جہاز کا کپتان تھانے جائے گا تو وہ ڈھیٹ بن کر معافی مانگ لے گا کہ "غلط فہمی" ہو گئی۔

لیکن ابھی میں اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھانے کی سوچ رہا تھا۔ میں نے قسمت کو کوستے' روتے دھوتے اور بک بک کرتے موشن میاں کو نقصانات کا تخمینہ لگاتے دیکھا۔

اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے میں نے کہا "معاف کرنا موشن میاں! یہ سب نقصان میری وجہ سے ہوا۔ میں پورا کروں گا۔"

اس کی آنکھیں مجھ پر جم گئیں۔ ایک دشمن جاں کی طرف سے اس ہمدردانہ پیش کش کے پیچھے کیا ہے؟ جو شخص بات بات پر کرٹچ کرنے کی دھمکی دے رہا تھا اور پونے چار ہزار کے بدلے جان لینے پر آمادہ تھا، وہ اچانک اتنا شریف کیوں ہو گیا۔

"کتنا نقصان ہوا ہے تمہارا؟" میں نے سو کا ایک نوٹ نکالتے ہوئے کہا "چلو یہ رکھ لو۔"

پہلے اس نے نوٹ کو جھپٹ لیا پھر اس نے مجھے مسکرا کے دیکھا۔

"یہ سفید وردی والا کون تھا؟" میں نے کہا۔

"ہم نہیں جانتا... ہم شے کیا پوچھتا۔"

"اس نے تمھیں گالی دے کر بلایا تھا۔ تمہارا یار معلوم ہوتا تھا۔" میں نے کہا "ورنہ اتنا بے تکلف کیوں ہوتا۔"

"ہم... بش یہ جانتا... کہ وہ خلاصی ہے... ایشور داش نام ہے اُش کا۔" موشن میاں نے میرے دوسرے ہاتھ کی حرکت سے متاثر ہو کے کہا۔

"اچھا موشن میاں! تم ہمارا ایک کام کرو گے؟ اس کے ہم تم کو پانچ سو روپے دیں گے۔ پورے پانچ سو۔" میں نے اسے پانچ نوٹ دکھا کے کہا۔

اس لالچی آدمی کی آنکھیں حرص سے چمکنے لگیں "کرے گا۔" میرا خیال تھا کہ وہ پہلے کام کی نوعیت پوچھے گا مگر وہ بیک وقت خوف اور لالچ کے جذبات کے دباؤ میں تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ انکار تو ممکن ہی نہیں۔ پھر پانچ سو روپے کیوں چھوڑے جائیں۔

"تم ابھی جہاز پر جاؤ۔" میں نے کہا۔

"ہم مجو... کون جانے کو دے گا... وہ فارن جہاز۔"

"تم یہ ڈول بھر کے لے جاؤ۔" میں نے گنے کے رس کو جمع کرنے والا ڈول اُٹھا کے کہا جو مشین کے نیچے لگا ہوا تھا۔ جتنا رس نکلتا تھا وہ ایک دھار کی صورت میں ڈول میں گرتا تھا۔ "یہ بھر کے لے جاؤ اور بولو چارلی نے منگوایا ہے۔"

"چارلی کون ہے؟ ہم نہیں جانتا۔"

"جان لو گے۔" میں نے کہا "جب کوئی تم کو روکے تو بولنا کہ مصرا صاحب سے بات کرنی ہے۔ مصرا جہاز کا کپتان ہے۔ اسے بتا دینا کہ یہاں کیا جھگڑا ہوا تھا۔ اور کس بات پر ہوا تھا۔ ایشور داس کی بوتل ٹوٹ گئی اور اسے پولیس لے گئی۔ میں چارلی صاحب کے لیے گنے کا رس لایا ہوں اور یہ اطلاع دینے بھی۔"

"کوئی گڑبڑ تو نئیں ہوئیں گا؟" وہ بولا۔

"کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔ جہاز کا کپتان، چارلی اور دوسرے سب کہیں گے کہ تم نے بہت اچھا کام کیا۔ تم نے بروقت کپتان کو اطلاع کر دی۔ تمہاری وجہ سے ایشور داس جلد چھوٹ جائے گا اور تم واپس آؤ گے تو پانچ سو کا انعام تمہارا۔"

وہ کائیاں شخص سمجھ گیا کہ میں اپنا کام نکالنے کے لیے اسے استعمال کر رہا ہوں۔ "پیشہ پہلے لے گا۔"

"یہ لو۔" میں نے نوٹ اسے پکڑا دیے۔ "مگر دیکھو، تم کو چارلی سے ضرور ملنا ہے۔"

"وہ ہم کو اندر جانے دے گا؟"

"ہاں، تم کہنا کہ مجھے ڈول بھی واپس لانا ہے اپنے ساتھ دو تین گلاس بھی لے جانا۔" میں نے کہا۔

میں نے ایک خطرناک جُوا کھیلا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ گنے کا رس جہاز پر کس نے منگوایا تھا۔ اگر خود مصرا نے منگوایا ہوگا پھر تو بنگالی کا جھوٹ نہیں چلے گا اسے اندر جانے کا موقع نہیں ملے گا۔ کوئی ماتحت اس سے ڈول لے کر اس کا پیغام مصرا کو پہنچا دے گا اور مصرا ضروری سمجھے گا تو خود باہر آجائے گا یا بنگالی کو اپنے کمرے میں بلوا لے گا لیکن اس کا امکان کم ہی تھا کہ مصرا گنے کا رس پیے۔ وہ بئیر پینے والا آدمی ہے۔ ایسی صورت میں موشن میاں کو چارلی یعنی غالب تک پہنچنے کا موقع مل جائے گا۔ یہ چائے بیچنے والے اخبار فروش اور موشن میاں جیسے لوگ اتنے بے ضرر سمجھے جاتے ہیں کہ ان کی آمد و رفت پر سیکیورٹی کے قوانین لاگو نہیں ہوتے اور ان کو شناخت کا مسئلہ بھی درپیش نہیں ہوتا۔ یہ وہی نظر آتے ہیں جو ہیں۔

"چارلی صاب کو کیا بولنے کا ہے؟" موشن میاں نے میری خاموشی سے اُکتا کے کہا۔

"کچھ نہیں۔ اس کو یہ گنے کا رس پہنچانا ہے اور ایک دو چیزیں ہیں۔ کے ٹو سگریٹ کا ایک پیکٹ۔ اور سیون او کلاک بلیڈ کا ایک پیکٹ اور... بس اپنا نام بتا دینا۔ وہ سامنے ایک پان سگریٹ کی دکان نظر آرہی ہے مجھے۔ تم اس لڑکے کو بھیجو۔ دونوں چیزیں لے آئے۔"

جب موشن میاں کا اسسٹنٹ چلا گیا تو اس نے کہا "جہاز پر فارن سگریٹ اور بلیڈ...!!"

"ہاں۔ مگر چارلی کو یہی کے ٹو سگریٹ پسند ہیں اور سیون او کلاک بلیڈ۔" میں نے کہا "تم نہ جا سکو تو یہ کسی کو دے دینا کہ چارلی کو پہنچا دے۔ اور اسے بتا دے کہ سب چیزیں موشن میاں نے بھیجی ہیں۔"

موشن میاں دس منٹ بعد چلا گیا۔ میں نے اس کو سمجھا دیا تھا کہ میرا حوالہ بھی کسی کو نہ دے۔ ورنہ کرٹچ اور وعدہ کیا تھا کہ میں اس کی عدم موجودگی میں اس کے بزنس کو نطریق احسن چلاؤں گا۔ بنگالی بڑی تیزی سے جہاز کی طرف بڑھ رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ غالب میرے پیغام کو سمجھ لے گا یا نہیں؟ مجھے اُس کی ذہانت میں کوئی شبہ نہ تھا۔ کے ٹو سگریٹ کوئی اعلیٰ درجے کے سگریٹ شمار نہیں ہوتے تھے کہ کسی کو تحفے میں بھیجے جائیں۔ غالب نے نہ کبھی یہ سگریٹ پیے تھے اور نہ پی سکتا تھا۔ چنانچہ کے ٹو سگریٹ کا پیکٹ وصول کرتے ہی اُس کا چونک جانا لازمی تھا۔ اس کے ذہن میں فوراً میرا نام آئے گا۔ کبیر خاں کو یہ لوگ بہت عرصے سے کے ٹو میں بدل چکے تھے اور اکثر مجھے چیف کے ٹو کہتے تھے اگر اس نے سگریٹ کے پیکٹ سے یہ مطلب سمجھ لیا کہ بھیجنے والا میں ہوں تو سیون او کلاک بلیڈ سے بھی یہ ضرور جان لے گا کہ میں نے اُسے سات بجے بلایا ہے۔ آخری چیز ہے گنے کا رس۔ موشن میاں کے نام سے وہ سمجھے گا کہ محسن میاں نے کہیں گنے کا رس نکالنے کی ریڑھی لگالی ہے یا کسی ریڑھی پر ملازمت کر لی ہے۔

اگر موشن میاں کو جہاز کے اندر نہ جانے دیا گیا تب بھی ایک خفیہ پیغام غالب کو مل جائے گا اور مجھے خاصا یقین تھا کہ وہ اپنی ذہانت سے اس کو ڈی کوڈ کر لے گا۔ شام سات بجے وہ جہاز سے نکل سکا تو محسن کی جستجو کرتا ہوا آئے گا اور یہ سمجھے گا کہ محسن کہیں قریب ہی ریڑھی پر گنے کا رس فروخت کرتا ہوا نظر آجائے گا۔ قریب نہ ہوتا تو تازہ گنے کا رس ڈول میں کیسے بھجواتا۔

موشن میاں کا اسسٹنٹ بڑے جوش و خروش سے گنے لگا رہا تھا اور میں وہ کام کر رہا تھا جو بُرا تو نہیں تھا مگر کبھی میں نے کرنے کا سوچا تک نہیں تھا۔ میں نے یہ کام آسانی سے کر لیا کیونکہ اس میں کسی فنی مہارت کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اسسٹنٹ جو صرف گالیاں اور تھپڑ کھانے کا عادی تھا میرے حوصلہ افزا پیار بھرے سلوک سے بہت خوش تھا۔ میں نے اُسے پانچ روپے انعام میں بھی دینے چاہے مگر اُس نے دُکھ اور مایوسی سے سر ہلا کے انکار کر دیا۔ موشن میاں ہر رات اُس کی جامہ تلاشی لیتا تھا اور وہ ایک روپیہ بھی چھپا لے تو برآمد ہو جاتا تھا۔ پھر موشن میاں اس کو چوری کے جرم میں گنے سے مارتے تھے۔ پولیس کے حوالے کرنے کی دھمکی دیتے تھے اور بے روزگار کر دینے سے ڈراتے تھے۔

موشن میاں کی واپسی کے انتظار میں آدھا گھنٹا میں نے ... گزارا۔ ایک دُعا یہ تھی کہ موشن میاں براہِ راست غالب کے پاس پہنچ جائیں۔ دوسری دُعا یہ تھی کہ غالب کی عقل گھاس چرنے نہ چلی جائے اور وہ میرا پیغام سمجھ لے تیسری دُعا یہ تھی کہ موشن میاں خیریت سے لوٹ آئیں اور اُن کے ساتھ کوئی نہ آئے۔

آدھے گھنٹے بعد میں نے جہاز پر سے ایک شخص کو بڑی تیزی سے نیچے آتے دیکھا۔ اس کے ساتھ دو افراد اور بھی تھے جو اُس کے ماتحت لگتے تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں بریف کیس تھا۔ یہ اندازہ کرنا مشکل نہ تھا کہ آگے والا شخص جہاز کا کپتان آر آر مصرا ہے جو اپنے خلاصی ایشور داس کی رہائی کے لیے پولیس اسٹیشن جا رہا ہے۔ وہ خاصا برہم دکھائی دے دیتا تھا۔

یہ ایک اچھی علامت تھی۔ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ موشن میاں کا مشن کامیاب رہا۔ اگر اُسے جہاز کے اندر نہ جانے دیا جاتا تو وہ اتنی دیر بھی نہ لگاتا۔ اب مجھے شدت سے اس کی واپسی کا انتظار تھا۔

بالآخر وہ خالی ڈول ہلاتا نمودار ہوا۔ میرے قریب آکے اُس نے ڈول پٹخ دیا "شالا، بے ایمان لوگ۔"

"کیا ہوا موشن میاں؟" میں نے کہا "چارلی ملا؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "ہم کو پیشہ نئیں دیا۔"

میں نے کہا "پیسے مجھ سے لے لو مگر یہ بتاؤ کہ چارلی کیوں نہیں ملا؟ کیا تم کو روک لیا گیا تھا؟"

"ہاں، اُدھر ایک خلاصی فرش صاف کرتا۔ ہم کو بولا کہ کون چارلی؟ ہم بولا وہ چارلی جو یہ شب منگایا۔ وہ شالا ہم کو ڈنڈا والا برش سے مارتا کہ تم شالا چور، اندر آتے کو مانگتا۔ اندر کوئی چارلی نہیں ہے۔ آ... آہ... بوہت موٹا ڈنڈا تھا برش کا۔" اُس نے ایک پسلی دبا کے کہا۔

"پھر کیا ہوا؟"

"پھر شب رش گر گیا، ہم بھی گر گیا۔ ڈول ہمارا سر پر لگا۔" موشن میاں نے کہا "اللہ پاک اور رسولؐ بچایا۔ اُدھر ایک نرس آگیا۔ وہ بولا، ہم چارلی کا واقف، تم کون؟ ہم اُش کو شب بتایا۔ وہ شب شنا۔ شگرٹ اور بلیڈ لے لیا ہم شے اور اس خلاصی کو بوہت غصہ کیا۔ ہم بولا کہ ہم تو چارلی صاب کا واشطے رش لایا۔ وہ بولا کہ ابھی جاؤ۔ ہم اُش کو بول دے گا اور یہ شب شگرٹ، بلیڈ دے گا... آہ... آہ۔"

"یعنی نرس نے سب چیزیں پہنچانے کا وعدہ کیا۔" میں نے مطمئن ہو کے کہا "اُس نے تمہارا نام پوچھا؟"

"ہاں، ہم بتایا۔ وہ شالا نرش ہم کو آنکھ مارا اور بولا کہ چلو تم جاؤ۔ تم بدمعاش ہے۔" موشن میاں جب بھی دایاں ہاتھ اوپر اٹھاتے تھے، دائیں پسلی کی چوٹ انھیں دُہرا کر دیتی تھی۔

"نرس نے آنکھ بھی ماری تم کو؟" میں نے کہا۔ "خلاصی نے برش مارا۔ نرس نے آنکھ ماری۔ بڑے خراب لوگ ہیں۔ غریب اور کمزور دیکھ کر سب مارنے لگتے ہیں۔ خیر یہ بتاؤ کہ مصرا سے کیا بات ہوئی؟"

"مصرا صاب بعد میں ملا۔ جب نرش چلا گیا تھا۔ ہم خلاصی کو بولا کہ ابھی ہم مصرا صاحب سے ملنے کو مانگتا۔ تمہارا شکایت کریں گا۔ وہ پھر برش مارا، ادھر ہمارا اشر میں۔ . . آہ . . . بولا مصرا سے ملے گا شالا چور، چلو بھاگو ادھر سے ورنہ رو دیئے گا بیوی بچہ۔ اُدھر سے ایک اور صاب آیا۔ وہ ہمارا بات سُنا اور مصرا صاب کے پاش لے گیا ہم کو۔ ہم پھر شب بتایا۔ وہ اچھا آدمی ہے، ہم کو دش روپیہ دیا انعام۔ شوری بولا۔"

"ہم بھی شوری بولتا تم کو۔" میں نے کہا۔ "پانچ سو رکھو مگر یہ بات بھی یاد رکھو کہ کسی کے سامنے میرے بارے میں ایک لفظ بولے گا تو کرچ۔ یہ سمجھو کہ ہم ادھر آیا ہی نہیں۔"

اُس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "ہم چوپ رہے گا۔"

"اب میں جاتا ہوں۔ تم کریم کی شادی کی بات ضرور کر لینا۔"

"ورنہ کرچ!" وہ سخت جلے بھُنے لہجے میں بولا۔ مجھے بے اختیار ہنسی آئی۔

"سمجھ دار آدمی ہو تم!" میں نے کہا اور بدمعاشوں کی طرح اکڑ کے چلتا ہوا وہاں سے رخصت ہو گیا۔ میرا مشن بے حد کامیاب رہا تھا۔ میں نے غالب سے رابطے کی صورت پیدا کر لی تھی اور کسی قسم کا خطرہ مول لیے بغیر۔ مجھے یقین تھا کہ موشن میاں جو ایک انتہائی کمینہ اور بزدل آدمی تھا، کرچ ہونے کے خوف سے لب نہیں کھولے گا۔ وہ صرف پیسے سے پیار کرتا تھا۔ پیسے کی خاطر اُس نے میرا کام کیا تھا۔ پیسے کے لیے وہ اپنی بیوی کو طلاق دینے پر تیار تھا کیونکہ دوسری صورت میں اُسے کریم بلوچ کو پونے چار ہزار روپے واپس کرنے پڑتے جو وہ ٹھگ چکا تھا اور ہضم بھی کر چکا تھا۔ شاید پیسے کی خاطر ہی اُس نے ایک ہندو لڑکی سے شادی کر لی ہو گی۔ یہ ذرا غور طلب مسئلہ تھا کہ اُس ہندو نے موشن میاں میں کیا دیکھا کہ اپنی لڑکی اُسے دے دی۔ موشن میاں ایسے جوان رعنا بھی نہیں تھے کہ مُرلی اُن پر فریفتہ ہو گئی ہو۔ اس کی وضاحت کریم بلوچ بہتر طور پر کر سکتا تھا۔

وہ مجھے موٹر بوٹ کے پاس دوربین سے کائنات کی سیر کرتا نظر آیا۔ سطح سمندر پر تاحدِ نگاہ اور کرۂ ارض پر وہ پہلے ہی غور کر چکا تھا اور اب دوربین کا رُخ آسمان کی طرف تھا۔ میں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ اُچھلا۔

"آپ آ گیا صاب۔"

"ہاں، تم کو کیا دن میں تارے نظر آ رہے ہیں؟" میں نے کہا۔

"نہیں صاب، مگر ابھی آپ دیکھو۔ یہ جو چھوٹا چھوٹا چڑیا اور چیل کوا اُڑتا پڑا ہے جہاز کا مالک لگتا ہے۔" اُس نے دوربین مجھے تھما کے کہا۔ "ہم بوہت دُور تک دیکھا صاب! آپ بھی دیکھو ادھر۔ وہ ایک لانچ ہے۔ اس پر صاب اور میم صاب لوگ کیا کرتا پڑا ہے۔" وہ قہقہہ مار کے ہنسا۔

"چھوڑو کریم۔ کسی کی پرائیویسی میں نہیں جھانکتے۔" میں نے کہا۔

"کدھر، کیا بولا صاب؟"

"کچھ نہیں، یہ بتاؤ کتنے میں ملی؟"

"بس صاب مل گیا۔ یہ لو باقی پیسہ۔" اُس نے چار سو مجھے پکڑا دیے۔

"صرف سو روپے؟ یہ دوربین تو بہت اعلیٰ قسم کی لگتی ہے۔" میں نے کہا۔ "چوری کا مال تو نہیں ہے؟"

"ہو گی صاب۔" وہ موٹر بوٹ میں اُتر گیا۔ "ہم نے تو کچھ چوری نہیں کیا، وہ ہم سے بولا سو روپیہ، ہم دے دیا۔ اب وہ چور تھا تو اللہ اُس کو سزا دیوے۔"

"تم کو معلوم تھا کہ وہ چور ہے؟" میں نے کہا۔ "تم پہلے بھی سامان خریدتے رہے ہو اس سے؟"

اُس نے موٹر بوٹ کو اسٹارٹ کیا۔ "ابھی صاب! ادھر تو سب ملتا ہے۔ ادھر جو شِپ آتا ہے اس کا مال بھی ایسے ہی نکلتا ہے۔ ہم نہیں لے گا تو کوئی دوسرا لے گا۔ شیر شاہ میں جا کے دیکھو، سارا شِپ کا سامان۔"

جب موٹر بوٹ باہر نکل آئی تو میں نے دوربین سے اس جہاز کو دیکھا جس پر مجھے نازو کے نظر آنے کا شبہ ہوا تھا۔ اُس کے عرشے پر دو آدمی ٹہل رہے تھے۔ ان دونوں کے پاس خودکار قسم کی رائفلیں تھیں۔ میں نے جہاز کے نام کو فوکس کیا۔ ایس ایس کرانتی تھرڈ، میرے سامنے آ گیا۔ دوربین کو آہستہ آہستہ گھماتے ہوئے میں نے جہاز کا تفصیلی جائزہ لیا۔

"صاب! وہ موشن میاں کیا بولا؟"

میں نے دوربین ہٹا کے دیکھا۔ "تم اب شادی کی تیاری کرو۔ میں نے بات پکی کر لی ہے۔"

"سچ صاب!" کریم بلوچ نے خوشی سے چیخ ماری۔ "کب؟"

"میں نے تو ایک ہفتہ دیا ہے لیکن یہ تو گڑبڑ ہو گئی۔ ہفتے بھر بعد تم ہمارے ساتھ نہ جانے کہاں ہو گے۔ ہمیں تو شاید کل پرسوں جانا پڑے۔"

"تو صاب، ہم مشتری کو بھی لے چلے گا ہنی مون!"

میں بھونچکا رہ گیا۔ "ہنی مون، تم جانتے ہو اس کا مطلب کیا ہوتا ہے؟"

"کیوں نہیں صاب، ہم لوگ شادی بناتا تو سیر کا واسطے جاتا۔ ہم انگریز لوگ کا نوکری کیا۔ ہمارا باپ بھی نوکری کیا اور دنیا دیکھا۔" وہ بولا۔

"نہیں کریم۔" میں نے کہا۔ "یہ سفر کسی بھی طرح تمہارے ہنی مون کے لیے موزوں نہیں۔ یہ ایک خطرناک سفر ہو گا اور اس میں تمہاری نئی نویلی دُلہن کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔"

"کیوں نہیں صاب۔ وہ آپ کا خادم، سب کا خادم، آپ کا واسطے کھانا پکائے گا، چائے بنائے گا، برتن دھوئے گا اور سب کام کرے گا۔ نہیں کرے گا تو ہم ایسا ٹھکائی لگائے گا۔"

میں ہنس پڑا۔ "ابھی سے یہ ارادے ہیں؟ نہیں کریم، وہ تمہاری بیوی ہو گی۔ نوکرانی نہیں لا رہے ہو تم۔ وہ تمہاری خدمت کرے تو یہ دوسری بات ہے۔ یہ بتاؤ کہ تمہاری مشتری کیسی ہے؟"

"ایک دم بمباٹ صاب، ہم بولا . . ."

"اور اس کی بہن مُرلی؟" میں نے کہا۔ "کیا وہ بدصورت ہے؟"

"نہیں صاب، دونوں بہن ہے سگا دالا۔"

"پھر کیا اس کی عمر زیادہ تھی؟ یا کوئی نقص تھا . . . میرا مطلب ہے کہ . . ."

"ہم سمجھ گیا صاب . . . آپ کو ہم کیا بولے، سب مولا کی مرضی۔ اُس کا دماغ خراب نہ ہوتا تو اس چرچڑی مار موشن میاں کا شادی اس سے ہوتا۔"

"اُس کا دماغ خراب ہے؟ پاگل ہے؟"

"ایک دم پاگل تو نہیں ہے صاب۔ کبھی اُس پر دورہ پڑتا ہے تو گھر سے بھاگ جاتا ہے۔" وہ کانوں کو ہاتھ لگا کے بولا۔ "دو چار دن موشن میاں پاگل پھرتا ہے اُس کا پیچھے۔ پھر وہ خود ہی آ جاتا ہے۔ کچھ نہیں بولتا کدھر رہا۔ دن کدھر گزارا، رات کدھر۔ موشن میاں اُس کو خوب مارتا۔ زنجیر سے باندھ کے رکھتا۔"

"تمہارے خیال میں وہ کہاں جاتی ہے؟"

"جدھر کوئی لے جاوے۔ پاگل کو کیا پتا صاب۔" وہ بولا۔ "ادھر کون شریف ہے کہ اُسے خود گھر چھوڑ جاوے۔ اللہ معاف کرے، اُس کا تین بچہ، سب کا ڈیزائن الگ . . . موشن میاں . . ."

"چھوڑو کریم، بڑے دُکھ کی بات ہے یہ۔" میں نے کہا۔ "وہ خبیث موشن میاں، اس عورت کو طلاق دینے کی بات کر رہا تھا، اُس کے باپ کو بلیک میل کرنے کے لیے کھولنے لگا تھا۔"

لانچ پر محسن اکیلا جاگ رہا تھا۔ کھانا رابعہ نے تیار کیا تھا اور تین بجے تک میری واپسی کا انتظار بھی کرتی رہی تھی، پھر محسن نے اس کے ساتھ کھانا کھا لیا تھا اور رابعہ بھی اب ناگ منی کے ساتھ سو رہی تھی۔ کریم بلوچ کے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے میں نے اسے شِپ یارڈ میں پیش آنے والے واقعات تفصیل سے بتائے۔ وہ غور سے سنتا رہا اور دوربین سے گرد و پیش کو دیکھتا رہا۔

"یہ بہت کام کی چیز لے آیا تو۔" وہ بولا۔

"اب سات بجے میں نہیں جاؤں گا۔" میں نے کہا۔

"ڈرتا ہے موشن میاں سے، کہ پکڑوا نہ دے؟"

"ہاں، اُس کا کیا بھروسا۔ ویسے تو میں نے کرچ کرنے کی ایسی دھمکی دی ہے کہ وہ ہمت نہیں کر سکتا۔ پھر بھی خطرہ مول لینے سے کیا فائدہ۔" میں نے کہا۔ "غالب اگر آیا تو اُسے بھی موشن میاں کی جستجو ہو گی۔ موشن میاں کی ریڑھی کے پاس اگر . . . محسن خان شیروانی کھڑے ہوں گے تو مسئلہ کوئی نہیں ہو گا۔ کسی کے لیے بھی۔"

"میرا یہ حلیہ تو بالکل مناسب نہیں۔" محسن بولا۔

"کیپٹن کریم!" میں نے کہا۔ "تم سب کچھ پیدا کر سکتے ہو۔"

"ہم . . . ہم کیسے صاب؟" کریم بلوچ کا مُنہ کھلا رہ گیا۔

"میرا مطلب تھا کہ لا سکتے ہو، ہمیں کچھ کپڑے لا دو۔ پرانی یونیفارم، شِپ کے مال سے۔" میں نے کہا۔

"نیلی زین کی ڈانگری، خاکی وردی، یا ملیشیا کی۔" محسن بولا۔

کریم نے اس مطالبے پر غور کیا۔ "پرانا ملے گا؟"

"پرانا ہی چاہیے یار۔" میں نے کہا۔ "یہ لو دو سو روپے رکھو اپنے پاس۔ اگر ٹوپی وغیرہ ملے تو وہ بھی لا دینا مالب کو۔"

"پانچ بجنے والے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "سات بجے تم مجھے وہاں لے کر بھی جاؤ گے۔ دو گھنٹے میں یہ کام کر لو۔"

"آپ فکر مت کرو صاب۔ ہم ابھی جاتا ہے، ابھی آتا ہے۔" وہ چٹکی بجا کے اُٹھ کھڑا ہوا۔ "لیکن صاب، ہم اُس کو ساتھ لے جائے گا، اپنا دالف کو۔"

"اچھا دیکھیں گے۔" میں نے ہنس کے کہا۔

کھانا کھاتے ہی مجھ پر غنودگی کا غلبہ ہوا۔ میں جہاں بیٹھا ہوا تھا وہیں سو گیا۔ جب میں جاگا تو رات ہو چکی تھی۔ میں نے رابعہ اور ناگ منی کو عرشے پر آمنے سامنے بیٹھے دیکھا۔ اُن کی باتیں چھپ کر سننے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ گھڑی میں آٹھ بج رہے تھے۔ میں نیچے آخری حصے میں واقع کچن تک گیا اور یہ دیکھ کر حیران ہوا کچن میں ضرورت کی ہر چیز موجود ہے۔ میں نے چار گیس سلنڈر بھی دیکھے۔ اُن میں سے ایک ٹیوب

سے دریبے پولیسے سے ملا ہوا تھا۔ میٹھے پانی کا ذخیرہ ایک تارکول کے ڈرم میں کیا گیا تھا پینتالیس گیلن کا ڈرم تقریباً تین چوتھائی بھرا ہوا تھا۔ تھوڑی سی جستجو کے بعد میں سب لوازمات اکٹھے کرنے میں کامیاب رہا جو چائے بنانے کے عمل کا حصہ تھے۔ چائے لے کر میں اوپر پہنچا۔

"چائے کا وقفہ لیڈیز۔" میں نے خوشدلی سے کہا۔

رابعہ اور ناگ منی اپنی گفتگو میں اتنی محو تھیں کہ میری آواز پر دونوں اُچھل پڑیں۔ میں نے چائے کی ٹرے درمیان میں رکھ دی۔

"تم جاگے ہوئے تھے؟" رابعہ نے کہا۔ "یہ کارروائی ہو رہی تھی۔"

"ہاں، میں نے سوچا کچھ آپ لوگوں کی خاطر تواضع ہو جائے۔" میں نے آلتی پالتی مار کے بیٹھتے ہوئے کہا۔ رابعہ چائے بنانے لگی۔

ناگ منی نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ "یہ کام بھی کر لیتے ہو؟"

"کیا کریں۔" میں نے سرد آہ بھر کے کہا۔ "لڑکیوں نے وہ سب کام شروع کر دیے ہیں جو مرد کرتے تھے۔"

"مثلاً ڈلکے ڈالنا۔" وہ تلخی سے بولی۔ "طعنے دیتے ہو۔"

"لاحول ولا قوۃ۔" میں نے کہا۔ "میں نے مذاق کیا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ ابھی تم سب سے ملی نہیں ہو۔ یہ جو تمہارے سامنے مسکین صورت لیے بیٹھی ہیں، یہ بڑی نامور وکیل رہی ہیں۔ چھکے چھڑا دیتی تھیں عدالت میں۔ اس کے بعد بھی انھوں نے جو کارہائے نمایاں سرانجام دیے، کبھی انھی سے سننا۔ اور ایک نازلی بیگم عرف نازو ہیں، اُس کے بارے میں غالب سے پوچھنا کہ وہ کیا ہے۔"

"مجھے رابعہ باجی نے سب بتا دیا ہے۔"

"باجی!" میں دم بخود رہ گیا۔ "تم نے بھی باجی بنا لیا اتنی جلدی۔ دوپٹہ بدلا یا ایسے ہی؟ مگر خیر، مس ناگ منی۔"

رابعہ نے چائے کا کپ میرے سامنے رکھا۔ "اب یہ گل بانو ہے۔ وہ نام اب ختم ہوا۔"

"وہ بھی بُرا نام نہیں تھا۔" میں نے کہا اور جیب سے پیکٹ نکال کے گل بانو کو سگریٹ پیش کی۔ اُس نے میرے ہاتھ سے پیکٹ چھینا اور مُچڑ مُرکر کے دور پھینک دیا۔

"جب میں چھوڑ سکتی ہوں تو تم بھی چھوڑ سکتے ہو۔ کیا ہے اس سالے نشے میں۔" وہ بولی۔

"پھر... پھر گالی۔" رابعہ نے اُسے ٹوکا۔

گل بانو شرمندہ نظر آنے لگی۔ "کیا کروں۔ وہاں سب ایسے ہی بولتے تھے۔ میں بھی بولنے لگی۔ احساس تک نہیں ہوتا اور گالی نکل جاتی ہے مُنہ سے۔ تم ٹوکتی رہو، بلکہ جب میں گالی دوں میرے مُنہ پر ایک تھپڑ مارو۔ خود چھوٹ جائے گی یہ عادت۔"

"ویری گڈ بھئی۔" میں نے کہا۔ "تربیتی کورس اور اصلاحی پروگرام شروع بھی ہو گیا۔ میں ابھی حاضر ہوا۔"

میں اٹھ کر اس پیکٹ تک گیا جو عرشے پر ہی رہ گیا تھا۔ اُس میں سے سگریٹوں کے تین ٹکڑے ایسے برآمد ہوئے جو اب بھی قابلِ استعمال تھے۔ میں نے بڑی مہارت سے ان کی خمیدہ کمر سیدھی کی اور ایک کو جلانے لگا۔

"تم نے کبھی منع نہیں کیا؟" گل بانو نے کہا۔

"یہ اپنا بُرا بھلا خود نہیں سمجھتے۔" رابعہ نے کسی جلی بھُنی بیوی کی طرح کہا جس کا شوہر پر بس نہ چلتا ہو۔

"یہ ایک مثبت رویّہ ہے۔" میں نے کہا۔ "کچھ بیویاں چاہتی ہیں کہ ان کے شوہر فرشتے ہو جائیں۔ ان کے سوا سب کو چھوڑ دیں، چائے سگریٹ، دوست احباب، سیر و تفریح رشتہ دار اور جوانی کی سب عادتیں جو شادی سے پہلے تھیں۔"

"کیا وہ غلط کرتی ہیں، اگر اچھا چاہتی ہیں۔"

"سو فیصد اچھا شوہر کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ تو فرشتہ ہی ہو گا اور فرشتہ دنیا میں کیوں آئے گا۔ آیا تو کسی عورت سے شادی کیوں کرے گا جس میں سو فیصد اچھائی نہ ہو، چنانچہ مس گل بانو..."

"یہ سب جھکّی ہیں۔ ان سے بحث کرنا فضول ہے۔" رابعہ نے مسکرا کے کہا۔

"مرد، خصوصاً شوہر۔" میں نے کش لے کر دھواں فضا میں منتشر کیا۔ "ایک اڑیل ٹٹو ہوتا ہے یا تو اس پر اثر نہیں ہوتا اور ہوتا ہے تو اُلٹا۔ ورنہ وہ چور دروازہ تلاش کر لیتا ہے بیوی کو دھوکا دینے لگتا ہے، پارسائی کا ڈراما کرتا ہے گھر کے اندر، باہر عیش کرتا ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ تم نے ٹھیک کہا۔ وہ... میری ہی غلطی تھی... کہ وہ مجھے چھوڑ گیا۔" گل بانو نے بے خیالی میں کہا۔

"کون چھوڑ گیا؟" رابعہ نے کہا۔

"میرا شوہر۔" گل بانو نے کہا اور اُس کی آنکھیں ماضی کے خواب آلود منظر میں کھو گئی رہیں۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات دسویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں

جاسوسی ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ

شکاری

دسواں حصہ

شکاری

نئی سوچ نیا رنگ نیا لہجہ نیا آہنگ

احمد اقبال کے شہر بند وشبنم فشاں قلم سے

معاشرے کے اُن ناسوروں کی رُوداد جو گوشت پوست سے گزر کر انسانی ہڈیوں میں اُتر رہے تھے۔ ایک کفن بردوش نوجوان کی کہانی جس کے شب و روز موت کی بستی میں گزر رہے تھے۔
جلتے دن سلگتی راتیں۔ آس و یاس، خوف و ہراس
تلخ حقیقتیں، شیریں خواب۔

"تم بھی شادی کر چکی ہو؟" رابعہ نے کہا۔ "بھی" کا لفظ اس نے بلا ارادہ استعمال کر لیا تھا مگر میں محسوس کر سکتا تھا کہ اس غیر شعوری عمل کے پس منظر میں کیسے جذبات کار فرما ہوں گے۔

"ہاں . . . ایک بار ایسا بھی ہوا تھا۔ پانچ سال ہو گئے اس بات کو، مگر کبھی یہ کل کی بات لگتی ہے، کبھی میرے پچھلے جنم کی۔" وہ بولی۔

"کون تھا وہ؟" رابعہ نے ایک فطری تجسس میں مبتلا ہو کے کہا۔

"تھا ایک شریف آدمی۔ ڈاکو نہیں تھا۔" وہ بولی۔ "رشتہ میرے والدین نے کیا تھا۔ اُس وقت میں انٹر کا امتحان دے چکی تھی اور نتیجہ آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ سوچا تو میں نے بھی تھا کہ میں بی اے، ایم اے کروں گی، خوب پڑھوں گی اور پھر پڑھاؤں گی۔ میں اپنے ساتھ کی لڑکیوں سے ذرا مختلف انداز میں سوچتی تھی۔ وہ سب تو ڈاکٹر بننے کے خواب دیکھتی تھیں۔ یہ ایک فیشن تھا یا جذباتی اندازِ فکر جسے ماں باپ اور دوسرے لوگوں کی طرف سے حوصلہ افزائی ملتی تھی مگر میں ٹیچر بننا چاہتی تھی۔ چاہنے سے کچھ ہو سکتا دنیا میں تو سب اچھا ہوتا۔ دنیا میں خوشحالی ہوتی اور امن ہوتا۔ کوئی کسی کا دشمن نہ ہوتا اور کوئی غریب نہ ہوتا۔ کوئی گل بانو ڈاکو نہ بنتی۔" وہ چپ ہو گئی۔

"پھر کیا تم نے انٹر کر لیا تھا؟" رابعہ نے اس کو بات جاری رکھنے کے لیے موقع فراہم کیا۔

"معلوم نہیں، کر ہی لیا ہوگا۔" وہ بولی۔ "فیل میں کبھی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے رزلٹ دیکھا ہی نہیں۔ ہم اس زمانے میں برنس روڈ پر رہتے تھے۔ وہیں میرا کالج بھی تھا۔ ایک بار ہم کسی شادی کی تقریب میں ناظم آباد گئے۔ جس کی شادی تھی وہ میرے ابا کے پرانے دوست کا بیٹا تھا۔ وہ ایک متمول کاروباری گھرانا تھا اور اُن کے بہت سے کاروبار تھے جو چھ سات بھائی مل کر سنبھالتے تھے۔ اُن کے گھر میں لندن سے ایک مہمان آ کے ٹھہرا تھا۔ لڑکوں کا کوئی دوست تھا۔ اُس نے مجھے دیکھا اور میرے پیچھے پڑ گیا۔ میں ایک نادان اور کم عمر جذباتی لڑکی تھی۔ اُس کی باتوں سے اور شخصیت کے رکھ رکھاؤ سے متاثر ہو گئی۔ دو چار ملاقاتوں کے بعد ہی اُس نے پیغام بھجوا دیا۔ وہ لوگ درمیان میں تھے جن سے ابا کے پرانے مراسم تھے چنانچہ کوئی تحقیق تفتیش نہیں ہوئی۔ لڑکے نے کہا کہ اس کے دور کے رشتے سے جتنے چچا، ماموں وغیرہ ہیں وہ اِدھر اُدھر ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کی بڑی بہن دُبئی میں ہے اور بڑا بھائی کینیڈا میں۔ اُن میں سے کوئی بھی شادی طے کرانے کے لیے اتنی دور سے نہیں آئے گا۔ ویسے بھی اُن سے بس نام کا رشتہ رہ گیا ہے۔ سب اپنے اپنے معاملات اور کاروبار میں مصروف ہیں۔ اُس کی صاف گوئی نے سب کو قائل کر لیا اور شادی ہو گئی۔ وہ

صرف ایک مہینے کے لیے پاکستان آیا تھا اور اسی عرصے میں سب کچھ ہوتا تھا۔ جب وہ واپس گیا تو مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔"

"کہاں؟ لندن؟" میں نے کہا "تم لندن میں رہ چکی ہو؟"

"ہاں" وہ اُداسی سے مسکرائی "مگر بہت کم عرصہ۔ تقریباً دو ہفتے۔ وہاں سے ہم پیرس چلے گئے۔ دو ہفتے بعد دُبئی پہنچے جہاں وہ اپنی بہن سے ملا۔ پھر کینیڈا، وہاں اُس کا بھائی تھا۔ میں خوش تھی کہ چلو مجھے ملوانے کے بہانے اس کے تعلقات تو استوار ہو رہے ہیں اور ساتھ ہی دنیا کی سیر بھی ہو رہی ہے۔ ٹھہرتے ہم ہوٹلوں میں تھے۔ یہ مجھے عجیب سا لگتا تھا کہ جہاں بھائی اور بہن کے گھر ہوں وہاں بھی ہم ہوٹل میں رہیں۔ لیکن باہر ایسے ہی چلتا ہے۔ گھر میں جگہ ہو تب بھی دلوں میں گنجائش نہیں ہوتی کہ کوئی مہمانوں کی خاطر خود بے آرام ہو۔ ہم دوسری طرح کے لوگ ہیں۔ مہمان آجائیں تو نیچے زمین پر سو جاتے ہیں۔ خود چاہے نہ کھائیں اُن کو اچھے سے اچھا کھلاتے ہیں اور جانے نہیں دیتے۔ دو مہینے بعد ہم واپس پاکستان پہنچے۔ ابھی تک مجھے معلوم نہیں تھا کہ میرے شوہر کا ذریعہ معاش کیا ہے میں نے اُسے کوئی کام کرتے نہیں دیکھا تھا لیکن وہ خرچ شاہانہ طریقے سے کرتا تھا۔ ہر جگہ ہم فور اسٹار قسم کے ہوٹلوں میں ٹھہرتے تھے۔ وہ ٹیکسی میں سفر پسند نہیں کرتا تھا۔ جتنا عرصہ کہیں قیام کا ہوا اتنے عرصے کے لیے کار کرائے پر حاصل کر لیتا تھا۔ میں نے خود بھی بہت شاپنگ کی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ پیسہ تو ایک بہتے دریا کا پانی ہے جو کبھی کم نہیں ہوتا اور جس کے بارے میں نہ کوئی سوچتا ہے اور نہ جانتا ہے کہ کہاں سے آ رہا ہے۔ میں نے کبھی روکا ٹوکا بھی تو اُس نے کہا جانِ من! یہ فکریں میرے لیے چھوڑ دو۔ پھر پاکستان آنے کے بعد ہم نے الگ گھر لیا اور وہاں میرے شوہر نے مجھے پہلی بار بتایا کہ اب ہمیں کیا کرنا ہے۔ اُس نے مجھ سے کہا کہ ایک تو وہ میری خوب صورتی سے متاثر ہوا تھا مگر ظاہری خوب صورتی بہت ملتی ہے۔ یورپ بھرا پڑا ہے، کسی بھی ماڈل گرل کو دیکھ لو۔ اس بات سے مجھے تھوڑا سا صدمہ بھی ہوا کہ کیا یورپ کی ایک معمولی ماڈل گرل جو برائے نام کپڑوں یا کپڑوں کے بغیر کسی اشتہار میں نظر آتی ہے مجھ سے بہتر ہے مگر حسن تو دیکھنے والے کی نظر میں ہوتا ہے نا۔ اُس نے کہا کہ میرا اثاثہ ہے میری ذہانت اور جرأت۔ شادی سے پہلے کچھ واقعات ایسے ہوئے تھے کہ اُس نے میری ان صفات کو نوٹ کیا تھا۔ پھر اُس نے واضح کیا کہ دو ماہ کا یہ ہنی مون بھی ایک ٹیسٹ تھا جس میں میں سو میں سے سو نمبر لے کر پاس ہوئی۔ اس ٹیسٹ کی تفصیل سُن کے مجھے پسینے آ گئے۔ اُس نے مجھے بتایا کہ لندن سے پیرس، وہاں سے دُبئی اور پھر کینیڈا جاتے ہوئے میں کیا کچھ لے کر کسٹم سے گزر گئی اور میں نے نہ کبھی شک کا اظہار کیا اور نہ بزدلی کا۔ میں نے اُسے کہا کہ یہ تم نے کیا کیا۔ تم میرے اعتماد کو دھوکا دیتے رہے۔ وہ بولا کہ نہیں، میں تو تمھارا اعتماد حاصل کرتا رہا اور جو اعتماد اب مجھے تم پر ہے وہ کسی شوہر کو اپنی بیوی پر نہیں ہوگا۔ میں تفصیل میں جانا نہیں چاہتی۔ ایک بار لندن میں دو آوارہ گرد گورے مجھے پریشان کر رہے تھے۔ میں نے سرِعام اُن کی پٹائی کی، مار بھی کھائی مگر اُن میں سے ایک کو بلا کی طرح چمٹ گئی۔ میرے کپڑے پھٹ گئے اور مجھے چوٹیں بھی آئیں۔ کیونکہ وہ بہرحال ایک طاقتور مرد تھا مگر پولیس کے آنے تک میں نے اُسے چھوڑا نہیں۔ وہاں پولیس کو آنے میں گھنٹے نہیں لگتے، منٹ لگتے ہیں۔

دوسرا واقعہ دُبئی میں پیش آیا تھا۔ میں کمرے میں اکیلی تھی کہ ایک سکھ میرے کمرے میں گھس آیا۔ وہ نشے میں دُھت تھا۔ میں نے اس کو باتھ روم میں بُلا لیا، بڑے پیار سے اور وہ اُلو کا پٹھا۔ ۔ ۔"

"پھر گالی!" رابعہ نے اسے ٹوکا۔

"سوری باجی" گل بانو نے کہا "وہ سمجھا کہ میں پٹ گئی۔ یہ بتا دوں کہ اُس وقت میں باتھ روم میں تھی جیسے ہی وہ میرے پیچھے آیا میں نے اُسے دھکا دیا اور خود باہر آ کے کنڈی لگا دی۔ پھر منیجر کو فون کیا اور اُس نے پولیس کو بُلا لیا۔ دس منٹ بعد وہ باتھ روم سے حوالات میں منتقل کر دیا گیا۔ میرے شوہر نے میری ہمت اور ذہانت کو سراہا اور کہا کہ تم نے تو کمال کر دیا۔ پاکستانی لڑکیاں تو اتنی بزدل اور بے وقوف ہوتی ہیں کہ کاکروچ دیکھ کر بے ہوش ہو جاتی ہیں۔ میں نے کہا کہ وہ تو میں بھی ہو جاتی ہوں۔ خیر، اُس نے مجھ سے پاکستان پہنچنے کے بعد کہا کہ میں پی آئی اے میں ایئر ہوسٹس بھرتی ہو جاؤں۔ وہ میری مدد کرے گا اور اس کے اوپر تک تعلقات ہیں، میرے مسترد کیے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں نے کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ شادی شدہ عورتوں کو کہاں لیتے ہیں۔ میرا شوہر کہنے لگا کہ کیا ضرورت ہے انھیں یہ بتانے کی کہ تم شادی شدہ ہو، ہم ملتے رہیں گے تم جہاں جہاں ہم وہاں وہاں۔ ان پر یہ پابندی تو نہیں ہوتی نا کہ وہ کسی مرد سے کبھی نہ ملیں۔ کوئی بوائے فرینڈ نہ رکھیں۔ کزن تو سب ہی بنا کے رکھتی ہیں۔ ٹھہرتی بھی وہ ہوٹلوں یا ہوسٹلوں میں ہیں۔ میں نے کہا کہ تم کو شرم نہیں آئے گی، بیوی سے ناجائز تعلقات رکھتے ہوئے اور جب تمھارا بزنس اچھا خاصا چل رہا ہے، پیسے کی کوئی کمی نہیں ہے تو پھر مجھے کیا ضرورت ہے ملازمت کی۔ عورت کی کمائی کھانا تو مرد کی غیرت کبھی گوارا نہیں کرتی، وہ بہت ڈھیٹ آدمی تھا، کہنے لگا یہ سب پرانی باتیں ہیں۔ میاں بیوی اگر ایک گاڑی کے دو پہیے ہیں تو دونوں پر برابر بوجھ ہونا چاہیے اور دونوں کو برابر چلنا چاہیے، ساتھ ساتھ۔ پیسہ زمین سے اُگتا تب بھی اس کے لیے ہل چلانا پڑتا، کھانے کے لیے محنت ضرور کرنی پڑتی ہے اور ہم دونوں ایک بہترین ٹیم بن سکتے ہیں۔ ہوائی جہاز کے عملے کے لیے ہر ایئرپورٹ پر الگ راستہ ہوتا ہے۔ ان کی چیکنگ بھی عموماً نہیں ہوتی۔ ہم ایک ہی جہاز سے سفر کر سکتے ہیں صرف ایئرپورٹ پر ہم جُدا ہوں گے اور وہ بھی ذرا سی دیر کے لیے، باہر ہم پھر مل جائیں گے۔ اُس کی اسکیم تو بہت لمبی تھی، قصہ مختصر یہ کہ میں نے انکار کر دیا۔ میں نے کہا کہ میں نے شادی کی ہے تو صرف بیوی رہوں گی اور گھر کے اندر سب کچھ کروں گی۔ گھر کے باہر کی ذمے داریاں تمھاری ہیں۔ میں ان میں شریک نہیں ہو سکتی اس سے اختلاف بڑھا۔ وہ مجھے سمجھاتا رہا، میں اُسے سمجھاتی رہی کہ جتنا پیسہ اب ہے اسی سے کوئی کاروبار کر لو یہاں۔ بہت زیادہ دولت کس کام کی اگر سر پہ ہمیشہ قانون کی تلوار لٹکتی رہے، ہر وقت احساسِ جرم ذہن پر مسلط رہے اور زندگی ایک مسلسل فرار ہو۔ اُس نے میری نہیں مانی اور میں نے اُس کی۔ وہ مجھے والدین کے گھر چھوڑ کے چلا گیا۔ دو ماہ بعد پھر آیا۔ اُس نے کہا کہ اب بھی وقت ہے، میں سوچ لوں ورنہ وہ مجھے طلاق دے کر چلا جائے گا۔ میں نے کہا کہ جاؤ گے کہاں تم۔ سب کچھ تو تم نے بتا دیا ہے یا مجھے معلوم ہے، تم تو مجھے چھوڑ دو گے مگر میں کب چھوڑوں گی تمھیں۔ ایک ایک ٹھکانے کا علم ہے مجھے۔ بس، وہ آخری ملاقات تھی، اس کے بعد نہیں دیکھا میں نے اُسے۔"

"تم نے اُسے تلاش بھی نہیں کیا؟"

"بہت تلاش کیا۔ میری ساری خوش فہمی دور ہو گئی۔ جو شخص انٹرپول کے ہاتھ نہ لگا اُسے میں کیسے پکڑ سکتی تھی۔ پتا نہیں اُس کے کتنے نام ہوں گے اور کتنے ٹھکانے اور کتنے مددگار ہوں گے۔ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ مجھ پر آنچ نہیں آئی، اُس نے خود ہی مجھے معاف کر دیا ہوگا کہ بے وقوف عورت ذات ہے۔ پرانی تعلیم و تربیت کے خول سے نہیں نکل سکتی ورنہ وہ مجھے اٹھوا سکتا تھا، قتل بھی کروا سکتا تھا۔"

"اُس نے تمھیں آزاد بھی نہیں کیا تھا؟" رابعہ نے کہا۔

"نہیں قانونی طور پر میں آج بھی اُس کی بیوی ہوں۔" وہ بولی۔

"اور اس کی گمشدگی کو کتنے سال ہو گئے؟"

"پانچ سال،" گل بانو نے کہا۔

"اس تمام عرصے میں وہ بالکل لاپتا رہا، تم سے کسی قسم کا رابطہ نہیں ہوا؟" رابعہ وکیل بن کے کیس کی قانونی نوعیت کا جائزہ لے رہی تھی۔

گل بانو نے نفی میں سر ہلایا "ایک بات نہیں پوچھی تم نے کہ میرے بچّے کیوں نہیں ہیں۔ کم سے کم ایک تو ہوتا۔"

میں نے دخل در معقولات سے گریز کیا تھا ورنہ یہ سوال بہت دیر سے میرے ذہن میں کُلبلا رہا تھا۔

"بعض اوقات بچّے دیر سے ہوتے ہیں۔" رابعہ نے کہا

"وہ تو خدا کی مرضی کی بات ہے باجی، یہاں تو میرے شوہر کی مرضی کو دخل تھا۔" گل بانو نے کہا "وہ نہیں چاہتا تھا کہ پہلے سال میں ہی میں ماں بن جاؤں۔ مجھ سے تو وہ کہتا تھا کہ ساری عمر پڑی ہے بچّے پیدا کرنے کے لیے۔ ابھی سے ان جھمیلوں میں پڑ گئے تو لائف کو خاک انجوائے کریں گے۔ میں اُسے کیسے بتاتی کہ عورت کے لیے تخلیق کے عمل سے گزرنا سب سے بڑی انجوائے منٹ ہے۔ اس کے بعد وہ ماتا کے جذبات کو انجوائے کرتی ہے۔ یہ سب مرد نہیں سمجھ سکتا، کیونکہ اس کا کام تو ختم ہو جاتا ہے نا۔ عورت ہی کو سب کچھ کرنا ہوتا ہے بعد میں، اکیلے۔"

رابعہ تھوڑی سی جھینپی، لیکن گل بانو نے صرف حقیقت بیان کی تھی۔

"اصل مقصد تو اُس کا کچھ اور تھا۔ میں ماں بنتی تو وہ مجھے غیر شادی شدہ لکھوا کے پی آئی اے میں ایئر ہوسٹس کیسے بھرتی کراتا۔" گل بانو نے کہا۔

"میرے خیال میں تم نے وہی کیا جو تمھیں کرنا چاہیے تھا اگر تمھاری جگہ کوئی بھی لڑکی ہوتی تو یہی کرتی۔" رابعہ بولی۔

گل بانو نے نفی میں سر ہلایا "میں نے جلدی کی اور جذبات سے کام لیا۔ عقل سے کام لیتی تو اُس کو ڈرانے دھمکانے اور طاقت سے راہِ راست پر لانے کی کوشش کرتی بلکہ یہ کام آہستہ آہستہ کرتی۔ کچھ مہلت لیتی اُس سے، کچھ شرائط عائد کرتی، مثلاً یہی کہ ایئر ہوسٹس میں بعد میں بنوں گی، پہلے میں ماں بنوں گی۔ میں تمھاری بات مانتی ہوں، تم میری بات مانو۔ شادی کو ایک سال چھپایا جا سکتا ہے تو بچّے کو بھی چھپایا جا سکتا ہے اور ایک بچّے کی ماں کو دیکھ کر کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ وہ شادی شدہ ہے۔ یہ سب ہو جاتا، اُسے میری اشد ضرورت تھی۔ ایک سال بعد جب وہ باپ بن جاتا تو اُس کے پیروں میں ایک اور زنجیر پڑ جاتی۔ پھر اس عرصے میں ایک عورت بن کے میں اُس سے کچھ بھی منوا سکتی تھی، عورت

اگر چاہے تو اُس کا جادو مرد کے سر چڑھ کر بولے۔ مگر یہ جادو اُس کی کمزوری میں ہے، شہ زوری میں نہیں۔ یہ بات اگر میں سمجھ لیتی تو میرے لیے کچھ بھی ناممکن نہ ہوتا۔ عورتوں نے تو حاکموں پر حکمرانی کی ہے۔ جو عورت امریکی صدر کینیڈی کے دل پر حکومت کرتی تھی اُس نے یونانی ارب پتی تاجر اوناسس کو بھی فتح کیا۔ الزبتھ ٹیلر نے کتنے مرد فتح کیے، اُن بادشاہوں کی طرح جو ملک فتح کرتے ہیں مگر ان عورتوں نے طاقت سے نہیں محبت سے فتح حاصل کی۔"

میں احمقوں کی طرح اس عورت کا فلسفہ سنتا رہا جو کل تک ناگ منی تھی، ایک خطرناک ڈاکو کی خطرناک بہن۔ آج وہ گل بانو بن کے زندگی کی باریک نفسیاتی گتھیاں سلجھا رہی تھی، مجھے بتا رہی تھی کہ وہ لندن، پیرس گھوم چکی ہے۔ اس کے اندر کی حقیقی عورت کا یہ روپ ناقابل یقین تھا۔ یہ مجھے دُہری شخصیت کا کیس لگتا تھا۔ ناگ منی اور گل بانو میں قطبین کی دوری تھی، آکاش اور پاتال کا فرق تھا۔

"تمہارے بھائی اور تمہارے والدین نے تمہاری مدد نہیں کی؟" رابعہ نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہا۔

"مدد تو سب نے کی تھی، مگر حاصل کچھ نہیں ہوا۔" گل بانو نے کہا۔ "اُلٹا پولیس میں رپورٹ کرنے سے ہمارے لیے مسائل پیدا ہو گئے تھے، وہ رات دن تفتیش کے لیے آتے تھے، ہمیں بلواتے تھے۔ انھوں نے میرے الزامات پر بہت سے تفصیلی بیانات لیے۔ کیس ایف آئی اے نے لے لیا۔ معاملہ ایک اسمگلر کا تھا اور میں اُس کی شریکِ حیات کی حیثیت سے انکشافات کر رہی تھی۔ یہ اچھا ہوا کہ میں نے شریکِ جرم ہونے کا اعتراف نہیں کیا ورنہ میں تو اندر ہو ہی جاتی۔ پھر ایک بہت سمجھ دار افسر نے جو ایف آئی اے میں ڈپٹی ڈائریکٹر تھا، ہمیں سمجھایا کہ یہ سب بے کار ہے۔ ہم لوگوں کو آگ سے کھیلتے ہوئے ڈرنا چاہیے۔ جو نقصان ہونا تھا ہو گیا مگر آگے جانے سے زیادہ نقصان ہو سکتا ہے۔ ان لوگوں کے ہاتھ بہت لمبے ہوتے ہیں۔ وہ خود کسی کے ہاتھ نہیں آتے۔ ہماری خاندان اور محلے میں بہت بدنامی ہو چکی تھی۔ لوگ ہر طرح کی باتیں کر کے مزہ لیتے تھے۔ ہم کس کس کو جھوٹا کہتے اور کہاں کہاں جا کے تردید کرتے۔ میرے ابا نے یہی مناسب سمجھا کہ اس ہمدرد بن کے آنے والے افسر کے مشورے پر عمل کیا جائے۔ ہم نے وہ محلہ ہی نہیں حیدرآباد شہر بھی چھوڑ دیا۔ میرپور خاص سندھ میں ہماری کچھ زمین تھی۔ وہ زمین آم کی فصل کے لیے بہت زرخیز تھی۔ ابا نے یہی فیصلہ کیا کہ ان زمینوں کو آباد کریں مگر یہ کیسے معلوم تھا کہ ہم سے تقدیر نے ایک اور غلط فیصلے پر دستخط کرا لیے ہیں۔ تدبیر کیا کرے گی جہاں تقدیر ہی خلاف ہو۔

پہلا سال بہت اچھا گزرا۔ میرے بھائی نے آم کے ایک باغ کا ٹھیکا لے لیا۔ وہ اس کام کا تجربہ حاصل کر چکا تھا اور اس کاروبار کی اونچ نیچ کو سمجھنا چاہتا تھا۔ اس ٹھیکے سے پہلے ہی سال پچاس ہزار کا فائدہ ہوا جو اس وقت کے اعتبار سے بہت بڑی رقم تھی۔ اس علاقے میں سرحد پار کے ڈاکو بہت سرگرم تھے۔ وہ گرد و نواح کے علاقوں میں حملے کرتے تھے اور عموماً ہندو سیٹھوں کو لوٹتے تھے۔ اندرونِ سندھ ہندو ساہوکار آزادی کے بیس سال بعد بھی معاشی طور پر بہت مستحکم تھے لیکن ڈاکو کا کسی کے مذہب سے کیا تعلق۔ اُن کے جیسے ڈاکو اُدھر بھی تھے اور وہ بھی مسلمانوں سے رعایت نہیں کرتے تھے۔ جس دن میرا بھائی ٹھیکے کی نیلامی سے ملنے والی رقم لے کر گھر آیا اُسی رات ڈاکو آ گئے۔"

"کسی نے مخبری کی تھی؟" رابعہ نے کہا۔

"مخبری کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ نیلام میں سب کے ساتھ وہ بھی ہوں گے۔ کسی کی صورت پر تو نہیں لکھا ہوتا کہ وہ ڈاکو ہے۔ میرا بھائی بھی اس خطرے سے بے خبر نہیں تھا۔ وہ رقم گھر لایا مگر پھر کہیں اور لے گیا۔ دن کا وقت ہوتا تو وہ بینک میں جمع کراتا۔ رات کے وقت اُس نے سب پیسہ ایک تھیلی میں ڈال کے زمین میں دبا دیا۔ شاید کسی نے اسے دیکھ لیا یا کوئی پہلے سے اس تاک میں تھا۔ وہ گھر آ گیا اور رات کو ڈاکو آ پہنچے۔ انھوں نے مجھے، میری دو بہنوں کو اور ماں کو قبضے میں کر لیا۔ اور پچاس ہزار روپے مانگے۔ میرا بھائی اُن کے سردار کو وہاں لے گیا جہاں اُس نے رقم چھپائی تھی۔ وہاں اُس کو خالی گڑھا ملا۔ کوئی پیٹھ میں خنجر گھونپ چکا تھا۔ ڈاکو ہم سب کو ساتھ لے گئے۔ میرا باپ بندوق لے کر پیچھے دوڑا اور اُن کی جوابی فائرنگ سے مارا گیا۔ ڈاکو جاتے وقت کہہ گئے تھے کہ رقم کا بندوبست ہو جائے تو اپنی عورتیں لے جانا۔ وہ سرحد پار کے کسی علاقے سے آئے تھے۔ رات بھر چلنے کے بعد وہ کسی غیر آباد مقام پر پہنچے جہاں انھوں نے ہم سب کو الگ الگ رکھا۔ انھیں ڈر تھا کہ یہ مسلمان عورتیں ہیں جو اپنی عزت پر جان قربان کرنا معمولی بات سمجھتی ہیں، کہیں بڑھیا اپنی تینوں بیٹیوں کا گلا نہ دبا دے۔ ایک بار پھر میری عقل اور ہمت کام آئی۔ میں نے سردار سے کہا کہ تم مجھے بیچ دو۔ میرے پچاس ہزار تو مل ہی جائیں گے کسی بردہ فروش سے۔ باقی سب کو جانے دو۔ وہ بہت حیران ہوا۔ کہنے لگا کہ تیری باقی دو بہنوں کو بھی نہ بیچ دوں۔ ڈیڑھ لاکھ تو مل جائیں گے۔ میں نے کہا کہ اوّل تو یہ اصول کے خلاف ہو گا۔ تم نے کبھی ایسا نہیں کیا ہو گا کہ مانگو پچاس اور وصول کرو ڈیڑھ لاکھ، دوسری بات یہ کہ میری بہنیں ہیں بہت غیرت والی وہ خودکشی کر لیں گی۔ ڈاکو ہنسنے لگا کہ اچھا وہ غیرت مند ہیں اور تو بے غیرت ہے۔ میں نے کہا کہ ہوں تو میں بھی بہت غیرت مند مگر یہاں سوال اپنی جان بچانے کا نہیں دوسروں کی عزت اور جان بچانے کا ہے۔ کسی کو تو قربانی دینی ہی پڑے گی سو میں اپنی زندگی قربان کرتی ہوں۔ دو کی عزت اور تین کی جان بچ جائے تو میرے نزدیک یہ سودا بُرا نہیں۔ ڈاکو چکر میں آ گیا۔ کہنے لگا کہ اچھا اگر میں ہی رکھ لوں تجھے؟ میں نے کہا کہ وہ تمہاری مرضی۔ تم رکھ سکتے ہو کسی کو بھی پچاس روپے کی عورت یا پچاس ہزار کی عورت۔ آخر شہر کے لوگ بھی گاڑیاں رکھتے ہیں۔ کوئی دس ہزار کی رکھتا ہے اور کوئی ایک لاکھ کی۔ شوق اور حیثیت کی بات ہے۔ بس جناب، ڈاکو تو ایک دم مر مٹا میری اس ادا پر۔ رات کو میں نے اُس کا کام تمام کیا۔ اُس سے ریوالور چھینا اور اُسے گولی مار دی۔ یہی بنیادی غلطی ہوئی مجھ سے۔ میں اُسے گلا گھونٹ کے تو نہیں مار سکتی تھی۔ وہ ایک طاقتور مرد تھا۔ مجھے زہر وغیرہ بھی نہیں مل سکتا تھا مگر یہ ہو سکتا تھا کہ میں اس کے سر پر کچھ مارتی۔ وہی ریوالور مارتی یا خنجر سے اُس کا گلا کاٹ دیتی۔ یہ سب میں نے بعد میں سیکھا اور کیا مگر اس وقت تجربہ نہیں تھا، صرف حوصلہ تھا۔ گولی چلنے کی آواز نے ڈیرے میں کھلبلی مچا دی۔ باقی ڈاکو اسلحہ لے کر آئے لیکن میرے سامنے آ کے دو مارے گئے تو باقی فرار ہو گئے۔ جاتے وقت میری ماں کو بھی لے گئے اور دونوں بہنوں کو بھی۔ میں اکیلی رہ گئی اور یہ مت پوچھو کہ کس طرح گھوڑے پر سوار ہو کے راتوں رات سفر کرتی ہوئی سرحد پار کر گئی۔ مجھے صرف سمت کا اندازہ تھا، یہ معلوم نہ تھا کہ سرحد کتنی دور ہو گی۔ میں نے کبھی گھوڑے پر سواری بھی نہیں کی تھی، اُس دن کر لی۔ گھوڑا بہت سمجھدار جانور ہوتا ہے۔ میں دو بار گری مگر گھوڑا بھاگا نہیں۔ اس نے میرا ساتھ دیا اور اُس رات وہی میرا دوست، ہمدرد تھا اور میرا رہنما تھا۔ اسے میں اپنی خوش قسمتی سمجھوں یا اتفاق کہ مجھے کسی سرحد پر کوئی گشت کرنے والا نہیں ملا۔ اُدھر بی ایس ایف والے مل سکتے تھے، اِدھر رینجرز۔ صبح ہونے سے پہلے ہی میں ایک گاؤں میں پہنچی تو مجھے پتا چلا کہ گاؤں پاکستان کی سرحد میں ہے۔ وہاں میں مسجد کے دروازے پر گر پڑی اور جو لوگ صبح نماز پڑھنے آئے، انھوں نے مجھے سنبھالا، میری پتا سنی اور مجھے پولیس کے ذریعے میرے بھائی تک پہنچایا۔ میرا بھائی تقریباً پاگل ہو گیا تھا۔ وہ ڈاکوؤں سے رابطے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ اُس نے کھڑے کھڑے آموں کا باغ اور ملحقہ زمینیں سب پچاس ہزار میں فروخت کر دیے تھے حالانکہ وہ کسی بھی طرح ستر پچھتر ہزار سے کم کے نہ تھے مگر اُسے جلدی تھی اور وہ ہوش میں کہاں تھا کہ نفع اور نقصان کو سمجھتا۔ اُسے تو بس پچاس ہزار دے کر ماں اور بہنوں کو واپس لانے کے خیال نے پاگل کر دیا تھا۔ جب میں پہنچی اور میں نے اُسے ساری کہانی سنائی۔ لیکن اس کہانی میں سے میں نے بہت سا سچ نکال دیا، ورنہ وہ اتنا پاگل ہو جاتا کہ مجھے بھی قتل کر دیتا۔ میں نے اپنی بے وقوفی کی بات اُسے نہیں بتائی۔ میں نے کہا کہ ڈاکوؤں نے مجھے چھوڑ دیا ہے یہ پیغام پہنچانے کے لیے کہ پچاس ہزار کا انتظام رکھو، ہم خود آئیں گے۔ ظاہر ہے کہ وہ نہیں آئے۔ میرا بھائی پچاس ہزار لے کر پھرتا رہا۔ اُس کی مایوسی بڑھتی گئی۔ پولیس اُس کی مدد کرنے سے قاصر تھی۔ وہ کہتے تھے کہ ڈاکو سرحد پار سے آئے تھے۔ میرے بھائی کا انتقامی جنون اتنا بڑھ گیا کہ اُس نے اپنے دو قابلِ اعتبار ساتھیوں کو ساتھ لیا اور مجھے ساتھ لیا۔ ہم رات کی تاریکی میں سرحد پار کر جاتے تھے اور اُن ٹھکانوں کو تلاش کرتے تھے جہاں وہ ڈاکو مل سکتے تھے مگر میرا خیال ہے کہ اُن کا گروہ ٹوٹ گیا تھا۔ اُن کا سردار مارا گیا تھا اور دو ساتھی بھی مارے گئے تھے، باقی سب اِدھر اُدھر ہو گئے اور . . .

اُن کے ساتھ وہ بھی اِدھر اُدھر ہو گئیں، میری ماں اور بہنیں۔ ماں کو تو شاید مار دیا ہو گا انھوں نے یا کہیں ریگستان میں چھوڑ دیا ہو گا، بہنوں کا پتا نہیں، وہ کس کے حصے میں آئیں، زندہ رہیں یا بک گئیں۔ چار چھ مہینوں میں ہم نے کوئی جگہ نہیں چھوڑی۔ میرے بھائی نے مجھے اس لیے ساتھ رکھا کہ میں اُس جگہ کی نشاندہی کر سکتی تھی، جہاں ہمیں رکھا گیا تھا اور انھیں پہچانتی بھی تھی۔ اس عرصے میں ہمارا سامنا متعدد بار سرحدی پولیس سے ہوا۔ ہم بھائی بہن تو بچ گئے۔ مگر اس کے دونوں دوست ایک ایک کر کے مارے گئے۔ اُس کا اشتعال اور بڑھ گیا۔ اب اُس نے باقاعدہ گروہ بنا لیا اور سرحدی دیہات میں ڈاکے ڈالنے لگا۔ اُس کی تمام سرگرمیاں پاکستان کی سرحد کے اُس پار تک محدود رہیں۔ میں اس کے ساتھ برابر کی شریک تھی۔ ویسی ہی انتقام کی آگ میرے خون میں بھی دہک رہی تھی مجھے کوئی ملال نہیں ہوتا تھا جب میرے بھائی کے گروہ کی بربریت کا شکار عورتیں، بچے، بوڑھے اور بے گناہ

لوگ ہوتے تھے تو میں سمجھتی تھی کہ یہ تو حساب برابر ہو رہا ہے۔ ہم نے کئی بار عورتوں، بچوں کے عوض پچاس پچاس ہزار روپے کا تاوان وصول کیا۔ کبھی تاوان نہیں ملا تو اُن عورتوں کو میرے بھائی نے منڈی میں ایسے بیچ دیا جیسے وہ بھیڑ بکریاں ہوں۔ جب وہاں دونوں طرف سے پولیس اور سرحدی حفاظتی فوج کا دائرہ ہمارے گرد تنگ ہونے لگا تو ہم نے سرحد بدل دی۔ ہم میر پور خاص کے علاقے سے بہاو لنگر چلے گئے۔ وہاں بھی یہی کچھ ہوا۔ وہاں سے ہم داہگہ کی سرحد پر پہنچے اور اب حال ہی میں پھر تھر پار کر، کھوکھرا پار اور نگر پار کر کے علاقے میں وارداتیں کرنے لگے تھے۔"

"کبھی . . . اتنے طویل عرصے میں تمھیں خیال نہیں آیا کہ انتقام کی کوئی حد بھی ہوتی ہے . . . اور کیا یہ واقعی انتقام تھا؟" میں نے کہا "یا محض لوٹ مار اور جرائم کی زندگی گزارنے کی عادت؟"

وہ کچھ دیر خاموشی سے اپنے انگوٹھے کو دباتی رہی، پھر اُس نے کہا۔ "اب انتقام کا خیال تو نہیں آتا تھا۔ ہم بھول چکے تھے اُن کو . . . . . کبھی یاد کرتے تھے تو ایسے جیسے وہ مر چکے ہوں اور وہ ہمارے لیے واقعی مر چکے . . . زندہ ہوں تب بھی کیسے مل سکتے ہیں۔"

"تم نے کتنے قتل کیے ہوں گے اب تک اپنے ہاتھوں سے؟" میں نے کہا۔

"تم اعترافِ جرم کرانا چاہتے ہو؟" وہ بدک گئی۔ "نہیں، ایسے تو ہم نے بھی بہت لوگ مارے ہیں مگر ہم اس کو قتل نہیں سمجھتے۔ یہ جنگ تھی، اس میں ہم بھی مارے جا سکتے تھے اور ہمارے ساتھی بھی مارے گئے۔ تمھاری جنگ کا مقصد مختلف تھا اور تمھارے دشمن مختلف تھے۔ تم نے اپنے دفاع میں گولی چلائی ہوگی۔ قتل وہ ہوتا ہے جو آدمی سوچ سمجھ کے ایک پلان کے مطابق ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ کرتا ہے۔" میں نے کہا۔

"مارے تو نہ جانے کتنے گئے میرے ہاتھوں مگر ایسے کسی کو نہیں مارا میں نے، جیسے تم کہہ ــــ ہو۔" وہ بولی "ہاں ایک لڑکی نے مجھ سے کہا ــــ ــاست کی تھی کہ اُسے مار دوں اُس کے ســ ــــ دگی تھی۔ اُسے میں نے مارا تو نہیں مگر خنجر فراہم کر ــــ ــں کے بعد میں نے اپنی ذمے داری بنالی کہ جب بھی جوان عورتیں آئیں تو انھیں اپنے ساتھ اپنی نگرانی میں رکھوں۔"

خاموشی کے ایک اور طویل وقفے کے بعد میں نے کہا "یہ ٹھیک ہے کہ تمھارے پاس بھی حالات کا جواز ہے مگر کیا تم مطمئن تھیں اپنی اُس زندگی سے؟ کب تک ایسے گزار سکتی تھیں؟"

"میرے لیے انتخاب کہاں تھا میرا کوئی مستقبل بھی تب ہوتا جب میرا ایک شریفانہ ماضی ہوتا۔ بھائی کے ہاتھوں دو اپنے ہی ساتھی اس لیے مارے گئے تھے کہ انھوں نے مجھ پر بُری نگاہ ڈالی تھی اور ایک نے تو دست درازی کی بھی کوشش کی تھی۔ اُس وقت میرے ڈاکو بھائی نے یہ نہیں سوچا کہ اب میری زندگی کا ساتھی کوئی ڈاکو ہی ہو سکتا ہے۔ شریف آدمی کہاں سے آئے گا اور کیوں آئے گا میرا ہاتھ مانگنے! ویسے بھی میں شادی شدہ تھی۔"

"اتنا خیال تھا تمھیں؟" میں نے تلخی سے کہا۔

"دو سال کے بعد تم تنسیخ نکاح کی درخواست دے سکتی ہو۔" رابعہ نے فوراً قانونی مشورہ دے کر بات بنائی۔ "قانوناً سات سال کا عرصہ درکار ہوتا ہے کسی کو لاپتا قرار دینے کے لیے مگر ایک بات تو بتاؤ، وہ جو تمھارا شوہر بنا تھا اُس کا نام کیا تھا؟"

"عبداللہ،" گل بانو نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

مجھ پر اس نام کا ردِعمل شدید ہوا یا رابعہ چونک پڑی تو یہ ایک قدرتی بات تھی۔ میرے ذہن میں فوراً حاجی عبداللہ کا خیال آیا۔ وہ ایسا ہی آدمی تھا۔ دنیا میں ہزاروں عبداللہ ہوں گے۔ اُن میں بدمعاش، اسمگلر، چور، ڈاکو، قاتل بھی ہوں گے۔ ضروری تو نہیں کہ یہ وہی عبداللہ ہو مگر ایسا ہونا بعید از قیاس بھی نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ میں عبداللہ کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرتا میں نے محسن کو اور اُس سے چند قدم پیچھے کریم بلوچ کو آتا دیکھا۔ وہ شاید موٹر بوٹ کہیں اور چھوڑ کے آئے تھے۔

کریم بلوچ نے سر پر ایک ٹوکری اٹھا رکھی تھی۔ اس کا وزن بھی کافی معلوم ہوتا تھا۔ لانچ پر آنے کے بعد اُس کے لیے توازن برقرار رکھنا مشکل ہو گیا۔ میں نے اُسے سنبھالا اور ٹوکری نیچے لے جانے میں مدد دی۔ ٹوکری میں وہ سب تھا جو میں نے منگوایا تھا مگر اس کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا۔ کپڑوں کے نیچے ایک ایف ایم بینڈ ریسیور تھا اور ایک شارٹ ویو ٹرانسمیٹر، بیٹری اور متعلقہ سامان۔ سب سے اوپر کھانے پینے کا سامان۔ ایک شاہانہ ضیافت کا پورا اہتمام۔

میں جب پھر اوپر آیا تو محسن خاں میری جگہ آلتی پالتی مارے بیٹھے ہوئے تھے اور گل بانو ہنس رہی تھی، معلوم نہیں کس بات پر۔ اُس کے مقابلے میں محسن نہایت بھونڈے پن سے شرما رہا تھا۔

"کیا ہوا، چارلی ملا؟" میں نے اُس کی خوفناک نقلی مونچھیں ہلا کے کہا۔ "یہ مردوں کا زیور کہاں سے لیا؟"

رابعہ کھلکھلا کے ہنسی "یہی تو میں نے بھی پوچھا تھا۔"

"اب میں مونچھوں کے بارے میں عرض کروں یا چارلی چپلن کے متعلق بتاؤں؟" محسن جھلّا کے بولا۔ "سب یکھی کررہے ہیں جیسے مونچھیں نہیں، گدھے کے سینگ ہیں۔ تم مس ناگ منی . . ."

"اے، خبردار جو میری بہن کو پھر اس نام سے پکارا۔ گل بانو ہے اس کا نام۔" رابعہ نے اُسے ڈانٹا۔

محسن بھونچکا رہ گیا۔ "بہن! گل بانو . . . یہ کیا ڈراما ہے خاتونِ اوّل؟"

"بعد میں پتا چلے گا۔" میں نے کہا۔ "تم یہ بتاؤ غالب ملا؟"

محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "اُس سے ملاقات نہیں ہوسکی۔"

"تو پھر اتنی دیر رات کے دس بجے تک آپ کہاں جھک مارتے رہے؟" رابعہ نے کہا۔

"کیا وہ آیا ہی نہیں؟" میں نے کہا۔

"آیا تو تھا ٹھیک وقت پر۔" محسن بولا۔ "مگر میرے پاس رُکا نہیں۔ غالباً اُس کو اندیشہ تھا کہ اُسے دیکھا جا رہا ہے، کوئی اُس کی نقل و حرکت کی نگرانی کر رہا ہے چنانچہ وہ میرے قریب سے بھی نہیں گزرا، خاصے فاصلے پر تھا وہ۔ جب اُس نے وہ کے۔ ٹو کی خالی ڈبیا نکال کر ایک طرف پھینک دی تو میں سمجھ گیا کہ دال میں خاصا کالا ہے۔ میں نے اُسے جانے دیا اور اُس خالی ڈبیا پر نظر جمائے کھڑا رہا۔ کچھ دیر بعد میں ٹہلتا ہوا آگے بڑھا۔ اُسی وقت ایک جمعدارنی نمودار ہوئی۔ اُس کے ہاتھ میں تھی جھاڑو اور کمر پر ٹوکری۔ اُس نے وہ ڈبیا اٹھائی اور ٹوکری میں ڈال لی۔ اب میں اُس کے پیچھے تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اُس کو کیسے روکوں اور اُس سے وہ خالی ڈبیا کیسے مانگوں۔ یہ اُمید تھی کہ کہیں نہ کہیں وہ کوڑا پھینکے گی۔ اس کے پیچھے مجھے کافی خوار ہونا پڑا۔"

"پھر کیسی؟" میں نے آہستہ سے کہا۔

گل بانو بے اختیار ہنسی۔ محسن بگڑ گیا۔ "تم لوگ سیریس نہیں ہو۔ وہ سالی تھی پچاس برس کی بڑھیا۔"

"گالی نہیں،" گل بانو نے اُنگلی کے اشارے سے کہا۔

محسن ایک بار پھر ہکا بکا رہ گیا "یا مظہر العجائب . . . یہ ہوا کافر تو وہ کافر مسلماں ہو گیا۔"

"پھر وہ ڈبیا ملی؟" میں نے بے صبری سے پوچھا۔

"ہاں ملی آدھے گھنٹے بعد، کوڑے کے ڈھیر سے۔" محسن بولا۔ "میں نے اُسے غور سے دیکھا اور پھر کھول کے پھاڑا۔ اُس کے اندر غالب نے لکھا تھا۔ لو تم بھی دیکھ لو۔" اُس نے جیب میں ہاتھ ڈال کے گتّے کا وہ ٹکڑا نکالا جس کے پیچھے کے۔ ٹو کی تصویر تھی۔ اس پر لکھا تھا۔

"زیرو آور۔ ایف ایم ون ڈبل زیرو۔"

میں نے پیغام کا مطلب فوراً سمجھ لیا۔ "پھر تو بازار چلا گیا؟"

"نہیں۔ میں نے کریم بلوچ سے کہا۔ اس نے مجھے ایک بندے سے ملوایا جو پورٹ کے علاقے میں چوری کے مال کا سب سے بڑا بیوپاری ہے۔ جہاز کے بے ایمان ملازم جو کچھ پار کر سکتے ہیں اُسے اونے پونے بیچ جاتے ہیں۔ آگے اُن سے مال خریدنے والے بہت ہیں، کیونکہ جہازوں پر سب فارن آئٹم ہوتے ہیں۔ اُسی کی معرفت یہ شارٹ ویو ٹرانسمیٹر اور بیٹری وغیرہ ملے۔"

"کھانا بھی فارن ہے۔ اُسی سے ملا؟" میں نے کہا۔

"ہاں، کھا کے دیکھو۔ مس ناگ منی! سوری گل بانو، یہ دونوں تو ہیں میری جان کے دشمن، تم ہی پوچھ لو کھانے کو۔ ظاہر ہے تم نے بھی میرے بغیر کچھ نہیں کھایا ہوگا۔ جا کے دیکھو میں تمھارے لیے کیا کچھ لایا ہوں۔"

ناگ منی کا چہرہ دمک اٹھا۔ اُسے محسن سے ایسی نیازمندی اور ایسے محبت بھرے ڈائیلاگ سننے کی اُمید نہیں تھی۔ وہ ایک دم اٹھی اور نیچے چلی گئی۔

"یہ تم اور وہ ہو گئے۔" میں نے کہا۔ "حد سے بڑھ گئے۔"

"مجھے بتاؤ غالب نے کیا کہا؟ پیغام کیا تھا اُس کا؟"

تازہ تو خیریت سے ہے؟" رابعہ نے کہا۔

"یہ سب تو معلوم ہو گا بی بی، آدھی رات کے بعد۔ زیرو آور کا مطلب ہے رات بارہ بجے۔" میں نے اُسے سگریٹ کے پیکٹ کا ٹکڑا اُٹھا کے کہا۔" ایف ایم ہنڈرڈ میگا ہرٹز پر ہم اُس سے بات کر سکتے ہیں۔"

"براہِ راست؟" رابعہ نے مسرت سے کہا۔"مگر کیسے؟"

"یہ سائنسی سوال ہے۔ قانون کی کتابوں میں اس کا جواب ہوتا تو ہم بتاتے۔" محسن بولا۔" آپ کی زنانہ عقل کی رینج اتنی زیادہ نہیں ہے۔"

"تم جیسے مرد ہی جب لاجواب ہوں یا بات کو ٹالنا چاہیں تو انھیں عورت کو ناقص العقل قرار دینے کے سوا کچھ نہیں سوجھتا۔" رابعہ نے خفگی سے کہا۔

"مجھے بھی کچھ نہیں سوجھ رہا ہے چکن اور بریانی کے سوا، جو میں ساتھ لایا ہوں۔ لو، وہ آ گئی گل بہار لے کے سامانِ بہار۔"

"گل بانو۔" میں نے تصحیح کی۔

کھانا بہت مدت کے بعد مل بیٹھ کے اور سکھ چین سے میسّر ہوا تھا چنانچہ سب کی بھوک چمک اُٹھی تھی۔

میں نے کھاتے کھاتے کہا۔" یار، یہ تو سب اسپیشل آئٹم ہیں۔"

محسن نے کہا۔"ہاں، انتخاب بھی کریم بلوچ کا ہے۔ اس نے ہی بتایا تھا کہ کیا کہاں سے لینا ہے اور پھر سب خود ہی لیا۔ آج کی دعوت کریم کی طرف سے ہے۔"

"وہ کس خوشی میں؟" رابعہ نے کہا۔

"اس کی شادی جو ہو رہی ہے۔" محسن نے کہا۔

"دُولھا ابھی بنا نہیں، ولیمہ پہلے کھا لیا۔" میں نے کہا۔

"وہ بھی ہوئیں گا صاب۔ ولیمہ بھی ہوئیں گا۔" وہ دانت نکالتے ہوئے بولا۔" آپ کا مہربانی سے ہمارا سب پیسہ وصول ہو گیا۔ ورنہ وہ تو ہم کو لوٹ لیا تھا۔"

"تمھاری اپنے خسرِ محترم سے بات پکّی ہو گئی؟"

"کیسے نہ ہوتا صاب۔ آپ موشن میاں کو بولا تھا کہ ایک ہفتہ میں شادی بناؤ، ورنہ کڑچ۔" کریم نے کہا۔" وہ بڈھا کو بولا کہ اگر تم مشتری کا رشتہ کریم سے نہیں کرے گا تو سب کڑچ۔"

"کڑچ۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اور بڈھا بولا کڑچ کیا؟ تو موشن میاں بولا کہ جب تم اور ہم سب کڑچ ہوئیں گا تو پتا چل جائے گا۔ کریم کا ماما آیا تھا اور وہ یہی بولتا تھا کہ سب کو کڑچ کریں گا۔ بولتا تھا سات آدمی کڑچ کر چکا ہے۔ بس بڈھا تو ایسا کانپتا تھا صاب، جیسے کرنٹ لگ گیا ہو، اُس کا حال خراب ہو گیا۔ بولا کہ بابا میرے کو منظور، میرے باپ کو منظور، ہزار بار منظور، تم ابھی لے جاؤ، کل لے جاؤ۔ ہم بولا کہ ایسا کیسے لے جاوے۔ بکرا منڈی سے بکرا خریدنے آیا ہے ہم کہ تم کان پکڑ کے ہمارے حوالے کرتا۔ پہلے مشتری کلمہ پڑھیں گا، مسلمان ہوئیں گا پھر ہم بارات مارات لائیں گا، باجا ماجا کے ساتھ اور چھوہارا، موہارا کھائیں گا۔ پھر کڑچ کریں گا۔" وہ کیا... کہ شادی کریں گا۔"

ہنستے ہنستے ہم سب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

رات کے گیارہ بجے محسن نے مواصلاتی رابطے کا اسباب جمع کیا۔ اُس نے ٹرانسمیٹر کو بیٹری سے جوڑا۔ اس کے بارے میں وہ خود بھی نہیں جانتا تھا کہ اس کی رینج کیا ہو گی۔ اُس نے لانچ کے سب سے بلند حصّے پر ایک بانس کے ساتھ ایریل کا تار باندھا۔ اور مجھے بتایا کہ ایریل جتنا بلند ہو گا اتنی ہی دور تک آواز سُنی جائے گی اور صاف بھی ہو گی۔"

"یہ نہ ہو کہ دوسرے جہازوں پر بھی سُنی جائے!"

"سُنی تو جائے گی۔" محسن بولا۔" یہ ریڈیو کی نشریات ہیں، ان کو فضا میں پھیلنے سے کیسے روکا جا سکتا ہے۔ لیکن ہزار میں ایک چانس بھی نہیں کہ عین اسی وقت کوئی اپنے ریسیور کو بالکل اسی فریکوئنسی پر ٹیون کیے بیٹھا ہو جس پر ہم بات کر رہے ہوں۔ ہر جہاز پر ریڈیو سگنل ایک الگ فریکوئنسی پر موصول ہوتے ہیں۔ وہ اُسی کو ٹیون کیے بیٹھے رہتے ہیں۔ اُسے چھوڑنے کا مطلب ہو گا کہ جو پیغام اُن کے لیے ہیں وہ انھیں نہیں ملیں گے۔ یُوں سمجھ لے کہ ریڈیو پر دنیا بھر کے اسٹیشن آتے ہیں، جسے جو سُننا ہے وہ سوئی کو ایک ہی جگہ رکھے گا۔ ہلائے گا تو بہت کچھ سُنے گا مگر اپنا اسٹیشن نہیں سُن سکے گا۔"

"اچھا اچھا۔ مجھے کوئی شوق نہیں ریڈیو انجینئر بننے کا۔ تو یہ بتا کہ غالب نے وہاں کیا چکر چلایا ہو گا۔ میرا مطلب ہے کہ اس جہاز پر اسے وائرلیس کے آلات حاصل کرنے کا موقع کیسے ملا؟ ریڈیو ریسیور اور ٹرانسمیٹر وہ کہاں سے لایا اور چھپ کر کیسے استعمال کرے گا؟"

"یہ سوالات تو مجھ سے کیوں کر رہا ہے اُسی سے پوچھنا۔"

"کیا گفتگو خواتین کی موجودگی میں ہو گی؟" میں نے کہا۔

"کیا ہرج ہے، ہم سب تو ایک ہیں۔ اجنبی تو صرف ڈاکو کی بیٹی ہے۔"

"اُس کا باپ ایک شریف آدمی تھا۔" میں نے کہا۔" اگر تو چاہے تو اُس کو ڈاکو کی بیوی کہہ سکتا ہے۔"

"بیوی! میرا خیال تھا کہ وہ مس ناگ منی... سوری، مس گل بانو ہے۔" محسن نے کہا۔

"وہ مسز عبداللہ ہے۔" میں نے کہا۔

محسن نے میری طرف یوں دیکھا جیسے وہ اس مذاق کو سمجھنے سے قاصر رہا ہو۔ پھر مجھے سیریس دیکھ کر اُس نے کہا۔ "مسز عبداللہ! کون عبداللہ؟"

"عبداللہ کے معنی ہیں اللہ کا بندہ۔" میں نے کہا۔ "ابھی یقین کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے کہ وہ کون عبداللہ ہے تاہم میں اپنے حاجی صاحب کو خارج از امکان نہیں سمجھتا۔ بہ لحاظِ صفات گل بانو کا سابق شوہر، جو عرصہ پانچ سال سے لاپتا ہے، ایسا ہی تھا جیسا حاجی۔ یہ معاملہ تصدیق طلب ہے۔ تفصیل میں جانے کا وقت نہیں۔"

"ہاں، بارہ بجنے والے ہیں۔" محسن بولا۔" میں ان آلات کو چیک کر لوں۔"

اُس نے ٹرانسمیٹر اور ریسیور کو باہم منسلک کیا۔ الیکٹرانکس میں وہ شروع سے گہری دلچسپی رکھتا تھا اور ہمارے ساتھ اُسے اپنی فیلڈ میں تجربات کرنے کے مواقع بھی بہت ملے تھے۔ یہ اُس کے لیے بہت معمولی کام تھا۔

ایف ایم بینڈ پر اِدھر اُدھر کے بہت سے سگنل موصول ہو رہے تھے۔ بیشتر سگنل مورس کوڈ میں تھے لیکن کہیں کہیں دو ریڈیو آپریٹرز کی گفتگو بھی سنائی دے جاتی تھی جس کا تعلق بحری جہاز کے اپنے مسائل سے ہوتا تھا۔ موسمیاتی رپورٹ، سمندر کا حال، تجارتی خبریں۔ قریب کی آواز صاف اور واضح سنائی دیتی تھی، جواب جو دور سے ملتا تھا مشکل سے سُنا جاتا تھا۔ صرف ایک جگہ دلچسپ گفتگو سننے کو ملی۔ یہ بالکل ٹیلی فون پر سنائی دینے والی کراس ٹاک کی طرح تھی۔

"تم نے اُلّو بنایا مجھے، چھ مہینے تک۔"

"میں نے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔"

"تم بیچ رہی ہو خود کو۔ کیا ہے اُس کالے چرغ کے پاس تمھیں دینے کے لیے؟ وہ گنجا ہے۔ وگ لگاتا ہے۔"

"تم بھی تو عینک لگاتے ہو اور جو کچھ وہ دے رہا ہے مجھے، تم اُن چیزوں کے خواب دیکھ سکتے ہو۔ تم ایک ہزار کماتے ہو، اُس کی آمدنی دس گُنا ہے۔ کار ہے اُس کے پاس کوٹھی ہے۔"

"مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم ایک طوائف ہو۔"

"کیا کوئی عورت ہے جو یہ سب نہ مانگتی ہو؟ ایسے تو ہر عورت طوائف ہو گئی اور مرد کیا ان چیزوں کے پیچھے نہیں بھاگتے۔ کیوں زیادہ پیسہ کمانے کے لیے چوری، اسمگلنگ اور رشوت کا راستہ اختیار کرتے ہیں؟"

"تم بھی سچے اور وہ بھی سچی۔" محسن نے بہ آوازِ بلند کہا۔"اب تو لیلیٰ بھی مجنوں کا گریڈ پوچھتی ہے اور مجنوں معلوم کرتا ہے کہ لیلیٰ کو جہیز میں کیا ملے گا۔ محبت الگ مسئلہ، شادی الگ مسئلہ۔"

"یہ کون ہے؟ بدتمیز!" عورت نے کہا۔

"کوئی سن رہا تھا مگر میں اب نکلنے کو سناؤں گا اور تم بھی سن لو کہ اب میں بھی برائے فروخت ہوں۔ میں اس ٹھیکے دار کی موٹی، کالی بھینس سے شادی کروں گا۔"

"شاباش بیٹے۔ عقل آ گئی تمھیں۔" محسن بولا۔

"چل یار، چھوڑ انھیں۔" میں نے کہا۔" بارہ بجنے والے ہیں، دو منٹ رہ گئے ہیں۔"

محسن نے ایف ایم بینڈ پر سو میگا ہرٹز کے قریب ٹیوننگ کی کوشش جاری رکھی۔ صحیح فریکوئنسی معلوم نہ ہونے کے باعث وہ اٹھانوے اور ایک سو دو میگا ہرٹز کے درمیان رہتے ہوئے غالب کی آواز سننے کے لیے کان لگائے بیٹھا ہوا تھا۔ اب رابعہ اور گل بانو بھی آ گئی تھیں اور میں نے انگلی کے اشارے سے انھیں خاموش بٹھا دیا تھا۔ رابعہ کے چہرے پر اُمید، اشتیاق اور فکرمندی کے جذبات کا ہر رنگ بہت واضح تھا۔

میں نے بے چینی سے گھڑی دیکھی۔ بارہ بج کے ساڑھے تین منٹ ہو گئے تھے۔ محسن بڑے انہماک سے غالب کی آواز کو اجنبی آوازوں میں تلاش کر رہا تھا۔ اندیشے اور وسوسے میرے دل میں مایوسی کے ساتھ احساسِ عدم تحفظ پیدا کر رہے تھے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ رابطہ قائم کرتے ہوئے پکڑا جائے۔ دشمن کے قلعے کے اندر بیٹھ کر جاسوسی کرنا آسان نہ تھا۔ مواقع دستیاب ہونے کے بعد بھی ایسی کوشش ناکام کے نتائج تباہ کُن ہو سکتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ وہ دونوں مصیبت اور عذاب میں گرفتار ہوں گے بلکہ یہ ہمارے پورے مشن کے حق میں بُرا ہو گا۔ تفتیش کرنے والے ان سے سب اُگلوا لیں گے...

"چارلی . . ." میں نے ایک لفظ سُنا اور خیالات کا تسلسل ایک جھٹکے سے ٹوٹ گیا۔ یہ آواز غالب کی تھی۔

محسن کا چہرہ دمک اُٹھا۔ اُس نے پھر وہیں ٹیون کیا۔

"ہیلو کے ۔ ٹو ..... ! چارلی ہیئر . . . ڈو یو ریڈ . . .؟"

"راجر!" میں نے کہا۔ "لاؤڈ اینڈ کلیئر . . . چارلی! ڈو یو ریڈ می؟"

"لاؤڈ اینڈ کلیئر۔" غالب کی آواز آئی۔

"کیا تمھیں یقین ہے کہ تم محفوظ ہو؟" محسن نے کہا۔

"کوئی تمھیں دیکھ یا سن تو نہیں رہا ہے؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ جہاں تک مجھے یقین ہے۔" غالب نے کہا۔

"نازو اِز او کے؟" رابعہ نے کہا۔

"تم!" غالب شاید رابعہ کی آواز پہچان کر سخت حیران ہوا تھا۔

"ہاں میں۔" رابعہ نے ہنس کے کہا۔ "نازو سے بات ہو سکتی ہے؟"

"نہیں، میرے پاس بھی وقت کم ہے۔" غالب نے کہا۔

"تمھیں کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی تھی؟"

"نہیں سب پلان کے مطابق رہا۔ تم گئے تھے؟"

"نہیں، ہم گرفتارِ بلا ہو گئے تھے۔" محسن نے کہا۔ "بلا کا نام حاجی عبداللہ۔"

"لیکن وہ سب قدرت کی طرف سے ایک انتظام تھا رابعہ کو پھر ہم سے ملوانے کا۔" میں نے کہا۔ "واپسی پر معلوم ہوا کہ جہاز کی روانگی ملتوی ہو گئی۔"

"ہاں، جہاز میں کوئی خرابی ہو گئی تھی۔"

"سُنا ہے خرابی کسی تخریبی کارروائی کا نتیجہ تھی۔"

"میں نے تو نہیں سُنا۔" غالب نے کہا۔

"یہ بھی سُنا تھا کہ بمبئی سے دوسرا جہاز آئے گا اور اسباب اس پر منتقل کیا جائے گا۔"

"یہ افواہیں پھیلائی گئی ہوں گی۔"

"پھر ۔۔ کیا اب یہی جہاز جائے گا؟" میں نے کہا۔

غالب نے جواب دیا۔ "ظاہر ہے، خرابی معمولی تھی، دُور ہو گئی۔"

"روانگی کا اب کیا پروگرام ہوگا؟"

"کل رات، کسی وقت۔"

"تم سے پھر رابطہ ہوگا؟" میں نے کہا۔

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا، چانس ملنے پر ہے۔" وہ بولا۔

"یہ چانس کیسے ملا؟"

"نازو کی بدمعاشی سے۔" غالب نے کہا۔

"کیا؟ کیسی بدمعاشی . . . مار دھاڑ سے زبردستی . . ."

"نہیں یار، ریڈیو روم کے عملے میں تین افراد ہیں۔ ایک ریڈیو آفیسر اور دو ماتحت۔" غالب نے کہا۔ "اُس نے ریڈیو آفیسر کو پھنسا لیا ہے۔ ماتحت تو شہر گئے ہوئے تھے۔ کام جو نہیں ہے آج کل۔"

"ریڈیو آفیسر کون ہے؟"

"ہے ایک اُلو کا پٹھا، کاٹھ کا اُلو۔" غالب نے خفگی سے کہا۔ "اس وقت بھی نازو اُسی کے ساتھ ہے اُسی کے کمرے میں کافی پینے گئی ہے۔"

"لگتا ہے تم خاصے پریشان ہو۔" محسن بولا۔ "ارے بھائی اس عورت ذات کا کوئی بھروسا نہیں۔ کھیل ہی کھیل میں تمھارا پتا نہ کٹ جائے، تمھارا یہ رقیبِ روسیاہ۔"

"وہ تو گورا چٹا لونڈا ہے، ہیرو ٹائپ بلکہ ہیروئن ٹائپ۔" غالب نے کہا۔ "سالا ریشہ خطمی ہو گیا اور نازو ایک بدمعاش۔ اُس کو ڈال دیا چکر میں۔ کہنے لگی کہ سُنا ہے تم کافی بہت اچھی بناتے ہو، پلاؤ گے نہیں؟ اُس نے کہا، تم شرفِ میزبانی تو دو۔ چنانچہ وہ مہمان بن کے گئی ہے۔ ایسی بے شرمی کا مظاہرہ کیا ہے۔"

"میزبان پر اللہ رحم کرے۔" رابعہ نے کہا۔

"وہ اپنی حفاظت کر سکتی ہے۔" میں نے کہا۔ "تم فکر مت کرو۔ یہ بے شرمی وغیرہ سب کچھ نہیں، صرف اداکاری ہو گی اُس کی۔"

"وہ تو مجھے معلوم ہے۔" غالب نے کہا۔ "جب جہاز روانہ ہوگا تو ایک آپریٹر ڈیوٹی پر رہے گا۔ پھر دیکھو موقع کب بنتا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے ڈاکٹر بھنڈاری اور اس ریڈیو آفیسر میں سے ایک رہے گا۔ دونوں کو اُس نے ہزار جان سے فریفتہ کر لیا ہے۔"

"گویا دو ہزار جان سے۔" محسن بولا۔

"اچھا اب سنو میری بات۔" غالب نے کہا۔ "مجھے ایک کارآمد بات معلوم ہوئی ہے۔ آج رات کو لاہور سے کچھ اور مال پہنچ رہا ہے جو یہاں لوڈ ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ جہاز کی خرابی بہانہ تھی۔ اسی لیے افواہیں پھیلائی گئی ہوں گی۔ یہ سامان دوسرے راستے سے اندر آئے گا اور کل دن میں جہاز پر چڑھایا جائے گا۔"

"ٹھیک ہے، ہم نگاہ رکھیں گے۔" میں نے کہا۔

"تم لوگ جہاز کے زیادہ قریب مت آنا۔" غالب نے کہا۔ "اس کے عرشے پر تاریکی میں دیکھنے والے اور تصویریں اُتار لینے والے کیمرے ہیں۔ محافظوں کے پاس جو رائفلیں ہیں اُن پر بھی اندھیرے میں نشانہ لینے کے لیے دُور بین ہے۔"

"فکر مت کر، ہم دور رہیں گے۔"

"اسی جگہ اپنا ریسیور ٹیون رکھنا، مگر صرف سنتے رہنا۔ تمھیں بہت کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔ بس بولنے کی غلطی مت کرنا ورنہ انھیں معلوم ہو جائے گا کہ کسی نے اس فریکوئنسی کو کیچ کر لیا ہے۔ وہ فریکوئنسی بدل دیں گے۔"

"ہم چار آدمی ہوں گے۔" میں نے کہا۔

"چار کون؟ تم دونوں، رابعہ اور کریم؟"

"ہاں . . . تین بھی ہو سکتے ہیں اور پانچ بھی، مگر تم ہمیں یہ تو بتاؤ کہ ہم کس طرف سے آئیں؟"

"کون ہے اندر؟" کسی نے بلند آواز میں کہا اور ہم نے ایک دھما کا سُنا جو دروازہ اچانک کھولنے کی آواز تھی پھر اسی آواز نے کہا۔ "تم . . . یہاں . . . اوہ مائی لارڈ۔ یہ سیٹ بھی آن ہے۔ یو فول! مجھے بتاؤ یہ سب کیا ہے ورنہ میں گولی مار دوں گا تمھیں۔"

اس کے ساتھ ہی ہمارے ریسیور میں سناٹا رہ گیا۔ دوسری جانب سے ٹرانسمیٹر آف کر دیا گیا تھا۔ ہم سب ایسے بیٹھے رہ گئے جیسے ہم سب چوری کرتے ہوئے پکڑے گئے ہوں۔ چشمِ تصور سے ہم نے غالب کو لاجواب اور بے بس، اعترافِ جرم پر مجبور اور پریشان دیکھا۔

"یہ تو بہت بُرا ہوا۔" بالآخر رابعہ نے کہا۔

"اتنی لمبی بات ہو گئی تھی۔ غلطی ہم نے بھی کی۔" محسن نے کہا۔

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ "صرف کام کی بات کی جا سکتی تھی۔ غالب نے رسک لیا۔"

"کیا یہ ریڈیو آفیسر خود تھا؟" رابعہ نے پوچھا۔

"ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "جہاز کا کپتان بھی ہو سکتا ہے اور آدمی دوسرا۔"

"غالب کیا کہے گا؟" رابعہ نے بے خیالی میں کہا۔

"کیا کہے گا!" میں نے کہا۔ "ہم ہوتے تو کیا کہتے؟ کیا ہوتا کہنے کے لیے۔ خدا اُسے بچائے تو بچ جائے۔"

رات کا باقی حصہ میں نے سونے کی کوشش میں کروٹیں لیتے ہوئے گزارا۔ رابعہ اور گل بانو بھی آنکھیں بند کیے ہوئے پڑی تھیں۔ پھر میرے ساتھ لیٹا ہوا محسن اٹھا اور عرشے پر چلا گیا۔ ہم نے بہت دیر تک آہستہ آہستہ باتیں کی تھیں اور بہت سے سوالات پوچھے تھے جو سب کے ذہن میں تھے مگر ان کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ پھر خاموشی کا ایک طویل عرصہ آیا تھا جس میں سب نے فرض کیا تھا کہ دوسرے سو رہے ہیں۔

محسن کے جانے کے چند منٹ بعد گل بانو اٹھی اور دبے پاؤں اوپر چلی گئی۔ میں اُسے خاموشی سے دیکھتا رہا۔ کیا یہ لڑکی کل تک اپنی زندگی میں آنے والے اتنے بڑے انقلاب کی خواہش بھی کر سکتی تھی لیکن ایسا لگتا تھا کہ وہ تبدیلی چاہتی تھی، بہتری کی آرزو مند تھی اور اپنی زندگی کے ان معمولات سے فرار کی تمنا رکھتی تھی جس میں قتل و خونریزی، ڈاکے اور اغوا، قانون شکنی اور سزا کے خوف سے مسلسل بھاگتے رہنا شامل تھا۔ کون عورت ہے جو ایک گھر نہیں مانگتی، خصوصاً اس عمر میں اور ایسے حالات میں اور اس حسن و شباب کی ملکیت کے ساتھ۔ گھر، شوہر اور بچے مل کر اس حصار کے تین اضلاع ہوتے ہیں جس میں عورت کی ساری خوشیاں آباد ہوتی ہیں لیکن اس حصار کی تکمیل وہ خود چوتھا ضلع بن کے کرتی ہے اور پھر اسی حصار میں ہنسی خوشی عمر گزار لیتی ہے۔

میں نے محسوس کیا کہ گل بانو نے بہت جلد اپنے ماضی کو خیرباد کہہ دیا ہے۔ اس میں یقیناً کسی لاشعوری خواہش کو بھی دخل تھا۔ چنانچہ جب موقع ملا تو اس نے مستقبل کے لیے وہی راستہ اختیار کرنے میں دیر نہیں کی جو حادثاتِ وقت کی آندھی میں کھو گیا تھا۔ اُس نے بھائی کا غم بھی بھلا دیا تھا، یہ کہتے ہوئے کہ ایسا کبھی نہ کبھی تو ہونا ہی تھا کیونکہ یہ سلامتی کا راستہ کبھی نہ تھا۔ وہ .... خوش قسمت تھی کہ بدقسمت، زندہ رہی مگر سب سے بچھڑ کر۔ ماں باپ، بھائی بہن مر گئے، اس نے سب غم سمیٹے۔

"سکندر!" رابعہ کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ میرے قریب دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھی ہوئی تھی۔

میں اُٹھ بیٹھا۔ "تمھیں بھی نیند نہیں آ رہی ہے؟"

"نیند کسے آ رہی ہے؟" وہ بولی۔ "وہ دونوں اوپر ہیں۔"

"ہاں، محسن پھر پکڑا گیا تنہائی میں۔"

"گل بانو سراب کے پیچھے بھاگ رہی ہے۔" وہ بولی۔

"جب اُسے حقیقت کا علم ہوگا تو کیا یہ جذباتی صدمہ اس کے اعتماد کی بنیاد کو نہیں ہلا دے گا؛ وہ اعتماد جو اُس نے ہم پر کیا، کہ ہم اُسے باعزت مستقبل دیں گے۔ ہم نے بھی اُسے سب سے پہلے دھوکا دیا۔"

"تم کیا چاہتی ہو؛ ہم اُسے ابھی اسی وقت بتا دیں کہ محسن سے سہارے کی اُمید نہ رکھے۔" میں نے کہا۔ "محسن سے کہیں کہ وہ گل بانو کا ہاتھ جھٹک دے اور اُسے کہہ دے کہ میں تو شادی شدہ ہوں، مجھے معاف رکھو۔ نہیں رابعہ! ابھی یہ ممکن نہیں۔ بعض اوقات جھوٹ بھی ایک ناگزیر ضرورت بن جاتا ہے اور سچ بولنا جرم ہو جاتا ہے۔ ہم پہلے اسے ماضی کی دلدل سے نکال کے اس قابل بنائیں گے کہ وہ اعتماد کے ساتھ قدم جما کے اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکے۔ کسی سہارے کے بغیر یہ ناممکن ہے اور اگر آج وہ محسن سے سہارا مانگتی ہے تو محسن کا فرض بنتا ہے کہ اس کی دستگیری کرے۔"

"کیا وہ ہمارے ساتھ جائے گی؟"

"مجھے تو تمھارے بارے میں بھی سوچنا پڑے گا۔"

"کیا سوچنا پڑے گا؟" وہ برہمی سے بولی۔

"یہ ایسا سفر نہیں ہوگا جس میں خواتین کو ساتھ رکھا جائے۔ اس سے ہماری ذمّے داری اور مشکلات میں اضافہ ہوگا۔ یہ ایک انتہائی پُرخطر مہم ہے۔ اس میں تم ہماری کوئی مدد نہ کر سکو گی۔ تم دونوں کو ہم اکرام شیخ اور موہنی کے سپرد کر کے جا سکتے ہیں۔ وہ نہ ملے تو ڈاکٹر انوار احمد خاں جھکّی والا ہے۔ تم واپس لاہور جا کے شہلا کے ساتھ یا منظر کے گھر میں رہ سکتی ہو۔"

اُس نے اندھیرے میں میرا ہاتھ تھام لیا۔ "سکندر! پلیز، ایسا مت کرنا۔ میں تم کو چھوڑ کے کہیں نہیں جا سکتی۔"

رابعہ کا نرم اور گداز ہاتھ بالکل سرد تھا۔ میں نے اُسے اپنے دونوں ہاتھوں کے درمیان رکھ لیا۔ "رابعہ! میری جان، سمجھنے کی کوشش کرو، عقل سے کام لو۔"

"عقل سے کام لیتی تو تمھارا ساتھ ہی کیوں دیتی۔"

"تم میری خاطر بھی یہ نہیں کرو گی۔ اگر میں کہوں کہ یہ میری خواہش ہے، میری درخواست ہے یا میرا حکم ہے تب بھی انکار کرو گی تم؟"

وہ کچھ نہیں بولی۔ گرم، شدتِ جذبات سے سُلگتے اور آتشِ سوزِ غم سے دہکتے ایک قطرۂ اشک نے میرے ہاتھوں کو چُوما۔ میں نے اُس کا سر اپنے شانے پر رکھ لیا اور آہستہ آہستہ اس کے بالوں کو سہلاتا رہا۔ آنسو اب میرے شانے پر اُترنے لگے۔

"تم کیا چاہتے ہو سکندر؟ یہ کہ ایک دن انتظار کی طویل صدیوں کا عذاب کاٹنے کے بعد مجھے تم سے گلہ ہو کہ تم نے میری ساری زندگی کو ایک لاحاصل پشیمانی کے سوا کچھ نہیں دیا، یا تمھیں احساس ہو کہ رابعہ بزدل اور بے وفا تھی کہ انتظار بھی نہ کر سکی۔ تمھارے آنے سے پہلے ہی موت آ گئی . . ."

"تم پر ڈیپریشن کا دورہ پڑا ہے۔" میں نے کہا۔

"ایسے ہی کسی دورے میں اگر میں نے خود کو ہی ختم کر لیا تو مجھ سے گلہ مت کرنا۔ تمھارے ساتھ رہ کے میں حالات کا مقابلہ بھی کر سکتی ہوں اور خطرات کا بھی۔ مرنا ہوگا تو ساتھ مر جائیں گے لیکن میں تمھیں اس کی اجازت نہیں دوں گی کہ تم مجھے اکیلے جینے کی سزا دو اور یہ بھی نہیں سوچ سکتی کہ تم اکیلے رہ جاؤ۔"

"یہ اچھی زبردستی ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں ہے زبردستی۔" وہ بولی۔ "تمھیں معلوم ہے؟ یہ گل بانو، جو کل ہمارے ساتھ آئی ہے، وہ بھی تیار نہیں اکیلی رہنے کو۔"

"تم نے کہا تھا اس سے؟"

"پوچھا تھا کہ تم کہاں رہو گی؟ ہم تو شاید چلے جائیں۔ وہ کہنے لگی کہ میں ساتھ آئی ہوں تو ساتھ ہی رہوں گی۔ میرا کون بیٹھا ہے یہاں۔ میں نے سمجھایا تھا کہ ہمارا کام بہت خطرناک ہے تو کہنے لگی کہ کیا مجھ سے زیادہ خطرات دیکھے ہیں تم نے؟ تم خود کو کیا بہادر سمجھتی ہو۔ کیا میں ڈرتی ہوں موت سے؟"

"یہ تو بہت مشکل ہو جائے گی۔" میں نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے وہ محسن سے یہی بات منوانے گئی ہے۔" رابعہ نے کہا۔

اوپر سے گل بانو کے چیخنے کی آواز آئی۔ "چھوڑ دو، چھوڑ دو مجھے۔ کمینے، کُتّے کے بچّے۔" وہ پھر اپنی پرانی زبان استعمال کر رہی تھی۔ میں گھبرا کے اٹھا اور اوپر کی جانب لپکا۔

"گل بانو!" محسن نے چلّا کے کہا۔ "میری بات سنو!"

جواب میں گل بانو نے چلّا کے کہا۔ "ناگ منی ہے میرا نام!" اُس نے محسن کو ایک اور گالی دی۔

رابعہ کے ساتھ جب میں اوپر پہنچا تو مجھے محسن لانچ کے آخری کنارے پر بے بس کھڑا دکھائی دیا۔ گل بانو نے سمندر میں چھلانگ لگا دی تھی۔ چند سیکنڈ کے وقفے سے محسن اُس کے پیچھے کُود گیا۔

میں نے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔ "یہ کیا ڈراما ہو رہا ہے!" اور ریلنگ پر چڑھ گیا۔

رابعہ نے میرا بازو پکڑ لیا۔ "یہ تم کیا کر رہے ہو؟ محسن اُسے نکال لائے گا۔"

"پاگل ہو رہی ہو۔ محسن کو تیرنا کہاں آتا ہے۔" میں نے کہا۔ "چھوڑو میرا ہاتھ۔ وہ دونوں ڈوب جائیں گے۔" رابعہ نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اور اجازت کے انداز میں سر ہلایا۔

دس بارہ فٹ کی بلندی سے میں بندرگاہ کے تیل ملے ہوئے کالے کیچڑ جیسے بدبودار پانی میں گرا۔ مجھ سے پہلے ساتھ والی کشتی پر سے کوئی سمندر میں چھلانگ مار چکا تھا، شاید یہ سمجھتے ہوئے کہ لانچ پر سے کوئی پانی میں گر گیا ہے۔ دس پندرہ منٹ کی جدّوجہد کے بعد میں اور کریم بلوچ مل کے محسن اور گل بانو کو واپس لانچ پر لانے میں کامیاب رہے۔ محسن ہوش میں تھا مگر گل بانو بے ہوش تھی تاہم خطرے کی کوئی بات نہ تھی۔

مجھے رابعہ کی مدد کی ضرورت تھی مگر رابعہ اب وہاں نہیں تھی جہاں میں اُسے چھوڑ کر گیا تھا۔ میں نے اُسے آواز دی۔ پھر نیچے جا کے دیکھا لیکن رابعہ کہیں بھی نہیں ملی۔ میں نے اسٹور، کیبن، باتھ روم، ہر جگہ دیکھ لی۔ میں نے اُسے آوازیں دیں۔ محسن اور کریم بلوچ میرے ساتھ ساتھ اوپر نیچے دوڑتے رہے اور رابعہ کو پکارتے رہے مگر وہ لانچ پر ہوتی تو ملتی۔

میں دیوانوں کی طرح اوپر گیا۔ "وہ ضرور سمندر میں کود گئی ہوگی، میرے پیچھے۔" میں نے کہا اور پھر ریلنگ پر چڑھ گیا۔

محسن نے مجھے نیچے کھینچ لیا۔ "پاگل مت بن، وہ سمندر میں گرتی تو ہم سب نہ دیکھتے اور بھی لوگ دیکھ رہے تھے۔"

میں نے سمندر کی سطح پر نگاہ ڈالی۔ "وہ اور کہاں جا سکتی ہے؟ وہ ڈوب گئی ہوگی محسن۔"

"اُسے تیرنا آتا ہے۔" محسن نے کہا۔ "اوّل تو وہ ایسی حرکت کر نہیں سکتی۔ اور اگر وہ اس پانی میں کُود پڑتی تو اب تک ضرور نکل آتی۔ یہاں کون سی لہریں ہیں۔"

کریم بلوچ ایک سرچ لائٹ لے آیا۔ اُس نے تیس چالیس گز کے دائرے میں روشنی پھیلا دی۔ میں اب متلاطم پانی کی سطح پر گھاس پھونس، کیچڑ، لکڑی کے ٹکڑے اور کالے رنگ کا تیل دیکھ سکتا تھا۔ ہماری لانچ اور ایک ماہی گیری کی بہت بڑی کشتی کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ پندرہ بیس گز پانی کی اس مختصر پٹی میں رابعہ غائب نہیں ہو سکتی تھی۔

پھر کریم بلوچ نے سرچ لائٹ سے عرشے کا جائزہ لیا۔ روشنی گیلے کپڑوں میں بے ہوش پڑی ہوئی گل بانو پر سے گزر کے اس مقام تک پہنچی جہاں رابعہ صرف پندرہ منٹ پہلے موجود تھی۔ جہاں اُس نے مجھے روکنے کی کوشش کی تھی۔ میرے سمجھانے پر وہ مان گئی تھی۔ اُس نے مجھے اجازت دے دی تھی کہ میں محسن اور گل بانو کو بچا لوں۔ وہ بالکل ہوش میں تھی۔ اب میں یہ فرض کرنے سے قاصر تھا کہ وہ دیوانگی کی کیفیت میں خود بھی چھلانگ مار دے گی۔

پھر میری نگاہ اس چمکتے ہوئے سفید کاغذ کے پُرزے پر گئی جو عین اُسی جگہ پڑا ہوا تھا۔ روشنی میں وہ کاغذ کا پُرزہ اور نمایاں ہو گیا۔ میں شرط لگا کے کہہ سکتا تھا کہ وہ پُرزہ پہلے وہاں نہیں تھا۔

میں نے کاغذ اٹھایا تو وہ ایک کھلا ہوا سفید لمبوترا لفافہ ثابت ہوا۔ اُس کے اندر سے ہوائی جہاز کا ایک غیر استعمال شدہ ٹکٹ برآمد ہوا جو منسوخ ہو چکا تھا لیکن حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس پر رابعہ قاری ایڈووکیٹ کا نام تھا۔ یہ ٹکٹ چھ ماہ قبل خریدا گیا تھا اور اس پر بکنگ آج ہی کے دن کی تاریخ کے لیے کرائی گئی تھی مگر بعد میں سیٹ کنفرم نہیں کرائی گئی تھی۔

میں نے ٹکٹ کو اُلٹ پلٹ کے دیکھا کہ شاید اس پر کہیں کوئی تحریری پیغام ملے مگر مجھے مایوسی ہوئی۔ لفافے کے اوپر یا اندر کسی قسم کی کوئی تحریر نہیں تھی۔

"یہ کیا ہے محسن؟" میں نے پریشان ہو کے کہا۔ "رابعہ کے نام پر بمبئی کے لیے ایئر ٹکٹ؟"

محسن نے بھی ٹکٹ کا بغور مطالعہ کیا۔ "یہ تو منسوخ ہو چکا ہے۔"

"وہ تو میں نے بھی دیکھ لیا ہے مگر اس ٹکٹ کی یہاں موجودگی کا کیا مطلب ہے؟" میں نے کہا۔ "کیا وہ بمبئی چلی گئی؟"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"پھر رابعہ کہاں گئی؟ اور یہ ٹکٹ کہاں سے آیا؟" میں نے کہا۔ "اس پر آج ہی کے دن کی تاریخ ہے۔ یہ سب ہمیں

بتانے کا مقصد۔"

"مقصد کیا ہوگا؟" محسن نے بے خیالی میں کہا۔

"یہ ایک پیغام ہے سمجھنے والوں کے لیے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ رابعہ کو آج بمبئی جانا تھا لیکن وہ پروگرام میں قدرت کی دخل اندازی کے باعث ہم تک پہنچ گئی۔" میں نے شکستہ دلی سے کہا۔ "حاجی عبداللہ اُسے ایک خاص مقصد کے تحت چاند بھائی کے قبضے سے چھڑا لایا تھا۔ اگر وہ مقصد پورا ہو جاتا تو چاند بھائی عین وقت پر اپنی پوری قوت کے ساتھ حملہ کرتا۔ حاجی عبداللہ سے سب سونا چھین لیتا اور رابعہ کو بھی واپس لے جاتا۔"

"اُس نے رابعہ سے کہا تھا کہ نصف سونا ہمارے مشن کی تکمیل کے لیے دے گا۔"

"لیکن یہ نہیں کہا تھا کہ تم کو بھی اُن کے ساتھ جانے کی آزادی ہوگی۔" میں نے کہا۔ "آخر یہ چاند بھائی رابعہ کو اپنی تحویل میں لینے کے لیے کیوں اتنا بے چین اور مستعد ہے؟"

"رابعہ بتا چکی ہے کہ وہ دلاور کو اپنے خلاف کرنا نہیں چاہتا۔" محسن بولا۔ "اُسے یہ تاثر دینا چاہتا ہے کہ رابعہ قید میں ہے اور درپردہ وہ ہماری مدد کرنا چاہتا ہے۔"

"یہ سب جھوٹ ہے، بکواس ہے۔ یہ اُس نے رابعہ کو بے وقوف بنانے کے لیے کہا ہوگا۔" میں نے طیش میں چلا کے کہا۔ "اصل بات وہی ہے۔ وہ رابعہ کے عشق میں گرفتار ہو چکا ہے مگر جانتا ہے کہ اُسے حاصل کرنا اتنا آسان نہیں۔ وہ رابعہ کو دھوکا دے رہا ہے، یہ اُس کے شاطر ذہن کی چال ہے۔ نہیں چاہیے ہمیں ایسی مدد۔"

"اچھا... چیخنے چلانے سے کیا ہوگا؟" محسن بولا۔

"چل یہ گیلے کپڑے بدل لے۔"

میں چلاتا رہا۔ "ہم نے اُس کی لانچ دیکھی تھی۔ وہ حرامزادہ رابعہ کو تلاش کرتا پھر رہا تھا۔ اُس نے ہماری عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا لیا۔"

محسن کی نظر اب گل بانو کی طرف تھی جو ابھی تربتر کپڑوں میں عرشے پر پڑی ہوئی تھی۔

"اس کے کپڑے کون بدلے گا؟" محسن نے جیسے خود سے سوال کیا اور پھر کریم سے مخاطب ہوا۔ "تم کردو یہ کام۔"

"نیں... صاب ہم کیسے کرے گا... زنانہ لوگ کا کپڑا ہم کبھی بدلی نہیں کیا۔" کریم بلوچ نے بوکھلا کے کہا۔

"چلو آج کرو۔ سمجھو کہ تم ایک ڈاکٹر ہو جسے ایک مریضہ کی جان بچانی ہے۔ اس کے کپڑے نہ بدلے گئے تو اسے ٹھنڈ لگ جائے گی۔" محسن نے اُسے ڈانٹ کر کہا۔

"اس کی جگہ بہن ہوتی تمھاری تو؟"

"اچھا صاب۔ یہ بہت مشکل کام بولا آپ ہم کو۔ خیر، ہم اپنا آنکھ بند کرے گا۔ پردہ آنکھ کا ہوتا ہے۔" وہ جاتے جاتے بڑبڑاتا رہا۔ "وہ بڑا بہن ہے ہمارا مگر... اللہ معافی دیوے ہم کو۔"

نیچے جانے کے بعد میں نے لباس بدلا اور سر کو تولیے سے رگڑ کے خشک کیا۔ میرے ذہن میں ایک طرف مایوسی اپنے پُر اذیت پنجے گاڑ رہی تھی تو دوسری طرف حسد کی آگ تھی جو میرے احساس کو جھلسا رہی تھی۔ میرے خون میں چاند بھائی کے خلاف ایک آتش فشاں کھول رہا تھا۔ آخر وہ کون ہوتا ہے ہمارے معاملات کو اپنے طریقے سے طے کرنے والا۔ اُسے دلاور کی مخالفت سے نقصان کا ڈر ہے اس لیے وہ رابعہ کو اسیر رکھے گا۔ ایک طرف دلاور کو دھوکا دے گا جبکہ دوسری طرف وہ رابعہ کو دھوکا دے رہا ہے۔ دونوں کو بے وقوف بنا رہا ہے۔ دونوں سے حقیقت کو چھپا رہا ہے۔ کاروباری مفاد بھی عزیز ہے اور رابعہ بھی۔ چاہتا ہے کہ نہ مال ہاتھ سے جائے نہ رابعہ۔ رابعہ کی خوشنودی کے لیے تھوڑی بہت مدد اس نے ہماری بھی کردی تو یہ مدد نہیں رشوت ہوگی۔ مدد بے غرض کی جاتی ہے۔ اگر اُس نے دس بیس لاکھ ہمیں دیے تو اس کا مقصد رابعہ کو اور مجھے اس بات کا یقین دلانے کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ وہ ہمارا ہمدرد ہے۔ لعنت اس جیسے ہمدرد پر۔ اس کے دل میں کچھ اور ہے۔ پیسہ اس کے لیے گندے ہاتھ کا میل ہے اور اس سے وہ رابعہ کو اور اس کے اعتماد کو خریدنا چاہتا ہے۔ رابعہ پر ظاہر کرتا ہے کہ وہ کتنا محبِ وطن ہے۔ کتنا فیاض ہے اور کتنا شریف النفس ہے کہ اُس کو تحفظ بھی فراہم کرتا ہے، حالانکہ زبردستی رابعہ کو حاصل کرنا ہر وقت اُس کے اختیار میں تھا اور ہے۔ وہ تو جُوا کھیل رہا ہے۔ ننانوے فیصد یقین کے ساتھ کہ بالآخر میں مارا جاؤں گا۔ میرا مشن تو موت کا مشن ہے اور خودکشی کے مترادف ہے۔ بکرے کی ماں خیر منائے گی تو کب تک۔ بہ فرضِ محال میں ایک فیصد پہ بچ بھی گیا تو وہ خود مجھے ختم کرا دے گا۔

محسن جب دوبارہ میرے پاس آیا تو میں بے حد آزردہ، دل شکستہ اور پریشان تھا۔ میرا دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔

محسن نے گرم کافی کے دو مگ درمیان میں رکھ کے میرے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ "رابعہ کسی سازش کا شکار ہوئی ہے۔ وہ اپنی مرضی سے تو نہیں جا سکتی۔"

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ "وہی سُور کا بچہ چاند بھائی لے گیا اُسے۔"

محسن نے کہا۔ "ہاں، میں بھی اسی نتیجے پر پہنچا ہوں۔ میرا ذہن بھی یہ بات قبول نہیں کرتا کہ کسی طے شدہ پروگرام کے تحت اُس نے اچانک بمبئی جانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ پاگل ہو جاتی تب بھی ایسا نہ کرتی۔"

"یار، اِس ٹکٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ رابعہ کا پروگرام تھا لیکن بیچ میں گڑبڑ ہوگئی اور وہ ہمارے ساتھ آگئی۔" میں نے کہا۔ "مگر اُس کو ذکر تو کرنا چاہیے تھا ہم سے۔"

"وہ ذکر کرتی اگر اُسے معلوم ہوتا۔" محسن نے پورے یقین کے ساتھ کہا۔ "ایسا تو چاند بھائی نے سوچا ہوگا۔ رابعہ کو اُس نے کچھ نہیں بتایا ہوگا۔ مجھے تعجب ضرور ہے کہ وہ اتنی خاموشی سے رابعہ کو کیسے لے گیا۔ ہم نہیں دیکھ رہے تھے تو کیا رابعہ کو بھی پتا نہیں چلا؟ وہ لانچ تک آیا کیسے؟ کسی موٹر بوٹ میں؟ کیا وہ رابعہ کو بے ہوش کر کے اٹھا لے گیا جو رابعہ آواز تک نہ دے سکی کسی کو؟"

"یار محسن، میں اس چاند بھائی کے ٹکڑے کر دوں گا۔ وہ کیوں اتنی دلچسپی لے رہا ہے رابعہ میں۔ کیوں اُسے زبردستی ساتھ رکھنا چاہتا ہے؟ اُس کی نیت خراب لگتی ہے مجھے۔"

"تو پاگل ہو رہا ہے۔"

"ہاں، میں پاگل ہو رہا ہوں۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "میں کب پاگل نہیں تھا رابعہ کے خیال سے۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا محسن۔"

"یار عقل سے کام لے کیا رابعہ پر بھروسا نہیں تجھے؟"

"اس بھروسے کا میں کیا کروں، مجھے رابعہ چاہیے۔" میں نے کہا۔ "رابعہ میری ہے۔ اُسے میرے ساتھ، میرے پاس ہونا چاہیے۔ کوئی مصلحت، کوئی ضرورت ایسی نہیں جس کی خاطر میں رابعہ کی دُوری کا عذاب قبول کر سکوں۔ وہ مجھ سے رابعہ کو چھین لینا چاہتا ہے سُور۔"

"رابعہ کو تجھ سے کون چھین سکتا ہے۔" محسن نے پُرخلوص، پُریقین اور پُراُمید لہجے میں کہا۔

"چھین سکتا ہے وہ۔" میں نے چاند بھائی کو ایک اور غلیظ گالی دی۔ "وہ بہت عیار اور مکار ہے۔ ذہنی مریض ہے۔ رابعہ کے سامنے جھوٹ کو سچ بنا سکتا ہے۔ کسی دن وہ رابعہ کو یقین دلا دے گا کہ سکندر فلاں جگہ یُوں مارا گیا۔ اُس کا ذہن جھوٹے سچے قصے گھڑنے میں ماہر ہے۔ وہ تو ایک دن کا جعلی اخبار تک چھاپ سکتا ہے۔ پاکستان ٹائمز یا دہلی اسٹیٹسمین کی چند کاپیاں چھپوانے میں لاکھوں خرچ نہیں ہوتے۔ پورا اخبار وہی ہوگا۔ صفحہ اوّل کی کسی ایک خبر کو نکال کے وہ میری تصویر اور میرے مارے جانے کی جھوٹی خبر، اے پی پی یا پریس ٹرسٹ آف انڈیا کی جاری کردہ، لگوا سکتا ہے۔ رابعہ کیا جانے ان چکروں کو۔ وہ یقین کرے گی۔"

"رابعہ کبھی یقین نہیں کرے گی۔" محسن کے یقین میں ذرا بھی فرق نہ آیا۔ "وہ چاند بھائی کو بھی جانتی ہے بلکہ اس کے قریب رہ کے زیادہ بہتر طور پر جان چکی ہوگی اور ایسے تمام چکروں سے بھی واقف ہو چکی ہوگی۔ تو کیوں بھول جاتا ہے کہ وہ ایک نامور وکیل تھی اور ہر قسم کے فراڈ، دھوکے بازی، جعلسازی کے واقعات دیکھے ہوئے ہے اور مجھے ایک بات دل پر ہاتھ رکھ کے بتا۔ فرض کر، خدانخواستہ... خدانخواستہ... تو سچ مچ مارا جائے تو کیا رابعہ اسے قبول کرنے پر مر جانے کو ترجیح نہیں دے گی؟ سال دو سال کیا ایک عمر بھی گزر جائے انتظار کرتے، تو کیا وہ تیری واپسی کا انتظار نہیں کرے گی؟"

محسن نے مجھے لاجواب کر دیا۔ میں اُس کی بات کے جواب میں ہاں بھی نہیں کہہ سکتا تھا، نہیں کہنا زیادہ دشوار تھا۔ میں اُفق کے تاریک منظر کو گھورتا رہا جس میں ایک بھی ستارہ روشن نہیں تھا۔ ایک لامتناہی، بیکراں، بے پناہ قوت سے زیر و زبر ہونے والا، تڑپتا، پھنکارتا، پُراسرار، پُرآسیب اور پُرہیبت سمندر تھا جس کی گونج زمین اور آسمان کے درمیان ایک بے رحم ہنسی کی صدائے بازگشت لگتی تھی۔ ہنسی جو میری تیرہ بختی کا نوحہ تھی۔ ساتھ جینے اور مرنے کے سب عہد و پیماں، سارے دعوے اور تمام وعدے فقط خود فریبی کا جال تھے۔ اتنی طویل مسافتِ ہجراں کے بعد رفاقت کی منزل کا پڑاؤ فقط ایک شب کا تھا۔

"اتنا مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔" محسن نے میرے شانے پر نرمی سے ہاتھ رکھا۔ "خبر بُری سہی مگر بے خبری سے بہتر ہے۔ اگر وہ بالواسطہ طور پر اتنا پیغام بھی نہ دیتے کہ رابعہ بمبئی چلی گئی ہے..."

"یار ابھی وہ گئی تو نہیں ہوگی؟" میں نے کہا۔

"پھر تُو کیا اُسے ایئرپورٹ پر جا کے جہاز سے اُتار لائے گا؟ کیا تجھے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ کس ایئرلائن کی کون سی فلائٹ سے کب جائے گی؟" محسن بولا۔ "چاند بھائی جیسے شخص کے لیے کچھ بھی ناممکن نہیں۔"

"لیکن رابعہ اُس کے ساتھ گئی تو ایک بات بہرحال واضح ہو جائے گی کہ وہ خود بھی رضامند تھی۔ کسی کو اغوا کر کے زبردستی ہوائی جہاز میں نہیں لے جایا جا سکتا۔ رابعہ کوئی دودھ پیتی بچی، بزدل یا نادان نہیں ہے۔"

"ارے بھائی، عورت ذات تو ہے اور کمزور بھی ہے کیونکہ اُسے تیری زندگی اور اپنی محبت کے نام پر بلیک میل بھی کیا جا سکتا ہے۔ فرض کر آج شکاری مجھے گرفتار کر لیں اور پھر شہلا سے کہیں کہ محسن کی خاطر قربانی دو، ورنہ ہم اُسے گلے میں پٹا ڈال کر کتوں کی طرح رکھیں گے کسی اندھے تہ خانے میں، روز اُسے کوڑے مارے جائیں گے اور کھانے کو دی جائے گی غلاظت، یہاں تک کہ ایک دن وہ مر جائے گا مگر نہ جانے کتنے کوڑے اور کتنا کوڑا کھا کے۔ بصورتِ دیگر وہ آرام سے رہے گا۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ شہلا وہ عورت ہے جو ہر قربانی دینے کے لیے تیار ہو گی۔ اُسے کہیں گے نوکرانی بن کے رہو، بھیک مانگو یا کوٹھے پر بیٹھو، وہ سب کرے گی۔"

میں محسن کو دیکھتا رہا۔ اُس کا محبت پر یقین کتنا پختہ، مکمل اور ناقابلِ شکست تھا اور کتنا حقیقت پسندانہ تھا۔

"تُو ٹھیک کہتا ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے بھی جینا ہی پڑے گا۔ اس کو پھر پانے کے لیے جھوٹی اُمید کا سہارا قبول کرنا ہی ہو گا۔ کاش، ایسا ہو سکتا محسن کہ میں بالکل مایوس ہو جاتا۔ مجھے یقین آ جاتا کہ اب اس دنیا میں، اس زندگی میں پھر اس سے ملاقات کا ایک فیصد امکان بھی نہیں رہا، تو پھر زندہ نہ رہنا میرے اختیار میں ہو جاتا، میرے لیے مرنا کتنا آسان ہوتا۔"

"میں ذرا ناگ منی کو دیکھ آؤں۔" وہ بولا۔

اس کی غیر حاضری کے مختصر وقفے میں میرے خیالوں نے مجھے پھر پریشان کیا۔ مجھے وہ روح فرسا مناظر دکھلائے جو میری رگوں میں لہو کو منجمد کرتے تھے۔ چشمِ تصور سے میں نے رابعہ کو دیکھا۔ وہ کسی ایئرلائن کی فرسٹ کلاس میں چاند بھائی کے ساتھ بیٹھی ہے۔ وہ ایک چمکتی دمکتی شاندار لیموزین میں بیٹھی بمبئی کی سیر کر رہی ہے، جوہو کے ساحل پر، تاج میں، میرین ڈرائیو پر۔ وہ شاپنگ کر رہی ہے جیولری شاپس میں، سپر اسٹورز میں۔ مسٹر اینڈ مسز چاند بھائی۔ وہ فلم انڈسٹری کا ایک بڑا نام ہے۔ سکندر بخت ایک بھولا بسرا نام۔ ۔ ۔ سمن آباد کا وہ گھر سنسان پڑا ہے جس کو سکندر اور رابعہ نے پھر سے آباد کرنے کا خواب دیکھا تھا۔ وزیر خاں کی روح اس میں تنہا بھٹکتی پھرتی ہے مگر اُس کی پکار سننے والا کوئی نہیں۔

محسن میرے قریب آ کے بیٹھا اور اس نے مجھے میرے کندھے پکڑ کے جھنجوڑا تو میں بُری طرح چونکا۔

"یہ کیا ہے؟ تُو پاگل ہو جائے گا سچ مچ۔" محسن نے کہا۔ "چل نیچے۔ میں خواب آور گولیاں دیتا ہوں تجھے، کچھ دیر سو جا۔ تجھے نیند کی ضرورت ہے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں سونا نہیں چاہتا۔ گل بانو کیسی ہے؟"

"ٹھیک ہے۔ پہلے کافی پلا دی تھی اور اسپرین دے دی تھی اور اب اُسے بھی نیند کی گولیاں زبردستی کھلا کے آیا ہوں۔" وہ بولا۔

"مجھے ایک سگریٹ دے ۔۔۔" میں نے کہا۔

"اُسے کیا ہوا تھا کہ پانی میں کود گئی تھی؟"

"ابے یار، مصیبت گلے پڑ گئی ہے میرے۔" محسن نے مجھے ایک سگریٹ سلگا کے دی۔ "کہہ رہی تھی کہ تم لوگوں کے ساتھ میں بھی چلوں گی۔ میں نے کہا کہ یہ ناممکن ہے، عورتوں کا اس مشن میں کیا کام۔ وہ بولی کہ رابعہ کیا مجھ سے زیادہ مرد ہے؟ میں نے تو مرد بن کے نہ جانے کتنے ڈاکے ڈالے ہیں۔ مجھے بتاؤ کبھی اُس نے مردوں کے ساتھ مرد بن کے کوئی تیر مارا ہے؟ میں تو اپنے بھائی کے ساتھ جب بھی جاتی تھی، مردانہ لباس میں، پگڑی باندھ کے اور ایسی ہی مردانہ شلوار قمیص پہن کے جیسی تم نے پہن رکھی ہے۔ ایک بار تو میں نے بال بھی کٹوائے تھے، کیپ لگا کے اور پتلون قمیص پہن کے پھرتی تھی۔ گاڑی لے کر سیر کو جاتی تھی، سگریٹ پیتی تھی۔ بھیا اُن دنوں روپوش تھے، ہر کام میرے سپرد تھا۔ میری زنانہ آواز پر لوگ مسکراتے ضرور تھے مگر یہ کون سی غیر معمولی بات ہے۔ بہت سے مردوں کی آواز میں نسوانیت ہوتی ہے اور بہت سی عورتیں مردانہ آواز میں بات کرتی ہیں۔ شک کبھی کسی نے نہیں کیا۔ میں اب بھی اسی طرح تمھارے ساتھ جا سکتی ہوں۔"

"پھر تُو نے کیا کہا؟ انکار کر دیا؟"

"اقرار کیسے کر لیتا؟" محسن بولا۔ "ابھی تو رابعہ کے بارے میں بھی طے نہیں تھا کہ ہمارے ساتھ جائے گی یا ابراہم شیخ کے پاس رہے گی لیکن بھائی، اِس گل بانو سے خدا سمجھے۔ میری ایک سننے پر تیار نہیں تھی۔ کہنے لگی، مجھے ایسی ویسی مت سمجھنا۔ ڈاکوؤں کے درمیان رہتی تھی۔ اپنے ہاتھ سے دو کو میں نے خنجر گھونپ کے مار ڈالا جو مجھ پر بُری نظر رکھتے تھے۔ ایک حد سے بڑھ گیا تھا۔ اُس کی تو میں نے آنکھیں نکال دی تھیں۔ غصے نے پاگل کر دیا تھا مجھے۔ بعد میں مجھے اُس پر ترس آیا کہ ایسے وہ کیسے جیے گا۔ میں نے اُسے مار دیا اور ویسے جو واردات میں مقابلہ کرتے ہوئے یا فرار ہوتے ہوئے اپنی جان بچانے کے لیے میری گولی کا نشانہ بنے اُن کی تعداد کا مجھے علم نہیں۔ تمھاری رابعہ کر سکتی ہے یہ سب کچھ؟ بس مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے کہا کہ اپنا اور رابعہ کا مقابلہ مت کرو، وہ ایک نامور وکیل تھی۔ ایک باعزت اور شریف عورت تھی۔ بس اسی بات پر وہ چلانے لگی کہ اچھا میں بے عزت ہوں، مجرم ہوں، ڈاکو ہوں تو مجھے مر جانے دو، ساتھ کیوں لائے تھے مجھے۔ پولیس کے حوالے کر دیتے اور پھر پانی میں کود گئی۔ عجیب طوفانی چیز ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اُس کا کیا ہو گا۔"

"ہمارے سامنے دو ہی صورتیں ہیں۔" میں نے کہا۔ "یا تو اُسے قانون کے حوالے کر دیں یا۔ ۔ ۔"

"میں اس کے حق میں نہیں ہوں۔ وہ اپنی مرضی سے مجرم نہیں بنی تھی اور اُسے ایک موقع ملنا چاہیے۔" محسن نے احتجاج کیا۔

میں نے کہا۔ "تو پھر دوسری صورت یہ ہے کہ ہم اُسے بھی ساتھ لے جائیں۔ اس کی زندگی کا راستہ بدل جائے گا۔ تخریب کی صلاحیت تعمیر میں کام آئے گی تو اس کے وجود میں دبی ہوئی نیکی کا جذبہ پھر زندہ ہو گا۔ صرف نام بدلنے سے کچھ نہیں ہو گا۔ ناگ منی کو گل بانو بننے کے لیے اپنے ماضی کے دامن سے ہر داغ کو مٹانا ہو گا۔"

"میں اسے پسند تو نہیں کرتا لیکن مخالفت بھی نہیں کر سکتا کہ اُسے یہاں حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے۔" محسن بولا۔ "بس مجھے شہلا کے خیال سے خوف آتا ہے کہ وہ کتنے صبر و شکر کے ساتھ اپنی قیدِ تنہائی کاٹ رہی ہے۔ زندگی سے اکیلی لڑ رہی ہے جب کہ مجھے اس کا ساتھ دینے کے لیے اُس کے ساتھ ہونا چاہیے۔ مجھے ہر رات اُس کا خیال آتا ہے اور میں سوچتا ہوں کہ کیا اس وقت وہ بھی مجھے یاد کر رہی ہو گی؟ اپنے بچے سے کہہ رہی ہو گی کہ بیٹا، شاباش! ہاتھ اُٹھا کے دعا کرو۔ 'اللہ میاں، ابو کی مدد کر، انھیں دشمنوں کے خلاف جہاد میں کامیاب کر، اُن کی حفاظت کر، انھیں جلد ہمارے پاس لے آ۔' دن تو کٹ ہی جاتا ہے یار۔ رات بڑے خوف اور اندیشے اور اُمیدوں کے خواب لے کر آتی ہے۔"

"تو ایسا کر، کل اُن سے بات کر لے۔" میں نے اُسے جذباتی ہوتے دیکھ کر کہا۔

"میں۔ ۔ ۔ ہاں۔ ۔ ۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ اس قربانی کا صلہ شہلا کو ایسی خبر کی صورت میں تو نہیں ملنا چاہیے نا کہ اُس کا مجازی خدا، اُس کا شریکِ زندگی، اس سے چاہت کے عہد و پیماں رکھنے والا محسن کسی اور سے دل لگا بیٹھا ہے۔ عورت ذات تو بے وفائی کی خوشبو کو پہچانتی ہے خواہ بات کتنی بے بنیاد کیوں نہ ہو۔ وہ بات سن ہی نہیں سکتی جس سے اُس کی محبت کی اہانت ہوتی ہو یا اُس کے حقِ ملکیت پر زد آئے۔"

"مجھے معلوم ہے۔ یہ سب میں جانتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس کے ساتھ ہی میں شہلا کو بھی جانتا ہوں۔ میں اُسے سمجھا سکتا ہوں۔ رابعہ، غالب اور نازو، ہم سب بتا سکتے ہیں کہ حقیقت کیا تھی۔"

"حقیقت!" محسن مسکرایا۔ "کون سی حقیقت؟ تم عقل سے کام لو گے اور وہ جذبات کی کسوٹی پر پرکھ کر انھیں مسترد کر دے گی۔ تم پر بھی جانبداری کا الزام آ جائے گا کہ تم طرفدار ہو، غالب کے سخن فہم نہیں۔"

شاید وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ عورت کا دل نہ جانے کون سا شیشہ ہوتا ہے کہ کبھی تھوڑے سے پیار بھرے جذبات کی حدت سے پگھل جاتا ہے، کبھی محبت کے سمندر کی سر پٹختی لہروں کے مقابل ہو تو پتھر کی ناقابلِ تسخیر چٹان بن جاتا ہے، دردِ فرقت اور سختیِ ایام کے شدید ترین صدمات جھیل سکتا ہے مگر شک کی بادِ سموم کے خفیف سے جھونکے کی تاب نہ لائے تو چٹخ جاتا ہے۔

محسن نے کچھ دیر بعد کہا۔ "دیکھ یار سکندر، میری مان، تھوڑا سا آرام کر لے۔ یوں سوچتے رہنے سے تو کوئی بھی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ دن میں بہت سے کام ہوں گے اور رات کا کچھ بھروسا نہیں کہاں گزرے، کیسی گزرے، ہم نہ جانے کہاں ہوں۔"

میں نے اب اس کے اصرار پر سرِ تسلیم خم کر دیا اور ہم نیچے آ گئے۔ رابعہ کے کیبن میں اس کی جگہ خالی پڑی تھی۔ دوسرے تختے پر گل بانو مدہوشی و بے ہوشی کی نیند میں بے سدھ پڑی

تھی۔ میں پل بھر کے لیے کیبن کے دروازے میں رُکا کیونکہ رابعہ کی خوشبو دامن گیر ہوگئی تھی۔ پھر محسن نے مجھے کھینچ لیا۔

اُس نے مجھے دو خواب آور گولیاں دیں اور اس وقت تک میرے سر پر سوار رہا جب تک میں نے انھیں حلق سے نہیں اُتار لیا۔ پھر خود اُس نے بھی ایک گولی کھائی اور ہم آمنے سامنے دیواروں کے ساتھ بنے ہوئے تختوں پر لیٹ گئے۔ آہستہ آہستہ میرے جذبات کا آتش فشاں سرد پڑنے لگا تھا۔ یہ بات تسلیم کر لینے کے بعد کہ رابعہ کو صرف چاند بھائی ہی لے جا سکتا تھا، میرے دل کو کچھ قرار آگیا تھا۔ اگر میرے لیے ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں تو پھر یونہی سہی مصلحت یا مجبوری کے تحت اسے بمبئی جانا پڑا تو یہ وقت کی ایک چھوٹی سی خلیج ہے۔ راستے الگ ہوگئے تو کیا، منزل تو وہی ہے اپنی۔ یہ چار دن کی جدائی تو کوئی بات نہیں۔

آنکھیں بند کرتے ہی رابعہ کے خیال سے دل نے کہا، "میں تو تم کو کراچی میں ڈاکٹر جھنگی والا یا اکرام شیخ کے پاس چھوڑ کے جانا چاہتا تھا، تم پہلے ہی مجھے چھوڑ گئیں۔"

اُس نے کہا، "پاگل ہو تم بھی۔ تمھارے پاس ہی تو ہوں میں۔ مجبوری کو دوری کیوں سمجھتے ہو۔ میں نے اسی لیے اپنے خط میں وضاحت کر دی تھی۔"

میں نے کہا، "کون سے خط میں۔ ۔ ۔؟"

"اُس خط میں جسے تم چیونگم کی طرح کھا گئے تھے۔"

وہ ہنسی اور غائب ہوگئی۔

"واقعی" میں نے خود سے کہا "سب کچھ تو سمجھا دیا تھا اس نے۔ چاند بھائی کو میں نے رقیب بنا لیا ہے۔ جو تمھارا رازداں اپنا۔ رابعہ سے دوری کیا جب اس کے میرے درمیاں ہیں فاصلے خیال کے اور خیال بے وجود ہے۔ لہروں کی سرگوشی ایک گیت بن گئی۔ کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں، کب ہاتھ میں تیرا ہاتھ نہیں، صد شکر کہ اپنی راتوں میں اب ہجر کی کوئی رات نہیں۔ یہ گیت سکون بن کے میرے رگ و پے میں اُتر گیا۔

دن کے اُجالے کے ساتھ بہت سی مانوس آوازوں نے مجھے بیدار کیا۔ میں نے رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی تو مجھے احساس ہوا کہ میں آٹھ گھنٹے کی نیند پوری کر چکا ہوں۔ اب ساڑھے گیارہ بج رہے تھے گویا دوپہر ہونے والی تھی۔ مجھے رابعہ کا خیال آیا کہ وہ اس وقت بمبئی میں ہوگی۔ چاند بھائی کے ساتھ تاج محل کے کسی سوئیٹ میں ؟ یا کسی شاہانہ لیموزین میں مع ڈرائیور۔ رشک اور حسد کے جذبات نے پھر میرے دل کو جلایا مگر میں نے ان فضول خیالوں کو ذہن سے جھٹک دیا۔ مشکل یہ تھی کہ دل کے جذبات کو عقل کی دلیل راس ہی نہ آتی تھی اور جذبات پر قدغن لگانا ہوا کو زنجیر پہنانے سے زیادہ مشکل کام تھا۔

ادپر آ کے میں نے گل بانو کو دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ کل رات کی سمندر کے غلیظ پانی میں ڈوب کے نکلنے والی اور میرے سامنے موجود گل بانو میں اتنا ہی فرق تھا جتنا خزاں کی شام اور بہار کی صبح میں ہوتا ہے۔ جو رُت جھڑ میں سوکھ جانے والے پتے اور موسمِ گل کے پہلے شگوفے میں نظر آتا ہے۔ اب وہ بہت پُرسکون تھی۔ اُس نے نہا دھو کے کپڑے بدلے تھے۔ رنگِ رخسار پہ ہلکا سا غازے کا غبار، ہونٹوں پر لپ اسٹک کا گلابی رنگ شانوں تک تراشے ہوئے ہوا کے ساتھ لہرا کے اُڑتے ہوئے سنہرے مائل بھورے بال جو پہلے میل سے چپکے ہوئے تھے مگر دُھل کے ریشم کی طرح ہو گئے تھے۔ انھیں اس نے ایک گلابی ربن میں یوں قید کیا تھا کہ وہ چہرے پر نہ آئیں۔ اس کی قدرے سبز اور بھوری آنکھوں میں غرورِ حسن کی شوخی تھی اور اداؤں میں نیا بانکپن۔

اُس نے رابعہ کے کپڑے پہنے تھے، جالی کی آستینوں والی سیاہ قمیص، سیاہ و سفید دھاری دار کپڑے کی شلوار اور دوپٹہ۔ اس نے میک اپ کا سب سامان بھی رابعہ ہی کا استعمال کیا تھا۔ راتوں رات وہ ایک مکمل عورت بن گئی تھی۔ وہ جو ناگ منی تھی اور ناگن سے زیادہ خطرناک تھی۔ جو ڈاکوؤں کے ایک گروہ میں شامل تھی، فراٹے سے گالیاں بکتی تھی اور مردوں کی طرح سگریٹ بھی پیتی تھی، جسے یہ احساس نہیں تھا کہ وہ کتنی حسین ہے۔ اُس نے نئی زندگی کے سارے حسن کو اپنا لیا تھا اور اُس کا یہ نیا تابناک روپ محسن کی نگاہوں کو بھی خیرہ کر رہا تھا مطمئن اور مسرور نظر آنے کے باوجود وہ مضطرب تھا۔ اس خیال سے کہ گل بانو نے اس پر اپنی قوتِ تسخیر آزمانے کے لیے یہ سب تیاری کی تھی۔

میرے قدموں کی آہٹ پر انھوں نے پلٹ کر دیکھا گل بانو کی نظر نے از خود مجھ سے پوچھا: "بتاؤ میں کیسی لگ رہی ہوں؟"

میں نے کہا، "گل بانو! رات پھر ڈاکا ڈالا تھا؟"

اُس کی مسکراہٹ کی شوخی کافور ہوگئی۔

"راتوں رات یہ کس کے حسن کا خزانہ لوٹ لائی ہو؟" میں نے ستائش میں پرستش کا انداز نمایاں کر کے کہا۔

وہ کھلکھلا کے ہنس پڑی۔ دل کے اندر سے پھوٹنے والی سچی خوشی سے بھرپور اُجلی اور کھنکتی ہنسی "تم سو کے اٹھے ہو نا۔ محسن کو تو ایسی کوئی تبدیلی محسوس نہیں ہوئی۔"

یہ شکایت کا ایک محبوبی انداز تھا جس نے محسن کو نروس کر دیا۔ میں نے کہا "پھر یہ کالا نشان کس نے بنایا ہے تمھیں نظرِ بد سے بچانے کے لیے؟"

"یہ؟ ۔ ۔ ۔ یہ تو تل ہے۔" وہ پھر ہنسی اور اُس نے یوں گال پر انگلی رکھی کہ مجھے محسن پر ترس آنے لگا۔ آخر وہ کب تک بچے گا اور کیسے بچے گا حُسن اور ادائے حسن کی اس بے باک پیش قدمی سے۔"

"یار، یہ بالکل رابعہ نہیں لگتی؟" محسن نے کہا۔ "اگر بال اتنے ہی لمبے ہوتے۔"

"وہ تو میں نے بتایا تھا کہ ایک بار کٹوانے پڑے تھے۔" وہ اُڑتے بالوں کو نازک انگلیوں سے سمیٹ کر بولی۔

"رابعہ، ۔ ۔ ۔ ہاں، لگتی ہے۔" میں نے گل بانو کا دل رکھنے کے لیے کہا۔ میں حیران بھی ہوا کہ مجھے وہ رابعہ جیسی کیوں نہیں لگتی جو محسن کو اسی کی طرح نظر آتی ہے۔ یہ بات وہ پہلے بھی کہہ چکا تھا شاید اس لیے کہ وہ اسے جذبات کے بغیر دیکھتا تھا۔ میں نے سوچا کہ مجھے رابعہ کے حسن میں اپنے جذبات کا جو رنگ نظر آتا ہے وہ اُس کے حسن کو سب سے جدا، سب سے منفرد اور بے مثال کر دیتا ہے۔ کوئی اور مجھے رابعہ جیسی کس طرح نظر آسکتی ہے جب کہ وہ رابعہ نہیں۔

ناشتے سے فراغت کے بعد میں نے اور محسن نے اپنا لباس بدلا اور کیپٹن کریم بلوچ کے لائے ہوئے کپڑے پہن لیے۔ معلوم نہیں کس نے اپنی پرانی وردیاں یوں بیچ دی تھیں کہ ان پر سارے بیج اور مونوگرام بھی لگے رہ گئے تھے۔ وردیاں میلی تھیں اور استری کے بغیر تھیں لیکن کپڑا زیادہ پرانا نہیں تھا۔ میں اور محسن کسی غیر ملکی جہاز کے نچلے درجے کے ملازم نظر آنے لگے تھے۔ یہ نیلے رنگ کی وردیاں تھیں اور ان کے شولڈرز پر پیتل کے حروف میں "سی فاکس" لکھا ہوا تھا جس کا مطلب "سمندری لومڑی" ہوتا تھا۔ یہ کوئی انگلش یا امریکن جہاز بھی ہو سکتا تھا۔ کینیڈا، آسٹریلیا، ہندوستان، پاکستان میں اور جہاں بھی انگریزی بولی جاتی تھی، یہ نام استعمال کیا جا سکتا تھا۔ یہ تصدیق کرنا ناممکن تھا کہ سمندری لومڑی کوئی چھوٹی سی موٹر بوٹ تھی، کوئی لانچ تھی یا تجارتی جہاز۔ وردی کی جیب پر جہاں پہننے والا نام کا بیج لگاتا ہے صرف پن لگی رہ گئی تھی۔ مگر وردی پہننے کے بعد ناموں کی آدھا انچ چوڑی اور دو ڈھائی انچ لمبی پٹیاں بھی جیب میں سے برآمد ہوئیں۔

"یہ وردی تو ہے کسی موصوف یا مرحوم جلدیپ آرمینڈس کی ـــــ" میں نے کہا۔ "یہ کس خطے کا نام ہے بھلا؟"

"جل دیپ اور مینڈس،" محسن نے کہا "یہ تو سری لنکا، ماریشس، مالدیپ برانڈ نام ہے اور خاکسار ہوا 'الیوسف پور بیو یا پور یو بیو'" اُس نے اپنا نام پڑھا۔ میں نے محسن سے اتفاق کیا کہ یہ انڈونیشیا، ملائشیا ٹائپ نام ہے۔

"جل دیپ کوئی ہندو ہو سکتا ہے یا کرسچین اور الیوسف تو شاید مسلمان ہو" میں نے کہا "لیکن فرض کرو یہ دونوں حضرات ہمیں کہیں مل جائیں"۔

"اپنی وردی تلاش کرتے ہوئے" محسن بولا۔ "کیا پتا انھوں نے خود ہی وردی بیچ کھائی ہو۔ یہ کیپ تو مجھے الیوسف پور بیو کی نہیں لگتی۔ کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا۔"

میں نے اپنی کیپ اس کے سر پر رکھ دی۔ "یہ مجھے ذرا تنگ تھی اور اس طرح ہم ٹوپی بدل بھائی ہو گئے ہیں۔ دوپٹہ بدل بہنوں کی طرح۔"

"ٹوپی کو مردانہ دوپٹہ کہا جا سکتا ہے" محسن بولا "دونوں سر ڈھانپنے کے کام آتے ہیں۔ کیا خیال ہے اب چلیں؟"

محسن نے اقرار میں سر ہلایا۔ "کیپٹن کریم بلوچ! ہماری واپسی تک شادی، خودکشی، مے کشی کچھ مت کرنا۔"

"کم سے کم ایک آنکھ کھلی رکھنا مگر اس سے چاروں طرف دیکھتے رہنا۔ سپردم بتو مایۂ خویش را" میں نے کہا۔

کریم بلوچ کا مُنہ کھل گیا۔ "کیا بولتے آپ صاب؟"

"مطلب یہ کہ چاند سی بتواب تیرے حوالے" محسن بولا۔

"چاند سی بانو" میں نے تصحیح کی اور گل بانو کا چہرہ دمک اُٹھا۔

"لوٹ کر کب آؤ گے؟" اُس نے محسن کی طرف دیکھا۔

محسن نے صحیح عاشقانہ انداز میں سینے پہ ہاتھ رکھا اور آگے جھک گیا "جب بھی تم بلاؤ گی۔"

"میں کیوں بلاؤں گی" گل بانو شرما کے ہنسی "میں تو کہتی ہوں جاتے ہی کیوں ہو۔"

معلوم نہیں محسن کے دل پر کیا بیتی۔ مجھے تو اُس بچے نے متوجہ کر لیا تھا جو چھلانگ مار کے لانچ پر آگیا تھا۔ وہ بارہ تیرہ سال کا غریب اور غلیظ بچہ تھا۔ میلی صورت، میلے

کپڑوں اور میلے بالوں والا۔ وہ بچہ جس کا لاوارث بچپن زمانے کی ٹھوکروں میں رہتا ہے، جسے نہ کسی گھر کی چھت کا سایہ ملتا ہے اور نہ کسی سے پیار کا تحفظ۔ وہ مزدور پیشہ یا گداگر کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

"اے، کون ہو تم؟" میں نے محتاط ہو کے کہا "کیا بات ہے؟"

"ہم چٹھی لایا ہے۔" اُس نے ایک براؤن رنگ کا لفافہ بڑھا کے کہا۔

"کس کے لیے؟" میں نے کہا۔

"اپن نام نہیں جانتا۔ دس روپیہ دو اور چٹھی لے لو۔" وہ بولا۔

میں نے جیب میں سے دس کا نوٹ نکالا۔ "اچھا بھئی، یہ لو۔" میں نے نوٹ بڑھا کے کہا۔ وہ خاصی بے خوفی سے آگے آیا۔ اُس نے ایک ہاتھ سے لفافہ آگے بڑھایا اور دوسرے سے نوٹ لینے کی کوشش کی مگر میں نے اس کی کلائی کو گرفت میں لے لیا۔ اُس نے ہاتھ چھڑانے کے لیے واجبی سا زور لگایا۔ پھر مزاحمت ترک کر دی۔

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، مت دو دس روپیہ۔ یہ لو اپنا چٹھی، ابھی جانے دو میرے کو۔" وہ بولا۔

"نہیں، ایسے نہیں بیٹے۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "مجھے معلوم ہے کہ جس نے بھی تم کو چٹھی دی ہوگی اُس نے تمھیں اس کام کا معاوضہ بھی دیا ہوگا۔ تم چالاکی سے دس روپے اور اینٹھنا چاہتے تھے۔ دس روپے کی کوئی بات نہیں۔ میں اپنی خوشی سے تم کو انعام میں دے سکتا ہوں لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ لفافہ کس نے دیا تھا؟"

"ہم نہیں جانتا صاب۔ ماں قسم، ہم کبھی نہیں دیکھا اس کو۔" لڑکے نے عاجزی سے کہا۔ "ہم ادھر کھڑا تھا۔ وہ ہم کو دس روپیہ دیا اور بولا کہ وہ ادھر سامنے لانچ پہ چٹھی دے کر آؤ۔"

"کس کو؟" میں نے لفافہ چھین کے دیکھا مگر اس پر کوئی بھی نام یا پتا نہیں تھا۔

"بس وہ بولا کہ اس لانچ پر دے آؤ۔" لڑکا اب کچھ خوف زدہ نظر آنے لگا تھا۔ اُس نے اپنی عمر سے زیادہ چالاک بننے کی کوشش کرتے ہوئے ہم سے دس روپے ٹھگنے چاہے تھے مگر اب اُسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ دس روپے بھی مہنگے نہ پڑ جائیں جو ایڈوانس معاوضے کے طور پر کسی نامعلوم شخص نے دیے تھے۔

میں نے لفافہ محسن کو دیا کہ کھول کر دیکھے مگر احتیاط کے ساتھ۔ سائنس اتنی ترقی کر گئی ہے کہ نامۂ اجل مقتول کے لیے ڈاک سے بھی ارسال کر دیا جاتا ہے۔ کھولتے ہی دھماکا ہوتا ہے یا کسی مہلک گیس کا اخراج اور تمت بالخیر۔

محسن نے خاصے بڑے لفافے میں سے ایک اتنا چھوٹا سا پُرزہ برآمد کیا کہ مجھے "کھودا پہاڑ نکلا چوہا" والی کہاوت یاد آئی۔ محسن نے پُرزے کو بغور ملاحظہ کیا اور اس پہ مزید غور فرمانے کے بعد اُس فلسفی کی طرح سر ہلایا جس نے اپنی عقل و دانش سے کائنات کی کسی پیچیدہ گتھی کو سلجھا لیا ہو۔

"ڈیئر نامہ بر!" محسن نے پرچی مجھے تھما کے کہا "تم اُس کا حُلیہ تو بتا سکتے ہو جس نے یہ خط دیا تھا؟"

لڑکے نے سر ہلایا اور کچھ سوچ کے بولا "کوئی مچھیرا تھا، بلوچی میں بات کیا۔ آپ سے تھوڑا کم لمبا۔ ہم سے غلطی ہوا تو ہم کو معاف کرو۔ وہ چٹھی دے کر بھاگ گیا۔ بولتا تھا 'صاب نہیں ہو دیں گا تو ایک میم صاب ہو دیں گا۔ ایک دم نیلو کا مافک خوب صورت۔'" اُس نے ناگ منی کی طرف اشارہ کیا "اس کو دے دینا چٹھی۔"

میں نے اُسے دس کا نوٹ دیا۔ "یہ لو شاباش۔ تم بہت اچھے لڑکے ہو۔ پھر کبھی کوئی کام ہو، کسی چیز کی ضرورت ہو تو آجانا اور وہ آدمی پھر نظر آئے تو بتانا۔"

"نام کیا ہے تمھارا، کہاں رہتے ہو؟" گل بانو نے کہا۔

"اللہ بھلا کرے آپ کا صاب۔" اُس نے دس کا نوٹ جیب میں رکھ کے پیشہ ور گداگروں کے لہجے میں کہا۔ "اللہ سکھی رکھے آپ کو میم صاب... اللہ آپ کا ہر مراد پورا کرے۔"

میں نے اُسے چھوڑ دیا تھا، اگر محسن اس کے پیچھے نہ ہوتا تو وہ گل بانو کے سوال کا جواب گول کر کے بھاگ جاتا۔

لڑکے نے کہا "اپن چھوٹو ہے صاب... اپن ادھر ہی رہتا ہے۔ ابھی اپن جاتا ہے۔" وہ تیزی سے پلٹا اور محسن کے ہاتھ کے نیچے سے نکل گیا۔ پلک جھپکتے میں وہ لانچ پر سے ایک کشتی میں کودا اور غائب ہو گیا۔ اس نے ایک بار بھی پلٹ کے نہیں دیکھا۔

"اب ہم بھی چلتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"کیا تھا اس خط میں؟ مجھے نہیں بتاؤ گے؟" گل بانو نے کہا۔

میں نے وہ پُرزہ اُس کی طرف بڑھا دیا جس پہ لکھا ہوا تھا "ایل ای ڈبل سیون ڈبل فور زیرو" اور اس کے بعد "ڈی ای پی — ایچ ڈی ڈبل وَن تھری زیرو۔"

"یہ کیا؟ کیا مطلب ہے اس کا؟" گل بانو حیران ہو کے بولی۔

میں نے محسن کی طرف دیکھا۔ "تو کچھ سمجھا؟"

محسن نے نفی میں سر ہلایا "شاید کسی نے مذاق کیا ہے۔"

"اور تم نے خوش ہو کے دس روپے دے دیے۔ مذاق تم کو پسند آیا۔" گل بانو نے تلخی سے کہا "صاف کیوں نہیں کہتے کہ بتانا نہیں چاہتے۔"

"کمال ہے بھئی۔ چھپانا ہوتا تو تمھیں یہ بھی کیوں دکھاتے۔" میں نے کہا۔

"خواہ مخواہ کی بدگمانی اچھی بات نہیں ہے۔" محسن نے میری تائید کی "اگر تم کچھ مطلب نکال سکتی ہو تو ہمیں بھی بتاؤ۔"

ہم نے اُسے خاموش تو کر دیا مگر وہ مطمئن نہیں ہوئی تھی۔ ہمارے روانہ ہونے تک اُس کا چہرہ بُجھا بُجھا سا رہا۔ پھر محسن نے نفسیاتی داؤ آزمایا۔

"مسکرا کے رخصت نہیں کرو گی تو یہ کوئی اچھا شگون نہیں ہوگا۔ معلوم نہیں دن کیسا گزرے۔" محسن نے آہ بھر کے کہا۔

گل بانو کی خفگی دُور ہو گئی۔ "جلدی آجانا۔" وہ مسکرا کے بولی۔ "تم بھی ذرا محتاط رہنا، زمانے کی نظر نہ لگ جائے۔" محسن بولا۔

میرے کندھے پر بیگ تھا۔ اس میں ایک تو دوربین تھی۔ دوسرا وہی ڈائریکٹ کنکشن والا پورٹیبل فون تھا جس کا استعمال ہم نے مدت سے نہیں کیا تھا۔ باقی اَلَم غَلَم صرف بیگ بھرنے کے لیے تھا مثلاً اس میں نوٹ بک اور قلم، کنگھا، برش، شیونگ کا سامان اور سلیپر تھے۔ یہ سب اس لیے تھا کہ کوئی ہم سے کہیں بھی بیگ دکھانے کو کہے تو اس میں کوئی چیز قابلِ اعتراض نہ ملے۔ سیکورٹی والے بعض مقامات پر زیادہ حسّاس ہوتے ہیں۔ بیگ میں تین سو روپے پاکستانی کرنسی میں اور تیس ڈالر بھی صرف اس لیے رکھے تھے کہ کوئی بطور رشوت وصول کرنا چاہے تو رکھ لے۔ ہم معترض نہ ہوں گے۔ پھر اصل اسباب ہمارے پاس محفوظ رہے گا۔ ایک ایک ریوالور جسے ہم نے بشرٹ کے نیچے اور پتلون کی بیلٹ کے بھی نیچے چھپایا تھا۔ ایک ایک ہزار روپے پاکستانی کرنسی میں جو ایک پیر کی جراب میں تھے اور پانچ پانچ سو ڈالر دوسرے پیر کی جراب میں۔ ڈالر ہم نے آج پہلی بار نکالے تھے۔ اب تک وہ ساری کرنسی جو ہمیں ایک سوٹ کیس میں بھری ہوئی ملی تھی، لانچ کے خفیہ خانوں میں محفوظ پڑی ہوئی تھی۔

"تُو نے وہ معمّا حل کر لیا تھا؟" میں نے بندرگاہ کے علاقے سے گزرتے ہوئے فرنچ میں بات کرنا مناسب سمجھا۔

"کسی حد تک۔" محسن بولا۔ "ایک ٹرک جس کا نمبر ایل ای سیون سیون فور فور زیرو ہے۔ یہ لاہور کا نمبر ہے۔"

"نمبر کسی گاڑی کا ہے۔ تُو نے ٹرک کیوں فرض کر لیا؟"

"ہمارا واسطہ ٹرکوں سے ہی پڑتا ہے۔" محسن نے سر کھجا کے کہا۔ "آگے ڈی ای پی کا مطلب تو خیر ڈیپارچر ہوا، یعنی کہ روانگی۔ اس کے بعد کیا ہے، کچھ آپ بھی ارشاد فرمائیے۔"

"آگے احقر کی ناقص عقل میں یہ آتا ہے کہ روانگی کا وقت اور مقام بھی بتایا گیا ہے۔" میں نے کہا۔ "ایچ ڈی کو میں حیدرآباد فرض کر لوں تو ڈبل وَن، تھری زیرو، گیارہ بیس۔"

"آفرین —" محسن نے چلّا کے کہا اور میرے کندھے پر زور سے ہاتھ مارا۔ بہت سے لوگ ہماری طرف متوجہ ہو گئے۔

میں نے گھبرا کے اِدھر اُدھر دیکھا۔ "یہ کیا بیوقوفی ہے۔" میں نے کہا مگر اس کے بعد میں بھول گیا کہ مجھے کیا کہنا تھا۔ میں نے ایک مکروہ صورت والے مسٹنڈے کو دیکھا جو بڑی بے رحمی سے ایک بچے کو مار رہا تھا۔ یہ وہی بچہ تھا جو خط لے کر ہمارے پاس آیا تھا۔

میں بے اختیار اُس کی طرف دوڑا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ آس پاس کھڑے ہوئے درجن بھر افراد خاموش تماشائی بنے ہوئے ہیں۔ محسن نے مجھے روکنا چاہا مگر کامیاب نہ ہو سکا۔

"دیکھ کر، دوست بولنا۔" محسن نے میرا ساتھ دیتے ہوئے کہا۔

کچھ پوچھے بغیر میں نے اس غنڈے کے ایک مُکّا رسید کیا اور بچے کو اپنے پیچھے کر لیا۔

"بدمعاش، قصائی، اس کو قتل کرنا چاہتے ہو؟" میں نے فرانسیسی میں غل مچایا۔ "آؤ میرا مقابلہ کرو۔"

غنڈہ میرے ہاتھ کے اشارے کو سمجھ گیا اور ایک غلیظ گالی دے کر مجھ پہ حملہ آور ہوا۔ میں نے اُس کے دوسرا مُکّا زیادہ زور سے مارا۔ وہ لڑکھڑا کے پیچھے گرا۔ اب دوسرے تماشا دیکھنے والے بھی مستعد ہوئے۔ انھوں نے درمیان میں حائل ہو کے اس بدمعاش کو مزید مار کھانے سے بچا لیا۔ سہما

ہوا بچّہ ہماری صورت دیکھ کر حیران ہوا کہ ہم وہی ہیں یا کوئی اور۔ کیونکہ اب ہم ایک بالکل مختلف زبان بول رہے تھے۔ معاملہ کیا ہے، یہ تو ہم سمجھ گئے تھے۔ وہ بچّہ بھیک مانگنے پر مامور تھا اور وہ غنڈہ اس سے پیسہ پیسہ وصول کر لیتا تھا۔ بچّے نے نامہ بری کر کے بیس روپے کما تو لیے تھے مگر اُن کو چھپانے میں ناکام رہا تھا۔ گداگری کا ٹھیکیدار اس کی ٹھکائی "چوری" پر کر رہا تھا۔ پوچھ رہا تھا کہ یہ رقم اُس نے کتنے عرصے میں جمع کی اور باقی رقم کہاں ہے؟ ہم انجان بن کے بچّے کو بچاتے رہے۔ پھر ٹھیکیدار اُس کا باپ بن گیا اور اُسے اپنے ساتھ لے جانے پر بضد رہا۔ ایک انگریزی دان نے ہمیں سمجھایا کہ اس چکر میں ہم نہ پڑیں تو اچھا ہے کیونکہ یہ ٹھیکیدار بہت بدمعاش لوگ ہوتے ہیں اور یہ کوئی انوکھی بات نہیں، کل پھر یہ لڑکا یہاں ہوگا یا کہیں اور ہوگا۔

مشکل یہ تھی کہ بچّہ ہم سے چمٹ گیا تھا اور مسلسل رو رو کے کہہ رہا تھا کہ وہ اس ظالم شخص کے ساتھ نہیں جائے گا۔ وہ ہمارے ساتھ جانا چاہتا تھا۔ ہمیں خدا، رسولؐ کے واسطے دے رہا تھا۔

"اب کیا ہوگا جناب؟" محسن خفا ہو کے بولا۔ "دیکھ لیا دخل در معقولات کا انجام؟"

"جو اس بچّے کے ساتھ ہو رہا تھا اُسے معقولات نہیں سمجھا جا سکتا۔" مَیں نے کہا۔ "اور یہ ناممکن تھا کہ مَیں آنکھ بند کر کے گزر جاتا۔ اب جو ہوگا دیکھا جائے گا۔"

"کیا اس بچّے کو ساتھ لے جانا ہے؟"

مَیں نے اقرار میں سر ہلایا۔ ہمارے گرد ایک مجمع اکٹھا ہو گیا تھا اور اس صورتِ حال نے غنڈے کو پریشان کر دیا تھا۔ نہ صرف یہ کہ ہم غیر ملکی تھے بلکہ جسمانی طور پر بھی اس پر بھاری پڑتے تھے۔ رائے عامہ بھی اس کے خلاف تھی اور خود بچّہ بھی بغاوت کر چکا تھا وہ بار بار کہہ رہا تھا کہ یہ ظالم اس کا باپ نہیں ہے۔ یہ اس کو روز مارتا ہے۔ اس سے بھیک منگواتا ہے اور اس کے پاس ایسے کئی بچّے ہیں۔ ہم گداگری کے نظام کی اصلاح یا اس لعنت کا خاتمہ کرنے کی مُہم پر نہیں نکلے تھے لیکن اب بھِڑوں کے اس چھتّے میں ہاتھ ڈال چکے تھے۔

اچانک مجمع میں سے ایک خاکی ٹوپی والا نمودار ہوا۔ اُس نے خاکی وردی بھی پہن رکھی تھی۔ "چلو جی! پولیس اسٹیشن چلو۔" اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

مَیں اُس کی آواز پر اُچھل پڑا۔ وہ اکرام شیخ تھا۔ ہم اس جگہ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھے جہاں ٹیکسی اسٹینڈ تھا اور وہ ہوٹل تھا جس میں ٹیکسی ڈرائیور بیٹھتے تھے۔ شاید وہ ہماری ہی جستجو میں سرگرداں تھا۔ ہم اُسے تلاش کرنے نکلے تھے کہ ایک حادثے نے اُسے ہم تک پہنچا دیا۔ وہ مجمع دیکھ کر آیا ہوگا پھر اُس نے ہمیں پہچان لیا۔

"مَیں نہیں جاؤں گا تھانے۔" غنڈہ اب بھاگنے پر آمادہ تھا لیکن مَیں نے اُسے پیچھے سے دبوچ لیا۔ کچھ لوگ اس فری اسٹائل کشتی کے داؤ سے محظوظ ہوئے۔

"آج ٹکر گیا کوئی بندہ بھئی!" کسی نے کہا۔ "ساڈے لوگ تے بس ویکھدے رہندے نے۔"

ایک بزرگ نے کہا۔ "بھتیا کون پڑتا ہے کسی کے پھڈے میں۔"

"یہ بھی تو ہمارے جیسے بندے ہیں۔" پہلے شخص نے کہا۔ "مگر ان کے دل میں درد ہے۔ ہم تو بے حس ہو گئے ہیں۔"

اکرام شیخ اپنی ٹیکسی لے آیا تھا۔ مَیں نے اُس غنڈے کو دروازے سے اندر پھینکا۔ اُس نے تھوڑی سی مزاحمت کی مگر مَیں نے اتنی دیر میں ریوالور نکال لیا تھا۔ اُس کی ساری اکڑ فوں غائب ہو گئی۔ محسن اور مَیں اُس کے دائیں بائیں بیٹھ گئے۔

"اے بھائی ڈرائیور! یار، اِن خدائی فوج داروں کو سمجھا کہ اپنا راستہ لیں۔" غنڈے نے اکرام شیخ سے بات شروع کی۔ "ہمارا کچھ نہیں بگڑے گا۔ ہم بہت خطرناک لوگ ہیں، پولیس ہماری اپنی ہے۔"

"ابے جو کہنا ہے اپنے انہی پولیس والوں سے کہیو۔" اکرام شیخ نے اُسے ڈانٹ کر کہا پھر بچّے کو آگے بٹھایا اور ٹیکسی چلا دی۔

اکرام شیخ اب کراچی کے راستوں سے اسی طرح واقف تھا جیسے پہلے کبھی لاہور کے گلی کوچوں سے آشنا تھا۔ بہت جلد وہ ٹیکسی کو ایک ویران علاقے میں لے گیا۔ فقیر بدمعاش نے یہ سمجھنے کے بعد کہ ہم پر منّت سماجت، دھمکی یا لالچ کے حربے کارگر نہیں ہوں گے، خاموشی اختیار کر لی تھی اور شاید اب اس کی آخری اُمید پولیس کے تعاون پر زندہ تھی۔ اُسے اچانک احساس ہوا کہ ٹیکسی کسی بھی تھانے کی طرف نہیں جا رہی ہے۔

اُس نے شور مچایا۔ "اوئے یہ کدھر لے جا رہے ہو تم لوگ مجھے۔ کون ہو تم سب؟"

مَیں نے ریوالور کی نالی اُس کی پسلیوں میں گھسا دی۔ "ہم ملک الموت کے ایجنٹ زیرو زیرو سیون ہیں۔"

محسن نے اُسے دوسری طرف سے دبایا۔ "اور مَیں منکر نکیر اینڈ کمپنی کا نمائندہ ہوں۔ تم سے کچھ سوال کرنے آیا ہوں۔"

وہ پریشان ہو کے کبھی ایک طرف اور کبھی دوسری طرف دیکھتا تھا۔ "تم . . . تم کوئی دھوکے باز ہو۔ کس نے بھیجا ہے تم کو؟"

"تمھاری شامتِ اعمال نے۔" اکرام شیخ بولا۔

"اب ہم تم کو ایک منافع بخش فقیر بنائیں گے۔ ہم نے یہ بزنس نیا شروع کیا ہے اور ہمیں اچھی کوالٹی کے فقیر ریڈی میڈ نہیں ملے تھے۔ ایسے فقیر جن کی حالتِ زار دیکھتے ہی پتھر دل آدمی کا ہاتھ بھی جیب میں جائے تو خالی واپس نہ آئے۔" مَیں نے کہا۔ "ہمارا بڑا بزنس ہے۔ ہم انٹرنیشنل فقیر بنائیں گے اور ایکسپورٹ بھی کریں گے۔ تم اس فیلڈ کے آدمی ہو۔ تمھارا تجربہ ہمارے کام آئے گا۔"

"خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔" وہ چلّانے لگا۔

"ہم ایسے بھی لوگ پکڑیں گے جو اَب تک یہ کام کراتے رہے ہیں۔" مَیں نے اپنی بات جاری رکھی۔ "اب وہ خود کریں گے بھیک مانگنے کا کام تمھارے جیسے ٹھیکیدار سب اچھے فقیر ثابت ہوں گے ہماری کوشش سے۔ ہم اُن کے ہاتھ پیر سائنٹیفک طریقے سے توڑیں گے یا موڑیں گے، اعضا کو بدنما بنائیں گے، کاٹیں گے اور ناکارہ کریں گے، اس طرح لنگڑے لُولے، اپاہج، کانے اور اندھے، کٹے پھٹے اور ٹوٹے پھوٹے فقیر تیار ہوں گے جو نہ کچھ بولیں گے، نہ اس قابل ہوں گے کہ لکھ کر کسی سے کچھ کہیں مگر اُن کی عبرت انگیز حالت سب سے سوال کرے گی۔"

وہ دہشت زدہ ہو کے بڑی طرح چلّایا اور اس نے پاگل پن میں ایک عجیب حرکت کی۔ حالانکہ وہ دروازے سے دُور تھا مگر اُس نے ہینڈل پر ہاتھ مارا۔ اتفاق سے ہاتھ صحیح جگہ پڑا اور دروازہ کھل گیا۔ اس سے پہلے کہ مَیں سنبھلتا، وہ مجھے عبور کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایسی جمپ نہیں تھی کہ وہ سنبھل سکتا۔ وہ تو مجھے بھی ساتھ لے گیا تھا مگر محسن نے میرا بازو پکڑ لیا اور مَیں باہر گرنے سے بال بال بچا۔

وہ نہایت بے ڈھنگے طریقے سے سر کے بل پکّی سڑک پر گرا۔ اس وقت ٹیکسی کی رفتار بھی کافی تھی۔ ایک دم کھل جانے والا دروازہ بھی ایک جھٹکے سے واپس آیا تو اس سے ٹکرایا۔ نتیجہ یہ کہ گرنے کے بعد اُس نے کئی بار قلابازی کھائی اور سڑک پر گھِسٹتا ہوا گیا۔ مخالف سمت سے ایک جیپ خالی سڑک پر بہت تیز رفتاری کے ساتھ آ رہی تھی۔ اس کی راہ میں یہ رکاوٹ بہت غیر متوقع ثابت ہوئی۔ ڈرائیور نے رفتار کم کرنے اور سڑک پر گرنے والے کو بچانے کی سر توڑ کوشش ضرور کی ہوگی مگر وہ اس کوشش میں ناکام رہا۔ جیپ اس سے ٹکرائی، گھوم کر سڑک سے اُتری اور ایک ٹیلی فون کے پول سے ٹکرا کر اُلٹ گئی۔

اکرام شیخ نے صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ کر لیا تھا۔ اُس نے رفتار ایک دم بڑھا دی اور کئی موڑ کاٹنے کے بعد ٹیکسی کو ایک کمپاؤنڈ میں لے گیا جہاں کوئی موٹر گیراج قائم تھا۔

ایک ایرنٹس مستری اس کی طرف لپکا۔ "کیا ہے اُستاد؟"

"ابے دیکھ، اس کے بریک ٹائٹ کر، واشر بھی چیک کر اور بریک شو بھی۔" اکرام شیخ نے پچاس کا ایک نوٹ نکالا۔ "کوئی پوچھنے آئے تو کہنا کہ گاڑی صبح سے یہیں کھڑی ہے۔"

لڑکے نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ "کون آئے گا اُستاد؟"

"ابے کوئی نہیں آئے گا، ڈرتا کیوں ہے۔"

"مروا مت دینا اُستاد۔" لڑکے نے نوٹ اُچک لیا۔

"ہم سامنے چائے پی رہے ہیں۔" شیخ نے کہا۔

ایک خاصے غلیظ ایرانی ہوٹل کے آخری کونے میں بیٹھ کے مَیں نے اس لڑکے سے کہا۔ "بیٹا چھوٹو! ڈرنے کی اب کوئی بات نہیں۔ ظالم کا انجام تم نے دیکھ لیا۔ اب تم اِن کے ساتھ رہو گے، انہی کے گھر میں، اِن کے بیٹوں کی طرح، عزّت کے ساتھ اور بہت آرام سے۔"

لڑکا اتنا سہما ہوا تھا کہ وہ فقط گردن ہلاتا رہا۔

"یہ تم نے کیا مجمع لگا رکھا تھا؟" اکرام شیخ نے ہمیں ڈانٹنا شروع کیا۔ "جیسے مَیں نے دیکھ لیا تھا ایسے کیا کوئی اور نہیں دیکھ سکتا تھا؟"

"اسی مجمع کے طفیل آپ کی ہم تک رسائی ہوئی۔" مَیں نے کہا۔

"آپ تو شوقیہ فن کار ہیں نا۔" محسن بولا۔ "بچپن سے، سڑک کے کنارے جہاں کوئی باتصویر مطب دیکھا کھڑے ہو گئے۔"

"سوال یہ ہے کہ تُو وہاں کیسے پہنچا؟" مَیں نے کہا۔ "کام

کاج کوئی نہیں؟"

"میرا کام کیا رہ گیا ہے سوائے تمھاری تلاش میں جھک مارنے کے" شیخ نے کہا۔ "آج تین دن ہوگئے۔ دن میں تین بار یہاں ٹیکسی لا کے کھڑی کر دیتا ہوں۔ سب سے کہہ رکھا ہے کہ مجھے کوئی پوچھتا ہوا آئے تو بتا دینا کہ میں کس وقت یہاں ملتا ہوں۔ کچھ پتا نہیں چلتا تمھارا کہ کہاں ہو، زندہ ہو کہ مر گئے۔"

"برادرِ عزیز سابق ڈبل ایس آئی شیخ" میں نے کہا "آپ سے ملنا ایک نیک فال ہے۔ شام کو ہم فارغ ہیں۔ آپ پورا پیریڈ لیکچر دے سکتے ہیں اور ہمیں جتنا چاہیں جھاڑ سکتے ہیں، ابھی تو ایک اہم مسئلہ درپیش ہے۔"

"ڈیڑھ مسئلہ" محسن بولا "آدھا آپ کے سامنے موجود ہے۔" اُس نے بچے کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ کس کا بچہ ہے؟"

"یہ قوم کا بچہ ہے، کسی ماں کی آنکھ کا نور ہے کسی باپ کے دل کا سرور ہے" میں نے کہا "لیکن بہت مجبور ہے معتوب ہے اور مقہور ہے۔ اِسے اپنے ساتھ لے جاؤ اور اس کے سر پر دستِ شفقت رکھو۔ تفصیل سے یہ خود بتائے گا، ابھی ہم جاتے ہیں، پھر ملیں گے اگر خدا لایا۔ فقط والسلام۔"

"ارے... بات تو سنو... جا کہاں رہے ہو؟"

اکرام شیخ ہمیں اٹھتے دیکھ کر بولا "چلو میں چھوڑ آؤں۔"

"تم اس بچے کو لے جاؤ۔ ہم خود جا سکتے ہیں اور تمھارے حق میں ویسے بھی یہی بہتر ہے کہ فی الحال خود کو ایم آر ایس کے معاملات سے الگ رکھو۔ اس طرح تم ہماری زیادہ مدد کر سکو گے" میں نے کہا۔

"ویسے آج کل تمھارا عشرت کدہ... میرا مطلب تمھارا غربت کدہ کہاں ہے" محسن بولا "تمھاری ٹیکسی ڈرائیور برادری سخت رشک اور حسد کا شکار ہے کہ یک نہ شد دو شد۔"

"کیا کریں وہ بھی بے چارے 'نہ سہی وصل تو حسرت ہی سہی'" میں نے کہا۔ "آج وہ تیرے ساتھ نہیں ہیں؟"

"تم ایک تو ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو۔ ایسی بھی کیا آفت آ رہی ہے کہ دس منٹ نہیں رک سکتے" اکرام شیخ بگڑ کے بولا "بہت ضروری... اور اہم باتیں تھیں، خبریں تھیں۔"

"ابھی تو سرخیاں پڑھ دے" میں نے کہا "تفصیل پھر سنیں گے۔"

"انکل رضوی کا انتقال ہوگیا ہے" اُس نے کہا۔

میں اور محسن اس المیے پر کچھ دیر تو رنج اور دکھ کے جذبات کی یلغار میں اسی طرح کھڑے رہے جیسے زلزلے کا پہلا جھٹکا محسوس کرنے والا کچھ دیر خوف اور دہشت سے مفلوج اور منجمد کھڑا رہتا ہے۔ آہستہ آہستہ اس دل فگار سانحے کی شدت نے احساس میں درد بھر دیا۔ میں کہنا چاہتا تھا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے مگر پھر بے یقینی پر یقین غالب آگیا۔ ہو کیوں نہیں سکتا۔ ہم سب فانی انسان ہیں۔ خدا کی عطا کردہ مہلت کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ چنانچہ طمانیت اور تحفظ کے ساتھ کاروبارِ حیات کی جدوجہد میں ہمہ تن مصروف رہتے ہیں۔ بے فکری کے ساتھ وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتے جاتے ہیں۔ خوابوں کی تعبیریں ڈھونڈتے، منصوبے بناتے، کامیابیوں کی جستجو کرتے اور مستقبل کو لامحدود تصور کرتے ہوئے اور زندگی کی ہر خواہش کو اپنے اختیار میں جانتے ہوئے۔

"وہ دونوں لاہور چلی گئی ہیں" اکرام شیخ نے خاموشی کے ایک سوگوار وقفے کا ماتمی سناٹا ختم کیا۔

"یہ کب کی بات ہے؟" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"ایک ہفتہ ہوگیا۔ مجھے بھی دیر سے اطلاع ملی۔ میں نے منظر کو فون کیا تھا۔ اُس نے بتایا اور تمھارا پوچھا۔ میں نے کہا کہ کیا معلوم کہاں ہوں گے۔ ملیں گے تو بتا دوں گا۔ سوئم بھی ہو چکا تھا مگر میں نے ان دونوں کو بھیج دیا۔ شہلا کو اور آنٹی کو کچھ تو تسلی ملے گی۔ الفاظ کی ہمدردی کو وہ کیا کریں گی۔ سب نے ہی کہے ہوں گے۔ اپنوں کی ضرورت تھی انھیں۔"

میں نے سر ہلایا "اُن کا بھی کون تھا۔ نہ ماں باپ نہ بھائی بہن۔ ہم تھے، تو ہمارا ہونا نہ ہونا برابر۔ بس دُکھ دیتے رہے انھیں۔ سُکھ دینے والا تو وہی تھا جو چلا گیا انھیں بیوہ کرکے اور ہم بدبخت اس وقت بھی اُن کے پاس نہیں۔"

"یہ سب کیسے ہوا یار اکرام؟" محسن بولا تو میں نے اُس کی طرف دیکھا۔ وہ رو رہا تھا۔

"بس، ہونے والی بات تھی، ہارٹ فیل ہوگیا۔ کوئی کچھ نہ کر سکا" اکرام شیخ نے کہا۔

"اب خیال آتا ہے کہ اس جنتی آدمی نے اصول اور ایمان کے راستے پر چل کر کیا پایا؟ فرض شناسی کا کیا صلہ ملا اُسے۔ ایک اپنا مکان تک وہ بنا نہیں سکے تھے۔ یہ گھر بھی ہم سب نے کسی نہ کسی طرح حاصل کر لیا ورنہ وہ نکالے جاتے یہاں سے بھی، جیسے نوکری سے نکالے گئے" میں نے تلخی سے کہا۔

"اس مکان کا بھی وہ تو کرایہ دیتے تھے۔ انھیں کہاں معلوم تھا کہ ہم نے کیا چکر چلا کے اُسے خرید لیا تھا" محسن بولا۔ "ورنہ وہ ہمارا احسان لینا گوارا کرتے؟"

"جیسا درویش صفت شوہر تھا، ویسی ہی اُسے شریکِ حیات ملی۔ صابر و شاکر اور باہمت۔ کبھی نہیں کہا اس نے کہ تمھارے مرتبے کے افسروں کی چار چار کوٹھیاں ہیں لاہور کراچی اور مری میں۔ وہ ہر سال شاندار کاریں بدلتے ہیں۔ اُن کے بیوی بچے یورپ سے مشرقِ بعید تک شاپنگ کے لیے جاتے ہیں۔ میں نے تو نہیں دیکھا کوئی انسپکٹر بھی جو لکھ پتی نہ ہو۔ وہ تو ایس پی تھے" محسن نے کہا۔

"اب دیکھو ایک اسکول چلا رہے تھے میاں بیوی۔ خدا کا شکر ہے کہ بیوی باصلاحیت ہے اور اسکول اچھا چل رہا ہے۔ آمدنی کا مسئلہ نہیں ہوگا" اکرام شیخ بولا "مو ہنی تو خیر نہیں مانی تھی۔ زیب النساء سے میں نے کہہ دیا تھا کہ وہیں رہے۔ وہ اور شہلا دونوں اسکول چلانے میں مدد کریں آنٹی کی۔ زیب النساء ذرا ڈرتی تھی۔ میں نے کہا کہ جب تک ہم لاہور میں تھے اور ضامن رضوی ایس پی تھے، اُن کا گھر غیر محفوظ تھا۔ اب وہ بات پرانی ہوگئی سب بھول چکے انھیں۔ اس گمنام گھر کی دیواروں میں تم بھی محفوظ رہو گی۔ چاہو تو نام بدل کے وہیں ٹیچر ہو جانا۔ انھیں سہارا ہوگا۔"

"یہ تُو نے اچھا کیا" محسن آنسو پونچھ کے بولا۔

میں نے کہا "بڑی حوصلہ شکن خبر سنائی تُو نے۔ کاش وہ کچھ دن اور جی لیتے۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے کہ ہم اپنی جدوجہد میں کامراں ہوئے۔ اُن کے اور ہمارے دشمن ایک تھے، مجرم ہم نہیں، وہ تھے۔"

"یہ تو جانتے تھے وہ۔ پہلے ہی سمجھ گئے تھے" محسن بولا "ان کے پاس عقل اور ذہانت تھی اور اتنا طویل تجربہ تھا۔ حالات کی مجبوری نہ ہوتی تو وہ اپنے یقین کا کھل کے اظہار کرتے۔"

"منظر نے یہ بھی بتلایا کہ اس زمین کا قبضہ حاصل ہوگیا ہے، جس پر وزیر اینڈ کمپنی، اور پھر ایم ڈبلیو ڈی کمپلیکس تھے۔ وزیر خاں ہاسپٹل کے پروجیکٹ کی تکمیل کی راہ میں اب کوئی رکاوٹ نہیں رہی۔ وزیر خاں چیریٹیبل ٹرسٹ کا نگراں خود عبدالودود منظر ہے۔ رابعہ کی لیگل فرم بھی اُس نے سنبھال رکھی ہے، منظر اینڈ قاری کے نام سے اچھا بزنس کر رہی ہے" اکرام شیخ نے کہا "انکل رضوی نے اس کی بہت مدد کی تھی۔"

میں نے گھڑی دیکھی، ڈیڑھ بجنے والا تھا۔

"اگر ایک ٹرک ساڑھے گیارہ بجے حیدرآباد سے چلے" میں نے کہا "تو کتنی دیر میں کراچی پہنچے گا؟"

"ٹرک؟... ڈھائی تین گھنٹے تو ضرور لگ جاتے ہیں۔ ایک تو ٹرک زیادہ رفتار سے نہیں چل سکتے، سڑک خراب ہے، کئی جگہ سے بن رہی ہے، میلوں کچا راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔"

"بس پھر ٹھیک ہے" میں نے اُس سے ہاتھ ملایا۔ "ہم اب چلتے ہیں ورنہ دیر ہوگئی تو اُس کی محنت بھی اکارت جائے گی جس نے یہ اطلاع ہم تک پہنچائی۔"

"وہ کون ہے؟"

"ہے کوئی نادیدہ مہربان۔ ہم قیاس کر سکتے ہیں مگر یقین کے ساتھ اُس کا نام نہیں لے سکتے" میں نے کہا۔

"دیکھ لو، کہیں یہ جال نہ ہو، غیر مصدقہ اطلاعات پر یوں دوڑے چلے جانا کوئی دانش مندی نہیں" اکرام شیخ بولا۔

"فکر مت کر ہماری۔ مار گزیدہ اتنا رستی سے نہیں ڈرتا جتنے ہم مردم گزیدہ انسان کے بھیس میں پھرنے والے شکاری حیوانوں سے ڈرنا سیکھ گئے ہیں۔ انھی نے ہمیں محتاط رہنا اور تاریک پہلو پر پہلے غور کرنا سکھا دیا ہے" میں نے کہا "وقت اور عمر نے وفا کی تو شام سے پہلے پھر ہمیں ملیں گے۔"

ہم اکٹھے نکلے اور سڑک پر پیدل چلتے گئے۔ ایک فرلانگ کے اس راستے پر ہمیں سامنے سے آنے والی دو گاڑیاں ملیں۔ پیچھے سے آنے والی تین گاڑیوں میں سے دو ہمارے اشارے کو نظرانداز کرتے ہوئے گولی کی طرح گزر گئیں۔ تیسری کار ایک فاکس ویگن تھی جسے ایک عورت چلا رہی تھی۔ خلافِ توقع اُس نے کار روک لی اور ہمیں پیچھے بیٹھنے کا موقع عطا کیا۔

کار کے ونڈ اسکرین پر ریڈ کراس کا نشان تھا اور اس کے نیچے ڈاکٹر کے الفاظ درج تھے۔ وہ تیس سال سے زائد عمر کی خاصی قبول صورت اور خوش اخلاق عورت تھی۔ مجھے اس خیال سے شرمندگی ہوئی کہ ہم اس کی نیکی کے بدلے اُس کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں اور اس سے کار چھین کر اس کے لیے پریشانی کے اسباب پیدا کرنے والے ہیں۔ بے شک ہم کوئی نقصان نہیں ہونے دیں گے مگر پھر بھی ایک عورت کے لیے گھر کے راستے کو چھوڑ کر دو اجنبی افراد کے ساتھ

کسی خطرناک مہم پر جانا بہت سے مسائل پیدا کر سکتا ہے۔ اس کے گھر والے، شوہر اور بچے سب اُس کی گمشدگی سے پریشان ہوں گے۔ خود اس کا جذباتی ردِعمل نہ جانے کیا ہو۔ آئندہ تو خیر وہ راہ چلتے کسی کو مرتا بھی دیکھے گی تو گاڑی نہیں روکے گی۔

مَیں نے اچانک آگے جھک کر کہا۔ ”بس یہاں اُتار دیں ہمیں۔“

عورت تھوڑی سی متعجب ہوئی۔ ”اتنا فاصلہ تم کو پیدل طے کرنے کی عادت ہونی چاہیے۔ جوان آدمی ہو۔“

”یس میڈم۔“ مَیں نے اُترنے کے بعد کہا۔ ”آپ سے بھی ایک گزارش ہے۔ راہ چلتے ہر اجنبی کو لفٹ مت دیجیے۔ خصوصاً غیر آباد سڑکوں پر۔“

وہ مسکرائی۔ ”مَیں ڈاکٹر ہوں۔ بیمار ذہن رکھنے والوں کے چہروں پر مجرم خیالات کا عکس دیکھ لیتی ہوں۔“

”کبھی کبھی چہرے دھوکا بھی دے جاتے ہیں ڈاکٹر صاحبہ!“ محسن بولا۔

وہ ہنسی۔ ”مجھے کوئی دھوکا نہیں ہوا تھا۔ مَیں نے تم دونوں کو دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔ تم سکندر اور محسن ہو۔“

اس کی بات نے مجھے اور محسن کو ایک سا حیران پریشان کر دیا۔

”مجھے افسوس ہے کہ اس سے زیادہ مَیں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکوں گی۔“ وہ بولی۔ ”میری کچھ مجبوریاں ہیں جینٹلمین۔ گڈ لک ٹو یو جینٹلمین، خدا حافظ!“

بیک وقت، ہم دونوں نے سیلیوٹ کے انداز میں ہاتھ اٹھائے۔

”خدا حافظ!“ محسن نے کہا۔ ”اینڈ تھینک یو۔“

”ہمیں سب سے زیادہ نیک خواہشات کی ضرورت ہے۔“ مَیں نے کہا۔

جب کار چلی گئی تو مَیں نے ایک گہری سانس لی۔

”یہ اچھا کیا تو نے۔“ محسن بولا۔ ”خود مجھے پشیمانی ہو رہی تھی اسے روکنے کے لیے۔“

”چلو۔۔ اچھا ہی ہوا۔۔۔ جاتے جاتے دعا تو دے گئی۔ یہ احساس تو دے گئی کہ دشمنوں کے مقابلے میں دوست بھی ہیں۔“ مَیں نے کہا۔ ”مجھے اب یقین آنے لگا ہے کہ راہ چلتے سیکڑوں ہزاروں لوگ ہمیں پہچان لیتے ہوں گے لیکن وہ کسی ذاتی مجبوری کے باعث یا ہماری پریشانی کے خیال سے سامنے آ کے شناخت کا اظہار نہیں کرتے۔

”اس یقین کے ساتھ کتنی طاقت ملتی ہے۔ راہ چلتے ہوئے سڑک اور بازار میں، ہوٹل ریسٹورنٹ میں، صبح سے شام تک ہمارا بیشتر وقت ایسے ہی پس پردہ رہنے والے دوستوں، مددگاروں اور بہی خواہوں۔۔۔۔۔۔۔ کے درمیان گزرتا ہے۔ لاکھوں میں ایک شکاری ہے تو ہزاروں محافظ۔“

مَیں نے پلٹ کے دیکھا۔ ”لے بھئی، ہمارے مطلب کی گاڑی بھیج دی اللہ میاں نے۔“

”اللہ کرے رُک بھی جائے۔“ محسن بولا۔

وہ گاڑی جو ایک چلتا پھرتا ڈبا تھی کسی بیکری کی ڈبل روٹیاں دکانوں پر پہنچاتی تھی۔ ڈبل روٹی کا ایک سنسنی خیز اشتہار اس کے پچھلے باکس نما حصے کی تینوں دیواروں پر نقش تھا۔ اس میں ایک حسینہ سوئمنگ کے لباس میں بڑی نزاکت سے ایک سلائس کھا رہی تھی نیچے 'بیوٹی بریڈ' کا نام لکھنے والے نے زبانِ افرنگ سے ناواقفیت کی بنا پر بریڈ میں اے کی جگہ 'ڈبل ای ای' لکھ دیا تھا۔ اس دلچسپ غلطی نے بریڈ کو بریڈ کر دیا تھا جس کا مطلب ہوتا ہے 'نسل'۔

”حسن کی نسل“ مارکہ ڈبل روٹی کے تقسیم کار نے گاڑی روک کے اپنا مُنہ باہر نکالا جس کے اوپر نیچے اور چاروں طرف بھورے بالوں کی گھنی باڑھ تھی، وہ چہرہ ایک ناریل سے مشابہ تھا جس کو ابھی چھیلا نہ گیا ہو۔

”کہاں جاؤ گے پو پائی دی سیلر؟“ اس نے مزاحیہ انداز میں کہا۔ یہ کارٹون سیریل ان دنوں خاصا مقبول تھا۔

ہم جواب دیے بغیر آگے چڑھ کر بیٹھ گئے۔ ”جہاں تم لے جاؤ گے۔“ مَیں نے کہا۔

”دو دو روپے لوں گا۔ نہیں منظور تو اُترو گاڑی سے۔“ وہ بولا۔

مَیں نے اُسے پانچ روپے دیے اور کہا۔ ”ہم ڈھائی ڈھائی دیں گے، بولو منظور ہے؟“

اُس نے دانت نکال کر کہا۔ ”پیٹرول بہت مہنگا ہو گیا ہے۔“

”تمہاری بیکری کا۔۔۔ میرا مطلب ہے گاڑی کا پچھلا پہیہ بیٹھ گیا ہے غالباً۔“ مَیں نے گاڑی کے روانہ ہوتے ہی کہا۔

اُس نے گاڑی فوراً روک دی اور اتر کے پیچھے گیا۔ دوسری طرف سے مَیں اُترا۔ مَیں نے محسن کو آگے کھسک کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھالنے کا اشارہ کیا۔

ڈرائیور نے باری باری دونوں ٹائروں پر کِک مار کے کہا۔ ”ہوا تو ٹھیک ہے۔“

”ہاں۔“ مَیں نے گاڑی کے پیچھے والے دروازے کے دونوں پٹ کھول کے کہا۔ ”زمانہ ٹھیک نہیں ہے۔“

وہ میری حرکت پر حیران بھی نہ ہو پایا تھا کہ مَیں نے اُسے اندر اچھال دیا اور پھر خود بھی چھلانگ مار کے اندر پہنچ گیا۔ اُس کے فرش پر گر کے اٹھنے سے پہلے ہی مَیں نے دروازہ اندر کھینچ کے بند کر لیا اور محسن نے گاڑی چلا دی۔ اندر خاصا اندھیرا تھا اور ڈبل روٹیوں کی مخصوص مہک تھی۔ اندر سے ڈبے کی ساخت بھی کسی بہت بڑی ڈبل روٹی جیسی تھی۔

”حسن کی نسل“ ڈبل روٹی کا تقسیم کار کسی آتش فشاں کی طرح گڑگڑاتا دھواں دیتا اُٹھا۔ ”بدمعاشی، غنڈہ گردی! میں تم کو پولیس کے حوالے کر دوں گا۔ میرے ماموں سسر ڈی ایس پی ہیں۔“

”پانچ روپے نکالو۔“ مَیں نے اُس کے ایک ایسا چھانپڑ مارا کہ وہ پھر نیچے جا گرا۔

”کون ہو تم لوگ، کیا چاہتے ہو؟“ وہ کانپتی آواز میں بولا۔ اُس نے پانچ کا نوٹ میری طرف بڑھا دیا۔

مَیں نے ریوالور نکال لیا۔ ”تم کیا چاہتے ہو؟“ مَیں نے پانچ کا نوٹ جیب میں رکھ کے کہا۔ ”ہم تمہاری لاش یہیں پھینک جائیں؟“

وہ چلّانے لگا۔ ”خدا کے لیے مجھے مت مارو۔ چار عورتوں کو بیوہ کرنے کا گناہ مت کرو۔“

”کون چار عورتیں؟“ مَیں نے کہا۔

”میری بیویاں۔ ان سب کا ایک ہی شوہر ہوں مَیں۔“

”اچھا!“ مَیں نے دلچسپی سے کہا۔ ”اکلوتے شوہر ہو تم۔ مجموعی پیداوار کتنی ہے؟“

اُس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اللہ نے اولاد دی ہوتی تو میں دوسری بھی کیوں کرتا۔“ وہ ایک سرد آہ بھر کے بولا۔

”پھر اب کیا کرو گے، پانچویں کی تو گنجائش ہی نہیں ہے۔“

”مَیں سب کو طلاق دے دوں گا۔“ وہ بولا۔ ”شرعی حق ہے میرا۔۔“

”واہ، کیا شرع کا استعمال ہے۔ ان چاروں کو طلاق دو پھر مزید چار کرو۔ اُن سے بھی کچھ نہ ہو تو کہو اللہ کی مرضی اور انھیں بھی نکال باہر کرو۔ سلسلے ناریل کی اولاد۔ اس سے بہتر ہو گا کہ مَیں اُن چاروں کو آزاد کر دوں ایک گولی سے تاکہ وہ اپنی مرضی سے پھر شادی کر سکیں۔ مَیں شرط لگا سکتا ہوں کہ وہ چاروں اولاد والی ہوں گی۔“

مَیں نے ریوالور اٹھایا تو وہ بلبلانے لگا۔ ”اللہ رسول کا واسطہ تم کو۔ مجھ سے جتنا پیسہ چاہو لے لو۔“

مَیں نے ریوالور رکھ لیا۔ ”ہم ڈاکو نہیں ہیں، فقیر لوگ ہیں پیسہ ہاتھ کا میل ہے ہمارے لیے۔ تمہاری جان بخشی کی صرف ایک شرط ہے۔ تم چپ چاپ بیٹھو اور کوئی سوال نہ کرو۔ شام کو تم گھر جا سکو گے لیکن بعد میں اگر۔۔۔۔ تمہاری زبان سے ایک لفظ بھی نکلا ہمارے بارے میں تو ہم آ جائیں گے۔“

”میری توبہ، میرے باپ کی توبہ۔“ وہ کان پکڑ کے بولا۔

اس کے باوجود مَیں نے اس پر اعتبار کرنے کا خطرہ مول نہیں لیا۔ وہ ایک ایسا شخص تھا جو ذاتی مفاد کے لیے شرع کے مفہوم کو بھی غلط بیان کر سکتا تھا۔ ایسا شخص دنیاوی معاملات میں ضمیر کی پروا کہاں کرتا ہو گا۔ مَیں نے اُسے گاڑی کے اندر ہی باندھ کے ڈال دیا۔ اس کے ہاتھ پیر باندھنے کے لیے مجھے ایک رسّی مل گئی تھی، منہ بند کرنے کے لیے مَیں نے اُسی کی قمیص پھاڑی اور کپڑا اُس کے حلق میں ٹھونس دیا۔ ایک پٹی مَیں نے اس کی آنکھوں پر بھی باندھی۔

محسن نے یہ وقت مسلسل ڈرائیونگ میں صرف کیا۔ اُس نے خاصی رفتار سے گاڑی چلائی۔ اس کا اندازہ مجھے پچھلے حصے میں ہچکولوں اور جھٹکوں سے ہوتا رہا۔ سڑک واقعی بہت خراب تھی۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد گاڑی ٹھہر گئی۔

مَیں نے نیچے اُتر کے دیکھا تو محسن بھی باہر آ چکا تھا۔

”ہم کراچی سے تقریباً تیس چالیس میل دُور ہیں۔“ محسن نے کہا۔

”یہاں گاڑی کیوں روکی ہے؟“

محسن نے سڑک کے دائیں جانب اشارہ کیا۔ ایک چھوٹی سی سڑک کو لکڑی کے ایک تختے سے بند کر دیا گیا تھا۔ یہ تختہ تقریباً ایک فٹ چوڑا اور بیس فٹ کے قریب لمبا تھا۔ اس پر سفیدی پھیر کے سرخ حروف میں لکھا گیا تھا۔ ”ہر قسم کی ٹریفک کے لیے بند ہے۔“ اس کے وسط میں ٹین کا گول دائرہ نما حصہ خطرے کی علامت ایک انسانی کھوپڑی

اور دو بڈیاں بنی ہوئی تھیں۔

"ابھی ہم جس راستے سے آئے ہیں اس پر جگہ جگہ ایسے بورڈ لگے ہوئے تھے جن پر لکھا ہوا تھا "متبادل راستہ" اور ایک تیر کا نشان تھا۔" محسن نے کہا۔ "مثلاً وہ دیکھ، ابھی ہم ایک متبادل راستے سے گزرے تھے۔"

تقریباً سو گز پیچھے مجھے متبادل راستے کا سائن بورڈ نظر آیا۔ سڑک جہاں سے بھی ٹوٹی پھوٹی تھی وہاں ٹریفک کو روک دیا گیا تھا۔ ہائی وے ڈیپارٹمنٹ والے سڑک کی مرمت کر رہے تھے چنانچہ ٹریفک کے لیے سڑک سے ہٹ کر کوئی عارضی راستہ فراہم کیا گیا تھا۔ چونکہ پوری سڑک ایک بار میں ٹریفک کے لیے بند نہیں کی جا سکتی تھی اس لیے صرف مرمت طلب حصے پر متبادل راستے کے سائن بورڈ لگا دیے گئے تھے اور مرمت کا کام پورا ہونے تک ٹریفک کو دائیں یا بائیں سڑک سے نیچے کچے راستے پر رواں رہنا تھا۔

"میں سارا راستہ ایک اسکیم پر غور کرتا آیا ہوں۔" محسن نے کہا۔ "اور یہاں پہنچنے کے بعد گویا اسکیم فائنل ہو گئی۔"

"تو نے سامنے سے آنے والی گاڑیوں کے نمبروں پر بھی غور کیا؟" میں نے کہا۔

"میں وہ بھی دیکھتا رہا۔" محسن بولا۔ "لیکن ابھی تک لاہور سے آنے والی صرف تین کاریں گزری ہیں۔"

"اچھا۔ اسکیم کیا ہے آپ کی مسٹر اسکیمو؟" میں نے کہا۔

"اگر کچھ ایسا ہو سکے۔" محسن سوچتے ہوئے بولا۔ "کہ تو گاڑی لے کر آگے چلا جائے جیسا کہ سامنے نظر آ رہا ہے، دو فرلانگ کے بعد ایک موڑ ہے۔ سڑک تھوڑا سا دائیں جانب گھوم گئی ہے اور یہ موڑ آیا ہے ایک ٹیلے کی وجہ سے۔"

میں نے اس جغرافیے کو غور سے دیکھا۔ واقعی ٹیلے کے پیچھے سے آنے والی گاڑی موڑ کاٹنے سے پہلے دکھائی ہی نہیں دیتی تھی۔

"تو اس ٹیلے کے پیچھے کسی جگہ اپنی گاڑی روک کر سڑک پر نظر رکھ۔ تیرے پاس دُوربین ہے۔ تو آدھے پونے میل تک ہر آنے والی گاڑی کو دیکھ لے گا۔ اس کا نمبر بھی دو فرلانگ سے پڑھا جا سکے گا۔"

"میں سمجھ گیا۔ میں وہاں آبزرویشن پوسٹ بنا کے بیٹھ جاتا ہوں اور جیسے ہی کوئی گاڑی آتی ہے جس پر مطلوبہ نمبر ہو، میں دوڑ کے آتا ہوں اور۔ ۔ ۔"

"نہیں، دوڑ کر آنے کی ضرورت نہیں۔ تو وہیں سے مجھے سگنل دے سکتا ہے، گاڑی کا ہارن بجا کے۔"

"ہارن تو ادھر سے آنے والی ہر گاڑی بجاتی ہے۔"

"تو وقفے وقفے سے تین بار ہارن بجا سکتا ہے۔" محسن بولا۔

"اتنے فاصلے سے ہارن کی آواز سنائی دے گی؟" میں نے کہا۔ "اچھا فرض کر، میں نے ہارن سگنل دیا کہ ٹرک آ رہا ہے تو پھر؟"

"پھر یہ کہ میں یہاں اپنی کارروائی کر دوں گا۔ ٹرک کا راستہ بدل دوں گا۔" محسن نے کہا۔ "میں وہ متبادل راستے کا سائن بورڈ اٹھا کے لاتا ہوں۔ میں بالکل تیار رہوں گا۔ اُدھر تیرا سگنل ملا، اِدھر میں نے 'متبادل راستے' کا یہ سائن بورڈ اِدھر رکھا جہاں لکھا ہوا ہے کہ "یہ راستہ ہر قسم کی ٹریفک کے لیے بند ہے۔" اس سائن بورڈ کو ہٹا کے میں یہاں سڑک کے بیچ میں لگا دوں گا۔"

"تو اکیلا کرے گا یہ کام؟" میں نے اسکیم کی افادیت کو تسلیم کرتے ہوئے کہا۔

"متبادل راستے کا سائن بورڈ میں ابھی لے آتا ہوں اور ایک طرف رکھ کے انتظار کرتا ہوں۔ پھر وہ سڑک بند کرنے والا بورڈ مجھے گھسیٹ کر ادھر لانا ہے اور متبادل راستے کا بورڈ اُدھر رکھنا ہے، یہ صرف پانچ سات منٹ کا کام ہے۔" محسن نے کہا۔

"پلان تو زبردست ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر دوست! پہلی بات تو یہ کہ ٹرک کو غلط سمت میں موڑنے سے کیا ہو گا؟"

"میرا خیال ہے کہ آگے سڑک پر کوئی کمزور پُل ہو گا۔ عموماً اس قسم کے غیر محفوظ پُل جو زیادہ وزن نہیں برداشت کر سکتے، پہلے بھاری گاڑیوں کے لیے ممنوع قرار دیے جاتے ہیں، اس کے بعد ہر قسم کی گاڑیوں کے لیے بند کر دیے جاتے ہیں۔ میں یقین کے ساتھ تو نہیں کہہ سکتا کہ آگے کیا ہے مگر سائن بورڈ پر خطرے کا نشان ہے تو خطرہ ضرور ہو گا۔"

"دوسری بات یہ کہ اس ٹرک کے ساتھ آگے یا پیچھے کوئی اور گاڑی ہوئی تو؟"

"خدا کرے کہ نہ ہو۔ ہوئی تو اُسے روکنے کی اور صحیح سمت میں بھیجنے کی کوئی صورت کریں گے۔" محسن نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے گھڑی دیکھ کے کہا۔ "میں آگے جاتا ہوں۔ دُوربین کی مدد سے میں ٹرک کو کافی فاصلے سے دیکھ سکوں گا۔ جیسے ہی مجھے نمبر نظر آیا تو میں ایک ہوائی فائر کروں گا۔"

"فائر پر وہ چوکنے نہ ہو جائیں؟"

"اس ویرانے میں انھیں کیا نظر آئے گا۔ 'بیوٹی برڈ' کی اس گاڑی پر تو وہ شک کرنے سے رہے۔ فائر کرتے ہی میں بھی چل پڑوں گا اور کوشش کروں گا کہ کسی دوسری گاڑی کو اس کے ساتھ نہ آنے دوں۔" میں نے کہا۔

میں نے محسن کو واپس جاتے دیکھا۔ وہ 'متبادل راستے' کا روڈ سائن اُٹھانے جا رہا تھا۔ سڑک کے اُس حصے کی مرمت کا کام ختم ہو چکا تھا۔ مگر ہائی وے ڈیپارٹمنٹ کے ٹھیکے دار نے ابھی تمام اسباب نہیں اٹھایا تھا۔ شاید اُس کا ارادہ سب سامان ایک ہی بار میں سمیٹنے کا ہو گا جب کام کہیں بھی ہو رہا ہے۔

میں 'حسن کی نسل' مارکہ ڈبل روٹی کی گاڑی لے کر آگے چل پڑا۔ دو فرلانگ کے بعد میں نے موڑ کاٹا تو مجھے سڑک تاحدِ نگاہ سیدھی اور سپاٹ نظر آئی۔ دوپہر کے وقت ٹریفک بھی برائے نام رہ گئی تھی۔ دُوربین لگا کے دیکھنے سے مجھے کافی فاصلے پر سڑک کی مرمت کرنے والے مصروف دکھائی دیے۔ وہاں سے ایک بس گزری تو اُس نے سڑک چھوڑ کر متبادل راستہ اختیار کیا۔ اور گرد کا بگولا سا اٹھا۔ بس جب پھر پکی سڑک پر آئی تو میں نے اُس کا نمبر پڑھنے کی کوشش کی۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس بہت طاقتور دُوربین کی مدد سے میں نے نمبر صاف پڑھ لیا۔ حالانکہ بس ابھی آدھا میل دُور تھی۔

میں نے 'بیوٹی برڈ' کی گاڑی کا رُخ واپس کراچی کی طرف کیا اور جب بس گزر گئی تو پیچھے کے دونوں دروازے کھول کے اندر چار بیویوں کے اکلوتے، بے اولاد شوہر کو دیکھا۔ وہ خبیث کھسکتا ہوا دروازے تک آ پہنچا تھا حالانکہ اُس کے ہاتھ اور پیر بندھے ہوئے تھے۔ شاید اُس کا ارادہ لاتیں مار کے دروازہ کھولنے کا ہو گا۔ اس طرح وہ گزرنے والوں کو متوجہ کر سکتا تھا۔

"تم کیوں چار بیویوں کا سہاگ اجاڑنے پر کمر بستہ ہو؟" میں نے اُسے گھسیٹ کر پھر پیچھے پھینکا۔ اُس کا سر ٹن سے سائڈ میں لگا اور اس چوٹ نے وقتی طور پر اُسے ناک آؤٹ کر دیا۔ میں نے اُس کے مکر کو آزمانے کے لیے جلتی سگریٹ اُس کے بازو پر لگائی۔ اُس نے حرکت تو کی مگر وہ اُچھلا نہیں۔

میں مطمئن ہو کے باہر آ گیا اور موقع محل دیکھ کے ایک درخت پر چڑھ گیا۔ وہ جگہ بہترین آبزرویشن پوسٹ ثابت ہوئی۔ میں وہاں پتوں میں چھپا ہوا کسی کو نظر نہیں آ سکتا تھا لیکن سڑک پر دُور تک کا منظر دیکھ سکتا تھا۔ "بیوٹی برڈ" کی گاڑی سڑک کے ایک کنارے کھڑی ہوئی تھی۔ کوئی بھی دیکھنے والا اس سے یہی سمجھ سکتا تھا کہ گاڑی خراب ہے۔ ایک اضافی فائدہ یہ تھا کہ درخت کے اوپر سے فائر کرنے میں آواز پھیل کر سنائی دے گی۔ کوئی یہ نہیں سمجھے گا کہ فائر 'بیوٹی برڈ' کی گاڑی سے کیا گیا ہے۔

آدھے گھنٹے تک میں ایک شاخ پر نیم دراز سگریٹ پیتا رہا اور وقفے وقفے سے دُوربین لگا کے دیکھتا رہا۔ اس عرصے میں دس گاڑیاں گزریں۔ ان میں سے تین مسافر بسیں تھیں، پانچ ٹرک تھے اور دو پرائیویٹ کاریں۔ گھڑی میں اب پونے تین ہو رہے تھے گویا ٹرک کو حیدرآباد سے روانہ ہوئے سوا تین گھنٹے ہو چکے تھے، ابھی کراچی تک مزید ایک گھنٹے کی مسافت تھی۔ کیا ٹرک سوا چار گھنٹے میں پہنچے گا؟ نہیں، راستہ تو ڈھائی تین گھنٹے کا ہے، کہیں ٹرک گزر تو نہیں گیا؟ لیکن محسن خاصے یقین کے ساتھ کہہ رہا تھا کہ وہ سارے راستے دیکھتا آیا تھا۔ ممکن ہے ٹرک کی روانگی دیر سے ہوئی ہو، یا راستے میں کوئی خرابی ہو گئی ہو؟ میرا ذہن دونوں طرح کے دلائل دیتا رہا۔ تاخیر کے حق میں بھی اور اس کے خلاف بھی۔ میری جھنجلاہٹ اور مایوسی بڑھتی جا رہی تھی۔ مجھے رہ رہ کے خیال آ رہا تھا کہ ٹرک پہلے ہی نہ نکل گیا ہو۔ اگر ایسا ہوا تو قصور میرا ہو گا۔ میں نے اس فقیر ٹھیکیدار کے معاملے میں ٹانگ اڑا کے کم سے کم آدھا گھنٹا گنوا دیا تھا۔ پھر ہم نے اکرام شیخ سے بھی آدھا گھنٹا باتیں کی تھیں۔ حالانکہ ہم چاہتے تو اس وقت ملاقات کو مختصر کر دیتے۔

ٹرک اچانک نمودار ہوا۔ میں نے دُوربین سے دیکھا تو اس کا نمبر فوکس کرتے ہی واضح ہو گیا۔ یہ ایک آئل ٹینکر تھا جو ایک عجیب بات تھی۔ میں کسی مال بردار ٹرک کی توقع کیے بیٹھا تھا۔ ٹرک ابھی آدھا میل دور تھا مگر

ایک گڑ بڑ یہ تھی کہ اُس کے آگے آگے ایک پرائیویٹ کار آ رہی تھی۔ اُسے روکنا ضروری تھا۔

وقت کم تھا چنانچہ میں نے فائر کیا اور درخت پر سے چھلانگ لگا دی۔ دو منٹ بعد میں 'بیوٹی بریڈ' کی گاڑی کو آہستہ آہستہ چلاتا ہوا واپس کراچی کی طرف رواں تھا۔ کار جب میرے قریب سے گزرنے لگی تو میں ایک دم سڑک کے درمیان میں آ گیا۔ کار ڈرائیور نے ایک دم بریک لگائے اور کار کو انتہائی بائیں جانب موڑ کے تصادم سے بچا لیا۔ میں پھر سائڈ میں ہو گیا مگر کار ڈرائیور بے حد مشتعل تھا۔ اُس نے کار روک لی تھی۔

"نشے میں ہے؟" اُس نے مجھے گالی دے کر کہا۔ "اندھے۔۔۔"

میں نے اپنی گاڑی اس کے سامنے روکی اور نیچے اُتر آیا۔

"گالی کیوں دی؟" میں نے اُسے کالر سے پکڑ کے باہر کھینچ لیا۔

"چھوڑو میرا کالر۔ تم جانتے نہیں میں کون ہوں؟" اس نے میرا ہاتھ جھٹکنے کی ناکام کوشش کی۔

"تم ٹنڈے لاٹ کے بھتیجے ہو؟" میں نے کہا "یا طرم خاں کے مامے ہو۔ میں تم کو بتاتا ہوں کہ میں کون ہوں؟"

اُس نے میرے سر پہ مکا مارا۔ میں نے جواب میں اس کو دو بار پٹخنی دی، ایک بار دھوبی پٹخنے کے انداز میں اور دوسری بار فلائنگ کِک مار کے۔ وہ طاقتور آدمی تھا مگر پروفیشنل نہیں تھا۔ دوسری پٹخنی کے بعد وہ لمبا لیٹ گیا۔ میں نے اُسے اُٹھا کے کار میں واپس اپنی جگہ بٹھا دیا۔

"سڑک پر کار لے کر آئے ہو تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم نے سڑک خرید لی ہے؟" میں نے کہا۔ "اُمید ہے کہ آئندہ تم پہلے تولو گے پھر بولو گے۔ غلطی اگر میری تھی تو تم مجھے معذرت کرنے کا موقع تو دیتے۔ غلطی کسی سے بھی ہو سکتی ہے اور غیر ارادی بھی ہو سکتی ہے۔"

وہ مجھے خون آشام نظروں سے گھورتا رہا اور ہانپتا رہا۔ "میں دیکھ لوں گا۔ تم مجھے جانتے نہیں۔"

"گالی بکنے سے پہلے تم بھی مجھے نہیں جانتے تھے۔" میں نے کہا۔ "لیکن تم نے دو منٹ میں وہ دیکھ لیا جو اتنی زندگی گزار کے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ آئندہ کیا دیکھو گے، یہ صرف اللہ ہی جانتا ہے۔"

ٹرک اتنی دیر میں میرے قریب سے گزر چکا تھا اور میرا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ ٹرک میں بیٹھے ہوئے کسی شخص نے میرا چہرہ نہیں دیکھا تھا کیونکہ اُن کی طرف میری پشت تھی۔

"میں نے خیال رکھا تھا کہ تمھیں زیادہ چوٹ نہ آئے۔" میں نے اس کی گاڑی سے چابی نکال کے کہا۔ "پھر بھی۔۔۔ آئی ایم سوری۔"

"یہ تم کیا کر رہے ہو؟" وہ پریشان ہو کے بولا۔

میں نے اندر ہاتھ ڈال کے اس کا بونٹ کھولا۔ ڈسٹری بیوٹر کیپ کے تار ایک جھٹکے سے کھینچ کر الگ کیے اور بونٹ بند کر کے چابی واپس اُسے تھما دی۔ "میری گاڑی کا نمبر نوٹ کر لو۔" میں نے کہا۔ "اور مجھے اجازت دو۔"

"خدا کے لیے ایسا مت کرو۔" وہ چلّایا۔ "میں گاڑی کیسے لے جاؤں گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں تمھیں کچھ نہیں کہوں گا۔"

لیکن میں نے بیوٹی بریڈ والوں کی گاڑی اسٹارٹ کی اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اب وہ کسی سے لفٹ لے لیا بس میں بیٹھے اور کراچی جائے۔ وہاں آٹو پارٹس مارکیٹ سے ڈسٹری بیوٹر کیپ وائر کا سیٹ لائے اور پھر گاڑی لے جائے۔ جو قانونی یا غیر قانونی کارروائی کرنا چاہے کرے۔ چار بیویوں کا اکلوتا بے اولاد شوہر اُسے کیا بتائے گا کہ وہ کون تھے جو اس کی گاڑی چلا رہے تھے۔

مار پیٹ ہوتے صرف ٹرک والوں نے دیکھی تھی۔ بعد میں جو بس گزری تھی، اُس کے مسافروں نے مجھے کار والے سے باتیں کرتے ضرور دیکھا تھا لیکن اس وقت میں کار کی کھڑکی سے لگا بہت پُرسکون کھڑا ہوا تھا۔ پھر بھی یہ اندیشہ ضرور تھا کہ وہ کسی کار کو روک کر لفٹ لے اور میرے تعاقب میں آئے۔

محسن نے دور سے ہی مجھے آتا دیکھا تو میری طرف لپکا۔

"کیا ہوا؟" میں نے اس کے قریب آتے ہی کہا۔ "ٹرک کدھر گیا؟"

محسن دروازہ کھول کے میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ "اُسی طرف جدھر ہم بھیجنا چاہتے تھے۔ مگر یار، وہ تو آئل ٹینکر تھا۔"

"ہاں، جگہ تو آئل ٹینکر میں بھی بہت ہوتی ہے اور اس میں اگر اوپر تک تیل بھر دیا جائے تو نیچے کا مال نظر بھی نہیں آتا۔" میں نے کہا۔ "بعد میں ایک بس بھی آئی تھی؟"

"ہاں، لیکن اس وقت تک میں روڈ سائن بدل چکا تھا۔" محسن نے کہا۔ "تُو نے دیر کیوں کی؟"

اس کی بات کا جواب دینے کا موقع مجھے نہیں ملا۔ ہمارے بائیں جانب ایک ایسا قیامت خیز دھماکا ہوا جس نے زمین ہلا دی۔ اس پہلے دھماکے سے ہی میرے کان سُن ہو گئے اور میں نے ونڈ اسکرین کا شیشہ بکھرتے دیکھا۔ میرے ہاتھوں میں گاڑی لہرائی اور میں اسے خاصی کوشش سے سنبھال کے پھر سڑک پر لانے میں کامیاب ہوا۔

محسن نے غیر ارادی طور پر دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ کے سر کو کہنیوں کے بیچ میں کر لیا تھا۔ اب میرے ساتھ اس نے بھی سر اٹھا کے دیکھا تو بائیں ہاتھ پر ہمیں گرد و غبار کا ایک بہت بڑا بادل سا اُٹھتا دکھائی دیا۔ اس غبار میں پتھر اور چٹانوں کے ٹکڑے بھی تھے۔ ٹرک کے جلتے ہوئے ٹکڑے بھی اور شاید ان کے اعضا کے ٹکڑے بھی جو ٹرک چلا رہے تھے۔ پہلے بڑے دھماکے کے بعد متعدد چھوٹے دھماکے ہوئے اور ہر بار فضا میں نیا بگولا اٹھا۔ یہ منظر کسی آتش فشاں کے پھٹنے کا منظر لگتا تھا جس کے دہانے سے بار بار لاوا سیکڑوں فٹ کی بلندی تک اچھل رہا ہو۔

گاڑی کا ونڈ اسکرین کسی چیز کے لگنے سے نہیں ٹوٹا تھا۔ اسے دھماکے سے پیدا ہونے والی 'شاک ویو' نے ریزہ ریزہ کر دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ شیشے کے ذرّات اُڑ کر ہمارے چہرے پہ نہیں آئے۔ ورنہ ہم اندھے بھی ہو سکتے تھے۔ تھوڑا سا تحفّظ ہمیں دھوپ کے چشموں سے بھی ملا جو ہم نے تو بھیس بدلنے کے لیے لگائے تھے مگر اس وقت ہماری آنکھوں کے سامنے ڈھال بن گئے۔ ہماری آنکھیں گرد و غبار سے محفوظ رہیں۔ گاڑی کے بے قابو ہونے کی وجہ بھی شاک ویو ہی تھی۔ میں نے سُنا تھا کہ جب کہیں کوئی بڑا دھماکا ہوتا ہے تو وہاں خلا پیدا ہو جاتا ہے اور اس خلا کو پُر کرنے کے لیے ہوا شدید دباؤ کے تحت حرکت میں آتی ہے۔ اس سے ایک زبردست طاقت رکھنے والی لہر پیدا ہوتی ہے جس سے دُور کی عمارات کے شیشے ٹوٹ جاتے ہیں اور قریب کی عمارات گر بھی جاتی ہیں۔

میں نے اب گاڑی کو ایک کنارے پہ روک لیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ہمارے پیچھے آنے والی ٹریفک بھی خوف اور دہشت سے جام ہو گئی ہو گی۔ یہ نظارہ ایسا تھا کہ اس سڑک پر آتے جاتے کسی نے کبھی نہیں دیکھا ہو گا۔ چونکہ مشرقی پاکستان میں تخریبی عناصر سرگرمِ عمل تھے اور یہ افواہیں بھی عام تھیں کہ انتہا پسند مغربی پاکستان کو بھی نشانہ بنانے والے ہیں، اس لیے لوگوں کا خوف و ہراس میں مبتلا ہونا ایک فطری بات تھی۔

میرے اندازے کے مطابق اس آئل ٹینکر کو ایک میل جانے سے پہلے ہی حادثہ پیش آ گیا تھا۔ اب یہ تصدیق کرنے کی نہ گنجائش تھی نہ ضرورت کہ حادثہ کیوں پیش آیا۔ کیا واقعی محسن کی تھیوری کے مطابق ادھر کوئی کمزور پُل تھا جو ٹرک کا وزن نہ برداشت کر سکا یا کسی برساتی نالے کا پہلے سے ٹوٹا ہوا پُل تھا جسے ڈرائیور بروقت نہ دیکھ سکا تاہم ایک بات ثابت ہو گئی کہ اس آئل ٹینکر میں بہت بڑی مقدار میں آتش گیر مادہ، 'ٹی این ٹی بم' بارودی سرنگ یا ڈائنا مائیٹ کی شکل میں بھرا ہوا تھا۔ ایک معمولی چنگاری نے آئل ٹینکر کو ایک بہت بڑے متحرک بم کی طرح اُڑا دیا۔ کوئی بھی گاڑی جب اُلٹتی ہے تو تاروں کے شاٹ ہونے سے بھی آگ لگ جاتی ہے۔

میں اور محسن ابھی تک بے خودی کے عالم میں اس غبار کو دیکھ رہے تھے جو آہستہ آہستہ بیٹھ رہا تھا۔ دھواں الگ ہو کے منتشر ہو رہا تھا اور بہت بلندی پر چیل کوّے دائروں میں چکّر کاٹنے لگے تھے۔

"ہُرّا!" میں نے محسن کے کندھے پہ ہاتھ مار کے نعرہ لگایا۔ "وہ مارا پاپڑ والے کو۔"

محسن نے قہقہہ مار کے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ "ایم آر ایس کے لیے ایک اور تحفۂ ذہانت۔ ایک اور فتح۔"

"دلاور اینڈ کمپنی کے لیے متبادل راستہ۔" میں نے پُرمسرت لہجے میں کہا۔ "سیدھا جہنم کی طرف۔"

واپس شہر کی طرف آتے ہوئے ہم دونوں بہت خوش تھے۔ یہ ہم دونوں کی مشترکہ کوشش تھی۔ بلاشبہ اس میں ہماری ذہانت اور ہمّت کا بڑا ہاتھ تھا لیکن اصل ہاتھ اُس کا تھا جو ہمیں طاقت دیتا تھا، راستہ دکھاتا تھا اور تحفّظ فراہم کرتا تھا۔ میرا دل اُس خدا کے لیے شکرگزاری کے جذبات سے معمور تھا جس نے ہم بے وسیلہ لوگوں کو اتنے بڑے کام کا وسیلہ بنایا اور ہمیں توفیق عطا کی۔

ساڑھے چار بجے ہم نے 'بیوٹی بریڈ' کی گاڑی کو نیشنل اسٹیڈیم کی طرف جانے والی سڑک کے کنارے کھڑا کر دیا۔

"فی امان اللہ!" میں نے پیچھے کا دروازہ کھول کے چار بیویوں کے اکلوتے، بے اولاد شوہر سے کہا۔ "اب ہم جاتے ہیں۔ تمہاری گاڑی کا تھوڑا سا نقصان ہوا ہے لیکن اس میں ہماری غلطی نہیں۔"

"دشمن نے ایٹم بم گرا دیا تھا۔" محسن بولا۔ "گھر پہنچ جاؤ تو چاروں بیویوں سے کہنا کہ شکرانے کے نفل پڑھیں، نیاز دلوائیں۔"

کے ڈی اے اسکیم نمبر ون سے کارساز جانے والی سڑک پر آتے ہی ہمیں ایک ٹیکسی مل گئی۔ اس ٹیکسی نے ہمیں ڈرگ روڈ کے راستے نرسری پر اُتارا۔ وہاں سے ہم نے دوسری ٹیکسی پکڑی تو صدر پہنچے۔ بھوک اور تھکن سے ہم دونوں کا برا حال تھا۔ شام کے پانچ بجے لنچ کا کوئی وقت نہ تھا۔ سینٹرل کافی ہاؤس میں ہمیں سینڈوچ اور گرم سموسے ملے جو ہم نے کافی کے ساتھ کھا لیے۔ کافی بھی بہت عمدہ تھی۔ ایک بہت بڑی کامیابی کے بعد پیٹ میں کچھ گیا تو مجھے سرور محسوس ہوا۔ چونکہ میں اور محسن فرنچ میں گفتگو کر رہے تھے اس لیے ہمیں غیر ملکی جہاز کا ملاح سمجھا گیا۔ صدر کے علاقے میں اجنبی ملکوں کے سیلرز اکثر شاپنگ کرتے دکھائی دے جاتے تھے۔

"اب یہ ضروری ہے کہ ہم یہ وردی اُتار دیں۔" محسن نے دوسرا اسگریٹ جلانے کے بعد کہا۔ "ہمیں لوٹ کر بندرگاہ کے علاقے میں جانا ہے جہاں صبح ہم خاصا ہنگامہ کر چکے ہیں۔"

"فقیروں کے ٹھیکیدار کو ہماری تلاش بھی ہوگی۔" میں نے اس سے اتفاق کیا۔

"وہ ٹھیکیدار تو اللہ کو پیارا ہوا۔"

"ایسے لوگ جہنم رسید ہوتے ہیں، اللہ کو پیارے نہیں ہو سکتے۔" میں نے کہا۔

"اس کے والی وارث دوسرے ٹھیکیدار، زیادہ بڑے بدمعاش ضرور پوچھتے پھر رہے ہوں گے کہ وہ غیر ملکی کون تھے اور کس جہاز پر سے آئے تھے۔" محسن بولا۔

"نام تو دیکھ لیا ہوگا وہاں بہت سے لوگوں نے۔ ہماری وردی کے کندھے پر جہاز کا نام تھا۔" میں نے کہا۔

"یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہمارے نام نوٹ کر لیے گئے ہوں۔"

"جس نے نوٹ کیے وہ سامنے کیوں نہیں آیا؟"

"یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ ہمارے راستے میں مزاحم ہوتا وہاں باقاعدہ جنگ چھڑ جاتی۔" میں نے کہا۔ "لیکن بات یقینی ہے کہ اسی علاقے میں دوسرے فقیر ہوں گے اور دوسرے ایجنٹ بھی ہوں گے۔ ان کی آپس میں پیشہ ورانہ رقابت الگ چیز ہے۔ گداگری کے مخالفین کے سامنے اُن کے مشترکہ مفادات ایک ہو جاتے ہیں۔ وہ مطمئن ہوں گے کہ ہم پولیس اسٹیشن ہی تو جا رہے ہیں۔ فکر کی کون سی بات ہے۔ وہ بھی انہی کے سرپرست ہوتے ہیں۔"

"لیکن اب تک انھیں معلوم ہو چکا ہوگا کہ ہم نے اس گداگری کے ٹھیکیدار کو مار کے پھینک دیا بے شک یہ حقائق کے خلاف بات ہے مگر واقعات کی شہادت تو ایسا ہی ثابت کرے گی، جب اُس کی لاش کچلی ہوئی حالت میں سڑک پر پڑی ملے گی۔"

"وہ جیپ والا تو یقیناً بھاگ گیا ہوگا۔" میں نے محسن کے خیال کی تائید کی۔ "میرا خیال ہے اب تک دوسرے گداگروں تک یہ خبر پہنچ چکی ہو گی۔ ایسی صورت میں ہمارے نام کی اور ہمارے جہاز کے نام کی تلاش جاری ہو گی۔"

محسن ہنسا۔ "ڈھونڈتے رہیں سالے۔ معلوم نہیں وہ جہاز کہاں گیا اور وہ کہاں گئے جن کی وردیاں ہم زیب تن کیے پھر رہے ہیں۔ ناکامی انھیں مزید مشتعل کرے گی۔"

خود کو غیر ملکی ثابت کرنے کے لیے میں نے بل کی ادائیگی کے لیے دس ڈالر کا نوٹ نکالا۔ ویٹر کچھ دیر سر کھجاتا رہا۔ پھر نوٹ اٹھا کے کاؤنٹر پر لے گیا جہاں مالک یا منیجر بیٹھا ہوا تھا وہ خود ہمارے پاس آیا۔

"یو نو انگلش؟" (تمھیں انگریزی آتی ہے؟)

ہم نے مسکرا کے نفی میں سر ہلایا۔

اُس نے اپنی جیب سے دس کا نوٹ نکالا اور دس ڈالر کے نوٹ کے ساتھ میز پر رکھا۔ "دس۔" اس نے دس روپے کے نوٹ پر انگلی رکھی اور سر کو اوپر نیچے ہلایا۔ "یس۔" پھر اس نے دس ڈالر پر انگلی رکھی اور سر کو نفی میں حرکت دی۔ "نو۔"

میں نے اس سے دس ڈالر کا نوٹ لے لیا اور احمقوں کی طرح اس کی شکل دیکھنے لگا۔ سوال میری صورت پر تحریر تھا کہ بتاؤ اب ہم کیا کریں، وہ منیجر تھا یا مالک مگر اس نے بڑی خوش اخلاقی اور فیاضی سے ہمارے شانے پر تھپکی دی۔

"اِٹ اِز آل رائٹ۔" (کوئی بات نہیں)، "یو آر مائی گیسٹ (تم میرے مہمان ہو)، سو لانگ ایز یو آر ان پاکستان۔" (جب تک تم پاکستان میں ہو۔)

اس شخص کی مہمان نوازی اور وطن دوستی نے مجھے خوش بھی کیا اور شرمندہ بھی۔ شرمندہ اس لیے کہ میں نے بے سبب خود کو غیر ملکی ظاہر کیا جبکہ میں پاکستانی تھا۔ میرے پاس پاکستانی کرنسی بھی تھی مگر میں کھانے کی ادائیگی کیے بغیر جانے پر مجبور تھا۔ مجھے ایسی صورت حال پیدا ہونے کی توقع بالکل نہ تھی ورنہ میں ایسا ہرگز نہ کرتا۔

آس پاس کی میزوں پر بیٹھے ہوئے بہت سے لوگ ہماری طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ ان میں سے ایک قدرے تاخیر سے ترجمان بننے کے لیے اٹھا۔ جو کچھ اس نے مضحکہ خیز فرانسیسی میں کہا، اُس کا مطلب یہ نکلتا تھا کہ وہ ابھی فرنچ سیکھ رہا ہے اور شام کے وقت "الائنس فرانس" سے فرنچ لینگویج کا کورس کر رہا ہے۔ اس نے سینٹرل کافی ہاؤس کے مالک یا منیجر کے جذبات کی عکاسی میں بھی بڑے جوش و خروش کا مظاہرہ کیا اور دو بار اپنے سینے پر بھی ہاتھ مار کے کہا کہ ہم پاکستانی قوم ہیں اور مہمان نوازی ہماری تہذیبی روایات کا حصہ ہے چنانچہ وہ ہماری طرف سے ادائیگی کرنا چاہتا ہے۔

اب کافی ہاؤس کے اس مالک یا منیجر اور ہمارے نئے جوشیلے میزبان کے درمیان مکالمہ شروع ہوا جس میں بالآخر کافی ہاؤس والا جیت گیا اور جوشیلے نوجوان کو خاصی مایوسی کے ساتھ واپس اپنی سیٹ پر جانا پڑا۔ ہم اُٹھ کھڑے ہوئے اور کاؤنٹر تک گئے تاکہ میزبان کا شکریہ ادا کریں۔

میں نے اس سے مصافحہ کر کے فرانسیسی میں اس کا شکریہ ادا کیا۔ پھر محسن نے اس سے ہاتھ ملایا مگر مجھے یوں لگا جیسے ہمارا میزبان ضرورت سے زیادہ سنجیدہ ہے اور متفکر ہے۔ ہم باہر نکلے ہی تھے کہ ایک ویٹر نے ہمارے ہاتھ میں وہ بل تھما دیا جس کی ادائیگی ہم فارن ایکس چینج میں نہیں کر سکے تھے۔ بل پیش کرنے والا ویٹر بھی وہی تھا۔

"یہ کیا اسب کے سامنے ڈراما ہو رہا تھا؟" میں نے برہمی سے کہا۔

"خبیث، بڑا مہمان نواز اور فراخ دل بن رہا تھا۔" محسن بولا۔

لیکن پھر میں نے بل کو دیکھا تو اس کی پشت پر انگریزی میں لکھا ہوا تھا۔ "مسٹر سکندر! اس ویٹر کے ساتھ آجائیے۔"

میں نے وہ رقعہ محسن کی طرف بڑھایا۔ محسن کی صورت پر بھی بارہ بج گئے۔ ویٹر خاموش اور منتظر کھڑا ہوا تھا اور میں عجیب مشکل میں پڑ گیا تھا۔ میں ویٹر سے یہ بھی نہیں پوچھ سکتا تھا کہ رقعہ کس نے دیا ہے۔ ویٹر فرنچ نہیں جانتا تھا۔ میں اردو بولتا تو اس کے سامنے شرمندہ ہوتا کہ میں نے بل نہ دینے کے لیے سب سوانگ رچایا تھا۔ محسن میری طرف دیکھ رہا تھا اور مجسم سوالیہ نشان بنا ہوا تھا۔

فیصلے سے پہلے سوچ بچار میں گنوانے کے لیے وقت تھا ہی نہیں۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا اور محسن نے سر ہلا کے اس فیصلے کی توثیق کی۔ دوست، دشمن ہر جگہ تھے مگر تجربہ بتاتا تھا کہ دشمن ایک ہے تو دوست ہزار۔ اور یہ شخص جو کراچی کے ایک معروف علاقے میں اپنا شریفانہ کاروبار چلا رہا ہے، دلاور یا حاجی عبداللہ جیسے بدمعاش لوگوں کا ساتھی کیسے ہو سکتا ہے۔

ویٹر ہمیں فریدہ چیمبر کی طرف سے اندر لے گیا۔ میں نے دیکھا کہ کئی منزلہ عمارت میں بہت لمبی چوڑی ڈگریوں والے اسپیشلسٹ ڈاکٹر ہر فلور پر موجود ہیں۔ ان سب کے ناموں کی تختیاں نیچے ہی لگی ہوئی تھیں جن پر اُن کا روم نمبر اور اوقات مطب بھی لکھے ہوئے تھے۔ گزرتے گزرتے میں نے ایک نام دیکھا۔ "رندھاوا۔" بہت سی ڈگریوں کے بعد لکھا ہوا تھا "سابق سول سرجن۔" اس سے مجھے کچھ یاد آیا۔ شاید میں نے کسی اخبار میں کوئی خبر پڑھی تھی کہ کسی ڈاکٹر رندھاوا پر پولیس نے رشوت ستانی کا جھوٹا کیس بنانے کی ناکام کوشش کی تھی پھر مجھے شک ہوا کہ بات کچھ اور تھی۔

اچانک محسن نے کہا۔ "یار، وہ جو صبح خاتون ہمیں ملی تھیں . . ."

"ہاں، وہ مسز ڈاکٹر رندھاوا تھی۔" میں نے کہا۔ اُس نے ہمیں پہچان لیا تھا۔

"وہ خود ڈاکٹر تھی . . . یا اس ڈاکٹر رندھاوا کی بیوی تھی۔"

"تو نے کیسے جانا کہ وہ مسز رندھاوا تھی . . .؟" میں نے کہا۔

"پیچھے گاڑی میں بہت سے لفافے وغیرہ پڑے تھے۔ اُن سب پر ایک ہی نام تھا۔" محسن نے کہا۔

ویٹر نے ایک کمرے کے بند دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے دروازے پر دستک دی اور پھر ہینڈل گھما کے اندر چلا گیا۔ اندر وہی شخص موجود تھا جس سے ہم چند منٹ پہلے کاؤنٹر پر ہاتھ ملا کے آئے تھے۔ ہم نے

اُس کے سامنے اداکاری کی تھی مگر وہ ہم سے بازی لے گیا تھا۔

"آیئے مسٹر سکندر۔" اُس نے پھر ہم سے ہاتھ ملایا اور اب اُردو میں بات کی۔ "کیا یہ آپ کے ساتھی ہیں محسن خان؟"

"پہلے تو میں بل ادا کروں گا۔" میں نے کہا۔ "شرمندگی کے ساتھ۔"

وہ ہنسا۔ "بل آپ ریسٹورنٹ میں دے سکتے تھے اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ آپ مہمان ہیں میرے۔"

"لیکن میں اور آپ دونوں پاکستانی ہیں۔"

"پھر کیا ہوا۔ کیا پاکستان میں لوگ ایک دوسرے کے مہمان نہیں ہوتے۔" وہ بولا۔ "شرمندگی کیسی۔ مجھے تو خوشی ہے کہ اس طرح مجھے آپ لوگوں سے ملنے کا موقع ملا۔ میں ہر گاہک کی صورت پر غور نہیں کرتا لیکن میں آپ کی ٹیبل پر آیا تو میں نے فوراً پہچان لیا آپ کو۔"

"یہ مسئلہ بہت تشویشناک ہوتا جا رہا ہے۔ آج صبح ایک لیڈی ڈاکٹر نے ہمیں پہچان لیا تھا۔" میں نے کہا۔

"میں نے آپ لوگوں کو اسی لیے بُلایا ہے کہ آپ کو کچھ سمجھا دوں۔" وہ بولا۔ "ویسے تو آپ مجھ سے زیادہ سمجھتے ہیں کہ آپ کو کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ کیا آپ چند منٹ تشریف رکھیں گے؟"

"رکھ دیں گے۔" میں نے کہا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔ "لیکن وقت کم ہے ہمارے پاس۔"

"میں نے کافی منگوائی ہے۔" وہ بولا اور ہمارے مقابل دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا۔ درمیان میں بہت خوب صورت کاشانی قالین تھا اور براس ٹاپ ٹیبل تھی۔ وہ کمرا ذوق نفاست اور شانِ امارت میں توازن کا آئینہ دار تھا اور مجموعی طور پر بہت پُر آسائش تھا۔ اس میں ایک طرف بیڈ تھا۔ اسی کے ساتھ ایک ہی ڈیزائن کی ڈریسنگ ٹیبل اور وارڈروب ایستادہ تھیں۔

"میں ایک ریسٹورنٹ چلاتا ہوں۔" وہ کچھ دیر بعد بولا۔ "صبح سے شام تک یہاں سیکڑوں لوگ آتے ہیں۔ سب اپنی اپنی باتیں کرتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ کوئی کسی دوسرے کی بات نہیں سننے آتا اور یہ سمجھتا ہے کہ اس کی بات بھی کوئی نہیں سنے گا۔ لیکن میں سب کی سنتا رہتا ہوں۔ بولتا نہیں مگر کان کیسے بند کر سکتا ہوں۔"

ویٹر نے دروازے کو آہستہ سے ناک کیا اور پھر کافی کی ٹرے کے ساتھ اندر آگیا۔ اس نے برتن خاموشی سے میز پر رکھے اور سوالیہ نظروں سے مالک کی طرف دیکھا کر اور کوئی حکم؟

مجھے اچانک یاد آگیا کہ میرے پاس سگریٹ ختم ہو گئے ہیں۔ میں نے ویٹر کو دس کا ایک نوٹ دینا چاہا مگر ہمارے میزبان نے مجھے روک دیا۔

"بجٹ آنے والا ہے نا۔ اور ان حالات میں بہت زیادہ ٹیکس لگ جانے کی اُمید ہے۔" وہ بولا۔ "بازار سے اچھے سگریٹ غائب ہو گئے ہیں لیکن میں منگوا دیتا ہوں۔"

اُس نے ویٹر کو سو کا نوٹ دیا اور کہا کہ چوہدری سے دو کارٹن لے آئے۔ ویٹر نے سر ہلایا اور غائب ہو گیا۔

"تو میں عرض کر رہا تھا کہ یہاں بیٹھ کے جو کچھ میں ایک دن میں سُن لیتا ہوں وہ دس اخباروں کے برابر ہوتا ہے۔ جھوٹ سچ، افواہیں اور خبریں۔ مجھے رائے عامہ کا بالکل صحیح اندازہ رہتا ہے۔ بیشتر لوگ کاروباری باتیں کرتے ہیں یا پھر سیاسی باتیں۔"

"حالانکہ آپ نے لکھ دیا ہے کہ سیاسی گفتگو سے احتراز کریں۔"

"وہ تو مجبوری ہے۔ ایک مارشل لا کو پہلے بھگت چکے ہیں۔ یہ دوسرا مارشل لا اس کی ناجائز اولاد ہے۔" وہ برہمی سے بولا۔ "ایک جنرل جاتے جاتے یہ ملک دوسرے جنرل کو تحفے میں دے گیا کہ عیش کرو۔ لوگ خود نالاں ہیں۔ دبے ہوئے جذبات اظہار کا راستہ مانگتے ہیں مگر ہم بزنس کر رہے ہیں۔ ریسٹورنٹ کو سیاسی اکھاڑہ نہیں بنا سکتے۔ اختلافِ رائے بڑھ جائے تو جذبات مشتعل ہو جاتے ہیں۔ بُردباری اور تحمل تو یہاں کا مزاج ہی نہیں۔ اب میں جانتا ہوں کہ رائے عامہ کس طرح بٹی ہوئی ہے۔ اکثریت شیخ مجیب کی مخالف ہے اور اُسے غدار سمجھتی ہے۔ یہ چاہتی ہے کہ اُسے سرِعام پھانسی پر لٹکا دیا جائے مگر سیاست میں غداری اور حُب الوطنی کے لیبل بدلتے رہتے ہیں۔ دوسرا گروہ پیپلز پارٹی کا حامی ہے۔ آپ تو جانتے ہوں گے کہ اس نئی جماعت نے بہت جلد کتنی عوامی مقبولیت حاصل کر لی ہے۔ پھر ایک طبقہ سابق صدر ایوب خان کا حامی بھی ہے۔ ڈر رہتا ہے کہ ایک میز پر ہونے والی بحث ہی خانہ جنگی کا سبب نہ بن جائے۔"

میں نے کافی پیتے ہوئے کلائی کی گھڑی کو دیکھا۔

وہ میرا مطلب سمجھ گیا۔ "مجھے صرف یہ کہنا تھا کہ میں نے بارہا لوگوں سے آپ کا ذکر سنا ہے۔ نوجوان خاص طور پر آپ کے کارناموں کو زیادہ سراہتے ہیں۔"

"ہم نے تو کوئی کارنامہ سرانجام نہیں دیا۔" میں نے کہا۔

"یہ کسرِ نفسی ہو سکتی ہے، حقیقت نہیں۔" وہ بولا۔ "سب اخبارات میں آچکا ہے۔"

"ہمارے مخالف اور دشمن بھی تو آتے ہوں گے۔ وہ کیا کہتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"میں آپ کو انھی سے خبردار کرنا چاہتا تھا۔ آپ کو اس طرح صدر جیسی جگہ پر ایسے نہیں پھرنا چاہیے۔" وہ بولا۔ "جیسے میں نے آپ کو پہچانا ایسے ہی آپ کے بدخواہ اور اس ملک کے دشمن بھی آپ کو پہچان کر نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ آپ اتنے غیر معروف اور گمنام نہیں رہے۔ یا پھر آپ کم سے کم چہرہ بدل لیں۔ ایسا میک اپ کرالیں کہ کوئی بھی شناخت نہ کر سکے۔ نہ دوست نہ دشمن۔"

"کہاں سے کرالیں؟" میں نے کہا۔ "یہاں تو ہم کسی کو بھی نہیں جانتے جو ہماری مدد کر سکے۔"

"اچھا، آپ یوں کریں۔" وہ بولا۔ "بالکل پیچھے والی سڑک ایلفنسٹن اسٹریٹ ہے۔ وہاں ایک ہی ائر کنڈیشنڈ ہیر ڈریسنگ سیلون ہے۔ 'ماڈرن'۔ وہ بہت اچھا آرٹسٹ ہے اور بہت اچھا آدمی۔"

"کیا مطلب؟ ہم اس کے پاس جا کے کہیں کہ دیکھو بھئی میں سکندر بخت ہوں۔ تم مجھے میک اپ سے وحید مراد بنا دو اور یہ محسن ہے، اسے ندیم۔"

وہ مسکرایا۔ "آپ میرا کارڈ لے جائیں اُس کے پاس۔" اس نے ہمیں جیب سے اپنا کارڈ نکال کے دیا۔ "میں آپ کو بتاتا ہوں کہ یہاں آپ کے مخالف کون لوگ آتے ہیں۔ ایک تو پولیس والے ہیں۔ سامنے ایف آئی اے کا دفتر ہے۔ سی آئی اے سینٹر بھی صدر میں ہے۔ ہم تو انھیں صورت سے بھی پہچان لیتے ہیں۔ ویسے وہ اپنا تعارف خود کرا دیتے ہیں۔ تعارف کا مقصد اور کچھ نہیں ہوتا اس کے سوا، کہ خبردار جو ہمیں بل بھیجنے میں کی غلطی کی۔"

"آپ انھیں بھی مفت کھلاتے ہیں۔ اس طرح تو ہم اور وہ برابر ہو گئے ہیں۔" میں نے کہا۔

"آپ سمجھنے کی کوشش کریں۔ کُتّے سے تو چور بھی ڈرتے ہیں۔ ہم تو شریف آدمی ہیں۔ ہمارے پاس شرفا آتے ہیں۔ ہم کُتّے کو بھونکنے اور کاٹنے سے اسی طرح روک سکتے ہیں کہ اسے ہڈی ڈال دیں۔" وہ بولا۔ "گزشتہ دنوں لاہور سے کوئی ایس پی آیا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ یہاں تین ایف آئی اے کے آدمی بھی آئے تھے، وہ آپ ہی کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔"

"کیا نام تھا اس ایس پی کا، سراج؟"

اُس نے نفی میں سر ہلایا۔ "نام تو معلوم نہیں ہو سکا۔ وہ اے ایس پی صاحب کہہ کے مخاطب کر رہے تھے۔"

"ایف آئی اے کے تینوں آدمی مقامی تھے؟ ان کو جانتے ہو تم؟" میں نے کہا۔

اُس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "وہ آتے رہتے ہیں جب آپ آئے تھے، اُس وقت وہ بھی بیٹھے ہوئے تھے۔"

مجھے پریشانی لاحق ہونے لگی۔ "انھوں نے بھی دیکھ لیا ہو گا؟"

"آپ لوگوں کی قسمت اچھی ہے۔" وہ بولا۔ "کہ ادھر سے آپ آئے اور وہ اٹھ کے دوسری طرف سے نکل گئے۔ ان کے علاوہ ایک ٹولی ہے سرکاری ملازمین کی۔ ان میں دو افسر ہیں۔ کلاس وَن اور دو ماتحت ہیں۔ سب الگ الگ محکموں کے آدمی ہیں۔ آپ تو جانتے ہوں گے کہ سامنے پاک سیکرٹریٹ ہے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "پاکستان سیکرٹریٹ کا صرف نام سُنا ہے۔"

"سب سرکاری دفاتر ہیں۔" وہ بولا۔ "مرکزی حکومت کے جو دفاتر اسلام آباد منتقل نہیں ہوئے وہ سب ہیں۔ ان دفاتر کا تھوڑا سا عملہ بھی ہے جو منتقل کیے جا چکے ہیں۔ سو، سوا سو بیرکس ہیں جو ادھر مسجدِ خضرا اور چیف کورٹ سے لے کر عقب میں اسمبلی بلڈنگ تک پھیلی ہوئی ہیں۔ ان دفتروں میں آدھے بنگالی کام کرتے ہیں۔"

وہ خاموش ہوا تو میں نے کہا۔ "وہ چاروں بھی بنگالی ہیں؟"

اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "وہ بنگالی میں بات کرتے ہیں۔ میں خود تو بنگالی نہیں سمجھتا لیکن ایک ویٹر ہے میرے پاس، جو بہت عرصہ مشرقی پاکستان میں رہا۔ ہیرا پھیری کرتا تھا۔ جیل گیا اور جیل سے بھاگا تو یہاں آگیا۔ اب سُدھر گیا ہے۔ اس نے ایک دن مجھے بتایا کہ یہ چاروں آدمی ٹھیک نہیں ہیں۔ میں نے تفصیل پوچھی تو اس نے کہا کہ یہ غداری کر رہے ہیں۔ دفتروں سے فائلیں لاتے

ہیں اور فوٹو اسٹیٹ کرا لیتے ہیں۔ آخر کیا کرتے ہوں گے یہ فائلوں کی فوٹو اسٹیٹ نقول بنوا کے۔ اس بات پر میں کھٹک گیا۔ میں نے اس ویٹر سے کہا کہ یہ بات کسی کو معلوم نہ ہو۔ آئندہ وہ جب بھی آئیں اُن کی باتیں سنو اور پھر کسی ایک کے پیچھے لگ جاؤ۔ دیکھو وہ باہر نکل کے کہاں جاتے ہیں۔ الگ الگ جائیں تو اُس کا پہلے تعاقب کرو جو اُن کا سرغنہ ہو۔ وہ حکم چلانے کا عادی ہوگا' باقی سب اس کی مانتے ہوں گے۔ اس ویٹر نے یہی کیا۔ تیسرے دن وہ پھر آئے اور ویٹر نے اپنی وردی اُتار دی۔ وہ اُن کے پیچھے والے کیبن میں جا بیٹھا۔ عام لوگوں کی طرح چائے پیتا رہا۔ آپ نے دیکھا ہوگا کیبن الگ الگ نہیں ہیں۔ بس ہر میز کو تین فٹ اونچی پارٹیشن سے الگ کر دیا گیا ہے۔ جو بیٹھے ہوں اُن کے چہرے ایک دوسرے کو نظر نہیں آتے۔ ایک میز پر چار آدمی بیٹھتے ہیں۔ آمنے سامنے دو دو۔ دونوں جانب پشت پر شیشے کی پارٹیشن کے پیچھے دوسرے لوگ ہوتے ہیں۔"

"میں سمجھ گیا۔" میں نے کہا۔

"جب وہ لوگ اٹھے تو میرا وہ جاسوس بھی اٹھا اور اُس نے دو اہم باتیں معلوم کرلیں۔ ایک تو یہ کہ فائلیں وہ کہاں فوٹو اسٹیٹ بنوانے کے لیے دیتے ہیں۔ وہ جگہ یہاں سے قریب ہی تھی۔ جتنی دیر میں دستاویزات کی نقلیں بنتی تھیں' وہ یہاں بیٹھ کے چائے پیتے تھے پھر گھنٹا بھر بعد جاتے تھے تو راستے میں ایک جگہ پان کھاتے تھے۔ اسی سڑک پر آگے آئیڈیل لائف انشورنس کا دفتر ہے' اُس کے نیچے فوٹو اسٹیٹ شاپ ہے' سامنے پان والا ہے۔ فوٹو اسٹیٹ مشین بھی ایک بنگالی نے لگا رکھی ہے اور پان شاپ بھی اُسی کی ہے۔ اس کا بھائی بیٹھتا ہے۔ وہ فائلوں کو سامنے پہنچا دیتا ہے۔ اس کی فوٹو کاپیاں خود رکھتا ہوگا۔ وہ پان کی دکان سے فائلیں لیتے ہیں اور اپنے اپنے گھر چلے جاتے ہیں۔ اگلے دن صبح آفس جاتے ہوں گے تو فائلیں ساتھ لے جاتے ہوں گے اور کسی کو خبر تک نہیں ہوتی ہوگی کہ فائلیں غائب ہوئی تھیں۔"

"اوہ مائی گڈنس — یہ تو بہت خطرناک کام ہو رہا ہے۔ تم کب سے دیکھ رہے ہو؟"

"تقریباً ایک مہینے سے۔"

"اور ابھی تک تم نے کچھ بھی نہیں کیا؟" میں نے کہا۔

"میں کیا کر سکتا ہوں اور کیسے کر سکتا ہوں۔ اس کام میں تو بہت سے قانونی مرحلے ہیں۔" وہ بولا۔ "اول تو پولیس کو یقین دلانا ہی مشکل کام ہے کہ اس طرح اہم ملکی رازوں پر مشتمل دستاویزات نکالی جا رہی ہیں۔ میرے پاس ثبوت کوئی نہیں ہے۔ پھر یہ کیسے پتا چلے گا کہ دستاویزات اہم ہیں یا کہ نہیں اور کہاں جا رہی ہیں۔ مجھے تو پولیس پر بالکل اعتماد نہیں۔ یا تو وہ مجھے ہی پریشان کریں گے یا ان غداروں کو پکڑا بھی تو مال بٹورنے کے چکر میں پکڑیں گے۔ انھیں تو خدا موقع دے۔ بعد میں وہ مجھے چھتر ماریں گے کہ شرفا پر جھوٹے الزامات لگاتے ہو۔ شرفا الگ دشمن ہوں گے اور ظاہر ہے اپنا ٹھکانا بدل دیں گے۔ ویٹر ان میں سے دو کے گھر دیکھ آیا ہے۔ دونوں افسر یہاں جیکب لائن کے سرکاری بنگلوں میں رہتے ہیں۔"

"نام پتے معلوم ہیں تمھیں؟"

اُس نے اقرار میں سر ہلایا اور جیب میں سے ایک نوٹ بک نکالی۔ اُس میں سے ایک صفحہ پھاڑ کے چند سطریں لکھیں۔ "ایک افسر رہتا ہے مولانا احتشام الحق تھانوی صاحب کی مسجد کے پیچھے نمبر سی ٹین میں اور دوسرا بندو خاں کے پیچھے نمبر سی اڑتیس میں۔ دونوں ماتحت سگے بھائی ہیں اور کلیٹن کوارٹرز میں رہتے ہیں۔ آپ نے دیکھے ہیں؟"

"جہانگیر روڈ کے کوارٹر دیکھے ہیں۔" میں نے اس بے باک اور نڈر صحافی کو یاد کیا جس نے اپنی جان ہم پر اور وطن پر قربان کر دی تھی۔

"بس وہیں۔ آپ نیوٹاؤن مسجد کی طرف سے جائیں' اس کے پیچھے سڑک جا رہی ہے کوارٹر نمبر ڈی سیون فور۔"

"یہ نیوٹاؤن مسجد کہاں ہے؟" محسن بولا۔

"گرومندر سے سیدھے ہاتھ والی سڑک . . . کیا میں آپ کو پہنچا دوں اپنی گاڑی میں؟"

"نہیں شکریہ۔ افسوس یہ ہے کہ ہمارے پاس آج وقت نہیں ہوگا ورنہ ہم ان سے بھی نمٹ لیتے۔" میں نے کہا۔ "سب معلوم کر لیتے۔ تم ایسا کرو کہ خاموشی سے اپنا کام کرتے رہو۔ ہم ایک شخص کو بھیج دیں گے۔ وہ ہمارے حوالے سے یہی کاغذ کا پرزہ لے کر آئے گا۔ وہ ایک ٹیکسی ڈرائیور ہے اور اُس کا نام ہے اکرام شیخ۔"

"ٹھیک ہے' میں اُسے بتا دوں گا۔"

"کیا یہ ممکن ہے کہ ہمارے خطوط یا پیغامات بھی تمھاری معرفت وصول ہو جائیں؟" میں نے پوچھا۔

"کافی ہاؤس میں تو نہیں لیکن میرے اس کمرے کا نمبر اور یہاں کا ٹیلی فون نمبر کارڈ پر ہے۔" وہ بولا۔ "اگر یہ آپ کے کام آتا ہے تو مجھے خوشی ہوگی۔"

ویٹر پھر اندر آیا۔ اُس نے سگریٹوں کے دو کارٹن اور باقی پیسے میز پر رکھے اور لوٹ گیا۔

"کیا یہی وہ ویٹر ہے؟" میں نے کہا۔

"آپ نے خوب پہچانا۔" وہ خوش ہو کے بولا۔

"میرا اندازہ تھا کہ تم کسی اور پر اعتبار کا رسک نہیں لوگے۔" میں نے کہا۔ "یہ بھی ایک مشکل کام تھا۔" میں نے سگریٹوں کے کارٹن کی طرف اشارہ کیا۔ "اس کے لیے شکریہ۔ اب ایک اور مشکل کام ہے جس میں آپ ہماری مدد کر سکتے ہیں۔ ہمیں دو ریڈی میڈ سوٹ چاہئیں۔ کوٹ پتلون' ٹراپیکل۔"

"نئے' آپ کے سائز کے؟" اُس نے مایوسی سے انکار میں سر ہلایا۔ "یہاں کون پہنتا ہے سوٹ اس موسم میں۔ ریڈی میڈ ملنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہاں' ارجنٹ چوبیس گھنٹے میں تیار ہو جائے گا۔"

"چوبیس گھنٹے نہیں ہیں ہمارے پاس۔ زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے ہیں۔" محسن بولا۔

"پھر . . . آپ ایسا کریں کہ لائٹ ہاؤس چلے جائیں۔"

"لائٹ ہاؤس' یعنی روشنی کے مینار پر؟" میں نے کہا۔

وہ ہنسنے لگا۔ "یہ بندر روڈ پر ایک سینما ہے۔ اس کے ساتھ لنڈا بازار ہے۔ امریکن امداد کا مرکز۔ ہر سائز اور قیمت کا کوٹ بھی مل جائے گا' پتلون بھی ملے گی۔ شاید سوٹ بھی نکل آئے۔"

یہ ایک اچھی تجویز تھی۔ میرے ذہن میں لاہور کا لنڈا بازار بھی تھا جو سب کی ضرورت پوری کرتا تھا۔ اُن کی بھی جو کسی کمپلیکس کے بغیر لباس کے مسئلے کو کم آمدنی میں ایسے ہی حل کرتے تھے اور اُن کی بھی جو اپنے کلاس کمپلیکس کے ساتھ گاڑیاں دُور روک کے جاتے تھے اور نئے فیشن کے لیڈیز کوٹ' کارڈیگن اور بے بی سوٹ یوں چھپا کے لاتے تھے جیسے چوری کا مال ہو' اور بعد میں اُسے گفٹ پیک میں سب کے سامنے امریکا میں مقیم کسی کزن یا ماموں کا تحفہ بنا کے پیش کرتے تھے۔

"بس تو آپ ہمیں وہیں پہنچا دیں۔ اگر آپ کے پاس گاڑی ہے تو ہمارا وقت کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔

"میں آپ لوگوں کو گاڑی دے دیتا ہوں۔" اُس نے کہا اور پتلون کی جیب میں سے چابی نکال کے ہمارے سامنے ڈال دی۔ "ساتھ والی گلی میں کھڑی ہے نئی کرولا۔ ایک ہزار سی سی والا ماڈل' آپ لوگوں نے کم ہی دیکھا ہوگا' لائٹ بلیو کلر میں ہے۔"

"تھینک یو ویری مچ۔" میں نے کہا۔ "کوئی حرج تو نہیں اگر ہم کار کو رات آٹھ بجے کہیں چھوڑ دیں اور آپ کو فون کر دیں؟"

"کوئی حرج نہیں۔ میں منگوا لوں گا۔" وہ بولا۔

ہم ایک بار پھر اُس کا شکریہ ادا کر کے باہر نکلے تو شام کے سائے ڈھل چکے تھے۔ صدر کے علاقے میں بہت رش تھا اور خوش باش لوگوں کے ہجوم ہر طرف پھیلے ہوئے تھے۔ ہمیں کار تلاش کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی لیکن لائٹ ہاؤس کا راستہ ہمیں پوچھنا پڑا۔

لنڈا بازار ایک پتلی لمبی گلی تھی جس میں زیادہ رش نہیں تھا۔ کار کو ہم نے لائٹ ہاؤس سینما کے سامنے پارک کیا اور آدھے گھنٹے میں اپنی مرضی کے پرانے کوٹ پتلون بھی خرید لائے۔ دو پرانے ہیٹ بھی' جوتے بھی اور ٹائیاں بھی۔ یہ سب خریداری دو سو روپے میں مکمل ہو گئی۔ کپڑوں میں سے بو آ رہی تھی لیکن ہم وردیوں سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ پہلے میں لائٹ ہاؤس سینما کے ٹائلٹ میں گیا اور وہاں سے کپڑے بدل کے نکلا۔ اس وردی کو میں نے بنڈل بنا کے بغل میں دبا لیا تھا۔ پھر یہی حرکت محسن نے کی۔ ہیٹ لگا کے ہم دونوں مضحکہ خیز نظر آنے لگے۔ کیونکہ ہمارے آس پاس کوئی بھی پتلون کے ساتھ کوٹ پہن کے نہیں پھر رہا تھا۔ کچھ لوگ ہم پر ہنسے مگر ہم اُنھیں نظر انداز کرتے ہوئے کار میں نکل گئے۔ اگلا مرحلہ اس ہیئر ڈریسر سے میک اپ کرانے کا تھا۔ ہمارا یہ لباس صرف بندرگاہ کے علاقے سے گزرنے کے لیے تھا۔ آگے ہمیں ماہی گیر بن کے سفر کرنا تھا چنانچہ محسن نے مجھے مشورہ دیا کہ ہم صرف داڑھی کا اضافہ کر لیں تو ہمارے چہرے مچھیرانہ ہو سکتے ہیں۔

محسن کی بات معقول تھی۔ سمندری سفر میں سوٹ بوٹ ہمارے لیے بے کار تھا۔ پھر بھی یہ کپڑے پھینکے نہیں جا سکتے تھے۔ آگے نہ جانے کہاں کس دیس میں کس کا بھیس بنانا پڑے۔

"اب اکرام شیخ سے ملنے کا تو کوئی چانس نہیں رہا۔" محسن نے گھڑی دیکھ کے کہا۔

"ہاں۔ مل جاتا تو اچھا تھا۔ اس سے رابطے کی بات کر لیتے کہ آئندہ کہاں ہوگا اور کیسے ہوگا۔"

"دیکھو شاید وہ انتظار کرے۔" محسن بولا۔ "ہم سے وہ بھی ملنا چاہے گا' یہ جاننے کے لیے کہ ہمارے مشن کا کیا بنا۔"

ایلفنسٹن میں داخل ہونے کے لیے ہمیں چکر لگا کے آنا پڑا۔ ہم دکٹوریہ روڈ سے سیدھے گئے اور پھر گھوم کے واپس آئے۔ اس ہیئر ڈریسنگ سیلون کو تلاش کرنا مشکل ثابت نہ ہوا، لیکن وہاں کار پارکنگ کے لیے جگہ بنانا مسئلہ بن گیا۔ بالآخر ایک گاڑی قطار سے نکلی تو ہم نے فوراً اس کی جگہ لے لی۔

سیلون ایئر کنڈیشنڈ تھا اور اندر سے پورا آئینہ خانہ تھا۔ چاروں طرف دیوار گیر آئینوں میں ہمیں اپنے اَن گنت عکس دائیں اور بائیں متحرک دکھائی دیے۔ یوں لگتا تھا جیسے ایک ہی قطار میں ایک سے لوگ ایک سا لباس پہنے کھڑے ہیں اور ایک مشین اُن سب کی نقل و حرکت کو کنٹرول کرتی ہے۔ صف بستہ فوجیوں کی ڈرل پریڈ میں بھی اتنی ہم آہنگی نہیں ہوتی۔

تین سر گنجوں افراد نے جو خاصے فارغ البال تھے اور باقی ماندہ بالوں کو فیشن اور اسٹائل سے سر کا گنج چھپانے کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے' ہمیں حیرانی سے دیکھا۔ شیو بناتے بناتے ایک کاریگر کا ہاتھ رک گیا۔ اُن کے نزدیک ہم کارٹون تھے یا بے حد مضحکہ خیز نمونے تھے۔ مجھے احساس ہوا کہ یہ لباس تو ہمیں غیر معمولی طور پر توجہ کا مرکز بنا رہا ہے۔ کراچی میں اس موسم میں لوگ سوٹ پہنتے ہیں تو کسی اعلا درجے کے ہوٹل میں یا ایئر کنڈیشنڈ کار میں، لیکن وہ بھی عموماً بڑے بیورو کریٹ ہوتے ہیں اور ایسے لنڈا بازار کے کپڑوں میں نہیں ہوتے۔

میں نے استقبال کے لیے آنے والے ہیئر ڈریسر سے فرنچ میں کہا۔ "تم میری کچھ مدد کر سکتے ہو؟" اور کافی ہاؤس کے مالک یا منیجر کا دیا ہوا کارڈ اُسے تھما دیا۔

شیو بنوانے والا شخص ایک دم اُچھلا۔ "تم فرنچ ہو؟" اُس نے رواں فرانسیسی میں کہا اور منہ پر لگے ہوئے شیو کے صابن سمیت ہم سے گلے ملنے دوڑا۔ "میری ماں بھی فرنچ تھی، باپ پاکستانی ہے۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ کیسے معلوم تھا کہ اچانک فرانسیسی جاننے والا یوں مل جائے گا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میں نے بار بر سے کوئی غلط بات نہیں کی تھی۔

"میں وہیں پیدا ہوا تھا' پھر میری ماں مر گئی۔ میں باپ کے ساتھ آ گیا۔ دوبارہ تعلیم کے لیے گیا۔ اب آیا تھا کیونکہ میرا باپ بیمار تھا۔ وہ بھی مر گیا۔ میں واپس جا رہا ہوں۔ تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ اور تم یہ کیا حلیہ بنائے پھر رہے ہو؟ یہاں یہ سب نہیں چلتا۔" اس شخص نے ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ ڈالا۔

بالآخر مجھے بھی بولنے کا موقع ملا۔ "میں فرنچ نہیں ہوں۔" میں نے غرا کے کہا۔ "لیبیا کا رہنے والا ہوں۔ سمجھے۔"

اس کی سٹی گم ہو گئی۔ وہ واپس اپنی جگہ جا بیٹھا۔ ہم زندہ ہونے کے باوجود میں نے خود کو اس کا دشمن قرار دیا تھا۔ ہیئر ڈریسر اب ہمیں ایک پارلر میں لے گیا۔

"میں انتظار کر رہا تھا آپ لوگوں کا۔ مجھے فون آ چکا تھا آپ کے دوست کا۔" اُس نے کارڈ لوٹا کے کہا۔ "انھوں نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ آپ لوگ لائٹ ہاؤس گئے ہیں۔"

میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔ "پھر تو وضاحت کی ضرورت ہی نہیں۔"

"بتائیے' میں آپ لوگوں کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔" وہ بولا۔

ہم نے اُسے اپنی آمد کا مقصد بتایا۔ اس نے ہماری صورتوں کا غور سے جائزہ لیا اور پھر ہمیں دو کرسیوں پر بٹھا کے دونوں کا باری باری میک اپ کیا۔ اُس نے ہمارے بالوں کو عجیب طرح سے پھیلا دیا۔ اس طرح کہ ہمارے بال سیدھے اور لمبے ہو گئے مگر سامنے سے پیشانی پر آ گئے۔ ایک اسپرے سے اُن کا رنگ بھورا ہو گیا۔ اُس نے کہا' یہ بھورا رنگ پندرہ بیس دن رہے گا، پھر رفتہ رفتہ اُڑ جائے گا۔ اُس نے بالوں سے میچ کرتی ہوئی داڑھی بھی فراہم کی جو بالکل اصلی لگتی تھی۔ اس حلیے میں ہم بالکل ہپی نظر آنے لگے تھے مگر اسی وضع قطع کے ساتھ، ہم لباس بدل کے لنگی باندھ لیتے اور بنیان پہن لیتے یا شلوار کے ساتھ واسکٹ استعمال کرتے تب بھی فرق نہ پڑتا۔

ہم اس وطن دوست شخص کی خدمات کے اعتراف میں شکریے کے سوا اُسے کچھ نہ دے سکے۔ اُس نے معاوضہ لینے سے انکار کر دیا اور یہ بھی کہا کہ آئندہ کبھی

جب اس کی خدمات کی ضرورت ہو اور ہم خود نہ آ سکتے ہوں تو اُسے بلوا لیں۔ مخصوص امریکن ہپی لوگوں کی طرح جوان دنوں پاکستان میں ہر جگہ اپنی ہیئت کذائی میں سڑکوں پر اور بازاروں میں گھومتے نظر آتے تھے، ہم بھی تماشا بنے مگر دیکھنے والوں نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔ اتفاق سے عین اُسی چوراہے کے موڑ پر ایک ہپی اپنا ہیٹ زمین پر رکھے گٹار بجا رہا تھا اور لوگ اس کے ہیٹ میں سکے اور نوٹ ڈالتے جا رہے تھے۔ دیارِ غیر میں جہاں نہ کوئی جانتا ہو، نہ پہچانتا ہو، شرم و حیا اور بے عزتی کا احساس بے معنی ہو جاتا ہے اور یہ ہپی جو تن کے ایک جوڑے میں دنیا دیکھنے نکل کھڑے ہوتے ہیں اس بات کی بالکل پروا نہیں کرتے کہ دنیا انھیں دیکھ رہی ہے۔ ان کے لیے مانگ کے کھانا یا فٹ پاتھ پر فقیروں کی طرح سو جانا بھی اس ایڈونچر کا ایک حصہ تھا۔ تاہم کچھ عرصے سے اخبارات کے باریک بیں صحافی اِن آوارہ گرد نظر آنے والوں کی تعداد میں تشویشناک اضافے پر قومی سلامتی کے نقطۂ نظر سے اظہارِ خیال کر رہے تھے۔ کچھ ہپی حساس نوعیت کے اداروں کے قریب اور ممنوعہ علاقوں کے آس پاس منڈلاتے بھی دیکھے گئے تھے اور اُن کی پُراسرار سرگرمیاں قیاس آرائی کا سبب بن رہی تھیں۔

کار میں بندرگاہ کی طرف جاتے ہوئے میں نے محسن سے کہا۔ "کیا تُو نے غور کیا کہ آج دن بھر میں ہم نے کتنے ہپی دیکھے ہوں گے؟"

"ان کی اچانک یلغار کا کیا مطلب نکالا جا سکتا ہے؟" محسن نے جواباً سوال کیا۔

"عام خیال تو یہی ہے کہ . . . یہ لوگ جاسوسی کرتے ہیں۔ سیاح بن کے آتے ہیں چنانچہ ہر رعایت حاصل کر لیتے ہیں۔ غلط مقام پر بھی پکڑے جائیں تو یہ لاعلمی کا اعتراف کر کے معصوم بن جاتے ہیں اور ڈھیٹ بن کے ہر غلط کام کرنے سے شرماتے بھی نہیں۔ مثلاً تُو نے اس ہپی کو دیکھا جو گٹار بجا رہا تھا؟"

"اُسے میں نے بندرگاہ کے علاقے میں بھی دیکھا تھا۔" محسن نے کہا۔ "اسی طرح ہیٹ سامنے رکھے خاموش بیٹھا تھا۔ بظاہر گٹار بجانے میں مگن تھا لیکن اُس کی نظریں ہر سمت میں بھٹک رہی تھیں۔ پھر ایک عجیب بات ہوئی۔ ایک ٹیکسی ڈرائیور نے اُسے ایک رقعہ لا کے دیا۔ اُس نے رُقعہ پڑھا اور ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ چلا گیا ٹیکسی میں بیٹھ کے۔"

گاڑی نے چلتے چلتے جھٹکے لینے شروع کیے۔ میں نے فیول میٹر پر نظر ڈالی تو سوئی 'ای' کے نشان سے بھی نیچے کی طرف مائل تھی۔

"پیٹرول ختم ہو گیا۔" محسن بولا۔

"ہاں۔ دھیان ہی نہیں رہا اس کا۔" میں نے کہا۔ گاڑی کے انجن نے چند ہچکیاں لیں اور خاموش ہو گیا۔

"اب پیٹرول پمپ تک دھکا لگا کے جانا ہوگا۔" محسن بولا۔

پیٹرول پمپ کا روشن سائن بورڈ تین چار فرلانگ کے فاصلے پر نظر آ رہا تھا۔ "مارے گئے پھر تو۔" میں نے کوٹ اُتار کے کار میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "نیچے اُتر آؤ شہزادے۔"

"یار کسی سے پیٹرول کی بھیک مانگتے ہیں، آخر ہم بھی ہپی ہیں۔" محسن بولا۔ "اللہ کے نام پر ایک روپے کا پیٹرول دے جا بابا۔"

"وہ تو ایک لیٹر بھی نہیں ہوگا۔" میں نے کہا۔

"پیٹرول پمپ تک تو پہنچ جائیں گے۔" محسن بولا۔ "کوشش کرتے ہیں' شاید کوئی دردمند دل رکھنے والا رُک جائے۔"

لیکن اس کی کوشش ناکام رہی۔ ایک گاڑی والا رُکا تو اُس نے معذرت کی۔ اس کے پاس کار میں سے پیٹرول نکالنے کے لیے نہ پائپ تھا نہ ڈبّا۔ تاہم اُس نے ہماری کار کو ایک موٹی رسّی نکال کے اپنی کار کے پیچھے باندھ لیا اور کھینچ کر پیٹرول پمپ تک پہنچا دیا۔ پیٹرول بھروا کے پھر روانہ ہونے میں مزید آدھا گھنٹا ضائع ہو گیا۔ جب ہم بندرگاہ کے علاقے میں پہنچے تو رات کے نو بج چکے تھے۔

کار کو ہم نے بہت دور چھوڑا اور اپنے اسباب کے پیکٹ اٹھا کے چل پڑے۔ ٹیکسی اسٹینڈ پر چھ سات ٹیکسیاں آڑی ترچھی کھڑی ہوئی تھیں لیکن ڈرائیور ایک بھی نہیں تھا۔ میں نے قریب سے سب کے نمبر دیکھے ان میں اکرام شیخ کی ٹیکسی نہیں تھی۔ مجھے اس کی توقع بھی کم تھی، پھر بھی مجھے مایوسی ہوئی۔

"میرا خیال تھا کہ وہ انتظار کرے گا۔" محسن بولا۔ "معلوم نہیں بعد میں کیا حالات ہوئے۔ کہیں گداگری کے ٹھیکیدار اس کے خلاف تو نہیں ہو گئے

یا پھر تو نہیں گئے؟" میں نے کہا" وہی پیش پیش تھا پولیس اسٹیشن جانے کے معاملے میں؟"

ہم آگے روانہ ہونے ہی والے تھے کہ ایک ٹیکسی پیچھے سے آئی اور تقریباً ہمیں چھوتی ہوئی گزر گئی۔ میں نے خود کو تیزی سے الگ نہ کیا ہوتا تو شاید اس سے ٹکرا کے گر جاتا۔

"اُلو کا پٹھا۔ نشے میں ہے کیا؟" میں نے کہا۔

محسن نے کہا" تو نے کچھ اور بھی دیکھا؟ اس ٹیکسی میں کون تھا؟"

"کون تھا؟" میں نے اُس کی سنجیدگی پر حیران ہو کے کہا۔

"وہی ہپی۔ جو ابھی ایک گھنٹا پہلے ایلفنسٹن اسٹریٹ کے چوراہے پر گٹار بجا رہا تھا خیرات اکٹھی کر رہا تھا" محسن بولا۔ اور اُس نے مجھے ہاتھ پکڑ کے کھینچ لیا۔ اتنے اسباب کے ساتھ دوڑنا ایک مشکل کام تھا لیکن ٹیکسی ابھی رُکی ہی تھی کہ ہم پہنچ گئے۔ اُس ہپی نے بڑی بے نیازی سے ٹیکسی ڈرائیور کو چند نوٹ دیے اور باقی رقم لیے بغیر چل پڑا۔ اب اس کے ہاتھ میں ایک براؤن پیپر کا تھیلے جیسا لفافہ بھی تھا۔ وہ کسی کی طرف دیکھے بغیر آگے بڑھتا جا رہا تھا۔

میں نے اپنا سامان محسن کے حوالے کیا" میں اس کے پیچھے جاتا ہوں۔ آخر یہ ہپی یہاں کیا لینے آیا ہے؟"

"یہ کچھ دینے آیا ہے" محسن بولا" مگر بھائی یہ سب بنڈل میں کیسے لے جاؤں گا؟"

"جیسے چاہے لے جا" میں نے کہا" میری چھٹی حس اچانک مجھے اس پُراسرار ہپی کے بارے میں خطرے کا سگنل دینے لگی ہے۔"

"میری ساتویں حس نے یہ سگنل پہلے دیا تھا" محسن بولا "اس کا پیچھا کرتے ہوئے امریکا مت چلے جانا۔"

"اگر میں لانچ پر نہ آؤں تو۔ . . پھر مجھے اسی جگہ ملنا جہاں ہماری کار کھڑی ہوئی ہے" میں نے کہا اور نگاہ اُس ہپی پر رکھی جو اَب ہم سے چالیس قدم آگے خاصے اطمینان سے سگریٹ کا دھواں اُڑاتا جا رہا تھا۔

"کتنے بجے تک انتظار کروں میں؟"

"دس بجے تک" میں نے کہا۔

محسن نے کہا" آج رات شاید ہمیں روانگی بھی اختیار کرنی پڑے۔"

میں نے سر ہلایا" ہم آدھی رات کے بعد ہی نکلیں گے نا، کریم بلوچ سے کہنا تیاری پوری رکھے۔ ویسے میرا خیال ہے کہ شاید ایس ایس کرانتی تھرڈ آج بھی نہ جائے۔ اُن کو جس ٹرک کا سامان لے جانا تھا وہ ابھی تک نہیں پہنچا ہے اور ظاہر ہے پہنچے گا بھی نہیں۔ یہ لوگ اُس کا انتظار کریں گے۔ سمجھیں گے لاہور سے ہی روانگی دیر سے ہوئی یا راستے میں خرابی ہو گئی۔ صحیح صورتِ حال اُن کو صبح تک ہی معلوم ہو گی۔"

"اگر پہلے پتا چل گیا تو ہو سکتا ہے جہاز فوراً لنگر اٹھا دے، کسی تخریبی کارروائی سے بچنے کے لیے" محسن بولا" یہ لوگ بھی تو ڈر جائیں گے۔"

"ہاں مگر امکان کم ہے کہ اتنی جلدی۔ . . اچھا میں ادھر اس کے پیچھے جا رہا ہوں" میں نے اس ہپی کو دائیں جانب جاتے دیکھ کر کہا۔ محسن کے اور میرے راستے جُدا ہو گئے۔ میں نے محسن کو سگریٹوں کے کارٹن، وردیوں کے بنڈل اور کپڑوں کے پیکٹ وغیرہ دونوں ہاتھوں میں اُٹھائے اُس سمت میں جاتے دیکھا جدھر ہماری لانچ کھڑی ہوئی تھی۔

وہ ہپی کہاں جا رہا تھا ابھی اس کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ وہ مسلسل چلتا جا رہا تھا اور گرد و پیش سے بے خبر دکھائی دیتا تھا۔ اس علاقے میں غیر ملکی جہازوں کے ساتھ ایسے آوارہ گرد اکثر نظر آ جاتے تھے۔ یہ لوگ کسی بھی مال بردار جہاز کے نچلے عملے کی مدد سے چھُپ کر سفر کرتے تھے۔ بحری جہاز کے کرائے ہوائی جہاز سے بہت کم ہوتے ہیں مگر یہ ہپی دو چار سو ڈالر میں اپنا کام نکالتے تھے اور سامان کے ساتھ اسمگل ہو جاتے تھے۔ بحری جہاز کے کسی بھی جگہ لنگر انداز ہونے کے بعد انھیں باہر نکلنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی تھی۔

مجھے اس ہپی کا تعاقب کرتے ہوئے صرف یہ اندیشہ لاحق تھا کہ وہ کہیں پلٹ کے نہ دیکھ لے اور اپنے ہی حلیے کے ایک اور شخص کو اتنا قریب پائے تو چوکنا نہ ہو جائے۔ چنانچہ میں بہت محتاط تھا اور خاصے فاصلے سے اس پر نگاہ رکھے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ کبھی میں کسی کھمبے کی اوٹ میں ہو جاتا تھا تو کبھی اسباب کے کسی ڈھیر کے پیچھے۔ رات کے وقت بھی وہاں دن جیسی چہل پہل تھی لیکن سورج کی روشنی کے مقابلے میں مصنوعی روشنی اندھیرے کو بالکل ختم نہیں کر سکتی تھی۔

مجھے نیم روشن اور تاریک حصّوں میں چھُپ کر آگے بڑھنے کے مواقع بھی حاصل رہے۔

آدھے گھنٹے بعد مجھے اندازہ ہو گیا کہ ہپی کا رُخ شپ یارڈ کی طرف ہے۔ اتنی دور آنے کے لیے اُس نے پیدل چلنا منظور کیا۔ اگر وہ چاہتا تو ٹیکسی کو شپ یارڈ تک لے جا سکتا تھا لیکن شناخت کے بغیر وہ شپ یارڈ کے کسی گیٹ سے نہیں گزر سکتا تھا۔ چنانچہ اُس نے دوسرا مشکل راستہ اختیار کیا۔ اب وہ سمندر کے کھُلے حصّے کی طرف سے داخل ہو گا۔ یہ بات میرے ذہن میں مزید شکوک پیدا کرنے کا سبب بنی۔ ایک بات تو یہی غور طلب تھی کہ اُسے یہ راستہ کس نے بتایا۔ اگر خود اُس نے دریافت کیا تو کیوں؟ گھومنے پھرنے کے لیے آنے والے کسی ہپی کا بطورِ خاص ٹیکسی میں بیٹھ کے یہاں پہنچنا اور شپ یارڈ میں داخلے کے لیے رات کے وقت ایسا پُرپیچ راستہ اختیار کرنا غلط عزائم کی نشاندہی کرتا تھا۔

ہپی کا خیال تھا کہ اُس پر کسی نے شک نہیں کیا ہو گا چنانچہ وہ مطمئن تھا کہ اس کے پیچھے کوئی نہیں آ سکتا۔ اُسے کیا معلوم کہ سب سے پہلے محسن اس کو دیکھ چکا تھا۔ جب وہ ایک ٹیکسی میں بیٹھ کے کہیں گیا تھا۔ آج پھر وہ ٹیکسی میں آیا تھا۔ کیا یہ وہی ٹیکسی تھی؟ میں نے سوچا۔ لیکن مجھے کوشش کے باوجود اس کا نمبر یاد نہ آیا حالانکہ میں نے اس کا نمبر دیکھا تھا۔ شاید محسن کو یاد رہ جائے اور ہم اسے تلاش کر لیں۔

ایک جگہ پہنچ کے میں رُک گیا اب میری نظریں ہپی کو آگے بڑھتا دیکھ رہی تھیں۔ میں موشن میاں کی گنّے کا رس نکالنے والی ریڑھی کے قریب کھڑا ہو گیا تھا۔ ریڑھی اور مشین اس وقت بند تھیں۔ شپ یارڈ میں جہازوں کی مرمت اور دیکھ بھال کی خدمات سرانجام دینے والے اپنے اپنے کام میں مصروف تھے اور میں متعدد [illegible]وں کے روشن حصّوں میں چلتے پھرتے افراد کو دیکھ سکتا تھا۔ کئی جگہ ویلڈنگ کرنے والے تیز نیلی روشنی کی چکاچوند پیدا کر رہے تھے۔ ایسی خیرہ کُن روشنی" ایس ایس کرانتی تھرڈ" کے عرشے کو بھی منوّر کر رہی تھی۔

میری حیرت زدہ نظروں کے سامنے وہ ہپی سیدھا ایس ایس کرانتی تھرڈ کی طرف گیا اور ایک سیڑھی کے ذریعے اوپر چڑھا۔ اوپر سے کسی نے اس پر ٹارچ کی روشنی ڈالی۔ پھر وہ عرشے پر پہنچ گیا۔ وہاں تین افراد پہلے سے موجود تھے۔ میں نے دوربین نکالی اور ایک ایسے حصّے میں چلا گیا جہاں بہت سا کاٹھ کباڑ پڑا ہوا تھا۔ لکڑی کے ایک خالی کنٹینر کے پیچھے سے میں نے دوربین کو فوکس کیا۔ ویلڈنگ ٹارچ کی تیز روشنی نے میری مدد کی اور میں نے اُن چار میں سے تین کو شناخت کر لیا۔

ان میں سے ایک وہی خلاصی تھا جس کی موشن میاں کی ریڑھی پر گنّے کا رس لیتے ہوئے مارپیٹ ہوئی تھی۔ (اس کا مدِمقابل کے پی ٹی کا غریب ملازم شاید ابھی تک تھانے میں بند تھا)، دوسرا شاہد جمیل تھا اور تیسرا وہ ہپی۔ چوتھے کے بارے میں میرے لیے یقین کے خاصے اسباب تھے کہ وہ جہاز کا کپتان آر آر مصرا ہو گا۔ اسی کو میں نے اپنے عملے کے ایک فرد کی گرفتاری کی خبر پا کے فوراً روانہ ہوتے دیکھا تھا۔

مصرا اس براؤن لفافے کے اندر سے کاغذات نکال کے دیکھ رہا تھا جو ہپی نے اُسے لا کے دیا تھا۔ معلوم نہیں عرشے پر برائے نام روشنی میں اُس نے کیا دیکھا مگر کچھ دیر کے بعد اس نے مطمئن ہو جانے کے انداز میں سر کو جنبش دی اور پلٹ کے غائب ہو گیا۔

میں اپنی کمین گاہ سے نکلا اور آہستہ آہستہ جہاز کی طرف بڑھنے لگا، اس طرح کہ کسی کو بھی میری کسی جہاز میں دلچسپی اور پیش قدمی کا احساس نہ ہو۔ پھر میں نے ایک کرین کے پیچھے سے دوربین کو اس وقت دوبارہ فوکس کیا جب درمیانی فاصلہ سو گز کے لگ بھگ رہ گیا تھا۔ اب میں نے خلاصی کے ہاتھ میں خودکار مشین گن جیسی کوئی چیز دیکھی۔

اچانک کسی نے میرے پیچھے آ کے کہا" اے۔ . . یو! واٹ آر یو ڈوئنگ ہیئر؟" (تم یہاں کیا کر رہے ہو؟)

وہ کے پی ٹی کی وردی میں کوئی آفیسر تھا۔ میں چونک کر اس کی طرف پلٹا اور مسکرانے لگا۔

"میرا دوست اس شپ پر کسی کام سے گیا ہے۔" میں نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور فرانسیسی میں کہا۔

"کانٹ یو اسپیک انگلش؟" (کیا تم انگریزی نہیں بول سکتے؟)

میں نے نفی میں سر ہلایا" نو انگلش" اور پھر جہاز کی طرف اشارہ کیا" می۔ . . فرینڈ۔ . . دیئر۔ . . یو سی؟" میں نے دوربین اُس کی طرف بڑھائی۔

وہ کچھ سمجھ گیا۔ اس نے دوربین لے کر جہاز پر دیکھا

تو اُسے میرے جیسا ہی دوسرا ہپی دکھائی دیا ہو گا۔

"می۔۔۔ ویٹ۔۔۔ ہئیر۔" میں نے یوں کہا جیسے میرے لیے انگریزی کے الفاظ یاد کرنا ایک امتحان سے کم نہیں۔

"اچھا اچھا، تم اس کی واپسی کا انتظار کر رہے ہو۔" اُس نے انگریزی میں کہا، دُوربین مجھے تھمائی اور واپس چلا گیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ رسیدہ بود بلائے۔ اگر وہ مجھ سے شناخت کے کاغذات مانگ بیٹھتا تو میں کیا کرتا؟

میں نے پھر دُوربین آنکھوں سے لگائی۔ وہ ہپی ایک سفید لفافہ اپنے کوٹ کے اندر چھپا رہا تھا۔ "ڈمی بلڈی باسٹرڈ!" میں نے خالص امریکی لہجے میں گالی دی۔ یہ غدّاروں کی مدد کر رہا ہے۔ ان کے لیے رابطہ فراہم کر رہا ہے جو ملکی راز دشمنوں کو بیچتے ہیں، صرف پیسے کے لیے ـــ یہ سوچے بغیر کہ ایسا کرنا اخلاقاً اور قانوناً کتنا سنگین جرم ہے مگر یہ ہپی اخلاقیات سے تو خیر دُور کا واسطہ نہیں رکھتے۔ لڑکے لڑکیاں مشترکہ میاں بیوی بن کے ساتھ رہتے ہیں۔ نشے کے اتنے عادی ہوتے ہیں کہ چرس کے ایک سگریٹ کی خاطر عزت بیچ دیتے ہیں۔ انھیں کیا غرض کسی ملک کی سلامتی سے۔

ہپی اب واپس آ رہا تھا۔ حسبِ توقع اس نے واپس جانے کے لیے بھی سیدھا راستہ اختیار نہیں کیا۔ میں نے دُوربین کو واپس بیگ میں ڈالا اور اُس کے پیچھے سائے کی طرح لگ گیا۔ اب میں زیادہ بے خوف تھا۔ میں اُسے کہیں بھی دبوچ سکتا تھا اور اُسے گن پوائنٹ پر اپنے ساتھ بھی لے جا سکتا تھا مگر اُس کو گم کر دینے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اس کے برعکس وہ کچھ خوف زدہ تھا۔ اس لیے کہ پہلے اُس کے ہاتھ میں بے مصرف کاغذات تھے لیکن اب اس کو اپنی پُرخطر غیر قانونی خدمات کا صلہ مل چکا تھا جو شاید سیکڑوں ڈالر ہو گا۔ وہ اس دولت کے لُٹ جانے کے ڈر سے ہر طرف دیکھتا ہوا جا رہا تھا کہ کہیں کوئی چور اُچکا تو اُس کے تعاقب میں نہیں ہے۔

جب اُس نے پہلی بار مجھے دیکھا تو وہ چونکا۔ چند قدم چلنے کے بعد اُس نے پھر دیکھا تو میں بہ دستور اس کے پیچھے تھا۔ وہ رک گیا اور اُس نے مجھے قریب آنے کا موقع دیا۔

"ہیلو!" اُس نے ایک پُرتجسّس، دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ اپنا ہاتھ بڑھا کے کہا۔ "یُو فرام امریکا؟" (تم امریکا سے آئے ہو؟)

میں نے نفی میں سر ہلا کے مصافحہ کیا۔ "آئی ایم فرام یو کے، ساؤتھ آف لندن۔" (میرا تعلق برطانیہ سے ہے، لندن کے جنوبی حصے سے)

ہم دونوں ساتھ چلنے لگے۔ اُس نے مجھے اپنا نام بتایا اور مجھ سے پوچھا کہ میں کب سے پاکستان میں ہوں۔ میں نے کہا کہ اب تک ہم نیپال میں تھے مگر ہمیں کالے چوروں نے لُوٹ لیا۔ پیسہ نہ ہونے کی وجہ سے ہمیں رُکنا پڑا۔ جو لڑکی میرے ساتھ آئی تھی وہ یہاں کسی جہاز پر آئی تھی۔ اُسے پچاس ڈالر ملنے کی اُمید تھی لیکن وہ واپس نہیں آئی چنانچہ میں اُس کے بارے میں متفکر ہوں۔ اُس نے یہ بالکل نہیں پوچھا کہ وہ لڑکی پچاس ڈالر کیسے لائے گی۔ وہ جانتا تھا کہ لڑکیاں سخت حالات میں کیا روزگار پیدا کر سکتی ہیں۔ میں نے اس اندیشے کا اظہار بھی کیا کہ وہ کُتیا، مجھے چھوڑ کر جہاز پر ہی نہ نکل گئی ہو۔

وہ ہنسنے لگا۔ "آج ایک جہاز پر تو میں بھی گیا تھا۔ اُس کی روانگی کل پر ملتوی ہو گئی ہے۔ اس پر معلوم کرنا چاہو تو کر لو۔"

"تم کس جہاز کی بات کر رہے ہو؟"

"وہ ایک انڈین شپ ہے۔" اُس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "اس کا کپتان میرا دوست ہے۔"

"شٹ اپ!" میں نے سخت بُرا مان کے کہا۔ "کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم اتنے گھٹیا اور گِرے ہوتے ہیں۔ صرف پچاس ڈالر کے لیے میری گرل فرینڈ کسی بلڈی بلیک انڈین کے پاس جائے گی۔ وہ کسی فرنچ ویسل پر ہے۔ تین مہذب سیلر اس کو لے گئے تھے۔"

اُس نے فوراً معذرت کر لی۔ "پھر تو تمھیں خود ہی معلوم کرنا پڑے گا۔ یہاں آج کل میں نہ جانے کتنے برٹش، فرنچ اور دوسرے یورپین جہاز آئیں گے اور جائیں گے۔"

اب ہم باہر آ گئے تھے۔ اُس نے مجھے بائی بائی کہنا چاہا مگر میں نے کہا۔ "میرے پاس گاڑی ہے، میں تم کو کہاں چھوڑ سکتا ہوں؟ کم آن!"

وہ حیران نظر آنے لگا۔ "یُو گاٹ اے کار؟"

"میری اپنی نہیں، کرائے کی ہے۔" میں نے وضاحت کی۔ وہ مطمئن نظر آنے لگا اور پھر میرے ساتھ ہو لیا۔

"تمھارے پاس کرائے کی کار کے لیے پیسے ہیں اور تمھاری گرل فرینڈ پچاس ڈالر کمانے گئی ہے۔" وہ طنز سے بولا۔

"بے شک ہم کچھ فضول خرچ بھی ہیں۔" میں نے تسلیم کیا۔ "تم کہاں ٹھہرے ہو؟"

"وائی ایم سی اے۔ میں کسی کو ساتھ رکھنا پسند نہیں کرتا، خصوصاً لڑکیوں کو۔" وہ بولا۔ "تم تو ہوٹل میں ٹھہرے ہو گے مسٹر فضول خرچ۔"

میں اُسے عمداً چکر دے کر اس طرف سے لے گیا تھا جدھر سے محسن کے آنے کا امکان تھا۔ اب ساڑھے دس بج چکے تھے اور میں نے اُسے دس بجے کا وقت دیا تھا۔ اُسے میں نے اکرام شیخ کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھا ہوا دیکھا۔ ٹیکسی بھی اسٹینڈ سے کافی دُور اس کار کے قریب کھڑی ہوئی تھی جس میں مجھے اور اس ہپی کو جانا تھا۔ ہمیں ایک ساتھ واپس آتے دیکھ کر محسن نے سمجھ لیا ہو گا کہ اب کیسی صورتِ حال ہو گی اور اُسے کیا کرنا پڑے گا۔

میں نے کار کا دروازہ چابی سے کھولا اور بیٹھتے ہی آگے پیچھے کے دونوں گیٹ اَن لاک کر دیے۔ وہ اگلے دروازے سے میرے ساتھ بیٹھا۔ میں نے کار اسٹارٹ کی اور پیچھے دیکھا۔ محسن نے سر ہلا کے مجھے چلتے رہنے کا اشارہ کیا۔ میں نے رفتار میں تھوڑا سا اضافہ کیا ہی تھا کہ محسن نے دوڑتے ہوئے پیچھے والا دروازہ کھولا اور سیٹ پر گرتے ہی بند کر لیا۔

ہپی نے چونک کر پیچھے دیکھا مگر جو کچھ اُسے نظر آیا، وہ اُس کے حواس گم کرنے کے لیے کافی تھا۔

"یہ۔۔۔ یہ کیا ہے؟۔۔۔ کون ہو تم۔۔۔؟"

وہ ہکلایا۔

"پلیز سِٹ کوائیٹ۔" محسن نے کہا۔ (چپ کر کے بیٹھے رہو)

"تم لوگ اغوا کر رہے ہو مجھے۔۔۔ کیوں؟"

"معلوم ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔ "تم یہ کیوں بھول گئے تھے کہ ہم کالے ضرور ہیں مگر ہماری آنکھیں اُسی طرح دیکھتی ہیں، ہمارے کان اُسی طرح سنتے ہیں اور ہمارا دماغ اُسی طرح کام کرتا ہے جیسے تمھارے ملک میں ایف بی آئی کے ایجنٹوں کا۔"

"تم۔۔۔ تم۔۔۔ سرکاری کارندے ہو؟" اُس کی حالت غیر ہو گئی۔

"ہمارے ملک میں اسے ایف آئی اے کہتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور کارکردگی کے اعتبار سے ہمارا معیار کیا ہے، اس کا تم کو بخوبی اندازہ ہو چکا ہے۔ تم بہت مطمئن تھے کہ کوئی تمھیں نہیں دیکھ رہا ہے۔ تم نے دستاویزات اس انڈین شپ پر پہنچانے کا کیا معاوضہ وصول کیا ہے؟"

"میں۔۔۔ میں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا۔"

"تم ایک براؤن لفافہ لے کر گئے تھے جو تم نے آر آر مصرا کے حوالے کیا۔" میں نے کہا۔ "ایس ایس کرانتی تھرڈ کا فرسٹ آفیسر شاہد جمیل بھی اس موقع پر موجود تھا اور ایک سیکیورٹی گارڈ جو گن لیے کھڑا تھا۔ وہاں ویلڈنگ ہو رہی تھی، اس لیے ہمیں فلیش گن کی ضرورت نہیں پڑی۔ ہم نے بہت سی تصویریں بنائی ہیں۔ ویسے ہمارے پاس انفرا ریڈ کیمرہ تھا۔ اُس کی ایک تصویر میں تم مصرا سے ایک سفید لفافہ وصول کرتے نظر آؤ گے۔ دوسری تصویر اُس وقت لی گئی جب تم نے وہ لفافہ اپنے کوٹ میں چھپایا۔ اس میں کتنی رقم ہے مسٹر؟"

"مسٹر واٹ؟۔۔۔" محسن نے کہا۔ "اپنا پاسپورٹ میرے حوالے کر دو۔"

"نہیں۔ کیا ثبوت ہے تمھارے پاس۔ پہلے مجھے اپنا شناختی کارڈ دکھاؤ۔" اُس نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے تم لٹیرے لگتے ہو۔"

پلک جھپکتے میں اُس نے گیٹ کھول کر باہر کودنے کی کوشش کی۔ کار کی رفتار بہت زیادہ تھی مگر اس سے بھی زیادہ برق رفتاری کا مظاہرہ محسن نے کیا۔ اُس نے ہپی کے سر پر ریوالور مارا اور میں نے اُسے بائیں ہاتھ سے واپس کھینچ لیا ورنہ وہ کھلے دروازے سے لٹک کر باہر جا گرتا تو اتنی رفتار سے سڑک پر گرنے سے اس کی گردن بھی ٹوٹ سکتی تھی۔ اب میں نے رفتار کم کی اور محسن نے آگے جُھک کر جھولتا ہوا دروازہ کھینچ کر بند کر دیا۔

اکرام شیخ کی ٹیکسی ہمارے پیچھے تھی۔ میں نے اُسے روانہ ہوتے ہی بیک ویو مرر میں دیکھ لیا تھا۔ اب وہ ہمارے برابر آ گیا۔

"سب ٹھیک ہے نا؟" وہ بولا۔

میں نے مسکرا کے اُسے انگوٹھا دکھایا جس کا مطلب تھا فائن۔

"اب تم آگے ہو جاؤ شیخ صاحب! تمھارے غریب خانے میں قدم رنجہ فرمانا ہے اور ما حضر تناول فرمانا ہے۔" میں نے کہا۔

اکرام شیخ نے کہا۔ "غریب تو حاضر ہے۔ غریب خانہ

کوئی نہیں ہے فی الحال۔"

"کیوں، پھر اس لڑکے چھوٹو کو کہاں چھوڑ لیے تم نے؟"

"ڈاکٹر جھگی والا کے پاس۔" اکرام شیخ بولا۔

میں اپنی کار کو اس کی ٹیکسی کے متوازی چلاتا رہا۔ "اچھا تم ایسا کرو، آگے کہیں ٹیکسی روک لو جہاں تخلیہ ہو۔"

شیخ نے ٹیکسی آگے بڑھادی تو میں نے اس ہپّی کی طرف دیکھا جو اب میرے قدموں میں مردے کی طرح پڑا ہوا تھا۔ ایک ڈیڑھ میل کے بعد شیخ نے انڈیکیٹر دیا اور ٹیکسی کو ایک سائڈ پر کھڑا کر دیا۔ میں نے کار پھر اس کے متوازی لگادی۔ محسن کی زبانی شیخ کو یہ تو معلوم ہو گیا تھا کہ میں کسی ہپّی کے تعاقب میں گیا ہوں۔ اس کے بعد کیا ہوا تھا، یہ جاننے کے لیے محسن بھی بے چین تھا۔ میں نے انھیں مختصر الفاظ میں ساری بات سنا دی۔

"پھر اب کیا کرنا ہے؟" محسن بولا۔

"میری ایک تجویز ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن شیخ صاحب، پہلے یہ فرمائیے کہ آپ بے گھر کیوں ہیں۔ یہ کیا چکر ہے؟"

"یار، پرانا چکر ہے۔ اب میں جہاں رہتا تھا وہاں بھی وہی شک اور تجسس کے مارے ہوئے لوگ تھے۔ انھیں سخت پریشانی لاحق تھی کہ ایک ٹیکسی ڈرائیور کے گھر میں دو جوان اور خوب صورت عورتیں کیوں ہیں جو کسی طرح بھی اس کی بیویاں نظر نہیں آئیں۔ خواتین کو موہنی نے مطمئن کیا یہ بتا کے کہ وہ میری بیوی ہے اور زیب النساء میری بہن ہے لیکن اسی دن ایک بیان میں نے جاری کر دیا جس کی رُو سے موہنی تو خیر میری بیوی ہی تھی مگر زیب النسا کو میں نے سالی کہہ دیا، یعنی موہنی کی بہن۔ ایک گھر میں میاں بیوی کے درمیان اختلافِ رائے ہوا تو بات پھیلی اور کچھ معززین پر مشتمل کمیٹی بنائی گئی جو تصدیق کے لیے میرے پاس آئی۔ میں نے بیان کو قابلِ قبول بنا دیا کہ دونوں باتیں درست ہیں۔ بیوی میری خالہ کی لڑکی تھی۔ اب اس کی بہن سے دہرا رشتہ ہو گیا تو کیا غلط بات ہے اس میں، خالہ زاد بھی بہن ہی ہوتی ہے اور سالی بھی ہے مگر اس کے بعد بھی کچھ شر پسند عناصر مطمئن نہیں ہوئے۔ معلوم نہیں کیسے ایک نوجوان کو لاہور کا وہ رسالہ مل گیا جس میں زیب النساء کی تصویر چھپی تھی اور ایک بوگس انٹرویو چھپا تھا کہ وہ فلاں فلاں فلم میں کام کر رہی ہے۔ لو صاحب، محلے میں تو سنسنی پھیل گئی۔ فلم ایکٹریس ہے تو پھر ایک ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ کیوں ہے؟ ضرور بھاگ کے آئی ہے۔ معلوم کرنا چاہیے دوسری کون ہے۔ ایک بار پھر تصدیق و تفتیش کے لیے مجھے بلایا گیا تو میں نے اُس نوجوان کو پکڑ لیا۔ سخت مشتعل ہوا کہ اُس نے میری بہن کو فلم ایکٹریس کہنے کی جرأت کیسے کی۔ اگر کسی سے صورت ملتی ہے اس کی، تو کیا وہ ایکٹریس ہو گئی؟ لاحول ولا قوۃ۔"

"کتنے افسوس کی بات ہے یار۔" میں نے کہا۔ "فلم اداکارہ کو ہمارے معاشرے میں کیا مقام دیا گیا ہے کہ اس کا نام ہی گالی بن کے رہ گیا ہے حالانکہ اداکاری کو اب فنونِ لطیفہ کا درجہ حاصل ہے۔ کتنی عزت ہے دوسرے ممالک میں اداکاروں کی۔ ہمارے پڑوسی ملک میں پرتھوی راج، نرگس اور دلیپ کمار، نہ جانے کتنے اداکار اسمبلی میں گئے اور کتنی عزت پائی۔ خود امریکا۔۔۔"

"ابے یار، اب یہ کیا قصہ لے بیٹھے۔" محسن جھنجلا کے بولا۔ "بات ختم کرو۔ پھر کیا ہوا؟"

"پھر یہ کہ انھیں لاہور جانا پڑا تو میں نے وہی کیا جو پہلے کرتا آیا ہوں۔ بوریا بستر سمیٹ لیا۔ ابھی اسباب ایک اپنے ہی ہم پیشہ ٹیکسی ڈرائیور کے گھر میں پڑا ہے۔"

"اچھا، میں اس ہپّی جاسوس کو ٹیکسی کی ڈکی میں ڈالتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "کار اس کے مالک کو واپس کر دینی چاہیے، اس کے بعد ہم کہیں کھانا کھائیں گے۔ ہم میں سے ایک واپس لانچ پر جائے گا یعنی محسن۔"

"قرعۂ فال میں میرا ہی نام کیوں؟" محسن نے احتجاج کیا۔

"حکم ہے میرا۔ بحیثیت چیف۔۔۔"

"بھاڑ میں گیا چیف مع حکم۔"

"تو ڈرتا ہے اُس سے۔" میں نے کہا۔ "وہ کھا جائے گی تجھے؟"

"ضرورت کیا ہے کسی کو واپس جانے کی؟"

"وہ اکیلی ہے اور یہ کام دو آدمی ہی کر سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"دو کی جگہ تین ہوں گے تو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ اس کے ساتھ کریم بلوچ ہے۔" محسن نے فیصلہ سُنایا۔ "میں اُسے بتا کے آیا تھا کہ شاید واپسی میں دیر ہو یا صبح ہو جائے تو فکر نہ کرے۔"

مجھے مجبوراً اُس کی بات ماننی پڑی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ گل بانو کے ساتھ تنہائی کے خیال سے گریزاں تھا۔ اُس نے شیخ کی مدد سے ہپّی کو ایسے باندھا کہ وہ حرکت بھی نہ کر سکے۔ ہوش میں آنے کے بعد بھی وہ مدد کے لیے کسی کو پکارنا چاہے تو اس کی آواز بھی نہ نکلے۔

پندرہ بیس منٹ کے بعد ایک ایک سگریٹ پھونک کر ہم اس ترتیب سے روانہ ہوئے کہ میں اکیلا کار میں آگے چلتا رہا۔ ٹیکسی میں شیخ کے ساتھ محسن بیٹھ گیا۔ میں نے بہتر یہی سمجھا کہ جب صدر سے گزر کے جاتا ہے تو کار کو پھر وہیں کیوں نہ چھوڑ دوں جہاں سے میں لے کر گیا تھا۔

رات کے سوا گیارہ بجے بازار کی رونق ماند پڑ چکی تھی۔ صرف ریسٹورنٹ اور شراب خانے آباد رہ گئے تھے۔ پیراڈائز سینما کے سامنے بھی مجھے ایک عام قسم کا شراب خانہ نظر آیا جس میں لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ کراچی کے سوا میں نے پاکستان کے کسی شہر میں ایسے بار نہیں دیکھے تھے جہاں صلائے عام ہو۔ پہلے میں بہت حیران ہوا تھا کیونکہ میں اسلامی جمہوریۂ پاکستان میں شراب کے عام ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اب مجھے صدمہ ہوتا تھا۔ آخر اس ملک کے اربابِ اقتدار و اختیار کو ابھی تک احساس کیوں نہیں ہوا کہ اسلام کے نام پر حاصل کیے جانے والے اس ملک میں یہ شراب خانے ہمارے قومی کردار پہ بدنما داغ ہیں۔ کون ہے جو اختلاف کرے گا کہ یہ کاروبار غیر اخلاقی اور حرام ہے۔ پھر انھیں لائسنس کیوں ملے ہوئے ہیں کہ بلا تخصیص اور بلا روک ٹوک مے فروشی کریں۔

کار کو میں نے عین اُسی جگہ پارک کر دیا۔ دن کا وقت ہوتا تو مجھے یہ جگہ خالی نہ ملتی۔ پھر میں نے اکرام شیخ سے کہا کہ وہ کافی ہاؤس جائے اور چابی کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے شخص کو دے دے۔

"وہ کون ہے، مالک یا منیجر؟"

"یہ تو مجھے نہیں معلوم۔ سینٹرل کافی ہاؤس دیکھا ہے نا؟"

"ہاں ہاں، کچھ اور کہنا ہے اُس سے؟" شیخ نے اپنی ٹیکسی سے اُترتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں، شکریہ ادا کر دینا اور کھانا بھی لیتے آنا مگر نہیں، وہ پھر پیسے نہیں لے گا۔" میں نے کہا اور ٹیکسی میں محسن کے ساتھ جا کے بیٹھ گیا۔

"تُو نے اپنی اس گل بانو کو تسلی دے دی تھی نا؟"

"وہ بھی عجیب چیز ہے یار۔ قمیص پتلون پہنے پھر رہی تھی۔ سر کے بال تو ویسے ہی ترشے ہوئے ہیں، انھیں کیپ میں چھپا لیا تھا۔ میں تو سمجھا کہ اپنا کیپٹن کریم بلوچ ہے۔ میں نے پیچھے سے ہاتھ مار دیا کہ واہ استاد۔ اور بس جب اُس نے پلٹ کے چیخ ماری نا تو میرے ہاتھوں کے کبوتر اُڑ گئے، جیسے انار کلی کے ہاتھ سے اُڑ گئے تھے۔"

"یہ اُلٹا کیس ہو گیا۔ کبوتر شہزادے کے ہاتھ سے اُڑ گئے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ڈر گئی ہو گی؟"

"ڈری تو تھی، مگر اس سے زیادہ ناراض تھی کہ شانہ توڑ دیا۔" محسن بولا۔ "حالانکہ میں نے کوئی بہت زیادہ قوت سے ہاتھ نہیں مارا تھا۔ کریم بلوچ سمجھ کے دوستانہ بے تکلفی کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ تو میرے پیچھے پڑ گئی کہ کریم بلوچ کے بھی ایسا ہاتھ رسید کرنا کون سی اچھی بات ہے۔ بضد تھی کہ دیکھو۔۔۔ کیسا لال نشان پڑ گیا ہے، پانچوں انگلیوں کا۔"

"پھر۔۔۔ تُو نے دیکھا خطرے کا لال نشان؟" میں نے کہا۔

"ابے جا۔ سالی خواہ مخواہ۔۔۔ زبردستی گلے پڑ رہی ہے۔" وہ جھینپ کر بولا۔ "نخرے دکھاتی ہے مجھے کہ تم بڑے بے رحم ہو۔ اتنا زور سے ہاتھ مار دیا۔ اب اخلاقاً سہلا ہی دو، حد ہو گئی۔"

مجھے بے اختیار ہنسی آئی۔ "اس وقت تیری یہ حالت ہو رہی ہے تو گل بانو کے سامنے کیا ہوئی ہو گی۔ ٹھیک ہی تو کہا تھا اُس نے کہ مجھے شادی کرنی ہے کسی مَرد سے۔"

"بھائی آپ مرد بن جائیں نا۔" محسن بھنّا کے بولا۔ "مجھے کیوں قربانی کا بکرا بنا کے جھٹکا کراتے ہیں میرا۔"

اکرام شیخ آیا تو ہم پھر روانہ ہوئے۔ میں نے اُسے محسن کے ساتھ گل بانو کی 'زیادتی' کا حال سُنایا تو وہ بھی بہت ہنسا۔ محسن کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔ ٹیکسی بندر روڈ پہ آنے کے لیے زیلسن کافی ہاؤس کے سامنے سے گزری تو ایک دم میری بھوک جاگ اُٹھی۔ اکرام شیخ نے مجھے مطلع کرایا کہ اس وقت ہم بندو خاں کے مہمان ہوں گے۔

"کون بندو خاں؟" محسن نے کہا۔

"کسی کراچی والے کے سامنے ایسی جہالت کی بات کرے گا تو مار کھائے گا۔" شیخ نے کہا۔

"شیخ صاحب!" میں نے روک کے کہا۔ "مانا کہ استاد بندو خاں عظیم سارنگی نواز کا ثانی نہیں۔ لیکن خالی پیٹ

موسیقی۔۔۔"

"یہ بندو خاں سارنگی نہیں بجاتے، مگر بڑا اٹھا کباب بنانے میں وہی کمال دکھاتے ہیں۔" شیخ نے کہا۔

اُس نے ٹھیک کہا تھا۔ رات کے بارہ بجے بھی ان کی دکان کے سامنے کاروں کی قطاریں اُن کی مقبولیت کا مُنہ بولتا ثبوت تھیں۔ چھ فٹ سے بھی زائد قد والے بندو خاں شاندار سفید طرّہ دستار کے ساتھ سب کو خوش آمدید کہہ رہے تھے اور سب کے درمیان گھوم پھر کے دیکھ رہے تھے کہ کسی کو کوئی شکایت تو نہیں۔ جب ہم پیٹ بھر کے روانہ ہوئے تو میں نے اُن سے مصافحہ کیا اور فرنچ میں کہا: "بہت عمدہ۔"

شیخ نے اس کا ترجمہ کیا اور بتایا کہ ہم غیر ملکی مہمان ہیں۔ اُن کا جذبۂ مہمان نوازی ایک دم بیدار ہو گیا۔ وہ ہمیں مدعو کرنے پر مُصر تھے مگر ہم شکریہ ادا کر کے بھاگ آئے۔

شیخ نے اپنی ٹیکسی عام جگہ سے دُور کھڑی کی تھی تاکہ کسی وقت ہمارا قیدی ہوش میں آ جائے تو کسی کو متوجہ نہ کر سکے حالانکہ ہماری احتیاطی پیش بندی کے باعث اس کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔ شیخ نے ڈکی کھول کے دیکھی تو بپتی کی آنکھیں کُھلی دکھائی دیں۔

مَیں نے جیب میں سے وہ کاغذ نکالا جس پر جیکب لائن کے دو اور کلیٹن کوارٹرز کا ایک نمبر لکھا ہوا تھا۔ "یہاں جانا ہے۔"

"یہاں کون رہتا ہے؟" شیخ نے ڈکی بند کر کے مجھ سے وہ پرچہ لے لیا اور ٹیکسی اسٹارٹ کی۔

"دو کوارٹر تو جیکب لائن میں ہیں۔" میں نے کہا۔

"جیکب لائن یہ پیچھے کا سب علاقہ ہے۔" شیخ نے کہا۔

"یہ غدّاروں کا ایک ٹولا ہے جس میں چار افراد شامل ہیں۔" مَیں نے کہا۔ "مجھے شک ہے کہ اس قیدی کا انھی سے کوئی تعلق ہو سکتا ہے جو اہم سرکاری راز چُرا کے دشمنوں تک پہنچا رہے ہیں۔ یہ چار بنگالی ففتھ کالم کے لوگ ہیں جو اس قسم کی صورتِ حال میں ملک کے اندر رہتے ہوئے ملک کی سلامتی کے خلاف سرگرمِ عمل ہو جاتے ہیں۔ یہ چاروں بھی علیحدگی پسند عناصر کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں یا پھر لالچ میں غدّاری کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ مجھے اطلاع ملی ہے کہ ان کی رسائی ٹاپ سیکرٹ انفارمیشن تک ہے جو یہ آگے پاس کر رہے ہیں۔ یہ بپتی بھی ایسے ہی کاروبار میں ملوّث تھا۔ کیوں نہ اسے اور انھیں آمنے سامنے بٹھا کے پوچھیں۔"

آدھی رات کے بعد کوارٹروں کے نمبر پڑھنا دشوار کام تھا۔ نمبر مٹ گئے تھے۔ سفیدی کرانے والوں نے دوبارہ یہ نمبر لکھنے یا لکھوانے کی زحمت نہیں کی تھی۔ ایک کوارٹر میں روشنی دیکھ کر شیخ نے کال بیل بجائی۔ اُس نے یہ ظاہر کیا کہ سی ٹین میں رہنے والوں کے مہمان آئے ہیں۔ ہم ٹیکسی سے باہر ہی نہیں آئے۔ شیخ چند منٹ کے بعد آیا اور ٹیکسی کو گھما کے پیچھے لے گیا۔

سی ٹین خاصا بڑا بیرک نما کوارٹر تھا جس کے ایک حصّے میں لائٹ نظر آ رہی تھی۔ مَیں اور محسن ٹیکسی سے اُتر کے ایک طرف اندھیرے میں کھڑے ہو گئے۔ شیخ کی دستک کے ساتھ ہی اندر جلنے والی وہ لائٹ بُجھ گئی جو کھڑکی کے شیشوں سے باہر بھی پہنچ رہی تھی۔ دو تین منٹ کے بعد کوئی دھوتی پہنے باہر آیا۔

"شیخ مطیع الرحمان صاب اِدھر رہتے ہیں؟" شیخ نے بالکل ٹیکسی ڈرائیوروں کی طرح پوچھا۔

"ور رہتا ہے یا نہیں رہتا ہے، تم کیا مانگتا؟" اس بنگالی نے تُند لہجے میں کہا۔

"ہم کیا مانگتا؟" شیخ نے کہا۔ "ہم یہ پتا مانگتا۔ یہ کوارٹر میں کون رہتا؟"

بنگالی نے وہ رقعہ لے لیا۔ "مسیح الرحمٰن۔" پھر اسے احساس ہوا کہ نام لے کر اُس نے غلطی کی ہے۔ "بابا ادھر کیوں آتا؟ وہ کوارٹر اُدھر ہے۔ ہمارا نیند خراب کرتا۔ تمھارا مغز خراب ہے۔"

اس سے زیادہ بولنے کا موقع ہم نے نہیں دیا۔ وہ واپس جانے کے لیے پلٹا ہی تھا کہ مَیں تیزی سے نکلا اور میں نے اُسے یوں دبوچ لیا جیسے چھپکلی کسی مچھر کو دبوچتی ہے۔ وہ پھڑپھڑایا مگر نہ وہ خود کو چھڑا سکا اور نہ حلق سے آواز نکال سکا۔ یہ سب کارروائی بیرونی برآمدے میں ہو رہی تھی۔ مگر اتنی رات کو وہاں دیکھنے والا کون تھا۔

مَیں اُسے گھسیٹ کر اندر لے گیا۔ محسن ہاتھ میں ریوالور لیے میرے پیچھے آیا۔ اکرام شیخ اپنی ٹیکسی کو اس کوارٹر کے سامنے سے ہٹا کے دُور کھڑی کرنے کے لیے لے جانا چاہتا تھا مگر شاید اُسے خیال آ گیا کہ اس میں استغاثے کا ایک اہم گواہ موجود ہے۔

اندر اچانک بھگدڑ مچ گئی تھی۔ مَیں نے ایک کمرے سے دو افراد کو نکل کر صحن کی طرف بھاگتے دیکھا۔

"دیکھ کوئی نکلنے نہ پائے۔" میں نے محسن کو خبردار کیا۔

محسن کمرے کے دروازے سے سیدھا نکل گیا۔ "خبردار! میں گولی مار دوں گا۔" محسن نے کہا۔ دونوں سائے دیوار کے ساتھ منجمد ہو گئے۔

اکرام شیخ نے اِدھر اُدھر دیکھا اور سوئچ بورڈ کی طرف ہاتھ بڑھا کے لائٹ آن کر دی۔ مَیں نے مطیع الرحمٰن کو دھکا دے کر دیوار کی طرف پھینکا۔ اُس کا سر دیوار سے یوں لگا کہ ناک سے خون بہنے لگا۔ وہ چکرا کے وہیں بیٹھ گیا۔

محسن ان دونوں کو اندر اسی کمرے میں لے آیا۔

"اور کون ہے ادھر؟" مَیں نے شیخ سے کہا۔ "جو بھی ملے اُسے یہاں لاؤ۔ ذرا بھی گڑبڑ کرے تو اُسے گولی مار دو۔"

محسن نے فرار کی کوشش میں ناکام ہونے والے دونوں بنگالیوں کو دیوار کی طرف مُنہ کر کے کھڑا دیا اور اُن کی تلاشی لی۔ وہ مجرم نہ ہوتے تو ہماری اس کارروائی پر مشتعل ضرور ہوتے لیکن اُن کی تو حالت ہی اتنی غیر ہو رہی تھی کہ اُن سے اعترافِ جرم کرانا بے مقصد تھا۔

شیخ دو خشک چھوارے جیسے مریل جوان لڑکوں کو گُدی سے پکڑ کے لایا۔ "یہ دونوں چارپائی کے نیچے چھُپے ہوئے تھے۔ تیسرے کمرے میں عورتیں اور بچّے سو رہے ہیں۔"

"سونے دو انھیں۔" مَیں نے کہا۔ "اگر یہ ہم سے تعاون کرتے رہے تو اُن کی نیند خراب نہیں ہو گی ورنہ۔۔۔" مَیں نے تھوڑا سا توقف کر کے کہا۔ "ورنہ انھیں بھی اُٹھوا لیں گے۔"

"تم کون لوگ ہو؟" مطیع الرحمٰن اب ہمّت کر کے کھڑا ہو گیا۔ "جانتا نہیں ہم گورنمنٹ کا افسر ہے؟"

"ہم تو سب کچھ جانتے ہیں تمھارے بارے میں اور جو نہیں جانتے، وہ معلوم کر لیں گے، مگر تم ہمیں نہیں جانتے۔" مَیں نے کہا۔

"تم اندر آیا۔ وارنٹ کا بغیر۔ آرڈر دکھاؤ ہم کو۔" مطیع الرحمٰن نے کہا۔ "شریف لوگ کے گھر میں گھُستا ہے رات کو۔"

مَیں نے اُس کے ایک جھانپڑ مارا۔ وہ نیچے گر گیا۔

"یہ تھا آرڈر۔ وارنٹ یہ ہے۔" مَیں نے ریوالور دکھا کے کہا۔ "اس میں جہنّم کے چھ پاسپورٹ ہیں۔ تم سب شریف آدمی اتنی رات کو اکٹھے ہو کے کیا کر رہے تھے اور جب ہم نے دستک دی تو اس کمرے کی لائٹ کیوں آف ہو گئی تھی؟ یہاں دونوں نے بھاگنے کی کوشش کیوں کی تھی؟"

شیخ نے کہا: "ان کو وہیں لے چلو، جہاں سب ثبوت ہیں۔ ان کے تمام جرائم کی شہادتیں پھیلی پڑی ہیں۔"

"اچھا! یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "تم ان میں سے ایک ایک کو اندر لاؤ۔ لیکن پہلے ان کے خلاف وعدہ معاف گواہ کو تو لے آؤ۔"

وہ سب بزدل اور کم ہمّت لوگ تھے۔ اُن میں سے دو تو ایسے کانپ رہے تھے جیسے سچ مچ انھیں جاڑا بخار چڑھنے والا ہو۔ یہ وہی دو سُورما تھے، جو چارپائی کے نیچے چھُپ گئے تھے۔ باقی دو جو فرار نہ ہو سکے تھے، مجرم بنے خاموش کھڑے تھے۔ اُن کے لیے انکار کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ جو کچھ ہوا اچانک ہوا اور ایسے وقت میں ہوا تھا کہ وہ سب ایک ہی جگہ رنگے ہاتھوں پکڑے گئے تھے۔ انھیں اندازہ تو ہو گا کہ یہ بھی ہو سکتا ہے مگر چور جب تک پکڑا نہ جائے ہیرا پھیری سے نہیں جاتا اور خوش قسمتی سے اپنی اُمیدیں وابستہ رکھتا ہے۔

شیخ اور محسن نے بپتی کو ایک گٹھری کی صورت میں سب کے درمیان رکھ دیا۔ اس وقت میں بپتی کی طرف نہیں، ایک ہی صف میں کھڑے ہوئے غدّاروں کی صورتیں دیکھ رہا تھا۔ مطیع الرحمٰن کی صورت پر صدمے کا ردِّ عمل اتنا شدید تھا کہ مجھے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں رہی۔ وہ یقیناً اس بپتی کو جانتا تھا۔ باقی چاروں کے چہرے سپاٹ رہے اور انھوں نے مطیع الرحمٰن کی طرف دیکھا بھی تو نگاہوں سے یہی سوال کیا کہ یہ کون ہے؟

ایک چارپائی کی رسّی کھول کے محسن نے چاروں ملزموں کے ہاتھ اُن کی کمر کے پیچھے باندھ دیے۔ ان میں سے ایک پھوٹ پھوٹ کے رونے اور معافی مانگنے لگا۔ "ہم سے گولتی ہوا۔"

"چُپ۔ غلطی کا بچّہ۔" محسن نے اس کے سر پر مُکّا مار کے کہا۔ "غلطی کر کے روتا ہے۔ ابھی تو سزا باقی ہے۔" اُس نے سب کو دیوار کے ساتھ بٹھا دیا۔ اور اُن پر واضح کر دیا کہ جس کے حلق سے مُرغی کے چُوزے جتنی بھی آواز نکلی اُسے وہ مرغا بنا دے گا اور پھر اُسے انڈے دینے پر

مجبور کرے گا۔

مطیع الرحمٰن کو میں گردن سے پکڑ کے دھکیلتا ہوا دوسرے کمرے میں لے گیا جہاں وہ سب ہمارے آنے سے پہلے جمع تھے۔ اس نسبتاً وسیع ہال جیسے کمرے کی ایک دیوار پر شیخ مجیب الرحمٰن کی بہت بڑی تصویر لگی ہوئی تھی۔ اُس کے ساتھ دوسری تصویر بنگالی شاعر رابندر ناتھ ٹیگور کی تھی۔ مقابل کی دیوار پر ایک فریم میں مجیب کے چھ نکات لکھے ہوئے تھے۔ میں بنگالی زبان سے ناواقف تھا مگر میں نے اندازہ کر لیا کہ چھ مختصر پیراگراف جن پر ترتیب کے نمبر بھی تھے اور کچھ نہیں ہو سکتے۔

"یہ شیخ مجیب کے چھ نکات ہیں ؟" میں نے تصدیق کے لیے مطیع الرحمٰن سے پوچھا۔ اُس نے برائے نام اثبات میں سر ہلایا۔

"اس کے ساتھ والے دوسرے فریم میں کیا ہے؟"

"بنگلہ دیش کا قومی گیت۔"

میں نے پلٹ کے اس کے مُنہ پر اتنی قوت سے اُلٹا ہاتھ مارا کہ وہ گھوم کے دیوار سے جا لگا۔

"میرے سامنے یہ لفظ پھر استعمال مت کرنا۔ ابھی تک وہ مشرقی پاکستان ہے۔" میں نے کہا۔ "ساری دنیا کے لیے۔ اب بتاؤ یہ کیا ہے؟"

"ٹیگور کا گیت۔" وہ گلوگیر لہجے میں بولا۔

اب میں نے کمرے میں پھیلی ہوئی دوسری چیزوں کا جائزہ لیا۔ ایک سادہ قسم کے ریک میں مختلف کتابچے رکھے تھے۔ میں نے ایک کتابچہ اٹھایا۔ "مجیب کے چھ نکات — حقیقت کے آئینے میں۔" یہی کتابچہ انگلش میں بھی موجود تھا۔ لکڑی کے تختوں کے ہر شیلف میں جو کتابچے، پمفلٹ اور پوسٹر بھرے ہوئے تھے، وہ باہر سے شائع ہو کے آتے تھے۔ "دو قومی نظریہ — ایک سراب — پاکستان ایک غیر فطری ریاست — استحصال کی کہانی — بنگالی کیوں غریب ہے؟ — ہم کماتے ہیں تم اُڑاتے ہو — بڑے صوبے میں کچھ نہیں — اقلیتی صوبہ حاکم ہے — کیا ہم اب بھی غلام ہیں؟ — بنگلہ دیش ہماری منزل —" یہ چند عنوانات تھے۔

"یہ زہر پھیلا رہے ہو تم یہاں؟" میں نے کہا۔

"جسے تم زہر کہتے ہو وہی ہمارے لیے آبِ حیات ہے۔" اُس نے رواں انگریزی میں کہا۔ میں اُس کی بے خوفی پر حیران رہ گیا۔ یکلخت وہ پُراعتماد اور نڈر ہو گیا تھا شاید اس لیے کہ اب وہ انجام سے بے نیاز ہو گیا تھا۔ درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا۔ جب تک پکڑے جانے کا ڈر تھا، وہ چھپ چھپ کے ہر کام کرتا رہا اور اپنے جرائم کی پردہ پوشی میں مصروف رہا مگر اب وہ ہر شریکِ جرم کے ساتھ، ثبوت اور شہادتوں کے ساتھ عین ارتکابِ جرم کی حالت میں پکڑا گیا تھا تو اُسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اب سزا ناگزیر ہے۔ اس احساس نے اُسے بولنے کی ہمت عطا کی۔ پکڑے جانے اور سزا پانے کی صورت میں اس کے ہم خیال طبقے میں وہ سچا، قوم پرست، مظلوم اور بنگلہ دیش کی جنگِ آزادی کے لیے استعمار پسندوں کے ہاتھوں مصائب جھیلنے والا مجاہد بن جاتا تھا۔

"یہ آبِ حیات کہاں سے آتا ہے؟" میں نے طنز کرتے ہوئے سارے کتابچوں کو نیچے گرانا شروع کیا۔

"بنگلہ دیش سے۔ اب تم میری زبان کاٹے بغیر مجھے اس مقدس نام کے استعمال سے نہیں روک سکتے۔۔۔" وہ بولا۔

"زبان کاٹنے کا وقت تو بعد میں آئے گا پہلے زبان کھلوانے کا مرحلہ آئے گا۔"

"تم مجھ سے کچھ نہیں معلوم کر سکو گے۔" وہ بولا۔ "تم سمجھتے ہو کہ میں اپنے ہی ساتھیوں سے غداری کر دوں گا۔ اُن کے نام اور پتے تمھیں بتاؤں گا۔" وہ تلخ لہجے میں بولا۔

میں نے سارے کتابچے فرش پر گرا دیے۔ "میرا خیال ہے کہ تم زیادہ مزاحمت نہیں کر سکو گے اور اس کے علاوہ تمھارے دوسرے شریکِ جرم بھی تو ہیں، کیا وہ بھی اتنے ہی بہادر ہیں؟ لیکن پہلے ہم تمھیں کیوں نہ دیکھ لیں۔۔۔ محسن!" میں نے آواز دے کر کہا۔

محسن دروازے میں نمودار ہوا۔ "یس باس۔"

"دیکھو، دوسرے کمرے میں جہاں عورتیں سو رہی ہیں، وہاں کتنے بچے اور کتنی عورتیں ہیں؟"

"دو عورتیں ہیں، ایک بوڑھی اور ایک جوان، تین بچے ہیں۔" محسن نے کہا۔

"سو رہے ہیں سب؟"

"عورتیں جاگ اٹھی ہیں۔ میں نے اُن کو خاموش رہنے کو کہا ہے اور سمجھا دیا ہے کہ انھوں نے تعاون کیا تو کچھ نہیں ہو گا۔"

"اُن دونوں کو یہاں لے آؤ۔" میں نے کہا۔ "پہلے

اُن کے ہاتھ پیچھے باندھ دینا، اُنھی کے ازار بند سے، اور مُنہ بند کر دینا، اُنھی کے کپڑوں سے۔"

"تم۔۔۔ عورتوں کے ساتھ۔۔۔ ایسا سلوک کرو گے؟" وہ مشتعل ہو کے چلانے لگا۔ "اتنا گر گیا ہے تمھارا اخلاق!"

میں نے اُس کو بڑی بے رحمی سے مارا۔ مسلسل لاتوں اور مُکوں سے۔ میں نے اُس کو اَدھ مُوا کر دیا۔ میں نے کئی بار اُسے اُٹھا اُٹھا کے دیوار پر پھینکا اور فرش پر پٹخا۔

"وہاں مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کے کارکن اور غنڈے ہر روز سیکڑوں عورتوں کی عزت سے کھیل رہے ہیں کیونکہ وہ پاکستان اور دو قومی نظریے کے حامی ہیں۔ وہ مجرم یا باغی نہیں ہیں، محبِّ وطن ہیں جن کے لہو سے تم سُرخرو ہو رہے ہو۔ تم ہندوؤں کے زرخرید کتّے۔ اپنے بھائیوں کی لاشوں کے تاجر۔ تم مجھے درسِ اخلاق دے رہے ہو۔۔۔ جو کچھ دوسروں کے ساتھ کرتے آئے ہو، دیکھو کہ اب وہی تمھارے ساتھ ہو گا۔ تم خود یہ عذاب جھیل کے دیکھو۔"

محسن دونوں تڑپتی مچلتی عورتوں کو دھکیلتا ہوا اندر لے آیا۔

"اب تم بتاؤ گے یا میں اِن سے پوچھوں؟" میں نے کہا۔ "کس کے ایجنٹ ہو تم؟ اور یہ لٹریچر کہاں سے آتا ہے؟"

"انھیں۔۔۔ کچھ معلوم نہیں۔" وہ بولا۔

"پہلے سب یہی کہتے ہیں۔" میں نے سر ہلایا۔ "ہمارے تفتیشی مرکز میں بہت کچھ ہے۔ تربیت یافتہ کتّے ہیں، چوہے ہیں، جن کے دانت بہت تیز ہوتے ہیں اور جو ہمیشہ بھوکے رہتے ہیں۔ آٹھ دس چوہوں کو ہم کسی مرد یا عورت کے ساتھ شیشے کے باکس میں ڈال دیتے ہیں تو وہ منظر بڑا دلچسپ ہوتا ہے۔ جب آدم خور چوہے اپنی بھوک مٹاتے ہیں اور آدھے گھنٹے میں جیتے جاگتے آدمی کی جگہ ہڈیوں کا پنجر رہ جاتا ہے۔ اُن سے لڑنا اور ان کے دانتوں سے خود کو بچانا ناممکن ہوتا ہے۔ کوئی کتنا ہی چیخے چلائے باہر اس کی آواز بالکل سنائی نہیں دیتی لیکن اس کی جدوجہد آخری سانس تک صاف نظر آتی ہے۔"

بوڑھی عورت ایکدم بے جان ہو کے فرش پر گری اور ساکت ہو گئی۔ دہشت سے اس کے اعصاب جواب دے گئے تھے۔

"تربیت یافتہ کتّے صرف مجرم عورتوں پر چھوڑے جاتے ہیں اور وہ کیا کرتے ہیں؟ اس کی کچھ فلمیں بھی بنائی ہیں ہم نے۔" میں نے کہا۔ "مگر یہاں ہم خالی ہاتھ آگئے تھے۔ تفتیش سے کچھ معلوم نہ ہوا تو ہم وقت ضائع نہیں کریں گے۔ جاتے وقت ہم عورتوں کو لے جائیں گے۔ باقی سب کی لاشیں اسی تخریب کار لٹریچر کی چتا پر آگ لگا کے چھوڑ جائیں گے۔"

"تم ہمیں مار سکتے ہو۔ ہمارے جذبے کو نہیں مار سکتے۔" مطیع الرحمٰن نے کہا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ایک جنونی شخص ہے۔ جنون عشق کا ہو، مذہب کا یا سیاست کا، انسان کو موت کے خوف سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ اور وہ جان دینے کو مقصدِ حیات سمجھنے لگتا ہے۔ اس سے کچھ معلوم ہونے کی اُمید نہیں تھی۔ میں نے دوسرے مجرموں کو بُلانے کا فیصلہ کیا۔

پہلا مجرم قدرے ہمت والا تھا۔ اُس نے کمرے کا نقشہ دیکھا اور سمجھ گیا کہ صورتِ حال کتنی سنگین ہو چکی ہے۔

"میں تم سے تین سوال کروں گا۔" میں نے کہا۔ "اور ہر سوال پر غور کرنے کے لیے تم کو ایک منٹ دوں گا۔"

حیرت انگیز طور پر اُس نے بھی رواں انگریزی میں کہا۔ "اور اس کے بعد؟ اگر میں نے جواب نہ دیا؟"

"تم سزائے موت پانے والے پہلے غدار ہو گے۔" میں نے کہا۔

"میں۔۔۔ اور ہم سب شہید ہوں گے۔" مطیع الرحمٰن نے کہا۔

"پہلا سوال۔۔۔ یہ سب لٹریچر کہاں سے آتا ہے؟" میں نے کہا۔

دوسرا مجرم چپ کھڑا رہا۔ دیوار پر لگے ہوئے کلاک کی سوئی آگے بڑھتی رہی۔ ایک منٹ پورا ہو گیا۔ مطیع الرحمٰن کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"دوسرا سوال۔۔۔ تم سب لوگ کس کس سرکاری محکمے کی فائلوں سے کس قسم کی دستاویزات چُراتے ہو؟"

ایک بار پھر سب کی نظر کلاک پر گئی۔ ایک گمبھیر سناٹے میں سیکنڈ کی سوئی کے بڑھنے کی آواز بھی صاف سنائی دیتی رہی۔ دوسرا منٹ زیادہ اعصاب شکن سکوت میں ختم ہوا۔ مطیع الرحمٰن کی مسکراہٹ میں میرے لیے نفرت کا زہر اور تحقیر کا انداز شامل ہو گیا۔

"تیسرا سوال۔۔۔ وہ دستاویزات تم کسے ارسال کرتے رہے ہو؟ اس کا مکمل نام اور پتا۔"

اب مَیں نے مجرم کے قریب جا کے بائیں ہاتھ کی کلائی کی گھڑی پر نظر رکھتے ہوئے دایاں ہاتھ ایک ضربِ کاری کے لیے اُٹھایا۔ اُس نے مجرم کو دہشت زدہ کیا۔ شاید وہ سمجھ رہا تھا کہ اُسے گولی ماری جائے گی اور وہ پُر اُمید تھا کہ ہم ایسی غلطی نہیں کریں گے۔ فائر کی آواز تو سارے سونے والوں کو جگا دے گی۔

سیکنڈ کی سوئی ابھی گیارہ کے ہندسے کو کراس کر کے آگے بڑھی ہی تھی کہ میرا ہاتھ حرکت میں آگیا۔ اس پھرتی کے ساتھ ایسی ہلاکت خیزی کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا جب اُس کی گردن کی ہڈی ٹوٹی تو یہ بھیانک آواز خندۂ اجل کی طرح سب نے سُنی۔ وہ کھڑے کھڑے گرا۔ سیدھا اُن کتابچوں پر جو فرش پر ڈھیر ہوئے پڑے تھے۔ عورت مچلی اور اُس نے محسن کی گرفت سے رہائی حاصل کرنے کی کوشش کی مجھے اُس کی دہشت زدہ آنکھوں میں التجا نظر آئی مطیع الرحمٰن بے یقینی سے اس شخص کو دیکھتا رہا جو ٹھیک تین منٹ پورے ہوتے ہی مر گیا تھا۔ اُسے ایک سیکنڈ کی مہلت نہیں ملی تھی۔ گرنے کے بعد اس کا جسم پھانسی پانے والے کی طرح تڑپتا رہا تھا اور نزع کے کرب میں اینٹھتا بل کھاتا رہا تھا۔ محسن نے بہت حاضر دماغی کا ثبوت دیا اور دوسرے مجرم کو لے آیا تاکہ وہ بھی ایک مجرم کو مرتا ہوا دیکھ لے۔ مَیں نے اس دقفے میں عورت کو پکڑے رکھا۔

"مَیں نے اس سے تین سوال کیے تھے۔" مَیں نے کہا۔ "اور ہر سوال کے بعد ایک منٹ سوچنے کے لیے دیا تھا۔"

"ہم کچھ نہیں جانتا۔ ہم اللہ پاک، رسولؐ کا قسم کھاتا۔" وہ چلّانے لگا۔ "ہم کو مت مارو۔"

محسن نے اس کا مُنہ دبا لیا۔ مَیں نے کہا "معلوم ہوتا ہے کہ تم تین منٹ کی مہلت بھی نہیں چاہتے۔ تمھاری مرضی۔"

ایک اور گردن کی ہڈی چٹخنے کی آواز کے ساتھ ہی وہ نسبتاً جوان عورت بھی بے ہوش ہو کے گر گئی جس کو مَیں نے ایک ہاتھ سے تھام رکھا تھا۔ پہلے میرے دوسرے ہاتھ میں ریوالور تھا جو اب مَیں نے جیب میں رکھ لیا تھا۔ مطیع الرحمٰن اب مجھے خالی ہاتھ دیکھ کے کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہو سکتا تھا۔ اُس نے میرے جیسے سرد خون والے ٹھنڈے مزاج والے اور حقیقی پیشہ ور قاتل پہلے نہیں دیکھے ہوں گے۔ اب وہ بھی نروس ہو چکا تھا۔ اُس کی مٹھیاں سختی سے بند تھیں اور دانت یُوں دبے ہوئے تھے کہ جبڑوں کی ہڈیاں اُبھر آئی تھیں۔

تیسرا ملزم اندر آتے ہی پاگلوں کی طرح ہاتھ پیر چلانے لگا۔ اُس نے ایک لاش کو سرد ہوتے اور دوسری لاش کو پھڑکتے دیکھا۔ وہ دونوں ایڑیاں رگڑتے ہوئے اپنے کتابچے اور پمفلٹ فرش پر پھیلاتے اور پھاڑتے رہے تھے۔

اُس نے میرے ایک سوال کا ہی جواب دیا یعنی صرف یہ بتایا کہ ان چاروں کا تعلق کس کس محکمے سے تھا اور وہ کس قسم کی ٹاپ سیکرٹ انفارمیشن اکٹھی کر کے لاتے تھے۔ باقی دو سوالوں کا جواب اُسے نہیں معلوم تھا۔ مطیع الرحمٰن نے اُسے بنگالی میں کچھ کہا جو مَیں نے اندازے سے سمجھا۔ وہ اپنے ساتھی کو بزدلی اور غداری پر شرمسار کر رہا تھا لیکن موت کو سامنے دیکھ کر تیسرے مجرم کا سارا جذبۂ جہاد بہہ گیا تھا اور اُس کی دھوتی کو گیلا کر گیا تھا۔ چند منٹ بعد وہ بھی کیفرِ کردار کو پہنچا۔ مطیع الرحمٰن کی کیفیت کسی پاگل کتے جیسی ہو گئی۔ وہ مجھ پر دیوانہ وار حملہ آور ہوا۔ مجبوراً مَیں نے پہلے اس سے نمٹنے کا فیصلہ کیا۔

مَیں نے اُس کی کلائی کو گرفت میں لے لیا اور اس کے پیٹ میں مُکا مارا۔ وہ درد کی شدت سے دُہرا ہو گیا اور اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مَیں نے دوسرا مُکا مارا تو اُس کی جیسے سانس رک گئی اور اُس نے پورا مُنہ کھول دیا۔ جب مَیں نے اس کے ہاتھ کو مروڑا تو وہ خود ہی گھوم کر میرے سامنے آگیا۔ اُس کے ہاتھ کو کمر سے لگا کے مَیں نے اُسے آگے دھکیلا اور دیوار سے لگا دیا۔ اُس کے دوسرے ہاتھ کو پکڑ کے مَیں نے گھٹنا کمر پر رکھا اور دبایا تو اُس نے کراہنا شروع کیا۔ اُس کی سانس رُکنے لگی۔

"تم نے میرے تین سوال کتنی بار سُنے ہیں؟ اب تو یقیناً تمھیں ازبر ہو گئے ہوں گے۔" مَیں نے کہا۔ "یہ تین باتیں اُن کا جواب نہ دے سکیں۔ کیا تم۔۔۔"

"مَیں لعنت بھیجتا ہوں تم پر۔" وہ چلّایا۔ "مجھے مار ڈالو مگر مَیں کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

"ان سب کی موت آسان تھی۔ گردن ٹوٹتے ہی جان کا جسم سے رابطہ منقطع ہو جاتا ہے۔ بے شک جسم ٹھنڈا ہونے میں دیر لگتا ہے مگر درد و کرب کے احساس کا تعلق دماغ سے ہے۔" مَیں نے کہا۔ "تمھاری موت بہت پُر عذاب ہوگی۔"

"تم جو چاہو کرو۔"

"او کے مسٹر مطیع الرحمٰن۔" مَیں نے اس کے سیدھے ہاتھ کی ایک انگلی کو اپنی دو انگلیوں میں پھنسا کے دبایا۔

انگلی ایک جوڑ کے پاس سے ایسے ٹوٹ گئی جیسے پنسل ٹوٹتی ہے۔ وہ بلبلایا مگر مَیں نے اُس کا مُنہ دبا لیا۔ وہ کچھ دیر اس ہاتھ کو جھٹکتا رہا اور میرے گھٹنے کے دباؤ اور دیوار کے درمیان بل کھاتا رہا۔

پھر مَیں نے اُس کے مُنہ سے ہاتھ ہٹا کے کہا "تم چیخنا چاہو تو چیخ سکتے ہو۔ کسی کو مدد کے لیے بلانا چاہو تو میری طرف سے اجازت ہے لیکن مَیں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ سونے والے تمھاری پکار سن بھی لیں گے تو نکلیں گے نہیں اور نکلے تو ہم انھیں لوٹا دیں گے۔ یہ بتا کے کہ مطیع الرحمٰن گردے یا اپنڈکس کے درد سے تڑپ رہا ہے۔ اب پھر وہی سوال کہ تم کچھ بتاؤ گے۔۔۔ یا۔۔؟" مَیں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور دوسری انگلی بھی توڑ دی۔ ہر بار مَیں نے اُسے دو منٹ کا وقفہ دیا۔ ایک ایک کر کے دس منٹ میں اُس کی پانچ انگلیاں ایسے لٹکنے لگیں جیسے ان کے درمیان میں ہڈی ہی نہیں ہے۔

وہ اب چلّا رہا تھا اور تڑپ رہا تھا مَیں نے اس کا مُنہ دیوار سے لگا دیا تھا۔ اس طرح کہ وہ چہرہ سیدھا کرتا تھا تو اُس کے ہونٹ اور ناک دیوار پر رگڑ کھاتے تھے۔ میرے لیے اُس کو سنبھالنا مشکل ہوتا جا رہا تھا چنانچہ مَیں نے محسن سے کہا کہ وہ آخری آدمی کو لے آئے اور اس رسّی سے مطیع الرحمٰن کو باندھ دے جس سے پہلے چار افراد باندھے گئے تھے۔

"اس بپتی کو اور اکرام شیخ کو بھی یہیں بُلا لوں؟"

"ہاں۔ انھیں دوسرے کمرے میں رکھنا اب بے مقصد ہے۔" مَیں نے کہا۔

بپتی نے اندر آتے ہی پانچ لاشیں دیکھیں۔ ان دو عورتوں کو بھی وہ مُردہ ہی سمجھا جو درحقیقت بے ہوش تھیں۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں اور اُس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ اکرام شیخ نے اُسے ایک کونے میں بٹھا دیا۔ چوتھا بنگالی جو اَب رسّی سے بندھا ہوا اُس بکرے کی طرح ممیا تا آ رہا تھا جسے قصائی چھری پھیرنے کے لیے لے جا رہا ہو، اس منظر کو دیکھتے ہی خوف سے مفلوج ہو گیا۔ وہ کچھ دیر جھولتا رہا اور پھر مُنہ کے بل گر گیا۔

لیکن یہ اس کی مکاری تھی۔ محسن نے اُس کے جلتی ہوئی سگریٹ لگائی تو وہ بلبلا کے تڑپا۔ محسن نے اسے سیدھا بٹھا دیا۔

اب وہ اور بپتی دونوں اُس کے ریوالور کی زد میں تھے۔ اکرام شیخ نے میری ہدایات کے مطابق مطیع الرحمٰن کو باندھ دیا۔

مَیں نے پھر مطیع الرحمٰن کی قوتِ برداشت اور مزاحمت آزمانے کا تماشا شروع کر دیا۔ وہ ایک ضدی اور حیرت انگیز حوصلہ رکھنے والا شخص تھا۔ مَیں نے اُس کے دوسرے ہاتھ کی انگلیاں بھی توڑ دیں۔ وہ ٹس سے مَس نہ ہوا لیکن آخری ملزم سچ مچ بے ہوش ہو گیا۔

میرے کہنے پر محسن نے بپتی کے مُنہ سے کپڑا نکال دیا۔ وہ لمبے لمبے سانس لینے لگا اور پھر بولا "یہ۔۔۔ بہت ظلم ہے۔"

"ہاں ہم جانتے ہیں کہ یہ ظلم ہے۔" مَیں نے کہا۔ "لیکن ہم ظلم کے جواب میں ظلم کر رہے ہیں اور ظالموں کو سزا دے رہے ہیں۔"

"سزا دیتے ہوئے بھی انسان کو رحم دل ہونا چاہیے۔ مارنا ہے تو فوراً مار دو۔"

محسن نے اس کے بال پکڑ کے سر کو پیچھے دیوار سے ٹکرایا۔ "مسٹر رحمدل، تم مشرقی پاکستان جا کے دیکھو۔ کس طرح ان علیحدگی پسندوں کے چھوڑے ہوئے بھوکے بھیڑیے سرِ عام ہوس کا ننگا کھیل کتنے انسانیت سوز طریقے پر کھیلتے ہیں۔ تم نے دہشت و بربریت کا ذکر تاریخ میں چنگیز خان اور ہلاکو سے منسوب کر رکھا ہے یا پھر اس خون ریزی کی پُر تشدد فلموں میں دیکھا ہے۔ مگر مشرقی پاکستان جا کے دیکھو۔ وہاں عورتوں کو کیسے حیا سوز طریقے پر سرِ بازار اذیت دے دے کر ہلاک کیا جاتا ہے۔ بچوں کے ٹکڑے کس طرح مکتی باہنی کے سورماؤں کے نیزوں پر نظر آتے ہیں۔"

"ہو سکتا ہے، ہو سکتا ہے۔" وہ بولا۔ "لیکن اُس کا یہ جواب۔۔۔"

"ہمارے مذہب اور تمھاری تعلیمات میں فرق ہے۔ تم کہتے ضرور ہو کہ کوئی ایک گال پر طمانچہ مارے تو اُسے دوسرا پیش کرو لیکن عملاً ایسا نہیں کر پاتے۔ یہ گاندھی کے اہنسا کے فلسفے کے خاصا قریب ہے۔ مگر کیا ہندو اپنے باپو کی تعلیمات پر عمل کرتے ہیں؟ تقسیم کے وقت وہ باپو کو بھول گئے تھے اور خون کی ہولی میں مصروف تھے۔ ہم مسلمان منافق نہیں ہیں اور نہ ہماری تعلیمات میں منافقت ہے۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ قصاص کیا ہے۔ خون کا بدلہ خون، آنکھ کے بدلے آنکھ اور کان کے بدلے کان۔ جو کچھ مَیں کر رہا ہوں یہ عین انصاف ہے اور مَیں اس لیے کر رہا ہوں کہ

انصاف کے ہاتھ ان کی گردن تک نہیں پہنچ سکتے۔ ان ہاتھوں کو نظامِ انصاف کے پُرپیچ مرحلے اور قانونی۔۔۔ مُوشگافیاں روک لیتی ہیں۔"

محسن کی کوشش سے چوتھا ملزم پھر ہوش میں آگیا مگر وہ دیوانہ ہونے کے قریب تھا۔ وہ ان میں سب سے کمزور دل کا مالک تھا۔ باقی سب کے لیے سزائے موت تو پہلے سے طے تھی لیکن وہ پہلے آجاتا تو اُس سے اعترافِ جرم اور اپنے نامۂ اعمال کے سارے گناہوں کی روداد سنتے اور مرنے سے پہلے اس اذیت سے بھی گزرتے کہ غداروں کے ساتھ بھی کسی نے غداری کی۔

چوتھا ملزم رو رہا تھا اور کانپ رہا تھا اور رضاکارانہ طور پہ سب کچھ بتا دینے کی پیش کش کر رہا تھا مگر میں مطیع الرحمٰن کا غرور توڑنا بھی ضروری سمجھتا تھا۔ جسمانی اذیت اُس کی ضد کو شکست نہیں دے سکتی تھی۔ چنانچہ میں نے دوسرا حربہ آزمانے کا فیصلہ کیا۔

"محسن! ان عورتوں کو ہوش میں لانے کا بندوبست کرو" میں نے کہا "ابھی کافی وقت ہے۔"

"دو بجنے والے ہیں۔" محسن بولا "زیادہ سے زیادہ تین گھنٹے میں ہمیں سب کام نمٹا کے واپس جانا ہے۔"

"فکر مت کرو" میں نے کہا "یہاں اب صرف آدھے پون گھنٹے کی مصروفیت ہے۔ جب یہ عورتیں ہوش میں آجائیں تو ان سے کہنا کہ کچھ چائے وغیرہ بنائیں۔ ان کو بھی پلانا۔ بہتر ہوگا کہ ان کو دوسرے کمرے میں لے جا تاکہ یہ ہوش میں آئیں تو میدانِ کارزار نہ دیکھیں۔ میں اتنی دیر میں مسٹر ہیتی سے بات کرتا ہوں۔"

محسن دونوں عورتوں کو واپس انھی کے کمرے میں لے گیا۔

میں نے ہیتی سے کہا "اب تم بتاؤ۔"

"میں سب کچھ بتا دوں گا کیونکہ اس میں میرا کوئی نقصان نہیں سوائے مالی نقصان کے" وہ بولا "میں نہ تمھارا دشمن ہوں اور نہ اُن کا دوست۔ میں صرف پیسے کے لیے کام کرتا ہوں۔"

"یہ لوگ کس کام کا پیسہ دیتے تھے؟"

"دستاویزات لے جانے کا۔ تم نے دیکھا ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ ان کی کیا اہمیت تھی اور اس لفافے میں کیا تھا" وہ بولا "وہ مُہر بند لفافہ تھا اس لیے میں صرف اندازہ کر سکتا تھا کہ اس میں کاغذات ہیں۔"

"کب سے کر رہے ہو یہ کام؟" میں نے سگریٹ جلا کے ایک کش لیا اور ایک اسٹول پر ٹک گیا۔

"یہ دوسرا پھیرا تھا۔" وہ بولا۔

"پہلی بار بھی دستاویزات لے گئے تھے؟" میں نے کہا۔

"ہاں، شاید اس میں کچھ تصویریں بھی تھیں۔" وہ بولا۔

"اور اس کام کا تمھیں کیا معاوضہ ملا تھا؟" میں نے کہا۔

"ایک ہزار ڈالر۔" اُس نے کہا۔

"کس نے ادا کیا تھا۔ انڈین شپ کے کیپٹن نے؟"

ہیتی نے نفی میں سر ہلایا "وہ صرف رسید دیتا تھا اور کوئی لفافہ جو میں ان کو دے دیتا تھا۔"

"وہ لفافہ کہاں ہے جو تمھیں آج ملا ہے؟" میں نے ہاتھ بڑھا کے چُٹکی سے اشارہ کیا۔

اس نے کوٹ کے اندر سے سفید لفافہ نکالا اور مجھے پکڑا دیا۔ میں نے اُسے کھول کے دیکھا۔ اس کے اندر ایک ہزار ڈالر تھے۔ میں نے رقم نکالے بغیر لفافہ قریب رکھ لیا۔

"کیا تم واقعی نہیں جانتے کہ اس میں کیا ہوگا؟" میں نے کہا۔

اُس نے نفی میں سر ہلایا۔ "جانتا تو بتا دیتا۔ میں نے تو لفافہ ہی تمھیں دے دیا ہے۔"

"یہ لفافہ تم کسے واپس لا کے دیتے تھے اور کہاں؟"

"یہاں۔ اِس کو۔" ہیتی نے مطیع الرحمٰن کی طرف اشارہ کیا۔

مطیع الرحمٰن اُسے گالیاں دینے لگا "تم بے غیرت کُتّے، نمک حرام۔"

لفافہ دینے کے بعد کیا ہوتا تھا؟" میں نے کہا۔

"مجھے اس کمرے میں بٹھا دیا جاتا تھا۔ دس پندرہ منٹ کے بعد رقم مل جاتی تھی۔" وہ بولا۔

"تم کسی فوٹو اسٹیٹ شاپ سے واقف ہو؟"

اُس نے اقرار میں سر ہلایا "لفافہ مجھے وہیں تیار ملتا تھا۔ اُس کو یہ شخص چلاتا تھا۔" اُس نے پہلے ملزم کی لاش کی طرف اشارہ کیا۔

"وہاں پان کی ایک دکان بھی تھی؟" میں نے کہا "سگریٹ شاپ۔"

اُس نے نفی میں سر ہلایا "میں سگریٹ نہیں پیتا۔"

"تمھیں کچھ معلوم ہے کہ یہ سب کہاں سے آتا تھا؟"

میں نے کہا۔

اُس نے پھر نفی میں سر ہلایا "یہ لوگ بنگالی میں بات کرتے تھے اور میں بنگالی نہیں سمجھتا۔"

"پہلی بار تمھارا ان سے کیسے رابطہ ہوا تھا؟"

"میں قلاش ہو چکا تھا۔" وہ بولا "مجھے صرف ایک کام آتا ہے۔ میں ایک اچھا سنگر ہوں۔ ایک گروپ میں بھی رہا ہوں۔ سیٹانز ڈسپل" SATAN'S DISCIPLE

"شیطان کے چیلے۔ صحیح نام تھا اس گروپ کا۔" میں نے طنز سے کہا "سب شیطانی کام ہی کرتے ہوں گے۔"

"ہم نے میامی اور ٹیکساس میں کامیاب شو کیے۔ یہ دو لڑکیوں اور چار لڑکوں کا گروپ تھا۔ ہم ایک کامن فیملی تھے۔"

"سب کے شوہر سب۔ سب کی بیویاں مشترک۔ بچے کس کے کھاتے میں جاتے تھے؟"

"ہمارے بچے نہیں تھے۔ ہو بھی نہیں سکتے تھے۔ ہوتے تو ہم مار ڈالتے۔ میں بھی ایک سنگر تھا۔ یہاں میں نے گٹار کے ساتھ گانے گائے اور بہت پیسہ اکٹھا کیا۔ تمھاری قوم کے افراد بہت زیادہ رحمدل ہیں، فراخ دل یا بے وقوف۔"

"سب کچھ ہیں بس بے غیرت اور بے ضمیر نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔ "تمھاری شناختی دستاویزات ہیں؟"

اُس نے ہپ پاکٹ میں سے ایک پلاسٹک میں لپٹا ہوا پیکٹ سا نکالا اور میری طرف بڑھا دیا۔ اس پر ہیتی کا پورا نام، پتا اور اس کے بارے میں تفصیلی معلومات درج تھیں۔

"میرا خیال ہے کہ اب یقیناً ان کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔" میں نے کہا۔

"کیوں؟ ان کے بغیر میں واپس کیسے جاؤں گا؟"

"جیسے سب کو ایک دن جانا ہے۔" میں نے کہا۔ "اور وہاں کے لیے پاسپورٹ اور ویزا وغیرہ درکار نہیں ہوتا۔"

"کیا۔۔۔ تم مجھے۔۔۔ لیکن میں نے تم سے پورا تعاون کیا اور میں۔۔۔ دشمن بھی نہیں تمھارا۔۔۔" وہ چلّانے لگا۔

"دشمنی تو کی تم نے۔"

"وہ مجبوری تھی میری۔"

"میں بھی مجبور ہوں۔" میں نے اس کے پاسپورٹ کے ٹکڑے کرتے ہوئے کہا "میرے دشمنوں کا ساتھ دینے والے بہرحال میرے دشمن ہیں تاہم میں تم کو وہ رعایت دوں گا جو تم اِن کے لیے مانگ رہے تھے۔ میں تمھاری موت کو بہت آسان بنا دوں گا۔ اور تمھیں آخری دعا کے لیے موقع بھی دوں گا۔۔۔ ایک منٹ۔"

"تم۔۔۔ یہ نہیں کر سکتے۔۔۔ میرے ساتھ۔۔۔ میں تم کو قتل کر دوں گا۔ یو باسٹرڈ۔" وہ ایک دم اُٹھ کے مجھ پر حملہ آور ہوا۔

میں یہی چاہتا تھا۔ جیسے ہی وہ میرے قریب آیا میں نے اس کے ایک بھرپور ہاتھ رسید کیا۔ اُس نے ایک جھٹکا لیا۔ اُس کے حلق سے ڈکرانے کی آواز نکلی اور اس کے ہاتھ اپنی گردن کی طرف بڑھے۔ میں نے دوسرا ہاتھ مارا تو وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح گر گیا۔

"مطیع الرحمٰن! تم نے ہمارے نظامِ انصاف کو دیکھا۔ اس میں کسی مجرم کے بچ نکلنے کا ایک فی صد امکان بھی نہیں۔ لیکن جیسا کہ تم جانتے ہو گے، گناہ گاروں کے اعمال کا خمیازہ انھیں بھی بھگتنا پڑ جاتا ہے جو عرفِ عام میں لواحقین کہلاتے ہیں۔۔۔ محسن!" میں نے آواز دے کر کہا۔

"دو منٹ باس۔" محسن نے کہا "چائے تقریباً تیار ہے۔"

"اب میں وہ کروں گا جو میں کرنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن تم نے مجھے اِس انتہا تک پہنچا دیا۔" میں نے مطیع الرحمٰن سے کہا "اب اِن دونوں عورتوں کے سامنے، غالباً ایک تمھاری بیوی ہے اور دوسری اس کی ماں یا تمھاری ماں، اِن کے سامنے باری باری تینوں بچّے پہلے اندھے کیے جائیں گے گرم سلاخوں سے۔"

"نہیں۔" مطیع الرحمٰن چلّایا "کیا تم حیوان ہو گئے ہو؟"

"تم انسان بن کے انھیں بچا سکتے ہو۔" میں نے نرمی سے کہا "ورنہ میرے لیے جنگ میں سب جائز ہے۔ جب دشمن کہیں بم گراتا ہے تو کیا اس سے بچّے ہلاک اور زخمی نہیں ہوتے، معذور نہیں ہوتے، یہاں تک کہ وہ جو ماؤں کے پیٹ میں ہوں، انھیں بھی مرنا پڑتا ہے۔ امریکا کے ایٹم بم نے تو آنے والی نسلوں تک کو ذہنی و جسمانی طور پر معذور اور بانجھ کر دیا تھا۔ چنانچہ دوسرے مرحلے میں ان کو آری سے چیر دیں گے۔ آری ہم لائے ہیں۔ درمیان سے ان کے دو کر دیں گے ان کی ماؤں کے سامنے۔ اس کے بعد

عورتوں کی باری آئے گی اور آدھے گھنٹے میں ہم سب لاشیں اس کوڑے پر ڈال کے آگ لگا دیں گے۔ پیڑول بھی ہے ہمارے پاس۔ اس وقت کون آئے گا بچانے تمھیں بلائیں تو کسی کو بلانے سے پہلے ہی جل جائیں گی اور جب تک آگ پھیل کر اس گھر کو اپنی لپیٹ میں لے گی اور فائر بریگیڈ پہنچے گا تب تک صبح ہو جائے گی، یہاں کچھ نہیں ہوگا۔ کوئی کسی کو بتانے والا نہیں ہوگا کہ یہ سب کیسے ہوا تھا۔"

میں مطیع الرحمٰن کے چہرے کی بدلتی ہوئی حالت دیکھ رہا تھا۔ جب محسن چائے لے کر آیا تو مجھے اپنی کامیابی کا خاصا یقین ہو چلا تھا۔

"دونوں عورتوں کو لے آؤ اور سامنے باندھ دو۔ ان کے منہ میں کپڑے ٹھونس دو۔" میں نے سفاک لہجے میں کہا "اور سب سے چھوٹے بچے کو لے آؤ۔"

مطیع الرحمٰن دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ "تم کو خدا رسول کا واسطہ۔ ایسا ظلم مت کرو۔ مجھے اندھا کر دو۔ مجھے چیر دو۔"

میں اطمینان سے چائے پیتا رہا۔ محسن دونوں عورتوں کو بیدردی سے گھسیٹ کر وہاں لے آیا۔ وہ چلتی پھرتی لاشوں کی طرح تھیں۔

اکرام شیخ ایک چھ سات سال کے بچے کو اٹھا کر لایا۔ وہ نیند سے پوری طرح جاگا بھی نہیں تھا اور کچی نیند سے جگائے جانے پر روتا ٹھنکتا آ رہا تھا۔ کمرے کے اندر آ کے بھی وہ معصومیت سے ہم سب کو دیکھتا رہا۔ اس کے نزدیک یہ کوئی دہشت زدہ کرنے والا منظر نہیں تھا۔ اس نے فرش پر پڑے ہوئے افراد کے بارے میں فرض کیا ہوگا کہ وہ سب سو رہے ہیں۔ وہ بے اختیار ماں کی طرف لپکا۔

اکرام شیخ نے اُسے پکڑ لیا۔ جوان عورت بری طرح تڑپنے اور بل کھانے لگی۔ مطیع الرحمٰن اپنے ٹوٹی ہوئی انگلیوں والے ہاتھ جوڑنے کی کوشش کرنے لگا۔

"کچن میں کوئی سلاخ ہو تو بہتر ہے ورنہ کوئی نوکیلی چھری ضرور ہوگی۔ اسے چولھے پر خوب گرم کر لاؤ۔" میں نے کہا۔

مطیع الرحمٰن کی مزاحمت دم توڑ رہی تھی۔ اُس نے مزاہمت آسان جانا تھا۔ یہ موت سے شدید تر عذاب تھا جس کا اُس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ تاہم ابھی تک وہ فرض اور محبت کی کش مکش میں مبتلا تھا۔ ایک طرف اس کا عہد اور مشن تھا۔ اس کے نظریات اور عقائد تھے جو قربانی مانگتے تھے۔ اس نے کسی جذباتی لمحے میں یقیناً جان و مال کی ہر قربانی دینے سے دریغ نہ کرنے کے عزم کا اعلان کیا ہوگا اور آج تک شاید اس کے ایمان میں خلل نہ پڑا ہوگا لیکن اب ایک باپ اور ایک شوہر کے جذبات اس کو رسوا کن شکست دے رہے تھے۔ ایک ایسی شکست جس کے بعد وہ خودکشی بھی کر سکتا تھا کیونکہ وہ وقت آنے پر بزدل ثابت ہوا تھا۔

محسن ایک نوکیلی سلاخ کے ساتھ اندر آیا۔ اس سلاخ سے شاید ڈرین یا پائپ وغیرہ کھولے جاتے ہوں گے۔ سلاخ دہک کر لال تو نہیں ہوئی تھی مگر اس پر سے دہشت زدہ کر دینے والا دھواں اٹھ رہا تھا۔

"آخری موقع مطیع الرحمٰن!" میں نے کہا۔ "میں دس تک گنوں گا۔ اس کے بعد یہ معصوم بچہ تمھاری سیاست پر قربان ہوگا۔ اس کی ایک آنکھ بے نور ہو جائے گی۔ ایک منٹ کے بعد دوسری۔"

ابھی محسن آگے بڑھا ہی تھا کہ ایک کے بعد دوسری عورت کا سب تڑپنا مچلنا ختم ہو گیا۔ مطیع الرحمٰن پاگلوں کی طرح بلبلانے لگا۔

"میں... میں بتاؤں گا... میں سب بتاؤں گا... اس کو چھوڑ دو۔" وہ سر کو ادھر اُدھر پٹخنے لگا۔ محسن پیچھے ہٹ گیا۔

"بولو... کہاں سے آتا ہے یہ سب لٹریچر؟"

"کہیں سے نہیں۔ ہم خود چھاپتے ہیں۔" وہ بولا۔ "یہ دو آدمی رائٹر ہیں۔ ایک ڈھاکا یونیورسٹی کے شعبۂ معاشیات کا پروفیسر ہے سبودھ مکرجی۔ دوسرا کلکتے سے آیا ہے۔ لاجیت رائے یہ انگلش کے ایک مشہور اخبار کا ایڈیٹر تھا پھر عوامی لیگ کے پبلسٹی سیل برائے مغربی پاکستان کا مشیر ہو گیا۔"

اُس نے مجھے تفصیل سے بتایا کہ ان دونوں ایجنٹوں کو کیسے ادائیگی ہوتی تھی۔ اس نے اپنے بارے میں اور دوسرے ساتھی کے بارے میں بتایا کہ وہ سیکشن افسر ہیں اور فوجی نقل و حرکت کے بارے میں اور اہم تنصیبات کے بارے میں فوجی ساز و سامان کی نوعیت کے بارے میں اور اہم شخصیات خصوصاً جنرلوں کے بارے میں مفصل معلومات آگے فراہم کرتے تھے۔ تمام سرکاری دفاتر میں ہم خیال لوگوں سے رابطہ رکھتے تھے اور انھیں یہ لٹریچر فراہم کرتے تھے۔ ان کی میٹنگز مختلف مقامات پر ہوتی تھیں جن میں سب سے عہد لیا جاتا تھا کہ وہ بنگلہ دیش بنانے کے لیے جان و مال کی قربانی دیں گے اور جس دن ان کی جد و جہد کامیاب ہوگی وہ مغربی پاکستان کے آقاؤں کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچا کے نکل جائیں گے۔ اس نے ہندوستانی فوج کے نوجوں سے رابطے کا ذکر بھی کیا اور بھارتی خفیہ پولیس "را" کا بھی جو انھیں فنڈ اور اسلحہ فراہم کرتی تھی۔ تاہم وہ کسی کے نام سے واقف نہیں تھا۔

چوتھے ملزم کا بیان ہم نے الگ لیا اور اس سے تصدیق ہوئی کہ مطیع الرحمٰن نے غلط بیانی نہیں کی تھی اور اسے جو کچھ معلوم تھا وہ سب بتا دیا تھا۔ اس کا بھائی پہلے ہی مارا جا چکا تھا۔ وہ دونوں حساس نوعیت کے ایک ادارے میں ٹائپسٹ اور اسٹینوگرافر تھے چنانچہ ہر قسم کی رپورٹ جو انھیں ٹائپ کرنے کے لیے دی جاتی تھی، وہ اس کی ایک اضافی کاپی بنا لیتے تھے۔

میں نے چوتھے ملزم کا قصہ بھی پاک کیا اور محسن سے کہا۔ "اب ہمیں جلد از جلد نکل جانا چاہیے۔ مطیع الرحمٰن کو باہر ٹیکسی میں ڈالو۔"

"اور ان عورتوں بچوں کو؟"

"انھیں جاتے وقت باہر نکال دیں گے۔" میں نے کہا۔ "شیخ سے کہو ٹیکسی قریب لے آئے۔ اس میں سے کچھ پیٹرول نکالا جا سکتا ہے؟"

"کچن میں مٹی کا تیل خاصی مقدار میں موجود ہے۔" محسن نے کہا۔

"بس پھر پیٹرول کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔ "تم اسے لے جاؤ اور ڈکی میں ڈال دو۔"

محسن نے اپنا کام بہت خوبی سے کیا۔ میں نے اور شیخ نے اسی وقفے میں کچن سے مٹی کا تیل لا کے اس لٹریچر اور لاشوں پر ڈال دیا۔ دوسرے کمروں سے ہر آگ پکڑنے والی چیز ان کے اوپر ڈھیر کر دی جس میں پردے، فرنیچر، کپڑے وغیرہ شامل تھے۔ آخری وقت میں ہم نے دونوں عورتوں کو باہر ساتھ والے کوارٹر کے برآمدے میں لٹا دیا۔ رات کے تین بجے ہر طرف اندھیرا اور سناٹا تھا چنانچہ ہماری اس کارروائی کا مشاہدہ کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ ایک بچہ پہلے سے جاگ رہا تھا۔ باقی دو کو ہم نے جھنجوڑ کر جگایا تھا اور اُن کو ڈانٹ کر کہا کہ وہ اپنی ماں کے پاس چپ کر کے بیٹھیں ورنہ ہم اُن کے گلے کاٹ دیں گے کیونکہ ہم ڈاکو ہیں۔ دونوں بڑے بچے نسبتاً سمجھدار تھے۔ انھوں نے چھوٹے والے کو بھی خاموش کر لیا۔

جب ہم اس تخریب کاری کے ایک ٹھکانے کو اور اپنے دشمنوں کی لاشوں کو آگ دکھا کے فرار ہوئے تو ہماری ٹیکسی کے روانہ ہونے سے قبل ہی بچوں نے چیخنا شروع کر دیا تھا اور آگ کے شعلے کھڑکیوں سے باہر اور کھلے صحن کی طرف سے صاف نظر آنے لگے تھے۔ ہم نے ٹیکسی کی رفتار کو کم رکھا اور ایک بلاک کا چکر کاٹ کے پھر اُدھر سے گزرے تو گرد و نواح میں افراتفری پھیل چکی تھی۔ گھر کی چھت کے نیچے بھی پرانی لکڑی کے شہتیر تھے اور کینوس کی چھت تھی جو اوپر ٹکونی چھت کی بدنمائی کو بھی چھپاتی تھی اور گرمی کے اثر کو بھی کم کرتی تھی۔ ہر چیز آگ پکڑ چکی تھی اور شعلے چھت سے اوپر تک بلند ہو چکے تھے۔ کراچی میں مغرب کی جانب سے مسلسل چلنے والی تیز ہوا اس آگ کو بھڑکا رہی تھی۔

مطیع الرحمٰن کو ہم نے کافی دور آ کے ڈکی سے نیم بے ہوشی کی حالت میں برآمد کیا۔ محسن نے اُسے پیچھے والی سیٹ پر ڈالا تو وہ شکستہ انگلیوں والے ہاتھ کی اذیت سے بے حال تھا اور بری طرح کراہ رہا تھا۔

"تم... تم نے جھوٹ بولا، دھوکے باز... تم نے ان عورتوں بچوں کو مار دیا۔" وہ بولا اور اس کے آنسو بے اختیار بہہ نکلے۔

"جھوٹ، بدعہدی اور بے ایمانی، سب کچھ تمھارے ساتھ جائز ہوگا کیونکہ ہم اور تم دشمن ہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن ہم ہر حال میں جنگ کے وہ اخلاقی اصول نبھاتے ہیں جو ہمیں ہادیٔ برحقؐ، خلفائے راشدینؓ اور صحابۂ کرامؓ نے سکھائے تھے۔ اور جن کو فتح مکہ اور اس کے بعد ہر عسکری فتح کے موقع پر مسلمانوں نے کبھی پامال کرنے کی جرأت نہیں کی۔ عورتوں اور بچوں، بوڑھوں اور بیماروں کو ہمیشہ امان حاصل رہی اور اُن پر ہاتھ اٹھانا آج بھی ہمارا شیوہ نہیں تمھارے بیوی بچے بالکل محفوظ ہیں۔"

"میں جب تک انھیں دیکھ نہیں لوں گا، یقین نہیں کروں گا۔"

"ٹھیک ہے، واپسی میں تم اُن کو دیکھ سکو گے۔" میں نے کہا اور پھر باہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "آخری بار۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تمھاری فوٹو اسٹیٹ مشین شاپ کدھر ہے؟" محسن نے سب کچھ جانتے ہوئے بھی کہا۔

"وہ... صدر میں... لیکن اُس کی چابی... اُسی کے پاس تھی۔" وہ بولا۔ "جس کو تم نے مار دیا۔"

مجھے اس پر غصہ آیا۔ خبیث وہاں نہیں بولا۔ مگر قصور میرا بھی تھا کہ میں نے اُس سے وہاں نہیں پوچھا۔ اب تک تو اس کی چتا بھی ٹھنڈی ہو رہی ہوگی۔ خیر ایک فوٹو اسٹیٹ مشین سے کچھ نہیں ہوتا۔ وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا۔ جو لوگ جاسوسی کے اس ایکٹ میں شامل تھے وہ تو سب اپنے انجام کو پہنچے۔

"چلو اس پریس کا راستہ بتاؤ جہاں تمھارا لٹریچر چھاپا جاتا ہے۔" میں نے کہا۔

میں اُس کی ہدایات کے مطابق چلتا گیا۔ آدھے گھنٹے بعد مجھے احساس ہوا کہ وہ ہماری صحیح راہنمائی نہیں کر رہا ہے اور یہ شک مجھے ایک چوک سے دوسری بار گزرنے کے بعد ہوا۔ میری جگہ اکرام شیخ ہوتا تو بہت پہلے تاڑ جاتا مگر وہ پیچھے مطیع الرحمٰن کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور میں ابھی کراچی کی سڑکوں سے اتنا زیادہ آشنا نہیں ہوا تھا۔

میں نے ٹیکسی روک کے شیخ کو آگے بُلا لیا۔ "گاڑی تم چلاؤ، یہ سؤر کا بچہ چکر دے رہا ہے۔"

"اچھا، میں نے غور نہیں کیا ورنہ اسے جلیبی کی طرح سیدھا کر دیتا۔" شیخ نے میری جگہ بیٹھتے ہوئے کہا۔ "ہاں بھئی، یہاں سے مجھے سمجھا دو کہ کدھر جانا ہے؟" وہ مطیع الرحمٰن سے مخاطب ہوا۔

"گاڑی میں پیٹرول بھی ختم ہونے والا ہے۔" میں نے کہا۔

"راستے میں لے لیں گے۔" شیخ نے کہا۔ "بول بھئی مسٹر مطیع و فرماں بردار۔"

اُس نے کہا۔ "میں کچھ بھول گیا۔"

"ٹھیک ہے۔ تمھاری یادداشت ہم فلمی فارمولے کے مطابق بحال کریں گے۔ ایک صدمے سے گئی، دوسرے صدمے سے واپس آ گئی۔ چلو بھئی واپس چلیں۔ اس کی فیملی کو بھی ساتھ ہی لے لیں۔"

"مسٹر چکرم، تم یہ مت سمجھو کہ اب وہ ہماری دسترس میں نہیں رہے۔" محسن نے کہا۔ "ہمارے پاس تمھارے ساتھیوں کے تین پتے اور بھی ہیں۔ ہم نے اُن کی فیملی کو معاف کر دیا تھا کیونکہ اُن سے ہمیں کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ تمھارے بیوی بچے کل ہمیں انھی کے گھر میں ملیں گے یا اُن کے ذریعے معلوم ضرور ہو جائے گا کہ وہ کہاں گئے۔ پھر تم وہی دیکھو گے جو آج... تم نے نہیں دیکھا اور تمھارا کیا ہے، اُن عورتوں کا کیا حال ہوگا جب..."

"چلو... میں بتاتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ اس کے بعد تم مجھے بھی مار ڈالو گے۔ میں اپنے بیوی بچوں کو تمھاری سفاکی سے بچانے کے لیے غداری کے الزام کا بوجھ اپنے ضمیر پر اپنے ساتھ لے جاؤں گا مگر کیا تم کسی طرح مجھے یقین دلا سکتے ہو کہ... انھیں کچھ نہیں ہوگا۔"

"تم کو کس طرح یقین آ سکتا ہے؟" محسن بولا۔

"میں خدا کی اور اس کے رسولؐ کی قسم کھا سکتا ہوں اور اس کے بعد اپنے ضمیر کی قسم کو سب سے بڑی قسم سمجھتا ہوں۔" میں نے کہا۔

اب اُس نے شیخ کو پتا سمجھایا۔ شیخ کچھ دیر سر ہلاتا رہا اور پھر ٹیکسی کو واپس موڑ لیا۔ رات کے ساڑھے تین بجے ہر سڑک سنسان تھی لیکن کہیں کہیں ریسٹورنٹ اب بھی کھلے ہوئے تھے۔ ہم ٹیلی ویژن اسٹیشن کے سامنے سے گزرے اور ایک پیٹرول پمپ پر ذرا سی دیر کے لیے رُکے۔ محسن نے بنگالی کے منہ کو دبا کے رکھنا ضروری نہیں سمجھا تھا اور یہ ایک ایسی غلطی تھی جس نے ہمارے لیے پریشانی پیدا کی۔ وہ اچانک چلانے لگا۔ "مرڈر... مرڈر... بچاؤ۔"

پیٹرول پمپ کا ملازم جو ہوز پائپ کو واپس پمپ پر لگا رہا تھا، ایک دم چونکا۔ پیٹرول پمپ پر اونگھنے والے دونوں پولیس مین ہڑبڑا کے اُٹھے تو ان میں سے ایک کی رائفل گر گئی۔ میں نے فوراً صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ کر لیا۔ پیٹرول پمپ کے ساتھ ہی نیو ٹاؤن کا پولیس اسٹیشن تھا۔ میں نے حسبِ عادت ٹیکسی کا انجن بھی بند کر دیا تھا اور اپنے موزے میں سے پیسے نکال رہا تھا، جب ایک پولیس مین "خبردار... خبردار!" کرتا ہوا میری طرف لپکا۔ اب میرے سامنے ایک راستہ تو یہ تھا کہ میں انجن اسٹارٹ کروں اور فرار ہو جاؤں، لیکن اس میں خطرات زیادہ تھے۔ وہ پیچھے سے فائر کر سکتے تھے۔ اُن کی از کار رفتہ اور دقیانوسی رائفلوں کو ڈاکو عموماً خاطر میں نہیں لاتے۔ پچاس فی صد امکانات بھی یہی ہوتے ہیں کہ گولی نہیں نکلے گی۔ پھر اونگھتے ہوئے محافظوں کا نشانہ خطا ہونے کے امکانات بھی ففٹی ففٹی تھے۔ پھر بھی رسک اپنی جگہ تھا چنانچہ میں نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔

میں اطمینان سے باہر نکلا اور ہاتھ اُٹھا کے کھڑا ہو گیا۔

"کیا بات ہے سنتری صاحب؟ ہم کوئی بھاگے جا رہے ہیں؟"

"یہ کون ہے؟ کون چلا رہا ہے؟"

"چھوٹا بھائی ہے ہمارا۔ دماغی مریض ہے۔" میں نے کہا۔ "علاج سب کرا چکے۔ اب گدو بندر لیے جا رہے ہیں۔"

میں تھوڑا تھوڑا دور ہٹتا گیا اور وہ میرے ساتھ اتنے فاصلے پر آ گئے کہ ان کے لیے سودا کرنا آسان ہو گیا۔ وہ ہر بات سمجھ لیتے ہیں اور مان لیتے ہیں بشرطیکہ سمجھانے والا سمجھ دار ہو۔ اندھیرے کی اوٹ میں رہ کے میں نے سو کا ایک نوٹ انھیں پیش کیا۔

"بدمعاش! گدو بندر رات کو جا رہے تھے۔" اُن میں سے ایک نے کہا۔

"کیا کریں جی۔ دنیا سے بھی تو چھپانا پڑتا ہے مگر اب آپ سے کیا پردہ۔" میں نے کہا۔

"اچھا، اچھا جاؤ۔" اُن میں سے ایک نے نوٹ کو بڑی صفائی سے ٹوپی کے نیچے رکھ لیا۔ شیخ نے اتنی دیر میں ٹیکسی بڑھا دی تھی۔ میں پھر اس میں بیٹھا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ ایک بہت بڑی مصیبت سو روپے میں ٹل گئی۔ محسن نے اتنی دیر میں مطیع الرحمٰن کے منہ میں وہ میلا کپڑا ٹھونس دیا تھا جو ٹیکسی کو صاف کرنے کے لیے سیٹ کے نیچے چھپا ہوا تھا۔ یہ کپڑا اُسے شیخ نے فراہم کیا تھا۔ پیٹرول پمپ کا ملازم معاملات کو قانون کے دائرۂ اختیار میں دیکھ کے دُور چلا گیا تھا تاکہ اس پر قانونِ شہادت کا اطلاق بھی نہ ہو۔

جب ہم نیشنل اسٹیڈیم کے پاس سے سیدھے گزر گئے تو محسن نے مطیع الرحمٰن کو پھر قوتِ گویائی دی۔

"اب بول..." محسن نے اس کے سر اور منہ پر ٹکّے مارتے ہوئے کہا۔ "تیرا مرڈر کر دوں... اسی جگہ۔"

"اچھا خیال ہے۔" میں نے تائید کی۔ "پتا سمجھ لیا ہے نا تو نے؟ ہم اس کے بغیر بھی پہنچ سکتے ہیں۔"

شیخ نے اقرار میں سر ہلایا۔ "بس پہنچ گئے سمجھو۔" اُس نے ٹیکسی کو اندھیرے جنگل جیسے علاقے میں اچانک دائیں طرف موڑ لیا۔ ہیڈ لائٹس میں ایک خستہ حال پتلی سی سڑک دکھائی دے رہی تھی جس پر شاید اب ٹریفک دن کے وقت بھی نہ چلتی ہو۔ ایک میل کے بعد وہ سڑک گھوم کے ایک شکستہ چار دیواری پر ختم ہو گئی۔ شیخ نے ٹیکسی روک دی اور لائٹس بجھا دیں۔

میں ایک طرف سے باہر نکلا اور محسن دوسری طرف سے، پھر مطیع الرحمٰن باہر آیا۔ ایک فوری خیال کے تحت جس کو میں اپنی چھٹی حس کا معجزہ بھی قرار دے سکتا تھا، میں نے پلٹ کے اُس کو دبوچ لیا عین اُس وقت جب وہ چیخنے والا تھا۔ اُس کی آواز میرے ہاتھ کے دباؤ سے گھُٹ کے رہ گئی۔

معلوم نہیں وہ گولی کس سمت سے آئی تھی اور کس نے چلائی تھی لیکن میں مستعد نہ ہوتا تو مطیع الرحمان مارا جاتا۔ گولی اُس کی ٹانگ میں لگی۔ محسن یا اکرام شیخ میں سے کسی نے جوابی فائر کیا اور اس کے ساتھ ہی تین طرف سے گولیوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ آخرِ شب کے سکوت میں گونجنے والی گولیوں کی آوازیں کسی محاذِ جنگ کا نقشہ پیش کرتی تھیں۔ اندھیرے میں ہمارے حریف کوئی نشانہ لیے بغیر فائرنگ کر رہے تھے جس سے ان کی بدحواسی کا اندازہ ہوتا تھا۔

اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ غافل نہیں تھے اور انھیں ہمارے آنے کا پتا چل گیا تھا۔ مطیع الرحمان اب بے ہوش ہو گیا تھا اور مجھے اس کی جان بچتی نظر نہ آتی تھی۔ وہ پہلے ہی نیم جان تھا اور گولی لگنے کے بعد اس کے زخم سے مسلسل خون بہہ رہا تھا مگر اسے روکنے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔

مزاحمت کرنے والوں کی قوت کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ ابھی تک انھوں نے صرف ریوالور سے گولیاں چلائی تھیں مگر ان کے پاس مشین گن یا دستی بم بھی ہو سکتے تھے جب کہ ہمارے پاس بہت محدود اسلحہ تھا۔ ہم تینوں کے ریوالور اندھا دھند فائرنگ میں بہت جلد خالی ہو سکتے تھے۔

میں نے اشارے سے محسن کو قریب بُلا کے اپنا پلان سمجھایا۔ اس نے ایک درخت کی اوٹ سے مُنہ کے سامنے ہاتھ رکھ کے اعلان شروع کیا۔

"میں تم کو دس منٹ دیتا ہوں۔ مقابلہ بند کر دو اور خود کو ہمارے حوالے کر دو۔ تم کو پولیس نے چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیا ہے۔ تمھارا سرغنہ مطیع الرحمان ہمارے قبضے میں ہے۔ اس کے باقی ساتھی جیکب لائن سے گرفتار کیے جا چکے ہیں۔ وہ سارا لٹریچر پکڑا جا چکا ہے جو تمھارے ساتھی تقسیم کرتے تھے۔ ہمیں انھوں نے سب کچھ بتا دیا ہے۔ تم لوگ مقابلہ کرو گے تو مارے جاؤ گے۔"

محسن آواز کو بہت بھاری بھرکم اور پاٹ دار بنا کے بول رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اعلان کا ایک ایک لفظ غور سے سنیں گے۔ عام طور پر پولیس محاصرہ کرنے کے بعد محصور مجرموں کو اسی قسم کی وارننگ دیتی ہے۔ اگر وہ لوگ تیاری سے جائیں تو ایسے

اعلانات میگا فون پر نشر کرتے ہیں مگر عام حالات میں کوئی ذمے دار افسر خود ہی میگا فون بن جاتا ہے۔

مجھے اور اکرام شیخ کو پیچھے پہنچ کر پوزیشن سنبھالنے کے لیے اتنی مہلت کافی تھی۔ محسن کی آواز ہم تک بھی بالکل صاف پہنچ رہی تھی۔ مجرم جو درمیان میں تھے اُسے زیادہ واضح طور پر سن رہے ہوں گے۔ میرے اور اکرام شیخ کے درمیان تیس گز کا فاصلہ ضرور ہوگا۔ اس طرح اب ہم تینوں ایک ایسی مثلث کے تین کونوں پر بیٹھے ہوئے تھے جس کے تینوں اضلاع تقریباً برابر تھے اور ہم اپنے دائیں بائیں اتنی دور تک دیکھ سکتے تھے کہ چاروں طرف سے کوئی بھی اس حصار کو توڑ کے نہیں نکل سکتا تھا۔

چند منٹ کے وقفے سے محسن نے اپنا اعلان دہرایا اور اس بار زیادہ تفصیل کے ساتھ۔ اس نے مطیع الرحمان کے ساتھیوں کے نام اور پتے ٹھکانے بھی بتائے۔ یہ بھی بتایا کہ ان دونوں بھائیوں نے وعدہ معاف گواہ بننا قبول کر لیا ہے۔ جن میں سے ایک سرکاری دستاویزات کی فوٹو اسٹیٹ نقلیں بناتا تھا اور دوسرا پان کی دکان چلاتا تھا۔ جہاں سے ایک انگریز ہپی کو بھی رنگے ہاتھوں پکڑ لیا گیا ہے۔

اس دوسرے اعلان نے محصور مجرموں کا رہا سہا حوصلہ بھی ختم کر دیا ہوگا کہ انھوں نے عقبی راستے سے نکل کر رات کے اندھیرے اور جنگل میں گم ہو جانے کی کوشش کی۔ میں نے بیک وقت چار افراد کو دبے پاؤں اپنے اور شیخ کے درمیان سے گزر کے فرار ہوتے دیکھا۔

میں نے نشانہ لے کر دو فائر کیے اور آگے دوڑنے والے دونوں مُجرم ایک چیخ مار کے زمین پر تڑپنے لگے۔ باقی دو رک گئے اور انھوں نے رضاکارانہ طور پر ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔

"خبردار! جو کسی نے ہلنے کی ذرا بھی کوشش کی۔" میں نے گرج کے کہا۔

شیخ میری نظر سے اوجھل تھا۔ جب اس کی طرف سے ایک فائر ہوا اور گولی کا نشانہ بننے والے کی بھیانک ہائے سنائی دی تو میں سمجھ گیا کہ فرار ہونے والے دو گروہوں میں بٹ کے دو مختلف سمتوں سے نکلنا چاہتے تھے۔

"ہاتھ اوپر...!" اکرام شیخ نے دہاڑ کر گالی دی "ہاتھ نیچے آیا تو اگلا سانس نہیں آئے گا۔"

دس منٹ کا وقفہ پورا ہونے سے پہلے ہی ہم ان سب کو ایک جگہ اکٹھا کر چکے تھے۔ وہ کُل پانچ آدمی تھے جو ہاتھ سر پر رکھے تھر تھر کانپ رہے تھے۔ ارتکاب جرم کے وقت ہر مجرم بڑی بے خوفی کا اور حاضر دماغی کا مظاہرہ کرتا ہے اور اُمید کتنی ہی مُبہم کیوں نہ ہو، اُسے رواں دواں رکھتی ہے مگر جیسے ہی وہ پکڑا جاتا ہے سزا کا خوف اس کے اعصاب پر سوار ہو جاتا ہے۔

یہ پانچوں اب مقابلے سے بھی دستبردار ہو چکے تھے۔ خود کو ہمارے رحم و کرم پر چھوڑ چکے تھے۔ میں نے ان کے پیچھے رہتے ہوئے انھیں آگے بڑھنے کو کہا۔ دائیں جانب سے محسن نے اور بائیں جانب سے شیخ بے حد قاتلانہ انداز میں انھیں گن کی زد پر لیے رہا۔

وہ مذبح خانے کی جانب ہانکے جانے والے بکروں کی طرح ممیاتے ہوئے آگے پیچھے چلنے لگے اور ہمیں اس دروازے تک لے گئے جہاں سے ایک زینہ نیچے جا رہا تھا۔ زینے پر فوٹو گرافر کے ڈارک روم کا سماں تھا۔ مکمل اندھیرے میں زیرو واٹ کے گہرے سرخ رنگ کے بلب کی روشنی پھیلی ہوئی تھی جس میں زینے کی سیڑھیاں زیادہ پُراسرار نظر آتی تھیں۔

زینے کے آخر میں پھر ایک دروازہ تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ سب عارضی انتظام تھا جو ضرورت کے تحت جلدی میں کیا گیا تھا۔ چنانچہ اسٹرکچر کی فنشنگ پر وقت اور سرمایہ ضائع نہیں کیا گیا تھا۔ اس جگہ تہ خانے کی موجودگی کا کوئی جواز نہ تھا۔ اگر یہ مکمل ہوتا یا قدیم عمارت ہوتی تو اس کے تہ خانے کو بھی پلاستر اور رنگ سے مزّین کیا جاتا اور بجلی کی تاریں بھی ایسے لٹکی ہوئی نہ چھوڑی جاتیں۔

نیچے والا دروازہ کھلتے ہی میں نے اپنے سامنے ایک بڑا ہال دیکھا۔ اس کے ایک حصّے میں پرنٹنگ پریس تھا۔ دیوار کے ساتھ ساتھ شیلف، مطبوعہ مواد اور طباعت میں کام آنے والے کاغذ بھرے پڑے تھے۔ وہیں دوسری طرف کمپوزیشن سیکشن تھا۔ یہ لوگ اپنا سارا لٹریچر انگلش میں چھاپتے تھے۔ ہال کا ایک حصہ کٹنگ اور بائینڈنگ کے کاموں کے لیے مختص تھا۔ ایک الگ حصہ فلمیں بنانے اور پروسیس کرنے کا تھا۔ جتنی دیر میں اکرام شیخ اور محسن نے مجرموں کی تلاشی لی اور ان کے ہاتھ باندھے، اتنی دیر میں میں نے اس پورے اشاعتی ادارے کا جائزہ لے لیا۔ کہتے ہیں کہ آدھی فتح پروپیگنڈے سے حاصل کی جاتی ہے۔ اسلحہ صرف محاذِ جنگ پر کام آتا ہے۔ سیاسی محاذ پر رائے عامّہ کی حمایت حاصل کرنے اور بین الاقوامی سطح پر دنیا کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے تحریر و تقریر کا ذریعہ بھی مؤثر ثابت ہوتا ہے۔

مشرقی پاکستان میں علیٰحدگی پسندی کے رجحان کو ہوا دینے والوں کے بھی دو محاذ تھے۔ ایک محاذ پر دلاور اینڈ کمپنی ان کی مددگار تھی اور وہ ملکی دفاع کو کمزور کر رہے تھے۔ دوسرا محاذ یہ تھا جس میں یہ نام نہاد دانشور پیش پیش تھے جو اس تخریب کاری کو احساسِ محرومی کا ردِ عمل، بنگلہ دیش کی تحریک کو آزادی کی جدوجہد اور غدّاروں کو مجاہد قرار دے رہے تھے۔ جو استحصال کا نعرہ لگا کے مظلومیت کا ڈھنڈورا پیٹ کے اور جھوٹے اعداد و شمار پیش کر کے عوام کو اور عالمی برادری کو گمراہ کرنے میں اپنی تمام تر ذہنی استعداد صرف کر رہے تھے۔

میں نے تمام نئے مطبوعہ کتابچے دیکھے۔ زیرِ تصنیف کتابوں کے مسودے دیکھے اور وہ سب اخبار و رسائل دیکھے جن میں یہ مواد شائع ہو چکا تھا۔ میں یہ دیکھ کر خوفزدہ ہو گیا کہ علیٰحدگی پسندی کی اس تحریک کے پیچھے کتنے قابلِ رشک دماغ کام کر رہے ہیں۔ یہ دماغ اگر قومی یک جہتی کو فروغ دیتے تو حالات مختلف ہوتے مگر ان کی صلاحیت کو خرید لیا گیا تھا۔ یہ بین الاقوامی سیاست کا کرشمہ تھا کہ ایک قوم کا شعور اچانک تاریخ اور حقائق سے منکر ہو گیا تھا۔ فکر اور سوچ کو بدل دینے والی یہ جنگ اسلحے کی اور طاقت کی جنگ سے کہیں زیادہ ضرر رساں اور خطرناک تھی۔ ایک گولی اگر ایک دشمن کو فنا کرتی ہے تو ایک سچ نظر آنے والے جھوٹ پر مبنی پوسٹر دس ذہنوں کو مسموم کرتا ہے اور انھیں صفِ دشمناں میں شامل کر دیتا ہے۔ بم اگر ایک گھر تباہ کرتا ہے تو مؤثر انداز میں لکھے جانے والے ایک پمفلٹ سے ایک آبادی میں نفرت پھیلتی ہے۔

پکڑے جانے والے سب غدّار مشرقی پاکستان کے رہنے والے نہیں تھے۔ ان میں دو مغربی پاکستان کے رہنے والے بھی تھے۔

ان میں ایک سرخ و سپید چہرے والا جوان آدمی بھی تھا جس نے سنہرے فریم والی عینک لگا رکھی تھی۔

"اس نے کہا۔" تم سکندر بخت ہو نا؟ خدائی فوجدار۔"

میں نے کہا: "مجھے خوشی ہے کہ اس نام کی دہشت تم جیسے ہر غدّار پر قائم ہے۔ تم صورت سے تعلیم یافتہ اور آسودہ حال لگتے ہو۔ تم کس مجبوری کے تحت ان وطن دشمن عناصر کے ساتھ مل گئے۔ صرف پیسے کی خاطر؟ یہ تو مشکل ہے کہ تم نظریاتی طور پر ان کے ساتھ اتفاق کرتے ہو۔"

"نظریات کچھ نہیں ہوتے۔ کتابی باتیں اور اصول۔ سب آدمی کو خوار کرتے ہیں۔" وہ تلخی سے بولا۔ "زندگی کو صرف پیسہ آسان بناتا ہے۔"

"تمھارے لیے پیسے نے ہی یہ مشکل بھی پیدا کی ہے کہ آج میں تم کو عام نچلی سطح کے لوگوں اور غدّاروں کی صف میں دیکھ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

وہ تلخی سے مسکرایا۔ "جب میں مُحبِّ وطن اور اصول پرست بنا تھا تب بھی یہی ہوا تھا۔ جو سلوک تم آج میرے ساتھ کرو گے، وہی پہلے بھی ہوا تھا۔ اگر مجھے حُبّ الوطنی کی سند مل جاتی تو میں اسے بھی کافی سمجھتا اور مطمئن ہو جاتا لیکن مجھے اس کا بہت نقصان ہوا تھا۔ آج میں اکیلا ہی نہیں، میرے جیسے ان گنت تعلیم یافتہ اور باضمیر لوگ ایسے ہیں جو تمام اقدار سے منحرف ہو چکے ہیں۔ وہ جمہوری حقوق، نظامِ انصاف، چارٹر آف ہیومن رائٹس، آئین، جواں مرداں حق گوئی و بے باکی اور اقبالؒ کے فلسفۂ خودی سے لے کر قائدِ اعظم کے فرمودات تک سب کو منسوخ شدہ نوٹ کی طرح بے کار اور بے مصرف سمجھتے ہیں۔ سکۂ رائج الوقت کچھ اور ہے جس نے مجھے خرید لیا۔ میری ساری عمر کے فلسفے کو اور میرے نظریات کو خرید لیا۔ اب تم مجھے جو سزا چاہے دو۔ مجھے مرنے کا بھی افسوس نہیں ہوگا کیونکہ میرے بعد میرے اہلِ خانہ کے لیے زندہ رہنے کے وسائل بہت ہیں۔"

مجھے اس شخص کی ذہنی شکست اور بغاوت پر افسوس ہوا۔ معلوم نہیں کس حادثے نے اس کی سوچ کی راہیں بدل دی تھیں۔

"تمھارے ساتھ جو کچھ ہوا، کیا اس کے ذمّے دار عوام تھے، یہ ملک تھا؟" میں نے کہا۔

"عوام!" وہ زہر بھرے لہجے میں بولا۔ "کہاں ہیں وہ عوام، جن کو تم اس ملک کا شہری کہتے ہو اور وہ ملک کہاں ہے جس کا ذکر آئین میں تھا۔ قراردادِ مقاصد میں تھا۔ جو قائدِ اعظمؒ نے بنایا تھا اور علامہ اقبالؒ کے خواب کی تعبیر تھا۔"

"مجھے حیرت ہے کہ تم سا باشعور آدمی...!"

"رہنے دو یہ طفل تسلیاں۔ مجھے بہت ملال ہے اپنے باشعور ہونے کا۔ کاش میں بے شعور ہوتا۔ پھر یہ طعنہ تو نہ سنتا اور میرا شعور میرے لیے بارِ ندامت تو نہ ہوتا۔" وہ نفرت سے بولا۔ "تم نے کچھ نہیں دیکھا مسٹر سکندر بخت۔ تم نے تو قانون اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے نا۔"

محسن اور شیخ بھی سب سن رہے تھے۔ ان کی طرح میں بھی سچ کا یہ زہر پینے پر مجبور تھا۔ بے شک، حالات کچھ لوگوں کو مجرم بنا دیتے ہیں۔ سب سقراط نہیں ہوتے کہ خوشی خوشی زہر کا پیالہ پی لیں۔ رشتوں کی جذباتی زنجیر میں جکڑا ہوا آدمی تو بہت کمزور ہو جاتا ہے۔ یہ پروفیسر قابلِ رحم ضرور تھا۔ اس کے جرم کی سنگینی ان حالات کے تناظر میں کم ضرور ہو جاتی تھی ختم نہیں ہوتی تھی۔

"مجھے افسوس ہے پروفیسر صاحب! کہ تم ہار گئے۔ تم نے اپنی اخلاقی شکست تسلیم کر لی۔" میں نے کہا۔ "عوامل کچھ بھی ہوں، تم خود فیصلہ کرو کہ تم مجرم آج ہو یا پہلے تھے؟ وقت کو، مورّخ کو اور نظامِ انصاف کو چھوڑو۔ اپنے ضمیر سے پوچھ کے مجھے بتاؤ۔"

"میرا کوئی ضمیر نہیں۔ اسے میں بہت پہلے قتل کر کے اس کی لاش بھی بیچ چکا ہوں۔" وہ بولا۔ "اور فیصلے تو ہمیشہ فاتح کرتے ہیں۔ افراد کے، اقوام کے اور تاریخ کے فیصلے انھی کے ہاتھ میں رہتے ہیں۔"

"دوسروں کو الزام مت دو۔" میں نے کہا۔ "آج کے دن

کا فیصلہ خود تم نے اس وقت تحریر کر لیا تھا جب تم نے اپنی شکست قبول کی تھی۔ پھر بھی جیسے عدالت کسی مجرم کو سزا دیتے ہوئے حالات سے صرفِ نظر نہیں کرتی ایسے ہی میں بھی تمھیں فوراً سزائے موت نہیں دے رہا ہوں۔ تمھارے کیس پر ہم سب غور کریں گے۔ تم ادھر آجاؤ۔"

پروفیسر نے کسی خاص خوشی کا اظہار نہیں کیا۔ وہ اپنی جگہ سے تھوڑا سا ہٹ کے کھڑا ہو گیا۔ اس کے باقی چاروں ساتھی اسے کینہ پرور اور حاسد نظروں سے گھور رہے تھے۔ مغربی پاکستان کا دوسرا باسی البتہ کچھ پُر اُمید نظر آنے لگا تھا۔

"عرض یہ ہے۔" اس نے بڑی لجاجت سے کہنا شروع کیا۔ "کہ عرض فدوی کی بھی سن لی جائے۔"

"یہ سالا فدوی کون ہے؟" میں نے کہا۔

"جی... وہ... میں...!" اس نے گڑبڑا کے کہا۔ "میں... کہنا یہ چاہتا تھا کہ آپ رحمدلی اور عفو و درگزر سے کام لیں۔ دراصل یہ حالات ہی ہوتے ہیں..."

وہ ایک چالاک آدمی تھا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ پروفیسر نے کس طرح اپنے حالات کا جواز پیدا کر کے ہم سے رعایت حاصل کر لی تھی اور شاید اتنی دیر تک وہ بھی اپنے لیے مناسب حالات گھڑنے میں مصروف رہا تھا۔ اس نے خاصے رقت انگیز پیرائے میں ایک دردبھری کہانی سنائی جس کا مرکزی خیال کسی حد تک پروفیسر کی سرگزشت سے ملتا جلتا تھا۔ بس اس نے اپنا پیشہ بدل دیا۔

اس نے کہا۔ "جناب! میں پولیس افسر تھا۔ میرا قصور یہ تھا جناب کہ میں رشوت نہیں لیتا تھا اور دوسروں کو بھی حرام کھانے سے روکتا تھا کیونکہ جناب آخر ہم مسلمان ہیں اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کو منہ بھی دکھانا ہے مگر جناب زمانہ ایسا ہے کہ نیکی کرنے والا ہی بُرا بن جاتا ہے۔ چنانچہ مجھے ہی بدخواہوں نے مجرم بنا دیا۔ میرے خلاف پورا محکمہ ہو گیا جناب مگر ہر درخواست انھوں نے پبلک سے دلوائی کہ یہ شخص رشوت خور ہے۔ میں اور رشوت! نعوذ باللہ! لیکن اس دھاندلی کے دور میں شریف آدمی کی شنوائی کہاں ہوتی تھی جناب! مجھے تحقیقات کے بغیر ہی برطرف کر دیا گیا۔ میرا قصور یہ بھی تھا کہ میں نوکرشاہی کے ظالمانہ رویّے کی حمایت نہیں کرتا تھا۔ مجرموں کی پشت پناہی نہیں کرتا تھا اور بے گناہوں کو جیل میں نہیں ٹھونستا تھا۔ کئی بار میں نے سیاسی جلوسوں پر لاٹھی چارج کرنے سے انکار کیا۔ کیونکہ جناب! عوام کی آواز کو طاقت سے نہیں دبایا جا سکتا اور جو کام پیار محبت کے سلوک سے ہو جائے، اس میں تشدد سے کام لینا کوئی اچھی بات تو نہیں جناب!"

"بالکل بالکل جناب۔" میں نے سر ہلا کے کہا۔ "تم یہ کہتے ہو گے کہ جب کوئی چور پکڑا جاتا ہو گا تو تھانے میں اس کی خاطر تواضع چائے اور کیک سے کرنے کے بعد پوچھتے ہو گے کہ بیٹا! سچ سچ بتا دو کہ تم نے چوری کی ہے؟ اور جب وہ آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہوئے سچ بول دیتا ہو گا کہ میں نے فلاں فلاں واردات کی تھی تو آپ پیار سے اس کے چپت لگا کے کہتے ہوں گے جناب کہ چلو بھاگو۔ آئندہ مت کرنا ایسی حرکت۔ چوری کرنا بُری بات ہے۔"

"اور جناب! کوئی قتل کا مجرم لایا جاتا ہو گا۔" محسن نے میری بات آگے بڑھائی۔ "تو آپ اسے لنچ میں چکن بریانی اور قورمہ کھلانے کے بعد اس کی پیٹھ پر تھپکی دیتے ہوئے کہتے ہوں گے کہ چلو اب مجھے بتا دو کہ تم نے اپنی بیوی کو کیوں قتل کیا اور کیسے کیا۔ اور جناب جب وہ اعترافِ جرم کر لیتا ہو گا تو آپ اسے بھی نصیحت کر کے رخصت کر دیتے ہوں گے کہ پھر مت کرنا ایسی حرکت۔ جاؤ دوسری شادی کی تیاری کرو!"

وہ محسن کی طرف ہکا بکا کھڑا دیکھ رہا تھا اور سمجھ چکا تھا کہ اس کا جھوٹ نہیں چلا۔ میں نے اسے اچانک آڑے ہاتھوں لے لیا۔ میں نے اسے بڑی بے رحمی سے مارا۔ مکّے مار مار کے میں نے اس کا چہرہ بگاڑ دیا۔ اس کے کئی دانت ٹوٹ گئے اور ناک سے خون بہنے لگا۔ وہ بہت چلّایا کہ جناب مجھے معاف کر دیں۔ مگر میں نے اسے اٹھا اٹھا کے دیوار پر مارا۔ فرش پر پٹخا اور اس کو ٹھوکریں مار مار کے اس کی ہڈی پسلی ایک کر دی۔ اس کا چیخنا چلّانا، بلبلانا، منّت سماجت کرنا اور گالی گلوچ کرنا سب رائیگاں گیا۔ چند منٹ میں وہ آدمی کی جگہ ایک ٹوٹا پھوٹا، خستہ حال اور لہو آلود نیم جاں لاشہ رہ گیا۔

پروفیسر نے میرے ردِعمل کو خاصی حیرانی اور ناپسندیدگی سے دیکھا لیکن وہ خاموش کھڑا رہا۔ تینوں بنگالیوں کی حالت اتنی ابتر ہو گئی کہ ان میں سے ایک تو بیٹھ گیا۔ وہ لرز رہا تھا اور اپنے انجام سے اتنا خائف تھا کہ اس کے اعصاب جواب دے گئے تھے۔ اس نے اپنے کپڑے ہی خراب نہیں کیے تھے، فرش پر بھی غلاظت پھیلا دی تھی۔

میں نے محسن سے کہا۔ "جناب کو باہر لے جاؤ۔ دیکھو، مطیع الرحمان زندہ ہے یا مر گیا۔ زندہ ہو تو جناب کے کندھوں پر اٹھا لاؤ۔"

محسن نے جناب کو ایک جھٹکے سے پیروں پر کھڑا کر دیا اور گھسیٹتا ہوا باہر لے گیا۔

میں نے باقی تین بنگالیوں میں سے پہلے کو مخاطب کر کے کہا۔ "تم میں سے جو زیادہ تعاون کرے گا، وہ رعایت کا مستحق ہو گا۔ پروفیسر نے سچ بولا تھا، اسے رعایت مل گئی لیکن دوسرا شخص جھوٹ بول کر ہمیں بے وقوف بنانا چاہتا تھا۔ اسے ہم یہیں دفن کر جائیں گے۔ سچ بولنے والے کے لیے ففٹی ففٹی چانس ہے کہ اسے نکل جانے کا ایک موقع عطا کر دیا جائے۔"

"ہم... ہم بتائے گا... جو ہم جانتا ہے۔" وہ بولا۔ اس کے ساتھی نے بنگالی میں بولنا شروع کیا۔ اس کے لہجے سے صاف پتا چلتا تھا کہ وہ اپنے ساتھی کو اس کی بزدلی پر اور خودغرضی پر شرمندہ کر رہا ہے۔ ایک غدار کا ایمان کچھ نہیں ہوتا۔ وہ لالچ میں وطن کا غدار بن سکتا ہے تو خوف کے تحت اپنے ساتھیوں سے بھی غداری کر سکتا ہے۔ وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے۔ یہ اس کا مسلک نہیں ہوتا۔

جب محسن اندر آیا تو جناب نے مطیع الرحمان کو کندھے پر ڈال رکھا تھا۔ مگر اس بوجھ کے ساتھ چلنا بھی جناب کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ وہ مطیع الرحمان کے ساتھ ہی فرش پر گرا مگر پھر اُٹھ کے دور جا بیٹھا۔ میں نے کوئی سوال کیے بغیر مطیع الرحمان کے سر کا نشانہ لیا اور گولی چلا دی۔ وہ بے ہوشی میں ہی تڑپا اور ساکت ہو گیا۔ دراصل مجھے صاف نظر آ رہا تھا کہ مطیع الرحمان اب تھوڑی دیر کا مہمان ہے۔ میں نے اسے مار کے ایک نفسیاتی فائدہ حاصل کیا۔ اس کے دماغ سے اُڑنے والے خون اور مغز کے چھینٹے جناب پر پڑے اور وہ دہشت سے پاگل ہو کے بھاگا۔ میں نے اس کا بھی نشانہ لیا اور اگلے لمحے وہ دیوار سے ٹکرا کے گرا اور فرش پر ایڑیاں رگڑنے لگا۔ یہ دونوں قتل میں نے بڑے سکون سے کیے تھے، کسی تیاری اور تذبذب کے بغیر۔

آپس میں جھگڑنے والے بنگالی سہم کر خاموش ہو گئے تھے۔ پروفیسر کی نظروں میں خوف سے زیادہ نفرت کے جذبات نمایاں تھے۔

"ہاں۔ تو تم کیا جانتے ہو؟" میں نے بنگالی سے مخاطب ہو کے کہا۔

اس نے بہت مفید معلومات فراہم کرنے کے علاوہ ہماری راہنمائی بھی کی۔ مثلاً اس نے تہ خانے میں ایک خفیہ راستہ دکھایا جس کا ہم سراغ نہیں لگا سکتے تھے۔ اس میں ایک ہائی پاور ٹرانسمیٹر نصب تھا۔ اسی کے اندر دیوار میں نصب الماری کرنسی نوٹوں سے بھری ہوئی ملی۔ اس بنگالی نے ہی ہمیں نمبروں والے تالے کو کھولنے کا طریقہ بتایا۔ الماری میں پاکستانی اور انڈین کرنسی کے ساتھ ڈالر بھی ملے اور یہ رقم ان سب کو ادائیگی کے لیے مخصوص تھی جو نظریاتی محاذ پر اس علیحدگی پسندی کی تحریک میں شامل تھے۔ ڈالر تو خیر عالمی کرنسی تھی، پاکستان کے دونوں حصّوں میں ہر قسم کی وطن دشمن سرگرمیوں میں ملوث افراد کو پاکستانی کرنسی میں ادائیگی ہوتی تھی۔ انڈین کرنسی کی ہر جگہ موجودگی یہ ثابت کرتی تھی کہ مغربی بنگال کا ہندو علیحدگی پسندی کے اس رجحان کی حوصلہ افزائی میں کس حد تک پیش پیش ہے۔ مجھے چالیس چیک ایسے ملے جو کلکتہ کے مختلف بینکوں کے تھے۔ پانچ ہزار سے پچاس ہزار تک کی مالیت کے یہ چیک دستخط شدہ تھے مگر ان پر تاریخ نہیں ڈالی گئی تھی۔ یہ سب بیئرر چیک تھے اور کسی کو بھی دیے جا سکتے تھے کہ وہ نقد رقم لیتے ہوئے ڈرتا ہو تو یہ کاغذ کا پرزہ لے کر کلکتہ چلا جائے اور کیش حاصل کر لے۔

مجھے ایک ڈائری بھی ملی جس کے سب اندراجات بنگالی زبان میں تھے۔ اس میں ناموں اور پتوں کی ایک طویل فہرست تھی۔ اس کے علاوہ ادائیگیوں کا حساب تھا۔ بنگالی نے بتایا کہ یہ ان لوگوں کے نام ہیں جو مغربی پاکستان، بھارت اور مشرقی پاکستان میں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ پناہ فراہم کر سکتے ہیں اور تحریک کے مقاصد کو آگے بڑھانے کے لیے کام کر رہے ہیں۔ ان سب ناموں اور پتوں کو اُردو یا انگریزی میں منتقل کرنا ایک لمبا کام تھا چنانچہ میں نے ڈائری کو بحفاظت اپنی جیب میں رکھ لیا۔

اب صبح قریب تھی۔ ہمارے لیے یہاں زیادہ وقت گزارنا ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ باہمی مشورے سے ہم نے ایک لائحہ عمل مرتّب کر لیا۔ تینوں بنگالیوں کے لیے سزائے موت پر ہم سب کا اتفاق تھا۔ اگر ہمارے پاس پرنٹنگ پریس اور خفیہ ٹھکانے کو تباہ کرنے کے لیے کچھ ہوتا تو ہم اسے ایک دھماکے سے اُڑا دیتے، سب دشمن جو اندر اور باہر تھے، ساتھ ہی فنا ہو جاتے۔

اکرام شیخ نے ایک زیادہ مؤثر اور مفید طریقہ بتایا۔ "کیوں نہ یہ مالِ غنیمت حکومت کی تحویل میں دے دیا جائے۔"

"وہ کیسے؟" محسن نے ایک احمقانہ سوال کیا۔

"بھئی! ایک فون کر کے شیروانی صاحب...!" میں نے کہا۔ "گمنام رہ کے ہم پہلے بھی نیک کام کرتے رہے ہیں اور فون کرنے کا آلہ ہمارے پاس ہے۔"

"فون نمبر کس کا ملائیں گے آپ؟" محسن نے کہا۔ "آئی جی صاحب کے گھر کا۔ وہ اس وقت خوابِ خرگوش کے مزے لے رہے ہوں گے۔"

"تو پکڑا جائے گا کسی دن۔" اکرام شیخ نے افسوس سے سر ہلا کے کہا۔ "آئی جی صاحب کو خرگوش کہتا ہے۔"

"کوتوالِ شہر پر الزام لگاتا ہے نابکار کہ وہ سو رہا ہے۔" میں نے کہا۔

"اتنے بڑے افسر کو کم سے کم اونٹ کے برابر تو سمجھنا ہی

چاہیے۔ آپ خوابِ شتر کہہ سکتے تھے۔" اکرام شیخ بولا: "یا گوش نکال دیتے۔ خوابِ خر کہہ دیتے۔ خاصا بڑا ہوتا ہے گدھا۔"

"کسی اور سے بڑا ہو نہ ہو۔ تم سے بڑا یقیناً ہوتا ہے۔" محسن چڑ کے بولا۔ "جو کرنا ہے کرو۔"

"چلو ڈرائیور ـ تم یہ ہاتھ کا میل سمیٹو۔ جس کا جوتا اسی کا سر۔" میں نے کہا: "انھی کے خلاف کام آئے گا جن کا پیسہ ہے۔"

مطیع الرحمان اور "جناب" کی لاشیں اپنی بے بسی کی زبان میں کہتی تھیں۔ سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ۔ جو ابھی زندہ تھے، وہ زندگی کی آخری سانسوں کا شمار کر رہے تھے۔ امید اور خوف کے درمیان عذاب کے پل صراط پر کھڑے لرزہ براندام تھے۔ اکرام شیخ نے ساری کرنسی اپنی ٹیکسی میں منتقل کی۔ اس کی مجموعی مالیت کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ لاکھوں روپے پاکستانی کرنسی میں تھے اور اتنے ہی انڈین کرنسی میں۔ ڈالر الگ تھے اور پاؤنڈ الگ۔

میں نے آخر میں تینوں بنگالیوں کو ایک ساتھ کھڑا کیا اور ان کی فردِ جرم انھیں پڑھ کے سنائی جس میں ان پر ملک اور قوم سے غداری۔ ملکی سالمیت کے خلاف سازش اور تخریب کاری جیسے سنگین الزامات شامل تھے۔

"تم کو اپنی صفائی میں کچھ کہنا ہے؟" میں نے کسی جج کی طرح سوال کیا۔

"یہ . . . تم کیا کر رہے ہو؟" پروفیسر نے پیش آنے والے واقعات کا اندازہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہم انصاف کر رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

"تم قتل کر رہے ہو انصاف کے نام پر۔ کس نے دیا ہے تم کو یہ عدالتی اختیار؟" پروفیسر نے کہا: "اگر تم اصول کی بات کرتے ہو اور اصول کی جنگ لڑ رہے ہو تو پھر یہ بے اصولی کیوں؟ ان کو قانون کے حوالے کرو۔ ثبوت شہادت سب موجود ہے۔"

میں نے اس کے منہ پر الٹے ہاتھ کا تھپڑ مارا۔ "ایسی احمقانہ، نظریاتی اور کتابی باتیں میرے سامنے مت کرو۔ مجھے معلوم ہے کہ تم جیسے لوگوں نے قانون کو کتنا کھوکھلا اور بے مصرف کر دیا ہے۔ پورا نظامِ انصاف ایک تماشا بن گیا ہے۔ انصاف کے نام پر ایک ڈراما جس میں فلمی فارمولے کے مطابق حق کی فتح اور باطل کی شکست نہیں ہوتی۔ اگر ایسا ہوتا تو شاید ہمیں کچھ بھی تو نہ کرنا پڑتا۔ وہ سب جو ہم کر رہے ہیں۔"

"اور اگر ہم نے فیصلہ اسی وقت نہ کیا۔" محسن نے کہا۔ "تو یہ لوگ اور ان کی پشت پناہی کرنے والے ہاتھ تمھارے نظامِ انصاف کو خرید لیں گے۔ ناکارہ بنا دیں گے۔"

پروفیسر کچھ نہیں بولا۔ وہ اچانک دہشت زدہ نظر آنے لگا تھا جیسے اس عدالتِ انصاف میں اگلی پیشی خود اس کی ہو۔

"یہ ایم آر ایس کی عدالت ہے جس کا فیصلہ حتمی، قطعی طور پر منصفانہ، شک و شبہے سے بالاتر اور کاملِ یقین کی بنیاد پر ہوتا ہے۔"

"ایم آر ایس؟"

"مائٹ از رائٹ سوسائٹی۔ یہ ہماری تنظیم کا نام ہے جو طاقت کے زور پر صرف وہی کام کرتی ہے جو ضروری ہیں اور صحیح ہیں۔ قانونی، اخلاقی اور معاشرتی یا مذہبی اصولوں کے عین مطابق ہیں۔" میں نے کہا اور پھر بنگالیوں سے مخاطب ہو گیا۔ "تم اپنے اپنے جرم کا اعتراف کرتے ہو؟"

ایک بنگالی چیخنے لگا۔ "ہم . . . کوئی جرم نہیں کیا۔ سالا، حرامی، کتا . . . تم قاتل ہے۔ بنگالی قوم کا قاتل ہے . . ."

میری گولی نے اس کے حلق میں سوراخ کر دیا۔ اس کی آواز ایک آخری بھیانک چیخ اور پھر ایک پُرعذاب خرخراہٹ میں ڈھل گئی۔ بے اختیار اس کا ہاتھ اپنے گلے پر جم گیا مگر اس طرح وہ اپنے لہو کو اُبلنے سے نہیں روک سکتا تھا۔ خون جو سرچشمۂ حیات تھا اور جسم کا روح سے رشتہ استوار رکھتا تھا، فرش پر اقبالِ جرم کی تحریر بن گیا تھا۔ اس کی روح پر شاید بارِ گناہ بھی زیادہ تھا کہ اسے نکلنا مشکل ہوا۔

باقی دو اس کے نزع کا کرب دیکھ کر اپنے آخری وقت کا تصور کر رہے تھے۔ انھوں نے نیم دیوانگی کے عالم میں ہاتھ جوڑ کے رونا دھونا اور گڑگڑانا شروع کیا۔ وہ زمین پر لوٹ رہے تھے اور میرے پاؤں پکڑنا چاہتے تھے۔ میں پیچھے ہٹ گیا۔ ایک ایک گولی سے میں نے ان کو بھی قیدِ حیات سے آزاد کیا۔ ہمیشہ کی طرح یہ احساس میرے لیے باعثِ تقویت بنا کہ ان چند غداروں کے ختم ہو جانے سے میرے وطن کے دشمنوں کی قوت کچھ کم ہو گئی۔

پھر ایک غیر متوقع بات ہوئی۔ پروفیسر نے ایک جست لگائی اور اس سے پہلے کہ کوئی کچھ کرتا، وہ بجلی کی طرح لپکا اور باہر نکل گیا۔ میں اس کے پیچھے دوڑا۔

"تم لوگ باہر آ جاؤ۔" میں نے جاتے جاتے چلا کر کہا۔

پروفیسر تہ خانے سے بھی نکل چکا تھا۔ میں نے اسے دیکھا تو وہ آخری دروازے پر تھا۔ میں نے اسے آواز دی اور پھر گولی چلائی۔ اس نے اوپر سے ایک بھاری پتھر لڑھکا دیا۔ کئی من وزنی چٹان کا ٹکڑا تھا اور شاید اوپر والے دروازے کے قریب ہی موجود تھا کہ پروفیسر کو فوراً نظر آ گیا۔ زندگی کے دفاع کے لیے اس کے جسم کی ہر حیوانی جبلت بیدار ہو چکی تھی۔ قتل و خونریزی کے یہ لرزہ خیز مناظر جو اس نے دیکھے حقیقی تھے۔ کسی فلم کا حصہ نہیں تھے۔ اس کے اعصاب پر خوف غالب آ گیا۔ ہم نے تو اسے وقتی طور پر زیرِ غور کر دیا تھا مگر نہ جانے کیسے اسے شک ہو گیا کہ ہم معاف کرنے والے لوگ نہیں ہیں۔

بھاری پتھر بڑی آواز کے ساتھ سیڑھیوں پر سے لڑھکتا ہوا نیچے آیا۔ میں کوئی سپرمین یا ٹارزن ہوتا تو اس کی متحرک قوت کو اپنے زورِ بازو سے ختم کر دیتا اور پتھر کو روک کر ایک کنکر کی طرح باہر اچھال دیتا۔ وہ ایک سیکنڈ یا اس سے بھی کم وقت تھا جس میں خدا نے مجھے عقل کی رہنمائی دی۔ میں ایک دم پلٹ کے بھاگا۔ ایک ساتھ میں دو دو تین تین سیڑھیاں پھلانگ کے نیچے پہنچا تو وہ چٹان میرے تعاقب میں تھی۔

میں نے چلا کے محسن اور اکرام شیخ کو خبردار کیا لیکن وہ پہلے ہی شور سے ہوشیار ہو گئے تھے۔ محسن نے ایک جھٹکے سے مجھے اپنی طرف کھینچا۔ اسی وقت دھماکا ہوا اور وہ چٹان کا ٹکڑا جو اتنا بڑا تھا کہ میرے دونوں ہاتھوں کے پھیلاؤ میں نہ آتا، فرش پر گرا اور اپنے ہی زور میں آگے نکل گیا۔ اس کی شکل ایک بے ہنگم گولے جیسی ہو گئی تھی۔ اگر اس کے کنارے تھے تو وہ سیڑھیوں کے نشیب کی جانب سفر میں ٹوٹ پھوٹ گئے تھے۔ یہ بھاری بھرکم پتھر مطیع الرحمان اور "جناب" کی لاشوں کو کچلنے کے بعد ساکت ہو گیا۔

صرف ایک لمحے کے لیے میں نے وہ بھیانک منظر دیکھا۔ دونوں لاشوں کی جگہ اب گوشت پوست کے لوتھڑے سے رہ گئے تھے۔ ایک لاش کا صرف ایک ہاتھ سلامت رہا تھا۔ دوسری لاش کا سر بچ گیا تھا۔ باقی سب پس گیا تھا۔ خوف کی ایک سرد لہر نے مجھے مفلوج سا کر دیا۔ اگر مجھ سے سیکنڈ کے ہزارویں حصے کی تاخیر ہو جاتی اور میں ایک قدم بھی آگے بڑھ جاتا تو اس وقت میرا اپنا جسم سیڑھیوں پر ایسے ہی ریشہ ریشہ بوٹی بوٹی ہو چکا ہوتا۔

محسن کو اُبکائی آئی تو میں چونکا۔ اب اوپر سے کوئی پتھر نہیں آ رہا تھا۔ شاید پروفیسر وہ چٹان لڑھکانے کے بعد فرار ہو گیا تھا۔ میں نے محسن کو اوپر کی جانب کھینچ لیا۔

"چل حوصلے سے کام لے۔ باہر تازہ ہوا میں تیری طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔" اکرام شیخ نے کہا۔

"شیخ! تم اسے لے کر ٹیکسی تک چلو۔" میں نے آگے نکلتے ہوئے کہا: "میں ذرا اس پروفیسر سے نمٹ لوں۔"

باہر خاصا اُجالا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ لیکن پروفیسر اس مہلت سے فائدہ اٹھا کے نکل گیا تھا۔ میرے چاروں طرف جھاڑیاں تھیں اور پتھریلی چٹانوں والی زمین تھی۔ یہ ہو سکتا تھا کہ وہ کہیں چھپ گیا ہو۔ میں نے محتاط رہتے ہوئے زمین پر اس کے قدموں کے نشان تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن وہاں ایک نہیں سیکڑوں نقشِ قدم تھے۔ کوئی پیشہ ور کھوجی ہی کسی ایک نقشِ قدم سے کسی سمت کا تعین کر سکتا تھا۔

اطمینان کی بات یہ تھی کہ پروفیسر اب مسلح نہیں تھا۔ ورنہ وہ کسی بھی طرف سے مجھے گولی کا نشانہ بنا دیتا۔ میرے پاس اتنا وقت بھی نہیں تھا کہ میں اس ویرانے کو چھان ماروں مگر خود پروفیسر اپنے خوف کے ہاتھوں شکست کھا گیا۔ اس نے مجھے دیکھا اور وہ ریوالور دیکھا جو میرے ہاتھ میں تھا۔ وہ خالی ہاتھ تھا۔ چنانچہ اس کی نظر میں میرا وجود فرشتۂ اجل کی طرح تھا جس نے اسے دیکھ لیا تو فوراً اس کی روح قبض کر لے گا۔ وہ پاگل ہو چکا تھا۔ اس نے فرشتۂ اجل کو مار ڈالنے کا سوچا۔

توپ سے نکلے ہوئے گولے کی طرح ایک پتھر آیا اور پشت کی جانب سے میرے شانے پر لگا۔ چند انچ کے فرق سے پروفیسر کا نشانہ خطا ہو گیا اور مجھے خدا نے گویا نئی زندگی دی۔ ورنہ وہ پتھر میرے سر کے پچھلے حصے پر لگتا تو میرا کام تمام کر دیتا۔

درد کی شدت نے مجھے بے اختیار چلّانے پر مجبور کر دیا، میں تڑپ کے پلٹا اور اگرچہ ضرب سے میرا بازو مفلوج ہو رہا تھا مگر میں نے اس سمت میں فائر جھونک دیا جدھر سے پتھر آیا تھا۔ اس کا یہ فائدہ بھی ہوا کہ دوسرا پتھر مجھے چھوئے بغیر دو فٹ کی دوری سے گزرا۔ پھر میں بازو کی تکلیف کو بھول کے دوڑا۔ میں نے سخت غصّے میں پروفیسر کو ایک اتنی ہی بڑی گالی دی جتنی بڑی چٹان اس نے مجھ پر لڑھکائی تھی۔

پروفیسر ایسے بھاگا جیسے جھاڑی میں سے اچانک خرگوش نکل کے بھاگتا ہے۔ وہ اب رعایت کا مستحق بھی نہیں رہا تھا اور خود میری ذہنی کیفیت کسی حد تک انتقامی ہو رہی تھی۔ میں نے نشانہ لے کر فائر کیا۔ وہ بھاگتے بھاگتے دو فٹ اوپر اچھلا اور پھر منہ کے بل ایک جھاڑی میں گر گیا۔ اس کا جسم جھاڑیوں میں غائب ہو گیا اور نہ جانے کیسے اس کی دونوں ٹانگیں تھوڑی سی اوپر اٹھی رہ گئیں، وہ ٹانگیں کچھ دیر یوں ہلتی رہیں جیسے وہ . . . . . سر کے بل کھڑا رہ کے ہوا میں سائیکل چلا رہا ہو۔ شاید جھاڑیوں میں کوئی گڑھا تھا جس میں پروفیسر الٹا گرا تھا۔ آہستہ آہستہ ان ٹانگوں کی حرکت سست پڑنے لگی۔ پھر گھٹنوں کے پاس سے اس کے پاؤں لٹک گئے۔

میں واپس آیا تو محسن اگلی سیٹ پر سر کو پیچھے ٹکائے آنکھیں بند کیے بیٹھا ہوا تھا۔ اکرام شیخ نے ٹیکسی اسٹارٹ

کر دی تھی۔

"کیا ہوا؟" اکرام نے شاید میری صورت سے اس اذیت کا اندازہ کرلیا جو میں برداشت کر رہا تھا۔

"کچھ نہیں۔ حرامزادے نے پیچھے سے پتھر کھینچ مارا۔" میں نے کہا اور ریوالور پچھلی سیٹ پر پھینک کے خود بھی گر گیا۔

محسن نے سر گھما کے مجھے دیکھا۔ "ادھر کر شانہ۔"

"ٹھیک ہے یار۔ ہڈی نہیں ٹوٹی۔" میں نے کہا۔

"ہڈی کی بات کرتا ہے۔" اکرام نے ٹیکسی اسٹارٹ کی۔ "شکر کر کھوپڑی بچ گئی۔ خالی ناریل ٹوٹ جاتا۔"

"یار محسن۔ یہیں سے فون کرلے۔ میں تو اب کھمبے پر نہیں چڑھ سکتا۔" میں نے شانے کو دباتے ہوئے کہا۔

"آگے تو آبادی شروع ہو جائے گی۔"

"آبادی تو یہاں بھی ہے لیکن صبح صبح شاید وہی اٹھتے ہوں گے جن کو حکیم نسخے میں لکھتا ہوگا کہ نہار منہ دوا کھانی ہے۔"

"نہار منہ۔ نہاری۔ آہ۔" محسن بولا۔ "ناشتے میں نہاری۔ اس خیال سے میری بھوک جاگ اٹھی ہے۔ میرا پیٹ چوہوں کا ریس کورس بن گیا ہے۔"

"بھول جا اپنی پیٹ کو۔" اکرام شیخ نے ٹیکسی کو ایک کنارے پر روک دیا۔ "اس ٹیلی فون کے کھمبے کو دیکھ۔ اوپر جا کے تازہ ہوا کھا۔ دماغ کو فرحت حاصل ہوگی۔"

"اور۔ مشرق سے نکلتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ۔" میں نے کہا۔ "یہ حکم شاعرِ مشرق نے دیا ہے۔ تیری آنکھیں روشن ہوں گی۔"

"چڑھ جا بیٹا سولی پر رام بھلی کریں گے۔" اکرام شیخ نے کہا۔

"میں ایک فاقہ زدہ مصیبت کا مارا یتیم اور لاوجہ شخص ہوں۔" محسن نے رونی شکل بنا کے کھمبے کو یوں دیکھا جیسے وہ ایفل ٹاور ہو۔ "کیوں مجھے سولی چڑھاتے ہو۔ میرا خون تمھاری گردن پر ہوگا۔ اگر میں آدھے راستے میں ہی اللہ کو پیارا ہوگیا اوپر گروں گا تیرے۔"

"کوئی بات نہیں۔ بس خیال رکھنا کہ کھمبا نہ گرے سرکاری پراپرٹی ہے۔" اکرام شیخ نے کہا۔

محسن نے کھمبے پر چڑھنا شروع کیا۔ میں اسے نیچے سے ہدایات دیتا رہا۔ "دیکھو پہلے انکوائری سے نمبر مانگ لینا۔ کمشنر سے یا ڈی آئی جی سے بات کرلینا۔ انھیں بتا دینا۔۔"

محسن اوپر تک پہنچا اور پھر نیچے اتر آیا۔

"کیا ہوا؟" میں نے کہا۔ "فون کیوں نہیں کیا؟"

"کیا ضرورت ہے اب؟" وہ خفگی سے بولا۔ "تم ایسے چلا چلا کے بات کر رہے تھے۔ کمشنر اور گورنر کے کانوں تک تمھاری آواز پہنچ ہی گئی ہوگی۔ کیا سمجھ رکھا ہے آخر تو نے مجھے۔ میں بچہ ہوں یا احمق کہ اس طرح ہدایات نشر ہو رہی ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ حکم چلانے کا عارضہ لاحق ہوگیا ہے۔"

"تم چیف کے تو کے ایک ادنیٰ ماتحت ہو۔" میں نے اسے ڈانٹ کر کہا۔ "حکم عدولی کی سزا معلوم ہے؟"

"ہاں، ناشتے میں نہاری نہیں ملے گی۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "دیر سے جانے والوں کو خالی دیگ ملتی ہے۔"

بالآخر وہ پھر کھمبے پر چڑھا اس شرط کے ساتھ کہ اب کوئی نہیں بولے گا۔ معلوم نہیں اس نے کسے فون کیا اور کیا کہا تاہم مجھے پورا بھروسا تھا کہ اس نے وہی کیا ہوگا جو میں کرتا۔ وہ محض اعصابی کشیدگی کا نتیجہ تھا کہ میں اس کو ہدایات دینے لگا تھا اور وہ بھی بُرا مان گیا تھا۔

دس منٹ کے بعد وہ اتر آیا۔ "آج بہت عرصے کے بعد صبح کا سورج دیکھا۔ بالکل اسی کے جیسا ہے۔"

"کس کے جیسا؟" میں نے کہا۔

"شہلا کے چہرے جیسا۔" وہ آگے بیٹھ کے بولا۔

"یہ کیا گڑبڑ ہے۔" میں نے احتجاج کیا۔ "کل چاند جیسا تھا تو آج سورج کے جیسا کیوں ہوگیا اور کیسے ہوگیا آخر مجھے بھی تو رابعہ کے لیے کوئی تشبیہ استعمال کرنی ہے۔"

"اوکے، اوکے۔" محسن بولا۔ "میں ترمیم کر دیتا ہوں اپنے بیان میں۔ رابعہ کے چہرے جیسا تھا مگر آج کے بعد کبھی رابعہ کے چہرے کو چودھویں کا چاند مت کہنا ورنہ پھڈا۔"

"ابھی پھڈا نہیں ہوئیں گا۔ ابھی تیرا ماسوک چاند کا مافک تو اپنا سورج کا مافک۔" میں نے کہا۔ "مگر ایک بات اہم ضرور بولیں گا۔ چاند کا اپنا روشنی نہیں ہوتا، وہ سورج کی لائٹ سے چمکتا اے، تمھارا والا کا بیوٹی اصلی نہیں اے۔ مس رابعہ کا بیوٹی اے اس میں۔۔۔"

یہ جھگڑا نہاری شاپ تک چلا۔ جب ہم بارہ مسالے والی آتش فشاں نہاری سے پیٹ بھر کے روانہ ہوئے تو سب کا ایک سا حال تھا۔ کوئی بھی صبح سویرے اتنی مرچیں کھانے کا عادی نہ تھا۔

"شاید اسی کا نام نہاری ہے شیفتہ۔۔۔ اک آگ سی ہے پیٹ کے اندر لگی ہوئی۔" میں نے کہا۔

"ابھی میرے منہ سے شعلے نکلیں گے۔" محسن نے کہا۔ "جیسے جادوگر نکالتے ہیں۔"

"میں خود کو کسی اسٹیم انجن کے بائلر کی طرح محسوس کر رہا ہوں۔" اکرام شیخ نے اتفاق کیا۔ "سیٹی بجانے کو دل چاہتا ہے۔"

"جو سیٹیاں میرے کانوں میں بج رہی ہیں۔" میں نے کہا۔ "وہ کون مار رہا ہے؟"

چائے کی فوری طلب مٹانے کے لیے ہم میکلوڈ روڈ کے ایک نسبتاً صاف ستھرے ریسٹورنٹ میں رک گئے اور وہ چائے پی جو کراچی میں اسپیشل کہلاتی ہے۔ اس میں چائے کے سب اجزا الگ الگ پیش کیے جاتے ہیں۔ ورنہ صرف چائے کا مطلب ہوتا ہے، ریڈی میڈ دودھ پتی چینی کا ابلتا ہوا وہ گاڑھا مشروب جس میں ہر چیز زیادہ ڈال دی جاتی ہے۔

"ناگ منی بہت پریشان ہوگی۔" محسن نے چائے پیتے ہوئے کہا۔ "کہ کہیں ہم اسے چھوڑ کے بھاگ تو نہیں گئے۔"

"ہمارے بھاگ جانے سے وہ پریشان نہیں ہوگی۔" میں نے کہا۔ "فکر اسے صرف تیری ہوگی جن کے ساتھ گزاری آدھی رات وہ۔"

"یار تم لوگ زبردستی اس کا اور میرا عشق مت کراؤ۔" محسن بگڑ کے بولا۔ "اس کا دل رکھنے کے لیے میں کچھ نہیں کہتا لیکن تم حد سے بڑھے یا وہ حد سے بڑھی تو میں سب کی ایسی تیسی کر دوں گا۔"

"اگر اس کا دل آگیا ہے تجھ پر تو اس کا یا ہمارا کیا قصور ہے۔" میں نے کہا۔ "اسے کون روک سکتا ہے؟"

"دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت۔۔۔" اکرام نے کہا۔

"کیا فائدہ؟ بعد میں اس کی دل شکنی ہوگی۔" محسن بولا۔

"نہیں، ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ وہ بددل ہو کے اپنی پرانی زندگی کی طرف لوٹ جائے۔ ہم اسے نئی زندگی کی طرف لے جا رہے ہیں اور وہ تیرا ہاتھ تھام کے آگے بڑھنا چاہتی ہے تو تجھے اپنا ہاتھ نہیں چھڑانا چاہیے۔" میں نے کہا۔ "وہ لڑکی بری نہیں ہے۔"

"یہ میں نے کب کہا ہے۔" محسن خاموش ہوگیا۔

"حالات نے اُسے بُرا بنا دیا تھا۔ ہم اس کے حالات سنوار دیتے ہیں۔ جب وہ سنبھل جائے گی تو اس سچ سے بھی اسے کوئی فرق نہیں پڑے گا کہ۔۔۔ یہ ایک کھیل تھا یا وہ جھوٹ تھا جو کسی کی جان بچانے کے لیے بولنا پڑتا ہے۔۔۔"

ساڑھے آٹھ بجے ہم پھر بندرگاہ کے اس علاقے میں تھے جہاں سے میں نے اس ہپی کا تعاقب شروع کیا تھا اور پھر یہ تعاقب ہمیں ایک رات میں کہاں سے کہاں لے گیا تھا۔ بندرگاہ کی چہل پہل اور گہما گہمی وہی تھی۔ کاروبارِ حیات اور زندگی کے معمولات اسی طرح جاری تھے۔ زندہ اور مصروف انسانوں کو نہ خبر تھی اور نہ سروکار تھا کہ اس شب کی سحر ہونے تک کس کس کی زندگی کا چراغ گل ہوا اور حیاتِ مستعار کس کس کو ملی۔ کتنے گھر آباد ہوئے اور کتنے اجڑے۔ مونٹی کارلو کے جوئے خانوں سے کراچی کی فٹ پاتھوں پر سٹہ کھیلنے والوں تک کتنے جواری سب کچھ ہار کے قلاش ہوئے اور کتنے جیت کے دولت مند ہوئے۔ نیویارک کی حصص مارکیٹ سے کلکتہ کے قحبہ خانوں تک کتنے سودے ہوئے۔

میں اور محسن اس جگہ سے کافی فاصلے پر اتر گئے تھے جہاں اکرام اپنی ٹیکسی کھڑی کرتا تھا۔ وہاں اس وقت بھی تین ٹیکسیاں ایک قطار میں موجود تھیں۔ ہم پیدل چلتے ہوئے گزرے تو ہم نے اکرام شیخ کو اپنے ہم پیشہ ڈرائیوروں کے ساتھ ایک میز پر گپ لگاتے دیکھا۔ کسی کو شک نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ رات بھر کہاں رہا۔ صبح وہ ان سب کی طرح ٹیکسی لے کر نکل کھڑا ہوا تھا جو رات بھر آرام سے اپنے اپنے گھروں میں سوئے تھے۔

اپنے حلیے سے ہم غیر ملکی سیاح نظر آتے تھے اور آپس میں گفتگو بھی فرنچ میں کر رہے تھے، اس کے باوجود امیگریشن کے عملے کے ایک افسر نے ہمیں پکڑ لیا۔ اس کے ساتھ ایک ماتحت بھی تھا۔

"یور پاسپورٹ پلیز۔" وہ ہاتھ پھیلا کے بولا۔

میں نے اور محسن نے ایک دوسرے کو احمقوں کی طرح دیکھا اور نفی میں سر ہلا کے کہا۔ "نو انگلش۔"

"یہ خبیث کچھ پیدا کرنے کے چکر میں ہے۔" محسن نے مسکرا کے فرنچ میں کہا۔

"یہاں سب کچھ نہ کچھ پیدا کرنے کے چکر میں ہیں۔" میں نے بھی مسکرا کے اقرار کیا۔

"فرنچ؟" وہ سر کھجا کے بولا پھر اس نے ہمیں ہاتھ سے ٹھہرنے کا اشارہ کیا اور ماتحت سے مخاطب ہوا۔ "دیکھو زمان صاحب ہیں یا چلے گئے، ان کو فرنچ آتی ہے۔"

"ابے مروا دیا۔ یہ کون فرانسیسی جاننے والا نکل آیا۔" محسن بولا۔ "اب کیا ہوگا؟"

"کچھ نہیں ہوگا۔" میں نے کہا۔ "پیسہ سب بگڑے کام بناتا ہے، تو دیکھ تماشا۔"

بڑی رازداری کے ساتھ میں نے اس کے کان کے قریب منہ لے جا کر کہا۔ "ٹین ڈالرز۔"

وہ چونکا اور پھر زور زور سے نفی میں سر ہلانے لگا۔

میں نے انگلی اٹھا کے کہا۔ "ٹوئنٹی۔" یہ گویا آخری بات تھی۔

"ففٹی۔۔۔" اس نے ہم دونوں پر انگلی رکھ کے کہا۔ یعنی دو کا سودا ہے۔ پچیس ڈالر فی کس دو اور جاؤ، قانون کو خرید لو۔

"ٹوئنٹی فائیو۔" محسن نے کہا اور ہم دونوں اطمینان سے یوں ہاتھ باندھ کے کھڑے ہوگئے جیسے اب کہنے کو کچھ نہیں رہا، اور باقی بات زمان صاحب کے آنے پر ہی ہوگی۔

"یار دے اسے پچاس اور جان چھڑا۔" محسن بولا۔ "ورنہ وہ اس کا باپ آجائے گا تو یک نہ شد دو شد والا معاملہ بہت لمبا ہو جائے گا۔"

"اسے تو میں بتا دوں گا کہ کاغذات شپ پر رہ گئے ہیں اور ہم وہی

لینے جا رہے ہیں مگر تمہارا یہ ساتھی رشوت مانگتا ہے، پانچ سو ڈالر۔ ہم پولیس کے پاس جانا پسند کریں گے اور اس بدمعاش کی رپورٹ کونسلیٹ کو بھی دیں گے۔ دیکھنا اس کی کیا حالت ہوتی ہے۔" میں نے کہا: "نوکری کے لالے پڑ جائیں گے۔"

میرے مقابل کھڑا ہوا شخص دو الفاظ پر چونکا۔ ایک پولیس کے نام پر اور دوسرا کونسلیٹ کے ذکر پر۔ پھر مجھے دور سے اس کا ماتحت ایک اور شخص کے ہمراہ آتا دکھائی دیا۔

"او کے، ٹوئنٹی فائیو ڈالرز۔" وہ جلدی سے بولا۔

میں نے ایک جراب میں سے ڈالر نکالے اور اسے پانچ پانچ ڈالر کے پانچ نوٹ تھما دیے جو اس نے بڑی صفائی سے جیب میں ڈالے اور اس عمل میں اتنی پھرتی دکھائی کہ زمان صاحب کو قریب آجانے کے باوجود خاک پتا نہ چلا۔

"کیا ہو گیا بھئی؟" اس شخص نے قریب آ کے کہا جو فرنچ جانتا تھا اور زمان صاحب کے علاوہ کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔

"کچھ نہیں، یہ فرانسیسی سیاح ہیں۔ کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں شاید ہوٹلوں کے بارے میں...۔" رشوت خور نے بات ختم کرنے کے لیے مسئلہ ہی بدل دیا لیکن زمان صاحب بھی اسی تالاب کی مچھلی تھے اور اتنی آسانی سے نہیں ٹل سکتے تھے۔

"اس شخص نے آپ لوگوں کو پریشان تو نہیں کیا؟" زمان صاحب نے فرانسیسی میں سوال کیا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا اور کہا۔ "اس شریف آدمی نے تو ہماری مدد کے لیے آپ کو بلایا ہے۔"

"آپ بتائیں کہ ہم کراچی کے کس ہوٹل میں قیام کریں جہاں ہمیں فرنچ شراب اور لڑکی آسانی سے اور سستی مل جائے۔" محسن نے کہا۔ زمان صاحب خاصے مایوس ہوئے۔

"میں کوئی ہوٹل گائیڈ نہیں ہوں۔" وہ بے رخی سے بولا۔ "اور تم جیسے شریف آدمی کہہ رہے ہو یہ ایک نمبر کا حرام خور ہے تم نہ جانے کیسے بچ گئے ورنہ یہ تو اپنے باپ کو نہ بخشے۔"

"کوشش تو اس نے کی تھی مگر ہمارے پاس تمام دستاویزات ہیں اور ہم کوئی غیر قانونی کام نہیں کرتے۔" میں نے کہا۔

اچانک میں نے لوگوں کے رواں دواں ہجوم میں ایک آشنا چہرہ دیکھا۔ یہ دوست محمد کا چہرہ تھا جو ایک پُراسرار شخصیت رکھتا تھا۔ اس کو رابعہ نے اپنا محافظ اور مددگار قرار دیا تھا مگر وہ چاند بھائی کا بھی معتمدِ خاص تھا۔ چاند بھائی کی شخصیت بھی متنازعہ تھی۔ میں ابھی تک یہ طے کرنے سے قاصر تھا کہ وہ رابعہ کو اپنی تحویل میں رکھنے پر کیوں بضد ہے۔ اس لیے کہ وہ رابعہ کی چاہت میں گرفتار ہو گیا ہے؟ یا بیچ دلاور اینڈ کمپنی کو یہ تاثر دینے کے لیے کہ رابعہ اس کی قید میں ہے۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ ہمارا ساتھی ہے یا ہمارا دوست ہے یا رقیب۔ اس نے سامنے آئے بغیر ہماری مدد کی تھی تو اس کا مقصد کیا تھا۔ یہ مقصد نیک نیتی پر مبنی تھا یا اس کے پس پردہ ذاتی مفاد تھا۔ اگر وہ ہمارے مقاصد سے اختلاف نہیں رکھتا تھا تو پھر دلاور جیسے شخص کے ساتھ کاروباری مراسم کیوں رکھتا تھا۔ یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا پہلے میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا لیکن شیش ناگ کی موت اور ناگ منی کا جذبہ دیکھ کر میں اپنے خیالات بدلنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اگر ایک ڈاکو محبِ وطن ہو سکتا ہے تو ایک اسمگلر کیوں نہیں ہو سکتا۔ اب مجھے یہ ناممکن نظر نہیں آتا تھا کہ چاند بھائی کے کاروباری تعلقات دلاور سے ہوں لیکن وہ دلاور کے ملک دشمن عزائم میں شریک نہ ہو۔

دوست محمد ایک لکڑی کی پیٹی پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھا ہوا تھا۔ آتے جاتے بہت سے لوگ اس سے دعا سلام کر جاتے تھے۔ نصف صدی انہی لوگوں میں گزارنے کے بعد وہ ماہی گیروں، ملاحوں، ہر قسم کے جہازوں یا لانچوں کے عملے اور بندرگاہ کے علاقے میں کام کرنے والوں کے لیے اجنبی نہیں رہا تھا۔

میں نے زمان صاحب اور ان کے ساتھی کو جاتے دیکھا اور اس وقت تک انتظار کیا جب تک کہ وہ ایک عارضی شیڈ کے پیچھے غائب نہیں ہو گئے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ ہمیں دوست محمد سے بات کرتا دیکھیں اور بعد میں دوست محمد کے پیچھے پڑ جائیں کہ وہ فرنچ سیاحوں سے کیا بات کر رہا تھا۔ میں نے دوست محمد پر بھی نگاہ رکھی کہ کہیں وہ اچانک اُٹھ کے نہ چل پڑے۔

دوست محمد ایک سے حلیوں والے دو افراد کو اپنے مقابل دیکھ کے حیران ہوا جو غیر ملکی نظر آتے تھے۔ دوست محمد کے پاس کھڑا ہوا ایک نوجوان لڑکا ہنسنے لگا۔

"اُستاد، ابھی یہ کیسا کارٹون آ پڑا ہے باہر سے۔"

"یہ ہپی ہیں۔" دوست محمد نے اسے سمجھایا۔

"ایک مافک بھورا داڑھی، اتنا لمبا بال، یہ فقیر لوگ ہے استاد یا حجامت کا پیسہ نہیں ہے؟" لڑکا بولا۔ "سالا کیسا بدمعاش لگتا ہے دونوں، چرس مرس کا بات کرے گا۔"

"دوست محمد!" میں نے آرام سے کہا۔ "کیا حال ہے؟"

دوست محمد تو خیر چونکا مگر وہ لڑکا اس طرح اچھل پڑا جیسے اس کو بھڑ نے کاٹ لیا ہو۔ کچھ کہے بغیر وہ رفوچکر ہو گیا۔

"تم... سکندر ہے۔" دوست محمد نے تھوڑا سا غور کرنے کے بعد کہا اور پھر محسن کی طرف دیکھا۔

"ہاں، میں محسن ہوں۔ تم نے کیسے پہچانا؟"

"تمہارا آواز سے۔" دوست محمد بولا۔ "ہم سمندر کا لوگ ہے

ہروں کو بھی آواز سے پہچانتا ہے۔ طوفانوں کو بھی۔ آواز سنتا ہے اور بتاتا ہے کہ انجن میں خرابی کیا ہے۔ آواز سے ہم سمندر کا سب مخلوق کو پہچانتا ہے۔ تم تو انسان ہے بابا۔"

"چاند بھائی کہاں ہے دوست محمد؟" میں نے اس کی خود ستائی کو نظر انداز کر کے کہا۔

"ابھی یہ کیسا سوال ہے۔ ہم کیا چاند بھائی کا سیکریٹری ہے۔"

"تم سیکریٹری سے زیادہ ہو۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "تم اس کے دوست ہو۔"

"چلو بابا، ادھر کون کس کا دوست ہے۔ سب یار مطلب کا ہوتا ہے... چاند بھائی، سورج بھائی...۔" وہ بلا وجہ ہنس پڑا۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ اس پر تھوڑا سا نشہ غالب ہے۔ اس نے شراب یا چرس بھری سگریٹ پی رکھی تھی۔ مجھے وہ کچھ بیمار اور کمزور بھی لگا۔ اس کی شیو بہت بڑھی ہوئی تھی۔ سفید بال اس کے کرخت نقوش والے سیاہ چہرے پر بدنما لگتے تھے۔

"دوست محمد! اگر تم شرافت سے نہیں بتاؤ گے...۔"

"ارے جاؤ نی، بڑا شرافت مرافت کا بات کرتا ہے۔" وہ چلانے لگا۔ "تم سالا بڑا شریف ہے۔"

وہی لڑکا نہ جانے کدھر سے دوڑتا ہوا آیا۔ "اڑے استاد، ابھی چلو نی میرا ساتھ۔ ایک کام ہے۔"

"چل ادھر سے...۔" دوست محمد نے اسے گالی دی۔ "ہم سے کام کا بات کرے گا تو تیرا فوٹو بگاڑ دیں گا، سالا...۔"

"استاد، کام نئیں کریں گا تو... گزارا کیسے ہوئیں گا۔" لڑکا دکھی لہجے میں بولا۔ "آخر کب تک نئیں کریں گا کام؟ یہ نشہ مشہ بھی کیسے ہوئیں گا، کھائیں گا کدھر سے؟"

"تیرے کو کاہے کا فکر ہے...۔" دوست محمد نے اسے ایک اور گالی دے کر کہا۔

"اُستاد، ہم کو فکر ہے۔ کب سے کام نئیں کیا تم... تمہارا بوہت نقصان ہو گیا۔ دوسرا لوگ تمہارا کام لے لیا۔ ابھی جو کام ملتا ہے تم نئیں کرتا، وہ بھی ختم ہو جائیں گا۔ پھر کوئی نئیں پوچھے گا تم کو، ایسا مت سمجھو کہ دُنیا کا دھندا تمہارے بغیر نئیں چلیں گا۔ سب چلیں گا استاد۔ کام نئیں رُکیں گا کسی کا، پر تم کیا کریں گا۔ بھیک مانگیں گا؟"

دوست محمد مشتعل ہو کے اٹھا۔ "تیری...۔" وہ چیخ کے بولا۔ "ہم کچھ بھی کریں گا تم کون ہے سالا؟"

"ہم بیٹا ہے تمہارا۔ تم خود بولا۔"

"بھاگ جا... دفع ہو جا...۔" دوست محمد اسے مارنے دوڑا۔ "سالا اپنا اولاد اپنا نئیں پھر تو کیسے بولتا ہے کہ میرا بیٹا ہے۔" اس نے ایک پتھر اٹھا کے مارا مگر وہ لڑکا بچ کے فرار ہو گیا۔ مجھے دوست محمد کی یہ حالت دیکھ کر افسوس ہوا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ کتنا اچھا مکینک ہے۔ اپنی مہارت اور تجربے سے فائدہ اٹھا کر وہ بہت کما رہا تھا لیکن اب شاید نشے کی حالت میں وہ خود کو تباہ کر رہا تھا۔

"سیٹھ سکندر، ابھی ہم تم کو ایک بات بتائیں گا۔" وہ پھر اس تھڑے پر بیٹھ گیا۔ "تمہارا مطلب کا بات ہے مگر ایسے نئیں بتائیں گا۔ پیسہ دیں گا تو بتائیں گا۔"

"کتنا پیسہ چاہیے تمہیں دوست محمد؟" میں نے کہا۔

"کتنا ہے تمہارے پاس... چلو سو دے دو...۔" وہ بولا۔

"صرف سو؟" میں نے حیرانی سے کہا اور اسے سو کا نوٹ تھما دیا۔ "بات بتاؤ۔" وہ مجھے ایک ویران گوشے میں لے گیا۔

"تمہارا وہ دلبر جانی ہے نا، رابعہ... وہ ہم کو ملا تھا۔" دوست محمد نے نوٹ کو بتی بنا کے بل دیتے ہوئے کہا۔

میرا دل سینے میں اچھلا۔ "رابعہ... رابعہ ملی تھی تم کو... کہاں... کب؟"

"کل... نئیں... پرسوں... ہاں پرسوں۔" وہ سوچ کے بولا۔ دو خستہ دیواروں کے درمیان کھڑا ہوا وہ مجھے ایک بدروح لگا۔

"یہاں... یہاں آئی تھی وہ؟"

"نئیں...۔" وہ نفی میں سر ہلا کے بولا۔ "یہ ہم نئیں بتائیں گا کہ وہ کدھر ملا تھا... لیکن ادھر نئیں...۔"

"اکیلی آئی تھی وہ...؟" میرے صبر کا پیمانہ چھلکنے لگا۔

"نئیں... چاند بھائی تھا اس کا ساتھ اور وہ بولا کہ دوست محمد ہم تیرے کو ایک بات بولتا۔ سکندر ملے تو اس کو بولنا اب ہم بمبئی میں ملے گا۔ وہ بمبئی چلا گیا۔"

"بمبئی میں کہاں ملے گا وہ؟" میں نے اس کی گردن دبوچ لی۔ "خبیث، پوری بات کیوں نہیں کرتا۔"

"بتاتا ہے... بتاتا ہے۔" وہ خود کو چھڑا کے بولا۔ "تم ماریں گا ہم کو تو ہم مر جائیں گا۔ ابھی گردن دبا کے پوچھیں گا تو ہم کیسے بتائیں گا۔" وہ لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔

"اچھا اچھا... غلطی ہو گئی مجھ سے۔" میں نے کہا۔

"ایسے زبردستی مت کر یار۔" محسن نے کہا۔ "دیکھتا نہیں اس کی حالت کیا ہو رہی ہے۔"

"کبھی تم بمبئی گیا ہے؟" دوست محمد نے میلی قمیص کی جیب میں سے ایک مڑی تڑی سگریٹ نکال کے سیدھی کی۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

اس نے سگریٹ جلا کے ایک لمبا کش لیا۔ "ادھر حاجی علی صاحب کا درگاہ ہے۔ سمندر میں، وہ ادھر ملے گا تم کو، جمعرات والا دن۔"

"کون سی جمعرات؟ ایک جمعرات تو کل ہے۔"

"ابھی نہیں معلوم... کون سا جمعرات، کوئی بھی جمعرات ہوگا بابا۔ جا کے دیکھو۔ اور ہم کچھ نہیں جانتا۔" اس نے ایک طویل کش لے کر بدبودار دھواں خارج کیا۔

میں خوشی، بے یقینی، اضطراب اور اشتیاق کے ساتھ درد کی اس کسک کو بھی محسوس کر رہا تھا جو امید کے ساتھ پیدا ہوئی تھی۔ ناامیدی کے اندھیرے آسمان میں رابعہ کا خیال کسی ستارے کی طرح ہو گیا تھا۔ مگر اس خبر کے ساتھ ہی جیسے وہ چاند بن کے طلوع ہو گئی اور اس کے تصور کی روشنی میرے وجود پہ پھیل گئی۔ اس کو میں نے پھر اپنے اتنا قریب محسوس کیا کہ ایک مہربان آشنا خوشبو سے فضا بھر گئی۔ اور ہجر کے راستے پر بچھے ہوئے آزار کے کانٹے امید کے رنگ بھرے پھول بن کے مسکرانے لگے۔

اور اتنی بڑی، اتنی قیمتی اور نایاب، اتنی دلنواز اور جانفزا خبر سنانے کے لیے دوست محمد نے صرف سو روپے مانگے تھے۔ وہ ہزار، دس ہزار، دس لاکھ یا دس کروڑ کی شرط رکھتا تب بھی میں رابعہ کا پتا پوچھنے کے لیے فراہم کرتا خواہ اس کے لیے مجھے اپنے آپ کو بیچنا پڑتا۔ مگر وہ بلیک میلر یا مجبوریوں کا خریدار نہیں تھا۔ اسے بس سو ہی روپے درکار تھے جو اس نے آج کی ضرورت پوری کرنے کے لیے مانگ لیے تھے۔ وہ اب گھٹنوں میں سر دیے چپ بیٹھا ہوا تھا۔ محسن نے مجھے کہنی مار کے متوجہ کیا۔ دوست محمد کے پیچھے اس سے کچھ فاصلے پہ وہی لڑکا کھڑا ہوا ہمیں اشارے سے بلا رہا تھا جسے دوست محمد نے گالیاں دے کر بھگا دیا تھا۔

"یہ کیا ہوا ہے دوست محمد کو؟" میں نے اس کے قریب جا کے کہا۔ "یہ تو بہت ہمت والا محنتی اور زندہ دل آدمی تھا۔"

"تھا صاب، پر ابھی ختم ہو گیا ہے۔" لڑکا افسوس کے ساتھ سر ہلانے لگا۔ "ایسا ہی رہیں گا تو تھوڑا دن میں مر جائیں گا۔ دشمن کا مراد پورا ہو گا۔"

"دوست محمد کا دشمن کون ہے؟" میں نے کہا۔

"جس کا دوست بہت ہوتا صاحب، اس کا دشمن بھی کم نہیں ہوتا۔" لڑکے نے ایک فلسفیانہ بات کہی۔ "سب اسی کو بلاتا تھا۔ دوسرا آدمی کو اس وقت بلاتا تھا جب دوست محمد نہیں ملتا تھا۔ لیکن دوست محمد کو ہزار دیتا تھا تو دوسرا آدمی کو سو۔ کبھی کوئی شور کرتا تھا تو سیٹھ لوگ بولتا تھا کہ بابا تم کدھر سے دوست محمد کا برابری کرتا۔ وہ ہے اصلی مستری، بہت بڑا مستری۔ ایسا بات سب کو برا لگتا۔ صاب وہ لوگ جل کے ایسا کیا کہ استاد کو چرس پلایا اور اس کا عادت ڈال دیا۔ ابھی استاد کچھ نہیں کرتا۔ کام نہیں کرتا، نشہ اس کو اندر سے خلاص کر دیا ہے پھر اس کا بیٹا لوگ اس کو چھوڑ گیا ہے۔ باقی سب تو پہلے ہی بھاگ گیا تھا۔ اپنا مرضی کا شادی بنا کے کوئی ولایت چلا گیا تھا، کوئی دبئی۔ ایک لڑکا تھا وہ خیال کرتا تھا باپ کا۔ استاد سب اس کو دیتا تھا، ہزاروں نہیں صاب، لاکھوں ہوتا تو اسی کو دیتا، وہ عیش کرتا۔ مگر اس کا بیوی... اللہ اس کا مردہ خراب کرے۔ وہ کہتا تھا کہ اس بڈھا کو ادھر مت آنے دو وہ خراب لڑکی تھا صاب۔ اس کو استاد بولا کہ بیٹا میرا ہے اور پوتا بھی میرا ہے۔ تو ہم کو روکے گا تو ہم تیرے کو شوٹ کر دے گا۔" وہ چپ ہو گیا۔

"تو کیا...؟" میں نے سانس روک کے پوچھا۔

"نہیں صاحب، استاد تو بس غصے میں بولتا تھا۔ وہ کیسے شوٹ کر سکتا تھا، اپنے بیٹے کا گھر والی کو کیسے مار سکتا تھا مگر صاب وہ عورت اس کو پھانسی ہووے تو ہم نیاز لانے گا۔ اس نے استاد کا بیٹا کو زہر دے دیا۔ بولا کھانے میں خرابی تھا۔ لیکن استاد بے وقوف نہیں ہے۔ اس نے پولیس کو بولا کہ لاش نکالو اور اس کا پوسٹ مارٹم کرو۔ صاب پھر جب لاش نکالا تو پتا چل گیا۔ اس عورت نے پولیس کو رشوت دیا۔ سب لڑکا کا پیسہ تھا۔ وہ نکل گیا، جہاز میں بیٹھ کے پتا نہیں کدھر بھاگ گیا کسی یار کے ساتھ۔ ابھی استاد بولتا کہ ہم کچھ نہیں کرے گا۔ صاب آپ ہم کو معاف کرو، ہم آپ کو گورا سمجھا غلط بات کیا۔"

میں نے اس کے کندھے پہ تھپکی دی۔ "وہ کوئی بات نہیں یار! یہ بتاؤ کہ تمہارے استاد کے لیے ہم کیا کر سکتے ہیں؟"

"آپ کیا کرے گا صاب، جب وہ خود کچھ نہیں کرتا۔"

"میرا مطلب ہے... پیسہ چاہیے؟ اس نے تو صرف سو روپے مانگے تھے۔ ہمارے پاس وقت نہیں ہے ورنہ ہم کچھ اور بھی کرتے۔ ابھی یہ کر سکتے ہیں کہ مالی مدد کر جائیں۔ دس بیس ہزار، بلکہ ایک لاکھ تک ہم دے سکتے ہیں۔ اگر استاد کہیں ورکشاپ کرنا چاہے یا اس کو علاج کے لیے درکار ہو۔"

"نہیں صاب، پیسہ کیا کرے گا... پیسہ تو بہت ہے اس کا پاس، بینک میں ہے نکالے گا کیسے؟ وہ تو بس ادھر ادھر پھرتا، اس سے سو روپے مانگ لیا، اس سے لے لیا، پرانا واقف کار سب دیتا مگر کب تک دے گا۔ آپ تو اس کا نشہ چھڑا دو۔"

"ہم نشہ چھڑا دیں... وہ کیسے؟ میرا مطلب ہے کہ یہ تو لمبا کام ہے۔ علاج وغیرہ کرانا پڑتا ہے۔" میں نے کہا۔

"نہیں صاب، آپ ساتھ لے جاؤ اسے... آپ کا ساتھ ہو گا تو کدھر سے نشہ کریں گا... پھر جب ٹھیک ہو گا تو بھلے ادھر چھوڑ جانا اسے۔"

میں نے شرمندگی اور دکھ کے ساتھ نفی میں سر ہلا کے کہا۔

"افسوس کہ ہم یہ نہیں کر سکتے۔ ہماری بھی مجبوریاں ہیں کچھ۔"

"بس تو پھر جاؤ صاب۔" لڑکے نے مایوسی کی تلخی سے کہا اور ایک دم پلٹ کے روانہ ہو گیا۔

"زندگی کبھی کبھی کتنی بے رحم ہو جاتی ہے۔" محسن بولا۔

"ہاں، اور پھر بھی لوگ جیتے ہیں، صرف اپنے لیے۔" میں نے اعتراف کیا۔ "وہ اپنی زندگی دوسروں کو نہیں دے سکتے، اس کا ایک لمحہ بھی نہیں۔"

محسن نے ایک دم مجھے بازو سے پکڑ کے پیچھے کھینچ لیا۔ یہ سگریٹ پان کا ایک موبائل اسٹال تھا جو کسی ریڑھی پر کیبن کی صورت میں بنایا گیا تھا۔ ابھی اس کے چاروں طرف سے کھل جانے والے پٹ مقفل تھے۔ ہمیں اس نے پناہ فراہم کی ورنہ وہاں کھڑے ہوئے عام لوگوں سے الگ دکھائی دیتے تھے۔ ایک شخص جو ابھی ابھی ہمارے قریب سے گزرا تھا اور جس کی ہم نے صرف پشت دیکھی تھی، اب دوست محمد کے پاس جا کے ٹھہر گیا تھا۔

"مجھے اس کی صورت دیکھی ہوئی لگتی ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ پہلے دلاور کی کار چلاتا تھا۔" محسن نے کہا۔ "پھر غائب ہو گیا تھا۔ اس کے بعد حاجی عبداللہ کے ٹرک پر نظر آیا تھا۔"

"یہاں سے تو ان کی باتیں سننا مشکل ہے۔"

"لیکن ہم قریب کیسے جا سکتے ہیں۔" محسن بولا۔

"اس ریڑھی کو تھوڑا تھوڑا کھسکاتے جاتے ہیں، اس طرح کہ حرکت محسوس نہ ہو۔" میں نے کہا۔ "ہم دو تین فٹ قریب ہو جائیں گے۔"

"کسی نے دیکھ لیا تو؟"

"اللہ مالک ہے، دیکھنے والوں کو بھی دیکھ لیں گے۔" میں نے کہا اور بظاہر ریڑھی سے پشت لگا کے کھڑا ہو گیا مگر آہستہ آہستہ میں نے ریڑھی کو دھکیلنا شروع کر دیا۔ محسن نے گرد و پیش پر نگاہ رکھی اور مجھ سے باتیں بھی کرتا رہا۔

"وہ دوست محمد کو سگریٹ کا پیکٹ دے رہا ہے۔ میرا خیال ہے چرس والے سگریٹ ہوں گے لیکن اپنے سکندر صاحب، یہ بندہ تو خاص ہے، ایسے چھوٹے کام بھلا کیوں کرے گا؟"

"بجا ارشاد، میری چھٹی حس کہتی ہے..."

"وہی جو میری ساتویں حس کہتی ہے کہ دوست محمد سے دلاور کے ایجنٹ کا رابطہ ایک غیر معمولی واقعہ ہے۔ چرس کے سگریٹ تو ویسے ہی مل جاتے ہوں گے اور پھر دوست محمد جیسے شخص کو کیا نہیں مل سکتا۔"

اچانک دوست محمد چلانے لگا۔ "او بابا جاؤ، خدا کا واسطے، ہم نہیں جانتا کسی کو۔"

"دوست محمد، تم مجھے نہیں جانتے۔" دوسرے شخص نے خطرناک لہجے میں کہا۔ "میرے ساتھ چالبازی مت کرو، تم سے تو سچ میں ایسے اگلوا سکتا ہوں جیسے..."

"ہاں میرے کو دھمکی مت دے، نکال اپنا چاقو اور میرا پیٹ پھاڑ کے سب نکال لے۔" دوست محمد نے کہا۔ "مرنے سے ابھی ہم کیا ڈرے گا... ہا۔"

"دوست محمد، تمہارے مرنے جینے کی بات نہیں، تم کو اپنا فائدہ دیکھنا چاہیے۔" دھمکی دینے والے کا لہجہ بدل گیا۔

"ہاہ... ! بوہت فائدہ دیکھا، سارا عمر فائدہ ہی فائدہ دیکھا۔ آخر میں کیا ملا؟ صرف نقصان۔" وہ تلخی سے بولا۔

"میں تم کو ایک موقع اور دیتا ہوں۔ اگر وہ دونوں یہاں نظر آئیں تو بس اتنا بتا دینا کہ ان کا حلیہ کیا ہے۔ یہ تو ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ وہ کراچی میں دندناتے پھر رہے ہیں۔ انھوں نے اسی علاقے میں کہیں ڈیرا جما رکھا ہے مگر وہ ابھی تک سامنے نہیں آئے مگر وہ تمھارے پاس ضرور آئیں گے۔"

"بابا کون آئے گا کیوں آئے گا، یہ بھی تو بول۔" دوست محمد نے جھلا کے کہا۔

"رابعہ کا یار آئے گا تیرے پاس، رابعہ کے بارے میں معلوم کرنے کے لیے۔" وہ شخص مشتعل ہو کے بولا۔ "تو جانتا ہے نا رابعہ کو یا اسے بھی نہیں دیکھا کبھی؟ وہ تیرے باپ چاند بھائی کے پاس ہے آج کل۔" اس نے رابعہ کے نام سے ایک ایسی بات کہی کہ میرا خون کھولنے لگا۔ "اگر تو نے کہا نا کہ میں چاند بھائی سے واقف نہیں تو میں تیرا یہ سر توڑ دوں گا ابھی۔" اس نے دوست محمد کے سر پہ ریوالور کا دستہ بجا کے کہا۔ "اور تیرا مغز نکال کے فرائی کروں گا اور پھر معلوم ہے کسے کھلاؤں گا؟ تیری ایک چیز ہے ہمارے پاس۔ وہ تیرا بیٹا تھا نا جسے اس کی بیوی نے اپنے یار کے ساتھ مل کے مار دیا تھا اور خود بھاگ گئی تھی۔ وہ فاحشہ جاتے وقت اپنی اولاد کو بھی چھوڑ گئی تھی۔ ہم نے اسے اپنی تحویل میں لے لیا دوست محمد!"

"نہیں، یہ جھوٹ ہے... بکتے ہو تم..." دوست محمد چیخنے لگا۔ "میرا پوتا...!"

"ہاں تمھارا پوتا۔ تم دیکھو گے اسے؟ ملنا چاہتے ہو اس سے؟" وہ بڑی سفاکی سے بولا۔ "ہم اس کو تمھارے حوالے کر دیں گے مگر اس وقت جب تم ہمارا کام کر دو گے، اگر انکار کرو گے تو وہی ہو گا جو میں نے کہا، اس سے بھی برا ہو سکتا ہے... یہ ہو سکتا ہے کہ ہم تمھارے سامنے تمھارے بیٹے کی نشانی کو ذبح کر دیں پھر اس کا مغز نکالیں اور فرائی کر کے تم کو کھلائیں۔" اس نے ایک مکروہ شیطانی قہقہہ مارا۔

دوست محمد پہ دیوانگی کا دورہ پڑ گیا۔ اس نے ایک دم گالی دے کر اپنے مقابل کھڑے ہوئے شخص کو ٹکر ماری لیکن حریف جوان اور طاقتور تھا۔ اس نے دوست محمد کو اٹھا کے پیچھے پھینک دیا۔ میں ایک دم آگے بڑھا مگر محسن نے میرا بازو پکڑ کے مجھے کھینچ لیا۔

دوست محمد اب اس کے پیروں میں لوٹ رہا تھا۔ "ہم بتائے گا، ابھی بتائے گا لیکن تم کو اپنا ماں کا قسم، پھر تم اس کو دے گا نا اس

معصوم کو چھوڑ دو، میرا جان لے لو۔" وہ بڑے افسوس ناک طریقے پہ روتا جارہا تھا۔ اس کی حالت دیکھتے ہوئے میری قوت برداشت جواب دے رہی تھی مگر محسن نے زیادہ ہوش مندی کا ثبوت دیا۔

"تمہارا پوتا ہم تمہارے حوالے کردیں گے۔"

"دیکھو، ابھی وہ آیا تھا۔" دوست محمد نے دونوں جانب دیکھ کے خوفزدہ لہجے میں کہا۔ "دونوں آیا تھا۔ انگریز کا جیسا بنا ہوا ہے۔ براؤن داڑھی، براؤن بال، لمبا بال۔ ہم سے بات نہیں ہوا۔"

"گڈ، یہ ہوئی نا کام کی بات۔ شام تک اسی جگہ بیٹھ کے ان کا انتظار کرو۔ وہ پھر آئیں گے اور اس مرتبہ ہم بھی دیکھیں گے پھر تمہارا کام ختم۔ تم اپنے پوتے کو لے کر جہاں چاہو چلے جانا۔ تمہارے مددگار بہت ہیں لیکن اس بچے کی مدد صرف تم کر سکتے ہو، تم ان کو روک کے رکھنا۔ کہنا کہ رابعہ کے پاس جانا ہے تو انتظار کرو، دو آدمی آئیں گے تمہیں اس کے پاس لے جانے کے لیے، پھر ہم آجائیں گے دو آدمی۔" وہ ہنسا۔

محسن نے مجھے نکلنے کا اشارہ کیا اور ہم بڑی عجلت میں وہاں سے فرار ہوئے۔ ہمارا مقصد اس وقت خود کو روپوش رکھنے کے علاوہ دلالہ کے اس ایجنٹ کا تعاقب کرنا اور اس کا سراغ لگانا تھا کہ واپسی پر وہ کس کو رپورٹ کرتا ہے اگر ہم خود اس کے پیچھے جاتے تو یہ ناممکن تھا کہ اسے پتا نہ چلتا۔ ابھی ابھی دوست محمد نے اسے ہمارا حلیہ بتایا تھا۔ وہ ہمیں دور سے بھی دیکھ لیتا تو پہچان جاتا۔ یہ کام اکرام شیخ بہتر طور پر کر سکتا تھا۔

اکرام شیخ کو اسی ریسٹورنٹ میں موجود پا کے مجھے تھوڑی سی خوشی ہوئی۔

"تم ابھی تک یہیں بیٹھے ہو ہاتھ پہ ہاتھ دھرے؟"

"اور کیا کروں؟" وہ بولا۔ "تم لوگ کچھ بتا کے نہیں گئے تھے کہ کب تک لوٹو گے اور وہ سب مال تو میری ٹیکسی میں ہی پڑا ہے۔"

میں نے سر پر ہاتھ مارا۔ "ہم بھی کیا درویش لوگ ہیں یار، اتنی دولت کو بھول گئے۔"

"شیخ جی، دھیان سے ایک بات سنو، عقل کو حاضر کرو اور کمر کس لو، ایک بندہ آرہا ہے۔" محسن نے کہا۔

"مجھ سے ملنے؟"

"وہ ایک شکاری ہے۔ دلاور کا نمائندہ خصوصی۔ ابھی وہ دوست محمد سے ہم دونوں کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ کیا پوچھ رہا تھا، یہ ہم فرصت ملنے پہ بتائیں گے۔" میں نے کہا۔ "دوست محمد نے ایک مجبوری کے باعث ہمارا سراغ دے دیا کہ فی زمانہ ہمارا کیا حلیہ ہے۔"

"مجبوری کیا تھی دوست محمد کی؟"

"یہ بھی ہم بعد میں فرصت ملنے پر بتائیں گے۔" محسن نے کہا۔

"اس کے پاس ریوالور بھی ہے۔" میں نے اپنی بات جاری رکھی۔

"اس لیے ہوشیار رہنا۔ جیسے ہی وہ باہر آئے ٹیکسی لے کر سامنے آجانا۔ اگر وہ کسی گاڑی میں ہو گا تو گاڑی کا نمبر دیکھ لینا اور اس کا پیچھا کرنا بصورت دیگر امکانات خاصے روشن ہوں گے کہ وہ تیری ہی ٹیکسی میں تشریف فرما ہو گا۔ پھر تو اسے شرافت سے اس کے ٹھکانے پر پہنچانا لیکن کرایہ مت چھوڑنا۔ واپس آ کے ہمیں بتانا ہم لانچ پہ ہوں گے۔ فی امان اللہ!"

"لیکن میں اسے پہچانوں گا کیسے؟"

"جیسے ہمارے چہروں پہ شرافت و نجابت کا نور ہے، ایسے ہی اس کی خباثت چہرے سے عیاں ہے۔" محسن بولا۔ "لیکن ظاہری حلیہ ایسا ہے کہ گہرے نیلے رنگ کی پتلون، سفید اور نیلی دھاری والی قمیص، لمبی مونچھیں، لمبی ناک، لمبا قد۔"

"بس اتنا کافی ہے... میں جاتا ہوں۔" اکرام شیخ نے ٹیکسی میں بیٹھنے کے بعد کہا۔

بہت دور سے ہم نے اسے گیٹ نمبر دو سے آتے ہوئے دیکھا۔ اگر اس کی اپنی گاڑی پارکنگ ایریا میں ہوتی تو وہ گیٹ نمبر ایک سے نکلتا۔ جب وہ اکرام شیخ کی ٹیکسی میں بیٹھ گیا تو ہم نے اطمینان کا سانس لیا۔

"کیا ہم دوست محمد کی کوئی مدد کر سکتے ہیں؟" محسن نے واپسی پر میرے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ "مثلاً یہ کہ کیا ہم اس کا پوتا اسے واپس دلوا سکتے ہیں؟"

"میرا خیال ہے کہ اس نے جھوٹ بولا تھا۔ ان کے پاس دوست محمد کا پوتا کیسے ہو سکتا ہے؟" میں نے کہا۔

"کیا بچے اغوا نہیں کیے جاتے؟"

"میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "مجھے یقین ہے کہ وہ دوست محمد کو بلیک میل کر رہے ہیں۔ شکاری اور کسی طریقے سے اس کو تعاون پر مجبور نہیں کر سکتے تھے، یہ تو ہمیں معلوم ہے کہ اس کے بیٹے کو خود اس کی بیوی نے قتل کیا یا کرایا اور ملک سے فرار ہو گئی۔ ایسی خبریں کبھی نظر آہی جاتی ہیں کہ عورت نے آشنا کے ساتھ مل کر شوہر کو مروا دیا مگر یہ بات میری عقل میں نہیں آتی کہ جس عورت نے یہ سب کچھ ایک باقاعدہ منصوبے کے تحت کیا..."

"یہ باقاعدہ منصوبے کے بارے میں آپ نے کیسے جانا...؟" محسن بولا۔

"شیروانی صاحب، وہ اس ملک سے ہی نکل گئی ہے۔ باہر جانے کے انتظامات پہلے سے کیے ہوں گے اس نے۔ پاسپورٹ ہو گا اس کے پاس، ویزا حاصل کیا ہو گا اس نے۔ پھر ٹکٹ لے کر کسی ایک فلائٹ کے لیے سیٹ کنفرم کرائی ہوگی۔ اس نے جو کچھ کیا اچانک نہیں کیا۔ ایسی عورت بچے کو لاوارث چھوڑ کے جا سکتی ہے؟ اس کا دو ہی تو بچہ تھا۔ اوّل تو یہ کسی بھی ماں کے لیے ممکن نہیں کہ وہ خود تو قتل کرے بھاگ جائے اور اولاد کو دُنیا کے رحم و کرم پہ چھوڑ دے۔ وہ خود گئی تھی تو بیٹے کو بھی لے جا سکتی تھی اور اگر کسی وجہ سے یہ ممکن نہیں تھا تو وہ بیٹے کو کسی محفوظ جگہ ضرور پہنچا دیتی۔ اگر ماں باپ کا گھر تھا تو وہاں کسی بہن یا بھائی کے پاس..."

"میری ناقص عقل میں یہ بات آگئی۔" محسن بولا۔ "لیکن یہ سوال خود دوست محمد نے کیوں نہیں پوچھا اس حرامزادے سے جو بار بار مغز فرائی کرنے کی دھمکی دے کر اسے دہشت زدہ کر رہا تھا۔"

"یار، وہ اپنے حواس میں کہاں ہے ورنہ ضرور پوچھتا کہ میرا پوتا تمہارے ہاتھ کیسے لگ گیا؟"

دوست محمد ابھی تک وہیں پڑا ہوا تھا اور اس کی حالت قابل رحم ہو رہی تھی۔ یہ جگہ بالکل الگ تھلگ تھی۔ آثار بتاتے تھے کہ پہلے یہ عمارت کا آخری کونا تھا جہاں دو دیواریں ملتی تھیں۔ کسی موقع شناس نظر نے اس کم خرچ بالانشیں جگہ کی کاروباری افادیت کو تاڑ لیا۔ اس نے تیسری دیوار اٹھا کے اور سیمنٹ کی شیٹس ڈالیں اور اس شیڈ میں کسی عوامی ریسٹورنٹ کا افتتاح کر دیا۔ مصوری کے کچھ نمونوں اور تحریروں سے یہی ثابت ہوتا تھا۔ معلوم نہیں ریسٹورنٹ کو کس کی نظر لگی کہ اب صرف تین دیواریں رہ گئی تھیں۔ چھت کی بھی ایک ہی شیٹ بچی تھی۔ باہر کی دیوار پر سفیدی کرنے والی کوچی سے واضح طور پر دھمکی دی گئی تھی کہ پیشاب کرنے والے کو گرفتار کیا جائے گا اور ایسا کرنے والے کو براہ راست مخاطب کر کے بھی بہت کچھ کہا گیا تھا مگر پھر بھی یہ جگہ مرجع خلائق تھی اور آزاد قوم کے مہذب افراد نے نوشتۂ دیوار کو نظر انداز کر کے ثابت کر دیا تھا کہ وہ گرفتاری سے نہیں ڈرتے۔

"یار، کیا ہم دوست محمد کو بچانے کے لیے کچھ نہیں کر سکتے؟ یہ یہاں رہے گا تو مر جائے گا، ورنہ مار دیا جائے گا۔ کل جب شکاری مایوس جائیں گے تو جاتے ہوئے اپنی ناکامی کا سارا غصہ اس شخص کو مار کر اتاریں گے جو یوں بھی زندہ لاش ہے۔" محسن نے دوست محمد کے قریب بیٹھ کے کہا۔

میں نے اس سے نظر ملائے بغیر کہا۔ "کاش! اسے ساتھ لے جانا ممکن ہوتا۔"

"اسے ساتھ لے جانا کیوں ممکن نہیں یار۔" محسن نے کہا۔ "یہ بہت کام کا آدمی ثابت ہو سکتا ہے ہمارے لیے۔ اس کا تجربہ..."

"مگر اس حال میں...؟"

"ہم اس کی یہ نشے کی لت چھڑا سکتے ہیں۔ ہم سب مل کر اس کی مدد کر سکتے ہیں۔ پہلے یہ ہماری مدد کرتا رہا ہے اب ہم اس کے کام نہ آئے تو یہ خود غرضی ہو گی۔ ہمارے ساتھ یہ محفوظ ہو گا۔ ہم زندہ رکھیں گے اسے۔" محسن بولا۔

"چل پھر اٹھا اسے۔" میں نے کہا۔

"ایسے نہیں، دوست محمد کو پہچاننے والے بہت ہیں۔ وہ پوچھ سکتے ہیں کہ اسے کہاں لے جا رہے ہو اور پوچھنے والوں کو بتا بھی سکتے ہیں کہ دوست محمد کو ہم کہاں لے کر گئے ہیں، یہ کام اس لونڈے کے سپرد کیا جا سکتا ہے۔"

"وہ کہاں ملے گا... چل دیکھتے ہیں۔"

شاید دوست محمد کی تقدیر یاور تھی کہ وہ لڑکا جو اپنے استاد کے ساتھ خلوص کا رشتہ رکھتا تھا، ہمیں آسانی سے مل گیا۔ ہم نے ایک شخص سے اس کے بارے میں پوچھا اور وہ چند منٹ میں اسے پکڑ لایا۔ ہم نے اسے مختصراً اپنے ارادے سے آگاہ کیا کہ ہم دوست محمد کو ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔

"اپنے ساتھ لے جائیں گے، کہاں؟"

"شاید ولایت۔" میں نے کہا۔ "اس کا علاج بھی ہو جائے گا۔ جب یہ واپس آئے گا تو بالکل صحت مند ہو گا پہلے کی طرح۔"

"یہ واپس آئے گا؟" لڑکے نے مشکوک سے لہجے میں بے یقینی اور اندر کے دکھ سے مغلوب ہو کے کہا۔

"تم تو جانتے ہو کہ اس کے کچھ دشمن ہیں۔ وہ ہمارے دشمن بھی ہو سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم ذرا بزدل لوگ ہیں اس لیے خود اسے اٹھا کے نہیں لے جا سکتے۔ یہ کام تم کر سکتے ہو کہ اپنے استاد کو ہماری لانچ پر پہنچا دو۔"

"آپ کی... اپنی لانچ ہے، کیا نام ہے؟"

"مرمیڈ، انگریزی میں لکھا ہوا ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم آگے جاتے ہیں۔ تم اس کو اٹھا کے چلو۔"

اب دوپہر ہونے کو تھی۔ بندرگاہ کے علاقے میں گہما گہمی اپنے عروج پر پہنچ گئی تھی۔ میں اور محسن جب لانچ کے قریب پہنچے تو دوست محمد کو لانے والا نوجوان بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ میں اسے نہیں دیکھ سکتا تھا مگر مجھے یقین تھا کہ وہ ہم پر نگاہ رکھے گا اور لانچ کو بھی تلاش کر لے گا۔

لانچ کے عرشے پر کوئی بھی نہیں تھا۔ میں اور محسن نیچے اترنے لگے تو آخری حصے کے کیبن سے کریم بلوچ کراہتا ہوا نمودار ہوا۔ اس کے چہرے، سر، ہاتھوں اور ٹانگوں پر پٹیاں لپٹی ہوئی تھیں۔ سر کے گرد لپٹی ہوئی پٹی پر خون کا ایک داغ پھیل گیا تھا۔ اس کے چہرے پر آنکھوں کے گرد بڑے بڑے نیل تھے اور ناک سوج گئی تھی۔

"کریم بلوچ!" میں نے چلا کے کہا۔

لیکن وہ مجھ سے پہلے چیخ مار چکا تھا۔ "صاب... یہ آپ ہے! ...آپ ہے صاب!" وہ اپنی تکلیف بھول کے ہماری طرف دوڑا ہوا آیا۔ "ابھی ہم آپ کو بھوت تو نہیں دیکھتا پڑا ہے صاب۔"

"کیا ہو گیا ہے تمہیں کریم بلوچ؟" محسن نے اسے کندھے سے

پکڑ کے کہا۔ "ہم بھوت نظر آ رہے ہیں تھیں۔"

"آہ ... آہ ... ایسا مت بولو صاب، سارا ہڈی الگ ہو جائیں گا۔ ایک دم چُورا ہو گیا ہے۔" وہ چلّانے لگا۔ "ہم مانتا ہے ... آپ ایک دم زندہ ہے، آپ مرا نہیں ہے، ہم مرنے والا ہے صاب، مگر بی بی صاب ہم کو یہی بولا کہ آپ مر گیا۔"

"کیا فضول بکواس کر رہے ہو، کس بی بی صاحب نے ایسی بات کہی ہے تم سے؟" میں نے کہا۔

"گل بی بی صاب نے ... وہ ہم کو بولا کہ کریم بلوچ تمھارا صاب خلاص، ایک دم خلاص، اس کو ایک لڑکی نے قتل کر دیا۔ وہ بہت روتا صبح سے ..."

"کیا گل بانو کا دماغ چل گیا تھا یا اس نے بھی پی لی تھی تمھارے ساتھ؟" محسن نے بھنّا کے کہا۔ "کہاں ہے وہ؟"

"سوتا پڑا ہے صاب۔" کریم بلوچ بولا۔ "آپ ابھی دیکھو اس نے گولی مولی تو نہیں کھایا ... بات ہی ایسا تھا صاب۔"

میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ "کس نے کہا تھا؟ کہاں سے سنی تھی یہ خبر کہ میں مر گیا اور یقین کیسے کر لیا تم دونوں نے، یار محسن تو جا کے دیکھ اس پاگل کو۔"

محسن نے اس کیبن کا دروازہ بجایا جس میں رابعہ کے ساتھ گل بانو کو جگہ ملی تھی۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔

"توڑ دے دروازے کو۔" میں نے چلّا کے کہا۔ "وہ سچ مچ ہی خواب آور گولیاں کھا کے نہ لیٹ گئی ہو۔"

محسن نے تھوڑا سا پیچھے ہٹ کے دروازے سے اپنا شانہ ٹکرایا۔ دروازہ نیچے سے ہلا جس سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ چٹخنی صرف اوپر سے لگائی گئی ہے۔ دوسری ٹکر میں اوپر کی دہلیز کے اسکرو نکل گئے۔ دروازہ کھلتے ہی میں نے گل بانو کو اپنے بیڈ پر دراز دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کیے ساکت و صامت پڑی ہوئی تھی۔

محسن نے اس کا ہاتھ تھام کے نبض دیکھی اور پھر پلکیں اٹھا کے آنکھوں میں جھانکا۔ میں نے اس کے سانس کی رفتار دیکھی۔

"میرے خیال میں تو کوئی تشویش کی بات نہیں۔" میں نے نیچے پڑی ہوئی ویلیم ٹو کی خالی شیشی اٹھا کے محسن کو دکھائی۔

"اس میں تیس گولیاں ہوتی ہیں۔" محسن بولا۔

"ہاں، ساٹھ ملی گرام کوئی خطرناک بات نہیں۔ ایک بار ڈاکٹر نے رابعہ کو دس ملی گرام کی چھ گولیاں ایک ساتھ دی تھیں اور میری پریشانی پر کہا تھا کہ شدید بے خوابی اور اعصابی دباؤ کی صورت میں اتنی ڈوز نارمل ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ تیس گولیاں بھی اتنی کے برابر ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ باقی دوائیں مقفل تھیں۔"

عرشے پر کسی نے زور زور سے چلّانا شروع کیا۔ "ابھی کون ہے ادھر، باہر آؤ۔"

یہ اسی لڑکے کی آواز تھی جو دوست محمد کو اٹھا کے لایا تھا۔

"کریم بلوچ؟" میں نے کہا۔ "دیکھو باہر ایک لڑکا آیا ہے۔ دوست محمد کو لے کر۔"

"کون دوست محمد؟"

"تم نہیں جانتے۔" میں نے جھلّا کے کہا۔ "ہو سکتا ہے، صورت دیکھ کے پہچان لو۔ اسے اپنے کیبن میں لے جاؤ، آرام سے لٹا دو۔"

کریم بلوچ کراہتا ہوا لنگڑاتا ہوا اور بڑبڑاتا ہوا اوپر گیا۔

"یہ کیا معاملہ ہے یار؟" محسن نے گل بانو کی طرف سے مطمئن ہو جانے کے بعد کہا۔ "گل بانو اتنی بے وقوف تو نہیں ہے کہ سُنی سنائی ہر بات پر یقین کر لے۔"

"یہ تو انتہا ہے یقین کی، اپنی جان لینے کی کوشش کرنا۔" میں نے وہیں فرش پر بیٹھ کے کہا۔ "بے سبب نہیں ہو سکتی یہ حماقت۔"

"اور اس کریم بلوچ کے ساتھ کیا ہوا ہے؟"

"ابھی پوچھ لیتے ہیں۔ پہلے تو جا اور کافی بنا کے لا۔ اس کا تو یہی علاج ہے۔" میں نے گل بانو کی طرف اشارہ کیا۔ "بلیک کافی۔"

"ڈاکٹر کی ضرورت نہیں؟" محسن نے تذبذب کے ساتھ کہا اور اٹھا۔

"نہیں یار، دو کپ اس کے حلق سے اتریں گے تو غنودگی کا اثر زائل ہونے لگے گا۔" میں نے کہا۔ "پریشان مت ہو۔ میں ذرا دوست محمد کو دیکھ لوں، کہیں وہ ہوش میں آتے ہی ہنگامہ کھڑا نہ کر دے۔"

دوست محمد کو لانچ پر لانے والا نوجوان جا چکا تھا۔ اب اس کے پاس کریم بلوچ بیٹھا ہوا تھا۔

"یہ ... یہ تو اپنا اُستاد ہے صاب۔" وہ بولا۔ "کیا ہوا ہے اس کو؟"

"کچھ نہیں، نشے میں ہے۔ تم پیتے ہو شراب اور یہ پیتا ہے چرس۔ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔" میں نے کہا۔ "جیسا اُستاد ویسا شاگرد۔ تم بتاؤ تمھاری یہ حالت کیسے ہوئی؟"

"وہ سالا موشن میاں، وہ ہم کو بہت مارا صاب۔ ہم ادھر تاریخ پتا کرنے کا واسطے گیا تھا۔" وہ کراہنے لگا۔

"کس اُلّو کے پٹھے نے یہ مشورہ دیا تھا تمھیں؟" میں نے برہمی سے کہا۔ "جب سالا معاملہ ہم نے ٹھیک کر لیا تو تم نے خود جا کے بگاڑ لیا۔ خود دولھا پہنچ گیا اپنی تاریخ لینے۔ تاریخِ وفات مل جاتی تمھیں تو اچھا تھا۔"

"ابھی غلطی ہو گیا نا صاب۔ وہ موشن میاں بڑا ..."

"تم جیسے لوگوں کے ساتھ یہی ہوتا ہے اور ہونا چاہیے جو اپنی عقل کے پیچھے لٹھ لیے پھرتے ہیں۔ پہلے وہ تم کو لوٹتا رہا اور اب کوٹ رہا ہے۔ عیش کرو، پیسہ بھی دو اور جوتے بھی کھاؤ۔ سچے عاشق ہو نا۔" میرا غصّہ ابھی ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔

لیکن بیچ میں دوست محمد بول پڑا۔ "او بابا، میرے کو ادھر کیوں لایا، میرے کو جانے دو۔"

"دوست محمد، دیکھو مجھے پہچانو۔" میں نے نرم لہجہ اختیار کر کے کہا۔ "میں سکندر بخت ہوں۔ میں لایا ہوں تم کو یہاں، اب تم اسی جگہ رہو گے ہمارے ساتھ۔"

اس نے اٹھنے کی کوشش کی اور نفی میں سر ہلانے لگا۔ "ہم ... ہم ادھر نہیں رہ سکتا ... وہ ... وہ بولا تھا۔"

میں نے کہا۔ "وہ بکواس کرتا تھا۔ تمھارا پوتا ان کے پاس نہیں ہے۔ اسے اس کی ماں اپنے ساتھ لے گئی تھی۔"

"ماں لے گیا تھا۔ تم ... تم کو مالوم ہے؟" اس کی آنکھوں میں بے یقینی کے ساتھ تھوڑا سا اطمینان اتر آیا۔

"میں نے معلوم کر لیا ہے۔ جب وہ تم سے باتیں کر رہا تھا تو میں سُن رہا تھا، پھر میں اس کے پیچھے گیا تھا۔ اس نے مان لیا کہ وہ سب جھوٹ تھا۔ وہ تم کو ڈرانے کے لیے تھا کہ تم ان کو میرے بارے میں بتا دو۔ میں اور محسن دونوں سامنے پہنچ گئے اچانک اور پوچھا کہ کیا بات ہے، کیوں تلاش کر رہے ہو ہمیں؟ اس کی حالت خراب ہو گئی، پھر ہم اس کو اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ اب فکر اور پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ وہ پھر کبھی نہیں آئے گا۔" میں نے ایک بہت لمبا جھوٹ بولا۔

"کبھی نہیں آئے گا ..." دوست محمد نے اپنی جیب ٹٹول کے سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ "تم مار دیا اس کو؟"

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔

"لیکن ... وہ اکیلا نہیں ہے۔" دوست محمد لرزتے ہاتھوں سے سگریٹ جلانے لگا۔ فی الحال میں نے اسے روکنا مناسب نہیں سمجھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ پُرسکون رہے۔

"تم کو ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہاں کوئی نہیں آئے گا۔" میں نے کہا۔

"تم ... تم سچ بولتا ہے نا ... اچھی طرح مالوم کر لیا ہے کہ وہ ... ہمارا بچّہ ان کا پاس نہیں ہے، وہ بہت ظالم لوگ ہے، وہ عورت بھی بہت ظالم ہے۔ ہمارا بیٹا لے لیا ... جب اس کا بیٹا جوان ہو ئیں گا تو ہم نے گا، ہم اس کو مار دے گا اور پھر پوچھے گا ابھی بتاؤ تمھارا دل کیسا پھٹ گیا ہے! ہمارا دل کا مانک۔" اس نے زور زور سے سینے پر ہاتھ مارا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ میں نے کریم بلوچ کو ہدایت کی کہ اس کا خیال رکھے اور واپس اس کیبن میں لوٹ آیا جس میں گل بانو اسی طرح محوِ خواب تھی۔ اس نے مردانہ کپڑے پہن رکھے تھے لیکن اس پوز میں نہ وہ اپنے حسن کو چھپا سکتی تھی نہ شباب کو۔ اس کے بال تکیے پر بکھر گئے تھے اور اس کے چہرے پر آ رہے تھے۔

وہ آٹھ فٹ لمبا اور چوڑا کیبن تھا جس کی دو دیواروں کے ساتھ انگریزی حرف ایل کی طرح ڈھائی فٹ چوڑے فولڈ ہو جانے والے تختے جوڑ دیے گئے تھے۔ دونوں تختوں کو اوپر اٹھا کے دیوار کے ساتھ ملایا جا سکتا تھا۔ مقابل کی ایک دیوار پر کپڑوں کے لیے الماری تھی اور وہ دروازہ تھا جو باہر کھلتا تھا۔ دوسری دیوار پر ڈریسنگ کیبنٹ تھی۔ ایک پٹ والی دو فٹ چوڑی اور تین فٹ اونچی کیبنٹ جس کے باہر والے حصّے پہ آئینہ تھا۔ اس کیبنٹ کے ساتھ ہی والا دروازہ ٹائلٹ کا تھا۔

درمیانی حصّے میں ایک فولڈ ہو جانے والی اسٹیل کی میز اور دو کرسیاں لگائی جا سکتی تھیں اور پھر تہ کر کے دیوار کے ساتھ کھڑی کی جا سکتی تھیں۔ جگہ کی کمی کے باعث لانچوں اور بحری جہازوں میں چھت سے فرش تک کی جگہ کے ایک ایک انچ کو ضرورت کے مطابق اسی طرح استعمال کیا جاتا ہے۔

محسن کافی لے کر آیا تو میں نے فولڈنگ میز کو درمیان میں پھیلایا اور خود ایک کرسی کھول کے بیٹھ گیا۔ محسن دوسرے خالی تختے پر آلتی پالتی مار کے بیٹھا۔ اس کا چہرہ متفکر تھا اور وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں نے اسے کریم بلوچ کے ساتھ موشن میاں کے سلوک کا ذکر کیا تب بھی وہ نہیں مسکرایا۔

"یار سکندر، کیا عجیب لڑکی ہے یہ بھی۔" اس نے گل بانو کی طرف دیکھ کر یوں کہا جیسے اس نے میری بات سنی ہی نہیں۔

"سب لڑکیاں عجیب ہوتی ہیں، بلکہ عجوبہ ہوتی ہیں۔ کبھی حسن کا، کبھی عشق کا۔ اور کبھی مجسّم حماقت کا۔" میں نے ایک فلسفیانہ خیال پیش کیا۔

محسن نے اقرار کا اظہار سر ہلا کے کیا۔ "اب اسی کو دیکھو۔"

"تم دیکھو بھائی، میں ذرا کافی بنا رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ ناگ منی تھی۔ ایک ڈکیت متعدد وارتوں میں ملوث۔ راتوں کو اندھیرے جنگلوں میں میلوں گھوڑے پر سفر کرنے والی اور خطرناک ڈاکوؤں کا ساتھ دینے والی۔ گولیوں کی بوچھاڑ سے نہ ڈرنے والی ... اور ان جرائم پیشہ اخلاق و تہذیب سے ناآشنا لوگوں کے درمیان ایسے رہنے والی۔"

"جیسے رہتی ہے زباں بتّیس دانتوں کے درمیاں۔ ایسا ہی کچھ فرمایا ہے کسی شاعر نے۔" میں نے کہا۔ "لے یہ کافی پی اور قنوطی نہ ہو۔ جب وقت آتا ہے تو قدرت کی جانب سے ایسے ہی معجزے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اس کی زندگی کے انقلاب کا وسیلہ ہم بنے۔ ہم اس پر فخر کر سکتے ہیں۔"

"خود اسے یہ نئی زندگی کتنی مہنگی پڑی ہے۔"

"کچھ پانے کے لیے کچھ تو دینا ہی پڑتا ہے اور اسے بھی خدا کی ایک اور مہربانی سمجھ کہ ناگ منی کا ردِ عمل مثبت سمت میں ہوا۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ اپنے بھائی کی موت کا فتے دار وہ ہمیں سمجھتی اور انتقامی جذبات

سے منسوب ہوکے وہی کرتی جو اس کے بھائی نے کیا تھا۔" میں نے کافی کے ساتھ باسی ڈبل روٹی کو کیک سمجھ کے کھالیا۔

ایک ہنگامہ پرور بے خواب رات کا صلہ تھکن، بوجھل آنکھوں اور بھاری سر کی صورت میں ملا۔ اس کا علاج نیند تھی صرف دو گھنٹے بھی مل جاتے تو میں سو جاتا۔ اور تازہ دم ہو کے اٹھتا لیکن ابھی پلک جھپکنے کی مہلت ملنا بھی مشکل تھا۔ گل بانو کا مسئلہ سر فہرست تھا۔ پھر اکرام شیخ کی بخیر و عافیت واپسی کی فکر تھی اس کے بعد یہ معلوم کرنا تھا کہ اس ایک رات میں غالب اور ناز و پر کیا گزری۔ دشمنوں کے حصار میں ان کی پوزیشن سب سے زیادہ نازک تھی۔ افشائے راز کا ڈر الگ ان کے اعصاب پر سوار رہتا ہوگا۔ ہم سے رابطہ نہ ہونے کا احساس ان کو زیادہ بے بس اور تنہا کرتا ہوگا۔ اگر جہاز نے اچانک لنگر اٹھا دیا تو ہمیں خبر ہونے تک وہ نہ جانے کتنی دور پہنچ جائیں گے....

ان حالات میں محسن کے خیالات بھی مختلف نہیں ہو سکتے تھے اس نے اچانک کہا۔ "یار اس کریم بلوچ کی عقل پر کس حد تک بھروسا کیا جا سکتا ہے؟"

"صرف عشق کے معاملے میں اس کی مت ماری جاتی ہے جو سب کی ہی ماری جاتی ہے۔" میں نے کہا۔

"اگر اسے ہم جاسوسی کے لیے بھیج دیں۔ یہ معلوم کر آئے کہ 'ایس ایس کرانتی تھرڈ' وہیں موجود ہے یا راتوں رات نکل گیا؟" محسن نے کہا۔

"کام تو مشکل نہیں، اسے سمجھانا پڑے گا کہ موشن میاں سے پرہیز کرے، ورنہ جس حالت میں جائے گا اس سے بدتر حالت میں واپس آئے گا۔ بشرط زندگی۔" میں نے کہا۔

"تم اسے اچھی طرح بریف کر کے روانہ کرو۔ میں اس فتنہ محشر کو جگالوں۔"

"اچھا... اگر آپ کو بے حد دلچسپی ہے اس کار خیر سے اور آپ چاہتے ہیں کہ میں یہاں سے دفع ہو کے تخلیہ فراہم کروں، تو میں دفع ہو جاتا ہوں۔" میں نے نکلتے نکلتے کہا۔ "ویسے یہ کام تو میں بھی کر سکتا تھا۔"

محسن جھینپ کے مسکرایا۔ "میں ایک شادی شدہ شخص ہوں جو زیادہ قابلِ اعتماد ہوتا ہے۔"

"اچھا... میرا خیال اس کے برعکس تھا۔"

جب میں کریم بلوچ کو مفصل ہدایات کے ساتھ جاسوسی کے مشن پر روانہ کرنے کے بعد واپس آیا تو محسن اپنی کوشش میں خاصا کامیاب ہو چکا تھا۔ اس نے ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارنے کے بعد گل بانو کے منہ پر اتنے تھپڑ مارے تھے کہ اس کے گال گلابی ہو رہے تھے وہ کچھ جاگ گئی تھی اور اب محسن کی پوزیشن یہ تھی کہ اس نے ایک ہاتھ گل بانو کی کمر میں ڈال کے اسے سہارا دے رکھا تھا۔ گل بانو اس کے اوپر یوں پڑی ہوئی تھی کہ اس کا سر محسن کے شانے پر تھا اور محسن دوسرے ہاتھ سے کافی کا مگ تھامے کوشش کر رہا تھا کہ وہ خود ہی کافی پی لے۔

"گل آنکھیں کھولو، چلو شاباش!" اس نے کافی کا مگ گل بانو کے لبوں سے لگایا۔ "پیو..."

گل بانو غنودگی میں کنگنائی۔ "آں... یہ... یہ تو... کڑوی ہے..."

"چلو ہوش میں آؤ گل۔ اس سے تمھاری طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔" اس نے مگ لبوں سے لگایا اور اسے ایک اور گھونٹ نگلنے پر مجبور کر دیا۔

گل بانو نے برا سا منہ بنایا۔ "کیا... یہ کیا کرتے ہو؟ مجھے سونے دو... مرنے دو مجھے..."

"نہیں، میں نہیں مرنے دوں گا تمھیں۔ تم کو زندہ رہنا ہے۔ اور تم زندہ رہو گی۔ یہ لو۔" اس نے مزید کافی گل بانو کے حلق میں انڈیل دی۔ "آخر کیوں سوجھی تمھیں مرنے کی؟ میرا بھی خیال نہیں آیا تمھیں پھر میں کیا کرتا...؟"

میں نے محسن کی کوشش کو دل ہی دل میں سراہا۔ وہ کسی عاشق صادق کا رول کرنے پر مجبور تھا اور یہ کام بہت حوصلہ طلب تھا۔ کچھ لوگ تو پیشہ ور عاشق ہوتے ہیں اور کسی کو بھی چاہت کا یقین دلانا ان کے لیے محض دل لگی ہوتی ہے مگر محسن جیسے شخص کے لیے جس نے کبھی کسی کو جانتے بوجھتے دھوکا نہ دیا ہو، یہ اداکاری بہت مشکل تھی۔ تاہم وہ اپنا فرض نبھا رہا تھا۔

بالآخر گل بانو نے آنکھیں کھول کے اسے دیکھا اور کچھ دیر پلک جھپکائے بغیر یوں دیکھتی رہی جیسے ذہن سے کسی گم گشتہ یاد کو کرید کر نکال رہی ہو اور پہچان کے حوالے تلاش کر رہی ہو۔ آہستہ آہستہ اس کی نظر محسن سے ہٹ کر مجھ پر فوکس ہوگئی پھر اس نے ایک چیخ ماری اور اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔ محسن نے گرم کافی کو اس کے اوپر گرنے سے بچانے کے لیے مگ ہٹا لیا۔ اس نے گل بانو کا سر تکیے پر رکھ دیا اور نرمی سے اس کے بالوں کو سہلانے لگا۔

"گل، ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ دیکھو میں ہوں تمھارے پاس اور یہ سکندر ہے۔"

گل بانو نے ڈرتے ڈرتے چہرے پر سے ہاتھ ہٹائے۔ اس کی آنکھوں میں ابھی تک خوف کے آسیب کا عکس نظر آتا تھا۔

"تم... نہیں... یہ خواب ہے... دھوکا ہے میری نظر کا۔" وہ بولی اور آنسو اس کی آنکھوں کے گوشوں سے اتر کے تکیے میں جذب ہوتے رہے۔ رونا ایک اچھی علامت تھی۔ اس کا احساس بیدار ہو گیا تھا۔

"تم کو کس نے بتایا تھا گل؟" محسن نے اس پر جھک کے کہا۔ "اور تم نے کیسے یقین کر لیا تھا اس خبر پر؟ دیکھو ہم زندہ ہیں۔ تمھارے قریب موجود ہیں۔ دیکھو یہ میرا ہاتھ ہے۔"

گل بانو نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کے اپنے گالوں سے لگا لیا۔ "محسن... معلوم نہیں... کیسا ڈراؤنا خواب تھا وہ... میں نے دیکھا کہ اخبار میں ایک خبر چھپی ہے... کوئی لڑکی موہنی نام کی تھی... اس کی تصویر کے ساتھ۔"

"موہنی کی تصویر؟" میرے دماغ کو جیسے برقی جھٹکا لگا۔

"ہاں... مجھے یاد ہے... اسی کا بیان تھا یہ..."

"گل بانو، کہاں ہے وہ اخبار؟" میں نے اسے جھنجوڑ کے کہا۔ "وہ خواب نہیں تھا... تم نے اخبار میں کچھ دیکھا تھا، کہاں سے آیا تھا وہ اخبار، کہاں رکھا تھا پڑھنے کے بعد... یاد کرو۔"

"مجھے ایسے مت دیکھو... میں نے کچھ نہیں کیا... کریم گیا تھا ناشتا لینے... وہ اخبار بھی لے آیا تھا..." وہ اب پوری طرح ہوش میں آگئی تھی۔ "اس نے دیکھا تھا کہ میں بور ہو رہی ہوں..."

"یہ سب مت بتاؤ مجھے۔ اخبار کہاں ہے؟" میں نے اس کے بستر کے اوپر نیچے گدے اور چادر کو ہٹا کر دیکھتے ہوئے کہا۔ اخبار مجھے تکیے کے نیچے تہ کیا ہوا ملا۔ میں نے اس کے دونوں صفحے الگ کیے۔ محسن نے ایک صفحہ مجھ سے لے لیا۔

"یہ... یہ موہنی کی تصویر ہے۔" محسن نے کہا۔

میں نے وہ صفحہ چھین لیا اور چند سیکنڈ موہنی کی صورت پر نظریں جمائے بیٹھا رہا۔ پھر میری نگاہ خبر کی سرخی پر جم گئی "پولیس کی تحویل میں بھارتی جاسوس حسینہ کی پراسرار ہلاکت۔" اگرچہ الفاظ میری آنکھوں کے سامنے دھندلا رہے تھے مگر میں نے خبر کا متن پڑھنا شروع کیا۔

"ایک حسین اور نوجوان لڑکی نے کل شام اس وقت سنسنی پھیلا دی جب اچانک پولیس اسٹیشن پہنچ کے اس نے خود کو قانون کے حوالے کیا اور کہا کہ اسے تحفظ فراہم کیا جائے کیونکہ چند نامعلوم افراد اس کی جان لینا چاہتے ہیں۔ اس لڑکی نے اپنا نام موہنی بتاتے ہوئے اعتراف کیا کہ وہ بھارت سے آنے والے تخریب کاروں کے ایک گروہ میں شامل تھی اور اس معاملے میں انتہائی اہم انکشافات کر سکتی ہے۔ ایس ایچ او نے حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے فوری طور پر اس عورت کو گرفتار کیا اور سخت پہرے میں حوالات کے ساتھ الگ کمرے میں بند کرنے کے بعد اس واقعے کی اطلاع اپنے اعلیٰ افسران کو دی۔ کہا جاتا ہے کہ اسی دوران دو مشتبہ افراد نے اس عورت سے قریبی تعلق ظاہر کرتے ہوئے اسے اپنے ہمراہ لے جانے کی بھی کوشش کی۔ ان میں سے ایک نے موہنی کا شوہر اور دوسرے نے بھائی ہونے کا دعویٰ کیا اور یہ بھی کہا کہ اس کا اصل نام رضیہ ہے اور وہ ذہنی طور پر نارمل نہیں ہے۔ تاہم انھوں نے اپنی گرفتاری کی کوشش ناکام بنا دی اور خودکار ہتھیاروں سے فائرنگ کرتے ہوئے ایک جیپ میں بیٹھ کر فرار ہو گئے جو انھوں نے تھانے کے باہر ہی کھڑی کی تھی۔

فائرنگ سے ایک سب انسپکٹر شدید زخمی ہو گیا جسے اسپتال میں داخل کر دیا گیا ہے۔ ہمارے نمائندے کی اطلاع کے مطابق بھارتی جاسوس حسینہ موہنی نے اصرار کیا کہ وہ مجسٹریٹ اور سفارتی عملے کے کسی ذمے دار فرد کی موجودگی میں بیان دینا چاہتی ہے۔ لیکن بھارتی کونسلیٹ نے اس الزام کو مسترد کرتے ہوئے مبینہ جاسوس عورت کو بھارتی شہری تسلیم کرنے سے بھی انکار کیا اور کہا کہ اس عورت کو جبر یا لالچ کے ذریعے ایک بے بنیاد بیان دینے کے لیے لایا گیا ہے جبکہ درحقیقت وہ پاکستانی عورت ہے جس کا نام رضیہ ہے۔ پولیس کے اعلیٰ حکام، وزارتِ خارجہ کے ایک افسر اور مجسٹریٹ کی موجودگی میں اس عورت نے جو بیان دیا اس سے اخبار نویسوں کو بے خبر رکھا گیا اور ان کے کسی سوال کا جواب دینے سے صاف انکار کی کوئی وجہ بھی نہیں بتائی گئی۔ پولیس نے صحافیوں کو پولیس اسٹیشن کی حدود میں بھی داخل ہونے سے روکا۔ اس بات سے بھی انکار کیا گیا کہ موہنی نام کی اس جاسوس حسینہ کو کسی نے زبردستی لے جانے کی کوشش کی تھی جب کہ عینی شاہدوں کے مطابق دو افراد تھانے سے فائرنگ کرتے ہوئے ایک بغیر نمبر کی جیپ میں بیٹھ کر فرار ہوئے تھے پولیس نے ایسے کسی واقعے سے لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے ایک سب انسپکٹر کے زخمی ہونے کو حادثہ قرار دیا جو ایک سپاہی سے اتفاقیہ گولی چل جانے کے باعث پیش آیا تھا لیکن تھانے کے عملے کے کسی فرد کو نہ غفلت کے الزام میں معطل کیا گیا ہے اور نہ کسی کے خلاف زیرِ دفعہ تین سو سات مقدمہ درج کیا گیا ہے۔ رات گئے ملنے والی اطلاعات کے مطابق مبینہ جاسوس حسینہ اپنا بیان دینے کے کچھ دیر بعد پراسرار طور پر ہلاک ہو گئی۔ پولیس کے ایک اعلیٰ ذریعے نے جس نے اپنا نام ظاہر نہ کرنے کی درخواست کی ہے، یہ بتایا ہے کہ اس پر پوچھ گچھ کے سلسلے میں کسی قسم کا جسمانی تشدد نہیں کیا گیا تھا۔ وہ عورت خودکشی کا مصمم ارادہ کرنے کے بعد بیان دینے آئی تھی۔ کیونکہ اسے اپنے قتل کا یقین تھا اور وہ سمجھتی تھی کہ پولیس کی تحویل میں بھی اس کی جان قطعی غیر محفوظ ہے۔ بیان پر دستخط کرنے کے بعد اس نے کسی زود اثر زہر سے اپنا خاتمہ کر لیا جو اس کے دانتوں کے درمیان کسی خلا میں ایسے ہی وقت کے لیے بھرا ہوا تھا۔ اس واقعے سے پولیس کے اعلیٰ افسران کی نااہلی بھی ثابت ہوتی ہے جو ایسے کسی امکان سے بے خبر رہے حالانکہ دنیا میں ایسے واقعات کی کمی نہیں جب انتہائی مایوسی کی حالت میں جاسوسوں اور سزائے موت پانے والوں نے اسی طرح پوٹاشیم سائنائیڈ نگل

کے اپنی زندگی کا خاتمہ کرلیا اور تفتیش کرنے والوں کی امیدوں کو خاک میں ملا دیا۔ یہ لازمی تھا کہ ایسی خطرناک جاسوس عورت کو اس وقت تک زندہ رکھنے کے لیے خصوصی اقدامات کیے جاتے جب تک کہ مکمل تفتیش کے نتائج سامنے نہ آتے۔ صحافت سے تعلق رکھنے والے تمام حلقوں نے پولیس کے رویّے اور حقائق کی پردہ پوشی کی کوشش کی سخت مذمت کی ہے۔ رات گئے تک اخباری نمائندوں کو پوسٹ مارٹم رپورٹ کا انتظار تھا۔ مزید سنسنی خیز انکشافات کی توقع ہے۔"

اس کے ساتھ ہی دوسری سُرخی تھی۔ بھارتی جاسوس حسینہ کے سنسنی خیز انکشافات۔ اخبارات کے نام دستخط شدہ بیان خود اس نے پولیس اسٹیشن جانے سے پہلے جاری کیا۔ اس خبر کے مطابق موہنی کا بیان ہاتھ سے لکھے ہوئے چھ صفحات پر مشتمل تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ کہاں پیدا ہوئی، کس قسم کے حالات کا شکار ہوئی اور پھر کیسے پاکستان پہنچی۔ موہنی کے بیان کا یہ حصّہ سو فیصد سچ پر مبنی تھا۔ اس نے میرا نام بھی لکھا تھا، میرے والد کا بھی اور اپنے بھائی کا بھی۔ یہ اعتراف بھی کیا تھا کہ وہ میری محبّت کو بھول نہیں سکی تھی اور صرف میری خاطر اس نے ہر قسم کی ذلّت قبول کی مگر بالآخر خود کو ان افراد کے ایک گروہ میں شامل کرانے میں کامیاب ہوگئی جو خفیہ طور پہ پاکستان میں علیحدگی پسندوں اور تخریب کاروں کو مدد اور تربیت دینے کے لیے سرحد عبور کرکے آئے تھے۔ اسے یقین تھا کہ اس طرح وہ مجھ سے مل سکے گی کیونکہ میرا اور میرے ساتھیوں کا براہِ راست ٹکراؤ ایسے ہی لوگوں سے تھا۔

اپنے بیان میں موہنی نے متعدد مقامات اور لوگوں کے حوالے دیے تھے جو سب درست تھے۔ اس نے تسلیم کیا تھا کہ وہ کئی ماہ کے بعد مجھ تک پہنچنے میں کامیاب رہی تھی اور اس نے کچھ وقت میرے ساتھ بھی گزارا تھا مگر وہ میرا اعتماد حاصل نہ کرسکی تھی جس سے اسے سخت مایوسی ہوئی تھی۔ موہنی نے میرے ساتھیوں کی نشان دہی بھی کی تھی جو وطن دشمنوں کے خلاف "ایم آر ایس" کے نام سے تحریک چلا رہے تھے اور ہماری متعدد کامیابیوں کا ذکر بھی کیا تھا مگر اس نے ہمارے کسی بھی دشمن کا نام نہیں لیا تھا۔ شاید وہ سمجھتی تھی کہ اس طرح ہماری مشکلات میں اضافہ ہو جائے گا۔

جھوٹ اس نے آخر میں بولا تھا کہ اب سے ایک ہفتے قبل میرے اور سکندر کے درمیان تلخ کلامی ہوئی۔ اس نے مجھے فاحشہ اور بے ضمیر کہا۔ دشمن اور ناقابلِ اعتبار قرار دیا اور کہا کہ وہ مجھ پہ تھوکتا بھی نہیں۔ یہی کافی ہے کہ بچپن کے تعلق اور سابقہ احسانات کے باعث اس نے ابھی تک مجھے شوٹ نہیں کیا۔ وہ رابعہ نام کی کسی لڑکی کو چاہتا ہے اور اس کے مقابلے میں میری وہی اوقات ہے جو کسی عبادت گاہ کے مقابلے میں کسی قحبہ خانے کی۔ اس تذلیل نے مجھے اتنا مشتعل کیا کہ میں نے اسے سزا دینے اور خود بھی سزا قبول کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ میں طے کرچکی تھی کہ اگر کبیر خاں میرا نہ ہوا تو رابعہ کا بھی نہ ہوگا۔ میں نے اس کے بارے میں اپنے ساتھیوں کو اطلاع دے دی۔ جن کا ساتھ میں چھوڑ چکی تھی۔ انھوں نے ایک رات کبیر خاں کے ٹھکانے پر حملہ کیا اور مقابلے میں کبیر خاں کے ساتھ اس کے کئی ساتھی بھی مارے گئے۔ جن میں خالد نام کا ایک سابق صحافی، ایک سابق سب انسپکٹر پولیس اکرام شیخ، حسن خان ایک لڑکی نازو جو اکرام شیخ کی بہن ہے اور چند دیگر افراد شامل تھے۔ میرے کئی پرانے ساتھیوں نے مجھے پہچان لیا اور مرنے نہیں دیا۔ وہ مجھ کو اپنے ساتھ کسی نامعلوم مقام پہ لے گئے جہاں مجھ سے پوچھ گچھ کی گئی۔ میں نے انھیں بتایا کہ میرا اس مشن پہ آنے کا مقصد ہی کبیر خاں عرف سکندر بخت تک رسائی حاصل کرنا تھا۔ میں اسے پہچانتی تھی اور اس کی تنظیم "ایم آر ایس" کو نیست و نابود کرنے کے بعد میرا یہ مقصد پورا ہوگیا ہے تاہم میری بات نے انھیں مطمئن نہیں کیا۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ جتنا عرصہ میں دشمن کی قید میں رہی، میں نے اپنے آپ کو کیسے محفوظ رکھا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ انھوں نے کوئی تفتیش نہ کی ہو اور میں نے انھیں کچھ نہ بتایا ہو۔ وہ تسلیم کرتے تھے کہ کبیر خاں سے میرا ایک دیرینہ تعلق تھا لیکن یہ ماننے پر تیار نہ تھے کہ "ایم آر ایس" جیسی تنظیم کے سربراہ نے ایک عورت سے جذباتی تعلق کی بنا پہ اس کی قومیت اور مذہب کے فرق اور سیاسی وابستگی کو نظرانداز کر دیا ہو۔ میں دھوبی کے کُتّے سے بدتر ہوگئی تھی۔ میں سکندر کا اعتماد حاصل نہ کرسکی تھی۔ حالانکہ اس کی خاطر میں نے اپنا مذہب تک بدل لیا تھا، اپنے ملک کو چھوڑ دیا تھا اور ماضی سے سارے رشتے منقطع کرلیے تھے۔ بائیس برس کی خلیج پاٹی نہیں جاسکتی تھی کیونکہ وہ مجھے بھول چکا تھا۔ یہ میری بھول تھی کہ اس کی خاطر میں نے زندگی تج دی۔ دوسری طرف مجھ پہ واپسی کے دروازے بند کیے جا رہے تھے۔ میں اپنوں کی نظر میں بھی اعتبار کھو بیٹھی تھی اور وہ میری وفاداری پر شبہ کر رہے تھے اور مجرم گردان رہے تھے۔ ان حالات میں میرے لیے نجات کا یہی ایک راستہ رہ گیا تھا کہ میں اپنی بے مصرف، بے آبرو اور بے غیرت زندگی کا سفر اسی دوراہے پہ ختم کر دوں جہاں سے ایک راستہ میرے ماضی کی طرف جاتا ہے تو دوسرا میرے مستقبل کی جانب۔ ماضی ایک یاد ہے اور مستقبل ایک سراب، حال ایک عذاب جسے میں اور نہیں جھیل سکتی۔ میں نے محبت کو بچپن کی معصوم رفاقت سے جوانی کی امنگوں تک پروان چڑھانے میں بائیس برس گزار دیے۔ یہ میری حماقت تھی یہاں کوئی پیچھے رہ جانے والوں کو یاد نہیں کرتا اور سب یادیں گزرتے ہوئے وقت کی گرد میں دفن ہو جاتی ہیں۔ میں اس ذلت کو بھی فراموش نہیں کرسکتی جو بائیس برس بعد مجھے خود اپنے محبوب و مقصود سے ملی۔ یہاں مجھے غالب کا ایک شعر یاد آتا ہے۔ لو وہ بھی کہہ رہے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے۔ یہ جانتا اگر تو لُٹاتا نہ گھر کو میں۔ سکندر نے مجھے صرف ٹھکرایا ہی نہیں، میری اپنی نگاہوں میں بھی رسوا کیا۔ اس نے رابعہ کی محبت کو جتنا بلند مقام دیا، مجھے اتنا ہی پستی کی جانب دھکیلا اور کہا کہ عرش کو فرش سے کیا نسبت۔ اس کے دل میں رقابت اور حسد کے جذبات پیدا کرنے کے لیے میں نے اپنے جذبات کا رُخ اکرام شیخ کی جانب کرلیا۔ میں اس پہ واضح کرنا چاہتی تھی کہ میں اتنی گئی گزری عورت نہیں ہوں۔ میری قوتِ تسخیر کے سامنے آج بھی کوئی نہیں ٹھہر سکتا۔ اور اس کے بے وقعت کرنے سے میں بے وقعت نہیں ہوئی لیکن افسوس، اس پتھر پہ خراش تک نہ آئی۔ میں اپنا سر پٹخ کے رہ گئی اور اس سے میرا احساسِ ذلت اور بڑھ گیا۔ میرا ردِّ عمل کسی زخم خوردہ ناگن کی طرح ہوگیا۔ میں نے اس سے انتقام لیا اور یہی وہ اذیت ہے جو اب مجھے جینے نہیں دیتی۔ خود میرا دل میرا دشمن بنا ہے۔ جو ہر وقت پوچھتا ہے کہ موہنی، کیا یہی تھی وہ محبت جس کی تو نے بائیس سال حفاظت کی، پرورش کی۔ اتنی نازک تھی وہ شاخ جس پر تو نے آشیاں بنایا تھا۔ ایک صدمے نے اس محبت کی بنیادیں ہلا دیں اور اسے زمین بوس کر دیا۔ نہیں، یہ محبت نہیں تھی، جسم کی طلب تھی، ہوس تھی۔ محبت ہوتی تو نفرت میں نہ بدلتی۔ سرحدیں نہ بدلتیں، صورتیں نہ بدلتیں، سکندر کو رابعہ کی ملکیت پاکے موہنی کو نہ بدلتی، چنانچہ اب موقع پاتے ہی میں یہاں سے نکل جاؤں گی اور ان تمام واقعات و حالات کی تحریر چھوڑ کے اس دنیا سے وہاں چلی جاؤں گی جہاں سکندر کے ساتھ رابعہ نہیں گئی ہے۔ وہاں جسم نہیں جاتا، اس کی اور میری روح شاید مل جائے۔۔۔ (نامکمل)۔"

اخبار میرے ہاتھ سے گر گیا، پھر میں خود نیچے گر گیا اور میرا سر تختے پر جا لگا۔ موہنی مر گئی، وہ عورت مر گئی جو بائیس برس تک سراب کے تعاقب میں رہی۔ میری محبت کو ایک امانت کی طرح سنبھال کے، زمانے کی دستبرد سے بچاکے اور دُنیا سے چھپا کے اپنے ساتھ رکھا لیکن سفر تمام ہوا تو اس کے کاندھے پر اپنی محبت کی لاش تھی۔ اس کی وفا کو میری جفا نے یوں مار دیا جیسے گناہ گاروں کے ہاتھ کسی جُرمِ بے گناہی کے مرتکب کو سنگسار کرتے ہیں۔ اس نے نارسائی کو اپنی تقدیر جان لیا، محرومیوں کے کانٹے چن لیے۔ سنگِ الزام اور تیرِ دشنام سب سمیٹ لیے اور ایک بار پھر مجھ پر زندگی کا قرض چھوڑ گئی۔ ایک بار جب خون کے پیاسے درندے میری تلاش میں تھے، اس نے مجھے اپنے گھر میں، اپنے پیار کی پناہ میں رکھا تھا۔ آج پھر وہ مجھے اپنی زندگی دے کر وہی تحفظ فراہم کرگئی۔ اس نے خود کو میرے راستے سے ہٹا لیا اور میرے راستے کے پتھر بھی ہٹا دیے۔ مرتے دم جھوٹ بولنے کو نیکی سمجھ کے قبول کیا اور وہ بیان دے گئی جو وقتی طور میرے خون کے پیاسے ہر شکاری کی پیش قدمی روک دے گا اور مجھے سب خطرات سے مامون کردے گا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں رو رہا تھا۔ وہ سب ستم جو میں نے روا رکھے، ہر زیادتی جو میں نے اس کے ساتھ کی، ہر زخم جو اس کے دل کو دیا، اب مجھے لہو رُلا رہا تھا۔ پس از مرگ تحفۂ وفا پانے والی موہنی کا متبسّم چہرہ میرے تصور میں رہا اور خیال کی بازگشت پکارتی رہی۔ گر بازی عشق کی بازی ہے جو چاہو لگا دو ڈر کیسا۔ گر جیت گئے تو کیا کہنے ہارے بھی تو بازی مات نہیں۔ موہنی جیت گئی تھی اور میں اپنی ہار کے احساسِ جرم میں مبتلا تھا۔

ایک ماتمی دوپہر ڈھل گئی۔ پہلے محسن نے میرے ساتھ موہنی کی یادوں کے مدفن پر اپنے اشکوں کے پھول چڑھائے، پھر اس کے ساتھ اکرام شیخ شریک ہوگیا۔ ہم باتیں کرتے رہے، شرمندہ ہوتے رہے۔ موہنی کی لاش کسی نامعلوم اسپتال کے مُردہ خانے کے سرد فرش پر پڑی رہی۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کیا کہتی ہے؟ وہ ہندو تھی کہ مسلمان؟ اس کے دل میں کتنی محبت تھی؟ کیسی تھی یہ محبت، شہابِ ثاقب جیسی۔۔۔ آتشِ خاموش کی مانند، تابکار؟ او نو، ڈیم اٹ آل۔ جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا۔ یہ دل بھی ایک ڈراما ہے۔ محبت بھی سیاست ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ موہنی تھی یا رضیہ؟ اس کا جنازہ پڑھا جائے گا یا چتا جلائی جائے گی۔ وہ سورگ باشی ہوئی یا جہنم رسید، غور طلب مسئلہ ہے۔

"کیا یہ سب ایسے ہی ہونا تھا؟" محسن نے ایک سوگوار وقفے کے بعد کہا۔

"ہاں، خودکشی سب سے باعزّت موت ہوسکتی تھی۔ یقیناً کچھ لوگ اس کی جان کے درپے تھے۔"

"کون لوگ؟"

"اپنے یا پرائے، اب کیا فرق پڑتا ہے اس سے۔" میں نے کہا۔ "تھے تو شکاری ہی مگر اسے شکار نہ کرسکے۔"

"لیکن میں نے اسے لاہور بھیجا تھا، انکل رضوی کے پاس۔۔۔ زیب النساء کے ساتھ۔" اکرام شیخ بولا۔

"معلوم نہیں زیب النساء بھی وہاں پہنچی یا نہیں۔" میں نے اس مسئلے کی سنگینی کا نئے پہلو سے جائزہ لیا۔

"کیا یہ ہوسکتا ہے کہ۔۔۔؟"

محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ ناممکن ہے۔ زیب النساء ایسی لڑکی نہیں ہے۔"

"میں اس پر کوئی الزام نہیں لگا رہا ہوں کہ اس نے موہنی کی مخبری کی اور اسے شکاری کُتّوں کے حوالے کر دیا۔ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ جو زیب النساء کو تلاش کر رہے ہوں، انھوں نے موہنی کو اس کے ساتھ دیکھ کر پہچان لیا ہو۔" اکرام شیخ نے کہا۔

"زیب النساء کا ایسا کون دشمن تھا؟"

"وہی جن کی وجہ سے وہ روپوش تھی۔ جو ہمارے دشمن ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ وہ بھی ہمارے ساتھ ہے۔" میں نے کہا۔

"اس کے بھائی نے بھی مرنے سے پہلے اسے کہا تھا کہ بھاگ جاؤ اور وہ خطرے کی بُو محسوس کرتے ہی غائب ہوگئی تھی۔ پہلے فلمی دنیا میں قدم رکھنے کی گمراہ کن خبر شائع کرا دی اور شکاری ادھر گئے تو خود کراچی پہنچ گئی۔ چالاک لڑکی تھی۔"

"تھی کیا مطلب؟" محسن چونکا۔

"نہ جانے کیوں... مجھے ایسا لگتا ہے کہ اس کے لیے ہمیں ماضی کا صیغہ ہی استعمال کرنا پڑے گا۔" میں نے کہا۔

"اخبار میں تو کچھ نہیں۔"

"میں لاہور فون کر کے معلوم کرتا ہوں۔" محسن اٹھا اور باہر نکل گیا۔

"میرا خیال ہے سکندر کہ موہنی نے یہ فیصلہ اچانک نہیں کیا۔" اکرام شیخ بولا۔ "یہ بیان اس نے پہلے سے تیار کر لیا تھا۔ اس نے لاہور جاتے ہوئے ٹرین میں یہ چھ صفحات نہیں لکھے اور پھر ان کی نقلیں تیار کرنا، اخبار کے دفتر پہنچانا اور خود پولیس کے پاس جانا۔ یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔"

"میں بھی قیاس آرائی کر سکتا ہوں۔ شاید وہ لاہور پہنچ کے یہ سب کرتی۔" میں نے کہا۔ "وہ شہلا اور آنٹی سے ملنا چاہتی ہوگی۔ میرا گھر دیکھنا چاہتی ہوگی، میرا اور رابعہ کا گھر۔ ان سب مقامات اور سب لوگوں سے شناسائی کا رشتہ استوار کرنا چاہتی ہوگی جن کا ہم تذکرہ کرتے تھے۔ مرنے سے پہلے آدمی ایسی ہی جذباتی تیاری کرتا ہے لیکن پھر راہ میں کچھ بات ہوئی کہ اسے لوٹ کر آنا پڑا۔ وہ جان بچا کے فرار ہونے میں کامیاب ہوگئی۔ وہ مرنے سے نہیں ڈرتی تھی۔ اسے فکر ہوگی کہ کہیں اس کا پروگرام چوپٹ نہ ہو جائے۔ وقتِ آخر اس نے پوری جدوجہد کی اور اپنے مقصد میں کامیاب رہی۔ وہ بہت مطمئن ہوگی جان دیتے وقت۔ بہت اچھی چال چل گئی وہ۔ ابھی کچھ عرصہ تو شکاری اپنے جال سمیٹ کر رکھ دیں گے کہ چلو قصہ ہی پاک ہوا، لیکن یہی مہلت ہمارے کام آئے گی۔"

"وہ شخص تو مجھے غچّا دے کر نکل گیا تھا۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "کہا تو تھا اس نے کہ صدر چلو۔ صدر میں ایک جگہ ٹریفک سگنل پر اتر کے بھاگ گیا۔ میرے اترنے اور شور مچانے سے پہلے ہی وہ کاروں کے بیچ میں سے گزر کے ایک گلی میں غائب ہوگیا۔ میں ٹیکسی کو وہاں نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ لائٹ گرین ہوگئی تھی۔"

"کیا اسے شک ہوگیا تھا؟"

"اگر شک نہیں ہوا تھا تو پھر وہ کسی کو دیکھ کے بھاگا تھا۔"

"بہتر ہوتا کہ ہم اسے یہیں دھر لیتے۔ خیر اب کیا معلوم کرے گا وہ ہمارے بارے میں اور کس سے معلوم کرے گا۔" میں نے کہا۔

گل بانو اس عرصے میں پھر سو گئی تھی جو ہم نے موہنی کو یاد کر کے گزارا تھا۔ اب اس نے آنکھیں کھول کے انگڑائی لی اور باری باری ہم دونوں کو دیکھا پھر اسے کچھ یاد آیا۔

"وہ اخبار تمھیں مل گیا تھا؟"

"ہاں، لیکن وہ خبر بے بنیاد تھی۔" میں نے کہا۔

"اخبار والے کیا پاگل ہیں کہ تصدیق کیے بغیر چھاپ دیتے ہیں۔" وہ بولی۔ "کچھ تو ہوگا..."

"تم دیکھ لو کہ ہم زندہ سلامت بیٹھے ہیں۔ یہ کسی نے شرارت کی ہے۔" اکرام شیخ بولا۔

"شرارت یا سازش؟" میں نے کہا۔ "سازشی ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ وہ پیسہ دے کر خبر بنوا سکتے ہیں اور لگوا سکتے ہیں۔"

"مگر اس میں ایک تھانے کا ذکر ہے اور تمھاری زبان سے میں نے کئی بار موہنی کا ذکر سُنا ہے۔" گل بانو آسانی سے ٹلنے والی نہیں تھی۔

"ہاں، سُنا ہوگا۔ موہنی کی حد تک یہ خبر درست ہوگی، لیکن ہمارے بارے میں شک کی کیا گنجائش ہے کہ ہم نہیں مرے۔"

"میں سمجھ گئی۔ اس نے تمھیں بچانے اور محفوظ رکھنے کے لیے ایسا بیان دیا۔ کون تھی وہ مجھے بتاؤ؟"

"ابھی محسن آئے گا اُس سے پوچھ لینا۔" میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "میں ذرا دیکھتا ہوں یہ کریم بلوچ کیوں واپس نہیں آیا ابھی تک۔"

کریم بلوچ کو گئے ہوئے ڈھائی گھنٹے سے زیادہ ہوگئے تھے۔ اگر وہ سیدھا جاتا اور جہاز کو دور سے ہی دیکھ کے لوٹ آتا تو یہ ایک گھنٹے کا کام بھی نہیں تھا۔ میں نے پہلے خود جا کے دیکھنے کا ارادہ کیا مگر پھر اسے خلافِ احتیاط سمجھتے ہوئے بدل دیا۔ اس حلیے میں میرا جہاز سے دور ہی رہنا بہتر تھا۔

میں نے نیچے جا کے دوست محمد کو دیکھا۔ وہ ایک سگریٹ ختم کر رہا تھا اور نشے کی ترنگ میں جھوم رہا تھا۔

"دوست محمد! تم نے کچھ کھایا پیا ہے؟"

اس نے لال لال آنکھیں کھول کے مجھے دیکھا۔ "اپن غم کھاتا ہے اور یہ پیتا ہے۔" اس نے سگریٹ کو لہرا کے آخری کش لیا۔

"یہ سب نہیں چلے گا یہاں۔" میں نے کہا۔ "کیونکہ تم ہمارے ساتھ چل رہے ہو۔"

"تم سالا کون ہوتا ہے یہ فیصلہ کرنے والا۔ ہم کہیں نہیں جائیگا اور تم ہم کو روک نہیں سکتا۔ ہم شراب بھی پیے گا، چرس بھی پیے گا..."

"نشے والی سگریٹوں کا یہ آخری پیکٹ ہے۔ اس کے بعد میں تمھیں سمندر کا پانی پلاؤں گا اور تم کو یہاں باندھ کے ڈال دوں گا۔ جتنا جی چاہے شور کرنا، گالیاں دینا، مجھے یا مرنے کی دھمکی دینا۔ میں ایک نہیں سنوں گا۔ میں دیکھوں گا کہ تم کیسے زندہ نہیں رہتے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔

وہ تھوڑا سا ڈر گیا۔ "تم ابھی تھوڑا مہربانی کرو ہمیرے کو ادھر چھوڑ دو۔ میں کچھ نہیں کر سکتا تمھارے واسطے۔"

"ابھی تو ہمیں ہی کچھ کرنا ہوگا۔ بعد میں تم وہ سب کرو گے جو پہلے کرتے تھے۔ یہاں رہو گے تو وہ تم کو مار دیں گے جو تم سے میرے بارے میں پوچھ رہے تھے۔"

"تم... قسم کھائے گا کہ ہمارا بچہ... ہمارا بیٹا کا بیٹا... ان کا پاس نہیں ہے۔" وہ بولا۔

"لوگ قسم کھانے والوں کو جھوٹا سمجھتے ہیں۔ پھر بھی اگر تمھاری تسلی ہو سکتی ہے تو میں قسم کھا کے کہہ سکتا ہوں کہ تمھارے پیارے پوتے کو تمھاری بہو اپنے ساتھ لے گئی تھی۔"

"تم نے یہ کیسے معلوم کیا؟"

"تم جانتے ہو کہ میرے لیے ناممکن کچھ نہیں۔ میرے تعلّقات بہت وسیع ہیں اور وسائل لامحدود ہیں۔ میرے ساتھی ہر جگہ ہیں اور معلومات حاصل کرنے کے لیے پیسہ سب سے زیادہ کام آتا ہے۔" میں نے کہا۔

"اچھا، تو ایک مہربانی کرو، یہ بھی معلوم کرو کہ وہ کنجری، ہمارا بیٹے کا خون پینے والا چڑیل، کس یار کے ساتھ گیا ہے؟ کون تھا وہ؟ جس کے لیے اس نے اپنا خاوند کو مارا۔ اصل مجرم وہ ہے جس نے عورت کو بہکایا، اس کو قابو کیا اور اس کو لے کر بھاگ گیا۔" وہ خلا میں گھورتا رہا۔

"میں... میں معلوم کر کے بتا دوں گا۔" میں نے کہا۔

"تمھارا احسان ہوگا جسے ہم کبھی نہیں بھولے گا۔ سارا عمر تمارا غلام رہے گا۔ جو تم کہے گا وہ کرے گا۔" وہ سسکیاں لے لے کر رونے لگا۔

میں نے اُسے تھپکی دی۔ "دوست محمد! یہ میرا وعدہ ہے کہ ایک دن میں تمھارے بیٹے کے قاتل کو تمھارے حوالے کر دوں گا لیکن یہ میں ابھی نہیں بتا سکتا کہ وہ دن کب آئے گا۔ اس کے لیے تم کو انتظار کرنا پڑے گا اور زندہ رہنا ہوگا۔"

"ام... زندہ رہے گا... اُس کا خون پینے کا واسطے زندہ رہے گا۔ ام اُس کا پیٹ پھاڑیں گا، دل نکال کے چبائیں گا تو ہمارا دل کو قرار آئیں گا۔" وہ چلّانے لگا۔ "ورنہ ہم قبر میں بھی تڑپے گا۔"

یہ وقت ایسا تھا کہ میں دوست محمد کو عفو و درگزر کی تلقین نہیں کر سکتا تھا، یہ نہیں سمجھا سکتا تھا کہ وہ قاتل کے حساب کو یومِ حساب پر چھوڑ دے۔ قدرت کے نظامِ انصاف پر بھروسا کرے کہ یہاں دیر ممکن ہے اندھیر ممکن نہیں۔

میں نے کہا۔ "دوست محمد! تم کو کسی پر شک ہے؟"

اُس نے نفی میں سر ہلایا۔ "پولیس بھی یہ پوچھتا تھا۔ ہم بولا کہ بابا شک سے کیا ہوتا ہے۔ ہم کیا بتا دے ادھر وہ کس سے ملتا تھا۔ ہم کو بتا کے تو نہیں ملتا تھا۔"

"تمھاری یہ بہو... کیا بہت دولت مند تھی؟" میں نے کہا۔

"دولت بہت تھا اُس کے پاس لیکن سب ہمارا تھا۔ وہ سب کچھ ہم دیا اُس کو۔" وہ سینے پر زور سے ہاتھ مار کے بولا۔ "روپیہ پیسہ... زیور... کپڑا... ہم بوہت کمایا مگر بابا، ہم اپنے واسطے نہیں کمایا۔ کیا کریں گا ہم یہ سب؟ اپنا ساتھ لے جائیں گا قبر میں؟ قبر اپنا کدھر ہوئیں گا۔ ابھی دو بار بچ گیا۔ تیسرا بار ڈوب جائیں گا اسی سمندر میں۔"

"کیا وہ بہت خوب صورت بھی تھی؟"

"ہاں، ادھر ڈانس مانس کرتا تھا، نیپئر روڈ پر۔ ہمارا بیٹا کا دل آگیا۔ ہم بھی بولا اور سب لوگ بولا کہ یہ کنجری لوگ کسی کا نہیں ہوتا۔ مگر وہ بولا کہ ہم شادی کریں گا تو ایک کنجری کم ہو جائیں گا۔ ایک عورت نیک راستہ پر آئیں گا۔ تو یہ... ثواب والا کام ہے کہ نہیں۔ شریف لڑکی تو سب مانگتا ہے بیوی بنانے کا واسطے۔ وہ ہم کو ایسا لیکچر دیا کہ ہم مان گیا۔"

وہ نیپئر روڈ کی طوائف تھی، اس انکشاف نے مجھ پر امکانات کے کئی روشن دروازے کھول دیے۔ یہ ہو سکتا تھا کہ وہ کہیں بھی نہ گئی ہو۔ وہ واپس اُسی کوڑے کے ڈھیر پر پہنچ گئی ہو، جہاں اُس نے عشوہ گری، جسم فروشی اور زر پرستی سیکھی تھی۔ ایسے ایک احمق ملا تھا جس کے پاس دولت تھی مگر وہ اس کی اپنی کمائی نہیں تھی۔ اُسے باپ کی دولت بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے مل رہی تھی۔ چنانچہ وہ اس کی قدر کرنا نہیں جانتا تھا۔ جتنی آسانی سے وہ دولت ملی تھی اتنی ہی آسانی سے اُس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ جان اُس نے مفت میں گنوائی۔ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ طوائف واقعی شمعِ محفل کی حیثیت چھوڑ کے چراغِ خانہ بننے کی آرزو رکھتی ہو مگر سب کچھ آرزو کی بات تو نہیں۔ اُس کے محافظ اور نگران، اُس کی کمائی کھانے والے مُردار خور گدھ، اُس کو زبردستی واپس لے گئے ہوں۔ انھوں نے بنائے فساد کو ہی ختم کر دیا ہوگا اور مجرم اس عورت کو بنا دیا ہوگا تاکہ وہ پھر کبھی ان کی جیل سے نکل بھاگنے کی کوشش بھی کرے تو پھانسی کا پھندا سامنے آجائے۔ دنیا میں ایسا بھی ہوتا ہے۔ کتابی باتوں، اصولوں اور نظریات کی دنیا بڑی اچھی ہے مگر ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے۔ حقائق کی دنیا میں ایک انڈر گراؤنڈ

ورلڈ بھی ہے جس میں کوئی قانون، اصول اور ضابطہ نہیں چلتا۔ پولیس کو دوست محمد سے کیا لینا دینا۔ انھوں نے اُسے قاتلہ کے فرار کی جھوٹی کہانی سنا کے ٹال دیا۔

"کیا نام تھا اس طوائف کا؟" میں نے خاموشی کے اس طویل وقفے کو ختم کیا۔

دوست محمد چونکا۔ "پہلے تو گولی تھا۔ ابھی شادی کا بعد شریفاں ہوگیا تھا۔"

گولی — ریوالور کی یا بندوق کی، مشین گن کی یا بازارِ حسن کی، آدمی کی جان اسی طرح لیتی ہے۔ اس کا نام شریف النساء یا انارکلی رکھنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آہستہ آہستہ میرا یقین پختہ ہوتا جا رہا تھا کہ وہ عورت تلاش کرنے پر گنا ہوں کی کسی بستی میں ضرور مل جائے گی۔ یہ ہوسکتا ہے کہ ابھی اس کو کراچی سے کہیں اور بھیج دیا گیا ہو اور پولیس کو مالِ غنیمت سے اتنا مل گیا ہو کہ حسبِ سابق ان کے مشترکہ مفادات کا معاہدہ برقرار رہے۔

میں دوست محمد کو تسلی دے کر لوٹا تو کریم بلوچ بدستور غائب تھا اور یہ بات خاصی تشویش کی تھی۔ کیبن میں گل بانو اور اکرام شیخ اپنے اپنے خیالوں میں گم چپ چاپ بیٹھے ہوئے تھے۔ میں اندازہ کرسکتا تھا کہ شیخ کی ذہنی کیفیت کیا ہوگی۔ اُسے موہنی نے دہرا غم دیا تھا۔ ایک جدائی کا اور دوسرا یہ انکشاف کر کے کہ اُس کا التفات ایک فریب تھا، وہ جسے پیار کا انداز سمجھ بیٹھا تھا، وہ اس کے جذبات کا انتقامی انداز تھا۔ انتقام وہ مجھ سے لینا چاہتی تھی اور اُس نے شیخ کو آلہ کار بنا لیا تھا۔

گل بانو نے شاید اکرام شیخ سے موہنی کے بارے میں سب کچھ معلوم کر لیا تھا اور اب افسردہ بیٹھی تھی۔ وہ بھی ایک عورت تھی اور موہنی کی محبت کے انجام نے اس کی نظر میں مجھے قاتل بنا دیا ہوگا۔ اس کی نظروں میں میرے لیے ملامت تھی لیکن میں نے اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہا۔ وہ انصاف کرسکتی تو شاید مجھے سب سے زیادہ مظلوم مان لیتی۔ ظلم تو مجھ پر موہنی نے کیا تھا۔

"کریم بلوچ نہیں آیا؟" میں نے اعصاب کو متاثر کرنے والی خاموشی سے گھبرا کے کہا۔

"میں دیکھ کے آتا ہوں۔" اکرام شیخ نے کہا۔

میں اور گل بانو تنہا رہ گئے۔ اُس نے کہا۔ "تم موہنی کو بچا سکتے تھے۔"

"میں نے ہی نہیں، ہم سب نے پوری کوشش کی تھی۔" میں نے بھڑک کے کہا۔ "ہم سب چاہتے تھے کہ وہ زندہ رہے اور خوش رہے مگر وہ کچھ اور چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ میں اس سے محبت کروں جو میرے اختیار میں نہ تھا۔ اختیار کی بات ہوتی تو وہ اکرام شیخ کی محبت کا جواب محبت سے دے سکتی تھی۔ ظلم تو اُس نے اکرام شیخ پر بھی کیا کہ اُسے محبت کا فریب دیتی رہی اور وہ ہم سب کی طرح اسے محبت سمجھتا رہا۔"

"تم نے اعتماد نہیں کیا اس پر۔ ۔ ۔"

"یہ غلط ہے۔ اب ایسا نہیں تھا۔ شروع شروع میں ہم اعتبار کرتے ہوئے ڈرتے تھے۔ وہ تخریب کاری کے ایک ٹھکانے سے پکڑی گئی تھی۔ ہندو تھی اور بھارتی شہری تھی۔ ان سب باتوں کو میں کیسے نظرانداز کر دیتا۔ بچپن کے تعلق کا آج کی سیاست سے کیا تعلق، بہت تھے میرے جاننے والے مگر وہ سب آج میرے دوست نہیں ہیں۔ میں کیسے مان لیتا کہ بائیس سال سے وہ ایک ناقابلِ یقین قسم کے غائبانہ عشق میں مبتلا تھی۔ میں نے اسے افسانہ سمجھا تو میرا کیا قصور، حقیقی دنیا میں میں نے ایسا عشق کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔ بعد میں اُس نے سب کا اعتماد حاصل کر لیا تھا۔ ہم اسے اپنا ہی سمجھتے تھے۔ میرا خیال تھا کہ وہ بھی اس حقیقت کی تلخی کو قبول کر چکی ہے کہ میں اُسے رابعہ کی جگہ مرنے کے بعد بھی نہیں دے سکتا۔ کسے معلوم تھا کہ دیوانگی میں وہ اس حد تک بڑھ جائے گی۔ وہ مجھ پر ہی نہیں، رابعہ پر بھی ندامت کا وہ داغ چھوڑ گئی ہے جسے ہم ساری عمر چھپانے کی کوشش کرتے رہیں گے لیکن اُس کے لہو کے جو چھینٹے میرے دامن پر آئے ہیں اُن سے میں کیسے نظر چراؤں گا۔"

اس وقت گل بانو نے ایک عجیب حرکت کی۔ اُس نے نیچے میرے پاس بیٹھ کر میرا سر اپنے شانے پر رکھ لیا۔ "چلو چھوڑو، اتنا دکھی مت کرو اپنے آپ کو۔" اُس نے میرے سر کو تھپکتے ہوئے کہا۔ "تم نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ تم مجبور تھے میرے ویر۔"

مجھے یوں لگا جیسے میں اپنی بڑی بہن کی پُرخلوص، بےغرض محبت کی ٹھنڈی چھاؤں میں پہنچ گیا ہوں۔ اس شفقت اور غمگساری نے میرے دل کو وہ سکون دیا کہ خودبخود میرے آنسو بہنے لگے، وہ مجھے تسلی دیتی رہی۔

"مرد ہو کے روتے ہو۔ یہی تو زندگی ہے۔ دیکھو اُس نے کس طرح مجھ سے سب کچھ چھینا اور پھر کیا دے دیا۔ جو میرے بھائی کو نہ مل سکا وہ مجھے مل گیا۔" اُس نے اپنے ہاتھوں سے میرے آنسو صاف کیے۔ "وہ سب رشتے اب میرے ہیں جن کے مفہوم سے میں ناآشنا تھی۔"

میں نے آہستہ سے سر اٹھایا۔ "پھر تم نے یہ کیا حماقت کی تھی؟"

"میں ڈر گئی تھی بھائی۔ میں سمجھی۔ ۔ کہ میں پھر اکیلی ہوگئی ہوں۔" وہ بولی۔

"کیا وہ زندہ نہیں رہتے جو اکیلے ہو جاتے ہیں؟ اور پھر تم ایک خاندان میں ہو۔" میں نے کہا۔ "جو بہت بڑا ہے۔ اس میں صرف میں اور محسن ہی نہیں، اکرام شیخ، غالب اور نازو، شہلا اور اُس کا بیٹا، دوست محمد اور کریم بلوچ۔ یہ چند نام ہیں لیکن ان کے علاوہ بھی بہت لوگ ہیں جن سے تم واقف نہیں ہو لیکن وہ سب بھی تم سے وہی رشتے رکھتے ہیں، انسانیت، شرافت، محبت اور خلوص، اعتماد اور سچائی کے رشتے۔"

"کیسے عجیب نام ہیں ان رشتوں کے۔" وہ بولی۔

"وعدہ کرو آئندہ ان رشتوں کو ٹھیس نہیں پہنچاؤ گی۔" میں نے کہا۔ "تقدیر کے فیصلے تو قبول کرنے ہی پڑتے ہیں لیکن تدبیر پر تو اپنا اختیار رہتا ہے۔ ہم سب ایک دوسرے کا سہارا ہیں، ایک دوسرے کی طاقت ہیں جیسے نظامِ شمسی کے سیارے آپس کی کشش کے توازن پر قائم ہیں اور گردش کر رہے ہیں۔"

"تم بہت عالم فاضل ہو۔ کہیں پروفیسر ہونا چاہیے تھا تم کو۔" وہ مسکرائی۔

"میں نے کیا کہا ہے، وعدہ کرو نہیں تو پنچ پہ کھڑا کر دوں گا۔" میں نے اُسے ڈانٹ کر کہا۔

"وعدہ سر، وعدہ۔" وہ کان پکڑ کے بولی۔ "آئندہ میں خودکشی کروں تو مجھے جان سے مار دینا۔"

"چلو اب جا کے نہا دھو لو، کچھ طبیعت ہلکی ہو جائے گی۔ اور یہ کپڑے۔ ۔ ۔ خیر۔ ۔ ۔ رہو گی تم گل بانو، خواہ نام اپنا گل خان رکھ لو اور حلیہ گل محمد کا بنا لو۔" میں نے کہا۔

"گل خان، یہ ٹھیک ہے۔" وہ ہنس پڑی۔ "جب تک میں گل بانو نہیں بن جاتی۔ ۔ ۔ گل خان۔"

"لیکن محسن تو اوپر کا نقطہ نیچے لگا کے بولے گا۔ ایسی ہی گڑبڑ پھیلاتا ہے وہ۔" میں نے کہا۔

وہ ذرا دیر سے سمجھی کہ اس طرح وہ گل جان ہو جائے گی۔ پھر اچانک اس کے رخسار دمک اٹھے اور میں نے پلٹ کے دیکھا تو محسن دروازے میں کھڑا ہوا تھا۔ شاید اس نے کچھ گفتگو سن لی تھی۔ گل بانو باتھ روم کا دروازہ کھول کے غائب ہوگئی تو وہ آگے آیا۔

"یہ تو اچھا نہیں کر رہا ہے یار۔" وہ سنجیدہ ہو کے بولا۔ "اس آگ کو ہوا مت دو جو تمھاری پھینکی ہوئی چنگاری سے لگی ہے۔"

"یہ حالات کا تقاضا ہے۔"

"کل اگر پھر کوئی موہنی حالات کے تقاضوں پر قربان ہو جائے تو مجھے الزام مت دینا۔" وہ ایک دم بھڑک اٹھا۔ "تم لوگ مجھے مجبور کر رہے ہو کہ میں اس خطرناک کھیل میں فریق بن جاؤں جس کے نتائج سب کے حق میں خطرناک ہوں گے، میرے لیے بھی، شہلا کے لیے بھی اور گل کے لیے بھی۔"

"میں تجھے مجبور نہیں کر رہا ہوں، تو انکار کرسکتا ہے۔ آج بھی اُس نے خودکشی کی ناکام کوشش کی تھی، کل یہ کوشش کامیاب ہو جائے گی، اللہ اللہ خیر سلاّ۔" میں نے کہا۔ "اوّل مرنا آخر مرنا۔ اُسے مرنا ہی ہے تو جینے کا موقع فراہم کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"شاید تیرے لیے یہ کام آسان ہو۔"

"ہاں، میں یہ کرسکتا تھا بشرطیکہ اس نے مجھ سے جذباتی سہارا مانگا ہوتا۔" میں نے کہا۔ "اور میں رابعہ کو بھی بتا دیتا۔ نہ بتاتا تب بھی کسی اندیشے کا شکار نہ ہوتا اس لیے کہ میں رابعہ کو سمجھتا ہوں اور اتنا ہی وہ مجھے سمجھتی ہے۔ وہ میرا ساتھ دیتی۔ کسی کو زندگی کی طرف لے جانا تو کارِ ثواب ہے۔ پھر یہ اُمید کی جاسکتی ہے کہ جب اُسے جینا آجائے گا تو وہ خود اپنے سہارے پر بھی جی لے گی، جیسے بچہ پہلے واکر کے سہارے چلتا ہے۔ پھر واکر کے بغیر چلنے لگتا ہے۔"

"زیب النساء وہاں نہیں پہنچی۔" محسن نے منہ دوسری جانب پھیر کے کہا۔ وہ گل بانو کے موضوع پر بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔

"نہیں پہنچی؟" میں نے کہا۔ "کسی سے بات ہوئی؟"

"شہلا سے اور آنٹی سے۔" وہ بولا۔

اُس کے جذبات میں منفی خیالات کی رَو کا سبب میری سمجھ میں آگیا۔ "یہ تو کوئی لمبا چکر ہوگیا۔"

"اکرام شیخ نے غلطی کی۔ وہ لاہور سے بھاگ کے کراچی آئی تھی اُسے واپس بھیج دیا۔ میرا تو خیال ہے کہ وہ دونوں ہی آدھے راستے سے لوٹ آئیں۔" محسن بولا۔

"مگر انھیں نہ جانا ہوتا تو وہ شیخ کے سامنے انکار کرسکتی تھیں۔ شیخ انھیں زبردستی تو نہ بھیجتا۔" میں نے کہا۔ "اُس نے اپنی طرف سے ٹھیک کیا تھا۔ اب غلط ہوگیا تو الزام اُسے دینے سے کیا فائدہ۔ دیکھنا یہ ہے کہ ہم کیا کرسکتے ہیں اب۔"

"ہم کچھ نہیں کرسکتے۔ پولیس کو اس کی گمشدگی کی رپورٹ تک نہیں دے سکتے۔" محسن نے تلخی سے کہا۔ "میں نے شہلا سے کہا ہے کہ اخبارات دیکھے، حادثات کی خبریں اور پُراسرار جرائم کی خبریں اور کچھ نہ ملے تو منظر کو بتا دے۔ وہ بھی کیا کرسکتا ہے۔"

"ہاں۔" میں نے کہا۔ "اُس کے پاس کیا اختیار ہے کہ وہ ایک اجنبی لڑکی کے بارے میں کسی سے کچھ کہے۔ اور کہے گا بھی کیا، ایک لڑکی کراچی سے لاہور جانے کے لیے سوار ہوئی مگر لاہور نہیں پہنچی۔ آئی بھی لاہور سے ہی تھی وہ۔ لاہور کا شہر اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ وہ لاہور میں روپوش بھی رہی تھی، پھر روپوش ہو

سکتی ہے۔ اس کا والی وارث کوئی ہے نہیں۔ وہ خوب صورت ہے اور پڑھی لکھی ہے، بالغ ہے، اکیلی سفر کر رہی تھی۔ راستے میں بھی اُتر سکتی ہے۔ کوئی کہاں تلاش کرنے جائے اُسے اور کیوں جائے، خود ہمیں کہاں فرصت ہے!!

مَیں اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا لیکن یہ میرے ہی خیالات نہیں تھے۔ محسن کی سوچ بھی مختلف نہیں ہو سکتی تھی۔

"اکرام شیخ کے سپرد کر جائیں گے یہ معاملہ۔" محسن بولا۔

"ہاں، وہی رہ جائے گا پیچھے، اکیلا۔" مَیں نے کہا۔

"ہمارا اس سے رابطہ کیسے رہے گا؟"

"تھرو پراپر چینل۔ ہم شہلا کو یا عبدالودود منظر کو باخبر رکھیں گے اور اسی کے ذریعے خبریں حاصل کرتے رہیں گے۔"

کریم بلوچ اُسی وقت عرشے پر نمودار ہوا۔

"کہاں مر گئے تھے تم؟" مَیں نے برہمی سے کہا۔ "ایک معمولی سا کام تھا۔"

"ابھی صاب، کام تو چھوٹا تھا پر اپُن کیا کرے۔ وہ سالا موشن میاں۔۔۔"

"موشن میاں، تم پھر موشن میاں کے پاس گئے تھے؟" مَیں نے دہاڑ کے اس کی بات کاٹ دی۔ "شادی کی تاریخ لینے۔۔۔!"

"نئیں صاب! ایسی بات نئیں، ہم خود نئیں گیا۔ وہ مل گیا ہم کو۔ ہم کیا کرتا صاب۔ ہم اس کو قتل کیا۔ اس واسطے تھوڑا ٹیم لگ گیا۔" اُس نے معذرت آمیز انداز میں کہا۔

مَیں نے محسن کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ "کیا تُو نے بھی وہی سنا جو مَیں نے سُنا ہے؟"

"کس لیے دیر ہوئی واپسی میں؟ کیا کہا تھا تم نے؟"

"ہم ٹھیک بولا صاب۔ ہم اس سالا موشن میاں کو۔ وہ۔۔۔ کیا بولتا آپ۔۔۔ کٹ۔۔۔ کر دیا۔" وہ بولا اور اُس نے نیفے میں اڑسا ہوا خنجر نکالا۔ "آپ فکر مت کرو۔ کوئی نئیں دیکھا ہم کو۔"

"کریم! تم نشے میں ہو، یہ کیا بکواس ہے؟" مَیں نے اسے غور سے دیکھ کے کہا۔ اس کی آنکھیں مجھے کچھ عجیب نظر آئیں۔ ان آنکھوں میں وحشت کے سوائے بہت اجنبی تھے ورنہ اپنے لہجے اور رویّے سے کریم بالکل نارمل تھا۔

"ابھی یہ بکواس ہم آپ کو بولا صاحب۔۔۔ آپ کو سچ بولتا ہم اس کو بکرا کا مافک ذبح کر دیا۔" اس نے خنجر میری طرف بڑھایا۔ "آپ دیکھو، ابھی ہم صاف کر دیا ہے اس کو۔"

مَیں اسے ہاتھ سے پکڑ کے اندر لے گیا۔ "تم قتل کر کے آئے ہو۔ کیا بات ہے، تم پاگل ہو گئے تھے۔ کیوں مارا تم نے اسے؟"

"ہم ایک دم پاگل ہو گیا صاب! وہ سالا۔۔۔ وہ ہم کو بولا کہ میرا ساتھ چل۔ تیرے کو ایک بات بولے گا۔۔۔ مَیں بولا کہ چل سالا۔ تو پھر مارے گا مگر اب تیری خیر نہیں۔ میرا ماما آ گیا ہے۔ وہ بولا کہ نئیں کریم، ہم تیرے ساتھ ایک راز کا بات کریں گا۔"

"یہ گفتگو کہاں ہو رہی تھی؟"

"اُدھر۔" اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "وہ ہم کو راستے میں ملا۔ بولا، ہم تیرے کو تلاش کرتا پڑا تھا۔ تیرا اوپنے چار ہزار روپیہ اپنا پاس ہے۔ یہ لے اور جا۔ ہم بولا کہ کدھر جاوے؟ ہم یہ پیسہ تیرے کو شادی بنانے کے واسطے دیا۔ ہم مستری کو ساتھ لے کر جائے گا۔ وہ بولا کریم! ابھی تیرا شادی مادی نئیں ہو سکتا۔ مَیں پوچھا کیوں نئیں ہو سکتا۔ کیا اس کا باپ کا مرضی نئیں ہے۔ وہ بولا کہ ایسا ہی بات ہے۔ اس کا شادی ہو گیا۔ بس صاب میرا دماغ خراب ہو گیا۔ وہ بولا کہ مستری کا شادی ہو گیا اب وہ تیرے ساتھ کیسے شادی کر سکتا ہے۔ مَیں پوچھا کہ یہ کیسے ہوا تو وہ بولا کہ ہمارا بی بی بھاگ گیا۔ ہم آپ کو بتایا تھا صاب کہ اس کا بی بی پاگل ہے۔ مستری کا بڑا بہن مرلی، جب موقع ملتا ہے گھر سے نکل جاتا ہے۔ موشن میاں کا بات پر ہم بولا کہ تیرا بی بی تو روز بھاگ جاتا ہے اور پھر آ جاتا ہے۔ وہ بولا کہ نئیں، ابھی وہ نئیں آئے گا۔ ہم اس کا علاج کر دیا اور اس کو ایک فقیر لے گیا، پانچ سو روپیہ میں۔ مَیں نے کہا کہ تو نے مرلی کو بیچ دیا، صرف پانچ سو روپیہ میں تو وہ بولا کہ ہم نے چار سو میں لیا تھا۔ سو روپیہ زیادہ ملا اور جان چھوٹ گیا ——— مَیں نے کہا کہ تیرے پر لعنت اور مرلی پر بھی لعنت، لیکن یہ بتا کہ اس بات کا مستری کا شادی سے کیا تعلق؛ میرا شادی اس سے کیوں نئیں ہو سکتا۔ وہ بولا کہ اس سے مَیں شادی بنا لیا۔ تو چل میرا ساتھ گھر، میں تیرا پیسہ واپس کرے گا۔ تو صاب! اس وقت ہم سب بھول گیا کہ آپ ہم کو کس کام واسطے بھیجا تھا۔۔۔ ہم فیصلہ کیا کہ اب اس کو پہلے قتل کرے گا۔ ادھر ہم اس کو کچھ نئیں بولا۔ ہم اس کو مبارک دیا۔ اور بولا کہ چلو ہمارا قسمت میں مستری نئیں تھا۔ ہم کسی اور سے شادی بنائے گا صاب! وہ ہم کو گھر لے گیا۔ اُدھر مستری بھی تھا، وہ بہت روتا تھا صاب۔ ہم بولا کہ ابھی مت رو، تیرا ساتھ یہ زبردستی شادی کیا۔ وہ بولا کہ ہاں، میرا باپ کو دس ہزار دیا۔ موشن میاں اندر گیا اور صندوق میں سے پیسہ نکالتا تھا کہ ہم بھی اندر گیا اور بس اس کو اُدھر ہی کاٹ دیا۔"

"مستری کے سامنے؟ اور تم کہتے ہو کہ کسی نے نہیں دیکھا؟" مَیں نے سر پکڑ کے کہا۔

"نئیں صاب، وہ چلا گیا تھا، اپنا باپ کا گھر۔ ہم بولا تھا کہ تم جاؤ، ابھی تم بیوہ ہو گیا۔ جب ہم واپس آئے گا تو تم سے شادی بنائے گا۔ ابھی چار مہینہ دس دن تم اپنا گھر میں بیٹھو۔"

"اُف، بے وقوف! پولیس سب سے پہلے اسے پکڑے گی لک میر۔" محسن نے کہا۔ "اسے قتل کر کے تو خیر تم نے ٹھیک کیا۔"

"ہاں، وہ شیطان اسی سزا کا مستحق تھا مگر اب مستری کا کیا ہو گا؟" مَیں نے فکرمندی سے کہا۔ "تم ایسا نہیں کر سکتے کہ اسے لے آؤ ادھر، ابھی اسی وقت۔ اس سے پہلے کہ پولیس اس تک پہنچے، تم اسے نکال لاؤ۔"

"ہم لائے گا صاب! آپ بولے گا تو ہم لائے گا۔ ہم جانتا تھا، آپ ہم کو بچائے گا۔ آپ مستری کو بھی بچائے گا۔ ہم آپ کا غلامی کرے گا صاب!"

"باتیں مت کرو اور جاؤ، جلدی جاؤ۔"

وہ پلٹا ہی تھا کہ مجھے اصل بات یاد آئی۔ "ابے اُلّو کے پٹھے، وہ جس کام سے گیا تھا تو اس کا کیا بنا؟"

"وہ۔۔۔ ہاں صاب! ہم مالوم کیا۔ وہ جہاز چلا گیا کل رات۔ ابھی اِدھر نئیں ہے۔" کریم بلوچ نے کہا اور پلٹ کے روانہ ہو گیا۔

مَیں نے دوڑ کر اسے پکڑا۔ "جہاز چلا گیا، کس وقت؟"

"رات دو بجے۔" وہ بولا۔ "ہم سب مالوم کیا۔"

"یہ تو معاملہ گڑبڑ ہو گیا۔" محسن نے سمندر کی وسعت کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "اب تک تو وہ نہ جانے کتنی دور نکل گیا ہو گا۔"

"بدقسمتی ہماری۔ ہم نے بہت وقت گنوا دیا۔ ہم صبح سے بندرگاہ کے علاقے میں ہیں۔ سب سے پہلے ہمیں جہاز کے بارے میں معلوم کرنا چاہیے تھا لیکن ہم دوست محمد کے چکر میں پڑ گئے، پھر گل نے ہمیں چکر میں ڈال دیا۔"

اس سے زیادہ مَیں کچھ نہ کہہ سکا۔ جو وقت ہم نے موہنی کو یاد کرتے گزار دیا تھا وہ اس کا حق تھا۔ ہم نے اس کے لیے کچھ بھی تو نہیں کیا تھا۔ ابھی اس کی لاوارث لاش کسی مُردہ خانے ہی میں پڑی تھی اور ہم اس سے بے تعلق ہو گئے تھے۔ ہم اس کی آخری رسوم کسی بھی عقیدے کے مطابق ادا نہیں کر سکتے تھے۔ کچھ یادیں تھیں جن پر ہم نے آنسوؤں کے دیے روشن کیے تھے۔ مَیں کیسے کہہ سکتا تھا کہ اس میں بھی وقت ضائع ہوا۔

"پھر اب کیا کرنا ہے؟" محسن بولا۔

"ہم اب مزید تاخیر نہیں کر سکتے۔" مَیں نے کہا۔ "جیسے ہی کریم آئے، روانگی کی تیاری کرنا ہے۔ وہ سارا حساب کتاب تو غلط ہو گیا۔"

"کون سا حساب کتاب؟"

"شاہد جمیل نے ایک نقشہ بنا کے دیا تھا کہ کس وقت وہ کہاں ہوں گے۔ چودہ گھنٹے کا فرق پڑ گیا ہے اور ابھی شام کے چھ بجے سے پہلے تو ہم نکل بھی نہیں سکتے۔" مَیں نے کہا۔

"وہ نقشہ دوست محمد کو دکھانا چاہیے۔ ممکن ہے وہ اس سے مدد لے کر ہماری راہنمائی کر سکے۔" محسن بولا۔ "تیاری تو سب ہے۔ ہم دو گھنٹے بھی کیوں ضائع کریں۔"

اسی وقت میری نگاہ بندرگاہ کے ہجوم میں اکرام شیخ پر گئی۔ وہ واپس آ رہا تھا مگر اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ مسلح پولیس تھی جس نے اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال رکھی تھی۔

"ہیں، یہ کیا ہوا؟" مَیں نے پریشانی کے ساتھ محسن سے کہا جو اَب میرے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ "شیخ کس چکر میں پڑ گیا؟"

"یہ تو کریم بلوچ کا پتا چلانے گیا تھا۔" محسن نے تشویش سے کہا۔ "کیا وہاں کسی سے جھگڑا ہو گیا؟"

اس وقت اچانک میرے ذہن میں وہ خیال آیا جو کسی الہامی کیفیت میں نازل ہونے والی وحی کی طرح تھا اور میری عقل نے اس خیال کی روشنی میں اصل حقیقت کو دیکھا اور سمجھا۔ اگر اکرام شیخ کا کسی سے جھگڑا ہوتا تو وہ اکیلا ہی زنجیر بہ دست کیوں نظر آتا، پولیس تو نقصِ امن کے الزام میں انھیں بھی سمیٹ کر لے جاتی ہے جو قیامِ امن کے لیے کوشاں ہوں یا محض تماشائی ہوں۔ گواہ، مدعی اور مدعا علیہ تعداد میں جتنے زیادہ ہوتے ہیں تھانیدار صاحب کو خصوصی اختیارات کے تحت معاف کرنے کا نذرانہ بھی اتنا ہی زیادہ ملتا ہے۔

اب اگر اکرام شیخ اکیلا پکڑا گیا تھا تو اس کی ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی تھی کہ شامتِ اعمال اسے جائے واردات پر لے گئی تھی۔ محتاط ہونے کے باوجود وہ غلط وقت پر موشن میاں کے گھر جا پہنچا اور بدقسمتی نے اسے گرفتار کرا دیا۔

"اب کیا کرنا چاہیے؟" محسن نے کہا۔

"ہم اکرام شیخ کو ایسے چھوڑ کے نہیں جا سکتے۔" مَیں نے کہا۔ "اگر وہ تھانے پہنچ گیا تو معاملہ لمبا ہو جائے گا۔ یہ اُلّو کا پٹھا کریم کہاں جا کے مر گیا؟"

"لعنت بھیج کریم پر۔۔۔ فیصلہ کر کہ شیخ کو اس مصیبت سے کیسے بچایا جائے؟"

"فیصلہ کیا کروں میں؟" مَیں نے جھنجلاہٹ میں کہا۔ "چل دیکھتے ہیں کہ معاملہ کیا ہے؟ شیخ کو چھڑانے کے بس دو ہی طریقے ہیں، بہ زورِ بازو یا بہ زورِ زر۔"

"طاقت کا استعمال بعد میں اکرام شیخ کے لیے مسائل پیدا کر سکتا ہے۔" محسن بولا۔ "وہ ہمارے جانے کے بعد پکڑا گیا تو اس کے الزامات کی فہرست بہت لمبی ہو جائے گی اور اُس وقت وہ اکیلا ہو گا۔"

"بس تو پھر سودا کر لیتے ہیں۔" مَیں نے کہا۔ "الزامات کے عائد ہونے سے پہلے ہی الزام لگانے والوں کو خرید لیتے ہیں۔ یہ

نسبتاً کم قیمت لوگ ہیں اور تعداد میں بھی کم ہیں۔"

محسن نے تائید میں سر ہلایا۔ "اگر وہ ہماری قوتِ خرید سے باہر ہوئے تو کیا ہوگا؟"

"ان کے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔ شیخ کو ہم بہرحال لے آئیں گے۔ تو فٹا فٹ مال لے آ۔" میں نے کہا۔

جب وہ نیچے کیبن میں جانے کے لیے غائب ہوگیا تو میں نے گل بانو کو دیکھا جو بڑے فلمی پوز میں کمر پہ ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔

"یہ اچانک کیا پروگرام بن گیا ہے؟" وہ ماتھے پر بل ڈال کے بولی اور میرے اتنے قریب آگئی کہ مجھے ایک قدم پیچھے ہٹنا پڑا۔ گل بانو کے انداز و اطوار میں ابھی تک پرانے وقتوں کی خود اعتمادی اور بے باکی کا جارحانہ انداز باقی تھا۔ میں اس کے حالات اور ماحول کے پس منظر سے واقف تھا اور جانتا تھا کہ ایسے ماحول میں اگر وہ نسوانیت کے آداب سے بے بہرہ رہی تو قصور اس کا نہیں۔ اس کے لیے روایتی قسم کی شرم و حیا کا مظاہرہ کرنا بھی ممکن نہیں تھا۔ اس وقت وہ مردانہ کپڑوں میں نہیں تھی۔ زنانہ لباس بھی اس نے خاصی بے تکلفی اور بے پروائی سے پہنا تھا لیکن اسے بالکل احساس نہیں تھا کہ رسمی ستر پوشی کے اس انداز میں بے حجابانہ نمائش کے کتنے اسباب نظر آتے ہیں۔ ایک اجنبی اسے بے شرم و بے حیا ہی قرار دے سکتا تھا۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہو مجھے؟ کوئی غلط سوال کیا ہے میں نے؟" وہ بولی۔

"نہیں۔۔۔" میں نے چونک کر کہا۔ "وہ دراصل ہم جا رہے ہیں اکرام شیخ کو چھڑانے کے لیے۔"

"اور تم خود دھر لیے گئے تو پھر؟"

"تمہارے اندیشے اپنی جگہ مگر بی بی! یہ بھی تو نہیں ہو سکتا نا کہ ہم اپنے دوست کو اس کی تقدیر کے سپرد کر کے نکل جائیں۔" میں نے کہا۔

"میں کب کہہ رہی ہوں کہ اس کے لیے کچھ مت کرو لیکن یہ بھی تو سوچو کہ پولیس نے تمھیں پہچان لیا تو پھر کیا ہوگا؟ میں کیا اکیلی جاؤں گی غالب اور نازو کی مدد کے لیے۔ تم اور محسن ہی جانتے ہو کہ تمھیں کیا کرنا ہے۔ تمھیں یہ رسک نہیں لینا چاہیے اس وقت۔"

"پھر کیا کرنا چاہیے؟" میں نے طنز اور تمسخر کے ساتھ کہا۔ "ہم دونوں کو یہاں چھپ کے بیٹھ جانا چاہیے۔ شیخ کو چھڑانے کے لیے تم جاؤ گی؟"

"اچھا ہوا تم جلدی سمجھ گئے۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

میں بھونچکا رہ گیا۔ "تم سیریس ہو؟"

"کیا تم مذاق کر رہے تھے؟"

"مگر یہ۔۔۔ یعنی کیا تم بہت آسان سمجھتی ہو اس کام کو؟"

"ہاں، اور اسی لیے چاہتی ہوں کہ یہ کام تم نہ کرو۔ یہ آسان کام ہے نا، مجھے کر لینے دو۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ "اب تک سارے مشکل کام تم کرتے آئے ہو۔ آئندہ بھی کرو گے کیونکہ تم مرد اور بدقسمتی سے میں ہوں عورت۔"

"تم غلط سمجھ رہی ہو گل۔" میں نے کہا۔

"نہیں، میں تم کو بالکل صحیح سمجھ رہی ہوں۔ تم عام مردوں کی طرح یہ تسلیم نہیں کر سکتے کہ جو کام تم کر سکتے ہو، وہ کوئی عورت بھی کر سکتی ہے۔ حالانکہ جس طرح رابعہ نے تمھارا ساتھ دیا اور اب جس طرح نازو غالب کے ساتھ چلی گئی ہے، انجام کی پروا کیے بغیر، اس کے بعد تمھیں تو یہ کہنے کا حق نہیں پہنچتا۔ مجھے دیکھتے تم اس وقت جب میں ڈاکوؤں کے ایک گروہ کے ساتھ انہی کے ایک رکن کی حیثیت سے جاتی تھی۔ سردار میرا بھائی تھا تو کیا، وہ میرا محافظ بن کے تو میرے ساتھ نہیں رہتا تھا۔"

"ٹھیک ہے، میں مانتا ہوں کہ تم کسی سے کم نہیں ہو، مگر مجھے بتاؤ کہ تم یہ کام کیسے کرو گی؟"

"یہ تم مجھ پہ چھوڑ دو۔" وہ بولی۔ "یا تو میں اکرام کو واپس لے آؤں گی، تھانے سے بھی لے آؤں گی، ورنہ واپس نہیں آؤں گی۔"

"تمہارے واپس نہ آنے سے مسائل دگنے ہو جاتے ہیں گل۔" محسن نے کہا جو تیار ہو کے آگیا تھا۔ "حل نہیں ہوتے۔"

"پلیز محسن! مجھے جانے دو۔ تم لوگ بھروسا کر کے تو دیکھو مجھ پر۔" وہ محسن کے گلے میں یوں بانہیں ڈال کے کھڑی ہوگئی کہ اس کا چہرہ محسن کے مقابل آگیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ محسن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن محسن میں اتنی ہمت ہی نہیں تھی کہ اس سے نظر ملاتا۔

اس نے گل بانو کے ہاتھوں کو ایک جھٹکے سے الگ کر دیا۔ "یہ بازاری طریقے مت اختیار کیا کرو اپنی بات منوانے کے لیے۔ تم آخر کیا سمجھتی ہو۔۔۔؟"

وہ محسن کے الفاظ کی پروا کیے بغیر میری طرف پلٹ گئی۔ "سکندر خدا کے لیے تم لوگ مت جاؤ۔۔۔"

جانے اس کی آنکھوں میں یقین کا وہ کون سا جادو تھا جس نے مجھے موم کر دیا۔

میں نے سر ہلا کے کہا۔ "ٹھیک ہے، ہم اکرام شیخ کی زندگی کو داؤ پر لگا کے جوا کھیلتے ہیں۔ یہ سمجھ لو کہ ہار ہم کسی صورت تسلیم نہیں کر سکتے۔ دوسری کوشش ہم خود کریں گے اور پھر کامیابی کی جو بھی قیمت ادا کرنا پڑی۔۔۔ وہ ہم کریں گے اور ہمارے ساتھ تم بھی چکاؤ گی۔۔۔ محسن۔۔۔ اسے دے دے سب رقم۔"

"تو پاگل ہوگیا ہے۔۔۔!" محسن نے احتجاج کیا مگر اب اس میں شدت نہیں تھی۔

"چھوڑ بحث، ہم سب پاگل نہیں تو اور کیا ہیں؟"

محسن نے ایک رومال میں لپٹی ہوئی رقم گل بانو کو تھما دی۔ "یہ پورے ایک لاکھ ہیں، کم پڑ جائیں تو فکر مت کرنا، سودا کر لینا ادھار پر اور واپس آ کے لے جانا۔ میرا خیال ہے کہ اتنی رقم بہت ہوگی۔"

گل بانو مسکرائی۔ اس نے ایک نظر اپنے لباس کو دیکھا اگرچہ یہ میرے نقطۂ نظر سے معیوب تھا مگر اس نے ایک دوپٹے کا اضافہ کرنے کے سوا کچھ نہیں کیا۔

"خدا حافظ اور گڈ لک۔" میں نے کہا۔

"تم بھی کچھ کہہ دو، مسکرا ہی دو۔" اس نے محسن کے گالوں پہ چٹکی لے کر کہا۔ "منہ پھلائے کھڑے ہو۔" اور اس سے پہلے کہ محسن گالی دیتا، وہ پلٹ کے لانچ کے آخری حصے میں پہنچ گئی۔ آخری بار اس نے ہماری طرف دیکھ کے ہاتھ ہلایا۔ میں نے جواب میں ہاتھ ہلایا۔ آخری حرکت گل بانو نے یہ کی کہ اپنی دو انگلیاں ہونٹوں پر رکھ کے خالص لوفرانہ انگلش فلمی اسٹائل میں ایک ہوائی بوسہ محسن کی طرف ارسال کر دیا۔

"الو کی پٹھی!" محسن نے دانت پیس کے کہا۔ "واپس آجائے پھر میں اس کا دماغ درست کروں گا۔"

"تو کسی الھڑ مٹیار کی طرح شرم و حیا سے لال گلابی ہو رہا ہے۔" مجھے محسن کی حالت پر بے اختیار ہنسی آئی۔ "اور وہ ہے کہ دست درازی پر اتر آئی ہے۔۔۔۔ بازاری عورت۔"

محسن اسے ہجوم میں گم ہوتا دیکھتا رہا۔ "عجیب ڈھیٹ شے ہے کوئی اور ہوتی تو میرے منہ پر تھپڑ مارتی۔"

"کانے کو کانا کہو تو وہ چڑتا ہے۔ وہ عورت کیوں تھپڑ مارے گی جسے یقین ہو کہ یہ غصے میں دی جانے والی گالی کے سوا کچھ نہیں۔ گالی کا مقصد تو ہو سکتا ہے مطلب کچھ نہیں ہوتا۔"

"میں دیکھ رہا ہوں کہ تو اس کی طرف داری میں حد سے بڑھتا جا رہا ہے۔" محسن ابھی تک خفا تھا۔ "ایسے غلط فیصلے مہنگے پڑ جاتے ہیں۔"

"کیا غلط فیصلہ کیا میں نے؟"

"اس کی بات مان کر۔ بھلا یہ عورتوں سے سنبھلنے والے معاملات ہیں۔ اس نے کہا کہ میں مردوں سے کم نہیں، آپ نے کہا کہ بجا ارشاد۔ کیا ہوگا اگر معاملہ اور بگڑ گیا؟"

"پھر ہم جائیں گے۔"

"ایک نہیں دو معاملے نمٹانے۔" محسن بولا۔ "بعد از خرابی بسیار فائدہ کیا ہوگا۔۔۔؟"

"آئندہ وہ کبھی نہیں کہہ سکے گی کہ میں کسی طرح بھی تم سے کم نہیں ہوں۔" میں نے برا مانے بغیر نرمی سے کہا۔ "کچھ باتیں سمجھانے سے سمجھ میں نہیں آتیں، تجربہ سکھاتا ہے۔"

"ڈاکا ڈالنا ہوتا تو میں بھی کہتا کہ خاتون چلیے آپ کا تجربہ زیادہ ہے۔ ہم آپ کے تابعدار ہیں لیکن یہ معاملہ تھا مختلف قسم کا۔" محسن نے کہا۔ "کسی اور موقع پر وہ ثابت کر سکتی تھی اپنی برابری کے دعوے کو، یہ بھلا کیا بات ہوئی کہ اس نے تھوڑا سا جذباتی ڈرامہ کیا اور آپ کی عقل اڑ گئی بخارات بن کے۔"

"کیا کروں اپنے شیروانی صاحب۔ بقولِ شاعر۔ مرا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ ہے۔" میں نے ایک سرد آہ بھری۔ "ہم نو خود اڑ جاتے تھے بخارات بن کے، شاید آپ کو یاد ہو گا ولایت کا زمانہ، یہ قصہ ہے تب کا کہ آتش جواں تھا دل تو نابکار اب بھی وہی ہے۔"

محسن کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ میری بات سن ہی نہیں رہا۔

اچانک اس نے کہا۔ "سکندر، میں جاتا ہوں۔"

"کہاں؟ یعنی اتنی سی دیر میں۔۔۔ دل کا یہ حال۔"

"بکواس مت کر۔" وہ برہمی سے بولا۔ "اسے ڈر تھا کہ ہم پکڑے جائیں گے۔ مجھے خیال کیوں نہیں آیا کہ وہ بھی گرفتار ہو سکتی ہے۔ اس کے بھائی شیش ناگ کے گروہ کا خاتمہ ہوگیا مگر کیا پولیس کو پتا نہیں چل گیا ہوگا کہ ناگ منی نکل گئی تھی۔ اور کیا انھیں اندیشہ نہیں ہوگا کہ اب بھائی کا بدلہ لینے کے لیے ناگ منی ڈاکوؤں کا نیا گروہ بنا لے گی۔ ریکارڈ پر سب کچھ ہوگا۔ سارے ڈاکوؤں کی تصویریں بھی ہوں گی۔ ناگ منی تو شاید ویسے بھی مشہور ہوگی کہ کیا دو دھاری تلوار ہے۔ مال و زر کے ساتھ عقل و ہوش بھی لوٹ لیتی ہے۔"

میں جتنا محسن کے دلائل سے قائل ہوتا تھا، اتنا ہی اپنے غلط فیصلے پر پشیمانی اور پریشانی کا احساس زیادہ ہوتا جاتا تھا۔ شاید میں نے بہت عجلت سے کام لیا۔ اس کی ہمت اور ذہانت آزمانے کا یہی تو ایک موقع نہ تھا۔

میں نے کہا۔ "تو پھر، غلطی میری تھی تو۔۔۔"

محسن نے مجھے خونخوار نظروں سے دیکھا اور ہاتھ چھڑا کے نکل گیا۔ میری بات پھر غلط ہوگئی تھی۔ اس کا ہرگز مقصد یہ نہیں تھا کہ میں اپنی غلطی کا کفارہ خود ادا کروں۔ غلط فیصلہ کسی سے بھی ہو جانا کوئی جرم نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس کا خمیازہ سب کو بھگتنا پڑتا تو کوئی کسی کو الزام نہ دیتا۔ سوال اس وقت فوری طور پر کچھ کرنے کا تھا۔ یہ سب سوچنے کا نہیں کہ کیسے کرنا ہے۔

میں محسن کے پیچھے دوڑا۔ "تیرے پاس..."

محسن نے میری بات سمجھتے ہوئے پلٹ کے اقرار میں سر ہلایا اور ساحل پر کود گیا۔ اس نے ایک پاؤں پہ ہاتھ مار کے واضح کر دیا تھا کہ ریوالور کو اس نے اپنی جراب میں چھپا رکھا ہے۔

اسی وقت مخالف سمت سے کریم بلوچ بدحواسی کے عالم میں نہایت مضحکہ خیز طریقے پر چلتا اور تھوڑا بہت دوڑتا ہوا نمودار ہوا۔ اس کی چال اور اس کے حال کی خرابی کا سبب وہ بوجھ تھا جو اس نے سر پر اٹھا رکھا تھا۔ کریم کوئی بہت تگڑا قسم کا جوان نہیں تھا۔ وہ سچے عاشق کی طرح ظالم سماج کے ہاتھوں پٹ بھی چکا تھا اور پیار کی اس مار کے باعث ابھی تک لنگڑانے پر مجبور تھا۔

اس کے سر پر جو بوری تھی اسے سُتلی سے یوں باندھا گیا تھا کہ نقل و حمل میں اندر کی چیز باہر نہ گرے۔ اس کے اندر کیا چیز ہو سکتی تھی، اس خیال نے ہی مجھے دم بخود کر دیا۔

"ہائے... ارے صاب، ہم مر گیا" وہ لانچ پر آتے ہی ہانپتے اور کانپتے ہوئے بولا۔ "ارے بابا، ہم کتنی بار بولے گا تیرے کو کہ ابھی ایسا ہل جل مت کر۔ ماں قسم ادھر پھینک دیوے گا تو ... آہ..."

"کریم! کیا ہے اس میں؟ تمھاری وہ متوقع منکوحہ؟"

"نئیں صاب..." کریم میرے پاس سے گزر گیا۔ "اس میں تو اپنا بی بی ہے، مشتری، اُف... ہم مر گیا صاب۔"

"ابھی سے کریم، ابھی تو ذمے داریوں کا بوجھ اٹھایا ہی ہے تم نے۔" میں نے ہنستے ہوئے اس کے پیچھے چلنا شروع کیا۔ "ابھی سے گھبرا گئے ہو؟"

"ارے صاب... ماں قسم ہم کو مالوم نہیں تھا، یہ سالی پھول کا جیسا نظر آتی ہے۔ اس کا وزن چٹان کے برابر ہووے گا مگر ہم اس کو ٹھیک کرے گا... ایک دم ہلکا پھلکا کرے گا۔"

اس نے بالآخر بوری کو خاصی احتیاط سے نیچے رکھا اور اطمینان کی گہری سانس لے کر پسینہ اپنی آستین سے صاف کرنے لگا۔

"تم نے ڈائٹنگ کرانے کا پروگرام بنا لیا، پہلے اسے نکالو تو سہی، ایسا نہ ہو کہ دم گھٹ جائے۔" میں نے کہا۔

گٹھڑی میں حرکت ہوئی۔ "ارے نکال مجھے باہر نامراد... کیا مارے گا مجھے؟" اندر سے آواز آئی۔

کریم بلوچ نے افسوس سے سر ہلایا۔ "ارے ہم تو خود مر گئے تیرے پیچھے۔" اس نے بوری کے منہ پر لپٹی ہوئی سُتلی کھولتے ہوئے کہا۔

وہ ایسے باہر آ گئی، جیسے محاورے کے مطابق، جادوگر کے تھیلے سے بلی باہر آتی ہے۔ اور وہ تھی بھی ایک تند خو بلی جیسی ہی، دُبلی پتلی اور سانولے رنگ کی تیکھے نقوش والی لڑکی جس کی آواز میں بانسری کے اونچے سُر محسوس ہوتے تھے۔ اس کی زبان حجام کی قینچی کی طرح چلتی تھی تو ہاتھ یوں ساتھ دیتے تھے جیسے قینچی کے ساتھ کنگھا۔

"ارے کم بخت، تیرا ستیاناس ہو۔" اس نے ہاتھ ہلا ہلا کے کہنا شروع کیا۔ "یہ ہے تیری وہ ڈولی جس میں تو مجھے دلہن بنا کے لانا چاہتا تھا۔ اس منحوس بوری میں ڈال کے لے آیا اس کباڑ خانے میں۔ یہ ہے تیرا وہ گھر جس پر میں راج کروں گی۔"

"صاب... یہ... مشتری ہے۔" کریم بلوچ نے بوکھلا کے تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "ذرا بولتی زیادہ ہے۔"

"ہائے ہائے کیوں نہ بولوں۔" وہ کریم بلوچ کے سامنے آ گئی بولی۔ "تو کتنا بولتا تھا، کیسے کیسے ڈائیلاگ یاد کر کے آتا تھا۔ اب بول... موئے خدائی خوار۔ ساری ہڈیاں اُلٹ پلٹ کے رکھ دیں میری۔ آرام سے اٹھا کے نہیں لا سکتا تھا اور کیسی بے دردی سے یہاں لا کے پھینکا مجھے ظالم، تیرا خانہ خراب ہو۔"

کریم بلوچ کی حالت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی جس مشتری کے عشق میں وہ پاگل پن کی اس انتہا تک پہنچ گیا تھا کہ اس نے ایک رقیب کی جان بھی اتنی ہی آسانی سے لے لی جتنی آسانی سے شاید وہ اپنی جان دے دیتا۔ وہ مشتری تو کریم بلوچ جیسے سیدھے سادے احمق نما آدمی کے مقابلے میں ایک طوفانِ بلا خیز تھی۔ شاعر کی زبان میں: بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات، عنایت کیا اشارت کیا ادا کیا۔ نہ وہ حسن میں غارت گر تھی اور نہ ناز و ادا میں ہوش رُبا۔ اس کے سامنے کریم بلوچ ایک گربۂ مسکین بنا کھڑا ہوا تھا اور میں حیران تھا کہ یہ اگر عشق ہے تو کیسا عشق ہے مگر عشق تو بس عشق ہے۔

مجھے اس صورتِ حال پر ہنسی بھی آ رہی تھی اور غصہ بھی آ رہا تھا۔ مشتری نے مجھے بھی کوئی لفٹ نہیں دی تھی اور پہلی بار میرے سامنے آتے ہوئے رسمی آداب و اخلاق کو بھی بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ میں بہ خوبی اندازہ کر سکتا تھا کہ مشتری جیسی عورت کے ساتھ کریم بلوچ کی زندگی اسی طرح گزرے گی جیسے شور مچاتی جھاگ اڑاتی لہروں کے ساتھ خاموش ساحل کی بسر ہوتی ہے اور دندناتی ٹرین کے ساتھ چُپ پڑی رہنے والی پٹڑی کی گزر ہوتی ہے۔ وہ کریم بلوچ کو موقع بے موقع ڈانٹتی رہے گی اس پر گرجتی برستی رہے گی اور حکم چلاتی رہے گی۔ کریم بلوچ سب سُنے گا اور سُن سُن کے چُپ رہے گا۔ مگر اس کی خاموشی ہی کہے گی۔ کہ عشق نے ہم کو نکما کر دیا، ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے۔

"آپ ناراض مت ہو صاب۔" کریم نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ کے کہا۔ "مشتری سب ہم کو بولتا، ہم آپ سے معافی مانگتا۔"

"ارے چھوڑو کریم۔" میں نے ہنس کے کہا۔ "اب یہ سب تو چلتا ہی رہے گا۔ تم کیا ہر وقت معافی ہی مانگتے رہو گے۔ ہم بُرا نہیں مانتے ایسی باتوں کا۔ عادت ہوتی ہے اپنی اپنی۔"

میرا مقصد مشتری کو تھوڑا سا شرمندہ کرنا تھا حالانکہ دل تو میرا بھی یہی چاہتا تھا کہ گربہ کشتن روزِ اوّل کے فارمولے پر عمل کرتے ہوئے مشتری بیگم کو ایک ڈانٹ لگاؤں کہ یہ کیا ٹر ٹر لگا رکھی ہے، خبردار جو پھر کبھی میرے سامنے کریم کو کچھ کہا لیکن یہ مدعی سُست گواہ چُست والی بات ہوتی اور شاید کریم کے عشق کی تذلیل بھی۔ کریم بے زبانی اور نیاز مندی، محکومی و اطاعت گزاری اس کے لیے رسمِ عاشقی تھی جس کا وہ پابند تھا۔

مشتری نے مجھے غور سے دیکھا۔ "تو کون ہے رے؟"

کریم نے گھبرا کے کہا۔ "ارے یہ بڑا والا صاب ہے سب سے بڑا والا سکندر صاب۔"

مشتری نے ایک ہاتھ کمر پر رکھ کے اسے گھورا۔ "پہلے نہیں پھوٹ سکتا تھا منہ سے۔ اب ہوش آیا ہے۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو گئی۔ "مجھ سے غلطی ہو گئی صاحب جی، معافی دے دو۔ مگر میں کیا کروں جی۔ ایک تو آپ اتنے بڑے صاحب نہیں لگو ہو، پھر یہ کریم ہے بے وقوف۔"

"اس میں کیا شک ہے۔" میں نے مسکرا کے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "بے وقوف نہ ہوتا تو تمھارے لیے جان کی بازی کیوں لگاتا اور کسی کی جان کیوں لیتا، پکڑا جاتا تو تمھارا کیا جاتا۔ پھانسی کا پھندا اس کے گلے میں پڑتا۔ تم کو قدر کرنا چاہیے اس کی۔"

کریم کی آنکھیں جذبۂ احسان مندی سے نمناک ہو گئیں۔

"قدر نہ کرتی صاب جی، تو ایسے آتی ہی کیوں۔" مشتری نے ہاتھ ہلا کے کہا۔ "بڑے بڑے گبرو پھر رہے تھے میرے پیچھے تو..."

"اچھا اچھا۔ چلو تم نیچے جاؤ۔" میں نے کہا۔ "مجھے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں کریم سے۔"

اس نے بادلِ ناخواستہ کریم کی اہمیت کو قبول کیا اور نہایت پُرتجسس انداز میں اِدھر اُدھر جھانکتی ہوئی چلی گئی۔ قانوناً وہ ایک بیوہ تھی اور موشن میاں کے قتل سے اتنی بے تعلق بھی نہ تھی مگر اسے نہ خوف تھا اور نہ کسی قسم کی پریشانی۔

"ابھی چار ماہ دس دن تک یہ تمھاری بیوی نہیں ہو گی کریم بلوچ!" میں نے کہا۔ "اگر تم نے یہ آزمائشی عرصہ گزار لیا اور پھر بھی شادی کر لی تو ماننا پڑے گا کہ تم فرہاد اور مجنوں سب کے باپ ہو۔"

کریم بلوچ نے اپنے دانتوں کی نمائش کی۔ "ابھی صاب! اگر ہم باپ بنے گا تو یہی نام رکھے گا جو آپ بولا۔"

"یہ بتاؤ کہ تم نے آتے جاتے کہیں اکرام شیخ کو دیکھا تھا؟" میں نے کہا۔ "وہ تمھارے پیچھے گیا تھا۔"

"کیوں صاب...؟"

"اس لیے کہ تم نے بہت دیر کر دی تھی۔ ہم سب پریشان ہو گئے تھے۔" میں نے خفگی سے کہا۔ "اب تم آ گئے ہو اور اسے پولیس نے پکڑ لیا ہے۔"

کریم کا رنگ فق ہو گیا۔ "پولیس نے... آپ کیا بولتا صاب! کدھر سے پکڑا، ابھی کیا ہوئیں گا؟"

"محسن گیا ہے اور گل بانو گئی ہے اسے چھڑانے کے لیے اور یہ سب تمھاری وجہ سے ہوا۔ کیا کر رہے تھے آخر تم؟"

"ہم صاب... ابھی ہم مشتری کو کیسے لاتا... اس کا سالا باپ اُدھر اندر رہتا۔ وہ دفع ہو گیا تو ہم اندر گیا۔ مشتری ہم کو بولا کہ بڈھا ادھر گیا ہے۔ ابھی اس کو مالوم ہو جائیں گا کہ موشن میاں ایک دم جنازہ بن گیا ہے تو وہ تیرے کو دفن کر دیں گا۔ ہم بولا کہ ابھی چل میرا ساتھ کوئی برقع مرقع ہے تو میرے کو بھی دے مگر صاب، بس ایک بوری ملا تو ہم مشتری کو اندر ڈالا اور سر پر اٹھا کر لایا۔ ڈولی ہم کدھر سے لاتا صاب، چھریا عورت کیسا بات کرتا۔ ابھی تو ہم اس کا خاوند صاب بھی نئیں بنا..."

"خدا کے لیے کریم!" میں نے ہاتھ جوڑ کے کہا۔ "تم دونوں کی بک بک نے میرا دماغ خراب کر دیا ہے۔ میں پہلے ہی کم پریشان نہیں ہوں۔ مجھے یہ بتاؤ کہ تیاری کیسی ہے؟"

"ایک دم پکا ہے صاب۔"

"اگر محسن اور گل بانو کے آتے ہی ہمیں روانگی اختیار کرنا پڑے تو... کتنی دیر میں ہم سفر شروع کرنے کے قابل ہوں گے؟"

"آپ جب بولے گا صاب، تھوڑا کھانے کے واسطے کمی ہوئیں گا تو ہم لائیں گا۔ ابھی چیک کر کے آپ کو بتاتا ہے۔" وہ پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔

"سنو" میں نے اسے روک کے کہا۔ "یہ جو تمھاری مشتری بیگم ہیں نا، ان کو سب سمجھا دو اور بتا دو کہ یہاں اس کو سب کام کرنا ہو گا۔ کھانے پکانے کا اور صفائی کا۔ اسی شرط پہ ہم اسے ساتھ لے جائیں گے۔ کیا تم نے اسے بتا دیا ہے کہ اس سفر میں خطرہ بھی بہت ہے؟"

"خطرہ تو اس کا واسطے اُدھر بھی ہے۔" کریم بلوچ نے ہاتھ سے ساحل کی طرف اشارہ کیا۔ "ابھی اس کو بولنے کا کیا فائدہ صاب، سب مریں گا تو وہ بھی مر جائیں گا۔"

"تم نے کیا کہا ہے، کہاں جا رہے ہیں ہم؟"

"ہم بولا کہ بمبئی جا رہا ہے،" کریم نے سر کھجا کے کہا۔ "غلط تو نہیں بولا صاب؟"

"اسے کھانا پکانا کیسا آتا ہے؟" میں نے کہا۔

"ابھی دیکھے گا صاب، ہم سکھائے گا آپ فکر مت کرو۔"

لیکن یہ خیال زیادہ حوصلہ افزا نہیں تھا کہ مشتری نے کھانے پکانے میں کریم کی شاگردی اختیار کی اور اوّلین تجربات کا تختۂ مشق ہمیں بنایا تو ایک طرف سمندری سفر میں یوں ہی نظامِ ہضم کا بیڑا غرق ہوتا ہے۔ عقل بھی ماری جائے گی۔

جب کریم بلوچ چلا گیا تو میں نے تاحدِ افق پھیلے ہوئے سمندر کی وسعت پر نگاہ کی اور ایس ایس کرانتی تھنڈر کا تصور کرنے کی ناکام کوشش کی۔ ہر لمحۂ گزراں کے ساتھ وہ فاصلہ بڑھتا جا رہا تھا جو غالب اور نازو کے اور ہمارے درمیان حائل ہو چکا تھا۔ وہ اس یقین پر دشمن کے حصار میں سر بکف جا پہنچے تھے کہ ہم ایک لمحے کے لیے بھی ان کے خیال سے غافل نہ ہوں گے۔ اور ہم سے وابستہ اُمیدوں نے ہی انھیں یہ عزمِ سفر دیا تھا لیکن یہاں ہم ساحل پر اپنے ہی مسائل کی زنجیروں میں اُلجھے ہوئے تھے۔

آدھے گھنٹے میں شاید میں نے احساس کی اذیت کی آدھی صدی گزار دی۔ رہ رہ کر مجھے اپنے آپ پر غصہ آتا تھا۔ آخر کیا ضرورت تھی مجھے کریم بلوچ کو پھر بھیجنے کی کہ وہ جائے اور اس مصیبت کو اٹھا لائے۔ عشق اسے تھا بھگتا ہم سب نے۔ نہ آتی مشتری تو کیا وہ مر جاتا۔ چند دن میں سب عشق کا بخار اُتر جاتا اور وہ اس کے ساتھ ہی پھانسی چڑھنے کے لیے رُک جاتا، تب بھی کیا فرق پڑتا ہمیں۔ ہمارے ساتھ دوست محمد بھی تھا جو کریم سے کہیں زیادہ تجربہ کار ملاح تھا۔

میری سوچ میں خود غرضی کا عنصر ذہنی انتشار کی پیداوار تھا لیکن یہ کریم بلوچ کے لیے ضرورت سے زیادہ خلوص کے جذبے کا مظاہرہ ہی تھا جس نے اکرام شیخ کو حالات کے گرداب میں پھنسا دیا۔ اور اسے بچانے کی کوشش میں گل بانو بھی ڈوب سکتی تھی۔ سب سے کٹ کر اپنے مفروضات اور خوش آئند امکانات پہ تکیہ کرنے والے غالب اور نازو انتظار ہی کرتے رہ جاتے۔ اجنبی دیس میں نااُمیدی کے شکست کے اور اکیلے پن کے احساس کی اذیت جھیلتے اور خود اپنی دیوانگی سے سوال کرتے کہ ان کی اور ہم سب کی جو ایم آر ایس کا عنوان تھے سعیٔ لاحاصل اور اس کارِ زیاں سے ثابت کیا ہوا، یہی کہ اس رزم گاہِ خیر و شر میں اب تائیدِ حق بھی جرم ہے۔ اور تائیدِ غیبی بھی انہی کے ساتھ ہے جو نمرود سے بڑھ کر خدائی کے دعوے رکھتے ہیں۔

لانچ کے پچھلے حصے میں اچانک شور اٹھا۔ اس میں دوست محمد کی آواز نمایاں تھی لیکن کریم بلوچ کی دُہائی بھی شامل تھی اور زنانہ آواز اس کے مستقبل کی مالک مشتری کے سوا کسی کی نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ تیز سیٹی جیسی آواز میں زنانہ لُغت کی منتخب گالیاں کوسنے دے رہی تھی مگر یہ پتا نہیں چلتا تھا کہ مخاطب کون ہے۔ میں لپک کر جائے واردات پر پہنچا تو وہاں عجیب نقشہ تھا۔

دوست محمد ایک عالمِ وحشت میں کریم بلوچ سے لپٹا ہوا تھا اور اسے اپنے سر سے ٹکریں مار مار کے گرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ "ابھی میں بولتا تیرے کو... سالا حرامی... ہٹ جا میرے راستے سے... جانے دے میرے کو بابا۔"

کریم بلوچ جسمانی طور پر کمزور تھا لیکن اس کی قوتِ ارادی کو شکست دینا آسان نہ تھا۔ وہ زخمی تھا اور تھکا ہوا بھی تھا لیکن اس نے دوست محمد کو روک لیا تھا اور کسی صورت اسے راستہ دینے پر تیار نہ تھا۔ وہ جھٹکے سے پیچھے جاتا تھا اور پھر پلٹ کے آتا تھا۔ گرتا تھا تو ایسے اُٹھ کھڑا ہوتا تھا جیسے کسی اسپرنگ پر گرا ہو۔ کبھی وہ دوست محمد کی ٹانگ سے لپٹ جاتا تھا تو کبھی کمر سے۔

"ارے ہم مر جائے گا... لیکن تیرے کو جانے نئیں دیں گا استاد... صاب ہم کو مار ڈالیں گا۔ ابھی ہم صاب کو بلاتا ہے، صاب خدا کا واسطہ!" وہ مجھے چلّا چلّا کے پکارنے لگا۔ "ارے صاب یہ استاد اپنا ملبہ کر دیا۔ آہ... کیسا بیل کا مافک ٹکھر مارتا ہے۔ مال قسم استاد، ہم بھی بہت حرامی ہے۔ تم بے شک ہمارا سر پھوڑ دو، ہمارا دل توڑ دو، ہڈیاں توڑ دو، پیٹ پھاڑ دو، مگر صاب بولا ہے تو ہم جانے نئیں دے گا..."

درمیان میں مشتری ایسے ہدایات دے رہی تھی جیسے وہ کسی اسٹنٹ فلم کی فائٹ انسٹرکٹر ہو۔

"ارے کریم کم بخت... اِدھر... ادھر بغل میں ہاتھ دے کر مار گدّی پر... اُف... ایسے تو تو مار کھائے چلا جا رہا ہے... ہاں... ایسے... اب ٹانگ مت چھوڑیو... نامراد کھینچ لے ٹانگ اور اسے مُنہ کے بل گرا دے... ارے تیرا ستیا ناس ہو... کیا اچھا موقع تھا... میں کہتی ہوں کاٹ... کاٹ لے اس کے کان پر۔"

یہ سب کچھ میں نے چند سیکنڈ میں دیکھا اور سن لیا۔ پھر میں نے درمیان میں آ کے دوست محمد کو کریم بلوچ سے جدا کیا اور گرج کے کہا۔ "آخر کیا ہو رہا ہے یہ؟" میں نے ایک ہاتھ سے کریم کو جھٹک دیا۔ وہ سیدھا اپنی دلرُبا کی طرف گیا اور اس کے ساتھ دیوار پہ منطبق ہو گیا۔

"دوست محمد؟" میں نے اسے دونوں شانوں سے پکڑ کے جھنجوڑا۔ "کیا ہنگامہ ہے یہ؟"

اس نے خود کو چھڑانے کے لیے مزاحمت جاری رکھی۔ "تم

ابھی جانے دو ہم کو بابا۔ ہم ادھر نئیں رہے گا، اپنا کوئی کام نئیں ہے اِدھر، تم نے کیوں قید کیا ہے ہم کو... ہم مر جائیں گا۔"

"کیوں جانا چاہتے ہو تم یہاں سے، نشہ کرنے کے لیے؟ تم کو چرس کی طلب نے پاگل کر رکھا ہے دوست محمد۔" میں نے اسے آرم لاک سے قابو کر لیا۔ "مگر تم آخری سگریٹ پی چکے ہو۔ اب تم جیو یا مرو۔ تمھارا اس دنیا میں واپس جانا ناممکن ہے جہاں تمھارے دشمن تمھیں یہ زہر فراہم کرتے ہیں۔ تمھیں اپنے راستے سے ہٹانے کے لیے وہ تمھاری جان لینا چاہتے ہیں مگر میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ راستہ ضرور صاف ملے گا انھیں لیکن تمھاری جان نہیں جائے گی۔ تم ہمارے ساتھ جاؤ گے، زندہ رہنے کے لیے اور زندگی کی طرف ہماری رہنمائی کے لیے۔"

وہ چیختا رہا اور گالیاں دیتا رہا۔ "تم سالا کیا باپ ہے میرا، تم کون ہوتا ہے میرے کو روکنے والا، اپن سب کچھ کریں گا، نشہ بھی کریں گا، قتل بھی کریں گا، خودکشی بھی کریں گا۔"

میں نے اسے کئی بار بڑی بے رحمی سے پیچھے پھینکا۔ اس کی مزاحمت بہت جلد ختم ہو گئی۔ نشہ نہ ملنے کی وجہ سے اس کا جسم ٹوٹ رہا تھا اور وہ بھوکا رہنے کی وجہ سے کمزوری کا بھی شکار تھا۔ آخری بار وہ نیچے گرا تو پھر نہ اُٹھ سکا۔ وہ فرش پر کسی پاگل ہو جانے والے کُتّے کی طرح پڑا ہانپتا رہا، کانپتا رہا اور مکروہ آوازیں نکالتا رہا۔ اس کا رونا دھونا، منت سماجت کرنا سب رائیگاں گیا۔ میں نے اسے صاف بتا دیا کہ وہ واپس نہیں جا سکتا۔ اسے چرس والی ایک سگریٹ بھی نہیں دی جا سکتی۔ اور اگر اس نے زیادہ دیوانگی کا مظاہرہ کیا تو میں اسے باندھ کے ڈال دوں گا۔

میں نے دروازے کو باہر سے کنڈی لگا دی۔ کریم بلوچ کے ساتھ مشتری اب کچھ سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ اس نے میرے زورِ بازو اور جاہ و جلال کا یہ پہلا نمونہ دیکھا تھا۔ میں نے دوست محمد کے ساتھ محبت آمیز سختی برتی تھی۔ میرا ارادہ اسے نقصان پہنچانے کا نہیں نقصان سے محفوظ رکھنے کا تھا۔ دوست محمد کی جگہ کوئی دشمن شکاری ہوتا تو میں اپنی جارحانہ قوت اور بھرپور ہلاکت خیز قوت کا استعمال کرتا۔ تاہم اس نمونے کا بھی مشتری پہ خاطر خواہ اثر ہوا تھا۔

"تُو دیکھا صاب کو، کیسا آملیٹ بنا دیا استاد کا... ابھی تو کھسک لے..." کریم نے کہا۔

"چل چل، مجھے کیا سمجھا رہا ہے۔ تو خود سیدھا ہو جا۔ میں تو اچھی طرح جانوں ہوں تجھے، کُتّے کی دُم ہے بالکل۔" مشتری نے ہاتھ ہلا کے کہا۔

اسی وقت دوست محمد نے دروازے کو ٹکر ماری۔ "سالا سکندر کا بچہ! بیڑا غرق ہووے تیرا، چھوڑ میرے کو..." اس نے پھر دروازے سے سر ٹکرایا اور مجھے گالی دی۔

"صاب جی، آپ تو باندھ ہی دو اسے۔ یہ تو باؤلا ہو رہا ہے۔" مشتری نے کہا۔ "دروازہ توڑ دے گا۔"

"دروازہ نئیں ٹوٹ سکتا۔" کریم بلوچ نے پورے یقین سے کہا۔

مشتری نے اسے گھور کے دیکھا۔ "تجھ سے تو پاپڑ بھی نہ ٹوٹے ہے۔"

میں نے کہا۔ "جاؤ کوئی رسّی لے کر آؤ۔ ایسے تو دوست محمد خود کو ہلاک کر لے گا۔"

میں نے بادلِ ناخواستہ دوست محمد کو بے بس کر کے اس کمرے کے ایک کونے میں ڈال دیا۔ اس کی یہ کیفیت وقتی تھی، مجھے معلوم تھا کہ آہستہ آہستہ اس کی حالت سنبھلنے لگے گی۔ جسم جو زہر سے لذت کشید کرنے کا عادی تھا، محرومی کے آزار سے گزر جانے کے بعد پھر جینے کی خواہش سے توانائی حاصل کرے گا اور سرچشمۂ حیات سے پھر پاک صاف، بے آلائش و بے ندامت، پُرعزم اور پُرمسرت زندگی کا دھارا بہنے لگے گا۔

دوست محمد سے نمٹنے کی جدوجہد میں بیس منٹ صرف ہو گئے تھے، جو انتظار اور اندیشوں کی یلغار میں کاٹے نہ کٹتے۔ اب میں نے پھر گھڑی دیکھی۔ گل کے بعد محسن کو گئے ہوئے پچپن منٹ ہو گئے تھے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ پانچ منٹ بعد مجھے کچھ نہ کچھ کرنا ہو گا۔ یوں بے کار بیٹھ کے انتظار کی بے عمل ندامت میں مبتلا رہنا کسی کو فائدہ نہیں پہنچا سکتا تھا۔

میرے لیے یہ بھی ممکن نہ تھا کہ میں ان تینوں یعنی شیخ، گل اور محسن کو بھول کر یہ سمندری مہم سر کرنے کے لیے اکیلا ہی لانچ لے کر روانہ ہو جاؤں اور یہ بھی ناممکن تھا کہ غالب اور نازو کے خیال کو بھول کر اس مہم سے ہی تائب ہو جاؤں۔ مجھے ایک خالص عقلی اور غیر جذباتی فیصلہ کرنا تھا۔ میرے سامنے وہ سوال تھا جو ریاضی کے اصولوں کے مطابق ہی حل کیا جا سکتا تھا۔ ایک طرف میرے دو ساتھی تھے جو ایک بحری جہاز پر دشمنوں کی قید میں تھے اور وہ جہاز ایک ایسا قلعہ تھا جس پر حفاظتی انتظامات بھی انتہائی سخت تھے۔ دوسری جانب میرے تین ساتھی دوسرے دشمن کی قید میں تھے۔

میرے پکڑے جانے کے امکانات دونوں طرف برابر تھے۔ ہر صورت میں ایم آر ایس کا مقدس مشن ناکام و ناتمام رہتا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ بفرضِ محال، میں غالب اور نازو کی مدد سے ایس ایس کرانتی تھنڈر کو غرق کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو ہم تینوں

اپنی آزادی سے اور کامیابی سے باقی تین ساتھیوں کو فائدہ نہیں پہنچا سکتے تھے۔ اس وقت تک وہ بے رحم قانون کی اَن گنت زنجیروں میں جکڑے ہوئے کسی نامعلوم زنداں کی بلند و ناقابلِ تسخیر دیواروں کے پیچھے پہنچ جاتے اور ہمارے لیے ان کو منزلِ دار و رسن تک نہ پہنچنے دینا فقط آرزو اور فریبِ آرزو کی بات ہو جاتی۔

لیکن دوسری جانب بہ فرضِ محال میں پولیس کے قبضے سے گل، محسن اور شیخ تینوں کو چھڑانے میں کامیاب ہو جاتا تو یہ کامیابی ہماری ٹیم کو پھر اپنی مہم کے لیے جادہ پیما کر سکتی تھی... اور ہم اپنی منظم قوت کے ساتھ طے شدہ پروگرام کے مطابق اور بروقت کارروائی کر کے غالب اور نازو کو بھی بازیاب کر سکتے تھے اور اس سے ایم آر ایس کی اسٹرائیکنگ فورس یعنی ضربِ کاری لگانے کی قوت بحال ہو جاتی تھی۔

ایک اسلحے سے جانے والے بحری جہاز کے مقابلے میں ایک تھانے پر حملہ اس لیے بھی قابلِ عمل تھا کہ تھانہ میرے لیے کوئی اجنبی جگہ نہ تھی۔ میرے ذہن میں ہر تھانے کا وہی ایک نقشہ تھا جو میں نے بار بار دیکھا تھا۔ دو چار بھاری پیٹ والے غیر مستعد سب انسپکٹر قسم کے افسر کرسیوں میں دھنسے ہوئے یا پھنسے ہوئے، کچھ کھاتے پیتے یا محکوم و مجبور عوام پر اپنی فرعونیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے۔ چند حوالاتی، اونگھتے محرر، حوالدار وغیرہ اور کچھ جاگتے کچھ سوتے کانسٹیبل، جنھیں ایک فوری اور مؤثر کمانڈو ایکشن کے ذریعے قابو کرنا ایک بحری جہاز کے عملے کو قابو کرنے سے کہیں زیادہ آسان تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی ازکار رفتہ رائفلیں اٹھانے کے لیے اٹھیں یا اختیار کی علامت کے طور پر آویزاں ریوالور کی جانب ہاتھ بڑھائیں، انھیں لائن حاضر کیا جا سکتا تھا۔

پانچ منٹ بعد میں تیار تھا۔ میں نے ایک خودکار ریوالور اپنے ایک جوتے کی جراب میں ڈال لیا تھا۔ تو دوسرا میری جیب میں تھا۔ مجھے ابھی معلوم نہیں تھا کہ بندرگاہ کی حدود سے نکل کے میں کس سمت میں جاؤں گا اور کس سے [illegible] اکرام شیخ کو کہاں لے گئے ہے۔ [illegible] تھا کہ قتل جیسے جرم پر تمام [illegible] متعلقہ تھانہ کرتا ہے۔ چنانچہ میں بندرگاہ کے علاقے [illegible] تھانے جا کے صورتِ حالات دیکھ سکتا تھا اور [illegible] بھی ان کی آزادی کی قیمت نقد چکانے میں [illegible] موقع محل کے مطابق مجھے طاقت کا بھرپور [illegible]

[illegible] ہی والا تھا تاکہ اسے بتا سکوں کہ میں [illegible] ماحول اور اگر میرے

جاتے ہی گل یا محسن آجائیں تو انھیں کچھ نہ بتائے۔ میں جلد ہی لوٹ آؤں گا لیکن ہم میں سے کوئی بھی نہ آئے تو وہ دوست محمد کے ذریعے چاند بھائی سے رابطہ قائم کر کے ساری بات اس تک پہنچا دے پھر اسے جو کرنا ہوگا وہ خود کرے گا اور معلوم ہو جائے گا کہ وہ کس حد تک ہمارا طرف دار ہے۔

کریم بلوچ لانچ کے مختصر سے کچن میں مشتری کو... امورِ خانہ داری سنبھالنے کی سزا بھگت رہا تھا۔ شاید اس نے مشتری سے پوچھنا چاہا تھا کہ وہ کیا کچھ پکا سکتی ہے اور اب جواب میں مشتری کی زبان ہوٹلوں کے ویٹر کی زبان سے زیادہ تیز چل رہی تھی جو ایک سانس میں پورا مینو پڑھ جاتے ہیں اور گاہک بے چارہ ہکا بکا بیٹھا رہتا ہے۔ مشتری کو اس لحاظ سے فوقیت حاصل تھی کہ اس نے مغلئی، انگلش، چینی کے علاوہ اپنی فہرست میں ایسے کھانے بھی شامل کر لیے تھے جو ہم نہیں کھا سکتے تھے۔ شاید افریقہ کے آدم خور بھی نہیں کھا سکتے تھے۔

میری دخل اندازی سے پہلے ہی ایک دھماکے سے لانچ ہل گئی اور میں نے پلٹ کر بلا ارادہ ریوالور کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر پھر میں نے محسن کو دیکھا جس نے شرافت سے اترنے کے بجائے لانگ جمپ ماری تھی اور اندازے کی غلطی کے باعث سیدھا عرشے پر لینڈ نہ کر سکا تھا۔ گل بانو اس کے پیچھے ہنستی ہوئی آئی اور محسن کو اٹھانے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھا کے جھکی۔ سخت خفت زدہ محسن اپنی چوٹ کو چھپانے کے لیے زبردستی مسکراتا ہوا خود اٹھ کھڑا ہوا۔

میں نے یہ منظر دور سے دیکھا اور اطمینان کا [illegible] گہرا سانس لیا۔ ان سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کے [illegible] کرتے چہروں پر کامیابی کی خوشی کے دمکتے شوخ رنگ سب بتا رہے تھے کہ ان کا خطرناک مشن بہ خیر و خوبی پورا ہوا۔

”خوش آمدید، گل و بلبل۔“ میں نے اوپر آ کے کہا۔

گل ہنس پڑی۔ ”میرا تو خیر یہی نام ہے مگر یہ بلبل؟“

”کیوں، صورت سے اُلو نظر آتا ہوں میں۔“ محسن نے کہا۔

”کم سے کم تمھیں شکر گزار ہونا چاہیے کہ میں نے اپنی عقل ہی استعمال کر کے تمھیں بھی بچا لیا۔“

”اونہہ... آخر میں آ گئے جب کوئی کام نہیں رہا تھا تو لہو لگا کے شہیدوں میں شامل ہو گئے۔“ وہ اٹھلا کے بولی۔

”اچھا جی، ابھی میں بتا دوں گا ساری بات۔“

”بتا دو۔ میں بھی بتا دوں گی ساری بات۔“ گل نے اس کی بات کاٹ کے [illegible]

”اچھا اچھا۔“ محسن گھبرا کے بولا۔ ”تم جاؤ نیچے [illegible]

کرو۔ میں بات کرتا ہوں سکندر سے۔“

”وہ کریم اور اس کی بیوہ آ گئے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”جا کے ملو اس سے، بڑی دلچسپ باتیں کرتی ہے۔“

جب گل چلی گئی تو محسن نے مجھے مختصراً اس کی بے شرمی کا احوال سنایا۔ گل نے خود کو شیخ کی بیوی ظاہر کیا تھا اور اسے گرفتار کر کے لے جانے والے سپاہیوں کے سامنے دیدہ و دانستہ ایسا رویہ اختیار کیا تھا کہ وہ گل کو ایک آبرو باختہ عورت سمجھے تھے تو ٹھیک سمجھے تھے۔ جب معاملے کی بات چلی تو گل نے پھر ایک غلط پیش کش کر دی۔ وہ سمجھے کہ مال کے ساتھ وہ اپنے آپ کو بھی پیش کر رہی ہے۔

”شیخ نے دیکھ لیا تھا کہ گل پیچھے آ رہی ہے۔ اس کے ساتھ جو پولیس مین تھے وہ انتظار کر رہے تھے کہ کوئی ٹیکسی ملے تو ملزم کو تھانے لے جائیں۔ اتفاق یا خوش قسمتی کہ وہاں صرف شیخ کی خالی ٹیکسی کھڑی ہوئی تھی۔ شیخ نے ایک بار مجھے بتایا تھا کہ وہ دوسری چابی کہاں رکھتا ہے۔ میں سیدھا ٹیکسی کی طرف گیا اور اگلے پہیے کے قریب چیسس کے ساتھ بندھی ہوئی وہ چابی نکال لی۔ میں نے دور ہی سے گل کو پولیس والوں کے پاس جاتے دیکھا مگر خود ٹیکسی سے دور کھڑا رہا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ بیگار میں پکڑا جاؤں۔ گل ان سے کیا بات کر رہی ہے اس کا اندازہ میں اتنی دور سے نہیں کر سکتا تھا لیکن تھوڑی دیر بعد جب انھیں ٹیکسی ملی اور سب اس میں بیٹھ گئے تو میں شیخ کی ٹیکسی لے کر تعاقب میں چل پڑا۔ گل کی کامیابی کا مجھے اس وقت یقین آیا جب میں نے دیکھا کہ پولیس والے ملزم کو لے کر تھانے نہیں جا رہے ہیں۔ میں ان کے اور اپنے درمیان فاصلہ رکھتے ہوئے چل رہا تھا۔ میں قریب رہ کے بھی پیچھا کرتے ہوئے ڈرتا تھا کہ کہیں انھیں شک نہ ہو جائے۔ مجرم سب ہی ضرورت سے زیادہ محتاط ہوتے ہیں۔ زیادہ فاصلے کا نقصان یہ ہو سکتا تھا کہ کہیں وہ دائیں بائیں مڑ جاتے اور میں نہ دیکھ پاتا تو ان کا پتا کس سے پوچھتا۔ خیر ابھی وہ بندرگاہ کے علاقے میں ہی تھے کہ اچانک ٹیکسی رک گئی۔ انھوں نے اکرام شیخ کو باہر دھکا دے کر گرا دیا۔ خدا کا شکر ہے کہ چلتی گاڑی میں سے نہیں لڑھکایا۔ اب تو خود سوچ کہ اس وقت میں پیچھے نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔ شیخ کو ڈراپ کرتے ہی ٹیکسی پھر روانہ ہو گئی تھی۔ میں نے پہلے تو رفتار بڑھانے کا سوچا لیکن پھر اس خیال سے رک گیا کہ شیخ کو باہر پھینکتے ہوئے انھوں نے آگے پیچھے ضرور دیکھا ہوگا۔ انھیں میری ٹیکسی نظر آئی ہوگی مگر انھوں نے ٹیکسی کو اہمیت اس لیے نہیں دی کہ مسافروں کے ساتھ کوئی ٹیکسی ڈرائیور اپنا راستہ چھوڑ کے مجرموں کے پیچھے نہیں دوڑتا خواہ وہ کتنا ہی سنگین جرم ہوتا کیوں نہ دیکھے۔ اوّل تو یہاں رضا کارانہ طور پر قانون کی مدد کرنے کا جذبہ ہے ہی نہیں۔ لوگ جانتے ہیں کہ اس قسم کے معاملات میں انصاف کی مدد کرنے والے کتنی ناانصافی کا شکار ہوتے ہیں۔ جرم کرنے والے تو بچ جاتے ہیں۔ جرم کے گواہ بننے والے سزا کاٹتے ہیں، پھر یہ ٹیکسی ڈرائیور تو ویسے ہی... براہِ راست پولیس کی معتوب رعایا میں شمار ہوتے ہیں۔ انھیں کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ پیچھے آنے والی ٹیکسی خالی ہے۔ انھوں نے تو فرض کیا ہوگا کہ اس میں جو دو چار مسافر ہوں گے، وہ اپنی منزل پر پہنچنے کی جلدی میں ہوں گے۔ چنانچہ ٹیکسی ڈرائیور کے مجاہدانہ جذبات میں اُبال آیا بھی تو وہ اس کو کچھ نہیں کرنے دیں گے اور کہیں گے کہ چل میاں چھوڑ اس چکر کو، پرائے پھڈے میں ٹانگ اڑا کے ہمیں تھانے نہیں جانا۔ خیر، یہ سب سوچ کے میں نے رفتار کچھ کم کی اور اکرام شیخ کے قریب جا کے اس سے کہا کہ دروازہ کھول کے بیٹھ جائے۔ میں ٹیکسی روکوں گا نہیں۔ اکرام شیخ سخت مشتعل تھا اور پولیس والوں کو اچھی کی زبان میں گالیاں دے رہا تھا۔ آخر تھا تو اسی خاک سے اٹھا ہوا خمیر۔ کیا کہا ہے وہ چچا غالب نے۔ گھر واں نہیں پر واں سے نکالے ہوئے تو ہیں۔ میں نے اس کو کچھ ٹھنڈا کیا تو اس نے بتایا کہ پولیس والے گل کو کسی کوارٹر میں لے جانا چاہتے ہیں۔ گل نے تو انھیں معاوضے کی پیش کش کی تھی مگر انھوں نے گل کو ہی معاوضہ سمجھ لیا۔ چنانچہ ملزم کو آزاد کر کے ٹیکسی سے خارج کر دیا گیا۔ وہ کباب میں ہڈی تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ تینوں بدمعاش نہ صرف یہ کہ گل کی عزت لوٹ لیں گے بلکہ بعد میں اس سے وہ سب رقم بھی چھین لیں گے جو ہم نے گل کو شیخ کی رہائی کی قیمت چکانے کے لیے دی تھی۔ میں نے ٹیکسی کا نمبر تو پہلے ہی نوٹ کر لیا تھا۔ اور برابر اس پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ شیخ نے اتنی دیر میں ایک کمال دکھایا۔ اس نے پیچھے والی سیٹ کی بیک ہٹائی، تو جانتا ہے کہ اس کے پیچھے خلا ہوتا ہے جس میں سے ڈکی نظر آتی ہے اور بہ وقتِ ضرورت اس چور دروازے سے ڈکی میں داخل ہونا بھی کوئی مشکل کام نہیں۔ شیخ نے اس کے اندر ہاتھ ڈال کے ایک پیکٹ نکالا جو پلاسٹک میں لپٹا ہوا تھا۔ پیکٹ میں اس کی پرانی سب انسپکٹری کے دَور کی وردی موجود تھی جو ابھی تک قابلِ استعمال بلکہ بہترین حالت میں تھی۔ شیخ نے چلتی ہوئی ٹیکسی میں ہی اپنے کپڑے اتارے اور وہ وردی پہنی۔ اتنی دیر میں آگے جانے والی ٹیکسی ایک کوارٹر کے سامنے ٹھہر گئی تھی۔ وہ غیر آباد رہائشی علاقہ تھا اور کوارٹر ماتحت عملے کے لیے تھے۔ دو یا تین کمروں کے چھوٹے چھوٹے کوارٹر۔ وہ تین بدمعاش تھے۔ میں نے

انھیں گل کو زبردستی گھسیٹ کر اندر لے جاتے دیکھا۔ مجھے اس ٹیکسی ڈرائیور کی کم ہمتی اور بے غیرتی پر طیش آنے لگا جو یہ سب کچھ دیکھ کے بھی خاموش تھا۔ ظاہر ہے اس نے بہت کچھ ٹیکسی میں سُنا بھی ہوگا۔ گل آسانی سے قابو آنے والی لڑکی تو نہیں ہے۔ اس نے شور مچایا ہوگا اور مزاحمت کی ہوگی لیکن ٹیکسی ڈرائیور نے اس کی مدد کرنے کے بجائے 'برامت دیکھو، برامت سنو، برامت کہو' کے مقولے پر اطاعت عمل کیا اور اپنی جان بچا کے نکل جانے کا سوچ کے خاموش ہوگیا۔ اب جیسے ہی وہ ٹیکسی واپس ہوئی تو اپنے شیخ صاحب نے اسے روک لیا کہ سواری کہاں سے آرہی ہے؟ مجرم تو وہ تھا ہی پولیس کو دیکھ کے اور بدحواس ہوا۔

"سواریاں چھوڑنے آیا تھا جناب...!" وہ بولا۔

"کیسی سواریاں؟" شیخ نے کہا۔ "زنانہ یا مردانہ؟"

"جی... وہ ایک عورت تھی..."

"کہاں سے لے کر آئے تھے انھیں؟" شیخ نے سخت لہجے میں کہا۔

ٹیکسی ڈرائیور نے شیخ کو غور سے دیکھا ہی نہیں تھا ورنہ دیکھا بھی ہوتا تو اسے کیسے شک ہو سکتا تھا کہ یہ وہی فالتو سواری ہے جسے راستے میں ڈراپ کر دیا گیا تھا۔ کسی تھانیدار کی تھانیداری پر شک کرنا کسی بچھو کے ڈنک کو چھو کر تصدیق کرنے سے کم خطرناک تو نہیں کہ وہ بچھو ہے یا کاکروچ۔

ٹیکسی ڈرائیور کی حالت غیر ہوگئی۔ "سرکار! میرا کوئی قصور نہیں... وہ آپ کے ہی ساتھی تھے۔"

شیخ نے اس کے ایک زبردست جھانپڑ رسید کیا۔ چٹاخ کی آواز کے ساتھ ہی اس کا گال سُرخ ہوگیا اور وہ لڑکھڑا گیا۔ چند منتخب قسم کی گالیاں دینے کے بعد شیخ نے کہا۔ "میرے ساتھی تھے وہ؟"

"وہ... میرا مطلب ہے... جناب! وہ پولیس کی وردی میں تھے۔" ڈرائیور نے کہا۔

"وہ اغوا کر کے لائے تھے کسی لڑکی کو؟"

"جی... ایسا ہی لگتا تھا..." ڈرائیور جو اپنی جان بچا کے فرار ہونے میں تقریباً کامیاب ہوگیا تھا، یوں پکڑے جانے پر سخت پریشان تھا۔ اب وہ بھی شریکِ جرم بن گیا تھا۔

"لگتا تھا کیا مطلب؟ سیدھی صاف بات کر..." شیخ نے اس کے سر پر ٹھکا مارا۔

"جی... جی ہاں جناب... وہ کسی کی بیوی کو اغوا کر کے لائے تھے..." ڈرائیور کی آواز لرزنے لگی۔ "انھوں نے شوہر کو ہتھکڑی لگا رکھی تھی۔ مگر چھیر تک مُکا ہوگیا۔"

"کیا ہوگیا؟"

"سودا ہوگیا جناب... لڑکی نے کہا کہ اس کے شوہر کو چھوڑ دیا جائے تو وہ ان کا جی خوش کر دے گی۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ چھوڑ کیسے دیں، قتل کا الزام ہے اس پہ۔ دوسرے نے دیکھا ہے کہ یہ جائے واردات سے پکڑا گیا تھا۔ وہ کہنے لگی کہ پکڑنے والے اب کہاں ہیں کہ تم ڈرتے ہو۔ انھوں نے کہا کہ ہم ملزم کو پکڑ کر لے آئے ہیں اور اپنا ایک بندہ وہاں چھوڑ آئے ہیں کہ کسی کو لاش کے پاس نہ آنے دے۔ ہم تھانے سے نفری لے کر آئیں گے کسی افسر کے ساتھ۔ لڑکی کہنے لگی کہ تم کو کیا ضرورت ہے واپس جانے کی۔ تمھارا جو ساتھی ہے اسے بھی پیغام بھجوا دو کہ وہاں سے نکل آئے یا لاش اٹھوا کے کسی اور جگہ ڈلوا دو کسی دوسرے تھانے کے علاقے میں۔ تم لوگ تو لاشوں کو ٹھکانے لگانا جانتے ہو۔ یہ دوسری تجویز ان کو پسند آئی مگر انھوں نے کہا کہ اچھا اگر ہم تمھارے گھر والے کو چھوڑ دیں تو تم کیا دو گی ہمیں۔ عورت نے کہا کہ جو مانگو گے۔ بس جناب، اس کے بعد ایک نے ملزم کی ہتھکڑی کھولی اور اسے وہیں چلتی گاڑی سے سڑک پر گرا دیا۔ عورت چلانے لگی کہ یہ تم نے کیا کیا۔ اس پر دوسرا بولا کہ ہم نے تمھاری بات مان لی اور ملزم کو چھوڑ دیا۔ پہلے نے کہا کہ اب تم اپنا وعدہ پورا کرو۔ ہم اب تم کو مانگتے ہیں۔ ہمارا جی خوش کر دو بس۔ عورت نے جب شور مچایا تو ان دونوں نے اس کا مُنہ بند کر دیا۔ اور..."

"اور تم اُلو کے پٹھوں کی طرح سب دیکھتے رہے اب سُنتے رہے۔" شیخ نے اس ٹیکسی والے کے دوسرا جھانپڑ مارا۔

"میں کیا کر سکتا تھا جناب... ان کے پاس ریوالور تھا اور پولیس سے ہم کیسے مقابلہ کر سکتے ہیں؟"

شیخ نے اسے میرے حوالے کیا اور کہا کہ اگر یہ بدمعاش بھاگنے کی کوشش کرے تو اسے گولی مار دوں۔ میں نے اپنی ٹیکسی کوارٹر کی سائیڈ میں روکی تھی جو اسے نظر نہیں آرہی تھی۔ میں ایک طرف تو ان کی گفتگو سن رہا تھا۔ دوسری طرف کوارٹر کے بند دروازے کی جھری سے اندر جھانک رہا تھا۔ دونوں پولیس مین گل کے ساتھ فری اسٹائل کشتی لڑ رہے تھے۔ گل کو باقاعدہ لڑنا تو نہیں آتا تھا مگر اس نے بے قاعدہ مقابلے میں بھی ان کا حال خراب کر رکھا تھا۔ انھوں نے کئی بار گل کو پکڑنے کی کوشش میں لاتیں کھائیں۔ گل ان کی گرفت سے مچھلی کی طرح تڑپ کر نکل گئی اور پلٹ کے ان میں سے کسی کو ہاتھ مار دیا کسی کو کاٹ لیا۔ وہ ایک بپھری ہوئی شیرنی کی طرح مقابلہ کر رہی تھی۔ مجھے حیرانی تھی کہ اس نے شور کر کے لوگوں کو بلانے کا کیوں نہیں سوچا۔ شاید وہ ان دونوں بدمعاشوں پر

ثابت کرنا چاہتی تھی کہ جسے وہ کوئی عام قسم کی کمزور عورت سمجھ بیٹھے تھے، وہ ناگ منی ہے۔ اگر وہ اپنا نام بتا دیتی تو ان کے ویسے ہی چھکے چھوٹ جاتے۔ اپنی بار بار کی ناکامی انھیں شرمندہ بھی کر رہی تھی اور آتش شوق کے ساتھ آتش غضب کو بھی بھڑکا رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ معاملہ حد سے بڑھ گیا تو وہ ناگ منی کو ریوالور کا دستہ مار کے ناک آؤٹ کر دیں گے۔ اس وقت وہ قانون کے محافظ نہیں تھے۔ ہوس کے مارے ہوئے بھوکے بھیڑیے بن چکے تھے۔ ناگ منی کے کپڑے بھی اس جدوجہد میں پھٹے تھے اور اس کے جسم پر بھی خراشیں آئی تھیں مگر پولیس والوں کی تو وردی پھٹ گئی تھی اور ان کے چہروں اور ہاتھوں پر خراشوں کے نیل الگ تھے اور گل کے دانتوں سے کاٹے جانے والے لہو آلود نشانات الگ۔

جب اکرام شیخ نے اس ٹیکسی ڈرائیور کو میری تحویل میں دیا تو میں نے ریوالور نکال لیا اور ٹیکسی ڈرائیور کو سمجھا دیا کہ اب وہ قانون کا ساتھ دے کر ہی بچ سکتا ہے۔

"جناب... مجھے معاف کر دیں... میں غریب ٹیکسی چلانے والا... کسی گواہی میں نہیں پڑ سکتا۔"

اب میں نے اس کے ہاتھ رسید کیا۔ "غریب! اب غریب بن گیا، تیری تو... تو ساتھی ہے مجرموں کا۔ سب کے ساتھ مل کے تو بھی اغوا میں شریک تھا... تو نے اپنی ٹیکسی واردات میں استعمال کی۔ اب تو ایک ہی صورت ہے تیرے بچنے کی کہ تو سرکاری گواہ بن جا، ورنہ ان کے ساتھ تو بھی کم سے کم سات سال کے لیے اندر ہوگا۔"

جب اکرام شیخ نے دروازے پہ دستک دی تو اندر سے آنے والی سب آوازیں ایک دم معدوم ہوگئیں۔ جیسا کہ بعد میں گل نے بتایا، ان دونوں پر تو سکتہ طاری ہوگیا تھا۔ گل نے بجلی کی طرح لپک کے کنڈی کھول دی۔ میں اور اکرام شیخ اس ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ اندر داخل ہوئے تو دونوں کانسٹیبل خود اپنے جرم کی تصویر بنے ہوئے کھڑے تھے۔ انھیں ایک لمحے کے لیے بھی شک نہیں ہوا کہ اچانک اندر آجانے والا سب انسپکٹر وہی ملزم بھی ہو سکتا ہے جسے وہ ہتھکڑی ڈال کے لائے تھے اور ابھی مشکل سے دس منٹ پہلے سڑک پر پھینک چکے تھے۔

"سیدھے کھڑے ہو جاؤ، ہاتھ اوپر اٹھا کے۔" شیخ نے گرج کے کہا۔ "بے غیرتو... بے ضمیرو... کُتّو... کون ہے یہ عورت؟"

اس وقت گل نے خوب اداکاری کی۔ وہ ایک دم شیخ کے پاؤں پڑ گئی اور رونے لگی۔ "تھانیدار صاحب! یہ مجھے اور میرے شوہر کو گھر سے چوری کے الزام میں پکڑ لائے تھے۔"

"جھوٹ... جھوٹ بکتی ہے یہ..." ایک نے ہکلا کے کہا۔

"اپنی بکواس بند رکھو۔" شیخ نے گرج کے کہا۔ "میں اندر آنے سے پہلے سب دیکھ چکا تھا کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔"

"انھوں نے میرے شوہر کو راستے میں مار کے پھینک دیا حضور!" گل نے زار و قطار رونے کی کوشش کی اور ناکام رہی۔ "اس کی لاش چلتی گاڑی سے گرا دی..."

"اجی صاحب! اوّل نمبر کی جھوٹی ہے یہ... حرافہ، مکّار عورت۔" دوسرا پولیس مین دانت پیس کے بولا۔ "وہ تو خود ہی چلتی گاڑی سے کود گیا تھا۔"

"اور تم اس کے تعاقب میں جانے کے بجائے اس عورت کو یہاں لے آئے؟" شیخ نے خالص پولیس اسٹائل میں اس کو بہترین گالیوں سے نواز کے ایک ہاتھ مارا۔ "کیوں؟... کیا تمھیں تھانے کا راستہ معلوم نہیں تھا؟"

دونوں پولیس والے صورتِ حال کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے منت سماجت پر اتر آئے۔ ان کے لیے اپنے جرم سے انکار کرنا عملاً ناممکن ہوگیا تھا۔

"سر، ہمیں معاف کر دیں... ہم..."

"اپنی پیٹی اتار دو۔" شیخ نے ان کی بات کاٹ دی۔ "تمھارے خلاف بہت سنگین چارج ہیں۔ اغوا، اقدامِ قتل، فرائض میں غفلت، مجرمانہ حملے کی سازش۔ یہ ٹیکسی ڈرائیور گواہ ہے تمھارے سب جرائم کا... چلو چلو... دیر مت کرو... پیٹی اتار کے میرے حوالے کرو۔"

انھوں نے آخری بار ہاتھ جوڑنے اور پاؤں پڑنے کی کوشش کی مگر شیخ کے سخت رویّے کو دیکھتے ہوئے انھوں نے اپنی اپنی پیٹی اتار کے مجھے تھما دی۔

"یہ ریوالور کہاں سے آیا تمھارے پاس؟" شیخ نے ریوالور لے کے ریوالور کو غور سے دیکھ کر کہا۔ "تم ریوالور رکھنے کے مجاز نہیں۔ اور یہ تو سروس ریوالور بھی نہیں ہے۔ گویا تم پر ناجائز اسلحہ رکھنے کا الزام بھی بنتا ہے اور بھی وارداتیں کی ہوں گی تم نے اس سے۔"

پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "ان دونوں کو ہتھکڑی ڈال دو۔ دونوں کے سیدھے ہاتھ ایک ساتھ باندھ دو، ایک ہی ہتھکڑی سے۔ پھر تم خاتون کو لے کر پولیس ہیڈ آفس چلو۔"

ہیڈ آفس کے نام پر وہ پھر چلانے لگے۔ ان کا خیال ہوگا کہ یہ نامعلوم سب انسپکٹر جو پُراسرار طور پر نمودار ہو کے بلائے جاں کی طرح چمٹ گیا ہے، ان کے اپنے تھانے پہنچ کے ٹھیک ہو جائے گا اور اپنے تھانہ انچارج صاحب کچھ نہ کچھ مدد کریں گے

تاکہ تھانے کی نیک نامی پر حرف نہ آئے۔

"تم کو تو میں براہِ راست ڈی آئی جی کرائمز کے سامنے پیش کروں گا،" شیخ نے اعلان کیا۔ "تاکہ تمھیں صحیح سزا ملے۔ کوئی پھر دخل اندازی کرکے دیکھے۔"

ابھی تک ان دونوں اُلّو کے پٹھّوں نے یہ نہیں سوچا تھا۔ یا سوچا تھا تو پوچھا نہیں تھا کہ آخر پولیس ارتکابِ جرم سے بھی پہلے کیسے پہنچ گئی؟ پولیس کو رپورٹ کس نے دی اور یہ..... سب انسپکٹر کہاں سے نازل ہو گیا؟ خیر میں نے شیخ کی ہدایات کے مطابق انھیں ایک ساتھ مقفّل کیا اور زنجیر شیخ کو تھما دی۔ ان کی جیبوں میں سے شناختی کارڈ اور کچھ مالِ غنیمت بھی برآمد ہوا تھا جو میں نے اپنی تحویل میں لے لیا۔

"تم جیپ لے کر جاؤ،" شیخ نے کہا۔ "میں اسی ٹیکسی میں پہنچتا ہوں۔ جیپ وہیں چھوڑ دینا۔"

جیپ کے حوالے نے انھیں چت کر دیا۔ انھوں نے فرض کر لیا ہو گا کہ راستے میں جب گل نے شور کیا تھا، اس وقت یا جب انھوں نے ملزم کو ٹیکسی سے خارج کیا تھا تو پیچھے یہ سب انسپکٹر جیپ میں آرہا تھا اور وہیں سے پیچھے لگ گیا۔ آدمی کی جب شامت آتی ہے تو بلائیں آسمان سے بھی نازل ہو جاتی ہیں۔ اس کے بعد میں تو گل کے ساتھ باہر آگیا۔ وہاں شیخ کی ٹیکسی موجود تھی، ہم اس میں بیٹھ کے بھاگ آئے۔"

محسن کی بات ختم ہونے تک میں نے کہیں مداخلت نہیں کی تھی اور اس سے کوئی سوال نہیں کیا تھا لیکن اب مجھے پوچھنا پڑا۔

"وہ شیخ صاحب اب کہاں ہیں؟"

"مجھے کیا معلوم،" محسن نے کہا۔ "اس کی ٹیکسی کو ہم نے وہیں کھڑا کر دیا تھا جہاں پہلے تھی، وہ آئے گا تو لے جائے گا۔"

"یعنی کس قدر عقلمندی کی بات کی ہے آپ نے۔ بھائی میں پوچھ رہا ہوں کہ ان دونوں پولیس والوں کو لے کر وہ کہاں گیا؟ کچھ بتایا تھا اس نے؟"

محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "سب کے سامنے کیسے بتا سکتا تھا لیکن ہے، وہ انھی کا باپ۔ ان سے نمٹنا جانتا ہے۔"

"وہ پھنس کیسے گیا تھا؟"

"آپ نے اس کی عقل کو گھاس چرنے بھیجا تھا،" محسن بولا۔ "اس کو حکم دیا تھا کہ میاں جاؤ، پرائے پھڈے میں ٹانگ اڑاؤ۔ وہ سالا مجنوں کا پٹھا کریم، خود تو آگیا خیریت سے، شیخ صاحب اس کو تلاش کرتے کرتے جا پہنچے لیلیٰ کے مقتل تک۔ جہاں ان کا کشتۂ ستم خدائے مجازی مقتول پڑا ہوا تھا۔"

"میں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ جائے واردات پر رپورٹ کرو اور پکڑے جاؤ،" میں نے کہا۔ "کریم نہیں ملا تھا تو واپس آجاتا۔"

"کیسے آجاتا۔ پولیس والا ہے نا۔ جرم کا سراغ لگاتے ہوئے سیدھا وہاں جا پہنچا۔ کریم کے کسی جاننے والے نے کہا کہ وہ تو ابھی ادھر گیا ہے، موشن میاں کے ساتھ۔ وہ پہلے کی بات کر رہا تھا۔ جب کریم اسے قتل کرنے گیا تھا۔ شیخ سمجھا کہ وہ بے وقوف موشن میاں کے گھر جا پہنچا ہے اور معلوم نہیں کیا ارادے رکھتا ہے۔ وہ اندر گیا تھا کریم کو لانے کے لیے مگر باہر نکلنا خود کو نصیب نہ ہوا۔ اچانک دو افراد اندر آگئے۔ ان میں ایک تو تھا موشن میاں کا خسر، جس کی اس عہدے پر توسیع ہو چکی تھی۔ دوسرا کوئی موشن میاں کا قرض خواہ تھا۔ انھوں نے اکرام کو پکڑ لیا اور شور مچا دیا۔ ارد گرد کی جھگیوں اور کوارٹروں سے لوگ کیڑے مکوڑوں کی طرح نکل آئے اور مجمع دیکھ کے کوئی آدمی پولیس والوں کو بلا لایا جو ڈیوٹی ختم کر کے لوٹ رہے تھے۔ آگے آپ جانتے ہیں، تفصیلات کے لیے انتظار فرمائیے، اکرام شیخ صاحب خود آپ کو بریف کریں گے۔"

"اسے ساتھ لے کر آنا تھا یار،" میں نے کہا۔ "اب یہ نیا انتظار، آخر وہ کیا کرے گا ان کے ساتھ؟"

"وہی جو سکندر نے پورس کے ساتھ نہیں کیا تھا۔ وہ ان کا اُلّو بنا کے چھوڑ آئے گا۔ یا بہت غصّے میں ہوا تو کریم کی زبان میں ان کا جنازہ بنا کے بھاگ آئے گا مگر فکر کی کوئی بات نہیں۔ شیخ کچا کام کرنے والا نہیں ہے۔"

محسن کی بات کچھ دیر بعد صحیح ثابت ہو گئی۔ شیخ اسی پولیس سب انسپکٹر کی وردی میں بڑے وقار کے ساتھ چلتا ہوا سیدھا اوپر آگیا۔ ہم دونوں اسے گھورتے رہے۔

"گل کہاں ہے؟" اس نے ہاتھ ہلا کر پوچھا۔ "مجھے اس کا شکریہ ادا کرنا ہے... اور اسے بہادری کی سند بھی دینا ہے۔"

"پہلے آپ مجھ سے سندِ حماقت تو وصول کر لیں،" محسن نے ہاتھ گھما کے کہا۔ مگر شیخ غوطہ مار گیا۔

"یار تم لوگوں کی خفگی بجا مگر دیکھو نا میں اپنی خوشی سے تو نہیں گیا تھا، مجھے بھیجا گیا تھا اور اگر میں پھنس گیا تھا تو اس پھندے سے نکل بھی آیا۔ اپنی پرائیویٹ لیاقت، ذہانت اور خداداد ہمت سے کام لے کر،" شیخ نے دانت نکال کے کہا۔ "تم نے کیا کیا؟"

"میں نے کچھ نہیں کیا،" محسن چراغ پا ہو کے بولا۔

"تم نے صرف میری ٹیکسی چرائی،" شیخ نے اسے ڈانٹ کر کہا۔ "اور سب تو گل نے کیا، اس نے بات کی پولیس والوں سے۔ ان کا مقابلہ کیا اور بالکل اکیلی ہونے کے باوجود ان کے قابو میں نہیں آئی، کسی کو مدد کے لیے نہیں بلایا اس نے..."

میں نے پلٹ کے دیکھا تو گل کا چہرہ خوشی سے دمکتا نظر آیا۔ میں سمجھ گیا کہ اتنی تعریف شیخ اسے سنانے کے لیے کر رہا تھا۔

"یہ لوگ ماننے والے نہیں ہیں بھائی جی،" گل نے قریب آکے کہا۔ "ان کی کھوپڑی میں تو وہی ایک بات ہے کہ عورت ذات کچھ نہیں کر سکتی۔ ناقص العقل ہوتی ہے۔ ناقص ہی سہی، عقل تو ہوتی ہے اس کے پاس۔"

"اچھا بابا، تم دونوں عقل مند، ہم اُلّو کے پٹھے،" میں نے جھنّا کے کہا۔ "اب یہ بتا کہ وہ دونوں کہاں ہیں؟"

"وہیں اسی کوارٹر میں،" شیخ نے قہقہہ مارا۔ "میں نے ان دونوں کی زنجیر پکڑ کے کہا کہ چلو۔ وہ ابھی ایک قدم ہی آگے بڑھے تھے کہ میں نے پیچھے سے دونوں کی کھوپڑی پر تاک کے ریوالور مارا۔ وہ وہیں لمبے لیٹ گئے۔"

"اس ٹیکسی ڈرائیور کے سامنے؟"

"نہیں... وہ میں بتانا بھول گیا،" شیخ نے سر کھجایا۔ "اسے میں نے پہلے ہی چلتا کر دیا تھا۔ خوب ڈانٹ ڈپٹ کے بعد کہ جاؤ، آج ترس کھا کے تمھیں چھوڑ رہا ہوں لیکن ان دونوں کو نہیں چھوڑوں گا۔ کسی سے کچھ کہو گے تو خود پھنسو گے۔ انھیں تو میں صرف ناجائز اسلحہ رکھنے کے الزام میں اور مار پیٹ کے جرم میں اندر کر دوں گا۔ اغوا کا کیس بنایا تو وہ بیچارے میاں بیوی خواہ مخواہ لپیٹ میں آئیں گے۔ ٹیکسی ڈرائیور تو میرے ہاتھ چوم کے بھاگ گیا تھا۔ وہ دونوں کچھ پُرامید ہو چکے تھے کہ شاید اب ڈانٹ پھٹکار کے بعد میں انھیں بھی چھوڑ دوں گا اور شاید میں نے ڈرائیور کو اسی لیے دوڑا دیا ہے کہ اس کے سامنے ملزموں کو رعایت دینا ایک پولیس افسر کے لیے مناسب نہ ہوتا۔ انھوں نے بعد میں کہا بھی کہ سر کچھ محکمے کا خیال کریں۔ میں نے ان کو مزید ذلیل کیا کہ تم بہت اچھا خیال رکھتے ہو محکمے کا۔ ان میں سے ایک کہنے لگا کہ اب آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ ہم نے کوئی جرم کیا ہے۔ دوسرا بولا کہ آپ آئے کدھر سے ہیں۔ اور اب ہمیں لے کر کیسے جائیں گے۔ میں نے کہا کہ میں تو اتفاق سے آگیا تھا۔ اپنی جیپ میں ہیڈ کوارٹر واپس جا رہا تھا کہ میں نے ٹیکسی سے ایک آدمی کو باہر گرتے دیکھا اور ٹیکسی کے پیچھے لگ گیا۔ میں ڈی آئی جی صاحب کے ساتھ ہوں اور اسی لیے تم کو تمھارے تھانے نہیں لے جا رہا ہوں۔ وہاں ثبوت وغیرہ ہم خود بنا لیں گے جیسے تھانے میں تم بناتے ہو۔ فی الحال یہ بغیر لائسنس کا ریوالور، تمھاری پھٹی ہوئی وردیاں اور یہ حلیہ ہی تمھارے جرم کا خاصا ثبوت ہے۔ میں کہوں گا کہ تم نے ایک دوسرے کو مارا اور اگر میں اتفاق سے وقت پر نہ پہنچ جاتا تو ایک ضرور مارا جاتا۔ لے جاؤں گا میں تم کو پیدل، جلوس کی صورت میں تاکہ خلقِ خدا بھی تماشا دیکھے، اس کے بعد وہ مایوس ہو گئے تھے۔ انھیں ناک آؤٹ کرنے کے بعد میں نے ان کے کپڑے یعنی یونیفارم جوتے وغیرہ سب اتار لیے تھے اور ان کو اچھی طرح باندھ کے اور سیل کر کے ڈال دیا تھا۔"

"کس کا تھا وہ کوارٹر؟"

"معلوم نہیں، لگتا تو کسی کا بھی نہیں تھا،" شیخ نے کہا۔

"وہاں کوئی نہ آیا تو... وہ مر جائیں گے۔"

"مر جانے دو۔ خس کم جہاں پاک،" شیخ بولا۔ "ویسے میرا خیال ہے کہ کوارٹر کو کھلا پا کے کوئی جھانکے گا ضرور، آج نہیں تو کل۔"

"اچھا میاں تھانیدار، اب تم خیر سے سدھارو،" محسن نے کہا۔ "ہم بھی چلے پردیس۔ آج لنگر اٹھانا ہے۔"

"ہاں ہم پہلے ہی بہت لیٹ ہو گئے ہیں۔ تم ہماری عدم موجودگی میں ہوشیار رہنا،" میں نے کہا۔ "اس علاقے میں اگر ٹیکسی نہ لے کر آؤ تو بہتر ہے۔"

"فی الحال تو میں ہفتہ دس دن روپوش رہوں گا۔ ہو سکتا ہے کہ ٹیکسی کو کہیں بند کر کے لاہور چلا جاؤں۔ جب وہ دونوں کانسٹیبل ہوش میں آئیں گے اور رہائی پائیں گے تو سمجھ جائیں گے کہ ان کے ساتھ کیسا شرمناک ڈراما ہو گیا۔ سب انسپکٹر جعلی تھا جو کپڑے تک اتار کے لے گیا۔ ظاہر ہے وہ میری ہی نہیں گل کی اور محسن کی تلاش بھی کریں گے۔ تم دونوں تو محفوظ رہو گے، ہفتہ دس دن بعد میرے لیے بھی خطرہ کم ہو جائے گا۔ پھر بھی میں ٹیکسی اس طرف نہیں لاؤں گا۔"

میں نے کہا۔ "کیا انھیں معلوم ہے کہ تم ایک ٹیکسی ڈرائیور بھی ہو؟"

شیخ نے نفی میں سر ہلایا۔ "ابھی تفتیش کہاں شروع ہوئی تھی۔ اب وہ جائیں گے موشن میاں مرڈر کیس کی تفتیش کے لیے تو انھیں بہت سے ملزمان کے نام معلوم ہوں گے مثلاً کریم بلوچ اور اس کی خونی حسینہ، کیا نام ہے اس کا؟"

"مشتری، وہ پہنچ گئی ہے یہاں ہمارا سر کھانے اور ہمیں اپنا پکا ہوا کھلانے کے لیے،" میں نے کہا۔ "ملو گے؟"

"ذرا بلاؤ اسے یار، تھوڑی سی دل لگی ہو جائے،" شیخ بولا۔ "اور ہاں ذرا کریم کو سمجھا دینا کہ ساتھ نہ آئے۔ انجان بن جائے۔"

محسن نے چند قدم کا فاصلہ طے کر کے منہ نیچے کی طرف کیا اور ہانک لگائی۔ "اے مشتری، مشتری! چل اوپر آ، پولیس آئی ہے۔"

نیچے سے ایک ایسی چیخ سنائی دی جو اسٹیم انجن کی سیٹی محسوس ہوتی تھی۔ چند منٹ انتظار کرنے کے بعد محسن خود نیچے گیا اور اسے پکڑ لایا۔ کریم اس کے پیچھے رہا۔

"چل ادھر جواب دے تھانیدار صاحب کو۔"

مشتری تھر تھر کانپ رہی تھی اور ایسا لگتا تھا کہ ایسے ہی

لڑتے ہوئے پٹ سے گر کر مر جائے گی۔

"سیدھی کھڑی ہو، کیا نام ہے تیرا؟" شیخ نے کہا۔ "تو بیوی ہے ناموشن میاں کی؟"

"ہائے ہائے تھانیدار صاحب، اللہ کا عذاب نازل ہو اس پر، وہ کہاں سے ہو گیا میرا خصم؟" مشتری نے ہاتھ اٹھا کے دُہائی دی۔ "وہ تو مُرلی کا میاں تھا... ہے... میری بہن کو پاگل کر دیا اسے بیچ کھایا اب مجھ پر نظر تھی اس کی۔ ارے کریم نامراد، تو بھی تو کچھ بول بتا انھیں کہ وہ بڈھا چونس، کیا وہ میرے لائق تھا، قبر میں پیر لٹکائے بیٹھا تھا۔"

"اور تم نے اسے قبر میں دھکا دے دیا، قتل کر دیا۔"

مشتری نے ایک چیخ ماری۔ "میں نے ؟ قسم لے لو تھانیدار صاحب جو میں نے مارا ہو اسے۔ وہ تو خود مر گیا ہو گا۔ کسی اور کی اسے آ گئی ہو گی۔ ارے ناس پیٹے کریم، بتا نا کیوں نہیں کہ تو لایا ہے مجھے بیاہ کرنے کے لیے۔"

"ابھی میرے کو کیوں پھنساتی ہے۔" کریم منمنایا۔ "تو خود بولا میرے کو کہ کریم، مجھ سے شادی بنا۔ میرے کو بھگا کے لے چل۔"

"ارے بے حیا، بے غیرت۔" مشتری کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ "میں نے کہا تھا تجھ سے، ارے میں تو تیرے ساتھ ہی بھتی کل سے... نہیں نہیں... پرسوں سے... کیوں صاحب جی، ذرا آپ ہی بتاؤ تھانیدار صاحب کو۔"

"بھئی میں تو اتنا بڑا جھوٹ نہیں بول سکتا۔" میں نے کہا۔

"ارے تو کیا اب مجھ بیوہ کو... پھانسی ہو گی؟" وہ چلّانے لگی تھی۔

"بیوہ ؟ ابھی شادی ہوئی نہیں تیری، بیوہ کیسے ہو گئی تو؟" شیخ نے کہا۔ "مان لیا نا کہ موشن میاں تیرا گھر والا تھا؟"

مشتری نے ایک دم ہاتھ مُنہ پر رکھ لیا۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ گل سے ہنسی ضبط نہ ہو سکی۔ اس کے ساتھ ہی محسن ہنسنے لگا۔ مشتری نے حیران ہو کے کریم کی طرف دیکھا۔

"چل اب نیچے جا۔ ابھی تیرے کو معاف کر دیا ہے اپنے اس تھانیدار نے۔" کریم نے بھی کھی کھی کرتے ہوئے کہا۔

مشتری سمجھ گئی کہ کریم کا ہنسنا بے سبب نہیں ہو سکتا۔ اس کا پارا ایک دم چڑھ گیا۔ کریم اس کے بدلے ہوئے تیور دیکھ کے بھاگا۔ وہ کریم کے پیچھے لپکی۔ "ارے خدائی خوار، ستیاناس ہو تیرا، مجھے اُلّو بنا رہا تھا... مجھے پھانسی چڑھاتا تھا... ٹھہر میں دیتی ہوں تجھے پھانسی کمینے... مجھے کہتا ہے... میں بھگا کے لائی ہوں تجھے۔"

ہم سب کا ہنستے ہنستے بہت بُرا حال ہو گیا۔ مشتری کو غصہ ہم سب پر آیا ہو گا مگر اس کا نشانہ بنا کریم بلوچ۔ ہم سے اسے جو کہنا تھا، وہ سب کریم کو سننا پڑا۔ ان کی چیخ چیخ بہت دیر تک نیچے سے سنائی دیتی رہی۔

"دونوں عجیب چیز ہیں۔" میں نے کہا۔

"رب نے ملائی جوڑی۔" گل نے کہا اور یوں محسن کی طرف دیکھنے لگی جیسے پوچھ رہی ہو کہ کیا خیال ہے اپنے اور میرے بارے میں۔ کسی حد تک اس کے جذبات کا یہ اندازِ پذیرائی ایک فطری ردِّعمل تھا، ان حالات کا جن سے گزر کے وہ پھر گل بانو بنی۔ عمر کے اس سفر کا آغاز بھی ایسا ہی تھا معصوم خواہشات اور انمول خوشیوں کا وہ دور جب چاہت بھی بہت تھی اور چاہنے والے بھی بہت تھے شفقت، محبت اور تحفظ سب حاصل تھا۔ پھر وہ ناگ منی بن کے زہریلے پُرخار نفرت بھرے راستوں پر سرگرداں رہی۔ اور یہ وہ عمر تھی جس میں رنگ، خوشبو اور خوشیوں کے جادوگر، خواب دکھانے والے لمحے بھی گنگناتے آتے ہیں۔ جذبات کے سات رنگ مل کر دل میں ایک روشنی کو جگا دیتے ہیں، آنکھیں انتظار کرتی ہیں اور دل کسی کے نام پر دھڑکنا چاہتا ہے، مگر یہ مسافت گولیوں کی بوچھاڑ، موت کے خوف، نداموں کے آزار اور تنہائی کے عذاب سے لڑتے گزر رہی تھی کہ اچانک ہم نے اسے اپنا لیا۔ اور محسن نے اسے پھر گل بانو بنا کے اس پر ان خوابوں کے بند دریچے وا کر دیے جو ناگ منی کے لیے شجرِ ممنوعہ ہو چکے تھے۔ اب اس کے بعد ان دریچوں کو بند کرنے کی ہمت کس میں تھی۔

اچانک شیخ نے کہا۔ "تو اب میں چلوں؟"

اور خاموشی کی وہ بوجھل چٹان جس کا بار ہم سب آنے والے لمحے اور پھر اس کے بعد والے لمحے کو منتقل کرتے جا رہے تھے، یکلخت ہمارے اوپر آ گئی۔

"ہاں..." میں نے کہا اور دوسری جانب دیکھنے لگا جدھر سمندر بھی وقت کی طرح ناقابلِ تصوّر حد تک پھیلا ہوا تھا۔

"یہاں اکیلا رہ کے میں کیا کروں گا یارو؟" شیخ نے التجا کے انداز میں کہا۔

"تم یہاں کی ذمے داریاں سنبھالو گے۔" محسن بولا۔ "یہاں کے حالات اور مسائل سے ہمیں باخبر رکھو گے۔"

"یہاں مجھے نہیں، تم کو رُکنا چاہیے۔ تمھارے بیوی بچے ہیں، ان کو تمھاری زیادہ ضرورت ہے۔" شیخ نے کہا۔

"ویسے تو ہم سب ایک دوسرے کی ضرورت ہیں۔" محسن بولا۔ "مگر میں سکندر کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا۔ شہلا کا خیال مجھے بھی ہے لیکن وہ بہت محفوظ ہے۔ اس کے ساتھ رہ کر میں بھلا کیا کر سکتا ہوں۔ میری ذات اسے قربت کے احساس کی خوشی تو دے سکتی ہے اس سے زیادہ تحفظ فراہم نہیں کر سکتی جو اسے پہلے ہی حاصل ہے۔ پھر تم یہاں ہو۔"

"بس اپنا خیال رکھنا اور محتاط رہنا۔" میں نے کہا۔ "دُعا کرتے رہنا کہ ہم زندگی کی آخری سرحد تک ساتھ چلتے رہیں اور یہ جو فاصلے آج درمیان میں ہیں کل نہ ہوں۔"

"تم رابطہ رکھو گے نا؟" وہ اب اُداس ہو رہا تھا۔

"بالکل، تم لاہور فون کرتے رہنا۔ شہلا اور منظر کے ذریعے تمھیں ہماری خیریت معلوم ہوتی رہے گی۔ ہم جہاں بھی ہوں گے تمھیں ہمارا پتا ملے گا کسی نہ کسی ذریعے سے۔"

"مجھے نازو کی فکر ہے۔" وہ بولا۔ "آج کئی دن سے اس کے خیال نے سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے میرا تعاقب شروع کر دیا ہے اور اس خیال سے اندیشوں کا رشتہ ہے۔ خوف میرے تصوّرات میں شامل ہے اور میرا دشمن ہے۔ مجھے شرمندگی ہوتی ہے کہ ایک بھائی کی حیثیت سے شیش ناگ نے اپنی بہن کے لیے بہت زیادہ کیا۔ یہاں تک کہ اپنی زندگی بھی اسے دے دی۔ میں نے کیا کیا؟"

"ایسی غیریت کی باتیں مت کرو۔ وہ ہماری ذمے داری بھی ہے۔ خدا وہ وقت نہ لائے لیکن کبھی ایسا ہوا کہ مجھے رابعہ اور نازو میں سے کسی ایک کو بچانے کی آزمائش سے گزرنا پڑا۔ تو میں یہ جانتا ہوں کہ رابعہ کے لیے میں کچھ نہ کر سکوں گا۔ خود رابعہ پیچھے ہٹ جائے گی اور کہے گی کہ نازو کو لے جاؤ ورنہ ہماری محبت پہ خود غرضی کا الزام آجائے گا۔"

"ہم میں سے کون ہے جو ایسے الزام کے ساتھ زندگی سے سمجھوتا کر سکے۔" محسن بولا۔ "ہم سب کچھ ہیں مگر خود غرض نہیں ہیں، صرف اپنے لیے جینے کا سوچنا نہیں جانتے۔ مجھے پورا اعتماد ہے کہ تم شہلا کی حفاظت مجھ سے بہتر طور پر کر سکتے ہو اور ایسی ہی صورتِ حال سے تم کو دوچار ہونا پڑے تو تم مجھے اور سکندر کو، غالب کو، نازو اور گل کو، یہاں تک کہ کریم اور مشتری کو پہلے بچاؤ گے..."

اکرام شیخ چپ کھڑا رہا، پھر اس نے کہا۔ "نازو کے ساتھ غالب بھی تو ہے۔ وہ اکیلی نہیں ہے۔ تم بمبئی پہنچو گے تو رابعہ بھی مل جائے گی۔ تم سب اکٹھے ہو جاؤ تو مجھے بلا لینا۔ میں شہلا کے ساتھ آجاؤں گا۔"

"شہلا کے ساتھ ؟" محسن نے کہا۔ "اس کا وہاں کیا کام، نہ ہم اسے اپنے ساتھ رکھ سکتے ہیں نہ الگ..."

"یہاں بھی تو ہمارے ساتھ نہیں ہے وہ۔ اس کے رہنے کا انتظام وہاں کیوں نہیں ہو سکتا... بمبئی اتنا بڑا شہر ہے۔ ہر نسل، قوم اور مذہب کے لوگ رہتے ہیں۔ انھی میں شہلا بھی رہ سکتی ہے..."

"لیکن اس کا فائدہ ؟" محسن نے چڑ کے کہا۔

"فائدہ یہ کہ ہم سب ایک ہی سرحد میں ہوں گے۔ سرحد ہمارے درمیان حائل نہیں ہو گی تو ہم ملتے بھی رہیں گے..." شیخ نے کہا۔

"اچھا... دیکھیں گے بعد میں۔ ابھی سے کیا کہہ سکتے ہیں کہ کیا ہو گا اور کیا نہیں ہو گا۔ تم جاؤ۔" محسن نے کہا۔ "خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔" میں نے کہا۔ "ہم کامیابی کے سفر پر جا رہے ہیں، ہمیں دُکھی دل کے ساتھ رخصت مت کرو۔"

شیخ چلا گیا۔ ہم سے گلے مل کے اور بہت جلد پھر ملنے کی امید دے کر۔ وہ خاصا قنوطی ہو رہا تھا چنانچہ اس نے ہمیں بھی افسردہ کیا۔ گل نے تو باقاعدہ رو کے الوداعی منظر کو المناک بنا دیا۔ اس کی ہم سب سے وابستگی کی عمر زیادہ نہ تھی مگر اس نئی زندگی کے نئے دور کا ہر نیا تجربہ پرانی گل بانو پر جمی ہوئی بے حسی، نفرت اور مایوسی کی گرد کو صاف کرتا جاتا تھا اور اس کے وجود سے لپٹی ہوئی تاریکی کو مٹاتا جاتا تھا جس کے نیچے اس کی شخصیت کا سارا اُجلا پن تھا۔ ڈاکو ناگ منی کے اندر کی عورت تو گل بانو تھی جو کسی طرح بھی رابعہ، شہلا یا نازو سے مختلف نہ تھی۔ جب وہ ہماری بے غرض دوستی، ہماری بے ریا زندگی اور بے پایاں محبتوں کے جذبات کو دیکھتی تھی تو اپنے جذبات پر قابو رکھنا اس کے لیے مشکل ہو جاتا تھا کیونکہ یہی اس کی زندگی کے بچھڑے ہوئے خواب تھے۔

دوپہر کا کھانا بہت دیر سے کھایا گیا اور بڑا [illegible] گیا۔ اس سے مسمّاۃ مشتری کی خاصی دل شکنی ہوئی جس [illegible] وقت میں داروغۂ مطبخ کی حیثیت سے اپنی ذمے داریاں سنبھال لی تھیں اور بہت اچھا مینو پیش کیا تھا۔

"صاحب جی! کیا کھانا اچھا نہیں پکا تھا؟" اس نے برتن سمیٹتے ہوئے بچ جانے والی کھانے کی وافر مقدار کو مایوسی سے دیکھا۔

"کھانا تو اچھا تھا، ہم کھاتے ہی کم ہیں۔" میں نے کہا۔

"ہم دوسری چیزیں بہت کھا لیتے ہیں مثلاً قوم کا غم، دھکّے، زخمِ جگر، دل پر چوٹ... وغیرہ۔" محسن نے غور و فکر کے سمندر سے سر نکال کے کہا۔ وہ ٹرانسمیٹر اور دوسرے مواصلاتی نظام کی کارکردگی کو بہتر اور موثر بنانے میں مصروف تھا۔

"اتنا کھانا ضائع گیا۔" مشتری نے دُکھ سے کہا۔

میں نے کہا۔ "یہ کوئی ہوٹل یا میس نہیں ہے۔ جو کھانا بچے اسے سنبھال کے رکھو۔ شام کو کھا لیا جائے گا۔"

"اور پھر بھی بچ گیا تو بطور سزا کے تمھیں رات بارہ بجے سے پہلے سب کھانا پڑے گا۔" محسن بولا۔

"لو... انعام کی بات کوئی نہیں، سزا پہلے..." مشتری نے احتجاج

کیا۔" میں کیوں کھاؤں گی... ؟"

"اس لیے کہ اندازے میں اتنی غلطی ناقابلِ معافی ہے اور یہ تمھاری ذمے داری ہے کہ ضرورت کے مطابق کفایت شعاری اختیار کرو۔ ہم کوئی چیز ضائع نہیں کرسکتے۔" میں نے اسے سمجھایا۔

کریم بلوچ ایک گھنٹے کے لیے بازار گیا تھا اور دو گھنٹے بعد واپس آیا تو ایک جلوس کی قیادت کر رہا تھا۔ جلوس میں وہ مزدور شامل تھے جو بوریاں، کنستر، گتّے کے ڈبّے اور ڈرم اٹھائے ہوئے تھے۔ اس نے سفر کی ضروریات کو مدِّنظر رکھتے ہوئے شاپنگ کی تھی اور چونکہ اس عرصے میں وہ ہماری عاداتِ نیک و بد سے واقف ہوچکا تھا۔ چنانچہ وہ سگریٹ اور کافی تک لے آیا تھا۔

میں نے اس وقفے میں گل بانو کے ساتھ بیٹھ کے دیگر انتظامات کو آخری شکل دی۔ وہ سب جعلی دستاویزات بنانے کا سامان جو ہمیں تخریب کاروں کے ایک کیمپ کو تباہ کرنے کے بعد ملا تھا ابھی تک ہمارے پاس محفوظ تھا۔ میں نے گل بانو کو السی کرانتی بھرڈے سے مختصر اُستعارف کرانے کے بعد یہ بتایا کہ نازو اور غالب اس جہاز پر الزبتھ اور چارلس کے ناموں والے پاسپورٹ کے ساتھ سفر کر رہے ہیں۔

وہ ہنسی۔" میرے لیے بھی کوئی پاسپورٹ بناؤ گے تم ؟"

"ہاں، اس کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ بین الاقوامی سمندر میں اور پھر آگے بھارت سے گزرتے ہوئے ہمیں کوئی بھی چیک کر سکتا ہے۔" میں نے کہا۔" سوال یہ ہے کہ تمھاری تصویر کا کیا بنے گا۔"

"تصویر تو نہیں ہے میرے پاس۔" وہ بولی۔

"ہمارے پاس پولورائڈ کیمرہ ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ کیا ہوتا ہے ؟" وہ دلچسپی سے بولی۔

"وہ کیمرہ جس سے تصویر کھینچی اور دس سیکنڈ بعد نکال لی۔ بالکل تیار۔" میں نے کہا۔" لیکن میرا سوال کچھ اور تھا عزیزہ! تمھارے نام میں نقطہ اوپر ہوگا یا نیچے۔"

وہ ذرا سی دیر کے لیے گڑبڑا گئی۔" کیا مطلب ؟"

"مطلب یہ کہ تم گل جان بنو گی یا گل خان۔ ویسے تو چشمِ بددور، خدا نے تمھیں جو بنایا ہے خوب بنایا ہے اسے بگاڑنا اچھا نہیں لگتا۔" میں نے کہا۔

وہ کچھ شرمائی، کچھ خوش ہوئی۔" لیکن میں گل خان بن کے تمھارا ساتھ دوں گی۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ مگر محسن کا ساتھ گل جان بن کے دینا۔" میں نے کہا۔ اور لانچ کے خفیہ خانے سے پولورائڈ کیمرہ نکال لیا۔

مجھے گل بانو کو صحیح مردانہ گیٹ اپ میں لانے کے لیے خاصی محنت کرنا پڑی۔ کپڑوں کا کوئی مسئلہ نہیں تھا مگر اس کی نسوانیت کو چھپانا مشکل کام تھا۔ میں نے تصویر کھینچنے سے پہلے اس کے بالائی ہونٹ پر سیاہی سے مونچھیں بنائیں جو تصویر میں بالکل اصلی نظر آتی تھیں۔ سیاہی کئی بار صابن رگڑنے کے بعد بھی باقی رہی اور محسن اسے مسٹری صاحبا کہہ کے چھیڑتا رہا۔ میں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ اپنی عادات و اطوار میں مردانگی کے جوہر دکھلائے تاکہ اس رول میں فٹ ہوسکے۔ مونچھوں کی کوئی بات نہیں۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ پہلے تھیں، بعد میں منڈوا دیں۔ کچھ لوگ شرط ہار کے بھی ایسا کرتے ہیں۔

"جیسے ہمارے چیف کو کرنا پڑا۔" محسن بولا۔" یہ مجھ سے شرط لگا بیٹھے تھے ایک دن۔ پوچھو شرط کس بات پر لگی تھی۔"

"کس بات پر لگی تھی ؟"

"جب ہم لندن میں تھے تو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے سے زیادہ اہم ہمارے لیے گوری چمڑی پر ناز کرنے والوں کی تحقیر ہوتا تھا۔" محسن نے کہا۔" وہ ایک تنگ نظر اور متعصّب قوم ہے۔ ہم بھی کم نہ تھے۔ ان کے خلاف ایک متحدہ محاذ بنا رکھا تھا۔ لڑکیاں اکثر چیلنج بن جاتی تھیں۔ ہم تو یہ کام ایک پلان کے تحت کرتے تھے نا۔ فلاں کی جو گرل فرینڈ ہے نا اسے ملتفت کرو تو بات ہے پھر ہم جان کی بازی لگا دیتے تھے اور مل کے ایسا چکر چلاتے تھے کہ وہ لڑکی اپنے گورے بوائے فرینڈ سے بدظن ہوجاتی تھی اور ہم دونوں میں سے کسی ایک کو ڈیٹ دے دیتی تھی۔ اکثر تو ایسی ہی شرطیں ہوتی تھیں۔ جس نے کسی کو ملتفت کرلیا چیلنج دے کر، وہ جیت گیا لیکن ایک بار معاملہ زیادہ سنگین ہوگیا۔"

گل ہنسنے لگی۔" کیا پرنسس مارگریٹ پر شرط لگا لی تھی ؟"

"نہیں، یہ ایک دن کسی سے اُلجھ گیا۔ وہ ایک اسٹیج ایکٹر تھا جو خود کو شیکسپئر سے منسوب کرتا تھا کہ وہ میرے نانا کے دادا کے سسر کے والدِ ثانی تھے... کچھ ایسا ہی رشتہ بتاتا تھا۔ چنانچہ وہ ڈرامے پر اپنی رائے کو حرفِ آخر سمجھتا تھا۔ سکندر سے کہنے لگا کہ تم جاہل انڈین، سپیروں کی اولاد اور ہاتھیوں کی ناک صاف کرنے والے، تم کیا جانو اداکاری کو۔ ہمارا فلاں اداکار ایسا ہے کہ تمھارا فلاں ہیرو اس کی جوتیاں صاف کرے۔ سکندر نے کہا کہ اس کو تم لوگ اداکار مانتے ہو۔ ہمارے ملک میں ہو تو جوتیاں سیے۔ اس نے کہا کہ ہمارا سر لارنس اولیور۔ سکندر نے کہا کہ ہمارے دلیپ کمار سے اس کا کیا مقابلہ۔ خیر خوب جھگڑا ہوا۔ یہ جب آیا تو سخت مشتعل تھا۔ کہنے لگا کہ اس سالے نے میری غیرت کو للکارا ہے۔ کہتا ہے کہ تم کیا جانو اداکاری کس جانور کا نام ہے۔ اب مجھے ثابت کرنا ہے کہ میں اس سے بڑا ایکٹر ہوں۔ میں نے اسے سمجھایا کہ بھائی یہ ثابت کرنا بہت مشکل ہے یہاں۔ اگر تو اس سے بہ زورِ بازو منوالے تو الگ بات ہے۔ اس نے کہا کہ نہیں، میں اس کو اسٹیج پر شکستِ فاش دوں گا اپنی اداکاری سے۔ اس کے مقابل مرکزی کردار ادا کروں گا اور اس کا باپ بجادوں گا۔ میں بہت ہنسا۔ میں نے کہا کہ نورِ چشم، تمھیں مرکزی کردار تو کیا اس کے مقابل کسی ڈرامے میں بھنگی کا کردار تک کوئی نہیں دے گا۔ بس ہمارے سکندرِ اعظم جوش میں آگئے۔ انھوں نے مونچھوں پر تاؤ دے کر کہا کہ میاں محسن، ایسا نہ ہوا تو ہم یہ مونچھیں منڈوا دیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ان کو مونچھیں منڈوانا پڑیں۔"

گل بہت ہنسی۔ میں اس پرانی بات کو یاد کرکے مسکراتا رہا۔ وہ بھی کیا دن تھے۔

"کچھ دن بعد ایک نیا ڈراما اسٹیج ہونے والا تھا۔" محسن نے کہا۔" سکندر بھی پہنچ گیا آڈیشن اور اداکاری کا ٹیسٹ دینے کے لیے۔ اسکرپٹ کا یہ ہے کہ وہاں ٹیسٹ پہلے لے لیا جاتا ہے اور پھر جو جس رول کے لیے موزوں ہو، اسے طلب کرلیا جاتا ہے۔ وہ شیکسپئیر کا پانچ نگڑ بگڑ دلوا قرار دینے والا بھی مقابلے پر تھا۔ وہ پرانا منجھا ہوا آرٹسٹ تھا اور اسے بلامقابلہ منتخب ہوجانے کا یقین تھا۔ ہمارے سکندرِ اعظم نے ہدایت کار کے سامنے زبردست پرفارمنس دی۔ فائنل سلیکشن ہوا تو اس نے سکندر سے کہا کہ تم کو بھنگی کے بچے کا رول دیا جارہا ہے اور اس کے حریف سے کہا کہ تم کرو گے لارڈ میئر کے بیٹے کا رول۔ بس جناب، سکندر نے ایک اشتعال انگیز جذباتی تقریر کی کہ تم انگریز کمینے ہو اور ایسی کی تیسی بھنگی کے بچے کا رول کرنے والے کی۔ اس ہدایت کار کی سُننے بغیر یہ واک آؤٹ کرگیا اور دوسرے دن مونچھیں منڈوا دیں۔"

"لیکن... بھنگی کے بچے کا رول تو مل گیا تھا۔" گل نے ہنستے ہنستے بے حال ہو کے کہا۔

"یہی تو کلائمکس ہے عزیزہ۔" محسن آہ بھر کے بولا۔" اگلے دن انکشاف ہوا کہ اس ڈرامے میں مرکزی کردار بھنگی کے بچے کا ہی تھا جو اپنی محنت اور صلاحیت کی بنا پر لندن کا لارڈ میئر منتخب ہوتا ہے۔ ہدایت کار نے بعد میں یہ رول سکندر کے حریف کو دیا اور وہ ڈراما بے حد کامیاب رہا۔ لارڈ میئر کے بیٹے کا کردار تو برائے نام اور ثانوی نوعیت کا تھا۔"

"اب فضول باتیں بند کرو اور چلنے کی تیاری کرو۔ بیٹری اور ٹرانسیٹر وغیرہ چیک کرلو۔" میں نے کہا۔

"ٹرانسمیٹر، ریسیور سب ٹھیک ہیں۔" محسن نے اعلان کیا۔" بیٹری میں بھی جان ہے۔ جب انجن چلے گا تو چارج ہوجائے گی۔"

"میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔" کیا اس لانچ سے ہم اس بحری جہاز کو پکڑ لیں گے جو چودہ گھنٹے پہلے سفر کا آغاز کرچکا ہے ؟"

"بڑے جہاز نسبتاً سست رفتار ہوتے ہیں۔" محسن بولا۔" اگر کوئی زیادہ طاقتور لانچ ہوتی تو زیادہ تیز رفتار ہوتی۔" میں نے کہا۔

"ہونے کو کیا ہے ؟" محسن بولا۔" ہمارے پاس جیٹ ہیلی کاپٹر ہوتا تو ہم سیدھے اس جہاز پر جا اترتے۔ وہ نیچے سے ہم پر گولیوں کی بوچھاڑ کرتے مگر جیسا کہ فلموں میں ہوتا ہے، ایک گولی ہمیں چھو کے بھی نہ گزرتی اور ہم پیراشوٹ کے بغیر جہاز پر کود تے، ڈز... ڈز... ڈز... مشین گن سے سب کو بھون ڈالتے اور بس جہاز پر قبضہ کرلیتے مگر افسوس کہ ایسا نہیں ہے اور نہ ہوسکتا ہے۔"

"اس لانچ سے کیا ہوسکتا ہے۔" میں نے محسن کی بات کا بُرا مانے بغیر کہا۔" یہ کریم بلوچ بتا دے گا مگر ایک مسئلہ اور ہے۔ اس بحری جہاز کا صحیح سمت میں تعاقب۔ صحرائی جہاز تو نقشِ قدم چھوڑ جاتا ہے۔ بحری جہاز کے نقشِ برآب کا نشان نہیں ملتا۔"

"ایک چیز ہوتی ہے قطب نما عرف کمپاس..."

"مگر اس کا استعمال کرنا کسے آتا ہے، سوائے دوست محمد کے۔" میں نے کہا۔" اور دوست محمد فی الحال اپنی عقل اور تجربے سے ہماری مدد نہیں کرسکتا۔ اس کی ذہنی و جسمانی حالت ایسی نہیں ہے۔"

"اس کی یہ حالت کب تک رہے گی ؟"

"نشہ چھڑانے کے بعد چند دن بہت صبر آزما ہوتے ہیں، جب طلب دیوانہ کرتی ہے پھر آدمی سنبھل جاتا ہے اور کوشش کرے تو چند دن میں عام لوگوں کی طرح زندگی کے معمولات سرانجام دینے لگتا ہے۔" میں نے کہا۔" مشکل تو یہی ہے کہ ہمارے پاس چند دن نہیں ہیں۔"

"ہاں، جمعرات کو آپ کی ڈیٹ ہے۔" محسن بولا۔

"اگر دوست محمد کی زندگی کو خطرہ لاحق نہ ہوتا تو ہم اسے ساتھ ہی نہ لے جاتے۔ ہمارے تو کسی کام نہیں آسکتا وہ۔"

"میرے ذہن میں ایک ترکیب ہے۔" محسن نے سوچتے ہوئے کہا۔" اس سے کام لیا جاسکتا ہے۔"

"وہ کیسے ؟"

"ہم اس کے علاج کو مؤخر کردیں، چند دن کے لیے۔ اس سے نشے کی یہ لت چھڑانے والا کام فرصت سے بھی کیا جاسکتا ہے۔ جب ہمیں اس کی پیشہ ورانہ مہارت کی فوری ضرورت نہ ہو، چند دن سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

"تیرا مطلب ہے... کہ ہم اسے نشہ فراہم کردیں ؟"

"ہاں، اگر اسے کارآمد بنانا ہے تو یہی کرنا پڑے گا۔ اس کی حالت فوراً سنبھل جائے گی۔" محسن نے کہا۔" بلاشبہ یہ زہر ہے لیکن ابھی دوا کا کام کرے گا۔ دو چار دن میں وہ مرے گا نہیں جو نہ جانے کب سے یہ زہر پی رہا ہے۔"

میں کچھ کچھ فائل ہونے لگا تھا۔" لیکن چرس کے سگریٹ کہاں سے لائیں گے ہم؟"

"کریم سے بات کرتے ہیں۔"

"اس کا یوں گھومنا پھرنا ٹھیک نہیں۔ مجھے معلوم ہو جاتا تو میں اسے سامان لانے کے لیے بھی بازار نہ جانے دیتا۔" میں نے کہا۔ "موشن میاں کے قتل اور مشتری کے غائب ہونے کی سنسنی خیز کہانی اس علاقے میں سب نے سُن لی ہو گی۔ سب جانتے تھے کہ کریم ہی ایک امیدوار تھا مشتری کا اور اس نے اپنے عشق کا ڈھنڈورا بھی خوب پیٹ رکھا تھا۔ وہ پکڑا گیا تو ہمارے لیے بھی مسائل کھڑے ہو جائیں گے۔"

"وہ ہوشیار لڑکا ہے۔ باتوں سے اور صورت سے بیوقوف ضرور لگتا ہے لیکن مجھے اس کی عیاری اور ذہانت میں کوئی شُبہ نہیں۔" محسن بولا۔ "کتنی آسانی سے اس نے موشن میاں کو مرحوم کر دیا۔ پھر مشتری کو نکال لایا۔ اور اب خود بازار ہو کے آیا ہے۔ ظاہر ہے وہ اپنی حفاظت کے خیال سے غافل نہیں تھا۔ ورنہ پکڑا جاتا۔ وہ چور دروازوں سے واقف ہے۔"

"یہ تو میں جانتا ہوں سارے چوروں کا اور چور بازاری کرنے والوں کا بھی علم ہے۔" میں نے کہا۔ "میں دیکھتا ہوں وہ کیا کر رہا ہے۔"

میرا خیال تھا کہ وہ اسٹور یا کچن میں ملے گا اور سفر کے انتظامات کو آخری شکل دینے میں مصروف ہو گا لیکن وہاں مشتری کی گُل سے چل رہی تھی۔

"کیا کہا تم نے... کیا بدل گیا؟"

"جنس بدل گئی ہے میری۔" گُل بانو نے کہا۔ "عورت سے مرد بن گیا ہوں میں۔ اسی لیے گُل خان نام رکھا ہے میں نے۔"

"ارے چلو، نام بگلا رکھنے سے کوّے کی خصلت بدلتی ہے کہیں۔ لو اور سنو، یہ کوئی اپنے اختیار کی بات ہے؟"

"ہاں، دُنیا میں ایسا ہوتا رہتا ہے۔" گُل نے کہا۔ "تم چاہو تو کریم بھی لڑکی بن سکتا ہے۔"

"ہائے ہائے، عقل کے ناخون لو..."

"ناخون... وہ کہاں ملتے ہیں؟ اور ان میں کیا خرابی ہے؟" گُل نے ہاتھوں کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

میں آگے نکل گیا۔ اب صرف ایک ہی جگہ دیکھنی رہ گئی تھی جہاں کریم کا ملنا ممکن تھا اور یہ آخری کیبن تھا جس میں دوست محمد قید تھا۔ میں کوئی آہٹ کیے بغیر اور دستک دیے بغیر دروازہ کھول کے اندر داخل ہوا تو کریم گھٹنوں کے بل دوست محمد کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ وہ بُری طرح چونکا اور ایک دم پلٹا۔ نیم تاریکی میں مجھے نیلگوں دھوئیں کا غبار نظر آیا اور چرس کی مخصوص بو محسوس ہوئی۔ دوست محمد اسی طرح دست و پا بستہ پڑا ہوا تھا لیکن دھواں اس کے نتھنوں سے خارج ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سرور سے بند تھیں۔

جلتی ہوئی آدھی سگریٹ کریم بلوچ کے ہاتھ میں تھی۔ وہ خود اپنے ہاتھوں سے دوست محمد کو کش لگوا رہا تھا۔

"یہ تم کیا کر رہے ہو کریم؟" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ بے خبری میں پکڑے جانے کی دہشت اتنی تھی کہ وہ بُت بنا کھڑا تھا۔ میری بات پر اس نے سُلگتی ہوئی سگریٹ پھینک دی۔ "ہم غلطی کیا..."

میں نے اس کی گردن دبوچ لی۔ "بات غلطی کی نہیں، تم نے حکم عدولی کی۔ وہ کام کیا جس کی تمھیں اجازت نہیں تھی۔"

"ہم کیا کرے صاب... وہ ہمارا استاد... ہم کو حکم دیا... اس کا حالت بوہت خراب تھا صاب۔" کریم بلوچ کانپنے لگا۔ "آپ ہم کو سو جوتا مارو... دن میں تین ٹائم..."

"میرے لیے سیریس رہنا مشکل ہو گیا۔" دن میں تین بار کیوں، پنج وقتہ کیوں نہیں۔" میں نے کہا۔ "کریم اس لانچ پر ہر شخص اپنی مرضی نہیں چلا سکتا۔ تم کو نیکی بھی کرنا تھی اپنے اُستاد کے ساتھ تو مجھ سے پوچھ کر کرتے۔ ایسے تو بالکل ڈسپلن نہیں رہے گا اور میں تم پر کیسے اعتبار کروں گا کہ تم وہی کرو گے جو تم سے کہا جائے گا۔"

"ابھی ماں قسم یہ بات ہمارا مغز میں ایک دم بیٹھ گیا ہے صاب، پھر ایسا غلطی کرے تو حرامی۔"

"چلو، دوست محمد کو کھول دو۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "اس سے کچھ باتیں کرنا ہیں۔" مجھے اس کی حالت کافی بہتر لگتی تھی۔

"دم لگایا صاب تو دم آیا۔" کریم نے خوش ہو کے کہا اور دوست محمد کے ہاتھوں پیروں سے لپٹی ہوئی رسّی کھولنے لگا۔

"یہ باقی سگریٹ بھی دے دو اسے۔" میں نے کہا۔

کریم بلوچ نے بے یقینی سے مجھے دیکھا، پھر آدھی سگریٹ...

"ہاں ہاں، میں اجازت دے رہا ہوں تم کو۔ کہاں سے لائے تھے یہ سگریٹ اور کب؟"

"ابھی ہم مارکیٹ گیا صاب... سامان لایا تو... بس ایک پیکٹ... نہیں... ہم جھوٹ بولا۔ تین پیکٹ اس کا دل... لایا صاب۔"

"کہاں ہیں وہ تینوں پیکٹ؟" میں نے کہا۔ "مجھے دو... دیکھو، اب کیا دیر ہے؟"

"کوئی دیر نہیں صاب، آپ بولو تو ہم انجن چالو کرے..." باہر جاتے جاتے رُک گیا۔

میں نے کہا۔ "تمھارا کیا خیال ہے، ہم اس بحری جہاز کو پکڑ سکتے ہیں؟"

"ایک دم پکڑیں گا صاب، بچ کے کدھر جاویں گا سالا۔" کریم نے جوش سے کہا۔ "اپن ایسا ریس کریں گا۔"

"وہ جہاز بہت آگے نکل گیا ہے۔ اسے روانہ ہوئے چودہ گھنٹے ہو چکے ہیں۔" میں نے کہا۔

"پھر کیا ہوا صاب، بس ابھی استاد ہم کو راستہ بتا دے تو ہم اس کو بالکل پکڑیں گا۔" کریم نے کہا۔ "رات کا ٹائم میں تھوڑا کان فیوز ہو جاتا ہے اپن۔"

"کان فیوز ہو جاتا ہے؟" میں نے حیرانی سے کہا اور پھر اس کا مطلب سمجھ کے ہنس پڑا۔ "تمھارا مطلب ہے کہ تم کنفیوز ہو جاتے ہو۔ خیر کوئی بات نہیں، اُستاد راستہ بتلائے گا۔ انجن تو دھوکا نہیں دے گا راستے میں؟"

"کیسے دھوکا دیں گا صاب، انجن کا باپ جو ہے ادھر۔" اس نے دوست محمد کی طرف اشارہ کیا۔ "ایسا بڑا بڑا جہاز بنایا استاد، یہ تو ایک دم کھلونا ہے۔"

وہ نکل گیا تو میں دوست محمد کے پاس بیٹھ گیا جو اب اپنے ہاتھوں پیروں کو مل رہا تھا۔

"دوست محمد! میں تمھارے ساتھ یہ سلوک کرنا نہیں چاہتا تھا۔" میں نے کہا۔ "لیکن مجبوری تھی۔"

"ارے بابا، مجبور تو ہم ہے۔" وہ سگریٹ کا کش لے کر بولا۔ "اس کا بغیر جی نہیں سکتا۔ مر بھی نہیں سکتا۔ ہم جانتا ہے تم اچھا آدمی ہے لیکن ہم ابھی کنڈم ہو گیا ہے۔ تم ہمارا ساتھ کیوں نیکی خلاص کرتا ہے۔"

"ہمیں تمھاری ضرورت ہے دوست محمد اور ہمیشہ رہے گی، تم کبھی کنڈم نہیں ہو سکتے۔" میں نے کہا۔ "اگر ہم تم کو یہاں چھوڑ جاتے تو ہمارے اور تمھارے دشمن مل کے تمھیں مار ڈالتے۔"

"پھر کیا ہوتا، ہم مر جاتا۔"

"نہیں، تم کو جینا ہے۔ اپنے لیے اور ہمارے لیے اور ہم تمھیں زندہ رکھیں گے۔ تم ہم سب سے بڑے ہو عمر میں بھی اور تجربے میں بھی۔ ہم تمھارے بچوں کی طرح ہیں۔"

"مت بولو ایسا بات۔" وہ چلّانے لگا۔ "جیسا ہمارا بچہ لوگ ہے ویسا کسی کا نہ ہووے۔ ابھی سالا ہم کچھ نہیں کر سکتا ورنہ ہم بولتا کہ جاؤ ہم کسی کا باپ نہیں ہے مگر ہم جانتا ہے کہ ان کا باپ ہم ہے۔ تمھارا جیسا ہوتا وہ... تو ہم اتنا دُکھ کیوں اٹھاتا۔ ایسا مالک خوار کیوں ہوتا؟"

میں نے دیکھا کہ میرے ایک غلط جملے نے اس کے زخموں کو نوکِ نشتر کی طرح کھرچ دیا تھا اور درد کی ٹیسوں نے اس کی آنکھوں میں رُکے ہوئے آنسوؤں کو بہنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"تم سمجھو کہ ہم ہی تمھارے بچے ہیں۔ ہم خدمت کریں گے تمھاری، جب تک زندگی نے مہلت دی۔ یہ مت سمجھنا کہ آج تمھاری ضرورت ہے تو میں تمھیں بہلا رہا ہوں۔ آنے والا وقت خود بتا دے گا کہ اس خاندان میں، جس میں ہم سب شامل ہیں، تمھاری حیثیت بزرگ کی ہے یا نہیں۔"

اس کی آنکھوں میں پھیلی ہوئی ناامیدی، بے حسی اور دل شکستگی کے ویرانے میں امید کا ایک دیا روشن ہوا اور بجھ گیا۔ میں نے اپنی کوشش جاری رکھی اور اسے بالآخر یقین دلانے میں کامیاب ہو گیا کہ ہمارے خلوص میں خود غرضی کو دخل نہیں اور ہم ان میں سے نہیں جو ضرورت کے وقت گدھے کو بھی باپ بنا لیتے ہیں۔

اس نے کہا۔ "ہم... یہ چھوڑ دے گا۔ اس لعنتی عادت کو ایک دم نہیں چھوڑ سکتا... تھوڑا تھوڑا... کم کرے گا... تم ہمارا مدد کرے گا، پھر ہم ٹھیک ہو جائے گا..."

اسی وقت کریم نے انجن اسٹارٹ کیا۔ دوست محمد چونکا اور غور سے کچھ سُننے لگا، پھر وہ ایک دم اٹھا۔ "سالا پاگل کا بچہ، انجن کا بیڑا غرق کریں گا۔ آئل کم جاتا ہے تو انجن چلاتا ہے۔ بابا آئل دو، کریم بہرا ہو گیا ہے۔" اس نے باہر جا کے چلّانا شروع کیا۔ "او بے وقوف بند کر انجن کو، آئل کا لائن بند پڑا ہے۔ ابھی انجن خلاص ہو جائیں گا۔"

میں اس کے پیچھے گیا۔ میرے پہنچنے تک وہ کریم کے ایک جھانپڑ مار چکا تھا اور انجن بند کر کے نہ جانے کس پُرزے کو کھول رہا تھا اور بڑبڑا رہا تھا۔ محسن اور گُل نے ایک نالائق شاگرد کو پٹتے دیکھا تھا اور میری طرح خوش ہوئے تھے۔ دوست محمد نے اپنی استادی کا ثبوت بھی دے دیا تھا اور ہماری سرپرستی بھی قبول کر لی تھی۔ اس کی دلچسپی ایک خوشگوار تبدیلی کی آئینہ دار تھی۔

صرف مشتری کو کریم پر تاؤ آ رہا تھا جو مار کھا کے شرمندہ ہونے کے بجائے بڑی ڈھٹائی سے مسکرا رہا تھا اور اپنا گال سہلاتا جا رہا تھا۔

"ارے کیسے زور سے چانٹا مارا ہے ظالم نے... اور اسے دیکھو بے غیرت کو... ہٹا کٹا مشٹنڈا... پلٹ کے مُنہ توڑ دے اس بڈھے پھونس کا۔" مشتری نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

"معلوم ہے یہ بڈھا پھونس کون ہے؟" میں نے کہا۔

"تم کو ڈرنا چاہیے اس سے۔" محسن بولا۔

"صاب جی، ڈرتی ہے میری جوتی۔" مشتری نے ہاتھ لہرا کے کہا۔

"تین قتل کر چکا ہے۔" میں نے رازدارانہ لہجے میں بتایا۔
"ایک اپنے سُسر کا، ایک داماد کا اور ایک بہو کا، اور یہ ہے کریم کا باپ یعنی تمہارا ہونے والا سُسر۔"

مشتری کا رنگ فق ہو گیا۔ "مگر کریم... اس نے تو کہا تھا کہ اس کا کوئی باپ نہیں ہے۔"

"لو، بغیر باپ کے بھی کوئی ہوا ہے۔" محسن بولا۔ "دراصل اس نے باپ کو عاق کر رکھا تھا۔ اس کی اپنی حرکتوں کی وجہ سے کریم کو بھی ایک دن شادی تو کرنا ہی تھی۔ تم سے نہ ہوتی کسی چڑیل سے ہوتی۔ بڈھا اسے بھی مار ڈالتا۔"

مشتری کا موڈ خراب ہو گیا۔ "صاب جی، پھر تو کسی چڑیل سے ہی کرا دو اس کا بیاہ۔ تو میں کیا ایسی گئی گزری ہوں۔ خود کریم ہے بھوت کا بچہ، جو میری جان کو چمٹ گیا۔ ایک سے ایک گبرو بانکے جوان میرے پیچھے پھرتے تھے۔"

میں نے ایک سرد عاشقانہ آہ بھری۔ "ان میں ہمارا نام بھی شامل ہے یا نہیں۔"

"بالکل ہو گا۔" محسن بولا۔ "ہم بھی بانکے سجیلے چھیل چھبیلے گبرو جوان ہیں اور اس کے پیچھے پھرتے ہی رہتے ہیں۔"

مشتری سمجھ گئی کہ ہم اسے بے وقوف بنا رہے ہیں اور غصے میں پاؤں پٹختی واپس چلی گئی۔

دوست محمد نے انجن اسٹارٹ کیا اور چند سیکنڈ اس کی آواز سنتا رہا۔ پھر اس نے انجن کو پیار سے تھپکی دی۔ "ہاں ابھی ایسا مافک چلے گا۔ خراب ہوئیں گا تو بابا دوست محمد ہے ادھر۔ خیال رکھنا... ہاں۔" وہ انجن سے باتیں کر رہا تھا۔ پھر وہ کریم کی طرف پلٹا۔ "ابھی سُن دونوں کان کھول کے۔ اس کا آواز سن۔ تیرے کو فرق لگتا ہے کہ نہیں؟ پہلے اس کا ایسا مافک آواز تھا جیسے... بچہ روتا ہے بھوک میں... ابھی کیسا ہنستا پڑا ہے۔ ہنستا ہے نا؟"

کریم نے زبردستی اقرار میں سر ہلایا ورنہ اس کو ایک اور جھانپڑ کھانا پڑتا۔ آواز میں کوئی مبہم محسوس نہ ہونے والا فرق پڑا تھا تو ہمارے کان اسے کیسے محسوس کر سکتے تھے۔ پورے گانے کے بولوں میں ایک غلط سُر لگ جائے تو صرف کسی موسیقار کے کان ہی اسے نوٹ کر سکتے ہیں۔ یہ مشینی موسیقی تھی جس کو دوست محمد کے کان تیس چالیس سال سے سن رہے تھے۔ وہی کسی ایک پرزے کی آواز کے فرق کو محسوس کرنے پہ قادر تھا۔

"ابھی کیا حکم ہے اُستاد؟"
"حکم کا بچہ!" دوست محمد نے برہمی سے کہا۔ "ابھی تیرے کو کیا سمجھایا تھا سکندر صاب، ڈسپلن مانگتا ادھر۔ جہاز پر ہ[م] کا حکم چلتا ہے اور کسی کا نہیں۔ ہمارا باپ بھی ہوتا تو ہم اس[ے] یہی بولتا۔"

"غلطی ہوا اُستاد۔" کریم نے کہا اور بڈھے کو والہانہ[...] ہوئے دیکھتا رہا۔ دوست محمد خشک مزاج اور سخت گیر تھا۔ شاید اسی لیے مشینوں کے ساتھ اس کی زیادہ بنتی تھی کیونکہ انسانوں کے مقابلے میں زیادہ نظم و ضبط، اصول اور قاعدے کے مطابق چلتی تھیں اور اس کے کنٹرول میں رہتی تھیں۔

"اگر سب ٹھیک ہے کریم تو پھر چلو، بسم اللہ کرو۔" [...] نے کہا۔ "مزید دیر کی گنجائش نہیں۔"

کریم ایک دم قبلہ رو ہو گیا۔ سورج اب مغرب کی جانب ڈھل گیا تھا۔ اس نے ہاتھ اُٹھا کے بلند آواز میں کہنا شروع [کیا]۔
"ابھی یا ربّ العالمین! تیرا بوہت مہربانی، کریم بلوچ [پر] اپنا فضل کر، یا مولا علی مشکل کشا۔ ابھی ہمارا خاص مدد فرما۔ تیرے اپنے رسولؐ کا واسطہ پاک پروردگار۔ جیسا مالک تو نے نوح کا کشتی کو بچایا ایسا ہمارا چھوٹا سا لانچ کا بیڑا غرق ہونے [سے بچا]۔"
اس کے خشوع و خضوع اور استغراق کی کیفیت میں [...] کا اعتراف تھا، عجز تھا، خلوص تھا۔ اس کے الفاظ جیسے [...] صدقِ دل کے ترجمان تھے۔ میں نے کئی بار زیرِ لب آمین [کہا]۔ محسن کے ساتھ گل کو بھی دیکھا جو اس دُعا کی الہامی کیفیت میں [اسی] طرح ڈوبے ہوئے تھے۔ شاید وہ ہر بار سمندری سفر پر جانے سے پہلے ایسے ہی دُعا مانگتا ہو گا اور یہ رسم خود اس نے نہیں [ایجاد] کی ہو گی۔ یہ شیوۂ ایمانی تھا۔ اس نے آبا و اجداد کو بھی اتنی ہی [عاجزی] کے ساتھ خدا کے سامنے دست بہ دُعا دیکھا ہو گا۔ آدمی کتنا [...] کمزور ہے۔ وہ خود کو مٹی کا پُتلا، پانی کا بلبلہ اور خس و خاشاک تو [تسلیم] کرتا ہے لیکن اس حقیقت کا ادراک تب ہوتا ہے، جب [...] اس کے قدموں کے نیچے بچھی ہوئی زمین کو تہس نہس کر دیتی ہے اور آسمانوں سے آگ برستی ہے تو بستیاں خاک ہو جاتی ہیں۔ آتش فشاں سرد نہیں ہوتے اور سمندر میں طوفان [اٹھتے] تو فولادی قلعے جیسے جہاز بھی تنکوں کی ناؤ کی طرح بکھر جاتے [ہیں]۔

کریم بلوچ کی دُعا اس کی سادگی کی مظہر تھی مگر اس میں بھی حقیقت پسندی کا شعور تھا۔ جب اس نے کہا کہ "ماں قسم پروردگار! ہم کو مگرمچھ سے بوہت ڈر لگتا [ہے]۔ ہم کو شارک کا پیٹ میں جانے سے بھی بچا... ابھی یہ بوہت [چھوٹا] لانچ ہے۔ اس کا راستہ کلیئر کر... طوفان کو دشمن کا طرف [بھیج]... ہم وعدہ کرتا اگر تو میرے کو ایک دم ٹھیک ٹھاک [واپس] لائیں گا تو ہم کبھی حرام نہیں پیئں گا۔ ہم سالا مشتری سے [...] مگر تیرے سے بوہت ڈر لگتا اپن کو..."

میں اور محسن مسکراتے بھی رہے اور آمین بھی کہتے رہے۔ بالآخر اس نے مُنہ پہ ہاتھ پھیرا اور ایک نعرہ لگا کے لانچ کو نکالنے لگا۔ میں نے وطن کے ساحل کو دیکھا۔ کیا میں پھر لوٹ کے اس مٹی کی طرف آؤں گا، میں نہیں جانتا۔ آدمی کی مٹی اسے وہاں لے جاتی ہے جہاں وہ سفر ختم کرتا ہے مگر میں یقین اور امید کے زادِ راہ پہ تکیہ کرتا ہوں کہ دیارِ غیر اور اجنبی دیس کے راستوں نے خطرات کے جنگل سے اور دشمنوں کے حصار سے مجھے حفاظت کے ساتھ واپس لانے والا خدا میرے ساتھ ہے۔

ساحل دور ہونے لگا تھا۔ افق کا آخری کنارہ پھیل گیا تھا۔ نامعلوم مسافتوں سے آگے کہیں رابعہ ایک خیال کی روشنی بن گئی ہے۔ سطحِ آب پہ اس کا عکس قائم نہیں رہتا۔ میرے تصور کا آئینہ بار بار دھندلا جاتا ہے، جب سمندر کی موجیں جھاگ اڑاتی آتی ہیں۔ یہ سوموار کی ڈھلتی سہ پہر ہے۔ ابھی کچھ دیر میں سورج کا آتشیں گولا پانی میں بجھ جائے گا۔ تو سمندر کی پُرہیبت ویران رات ہم پر مسلط ہو گی۔ اس رات کے بعد بھی دو راتیں آئیں گی۔ جمعرات کو حاجی علی کی درگاہ پہ میرا انتظار کرنا۔ میں آؤں گا۔ زندگی نے وفا نہ کی تو میرا خیال آئے گا، جیسے تمہارا خیال روز آتا ہے مجھے تسلی دینے کے لیے۔ اور رابعہ ایک موجِ آب کے دوش پہ تیرتی ہوئی قریب آ کے ہنسی۔ تمہارا خیال تو اس وقت بھی میرے ساتھ ہے۔ میں نے اپنی گھڑی میں وقت دیکھا۔ پونے پانچ بج رہے تھے۔ ٹھیک ہے، میں پوچھوں گا وہاں آ کے۔

گل نے میرے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔ "بھائی جی، تم تو رابعہ کے خیال میں گم ہو، یہ محسن کس کی یاد میں ڈوبا ہوا ہے؟"

میں نے چونک کے اسے دیکھا اور زبردستی مسکرایا۔ "ڈوبا ہوا ہے تو نکال لو، کہیں بالکل ہی نہ ڈوب جائے۔" میں نے بات بنائی۔ میں جانتا تھا کہ وہ شہلا اور اپنے بچے سے دوری کے دکھ میں تنہا ہے۔ اس وقت وہ ہمارے ساتھ نہیں تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ اسے اپنے خیالوں کی خلوت گاہ سے باہر لا کے تصورات سے ملنے والی جذباتی آسودگی سے بھی محروم کر دوں۔

"تم کو اپنے... بھائی کی یاد نہیں آ رہی اس وقت؟" میں نے گل کو دیکھ کر کہا۔

"یاد تو کیا تھا میں نے اسے، مگر اس نے کہا کہ گل، تو بہادر بھائی کی بہادر بہن ہے، کہیں مجھے شرمندہ مت کرنا۔ میں نے زندگی میں کوئی نیکی ضرور کی ہو گی جس کے بدلے میں خدا نے تجھے اپنوں میں پہنچا دیا۔ پہلے تو میرے سوا کون تھا تیرا اپنا۔ اب تیرے بہت سے پیار کے رشتے ہیں۔"

"یہ سب اس نے کہا تم سے؟"

"ہاں، تم ہنسو گے مجھ پر۔" وہ بولی۔ "اس کی آواز میں نے ایسے ہی سُنی تھی... جیسے وہ میرے سامنے ہو۔ اور میں سمجھی تھی کہ تم بھی سُن لو گے۔"

ہم سب کے ساتھ اپنے اپنے خیالوں کی بازگشت تھی۔ میں اسے کیسے بتاتا کہ جیسے میں نے رابعہ کو دیکھا تھا اور اس کی آواز سنی تھی، اس سے باتیں کی تھیں، ایسے ہی اس وقت محسن بھی شہلا سے اور اپنے بچے کے خیال سے ہم کلام تھا۔

گل اسے غور سے دیکھتی رہی، پھر اس نے کہا۔ "بھائی جی، ایک بات پوچھوں، سچ سچ بتاؤ گے؟"

"پہلے تم سے جھوٹ کب بولا ہے میں نے؟" اس کے سوال کی نوعیت کا مجھے اندازہ ضرور ہو گیا تھا۔ چنانچہ میں نے گول مول بات کی۔

"محسن کو محبت ہے کسی سے؟"

میں ایسے ہی سوال کی توقع رکھتا تھا اور جواب کے لیے تیار تھا۔ "ہاں، دُنیا میں محبت کے بغیر کون جی سکتا ہے۔"

"ٹالو مت مجھے۔" وہ بولی۔ "میں اس محبت کی بات کر رہی ہوں جو تم رابعہ سے کرتے ہو، جو نازو کو غالب سے ہے۔"

"دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔" میں نے ریلنگ پر جھک کر متلاطم پانی میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "تمہارا دل کیا کہتا ہے؟"

"میرا دل... میرا دل کہتا ہے... تم اسے بتاؤ گے تو نہیں..."

"اب نہیں بتاؤں گا۔" میں نے کہا۔

"میرا دل کہتا ہے کہ محسن کبھی میرا نہیں ہو گا۔" گل نے بڑے یقین کے ساتھ کہا۔

"تم... تم چاہتی ہو کہ وہ تمہارا ہو جائے؟" میں اس کے بے باک اعترافِ محبت کے لیے ذہنی طور پر تیار نہ تھا۔

"ہاں، مگر چاہنے سے سب کچھ کہاں ملتا ہے۔ میں اتنی خوش قسمت کبھی نہیں تھی۔ میری تقدیر تو اب بھی وہی ہے۔"

"تقدیر کے بارے میں کون جانتا ہے کہ کب زندگی کے راستے بدل دے گی۔" میں نے کہا۔ "تم اپنی ہی مثال لو۔ تم پہلے گل بانو تھیں، پھر ناگ منی ہوئیں اور اس رات ہمارے آنے سے پہلے کیا تم سوچ بھی سکتی تھیں کہ تمہاری زندگی میں اتنا بڑا انقلاب آنے والا ہے۔"

"تم پوچھو گے نہیں کہ میں محسن کو کیوں چاہتی ہوں؟"

"نہیں، اس سوال کا جواب تو میں بھی نہیں دے سکتا۔ کوئی بھی نہیں دے سکتا۔" میں نے کہا۔ "میری طرح تم بھی

بے اختیار ہو۔ جیسے خدا کے معاملے میں بندہ بے اختیار ہے۔ اس تک رسائی ہو نہ ہو، وہی معبود رہے گا۔ دل کا سودا بھی کسی شرطِ وصل پر نہیں ہوتا۔"

گل مجھے یوں دیکھتی رہی جیسے میری بات کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ پھر اس نے آہستہ سے سر ہلایا۔ اور پلیٹ کے نیچے چلی گئی۔ میں سوچتا رہ گیا کہ اس کی خاموشی میرے خیال کی تردید کرتی تھی یا تائید؟

پھر محسن نے سر گھما کے مجھے دیکھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا میرے قریب آ کے بیٹھ گیا۔

"تو نے سچ کیوں نہیں بولا۔" یہ موقع کیوں گنوا دیا؟ جب وہ حقیقت جاننا چاہتی تھی اور سب کچھ سُن سکتی تھی۔"

"میں نے کوئی جھوٹ بھی تو نہیں بولا اس سے۔" میں نے کہا۔

"مگر تو نے جانتے بوجھتے سچ سے گریز کیا۔" محسن نے بربی سے کہا۔ "مجھے اس آزمائش میں مت ڈال سکندر۔ میں اس جھوٹ کو نبھانے میں تیرا ساتھ نہیں دے سکتا۔"

"ٹھیک ہے، جا اور اسے شہلا کے بارے میں خود ہی بتا دے۔" میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "آج تو مجھ میں ہمت نہیں تھی۔"

"ایک نہ ایک دن اسے سب معلوم ہو ہی جائے گا

"ہاں، مگر اس سے پہلے حالات و واقعات خود اسے اندازے قائم کرنے پر مجبور کریں گے۔ آہستہ آہستہ اس کے شکوک کی بنیادیں جب استوار ہوں گی تو یقین کی دیوار اُٹھے گی۔ وہ عقلی اور منطقی نتائج کی مدد سے سچ کو سمجھے گی، جانے گی اور مانے گی۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی خود کو ذہنی طور پر کسی سے بچھڑنے کا صدمہ اٹھانے کے لیے تیار کرتا ہے۔ ناقابلِ علاج مرض میں مبتلا کسی بھی مریض کے لواحقین اپنے احساس سے سمجھوتا کر لیتے ہیں۔ انھیں حوصلہ مجتمع کرنے کی مہلت مل جاتی ہے لیکن گھر سے معمول کے مطابق خوش و خرم اسکول یا آفس جانے والے کی کچلی ہوئی لاش اچانک گھر پہنچتی ہے تو یہ صدمہ جان لیوا بھی ثابت ہوتا ہے۔"

"میں دونوں طرف سے احساسِ پشیمانی کا شکار ہوں میں شہلا کے اعتماد کو دھوکا دینے کا مرتکب بھی ہو رہا ہوں اور گل کے جذبات سے بھی کھیل رہا ہوں۔" محسن نے بے بسی سے کہا۔ "تم تو صرف کھیل کے تماشائی ہو اور جب گل کو معلوم ہو گا..."

"تو بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔" میں نے محسن کی بات کاٹ دی۔ "اگر تیرا خیال ہے کہ وہ پاگل ہو جائے گی یا خودکشی کر لے گی تو میری بات لکھ لے، نہ وہ تجھ سے شکوہ کرے گی اور نہ مجھے الزام دے گی۔"

محسن نے مجھے حیرانی سے دیکھا۔ "یہ تو کیسے جانتا ہے؟"

"میں جانتا ہوں کہ اس کی محبت تیری طلب سے مشروط نہیں ہے۔ بالکل موہنی کی طرح، جو اچھی طرح جانتی تھی کہ رابعہ سے مجھے کتنی محبت ہے اور میں اس کے لیے کتنا ناقابلِ حصول ہوں لیکن اس نے رابعہ کے خلاف اپنی رقابت کے جذبات کا اظہار کبھی نہیں کیا۔ یہ بھی ویسی ہی محبت ہے جو رقابت کے تصور سے بے تعلق رہتی ہے۔ ساری دُنیا اس کے محبوب کو چاہے تو کوئی فرق اس لیے نہیں پڑتا کہ اسے اپنی محبت کے سوا کسی سے سروکار نہیں ہوتا۔"

"تیرا یہ فلسفہ... یا نظریۂ عشق..."

"میں نے کہا نا کہ میں لکھ کر دینے کو تیار ہوں۔ تو آج ہی آزمانا چاہے تو جا گل کو بتا دے کہ شہلا میری بیوی ہے اور میں ایک بچے کا باپ بھی ہوں، پھر دیکھ کیا اس کی محبت تجھ سے نفرت میں بدلتی ہے، لیکن اچھا ہے اگر تو اسے حقیقت کو قبول کرنے کے لیے کچھ وقت دے۔"

محسن خاموش ہو گیا اور دُور اُفق پر گم ہونے والے ساحل کو دیکھنے لگا۔ لانچ خاصی تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھی اور اب بڑے بڑے بحری جہازوں کے قریب سے گزر رہی تھی جو گہرے سمندر کے متلاطم سینے پر قلعوں کی طرح قائم تھے۔ آسمان اب بھی روشن تھا اور میں کراچی کی بندرگاہ پر کھڑی ہوئی بھاری بھرکم کرینوں کے فولادی بازوؤں کی آڑی ترچھی لکیریں دیکھ سکتا تھا۔ ساحل کے پانی کی وہ بُو جس میں تیل اور کوڑا کرکٹ اور دُھواں سب کچھ شامل تھا اب باقی نہیں رہی تھی۔ اب تازہ مرطوب ہوا میں ایک نمکین مہک تھی۔ اوپر آبی پرندے محوِ پرواز تھے اور نیچے سمندر بھی آسمان کی طرح ویران ہونے لگا تھا۔

گل پھر اوپر آئی۔ "بھُس میں چنگاری ڈال کے یہاں کھڑے ہو دونوں؟"

میں نے کہا۔ "بھُس... کہاں ہے بھُس؟"

"بھوسا ہو سکتا ہے۔" محسن بولا۔ "مشتری کی کھوپڑی میں تو یقیناً ہے... آپ ذرا چیک کرا لیں۔"

"اسے کہہ دیا کہ دوست محمد تمھارا شسر ہے اور تین قتل کر چکا ہے۔" گل نے بگڑ کے کہا۔ "وہ کریم کی ایک سننے پر تیار نہیں۔" ہم نیچے گئے تو صورتِ حال اس حد تک سنگین ہو چکی تھی کہ مشتری اور کریم بلوچ ایک دوسرے کی طرف پیٹھ کیے بیٹھے تھے اور... "میں باز آیا محبت سے اٹھا لو پاندان اپنا..." قسم کی کیفیت تھی۔ اور اس سے پہلے کہ ہم دخل در معقولات کرتے، دوست محمد نے کریم کو ڈیوٹی پر طلب کر لیا۔ میں نے مشتری سے کہا کہ وہ ہمارے کمرے میں چائے بھجوا دے اور اس نے ٹسر ٹسر آنسو بہاتے ہوئے کہا۔ "اچھا صاحب جی، مگر ایک فیصلہ کر جاؤ۔ یہاں اب میں رہوں گی یا کریم رہے گا۔"

"اوہ... یہ تو مشکل فیصلہ ہے۔" میں نے کہا۔ "گویا ایک کو سمندر میں پھینکنا پڑے گا۔"

"اور اس کے لیے دیکھنا پڑے گا کہ بھاری اور فالتو سامان میں کس کا شمار کیا جا سکتا ہے۔" محسن بولا۔ "پہلے تو لیں گے پھر بولیں گے۔"

"جب تم چائے... تو ترازو بھی لیتی آنا اور کریم کو بھی۔" میں نے کہا۔

اپنے کیبن میں پہنچ کے میں نے محسن سے کہا۔ "رات ہونے سے پہلے پہلے ہمیں اپنے ضروری کام نمٹا دینے چاہئیں۔ سب سے پہلے تو ضروری ہو گا کہ ہم دوست محمد کو وہ نقشہ دکھا دیں جو شاہ جمیل نے بنا کے دیا تھا تاکہ وہ صحیح سمت متعین کر لے۔"

"کیا وہ اب بھی کارآمد ہو گا؟"

"ظاہر ہے جہاز اپنے مقررہ راستے پر ہی سفر کرے گا۔ دیر سے روانہ ہونے سے روٹ تو نہیں بدل سکتا نا۔" میں نے کہا۔

"دوست محمد ہی بتا سکتا ہے کہ ہم اس بحری جہاز کے نزدیک کب پہنچ سکتے ہیں۔ آج رات تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن کل کی رات سب سے موزوں ہے۔ اگر ہم سارا دن چلتے رہے اور کوئی گڑبڑ نہ ہوئی تو چوبیس گھنٹے بہت ہوتے ہیں۔" محسن نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ لانچ مسلسل سفر نہیں کر سکتی۔ چھوٹا انجن ہے نا، اسے وقفہ دینا پڑے گا۔" میں نے کہا۔ "دوست محمد کچھ ایسا بندوبست کرے کہ ہم پرسوں یعنی بُدھ کی رات تک جہاز کے قریب ہوں۔ اور اسی رات کے دوران ہم جہاز پر پہنچنے کی کوشش کریں۔ کامیابی کا انحصار نازو اور غالب سے رابطے پر ہے۔"

"بدھ کی رات میں رسک ہے۔ جمعرات کی صبح یا زیادہ سے زیادہ دوپہر تک ہم بمبئی کے ساحل پر نہ اُترے تو تیری اور رابعہ کی ملاقات کیسے ہو گی۔ شہر میں داخل ہونے اور پھر حاجی علی کی درگاہ تک پہنچنے کے لیے بھی وقت درکار ہو گا۔ ہم وہاں اجنبی ہوں گے اور ہمارے سامنے ایک نہیں دس مسئلے ہوں گے۔" محسن نے کہا۔

اسی وقت دوست محمد اندر آ گیا اور اس کے پیچھے مشتری چائے کی ٹرے لے آئی۔ دوست محمد کی شان پہلے بھی قلندرانہ تھی۔ رنگ کالا تھا اور سر کے سخت کھردرے بالوں میں سفیدی غالب تھی۔ جب سے وہ نشہ کرنے لگا تھا اس نے شیو بنانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ چنانچہ اس کے چہرے پر بھی بال اُگ آئے تھے۔ لال چار خانے والی میلی قمیص اور بوسیدہ خاکی پتلون شاید اس نے کئی ہفتے سے پہن رکھی تھی۔ رہی سہی کسر اس کے بدن پر میل کی تہ نے پوری کر دی تھی۔ مشتری نے چائے کے برتن رکھتے ہوئے ناک پہ دوپٹے کا پلو رکھا اور زیرِ لب کہا۔ "مُوا چرسی... کوڑے کی پوٹلی۔"

"کیا تم نے دوست محمد سے کچھ کہا؟" محسن بولا۔ "بھئی یہ تم سے کچھ پوچھنا چاہتی ہے۔"

"ہاں ہاں، جو پوچھنا ہے سامنے پوچھ لو۔" میں نے کہا۔ "میں نے غلط نہیں بتایا تھا۔ سب سے پہلے قصہ پاک کیا سسر کا۔ یوں۔" میں نے گلے پہ ہاتھ کو چھری کی طرح پھیرا۔ "پھر داماد۔" میں نے ہاتھ سے سینے میں خیالی خنجر گھونپا۔ "اور آخر میں بہو۔" میں نے ایک ہاتھ کی انگلی سے ریوالور بنا کے ٹرائیگر دبایا۔ دراصل میں نے دیکھ لیا تھا کہ دوست محمد نے بھسکڑا مار کے زمین پر بیٹھتے ہی آنکھیں بند کر لی تھیں اور ذہنی طور پہ وہ غیر حاضر تھا، لیکن پیچھے کھڑی ہوئی مشتری کو یہ معلوم نہیں ہو سکتا تھا۔

"کیوں بھئی، دوست محمد۔" میں نے بلند آواز میں کہا۔ "یہ ٹھیک بولا نا میں نے۔"

دوست محمد بیزاری سے بولا۔ "او بابا، سب ٹھیک ہے۔" مشتری پہلے ہی بدحواس ہو گئی تھی۔ دوست محمد کا جواب سنتے ہی اس کا حوصلہ جواب دے گیا۔ وہ ایک دم بھاگی... ٹھوکر کھا کے گری، چیخ مار کے اٹھی اور غائب ہو گئی۔

دوست محمد نے اسے غور سے دیکھا۔ "اس لڑکی کا مغز میرے کو خراب لگتا۔"

"ہاں، پاگل ہے بیچاری۔" محسن بولا۔ "لیکن خطرناک نہیں ہے۔"

"کیا نام ہے اس کا؟" دوست محمد نے ہمدردی سے کہا۔

"نام تو... پتا نہیں... کریم پیار سے باولی کہتا ہے۔" میں نے کہا۔ "بُرا نہیں مانتی۔"

"کریم پیار سے بولتا... اس کا کون ہے یہ پاگل؟"

"تمھیں نہیں معلوم؟" میں نے کہا۔ "بیوی ہے اس کی۔"

"اچھا... سالا حرامی... شادی بنایا اور ہم کو نہیں بتایا۔ ہم کو اُستاد بولتا اور ہم سے استادی کرتا۔" وہ خفا ہو کے بولا۔

"چلو چھوڑو استاد، یہ نقشہ دیکھو۔" میں نے کہا۔

دوست محمد نے کاغذ کو پھیلا کے نظر جمانے کی کوشش کی، پھر آنکھیں مَل کے دیکھا۔ اس کی صورت پر جھنجلاہٹ کے آثار نظر آنے لگے۔

"ابھی ایک سگریٹ دو ہم کو۔" وہ التجا آمیز بے بسی سے بولا۔

پھیلا کے بولا۔

میں نے محسن کی طرف دیکھا اور اسے ایک سگریٹ نکال کے دے دی۔ "اب رات کو سونے سے پہلے تمھیں سگریٹ نہیں ملے گی۔"

اس نے میری بات اَن سُنی کر دی اور سگریٹ جلا کے لمبے لمبے کش لینے لگا۔ میں اور محسن چائے پیتے رہے اور دوست محمد کے 'ہوش' میں آنے کا انتظار کرتے رہے۔

بالآخر اس نے آنکھیں کھول کے نقشہ دیکھا۔ اس کے ماتھے پر غور و فکر کی لکیروں کا جال گہرا ہونے لگا۔ اس نے دو بار سر ہلا کے دوست محمد نے کہا۔ اور پھر آنکھیں بند کر کے ایک انگلی سے ہوا میں فرضی لکیریں بناتا رہا۔ وہ اپنے تجربے کی روشنی میں کچھ حساب لگا رہا تھا اور اندازے قائم کر رہا تھا۔

"یہ تو تم جانتے ہو کہ ہم ایک بحری جہاز کے تعاقب میں ہیں۔" میں نے کہا۔ "اس کا نام ہے ایس ایس کرانتی ٹھنڈر۔ وہ جہاز کل آدھی رات کے بعد کراچی کی بندرگاہ سے بمبئی کے لیے چلا تھا۔"

دوست محمد نے سر ہلایا۔ "ابھی یہ نقشہ کس پاگل کا بچہ نے بنایا ہے؟"

"کیوں... کیا یہ غلط ہے؟" میں نے کہا۔

"کوئی کا غند لاؤ۔" وہ نقشے پر غور کرتے ہوئے بولا۔ "ہم اس کو ٹھیک کر کے بنائیں گا۔"

وہ کوئی نیوی گیشن انجینئر نہیں تھا۔ اس کے پاس کسی یونیورسٹی کی کسی فنی ادارے کی کوئی سند نہیں تھی، لیکن چالیس برس کا تجربہ اس کی سب سے بڑی سند تھا۔ میں نے اسے کورے کاغذ پر آڑی ترچھی لکیریں بناتے اور آنکھیں بند کر کے بڑبڑاتے دیکھا۔ وہ کسی قطعی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاہد جمیل کے نقشے میں جو تفصیلات نہیں تھیں، وہ انھیں مکمل کرنے میں مصروف ہے۔

بالآخر اس نے کہا۔ "ابھی کیا کرنے کو مانگتا؟"

میں نے کہا۔ "پہلے تو یہ بتاؤ ہم اس جہاز تک کب پہنچ سکتے ہیں۔ کیا کل رات تک یہ ممکن ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "کل رات مشکل ہے بابا۔ ابھی جو فرق ہے... تو چھتیس گھنٹا۔ اس میں چھ گھنٹا ملاؤ۔ لانچ چلیں گا چھ گھنٹا، پھر ایک گھنٹا نہیں چلیں گا۔"

"بیالیس گھنٹے... یعنی پرسوں بعد دوپہر۔" میں نے کہا۔

"اگر کوئی گڑبڑ نہ ہوا۔" دوست محمد بولا۔

"گڑبڑ کس قسم کی ہو سکتی ہے؟" محسن بولا۔

"کیسا بات کرتا ہے تم... یہ سمندر ہے۔ کراچی کا سڑک پر بھی بہت کچھ ہو جاتا ہے۔ ادھر تم کو وھیل ٹکر مارے پھر، اور رات کو تم چڑھ جاوے کسی چٹان مٹان پہ... پھر...؟ انجن خراب ہو جاوے پھر؟"

"انجن تو تمھارے لیے کوئی مسئلہ نہیں۔"

"او بابا، بات ٹائم کا ہے۔ تھوڑا وقت تو لگیں گا نا۔" وہ چڑ کے بولا۔ "ہم وہ جہاز دیکھا ہے۔ اس کا اسپیڈ بھی مالوم ہے ہم کو۔ لیکن راستہ خراب ہے۔ شام ہو سکتا ہے۔"

"شام تو ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "کوشش کرنا کہ ہم اندھیرا ہونے تک ان کی نظر میں نہ آئیں۔"

اس نے سر ہلایا۔ "ابھی یہ بولو کہ تم پکڑا گیا تو کیا کریں گا؟"

"اس کا بندوبست ہم کر رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم سب کے فرضی نام ہوں گے اور جعلی پاسپورٹ۔ جعلی سے میرا مطلب ہے پاکستانی نہیں ہوں گے۔ انڈین نام ہوں گے تو انڈین پاسپورٹ۔"

"یہ تو بہت لفڑا ہے بابا..."

"تم فکر مت کرو، اگر کوئی چیک کرنے آئے تو تم آنکھیں بند کر کے سو جاؤ۔ ہم بتا دیں گے کہ... بابا نشے میں ہے۔ کوئی تم سے لاکھ پوچھے جواب مت دینا۔ ویسے ہم بتا دیتے ہیں تمھیں کہ آپس میں ہمارا رشتہ کیا ہے۔ میں اور محسن بھائی ہیں۔ گل خان دوست ہے محسن کا، اور ہم دونوں تمھارے بیٹے ہیں۔"

"اور وہ پاگل؟"

"تمھارا مطلب ہے بادلی؟" میں نے ہنسی روک کے کہا۔

"وہ تو ہے ہی کریم کی بیوی۔ کریم ہمارے ساتھ کام کرتا ہے۔ ہم سب ماہی گیر ہیں۔"

"جو تمھارا مرضی بولو بابا۔ ہم اپنا کام کرے گا۔" وہ اُٹھتے ہوئے بولا۔ "رات کو باری باری ڈیوٹی دے گا تم۔ ایک آدمی ہمارا ساتھ ہوئیں گا، ایک کریم کا ساتھ۔"

"کریم تمھاری مدد کے بغیر بھٹک تو نہیں جائے گا؟"

"ہم اس کا مغز میں سیدھا راستہ ڈالیں گا۔ پھر کیسے بھولیں گا راستہ وہ... اور ہم بھی ادھر ہے، لیکن ہم اکیلا سارا رات نہیں جاگ سکتا۔" اس نے باہر جاتے جاتے کہا۔

اس کے جانے کے بعد مجھے گل کا خیال آیا۔ "اس نے چائے بھی نہیں پی ہمارے ساتھ۔"

"عرشے پر ہو گی۔" محسن نے کہا۔ "میں لے کر آتا ہوں۔"

جب وہ دونوں آئے تو گل کے چہرے پر بڑی تیکھی مسکراہٹ تھی۔ دلبری کے ناز اور محبوبی کے انداز سے روشن۔ فتح مندی کے غرور سے معمور اور مخمور۔ معلوم نہیں محسن نے کیا کہہ دیا تھا یا اس نے کیا سمجھ لیا تھا کہ اداس اور بجھی بجھی گل... کی شوخی عود کر آئی تھی۔

"کہاں تھیں تم؟" میں نے ڈانٹ کر کہا۔

"پہلے تو کریم اور مشتری کا ڈراما دیکھ رہی تھی۔ تم نے بنا شوشہ چھوڑ دیا ہے۔" وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "اب وہ کریم کی قسم پر بھی اعتبار کرنے کو تیار نہیں۔ کہتی ہے تمھارا باپ مجھے بھی قتل کر دے گا۔ اس کے بعد سورج کو ڈوبتا دیکھتی رہی۔ بڑا اچھا لگتا ہے۔"

"ابھی سفر شروع ہوا ہے۔" میں نے کہا۔ "صبح پوچھیں گے تم سے تمھارا حال کہ اب کیسا لگتا ہے۔"

"کیوں؟ صبح کیا ہو گا؟" وہ بولی۔

"سمندر پیٹ میں طوفان اٹھائے گا، چکر، متلی اور قے ہو گی جسے سی سِکنیس کہتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "تھوڑی بہت سب کی حالت خراب ہو گی۔ بہتر ہے اس سے پہلے ہی ضروری کام کر لیں۔"

کیبن کی لائٹس جلا کے میں نے محسن کی مدد سے چار پاسپورٹ تیار کیے۔ پہلا پاسپورٹ میرا تھا، دوسرا محسن کا۔

"جب ہماری قومیت اور شہریت بدلے گی تو نام بھی یہ نہیں ہوں گے۔" میں نے کہا۔ بہت غور فرمانے کے بعد میں نے اپنا نام امیر چند ولد دمڑی لال اور تیرا نام فقیر چند ولد دمڑی لال منظور کیا ہے۔"

گل ہنسی مگر محسن نے احتجاج کیا۔ "کیوں یہ کافروں کے نام رکھ کے اپنی اور میری عاقبت خراب کرتا ہے؟"

"نقلِ کفر، کفر نہ باشد۔" میں نے کہا۔ "ہماری اصلیت، ولدیت بدل نہیں سکتی۔ اس سے نہ ہمارے ایمان میں خلل پڑنے کا کوئی سوال ہے اور نہ ایقان میں۔"

"پھر بھی ضرورت کیا ہے امیر چند ولد دمڑی لال بننے کی؟ آخر ہندوستان میں مسلمان بھی رہتے ہیں۔" محسن بولا۔

"ہاں، رہتے ہیں لیکن انھیں وہ تحفظات اور مراعات حاصل نہیں جو ہندوؤں کو حاصل ہیں۔" میں نے کہا۔ "ممکن ہے مسلمان کی حیثیت سے ہم ہر جگہ اپنے لیے جگہ نہ بنا سکیں، مشکوک سمجھے جائیں یا تعصب کا شکار ہو جائیں۔ ہمیں عام لوگوں کے درمیان رہنا ہے اور کون جانے کہاں کی خاک چھاننی ہے۔"

"میں قائل ہوئے بغیر تیری بات مان سکتا ہوں بشرطیکہ میرا نام امیر چند ہو جو میری رئیسانہ عادات اور شاہانہ اطوار کے زیادہ شایانِ شان ہے۔" محسن نے کہا۔

"بات صورت کی ہے عزیزم! اگر تم غیر جانبداری سے غور کرو تو تمھاری شکل کنگلوں والی ہے۔ آدمی دیکھے تو خواہ مخواہ ترس کھا کے خیرات دینے کی سوچتا ہے۔ فقیر چند کا لیبل تمھاری صورت پر بہت صحیح چسپاں ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ دھاندلی نہیں چلے گی۔ ثالث کو فیصلہ کرنے دو۔"

"اور ثالث گل ہو گی۔" میں نے کہا۔ "چور کا گواہ گرہ کٹ، تم دونوں تو ایک ہو۔ یہ تمھیں کہے گی مسٹر پاکستان اور تم اسے بنا دو گے مِس یونیورس، ہمیں چکر دیتا ہے بھک منگے۔"

"اچھا ٹاس کر لو، ورنہ کشتوں کے پشتے لگ جائیں گے۔"

میں نے سکہ نکالا اور اوپر اچھالا۔ گل نے اسے کیچ کر کے دونوں ہاتھوں میں دبا لیا۔ محسن نے چاند تارا مانگا۔

"اب بولو۔" وہ دونوں ہتھیلیوں کے درمیان جھانک کے ہنسی۔ "کون سا ہاتھ سامنے کروں، دایاں یا بایاں۔"

"بایاں۔" میں نے کہا۔

"نہیں دایاں۔" محسن نے شور مچایا اور گل نے سیدھے ہاتھ کی ہتھیلی سامنے کر دی۔

میں نے قہقہہ مارا۔ "دیکھا اسے کہتے ہیں تقدیر کا فیصلہ اور وہ سکہ فوراً گل سے لے کر جیب میں ڈال لیا جس کے دونوں جانب چاند تارا ہی تھا۔ محسن کو یاد نہیں آیا کہ ٹاس جیتنے کے لیے ایسے خصوصی سکے ہم کتنی محنت سے بناتے تھے۔ اور سنبھال کے رکھتے تھے۔ گل نے یہ بات یقیناً نوٹ کی ہو گی مگر اس نے میرا راز افشا نہیں کیا۔

"گلاب کو جس نام سے چاہو پکارو، وہ گلاب ہی رہتا ہے۔" محسن نے ڈھٹائی سے کہا۔

"یہ تو ہے۔" میں نے اتفاق کیا۔ "مثلاً اپنی گل پاسپورٹ میں گل خان ہے، تم اسے گل جان کہو تب بھی رہے گی یہ گل بانو۔"

"او گل جاناں، او شے۔" محسن نے نعرہ لگایا۔ "دی قربان۔"

میں نے گل کو گُلِ لالہ بنتے دیکھا اور سر جھکا کے پاسپورٹ کے اندراجات مکمل کرنے لگا۔ یہ بہت احتیاط اور جانفشانی کا کام تھا۔ محسن نے میری مدد کی اور آدھے گھنٹے میں ہم فارغ ہو گئے۔ ہمارے پاس جو مہریں تھیں وہ اصلی تھیں کیونکہ یہ مہریں بھارتی ایجنٹوں کو خود حکومت نے فراہم کی تھیں۔ بلینک پاسپورٹ بھی جعلی نہیں تھے۔ اب وہ لوگ بھی زندہ نہ تھے جو اِن کی گمشدگی کی رپورٹ لکھواتے۔ چنانچہ نقل ہر طرح سے اصل کے مطابق تھی۔ خود تصدیق کرنے والے ہم پہ شک نہیں کر سکتے تھے اور یہ دستاویز ہمارے تحفظ کی سب سے بڑی ضمانت تھی۔

"کیا ہم یہ پاسپورٹ ہر جگہ ہر وقت پیش کریں گے۔ ہر ایرے غیرے نتھو خیرے کو؟" محسن نے کہا۔

"نہیں جب تک کوئی ہماری شناخت کا ثبوت نہ مانگے اور رشوت لے کر بھی ٹلنے پر آمادہ نہ ہو۔ پاسپورٹ نکالنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ پاسپورٹ بھارت سے گزرتے ہوئے یا مشرقی پاکستان کی سرحد عبور کرتے وقت زیادہ کارآمد ثابت ہوں گے۔ ابھی تو ہم مچھیرے ہیں۔ پکڑے گئے تو کہہ دیں گے کہ غلطی سے آگے نکل آئے۔ پاکستان اور بھارت دونوں ہی اپنی

سمندری حدود میں گھس آنے والے ماہی گیروں کی لانچیں پکڑتے رہتے ہیں لیکن ان کے خلاف قانونی کارروائی نہیں ہوتی۔ بس دو چار دن رکھتے ہیں۔ کچھ مال بناتے ہیں یا مال نہ ملے تو تیرہ نمبر کے چھتر سے تھوڑی سی خاطر تواضع کرتے ہیں اور چھوڑ دیتے ہیں۔ چونکہ ہم نذرانہ پیش کرنے کی پوزیشن میں ہیں۔ اِدھر بھی اور اُدھر بھی، اس لیے فوری طور پر ہمیں قانون سے کوئی خطرہ لاحق نہیں۔"

"پھر اتنی جلدی کیا تھی پاسپورٹ بنانے کی؟" گل نے کہا۔

"اچھا سوال کیا ہے تم نے گل خان۔" میں نے کہا۔ "بات یہ ہے کہ دورانِ سفر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ کوئی بھی حادثہ ایسا پیش آسکتا ہے جو ہم سب کو جدا کر دے۔ کسی بھی نوعیت کی ہنگامی صورتِ حال کے بارے میں ہم سب کو پہلے سے معلوم ہونا چاہیے کہ ہماری کیا ذمے داری ہے۔"

"کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ اس لیکچر کے سامعین میں مسماۃ مشتری اور ان کے مجنوں میاں کریم کو بھی شامل کر لیا جائے؟" محسن نے کہا۔

"ٹھیک ہے، اس بریفنگ کی زیادہ ضرورت انھی کو ہوگی۔" میں نے کہا۔ "دوست محمد کو چھوڑ دو۔ وہ ہم سے زیادہ جانتا ہے سمندر کو۔"

محسن واپس لوٹا تو اس کے ساتھ صرف مشتری تھی۔ اس کا بھی منہ سوجا ہوا تھا اور وہ ایسے آئی جیسے غلط ایل بی ڈبلیو قرار دیا جانے والا کھلاڑی پویلین میں آتا ہے۔

"نصف بہتر تو آگئی۔" میں نے کہا۔ "نصف بدتر کہاں ہے؟"

"اپنے اعمال کی سزا بھگت رہا ہے۔" محسن بولا۔ "اُستاد نے شاگرد کو مُرغا بنا رکھا ہے۔"

"کس جرم میں؟"

"جرم... بفرمایا ہے شاعر نے کہ جرمِ اُلفت میں ہمیں لوگ سزا دیتے ہیں۔" محسن بولا۔ "دوست محمد اس ظالم سماج کا نمائندہ بن گیا ہے۔ میری سفارش سے وہ پیرول پہ رہا ہو کے آرہا ہے۔ جب واپس جائے گا تو باقی سزا کاٹے گا۔"

کریم آہ و بکا کرتا اور لڑکھڑاتا اندر آیا۔ "اللہ کا قسم ہم ایک دم مر گیا صاب، آپ بوہت ظلم کیا کریم بلوچ پہ۔ استاد کو بول دیا کہ ہم چوری چوری شادی بنایا۔ اس کو نہیں بلایا۔ ہم بولا کہ استاد ایسا کیسا بولتا۔ ماں قسم قاضی ماضی کوئی مت آدے تو شادی ہووے گا لیکن تم نئیں آئیں گا تو کریم بلوچ ہاں نہیں بولیں گا۔"

"پھر اُستاد نے یقین کیوں نہیں کیا؟"

"کیا صاب، لیکن ابھی بولتا کہ اچھا، تو شادی نئیں بنایا ہے تو میرے ساتھ وعدہ کر، اس پاگل سے نئیں بنائیں گا۔ میں بولا کون پاگل استاد؟ تو صاب... وہ مشتری کا نام لیا۔ اب ہم اس کو کیسے بتا وے کہ یہ پاگل نئیں ہے۔"

"اے ہے، اس منحوس بڈھے پر خدا کی مار، مجھے پاگل کہتا ہے۔" مشتری نے ہاتھ ہلا کے کہا۔ "وہ خود پاگل... اور تو کیوں نہیں بتا سکا یہ بات اسے۔"

"کبھی کبھی ہم استاد سے جھوٹ بولتا ہے مشتری۔ اللہ ہم کو مافی دیوے۔ لیکن اتنا بڑا جھوٹ کیسے بولے۔"

"کیا مطلب؟" مشتری نے چمک کے کہا۔ "یہ جھوٹ ہے اگر وہ بھی کہتا ہے تجھے پاگل، تیرا اپنا دماغ ٹھکانے ہے...؟"

"ارے اپنا پاس کدھر ہے نی دماغ، لیکن تو فکر مت کر۔ ہم ایسا بات نئیں بولیں گا۔ ہم ساری رات مرغا بنیں گا مگر پھر بھی صبح اذان دیں گا۔ تو تیرا نام لیں گا... آہ اپنا کمر کا کمانی ٹیڑھا ہو گیا...۔" وہ دھڑ سے فرش پر بیٹھ گیا۔

اس کی باتوں پہ ہنسی آنا لازمی تھی۔ لیکن میں نے سیریس ہو کے کہا۔ "اس وقت تمھیں بلانے کا مقصد یہ ہے کہ کچھ ضروری باتیں تمھیں پہلے سے بتا دی جائیں۔ اتنا تو تم جانتے ہوگے کہ ہمارے اس سفر کا مقصد کیا ہے۔ ہمارے سامنے خطرات ہی خطرات ہیں لیکن ہم خدا پر بھروسا رکھتے ہیں کہ جیسے اس نے آج تک ہماری حفاظت کی ہے، آئندہ بھی کرے گا۔ احتیاط اپنی جگہ لازم ہے۔ ایک بات تم دھیان سے سن لو۔ اب ہم وہ نہیں ہیں جو روانگی کے وقت تھے۔ حالات کا تقاضا ہے کہ یہ سفر بھیس بدل کے اور اپنی اصلیت کو پوشیدہ رکھتے ہوئے کریں۔ ہم سب نے اپنے نام بدل لیے ہیں اور آج کے بعد ہم انھی ناموں کے ساتھ سفر کریں گے۔ ہمارے یہ نام واپسی تک یہی رہیں گے۔ اگر ابھی سے ہم نے ایک دوسرے کو ان ناموں سے پکارنا شروع نہ کیا تو عادت نہیں ہوگی اور کہیں کسی غلط موقع پہ نادانستگی میں صحیح نام ہمارے منہ سے نکلا تو سب پھنس جائیں گے۔ یاد رکھو میرا نام ہے امیر چند، محسن کا نام ہے فقیر چند اور یہ گل بانو جو مردانہ لباس اور حلیے میں بیٹھی ہے، یہ گل خان ہے۔ یہ عورت نہیں مرد ہے۔ امیر چند اور فقیر چند بھائی ہیں اور ان کے باپ کا نام ہے دمڑی لال۔"

"صاحب جی! یہ تو بہت مشکل نام ہیں۔" مشتری نے کہا۔

وہ میری باتوں پر بے حد حیران اور پریشان تھی۔

"فکر مت کر، میں تیرے کو سمجھا دوں گا۔" کریم نے کہا۔

"مگر صاب، یہ دمڑی لال کون ہے؟"

"تمھارا اُستاد۔ ہم یہ ظاہر کریں گے کہ وہ ہمارا باپ ہے۔ میرا اور محسن کا۔" میں نے کہا۔ "گل خان ہمارا ساتھی ہے اور ہم سب ماہی گیر ہیں۔ مچھلی پکڑتے ہیں اور کل صبح سے ہم یہ کام شروع بھی کر دیں گے تاکہ کسی کو شک نہ ہو۔"

"ہمارا بھی کوئی اچھا نام رکھو صاب۔" کریم نے کہا۔ "یہ مشتری بھی ہم کو اچھا نہیں لگتا۔"

"ارے کلمو ہے، میں اچھی نہیں لگتی تجھے۔" مشتری نے چمک کے کہا۔ "کون اچھی لگے ہے پھر تجھے، بتا...۔"

"ارے بابا، ہم نام کو بولتا۔ مستری تو وہ ہوتا جیسے اپنا استاد... مکینک۔" کریم نے اسے سمجھایا۔ "پہلے اس کو سب مستری صاب بولتا۔ ابھی وہ استاد ہے۔"

"چلو تم خود اپنے لیے اور مستری صاحب کے لیے وہ نام تجویز کرو جو تمھیں اچھا لگتا ہے۔" میں نے مسکرا کے کہا۔

"طبلہ اور سارنگی کیسا رہے گا۔ ہر وقت ایک دوسرے کے ساتھ سنگت کرتے رہتے ہو۔" محسن نے کہا۔

"ایک دم ٹھیک صاب۔" کریم خوش ہو کے بولا۔

"ارے چل نامراد، تو بن جا طبلہ۔ میں مشتری ہی بھلی۔" مشتری نے جل بھن کے کہا۔ "تجھے تو وہ بڈھا طبلے کی طرح بجاتا پھرے ہے۔"

"چلو چھوڑو، تمھارے یہی نام ٹھیک ہیں۔" میں نے کہا۔ "تم کریم، صرف کریم اور یہ تمھاری گھر والی یعنی مسز کریم۔"

"میں... نا صاحب جی، مجھے تو معاف ہی رکھو...۔"

"اچھا... گویا تمھیں کریم کی شریکِ حیات کہلانا بھی منظور نہیں مسماۃ مشتری۔" میں نے کہا۔ "میں بھی مجبور ہوں، محسن کے لیے بھی یہ ممکن نہیں۔ چلو ہم فی الحال تمھیں دوست محمد کی زوجیت میں دیتے ہیں۔ عارضی طور پر۔"

"بس طے ہو گیا کہ تم ہو دوست محمد کی بیوی۔" محسن نے کہا۔

"اور یہ فیصلہ بدلا نہیں جا سکتا۔ کریم کے علاوہ اس پوسٹ کے لیے وہی دستیاب ہے۔"

"اچھا جی... تو پھر کریم ہی ٹھیک ہے۔" مشتری نے مُردہ لہجے میں کہا۔ "لیکن اسے سمجھا دینا۔"

"بھئی، یہ تو کاغذی کارروائی ہے۔ اس نے تمھارا شوہر بننے کی کوشش کی، تو ہم پھر بیوہ کر دیں گے تمھیں۔" میں نے کہا۔ "اور اب ذرا توجہ سے میری بات سنو۔ ہم تینوں کے پاسپورٹ تو ہیں۔ چوتھا پاسپورٹ ہم کریم کے لیے بنا دیں گے۔ مشتری کا اور دوست محمد عرف دمڑی لال کا کوئی پاسپورٹ نہیں ہوگا۔ کبھی کسی نے چیک کیا تو چار افراد کی چیکنگ کافی ہوگی۔ سب نے پاسپورٹ نکال کے پیش کیے تو یہ بھی شک پیدا کرنے والی بات ہوگی۔ کریم کہہ سکتا ہے کہ اس نے نئی شادی کی ہے۔ بیوی کا پاسپورٹ ابھی نہیں بنوایا۔ دمڑی لال کے لیے میں اور محسن کہہ دیں گے کہ اس کو نشے کی لت ہے۔ پاسپورٹ تھا مگر نہ جانے کہاں گم ہو گیا ہے... جن کے پاسپورٹ ہیں وہ انھیں اس وقت تک پیش نہیں کریں گے جب تک میں نہ کہوں لیکن ان کو اپنے پاس رکھیں گے، ہر وقت۔ اس کا طریقہ یہ ہوگا کہ ایک پلاسٹک میں پاسپورٹ کے ساتھ انڈین کرنسی اور پاکستانی کرنسی ہوگی۔ کریم کو دو ہزار پاکستانی روپے اور دو ہزار بھارتی روپے دیے جائیں گے۔ ہم سب کے پاس پانچ پانچ ہزار ہوں گے۔ اس رقم کو انتہائی ہنگامی ضرورت کے لیے محفوظ رکھنا ہوگا۔ اگر طوفان یا کسی اور حادثے کے باعث لانچ غرق ہو جائے تو ہم سب لائف جیکٹ کی مدد سے ڈوبنے سے بچ جائیں گے۔ یہ ایسا راستہ ہے کہ ادھر سے بحری جہاز اور لانچیں گزرتی رہتی ہیں۔ کوئی نہ کوئی سب کو بچا لے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہم بچھڑ جائیں اور الگ الگ لانچوں یا بحری جہازوں پر پہنچ جائیں۔ اس قسم کے حالات میں گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ مدد کرنے والے کچھ نہیں پوچھتے۔ ان سے صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ ہماری لانچ ڈوب گئی ہے۔ وہ ممبئی کی طرف جا رہے ہوں گے تو کوئی مسئلہ نہیں۔ کراچی کی جانب جا رہے ہوں گے تو ایسی صورت میں ان سے درخواست کی جا سکتی ہے کہ وہ تمھیں ممبئی جانے والے جہاز پر منتقل کر دیں۔ تھوڑا آگے پیچھے سب ممبئی پہنچ جائیں گے۔"

"اگر اس سے پہلے ہی کسی وہیل کے یا شارک کے اندر نہ پہنچے تو۔" محسن بولا۔

مشتری نے ایک چیخ ماری۔ "کیسی باتیں کرو ہو صاحب جی۔"

"تمھیں ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ کوئی قریب آئے تو ایسے ہی ڈانٹ کر بھگا دینا۔ جیسے کریم کو ڈانٹتی ہو۔" محسن بولا۔

"آرڈر... آرڈر...۔" میں نے میز پر مُکا مار کے کہا۔ "میری بات ابھی ختم نہیں ہوئی۔ ممبئی پہنچ جانے کے بعد ممکن ہے شناخت کا مسئلہ درپیش ہو۔ اوّل تو کچھ دے دلا کر نکلنے کی کوشش کرنا۔ بندرگاہ کسی کے لیے نئی جگہ نہیں۔ کراچی اور ممبئی کی بندرگاہ میں کوئی فرق نہیں ملے گا۔ ویسے ہی لوگ ہوں گے، وہی سب دھندے۔ ہیرا پھیری کرنے والے اور چور دروازے بتانے والے۔ وہ تمھیں باہر نکال دیں گے۔ براہِ راست پولیس یا کسٹم والوں سے واسطہ پڑ جائے تو پھر اپنے پاسپورٹ پیش کر دینا۔"

"میرے پاس تو وہ بھی نہیں ہے۔" مشتری نے کہا۔

"تمھارا پاسپورٹ یہ ہے۔" میں نے کریم کی طرف اشارہ کیا۔ "بتا دینا کہ سمندر میں گر گیا تھا۔ ملنا ہوگا تو مل جائے گا۔ ممبئی میں بھی ہزاروں کشتیاں اور لانچیں ہوں گی اور مچھلی بندر بھی ہوگا۔

جہاں ماہی گیر ملیں گے۔ اپنے کراچی کی فش ہاربر کی طرح۔ وہ علاقہ زیادہ محفوظ ہوگا۔ اور تم نے ادھر سے نکلنے کی کوشش کی تو پوچھ گچھ کوئی نہیں کرے گا۔ ہزاروں افراد کے ہجوم میں شامل ہونا اس لیے مشکل نہیں کہ وہ سب ہمارے جیسے ہی ہوں گے رنگ، نسل اور زبان یا لباس کا کوئی فرق نہیں کہ ہم الگ نظر آئیں۔ تھوڑی سی عقل استعمال کرتے ہوئے بندرگاہ سے باہر آجانا کوئی مسئلہ نہیں۔ ضرورت اعتماد کی ہوگی۔ یہ سمجھ لینا کہ ہم بمبئی میں نہیں کراچی میں ہیں۔ باہر نکلنے کے بعد اپنے محفوظ سرمایے کو استعمال کرتے ہوئے سب اپنے لیے لباس وغیرہ خرید سکتے ہیں ابھی کسی کو بھی بمبئی کا جغرافیہ نہیں معلوم۔ میں نے بھی ایک ہی جگہ کا نام سنا ہے۔"

محسن نے کہا "میں نے کئی نام سنے ہیں۔ ماہیم، دادر، چوپاٹی۔"

"یہ سب علاقے ہیں۔" میں نے کہا "حاجی علی کی درگاہ ایک جگہ ہے۔ سب وہیں پہنچ جائیں گے تو پھر اکٹھے ہو جائیں گے۔ اس کے لیے میرا مشورہ ہے کہ شام کا ایک وقت مقرر کر لیا جائے۔ مثلاً یہ کہ روز شام کو چھ بجے۔ ابھی تو ہم سب ساتھ ہیں۔ راستے میں جو بھی ہوگا اس سے ہم نمٹ لیں گے۔ رات کو باری باری دوست محمد اور کریم لانچ چلائیں گے۔ مشتری اور گل کو سونے کی اجازت ہے۔ میں اور محسن باری باری جاگ کر پہرا دیں گے۔"

"میں تو اب جاؤں صاحب جی۔" مشتری نے اکتا کے کہا "ابھی سب کھانے کو مانگو گے۔"

میں نے اجازت دی اور وہ اٹھی تو کریم بھی اس کے ساتھ جانے کے لیے اٹھا۔

میں نے اسے ڈانٹ کے کہا "تم کیا مُرغا بننے جا رہے ہو؟"

"وہ... نیں صاب... مُرغی ذبح کرنے۔" وہ بولا "عورت ذات کو اللہ نے بولا کہ تیرے کو یہ کام منع ہے۔"

"اچھا، ایک منٹ ٹھہرو۔" میں نے کہا "یہ بتاؤ کبھی گولی چلائی ہے، کسی بندوق سے یا ریوالور سے؟"

اس نے جھجکتے ہوئے کہا "اپنا پاس ایک ریوالور تھا صاب، ولایتی۔ اس کا لائسنس نہیں تھا۔ ہم ایک گورا کو شراب کا بوتل دے کر لیا تھا۔ ایک سال ہمارا پاس رہا۔ ہم بوہت فائر مارا کیا۔ جدھر ہم رہتا ادھر سب کُتا خلاص کیا۔ ایک بکرا بھی مارا غلطی سے ہم صاب نشے میں ہم کُتا سمجھا، اندھیرا بھی تھا اُدھر۔ اس کا مالک بوہت شور کیا کہ ہم قربانی کا واسطے لایا تھا۔ تم شہید کیا اس کو۔ ہم بولا کہ بابا تیرا قربانی ہوگیا مگر وہ بولا کہ نیں، ابھی ہم کو دوسرا بکرا مانگتا ورنہ ہم تیرے کو حلال کریں گا عید پہ۔"

ہم سب کی آنکھوں میں ہنستے ہنستے آنسو آگئے "پھر کیا ہوا؟"

"پھر صاب... ہم بکرا لا کے دیا... اللہ معافی دیوے، خریدنے کا واسطے پیسہ نہیں تھا مگر بکرا ہم کو مل گیا۔ ہم اس کو کھول کے لے آیا اور اس کو دیا۔ وہ بوہت خوش ہوگیا۔ اس کا بکرا تو ایک دم پتلا سوکھا تھا۔ ہم دیا موٹا تازہ، گدھے کا برابر۔"

"اچھا چھوڑو یہ بات۔" میں نے ہنسی پر قابو پا کے کہا "تمھارا وہ ریوالور ہے تمھارے پاس؟"

"کدھر صاب، ہم بھی ایک بوتل شراب لیا اور دے دیا ایک گورا کو، ولایتی شراب تھا۔"

"نشانہ تو ٹھیک ہے نا تمھارا؟" میں نے ہنستے ہنستے پوچھا۔

"ایک دم اُدھر گولی مارتا تھا ہم صاب۔" اس نے اپنی پیشانی کے وسط پر انگلی رکھ کے کہا "سالا کُتا ایک بار چاؤں کرتا اور خلاص..."

"ہم تمھیں رات کو ریوالور دیں گے۔" میں نے کہا "اسے سنبھال کے رکھنا اور دیکھ بھال کے استعمال کرنا۔ یہاں کُتے اور بکرے تو ہیں نہیں، یہ نہ ہو کہ ہم ہی مارے جائیں۔ خدانخواستہ کسی دشمن سے واسطہ پڑ جائے تو دیکھ لینا اس کی نال کدھر ہے۔"

وہ دانت نکالتا ہوا چلا گیا۔ تو میں بھی محسن اور گل کے ساتھ شامل ہوگیا جو ابھی تک ہنس ہنس کے بے حال ہو رہے تھے۔

"کیا مسخرہ ہے یہ کریم بھی۔" گل نے پیٹ پکڑ کے کہا۔

"بڑی سادگی سے سچ بات کہہ دیتا ہے۔ لوگ ہنسنے لگتے ہیں۔" میں نے کہا۔

کھانا تیار ہونے تک ہم نے فارغ بیٹھنا مناسب نہ سمجھا۔ میں نے محسن اور گل بانو کو پاسپورٹ کے ساتھ پانچ ہزار روپے پاکستانی کرنسی میں اور پانچ ہزار انڈین کرنسی میں دیے۔ مالِ غنیمت میں ڈالر اور پاؤنڈ بھی تھے چنانچہ میں نے اس رقم میں ایک ہزار ڈالر بھی ڈال دیے۔ پلاسٹک بیگ کچن سے مشتری نے فراہم کیا اور ہم نے باری باری... باتھ روم میں جا کے کپڑے کی ایک بیلٹ سی بنائی جس کے اندر پلاسٹک میں لپٹا ہوا پاسپورٹ اور سلی رقم اس طرح رکھی کہ ہنگامی صورتِ حال میں سمندر کا پانی کسی چیز کو نقصان نہ پہنچا سکے۔ کپڑے کی بیلٹ ہمارے کپڑوں کے نیچے محسوس بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔

میرا اور محسن کا حلیہ ایک سا تھا۔ ہم دونوں کے سروں پر بھورے بالوں کی وگ تھی اور ہمارے چہروں پر بھوری داڑھیاں تھیں۔ ہم لنڈا بازار کی بہت پرانی اور خستہ حال پتلونوں کے ساتھ بے ہنگم قمیصیں پہنے ہوئے تھے جو ہمارے سائز سے بڑی تھیں اور ان کا ایک بھی بٹن سلامت نہ تھا۔ مفلس اور محنتی ماہی گیر کی حیثیت سے یہ لباس ہماری ضروریات کے عین مطابق تھا۔

رات سمندروں میں رہنے والے اور مچھلیاں پکڑنے والے ڈھنگ کے صاف ستھرے کپڑے پہن ہی نہیں سکتے تھے۔

مسئلہ گل نے پیدا کیا۔ ایک تو اس کا رنگ روپ بہت صاف تھا۔ پھر اس کے چہرے کی جلد میں جو ملائمت تھی وہ مچھلی پکڑنے والوں کی سخت زندگی کے حالات سے مطابقت نہیں رکھتی تھی اور مرد تو کیا وہ ماہی گیروں کے خاندان کی عورت بھی نظر نہیں آتی تھی۔

"ابھی یہ نہیں چلے گا۔" میں نے کہا "مس گل بانو، بمبئی پہنچ جانے کے بعد اگر تم گل خان بنو تو بہتر ہے۔"

"کیوں، ابھی کیا ہے؟"

"ابھی اندیشہ ہے کہ تمھاری مردانگی کا راز فاش ہو جائے گا۔ تم نے کبھی دیکھا ہے، ماہی گیروں کے خاندان میں ایسا نرم و نازک اور دلکش نقوش والا جوان، اور پٹھان تو ماہی گیر ہوتے بھی نہیں۔" میں نے کہا "اب تم ہی بتاؤ تمھیں گل خان کیسے بنائیں؟"

"میں کیا بتاؤں؟" گل بانو کا چہرہ سُرخ پڑ گیا۔

"ابھی تو ہمارے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں ہے، میک اپ سے تمھارا یہ چہرہ بدصورت بنانے کے لیے۔" میں نے کہا۔

"عام طور پر میک اپ سے چہرے زیادہ خوبصورت بنائے جاتے ہیں۔" محسن بولا۔ "تمھیں تو خیر وہ کیا کہا ہے شاعر نے، نہیں محتاج میک اپ کا جسے خوبی خدا نے دی۔"

"میرا خیال ہے کہ تم فی الحال زنانہ رول ہی قبول کر لو۔ کسی مچھیرے کی بیوی کا خوبصورت ہونا باعثِ رشک و حسد ہو سکتا ہے مگر ناقابلِ یقین نہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ فقیر چند ولد دمڑی لال کی بیوی اگر دولتِ حسن سے مالا مال ہے تو بھگوان کی اِچھا۔"

"اور فقیر چند کی خوش قسمتی۔" محسن بولا۔

"اب تم یہ شرمانا چھوڑو۔" میں نے کہا "مشتری خانم سے بات کرو کہ اپنا سب سے واہیات جوڑا تمھیں بخش دے۔ کپڑے تو رابعہ کے بھی پڑے ہوئے ہیں مگر ان سے معاملہ زیادہ گمبھیر ہو جائے گا۔"

"کیا رابعہ باجی بُرا مانیں گی؟" گل نے مایوسی سے کہا۔

"ارے نہیں بابا، تمھارے حسن میں چار چاند لگ جائیں گے۔ ایک چاند سا چہرہ ملا کے پانچ چاند ہو جائیں گے۔" محسن بولا "کیا بتائیں گے ہم کسی کو کہ اتنے چاند لے کر کہاں جا رہے ہیں؟"

گل ہنسی اور خوشی کی جھنکار بکھیرتی باہر چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی دوست محمد اندر آگیا۔

"اس پاگل نے مُرغی پکایا ہے اور کھیر۔ بہت مزے کا۔"

دوست محمد بولا "لیکن تم مت کھانا۔"

"تم نے کھا لیا اور ہم نہ کھائیں؟" میں نے کہا۔

"بابا، ہم تمھارے فائدے کا بات بولتا ہے۔ کھائیں گا تو حالت خراب ہو جائیں گا۔ سب باہر نکال دیں گا۔" دوست محمد نے ہمیں سی سکنیس سے بچنے کے لیے خالی پیٹ رہنے کا مشورہ دیا تھا۔ "اپن کو عادت ہے۔" وہ بولا۔

"اب تو یہ بہت مشکل ہے استاد۔" میں نے کہا "ایک تو بھوک سے بُرا حال ہے، پھر ایسا کھانا بہت عرصے بعد نصیب ہوگا۔ نہ کھایا تو اس کا دل ٹوٹ جائے گا۔ تمھاری بہو کا۔"

"اللہ مالک ہے۔ ابھی تو کھا لیتے ہیں۔ نکلنا ہوگا تو نکل جائے گا بعد میں۔" محسن بولا۔

"کھاؤ بابا، اپن کو کیا۔ لاؤ ایک سگرٹ دو ابھی۔"

"دوست محمد! اگر اس وقت میں تم کو سگریٹ نہ دوں تو تم اور کتنی دیر برداشت کر لو گے؟" میں نے کہا۔

"بابا، ہم بہت دیر سے برداشت کر رہا ہے۔ ابھی تم بولا تھا، کھانے کا بعد دے گا..." وہ بگڑنے لگا۔

"ہاں ہاں، میں اپنے وعدے پر قائم ہوں۔ شاید تم نے اسی لیے کھانا پہلے کھا لیا۔" میں نے کہا "کوشش کر کے دیکھو آج رات۔"

"سکندر صاب، ہم آپ کو بولا ہے کہ یہ عادت ہم ضرور چھوڑ دے گا۔" دوست محمد نے کہا "کوئی اور بولتا تو ہم اس کو گالی دیتا کہ سالا جاؤ، تم کیا ہمارا باپ ہے لیکن تم اچھا لوگ ہے۔ تم نے ہم کو باپ کا مافک بولا۔ ابھی بہت شرم کا بات ہے، اگر باپ ایسا خراب عادت والا ہو، اور بیٹا لوگ اس کا اتنا خیال کرے لیکن ابھی ہم کو کچھ مت بولو۔ ہمارا مغز خراب ہوئیں گا تو ہم لانچ کا خیال کیسے رکھیں گا۔ ہمارا آنکھ، کان، ناک سب ٹھیک ہونا چاہیے..."

میں نے اسے پیکٹ میں سے سگریٹ دے دیا۔ جب وہ سگریٹ سُلگا رہا تھا تو اس کے ہاتھوں میں مجھے لرزش محسوس ہوئی۔

"اس راستے پر تم نے پہلے بھی سفر کیا ہوگا؟" میں نے کہا۔

اس نے اقرار میں سر ہلایا، ایک کش لیا اور اس کے سُرور میں کھو گیا۔

"رات کو طوفان وغیرہ کا اندیشہ تو نہیں ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "یہ طوفان کا موسم نہیں ہے۔"

"اندازاً ہم کتنی دور آچکے ہیں؟"

"دو سو میل سے اوپر۔" وہ بولا "شاید ڈھائی سو۔"

"یہاں کوئی پکڑ سکتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، پولیس۔" وہ بولا "انٹرپول والا دیکھتا ہے لیکن جب تک اسے رپورٹ نہ ملے وہ کسی کو روکتا نہیں۔"

"خیر! انھیں کچھ نہیں ملے گا ہماری لانچ پر۔" میں نے کہا۔ "اور بھلا کیا خطرہ ہو سکتا ہے؟"

وہ ہنسا۔ "یہ کیسا بات بولتا سکندر صاب۔ خطرہ کدھر نہیں ہوتا۔ گھر میں، سڑک پر، آسمان میں۔ اللہ پہ بھروسا رکھو۔" پھر وہ پلٹا اور کش لیتا ہوا غائب ہو گیا۔

جب مشتری نے کھانے کا اعلان کیا تو میں اور محسن عرشے پر کھڑے ہوئے تھے۔

"ہم کھانا نہیں کھائیں گے۔" میں نے کہا۔

"کیوں صاحب جی، اتنی محنت کی ہے میں نے۔" مشتری نے مایوسی سے کہا۔

"تمھارے سسر نے منع کر دیا ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ کھانا کھا کے آیا تھا میرے پاس۔ کہتا تھا کہ ایسے کھانے سے نہ کھانا بہتر۔"

"کیوں، کیا خرابی نظر آئی اس بڈھے منحوس کو؟ میں ابھی پوچھتی ہوں جا کے۔" مشتری بگڑ گئی۔

"ارے، ایسا اقدام خودکشی مت کرنا۔" میں نے کہا۔ "ایک تو وہ غصے میں ہے پھر نشے میں بھی ہے۔ کہیں تجھ کو ہی قتل نہ کر دے۔"

"آپ مذاق کرتے ہو مجھ سے صاحب جی۔" مشتری نے کھانا نیچے رکھ دیا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے... میں قتل۔"

"یار، مجھے بھوک لگی ہے۔" محسن نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "تجھے سوجھ رہی ہیں باتیں۔"

"دیکھ، میری بات سن۔ واقعی دوست محمد نے منع کیا تھا۔ حالت خراب ہو جائے گی اگر پیٹ بھرا ہوا ہو گا۔" میں نے کہا۔ "رات بھر پہرے داری کریں گے یا تیمار داری۔"

"فاقہ زدہ ہوں گے تو کچھ بھی نہیں کر پائیں گے۔" محسن نے کہا۔ "اور سمندری سفر سے جو کچھ ہوتا ہے نا، اس کا علاج ہے میرے پاس۔ میں نے کریم سے کہہ دیا تھا کہ دوا علاج کا بندوبست بھی رکھے، ورنہ سب لمبے پڑے رہیں گے۔ پہلے کھانا کھائیں گے پھر دوا کھائیں گے۔"

"اگر یہ بات ہے تو پھر بسم اللہ۔" میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "مگر یہ گل کہاں ہے؟"

"اس کی طبیعت بگڑ گئی تھی۔ میں نے دوا دے دی ہے۔ اس کا آرام کرنا ہی بہتر ہے۔" محسن بولا۔ "طبیعت سنبھلے گی تو کچھ کھا لے گی۔ بسکٹ کافی یا دودھ۔"

"ہم پہ کیوں اثر نہیں ہوا اب تک؟" میں نے کہا۔

"یہ سب منجانب اللہ ہے۔" محسن اوپر انگلی اٹھا کے بولا۔ "وہ چاہتا تھا کہ ہم چکن روسٹ کھائیں، خوب ڈٹ کے۔ سبحان اللہ بی مشتری جی چاہتا ہے کہ کھائیں... میرا مطلب ہے تمھارے ہاتھ ہی چوم لوں ابھی تو۔ کھیر بھی کیا بنائی ہے کھیرے کی۔"

"لوکی کی کھیر ہے صاحب جی۔" مشتری نے خوش ہو کے کہا۔

"کریم کے تو مزے ہو گئے۔ کبھی کدو کی کھیر، کبھی کریلے کا، کبھی گوبھی کا حلوا تو کبھی بینگن کا۔" محسن نے کھاتے کھاتے کہا۔ "گھاس پھونس سب پکا لیتی ہو تم؟"

"آپ بڑے مذاقیے ہو صاحب جی۔" مشتری نے کہا۔

"مذاقیے، یعنی مسخرے۔" میں نے مرغی کی ٹانگ ملا کے کہا۔ "آپ نے سنا شیردانی صاحب۔ آپ کو جوکر بلکہ بھانڈ کہتی ہے یہ گستاخ کنیز۔ آپ کے خاندان کی ناموس پر حملہ ہو رہا ہے اور آپ پیٹ کا دوزخ بھر رہے ہیں۔ کیا ہوا آپ کی غیرت کو؟"

"نکل گئی ایک بے غیرت کے ساتھ۔" محسن نے دوسری ٹانگ اڑا کے کہا۔ "ویسے بھی چکن روسٹ کھاتے ہوئے ہمارا خون سرد پڑ جاتا ہے اور سفید بھی ہو جاتا ہے۔"

"صاحب جی، ایک بات پوچھوں؟ کریم تو کہتا ہے کہ یہ میرا باپ نہیں ہے۔" مشتری نے کہا۔

"باپ نہیں تو پھر کیا ہے...؟ مال ہے؟" میں نے کہا۔

مشتری ہنسی۔ "اس نے تین قتل کیے کیسے؟ مجھے تو یقین نہیں آتا۔"

"جب وہ تمھیں قتل کرے گا نا تو تمھیں بھی یقین آ جائے گا۔" میں نے کہا۔ "جیسا کہ میں نے بتایا تھا، سب سے پہلا مقتول تھا بدنصیب سسر، اس کا جرم تو خیر تھا بہت سنگین۔ آخر اس نے ہی پیدا کیا تھا دوست محمد کی بیوی جیسی افسوس ناک چیز کو۔ اس کی سزا ملی اسے۔ پھر وہ داماد... جو گھر داماد تھا۔ اچھا آدمی تھا۔ زن مرید غلام ابن غلام بس فرمائشی پروگرام میں مارا گیا۔"

"فرمائشی پروگرام؟" مشتری نے حیرانی سے کہا۔

"ہاں بیٹی کی کوئی بات نہیں ٹالتا تھا دوست محمد۔ اس نے ایک دن فرمائش کی۔ ابا، آپ شکاری تھے، کیا مارا؟ ابا نے کہا کہ بیٹا بہی شیر، چیتے، ہاتھی۔ اب تو رہ گئے ہیں چیل کوے۔ اس نے کہا کہ ہمیں الو مار کے دکھاؤ۔ وہ بیٹھا ہے اور ابا نے بندوق اٹھا کے داغ دی۔ سامنے بیٹھا تھا داماد۔ بے شک بیٹی نے اشارہ دوسری طرف کیا تھا مگر اس نے دیکھا نہیں۔ جو الو نظر آیا، مار دیا۔"

"اور بہو؟" مشتری اب خوب ہنس رہی تھی اور سمجھ چکی تھی کہ یہ سب مذاق کے سوا کچھ نہیں۔ میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ اس کا چڑچڑا پن ایک غلیظ ماحول کی گھٹن اور فرسٹریشن کا نتیجہ تھا۔ ایک ایسی زندگی کا عطیہ تھا جس میں دکھ اور مصائب، افلاس اور اپنے بچپن سے جوانی تک ناآسودہ خواہشوں کے قتل کی مجبوریوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ہمارے درمیان رہ کر وہ آزادی سے سانس لینے کی عادی ہو گی اور اپنی زندگی پر اپنے اختیار کا استعمال

کرے گی تو اس کے مزاج کی تندی اور اس کا چڑچڑا پن سب ختم ہو جائے گا۔

"اب یہ بھی بتا دو صاحب جی کہ بہو کا کیا قصور تھا؟" وہ مجھے نادش دیکھ کے بولی۔

"وہ... اس بیچاری کا قصور کوئی نہیں تھا۔" میں نے ہاتھ جھاڑ کے اٹھتے ہوئے کہا۔ "بیٹا خبیث دوسری شادی کرنا چاہتا تھا۔ بیوی نے کہا کہ میری زندگی میں تمھاری یہ خواہش پوری نہیں ہو سکتی۔ باپ نے کہا، پھر تو کوئی مسئلہ نہیں۔ ٹھاہ۔ گولی مار دی اسے۔ لیکن تم فکر مت کرو۔ اگر ایسے ہی مزے مزے کے کھانے پکاتی رہو گی تو تمھارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ کوئی انگلی نہیں اٹھا سکے گا تم پر۔"

"کسی جھینگے نے بھی ٹیڑھی نظر سے دیکھا تو ہم اس کو کانا تو ضرور کر دیں گے۔" محسن بولا۔

جب وہ برتن سمیٹ کر ہنستی ہوئی چلی گئی تو میں نے سگریٹ پیتے ہوئے متلی سی محسوس کی۔ محسن فوراً دوا لینے دوڑا مگر اس کے آنے اور دوا کے اندر جانے سے پہلے ہی مجھے دو بار الٹی آ گئی۔ جتنا کھایا تھا سب نکل گیا اور میں دو گھنٹے تک عرشے پر سرد ہوا میں لیٹا رہا۔ محسن نے اس عرصے میں لانچ کے اندر تمام شک پیدا کرنے والی چیزوں کو چھپا دیا۔ اس طرح کہ کوئی اچانک تلاشی لینے آ جائے تو اسے کچھ نہ ملے۔ گل نے بھی اپنا لباس بدل لیا تھا اور اگرچہ اس نے پرانے میلے کپڑے پہنے تھے مگر اس کے باوجود وہ مچھیرن نہیں لگتی تھی۔ اگر رابعہ یا نازو ہمارے ساتھ ہوتیں تو یہی ان کا مسئلہ بھی ہوتا۔ ماہی گیروں کے گھروں میں حسن کی کمی نہیں، لیکن ان کے رنگ سمندری آب و ہوا میں سنولا جاتے ہیں اور جسم شاخ گل کی طرح نرم و نازک نہیں رہتے۔ گل نے بھی سخت زندگی ضرور گزاری تھی مگر نہ جانے کیا بات تھی کہ اس کی نازکی میں فرق نہیں پڑا تھا۔

محسن نے سب کو ضرورت کے مطابق اسلحہ دیا لیکن سختی سے تاکید کی کہ اپنے پاس کچھ نہیں رکھنا ہے جو تلاشی میں برآمد ہو جائے۔ اسلحہ قریب رہنا چاہیے جہاں سے ایک دم نکالا جا سکے۔

میں نے اور محسن نے بھرے ہوئے خودکار ریوالور عرشے پر پھیلے ہوئے اسباب کے درمیان چھپائے۔ وہ ایسی جگہ تھی کہ کوئی کشتی کا چپہ چپہ چھان مارتا تب بھی اسے مایوسی کے سوا کچھ نہ ملتا لیکن ہم کھڑے کھڑے ایک دم بیٹھ کے یا بیٹھے ہوئے ہونے کی صورت میں ہاتھ بڑھا کے پانچ سیکنڈ سے بھی کم وقت میں فائر کر سکتے تھے۔ مزید اطمینان کے لیے میں نے اور محسن نے ایک ریہرسل کی۔

"اگر ہم کسی دشمن کی یا قانون نافذ کرنے والے کسی ادارے کی لانچ کو اپنی طرف آتا دیکھیں گے۔" میں نے کہا۔ "تو ہم پہلے سے یہاں بیٹھ جائیں گے۔ فلم گنز آف نیورون کے سین کو ذہن میں رکھو۔"

"مجھے یاد ہے۔ ہم ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر آمنے سامنے بیٹھ کے جال کو گھٹنوں پر پھیلا لیں گے اور اس کی مرمت میں مصروف ہو جائیں گے۔ مزاحمت بالکل نہیں کریں گے اور اپنے رویے سے خود کو غریب اور بے سہارا ماہی گیر ثابت کریں گے۔ گالی گلوچ یا ایک آدھ تھپڑ کھا لینے کی حد تک برداشت کا مظاہرہ کرنے سے کوئی ٹل جائے تو اچھا ہے۔"

"ورنہ تکلف برطرف۔" میں نے کہا۔

"ہم میں سے کسی ایک کے پاس مشین گن ...... کے پاس دستی بم بھی ہونا چاہیے۔" محسن نے کہا۔ "کامیابی کو یقینی بنانے کے لیے۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا اور یہ دونوں چیزیں بھی قریب رکھ لیں۔ کسی کے براہ راست خواتین تک پہنچنے کا امکان کم تھا۔ خواتین کی نصف آبادی صرف زبان چلا سکتی تھی۔ ریوالور یا اسٹین گن چلانے والی گل تھی اور محصور یا شکست سے دوچار ہونے کی صورت میں وہ ہماری فتح کے لیے ایسا ہی خفیہ مؤثر ہتھیار ثابت ہو سکتی تھی جیسا کہ دوسری جنگ عظیم میں ایٹم بم ثابت ہوا تھا۔ خدانخواستہ کوئی ہم پر قابو پا لیتا تو عورتوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہنکانے کی کوشش کرتا اور ایسے میں گل ان کو حیران ہونے کا موقع دیے بغیر خلاص کر سکتی تھی۔

گل کی طبیعت سنبھل چکی تھی۔ اس نے کہا کہ زنان خانے تک کوئی پہنچ کے تو دیکھے۔ گل خان نے چوڑیاں نہیں پہن رکھی ہیں۔

"مسماۃ مشتری، فرض کرو دشمن نے حملہ کر دیا تو تم کیا کرو گی؟" محسن نے مشتری سے پوچھا۔

"کون دشمن صاحب جی؟" وہ خوفزدہ لہجے میں بولی۔

"دشمن بہت ہیں ہمارے۔" محسن نے ڈانٹ کر کہا۔ "دشمن بنانے کے سوا آج تک ہم نے کیا کیا ہے؟"

"مشتری رو دھو سکتی ہے۔ کوسنے دے سکتی ہے اور اگر ضرورت پڑے تو بے ہوش بھی ہو سکتی ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ نفسیاتی جنگ کی حکمت عملی سمجھی جا سکتی ہے۔ جو بعض اوقات کامیاب بھی ہوتی ہے لیکن یہ سب اس صورت میں ہو گا جب ہم پر براہ راست حملہ ہو۔" میں نے کہا۔ "چیکنگ کرنے والوں سے پورا تعاون کرنا ہو گا۔ وہ جیسے چاہیں تلاشی لیں۔ یہ سب کچھ میں کریم اور دوست محمد کو بھی سمجھا دیتا ہوں۔ آپ لوگ اب سو جائیں۔"

"میرا خیال ہے کہ تو بھی سو جا۔" محسن نے کہا۔

"اس وقت بارہ بجے ہیں۔" میں نے کہا۔ "تین گھنٹے بعد میری ڈیوٹی ہو گی، مجھے جگا دینا۔"

مشتری اور گل اب اسی کیبن میں تھیں جس میں پہلے رابعہ

کے ساتھ موہنی تھی۔ دوسرے کیبن کے ایک تختے پر میں بہت دیر تک سونے کی کوشش میں آنکھیں بند کیے لیٹا رہا لیکن ذہن اور اعصاب پر اندیشے سوار تھے۔ ماحول اجنبی تھا اور رات کے سناٹے میں ہر سمت سمندر کی پُرہیبت گونج تھی۔ میں اس لیے تنہائی سے بھاگتا تھا کہ اکیلا پاتے ہی وہ سب خیال جو مصروفیات کے ہجوم میں پیچھے ہٹ جاتے تھے، مجھے گھیر لیتے تھے۔ رابعہ کا تصور ایک زندہ حقیقت کی طرح سامنے آجاتا تھا۔ پھر ناز و اور غالب کے مایوس اور افسردہ چہرے تھے جو شکوہ کرتے تھے کہ ہم کس سے شکایت کریں؟ آنے والے وقت کے عدشات تھے جو الگ عذاب رکھتے تھے۔

ابھی میں سویا بھی نہ تھا کہ محسن نے مجھے اُٹھا دیا۔ میں نے گھڑی دیکھی تو صبح کے ساڑھے چار بجے تھے۔ میں نے ایک چکر لانچ کے اس حصّے کا لگایا جہاں اب کریم ڈیوٹی پر تھا۔ اور اس کا استاد قریب ہی بہت کم جگہ پر سمٹا ہوا سو رہا تھا۔ پھر میں عرشے پر آگیا اور سمندر کی وسعت کو تصوّر میں سمیٹنے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ اتنا ہی ناممکن تھا جتنا خلا کی گہرائی کا تصوّر کرنا۔ آخری رات کا دُھندلا سا چاند سمندر پر غبار سا پھیلا رہا تھا۔ کراچی بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ بمبئی بہت آگے تھا۔ یہ لانچ ایک چھوٹا سا عافیت کا جزیرہ تھی ورنہ ہر طرف لامحدود گہرائی میں کھینچ لینے والا گونجتا گرجتا، پھنکارتا، دہاڑتا سمندر تھا۔ ایک مکعب فٹ پانی کا وزن باسٹھ پونڈ ہوتا ہے۔ لاکھوں مکعب میل سمندر کے پانی کا وزن کیا ہوگا؟ میں نے سوچا۔ ایسے ان گنت سوال ہیں جو اپنا جواب نہیں رکھتے۔ مثلاً اس وقت میں کیسے جان سکتا ہوں کہ رابعہ کہاں ہے۔ سو رہی ہے یا جاگ رہی ہے اور سو رہی ہے تو کیا خواب دیکھ رہی ہے؟

دو ایک تجارتی جہاز کسی متحرک روشن قلعے کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ اس کے پیچھے بھی ایسے ہی روشن دھبّے سے تھے جن کی حرکت کو محسوس نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لانچ کے انجن کی آواز یکلخت بند ہوگئی۔ اس کی رفتار میں نمایاں کمی واقع ہوئی لیکن سطحِ آب پر اس کا توازن برقرار رہا۔ انجن کیوں بند ہوگیا؟ دوست محمد نے کہا تو تھا کہ چھ گھنٹے بعد انجن کو بند کرنا پڑے گا۔ اس وقت مجھے یہ پوچھنا چاہیے تھا کہ بیچ سمندر میں ہم لانچ کو روک کے کیسے کھڑے رہیں گے۔ کیا اس طرح توازن کو برقرار رکھا جاسکے گا؟

میں نے لانچ کے اس حصّے کا رُخ کیا جہاں اب دوست محمد کی ناخدائی تھی۔

"یہ کیا ہوا دوست محمد، انجن کیوں بند ہوگیا؟"

"گرم ہوگیا تھا بابا، بند تو ہونیں گا۔ ہم خود کیا۔" اس نے چڑچڑے لہجے میں کہا۔ "تم کاہے کو پریشان ہوتا؟"

"لانچ کیا... ایسے ہی ڈولتی رہے گی؟"

اس نے ایک ہاتھ نیچے کیا اور جھٹکے سے اوپر کھینچا۔ انجن پھر اسٹارٹ ہوگیا لیکن اب اس کی آواز بدلی ہوئی تھی۔ لانچ نے ایک جھٹکا لیا اور پھر آگے بڑھنے لگی۔

"یہ دوسرا انجن ہے۔" دوست محمد نے کہا۔

"یہ دوسرا انجن کہاں سے آگیا؟" میں نے حیران ہوکے کہا۔

"ادھر لانچ میں ہی تھا سکندر صاب۔ آپ تو نہیں دیکھا مگر ہم دیکھا تھا۔" وہ بولا۔ "پتا نہیں، کون کنڈم کرکے ڈالا تھا۔ ہم بنا کے چالو کیا۔"

میں بے وقوفوں کی طرح کھڑا رہا۔ "اگر یہ دوسرا انجن نہ ہوتا؟"

"کیسے نہ ہوتا۔ پھر ہم بولتا کہ لاؤ۔" دوست محمد مسکرایا۔ "تمہارا بوہت خرچا مرچا ہوتا۔ ابھی دیکھو کیسا ہماٹ چلتا ہے۔"

"یہ تو تم نے کمال کر دیا۔ ہمیں واقعی خیال نہیں تھا۔ کیا یہ بات کریم کو معلوم نہیں تھی؟" میں نے کہا۔

"وہ ابھی بچہ ہے بابا۔" دوست محمد بولا۔ "لمبا سفر کدھر کیا؟ اس کا واسطے تجربہ مانگتا۔ ہم چار گھنٹا میں انجن فٹ کیا۔ وہ کیا کرتا؟"

"شاید ہمیں یہیں غرق کر دیتا۔" میں نے کہا۔

دوست محمد ہنسا۔ "نہیں نہیں، وہ بولتا کہ دوسرا انجن لو نا لو والا لیکن ابھی وہ انجن بنا نہیں سکتا۔ خراب ہو جاتا تو اس کا باپ بھی اس کو چالو نہیں کر سکتا۔"

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ہم دوست محمد کو ساتھ لے آئے۔ سوچا تو ہم نے اس کی زندگی کو بچانے کا تھا مگر بچالی اس نے ہم سب کی زندگی۔ خدا جسے چاہے وسیلہ بنائے اور جسے چاہے سبب بنائے۔ افق پر ستارۂ صبح روشن ہو چکا تھا لیکن سمندر پر ہنوز رات کی حکمرانی تھی۔ یہ اندھیرا چاند کی برائے نام روشنی سے گہرا دُھندلکا نظر آتا تھا۔

اچانک میں نے ایک تیز روشنی دیکھی۔ ایک جھلک دکھا کے روشنی غائب ہوگئی۔ پھر تھوڑے سے وقفے کے بعد روشنی جھلملائی۔ یہ گھومتی ہوئی سرچ لائٹ تھی۔

"ابھی آپ تھوڑا ہوشیار ہو جاؤ۔" دوست محمد نے کہا۔

"کیا ہے یہ؟" میں نے کہا۔

"پولیس کا لانچ بھی ہوسکتا ہے۔" دوست محمد نے کہا۔

میں نے گھڑی دیکھی۔ سوا پانچ بجے تھے۔ ابھی محسن سویا بھی نہیں تھا کہ میں نے اسے جھنجوڑ کے اٹھا دیا۔ "محسن...!"

"کیا بات ہے؟" وہ پریشان ہوکے بولا۔

"کوئی لانچ آرہی ہے ہماری طرف۔" میں نے کہا۔ "دوست محمد کا خیال ہے کہ انٹرپول والے نہ ہوں۔"

محسن اٹھ کھڑا ہوا۔ "کیا انھیں بھی جگائیں؟"

محسن کی مراد گل اور مشتری سے تھی۔ "کیا فائدہ؟ ہم نمٹ لیتے ہیں ان سے۔ وہ کیا کریں گے سوال جواب۔ اپنے پاسپورٹ دکھا دیں گے ان کو، اگر انھوں نے مانگے۔ چلو اوپر چلتے ہیں۔"

محسن نے سر ہلایا اور میرے ساتھ عرشے پر آگیا۔ سرچ لائٹ اب گھوم نہیں رہی تھی۔ اس کا رُخ ہماری جانب تھا اور بظاہر وہ ساکت تھی مگر مجھے اندازہ تھا کہ اس کی رفتار کم نہیں ہوگی۔ بین الاقوامی سمندروں میں ہر قسم کے مجرموں سے نمٹنے والی پولیس ہمارے ملک کی پولیس نہیں ہوتی۔ ان کا تجربہ، مستعدی اور برق رفتاری ہی انھیں اس قابل بناتی ہے کہ وہ مجرموں کو فرار نہ ہونے دیں۔

"دوست محمد نے کہا تھا کہ یہ لوگ بلاوجہ پریشان نہیں کرتے۔" محسن نے کہا۔ "اگر کوئی مخبری کر دے تو اور بات ہے لیکن مخبری انھی کی ہوتی ہے جو اسمگلنگ میں مصروف ہوں۔"

"ہاں، ماہی گیروں سے انھیں کیا۔" میں نے قریب آتی ہوئی لانچ پر نگاہ جما کے کہا۔ "وہ تو دُنیا بھر کے سمندروں میں اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔"

"اگر یہ پولیس نہ ہوئی؟" محسن نے کہا۔

"پولیس ہوگی تو وردی میں ہوگی۔" میں نے کہا۔ "شناختی بیج وغیرہ ہوں گے ان کے پاس۔ سمندری قزاق تو ہونے سے رہے۔"

"کبھی سُنا تو نہیں کہ سمندر میں ڈاکا پڑا ہو یا کسی نے بحری جہاز ہائی جیک کر لیا ہو۔" محسن بولا۔ "پھر ماہی گیری کی چھوٹی سی لانچ پر کسی کو کیا ملے گا؟"

"ملنے کو تو بہت کچھ مل سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "انھی لانچوں کے ذریعے ہیرے جواہرات، سونا، منشیات اور نوادرات، یہاں تک کہ عورتوں اور بچّوں کو اسمگل کیا جاتا ہے۔ دُنیا کی منڈی میں سب بکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"فرض کرو انھوں نے سرسری تلاشی نہ لی، ہماری وضاحت سے مطمئن نہ ہوئے یا تاڑ گئے کہ ہم ماہی گیر نہیں ہیں۔" محسن نے کہا۔ "آخر پرانے اور تجربےکار لوگ ہوں گے یہ بھی۔"

لانچ اب اتنی قریب آچکی تھی کہ اس کے طاقتور انجن کی گونج سمندر کے شور پر غالب آگئی تھی۔

"کیا ہم خود کو بالکل جاہل ظاہر کریں گے؟" محسن بولا۔

"یہ لوگ بات تو انگریزی میں ہی کریں گے۔" میں نے کہا۔ "تو مت بولنا۔ میں میٹرک فیل انگلش سے کام چلانے کی کوشش کروں گا۔"

لانچ ہمارے بالکل قریب آکے متوازی ہوگئی۔ ابھی تک سرچ لائٹ نے ہمیں اندھا کر رکھا تھا۔ اب بیک وقت دو ٹارچ لائٹس ہم پر پڑیں۔ دوست محمد نے سمجھداری سے کام لیتے ہوئے لانچ کی رفتار بہت کم کر دی تھی تاکہ انھیں شک بھی نہ ہو کہ ہم فرار کا ارادہ رکھتے ہیں۔

"کون ہو تم لوگ؟" کسی نے بہت صاف آواز میں چلّا کے انگریزی میں کہا۔ لانچ کا درمیانی فاصلہ اب چند گز سے بھی کم ہوگیا تھا۔ بات کرنے والا میگا فون استعمال کر رہا تھا۔

"فشرمین۔" میں نے منہ پر ہاتھ رکھ کے جواب دیا۔

"ہم لانچ پر آکے دیکھیں گے۔" اسی شخص نے میگا فون پر کہا۔ اب میں نے لانچ پر کھڑے ہوئے تین افراد کو دیکھا۔ وہ سب وردی میں تھے۔ ان میں سے ایک نے میگا فون اٹھا رکھا تھا۔ باقی دو اس کے پیچھے تھے۔ ان کے ایک ہاتھ میں ٹارچ تھی اور دوسرے میں ریوالور۔ بات کرنے والا افسر معلوم ہوتا تھا۔ اس کا انگریزی بولنے کا لہجہ مجھے غیر مانوس نہیں لگا۔ وہ پاکستان بھارت یا اسی علاقے کے کسی ملک کا باشندہ ہوسکتا تھا۔

لانچ بالآخر اتنے قریب آگئی کہ درمیانی فاصلہ تین فٹ ہوگیا۔ یہ دونوں لانچوں کو چلانے والوں کی مہارت تھی کہ اتنے کم فاصلے کے باوجود لانچیں ٹکرائی نہیں۔ تینوں پولیس مین جست لگا کے ہماری لانچ پر آگئے۔ اس سے پہلے میں نے انٹرپول کا صرف نام ہی سنا تھا۔ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ ان کے دائرہ اختیار میں کیا ہے۔ وہ کیا کر سکتے ہیں اور کیا نہیں کر سکتے مگر کرتے ہیں۔ ان کی وردی کیسی ہوتی ہے اور ان سے شناختی ثبوت مانگنا گستاخی یا جرم تو شمار نہیں ہوتا۔

"تم فشرمین ہو، دونوں بھائی ہو؟"

"یس سر۔" میں نے کہا۔ "امیر چند، فقیر چند۔" میں نے اپنے سینے پر اور محسن پر انگلی رکھ کے کہا۔ "فادر دمڑی لال۔"

"تم ہندو ہو۔ کس ملک کے شہری ہو؟"

"بھارت سر۔" میں نے کہا۔

"تمھارے ساتھ اور کون ہے؟"

"دِس فقیر چند، نیو وائف۔" میں نے کہا۔ "سلیپنگ، ون فرینڈ کریم اینڈ وائف۔"

اپنی بغیر گرامر کی انگلش سے میں نے لانچ پر موجود سارے ارکان کے بارے میں بتا دیا مگر اس کی تشفی نہیں ہوئی۔ وہ پلک جھپکائے بغیر مجھے گھورتا رہا۔

"ان کو لاؤ، میرے سامنے پیش کرو۔" وہ بولا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا اور کہا۔ "سلیپنگ، ویری سک۔" یعنی وہ بیمار ہے اور سو رہی ہے۔ پھر میں نے ہمت کرکے کہا۔

"یور نیم؟"

"کیا؟ نام پوچھتا ہے میرا؟" وہ تیز لہجے میں بولا۔

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ "اینڈ کارڈ۔"

اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ "میرا شناختی کارڈ دیکھنا چاہتے ہو۔ ابھی بتاتا ہوں میں تجھیں۔" اس نے دونوں ماتحتوں کی طرف دیکھا اور بولا۔ "اندر جو ہے اسے گھسیٹ لاؤ۔"

"نو، نو۔" میں نے احتجاج کیا۔ "وائی؟"

"ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تم بردہ فروش ہو۔ یہاں سے لڑکیاں اغوا کر کے لے جاتے ہو اور بیچتے ہو۔" اس نے کہا اور ریوالور تان لیا۔ "اپنی جگہ پر کھڑے رہو ورنہ مجھے اختیار ہے کہ تمہیں گولی مار دوں۔"

وہ شک جو مجھے اس کے لہجے سے [illegible] یقین کی صورت اختیار کرنے لگا تھا۔ یہ صاف ظاہر تھا کہ وہ اسی خطے کا رہنے والا ہے۔ پھر وہ اس خطے کے ایک جاہل ماہی گیر کے ساتھ انگریزی کیوں بول رہا تھا؟ وہ مجھ سے اردو میں بات کر سکتا تھا۔ عام حالات میں دو افراد کسی اجنبی زبان کا سہارا کیوں لیں گے جب کہ اظہارِ خیال کے لیے وہ ایک مشترک زبان پر قادر ہوں اور خصوصاً اس وقت جب ایک فریق اجنبی زبان سے ناواقف ہو۔ مگر یہ شخص ظاہر کر رہا تھا کہ وہ اردو نہ سمجھتا ہے اور نہ بول سکتا ہے۔ اس کے دو مقاصد یہ ہو سکتے تھے کہ وہ اپنی افسری کی شان بگھارنے کے لیے یا مجھے مرعوب کرنے کے لیے انگریزی کی سطح سے نیچے آنا نہیں چاہتا۔ مگر میرے ذہن میں ایک تیسرا مقصد واضح ہونے لگا تھا۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آپ کے گھر میں کیا ماں بہن نہیں ہیں کہ آپ کو سب بردہ فروش نظر آتے ہیں؟ آپ خود کرتے ہو یہ کام؟"

یہ بات میں نے عمداً اردو میں کی تھی اور اپنے چہرے کے تاثرات کو یکسر مختلف رکھا تھا۔ میں نے اسے گالی دی تھی مگر میرے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ اگر وہ میری بات نہ سمجھتا تو زخم خوردہ ناگ کی طرح کیوں پلٹتا۔

"ہاؤ ڈیر یو۔" (تمھاری یہ مجال) اس نے دہاڑ کر کہا اور ہاتھ گھما کے میرے منہ پر تھپڑ مارا۔

محسن نے مجھے روک لیا۔ "جانے دو بھائی۔ افسر لوگ ہیں۔ جب کوئی ایسی بات ہی نہیں تو ہمیں ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

تھپڑ کھا کے میں نے خوف کے سوا کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے بھیا لیکن پہلے انھیں جگا دیں ہم، پھر یہ شوق سے تلاشی لیں۔ عورتوں کے کمرے میں ایسے جانا..."

"ارے تو بھائی ان کو بولو نا۔ تم ہی جانتے ہو انگریزی۔" محسن نے کہا۔

"... آئی گو... فرسٹ۔" میں نے کہا۔ "وومن لوگ سلیپ... آئی اویک..."

مطلب یہ تھا کہ میں پہلے خواتین کو جگا دوں۔

افسر نے غصے کے باوجود اجازت دینے کے انداز میں سر ہلایا۔ اس کی پتلون کی بیلٹ سے ایک چھوٹا سا واکی ٹاکی لٹکا ہوا تھا جس کا انٹینا ایک مختصر سا تار تھا۔ یہ دو یا تین سیل سے چلنے والا دو طرفہ وائرلیس سیٹ تھا یعنی اس سے پیغام دیا بھی جا سکتا تھا اور سنا بھی جا سکتا تھا مگر اس کے سائز سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ طویل فاصلے کے مواصلاتی رابطے میں کام نہیں آ سکتا۔ اس کی رینج پانچ کلومیٹر کے اندر ہو سکتی تھی یا اس سے بھی کم۔ ریسیور آف تھا۔ اپنی لانچ پہ موجود کسی فرد سے بات کرنے کے لیے وہ اس کا کوئی بٹن دبا کے آن کرتا۔ شاید وہ بٹن سامنے ہی تھا۔

اس نے اچانک مجھے ایک ہاتھ سے آگے دھکیلا۔ "چلو۔" اور ہاتھ کی اس حرکت کے نتیجے میں واکی ٹاکی آن ہو گیا۔ یہ ایک غیر ارادی فعل تھا۔ اس کا ہاتھ بٹن پر لگا اور رگڑ سے یا دباؤ سے ریسیور نے کام شروع کر دیا۔

چند سیکنڈ کے لیے اسپیکر نے دوسری لانچ میں ہونے والی گفتگو نشر کی۔ لانچ میں شور تھا۔ کچھ انجن کا کچھ سمندر کا مگر اس کے باوجود میں نے ایک قہقہہ صاف سنا پھر کسی نے کہا۔

"دونوں کی..." لیکن اس سے زیادہ میں کچھ نہ سن سکا۔ اس شخص نے فوراً واکی ٹاکی بند کر دیا۔ میں نے سخت کوشش کی اور اپنے ردِ عمل کو ظاہر نہیں ہونے دیا لیکن اب مجھے مزید کسی ثبوت کی ضرورت نہیں تھی۔ میں اس ہنسی کے انداز سے بھی واقف تھا اور وہ آواز بھی میرے لیے اجنبی نہیں تھی جس نے صرف دو لفظ ادا کیے تھے۔ ذکر ہم دونوں کا تھا یا دونوں عورتوں کا۔ اور لہجہ [illegible] انھوں نے کوئی غلیظ گالی دی تھی یا یہ کہا تھا کہ دونوں کی لاشوں کے لیے اسی سمندر کو مدفن بنا دیں گے۔ یا کوئی ملتی جلتی بات جس سے ان کے عزائم کا اظہار ہوتا تھا۔ پوری بات نہ سننے کے باوجود میں نے سمجھ لی۔

مجھے یقین تھا کہ میری طرح محسن کے حواسِ خمسہ بھی مستعد ہوں گے اور اس نے بھی آوازوں کو اور ارادوں کو پہچاننے کے بعد سمجھ لیا ہو گا کہ ان حالات میں وہ سب نہیں ہو سکتا جو ہم نے سوچا تھا۔ یہ قطعی غیر متوقع صورتِ حال تھی اور باہمی مشورے کے بغیر صرف اس یقین پر کہ ہماری سوچ اور ہمارے خیالات کے دھارے ایک ساتھ چلتے ہیں، ہم ایک متفقہ فیصلے پر عمل کر سکتے تھے۔ اگر ہمارے ذہن ایک سے منطقی نتائج اخذ کریں گے تو ہم دونوں کی حکمتِ عملی میں بھی فرق نہیں ہو گا۔ یہی سوچنے کے بعد میں نے قدم آگے بڑھایا۔ وہ شخص مجھ سے ایک قدم پیچھے ریوالور میری گردن پر رکھ کے چلنے لگا۔ دوسرے شخص نے محسن کو بالکل اسی طرح دھکیلا۔

"بھیا، عورتوں کی تو کوئی بات نہیں۔" میں نے چلتے چلتے اپنے پیچھے آنے والے محسن کو مخاطب کیا۔ "لیکن یہ سسرے کہیں ہمارے کمرے میں نہ چلے جائیں جہاں ہم سوتے ہیں۔"

"وہاں تو یہ ضرور جائیں گے بھائی۔" محسن نے سخت تشویش زدہ لہجے میں کہا۔

اس کا نتیجہ ہماری خواہش کے عین مطابق رہا۔ مجھے آگے لے جانے والے افسر نے اپنے ماتحت سے کہا۔ "تم جاؤ عورتوں کے کمرے کی تلاشی لو اور انھیں باہر لے آؤ۔ میں اس کے ساتھ دوسرے کمرے میں جاتا ہوں۔"

"دس ہیئر سر..." میں نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ افسر نظر آنے والے نے عیاری سے زیرِ لب مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلایا اور بولا۔ "تم دونوں کہاں سوتے ہو، الگ کیبن ہے کوئی تمھارا؟"

میں نے خوفزدہ نظر آتے ہوئے زبان ہونٹوں پر پھیر کے کہا۔ "نو۔"

اس نے سیدھے ہاتھ والے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ "اس دروازے کو کھولو..."

"سر... اسٹور... نو تھنگ ہیئر..." میں نے کہا۔

اس نے میری گدی پر ہاتھ مارا۔ پھر مجھے یوں دھکا دیا کہ میں دروازے سے ٹکرایا اور اندر جا گرا۔ دروازے کے دونوں پٹ کھل گئے تھے۔ میں یہی چاہتا تھا۔ وہ میرے پیچھے اندر آیا اور ریوالور کا رخ میری جانب کرتے ہوئے اس نے اپنی ایک ٹانگ پیچھے گھما کے دونوں پٹ ملا دیے۔ کم رفتار پہ چلنے والی لانچ زیادہ ہچکولے لے رہی تھی اور مجھے ہر لحظہ اندیشہ تھا کہ میری گدی پہ رکھے ہوئے ریوالور سے گولی نہ چل جائے۔ وہ ہمیں قتل کرنے ہی آئے تھے لیکن وہ پہلے دیکھنا چاہتے تھے کہ لانچ پہ اور کون ہے۔ اب انھیں معلوم ہو گیا تھا کہ ہمارے علاوہ لانچ پہ دو عورتیں بھی ہیں۔ ان کو اصل خطرہ مجھ سے تھا۔ چنانچہ جو ان میں سب سے ہوشیار شکاری تھا وہ مجھے گھیر کے سب سے الگ کرنے میں کامیاب رہا تھا۔

اب فرش پر گرتے ہی میں نے پلٹ کے دیکھا تو مجھے اس کے ہاتھ میں دوسرا ریوالور دکھائی دیا۔ اس کی نالی کے آگے سائلنسر لگا ہوا تھا۔ اور جب اس نے فائر کیا تو اس کی آواز اتنی ہی ہوئی جتنی میرا سر لکڑی کے فرش پہ ٹکرانے سے ہوئی تھی۔

اندازے کے فرق نے اس وقت میری جان بچا لی یا یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ میرے لیے قدرت کی عطا کردہ مہلت ابھی تمام نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ ابھی تک میری جان کو گزند پہنچانے والے ناکامی سے دوچار ہوتے آئے تھے۔

لیکن یہ ایک ایسی حقیقت تھی جس پر تکیہ کر کے میں جدوجہد ترک نہیں کر سکتا تھا اور جسے تسلیم کر لینے کے بعد دشمن بھی اپنے قاتلانہ عزائم سے دستبردار نہیں ہو سکتا تھا۔ فوری طور پر ہم یہ بقا کی جنگ اپنی حیوانی جبلت کے تقاضوں کے مطابق لڑ رہے تھے۔

میں نے گرتے ہی کروٹ لے کر پلٹنے اور اٹھنے میں اتنی دیر بھی نہیں لگائی جتنی دیر میں ریوالور سے نکلنے والی گولی نے درمیانی فاصلہ طے کیا۔ میری جان لینے کی کوشش کرنے والے نے بھی کچھ دیر کی۔ تاخیر کا یہ وقفہ سیکنڈ کے دسویں یا سوویں حصے کے برابر تھا یا اس سے بھی کم، لیکن یہی زندگی اور موت کے درمیان احساس کا وہ فاصلہ تھا جو ابد تک پھیلا ہوا تھا۔ احساس کے فنا ہو جانے کی صورت میں یہ قبر کی بےکراں تنہائی میں صورِ اسرافیل کا لامحدود، بےوجود اور ناقابلِ فہم انتظار بن سکتا تھا۔

گولی میری جگہ پہنچی تو میں وہاں نہ تھا بلکہ نشانے سے چند انچ دور کچھ اوپر اٹھ چکا تھا۔ میرے حریف کو نہ مجھ سے ایسی پھرتی کی توقع تھی اور نہ اتنے کم فاصلے سے اپنا نشانہ خطا جانے کی مطلق کوئی امید۔ وہ حیرانی اور بےیقینی کی کیفیت سے گزر کے کامیابی کی خاطر دوسری کوشش کے لیے پوری طرح مستعد ہو چکا تھا جب میں نے اسے جا لیا۔

اس کے ریوالور کا رخ نیچے کی جانب ہی تھا چنانچہ میں اٹھ کر کھڑا ہوتا تو دوسری گولی کا نشانہ ضرور بن جاتا۔ میں نے تقریباً رینگتے ہوئے ایسے جست لگائی جیسے کبھی کبھار گلہری زمین پر دوڑتے ہوئے تھوڑا سا اڑنے کا مظاہرہ کرتی ہے، ایک لمبی جست کی صورت میں۔

اس کو سنبھلنے کا موقع ہی نہ ملا۔ میں نے اس کے ایک پیر پر ٹخنوں سے اوپر وار کیا۔ پنڈلی کے نیچے والے حصے کی ہڈی پر ضرب صحیح لگتی تو ہڈی ٹوٹ جاتی۔ پھر بھی یہ چوٹ مؤثر ثابت ہوئی۔ اس نے بلبلا کے پیر اٹھایا ہی تھا کہ میں نے دوسری ٹانگ کو دونوں ہاتھوں کی گرفت میں لے کر جھٹکا دیا۔

وہ سر کے بل پیچھے کی طرف گرا اور اس کے دونوں ہاتھ ہوا میں غیر موجود سہارے کے لیے پھیل گئے۔ اگلے لمحے میں اس کے اوپر سوار تھا۔ میرے ہاتھوں نے اس کی گردن کو دبوچ لیا۔ اس کے دونوں بازو میرے گھٹنوں سے دبے ہوئے تھے، ورنہ

وہ مجھ پر فائر کرتا یا ہاتھوں کو بھی اپنے دفاع کے لیے استعمال کرتا۔ اب وہ صرف اپنی ٹانگیں چلا سکتا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ مجھ پر جنون سوار ہونے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ ورنہ میں اس کی گردن توڑ دیتا یا اس کی سانس رُک جانے تک اس کا گلا نہ چھوڑتا۔ میرے ذہن کے کسی گوشے میں یہ خیال موجود تھا کہ ایک پولیس مین کو قتل نہیں کرنا چاہیے۔ پھر میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں حلقوں سے اُبلنے لگی ہیں اور زبان حلق سے باہر نکل آئی ہے۔

میں نے دباؤ کو تھوڑا سا کم کیا اور کہا: "تم زندہ رہنا چاہتے ہو؟"

اس نے اقرار میں سر ہلا کے اپنی آنکھوں سے رحم کی التجا کی۔

"میرے لیے تم کو مار کے سمندر میں پھینک دینا بہت آسان ہے۔" میں نے کہا۔ "تمھارے ساتھ آنے والے دونوں ماتحت بھی تم کو نہیں بچا سکتے۔ وہ شاید تم سے زیادہ بے بس ہوں گے۔ تمھاری لانچ پر جو لوگ رہ گئے ہیں انھیں مار کے ہم آسانی سے تمھاری لانچ پر قبضہ کر سکتے ہیں اور اسے غرق بھی کر سکتے ہیں لیکن ہم قانون کے محافظوں کے دشمن نہیں ہیں۔"

اس کے ہاتھ سے ریوالور لے کر میں نے اسے آزاد کر دیا اور اسے اپنے پیروں پر کھڑا ہو جانے کی اجازت دی۔ وہ مجھے شعلہ فشاں نظروں سے گھورتا رہا۔ ایک رعایت کا یقین آتے ہی اس کا رویّہ پھر بدل گیا۔

"یہ تم نے اچھا نہیں کیا سکندر بخت۔" وہ بولا۔ "تم نے اپنے جرائم کی طویل فہرست میں ایک اور جرم کا اضافہ کر لیا ہے۔ تم اب بھی خود کو قانون کے حوالے کر دو تو بچ جاؤ گے۔"

"یہ ضمانت تم کیسے دے سکتے ہو؟" میں نے کہا۔ "اگر تم میرے جرائم کی طویل فہرست سے پہلے ہی باخبر ہو تو یہ بھی جانتے ہو گے کہ میرے خلاف کتنے مقدمات عدالتوں میں زیرِ سماعت ہیں؟"

"میرا مطلب تھا... کہ تم بین الاقوامی مجرم بننے سے بچ سکتے ہو۔" وہ بولا۔ "ہم تمھاری مزاحمت کے معاملے کو نظر انداز کرتے ہوئے کہہ سکتے ہیں کہ تم نے پُرامن طور پر خود کو قانون کے حوالے کیا۔ تم کو رعایت مل سکتی ہے..."

"مگر میں نے ابھی یہ فیصلہ نہیں کیا ہے کہ تمھیں کیا رعایت دوں۔" میں نے کہا۔

"تم بے وقوف نہیں ہو سکندر بخت۔" وہ بولا۔ "تم کو سمجھنا چاہیے کہ ہم بین الاقوامی تنظیم کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ہم اکیلے نہیں ہیں۔ تم مجھے مار دو یا ہم سب کو لانچ کے ساتھ ہی ختم کر دو تو اس سے تمھارے لیے فرار کے راستے کھل نہیں سکتے۔ تم بہت جلد محصور کر لیے جاؤ گے، یہ کھلا سمندر ہے۔ یہاں چھپنے چھپانے کی کوئی جگہ نہیں۔ جیسے ہی ہمارا دوسروں سے مواصلاتی رابطہ منقطع ہوگا، ہماری تلاش شروع ہو جائے گی۔ سب جانتے ہیں کہ ہم کہاں تھے اور ہم نے آخری رابطہ کب قائم کیا تھا اور کس سلسلے میں قائم کیا تھا۔"

"تمھیں یہ سب اطلاعات کس نے فراہم کی ہیں۔ میرے نام اور مجھ پر عائد الزامات کے بارے میں؟"

"تمھاری حکومت نے۔" وہ بولا۔

"حکومتِ پاکستان نے؟" میں نے کہا۔ "میں نہیں مان سکتا۔"

"اس سے مجھے فرق نہیں پڑتا۔"

"تم... خود کون ہو؟" میں نے کہا۔ "انگریزی بول کے تم نے مجھے یہ دھوکا دینے کی کوشش کیوں کی تھی کہ تم اُردو جانتے ہی نہیں، تمھارا تعلق اسی برِصغیر سے ہے یا جنوب مشرقی ایشیا کے کسی ملک سے۔ ہر جگہ ٹوٹی پھوٹی اُردو بولی ضرور جاتی ہے۔"

"تمھیں میری قومیت سے سروکار نہیں ہونا چاہیے۔ انٹرپول کا عملہ صرف میرٹ پر منتخب کیا جاتا ہے اور ہر ملک کی پولیس سے لیا جاتا ہے۔"

"رائٹ۔ پھر تمھیں اپنی قومیت بتانے سے انکار کیوں ہے؟ اگر تم پاکستانی ہو تب بھی میں تم سے رعایت طلب کرنے کا حق نہیں رکھتا اور یہ تمھاری فرض شناسی کا تقاضا ہے کہ کوئی مجرم قومیت کے حوالے سے رعایت مانگے تو تم اسے بالکل معاف نہ کرو۔ تاکہ انٹرپول میں پاکستان کی پولیس کا نام روشن ہو۔" میں نے کہا۔

"میرا وقت ضائع مت کرو..."

"او کے، میں براہِ راست کچھ سوالات کرتا ہوں۔ ہمارے بارے میں تمھیں کس نے اطلاع دی تھی کہ ہم بردہ فروش ہیں؟"

"میں نے ابھی بتایا تھا..."

اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی میں نے اس کے منہ پر اُلٹے ہاتھ کا طمانچہ مارا۔ "یہی بات تمھارے جھوٹے ہونے کی دلیل ہے۔ میری حکومت کی جانب سے اگر میرے خلاف الزامات کی کوئی فہرست جاری کی جائے گی۔ تو اس میں سب کچھ ہوگا مگر دو الزامات میرے بدترین دشمنوں کی سازش کے باوجود اس میں شامل نہیں ہوں گے۔ ایک منشیات کے کاروبار میں ملوث ہونے کا، دوسرا بردہ فروشی کا۔ یہ خدا کی مجھ پر خاص مہربانی ہے کہ میرے بدخواہ اور جانی دشمن بھی مجھے بے ضمیر یا لالچی نہیں سمجھتے۔"

"پکڑے جانے والے الزام لگاتے وقت کچھ نہیں سوچتے۔"

"آل رائٹ۔ تمھارا نام کیا ہے؟" میں نے کہا۔ "مجھے تم سے تمھاری شناخت معلوم کرنے کا قانونی تحفظ حاصل ہے۔"

"شناختی کارڈ میری جیب میں ہے۔"

"اپنا منہ دیوار کی طرف کر لو اور ہاتھ اوپر اٹھا لو۔" میں نے کہا: "میں خود دیکھ لوں گا۔"

اس کا ریوالور اب میرے ہاتھ میں تھا۔ وہ انتہائی مجبوری اور بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے تھوڑا سا گھوما لیکن یہ اس کی مکاری تھی۔ وہ اس ایک لمحے کی مہلت حاصل کرنا چاہتا تھا جب پُراعتماد ہونے کے باعث میں اس کی طرف سے بے فکر ہو جاؤں۔ وہ ایک دم پلٹا اور اس نے بیک وقت گھٹنا اُٹھا کے میرے پیٹ سے ذرا نیچے مارا اور دونوں ہاتھوں کی کہنیوں سے میری پسلیوں پر بھرپور وار کیا۔

یہ حملہ اتنا شدید اور فوری تھا کہ ذرا سی دیر کے لیے میری سانس رُک گئی اور میرے قدم اُکھڑ گئے۔ اس نے بڑی پھرتی سے اپنا ہاتھ قمیص کے اندر ڈالنے کی کوشش کی۔ میرا آدھا دھڑ جزوی طور پر مفلوج تھا لیکن ذہن پوری طرح مستعد تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اب وہ دوسرا ریوالور نکالے گا۔ اس یقین نے میرے ہاتھوں کو متحرک کیا۔ اس بار میرے عزائم کی راہ میں یہ خیال حائل نہیں تھا کہ میرے ہاتھوں کوئی پولیس مین نہ مارا جائے۔ مجھے یقین آچکا تھا کہ پولیس کی یہ وردی پہن لینے والا کوئی قانونی اختیار نہیں رکھتا۔ اور درحقیقت یہ وردی صرف بھیس بدلنے کے لیے استعمال کی گئی ہے۔

میرے بائیں ہاتھ کی ضرب اس کی گردن پر گی۔ وہ گردن کی ہڈی چٹخنے ہی چلایا مگر یہ صرف ایک کراہ تھی جو گردن کے ٹوٹ جانے سے ادھوری رہ گئی۔ وہ جہاں کھڑا تھا وہیں ڈھیر ہو گیا۔

اب میں نے جُھک کر اسے سیدھا کیا اور اس کی شرٹ کے اندر ہاتھ ڈالا۔ اعشاریہ بائیس بور کا چھوٹا سا آٹومیٹک ریوالور خود بخود میرے ہاتھ میں آگیا۔ اس نے دُہرے حفاظتی انتظام کو مؤثر بنانے کے لیے اس ریوالور کو اپنی آسان دسترس میں رکھا تھا۔ دغا اسے اپنی تقدیر نے دی کہ اس کو طاقت پر غرور میں مبتلا کیا اور وہاں پہنچا دیا جہاں اس کا حریف میں نہیں، اجل کا لمحہ تھا۔

شناختی کارڈ مجھے باہر والی جیب سے ملا لیکن اسے کھول کر دیکھتے ہی میں چونک پڑا۔ اس پر تصویر بھی کسی اور کی تھی جو صورت سے کوریا، فلپائن یا جاپان کا رہنے والا ہو سکتا تھا یا اسی خطے میں آباد کسی قوم کا باشندہ جو ویت نام، چین اور برما، ملائشیا تک اپنے مخصوص نسلی خصائل کی بنا پر پہچانی جاتی ہے۔ ان علاقوں کے نام بھی ایک سے لگتے ہیں۔

اہم بات یہ تھی کہ شناختی کارڈ اصلی تھا۔ ابھی تک اس مجرم کو جس کی لاش خود اعترافِ جُرم کی تفسیر بنی پڑی تھی، یہ موقع نہیں ملا تھا کہ وہ اس تصویر کی جگہ اپنی تصویر لگا سکے اور ردّوبدل کر کے اس پر اپنا نام بھی لکھوا لے۔ غالباً وردی پہن لینے کے بعد اسے اتنی فرصت نہیں ملی تھی۔

اس کے ساتھ ہی یہ خیال آنا لازمی تھا کہ انٹرپول کی وردی اور لانچ صرف ہمارے خلاف کارروائی کے لیے حاصل کی گئی تھی۔ اور وہ اس حد تک ضرور کامیاب ہو گئے تھے کہ بےخوف و خطر ہماری لانچ پر پہنچ گئے تھے لیکن انھوں نے یہ سب کیسے کیا؟ انٹرپول کی لانچ پر قبضہ کرنا آسان کام تو نہیں اور پھر وہ شخص کون تھا اور اب کہاں ہے جس کی وردی لاش کے جسم پر تھی۔

باہر مکمل خاموشی میں دونوں لانچوں کے انجن آپس میں ہمکلام معلوم ہوتے تھے۔ دونوں کی آوازوں میں نمایاں فرق تھا۔ ہماری لانچ کے انجن پر تھکن اور بڑھاپا غالب محسوس ہوتا تھا۔ دوسری لانچ کے انجن میں طاقت اور سرکشی کی غراہٹ تھی۔ کیا انٹرپول کی یہ نئی، زیادہ تیز رفتار لانچ اب ہمارے کام نہیں آسکتی؟ اسے وہ شکاری چھین سکتے ہیں جو ہمارے تعاقب میں آئے تھے تو ہم بھی ان سے چھین سکتے ہیں۔ لانچ کا جو عملہ ایک بار بدلا تھا، وہ پھر بدل سکتا ہے۔

زیادہ سوچنے اور غور کرنے کے لیے وقت نہیں تھا۔ نتائج کی پروا کیے بغیر میں نے اس منصوبے پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ تو پھر مجھے اپنے کپڑے لاش کو پہنانے اور اس کی وردی خود پہننے میں چند منٹ لگے۔ میں نے اس کی بیلٹ کے ساتھ لٹکے ہوئے واکی ٹاکی کو دیکھا تو مجھے اس میں صرف دو ہی بٹن نظر آئے۔ ایک سامنے تھا جس پر "پاور" لکھا ہوا تھا، یہ درمیانی پوزیشن میں تھا اور آف تھا۔ نشانات سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسے اوپر کرنے سے آواز سنی جا سکتی ہے اور نیچے کر کے اپنی آواز سنائی جا سکتی ہے یعنی اوپر کا کنکشن ریسیور سے تھا اور نیچے کا ٹرانسمیٹر سے۔

میں نے بٹن کو دبا کے اوپر کیا۔ ایک دم اس کا اسپیکر آوازوں سے بھر گیا۔ والیوم کا بٹن اس چھ انچ لمبے چار انچ چوڑے سیٹ کی سائڈ پر تھا۔

"کیا بات ہے... تم کب تک کھڑے رہو گے..." کسی نے برہمی سے کہا۔ پس منظر میں مجھے لانچ کا شور سنائی دیا۔

جواب نسبتاً بلند اور واضح آواز میں آیا۔ "اور میں کیا کروں؟ میں اکیلا ہوں... اس کی مرضی کے خلاف بات ہو تو وہ گرم ہوتا ہے۔"

"او یار... تم دو ہو..." دور کی آواز نے کہا۔

"دو کیسے یار! انسپکٹر تو اوپر کھڑا ہوا ہے۔ وہاں بھی تو ہونا چاہیے کسی کو۔" قریب سے بات کرنے والے کی آواز آئی۔ "وہ ہوتا تو میں کہتا کہ تینوں کو باندھ دے یا اسے ریوالور دے کر کھڑا کر دیتا۔"

میں سمجھ گیا کہ یہ گفتگو دوسری لانچ اور ہماری لانچ کے کسی کیبن میں موجود دو شکاری آپس میں کر رہے ہیں اور ان میں سے ایک

نے محسن کے ساتھ گل اور مشتری کو یرغمال بنا رکھا ہے۔ غالباً ان کے ساتھ آنے والے تیسرے شخص کے پاس واکی ٹاکی نہیں تھا چنانچہ وہ عرشے پر صورتِ حالات سے بے خبر مطمئن کھڑا ہوا رہا تھا۔

کیپ درست کر کے اور ریوالور ہاتھ میں پکڑ کے میں باہر نکلا اور سیدھا سامنے والے کیبن میں داخل ہو گیا۔ اس کا دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ ایک انچ کی جھری سے مجھے اندر کے منظر کی ایک جھلک نظر آ گئی تھی۔

جو شخص محسن کے ساتھ دونوں عورتوں کو لائن اپ کیے کھڑا تھا وہ ایک دم پلٹا۔ قدرتی طور پر اس نے پہلے وردی کو دیکھا اور ذرا سی دیر کے لیے مطمئن ہو گیا۔ اس کا ریوالور جو میری طرف اٹھا تھا پھر اپنے اسیروں کی جانب ہو گیا جو اپنی ناک کیبن کی دیوار سے لگائے سیدھے کھڑے رہنے پر مجبور تھے اور اپنے پیچھے کچھ بھی نہیں دیکھ سکتے تھے، ورنہ محسن ضرور اس مہلت سے فائدہ اٹھاتا جب ریوالور کی نال کا رخ ان کی طرف نہیں تھا۔ شاید وہ میری صورت بھی اپنے حریف کی نگاہ پڑنے سے پہلے دیکھ لیتا۔

وردی پہن کے خود کو انٹرپول کا نمائندہ ظاہر کرنے والے اس دوسرے جعلساز شکاری نے بھی صورت کی تبدیلی کو دوسری نظر میں محسوس کیا۔ ظاہر ہے اسے صدمے سے سنبھلنے میں کچھ وقت لگا لیکن مجھے اس کو ناک آؤٹ کرنے میں کوئی وقت نہیں لگا۔ میں سیدھا اس کی طرف گیا۔ درمیانی فاصلہ اتنا کم تھا کہ وہ ہل بھی نہ سکا۔ میری گرفت میں آ جانے کے بعد اس نے مزاحمت کا آغاز کیا مگر اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ اس کا ریوالور والا ہاتھ میرے بائیں ہاتھ کے وار سے ناکارہ ہو گیا اور اس میں اتنی طاقت بھی نہ رہی کہ ریوالور تھام سکے۔

ریوالور نیچے گرا اور اس کے ساتھ ہی محسن نے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ میں نے اپنے حریف کی گردن کو بائیں بازو کے شکنجے میں اس طرح کس لیا تھا کہ اس کے نرخرے پر پورا دباؤ تھا۔ وہ منہ کھول کے سانس لینے کی کوشش میں تڑپ رہا تھا اور لاتیں چلا رہا تھا۔ میں نے دوسرا ہاتھ استعمال کرتے ہوئے اس کے سر کو ایک جھٹکا دیا۔ ایک ہچکی کے ساتھ وہ سجدے میں گر گیا اور پھر ایک عجب سے مضحکہ خیز پوز میں ساکت ہو گیا۔

اتنی دیر میں محسن ریوالور اٹھا چکا تھا اور دونوں عورتوں کو بھی معلوم ہو گیا تھا کہ پانسا پلٹ گیا ہے۔ مشتری تو وہاں سے ایسے فرار ہوئی کہ ایک بار مجھ سے ٹکرائی، پھر دروازے میں سے گزرتے ہوئے ٹھوکر کھائی تو گرتے گرتے بچی۔ وہ پیچھے دیکھ رہی تھی، جیسے ڈر ہو کہ وہ لاش پھر اٹھ کھڑی ہو گی۔ گل نے پہلے بھی کشت و خون دیکھا تھا۔ وہ پُرسکون رہی۔

"اب کیا کرنا ہے؟" محسن نے کہا۔

"تجھے بھی یہ لباس بدلنا ہے۔" میں نے کہا۔ "عزیزہ گل ... یہ سرچ لائٹ ذرا دوسری طرف کر لو۔"

"کون سی سرچ لائٹ؟" وہ حیران ہو کے بولی۔

"اپنے رخِ روشن کی۔" میں نے کہا۔ "پردہ آنکھ کا ..."

گل مسکراتے ہوئے منہ پھیر کے کھڑی ہو گئی۔ جتنی دیر میں ... نے لاش کے بدن سے یونیفارم الگ کی، اپنے کپڑے اتار کے ... پہنی اور پھر لاش کو اپنے کپڑے پہنائے وہ ہماری طرف ... پیٹھ کیے کھڑی رہی۔

میں نے اتنی دیر میں صورتِ حال کی وضاحت کی۔ "یہ ... لوگ ہیں انھوں نے غالباً عملے کو مار کے انٹرپول کی لانچ حاصل ... اور ہمیں دھوکا دینے کے لیے یہ بھیس بدلا۔ اصل آدمی کوئی ... جاپانی نسل کا تھا۔ اس کا شناختی کارڈ جیب سے برآمد ہوا۔ اس ... شخص کی جیب میں بھی کوئی کارڈ ضرور ہونا چاہیے۔"

"بالکل ہے۔" محسن نے کارڈ نکال کے مجھے دکھایا۔ "... یا مرحوم بھی اسی قسم کی چیز ہیں۔ نام ہے ..."

"چھوڑ نام کو، یہ اسی ٹریجن کے لوگ ہیں۔ ممکن ہے انٹرپول میں بھی علاقائی سمندروں کی الگ الگ تنظیم ہو۔" میں نے کہا۔ "اب ہم وہی کریں گے جو ہمیشہ کرتے آئے ہیں۔"

"انگریزی محاورے کے مطابق، قرض کی ادائیگی انھی کے سکوں میں۔" محسن اپنے کپڑے لاش کو پہنا کے بولا۔ "مس گل ... آپ ملاحظہ فرما سکتی ہیں کہ میں کتنا ہینڈسم اور اسمارٹ لگ رہا ہوں۔"

گل نے پلٹ کے دیکھا اور محسن نے تو مذاق کیا تھا مگر ... مسحور سی کھڑی رہی۔ یہ وردی واقعی اس کے جسم پر سج رہی تھی۔ میں نے چٹکی بجا کے اسے متوجہ کیا۔ "ادھر ... غور فرمانے کے لیے میری بات سنیے، یہ شکل فرصت میں دیکھیے گا۔ جی ... تو میں ... کر رہا تھا کہ اب ہم انھی کے بھیس میں وہی کریں گے جو انھوں نے ہمارے ساتھ کیا تھا۔ ان کے ساتھی واپسی میں دیر ہو جانے کے ... پریشان ہیں۔ میں نے انٹرکام پر ان کی گفتگو سنی تھی۔"

"تو نے کسی کی آواز پہچانی تھی؟" محسن بولا۔

"ہاں، تو نے بھی سنی ہو گی۔ جب پہلی بار غلطی سے واکی ٹاکی ... آن ہوا تھا۔" میں نے کہا۔ "شک مجھے اسی وقت ہو گیا تھا۔"

"ان کا ایک ساتھی ابھی عرشے پر موجود ہے۔" محسن بولا۔

"میں اسے بلاتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"وہ پہچان جائے گا۔" محسن نے کہا۔

"فکر مت کر، میں اسے موقع نہیں دوں گا۔" میں نے ...

"گل، تم کو اس کی وردی ملے گی۔ لباس بدلنے اور میک اپ کے ...

لیے تم کو صرف پانچ منٹ دیے جائیں گے۔"

"اور پانچ منٹ کا مطلب ہو گا پونے پانچ منٹ پینتالیس منٹ نہیں۔" محسن نے اسے ڈانٹ کر کہا۔ "جیسا کہ تم عورتوں کی عادت ہوتی ہے۔ میدانِ حشر میں جانے سے پہلے بھی لپ اسٹک ضرور ٹھیک کرو گی۔"

"میں ساڑھے چار منٹ میں تیار ہو سکتی ہوں۔" گل نے کہا۔

میں راہداری میں واپس گیا۔ مجھے اوپر پہرا دینے والے کی پرچھائیں سی نظر آئی۔ وہ بڑی بے قراری سے ایک محدود فاصلے پر گردش کر رہا تھا۔ میں چند قدم دوڑا تو وہ چونکا اور ایک دم پلٹا۔ اس سے پہلے کہ وہ میرا چہرہ دیکھتا میں نے مڑتے ہوئے اس کو ہاتھ سے اشارہ کیا اور دبی ہوئی آواز میں پکار کے کہا۔ "نیچے آؤ بے وقوف۔" پھر میں واپس بھاگا چنانچہ وہ سمجھا اس کا ساتھی مشکل میں گرفتار ہے اور اسے مدد کے لیے بلا رہا ہے۔ میں اونچی آواز میں بولتا تو وہ آواز کے فرق کو بھی نوٹ کر لیتا۔ اس نے فرض کیا ہو گا کہ آواز کو دبا کے بات کرنا بھی خطرے سے محفوظ رہنے کے لیے ضروری تھا۔

وہ میرے پیچھے دوڑتا آیا۔ میں کیبن میں داخل ہوتے ہی دروازے سے لگ کے کھڑا ہو گیا۔ وہ جیسے ہی اندر آیا میں نے اسے دبوچ لیا۔ چند منٹ میں اس کا بھی وہی انجام ہوا جو اس کے دو ساتھیوں کا ہو چکا تھا۔ ایک بار پھر محسن نے ہی اس کی وردی اتاری اور گل کی طرف پھینک دی جو دوسری طرف دیکھ رہی تھی۔

"لو اب تم کو ٹھیک ساڑھے چار منٹ دیے جاتے ہیں۔ گل جان سے گل خان بننے کے لیے۔" وہ بولا۔ "اور ساڑھے چار منٹ پورے ہوتے ہی ہم پھر اندر ہوں گے۔ آدھا منٹ گزر چکا ہے۔"

"چلو چلو بے ایمان۔" گل نے اسے باہر دھکیل دیا۔ میں نے اس مہلت سے فائدہ اٹھایا اور دوست محمد کے پاس جا پہنچا۔ وہ کسی حد تک صورتِ حال کو سمجھ چکا تھا لیکن مشتری نے اپنی بدحواسی سے اس کو کنفیوز کر دیا تھا۔ وہ اپنا سر پکڑے بیٹھا تھا۔

"ٹھیک بولتا سب تیرے کو، پاگل ہے تو ..."

"قسم اللہ کی، میں ٹھیک کہہ رہی ہوں ..." مشتری نے ہانپتے کانپتے ہوئے کہا۔ "ارے کریم بدذات ... پانی ہی پلا دے ... ہائے میں مر گئی کیسے دھوکے باز ... اُف ... اور انھوں نے ہٹ سے گردن ایسے توڑ دی جیسے ... موئی گردن نہ ہو ککڑی ہو۔"

"اُف۔ ارے بابا کون کس کا گردن توڑا ...؟"

میں نے اسے مختصراً ساری بات بتائی اور یہ بھی سمجھا دیا کہ اب ہم دوسری لانچ پر قبضہ کرنے جا رہے ہیں مگر وہ اپنا کام کرتا رہے اور لانچ کو سنبھالے۔ اس کا کام ہماری کامیابی کے بعد شروع ہو گا۔

"اور صاب ... ہم کیا کرے؟" کریم نے کہا۔

"تم اپنی اس ڈوبتی ناؤ کو سنبھالو۔" میں نے مشتری کی طرف اشارہ کیا اور واپس چل پڑا۔

جب میں کیبن میں داخل ہوا تو گل اپنے بالوں کو سمیٹ کر کیپ میں چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔

"آدمی کو دعوے کرنے سے پہلے سوچنا چاہیے۔" محسن نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔ "ساڑھے چار منٹ ..."

"ایک منٹ گھڑی آگے کی تم نے ..." گل چلا کے بولی۔ پھر اس نے مجھے دیکھا اور خاموش ہو گئی۔

"میں مدد کروں؟" محسن نے کہا۔

"کوئی ضرورت نہیں سکندر بھائی، آپ ذرا پلیز۔" وہ پلٹ کے بولی اور میں نے اناڑی ہونے کے باوجود اس کے تراشیدہ بالوں کو اکٹھا کر کے ٹوپی میں قید کر دیا۔ اس کے پلیز کہنے کے انداز نے مجھے دم بخود کر دیا تھا۔ یہ وہی ناگ منی تھی جو گفتگو کرتے ہوئے مردانہ انداز کی گالیاں بک جاتی تھی اور اسے احساس نہیں ہوتا تھا۔

"جوتے ڈھیلے ہیں۔" گل نے تسمے باندھتے ہوئے کہا۔

"تم چارلی چیپلن کی طرح چل سکتی ہو۔" محسن نے کہا۔

"یہ لو اپنا ریوالور۔" میں نے کہا۔ "ریڈی فار ایکشن؟"

"یس سر۔" گل نے مجھے سیلوٹ مارا۔ "کیسی لگ رہی ہوں؟"

"اے ون۔" میں نے کہا۔ پھر میں اور محسن آگے پیچھے باہر نکلے۔ عرشے پر ابھی اندھیرا ہی تھا۔ یہ صبحِ کاذب کا دھندلکا غائب ہونے کے بعد ذرا سی دیر کے لیے پھر اپنا تسلط قائم کرنے والی تاریکی تھی جس نے ہمیں اضافی مدد دی۔

"تم یہیں ٹھہرو۔" میں نے گل سے مخاطب ہو کے کہا۔ "اور اسی طرح پہرا دیتی رہو جیسے وہ دے رہا تھا۔ جب تک ہم نہ بلائیں تم ادھر مت آنا۔"

"میرے بیوی بچوں کی خیریت کے لیے دعا کرتی رہنا۔" محسن بولا۔

گل کیسے سمجھ سکتی تھی کہ یہ پیار بھری شرارت نہیں ہے۔ محسن کے الفاظ کا مفہوم میرے لیے کچھ اور تھا گل کے لیے کچھ اور حالانکہ الفاظ وہی تھے۔ وہ منہ دبا کے ہنسی اور شاید شرمائی بھی ہو گی۔ مجھے محسن کی یہ حرکت اچھی نہیں لگی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کا جذباتی استحصال ہو رہا ہے۔ جو حالات کی ضرورت تھا مگر گل کو حالات کی ضرورت بنانا غلط تھا۔

ایک لانچ سے دوسری لانچ پر پہنچنا مشکل نہ تھا۔ آگے پیچھے ہم انٹرپول کی لانچ کے عرشے پر کودے تو عرشے پر نہ جانے کدھر سے ایک شخص نمودار ہو گیا۔ وہ سیدھا ہماری طرف آیا۔

"کیا ہوا... ؟" اس نے قریب آ کے کہا پھر اسے معاملہ گڑبڑ نظر آیا۔ میں نے اسے آواز نکالنے کی مہلت نہیں دی۔ ایک منٹ سے بھی کم وقت میں اس کی لاش سمندر کی لہروں میں گم ہو گئی۔

اب میں نے لانچ کا جائزہ لیا۔ یہ ہماری لانچ کے مقابلے میں بہت بڑی اور صاف ستھری تھی۔ بائیں جانب ایک کھلا ہوا روشن دان سا نظر آ رہا تھا۔ یہ نیچے جانے والا راستہ تھا۔ میں نے محسن کو چند قدم پیچھے رہنے کی تاکید کی اور دبے پاؤں آگے بڑھا لیکن بھاری جوتوں کے ساتھ آہٹ پیدا کیے بغیر چلنا ممکن نہیں تھا چنانچہ جوتے اتار کے میں نے ایک طرف رکھ دیے اور پھر نیم روشن، فولادی زینے کے پہلے تختے پر قدم رکھا۔

کم سے کم تین افراد نیچے موجود تھے۔ ان میں سے دو کسی بات پر آپس میں جھگڑ رہے تھے اور کچھ فاصلے پر تھے۔ تیسرے کی آواز بہت نزدیک سے آ رہی تھی۔ وہ مسلسل واکی ٹاکی یا وائرلیس پر اپنے ان ساتھیوں سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش میں مصروف تھا جو دوسری لانچ پر پہنچنے کے بعد لاپتا ہو گئے تھے۔

"ہیلو... ہیلو... نمبر ون... تم بولتے کیوں نہیں...، نمبر ٹو... کیا تم میری آواز سن رہے ہو؟ دیکھو تمھارے واکی ٹاکی صحیح کام کر رہے ہیں یا نہیں، جواب دینے کے لیے پُش بٹن کو صحیح پوزیشن میں رکھو... ہیلو... ارے کیا مصیبت ہے یار... بند کرو اپنی بکواس، شور مچا رکھا ہے..."

یہ آخری بات اس نے ان دونوں کو مخاطب کر کے کہی تھی جن کی تکرار سے مواصلاتی رابطے میں خلل پڑ رہا تھا۔ دونوں لڑنے والوں کی آواز ایسے مدھم پڑ گئی جیسے انھوں نے بیچ کا کوئی دروازہ بند کر دیا ہو۔ وہ اپنے اختلافی مسائل کو التوا میں رکھنے پر تیار نہیں تھے۔

اب آپریٹر کی ڈیوٹی پر مامور شخص نے پھر چلانا شروع کیا۔ میں نے اس وقت کو مناسب سمجھتے ہوئے پیش قدمی کی اور اسی طرح پنجوں کے بل چلتا ہوا وائرلیس آپریٹر کے سر پر جا پہنچا جو اب کانوں پر ہیڈ فون چڑھانے میں مصروف تھا۔

اپنی گردن کی جلد پر ریوالور کی سرد نال کا لمس محسوس کرتے ہی وہ ساکت ہو گیا۔ اس کی سابقہ زندگی کے تجربات نے اسے بتا دیا کہ یہ موت کا لمس ہے۔ اس کی جگہ کوئی اناڑی ہوتا تو ضرور پلٹ کے دیکھتا اور شاید چیخ بھی مارتا۔

"کون ہو تم لوگ؟" اس نے سیدھا سامنے دیکھتے ہوئے کہا اور ہیڈ فون کو اتار کے نیچے رکھ دیا۔

"ہم وہ نہیں ہیں جن سے تم رابطہ قائم کرنا چاہتے تھے۔" میں نے کہا۔ "ان کی روح وائرلیس پر جواب نہیں دے سکتی۔"

"دیکھو... مجھے مت مارنا... تم جو کہو گے میں وہ کروں گا۔" وہ عاجزی سے بولا۔ اس کے لہجے سے گھبراہٹ یا خوف کا پتا نہیں چلتا تھا، یہ کچھ عجیب سی بات تھی۔ یا تو وہ بہت ہی ... تھا یا حالات کے یکلخت پلٹ جانے کے لیے ذہنی طور سے تیار تھا۔ اس کے سامنے ایک لمبی سی میز پر مختلف آلات رکھے تھے۔

"اپنا کام جاری رکھو۔" میں نے کہا۔ "تاکہ کسی کو شبہ نہ ہو۔ اپنے دائیں جانب دیکھو، زینے پر میرا ایک اور ساتھی ہے اور تمھارا سر اس کی گولی کا ہدف ہے۔ اسے صرف کھوپڑیوں میں سوراخ کرنے کا شوق ہے۔ تم نے ذرا بھی غلط حرکت کی تو اسے بہانہ مل جائے گا اپنی گولڈن جوبلی کا۔ انچاس سر پہلے توڑ چکا ہے۔"

اس نے مردہ آواز میں کہنا شروع کیا۔ "ہیلو... نمبر ... جواب دو... نمبر ٹو..."

میں اس کے سامنے والی میز کے نیچے دُبک کے بیٹھ گیا، اس طرح کہ عملے کا کوئی بھی فرد ادھر آ نکلتا تو مجھے نہ دیکھ پاتا۔ آپریٹر کو اپنے کام میں مصروف دیکھتا تو اسے کسی قسم کی گڑبڑ کا احساس بھی نہ ہوتا۔ میں نے اپنے سائلنسر والے ریوالور کا رخ اس کی جانب رکھا۔

"تمھارے علاوہ لانچ پر کتنے افراد ہیں مسٹر آپریٹر؟" اس نے میز کے نیچے مجھ پر نگاہ ڈالے بغیر کہا۔ "پانچ۔" "ایک تو ہوگا پائلٹ، دوسرا انجن گیئر۔ کیا وہ بھی تمھارے ساتھی ہیں؟"

"نہیں، ہمارے دو ساتھی ان کے ساتھ ہیں۔" وہ بولا۔ "ساتھ ہیں یا ان کے سر پر سوار ہیں؟" میں نے کہا۔ "میں تمھارے قدموں میں پڑا ہوا ہوں۔ پھر بھی تمھارے ... ہوں۔ ان کے نام بتاؤ گے؟"

"وہ چھ اور سات نمبر ہیں۔"

"ون ٹو تھری لانچ پر گئے تھے۔ نمبر چار اوپر مارا گیا!"

"نمبر پانچ میں ہوں۔"

"اچھا نمبر پانچ! تم اپنے کام کے ماہر معلوم ہوتے ہو۔ تم بھی اصل آپریٹر کے سر پر ریوالور لیے کھڑے ہوتے ... آدمی کہاں ہے۔ اس دنیا میں یا...؟"

"وہ تمھارے پاس پڑا ہوا ہے... بائیں جانب۔"

میں نے بائیں جانب دیکھا۔ اب میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کی عادی ہو گئی تھیں چنانچہ مجھے دو فٹ کے فاصلے پر کوئی گٹھڑی سی نظر آئی۔ میں نے اسے چھو کر دیکھا۔ اس کا ... اور بے لباس جسم سرد پڑ چکا تھا۔ عجلت میں اسے ڈھیر کر ... ٹھونس دیا گیا تھا۔

"اس کے علاوہ کتنے افراد کی لاشیں دستیاب ہیں؟" میں نے کہا۔

"تین لاشیں ہم نے سمندر میں پھینک دی تھیں۔" وہ بولا۔

"جن کی وردیاں وہ پہنے ہوئے تھے؟ تمھارے کمانڈوز، اور اب ہم نے پہن رکھی ہیں؟" میں نے کہا۔ "ابھی تک ہم نے انھیں سمندر میں نہیں پھینکا ہے، لیکن حساب برابر تو کرنا پڑے گا۔ خیر، تم باقی دو کے بارے میں بتاؤ۔ وہ کون ہیں؟ نمبر آٹھ اور نو۔"

"ان کا کوئی نمبر نہیں۔ ہمیں یہ نمبر انھوں نے دیے تھے اور کہا تھا کہ کوئی ایک دوسرے کو نام سے مخاطب نہیں کرے گا۔ ہمیں اپنے اپنے کام سے مطلب رکھنے کو کہا گیا تھا۔ کسی کو بھی کسی کا نام معلوم ہی نہیں تھا۔"

"تم سب پرانے ساتھی ہو؟"

"نہیں، ہمیں صرف اس کام کے لیے لایا گیا تھا۔ اس سے پہلے ہم ایک دوسرے کو نہیں جانتے تھے۔" آپریٹر رضاکارانہ طور پر تمام اطلاعات فراہم کر رہا تھا۔

"تمھیں کام کی نوعیت کے بارے میں کچھ بتایا گیا تھا؟"

"مجھے صرف یہ کام کرنے کو کہا گیا تھا جو میں کر رہا ہوں۔ شاید سب اتنا ہی جانتے تھے جتنا انھیں کرنا تھا۔" وہ بولا۔

"تم مجھے جانتے ہو، اور میرے ساتھی کو؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں کیسے جان سکتا ہوں۔"

"تم نے کبھی سکندر کا، محسن کا یا ایم آر ایس کا نام تو سنا ہوگا؟" میں نے کہا۔

"ایم آر ایس کا نام سنا ہے..."

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔ تمھارے تین ساتھی جو ہمارے ہاتھوں مارے گئے، سکندر اور محسن کے نام سے واقف تھے۔"

"انھیں نام بتائے گئے ہوں گے۔ مجھے نہیں بتائے گئے تھے۔ صرف اتنا کہا گیا تھا کہ ایم آر ایس ایک غیر قانونی اور خطرناک تنظیم ہے۔ اور ہمارا کام ہے اس کے وجود کو ختم کرنا۔ ہمیں سوال کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ کل رات بتایا گیا کہ ہمیں فوری طور پر روانہ ہونا ہے اور ایم آر ایس کی ایک لانچ کو غرق کر کے واپس آنا ہے۔ اس سے زیادہ مجھے کچھ نہیں معلوم۔"

"تمھیں یہ سب بتانے والے کون تھے؟"

"یہی دونوں۔" اس نے ایک بند دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ان کے کچھ نام تو ہوں گے؟" میں نے کہا۔

"ایک چیف کہلاتا ہے، دوسرا باس۔ وہی سب کو کنٹرول کرتے تھے اور سب کو لائے بھی تھے۔"

"تم انھیں کہاں ملے تھے؟"

"میں نارووال کا رہنے والا ہوں۔ شاہ دین میرا نام ہے۔"

"خیر ہو وے شاہ جی۔ بڑی دور سے آئے اس کارِ خیر کے لیے۔ واپسی کا بھی سوچا تھا کہ کیسے ہوگی؟" میں نے کہا۔ "اسٹریچر پر، ایمبولینس میں یا چار کندھوں پر؟ اور ہوگی بھی یا نہیں۔ غداروں کا ساتھ دینے سے پہلے انجام پر نظر رکھنا چاہیے، مگر تم نے صرف پیسہ دیکھا ہوگا۔"

"غداروں کا ساتھ دینے والوں پر لعنت۔" وہ بولا۔ "انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ کچھ لوگ ساحلی علاقوں میں ڈاکے ڈالتے ہیں اور وہاں سے لڑکیاں اٹھا کے لے جاتے ہیں، انھیں آگے جا کے بیچ دیتے ہیں۔"

"کس نے کہی تھی یہ بات؟"

"نارووال کا ہی ایک پولیس انسپکٹر ہے۔ اس نے مجھے بلا کے سب سمجھایا تھا اور کہا تھا کہ جاؤ، خدا نے نیک راستے پر چلنے کا ایک موقع دیا ہے، اس سے فائدہ اٹھاؤ۔" شاہ دین بولا۔ "اس کے پاس چیف بیٹھا ہوا تھا۔"

"اس پولیس انسپکٹر نے تمھیں ہی کیوں منتخب کیا؟ کیا نارووال میں تمھاری بہادری کے چرچے تھے؟"

شاہ دین نے سر جھکا لیا۔ "وہ جی، میں پہلے تو ایک معمولی چور تھا۔ ایک بار پکڑا گیا، سال جیل کاٹی۔ اس کے بعد پولیس نے ہر واردات میں پکڑنا شروع کر دیا۔ چوری میرے گھر سے چالیس کوس پر ہو اور میرے گواہ فرشتے ہوں تب بھی وہ مجھے اٹھا لے جاتے تھے اور تفتیش کے بہانے کُٹ لگاتے تھے۔ انھوں نے جی مجھے مجبور کر دیا۔ میں پولیس کا مخبر اور خاص آدمی بن گیا۔ ایک پورا گروہ تھا جی ان کا۔ اس میں دو کانسٹیبل تھے اور ایک نائیک، گشتی پولیس کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔ رات کو جہاں موقع پاتے تھے ڈاکا ڈالتے تھے۔ اطلاع ان کو میں دیتا تھا کہ فلاں گھر سے مال ملے گا۔ دو سال میں آٹھ وارداتیں ان کے ساتھ ... کبھی کوئی نہیں پکڑا گیا۔ پکڑا بھی کیسے جاتا۔ خود ... ساتھ ملے ہوئے تھے۔ علاقے میں گشت کرنے والی پولیس اپنا حصہ لے کر الگ ہو جاتی تھی۔ آدھا تھانیدار رکھتا تھا۔ باقی آدھا ... سب بانٹ لیتے تھے۔ ایک لاکھ میں سے میرے دس ہزار ہی ہوتے تھے مگر میں پھنسا ہوا تھا۔ پولیس نے مجھے ہسٹری شیٹر جو بنا دیا تھا صرف اپنے کام کے لیے۔ اسی تھانیدار نے بلا کے کہا کہ کراچی جاؤ۔ ایک ہفتے میں واپس آ جاؤ گے۔ تمھارے لیے کوئی مشکل کام نہیں۔ ایک لاکھ ملیں گے نقد۔ اس سے کوئی شریفانہ کام دھندا

کرلینا۔ اب اس وقت میں کیا بولتا جناب۔ اس اجنبی کے سامنے کیسے کہتا کہ آپ [illegible] ہوتے ہوئے تو ممکن ہی نہیں [illegible] میں نے سوچ لیا تھا [illegible] پس نہیں آؤں گا۔ ایک لاکھ [illegible] چلاؤں گا اپنی۔"

"گویا اس چور تھانیدار نے تمھاری خدمات اس شخص کو فراہم کی ہیں جو چیف کہلاتا ہے۔ ضرور تھانیدار نے بھی اس سے اپنا کمیشن وصول کیا ہوگا؟"

"مجھے تو نہیں معلوم جناب۔ [illegible] اس نے مجھے [illegible] ہی دلوائے ہوں [illegible]"

"یہ چیف اس تھانیدار کے پاس کیسے پہنچا؟ کیا تم نے اسے پہلے کبھی دیکھا تھا؟" میں نے کہا۔

"نہیں جناب، وہ [illegible] والا ہوتا تو میں اسے پہچان جاتا۔ وہ تو پنجابی بول ہی نہیں سکتا تھا۔ [illegible] "مگر اسے کسی وڈے پولیس افسر نے بھیجا تھا۔ تھانیدار نے میرے سامنے ہی سینے پر ہاتھ رکھ کے بڑے خوشامدانہ انداز میں کہا تھا کہ سراج صاحب کو ہمارا سلام کہنا۔ ہم تو خاص خادم ہیں، ان کے، بس اتنی مہربانی کریں کہ اس بار لاہور میں انار کلی تھانہ مل جائے تو ہم ہر وقت وہیں حاضر رہیں ان کی سرخدمت کے لیے۔"

بہت عرصے بعد ایس ایس پی سراج کا نام سن کے میرے کام ذہن میں یادوں کی تلخی گھل گئی۔ سارا قصہ اب میری سمجھ میں آگیا تھا۔ اس ٹیم کے ارکان کا انتخاب کرنے والا بھی سراج تھا۔ [illegible] مدد مانگی ہوگی دلاور نے یا عبداللہ نے کہ کچھ ایسے لوگ، درجو جبر سے کے قابل ہوں مگر انھیں پہچانتا کوئی نہ ہو اور اس نے بہت سوچ سمجھ کے اپنے علاقے کے جانے پہچانے تھانیداروں سے رابطہ قائم کیا۔ انھوں نے ایک ایک آدمی بھیج [illegible] سب لوگ ایک دوسرے سے بالکل ناواقف تھے۔ سب پولیس ریکارڈ کے مطابق قابلِ اعتماد تھے اور پولیس کے قابو میں تھے [illegible] انکار نہیں کرسکتے تھے۔ پیسہ دلاور کا تھا یا عبداللہ کا، ان تھانیداروں کو بھی ملا اور ان کے حکم کے غلاموں کو بھی۔

جو نقشہ اس طرح میرے ذہن میں بنتا تھا وہ کسی اور کے ذہن میں نہیں تھا۔ یہ حکم کے غلام زندہ انسانوں کی منڈی سے اٹھائے گئے تھے۔ ان کو لالچ کے جال میں پھنسا کے گھروں سے دور لایا گیا تھا۔ انتہائی پُراسرار طریقے پر ان کو نمبر دیے گئے تھے اور کوئی جھوٹی سچی کہانی سنائی گئی تھی۔ چیف اور باس اس مشن کے نگراں تھے اور کامیابی کا انعام شاید انھی کے لیے تھا۔ باقی سب کے لیے ہر صورت میں موت کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ ناکامی کا خمیازہ چار افراد بھگت چکے تھے اور ان کی لاشوں کو بحیرۂ عرب کی سمندری مخلوق کا لقمۂ تر بننا تھا۔ اگر وہ کامیاب ہو جاتے تب بھی ایک لاکھ کے خواب کی تعبیر انھیں نہ ملتی۔ ساحل پر پہنچنے سے پہلے ہی انھیں عرشے پر کھڑا کر کے پُشت پر گولی مار دی جاتی تاکہ وہ براہِ راست اپنے مدفنِ آب میں گریں لیکن ان کے خون کا ایک قطرہ بھی لانچ پر نہ گرے۔ یہ ایسے لوگ تھے جن کی موت کو بالکل ضرورت نہیں تھی۔ ان کے واپس نہ جانے سے تشویش تو خون کا رشتہ رکھنے والے چند افراد کو ہوتی لیکن شکھ کا سانس لینے والے بہت ہوتے کہ چلو خس کم جہاں پاک۔ شاید اپنے بچے بالآخر کہتے کہ جان چھوٹی۔ کسی ہسٹری شیٹر کا اپنے علاقے سے غائب ہو جانا کسی کو شک میں مبتلا نہیں کرتا اور اس کی بازیابی کے لیے کوئی کوشش کرے تو اس کی مدد کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ یہ مختلف علاقوں کے وہ تیرہ بخت لوگ تھے جن کی ہسٹری شیٹ بہت جلد بند ہونے والی تھی۔ ایک لاکھ میں پولیس نے ان کی زندگی بیچ دی تھی اور بک جانے والے ایک لاکھ نقد کے خواب دیکھ رہے تھے۔

"شش..." محسن نے چٹکی بجا کے مجھے اشارہ کیا اور ہاتھ ہلا کے پوچھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ یقیناً وہاں کھڑے کھڑے تھک گیا تھا اور یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اتنی دیر سے میز کے نیچے گھسا ہوا میں کیا کر رہا ہوں۔ صبح کا اُجالا اب محسن کے پیچھے کے آسمان پر صاف نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس تفتیش میں آدھا گھنٹہ گزار دیا تھا تو اس کا بھی ایک مقصد تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ دو ہیں جو پائلٹ اور نیوی گیٹر کے ساتھ ہیں اور گن پوائنٹ پر ان سے مرضی کے مطابق کام لے رہے ہیں، اپنی جگہ چھوڑ کے نہیں آسکتے۔ اپنے ساتھیوں کی واپسی کا انتظار کرنے والے یہی چھ افراد تھے ان میں سے ایک اوپر مارا جا چکا تھا، دوسرے کو میں نے قابو کر رکھا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتا تھا۔ ایسی صورت میں چیف اور باس کو ہی بالآخر باہر آ کے صورتِ حالات کا جائزہ لینا تھا۔ اگر وہ خود چل کے ان کے پاس جانے سے گریز کر رہا تھا تو صرف اس لیے کہ میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ خود چل کے میرے پاس آئیں گے اور اس وقت میں اور محسن آسانی سے انھیں شکار کرلیں گے۔

میں نے جواب میں ہاتھ ہلا کے محسن کو صبر کرنے کا سگنل دیا اور پھر شاہ دین سے مخاطب ہوگیا۔

"شاہ جی! ایک لاکھ وصول کر چکے ہو تم؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں جی، اسی لیے تو میں راضی ہوگیا تھا۔ [illegible] لاکھ کراچی پہنچتے ہی مل گئے تھے۔"

"اور تم نے اس رقم سے کیا خریدا شاہ جی؟"

"ایک ٹیکسی لی، ایک کرائے کا مکان لیا... بس، باقی رقم میرے پاس ہے۔"

"کفن دفن کا سامان بھی ساتھ لے آتے تو اچھا تھا۔" میں نے کہا۔ "وصیت کرآتے کہ ٹیکسی فلاں کو پہنچا دی جائے۔ بیوی بچے یا بھائی بہن، کسی کو فائدہ تو پہنچتا تمھاری موت سے، زندگی سے تو نہیں ملا۔"

"کیا... کیا مطلب... تم مار ڈالو گے مجھے... دیکھو... میں نے سب کچھ بتا دیا تم کو۔" اس کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔

"اس تھانیدار کا نام نہیں بتایا۔"

"ملک شیر۔ میں باقی سب کے نام بھی بتا دوں گا۔ خدا کے واسطے مجھے مت مارو..." وہ ہاتھ جوڑ کے گڑگڑانے لگا۔ "میں سرکاری گواہ بن جاؤں گا۔"

"تم بھی کتنے بھولے ہو شاہ جی۔ واپس جاؤ گے تو وعدہ معاف گواہ ہوگے۔" میں نے کہا۔ "واپسی کا ٹکٹ تمھارے پاس تھا ہی نہیں، تم کو صرف یہاں تک آنا تھا، جانا اس سے بھی آگے تھا۔ تمھاری گواہی اب میدانِ حشر میں ہوگی۔ تمھیں لانے والے تمھارے بارے میں یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ جب کام تمام ہو جائے تو تمھارا بھی کام تمام کر دیا جائے۔ یہ ایسے کام ہیں کہ کوئی گواہ رکھنے کی حماقت نہیں کرتا۔"

"تم... یہ تم کیسے جانتے ہو، تم غلط کہتے ہو،" وہ چلّانے لگا۔

"مجھے معلوم ہے شاہ جی!" میں نے کہا۔ "اپنی آواز کم رکھو۔"

میں میز کے نیچے تقریباً مُرغا بنا ہوا تھا اور بہت تھک گیا تھا۔ انتظار اب میرے لیے برداشت سے باہر ہونے لگا تھا۔ چیف اور باس آخر باہر نکل کے معلوم کیوں نہیں کرتے کہ ان کے سورما محاذ سے لوٹ کر کیوں نہیں آئے۔ یہ سب تفتیش تو بعد میں بھی کی جاسکتی تھی لیکن میں نے وقت سے فائدہ اٹھایا اور شاہ دین کو اپنی جگہ پر یوں بٹھائے رکھا جیسے شیر کا شکار کرنے والے شکاری خود مچان پر بیٹھتے ہیں اور کسی قربانی کے بکرے کو وہاں باندھے رکھتے ہیں جہاں شیر کے آنے کی امید ہوتی ہے۔

ابھی میں کچھ وقت اور گزار سکتا تھا اور یہ پوچھ سکتا تھا کہ انھوں نے انٹرپول کی [illegible] حاصل کی تھی لیکن [illegible] ایک وقت اور یکلخت متعدد واقعات پیش آئے جو تفتیش کو ملتوی اور موخر کرنے کا سبب بنے۔

ایک طرف تو محسن کے پیچھے گل نمودار ہوئی۔ میرے احکامات کی صریحاً خلاف ورزی کرتے ہوئے اور ڈسپلن کو اپنے جذبات پر وارتے ہوئے وہ اپنی جگہ چھوڑ کے آگئی۔ میں نے محسن کو سر پر ہاتھ مار کے دانت پیستے اور کچھ بڑبڑاتے [illegible] اس نے اشارے سے گل کو دفع ہو جانے کے لیے بھی کہا مگر گل نے واضح انداز میں سر ہلا کے کہا کہ یہ ناممکن ہے۔ ایک روشن آسمان کے پس منظر میں مجھے ان کی حرکات و سکنات صاف نظر آ رہی تھیں۔

اس کے ساتھ ہی سامنے والے کیبن کا دروازہ کھلا اور ایک شخص باہر آگیا۔ شاہ جی کی آواز کچھ زیادہ ہی بلند ہوگئی تھی کہ وہ سیدھا ادھر ہی آیا۔

"کیا بات ہے نمبر پانچ؟" وہ قریب آ کے بولا۔

میز کے نیچے سے میں نے نمبر پانچ کو خاموش رہنے کا سگنل دیا مگر نمبر پانچ کا نروس بریک ڈاؤن ہو چکا تھا۔ اس نے ایک دم چلّانا شروع کر دیا۔ "باس..."

اس نے انگلی سے میز کے نیچے کی جانب اشارہ ہی کیا تھا کہ میں نے اسے شوٹ کر دیا۔ گولی اس کی پیشانی پر لگی اور وہ کرسی سمیت اُلٹ کے باس کہلانے والے پر گرا جو عین اس کے پیچھے آکھڑا ہوا تھا۔ اس سے مجھے تھوڑا سا فائدہ ہوا۔ میرا راستہ صاف ہوگیا اور مجھے میز کے نیچے سے نکل آنے کی مہلت بھی مل گئی۔ فائر کی آواز تو بہت کم ہوئی تھی مگر باس جیسے لوگ جو پرانے شکاری ہوں، زندگی کی آہٹ اور موت کی چاپ میں فرق کی شناخت میں دیر نہیں کرتے اور خطرات سے اپنی حیوانی جبلّت کے مطابق نمٹنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ اس نے پیچھے ہٹتے ہوئے بڑی پھرتی سے اپنا ریوالور نکال لیا۔ فائر کی آواز لانچ پر بم کا دھماکا بن کے ابھری مگر اس دھماکے کے ساتھ ہی باس اُچھلا اور فرش پر گر کر تڑپنے لگا۔ اس کے منہ سے اور گردن سے خون اُبل رہا تھا۔

"اُلّو کی پٹھی!" میں نے اٹھتے ہی بے اختیار گل کو گالی دی جس نے یہ خوفناک دھماکا کیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے بھی میں نے یہ نہیں سمجھا تھا کہ باس کے ریوالور کی گولی سامنے سے نکلنے کے بجائے پیچھے سے نکل کے اسے لگ گئی۔ محسن سے ایسی حماقت کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی اور اس نے بالکل ٹھیک کیا تھا کہ ایک دم نیچے اتر آیا تھا اور باس نے دیکھ بھی لیا تھا کہ وہ دوسری جانب سے براہِ راست نشانہ بن سکتا ہے مگر اس کا ریوالور اُٹھانے والا ہاتھ نیچے آنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ گل نے اس سے پہلے ہی فائر داغ دیا۔ جو کام خاموشی سے کیا جاسکتا تھا اس کے لیے اعلانِ جنگ غیر ضروری تھا۔

"محسن واپس بھاگ..." میں نے چلّا کے کہا اور خود اپنے اندازے کے مطابق اُدھر بھاگا جہاں دو افراد نے لانچ کے عملے کو یرغمال بنا رکھا تھا۔ ریوالور کے فائر کی آواز کے ساتھ ہی کیبن کے دروازے کا شیشہ ٹوٹا۔ سامنے آئے بغیر چیف نے مشین گن کا ایک

برسٹ مارا۔ اس وقت تک میں اس حصے میں پہنچ چکا تھا جہاں انجن نصب تھا۔ فائر کی آواز سے اور پھر مشین گن کا راؤنڈ چلنے سے وہاں موجود سب لوگ سمجھ گئے تھے کہ جنگ اسی لانچ پر شروع ہو چکی ہے۔ لیکن مجھے معلوم نہ تھا کہ گل اور محسن اب کہاں ہیں۔

"چلو"، کسی شخص نے چیخ کر کہا۔ "لانچ کو یہاں سے نکالو۔"

میں نے دروازے سے کان لگا کے سننے کی کوشش کی مگر جواب میری سمجھ میں نہ آیا۔ لانچ اب حرکت کرنے لگی تھی۔

"یہ کیا ہے؟ اس کی رفتار بڑھاؤ۔" اب یہ حکم کسی اور نے دیا تھا۔

"رفتار ایک دم نہیں بڑھ سکتی"، یہ جواب انگریزی میں دیا گیا تھا۔ "اور جہاں تک میرا خیال ہے اس لانچ کے ساتھ دوسری لانچ اٹک گئی ہے یا اٹکا دی گئی ہے۔ اس کا انجن دو لانچوں کو نہیں کھینچ سکتا۔"

"میں دیکھتا ہوں۔" دوسرے شخص نے کہا۔ جو نسبتاً پُرسکون تھا اور انگریزی میں بات کر سکتا تھا۔ "تم دونوں کو سنبھالو۔"

میرے لیے دونوں لانچوں کا اکٹھا ہو جانا ایک اچھی خبر تھی۔ معلوم نہیں ایسا کس نے کیا تھا۔ شاید دوست محمد نے۔ وہی ایک ایسا شخص تھا جو تجربے کے ساتھ عقل سے کام لینا جانتا تھا۔

"باہر مت آنا۔" میرے پیچھے سے کوئی چلا یا۔

لیکن یہ حکم دیر سے جاری ہوا۔ اس وقت تک ایک شخص اندر سے باہر آنے کے لیے دروازہ کھول چکا تھا۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھایا پھر بڑی عجلت میں پیچھے ہٹانے کی کوشش کی۔ میں نے دروازے کو ایک ٹکر ماری۔ وہ شخص دونوں پٹ لگنے سے پیچھے گرا مگر ریوالور اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے فائر کیا اور میں نے غوطہ مارا۔

مجھے احساس تھا کہ یہاں ایک اور شخص بھی ہے جو مجھے بغیر وارننگ کے شوٹ کر سکتا ہے لیکن میں بہ یک وقت دونوں طرف سے آنے والی گولیوں سے نہیں بچ سکتا تھا۔ میں نے پہلے والے شخص پر جست لگا کے اسے اٹھنے سے پہلے بوٹ کی ٹھوکر مار کے گرا دیا۔ اس کی زبان شاید دونوں جبڑوں کے درمیان آگئی تھی کہ اس کے منہ سے خون نکلا۔ میں نے پھر اس کے لات ماری۔ یہ لات اس کے سینے پر تھوڑا سا بائیں جانب پوری قوت کے ساتھ لگی۔ وہ بلبلایا اور سینے پر ہاتھ رکھ کر جھک گیا۔

میری دائیں جانب اتنی دیر میں بہت کچھ ہو گیا تھا۔ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ عملے کے یرغمال بنے ہوئے پائلٹ نے اور نیوی گیٹر نے حاضر دماغی سے اور جرأت سے کام نہ لیا ہوتا تو ٹنگ پہلی لک مارنے سے پہلے ہی مارا جاتا۔ جیسے ہی انھوں نے اپنے پیچھے ہنگامہ سنا اور اس شخص کو میری طرف ریوالور اٹھاتے دیکھا جو ابھی تک ان کا نشانہ لیے کھڑا ہوا تھا، ان میں سے ایک نے جست لگائی اور اسے نیچے گرا دیا۔ اسے گرانے میں لانچ کو لگنے والے زبردست جھٹکے کا بھی دخل تھا۔ یہ صرف میری ہی نہیں باقی دو افراد کی کوششوں کا مشترکہ نتیجہ تھا کہ میدان ہمارے ہاتھ رہا۔

یہ انتہائی فیصلہ کن جنگ چند منٹ سے زیادہ جاری نہ رہی لیکن ان چند منٹوں میں فیصلہ کسی بھی فریق کے حق میں ہو سکتا تھا۔ دشمن بہتر اور مستحکم پوزیشن میں تھا۔ اس غنیم کی طرح جو کسی مضبوط قلعے کے اندر اسلحے سے پوری طرح لیس مورچا بند بیٹھا ہو۔ ہماری تعداد بھی ان کی قوت دگنی تھی۔ محسن میرے ساتھ ہوتا اور ہم دونوں مسلح ہوتے تو مقابلہ برابر کا سمجھا جا سکتا تھا۔ ایک فائدہ جو مجھے حاصل رہا، وہ اندر سے حاصل ہونے والی حمایت تھی۔

جب ہم دونوں دشمنوں کو زیر کر چکے۔ میں نے ایک کو اس قابل نہ چھوڑا کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑا بھی ہو سکے اور لانچ کے عملے نے دوسرے کو بے دست و پا کر دیا۔ تو ہم تینوں نے ایک دوسرے کو شکر گزاری اور فتح مندی کے احساس سے ملنے والی مسرت اور اعتماد کے جذبات کے ساتھ دیکھا۔ ہم آپس میں اجنبی تھے مگر ایک دوسرے کی زندگی کے تحفظ کے لیے لڑی جانے والی جنگ کے اتحادی تھے۔

"تھینک یو ویری مچ۔" ان میں سے ایک نے مجھ سے ہاتھ ملا کے انگریزی میں کہا۔ وہ گورا چٹا صحت مند جوان آدمی تھا۔ "تم نے اپنی جان خطرے میں ڈال کے ہمیں بچا لیا۔"

دوسرے نے فقط مسکرا کے ہاتھ ملایا اور زیر لب کچھ کہا۔ جو میں نہ سمجھ سکا تاہم اس کے جذبات کا اظہار اس کی صورت سے ہوتا تھا۔ یقیناً اس نے اپنے ساتھی کی بات ہی دہرائی ہوگی۔

"یہ انگریزی نہیں بول سکتا کیونکہ یہ برما کا رہنے والا ہے۔" پہلے شخص نے کہا۔ "میرا نام راجندر سنگھ ہے اور میں انڈین ہوں بلکہ تھا۔ اب تو میں بین الاقوامی شہری ہوں۔"

"ان کا ایک ساتھی جو گروہ کا سرغنہ ہے، ابھی باہر ہے۔" ٹنگ نے فوری طور پر تعارف سے گریز کرتے ہوئے کہا۔ "وہ ایک خطرناک آدمی ہے اور اس کے پاس سب مشین گن ہے۔"

"اوہ، میں تو سمجھا تھا کہ سب مشین گن کے ساتھ تم نے حملہ کیا ہے۔"

وہ تشویش اور مایوسی سے بولا۔

"تم حوصلہ رکھو۔ ہم اس پر بھی قابو پا لیں گے۔" میں نے کہا۔

وہ بولا۔ "وہ تو لانچ کو چھلنی کر دے گا... ہم سب ڈوب جائیں گے۔"

"ہمارے ساتھ کیا وہ خود نہیں ڈوبے گا؟" میں نے کہا۔ "اور پھر ہماری لانچ بھی تو ہے۔"

"اس کے ساتھ اب کتنے لوگ ہیں؟"

"میرا خیال ہے کہ اب وہ اکیلا رہ گیا ہے۔ اس کے چھ ساتھی مقابلے میں ہلاک ہوئے۔ دو یہاں تمھاری قید میں ہیں۔"

"تم بھی اکیلے ہو؟" راجندر سنگھ نے کہا۔

"نہیں، میرے ساتھی دوسری لانچ پر ہیں اور ہمارے لیے تشویش کی کوئی بات نہیں۔ ایک مشین گن سے وہ مقابلہ جاری نہیں رکھ سکتا۔" میں نے کہا۔

"سکندر، باہر آجاؤ۔ تم کب تک اندر چھپے رہو گے؟" باہر سے کسی نے چیخ کر کہا۔ اور وہ شک جو مجھے پہلی بار اتفاق سے صرف دو لفظ سن کے ہوا تھا میرا یقین بن گیا۔ لانچ پر سب سے پہلے آنے والے کا ہاتھ لگنے سے جب واکی ٹاکی آن ہو گیا تھا تو میں نے دو افراد کی گفتگو اور ہنسی کی آواز سنی تھی صرف ایک سیکنڈ کے لیے، اور ان میں سے ایک نے اتنا ہی کہا تھا 'ان دونوں کی'..... پھر واکی ٹاکی آف کر دیا گیا تھا لیکن میرے اور محسن کے کان اس آواز پر کھڑے ہو گئے تھے۔ ہم دونوں نے استاد پیڈرو کی آواز کو پہچان لیا تھا۔

اب وہ چیف کی حیثیت سے ہمیں خوفزدہ کرنے کی احمقانہ کوشش میں مصروف تھا۔ ہار سامنے نظر آنے لگے تو بڑی ذہانت سے جنگی حکمت عملی تیار کرنے والا حریف بھی نفسیاتی حربے کو ترکش کے آخری تیر کی طرح استعمال کرتا ہے۔ طاقت استعمال کر کے بازی ہار جانے والے کے پاس مکر و فریب سے جھوٹی امیدیں وابستہ کرنے کا سہارا تو رہتا ہے۔

"میں تم کو اندر ہی بھون کے رکھ دوں گا سکندر!" پیڈرو نے پھر چلا کے کہا۔ "میرے ہاتھ میں دستی بم ہے..." اس نے ایک سانس میں مجھے ماں بہن کی گالیاں دے کر میرے اس خیال کو تقویت پہنچائی کہ وہ ذہنی طور پر اشتعال، بے بسی اور خوف کے ملے جلے جذبات سے کتنا مغلوب ہے۔

ٹنگ نے خاموش رہ کے اس پر اعصابی دباؤ بڑھانا بہتر سمجھا۔

"میں دس تک گنوں گا..." عادتاً اس نے ایک گالی دے کر کہا۔ "پھر میں بم پھینک دوں گا۔ تمھارے چیتھڑے اڑ جائیں گے لانچ کے ساتھ۔"

ٹنگ نے اپنے دونوں ساتھیوں سے کہا کہ وہ فرش پر لیٹ جائیں۔ کوئی سوال کیے بغیر انھوں نے تعمیل کی۔ میں نے ان کا ساتھ دیا۔ یہ سول ڈیفنس کی ٹریننگ کا ایک ابتدائی اصول ہے کہ بم کے دھماکے سے خود کو بچانے کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ مجھے دستی بم والی بات محض ایک دھمکی محسوس ہوتی تھی لیکن میں امکانات کو یکسر مسترد نہیں کر سکتا تھا۔ اس احتیاط سے مجھے فائدہ ہوا۔

باہر پیڈرو چیخ رہا تھا۔ "... تین.... چار... پانچ" اور جیسے جیسے گنتی آگے بڑھ رہی تھی درمیانی وقفہ بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ تین کے بعد چار کہنے میں دو سیکنڈ لگے تو پانچ تک پہنچنے میں مزید تین سیکنڈ گزر گئے۔ چھ اس نے پانچ سیکنڈ کے بعد کہا۔

اندر فرش پر الٹا لیٹ کے اور کہنیوں کے بل رہتے ہوئے کانوں کو ہاتھ سے بند کرنے کے بعد میں نے انگلیوں کو سر کے پیچھے ملالیا تھا۔ میرا ذہن کسی ایسی مشین کی طرح چل رہا تھا جس کے اندر مختلف گراریاں الگ الگ سمت میں تیزی سے حرکت کر رہی ہوں۔ میں بہ یک وقت بہت کچھ سوچ رہا تھا۔ کیا واقعی پیڈرو بم پھینک دے گا؟ محسن آخر کیا کر رہا ہے۔ کہیں وہ اور گل پہلے ہی حملے میں تو نہیں مارے گئے؟ ایسی صورت میں کیا دوست محمد اور کریم کچھ کر سکتے ہیں؟ دس تک گننے کے بعد پیڈرو نے بم نہ پھینکا تو پھر وہ کیا کرے گا؟

پیڈرو نے دس تک گنتی پوری ہوتے ہی مشین گن کا برسٹ مارا۔ گولیاں کیبن کے دروازے میں سوراخ کرتی ہوئی ہمارے اوپر سے گزر گئیں۔ میں نے اپنے ساتھ لیٹے ہوئے دونوں افراد کو دیکھا۔ وہ بھی محفوظ تھے۔

راجندر سنگھ نے اپنی مادری زبان میں پیڈرو کا شجرۂ نسب غلط کرتے ہوئے کہا۔ "دستی بم دا پُتر۔" اور یوں میرے اس خیال کی تائید ہو گئی کہ پیڈرو کے پاس مشین گن کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ورنہ وہ اپنی دھمکی پر عمل ضرور کرتا۔

"ڈٹے رہو سردار جی۔" میں نے سرہلا کے کہا۔

"سول واہگورو دی۔ میں نے اس کے نیچے ڈائنا مائٹ نہ رکھا تو میرا بھی نام راجندر سنگھ نہیں۔ اور یہ دونوں ان کا تو میں اپنی کرپان سے قیمہ کروں گا۔" اس نے دونوں قیدیوں پر عزائم کا اعلان کیا۔

"ایک پولیس مین کو قانون کے مطابق کارروائی کرنا چاہیے سردار جی!" میں نے کہا۔

جواب میں اس نے وہی کہا جو عام طور پہ کہا جاتا تھا کہ کیسا قانون اور کہاں کا قانون۔ دُنیا میں قانون کس نے اپنے ہاتھ میں نہیں لے رکھا ہے اور جو زبردست ہے، وہی قانون بناتا ہے اور توڑتا ہے۔ ساری دُنیا میں یہی ہو رہا ہے۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ وہ ایک طرح سے ایم آر ایس کے اغراض و مقاصد کی تائید کر رہا تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ لاقانونیت کی وبا ایک بین الاقوامی سانحہ تھی۔ ایم آر ایس یعنی مائٹ از رائٹ سوسائٹی کے

باقاعدہ اراکین ہم چند سرپھرے تھے۔ مگر درحقیقت اس کے حامی اور اس کے نظریات سے اتفاق کرنے والے اِس دُنیا کے وہ سب مظلوم اور مجبور عوام تھے جو اکثریت میں تھے۔

خاموشی کا ایک مختصر وقفہ میرے لیے نئے خدشات اور خطرات کا احساس لے کر آیا۔ اب پیڈرو کیا کر رہا ہے؟ کیا اس کے پاس مشین گن کے راؤنڈ بھی ختم ہو گئے؟ یا وہ آخری داؤ کی ناکامی کے بعد میدان چھوڑ گیا۔ فرار کے راستے اس کے لیے کُھلے ہوئے تو ہیں۔ وہ لائف جیکٹ پہن کے کُھلے سمندر میں کُود سکتا ہے مگر اسے ایک طرف دوسری لانچ سے کیے جانے والے فائروں کا سامنا ہوگا تو دوسری طرف بچ نکلنے کی صورت میں ہر طرف پھیلے ہوئے سمندر کا۔ ساحل سے سیکڑوں میل دور وہ کسی بحری جہاز یا لانچ پر پہنچ جانے کی توقع رکھ سکتا ہے مگر اس کا امکان بہت کم ہوتا ہے کہ سمندر کے شور میں کسی شخص کی چیخ وپکار کوئی سُن سکے۔ یا موجوں کی رست وخیز میں گھرے ہوئے ایک آدمی پر کسی کی نظر پڑے۔

سردار جی نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ زخمی قیدیوں میں سے ایک دم توڑ رہا تھا۔ اس کے سارے اعضائے رئیسہ میری لاتوں اور ٹھوکروں سے پاش پاش ہو چکے تھے۔ دوسرے کو سردار جی اور اس کے ساتھی نے مل کر باندھ دیا تھا مگر وہ ہوش میں تھا۔

"یہ... مر جائے گا..." وہ دہشت زدہ ہو کے بولا۔

سردار جی نے اس کے مُنہ پر مکّا مارا۔ "سُور دا تخم... اوئے مرتے توں وی جانا اے، اپنی فکر کر۔"

اچانک باہر سے میگا فون پر محسن کا اعلان سنائی دیا جو میرے لیے اتنا ہی اطمینان بخش اور حوصلہ افزا ثابت ہوا، جتنا ہوائی حملے کے بعد خطرہ ٹل جانے کا سائرن خندق میں پناہ لینے والوں کے لیے ہوتا ہے۔

"پیڈرو! مقابلہ مت کرو۔ تمھارے سب ساتھی مارے جا چکے ہیں۔" محسن کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ "ہم تمھاری لانچ پر قبضہ کر چکے ہیں۔ تمھارے لیے اب بھاگ جانے کا کوئی راستہ بھی نہیں رہا۔"

یہ وہی میگا فون تھا جو انٹرپول کا نمائندہ بن کے آنے والا پہلا شخص استعمال کر رہا تھا۔ اس کے اعلان نے ہمیں ہراساں نہیں کیا تھا، صرف تشویش میں مبتلا کیا تھا لیکن اب اسی میگا فون سے نشر ہونے والا اعلان اکیلے رہ جانے والے استاد پیڈرو کو کتنا دہشت زدہ کر رہا ہوگا، یہ سوچ کے مجھے خوشی ہوئی۔ میرے لیے وطن کے سارے دشمن ایک سے مجرم تھے مگر پیڈرو کے خلاف میرے جذبات میں ذاتی عداوت کا پہلو بھی تھا کیونکہ وہ میرے باپ کا قاتل ثابت ہو چکا تھا۔ بعض اوقات میں سوچتا تھا کہ اگر وہ میرے سامنے ایک مجرم کی طرح آیا اور مجھے اس کو انصاف کے مطابق موت کی سزا دینے کا اختیار حاصل ہوا تو میں کس طرح اس کو زیادہ سے زیادہ اذیت دے کر جہنم رسید کروں گا۔ پھر انتقام کی آگ تو شاید کسی طرح بھی سرد نہ ہوگی۔

جب محسن نے اپنا اعلان دُہرایا تو میں اپنی جگہ سے اُٹھا۔ میں نے اس کیبن میں گولی سے ہو جانے والے سوراخ پر آنکھ رکھ کے باہر جھانکا۔ وہ باہر کی مختصر راہداری میں نہیں تھا۔ اس سے آگے میں وہ میز بھی دیکھ سکتا تھا جس پر وائرلیس سیٹ وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ اس کے قریب اُلٹی ہوئی کرسی اور شاہ دین کی لاش بھی مجھے نظر آ رہی تھی لیکن آگے کا منظر میری نگاہوں سے اوجھل تھا۔ یہ اعلان عرشے کے اوپر والے اس حصّے سے کر رہا تھا جہاں سے نیچے آنے والا زینہ شروع ہوتا تھا۔

میں نے سردار جی کو اشارہ کیا۔ "آجاؤ، باہر کوئی نہیں ہے۔"

راجندر سنگھ کے ساتھ اس کا ساتھی بھی کپڑے جھاڑ کر اُٹھ کھڑا ہوا اور انھوں نے باری باری سوراخ سے جھانک کے اپنا اطمینان کیا۔ اُستاد پیڈرو نے محسن کے اعلان کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ غالباً اب وہ کسی محفوظ مقام پر مورچا بند ہو گیا تھا جہاں سے قریب آنے والا ہر شخص اس کی زد میں ہو لیکن کوئی اسے وہاں رہ کے نشانہ نہ بنا سکے۔

میں نے سردار جی سے مشورہ کیا۔ "ذرا مجھے نقشہ سمجھائیں۔ اگر وہ خبیث کہیں چُھپ گیا ہے تو اسے کس طرح باہر نکالا جا سکتا ہے؟"

"تمھارا یہ بندہ اوپر سے بول رہا تھا؟" راجندر سنگھ نے پوچھا۔

"ہاں، اوپر سے تو وہ ہر طرف دیکھ رہے ہوں گے۔ اس کے لیے یہ ناممکن ہے کہ سمندر میں کود کے نکل جائے۔" میں نے کہا۔

"نیچے ایک تو وہی کپتان کا کمرا ہے۔" راجندر سنگھ نے کہا۔ "پھر اس کے ساتھ اسٹور ہے، ادھر سیدھے ہاتھ پر کچن اور اس کے پیچھے ٹائلٹ۔"

محسن نے تیسری بار پیڈرو کو مخاطب کیا۔ "پیڈرو، اگر تم خودکشی کرنا چاہتے ہو تو تمھاری مرضی۔ لانچ ڈوب جانے سے ہمیں کچھ نہیں ہوگا۔ ہم اپنی لانچ میں بالکل محفوظ ہوں گے۔ نہ تمھارا باپ دلدا تمھاری مدد کر سکتا ہے اور نہ اس کا باپ سراج۔ تم اکیلے ہو۔ اب تم کو جان دینی ہے اور سب حساب برابر کرنا ہے۔ ہمت ہے تو سمندر میں چھلانگ مار دو۔ ہم تمھارا پیچھا کریں گے اس وقت تک جب تک کہ تم کسی شارک کا لقمہ نہیں بن جاتے۔ ہم تمھیں گولی نہیں ماریں گے۔ ہم دیکھیں گے کہ تم کہاں تک تیر کے جا سکتے ہو۔"

راجندر سنگھ نے اتنی دیر میں مجھے سمجھا دیا تھا کہ پیڈرو تک ہم کدھر سے پہنچ سکتے ہیں۔ اس نے متبادل راستے بتائے تھے جو محفوظ تھے۔ ہم سامنے سے جانے کے بجائے یہ کر سکتے تھے کہ پانی میں اُتر جائیں اور پچھلی طرف سے شیشہ توڑ کے پیڈرو پر فائرنگ کریں۔ اور وہ اُدھر سے جواب دے تو سامنے سے محسن دروازہ توڑ دے۔ پیڈرو ایک وقت میں ایک ہی طرف کے حملے کا جواب دے سکتا تھا۔ غالب امکان یہ تھا کہ اس کے پاس مشین گن کے اضافی راؤنڈ نہیں تھے چنانچہ وہ ریوالور سے مقابلہ کرے گا۔ ایک ریوالور خالی ہو جانے کے بعد وہ دوسرا استعمال کر سکتا تھا مگر محصور ہو جانے کے بعد وہ غیر معیّنہ عرصے تک ہمارا راستہ نہیں روک پاتا۔ سمندر کی طرف کھڑکی کے گول سوراخ سے گردن نکالے بغیر وہ ہمیں نشانہ نہیں بنا سکتا تھا مگر ہم پانی میں رہ کر اسے دھوکا دے سکتے تھے اور جیسے ہی اس کا سر نظر آئے فائر کر سکتے تھے۔

اس پورے پلان میں بہت سی خامیاں بھی تھیں اور خطرات بھی تھے۔ ایسے امکانات بھی تھے جو ہمارے خلاف بھی جا سکتے تھے لیکن مجموعی طور پر یہ قابلِ غور لائحہ عمل تھا۔ پیڈرو اب کہیں دُبکا ہوا ہمارے ساتھ بلی چوہے کا کھیل کھیل رہا تھا۔ یہ عقل کی اور اعصاب کی جنگ تھی جس میں نفسیاتی فوائد ہمیں حاصل تھے۔ ہم تعداد میں زیادہ تھے اور قوت میں بھی۔ ہم محفوظ بھی تھے اور نقل و حرکت کے لیے آزاد بھی۔ اکیلا پیڈرو کہیں عارضی طور پر مورچا بند ہو گیا تھا تب بھی اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر مجبور تھا کہ بات صرف وقت کی ہے ورنہ جنگ تو ختم ہوئی اور اس کے لیے فتح کی امید رکھنا کسی معجزے کی امید رکھنے سے بھی زیادہ بعید از قیاس ہے۔ ہم صرف انتظار کر کے بھی جیت سکتے تھے۔ پیڈرو کچھ کھائے پیے بغیر یا اپنے موجودہ اسٹاک کے ساتھ کب تک ایک کمرے میں بند رہ سکتا تھا۔ بالآخر اس کو باہر آنا پڑتا مگر یہ سلسلہ دنوں پر محیط ہو سکتا تھا۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ محسن کو میری فکر بھی ہوگی۔ اسے نہیں معلوم کہ میں راہداری کے دوسری جانب موجود ہوں اور میرے ساتھ دو مددگار بھی ہیں۔

میں نے چلاّ کے کہا۔ "محسن! وہ حرامزادہ ایسے نہیں نکلے گا۔"

محسن نے میگا فون پر کہا۔ "تو خیریت سے ہے نا؟"

"ہاں، عملے کے دو افراد میرے ساتھ ہیں۔ پیڈرو کے دو ساتھی اندر تھے۔ ایک شاید مر گیا ہے، ایک زندہ ہے۔" میں نے کہا۔ "عرشے پر کون ہے؟"

"باقی سب لوگ، وہ نکل کے جا نہیں سکتا۔"

"اس کے لیے میں نے دوسرا بندوبست کیا ہے۔" میں نے کہا۔ "سامنے سے مت آنا، وہ فائر کر دے گا..."

اسی وقت شیشہ ٹوٹنے کی آواز آئی۔

راجندر سنگھ نے کہا۔ "نکل گیا وہ حرمزادہ، سمندر میں کود گیا۔"

محسن ایک دم واپس بھاگا۔ میں نے زینے پر اس کے قدموں کی آواز سنی۔ سردار جی کی بات میں اتنا یقین تھا کہ میں بھی باہر جانے کے لیے لپکا لیکن پھر ایک خیال نے مجھے روک لیا۔ میرے پیچھے دوڑنے والے سردار جی مجھ سے ٹکرا گئے۔

"کی ہویا جے بادشاہو؟" انھوں نے ناک کو ہلا جُلا کے کہا۔

"سردار جی! کون سا سچ زیادہ قابلِ اعتماد ہوتا ہے؟ جو آدمی اپنے کانوں سے سنے یا وہ جو آنکھوں سے دیکھے؟"

"کس کی آنکھوں سے؟" سردار جی نے ایک منطقی سوال کیا۔

مگر میں نے کہا۔ "یہ بہت موٹی سی بات ہے۔ ہم نے صرف شیشہ ٹوٹنے کی آواز سنی ہے۔ بندے کو فرار ہوتے نہیں دیکھا۔ اور یہ بندہ کوئی احمق نہیں ہے۔ انتہائی عیار آدمی ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اس نے راستہ صاف کرنے کے لیے دھوکا دیا ہو یا ہمیں سامنے بلا کے مارنے کے لیے یہ چال چلی ہو۔"

"پھر کیا کرنا چاہیے؟" وہ سر کھجا کے بولا۔

"انتظار۔" میں نے کہا۔ "محسن اوپر گیا ہے۔ عرشے پر جو دوسرے لوگ موجود ہیں، اُن سے بچ کے پیڈرو کے نکلنے کا سوال ہی نہیں، اسے وہ پانی میں نظر آتے ہی شکار کر لیں گے۔ وہ بڑے ماہر شکاری ہیں۔"

"یہ استاد پیڈرو کون ہے؟"

"یہ بھی شکاری ہے۔" میں نے کہا۔

"عجیب بات ہے۔ تم بھی شکاری ہو، وہ بھی شکاری اور شکار کرتے ہو ایک دوسرے کا۔"

"سردار جی! دُنیا جب سے وجود میں آئی ہے، ایسا ہی ہو رہا ہے۔ شاید اس سے بھی پہلے، ہمارے عقیدے کے مطابق... شیطان نے جنت میں باوا آدمؑ کو شکار کیا۔ شیطان آج بھی انسان کا شکاری ہے۔ چنانچہ کیا سیاست کیا تجارت، ہر جگہ چھوٹے اور بڑے شکاری ہیں، سامنے بھی اور پردے کے پیچھے بھی۔ لیلیٰ بھی شکاری ہے اور مجنوں بھی۔"

"بلّے بلّے... کیا سوہنی بات کی ہے بادشاہو آپ نے۔" سردار جی نے بے حد متاثر ہو کے کہا۔

عرشے کے اوپر سے مجھے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اگر پیڈرو نے سمندر میں چھلانگ ماری تھی تو اب تک اس

پر کسی نے فائر کیوں نہیں کیا؟ اب تو سورج اتنا بلند ہو چکا ہے کہ پیڈرو چھپا نہیں رہ سکتا۔ کہیں وہ پانی کے نیچے ہی نیچے نہ نکل جائے۔ مگر یہ ساکت پانی نہیں ہے، لہریں خود اسے اچھال دیں گی، اور تیر کر وہ کتنی دور جا سکتا ہے؟ زیادہ سے زیادہ پچاس گز۔ سمندری لہروں سے لڑنا کوئی آسان کام ہے۔ پھر یہ خاموشی کیسی؟ اگر کریم بلوچ اور دوست محمد بھی ہیں تو ان کو کچھ کرنا چاہیے۔ ایسے احمقوں کی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھتے رہے تو وہ نکل جائے گا۔ محسن خود چھلانگ مار دے، دوست محمد کود جائے۔ کسی کو تو نیچے جا کے دیکھنا چاہیے۔

میرا نروس بریک ڈاؤن ہونے لگا۔ ایک طرف یہ خیال تھا کہ پیڈرو نے شیشہ توڑ کے ہمیں دھوکا دینے کی کوشش کی ہوگی۔ چنانچہ مجھے اس محفوظ پناہ گاہ سے نکل کے اس کا نشانہ نہیں بننا چاہیے۔ دوسری طرف محسن کی طرف سے پیڈرو کے بارے میں کوئی اطلاع نہ ملنے سے مجھ پر جھنجلاہٹ سوار تھی۔

بالآخر انتظار میری قوتِ برداشت سے باہر ہو گیا۔ میں نے اللہ کا نام لے کر دوڑ لگائی اور درمیانی راستے سے سیدھا گزر گیا۔ ہر قدم پر مجھے کسی گولی کا انتظار رہا لیکن اس سے میری رفتار میں کوئی فرق نہیں آیا۔ مخالف سمت کے زینے سے محسن نیچے آرہا تھا۔ گل اس کے پیچھے تھی۔

"کیا ہوا؟" میں نے کہا۔

"کچھ نہیں، وہ نظر ہی نہیں آیا۔" محسن بولا۔

"تم صرف ایک طرف دیکھتے رہے ہو گے۔" میں نے کہا۔ "وہ چالاک آدمی لانچ کے نیچے سے گزر کے دوسری جانب نکل گیا ہوگا۔"

محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "ایک طرف میں تھا۔ دوسری طرف گل تھی اور سمندر میں چھپنے کی تو کوئی جگہ ہے نہیں۔ یہ"

"وہ دونوں لانچوں کے درمیان نہ ہو...؟"

"اب دونوں لانچوں کے درمیان پچاس گز کا فاصلہ ہے۔" محسن نے کہا۔ "پہلے دوست محمد نے لوہے کے رسّے کا ہک باندھ دیا تھا مگر پھر وہ رسّا ٹوٹ گیا۔ جب آگے والی لانچ چلی تھی۔"

"اچھا وہ جھٹکا اسی کا تھا۔" میں نے یاد کرتے ہوئے کہا۔ "مگر یار، یہ کیسے ممکن ہے؟"

"یہ تو ممکن ہے کہ وہ اندر رہی ہو۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ سمندر میں ہوتا تو ہم اسے دیکھ لیتے۔ بیک وقت چار افراد کی نظریں اسے تلاش کر رہی تھیں۔"

"چار کون؟" میں نے کہا۔

"دوست محمد اور کریم بلوچ بھی تو تھے۔ دوست محمد کا نشانہ اچھا ہے۔ کریم بلوچ کا نشانہ کیسا بھی ہو، نگاہ تو ٹھیک ہے۔ اگر وہ کچھ دیکھتا تو شور ضرور مچا دیتا، گولی ضرور چلاتا لیکن ہم سب کے ساتھ دھوکا نہیں ہوا۔ اتنی دیر تک وہ پانی کی گہرائی میں چھپ کے بھی سفر نہیں کر سکتا تھا کہ تیرتا ہوا فرلانگ بھر دور جا کے نکلے، آخر وہ آدمی ہے، آب دوز نہیں۔ میں نے تو اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا تھا کہ وہ دونوں میں سے کسی ایک لانچ کے نیچے کوئی کونا یا کیل تھامے اور سر پانی سے نکال کے روپوش نہ ہو۔ وقفے وقفے سے ناک باہر نکال کے سانس لیتا جائے اور لانچ کے نیچے موجود رہے مگر ایسا بھی نہیں ہے۔ دوست محمد نے اور پھر میں نے دوربین سے کونا کونا دیکھ لیا ہے۔"

"مگر وہ اندر بھی تو نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ تو نے کیسے جانا؟" محسن بولا۔

"وہ اندر ہوتا تو مجھ پہ فائر نہ کرتا۔ میں سامنے سے گزر کے آیا تھا۔" میں نے کہا۔

"اس کے فائر نہ کرنے سے یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ وہ اندر نہیں ہے۔ ممکن ہے اس نے ایسا عمداً نہ کیا ہو یا اس کے پاس خالی ریوالور رہ گیا ہو۔ سو امکانات ہیں۔"

"تو نے ٹھیک کہا۔" میں نے ایک دم چٹکی بجائی۔ "اس نے دھوکا دیا ہمیں محسن، ایک بار نہیں دو بار۔ پہلے اس نے شیشہ توڑ کر یہ ظاہر کیا کہ وہ نکل گیا۔ تم اسے تلاش کرنے اوپر دوڑے لیکن وہ اندر ہی چھپا رہا۔ مجھے شک ہوا تھا کہ وہ عیار آدمی ایسا کر سکتا ہے چنانچہ میں نے سامنے سے گزرنے کا رسک نہیں لیا۔ اس نے ہمیں بے وقوف بنا کے مہلت حاصل کرلی۔ اب وہ اندر نہیں ہوگا۔ واقعی نہیں ہوگا۔"

میں واپس دوڑا۔ میرے پیچھے سردار جی اور ان کا ساتھی بھی آگئے تھے مگر ہماری گفتگو میں مخل نہیں ہوئے تھے۔

اب سردار جی نے مجھے روکا۔ "کدھر جاتے ہو بادشاہو!"

میں نے کہا۔ "تم بھی آؤ میرے ساتھ۔ ممکن ہے دروازہ توڑنا پڑے۔"

"لیکن... ایسے... ذرا خیال سے...؟" سردار جی نے میرا ساتھ دیتے ہوئے کہا۔ "گولی بڑی نامراد شے ہے۔"

"ڈرو مت، اب کچھ نہیں ہوگا۔" میں نے کہا۔ "گولی کون چلائے گا جب اندر کوئی بھی نہیں ہوگا؟"

سردار جی کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ "چلتے چلتے اندر بھی نہیں اور باہر بھی نہیں، بندہ ہے کہ بھوت، بڑا استاد ہے...؟"

میں نے دروازے کو لات ماری۔ دروازہ میری توقع کے مطابق اندر سے بند تھا۔ محسن کی طرف میں نے اس وقت دیکھا جب میں پلٹا۔

"تو... تیرا دماغ خراب ہے۔" میں نے چیخ کے کہا۔ "اوپر جا... تم دونوں جاؤ، وہ اب تک نکل گیا ہوگا۔ وہ یہی تو چاہتا تھا۔"

بات فوراً محسن کی سمجھ میں آگئی۔ وہ واپس دوڑا۔ اس کے پیچھے گل نے دوڑ لگائی۔ اپنے سائز سے بڑے جوتوں کے ساتھ اس کا دوڑنا ایک مضحکہ خیز منظر پیش کرتا تھا۔ میرے ساتھ سردار جی نے ایک فولنگ کے شانہ ملایا۔

"اب ذرا پیچھے ہٹ کے، ایک ساتھ۔ واگورو کا خالصہ۔"

"یا علی مدد۔" میں نے بھی جوابی نعرہ لگایا۔ ہم دونوں ایک ساتھ دروازے سے ٹکرائے۔ دروازہ کچھ کمزور ثابت ہوا۔ میں تو سنبھل گیا مگر سردار جی سیدھے اندر گئے اور پھر منہ کے بل گرے۔

"او تیری ماں نوں لے جان چور۔" انھوں نے گھٹنے سہلاتے ہوئے اُٹھ کر کہا۔

"نکل گیا چور تو۔" میں نے مایوسی سے خالی کیبن کو دیکھا۔

"میں ادھر دیکھتا ہوں۔" سردار جی لنگڑاتے ہوئے دوسرے ننھا چھوٹے سوراخوں کی طرف گئے۔ مگر صاف نظر آتا تھا کہ وہ برقی گول شیشے والے سوراخ سے باہر اتر گیا ہے۔ مجھے عقبی دیوار کے ایک ہک سے وہ رسّی بھی بندھی ہوئی نظر آگئی جو پورٹ ہول سے گزر کر پانی میں ڈوب گئی تھی۔

اب مجھے اپنی عقل پر ماتم کرتے ہوئے بھی شرم آتی تھی۔ کتنی آسانی سے اس نے راستہ بنا لیا۔ وہ صرف عقل کی مدد سے محصور ہونے کے باوجود آزاد ہو گیا اور ہم جو آزاد تھے، ادھر سے اُدھر خیال کے گھوڑے بحرِ ظلمات میں دوڑاتے رہ گئے اور خود لدھوں کی طرح دوڑتے پھرے۔ اس نے شیشہ توڑنے کے بعد انتظار کیا۔ وہ اوپر سے آنے والی سب آوازوں کو سنتا رہا۔ یقیناً محسن اور گل، دوست محمد اور کریم سب چلا چلا کے ایک دوسرے کو ہدایات دیتے رہے ہوں گے۔ تم ادھر دیکھو، تم اُدھر جاؤ۔ وہ اِدھر سے نہ نکل جائے۔ استاد، کریم... تم کیا کر رہے ہو؟ گل دوربین پکڑلو، دوڑو، بھاگو۔

جب یہ شور ختم ہو گیا اور اس نے اپنے کانوں سے سن لیا کہ اسے تلاش کرنے والے مایوس ہو چکے ہیں اور اس یقین کے ساتھ واپس نیچے آگئے ہیں کہ وہ باہر نکلا ہی نہیں تو وہ اطمینان سے کوئی آہٹ پیدا کیے بغیر پانی میں خاموشی سے اتر گیا۔ اس نے یہ بھی اندازہ کر لیا ہوگا، سکندرِ اعظم تو اپنی پناہ گاہ سے باہر آئے ہی نہیں اور اسے کسی آواز بھی اوپر سے سنائی دینے والی آوازوں میں سنائی نہ دی ہوگی۔ میری ہی آواز کو وہ سب سے الگ شناخت کر سکتا تھا پھر کسی نے مجھے میرا نام لے کر بھی نہیں پکارا ہوگا۔ اس نے دروازے کو اندر سے بند کر دیا تاکہ اسے توڑنے میں بھی کچھ وقت لگے۔ میں اس کی گولی کا نشانہ بن جانے کے ڈر سے ایک طرف رہا۔ دوسری طرف اسے تلاش کرنے والے لوٹ آئے۔ یہی وہ وقت تھا جب استاد پیڈرو باہر گیا۔

"آجاؤ سردار جی، اب کوئی فائدہ نہیں۔" میں نے کہا۔ "اوپر چل کے دیکھتے ہیں۔"

"ہاں جی، یہ تو بڑی عجیب بات ہو گئی۔"

اوپر محسن اور اس کے ساتھ باقی سب لوگ پھر مستعد ہو گئے تھے۔ محسن دوربین لگائے دور دور دیکھ رہا تھا۔

"اسے کم سے کم دس پندرہ منٹ مل گئے۔" میں نے افسوس سے سر ہلا کے کہا۔

"دس پندرہ منٹ میں وہ دس پندرہ میل تو جا نہیں سکتا بادشاہو۔" سردار جی نے کہا۔ "آخر بندہ بشر ہے۔"

انھوں نے یہ پہلی عقلمندی کی بات کی تھی۔ "آپ نے ٹھیک کہا۔ ہم اسے تلاش کریں گے۔ محسن، تو استاد کے ساتھ اپنی لانچ پر جا۔"

"تم بھی زیادہ دور مت جانا۔" محسن نے دوربین مجھے تھماتے ہوئے کہا۔

"ایک میل کے دائرے میں۔ ایک میل قطر کے دائرے میں ہم مخالف سمتوں سے چلیں گے۔" میں نے کہا۔ "ہم کلاک وائز جائیں گے۔ تم دوسری طرف سے یعنی اینٹی کلاک وائز آؤ گے۔ ہم ایک دوسرے کو کراس کریں گے اور اپنا اپنا چکر پورا کریں گے۔ اس طرح ایک راؤنڈ میں دو مرتبہ دیکھیں گے۔ پھر دائرہ تھوڑا سا وسیع کریں گے۔ تقریباً دو فرلانگ جس کا مطلب ہے کہ ہم ڈیڑھ میل قطر میں اسے تلاش کریں گے لیکن یہ حد ہے، اس سے آگے وہ نہیں جا سکتا۔"

"آئے آئے سر۔" محسن نے عین سیلرز کے انداز میں یس سر کہا اور دوست محمد کو اشارہ کیا کہ لانچ قریب لائے۔

"سردار جی، آپ بھی گڈی اسٹارٹ کرو۔" میں نے کہا۔

"کیوں نہیں، ابھی لو۔" سردار جی نے کہا۔

محسن نے گل کو ڈانٹا۔ "یہ تم کیا میرا دُم چھلا بنی ہوئی ہو۔"

"کیا کروں پھر میں۔" گل جھلا کے بولی۔ "اور کسی کی دُم ہے ہی نہیں۔"

سردار جی رُک گئے چلتے چلتے... "او ئے بادشاہو، ایہہ تے کڑی اے۔" انھوں نے گل کی بات پہ غور فرما کے کہا۔ "زنانہ

انٹرپول۔"

مجھے گل کے جواب نے محظوظ کیا۔ ان حالات میں جب ہم سخت اعصابی کشیدگی کا شکار تھے، ایک مسکراہٹ کسی سکون آور دوا کی گولی سے زیادہ مؤثر ثابت ہوئی۔ گل اب اسی لانچ پر رک گئی تھی۔ اور گویا محسن سے ناراض تھی۔ جب دوست محمد اپنی لانچ لے آیا تو میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا مگر وضاحت کے لیے وقت نہیں تھا۔

چنانچہ میں نے محسن سے کہا "تم یہیں ٹھہرو۔ دوست محمد کے ساتھ میں جاؤں گا۔"

محسن نے گل پر ایک قہر آلود نگاہ ڈالی جیسے پروگرام میں اس فوری تبدیلی کی ذمے دار وہی ہے۔ گل کا پارہ اور چڑھ گیا۔

"میں آپ کے ساتھ چلوں گی، سکندر بھائی" اس نے مجھ سے مخاطب ہو کے اور محسن کو گھور کے کہا۔ میری اجازت لیے بغیر اس نے اپنی لانچ پر چھلانگ مار دی۔

میں نے دوست محمد کو سمجھایا کہ ہمیں اب کیا کرنا ہے۔

"ہم سمجھ گیا بابا، پر ابھی اپن کو ایک سگریٹ تو دو۔ سویرا ہو گیا" وہ بولا۔

"سگریٹ" میں نے کہا" وہ تو خیر میں لاتا ہوں۔ تم لانچ کا راستہ کریم کو بتاؤ اور میرے ساتھ ساتھ آؤ۔"

میں نیچے جانے لگا تو گل نے کہا "میں کیا کروں؟"

"تم آنکھیں کھلی رکھو اور چاروں طرف دیکھو۔ پانی میں جو چیز نظر آئے اسے گولی مار دو" میں نے کہا "میں ذرا لاشیں ڈھونڈنے جا رہا ہوں۔ ابھی پانچ منٹ میں آتا ہوں۔"

جس لاش کے جسم پر میرے کپڑے تھے اس کو الٹ پلٹ کے میں نے جیبوں کو دیکھا۔ دوست محمد کے اسپیشل سگریٹ اس کی اندر والی جیب میں محفوظ تھے۔ اسے ایک سگریٹ دے کر باقی میں نے اپنی یونیفارم کی جیب میں رکھ لیے۔ کریم بلوچ نے لانچ کو اپنے استاد کی ہدایت کے مطابق چلانا شروع کر دیا تھا۔

میں نے ایک لاش کو اٹھایا اور سمندر میں پھینک دیا۔ "استاد، ایک بات غور سے سنو" میں نے کہا "یہ بات میں کسی اور کے سامنے کہنا نہیں چاہتا تھا۔"

استاد نے سگریٹ کا لمبا کش لے کر سر ہلایا "بولو۔"

"جب یہ تلاش کا کام ختم ہو جائے گا" میں نے دوسری لاش کو اٹھاتے ہوئے کہا۔ "تم لوگ لانچ لے کر واپس چلے جاؤ گے۔"

"واپس؟ کدھر... کراچی؟"

"ہاں، واپس کراچی" میں نے کہا اور تیسری لاش کی طرف چل پڑا۔

"اور تم... کیا کریں گا؟"

"ہم، یعنی میں، گل اور محسن۔ ہم اس انٹرپول کی لانچ میں جائیں گے" میں نے تیسری لاش کو بھی سپردِ آب کر دیا۔

"ابھی اپن کو سمجھ نہیں پڑا" دوست محمد نے کہا۔

"دیکھو استاد! دشمن کا ایک بہت خطرناک آدمی نکل گیا ہے۔ اگر وہ نہ ملا تو یہ بات یقینی ہے کہ وہ کسی ... بمبئی پہنچ جائے گا۔ اسے ہماری منزل کا علم ہو گیا ہے ... لانچ کو بھی دیکھ لیا ہے۔ ہم اس لانچ میں گئے تو ایسے پکڑے ... گے جیسے چوہے دان میں چوہا سیدھا آتا ہے اور پکڑا جاتا ... ان کو بمبئی میں انتظار کرنے دو۔ تم واپس کراچی جا کے شیخ ... اکرام شیخ کو جانتے ہو نا؟ اس کی ٹیکسی کا نمبر میں تم کو بتا دوں ... تمہاری مدد کرے گا۔"

"کاہے کا واسطے۔ اپن کو مدد نہیں مانگتا بابا" دوست ... نے خفگی سے کہا۔

"تمہاری نہیں بلکہ کریم بلوچ کی مدد کرے گا وہ ... گا اور مشتری کو بچائے گا..." میں نے کہا۔

"ان کو ہم بچا سکتا ہے... اپن کو کسی شیخ میخ کا ... نہیں ہے۔ لیکن یہ جو تم بولا۔ یہ ایک دم غلط بولا۔"

"کیا غلط بات کہی ہے میں نے استاد" میں نے اس ... کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"ارے بابا، تم لوگ خالی ایسا بات بولتا کہ بڈھا ... کو باپ کا مانک جانتا" دوست محمد نے کہا "ابھی باپ ... چلو تم جاؤ۔ ادھر جاؤ جدھر تمہارا دشمن لوگ بھرتا ہے۔ وہ ... کو مارتا ہے... تو مارے۔ کریم اور اس کا پاگل عورت کو ..."

مجھے سخت شرمندگی ہوئی۔ "یہ تم نے کیسے سمجھ لیا استاد ... تمہاری زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ تمہاری ہی زندگی کی ... کہ میں نے لانچ بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ ہم تو بچ بھی جائیں گے لیکن ... تمہاری لانچ بمبئی میں پکڑی جائے گی اور اس میں ہم نہیں ..."

"ارے بابا، کاہے کو ایسا بولتا کہ لانچ پکڑا جائے گا ... سالا دوست محمد اپنا زندگی ایسا مانک گزارا، کبھی ادھر تو کبھی ... بمبئی، کلکتہ، مدراس سب اپنا واسطے کراچی کا جیسا ہے ... کتنا بار گیا۔ کوئی پاسپورٹ نہیں مانگا، مانگتا تو ہم کدھر سے لا... ادھر اپنا سب یار مارہے، اپنا برادری ہے۔ ادھر کا لوگ ... پاس آتا ہے۔ ہم ان کو مہمان رکھتا ہے۔ ہم کوئی سالا چر... سیدھا بندرگاہ جاوے اور پکڑا جاوے۔ نا بابا، اپن دس ... ہے۔ بمبئی کو گولی مارو۔ اپن اور کدھر اتریں گا۔ جدھر کوئی نہیں ... ادھر سے لانچ چھوڑ کے بمبئی... تم بولو کدھر آنے کا ہے۔"

"تم ساحل پر کہیں دور اتر کے آ جاؤ گے" میں نے کہا "یہ بات ہے تو پھر کوئی بات نہیں، لیکن تم ہمارے ساتھ نہیں چلو گے۔ میرا مطلب ہے، ہماری لانچ کے ساتھ۔ پھر تم کہاں ملو گے اور کب؟"

"ابھی تم بتاؤ، ہم سارا بمبئی دیکھا ہے۔"

"اچھا... تو پھر جمعرات کی رات، حاجی علی کی درگاہ پر" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ اپنی لانچ کو سیدھا ادھر لاوے گا۔ درگاہ شریف سمندر میں ہے" دوست محمد نے کہا۔

"سمندر میں؟" میں نے حیرانی سے کہا "کوئی جزیرہ ہے؟"

دوست محمد نے اقرار میں سر ہلایا "بہت بڑا درگاہ شریف ہے۔ ادھر سب آتا ہے، ہندو، پارسی، عیسائی اور مسلمان۔"

اوپر سے فائر کی آواز سن کے میں اچھل پڑا۔ گولی یقیناً گل نے چلائی تھی اور اس کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ اس نے پیڈرو کو دیکھ لیا ہے۔ میں تیزی سے اوپر پہنچا۔ گل ہاتھ میں ریوالور لیے خفت سے مسکرا رہی تھی۔

"کیا ہوا، کسے مار دیا؟" میں نے کہا۔

گل نے پانی کی طرف اشارہ کیا۔ ایک جگہ مجھے سطحِ آب پر سرخی دکھائی دی جو خون کی نشان دہی کرتی تھی۔ لیکن وہ ایک خاصی بڑی مچھلی تھی۔

"تم مچھلی کا شکار کرنے آئی ہو؟" میں نے کہا۔

"وہ... دراصل میں سمجھی تھی کوئی آدمی ہے۔"

"آدمی کی دو ٹانگیں ہوتی ہیں اور دو ہاتھ۔ اور مس گل، وہ مچھلی کی طرح انڈے بھی نہیں دیتا" میں نے کہا۔ "اس فرق کو ذہن میں رکھنا۔"

"تم نے کہا تھا کہ پانی میں جو چیز نظر آئے اسے گولی مار دینا" وہ بولی۔ "خیر اب میں محتاط رہوں گی۔ پہلے پوچھ لوں گی کہ آپ استاد پیڈرو ہیں اور جواب ہاں میں ملا تو فائر کروں گی، ٹھیک؟"

میں ہنس پڑا۔ "کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ تم مشتری کی مدد کرو اور بھوکوں کا پیٹ بھرنے کی تحریک میں حصہ لو۔ دس بج چکے ہیں اور کسی کو ایک پیالی چائے بھی نصیب نہیں ہوئی ہے۔ کچھ تو خدا کا خوف کرو۔"

اس کے جانے کے بعد میں نے اور دوست محمد نے متلاطم سمندر کے پانی کو اپنی نظروں سے کھنگالنے کا عمل جاری رکھا۔ اجلی دھوپ میں سمندر کا منظر دور دور تک بالکل واضح تھا۔ سطحِ آب سے اٹھنے والے بخارات نے ابھی تک حدِ نگاہ کو محدود نہیں کیا تھا۔ چنانچہ لانچ کے دونوں جانب دو فرلانگ تک پانی میں کوئی چھوٹی سی مچھلی بھی اچھلتی تو دکھائی دیتی تھی۔

محسن جس لانچ پر تھا وہ نسبتاً تیز رفتاری کے ساتھ اپنا چکر پورا کر رہی تھی اور ابھی ہم نے ایک تہائی فاصلہ طے کیا تھا کہ وہ دائرے کا دو تہائی حصہ مکمل کر چکی تھی۔ جب وہ میرے قریب سے گزرے تو میں نے ان سے رفتار کم رکھنے کو کہا تاکہ یہ فرق نہ رہے اور دو چکر ہم بھی پورے کر لیں۔ انٹرپول کی اس لانچ کی رفتار ہماری پرانی لانچ کے مقابلے میں دگنی ضرور تھی۔

ایک راؤنڈ پورا ہو جانے کے بعد رپورٹ نیگیٹو تھی۔ کسی نے پانی میں مچھلیوں کے سوا کوئی چیز متحرک نہیں دیکھی تھی۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق دوسرے راؤنڈ میں ہم نے دائرے کو بڑھا لیا۔ ناکامی میرے اعصاب پر اثر انداز ہونے لگی تھی۔ میں جھنجلاہٹ کا شکار تھا۔ پیڈرو آدمی تھا کوئی چھلاوا نہیں کہ بیچ سمندر میں غائب ہو گیا۔ نہ اس کا سراغ لانچ کے اندر ملا اور نہ باہر۔ آخری امکان جسے میرا ذہن قبول نہیں کرتا تھا، یہ تھا کہ پیڈرو فرار ہونے کے بعد ڈوب گیا۔

میں نے دوسرے چکر کے اختتام سے پہلے دوربین لگا کے مشرقی افق کی جانب دیکھا تو مجھے سطحِ آب پر ایک سیاہ دھبا سا دکھائی دیا۔ میں نے دوربین کو پھر فوکس کیا۔ دھبا واضح ہوا اور پھر غائب ہو گیا۔

میں نے دوربین دوست محمد کو دی۔ "تم دیکھو، تھوڑا سا شمال مشرق کی جانب۔ وہ کالی کالی چیز کیا ہے؟"

دوست محمد نے کہا "تم کیا سمجھتا ہے ابھی؟"

"وہ کسی آدمی کا سر بھی ہو سکتا ہے" میں نے کہا۔

دوست محمد نے دوربین کو گھما پھرا کے دیکھا اور تائید کے انداز میں سر ہلایا۔ میری مایوسی ایک دم نئی امید کی سنسنی میں ڈھل گئی۔

"لانچ کو ادھر موڑ لو" میں نے کہا "ہم اس کا پیچھا کریں گے، فاصلہ زیادہ نہیں ہے۔"

"ابھی ہم خود لانچ کو چلاوے گا" دوست محمد نیچے اتر گیا۔

چند منٹ میں لانچ نے رخ بدل لیا۔ کریم اوپر آ گیا۔ میں نے اسے دوربین دی۔

"تم بھی دیکھو، ادھر کیا یہ کوئی آدمی ہے؟" میں نے کہا۔

کریم نے اپنی نظر کے مطابق دوربین کو فوکس کیا۔ "مالک قسم، یہ آدمی کا کھوپڑی ہے" اس نے چلا کر کہا "ابھی سالا بچ کے کدھر جائیں گا۔"

میں نے پھر دوربین اس سے چھین لی۔ میرے دل کی دھڑکن اور لہو کی گردش تیز ہو گئی تھی۔ لانچ کی رفتار میں بھی اضافہ ہو گیا تھا اور ہم اس شخص کے قریب ہوتے جا رہے تھے۔

دوربین کے عدسے سے میں مسلسل اس ڈوبتی ابھرتی کالی سی چیز پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ جب فاصلہ دو فرلانگ سے بھی کم رہ گیا تو میرے لیے شک و شبہے کی کوئی گنجائش نہ رہی۔ وہ کوئی آدمی تھا جو سمندر کی موجوں سے لڑتا ہوا تیر رہا تھا اور ہم سے دور جانے کی سخت جدوجہد میں مصروف تھا۔

"بس اُستاد پیڈرو"، میں نے شدتِ جذبات میں دانت پیس کے کہا۔ "اتنا ... ... سمجھتے تم تم اس دن سے بھاگ رہے ہو جب تم نے میرے والد وزیر خان کو قتل کیا تھا پھر خرافت علی کو قتل کیا تھا اور تم نے بھاگتے ہوئے بھی اَن گنت خون کیے تھے مگر بالآخر تمھارا اپنا وقت آگیا ہے۔ تم اب تک وحشی انسانوں کے جنگل میں روپوش ہونے میں کامیاب رہتے تھے لیکن یہ سمندر ہے۔ تمھارے لیے اب کوئی جائے پناہ نہیں۔ ہاں تمھاری لاش کے لیے یہ ایک قبرستان ہے ...!"

کریم بلوچ میری خود کلامی پہ حیران تھا۔ اس نے یہی سمجھا ہوگا کہ صاب کا دماغ چل گیا ہے۔ لیکن وہ میرے جذبات کا اندازہ کیسے کرسکتا تھا۔ ایک بہت بڑا، اپنے تجربے، اپنی فریب کاری اور اپنی طاقت پر غرور کرنے والا شکاری دامِ اجل میں آگیا تھا۔

میں نے اس پر نشانہ لیے بغیر فائر کیا۔ اتنی دور سے میری گولی ایک ایسے ہدف کو کیسے نشانہ بنا سکتی تھی جو بہت چھوٹا تھا اور لہروں کے ساتھ متحرک تھا۔ خود میں لانچ پر کھڑا ہوا تلاطم کے ساتھ حرکت کر رہا تھا لیکن میں اُسے دہشت زدہ کرنا چاہتا تھا۔ دوسرا فائر کر کے میں نے ایک قہقہہ لگایا۔

"پیڈرو ...! بھاگ ... میں تجھے موقع دیتا ہوں"، میں نے چلّا کے کہا، یہ جانتے ہوئے بھی کہ سمندر کے شور میں میری آواز اُس کے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی۔ اب میں دوربین کے بغیر بھی اُس کے ہاتھوں کی دیوانہ وار جدوجہد کو دیکھ سکتا تھا۔ وہ بار بار پانی میں غائب ہو جاتا تھا پھر اُبھر آتا تھا اور آگے بڑھنے کے لیے سمندر سے لڑنے لگتا تھا۔ یہ زندگی کی محبت تھی اور موت کا خوف تھا جو اُسے شکست تسلیم نہ کرنے پہ مجبور کرتا تھا ورنہ اب مقابلہ بے سود تھا۔ میں اندازہ کرسکتا تھا کہ وہ کتنا تھکا ہوا ہوگا۔ وہ لانچ کی تیز رفتاری کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا لیکن وہ پاگلوں کی طرح بھاگ رہا تھا۔ وہ ہمارے ہاتھوں مرنے کے عذاب سے دہشت زدہ تھا۔

میں نے اس پر دو گولیاں اور چلائیں۔ میں اس پوزیشن میں تھا کہ کوشش کرتا تو اُس کو نشانہ بنا لیتا مگر میں اُسے اتنی آسانی سے مرنے کی اجازت دینے کے حق میں نہیں تھا۔ میں اُسے زندہ پکڑنا چاہتا تھا۔

محسن نے یہ دیکھتے ہوئے کہ میں اپنی لانچ کے ساتھ دائرے سے نکل کے سیدھا جا رہا ہوں تو انٹرپول کی لانچ کا رُخ بھی ہماری طرف کر دیا لیکن وہ ابھی بہت پیچھے تھے۔

اچانک ہماری لانچ نے ایک جھٹکا لیا اس کا انجن کھانس کھانس کر بند ہوگیا۔

میں نے کریم کی طرف دیکھا۔ "یہ کیا ہے؟"

"دیکھیے کا صاب۔ ابھی استاد ... ... خرابی ہو... گا تو ٹھیک کر دیں گا"، وہ بولا اور وہاں سے بھاگ گیا۔

گل ایک ٹرے کے ساتھ میرے قریب آئی۔ "کیا وہ ... گیا ہے؟ کریم بہت بدحواس تھا۔"

میں نے ہنس کے کہا۔ "ہاں۔ وہ دیکھو، وہ ہے اُستاد پیڈرو۔ میرے باپ کا قاتل اور مجھے قتل کے جرم میں پھانسی کے تختے کی طرف لے جانے کی سازش کرنے والا شکاری ... آج موت اسے کہاں لے آئی۔"

"میں نے تین بار فائر کی آواز سنی تھی"، وہ بولی۔ "کیا مارا گیا ... وہ تو زندہ ہے۔"

"پہلے گرفتار تو کرلیں اُسے"، میں نے کہا۔

"اچھا لو چائے پیو"، گل نے کہا۔ "ناشتا بھی کرلو۔"

میں نے صرف چائے کا مگ اٹھا لیا۔ میری نظر اُس ... پر جمی ہوئی تھی جو اب پھر سو گز دور چلا گیا تھا۔ لانچ کا انجن بند ... مگر مجھے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ وہ ایک میل آگے بھی نکل جاتا تو فرق نہ پڑتا۔ سمندر کی بیکراں وسعت کو عبور کرنا اُس کے ... ناممکن تھا۔

محسن کی لانچ قریب آئی اور ہماری لانچ کے متوازی ہو... محسن چھلانگ مار کے آیا اور اُس نے دوربین مجھ سے لے لی۔

"یہ وہی ہے؟" محسن نے کہا۔

"اور کون ہوسکتا ہے"، میں نے کہا۔ "کوئی اور ہوتا تو ... بھاگتا کیوں۔ اُلٹا ہماری طرف آتا اور خدا کا شکر ادا کرتا کہ اُس کی جان بچانے والے پہنچ گئے۔"

محسن نے اقرار میں سر ہلایا۔ "پھر لیٹ کیوں گئے تم لوگ؟"

"انجن بند ہوگیا ہے"، میں نے کہا۔ "چلتے ہیں ابھی ... ناشتا وغیرہ کرلیں۔"

"ناشتا"، محسن چلّایا۔ "آہ ... یہ کیا یاد دلایا تم نے ... تک تو مجھے احساس نہیں تھا لیکن اب تو شاید میں بھوک ... فوت ہو جاؤں۔"

"ہو جاؤ شوق سے"، گل نے کہا۔ "تمھارے لیے ... ناشتا نہیں بنایا ہے۔ اپنے لیے اور سکندر بھائی کے لیے بنایا ہے۔"

"ایسی کی تیسی تمھارے سکندر بھائی کی۔" محسن نے چائے کا مگ مجھ سے چھین لیا اور پھر ٹرے میں سے ایک ساتھ چار سلائس اٹھا لیے۔ "یہ تو بابا پیٹ کا سوال ہے بابا۔ اس میں نہ کوئی کسی کا بھائی نہ یار۔ اور بہت خیال ہے اپنے سکندر بھائی کا تو انھیں اپنے حصے کا ناشتا دے دو۔"

"مجھے بھوک نہیں ہے فی الحال"، میں نے چائے کا دوسرا مگ لے لیا۔

"یہ اور بھی اچھا ہے۔ ویسے یار ... یہ گل ہے بڑی اچھی لڑکی۔ بُرا تو کسی بات کا مانتی ہی نہیں"، محسن مجھ سے مخاطب رہا۔ "اور واہ واہ! کیا ذائقہ ہے چائے کا؟ کیا لذت ہے سلائس میں۔ سبحان اللہ ایسی جس کے گھر جائے گی ..."

گل نے احتجاجی انداز میں واک آؤٹ کیا مگر مسکراتے ہوئے۔

"ساری عمر روئے گا وہ اپنا سر پکڑ کر"، محسن نے بلند آواز میں کہا۔ گل کا موڈ پھر آف ہوگیا۔

"کیا خیال ہے۔ دوسری لانچ میں چلیں؟" محسن بولا۔

"نہیں ... انھیں بھی کہو کہ کچھ کھا پی لیں۔ چاہیں تو یہاں آجائیں یا ناشتا وہیں لے جائیں"، میں نے کہا۔ "گل اور مشتری مل کے کام کر رہی ہیں۔"

"یار، وہ کیا ہے؟" محسن نے ایک دھبّے کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے پلٹ کے دیکھا۔ "یہ ... کوئی ایسی ہی لانچ ہے۔ یہ ایک دم کہاں سے نمودار ہوگئی؟"

"ایک دم تو نہیں آسکتی۔ ہم اُدھر دیکھ ہی نہیں رہے تھے"، محسن نے کہا۔

میں نے دوربین لگا کے دیکھا۔ "یہ تو ادھر ہی آرہی ہے۔ لیکن ابھی بہت دور ہے۔ تین چار میل یا اس سے بھی زیادہ۔ سمندر میں زیادہ فاصلے بھی کم لگتے ہیں۔"

لانچ کا انجن دو بار اسٹارٹ ہو کے بند ہوا اور تیسری کوشش میں چل پڑا۔ محسن نے واپس اپنی لانچ پر چھلانگ لگائی۔

"تم مت آنا ادھر"، میں نے کہا۔ "انٹرپول کی یہ لانچ کسی کی نظر میں نہ آئے تو اچھا ہے۔ ہمیں اسی میں آگے جانا ہے۔"

ایک بار پھر لانچ کی رفتار میں اضافہ ہوا۔ اب میری نگاہ بیک وقت استاد پیڈرو پر اور قریب آنے والی لانچ پر تھی۔ آہستہ آہستہ میری تشویش میں اضافہ ہونے لگا۔ یہ نہ ہو کہ وہ پیڈرو کو بچا لیں۔ پیڈرو پوری کوشش کرے گا کہ انھیں متوجہ کرلے۔

اس بار میں ریوالور نکال کے پوری طرح مستعد ہوگیا۔ جو لانچ بہت دور لگتی تھی وہ اب صاف نظر آنے لگی تھی۔ ادھر میرے اور پیڈرو کے درمیان فاصلہ سو گز سے بھی کم رہ گیا تھا۔ میں نے احتیاط سے نشانہ لے کر فائر کیا۔ پیڈرو کا سر اوپر اٹھا اور غائب ہوگیا۔ میں انتظار کرتا رہا۔ وہ دوبارہ سطحِ آب پر آیا تو میں نے بیک وقت دو فائر کیے۔ پچاس گز کے فاصلے سے میں اس کی موت ... سکتا تھا لیکن میرا نشانہ خطا گیا۔ لہریں پیڈرو کو اُچھال رہی تھیں اور میرے لیے توازن قائم رکھنا مشکل سے مشکل ہوتا جا رہا تھا۔

سخت مشتعل ہو کے میں نے پھر نشانہ لیا اور گولی چلائی۔ وہ اب اتنے کم فاصلے پر تھا کہ میں نے اس کے چلّانے کی آواز صاف سُنی۔ وہ آخری بار اُبھرا اور غائب ہوگیا۔ جب لانچ اُس جگہ پہنچی جہاں پیڈرو میری گولی کا نشانہ بنا تھا تو وہاں مجھے پانی میں تازہ خون کے دھارے نظر آئے۔ خوشی کی ایک بے قابو کر دینے والی لہر نے میرے وجود میں سنسنی پھیلا دی۔ پیڈرو کا میرے ہاتھوں قتل ہونا میری ایک بہت پرانی خواہش کی تکمیل تھی۔ اسے میں دنیا میں اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتا تھا۔ کسے معلوم تھا کہ میرے لہو میں دن رات دہکنے والی انتقام کی آتشِ سوزاں کو پیڈرو کا لہو کب سرد کرے گا۔ یہ انتظار بالآخر یہاں تمام ہوا۔ میں نے محسوس کیا جیسے ابھی ابھی میں نے جلاد کے ہاتھوں کی طرح لیور کھینچا ہے اور قتل کے جرم میں عدالتِ انصاف سے موت کی سزا پانے والے پیڈرو کا جسم سمندر میں غائب نہیں ہوا، پھانسی گھاٹ کے اندھے کنوئیں میں پہنچ گیا ہے۔

اب میں نے اس لانچ کو دیکھا جو مشکل سے تین چار فرلانگ دور تھی۔ یہ کوئی مسافر بردار لانچ تھی۔ مجھے فوراً اس وردی کا خیال آیا جو میرے جسم پر تھی۔ یہ وردی شک پیدا کر سکتی تھی کہ انٹرپول والے ایسی پرانی اور پرائیویٹ لانچ پر کیوں ہیں۔ میں نے کسی ناخوشگوار صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے خود روپوشی اختیار کر لینا بہتر سمجھا۔

میں نے نیچے جا کے دوست محمد کو ساری بات سمجھائی۔ "تم اوپر جاؤ استاد، اور کریم سے کہو کہ اپنا رُخ بدلے۔ ایک لانچ ادھر آرہی ہے۔ اس کا راستہ کاٹنے کی کوشش کرے۔ میں اور گل اس وردی میں اوپر نہیں جا سکتے"، میں نے کہا۔ "سمجھ رہے ہو نا میری بات کو؟"

"سمجھ گیا بابا۔ ابھی تم فکر مکر چھوڑو۔ اپن سب ٹھیک کرلیں گا"، دوست محمد نے مجھے تسلی دی۔ "یہ سمندر اپنا شہر ہے۔ اپنا وطن ہے۔"

"یہ ہوسکتا ہے کہ انھوں نے فائر کی آواز سنی ہو ..."، میں نے کہا اور دوست محمد کو اوپر جاتا دیکھتا رہا۔ ہماری لانچ ابھی

تک آگے بڑھ رہی تھی پھر اس کا رُخ تھوڑا سا بدلا دوسری لانچ کی آواز بہت قریب سے آئی۔

اوپر کریم بلوچ نے چلا کے کسی سے کچھ کہا، اُس کا دوسری لانچ پر سے کیا جواب دیا گیا، یہ میں نہ سن سکا لیکن دوست محمد نے قہقہہ مارا تو مجھے اطمینان ہوا۔ میں گل کے کمرے میں گھس گیا۔ وہ جوتے اور ٹوپی اتار کے بڑی بے تکلفی سے ٹانگ پر ٹانگ رکھے لیٹی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ ہڑبڑا کے اٹھی۔ اس کے بال شانوں پر بکھر گئے۔

"لیٹی رہو۔" میں نے سگریٹ جلا کے سامنے والی برتھ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "مشتری کہاں ہے؟"

"اپنے اور میرے لیے ناشتا بنانے گئی تھی۔ تم بہت خوش ہو؟"

"یہ میری زندگی کا ایک اہم دن ہے۔" میں نے کہا۔ "آج میں نے وہ قرض تو چکا دیا ہے جو ایک بیٹے کی حیثیت سے مجھ پر واجب الادا تھا۔۔۔ تمھیں کیا معلوم کہ میں نے کتنی مشکل سے انتقام کی آگ کو دبایا تھا۔ خود کو قائل کیا تھا کہ میری ذاتی دشمنی کے جذبات میرے اس مشن سے زیادہ اہم نہیں جس کا مقصد چند غداروں کو بے نقاب کرنا اور انھیں کیفر کردار تک پہنچانا ہے۔ لیکن جب یہ شخص میرے سامنے آتا تھا تو میرے زخم تازہ ہو جاتے تھے۔ میری نظروں میں میرے والد کا چہرہ آ جاتا تھا۔ جو انصاف مانگتا تھا۔ تم کو معلوم ہوگا کہ انھیں کیسے رسوا کن اور قابلِ صد ملامت طریقے پر، کتنی بے کسی و بے چارگی کا عذاب دے کر مارا گیا تھا اور مارنے والے یہی نمک حرام تھے!"

"مجھے معلوم ہے۔" گل نے کہا۔

"پاکستان میں میرے مصائب و آلام کی داستان کا حرفِ اوّل یہی شخص تھا۔" میں نے کہا۔ "آج اس کی اپنی داستان تمام ہوئی۔ کاش، یہ تماشائے عبرت میں ان سب کو دکھا سکتا۔ . . ."

"چلو چھوڑو سکندر بھائی۔ اُسے اپنے اعمال کی سزا اس دنیا میں تو مل گئی۔" گل نے کہا۔ "ابھی آخرت کی سزا باقی ہے جو زیادہ سخت ہوگی۔"

مشتری بڑبڑ کرتی اندر آ گئی۔ "لو صاحب جی۔ اچھا ہوا کہ میں نے کچھ زیادہ ناشتا بنا لیا۔ صبح سے تین بار تو بنا چکی ہوں۔"

"مگر میں نے تو ایک بار بھی ناشتا نہیں کیا اور نہ گل نے۔ ہم پر کیوں خفا ہو۔" میں نے کہا۔

"اجی، وہ آپ کا چہیتا کریم، اُس کے پیٹ کا دوزخ تو خدا ہی بھرے۔ ایک بار دونوں کے لیے ناشتا بنا کے لے گئی۔ اُس کے لیے اور اُستاد کے لیے۔ . . وہ سب چٹ کر گیا، پھر آپ کے لیے اور اُستاد کے لیے بنایا۔ اس میں بھی شامل ہو گیا۔ بس اب جلدی سے کھا لو وَرنہ وہ پھر آ جائے گا۔ قسم اللہ کی صاحب جی! ایسے راشن نہیں چلنے کا چار دن بھی۔" مشتری نے چائے بناتے ہوئے زبان کا استعمال جاری رکھا۔

"شادی کے بعد کیا ہوگا مشتری؟" میں نے کہا۔ "تم صبح سے شام تک پکاتی رہو گی اور وہ کھاتا رہے گا۔ دراصل اُس کے پیٹ میں جن ہے۔ وہ بے چارہ بھی کیا کرے۔"

"پیٹ میں جن ہے؟" مشتری کے ہاتھ میں چمچہ لرزنے لگا۔

"ہاں، کئی سال سے ہے۔" میں نے بے نیازی کے انداز کو برقرار رکھا۔ "بہت جتن کیے۔ بڑے زبردست عامل آئے مگر اُسے نکال نہ سکے۔ پھر ایک بہت بڑے جلالی قسم کے پیر صاحب کے پاس لے گئے اُسے۔ انھوں نے کہا کہ جن کیا جن کے باپ کو بھی نکال دوں میں۔ ابھی شاہِ جنات کو حکم دوں تو وہ اندر جائے اُسے کان سے پکڑ لائیں۔ مگر یہ سمجھ لو کہ گھر کا جن ہے، گھر سے جائے گا نہیں۔ ابھی تو بوتل میں بند ہے . . ."

"بوتل میں . . . کون سی بوتل میں؟" مشتری کو اس انکشاف نے بدحواس کر دیا تھا۔ "اس کے پیٹ میں کوئی بوتل بھی ہے؟"

"نہیں بھئی۔ انھوں نے کریم کو ایک بوتل سے تشبیہ دی تھی، ہر طرف سے بند جو ہے۔" میں نے کہا۔ "اب جن باہر آتا تو کس پر آتا۔ ظاہر ہے اُس کی بیوی پر۔"

"بیوی پر کیوں صاحب جی؟" مشتری کی حالت غیر ہو گئی۔

"جن تو عورتوں پر ہی آتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور کریم کے گھر میں بیوی کے سوا کون عورت ہوگی۔ چنانچہ کریم نے کہا کہ چھوڑو، اپن گزارا کریں گا جن کے ساتھ۔ ویسے خاصا بے ضرر سا جن ہے، ہاں کھانے کو کچھ نہ ملے تو پھر . . ." میں نے دونوں کانوں کو توبہ کے انداز میں چھوا۔

"پھر کیا ہوتا ہے؟" مشتری کانپتے ہوئے بولی۔

"بھئی سب کچھ ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "آخر وہ جن ہے، کلیجہ چبا لے، خون پی جائے کریم کا یا دل توڑ دے۔ بس تم خیال رکھنا کریم کو نہیں، جن کو مزے مزے کے کھانے کھلا کے خوش رکھنا۔ تمھیں کچھ نہیں ہوگا۔"

مشتری کے جاتے ہی گل نے ہنسنا شروع کر دیا۔ اب تک وہ بڑی مشکل میں تھی اور اُسے ہنسی ضبط کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

"آپ بھی حد کرتے ہیں سکندر بھائی۔ خواہ مخواہ اُسے دہلا دیا۔" گل نے کہا۔

"انگریز کہتے ہیں کہ مرد کے دل کا راستہ اس کے پیٹ سے گزرتا ہے۔" میں نے کہا۔ "میں نے مشتری کو کامیاب ازدواجی زندگی کا گر سکھا دیا ہے۔ وہ پیٹ کے جن کو قابو میں رکھے گی تو کریم اس کے قابو میں رہے گا۔"

اوپر سے دوست محمد نے مجھے آواز دی۔ "ابھی آ جاؤ۔ کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

میں نے اوپر جا کے دیکھا تو وہ لانچ کافی دور جا چکی تھی اور ہم اپنی دوسری لانچ کے قریب پہنچ چکے تھے۔

"کون لوگ تھے اس لانچ میں۔ اِدھر کیوں آئے تھے؟" میں نے کہا۔

"اِدھر اپن سے ملنے کا واسطے نہیں آیا تھا۔ اپنا راستہ پر جاتا پڑا تھا۔" وہ بولا۔ "اپنا کراچی کا لوگ تھا۔"

"یہ لانچ کراچی جا رہی تھی؟ تم پہچانتے تھے کسی کو؟"

"ہاں بابا۔ سب ہیرا پھیری والا لوگ تھا۔" دوست محمد نے کہا۔ "اِدھر کا آدمی اُدھر لاتا۔ مسلمان لوگ کو اُدھر سے پاکستان جانے کا ویزا نہیں ملتا۔ بوہت پریشانی سے ملتا ہے۔ اب کسی کو ایک دم جانے کو ہے۔ اس کا ماں مر گیا ہے ادھر یا شادی مادی ہے۔ کسی کا نوکری لگ گیا ہے، وہ کیسے آوے گا، سب مجبور لوگ ہے۔ آدھا خاندان انڈیا میں، آدھا پاکستان میں۔"

"یہ تو بہت غلط ہو رہا ہے دوست محمد۔"

"سب جگہ ہوتا ہے سکندر صاحب! اِدھر ولایت میں بھی ہوتا ہے۔ سارا دنیا سے لوگ اِدھر اُدھر جاتا ہے۔" دوست محمد نے کہا۔ "امریکا جاتا ہے اور سارا یورپ جاتا ہے۔ کیا پکڑا جاتا ہے؟ نہیں پکڑا جاتا۔ انڈیا کا مسلمان لوگ کیا کرے۔ اِدھر بوہت تنگ ہے۔ ابھی جس کو موقع ملتا ہے آ جاتا ہے۔"

ایک بار پھر دونوں لانچوں کے قریب آتے ہی ہم سب اکٹھے ہوئے۔ دوست محمد کو میں پہلے ہی سمجھا چکا تھا کہ اُسے کیا کرنا ہے۔ جب اس نے اعلان کیا کہ ہم واپس جا رہے ہیں تو کریم بلوچ کا چہرہ اُتر گیا۔

"تم یہ کیا بولتا اُستاد . . . ہم کیسے واپس جائیں گا؟"

"اسی لانچ میں جائے گا جیسے آیا تھا۔"

"لیکن اُستاد، خیال کرو مستری کا . . ."

"اپن کیا خیال کریں گا۔" دوست محمد نے کہا۔ "ابھی تو خیال کر اس کو کیا بمبئی لے جا کر فلم ہیروئن بنانے کا تھا، سالا چڑیا۔"

میں نے سب کی نظر بچا کے کریم کو آنکھ ماری۔ "اُستاد ٹھیک کہہ رہا ہے کریم۔ فی الحال تمھارا واپس چلے جانا ہی ٹھیک ہے۔"

"اور آپ لوگ . . ." کریم سر کھجا کے بولا۔

"ہم آ جائیں گے بعد میں۔" میں نے کہا۔

اس کے بعد آدھا گھنٹا عملِ انتقال میں گزرا۔ میں نے اور محسن نے اپنے تین سوٹ کیس انٹرپول کی لانچ پر منتقل کیے۔ کپڑے صرف ایک میں تھے جو میں نے سردار جی کو محض اُن کا شک دور کرنے کے لیے کھول کے دکھا دیا۔

سردار جی سخت کشمکش و پیچ میں تھے۔ ابھی تک اُن کو ہمارے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوا تھا اور وہ ہمارے ساتھ تھے تو صرف ایک جذبۂ احسان مندی کا اظہار کرنے کے لیے ہم نے انھیں بروقت مدد کر کے بچا لیا تھا وَرنہ معلوم نہیں اُن کا کیا ہوتا جیسے ان کے باقی ساتھی مارے گئے تھے ویسے ہی وہ بھی مارے جاتے۔

ابھی تک مقابلے کا آخری راؤنڈ ہی چل رہا تھا مگر ہیڈ رو کے مارے جانے کے بعد حملہ آوروں کا تو صفایا ہو گیا تھا۔ اُن کا ایک ساتھی زندہ بچا لیا گیا تھا جو تفتیش کے لیے محفوظ پڑا تھا۔ سردار جی کے پیشہ ورانہ فرائض کا تقاضا تھا کہ وہ اس واردات کی اطلاع فوراً اپنے مرکز کو یا دوسرے ساتھیوں کو دیں۔ لیکن عملی صورتِ حال یہ تھی کہ وہ آسمان سے گر کر کھجور میں اٹک گئے تھے۔ پہلے ایک خطرناک مجرموں کے گروہ نے انھیں یرغمال بنا لیا تھا۔ اب ہم انھیں اپنی مرضی کے مطابق استعمال کر رہے تھے۔ ہم نے اُن کی وردیاں پہن لی تھیں اور ہمارے پاس انھی کا اسلحہ تھا۔ ہم اُن کے میگا فون اور اُن کے واکی ٹاکی ایسے استعمال کر رہے تھے جیسے ہمارا نام بھی انٹرپول کے عملے میں لکھا جا چکا ہے۔

ممکن ہے سردار جی اور اُن کے برمی ساتھی کے درمیان کسی قسم کی گفتگو ہوئی ہو، جس میں انھوں نے ایک دوسرے پر اپنی تشویش ظاہر کی ہو لیکن ذریعۂ اظہار اُن کے درمیان کیا تھا۔ زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم۔ سردار جی اپنی مادری اور فادری زبان کے علاوہ انگریزی پر قادر تھے۔ اُن کا ساتھی برمی میں کبھی کچھ کہتا تھا تو معلوم نہیں سردار جی کیا سمجھتے تھے اور کیا نہیں سمجھتے تھے۔ اگر وہ تھوڑی بہت برمی سیکھ گئے تھے تو انھوں نے یہ بات ظاہر نہیں کی تھی۔ ایک دوسرے کی بات سمجھنے کا مسئلہ تو اس سے پہلے بھی ہوگا جب عملے کے سب ارکان ایک ہی لانچ پر دن رات ساتھ رہتے تھے لیکن اصل بات یہ ہے کہ زبان ایک مؤثر ذریعہ ضرور ہے مگر ابلاغ کے لیے ناگزیر نہیں ہے۔ انسان کی زبان جانور بھی سمجھ جاتے ہیں اور وہ جو کوئی زبان بول ہی نہیں سکتے اور گونگے کہلاتے ہیں، وہ بھی دل کی بات جان لیتے ہیں۔

محسن جب دوسرا سوٹ کیس اٹھا کے لایا تو گل اس کے ساتھ تھی۔ پیچھے کریم نے تیسرا سوٹ کیس سر پر اٹھا رکھا تھا اور

یہ دونوں سوٹ کیس خطرناک اسباب سے بھرے ہوئے تھے۔ ایک میں گولہ بارود اور اسلحہ تھا تو دوسرے میں کرنسی تھی اور جعلی دستاویزات تیار کرنے کا سامان تھا جو کپڑوں کے نیچے چھپا دیا گیا تھا۔

سردار جی نے کہا "بھئی یہ کیا ہو رہا ہے کڑی؟"

اور گل نے بڑی معصومیت سے جواب دیا "جی... ان میں زنانہ کپڑے ہیں میرے۔ آپ کو دکھا دوں؟"

سردار جی نے کہا "نہیں... یہ بات نہیں..."

گل نے مسکرا کے اور بل کھا کے ایک ادائے ناز سے تھینک یو کہا اور آگے بڑھ گئی۔

سردار جی اب مجھ سے مخاطب ہوئے "بھئی، یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ تمھارا سامان اِدھر کیوں آ رہا ہے؟"

میں نے کہا "کیا محسن نے آپ کو کچھ نہیں بتایا؟"

سردار جی نے نفی میں سر ہلایا "مجھے تو نہیں بتایا۔"

"ہو سکتا ہے آپ کے دوسرے ساتھی کو بتایا ہو" میں نے بات کو طول دینے کی غرض سے کہا۔

"لو جی، اُس نے کیا سمجھنا تھا..."

"اچھا... میں پوچھتا ہوں محسن سے" میں نے وہاں سے کھسکتے ہوئے کہا۔ میرا مقصد اس کام کی تکمیل تک اپنے عزائم کے بارے میں کچھ نہ بتانا تھا۔

اپنی لانچ پر پہنچ کے میں نے دوست محمد سے کہا "اب دیر مت کرو، بھاگ جاؤ فوراً۔ ایسا نہ ہو سردار جی اَڑ جائیں اور ہمیں ان کے ساتھ بھی زبردستی کرنی پڑے۔"

"زبردستی کرنی پڑے گی" محسن بولا "ابھی نہ سہی بعد میں سہی۔ وہ آسانی سے ہماری بات کیسے مان سکتے ہیں!"

میں نے اور محسن نے واپس انٹرپول کی لانچ پر چھلانگ ماری ہی تھی کہ ہماری لانچ روانہ ہو گئی۔

"یہ... یہ کیا ہوا؟ تمھاری لانچ تو جا رہی ہے" سردار جی نے کہا "تم... کیوں نہیں گئے؟" وہ اب انگریزی میں بات کر رہے تھے۔

"ہم آپ کے ساتھ رہنے پر مجبور ہیں" میں نے کہا "اس لانچ میں کچھ ایسی خرابی ہو گئی ہے کہ وہ سفر کے قابل نہیں رہی۔ وہ کراچی جائے گی اور ہمیں بمبئی جانا ہے۔"

"لیکن... ہم تو بمبئی نہیں جا رہے ہیں" سردار جی نے کہا "ہم ایک خاص علاقے میں پیٹرول ڈیوٹی کرتے ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے، لیکن اب ہماری بھی مجبوری ہے، یہاں بیچ سمندر میں ہم کیا کریں" میں نے کہا "اور آپ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ اگر ہم مداخلت نہ کرتے تو وہ حملہ آور اس وقت بھی لانچ پر قابض ہوتے۔ رات سے وہ آپ کو گن پوائنٹ پر چلا رہے تھے، وہ آپ کو زبردستی قطب شمالی یا جنوبی افریقہ بھی لے جا سکتے تھے، آپ کو مار کے لانچ پر قبضہ بھی کر سکتے تھے اور بعد میں لانچ کو غرق بھی کر سکتے تھے۔"

"اور تم... تم کیا کرو گے؟" سردار جی نے کہا۔

"ہم آپ سے صرف درخواست کریں گے کہ ہماری مدد کریں" میں نے کہا "اور یہ کام کوئی ناممکن... یا غیر قانونی نہیں..."

"غیر قانونی تو ہے" سردار جی نے کہا "ہم اس علاقے کی نگرانی پر مامور ہیں۔ یہ ہمارا کام نہیں ہے کہ اِدھر اُدھر سے مسافر اُٹھاتے پھریں۔"

"میں نے مدد کا لفظ استعمال کیا تھا۔ اگر آپ کسی کو ڈوبتا دیکھیں گے یا کسی جگہ مسافروں کو لے جانے والی کشتی، لانچ یا بحری جہاز سے ایس او ایس موصول کریں گے، تو کیا مسافروں کو اُن کی منزل تک نہیں پہنچائیں گے؟" میں نے کہا۔

"ہم انھیں دوسرے بحری جہاز پر منتقل کریں گے... لیکن تمھارا تو کیس ہی مختلف ہے جو ابھی تک میں سمجھا ہی نہیں۔"

"تو پھر یہ بہتر ہوگا کہ آپ اس صورتِ حال کو اچھی طرح سمجھ لیں" میں نے کہا "کیا خیال ہے اگر ہم آپ کے کیبن میں بیٹھ کے بات کریں۔ اوور اے کپ آف ٹی؟"

"مجھے چائے بنانی نہیں آتی" سردار جی نے کہا۔

"آپ کو ایک بہترین ہاؤس میڈ کی خدمات حاصل ہیں، اس نے جو وردی پہن رکھی ہے اسے نظرانداز کر دیں۔ وہ ایک سلیقہ مند اور باکمال عورت ہے۔"

"باکمال تو تم سب ہی ہو" سردار جی نے کہا۔ انگریزی میں اتنی سنجیدگی سے بات کرتے ہوئے ان کی شخصیت بالکل بدل گئی تھی اور اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس صورتِ حالات سے ناخوش ہیں۔

سردار جی کا کیبن وہی تھا جس میں کچھ دیر پہلے استاد پیڈرو نے قیدِ حیات سے نجات پانے سے پہلے اسیری کے آخری لمحات گزارے تھے۔ اس کا سامان مختصر مگر پُرتکلف تھا۔ اس سے ملحق کیبن میں گل نے اپنا ٹھکانا بنا لیا تھا اور اس کا حلیہ ابھی تک دھا نیم مردانہ نیم زنانہ تھا۔ اس نے مردانہ یونیفارم پہن رکھی تھی مگر ٹوپی ہٹ جانے سے اس کے شانوں تک ترشے ہوئے بال آزاد

ہو گئے تھے اور بڑی شوخ ادا کے ساتھ چہرے پر سایہ فگن تھے۔

"گل، ذرا دیکھو کچن کہاں ہے۔ کچن میں کیا ہے جو تم ایک اچھی لڑکی کی طرح ہمیں پیش کر سکتی ہو" میں نے کہا "مثلاً چائے کافی؟"

"مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں کسی لمبے چکر میں پڑ گیا ہوں" سردار جی نے کہا "تم لوگوں نے جان تو بچائی ہے میری، مگر ساتھ ہی عذاب میں ڈال دی ہے اور یہ نیکی بھی تم نے کسی ذاتی مفاد میں کی تھی۔"

"میں ابھی سب بتا دیتا ہوں۔ اس سے آپ کی غلط فہمی دُور ہو جائے گی۔"

"غلط فہمی یا خوش فہمی؟" سردار جی نے طنز سے کہا۔

"ہم شریف لوگ ہیں" میں نے کہا "اس کا گواہ ہمارا رویہ بھی ہے۔ کیا ہم آپ کے ساتھ اسی طرح پیش آ رہے ہیں جیسے وہ لوگ پیش آئے تھے۔ وہ جرائم پیشہ اور غیر مہذب لوگ تھے۔ ہم مہذب اور تعلیم یافتہ لوگ ہیں۔ کیا اس فرق کو آپ نظرانداز کر دیں گے؟ آپ نے یہ بھی دیکھا کہ ہم اپنے اور آپ کے دشمنوں سے کیسے نمٹے۔ ہم طاقت کے استعمال میں کم نہیں تھے ورنہ ان پر غالب نہیں آ سکتے تھے۔ اس کے باوجود ہم آپ کے خلاف جارحانہ رویہ تک نہیں رکھتے۔ آپ کو دلیل سے قائل کرنے کے بجائے ہم طاقت سے مجبور بھی کر سکتے ہیں مگر ہم ایسا نہیں کریں گے۔"

سردار جی کے لبوں پر اطمینان کی مسکراہٹ نمودار ہوئی "یار تُوں بڑا سیانا بندہ ایں" پھر وہ پنجابی پر آ گئے "چل خیر گل کر۔"

"بات لمبی ہے" میں نے کہا "مناسب ہوگا کہ آپ اپنے ساتھی کو پہلے یہ سمجھا دیں۔ کہ ہم بمبئی کی طرف جا رہے ہیں مگر ہماری منزل بمبئی نہیں ہے۔ راستے میں کسی جگہ ہم آپ سے کہیں گے کہ مدد کا شکریہ۔ اب آپ جا سکتے ہیں۔"

یہ بات بھی سردار جی کی سمجھ میں نہیں آئی لیکن انھوں نے کہا "اچھا بھئی... جو کرے کرتار" اور اپنے برمی ساتھی کو میری بات پرائمری کلاس کی انگلش میں سمجھائی۔ اس قسم کی زبان ٹمٹا ٹار وینے والے استعمال کرتے ہیں۔

انھوں نے کہا "دی گو... بمبئی۔"

"بمبئی؟" برمی نے حیران ہو کے کہا اور سوال اُس کی آنکھوں میں اتر آیا۔

سردار جی نے اس کے شانے پر تھپکی دے کر اسے مطمئن رہنے اور پریشان نہ ہونے کو کہا اور واپس چل پڑے۔ محسن اُن کے کیبن کا ٹوٹا ہوا دروازہ مرمت کرنے کی کوشش میں مصروف تھا چنانچہ ہم نے دوسرے کیبن کو استعمال کیا۔

"سردار راجندر سنگھ" میں نے بیٹھنے کے بعد کہا "سب سے پہلے تم یہ بتاؤ کہ تمھاری لانچ کیسے ہائی جیک ہو گئی تھی۔ کیا میں سگریٹ پی سکتا ہوں؟"

"پیو بادشاہو۔ اپن بھی تھوڑی سی پی لیں" اُس نے ایک سائڈ ریک سے شراب کی بوتل نکالی۔

"آپ کس قسم کے سکھ ہیں؟" میں نے کہا "وہ سب کہاں ہیں؟ کیس، کڑا، کرپان، کنگھا اور کاچھا۔ آپ کے پانچ ککے!"

"صرف کیس نہیں ہیں۔ نوکری کی مجبوری ہے۔ باقی واہگورو کی کرپا سے سب ہے" سردار جی نے کہا۔

"آپ پر تو شاید سگریٹ بھی حرام ہے؟"

"وہ تو آپ لوگوں پر بھی شراب حرام ہے۔ مگر کیا مسلمان شراب نہیں پیتے؟ میں نے خود کراچی میں بار دیکھے ہیں" وہ خفا ہونے لگا۔

"میرا مطلب آپ کی دل آزاری نہیں تھا اور ان سوالات کا تعلق ذاتیات سے نہیں تھا۔ خیر... آپ فرمائیں۔"

"او بھائی جی! بس بندہ مارا جاتا ہے نیکی کر کے۔ ہم نے تو یہی دیکھا ہے" سردار جی نے فریاد کے انداز میں کہا "یہ کچھ لوگ ایک کشتی میں تھے۔ ہمیں دُور سے دیکھ کے انھوں نے رومال اور کپڑے ہلانے شروع کیے۔ ہم تو سیدھے گزر جاتے لیکن یہ سمجھ کر کہ ان پر کوئی مصیبت آ گئی ہے، ہم نے رُخ بدلا اور اُن کی کشتی کے قریب چلے گئے۔"

"یہ واقعہ کہاں پیش آیا تھا؟ میرا مطلب ہے..."

"میں سمجھ گیا۔ وہ علاقہ پاکستان کی سمندری حدود سے زیادہ قریب تھا" سردار جی نے کہا "وہ کشتی بھی بادبانی تھی اور عموماً گہرے سمندروں میں نظر نہیں آتی۔ خیر میں نے جب نزدیک جا کے پوچھا تو ایک شخص چلانے لگا کہ ہم لُٹ گئے، برباد ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ وہ ماہی گیر ہیں۔ ساحل سے بہت دور نکل آئے تھے اور طوفان میں گھر گئے تھے۔ ڈوبنے سے تو بچ گئے مگر کھانے پینے کو کچھ نہیں رہا۔ انھوں نے کھانے کا تو کر لیا۔ سمندر سے مچھلی پکڑی اور کھا لی۔ مچھیرے کچی مچھلی کھا لیتے ہیں، پینے کو کچھ نہیں تھا۔ اتفاق سے ناریل جیسی کوئی چیز بہتی ہوئی گزری انھوں نے اسے پکڑا اور توڑا تو اندر ناریل جیسا پانی بھی تھا۔ وہ تھوڑا تھوڑا سب نے پیا۔ شروع میں پینے والے زیادہ پی گئے تھے۔ باقی کو قطروں کے حساب سے ملا مگر اس کے بعد ان کی حالت زیادہ بگڑ گئی جو دوسروں کا حصہ پی گئے تھے۔ ایک تو مر چکا تھا۔ باقی دو مرنے والے تھے۔ انھیں فوری طبی امداد کی ضرورت تھی اور خوراک کی۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ان سب کو لانچ پر منتقل کریں۔ اب کیا پتا چلتا ہے بادشاہو کہ بندہ مکر کر رہا ہے یا سچ مچ مر گیا ہے۔ لو جی! لانچ پر پہنچتے ہی مردہ تو کھڑا ہو گیا۔ اس سے

پہلے وہ اکڑا ہوا تھا لاش کی طرح اور سانس بھی روکے پڑا تھا۔ باقی دو کا بھی ایسا ہی لگتا تھا کہ بس فوت ہونے والے ہیں۔ لمبی لمبی سانسیں لے رہے تھے اور ہائے ہائے کر رہے تھے۔ وہ سارے ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے ریوالور نکال کے۔ ہمارے بندے تو ہل بھی نہ سکے۔ اس کے بعد جیسا انھوں نے کہا، ہم نے کیا۔"

"پھر وہ سب لوگ کیوں مارے گئے، جب وہ تعاون کر رہے تھے؟"

"بس جی، موت آئی تھی اُن کی۔" سردار جی نے اُداس ہو کے کہا۔ "میں نے تو منع کر دیا تھا کہ کوئی لڑائی جھگڑا نہ کرے اور کسی نے مزاحمت بھی نہیں کی لیکن وہ بڑے . . . تھے۔" سردار جی نے چند گالیوں سے پیڈرو کے ساتھیوں کی صفات بیان کرتے ہوئے کہا۔ "انھوں نے کہا کہ یہ تو بڑا مشکل ہے کہ ایک بندے پر ایک بندہ کھڑا رہے۔ نفری کم کرو۔ کسی وجہ کے بغیر انھوں نے نفری کم کر دی۔ یہ ریڈیو آپریٹر سب سے پہلے مارا گیا تھا۔ اُن کو ڈر تھا کہ کسی کو اطلاع نہ کر دے۔ وہ اپنا ریڈیو آپریٹر لائے تھے جس کو تم نے مار دیا۔ اچھا کیا۔ اُن کے باقی ساتھیوں کی لاشیں کہاں ہیں؟"

"اوہ وہ تو اس لانچ پر ہی چلی گئیں۔" میں نے کہا۔ "خیر، وہ ٹھکانے لگا دیں گے۔"

"دو بندے اُدھر پڑے ہوئے ہیں۔"

"ہاں، مگر زیادہ کام کا وہ بندہ ہے جو ابھی زندہ ہے اور بہت کچھ بتا سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "لاشوں کو ہم سمندر میں پھینک دیں گے۔"

"میں اپنے آپ کو مجرم محسوس کرتا ہوں۔" سردار جی پھر انگریزی پر آ گئے۔ "میرے ہی کہنے پر لانچ اُن بدمعاشوں کی مدد کے لیے گئی تھی۔"

"آپ کو معلوم تو نہیں تھا کہ وہ بدمعاش ہیں۔ آپ کی جگہ میں بھی ہوتا تو یہی کرتا۔" میں نے تسلی دی۔

"اب میں کسی کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ مجھے ایک نہیں دس جھوٹ بولنے پڑیں گے۔ یہ میرا فرض تھا کہ اس غاصبانہ قبضے کی فوراً رپورٹ کرتا۔ میں تو ایک لاش بھی واپس نہیں لے جا سکتا۔"

"آپ فرض کر لیں کہ قبضہ ابھی ختم نہیں ہوا۔"

"ہم آپس میں بھی رابطہ رکھتے ہیں۔ بہت دیر سے ہم نے نہ کسی کو پیغام دیا ہے، نہ کسی کا پیغام وصول کیا ہے۔ یہ بہت خطرناک بات ہے۔ ہمارے ساتھی تشویش میں مبتلا ہو گئے تو ہمیں لاپتا قرار دے دیں گے۔ ہر طرف ہماری تلاش شروع ہو جائے گی۔ اور تلاش میں نیوی کا بیڑہ بھی شامل ہو سکتا ہے۔"

"یہ تو واقعی خطرناک بات ہے۔" میں نے کہا۔ "ایسی صورت میں ہمارے لیے بھی پریشانی پیدا ہو جائے گی۔ لیکن اس مسئلے کا ایک حل بھی ہے۔"

"وہ کیا؟"

"آپ اپنا پیغام دیں۔ آپ کے ساتھی یقیناً گوش برآواز ہوں گے۔ ایک تو آپ اپنی پوزیشن غلط بتائیں تاکہ اِدھر کوئی نہ آئے۔ پھر آپ یہ کہیں کہ لانچ خطرناک قسم کے مجرموں کے قبضے میں ہے اور انھوں نے دھمکی دی ہے کہ کوئی قریب آیا تو وہ لانچ کو دھماکے سے اُڑا دیں گے۔ ایک ایک آدمی کو قتل کر دیں گے۔ آپ ان سے کہیں کہ وہ دُور رہیں۔ آپ کی مدد کی کوشش بھی نہ کریں۔"

"آخر یہ سب میں کیوں کروں؟" سردار جی نے ایک منطقی سوال کیا۔

"ہم نے بھی آپ کی مدد کی تھی۔" میں نے کہا۔ "فرض کر لیں میں آپ سے اُس نیکی کے بدلے ایک نیکی مانگتا ہوں۔"

"تم نے مدد کی تھی انٹرپول کی۔ جو ایک قانونی تنظیم ہے اور ایسے کسی بھی ادارے کی مدد کرنے میں کسی کے لیے رسک نہیں ہوتا۔ پھر ایک بات اور ہے۔ بُرا مت ماننا۔ تم نے اپنے دشمن کے خلاف اپنا دفاع کیا تھا۔ تمھارے درمیان جھگڑا کیا تھا، یہ کاروباری مخاصمت تھی۔ ذاتی عداوت یا جذباتی رقابت، یہ میں نہیں جانتا لیکن اس قسم کے مقابلے میں دیکھتا رہتا ہوں۔ بین الاقوامی مجرموں کے گروہ بھی ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو جاتے ہیں۔ حملہ تم پر ہوا تھا مگر تمھاری خوش قسمتی نے ساتھ دیا اور تم نے انھیں نیست و نابود کر دیا۔ تم بطورِ خاص ہمیں بچانے کے مشن پر نہیں آئے تھے۔ نہ میں نے تم کو ایسی اپیل کی تھی کہ ہمیں بچاؤ۔ تم بچ گئے تو ہم بھی بچ گئے۔ لیکن اب تم نے جو مطالبہ کر دیا ہے، اس نے مجھے اُلجھن میں ڈال دیا ہے کہ کہیں میں غلط قسم کے لوگوں کی مدد کر کے شریکِ جرم تو نہیں ہو جاؤں گا۔"

میں نے اس کی پوری بات صبر سے سنی۔ پھر میں نے کہا۔ "آپ کی تشویش بجا ہے سردار راجندر سنگھ جی۔ لیکن ابھی میں نے کہا تھا کہ کیا ہم بھی انھی جیسے لگتے ہیں آپ کو؟ آپ کا دل کیا کہتا ہے؟"

"دل کی کیا بات کرتے ہو بادشاہو۔ . . دل تو میرا ابھی تک ساتھ ہے مگر یہ جو اوپر کی منزل میں تھوڑی بہت عقل ہے، جو دن کے بارہ بجے ماری جاتی ہے۔" وہ اپنی بات پر ہنسا۔ "اپنے بھی بارہ بجنے والے ہیں۔"

"ابھی ساڑھے گیارہ ہوئے ہیں۔" میں نے کہا۔ "آپ غور کریں سردار جی! کیا ہم آپ کو زبردستی نہیں لے جا سکتے؟" ریوالور دکھا کے۔" میں نے پتلون اٹھا کے جراب میں سے ریوالور برآمد کیا اور واپس رکھ لیا۔ "ہم سب مسلح ہیں مگر پھر بھی میں آپ سے درخواست کر رہا ہوں۔"

"او بھلے آدمی، مجھے کچھ تو بتاؤ یہ معاملہ کیا ہے۔ کون ہو تم لوگ آخر؟" سردار جی نے کہا۔ "چنگے بھلے جوان پڑھے لکھے اور معقول لوگ ہو۔ سوہنی شکل دی ہے واہ گورو نے۔ پھر یہ کیا کرتے پھر رہے ہو تم سمندر میں؟ تم نے انٹرپول کی وردی پہن لی ہے۔ ایک وہ کُڑی جو معلوم نہیں تمھاری کیا ہے، وہ بھی وردی پہن کے ٹھاہ ٹھاہ گولیاں چلاتی ہے . . . گھر بار کوئی نہیں تم سب کا۔ تمھیں پوچھنے والا کوئی نہیں کہ تم کس چکر میں ہو؟"

"اس سوال کے جواب میں سچ اور صرف سچ بولنا تو بہت مشکل ہے بلکہ ناممکن ہے میرے لیے۔" میں نے سوچ کر کہا۔ "میں آپ کو سچ کے اقتباسات سناتا ہوں۔ اس میں جھوٹ بالکل نہیں ہوگا لیکن ایک شرط ہے، آپ جو کچھ سنو گے اس کو بھول جاؤ گے۔ جب ہم آپ کو خدا حافظ کہیں گے تو بس ایک دوسرے کو اپنی اپنی نیکی کے حوالے سے یاد رکھیں گے۔ نیکی کا یہ ہے کہ نیکی کر سمندر میں ڈال۔ آپ کے کسی ساتھی کو ہم نے نہیں مارا۔ ایک بندہ آپ کی تحویل میں ہے، اس سے جو تفتیش کر سکو کر لینا۔ ہمارا نام لینے کی ضرورت بھی نہیں۔ انھوں نے حملہ کیا، آپ لوگوں نے مقابلہ کیا۔ کچھ لوگ اُن کے مارے گئے، کچھ آپ کے۔ ایک آدمی زندہ ہاتھ آیا ہے۔"

"چلو ٹھیک ہے، وہ میرا کام ہے کیا بیان دوں اور کیا نہ دوں۔" سردار جی نے کہا۔ "پہلے تم مجھے قائل کرو۔"

"سردار جی، میں ایک صنعت کار کا بیٹا ہوں۔ جب میں لندن میں زیرِ تعلیم تھا تو کچھ نمک حراموں نے میرے والد کے کاروبار پر قبضہ کر لیا اور انھیں مار دیا۔ مجھے معلوم ہوا تو میں پاکستان پہنچ گیا۔"

"تم پاکستانی ہو؟" سردار جی چونکے۔

"ہاں، خالص پاکستانی۔" میں نے کہا۔ "پاکستان میں وہ بدمعاش میرے بھی دشمن ہو گئے۔ انھوں نے پولیس کے ساتھ مل کر، کچھ اپنی بدمعاشی کے زور پر اور کچھ دولت کی مدد سے مجھ پر بہت سے مقدمات بنوا دیے۔ ان میں قتل کے جھوٹے مقدمات بھی تھے۔ میں نے قانونی جنگ لڑنے کی بہت کوشش کی مگر یوں سمجھ لیں کہ وہ پاکستان میں مافیا جیسا طاقتور گروہ تھے۔ اُن کے سامنے قانون بھی بے بس تھا اور پھر آپ جانتے ہیں کہ قانون میں کتنے مشکل اور صبر آزما مرحلے ہیں، گواہوں کے اور ثبوت کے۔ جرم کرنے والے ثبوت نہیں چھوڑتے۔ اُلٹا اپنی بے گناہی کے گواہ لے آتے ہیں۔"

"وہ سب میں جانتا ہوں۔" سردار جی نے ایک آہ بھری۔

"بس تو اُس کے بعد میں نے کہا کہ اب اپنے معاملات میں خود طے کروں گا۔ میرا خدا جانتا ہے کہ میں بے گناہ ہوں اور میرا ضمیر مطمئن ہے کہ میں کوئی غلط کام نہیں کر رہا ہوں۔ ہاں ایک بات اور بتا دوں۔ ان بدمعاشوں نے جو میرے والد کے قاتل تھے، مجھے ایک پیش کش کی تھی کہ میں اُن کے ناجائز کاروبار میں شریک ہو جاؤں۔ میرے والد بھی اسی لیے قتل کیے گئے تھے کہ انھوں نے انکار کیا تھا۔ شاید دھمکی دے دی تھی کہ وہ اس کاروبار میں ملوث افراد کو قانون کے حوالے کر دیں گے۔ وہ قانون کی طاقت پر اپنے یقین کی بھینٹ چڑھ گئے۔ اب آپ کہہ سکتے ہیں کہ میں نے قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے جو غلط ہے مگر میری مجبوری ہے اور ضرورت ہے۔ یہی وہ شخص تھا جس کو میں نے ابھی ابھی پیچھا کر کے مارا۔ استاد پیڈرو اس کا نام تھا۔ یہ بہت بڑا بدمعاش شمار ہوتا تھا۔ اسی نے میرے والد کا قتل کیا تھا۔ مگر قانون اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکا تھا کیونکہ ساری بات ثبوت اور شہادت کی تھی۔ میرے لیے ان بدمعاشوں سے صلح کر لینا اور اِن کے کاروبار میں شریک ہونا بہت منافع بخش سودا ہوتا۔ میں لاکھوں کیا کروڑوں بنا لیتا اور محفوظ بھی رہتا۔ دربدر بھی نہ ہوتا مگر آپ کہہ سکتے ہیں کہ میرا دماغ خراب ہے۔ وزیر خاں میرا باپ تھا۔ آبا و اجداد سب خالص پٹھان تھے۔ غیرت و محبت اور عزت و آبرو کے معاملے میں ہم جب اَڑ جاتے ہیں تو پھر جان جانا معمولی بات ہے۔ یہی میں نے کیا۔ بعد میں وہ بدمعاش میری منگیتر کو اٹھا کے لے گئے۔ اُسے وہ بمبئی لے جا رہے ہیں اور میں اُسے واپس لانا چاہتا ہوں۔"

"بلّے بلّے . . . ہیرو۔" سردار جی نے کہا۔ "خیر سے اس کا کیا نام ہے . . . ہیروئن کا؟"

"رابعہ۔" میں نے کہا۔ "بہت زبردست اور کامیاب وکیل تھی وہ، اور میری وجہ سے اُس نے بھی بہت دکھ اُٹھائے۔ یہ جنگ ابھی جاری ہے اور اس کا ایک سین آپ نے دیکھا۔ مجھے خدا پر بھروسا ہے۔ میرے مددگار میرے دوست ہیں، جیسے یہ دونوں میاں بیوی جو میرے ساتھ ہیں . . . سوری . . . میں

نے کہا تھا کہ میں جھوٹ بالکل نہیں بولوں گا۔ یہ میاں بیوی نہیں ہیں۔"

سردار جی مُنہ پھاڑ کے ہنسے۔ "عاشق معشوق ہیں؟ اوئے ہم تو سمجھ گئے تھے جن جی۔ خیر واہ گورو کرے گا تو میاں بیوی بھی بن جائیں گے۔"

"یہ تھی میری زندگی کی فلمی اسٹوری۔" میں نے کہا۔ "اب مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ رابعہ کو اغوا کرنے والے اُسے ایک بحری جہاز میں لے کر گئے ہیں۔ ہم انھی کے تعاقب میں تھے کہ یہ بدمعاش ہمارے پیچھے لگ گئے۔ یہ ہمارا راستہ روکنا چاہتے تھے۔ معلوم نہیں انھوں نے کیسے ہمارا سُراغ لگا لیا۔ ہم بہت رازداری سے بھیس بدل کے نکلے تھے۔ اگر آپ نے ہمیں پہلے دیکھا ہوتا تو ہمارا حلیہ ہی مختلف نظر آتا۔ ہم ماہی گیر بنے ہوئے تھے، اب انٹرپول کی وردی میں ہیں۔ انھوں نے بھی یہ وردی پہن کے ہمیں دھوکا دینا چاہا تھا۔ اب یہی کام ہم کر رہے ہیں۔ ہم نے تو انھیں پہچان لیا تھا۔ ان کی بے وقوفی کے باعث۔ دیکھنا یہ ہے کہ ہم پہچانے جاتے ہیں یا نہیں۔"

"اب کس کے سامنے جانے کا خیال ہے، اوئے بس شکر کرو کہ جان بچ گئی۔ گھر واپس جاؤ۔" سردار جی نے کہا۔

"آپ نے یہ بات ٹھیک بارہ بجے کی ہے اس لیے میں معاف کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔

سردار جی چونکے۔ "بارہ بج گئے؟"

"جی۔ . . اسی لیے آپ ساری بات بھول گئے۔" میں نے کہا۔ "واپسی کا اب کیا سوال۔ مجھے رابعہ کو واپس ساتھ لے کر آنا ہے اور رہی جان بچانے کی بات، تو اب تک خدا نے بچائی ہے، آگے بھی وہی بچائے گا اور نہیں بچائے گا تو میری کوشش سے کیا ہوگا۔ رابعہ جس جہاز پر ہے، وہ ابھی بمبئی نہیں پہنچا۔ میں اُسے راستے میں ہی پکڑ لینا چاہتا ہوں۔"

"کیسے پکڑنا ہے؟ جال ڈال کے یا کانٹے سے؟"

"آپ مذاق کر لیں۔ یہ میرا کام ہے۔" میں نے کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ کیسے کرنا ہے۔ آپ سے صرف اتنی مدد کی درخواست ہے کہ مجھے اس جہاز تک پہنچا دیں۔ جب ہم اس جہاز پر پہنچ جائیں گے تو آپ کا کام ختم، آپ واپس آ جائیں اور جو کارروائی چاہیں کریں۔ اگر تمہارا نام لیے بغیر کام چل جائے تو اچھا ہے۔ ورنہ جہاں سیر وہاں سوا سیر۔ آپ کہہ دیں کہ سکندر اور محسن کے ساتھ کیا ہوا۔ پھر انھوں نے کیا کیا۔ ہم نے کیسے مقابلہ کیا، کتنے بندے مارے اور آپ کی کیا مدد کی۔ یہ سب بتا دینے سے ہمیں کوئی خاص نقصان نہیں ہوتا۔ ہم یہ چاہتے تھے کہ ہمارے بمبئی پہنچنے کی خبر کسی کو نہ ہو۔ سارے سچ میں سے اگر آپ یہ آخری سچ نکال دیں کہ آپ نے ہمیں یہاں تک پہنچایا، تو اس میں آپ پر بھی کوئی الزام نہیں آتا۔ ہم کو... جاتے ہیں اور نیکی کا قرض برابر۔ ایک چھوٹا سا جھوٹ بولنا ہے آپ کو... ہیں آپ کہ وہ اپنی لانچ میں بھاگ گئے تھے۔"

"چھوٹا سا جھوٹ۔ سچا واہ گورو معاف کرے۔ بڑے بڑے جھوٹ بولے ہیں سردار راجندر سنگھ نے، اپنے فائدے کے لیے۔ پھر یہ جھوٹ کیوں نہیں بولوں گا میں جو سچ سے زیادہ سچا ہے۔ اس لیے کہ یہ نیکی والا جھوٹ ہے۔ بدی والا سچ نہیں۔"

"آپ جذباتی ہو رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اچھی طرح سوچ لیں اور اپنے ساتھی سے بھی مشورہ کر لیں۔ اگر وہ آپ کے فیصلے سے متفق نہ ہوا۔ . ." گل چائے لے کر آئی تو اس کے ساتھ محسن بھی آ گیا۔

"او نہیں یار۔ وہ بڑا بیبا بندہ ہے۔ تم نے دیکھا نہیں ... کر کے سب دیکھتا رہتا ہے اور اپنے کام سے کام رکھتا ہے۔ میں اُسے سمجھا دوں گا۔ افسوس مجھے صرف یہ ہے کہ جن کی امانت تھی ... تک نہیں پہنچی۔ . . جو مر گئے اُن کے پیارے انھیں دیکھ بھی نہ سکے۔ خیر دیکھنے سے دُکھ بڑھتا ہی ہے۔ اب صبر کر لیں گے۔"

"میں آپ کا احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔ . . رابعہ کو بھی بتاؤں گا آپ کے بارے میں۔" میں نے کہا۔ گل نیچے بیٹھ کے چائے بنانے لگی۔

"وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن اپنے رانجھا صاحب" ایک بات بتاؤ مجھے۔ اگر تمھیں اپنی ہیر نہ ملی اور دشمنوں نے تمھاری کھیر بنا دی تو تمھاری واپسی کیسے ہوگی؟"

"واپسی پھر کہاں ہوگی سردار جی۔" میں نے کہا۔

"یہ اطلاع غلط بھی تو ہو سکتی ہے کہ تمھاری ہیر اس جہاز پر ہے۔"

"اطلاع سو فی صد درست ہے۔" میں نے کہا۔ "اور غلط ہوتی تب بھی میں جاتا۔"

سردار جی نے ایک آہ بھری۔ "بڑا مشکل کام ہے عشق کرنا بھی اور پھر آج کل کے زمانے میں۔ . . توبہ توبہ۔"

"آپ نے کسی سے عشق کیا ہے؟" گل نے کہا۔

"ہاں، جوانی میں ڈیڑھ عشق کیا تھا، ایک آدھا۔ . . ایک پورا۔ . . اس کے بعد اپنا باجا بج گیا۔"

"باجا بج گیا؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"ہاں یار۔ ابّے کو پتا چلا تو اس نے کہا چل بیٹھ گھوڑے پر کھوتے دے پتر۔ پھر بینڈ باجا آ گیا اور جنج چڑھ گئی۔ عشق بالکل سواد نہیں آیا۔ نہ کوئی دولت نہ ظالم سماج۔ نہ ماں پیو کا شور۔ اب تو خیر سے سال ہو گیا شادی کو۔ ہر چھ ماہ میں ایک بچے کا اوسط ہے۔"

مجھے بہت ہنسی آئی۔ "ہر چھ ماہ کے بعد کیسے۔ کیا یہ بھی ربیع اور خریف کی فصل ہے؟"

"کچھ ایسا ہی ہے۔ اکٹھے دو ہو گئے تو اوسط کیا آیا حساب کے قاعدے سے۔"

"اور آدھے عشق کا قصّہ کیا ہے؟" محسن بولا۔

"وہ۔ . . پہلا عشق تھا۔ . . سچا مگر کچا۔ . . اس میں بھی سردار راجندر سنگھ کا ہی باجا بجا۔ پہلے تو ایک بڑا ظالم رقیب آ گیا۔ اس نے ہمیں جھاڑو سے بجایا اور دھمکی بھی دی کہ مور بنا دوں گا۔ پھر ابّے کو پتا چلا تو اُس نے مُرغا بنا دیا اور ڈنڈے سے بجایا کہ خبیث ناک کٹوا دی۔ عشق بھی کیا تو کس سے۔ میں نے سچے عاشق کی طرح کہا کہ عشق نہ پوچھے ذات۔ وہ بھنگن ہے تو کیا۔ دل جس پر آ جائے وہی لیلیٰ۔ سچا عشق تھا ناجی۔ ایسے کون ختم کر سکتا تھا۔ ایک دن ہم جذبات کے گھوڑے پر سوار تھے کہ گھوڑا بے قابو ہو گیا۔ پھر رات بھر پولیس نے بٹھایا۔ اور اس کے سامنے ناک سے زمین پر لکیریں نکالنی پڑیں۔"

میں نے اور محسن نے تو ہنسی پر کچھ قابو پا لیا مگر گل کو ہنسی آتی تھی تو روکے نہیں رکتی تھی۔

"یہ تو پورا عشق ہوا سردار جی، آپ آدھا کہتے ہیں۔"

"آدھا ہی تھا یار۔ وَن وے ٹریفک تھی نا۔ وہ بھی کرتی عشق تو پھر میں یہاں بیٹھا ہوتا تمھارے سامنے۔ امرتسر کی کسی سڑک پر جھاڑو دے رہا ہوتا۔" سردار جی نے ہنس کے کہا۔ "اچھا ہی ہوا نا کہ آدھا رہا۔" انھوں نے جیب میں سے ایک پرس نکالا اور اس میں لگی ہوئی تصویر کو دیدارِ عام کے لیے پیش کیا۔ "ہے نا آفت؟"

مجھے خاصی مایوسی ہوئی۔ وہ ایک بھدّی موٹی سی لڑکی تھی جو زیور سے لدی پھندی کھڑی ہوئی تھی۔ تاہم سردار جی کے کہنے کے مطابق جس پر دل آ جائے وہی لیلیٰ۔۔۔ اور لیلیٰ کے لیے تو بہت پہلے کہا گیا ہے کہ اسے مجنوں کی آنکھ سے دیکھو۔ چنانچہ ہم سب نے اتفاقِ رائے سے اس کو 'آفت' قرار دیا۔ سردار جی کو جیوری کے فیصلے سے بے حد خوشی ہوئی۔

دوپہر کے کھانے کے بعد، جو گل نے ایجاد کیا تھا اور محسن کے خیال میں اس خوراک سے بہرحال بہتر تھا جو ہم گناہ گاروں کو دوزخ میں کھانے کو ملے گی، میں سو گیا۔ گل اور محسن کے تعلقات بھی کشیدہ ہو گئے تھے۔ گل ایک کیبن میں بند ہو گئی اور محسن نے بہت سے کام کیے مثلاً اس نے وائرلیس آپریٹر کی اور باس کی لاشوں کو ٹھکانے لگایا۔ جو شخص اندر بندھا ہوا مر گیا تھا اسے بھی سمندر کے سپرد کیا۔ پھر وہ سردار جی کے ساتھ واحد زندہ قیدی سے تفتیش کرتا رہا۔

اپنی بدقسمتی کے باعث زندہ گرفتار ہونے والا بھی اس سے زیادہ کچھ نہ بتا سکا جو مجھے وائرلیس آپریٹر شاہ دین نے بتایا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ شیخوپورہ کا رہنے والا تھا۔ اسے بھی ایس بی سراج نے پیڈرو کے ذریعے حاصل کیا تھا۔ وہ شیخوپورہ کا ہسٹری شیٹر تھا اور پولیس نے اسے پیڈرو کے ساتھ بھیجتے وقت وہی کہا تھا جو شاہ دین سے نارووال کے تھانے دار ملک شیر نے کہا تھا۔ وہ پیڈرو کے بارے میں بھی کچھ نہیں جانتا تھا۔ اس نے صرف ایک نئی بات بتائی کہ باس کے نام سے سفر کرنے والا کسی چوہدری دلاور کا ڈرائیور تھا اور وہی باقی سب لوگوں کو ایک کار میں کراچی تک لایا تھا۔

جب میں سو کر اٹھا تو شام ڈھل چکی تھی اور سورج مغرب میں بہت نیچے آ گیا تھا۔ لانچ بڑی تیزی سے آگے بڑھتی جا رہی تھی لیکن چاروں طرف جہاں تک نگاہ جاتی تھی سمندر ایک ویران صحرا کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ زمین اور آسمان کے درمیان صرف سمندر کی گونج تھی یا لانچ کے انجن کی آواز۔ اُفق کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک ایک خلا تھا جس میں زندگی کے آثار مفقود تھے۔ نہ کہیں کوئی پرندہ تھا، نہ کوئی پودا یا درخت۔ ایک ہوائی جہاز اوپر سے گزرا تو اپنے جیسے زندہ انسانوں کا تصور ذرا سی دیر کے لیے قائم ہوا۔ جہاز اوجھل ہوا تو تنہائی کا جمود پھر مسلط ہو گیا۔

محسن نے مجھے بتایا کہ اس نے تفتیش سے کیا مفید معلومات حاصل کی ہیں۔ پھر وہ سونے چلا گیا۔ گزشتہ رات میں ہم نیند پوری نہ کر سکے تھے اور آنے والی رات کے بارے میں یقین سے کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا۔ خود سردار جی بھی سوئے پڑے تھے۔ صرف وہ برمی تھا جو ایک پُراسرار قسم کی شخصیت رکھتا تھا۔ خاموش اور بظاہر تمام معاملات سے بے تعلق نظر آنے والا اور اپنی ذات کے خول میں بند رہنے والا۔ لیکن ہمہ وقت مستعد اور ہوشیار۔ کُھلی آنکھوں سے وہ سب کچھ دیکھتا تھا مگر کوئی اُسے دیکھے تو وہ انجان بن جاتا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ مسلسل ایک تھکا دینے والے اور بیزار کُن کام میں مصروف ہے مگر ابھی تک تھکن کا شکار نظر نہیں آتا۔

میں نے اُس سے دوستانہ مراسم استوار کرنے کی کوشش کی اور کچھ دیر اس سے اشاروں کی زبان میں گفتگو کرتا رہا۔ مثلاً میں نے لانچ چلانے کی خواہش کا اظہار کیا اور اُس نے مسکراتے ہوئے مجھے اس کا موقع دیا۔ یہ میرے لیے ایک مشکل کام ثابت ہوا۔ اگر وہ مسلسل نگرانی نہ کرتا رہتا تو میں عملاً بیڑا غرق کر دیتا۔ پھر میں نے

اُس سے پوچھا "لی ؟" اور اُس نے مسکرا کے اقرار میں سر ہلایا۔

چائے کی طلب مجھے بھی تھی چنانچہ میں نے گل کے کیبن میں جھانک کے کہا "بھئی کوئی اللہ کا بندہ جاگ رہا ہے یہاں ؟"

گل نے آنکھیں کھولے بغیر کہا "یہاں کوئی اللہ کا بندہ نہیں ایک بندی ہے جو سو رہی ہے۔"

"اس بندی سے اللہ کے نام پر ایک پیالی چائے کا سوال ہے۔"

"مل جائے گی۔ انعام کیا ملے گا؟" وہ اٹھ بیٹھی۔

"انعام . . . میں تم کو غروبِ آفتاب کا بے حد خوب صورت منظر بالکل مفت دکھاؤں گا، چائے لے کر عرشے پر آجانا۔" میں نے کہا۔

وہ ہنس پڑی اور میں نے عرشے کا رُخ کیا۔ میں سگریٹ سلگا کے ٹہلتا رہا اور بہت سے ایسے سوالات پر غور کرتا رہا جو اب میرے ذہن میں پیدا ہو رہے تھے۔ ایک سوال یہ تھا کہ مسلسل کئی گھنٹے کا یہ سفر اب تک کس سمت میں ہوا ہے؟ ہم اس بات کا یقین کیسے کر سکتے ہیں کہ ہمارا اور ایس ایس کرانتی تھرڈ کا ایک ہی راستہ ہے اور ہمارے درمیان فاصلہ کتنا کم ہوا ہے؟ اندازے کا معمولی سا فرق بڑھتے بڑھتے سیکڑوں میل کا فرق بن جاتا ہے۔ ہم نے سردار جی سے بمبئی والے راستے پر چل کے ایس ایس کرانتی تھرڈ تک پہنچنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ کیا لانچ اسی راستے پر جا رہی تھی اور کیا پانی پر نظر نہ آنے والا یہ راستہ ایک ہی تھا؟ میں جو کچھ معلومات رکھتا تھا اُس کے مطابق خشکی پر بنی ہوئی سڑکوں کی طرح فضا میں ہوائی جہازوں کے لیے راستے متعین ہیں اور سمندر میں بحری جہازوں کے لیے۔ اگر یہ بات درست تھی تو پھر تشویش بے جا تھی مگر درمیانی فاصلے کے بارے میں بے یقینی کا اضطراب اپنی جگہ تھا۔ ہم اس بحری جہاز کے قریب بھی ہو سکتے تھے اور اس سے بہت دور بھی۔ ہمیں یہ معلوم نہیں تھا کہ اس بحری جہاز نے کتنی رفتار سے سفر کیا تھا اور لانچ کی تیز رفتاری کے باعث ہم نے وقت کے فاصلے کو کم کیا تو ہم اس بحری جہاز تک آج رات پہنچنے میں کامیاب ہوں گے یا نہیں ؟

دوسرے زیادہ پریشان کن سوال کا تعلق اُن واقعات سے تھا جو ہماری لانچ پر حملے اور پیڈرو کی ہلاکت کے دوران میں پیش آئے تھے۔ ہم نے سفر کا اہتمام انتہائی رازداری سے کیا تھا مگر یہ ہماری خوش فہمی تھی کہ کسی کو کچھ معلوم نہیں۔

چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کو سب معلوم تھا۔ وہ سب کچھ دیکھ رہے تھے اور نہ جانے کب سے دیکھ رہے تھے۔ جب ہم نے ایس ایس کرانتی تھرڈ کا تعاقب شروع کیا تو انھوں نے اپنے آدمی ہمارے تعاقب میں روانہ کر دیے۔ انھوں نے بھی اس کے لیے لمبی پلاننگ کی تھی۔ سوال یہ تھا کہ وہ اتنا عرصہ دور دور رہ کر ہماری تیاری کو کیسے دیکھتے رہے اور کیوں دیکھتے رہے؟ پھر اُن کو روانگی کے وقت کا علم کیسے ہوا؟ کیا یہ ممکن ہے کہ انھیں پہلے سے کچھ معلوم نہ ہو مگر ہمارے روانہ ہوتے ہی کسی نے اُن کو مطلع کر دیا ہو کہ محسن اور سکندر کس لانچ پر کیا بھیس بدل کے نکلے ہیں۔ یہ اطلاع انھیں کس نے فراہم کی؟ مشتری، کریم بخش یا دوست محمد؟ کیا ان تینوں میں سے کوئی . . . ؟ نہیں . . . یہ ناممکن اور بعید از قیاس ہے کہ ہم میں سے کسی نے مخبری کر کے غدار ہونے کا ثبوت دیا ہو۔ ہمارے علاوہ کون ہو سکتا ہے؟

جب گل چائے لے کر آئی تو میں ریلنگ پر جھکا ہوا کھڑا میں لانچ کے چلنے سے اٹھنے والی لہروں کو دیکھ رہا تھا۔

"کہاں ہے میرا انعام؟" گل مجھے چائے کا کپ تھما کے بولی۔

میں نے تاریک ہوتے اُفق کو دیکھا "ارے . . . سورج تو غروب ہو گیا۔ خیر تم طلوعِ آفتاب کا منظر دیکھ لینا۔ فرق صرف سمت کا ہوگا، منظر بالکل ایک سا ہوتا ہے۔"

وہ چائے کا مگ لے کر قریب ہی ایک بنچ پر بیٹھ گئی "سکندر بھائی، یہ بتایئے کھانا کیسا پکاتی ہوں میں؟"

میں نے کہا "کھانا . . . جب تم پکاؤ گی عزیزہ . . . تو بتائیں گے۔"

"کیوں، دن میں کیا کھایا تھا؟" وہ بگڑ کر بولی۔

"وہ . . . اچھا وہ کھانا تھا، پھر تو بھئی سبحان اللہ، ماشاء اللہ وغیرہ . . . کیا بات ہے؟" میں نے کہا۔

وہ اداس ہو گئی "مجھے پکانا آتا نہیں۔ آتا کیسے، یہ کام تو مائیں سکھاتی ہیں یا لڑکیاں گھروں میں سیکھتی ہیں۔ میرا نہ کوئی گھر تھا اور نہ ماں تھی۔ میں نے جو کچھ سیکھا . . ."

"ارے پاگل . . . میں تو مذاق کر رہا تھا۔ کیا مجھے معلوم نہیں" میں نے کہا "لیکن تم میں سیکھنے کی اور خود کو بدل لینے کی زبردست صلاحیت ہے، صرف صلاحیت ہی نہیں ہے، ہمت بھی ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ جب تم امورِ خانہ داری سنبھالو گی تو سب کو حیران کر دو گی، رابعہ کو بھی اور . . . نازو کو بھی۔" میرے منہ سے شہناز نام نکلنے والا تھا۔ بر وقت میری زبان پر نازو کا نام آگیا۔

"امورِ خانہ داری!" وہ خلا میں دیکھتے ہوئے بولی "کتنا مختلف کام ہے یہ ڈکیتی سے۔ کچھ عرصے پہلے کوئی ایسی بات میرے سامنے کرتا ہی نہیں تھا۔ میرا گھر کہاں ہوگا؟ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا اور میں تصور تک نہیں کر سکتی تھی کہ کسی گھر میں صبح سے شام تک میں وہ سب کروں گی جو عورت اپنے گھر میں کرتی ہے۔"

میں سمجھ گیا کہ اب اس کے جذبات کا دھارا کس سمت میں بہنے لگا ہے۔ یہ خواب دیکھنے کا اور سننے کا وقت نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے کہا "تم نے اس بڑھی کو چائے دی تھی؟"

"نہیں، تم نے کب کہا تھا؟"

میں نے سر پر ہاتھ مارا "میں اس سے کہہ چکا تھا، خیر اب دے دو۔"

گل کے جاتے ہی میں نے اس قیدی کو تلاش کیا۔ وہ مجھے اسٹور میں بند ملا۔ محسن نے اُس سے خاصی سخت تفتیش کی تھی۔ اس کے آثار تشدد کے نشانات کی صورت میں عیاں تھے۔ مجھے دیکھتے ہی اُس کی آنکھوں میں دہشت اُتر آئی۔ وہ رسیّوں سے یوں بندھا ہوا تھا کہ اس کے دونوں ہاتھ الگ الگ اوپر اٹھے ہوئے تھے اور وہ دیوار سے لگ کے سیدھا کھڑا رہنے پر مجبور تھا۔ رسیّوں کے دوسرے حصّے کو چھت کے قریب ہُک سے منسلک کر دیا گیا تھا۔ وہ اُچھلتا تو پیر زمین پر لگتے ہی اس کے سارے جسم کو جھٹکا لگتا۔ نہ وہ دائیں بائیں ہو سکتا تھا اور نہ جھک سکتا تھا۔ بیٹھنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

وہ سخت اذیت میں تھا اور میں اندازہ کر سکتا تھا کہ اس کی قوتِ برداشت بہت جلد جواب دینے والی ہے۔

میں نے اس کے قریب جا کے کہا "میں تم کو آزاد کر سکتا ہوں اگر تم میرے چند سوالات کا جواب دے سکو۔"

"نہیں . . . میں سب بتا چکا ہوں۔" وہ کراہنے لگا۔

"نہیں۔ ایک بات تم سے کسی نے نہیں پوچھی۔" میں نے کہا "تم نے بتایا ہے کہ جو باس تھا وہ چوہدری دلاور کا ڈرائیور تھا۔ تم نے چوہدری دلاور کا نام کہاں سے سنا؟"

"اسی . . . کی زبان سے . . ."

"تمھارا مطلب ہے خود اس نے تمھیں یہ بات بتائی؟" میں نے کہا اور جلتی ہوئی سگریٹ اُس کی گردن پر لگا دی "جھوٹ مت بولو۔ جو لوگ تم کو اتنی دور سے، الگ الگ مقامات سے لائے تھے، وہ بے وقوف نہیں تھے۔ اگر رازداری مقصود نہ ہوتی تو وہ بھانت بھانت کے لوگ جمع نہ کرتے۔ ان کے اپنے پاس بہت سے ملک کے غلام تھے۔"

وہ بُری طرح تڑپا تھا لیکن اپنی جگہ جھول کے رہ گیا تھا۔

"ایک بار پھر سوچو۔" میں نے کہا۔

"وہ . . . وہ کراچی میں ملے تھے . . . ہم سب کار میں گئے تھے اور کار چوہدری دلاور کی تھی۔" وہ بولا۔

"یہ تم کو کیسے معلوم ہوا؟"

"مجھے موقع مل گیا تھا۔ راستے میں ایک جگہ . . . ڈرائیور اُتر کے سگریٹ لینے گیا تھا۔ میں نے گلوز کمپارٹمنٹ کھول کے دیکھا . . . اس میں کاغذات تھے۔ گاڑی کے مالک کا نام چوہدری دلاور لکھا ہوا تھا۔"

میں نے سر ہلایا "یہ بات سمجھ میں آتی ہے، اب آگے بولو۔"

"چوہدری دلاور صاحب . . . اور چیف . . . دونوں ہوائی جہاز سے کراچی پہنچے تھے۔" اس نے کہا "وہ ہمیں یہاں ملے تھے تو ڈرائیور اُن کو چوہدری صاحب کہہ رہا تھا۔"

"یہ چیف کون تھا، اس کا نام تمھیں معلوم ہے؟"

اُس نے نفی میں سر ہلایا "وہ کالا سا آدمی تھا، موٹے . . . گھونگریالے بالوں والا، اُس کے کانوں میں مندریاں تھیں . . . اس نے سب کو ادائیگی کی تھی، ڈرائیور کے سوا۔ باس نے اس سے کہا تھا کہ تمھیں خود چوہدری صاحب انعام دیں گے، جب تم واپس آؤ گے۔ وہ کہنے لگا کہ . . . کیا مجھے بھی جانا ہے . . . میں تو ڈرائیور ہوں ان کا۔ انھوں نے تو مجھ سے کچھ نہیں کہا تھا۔ باس نے کہا کہ چلو اب میں کہہ رہا ہوں، تم ساتھ جاؤ گے ان کے ورنہ . . . انھیں کون لے جائے گا۔ اس وقت تک باس نے نہیں بتایا تھا . . . کہ وہ خود بھی ہمارے ساتھ ہوگا۔ وہ ہمیں رات کو کشتی پر سوار ہونے کے بعد نظر آیا۔ جب کشتی روانہ ہو چکی تھی۔"

"اچھا، کشتی کس کی تھی؟"

"مجھے نہیں معلوم . . ."

"تم لوگ کس وقت چلے تھے؟" میں نے کہا۔

"رات آٹھ بجے۔ اس وقت کشتی کوئی اور چلا رہا تھا۔ کوئی غریب سا ماہی گیر تھا، اس کی بیوی تھی اور ایک بیٹی . . . اُن سے چیف نے کہا تھا کہ ہم سمندر کی سیر کریں گے۔ رات دس بجے تک کے پانچ سو روپے دیں گے۔ ایک گھنٹا جانے کا، ایک گھنٹا واپس آنے کا . . . لیکن ان میں سے کوئی بھی واپس نہیں گیا۔"

"سب کو مار دیا تم نے؟"

"ہم نے نہیں . . . اُن دونوں نے . . . جو باس اور چیف کہلاتے تھے۔ باس نے پہلے بڈھے کو دھکّا دیا۔ وہ سمندر میں گر گیا تو اس کی بیوی چلاّنے لگی۔ اسے چیف نے پانی میں پھینک دیا . . . یہ رات نو ساڑھے نو بجے کی بات ہے . . . اس کے بعد انھوں نے لڑکی کو پکڑ لیا . . . وہ بہت چیخی چلاّئی . . ."

"اور تم بے غیرت . . . دیکھتے رہے۔" میں نے اُس کے سر پر مکّا مارا۔ اس کا سر لٹک گیا۔

"ایک نے ہمّت کی تھی . . . لڑکی نے اُسے مدد کے لیے بلایا تھا . . . باس نے اُسے شوٹ کر دیا . . . اور ہم سے کہا کہ یہ تم سب کے لیے سبق ہے۔" وہ بڑی مشکل سے سر اُٹھا

کے بولا۔ "اس کے بعد کسی نے . . . دخل نہیں دیا۔ انھوں نے . . . حرامیوں نے . . . لڑکی کو زبردستی شراب پلائی . . . پھر اُس کے ساتھ زبردستی کی . . . انھوں نے ہم سے بھی کہا . . . مگر کسی نے بھی ہمت نہیں کی . . . معلوم نہیں وہ بے ہوش تھی . . . یا مر چکی تھی . . . جب انھوں نے اس کو بھی سمندر میں ڈال دیا۔"

میرا خون آہستہ آہستہ کھولنے لگا تھا مگر وہ جن کو میں موت سے سخت تر سزا دے سکتا تھا اپنے انجام کو پہنچ چکے تھے۔ اس دنیا میں اُن کی بربریت اور شیطانی ہوس کا شکار ہونے والی وہ آخری لڑکی تھی جسے میں نہیں جانتا تھا مگر اُس کے آخری وقت کے سارے کرب کو محسوس کر سکتا تھا۔ جب بھوکے ننگے بھیڑیوں نے اس کی نظروں کے سامنے پہلے باپ کو اور پھر اس کی ماں کو مار ڈالا تھا اور ابھی یتیمی کے زخم سے بے ... ہی رہا تھا کہ وہ بھیڑیے اُس پر پل پڑے اور اُسے نوچنے کھسوٹنے لگے تھے۔ یقیناً اُس نے موت کی آرزو کی ہو گی۔ اس کی یہ آرزو پوری تو ہوئی مگر کتنی بار مرنے کے بعد۔

"اب . . . خدا کے لیے مجھے کھول دو . . . چند منٹ کے لیے بیٹھنے دو . . ." وہ چلاّیا۔

"کاش میرے لیے تم کو اس لڑکی سے زیادہ بے آبرو کر کے مارنا ممکن ہوتا۔" میں نے کہا۔ "مجھے تو افسوس ہے کہ باقی سب اتنی آسان موت کیوں مر گئے۔"

وہ چلاتا رہ گیا اور میں باہر نکل آیا۔ دروازے کے پاس گل انتہائی وحشت زدہ کھڑی تھی۔ شاید اُس نے بھی وہ سب سن لیا تھا جو میں نے سُنا تھا۔ کچھ کہے بغیر وہ میرے ساتھ عرشے پر آ گئی۔ میں ذہنی طور پر بہت پریشان تھا۔ اس تفتیش کے نتیجے میں مجھے ایک ایسی بات معلوم ہو گئی تھی جس نے میرے اعصاب کو متاثر کیا تھا۔ میرے کان ایک مجبور لڑکی کی چیخوں سے سنسنا رہے تھے جو کمزور اور بے بس تھی اور اس کے مقابل ہوس کے شکاری تھے۔ بے ضمیر، ننگِ انسانیت اور درندہ صفت۔

"سکندر بھائی! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" گل نے کہا۔

میں نے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھ کے اسے قریب کر لیا۔ "تم تو کہتی تھیں کہ تمھیں کسی سے ڈر نہیں لگتا۔"

"ایسا میں نے . . . کبھی نہیں سُنا . . . کبھی نہیں دیکھا . . . ہم تو مال لوٹتے تھے . . . ہم تو ڈاکو تھے سکندر بھائی۔" اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ "کوئی ہماری جان لینے کی نیت سے سامنے آ جاتا تھا تو مارا بھی جاتا تھا . . . مگر ہم نے کسی گھر سے کسی کی بہو بیٹی نہیں اٹھائی تھی۔ کسی گاؤں کی عزت نہیں لوٹی تھی۔ ڈاکو تو ڈاکو ہوتے ہیں۔ کون روک سکتا ہے ان کو . . . لیکن ہم لوگوں نے یہ کبھی نہیں کیا تھا جو اُن شیطانوں نے کیا۔"

"تم کیوں روتی ہو گل! اس لڑکی کے لیے جسے تم نے دیکھا تک نہیں تھا؟"

"وہ لڑکی میں بھی تو ہو سکتی تھی سکندر بھائی . . . ایسے خطرناک لوگوں میں گھری ہوئی تھی میں . . . میرا ایک ... کیا بگاڑ لیتا اُن کا۔ اگر اُن پر بھی شیطان سوار ہو جاتا۔ مگر ... ناقابلِ تصور تھا میرے لیے . . . نا ممکن تھا اُن کے ..." اُس کا بدن لرزنے لگا تھا۔

"یہی وجہ ہے گل . . . کہ میں اُن کو سخت ترین عذاب کے ساتھ مارنا چاہتا ہوں۔ ان کے مقابلے میں ڈاکو تو واقعی شریف آدمی نظر آتے ہیں . . ."

سردار جی جمائیاں لیتے ہوئے نمودار ہوئے تو گل نے ... آنسو صاف کر لیے۔

"بلتے بلتے رات ہو گئی۔ میں تو سمجھا تھا اپنے مہینوال صاحب ہیں۔" انھوں نے دانت نکالے۔

"کون مہینوال؟" گل نے معصومیت سے سوال کیا۔

"لو جی، کڑی بھی کیسی بھولی ہے۔ او بھئی سوہنی دا مہینوال یہ ہو گئے ہیر رانجھا۔" سردار جی نے میری طرف اشارہ کیا۔ "تو پھر اور کون ہو سکتا ہے سوہنی مہینوال . . ."

گل سوال کر کے پچھتائی۔ "میں آپ کے لیے چائے ... کے لاتی ہوں۔" اُس نے جاتے ہوئے کہا اور سردار جی منہ پھاڑ کر ہنسے۔ وہ کچھ ترنگ میں تھے۔

میں نے کہا۔ "سردار جی! آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ ہم ... وقت کہاں ہیں؟"

"ہاں، ہم لانچ میں ہیں اور لانچ سمندر میں ہے۔"

"مذاق کی بات نہیں۔" میں نے کہا۔ "میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ہم نے کتنا فاصلہ طے کر لیا ہے اور ہم اس جہاز تک کتنی دیر میں پہنچ جائیں گے؟"

"بس جہاز نظر آ جائے، پھر میں بتا دوں گا کہ ہم کتنی دیر ... پہنچ سکتے ہیں۔" سردار جی نے کہا اور پھر ایک دم سیریس ... گئے۔ "او ئے بے وقوف، مجھے کیا معلوم جہاز اتنے ... میں کہاں ہو گا؟"

"فرض کریں، میں آپ کو ایک نقشہ بنا دوں۔" ... کہا۔ "یادداشت کی مدد سے۔"

"کیسا نقشہ؟"

"ایک نقشہ تھا۔ افسوس کہ مجھے لینا یاد نہیں رہا ... بڈھے کے پاس رہ گیا جو ہماری لانچ لے گیا ہے۔ میں ... بس وہی اس کو سمجھتا تھا مگر میں نے وہ اتنی بار دیکھا تھا کہ میرے ذہن میں ہے۔"

"اچھا، اندر آ کے نقشہ بناؤ۔" سردار جی نے کہا۔ "میں تم کو کاغذ پنسل دیتا ہوں۔"

میں ذہن پر زور دیتے ہوئے اس نقشے کو تصور کی مدد سے کاغذ پر منتقل کرنے میں مصروف ہو گیا۔ کافی سوچ بچار کے بعد بالآخر میں نے اپنے اطمینان کی حد تک نقشے کی تمام ضروری تفصیلات درج کر دیں۔ سردار جی نے چائے نوش فرما کے گلا صاف کیا۔ "واہ واہ!" اور پھر نقشے پر غور کرنے لگے۔

"اس میں ایک دو چیزیں کم ہیں . . . لیکن کوئی حرج نہیں . . . میں خالی جگہ مکمل کر سکتا ہوں . . ." انھوں نے کہا۔ "اور اس نقشے کے مطابق . . . مگر ایک بات تو میں نے پوچھی ہی نہیں۔ وہ بحری جہاز کتنا بڑا ہے۔ کتنے ٹن کا ہو گا؟"

"وہ . . . میں نے تولا تو نہیں . . . مگر خاصا بڑا ہے۔"

میں نے اندازے کی بنیاد پر جہاز کا طول و عرض بیان کیا۔

"ہوں۔" سردار جی نے کہا۔ "میں سمجھ گیا۔ اس کی رفتار زیادہ نہیں ہو سکتی۔ میں ذرا حساب لگا لوں۔"

سردار جی نے نقشے کو سمجھ لیا تھا اور ان تمام عوامل کو بھی جو سمندری سفر میں وسیلۂ ظفر ثابت ہو سکتے تھے اور جو ہم جیسے ناتجربہ کار لوگوں کی نگاہ میں آ ہی نہیں سکتے تھے۔ کسی بھی مقصد کے حصول کے لیے محض ارادہ کافی نہیں ہوتا۔ کامیابی کے لیے سازگار حالات میسر آنے کی شرط ہے۔ تاہم نیت میں کھوٹ نہ ہو تو اسباب اور وسائل قدرت فراہم کرتی ہے۔

سردار جی کے لیے ہم اور ہمارے لیے سردار جی فرشتۂ غیبی ثابت ہوئے تھے۔ عام حالات میں وہ کسی بھی واردات کے بعد وقت ضائع کیے بغیر اس کی رپورٹ کرتے۔ اُن کے بہت سے ساتھی مارے گئے تھے اور حملہ آوروں نے انھیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا تھا۔ نوعیت کے اعتبار سے یہ بہت سنگین معاملہ تھا لیکن ایک مشکل وقت میں مدد کرنے والوں نے ان کو دوسری مشکل میں ڈال دیا تھا۔ وہ انکار بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ایک طرف اخلاقی احسان مندی کا جذبہ تھا تو دوسری طرف مجبوری بھی تھی اور معلوم نہیں، انھوں نے میری بات سن کے یہ فیصلہ کیا تھا کہ ہم مظلوم ہیں اور شریف لوگ ہیں۔ چنانچہ ہمدردی کے مستحق ہیں یا کوئی اور بات تھی۔ بہر حال اب وہ ہماری مدد کر رہے تھے اور ہمارے درمیان کسی قسم کی رنجش یا کشیدگی نہیں تھی۔

"کچھ بولو سردار جی۔" میں نے کہا۔ "کچھ بات بنی؟"

"ہاں، بات کیسے نہیں بنے گی۔" سردار جی نے کہا۔ "اپنی اتنی عمر سمندر میں گزر گئی جھک مارتے۔"

"کتنی عمر گزر گئی؟" میں نے کہا۔

"اوئے یار، تو بیچ میں بڑے مشکل سوال کر دیتا ہے۔ ٹھہر میں حساب لگا کے بتاتا ہوں۔" وہ بولے۔ "یہ ہو گئے خیر سے . . . چار سال . . . اور . . . ہاں . . . تیرہ مہینے . . . تے انتیس دن۔"

مجھے ہنسی آئی۔ "پانچ سال دو مہینے بھی تو کہہ سکتے ہیں آپ۔"

"اچھا . . . ہاں یار . . ." وہ جھینپ کر مسکرانے لگے۔ "خیر تو مطلب یہ تھا کاکا، کہ اب ہم کام بھی ایسا ہی کر رہے ہیں۔ سراغ لگاتے ہیں کہ کون کدھر ہے، کیا کر رہا ہے اور کیوں کر رہا ہے۔ تو پھر ایک سالم جہاز کا سراغ لگانا کیا مشکل ہے۔ بالکل ... اندازہ کر لیا ہے میں نے۔"

"یہ تو بہت ہی اچھی خبر ہے۔" میں نے کہا۔ "کیا خیال ہے ہم کب تک اس جہاز کو پکڑ لیں گے؟"

"میرے اندازے کے مطابق۔ بارہ سے چودہ گھنٹے لگ جائیں گے۔"

"یعنی آج رات کوئی امکان نہیں۔" میں نے مایوسی سے کہا۔

"امکان کیوں نہیں۔" انھوں نے ایک ہچکی لے کر کہا۔ "... سی رفتار سے (ہچکی) سیدھے تیر کی طرح گئے (ہچکی) . . . تو آٹھ گھنٹے . . ." انھوں نے ہچکی لی۔ "او مٹھا جا کبھی کو کے۔"

"کیا ہوا سردار جی! کیسے کہہ رہے ہیں؟" میں نے حیرانی سے ادھر اُدھر دیکھا۔

"او یار . . . تیری بھرجائی . . . ہمیشہ بڑے غلط موقع پر یاد . . . (ہچکی) کرتی ہے۔"

"اس لیے ہچکی لگ گئی آپ کو؟" میں نے کہا۔

"اور کیا، یہی بات ہے کہ اس وقت وہ (ہچکی) . . . آج بدھوار ہے نا . . . ہاں . . . بدھوار کو وہ گڑ والے میٹھے چاول پکاتی ہے . . . بھئی واہ، کیا سواد والے ہوتے ہیں۔ بندہ زردہ بھول جاتا ہے . . . اس نے کہا ہو گا، ہائے جند۔"

"ہائے جند یعنی ہائے زندگی۔" میں نے کہا۔

"جند مجھے کہتی ہے نا وہ۔ راجندر نام ہے میرا۔" سردار جی نے سینے پر ہاتھ مارا۔ "ہاں . . . اب ٹھیک ہے۔ دیکھا ہچکی رک گئی ہے۔ اب وہ مجھے بھول کے کھانے میں لگ گئی ہے . . . کچھ پتا ہے یار کہ رات کو کھانے میں کیا ملے گا؟" انھوں نے رازدارانہ انداز میں پوچھا۔

"رات کو . . . کیا خیال ہے گڑ والے میٹھے چاول ..."

نے کہا۔

"اوئے بلّے بلّے۔" انھوں نے میرے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ "دل خوش کیا اس وقت تو نے۔"

گل ہم سے خاصے فاصلے پر اکیلی کھڑی سمندر کی رات کو دیکھ رہی تھی اور صاف ظاہر تھا کہ ہمارے دوپہر کے رویّے پر ابھی تک برہم ہے۔ محسن بھی اس کے ساتھ نہیں تھا۔

"گل۔۔۔ اے گل!" میں نے چلّا کے کہا۔ "ادھر آؤ۔"

اُس نے سر گھما کے دیکھا اور آہستہ آہستہ قریب آئی۔

"کیا ہے؟"

"سردار راجندر سنگھ تم سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "بولو سردار جی۔ گل ایسی نہیں ہے کہ کسی بات کا بُرا مانے۔ اور محبت سے تو پتھر بھی موم ہو جاتا ہے۔"

"وہ بھئی گل۔" سردار جی نے کہا۔ "ہے تو ذرا عجیب سی بات، پر یہ اپنا دل نامراد۔۔۔ ایسا ہی ہے بس۔"

"دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت۔" میں نے کہا۔

"ہاں — ناراض مت ہونا۔۔۔ دل اس وقت اچانک مچل گیا۔۔۔"

گل نے پہلے مجھے گھورا اور پھر سردار جی کو۔

"کہہ دیں سردار جی۔ دل کی بات کہتے ہوئے ڈرنا نہیں چاہیے۔ آپ کہیں تو میں ہٹ جاؤں۔" میں نے کہا۔ "اکیلے میں۔۔۔"

"سکندر بھائی، یہ کیا بے ہودہ مذاق ہے؟" گل بگڑ کے بولی۔

"نہیں گل، سردار جی بھی آخر انسان ہیں۔ ان کے بھی کچھ ارمان ہیں اور دل پر کسے اختیار ہے۔" میں نے کہا۔ "تم کو دیکھتے ہی۔۔۔"

"کیا۔۔۔! سردار جی، اس وقت بھی بارہ بجے ہوئے ہیں آپ کے؟" گل نے مشتعل ہو کے کہا۔

"او بھئی گل۔" سردار جی نے بوکھلا کے کہا۔ "تم کو دیکھ کے میں نے سوچا۔۔۔" وہ میری طرف دیکھ کر ہنسنے لگے۔

"کیا سمجھا ہے آخر آپ نے مجھے؟" گل چراغ پا ہو کے بولی۔

"او بھئی کاکی، غصہ کیا۔ گڑ کے چاول پکانا کوئی ایسا مشکل کام تو نہیں۔" سردار جی نے کہا۔ "تم کو دیکھا تو میں نے کہا، پوچھ لیتے ہیں۔ تم کو پکانا نہیں آتا تو مٹی پاؤ۔"

خفت سے گل پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ "گڑ کے چاول۔۔۔"

"اور کیا۔" میں نے اُسے ڈانٹ کر کہا۔ "تم تو ایسے لال پیلی ہو رہی تھیں جیسے سردار جی تم کو پرپوز کرنے والے تھے۔"

"کیا کرنے والے تھے؟" وہ سمجھی نہیں تھی کہ پرپوز کرنا پیغام دینے کو کہتے ہیں۔

"کچھ نہیں، کچھ نہیں۔" سردار جی نے گھبرا کے کہا۔ "او یار، گل کے ہاتھوں میرا جھٹکا کراتا ہے؟ گولی مارو گڑ کے چاولوں کو۔"

"سردار جی! گڑ یہاں کہاں، ورنہ میں ضرور پکاتی آپ کے لیے گڑ کے چاول۔" گل نے کہا۔

"چلو پھر جاؤ۔ یہاں وقت کیوں ضائع کر رہی ہو ہمارا۔" میں نے اُسے ڈانٹ کر کہا۔ "غضب خدا کا! لڑکیاں ہر معاملے میں ٹانگ اڑانے لگی ہیں۔ جاؤ جا کے ہانڈی چولہا کرو۔۔۔ کھانا پکاؤ۔"

"نوکر نہیں ہوں میں کسی کی۔" وہ جھلا کے پیر پٹختی ہوئی جانے کے لیے پلٹی۔

"نوکرانی تو ہو، نوکر نہ سہی۔" محسن نے سامنے سے آ کے کہا۔

"خود اپنا پکاؤ اور کھاؤ۔ احسان فراموش لوگ ہو تم۔ دن میں اتنی محنت کی میں نے اور جناب کو کچھ پسند ہی نہیں آیا۔" گل نے کہا۔

"اب یہ تو بہت مشکل ہے عزیزہ۔" محسن بولا۔ "کہ ہم مروت میں وہ سب جان لیوا مرکبات کھا لیں جو تم ایجاد کرتی ہو۔ اور پھر تمھارا شکریہ بھی ادا کریں۔ ہم خود بہترین کک ہیں۔"

رات نو بجے میں نے اور محسن نے خود کو بہترین کُک ثابت کرنے کا عملی مظاہرہ شروع کیا۔ متعدد اختلافی مسائل ہم نے ٹاس کر کے طے کیے۔ مثلاً یہ کہ آٹا کون گوندھے گا، پیاز کون کاٹے گا۔ جب محسن زار و قطار روتے ہوئے پیاز کاٹ رہا تھا تو میں آٹا گوندھنے کے تجربے سے دوچار تھا۔ کبھی اس میں پانی زیادہ ہو جاتا تو آٹے کی لئی سی بن جاتی تھی، مزید آٹا ڈالنے سے آٹا سخت ہو جاتا تھا۔

"یار محسن۔" میں نے آٹے میں لتھڑی ہوئی انگلیاں جھٹک کے کہا۔ "آخر یہ عورتیں کیا چکر چلاتی ہیں۔ آٹا گوندھنے کے بعد ہاتھ صاف، برتن صاف۔ ایسی صفائی سے آٹے کو سمیٹتی ہیں، اُٹھاتی ہیں اور پٹختی ہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ ان کے ہاتھوں سے کوئی ایسی رطوبت خارج ہوتی ہے۔" محسن نے قمیص کی آستین سے اپنی ناک اور آنکھوں کی رطوبت صاف کرتے ہوئے ایک سائنسی نظریہ پیش کیا۔ "جو آٹے کو چپکنے نہیں دیتی۔ اس کیچڑ سے تو روٹیاں کیسے بنائے گا؟"

"اللہ بڑا کارساز ہے۔" میں نے کہا۔ "ہو رہے گا کچھ نہ کچھ۔ گھبرائیں کیا۔ دوست۔"

"یار، کیا یہ جو آنسو گیس ہوتی ہے، اس میں پیاز کا عرق استعمال ہوتا ہے؟" محسن بولا۔

"کتنی دیر ہے کھانے میں؟" اوپر سے گل نے چلّا کے کہا۔

"بس جی، بریانی دم ہو رہی ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "شامی کباب بھی تیار ہیں۔"

"یہ سب تیری وجہ سے ہوا۔ کیا تھا اگر دن میں اس کی تعریف کر دیتا۔" محسن بولا۔ اس وقت وہ انڈے پھینٹ رہا تھا۔

"آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بیباکی۔" میں نے کہا۔ "یہ بتا، پرکار ہے؟ جس سے گول دائرہ بناتے ہیں۔"

"اسے پرکار نہیں بیلن کہتے ہیں جس سے گول روٹیاں بنائی جاتی ہیں۔" محسن نے کہا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ بھی کوئی زنانہ ٹرک ہے آخر وہی بیلن میں بھی تو استعمال کر رہا ہوں۔"

ایک گھنٹے بعد پھر گل نے ڈانٹ کر پوچھا۔ "آخر کیا ارادہ ہے یہ۔ رات کا کھانا کیا ناشتے میں پیش کیا جائے گا؟"

"بس جناب، یہ شاہی ٹکڑے بھی ہو گئے۔" میں نے کہا۔

بالآخر ہم ایک ایک ٹرے فاتحانہ انداز میں اٹھائے عرشے پر نمودار ہوئے۔ گل کے ساتھ سردار جی تھے اور اُسے اپنی داستانِ حیات سے کوئی اقتباس بڑی سنجیدگی سے سنا رہے تھے مگر گل تھی کہ مسلسل کھی کھی کر رہی تھی۔

"لو وہ ڈنر آ گیا۔" سردار جی نے خوش ہو کے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ "بلّے بلّے جوانو۔ بریانی، شامی کباب اور شاہی ٹکڑے۔"

"آپ بھی کیا یاد کریں گے۔ ہم کسی کی دھونس میں آنے والے نہیں ہیں۔" محسن نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اپنا کام خود کرتے ہیں۔" میں نے اس کی تائید کی۔

مگر ٹرے پر سے کپڑا ہٹاتے ہی سردار جی نے وہ آملیٹ دیکھا جس کا موجد محسن تھا اور میری صنعت گری کی شاہکار روٹیوں کو دیکھا تو ان کی صورت پر واقعی بارہ بج گئے۔ گل کا ہنس ہنس کے بُرا حال ہو گیا۔

"کھائیں سردار جی۔ یہ دیکھیں، کیسا صحیح نقشہ بنا ہے برِاعظم آسٹریلیا کا۔ وہاں کنگارو بھی ہوتے ہیں اس شکل کے۔" اس نے دوسری روٹی اٹھا کے کہا۔

"اوئے تواڈا بیڑا غرق۔" سردار جی نے پہلے لقمے کو نگلتے ہی کہا۔ "الگ الگ لے آتے ساری چیزیں۔ پانی میں آٹا گھول کے پی لیتے، انڈے پھینٹ کے پی لیتے۔ پھر بیٹھ جاتے چولھے پر۔"

"بھئی واہ اپنے سکندر صاحب، کیا لطف ہے اس ساؤتھ امریکن آملیٹ کا۔" محسن بولا۔

"اور کیا وٹامن سے بھرپور صحت بخش روٹیاں ہیں۔ مگر افسوس کہ لوگ صورت کو دیکھتے ہیں۔"

"اور صورت پر اتراتے ہیں۔ سیرت کی قدر نہیں رہی۔"

"ہائے ہائے! اُدھر وہ کھا رہی ہوگی گڑ کے میٹھے چاول، الائچی کی خوشبو والے۔" سردار جی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "اِدھر سردار راجندر سنگھ کی جان پر بنی ہوئی ہے۔ اوئے یار، ہاتھ جوڑ کے معافی مانگ لو گل سے۔"

ہم نے اپنی خودی کو بلند رکھتے ہوئے اس آخری مشورے کو نظر انداز کیا اور اگرچہ آملیٹ میں مرچوں کا تناسب بھی اتنا ہی زیادہ تھا جتنا نمک کا، مگر ہم مسکراتے ہوئے ڈنر میں مصروف رہے اور ایک دوسرے کو مبارکباد بھی دیتے رہے۔ ہم پر آج اپنی قابلِ رشک صلاحیتوں کا انکشاف ہوا کہ ہم اتنا اچھا پکا بھی سکتے ہیں اور پھر اُسے کھا بھی سکتے ہیں!

بعد میں میرے اور محسن کے درمیان ایک شدید قسم کی جھڑپ ہوئی جس میں اُس نے مجھے اور میں نے اُسے موردِ الزام ٹھہرایا۔ سردار جی نے رات بھر کے لیے لانچ کی کمان سنبھال لی تھی اور بڑی جو حد درجہ صابر و شاکر قسم کا ماتحت تھا ہمارے تیار کردہ ڈنر کو خاموشی سے کھا کے سو گیا۔

آدھی رات سے کچھ پہلے ہی ہماری گل سے صلح ہو گئی اور وہ ہمارے لیے کافی بنا کے لائی تو ہم عرشے پر نیم روشن، کھلے آسمان کے نیچے بیٹھے ہوئے سمندر کی نمی سے بوجھل ہوا کی ٹھنڈک کو محسوس کر رہے تھے۔

"اگر آج رات کسی وقت اچانک الیس الیس کرانتی تھرڈ ہمارے سامنے آ گیا، تو کیا ہوگا؟" محسن بولا۔

"کیا ہوگا؟" میں نے کہا۔ "ہم خدا کا نام لے کر چڑھ جائیں گے اوپر۔ ہمارا پروگرام یہی تھا۔"

"ٹھیک ہے۔ وہ ہمیں روکنے کی کوشش بھی نہیں کریں گے، لیکن اس کے بعد لانچ واپس چلی جائے گی۔ کیا یہ بات شک پیدا نہیں کرے گی کہ لانچ نے عملے کو واپس لے جانے کے لیے انتظار کیوں نہیں کیا؟"

"یہ نکتہ غور طلب ہے۔" میں نے کہا۔ "ہمیں سردار جی سے یہ درخواست کرنا ہوگی کہ وہ ہمیں چھوڑ کے فوراً واپس نہ جائیں لیکن اس قسم کی درخواست وہ کیوں مانیں گے؟"

"ابھی تو ہم انھیں ساتھ لے آئے ہیں۔ بعد میں اُن کو روکنے والا کون ہوگا۔" محسن نے کہا۔ "اور پھر یہ بھی تو بالکل غیر یقینی ہے کہ اس جہاز پر ہمارا قیام کب تک ہوگا۔ پھر اس مشن کے بارے میں ابھی خود ہم بھی نہیں جانتے کہ اس میں ہمیں کامیابی ہوگی یا ناکامی — اور کامیابی کے لیے مواقع کب ملیں گے۔"

"مزید غور کرنے پر میری عقلِ سلیم میں وہ سب باتیں آنے

لگی ہیں جو اب تک نہیں آئی تھیں، مثلاً یہ کہ ہمارا سب سامان تو اسی لانچ پر ہے۔ اُسے ہم جہاز پر بھی منتقل نہیں کر سکتے اور سردار جی سے بھی نہیں کہہ سکتے کہ جاؤ ہم نے اپنا سب کچھ تمھیں سونپا۔"

"وہ قبول بھی نہیں کریں گے یہ ترکہ۔"

"خود ہم کیسے دستبردار ہو سکتے ہیں اپنے زادِ راہ سے آگے چل کے یہی تو ہماری مشکل کشائی کا سامان ہوگا۔" میں نے کہا۔ "پھر آخری اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اگر ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے تو جہاز کے ساتھ کیا خود بھی غرق ہوں گے؟ کون بچانے والا ہوگا ہمیں، دوست محمد کو ہم نے واپس کر دیا۔"

"یہ ایک بنیادی غلطی تھی۔ ہم اس سے کہہ سکتے تھے کہ وہ اسی راستے پر ہمارے پیچھے آئے اور فاصلہ برقرار رکھتے ہوئے ایک محدود دائرے میں گشت کرتا رہے اور جب ضرورت پڑے تو ہمیں نکال کے لے جائے۔"

"وہ تو اب گیا۔ نہ جانے کس راستے سے بمبئی پہنچے گا۔" میں نے کہا۔ "ہم کیا کریں؟ میرے نزدیک ان سارے مسائل کا صرف ایک ہی حل ہے۔"

"ہاں۔" محسن نے میری تائید کی۔ "میں بھی اس حل سے اتفاق کرتا ہوں، لیکن بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے گا؟"

"سابق ناگ منی کو میں اس کام کا اہل سمجھتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "وہ سردار جی کو گولی بھی مار سکتی ہے سامنے گی نہیں۔ مگر اس میں عقل کے ساتھ حوصلہ بھی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ سردار جی بھی اس مرحلے پر وفات پانا پسند نہیں کریں گے۔ اُن کو انکار کر کے مرنا ہوتا تو وہ شروع سے ہی تعاون نہ کرتے۔ یہ تو ہو جائے گی سو پیاز کھا کے سو جوتے کھانے والی بات، کہ نہ فرض ادا ہوا نہ ہماری مدد ہوئی اور جان بے سبب گئی۔"

"سکھ کا کیا بھروسا کب دماغ گھوم جائے۔"

"راجندر سنگھ ویسا سکھ ہوتا تو اب تک خود مارا جا چکا یا ہمیں مار چکا ہوتا۔" میں نے کہا۔ "گل کو یہ بات تو سمجھا دے۔ بحری جہاز پر ہم دونوں جائیں گے۔ وہ سردار جی کو روکے گی۔"

"مگر کب تک؟"

"جب تک۔ . . لانچ کہیں خود نہ رک جائے۔ اس میں تیل ختم ہو جائے گا بالآخر — دو چار گھنٹے یا آٹھ دس گھنٹے، جب تک لانچ چلتی ہے اسے ایک دائرے میں چلتے رہنا چاہیے اور گل کچھ نہ کرے، بس سردار جی کو دُور نہ جانے دے۔ انھیں مجبور کر دے کہ وہ ہماری مدد کے لیے نزدیک ہی موجود رہیں۔"

محسن نے کہا۔ "یار، فرض کرو ایسا نہ ہوا، سردار جی نے بعد میں انکار کر دیا اور کہا کہ لڑکی مار دے مجھے گولی۔ وُرتہ میں تو جا رہا ہوں سیدھا واپس، تو گل کیا کرے گی؟ جسمانی طور پر تو وہ کمزور ہے۔ وہ گولی چلائے گی تو لانچ کون چلائے گا؟ کیا اس کی مجبوری سے فائدہ نہیں اٹھائیں گے سردار جی؟"

"لانچ پر صرف سردار جی ہی نہیں، دوسرا وہ برمی بھی ہے۔ بفرضِ محال سردار جی نے خودکشی قبول کی۔ تو برمی شاید اپنا مرنا پسند نہ کرے۔ . . یہ رسک تو گل کو لینا ہی ہوگا محسن۔ . . اور ہمیں بھی۔ اس میں ففٹی ففٹی چانس ہیں کہ سردار جی انکار کر دیں اور مارے جائیں۔ پھر باقی ففٹی پرسنٹ میں بھی برابر کے امکانات ہیں کہ برمی مانے یا نہ مانے۔ گویا گل کے حق میں پچھتر فی صد امکانات ہیں اور اس کے خلاف پچیس فی صد۔"

"یہ ایک احمقانہ نتیجہ اخذ کیا ہے آپ نے۔ صرف ایک فی صد کے رسک پر بھی گل اسی طرح ڈوب جائے گی جیسے ننانوے فی صد پر۔ یہ کوئی ریاضی کا سوال نہیں ہے۔ ہم اس حقیقت کو نظر انداز کریں گے کہ تنہا گل کے لیے اس سمندر میں لانچ کو کنٹرول کرنا ناممکن ہے۔ تو صاف اسے موت کے منہ میں دھکیلنے والی بات ہوگی۔ جانتے بوجھتے میں اس تجویز کی حمایت نہیں کر سکتا جس کے بارے میں مجھے یقین ہے کہ یہ قابلِ عمل نہیں۔"

"پھر ہم دونوں میں سے ایک یہ کام کرے۔ میں لانچ پر رک جاتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "تم دونوں جہاز پر چلے جاؤ۔"

"یہ بھی نہیں ہو سکتا۔ تمھاری ضرورت وہاں زیادہ پڑتی ہے جہاں ہاتھ خالی ہوں۔ میں اور گل اسلحہ ضرور استعمال کر سکتے ہیں مگر کوئی ایسی صورتِ حال پیدا ہو گئی کہ ہم سے اسلحہ رکھوا لیا گیا تو ہم کام خلاص۔ . . میں اکیلا جہاز پر جاؤں تب بھی۔ . ."

"پھر آپ ہی بتا دیں کہ کیا کرنا چاہیے؟" میں نے جھنجھلا کے کہا۔ "یہ بھی نہیں وہ بھی نہیں۔"

"ہمیں وہی کرنا چاہیے جو ہم نے طے کیا تھا۔ سردار جی لانچ لے کر چلے جائیں۔ ہم تینوں بحری جہاز پر ایک ساتھ رہیں گے۔" محسن بولا۔ "ایک ساتھ رہ کے رسک لینا اور مر جانا بہتر ہے۔"

"اور ہمارا سامان؟"

"سامان جائے بھاڑ میں۔ زندگی رہی تو اسباب پھر اکٹھا ہو جائے گا۔" محسن نے کہا۔ "جتنا اسلحہ ہمارے پاس ہے اگر وہ کام نہ آیا تو وہ سوٹ کیس بھی بے کار ہے جس میں گولہ بارود بھر انتظام نے۔ روپیہ پیسہ بھی جو ساتھ رکھ لیں کافی ہونا چاہیے۔ ورنہ کوئی بات نہیں۔ یہ ہاتھ کا میل ہم کسی سے بھی حاصل کر سکتے ہیں۔"

"سردار جی کو بخش دیں یہ سارا خزانہ؟"

"اگر وہ لیتے ہیں تو ہماری طرف سے ایک تحفہ نہیں بلکہ خزانہ بھی سمندر کے حوالے کر دیتے ہیں۔ اس کی تہ میں لاکھوں خزانے پہلے سے موجود ہیں۔" محسن نے کہا۔

حسبِ توقع سردار جی نے ہماری پیش کش کو مسترد کر دیا۔ جب میں نے سوٹ کیس کھولا تو ان پر تھوڑی سی دیر کے لیے سکتہ طاری ہو گیا۔

"اوئے، یہ کیا۔ . . اصلی نوٹ ہیں یا جعلی؟" انھوں نے کہا۔ "اور تمھارے پاس۔ . . تم ڈاکو بھی نہیں ہو۔ پھر اتنا مال کہاں سے مارا تم لوگوں نے؟"

میں نے کہا۔ "سردار جی! آم کھاؤ گے یا پیڑ گنو گے؟"

"آم اپنے بوٹے کے ہوں تا کاکا، تو پھر اپن آم کو دیکھتے ہیں بوٹے کو بھی نہیں۔ آم وہ کھائے جس کا بوٹا۔" سردار جی نے کہا۔

"ہم یہ سب دولت آپ کی نذر کرنا چاہتے ہیں۔"

"مگر کیوں؟ اور جب تم کو اس کی ضرورت نہیں رہی تو اپنی مصیبت میرے گلے کیوں ڈالتے ہو؟" سردار جی نے کہا۔

"آپ نے ہماری بہت مدد کی۔" میں نے کہا۔ "اس کا صلہ سمجھ کے قبول کریں، جتنی چاہیں رکھ لیں، ڈالر یا پاؤنڈ رکھ لیں یا انڈین کرنسی۔"

سردار جی نے قہقہہ لگایا۔ "او یارو! سردار راجندر سنگھ کو بڑے مواقع ملے اس سمندر میں کوئی دیکھنے والا بھی نہیں تھا۔ اسمگلروں نے ہیرے جواہرات پیش کیے۔ اس سے دس گنا رقم کے بھرے ہوئے سوٹ کیس دیے۔ لیکن اپنی عقل میں ایک ہی خرابی ہے۔ اپنی عقل غلام ہے دل کی۔ جو دل کہتا ہے کرتی ہے۔ دل جو بات نہ مانے، وہ ہم بھی نہیں مانتے۔ یہ تو ہمارے دل نے کہا تھا کہ تمھاری مدد کرنی چاہیے۔ دل اس کے خلاف بات کرتا تو اب تک یا ہم نہ ہوتے یا تم نہ ہوتے۔ یہ مت سمجھنا کہ تم نے سردار راجندر سنگھ کو قابو کر لیا تھا۔ ایسی ایسی جگہ ریوالور چھپا کے رکھے ہیں میں نے کہ تمھارے فرشتوں کو بھی پتا نہ چلتا اور میں تم کو ہینڈز اپ کرا دیتا کیونکہ تم ہو بے وقوف۔ دشمن پر بھروسا کرنے والے۔"

میں اور محسن اُسے بے وقوفوں کی طرح دیکھتے رہے۔

"ایک بات تو بتائیں سردار جی! کیا آپ نے میری کہانی پر یقین کر لیا تھا؟" میں نے کہا۔

"میں نے؟ یا میرے دل نے؟ دل کی گواہی پر ہی میں نے مان لیا تھا کہ تم اچھے لوگ ہو۔ جو کچھ تم کر رہے ہو وہ تمھارا کام ہے۔ میں تمھیں منع کرتا تو تم کون سا مان جاتے۔ یہ بتاؤ ان باقی دو سوٹ کیسوں میں کیا ہے؟"

"چلو چھوڑو سردار جی۔" میں نے کہا۔ "اب جو کچھ ہے سمندر کی امانت ہے۔ راز کو راز ہی رہنے دو۔"

"راز؟" سردار جی نے میرے کندھے پر ہاتھ مارا۔ "اوئے سُور دے پتر۔ سردار راجندر سنگھ سے راز کی بات کرتا ہے۔ لو ہم بتاتے ہیں تم کو کہ ان میں کیا ہے۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ اس سادہ دل اور بے وقوف نظر آنے والے سکھ نے قابلِ رشک ذہانت کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس نے ہمیں کچھ معلوم نہیں ہونے دیا تھا اور سب معلوم کر لیا تھا۔

میں نے کہا۔ "سردار جی! آپ نے اپنا قرض ہی نہیں چکایا بلکہ ہمیں مقروض کر دیا ہے۔"

"او نہیں یار۔ . . کیسا قرض اور کس کا قرض؟ تم نے میری مدد کی تھی لیکن اپنی غرض سے — تم آئے بھی اُس وقت جب ہم دو ہی بندے باقی رہ گئے تھے، پھر بھی تم نے ہمیں مارا نہیں۔ یہی تمھاری مہربانی تھی ورنہ تم کو لانچ کی ضرورت تھی، تم لانچ لے سکتے تھے۔ میں بھی تم کو ٹھکانے لگا سکتا تھا مگر میں نے سوچا کہ چلو، کچھ تمھارے لیے میں بھی کر دوں۔"

"آپ واپس جانے کے بعد بیان وہی دیں گے جو ہم پر اثر انداز نہ ہو۔"

"فکر مت کرو۔ تمھارا نام نہیں آئے گا اس میں۔ مجھے جو کہنا ہے میں کہہ دوں گا۔" سردار جی نے کہا۔ "اپنے آپ کو بھی تو بچانا ہوگا مجھے۔"

رات کے ایک بجے میں نے اور محسن نے مل کے اپنے تمام اسباب کو سمندر کے سپرد کیا۔ اب ہمارے پاس وہی رقم باقی رہ گئی جو ہم نے پاسپورٹ کے ساتھ اپنی کمر کے گرد بیلٹ بنا کے باندھی تھی۔ اسلحے کے نام پر بھی ہم سب کے پاس ایک ایک ریوالور رہ گیا۔ یہ اسلحہ کسی جنگ یا کسی سے مقابلے کے لیے قطعی ناکافی تھا۔ ہر ریوالور میں چھ گولیاں تھیں اور وقتِ ضرورت ہمیں ہر گولی کو احتیاط کے ساتھ استعمال کرنا تھا۔

سفرِ بے کراں سمندر میں مسلسل حرکت اور بیزار کُن یکسانیت رکھنے والے شور، بے یقینی اور ذہن پر مسلط بے نام خوف کا نام تھا۔ کب کیا ہوگا، ہوگا یا نہیں ہوگا اور آنے والی صبح کون کہاں دیکھے گا۔ دیکھے گا یا نہیں دیکھے گا۔ ہم جو آج اُس وقت عزم اور حوصلے اور جدوجہد کے جوش، جذبۂ اعتماد اور توانائی سے بھرپور، جیتے جاگتے، پُرامید انسان ہیں جو ایک مشترک مقصد اور جذبات کے رشتوں اور اچھے مستقبل کے خوابوں کے مالک ہیں، کل اس بحرِ بے کنار کی تہ میں گوشت پوست سے محروم

ڈھلانچے بنے ہوئے تو نہیں پڑے ہوں گے۔
سونے کی کوشش بے سود تھی مگر میں آنکھیں بند کیے لیٹا رہا۔ میں نے خیالات کا رُخ بدلنے کی کوشش بھی کی لیکن رابعہ اور اس کی محبت سے وابستہ خیالوں کا عکس قائم نہ رہا۔ خود محسن بھی جاگ رہا تھا مگر خاموش تھا۔ سمندر کے شور کے باوجود رات پر ایک جمود حاوی تھا۔ اس جمود سے ہمارے اعصاب بھی متاثر ہو رہے تھے اور ہماری خاموشی کے پیچھے انتظار اور اضطراب کی بے نام خلش تھی۔
رات کا آخری پہر تھا جب اچانک میں نے اوپر سے سردار جی کے چلّانے کی آواز سنی۔ وہ ہمیں پُکار رہے تھے۔
"او یار کھوتے بیچ کے سو گئے ہو، واہ بھئی۔"
میں اور محسن ایک ساتھ دوڑتے ہوئے گئے۔
"سردار جی، کیا ہوا؟" میں نے کہا۔
سردار جی نے دُوربین مجھے تھمادی۔ "وہ دیکھو، اِدھر جنوب کی طرف، او یار اُدھر شمال ہے۔"
میں نے رُخ بدل کے دُوربین کو فوکس کیا۔ ایک بحری جہاز کا دُھندلا سایہ سا میری نظر میں آگیا جس پہ کہیں کہیں روشنی بھی تھی۔
"تم نے دیکھا ہے اس بحری جہاز کو۔ ۔ ۔ کیا نام ہے اس کا؟"
"ایس ایس کرانتی سھرڈ۔" محسن بولا۔
"ہاں دیکھو، یہ وہی ہے یا کوئی اور۔ ۔ ۔"
میں نے دُوربین محسن کو دی۔ "تو دیکھ یار۔ ۔ ۔ مجھے وہی لگتا ہے۔"
"میرا حساب کہتا ہے کہ وہ دور نہیں ہو سکتا۔ ہمارے آس پاس، اِدھر اُدھر تھوڑا بہت فرق ہوگا۔"
"بالکل وہی ہے یار۔" محسن نے کہا۔ "اتنے دن سے ہم دیکھ رہے تھے۔ میں بھول سکتا ہوں اس کی ساخت کو۔"
"اُجالا ہوتا تو نام پڑھا جاتا، لیکن شک مجھے بھی نہیں ہے، یہ جہاز دوسرا نہیں ہو سکتا۔" میں نے کہا۔
"پھر اب کیا کرنا ہے؟ چلیں سیدھا اُدھر؟" سردار جی نے کہا۔
"ابھی ٹھہر جائیں۔ آدھا گھنٹا تو دیں ہمیں تیاری کے لیے۔" میں نے کہا۔
سردار جی ہنسنے لگے۔ "آدھا گھنٹا؟ اوکاکا! دُوربین سے دیکھنے سے فاصلہ کم تو نہیں ہوتا۔ ہمیں گھنٹا لگ جائے گا۔ آخر وہ بھی تو آگے بڑھ رہا ہے۔"
"پھر کوئی بات نہیں۔" میں نے کہا۔ "میں گل کو بھی اُٹھا دیتا ہوں۔"
تقریباً چالیس منٹ بعد جب اُفق پر مدھم پڑتی روشنی کاذب کے اختتام کی خبر دے رہی تھی، ہم نے خود کو ایس ایس کرانتی سھرڈ کے مقابل پایا۔ میں نے اور محسن نے دونوں سرچ لائٹس کو اس کے عرشے کی جانب موڑ دیا تھا۔ اور اس روشنی میں مجھے عرشے پر کھڑے ہوئے تمام افراد کی حرکات و سکنات بھی دکھائی دے رہی تھیں۔
سرچ لائٹ کے پیچھے رہتے ہوئے میں نے جب دوربین کو فوکس کیا تو مجھے ایک چہرہ جہاز کے کپتان مصرا کا نظر آیا۔ اُس کے ساتھ شاہد جمیل تھا۔ اُن کے دائیں بائیں دو مسلح محافظ۔ انھوں نے بھی ایک پولیس لانچ کو آتا دیکھ لیا تھا لیکن وہ بہت پُرسکون اور پُراعتماد تھے۔ میری آنکھوں نے غالب اور نازو کو تلاش کرنے کی عبث جدّوجہد کی۔ نازو تو اپنی نرس کی وردی میں صاف نظر آتی لیکن رات کے آخری حصّے میں اُس کا عرشے پر کوئی کام نہیں ہو سکتا تھا۔ بین الاقوامی سمندروں میں سفر کرنے والوں کو پولیس کسی بھی وقت چیک کرے، جہاز کا عملہ اُن سے نمٹ سکتا ہے۔
بالآخر درمیان کا فاصلہ اتنا کم ہو گیا کہ میں نے میگافون اُٹھا کے کہا۔ "یہ انٹرپول ہے۔ ہم جہاز پر آنا چاہتے ہیں۔"
"یہ ایک تجارتی جہاز ہے۔" مصرا نے میگافون کے ذریعے ہی جواب دیا۔ "ہمارے پاس ایسی کوئی چیز نہیں۔"
"میں نے تم سے یہ نہیں پوچھا ہے کہ تم کیا لے جا رہے ہو اور نہ ابھی تک کوئی شک ظاہر کیا ہے۔ ہم اپنا فرض ادا کر رہے ہیں، اُمید ہے آپ لوگ تعاون کریں گے۔"
"ہم تعاون کریں گے، اپنا نام بتاؤ۔" مصرا نے کہا۔
"میں لیفٹیننٹ میڈلیس اور میرا ساتھی لیفٹیننٹ سندیپ۔ ۔ ۔"
"او کے۔ ۔ ۔ ہم سیڑھی لٹکاتے ہیں۔" مصرا نے کہا۔
محسن سب سے پہلے چڑھا، اس کے پیچھے گل گئی جو مردانہ حُلیے میں اور انٹرپول کی وردی میں تھی۔ اس کے لیے یہ کام تجربے کی بنا پر مشکل ثابت نہ ہوا۔ ڈکیتی کی وارداتوں میں بھائی کا ساتھ دیتے ہوئے اُس نے کئی دیواریں عبور کی ہوں گی اور کئی چھت تک پہنچنے کے لیے ایسے ہی طریقے اختیار کیے ہوں گے۔
میں نے آخری وقت میں سردار جی سے ہاتھ ملایا۔ "آپ کی بہت مہربانی، ہم نے یقیناً بہت زیادتی کی تھی آپ کے ساتھ، اس کے لیے معافی۔ ۔ ۔ اور اجازت۔"
"جاؤ، واہ گورو تمھاری مدد کرے۔" سردار جی نے کہا۔

"ایک آخری گزارش ہے۔" میں نے کہا۔ "ہمارے اوپر جانے کے بعد فوراً واپس مت ہو جانا۔ چند منٹ انتظار کر لینا۔ جب تک ہم عرشے پر سے غائب نہ ہو جائیں۔"
سردار جی نے سر ہلایا اور میں باہر لپکا۔ اس وقت تک محسن اوپر پہنچ چکا تھا اور گل آدھی بلندی کو سر کر چکی تھی۔ پانچ منٹ بعد میں نے بھی عرشے پر قدم رکھا تو میرا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا لیکن میں نے خود کو سنبھالے رکھا۔
میں نے دیکھا کہ مصرا کی نگاہیں گل پر جم گئی تھیں۔ شاید اُسے شک ہو گیا تھا کہ ایسی نرم و نازک جلد اور ایسے دل کش نقوش رکھنے والا پولیس مین کیسے ہو گیا۔ پروگرام کے مطابق ہمیں عرشے پر قدم رکھتے ہی مصرا کو اور وہاں موجود سب افراد کو ہینڈز اپ کرا لینا تھا لیکن اس سے پہلے کہ میں اپنا ہاتھ لبنی (؟) جراب کی طرف بڑھاتا، ایک ٹارچ کی تیز روشنی میرے چہرے پر پڑی۔
"تو تم آگئے؟" ایک مانوس آواز نے کہا۔
"بہت دیر کی مہرباں آتے آتے۔" دوسری آواز نے کہا۔
"ہم تو مایوس ہو چلے تھے۔" اس تیسری آواز نے مجھے چونک کر پلٹنے پر مجبور کر دیا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ نہیں، میں نے اپنے آپ سے کہا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے!
لیکن حقیقت کا ایک بے رحم اور ناقابلِ تردید ثبوت اس کی صورت تھی جو میری نظر سے اوجھل ہو جانے کے بعد بھی میرے تصور میں زندہ تھی۔ یادِ ماضی کے سارے عذاب کا رشتہ اسی کے خیال سے بندھا ہوا تھا۔

پیڈرو

میرے سامنے اپنے وجود کی ساری خباثت کے ساتھ موجود تھا اور یہ منظر میرے لیے اور محسن کے لیے ایک سا ناقابلِ یقین تھا۔ اس بے یقینی میں ایک پہلو حیرت کی اس انتہا کا تھا جو کسی بھی ایسے شخص کو پھر زندہ دیکھنے سے ہو سکتی ہے جس کے بارے میں شبہے کی گنجائش ہی نہ ہو کہ وہ مر چکا ہے۔
بے شک ایک فطری ردِعمل تھا۔ اگر آج میں اپنے ساتھی استاد ٹیڈی کو اپنے مقابل دیکھتا تب بھی مجھے اتنا ہی تعجب ہوتا لیکن فرق میرے جذباتی ردِعمل کا ہوتا۔ استاد ٹیڈی کو زندہ پانے میں خوشی سے پاگل ہو جاتا اور میرا دل خدا کے لیے شکرگزاری کے جذبات سے معمور ہوتا۔ جبکہ پیڈرو کو زندہ دیکھ کے مجھے سخت صدمہ ہوا۔ اس صدمے نے مجھ سے میرا احساسِ طمانیت چھین لیا اور میری فتح مندی کے خیال کو مٹا دیا۔ وہ دشمن جس کی موت کا میں ہمیشہ سے خواہاں تھا اور جس کو قتل کر دینے کے بعد میرے وجود میں بھڑکنے والی آتشِ انتقام کچھ سرد پڑ گئی تھی، وہ میری حسرتِ ناکام اور کوششِ ناتمام پر خندہ زن پھر میرے روبرو تھا اور اس کے لبوں کی زہریلی مسکراہٹ میرے لیے تحقیر و تذلیل کی اذیت بن رہی تھی۔
اگرچہ عملے کے رویّے میں ایک غیر متوقع بے تکلّفی کا پُرتمسخر انداز تھا لیکن اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ ان میں سے کسی نے ہمیں پہچان لیا ہے۔ پھر بھی میرا ماتھا دو باتوں پر ٹھنکا۔ ایک تو ان کا اندازِ پذیرائی تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کہ وہ ہمارے ہی انتظار میں تھے اور یہ انتظار کسی قدر طویل ہو گیا تھا۔ شک کی دوسری وجہ ان کا اُردو میں بات کرنا تھا۔ پیڈرو کے لبوں سے آج تک میں نے غلاظت کے سوا کچھ نکلتے نہ دیکھا تھا اور نہ سنا تھا۔ اس نے بھی شاعری بگھاری تو مجھے اتنا ہی افسوس ہوا جتنا گدھے کو زعفران کھاتا دیکھ کے ہوتا۔
"کیا بات ہے؟" میں نے فرانسیسی میں کہا۔ "تم لوگ ایسے ہتھیار اٹھائے کیوں کھڑے ہو۔ تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہم سمندری ڈاکو نہیں انٹرپول کے نمائندے ہیں اور تمھارے ذہن میں اگر مقابلے کا خیال ہے تو نکال دو۔"
مصرا نے حیرانی سے میری صورت کو دیکھا۔ میں نے بہت تیز لہجے میں مسلسل فرنچ بول کے اسے سر کھجانے پر مجبور کر دیا تھا۔
"شاہد! کیا بکواس کر گیا یہ؟" مصرا نے اپنے فرسٹ آفیسر سے کہا۔ میں نے شاہد جمیل کو سب کی نظر بچا کے آنکھ ماری۔
"میں خود کچھ نہیں سمجھا سر۔ ۔ ۔"
"اس اُلو کے پٹھے سے کہو کہ ہم فرانسیسی نہیں جانتے۔" مصرا نے کہا۔
"یہ تو آپ بھی کہہ سکتے ہیں سر۔" شاہد جمیل بولا۔ "میں بھی تو فرنچ نہیں جانتا۔"
"کیا تم انگریزی نہیں بول سکتے؟" مصرا نے غُرّا کے کہا۔
محسن نے فوراً مترجم کے فرائض سنبھال لیے۔ اس نے میری بات کا ترجمہ کیا مگر ترجمے کو فصاحت و بلاغت سے عاری رکھا۔ وہ ایک تھرڈ کلاس نقل کر کے پاس ہونے والے کالج گریجویٹ جیسی انگلش بولتا رہا۔
مصرا کچھ نشے میں تھا۔ اس نے ایک قہقہہ مارا۔ "کہتا ہے تم لوگ ہتھیار کیوں اُٹھائے کھڑے ہو؟" وہ پیڈرو سے مخاطب ہوا۔ "اس پاگل کے بچّے سے کہو کہ اسے کیا توقع تھی کہ

ہم پھولوں کے ہار اور گلدستے اٹھائے کھڑے ہوں گے۔"

"میرا خیال ہے کہ آپ ان سے مطلب کی بات کریں۔ یہ لوگ کیا چاہتے ہیں؟" شاہد جمیل نے مشورہ دیا۔ "اور بہتر ہوگا اگر انھیں اپنے ساتھ لے جائیں۔"

"کہاں لے جاؤں؟"

"اپنے کمرے میں کوئی ایسی ویسی بات [illegible] آسانی سے کی جاسکتی ہے۔" شاہد جمیل نے کہا۔

"یہ تو معلوم کرلیں ان سے کہ یہ کون ہیں؟" پیڈرو بولا۔

شاہد جمیل نے اسے شرمندہ کرنے والی نظروں سے دیکھا۔ "کیا یہ بھی پوچھنے والی بات ہے؟"

"ہاں! صرف انٹرپول کہہ دینا کافی نہیں ہوتا۔" پیڈرو نے کہا۔

"اور یہ وردیاں تمھارے خیال میں کوئی بھی پہن سکتا ہے؟ اور جس لانچ میں یہ لوگ آئے تھے کیا وہ بھی انٹرپول کی لانچ نہیں تھی؟" شاہد جمیل نے برہمی سے کہا۔

شاہد جمیل بہت خوبصورتی سے ہمارا دفاع کر رہا تھا اور ہمیں ناخوشگوار صورتِ حال سے بچانے کی کوشش میں مصروف تھا۔ اس کے پیشِ نظر دو مقاصد تھے۔ ایک یہ کہ ہمیں شناخت کرلینے کے مسئلے کا فوری سامنا نہ ہو جس سے ہمارا راز فاش ہونے کا خطرہ ٹل جائے، دوسرے یہ کہ ہم اس مہلت سے کوئی فائدہ اٹھانا چاہیں تو حالات سازگار رہیں۔ جب میں نے اُسے آنکھ ماری تھی تو وہ کچھ حیران ہوا تھا مگر آدمی ذہین تھا اس لیے فوراً سمجھ گیا تھا کہ منصور کے پردے میں خدا بول رہا ہے۔

"تم نے ٹھیک کہا۔" مصرا نے شاہد جمیل کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر سہارا لیا۔ "ان لوگوں سے بگاڑ ٹھیک نہیں۔ انھیں ٹال دینا چاہیے۔ تھوڑی بہت خاطر مدارات، تھوڑی سی رشوت اور تھوڑی سی فرماں برداری اور جی حضوری۔ اور کیا مانگتا ہے بھلا تھانیدار۔ یہ سالے سمندری تھانیدار ہیں۔"

"رشوت کی بات ذرا سوچ سمجھ کر کریں۔" شاہد جمیل نے اپنے افسر کو سمجھایا۔ "یہ ذرا مختلف قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔"

"ہاں ہاں۔ یار! کیا میں اُلّو ہوں۔ وہ کیا۔ اپنی ساری زندگی گزری ہے اسی صحرا کے لوٹ رزم میں۔"

"دشت کی سیاحی میں۔" شاہد جمیل نے تصحیح کی۔

"ایک ہی بات ہے۔ ایک ہی بات ہے۔ ان سے کہو نہیں پہلے ان سب سے کہو کہ جائیں۔ سب اپنا توپ خانہ لے کر آ گئے ہیں۔ چل بے ڈاکٹر بھنڈاری۔"

"کیا؟ کیا بولا؟" بھنڈاری اچھلا۔ "ابھی تم پھر سب کا سامنے ہمارا انسلٹ کرتا ہے مصرا۔ بعد میں بولے گا ہم نشے میں تھا۔"

"نشے میں تو ہے نا یار۔" شاہد جمیل نے اس کے کان کے آہستہ سے کہا۔ "جب تم جانتے ہو تو خواہ مخواہ شور سے فائدہ۔"

"میں کہتا ہوں ان کے کاغذات اور شناختی کارڈ دیکھو" پیڈرو نے اصرار کیا۔

"شٹ اپ۔ یہ حکم دینے والے تم کون ہو۔ اس جہاز میں ہوں۔" مصرا نے اپنے سینے پر ہاتھ مارا۔ "تم بھی ذریعہ اللہ آئندہ جب تک میں نہ کہوں میرے سامنے ریوالور تم جو بھی ہو..."

"تمھیں معلوم ہے اچھی طرح کہ میں کون ہوں"

"ہاں ہاں معلوم ہے۔ اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ خود کو باپ مت سمجھو۔ یہاں میں تمھارا باپ ہوں۔" مصرا نے کے کہا۔ "میرے حکم کی خلاف ورزی کی تو کتے کی طرح گا اور سمندر میں پھینک دوں گا۔"

صورتِ حال خطرناک حد تک کشیدہ ہو گئی تھی۔ کے ذہن میں کوئی شک پیدا کرنے والی بات تھی تو اس کا سب کے سامنے کرنا نہیں چاہتا تھا اور غالباً خود بھی بے یقینی تذبذب میں مبتلا تھا مگر مصرا کے اشتعال انگیز رویے بعد یہ عین ممکن تھا کہ وہ کچھ کر بیٹھتا۔ ریوالور اس کے ہاتھ وہ مصرا کی کپتانی کی پروا کیے بغیر باغیانہ سرکشی اختیار کر لیتا خون خرابے تک پہنچ جاتی جس میں کوئی بھی مارا جاتا۔ وہ خود یا ہم۔

ان کی آپس کی چپقلش نے مجھے وہ موقع فراہم کر کی مجھے تلاش تھی۔ میں نے ایک سیکنڈ کی حرکت میں پاؤں کے جراب میں سے ریوالور نکال لیا۔ میرا اشارہ پاتے ہی محسن بھی ایسا ہی کیا اور جب تک پیڈرو اپنے جارحانہ عزائم ہوتا، ہم نے اپنے آٹومیٹک ریوالور دو مختلف سمتوں سے لیے۔ میرا نشانہ مصرا تھا تو محسن کی زد میں استاد پیڈرو تھا کے پیچھے گل نے پوزیشن سنبھال لی تھی۔

"شاید تم لوگوں کی سمجھ میں میری بات نہیں آئی تھی" نے فرنچ میں کہا۔ "ہم بلاوجہ خون خرابا نہیں کرتے لیکن میں گولی چلانے کا حق رکھتے ہیں اور قانونی فرائض کی میں رکاوٹ ڈالنے والوں سے نمٹ سکتے ہیں۔"

محسن نے پھر انگریزی میں میری بات آگے پہنچائی۔

مصرا نے کہا۔ "ایسی کوئی بات نہیں۔ نہ ہم مقابلے کا ارادہ رکھتے نہ اس کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ ہم قانون کا احترام کرنے والے لوگ ہیں اور مجھے افسوس ہے کہ ایسی غلط فہمی پیدا ہوئی۔ آپ کی تشریف آوری کا مقصد کچھ بھی ہو، کیپٹن آر آر مصرا آف ایس ایس کرانتی تھرڈ آپ کو خوش آمدید کہتا ہے، اور آپ کو مکمل تعاون کا یقین دلاتا ہے۔"

محسن نے جو کچھ فرنچ میں کہا یہ تھا کہ "یہ حرامزادہ جو ایک بار مرنے سے بچ گیا یا جہنم سے لوٹا دیا گیا، دوسری بار زیادہ عذاب کی موت کے لیے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اسے ہماری جعلسازی کا پتا چل گیا ہے۔ ہم میں سے ایک کو اس پر نگاہ رکھنی ہوگی۔"

میں نے کہا۔ "ابھی سے جنگ چھیڑ دینا مناسب نہیں۔ پہلے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ غالب اور نازو کہاں ہیں۔"

محسن نے انگریزی میں ترجمہ کیا۔ "کیپٹن مصرا کا مثبت رویہ ایک نیک فال ہے۔ ہم ضابطے کے مطابق کارروائی کر رہے ہیں اور اگر جہاز بھی معمول کے تجارتی سفر پر رواں ہے تو کسی کو ہم سے کوئی خطرہ محسوس نہیں کرنا چاہیے۔"

مصرا نے کہا۔ "آپ لوگ میرے ساتھ آئیں۔ جو بات بھی ہوگی میرے کیبن میں ہو جائے گی۔"

میں نے محسن کی معرفت جواب دیا۔ "ہم بیٹھنے کے لیے نہیں آئے ہیں اور نہ ہمیں کسی مسئلے پر بات کرنی ہے۔"

مصرا نے کہا۔ "مہمانوں کے لیے ایک جام یا کافی کا ایک کپ پیش کرنا اگر رشوت شمار نہ ہو..."

میں نے کہا۔ "ہم ایک نظر جہاز کو دیکھیں گے اور واپس جائیں گے۔"

مصرا نے واپس جانے والی لانچ کی طرف دیکھا۔ "واپس کیسے جائیں گے؟"

محسن نے خود ہی جواب دیا۔ "لانچ واپس آئے گی۔"

"پھر تو بہت وقت ہے۔" مصرا نے کہا۔ "شاہد! تم اس شخص کو لے جاؤ میری نظر کے سامنے سے۔ اس کی استادی یہاں نہیں چلے گی۔ یہ کسی کا نمائندہ ہے مگر میرا افسر بنا کے نہیں بھیجا گیا ہے۔"

"میں ان لوگوں کے مفاد کے خلاف کوئی کام نہیں ہونے دوں گا جن کا میں نمائندہ ہوں۔" پیڈرو نے اسی سرکشی سے کہا۔

"ان کے مفاد سے میرا مفاد بھی وابستہ ہے لیکن میں اپنے جہاز پر مفادات کے تحفظ کی ذمے داری کسی اور کو نہیں سونپ سکتا۔ نفع نقصان کے لیے جواب دہ میں ہوں۔" مصرا نے غصے میں چلاتے ہوئے کہا۔ "مجھے کسی مشیر کی ضرورت نہیں، اگر کوئی سؤر کا بچہ مجھ پر مسلط ہونے کی کوشش کرے گا تو..."

"آپ چلیں سر۔" شاہد جمیل نے اُسے سمجھاتے ہوئے نرمی سے کہا پھر وہ پیڈرو سے مخاطب ہوگیا۔ "تم اس جہاز کے عملے سے یہ توقع کبھی مت رکھنا کہ وہ مصرا کی جگہ تمھارا حکم ماننے پر تیار ہو جائیں گے، خواہ وہ کتنے ہی مجبور کیوں نہ ہوں۔ تم جہاز پر قبضہ کر لو تب بھی کپتان کی جگہ نہیں لے سکتے۔"

"طاقت ور اپنی ہر بات منوا لیتا ہے شاہد۔ اس وقت بھی میں چاہتا تو..."

"خوش فہمی ہے تمھاری۔ تم زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے تھے کہ مصرا کو مار دیتے۔ مجھے بھی مار دیتے لیکن اس سے کیا فرق پڑتا۔ جہاز کے عملے کا آخری فرد بھی مر جاتا مگر تمھارے حکم کی تعمیل نہ کرتا کیوں کہ تم باہر کے آدمی ہو۔ ہمارے پاس ایک ضابطہ ہے کہ ایک نہ رہے تو اس کی جگہ لینے والا دوسرا کون ہوگا۔ تم اس فہرست کے آخری آدمی بھی نہیں ہو۔ اس لیے بھول جاؤ یہ بات کہ تم اپنی بدمعاشی یہاں بھی چلا سکتے ہو۔"

مصرا اس کی بات سے خوش ہوا۔ "بالکل ٹھیک کہا تم نے شاہد۔ میں بھی یہی سمجھا رہا تھا اس کو اور اگر یہ باتوں سے نہ سمجھتا تو لاتوں سے کام لیتا۔ کچھ بھوت ہوتے ہیں ایسے..."

پیڈرو نے ایک گالی دے کر ریوالور اٹھایا ہی تھا کہ شاہد نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "پاگل مت بنو۔"

پیچھے سے گل نے رُعب دار آواز نکال کے کہا۔ "ہاتھ اوپر اُٹھا لو۔"

گل کی آواز کا رعب تو کیا قائم ہوتا لیکن یہ وارننگ کام کر گئی۔ پیڈرو خاموشی سے واپس ہوگیا۔ بھنڈاری پہلے ہی جا چکا تھا۔ ہم نے بھی ریوالور جیب میں ڈالے اور مصرا کے ساتھ چل پڑے۔ اس نے محسن کی معرفت اپنے عملے کے ایک جاہل اور غیر ذمے دار شخص کے رویّے پر معافی مانگی اور ایک دلچسپ بات کہی۔ اس نے پیڈرو کے بارے میں کہا کہ وہ نشے میں تھا۔ جب کہ نشے میں خود کپتان صاحب تھے۔

"تم کس قسم کے کپتان ہو آخر۔" محسن نے اُسے ڈانٹ کر کہا۔ "تمھارا عملہ تمھارے سامنے سرکشی سے بات کرتا ہے۔ شراب کے نشے میں دُھت رہتا ہے اور حد یہ ہے کہ تمھارے منع کرنے کے باوجود اسلحہ نکال لیتا ہے۔ وہ بھی بین الاقوامی پولیس پر۔"

"دراصل... وہ عملے میں شامل نہیں ہے..."

"کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ کوئی مسافر ہے؟ ایک مال بردار جہاز پر کسی مسافر کی موجودگی کا کیا جواز ہے؟" محسن نے کہا۔ "کیا تم ناجائز طور پر لوگوں کو ایک ملک سے دوسرے ملک کے ساحل پر اتارنے کا کام بھی کرتے ہو؟ کتنا معاوضہ لیتے ہو ایک ایسے مسافر سے اور... اس کے علاوہ کتنے لوگوں کو لے جا رہے ہو؟"

مصرا گھبرا گیا۔ "آپ ادھر آئیں۔ یہ ہے میرا کیبن۔ میں ابھی سب وضاحت کر دیتا ہوں۔"

محسن نے میری طرف دیکھا اور فرنچ میں کہا۔ "یہ سالا پھنس گیا ایک بات کہہ کر۔ اب ہم مطالبہ کر سکتے ہیں کہ اس شخص کو پیش کیا جائے۔ اس کی سفری دستاویزات دکھائی جائیں اور مزید ناجائز سفر کرنے والوں کا پتا چلانے کے لیے ہم جہاز کی تلاشی بھی لے سکتے ہیں۔"

میں نے یہ ظاہر کیا جیسے ساری بات کا علم مجھے اب ہوا ہے۔ چنانچہ میں نے زیادہ برہمی کا مظاہرہ کیا۔ "یار! مجھے غالب اور نازو کی زیادہ فکر ہے۔ وہ دکھائی نہیں دیے۔" میں نے گرج کے کہا۔

مصرا نے ایک بٹن دبا کے کسی کو طلب کیا اور پھر پوچھا کہ ہم کیا پسند کریں گے۔ "دیٹ انہتر سے بلیک ڈاگ تک سب دستیاب ہے۔" اس نے رازدارانہ انداز میں کہا۔ "لانگ جان یا دو ٹڈ کا...؟"

"گویا تم ایک انڈین شپ پر غیر ملکی شراب کی موجودگی کے جرم کا اعتراف بھی کر رہے ہو۔" محسن بولا۔ "اسمگلنگ کا اور کیا کیا سامان ہے؟"

مصرا پریشان ہونے لگا۔ "وہ تو میں اپنے طور پر... مہمان نوازی کے لیے تھوڑی بہت رکھتا ہوں۔ اسمگلنگ کرنے والے پر لعنت!"

"ہم ڈیوٹی پر ہوں تو پی نہیں سکتے۔" محسن نے رکھائی سے کہا۔

"او کے۔ کافی یا چائے؟ لنچ سے پہلے...؟"

"کچھ نہیں۔" محسن نے کہا۔ "اس آدمی کو لاؤ۔ کون ہے وہ؟"

"وہ... دراصل ایک تجارتی کمپنی کا نمائندہ ہے۔ ہم ان کا کچھ سامان لے جا رہے ہیں۔" مصرا نے کہا۔

"کس قسم کا سامان۔ اس کی تفصیل تو ہوگی؟ اور جس کمپنی کا یہ بدتمیز بلکہ غنڈہ نمائندہ ہے اس کا دھندا کیا ہے؟ اس بدمعاش کے پاس سفری دستاویزات ہیں یا نہیں؟" محسن نے ایک ہی سانس میں کہا۔ "تمہارے ساتھ اس کے رویے نے مجھے اور ہم سب کو شکوک میں مبتلا کر دیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ مالک ہے جہاز کا اور تم اس کے معمولی ملازم جس کی کوئی عزت نہیں۔"

مصرا اس ذلت کو پی گیا۔ وہ مجبور تھا ورنہ اتنی بے عزتی کبھی برداشت نہ کرتا۔ جب محسن اس سے بات کر رہا تھا تو میں سوچ رہا تھا کہ کپتان سے حقیقت کیسے اگلوائی جائے۔ میں معلوم کرنا چاہتا تھا کہ جس پیڈرو کو ہم اپنی دانست میں فائر کر کے یہاں سے بہت دور سمندر میں غرق کر چکے تھے، وہ کس طرح بچ نکلا تھا اور پھر اس جہاز تک پہنچنے میں کیسے کامیاب ہوا تھا؟

میں نے یہ بات محسن سے کی تو اس نے بھی تسلیم کیا کہ یہ مسئلہ آسانی سے حل نہیں ہوگا۔ یعنی سیدھی انگلیوں سے گھی نکالنا مشکل ہوگا۔ مصرا سے براہ راست پوچھا گیا تو وہ صاف انکار کر دے گا اور شک میں بھی پڑ جائے گا کہ ہمیں پیڈرو کے بارے میں یہ سب کس نے بتایا۔ جہاں اس پر فائرنگ ہوئی تھی، وہاں صرف دو لانچیں تھیں اور عینی شاہد وہی تھے جو ان لانچوں پر موجود تھے۔ ایک لانچ واپس چلی گئی تھی اور دوسری پر ہم آ گئے تھے۔ خود پیڈرو جانتا تھا کہ ہم وہ نہیں جو نظر آتے ہیں۔ ہم نے اُسی کے ساتھیوں کو مار کے یہ لانچ چھینی تھی اور اُسے معلوم تھا کہ اس وردی میں محسن اور سکندر ہیں۔ پھر یہ بات اس نے مصرا کو کیوں نہیں بتائی تھی؟ محسن کا خیال تھا کہ وہ اپنے اس جرم کی پردہ پوشی پر مجبور تھا۔ وہ مصرا کو نہیں بتا سکتا تھا کہ اس نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے انٹرپول کی لانچ پر قبضہ کر کے اور عملے کے افراد کو مار کے ایک بین الاقوامی نوعیت کے سنگین ترین جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ اس معاملے سے آگاہ ہوتے ہی مصرا اسے خود پولیس کے حوالے کر دیتا۔ وہ غیر قانونی طور پر مالِ تجارت کو ادھر سے ادھر پہنچانے کے کاروبار میں ضرور ملوث تھا لیکن اس کام میں وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس جیسے سیکڑوں ہزاروں تھے جو بین الاقوامی طور پر اس سمندر میں غیر قانونی تجارت کے فروغ میں معاونت کے مجرم تھے۔ وہ کہہ سکتا تھا کہ اس کی حیثیت صرف ایک ملازم کی ہے اور کمپنی میں اس جیسے ملازم ہر حکم بجا لانے پر مجبور ہوتے ہیں۔ لیکن اس نے ہمیشہ بین الاقوامی اصولوں اور اداروں کی حیثیت کو تسلیم کیا ہوگا ورنہ وہ کسی بحری راستے پر سفر نہیں کر سکتا تھا۔ انٹرپول کی لانچ پر قبضہ کرنے اور عملے کے افراد کو قتل کرنے کا تو وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ شاید کوئی بھی ایسی واردات کا تصور بھی نہیں کر سکتا جس کے بعد دنیا میں جائے پناہ کہیں بھی نہ رہے۔ خلافِ قانون نقل و حرکت کرنے والے اور ناجائز دھندے کرنے والے مفاہمت کے عالمی اصولوں سے کام چلاتے ہیں یا پھر سیاسی بنیادوں پر راستے کھلے رکھتے ہیں۔

محسن کے دلائل اور خود میری عقل نے مجھے قائل کیا کہ پیڈرو مجبور تھا ورنہ ہمارا بھانڈا پھوڑ دیتا۔ اسے اپنے جرم کے افشا ہونے کا ڈر تھا۔ وہ ہمارے بارے میں ایک لفظ بھی کہتا تو ہم اس کے پورے گروہ کی قتل و غارت گری کی روداد سنا دیتے اور مصرا ہمارے ساتھ جو کرتا سو کرتا، پیڈرو کو گرفتار کر لیتا اور وہ مزاحمت کرتا تو اسے گولی مار دیتا۔ اسے قطعی ضرورت نہ تھی کہ وہ کسی بین الاقوامی مجرم اور قاتل کو پناہ دے کر خود بھی شریکِ جرم بنے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ پیڈرو اب کیا کرے گا؟ وہ خاموش رہ کے کوئی خطرہ کیسے مول لے سکتا ہے۔ وہ اچھی طرح جانتا ہوگا کہ ہم اس جہاز پر کیا عزائم لے کر آئے ہیں۔ اسے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا یا وہ ذاتی خطرہ مول لے کر مصرا کو قائل کرے کہ خود اس کی اور جہاز کی سلامتی خطرے میں ہے یا جو کرنا ہے خود کرے۔ اگر اُسے شاہد جمیل نے نہ روکا ہوتا تو وہ سارے معاملات کو اپنے کنٹرول میں لینے کے فیصلے پر عمل درآمد کر چکا ہوتا۔ شاہد جمیل نے اُسے بروقت سمجھا دیا کہ معاملہ ایک مصرا کا نہیں، جہاز کا سب عملہ اس کے خلاف صف آرا ہو جائے گا اور یہی بات پیڈرو کی حوصلہ شکنی کا باعث بنی تھی۔

پھر بھی وہ کب تک رسک لے گا۔ کیا اُسے معلوم نہیں کہ ہمیں ملنے والی مہلت کا ہر لمحہ تباہی کو قریب سے قریب تر کرتا جا رہا ہے۔ جہاز کسی بھی کمپنی کا ہو، وہ خود چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کے مال کا نگراں اور محافظ ہے اور ایسا کبھی نہیں ہونے دے گا کہ جہاز کے ساتھ کروڑوں کا مال ڈوب جائے۔ وہ کسی کپتان کو خاطر میں نہیں لائے گا، اگر یہ دیکھے گا کہ اس کی ناواقفیت یا حماقت کی بنا پر جہاز کے پرخچے اڑ سکتے ہیں۔ اس کے لیے اس کے ساتھیوں کی موت نے ایک بہت بڑا مسئلہ یہ پیدا کر دیا تھا کہ وہ اکیلا رہ گیا تھا۔ اس کا مشن ناکامی کی نظر نہ ہوتا تو وہ ہم سب کو مار کے یا زندہ گرفتار کر کے اسی لانچ میں لے جاتا جس میں ہم پہنچے تھے۔ اس کے سب ساتھی ہوتے تو وہ بڑی آسانی سے "ایس ایس کرانتی تھرڈ" پر قبضہ کر لیتے اور مصرا کی ساری کپتانی دھری رہ جاتی۔ عملاً خود پیڈرو کپتان ہوتا اور وہ جو حکم دیتا وہ مانا جاتا۔

اب صورتِ حال یکسر پلٹ گئی تھی۔ وہ خود بڑی مشکل سے جان بچا کے فرار ہونے میں کامیاب ہوا تھا۔ یہ ابھی تک ایک ناقابلِ فہم اور پُراسرار معما تھا کہ آخر وہ کسی گولی کا نشانہ کیوں نہیں بنا اور پھر غائب ہونے کے بعد ہم سے پہلے اس جہاز پر کیسے پہنچ گیا۔ جس جہاز پر اس کو اپنے ساتھیوں کے ساتھ قبضہ کرنا تھا اس پر ہم پہنچ چکے تھے۔ ہم مسلح تھے اور ابھی تک اس نے ہم تین کو دیکھا تھا۔ اسے یہ علم نہ تھا کہ ففتھ کالم کے دو لوگ غالب اور نازو بھی جولنزا اور چارلی کے نام سے جہاز پر سفر کر رہے ہیں۔ مجموعی طور پر ہم اس پوزیشن میں تھے کہ جہاز پر آسانی سے قبضہ کر سکتے تھے۔ پیڈرو کے مشن کے پہلے حصے کی ناکامی نے اُسے دوسرے مرحلے کی ناکامی کے خطرات سے دوچار کر دیا تھا۔ ممکن ہے جہاز پر خیریت کے ساتھ پہنچ جانے کے بعد اس نے مصرا سے کپتانی کا چارج لینے کا ارادہ ترک کر دیا ہو اور بمبئی تک وہ کچھ نہ کرنا چاہتا ہو مگر ہم اس کے تعاقب میں فرشتۂ اجل کی طرح پہنچ گئے تھے۔ اب اکیلا ہونے کے باوجود اس جیسے عیار اور خطرناک مجرم کے لیے اس مشکل کا کوئی حل تلاش کرنا ناممکن نہیں تھا۔ اس کا شیطانی ذہن یقیناً کسی منصوبے پر عمل پیرا ہوگا۔ یہ احساس مجھے فکرمند کر رہا تھا۔

جب کافی آ گئی تو میں نے محسن سے کہا۔ "وقت ضائع مت کر۔ مجھے اس حرام زادے کی طرف سے تشویش ہو رہی ہے۔"

"میرا ارادہ کافی پینے کا نہیں ہے۔" محسن بولا۔ "اس میں زہر ملانا بہت آسان ہوگا۔ کافی کے تلخ ذائقے میں پتا بھی نہیں چلے گا۔"

"پھر تو میٹھا کیوں ہے؟" میں نے کہا۔

"میں 'ویٹ اینڈ سی' یعنی انتظار کرو اور دیکھو کے مقولے پر عمل کر رہا ہوں۔ شکاری کو نفسیاتی اور اعصابی جنگ کا ماہر بھی ہونا چاہیے۔ یہ ایک دلچسپ مقابلہ ہے جس میں تین فریق ہیں۔ صرف ایک فریق کا اصلی چہرہ سامنے ہے اور وہ نہیں جانتا کہ اس کی نظروں کے سامنے دو خطرناک شکاری کس قسم کا کھیل کھیل رہے ہیں، جو ایک دوسرے سے بھی واقف ہیں اور ایک دوسرے کے خونی عزائم کو بھی جانتے ہیں مگر ابھی اپنی مجبوریوں کے باعث کھل کر سامنے آنے سے گریز کر رہے ہیں۔"

"لیکن ایسا کھیل چل نہیں سکتا۔" میں نے کہا۔ "اس سے پہلے کہ وہ کچھ کر گزرے ہمیں اس مہلت سے فائدہ اٹھا لینا چاہیے۔"

مصرا نے کافی بنا کے گل کی طرف بڑھائی۔ وہ گل کو خاصی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا اور گل اپنے دفاع میں محتاط

ہونے کے باوجود وہ گفتگو سمجھنے سے قاصر تھی، جو ہم فرنچ میں کر رہے تھے۔

اس نے کافی کا مگ لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور پھر میری طرف دیکھا۔ میری نظر کا مطلب بہت واضح تھا۔ اس نے ہاتھ کھینچ لیا۔

"کیا بات ہے؟ تمھیں کافی پسند نہیں؟" مصرا نے کہا۔

"چائے..."

"نہ کافی نہ چائے۔" میں نے صاف اُردو میں کہا۔ "یہ کھیل ختم سمجھو مصرا۔" اور اپنا ریوالور نکال لیا۔

مصرا کے ہاتھ سے مگ گر گیا۔ "تم..."

"اپنے لیے کافی بناؤ۔" میں نے کہا۔ "یہ سوال بعد میں کرنا کہ ہم کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟"

مصرا نے خود کو ہر سمت سے محصور پایا اور... بیک وقت تین اصلی ریوالور دیکھے جن کا رُخ اس کے سینے یا سر کی جانب تھا۔ اس نے اچانک فرنچ سے اُردو پر آ جانے والوں کے چہروں کے جذبات بھی بدلتے دیکھے اور بہت جلد سمجھ لیا کہ پیڈرو ہم پر شک کرنے میں کس حد تک حق بجانب تھا۔ غلطی خود مصرا نے عقل سے کام نہ لے کر کی تھی۔ پیڈرو کی غلطی صرف یہ تھی کہ اس نے مصرا کو حقیقت حال سے بے خبر رکھا تھا۔ اور جو فوراً بتا دینا ضروری تھا اُسے مؤخر کر دیا تھا۔ تاہم دشمن ایسی غلطی نہ کرتا تو اس کے حریف یعنی ہم کیسے کہتے کہ ہمیں تائید غیبی ہمیشہ حاصل رہی۔

"تم نے سُنا نہیں، کافی بناؤ اور پیو۔" میں نے کہا۔

"میں؟... اکیلا کیوں؟" مصرا نے خوف پر قابو پا کے حیرانی سے کہا۔ "کیا تمھیں ڈر ہے کہ اس میں زہر ہو گا؟"

"یہ احتیاط ہم لازمی سمجھتے ہیں۔" میں نے کہا۔

مصرا ہنس پڑا۔ "تم جو بھی ہو خبطی ہو۔" اور اپنے لیے کافی کا دوسرا مگ بنانے لگا۔ "ویسے یہ چکر کیا ہے آخر۔ تم اگر بھارتی یا پاکستانی ہو اور انٹرپول میں ہو تو گویا پھر اپنے ہی بندے ہو۔ خواہ مخواہ فرانسیسی بولنے کا ڈراما کیوں رچا رہے تھے؟"

"بہت سے ڈرامے سمجھ میں نہیں آتے۔ مثلاً علامتی قسم کے ڈرامے۔" میں نے کہا اور اسے کافی پیتے دیکھتا رہا۔ "اس میں ہر کردار وہ نہیں ہوتا جو نظر آتا ہے۔ اور جو کچھ وہ کرتا ہے یا کہتا ہے اس کا اصل مطلب بھی کچھ اور ہوتا ہے۔"

"کافی میں زہر! حد ہو گئی۔" مصرا نے کہا۔ "یہ بھی کوئی جاسوسی ناول یا فلم ہے۔"

"مسٹر مصرا! اُستاد پیڈرو تمھارے جہاز پر کیسے پہنچا؟" میرے الفاظ پر ایک بار پھر اس کے ہاتھ سے مگ گر گیا۔ وہ زیادہ عمر کا آدمی تو نہیں تھا مگر شراب نے اس کے اعصاب کو تباہ کر دیا تھا۔

"تم اسے جانتے ہو؟" مصرا کا چہرہ خوف سے پیلا پڑنے لگا۔ "ہے بھگوان! کیا ہو گیا ہے میری عقل کو، مجھے پہلے ہی سمجھ جانا چاہیے تھا کہ تمھیں دیکھ کر اس پر جنون کا دورہ کیوں پڑ گیا تھا۔"

"بہت دیر سے پہچانا تم نے۔" میں نے کہا۔ "اب میرے سوال کا جواب..."

"وہ ایک لانچ پر پہنچا تھا۔" مصرا نے کہا۔ "لانچ بحالیا کی تھی اور سمندر میں ریسرچ کرنے والے دو یا گل بڈھے اس پر سوار تھے۔ انھوں نے پیڈرو کو ڈوبنے سے بچایا تھا۔"

"اور پیڈرو نے تمھیں کیا بتایا تھا؟" میں نے کہا۔

"اُس نے کہا تھا کہ جس لانچ میں وہ بمبئی جا رہا تھا وہ تہ میں شگاف پڑ جانے کے بعد غرق ہو گئی تھی۔ اسے ہمارے ساتھ ہی جانا تھا مگر نہ جانے کیوں وہ کراچی سے روانگی کے وقت پہنچ نہیں سکا تھا۔ اس کا پیغام ملا تھا کہ وہ بمبئی میں ہمارا انتظار کرے گا۔ میں سمجھا تھا کہ وہ ہوائی جہاز سے نکل گیا۔"

"کیا لانچ پر وہ اکیلا تھا؟" میں نے پیڈرو کی کہانی سے دل ہی دل میں لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔

"نہیں، مگر اسے اپنے ساتھیوں کے بارے میں کچھ پتا نہیں چلا کہ ڈوبے یا بچ گئے۔ وہ خود اس لیے بچ گیا تھا کہ اسے لائف جیکٹ پہننے کی مہلت مل گئی تھی۔"

"حادثے کے بعد وہ کتنی دیر تک تیرتا رہا تھا؟"

"تقریباً آدھے گھنٹے تک، پھر وہ برٹش لانچ آ گئی۔ ادھر ہی جا رہے تھے۔ انھوں نے پیڈرو کو ہمارے جہاز پر پہنچا دیا۔" مصرا نے کہا۔ پھر یکلخت اس نے خود کو سنبھالا۔ "یہ کیا ہوا تھا؟"

"کیا ہوا تھا؟" میں نے کہا۔

"جہاز... اور یہ لائٹس... کیا ہو رہا ہے یہ آخر؟" اس نے گھبرا کے کہا اور اپنا ہاتھ ایک سوئچ کی طرف بڑھایا۔

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "جو کچھ ہو رہا ہے ٹھیک ہو رہا ہے۔"

"مجھے... کیا... میرا خیال ہے کہ... اُف... کیا تم مجھے دوا لینے کی اجازت... بھی نہیں دو گے۔" وہ چلایا۔ "یہ ہارٹ اٹیک ہے... دیکھو، شپ کے ڈاکٹر کو... بلاؤ۔" جملہ پورا ہونے سے پہلے وہ گر گیا۔ اس کا سانس رُکنے لگا تھا۔ مگر یہ ہارٹ اٹیک نہیں تھا، یہ زہر ملی ہوئی کافی کا اثر تھا۔ مصرا کا آخری وقت آ گیا تھا۔ گل اُسے دہشت سے دیکھ رہی تھی اور شاید یہ سوچ رہی تھی کہ میں اُسے کافی لینے سے نہ روکتا یا ہم سب کافی پی لیتے تو یہ منظر کتنا مختلف ہوتا۔

"تم... بچ گئے... میں بے وقوف مارا گیا... میری تم سے کوئی... کوئی دشمنی نہیں تھی۔"

"پھر کیا سوچ کے تم نے اس جنگ میں قدم رکھا تھا مصرا؟" میں نے کہا۔ "جنگ میں دشمن کا ساتھی بھی دشمن ہی سمجھا جاتا ہے اور مارے وہ بھی جاتے ہیں جو کسی کے ساتھی نہیں ہوتے۔"

"میری... ایک خواہش ہے۔" اس نے مُنہ سے جھاگ اُگلتے ہوئے بڑی مشکل سے سر اٹھایا۔

"میں کوئی وعدہ نہیں کر سکتا۔" میں نے کہا۔

"اس... کو مت چھوڑنا۔" مصرا نے پیڈرو کے لیے ایک گالی استعمال کی۔ "یہ اسی نے... کیا..."

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "آدمی خود اپنی قبر کھودتا ہے مگر الزام ہمیشہ دنیا کو دیتا ہے یا تقدیر کو دیتا ہے... تم نے لالچ میں یہ راستہ اختیار کیا۔ بہت پیسہ ملا ہو گا تم کو لیکن اس وقت وہ پیسہ تمھاری جان نہیں بچا سکتا۔ پیسہ دینے والے ہاتھ کبھی جان لے بھی سکتے ہیں، یہ تم نے نہیں سوچا ہو گا۔"

"وہ... بلیک میلر... مجھے اس نے مجبور کر دیا..." وہ اب سانس بھی مشکل سے لے رہا تھا۔ "ایک لاکھ، تم میری نیلی کو..." آخری الفاظ اس کے لبوں پر ٹوٹ گئے۔ اس کا جسم تشنج کے آخری جھٹکے کے بعد ساکت ہو گیا۔

میں نے فوراً اس کی جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔ اندر ایک پرس تھا جسے میں نے کھول کر دیکھے بغیر اپنی جیب میں منتقل کر لیا۔ اندر کی دوسری جیب میں ریوالور تھا۔ اسے میں نے بے مصرف جانتے ہوئے چھوڑ دیا۔

باہر سے سُنائی دینے والی آوازوں پر میرے کان کھڑے ہو گئے۔

"خبردار! میں گولی مار دوں گا۔" یہ آواز پیڈرو کی تھی۔ پھر گولی چلنے کی آواز آئی۔ کوئی بڑے کرب میں چلایا۔ "تم نے دیکھ لیا؟" پیڈرو دہاڑ کے بولا۔ "جو میرا حکم نہیں مانے گا اس کا یہی انجام ہو گا۔ چلو باقی سب لوگ لگ جاؤ۔"

"یہ کون ہوتا ہے تم کو حکم دینے والا۔" یہ آواز شاہد جمیل کی تھی۔ "تم کو شرم آنی چاہیے۔ اس جہاز کا کپتان..."

"کپتان مر چکا ہو گا اب تک۔" پیڈرو نے قہقہہ مارا۔ "یقین نہیں تو جا کے دیکھ لو۔ اس کی لاش اُٹھا کے یہاں لے آؤ اور دکھا دو شاہد جمیل صاحب کو۔"

"جب تک تم مجھے بھی نہیں مار دیتے اس جہاز کے عملے کو مجبور نہیں کر سکتے..." شاہد جمیل اپنی بات پر قائم رہا۔ شاید اسے افسوس ہو رہا تھا کہ جہاز کا عملہ وفاداری اور... فرض شناسی کے پہلے امتحان سے بھی نہ گزر سکا۔ اسے اپنے اعتماد کی شکست کا دُکھ تھا۔

"تمھیں مارنا کوئی مشکل کام نہیں لیکن میں بلاوجہ کشت و خون پسند نہیں کرتا۔" پیڈرو بولا۔ "اور پھر یہ سب لوگ بزدل ہیں۔ موت سے ڈرنے والے۔ ان سب کو اپنی اپنی زندگی سے پیار ہے، نہ یہ تمھارا حکم مانیں گے اور نہ تم کو بچائیں گے۔"

"تم سب سُن رہے ہو۔ بولتے کیوں نہیں؟" شاہد جمیل نے چلا کے کہا۔ "اس کی تردید کیوں نہیں کرتے۔ اسے بتاتے کیوں نہیں کہ تم نمک حرام نہیں ہو۔ تم سب اپنی جان دے سکتے ہو..."

"نہیں سر۔ میں مرنا نہیں چاہتا۔" ایک شخص نے کہا۔

"میں مجبور ہوں سر۔" یہ دوسرے نمک حرام کی آواز تھی۔

"لعنت ہو تم سب پر۔" شاہد جمیل چلایا۔ "اگر تم سب مل کے مقابلہ کرتے تو ایک آدمی تمھارا کیا بگاڑ سکتا تھا۔"

"ایک آدمی۔" پیڈرو نے پھر قہقہہ مارا۔ "شاہد جمیل، یہ سب میرے آدمی ہیں۔ انھیں میں نے زیادہ بولی لگا کے خرید لیا ہے۔ میری بولی اتنی اونچی تھی کہ یہ سب ایک ساتھ بک گئے۔ دنیا میں یہی ہوتا ہے شاہد جمیل۔ اصول اور ایمان، ضمیر اور انسانیت سب جنس بازار ہیں۔ خریدار کا حوصلہ کم نہ ہو تو دنیا کیا وہ تو آخرت کو خرید لے۔ خدا کی خدائی کو خرید لے۔"

پیڈرو طاقت کے نشے میں کفر بک رہا تھا اور وہی دعوے کرنے لگا تھا جو نمرود اور فرعون جیسے لوگ پہلے بھی کر چکے تھے لیکن وہ ان کے انجام کو بھولا ہوا تھا۔

میں دروازے کا پٹ تھوڑا سا وا کیے ساری گفتگو سُن رہا تھا جو مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر ہو رہی تھی مگر میں باتیں کرنے والوں کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ سکندر اور گل میرے پیچھے تھے۔

"اب کیا ہو گا شیروانی صاحب؟" میں نے کہا۔ "پیڈرو اکیلا نہیں رہا۔"

"ہم بھی اکیلے کہاں ہیں۔" محسن بولا۔

"ہمارا خدا ابھی ہمارے ساتھ ہے۔" گل نے یوں کہا کہ میں اپنی ہی بات پر شرمندہ ہو گیا۔

"یہ لوگ اب ادھر آ رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم مورچا بند ہو کے ان کا مقابلہ زیادہ دیر جاری نہیں رکھ سکتے۔"

"پھر کیا ہتھیار ڈال دیں؟"
میں نے کہا: "ایمان کے بعد سب سے بڑی طاقت عقل کی ہے۔ ہم اسی پر انحصار کر سکتے ہیں۔ کیوں نہ ہم سب مر جائیں؟"
"کیا... آپ کا مطلب ہے... خودکشی کر لیں؟" گل نے پریشان ہو کے کہا۔
"میں نے حرام موت کی بات نہیں کی تھی۔" میں نے کہا۔ "چلو جلدی کرو۔ گل! تم وہیں لیٹ جاؤ۔ مصرا کو دیکھو، یہ نیچرل پوز ہے۔"
گل نے میری بات سمجھ لی۔ وہ اس مگ کے پاس لیٹ گئی جو پہلے مصرا کے ہاتھ سے گرا تھا۔ محسن جہاں تھا وہیں آلٹا لیٹ گیا اور میں نے دروازے کے قریب ایک جگہ پسند کی۔
شاہد جمیل نے شکست قبول نہیں کی تھی مگر مزاحمت ترک کر دی تھی۔ نہ جانے کب سے وہ اپنے اعتماد کے رشتے کی مضبوطی پر اندھا یقین رکھتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ ایک جہاز کا عملہ ایک خاندان ہوتا ہے جس کا سربراہ کپتان ہو۔ اس کے لیے عقائد و نظریات کو آزمائش کی کسوٹی پر پرکھنے کا وقت کبھی نہیں آیا تھا اور اس نے کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں کی ہو گی کہ "وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے۔" کے مقولے کی صداقت پر شک کرے اور اس خاندان کے افراد سے جس کا وہ خود بھی ایک رکن تھا، یہ پوچھے کہ کبھی اُن پر بُرا وقت آیا تو اچھے وقت کی طرح وہ سب ساتھ ہوں گے یا نہیں۔ اس نے سوچا ہو گا کہ یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے!
مگر خوش فہمیوں کے طلسم میں اسیر رہنے والا جو بدلتے وقت کی حقیقت کو نہ دیکھے اور تسلیم نہ کرے، ایسی ہی شکست کا صدمہ اٹھاتا ہے۔ پیڈرو اب اسے سمجھا رہا تھا کہ وہ ضد نہ کرے۔ اس بحری جہاز کا سارا عملہ اپنی وفاداریاں تبدیل کر چکا ہے اور جذباتی دلائل سے وہ لوگ وفادار نہیں ہو سکتے جو دولت کی طاقت کے سامنے سر جھکا چکے ہوں۔
"خدا اور ضمیر کی بات چھوڑ دو۔ بمبئی پہنچ کے تم مالکوں سے کیا کہو گے؟" شاہد جمیل نے کہا۔
"کچھ کہنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی۔ نہ جہاز نے اپنی منزل بدلی ہے، نہ کوئی بات خلافِ معمول ہوئی ہے۔ جہاز کا کپتان مر گیا ہے، وہ شراب بہت پیتا تھا اور دل کا مریض تھا۔ اس کا مر جانا کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہو گی۔ ہم اسے سمندر میں ڈال دیں گے تو یہ بھی خلافِ قاعدہ نہیں۔"
"مگر تم نے اسے کیوں مارا؟" شاہد جمیل بڑے دُکھ سے بولا۔

"ایک تو وہ شک بہت کرتا تھا۔ پھر اس کی نظر میں میری وقعت ایک کتے جتنی بھی نہیں تھی۔" پیڈرو نے کہا۔ "اس سے میں نے ایک لاکھ میں سودا کیا تھا اور جو شخص ایک لاکھ دیتا ہے، وہ کتا نہیں ہوتا۔ مالک اور آقا ہوتا ہے، اس کی بات ماننی پڑتی ہے اور عزت کرنی پڑتی ہے۔ لیکن وہ الٹا مجھے ذلیل کرتا تھا اور اپنی کپتانی کی دھمکی دیتا تھا۔"
"کیا اسے مار کے تم نے عزت حاصل کر لی؟" شاہد کے لہجے میں زہر تھا اور نفرت کی آگ تھی۔ "تمہارے ایک لاکھ بھی بچ گئے۔ جو تم نے ان گھٹیا نسل کے چھوٹے کتوں کے سامنے ڈال دیے، اب تم آقا اور مالک بن گئے ہو۔"
"اصل بات یہ نہیں ہے۔" پیڈرو نے کہا۔ "تمہارا کپتان جیسے مجھے بلیک میل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنا مطالبہ نامعقولیت کی حد تک بڑھا کے پانچ لاکھ کر دیا تھا۔ دو لاکھ میں شاید دے دیتا۔ پانچ لاکھ کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا مگر وہ مجھے بس دھمکی دے رہا تھا کہ میں نے اس کی بات نہ مانی تو وہ جہاز کو بمبئی میں رکوا دے گا اور سارا سامان ضبط کرا دے گا۔ یا وہ کسی تیسری پارٹی سے ڈیل کرے گا۔ انٹرپول والوں کو بتا دے گا۔"
کیا ثبوت ہے تمہارے پاس...؟"
"ثبوت اس کے کمرے میں جا کے دیکھ لو۔ میری مخالفت کے باوجود اس نے انٹرپول والوں کو شپ پر آنے کی اجازت دی۔ ان سے شناخت نہیں مانگی۔ ان کے سامنے میری ایک نہیں چلنے دی اور مجھے ذلیل کیا۔ اس طرح وہ مجھے دبانا چاہتا تھا۔ یہ بتانا چاہتا تھا کہ اس نے اپنی دھمکی پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ میں ڈر جاؤں اور اس سے بات کر لوں۔ اس سے کہوں کہ مجھے پانچ لاکھ دینے منظور ہیں۔ کیا سمجھا تھا اس سور کے بچے نے اُستاد پیڈرو کو۔ اس جیسے دس مصرا میں دس مرتبہ بیچ کے کھا جاؤں۔ کیا ملا اسے اُستاد پیڈرو سے ٹکر لے کر؟ ایک لاکھ گئے اور جان مُفت میں گئی۔ میں کچی گولیاں کھیلنے والا نہیں ہوں۔ میں نے پکا انتظام کر رکھا تھا۔ میں گڑ سے مرنے والے کو بھی زہر دینے کا قائل ہوں اور زہر میں ہمیشہ پاس رکھتا ہوں۔ بس مجھے موقع کا انتظار تھا۔ جاؤ اور وہ ساری لاشیں دیکھ لو جو استاد پیڈرو کی اُستادی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ اور پھر مجھے سوچ کے بتاؤ شاہد جمیل کہ تم کس کے ساتھ جاؤ گے۔ ان لاشوں کے ساتھ یا ہمارے ساتھ؟"
"سوچنے کو اب کیا رہا ہے۔" شاہد جمیل نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ "اس حمام میں سب ننگے ہیں تو مجھے بھی اب کپڑے اُتار ہی دینے چاہئیں۔"
"تم نے صحیح وقت پر صحیح فیصلہ کر لیا۔ اب تم اس جہاز کے کپتان ہو اور اسے بمبئی کے ساحل تک سلامتی کے ساتھ پہنچانے کے ذمے دار ہو۔ میں تمہارے کام میں دخل نہیں دوں گا۔ جب تک تم مصرا بننے کی کوشش نہیں کرو گے، عملہ بھی تمہارا ساتھ دے گا۔ وہ سب حکم کے غلام ہیں۔"
"ہوس کے غلام کہو۔" شاہد نے کہا۔
"غلامی کسی کی ہو، غلامی ہے۔" پیڈرو بولا۔ "چلو اب آ گئے۔"
یہ سب گفتگو میں نے دروازے کے قریب لیٹ کر سُنی۔ دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا چنانچہ میں ایک ایک لفظ صاف سُن سکتا تھا۔ اب میں نے قدموں کی آواز کو نزدیک آتے سُنا تو میں نے محسن اور گل کو اشارہ دیا اور خود بھی انھی کی طرح "مر گیا۔"
پہلے میرا ارادہ تھا کہ پیڈرو کو اندر قدم رکھتے ہی قابو کر لوں گا۔ پھر باقی معاملات آسان ہوں گے۔ گل اور محسن کے ساتھ جب شاہد جمیل بھی شامل ہو گا تو "ایس ایس کرانتی تھرڈ" کے غدار، نمک حرام اور خود فروش عملے کے لیے مقابلہ ناممکن ہو جائے گا اور بعد میں ان کو ایم آر ایس کی عدالت میں مقدمہ چلا کے باقاعدہ موت کی سزا دی جا سکے گی۔
لیکن پیڈرو نے ثابت کیا کہ وہ بے وقوف نہیں ہے۔ وہ خود اندر نہیں آیا۔ اندر آنے والوں میں سب سے آگے خود شاہد جمیل تھا۔ میں نے ایک آنکھ کو تھوڑا سا کھول کے دیکھا۔ وہ تصویرِ غم بنا چاروں لاشوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ عملے کے تین ارکان تھے، وہ سب خفت زدہ اور گھبرائے ہوئے نظر آتے تھے۔
"یہ سب تو مر چکے ہیں پیڈرو۔" شاہد جمیل نے کہا۔
"میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے سر کہو۔ اور اگر یہ تمہارے لیے مشکل ہے تو پھر استاد پیڈرو کہہ کے مخاطب کرو۔" پیڈرو نے کمرے کے باہر سے کہا۔
"یس سر۔" شاہد جمیل نے تلخ لہجے میں کہا۔ "کیا حکم ہے ان لاشوں کے بارے میں؟"
"تمھیں یقین ہے کہ یہ لاشیں ہیں؟" پیڈرو نے عیاری سے کہا۔
"کیا آپ کا یقین اس کے برعکس ہے سر؟" شاہد جمیل نے طنز سے کہا۔ "آپ کہتے ہیں کہ یہ زندہ ہیں تو میں مان لیتا ہوں۔"
"خود دیکھو، خود یقین کرو۔" پیڈرو نے کہا۔ "انسان کی نظر اسے دھوکا بھی دے سکتی ہے۔"
میں نے دل ہی دل میں پیڈرو کو اس کی ہوشیاری پر داد دینے کے بجائے گالی دی۔ شاہد جمیل کے رویے نے مجھے تھوڑا سا مایوس کیا تھا۔ اس کا ایک ماتحت اسی کے سامنے مردانہ وار مارا گیا تھا۔ اس نے پیڈرو کی اطاعت پر اور غداری کے الزام پر موت کو ترجیح دی تھی۔ میرا خیال تھا کہ شاہد جمیل حقیقی معنوں میں ایک فرض شناس ماتحت کا مثالی افسر ہو گا مگر ثابت یہ ہوا کہ جو باتیں کرتے ہیں وہ صرف باتیں کر سکتے ہیں۔ شاہد جمیل اس جہاز پر پیڈرو کی ایک ضرورت تھا۔ پیڈرو اسے نہیں مار سکتا تھا لیکن موت کے مقابل ہوتے ہی شاہد جمیل کے سارے زبانی دعوے نقش بر آب ہو گئے۔ اب وہ پیڈرو جیسے شہدے، بدمعاش اور ہسٹری شیٹر جرائم پیشہ کو سر کہہ رہا تھا۔ لہجہ تلخ سہی، اس نے مصرا کی جگہ پیڈرو کو باس مان لیا تھا۔ اس شکست کو طنزیہ اور تلخ احتجاجی انداز اختیار کر کے جھیلنے کی کوشش خود اپنا مذاق اڑانے کے مترادف تھی۔
"میں سب کی موت کی تصدیق کرتا ہوں اور یہ تصدیق بھی کر سکتا ہوں کہ ان سب کی موت زہریلی کافی پینے سے واقع ہوئی ہے۔" شاہد جمیل نے کہا۔ "آپ ڈاکٹر بھنڈاری کو پوسٹ مارٹم کے لیے بلوا سکتے ہیں۔ اگر میری بات پر اعتبار نہیں۔"
"کافی میں ایک خطرناک زہر تھا۔" پیڈرو بولا۔
"کیوں نہ ان لاشوں کو یہیں چھوڑ دیا جائے۔" شاہد جمیل بولا۔
اس کی بات نے جتنا مجھے حیران کیا اتنا ہی پیڈرو کو کیا۔
"یہاں؟ کیا احمقانہ تجویز ہے، مسٹر شاہد جمیل، یہ کپتان کا کمرا ہے، جس میں اب میں رہوں گا۔ سوری! تم رہو گے۔ کیا تم لاشوں کے ساتھ رہنا چاہو گے؟"
"لاشوں کا کیا ہے، کہیں بھی پڑی رہیں۔" شاہد جمیل نے بے نیازی سے کہا۔ "مجھے ان سے ڈر نہیں لگتا۔"
"انھیں یہاں سے اُٹھاؤ اور میرے کمرے کے ساتھ والے اسٹور میں پہنچا دو۔" پیڈرو نے کہا۔ "چلو تم دونوں، پہلے مصرا صاحب کی ارتھی اُٹھاؤ، رام نام ست ہے۔" وہ اپنے مذاق پر خود ہی قہقہہ مار کے ہنسا۔ مجھے اس کے اندر نہ آنے سے مایوسی ہوئی تھی اور اب میں سوچ رہا تھا کہ مجھے اپنا پلان بدلنا پڑے گا۔
پیڈرو کی باتوں سے اور اس کی احتیاط سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ہمارے معاملے میں کسی قسم کا خطرہ مول لینے پر تیار نہیں۔ اگر اس وقت میں اور محسن اُٹھ کھڑے ہوتے تو صرف انھی کو مار سکتے تھے جو پہلے ہی مجبوری کے مارے ہوئے تھے۔ باہر مسلح کھڑا ہوا پیڈرو بالکل محفوظ رہتا اور ہم باہر نکلتے تو اس کی گولی کا نشانہ بن جاتے۔ اندر رہتے تو بے بسی کی قید کاٹتے۔
"ڈاکٹر شاہد جمیل!" پیڈرو نے اچانک کہا۔ "تم باقی سب کی موت کا سرٹیفکیٹ بھی جاری کر سکتے ہو؟"

میرا دل ڈوبنے لگا۔ پیڈرو نے بندوق شاہد جمیل کے کندھے پر رکھ دی تھی۔ اب شاہد جمیل کیا کرے گا؟ ایک زندہ آدمی کے لیے خود کو مردہ ثابت کرنا بھی اتنا ہی ناممکن ہوتا ہے جتنا کسی مُردے کے لیے خود کو زندہ ثابت کرنا۔ ہمارے جسم زندگی کی حرارت سے معمور تھے اور نبض زندگی کی حرکت پذیری اور توانائی کا اعلان کر رہی تھی۔ زیادہ سے زیادہ ہم جسم کو اکڑا کے ایک منٹ کے لیے سانس روک سکتے تھے لیکن ایسی طفلانہ کوشش سے کچھ حاصل نہ ہوتا۔ اب میرے آئندہ اقدام کا انحصار شاہد جمیل کے جواب پر تھا۔

جب شاہد جمیل نے میرے قریب بیٹھ کے میرا ہاتھ پکڑا اور میری نبض پر اپنی انگلی رکھی تو میں نے اسے آنکھیں کھول کے دیکھا اور زبان سے کچھ کہے بغیر اس سے ایک التجا کی۔ معلوم نہیں کیسے شاہد جمیل نے میری التجا کو سمجھ لیا۔ کیا خیالات کا عکس آنکھوں میں اُتر آتا ہے؟ اور اگر ایسا ہوتا ہے تو یہ عکس ایک تحریر کیسے بن جاتی ہے اور وہ تحریر سب میں پڑھ سکتے؟ صرف وہی اس کا مطلب کیوں سمجھتے ہیں جن کے جذبات اور احساسات میں ذہنی مطابقت ایک سی ہو۔ میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔ ایسا ہوتا ہے اور اس وقت بھی ہوا۔

شاہد جمیل نے کہا۔ "مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سب ایک ساتھ وہی زہریلی کافی پی کر مرے۔"

"گویا خطرے کی بات کوئی نہیں؟" پیڈرو بولا۔

"اب کیسا خطرہ؟"

"یہی کہ کہیں مُردہ پھر زندہ نہ ہو جائے۔ کبھی کبھی اخبار میں ایسی خبر آجاتی ہے۔" پیڈرو نے کہا۔

مجھے اس کی بات سن کے یقین آگیا کہ پیڈرو کو آسانی سے بے وقوف نہیں بنایا جاسکتا اور شاہد جمیل نے ہماری خاطر اتنا بڑا جھوٹ بول کے اپنی زندگی کو داؤ پر لگا دیا ہے، اس کے بارے میں میری رائے بدل گئی۔ وہ بزدل نہیں تھا۔ مصلحت کا تقاضا تھا کہ وہ پیڈرو کے سامنے اپنی شکست کا اظہار کرے۔ اسے اپنا پاس تسلیم کرے اور سر کہے۔ وہ بہادری نہیں، بے وقوفی ہوتی اگر شاہد جمیل حق گوئی و بے باکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مارا جاتا اور پیڈرو جیسا دشمن بچ جاتا۔ زندہ رہ کے ہی اسے مارنے کی کوئی صورت نکالی جاسکتی تھی اور شاہد جمیل نے جان کی بازی لگا کے یہ صورت نکالنے کی کوشش کا آغاز کر دیا تھا۔

مصرا کی لاش اُٹھا کر لے جانے والے لوٹ آئے تھے۔

"کپتان صاحب کو عزت آرام کے ساتھ لٹا دیا ہے نا؟"

پیڈرو نے کہا اور ہنسا۔ "چلو اب ایک وردی والے کو بھی اٹھا لو۔ پہلے اسے لے جاؤ۔ وہ جو چھوکری ٹائپ ہے، نرم و نازک سب صورت سا لونڈا۔" اس نے ایک فحش قہقہہ مارا۔

"کیا ایک لاش میں اٹھوالوں؟" شاہد جمیل بولا۔

"نہیں۔ تم اندر ہی رہو۔" پیڈرو نے باہر سے حکم دیا۔ "ہر لاش کے ساتھ تین آدمی جائیں گے۔ دو واپس آئیں گے، تیسرا وہیں رُکے گا اور وہ تیسرا شخص اپنے ہاتھ میں ریوالور رکھے گا اور لاشوں پر نظر رکھے گا۔"

"کہیں کوئی لاش فرار نہ ہو جائے؟" شاہد جمیل بولا۔

"ہاں۔ اگر ایک لاش بھی کم ملی تو اس کی جگہ محافظ کی لاش سے ٹوٹل پورا کیا جائے گا۔" پیڈرو بولا۔ "تم... تم رُکو گے وہاں۔"

"میں... میرے پاس ریوالور نہیں ہے۔" مخاطب کیے جانے والے نے بوکھلا کے کہا۔

"کپتان صاحب کی جیب میں ہوگا۔ ان سب کی جیب میں کم سے کم ایک ایک ریوالور ہوگا۔ کچھ عقل سے کام لو۔ باقی ریوالور سے۔" پیڈرو نے کہا۔

جب باری آنے پر مجھے اُٹھایا گیا تو جسم اکڑانے اور سانس روکنے کے باوجود مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں لاشیں ڈھونے والے میرے مکر کو تاڑ نہ جائیں لیکن وہ اُستاد پیڈرو نہیں تھے۔ وہ بدحواس اور پریشان بھی تھے چنانچہ انھوں نے ہانپتے ہوئے میری ایک سو ساٹھ پونڈ وزنی لاش کو اس مُردہ خانے تک پہنچایا جہاں ایک اصلی مُردے کے ساتھ دو خود ساختہ لاشیں بھی لیٹی ہوئی تھیں۔ راستے میں ایک جگہ انھوں نے مجھے تقریباً گرا دیا تھا۔ وہ بہت تھک گئے تھے اور جہاز کے ہچکولے الگ تھے جس کی وجہ سے وہ توازن قائم رکھنے میں ناکام تھے۔ یہ غنیمت ہوا کہ مجھے ٹانگوں سے پکڑ کے اُٹھانے والے نے چھوڑا۔ اگر میرا سر فرش پر لگتا تو میری لاش کے حلق سے آہ یا ہائے ضرور نکل جاتی۔

پیڈرو کے بارے میں مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ ہمارے پیچھے آرہا ہے۔ میں آخری مُردہ تھا اور میرا جنازہ اُٹھانے والوں کے ساتھ شاہد جمیل اور اُستاد پیڈرو بھی جہاز کے ادھر سے روانہ ہو گئے تھے، اس طرح کہ پیڈرو سب سے پیچھے تھا۔ مُردہ خانے میں جب مجھے فرش پر سیدھا رکھ دیا گیا تو مجھے احساس ہوا کہ میری کمر میں کوئی نوکیلی چیز چبھ رہی ہے۔ جب تک میں حرکت میں تھا میرے لیے محسوس نہ ہونے والے طریقے پر سانس لینا ممکن تھا۔ ڈگمگاتے قدموں سے لاش ڈھونے والوں کے لیے اس خفیف سی حرکت کو نوٹ کرنا مشکل تھا لیکن اب اچانک میرے لیے آزمائش سخت ہو گئی

ایک طرف وہ کیل تھی جو میری کمر میں پیوست ہوتی جارہی تھی اور میرے لیے حرکت نہ کرنا سخت ترین قوت برداشت کا کام تھا۔ دوسری طرف سانس کی آمد و رفت کو پابند رکھنا اس سے زیادہ مشکل کام تھا۔ چند سیکنڈ میں یہ ڈراما فلاپ ہو سکتا تھا۔

اچانک پیڈرو نے کہا۔ "باقی سب لوگ باہر جاؤ۔ دروازے کے پاس رہو۔ بالکل تیار۔ شاہد جمیل تم یہ دروازہ بند کر دو اور پھر سامنے آجاؤ اور لاشوں کے ساتھ لیٹ جاؤ۔"

"لاشوں کے ساتھ؟" شاہد جمیل کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

"ہاں۔ کیا ڈرتے ہو؟" پیڈرو ہنسا۔ "ابھی خود تم نے کہا تھا کہ تمہیں لاشوں سے ڈر نہیں لگتا۔"

"آخر تم کیا چاہتے ہو؟" شاہد جمیل نے تند لہجے میں کہا۔

"میں تم کو ایک تماشا دکھانا چاہتا ہوں جو تم نے پہلے کبھی نہیں دیکھا ہوگا۔" پیڈرو بولا۔ "فرض کرو میں ان مُردوں کو زندہ کر دوں۔"

اب میرے لیے اپنی اداکاری کو جاری رکھنا بے مقصد اور مشکل ہو گیا تھا۔ میں اُٹھ بیٹھا۔ پیڈرو مجھے مشین گن کے مانند نظر آیا۔

"او کمینے پیڈرو۔" میں نے کہا۔ "یہ راؤنڈ بھی تم جیت گئے۔" میری آواز پر محسن بھی اُٹھ گیا۔ "تم خود ایک زندہ ہو جانے والے مُردے ہو۔"

پیڈرو نے ایک قہقہہ مارا۔ "تم نے دیکھا شاہد جمیل، جن کی موت کا سرٹیفکیٹ جاری کر چکے تھے، وہ صرف مرنے کا ڈراما کر رہے تھے یا تم نے بوگس سرٹیفکیٹ دیا تھا؟"

"میں... شاید غلط سمجھا تھا۔" شاہد جمیل نے کہا۔

"بکواس بند کرو۔" پیڈرو نے مشین گن کا دستہ شاہد جمیل کے سر پر مارا۔ "تم نے مجھے دھوکا دینے کی کوشش کی تھی۔"

شاہد جمیل نیچے گر گیا۔ اس کا سر پھٹ گیا تھا اور خون کی ایک لکیر اس کی گردن پر بہنے لگی تھی۔

"یہ سب احمق، اُلو کے پٹھے گدھے تھے۔" پیڈرو نے اپنا اصلی روپ میں آتے ہی گالیاں دیتے ہوئے کہا۔ "بہت زعم تھا اس... کو بھی اپنی کپتانی پر۔ لیکن یہ نہیں جانتے تھے کہ پیڈرو کیا چیز ہے۔ ایسے ہی اُستاد پیڈرو نہیں بنا۔ اس کو دھوکا دینا آسان نہیں ہے۔ وہ اُڑتی چڑیا کے پر گن لیے، اور دشمنوں کے چہرے سات پردوں میں تاڑ لیے۔ وہ بند وردی کیا چیز ہے۔ مصرا یہ بات سمجھ لیتا تو اس وقت لاش نہ ہوتا۔ جیسے کسی کتے کی لاش۔"

"بھونک تو تم رہے ہو۔" میں نے سر ہلا کے کہا۔

"اور کہتے ہیں کہ بھونکنے والے کتے کاٹتے نہیں۔" محسن بولا۔

"یہ ویسے بھی چودھری دلاور کا پالتو کتا ہے۔"

"مگر اس وقت گلے سے پٹا اُترا ہوا ہے۔" محسن بولا۔

"بہت خوب! بہت عرصے بعد بھانڈوں کی جوڑی پھر ملی ہے۔" پیڈرو نے کہا۔ "کیا مجھے ہنسنا چاہیے اس مذاق پر؟"

"تم کو رونا چاہیے اپنی قسمت پر۔" [illegible]

"اور اپنی صورت پر۔" محسن بولا۔ "جس پر [illegible] سیاہی ہے۔"

"بہت جلد معلوم ہو جائے گا [illegible]"

پیڈرو تلخ لہجے میں بولا۔ "جہاز کو ڈبونے [illegible] حوصلہ ہے اور کیا ارادے ہیں۔ شیخ چلی [illegible] ہوگا کبھی خالی ہاتھوں سے دنیا کو فتح کرنے [illegible]" ہنسا اور ہنستا رہا۔

پھر اچانک ہنسی کو روک کے اس [illegible] ایک راؤنڈ فائر کیا۔ سب گولیاں ہمارے [illegible] اوپر سے گزر کے دیوار میں پیوست ہو گئیں [illegible] چیخ ماری۔

پیڈرو نے چونک کر اُسے دیکھا اور [illegible] مسکرایا۔ "اچھا۔ یہ بھی ہے ایک ڈراما۔ تمھاری ہمشیرہ [illegible] ایڈووکیٹ نے اپنی جنس بدل لی ہے۔ باہر سے تو [illegible] ہیں، اندر سے... دیکھنا پڑے گا اُلٹ پلٹ کے۔"

میں نے اپنے ردِعمل کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔ یہ بات میرے لیے حیرانی کا باعث تھی کہ پیڈرو نے گل کو رابعہ سمجھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی تھی کہ پیڈرو نے عرصہ دراز سے رابعہ کو دیکھا نہیں تھا اور گل کو وہ پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ یہ اس کی بھول بھی ہو سکتی تھی مگر مجھے اُستاد پیڈرو کے طرزِ عمل میں رونما ہونے والی تبدیلی بہت فطری لگی۔ اس کی بات نے میرے خیالات کی رو کو ایک نئی سمت دے دی۔ میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ کیا واقعی پیڈرو نے گل کو رابعہ سمجھا ہے، اور اگر ایسا سمجھا ہے تو اس کا ایک مطلب یہ نکلتا ہے کہ اسے رابعہ کے بارے میں کچھ معلوم نہیں اور شاید اس تمام عرصے میں جب رابعہ ہمارے ساتھ نہیں تھی، پیڈرو نے اُسے ایک بار بھی نہیں دیکھا تھا۔ ورنہ وہ رابعہ کی صورت کو کیسے بھول سکتا تھا اور گل کو رابعہ کیسے سمجھ سکتا تھا۔ یہ ایک منطقی نتیجہ تھا جو اس کے ذہن نے خود بخود اخذ کر لیا تھا کہ میرے ساتھ بھیس بدل کے ایسے خطرناک مشن پر آنے والی لڑکی صرف

رالعہ ہی ہو سکتی ہے۔ شہلا کا خیال اسے یوں نہیں آیا ہوگا کہ شہلا مدت سے لاہور میں رضوی صاحب کے گھر میں تھی اور یہ سب ہی جانتے ہوں گے کہ شادی کے بعد وہ ایک بچے کی ماں بھی بن چکی تھی۔

رالعہ کو دلاور نے یقیناً دیکھا تھا اور دلاور یہ بھی جانتا تھا کہ وہ چاند بھائی کی تحویل میں ہے۔ پھر اس نے اپنے افسر بہ کارِ خاص استاد پیڈرو کو یہ بات کیوں نہیں بتائی؟ فوری طور پر اس سوال کا جواب تلاش کرنا ممکن نہیں تھا۔ میرے لیے اس میں ایک پہلو اطمینان کا تھا کہ رالعہ کے بارے میں پیڈرو غلط فہمی کا شکار ہے۔ اس سے رالعہ کسی حد تک محفوظ ہو جاتی تھی مگر اس کے حصے کا عذاب گل کو ملنے کے آثار پیدا ہونے سے میری پریشانی بڑھ گئی تھی۔

پیڈرو نے آواز دے کر دو افراد کو اندر بلا لیا تھا۔

"یہ کون ہے؟" اس نے گل کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "عورت یا مرد؟"

"ہے تو مرد۔" ایک نے مسکرا کے کہا۔

"بے وقوف، کبھی پیکنگ دیکھ کے متاثر نہیں ہونا چاہیے، اچھی طرح دیکھ کے بتاؤ۔" پیڈرو نے کہا۔

"خبردار جو کسی نے... ایسی جرأت کی۔" میں نے کہا۔

"اگر تم نے اپنی جگہ سے حرکت بھی کی، تو فی الحال میں گولی تمھاری ٹانگ میں ماروں گا۔" پیڈرو نے کہا۔ "ایک برسٹ میں تم دونوں کی ایک ایک ٹانگ کا آپریشن ہو جائے گا۔ تم کیوں رک گئے۔ ادھر لاؤ اس انٹر لپل کو۔ اس کا پول ابھی کھل جائے گا۔"

وہ دونوں پھر آگے بڑھے۔ گل ان کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنی ٹوپی اُتار کے پھینک دی۔

"ٹھیک ہے، میں رالعہ ہوں۔" گل نے بے خوفی سے کہا۔ اس کے تراشیدہ بال اس کے شانوں پر پھیل گئے۔

میں نے ایک گہری سانس لی۔ بوجھ میری روح پر بڑھتا جا رہا تھا اور میں یہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ گل کو بچانے کے لیے پیڈرو کو بتا دینا چاہیے کہ یہ رالعہ نہیں ہے یا اس کی غلط فہمی سے فائدہ اٹھانے کے لیے خاموش رہنا چاہیے۔ پیڈرو کو نام سے کیا فرق پڑے گا۔ وہ رالعہ ہو یا گل، اگر اس کے ذہن میں کوئی ناپاک شیطانی خیال ہوگا تو اظہارِ حقیقت سے میں اس خیال کو بدل نہیں سکوں گا۔ گل نے میری مشکل اپنی جرأت کے مظاہرے سے آسان کر دی۔

"تم کچھ بدلی ہوئی لگتی ہو۔" پیڈرو نے لبوں پر زبان پھیر کے اسے پُرہوس نظروں سے دیکھا۔ "شاید بال کٹوا کے زیادہ خوب صورت ہو گئی ہو۔ اب تم خود ہی ادھر آ جاؤ ورنہ ان سے کہوں کہ تمھیں زبردستی کھینچ لائیں۔"

میرے نہ چاہنے کے باوجود گل آگے بڑھ گئی۔ گل نے میری طرف دیکھ کے افسوس سے سر ہلایا۔ معلوم نہیں کیا ہونے والا تھا۔

"اس کی تلاشی لو۔" پیڈرو نے حکم دیا۔

گل نے رضاکارانہ طور پر ہاتھ اوپر اٹھا لیے۔ دونوں نے خاصی تفصیل سے اس کو ٹٹول کے دیکھا۔ تلاشی کے بہانے اپنے سفلی جذبات کی تسکین کا کچھ سامان کر رہے تھے۔ گل کا چہرہ غصے اور شرم سے سرخ پڑ گیا لیکن اس نے مزاحمت نہیں کی اور زبان سے بھی کچھ نہیں کہا۔ میں یہ سب روکے بیٹھا رہا۔ گل کی وردی کی ہر جیب خالی کرا لی گئی۔ اس کا ریوالور بھی لے لیا گیا تھا مگر وہ بیلٹ محفوظ رہ گئی جو گل کی کمر کے ساتھ بندھی ہوئی تھی اور جس میں اس کا ... تھا اور ہنگامی حالات کے لیے محفوظ رقم تھی۔ تلاشی لینے والوں کے ہاتھ کمر کے علاوہ ہر جگہ پہنچے۔ میں نے اس سے کہیں زیادہ دیکھا تھا جو رالعہ کے ساتھ ہوا تھا۔ اس کے باوجود میرے خون کی حدت بڑھ رہی تھی کیوں کہ میں گل کی اس اذیت میں برابر کا شریک تھا جو گل کے لیے نئی تھی۔ ایک بار میری اور گل کی نظریں ملیں تو میں نے اس کی آنکھوں کا اشارہ صاف دیکھا۔ وہ مجھے کچھ نہ کرنے اور ضبط سے کام لینے کا کہہ رہی تھی۔

پیڈرو کے حکم پر گل کو ایک رسی سے اس طرح باندھ دیا گیا کہ اس کے دونوں ہاتھ اوپر رہے اور رسی کا دوسرا سرا ایک روشن دان کی سلاخ سے گزار کے واپس نیچے لایا گیا۔ اس رسی کا باقی حصہ گل کے دونوں پاؤں ایک ساتھ باندھنے میں کام آیا۔

میں اس تمام کارروائی کا مطلب سمجھ رہا تھا۔ وہ ... سے تفتیش کرنا چاہتا تھا اور اس کا آغاز روایتی ... پر ہماری کمزوری سے ناجائز فائدہ اٹھا کے کرنا چاہتا تھا۔ وہ خوش تھا کہ رالعہ اس کے ہاتھ لگ گئی اور میں سمجھ چکا تھا کہ اگر اس نے گل کے ساتھ کوئی شرمناک حرکت کی یا اس پر تشدد کا کوئی انسانیت سوز طریقہ آزمایا تو میں گل کو بچانے کے لیے سب کچھ کروں گا۔ اصل خطرہ پیڈرو تھا جس نے سب مشین گن اٹھا رکھی تھی۔ نشانہ خطا نہیں ہو سکتا تھا۔ ریوالور ہوتا تو میں جان ... اور پیڈرو میرے ہاتھ لگ جاتا تو بازی وہیں پلٹ ... باقی سب حکم کے غلام تھے اور انھیں ایک آقا کی ... سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

پیڈرو کی دھمکی نے بھی مجھے تھوڑا سا خوف زدہ کر دیا تھا۔ اگر وہ گولی مار کے مجھے ختم کرنے کی بات کرتا تب بھی میں یہ جوا ضرور کھیلتا کہ تخت یا تختہ۔ میں نہیں مارا گیا تو وہ مارا جائے گا لیکن اس نے میری ٹانگ اڑا دینے کی دھمکی دی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ مجھے قتل کرنا نہیں چاہتا۔ ایک پوری اور ایک آدھی ٹانگ کے ساتھ معذوری اور بے بسی سے پیڈرو کا قیدی بن جانا ایک پُراذیت تصور تھا۔

"پیڈرو، تم کو جو کچھ پوچھنا ہے مجھ سے پوچھو۔" میں نے کہا۔ "یا محسن سے پوچھو۔"

"تم لوگ بہت بدل گئے ہو۔" پیڈرو بولا۔ "پہلے تو تم کبھی ... سے کچھ نہیں بتاتے تھے۔ بزدل ہو گئے ہو تم؟"

"حالات بھی بہت بدل گئے ہیں۔" میں نے کہا۔

"اچھا؟ مجھے معلوم نہیں تھا۔" پیڈرو نے میرا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔ "ایک بات میں بھی بتا دوں تمھیں۔ مجھے حالات نے پہلے کے مقابلے میں زیادہ سخت دل اور بے رحم بنا دیا ہے۔ اور یہ بھی سکھا دیا ہے کہ سانپ بچھو پر اعتبار کروں مگر تم پر نہیں۔ تم ایسے ہی مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے سکندرِ اعظم۔ میں جانتا ہوں کہ وقت کی مار کھا کے تم اب پہلے سے زیادہ سخت جان ہو گئے ہو اور اب تم سے سچ اگلوانا زیادہ مشکل ہوگا لیکن تجربہ میں نے بھی حاصل کیا ہے۔ اب زیادہ کر سکتا ہوں جو پہلے نہیں کر سکتا تھا۔ اور جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔"

"کیا تم تصور کر سکتے ہو کہ تشدد کے سامنے ہم سر جھکا دیں گے؟" میں نے کہا۔ "اگر ہم کچھ نہ بتانے پر تل گئے تو پھر تم جتنا ظلم اور جبر، دہشت و بربریت کا مظاہرہ اور جتنا چاہے تشدد کر لو بالآخر تم ہار جاؤ گے۔ ایسا پہلی بار نہیں ہوگا۔ پہلے بھی تم زورِ بازو اور مال و زر ضائع کرتے رہے ہو۔"

"پھر آج تعاون کا جذبہ کیوں جوش مار رہا ہے؟" وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ "رالعہ کے لیے؟"

"رالعہ بہت کچھ دیکھ چکی ہے اور جھیل چکی ہے۔ تم ... کیا اس سے کیا فرق پڑتا؟ میں پھر تیار ہوں۔ رالعہ سے ... مجھ سے، اس کوشش میں تمھارا اتنا وقت ضائع ہو جائے گا کہ پھر کچھ بتانے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ ... سامنے آ جائے گا۔ آئے ہم یہ امید لے کر تھے کہ جہاز غرق ... لیکن ہم بچ کر نکل جائیں گے۔ اب جہاز کے ساتھ ہی ڈوبے ... بات نہیں۔ اندازے غلط بھی ہو جاتے ہیں اور یہ سارا کھیل ہی موت کا کھیل ہے۔"

پیڈرو کے چہرے پر الجھن کے آثار نمودار ہوئے۔ "جہاز کیسے ڈوب جائے گا؟"

میں ہنسا۔ "بعد میں جہاز کی غرقابی کے اسباب معلوم کرنے کے لیے ایک تحقیقاتی کمیشن بنایا جائے گا۔ اگر اس میں ماہر ہوں گے تو پتا چلا لیں گے۔"

محسن نے گھڑی دیکھی۔ "یا تم خود پتا چلا لو۔ ابھی وقت ہے۔"

"ہاں، تین چار گھنٹے میں جہاز کا پُرزہ پُرزہ دیکھ لو اوپر سے اور نیچے سے، اندر سے اور باہر سے۔" میں نے کہا۔

پیڈرو کی صورت کا تاثر بدل گیا۔ "تم یہ ثابت کرنا چاہتے ہو کہ جہاز کے کسی بہت مشکل اور پوشیدہ مقام پر تم نے کوئی تباہ کن بم وغیرہ نصب کر دیا ہے۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ جادو سے جنگ جیتنا تم نے کس سے سیکھا؟ جہاز پر قدم رنجہ فرمانے کے بعد تم ایک لمحے کے لیے بھی ہماری نظر سے اوجھل نہیں ہوئے لیکن اپنا کام بھی کرتے رہے۔"

"یہ جادو نہیں تھا۔" میں نے کہا۔

پیڈرو ہنسا۔ "پھر کوئی ہمزاد ہوگا تمھارے ساتھ، وہ سب کچھ کرتا رہا اور کسی کو کچھ نظر نہیں آیا۔"

"یہ کام ہمارے ساتھی گزشتہ رات ہی کر چکے تھے استاد پیڈرو۔" میں نے کہا۔

"اور وہ ساتھی سلیمانی ٹوپی اوڑھ کے آئے تھے کہ کسی کو دکھائی نہیں دیے؟"

"آدھا کام انھوں نے کراچی کی بندرگاہ میں ہی کر لیا تھا اور باقی جہاز کے روانہ ہونے کے بعد کیا۔ تم اتنا تو جانتے ہو گے کہ کسی بھی ٹائم بم کو بارہ گھنٹے سے زیادہ عرصے کے لیے سیٹ نہیں کیا جا سکتا۔ گھڑی کی سوئیاں بارہ گھنٹے کے بعد پھر ایک گھنٹے پر آ جاتی ہیں۔ جہاز کے بارے میں یہ معلوم ہونے تک کہ اس کی روانگی کب ہوگی، یہ کام ناممکن تھا۔ اور سلیمانی ٹوپی تو آنکھ پر پڑ جانے والا پردہ ہوتی ہے۔ اندھیرا بھی سلیمانی ٹوپی ہے جس میں آنکھ کچھ نہیں دیکھ سکتی اور لاعلمی بھی سلیمانی ٹوپی ہے۔ تمھیں کیا معلوم کہ یہاں تمھارا ساتھی کون تھا اور ہمارے ساتھ کون ملا ہوا تھا۔ یہ سارا کھیل ہے پیسے کا یا جذبات کا۔ تم نے آج جہاز کے عملے کی وفاداری خرید لی ہے تو بہت مطمئن ہو۔ کیا تمھیں یہ خیال نہیں آتا کہ تم سے پہلے بھی ان کو خریدنا ممکن تھا؟"

"ہاں۔ جو چیز بازار میں برائے فروخت ہو، اسے کوئی بھی خرید سکتا ہے، جو پہلے پہنچ جائے۔" محسن بولا۔ "اور یہ بھی مت بھولو کہ انسان جو ایک بار بکتا ہے، وہ دوسری بار

بھی بک سکتا ہے اور سب سے زیادہ ناقابلِ اعتبار وہی ہوتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ پیسہ تم سے لے مگر ساتھ تمھارا نہ دے۔“

”صرف وہی، قابلِ اعتبار ہوتا ہے جو یقین یا ایمان کے جذبے کو اہم سمجھتا ہو۔“ میں نے کہا۔ ”ہم جو اتنی بے خوفی سے یہاں آئے گھسے تو آخر کس کے بھروسے پر... خدا کے بعد ہم ان کی مدد پر تکیہ کرتے ہیں جو اصولی طور پر ہمارے ساتھی ہیں۔ زر خرید نہیں ہیں۔ اور اگر سب تم کو زر خرید محسوس ہوتے ہیں تو یہ دھوکا ہے تمھاری نظر کا۔“

پیڈرو سوچ میں پڑ گیا۔ ”جھوٹ بکتے ہو تم، یہ سب میرے ساتھ ہیں۔ اُن سے میرا معاملہ پہلے ہی طے ہو گیا تھا۔ جہاز جب کراچی کی بندرگاہ میں تھا تو وہیں ساری بات ہو گئی تھی۔ مگر... یہ ہو سکتا ہے.... کہ ان میں سے کوئی دغا بھی ہو۔ میں معلوم کر لوں گا۔ مجھے تو اب مصرا پر بھی شک ہے۔ ضرور وہ تم سے ملا ہوا تھا ورنہ... ورنہ میری بات ضرور سنتا۔“

میں نے مسکرا کے محسن کی طرف دیکھا۔ ”شک کی کیا بات ہے۔ مصرا ہماری مدد نہ کرتا تو ہم کیا کر سکتے تھے؟ تم نے اسے ایک لاکھ دینے کا وعدہ کیا تھا نا؟“

پیڈرو چونکا۔ ”یہ تم کیسے جانتے ہو؟“

”ہم تو یہ بھی جانتے ہیں کہ مصرا کو اس دھندے میں تم زبردستی کھینچ لائے تھے۔ تم نے اُسے بلیک میل کر کے مجبور کر دیا تھا۔“ محسن بولا۔

”اور جس معاملے میں تم نے اسے بلیک میل کیا وہ ایسا تھا کہ اس کی جگہ میں بھی ہوتا تو تمھاری بات مانتا لیکن یہ میں بھی وہی کرتا جو مصرا نے کیا۔ میں اسی طرح تمھاری پیٹھ میں خنجر گھونپ دیتا۔“

پیڈرو کے اعتماد کا شیرازہ بکھرنے لگا تھا۔ اس نے کچھ دیر مجھے اور محسن کو گھورنے کے بعد کہا۔ ”یہی دو آدمی تھے... انھی سے خطرہ تھا۔ چوہدری صاحب کو بھی۔“ وہ اپنے آپ سے مخاطب تھا۔

”چوہدری دلاور ایک ذہین آدمی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اس کے اندازے درست تھے۔ مگر تم ان دونوں سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ مصرا تنگ دست تھا۔ ہم نے اسے دُگنی رقم پیش کی تو اس نے کہا کہ یہ رقم اس کے بیوی بچوں کو پہنچا دی جائے۔ اسے تم پر اعتبار نہیں تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ تمھارے لیے ایک لاکھ ادا کرنے سے زیادہ آسان ایک گولی چلانا ہے۔ تم اسے قتل کر دو گے اور دُہرا فائدہ حاصل کرو گے۔ تمھارے ایک لاکھ بھی بچ جائیں گے اور تمھیں افشائے راز کا بھی خطرہ نہیں رہے گا۔“

پیڈرو نے مشین گن کا رُخ شاہد جمیل کی طرف کر... ”ایک کو تو اس کے کیے کی سزا مل گئی۔“

”ٹھہرو۔“ میں نے چلا کے کہا۔ ”اسے بھی مار دو گے تو تمھیں ہم بھی نہیں بچا سکیں گے۔ مصرا کے سلسلے میں تم کہہ سکتے ہو کہ اسے کسی نے کافی میں زہر دے دیا تھا اور اس الزام میں کچن کے ملازموں کو گرفتار کرا سکتے ہو۔ فرسٹ آفیسر کو مار ڈالو گے تو بمبئی پہنچ جانے کے بعد حکام کو کیا جواب دو گے اور کمپنی سے کیا کہو گے۔“

”انھوں نے تمھیں جہاز کی اور عملے کی خدمات سونپ دی تھیں۔ ان کی زندگی کا سودا نہیں کیا تھا۔ جہاز یا عملے کے کسی فرد کو تمھارے ہاتھوں نقصان پہنچا تو وہ تم کو معاف نہیں کریں گے۔ وہ تمھیں گرفتار اور تمھارے مال کو ضبط کر دیں گے۔“

پیڈرو رُک گیا۔ شاہد جمیل نے ایک گہری سانس لی۔ اس کا چہرہ جو دہشت سے پیلا پڑ گیا تھا مطمئن نظر آنے لگا۔ اس نے ممنونیت کے جذبات کے ساتھ ہمیں دیکھا۔

”شاہد جمیل! کیا تم ان کو بحفاظت بمبئی پہنچانے اور انھیں معاہدے کے مطابق اپنا مال اتارتے وقت تحفظ فراہم کرنے کی ضمانت دے سکتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”اور اس کے بدلے کیا مجھے اور میرے عملے کو سلامتی کی ضمانت ملے گی؟“ شاہد جمیل نے میری بات پر غور کر کے... ”پیڈرو کی طرف سے میں کوئی ضمانت نہیں دے سکتا لیکن یہ ضمانت تمھیں بہر حال حاصل ہے، کیوں پیڈرو؟“

پیڈرو نے بادلِ ناخواستہ اقرار میں سر ہلایا۔ ... صورتِ حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پہلے پیڈرو کے ... میں شکوک پیدا کیے تھے پھر اس پر ایک طرح سے نفسیاتی غلبہ حاصل کر لیا تھا اور اسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ میری عقل سے سوچے۔ اس طرح پیڈرو کی قوتِ فیصلہ مفلوج ... تھی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ ایک دوسرے سے تعاون کرنا ... باہمی کے لیے ضروری ہے۔

”تم اپنے عملے کو بھی سمجھا سکتے ہو کہ مصرا کی موت ایک حادثہ تھی یا طبعی موت تھی۔ اس کا ہارٹ فیل ہو ...“ میں نے شاہد جمیل سے کہا۔

”یہ... تو ٹھیک ہے لیکن اس سے زیادہ ... نہیں کر سکتا۔“ شاہد جمیل نے کہا۔ ”مجھے جہاز کے بارے ... کچھ معلوم نہیں۔“

”کیا معلوم نہیں؟“ پیڈرو غرا کے بولا۔

”یہی... کہ مصرا صاحب نے آتشگیر اور تباہ کن مادہ کہاں کہاں چھپایا تھا۔“ شاہد جمیل نے ترپ کا جوابی پتا پھینکا۔

”وہ مصرا نے مرنے سے پہلے ہمیں بتا دیا تھا۔“ میں نے سکون سے کہا۔

شاہد جمیل کی چال کامیاب رہی تھی۔ پہلے ہم نے اس کے لیے تحفظ کی ضمانت فراہم کی تھی تو اب اس نے ہمیں موقع دیا تھا کہ ہم اپنے دفاع کو یقینی بنا لیں۔ پیڈرو بے بسی کے عالم میں ہونٹ کاٹ رہا تھا اور سخت مشتعل تھا۔ ہماری مدد کے بغیر وہ جہاز کو غرقابی سے نہیں بچا سکتا تھا اور اُدھر شاہد جمیل کی مدد کے بغیر خود کو ان قانونی الجھنوں سے محفوظ نہیں رکھ سکتا تھا جو اس کے مشن کو منزل پر پہنچنے کے بعد ناکامی سے دوچار کر سکتی تھیں۔

پیڈرو نے اپنے دو ساتھیوں کو حکم دیا کہ وہ شاہد جمیل کو لے جائیں۔ ”اس کو انجن روم میں قید رکھو۔ یہ تم دونوں کی ذمے داری ہے کہ نہ یہ اس کمرے سے نکلے اور نہ کوئی اس کے پاس جائے۔“

”عملے کو میری ہدایات کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔“ شاہد جمیل نے کہا۔

”سب ہدایات میری موجودگی میں دی جائیں گی۔“

باہر سے بلائے جانے والے دو افراد نے پیڈرو کے حکم پر گل کو آزاد کر دیا جو اب سخت ... تھی ... جس طرح باندھا گیا تھا وہ انتہائی تکلیف دہ طریقہ تھا۔ وہ پنجوں کے بل زمین پر کھڑی رہ سکتی تھی اور قدم جما کے کھڑے ہونے کی صورت میں اوپر بندھے ہوئے ہاتھوں، شانوں اور بازوؤں پر جسم کا سارا بوجھ پڑ جاتا تھا۔ اس کے ہاتھ پیر دورانِ خون کے متاثر ہونے سے بھی اکڑ گئے تھے لیکن ابھی تک وہ قوتِ برداشت کا مظاہرہ کرنے میں کامیاب تھی۔ جب اسے کھولا گیا تو وہ فرش پر ڈھیر ہو گئی۔

جب وہ اسے گھسیٹ کر لے جا رہے تھے تو گل نے چلا کے مجھ سے کہا۔ ”سکندر! میری فکر مت کرنا۔ میں مر جاؤں گی مگر انھیں کچھ نہیں بتاؤں گی۔“

وہ ہمیشہ مجھے سکندر بھائی کہتی تھی۔ اس وقت سکندر کہنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ رابعہ کا کردار نبھانے پر کمر بستہ ہے۔ اسے میں کیسے بتاتا کہ یہ کام آسان نہیں ہے۔ جو عذاب اس نے تھوڑی سی دیر برداشت کیا تھا وہ بہت معمولی تھا۔ رابعہ پر اس سے ہزار گنا مظالم توڑے گئے تھے اور وہ ثابت قدم رہی تھی۔ ایک عورت جب بے ضمیر شیطان صفت بھیڑیوں کے ہاتھوں میں ہو تو اس پر کیسے کیسے اندازِ ستم آزمائے جا سکتے ہیں، گل کو اس کا اندازہ نہ تھا۔ مگر میں اسے منع بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ رابعہ نہ بنے۔ ایک عذاب جسمانی اذیت کا ہو گا جو وہ اکیلی بھگتے گی۔ دوسرا عذاب میری ذہنی اذیت کا ہو گا اور ہم دونوں بے بس ہوں گے۔

”یہ ٹھیک ہے پیڈرو کہ ہم ایک دوسرے کو زندہ نہیں دیکھ سکتے۔“ میں نے کہا۔ ”اور جب موقع ملے گا تو ایک دوسرے کی جان لے کر دلی تسکین حاصل کریں گے لیکن اس وقت صورتِ حال مختلف ہے۔ یہ ایک ساتھ خودکشی کر لینے والی بات ہے۔ اس طرح نہ تمھارے لیے جیت کی خوشی ہے اور نہ میرے لیے کامیابی کی۔ تم نے بروقت فیصلہ کر لیا۔ یہ بازی ڈرا ہو گئی۔“

پیڈرو نے حقارت سے کہا۔ ”ابھی میں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔ میں اگلی چال سوچ رہا ہوں۔“

”اب کوئی چال باقی نہیں رہی۔“ میں نے کہا۔ ”شطرنج کے کھیل میں بھی ایسا ہو جاتا ہے تو مُہرے پھر جمانے پڑتے ہیں۔“

وہ ہنسا۔ ”بازی ابھی ختم نہیں ہوئی سکندرِ اعظم۔ تم کیا جانو کہ میں کون سا مہرا ایک چل کے تمھیں مات دے سکتا ہوں۔“

گل کو لے جانے والے لوٹ آئے تھے۔ پیڈرو نے کہا۔ ”اپنا مُنہ دیوار کی طرف کر لو اور ہاتھ اوپر رکھو۔ اگر تم نے مزاحمت کی یا تلاشی لینے والوں کو یرغمال بنایا تو تمھیں کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ میرے لیے ان دونوں کی زندگی کی کوئی قیمت نہیں۔ بے شک تم جوڈو کراٹے کے ماہر ہو مگر میرے ہاتھ میں سب مشین گن ہے۔ میں بتا چکا ہوں کہ تم دونوں کی ٹانگیں گھٹنوں کے پاس سے الگ کرنے میں مجھے چند سیکنڈ لگیں گے۔“

میرا فوری طور پر کسی جوابی کارروائی کا ارادہ بھی نہیں تھا۔ مجھے تھوڑی سی مہلت مل گئی تھی اور جہاں جدّوجہد کے سب راستے بند ہو جائیں، وہاں وقت کی مشکل کشائی پر اور دستِ قدرت کی راہنمائی پر انحصار کرنے کے سوا کیا کیا جا سکتا ہے۔ میں نے پیڈرو کے احکامات کی لفظ بہ لفظ تعمیل کی تھی مگر شاید وہ میری طرف سے عدم اطمینان کا شکار تھا۔ تلاشی لینے والوں نے بغیر نوٹس دیے اور بے سبب میرے سر پر ریوالور کا دستہ مارا۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ میں دیوار کے ساتھ پھسلتا ہوا نیچے گیا مگر مجھے اپنے فرش پر گرنے کا پتا بھی نہ چلا۔ غالباً ایسا ہی محسن کے ساتھ ہوا۔

ہوش آنے پر میں نے خود کو بہت عجیب حالت

میں دیکھا میرے پیروں پر میرا جسم رکوع کی حالت میں قائم تھا لیکن اس طرح کہ میں دو کمروں میں بٹ گیا تھا۔ میرا سر ایک گول شگاف سے گزارا گیا تھا جو درمیانی دیوار میں بڑی مہارت سے بنایا گیا تھا۔ یہ شگاف میری گردن کے سائز سے کچھ ہی بڑا تھا۔ اتنے چھوٹے سوراخ سے میرا سر نہیں گزر سکتا تھا چنانچہ سوراخ بڑا رکھا گیا تھا مگر سر نکالنے کے بعد گردن پر اوپر نیچے لوہے کی سلاخیں فٹ کر دی گئی تھیں۔ گردن سے نیچے میرے بازو، دھڑ اور ٹانگیں دوسرے کمرے میں رہ گئے تھے۔

میں نے سر کو دائیں بائیں گھما کے دیکھا۔ سیدھے ہاتھ کی طرف محسن کا سر لکڑی کی دیوار میں ایسے لگا ہوا تھا جیسے شکار کیے ہوئے جانوروں کے بھس بھرے سر دیواروں پر لگے نظر آتے ہیں۔ میں اپنی گردن کو تھوڑا بہت آگے پیچھے کر سکتا تھا مگر اس سوراخ سے اپنا سر نہیں نکال سکتا تھا۔ اسی طرح میں رکوع کی حالت میں رہتے ہوئے جسم کو حرکت تو دے سکتا تھا لیکن صرف اس حد تک کہ ٹانگوں کو تھوڑا سا آگے پیچھے کر سکوں۔ میری ریڑھ کی ہڈی میں تکلیف ابھی قابل برداشت تھی لیکن میں جانتا تھا کہ اسی طرح میں ایک گھنٹا بھی نہیں گزار سکتا۔

دوسرے کمرے میں جو آٹھ فٹ چوڑا اور لمبا تھا، پیڈرو اکیلا کھڑا ہوا تھا۔ کمرے کی خالی دیواریں لکڑی کی بنی ہوئی تھیں اور بالکل سامنے والی دیوار میں ایک بند دروازے کے سوا باہر آنے جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ کمرے کی چھت میں ایک بلب روشن تھا۔

پیڈرو آہستہ آہستہ میرے قریب آیا۔ اس کے لبوں پر وہی پرانی پُرخباثت شیطانی مسکراہٹ تھی۔

"کیا خیال ہے شاطر اعظم۔ بازی کیسی جا رہی ہے؟" اس نے میرے منہ پر ایک تھپڑ مارتے ہوئے کہا۔

میرا چہرہ سنسنانے لگا۔ "تم بچ نہیں سکتے پیڈرو۔"

اس نے میرے دوسرے گال پر تھپڑ مارا۔ "بچ تو میں اس وقت بھی گیا تھا جب تم مجھ پر گولیاں برسا رہے تھے اور میں سمندر میں غوطے کھا رہا تھا۔"

میرے سر کو ایک جھٹکا لگا۔ اوپر نیچے سے لوہے کی سلاخیں میری گردن میں گڑ رہی تھیں اور دائیں بائیں لکڑی کے کھردرے کنارے تھے۔ نہ میں سلاخیں توڑ سکتا تھا اور نہ لکڑی کی دیوار۔ میں تو پیڈرو کو چھو بھی نہیں سکتا تھا۔ میرے ہاتھ پیر جو میری طاقت تھے دوسرے کمرے میں قید تھے۔

"مصرا نے کیا بتایا تھا تمھیں؟" پیڈرو نے محسن کے سامنے جا کے کہا۔

"اس نے بتایا تھا کہ پیڈرو کے تین باپ تھے۔" محسن بولا۔

پیڈرو نے اس کے منہ پر تین تھپڑ مارے۔ ہر تھپڑ... بھرپور تھا اور اس کی آواز خالی کمرے میں پٹاخے کی طرح سنائی دی۔

وہ پھر میری طرف لوٹ آیا۔ "یہی سوال میں تم سے کرتا ہوں۔"

"مجھے تو مصرا نے بتایا تھا کہ یہ تمھاری خاندانی روایت ہے۔ سب کے تین باپ ہوتے ہیں۔" میں نے کہا۔

پیڈرو نے مجھے تین تھپڑ نہیں مارے۔ وہ پیچھے ہٹ کے کہنے لگا۔ "اس کا مطلب ہے کہ تم اپنی ضد پر قائم رہو گے۔ ہمیشہ کی طرح سو پیاز اور سو جوتے کھاؤ گے۔ تمھاری مرضی۔" اس نے باری باری ہم دونوں کو دیکھا اور دروازہ کھول کے کمرے سے نکل گیا۔

"محسن! کیا تجھے اندازہ ہے کہ اب کیا ہوگا؟"

"ہاں۔ اب وہ گل کو لائے گا۔" محسن نے کہا۔ "اور اس کے ساتھ...!"

"محسن! میں اسے بتا دوں گا کہ یہ رابعہ نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"اس سے کیا فائدہ ہوگا؟" محسن نے بڑی مشکل سے میری طرف گردن گھمائی۔ "وہ ہر صورت میں وہی کرے گا جو اسے کرنا ہوگا۔"

"گل اپنی جان بچا سکتی تھی۔" میں نے افسوس سے کہا۔ "اگر وہ چاہتی... مگر اس نے کوشش ہی نہیں کی۔"

"وہ ہمارا ساتھ دینے کی کوشش کر رہی ہے۔ یہ زیادہ اچھی بات ہے اور... حوصلے کی بات ہے۔"

"ہم بُرے پھنسے..." میں نے کہا۔ "اور یہ سب تھوڑے سے تذبذب کا نقصان ہوا ہے۔ جہاز پر آتے ہی ہمیں اچھا موقع ملا تھا۔ ہم وہیں سب کو ٹھکانے لگا دیتے۔ سب موجود تھے وہاں۔"

"ہاں۔ ضرورت سے زیادہ احتیاط بھی اچھی نہیں۔ ہم نازو اور غالب کی طرف سے فکرمند تھے کہ کہیں وہ مشکل میں نہ پڑ جائیں۔ اب یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ جہاز پر ہیں بھی یا نہیں۔"

میری گردن درد سے اینٹھ رہی تھی اور میرے لیے میری کمر کا درد ناقابل برداشت ہونے لگا تھا۔ میں مجبور تھا کہ اپنے دھڑ کے بوجھ کو ٹانگوں پر اٹھائے رکھوں۔ اس سے میری ٹانگ کے پٹھے بھی اکڑ رہے تھے۔ مجھے اندازہ تھا کہ کچھ دیر بعد میرے لیے خود کو سنبھالنا بالکل ناممکن ہو جائے گا۔ بے ہوشی میں میرا جسم لٹک جائے گا اور اس کا سارا بوجھ گردن پر آئے گا جو سلاخوں کے درمیان پھنسی ہوئی ہے۔ اگر میں گردن ٹوٹنے سے نہ مرا تو سانس رکنے سے ضرور مر جاؤں گا۔ اور یہ مہلت کتنی ہوگی؟ ایک گھنٹا۔ زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے یا تین گھنٹے۔ میرے ذہن پر مایوسی کے جالے پھیلنے لگے۔ ٹوٹی کہاں کمند۔

دروازہ کھلا تو میں چونکا۔ گل اندر آئی اور ایک دم اس کی نظر میرے اور محسن کے چہرے پر گئی جو سامنے سے دیکھنے پر دیوار میں جڑے ہوئے نظر آتے ہوں گے۔ اس کا چہرہ دہشت سے پیلا پڑ گیا۔ اس کے ساتھ ہی اندر آ جانے والے پیڈرو نے اسے دھکا دیا تو وہ منہ کے بل گری۔

پیڈرو میرے سامنے آ گیا۔ "تم سمجھ تو گئے ہو گے کہ اب میں کیا کروں گا؟"

"ہاں، مجھے معلوم ہے۔" میں نے سکون سے کہا۔ "اور رابعہ بھی جانتی ہے۔ تم اسے بے آبرو کرو گے۔ اس کی نسوانیت کی بھرپور تذلیل کرو گے اور مجھے مجبور کرو گے کہ میں سب دیکھوں۔"

"اور تم اس کے لیے تیار ہو؟"

"اور میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں اپنی آنکھیں بند رکھ سکتا ہوں۔ کان کیسے بند رکھوں گا۔ میں تمھارا ابھی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ہاں! ایک کام ضرور کر سکتا ہوں۔" میں نے کہا اور اس کے منہ پر تھوک دیا۔

وہ میرے اتنا قریب تھا کہ تھوک اس کی آنکھوں میں گیا۔

"اب دیکھو کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔" پیڈرو نے مجھے چیخ کر گالی دی اور پھر جیب میں سے کچھ نکالا۔ یہ ایک چھوٹا سا چمڑے کا ٹکڑا تھا۔ تقریباً ایک بالشت لمبا۔ اس کی شکل جوتے کے سول جیسی تھی۔ اس نے نچلے کم چوڑے حصے کو ہاتھ میں پکڑ کے وہ چمڑے کا ٹکڑا میرے منہ پر مارا۔ اس کی آواز پٹاخے کی طرح سنائی دی اور مجھے یوں لگا جیسے میرے ایک گال پر انگارے دہکنے لگے ہیں۔ جلن سے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے چمڑے کے ساتھ میری کھال بھی اتر گئی ہو گی۔ گل نے جو تھوڑا سا سر اٹھا کے وحشت سے کانپ رہی تھی اور رو رہی تھی، ایک چیخ ماری۔ پیڈرو نے میرے دوسرے گال پر وار کیا۔ پھر پہلے گال پہ۔ ہر ضرب کے ساتھ میرا سر جھٹکے کھاتا رہا۔

"یہ دیکھو۔" پیڈرو نے اس چمڑے کے ٹکڑے کو میرے سامنے لیا۔ "یہ تمھارا خون ہے۔"

میں نے کراہتے ہوئے چمڑے پر نظر آنے والے سرخ داغ کو دیکھا۔ یقیناً میرے چہرے کی کھال پھٹ گئی تھی۔

"چاٹو اسے۔" پیڈرو چلایا اور اس نے سول جیسے چمڑے کو میرے منہ پر رگڑ دیا۔ خون کا ایک قطرہ رخسار سے بہہ کر ٹھوڑی تک پہنچا اور نیچے ٹپک گیا۔

"اب بتاؤ۔ تم نے جھوٹ بولا تھا یا سچ؟" اس نے میرے بال پکڑ کے سر کو جھٹکا دیا۔

"کس کے بارے میں؟..." میں نے کہا۔

"مصرا نے تمھیں کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ سب تمھارے دماغ کی اختراع تھی۔"

"تمھیں... جھوٹ سچ کا پتا چل جائے گا..." میں نے کہا۔

"وہ جھوٹ تھا یا سچ؟" پیڈرو چلایا۔

"وہ سب سچ تھا۔" میں نے کہا۔

پیڈرو نے دوسری جیب میں سے ایک شیشی نکالی۔ اس میں ایک بے رنگ محلول تھا۔ یہ محلول اس نے میری آنکھوں پر ٹپکا دیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ تیزاب ہوگا لیکن وہ نمک کا پانی تھا۔ یہ پانی میرے رخساروں کی پھٹی ہوئی کھال تک پہنچا تو میرا چہرہ پھر آگ میں جلنے لگا۔

"بولو وہ جھوٹ تھا..."

"وہ... سچ تھا..." میں نے درد سے تڑپتے ہوئے کہا۔ مشکل یہ تھی کہ میں سر کو کرب میں ہلاتا تھا تو خود اپنی ہی گردن زخمی کرتا تھا۔

گل اب زار و قطار رو رہی تھی۔ اس نے ایک بار پیڈرو پر حملہ بھی کیا مگر پیڈرو نے ایک جھٹکے سے اسے پھر دور پھینک دیا۔ میرے بعد محسن کی باری آئی۔ اس کا چہرہ بھی لہولہان ہو گیا۔ مگر پیڈرو اس سے یہ تسلیم نہ کرا سکا کہ ہم نے مصرا کے بارے میں جو کہانی سنائی تھی، اس کی بنیاد جھوٹ پر تھی۔

بالآخر اسے یقین آ گیا کہ مصرا نے ہمارا ساتھ دیتے ہوئے بحری جہاز میں کہیں آتش گیر مادہ چھپایا تھا اور ہمیں مطلع کر دیا تھا چنانچہ ہم صرف بارود کو چنگاری دکھانے کے لیے پہنچے تھے۔ اگر پیڈرو کا یقین اس کے برعکس ہوتا تو اس کے لیے پریشانی کی کوئی بات نہ ہوتی۔ اب اسے احساس تھا کہ مصرا تو مر گیا لیکن معلوم نہیں جہاز پر اس کے علاوہ کون ہمارا ساتھی ہے۔ وقت کم تھا اور وہ اتنے بڑے بحری جہاز کی تلاشی نہیں لے سکتا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ جہاز

کو تباہ کرنے کا سامان کیا ہے۔ ویسے تو خود اسلحے سے لدا ہوا جہاز ایک چلتا پھرتا بم تھا لیکن اس میں دھماکا کرنے کے لیے ٹائم بم رکھا گیا ہوگا۔ ڈائنامائیٹ لگایا گیا ہوگا یا آگ لگانے کا بندوبست کیا گیا ہوگا۔ یہ مصر اجانتا تھا یا پیڈرو کے یقین کے مطابق ہم جانتے تھے۔

وہ سمجھتا تھا کہ ہم موت سے ڈرنے والوں میں نہیں ہیں اور روزِ اوّل سے سربکف جان ہتھیلی پر لیے کفن بردوش پھرتے ہیں۔ وہ اپنی جان بچانے کے لیے لائف بوٹ میں فرار ہو سکتا تھا مگر اس کا مسئلہ جہاز پر لدے ہوئے اسباب کو بچانے کا تھا جو اس کے بیان کے مطابق کروڑوں کا تھا۔ ظاہر ہے اس مال کی قیمت دلاور اینڈ کمپنی وصول کر چکی تھی اور اب یہ ان کی ذمے داری تھی کہ مال خریدار تک پہنچے۔ جہاز غرق ہو جانے کی صورت میں دلاور اینڈ کمپنی کو نقصانات کی تلافی کرنی پڑتی اور ان کی "ساکھ" بھی متاثر ہوتی۔ اس جہاز پر پیڈرو مال سپلائی کرنے والوں کا نمائندہ تھا اور ہم نے اس کے لیے بہت بڑی پریشانی پیدا کر دی تھی۔

"دیکھو سکندر،" اس نے کچھ دیر تک کمرے میں چکر لگانے کے بعد کہا۔ "میں بہت برا آدمی ہوں۔"

"آدمی کا نام بدنام مت کرو۔ کہو کہ میں بدترین شیطان ہوں۔" میں نے کہا۔

"میں تم کو پانچ منٹ دوں گا۔" اس نے کہا۔ "اگر تم میرے ساتھ تعاون کرو گے تو میں تم کو بحفاظت نکل جانے کا موقع دوں گا۔ تم صرف یہ بتا دو کہ جہاز کو تباہ کرنے کے لیے مصرا نے کچھ رکھا ہے تو کہاں رکھا ہے۔"

"یہاں سے ہم بحفاظت کیسے جائیں گے؟" میں نے کہا۔ "اس کا طریقہ بھی مجھے سمجھا دو۔ کوئی ہیلی کاپٹر لے جائے گا ہمیں یا اقوام متحدہ کی امن فوج آئے گی؟"

"ایک بار اعتبار کر کے دیکھو مجھ پر..."

"یعنی ایک بار بے وقوفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مر کے دیکھوں۔ پہلے تم کو بتا دوں کہ ٹائم بم...؟"

"سکندر!" محسن نے چلا کے مجھے یوں ٹوکا جیسے میں نے غلطی سے ٹائم بم کا حوالہ دے کر راز کو راز نہیں رہنے دیا تھا۔

میں نے شرمندگی سے اس کی طرف دیکھا۔ "سوری یار۔"

"کیا ضرورت ہے کوئی جواب دینے کی۔" محسن نے برہمی سے کہا۔ "اس کتے کو بھونکنے دے۔ اب مرنا ہے تو ایک بار ہی مریں گے سب کے ساتھ۔"

"تو ٹائم بم نصب کیا گیا ہے۔" پیڈرو نے کچھ دیر بعد خود کلامی کے انداز میں کہا۔

"ہاں، اتنا تو تمھیں معلوم ہو ہی گیا۔ باقی تم خود معلوم کر لو۔" میں نے کہا۔ "مجھ سے کوئی توقع مت رکھو اعتبار کی۔ مجھے معلوم ہے کہ تمھارا اور میرا صرف دشمنی کا رشتہ ہے۔"

"سکندر! میں رابعہ کی عزت و آبرو کے بخیے ادھیڑ دوں گا۔ تمھارے سامنے اس کی کھال کھینچ لوں گا۔ میرے پاس جانور ہیں اور انسان ہیں جو جانوروں سے بدتر ہیں۔ وہ رابعہ کا گوشت پوست سب نوچ کھائیں گے۔ کیوں تم آسان طریقے سے جان بچانے کے بجائے مشکل طریقے سے مرنا چاہتے ہو۔ تم نہیں جانتے میں کیا کر سکتا ہوں۔ نہ تم دیکھ سکو گے نہ برداشت کر سکو گے۔ مجھے بتاؤ تم کیا چاہتے ہو۔"

"جو میں چاہتا ہوں وہ اپنے وقت پر خود ہی ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔

"اس سے تمھیں کچھ نہیں ملے گا۔" وہ چیخ کر بولا۔

"مجھے شہادت نصیب ہوگی۔ جو خسارے کا سودا نہیں میرے لیے۔ ہاں تم بہت گھاٹے میں رہو گے۔" میں نے کہا۔

پیڈرو کے ضبط کا حوصلہ ختم ہو رہا تھا اور اس پر دیوانگی طاری ہونے لگی تھی۔ اس کی آنکھیں وحشی کبوتر کی طرح سرخ ہو رہی تھیں اور وہ سانس لیتے ہوئے کسی خوں آشام درندے کی طرح پھنکار رہا تھا۔

"دیکھو، ایک آخری تجویز ہے میری۔" وہ میرے سامنے آ کے بولا۔ "فرض کرو میں تمھیں، محسن کو اور رابعہ کو ایک لائف بوٹ میں کہیں بھجوا دوں۔ میں خود تمھیں اس جہاز سے دور لے جاؤں اور تم کو کسی دوسرے جہاز پر کسی لانچ پر چھوڑ دوں تو تم مجھے بتا دو گے کہ وہ ٹائم بم کہاں اور کس وقت پھٹے گا؟"

"اور جب میں تم کو یہ بات بتا دوں گا تو تم مجھے گولی مار کے لوٹ آؤ گے؟"

"نہیں نہیں، کسی کے پاس اسلحہ نہیں ہوگا۔ میں تمھیں یقین دلاتا ہوں۔" پیڈرو نے کہا۔ "تم میری تلاشی لے لینا۔"

"پھر تم واپس کیسے آؤ گے؟" میں نے اس کی گھبراہٹ اور بدحواسی پر دل ہی دل میں لطف لیتے ہوئے کہا۔

"میں... میں ایک اور لائف بوٹ میں...... یہ ٹھیک ہے۔ فرض کرو ہم ایک لائف بوٹ میں جاتے ہیں... آدھے گھنٹے بعد دوسری لائف بوٹ لے کر کوئی اور اسی سمت میں آ جاتا ہے اور ایک گھنٹے بعد مجھے واپس لے آتا ہے۔ ایک گھنٹے میں تم کافی دور نکل جاؤ گے۔ تمھارے لیے کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔"

"تم پاگل ہو گئے ہو پیڈرو۔ تمھارے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو گئی ہے۔" میں نے کہا۔ "خطرہ مجھے نہیں تم کو درپیش ہے۔ فرض کرو میں نے تم کو غلط بتا دیا۔ واپس آ کے تم کو ٹائم بم وہاں نہ ملا پھر؟ اس کے علاوہ جب تم خالی ہاتھ میرے ساتھ جاؤ گے تو تمھاری واپسی ہوگی ہی نہیں۔ میں تمھاری گردن توڑ کے تمھیں ٹھنڈا کر دوں گا۔"

پیڈرو کا دماغ الٹ گیا۔ اس نے مجھے ایک سے ایک گندی گالی دی اور میرے منہ پر تابڑ توڑ مکے مارے۔ گل نے ایک بار پھر اس کا ہاتھ تھامنے کی بے سود کوشش کی مگر ایک بپھرے ہوئے وحشی درندے کی قوت کے سامنے وہ کیسے ٹھہر سکتی تھی۔ پیڈرو نے اس کے کپڑے تار تار کر دیے۔ اسے بالوں سے پکڑ کے گھسیٹا اور اس کا سر کئی بار دیوار پر مارا۔ ایک طرف پیڈرو کی دیوانگی تھی، دوسری جانب گل کا صبر۔ بالآخر گل فرش پر پڑی رہ گئی۔ پیڈرو اسے ٹھوکر مار کے باہر نکل گیا۔

"گل!" میں نے بمشکل تمام کہا۔ خون میرے ہونٹوں سے رس رہا تھا اور میری ناک سے ٹپک رہا تھا اور اس کا ذائقہ مجھے اپنی زبان پر محسوس ہوتا تھا۔ "میری طرف دیکھو گل۔"

"رابعہ ہے میرا نام۔" گل نے سر اٹھا کے کہا۔

"ایسا مت کرو گل۔ مجھ پر پہلے ہی بہت سے لوگوں کے قرض کا بار ہے۔ اپنی جان بچاؤ۔ ان سے کہہ دو کہ تم... ہمارے ساتھ نہیں ہو۔ ہم تمھیں دھوکے سے لے آئے تھے... کچھ بھی کہہ دو۔"

"تم رابعہ سے یہ توقع رکھتے ہو۔ کیا رابعہ ایسا کر سکتی تھی؟ تو اس سے یہ سب کہہ سکتے تھے؟" وہ روتے روتے بولی۔ "پھر میری تذلیل کیوں کرتے ہو؟ تم نے ناگ منی کو گل بانو اپنی مرضی سے بنا دیا۔ کیا میں اپنی مرضی سے رابعہ بھی نہیں بن سکتی۔"

دروازہ پھر کھلا اور اس بار پیڈرو کے ساتھ دو حکم کے غلام بھی اندر آ گئے۔ انھیں پہلے سے معلوم تھا کہ ان کا یہاں کیا کام ہے۔ کچھ کہے سنے اور انتظار کیے بغیر انھوں نے گل کو پکڑ لیا۔ وہ تنومند کرخت نقوش والے اجڈ لوگ تھے۔ ان کے سامنے گل کی ساری مزاحمت بے کار گئی۔۔۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ ذہنی و جسمانی اذیت کا ہر لمحہ تاریک ہو گیا۔ اس اندھیرے میں جب آنکھیں کچھ دیکھنے سے قاصر تھیں میرے تصور نے مجھے جھنجھوڑنا شروع کیا۔

میں نے گھبرا کے آنکھیں کھول دیں۔ گل کے ہاتھ اس کی کمر کے پیچھے باندھ دیے گئے تھے اور رسی کا ایک ٹکڑا اس کے پیروں پر لپٹا ہوا تھا۔ وہ گٹھڑی سی بنی فرش پر اکیلی پڑی ہوئی تھی۔ پھر انھی دو حکم کے غلاموں میں سے ایک اندر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ڈول سا تھا۔ اس ڈول میں ہاتھ ڈال کے اس نے کوئی لیس دار چیز نکالی اور گل کے جسم پر ملنے لگا۔ میری ناک سونگھنے کے قابل نہیں رہی تھی پھر بھی میں نے لہو کی بو کے ساتھ میں نے شہد کی خوشبو کو محسوس کر لیا۔

اس کے جسم پر شہد ملنے والے کے جذبات برانگیختہ تھے اور وہ بے خودی میں حد سے گزرنے لگا تھا کہ پیڈرو پھر آ گیا۔ اس کے ساتھ دوسرے شخص نے لکڑی کا ایک ڈبا اٹھا رکھا تھا۔ پہلا شخص فوراً وہاں سے نکل گیا۔ جاتے جاتے اس نے ایک پُرہوس، پُرحسرت نظر سے گل کو دیکھا جس کے شباب کی تازگی میں شہد کی چاشنی بھی شامل ہو گئی تھی اور وہ گیا تو اپنے ہونٹ چاٹ رہا تھا۔

پیڈرو کے اشارے پر دوسرا شخص وہ ڈبا زمین پر رکھ کر رخصت ہو گیا۔ گل کی پھٹی پھٹی نظریں اس بند ڈبے پر جم کر رہ گئی تھیں۔ یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ اس ڈبے میں کیا ہوگا۔ پیڈرو نے ڈھکن کھولا اور ڈبے کو الٹ دیا۔

بڑے بڑے لال چیونٹوں کا ایک خونی لشکر شہد کی خوشبو پر گل کے جسم کی طرف لپکا۔ پہلے چیونٹے نے اس کے بدن پر اپنے پُرخار پنجے گاڑے تو گل نے چیخ ماری اور کروٹ لے کر پلٹ گئی۔ لیکن اتنی دیر میں کچھ اور چیونٹے آگے بڑھ گئے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے شفاف مرمریں بدن کی جلد پر لال چیونٹے بدنما داغوں کی طرح نظر آنے لگے۔ گل ان سے بچنے کے لیے کروٹیں لیتی ہوئی بھاگ رہی تھی مگر اس کمرے کی دیواروں کے درمیان جگہ کہاں تھی۔ پھر وہ لال رنگ کے چیونٹے اتنی تیزی سے حملہ آور ہو رہے تھے کہ اگر گل کے ہاتھ پاؤں کھلے ہوتے تب بھی وہ ان کی یلغار سے محفوظ نہیں رہ سکتی تھی۔

چیونٹے اب شہد چاٹ رہے تھے اور گل کے جسم کو کاٹ رہے تھے۔ گل کی دلخراش چیخوں کے ساتھ استاد پیڈرو کے فحش اور پُرخباثت حیوانی قہقہے گونج رہے تھے اور میں اذیت سے سر پٹخ رہا تھا۔ گالیاں بک رہا تھا اور دھمکیاں دے رہا تھا جو میرے پاگل پن کے سوا کچھ نہ تھا۔ یہی محسن کر رہا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ایسی دیوانگی کے مظاہرے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔

"بتاؤ سکندرِ اعظم۔ ابھی وقت ہے۔" پیڈرو نے میرے پاس آ کے میرے بال کھینچ کر کئی جھٹکے دیے۔ "نہیں بولو گے تو رابعہ کی صرف ہڈیاں رہ جائیں گی۔ یہ گوشت خور چیونٹے ہیں۔

یہ جسم پر سے ایک ایک ریشہ چُن لیتے ہیں۔"

"سکندر!" گل نے چلّا کے کہا۔ "خدا کے لیے۔"

"پیڈرو! میں بتاؤں گا۔" میں نے محسوس کیا کہ گل کی پکار میرے دل میں انگارے کی طرح اتر گئی ہے۔

"نہیں نہیں۔ تم کو رابعہ کی قسم۔" گل نے چلّا کے کہا۔ "تم کچھ نہیں بتاؤ گے۔ تم کو اس محبت کی قسم جو تمھیں رابعہ سے ہے، تم ہار نہیں مانو گے۔۔۔"

میرا لہو رگوں میں سرد پڑنے لگا۔ منجمد ہونے لگا۔ گل نے مجھے وہ قسم دے دی تھی جسے میں نہیں توڑ سکتا تھا۔ اور یہ قسم بھی اس نے اتنی ہوشیاری سے دی تھی کہ پیڈرو کو کچھ معلوم نہ ہوا۔ وہ یہی سمجھتا رہا کہ مجھے خود رابعہ نے اپنی قسم دی ہے۔

گل اب ہر طرف لوٹ رہی تھی۔ وہ پیروں پر کھڑا ہونے کی کوشش کرتی تھی اور گر جاتی تھی۔ کچھ چیونٹے اس کے جسم کے نیچے دب جاتے تھے۔ باقی پھر اس سے چمٹ جاتے تھے۔ اس کا سارا بدن لال چیونٹوں سے بھر گیا تھا۔ وہ سب اسے کاٹ رہے تھے اور وہ بُری طرح چیخ رہی تھی۔ اس کی اذیت میرے لیے ناقابلِ برداشت ہو چکی تھی۔

اچانک میں نے اپنے پیچھے کچھ آوازیں سنیں۔ کسی کے ہاتھ میرے جسم کو ٹٹول رہے تھے۔

"اچھی طرح دیکھ جارلی۔" کسی نے کہا۔ "ان کے پاس بھی وہ بیلٹ ہوگی جس میں پاسپورٹ تھا اور پیسہ تھا۔"

"دیکھ تو رہا ہوں۔" جارلی نے کہا اور اس آواز کو سنتے ہی میری ساری اذیت دُور ہو گئی اور میری تمام مایوسی ختم ہو گئی۔ یہ غالب کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ زندہ تھا اور آزاد تھا اور میرے اتنے قریب آنے کے بعد یہ ناممکن تھا کہ وہ کچھ نہ کرے۔

"ایسے مت دیکھ، ان کے کپڑے اُتار لے۔ چل ہٹ۔ میں اُتارتا ہوں کپڑے۔ تو سالا شرماتا ہے چھوکریوں کی طرح۔" دوسرے شخص نے کہا اور چند منٹ میں میری پتلون کھینچ لی گئی۔ میرے پیروں کو ایک جھٹکا لگا۔ "دیکھا تو نے؟" وہ خوش ہو کے بولا۔ "یہ رہی بیلٹ، اب اس کو دیکھ۔" پھر بولنے والے کی آواز ایک دم بند ہو گئی۔ میں نے ایک ایسی آواز سنی جیسے کوئی کھڑے کھڑے گر گیا ہو۔

"سکندر!" غالب نے آہستہ سے کہا۔ "بس تھوڑی سی دیر اور۔۔۔ حوصلہ مت ہارنا۔"

میرا وجود جو مایوسی کے گھُپ اندھیرے میں معلق تھا، یکلخت سکون اور اُمید دینے والے اُجالے میں اُتر گیا۔

فرطِ جذبات سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میرا خدا مجھے آزمائش کی گھڑی میں تنہا نہیں چھوڑتا اور میرا حوصلہ بحال کر دیتا ہے۔ میں نے شکر گزاری کے جذبات سے مغلوب ہو کے سوچا۔ غالب کی آواز تمام رات بے سمت صحرا میں بھٹکنے والے کے لیے صبح کے اجالے کی نوید کے ساتھ سنائی دینے والی آوازِ اذاں سے کم نہ تھی۔

محسن نے سر گھما کے میری طرف دیکھا اور اذیت کی شدت کے باوجود ہم نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے وہ سب کہہ دیا جو الفاظ کا محتاج نہ تھا۔ گل اب بے ہوش ہو چکی تھی۔ اس کا جسم ایک حد تک ہی مزاحمت کر سکتا تھا اور تکلیف برداشت کر سکتا تھا۔ احساس کے فنا ہو جانے کے بعد وہ دُکھ درد سے بے نیاز تھی۔ بے حس و حرکت پڑی تھی اور وہ آدم خور خونی چیونٹے جو اس کے جسم سے گوشت کا ذرہ ذرہ نوچ کھانے کے لیے اپنے تیز دھار والے دانتوں کا بھرپور استعمال کر رہے تھے اب بھی اپنے کام میں مصروف تھے۔

آہستہ آہستہ چیونٹوں کی بھیڑ چھٹنے لگی تھی۔ کچھ چیونٹے شکم سیر ہو کے الگ ہوئے، پھر کچھ اور چیونٹے نیچے اُتر گئے۔

کسی کے ہاتھ نے میرا جھومتا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ "یہ پکڑ اور سنبھال کے رکھ۔ اسے ریوالور کہتے ہیں۔" غالب نے لکڑی کی دیوار کے پیچھے سے سرگوشی کی۔ اس کے لبوں اور میرے کانوں کے درمیان ایک ڈیڑھ انچ موٹے تختے کی دیوار حائل تھی، چنانچہ میں اس کی سرگوشی کو نہیں سُن سکتا تھا لیکن اس کی صورت کا صرف تصور ممکن تھا۔ ریوالور کو میں نے سینے کے ساتھ لگا لیا اور اس طاقت کے ساتھ میرے وجود میں پھر وطن دشمنوں کے خلاف نفرت اور عداوت کا آتش فشاں بھڑک اُٹھا۔

میری نظروں نے گل کو دیکھا۔ اس مقدس جنگ میں آج تک ہمارے ساتھ لڑنے والوں کا شوقِ شہادت اور جذبۂ سرفروشی ہمیشہ قابلِ رشک رہا تھا کہ جان بیچنے کو آئے تو بے دام بیچ دی۔ گل اس رزم گاہ میں نووارد تھی مگر اس نے بھی رابعہ کی طرح ثابت کیا تھا کہ اس کا عزم ناقابلِ شکست ہے اور شکاری اس کے جسم کو شکار کر سکتے ہیں مگر اس کے یقین اور اس کے ایمان کو نہیں مار سکتے۔

چیونٹے اب اس کے جسم پر سے اُتر گئے تھے۔ ان کے پیٹ گل کا خون پی کے اور اس کے نازک بدن کا گوشت کھا کے بھر گئے تھے۔ اب وہ اپنے خونی پنجے جھاڑ رہے

تھے اور اپنے لبوں پر دکھائی نہ دینے والے لہو کو چاٹ رہے تھے۔ گل کا جسم خون رنگ ہو گیا تھا۔ اس کا اپنا خون اس کے بدن پر ایسے پھیلا ہوا تھا جیسے کسی نے گہرے شوخ لال رنگ کے برش سے اسے پینٹ کیا ہو۔

اس تمام کارروائی سے بے خبر جو درمیان کی دیوار کے پیچھے جاری تھی، استاد پیڈرو ایک فاتحانہ شان کے ساتھ اپنے ہاتھ کمر کے پیچھے باندھے کھڑا تھا اور میری طرف دیکھ کے مسکرا رہا تھا۔

"پیڈرو! خدا کے لیے رابعہ کو بخش دو۔" میں نے بے حد مظلوم بن کے اور شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ "اس کی جگہ مجھے۔"

"تمھاری باری بھی آئے گی۔ آئے گی کیوں نہیں۔" وہ بولا۔

محسن نے چلّا کے کہا۔ "باری تیری بھی آئے گی۔۔۔" اس نے پیڈرو کو فحش ترین گالیوں سے نوازنا شروع کیا جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اس کی قوتِ برداشت جواب دینے لگی ہے اور گل کی اذیت کے احساس نے اسے پاگل کر دیا ہے۔

پیڈرو میرے سامنے آ گیا۔ "وقت کم ہے سکندر، تم کیوں ضد پر اڑے ہوئے ہو۔ پہلے تم صلح کی بات کر رہے تھے، اب میں تم کو دوسرا موقع دے رہا ہوں کہ اس بازی کو برابر سمجھو۔ تم جیسے چاہو، مجھے بتا دو کہ وہ بم کہاں ہے۔۔۔ کسی بھی طرح مجھ سے یہ ضمانت لے لو کہ میں تم کو نکل جانے کا موقع دوں گا۔ اس بار نہ کوئی جیتا نہ کوئی ہارا۔ زندگی رہی تو پھر ملیں گے۔ مگر یہ تب ہی ممکن ہے جب تم زندگی کے مواقع ضائع نہ کرو۔ آخری فتح یا آخری شکست سے پہلے ہی خودکشی کیوں کرتے ہو۔"

اس کے اندازِ گفتگو میں نمایاں تبدیلی آئی تھی۔ اب وہ سختی سے نہیں دوستانہ عاجزی سے کام لے رہا تھا۔ مجھے دلائل سے قائل کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ میں اسے باتوں میں اُلجھانا اور جھوٹ کے جال میں گرفتار رکھنا چاہتا تھا لیکن میرے ذہن میں ایسی کوئی ترکیب نہیں آ رہی تھی جس سے میں اپنے لیے آزادی اور تحفظ کو یقینی بنا سکوں۔ میرے مقابل کوئی عام آدمی نہیں پیڈرو تھا جو اُستاد کہلاتا تھا۔ اسے بے وقوف بنانا آسان نہ تھا۔

"میں تم کو ایک موقع اور دوں گا۔"

"ایک اور موقع۔۔۔؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔

"ہاں۔ ابھی تو پہلا راؤنڈ ختم ہوا ہے۔" وہ بولا۔ "یہ بہت تھوڑے سے چیونٹے تھے اور ان کا پیٹ بھی شہد سے ہی بھر گیا تھا۔ خون اور گوشت کو ان چیونٹوں نے صرف چکھا ہے۔"

"مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ رابعہ مر چکی ہے۔" میں نے کہا۔

"نہیں۔ زخم بہت معمولی ہیں۔ خون زیادہ پھیل گیا ہے اس لیے تم کو ایسا محسوس ہوتا ہے۔" پیڈرو نے کہا۔ "اگر تم تعاون کی بات کرو تو میں نرس کو اور ڈاکٹر کو بلوا سکتا ہوں۔ وہ اس کے زخم صاف کر دیں گے۔ جسم پر دوا مل دیں گے اور آدھے گھنٹے یا ایک گھنٹے میں رابعہ تم سے بات کر سکے گی۔ بے شک زخم فوراً مندمل نہیں ہوں گے لیکن چند دن کے علاج سے سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

اس کی بات میں اُمید کے دو پہلو تھے۔ ایک یہ کہ گل کے بدن پر کھلے ہوئے زخموں کے لالہ زار کا نظارہ کتنا ہی روح فرسا کیوں نہ ہو اس کی حالت تشویش ناک نہیں، دوسرے یہ کہ میرے اقرار کی صورت میں نرس کے روپ میں نازو ہی ڈاکٹر کے ساتھ آئے گی۔ لیکن پیڈرو کو میں کیا بتاؤں کہ بم کہاں ہے جب کہ بم کہیں بھی نہیں ہے۔ جب تک اسے ٹائم بم نہیں ملے گا وہ ہمیں کوئی رعایت نہیں دے گا۔ اگر ٹائم بم کہیں ہوتا اور میں اسے صحیح جگہ لے جاتا تو پھر اسے رعایت دینے کی ضرورت ہی نہ رہتی۔ وہ کوئی بااصول اور وعدے پر قائم رہنے والا آدمی ہوتا تو استاد پیڈرو ہی کیوں کہلاتا۔

"جلدی بولو۔ کیا سوچا ہے تم نے؟ ورنہ۔۔۔" اس نے دھمکی کو نامکمل چھوڑ دیا۔

"ورنہ تم رابعہ کو مار ڈالو گے۔" میں نے کہا۔ "مار ڈالو۔ تاکہ اس کی جان اس عذاب سے ہمیشہ کے لیے چھوٹ جائے۔"

"ایسے نہیں سکندرِ اعظم۔ رابعہ اور تم ایک ساتھ مرو گے مگر بہت زیادہ دُکھ اُٹھا کے۔" پیڈرو مشتعل ہو کے بولا۔ "ابھی بہت دم خم ہے تم میں۔ اگلا راؤنڈ رابعہ دیکھے گی۔ جب یہی چیونٹے تمھارے جسم کو چاٹیں گے اور وہ بھی اتنی ہی بے بس ہو گی جتنے تم ہو۔ میرے پاس دوسرے راؤنڈ کے لیے چیونٹوں کی دوسری فوج ہے۔"

"میں اس کے لیے تیار ہوں۔۔۔" میں نے اسے چیخ کر ایک گالی دی۔

دراصل میں فوری طور پر اس عذاب سے نجات چاہتا تھا جس میں میرے ساتھ محسن بھی گرفتار تھا۔ میرا اوپر کا دھڑ تقریباً مفلوج ہو چکا تھا۔ میری گردن درد سے اکڑ گئی تھی اور تختے کے کھُردرے کناروں نے میری گردن کی کھال کو اُدھیڑ دیا تھا۔ گردن سے نیچے میری ریڑھ کی ہڈی اب میرے جسم کا بوجھ اُٹھانے کے قابل نہ رہی تھی اور میرے پیروں کی طاقت جواب دے چکی تھی۔ چنانچہ میں بار بار نیچے پھسلنے لگا تھا۔ ہر بار جھٹکا میری گردن میں آتا تھا اور میری ٹھوڑی سوراخ

سے ٹکراتی تھی تو میں پھر ٹانگوں کو گھسیٹ کر آگے لاتا تھا اور رکوع کی حالت میں توازن برقرار رکھنے کی کوشش میں مصروف ہو جاتا تھا۔

آہستہ آہستہ میرے لیے اس حالت میں قید رہنا ناممکن ہوتا جا رہا تھا۔ میرے ہاتھ میری کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے۔ جب تک میرے ہاتھ میں ریوالور نہیں تھا، میں ان ہاتھوں کو دیوار پر پھیلا سکتا تھا لیکن دیوار پر سہارے کے لیے کوئی چیز نہ تھی۔ میرے ہاتھ سپاٹ دیوار پر سے پھسل جاتے تھے۔ اب میں نے ہاتھوں میں ریوالور دبوچ رکھا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ بے ہوش ہونے سے پہلے میں اس کی طاقت کو آزما لوں۔ یہ نہ ہو کہ غالب کچھ کرنے سے پہلے ہی ریوالور استعمال کرنے کے قابل نہ رہوں۔

پیڈرو نے دوسرے راؤنڈ میں میرے جسم کی قوتِ برداشت آزمانے کا ذکر کر دیا تو میرے لیے اسے مشتعل کرنا ضروری ہو گیا تاکہ وہ مجھے اس شکنجے سے نکالے اور اس دوران میں غالب یا نازو کا پلان بھی میرے سامنے آ جائے تو ہم سب مل کے کچھ کرنے کی پوزیشن میں ہوں۔ غالب کا کچھ پتا نہ تھا کہ کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے؟

پیڈرو نے دروازہ کھول کے چلاّنا شروع کیا۔ ”نرس! الو کی پٹھی۔ تو یہاں کھڑی کیا کر رہی ہے؟“ اس نے نازو کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا۔ وہ ایک جھٹکے سے اندر آ گری۔

”وہ ... آپ نے ہی کہا تھا کہ... تیار رہنا۔“ نازو نے خوف کی بہترین اداکاری کا مظاہرہ کیا۔

”اور وہ کہاں ہے، تیرا خصم۔ چارلی؟“

”مجھے... نہیں معلوم سر۔“ نازو کانپتے ہوئے بولی۔

”چل جا اس.... ڈاکٹر بھنڈاری کو بلا کے لا اور دیکھ، اس عورت کو آدھے گھنٹے کے اندر اندر ٹھیک ہو جانا چاہیے۔“ پیڈرو نے کہا۔

نازو نے سخت دہشت کے عالم میں ان چیونٹوں کو جھاڑ دیا جو اس کے کپڑوں پر چڑھ گئے تھے اور اب پورے کیبن میں پھیر رہے تھے۔ اس نے فرش پر لہولہان پڑی ہوئی گل کی طرف دوسری بار دیکھنے کی جرأت نہیں کی اور دروازے کی طرف بڑھی۔ مجھے تعجب بھی ہوا اور غصہ بھی آیا کہ اتنی مہلت ملنے کے باوجود نازو بجلی بن کے اُستاد پیڈرو پر نہیں گری۔ ابھی تک وہ ایک بزدل اور بے وقوف نرس کے کردار کو مناسب موقع کے انتظار میں نبھا رہی تھی اور شاید وہ مناسب وقت ابھی نہیں آیا تھا جس کا اسے بھی غالب سے زیادہ انتظار تھا۔

”بات سن۔“ پیڈرو نے اُسے دروازے میں روک لیا۔ ”... ان چیونٹوں کو پھر جھٹک کے پھیل دیا جو اس کے جوتوں پر چڑھ گئے تھے۔“ چارلی کو بولنا کہ اسپرے گن لائے اور ان سب کو صاف کر دے۔“

”جی... جی سر۔“ نازو نے کیبن کے فرش پر پھیلنے والے اور دیواروں پر چڑھنے والے چیونٹوں پر نظر ڈالی۔ ایک سیکنڈ کے لیے اس کی اور میری نظر ملی۔ وہ ایک نگاہ جو بظاہر نگاہ سے کم تھی بہت کچھ کہہ گئی۔ میں نے اس کے لبوں کی بے نام مسکراہٹ میں اُمید کی روشن کرن کو دیکھا اور غیر ارادی طور پر مسکرانے لگا۔

پیڈرو نے مجھے دیکھا اور پھر پلٹ کے دیکھا تو نازو غائب ہو چکی تھی۔ ایک چیونٹا میرے قریب آیا اور میری گردن پر چڑھ گیا۔ اس کے پیچھے میری کھال کی خراشوں میں کانٹے کی طرح چبھنے لگے پھر دوسرا چیونٹا کان کی طرف سے آیا۔ اس نے میرے گال پر کاٹا۔ تکلیف اتنی نہیں تھی جتنی بڑی چیخ میں نے ماری۔ پیڈرو کے ہونٹوں پر ایک پُرلطف مسکراہٹ پھیل گئی۔

”کچھ اندازہ ہوا کہ رابعہ نے کتنی تکلیف برداشت کی ہو گی! یہ مانتا ہوں میں کہ وہ بہادر عورت ہے۔“ پیڈرو بولا۔ ”... ساتھ دیتی تو...“

”پھر وہ رابعہ نہ ہوتی۔“ میں نے کہا۔ ”رابعہ تو نام ہے ایک طاقت کا۔ محبت کی طاقت کا جس نے مجھے تمہارے مقابلے میں سکندرِ اعظم بنا دیا۔“

”ابھی کچھ دیر میں تم دیکھو گے کہ شکاری چیونٹوں کی فوج کے مقابلے میں سکندرِ اعظم کتنا کمزور اور ... ہے۔ یہ پورس کے ہاتھی نہیں معمولی چیونٹے ہیں جو بال آخر ... کو اور رابعہ کو ... جائیں گے۔ تمہارا خون گوشت سب چٹ کر جائیں گے ... آخری راؤنڈ ہو گا جب تم دونوں ایک ساتھ مرو گے۔ تمہارے لیے اس لشکر کا مقابلہ ناممکن ہو گا جس میں ہزاروں بھوکے چیونٹے شامل ...“

میں سمجھ گیا تھا کہ ان باتوں سے وہ صرف مجھے دہشت زدہ کر رہا ہے اور میرا حوصلہ توڑنا چاہتا ہے۔ میں نے اسے بولنے کا موقع دیا۔ شاید غالب اور نازو کو ابھی مزید مہلت درکار تھی۔

”تمھیں کیا معلوم پیڈرو کہ تمہارے پاس کتنا وقت ہے؟“ میں نے کہا۔ ”تیسرے راؤنڈ سے پہلے ہی جہاز کے پرخچے اُڑ سکتے ہیں۔“

”اُڑنے دو۔“ پیڈرو نے ظاہری بے پروائی کے ساتھ ...

”ہم ایک ساتھ ہی مریں گے۔ تمہارے مقابلے میں میرے بچ ... تھوڑا سا چانس ہے کہ میں بچ جاؤں کیوں کہ میں آزاد ہوں ...“

... شکنجے میں جکڑے ہوئے ڈوب جاؤ گے۔ ہاتھ پیر ہلائے بغیر ... امید رکھ سکتا ہوں کہ کسی تختے کا سہارا کیا، تنکے کا سہارا بھی ... جائے تو تیر کر نکل جاؤں...“

نازو کے اندر آنے سے اس کی بات ادھوری رہ گئی۔

نازو کے ساتھ دو افراد اسٹریچر لیے اندر آئے۔ ان میں سے ایک چارلی کے روپ میں غالب تھا، دوسرا ڈاکٹر بھنڈاری۔ ان دونوں نے گل کو اٹھا کے اسٹریچر پر ڈالا اور دروازے سے باہر لے گئے۔ پیڈرو اپنے ہاتھ میں ریوالور لیے ٹہل رہا تھا۔ نازو کی بے عملی اب مجھے مشتعل کرنے لگی تھی۔ میں جھنجلاہٹ اور مایوسی کا شکار ہو رہا تھا۔ کیوں کہ میرے لیے اپنی جسمانی اذیت سے نجات کے انحصار کا وقفہ طویل سے طویل تر ہوتا جا رہا تھا۔

محسن کی خاموشی ظاہر کرتی تھی کہ وہ اپنے ہوش و حواس برقرار رکھنے کی جدوجہد میں ناکام ہو گیا ہے۔ اب مجھے اس کی طرف سے بھی فکر لاحق ہو گئی کہ کہیں ہر قسم کے وزن کو برداشت کرنے والی گردن پر دباؤ اتنا نہ بڑھ جائے کہ سانس کی آمد و رفت رُک جائے۔

اچانک باہر سے کسی کی چیخ سنائی دی۔ پھر ایک فائر ہوا۔ پیڈرو جو پہلے ہی چونک پڑا تھا، ریوالور ہاتھ میں تھام کے دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے دروازے کو تھوڑا سا کھولا اور باہر جھانک کر دیکھا۔ باہر اب مکمل خاموشی تھی لیکن پیڈرو کی صورت پر تشویش کے آثار نمایاں تھے۔

”چارلی!“ پیڈرو نے چلاّ کے کہا۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے؟“

اس کی بات کا کسی نے جواب نہیں دیا۔ دوسری بار اس نے بھنڈاری کو پکارا۔ پھر وہ باہر نکل گیا۔ انتظار کا ایک طویل، اعصاب شکن وقفہ آیا جس میں میرے کان ہر آہٹ پر لگے رہے اور میرا دل بے قراری سے دھڑکتا رہا۔

بالآخر میں نے اپنے پیچھے آوازیں سنیں لیکن میری مایوسی کی انتہا نہ رہی جب میں نے پیڈرو کو حکم دیتے سنا۔ حکم کی تعمیل کرنے والوں نے مجھے اس شکنجے سے نکالنے کی کارروائی شروع کی۔ انھوں نے میری گردن کے اوپر فٹ آ جانے والے ایک تختے کو ہٹانے کے لیے وہ پیچ کھولے جن سے تختہ دیوار پر نصب تھا۔

میرے لیے نئی پریشانی اپنے ریوالور کو چھپانے کی تھی۔ ابھی تک پیڈرو نے کچھ بھی نہیں دیکھا تھا۔ میرے دونوں ہاتھ لٹکے تھے اور ایک ہاتھ سے میں نے ریوالور کو سینے سے لگا رکھا تھا۔ تختہ ہٹتے ہی میرا آزاد ہو کر پیڈرو کے روبرو ہونا اور میرے قبضے سے ریوالور کا برآمد ہونا لازمی تھا۔ مجھے فوری طور پر فیصلہ کرنا تھا کہ میں اس ریوالور کا بے دریغ استعمال کرتے ہوئے ان سب کو وہیں ٹھکانے لگا دوں جو مجھے اپنے سامنے نظر آئیں یا صبر سے کام لیتے ہوئے انتظار کروں۔ عین وقت پر مجھے ایک ترکیب سوجھ گئی۔

تختہ جیسے ہی میری گردن سے جدا ہوا میں نیچے گر گیا۔ یوں جیسے میں بے ہوش ہوں اور میرے جسم کی قوتِ برداشت پہلے ہی جواب دے گئی تھی۔ اس سے مجھے فائدہ ہوا۔

”اسے چھوڑ دو۔“ پیڈرو نے حکم دیا۔ ”اس دوسرے کو نکال لو پہلے۔ وہ بھی نہ مر جائے کہیں۔“

حکم کے غلام دوسری طرف چلے گئے۔ مجھے یقین تھا کہ اس وقت پیڈرو کی توجہ بھی محسن کی طرف ہو گی۔ کوئی حرکت کیے بغیر میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کو ہلایا جو میرے جسم کے وزن سے دب گئے تھے۔ آہستہ آہستہ ایک ہاتھ کو میں اپنے گریبان تک لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔ ریوالور کو میں نے قمیص کے اندر ڈال دیا۔ اس سے زیادہ میں کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔

پانچ دس منٹ بعد مجھے دو افراد نے بغلوں کے نیچے ہاتھ دے کر ایسے گھسیٹنا شروع کیا جیسے میں زندہ انسان نہیں ایک لاش ہوں۔ میرے پیر پھیلے ہوئے تھے اور فرش پر رگڑتے جا رہے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق وہ چار افراد تھے جو مجھے اور محسن کو لے جانے کے لیے آئے تھے۔ ان کی قیادت خود پیڈرو کر رہا تھا۔ ایک آنکھ کو تھوڑا سا کھول کر دیکھنے پر میرا خیال درست نکلا۔ ہم اب ایک تنگ راہداری سے گزر رہے تھے۔ سب سے آگے مجھے گھسیٹنے والے تھے، پھر محسن کو کھینچنے والے۔ پیڈرو ہاتھ میں ریوالور لیے سب کے پیچھے تھا۔ مگر انتہائی مستعد تھا۔

ریوالور کی موجودگی کا ابھی تک کسی کو علم نہیں ہو سکا تھا جو میرے سینے اور پیٹ کے درمیان قمیص کے نیچے پوشیدہ تھا۔ غالباً محسن کے پاس کچھ نہیں تھا۔ غالب اسے کیسے مسلح کر سکتا تھا جب کہ وہ ہوش میں ہی نہیں تھا۔

جب مجھے فرش پر ڈال دیا گیا تو ایک آنکھ کو تھوڑا سا کھول کر دیکھنے پر مجھے مقابل کی دیوار میں چھ انچ قطر کے دو سوراخ نظر آئے۔ ابھی کچھ دیر پہلے انہی دو سوراخوں میں سے میرے اور محسن کے سر باہر نکلے ہوئے تھے۔ شاید ہمیں نکالنے کے بعد دیوار کے پیچھے وہ تختے پھر نصب کر دیے گئے تھے جن میں ہماری گردنیں پھنسی ہوئی تھیں۔ یہ وہی عقوبت خانہ تھا جس میں کچھ دیر پہلے گل کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔

پہلے ہم تماشائی تھے مگر اب تماشا بننے والے تھے۔ شک کی کوئی بات نہ تھی کہ اب میرے ساتھ بھی وہ سب ہوگا جو گل کے ساتھ ہوا تھا۔ مجھے بے لباس کرکے میرے جسم پر بھی شہد ملا جائے گا پھر وہ بھوکے چیونٹے لائے جائیں گے اور گل کو لایا جائے گا کہ یہ سب دیکھے۔

اس خیال نے میرا دماغ الٹ دیا۔ میرے لیے ممکن ہی نہ رہا کہ میں صبر اور ضبط کا مظاہرہ کرتا رہوں اور کچھ نہ کرنے کی پاداش میں اس موقع سے بھی محروم ہو جاؤں جو غالب نے جان ہتھیلی پر رکھ کے مجھے فراہم کیا تھا۔ ان کا کیا پلان تھا؟ کوئی پلان تھا یا نہیں تھا۔ یہ میں کیسے جان سکتا تھا۔ ممکن ہے غالب اور نازو اس انتظار میں ہوں کہ ہم کچھ کریں۔ نازو جانتی تھی کہ خالی ہاتھوں سے بھی میں اپنا دفاع کرسکتا ہوں۔ کمی تھی تو اسلحے کی جو غالب نے فراہم کردیا تھا۔ پھر اب انتظار کیسا؟ خوف کیسا اور تذبذب کیوں۔

دو افراد پیڈرو کے حکم پر میرے کپڑے اُتارنے کے لیے مجھ پر جھکے ہی تھے کہ میں تڑپ کے اُٹھا۔ محاذ جنگ کا پورا نقشہ میرے ذہن میں تھا اور میں طے کر چکا تھا کہ میری حکمت عملی کیا ہوگی۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھل سکتے یا پیڈرو کچھ سمجھتا میں نے ایک کی گردن دبوچ کے جھٹکا دیا اور دوسرے کو تھوڑا سا گھوم کے لات ماری۔ وہ میرے اندازے کے عین مطابق سیدھا پیڈرو کی طرف گیا اور اس سے ٹکرا گیا۔

پہلے شخص کو میں نے بلا تاخیر اوپر اٹھایا اور اُن دونوں کی طرف اچھال دیا جو محسن پر جھکے ہوئے تھے۔ پہلا فائر پیڈرو نے کیا۔ وہ لڑکھڑا کر گرتے ہی سنبھل گیا تھا۔ اس کی گولی نے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ یہ گولی اس کے اوپر گرنے والے نے اپنے جسم پر روک لی۔ اس نے ایک دلخراش چیخ ماری اور ایک عجیب حرکت یہ کی کہ پیڈرو سے چمٹ گیا۔

محسن بدستور ساکت پڑا ہوا تھا۔ اس کو اندر لانے والے اس اچانک حملے سے بوکھلا گئے تھے۔ جب انھی کا ایک ساتھی اُڑتا ہوا آیا اور ان سے ٹکرایا تو ذرا سی دیر کے لیے وہ آپس میں اُلجھ گئے۔ جس شخص کو میں نے پھینکا تھا وہ گردن ٹوٹ جانے کے باعث پہلے ہی مر چکا تھا۔ باقی دو کے اُٹھنے سے پہلے ہی دروازہ ایک دھماکے سے کھلا اور نازو اندر آ گئی۔

پیڈرو نے پھر میرا نشانہ لیا تھا اور اگر نازو اسی وقت نازل نہ ہوتی تو میرے لیے خود کو پیڈرو کی چلائی ہوئی گولی سے بچانا ممکن نہ ہوتا۔ اس کے اور میرے درمیان چند فٹ کا فاصلہ تھا اور وہ ریوالور اُٹھا چکا تھا۔ میں نے ایک دم غوطہ مارا اور

اسی وقت پیڈرو کی توجہ دروازے کی طرف ہو گئی۔ میں نے فائر کی آواز تو سُنی لیکن مجھے یہ معلوم نہ ہوسکا کہ گولی کدھر گئی۔

محسن کے قریب کھڑے ہوئے دونوں حکم کے غلام مسلح نہیں تھے۔ پیڈرو نے ان سے ہتھیار لے لیے تھے۔ وہ اپنے ہاتھ میں ایک ریوالور کو کسی بھی غیر متوقع صورت حال کے لیے کافی سمجھتا تھا۔ ابھی تک کسی کو اندازہ نہ تھا کہ نرس کی یونیفارم میں انتہائی بے ضرر اور کمزور نظر آنے والی لڑکی درحقیقت ایک طوفانِ بلاخیز ہے اور فتنۂ محشر ہے۔

دو بے حد تندرست و توانا اور لمبے چوڑے مرد اپنے مقابل پاکے یقیناً محظوظ ہوئے ہوں گے۔ دل ہی دل میں ہنسے ہوں گے کہ واہ! بالشت بھر کی چھوکری سکرا کے کہتی تو ہم ایک اشارۂ ابرو پر سو بار جان دیتے مگر کیا لطیفہ ہے کہ وہ بیک وقت دو مردوں کو قوتِ بازو سے زیر کرنا چاہتی ہے۔

میں نے ان شہ زور مردوں کا خانہ خراب ہوتے نہیں دیکھا کیوں کہ میں پیڈرو کی طرف متوجہ تھا۔ پیڈرو کو اچانک احساس ہوا کہ وہ محصور ہوگیا ہے اور پلک جھپکتے میں بازی پلٹ گئی ہے۔ اس نے نرس کے بھیس میں نازو کو بھی شناخت کرلیا۔ اس کی وجہ بعد میں نازو نے بتائی کہ جہاز پر پہنچنے کے بعد وہ اور غالب آپس میں بھی بات کرتے تھے تو آواز بدل کے۔ رفتہ رفتہ یہ ان کی عادت ہوگئی تھی۔

اب اچانک نازو نے اپنی اصل آواز میں مجھ سے کہا۔ ”سکندر، تم استاد کو سنبھالو، شاگردوں سے میں نمٹ لوں گی۔“ اور اس کے ساتھ ہی نازو کے ہاتھوں کی نزاکت کے جوہر کھلے تو پیڈرو کی ساری خوش فہمی کافور ہو گئی۔ اس نے بچ کر فرار ہونے کے لیے دروازے کی جانب جست لگائی۔ اگر میں چاہتا تو بہ آسانی اسے شوٹ کرسکتا تھا کیوں کہ اتنی دیر میں مجھے قمیص کے اندر سے ریوالور نکالنے کی مہلت مل گئی تھی لیکن میں اسے زندہ گرفتار کرنا چاہتا تھا۔ میری اس خواہش کو نازو نے یوں پورا کیا کہ اچانک اسے ٹانگ اڑا کے فرش پر چت کردیا۔

میں نے اُلٹے پڑے ہوئے پیڈرو کی پشت پر اپنا ایک پیر رکھ دیا۔ اس نے کروٹ بدل کے میرا پاؤں کھینچنے کی کوشش کی۔ میں نے ایک جھٹکے سے اپنا پیر چھڑایا اور اس کے منہ پر ٹھوکر ماری۔ اس کا سر فرش پر لگا اور ٹھوکر سے اس کے سامنے والے دانت ٹوٹ گئے۔ اس نے پھر اُٹھنا چاہا اور میں نے اس کی پسلیوں میں اور اس کی کمر میں مسلسل ٹھوکریں ماریں۔ یوں جیسے وہ کوئی فٹ بال ہو۔ وہ فٹ بال کی طرح لڑھکتا ہوا کمرے کی دوسری دیوار تک گیا

اور بے سُدھ ہوگیا۔

اس کے اوپر بیٹھ کر میں نے اس کی جامہ تلاشی لی۔ جو ریوالور اس کے ہاتھ میں تھا وہ اب محسن کے قریب بے کار پڑا تھا۔ نقد رقم سے مجھے سروکار نہ تھا۔ ایک جیب سے سگریٹ اور لائیٹر برآمد کرکے مجھے خوشی ہوئی۔

میرے وزن کے نیچے پیڈرو بُری طرح ہانپ رہا تھا اور کراہ رہا تھا لیکن میں اس پر بڑی فراغت سے پیر پھیلا کے بیٹھ گیا۔ اپنی پشت دیوار سے لگا کے میں نے ایک سگریٹ جلائی۔ پیڈرو نے پھر اُٹھنے کی کوشش کی۔

میں نے اس کے سر پر مُکا مارا۔ ”دیکھتے نہیں، میں سگریٹ جلا رہا ہوں۔ آرام سے پڑے رہو۔“ میں نے کہا اور نازو کی دست بدست جنگ کا دلچسپ منظر دیکھنے لگا۔ نازو نے اپنے حریف طاقت ور مردوں کا سارا کس بل نکال دیا تھا اور وہ ادھ موئے ہو رہے تھے۔

”اٹھو بھئی... شاباش۔“ نازو نے ایک کا ہاتھ پکڑ کے جھٹکا دیا۔ ”یہ تو کوئی مقابلہ نہ ہوا۔“

اس نے ہاتھ گھما کے نازو کو مُکا مارنے کی کوشش کی۔ نازو نے اس کا ہاتھ کلائی پر سے پکڑ لیا اور اسے اپنے ہی زور میں پورا چکر دے کر چھوڑ دیا۔ وہ مدار سے نکلے ہوئے سیارے کی طرح گیا اور دیوار سے ٹکرا کے ڈھیر ہوگیا۔ اس کے ساتھی نے نازو پر پیچھے سے سوار ہونے کے لیے جست لگائی نازو نے آگے جُھک کر اسے فرش پر الٹ دیا۔ وہ پلٹ کے اُٹھا اور پاگل ہو جانے والے بیل کی طرح ٹکر مارنے کے لیے آگے بڑھا۔ نازو پہلے سے تیار تھی۔ اس نے بڑی آسانی سے ایک گھٹنا اوپر اٹھایا۔ ایک ہاتھ اس کی گردن پر ملا اور اسے تھوڑا سا اُچھال کے سیدھا گزار دیا۔ وہ بے قابو ہو جانے والے جہاز کی طرح دیوار سے ٹکرایا اور وہیں گر گیا۔

”ویری گڈ۔ نازو بی بی! ہم خوش ہوئے یہ دیکھ کر کہ تم آؤٹ آف پریکٹس نہیں ہو۔“ میں نے سگریٹ کا ایک کش لے کر کہا۔

نازو ہاتھ جھاڑ کے ہنسی۔ ”پریکٹس تو میں کرتی رہتی تھی۔“

”اور یہ مشق تم اسی بدبخت پر جاری ہوگی جو اچھا خاصا صحافی تھا؟“ میں نے آہ بھر کے کہا۔ ”ہم سے ملا تو صحافی نہ رہا۔ تم سے ملا تو آدمی نہ رہا۔ مجنوں ہوگیا۔ اب سُنا ہے کسی لنزا کا شوہر چارلی بنا ہوا ہے۔ یہ لنزا کون ہے؟“

”کمال ہے کہ تم اتنے سکون سے بیٹھے سگریٹ کے کش پہ کش لے رہے ہو، جیسے اور کچھ نہیں رہا کرنے کو۔“

”اور کیا کرنا ہے؟“ میں نے سوچ کے کہا۔

”بھئی یہ شیر دانی صاحب ہیں اور اپنے اُستا پیڈرو ہیں۔ کیا یہ ایسے ہی پڑے رہیں گے؟“ نازو نے انگلیوں سے اپنے بال سنوارے۔

”اور یہ خاموشی کیسی ہے؟“ میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ”تمھارا وہ خصم عزیز چارلی چیلن کہاں ہے مس لنزا؟“

”وہ پہرا دے رہا ہے اور انتظار کر رہا ہے...“

”کس کا...؟ اور کس بات کا؟“ میں نے کہا۔

”چار باغی اس کی تحویل میں ہیں۔“ نازو بولی۔ ”اور وہ ہمارا انتظار کر رہا ہے۔ جہاز کی کپتانی شاہد جمیل نے سنبھال لی ہے۔ صورتِ حال پوری طرح قابو میں ہے۔“

”یہ بتاؤ گل کیسی ہے؟“ میں نے کہا۔

”گل...؟“ نازو چونکی۔ ”اچھا... تو وہ گل ہے؟ یہ تازہ گل کھلایا ہے آپ نے۔ گل بہت اچھی ہے جناب۔“

میری نظر پیڈرو کی طرف گئی۔ ”بچ کے رہنا اس سے۔ وہ ناگ منی ہے۔ شیش ناگ کی بہن۔ اس کا کاٹا پانی نہیں مانگتا مثلاً اپنے اُستاد پیڈرو ابھی تک اسے رالبعہ سمجھ رہے تھے۔“

پیڈرو کے چہرے پر اس انکشاف کا دُکھ پشیمانی کا احساس بن گیا جیسے وہ رالبعہ سمجھا تھا وہ رالبعہ نہیں تھی۔

”پانی تو تم نے بھی نہیں مانگا ابھی تک؟“ نازو مسکرائی۔

”پانی کیا۔ اب چائے یا کافی پئیں گے لیکن ذرا اس کوڑے کو سمیٹ لیں۔“ میں نے کہا۔ ”تمھارے حکم کے غلام کتنے ہیں علاوہ غالب کے؟“

”شاہد جمیل کا وہ سب عملہ جس نے فروخت ہونے سے انکار کردیا تھا صرف تین افراد پر مشتمل ہے۔“ نازو نے کہا۔ ”چار افراد جن میں کپتان مصرا بھی شامل ہے، مارے گئے تھے۔ ڈاکٹر بھنڈاری کے علاوہ دو افراد ہیں جو ہمارے ساتھ ہیں۔“

”یہ ریوالور اُٹھا کے لے جاؤ۔“ میں نے کہا۔ ”اور ان دو کو بھی باغیوں کے ساتھ قید کردو۔ ان سے بعد میں نمٹ لیں گے۔ غالب کو میرے پاس بھیج دو اور ڈاکٹر بھنڈاری سے کہو کہ محسن کو ہوش میں لانے کی ترکیب کرے۔“

نازو نے محسن کے قریب پڑا ہوا ریوالور اُٹھا لیا پھر وہ میری طرف پلٹی۔ ”سکندر، ایک بات تو پوچھی ہی نہیں میں نے۔“

”یہ کہ اکرام شیخ کیسا ہے؟“ میں نے کہا۔ ”اچھی بہن ہو۔“ نازو کچھ شرمندہ سی نظر آنے لگی۔

”کیا بھیا یاد کرتے ہیں مجھے؟“

”مجھے نہیں معلوم کہ ایک بھائی کے جذبات کیا ہوتے ہیں مگر میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ رشتوں کی راہ میں فاصلے حائل

نہیں ہوتے۔ یہ سوال تم کو اپنے آپ سے کرنا چاہیے۔ اگر تم اسے یاد کرتی رہی ہو تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اسے تمھارا خیال نہ آیا ہو۔" میں نے کہا۔" وہ ہمارے ساتھ آنے پر بضد تھا۔"

"موہنی نے روک لیا ہوگا۔" نازو نے کہا۔

"موہنی!" میرے دل میں دکھ کا ایک کانٹا اتر گیا۔" نہیں نازو، نہ وہ روکنے والی تھی۔ اور نہ رکنے والی۔ وہ چلی گئی۔"

"کہاں چلی گئی؟ واپس...؟"

"یہی سمجھو۔" میں نے ایک سرد آہ بھری۔" ہمارے عقیدے کے مطابق ہم سب کو لوٹ کر وہیں جانا ہے۔"

"وہ... وہ مر گئی... کیسے... اور کب؟" نازو کا چہرہ متغیر ہوگیا۔

"فرصت میں کریں گے یہ سب باتیں۔ یوں سمجھ لو کہ شیخ کو ہم پیچھے چھوڑ آئے۔" میں نے کہا۔" تھے کچھ ایسے معاملات جو اسے سنبھالنے ہوں گے۔"

نازو نے سر ہلایا اور پھر ان دونوں کو اشارہ کیا جو ایک لڑکی سے پٹ جانے کے بعد اتنے شرمسار تھے کہ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے سے بھی گریز کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک کا کندھا اتر گیا تھا اور دوسرے کا بازو ٹوٹا تھا۔ ان کے لیے اپنے پیروں پہ کھڑا ہونا بھی آسان نہ تھا مگر نازو نے ریوالور کا رخ ان کی طرف کیا تو وہ ہانپتے کانپتے اٹھے۔ انھیں اب اپنے یا نازو کے بارے میں کوئی غلط فہمی نہ رہی تھی جو لڑکی خالی ہاتھوں سے ان کے انجر پنجر ڈھیلے کر سکتی تھی وہ ریوالور سے ان کو چھلنی بھی کر سکتی تھی۔

جب نازو انھیں باہر لے گئی تو میں نے پیڈرو سے کہا۔" آپ کیا خیال ہے دوسرے راؤنڈ کے بارے میں؟"

"میں تمھیں کچھ نہیں بتاؤں گا۔" پیڈرو نے کہا۔

"مجھے کچھ پوچھنا بھی نہیں ہے اور نہ کوئی اعتراف جرم حاصل کرنا ہے۔" میں نے کہا۔" مجھے افسوس صرف اس بات کا ہے کہ تم اکیلے ہو۔ گل کے ساتھ جو کچھ تم نے کیا، اسے دیکھنے کی اذیت میں نے اور محسن نے برداشت کی۔ کاش یہ ممکن ہوتا کہ تمھارا تماشا بھی ایسے ہی کوئی دیکھتا، اور کوئی نہ سہی، اپنے چوہدری دلاور صاحب ہی ہوتے۔"

غالب اندر آیا اور مجھ سے لپٹ گیا۔" ابے بھوتنی کے۔ ہم تو مایوس ہو گئے تھے۔ سمجھے تھے کہ اب کوئی نہیں آئے گا۔"

میں نے اس کو دو مکے مارے۔" الو کے پٹھے۔ ایسا ہو سکتا ہے! یہ خیال ہی کیسے آیا تم دونوں کے دل میں...؟"

غالب کے ساتھ آنے والے دو افراد اسٹریچر بھی لائے تھے۔ وہ محسن کو اٹھا کے لے گئے۔ غالب نے غور سے گل کو دیکھا اور اطمینان کا اظہار سر ہلا کے کیا۔" فکر کی کوئی بات نہیں۔" وہ بولا۔" ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ بتا شہلا کا کیا حال ہے اور شیخ...؟"

"یہ سب باتیں بعد میں ہوں گی۔ پہلے اس کام سے نمٹ لیں۔" میں نے کہا۔" کچھ معلوم ہے کہ ہم بمبئی سے کتنی دور ہیں؟"

"شاہد جمیل نے تو اپنا سمندری حساب لگا کے مجھے کنفیوز کیا تھا لیکن یوں سمجھ لے کہ ڈیڑھ دو سو کلومیٹر کا فاصلہ باقی ہے۔ شام تک چلتے رہتے تو بمبئی پہنچ جاتے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ ہم تین چار گھنٹے جہاز پر گزار سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔" کام بھی بہت ہے اور باتیں بھی بہت سی کرنی ہیں۔"

"دونوں کام ایک ساتھ کیے جا سکتے ہیں۔" غالب نے کہا۔" مگر چل پہلے کچھ تازہ دم ہو جا۔ نہا دھو لے۔ اس جہاز پر دنیا کی ہر نعمت تیرے انتظار میں ہے۔ چائے، کافی، سینڈوچ، مرغ مسلم۔"

"بس بس۔" میں بے ہوش ہو جاؤں گا۔" میں نے کہا۔" پہلے استاد کی خاطر تواضع کا بندوبست کر۔ تو نے گل کو دیکھا؟"

"اگر اس کا نام گل ہے تو ہاں... خوب چیز ہے۔"

"وہ ایم آر ایس کی اتنی ہی قابل اعتماد رکن ہے جتنی نازو۔ اور یہ اس کے لیے پہلی آزمائش تھی۔" میں نے کہا۔" ہم اس کے ہوش میں آنے کا انتظار نہیں کر سکتے ورنہ اس کے لیے یہ تماشا باعث تسکین ہوتا۔ جواب ہوگا۔ در جواب آں غزل..."

مجھے وضاحت کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ غالب نے میری بات سمجھ لی اور چند منٹ کے لیے باہر گیا۔ جب وہ واپس آیا تو اس کے دونوں ہاتھوں میں دو ڈبے تھے۔ پیڈرو کی حالت ان ڈبوں کو دیکھتے ہی غیر ہو گئی۔

"دیکھو... خدا کے لیے یہ سب مت کرو۔" وہ گڑگڑانے لگا۔

"ہم یہ سب خدا کے لیے نہیں کر رہے ہیں۔" میں نے اسے یقین دلایا۔" راہ خدا میں ہم جہاد کر رہے ہیں اور بہت سے نیک کام کر رہے ہیں۔"

"میں تم کو بہت سی باتیں بتا سکتا ہوں۔" پیڈرو چلایا۔

میں نے اسے سیدھا کھڑا کر دیا۔" بعد میں بتانا۔ پہلے اپنے کپڑے تم خود اتارو گے یا...؟"

وہ مجھے گالیاں دینے لگا اور اس نے اپنے آپ کو آنے والے عذاب سے محفوظ رکھنے کی دیوانہ وار کوشش کی لیکن

میں نے آسانی سے اس پر قابو پا لیا۔ مزاحمت کے باعث اس کے کپڑے تار تار ہو گئے اور مجھے اس کو باندھنے کے لیے انھی کپڑوں کی پٹیاں بنانی پڑیں۔

غالب نے شہد کا ڈبا اس پر الٹ دیا۔ آہستہ آہستہ شہد اس کے جسم پر پھیلتا گیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان چیونٹوں کو دیکھتا رہا جو ڈبے کے اندر بھوک سے بے قرار پھر رہے تھے۔ ڈبے کا سامنے والا حصہ شیشے کا تھا جس کے پیچھے لال چیونٹوں کا شکاری لشکر صاف نظر آتا تھا۔ تڑپنے اور مچلنے کا نقصان خود پیڈرو کو ہوا۔ اس کے سارے جسم پر شہد کی تہ جم گئی۔

جب میں نے چیونٹوں کو آزاد کیا تو پیڈرو نے ایک بھیانک چیخ ماری۔ چیونٹے بڑی بے تابی سے شہد چاٹنے کے لیے لپکے اور دیکھتے ہی دیکھتے پیڈرو کے جسم پر قابض ہو گئے۔ وہ پیڈرو کی دلخراش چیخوں سے اتنے ہی بے نیاز تھے جتنے گل کے نازک جسم کو بے رحمی سے کاٹنے والے چیونٹے۔

"اس پہلے راؤنڈ کو ختم ہونے دو۔" میں نے کہا۔" پھر ہم تمھیں بتائیں گے کہ ہمارا دوسرا راؤنڈ کیا ہے۔"

میں نے دروازہ باہر سے بند کیا اور غالب کے ساتھ چل پڑا۔ پیڈرو کے وحشیانہ انداز میں چیخنے کی آواز باہر بھی سنائی دے رہی تھی لیکن میرے دل کے لیے اس میں صرف سکون کا سامان تھا۔ ذاتی سطح پر وہی میرا بدترین دشمن تھا اور مجھے اس سے اتنے انتقام لینے تھے کہ اس کی ایک زندگی مجھے ناکافی لگتی تھی۔

باہر نکل آنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ ہم جہاز کی نچلی منزل پر کسی تہ خانے یا اسٹور میں تھے۔ اوپر جانے والے راستے پر عین سیڑھیوں کے درمیان ایک لاش پڑی ہوئی تھی۔ ایک اور لاش مجھے اس کمرے کے دروازے پر نظر آئی جہاں نازو پہرا دے رہی تھی۔ لاش کے آس پاس کہیں خون نہ تھا اور اس کے جسم پر مجھے زخم کا بھی کوئی نشان نظر نہ آیا۔

"یہ خودکشی کا کیس ہے۔" نازو نے مجھے مطلع کیا۔

"حوالات میں کوئی قیدی تشدد سے ہلاک ہو جائے تو تھانہ انچارج بھی یہی کہتا ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ بدبخت، تھانہ انچارج پر فریفتہ ہو گیا تھا۔" غالب نے کہا۔" نازو کو لڑکی سمجھ کے۔"

"کیا میں لڑکی نہیں ہوں؟" نازو نے غالب کی بات کاٹ کے کہا۔" سمجھنے کا کیا مطلب؟ تم کیا سمجھتے ہو مجھے؟"

"قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو۔" غالب نے کہا۔" اب کیا پوچھتی ہو ہم سے کہ ہم تمھیں کیا سمجھتے ہیں۔"

دونوں قیدی حوالات میں پہنچا دیے گئے — یہ ایک کمرا تھا جس پر آرتھوپیڈک یعنی ہڈیوں کے وارڈ کا گمان ہوتا تھا۔ ایک شخص کی ناک سے خون بہہ رہا تھا اور وہ اپنا ایک ٹوٹا ہوا بازو گھٹنے پر رکھے بلبلا رہا تھا۔ دوسرا فرش پر دہرا پڑا پسلیوں کو دبائے کراہ رہا تھا۔ تیسرا چت لیٹا چھت کو گھور رہا تھا۔ اس کا منہ سوجا ہوا تھا اور آنکھوں کے پاس گہرے نیل تھے۔ چوتھا بے ہوش تھا۔ چنانچہ بظاہر سالم نظر آتا تھا لیکن وہی سب سے زیادہ شکستہ تھا۔ یہ سب توڑ پھوڑ نازو نے کی تھی۔ یہ سب ایسے مرد تھے جنھوں نے نازو کو پہچاننے میں غلطی کی تھی۔ ان سب کو ایک بے وقوف نظر آنے والی مگر بے حد حسین اور کمزور دکھائی دینے والی نگران سے زیادہ طاقت ور نرس نے وہ "پھینٹی" لگائی تھی جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ وہ تازہ وارد ہونے والے اس وارڈ میں داخل ہوئے تو بہت سی نظریں ان کی طرف اٹھیں۔ ان سب میں ایک ہی سوال تھا۔ کیا تم بھی اسی بت طناز کے کشتۂ ستم ہو؟ اور خاموشی سے سر جھکانے والوں کی شرمندگی ان کا جواب تھی کہ۔ ہاں یارو، یہ شرم سے ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ نصف درجن جری مرد ایک لڑکی کے ہاتھوں تہس نہس ہو گئے۔

سب سے پہلے میں نے شاہد جمیل سے ملاقات کی۔

"میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کی مدد کے بغیر ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے۔" میں نے ہاتھ بڑھا کے کہا۔

اس نے میرے ہاتھ کو نظر انداز کر دیا۔" کیا خوب صلہ دیا ہے آپ لوگوں نے میری نیکی کا؟"

"آپ کی یہ ناراضگی میری سمجھ میں نہیں آئی۔" میں نے اپنا ہاتھ خفت سے پیچھے ہٹا لیا۔" ایسا کیا قصور کیا ہے ہم نے؟"

"یہ آپ مجھ سے پوچھتے ہیں؟" شاہد جمیل پھٹ پڑا۔" مجھے معلوم ہوتا کہ آپ لوگ اتنا کشت و خون کریں گے اور جہاز کے عملے کے ساتھ ایسا وحشیانہ سلوک ہوگا تو میں آپ لوگوں کو جہاز پر قدم بھی نہ رکھنے دیتا۔ میں صرف ان کے خلاف تھا جو اس جہاز کو ناجائز اور غیر قانونی طور پر استعمال کر رہے تھے۔ انھیں پکڑا جا سکتا تھا اور قانون کے حوالے کیا جا سکتا تھا۔ وہ مزاحمت کرتے تو ان کے ساتھ آپ لوگ کچھ بھی کرتے، مجھے اعتراض نہ ہوتا۔ مگر آپ لوگ تو خود بحری قزاق ہیں۔ آپ لوگوں نے میرے عملے کے کتنے بے گناہ لوگوں کو مار ڈالا۔"

"وہ سب مجرموں کے ساتھی تھے اور ہمارے دشمن کا

ساتھ دینے والا ہمارا بھی دشمن ہوگا؟" میں نے کہا۔

"وہ کسی کے دشمن نہیں تھے اور کسی مجرم کے ساتھی نہیں تھے۔" شاہد جمیل نے غصے سے کہا۔ "انھوں نے صرف جہاز پر قبضہ کرنے والوں کے خلاف مزاحمت کی تھی اور یہ ان کا فرض تھا کہ وہ جہاز کی حفاظت کریں۔ مصرا اور اس کے ساتھی اگر چور تھے تو آپ لوگ ڈاکو ہیں۔ کس نے دیا ہے یہ حق تمھیں کہ اس طرح تم ایک بحری جہاز پر قابض ہو جاؤ۔"

میں ہنس پڑا۔ "مسٹر شاہد جمیل! تم کیسی ناسمجھی کی باتیں کرتے ہو۔ کیا پورس نے سکندر سے پوچھا تھا کہ تمھیں دنیا کو فتح کرنے کا خواب دیکھنے کا حق کس نے دیا ہے؟ کسی نے محمود غزنوی سے یا انگریز قوم سے پوچھا تھا کہ تمھیں ہندوستان کو فتح کرنے کا حق کس نے دیا؟ یہ حق ہر فاتح خود حاصل کرتا ہے اور اس کی فتح ہی اس کے برحق ہونے کا جواز بن جاتی ہے۔ ہم کیا اقوامِ متحدہ سے یہ حق مانگتے؟ عالمی عدالتِ انصاف سے حق کا دعویٰ تسلیم کراتے؟ کسی کو آج تک مانگنے سے حق ملا ہے؟"

"مسٹر سکندر، یہ فلسفے اور سیاست کی منطق میرے کس کام کی؟ یہ جہاز کسی حکومت کی ملکیت نہیں، ایک کمپنی کا ہے جس نے مجھے بھی ملازم رکھا تھا اور مصرا کو بھی۔ مصرا مارا گیا۔ جہاز کا سارا عملہ یا تمھاری قید میں ہے یا مارا جا چکا ہے۔ شاید تم جہاز کو بھی غرق کر دو گے۔ مجھے بتاؤ میرا قصور کیا تھا جس کی تم مجھے سزا دے رہے ہو۔ میں کیا کروں گا۔ کہاں جاؤں گا۔ میری نوکری، زندگی سب خطرے میں ڈال دی ہے تم نے۔"

"یہ ٹھیک ہے شاہد جمیل کہ ہم اس جہاز کو غرق کر دیں گے لیکن ہم تمھیں بحفاظت نکل جانے کا موقع دیں گے اور اس بات کی پوری ضمانت فراہم کریں گے۔"

"کوئی فائدہ نہیں تمھاری ضمانت کا۔ میرے جہاز کا عملہ جانتا ہے کہ میں نے ہی تمھاری مدد کی تھی۔" شاہد جمیل بولا۔ "وہ میرے خلاف گواہی دیں گے۔ مجھ پر مقدمہ چلایا جائے گا، اگر اس سے پہلے ہی تمھارے دشمنوں نے مجھے سزائے موت نہ دی۔ جو فلسفہ تمھارا ہے وہی ان کا بھی ہوگا کہ ہمارے دشمنوں کا ساتھی ہمارا دشمن۔"

"لیکن اب تمھارے خلاف گواہی دینے والا کون بچا ہے؟" میں نے کچھ سوچ کے کہا۔ "ایک ڈاکٹر بھنڈاری ہے۔ اس کے علاوہ دو افراد۔"

"صرف تین آدمی بچے ہیں!" شاہد جمیل نے افسوس سے سر ہلایا۔ "عملے کے ستائیس ارکان تھے۔"

اس وقت اگر میں شاہد جمیل کو بتاتا کہ چھ افراد ابھی زندہ ہیں تو کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ اٹھارہ افراد کے مارے جانے کا صدمہ کم نہ ہوتا۔ اُلٹا یہ اندیشہ بڑھ جاتا کہ اس کے خلاف گواہی دینے والے نو افراد موجود ہیں۔

"میں سمجھتا ہوں کہ تم سب کا ایک ہی مسئلہ ہوگا۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ تمھارے اور ڈاکٹر بھنڈاری کے علاوہ دو افراد نے ہم سے پورا تعاون کیا۔ بچ جانے والے یہ کہہ سکتے ہیں کہ جہاز کی تباہی کے بعد باقی سب لوگوں پر کیا بیتی، یہ انھیں نہیں معلوم۔ بس قدرت نے انھیں بچا لیا۔ ایسا ہو جاتا ہے۔ بحری جہاز کی غرقابی میں سو فیصد لوگ نہیں مرتے جو جہاز پر ہوں اور بچنے والے لوگ ہوائی جہاز کریش ہو جانے کے بعد بھی بچ جاتے ہیں۔ تمھارے ساتھ... زندہ سلامت ساحل تک پہنچ جانے والے ایک دوسرے کے خلاف کیسے بیان دے سکتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ ایک جرم میں شریک ہو جانے کے بعد ہم صرف جھوٹ کا سہارا لے سکتے ہیں۔" شاہد جمیل نے کہا۔ "پھر بھی تفتیش تو ہوگی اور سب سوالات ہم سے ہی کیے جائیں گے۔"

"شاہد جمیل تم بلاوجہ پریشان ہو۔ کیا تم جانتے نہیں تھے کہ جہاز پر کتنا اسلحہ تھا؟" میں نے کہا۔ "ڈاکٹر بھنڈاری اور باقی دو زندہ بچ جانے والے اگر کچھ نہیں جانتے تو میں ان کو سب بتا دوں گا۔ کیا وہ اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد بھی یقین نہیں کریں گے؟ جہاز کی تباہی کے اسباب متعین کرنے والے خود ہی سمجھ لیں گے کہ اسلحے کے ڈھیر میں آگ لگ جانے سے جہاز تباہ ہوا۔ آگ لگنے کے اسباب ایک سو ایک ہو سکتے ہیں۔ شارٹ سرکٹ سے تخریب کاری تک اور بے وقوفی میں جلتی ہوئی سگریٹ پھینک دینے تک۔ تمھارا صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ تمھیں دھماکے نے سمندر میں اُچھال دیا تھا۔ اس سے زیادہ تم کچھ نہیں جانتے اور تم کسی پر شک بھی نہیں کر سکتے۔ ظاہر ہے پھر جہاز کی تباہی کو صرف ایک حادثہ سمجھا جائے گا۔"

شاہد جمیل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں اسے اپنے خیالوں میں کھویا ہوا چھوڑ کے باہر آ گیا۔ بلاشبہ شاہد جمیل کے ساتھ زیادتی ہوئی تھی اور اس کا احساسِ جرم میں مبتلا ہونا بھی ایک مختلف زاویے سے جائز تھا۔ لیکن اس جنگ میں زیادتی سب کے ساتھ ہو رہی تھی۔ مارے وہ بھی جا رہے تھے جو حق پر تھے اور مظلوم تھے۔ ہم اور ہمارے ساتھی سب امن پسند اور محبِ وطن۔ وہ سب جو علیحدگی پسندوں کے خلاف صف آرا تھے۔ مشرقی پاکستان کے محبِ وطن عوام، بے گناہ عورتیں اور معصوم بچے سیکڑوں ہزاروں کی تعداد میں ہر روز میرے وطن کے دشمنوں کی سازش کا شکار ہو رہے تھے اور مفاد پرستوں کے ہاتھوں زندگی سے ہاتھ دھو رہے تھے۔ ایسے حالات میں اگر چند افراد کے ساتھ ہم سے بھی زیادتی ہو جائے اور کچھ اپنے حامی و مددگار بھی ہماری کارروائی کے دوران مر جائیں تو ہم افسوس کر سکتے ہیں کہ ہم ایسا نہیں چاہتے تھے لیکن مجبور تھے۔ کبھی دشمن کے طیارے اپنے ملک کی حدود میں داخل ہو جائیں تو ان کے خلاف کارروائی سے اپنے ہی ملک کے عوام کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ فوج کبھی دشمن کی پیش قدمی کو روکنے کے لیے اپنے ہی پُل اڑا دیتی ہے، ہم اپنے ہی علاقے میں بھی گھر جاتے ہیں۔

عرشے سے سمندر کا نظارہ وہی تھا۔ تاحدِ نگاہ پھیلا ہوا سمندر، بپھری ہوئی بے قرار موجیں، ساکت آسمان اور سمندر کا شور۔ تاہم ایک لانچ کے مقابلے میں اس بحری جہاز پر تحفظ کا زیادہ احساس ہوتا تھا۔ غالب میرے انتظار میں ٹہل رہا تھا۔

"چل ہیرو، پہلے اپنی حالت درست کر لے۔" غالب نے کہا۔ "نازو ایک تربیت یافتہ نرس کی طرح تیری مرہم پٹی کرنے کے لیے تیار بیٹھی ہے۔" وہ میرے ساتھ چل پڑا۔

"محسن کا کیا حال ہے؟" میں نے کہا۔

"تو خود پوچھ لے۔" غالب نے میرے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ "نازو نے اسے باقاعدہ اسپتال میں داخل کر دیا تھا۔ اس کو جھاڑ پونچھ کے اس کے کپڑے بھی بدل دیے تھے۔ ہوش میں آتے ہی اس نے بالکل فلمی سوال کیا۔ میں کہاں ہوں۔ میں نے کہا کہ جہنم کی سی کلاس میں۔"

"یار میں گل کو دیکھنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

غالب نے ایک آہ بھری۔ "دیکھو بھائی ضرور دیکھو، ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ۔ ویسے یہ گل ہے کس گلستان کا اور کفِ گلفروش میں کیسے آیا؟"

"ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں۔ بس یہ بھی اسی جستجو کا حاصل ہے۔" میں نے کہا۔ "اور ایک دلچسپ بات بتاؤں، وہ محسن کے عشق میں مبتلا ہے، ناقابلِ علاج قسم کا عشق ہے جس کی دوا ایجاد نہیں ہوئی۔"

"دوا تو ہے۔ شربتِ وصل۔" غالب نے کہا۔

"اور وہ جو شربتِ وصل کی ایک بوتل لاہور میں رکھی ہوئی ہے۔" میں نے کہا۔ "ابھی گل کو اس کی خبر نہیں ہے۔"

"کیا کہا؟" غالب نے شور مچانا شروع کیا۔ "میں تو سمجھا تھا اس لڑکی کے دماغ میں فتور ہوگا۔ مگر یہ دھوکا دہی کا کیس ہے۔ لبقائمی ہوش و حواس کوئی لڑکی کیسے عاشق ہو سکتی ہے محسن جیسے پالتو شوہر پہ۔ میں اسے بتاتا ہوں۔"

"دیکھ مرزا غالب کے چیلے، ایسا ہرگز مت کرنا۔ ہم جو بھی کرتے ہیں سوچ سمجھ کے کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "فی الحال اس کو تھلّا کے وجود سے بے خبر رکھنا ضروری ہے، نازو کو بھی یہ بات اچھی طرح سمجھا دینا۔۔"

"پہلے تم اچھی طرح سمجھ لو میری بات۔" نازو نے اچانک سامنے آ کے کہا۔ "باقی سب کام بعد میں ہوں گے۔"

"مثلاً نکاح، ولیمہ وغیرہ؟" غالب نے کہا۔ "جیسی تمھاری مرضی بھئی۔ سرِ تسلیم خم ہے۔۔۔"

"سکندر بھائی تمھاری موجودگی میں ان کی زبان بہکنے لگتی ہے۔" نازو نے کہا۔ "اتنے دن سے چپ تھے۔"

"ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں، ورنہ کیا بات کرنی نہیں آتی۔" غالب نے تسلیم بجا لا کے کہا۔ "آداب عرض۔"

"سکندر بھائی! آپ گرم پانی سے نہا لیں۔ کپڑے بدلیں۔ میں اتنی دیر میں کافی وغیرہ بناتی ہوں۔ پھر آپ کی ڈریسنگ کروں گی۔" نازو نے کہا اور مجھے بازو سے پکڑ کے اندر لے گئی۔

"ارے بھائی۔ میں گل کو تو دیکھ لوں۔"

"ابھی اسے نہیں دیکھ سکتے آپ۔ چلیں اندر۔" اس نے مجھے باتھ روم میں دھکیل دیا۔

وہ شاید مصرا کے کمرے سے متصل باتھ روم تھا۔ اس میں ضرورت کے سب اسباب شاہانہ تھے۔ میں نے گرم پانی ٹب میں بھرا۔ اس میں ڈیٹول ڈالی اور پھر آدھے گھنٹے تک اپنی ساری تھکن اتارتا رہا۔ بالآخر نازو نے دروازہ بجانا شروع کیا تو میں لباس بدل کے باہر آیا۔ نازو پہلے میری گردن کی خراشوں پر مرہم لگانا چاہتی تھی مگر میں نے کسی ضدی بچے کی طرح صاف انکار کر دیا۔

"گردن کی خراشوں سے میرے فوت ہونے کا کوئی امکان نہیں۔" میں نے کہا۔ "بھوک سے مر گیا تو میرا خون تمھاری گردن پہ ہوگا۔ میرے پیٹ کے خلا میں راکٹ گردش کر رہے ہیں۔"

"پہلے بھوک سے پیٹ میں چوہے دوڑتے تھے، پرانے وقتوں کی بات ہے۔" غالب نے کہا۔ "محسن بھی آدھے گھنٹے سے اعلان کر رہا ہے کہ میں دس سیکنڈ میں فاقے سے ہلاک ہو جاؤں گا۔"

محسن کو صحت مند اور پوری طرح مستعد دیکھ کے مجھے خوشی ہوئی۔ ہم تینوں اب سابق کپتان مصرا کے کمرے میں اس کے بیڈ پر آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ نازو نے

بہترین میزبانی سے فرائض سرانجام دیے، ہر عورت ہر مرد کی ہر ضرورت کو محسوس کر کے سمجھتی ہے اور پھر اپنی فطری صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے اسے وہ اسباب فراہم کرسکتی ہے جو آرام و آسائش، تحفظ اور طمانیت، سکون اور مسرت کے اور اپنائیت کی شکر گزاری کے جذبات کی صورت میں اس کا انعام بن جاتے ہیں اور اس کے وجود کی اہمیت کو تسلیم کرلیتے ہیں۔

اپنی پسند کی ہر چیز ختم کردینے کے بعد میں نے نازو سے کہا "نازو بی بی! یو آر گریٹ۔" محسن نے تائید میں سر ہلایا۔

غالب نے دانت نکالتے ہوئے کہا "تھینک یو۔"

"تم کس بات پر شکریہ ادا کر رہے ہو؟" محسن نے کہا۔

"میری پسند کو پسند کرنے کا شکریہ۔" غالب نے کہا۔

نازو کا چہرہ ایک اندرونی خوشی سے دمکنے لگا۔ عورت بیک وقت اپنے بھائی، اپنے شوہر، اپنے باپ اور اپنے بیٹے کو خوشی دے کر کتنی بے غرض خوشی حاصل کرسکتی ہے۔ مختلف رشتوں کے حوالے اس کے جذبات کی نوعیت پر اثرانداز نہیں ہوتے۔ مرد شاید محبت کو رشتوں کے خانوں میں اتنی ایمانداری سے تقسیم نہیں کرسکتے۔ شہلا سے موہنی تک اور رابعہ سے ناگ منی تک۔ عورت کی ذات ایک سائبان ہے۔ آسمان کی طرح جو سب کے لیے وہی ہے۔

"اب تم گل سے مل سکتے ہو۔" نازو نے کہا "لیکن دیکھو، اسے آرام کی ضرورت ہے۔"

"کبھی اپنے کفش برداروں کی ضرورت کا خیال بھی آتا ہے؟" غالب نے کہا اور دوڑ کے آگے نکل گیا۔

"یہ کفش بردار کیا ہوتا ہے۔ اس لفظ کا مطلب بھی معلوم ہے؟" محسن نے کہا۔

"ہاں، جوتیاں اٹھانے والا۔" غالب نے کہا "پہلے سب شوہر ہوتے تھے۔ نکاح کے بعد کہتے تھے کہ بیوی آنکھیں کھولو، میں تمھارا غلام۔ تمھاری جوتیاں اُٹھاؤں گا۔ میں بھی کہوں گا۔"

"وہ پرانے شوہر بعد میں اسی بیوی کو پاؤں کی جوتی بھی سمجھتے تھے۔" محسن نے طنز سے کہا۔

"میں بھی سمجھوں گا۔" غالب نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔

گل صاف ستھرے بستر پر چادر اوڑھے چپ لیٹی ہوئی تھی۔ مجھے ہمت نہ ہوئی کہ چادر ہٹا کے دیکھ سکوں۔

"کیا حال ہے گل؟" میں نے اس کے ماتھے پر پیار سے ہاتھ رکھ کے کہا۔

"ٹھیک ہوں بھائی سکندر۔" وہ مسکرائی "تم نہیں پوچھو گے؟" اس نے محسن سے مخاطب ہو کے کہا۔

"کل تک تم ٹھیک ہوجاؤ گی۔" محسن نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"نازو نے مجھے دوا دی ہے۔ اس سے درد کا احساس بالکل ختم ہوگیا ہے۔" گل نے کہا "زخم گہرے نہیں ہیں۔"

"تم بہت بہادر لڑکی ہو گل۔ ناگ منی سے بھی زیادہ ہمت ہے تم میں۔" میں نے کہا "ہم سب فخر کرسکتے ہیں تم پر۔"

"وہ... بدمعاش... اُستاد پیڈرو۔" گل نے نظریں جُھکا کر کہا "کیا تم نے مار دیا اسے؟"

"نہیں، ابھی اس کی سزا شروع ہوئی ہے۔ جو سزا اس نے تم کو دی تھی، اسی سے اب خود گزر رہا ہے۔ میری خواہش تھی کہ تم دیکھو مگر..."

"میں دیکھوں گی۔" گل کی آنکھوں میں نفرت اور انتقام کی آگ دہکنے لگی۔ اس نے چادر کو ہاتھ مار کے ہٹا دیا۔ نیچے اس نے صرف ایک گاؤن پہن رکھا تھا۔ جسم کے بیشتر حصوں پر نازو نے پٹیاں باندھی تھیں یا مرہم لگا کے ٹیپ لگا دیا تھا۔ ایسی حالت میں وہ ڈھیلا ڈھالا سوتی سا لباس پہن سکتی تھی لیکن چلنے پھرنے اور حرکت کرنے سے اس کے زخموں سے کپڑا... چھو جانے کی تکلیف بھی بہت زیادہ ہوسکتی تھی۔ سوچے سمجھے بغیر میں نے بھی اس کو کندھے سے پکڑ کے پھر بستر پر لٹا دیا۔ وہ کراہنے لگی۔

"مجھے لے چلو... میں چل سکتی ہوں۔ اس کمینے کُتے کی آنکھیں نکال کے چبا سکتی ہوں میں..." اس کا جسم کانپ رہا تھا اور وہ ہچکیاں لے رہی تھی۔ خوف اور دہشت کے ختم ہوتے ہی آنسو اُمڈ آئے تھے اور جذبات کا آتش فشاں پھٹ پڑا تھا۔ میں نے نازو کو آواز دے کر بلایا اور اس نے گل کو سنبھال لیا۔

"یہ کسی صورت مناسب نہیں ہے کہ وہ پھر پیڈرو کو دیکھے۔" میں نے کہا "اور اس حالت میں۔"

"یار سکندر! ہم گل کو اپنے ساتھ کیسے لے جائیں گے؟" محسن نے میرے ساتھ ہی باہر آکے کہا "جہاز کو غرق کرنے سے پہلے ہم کسی لائف بوٹ میں جائیں گے۔ گل اس میں کیسے رہے گی؟"

"لائف بوٹ کے سوا کیا ہے ہمارے پاس۔" میں نے کہا "یہ ہوسکتا ہے کہ ہم سب ایک ہی لائف بوٹ میں نہ جائیں۔ گل کو ایک الگ لائف بوٹ میں رکھیں۔ ہم میں سے ایک اس کے ساتھ رہے۔"

"پھر بھی ہم اسے سمندر کے پانی سے تو نہیں بچا سکتے۔ سمندر کا نمکین پانی اس کے زخموں پہ لگے گا۔"

"ہاں، گل کو اس آزمائش کا سامنا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"ہم اسے درد کا احساس ختم کرنے والی دوا کی دوگنا یا تین گنا خوراک دے سکتے ہیں۔" غالب نے کہا "اس کے جسم پر اینٹی سیپٹک اور جلد کو سُن کرنے والی کریم کا لیپ کیا جاسکتا ہے۔"

"کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔ ہم اسے چھوڑ کے بہرحال نہیں جائیں گے۔" میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ اب ہمیں جہاز سے روانہ ہونے کے آخری مرحلے کی تیاری شروع کردینی چاہیے۔"

"ان سب کا کیا ہوگا جو ہمارے ساتھ نہیں جائیں گے؟" محسن نے کہا "مثلاً استاد پیڈرو، شاہد جمیل۔"

"استاد پیڈرو کا کیس الگ ہے۔" میں نے کہا "اس پر ایم آر ایس کی عدالت میں اس کے تمام جرائم پر مقدمہ چلایا جائے گا۔ شاہد جمیل اور اس کے ساتھی ہمارے ساتھی نہیں ہیں لیکن انھوں نے ہماری مدد کی تھی۔ ان کو ہمارا تعاون حاصل رہے گا۔ وہ جہاز پر سے جو کچھ بھی لے جانا چاہیں انھیں اجازت ہوگی۔ جہاز پر چار لائف بوٹس ہیں۔ ایک وہ استعمال کرسکتے ہیں۔"

"اور ان کے باقی ساتھی؟"

"میں نے شاہد جمیل کو ان کے بارے میں یہی بتایا ہے کہ سب مارے گئے، سوائے ان تین افراد کے جو ہماری مدد کرتے رہے۔ انھیں ہم جہاز پر ہی چھوڑ جائیں گے۔" میں نے کہا۔

"وہ ہمارے دشمن ہیں۔" محسن نے کہا "ان سب کی طرح جو ہلاک ہوچکے ہیں۔ وہ کسی رعایت کے مستحق نہیں ہو سکتے۔"

مصرا کے کمرے میں ہم نے ایک مختصر اجلاس کیا جس میں خواتین کی عدم موجودگی کو سب نے محسوس کیا لیکن گل اس قابل نہ تھی اور نازو اس کے معالج و تیماردار کے فرائض انجام دے رہی تھی۔ غالب اور نازو نے اپنے پاسپورٹ جہاز پر پہنچنے کے بعد ایک محفوظ مقام پر چھپا دیے تھے۔ انھوں نے درمیانی وقفے میں اپنے لیے اسلحہ بھی حاصل کرلیا تھا جہاز پر وہ ڈاکٹر بھنڈاری کے اسسٹنٹ سمجھے جاتے تھے چنانچہ وہ بلا روک ٹوک ہر جگہ آجا سکتے تھے۔ چارلی یعنی غالب سب کا خادم تھا اور اس سے سب خوش تھے کیوں کہ وہ کسی بات کا بُرا نہیں مانتا تھا۔ لوگ اس سے ہر طرح کا مذاق کرتے تھے۔ نازو کے حوالے سے اشتعال انگیز سوالات کو بھی وہ ہنس کے ٹال جاتا تھا۔ اسے ایک احمق شخص سمجھا جاتا تھا اور عملے کے نچلے درجے کے لوگ بھی اس پر حکم چلاتے تھے۔ چارلی بے بچے ادھر آؤ، میرے پیر دباؤ۔ چارلی میرے بوٹ پالش کرو، وہ ہر کام خوشی خوشی کرتا تھا چنانچہ کسی بھی جگہ اس کی موجودگی پر کسی کو شک نہیں ہوتا تھا۔ غالب نے خاصی محنت، ذہانت اور برداشت سے یہ تاثر پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کی تھی کہ وہ ایک غیر اہم، بے ضرر اور بے عقل شخص ہے۔ ان بدبخت لوگوں کی طرح جو ذلت اٹھانے، ظلم سہنے اور غلامی کرنے کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔

دوسری طرف نازو نے ہوس پیشہ ڈاکٹر بھنڈاری کو پوری طرح قابو کرلیا تھا۔ اس نے بیک وقت انتہائی سادگی و ہوشیاری سے اس کی آتش شوق کو ہوا دی تھی لیکن ایسا کوئی موقع نہیں آنے دیا تھا کہ وہ نازو پر دست درازی کرسکتا۔ وہ شراب کا رسیا تھا اور نازو اسے اپنے ہاتھوں سے پلاتی تھی تو اس کا نشہ دوچند ہوجاتا تھا مگر اس بے وقوف کو یہ کبھی معلوم نہیں ہوتا تھا کہ شراب میں خواب آور دوا کی خفیف سی مقدار بھی شامل ہے۔ الکحل کے ساتھ سکون آور دوا کے اثرات بھی زیادہ ہوجاتے ہیں۔ خواب آور دوا کی زیادہ مقدار ہلاکت خیز ثابت ہوسکتی ہے۔ نازو کا مقصد اسے مارنا ہوتا تو اس کے مواقع کم نہ تھے مگر ڈاکٹر بھنڈاری مرجاتا تو شکوک پیدا ہوتے اور تفتیش کا نقطۂ آغاز خود نازو ہوتی۔ وہ ڈاکٹر بھنڈاری کو کم سے کم وقت میں مدہوش کردیتی تھی۔ بعد میں بھنڈاری تاسف سے ہاتھ ملتا تھا کہ شراب نے اُسے ناک آؤٹ کردیا ورنہ نازو کی طرف سے وعدۂ وصل جھوٹا نہ تھا۔ اسے کبھی شک نہیں ہوا کہ ع، ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں۔

نازو بعد میں اس کے پاس رہنے والی خطرناک ادویات کی الماری کی چابی لے کر اپنی ضرورت کی کوئی بھی چیز نکال لیتی تھی مگر اس طرح کہ ڈاکٹر بھنڈاری کو خورد بُرد کا احساس نہ ہونے پائے۔ اس نے ایک شیشی کلوروفارم کی غائب کی۔ کلوروفارم کو کھانسی کے شربت کی خالی شیشی میں ڈالا اور کلوروفارم کی جگہ پانی بھر کے پھر اصل شیشی واپس اپنی جگہ رکھ دی۔ خواب آور گولیوں کی کمی کو اس نے اسپرین کی گولیوں سے پورا کیا اور ایک خطرناک زہر کی جگہ آٹا بھر دیا۔ یہ کیمیائی ہتھیار اس نے موقع محل دیکھ کے استعمال کیے۔ ایک رات شور مچا کہ کوئی ملاح سمندر میں گر گیا ہے۔ اسے نازو نے بے ہوش کیا تھا اور سمندر میں پھینک دیا تھا۔ یوں پہلا ریوالور اس کے ہاتھ لگا تھا۔ وہی ریوالور غالب نے مجھے فراہم کیا تھا۔

اب ہم نے مصرا کے کمرے کی تلاشی لی تو مختلف... نوعیت کا بہت سا سامان الماریوں کے خفیہ خانوں سے

برآمد ہوا۔ ان میں دستاویزات بھی تھیں جن میں مصر اکو اسلحے کی خرید کے معاملے میں ضروری احکامات و اختیارات دیے گئے تھے۔ یہ سب ہمارے لیے بے کار تھا۔ اسی کمرے سے ایک بار پھر ہمیں انڈین، پاکستانی اور بین الاقوامی کرنسی میں خطیر رقم دستیاب ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی میری، محسن اور گل کی وہ بیلٹ بھی مل گئی جس میں ہم نے اپنے پاسپورٹ کے ساتھ ہنگامی ضرورت کے لیے کچھ رقم محفوظ کی تھی۔

باہمی صلاح مشورے سے ہم نے صرف دو سوٹ کیس پیک کرنے کا فیصلہ کیا جو ہم لائف بوٹ میں اپنے ساتھ لے جا سکتے تھے۔ ایک میں کرنسی بھری گئی اور دوسرے میں منتخب اسلحہ۔ ہر سوٹ کیس کو اوپر تک زنانہ اور مردانہ کپڑوں سے بھر دیا گیا اور اسلحے کے ساتھ نقد رقم کو بھی واٹر پروف بنانے کے لیے پلاسٹک کے تھیلے استعمال کیے گئے۔ میں نے محسن اور غالب کی رائے سے اتفاق کیا کہ بمبئی سے پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر جہاز ڈوب جائے تو ہمارے لیے ساحل تک پہنچنا مشکل نہ ہوگا لیکن ہم کوشش کریں گے کہ کسی غیر آباد ساحل پر اُتریں اور اوّلین فرصت میں دونوں سوٹ کیس دفن کر دیں اور اگر اس سے پہلے ہی چیکنگ کا خطرہ پیدا ہو جائے تو دونوں سوٹ کیس سمندر میں پھینک دیں۔ جو رقم ہمارے پاس بیلٹ میں محفوظ ہوگی وہ ہماری کفالت کرے گی اور اس کے بعد ہم اپنے وسائل خود پیدا کریں گے۔

نازو نے ڈاکٹر بھنڈاری کے مشورے سے گل کو مارفیا دے کر سُلا دیا تھا۔ غالب مجھے اسلحے خانے میں لے گیا۔ جہاز کے زیریں حصے میں تین گودام تھے۔ ایک گودام میں نیچے سے اوپر تک لکڑی کے کریٹ رکھے ہوئے تھے۔ سامنے کی پہلی قطار کے کریٹ عام اشیائے ضرورت سے بھرے ہوئے تھے۔ مثلاً گھی کے ڈبے، ٹرانسسٹر ریڈیو، کھیلوں کا سامان، بجلی کے میٹر فیوز اور سوئچ گیئر، خراد مشینیں اور فولڈ ہو جانے والا فرنیچر۔ اسلحہ پیچھے تھا۔ وہ سیکڑوں کریٹ تھے جن میں ریوالور سے مشین گن تک اور رائفل سے طیارہ شکن اور ٹینک شکن توپ کی بھاری گولیاں تک بھری ہوئی تھیں۔ دوسرے گودام میں آگے چاول اور چینی کی بوریاں تھیں۔ پیچھے والی بوریوں میں رائفلیں، مشین گنیں اور ہر قسم کے ریوالور تھے۔ ان سب کو کھول کے چیک کرنا ناممکن نہ تھا، مگر اس کے لیے ہمارے پاس وقت نہیں تھا۔ غالب نے مجھے بتایا کہ چند بوریوں میں بارود بھی ہے۔ تیسرا گودام بارودی سرنگوں، دستی بموں، ڈائنامائٹ اور ٹائم بموں کے لیے مخصوص تھا اور یہ حصہ تقریباً جہاز کے وسط میں تھا۔

اسلحے کی اس کثیر مقدار نے جو میرے ہم وطنوں کے جذبۂ اخوت اور حُب الوطنی کو شہید کرنے کے لیے لے جائی جا رہی تھی، مجھے مشرقی پاکستان کے تخریب کار عناصر کی بے پناہ قوت اور ان کے لامحدود وسائل کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیا۔ یہ صرف ایک کھیپ تھی۔ اس سے پہلے ہلاکت خیزی کا کتنا سامان مشرقی پاکستان پہنچا دیا گیا اور اس جہاز کے علاوہ اور کتنے ذرائع سے یہ اسلحہ مفسد عناصر تک پہنچانے کا بندوبست کیا جا چکا ہے، اس کا اندازہ کرنا محال تھا۔ یہ صرف ایک چوہدری دلاور اینڈ کمپنی ہی تھی جو اس موت کے کاروبار میں مال و زر سمیٹ رہی تھی۔ عالمی سیاست کی بساط پر نہ جانے کتنے مُہرے تھے جو دلاور کی طرح خریدے جا چکے تھے اور ان ہاتھوں میں کھیل رہے تھے جو بہت بڑے شاطروں کے نظر نہ آنے والے ہاتھ تھے۔

"کس سوچ میں پڑ گیا تو؟" محسن نے کہا۔

میں چونکا۔ "کچھ نہیں، میں سوچ رہا تھا کہ یہ سب اسلحہ مشرقی پاکستان پہنچ جاتا تو کیا ہوتا؟"

"اگر ہم یہی سوچتے رہے تو رات ہو جائے گی۔ شام تک ہمیں جہاز سے اتنی دور نکل جانا چاہیے کہ دھماکے سے ہمارے لیے خطرہ لاحق نہ ہو۔" محسن نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ تم دیکھو کہ یہ کتنی دیر کا کام ہے۔" میں نے کہا۔ "اس وقت پانچ بجے ہیں۔"

"کیا میں چھ بجے کا ٹائم سیٹ کر دوں؟" محسن بولا۔

"کیا ہم آدھے گھنٹے میں نکل جائیں گے اور نکل بھی گئے تو زیادہ دُور نہیں جا پائیں گے۔" غالب نے کہا۔

"ساڑھے چھ کا وقت رکھ لو۔" میں نے کہا۔ "آدھے گھنٹے میں ایک لائف بوٹ اُتار دو۔ اس میں گل کو لٹا دو، گل کے ساتھ نازو رہے گی اور محسن ہوگا۔ دوسری لائف بوٹ میں غالب اور میں ہوں گے اور سامان ہوگا۔ تھوڑا بہت کھانے کا سامان اور پانی دونوں لائف بوٹس میں رکھو۔"

"یہ سب تو ہو جائے گا۔ شاہد جمیل اور اس کے ساتھی کیا آخری وقت تک ہمارے ساتھ رہیں گے؟" محسن بولا۔

"اور پیڈرو... دوسرے قیدی؟" غالب نے کہا۔

"یار! افراتفری مت پھیلاؤ۔ ہر کام ایک پلان کے مطابق ہوگا۔ چل محسن تو اپنا کام شروع کر۔ ٹائم بم بھر دے کے قابل ہیں نا؟" میں نے کہا۔

"دو چار منٹ کا فرق پڑ سکتا ہے ڈیڑھ گھنٹے میں۔ کیوں کہ ہر ٹائم بم کے ساتھ ایک گھڑی ہوتی ہے۔" محسن نے کہا۔ "میں ایک ایک بم تینوں گوداموں میں نصب کر دیتا ہوں۔"

"اس کام سے فارغ ہونے میں کتنا وقت لگ جائے گا؟"

"زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ۔" محسن نے کہا۔

"اس کے بعد تم نازو اور گل کو لے کر نکل جاؤ۔ میں نازو سے کہہ دیتا ہوں کہ وہ تیار ہو جائے اور گل کو بھی تیار کر لے۔ غالب اس کام میں تمھاری مدد کرے گا۔ لائف بوٹ کو سمندر میں اُتارنا ایک آدمی کا کام نہیں ہے۔ میں دوسرے معاملات سے نمٹتا ہوں۔ میں اور غالب آخر میں روانہ ہوں گے۔"

محسن کو وہیں مصروف چھوڑ کے میں اور غالب اوپر گئے۔ غالب نے میری ہدایات نازو تک پہنچانے کے لیے اس کمرے کا رُخ کیا جہاں گل لیٹی ہوئی تھی۔ میں نے ڈاکٹر بھنڈاری کو اس کے دونوں ساتھیوں سمیت عرشے پر طلب کر لیا۔

"کیا بولا؟ ہم سالا اتنا بڑا جہاز چھوڑ کے لائف بوٹ پر جائے گا؟" ڈاکٹر بھنڈاری نے واویلا شروع کیا۔

"مجبوری ہے ڈاکٹر بھنڈاری۔" میں نے کہا۔ "یہ جہاز غرق ہونے والا ہے۔"

وہ اُچھل پڑا۔ "غرق ہونے کو ہے، کیسا بات بولتا... تم کیا بے وقوف سمجھتا ہم کو، ہم نہیں جائے گا۔"

میں نے اس کے ایک چھانپڑ رسید کیا۔ "میں تم کو پندرہ منٹ دوں گا۔ تم اس جہاز پر سے کچھ بھی لے جا سکتے ہو۔ پندرہ منٹ گزر جانے کے بعد میں تم کو زندہ یا مُردہ سمندر میں پھینک دوں گا۔ لائف بوٹ میں تم آسانی سے ساحل تک پہنچ سکتے ہو۔"

"اوہ مائی گاڈ! ابھی ہم کیا کرے۔ اچھا، ہم اپنا نرس کو ساتھ لے جائے گا۔" وہ گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔

میں نے اس کے دوسرا چھانپڑ مارا۔ "تمھارے ساتھ یہ دونوں ہوں گے، اور شاہد جمیل ہوگا۔"

باقی دو چُپ کھڑے تھے۔ نگران کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگی تھیں۔ یہ صورتِ حال ان کے لیے اچانک پیدا ہو گئی تھی جس کا انھوں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ صرف پندرہ منٹ کی مہلت نے ان کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو بھی مفلوج کر دیا تھا۔

"ہم سے وعدہ کیا گیا تھا... کہ تعاون کرنے پر انعام ملے گا۔" بالآخر ایک نے انگریزی میں کہا۔ "اب تم ہمیں خالی ہاتھ سمندر کے سپرد کر رہے ہو۔ ہمارا کوئی مستقبل بھی نہیں ہے۔"

"اگر تم سمجھتے ہو کہ مستقبل صرف دولت سے محفوظ ہوتا ہے تو یہ رہا تمھارا انعام۔" میں نے اس سوٹ کیس کی طرف اشارہ کیا جس میں ہم نے کرنسی بھری تھی۔

"اس میں کیا ہے؟" وہ خوفزدہ ہو کے بولا۔

"ڈرو نہیں، اس میں دولت ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ... مالِ غنیمت ہے، ہم اس کے بغیر بھی گزارہ کر سکتے ہیں۔ ویسے میں نے شاہد جمیل کو سمجھا دیا ہے کہ اسے کیا بیان دینا چاہیے۔ وہ تم کو سمجھا دے گا۔ تم جہاز کی تباہی کو ایک حادثہ یا تخریبی کارروائی قرار دے سکتے ہو جس میں تمھارے سب ساتھی ہلاک ہو گئے۔ بچ جانے والے خوش قسمت تم چار ہی ہو۔ تم سب کا ایک بیان ہوگا تو کسی پر آنچ نہیں آئے گی۔"

اس نے سر ہلایا اور سوٹ کیس کو کھول کر دیکھنے لگا۔ کپڑوں کے نیچے دولت کے ڈھیر کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں چمک اور چہرے پر رونق آ گئی۔ اس کے دوسرے ساتھی نے حریص نظروں سے اس تمام کرنسی کو دیکھا جو کپڑوں کے نیچے چھپی ہوئی تھی، پھر اس نے رضامندی میں سر ہلایا اور مسکرانے لگا۔ غالباً وہ ہندی انگریزی بھی نہیں بول سکتا تھا۔

"یہ کپڑے سب نکال دو، اور جا کے لائف بوٹ اُتارنے کی تیاری کرو۔" میں نے کہا۔ "ایک بات یاد رکھنا، یہ سب تم چاروں کے لیے ہے۔ اس کی تقسیم تم آپس میں اپنی مرضی سے کر سکتے ہو۔"

"ہاں! ابھی میرے کو اِدّیٹ مت سمجھنا۔" ڈاکٹر بھنڈاری نے کہا۔ "اپن برابر حصہ لے گا۔ کیا ہم شراب کا بوتل لے جا سکتا ہے اپنا ساتھ؟"

"ضرور لے جاؤ۔ دو چار بوتلیں پیٹ میں ڈال کے بھی لے جاؤ۔" میں نے کہا۔

شام ساڑھے پانچ بجے پہلی لائف بوٹ سمندر میں اُتاری گئی تو سورج مغرب کی طرف جھک گیا تھا۔ لہروں کا تلاطم کم ہو گیا تھا اور آسمان پر اُڑنے والے آبی پرندے خبر دیتے تھے کہ زمین کا ساحل اب زیادہ دُور نہیں ہے۔ پہلی لائف بوٹ میں پروگرام کے مطابق نازو کے ساتھ گل اور محسن تھے۔ نازو نے بڑی عقل مندی سے گل کو ایک پلاسٹک شیٹ میں لپیٹ کر یوں اُلٹا لٹا دیا تھا کہ وہ آسانی سے سانس لے سکتی تھی مگر سمندری پانی کی زخموں میں آگ لگانے والی یلغار سے محفوظ تھی۔ محسن کا ساتھ گل کے نفسیاتی اطمینان اور سکون کے لیے ضروری تھا۔

روانگی سے پہلے محسن نے کہا۔ "بمبئی میں ہم کہاں ملیں گے؟"

"حاجی علی کی درگاہ پر اور کہاں۔" میں نے کہا۔ "اس لائف بوٹ کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے کہ یہ کب کنارے پر پہنچے گی اور کہاں پہنچے گی۔"

"میرا اندازہ ہے کہ رات کے وقت سفر میں آٹھ دس

گھنٹے لگ جائیں گے۔" محسن نے کہا۔ "بشرطیکہ ہم صحیح سمت میں چلتے رہے۔"

"اس سے زیادہ وقت بھی صرف ہو جائے تو پریشانی کی کون سی بات ہے۔ ضرورت کا سامان تو ہے نا؟"

"ہاں۔ نازو نے تو سب کچھ ہی لے لیا ہے جیسے پکنک پر جا رہے ہیں ہم۔" محسن بولا۔

"صبح تک تم بہرحال ساحل کے قریب پہنچ جاؤ گے۔ کوئی لانچ ماہی گیروں کی کشتی یا موٹر بوٹ تم کو سمندر سے نکال لے گی۔ تم ان سے کہہ سکتے ہو کہ ایک بیمار کو حاجی علی کی درگاہ پر لے جانے کے لیے چلے تھے۔"

"لانچ پولیس کی ہوئی تو انھیں مطمئن کرنا دشوار ہوگا۔" محسن نے کہا۔

"کیوں دشوار ہوگا۔ تیرا اپنا پاسپورٹ ہے۔ نازو کا اپنا۔ گل کا پاسپورٹ مت دکھانا ورنہ گڑبڑ ہو جائے گی۔"

"کیا گڑبڑ ہو جائے گی؟" نازو نے کہا۔

"بھئی اس کا نام گل خان لکھا ہوا ہے۔ اور تصویر بھی مردانہ لباس میں ہے۔" میں نے کہا۔ "آگے اس کا رول حسبِ ضرورت زنانہ بھی ہو سکتا ہے لیکن مردانہ رول میں وہ زیادہ کارآمد ثابت ہوگی۔ کیوں اور کیسے کا جواب تم آج رات کے سفر میں محسن سے پوچھنا۔"

"تم لوگ کب پہنچو گے؟" نازو نے کہا۔

"یہ سب تقدیر کے کھیل ہیں نازو۔" محسن بولا۔ "کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے اور اس کے برعکس گیدڑ کی شامت آئے تو وہ شہر پہنچ جائے جو جہاں سے چلے وہیں پہنچ جائے یا کوئے یار کے چکر میں سوئے دار پہنچ جائے ـــ بقول شاعر..."

"بھاڑ میں گیا شاعر۔" نازو نے بھنّا کے کہا۔

"کون سا شاعر؟ وہ!" اس نے غالب کی طرف اشارہ کیا جو اوپر سے ہاتھ ہلا رہا تھا۔ "اس کے ساتھ تم بھی جاؤ گی نا؟"

"یاد ہے نا کل جمعرات بھی ہے۔" میں نے کہا۔ "کمال ہوگیا۔"

"ہر بدھ کے بعد جمعرات ہی آتی ہے۔" نازو نے کہا۔ "کمال کی کیا بات ہے۔"

"مگر رابعہ ہر جمعرات کو نہیں آتی۔" محسن بولا۔ "اور یہ بات بھی وضاحت طلب ہے اس لیے دورانِ سفر سناؤں گا۔ کہ ہم نے جمعرات کی شام سے پہلے حاجی علی کی درگاہ پہنچ کے کیا کمال کیا۔"

"کل مغرب کے وقت رابعہ بھی وہاں پہنچ جائے گی۔"

میں نے کہا۔

"اچھا!" نازو نے خوش ہو کے کہا۔ "تمھیں یقین ہے۔"

"ہاں۔ جب میں پہنچ جاؤں گا سیکڑوں میل کی مسافت طے کر کے اور ہر آزمائش سے گزر کے تو وہ کیوں نہیں۔ اس کو آنا چاہیے۔" میں نے کہا۔ "اچھا اب جاؤ۔ خدا حافظ۔"

میں رسی کی سیڑھی کے سہارے اوپر چڑھ گیا۔ وہاں غالب سخت بیزار اور برہم کھڑا ہوا تھا۔

"یہ کیا الوداعی تقریبات میں آدھا گھنٹا گزار دیا۔" اس نے گھڑی دکھا کے کہا۔ "چھ بجنے والے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ دوسری پارٹی کو روانہ کر دینے میں۔" میں نے کہا اور دور جاتی ہوئی لائف بوٹ کو متلاطم موجوں سے نبرد آزما ہوتے اور اپنا راستہ بناتے دیکھتا رہا۔

"شاہد جمیل نے ان تینوں کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا ہے۔" غالب نے کہا۔ "وہ ہمارے ساتھ رہے گا۔"

"ہمارے ساتھ کیوں؟" میں نے کہا۔

"اسے جہاز کو بھی تو رواں رکھنا ہے۔" غالب نے کہا۔ اس دلیل نے مجھے قائل کیا۔ آدھے گھنٹے بعد ڈاکٹر مراد اور اس کے دو ساتھی ہم سے ہاتھ ملا کے اور ہمارا شکریہ ادا کر کے دوسری لائف بوٹ میں روانہ ہو گئے۔ ڈاکٹر بھنڈاری شراب کے نشے میں دُھت تھا اور اسے بڑی مشکل سے لائف بوٹ میں ڈالا گیا۔ لائف بوٹ کے روانہ ہوتے ہی میرے اندیشے درست ثابت ہوئے۔ ابھی وہ مشکل سے سو گز دُور گئے ہوں گے کہ ڈاکٹر بھنڈاری کو سمندر میں پھینک دیا گیا۔ یہ پیسے کا لالچ تھا جس نے باقی دو کو ایسا کرنے پر مجبور کیا۔ اب وہ ساری دولت آپس میں آدھی آدھی تقسیم کر سکتے تھے لیکن مجھے اس میں بھی شک تھا۔ مجھے بچپن میں پڑھی ہوئی وہ کہانی یاد آ رہی تھی جس میں اچانک خزانہ پا لینے والے تین دوستوں نے ایسے ہی لالچ کے جذبات سے مغلوب ہو کے ایک دوسرے کو قتل کر دیا تھا۔ ایک کھانا لینے شہر گیا تھا اور کھانے میں زہر ڈال کے لایا تھا۔ باقی دو اس کی عدم موجودگی میں اسے قتل کر کے ایک حصے دار کم کرنے کی قرارداد پاس کر چکے تھے۔ اس پر عملدرآمد کے بعد انھوں نے بھی آخری طعام نوش کیا اور اللہ کو پیارے ہوئے۔ کیا یہ کشتی پار لگے گی؟ کس کو جنگلے کا اندھیارا۔ کس کو ... کا دھوپ ...

جہاز پر اب شام کا سایہ گہرا ہونے لگا تھا اور ... احساس کا آسیب ماحول پر مسلط تھا۔ ان لاشوں کے علاوہ جو اوپر نیچے ہر جگہ نظر آتی تھیں ایک بند کمرے میں چھ افراد موت سے بے خبر پڑے تھے جو گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ ساتھ ان کی جانب بڑھتی آ رہی تھی۔ ایس ایس کلانتی نمبر ۵ بھی اپنے انجام سے بے خبر آگے بڑھتا جا رہا تھا اس لمحے کی جانب جو سمندر کی وسعت میں ایک جگہ موت کا جال پھیلائے کھڑا تھا۔ جہاں اس پرشکوہ متحرک فولادی قلعے کو ریزہ ریزہ ہو کے ہمیشہ کے لیے بحیرۂ عرب کی گہرائی میں کھو جانا تھا۔

تیسری لائف بوٹ میں بیس منٹ کے اندر اندر ہمارا روانہ ہو جانا لازمی تھا۔

"غالب! تو جا کے شاہد جمیل کو لے آ۔" میں نے کہا۔ "میں پیڈرو کو لاتا ہوں۔"

"پیڈرو... کیا وہ بھی ہمارے ساتھ رہے گا؟" غالب نے برہمی سے کہا۔ "یہ کیا بے وقوفی کی بات ہے۔ مرنے دے اسے بھی۔"

"ایسے نہیں مرزا۔ کم سے کم اتنا تو ہو کہ میں اسے خود پھانسی دے سکوں۔" میں نے کہا۔ "اس کے مرنے سے مجھے یہ اطمینان تو حاصل ہو کہ میں نے اپنے باپ کے قاتل کو سزا دی۔"

غالب کو مجھ سے اتفاق نہیں تھا مگر اس نے اختلاف کا اظہار بھی نہیں کیا اور شاہد جمیل سے بات کرنے چلا گیا۔ میں پلٹ کر نیچے اس تہ خانے میں پہنچا جہاں میں نے پیڈرو کو لال چیونٹوں کے ساتھ چھوڑا تھا۔

تہ خانے کا دروازہ پورا کھلا ہوا تھا۔ میں نے فوراً ریوالور نکال لیا اور ایک دم اندر داخل ہو گیا مگر اندر کوئی بھی نہیں تھا۔ میں پلٹ کے بھاگا۔ یہ میری بے وقوفی تھی کہ میں یوں سوچے سمجھے بغیر اندر گھس گیا تھا۔ سامنے والی دیوار کے کسی بھی سوراخ سے وہ مجھے نشانہ بنا سکتا تھا۔

غالب مجھے سامنے سے آتا ہوا ملا۔ "کیا ہوا؟"

"یار، وہ پیڈرو۔ وہ نکل گیا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ کیسے۔" میں نے کہا اور وہ دروازہ کھولا جس میں چھ افراد قید تھے۔ وہ سب موجود تھے۔ ان میں سے ایک مر گیا تھا اور باقی کی حالت غیر تھی۔

"سکندر! یار وہ شاہد جمیل بھی نہیں ہے۔" غالب نے کہا۔

میں ایک دم پلٹا۔ "کیا؟ شاہد جمیل بھی؟"

غالب نے اقرار میں سر ہلایا۔ "میں نے اسے ہر جگہ دیکھ لیا ہے۔ اتنی سی دیر میں وہ کہاں جا سکتا ہے؟"

میں نے اچانک خود کو انتہائی غیر محفوظ اور خطرے میں گھرا ہوا محسوس کیا۔ بیک وقت شاہد جمیل کا اور پیڈرو کا غائب ہو جانا متعدد خدشات کو جنم دیتا تھا۔ کیا پیڈرو نے شاہد جمیل کو مار کے سمندر میں پھینک دیا؟ اس وقت جب ہم لائف بوٹس کو رخصت کر رہے تھے؟ یا معاملہ اس کے برعکس ہوا۔ شاہد جمیل جہاز کی تباہی کے معاملے میں ہم سے اختلاف رکھتا تھا۔ ہر کپتان کی طرح اسے بھی جہاز کے ساتھ ایک جذباتی وابستگی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ہم جہاز کے عملے کے بعد جہاز کو بھی تباہ کر دیں۔ عملے کے افراد اس خاندان کی طرح تھے جس کا وہ خود سربراہ تھا۔ یہ جہاز ان کے لیے گھر تھا جس میں وہ آباد تھے۔ ہم نے اس کے خاندان کو قتل کر دیا تھا اور اب اس کے گھر کو نیست و نابود کرنے والے تھے۔ کہیں اس نے پیڈرو کو اس وعدے پر آزاد نہ کر دیا ہو کہ وہ جہاز کو بہ حفاظت بندرگاہ تک پہنچائے گا۔ ظاہر ہے پیڈرو خود بھی یہی چاہتا تھا اور اس کی ضمانت دے سکتا تھا۔

اب وہ اسی جہاز میں کہیں روپوش تھے اور ہمارے لیے یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ اتنے کم وقت میں انھیں تلاش کریں۔ میں اس وقت میں اضافہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ صرف محسن جانتا تھا کہ ٹائم بم کہاں ہیں اور وہ جا چکا تھا۔ اگر ہم فوری طور پر لائف بوٹ میں فرار ہونے کی کوشش کرتے تو یہ بات تقریباً یقینی تھی کہ پیڈرو جو کہیں چھپ کر سب دیکھ رہا ہوگا ہم پر مشین گن کا منہ کھول دے گا۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ شاہد جمیل یا پیڈرو نے مل کے ٹائم بم تلاش کر لیے ہوں اور انھیں ناکارہ کر دیا ہو۔ گھڑی کی سوئیاں تیزی سے آگے بڑھ رہی تھیں اور ابھی تک میں کوئی فیصلہ نہیں کر پایا تھا۔

مجھے اپنے پیچھے ایک جنوں خیز قہقہہ سنائی دیا جس میں ایک ایسی پُرآسیب کیفیت تھی کہ یہ ویران کھنڈر میں اجل گرفتہ آوازوں کی بازگشت محسوس ہوتی تھی۔

میں چونک کے پلٹا تو مجھے اپنے مقابل شاہد جمیل دکھائی دیا۔ اس کی صورت پر عیاں وحشت کے آثار نے مجھے بتا دیا کہ وہ اپنے ذہنی توازن سے محروم ہو چکا ہے۔ وقت کے بے رحم فیصلوں اور اپنے غلط اندازوں نے اس کے سب خوابوں کو چکنا چور کر دیا تھا اور اس سے سب کچھ چھین لیا تھا۔ وہ ماضی، حال اور مستقبل سے محروم احساس کے خلا کی بے سمت وسعت میں سرگرداں ایک بے وجود لمحے کا عکس رہ گیا تھا۔

یکلخت وہ بے گھر ہو گیا تھا اور لاوارث رہ گیا تھا۔ ایک گھر وہ تھا جس کی حسرتِ تعمیر میں وہ ساحلوں سے سمندروں تک بھٹکتا رہا اور دولت سمیٹ کر اپنے بیوی بچوں کو دیتا رہا تاکہ وہ دنیا کے بازار سے اپنے لیے ساری آرزوئیں اور سب

خوشیاں خریدلیں۔ اس گھر سے اس کی جذباتی وابستگی میں خون کا رشتہ تھا۔

دوسرا گھر یہ جہاز تھا جس میں اب وہ تنہا رہ گیا تھا۔ اس کے عملے کا ہر فرد جس کو وہ اپنے خاندان میں شامل سمجھتا تھا، بے مروت یا بے وفا ثابت ہوا تھا اور اسے چھوڑ کے جا چکا تھا۔ اب ہم رہ گئے تھے جو اس گھر کے وجود کو بھی پُرزہ پُرزہ کر کے سمندر میں بکھیر دینا چاہتے تھے۔

اور شاہد جمیل نے فیصلہ کر لیا تھا کہ گھر والے نہیں رہے تو کیا، گھر تو ابھی ہے اور وہ مرتے دم تک اس کی حفاظت کرے گا اور اس کے ساتھ موت میں بھی وہ تعلق برقرار رکھے گا جو زندگی میں تھا۔ میں اس کی ذہنی کیفیت کو سمجھ سکتا تھا کیونکہ میں نے جہازوں کے ساتھ کپتانوں کے تعلق کی وہ سب کہانیاں سنی تھیں جن میں ایسا ہی ہوا تھا۔

شاہد جمیل کے ہاتھ میں ایک مشین گن تھی لیکن میرے لیے اطمینان کی بات یہ تھی کہ اس کا رخ ہماری طرف نہیں تھا ورنہ اس سے گولی بلا ارادہ بھی چل جاتی۔ جہاز کے ہچکولے یہ ظاہر کرتے تھے کہ اب یہ سفینہ کسی ناخدا کے بغیر موت کے ساحل کی سمت خود ہی رواں ہے۔ اسے دستِ اجل نے منزل تک لے جانے کے لیے اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔

"شاہد جمیل!" میں نے سکون سے کہا۔ "کیا تم ہمارے ساتھ نہیں چلو گے؟"

"نہیں۔ تم مجھے ساتھ نہیں لے جا سکتے۔" اس نے پھر بے وجہ قہقہہ مارا۔ "تم مجھے مجبور نہیں کر سکتے۔ کوئی زبردستی نہیں کر سکتے میرے ساتھ۔ اگر تم نے اس کی کوشش کی تو خود بھی نہ جا سکو گے۔"

"شاہد صاحب! جہاز ڈوبنے والا ہے۔"

"جہاز۔ کون سا جہاز؟" وہ بولا۔ "میرا گھر ڈوبنے والا ہے۔ دیکھو، کیسا طوفان آیا ہے۔ میری زندگی گزر گئی ایسے طوفانوں کا مقابلہ کرتے۔ میں اسے بچا لوں گا۔ جیسے پہلے کئی بار بچایا تھا۔ مگر تم جاؤ۔ تمہارا گھر تو نہیں ہے یہ۔"

اس سے بحث کرنا فضول تھا کہ وہ اپنا فیصلہ بدل دے۔ اس کے لیے وقت بھی نہیں تھا۔

میں نے کہا۔ "ہمارا ایک قیدی تھا۔ استاد پیڈرو؟"

"وہ بھی گیا۔ میں نے کہا کہ جاؤ۔ میرے گھر سے تم سلامتی کے ساتھ جا سکتے ہو۔ تم نے جو کیا، اچھا نہیں کیا۔ میں نے بھی جو کیا، اچھا نہیں کیا۔ مجھے میرے اعمال کی سزا ملی۔ تم کو سزا دینے والا میں کون ہوتا ہوں۔ خدا کا عذاب نازل ہو گا تم سب پر۔ کہ تم نے میرا گھر تباہ کیا۔ کاش وقت مجھے مہلت دیتا کہ میں بھی اسی طرح تمہارے گھر تباہ کر سکتا۔" وہ اب رو رہا تھا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے اس کے پُروحشت چہرے پر بہہ رہے تھے۔

"وہ۔ کب گیا۔ اور کیسے...؟"

"مجھے نہیں معلوم۔" وہ چلّایا اور اس نے اچانک مشین گن اٹھا لی۔ "جاؤ تم بھی۔ میں تم کو قتل کرنا نہیں چاہتا اپنے گھر میں۔ حالانکہ تم بھی قاتل ہو میرے گھر کے۔ میرے جہاز کے۔ مگر اپنے آخری وقت میں اس کے وجود کو میں کسی کے خون سے داغدار نہیں دیکھ سکتا۔"

میں نے غالب کو اشارہ کیا۔ "لائف بوٹ اتار دو۔"

"لیکن وہ..." غالب نے چاروں طرف دیکھ کے کہا۔

"وہ اندر ہی ہے۔"

"ہے تب بھی ہم کیا کر سکتے ہیں؟" میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ "صرف دس منٹ باقی ہیں۔"

کچھ سوچنے سمجھنے کے لیے وقت نہیں رہا تھا۔ میں نے اور غالب نے لائف بوٹ کو سمندر میں پھینک دیا۔ میں نے ایک آخری نگاہ شاہد جمیل پر ڈالی جو اب مشین گن پھینک چکا تھا اور مغرب میں غروب ہوتے سورج کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اپنی زندگی کی آخری روشنی دیکھ رہی تھیں مگر وہ خود شاید وسعتِ افلاک اور حدِ امکان سے آگے ابد کے ساحل پر اتر چکا تھا۔

پہلے غالب نے اور پھر میں نے متلاطم سمندر میں چھلانگ لگائی۔ اس وقت میں بالکل تیار تھا کہ کسی بھی سمت سے آنے والی گولیوں کی بوچھاڑ مجھے ہوا میں ہی چھلنی کر دے۔ اتنے کم وقت میں استاد پیڈرو کا فرار ہو جانا بعید از قیاس تھا۔ اس کی حالت بھی ایسی نہ تھی کہ وہ سمندر کی موجوں سے لڑ کے اور ایک بار پھر دستِ قدرت کی یاوری پر انحصار کرتے ہوئے اس وقت تک تیرتا رہے جب تک کہ کہیں سے غیبی امداد نہ پہنچ جائے۔ ایسا ایک بار ہو چکا تھا۔ امید رکھنے والے کو یہ منطق قائل نہیں کرتی کہ خوشگوار اتفاقات بار بار پیش نہیں آتے۔

پیڈرو یقیناً اندر ہی تھا اور شاید اس نے جہاز کے اس کے لیے اسلحے کے ذخیرے کو تباہی سے بچانے کی کوئی صورت نہیں رہی تھی چنانچہ اس نے اپنی زندگی بچانے کا فیصلہ کیا ہو گا۔ اس کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی یہ وقت ٹائم بم کو تلاش کرنے میں نہ گنواتا۔ میں جہاز کے آخری کھلے حصے میں چلا جاتا جہاں سے میں دھماکے کے بعد سمندر میں جا گرتا تو کسی تختے کے سہارے تیر کر دور نکل جانے کی امید کر سکتا تھا۔

لیکن میرے لیے یہ خطرہ اپنی جگہ پوری اہمیت رکھتا تھا کہ پیڈرو عرشے کے آخری حصے پر موجود ہوا تو وہ ہمیں اتنی

آسانی سے نکل جانے کا موقع نہیں دے گا۔ وہ کوشش ضرور کرے گا کہ ہماری لاشیں اس جہاز سے پہلے غرقاب ہو جائیں۔

اور میرا اندازہ اس وقت درست ثابت ہوا جب بحری جہاز کی بلندی سے اڑتا ہوا میں سمندر کی متلاطم آغوش میں گر رہا تھا۔ پانی میں گرتے ہی لائف بوٹ میں ہوا بھر گئی تھی اور اس کے بیضوی کنارے پھول کے گاؤ تکیے کی طرح ہو گئے تھے۔ یہ کشتی چاروں سمت میں ایک حفاظتی حصار کا کام بھی دیتا تھا۔

جب میں نے لہروں کے شور میں فائر کی آوازیں سنیں تو مجھے اپنی بے اختیاری کا احساس ہوا۔ اس لمحے پر اگر اختیار تھا تو صرف نوشتۂ تقدیر میں بقا و فنا کے فیصلے تحریر کرنے والی قوت کو۔ اور یہ فیصلہ مجھے معلوم نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر اسی لمحے میں میرے سفرِ حیات کی آخری منزل آ جاتی تو اوپر سے نیچے تک آتے ہوئے ایک خاص بلندی پر وہ گولی میرے جسم سے ضرور گزرتی جس پر دستِ قدرت کی تحریر میں میرا نام لکھا ہوتا۔

لیکن ایسا نہیں ہوا۔ میں پانی میں گرا اور ایک مختصر فاصلہ میں نے تیر کر طے کیا۔ مجھے صرف اتنا احساس تھا کہ لہروں کی گھن گرج سے الگ بھی ایک آواز ہے جو اس ماحول کا حصہ نہیں۔ یہ گولیوں کی آواز تھی، گولیاں نہ جانے کس سمت سے آ رہی تھیں اور کہاں جا رہی تھیں۔ نہ میں دیکھنا چاہتا تھا اور نہ دیکھ سکتا تھا۔ میری ساری جدوجہد لائف بوٹ میں سوار ہونے اور اس کے بعد جلد از جلد دور نکل جانے کے لیے تھی۔

اسے میں بہت کچھ کہہ سکتا ہوں۔ اتفاق، خوش قسمتی، تائیدِ ایزدی، شاید سب کا ایک ہی مفہوم ہو گا لیکن میں یہ ہرگز دعویٰ نہیں رکھتا کہ ہمارے بچ جانے میں ہماری خواہش کے ساتھ کوشش کا دخل بھی تھا۔ وہ کوئی اور ہی ہاتھ تھا، بچانے والا ہاتھ جس نے سمندر کو متلاطم رکھا تا کہ مارنے والا ہاتھ بہک جائے جس نے نشانے کی زد میں آئی ہوئی چھوٹی سی لائف بوٹ اور اس کے دو عاجز مسافروں کو تحفظ دیا۔ اس کشتی میں ایک ہلکی کے برابر سوراخ ہو جاتا تو اس کی سب ہوا نکل جاتی۔ ایک کسی محفوظ ترین حصے میں پناہ لے لی تھی۔ وہ جہاز کے بارے میں مفصل معلومات رکھتا تھا کہ اس کے کس حصے میں کیا ہے۔ مشین گن کی اگلی ہوئی ان گنت گولیاں تو ایک پورا فلیٹ ڈبو سکتی تھیں لیکن لائف بوٹ کو کسی گولی نے نہیں چھوا۔ بعد میں جب میں نے غور کیا تو میرے ذہن نے بہت سے عوامل تلاش کر لیے۔ مثلاً یہ کہ پیڈرو زخمی تھا۔ وہ شاید سیدھا کھڑا بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ ہچکولے کھاتے جہاز پر وہ مشین گن اٹھا کے صحیح سمت میں کیسے نشانہ لے سکتا تھا۔ پھر نشانہ بھی ساکت کہاں تھا۔ موجوں کا تلاطم ہر لمحہ ہمیں زیر و زبر کر رہا تھا۔

لیکن اس وقت صرف یہ ہوا کہ غالب نے ہاتھ بڑھا کے مجھے اوپر کھینچ لیا۔ میرے کپڑے پانی میں شرابور تھے اور میں ہانپ رہا تھا۔ کچھ کہے بغیر غالب نے میرے ہاتھ میں ایک چپّو پکڑا دیا۔ یہ تقریباً آٹھ فٹ لمبا بہت ہلکا مگر مضبوط ڈنڈا تھا جس کے دونوں کنارے بیضوی شکل کے اور چپٹے تھے۔

میں نے اور غالب نے بحری جہاز سے دور ہونے کی ایک دیوانہ وار جدوجہد کا آغاز کیا، تب بھی ہمیں معلوم نہ تھا کہ زندگی اور موت کی سرحد ہم سے کتنی دور ہے اور ہم یہ سرحد عبور کر لیں گے یا اس سے پہلے ہی قضا آ جائے گی۔ مجھے معلوم تھا کہ پیڈرو فائر کر رہا ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ ٹائم بم کے پھٹنے کا وقت ہو گیا ہے۔ نہیں ہوا تو شاید چند منٹ باقی ہوں گے۔ دو گھڑیاں آپس میں ملتی نہیں۔ دھماکا دو چار منٹ پہلے بھی ہو سکتا تھا اور دو چار منٹ کی تاخیر سے بھی۔ پہلا دھماکا حرفِ آغاز تھا۔ اس سے جہاز پر لدے ہوئے کروڑوں روپے مالیت کے اسلحے کی تباہی کا سلسلہ شروع ہونا تھا۔ ایک کے بعد دوسرا، پھر تیسرا۔ ہر گودام کا آتش گیر مادہ ایک الگ دھماکا کرے گا۔ مگر یہ سب مسلسل ہو گا۔

میں اس وقت غالب کو بھولا ہوا تھا اور غالب مجھے۔ ہم دونوں کو قطعی احساس نہ تھا کہ ہمارے بازو شل ہو رہے ہیں۔ ہم سمندر سے لڑ رہے تھے۔ زندگی کی چاہت، امید اور آرزو ایک پیہم جدّوجہد بن گئی تھی۔ یہی آخری وقت تک شکست تسلیم نہ کرنے کا جذبہ تھا جو ہماری توانائی بن گیا تھا، دعا بن گیا تھا اور یقین بن گیا تھا۔

معلوم نہیں کتنی صدیوں پر محیط لمحوں، سیکنڈوں اور منٹوں کا سفر تھا جو یکلخت تمام ہوا۔ اچانک ہر آواز تھم گئی۔ سمندر ساکت ہو گیا۔ اس سکوت نے فضا کو خوف سے بھر دیا۔ ہوا رک گئی۔ ہمارے دل کو دھڑکنا یاد نہ رہا۔ ہمارے ہاتھوں کی حرکت ختم ہو گئی۔ جدوجہد کی مہلت تمام ہوئی۔

دھماکا ہوا تو میری نظر جہاز پر ٹھہر گئی۔ جہاز کتنی دور تھا، معلوم نہیں۔ فاصلے کی اہمیت ہی کہاں تھی۔ کیا ہم محفوظ فاصلے تک پہنچ چکے تھے؟ معلوم نہیں، ایک گز، ایک فرلانگ، ایک میل سب اس وقت برابر تھے۔ ہم پُل صراط پر سے گزر رہے تھے۔

میرے کانوں اور آنکھوں نے دھماکا ہوتے ہی جیسے پوری کائنات کو مرتعش ہوتے اور منتشر ہوتے دیکھا، سنا اور محسوس کیا۔ وہ ایک شورِ محشر تھا جس نے زمین اور آسمان کو دہلا دیا۔ سورج کا آتشیں گولا مغرب کے افق پر آتشیں اجالا پھیلا رہا تھا۔ یکلخت یہ شفق جہاز کے اوپر آ گئی، بجلی مسلسل چمکی اور گھن گرج کے ساتھ طوفانی ہوائیں چلنے لگیں۔

سمندر ایک دم مشتعل ہو کے اٹھا۔ ایک لہر نے لائف بوٹ کو اوپر اُٹھا لیا ـــــ میں نے غالب کا ہاتھ تھام لیا اور ہم لائف بوٹ سے چمٹ گئے۔ نہ جانے کتنی بلندی پر لے جا کے لہر نے ہمیں اُچھال دیا۔ دوسری لہر نے لائف بوٹ کو کیچ کیا اور آگے پھینک دیا۔ ہر دھماکا خواہ وہ کسی بم کا ہو یا ایٹم بم کا، فضا میں ایک خلا پیدا کرتا ہے۔ اس خلا کو پُر کرنے کے لیے ہوا ایک بگولے کی طرح دوڑتی ہے۔ ہوا کی یہ لہر جو شاک ویو کہلاتی ہے، انسانوں کو اور کھمبوں کو، درختوں کو اور عمارتوں کو گراتی جاتی ہے۔ سمندر میں اس موجِ ہوا نے لہروں میں وہ تلاطم پیدا کیا جس نے ہمیں تنکے کی طرح آگے پھینکا۔ دوسرے دھماکے سے دوسری لہر آئی جو پہلی لہر کے بالکل پیچھے اس کے تعاقب میں تھی۔

ہولے سے بھری ہوئی کشتی اُلٹ نہیں سکتی تھی۔ پانی کے جان لیوا تھپیڑوں نے کئی بار کوشش کی مگر نہ میں نے غالب کو چھوڑا اور نہ کشتی کو۔ بالآخر لہریں آپس میں ٹکرا کے ٹوٹ گئیں۔

میں نے خود کو سنبھالا اور سر اٹھا کے دیکھا تو میرے مُنہ پر نمکین پانی کی بوچھاڑ آئی۔ نمک کا ذائقہ میرے لبوں کو کاٹ رہا تھا لیکن میں نے محسوس کیا کہ میں مسکرا رہا ہوں۔ یہ اندر کی خوشی تھی جو میرے وجود سے پھوٹ رہی تھی اور خود بخود لبوں تک آ گئی تھی۔

دُھوئیں کا ایک مرغولہ اوپر اٹھ کے بادل سا بنتا جا رہا تھا۔ اس کے وسط میں آگ تھی جس کے شعلوں کی زبانیں اوپر لپک رہی تھیں۔ "ایس ایس کرانتی تھرڈ" ایک آتش فشاں پہاڑ بن گیا تھا جو لاوا اُگل رہا ہو۔ جہاز کے جسم کے سیکڑوں چھوٹے بڑے فولادی اور لکڑی کے ٹکڑے، اسباب کے پُرزے اور آتشیں اسلحے کے اجزا سیکڑوں فٹ کی بلندی تک اُڑتے جاتے تھے۔ یہ کسی آتش بازی کے منظر سے کم دلکش نظارہ نہ تھا۔ شعلوں کے ٹکڑے اور دہکتے انگارے تاریک آسمان کے پس منظر میں زیادہ نمایاں دکھائی دیتے تھے جو شہابِ ثاقب کی طرح ایک قوس کی صورت میں لہراتے آتے تھے اور سمندر میں گم ہو جاتے تھے۔ آسمان تک اٹھنے والے شعلوں کے نارنجی رنگ نے لہروں میں بھی آگ سی لگا دی تھی۔

یہ ایسا مسحور کُن اور دلکش نظارہ تھا کہ میں گرد و پیش سے بے خبر اس میں گُم رہا۔

اچانک غالب نے کہا۔ "یہ کتنا دل خوش کُن منظر ہے جو ہم دیکھ رہے ہیں۔"

میں بے اختیار ہنسنے لگا۔ "یہ ہماری فتح کے جشن کی خوشی میں آتشبازی کا منظر ہے۔"

"کیا اس منظر کو وہ سُوّر کا بچّہ بھی دیکھ رہا ہوگا؟" غالب نے کہا۔

میں سمجھ گیا کہ اس کا اشارہ پیڈرو کی طرف ہے۔ "خدا کرے کہ دیکھ رہا ہو۔ اس کی اذیت کا احساس مجھے تسکین دیتا ہے۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ مر گیا ہو۔"

"نہیں یار! ایسے بے غیرت یوں نہیں مرتے۔ وہ بچ گیا ہوگا اور میری تو خواہش ہے کہ وہ ابھی نہ مرے۔" میں نے کہا۔

غالب نے حیرانی سے میری طرف دیکھا۔ "تو اس کی درازیٔ عمر کی دعا کر رہا ہے۔"

"ہاں۔ اس لیے کہ میں اس کے لیے بہادری اور آبرومندی کی موت نہیں چاہتا۔ میری آرزو ہے کہ وہ پھر میرے مقابل آئے، ایک مجرم کی حیثیت سے۔ جب انصاف کی کرسی پر بیٹھ کے میں اس کی فردِ جرم پڑھوں اور پھر اسے اتنی ہی ذلت آمیز موت ملے جتنی ذلت آمیز اس کی زندگی تھی۔"

"اگر وہ بچ گیا ہوگا تو ہمارے اور اس کے راستے پھر کہیں نہ کہیں ملیں گے۔" غالب نے کہا۔

"مجھے شاہد جمیل کے مرنے کا رنج ہے۔ حالانکہ یہ بڑی باعزت اور قابلِ فخر موت تھی۔" میں نے کہا۔ "اور میرا دل اس خیال سے بھی بوجھل ہے کہ اس کے ذمّے دار ہم تھے۔"

"وہ بہادر اور عالی ظرف آدمی تھا۔ اس نے اپنے لیے خود موت قبول کی مگر ہمیں معاف کر دیا۔" غالب نے کہا۔

اب رات کا تاریک سایہ سمندر پر پھیل چکا تھا۔ ہم بحری جہاز کے جلتے ہوئے ڈھانچے سے ایک میل یا شاید زیادہ دور تھے اور لہروں کے ساتھ ہمارا بے سمت سفر جاری تھا۔ جہاز کا روشن ہیولا اب کسی الاؤ کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ وہ سب شعلے اور انگارے ڈوب چکے تھے جو آسمان کی کالی چادر پر اڑتے رہے تھے۔

میں نے اور غالب نے پھر چپّو سنبھالے جو ہمارے جسم کے بوجھ سے دبے ہوئے لائف بوٹ میں پڑے رہے تھے۔ یہ ضروری تھا کہ ہم اپنی سمت کو اندازے کی حد تک درست رکھیں۔ ابھی سورج ہماری نظروں کے سامنے غروب ہوا تھا۔ چنانچہ ہم سمت کا تعین کر سکتے تھے۔ "ایس ایس کرانتی تھرڈ" کی چِتا سے بھی ایک نظر میں اندازہ ہو جاتا تھا کہ شمال کدھر ہوگا۔ ہمیں جنوب کی طرف جانا تھا اور صاف آسمان ایک حوصلہ افزا علامت تھی۔ ہم رات کو قطبی ستارے سے مدد لے سکتے تھے۔

ایک گھنٹے بعد جب ہم مزید ایک میل دور جا چکے تھے "ایس ایس کرانتی تھرڈ" جو پہلے ایک آتش فشاں تھا، سمٹ کر ایک شعلہ رہ گیا تھا۔ میں اور غالب اس پر نظر جمائے بیٹھے رہے۔ یہاں تک کہ یہ شعلہ فقط ایک چنگاری رہ گیا۔ پھر یہ چنگاری بھی غائب ہو گئی۔ رات کا پُرہیبت اندھیرا اور سمندر کا شور رہ گیا۔ ہم نے دشمن کے ایک قلعے کو نیست و نابود کر دیا تھا۔ وہ سب اسلحہ غرقِ آب کر دیا تھا جو میرے ہم وطنوں کے خلاف استعمال ہو سکتا تھا۔

اس فتح کے احساس میں بیک وقت فخر و مسرّت کے ساتھ شکر گزاری اور اطمینانِ قلب کے جذبات شامل تھے۔ بلاشبہ یہ خدا کی ذات ہی تھی جس نے مجھے توفیق، استقامت اور ہمّت عطا کی تھی اور میری کامیابی کے اسباب مہیا کیے تھے۔ سب سے فرحت و طمانیت دینے والا خیال یہ تھا کہ میں نے ہزاروں مسلمان، مُحبِ وطن پاکستانیوں کو، ان کے گھروں کو اور اہل و عیال کو تباہی سے اور موت سے بچا لیا۔ بچانے اور مارنے والا تو ایک ہی ہے لیکن میں نے اتنا ضرور کیا کہ اس موت کے سامان کو ضمیر فروش اور غدار قاتلوں تک نہیں پہنچنے دیا۔ اگر یہ سارا اسلحہ تخریب کاروں اور علیحدگی پسندوں کے ہاتھ لگ جاتا تو کتنا نقصان ہوتا! اس کا حساب اندازے سے بھی کرنا محال تھا۔ بس مجھے خوشی تھی کہ وہ سب خون نہیں بہا۔ وہ سب گھر پیوندِ خاک نہیں ہوئے۔ ان سب عورتوں کا سہاگ نہیں اجڑا اور وہ سب بچے یتیم نہیں ہوئے جو اس تمام اسلحے کی تباہ کُن قوّت سے ہو سکتے تھے۔

یہ الگ بات ہے کہ ایسے نہ جانے کتنے جہاز ہیں جو پہلے بھی جا چکے ہیں اور آئندہ بھی نکل جائیں گے۔ زمین کے راستوں سے اور خشکی کے راستوں سے۔ انسانیت اور شرافت کا خون کرنے والوں کے درمیان تجارت جاری تھی۔ مگر پھر بھی۔ مجھے اَن گنت چہرے شکر گزار نظر آتے تھے۔ ان بوڑھوں، بچّوں، جوانوں اور عورتوں کے، جن سے میرا کوئی رشتہ تھا تو اخلاق کا یا مذہب، انسانیت کا اور وطن کا۔ جن کو میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا اور جو مجھے بالکل نہیں جانتے تھے لیکن جو میری کوشش سے محفوظ رہے تھے۔

"مجھے یقین نہیں آتا کہ... یہ سب ہو گیا۔" غالب نے اچانک اپنے آپ سے کہا۔

میں چونک پڑا۔ "ہاں۔ سب سے دشوار یہی کام ثابت ہوا۔ بعض اوقات تو میں مایوس ہو جاتا تھا۔"

"میں خود بے یقینی کا شکار تھا۔ وقت اور حالات پر کسی کا اختیار نہ تھا۔ سارے اندازے غلط ہوتے جا رہے تھے۔ ہم کچھ سوچتے تھے اور ہو جاتا تھا کچھ اور۔" غالب نے کہا۔ "میں اور نازو یہ محسوس کرتے تھے کہ شاید کرانتی تھرڈ پر آ کے ہم نے دُور اندیشی کا ثبوت نہیں دیا اور ہماری یعنی ہم سب کی حکمتِ عملی غلط تھی۔ کہیں یہ ہمارا واٹرلو یا لینن گراڈ کا معرکہ ثابت نہ ہو۔"

"تم دونوں نے وہ کام کیا جو شاید میں نہیں کر سکتا تھا۔ کوئی اور بھی نہ کرتا۔" میں نے کہا۔ "تم نے عملاً جان کی بازی لگا دی۔"

"اب بڑا عجیب لگتا ہے۔ وہ سب وقت جو ہم نے جہاز کے اندر گزارا۔ اداکاری کرتے، ڈرتے، سوچتے، امیدیں باندھتے اور توڑتے۔ جہاز کا پروگرام روز بدل جاتا تھا اور نئے اسباب پیدا ہو جاتے تھے پریشانی کے۔ تمہاری طرف سے کوئی صورت نہیں تھی رابطے کی اور یقین دہانی کی کہ تم سب وقت پر ضرور پہنچ جاؤ گے۔"

"واقعی۔ اس محاصرے نے بہت طول کھینچا اور اس دوران کیا کچھ نہیں ہوا۔" میں نے کہا۔

"یار، مجھے سردی لگنے لگی ہے۔" غالب نے کہا۔

"ابھی سے؟ ابھی تو پوری رات باقی ہے۔" میں نے کہا۔ "یہاں تو گیلے کپڑے گیلے ہی رہیں گے۔"

"مجھے بھوک بھی لگنے لگی ہے۔" غالب نے کہا۔

"اور بہت کچھ لگے گا، پیاس لگے گی، ڈر لگے گا لیکن اس سفر میں ہمارا زادِ راہ صرف ہمارا حوصلہ ہے اور عزم ہے۔" میں نے کہا۔

"کھانا چاہئے کافی کچھ نہیں۔" غالب نے سرد آہ بھر کے کہا۔ "میرا جسم ٹوٹ رہا ہے سمندر کے تھپیڑوں سے۔"

"میں بھی تھک گیا ہوں لیکن میں آرام کا صرف تصوّر کر سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "کہتے ہیں، نیند سولی پر بھی آ جاتی ہے۔ آج تجربہ ہوگا کہ آتی ہے یا نہیں۔"

غالب نے کہا۔ "کیا ہم صحیح سمت میں جا رہے ہیں؟"

"میرا خیال ہے، ابھی سے سمت کے بارے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ ابھی تو چلے ہیں۔ چلتے جائیں گے، جب تک امید اور یقین کا سہارا حاصل رہے گا۔" میں نے کہا۔

"معلوم نہیں، ہم ساحل سے کتنی دور ہوں گے۔"

"پچاس ساٹھ میل۔ سُو میل بھی ہو سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

غالب چُپ ہو گیا۔ ہم دونوں کے ہاتھ ایک میکانکی انداز میں چپّو چلا رہے تھے۔ تا حدِ نگاہ ایک پُرشور تاریک ویرانہ تھا جس میں اربوں کھربوں سال پرانے سمندر کے پانی کا تلاطم تھا۔ ہمارے دائیں بائیں سمندر کی انتہائی گہرائی تک ہزاروں اقسام کی سمندری مخلوق تھی لیکن وہ ہماری تنہائی کے احساس میں شریک نہ تھی۔ اس بے کنار و بے پایاں سمندر کی وسعت میں صرف ہم دو انسان تھے۔ جو باقی سب انسانوں کا تصوّر کر سکتے تھے جو کہیں بھی موجود تھے، جہاں تک ہمارے تصوّر کی رسائی تھی۔ کسی بھی حال میں تھے اور کچھ بھی کر رہے تھے۔ مگر وہ نہیں جانتے تھے کہ ہم کون ہیں اور کہاں ہیں۔ اور وہ ہمارا تصوّر بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اس دنیا میں کوئی اتنا اکیلا بھی ہو سکتا ہے، یہ میرے لیے

ایک بھیانک تجربہ تھا۔

"معلوم نہیں، وہ کہاں ہوں گے۔" غالب پھر بولا۔ وہ مجھ سے بات نہیں کرتا تھا۔ اس کے خیالات کسی ارادے کے بغیر الفاظ کا روپ دھار کے لبوں تک آجاتے تھے۔

"کہیں تو ہوں گے۔" میں نے چڑ کے کہا۔ "میں کیا بتاؤں۔"

"بس — ایسے ہی سوچ رہا تھا۔"

"میں سوچنا بھی نہیں چاہتا۔ ہر خیال مجھے خوفزدہ ہی کرے گا۔" میں نے کہا۔ "اپنے آپ کو مایوسی سے دور رکھنے کے لیے سوچ کے عذاب سے دور رہنا پڑے گا۔ تجھے بھی اور مجھے بھی۔ پہلے سے مت سوچ کہ کیا ہوگا جب کہ ہمارے اختیار میں کچھ نہیں، جو ہونا ہے، ہو جائے گا۔"

یہ عجیب سفر تھا جس میں ہم پر ہمارا خیال بھی بار تھا۔ خالی بوٹ میں پانی کی لہروں کا مقابلہ کرتے رہنے اور سمت کا خیال رکھنے کے سوا ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ ہونے کو بہت کچھ ہو سکتا تھا۔ کشتی میں ایک ننھا سا سوراخ ہو سکتا تھا۔ جو سارے عزمِ سفر کو ختم کرنے کے لیے کافی تھا۔ ہم ایسے گم ہوتے کہ تاحشر ہمارا سراغ نہ ملتا۔ ہم پر کوئی شارک یا وھیل حملہ کر سکتی تھی۔ ہماری جسمانی توانائی ختم ہو سکتی تھی جس کے بعد ہم اس لائف بوٹ کو سمندر کی لہروں کے رحم و کرم پر چھوڑنے کے لیے مجبور ہو جاتے اور بہتے بہتے کسی حسنِ اتفاق سے سلامتی کے ساحل تک پہنچ جاتے تو آگے سفر کی اگلی منزل کا ارادہ کرتے۔ ورنہ ارادہ کیا اور آرزو کیا۔ اگلے لمحے کوئی بھنور ہمیں فنا کی آغوش میں کھینچ سکتا تھا۔

وسوسے اور اندیشے، خطرات اور حادثات کا ڈر۔ امید کی کرن کو روشن رکھنے کی جدوجہد۔ ایمان اور یقین کا سہارا، جینے کی آرزو۔ سب کے ساتھ سفر جاری تھا۔ اندھیرے میں خواب روشن ہوتے تھے۔ یادوں کے عکس جھلملاتے تھے۔ چہرے فروزاں ہوتے تھے۔ آشنا، مہرباں، دلدار چہرے، محبتوں کے امین چہرے، رفاقتوں کے سفیر چہرے۔ وہ جو ساتھ تھے اور نہ رہے۔ اور وہ جو کل پھر روبرو ہوں گے۔ رابعہ، شہلا، مونی، استاد ٹیڈی اور انکل رضوی سب مجھے یاد آئے۔ سب نے میری دلجوئی کی اور میرے احساسِ تنہائی کے ڈپریشن کو ختم کرنے کی کوشش جاری رکھی۔

وہ سفر کی اور آزمائش کی، قوتِ برداشت اور یقین کے امتحان کی سخت ترین رات تھی اور شاید وہی ایک رات تھی جو میرے اعصاب کو شکست دے سکتی تھی۔ مجھ سے بدتر حال غالب کا تھا۔ ہم خاموش تھے اور بولتے تھے تو ایک دوسرے کو رفاقت فراہم کرنے کے لیے نہیں، اپنی بیزاری اور بے بسی کا بوجھ اتارنے کے لیے، اپنی فرسٹریشن کو منتقل کرنے کے لیے۔ ہم اپنے مزاج کی ساری شگفتگی اور خوش گفتاری، نرم خوئی اور عاجزی کھو بیٹھے تھے۔ اگر یہ کیفیت صبح تک رہتی تو شاید پاگل پن کے دورے میں ہم ایک دوسرے سے لڑتے، پھر ایک دوسرے کو مارتے اور انسانوں کی سطح سے گر کر دو وحشی جانور رہ جاتے جن کے احساس کو بھوک، تھکن، خوف اور عدم اعتماد نے شکست دے دی ہو۔

لیکن ایسا نہیں ہوا۔ رات کے کسی حصے میں جب ہم ہمت ہار چکے تھے اور لائف بوٹ میں نڈھال پڑے تھے، یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ سمندر کی لہروں پر ڈولتی ہوئی لائف بوٹ کس سمت میں رواں ہے۔ ہماری ساری کوشش خود کو کسی موج کے تھپیڑے سے سمندر میں گرنے سے بچانے کے لیے وقف تھی۔ میں نے ایک روشنی دیکھی۔ یوں تو پہلے بھی میں نے متعدد بحری جہازوں کو دیکھا تھا جو بہت دور سے گزر گئے تھے اور ان کی ساکت نظر آنے والی مدھم روشنیاں تاریکی میں کھو گئی تھیں لیکن یہ روشنی بہت واضح تھی اور میں نے اسے دوسری بار دیکھا تو پہلے کی نسبت زیادہ قریب آچکی تھی۔ سمندر کے پانی کی مسلسل مار سے میرا بدن سُن ہو رہا تھا لیکن میں نے غالب کے پاس جا کے اسے نزدیک آنے والی روشنی کی طرف متوجہ کیا۔

"یہ... کیا ہے۔ کوئی لانچ؟" غالب نے کہا۔

"لانچ یا موٹر بوٹ۔"

"مگر کس کی؟" غالب نے کہا۔ پھر اسے اپنے سوال کے احمقانہ ہونے کا احساس ہوا۔ "خیر ہمیں اس سے کیا۔" غالب بولا۔ "وہ ہمیں بچا لیں گے۔ یہی کافی ہے۔"

"لیکن کیا انھوں نے ہمیں دیکھ لیا ہے؟"

"دیکھا نہ ہوتا تو وہ سیدھے ادھر کیوں آتے۔" غالب بولا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "ہم انھیں اتنے فاصلے سے کیسے نظر آسکتے ہیں۔ دن کے وقت تو شاید وہ دیکھ لیتے۔"

غالب کے لہجے میں مایوسی اتر آئی۔ "تو نے ٹھیک کہا۔ اتنے بڑے سمندر میں ہم ایک تنکے کی طرح ہیں اور وہ کسی تنکے کو تلاش نہیں کر رہے ہیں۔"

"ہم ان کو ایس او ایس دیتے تب بھی اندھیرے میں ان کے لیے ہمارا سراغ لگانا دشوار ہوتا۔" میں نے کہا۔

"کیا ہم کسی طرح بھی ان کو متوجہ نہیں کر سکتے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "دن میں ہم کوئی کپڑا لہراتے، اپنی قمیص اتار کے بھی لہراتے تو شاید وہ دیکھ لیتے۔ رات کے وقت تو لائٹ سگنل ہی کام کرتا ہے۔ ہمارے پاس ٹارچ ہوتی تو شاید..."

روشنی کا رخ اب تک ہماری سمت میں تھا۔ یہ کسی کار کی ہیڈ لائٹ جیسی روشنی تھی۔ تیز اور ایک جگہ مرتکز۔ اور اس روشنی کے تیز تر ہونے سے ہی فاصلے میں کمی کا اندازہ ہوتا تھا۔ بظاہر یوں لگتا تھا کہ وہ لانچ یا موٹر بوٹ سیدھی اس طرف آرہی ہے جہاں ہم کسی غیبی امداد کے آسرے پر اپنی زندگی کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔

"وہ ادھر ہی آرہے ہیں۔" غالب نے مسرت سے چلّا کے کہا۔

میں نے کہا۔ "یہ ہو سکتا ہے کہ وہ صرف پچاس گز کے فاصلے سے گزر جائیں اور ہمیں نہ دیکھ پائیں۔"

"رات کے اندھیرے میں دیکھنے والی دوربین بھی ہوتی ہے۔"

"ہوتی ہے مگر اس وقت کون ہوگا۔ جو دوربین سے دیکھے گا اور کیا دیکھے گا یہاں؟" میں نے کہا۔

"ہیلو۔" غالب نے چیخ کر کہا۔ "ادھر دیکھو، ادھر، ہم یہاں ہیں۔ ہیلو۔"

"غالب!" میں نے کہا۔ "کیا ہو گیا ہے تجھے؟ وہ تیری آواز کیسے سن سکتے ہیں اس شور میں۔"

لیکن غالب ہاتھ اٹھا کے چلّاتا رہا۔ "ہیلو۔ ہماری مدد کرو۔ ادھر آؤ۔"

غالب کے مقابلے میں میرے دماغ کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بہتر طور پر کام کر رہی تھی۔ اس لانچ یا موٹر بوٹ میں گنے چنے افراد ہوں گے۔ ان میں سے بیشتر سو رہے ہوں گے، ایک دو ڈیوٹی پر ہوں گے تو اپنے پہلے سے متعین راستے پر رواں رہنے کی کوشش کے سوا کچھ نہیں کر رہے ہوں گے۔ موسم اچھا ہے اور راستہ صاف ہے۔ کسی دشواری کے بغیر ان کی لانچ چلتی جائے گی۔ وہ اطمینان سے گپ لگاتے رہیں گے یا سگریٹ، چائے، کافی پیتے رہیں گے۔ ان کو کوئی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوگی کہ وہ کسی وجہ کے بغیر دوربین سے سمندر پر نظر رکھیں۔

لیکن میری اس منطقی سوچ کی نفی وہ روشنی کرتی تھی جو لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ میں اب انجن کی آواز کو لہروں کے شور سے الگ سن سکتا تھا۔

میں نے غالب کو دیکھا۔ وہ دونوں ہاتھ اٹھا کے چیخ رہا تھا اور لانچ میں آنے والوں کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ حالانکہ ان کے کانوں تک یہ آواز پہنچ ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ لانچ کے کسی بند کیبن میں تھے۔ اندر انجن کے چلنے کی آواز تھی اور باہر سمندر کی لہروں کا شور تھا۔ اس کے باوجود نہ جانے کیا ہوا کہ میں نے بھی غالب کے ساتھ چلّانا شروع کر دیا۔ میں اپنے دونوں ہاتھ ہلا رہا تھا اور انگریزی کے علاوہ فرنچ میں مدد کے لیے پکار رہا تھا۔

پھر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ روشنی رُخ بدلے بغیر ہم سے سو دو سو گز تک آئی اور دور ہونے لگی۔ وہ کوئی لانچ تھی جس کے کیبن کی کھڑکی میں بھی روشنی نظر آرہی تھی۔ وہ اپنے سیدھے راستے پر چلتی جا رہی تھی اور یہ سیدھا راستہ ہماری سمت میں مگر کچھ فاصلے سے گزرتا تھا۔

چلّاتے چلّاتے ہمارا گلا درد کرنے لگا مگر لانچ کا رُخ نہیں بدلا۔ ہم نے اسے بہت قریب آکے دور ہوتے دیکھا۔ اس کے انجن کی آواز کا شور مدھم پڑنے لگا اور روشنی پھر تاریکی کے سمندر میں کھو گئی۔

شدید مایوسی نے ہم دونوں کو مغلوب کر لیا۔ ہم تھک کے لائف بوٹ میں گر گئے۔ بے رحم رات پھر ہمارے اعصاب پر سوار ہو گئی۔ ہم بے بسی سے اس سمت میں دیکھتے رہے جدھر وہ لانچ گئی تھی۔

"صبح تک کچھ نہیں ہو سکتا۔" میں نے کہا۔

"کیا صبح ہو گی؟" غالب نے تلخ ناامید لہجے میں کہا۔

اگر ہمارے پاس کچھ ہوتا۔ تھوڑا بہت سفر کا سامان، مثلاً کچھ کھانے پینے کے لیے۔ ایک کمبل، ترپال یا پلاسٹک شیٹ، تو حالات اتنے خراب نہ ہوتے۔ ہماری جسمانی توانائی کا گراف اتنا نہ گرتا اور ہم چپو چلاتے رہتے۔ گرم چائے یا کافی سے بھرا ہوا تھرماس بھی ہوتا تو بہت تھا۔ سگریٹ ماچس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پانی کی مسلسل بوچھاڑ میں دونوں استعمال کے قابل نہ رہتے۔ ہاں، ٹارچ ہوتی تو بہت کار آمد ثابت ہوتی۔ ہم روشنی کو جلا بجھا کے ہر طرف سگنل دے سکتے تھے۔ شاید یہ اشارہ کسی کو متوجہ کر لیتا۔ مگر ہم بالکل خالی ہاتھ تھے۔ روانگی سے پہلے ہمیں اسبابِ سفر ساتھ لینے کی جو مہلت مل سکتی تھی، وہ پیڈرو کی اور شاہد جمیل کی تلاش میں صرف ہو گئی تھی۔ ہم بڑی افراتفری اور عجلت میں روانہ ہوئے تھے چنانچہ کچھ بھی ساتھ نہیں لائے تھے۔

باقی رات کیسے گزری یہ خود مجھے بھی نہیں معلوم۔ میں نقاہت کا شکار تھا اور نیم بے ہوشی کے عالم میں آنکھیں بند کیے پڑا ہوا تھا۔ میرا تصور مجھے دھوکا دینے لگا تھا۔ کبھی مجھے یوں لگتا تھا جیسے میں اُڑ رہا ہوں اور لائف بوٹ ایک انجن والا ہوائی جہاز بن گئی ہے۔ پھر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کشتی ساکت ہے اور مجھ پر اُجلی تیز دھوپ پڑ رہی ہے۔ اس کی زندگی بخش تمازت میرے جسم میں پھیل چکی ہے۔ آنکھیں کھول کے دیکھنے پر میں نے اسی متلاطم اندھیرے سمندر کو اور پُرآسیب رات کو دیکھا۔

یہ نیند نہ تھی۔ یہ بے ہوشی بھی نہیں تھی۔ یہ صرف انتظار تھا۔ سفر کے ختم ہونے کا یا رات کے ختم ہونے کا۔ سفر یوں بھی تمام ہو سکتا تھا کہ اچانک لائف بوٹ جواب دے جائے۔ ایسی صورت میں ہم کسی قسم کی جدوجہد کے بغیر ڈوب جاتے۔ غالب کو تیرنا آتا ہی نہیں تھا اور میں اس قابل نہ تھا کہ تیر سکوں۔ ایک بار میں نے کسی شارک کو بھی دیکھا جو ہماری لائف بوٹ کے

ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ میرے ذہن میں وہ سب قصے تھے اور روایات تھیں جو ڈوب جانے والی کشتیوں اور جہازوں سے منسوب تھیں۔ یہ مشہور تھا کہ شارک مچھلیاں پہلے سے جان لیتی ہیں کہ سمندر کے سفر میں کون قضا کا نشانہ ہوگا اور وہ اپنے لقمۂ تر کے انتظار میں اس کے پیچھے چلتی جاتی ہیں۔

میں دہشت زدہ ہو کے اٹھ بیٹھا۔ میں نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے ہر طرف دیکھنے کی بے سود کوشش کی۔ مگر سوائے جھاگ اڑاتی موجوں کے میں کچھ بھی نہ دیکھ سکا اور آسمان بھی تاریک تھا۔ ستارے کہیں کہیں جھلملاتے نظر آجاتے تھے لیکن مجھے ان میں قطبی ستارہ دکھائی نہ دیا جس سے میں سفر کی سمت کا تعین کر سکتا تھا۔ لائف بوٹ حیرت انگیز طور پر لہروں کے سہارے بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کے اندر بھی پانی بھر گیا تھا اور ہم اس تالاب میں نصف ڈوبے ہوئے تھے۔ یہ لائف بوٹ کی ہوا کا دباؤ تھا جس کی وجہ سے وہ ڈوب نہیں سکتی تھی۔

ایک بار میں نے غالب کو ہاتھ لگا کے دیکھا۔ وہ بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا اور اس کا جسم سرد تھا۔

"ابھی مرا نہیں ہوں میں۔" غالب نے کمزور لہجے میں کہا۔

"میں بھی زندہ ہوں۔" میں نے اسے اطلاع دی۔

"وقت کیا ہوا ہے؟"

"معلوم نہیں۔ گھڑی میں شاید پانی چلا گیا ہے۔" میں نے کہا۔ "میں اندھیرے میں سوئیوں کو دیکھ بھی نہیں سکتا۔"

"چل چھوڑ۔ وقت معلوم ہو بھی گیا تو کیا ہوگا۔"

پھر نہ جانے کب مجھے ایسا لگا جیسے لائف بوٹ کو جھٹکا لگا ہے۔ میں نے انسانی آوازیں سنیں اور آنکھیں کھول کے دیکھا۔ لائف بوٹ کو ایک بادبانی کشتی نے روک رکھا تھا۔ اس میں جو لوگ تھے، وہ سب کنارے پر جھک کے ہمیں دیکھ رہے تھے۔

"کون ہیں یہ؟" کسی نے انگریزی میں کہا۔ "بے ہوش ہیں صرف، یا مر گئے؟" یہ کسی عورت کی آواز تھی۔

"ان کو اوپر کھینچو۔ ایسے نہیں بے وقوف۔" مرد نے ڈانٹ کر کہا۔ "دیکھو چوٹ نہ لگنے۔"

"یہ انڈین لگتے ہیں۔" عورت نے کہا۔

"مجھے تو یہ انسان لگتے ہیں۔" مرد نے طنزیہ انداز میں عورت کی بات کا جواب دیا۔ "کیا قومیت اور مذہب، پیشہ اور عمر حسب نسب اور بیوی بچوں کے بارے میں پہلے معلوم کروں؟"

"اتنے تلخ کیوں ہو جاتے ہو تم۔ کیا بات بھی نہ کروں میں؟"

"میں تو تم کو بے وقوفی کی باتیں کرنے سے بھی نہیں روکتا لیکن اس کا کوئی وقت ہونا چاہیے۔" مرد نے کہا۔

جب مجھے ایک رسی بغل میں سے گزار کے اوپر کھینچا جا رہا تھا تو یہ سب وہ گفتگو تھی جو میرے کانوں نے سنی۔ مجھ میں سر اٹھا کے اوپر دیکھنے کی ہمت بھی نہیں تھی لیکن مجھے یہ احساس ضرور تھا کہ میرے ہوش سلامت ہیں۔

"اندر لے جاؤ انھیں۔" مرد نے کہا۔ اس کا لہجہ خاصا تحکمانہ تھا جس سے دوسروں کے ماتحت ہونے کا اندازہ کیا جا سکتا تھا۔ وہ انگریزی بول رہا تھا لیکن اس کا لہجہ امریکن یا انگلش نہیں تھا۔ وہ اطالوی یا فرانسیسی بھی ہو سکتا تھا اور ترک یا اسپینی بھی۔ دنیا میں ایسے ملکوں کی تعداد کافی ہے جو "ڈی" اور "ٹی" کے لیے "دی اور تی" استعمال کرتے ہیں۔

"پہلے ان کو کمبل میں لپیٹ دو۔ ابھی کپڑے مت اتارو۔" اسی مرد نے کہا۔ "تم کیا کھڑی تماشا دیکھ رہی ہو؟"

"تمھارے خیال میں یہ سب مجھے کرنا چاہیے؟" عورت نے کہا۔

"اس کے علاوہ بھی کرنے کو بہت کچھ ہے۔ ان کے لیے کافی لاؤ۔ گرم اور سیاہ۔ جیسی کہ تم ہو۔" مرد بولا۔

پانی سے نکالے جانے کے دس منٹ بعد میرا جسم اپنی حرارت سے کمبل کے اندر اتنی توانائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ میں نے آنکھیں کھول کے غور سے دیکھنے کی کوشش کی مگر مجھے اندھیرے کے سوا کچھ محسوس نہ ہوا۔ شاید ابھی میں اس قابل نہیں ہوا کہ کچھ دیکھ سکوں۔ میں نے سوچا۔ مگر اسی وقت میرے چہرے پر سے کمبل ہٹا دیا گیا۔ میری آنکھیں کم روشنی میں بھی خیرہ ہونے لگیں۔

"ہیلو۔" مجھ پر جھکے ہوئے بھوری داڑھی اور سفید رنگت والے ادھیڑ عمر شخص نے کہا۔ "تم تو پہلے ہی ہوش میں آگئے ہو۔"

میں نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی۔ "میں بالکل ہوش میں ہوں۔ میرے ساتھی کا کیا حال ہے؟"

وہ ہنسا اور اس نے فرنچ میں ایک جملہ کہا جس کا مطلب کچھ یہ ہوتا تھا کہ اپنی خبر نہیں مگر دوسروں کی ہے۔

اس وقت میں نے سوچا کہ فرنچ بول کے اس کے ساتھ ہم زبان ہونے کا رشتہ استوار کر لوں لیکن پھر میں نے اس ارادے کو ملتوی کر دیا۔ ابھی میں نہیں جانتا تھا کہ یہ بھوری داڑھی والا کون ہے اور کسی شریفانہ ارادے کے ساتھ نکلا ہوا ہے یا کوئی اسمگلر قسم کی چیز ہے۔ اگر اس کا تعلق کسی خطرناک پیشے سے ہوا تو وہ ایک دم محتاط ہو جائے گا اور اپنی حقیقت کو مجھ سے چھپائے گا۔ بصورت دیگر یہ امکان باقی رہتا تھا کہ مجھے کچھ پوچھے بغیر ہی بہت کچھ معلوم ہو جائے۔

وہ ایک پُر تکلف بیڈ روم تھا۔ بیڈ آخری دو دیواروں کے ساتھ لگا ہوا تھا اور تقریباً چار فٹ چوڑا تھا۔ بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر کلاک ریڈیو تھا۔ دیواروں میں سے ایک پر زنانہ مردانہ

بڑے نیلے ہوئے تھے۔ دوسری پر فلمسٹار یا ماڈلز کے لائف پوسٹر تھے جو پردے پر لگائے گئے تھے اور پردہ ہلتا تھا تو لگتا تھا۔ جیسے وہ متحرک تصویر نہیں جیتی جاگتی عورت ہے۔ دونوں لوگ لباس سے بے نیاز تصاویر کو دیکھنے کے عادی۔ چنانچہ وہ ہمیں دیکھ رہے تھے۔

ہم قالین پر کفن میں لپٹے ہوئے مُردوں کی طرح پڑے تھے اور دیکھنے والوں میں سے دو میرے جیسے دیسی لوگ تھے۔ انڈین چہرے کے نقوش اور سانولی رنگت والے۔ وہ دونوں چست خاکی پتلونوں کے ساتھ بنیان میں تھے۔ دونوں کی بنیان بھی تنگ تھے۔ چنانچہ ان کے چوڑے سینے اور گٹھے ہوئے بازو زیادہ نمایاں تھے۔ ایک کے بنیان پر جیسی خنجر اور دوسرے کے بنیان پر خطرے کی علامت کھوپڑی اور ہڈیاں کراس کی شکل میں یہ ظاہر کرتی تھیں کہ وہ خود کو شوقین اور خطرناک ثابت کرنا چاہتے ہیں۔

پھر وہ عورت آگئی جس کو بھوری داڑھی والے نے "گرم اور سیاہ" کافی کہا تھا اور ٹھیک کہا تھا۔ اس نے منی اسکرٹ پہن رکھا تھا اور اس کی سڈول مضبوط ٹانگوں پر اسکن کلر کی اسٹاکنگ "ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے" کی عملی تفسیر تھی۔ وہ بے حد جوان عورت تھی جس کے لیے اپنی جوانی کو سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ بڑے طمطراق سے کافی لے کر آئی اور جب ٹرے رکھنے کے لیے جھکی تو "دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں" کوئی فاصلہ نہ رہا۔ اس کے بال سخت اور یوں اٹھے ہوئے تھے کہ شاید سیدھے نہیں ہو سکتے تھے چنانچہ اس نے بیا کے گھونسلے کا اسٹائل اپنا لیا تھا۔ جب وہ مسکرائی تو اس کے کالے لپ اسٹک لگے ہونٹوں کے درمیان موتیوں جیسے سفید دانت جھلملائے۔

"ہیلو۔ کیسا حال ہے؟" اس نے اردو میں کہا مگر یہ اکھڑی ہوئی زبان کے گوراشاہی لہجے والی اردو تھی۔

"اچھا ہے میم صاحب۔" میں نے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

میم صاحب کہلا کے وہ بے حد خوش ہوئی۔ "ویٹ۔" اس نے کہا اور پھر مجھے اپنے ایک بازو کو گردن کے نیچے ڈال کر ایسے سہارا دیا کہ مجھے تقریباً اپنی آغوش میں لے کر بٹھانے لگا لیا۔ یہ بالکل غیر ارادی حرکت تھی اور اس کا مقصد کچھ اور نہیں تھا مگر میں نے اس کے گدراتے ہوئے جوان جسم اور پرفیوم کی مہک سونگھی تو میں ایک دم ہوش میں آگیا۔

"تھینک یو۔" میں نے اپنے ہاتھوں کی مدد سے پیچھے دیوار کا سہارا لے لیا۔

بھوری داڑھی والا ہنسا۔ "گرمی تو دے دی اسے، اب کافی بھی دے دو۔ بلیک روز۔"

"شٹ اپ۔" اس نے بُرا مانے بغیر کہا اور کافی کا مگ مجھے تھما دیا۔ "یہ لو۔" اس نے دو گولیاں میری ہتھیلی پر رکھ دیں۔ "اسپرین ہے۔" پھر وہ غالب کی طرف متوجہ ہو گئی۔

میں نے اسپرین کو کافی کے ساتھ نگلنے کے بعد ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کر کے خدا کا شکر ادا کیا جس نے مجھے پھر زندہ رہنے کے مواقع فراہم کیے۔ پھر میں سوچنے لگا کہ مسٹر براؤن اور بلیک روز کو اپنے بارے میں کیا بتانا مناسب ہوگا۔ یہ غنیمت تھا کہ ابھی تک انھوں نے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ جو کچھ کہوں، غالب کے ہوش میں آنے سے پہلے نہ کہوں تاکہ اس کے اور میرے بیان میں فرق کا اندیشہ ہی نہ رہے۔

مسٹر براؤن نے یہ سوال بروقت داغا۔ "ویل۔ کون ہو تم لوگ؟ انگریزی تو سمجھ لیتے ہو؟"

"یس سر۔" میں نے کہا۔ "میرا نام امیر چند ہے اور یہ میرا بھائی ہے فقیر چند۔ باپ کا نام ہے دمڑی لال۔"

بلیک روز نے پلٹ کے کہا۔ "دونوں تمھارے بھائی لگتے ہیں حلیے سے تو۔" یہ بات اس نے فرنچ میں کہی تھی۔

"دیکھو نا ایسی ہی بھوری داڑھی ہے جیسی تمھاری۔ ہے نا؟" جو کچھ جواب میں اس نے کہا، وہ ایک فحش بات تھی اور اس کا مطلب کسی حد تک یہ تھا کہ اسے اب ایک کی جگہ تین چاہنے والے ملیں گے چنانچہ اسے اپنی فکر کرنی چاہیے۔

"آپ۔ کون لوگ ہیں؟" میں نے بڑی سادگی سے کہا۔

"میرا نام...؟" وہ سوچتے ہوئے بولا۔ پھر اس نے ایک فرنچ نام بتایا جو نام ہرگز نہیں تھا۔ اس لفظ کا مطلب ہوتا تھا بغیر باپ کا۔ مختصراً حرامی۔ اس نے یہ نام بڑی سنجیدگی سے بتایا تھا۔ چنانچہ میں سمجھ گیا کہ وہ اصل نام بتانا نہیں چاہتا اور شریف آدمی بہر حال نہیں ہے۔

بلیک روز نے غالب کو کافی پلاتے ہوئے ہنس کے کہا۔ "کم سے کم ایک باپ کا نام تو بتا دیتے۔"

"تم مجھے جان کہہ سکتے ہو۔" وہ بلیک روز کی بات کو نظر انداز کر کے بولا۔ "میں ایک بزنس مین ہوں۔ اب یہ مت پوچھنا مجھ سے کہ میرا بزنس کیا ہے۔"

"میں بتا دوں گی۔" بلیک روز نے پھر دخل دیا۔

"کالی کتیا۔ اپنی زبان بند رکھ۔ ورنہ میں سب کے سامنے...!" جان نے آگ بگولا ہو کے کہا۔

"تم کیا کر سکتے ہو۔ کیا بگاڑ سکتے ہو میرا؟" وہ اس کا تمسخر اڑاتے ہوئے نفرت اور حقارت سے بولی۔ "جب تک تم مجھے میرا حصہ نہیں دو گے خطرہ باقی رہے گا تمھارے لیے۔"

جان ایک دم نرم پڑ گیا۔" بلیک روز! یہ ہماری آپس کی بات ہے۔ سب کے سامنے جھگڑا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں وضاحت کر چکا ہوں ایک بار کہ میں بے ایمان آدمی نہیں ہوں۔"

" تم آدمی ہی نہیں ہو، شیطان ہو۔ اور مجھے کوئی غرض نہیں تمہارے نفع و نقصان سے۔ نہ میں وضاحت چاہتی ہوں۔ میں تو اپنا پورا حصہ چاہتی ہوں اور بس۔"

" او کے۔ او کے۔ ہم ایک بار پھر بات کریں گے لیکن ابھی نہیں۔" جان نے ہاتھ اٹھا کے کہا۔" پہلے ہم ان سے نمٹ لیں۔"

میں نے کافی ختم کر کے مگ اسے تھمایا۔" تھینک یو۔ کیا ایک سگریٹ مل سکتا ہے مجھے؟"

" میں سگریٹ نہیں پیتا۔" وہ بولا۔

بلیک روز نے نہ جانے کہاں سے ایک پیکٹ برآمد کیا اور میری طرف اُچھال دیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ کسی تربیت یافتہ نرس کی طرح غالب کو اسپرین دے رہی تھی اور اسے چمچے سے کافی پلا رہی تھی۔

" کیا... مجھے خشک کپڑے مل سکتے ہیں؟" میں نے سگریٹ کا ایک کش لے کر سکون اور راحت کے اور نئی توانائی کے احساس کے ساتھ کہا۔" مجھے سردی لگ رہی ہے۔"

" مل جائے گا۔"

" اور ہم نے کچھ کھایا بھی نہیں ہے۔ کل سے..." میں نے کہا۔

" فکر مت کرو۔ اب تم ہمارے ہاتھوں میں ہو تو سردی اور بھوک سے نہیں مرو گے۔" وہ بولا۔" ویسے تمہاری مرضی۔"

کیا اس بات کا یہ مطلب لیا جا سکتا تھا کہ ہم نے کسی بھی معاملے میں غیر ضروری تجسس کا مظاہرہ کیا اور دخل در معقولات کیا تو ممکن ہے ہمیں مرنا پڑے؟ میں نے سوچا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ میں اس کو فوری طور پر سوال جواب کی مہلت نہیں دینا چاہتا تھا۔ غالب کی حالت بہتر ہو رہی تھی اور مجھے امید تھی کہ میرے کپڑے بدل کے واپس آنے تک وہ پوری طرح ہوش میں آ چکا ہو گا۔

مجھے اٹھتا دیکھ کر جان نے اپنے حکم کے ایک غلام سے کہا۔" اس کو پہننے کے لیے کچھ دو۔ مگر..." اس نے دونوں کو اوپر سے نیچے تک دیکھا۔" یہ تو ہے آدمی۔"

وہ دونوں جو خود کو نارزن یا کنگ کانگ سمجھتے تھے اور ڈیل ڈول میں مجھ سے دُگنے تھے، اسے اپنی تعریف سمجھ کے مسکرائے۔

" میرے کپڑوں میں دیکھو۔ جو پرانے کپڑے میں مسترد کر چکا ہوں، اُن میں سے ان کا سائز نکل آنا چاہیے۔" جان نے کہا اور پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔" لیکن جوتے نہیں ہیں میرے پاس۔"

" کوئی بات نہیں۔ انھی جوتوں سے کام چل جائے گا۔ جب یہ خشک ہو جائیں گے۔" میں نے اپنے پھولے ہوئے بدرنگ جوتوں کو دیکھ کر کہا۔

سینے پر جیسی ڈانسر کو سندِ مردانگی کے طور پر سجانے والے نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

" فار ہیون سیک۔" جان نے سر پر ہاتھ مار کے کہا۔" میرے قالین کا ناس تو مت کرو۔"

" سوری۔" میں نے کہا اور دونوں جوتے اتار کے ہاتھ میں اٹھا لیے۔ ابھی تک قالین اس لیے محفوظ تھا کہ ہم کمبلوں میں لپٹے پڑے ہوئے تھے۔ جب میں کھڑا ہوا تو پانی جوتوں میں بولنے لگا۔ اسٹیج پر دیہاتی مسخرے کا کردار ادا کرنے والے کی طرح میں کمرے سے یوں باہر گیا جیسے وہ دیہاتی کسی ایوانِ صدر کی خوابگاہ سے نکل رہا ہو۔ بلیک روز کھلکھلا کے ہنسی۔ اس کی ہنسی بڑی دلکش تھی۔ اس خوشبو کی طرح جو اس نے لگا رکھی تھی۔ قدرت نے انسانوں کو سیاہ و سفید کے تعصب میں مبتلا نہیں کیا تھا۔ یہ تفریقِ سفید رنگ کو وجہِ امتیاز بنانے والوں نے پیدا کی۔ بلیک روز اگر وائٹ روز ہوتی تو قیامت کہلاتی۔ اس کے تمام نقوش دلکش، سارے خطوط قاتل اور سب ادائیں نظر نواز تھیں مگر بدقسمتی کے باعث وہ سیاہ نسل کی عورت تھی۔

جو سوٹ جان کہلانے والے نے مسترد کیے تھے، ایسے تھے کہ ہمارے ملک کے لنڈے بازاروں میں پہنچنے سے قبل ہی امیر زادوں کے ہاتھ لگ جاتے تو وہ فخر کے ساتھ پہنتے۔ مگر میں نے جو سوٹ منتخب کیا، وہ بھی بہترین حالت میں تھا۔ جب میں نے اس کے ساتھ میچ کرنے والی ٹائی مانگی تو مجھے ڈریسنگ روم تک لانے والے کا چہرہ بگڑ گیا۔

" سالے امیر چند۔ دمڑی لال کی اولاد۔ پورا ولایتی صاحب بنے گا؟ خیرات بھی اپنی مرضی سے لے گا۔"

اسے اُردو میں بات کرتے سن کے میں نے شدید حیرانی کے ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا۔ میں نے متانت سے کہا۔" میرے ساتھ پھر اس لہجے میں بات مت کرنا۔ میں اس جیسے دس کتے خرید سکتا ہوں جس کے اشارے پر تم دُم ہلاتے پھرتے ہو سمجھے؟"

اس کا رویّہ ایک دم بدل گیا۔" سوری سر! میں مانگتا ہوں آپ کو۔ پلیز مسٹر فروش سے شکایت مت کیجیے گا۔"

مجھے جان کا اصل نام معلوم ہو گیا تھا۔ میں نے کہا۔" تمھارا نام کیا ہے؟"

اس نے اپنے لبوں پر زبان پھیری۔" میں نے غلطی سے ایک نام بتا دیا۔ یہ بھی معلوم نہیں ہونا چاہیے انھیں۔"

" اگر تم اپنا نام نہیں بتاؤ گے تو میں تمھاری شکایت کر دوں گا۔" میں نے کہا۔" اور اپنے دوسرے ساتھی کا نام نہیں بتاؤ گے تو مسٹر جان کو بتا دوں گا۔"

" تم مجھے بلیک میل کر رہے ہو؟"

" ہاں۔ وائٹ میل تمھارا باس ہے۔ اس کے ساتھ ایک بلیک فیمیل ہے۔" میں نے کہا۔" چنانچہ بلیک میل تم ہی ہو سکتے ہو۔"

وہ میری بات سے محظوظ نہیں ہوا۔ ٹائی تلاش کرتے ہوئے وہ سوچتا رہا کہ اسے کیا کرنا چاہیے؟ وہ شش و پنج میں پڑ گیا تھا۔

بالآخر اس نے کہا۔" میرا نام ہے سوہن اور دوسرا ہے میرا بھائی موہن۔ کیا خیال ہے۔ ٹھیک ہیں یہ نام؟"

میں سمجھ گیا کہ وہ ہمارے ناموں کی مماثلت اور ہمارے رشتوں کے بارے میں اپنے شکوک کا اظہار کر رہا ہے اور بالواسطہ طور پر یہ بتانا چاہتا ہے کہ ہم اگر فقیر چند اور امیر چند ہو سکتے ہیں تو وہ موہن اور سوہن کیوں نہیں ہو سکتے۔ میں اس کو چیلنج نہیں کر سکتا تھا کہ یہ اس کا اصل نام نہیں ہے اور جان کے سامنے اگر میں انھیں سوہن موہن کہتا تو اس کے لیے تشویش کی کوئی بات نہ ہوتی۔

میں نے سر ہلا کے کہا۔" اچھے نام ہیں۔ چلیں گے۔"

" کیا اب ہم بھی چلیں؟" وہ بولا۔

" چلو۔" میں نے ٹائی کی ناٹ درست کر کے کہا اور اس سے آگے ہو گیا۔ اپنے ڈیل ڈول کے باوجود وہ ایک بزدل اور غلام آدمی تھا۔ اس نے مجھے بھی اپنا آقا تسلیم کرنے میں دیر نہیں کی۔

غالب ہوش میں آ چکا تھا اور خاموش بیٹھا دیوار کو گھور رہا تھا۔ مجھے یہ صورتِ حال کچھ عجیب لگی۔

" کیا بات ہے؟ تمھارا یہ بھائی بولتا نہیں؟" جان یعنی اس بھوری داڑھی والے نے کہا جس کا اصل نام فروش تھا۔ یہ نام بھی بہت عجیب تھا اور اس سے پتا نہیں چلتا تھا کہ اس کی قومیت کیا ہے۔

" یہ انگریزی نہیں سمجھتا۔" میں نے کہا۔" اور کچھ اونچا بھی سنتا ہے۔" اُس کی خاموشی سے میں سمجھ گیا تھا کہ میری عدم موجودگی میں غالب نے کسی بھی سوال کا جواب دینے سے گریز کیا ہو گا۔

" تم دونوں۔ کیا نام بتائے تھے تم نے؟"

" میں امیر چند۔ یہ فقیر چند۔" میں نے کہا۔

" کیا حادثہ پیش آیا تھا تمھارے ساتھ؟"

" کچھ لوگ ہماری لانچ چھین کر لے گئے۔" میں نے کہا۔" وہ ہمیں مار ڈالتے لیکن ان کو رحم آ گیا شاید۔ انھوں نے ہمیں لائف بوٹ میں نکل جانے کی اجازت دے دی۔"

" وہ لانچ تھی یا بحری جہاز تھا؟" فروش نے کہا۔" اس کا نام لائف بوٹ پر ہے۔"

" ایک بہت بڑی لانچ یا ایک چھوٹا بحری جہاز۔ تم کچھ بھی سمجھ لو۔" میں نے کہا۔

" تم مالک تھے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔" ہم نے کرائے پر لیا تھا۔"

" کس لیے؟"

" بزنس کے لیے اور فار ہیون سیک۔ یہ مت پوچھنا کہ ہمارا بزنس کیا تھا؟" میں نے کہا۔

یہ اسی کے الفاظ تھے۔ وہ ہنسنے لگا۔" میں سمجھ گیا۔ خیر یہ بتاؤ کہ تم سے وہ لانچ چھیننے والے کون تھے۔ یہ کام اتنا آسان تو نہیں ہوتا۔"

" میرا خیال ہے کہ زیادہ مشکل بھی نہیں ہوتا۔"

" اگر تم ہوشیار ہو، دشمنوں کو پہچانتے ہو اور کوئی ایسا موقع نہیں آنے دیتے..."

" موقع بن بلائے آتا ہے۔ جیسے حادثہ ہوتا ہے سڑک پر۔ یا آدمی کو عشق ہو جاتا ہے اچانک۔" میں نے کہا۔

وہ پھر ہنسنے لگا۔" کیا عجیب بات ہے۔"

" میرا مطلب تھا کہ آدمی کی شامت آتی ہے تو وہ دشمنوں پر اعتبار کر لیتا ہے یا دوست ہی دشمن ہو جاتے ہیں مگر وہ ان کو پہچاننے سے قاصر رہتا ہے۔ خوش فہمی میں مارا جاتا ہے مثلاً اب تم ہو۔ کیا تم مجھ سے توقع رکھتے ہو کہ میں... جیسے ایک گھنٹے قبل تم جانتے ہی نہیں تھے اور نہ تم نے سوچا تھا کہ کوئی اس وقت سمندر میں پڑا ہوا مل جائے گا جس کو تم انسانی ہمدردی کی بنیاد پر نکالنے پر مجبور ہو جاؤ گے۔ کیا تم توقع کر سکتے ہو کہ میں لانچ پر قابض ہو جاؤں گا؟"

اس کے ایک ہاتھ میں شراب کا جام تھا۔ وہ اتنا ہنسا کہ جام چھلکنے لگا۔ میری بات اتنی مضحکہ خیز نہیں تھی مگر اس پر نشے کا اثر تھا۔" کیا تم ایسا کر سکتے ہو... فقیر چند؟"

" میں امیر چند ہوں۔" میں نے کہا۔" یہی ہوتی ہے خوش فہمی مسٹر جان۔"

" پھر کیا مجھے تم کو واپس سمندر میں پھینک دینا چاہیے اپنا دشمن سمجھ کر؟" وہ بولا۔

" یہ ہوتی ہے غلط فہمی۔" میں نے کہا۔

" تم کو اپنے نقصان کا کچھ اندازہ ہے؟" وہ بولا۔

" ہاں، تقریباً دس لاکھ ڈوب گئے میرے۔ لیکن اچھی بات یہ ہے کہ میں نہیں ڈوبا۔" میں نے کہا۔" قانونی طور پر تو میں دس لاکھ میں سے دس بھی وصول نہیں کر سکتا۔ ہاں! اپنے طور پر میں بیس لاکھ وصول کر لوں گا ان سے۔"

اس نے تعریف اور تائید کے انداز میں سر ہلایا۔" یہی طریقہ ہونا چاہیے۔ قانون کے بارے میں احمق یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ وہ کمزور کی حفاظت کے لیے بنایا جاتا ہے۔ طاقت ور کو تو قانون کی ضرورت

نہیں پڑتی؟"

"ہاں، وہ خود اپنا قانون ہوتا ہے اور وہ قوانین جو ملک میں نافذ کیے جاتے ہیں۔ مثلاً کسٹم کے قوانین نہ ہوں تو کسٹم والے کسی کو کیسے پکڑیں۔ ٹریفک کے قوانین نہ ہوں تو۔ ۔ ۔"

"میں سمجھتا ہوں یہ سب۔ مجھے بتاؤ کہ وہ کون لوگ تھے جو تم جیسے ہوشیار آدمی کے ساتھ ایسی بدمعاشی کر گئے۔ ضرور وہ بے وقوف ہوں گے کہ انھوں نے تم کو مار کے سمندر میں نہیں ڈالا اور زندہ نکل جانے دیا۔ کیا انھیں اندازہ نہیں تھا کہ تم ان کے لیے خطرہ بن جاؤ گے؟"

"ان کو اندازہ نہیں تھا کہ تم مجھے بچا لو گے۔" میں نے کہا۔

"وہ لانچ کا مال کہاں لے گئے ہوں گے؟"

"مال وہ کہیں بھی لے جائیں۔ لوٹ کر تو بمبئی ہی آئیں گے اور وہاں میں اُن کے استقبال کے لیے موجود ہوں گا۔" میں نے کہا۔

"بمبئی کیسے جاؤ گے تم؟" وہ سوچ کے بولا۔

"ابھی تک سوچا نہیں تھا میں نے۔ اب بچ گیا ہوں تو سوچ رہا ہوں کہ تم سے درخواست کروں۔" میں نے کہا۔

"مجھ سے۔ ۔ ۔ دیکھو میں تو جا رہا ہوں دُبئی کی طرف یعنی بالکل مخالف سمت میں۔" وہ بولا۔ "میں تم کو کراچی اُتار سکتا ہوں۔ وہاں سے تم خود واپسی کا انتظام کر لینا۔"

کیا میں کراچی سے تیر کے سمندر کے راستے بمبئی تک جاؤں؟ کرایہ میرے پاس نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ایک اجنبی ملک میں پاسپورٹ اور امیگریشن کے قانونی مسائل ہوں گے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ تم مجھے بمبئی پہنچا دو؟"

"یہ بالکل ناممکن ہے۔"

"میں تم کو خدمات کا معاوضہ، نذرانہ، انعام، حرجانہ سب کچھ دے سکتا ہوں۔"

"مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ ضرورت اس بات کی اہم ہے کہ میں وقت پر اپنی کاروباری کمٹمنٹ کو پورا کروں۔ جس پارٹی سے میری ڈیل ہے وہ میری انسانی ہمدردی کے اقدام کا عذر قبول نہیں کرے گی مسٹر فقیر چند۔"

"امیر چند۔" میں نے تصحیح کی۔

"میں تم کو بمبئی کی طرف جانے والے کسی جہاز پر یا کسی لانچ پر سوار کرا سکتا ہوں۔ تم اُن کو جو اسٹوری چاہو سناؤ۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کر سکتا۔" وہ بولا۔

"میں اس سے زیادہ باتیں نہیں کر سکتا۔ میں بتا چکا ہوں کہ میں نے کل سے کچھ نہیں کھایا۔"

"کل سے؟ کل یہ واردات کس وقت ہوئی تھی؟"

"رات ہوتے ہی۔" میں نے کہا۔ "سات ساڑھے سات بجے اور اب صبح کے ساڑھے تین بجے ہیں۔ تقریباً سات گھنٹے ہم سمندر میں رہے۔"

"تمھارا بھائی کپڑے بدل کے آ جائے تو کھانا بھی آ جائے گا۔ بلیک روز کچھ انتظام کر رہی ہو گی۔" وہ بولا۔

"بلیک روز اُس کا اصل نام ہے؟"

اُس نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں کہتا ہوں اس کو۔"

"بلیک روز بہت نایاب ہوتا ہے۔ وہ تمھاری۔ ۔ ۔"

فروش ہنسنے لگا۔ "کچھ نہیں۔ کاروبار میں میری مددگار ہے اور عورت بہرحال ہے۔ اس کے رنگ کو مجھے نظر انداز کرنا پڑتا ہے کبھی کبھی۔ وہ یہودی ہے کاروبار کے معاملے میں۔"

"کس کاروبار کی بات کر رہے ہو؟"

"چالاک مت بنو۔ ہم ایک دوسرے کے کاروبار کی نوعیت کے بارے میں کوئی سوال نہیں کریں گے۔" وہ بولا۔

غالب کے ساتھ بلیک روز اندر آئی۔ غالب کو بھی سوٹ پہننا پڑا تھا کیونکہ فروش کے پاس صرف سوٹ تھے۔ درجن کے حساب سے جو اس کے باتھ روم سے ملحق ڈریسنگ روم میں بھرے پڑے تھے۔ لباس کے معاملے میں وہ خبطی معلوم ہوتا تھا۔ یہ شوق کی انتہا تھی کہ ایک لانچ پر سفر کرنے والا اتنے سوٹ بدلتا ہو۔ شاید لانچ ہی اس کا گھر ہو اور سفر کے دوران بھی وہ سوٹ میں ہی رہتا ہو۔

بلیک روز نے ٹرے کو ایک گلاس ٹاپ ٹیبل پر رکھا۔ ایک بار پھر کالے گلاب کی خوشبو نے مجھے ڈسٹرب کیا اور مجھے نگاہ دوسری طرف کرنی پڑی۔ میں اور غالب آمنے سامنے بیٹھ کے اس خوانِ نعمت کو صاف کرنے لگے جس پر سب کچھ تھا۔ اُبلے ہوئے انڈے، سینڈوچ، پنیر اور گوشت کے نمکین ٹکڑے اور کافی کا تھرماس۔

"کیا تم دونوں آپس میں بھی بات نہیں کرتے؟" فروش نے سگار جلاتے ہوئے کہا۔

"مجھے جلاتا پڑتا ہے کیونکہ یہ اونچا سنتا ہے۔" میں نے کہا۔

"ویسے بھی اس وقت ہم مصروف ہیں۔"

بلیک روز نے کہا۔ "یہ وقت معاملات کو طے کرنے کے لیے مناسب ہے۔" اس نے فرنچ میں بات کی تھی۔

"تم کو جلدی کیا ہے؟" فروش نے کہا۔

"تم ٹالنا کیوں چاہتے ہو؟" بلیک روز نے کہا۔ "میں تم کو بتانا ضروری سمجھتی ہوں کہ مجھے تمھاری بے ایمانی کا اور دھوکے کا علم بہت پہلے سے ہے لیکن میں نظر انداز کر رہی تھی۔ اب تم حد سے بڑھ رہے ہو۔"

"پہلے کیا بے ایمانی کی تھی میں نے؟"

"گزشتہ بار تم نے ایک پیس کے ایک ہزار ڈالر دصول کیے مگر مجھے ساڑھے سات سو بتائے۔"

"یہ کس نے کہا ہے تم سے؟"

"تم نے اس پارٹی کے ایک بے ایمان شخص کو مجبور کیا کہ وہ جھوٹ بولے۔" بلیک روز نے برافروختہ ہو کے کہا۔ "مجھے وہی قیمت بتائے جو تم نے بتائی ہے۔ ڈھائی سو ڈالر تم دونوں نے آپس میں تقسیم کر لیے۔ اس بار تم پانچ سو ڈالر ہتھیانا چاہتے ہو۔"

"مارکیٹ ڈاؤن ہے ڈیئر! تم جانتی ہو کہ سپلائی میں کتنا اضافہ ہو گیا ہے اس خانہ جنگی کی وجہ سے۔ اب ہم ہی نہیں ہیں اور بھی بہت سی پارٹیاں ہیں۔ مجھے تو ڈر ہے کہ اگلی لاٹ چار سو یا تین سو میں نہ لگانی پڑے۔ بائی دی وے، تم کو میرے خلاف اُکسانے والا کون تھا، میں اندازہ تو کر سکتا ہوں۔ مگر اس کا نام جاننا چاہتا ہوں۔"

بلیک روز تلخی سے مسکرائی۔ "اب بھی وقت ہے کہ مجھے احمق سمجھنا چھوڑ دو۔"

"احمق تو نہیں، تم خطرناک ہو گئی ہو میرے لیے۔"

"میں خود کو غیر محفوظ سمجھتی ہوں۔ تم ایسے آدمی ہو کہ نقصان کا ڈر ہو تو مجھے راستے سے ہٹا دو گے لیکن میں تم کو بتا دینا چاہتی ہوں کہ تم بھی اتنے ہی غیر محفوظ ہو۔ اب مجھے صاف بتا دو کہ میرا حصہ کیا ہو گا۔ ایک ہزار ڈالر میں سے ڈھائی سو مجھے ملنے چاہئیں۔ اس کے بعد تمھاری مرضی۔ تم اپنا مال ساڑھے سات میں نکالو یا پانچ میں۔ گزشتہ حساب پر میں لعنت بھیجتی ہوں۔"

"اگر میں ایسا کرنے سے انکار کروں ڈیئر۔ ۔ ۔؟"

"تو تم مجھے مجبور کر دو گے کہ میں وہ کروں، جو میں کرنا نہیں چاہتی۔" بلیک روز نے کہا اور باہر نکل گئی۔

اس ساری گفتگو میں کوئی بات ایسی نہ تھی جو میری سمجھ میں نہ آتی۔ سوائے ایک بات کے۔ ہزار ڈالر کا ایک پیس کیا چیز تھی؟ فروش نے خانہ جنگی کا ذکر کیا تھا۔ وہ کس ملک کے حوالے سے یہ بات کر رہا تھا اور خانہ جنگی کے باعث کس چیز کی سپلائی بڑھ گئی تھی جس کی وجہ سے قیمت گر گئی تھی۔ کیا فروش بھی اسلحہ فروش تھا مگر اسلحے کی سپلائی میں نہیں طلب میں اضافہ ہوا تھا اور اس کی قیمت زیادہ ہو گئی تھی۔ پھر وہ کیا چیز تھی جس کی ہیرا پھیری میں فروش عمداً بلیک روز کے ساتھ بے ایمانی کا مرتکب ہو رہا تھا۔

فروش کے انداز و اطوار سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ٹھنڈے مزاج کا انتہائی خطرناک آدمی ہے۔ اس کے مقابلے میں بلیک روز نہ صرف یہ کہ عورت تھی اور کمزور تھی بلکہ وہ جذباتی اور بے وقوف بھی تھی۔ اس نے کاروباری اختلاف کو ذاتی دشمنی بنا لیا تھا اور اعلان بھی کر دیا تھا کہ وہ کیا کرے گی جبکہ میرا خیال تھا وہ کچھ نہیں کر سکتی۔ اس کے برعکس فروش وہ آدمی تھا جو زبان سے کچھ کہے بغیر سب کچھ کر سکتا تھا۔

میں فوراً طے نہیں کر سکتا تھا کہ فروش اور بلیک روز کے معاملات میں مجھے کس حد تک مداخلت کرنی چاہیے اور کس کا ساتھ دینا چاہیے۔ ظالم اور مظلوم تو ہر جگہ ہوتے ہیں لیکن میں کوئی خدائی فوجدار نہیں ہوں کہ ہر جگہ غیر ضروری طور پر مظلوم کی حمایت میں کھڑا ہو جاؤں۔ سب سے پہلے تو مجھے کاروبار کی نوعیت معلوم ہونی چاہیے پھر یہ دیکھنا چاہیے کہ میرا مسئلہ کون حل کر سکتا ہے۔ اس لانچ پر پہنچ جانے کے بعد یہ مشکل تھا کہ میں اس موقع سے فائدہ نہ اٹھاؤں۔

ہمارے پاس وقت کم تھا اور حالات کے پیشِ نظر یہ بے حد ضروری ہو گیا تھا کہ ہم اسی لانچ کو بمبئی کے ساحل تک لے جائیں۔ میں نے فروش کو قائل کرنے کی کوشش کی تھی اور ناکام رہا تھا۔ اس کے بعد زبردستی کے بنا چارہ نہ تھا۔

خاموش رہ کے ہم نے بہت کچھ جان لیا تھا۔ اگر میں اپنی فرنچ بگھارنے لگتا تو فروش اور بلیک روز کی ساری گفتگو سننے سے محروم رہتا اور مجھے ان کے اختلافات کا بھی علم نہ ہوتا جو اب دشمنی کی حد تک بڑھ چکے تھے۔ سیاسی حکمتِ عملی کا تقاضا تھا کہ ہم فروش کے مقابلے میں بلیک روز کا ساتھ دیں۔ وہ کمزور تھی خود کو غیر محفوظ سمجھتی تھی اور اس کے ساتھ زیادتی بھی ہوئی تھی لیکن ابھی مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ ہم اس کی کس طرح مدد کر سکتے ہیں؟

دونوں حکم کے غلام فروش کے باڈی گارڈ تھے۔ ان میں سے ایک کو میں آزما چکا تھا، دوسرے کے بارے میں بھی فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ عموماً ایسے نمونے دکھانے کے لیے ہوتے ہیں کہ ان کی لمبائی چوڑائی کے سامنے عام آدمی سر نہ اُٹھا سکے۔ جسمانی طاقت کا اندازہ یوں نہیں ہوتا۔ بفرضِ محال وہ جوڈو کراٹے اور فری اسٹائل کشتی یا باکسنگ کے چیمپئن تھے تب بھی وہ اپنے آقا کو بچا نہیں سکتے تھے۔ انھوں نے مجھے ایک سرمایہ دار فرض کر لیا تھا جس کے پاس پیسے کی طاقت تو ہوتی ہے اور وہ لڑوا سکتا ہے یا مروا سکتا ہے مگر لڑ نہیں سکتا اور مار نہیں سکتا۔ ایک کو اچانک بے خبری کے عالم میں ناک آؤٹ کیا جا سکتا تھا تو دوسرے کو تھوڑے سے مقابلے کے بعد۔ اس عرصے میں غالب ریوالور کی مدد سے مسٹر فروش کو سنبھال سکتا تھا۔ ہمارے ریوالور اس بیلٹ کے اندر ابھی تک بالکل محفوظ تھے جو ہماری کمر کے گرد لپٹی ہوئی تھی اور جس میں ہم نے اپنے پاسپورٹ کے ساتھ ہنگامی ضرورت کے لیے نقد رقم بھی رکھی تھی۔

"تم کیا سوچ رہے ہو؟" فروش نے مجھ سے مخاطب ہو کے کہا۔

میں چونکا۔ "میں اونگھ رہا تھا اور سونے کی سوچ رہا تھا۔"

"اس میں سوچنے کی کیا بات ہے۔ ۔ جاؤ۔ ۔ ۔ سو جاؤ۔" اُس نے دوسرے حکم کے غلام کو اشارہ کیا۔ "ان کو اسٹور میں لے جاؤ۔"

دوسرا غلام وہ تھا جس کے بنیان پر کھوپڑی کے ساتھ دو ہڈیاں بنی ہوئی تھیں۔ میں دروازہ بند کر کے اُس کے پیچھے چل دیا۔ غالب

مجھ سے آگے تھا۔ اچانک میں نے راہداری کے آخری دروازے سے بلیک روز کو باہر آتے اور پھر پلیٹ کے اندر جاتے دیکھا۔ شاید وہ ہمیں دیکھ کر واپس ہو گئی تھی مگر اس طرح مجھے معلوم ہو گیا کہ اُس کا کیبن کون سا ہے۔ میں نے اُسی دروازے میں داخل ہونے کی کوشش کی۔

حکم کے غلام نے مجھے گردن سے پکڑ کر کھینچ لیا۔ "ادھر مرو۔" اُس نے مخالف سمت کے دروازے کو کھول کے مجھے اندر دھکیلتے ہوئے کہا۔

"میں سمجھا تھا۔ ۔ کراس نے بُلایا ہے مجھے۔" میں نے گردن کو ملتے ہوئے خفت سے دانت نکال کے کہا۔

"اتنے حسین نہیں ہو تم۔" وہ بولا۔ "خبردار جو اس کی طرف آنکھ اٹھا کے بھی دیکھا۔"

"کیوں . . . تمھاری والدہ ہیں وہ؟" میں نے کہا۔

وہ مرکھنے سانڈ کی طرح پھنکارتا اندر آیا۔ میں یہی چاہتا تھا۔ اُس کا رخ میری طرف تھا۔ اُس نے غالب کو نہیں دیکھا تھا، جو دروازے کے ساتھ لگا کھڑا تھا۔ غالب نے ٹانگ اڑائی تو وہ منہ کے بل گرا۔ میں نے اُسے اُٹھنے کا موقع نہیں دیا اور اس کی کمر پر سوار ہو گیا۔ پھر میں نے اُس کے دونوں ہاتھ پیچھے موڑ کے لاک کر دیے اور اس کے لیے حرکت کرنا بھی ممکن نہ رہا۔

"یہ . . . کیا مقصد ہے اس حرکت کا۔" وہ سر کو اُٹھاتے ہوئے بولا۔

میں نے اس کا سر نیچے دبا دیا۔ "ہاتھی کی سواری۔" میں نے کہا اور غالب کو اشارہ کیا۔ اُس نے ہاتھی کی پتلون کی جیب سے ریوالور نکال کے مجھے تھما دیا۔

"باس تم کو مار ڈالے گا۔ ۔ تم اُسے جانتے نہیں۔"

"تم بھی ہمیں نہیں جانتے۔" میں نے کہا۔ "مرتے وقت تم کو پتا بھی نہیں چلے گا کہ تم کب فوت ہوئے اور کس کے ہاتھوں۔" میں نے ریوالور اُس کی گُدّی سے لگا دیا۔

"مجھ سے کیا چاہتے ہو تم . . . ؟" وہ بڑی مشکل سے سر اٹھا کے بولا۔

"چند سوالات کے جواب۔" میں نے کہا۔ "جواب غلط ہو گا تو ہمیں معلوم ہو جائے گا۔ پہلے تو یہ بتاؤ کہ تمھارے اس باس کی بھوری داڑھی اصلی ہے یا نقلی؟"

وہ شاید سوال کے بے تکے پن پر حیران ہوا مگر اس نے کہا۔ "اصلی ہے۔"

"اس کا نام کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"جان ۔ وہ تمھیں خود بتا چکا ہے۔"

میں نے ایک ہاتھ کو جھٹکا دیا۔ وہ بلبلایا کیونکہ اس کا ہاتھ کندھے کے پاس سے اُتر گیا تھا۔ "اس کا نام فروش ہے۔ اصل نام پوچھا تھا میں نے۔ دوسرے سوال کا غلط جواب مت دینا ورنہ گردن توڑ دوں گا۔ یہ فروش کیا بلا ہے۔ ضمیر فروش تو وہ ہے اس کے علاوہ کیا بیچتا ہے؟"

"وہ ایک اسمگلر ہے۔" وہ کراہتے ہوئے بولا۔ "ہر چیز ادھر سے اُدھر کرتا ہے۔ اطالوی شراب لاتا ہے۔"

"کیا وہ اطالوی ہے؟"

"وہ گوا کا رہنے والا ہے۔" وہ بولا۔ "کلکتہ میں بزنس کرتا ہے۔"

"کلکتہ سے کیا لے جاتا ہے؟"

"نوادرات۔" وہ بولا۔ "تاریخی چیزیں . . . اور لڑکیاں۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ "وہ بردہ فروش ہے؟"

"ہاں . . . ان کا یہی مال آسانی سے مل رہا ہے۔"

"ایک ہزار ڈالر ایک پیس کے۔ تم نے ڈھائی سو ڈالر ہتھیائے۔" میرے ذہن میں بلیک روز کے الفاظ گونجنے لگے۔ "مارکیٹ ڈاؤن ہے، خانہ جنگی کے باعث۔" فروش نے کہا تھا تو وہ لڑکیوں کی بات کر رہے تھے جو عالمی منڈی میں سپلائی کی جا رہی تھیں۔ میرے دماغ کا ٹمپریچر اتنا زیادہ ہو گیا کہ عقل کا فیوز اُڑ گیا۔ ایک ہاتھ مار کے میں نے ہاتھی کی گردن توڑ دی جس پر میں سوار تھا گو کہ یہ کام میں نے عجلت میں کیا مگر اس اذیت ناک انکشاف کے بعد میرے لیے ممکن ہی نہ رہا تھا کہ میں کسی کو رعایت دیتا۔

"مرزا! تم ٹھہرو یہاں، اگر کوئی ادھر آئے تو کچھ پوچھے بغیر گولی مار دو۔" میں نے کہا اور راہداری عبور کر کے بلیک روز کے کمرے میں گھس گیا۔

وہ سونے کی تیاری کر رہی تھی اور آئینے کے سامنے بیٹھی اپنے جسم پر کوئی کریم مَل رہی تھی۔ مجھے ہاتھ میں ریوالور لیے اندر آتا دیکھ کے اس نے چیخ مارنے کی کوشش کی مگر آواز خوف سے اُس کے حلق میں پھنس گئی۔

"بلیک روز! مجھے سب معلوم ہو چکا ہے۔" میں نے کہا۔ "تم اس بردہ فروش کی ساتھی ہو۔"

میری رواں فرانسیسی نے اُس کے رہے سہے اوسان بھی خطا کر دیے۔ اُس نے خود کو سنبھال لیا تھا اور مسکرا کے مجھے خوش آمدید کہنے کی تیاری کر رہی تھی۔ اس کا چمکتا ہوا آبنوسی مجسمے جیسا بدن کانپنے لگا۔

"اب تک کتنی لڑکیاں بیچ چکے ہو تم لوگ؟" میں نے سرد سپاٹ لہجے میں کہا۔

"مجھے . . . نہیں معلوم . . . تعداد . . . لیکن یہ تیسری کھیپ ہے۔" وہ ہکلا کے بولی۔

"اس وقت . . . اس لانچ میں بھی . . . او مائی گاڈ . . .!"

"کتنی لڑکیاں ہیں . . . کہاں سے لائی گئی ہیں؟" میں نے چیخ کر کہا۔

"تقریباً اَسی۔ سب کلکتہ سے سوار ہوئی تھیں۔"

"اور اس سے پہلے؟" میں نے محسوس کیا کہ میرا چہرہ گرم ہو رہا ہے۔ میرے جسم کا سارا خون سر کی طرف کھنچ آیا تھا۔

"پہلی دفعہ . . . اڑتالیس . . . دو مہینے قبل . . . پھر ایک مہینے پہلے ساٹھ . . ." وہ لرزتے ہوئے بولی۔ کیونکہ اُس کو میری آنکھوں میں اُترا ہوا خون صاف نظر آ رہا تھا۔ "مگر دیکھو . . ."

"بلیک روز! ادھر آؤ۔" میں نے نرمی سے کہا۔

وہ متوقع نظروں سے مجھے دیکھتی ہوئی میرے سامنے آ گئی۔ شاید اُسے ایک جھوٹی اُمید کا سہارا بھی غنیمت محسوس ہوا ہو گا کہ اس کا جوان سڈول جسم اپنی قربت کی آنچ سے میرے دل کو پگھلا دے۔ میں نے اُس کو اوپر سے نیچے تک دیکھا۔

"کبھی تم نے اپنی قیمت کا اندازہ کیا ہے۔ کسی نے کالے گلاب کی بولی لگائی . . . کالا گوشت پسند کرنے والے گدھ اور بھیڑیے بھی تو ہوں گے دنیا کے بازار میں؟"

"تمھارے لیے کوئی قیمت نہیں۔ ویسے میں برائے فروخت نہیں ہوں۔" وہ بولی اور اپنی شہوانی مسکراہٹ کے ساتھ ہاتھ پھیلا کے آگے بڑھی۔

میں پیچھے ہٹ گیا۔ "کاش میرے پاس اتنا وقت ہوتا . . ."

"وقت تو ہے۔" وہ میری بات کا غلط مطلب نکالتے ہوئے بولی۔

"کہ میں تم کو ایک فرانک میں بیچ سکتا . . . تو وہ فرانک میرے کام آتا۔ لیکن تم بے مصرف ہو میرے لیے۔" میں نے کہا اس کے ساتھ ہی میں نے اس کے ہاتھ مارا۔ وہ کٹی ہوئی شاخ کی طرح گری اور ساکت ہو گئی۔ میں غصے میں اندر سے کسی تنور کی طرح پھنک رہا تھا مگر میرے پاس وقت کم تھا۔ ایک طرف لانچ مخالف سمت میں بڑھتی جا رہی تھی تو دوسری طرف رات تیزی سے صبح کی جانب رواں تھی۔

میرے لیے اپنے کام کو چھوڑ کر اس گروہ کی سرکوبی کے لیے سوچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس جیسے نہ جانے کتنے تھے جو دنیا بھر میں عورت کی حرمت کی سوداگری میں اپنا منہ کالا کر رہے تھے اور نامۂ اعمال کو سیاہ کر رہے تھے مگر اُن کے خزانے معمور تھے اور وہ خوش تھے۔ ان سے بدتر گناہ کے کاروبار میں لاکھوں لوٹ رہے تھے مگر مجھے ان سے سروکار نہ تھا۔ میرا واحد مقصد اس لانچ کے ذریعے بمبئی پہنچنا تھا۔ اگر فروش ایک بردہ فروش نہ ہوتا، کوئی شریف آدمی ہوتا تب بھی میں اس مقصد سے کنارہ کش نہ ہوتا لیکن اس کے کردار کا شیطانی چہرہ اور اس کے کاروبار کا گھناؤنا پہلو سامنے آ جانے کے بعد تذبذب کا کوئی سوال نہ تھا۔ وہ سب ایک جیسی سزا کے مستحق تھے جو کم سے کم موت ہو سکتی تھی۔

میری آواز نے یا بلیک روز کی چیخ نے جو اُس کے حلق سے نکلنے والی آخری آواز تھی، فروش کو چوکنا کر دیا ہو گا۔ مجرم کی خطرے کو بھانپنے والی چھٹی حس یوں بھی بہت تیز ہو جاتی ہے۔ میں بلیک روز کے کمرے سے نکلا ہی تھا کہ فروش کے کمرے میں سے دوسرا ہیوی ویٹ غلام نکلا۔ اس کے ہاتھ میں بھی ریوالور تھا۔ میرے ہاتھ میں ریوالور دیکھتے ہی اس کی حیوانی جبلت جاگ اٹھی۔ اس نے سمجھ لیا کہ اب ہم میں سے ایک ضرور مارا جائے گا۔

فرق سیکنڈ کے ہزارویں حصے کا تھا یا اس سے بھی کم مگر وہ مجھ سے پہلے فائر کے لیے ہاتھ اٹھا چکا تھا۔ اس وقت میں کچھ نہیں کر سکتا تھا، فاصلہ بہت کم تھا۔ نہ اُس کا نشانہ خطا ہونے کا کوئی امکان تھا اور نہ میرے لیے اس کی چلائی ہوئی گولی کے راستے سے ہٹ جانا ممکن تھا۔ فائر میں نے بھی کیا مگر بعد میں۔

یہ غالب تھا جس نے اسے بروقت نشانہ بنایا۔ اس کمرے کے دروازے کی اوٹ سے جس میں فروش کے پہلے باڈی گارڈ کی لاش پڑی ہوئی تھی، غالب راہداری پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ یقیناً اس وقت تک غالب کو بھی اندازہ ہو چکا ہو گا کہ راہداری میں اچانک سامنے آ جانے کے بعد میرے لیے خود اپنے دفاع میں کچھ کرنا ممکن نہیں رہا۔

میرے حریف کی چلائی ہوئی گولی شاید میرے اوپر سے گزری اور جو گولی میں نے چلائی تھی وہ بھی نشانے پر نہیں لگی۔ غالب کی گولی لگتے ہی وہ اُچھلا اور پیچھے کی طرف گر گیا۔ اب انتظار میں وقت گزارنے کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ فائر ایک بعد ایک ہوتے تھے چنانچہ لانچ کے عملے سے فروش تک ہر شخص سمجھ گیا ہو گا کہ ان کو سنگین خطرات کا سامنا ہے۔

وہ سنگین خطرات میں سفر کرنے کے عادی تھے اور ہر قسم کی گڑبڑ سے نمٹنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ اب ایک کھلی جنگ ہو گی۔ خونریز، مختصر اور فیصلہ کن۔ میں نے ایک سیکنڈ ضائع کیے بغیر آگے جست لگائی۔ فروش اپنے کیبن سے مشین گن لے کر نکل رہا تھا کہ میں اُس سے ٹکرا گیا۔

ہم دونوں اندر جا گرے۔ اُس کے پیچھے کوئی چیز آ گئی تھی جس نے اُسے سنبھلنے نہ دیا۔ وہ سر کے بل گرا تو مشین گن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ میں فروش سے ٹکرانے کے بعد گھوم گیا تھا اور دہلیز سے ٹھوکر کھا کے گرا تھا چنانچہ میں اوپر رہا تھا۔ اُسی اسٹول کے اوپر سے گزر کے میں فروش کو دبوچنے میں کامیاب رہا۔ اُس کا ہاتھ پھر مشین گن کی طرف بڑھ رہا تھا کہ میں نے اس کی کلائی پر ہتھیلی ماری۔ اُس نے بڑی پھرتی سے مجھے دونوں ٹانگوں پر اٹھا کے پیچھے اُچھال دیا۔ چونکہ کیبن مختصر تھا اس لیے میں عقبی دیوار سے ٹکرا کے واپس آیا تو پھر فروش کے اوپر گرا۔ فروش نے

میری گردن کو ایک ہاتھ کے شکنجے میں کسنے کی کوشش کی مگر میں نے اُسے پلٹ دیا۔ اب اُس کی گردن میری بغل میں آ گئی۔ میں نے دوسرے ہاتھ کی دو انگلیاں اُس کی آنکھوں میں گھونپ دیں۔ وہ درد سے چلّایا لیکن اب وہ وقتی طور پر اندھا ہو چکا تھا اور پوری طرح میری گرفت میں تھا۔

"بس مسٹر فرِدش! تم نے دیکھا کہ جب شامت آتی ہے تو آدمی اپنے دشمن کو پہچاننے میں کیسے غلطی کرتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اور تقدیر کیسے دھوکا دیتی ہے۔"

"تم . . . تم فرنچ جانتے ہو؟ کون ہو تم؟ کس نے بھیجا تھا تمھیں؟" وہ کراہتے ہوئے بولا۔

"کسی نے نہیں۔ تم خود آئے تھے اپنی موت کی طرف۔ ہم نے کوئی ایس او ایس نہیں دیا تھا تمھیں۔" میں نے اُسے جھٹکا دے کر کھڑا کر دیا۔ "تم دینا چاہو گے کوئی آخری پیغام؟"

"مجھے معلوم ہے . . . تم کس کے آدمی ہو؟"

میں نے اُس کی غلط فہمی دُور کرنے کے لیے بحث کرنا بے مقصد سمجھا۔

"چلو اچھا ہے اگر تم کو معلوم ہے، اب آگے چلو اور دو باتیں ذہن میں رکھو۔" میں نے کہا۔ "ایک یہ کہ میرے ہاتھ میں ریوالور ہے، دوسری یہ کہ ریوالور کے نہ ہونے سے بھی مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں تمھاری گردن توڑ دُوں گا۔"

"تم کیا چاہتے ہو . . . سودا کر لو مجھ سے . . ."

میں نے اُسے آگے دھکا دیا۔ "وہ بعد کی بات ہے، پہلے مجھے بتاؤ کہ وہ سب بدبخت عورتیں کہاں ہیں اور اپنے عملے کو یہ بات بھی سمجھا دو کہ اب مالک ہم ہیں اور اُنھیں ہمارے حکم کی تعمیل کرنی چاہیے بلا چون و چرا۔"

"لانچ کے زیریں حصّے میں، جہاں ابھی تک خاموشی تھی، اب چیخ و پکار مچی ہوئی تھی۔ میں فرِدش کی رہنمائی کے بغیر بھی اس قید خانے تک جا سکتا تھا جس میں اُسّی لڑکیاں مالِ تجارت کی طرح رکھی گئی تھیں مگر میں اُن سب کے سامنے فرِدش کو ایک مجرم کی طرح پیش کرنا چاہتا تھا۔ شاید فائرنگ کی آواز سننے کے بعد نیچے بھی خوف و ہراس پھیلا تھا یا اُن کے محافظوں نے عورتوں کے گودام میں ہنگامی صورتِ حال کے مطابق کارروائی کی تھی۔

غالب نے اس عرصے میں بڑی عقل مندی سے کام لیتے ہوئے لانچ چلانے والے عملے کو عملاً سمجھا دیا تھا کہ تختہ اُلٹا جا چکا ہے مگر انھیں کوئی فرق نہیں پڑے گا، اگر وہ حسبِ سابق احکامات کی تعمیل کرتے رہے۔ انھوں نے مزاحمت کیے بغیر ہمیں مالک مان لیا تھا اور اب لانچ کا رُخ بمبئی کی طرف موڑ دیا تھا۔ کیونکہ ہماری طاقت وہ گولی تھی جو ریوالور کی نال کے ذریعے ان کو خبردار کر رہی تھی کہ وہ خودکشی سے گریز کریں۔

لانچ کے بالکل پیچھے والے حصّے میں سے آنے والا راستہ ایک ایسے تہ خانے میں کھلتا تھا جو تقریباً لانچ کی مجموعی لمبائی اور چوڑائی کے برابر ہو گا۔ لیکن اس کی بلندی کہیں بھی پانچ فٹ سے زیادہ نہ تھی اور ایسا لگتا تھا کہ یہ زیریں منزل جو پہلے ایک عام قسم کی لانچ کا اسٹور تھی، بطورِ خاص کشادہ کی گئی تھی۔

اس میں دُہرے دروازوں سے داخل ہونے کا نظام تھا۔ پہلے دروازے کے باہر ایک کرسی پڑی ہوئی تھی لیکن اس پر بیٹھنے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ اس وقت اندر گیا ہوا تھا اور قیدیوں کے ہنگامے اور شورش کو ختم کرا کے انھیں خاموش رکھنے کی کوشش میں اپنے دوسرے ساتھی کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔

اس دروازے سے گزرنے کے بعد قید خانے کا وہ خاص دروازہ تھا جو بند تھا اور جس کے پیچھے سے عورتوں کی دلخراش چیخوں کے ساتھ اُن کے محافظوں کے دہاڑنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں، وہ چیخ چیخ کر انھیں غلیظ گالیاں دے رہے تھے۔ دونوں دروازوں کے درمیان چھ فٹ کا فاصلہ تھا اور اس میں بوریاں، کنستر اور کریٹ اس طرح رکھے ہوئے تھے کہ پانچ فٹ کی بلندی تک بنی ہوئی دیواروں کے بیچ میں مشکل سے دو فٹ چوڑا راستہ رہ گیا تھا۔

میں نے ریوالور کو فرِدش کی پشت سے لگا رکھا تھا اور بار بار اس کی نالی سے فرِدش کو دھکیل کر یہ احساس دلا رہا تھا کہ وہ مجھے غافل نہ سمجھے۔ فرِدش سر جھکائے آگے چلتا گیا۔ پھر اُس نے دروازے پر دستک دی اور اندر داخل ہو گیا کیونکہ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔

جو منظر میں نے اندر دیکھا اُس نے میرے لہُو کو منجمد کر دیا۔ یہ ایسا حیا سوز، عبرت ناک اور انسانیت کو رُسوا کرنے والا نظارہ تھا جس کا میں . . . بیسویں صدی کے مہذب معاشرے کا شہری آج کے دور میں تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا اور اگر کوئی مجھ سے کہتا کہ آج بھی جب کہ ہم انسان کی عزتِ نفس، آزادی، جمہوریت اور اقوامِ عالم کے منشورِ انسانی کی باتیں کرتے ہیں، غلامی کا وہ عہد ختم نہیں ہوا جب گھوڑوں گدھوں کی طرح مشقّت اور تشدّد جھیلنے والے غلام انسان سرِ بازار فروخت ہوتے تھے اور عورتیں اپنے جسم اور گوشت کے بھاؤ پر بکتی تھیں تو میں اسے مبالغہ یا جھوٹ سمجھتے ہوئے کبھی تسلیم نہ کرتا۔

لیکن اس وقت میرے سامنے جو سین تھا اس نے میرے ذہن میں دورِ غلامی کی یاد تازہ کر دی۔ میں نے بہت سی فلمیں دیکھی تھیں جن میں غلاموں کی جانوروں سے بدتر زندگی اور اُن پر توڑے جانے والے وحشیانہ مناظر دکھائے گئے تھے مثلاً 'سرزمینِ فرعون' (LAND OF PHAROS) — اس وقت میرے پیشِ نظر ان سب فلموں کے مناظر سے زیادہ لرزہ خیز لمحہ

رونگٹے کھڑے کر دینے والا منظر تھا۔

تقریباً بیس فٹ لمبے اور پندرہ فٹ چوڑے تہ خانے میں پاسی زرخرید عورتیں انتہائی بے بسی کے عالم میں برہنہ کھڑی ہوئی تھیں، گھٹنوں میں سر دیے رو رہی تھیں یا فرش پر پڑی چلّا رہی تھیں۔ سب چودہ سے بیس سال کی عمر کی عورتیں تھیں لیکن اُن کے جسم غربت و افلاس اور زندگی کے مصائب کے مارے ہوئے تھے اُن میں جوانی کی شادابی و شگفتگی، رعنائی و دلکشی نہ ہونے کے برابر تھی۔ وہ ایک نفرت انگیز اور کراہت پیدا کر دینے والا منظر تھا جس میں اشرف المخلوقات کی ماں کہلانے والی عورت کو ذلت کی انتہائی پستی میں دیکھتے ہوئے مجھے اپنے انسان کہلانے پر شرم آنے لگی۔

دو سفاک درندہ صفت افراد ہاتھوں میں بید کی لمبی لمبی چھڑیاں لیے انھیں بے دردی سے مار رہے تھے۔ اُن کے ہاتھوں کی حرکت سے شائیں شائیں کی آواز آتی تھی پھر اُن کے مُنہ سے غلیظ گالیاں اُبلتی تھیں اور عورتیں ضرب کی شدت سے تڑپ کے چیخ مارتی تھیں تو وہ ہنستے تھے۔ میں نے اُن عورتوں کے جسم پر لمبے لمبے نیل دیکھے اور وہ زخم دیکھے جو رِس رہے تھے یا خشک ہو کے سیاہ داغ بن گئے تھے۔ بکھرے بالوں اور دہشت زدہ آنکھوں والی ان عورتوں کے اس غول کو دیکھ کر مجھے طیش آ گیا آخر غلامی انسان کو بزدل کیوں بنا دیتی ہے؟ اس سے اپنی طاقت کا اجتماعی احساس کیوں چھین لیتی ہے۔ مانا کہ ایک یا دو عورتوں کا کسی مرد کی جسمانی طاقت کے مقابلے میں ٹھہرنا مشکل ہوتا ہے، مگر یہاں اُسّی عورتیں تھیں اور سب جوان، کیا وہ ایک ساتھ ان دو بھیڑیوں پر حملہ نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ ایک دو کو مار گراتے، ریوالور سے فائر کر کے وہ ایک ساتھ اُسّی عورتوں کو ہلاک نہیں کر سکتے تھے۔ اگر وہ دروازہ بند کر کے ان دونوں سے چمٹ جائیں تو ان کے جسم کا گوشت نوچ کھاتیں۔ اُن کے ناخن اور دانت کسی نے نہیں چھینے تھے۔ ایک سو ساٹھ ہاتھوں اور آٹھ سو انگلیوں کے ناخنوں کی یلغار کے سامنے دو خونی بھیڑیے کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔

اصل بات یہ تھی کہ وہ دو افراد حاکمیت کا غرور اور آزادی کا احساس رکھتے تھے۔ اُسّی عورتیں ذہنی طور پر بھی غلامی کے احساس سے مفلوج تھیں اور اکٹھی ہونے کے باوجود تنہا تھیں۔ اُن میں اجتماعی قوت کا شعور تھا مگر اُسے بیدار کرنے اور منظم کرنے والا کوئی نہیں تھا۔

ہمیں دیکھتے ہی ذرا دیر کے لیے سناٹا چھا گیا، بید برسانے والے ہاتھ رُک گئے، جسموں پر تشدّد جھیلنے والی عورتوں کی آہ و زاری رُک گئی، درد سے تڑپنے والی عورتوں کی آہیں اور سسکیاں رُک گئیں، انھوں نے خوف اور دہشت کے عکس آمیز چہرے

اٹھا کے دیکھا اور ایک لمحے کے لیے اُن کی نظر میری نظر سے ملی تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے نفرت کا زہر میری ریڑھ کی ہڈی میں آگ بن کے اُتر رہا ہے۔ اُن سب کا مجھے ملامت کرنا اور مطعون کرنا بجا تھا کیونکہ میں بھی ایک مَرد تھا اور یہ مردوں کی دنیا تھی جس میں مَرد ایک طرف کہہ رہے تھے کہ اے ماؤ، بہنو، بیٹیو! دنیا کی عزت تم سے ہے، جنت تمھارے قدموں کے نیچے ہے۔ اور دوسری طرف اُن کی عزتوں کو اور ان کے جسموں کی پاکیزگی کو خود ہی کُتوں کے آگے ڈال رہے تھے۔

خاموشی کا وہ لمحہ بڑا اذیت دینے والا تھا جس میں ہزار سوال تھے اور بے یقینی کے امکان تھے اور آرزو کے پُرسراب لمحوں کے فریب کا عکس تھا۔ جب یہ لمحہ گزر گیا تو میں نے ریوالور اٹھایا اور اُن دونوں کے سر میں ایک ایک گولی مار دی جو بید ہاتھ میں لیے گومگو کی کیفیت میں کھڑے ہوئے تھے۔ وہ گرے تو ان کے سر سے پھوٹنے والا خون ہر طرف پھیل گیا۔ ایک بار پھر فضا چیخوں سے بھر گئی۔ میں نے اُن عورتوں کو اپنے جسم پر پڑنے والے گندے خون کے چھینٹے دیوانہ وار صاف کرتے دیکھا جو قریب تھیں، وہ اپنے ہاتھوں سے لہو کے ہر چھینٹے کو صاف کر رہی تھیں اور پھر ہاتھوں کو دیوار پر رگڑ رہی تھیں اور فرش سے صاف کر رہی تھیں۔ دو عورتیں لڑکھڑا کے گریں اور بے ہوش ہو گئیں۔ جو سر گھٹنوں میں دیے بیٹھی تھیں یا فرش پر بے حس پڑی تھیں انھوں نے خون میں غلطاں ان درندوں کو دم توڑتے دیکھا جو اُن کی ساری ذلت و اذیت کے فتنے دار تھے اور اس منظر کو یوں دیکھتی رہیں جیسے یہ بھی خواہشوں کا سراب ہے ورنہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ کچھ عورتوں نے ہسٹریا کی دیوانگی میں دیوانہ وار ہنسنا شروع کیا۔

"میری بہنو!" میں نے ہاتھ اٹھا کے کہا۔ "مجھے معاف کر دو کہ میں بہت دیر سے آیا اور تم کو اس حال میں دیکھنے پر مجبور ہوا۔ خدا نے چاہا تو میں تم سب کو عزت آبرو کے ساتھ واپس اپنے اپنے گھر پہنچاؤں گا۔ شاید میں ہر ایک کے ساتھ نہ جا سکوں مگر آج ہی تم سب کو آزادی ملے گی، اور ایک موقع ملے گا کہ تم اپنی اپنی ہمت سے کام لے کر واپس وہیں جا سکو جہاں سے تم کو لایا گیا تھا۔ کیا تم جانا چاہتی ہو؟"

بیشتر عورتوں نے اقرار میں سر ہلایا۔

"اس کے لیے موقع میں فراہم کر رہا ہوں اور بھی جو کچھ تم کو میں دے سکا ضرور دوں گا لیکن اصل چیز تمھاری اپنی ہمت ہے جو تمھارے کام آئے گی۔ ان درندوں سے ڈرنے کی ضرورت نہیں، یہ نہ تمھارا تعاقب کریں گے اور نہ پھر کبھی تم پر ہاتھ ڈالیں گے۔ ہم نے دُنیا کو ان کے ناپاک وجود سے نجات دلا دی ہے۔"

میرا خیال ہے کہ وہ بہت کم اُردو سمجھتی تھیں۔ پھر بھی جو کچھ میں کہہ رہا تھا وہ واضح تھا۔ میرے عمل سے ثابت ہو چکا تھا۔ "اصل مُجرم یہ ہے۔" میں نے فرِدوش کو دھکا دے کر مُنہ کے بل گرا دیا۔ "اس کو میں بھی سزا دے سکتا تھا لیکن اسے میں تمھارے حوالے کر رہا ہوں۔ سب مل کے اس پر ٹوٹ پڑو کیونکہ تم سب کو اس سے اپنی اپنی رسوائی کا انتقام لینا ہے۔ ڈرو نہیں، یہ خالی ہاتھ ہے اور میں یہاں موجود ہوں۔"

فرِدوش چلایا۔ "یہ . . . یہ تم کیا کر رہے ہو۔" اور اٹھ کے میری طرف لپکا۔ میرے ایک مُکّے نے اسے پھر چِت کر دیا۔

"شاباش . . . ہمت سے کام لو، تمھیں ہمّت کی ضرورت ہے۔ ہر دشمن کے خلاف خود تم کو لڑنا ہے خواہ تمھاری دشمن اپنی ہی تقدیر کیوں نہ ہو۔ جب تک تم خود کچھ نہیں کرو گی خدا بھی تمھاری مدد نہیں کرے گا۔"

معلوم نہیں میرا یہ فلسفہ کس حد تک اُنھیں قائل کر سکا اور اس کا کتنا حصّہ ان کے دماغ میں بیٹھا۔ لیکن میرے اشارے نے انھیں خوف سے نجات دلا دی۔ کچھ خوشی کے ہسٹریا میں رونے لگیں تھیں مگر کم سے کم نصف تعداد اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ ان کی آنکھوں میں نفرت کی اور انتقام کی آگ دہکنے لگی تھی اور اس کے شعلے بلند سے بلند تر ہوتے جا رہے تھے۔

وہ کسی آدم خور چڑیلوں کے غول کی طرح اپنے پنجے پھیلا کے اور دانت تیز کر کے آگے بڑھیں۔ فرِدوش نے اُٹھ کر بھاگنے کی آخری بے سود کوشش کی۔ میں نے ایک اور مُکّا مار کے اُسے اُن عورتوں کے درمیان پھینک دیا۔

پھر میں نے وہ منظر دیکھا جو نہ میں نے کسی فلم میں دیکھا تھا اور نہ کسی دہشت ناک خواب میں۔ جو کسی فلم میں دکھایا جاتا تو ہال میں بیٹھے ہوئے کمزور دل لوگ بے ہوش ہو جاتے۔ اس سے ملتا جلتا سین میں نے گزشتہ روز بھی دیکھا تھا جب گل کے جسم کو لال چیونٹے چاٹ رہے تھے۔

اب گل کی جگہ فرِدوش پڑا ہوا تھا اور لال چیونٹوں کی جگہ وہ عورتیں تھیں جو اپنے جسم کی بے لباسی، اپنی ساری ذلت و رسوائی کے احساس کو بھول کر اپنے بدترین دشمن کو حیوانی جذبے کے ساتھ انتہائی اذیّت دے کر ہلاک کرنا چاہتی تھیں۔ وہ تہ خانہ اب فرِدوش کی چیخوں سے اور ان عورتوں کی خونی، ہذیانی ہنسی سے گونج رہا تھا۔ وہ فرِدوش کو دانتوں سے اُدھیڑ رہی تھیں اور ناخنوں سے نوچ رہی تھیں۔ فرِدوش کا خون بہہ رہا تھا۔ ان کے ہونٹ خون سے لال ہو رہے تھے اور ہاتھ خون سے بھر گئے تھے۔ دیوانگی میں وہ اپنے ہونٹ چاٹ رہی تھیں اور ہاتھوں کو چاٹ رہی تھیں۔

دس منٹ بعد یہ خونریز کھیل ختم ہو گیا۔ کچھ عورتیں احساس کے ردِ عمل سے بے ہوش ہو گئیں۔ باقی دور جا کھڑی ہوئیں اور اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگیں جن پر خون جم رہا تھا۔ درمیان میں فرِدوش کی لاش پڑی رہ گئی۔ گوشت کے اُدھڑے ہوئے ٹکڑے پھٹی ہوئی کھال، لہو آلودہ اور شکستہ۔ اس کی آنکھیں بھی ان خوں آشام عورتوں نے نکال دی تھیں اور اس کے جبڑے چیر دیے گئے۔ بہت سی عورتیں اُبکائی لے رہی تھیں۔ خود میں نے متلی محسوس کی اور اوپر بھاگا۔

میں نے کئی بار مُنہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے اور پھر عرشے پر لیٹ کر لمبے لمبے سانس لیتا رہا۔ ٹھنڈی ہوا نے میری طبیعت کو کسی حد تک بحال کر دیا۔ جب مجھے احساس ہوا تھا کہ کسی نے مجھے سمندر کے عذاب ناک سفر کی صعوبت اور بے چارگی کی موت سے بچا لیا تھا تو میں نے کتنا اطمینان محسوس کیا تھا اور اب یہ احساس تھا جو میری روح کا آزار بن گیا تھا۔ جو کچھ میں نے دیکھا تھا کیا اسے میں تمام عمر فراموش کر سکوں گا؟ یہ میری زندگی کے بدترین تجربات میں سے ایک تھا۔

اچانک میں نے کسی کے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سُنی، پھر کوئی عورت چیخ مار کے رونے لگی۔ میں نے آنکھیں کھول کے سر اُٹھایا اور بجلی کی طرح لپک کے اُٹھا مگر مجھے دیر ہو گئی۔ ایک عورت کے جسم کا ہیولا سا فضا میں لہرایا اور غائب ہو گیا۔ اُس نے عرشے کے کنارے پر سے سمندر میں چھلانگ لگا دی تھی۔ دوسری عورت جو اس کے پیچھے آئی تھی، ابھی سکتے کے عالم میں کھڑی تھی۔ مگر دوسرے ہی لمحے اُس نے بھی خود کو سمندر کے حوالے کر دیا۔

میں نے اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کی مگر لانچ انھیں پیچھے چھوڑ کے آگے بڑھ گئی تھی۔ یہ وہ عورتیں تھیں جنھوں نے آزادی ملتے ہی موت کو گلے لگانے کو ترجیح دی تھی۔ زندگی کی نہ انھیں خواہش تھی اور نہ ضرورت مگر وہ جینے پر مجبور تھیں۔ اُن کے لیے واپسی کے راستے مسدود ہوں گے یا پھر وہ اپنی آنکھوں میں بے آبروئی کا اعتراف لے کر اُن گھروں میں داخل ہونا نہیں چاہتی ہوں گی جو آبرو کے حصار تھے۔

میں نے انھیں بچانے کی کوشش کے بارے میں سوچا بھی نہیں۔ انھیں بچانا ممکن ہوتا تب بھی بے مقصد ہوتا۔ زندگی اُسی کی ہے جو جینا چاہے۔ زبردستی کسی کو ماہ و سال کی زنجیروں میں جکڑے رکھنا اور ایک عمر کو قیدِ بامشقت کی طرح کاٹنے پر مجبور کرنا بھی تو ظلم ہے۔

میرے پاس وقت بھی نہیں تھا۔ مجھے احساس تھا کہ ان میں چند ایسی ضرور ہوں گی جو واپس جا کے خوش نہیں ہوں گی کیونکہ وہ مفلسی اور فاقہ کشی، ہر خواہش کے احساسِ محرومی سے سمجھوتا کرنے کی مجبوری اور ناامیدی کی زندگی سے نکل گئی ہیں اور واپسی پر اُن کے لیے سارے پرانے عذاب تھے۔ اُن کا سرمایہ ایک جسم تھا جو یہاں بھی پامال ہوتا۔ باہر جسم کے عوض کچھ خوابوں کی تعبیر مِلتی۔ بہت سی ایسی ہوں گی جو عزت دار گھرانوں میں واپس لے لی جائیں گی یا قبول نہیں کی جائیں گی کہ اُن کا وجود ایک بدنما داغِ ندامت بن چکا ہے۔ میں ان سب کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ سب کے ساتھ اپنی تقدیر ہے اور میری تدبیر اُسے بدل نہیں سکتی۔

اب صبحِ کاذب کا اُجالا پھیل رہا تھا۔ صبح قریب تھی اور شاید چند گھنٹوں میں ہماری منزل آنے والی تھی۔ میں نے ایک سگریٹ جلا کے اعصاب کو سکون دینے کے لیے چند کش لیے پھر میں غالب کے پاس گیا۔ اُسے مختصراً ان بدبخت عورتوں کے بارے میں بتا کے واپس لوٹ آیا۔ غالب کے لیے لانچ چلانے والوں کے سر پر سوار رہنا ضروری تھا۔

لانچ کے ہر کیبن سے مجھے جتنے کپڑے۔ پردے، چادریں، اور تولیے، فرِدوش کے کوٹ اور دوسرے لوگوں کی قمیصیں اور پتلونیں ملیں، وہ سب میں نے نیچے اُن عورتوں تک پہنچا دیں جو پہلے ستر پوشی کے احساس سے ہی بے نیاز تھیں مگر اب سمٹی بیٹھی تھیں۔ اُن میں سے مجھے چار لڑکیاں ایسی ملیں جو اُردو سمجھتی بھی تھیں اور بولتی بھی تھیں۔ وہ سب تعلیم یافتہ تھیں اور ان بردہ فروشوں کے گروہ نے ان کو بیرونِ ملک لے جا کے اعلا ملازمتوں کے سبز باغ دکھائے تھے۔

میں نے انھیں کہا کہ وہ لانچ پر سے کھانے پینے کا سارا سامان لے جائیں، جو پکانا ہے پکائیں، سب کو کھلائیں اور خود بھی کھائیں۔ اس لانچ پر جو کچھ ہے وہ سب ان کا ہے۔ میرے اس اعلان نے جیسے مُردوں میں زندگی کی روح پھونک دی۔ ایک دم لانچ کا گوشہ گوشہ آباد ہو گیا۔ سوٹوں اور مردانہ کپڑوں یا چادروں میں لپٹی ہوئی عورتیں مضحکہ خیز ضرور لگ رہی تھیں مگر وہ خوش تھیں ہنس رہی تھیں اور شرما رہی تھیں۔ مجھے ان کو دیکھنے سے جو خوشی حاصل ہو رہی تھی وہ دنیا کی سب سے انمول، سچی اور بھرپور خوشی تھی۔

ایک لڑکی نے ڈرتے ڈرتے میرے قریب آ کے پوچھا۔ "سر! آپ کچھ پئیں گے، چائے یا کافی؟"

میں حیران رہ گیا۔ "تھینک یو۔ اگر تم لا کے دو گی تو ضرور پیوں گا اور دیکھو میں اکیلا نہیں ہوں۔ میرا ایک اور ساتھی بھی ہے۔ کیا تم کافی بنا سکتی ہو؟"

"یس سر! آپ دیکھیں گے کہ میں کتنی اچھی کافی بناتی ہوں۔" اُس کا چہرہ مسرّت سے دمکنے لگا۔ "شکریے کی کوئی بات نہیں۔ جو کچھ آپ نے ہم سب کے لیے کیا، اُس کے بدلے میں یہ کچھ نہیں اس احسان . . . والسے ااا . . ."

"مجھے دُکھ ہو رہا ہے، جاؤ کافی بناؤ۔" میں نے کہا اور عرشے کی ریلنگ کا سہارا لے کر صبحِ صادق کے آثار کو مشرق کے اُفق پر عیاں ہوتے دیکھتا رہا۔ اب میرا ذہن پہلے کے مقابلے میں بہت پُرسکون تھا اور میرے تھکے ہوئے اعصاب بھی ایک رات کے ایڈونچر کو سر کر لینے کے بعد کم کشیدہ تھے تاہم نیند کی کمی اور تھکن مجھ پر اثر انداز ہو رہی تھی لیکن اب سونے کا وقت گزر چکا تھا۔

جب وہ لڑکی کافی لے کر آئی تو میں نے اُس کا دل رکھنے کے لیے تسلیم کیا کہ اس سے بہتر کافی کا ذائقہ میں نے پہلے نہیں چکھا، حالانکہ اس کافی میں بنانے والے کی مہارت کا دخل ہی نہیں تھا۔ یہ انسٹنٹ کافی تھی جو گرم پانی میں حل ہو جاتی تھی، چینی دودھ اختیاری۔ میری تعریف سے خوش ہو کے وہ مزید کچھ . . . باتیں کرنے کے موڈ میں تھی اور مجھے اپنے بارے میں بتانا چاہتی تھی کہ کس طرح وہ ان بردہ فروشوں کے چنگل میں پھنس گئی تھی اور شاید اس کے بعد مجھ سے سوال کرتی کہ ہم کون ہیں جو مصیبت زدگان کی مدد کسی غرض کے بغیر کرنے کے لیے یوں نازل ہو گئے تھے لیکن میں اُتنی عورتوں کی بدبختی کی کہانیاں سُن کے مزید دُکھی ہوتا اور سب کی سُنتا تو سُن ہی نہ پاتا۔ پھر میرے لیے اپنے بارے میں سچ بتانے کا کوئی سوال نہ تھا چنانچہ میں نے جھوٹ بولنا بھی غیر ضروری جانتے ہوئے اُسے ٹال دیا۔

اُس کی دل شکنی تو ہوئی مگر میرا ذہن اپنے مسائل کے بارے میں سوچنے کے لیے آزاد رہا۔ میں کافی کا مگ لے کر وہاں چلا گیا جہاں غالب اور لانچ کے عملے کے درمیان سرد جنگ کی خاموشی تھی۔ ماتحت عملہ قیدی عورتوں کو آزادانہ گھومتا پھرتا دیکھ کے اور اُن کے ہنسنے بولنے کی آوازیں سن کے یقین کر چکا تھا کہ تختہ واقعی اُلٹ چکا ہے اور اب واپسی کا مطلب ہے، قانونی کارروائی، عمر قید۔ بردہ فروشی سے حاصل ہونے والی دولت کی عیّاشی ختم اور وہ عذاب شروع جس کا ڈر تھا۔

غالب اکیلا تھا چنانچہ اُن کی جامہ تلاشی نہ لے سکا تھا۔ کافی ختم کرنے کے بعد میں نے باری باری ان دونوں کی ہر جیب خالی کی۔ ایک نے نادانستگی میں مجھے ڈھال بنا کے غالب سے ہتھیار رکھوانے کی مختصر سی جدّوجہد کی۔ میرے ہاتھوں پٹ کر وہ سوجی ہوئی ناک پھٹے ہوئے ہونٹ اور ایک ٹوٹے ہوئے بازو کے ساتھ اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ اُس کے جسم کی چولیں دو منٹ میں ڈھیلی ہو گئیں چنانچہ وہ بُری طرح کراہ رہا تھا۔ اس کا دوسرا ساتھی وقت پر عبرت پکڑ کے بچ گیا۔

اب ہم دونوں زیادہ بے فکری کے ساتھ بیٹھ گئے۔ میں نے غالب کو فرِدوش کی موت کا واقعہ صرف اس لیے تفصیل سے سُنایا کہ وہ دونوں سُنیں جو عملے کے پسماندگان میں سے تھے۔

"کیا تم ہمیں بھی مار ڈالو گے؟" اُن میں سے

جاننے والا بولا۔

"اس کا انحصار۔ ۔ حالات اور تمھارے رویّے پر ہے۔" میں نے گول مول جواب دیا۔

"میں سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن آپ مجھے ایک موقع دیں۔ میں آئندہ یہ کام نہیں کروں گا،" وہ بولا۔ "میں ان کا ساتھ چھوڑ دوں گا۔ اگر آپ نے مجھے پولیس کے حوالے کیا تو بہت بُرا ہوگا۔"

"بُرائی کا نتیجہ تو بُرا ہی ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "کیا اس سیدھی سادی سچائی پر تم نے کبھی غور نہیں کیا تھا؟"

"میں لالچ میں اندھا ہوگیا تھا۔" وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ "بڑا گناہ گار ہوں میں۔ ۔ ۔"

"کب سے شریک ہو تم ان کے کاروبار میں؟"

"تین سال سے۔" وہ بولا۔

"اس گروہ میں اور کتنے لوگ شامل ہیں؟"

"بس یہی لوگ تھے، باقی تو ایجنٹ ہیں جو ہر جگہ سے مال لا کے سب ہی کو دیتے ہیں۔" وہ آنسو پونچھ کے بولا۔

"بے غیرت لوگ۔ اپنی بہنوں اور بیٹیوں کا خیال نہیں آتا تھا ان کے دل میں۔ کہاں سے لاتے تھے یہ مال؟"

"پورے انڈیا سے۔ ۔ ۔ زیادہ بمبئی اور کلکتہ سے۔ اب ڈھاکا سے۔ ۔ ۔"

"کیسے؟ زبردستی اغوا کر کے۔ ۔ ۔؟"

"اغوا بھی کرتے ہوں گے۔ بمبئی میں تو زیادہ تر وہی ملتی تھیں جو گھروں سے فلمی ہیروئن بننے نکلتی تھیں مگر ایکسٹرا بھی نہیں بن پاتی تھیں تو یہ ایجنٹ انھیں باہر اچھی جگہ رکھوانے کا سبز باغ دکھا کے لے آتے تھے۔ باقی پیشہ ور عاشقوں کے جال میں پھنس کے آتی تھیں۔"

"پیشہ ور عاشق؟"

اُس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "کچھ کالج کے لڑکے ہیں جن کی شکل و صورت اچھی ہے اور جو باتیں کرنا جانتے ہیں لیکن ہیں غریب۔ ان کو اسی کام کا معاوضہ دیا جاتا ہے ہر ماہ۔ وہ شہزادوں کی طرح رہتے ہیں۔ تحفے تحائف دیتے ہیں اور اپنا جال پھیلاتے پھرتے ہیں ہر جگہ۔ جو لڑکی پھنسی وہ بالآخر ہمارے پاس پہنچی۔ سب اپنے کام کے ماہر ہیں۔"

"کاش میرے پاس وقت ہوتا تو میں اُن سب پیشہ ور عاشقوں کے نام پتے تم سے پوچھتا اور پھر ایک ایک کو اٹھوا لیتا۔" میں نے افسوس کے ساتھ کہا۔ "سب کالج کے لڑکے ہیں؟"

"سب تو نہیں، زیادہ تر۔ باقی انھی کے جیسے کلرک وغیرہ ہیں۔ ان کے لیے تو یہ کام نہیں عیاشی ہے۔ پیسہ الگ ملتا ہے، نئی نئی لڑکیاں الگ ملتی ہیں۔ غریب لڑکیاں ہوتی ہیں، اس لیے بہت جلد خوابوں کی اسیر ہو جاتی ہیں۔" وہ بولا۔

"سبحان اللہ! کیا مشاہدہ اور تجزیہ ہے اور کیا حسنِ بیان ہے۔" میں نے کہا۔ "اہلِ زبان ہو تم تو؟"

"میں نے اُردو میں آنرز کیا ہے۔" وہ بولا۔

مجھے سخت صدمہ ہوا۔ "کاش نہ کیا ہوتا۔ پڑھے لکھوں کی لٹیا ڈبو دی تم نے۔ ہمیں بھی اب شرم آنے لگی ہے خود کو تعلیم یافتہ کہتے۔ تم میٹرک فیل ہوتے تو مجھے افسوس نہ ہوتا یا کم از کم ادب نہ پڑھا ہوتا تم نے۔"

غالب نے کہا۔ "تم ملازم تھے یا پارٹنر؟"

"سب حصے دار تھے۔ فرزوق کا پچاس فیصد تھا۔ اس میں سے وہ بلیک روز کو بھی دیتا تھا۔" وہ بولا۔ "باقی سب کو دس فیصد ملتا تھا۔"

"بلیک روز کا اس کاروبار میں کیا کردار تھا؟"

"وہ باہر کی ایجنٹ تھی۔ سپلائی کے آرڈر لیتی تھی اور مال لینے والے تلاش کرتی تھی۔ وہ کالی ضرور تھی مگر اس کے کالے جادو کا توڑ نہیں تھا۔ بڑے بڑے اُس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے تھے اور انھی کی مدد سے وہ تعلقات کا دائرہ وسیع کرتی جاتی تھی۔ اس پر کوئی ہاتھ نہیں ڈال سکتا تھا اور اس کی وجہ سے ہم محفوظ رہتے تھے۔"

یہ سب کچھ جان لینے کے بعد فیصلہ آسان ہوگیا تھا۔ اگر وہ مجبوری کا عذر پیش کرتے کہ وہ غربت کی مجبوری یا جان کے خوف سے اس مذموم کاروبار میں شریک تھے تو مجھے سوچنا پڑتا لیکن اب اس عالم فاضل نے خود ہی اعتراف کر لیا تھا کہ وہ رضاکارانہ طور پر اس دھندے میں شریک تھے اور اُن کی حیثیت ملازم کی نہیں پارٹنر کی تھی، ان کا وہی انجام ہونا لازمی تھا جو دوسرے پارٹنرز کا ہوا۔ وہ ایک چالاک آدمی تھا۔ اُس نے سچ بول کے اور تمام معلومات فراہم کر کے وہی رعایت حاصل کرنے کی کوشش کی تھی جو وعدہ معاف گواہ کو مل جاتی ہے لیکن ایم آر ایس بھی اس قانون کو نہیں مانتی تھی جس کو مجرم بھی قانون نہیں مانتے تھے چنانچہ ہم ایم آر ایس کے نظامِ انصاف کے مطابق سزا دینے میں حق بجانب تھے اور ہمارے لیے اطمینان کی سب سے بڑی وجہ یہی تھی کہ آج تک ہم نے انصاف کے نام پر کسی بے گناہ کو سزا نہیں دی تھی مگر وہ جو مجرم تھے اور اس خوش فہمی میں مبتلا رہتے تھے کہ وہ قانون کو خرید سکتے ہیں اور بدل سکتے ہیں، قانون سے کھیل سکتے ہیں، قانون کے عمل کو معطل کر سکتے ہیں اور موقوف کر سکتے ہیں اور اسے تماشا بنا سکتے ہیں اور قانون اُن کے تابع ہے، وہ قانون کے تابع نہیں ہیں ایسے سب مجرموں کے لیے ایم آر ایس کے نظامِ انصاف کی گرفت میں آجانے پر بچ جانا ناممکن ثابت ہوا تھا۔ ثبوت مٹانے، شہادت غلط کرنے یا

...نیوں سے مہلت حاصل کرنے کی یہاں کوئی گنجائش نہیں تھی۔ سارے فیصلے جائے واردات پر ہی ہوتے تھے جہاں زبان خنجر چپ رہتی تھی اور نہ آستین کا لہو۔

"صبح ہو گئی۔" غالب نے اچانک کہا۔

میں نے چونک کر سورج کو دیکھا جو سمندر سے ابھی ابھی ابھرا تھا۔ اس کا زرد گولا بجھا بجھا سا لگتا تھا۔

"آج جمعرات ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم پہنچ گئے۔"

غالب مسکرانے لگا۔ "ہاں، شام سے پہلے پہنچ گئے۔"

"خدا کرے وہ بھی خیریت سے پہنچ گئے ہوں۔" میں نے گل، نازو اور محسن کا نام لیے بغیر کہا۔ "معلوم نہیں اُن کا سفر کیسا گزرا؟"

"اُن کے پاس اسبابِ ضرورت تھا۔"

"سفر کی سختی تو وہی تھی اور ہم دونوں کے مقابلے میں صرف محسن کے لیے کہا جا سکتا ہے کہ وہ اتنی ہی قوتِ برداشت رکھتا تھا۔"

"نازو مجھ سے زیادہ سخت جان ہے۔" غالب نے کہا۔ "مگر ہاں، گل کی طرف سے مجھے بھی تشویش ہے۔"

گل اور نازو کے نام پر لانچ چلانے والے نے ہمیں چونک کر دیکھا لیکن میں نے اہمیت نہیں دی۔ اس کے سامنے ہم کھل کے بات کر سکتے تھے۔ اس سے یہ خطرہ نہیں رہا تھا کہ وہ ہمارا راز افشا کر سکے گا کیونکہ اُن کی زندگی کا سفر بھی اس سفر کے ساتھ ہی تمام ہونے کو تھا۔

"تم بمبئی کے ساحل سے کس حد تک واقف ہو؟" میں نے لانچ چلانے والے سے کہا۔

"میں ہر ساحل سے واقف ہوں۔ بمبئی سے راس کماری اور ملک کے ساحل سے کلکتہ تک۔" وہ فخر سے بولا۔

"ہوں۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "بمبئی کے ساحل پر یا اس کے قریب کوئی ایسی جگہ ہے جہاں ہم بحفاظت اُتر سکیں اور کوئی ہمیں نہ دیکھے؟"

اُسے اب یقین ہو چلا تھا کہ اپنی افادیت ثابت کر دینے کے بعد وہ ہمارے ساتھی کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔ "میں سمجھ گیا، ہم خود ایسے ہی مقامات تلاش کرتے رہتے ہیں۔ ہر بار ایک ہی جگہ سے روانہ نہیں ہوتے۔" وہ بولا۔

"اپنی ذمے داری پر لانچ کو ایسی جگہ لے چلو جو بمبئی سے نزدیک ہو تو کوئی حرج نہیں مگر اس جگہ کو عام طور پر کوئی بھی استعمال نہ کرتا ہو۔" میں نے کہا۔

"دن کے اُجالے میں صرف بندرگاہ استعمال ہوتی ہے۔ تمام نمبر اڈے اس وقت ویران ہوں گے۔ پولیس اور چھاپے مارنے والے بھی نہیں ہوں گے۔ ویسے آپ کو جانا کہاں ہے؟" وہ بولا۔

"ہمیں کہاں جانا ہے۔" میں نے کہا۔ "جانا ان بدنصیب عورتوں کو ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ کسی کو بھی ان کی واپسی کی خبر ہو ورنہ یہ پھر پکڑی جائیں گی۔" میں نے کہا۔

"اس کے بعد ہم تو ظاہر ہے بمبئی ہی جائیں گے۔" غالب نے کہا۔

"تمھارے خیال میں اب کتنی مسافت باقی ہے؟" میں نے کہا۔

اُس نے کلائی کی گھڑی دیکھی۔ "دو گھنٹے، زیادہ سے زیادہ تین گھنٹے میں ہم ساحل پر ہوں گے۔"

میں نے اُسے غالب کی نگرانی میں چھوڑا اور باہر آگیا۔ رہائی پانے والی زیادہ عورتیں عرشے پر کھڑی سمندر کا نظارہ کر رہی تھیں۔ وہ سب شریف عورتیں نہیں تھیں۔ ان میں سے چار عورتیں ناکافی لباس کے باوجود بے فکری سے گھوم رہی تھیں اور سگریٹیں پی رہی تھیں۔ ان سب کو کھانے پینے کا وافر سامان مل گیا تھا۔ سگریٹ اور شراب جو پہلے لانچ کے مالک پیتے تھے اب اُن کے تصرّف میں تھی اور وہ چاروں عرشے کے کٹہرے پر جھکی قہقہے لگا رہی تھیں۔ اُن کے ہاتھوں میں بوتلیں تھیں اور لبوں میں سلگتے ہوئے سگریٹ۔ کند ہم جنس با ہم جنس پرواز۔ ایک سی خصلت رکھنے والی چاروں اوباش عورتوں کی منڈلی سب سے الگ ہوگئی تھی۔ باقی عورتوں میں سے کچھ مطمئن انداز میں ٹہل رہی تھیں، کچھ مستقبل کے اندیشوں میں گرفتار تھیں اور شاید یہ سوچ رہی تھیں کہ معاشرے نے ان کو واپس قبول نہ کیا تو وہ کہاں جائیں گی؟ چند ایک ابھی تک اپنے قید خانے سے ہی برآمد نہیں ہوئی تھیں۔

میں نے اُس لڑکی کو بلایا جو میرے لیے کافی لے کر آئی تھی۔ وہ لپک کر آئی۔

"اِن سب نے اچھی طرح کھا پی لیا ہے؟"

"یس سر۔ آپ دیکھ رہے ہیں ان کی حالت میں تبدیلی۔" میں نے کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ ان کو آگے جا کے کئی گھنٹے بھوکے پیاسے گزارنے پڑیں۔ کیا یہ سب واپس جانے کے خیال سے خوش ہیں؟"

"سب کے بارے میں کیا کہہ سکتی ہوں میں؟" وہ بولی۔ "خوش ہونا تو چاہیے انھیں۔ لیکن وہ چاروں بے حیا طوائفیں ہیں، وہ یہاں بھی خوش تھیں۔"

"تم خوش ہو؟"

"یقیناً خوش ہوں میں۔" اُس نے ممنونیت کے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"کہاں رہتی ہو تم؟ بمبئی میں؟ کیا کرتی ہو؟"

"میں نرسنگ کے آخری سال میں تھی۔ آپ نے میرا

کیریئر تباہ ہونے سے بچا لیا۔ میں واپس پہنچ کر کورس پورا کرلوں گی۔ چند دن کی غیر حاضری کا کسی کو احساس بھی نہیں ہوگا۔" وہ بولی۔ "نوشیرواں نرسنگ ہوم کے ہوسٹل نمبر ایک میں رہتی ہوں۔"

"والدین ہیں؟"

"ہیں مگر دونوں سوتیلے۔ پہلے ماں مر گئی تھی تو باپ نے دوسری شادی کی۔ پھر باپ مر گیا تو ماں نے۔ اُن سے میرا کوئی تعلق نہیں۔"

"اِن کے چکّر میں کیسے پڑ گئیں؟"

"لمبی کہانی ہے سر۔ یوں سمجھ لیں قسمت نہیں عقل خراب تھی۔ میرا منگیتر ایک ڈاکٹر ہے جو اعلا تعلیم کے لیے باہر گیا ہے۔ بہت اچھا اور نیک آدمی ہے، بس وہ بدصورت ہے۔ میں نے اس لیے قبول کیا تھا کہ ایک ڈاکٹر کی بیوی ہونے کے ساتھ ساتھ میں کوالیفائڈ نرس بن کے اس کی مدد کر سکوں گی اور ہم اپنا کلینک قائم کرلیں گے تو کامیاب رہیں گے۔ بعد میں ایک بزنس مین میرے پیچھے پڑ گیا۔ وہ بے حد دلکش شخصیت کا مالک تھا۔ اس نے مجھ پر ایسا جادو کیا کہ میں اپنے منگیتر کو بھول گئی۔ میرے لیے مزاحمت ناممکن ہو جاتی تھی۔ کوئی ایسی بات تھی اس میں کہ وہ عورتوں کو ایسے کھینچ لیتا تھا جیسے مقناطیس لوہے کو کھینچ لیتا ہے۔ یہ میں نے کئی بار دیکھا۔ اور میں خود اس کی مثال تھی۔ جب اس نے مجھ سے شادی کے لیے کہا تو میں خوشی سے پاگل ہو گئی۔ جو اُس نے کہا میں نے مان لیا۔ ہم نے سول میرج کی۔ ایک ہفتے بعد وہ مجھے اس لانچ پر چھوڑ کے غائب ہو گیا۔ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ میرے علاوہ بھی اُس کی دو بیویاں اسی لانچ پر ہیں۔ وہ ایک ہی آدمی تھا جس کی تصویر ہم سب کے پاس تھی لیکن ہم تینوں اس کو مختلف ناموں سے اپنا اپنا شوہر مانتی تھیں۔"

"کیا تم تینوں اسے تلاش کرو گی؟"

"کیا فائدہ اس سے؟ وہ انھی کا آدمی تھا اور ظاہر ہے اس کا کوئی نام اصل نام نہیں ہوگا۔ باقی دو کا تو مجھے پتا نہیں مگر میں اس سے دُور ہی رہنا چاہتی ہوں۔ ورنہ اُسے مجھ سے خطرہ لاحق ہوا تو وہ مجھے اغوا کرائے گا یا قتل کرا دے گا۔ اس کو فی الحال اطمینان حاصل رہنا چاہیے کہ میں اس کے خلاف کوئی انتقامی جذبہ نہیں رکھتی۔ اس سے کوئی تعلق بھی رکھنا نہیں چاہتی۔"

"لیکن تم انتقام لوگی اُس سے؟"

"ہاں۔۔۔ ابھی نہیں۔۔۔ سال دو سال۔۔۔ چار سال بعد جب میری شادی اس ڈاکٹر سے ہو جائے گی تو میں بدلہ ضرور لوں گی۔ کسی دن موقع ملتے ہی میں اس کو ایسا انجکشن لگا دوں گی کہ وہ پاگل ہو جائے گا، یا مر جائے گا تڑپ تڑپ کے۔"

"ایسا ضرور کرتا۔۔۔ اور اگر ہو سکے تو ان سب کو جو انتقام لینا چاہتی ہیں یہ سمجھاتا کہ اِن کو وُور غلاک کے فروخت کر دینے والے عاشق ہی اصل مجرم ہیں۔ اُن کے ساتھ عفو و درگزر کرنا ایسا ہی ہے جیسے خطرناک سانپ یا پاگل کتے کو نہ مارنا۔ معاشرے میں یہ سب کا فرض بنتا ہے کہ ایسے لوگوں کو ختم کیا جائے تاکہ اُن سے دوسری لڑکیاں اور شریف عورتیں محفوظ رہیں۔ یہ کام قانون نہیں کرتا، کر بھی نہیں سکتا۔ اپنے مجرم کو خود سزا دو۔ اپنی مظلومیت کی تشہیر سے صرف رسوائی ملتی ہے ـــ لاٹھی ٹوٹ جاتی ہے سانپ نہیں مرتا۔"

وہ پلک جھپکائے بغیر مجھے دیکھتی رہی اور میری بات سنتی رہی۔ "آپ نے ٹھیک کہا سر۔ لیکن اتنی جراُت سب میں نہیں ہوتی کہ قتل کریں اور پھانسی چڑھ جائیں۔"

"حوصلہ ہونا چاہیے۔ اب وہ شخص جس نے تمھیں دھوکا دیا تھا، تم سے پہلے نہ جانے کتنی لڑکیوں کو ایسی ہی لانچوں پر روانہ کر چکا ہوگا اور زندہ رہے گا تو آئندہ نہ جانے کتنی اور تم جیسی لڑکیاں جلا وطن ہو کے دنیا کے بازار میں بک جائیں گی۔ کیا یہ احساس تمھارے لیے باعثِ طمانیت نہیں ہوگا کہ اپنی جان پر کھیل کے تم نے ایک شیطان کو ختم کر دیا۔ ایک برائی کو مٹا دیا اور بہت سی لڑکیوں کی عزت بچالی۔ اگر ہر لڑکی جو کسی بھی عزتوں کے بیوپاری کے ہاتھوں جنسِ بازار بنی تھی، ایک خرابی کے سبب کو ختم کر دے تو سوچو کتنی خرابیاں ختم ہو جائیں گی۔ یہ ضروری تو نہیں کہ سب پکڑی جائیں۔"

"آپ سب کو قاتل بنانا چاہتے ہیں؟"

"میں سب کو اپنے مقدمے کا مدعی اور منصف خود بنانا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "خدا سے فریاد کرنے اور حاکم کے آگے رونے پیٹنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ شکایت کرنا بھی سزا بن جاتا ہے۔ ہر ظلم کو برداشت کرنے کی عادت ظالم کو شہ دیتی ہے۔ جاؤ اور ان سب کو نیچے پہنچا دو ـــ اُن سب سے کہو کہ ساحل پر پہنچنے کے بعد بھی جب تک ہم نہ کہیں کوئی باہر نہ آئے۔"

اُس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "میں کوشش کرتی ہوں کہ وہ میری بات سن لیں۔"

"ان سب کے پاس نقد رقم ہے؟ کچھ ملا تھا یہاں؟"

"بہت کچھ ملا تھا سر۔ سب نے آپس میں تقسیم کر لیا ہے بلکہ میں نے تین لڑکیوں کی مدد سے برابر تقسیم کیا ہے ورنہ لوٹ مار شروع ہو جاتی۔ ہر لڑکی کو پچاس پچاس ڈالر مل گئے ہیں اور پانچ پانچ سو روپے۔" وہ بولی۔

"ٹھیک ہے۔ سفر میں پیسہ بھی کام آئے گا۔ ہم انھیں بمبئی کے ساحل سے رخصت کر دیں گے۔" میں نے کہا۔

وہ ایک سمجھدار اور ذہین لڑکی تھی، صرف وقت گزارنے کے لیے میں نے اس کی کہانی سُن لی۔ مجھے اندازہ تھا کہ باقی سب کی کہانیاں بھی مختلف نہیں ہوں گی، بس کرداروں کے نام اور مقامات کا فرق ہوگا۔ میں نے اُس کو ظلم کے خلاف جہاد کا وہ فلسفہ بھی پڑھا دیا تھا جو ایم آر ایس کا فلسفہ تھا۔ مائٹ از رائٹ۔ آگے سب کی اپنی اپنی مرضی اور اپنی اپنی تقدیر جسے جہاں چاہے لے جائے۔

اب ہمارے چاروں طرف کشتیوں اور لانچوں کے ساتھ بحری جہازوں کی آمد و رفت بہت بڑھ گئی تھی لیکن ساحل کا ہنوز دُور دُور تک پتا نہ تھا۔ صاف آسمان پر سورج خاصا بلند ہو گیا تھا اور صبح دم پرواز کرنے والے آبی پرندوں کی قطاریں بھی اب دکھائی نہ دیتی تھیں۔ سمندر اس سفر کے دوران پُرسکون رہا تھا اور ہوا بھی تیز نہیں تھی ورنہ جیسا کہ میں نے سُنا تھا سمندروں کا مدوجزر۔۔۔ سائیکلون اور طوفانی گرداب بڑے بڑے بحری جہازوں کو ڈبو دیتے ہیں۔

عرشے پر ٹہلنے والی عورتیں اب سمٹ کر واپس نیچے جا رہی تھیں۔ جس لڑکی سے میری بات ہوئی تھی، وہ ایک اچھی منتظم تھی۔ اُس نے تین دوسری عورتوں کی مدد سے اس مردم گزیدہ بھرے ہوئے اور لاوارث ہجوم کو سمجھا بُجھا کے قائل کر لیا تھا کہ یہ وقتی پابندی انھی کے مفاد میں ہے اور پابندی لگانے والے انھی کے نجات دہندہ ہیں۔

وہ چار عورتیں جو بے شرمی کی حد تک بے باک تھیں، بوتل سے مُنہ لگا کے پیتی رہی تھیں اور نشے سے مغلوب تھیں۔ انھوں نے اس حکم کی تعمیل سے صاف انکار کر دیا۔ ان میں سے تین اپنی اپنی خالی بوتلیں سمندر میں اُچھال چکی تھیں مگر چوتھی نے آخری گھونٹ لے کر بوتل سے اُس لڑکی پر وار کیا تو میرے لیے دور کھڑے رہ کر تماشا دیکھنا مشکل ہو گیا۔ اُس نے میرا مقابلہ کرنے کی کوشش بھی کی اور مجھے وہ سب گالیاں بھی سننا پڑیں جو درحقیقت فرشتوں کے لیے تھیں مگر اُسے دی نہیں گئی تھیں۔ بالآخر میں اس کو گھسیٹ کر لے گیا اور تہ خانے میں پھینک دیا۔ باقی دو کا نشہ ہرن ہو گیا اور وہ خاموشی سے نیچے اُتر گئیں۔ آخری عورت جاتے جاتے میرے سامنے ٹھہر گئی۔ اُس نے پتلون پر صرف کوٹ پہن رکھا تھا اور اُسے بھی بند نہیں کیا تھا۔

وہ مجھے دیکھ کر دیوانگی کے انداز میں ہنسنے لگی۔ "تم۔۔۔ سالے مرد۔۔۔ سب ایک جیسے کتے ہو۔۔۔ وہ گھٹیا نسل کے۔۔۔ کتے تھے۔۔۔ تم۔۔۔ اچھی نسل کے ہو۔۔۔ مگر کتے ہو۔۔۔ مجھے معلوم ہے۔۔۔ تم بھی وہی کرو گے۔۔۔ جو سب مرد کرتے ہیں۔۔۔ پھر ڈرتے کیوں ہو۔۔۔ آؤ میرے ساتھ۔۔۔ میں نہیں ڈرتی۔۔۔"

میں نے بلا ارادہ اس کے چھانپڑ مار دیا۔ یہ سوچے بغیر کہ ایک فاحشہ جب شراب کے نشے میں بولے گی تو نیکی اور شرافت کی باتیں نہیں کرے گی۔ وہ گری اور چند سیکنڈ ساکت بیٹھی رہی۔

"ہنٹر۔۔۔ یا چھڑی نہیں ہے۔۔۔ تمھارے پاس؟۔۔۔ ٹائم تو ہو گیا ہے۔۔۔" وہ بولی۔ پھر اُس نے کوٹ اُتار کے پھینک دیا اور سجدہ کرنے کے انداز میں جھک گئی۔ اس کی کمر پر آڑی ترچھی سیاہی مائل نیلی لکیروں کا جال سا پھیلا ہوا تھا۔ میں نے اپنا مُنہ دوسری طرف کر لیا اور دو عورتوں سے کہا کہ اسے اٹھا کے لے جائیں۔ اس کی ہذیانی ہنسی بہت دیر تک میرے احساس پر کوڑے برساتی رہی۔ "یہ میں کس عذاب میں پڑ گیا میرے خدا!" میں نے کہا۔ "جسم کی اذیت ہی بہتر تھی اس سے تو!" میں نے عرشے کی ریلنگ پر سر رکھ کے سوچا۔

ساحل کی لکیر صبح کے پونے نو بجے نمودار ہوئی۔ میں اُس لکیر کو اُفق سے سامنے ابھر کے واضح صورت اختیار کرتے دیکھتا رہا۔ سرِدست مجھے کچھ بھی نہیں کرنا تھا۔ لانچ کی سمت کو غالب کنٹرول کر رہا تھا اور بظاہر سب ٹھیک تھا۔ جدھر ہم جا رہے تھے اُدھر بہت کم سمندری ٹریفک یہ ظاہر کرتا تھا کہ ہم بمبئی کی اصل بندرگاہ سے آگے نکل گئے ہیں۔ کئی میل پیچھے نظر آنے والی موٹر بوٹس اور کشتیاں، لانچیں اور بحری جہاز ایک مخصوص علاقے میں رواں دواں تھے۔

ساڑھے نو بجے میں نے پام کے درختوں اور اونچی نیچی پہاڑیوں والے ساحل کو اپنے سامنے پایا۔ لانچ کی رفتار اب کم ہو گئی تھی اور یہ سفر بالآخر ختم ہونے والا تھا۔ آس پاس مجھے کوئی دوسری لانچ دکھائی نہ دی۔ جو لائحہ عمل میرے ذہن میں تھا، اس کے مطابق سب سے پہلے ان بدقسمت عورتوں کو روانہ کرنا ضروری تھا۔ مگر کیا وہ اس ویران ساحل پر اُتر کے روانہ ہو جائیں گی؟ وہ پوچھیں گی نہیں کہ یہ ہمیں کہاں لا کے چھوڑ دیا؟ اس حالت میں ایک ساتھ اتنی عورتوں کا ہجوم جہاں بھی جائے گا شکوک پیدا کرے گا۔ خیر ہماری صحت پر اس سے کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ وہ کچھ بھی کہیں اور ہمارے بارے میں جو چاہیں بتائیں لیکن انھوں نے جانے سے انکار کر دیا تو پھر ـــ پھر ترکیب میری سمجھ میں آ گئی۔

لانچ اب پتھریلی چٹانوں کے درمیان سے گزر رہی تھی۔ لانچ کو چلانے والا خفیہ پناہ گاہوں کے جغرافیے کو سمجھتا تھا اور ہمیں محفوظ مقام پر پہنچانے کا وعدہ اس اُمید میں پورا کر رہا تھا کہ اس طرح وہ ہم سے رعایت کا مستحق ہو جائے گا۔ یہ اُس کی خام خیالی تھی۔ یہ اُس کی موت تھی جو اُسے گھیر کر یہاں لائی تھی۔

میں نے اُس لڑکی کو بلایا جو اب تک عورتوں کے معاملات کو سنبھالنے میں میری مددگار ثابت ہوئی تھی۔ میں نے اُسے تاکید کی وہ باہر آنے سے پہلے دروازے کو بند کر آئے۔ لانچ اب

دو چٹانوں کے درمیان رُک چکی تھی، تیسری چٹان سمندر کی جانب تھی چنانچہ لانچ کے نظر آ جانے کا اندیشہ نہیں رہا تھا۔ چوتھی جانب سمندر کا ساحل تھا جو اب بھی پچاس گز دور تھا۔ لانچ اگر اس سے آگے جاتی تو خشکی پر چڑھ جاتی۔

"آپ نے بُلایا تھا سر۔"

مَیں نے کہا۔ "ہاں، تم نے بتایا تھا کہ تم نرسنگ کا کورس کر رہی ہو۔ اس کے علاوہ کیا کر سکتی ہو؟"

وہ میرے سوال کی نوعیت پر حیران ہوئی۔ "وہ... سب کچھ جو ایک لڑکی کر سکتی ہے... سر۔"

"گولی چلا سکتی ہو؟"

وہ خوفزدہ ہو گئی۔ "نہیں... نہیں سر۔"

"ڈرو نہیں، مجھے معلوم ہے کہ تمھارا پیشہ تم کو زخم سینا اور اُن پر مرہم رکھنا سکھاتا ہے۔" مَیں نے کہا۔ "لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ حالات کے تقاضے... وہ سب کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں جو آدمی نہیں کرنا چاہتا... مجھ پر بھی ایسے وقت آئے جب میرا خیال تھا کہ مَیں کوئی کام نہیں کر سکوں گا لیکن مَیں نے کیا..."

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں سر، صاف کہیے۔"

میں نے جیب سے ریوالور نکالا۔ "یہ لو... پکڑو۔"

وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ "کیا... کسی کو قتل کرانا چاہتے ہیں آپ مجھ سے...؟ میں نہیں کروں گی یہ کام... جو کرنا ہے خود کرو۔"

"پہلے میری بات سُن لو۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "نہ تم کو قتل کرنا ہے کسی کو اور نہ میں اتنا گیا گزرا ہوں کہ تم سے ایسا کام کراؤں۔ کیا تم نے دیکھا نہیں تھا کہ مَیں نے ہی اُن کو کُتے کی موت مارا تھا... لو پکڑو اسے، یہ خود بخود نہیں چلتا۔"

اُس نے آہستہ آہستہ اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور ریوالور لے لیا۔ مَیں نے اُس کا ہاتھ تھام کے اُسے ریوالور کو صحیح طرح پکڑنے کا طریقہ بتایا۔

"یہ دیکھو، یہ سیفٹی کیچ ہے۔ یوں سمجھو کہ اس کا لاک ہے۔ جب تک یہ اس پوزیشن میں ہے فائر غلطی سے بھی نہیں ہو سکتا۔ اس کو ہٹانے کے بعد۔" مَیں نے کہا۔ "یہ دیکھو۔ اس کا رُخ سامنے کی طرف رکھو..."

"مَیں... مَیں نہیں چلا سکتی اسے..."

مَیں نے اُس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ "میرا خیال ہے کہ اس کی ضرورت بھی پیش نہیں آئے گی۔" مَیں نے کہا۔ "بس تم اسے ایک ہی رُخ میں رکھنا، جو بھی سامنے ہو گا وہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکے گا۔ اس کی دہشت ہی کافی ہوتی ہے۔ اب دھیان سے میری بات سنو۔ مَیں اور میرا ساتھی یہاں اُتر جائیں گے۔ تم اور باقی سب عورتیں اسی لانچ میں بمبئی کی بندرگاہ تک جاؤ گی۔ وہاں پہنچنے کے بعد تمھاری مرضی، چاہو تو اس کو گولی مار دینا، الیسے ٹریگر دبا دینا۔ اتنے قریب سے نشانہ خطا نہیں ہوتا یا پھر اسے پولیس کے حوالے کر دینا۔ پولیس تو آ ہی جائے گی۔ اگر تم اپنی جان پولیس کے چکروں سے چھڑانا چاہو تو اسے گولی مارتے ہی فرار ہو جانا۔ اتنی لڑکیوں کو ایک لانچ سے ایسے عجیب لباس میں اُترتے دیکھ کے مجمع تو اکٹھا ہو گا اور پوچھا بھی جائے گا کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ تم سب کو جھوٹ بولنے کی قطعی ضرورت نہیں، جو ہوا وہ سب کو بتا دینا۔ اب آؤ میرے ساتھ۔"

بادلِ ناخواستہ وہ میرے ساتھ چل پڑی۔ غالب لانچ کے رُک جانے کے بعد میرے انتظار میں مستعد بیٹھا [illegible] غالب کو اس ناخوشگوار فریضے سے نجات دلائی جس میں وہ ایک لمحے کے لیے غافل ہونے کا رِسک نہیں لے سکتا تھا۔

"تم اس بندے کو ساتھ لے جاؤ۔" مَیں نے لانچ چلانے والے کے دوسرے ساتھی کی طرف اشارہ کیا۔ "اور میرا انتظار کرو۔"

"مَیں کہیں نہیں جاؤں گا۔" وہ سرکش لہجے میں بولا۔

"جاؤ گے کیسے نہیں؟ تمھارا تو باپ بھی جائے گا۔" مَیں نے کہا۔ "اب یہ بتا دو کہ کس طرح جانا چاہتے ہو؟ اپنے پیروں پر چل کر سالم ایک پیس کی صورت میں یا آملیٹ بنوا کے؟"

"مجھے گولی مارنی ہے تو اسی جگہ مار دو۔" وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بولا۔

"یہ بھی اچھا آئیڈیا ہے۔" مَیں نے کہا۔ "او کے، مَیں گنتا ہوں پانچ تک۔ پانچ سیکنڈ بعد تمھاری خواہش پوری ہو جائے گی۔"

مَیں نے صحیح وقفے کے ساتھ پانچ تک گنا۔ وہ نہیں اُٹھا تو میرے لیے اُس کو شوٹ کر دینا ضروری ہو گیا۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو خود اپنی نظروں میں گر جاتا کہ مَیں خود سب کے سامنے ایک بات کہہ کے اس پر عمل نہ کر سکا تھا۔ سزائے موت ویسے بھی اُس کا مقدر ہو چکی تھی اور شاید وہ بھی یہ بات سمجھ گیا تھا۔

اُس کی موت نے میرے ساتھ آنے والی لڑکی کو نروس بھی کیا تھا مگر اس کے اعتماد میں اضافہ بھی کیا تھا۔ تھوڑی دیر کے ساتھ میں نے پریکٹیکل کر کے بتا دیا تھا کہ دشمن کو گولی مارنا کتنا آسان ہوتا ہے۔ اُس کے واحد زندہ بچ جانے والے ساتھی کی نظریں پہلے لاش پر مرتکز رہیں۔ پھر اُس نے میری طرف دیکھا۔

"میرے لیے کیا حکم ہے سر؟" اُس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کے کہا۔ "مَیں نے کوئی حکم عدولی نہیں کی۔ آپ سے پورا تعاون کیا۔"

"طے تو ہم نے یہی کیا تھا کہ تمھارا انجام بھی مختلف نہیں ہونا چاہیے۔" مَیں نے کہا۔ "لیکن تم زندہ رہنے کی رعایت حاصل کرنے میں تقریباً کامیاب ہو گئے ہو بس تھوڑا سا کام باقی ہے۔

اب ہم جا رہے ہیں۔ تم اِن سب لڑکیوں کو بمبئی کی بندرگاہ پر لے جاؤ گے اور خود کو پولیس کے حوالے کر دو گے۔"

اُس کا رنگ فق ہو گیا۔ "پولیس...؟"

"ہاں، یہ بات یقینی ہے کہ تم کو سزائے موت نہیں ہو گی۔ تم پولیس کو وہ سب کچھ بتا سکتے ہو جو سچ ہے۔ جو تم نے کیا، دیکھا یا سُنا۔ اعتراف کی صورت میں قانون تمھیں رعایت ضرور دے گا۔ تم کو سات سال شاید جیل میں گزارنے پڑیں گے مگر تم زندہ رہو گے۔ تم مجبوری کا عُذر بھی پیش کر سکتے ہو۔ میری طرف سے اجازت ہے کہ خود ہیرو بن جاؤ۔ یہ کہو کہ تم ان کے ساتھی ہی نہیں تھے اور تم نے ہی ایک غیرت مند انسان ہونے کی وجہ سے بردہ فروشوں کو مار دیا اور لانچ لے کر ساحل پہ آ گئے۔ تم لانچ پر کیسے پہنچے تھے اس بارے میں قابلِ یقین اسٹوری خود بنا دو یا سات سال کی جیل قبول کر کے سابقہ زندگی کا کفارہ ادا کرو۔ تمھیں سال بھی نہیں لگیں گے کہ تم کو پھر زندگی گزارنے کا اختیار حاصل ہو گا۔"

"مَیں... یہی کروں گا۔" وہ بولا۔

"یہ لڑکی بمبئی تک تمھاری نگرانی کرے گی۔" مَیں نے کہا۔ "اس کو عام لڑکی سمجھنے کی غلطی مت کرنا۔ مَیں نے اُتنی لڑکیوں میں سے اس کو چُنا ہے تو اس کی وجوہات ہیں۔ تربیّت یافتہ نہ سہی مگر ہے یہ لیڈی کمانڈو اور اس کا نشانہ بھی مَیں نے دیکھا ہے۔ اگر مَیں کہوں تو یہ بیس فٹ کے فاصلے سے تمھاری دائیں آنکھ..."

"اس کی ضرورت نہیں، مَیں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔" وہ بولا۔

"بس تو پھر تم جاؤ۔" مَیں نے کہا اور لڑکی کے شانے پہ تھپکی دی۔ میری تعریف نے اس کو کسی حد تک بے خوف کر دیا تھا۔ وہ ریوالور لے کر وہیں بیٹھ گئی جہاں پہلے غالب بیٹھا ہوا تھا۔

مَیں نے پانی میں اُتر کر ساحل کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ لہریں میرے گھٹنوں سے اوپر تک آ رہی تھیں اور چٹانوں کے درمیان جھاگ بن کے ٹوٹ رہی تھیں۔ لانچ آہستہ آہستہ گھوم کے واپس ہوئی۔ میرے خشکی پر قدم رکھنے تک لانچ پھر سمندر میں رواں ہو چکی تھی اور بمبئی کی بندرگاہ کی سمت جا رہی تھی۔

"خوش آمدید!" غالب نے کہا اور ہم ایک دوسرے سے بغلگیر ہو گئے۔ اجنبی سرزمین پر خدا کے بعد ہم دونوں ہی ایک دوسرے کا سہارا تھے۔

"یہ کبھی ناممکن ہی لگتا تھا، جو ممکن ہو گیا۔" مَیں نے کہا۔

ہم دونوں سوٹ اور ٹائی میں تھے مگر ہماری پتلونیں بھیگ چکی تھیں اور جُوتوں میں پانی بھر گیا تھا۔ ساحل سے کچھ فاصلے پر کھجور یا ناریل کے درختوں کا ایک جھنڈ تھا۔ اس کے آس پاس جھاڑیاں تھیں اور کچھ دیر آرام کرنے کے لیے وہ جگہ بہترین تھی۔ ہم نے پتلونیں اُتار کے سوکھنے کے لیے ڈال دیں اور خود ریت پر دراز ہو گئے۔ فضا ساکت تھی۔ دور دور تک سمندر کے شور کے سوا کوئی صدا نہ تھی۔ تحفّظ اور عافیت کا احساس۔ سورج کی تمازت سے حاصل ہونے والی راحت اور اعصاب کی کشیدگی کے یکلخت ختم ہو جانے سے ہمارے دل گہرے سکون اور سُرور میں ڈوب گئے۔ مَیں نے نیلے آسمان کو دیکھا اور سوچا کہ سگریٹ نکال کے جلاؤں مگر اس سے پہلے رابعہ کے تصوّر نے آ لیا۔ وہ ایک خواب تھا جو نیند کی آغوش میں پہنچتے ہی شروع ہو گیا تھا۔ بعد میں غالب نے بھی اعتراف کیا تھا کہ وہ سونا نہیں چاہتا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا سب کے بارے میں اور اچانک اس کے خواب پر نازو قابض ہو گئی تھی۔

میں نے کہا۔ "تم نے دیکھا رابعہ، میں آ گیا ہُوں۔"

وہ ہنسی۔ "سونے کے لیے آئے ہو کیا؟ شام تو یہیں ہو جائے گی۔"

میں ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ اس کی بس ایک جھلک ہی تھی جس کا تصوّر ہنوز قائم تھا۔ دوپہر ڈھل چکی تھی جس کا مطلب تھا کہ میں کم سے کم تین گھنٹے سوتا رہا تھا۔ ریت پر گرتے ہی مجھے نیند آ گئی تھی جو اتنی گہری تھی کہ بے ہوشی سے کم نہ تھی۔ خواب گہری نیند میں نہیں آتے چنانچہ میں نے تین گھنٹے بعد اس وقت رابعہ کو دیکھا جب شعور خوابیدہ تھا مگر لاشعور بیدار ہو چکا تھا۔

رابعہ کے تصوّر نے مجھے اتنا بے قرار کیا کہ میں نے غالب کو جھنجوڑ کے جگا دیا۔ "اٹھ مُردے۔ آنکھیں کھول۔"

"کیا ہے۔ کیا مصیبت آ گئی اب؟" وہ اٹھ کے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ "سونے کے لیے آئے ہو کیا۔ شام تو یہیں ہو جائے گی۔"

غالب چونکا۔ "یہ... کیا کہا تو نے... پھر کہنا۔"

"کیوں؟ اتنا حیران کیوں ہے تو؟"

"کمال ہے یار۔ بالکل یہی نازو نے کہا تھا، ابھی ابھی۔ تُو نہ جگاتا مجھے تو کوئی بات اور بھی ہوتی۔"

حیران ہونے کی اب میری باری تھی۔ "یہ نازو نے کہا تھا؟ تجھے یقین ہے کہ... بالکل یہی الفاظ تھے۔ میں نے تو جانتے بوجھتے دُہرائے تھے۔" میں نے کہا۔

"دُہرائے تھے کیا مطلب ہے؟"

"مجھ سے یہ بات رابعہ نے کی تھی۔ میں بھی تو ابھی جاگا ہوں، وہ خواب میں آئی تھی۔"

غالب مجھے بے وقوفوں کی طرح دیکھتا رہا۔ "کیسی عجیب بات ہے۔ کیا تو توضیح کرے گا کوئی اس کی؟ کہ ایک ہی وقت میں تو نے رابعہ کو خواب میں دیکھا اور میں نے نازو کو۔ اور ایک ہی بات کی دونوں نے ہم سے۔"

"یہ سائیکالوجی اور پیراسائیکالوجی کے ماہرین کے لیے

ایک دلچسپ کیس ہوگا" میں نے کہا۔" میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ سوتے وقت ہم دونوں کے ذہن میں، بلکہ ہمارے لاشعور میں یہ خوف پنہاں تھا کہ کہیں ہم شام تک سوتے نہ رہ جائیں۔ اس کے ساتھ ہی میرے خیالوں میں رابعہ تھی اور تیرے خیالوں میں نازو۔"

غالب اٹھ کھڑا ہوا۔"ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ دونوں نے ایک جیسے الفاظ بھی استعمال کیے۔" اس نے اپنی پتلون کو جھاڑ کر پہنتے ہوئے کہا۔" نازو ایسے بات کہاں کرتی ہے۔"

"پھر کیسے بات کرتی ہے؟"

"اپنی اسی ڈھول دھپّے کی قاتلانہ زبان میں۔ مزہ آتا اگر وہ ہاتھ پکڑ کے اٹھاتی۔ چکر دیتی۔ گھماتی اور الٹ پلٹ کے سیدھا کھڑا کر کے کہتی کہ ہوش آیا، نیند اُڑ گئی یا کچھ اور اُڑاؤں تمھیں؟"

میں ہنس پڑا۔" تم بھی مجنوں سے کم نہیں ہو۔ بلائے جاں ہے اس کی ہر بات مگر اسی ادا پر مرتے ہو اس کی۔"

"یہ تو ہے۔ جو اپنی خو بدل دے وہ نازو ہی کیا۔"

میری پتلون بھی خشک ہو چکی تھی۔ جوتے خشک ہو کے اکڑ گئے تھے مگر انھیں پہننے بنا چارہ نہ تھا۔ سوٹ کے واش اینڈ ویئر کپڑے کو بھیگنے سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا چنانچہ ہم ان بیش قیمت سوٹوں میں خاصے شریف اور معزز نظر آتے تھے۔

"معلوم نہیں وقت کیا ہوا ہے؟" میں نے کہا۔

غالب نے اپنے کوٹ کی جیب سے دو بیش قیمت گھڑیاں برآمد کرتے ہوئے ایک مجھے پیش کی۔" مسٹر فروش کی ایک نشانی یہ اور یہ دوسری؟"

"اس ہاتھی کی جس پر تو نے سواری کی تھی۔ دونوں ایک ہی چیز ہیں۔" غالب نے کہا۔

"یہ نیک کام کب کیا تو نے؟"

"جب تو اس نرس کو... کیا نام تھا اس کا... یہ لیکچر دے رہا تھا کہ لانچ کو ممبئی لے جانے کے لیے اسلحہ کیسے استعمال کرنا ہے۔"

"اور بھی کچھ ملا؟"

"ہاں۔ مال و زر تو سب انھوں نے لوٹ لیا تھا، جن کو تو نے کھلی چھٹی دے دی تھی کہ لانچ میں جو کچھ ہے تمھارا ہے۔ یہ دو ریوالور بھی ہیں۔" غالب نے اندر ہاتھ ڈال کے دو بہت کارآمد آٹومیٹک ریوالور برآمد کیے، پھر ایک سائلنسر جو دونوں پر فٹ ہو جاتا تھا۔ بلیک روز کی ایک بہت خوب صورت رسٹ واچ تھی جس کے ڈائل پر ہیروں کے نگینے جڑے ہوئے تھے۔

"یہ چوری کا مال تحفے میں دے گا نازو کو۔ تھانیدار کی بہن ہے۔ پوچھے گی کہ کہاں سے لی؟"

"پہلے تو آپ نوٹ فرمائیں کہ مالِ غنیمت کو چوری کا مال نہیں کہا جاتا۔ تاریخ گواہ ہے کہ اسے مسلمانوں میں برابر تقسیم کیا جاتا تھا۔ میں نے اسی روایت پر عمل کیا ہے۔ دوسری بات یہ کہ اس تحفے کی حیثیت ایک سووینیر کی ہے۔ جب تک ہمارے پاس رہے گا یادگار رہو گا۔"

"افسوس کہ یہ خیال ذرا دیر سے آیا۔" میں نے کہا۔" ورنہ ہر معرکے کی کوئی نشانی رکھتے۔ بعد میں ہمارا ذاتی میوزیم ہوتا جس میں یہ سب چیزیں رکھی جا سکتی تھیں۔ میرے خیال میں اب چلنا چاہیے۔"

"ہم اب دشمن کی سرزمین پر ہیں۔" غالب نے کہا۔" کیا ہمیں پاسپورٹ وغیرہ نہیں نکال لینے چاہئیں؟"

میں نے اس سے اتفاق کیا۔" نقد رقم بھی ہماری جیب میں ہونی چاہیے۔"

کمر کے گرد لپٹی ہوئی بیلٹ کھولنے کے لیے ہمیں کوٹ اور قمیص اتارنے پڑے۔ پلاسٹک کور نے ہر چیز کو محفوظ رکھا تھا۔ پاسپورٹ اور نقد رقم میں سے پانچ ہزار روپے کی انڈین کرنسی کو ہم نے اندر کی جیب میں ڈال لیا۔ پانچ ہزار ڈالر ایک بوٹ کی جراب میں اور ریوالور کو دوسری جیب میں چھپا کے ہم نے پھر کپڑے پہنے۔ ہم دونوں کے پاس اب دو دو ریوالور تھے۔ ایک وہ جو ہم اپنے ساتھ بیلٹ میں باندھ کر لائے تھے اور دوسرے وہ جو غالب لانچ پر مرنے والوں کی جیب سے نکال لایا تھا۔

"کیا تم اندازہ کر سکتے ہو مرزا کہ ممبئی کا شہر کس سمت میں ہوگا؟"

"ہاں، لانچ اسی سمت میں گئی تھی۔ اس کے علاوہ یہ ہو سکتا ہے کہ کچھ دور جانے کے بعد ہمیں کوئی سڑک مل جائے یا راستہ بتلانے والا مل جائے۔ ہم ممبئی سے چالیس پچاس میل بھی دور ہوئے تو زیادہ دور نہیں۔ ایک بڑے شہر کے مضافات میں پچیس تیس میل تک تو آبادی پھیل جاتی ہے۔ اس کے بعد بھی ویرانہ نہیں ہوتا۔ ڈیری فارم، پولٹری فارم اور کارخانوں وغیرہ کا سلسلہ چلتا ہے۔ پھر چھوٹے موٹے گاؤں آجاتے ہیں۔"

"بس تو پھر چلتے ہیں۔" میں نے کہا۔" نیند نے کافی تازہ دم کر دیا ہے۔"

"لیکن بھوک، غالب پر غالب ہے۔ جی چاہتا ہے چڑھ جاؤں ان درختوں پر اور کچے ناریل توڑ کے کھا جاؤں۔"

"بسم اللہ... پھر انتظار کیسا؟"

"درخت پر چڑھنا کہاں آتا ہے مجھے۔" غالب نے کہا۔

تقریباً ایک میل کا فاصلہ ہم نے ریت پر طے کیا جو رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی۔ درخت بھی کم گھنے ہو گئے۔ بائیں ہاتھ پر بہت دور ہم نے ایک فیکٹری کی دھواں اگلنے والی چمنی دیکھی۔ پھر

ایک کچا راستہ نمودار ہو گیا جس پر سائیکل کے پہیوں کے نشانات تھے۔ پہلا سائیکل والا ہمیں بیس منٹ تک اسی راستے پر چلنے کے بعد ملا۔ وہ ہمارے اشارے پر رک گیا لیکن شہر جانے والے راستے کے بارے میں جو کچھ اس نے ہمیں بتایا وہ ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ اس کے باوجود ہم نے اس کا شکریہ ادا کیا اور آگے چل پڑے۔

"یہ کون سی زبان تھی، عبرانی؟" غالب نے کہا۔

"گجراتی ہوگی۔" میں نے کہا۔

"گجراتی سمجھ میں آجاتی ہے۔ اس میں تو چیں پٹام ڈم ڈم گڑھ بھٹ دھم ترڑ کے سوا کچھ نہیں تھا۔"

"ہو سکتا ہے مدراسی ہو۔" میں نے ہنس کے کہا۔" کراچی کی طرح ممبئی بھی کوسموپولیٹن سٹی ہے۔ ہر ملک اور قوم کے لوگ رہتے ہیں، بھانت بھانت کی بولیاں بولتے ہیں۔"

ایک سڑک اچانک سامنے آگئی۔ یہ کوئی شاہراہ نہیں تھی۔ لیکن وقفے وقفے سے کوئی کار یا بس گزرتی دکھائی دے جاتی تھی۔ کاریں سب ایک جیسی تھیں۔ فرق تھا تو ان کے رنگ میں۔ غالباً یہ فئیٹ کار کا انتیس سو ترسٹھ کا ماڈل تھا جس کو سات سال بعد بھی کفایت شعاری کے قومی جذبے کے تحت تیار کیا جا رہا تھا۔ اس طرح جہاں کار والوں کو "ماڈل کمپلکس" نہیں ہوتا تھا وہاں یہ آسانی بھی حاصل رہتی تھی کہ پورے ہندوستان میں ان گاڑیوں کے پارٹس بہ افراط دستیاب رہتے تھے۔ ایکسیڈنٹ میں ٹوٹ پھوٹ جانے والی اور اسکریپ ہو جانے والی گاڑیوں کے پرزے بھی ضائع نہیں ہوتے تھے اور میکینک ایک ہی ماڈل کی مرمت کرتے تھے تو اس کے ماہر ہو جاتے تھے۔ انھیں ہر سال ایک نئی کار اور ہر کار کے نئے ماڈل کے انجن کو سمجھنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔

سب بسوں کے اور ٹرکوں کے سامنے مجھے "ٹاٹا" کا نشان "ٹی" کی صورت میں نظر آیا۔ بسیں پرانی اور بھدی شکل کی تھیں۔ مگر ان کی دیکھ بھال کی گئی تھی۔ سب سے اچھی بات یہ تھی کہ ان میں مسافروں کو ٹھونس ٹھونس کر اور کوٹ کوٹ کر نہیں بھرا گیا تھا۔ اوورلوڈنگ پر پابندی کا قانون تو ہمارے ملک میں بھی تھا مگر یہاں ہم نے اس پر عمل ہوتے بھی دیکھا۔

"کیا خیال ہے کسی بس کو رکنے کا اشارہ کریں؟" غالب نے کہا۔" یوں کب تک چلتے جائیں گے؟"

"بسیں تو دونوں طرف سے آ جا رہی ہیں۔" میں نے کہا۔

"ممبئی شہر ادھر ہوگا۔" غالب نے کہا۔" ہم ناک کی سیدھ میں سفر کرتے رہے تو شام تک پیدل بھی پہنچ جائیں گے۔"

"اگر سمت غلط ہوئی تو دنیا گول ہے۔ ہم چلتے چلتے بالآخر ممبئی پہنچ جائیں گے۔ ایک چکر مکمل کرنے کے بعد۔" میں نے کہا۔

"ابھی سے ایسے دھندوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں کہ آتے ہی نیک نامی کا چرچا ہونے لگے۔" غالب نے کہا۔" ضامن بھی نہیں ملے گا یہاں۔"

سڑک کے کنارے ایک کار کھڑی ہوئی تھی اور اس کا بونٹ اٹھا ہوا تھا۔ ایک عورت کو بونٹ پر جھکا ہوا دیکھ کر ہم رک گئے۔ غالب نے مجھے آنکھ ماری، جس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ ہم اس کی مدد کرتے ہیں اور اگر ہماری کوشش سے گاڑی اسٹارٹ ہو جاتی ہے تو پھر دیکھتے ہیں خاتون اخلاقاً ہم سے پوچھتی ہیں یا نہیں کہ ہم کہاں جائیں گے۔

میں نے کھنکار کے کہا۔" کیا ہو گیا گاڑی کو؟"

وہ پہلے ہی متوقع نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ ویسے تو نوجوان عورت تھی۔ اٹھائیس تیس سال کی اور شادی شدہ ہی نظر آتی تھی۔ لیکن اس نے بہت شوخ میک اپ کر رکھا تھا اور میرے نزدیک اس کا لباس بھی قابلِ اعتراض تھا۔ اس کے اسکرٹ کو کچھ نیچا اور بلاؤز کے گلے کو کچھ اونچا ہونا چاہیے تھا۔

"گاڑی رک گئی ہے۔" اس نے تقریباً رو کر کہا۔

میں نے غالب کی طرف دیکھ کر اس حیرت انگیز انکشاف پر سر ہلایا۔" کتنے افسوس کی بات ہے۔"

"لیکن کیوں رک گئی ہے، یہ پوچھا... میرا مطلب ہے دیکھا آپ نے۔" غالب نے کہا۔" ذرا سیلف گھمائیے۔"

"سیلف بھی نہیں گھومتا۔" خاتون نے اسی لہجے میں کہا۔

"او ہو ہو۔ سیلف بھی نہیں گھومتا۔ کیوں نہیں گھومتا؟"

"پہلے گھومتا تھا مگر..." خاتون نے اعتراف کیا۔

"اسی کوشش میں۔ بیٹری بیٹھ گئی ہے۔"

"اچھا آپ بھی بیٹھ جائیں۔ میں دیکھتا ہوں۔" میں نے اپنا کوٹ اتار کے غالب کو پکڑا دیا۔ تھوڑا سا غور کرنے پر میں نے خرابی کو پکڑ لیا۔ کوائل کے ایک تار کا کنکشن ڈسٹری بیوٹر سے الگ ہو گیا تھا۔ مزید یہ کہ خاتون نے گاڑی اسٹارٹ کرنے کی مسلسل کوشش میں ایک طرف بیٹری ڈسچارج کر لی تھی تو دوسری طرف کاربوریٹر میں پیٹرول زیادہ کر دیا تھا۔ تار تو میں نے فوراً جوڑ دیا مگر زائد پیٹرول کو خشک کرنے کے لیے مجھے ایئر کلینر ہٹانا پڑا اور رومال کے کونے سے پیٹرول خشک کرنے کے بعد واپس لگانا پڑا۔

اب گاڑی دھکے سے اسٹارٹ ہو سکتی تھی۔ ہاتھ صاف کر کے کوٹ پہن لینے کے بعد میں نے خاتون سے کہا کہ وہ ایک بار کوشش کرے۔ شاید گاڑی اسٹارٹ ہو جائے لیکن بیٹری بالکل ہی ڈیڈ تھی۔ سیلف کسی افیونی کی طرح ہلا اور ساکت ہو گیا۔

"آؤ بھائی فقیر حنید۔" میں نے کہا۔" اپنی جانِ ناتواں...

ساتھ۔ اللہ اجر دے گا اس نیکی کا۔"

"اللہ نہیں، بھگوان۔" غالب نے سرگوشی میں مجھے ڈانٹا۔ اور میرے ساتھ دھکا لگانے لگا۔ خاتون کی پہلی کوشش ناکام رہی۔

"ایک بار اور بھائی فقیر چند۔" میں نے آہ بھر کے کہا۔

"اب ہم لفٹ کے حق دار تو ہو ہی چکے ہیں بھائی امیر چند۔" غالب بولا۔

میری ہدایات کے مطابق دوسری بار خاتون نے گاڑی کا کلچ اس وقت چھوڑا جب اس کی رفتار اتنی تیز ہو گئی تھی کہ ہم اس کے پیچھے دُہرے ہوئے دوڑ رہے تھے۔ خاتون اتنی عقل مند تھیں کہ انھوں نے دوسرے پیر سے ایکسیلریٹر بھی دبا رکھا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گاڑی اسٹارٹ ہوتے ہی ایک جست لگا کے بھاگی۔ میں اور غالب منہ کے بل سڑک پر گرے۔ قریب سے گزرنے والی ایک بس کے مسافر اس منظر پر خوش ہو کے ہنسے۔

خاتون نے کار کو روک لیا تھا۔ انھوں نے کھڑکی سے سر نکال کے کہا۔ "تھینک یو۔ پیسے کتنے ہوئے؟"

میرا غصّے سے بُرا حال ہو گیا۔ "بہت افسوس کی بات ہے۔"

"اوکے... یہ لو۔ پورے پچاس۔" عورت نے تنک کے کہا۔ "یہی تو مصیبت ہے تم میکینک لوگوں کے ساتھ۔ مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہو۔"

میں نے پیچھے والا دروازہ کھولا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔

"ہمیں بمبئی جانا ہے۔ سو روپے دیں گے۔"

"کیا... اسے ٹیکسی سمجھا ہے تم نے؟" وہ چیخ کے بولی۔

"آپ نے ہمیں میکینک کیسے سمجھ لیا؟" میں نے کہا اور غالب کے لیے دوسرا دروازہ کھول دیا۔

"ہم آپ کی یہ کار یہیں کھڑے کھڑے نقد خرید سکتے ہیں۔" غالب نے کہا۔ "بولیے کیا قیمت لیں گی؟"

"میں سیٹھ امیر چند ہوں اور یہ میرا بھائی فقیر چند۔ مشہور پروڈیوسر۔" میں نے کہا۔

بمبئی ہندوستان کی فلم نگری ہے۔ میں نے سُنا تھا کہ یہاں ہر تیسری عورت ایکٹریس، ہر چوتھا مرد ایکٹر، ہر پانچواں آدمی پروڈیوسر اور ہر چھٹا ڈائریکٹر ہو سکتا ہے۔ باقی بھی فلم کے کسی نہ کسی شعبے سے متعلق ہوں گے۔ خواہ وہ اسکرپٹ رائٹر ہوں یا فوٹو گرافر، ساؤنڈ ریکارڈسٹ ہوں یا میوزک ڈائریکٹر۔

وہ بڑی عجیب نظروں سے ہمیں دیکھتی رہی۔ اس کے لبوں کی معنی خیز مسکراہٹ سے اندازہ ہوتا تھا کہ ہم اسے بلف کرنے میں ناکام رہے ہیں۔

"آئی ایم سوری۔" اس نے بالآخر نوٹ کو واپس اپنے بیگ میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "مجھ سے غلطی ہوئی۔"

"کوئی بات نہیں۔" میں نے کہا۔ "کسی کی صورت پر تو نہیں لکھا ہوتا کہ وہ کیا ہے۔"

گاڑی کچھ دیر خاموشی سے دوڑتی رہی۔ پھر اس نے کہا۔ "آج کل آپ کون سی فلم پروڈیوس کر رہے ہیں؟"

"جی... وہ ابھی اس کا نام طے نہیں ہوا۔" میں نے کہا۔

"آئی سی... کاسٹ تو فائنل کر لی ہو گی؟"

"کاسٹ... بھی زیرِ غور ہے ابھی۔" میں نے کہا اور خدا کا شکر ادا کیا جب اس نے اگلا سوال نہیں کیا۔ خود کو فلمی پروڈیوسر کہنا ایک غلطی ثابت ہو سکتا تھا۔ بمبئی میں قدم رکھنے سے پہلے ہم اس فلم نگری کے بارے میں بہت کم معلومات رکھتے تھے ادھر اس عورت کی باتیں یہ ظاہر کر رہی تھیں کہ اس کا فلمی دنیا سے کوئی تعلق ضرور ہے۔

اب تک اس سے تمام گفتگو انگریزی میں ہوئی تھی۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط ہوتا کہ وہ اُردو نہیں جانتی۔

غالب نے میرے کان میں کہا۔ "خود کو فلم پروڈیوسر کہنے کا پنگا لینے کی کیا ضرورت تھی؟"

"میں نے کب فلم پروڈیوسر کہا تھا۔ فلم کا تو نام بھی نہیں لیا تھا میں نے۔ صرف پروڈیوسر کہا تھا۔" میں نے کہا۔

"اور کیا مطلب ہوتا ہے پروڈیوسر کا؟"

"پروڈیوسر کا مطلب ہے پیدا کرنے والا۔ کسان بھی پروڈیوسر ہے جو اناج پیدا کرتا ہے۔ صنعتکار بھی۔ اور گیارہ بچوں کا باپ ایک زبردست پروڈیوسر ہے۔" میں نے کہا۔

"اگر اس نے پوچھ لیا کہ پہلے کون سی فلمیں بنائی ہیں تو کہہ دینا مغلِ اعظم، مدر انڈیا، سنگم۔ بہت مشہور فلمیں ہیں۔" غالب نے بھنا کے کہا۔

ہم بہت آہستہ باتیں کر رہے تھے اور ساٹھ ستّر میل فی گھنٹا کی رفتار سے گاڑی چلانے والی عورت ہماری طرف متوجہ بھی نہیں تھی۔

میں نے کہا۔ "آپ نے اپنا تعارف نہیں کرایا ابھی تک؟"

وہ مسکرا کے بولی۔ "میں فلم ایکٹریس ہوں۔"

"جی... کیا نام ہے آپ کا؟" میں نے کہا۔

"شرمیلا ٹیگور۔" وہ بولی۔ "کمال ہے آپ نے مجھے نہیں پہچانا؟"

صاف ظاہر تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ میں نے کہا۔ "آپ ہرگز شرمیلا ٹیگور نہیں ہیں۔"

وہ ہنسی۔ "آپ بھی تو فلم پروڈیوسر امیر چند یا فقیر چند نہیں ہیں۔"

صورتِ حال اچانک خراب ہو گئی تھی مگر میں نے نروس ہوئے بغیر کہا۔ "پھر آپ کے خیال میں ہم کون ہیں؟"

"دو بہروپیے۔" وہ بولی۔ "جو اپنا چہرہ بدل کے پھر رہے ہیں۔ معلوم نہیں کیوں؟"

"یہ آپ نے کیسے جانا؟" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"میں یہی کام کرتی ہوں۔ روپ بہروپ بدلنے کا۔ یہاں میک اپ آرٹسٹ کہا جاتا ہے۔" وہ بولی۔ "میں آر کے اسٹوڈیو میں بیس سال سے ہوں۔ سورگباشی پرتھوی راج نے رکھا تھا مجھے۔"

"یہ شک کیسے ہو گیا آپ کو... کہ...؟"

"پہلے تو میں نے غور نہیں کیا تھا لیکن جب آپ نے خود کو مشہور فلم پروڈیوسر کہا تو میں نے غور سے دیکھا۔ میں بمبئی کے سب مشہور پروڈیوسروں کو جانتی ہوں۔ آپ لوگ جو بھورے بالوں کی وِگ اور بھوری داڑھی لگا کے پھر رہے ہیں، اسے عام آدمی نقل نہیں سمجھے گا مگر میرا تو یہ پیشہ ہے۔ میں نے تو ایک نظر میں دیکھ لیا تھا۔" وہ بولی۔

غالب نے میری طرف اور میں نے غالب کی طرف دیکھا۔ انکار کی قطعی گنجائش نہ تھی۔ وہ ہوشیار عورت تھی اور خطرناک بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ ابھی تک ہم نے زبردستی کار میں بیٹھنے کے سوا کوئی زیادتی نہیں کی تھی، یہ کوئی ایسی وجہ نہ تھی کہ شہر پہنچنے کے بعد وہ ہمیں پولیس کے حوالے کر دیتی۔ ہم نے اس کی مدد کی تھی اور اُجرت کے طور پر لفٹ لے لی تھی۔ حساب برابر۔ مگر عورت ذات کے شکّی ذہن کا کیا بھروسا۔ جس نے یہ تاڑ لیا تھا کہ ہم بھیس بدل کے پھر رہے ہیں، وہ ہماری اصلیّت جاننے کی خواہش مند ضرور ہو گی۔

"تم چپ ہو۔" وہ بولی۔

"سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کہوں۔" میں نے کہا۔ "آپ کا کیا خیال ہے، ہم کون ہیں؟"

"چہرہ چھپانے والے دو ہی طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ یا مجرم اور گناہ گار۔" وہ بولی۔ "یا بزدل اور شریف آدمی جن کو دشمنوں سے جان کا ڈر ہو۔"

"بہت منطقی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "اپنے اس معیار سے دیکھنے پر ہم کیسے لوگ نظر آتے ہیں۔ پہلی قسم کے یا دوسری طرح کے؟"

"فی الحال میں اپنی رائے محفوظ رکھوں گی۔" وہ بولی۔ "ابھی تک میرے ساتھ تمھارا رویّہ شریفانہ ہے چنانچہ تمھیں بھی مجھ سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"آپ کو تو ڈرنا چاہیے۔ آدمی کی نیت بدلتے دیر نہیں لگتی۔" غالب نے کہا۔

"کیا لو گے تم مجھ سے؟ مشکل سے دو ہزار روپے ہوں گے میرے پاس۔ ایک یہ انگوٹھی ہے اور ایک رسٹ واچ۔" وہ بولی۔ "یہ تم کو لینے ہوتے تو پہلے ہی لے لیتے، اس کے لیے مری گاڑی ٹھیک کرنے اور اسے دھکا لگانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہاں کون تھا جو میری مدد کے لیے آتا۔"

"تھینک یو میڈم کہ آپ نے ہمارے بارے میں غلط رائے قائم نہیں کی۔ عام عورت سوچے سمجھے بغیر بدحواس ہو کے اپنے لیے بھی پریشانیاں پیدا کرتی۔ اور ہمارے لیے بھی۔"

"آپ کی طرح ہمیں بھی صرف مدد کی ضرورت تھی۔" غالب نے کہا۔ "کوئی لفٹ دینے کو تیار نہیں تھا۔"

"ایسی جگہ پر کوئی کسی کے لیے نہیں رُکتا میری تو گاڑی ہی رک گئی تھی۔" وہ بولی۔

"آپ نے نام نہیں بتایا ابھی تک اپنا..."

"میں للی ہوں۔ پہلے للی فیروز تھی۔ چار سال للی راج رہی۔ اب پھر للی فیروز ہوں۔ اپنے پیشے میں صرف للی۔" وہ بے تکلف پُراعتماد لہجے میں بولنے والی عورت تھی۔ "دادر میں رہتی ہوں۔ آر کے اسٹوڈیو میں آ کے کسی کو بھی بولو کہ للی سے ملنا ہے کوئی نہیں روکے گا تم کو۔ اگر روکے گا تو راج کپور اس کی ایسے چھٹی کر دے۔" اس نے چٹکی بجا کے کہا۔ "اپنے فادر کی وجہ سے بہت لحاظ کرتا ہے میرا۔"

"آپ۔ اس کے والد پرتھوی راج کے زمانے سے یہ کام کر رہی ہیں۔ تو کیا پانچ سال کی عمر سے لوگوں کے چہرے بنانے اور بگاڑنے شروع کر دیے تھے؟" میں نے کہا۔

"نانٹی بولئے۔ میری عمر بیالیس سال ہے۔" وہ ہنسی۔

"کیا زبردست میک اپ کیا ہے آپ نے۔ چوبیس کی لگتی ہیں۔"

اس نے پلٹ کر مجھے غور سے دیکھا۔ "یہ تعریف ہے، خوشامد یا بے وقوف بنانے کی کوشش؟"

"لاحول وَلا..." میرے مُنہ سے بے اختیار نکل گیا۔ "مجھے کیا ضرورت ہے... مگر ہے یہ کمال کی بات۔ میں نے اب دیکھ لیا ہے کہ آپ نے کوئی میک اپ نہیں کیا۔"

"اب ایک بات میں بھی پوچھ لوں؟" وہ مسکرائی۔ "تم یہ میک اپ کر کے وہاں کیوں بھٹک رہے تھے؟"

"کیا ادھر فلم کی شوٹنگ کے لیے بھی کوئی نہیں جاتا؟"

"جاتے ہیں مگر پوراٹ ہوتا ہے لوکیشن پر۔ تم لوگ تو ایسا لگتا تھا کہ سمندر میں سے نکل کے آئے تھے۔"

میں چونکا۔ "یہ... کیسے اندازہ کیا آپ نے؟"

"ایک تو کپڑوں سے جو بھیگ کر خشک ہوئے ہیں، پھر جوتوں سے۔ اور اس کے بعد چہرے سے۔ شاید پہلے یہ گیٹ اپ ٹھیک ہو گا، پانی سے سب خراب ہو گیا ہے۔" وہ بولی۔

"یہ بڑی لمبی کہانی ہے۔" میں نے کہا۔ "اور ہمارا ساتھ بہت مختصر۔ شاید یقین بھی نہ کریں آپ۔"

"تمھارے یہ نام تو اصلی ہیں؟ فقیر چند اور امیر چند۔" وہ بولی۔

"اگر میں کہوں کہ ہمارے باپ کا نام دمڑی لال تھا تو آپ کو یہ سب نام زیادہ مضحکہ خیز لگیں گے۔" میں نے کہا۔ "لیکن

اس میں کوئی جھوٹ نہیں۔ آپ میرا پاسپورٹ دیکھیے اور میرے بھائی کا بھی۔"

"نہیں نہیں... میں یقین کرلیتی ہوں۔" اس نے کار کو اچانک ایک روڈ سائیڈ ریسٹورنٹ کے احاطے میں روک لیا۔

عین اسی وقت ایک پرانے ماڈل کی کھٹی سیڈان نے بہت غلط طریقے پر سامنے سے آتے ہوئے موڑ کاٹا۔ للی نے بڑی مہارت سے اپنی گاڑی کو بچالیا۔ اس میں کچھ شائبہ خوبیٔ تقدیر کا بھی تھا۔ وہ پہلے ہی طے کرچکی تھی کہ اسے گاڑی کو ریسٹورنٹ کی جانب موڑنا ہے۔ اگر یہ ارادہ وہ سامنے سے آنے والی گاڑی کو دیکھنے کے بعد کرتی تو حادثے سے بچنا ناممکن ہوتا۔ وہ گاڑی للی کی کار کو سائڈ سے ٹکر مارتی اور شاید ہم کار کے ساتھ تین چار قلابازیاں کھاتے تو اندر ہی چرمُر ہوجاتے۔ اس لمبی چوڑی جہازی قسم کی گاڑی کا کچھ نہ بگڑتا کیوں کہ اس کا سامنے والا بمپر ہی بہت خوف ناک تھا۔

غیرارادی طور پر للی نے کار کو روکتے ہی پلٹ کے دیکھا اور زیرِلب ان لوفر ٹائپ لوگوں کو گالی دی جو شاید نشے میں تھے۔ مگر جواب میں انھوں نے چیخ کر جو کچھ کہا وہ ہم نے بھی سنا اور للی نے بھی اور ریسٹورنٹ کے باہر کھلی جگہ میں بیٹھے ہوئے لوگوں نے بھی۔ للی کا چہرہ شرم اور غصے سے سرخ ہوگیا۔ سیاہ سیڈان جس طوفانی رفتار سے آئی تھی اسی رفتار سے دھول اڑاتی غائب ہوچکی تھی۔

میں نے نرمی سے للی فیروز سے کہا۔" جانے دیں۔ ایسے کتے تو بھونکتے ہی رہتے ہیں۔"

غالب نے کہا۔" آپ کی کسی نیکی نے ہی بچالیا۔ چلیے بھول جائیے اس بات کو اور شکر ادا کیجیے۔"

للی نے ایک گہری سانس لے کر سر ہلایا اور کار سے اتر آئی۔ ہم ایک ٹیبل پر جا بیٹھے۔

"میں صرف چائے پیوں گی۔" للی نے کہا۔

"ہم کھانا کھائیں گے۔" میں نے کہا۔

"کھانا تو اس وقت نہیں ہے۔" ویٹر نے کہا۔" ختم ہوگیا۔"

"تو پھر چائے کے ساتھ جو کچھ بھی لاسکتے ہو سب لے آؤ۔ ہم کھانا سمجھ کے کھالیں گے۔" میں نے کہا۔

"ان کے کلب سینڈوچ اور شامی کباب اچھے ہوتے ہیں۔ اگر پیٹ بھرنا ہے تو وہی منگوالو۔" للی نے کہا۔

"ایسی صورت میں ہمارے لیے چائے نہیں کافی۔" میں نے آرڈر میں ترمیم کرتے ہوئے کہا۔" ویری بلیک، ویری ہاٹ۔"

"تم لوگ کہاں جاؤ گے؟... میں..."

"آپ ہمیں اپنے راستے میں کہیں بھی اتار دیں۔ وہاں سے ہم خود چلے جائیں گے حاجی علی کے مزار پر۔" میں نے کہا۔

"میں بھی وہاں ہر جمعرات کو جاتی ہوں۔" وہ بولی۔" تم میرے ساتھ چلو۔"

میں نے غالب کی طرف دیکھ کر نفی میں سر ہلایا۔" بہت خوشی ہوتی ہمیں یہ پیش کش قبول کرکے لیکن افسوس مس للی کہ یہ ممکن نہیں۔" میں نے کہا۔" ہم آپ کے ساتھ نہیں جاسکتے۔"

"تمھیں کہیں اور جانا ہوگا یا کسی اور کے ساتھ جانا ہوگا۔" وہ بولی۔" ویسے بھی میں تو مغرب کے بعد جاتی۔"

اس کے بعد خاموشی کا ایک وقفہ آیا جس میں للی نے چائے پی اور ہم نے بہت ضبط کرتے ہوئے کلب سینڈوچ کی پلیٹ صاف کرنے میں ندیدے پن کا مظاہرہ نہیں کیا۔ تاہم میرے لیے دوسری پلیٹ نہ منگوانا مشکل ہوگیا۔

"کب سے بھوکے ہو تم لوگ؟" للی نے ہنس کے کہا۔

"اب تم سے کیا پردہ۔ صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔" میں نے کہا۔ جب بل کی ادائیگی کا وقت آیا تو للی نے پہل کردی۔ میں نے ویٹر کو روک لیا۔ للی کا دیا ہوا نوٹ ہٹا کے میں نے جیب میں سے نوٹوں کی گڈی نکالی اور اس میں سے ایک نوٹ پلیٹ میں ڈال دیا۔

"تم لوگ واقعی میری کار خرید سکتے تھے۔" للی نے طنز سے کہا۔

میں شرمندہ ہوگیا۔" میرا مقصد تمھیں یہ بتانا نہیں تھا مگر یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ حضرات کی موجودگی میں خواتین ادائیگی کریں۔"

وہ ہنس پڑی۔" میں ایٹی کیٹس کو بھول گئی تھی۔ تم مجھے بمبئی کے رہنے والے نہیں لگتے۔"

"وہ کیسے؟" میں نے کہا۔

"بمبئی کے رہنے والوں کا کوئی برانڈ یا ٹریڈ مارک ہے؟" غالب بولا۔

"ہاں، ہر شہر کا ایک برانڈ ہوتا ہے۔ آدمی اسی سے پہچانا جاتا ہے کہ کہاں کا رہنے والا ہے۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔" لیکن اس برانڈ کو وہی پہچانتا ہے جو بمبئی میں پیدا ہوا ہو۔ پلا اور بڑھا ہو۔ دلی والا اور لکھنؤ والا سب اپنے اپنے برانڈز رکھتے ہیں۔"

"تم ایک حیرت انگیز عورت ہو۔" میں نے کہا۔" ہم واقعی نئے ہیں بمبئی میں۔ تاہم یہ مت سمجھنا کہ ہم جیل کے مفرور مجرم ہیں اس لیے بھیس بدل کر پھر رہے ہیں۔"

"مجھے کچھ سمجھنے کی کیا ضرورت ہے۔" وہ بولی۔" جب تم کچھ نہیں بتانا چاہتے مطمئن رہو، میں کسی سے اس ملاقات کا تذکرہ بھی نہیں کروں گی۔"

"مگر ہم ضرور کریں گے۔" میں نے اس کا موڈ ٹھیک کرنے کے لیے کہا۔" اور بہت اچھے الفاظ میں۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور گاڑی اسٹارٹ کردی۔ ابھی ہم سڑک پر آئے ہی تھے کہ میں نے اپنے پیچھے اسی بلیک سیڈان کو آتے دیکھا۔ وہ شاید کہیں سائیڈ میں رک کے ہماری روانگی کا انتظار کر رہے تھے۔ ڈرائیور کے علاوہ میں نے تین افراد کو دیکھا۔ ان میں سے ایک آگے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ بالکل گنجا اور فربہی مائل شخص تھا۔ اس کے ساتھ والا بھی گنجا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ انھوں نے اپنے سر استروں سے صاف کرائے تھے۔ دونوں پیچھے بیٹھے ہوئے بدمعاشوں کو میں صاف نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن ان سب کے عزائم کی خباثت بالکل واضح تھی۔

"مس للی!" میں نے کہا۔

"یس۔ میں نے دیکھ لیا ہے۔ وہ بدمعاش پیچھے آرہے ہیں۔ میں پوچھتی ہوں ان سے کہ کیا بات ہے۔ کیا غلطی میں نے کی تھی؟"

"نہیں۔ آپ چلتی جائیں۔ یہ بات اب ہم ان سے پوچھیں گے۔" میں نے کہا۔

"دیکھو... جھگڑا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں..."

"وہ جھگڑا چاہتے ہیں مس للی۔ آپ کے نہ چاہنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ آپ بس گاڑی کو جتنا دور لے جاسکتی ہیں لے جائیں اور ان کو موقع دیں ہمارا راستہ روکنے کا۔" میں نے کہا۔

شاید للی نے میرے لہجے کو سمجھ لیا۔ اس نے ایک دم رفتار بڑھائی۔ تعاقب میں آنے والی سیڈان ابھی تک فاصلے سے چل رہی تھی۔ وہ لوگ ریسٹورنٹ کے قریب بدمعاشی کے مظاہرے سے گریز کر رہے تھے۔ ہمیں فرار ہوتا دیکھ کر انھوں نے بھی گاڑی کو اندھا دھند دوڑانا شروع کردیا۔

گنجا ڈرائیور بڑے زور زور سے قہقہے لگا رہا تھا۔ اس کا ساتھی سیٹ پر تقریباً کھڑا ہوا تھا۔ پیچھے والی سیٹ پر بھی جو دو افراد بیٹھے ہوئے تھے، وہ شوخ لباسوں کے علاوہ اپنے رویّے سے بھی خود کو بدمعاش ثابت کرنے میں کوشاں تھے اور معلوم نہیں کیا چلا رہے تھے۔

للی نے بڑے صحیح وقت پر ان کو آگے نکل کے راستہ روکنے کا موقع دیا۔ ان کی لمبی چوڑی کار بریک جام ہونے سے گھوم کر سامنے آگئی۔ پہیوں کی رگڑ سے گرد کا بگولا اٹھا۔

"تم بالکل باہر مت آنا خواہ کچھ بھی ہوجائے۔" میں نے باہر نکلتے ہوئے کہا۔" اور موقع ملے تو بھاگ جانا۔"

"ہماری فکر مت کرنا۔" غالب نے کہا۔

خلافِ توقع وہ اترتے ہی ہم پر حملہ آور نہیں ہوئے۔ ان میں سے ایک چیونگ گم چباتا اور بیل کی طرح جبڑے ہلاتا آگے آیا۔ میرے سامنے آکے اس نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ لیے اور پیر پھیلا کے کھڑا ہوگیا۔ باقی تین ایک نصف دائرے کی صورت میں اس سے ایک قدم پیچھے رہے۔

"تم ہی ہو وہ حرامی جس نے فردوس کو اور ہمارے دوستوں کو مارا تھا؟" وہ بولا۔ پھر اس نے چیونگ گم میرے منہ پر تھوک دی۔ میں نے معاملہ سمجھنے کے بعد ضبط سے کام لیا۔" ان سب کُتوں کو مارنے کا نیک کام مجھے ہی کرنا پڑا۔" میں نے چہرہ صاف کرکے کہا۔

"وہ ہمارے دوست تھے۔" پیچھے سے ایک مونچھوں والے نے غرا کے کہا۔

"تم نے ہمارے کاروبار میں بھی ٹانگ اڑائی ہے۔" دوسرا بولا۔

"اب تم اس کی قیمت چکاؤ گے۔" تیسرے نے کہا۔

"ویری گڈ، تم سب اپنی اپنی کہہ چکے۔" میں نے کہا۔" اب میں بھی کچھ کہوں؟"

اس کے ساتھ ہی میں نے پوری قوت سے اس کے پیٹ میں مکا مارا۔ وہ پیٹ پکڑ کے جھکا اور دہرا ہوگیا۔ میں نے ایک کہنی سے اس کی گدی پر وار کیا اور آگے بڑھ آنے والے دوسرے گنجے کے لات ماری جو اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان لگی۔ اس نے چیخ کر مجھے ایک فحش گالی بکی۔ باقی پیچھے سے مجھ سے چمٹ گئے تھے۔ ایک نے میرے سر پر مکا مارا جس نے ذرا سی دیر کے لیے مجھے چکرا دیا۔ پھر میں نے گھوم کر اس کے نرخرے پر بائیں ہاتھ کی الٹی ہتھیلی ماری۔ اس کا سانس رک گیا اور وہ ہاتھ پھیلا کے نیچے گرا۔

غالب کو میں نے منع کردیا تھا کہ وہ گولی چلانے سے گریز کرے اور جب تک ناگزیر نہ ہوجائے ریوالور نہ نکالے۔ وہ گاڑی کے پیچھے تھا اور خاصے محفوظ فاصلے سے ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔ للی کار کے اندر دہشت زدہ بیٹھی چلا چلا کر سب سے لڑائی بند کرنے کی اپیل کر رہی تھی مگر وہ نہ اس نیت سے آئے تھے کہ شرافت سے بات کرکے چلے جائیں اور نہ ہم انھیں سبق سکھائے بغیر واپس بھیجنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

میرے تینوں حریف اب ایک ساتھ مجھ پر حملہ آور ہوئے۔ ایک کو میں نے ڈاج کیا اور وہ مجھے ٹکر مارنے کے شوق میں سیدھا گیا اور گاڑی سے ٹکرا گیا۔ دوسرے کو میں نے دھوبی پٹخے کے انداز میں پیچھے سے آگے لا کے زمین پر دے مارا، لیکن تیسرا مجھے نیچے گرانے میں کامیاب ہوگیا۔ اس نے ہاتھوں سے میرے گلے کو دبانا شروع کیا۔ اس کے ہاتھ بڑے بڑے اور سخت تھے۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ ایک جھٹکا لے کر میں نے اسے گرانے کی کوشش کی مگر وہ بڑی مضبوطی سے جما ہوا تھا۔ پھر میری گردن پر دباؤ بڑھانے کے لیے وہ آگے جھکا اور مجھے اس کی آنکھوں میں انگلیاں گھسیڑنے کا موقع مل گیا۔ وہ درد سے چیختا ہوا دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کے زمین پر لوٹنے لگا۔ میرا خیال ہے کہ اس کی ایک آنکھ ضرور پھوٹ گئی تھی کیوں کہ میری ایک انگلی خون میں بھر گئی تھی۔

ابھی میں اٹھا بھی نہ تھا کہ دوسرے گنجے نے بڑی آواز کے ساتھ کھلنے والا کمانی دار چاقو نکال لیا۔ اس نے مجھ پر وار کرنے کے لیے جست لگائی اور میں نے اپنی جگہ چھوڑ کر اٹھتے

ہوئے اس کی کلائی پر ہاتھ مارا۔ چاقو اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ اپنے ہی زور میں مُنہ کے بَل گرا۔ میں نے غالب کو ریوالور کے ساتھ آگے آتا دیکھ لیا تھا مگر چاقو سے حملہ ناکام رہا تو وہ پھر رک گیا۔

میں نے نیچے پڑے ہوئے شخص کو پے در پے ٹھوکریں ماریں لیکن صورتِ حال اس وقت اچانک ہی بدل گئی جب چوتھے شخص نے غالب پر حملہ کیا۔ وہ کار سے ٹکرانے کے بعد ذرا سی دیر کے لیے بے ہوش ہو گیا تھا یا محض اس کی اداکاری کر رہا تھا۔ اس نے غالب کو سامنے دیکھا تو اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

جب اس نے چیخ کر کہا۔ "بس کرو، ورنہ میں اس عورت کو گولی مار دوں گا۔" تو میں اپنا ہاتھ روکنے پر مجبور ہو گیا! ان چاروں کے پاس اسلحہ نہیں تھا اور غالب کا ریوالور انھیں نہ ملتا تو وہ زیادہ دیر تک مقابلہ جاری نہیں رکھ سکتے تھے۔ وہ صرف جسمانی طاقت کے بَل پر ہمیں زیر کرنے آئے تھے اور ہمارے بارے میں زیادہ معلومات نہیں رکھتے تھے ورنہ خالی ہاتھ نہ آتے۔

صاف ظاہر تھا کہ جب اُتی برائے فروخت لڑکیوں سے بھری ہوئی لانچ سامانِ تجارت سمیت واپس پہنچی ہو گی تو ان سب کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ ان کے نقصان کے ذمّے دار کون تھے۔ انھوں نے فروش کی اور اس کے دونوں باڈی گارڈز کی لاشیں بھی دیکھ لی ہوں گی اور شاید انہی لڑکیوں میں سے کسی نے ان کو تفصیل سے سب کچھ بتا دیا ہو گا کہ ہم لانچ سے کس جگہ اترے تھے۔ انھیں تلاش کے لیے روانہ ہونے میں یقیناً کچھ وقت لگا ہو گا۔ اگر ہم ساحل پر اترنے کے بعد آرام کے لیے نہ رُکتے تو ان کے وہاں پہنچنے تک ممبئی پہنچ جاتے اور پھر ان کے ہاتھ نہ آتے۔ ہم تین گھنٹے تک سوتے رہے اور پھر للّی کی گاڑی ٹھیک کرتے رہے۔ اس دوران میں انھوں نے پورا ساحل چھان مارا ہو گا۔ ہم درختوں کے ایک جھنڈ کی پناہ میں تھے اس لیے انھیں فوراً دکھائی نہ دیے، ورنہ ہوتا یہ کہ ہم آنکھ کھولتے اور خود کو ان کی تحویل میں پاتے۔

لیکن للّی کے ساتھ روانہ ہو جانے کے بعد ہم ان کی نظر میں آ گئے۔ وہ اسی سڑک پر سرگرداں تھے کہ اچانک انھوں نے ہمیں دیکھا۔ اس وقت ہم ریسٹورنٹ میں داخل ہو رہے تھے چنانچہ انھوں نے چھپ کر انتظار کیا۔

ریسٹورنٹ کی طرف سے آنے والی دو گاڑیاں دُور ہی رک گئی تھیں۔ ان میں سے کوئی بھی بدمعاشوں کی اس لڑائی میں نہ فریق بننا چاہتا تھا نہ گواہ۔

"اس کو چھوڑ دو۔" میں نے کہا۔ "یہ عورت ہمارے ساتھ نہیں تھی۔"

"اچھا، تم اس کے ساتھ تھے مگر یہ تمھارے ساتھ نہیں تھی۔" للّی کی کنپٹی پر ریوالور رکھ کر اکڑنے والا بولا۔

"اس نے لفٹ دی تھی ہمیں۔" میں نے کہا۔

"اور چائے بھی پلائی تھی۔ سینڈوچ بھی کھلائے تھے۔ ایسی لفٹ کبھی ہمیں نہیں ملی۔" وہ بولا۔ "چلو اب آرام سے گاڑی میں بیٹھو۔"

ان کے باقی تین ساتھی بھی اب شیر ہو گئے تھے اور میرے لیے ریوالور نکالنے کی مہلت بھی نہ رہی تھی۔ میں خاموشی سے للّی کے ساتھ جا بیٹھا۔ ریوالور والا میرے پیچھے بیٹھ گیا۔

"آئی ایم سوری!" میں نے بڑی مشکل سے للّی سے کہا۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔" اس نے مجھے تھپکی دی۔ "یہ بدمعاش تمھارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ افسوس تو مجھے ہے کہ میری وجہ سے تم مجبور ہو گئے۔ بہادر آدمی ہو تم امیر جنید!"

"چلو اب گاڑی چلاؤ میم صاب۔" پیچھے بیٹھے ہوئے شخص نے ریوالور لہرا کے کہا۔ "ورنہ اس کی ساری بہادری نکال دوں گا سر میں ایک سوراخ کر کے۔"

للّی چلّائی۔ "یسوع کے واسطے ایسا مت کرو!"

میں نے دیکھا کہ غالب کو باقی دو نے اپنی کار میں بٹھا لیا ہے۔ ڈرائیونگ بھی غالب کے سپرد کر دی گئی تھی۔ شاید اس لیے کہ ایک اگر ڈرائیور کے فرائض انجام دیتا تو غالب کے مقابلے پر ایک رہ جاتا۔ انھوں نے یہ رسک نہیں لیا تھا لیکن ان کے خیال کے برعکس میرا خیال یہ تھا کہ اس طرح انھوں نے زیادہ بڑا رسک لیا تھا۔ سیاہ سیڈان آگے روانہ ہوئی اور للّی نے اپنی کار اس کے پیچھے رکھی۔ تقریباً پانچ چھ میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد جب ممبئی شہر کے مضافات کی آبادی شروع ہو چکی تھی، سیاہ کار بائیں جانب مڑی۔ للّی نے بھی اپنی کار کا رُخ موڑ لیا۔

اس کچے راستے پر کچھ دور چلنے کے بعد وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔

کسی وجہ کے بغیر غالب نے ایک دم بریک لگا دیے اور ابھی گاڑی رُکی بھی نہ تھی کہ میں نے اسے تیزی سے واپس آتے دیکھا۔ غالب نے حاضر دماغی کا بہترین مظاہرہ کیا تھا جس سے دونوں ساتھ بیٹھے ہوئے بدمعاش بُری طرح مستعد ہونے کے باوجود دھوکا کھا گئے۔ وہ اوسط سے بھی کم ذہانت کے مالک تھے اور یہ اندازہ کیسے کر سکتے تھے کہ تعاون اور تابعداری کی تصویر نظر آنے والا غالب خاموشی سے ایسی خطرناک حرکت بھی کر گزرے گا۔ وہ جھٹکے سے آگے کو ڈھلک گئے ہوں گے۔ ایک کا سر ڈیش بورڈ سے ٹکرایا ہو گا تو دوسرے کا سیٹ کی بیک سے۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتے غالب نے ریورس گیئر لگا کے پھر ایکسیلیٹر دبا دیا ہو گا۔ ظاہر ہے یہ سب پہلے سے اس کے ذہن میں تھا چنانچہ

گاڑی کے اچانک رُکنے اور جھٹکا لے کر تیزی سے واپس آنے کا عمل پانچ سیکنڈ سے بھی کم وقت میں پورا ہو گیا۔

دونوں گاڑیوں کا درمیانی فاصلہ بیس تیس گز ہی ہو گا۔ جب آگے والی گاڑی رُکی تو للّی کا پاؤں غیر ارادی طور پر پہلے بریک پر گیا مگر اتنی دیر میں گاڑی بیس گز آگے جا چکی تھی اور مخالف سمت سے آنے والی گاڑی بھی دس گز کا فاصلہ ضرور طے کر چکی تھی۔ تصادم کو بچانا شاید میرے لیے بھی ناممکن ہوتا مگر میں نے دیکھا کہ للّی نے آخری وقت میں پاؤں بریک سے ہٹا کے پھر ایکسیلیٹر پر رکھ دیا تھا۔ شاید اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ غالب کی نیت کیا ہے اور حیرت انگیز قوتِ فیصلہ کے ساتھ غیر معمولی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے بھی گاڑی کو ٹکرا دیا۔

میں آگے تھا اور سب دیکھ رہا تھا چنانچہ چند سیکنڈ کی ملنے والی مہلت میرے لیے کافی ثابت ہوئی۔ دونوں گاڑیوں کے ٹکرانے سے ایک خوفناک دھماکا ہوا۔ میں اُچھل کے آگے گیا اور ردِعمل کے انداز میں دونوں پیروں کی قوت سے واپس آیا۔ یوں جیسے میرے پیر نہیں اسپرنگ ہیں۔ اپنے پنجوں کی مدد سے میں نے جسم کو واپس دھکیل دیا تھا۔

میں سیٹ کے اوپر سے گزر کے پیچھے والے دونوں بدمعاشوں پر گرا۔ وہ گالیاں بکتے ہوئے اُٹھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ میں نے انھیں اندر ہی رگید دیا۔ ایک کے سر پر میں نے یوں کہنی ماری کہ اس کی کنپٹی دروازے کے ہینڈل پر لگی۔ ریوالور اس کے پاس تھا جو کہیں نیچے گر گیا تھا۔ دوسرا سر اُٹھا رہا تھا کہ میں نے پلٹ کے اس کی گردن پر ہاتھ مارا جو اشتعال کی بے اختیاری کے باعث زیادہ قوت سے پڑ گیا اور جب میں نے اس کی گردن کی ہڈی کے ٹوٹنے کی آواز سنی تو مجھے تھوڑا سا افسوس ہوا۔ مار پیٹ اگر دو بدمعاشوں کے گروہوں میں ہو اور کچھ ٹوٹ پھوٹ ہو جائے تو پولیس کے نزدیک یہ کوئی خاص بات نہیں ہوتی مگر کوئی مارا جائے تو قانون کو حرکت میں آنا ہی پڑتا ہے۔

ریوالور والا گینڈے جیسا شخص اب بے سُدھ اُلٹا پڑا ہوا تھا۔ میں اسی طرف سے دروازہ کھول کے باہر نکلا تو وہ بھی باہر جا گرا۔ تھوڑی سی روشنی اندر پھیلی تو مجھے فرش پر گرا ہوا ریوالور نظر آ گیا۔ میں نے جھپٹ کے اسے اپنے قبضے میں لیا اور پھر للّی کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ خون سے بھرا ہوا تھا مگر وہ ہوش میں تھی اور مجھے تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔

"ویل ڈن بوائے۔ تم میری فکر مت کرو۔"

"مس للّی۔ آر یو شیور... کہ تم ٹھیک ہو؟" میں نے غالب کی طرف دیکھ کے کہا۔ غالب اپنے دونوں اغوا کنندگان سے فری اسٹائل لڑ رہا تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ پٹ رہا تھا مگر حسبِ توفیق ان کو بھی لاتیں اور مُکّے مار رہا تھا۔ وہ پروفیشنل لوگ تھے چنانچہ ان کے چار ہاتھوں کا کوئی وار خالی نہیں جاتا تھا مگر مرزا غالب جو بلحاظِ پیشہ صحافی، طبعاً شاعر اور مزاج کے اعتبار سے عاشق تھے، دو ہاتھ چلاتے تھے تو ایک کسی کے لگ بھی جاتا تھا اور قطعی بےضرر ثابت ہوتا تھا۔ تاہم کمال اس کی پھرتی کا تھا جس کی وجہ سے ابھی تک وہ دونوں اسے قابو نہیں کر پائے تھے۔

میرے میدانِ جنگ میں کودتے ہی طاقت کا توازن غالب کے حق میں ہو گیا۔ اس کے ایک حریف کو میں نے پے در پے مُکّے مار کے چت کر دیا۔ وہ چکرا کے گرنے ہی والا تھا کہ میں نے اسے سنبھال لیا۔ وہ کسی نشے میں دُھت شرابی کی طرح ڈولتا رہا۔

"مُنّے... ہیلو... چیونگ گم کھاؤ گے؟" میں نے اس کے گالوں پر چپت مار کے کہا۔ یہ وہی سورما تھا جو چیونگ گم کھا کے بیل کی طرح جگالی کر رہا تھا۔ اس کے جبڑے نہ صرف یہ کہ ساکت تھے بلکہ خاصے ڈھیلے پڑ کے لٹک گئے تھے۔

اس نے "جے بجرنگ بلی" قسم کا نعرہ مارنے کی فضول سی کوشش کے بعد ہاتھ گھمایا جو اس طرح گھوما جیسے کار کے انجن کا پنکھا بیٹری کا بھٹا بیٹھ جانے کے بعد گھومتا ہے۔ میں نے آخری ضربِ مجاہد سے اس کی ناک کو افسوس ناک بنا دیا اور پھر اسے یوں زمین پر ڈال دیا جیسے بقر عید پر قصاب چھری پھیرتے ہی بکرے کو وہیں ڈال کے دوسرے بکرے کی جانب لپکتے ہیں۔

دوسرا بکرا اپنی پچھتر فیصد افواج کی تصویرِ عبرت دیکھ کے بھاگنے لگا تھا کہ مرزا غالب اس کے پاؤں پڑ گئے۔

"جاتے ہو کس طرف کو، کدھر کا خیال ہے؟" غالب نے اس کو مُنہ کے بل گراتے ہوئے کہا۔

میں نے اس کو قمیص کا کالر پکڑ کے اوپر اُٹھایا۔ "اور اکیلے کیوں جاتے ہو۔ ہم بھی چلیں گے تمھارے ساتھ۔"

"ہمیں ہی لینے آئے تھے نا تم؟" غالب نے کہا۔ "اب اپنے مُردے چھوڑ کے بھاگنا چاہتے ہو۔ پہلے تم ان کو دفنا دو۔ پھر ہم تمھیں دفنا دیں گے۔ بلا معاوضہ۔"

وہ ہاتھ پیر جوڑنے لگا۔ "مجھے... جانے دو... میں ان کا ساتھی نہیں ہوں... یہ تو مجھے... ساتھ لے آئے تھے۔"

میں نے اسے زمین پر رکھ دیا۔ وہ چھوٹے قد کا آدمی تھا چنانچہ اس کے پیر زمین سے اوپر اُٹھے ہوئے تھے اور وہ مضحکہ خیز انداز میں لاتیں چلا رہا تھا۔

"تم ان کے ساتھ آئے تھے مگر ساتھی نہیں ہو ان کے۔ کیسی عجیب بات ہے!" میں نے کہا۔

"انھوں نے... دو سو روپے دیے تھے..."

"اچھا اچھا... گویا کرائے پر چلنے والی چیز ہو تم۔ چلو یہ اچھا ہوا کہ تم نے خود ہی بتا دیا۔ اب ہم تمھیں دو سو روپے دیں گے۔ تم ہمارے ساتھ وہیں چلو جہاں یہ جا رہے تھے۔" میں نے کہا۔ "اب تم ہماری طرف سے لڑو گے۔"

"اتنی ہی بہادری کے ساتھ۔" غالب نے طنز سے کہا۔

"مجھے۔۔۔ نہیں معلوم۔۔۔ ان کو کہاں جانا تھا۔۔۔" وہ بولا۔

"شاید تم کو یاد نہیں آرہا ہے۔ کوئی بات نہیں۔ ذہنی صدمے کا عارضی اثر ہے۔" میں نے کہا۔ "جب چھٹی کا دودھ یاد آئے گا اور نانی یاد آئے گی تو یہ بھی یاد آجائے گا کہ صرف دو سو روپے میں تمھاری زندگی کو اپنی بازی کے لیے داؤ پر لگانے والا کون تھا۔"

میں نے اسے تقریباً اٹھا کے بلیک سیڈان کے کھلے دروازے سے اندر پھینک دیا۔

غالب نے میرے قریب آکے ہاتھ جھاڑے۔ "بڑے بدمعاش بنتے تھے۔ غالب کو اکیلا سمجھ کے دونوں کے دونوں اتر آئے تھے مقابلے پر۔ اچھا ہوا تم بیچ میں آگئے۔"

"ورنہ تم ان کے بیچ میں آجاتے۔" میں نے کہا۔ "اور سینڈوچ ہوجاتے اخلاقاً۔ یہ لو توپ۔۔۔" میں نے اسے ریوالور تھما کے کہا۔ "اس کرائے کے گوریلے کو سنبھال کے رکھو۔ کرائے کی چیز ہے خراب یا ضائع نہ ہو۔"

للی کی ہنسی پر میں اس کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ کار سے باہر نکل آئی تھی اور ٹشو پیپر سے چہرہ صاف کر رہی تھی۔

"تم دونوں بہت۔۔۔ پُراسرار ہو۔۔۔" وہ بولی۔ "کیا فائٹ دی ہے تم نے! یہ شاٹ کسی فلم میں آجاتا تو لوگ تالیاں پیٹ پیٹ کے پاگل ہوجاتے۔ رئیل فائٹ کہاں ہوتی ہے فلموں میں۔"

"مس للی! تمھارے چہرے پر گہرے زخم تو نہیں ہیں؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ خراشیں ہیں معمولی۔" وہ بولی۔

"مجھے اب واقعی افسوس ہو رہا ہے۔۔۔ تمھاری گاڑی کی حالت دیکھ کر بھی۔۔۔"

"یہ وقت ایسی باتوں میں ضائع کرو گے تو تمھیں زیادہ افسوس ہوگا۔" وہ بولی۔ "بس اب نکل چلو یہاں سے۔"

"تم بیٹھو اس گاڑی میں۔" میں نے کہا۔ "میں باقی سب کو سمیٹ لوں۔ ان کو یہاں چھوڑ کے تو نہیں جاسکتے۔"

"اور میں اپنی گاڑی چھوڑ جاؤں؟" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"گاڑی ہم بعد میں لے جائیں گے۔" میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"بعد میں کب؟"

"ہم پہلے ان چاروں کو کہیں پہنچا دیں۔" میں نے کہا۔ "غالباً ایک تو جائے گا سرکاری مردہ خانے۔ باقی تین۔۔۔"

"کیا ایک کو قتل کردیا ہے تم نے؟" وہ خوفزدہ ہو کے بولی۔

"قتل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا میرا۔ مگر وہ قتل ہونے کے لیے آیا تھا۔ مجھے اس کی خواہش پوری کرنی پڑی۔" میں نے کہا۔ "تم فکر مت کرو۔ تم نے نہ کچھ دیکھا نہ سنا۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو۔" وہ بولی۔ "میری گاڑی کی یہ حالت نہیں تھی پہلے۔ کیا پولیس نہیں پوچھے گی مجھ سے؟"

"مس للی! تم بہت نروس ہو۔ حالانکہ ٹکر مارتے وقت تم نے خاصی جرأت دکھائی تھی۔" میں نے کہا۔ "یہ سب خرابی ہماری وجہ سے ہوئی۔ نہ ہم دخل در معقولات کرتے نہ تم کو ان معاملات میں ملوث ہونا پڑتا۔ مگر کوئی بات نہیں۔ ہم سب ٹھیک بھی کردیں گے۔ چلو تم آگے بیٹھو۔ میں ان سب کو ڈکی میں ڈالتا ہوں۔"

"میں اپنی گاڑی یہاں نہیں چھوڑوں گی۔"

"او کے۔ او کے۔ اسے بھی لے چلتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "وہ اس قابل نہیں ہے کہ تم اسے چلا کے لے جاسکو۔ ہم اسے ٹو کر کے لے جاتے ہیں۔"

"لیکن۔۔۔"

"پلیز۔۔۔" میں نے سخت لہجے میں کہا اور اس کو بازو سے پکڑ کے بلیک سیڈان کی اگلی سیٹ پر بٹھا دیا۔ "یہاں بحث مت کرو مجھ سے۔ میں راستے میں سب سمجھا دوں گا۔"

وہ میری درشتی سے سہم گئی اور اس کے اندر جمع ہوجانے والے خوف کے طوفان کی جو لہر اسے بہا کر لے جانے والی تھی وہ ٹوٹ گئی۔

میں نے اٹھا کے لاش کو بلیک سیڈان کی ڈکی میں ڈالا جو اتنی بڑی تھی کہ آٹھ دس مُردے اس میں آسانی سے سما جاتے۔ باقی دو بے ہوش تھے اور اس بات کا ڈر تھا کہ وہ کسی بھی وقت ہوش میں آگئے تو راستے میں ایک اور ہنگامہ کھڑا کردیں گے۔ احتیاطاً میں نے ان کو ڈکی میں ڈالنے کے بعد تار کے ان ٹکڑوں سے باندھ دیا جو ڈکی کے اندر تھے اور ٹیل لائٹس تک پھیلے ہوئے تھے۔ یہ تار زیادہ مضبوط نہیں تھے لیکن وہاں اور کچھ دستیاب بھی نہ تھا۔ ڈکی میں ایک ہی مضبوط رسی تھی جس کی مجھے للی کی گاڑی کو ٹو کرنے کے لیے ضرورت تھی۔

للی کی گاڑی کا سامنے والا حصہ تباہ ہوگیا تھا۔ اس کا بونٹ خاصا اندر چلا گیا تھا۔ ہیڈ لائٹس کا چُورا تو سب سے پہلے ہوا ہوگا۔ بمپر بھی درمیان سے اندر گھسا تھا۔ شاید اس سے گاڑی کا ریڈی ایٹر ٹوٹا تھا کہ سب پانی نیچے بہہ گیا تھا۔ بونٹ کو کھولے بغیر میں اندازہ کرسکتا تھا کہ ریڈی ایٹر فین بھی ٹوٹا ہوگا اور اس حالت میں انجن اسٹارٹ ہو بھی جاتا تو کار کو چلایا نہیں جاسکتا تھا۔

بلیک سیڈان لمبی اور اونچی گاڑی تھی چنانچہ اس کا صرف وہ حصہ تباہ ہوا تھا جس میں ٹیل لائٹس تھیں اور ڈکی کا نچلا حصہ۔ بیک گیئر۔۔۔ انجن بالکل محفوظ رہا تھا چنانچہ ہم للی کی کار کو محتاط جنگ سے کھینچ کر ہی لے جاسکتے تھے۔ آہستہ آہستہ پورا پلان میرے ذہن میں واضح ہوتا جارہا تھا۔ مجھے فکر تھی تو صرف للی کی۔ ان بدمعاشوں نے اس کی کار کو دیکھ لیا تھا۔ ہم تو غائب ہوجائیں گے مگر للی کہاں جائے گی۔ ان سے بچ کر کہاں جائے گی۔ وہ کوئی گمنام عورت نہیں تھی اور کار کے نمبر سے اس کا پتا ٹھکانا معلوم کرنا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ وہ

نہیں کیا بتائے گی کہ ہم کون تھے اور کہاں گئے؟

لیکن ان سب سوالات کا جواب فوراً تلاش کرنا بھی ممکن نہ تھا۔ میں نے اگنیشن کی چابیاں نکال کے للی کی کار کی ڈکی کھولی تو اس میں مجھے دوسری رسی مل گئی۔ ہر سمجھدار کار ڈرائیور یا پرانی کار کا مالک دوراندیش ہو تو بُرے وقت سے نمٹنے کے اسباب پہلے سے مہیا رکھتا ہے۔ گاڑی کسی ویرانے میں ٹھہر جائے اور چلنے پر کسی صورت آمادہ نہ ہو تو ایک رسی بہت کام آتی ہے۔ کوئی نہ کوئی رحمدل کار والا اسے اپنی گاڑی کے پیچھے باندھ کے گھر یا میکینک کے دروازے تک چھوڑ ہی جاتا ہے۔

اس دوسری رسی نے میرا پہلا مسئلہ حل کردیا۔ میں نے ان دونوں کو جو بے ہوش تھے انہی کی رسی سے ایک ساتھ یوں باندھا کہ وہ سیون شکر ہوگئے۔ دونوں کی پُشت مل گئی اور چہرے مختلف سمتوں میں رہے۔ ان کے ہاتھوں کو پیروں کے متوازی کر کے میں نے پوری رسی نیچے سے اوپر تک لپیٹ دی۔ وہ ایک لکڑی کے لٹھے کی طرح ہوگئے جو لڑھک نہیں سکتے تھے۔ اگر وہ لڑھکتے تو باری باری ایک دوسرے کے اوپر سے گزرتے۔ جو میلے چیتھڑے گاڑی کو صاف کرنے کے لیے پڑے ہوئے تھے وہ ان کی آوازیں بند کرنے کے کام آگئے۔

یہ سب کام میں نے بڑی پھرتی سے پانچ منٹ میں ختم کر لیا تو ہجرت کا دوسرا مرحلہ شروع ہوا۔ اس کے لیے میں نے للی کی ٹوٹی گاڑی کو جہاز جیسی بلیک سیڈان کے ساتھ ایسے باندھا جیسے ہندوؤں کی شادی میں پھیرے کی رسم کے وقت دُلہا کے ساتھ دُلہن کو باندھا جاتا ہے۔

"اب ہم واپسی کے سفر کے لیے تیار ہیں۔" میں نے مرزا غالب کو مطلع کیا۔ "لاؤ یہ توپ مجھے دے دو۔"

"پہلے میں اسے شوٹ کروں گا۔" غالب نے کسی ضدی بچے کی طرح ٹھنک کر کہا۔

"کر لینا بیٹا۔" میں نے اسے ایک شفیق باپ کی طرح ڈانٹ کر کہا۔ "جلدی کیا ہے۔ چلو شاباش! اس گاڑی میں۔"

غالب کو پیچھے والی کار میں بیٹھ کے صرف اسٹیئرنگ سنبھالنا تھا اور ضرورت کے وقت بریک لگا کے دونوں کاروں کا درمیانی فاصلہ برابر رکھنا تھا۔ اس سے کوئی فرق تو نہیں پڑتا تھا کیونکہ اب دونوں گاڑیاں دس بار بھی گلے مل جاتیں تو نقصان جہاں سیر تھا وہاں سوا سیر ہو جاتا۔ لیکن للی اپنی گاڑی کے بارے میں بہت فکرمند نظر آتی تھی۔ مجھے حیرت تھی کہ اسے اپنی زندگی کو لاحق خطرات کا خیال نہیں۔ ایک مرد کے متعصب ذہن سے سوچتے ہوئے میں نے سوچا کہ عورت ذات اتنی دور کا کیسے سوچ سکتی ہے۔ اسے تو بس گاڑی کا نقصان دکھائی دے رہا ہے۔

"مس للی! کیا تم یہ شپ چلا سکتی ہو؟" میں نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ چلا سکتی ہوں۔ اس میں وہ سب چیزیں ہیں نا؟ کلچ۔ بریک۔ ایکسیلریٹر وغیرہ۔" وہ مسکرائی اور ڈرائیور کی نشست پر کھسک گئی۔ اس نے اگنیشن میں لگی چابی تلاش کی اور اسے آن کر کے میری طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھا۔

میں نے اقرار میں سر ہلایا اور دروازہ بند کر کے اپنا رخ پیچھے کی طرف کرلیا۔ "مس للی! گاڑی کو گدھا گاڑی سمجھ کے چلانا۔ ورنہ اس کا انجن بے قابو ہوگیا تو تمھارے لیے دونوں گاڑیوں کو سنبھالنا مشکل ہوجائے گا۔ بالکل بائیں جانب رہنا۔۔"

"ول یو پلیز شٹ اپ۔" وہ بھنّا کے بولی۔ "میرے ڈرائیونگ انسٹرکٹر بننے کی کوشش مت کرو۔ میں کئی بار ایسی گاڑیوں کو کھینچ کر لے جاچکی ہوں جن کے مقابلے میں میری گاڑی بالکل نئی سمجھی جاسکتی ہے۔ اور یہ بھی پہلا موقع نہیں ہے کہ میری گاڑی ٹو کی جارہی ہے۔ آخری بات تمھاری اطلاع کے لیے یہ ہے کہ میں لانچ بھی چلاتی ہوں اور چھوٹا جہاز اُڑانے کا لائسنس بھی رکھتی ہوں۔ جو فلائنگ نہ کرنے کی وجہ سے ری نیو نہ ہوسکا ورنہ۔۔۔"

"میں امپریس ہوگیا۔" میں نے کہا۔ "لیکن دیکھو، ایسے ہچکی لے گا انجن تو جھٹکے سے وہ نازک رشتہ ٹوٹ جائے گا جو اس پرانی اور تمھاری بالکل نئی گاڑی کے درمیان قائم ہے۔ پھر میرا دوست اور تمھاری گاڑی۔۔۔ دونوں پیچھے رہ جائیں گے اور ہمیشہ کے لیے بچھڑ جائیں گے۔"

وہ ہنسی۔ "فنی مین۔ تمھارا بھائی اب تمھارا دوست ہوگیا؟"

"سب انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔" میں نے متانت سے فلسفیانہ لہجے میں کہا۔

"وہ بھی تمھارے بھائی ہیں جو ڈکی میں لیٹے ہوئے ہیں؟" وہ ہنسی۔ "کیا رشتۂ اخوت ہے۔"

کار اتنی دیر میں ایک لمبا چکر کاٹ کے نیم دائرہ بناتی ہوئی واپس بڑی سڑک پر آگئی تھی۔ وہ سب کارروائی جو ویران کچی سڑک پر ہوئی تھی کسی نے نہیں دیکھی تھی۔ ایک تو بڑی سڑک بھی بہت بڑی نہیں تھی اور اس پر ٹریفک برائے نام رہتی تھی۔ پھر یہ کہ ہمارے اور سڑک کے درمیان درخت اور جھاڑیوں کی دیوار سی حائل رہی تھی۔

"یہ بھی میرا بھائی ہے۔" میں نے پچھلی سیٹ پر پڑے ہوئے شخص کے سر کو ریوالور کی نالی سے دبا کے کہا۔ "ایک سگا بھائی ہوتا ہے۔ ایک سوتیلا۔ کوئی رشتے کا اور کوئی نام کا۔ یہ بڑا خبیث بھائی ہے۔ ہے نا؟"

اس نے مجبوراً اقرار میں سر ہلایا۔

"اس کی یادداشت اچانک خراب ہوگئی ہے۔ میرا خیال ہے اندر کا کوئی پرزہ ٹوٹ گیا ہے یا ڈھیلا ہوگیا ہے۔" میں نے کہا۔ "کھوپڑی کو کھول کر دیکھنا پڑے گا۔ بیچارے کو نام تک یاد نہیں رہا اپنا۔ کیا ہے بھئی تیرا نام؟"

وہ چپ رہا اور مجھے التجا کرنے والی نظروں سے دیکھتا رہا۔

"معلوم نہیں کون اس کو کرلٹے پر چلاتا رہا۔ دو سو روپے دے کر مرنے کے لیے روانہ کر دیا۔ کون ہے وہ بدمعاش؟" میں نے کہا۔

"دیکھو... میں تم کو کچھ نہیں بتا سکتا۔ تم چاہو تو مار ڈالو مجھے لیکن جس بات کا مجھے علم ہی نہیں وہ میں کیسے بتاؤں۔ مجھے ان میں سے ایک نے بلایا تھا کہ ذرا سی دیر کے لیے آجاؤ۔ ایک چھوٹا سا کام ہے۔ میں آگیا۔ اس نے مجھے دو سو روپے دیے اور کہا کہ چلو ذرا سمندر تک ڈرائیو کرتے ہیں۔ یہاں آجانے کے بعد اس نے بتایا کہ ایک آدمی کو ساتھ لے جانا ہے۔ یہ نہیں بتایا تھا کہ کہاں اور کیوں۔"

"یہ تو بتایا ہوگا کہ وہ آدمی کون ہے؟"

"بس یہ کہا تھا کہ ایک... ہے۔" اس نے میرے بارے میں خاصی فحش گالی استعمال کی۔ "خواہ مخواہ ٹانگ اڑا کے ہمارا کام خراب کیا۔ سیٹھ نے کہا ہے کہ اسے سامنے لاؤ ذرا۔"

"اور یہ سیٹھ کون ہے؟"

"سیٹھ ہے... سیٹھ کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ جو پیسہ دے وہ سیٹھ۔" وہ بولا۔ "ہم نہیں پوچھتے فالتو باتیں۔ اور کوئی نام بتاتا بھی نہیں۔"

"یہ سیٹھ کا آدمی کون تھا جس نے تمہیں بلایا تھا؟" میں نے محسوس کیا کہ وہ سچ بول رہا ہے۔

"وہی... جس کو مار دیا تم نے۔ دادا تو نہیں تھا مگر اپنے کو شیامو دادا بولتا تھا۔" اس نے کہا۔ "باقی دو کو بھی اسی نے بلوایا تھا۔ ایسے چھوٹے موٹے کام ہوں تو کام کرنے والے بہت ہوتے ہیں۔ اسی لیے دام بھی کم ملتے ہیں۔"

"دو افراد کا اغوا چھوٹا کام ہے؟"

"ہاں۔ شیامو نے بولا تھا کہ بس ان کو اٹھا کر گاڑی میں ڈالنا ہے۔ سیٹھ کے پاس میں خود لے جاؤں گا۔ یہ گاڑی بھی اسی کی ہے۔" وہ بولا۔

"بڑا کام کیا ہوتا ہے؟"

"بڑے کام بہت ہیں۔ اپن نے کبھی کیے نہیں۔ جو لوگ کرتے ہیں، بڑا مال کماتے ہیں۔ شراب کی اسمگلنگ۔ جوئے کا اڈا۔ عورت کا دھندا جیسا یہ شیامو کرتا تھا۔ قتل اور ڈاکا سب بڑے کام ہیں۔"

"تم باقی دو کو نہیں جانتے؟"

"نام نہیں معلوم۔ دیکھا پہلے بھی تھا۔ ایک ہی دنیا ہے اپنی اس لیے ملتے رہتے ہیں۔" وہ بولا۔ "ان کو بھی دو دو سو روپے ملے ہوں گے۔"

"اور شیامو دادا کو؟"

"پتا نہیں۔ اپنا خیال ہے کہ اس نے سیٹھ سے دو ہزار تو ضرور لیے ہوں گے۔ تم اس سے معلوم کر سکتے تھے کہ وہ سیٹھ کون ہے جس نے تمہیں بلوایا تھا۔"

"اس نے ایک آدمی کا کہا تھا؟"

"ہاں۔ شاید خود شیامو کو پتا نہیں تھا کہ آدمی دو ہوں گے۔" وہ بولا۔

"اور وہ بھی جلیبی کی طرح سیدھے نہیں ہوں گے۔ یہ معلوم ہوتا اسے تو وہ اسے چھوٹا کام نہ سمجھتا۔ دو لاکھ میں بھی اپنی گردن تڑوانے کون جاتا ہے۔" میں نے کہا۔

ہم اب شہر کے قریب تھے چنانچہ جگہ جگہ ٹریفک پولیس کے سارجنٹ نظر آنے لگے تھے۔ سڑکوں پر گاڑیوں اور بسوں کے ساتھ سائیکلوں اور اسکوٹروں کی آمد و رفت بھی بہت بڑھ گئی تھی۔ ایک چوراہے پر للّی نے دائیں طرف دیکھے بغیر گزرنے کی کوشش کی اور ادھر سے آنے والی کار کے ڈرائیور نے زبردست بریک لگائے۔

"پہلے گزرنے کا حق دائیں طرف سے آنے والے کا ہوتا ہے مس للّی۔" میں نے کہا۔ "کیا تم کو یہ بات معلوم ہے؟"

"مجھے یہ معلوم ہے کہ ٹریفک سارجنٹ پیچھے آرہا ہے۔" وہ عقب نما آئینے میں دیکھ کر بولی۔

"یاد رکھو۔ ہم میکینک ہیں۔ تم نے ہمیں بلایا تھا گاڑی ٹھیک کرنے کے لیے مگر تمہاری اپنی غلطی کی وجہ سے جب گاڑی ٹھیک ہوگئی تو ہماری گاڑی سے ٹکرا گئی۔ جب تم نے گاڑی اسٹارٹ کی تو تم کو اندازہ نہیں تھا کہ بریک بھی فیل ہو چکے ہیں۔ ہم اب گاڑی اپنے ورکشاپ لے جا رہے ہیں۔ شکایت نہ تم کو ہے نہ ہمیں۔ تم ذرا نروس ہو اس لیے چوک میں بے احتیاطی ہوگئی۔ رائٹ۔"

"رائٹ۔ میرے کاغذات پورے ہیں۔ مگر تم...؟"

"عموماً یہ لوگ کسی میکینک کے منہ نہیں لگتے۔ اس کے علاوہ مس للّی بعض اوقات خوبصورت عورت کی ایک مسکراہٹ وہ کام کر جاتی ہے جو بندوق کی یا جلاب کی گولی نہیں کر پاتی۔" میں نے کہا۔ "تم سیدھے اور خاموش بیٹھنا پسند کرو گے کرلٹے کے گوریلے یا...؟"

"میں... وہی کہوں گا جو تم نے کہا... اگر کسی نے پوچھا۔"

سارجنٹ نے سائرن بجا کے ہمیں متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ میں نے للّی سے کہا کہ وہ پروا نہ کرے اور چلتی رہے۔

"اس سے وہ مشتعل ہوگا۔ ہمارا جرم زیادہ سنگین بھی ہو جائے گا۔" وہ پریشان ہو کے بولی۔

"سائیکالوجی مس للّی۔" میں نے کہا۔ "ہم یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ ہمیں تو احساس بھی نہیں کہ ہم سے کوئی غلطی سرزد ہوئی تھی۔ خود سوچو کہ ہم نے کچھ نہ کیا ہوتا تو یہ کیوں سمجھتے کہ پولیس ہمارے پیچھے آرہی ہے۔ سڑک پر اور گاڑیاں بھی تو ہیں۔"

سارجنٹ نے اتنی دیر میں ہمیں اوورٹیک کرتے ہوئے اپنی موٹر سائیکل کو بالکل سامنے لا کے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ ہم گاڑی کو ایک کنارے پر روک لیں۔

حسب توقع اس نے پولیس کی روایتی بداخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے غرا کے پوچھا۔ "کیا تم لوگ بہرے ہو، سائرن سن کے گاڑی

نہیں روکی؟" اس کے لہجے میں جنوبی ہند کی کھن گرج تھی۔

"مجھے کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ سائرن میرے لیے ہے؟" للّی نے کہا۔

میں نے اس کی تائید کی۔ "سائرن کوئی لاؤڈ اسپیکر نہیں ہوتا کہ نام لے کر پکارے۔ ویسے بات کیا ہے؟"

"تم اپنا منہ اس وقت تک بند رکھو جب تک کہ میں تم سے کوئی سوال نہ کروں۔" وہ میری انگریزی سن کے کچھ دب گیا۔ "خاتون آپ نے بہت غلط طریقے پر چوک کراس کیا تھا۔ ایک حادثہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔"

"سوری آفیسر۔" للّی نے ایک دلکش مسکراہٹ میں آواز کا ترنم شامل کر کے کہا۔ "میں اپنی طرف سے تو محتاط تھی۔"

"میں ڈرائیونگ لائسنس دیکھ سکتا ہوں آپ کا؟" وہ کھائی سے نکر نرم لہجے میں بولا۔

"ضرور۔ وہ میری گاڑی میں ہے۔" للّی نے انگوٹھے سے پیچھے کی طرف اشارہ کیا اور نیچے اتری۔

"کیا ہوا ہے آپ کی کار کو؟" وہ بولا۔

"بس... ہونے والی بات تھی۔ اور مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ وہ بھی میری ہی غلطی تھی...!" للّی نے لہجے کی شرمندگی سے کہا۔

"گویا آپ غلطی اکثر کرتی ہیں۔ ایسی ہی خطرناک قسم کی..." وہ مسکرا کے بولا۔

"وہ... نہیں... دراصل اسی کی وجہ سے میں کچھ نروس تھی۔" للّی نے اسے پیچھے لے جا کے اپنی اسٹوری سنائی۔ کاغذات اس کی گاڑی کے گلوز کمپارٹمنٹ میں تھے جو للّی نے بڑے اعتماد اور انداز دلربائی کے ساتھ پیش کیے۔

وہ میری طرف آیا۔ "تم کیسے میکینک ہو؟ بیٹھے رہے۔ جوان آدمی ہو کے بیٹھے ہو۔ ڈرائیونگ یہ نازک سی لڑکی کر رہی ہے۔"

للّی کو لڑکی کہنے کا مطلب یہ تھا کہ پھول کی پتی سے ہیرے کا جگر کٹ چکا ہے۔

"میرے دائیں ہاتھ اور بائیں پنجے میں چوٹ آگئی تھی۔ اسی نازک سی لڑکی نے تو گاڑی چڑھا دی تھی مجھ پر!" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

"ورکشاپ کہاں ہے تمہارا؟"

میں اس سوال کے لیے بالکل تیار نہ تھا لیکن میں نے کہہ دیا۔ "ماہم میں۔"

"اچھا۔ یہ لو میرا کارڈ۔" اس نے مجھے ایک کارڈ تھما کے کہا۔ "کسی وقت میری گاڑی کو چیک کر لینا۔ دھواں دینے لگی ہے۔ رنگ بیٹھ گئے ہوں گے۔" میں نے میکینک حضرات کے مخصوص انداز میں فیصلہ صادر کر دیا۔

"جو بھی ہو دیکھ لینا۔" وہ بولا اور موٹر سائیکل کو کک مارنے لگا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ رسیدہ بود بلائے... میں اپنے اس جنگلی قیدی کا بھی شکر گزار تھا جس کی خاموشی نے مجھے زیادہ بڑی مشکل میں پڑنے نہ دیا۔ اگر وہ چلا اٹھتا تو مجھے اس کو بھی خاموش کرنا پڑتا اور پھر پولیس سارجنٹ سے نمٹنے کے لیے زور بازو صرف کرنا پڑتا۔ لیکن وہ خود ایک مجرم تھا۔ مجرموں کا تعاون و مددگار تھا اور انہی کی دنیا کا باسی تھا۔ وہ بولتا تو اپنا راز کھولتا مگر ہم بچ جاتے کیونکہ اس کے خیال میں ہم مجرم نہیں تھے۔ ہم نے مجرموں کے ایک گروہ کو کاروباری نقصان پہنچایا تھا چنانچہ وہ ہمارے دشمن ہو گئے تھے۔ یہ بالواسطہ طور پر پولیس کی مدد تھی اور اس سے ہم قانون کے طرفدار ثابت ہوتے تھے۔ مزید یہ کہ وہ خود اغوا کرنے والوں میں شامل تھا۔ اغوا کیے جانے والے ہم تھے چنانچہ قانون بھی ہمارا طرفدار ثابت ہوتا۔

یہی سب کچھ سوچ کے اس نے بھی پولیس کے دفع ہو جانے پر خدا کا شکر ادا کیا ہوگا کہ آسمان سے گر کے کھجور میں اٹکنے کی نوبت نہیں آئی۔

سارجنٹ کے کارڈ کو میں نے دیکھے بغیر جیب میں ڈال لیا تھا۔ جب وہ واپس چلا گیا اور ہم آگے نکل آئے تو میں نے کارڈ کو نکال کے دیکھا۔ اس پر نام پتا سب ہندی میں لکھا ہوا تھا اور میں للّی پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ مجھے اس دیش کی بھاشا نہیں آتی۔

"مس للّی! گاڑی کو یہاں روک لو۔" میں نے کارڈ واپس رکھ کے کہا۔ جس جگہ کی طرف میں نے اشارہ کیا تھا وہ ایک پرانی ریلوے سائیڈنگ تھی جو مدت سے زیر استعمال نہ ہونے کے باعث بمبئی کی اس "مات کی مخلوق" کا مستقل ٹھکانا بنی ہوئی تھی جن کا کوئی گھر ٹھکانا نہیں ہوتا۔ ایسے لاکھوں لوگ بمبئی میں سرفٹ پاتھ پر، پارک میں، دکانوں کے تھڑوں پر یا پلوں کے نیچے اپنا بسیرا کرتے ہیں۔ سینگ سمانا تو محاورہ ہے۔ عملاً جہاں بھی آدمی کے سمانے کی اتنی جگہ تھی کہ وہ لمبا لیٹ سکے، وہاں ہر رات کوئی سونے کے لیے آجاتا تھا اور یہ آدمی... بھی خدا کی زمین اور آسمان کی چھت کو اپنا حق سمجھ... استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے لیے وہ جگہ کے ٹھیکیدار کو بھتا دیتے تھے۔ بھتا دیے بغیر نہ کوئی کسی کی جگہ... سکتا تھا اور نہ کسی کو اپنی جگہ آباد کر سکتا تھا۔ بمبئی کی زندگی کے یہ اسرار و رموز ہم پر بعد میں آشکار ہوئے تھے۔

ریلوے سائیڈنگ پر پڑے ہوئے بستر زمین کے صندوقوں پر بڑے سلیقے اور قرینے سے رکھے ہوئے تھے۔ کتابوں، رسالوں خصوصاً کرشن چندر کے ناولوں میں بمبئی کا جو نقشہ میں نے دیکھا تھا وہ میرے ذہن میں تھا۔ اور جو تصویر میرے سامنے تھی وہ اس نقشے سے مختلف نہ تھی چنانچہ میں نے للّی کے سامنے کسی حیرانی کا اظہار نہیں کیا۔

دونوں گاڑیاں آگے پیچھے رک گئیں۔ غالب اُتر کے آگے آیا۔

"کیا آپ یہاں رہتی ہیں؟" اس نے بستروں اور صندوقوں کی قطار کی سمت میں اشارہ کرکے کہا۔

للی ہنسی۔ "پہلے رہتی تھی۔ بہت پہلے۔ ایسی ہی جگہ تھی وہ بھی۔ خدا کا شکر ہے کہ اب میرے پاس خوش قسمتی کے دعوے کو ثابت کرنے کے لیے اپنا ایک گھر ہے۔"

"مس للی کی گاڑی کو الگ کرلو۔" میں نے کہا۔ "اور مس للی! آپ اپنی اس گاڑی میں سے سب کچھ نکال لیں۔ کوئی بھی ایسی چیز نہ رہنے دیں جس سے بعد میں آپ کا سراغ ملے۔"

"کیا مطلب؟ اس گاڑی کو میں یہاں ہمیشہ کے لیے چھوڑ جاؤں گی؟" وہ بگڑ کے بولی۔

"میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کہی . . ." میں نے کہا۔ "ہم اسے بعد میں لے جائیں گے۔"

وہ کچھ شرمندہ ہوئی۔ "سوری۔ میں اس کی مرمت پر دو چار ہزار خرچ کر سکتی ہوں۔ دوسری گاڑی افورڈ نہیں کر سکتی۔"

غالب دونوں گاڑیوں سے بندھی ہوئی مضبوط نائلون کی رسّی کو کھولنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ کھینچنے سے گانٹھیں اتنی سخت ہوگئی تھیں کہ اب آسانی سے کھلنے والی نہیں تھیں۔ للی کار کے دروازے میں آدھی گھسی ہوئی اندر سے اپنے کاغذات نکالنے میں مصروف تھی۔

میں نے پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص کو باہر آنے کا حکم دیا۔ وہ کچھ وحشت زدہ سا اُتر آیا۔ شاید اسے اندیشہ تھا کہ ہم اس ویران اور الگ تھلگ جگہ پر گاڑی کے ساتھ اس کی لاش بھی چھوڑنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

"تم اب جا سکتے ہو۔" میں نے کہا۔ "ایک شرط پر۔"

وہ بھونچکا رہ گیا۔ چند سیکنڈ کے بعد جب اس نے اپنی حیرانی پر قابو پالیا اور اسے میرے الفاظ کا یقین آگیا تو اس کے چہرے کی رونق لوٹ آئی۔ "کیا شرط ہے . . . ؟"

"شیامو دادا کے ٹھکانے کا تم کو ضرور علم ہوگا۔ جب وہ تم کو بلاتا تھا تو تم کہاں رپورٹ کرتے تھے؟" میں نے کہا۔

"بار بار۔" وہ بولا۔

"سو بار یا ہزار بار۔ کہاں پہنچتے تھے تم؟" میں نے جھلا کے کہا۔

"اس جگہ کا نام ہے بار بار۔ وہ ایک تھرڈ کلاس بار ہے بھنڈی بازار میں۔" وہ بولا۔ "اس پر سائن بورڈ کوئی نہیں ہے۔ مگر وہ مشہور . . . میرا مطلب ہے بدنام جگہ ہے۔ تم کسی سے بھی پوچھ لینا جو شریف آدمی نظر نہ آتا ہو۔ بار کی مالک ایک عورت بار برا ہے۔ اس کے نام میں دو مرتبہ بار کا لفظ آتا ہے۔"

"یہ فلسفیانہ نکتہ میری سمجھ شریف میں آگیا۔" میں نے کہا۔ "تم آگے بولو کس قماش کی عورت ہے؟"

"ویسی ہی جیسی کہ ہونی چاہیے۔ اس کاروبار میں۔ وہ بار کے علاوہ قحبہ خانہ چلاتی ہے۔ اس کے مراسم پولیس اور بدمعاشوں سے ایک جیسے کاروباری ہیں۔ وہ اس کو تحفظ فراہم کرتے ہیں اور باربرا ان کو دونوں چیزیں فری فراہم کرتی ہے۔ جو اس کے پاس دوسرے عام لوگوں کو قیمت ادا کرکے ملتی ہیں۔"

"پھر کاروبار خاک کرتی ہوگی۔ سارے شہر کے بدمعاشوں اور پوری بمبئی کی پولیس کا اجتماع رہتا ہوگا۔"

وہ ہنسنے لگا۔ "صرف اپنے علاقے کے دادا اور اپنے علاقے کی پولیس، علاقے سے باہر کوئی نہیں جاتا۔ کیا اب میں جاؤں؟"

"ضرور جاؤ۔ اور یہ سب بھول جاؤ جو تم نے دیکھا یا سُنا۔ اس میں تمھاری بہتری ہے ورنہ تم دیکھ ہی چکے ہو کہ ہم کیسے لوگ ہیں، ہم آجائیں گے تم کو تلاش کرتے ہوئے۔ دُنیا ہمارے لیے چھوٹی سی جگہ ہے۔" میں نے کہا۔

اس نے سر ہلایا اور پلٹ کر تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا غائب ہوگیا۔ للی اپنی گاڑی سے سب کاغذات وغیرہ نکال کر لے آئی تھی اور غالب نے بھی رسّی کاٹ کے الگ کر دی تھی۔ ڈرائیونگ اب میں نے سنبھالی اور للی سے کہا کہ وہ ہمیں راستہ بتاتی جائے۔

دو میل آگے جانے کے بعد مجھے پھر ایک ایسی جگہ نظر آئی جہاں کار روک کے میں نے ڈکی کھولی۔ بندھے ہوئے افراد میں سے ایک کو ہوش آگیا تھا۔ میں نے اسے کھینچ کر باہر نکالا اور سڑک کے کنارے پر پھینک دیا۔ اس میں فوراً اُٹھنے کی ہمت بھی نہ تھی۔ گاڑی چلانے کے بعد میں نے آئینے میں دیکھا تو وہ کھڑا ہو چکا تھا۔ پھر ہم نے موڑ کاٹا اور میں نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ دوسرا شخص اس وقت بھی بے ہوش تھا جب میں نے اسے سڑک کے کنارے ایک بنچ پر لٹایا۔

"تمھارا فلیٹ اب کتنی دور ہے؟" میں نے پھر گاڑی بڑھا کے کہا۔

"ابھی پانچ چھ میل کا فاصلہ تو ہوگا۔" للی نے کہا۔ "کیوں؟"

"میں تم کو اس شاہی چھکڑے میں عین گھر کے دروازے پر ڈراپ کروں گا تو تمھاری پوزیشن مشتبہ ہو جائے گی۔" میں نے کہا۔

"کیا تم گاڑی کو ایسے ہی چھوڑ دو گے۔ لاوارث؟"

"یہ گاڑی نہیں، میت گاڑی ہے۔" میں نے کہا۔ "اس میں جو لاش ہے، وہ بھی لاوارث ہے۔"

گاڑی کو میں نے دو میل آگے جا کے روک دیا۔ ہم تینوں اطمینان سے اُتر کے پیدل روانہ ہو گئے۔ ایک فرلانگ چلنے کے بعد میں نے ٹیکسی روکنے کا خیال ظاہر کیا۔

"اب تم جاؤ۔" میں نے کہا۔

"کیا مطلب! اکیلی جاؤں؟"

"تم اس ویرانے میں کار لے کر اکیلی پھر رہی تھیں۔ پھر بیچ شہر

میں ڈرنے کی کون سی بات ہے۔"

"تم نے بل ادا کرتے وقت ایٹی کیٹس کی بات کی تھی۔ کیا یہ ایٹی کیٹس کے خلاف نہیں کہ تم مجھے چھوڑنے جاؤ۔ اور پھر میں تم کو کم سے کم ایک کپ چائے کے لیے ضرور کہوں۔ اور تم اخلاقاً اس دعوت کو مسترد نہ کرو۔"

میں ہنس پڑا۔ "ہم ایٹی کیٹس کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔"

للی نے خود ہی میرا مسئلہ حل کر دیا۔ میں چاہتا تھا کہ اس کے ساتھ جاؤں اور اسے بہت سی باتیں سمجھا دوں، جو شاید اس کے ذہن میں نہیں تھیں لیکن میں زبردستی اس کے ساتھ کمبل نہیں ہونا چاہتا تھا۔

للی کا فلیٹ ایک پرانی پانچ منزلہ عمارت کے تیسرے مالے پر تھا یعنی تیسری منزل پر۔ دو مختصر کمروں اور مختصر ترین کچن اور باتھ پر مشتمل فلیٹ کا مجموعی رقبہ شاید چار سو اسکوائر فٹ ہوگا۔ لیکن للی اکیلی رہتی تھی۔ اس نے اپنے کمرے کا بھی ایسا شاندار میک اپ کیا تھا کہ وہ معمولی فلیٹ اس معمولی لڑکی کی طرح قیامت خیز طور پر خوبصورت نظر آنے لگا تھا۔ جیسے ماہرین آرائش نے دلہن بنا دیا ہو۔

ڈرائنگ روم میں ہر چیز اتنی صاف ستھری، چمکتی دمکتی اور قرینے سے رکھی ہوئی تھی کہ ہمیں قالین پر اپنے بھدّے جوتوں کے ساتھ چلتے ہوئے جھجک محسوس ہوئی۔ یہی حال بیڈ روم کا بھی تھا۔ یوں لگتا تھا کہ یہ فلیٹ صرف ایک شو پیس ہے۔ اس میں رہتا کوئی نہیں اور اسے صرف فلیٹ بنانے والے اپنی اشتہاری فلموں کی شوٹنگ میں استعمال کرتے ہوں گے۔

"کہتے ہیں گھر مکین کی خوبصورتی کا آئینہ ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ بات سچ ہے۔"

"آرام سے بیٹھ جاؤ۔ اور یہ سُن لو کہ میں یہاں تم کو صرف چائے کا ایک کپ پلانے کے لیے نہیں لائی ہوں۔" وہ بولی۔ "میں چاہتی ہوں کہ تم اپنا حُلیہ ٹھیک کر لو۔ اس میک اپ کو بدل ڈالو۔ اگر میک اپ کرکے پھرنا ضروری ہے تو میں تمھاری مدد کروں گی۔ لیکن اس میک اپ میں فنّی خرابی ہی نہیں، خطرہ بھی ہے۔ اب یہ بتاؤ کہ پہلے تم نہا دھو کے یہ میک اپ اتارو گے یا پہلے چائے پیو گے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس وقت تو ہم صرف ایک کپ چائے کا ہی پئیں گے۔" میں نے گھڑی پر نگاہ ڈال کے کہا جس میں شام کے پانچ بجنے والے تھے۔ "ہمارے لیے تمھاری تشویش کے جذبات یقیناً قابل قدر ہیں۔ اور چونکہ تم سے کوئی پردہ نہیں رہا، اس لیے میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ اس میک اپ کے ساتھ پھرنے میں واقعی ہمارے لیے خطرات پیدا ہو سکتے ہیں۔ ہمارا اصل چہرہ پھر کبھی دیکھنا جب ہم تمھارے فنکار ہاتھوں سے اپنا چہرہ بدلوانے آئیں گے۔"

"آج کس بات کی جلدی ہے؟" وہ مایوسی سے بولی۔

"مجھے کوئی جلدی نہیں۔" غالب نے مسکرا کے کہا۔ "لیکن اس کو کہیں پہنچنا ہے۔ ایک ایسا کام جو ٹالا نہیں جا سکتا . . ."

"تو اسے جانے دو۔" وہ بولی۔ "میں نہیں پوچھتی کام کیا ہے، مگر اس طرح یہ لوٹ کر تو آئے گا۔"

غالب نے کہا۔ "ہم میں سے کوئی کبھی اکیلا کہیں نہیں گیا۔ ہم ایک دوسرے کا سایہ ہیں۔ شاید جہنم میں بھی اکٹھے جائیں گے۔"

"جاؤ تم اپنا ہاتھ منہ دھو لو۔ اور ڈریسنگ کرلو۔ چہرے پر خراشوں کے نشان نہ رہ جائیں کہیں۔" میں نے کہا۔

وہ پلک جھپکائے بغیر مجھے دیکھتی رہی لیکن اس کی آنکھوں کی ویرانی سے میں نے اندازہ کر لیا کہ درحقیقت وہ کچھ اور دیکھ رہی ہے۔ جو نہ میرے سامنے ہے اور نہ اس کے سامنے بلکہ صرف اس کے خیالوں میں ہے اور اس کے ماضی کا حصہ ہے یا مستقبل کا خواب ہے۔ پھر اس نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔ "کون دیکھتا ہے یہ داغ۔ ان سے گہرے تو دل کے داغ ہیں۔"

پھر اچانک اس نے اپنی بات پر ہنسنا ضروری سمجھا لیکن یہ ہنسی مصنوعی تھی۔ جیسے کوئی دیوار کی بدنمائی کو چھپانے کے لیے اس پر خوبصورت رنگوں والا ریشمی پردہ ڈال دے۔ وہ ایک دم پلیٹ کے اندر غائب ہو گئی کہ کہیں ہم اس سے کچھ پوچھ نہ لیں۔ یہ کہ اب کتنی جگہ ہے تمھارے دلِ داغدار میں۔ اور جو داغ دل کے ہیں کس کی عطا ہیں چارہ گرو!

"ایک دُکھی عورت ہی ایسے کسی کا دُکھ بانٹنے کو ترستی ہے۔" غالب نے کہا۔ "اور لوگ اتنے خود غرض اور بے رحم ہیں کہ اپنے دُکھ میں بھی کسی کو شریک نہیں کرتے۔"

"جیسے کہ تم۔" میں نے کہا۔ "ہم کب چاہیں گے کہ وہ ہمارے دُکھوں میں شامل ہو۔ سُکھ سے تو ہمارے دل کا دامن بھی خالی ہے۔"

"ہم سُکھ کے خواب تو رکھتے ہیں۔ کیا اس کے پاس خواب بھی نہیں؟" غالب نے کہا۔

"کیا پتا اس کے دل میں ٹوٹے ہوئے خوابوں ہی کے داغ ہوں۔" میں نے کہا۔

"پھر وہ کیوں ایسے اعتماد کر لیتی ہے۔ ہر اجنبی پر . . . جیسے کہ ہم! کیا اسے خوف محسوس نہیں ہوتا کہ چہرہ بدل کے پھرنے والے لوگ بے اعتماد ہوتے ہیں۔" غالب اب باقاعدہ قنوطی ہو رہا تھا۔

"یہ سب تقدیر کی پلاننگ ہے۔" میں نے صوفے پر نیم دراز ہو کے سگریٹ نکالی۔ "ورنہ ہم کیا اس سے ملنے کے لیے بمبئی آئے تھے لیکن میں نے یہ طے کیا ہے کہ ہم یہاں لوٹ کر نہیں آئیں گے۔"

"یہ تو . . . بڑی خود غرضی ہوگی . . . اگر ہم اس کے لیے کچھ نہ کر سکے . . . اس پر کوئی مصیبت آئی تو . . . ہماری وجہ سے آئے گی۔"

"یہ تو میں نے بھی سوچا تھا۔" میں نے سگریٹ کو انگلیوں میں گھماتے

ہوئے کہا۔ "مگر مرزا! ہمارا اس کے ساتھ تعلق بھی تو کسی طرح کم خطرناک نہیں۔۔۔!"

للی کے آجانے سے ہماری بات ادھوری رہ گئی۔ اس نے چہرہ دھو کے صاف کر لیا تھا اور بالوں کو برش کر لیا تھا لیکن کسی قسم کا میک اپ نہیں کیا تھا۔ اس کے باوجود للی کا چہرہ اُجلا اور نکھرا ہوا لگتا تھا۔ اس نے چائے کی ٹرے سینٹر ٹیبل پر رکھ دی۔

"کس سوچ میں گم ہو؟" وہ مجھے دیکھ کے مسکرائی۔

"سوچ رہا تھا کہ اس سگریٹ کو جلاؤں یا نہ جلاؤں۔" میں نے کہا۔

"بیک وقت اتنے بے تکلف بھی ہو اور پُر تکلف بھی۔ اجازت لوگے پہلے مجھ سے۔" وہ بولی۔

"اجازت تو دے دوگی تم۔ مجھے ہی کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ اس صاف ستھرے ماحول میں دھوئیں اور تمباکو کی بُو شامل کرنا ایسا ہی ہوگا جیسے بے داغ چادر پر میں ان جوتوں سمیت چڑھ جاؤں؟" میں نے کہا۔

اس نے کہا۔ "اچھا تم چائے بناؤ۔ سگریٹ میں جلاتی ہوں۔" اور ایک سائیڈ ٹیبل پر سے نازک نفیس اور سنہرے رنگ کا سگریٹ کیس اُٹھا لیا۔ "یہ لیڈیز سگریٹ ہیں اگر تم پینا چاہو تو۔۔۔" اس نے ویسے ہی لائٹر سے اپنی سگریٹ جلالی۔ غالب چائے بنانے لگا۔

میں نے لائٹر اٹھا کے تعریفی انداز میں دیکھا اور اپنی سگریٹ سلگا کے کہا۔ "تم نے مجھے احساسِ جرم سے بچا لیا!"

"اچھا! کمال ہے!" وہ بولی۔ "دن میں کتنی بار احساسِ جرم میں مبتلا ہوتے ہو تم؟ زندگی میں تو ہر قدم پر کچھ نہ کچھ ہو جاتا ہے۔۔۔ ایسا کون ہے جو کوئی غلطی نہ کرے۔ گناہ نہ کرے اور جرم نہ کرے۔ ایسے تو شاید زمین پر چلنا بھی گناہ ہو کہ پیروں کے نیچے کوئی چیونٹی بے گناہ مر جائے گی۔ سانس لینا بھی سزا ہو۔۔۔"

"مس للی۔۔۔ یہ بہت مشکل کام ہے۔۔۔ یہ فیصلہ کرنا کہ کون مجرم ہے اور کون گناہ گار۔" میں نے کہا۔ "اور ایسا کرنا بھی نہیں چاہیے۔ صرف خدا ہی وہ منصف ہو سکتا ہے، انسان نہیں۔ مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے وہ سب کیوں کیا جو بالکل ضروری نہیں تھا۔ جب تم نے سمجھ لیا تھا کہ ہمارے چہرے نقلی ہیں۔ یہ دیکھ لیا تھا کہ ہمارے پیچھے بدمعاش رہتے ہیں۔ تمہارا بہت نقصان بھی کر دیا ہم نے۔ تو پھر تم نے ہمیں پولیس کے حوالے کیوں نہیں کیا؟ تمہیں یہ خیال کیوں نہیں آیا کہ ہم دھوکے باز، جعلساز، جیل سے بھاگے ہوئے قیدی کچھ بھی ہو سکتے ہیں۔"

"پہلے مجھے یہ خیال آیا تھا، مگر بعد میں بدل گیا۔۔۔!"

"پھر۔۔۔ کیا ضرورت تھی ہمیں یہاں لانے کی؟ اتنی ہمدردی کے اور مہمان نوازی کے مظاہرے کی؟"

"کیا میں نے کوئی غلطی کی؟ تم کو بے ضرر جان کے اور تم پر بھروسا کر کے؟" وہ پریشان ہو کے بولی۔

"ہاں۔ بہت سخت غلطی کی۔ تم پر مصیبت بھی آ سکتی ہے، ہماری وجہ سے۔" میں نے کہا۔ "یہ بتاؤ وہ گاڑی تمہارے نام پر رجسٹرڈ ہے؟ اسی پتے پر؟"

اس نے کچھ سوچ کے کہا۔ "نام۔۔۔ نہیں۔۔۔ اس پر ابھی تک وہی نام چل رہا ہے۔ جواب کہیں نہیں، سوائے اس جگہ کے۔" وہ اپنے دل پر انگلی رکھ کے بولی۔ "اور ایک سنگِ مرمر کے ٹکڑے کے جو ایک قبر کے سرہانے نصب ہے۔ یہ دل بھی ایک پتھر ہے۔ وہ کتبہ بھی اور نام ابھی تک فیروز کا ہے۔"

"آئی ایم سوری۔" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ "مجھے مجبوراً یہ سوال کرنا پڑا تھا۔ کیا وہ شوہر تھا تمہارا؟"

للی نے اقرار میں سر ہلایا۔ "گاڑی اسی نے خریدی تھی میرے لیے۔ یوں ہی۔ اتنا خیال تھا اسے میرا۔ اور اب بھی ہے۔" وہ عجیب طرح سے ہنسی۔ "آج بھی اسی کے نام کی وجہ سے محفوظ ہوں میں۔ وہ اگر کار کی رجسٹریشن دیکھ کے میرا سراغ لگانے کی کوشش کریں گے تو ان کو مایوسی ہوگی۔ وہ پتا بھی اب تک کاغذات میں چل رہا ہے۔"

"تمہاری اس کار سے ایک جذباتی وابستگی ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر میں یہ کہوں کہ اسے بھول جاؤ۔ تو تمہارے لیے مشکل ہوگا!"

"مشکل تو ہوگا۔" اس نے غالب سے چائے کا کپ لے کر کہا۔

"مگر ناممکن نہیں؟" میں نے کہا۔

"ناممکن کچھ ہوتا تو میں فیروز کے بغیر زندہ کیسے رہتی۔ آخر اسے بھی تو بھلا ہی دیا میں نے۔ اب ایسے ہی اس کا ذکر آ جاتا ہے کبھی تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ زندگی گزر رہی ہے۔ تم چائے پیو اور یہ بسکٹ لو۔ اس وقت یہی ہے۔"

میں سخت جذباتی شکنجے میں گرفتار ہو گیا تھا۔ لیکن للی کے رویے نے مجھے حوصلہ دیا۔ "مس للی! تم کو یہ صدمہ بھی برداشت کرنا ہوگا۔ سمجھ لو کہ تمہارے شوہر کی ایک عزیز نشانی تھی۔ آج وہ بھی کھو گئی۔ قصوروار ہم ہیں۔ صرف سوری کہنے سے زیادہ شرمندگی ہوگی۔"

"پھر کیا کروگے؟" وہ مسکرائی۔ "ہمارا دل رکھنے کے لیے۔"

"جو میں کہوں گا، مانوگی؟" میں نے کہا۔ "صاف بات یہ ہے مس للی کہ تمہارے اور ہمارے درمیان ابھی تک کوئی جذباتی رشتہ ہے ہی نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہماری وجہ سے تم کو بہت نقصان ہوا اور شاید آئندہ بھی ہو۔ اس لیے میں کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ تمہیں مزید نقصانات سے بچانے کے لیے۔ اگر تم نے انکار کیا تو میرے دل پر ایک بوجھ ہمیشہ رہے گا۔ پھر میرے لیے لوٹ کر آنا بالکل ناممکن ہو جائے گا۔"

"تم کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"یہ بہت اچھی بات ہے مس للی کہ تم حقیقت پسند بھی ہو۔ کوئی بھی چیز ہمیشہ ساتھ نہیں دیتی۔ اس کار کو تم کب تک رکھ سکتی تھیں۔ وہ اتنی پرانی ہو گئی تھی کہ دو چار سال میں جواب دے جاتی۔ اس کے بعد تم اسے اپنے ذاتی میوزیم میں سنبھال کے تو رکھ نہیں سکتی تھیں۔ وہ نیچے گلی میں کھڑی رہتی۔ اسکریپ ہو جاتی۔ تم نے کبھی گاڑیوں کو مرتے دیکھا ہے؟ آہستہ آہستہ ٹی۔ بی کے لاعلاج مریض کی طرح۔ ایسے ہی وہ بھی مر جاتی۔ اس کی لاش بھی تمہارے دروازے پر رکھی رہتی تو کتنے دن؟ بالآخر لوگ اعتراض کرنے لگتے کہ اسے ہٹاؤ۔ گلی تنگ ہے اور ہمارا راستہ روک رہی ہے تمہارے مرحوم شوہر کی یہ نشانی۔ کباڑی اسے لے جاتے یا پھر کارپوریشن والے۔ ہم سب کے لیے اپنے گزرے ہوئے وقت کی سب نشانیوں کو سمیٹ کر رکھنا ممکن ہی نہیں کیونکہ ہم آگے چلنے پر مجبور ہیں۔ تم مجھے سنگدل کہو یا سفاک۔ مگر میں وہی کہوں گا جو مجھے کہنا چاہیے۔ اس گاڑی کو بھول جاؤ۔"

وہ کچھ دیر خاموشی سے سگریٹ کے کش لگاتی رہی۔ "ہاں۔۔۔ ایک نہ ایک دن یہ ہونا ہی تھا۔ خود مجھے کئی بار خیال آیا کہ اس گاڑی کو اب بدل دینا چاہیے۔ جو لوگ مذاق نہیں اڑاتے وہ محض میرا دل رکھتے ہیں۔۔۔ ورنہ اس کے کتنے نام رکھے ہیں دوسروں نے یہ مجھے معلوم ہے۔ لیکن۔۔۔ اس کار کا کیا بنے گا؟"

میں نے کہا۔ "کچھ نہیں۔ وہ وہاں لاوارث کھڑی رہے گی۔ جو لاوارث لوگ وہاں سوتے ہیں انہی میں سے کچھ کا بھلا ہو جائے گا۔ ایک ایک کر کے وہ اس کے ٹائر اور کارآمد پرزے نکالتے جائیں گے اور بیچ کر کھاتے جائیں گے۔ کوئی اس کی سیٹ نکال لے گا، اپنا تکیہ بنانے کے لیے۔ یا ممکن ہے کوئی اسی میں رہنے لگے۔ تم ایک حوصلہ مند عورت ہو۔ جینا چاہتی ہو اور جینا جانتی ہو۔ تم دوسری کار میں آتی جاتی رہو گی اور زندگی پہلے کی طرح گزرتی جائے گی۔"

"وہ نہیں۔" میں نے تم کو بتا دیا تھا کہ میں دوسری کار ابھی نہیں لے سکتی۔ کیا تم نے اس پر یقین نہیں کیا تھا؟"

میں نے کہا۔ "دوسری کار ہم لائیں گے تمہارے لیے۔"

وہ ایک دم برہم ہو گئی۔ "تم۔۔۔ تم کیوں لاؤ گے۔ تم کو کیا حق پہنچتا ہے؟"

"حق پہنچتا ہے۔ اس لیے کہ ہماری وجہ سے ہی تمہاری کار گئی۔ حق تو تم کو بھی پہنچتا ہے کہ ہم سے نقصانات کی تلافی کا مطالبہ کرو۔ تم ہم کو دھمکی دے سکتی ہو اور زبردستی کر سکتی ہو۔ مگر نہ تم نے ایسا کیا اور نہ ہم ایسے ہیں کہ زبردستی کوئی ہم سے کچھ وصول کر سکے۔ تمہارے رویے نے ہی ہمارے دل میں یہ احساس پیدا کیا ہے کہ اس نقصان کو پورا کرنا ہماری اخلاقی ذمے داری ہے۔ اس کار کے بدلے۔۔۔ دوسری کار تمہیں ضرور ملے گی۔"

"کون سی؟" وہ تمسخر آمیز لہجے میں بولی۔ "بالکل نئی مرسڈیز؟"

میں نے کہا۔ "اگر ہم ڈاکو یا اسمگلر ہوتے تو ضرور ایسا ہی تحفہ پیش کرتے۔ لیکن ہم تم کو بے عزت نہیں کر سکتے۔"

"میں کسی اجنبی سے تحفہ قبول نہیں کر سکتی۔ یہ بھی بے عزتی ہے میری۔۔۔!"

"ہم اب اجنبی نہیں رہے۔" غالب نے کہا۔

"اور یہ تحفہ نہیں تلافی ہے۔ تم کو ویسی ہی کار ملے گی۔ بالکل نئی شاید نہ ہو مگر اچھی سے اچھی لانے کی کوشش کریں گے ہم۔"

"پھر یہ تلافی تو نہ ہوئی۔۔۔ تم کو تو زیادہ سے زیادہ وہ قیمت لگانی چاہیے جو مجھے مل سکتی تھی۔" للی نے کہا۔

"اس میں اپنی پریشانی کا معاوضہ بھی شامل کرو۔" میں نے کہا۔ "اس کے ذمے دار بھی ہم ہی تھے۔ پھر جو مدد تم نے کی، اور آئندہ کروگی، اس کا ہماری طرف سے کوئی صلہ، نذرانہ، انعام، کچھ تو ہوگا۔ بس اس سے ایک تقریباً نئی گاڑی آ جائے گی۔"

وہ ہنس پڑی۔ "تم بہت چالاک آدمی ہو۔ لیکن مسٹر چالاک! میں نے کسی صلے یا انعام کی خاطر تمہاری مدد نہیں کی تھی۔"

"مجھے معلوم ہے۔ شاید میں نے غلط الفاظ استعمال کیے۔ تم یوں سمجھ لو کہ ہم اس نیکی کے جواب میں ایک معمولی سی نیکی کرنے کے خواہش مند ہیں۔ اپنی عقیدت کا اظہار کرنے کے لیے۔۔۔"

"دیکھو۔ یہ بہت مشکل ہے میرے لیے۔ میں بس میں آ جا سکتی ہوں۔ ابھی نہ سہی سال بھر کے بعد لے لوں گی نئی گاڑی۔ ویسے تو وہ سب میری اتنی عزت کرتے ہیں۔ راج کپور، رشی کپور، رندھیر اور ان کی فیملی کے سب لوگ۔ کہ آج میں ان سے کہوں تو صبح مجھے دروازے پر ان کی اپنی کار کھڑی ملے۔ میں ایڈوانس یا قرض بھی لے سکتی ہوں۔۔۔"

"اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ تمہاری خود اعتمادی مجروح ہوگی اس سے۔" میں نے کہا۔ "اور اگر تم نے ہمیں بھی انکار کیا تو ہم آج کے بعد لوٹ کر یہاں نہیں آئیں گے۔ حالانکہ ہمیں تمہاری مدد کی اور پناہ کی ضرورت ہے۔ اپنا چہرہ بدلوانے کے لیے۔"

"ابھی سے دھمکی دے رہے ہو؟"

"ظاہر ہے جب تم انکار کروگی تو تعلق خود ہی ختم ہو جائے گا۔" غالب نے کہا۔ "ورنہ تم ہمارے جذبات کی قدر کروگی تو پھر ہم ضرور آئیں گے اور تم ہمارا اصل چہرہ بھی دیکھوگی۔"

اس نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا۔ "معلوم نہیں کیوں میں تمہاری ہر بات ماننے پر مجبور ہوں۔ تم مجھے ایسی ویسی عورت مت سمجھنا جیسی کہ بمبئی میں عام ہیں۔ میں نے کسی مرد کو اتنی لفٹ نہیں دی کبھی۔"

"وجہ تمہیں ضرور معلوم ہوگی۔" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔ "یا معلوم ہو جائے گی کہ اس ملاقات کو تم نے تعلق کی بنیاد کیوں بنا لیا۔ اور وہ بھی کچھ جانے بغیر۔ تم نے تو ابھی تک ہمارا نام بھی نہیں پوچھا۔ ہمارا اصل نام۔"

"تم خود ہی بتا دوگے۔" اس نے اپنی اُداسی کو بشاشت میں بدلنے کی کوشش کی۔ "کبھی نہ کبھی۔"

میں نے غالب کی طرف دیکھا لیکن وہ دوسری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے ایک لمحے کے تذبذب کے بعد فیصلہ کیا کہ نام میں کیا

رکھا ہے۔ اصل اہمیت تو جذبات کی ہے اور نیت کے خلوص کی ہے۔

میں نے کہا۔" ہاں۔ یہ ٹھیک کہا تم نے۔ ایک نہ ایک دن ایسا ضرور ہوگا۔ لیکن ابھی ہمارے نام وہی ہیں جو ہمارے پاسپورٹ میں لکھے ہوئے ہیں۔ میں امیر چند ولد دمڑی لال۔ یہ میرا بھائی فقیر چند ولد دمڑی لال، سورگباشی۔"

للی کو بے اختیار ہنسی آگئی۔" ایک بھائی امیر اور ایک فقیر۔"

غالب نے ایک سرد آہ بھری۔" جو چھوٹے ہوں ان کے ساتھ انصاف کہاں ہوتا ہے مس للی۔ میں چھوٹا تھا ورنہ آپ خود فیصلہ کریں۔ صورت سے کون بھک منگا نظر آتا ہے۔"

میں نے کہا۔" مس للی! ایک بات پوچھوں، ذاتی سی ہے۔"

" میری ذات کے بارے میں بھی کوئی بات ذاتی نہیں۔"

" میں نے دیکھا تھا کہ تم اچھی اداکاری کر لیتی ہو۔ اس پولیس سارجنٹ کو تم نے اداکاری سے ہی مات دی تھی۔" میں نے کہا " بغیر میک اپ کے بھی تم خوبصورت ہو۔۔۔"

" یہ تم تیسری بار مجھے خوبصورت کہہ رہے ہو۔" اس نے ہنس کے کہا۔" کیا بات ہے۔ میرے چکر میں تو نہیں پڑ گئے ہو؟"

اس کی بے باکی میں بھی بڑی معصومیت تھی۔ میں نے کہا۔ "ضرور پڑ جاتا اگر پہلے ملا ہوتا۔ اب اگلے جنم میں دیکھوں گا۔"

" گویا شادی کر چکے ہو۔ کیا وہ بھی بہت خوبصورت ہے۔ مجھ سے بھی زیادہ؟" للی نے کہا۔

" شاید۔ مجھے تو لگتی ہے۔ کسی اور کو نہ لگے تو قصور میرا نہیں۔" میں نے کہا۔

" بچّے کتنے ہیں؟"

" پتا نہیں۔" میں نے افسردہ شکل بنا کے کہا۔

وہ بولی۔" پتا نہیں سے کیا مطلب؟"

" مطلب یہ کہ جب ہوں گے تب ہی پتا چلے گا نا۔ مقدر میں کتنے ہیں، یہ اس نے کسی جوتشی سے بھی نہیں پوچھا۔" غالب نے جواب دیا۔

" تم نے اس سوال کا جواب گول کر دیا۔ تم نے اداکارہ بننا کیوں منظور نہیں کیا۔ جبکہ تمھیں اس کے بہترین مواقع حاصل تھے۔ کون نہیں جانتا کہ راجکپور فیملی اسٹار بناتی ہے۔ اور یہ وہ خواب ہے جو بمبئی آنے والی ہر لڑکی دیکھتی ہے۔ اس خواب کو تعبیر مل جائے تو عزت، شہرت، دولت سب مل جاتا ہے۔ تمھاری دسترس میں تھا یہ سب کچھ۔" میں نے کہا۔

وہ جیسے پھر اپنے خیالوں میں گم ہوگئی۔" ہاں۔ مگر بعض اوقات اپنے خوابوں سے بھی دستبردار ہونا پڑتا ہے۔ زیادہ بڑی خوشیوں کے لیے۔ یا کسی اور کی خاطر۔ کم سے کم تین لڑکیاں ایسی ہیں جن کے لیے میں نے راج سے کہا۔ راج کپور سے۔ اور ان میں سے ایک ٹاپ کی ہیروئن ہے آج۔"

" تم سے نہیں کہا انھوں نے۔ راج کپور یا ششی کپور نے؟"

" سب نے کہا مگر میں نے ہی انکار کر لیا۔ [illegible]

دُنیا کی سو فیصد عورتیں اداکارہ بن کے شہرت، عزت اور دولت حاصل کرنا چاہتی ہیں؟ ایسی کوئی عورت نہیں ہوتی جسے یہ سب زندگی میں خوشی حاصل کرنے کے لیے ضروری محسوس نہ ہوتا ہو۔"

میں اس کے سوال پر حیران اور خفت زدہ ہو کے سر کھجانے لگا۔" نہیں۔۔۔ ایسا تو نہیں۔ میں عام بات کر رہا تھا۔ سو فیصد کی نہیں۔ دو چار یا دس بیس فیصد ایسی ضرور ہوتی ہوں گی جو راج کپور کی فلم میں لیڈ رول قبول کرنے سے بھی انکار کر دیں۔"

" بس تو سمجھ لو کہ میں انھی دو چار یا دس بیس فیصد میں شامل ہوں۔" وہ ہنسی۔" جو بے وقوف ہوتی ہیں۔"

میں نے احتجاج کیا۔" میں نے یہ نہیں کہا مس للی!"

غالب نے گھڑی کی طرف دیکھ کے کہا۔" یہاں سے حاجی علی کی درگاہ تک ہم کتنی دیر میں پہنچ سکتے ہیں؟"

" کس طرح؟ پیدل یا کسی چیز پر سوار ہو کے، مثلاً جہاز۔"

" فرض کرو ہم اپنی استطاعت کے مطابق ایک ٹیکسی لے لیں۔"

" ایک گھنٹا تو لازمی ہے۔ احتیاطاً ڈیڑھ گھنٹا سمجھو۔ راستے میں ٹریفک جام ہو یا ٹیکسی خراب ہو جائے۔۔۔"

" پھر تو ہمیں دیر ہوگئی۔" میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

" کل آؤ گے نا؟"

" انشاء اللہ۔" میرے مُنہ سے بے اختیار نکل گیا جبکہ مجھے کہنا چاہیے تھا "بھگوان نے چاہا تو"۔ غالب نے مجھے کن انکھیوں سے گھور کے دیکھا اور ملامت بھی کی مگر للی نے اپنے رویّے سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا یا اسے یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں لگی۔ بہت سے الفاظ ہماری معاشرت میں داخل ہیں اور ہندو مسلمان بلاتفریق استعمال کر جاتے ہیں، مثلاً خود ہمارے پاکستانی معاشرے میں "رام رام جپنا پرایا مال اپنا"، جو اسی طرح استعمال ہو رہا ہے حالانکہ " اللہ اللہ کرنا پرایا مال اپنا" بھی استعمال ہو سکتا ہے اور ایسے بہت سے محاورے خالص ہندوستانی تہذیب کے آئینہ دار ہیں جن کو مسلمان صرف عادتاً استعمال کرتے ہیں۔

دروازے پر پہنچ کر میں نے کہا۔" مس للی! کیا یہ ہو سکتا ہے کہ تم کچھ عرصہ باہر گزار لو۔ کم سے کم دو چار دن اس فلیٹ میں نہ رہو۔"

" میں کہیں بھی رہ سکتی ہوں۔ لیکن ضرورت کیا ہے اس کی؟"

" بس ایسے ہی۔ احتیاطاً۔" میں نے کہا۔" اگر اس عرصے میں کوئی تم کو تلاش کرتا ہوا آیا تو پاس پڑوس سے ضرور معلوم کرے گا۔ اور تمھیں پتا چل جائے گا۔"

" اس سے کیا ہوگا؟ دو چار دن بعد وہ پھر آ جائے گا۔"

" دو چار دن بعد کیا ہوتا ہے، یہ بعد میں دیکھیں گے۔ ہم بھی اتنے بے وقوف تو نہیں ہیں مس للی۔ ہم معلوم کریں گے کہ کون آیا تھا اور کس نیت سے آیا تھا۔ تم یہ کرو کہ اپنے دونوں ہمسایوں کو ہدایات

دے جاؤ کہ جو بھی تمھیں پوچھتا ہوا آئے اس کا نام ضرور پوچھ لیں اور پیغام ہو تو نوٹ کر لیں۔"

" ان سے میں کیا کہوں گی۔ کہ کہاں جا رہی ہوں؟"

" کمال ہے بھئی! کچھ بھی کہہ دو۔ کام زیادہ ہے۔ یا لوکیشن پر جانا ہے۔ جانا تو پڑتا ہوگا تمھیں کبھی نہ کبھی؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔" میں نہیں گئی کبھی۔ مگر خیر میں کہہ دوں گی۔"

" یہ بھی کہہ دینا کہ تمھارا ایک اہم پیغام آئے گا۔ یا کوئی اہم ملاقاتی آئے گا اس لیے نام وغیرہ نوٹ کر کے رکھیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ واپس آنے کے بعد تم تصدیق کر سکو گی۔" میں نے کہا۔

" یعنی کوئی مجھے قتل کرنے کی نیت سے آیا ہوگا تو اس سے پوچھ سکوں گی کہ کیا آپ تشریف لائے تھے؟"

" یہ مذاق کی بات نہیں ہے۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔" جو غلط نیت سے آئے گا وہ اپنا اصل نام بتا کے نہیں جائے گا۔ کسی بھی اجنبی نام سے تم کو اندازہ ہو جائے گا کہ اس کے آنے کا کیا مقصد ہوگا لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ وہ تمھارے کسی شناسا کا نام بتا جائے۔ جو آئے ہوں گے وہ تو کہہ دیں گے کہ ہاں ہم آئے تھے لیکن جو کوئی نہیں آیا ہوگا وہ انکار کر دے گا۔ اور اس کا مطلب ہوگا کہ دال میں کالا ہے۔"

" تم تو شرلاک ہومز بھی ہو۔" وہ ہنسی۔" جاؤ میری فکر مت کرو۔ یہاں کوئی نہیں آئے گا۔"

" مس للی! کم سے کم آج کی رات۔ پلیز!"

" او کے۔ یہ سب مجھے بہت افسانوی اور فلمی سسپنس لگتا ہے مگر میں تمھاری بات مان لیتی ہوں۔" وہ بولی۔" آج رات میں ایک فرینڈ کے گھر گزار لوں گی۔ صبح وہیں سے اسٹوڈیو چلی جاؤں گی۔ تم اُدھر ہی آ جانا۔"

" کوئی فون نمبر۔ یہاں یا وہاں رابطے کے لیے؟"

" کیوں نہیں۔ میں کارڈ دینا بھول گئی۔" اس نے واپس جا کے ایک دراز میں سے کارڈ نکالا اور مجھے تھما دیا۔ اس پر "للی فیروز" کے نام کے ساتھ اسٹوڈیو کا اور اس کے فلیٹ کا فون نمبر ہی نہیں پتا بھی تھا۔

نیچے اُتر جانے کے بعد ہم نے بلڈنگ اور گلی کے نقشے کو ذہن نشین کیا اور سڑک پر آ جانے کے بعد ایک ٹیکسی کو روکا۔ جب ٹیکسی روانہ ہوگئی تو یکلخت صبح سے اب تک کے واقعات میرے ذہن سے محو ہو گئے۔ اس وقت کا تصور اُبھر آیا جب حُسنِ دل آرا کی وہی دھج ہوگی۔ اور اُن ہاتھوں سے مَس ہوں گے یہ ترسے ہوئے ہاتھ۔ کیا ایسا ہوگا؟ کیا سچ مچ ایسا ہو جائے گا کہ بالآخر یہ مسافتِ ہجراں تمام ہوگی اور پھر سفرِ حیات میں فرقت کا صحرا کبھی نہ آئے گا۔ صرف اس کی رفاقت سے مہکتا راستہ ہوگا اور محبت کے روشن رنگوں والے پھولوں کی راہ میں

دردِ جدائی کے پُرآزار کانٹے نہ ہوں گے۔

غالب نے اس کے خیال کا عکس یوں منتشر کر دیا جیسے شفاف جھیل میں پڑنے والا پتھر ساکت سطحِ آب کے ہر عکس کو مٹا دیتا ہے۔" کیا تو نے غور کیا کہ للی نے اس ملاقات کو تعلق کی بنیاد کیوں بنا لیا؟" غالب نے کہا۔

میں چونک پڑا۔" میں نے تو پوچھا تھا اس سے۔"

" ہاں۔ مگر اس نے کہا تھا کہ مجھے اس کی وجہ نہیں معلوم۔"

میں نے غالب کی طرف دیکھ کے سر ہلایا۔" اور کیا کہتی وہ؟"

" اس نے جھوٹ بولا تھا۔" غالب نے کہا۔

" جھوٹ بولا تھا؟ کیا مطلب؟۔۔۔"

" مطلب یہ ہے کہ اسے وجہ معلوم تھی۔ وہ جانتی تھی کہ جو کچھ وہ کر رہی ہے کیوں کر رہی ہے۔" غالب نے کہا۔" اور وہ وجہ نہ ہوتی تو برادر، ہم اس وقت ہوتے حوالات میں۔ وہ موقع ملتے ہی ہمیں پولیس کے حوالے کر دیتی کہ معلوم نہیں یہ کون بدمعاش ہیں۔ زبردستی میری کار میں بیٹھ گئے تھے۔ ان کی بدمعاشوں سے مار پیٹ ہوئی جس میں ایک قتل بھی کر دیا انھوں نے اور میری گاڑی کا بھی بیڑا غرق کر دیا۔ اسے یہ موقع ملا بھی تھا جب ایک پولیس سارجنٹ آیا تھا اور وہ اس کے ساتھ اکیلی پیچھے اپنی گاڑی تک گئی تھی۔ وہاں میں خالی ہاتھ بیٹھا ہوا تھا۔ وہ پولیس کو صرف اتنا کہہ سکتی تھی کہ آفیسر دیکھو اس آدمی کا چہرہ نقلی ہے۔ باقی سب وہ خود معلوم کر لیتے۔ مگر اس نے جھوٹ بولا، خود کو خطرے میں ڈالا۔ اپنا نقصان برداشت کیا اور ہمیں گھر لے گئی۔ آخر کیوں؟ خود اس کا دعویٰ ہے کہ آج تک کوئی مرد اس سے یہ رعایت حاصل نہیں کر سکا۔ اور میں اس کے دعوے کو غلط نہیں کہتا۔ بلاشبہ وہ ایک مضبوط کردار کی مالک ہے۔"

میں حیرت سے غالب کی صورت کو دیکھتا رہا۔" یہ سب مجھے بھی عجیب ضرور لگا تھا۔ مگر اس کی وجہ۔۔۔ کوئی جذباتی وجہ ہی ہو سکتی ہے۔"

" صحیح فرمایا آپ نے۔ اور یہ جذباتی وجہ کیا تھی، یہ للی نے جانتے بوجھتے چھپا لیا۔ غالباً۔ میں اس امکان کو بالکل نظرانداز نہیں کروں گا کہ شاید ابھی وہ خود اس حقیقت سے بے خبر ہو۔ بعض اوقات لاشعور کی راہ میں اُلجھنوں کا سایہ رہتا ہے۔ چنانچہ شعور میں وہ بات واضح نہیں ہوتی۔"

" یہ تو میں سمجھ گیا۔ لیکن ایسی کون سی وجہ آپ نے معلوم کر لی وہاں بیٹھے بیٹھے۔" میں نے کہا۔" آپ کب سے ایسے صاحبِ کشف و کرامات ہو گئے؟"

" وہ تو خیر ہم گناہ گار ہو ہی نہیں سکتے۔ مگر وجہ سامنے بھی، عقل کا اندھا نہ سمجھے تو اور بات ہے۔ آپ کی آنکھوں نے بھی اسے نہیں دیکھا تو میرا کیا قصور ہے۔" غالب نے کہا۔" اس کے بیڈ روم میں سرہانے کی طرف ایک تصویر رکھی ہوئی تھی۔ ڈبل فریم والا اسٹینڈ

تھا اور اس میں ایک تصویر تو خود للی کی تھی۔ دوسری تصویر میں آپ مسکرا رہے تھے۔"

"سبحان اللہ! یہ تو کمال ہو گیا۔" میں نے کہا۔ "یعنی میں للی کا مرحوم شوہر بھی ہوں۔ یہ مجھے بالکل معلوم نہیں تھا۔ ایسے ہی کسی دن اچانک پتا چلے گا کہ میں آپ کا دادا بھی ہوں یا آپ میرے سسر بھی رہے ہیں۔ کسی پچھلے جنم میں۔"

"بکواس کی کیا ضرورت ہے۔ صاف مان لے کہ تو نے وہ تصویر ہی نہیں دیکھی جو میں نے دیکھی۔ جہاں تو بیٹھا ہوا تھا وہاں سے شاید نظر بھی نہیں آئی ہو گی۔ بہرحال، میں نے اس پر غور کیا تو یہ وجہ میری سمجھ میں آ گئی۔"

"مرزا جی! آپ ہوش کے ناخن لیں۔ میرا یہ چہرہ اصل نہیں ہے۔ یہ براؤن بال اور براؤن داڑھی۔۔۔"

"اس تصویر میں ایک ایسا ہی شخص تھا۔" غالب نے میری بات کاٹ دی۔ "اور میں خاصے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ للی کو اس کا احساس تھا۔ ممکن ہے یہ احساس دیر سے ہوا ہو۔ مگر تھا کچھ ایسا ہی معاملہ کہ تیری صورت میں اسے ایک آشنا چہرہ ملا جس سے اس کی زندگی کی یادیں وابستہ رہی ہیں۔ اور تو نے دیکھا کہ وہ کتنی جذباتی عورت ہے۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ "یار غالب! اگر ایسا ہی ہوا تو پھر اسے میرا یہی چہرہ عزیز ہونا چاہیے۔ جب یہ چہرہ اپنے اصلی روپ میں سامنے آئے گا تو اس کے جذبات بدل جائیں گے۔"

"میں شرط لگانے کو تیار ہوں کہ وہ تیرا چہرہ نہیں بدلے گی۔" غالب نے کہا۔ "وہ میرا میک اپ ضرور بدل دے گی لیکن تیرے اس میک اپ کو باقی رکھے گی البتہ کچھ ٹھیک کر دے گی۔ اور جان بوجھ کے یا بلا ارادہ نقل کو مطابق اصل کر کے بنائے گی۔"

"اگر تیرا دعویٰ سچا ہوا۔ تو سچائی خود سامنے آ جائے گی۔" میں نے متفکر ہو کے کہا۔ "مگر یہ بہت پُرفریب سچائی ہو گی۔ میں اس خود فریبی کے کھیل میں شریک ہونا پسند نہیں کروں گا۔"

"اور شریک ہونا پڑا تو؟" غالب مسکرایا۔

"تو کیا؟۔۔۔ کیا رول ہونا چاہیے میرا۔ میری جگہ تو ہوتا تو کیا کرتا؟" میں نے گڑبڑا کے کہا۔

"معلوم نہیں کیا کرتا۔" غالب نے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ "تو نے اچھا کیا جو اس پر اعتماد کرتے ہوئے اپنا اصل نام نہیں بتایا۔ وہ پہلے ہی اس پوزیشن میں ہے کہ تمہیں۔۔۔ یعنی تجھے بلیک میل کر سکے۔"

"وہ ایسی عورت نہیں ہے۔۔۔"

"وہ ایک عورت ہے۔ جوان اور خوبصورت عورت جس نے خود کو آج تک وفاداری کے زنداں میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اس نے جذبات پر پہرے بٹھا دیے تھے اور شاید اپنے جسم کی آواز کو دبانے میں کامیاب بھی تھی۔ مگر کیا ایسا ممکن ہے کہ کوئی بھوک سے نجات پالے؟ بھوک کے احساس کو وقتی طور پر مار دیتے ہیں لوگ۔ وہ کرتے ہیں اور تسکین کے خیال سے گریزاں رہتے ہیں۔ مگر کیا بھوک ہمیشہ کے لیے ختم ہو سکتی ہے جو آدمی بنیادی طور پر حیوان ہے اور ہر حیوانی جبلت رکھتا ہے۔"

"للی نے آج تک اپنی زندگی گزاری ہے۔۔۔"

"ہاں۔ مگر وہ ابھی زندہ ہے۔ اور مرنا بھی نہیں چاہتی۔ مجھے نہیں معلوم کہ اپنے آپ سے لڑتے ہوئے اسے کتنا وقت گزرا ہے۔ لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ یہ جنگ تاعمر جاری نہیں رہ سکتی۔ وہ ہار جائے گی اور ہار سے پہلے فرسٹریشن کا شکار ہو گی۔ ڈیپریشن میں مبتلا ہو گی۔ ہسٹیریا کے دورے اور پاگل پن۔ یہ سب کچھ ہوتا ہے اور ہو سکتا ہے۔ للی کے ساتھ بھی۔"

میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ "یار کیوں مجھے پاگل کرتا ہے۔ اب یہ تو ناممکن ہے کہ میں اس کے شوہر کی جگہ لے لوں۔"

"جگہ تو خالی ہے۔ اب یہ مرضی ہے تیری لے نہ لے۔" غالب ہنسنے لگا۔

"دماغ خراب ہے تیرا۔ اس خالی جگہ کو پُر کرنا ہے تو اپنی صورت بنا لے فیروز جیسی۔ وہ اگر اتنی ہی بے عقل ہے کہ فیروز کی جگہ اس جیسی صورت والے کسی بھی شخص کو قبول کر سکتی ہے تو پھر اب تک کیوں فارغ بیٹھی تھی۔ خود میک اپ آرٹسٹ ہے۔ بنا لیتی دوسرا فیروز۔ حد ہے حماقت کی۔ ایسے بھی کوئی دھوکا دے سکتا ہے خود کو؟"

غالب صرف مسکراتا رہا۔ "کہتے ہیں جس کو عشق، خلل ہے دماغ کا۔"

"یہ صرف دماغ کا خلل ہے۔ اوّل تو میرا خیال ہے کہ یہ تیرے دماغ کا خلل ہے۔ لیکن تیری بات کو درست مان لیا جائے تو میرے لیے اس کے سوا چارہ نہیں رہتا کہ میں لوٹ کر ہی نہ جاؤں۔ یا ایک بار جاؤں اور اپنا قرض ادا کر دوں۔ گاڑی اس کے سپرد کر کے کہوں کہ جھگوان تمہیں سکھی رکھے اب اگلے جنم میں ملیں گے۔"

"جنم کی تھیوری یعنی آواگون کے فلسفے میں یہ ضمانت نہیں دی گئی کہ جو اس جنم میں جیسا ہے ویسا ہی اگلے جنم میں بھی ہو گا جانم۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اگلے جنم میں وہ ہو ایک لومڑی اور آپ ہوں افریقہ کے گیدڑ۔ یا لال بیگ تو ہر صورت میں ملاپ مشکل ہو گا۔ ویسے یار آج رات وہ کسی فرینڈ کے پاس رہے گی۔ فرینڈ سے تو کچھ پتا نہیں چلتا کہ وہ مذکر ہے یا مونث؟"

"بھاڑ میں گیا فرینڈ کا صیغہ۔" میں نے جھنا کے کہا۔ "کوئی اور بات کر۔"

غالب اس صورت حال سے بہت لطف اندوز ہو رہا تھا لیکن میں سخت پریشانی میں مبتلا ہو گیا تھا۔ عقل کی کسوٹی پہ غالب کی بات میں ایک فیصد کھوٹ دکھائی نہ دیتا تھا۔ اس نے جو تجزیہ کیا تھا وہ منطقی تھے اور اس کا تجزیہ سو فیصد درست معلوم ہوتا تھا۔

ٹیکسی رک گئی تو میرے خیالات کی پرواز بھی رک گئی۔ میں نے للی کے خیال کو ذہن سے جھٹک دیا اور حاجی علی کی درگاہ کو جانے والے عقیدت مندوں کے ہجوم میں شامل ہو گیا۔ یہ بڑی عجیب فضا تھی۔ ہر مذہب اور عقیدے کے لوگ بلاتفریق ایک ہی سمت میں رواں تھے۔ ان میں ہم جیسے نقلی چہرے رکھنے والے بھی تھے، جن کے نام بھی اصلی نہیں تھے۔ اور اگر ایمانداری سے دیکھا جاتا تو ہمارے جذبات بھی وہ نہیں تھے جو دوسرے ہزاروں لوگوں کے تھے۔ ہم حاجی علی کی درگاہ پر نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کے لیے حاضر نہیں ہوئے تھے۔ شاید اس بھیڑ میں ہم جیسے دو چار اور بھی ایسے ہوں گے۔ چور اور گرہ کٹ جن کے ظاہر و باطن میں اتنا ہی فرق ہو گا۔ مجھے اس خیال پر شرم آئی۔

درگاہ سمندر کے بیچ میں واقع تھی اور یہ بڑا دلکش نظارہ تھا۔ ہم نے درگاہ کی جانب بڑھنے والوں سے الگ ہو کے دیکھا تو میرا دل مایوسی کا شکار ہونے لگا۔ اس ہجوم میں اور اتنے وسیع علاقے میں ہم کو نہ جانے کیسے تلاش کروں گا۔ شاید یہی غالب سوچ رہا تھا کہ وہ سب کیسے ملیں گے۔ جن کو یہاں پہنچنا تھا۔ نازو اور محسن کے علاوہ لاست محمد کی ٹیم نے بھی جمعرات کی شام کو حاجی علی کی درگاہ پر ملنے کی بات کی تھی۔

بائیں ہاتھ پر مجھے ایک بہت شاندار مسجد نظر آ رہی تھی۔ اس کے سامنے وہ بازار تھا جس کی ساری رونق زائرین کے دم سے تھی۔ ان میں سے ایک دکان پھلوں کے جوس کی تھی جس کے سامنے ہم کھڑے ہوئے تھے۔

"کیا خیال ہے؟ اس سے پوچھیں؟" غالب نے کہا۔

"یہ کیا بتائے گا؟" میں نے کہا۔

"یہ حاجی صاحب پاکستانی ہے۔ اور سوات کا رہنے والا ہے۔" غالب نے کہا۔ "ابھی میں نے دو افراد کو اس سے باتیں کرتے سنا ہے۔ وہ دونوں ابھی پاکستان سے آئے ہوئے تھے۔ حاجی بڑے تپاک سے ملا تھا۔"

"چل مل لیتے ہیں ہم بھی۔" میں نے کہا۔ "آدمی نیک لگتا ہے، ہو سکتا ہے کچھ مدد کر دے۔ کیا خیال ہے تیرا؟ ہم اسے بتا دیں کہ ہم کس کی تلاش میں ہیں۔ ہمارا نام کیا ہے اور ان کا کیا ہے؟"

"پہلے اسے دیکھ لیتے ہیں کہ آدمی بھروسے کے قابل ہے یا نہیں۔ پھر نام بھی بتا دیں گے۔ اور نام کے سلسلے میں آپ یہ بار بار کیوں بھول جاتے ہیں کہ میں فقیر چند نہیں ہوں۔ ہر جگہ امیر چند ولد مٹھائی لال۔۔۔"

میں نے سر پر ہاتھ مارا! "یار یہ تو بڑی بھول ہو گئی تھی مجھ سے۔ شکر ہے کہ ابھی تک کسی نے ثبوت نہیں مانگا۔ دراصل محسن کے ساتھ رہ کے یہ نام ایسا زبان پر چڑھا کہ اب بے خیالی میں منہ سے نکل جاتا ہے سیٹھ جارلی۔"

"ایسے تو کسی جگہ پھنس جائیں گے۔ پرانے نام کی جگہ نئے نام ہی استعمال کرنے چاہئیں سب کو۔ اس کے بغیر عادت نہیں پڑے گی۔"

"مجھے تنا مت ڈانٹو۔ تم خود بھی نازو کو لزا نہیں کہتے۔" میں نے کہا۔

"جب میں بحری جہاز پر اس کے ساتھ تھا تو کسی کے سامنے کیا تنہائی میں بھی ایک دوسرے کا اصل نام لینے کی غلطی نہیں کی۔ نہ اس نے نہ میں نے۔"

"یہ ایک پوائنٹ آف آرڈر ہے۔ تنہائی کب کہاں اور کیسے میسر آئی تھی اور اس تنہائی کا مصرف۔۔۔"

"تنہائی میں ہم عشق کرتے تھے اور وہ سب کرتے تھے جو عشق میں ہوتا ہے۔ یا نہیں ہوتا۔" غالب نے جھنا کے کہا۔ "تمہیں کیا؟"

"ہاں بھائی، ہمیں کیا۔" میں نے سرد آہ بھر کے کہا۔ "تم ہو تو لا کمر بستہ ہو ہماری ناک کٹوانے پر۔۔۔"

غالب نے مجھے حاجی صاحب کی دکان کی طرف کھینچ لیا۔ ان کی دکان کے مشروبات زائرین میں خاصے مقبول نظر آتے تھے۔ اپنے وطن میں بھی ہم نے انار، سیب، اور نج یا گنے کا جوس اکثر پیا تھا مگر حاجی صاحب جوس ایکسپرٹ تھے اور مختلف اقسام کے جوس کی کاک ٹیل بڑے کمال سے بناتے تھے۔ ایک دو یا تین پھلوں کا جوس ملا کے یا ان کے تناسب میں کمی بیشی کر کے وہ ایک نیا ذائقہ پیدا کر لیتے تھے۔

ہم جیسے ناتجربہ کار کے لیے یہ طے کرنا مشکل ہو گیا کہ ترجیح دیں تو کس کاک ٹیل کو۔ بالآخر ہم نے فیصلہ آرڈر لینے والے چھوکرے پر چھوڑا۔

"فیصلہ تمہارے حسن انتخاب پر چھوڑا نور چشم۔"

"نور چشم کوئی ڈرنک نہیں ہے۔" چھوکرے نے ٹرے بجاتے ہوئے کہا۔ "ابھی جلدی بولو۔ اسپیشل لاوے۔"

"واہ واہ! ایک دم اسپیشل لاؤ۔" میں نے کہا۔

چھوکرا ہماری فارسی آمیز اردو نہیں سمجھا تھا مگر اس جملے پر حاجی صاحب نے پلٹ کر دیکھا اور ہمارے قریب آ گئے۔

"ماشاء اللہ سے اتنی اچھی اردو سنا مگر لکھنؤ کے تو نہیں لگتے ہو آپ۔" انہوں نے ہمیں بغور ملاحظہ فرما کے کہا۔

"آپ تو مجھے پاکستانی لگتے ہیں حاجی صاحب۔" میں نے کہا۔

حاجی صاحب کا چہرہ کھل اٹھا۔ "الحمدللہ ہم پاکستانی ہیں۔"

"لہجہ بتاتا ہے کہ آپ سوات یا گلگت سے تعلق رکھتے ہیں۔" غالب نے کہا۔

حاجی صاحب ہماری چالاکی کو کیسے سمجھ سکتے تھے کہ یہ تمام معلومات تو ہمیں ابھی ابھی حاصل ہوئی ہیں۔

"سچ بولے آپ سبحان اللہ سے۔" وہ ہمارے پاس بیٹھ گئے۔

"لیکن ابھی بس اِدھر کا ہو گئے۔ جو ہمارا خدا کو منظور۔"

"آپ مستقلاً یہاں آ گئے ہیں! کیوں حاجی صاحب! کیا وطن سے اچھی ہے یہ جگہ۔ پاکستان اتنی خراب جگہ ہے؟"

"استغفر اللہ سے ایسا مت بولو۔" انھوں نے کانوں کو ہاتھ لگا کے کہا۔ "پاکستان پر ہمارا جان قربان۔ سو بار ہزار بار قربان۔ اپنا وطن کا گتا بھی عزیز ہم کو۔ لیکن ہم اِدھر سے کیسے جاوے۔ اتنا سال ہو گیا۔ بچہ لوگ ادھر بڑا ہوا۔ اپنا سوات جاتا ہے کبھی تو دیکھتا ہے اپنا لوگ کوئی نہیں۔ سب باہر چلا گیا یا مر گیا۔ نیا لوگ ہم کو نہیں پہچانتے۔ بڑا افسوس ہوتا ہے ان کا حالت دیکھ کر۔ ابھی تک غریب ہے اور جاہل ہے چھوٹا چھوٹا بات پر قتل کرتا ہے۔ دشمنی کرتا ہے۔ باپ کے بعد بیٹا۔ پھر اس کا بیٹا۔ ہمارا دل بہت دکھی ہوتا۔ آپ پاکستان سے آئے ہو؟"

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ "عارضی ویزا پر آئے تھے پندرہ دن کے لیے۔ دہلی گئے اور اجمیر شریف۔"

"ماشاء اللہ سے اجمیر شریف گیا آپ؟ خواجہ صاحبؒ کی درگاہ پر حاضری دیا، بہت خوش نصیب ہے آپ،" حاجی صاحب نے کہا۔ "ہم بھی کئی بار گیا۔ یہ سب خواجہ صاحبؒ کا برکت ہے جو آپ دیکھتے ہو اور الحمد اللہ سے خدا کا خاص مہربانی ہے ہم پر۔"

"کاروبار تو خوب چل رہا ہے آپ کا۔"

"روز دو ہزار کا آمدنی ہو جاتا ہے ماشاء اللہ سے۔" حاجی صاحب نے خوش ہو کے بتایا۔

"روز دو ہزار کی آمدنی تو واقعی بہت اچھی ہے۔" میں نے کہا۔

"اللہ دیتا ہے۔ ہم اللہ کے واسطے خرچ کرتا ہے۔ آپ ادھر مسجد دیکھتے ہو،" حاجی صاحب نے کہا۔ "وہ ہم بنایا۔ اس کا سارا خرچہ ہم کرتا الحمد اللہ سے۔ مسافر لوگ کے واسطے کھلا رہتا ہے چوبیس گھنٹے۔ سب ہمارا مہمان ہوتا۔ ہندو مسلمان، سکھ عیسائی جو بھی آوے۔ اللہ کا گھر ہے، ہمارا نہیں۔ ہم تو خدمت گار ہے اللہ کا اور سب کا میزبان ہے۔"

میں نے حیرانی سے اس اللہ کے خدمت گزار انسانیت کے نام لیوا ایمانی شرافت کے نمونے کو دیکھا جس کو اپنے پاکستانی ہونے پر فخر تھا اور جو صاحب ثروت ہونے کے باوجود عجز و انکسار کا پیکر تھا۔

"آپ کا مہمان خانہ تو ہر وقت بھرا رہتا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"الحمد اللہ سے۔" وہ اوپر انگلی اٹھا کے بولا۔ "ہم تو خادم ہے۔ مہمان خانہ اللہ کا ہے۔"

"میرا مطلب تھا کہ یہاں جب سونے اور کھانے کا انتظام ہے تو وہ سب بھی آ جاتے ہوں گے جو مسافر نہیں ہیں۔"

اس نے مسکرا کے نفی میں سر ہلایا۔ "اللہ عقل دیا ہم کو۔ ہم مفت خوری بے ایمان کو نہیں گھسنے دیتا۔ سب دیکھتا کہ کون مسافر ہے۔ پاسپورٹ دیکھتا اگر کوئی پاکستان سے آتا۔ آپ بھی ادھر ٹھہرو۔"

"نہیں حاجی صاحب۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "ہم بمبئی میں ہیں اور آپ کی دعا سے ایک دوست کے گھر ٹھہرے ہیں۔"

"کدھر سے آیا آپ صاحبان؟"

"میں کبیر خان پشاور سے آیا ہوں۔ یہ میرا دوست ہے سکندر، یہ راولپنڈی سے آیا ہے۔" میں نے غالب کی طرف اشارہ کیا۔ "ہمارا ایک تیسرا ساتھی گل خان تھا۔ وہ بھی پشاور سے ساتھ چلا تھا مگر بمبئی میں بچھڑ گیا۔ آج ہم سب کو یہاں حاضر ہونا تھا۔"

"گل خان۔ ماشاء اللہ سے نوجوان ہے؟ بہت اچھا خوبصورت لڑکا؟" حاجی صاحب نے سوچتے ہوئے کہا۔

گلاس میرے ہاتھ میں کانپنے لگا اور جو گھونٹ میں حلق سے اتار رہا تھا وہ سینے میں اٹک گیا۔ "جی... بالکل...." میں نے بڑی مشکل سے کہا۔ "کیا وہ آیا تھا یہاں؟"

"ابھی یہ تو پتا نہیں وہ کدھر ملے گا۔ اتنا بھیڑ بھاڑ ہے مگر وہ پھر آئے گا تو ہم بولے گا اس کو۔" حاجی صاحب نے کہا۔

میرا دل پھر مایوسی میں ڈوب گیا۔ "اس نے اپنا کوئی پتا نہیں دیا... وہ اکیلا تھا۔"

"یہی ہم سوچتا۔ ایک اور جوان آدمی تھا اس کا ساتھ... وہ اپنا نام بولا... کیا بولا؟" انھوں نے اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھ کے سوچا۔ "ہاں۔ خان شیروانی۔ نہیں۔ شیروانی خاں۔"

"بالکل ٹھیک حاجی صاحب۔ وہ بھی ہمارے ساتھ ہی لاہور سے آیا تھا۔" میں نے کہا۔ "آپ کے پاس کیسے آ گئے تھے وہ؟"

"جیسے آپ آیا۔ ادھر پاکستان سے جو آتا وہ حاجی کے پاس ضرور آتا الحمد اللہ سے۔" حاجی صاحب نے کہا۔ "کوئی اس کو بولا کر حاجی کا دکان پر جاؤ۔ وہ تم کو تلاش کرتا تھا۔"

"ان کو چاہیے تھا کہ پیغام چھوڑ جاتے۔ کہ وہ کہاں ہوں گے، وہ دوبارہ یہاں آ سکتے تھے۔" میں نے کہا۔

"ہم ان کو بولا مغرب کا بعد آ جاؤ۔ رات کو آ جاؤ عشا کا نماز کے بعد۔ ہم تمھارا دوست کو بتا دے گا انشاء اللہ سے۔"

"آپ نے کہا تھا ان سے؟" غالب خوش ہو کے بولا۔ "اس کا مطلب تو یہ ہے کہ وہ ہجوم میں نہ ملے تو یہاں ضرور مل جائیں گے۔ آپ انھیں اِدھر ہی روک لیں۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔"

"مہربانی کیسا بھائی۔ ہم خادم ہے۔" وہ سینے پر ہاتھ رکھ کے بولا۔

"حاجی صاحب! کیا انھوں نے ہمارا نام بتایا تھا آپ کو؟" میں نے کہا۔

"تمھارا نام بولا۔ کبیر خان۔ اس کا نام نہیں بولا۔" حاجی صاحب نے غالب کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میرے منہ سے غلط نام نہیں نکلا اور محسن نے میرا وہی نام لیا جو غیر معروف تھا۔ ایک بار پھر میں نے اسے اپنے اور محسن کے خیالات کی ہم آہنگی اور سوچ کی یکسانیت کا کمال سمجھا۔ ایسے لاتعداد مواقع ہمارے حساب میں تھے جب اس نے اور میں نے الگ الگ ہونے کے باوجود ایک ہی لائحہ عمل اختیار کیا۔ ایک سے نتائج اخذ کیے اور ایک نے وہی کیا جو دوسرا کرتا۔ یہ پیدائش کے دن سے اب تک کی دوستی اور ذہنی رفاقت کا کرشمہ تھا۔ من تو شدم تو من شدی۔

پہلے میرا خیال تھا کہ میں حاجی صاحب کو للّی کے گھر کا فون نمبر دے دوں گا۔ لیکن اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ ویسے بھی للّی کو ہم نے رات کہیں اور گزارنے کا مشورہ دیا تھا۔ محسن اگر فون کرتا تو اسے کوئی جواب ہی نہ ملتا۔ تاہم اس فون نمبر کی مدد سے وہ ہمیں بمبئی میں تلاش کر سکتا تھا۔ بلا شبہ خدا کی حاجی صاحب پر خاص مہربانی تھی کہ اسے ہر نیکی کرنے کی توفیق دی۔ مسجد تو کوئی بھی پیسے والا کھڑی کر دیتا ہے مگر وہ اللہ کا خدمت گزار اور اس کی مخلوق کا خادم نہیں بنتا۔ حاجی مسافروں کی خدمت کر رہا تھا اور بلا امتیاز کر رہا تھا۔ وہ بچھڑے ہوئے لوگوں کو ملا رہا تھا اور دیارِ غیر میں ہم جیسے غریب الوطن لوگوں کو کاک ٹیل پلا کے خوش کر رہا تھا اور شرافت سکھا رہا تھا اور انسانیت کا درس دے رہا تھا۔ اتنی ساری نیکیاں اور اتنے بہت سے لوگوں کی دعائیں سمیٹنے والے کے بارے میں کون شک کر سکتا تھا کہ وہ جنتی نہیں ہے۔

حسب توقع حاجی صاحب نے ہم سے اسپیشل جوس کے پیسے نہیں لیے۔ اس کا ذائقہ مجھے آج بھی یاد ہے۔ میں نے حاجی صاحب سے پوچھ لیا ہوتا کہ انھوں نے اس میں کتنے پھلوں کا جوس کس تناسب سے شامل کیا تھا تو شاید کبھی زندگی میں پھر میں خود وہ کاک ٹیل تیار کرتا اور اس جنتی مشروب کے ذائقے سے پھر لطف اندوز ہوتا مگر ایسا نہ ہوا اور اب فقط اس کی یاد باقی ہے۔

باہر آتے ہی میں نے غالب سے ہاتھ ملایا۔ "اللہ بہت بڑا مسبب الاسباب ہے۔"

"خدا کے بعد تجھے میرا شکر گزار بھی ہونا چاہیے کہ جب تو ہونقوں کی طرح کھڑا ہوا اس مجمع کو گھور رہا تھا تو میں نے حاجی صاحب کی باتیں سن لی تھیں۔" غالب نے کہا۔

"یار یہ گل خان والی بات سمجھ میں نہیں آئی۔"

"کیوں۔ اتنی ناقص اور ناکارہ ہو گئی ہے تیری سمجھ۔"

میں نے کہا۔ "گل زخمی تھی۔ راتوں رات وہ ٹھیک نہیں ہو سکتی۔ اتنی صحت مند نہیں ہو سکتی کہ یہاں محسن کے ساتھ آ جاتی۔"

غالب نے کہا۔ "وہ نازو ہو گی۔"

میں اچھل پڑا اور بے اختیار میں نے غالب کے شانے پر ہاتھ مارا۔ "واہ سبحان اللہ سے کمال کر دیا۔ ماشاء اللہ سے کیا صحیح تیر چلایا ہے اندھیرے میں عقل کے اندھے نے۔ اور وہ نشانے پر جا لگا۔"

"میری ذہانت کی داد نہ دینا آپ کی کم ظرفی ہے چیف کے ٹو۔" غالب نے کہا۔

"لیکن نازو... مردانہ لباس میں...؟"

"سودا کا شعر ترمیم کے ساتھ یوں ہوگا کہ۔ غالب جو مرا حال ہے ایسا تو نہیں وہ۔ کیا جانیے میں نے اسے کس حال میں دیکھا۔ تو برادر میں اس گل پیرہن کو ہر انداز میں دیکھ چکا ہوں۔"

"اس کے غلط معنی لیے جائیں تو اکرام شیخ تجھے شہیدِ الفت کر سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"جو غلط معنی نکالے میں اسے پہلے جہنم رسید نہ کرا دوں۔" غالب نے بگڑ کے کہا۔ "نازو کے ہاتھوں۔ وہ مردانہ لباس جہاز پر بھی پہنتی رہی ہے۔ میرے ساتھ اس نے بھی جہاز کے اندر گھوم پھر کے سب معلوم کیا تھا کہ کون سی چیز کہاں ہے۔ اس نے ایک وردی حاصل کر لی تھی۔ اس کے باوجود ممنوعہ علاقوں میں جانا خطرناک تو تھا۔ وہ محافظوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے میں کامیاب رہی۔ یہ خوش قسمتی تھی اس کی۔"

"اسے اپنی قوتِ بازو پر بھی بھروسا ہوگا۔ کوئی اسے پکڑ لیتا تو گویا موت کو پکڑ لیتا۔" میں نے کہا۔

"صرف تین بار اس نے جاسوسی کی۔ پھر میں نے اسے منع کر دیا۔"

"اور وہ مان گئی؟"

"ہاں... قسم جو دے دی تھی میں نے۔ اپنی۔" غالب نے کچھ شرما کے کہا۔

میں ہنس پڑا۔ "یہ ٹرمپ کارڈ ہوتا ہے۔"

"مگر اس نے کہا... کہ آئندہ قسم مت دینا اپنی۔ ورنہ... قسم تو خیر نہیں توڑوں گی لیکن دانت توڑ دوں گی تمھارے۔" غالب نے خفت سے کہا۔

"استغفر اللہ سے۔ اب بھی وقت ہے مرزا۔ باز آ جا اس کے عشق سے ورنہ ہنی مون ختم ہونے سے پہلے وہ تیرے جسم کے سارے قابلِ شکست حصّے توڑ پھوڑ دے گی اور تجھے اسٹریچر پر ڈال کے نمونے کے طور پر ساتھ لیے پھرے گی کہ دیکھو یہ ہے وہ ناقص العقل جس نے میرا شوہر بننا قبول کیا تھا۔"

"ابھی میں عاشق کا رول کر رہا ہوں۔ جب شوہر کا رول شروع ہوگا تو دیکھنا، پاؤں کی جوتی بنا کے رکھوں گا اور ابتدا کروں گا پہلے دن میں ایک بلّی کے مرڈر سے۔" غالب نے کہا۔

"تیرے خیالات بہت نیک ہیں۔ میں نازو تک پہنچا دوں گا۔"

ہم اب مزار تک جانے والی سیڑھیوں کے قریب کھڑے ہوئے تھے اور آتے جاتے لوگوں کے چہروں کو دیکھتے جا رہے تھے۔ سورج مغرب کے سمندر میں ڈوب رہا تھا اور شام کا گہرا سایہ

درگاہ کے اندر اندھیرا بن کے پھیل چکا تھا۔ سیکڑوں چراغوں کی روشنی ہزاروں امیدوں کے ساتھ آنے والوں کے یقین کی علامت تھی۔ یقین کا مذہب کیا ہوگا۔ یقین تو خود ایک مذہب ہے۔ ایک مافوق الفطرت۔ سب سے عظیم۔ ازل سے ابد تک محیط ہر شے پر قادر مطلق کی ذات جو انسانوں کی تقدیر پر اختیار رکھتی ہے۔ جس کے دستِ امکان میں وہ سب کچھ ہے جو انسان مانگ سکتا ہے چنانچہ وہ مانگتا ہے۔

"کیا خیال ہے، ہم بھی اندر چلیں۔ فاتحہ کے لیے ہاتھ ہی اٹھالیں۔ اور کوئی دعا ہی مانگ لیں۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔ دعائیں تو بہت سی مانگی جا سکتی ہیں۔"

"میں صرف ایک دعا مانگوں گا۔" میں نے کہا۔

"میں بھی۔" غالب نے کہا۔

ہم نے ایک دوسرے سے سوال نہیں کیا کہ وہ ایک دعا کیا ہوگی۔ ہم جانتے تھے کہ ہماری دعا وہی ہوگی۔ زائرین کے ریلے نے ہمیں بالآخر اندر پہنچا دیا۔ اندر درگاہوں کی مخصوص فضا تھی، ہیبت تعظیم پر مجبور کر دینے والی۔ اثر انگیز۔ عود و لوبان اور اگر بتی کے معطر نیلگوں دھوئیں سے بھری ہوئی۔ حاجی علی کی قبر کے گرد مرد و زن کا اژدحام تھا۔ ہم بڑی مشکل سے مزار تک پہنچے۔ اس پر سبز، سرخ اور سفید رنگ کی گوٹا لگی چادریں تہ در تہ پڑی تھیں اور ڈھیروں گلاب تھے۔

دعا سے فارغ ہو کے میں نے ہجوم کو دیکھا۔ حیرت انگیز طور پر عقیدت مندوں کی اس بھیڑ میں مجھے ہر قسم کے لوگ نظر آئے جو اپنے حلیے سے واضح طور پر مسلمان، ہندو یا سکھ لگتے تھے۔ ان میں پارسی یا عیسائی تھے تو الگ نہیں پہچانے جا سکتے تھے۔ لباس کے اعتبار سے وہاں سب عورتوں نے اسکرٹ پہن رکھے تھے یا ساریاں باندھ رکھی تھیں۔

اچانک میرے کانوں نے آواز اذان سنی۔ اور نہ جانے کیوں اس وقت مجھ گناہگار کے دل میں خیال آیا کہ آج خدا کے حضور بھی حاضری دے دوں۔ بندہ بڑا خود غرض اور کمینہ ہے۔ خدا کو صرف اس وقت یاد کرتا ہے جب اپنی زندگی کے مسائل کے مقابل خود کو بے بس پاتا ہے۔ اپنی تدبیر کو بے اثر اور اپنی عقل کو بے خبر پاتا ہے۔

غالب نہ جانے کہاں رہ گیا تھا۔ بھیڑ میں ہم خود ہی الگ ہوگئے تھے لیکن یہ پریشانی کی بات نہیں تھی۔ وہ درگاہ کے باہر مل سکتا تھا یا حاجی کی دکان پر۔ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتا میں درگاہ سے نکل آیا۔ اپنے جوتے تلاش کر کے پہنے تو غالب کے جوتے نظر نہ آئے۔ وہاں رکنا بے مقصد محسوس ہوا اور میں مسجد کی طرف چل پڑا۔ حاجی صاحب کی بنوائی ہوئی مسجد واقعی شاندار تھی۔ اس کا موازنہ دنیا کی عظیم یا خوبصورت ترین مساجد سے کرنا غلط ہوتا —

قابل ستائش وہ جذبہ تھا جس نے اس جگہ ایسی مسجد کی تعمیر کے لیے سوات کے رہنے والے حاجی صاحب کو توفیق و استطاعت خدا نے دی اور ایک ایسے ملک میں جہاں اسلام کے نام لیوا اقلیت میں تھے اور ایک ایسے شہر میں جہاں مذہب نے معاشی جدوجہد کے مقابلے میں ثانوی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ یہ مسجد ایک کرشمۂ قدرت تھی۔

اندر نمازی صف بستہ ہو رہے تھے جب میں جلدی جلدی وضو کر کے نماز میں شامل ہوا۔ مجھے نہیں معلوم کہ یکلخت خشوع و خضوع کے وہ جذبات میرے دل میں کیسے پیدا ہوگئے جن سے میں آج تک ناآشنا تھا۔ جب نماز ختم ہوئی اور لوگ جانے لگے تو میں وہیں دوزانو بیٹھا رہا۔ یہاں تک کہ مرکزی حصے میں گنے چنے لوگ رہ گئے۔ اس وقت میں نے غالب کو دیکھا جو مجھ سے آگے چوتھی صف میں بیٹھا دعا مانگ رہا تھا۔

میں بھونچکا رہ گیا۔ کیا یہ اتفاقی تھا؟ اس ماحول کا اثر تھا یا کچھ اور۔ کہ بیک وقت میرے اور غالب کے دل میں ایک ہی خیال آیا جو پہلے کبھی نہیں آیا تھا اور ہم نے ایک ہی سمت میں رجوع کیا۔ شاید یہ حاجی علی کی کرامات کا اثر تو تھا۔ خدا کے برگزیدہ بندے دلوں کو منقلب کر سکتے ہیں۔

غالب نے میرے قریب آ کے کہا "کیسی عجیب بات ہے؟"

میں نے کہا "ہاں۔ کیسی عجیب بات ہے۔"

ہم مسجد سے نکل آئے۔ باہر رات پھیل چکی تھی۔ حاجی علی کی درگاہ پر حاضری دینے والے واپس جا رہے تھے۔ میں اور غالب چلتے گئے اور اپنی نظروں سے ہر سمت دیکھتے گئے کہ گزرنے والوں کی صورتوں میں کوئی آشنا صورت ملے۔ مایوسی رفتہ رفتہ ہم دونوں پر غالب آنے لگی تھی۔ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ ملاقات کے لیے جگہ کا تعین کرتے ہوئے ہم نے لاعلمی کے باعث کسی ایک مقام کا انتخاب نہیں کیا۔ ہم ایک سمت ہی مقرر کر لیتے۔ مثلاً وہ سمت جدھر سے چاند طلوع ہو رہا تھا۔ چودھویں شب کا پورا چاند۔ اس کا اجالا بھی مدھم تھا۔

میرے دل کی بے قراری کا عجب عالم تھا۔ مجھے احساس تھا کہ وہ میرے قریب ہے۔ اسی جگہ کہیں رابعہ کی نگاہیں بھی مجھے تلاش کر رہی ہیں مگر کہاں؟ اتنے قریب ہو کے بھی دوری رہی۔ سیکڑوں میل کی مسافت طے کر کے اور سمندروں سے اور راہِ طلب میں حائل ہونے والی سب مشکلات سے لڑ کے بالآخر میں وہاں آ پہنچا تھا جہاں اس نے مجھے طلب کیا تھا مگر ہنوز بارگاہِ حسن میں باریابی کی منزل نہیں آئی تھی۔

بار بار میں اس خیال کو دبا دیتا تھا کہ شاید وہ آئی نہ ہو۔ اس نے چاہا ہو مگر صرف چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ وہ اپنی مرضی کی مالک ہوتی تو مجھے چھوڑ کے ہی کیوں آتی۔ اسے یہاں لانے والے بظاہر ہمدرد تھے مگر درپردہ دشمنی کر رہے تھے۔ یا پھر دشمن تھے جو

[illegible]ت داری کے جذبات کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ چاند بھائی کی [illegible]نیت ابھی تک میرے لیے ایک معما تھی۔ وہ حد درجہ عیار آدمی [illegible] حد تک نفسیاتی مریض۔ ایک خطرناک کاروبار میں ملوث [illegible]شریک کار اور دوسرے حوالے سے اس کا دشمن۔ مجھے لگتا تھا [illegible]رابعہ کے عشق میں گرفتار ہے مگر رابعہ اس سے انکار کر رہی تھی۔ [illegible]میرا انتہائی طاقتور حریف ثابت ہو سکتا تھا لیکن ابھی تک اس کے مخالفانہ رویے کا کوئی ثبوت سامنے نہیں آیا تھا۔

رابعہ نے آج رات یہاں ملنے کا وعدہ کیا تھا تو اس میں بھی چاند بھائی کی مرضی کو دخل تھا۔ وہی اسے مجھ سے چھین کر لے گیا تھا۔ [illegible] کی دلیل یہ تھی کہ یہ سب میرے فائدے کے لیے ہے لیکن [illegible] جذبات کے تقاضے ایسے مفادات کے برعکس تھے۔ اور میں [illegible] یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ رابعہ کا مجھ سے دور اور چاند بھائی کی حفاظت میں رہنا کس طرح میرے یا رابعہ کے مفاد میں ہو سکتا [illegible] زیادہ سے زیادہ میں یہ کہہ سکتا تھا کہ رابعہ بہت سی پریشانیوں [illegible] رہی۔ مگر نازو نے اور گل نے بھی تو مشکل حالات کو برداشت کیا تھا۔ رابعہ ان سے زیادہ آزمائش کی صلاحیت رکھتی تھی۔

"تیرا کیا اب بھی یہی خیال ہے کہ وہ ملے گی؟" غالب نے کہا۔

"ہاں۔ جب اس نے وعدہ کیا تھا۔"

"وہ اپنا وعدہ پورا کرنے کے لیے آزاد نہیں ہے۔"

"کیا یہ بات وہ نہیں جانتی تھی؟" میں نے کہا "کیا ضرورت تھی پھر اسے وعدہ کرنے کی؟"

"اس نے چاند بھائی پر اعتبار کیا ہوگا۔ چاند بھائی نے کہا ہوگا کہ میں تم کو وہاں پہنچانے کی ذمے داری قبول کرتا ہوں۔ بعد میں اس کی نیت بدل گئی یا کسی اور وجہ سے یہ ممکن نہ رہا تو رابعہ کیا کر سکتی ہے۔ ممکن ہے شروع سے ہی اس نے جھوٹ بولا ہو۔" غالب نے کہا۔

"وہ آئے گی۔" میں نے برہم ہو کے اور چلا کے کہا "اسے آنا [illegible] گا۔ نہیں [illegible] تو۔۔۔"

"تو کیا؟" غالب نے کہا۔

"تو۔۔۔ کچھ نہیں۔" میں نے گہری سانس لے کر مایوسی سے کہا۔ "انتظار کریں گے [illegible] قیامت تک۔ تمہارے [illegible] قیامت [illegible] آئے؟"

[illegible] چلتے [illegible] کا فاصلہ طے [illegible] پہنچے تھے وہ حاجی علی کی [illegible] پہنچ [illegible] تھے۔ واپس جانے والے اب بھی وہاں [illegible] گزر رہے تھے [illegible] گرم اور بھیل پوری چائے اور ٹھنڈی بوتل [illegible] سرف [illegible] پھر رہے تھے۔ اچانک مخالف سمت میں [illegible] والوں [illegible] چہرہ ایک شخص نکلا اور مجھ سے لپٹ گیا۔ [illegible] محسن تھا۔

[illegible] اب میری ٹانگیں جواب دے گئیں۔ آنکھیں خراب [illegible] تجھے تلاش کرتے کرتے۔" محسن نے دو مکے میری کمر پہ مار کے کہا۔

"تیری آنکھیں واقعی خراب ہوگئی ہیں۔" غالب نے کہا "جان نہ پہچان۔ آخر کون ہے تو؟ ہم تو نہیں جانتے تجھے۔"

اب محسن نے پلٹ کے اسے دیکھا "ابے تو۔ شاعری کی دم، مجنوں کی اولاد، صحافی کے گھوڑے۔" وہ مجھے چھوڑ کے غالب کو چمٹ گیا اور وہ ایک دوسرے کو دبانے اور مکے مارنے لگے۔ ان کے درمیان زیادہ ناقابلِ اشاعت گالیوں کا تبادلہ بھی دیر تک جاری رہا۔ بالآخر میں نے انھیں الگ کیا۔

"بس کر دیار۔ یہ کیا دیوانگی ہے؟ لوگ دیکھ رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

"لوگوں کی۔۔۔" غالب نے کہا "ان کو کیا معلوم کہ یہاں ہم کیسے اکیلے ہوئے ہیں۔"

"میں تو سمجھا تھا کہ تو ہوگیا غرق۔" محسن نے کہا۔

"ابے یہ تو ایک چھوٹا سا سمندر تھا۔ میں بحرِ اوقیانوس کو تیر کے پار کر لیتا۔ بحرِ ظلمات میں گھوڑے دوڑا کے آتا۔ تیرا بیڑا غرق نہیں ہوا۔" غالب بولا۔

"گل اور نازو کہاں ہیں؟" میں نے کہا "گل کے بارے میں اور تیرے بارے میں تو حاجی صاحب نے بتا دیا تھا۔"

"تم لوگ مل چکے ہو ان سے؟" محسن بولا "میں نے ایسے نام بتائے تھے کہ تمھیں اندازہ کرنے میں دشواری نہ ہو۔"

"حاجی صاحب کے پاس جانے کا خیال کیسے آگیا تمھیں؟"

"مل گیا تھا ایک خدا کا نیک دل بندہ۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ حاجی صاحب کی دکان کہاں ہے۔ میں نے کہا کہ کون حاجی۔ یہاں نہ جانے کتنے حاجی ہوں گے۔ وہ کہنے لگا کہ حاجی صاحب سوات والے جن کی یہاں جوس کی مشہور دکان ہے۔ بعد میں مجھے خیال آیا کہ یہ اپنا ہم وطن حاجی صاحب ہماری کیا مدد کر سکتا ہے۔ میں نازو کے ساتھ گیا۔ وہ بڑا فرشتہ صفت آدمی ثابت ہوا۔"

"کمال ہے! یہی سوچ کے ہم بھی گئے تھے۔" غالب نے کہا۔

"یہ بتا گل کا کیا حال ہے؟" میں نے کہا۔

"وہ بالکل ٹھیک ہے۔" محسن نے کہا۔

"اور نازو۔ وہ تیرے ساتھ تھی تو اب کہاں ہے؟" غالب نے کہا۔

"وہ چلی گئی واپس۔ اسی فائیو اسٹار ہوٹل میں جہاں ہم ٹھہرے ہوئے ہیں۔" محسن بولا۔

"فائیو اسٹار ہوٹل! یہاں؟"

محسن ہنسا "ایک پرانا شکستہ عمارت کا ڈھانچا ہے۔ ہم نے [illegible] کوئی ہوگا۔ ہونے کو بھوت ہوں گے یا چڑیلوں کا ڈربہ ہوں گی لیکن پیارے بھیا بمبئی میں تو دنیا نے بھی نہیں چھوڑے انسانوں نے۔ شمشان اور قبرستان تک نہیں چھوڑے جہاں پہ بھوت وغیرہ

رہ سکیں۔ اس میں بھی ایک نہیں چار خاندان آباد تھے۔ بڑے ٹھاٹ سے رہتے ہیں اور بہت خوش ہیں کہ ساحلِ سمندر پر ایسی رہائش گاہ ملی۔"

"وہ بھی بالکل مفت۔۔۔!"

"مفت یہاں موت بھی نہیں ملتی۔ فی خاندان پانچ سو روپے ادا کرتے ہیں کسی کو۔" محسن نے کہا۔ "ایک خاندان نے ہمیں عارضی رہائش کے لیے ایک کوریڈور میں جگہ دے دی۔ اس کے پانچ سو لیے مگر وہ بہت محفوظ جگہ ہے۔ صبح میں ایک ڈاکٹر کو لے گیا تھا۔ اس نے کوئی جلد اثر دوا دی زخموں پر لگانے کے لیے۔ اور کھانے کے لیے۔ بعد میں میزبان فیملی کی کوئی رحم دل خاتون حاجی علی کی درگاہ کی مٹی گھول کر لے آئی کہ یہ پیو اور اس کو زخموں پر لگاؤ۔ اور اب میں نازو یا گل میں سے کسی کو قائل نہیں کر سکتا کہ یہ حاجی علی کی کرامت نہیں۔"

"ہمیں دو گھنٹے ہو گئے بھٹکتے ہوئے۔۔۔"

"رابعہ نہیں ملی؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "ابھی تک تو نہیں ملی۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ ملی تو کہاں ملے گی اور کب ملے گی؟ ملے گی یا نہیں۔"

"ملے گی یار۔ مایوس مت ہو۔" غالب نے کہا۔ "جب تک وہ ملے گی نہیں، ہم یہاں سے جائیں گے نہیں۔"

تلاش تو میں بھی کر رہا تھا لیکن مسئلہ وہی ہے کہ اس پورے جزیرے پر کوئی ایک جگہ ہوتی تو ہم وہاں چلے جاتے۔"

"اس نے درگاہ کہا تھا۔" میں نے کہا۔

"درگاہ سے لوگ واپس جا رہے ہیں۔" محسن بولا۔ "اور درگاہ بھی چھوٹی جگہ تو نہیں ہے۔ اس کے آگے پیچھے۔ خیر۔ ہم ہر طرف نگاہ رکھیں گے۔"

"یہ ہو سکتا ہے کہ وہ دیر سے آئے۔ جب یہ بھیڑ ختم ہو جائے۔" غالب نے کہا۔ "یہ مشکل تو اسے بھی ہو گی کہ کہاں دیکھے۔"

"یار، وہ اکیلی تو نہیں آ سکتی۔ وہ خبیث چاند بھائی ضرور اس کے ساتھ ہو گا۔" میں نے کہا۔ "مردود، خدائی فوجدار۔ زبردستی رابعہ کا باپ بنا ہوا ہے۔ اس کے دوسرے حکم کے غلام بھی ساتھ آ سکتے ہیں۔"

"ہمارا کیا نقصان ہے اس میں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ہم انھیں نہ دیکھ پائیں مگر وہ ہمیں تلاش کر لیں۔" غالب نے کہا۔

"اس بار کچھ بھی ہو جائے۔ بس ایک بار مل جائے رابعہ تو پھر ایسی کی تیسی چاند بھائی کی۔ یا وہ نہیں یا میں نہیں۔ میں رابعہ کو واپس نہیں جانے دوں گا۔" میں نے کہا۔

"خواہ مخواہ اپنا خون مت جلا۔ ابھی تک چاند بھائی نے کوئی دشمنی نہیں کی ہے ہمارے ساتھ۔" محسن بولا۔ "وہ دوست اور مددگار ہی رہا ہے۔"

"نہیں چاہیے مجھے اس کی دوستی اور مدد۔" میں نے چلّا کے کہا۔ "میں نے بتا دیا ہے کہ رابعہ ہمارے ساتھ رہے گی بھی جاؤ جہنم میں۔ اگر رابعہ ساتھ نہیں ہو گی تو میں نہیں جاؤں گا ساتھ۔"

"اچھا اچھا۔ یہ مت سمجھ کہ ہم تیرے مقابلے میں چاند بھائی کی حمایت کر رہے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "میرے ذہن میں ایک اسکیم ہے۔ ہم ایک ساتھ رہنے کے بجائے الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ چاروں طرف دیکھتے رہیں گے۔ ایک طرف میں۔ دوسری طرف غالب۔ تیسری جانب نازو اور چوتھی طرف آپ خود۔"

"لیکن نازو ہے کہاں؟" غالب نے کہا۔

"اور ہمارا آپس میں رابطہ کیسے رہے گا؟" میں نے کہا۔

"نازو بس آتی ہی ہو گی۔ وہ ایک چیز لینے گئی تھی جو ہم نے تین سو ڈالر میں خرید لی تھی۔ اس خیال سے کہ کام آئے گی۔ ایک شخص چوری چھپے بڑے مشتبہ انداز میں بیچ رہا تھا۔" محسن نے کہا۔

"ایسی کیا چیز ہے۔۔۔؟"

"دو واکی ٹاکی ہیں۔ بہت چھوٹے ٹیلی فون ریسیور جتنے۔ پانچ کلومیٹر کی رینج ہے۔" محسن نے کہا۔ "پینسل ٹارچ سیل سے چلتے ہیں۔"

"کہاں آئے گی وہ؟"

محسن ہنسا۔ "ابے مجنوں، باطن کی آنکھ سے نہیں ظاہر کی آنکھ سے دیکھ۔"

اچانک میں نے بھی نازو کو دیکھ لیا۔ ہم چلتے چلتے پھر ان دکانوں کی قطار تک آ گئے تھے جس کے آخر میں حاجی صاحب کا جوس سینٹر تھا۔ نازو بڑے اطمینان سے ایک کھمبے کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑی ہوئی تھی اور ہم اس سے بہت کم فاصلے پر دس منٹ سے باتیں کر رہے تھے۔ یقیناً ہماری نظر نے کئی بار بجلی کے کھمبے کو اور اس کے نیچے واسکٹ قمیص اور پتلون میں ملبوس دبلے پتلے شخص کو دیکھا ہو گا مگر کسی نے بھی اسے غور سے نہیں دیکھا تھا۔ ہم سب ذہنی طور پر نازو کو اس حلیے میں قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے اور ہمارے خیالات کا محور بھی رابعہ کی ذات تھی چنانچہ نازو کو روشنی میں ہونے کے باوجود کسی نے نہیں پہچانا۔

غالب سخت خفیف ہو کے اس کی طرف بڑھا۔ "نازو۔۔۔!"

"کون ہے بے تو؟" نازو نے غرّا کے کہا اور ایک قدم آگے آ گئی۔

"ابے یار۔۔۔ یہاں بھی۔" غالب بے اختیار پیچھے ہٹ گیا۔

"یہ کوئی جگہ ہے بدمعاشی جتانے کی۔"

"کس کو بولا بدمعاش؟" نازو اور آگے آ گئی۔

میں فوراً درمیان میں آ گیا۔ "بھئی نازو، معاف کر دو اسے بھی اور ہمیں بھی۔ ہم سب دھوکا کھا گئے۔"

نازو ہنسنے لگی۔ "خوب نظر ہے آپ دونوں کی۔ پتا نہیں کتنی بار دیکھا ہو گا مجھے۔ ایسے ہی دیکھ رہے ہوں گے آپ بھی بہ باہی ہو۔"

"تم وہ لائی ہو؟" محسن نے کہا۔

"دو واکی ٹاکی ہیں۔ تو چار افراد کے درمیان رابطہ کیسے رہے گا؟" میں نے کہا۔

"اس مسئلے کا ایک آسان حل ہے۔" غالب نے کہا۔ "ایک مجھے اور نازو کو دے دو، دوسرا تم اور محسن رکھو۔"

محسن ہنس پڑا۔ "تمھیں واکی ٹاکی کی کیا ضرورت ہے؟"

"یہ بھی کچھ غلط نہیں کہا آپ نے۔" غالب بولا۔ "ہم واک بھی رکتے ہیں۔ اور ٹاک بھی۔"

"ہاں بھئی۔" محسن نے ٹھنڈی آہ بھر کے کہا۔ "یہ سب تمھارے لیے ہی تو ہے۔ یہ ہوا یہ رات یہ چاندنی۔ چلو جاؤ تم دونوں سامنے کے حصے پر نظر رکھو۔ مگر دیکھو نظر سے اوجھل مت ہونا۔ اور مفرِ صحت ناک مت کرنا۔"

چونکہ نازو مردانہ لباس میں تھی اس لیے غالب نے بڑی بے تکلفی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور پھر کمر میں ہاتھ ڈال کے کہا۔ "چل یار گل خان۔" دوسرے لمحے وہ زمین پر لمبا لیٹا ہوا نظر آیا۔

"ساتھ چلنا ہے تو مجھ سے اتنی دور رہو کہ پھر یہ نوبت نہ آئے۔" نازو نے کہا۔ "تم کو سوچنا چاہیے۔۔۔"

غالب اٹھا اور اس کے ساتھ چل پڑا۔ "مجھے تو ڈوب مرنا چاہیے اس سمندر میں۔"

میں اور محسن ہنستے ہوئے آگے چل پڑے۔ پھر ایک جگہ ہم نے اپنے اپنے راستے پر الگ جانے کا فیصلہ کیا۔ واکی ٹاکی بہت کارآمد ثابت ہوا۔ میں اور محسن اطمینان سے باتیں کرتے رہے۔ کسی بھی جگہ ہمارے درمیان یہ فاصلہ ایک کلومیٹر سے زیادہ نہیں ہوا۔ میری نظر درگاہ کے قرب و جوار میں ہر شخص پر تھی۔ رات کے ساتھ ساتھ رونق ماند پڑتی جا رہی تھی اور درگاہ سے نکلنے والے لوگ بہت کم رہ گئے تھے۔

مجھے بالکل اندازہ نہیں ہوا کہ ان دو افراد نے کہاں سے اور کب میرا تعاقب شروع کیا۔ وہ تو اچانک میرے دائیں بائیں آ گئے اور پھر مجھ سے قدم ملا کے چلنے لگے۔ ان میں سے ایک کو میں نے فوراً پہچان لیا۔ یہ انھی میں سے ایک تھا جو مجھے اور غالب کو اغوا کر کے لے جانا چاہتے تھے۔ ان میں سے ایک مارا گیا تھا اور دوسرا ہم سے وعدہ کر کے بھاگ گیا تھا کہ وہ کسی سے کچھ نہیں کہے گا لیکن باقی دو اس کے مقابلے میں اپنے آقا کے زیادہ وفادار ثابت ہوئے تھے۔

"تم پھر آ گئے؟" میں نے خود کو پُرسکون رکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ ابھی سیدھے چلتے جاؤ۔" ایک نے میری پسلیوں کے ساتھ ریوالور لگا کے کہا۔ "تم نہیں جاؤ گے تو تمھاری جان جائے گی۔"

"کیا یہ بات تم نے آج ہی صبح نہیں کہی تھی؟" میں نے کہا۔ "مگر جان میری نہیں، تمھارے بینڈ ماسٹر کی گئی۔"

"تمھارا کیا خیال تھا کہ ہم اتنی آسانی سے چھوڑ دیں گے تمھیں؟" دوسرے نے بھی ریوالور کو دبا کے کہا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں۔ کچھ لوگ آسان موت قبول نہیں کرتے۔"

میرے اطمینان کی وجہ ایک تو یہی تھی کہ ریوالور سے مسلح ہونے کے باوجود میرے حریف پُراعتماد نہیں تھے۔ ان میں سے ایک کی بہادری میں دیکھ چکا تھا۔ نیا چہرہ اپنی بدمعاشی کا اشتہار دینے میں کامیاب ضرور تھا لیکن وہ ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے تھے۔ وہ سب اتنے خطرناک بدمعاش نہیں تھے جتنا خود کو ظاہر کرتے تھے۔

زیادہ بھروسا مجھے اس واکی ٹاکی پر تھا جو میری شرٹ کی اوپری جیب میں تھا جیسے ہی میں نے محسوس کیا تھا کہ مجھے دونوں طرف سے محصور کر لیا گیا ہے، میں نے بڑی صفائی سے ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے واکی ٹاکی کے ایک بٹن کو اوپر کھسکا دیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ بٹن بالکل نیچے دائیں طرف ہے چنانچہ جیب کے باہر ہی سے اس کے ابھار کو محسوس کرتے ہوئے میں نے اپنا کام کر لیا تھا۔

بٹن جب اوپر والی پوزیشن میں ہوتا تھا تو واکی ٹاکی ٹرانسمیٹر بن جاتا تھا اور میں محسن سے بات کر سکتا تھا۔ درمیان کی پوزیشن میں بٹن سے ریسیور آن ہوتا تھا اور میں محسن کی آواز سن سکتا تھا۔ بٹن کو بالکل نیچے کرنے سے واکی ٹاکی آف رہتا تھا۔

اب مجھے یقین تھا کہ ہماری سب گفتگو محسن کے کانوں تک پہنچ رہی ہو گی لہٰذا مجھے کسی سے مدد کی درخواست کرنے کی ضرورت نہیں۔ محسن فوراً غالب اور نازو کو بتا دے گا کہ میں گرفتار ہوں اور وہ میرے کچھ کرنے سے پہلے ہی ان دونوں دلاوروں کو گھیر لیں گے جو ریوالور کی طاقت سے مجھ پر فتح حاصل کر کے بہت اکڑ رہے تھے۔ خالی ہاتھوں سے بھی میں اُن کی فتح کو شکست میں بدلنے پر قادر تھا لیکن میں نے خطرہ مول لینا بے سود سمجھا۔

"سیدھے کہاں چلے جا رہے ہو؟" دائیں طرف والے نے مجھے ڈانٹ کر کہا۔ "ادھر چلو۔"

"آدمی کو سیدھے راستے پر چلنے کی کوشش ضرور کرنی چاہیے۔" میں نے کہا۔ "ویسے تم کہو تو میں ٹیڑھا ترچھا چل کے بھی دکھا سکتا ہوں، لگڑ بگڑ کی طرح ایسے۔۔۔ اور شرابی کی طرح جھومتا ہوا۔۔۔ ایسے۔"

"بس بس۔۔۔ ہم تمھارا اسکرین ٹیسٹ لینے نہیں آئے۔" دوسرے نے درشت لہجے میں کہا۔ میری چال کے عملی مظاہرے نے انھیں پریشان کر دیا تھا۔

"مجھے معلوم ہے کہ تم مجھے لینے آئے ہو لیکن اتنا تو بتا دو کہ آئے کیسے ہو؟" میں نے کہا۔ "مطلب یہ نہیں کہ پیدل آئے ہو یا ٹیکسی میں، او ونٹ یا گھوڑے پر بیٹھ کر یا گدھا گاڑی میں۔ . . پوچھنا یہ تھا کہ میرا پتا کس نے بتایا؟ تم کو پتا؟"

"ہم صورت سے شاید بے وقوف نظر آتے ہوں۔ . ."

"شاید کیا، یقیناً نظر آتے ہو۔" میں نے کہا۔

"لیکن تم جیسے عقل مند ہم سے نہیں بچ سکتے۔" دائیں طرف والے نے بگڑ کر کہا۔ "تم کہیں بھی چلے جاؤ، ہم تمہیں تلاش کر لیں گے۔"

"کیا تم مجھے چیلنج کر رہے ہو؟" میں نے کہا۔ "اگر ایسا ہے تو ایک موقع دے کر دیکھو۔"

بائیں ہاتھ پر چلنے والے نے ریوالور کی نال کو میری پسلیوں میں دبا کے مجھے ایک گالی دی۔

میں چلایا۔ "آہ۔ . . آہ۔ . . ادھر میرا دل ہے۔ دل ٹوٹ جائے گا تو۔ . ." اور چلتے چلتے رک گیا۔ مجھے اب تھوڑی سی تشویش لاحق ہونے لگی تھی۔ ہم آبادی سے دور آ چکے تھے اور ساحل کے اس حصے میں تاریکی تھی۔ ابھی تک میری مدد کے لیے کوئی نہیں پہنچا تھا حالانکہ میری گفتگو سن لینے کے بعد صورت حال کی وضاحت خود ہی ہو جاتی تھی۔ پھر مجھے ایک اور خیال آیا۔ کہیں محسن بھی مجھ سے بات نہ کر رہا ہو۔ بیک وقت دونوں بات کرنے کی کوشش کریں گے تو نہ وہ میری آواز سن سکے گا اور نہ میں اس کی سنوں گا۔ واکی ٹاکی میں ون وے ٹریفک چلتی ہے۔ پہلے بات سن لیں پھر جواب دیں۔ پھر بٹن دبا کے اپنی آواز بند کر دیں اور دوسرے کی آواز کو آنے دیں۔

اس خیال کے آتے ہی میں مستعد ہو گیا۔ اب جو کچھ کرنا تھا مجھے خود ہی کرنا تھا۔ اگر میں واکی ٹاکی پر محسن کی آواز سنتا تو پہلے تو مجھے اس کو آن کرنا پڑتا۔ واکی ٹاکی میری جیب میں تھا اور میں ہاتھ نیچے لے جاتا تو وہ دونوں یہ سمجھتے کہ میں ریوالور نکالنا چاہتا ہوں۔ پھر مجھ سے واکی ٹاکی بھی چھین لیا جاتا اور شاید وہ فیصلہ کر لیتے کہ مجرم زیر حراست کی جامہ تلاشی کی۔ یہی کارروائی بلاتاخیر ہو جانی چاہیے۔ اس کا نتیجہ ریوالور، پاسپورٹ اور نقد رقم سے محرومی کی صورت میں برآمد ہوتا۔ اس اجنبی سرزمین پر جہاں سب ناآشنا اور دشمن چہرے تھے میں بھی تہی دست رہ جاتا تو کہیں کا نہ رہتا۔

یہ سب سوچ کے میں نے ان دونوں سے دو دو منٹ نمٹنے کا فیصلہ کیا۔ جہاں آ گئے تھے وہاں نہ ان کا کوئی مددگار نظر آتا تھا اور نہ کسی کی مداخلت کا اندیشہ تھا۔ میں چلتے چلتے ایک دم رک گیا۔ انھوں نے ایک ساتھ مجھے آگے دھکیلا مگر میں اڑیل ٹٹو کی طرح قدم جمائے کھڑا رہا۔

"میری ایک بات سن لو پہلے۔" میں نے کہا۔

"جو کہنا ہے وہاں جا کے کہنا۔" ان میں سے ایک نے غرا کے کہا۔

"یہاں میری بات سن لینے میں تمہارا فائدہ ہے۔" میں نے کہا۔

"ہم تمہارے فائدے کی نہیں، اپنے نقصان کی فکر کرو۔"

"جب تک میں اپنی بات نہیں کہہ لوں گا یہاں سے نہیں ہلوں گا۔" میں نے کہا اور زمین پر گر گیا۔

اس نے مشتعل ہو کے ریوالور اٹھایا اور میرے سر پہ وار کرنے کی کوشش کی جب اس نے دیکھا کہ میں ساکت لیٹا ہوں اور میری اس حرکت کا مقصد انھیں دھوکا دے کر مقابلہ کرنا نہیں ہے تو اس نے اپنا ہاتھ روک لیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ میرے قتل پر مامور نہیں کیے گئے ہیں۔ قتل کرنا ہوتا تو وہ مجھے اتنی مہلت بھی کیوں دیتے۔ وہ اپنا کام ختم کر کے جا چکے ہوتے۔ انھیں حکم دیا گیا تھا کہ مجھے زندہ گرفتار کر کے پیش کریں۔

"میں تین تک گنوں گا۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"ابھی تک تم نے بالکل مزاحمت نہیں کی ہے۔" میں نے کہا۔

"ایک۔ . ."

"اور میرا خیال ہے کہ جو کوئی مجھ سے ملنا چاہتا ہے وہ میری اس طرح ملاقات کر کے خوش نہیں ہو سکتا۔" میں نے کہا۔

"دو۔ . ." اس نے خاصے وقفے کے بعد کہا۔

"آخر تم اتنا ڈرتے کیوں ہو؟ ایک بات سن لینے میں کیا ہے۔ ماننا نہ ماننا تمہارے اختیار میں ہے۔" میں نے کہا۔

اس کے دوسرے ساتھی نے تائید میں سر ہلایا۔ "سن لے یار اس کی بھی۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "لمبی بات مت کرنا اور چالاک بننے کی کوشش مت کرنا۔"

"ایک منٹ میں کہہ دے جو کہنا ہے۔" تین تک گننے والے نے گویا مجھے معاف کر دینے والی مہلت بڑھا دی۔

"تم لوگ جو معاوضہ لو گے میں اس سے دوگنا دے سکتا ہوں۔" میں نے لیٹے لیٹے کہا۔

"بس یا کچھ اور؟" وہ پھر تمسخرانہ انداز میں بولا۔

"تین گنا کے بارے میں کیا خیال ہے؟" میں نے کہا۔

"دیکھو، یہ ٹھیک ہے کہ باس تم سے ملنا چاہتا ہے۔ . ."

"باس؟ یہاں بھی کوئی باس ہے؟" میں نے اپنے سر پہ ہاتھ مار کے کہا۔ "ہر جگہ ایک باس پیدا ہو جاتا ہے۔ کون ہے آخر یہ باس؟"

"تمہارا باپ۔" وہ مشتعل ہو کے بولا۔ "اس نے صاف کہا تھا کہ وہ ساتھ آنے پر رضامند نہ ہو تو اسے گولی مار دینا، اپنی جان کو خطرے میں مت ڈالنا۔ سمجھ میں آ گئی ہے یہ بات یا نہیں؟"

"میں معاوضے کی رقم پانچ گنا دینے کو تیار ہوں۔" میں نے کہا۔ "تم کچھ بھی کہہ سکتے ہو مثلاً یہ کہ پولیس آ گئی تھی یا وہ نکل کے

غائب ہو گیا۔ . . حاجی علی کے مزار میں داخل ہوا اور واپس نہیں آیا۔ شاید کسی عورت کے برقعے میں گھس کے نکل گیا۔"

"یہ پانچ گنا یا دو گنا معاوضے کی بات نہیں ہے۔" دوسرے نے کہا جو زیادہ معقولیت پسند تھا۔

"پھر کیا بات ہے؟"

"جو ذمہ داری ہم قبول کر لیتے ہیں وہ پوری کرتے ہیں۔ پھر کوئی تو ہمارا اعتبار اٹھ جائے گا اور ہمارا دھندا چوپٹ ہو جائے گا۔ کوئی بھی اتنا بے وقوف نہیں ہوتا کہ اتنی آسانی سے چکر میں آ جائے۔"

"پھر تم مجھے اسی جگہ گولی مار دو۔ مجھے کیا ضرورت ہے تمہارے ساتھ جانے اور باس کے ہاتھوں قتل ہونے کی؟" میں نے کہا۔

"یہ تو ممکن ہے کہ باس تمہیں قتل نہ کرے۔ اس کا مقصد قتل کرانا ہوتا تو وہ یہاں خدمات حاصل نہ کرتا، کسی اور کو بھیجتا اور وہ تم کو گولی مار کے فرار ہو جاتا۔ تمہیں پتا بھی نہ چلتا کہ اس نے تم کو کس نے مار دیا تھا۔" وہ مجھے سمجھاتے ہوئے بولا۔ "اب وقت ضائع نہ کرو۔" پہلے والے نے برہمی سے کہا۔ "یہ لاتوں کا بھوت ہے۔" اس نے میری پسلیوں میں ٹھوکر ماری۔ "اٹھ، ورنہ۔ . ."

میں نے اس وقت سے مایوس ہو جانے کے بعد میں ایسے ہی کسی موقع کے انتظار میں تھا جب میں ان دونوں کو ایک ساتھ ٹھکانے لگا سکوں۔ ٹھوکر لگنے والی ضرب بڑی شدید تھی۔ سینے میں درد کی ایک لہر اٹھی۔ اٹھانے والے درد کی ٹیسیں نے مجھے اسی وقت کے لیے تیار کر دیا جو میرا جسم مدافعت کے لیے متحرک ہوا۔ میں نے ٹوٹ پڑنے والے کے پاؤں کو اپنے ہاتھوں کی گرفت میں لے کر جھٹکا دیا۔

وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ سنبھلنے کی کوشش میں وہ ہاتھ پھسلا کے گرا۔ میں اسی جھٹکے کے ساتھ میں نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اس کا ساتھی زیادہ مستعد تھا۔ اس نے اوپر سے مجھے دبوچ لیا۔ ایک لمحے کو میری گرفت بہت کمزور ہو گئی اور عام حالات میں میرے لیے ان دونوں سے نمٹنا بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ میں اوپر آ جانے والے کی گردن کو دونوں ہاتھوں سے مروڑ دیا اور اسے گھما کے دوسرے شخص پر مارتا۔ میرے دونوں ہاتھ اور دو پیر ایک ریوالور کی گولی کے سامنے یقیناً کچھ نہیں کر سکتے تھے مگر اب صورت حال ایسی پیدا ہو گئی تھی کہ وہ دونوں ریوالور استعمال کرنے سے قاصر تھے۔

لیکن ایک جذباتی ردعمل نے اس لمحے پر میری گرفت ختم کر دی۔ میری قوت فیصلہ اور اپنی توجہ کو مرتکز رکھنے کی صلاحیت اس لمحہ مفلوج ہو گئی۔ یہ سب کچھ اتنا اچانک اور غیر متوقع طور پر ہوا کہ میری یقینی فتح میری شکست میں بدل گئی۔ اس میں قصور میرا نہیں رابعہ کا تھا۔

جیسے ہی دوسرا شخص مجھے دبوچنے کے لیے میرے اوپر گرا اس کے جسم یا ہاتھ کی رگڑ سے واکی ٹاکی کا وہ سوئچ مل گیا جسے میں نے خود او پر کیا تھا۔ سوئچ بالکل نیچے آ گیا۔ واکی ٹاکی کا اسپیکر جاگ اٹھا اور میرے کانوں نے رابعہ کی آواز سنی۔

". . . تک انتظار کرتے رہو گے۔ . ."

پھر محسن نے کہا۔ "ایسی بھی کیا بے قراری۔ . ."

اس سے زیادہ میں نے کچھ نہیں سنا۔ رابعہ کی آواز سنتے ہی میرے ذہن کو جیسے ہزاروں وولٹ کی قوت کا برقی جھٹکا لگا۔ وہ صرف چار الفاظ تھے لیکن اس کی آواز میں اضطراب اور اشتیاق کے جذبات کی ساری شدت سمٹ آئی تھی اور اس پر درد و رقت میں لرزتا ہوا میرے ترستے ہوئے پاگل دل کا تڑپ اٹھنا بھی ایک فطری سی بات تھی۔

جواب میں یہ الفاظ محسن نے بھی کہے تھے مگر وہ ہکش کی کیفیت میں پہنچنے والی آخری آواز تھی جو میرے کانوں تک پہنچی۔ چند لمحے میں وہی غفلت کا ایک لمحہ تھا جب رابعہ کی آواز نے مجھے دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیا تھا اور اسی لمحے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دشمن نے مجھے زیر کر لیا تھا۔ میرے سر پر ریوالور کی ضرب پڑی اور میرے چاروں طرف پھیلا ہوا اندھیرا سمندر کا شور، رابعہ کی آواز کے ساتھ ہی قائم ہو جانے والے تصورات کا سلسلہ، اس کی صورت کا تصور، خیال اور حسرت دیدار کی خواہش سب سے محروم ہو گئے۔

ایک بار پھر میرے حواس بحال ہونے لگے تو اجنبی کرخت لہجے والی آوازوں کے شور میں گھنٹیوں کے مترنم سُر الگ بولنے لگے۔ . . کب تک انتظار کرتے رہو گے؟ . . . آخر کب تک۔ . . کتنی دیر تک؟ بھئی محسن۔ . . اتنی دیر تو ہو گئی۔ تم بھی ضد کرتے ہو۔ . . جواب کوئی نہیں ملتا تو چلو۔ . . یہاں کب تک انتظار کرتے رہو گے۔ . . ؟

میں ایک دم اٹھ بیٹھا۔ میں سر کے بل دوڑتا ہوا واپس جانا چاہتا تھا۔ رابعہ آ گئی تھی اور میری بدقسمتی کہ وہ مجھ سے نہیں مل سکی تھی۔ محسن اسے پریشان کر رہا تھا۔ . . اب ایسی بھی کیا بے قراری۔ . . وہ مسلسل مجھ سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش میں مصروف تھی مگر نہ اس کی آواز مجھ تک پہنچ رہی تھی اور نہ اسے میری طرف سے کوئی جواب مل رہا تھا۔ رابعہ کے اعصاب مزید انتظار کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ اس نے ہجر کے صحرا میں صدیوں کا سفر اسی ایک لمحے کے انتظار میں کیا تھا۔ وہ محسن کو کھینچ رہی تھی۔ . . چلو۔ . . سکندر ادھر ہی گیا ہے نا۔ . . ہم چلتے ہیں۔ . . اور اس کی آواز کا ایک گنگناتا ٹکڑا۔ . . گیت کا ایک بول۔ . .

نغمہ ساز کا ایک سُر مجھے بلانے آگیا تھا۔ ۔ ۔ یہ بتانے آگیا تھا کہ چلو۔۔۔ تم کو جس کا انتظار تھا۔۔۔ اب وہ تمھارے لیے محوِ انتظار ہے۔ ۔ ۔

لیکن اب مَیں اس سمندر کے ساحل پر نہیں تھا۔ مَیں ایک سجے سجائے کمرے کے قالین پر پڑا ہوا تھا۔ جلتی بجھتی روشنیاں اور متحرک دیوار و در مجھ پر خندہ زن تھے۔ نامانوس چہروں پر تمسخر اُڑانے والی مسکراہٹ تھی اور مَیں اپنی بے بسی کے حصار میں تنہا رہ گیا تھا۔

آہستہ آہستہ مَیں اس قابل ہو گیا تھا کہ تقدیر کے اِس بے رحم مذاق کو سمجھ سکوں۔ وہ سب انتظامات جو ہم نے آپس میں رابطہ قائم رکھنے کے لیے کیے تھے، بے فائدہ ثابت ہوئے تھے۔ غالب اور محسن یا نازو میں سے کوئی بھی میری مدد کے لیے نہ پہنچ سکا تھا اور وعدے کے مطابق مجھ سے ملنے کے لیے پہنچ جانے والی رابعہ مجھے پکارتی رہ گئی تھی۔

میرے سامنے صوفے پر ایک پستہ قد بھدّے جسم والا گنجا شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے اور گردن کی جلد پر برص کی سفیدی تھی جو بڑے بڑے دھبوں کی صورت میں ہاتھوں پر بھی پھیل گئی تھی۔ اس میں کہیں کہیں اُس کے گندمی رنگ کے داغ رہ گئے تھے جو بدنمائی اور کراہیّت کا احساس پیدا کرتے تھے۔ کمرے کی ہر دیوار پر دو لائٹس تھیں جن پر جھلمل کرتی شیشے کے موتیوں والی جھالریں تھیں۔ ایسی ہی جھالروں والی دس لائٹوں سے بنا ہوا فانوس درمیان میں روشن تھا۔ باقی کمرا بھی بیش قیمت سامانِ آرائش سے بھرا ہوا تھا۔

صوفے پر بیٹھے ہوئے پستہ قد شخص کا سر بھی ایک گلوب کی طرح چمک رہا تھا۔ اُس نے بہت قیمتی کپڑے کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ لیکن اُس کا جسم اتنا بے ہنگم تھا کہ اپنی تمام تر کوشش کے باوجود کوئی درزی سوٹ کو اس کے جسم کی ساخت کے مطابق نہیں بنا سکا تھا چنانچہ وہ سوٹ میں بھی کارٹون نظر آتا تھا۔ اس نے رات کے وقت بھی کالے رنگ کی عینک لگا رکھی تھی صرف اس کی اکڑی ہوئی گردن کے خم اور ناک کی سمت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مجھے ہی گھور رہا تھا۔

عین صوفے کے پیچھے وہ شخص اٹینشن کھڑا ہوا تھا جس نے مجھے ایک دو تین کرکے گولی مار دینے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ اس کا دوسرا ساتھی مقابل کی دیوار سے لگا ہوا میرے پیچھے موجود تھا۔ وہ ویسے ہی حکم کے غلام دائیں اور بائیں جانب بھی، باادب باملاحظہ ہوشیار نظر آ رہے تھے۔ وہ سب خونخوار شکاری کتوں کی طرح اپنے آقا کے ایک اشارے کے منتظر تھے اور شکار کو یعنی مجھے یہ تاثر دینے میں مصروف تھے کہ بس اب کوئی دم کی بات ہے چنانچہ مجھے کلمۂ شہادت ضرور پڑھ لینا چاہیے۔

"بیٹھ جاؤ امیر چند۔۔۔ ولد دمڑی لال۔" برص کے مارے ہوئے 'باس' نے اپنی بھاری مصنوعی آواز میں کہا۔ ہر چند کہ ولدیت کے ساتھ مجھے مخاطب کرنے میں تمسخر کا انداز تھا مگر اُس کا لہجہ بے جان اور چہرہ سپاٹ رہا۔ مَیں نے محسوس کیا کہ لبوں کے سوا اس کے پورے ساکت وجود میں ذرا بھی جنبش نہیں ہوئی اور وہ مجھے انسان سے زیادہ کوئی روبوٹ لگا۔ اُس کے اور میرے درمیان سب گفتگو انگریزی میں ہوئی۔

مَیں چند قدم پیچھے ہٹ کے صوفے پر بیٹھ گیا۔ مجھے پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ تلاشی لینے والوں نے مجھے ریوالور، پاسپورٹ اور نقد رقم سے محروم کر دیا ہے۔ کمر سے لپٹی ہوئی بیلٹ حاصل کرنے کے لیے انھوں نے میرے کپڑے ضرور اُتارے ہوں گے تاہم یہ کپڑے مجھے پھر پہنا دیے گئے تھے۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم نے میرا پاسپورٹ دیکھ لیا ہے۔" مَیں نے سر کو تھوڑا سا جھٹک کے کہا۔

"وہ سب جعلی کام ہے۔" روبوٹ نے کہا۔

"جعلی تو مجھے تم بھی لگتے ہو۔" مَیں نے کہا۔ "نیچے سے اوپر تک تمھاری یہ شخصیت جعلسازی کا نمونہ ہے۔"

اُس نے کسی قسم کے ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔ "کس کے لیے کام کرتے ہو تم؟"

مَیں نے دَرد کرتے ہوئے سر کو دونوں ہاتھوں سے دبا کے کہا۔ "میں کسی کے باپ کا نوکر نہیں ہوں۔"

اُس نے مجھ سے اتفاق کیا۔ "میرا بھی یہی خیال تھا۔ مَیں نے پہلے تمھیں کبھی نہیں دیکھا۔"

میں نے خوشدلی سے کہا۔ "کمال ہے! مَیں نے بھی پہلے تمھیں کبھی نہیں دیکھا۔ حالانکہ تم ہو دیکھنے کی چیز۔"

"تم ایک بہادر آدمی ہو۔" اس نے بُرا مانے بغیر اپنے انداز کی بے حسی کو برقرار رکھتے ہوئے کہا۔

"کیا یہاں مجھے بہادری کا کوئی میڈل دیا جائے گا؟"

"میرے لیے کام کرو گے تم؟" اس کا لہجہ جذبات سے عاری سا۔ وہ شخص اپنے ہر طرح کے ردِعمل پر مکمل کنٹرول رکھتا تھا چنانچہ میری انتہائی کوشش کے باوجود ابھی تک مشتعل نہیں ہوا تھا۔ حکم کے غلام میری بدتمیزی پر ناخوش نظر آتے تھے مگر خاموش تھے۔ شاید وہ جانتے تھے کہ باس کو دخل در معقولات پسند نہیں۔ اُن کی برہمی کا اندازہ صرف اُن کی آنکھوں سے ہوتا تھا۔

"ابھی تو مَیں کچھ نہیں کر سکتا۔" مَیں نے کہا۔ "تمھارے سر پر بیٹھنے والی گستاخ مکھی کو بھی نہیں مار سکتا۔"

جیسے چودھری کا ہاتھ داڑھی کے تنکے کی طرف بلا ارادہ گیا تھا۔ ایسے ہی اُس کا ہاتھ اوپر نہیں اٹھا۔۔۔ میری توقع کے برعکس اس نے اپنے سر کی شفاف سطح پر پھسلنے والی مکھی تلاش نہیں کی۔

"مکھیاں مارنے والوں کی ضرورت بھی نہیں ہے مجھے۔ مَیں ... بات کر رہا تھا۔" اُس نے کہا۔

"میرے لیے بات کرنا بھی مشکل ہو رہا ہے۔" مَیں نے کہا۔

"ٹھیک ہے، ہم بعد میں بات کریں گے۔" اُس نے کہا ... ہاتھ اٹھا کے چٹکی بجائی۔

ایک پوری دیوار پر پھیلا ہوا سُرخ ریشمی پردہ ہلا اور ایک لڑکی ... سی سنہری ٹرالی کو بے آواز قدموں کے ساتھ دھکیلتی ہوئی ... آگئی۔ وہ خود بھی نازک اور سنہری سی تھی اور اس کے آدھے ... پر چھا جانے والے بال بھی سنہرے تھے۔

میں دل فریب اندازِ نقشِ پا دیکھتا رہا۔ موجِ خرامِ ناز کے ... کا مفہوم آج میری سمجھ میں آیا۔ اُس کے گلابی پاؤں قالین ... پھولوں پر یوں پڑ رہے تھے جیسے اُس کے قدموں میں قالین ... گلاب کے تازہ پھولوں کا فرش ہے۔ ٹرالی کی حرکت بھی ... بے آواز تھی۔ یہ بڑا متاثر کن ڈرامائی منظر تھا۔

یُوں لگتا تھا جیسے یہاں سب کچھ باس کے اشارے پر ... ہے۔ جب اُس نے چٹکی بجائی تھی تو یہ ناممکن تھا کہ اس ... کچھ اور سمجھا جاتا اور پردے کے پیچھے سے وہ لڑکی ... ٹرالی کے ساتھ نمودار نہ ہوتی۔ حکم کے جو غلام بت ... کھڑے ہوئے تھے، وہ بھی اس کی مرضی کے بغیر نہ ہل سکتے ... نہ مُسکرا سکتے تھے اور نہ کوئی بات کر سکتے تھے۔ وہ میری ... گستاخانہ بے تکلفی پر برہم تھے تو اپنی برہمی کا اظہار کرنے ... سے قاصر تھے۔ بلا اجازت وہ اپنی نیازمندی اور جاں نثاری کا ... مظاہرہ بھی کرتے تو شاید یہ اُن کا جرم شمار ہوتا۔ ایسا محسوس ... ہوتا تھا کہ باس، کے اس قصرِ عالیشان میں عملاً پرندہ بھی اپنی ... مرضی سے پَر نہیں مار سکتا جو لوگ اس کے اشاروں پر چلتے تھے ... ان کا ہنسنا، رونا، کھانا پینا یہاں تک کہ جینا مرنا بھی شاید ان سب ... کے لیے اپنے اختیار کی بات نہیں تھی۔

خود اس کا رویہ ناقابلِ یقین حد تک غیر جذباتی تھا۔ وہ ... کم سے کم الفاظ استعمال کرتا تھا اور کم سے کم حرکت کرتا تھا۔ مفہوم ... جو بھی ہو اس کا لہجہ یکساں اور اس کی آواز اسی سطح پر رہتی تھی پھر ... جو کچھ وہ کہتا تھا یُوں کہتا تھا جیسے مستند ہے میرا فرمایا ہوا۔۔۔ جیسے اُس کی ہر بات حرفِ آخر ہے جس میں نہ غلطی کی گنجائش ہے ... اور نہ اختلاف کی۔ مثلاً جب اُس نے کہا تھا کہ "وہ سب جعلی ... کام ہے۔" تو یہ گویا قطعی فیصلہ تھا جو اُس نے اپنی حاصل کردہ ... معلومات پر کامل یقین کے ساتھ کیا تھا چنانچہ میرے انکار ... سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اسی یقین کے ساتھ اُس نے مان لیا ... تھا کہ میں کسی کے لیے کام نہیں کرتا کیونکہ اُسے تفتیش کے نتائج ... موصول ہو گئے ہیں اور یہ ناممکن ہے کہ اُسے کوئی بات ... معلوم نہ ہو۔

چائے کی ٹرالی میں وہ سب کچھ موجود تھا جس کی مَیں خواہش کر سکتا تھا۔ ساقی گری کے فرائض انجام دینے والی نے جب ایک ہاتھ سے زلفیں ہٹا کے اور چہرہ میری طرف کرکے پوچھا کہ "چینی؟" تو مَیں نے اس کے ساتھ ایک پرانا مذاق دُہرایا کہ مٹھاس تو ان ہاتھوں کی بھی بہت ہوگی مگر وہ بالکل نہیں مسکرائی۔ غالباً وہ باس کی نظر کا اشارہ سمجھ کے واپس ہو گئی۔ ایک ایک کرکے چاروں حکم کے غلام بھی پردوں کے پیچھے روپوش ہو گئے۔ یہ طے کرنا مشکل تھا کہ وہ سچ مچ چلے گئے ہیں یا چھت سے فرش تک آویزاں پوری پوری دیواروں پر محیط شنیل کے بھاری پردوں کی شکنوں کے درمیان موجود ہیں۔

مَیں نے خود ہی بلیک کافی کے مگ میں دو چمچے چینی کے ڈالے اور نفیس کام والے چاندی کے چمچے، تاریک انگلش کراکری اور بیگمی نما ٹرالی کی خوب صورتی سے متاثر ہوا جو اس رئیسانہ ماحول میں حسنِ ذوق کی آئینہ دار تھی۔ برازیل کی اعلیٰ ترین کافی کی پُر سرور مہک اور کلب سینڈوچ دیکھ کے مجھے بے اختیار محسن یاد آیا جو کھانے پینے کے معاملے میں میرا ہم ذوق تھا۔ مجھے اس پر تاؤ بھی آیا اگر وہ محض رابعہ کو تنگ کرنے کے لیے دیر نہ کرتا اور دائی ٹائی پر رابطہ قائم نہ ہونے کی صورت میں فوراً آ جاتا تو صورتِ حالات مختلف ہوتی اور اس کے بالکل برعکس ہوتی جو اَب درپیش تھی۔ ہم ان دونوں کو لے جاتے جو مجھے یہاں لے آئے تھے۔ مَیں 'باس' بن کے بیٹھتا اور ان دونوں سے پوچھتا۔ ۔ ۔

"ایک شخص تم سے ملنا چاہتا ہے۔" باس نے اچانک کہا۔ مَیں اس وقت تک اپنا پیٹ بھر چکا تھا۔ کافی کا دوسرا مگ پی رہا تھا اور ان سب اشیائے خورونوش کو حسرت سے دیکھ رہا تھا جن کے لیے میرے پیٹ میں جگہ نہ رہی تھی اور سوچ رہا تھا کہ ہم سب ہوتے تو یہ ٹرالی خالی کر سکتے تھے۔

"بہت سے لوگ ملنا چاہتے ہیں مجھ سے۔" مَیں نے درمیان میں رکھے ہوئے باکس میں سے ہوانا سگار منتخب کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن مَیں ایک مصروف آدمی ہوں۔ اپائنٹمنٹ کے بغیر نہیں ملتا۔"

وہ بڑے میکانکی انداز میں اٹھا۔ مَیں نے اُسے نپے تُلے قدموں سے چل کر ایک دیوار کی طرف جاتے دیکھا۔ وہ مشکل سے پانچ فٹ قد کا آدمی تھا۔ تین انچ کا اضافہ اُس نے اونچی ایڑی والے جوتے پہن کے کیا تھا اور یہ اسپیشل آرڈر پر بنے ہوئے جوتے تھے جس میں آدھی ایڑی کو مہارت سے چھپا دیا گیا تھا۔ اس طرح وہ اوسط قد کا آدمی نظر آتا، اگر وہ اپنی چوڑائی میں ڈرم کی طرح نہ ہوتا۔

ایک ڈوری کھینچ کے اس نے پردہ ہٹا دیا۔ درمیان میں ایک شفاف چوکھٹا سا نمودار ہو گیا اور اس شیشے کی پارٹیشن کے

اور دوسرے کمرے کا منظر یکلخت ایسے روشن ہو گیا جیسے سینما ہال کی تاریکی میں اسکرین پر فلم کا منظر آ جاتا ہے۔

وہ کمرا بھی انداز آرائش میں شانِ امارت کا مظہر تھا لیکن اس وقت میں نے کمرے کو نہیں اُس شخص کو دیکھا جو مجھ سے ملاقات کا متمنی تھا اور ایک دم مجھے یوں محسوس ہوا، جیسے ہموار سڑک پر چلتے چلتے میں گہری خندق میں گر گیا ہوں یا ایئر کنڈیشنڈ کمرے کی ٹھنڈک سے نکل کے تنور میں اتر گیا ہوں، میں سگار منہ میں دبائے پتھر کا مجسمہ بنا رہ گیا کیونکہ میرے دل کی دھڑکن رک گئی تھی، سانس رک گئی تھی اور نبض رک گئی تھی، میری آنکھیں پتھرا کے ایک ہی جگہ ٹھہر گئی تھیں اور میں مجسمے کی طرح ساکت اور منجمد بھی ہو گیا تھا۔ میری عقل کے ساتھ میرے ہوش بھی جواب دے گئے تھے۔

روبوٹ نے پردہ برابر کیا اور واپس آ کے صوفے پر اُسی جگہ بیٹھ گیا جہاں سے وہ اُٹھا تھا لیکن میں ... پردے کے پیچھے موجود اس شخص کو دیکھتا رہا جو میرا ازلی و ابدی حریف چوہدری دلاور تھا۔ یہ سب ایک ناقابلِ یقین ڈراؤنا خواب لگتا تھا۔ ایک ایسی سنگین حقیقت، جس کو تسلیم کرتے ہوئے میرا وجود خوف کی سرد برفانی سل کے نیچے ملفوف ہوتا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے! چوہدری دلاور ۔۔۔ یہاں ۔۔۔؟

"کیا تم اس سے ملنا چاہو گے؟" روبوٹ نے کہا۔

میں بُری طرح چونکا۔ سگار میرے ہاتھ سے گر گیا۔ روبوٹ مجھے گھورتا رہا۔

"کیا یہ میرے اختیار میں ہے؟" میں نے اپنا اعتماد بحال کرنے کی بھرپور جدوجہد کرتے ہوئے سگار کو اٹھا کے جلانا شروع کیا۔

"ہاں، اگر تم نہیں چاہتے تو میں اُسے واپس کر دیتا ہوں حالانکہ میں اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہوں۔" روبوٹ نے کہا۔ "اس نے مجھے بہت معقول پیشکش کی ہے۔"

"کس قسم کی پیشکش؟" میں نے ... کہا۔ "کیا قیمت لگائی ہے اس نے میری زندگی کی؟"

"قیمت کی بات ابھی نہیں ہوئی لیکن وہ بزنس مین ہے یقیناً تمھاری زندگی کی اس کے نزدیک معمولی قیمت نہیں ہو سکتی۔ کون ہے یہ شخص؟"

سوال اس نے اچانک کیا تھا اور میرے جواب کا منتظر سا تھا۔ میں نے کہا "کیا مطلب ... اس نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟"

روبوٹ نے کہا "ابھی نہیں بتایا۔"

"اپنا نام تو بتایا ہو گا؟" میں نے کہا "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جو شخص تمھارے اس محل کے ایک کمرے میں اتنے اطمینان سے بیٹھا ہوا ہے۔ اُس کے بارے میں تم کو کچھ معلوم نہ ہو۔ جب کہ وہ میرے بارے میں تو تمھیں بہت کچھ بتا چکا ہو گا۔"

روبوٹ نے کہا "اس نے تمھارے بارے میں بھی کچھ نہیں بتایا۔"

میں نے ایک گہری سانس لے کر خود کو سنبھالا اور ... چھوڑ دیا۔ روبوٹ کا رویہ میرے ... پُراسرار ہونے لگا تھا۔ میں نفسیاتی بریک ڈاؤن کا شکار ہو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ میری قوتِ برداشت کو آزما رہا ہے۔ اس نے مجھے چوہدری دلاور کی ایک جھلک دکھا کے ایک بڑی اذیت کا آغاز کر دیا تھا۔ اب وہ اپنی ہر چال سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا۔

بالآخر میں نے اپنی حالت پر قابو پا لیا ... بڑی عجیب صورتِ حال ہے ... میرے پاس اس شخص کے ... بیٹھا ہوا ہے۔ ممکن ہے تمھیں سب کچھ معلوم ہو لیکن تم مجھ سے نہ بتا رہے ہو ۔۔۔ یا واقعی ابھی تک تمھیں کچھ پتا نہ چلا ہو کیونکہ وہ شخص بھی بہت عیار ہے، زبردست ایکٹر ہے۔ کبھی ظاہر سے باطن کا پتا نہیں چلنے دیتا اور حقیقی زندگی کو ایسا ڈراما بنا دیتا ہے جسے کوئی نہیں سمجھ پاتا۔ بلاشبہ وہ بہت بڑا بزنس مین ہے اور اتنا ہی بڑا دھوکے باز، جعلساز اور ضمیر فروش بھی ہے۔ غالباً آج کی دنیا میں کامیابی کے لیے آدمی کا ان صفات سے مزین ہونا بے حد ضروری ہے۔"

"میرے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے؟"

"اگر جان کی امان پاؤں تو عرض کروں کہ تم مجھے اس کے بھی باپ لگتے ہو۔" میں نے کہا "یہ میرا تاثر غلط بھی ہو سکتا ہے۔"

"اب کچھ اپنے بارے میں بتاؤ۔"

"اپنے بارے میں ... کیا بتاؤں اور کیا نہ بتاؤں۔ یہ بڑا مشکل سا سوال ہے۔ مختصراً یہ کہ وہ میرا جانی دشمن ہے ۔۔۔ شاید تم بھی ہو مگر ابھی تک میرے اور تمھارے درمیان دشمنی کا باقاعدہ آغاز نہیں ہوا ہے۔ میں اس شخص کا بہرحال ایک دشمن ہوں۔ دشمن تو سب کے ہی بہت ہوتے ہیں۔ اس کے ہزاروں لاکھوں ہیں مثلاً سب قانون کے رکھوالے اور قانون کا احترام کرنے والے۔ میں ایک خطرناک دشمن ہوں جس سے وہ زیادہ ڈرتا ہے اتنا ہی میں بھی اس سے ڈرتا ہوں۔ ہماری دشمنی کے رشتے کا پہلو ذاتی بھی ہے۔ میں اسے اپنے باپ کا قاتل سمجھتا ہوں اور وہ چاہتا ہے کہ میرے باپ کے بعد مجھے بھی مار ڈالے تاکہ وہ سب کچھ جو باپ نے میرے لیے چھوڑا تھا اُسے مل جائے۔"

"کیا وہ تمھارا بھائی ہے؟"

"نہیں، کسی کتے یا سؤر کا ۔۔۔ یا شیطان کا بھائی کہلانا پسند کر لو تو اس کی ... کا نگار اس کا نہیں۔" میں نے برہمی سے کہا "میرے ...

دشمنی بھی باعثِ شرم ہے۔"

"پھر وہ تمھارے باپ کا وارث کیسے بن سکتا ہے؟"

"وہ ان کا بزنس پارٹنر تھا۔" میں نے کہا "دو ہم بزنس پارٹنر تھے، دونوں کو اس نے مار دیا ... مگر دوسرے کے قتل کے الزام میں مجھے ملوث کیا تاکہ میں بھی پھانسی چڑھ جاؤں لیکن ابھی تک میں زندہ ہوں۔ یہ بہت لمبی کہانی ہے جو میں تم کو نہیں سنا سکتا نہیں تفصیلات ظاہر کر سکتا ہوں۔ خواہ تم مجھے اس کے حوالے کر دو یا خود شوٹ کر ڈالو۔ میرا قیمہ کر دو یا مجھے روڈ رولر کے نیچے لٹا دو۔ تم تشدد کے سارے طریقے آزما سکتے ہو اور دیکھ سکتے ہو کہ میری قوتِ برداشت کی حد کیا ہے۔ تم چاہو تو مجھے منہ مانگی قیمت پر فروخت کر کے پورا فائدہ بھی اٹھا سکتے ہو۔"

"میرا فی الحال ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ بہت کچھ حالات پر منحصر ہے اور حقائق پر۔"

"کیا مجھے بھی چند سوالات کی اجازت ہے؟" میں نے کہا۔

اُس نے سر کی خفیف سی جنبش سے رضامندی کا اظہار کیا۔

"سب سے پہلے تو میں یہ جاننا چاہوں گا کہ اس شخص کا تم سے کیسے رابطہ ہوا جو دوسرے کمرے میں بیٹھا ہوا ہے؟"

اس نے کہا "وہ بندرگاہ کے علاقے میں پوچھتا پھر رہا تھا کہ وہ کون ہیں جو جھانو متی کو واپس لائے ہیں؟"

"جھانو متی کون خاتون ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"جھانو متی اس لانچ کا نام ہے جس کا کپتان فردوش تھا۔" اس نے مختصراً جواب دیا۔

میں چونک کر رہ گیا "کیا ... وہ تمھاری لانچ تھی؟"

"نہیں۔ جب وہ لانچ واپس پہنچی اور وہ سب لڑکیاں جو لانچ پر تھیں آزاد ہوئیں تو بندرگاہ کے علاقے میں سنسنی پھیل گئی تھی۔ وہاں ایک مشتعل ہجوم اکٹھا ہو گیا اور پولیس کمشنر کو خود وہاں جا کے صورتِ حال کو کنٹرول کرنا پڑا۔ اخبارات والے بھی بہت تھے۔ انھوں نے مختلف عورتوں سے بہت کچھ پوچھا۔ اس کے نتیجے میں پوری کہانی معلوم ہو گئی۔ وہاں کچھ اور لوگ بھی تھے جو تم کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ انھی میں یہ شخص بھی شامل تھا۔"

"اور تمھارے آدمی بھی تھے؟"

"میرے آدمی تمھیں تلاش نہیں کر رہے تھے۔" وہ بولا "لیکن وہ جھانو متی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے گئے تھے۔ یہ شخص انھیں مل گیا۔ اس نے کہا کہ وہ جھانو متی کو واپس لانے والوں سے واقف ہے مگر نہ یہ بات پولیس کو بتا سکتا ہے اور نہ کسی عام آدمی کو۔ وہ کسی ذمے دار شخص سے بات کرنے پر تیار تھا۔ چنانچہ میرے آدمی اس کو یہاں لے آئے۔ اس وقت تک میں نے اپنے آدمی تمھیں لانے کے لیے بھیج دیے تھے چنانچہ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کون ہے اور جو لوگ اس لانچ کو واپس لائے ہیں انھیں وہ کیسے جانتا ہے۔ اُس نے کہا کہ فی الحال وہ صرف ایک پیشکش کر سکتا ہے۔ یہ پیشکش مشروط ہے۔ اگر جھانو متی کے ذمے دار افراد کو اس کے حوالے کر دیا جائے تو وہ نقد رقم بھی ادا کر سکتا ہے۔ یہاں یا باہر کسی بھی ملک کے اکاؤنٹ میں۔ ہر قسم کے کاروبار میں فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ خواہ وہ ملکی سطح پر ہو یا بین الاقوامی سطح پر۔ وہ ایک بزنس مین ہے اور اس کے وسائل لامحدود ہیں۔ میرے اطمینان کے لیے وہ بہت قابلِ اعتماد اور معتبر ریفرنس بھی دینے کو تیار ہے جو اس کے ضامن ہوں گے لیکن جب تک وہ سب لوگ اس کے حوالے نہیں کیے جائیں گے جو اس کے کہنے کے مطابق دہشت گرد ہیں۔ اَن گنت افراد کو قتل کر چکے ہیں اور ان کا تازہ ترین کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے کروڑوں روپے مالیت کے ایک تجارتی بحری جہاز کو سامانِ تجارت سمیت غرق کر دیا ہے۔ اس وقت تک بات نہیں ہو گی۔"

"تم نے اس سے سامانِ تجارت کے بارے میں معلوم نہیں کیا، جہاز کا نام نہیں پوچھا؟"

"میں سب کچھ معلوم کر سکتا تھا اور یہ ناممکن تھا کہ وہ مجھے بتائے بغیر جا سکتا۔" وہ بولا "یوں بھی اس گھر کا حفاظتی نظام ایک فوجی ہیڈ کوارٹر کے مقابلے میں بہت زیادہ بہتر ہے۔ اوّل تو یہاں کوئی آ نہیں سکتا اور جو آ جائے وہ اپنی مرضی سے جا نہیں سکتا لیکن میں نے اس سے کہا کہ اچھا تم ابھی جاؤ، ابھی میں معلوم کرنا۔ میں نے خود ہی دلچسپی نہیں لی کیونکہ مجھے اس کی پیشکش احمقانہ لگی تھی۔"

"اس نے تم کو فائدہ پہنچانے کی بات کی تھی؟"

"وہ کیا فائدہ پہنچائے گا مجھے، اپنے مفادات کی نگرانی میں خود کر لیتا ہوں اور مجھے کسی کی مدد کی ضرورت کبھی محسوس نہیں ہوتی۔ ہاں اس جیسے اور کتنے ہیں جو میری مدد کے طلب گار بن کے آ جاتے ہیں۔" وہ بولا۔

میں نے کہا "میری ذات میں تمھیں کیا دلچسپی تھی؟"

"تمھیں معلوم ہو جائے گا۔" وہ بے نیازی سے بولا "دلچسپی نہ ہوتی تو میں اپنے آدمی تمھیں بحفاظت یہاں لانے کے لیے کیوں بھیجتا۔"

"بحفاظت؟" میں نے کہا "انھوں نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی مجھے مارنے میں۔"

"لیکن تم نے اُن کو مارا۔ ایک کو تو جان سے مار دیا۔"

"وہ مجھے قتل کرنا چاہتے تھے۔ اپنے دفاع میں جو کچھ میں نے کیا ٹھیک کیا۔" میں نے کہا۔

"جو کچھ انھوں نے کیا اور تم نے کیا، غلط تھا۔ وہ ایک غلط فہمی کا نتیجہ تھا۔" وہ بولا۔

"غلط فہمی - یعنی وہ مجھے قتل کرنا نہیں چاہتے تھے، اور میں نے اُن کے عزائم کو سمجھنے میں غلطی کی تھی؟ کیا تم اتنا بے وقوف سمجھتے ہو مجھے؟" میں نے بگڑ کے کہا۔

"جس شخص کی بے وقوفی نے یہ غلط فہمی پیدا کی تھی، وہ پہلے ہی مارا جا چکا ہے۔ باقی تین اس کا حکم ماننے کے پابند تھے۔ اگر وہ بچ جاتا تو اس غلطی کی سزا مجھ سے پاتا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ میں نے تمہاری حفاظت کے لیے ان کو بھیجا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ تمہارے اصل دشمن پہلے نہ پہنچ جائیں۔ یہ کوئی بہت بڑا کام نہیں تھا لیکن جسے میں نے بھیجا تھا، وہ احمق ثابت ہوا۔ اُس نے غلط افراد کا انتخاب کیا اور غلط طریقہ اختیار کیا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ جب وہ تم سے ملے تھے تو نشے میں تھے۔"

میں اس کی باتیں حیرانی سے سُن رہا تھا اور ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ اُس کی کس بات کا یقین کروں اور کس کا نہ کروں۔

"میرے اصل دشمن آخر کون ہیں؟"

"جن کو تمہاری وجہ سے نقصان ہوا۔" وہ بولا۔ "کیا تمہاری ان سے کوئی کاروباری رقابت تھی؟"

"کن سے . . . ؟"

"جن کی لانچ تھی، بھانومتی۔"

میرے تن بدن میں آگ بھر گئی۔ "کاروباری رقابت ان سے جو بردہ فروش ہیں! اس کا مطلب ہے تم مجھے بردہ فروش کہہ رہے ہو؟ بردہ فروش نظر آتا ہوں میں صورت سے؟" میں نے چیخ کر کہا۔

"چلاؤ مت۔ یہ صورت کون سی اصلی ہے تمہاری۔" وہ بولا۔ "اور اگر یہ کاروباری جھگڑا نہیں تھا تو پھر تم نے یہ حماقت کیوں کی؟"

"کیسی حماقت؟ میں سمجھتا ہوں، یہ خوش قسمتی ہے میری۔ مجھے فخر کرنا چاہیے اور غرور کرنا چاہیے اس بات پر کہ میں نے انسانیت فروشوں کی ایک کوشش بہرحال ناکام بنادی۔ میں ساری دنیا کی عورتوں کو نہیں بچا سکتا اور سارے بردہ فروشوں کو جہنم رسید نہیں کرسکتا لیکن مجھے بے حد خوشی ہے کہ کچھ عورتوں کی زندگی میری وجہ سے بچ گئی۔"

وہ پہلی بار مسکرایا۔ "تم ایک جذباتی احمق ہو۔ تم نے بلاوجہ ٹانگ اڑائی تھی اس معاملے میں۔ نہ تمہارے لیے کوئی فخر کی بات ہے اس میں اور نہ خوشی کی۔ تم نے کسی کی زندگی نہیں بچائی۔ وہ سب آج رات پولیس کی تحویل میں ہیں۔ کل انھیں بے سہارا عورتوں کے آشرم میں بھیج دیا جائے گا، پھر تحقیقات شروع ہوں گی اور ختم ہو جائیں گی۔ ان سب کو پولیس پھر اُنھی کے پاس پہنچا دے گی جو انھیں ایکسپورٹ کر رہے تھے کیونکہ اخلاقی طور پر پولیس اس کی پابند ہے۔"

"اخلاقی طور پر؟" میں دم بخود رہ گیا۔

"ہاں، کیونکہ اپنا حصّہ وہ پہلے ہی وصول کر چکے تھے۔ اب ان لڑکیوں کو دو دو چار چار کر کے الگ الگ جہازوں سے بھیجا جائے گا۔"

صدمے اور احساسِ شکست سے میرا دل ٹوٹنے لگا۔ "مگر اُن کے والی وارث . . . کیا وہ معلوم نہیں کریں گے . . . ؟"

"کیسے معلوم کریں گے؟"

"اخبارات میں ان کے نام، تصویریں . . . سب شائع ہونے کے بعد . . ."

اُس نے کہا۔ "تم واقعی بے وقوف ہو۔ ان میں سے نصف تو اپنی مرضی سے جا رہی تھیں۔ باقی دور دراز کے علاقوں سے لائی گئی تھیں۔ اخبار کتنے لوگ پڑھتے ہیں اور بمبئی کے اخبارات کلکتہ، آسام، بہار یا ڈھاکہ کب جاتے ہیں۔ یہ خبر بمبئی تک محدود رہے گی۔ اس کے علاوہ تصویریں صرف اُن کی شائع ہوں گی جو اپنی مرضی سے جا رہی تھیں۔ انھیں واپس لے جانے والا کوئی نہیں۔ باقی کے نام پتے شائع ہوں گے تو وہ غلط ہوں گے، کیونکہ سب معلومات پولیس ہی فراہم کرے گی۔ تفتیش کے مکمل ہونے تک اُن کے بارے میں خبریں شائع ہوتی رہیں گی کہ آج مزید چار لڑکیاں فلاں آشرم سے فرار ہوگئیں۔ آشرم کوئی جیل نہیں ہے کہ ان پر ذمّے داری عائد کی جا سکے۔ دو چار مہینے بعد نہ کوئی مدعی ہوگا نہ کوئی ملزم اور نہ گواہ۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ تم نے ایک جذباتی حماقت کی تھی۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں اپنی بات پر قائم ہوں۔ میں نے جو کچھ کیا تھا، ٹھیک کیا تھا۔ اس کے بعد کیا ہوتا ہے، اس کی مجھ پر کوئی ذمّے داری عائد نہیں ہوتی۔ میں دنیا میں اس انسان فروشی کے کاروبار کو ختم نہیں کرسکتا تو یہ میری بد قسمتی۔ میں نے فروش اور اس کے ساتھیوں کو مار دیا، بڑی نیکی کا کام کیا۔"

"یہ نیکی تم کو بہت مہنگی پڑتی۔ معلوم نہیں کیسے تم ان کی نظر میں نہیں آئے جو فوراً ہی تم کو ساحل پر تلاش کرنے چلے گئے تھے۔"

"شاید وہی نیکی میرے کام آگئی۔" میں نے کہا۔

"وہ تمہیں حاجی علی کی درگاہ پر بھی تلاش کر رہے تھے۔ تم وہاں کیوں گئے تھے؟" اس نے کہا۔

"وہاں میرے علاوہ بھی ہزاروں لوگ تھے۔ وہاں کیوں جاتے ہیں لوگ؟" میں نے کہا۔

"سوال کے جواب میں سوال مت کرو۔" اُس نے کہا۔ "وہاں دو قسم کے لوگ جاتے ہیں۔ حاجت مند یا اسمگلر . . . تم کیا ہو؟"

"نہیں . . . حاجت مند . . . کر گیا تھا اور شاید ہاں ملا"

. . . ہوتا اگر تمہارے آدمی بیچ میں نہ کود پڑتے۔" میں نے بے خیالی . . . ایک آہ کی جو میرے اندرونی دُکھ کی غمّاز تھی۔

"انھی کی وجہ سے تم بچ گئے . . ."

"میں اس جھوٹ کا مقصد نہیں سمجھ سکا۔ اگر وہ میرے . . . تھے تو انھوں نے میری جان لینے کی کوشش کیوں کی تھی؟" میں . . . مشتعل لہجے میں کہا۔ "بلاؤ اُسے جو ابھی یہاں بڑا مسکین سا . . . کھڑا ہوا تھا۔ اس خبیث کے بچّے نے مجھے تقریباً گولی مار دی تھی۔ . . . رہا تھا کہ میں تین تک گنوں گا۔ اور اس کے بعد کیا ہوا میرے . . . ساتھ؟ یہ دیکھو۔" میں نے اپنا سر جھکایا۔ سر کے پچھلے حصّے میں ایک . . . گومڑ بہت نمایاں تھا۔

"ایسا کرنا ضروری ہوگیا تھا۔ تم اُن کا پھر وہی حشر کرتے جو . . . میں کر چکے تھے۔" وہ بولا۔ "گولی مارنے کا کوئی سوال نہیں تھا۔ . . . انھوں نے خود کو بچایا اور تمہیں اٹھا لائے۔"

"وہ مجھ سے شرافت سے درخواست بھی کرسکتے تھے۔"

"نہ وہ شریف آدمی تھے اور نہ انھیں تمہاری شرافت کا یقین . . . تھا۔ کیا تم اُن کی درخواست قبول کر لیتے؟"

میں نے کہا۔ "ایمانداری کی بات یہ ہے کہ نہیں۔ ایک بار اُن . . . سے واسطہ پڑ چکا تھا۔ دوسری بار میں کیسے اُن کے ساتھ چل پڑتا خواہ . . . مجھے جنّت میں لے جانے کے لیے آتے۔ مگر انھیں کیسے معلوم . . . ہوگیا کہ میں اس وقت حاجی علی کی درگاہ پر ملوں گا؟"

"انھیں للّی نے بتادیا تھا۔" وہ بولا۔

"للّی نے . . . میں نہیں مان سکتا . . ."

"نہ مانو، میں تمہیں مجبور تو نہیں کر رہا ہوں ماننے پر لیکن . . . وہی ایک ذریعہ تھی تمہارے بارے میں معلومات حاصل . . . کرنے کا۔ تم اُسی کے ساتھ تھے۔"

ایک نئے دہشت زدہ کر دینے والے خیال نے میرے . . . ذہن کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ یہ شریف لوگ نہیں تھے اور للّی پر . . . مجھے پورا بھروسا تھا کہ وہ دغا دینے والی عورت نہیں تھی۔ اُسے . . . معلوم تھا کہ دشمن ہمارے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ اس سے ہمارے . . . بارے میں معلومات حاصل کرنا آسان کام نہیں تھا۔ انھوں نے یقیناً . . . مشکل طریقہ اختیار کیا ہوگا۔

"کیا . . . طریقہ اختیار کیا تھا انھوں نے؟" میں نے چلّا . . . کر کہا۔ "انھوں نے ضرور تشدد کیا ہوگا اس پر۔"

"کیا ہوگا۔ مجھے نہیں معلوم . . ."

اس کے لبوں سے الفاظ نکلے ہی تھے کہ میں نے ایک . . . جست لگائی اور اس کے اوپر جا گرا۔ میں نے اس کی موٹی گردن کو . . . دبوچ لیا۔

"معلوم کرو، سُور کے بچّے . . . پوچھو ان کتّوں سے کہ انھوں نے للّی کے ساتھ کیا کیا . . . ورنہ . . ."

اُس نے بڑی پھرتی سے اپنا ریوالور نکال لیا تھا۔ "ہٹ جاؤ۔ میں تم کو مارنا نہیں چاہتا۔" وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔

دو مضبوط ہاتھوں نے مجھے ایک جھٹکے سے پیچھے کھینچ لیا اور اسی صوفے پر پھینک دیا جہاں سے میں نے اشتعال کی دیوانگی میں چھلانگ لگائی تھی۔ صوفے پر گرتے ہی میں پھر اُٹھا تھا مگر مجھے اپنے مقابل وہی دونوں نظر آئے جو مجھے یہاں لائے تھے۔ ان دونوں نے ریوالور سے میرے سر اور سینے کو نشانہ بنا رکھا تھا۔

روبوٹ نے اپنی ٹائی کی ناٹ درست کی اور ریوالور جیب میں ڈال کے پھولوں بیٹھ گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

"للّی کے پاس تم دونوں گئے تھے؟"

"یس سر۔" ان دونوں نے بیک زبان کہا۔

"وہاں کیا ہوا تھا؟ تم بولو۔"

جس کی طرف اشارہ کیا گیا تھا، وہ فرفر بولنے لگا۔ "وہ پتا بتانے پر آمادہ نہ تھی۔ اس نے کہا کہ تم کس کی بات کر رہے ہو۔ میں نے کہا اُسی کی جو تمہارے شوہر کا ہم شکل تھا اور جسے تم شوہر بنانے کے لیے یہاں کھینچ لائی تھیں۔"

"میرا خون کھولنے لگا۔" "تم نے یوں نہیں کہا ہوگا۔ میں جانتا ہوں تمہارے جیسے لوگوں کو . . ."

"پہلے پوری بات سُن لو۔" روبوٹ نے کہا۔ "پھر کیا تم نے مارا اُسے؟"

"نہیں سر۔ اس کی ضرورت پیش نہیں آئی۔" وہ بولا۔ "ہم نے دوسرا طریقہ اختیار کیا۔ ہم نے کہا کہ خود کو خراب مت کرو۔ پولیس تم کو اٹھا کر لے جائے گی۔ رات بھر میں تم سے وہ دس شوہروں کے نام پتے پوچھ لیں گے۔ وہ پھر بھی خوفزدہ نہیں ہوئی اور ہم پر چلّانے لگی کہ جاؤ پولیس کے پاس اور جو تمہارا جی چاہے کرو۔ کوئی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ میں ابھی راج کو فون کرتی ہوں۔ ہم نے کہا، راج صاحب سے یہ بھی کہنا کہ نئی سمٹری (قبرستان) میں تمھارے شوہر کی قبر پر بھی پہرا لگوا دیں دن رات، سارا سال کے لیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ چور ڈاکو تمھارے شوہر کا ڈھانچا نکال کر لے جائیں۔ ڈھانچے بڑے مہنگے فروخت ہوتے ہیں۔ میڈیکل کے طالب علم خرید لیتے ہیں۔ ڈاگ فیڈ اور فاسفیٹ بنانے والے بھی لے لیتے ہیں۔ بس یہ للّی کا بریک ڈاؤن ہو گیا۔ وہ چیخنے چلّانے لگی۔ ہم کو مارنے کاٹنے دوڑی۔ لیکن ہم نے اس کو اور کچھ نہیں کہا۔ بس ایک تھپّڑ ضرور مارا تھا تاکہ وہ ہوش میں آجائے۔ ہوش میں آنے کے بعد اُس نے بتادیا کہ حاجی علی کی درگاہ پر جا کے دیکھو۔ ہم نے کہا کہ دیکھ لیتے ہیں مگر یہ جھوٹ ہوا تو ہم پھر آئیں گے۔ آج یا کل"

اکیلے ہی بعد ایک مہینے کے بعد، یہ بتانے کے لیے کہ دیدہ زدگی، قبر کھود دے گی۔ میں نے اس کا صفایا کر دیا ہے اور اس قبر میں تو اب ایک خارش زدہ کتا مرا پڑا ہے۔"

میرا دل دکھ کے احساس کی بھاری چٹان کے نیچے دب کر کراہنے لگا۔ ہم خود تو جیسے مقدر کے سکندر تھے! اپنے سبب سے تھے، شکر تھا دوستوں سے شکایت زمانہ۔ لیکن اپنی تیرہ بختی کے ساتھ ہم نے للی کی زندگی میں قدم رکھا تو اس کو بھی اندھیروں میں دھکیل دیا۔ وہ ظریف النفس اور مضبوط کردار کی عورت تھی لیکن جیسے کوئی قلعہ ناقابل تسخیر نہیں ہوتا ایسے ہی کوئی انسان ناقابل شکست نہیں ہوتا۔ کسی نہ کسی پہلو سے اس کی ذات کا حصار توڑا جا سکتا ہے، کہیں نہ کہیں کوئی مجبوری ہی اس کی کمزوری بن جاتی ہے۔ میں نے للی کو قطعی موردِ الزام نہیں سمجھا۔

"۔ ۔ ۔ اس کے بعد سب بتا دیا اس نے ۔ ۔ ۔"

یہ آخری الفاظ تھے جو میں نے ذہنی طور پر کچھ دیر کی غیر حاضری کے بعد سنے۔ درمیان میں جو کچھ اس نے کہا وہ میرے لیے اتنا اہم بھی نہ تھا۔

"اب تم مطمئن ہو؟" روبوٹ نے کہا۔

"مطمئن ۔ ۔ ۔ کیسا عجیب سوال ہے یہ۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "جو کچھ تم نے للی کے ساتھ کیا، اس پر کیا مجھے تمہارا شکر گزار ہونا چاہیے؟"

"جو کچھ تم سے کیا اس پر تم کو شکر گزار ہونا چاہیے،" وہ بولا۔ "جو کام آسانی سے ہو جائے اس کے لیے ہم مشکل راستہ نہیں چنتے۔ ایک عورت کو بلیک میل کرنا یقیناً آسان کام ہے۔" میں نے کہا۔

"ہمارے سیاسی معاملات ۔ ۔ وہی ایک ذریعہ تھی۔" وہ بولا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میری ذات سے تم کو اتنی دلچسپی کہاں ہو گئی تھی؟" میں نے کہا۔ "کہ اس کے لیے تم نے اپنے ایک آدمی کو مروایا اور پہلی ٹیم کی ناکامی کے بعد اپنے کمانڈوز کی دوسری ٹیم میرے اغوا کی مہم پر بھیجی۔ اپنا اتنا نقصان کیا؟"

"نقصان اس کی بیوقوفی کے باعث ہوا جو مارا گیا۔ گاڑی بھی اسی کی تھی،" روبوٹ بولا۔ "اگر وہ نشے میں نہ ہوتا تو خواہ مخواہ لڑنے بھڑنے سے گریز کرتا۔ پہلے تم کو میرا پیغام پہنچاتا اور تم انکار کرتے تو پھر زبردستی لاتا۔ مجھے علم ہوا ہے کہ اس نے ابتدا ہی سے غلط رویہ اختیار کیا تھا، مگر خیر ۔ ۔ ۔ وہ میرا آدمی نہیں تھا۔ ایسے کام میں کسی بھی کارکن کے سپرد کر دیتا ہوں اور یہ کارکن سیکڑوں کی تعداد میں ہیں جو کسی کے ملازم نہیں۔ جو پیسہ دے اس کا ہر کام کر سکتے ہیں۔ تمہاری ذات میں میری دلچسپی کا سبب ایک تو تمہاری نیک نامی ہے۔ تمہارے کارنامے کی شہرت تم سے پہلے مجھ تک پہنچ گئی تھی کہ کس طرح تم نے اپنے ایک ساتھی کی مدد سے فروش

جیسے بدمعاش کو مار دیا اور اس کی لانچ پر قابض ہو جانے کے بعد اسے واپس بمبئی لے آئے۔ تمہارے اس ساتھی نے کچھ نہیں کیا تھا۔ یہ تمہارا اکیلے کا کام تھا۔ تمہارے متعلق دوسری رپورٹ مجھے شام کو ملی۔ تم نے چار کا مقابلہ کیا اور ان پر غالب رہے۔ اس کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا کہ مجھے ہر قیمت پر تمہاری خدمات حاصل کرنے کی کوشش ضرور کرنی چاہیے۔"

"کس مقصد کے لیے؟"

"مجھے تم جیسے ہی کسی آدمی کی اشد ضرورت تھی اپنا پرسنل باڈی گارڈ رکھنے کے لیے،" وہ بولا۔ "اپنا ذاتی محافظ بنانے کے لیے جو ہر وقت ہر جگہ میرے ساتھ رہے۔"

"تم اتنا غیر محفوظ سمجھتے ہو خود کو؟"

"میرے دشمن بہت ہیں اور خطرناک بھی ہیں۔ اس کو بھی میں اپنے دشمنوں میں شمار کرتا ہوں جو اس لانچ سہانو متی کا مالک ہے۔ اب جو نکہ وہ تمہارا بھی دشمن ہو گیا ہے اس لیے تمہارا بھی فائدہ میرے ساتھ رہنے میں ہے۔ تم میری حفاظت کرو گے تو خود بھی میرے تحفظ میں رہو گے۔ میرے کسی خاص آدمی پر ہاتھ ڈالنا آسان نہیں۔"

میں نے دانش مندی کا تقاضا یہ سمجھا کہ اس پیشکش کو فوراً مسترد نہ کروں۔ بمبئی میں مجھے ایک آسرا للی کا تھا مگر اب تو لوٹ کر اس کے پاس کس منہ سے جاتا۔ میں خود بھی شرمسار ہوتا اور وہ بھی شرمسار کرتی۔ وقتی طور پر اس کارٹون نما باس کا خاص آدمی بن کے رہنے میں میرا ہی نہیں، سب کا فائدہ تھا۔ محسن اور غالب، نازو، گلاب رابعہ، سب مجھ سے بچھڑ چکے تھے اور انہیں تلاش کرنے کے لیے میرے وسائل نہ ہونے کے برابر تھے۔ قطع نظر اس کے کہ روبوٹ کا دھندا کیا تھا۔ اس کے دشمن کون تھے اور اس کے ذاتی محافظ کی حیثیت سے میرے فرائض کی نوعیت کیا تھی۔ میرے لیے انکار کی یوں بھی گنجائش نہ تھی کہ پھر وہ مجھے دلاور کے حوالے کر دیتا جو شومئی قسمت سے مجھے تلاش کرتا ہوا یہاں تک پہنچ گیا تھا۔ اب اس کے اور میرے درمیان ایک دیوار حائل تھی۔ اس دیوار کے پیچھے ہی میں چوہدری دلاور اینڈ کمپنی سے محفوظ تھا اور یہ شخص انسان ہی اتنا طاقتور تھا کہ دلاور سے انکار کر سکے اور اسے بتا سکے کہ جس کو تم مانگ رہے ہو وہ تو میرا خاص آدمی ہے اور یہ پاکستان نہیں ہے جہاں دلاور کی بدمعاشی کا سکہ چلتا تھا۔ یہاں ایک سے ایک بڑا بدمعاش ہے جو اس کے باپ کا بھی باپ ہے جسے ہم دادا کہلاتا ہے۔ مجھے اتنی بڑی طاقت کی پشت پناہی حاصل ہونے سے دلاور کے حوصلے یقیناً پست ہو جائیں گے۔ فوری طور پر وہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا مگر یہ مہلت میرے لیے بہت کار آمد ہو گی۔

"یہ سب سوچ کے میں نے کہا۔ "ابھی تک مجھے نہ تمہارے نام

کا پتا ہے اور نہ کام کا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اپنی جان پر کھیل کر تمہاری جان بچانے کا صلہ کیا ہو گا ۔ ۔ ۔"

"یہ سب تمہیں بتا دیا جائے گا۔"

"اس کے علاوہ ابھی تک مجھے ایک سبب معلوم ہوا ہے یعنی تم میری بہادری سے متاثر ہوئے ۔ ۔ ۔ دوسرا سبب کیا ہے؟"

"دوسرا سبب بھی تمہاری سمجھ میں آ جائے گا۔"

میں نے کہا "کیا تم نے میرے بارے میں اپنا اطمینان کر لیا ہے؟"

"ہاں، تم یہاں رہے ہو۔ تم جیسا کوئی شخص پہلے سے بمبئی میں رہتا تو یہ ناممکن تھا کہ مجھے معلوم نہ ہوتا۔ تمہارے بارے میں کوئی بھی کچھ نہیں جانتا۔ میری مراد اپنی لائن کے لوگوں سے ہے۔" اس نے کہا۔

"میرا ایک ساتھی بھی تھا جو ساحل پر تنہا رہ گیا تھا۔ وہ میرے ساتھ رہے گا۔" میں نے کہا۔

"نو پرابلم۔ اسے تلاش کر لیا جائے گا۔"

"ایسی صورت میں۔" میں نے سوچ کے کہا "میرے لیے انکار کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی۔ تم اس شخص کو جواب دے دو۔"

اس نے دائیں ہاتھ کی جانب رکھے ہوئے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا کے ایک بٹن دبایا اور کہا۔ "اس سے کہو کہ جائے اور اب نہ آئے۔ جو بات تم نے پہنچے، ہاں اس کا پتا لے لو اور اس کو سمجھا دو کہ وہ خود رابطہ قائم کرنے کی غلطی نہ کرے۔" پھر اس نے ریسیور رکھ دیا۔

"اگر اسے تمہارا نام پتا معلوم ہے تو وہ پھر آئے گا۔" میں نے کہا۔ "وہ اتنی آسانی سے پیچھا چھوڑنے والا آدمی نہیں ہے۔"

"آ کے کیا کرے گا۔ اسے ایک فرلانگ دور گیٹ پر روک لیا جائے گا۔ اسے تو میرا نام تک معلوم نہیں۔ وہ کیا تلنے گا کہ اس سے ملنا چاہتا ہے اور میں آج یہاں ہوں مگر ضروری نہیں کہ کل بھی یہاں ملوں۔ میں اپنے ایک درجن ٹھکانوں میں سے کسی بھی ٹھکانے پر ہو سکتا ہوں اور میں عام طریقے سے باہر نہیں نکلتا کہ کوئی میری گاڑی کے پیچھے لگ جائے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ میں رات کے دو بجے ہیلی کاپٹر سے نکل جاؤں یا صبح چار بجے ٹیکسی منگوا لوں۔ ہر جگہ میرے اپنے خفیہ راستے ہیں۔"

"ایسا کیا کام کرتے ہو تم کہ تمہیں اتنے سخت حفاظتی انتظامات اور ایسے خفیہ مقامات کی ضرورت پڑتی ہے؟" میں نے کہا۔

"میں اپنے کاروباری راز کسی پر ظاہر نہیں کرتا۔ تم میرے ساتھ رہو گے، عقل سے کام لو گے اور آنکھیں کھلی رکھو گے تو خود ہی سمجھ لو گے مگر یہ خیال رکھنا کہ تمہارے لب بند رہیں۔ تم کو صرف باڈی گارڈ کے فرائض سر انجام دینے ہیں۔ میں کیا کرتا ہوں اور کیوں کرتا ہوں، اس بارے میں تم نہ کسی سے پوچھو گے نہ کچھ کہو گے۔ اپنا برا بھلا

میں خوب سمجھتا ہوں اس لیے اپنے فیصلے خود ہی کرتا ہوں۔ تم کبھی مجھے کوئی مشورہ نہیں دو گے۔ معاوضہ کم نہیں، تمہاری ہر ضرورت پوری ہو گی۔ تم جو مانگو گے مل جائے گا۔ ڈیوٹی کا ٹائم بھی کوئی نہیں، جب تم کو بلایا جائے گا تم آؤ گے ورنہ جو چاہو کرو، جہاں چاہو جاؤ۔ میری طرف سے کوئی پابندی نہیں۔ رسک تمہارا اپنا۔ اب تم جاؤ۔" اس نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "رات کے گیارہ بجے ہیں، کھانا کھاؤ اور آرام کرو۔"

اس نے پھر چٹکی بجائی اور ایک دم پردے کے پیچھے سے وہ پری رو نکل آئی جو اس سے پہلے چائے لے کر آئی تھی۔

"آپ میرے ساتھ آئیں سر۔" اس نے چہرے پر سے بال ہٹا کے کہا۔

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "کم سے کم اپنا نام تو بتا دیں مجھے۔"

"تمہارے لیے میرا نام ۔ ۔ ۔ سکندر ہو گا۔" وہ بولا اور اس سے پہلے کہ میں اتنے بڑے شاک سے سنبھلتا وہ پردے کے پیچھے غائب ہو گیا۔ اس کی آواز کی بازگشت میرے کانوں سے ٹکراتی رہی ۔ ۔ ۔ سکندر ۔ ۔ ۔ سکندر ۔ ۔ ۔ تمہارے لیے میرا نام ہے سکندر ۔ ۔ ۔ شیطنی انسان ۔ ۔ ۔ روبوٹ ۔ ۔ ۔ خبیث ۔ ۔ ۔ سب جانتا تھا اور مجھے بے وقوف بنا رہا تھا۔ ٹھیک ہی تو جانتا ہو گا کیونکہ دلاور نے اسے ہر بات بتا دی ہو گی۔

اپنے کمرے میں پہنچ کے پہلی بار میں اس احساس سے بے چین تھا کہ میں کہاں بہت بڑے چکر میں پھنس گیا ہوں۔ جھوٹ، فریب اور عیاری و مکاری کی اس دنیا میں ہر قدم پر نیا شکاری نیا جال لیے بیٹھے ہیں۔ ان کے چہروں سے ان کے عزائم نہیں ظاہر ہوتے کیونکہ وہ اداکاری کے فن میں طاق ہیں۔ اصل جذبات کو چھپا سکتے ہیں اور مصنوعی شخصیت اختیار کر سکتے ہیں۔ ان کے درمیان قدر مشترک نہ مذہب ہے نہ اخلاق، نہ ان کی قومیت اور نہ انسانیت ۔ ۔ ۔ قدر مشترک صرف پیسہ ہے جس کے حصول کی خاطر وہ صرف ایک نکتے پر متفق ہیں کہ یہی اصل طاقت ہے جو کبھی ناجائز نہیں ہوتا جسے ہاتھ کا میل وہی لوگ کہتے ہیں جن کے ہاتھ خالی ہوں اور کالا دھن وہ کہتے ہیں جو مفلسی کے اندھیرے میں آنکھ کھولتے ہیں اسی میں جیتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ ساون کے اندھے کو ہرا ہرا نظر آتا ہے۔ جو سیاہ بخت ہو گا اسے تو حسن بھی کالا لگے گا حالانکہ دھن کا رنگ بلاشبہ ساری کائنات کا سب سے حسین رنگ ہے۔ سنہرا روپہلا ۔ ۔ ۔ روشن ۔ ۔ ۔ چمکتا ہوا نیلا سرخ نوٹوں جیسا ۔ ۔ ۔ ڈالروں پاؤنڈ جیسا۔

میں اس کمرے کی دیواروں کے درمیان اتنی ہی اذیت محسوس کر رہا تھا جتنی کسی جیل کی سی کلاس میں کھردرے سنگین فرش پر بیڑیوں میں جکڑا ہوا قیدی محسوس کرتا ہے حالانکہ اس شاہانہ انداز آرائش رکھنے والے بیڈ روم میں عیش و عشرت کے تمام

لوازم موجود تھے۔ مَیں تقدیر کے اس انوکھے مذاق پر بیک وقت ہنسنا اور رونا چاہتا تھا۔ میرے ذہن میں بہت سے 'اگر' تھے جو سانپوں کی طرح پھنکارتے تھے۔ اگر میں نے لائف بوٹ سے لانچ پر پہنچنے کے بعد عقل سے کام لیا ہوتا۔ اگر میں جذباتی ہو کے اپنے مقصد کو فراموش نہ کرتا۔ وقت کے تقاضوں کو قبول کرتے ہوئے تھوڑی سی بے حسی، تھوڑی سی خود غرضی اور تھوڑی سی شرمندگی کو قبول کر لیتا۔ یہ سمجھ لیتا کہ مجھے اپنی آنکھیں بند رکھتے ہوئے اس راستے سے بھٹکنا نہیں ہے جو منزل کا راستہ ہے خواہ میرے دائیں بائیں اور آگے پیچھے کچھ بھی ہو جائے۔ اگر میں بھانومتی کے 'سامانِ تجارت' کو جاننے کی کوشش ہی نہ کرتا، اگر مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ یہ بردہ فروشوں کا گروہ ہے تو میں ان کے خلاف اعلانِ جنگ نہ کرتا۔ حالانکہ یہ ناممکن سی بات تھی۔ فروش مجھے کسی بھی بحری جہاز کے سپرد کر دیتا اور میں خاموشی سے بمبئی پہنچ جاتا۔

پیڈرو نے شاید دلاور کو مطلع کر دیا تھا کہ ہم جہاز کو تباہ کر کے بمبئی پہنچنے والے ہیں چنانچہ دلاور پہلے سے ہمارے استقبال کے لیے موجود تھا۔ اگر ہم خاموشی سے پہنچتے تو وہ ہمیں تلاش کرتا رہ جاتا مگر اتنی بڑی بمبئی کی آبادی میں ہمارا سراغ نہ لگا پاتا لیکن ہم تو پہنچے پوری ہنگامہ آرائی کے بعد۔ یوں کہ بندرگاہ کے علاقے میں شور مچ گیا۔ اگر اس کے بعد بھی ہم روپوش ہو جاتے اور للّی کے ساتھ نہ جاتے تو ہمیں کوئی کیسے تلاش کرتا۔ للّی ہی ایک ذریعہ بن گئی اور اُس بدمعاش نے بڑی آسانی سے میرا سراغ لگا لیا جس نے مجھے اپنا باڈی گارڈ مقرر کیا تھا اور دلاور سیدھا اس کے پاس آ گیا۔

یہ سب جھُوٹ تھا۔ کوئی ایسا ڈراما تھا جسے میں سمجھنے سے قاصر تھا۔ میری بہادری سے متاثر ہونے والی بات فقط زیبِ داستان کے لیے تھی۔ وہ مجھ سے کچھ اور کام لے گا، یا وہ دلاور سے میرا سودا کرے گا۔ ان کے درمیان کوئی معاہدہ ہو رہا تھا یا کوئی خطرناک قسم کا گٹھ جوڑ ہونے والا تھا۔ وہ دونوں ایک ہی جیسے لوگ تھے۔ ان کے کاروبار کے اصول اور مقاصد ایک تھے، ان کے درمیان اشتراک ممکن تھا۔ روبوٹ مجھے بلیک میل کرنا چاہتا ہے یا میرے بدلے میں دلاور سے زیادہ سے زیادہ وصول کرنے کی فکر میں ہے۔ بہرصورت مَیں اس قصرِ عالیشان میں قید تھا اور اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ روبوٹ نے مجھے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا لیکن مجھے جھُوٹ کے جال میں اسیر کر لیا تھا۔ اس طرح کہ مجھے اسیری کا احساس بھی نہ ہو۔

اب حقیقی صورتِ حال یہ تھی کہ میں محسن اور غالب سے بچھڑ چکا تھا۔ رابعہ کا صرف تصوّر کر سکتا تھا۔ وہ میرے لتنے قریب آ چکی تھی کہ میں اس کی آواز سن سکتا تھا اور پھر میں خود کسی کو کچھ بتائے بغیر غائب ہو گیا۔ اب کسی کو معلوم نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں اور میرے پاس ان سے پھر رابطہ قائم کرنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ بے شک رابطے کی ایک جگہ تو للّی کا گھر ہی تھا۔ دوسری جگہ حاجی صاحب کا جُوس سینٹر تھا مگر وہاں میرا پہنچنا ایک ہی صورت میں ممکن تھا کہ مَیں اس محل کی قید سے فرار ہو جاؤں۔ یہ کام اتنا ہی مشکل تھا جتنا میرے ساتھیوں میں سے کسی کا اندر پہنچ جانا۔ معلوم نہیں بعد میں ان سب پر کیا بیتی۔ . . کہیں وہ بھی . . .

اچانک مجھے ایک اور خیال آیا۔ روبوٹ کے کہنے کے مطابق اس کے آدمی للّی سے میرے بارے میں معلومات حاصل کر کے حاجی علی کی درگاہ پہنچے تھے۔ دلاور کے آدمی وہاں کیسے پہنچے؟ للّی نے تو زیادہ سے زیادہ میرے اور غالب کے بارے میں بتایا ہو گا۔ وہ محسن، نازو اور گل سے تو واقف ہی نہیں تھی۔ لیکن دلاور کے آدمی گل کے سوا سب کو پہچانتے ہوں گے۔ پھر کیا انھوں نے باقی لوگوں کو چھوڑ دیا ہو گا؟ گل شاید محفوظ رہی ہو، کیونکہ وہ ساحل پر موجود نہ تھی مگر باقی سب پر کیا بیتی؟ جو مجھے گرفتار نہ کر سکے تھے، کیا وہ ناکام لوٹ گئے ہوں گے؟ نہیں، انھوں نے تلاش جاری رکھی ہو گی اور اس وقت جب کہ زائرین بھی بہت کم رہ گئے تھے، رابعہ کے ساتھ محسن اور غالب کے ساتھ نازو انھیں ضرور مل گئے ہوں گے۔ پھر کیا ہوا؟ کیا ان کے درمیان مقابلہ ہوا؟ بلا مقابلہ ہتھیار ڈالنے والے تو وہ لوگ بھی نہیں تھے۔

اب جس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا وہ ایک ہی تھا کہ دلاور کے آدمی میری تلاش میں وہاں کیسے پہنچ گئے؟ کیا انھوں نے بھی للّی سے ہی سب کچھ معلوم کیا ہو گا! اُس کے سوا تو کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ ہم یہاں مل سکتے ہیں اور للّی کی کار کے نمبر نے اُن کا مسئلہ حل کر دیا ہو گا۔ یہ ہماری خوش فہمی تھی کہ گاڑی کی رجسٹریشن اُس کے شوہر کے نام پر ہے جو مر چکا ہے اور پتا بھی پُرانا ہے اس لیے للّی تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ للّی فیرونڈا اتنی گمنام بھی نہ تھی۔ اس کے پاس ٹیلی فون بھی تھا اور ٹیلی فون کا نمبر ڈائریکٹری میں ہو گا۔ نمبر کے ساتھ اس کا پورا پتا درج ہو گا۔

مَیں ٹہلتے ٹہلتے اور سوچتے سوچتے تھک چکا تھا مگر [illegible] تک کچھ نہیں سمجھ پایا تھا کہ میں کہاں ہوں کس کے ساتھ ہوں اور میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ مجھے اپنے نئے پُراسرار 'باس' کے باڈی گارڈ کی حیثیت سے کیا کرنا ہو گا اور اگر دلاور کے ساتھ جانا پڑا تو کیا ہو گا؟ میری حالت اس راہ گم کردہ مسافر کی سی تھی جو پُرپیچ گلیوں میں بھٹک رہا ہو مگر ہر گلی آگے جا کے بند ہو جاتی ہو۔ میرے سب خیالوں کے راستے بھی ایک جگہ پہنچ کے خلا میں گم ہو جاتے تھے۔

بالآخر میں نے طے کیا کہ فوری طور پر میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ میری کوششوں کی کامیابی یا ناکامی کا انحصار آنے والے وقت کے فیصلوں پر ہو گا۔ بھوک اور جسمانی تکان بہرحال ذہن کو متاثر کرتی ہے۔ نہا دھو کر پیٹ بھرنے اور سکون سے رات بسر ہونے کے بعد صبح یقیناً میری قوّتِ فیصلہ بہتر ہو گی اور میں جسمانی طور پر بھی حالات کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جاؤں گا۔ یہی سوچ کے میں نے باتھ روم کا رُخ کیا۔

ایسے باتھ روم مَیں نے فلموں میں دیکھے تھے۔ بادشاہوں کے محلات تو اب تاریخی عمارات بن چکے تھے مگر جدید دنیا کے دولت مندوں کی شان و شوکت کے افسانے عام تھے۔ یہ بھی ایک ایسا ہی باتھ روم تھا جس کی تزئین و آرائش پر بلا مبالغہ لاکھوں روپیہ صرف کیا گیا ہو گا۔ اس وقت مجھے خاصی خفت اٹھانی پڑی جب میں نے ایک سوئچ دبانے کا تجربہ کیا۔ سوئچ پر 'مددگار' لکھا ہوا تھا۔ چند سیکنڈ کے بعد وہی لڑکی اندر آ گئی جو مجھے اس خواب گاہ تک لائی تھی اور اس نے بڑی دلنشیں مسکراہٹ کے ساتھ جب مجھ غسل میں میری مدد کا ارادہ ظاہر کیا تو مَیں گھبرا گیا۔ اپنی اماں کے ہاتھوں کے سوا جنھوں نے مجھے نو دس سال کی عمر تک نہلایا تھا، آج تک میں نے اپنے ہاتھوں سے خود ہی غسل کیا تھا۔

"کیا بات ہے، اندر گھسی چلی آ رہی ہو!" میں نے خفگی کا اظہار کرنے کی کوشش کی۔ "عجیب بے شرم لڑکی ہو۔ دیکھتیں نہیں کہ میں نہا رہا ہوں۔"

"لیکن آپ نے ہی مجھے طلب کیا تھا سر۔" وہ میری گھبراہٹ سے لُطف اندوز ہوتے ہوئے بولی۔ "آپ کی مدد کرنا میرے فرائض میں شامل ہے۔"

"بھاڑ میں گئے فرائض۔ تم جاؤ یہاں سے۔" مَیں نے ٹب میں غرق ہو کے اپنی ستر پوشی کا اہتمام کیا۔

'لاحول ولا قوۃ' مَیں نے اس حسین مددگار کے مایوس لوٹ جانے کے بعد کہا۔ یہ انجام ہوتا ہے سوچے سمجھے بغیر کچھ کرنے کا۔ جب اس سوئچ پر صاف لکھا ہوا تھا 'مددگار'، تو پھر اُسے دبا کر پنگا لینے کی کیا ضرورت تھی۔ اس عیّاشانہ باتھ میں تو ایسی ہی مددگار آ سکتی تھی۔ یہ سب دولت مندوں کے عیش پرستی کے انداز ہیں جن میں بنیادی ضرورت کنیزانِ خوبرو کو سمجھا جاتا ہے۔ نہانا تو صرف بہانہ ہوتا ہے۔ اس خیال کی تصدیق میرے چاروں طرف دیواروں پر محیط آئینے بھی کرتے تھے، جس میں دو ہوں تو آٹھ نظر آتے ہیں اور اکیلا آدمی بھی ایک حمام والے محاورے پر غور کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔

آدھے گھنٹے تک میں نے اسٹیم باتھ لیا اور جسم کی ساری تھکن کو خوشبودار جھاگ سے بھرے ہوئے گرم پانی کے ٹب میں دھو ڈالا۔ ڈریسنگ روم میں ہر سائز اور ہر ضرورت کے لیے مردانہ اور زنانہ کپڑے موجود تھے۔ مَیں نے سمندر کے پانی میں بھیگے ہوئے کپڑے وہیں چھوڑے۔ پہلے اپنے لیے شب خوابی کا [illegible] لباس منتخب کیا مگر پھر ارادہ بدل دیا۔ بفرضِ محال مجھے یہاں سے نکلنے کا موقع ملا تو یہ نائٹ سوٹ بدلنے میں وقت ضائع ہو گا۔

ایک آدھی آستین والی زرد قمیص اور گہرے پتلون مجھے فٹ آ گئی۔ دو خانوں میں بھرے ہوئے جوتوں میں سے کاف لیدر کے دو جوڑے بہت قیمتی تھے مگر مَیں نے جاگنگ شوز کا انتخاب کیا جو دوڑ لگانے کے لیے بہترین ہوتے ہیں۔

باہر نکلتے ہی مجھے ایک اور صدمے سے دوچار ہونا پڑا۔ کمرے میں ایک ہی کنگ سائز بیڈ تھا۔ آٹھ فٹ لمبا اور اتنا ہی چوڑا۔ اس کے ساتھ ہی گول کشمیری قالین پر اخروٹ کی لکڑی اور ہاتھی دانت کے کام والی گول سینٹر ٹیبل تھی اور ٹیبل کے گرد چار کشن چیئرز تھیں۔ ان میں سے ایک کرسی پر ایک لڑکی 'فلم فیئر' کا تازہ شمارہ دیکھ رہی تھی۔

اُس کا چہرہ رسالے کے پیچھے تھا۔ ڈریسنگ روم کا دروازہ کھلا تو اُس نے رسالہ ہٹایا اور میں نے اپنے سامنے ایک آشنا صورت کو دیکھا۔ یہ اُس نرس کی معاون و مددگار بنی تھی جس نے اپنے حُسنِ انتظام سے سب عورتوں کو کنٹرول کیا تھا۔ لانچ پر میں نے اُسے بہت مستعد دیکھا تھا اور میں اس سے متاثر بھی ہوا تھا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ وہاں وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن مجھے اس سے براہِ راست بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔

"تم ؟ یہاں ؟" میں بھونچکا رہ گیا۔

وہ آہستہ سے مسکرائی اور اُس نے رسالہ پیچھے رکھ دیا۔ "اِس میں پریشانی کی کون سی بات ہے ؟"

"مَیں تو سمجھا تھا کہ وہ بھیانک خواب ختم ہو گیا لیکن ابھی تک مَیں اسی لانچ پر ہوں۔" مَیں نے افسوس سے سر ہلایا۔

وہ ہنس پڑی۔ "دیکھ لو کہیں یہ تو خواب نہیں ہے۔" اُس نے ہاتھ بڑھا کے میرے بازو پر چٹکی لی۔

مَیں نے بازو پر نمودار ہو جانے والے لال نشان کو دیکھا جو آہستہ آہستہ ختم ہو رہا تھا۔ "خواب میں تم نے چٹکی لینے کے بہانے مجھے نوچ لیا ہے۔ بہت تیز ناخن ہیں تمھارے۔"

وہ پھر ہنسی اور میں اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ وہ اب ایک بالکل مختلف لڑکی تھی۔ اس نے میرون کلر کے جارجٹ کی ساری باندھ رکھی تھی اور ایسا بلاؤز پہن رکھا تھا جو کسی ماہرِ فن درزی نے اس کے جسم کی ایک ایک شکن، قوس اور خم کو ذہن میں رکھ کے سیا تھا اور اس کے بھرپور بدن کو ریشمی کپڑے کے سانچے میں ڈھال دیا تھا۔

"مَیں تمھارا شکریہ ادا کرنے آئی ہوں کہ تم نے مجھے بچا لیا۔" وہ پلکیں جھکا کے بولی۔ "ورنہ معلوم نہیں کیا ہوتا۔"

"جو سب کے ساتھ ہوتا۔" مَیں نے کہا۔ "اور مجھے تو بتایا گیا ہے کہ مَیں نے جھک ماری۔ غلطی کی ٹانگ اڑا کے، ہو گا اب بھی وہی جو پہلے ہونا تھا ان سب کے ساتھ۔"

"میں صرف اپنی بات کر رہی ہوں۔" وہ بولی۔ "دوسروں کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ لیکن جو کچھ تم نے کیا اسے غلطی نہیں کہا جا سکتا۔ میرے جیسی اور بھی تھیں جن کو ان کی مرضی کے خلاف اغوا کر کے لے جایا جا رہا تھا۔"

"مجھے تو یہ سب کچھ غیر حقیقی لگتا ہے۔ میرا اس لانچ پر پہنچنا پھر یہاں لایا جانا، اور اب تم سے ملنا۔" میں نے حاجی علی کی درگاہ تک پہنچنے کے واقعات کو عملاً گول کر دیا۔

"اس میں کیا غیر حقیقی ہے۔ میں پھر تمہارے سامنے ہوں۔"

"لیکن کیسے؟ تم یہاں کیسے آئیں، کس نے بتایا تمہیں کہ میں اس وقت کہاں ملوں گا؟" میں نے کہا۔

"چلو پہلے کچھ کھا پی لو۔" اس نے اخروٹ کی لکڑی سے بنی ہوئی نقش و نگار والی ٹیبل کی دو سائیڈز کو کھول کر پھیلا دیا۔ اس کے قریب ہی کھڑی ہوئی ٹرالی کے اوپر والے شیلف میں تین ڈونگے ڈھکے ہوئے رکھے تھے۔ نیچے والے شیلف میں چائے یا کافی کا سامان تھا۔

"میری بھوک ایک دم اڑ گئی ہے، تمہیں دیکھ کر۔" میں نے کہا۔ "اسے ابتدائے عشق کی تمہید مت سمجھنا۔"

"کیوں؟ میں اس قابل نہیں ہوں کیا؟" وہ مسکرائی۔

"میں اس قابل نہیں ہوں مس . . ." میں نے نفی میں سر ہلایا۔

"کملا . . . کملا تریویدی . . ." وہ بولی اور میں نے اس کے شانوں پر پھیلے ہوئے بالوں میں چمپا کے تازہ پھولوں کی خوشبو کو سونگھا۔ چمپا کے ایک ہار نے سامنے سے ان بالوں کو روک لیا تھا۔ کملا کا رنگ سانولا تھا مگر جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا تو وہ ایک پریشان حال، پژمردہ اور بے جان سی لڑکی تھی۔ یہاں وہ بہت نکھری ہوئی اور اجلی اجلی لگ رہی تھی۔ اس کا سانولا رنگ پرکشش گندمی ہو گیا تھا اور اس کے چہرے کی شادابی نے اس کے حسن کو جلا بخش دی تھی۔

"میں صرف چائے پیوں گا اور بسکٹ بھی کھا لوں گا تمہارے اصرار پر۔" میں نے کہا۔ "لیکن مس کملا تریویدی! کیا تم مجھے بتا سکتی ہو کہ یہ سب کیا ہے؟ میں کس طلسم خانے میں ہوں؟ میرے ساتھ پیش آنے والے واقعات ایسا گورکھ دھندا ہیں جسے سمجھنے کی کوشش میں میرا دماغ خراب ہونے لگا ہے۔ سب سے پہلے تو مجھے یہ بتاؤ کہ تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

"دیکھتے نہیں، چائے بنا رہی ہوں تمہارے لیے۔" وہ بولی۔

میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ "کملا دیوی! میں نے تم کو اس لانچ پر دیکھا تھا۔ اب اچانک آدھی رات کو تم یہاں کیسے نازل ہو گئیں؟"

"نازل ہونا کیا معنی . . . میں رہتی ہوں یہاں۔ نہیں؟"

"جتنی تمہارا دل چاہے ڈال دو اور پھر اپنی بات کا مطلب سمجھاؤ۔ کیا تم بھی اس چھوٹے موٹے گنجے مطلبی انسان کی ایک کنیز ہو۔ کیا تم کو بھی میری خدمت پر مامور کیا گیا ہے؟ اس کی طرح جو باتھ روم میں آ گئی تھی مجھے نہلانے کے لیے . . . جدا ہو گئی . . ."

وہ ہنسی۔ "بن بلائے تو کوئی نہیں آتا۔"

"تم جو آئی ہو۔" میں نے کہا۔ "تم کون ہو آخر؟"

"میں اس کی بیٹی ہوں جسے تم نے چھوٹا موٹا گنجا مشینی انسان کہا ہے، اس کی سب سے چھوٹی اور اکلوتی بیٹی۔"

"اوہ!" میں نے سر کھجا کے کہا۔ "میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔ ویسے میرے لیے بہت مشکل ہے اس بات کا یقین کرنا کہ وہ تمہارا باپ ہو سکتا ہے۔ کیا تمہاری ماں بہت حسین تھی؟"

"ہاں۔" اس نے چائے بنا کے کپ میرے سامنے رکھ دیا۔ "وہ واقعی بہت حسین تھی۔ اتنی حسین نہ ہوتی تو مسٹر تریویدی کی بیوی کیسے بنتی۔ سیکرٹری بنی رہتی۔ وہ حسین ہی نہیں، انتہائی ذہین بھی تھی۔ چنانچہ اس نے تریویدی جیسے جن کو قابو میں کر لیا۔ اس کی پہلی بیوی کا پتا صاف کیا اور وہ سب کچھ اپنے قبضے میں کر لیا جو تریویدی کا تھا۔" اس نے ایک سرد آہ بھری۔ "اور بس . . ."

"بس کیا؟"

"بس یہ کہ جو اس نے ایک عورت کے ساتھ کیا تھا وہ دوسری عورت نے میری ماں کے ساتھ کیا۔ یہ سلسلہ ابھی جاری ہے لیکن میں محفوظ ہوں۔ پہلی بیوی کے دو بیٹے تھے۔ وہ کبھی کے گئے تھے جو میرے سوتیلے بھائی ہیں مگر سگے بھائیوں سے اچھے ہیں۔"

"مسٹر تریویدی اور کیا کرتے ہیں بیویاں بدلنے کے علاوہ؟ پہلی بیویوں کا وہ کیا کرتے ہیں؟ بائی دی وے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔" وہ خلا میں دیکھتے ہوئے بولی۔ "شاید کسی کو کبھی معلوم نہیں ہوگا۔ وہ کام کیا کرتے ہیں، یہ جاننے کی کوشش مت کرنا۔ کوئی فائدہ نہیں ہوگا تمہیں۔"

"نقصان کیا ہوگا؟"

"نقصان اٹھانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ آج رات تم یہاں ہو، کل کہاں جاؤ گے اس کی فکر کرو۔"

"کیا میں اپنی مرضی سے کہیں جا سکتا ہوں؟" میں نے مایوسی سے کہا۔ "میرے چاروں طرف شکاری ہیں، میری جان کے طلبگار۔ اگر یہ میرے اختیار کی بات ہوتی تو میں رات بھی یہاں نہ گزارتا۔"

"اچھا، چائے پی لو، پھر چلتے ہیں۔" اس نے کہا۔

چائے کا کپ میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ "کیا . . . یہ ممکن ہے؟"

اس نے حیرانی سے نیچے پڑے ہوئے کپ کو دیکھا۔

"جب میں نے تمہیں لانچ پر دیکھا تھا تو تم بہت مختلف آدمی تھے۔ دلاوری، مصائب اور حیرت انگیز حوصلہ رکھنے والے۔ اب کیا ہو گیا ہے تم کو؟"

"آئی ایم سوری . . . ایک کپ چائے اور بنا دو مجھے۔" میں نے کہا اور ایک گہری سانس لے کر اپنے آپ کو پرسکون رکھنے کی کوشش کی۔ "دراصل تمہارا یوں آنا اور پھر یہ کہنا کہ میں کہیں بھی جانے کے لیے آزاد ہوں، یہ سب میرے لیے انتہائی غیر متوقع اور بے حد ڈرامائی ہے . . . میں بے حد پریشان تھا اور بہت مایوس تھا۔ تمہارے ڈیڈی نے جو باتیں کی تھیں، بہت . . ."

"وہ سب میں نے سن لی ہیں۔" وہ بولی۔

"کمال کی لڑکی ہو تم بھی۔ اپنے باپ سے بھی دو ہاتھ آگے۔" میں نے کہا۔ "تم نے کہاں سے سنی وہ سب گفتگو؟"

"یہاں جو کچھ کہا جاتا ہے، کسی بھی جگہ وہ سنا جا سکتا ہے۔ دیواروں کے کان ہوتے ہیں نا۔ یہاں بھی ہیں۔ دیواروں کے اندر اور چھت میں خفیہ مائیکرو فون نصب ہیں۔ اندر ہی اندر تاروں کا ایک جال سا پھیلا ہوا ہے اور اس پیچیدہ نظام کی مدد سے کوئی شخص جو اس نظام کو سمجھتا ہو، سارے ٹیپ سن سکتا ہے۔ یہ دیکھ سکتا ہے کہ کہاں پر کیا ہو رہا ہے۔ اندر باہر ہر جگہ کیمرے نصب ہیں لیکن دیکھنے اور سننے کے لیے ڈیڈی کے کمرے میں جانا پڑتا ہے جہاں پر کوئی نہیں جا سکتا۔"

"مگر تم جا سکتی ہو؟"

"میں پرندہ تو نہیں ہوں نا۔ بیٹی ہوں ان کی۔" وہ ہنس پڑی۔ "کبھی کبھی میں چھپ کر جاتی ہوں، بہانے بہانے۔ ڈیڈی سمجھتے ہیں میں بہت بھولی بلکہ احمق ہوں۔ مجھے کچھ معلوم نہیں ہے اور میں ان کے چکروں کو سمجھ ہی نہیں سکتی۔ عموماً والدین اسی غلط فہمی میں مارے جاتے ہیں کہ بچوں کو کیا پتا۔ آخر ہم ان کے باپ ہیں مگر ہوتا الٹا ہے۔ بچے بالآخر باپ بن کے دکھاتے ہیں۔ ہر نسل اپنی پچھلی نسل سے بہت آگے رہتی ہے۔ میں ان کو منع تو نہیں کر سکتی کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں، کیوں کر رہے ہیں اور اب کیا ضرورت ہے جبکہ اتنی دولت کے انبار لگ چکے ہیں مگر میں سب جانتی ہوں کہ یہ دولت کہاں سے آتی ہے اور کیسے آتی ہے۔ میں بھگوان سے پرارتھنا کرتی رہتی ہوں کہ ان کی رکھشا کریں۔"

"کیا بھگوان ایسے لوگوں کی رکھشا کرتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"معلوم نہیں، یہ بھگوان ہی جانیں۔" وہ گڑگڑا کے بولی۔ "پرارتھنا سے دل کو شانتی تو مل جاتی ہے۔ میں نے تم کو دیکھ بھی لیا تھا۔ اس وقت میں ڈیڈی کے کمرے میں تھی۔ ان کے بیڈ کے سرہانے ایک کیبنٹ ہے۔ اس کی خاص چابی ہے جو صرف ڈیڈی کے پاس رہتی ہے مگر میں نے ایک دن اس کی ڈپلی کیٹ بنوا لی تھی۔"

"اگر ڈیڈی اچانک آ جاتے تو کیا ہوتا؟"

"اچانک وہ کیسے آ سکتے تھے؟ جیسے ہی وہ اٹھتے میں دیکھ لیتی یا ان کی باتوں سے اندازہ کر لیتی کہ اب وہ آنے والے ہیں۔ میں کیبنٹ بند کر کے خاموشی سے باہر . . . کیبنٹ خود لاک ہو جاتا ہے۔"

"اور یہ سب گفتگو جو تم اس وقت کر رہی ہو، کیا یہ تمہارے ڈیڈی نہیں سنیں گے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا اور بیڈ کے سرہانے کی طرف لگے ہوئے سوئچ بورڈ کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ دونوں سوئچ آف ہیں۔ ایک سے کیمرہ آن ہوتا ہے۔" اس نے چھت سے آویزاں فانوس کی طرف اشارہ کیا۔ "اور دوسرے سے مائیکرو فون۔"

میں اسے حیرانی سے دیکھتا رہا۔ "اور فرض کرو ڈیڈی تمہیں دیکھنے کے لیے تمہارے کمرے میں چلے جاتے ہیں؟"

"اول تو یہ ممکن نہیں۔ ڈیڈی سو رہے ہیں۔ ان کے خراٹوں کی آواز سنو گے؟" اس نے ایک سوئچ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"نہیں نہیں، رہنے دو۔ اگر وہ اتنی اونچی آواز میں سوتے ہیں تو اچھی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے اب یہ بتاؤ کہ ان کی اور میری گفتگو سن کے تم نے کیا نتیجہ نکالا تھا؟ یقیناً تم کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ عین اسی وقت ایک اور شکاری بھی یہاں موجود تھا جو مجھے اپنا شکار سمجھ کے لے جانا چاہتا تھا۔"

"ہاں، تم چوہدری دلاور کی بات کر رہے ہو نا؟"

میں پھر بھونچکا رہ گیا۔ "تم بھی جانتی ہو اس کا نام؟"

"میں سب جانتی ہوں۔" اس نے بڑے فخر اور مسرت سے اعلان کیا۔ "جو کچھ یہاں ہوتا ہے۔"

"پھر یہ بتاؤ کہ میرا کیا ہوگا؟ تمہارے ڈیڈی کا رویہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔" میں نے کہا۔ "وہ کیا کریں گے آخر؟ مجھے اپنے ساتھ باڈی گارڈ بنا کے رکھیں گے۔"

"باڈی گارڈ۔" وہ ہنسی۔ "ان کو کسی باڈی گارڈ کی کبھی ضرورت نہیں پڑی۔ وہ تو بس تم کو مطمئن کرنے کے لیے تھا تاکہ تم کسی قسم کی گڑبڑ نہ کرو۔"

"کیا چوہدری دلاور نے انہیں میرے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ تم نے تو سنا ہوگا؟"

"ہاں، اس نے نام بتلایا تھا تمہارا اور تمہارے چند ساتھیوں کا۔ یہ کہا تھا کہ تم نے کاروبار میں اس کا بیڑا غرق کر دیا ہے۔ کل ہی تم نے اس کا کوئی جہاز ڈبو دیا جس پر لاکھوں کا سامان تجارت تھا۔ جہاز سمیت سب کچھ تباہ ہونے سے اس کو کروڑوں کا نقصان ہوا ہے۔ وہ ہر قیمت پر تمہیں حاصل کرنا چاہتا تھا۔"

"قیمت کیا لگائی تھی اس نے میری؟"

"وہ نقد بھی دینے کو تیار تھا مگر ڈیڈی اس کے ساتھ بزنس

پارٹنر بننے کو ترجیح دے رہے تھے۔" کملا نے کہا۔ "اُس نے اپنے کاروبار میں ڈیڈی کو برابر کا شریک بنانے کی پیش کش کی تھی۔ لیکن تم سے بات کرنے کے بعد ڈیڈی شک میں پڑ گئے۔ تم نے کہا تھا کہ یہ شخص پہلے ہی اپنے دو بزنس پارٹنرز کو ٹھکانے لگا چکا ہے جس میں ایک تمھارے پتا جی تھے۔ ایسے شخص کا بزنس پارٹنر بننے میں خطرہ تھا۔ ظاہر ہے ڈیڈی سمجھے سوچے بغیر فیصلہ نہیں کر سکتے تھے۔ انھوں نے دلاور کو ٹال دیا کہ میں عجلت میں فیصلہ نہیں کرنا چاہتا۔ پھر جب وہ چلا گیا تو میں نے ڈیڈی کو پکڑ لیا کہ یہ آپ کیا کر رہے ہیں، جس شخص نے میری زندگی بچائی اُس کے احسان کا یہ بدلہ دیں گے؟ ڈیڈی نے کہا کہ اس کے احسان کو میں نہیں مانتا۔ ہاں اگر میں اُسے بھیجتا کہ جاؤ فلاں لانچ پر سے کملا کو چھڑا لاؤ اور وہ تمھیں لے آتا تو احسان مجھ پر ہوتا۔ یہ تو اُس نے جو کچھ کیا تھا اپنے لیے کیا تھا۔ ڈیڈی کی اس بات پر میرا بہت جھگڑا ہوا اُن سے کہ یہ تو آپ جان بوجھ کے خود کو بچا رہے ہیں ورنہ احسان تو ہے۔ آخر کس کی وجہ سے میں واپس آئی اور وہ شخص اگر اپنی جان پر کھیل کے بھیا نوستی کو واپس نہ لاتا تو میں کہاں جاتی؟ کچھ اندازہ ہے آپ کو کہ مجھے کون خریدتا اور میں کس کے حرم کی زینت بنتی؟ کیا آپ کے سارے چمچے، آپ کی ساری دولت اور اثر و رسوخ، سب مجھے تلاش کرنے میں کام آ سکتے تھے؟ ... کہاں سے واپس لاتے آپ مجھے ..."

"ایک بات بتاؤ۔" میں نے درمیان میں اس کی بات کاٹ کے کہا۔ "آخر تمھارے ڈیڈی جیسے شخص کی بیٹی کو اغوا کر کے لے جانے کی ہمت کس نے کی؟"

"ان کے دشمن بھی بہت ہیں اور سب کمینے ہیں۔ چھپ کر وار کرنے والے۔ بھلا لڑکیوں کو اٹھانا بھی کوئی بدمعاشی ہے؟"

"تمھارے ڈیڈی ایسے نہیں ہیں؟"

اُس نے کچھ تامل کے بعد کہا۔ "اب نہیں ہیں۔"

"کیا اس کا مطلب ہے کہ پہلے تھے؟" میں نے کہا۔

اُس نے نظر جھکالی۔ "ہاں، جو کچھ میں نے بھگتا، ڈیڈی کے اعمال کا ہی خمیازہ تھا۔ کل انھوں نے کسی کی بیٹی اٹھائی ہوگی، وہ وقت گزر گیا اور میں جوان ہوگئی۔ کوئی انتظار کرتا رہا مناسب وقت کا۔ پھر کفارہ میں نے ادا کیا۔ کیسی عجیب بات ہے۔ جرم باپ کرتے ہیں، سزا اولاد کو ملتی ہے۔ مجھے بھی ملی تو قصور کس کا تھا؟"

"کیا تمھارے ڈیڈی جانتے ہیں اُسے؟"

"اب جان گئے ہیں۔" وہ بولی۔ "میں نے کہا کہ آپ دشمنوں کے بجائے محسنوں کو سزا دیں گے۔ میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گی اور اگر ایسا ہوا تو سوگند ہے مجھے اپنی ماتا کی، میں خودکشی کر لوں گی۔ بس اس کے بعد ڈیڈی کا حوصلہ جواب دے گیا۔ وہ شراب کے نشے میں تھے۔ انھوں نے مجھے گالیاں دیں کہ جا، تو بھی چلی جا اپنے یار کے ساتھ۔ دفع ہو جاؤ دونوں۔ میں دونوں کی صورت نہیں دیکھوں گا دوبارہ۔ مگر یہ سب نشے کی بات تھی۔ اصل بات یہ تھی کہ انھوں نے تم کو میرے حوالے کر دیا تھا۔"

میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا جس نے مجھے ایک نیکی کا صلہ عطا کرنے میں دیر نہیں کی۔

"گویا میں بال بال بچ گیا۔" میں نے کہا۔

"ہاں، دلاور کی قید میں جلنے سے تو بچ گئے۔" وہ شوخی سے مسکرا کے بولی۔ "مگر اب میری قید میں ہو۔ جیسے سزائے موت ہو جائے اُس کی رحم کی درخواست پر کیا فیصلہ ہوتا ہے؟"

میرے کان کھڑے ہوئے۔ "کیا فیصلہ ہوتا ہے؟"

"سزائے موت کو عمر قید میں بدل دیا جاتا ہے۔" وہ بولی۔ "تم کو عمر قید کاٹنا ہوگی اب ... میرے ساتھ۔"

میرا دل ڈوبنے لگا۔ "لیکن ... تم نے تو کہا تھا ..."

"میں نے کہا تھا کہ چائے پی لو، پھر چلتے ہیں۔" وہ بولی۔ "یہی کہا تھا نا؟"

"مگر ... تمھارے ساتھ ..."

"اکیلے جا سکتے ہو تم؟ ذرا جا کے دکھاؤ۔" وہ ہنسی۔ "باہر نکلنا تو دور کی بات ہے، اس کمرے سے باہر کہاں تک جا سکتے ہو۔ کوشش کر دو۔"

"تم میرے ساتھ کہاں تک جاؤ گی؟" میں نے دل کو مضبوط کر کے کہا۔

"جہاں تک تم لے چلو گے۔" وہ بولی۔ "یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ ہم میں سے کوئی بھی اکیلا نہیں رہ سکتا۔ نہ میں نہ تم۔ شرط یہی ہے ..."

"میں اس شرط کو نہیں مان سکتا۔ میں رہ سکتا ہوں تمھارے بغیر بھی۔" میں نے بے رحمی سے کہا۔

"لیکن میں بہرحال نہیں رہ سکتی۔" اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "یہ میں نے ڈیڈی کو بھی بتا دیا تھا۔"

"کیا بتا دیا تھا۔ تمھارا دماغ ..."

"دماغ تو اُسی وقت خراب ہو گیا تھا جب میں نے تمھیں دیکھا تھا لیکن میں اُس وقت مجبور تھی۔ تمھیں حاصل نہیں کر سکتی تھی۔ اب تم مجبور ہو ..."

"میں بالکل مجبور نہیں ہوں۔ یہ خیال نکال دو اپنے دماغ سے کملا دیوی کہ تم مجھے عمر بھر کے لیے قید کر سکتی ہو۔" میں نے کہا۔ "ناممکن ہے یہ۔"

"کیوں ناممکن ہے یہ؟"

"اس لیے ... کہ تم ہندو ہو اور بے شک پاسپورٹ پر میرا نام امیر چند ولد دمڑی لال لکھا ہوا ہے لیکن درحقیقت میں سکندر بخت ہوں، مرحوم وزیر خاں کا بیٹا۔ میں ایک مسلمان ہوں۔"

"پھر کیا ہوا، عشق کا کون سا مذہب ہوتا ہے۔ نرگس نے سنیل دت سے شادی کی تھی یا نہیں اور مدھوبالا نے جس کا اصل نام ممتاز بیگم تھا کشور کمار سے، مینا کماری نے کمال امروہوی سے ..."

"بس بس، یہ فلمی دنیا کے کیس ہیں اور حقیقی دنیا میں بھی ایسے کیس ہیں تو مجھے کیا۔" میں نے کہا۔ "جس کام کو تم آسان سمجھتی ہو وہ میرے لیے ناممکن ہے۔"

"پریشان کیوں ہوتے ہو۔ میں مسلمان ہو جاؤں گی، پھر تو کوئی اعتراض کی بات نہیں رہے گی نا۔"

میں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ "کملا! خدا کے لیے سمجھنے کی کوشش کرو، زندگی بھر ساتھ نبھانے کے فیصلے یوں نہیں کیے جاتے اور جو ایسے فیصلے کرتے ہیں وہ تمام عمر پچھتاتے ہیں۔"

"میں نہیں پچھتاؤں گی۔"

"کملا! میں کسی اور کو چاہتا ہوں۔ میں تم سے محبت نہیں کر سکتا۔" میں نے رو دینے کے انداز میں کہا۔ "پھر شادی کا کیا سوال؟"

"تم مسلمان تو دو شادیاں بھی کر لیتے ہو ..."

"لاحول ولاقوۃ۔ کیا غلط پروپیگنڈا ہے یہ بھی۔ ارے بابا وہ کوئی فرض نہیں ہے۔ مجبوری کے تحت انتہائی سخت شرائط کے ساتھ مخصوص حالات میں اس کی اجازت ہے۔" میں نے مشتعل ہو کے کہا۔ "میں محبت کی بات کر رہا تھا، مجبوری کی نہیں۔ مجھے کوئی مجبوری نہیں اور محبت میں صرف ایک سے کر سکتا ہوں، وہ مجھے رابعہ سے ہے۔ جب تک رابعہ کی محبت میرے دل میں ہے کسی اور سے محبت کرنا میرے لیے اتنا ہی ناممکن ہے جتنا بیک وقت زندہ رہنا اور مر جانا۔"

"چلو تم محبت نہیں کر سکتے مجھ سے، مت کرو۔ محبت تمھیں اُس رابعہ سے ہے تو اُسی سے رکھو مگر مجھے کیوں روکتے ہو؟ اگر میں تم کو محبت کرنے سے نہیں روک سکتی تو کیا تم روک سکتے ہو مجھے؟ میری بھی تو مجبوری ہے۔ اسے سمجھو۔ تم رابعہ سے محبت کرو، میں تم سے کرتی رہوں گی۔ اس میں تو کسی کا نقصان نہیں ہے، ہم تینوں خوش رہ سکتے ہیں ..."

"کملا! تم پاگل ہو گئی ہو۔" میں نے دھاڑ کے کہا۔ "جو ناممکن ہے ... وہ ناممکن ہے۔ نہ تم میرے ساتھ جاؤ گی اور نہ میں تمھارے ساتھ جانا پسند کروں گا۔ میں دلاور کے ہاتھوں مر جانا قبول کروں گا۔"

اُسی وقت دروازہ کھلا اور چوہدری دلاور کے ساتھ کملا کا باپ اندر آ گیا۔ اُس کی آنکھوں کو میں اب بھی سیاہ شیشوں والی عینک کے پیچھے نہیں دیکھ سکتا تھا مگر نفرت کی آگ کی تپش کو میں دور سے بھی محسوس کر سکتا تھا جو اُس کے وجود کو جلا رہی تھی۔ میں نے اس کی بیٹی کو ٹھکرا کے اُس کی اَنا کو ٹھوکر مار دی تھی۔

"میں نے کیا کہا تھا ... ہیں جی۔" چوہدری دلاور نے اپنے مخصوص انداز میں مسکرا کے کہا۔ "اپنے سکندرِ اعظم صاحب بالکل وہ ہیں۔ کیا کہتے ہیں اسے کتے کی دم ... سیدھے ہونے والے نہیں ہیں۔"

کملا کا رنگ فق ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے رخساروں پر بہنے والے آنسوؤں کے اوٹ سے میری طرف دیکھا، پھر اپنے باپ کی طرف جو زخم خوردہ سانپ کی طرح پھنکار رہا تھا۔ اس کی ہر سانس میں زہر بھرا ہوا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کا ہاتھ اوپر اٹھا۔

خیال تھا کہ اب وہ چٹکی بجائے گا اور جیسے چراغ کو رگڑتے ہی الٰہ دین کے سامنے جن کورنش بجا لاتا تھا ایسے ہی کوئی حکم کا غلام فوراً حاضر ہو گا یا پھر اچانک کسی جادوگر کی طرح اس کے ہاتھ میں ریوالور آ جائے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔

غالباً تریوینی نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ وہ حد درجہ چالاک اور عیار آدمی تھا جس کی حسِ خطرے کی بُو کو سونگھنے میں کتے کی حس کو مات کرتی تھی اور اس کی آنکھیں کالے چشمے کے پیچھے سے تاڑ لیتی تھیں کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ شاید اسے سفید دکھائی ہی نہ دیتا ہو۔ ساون کے اندھے کو ہرا ہی ہرا سوجھتا ہے تو کالے دھندوں سے کالا دھن بنانے والوں کو کالا ہی کالا نظر آ سکتا ہے۔

تریوینی کی بیٹی کو بھی یہ صفات ورثے میں ملی تھیں۔ فرق صرف ان کی عمر اور تجربے کا تھا تاہم باپ کے معاملے میں وہ دھوکا نہیں کھا سکتی تھی۔ اس نے ہاتھ کے اشارے کا مطلب یوں سمجھ لیا جیسے ہوشیار لوگ خط کا مضمون بھانپ لیتے ہیں لفافہ دیکھ کر۔

"یہ نہیں ہو گا ڈیڈ۔" اس نے میرے سامنے آ کے کہا۔

"ابھی تو کچھ بھی نہیں ہوا۔" ڈیڈ نے کہا۔

"مجھے آپ کی نیت پر شک پہلے بھی تھا۔ آپ مجھے ٹریپ کے طور پر استعمال کرنا چاہتے تھے۔"

"تم خود ٹریپ ہو جاؤ گی۔ یہ معلوم نہیں تھا مجھے۔" اس نے کہا۔ "یو آر اے فول۔"

"آپ اس شخص کو کیوں لائے ہیں یہاں؟" کملا نے دلاور کی طرف انگلی اُٹھا کے کہا۔

"تم خود کیوں آئی ہو یہاں؟"

"آپ کے حکم کی تعمیل کرنے۔" وہ طنز سے بولی۔

"اچھا تو پھر میں حکم دیتا ہوں کہ اب واپس اپنے کمرے میں جاؤ۔" تریوینی نے کہا۔

"میں نہیں جاؤں گی۔" کملا اڑ گئی۔

"کمل! مجھے کچھ باتیں کرنی ہیں ..." تریوینی نے لہجہ بدل کے کہا۔

"باتیں آپ میری موجودگی میں بھی کر سکتے ہیں ..."

"فضول ضد مت کرو۔ میں زبردستی بھی کر سکتا ہوں۔ یہ تم اچھی طرح جانتی ہو۔" بیٹی کے سامنے تریوینی کے لیے جذبات پر قابو رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔

کملا نے نفی میں سر ہلایا۔ "آپ ایسی غلطی نہیں کریں گے ڈیڈ جس پر آپ کو پچھتانا پڑے۔ آپ ایسا کوئی کام کرتے ہی نہیں جس کی وجہ سے پچھتانے کی نوبت آئے۔ میں بھی تو آپ کی ہی بیٹی ہوں۔ آپ کو اتنا ہی سمجھتی ہوں جتنا آپ مجھے سمجھتے ہیں۔"

میں خاموش تماشائی بنا رہنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کملا کی حمایت نے فوری طور پر مجھے اتنا تحفظ ضرور فراہم کر دیا تھا کہ تریوینی یا اس کا کوئی غلام میرے نزدیک نہیں آ سکتا تھا اور مجھ پر گولی نہیں چلا سکتا تھا۔ اس سے یہ ضمانت بہرحال حاصل نہیں ہوتی تھی کہ میرے لیے خطرے کی بات ہی نہیں رہی اور میں کملا کی مدد سے آزادی بھی حاصل کر سکتا ہوں۔ اگر تریوینی طاقت کے بل پر مجھے مغلوب کرنے کی کوشش کرتا تو میں کملا کو ڈھال کے طور پر استعمال کر سکتا تھا۔ یہ موقع مجھے خود کملا نے فراہم کیا تھا اور ابھی تو وہ رضاکارانہ طور پر ڈھال بنی ہوئی تھی۔

چوہدری دلاور بھی باپ بیٹی کے مکالمے سننے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی صورت پر تھوڑی سی مایوسی کا سایہ نظر آتا تھا۔ اس غیر متوقع صورتِ حالات نے اس کی امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ وہ یہاں شکاری بن کے نہیں خریدار بن کے پہنچا تھا۔ شکاری کو اپنا نشانہ خطا ہو جانے کے امکانات کو مدِنظر ضرور رکھنا پڑتا ہے لیکن جو شخص پنجرے میں بند مرغی خریدنے جاتا ہے اسے تو یقین ہوتا ہے کہ مرغی خانے کا مالک ایک ہاتھ سے مرغی کو دبوچ کر اس کے حوالے کر دے گا۔

خاموشی کا ایک بہت مختصر وقفہ آیا جس میں میری نظر دلاور کی نظر سے ملی اور میں اپنے لبوں کی تمسخر اڑانے والی مسکراہٹ سے اس کی مایوسی میں اضافہ کرنے میں کامیاب رہا۔ دلاور کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ ماتھے پر شکنوں کی تعداد بڑھ گئی اور اس کی پُرغرور فاتحانہ مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

تریوینی سیاہ چشمے کے پیچھے سے اپنی نالائق بیٹی کے ساتھ ساتھ مجھے بھی گھور رہا ہوگا مگر اس کی آنکھوں کی حرکت نظر ہی نہیں آتی تھی اور گردن گھمانے کا وہ قائل ہی نہیں معلوم ہوتا تھا۔ وہ کسی بے جان مجسمے کی طرح ساکت تھا مگر اس کے روشن گنبد نما سر کے اندر عقل کا کمپیوٹر پوری طرح فعال و متحرک تھا۔

اچانک کملا نے صورتِ حال کو مزید خراب کر دیا مگر صرف اپنے والد ماجد کے لیے اور ان کے مہمان کے لیے۔ اس نے اپنے بلاؤز کے زنانہ سیف ڈپازٹ والٹ میں ہاتھ ڈالا اور ایک ننھا سا خوبصورت ریوالور نکال لیا۔ یہ اعشاریہ بائیس کا لیڈیز ماڈل کو برا گولڈ تھا جس کے سفید ہاتھی دانت والے دستے پر

بڑے دلفریب نقش و نگار تھے۔ قتل کا سامان کرنے والے بھی کیا کمال کرتے ہیں۔ نگاہِ ناز اور ادائے حسن سے کوئی بچ جائے تو حسینہ ہاتھوں میں اتنا حسین ریوالور دیکھ کے مرنے کی تمنا کرنے لگے۔

"کملا! پاگل ہو گئی ہو کیا؟"

"جی میں بدقسمتی سے بالکل پاگل ہو گئی ہوں۔" کملا نے کہا۔ "لیکن آپ ہوش میں رہیں۔ اگر آپ نے کوئی سودا کر لیا ہے تو اسے منسوخ کر دیں اور جائیں اس خریدار کو بھی رخصت کریں۔"

دلاور ہنس پڑا۔ "بھئی واہ۔ یہ کیا باتیں ہو رہی ہیں اتنی دیر سے۔ اپنی سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا۔"

"وہ کیا ہے اپنے چوہدری صاحب۔" میں نے کھنکار کے گلا صاف کیا۔ "کہ بات تو بڑی موٹی سی ہے۔ یہ جو خیر سے اپنے تریوینی صاحب کی نورِ چشم لختِ جگر دختر نیک اختر ہیں نا۔ یہ اس وقت مرنے مارنے پر کمربستہ ہے۔ اور یہ جو آلۂ قتل اس کے ہاتھ میں ہے یہ بھی سو فیصد اصلی ہے۔ مجھے نہیں معلوم اس بانکی حسینہ کا نشانہ کیسا ہے مگر اتنے کم فاصلے سے آپ کے مرغ دل کی خیر نہیں۔"

"خوب! تو آپ بھی خیر سے آ گئے اپنی پرانی پٹری پر۔" دلاور نے طنز سے کہا۔ "افسوس کہ آپ کا دوسرا جوڑی دار نہیں ہے ورنہ بھانڈوں کی جوڑی خوب رونق لگاتی۔"

"وہ ایسا ہے اپنے چوہدری صاحب کہ یار نہ رہا تو صحبت باقی۔ اب آپ چلے ہی جائیں تو اچھا ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ نہ ہو کہ معاملات زنانہ ہاتھوں سے مردانہ ہاتھوں میں آ جائیں۔"

"مسٹر دلاور۔" تریوینی نے کہا۔ "ہم پھر بات کریں گے۔"

"بات تو ہو چکی ہے فائنل۔" دلاور نے برہمی سے کہا۔ "کون سی بات دوبارہ ہو گی؟"

"مجھے... کچھ سوچنا پڑے گا۔" تریوینی نے کہا۔

"اتنے بڑے کاروبار کے مالک ہو کے پھر سوچو گے؟" دلاور نے تلخ لہجے میں کہا۔ "یہی ہے تمہاری قوتِ فیصلہ؟"

"فیصلے حالات کے مطابق ہوتے ہیں۔ اور حالات ہی اگر فیصلے بدل دیں تو کوئی کیا کر سکتا ہے۔" تریوینی نے کہا۔

"تم اپنے گھر میں اپنی بیٹی کے سامنے اتنے مجبور اور اتنے بے بس ہو...؟"

"کیا تمہاری کوئی بیٹی ہے؟ اتنی ہی بڑی۔ اکلوتی سرکش اور ضدی؟" تریوینی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "مجھے معلوم ہے کہ نہیں ہے۔ اس لیے تم یہ بات نہیں سمجھو گے۔ کملا نے اگر یہ سودا منسوخ کر دیا ہے تو اسے منسوخ ہی سمجھو فی الحال۔ کل پھر کوئی بات بن جائے تو میں نہیں کہہ سکتا۔ میں کوشش کروں گا۔"

"کوئی فائدہ نہیں ڈیڈ۔ آپ اس آدمی کو چلتا کریں اور اسے اپنے گھر کی حدود سے باہر نکال دیں۔ میں کسی قسم کا رسک مول نہیں لوں گی۔" کملا نے کہا۔

"چلو مسٹر دلاور۔" تریوینی نے کہا۔ "ابھی کوئی خاص نقصان نہیں ہوا ہے۔ اور ہوا ہے تو میں اس کی تلافی کے لیے تیار ہوں مگر بعد میں ایسا نہ ہو کہ یہ پاگل لڑکی کچھ اور مانگ بیٹھے۔ مثلاً تمہاری جان۔ میں اسے انکار کیسے کروں گا۔ آج تک اس نے اپنی بات منوائی ہے۔"

"اتنی زیادہ اوور ایکٹنگ نہ کریں ڈیڈ۔" کملا نے کہا۔ "میں اچھی طرح سمجھتی ہوں آپ کے الفاظ کو اور مطلب کو۔ صرف مجھے مطمئن کرنے کے لیے ایسی بات کہہ رہے ہیں آپ۔ کیونکہ آپ سمجھتے ہیں یہ میرا ہسٹریا ہے اور اس دورے کی شدت کو اسی طرح کم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے ڈیڈ۔ میں بالکل پُرسکون اور نارمل ہوں۔"

ڈیڈ نے سر ہلایا۔ "اچھا..." جو نہ سوال تھا اور نہ یقین کا اظہار نہ حیرت تھی اور نہ حقیقت کو تسلیم کرنے کا انداز۔ دلاور کی مایوسی البتہ قابلِ دید تھی۔ وہ اچھا ایکٹر تھا اور عموماً اپنے حقیقی جذبات کو چھپا لیتا تھا مگر اس وقت جو کچھ ہوا اس کی توقعات کے بالکل برعکس تھا چنانچہ وہ اپنے جذباتی ردِعمل پر قابو پانے سے قاصر رہا۔ یہ بالکل لبِ بام سے دو چار ہاتھ دور رہ جانے والی بات تھی۔ تقدیر نے اس کے ساتھ بہت رسوا کن مذاق کیا تھا۔ وہ مدت سے میری تلاش میں سرگرداں تھا۔ اس کے شکاری کتے میری بو سونگھتے پھر رہے تھے مگر اس کو آج تک جتنی خبریں ملی تھیں ناکامیوں کی ملی تھیں اور ان نقصانات کی ملی تھیں جو اسے اٹھانے پڑے تھے۔ پھر اچانک ایک حادثے نے اسے میرا سراغ دے دیا۔ یہ حادثہ "بھانومتی" کی واپسی تھی جس نے مجھ سے پہلے میری نیک نامی کا چرچا کر دیا۔ مجھے تو حالات نے "بھانومتی" کے معاملے میں دخل در معقولات پر مجبور کیا تھا لیکن اس معاملے نے میرا راز افشا کر دیا۔ جو مجھے کسی قیمت پر منظور نہ تھا وہ ہو گیا یعنی پھر دلاور کو میرا پتا مل گیا۔

ایسے حالات میں دلاور کا ناکام و نامراد واپس جانا اس کے لیے ایک دلی صدمہ تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ تریوینی کس حد تک قابلِ اعتبار ہے۔ وہ سوداگر کے فیصلہ واقعی منسوخ کرنے پر مجبور ہے یا صرف بیٹی کے سامنے ایسا ظاہر کر رہا ہے۔ اس کا احتجاج اور غصہ سب بے کار تھا۔ نہ یہ اس کا شہر تھا اور نہ گھر جہاں اس کی بدمعاشی چلتی تھی۔

جب وہ واپس جا رہا تھا تو شاید اسی خیال سے افسردہ بھی تھا کہ کہیں سچ مچ اسے کملا کی خواہش کے مطابق اس گھر کی حدود سے باہر نکال دیا گیا تو وہ کیا کرے گا۔ دوبارہ مجھ تک کیسے پہنچے گا؟ میرے بارے میں اس کو خوش فہمی کبھی تھی تو اب نہیں تھی۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ میں اس بار دام سے نکل گیا تو پھر اس کے خیال کی رسائی ... بہت دور نکل جاؤں گا۔ میں اپنا ... پتا ٹھکانا ... بدل لوں گا۔

جاتے ہوئے دروازے میں رک کے ... جو نگاہ کی وہ اس کے دلی جذبات کی ترجمان تھی جس میں اس کی جھنجلاہٹ، بے بسی، غصے اور نفرت کے احساس کا ہر رنگ تھا۔ دھمکی تھی کہ اپنے سکندرِ اعظم۔ عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے۔ زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں کہ ایک احمق لڑکی تم پر فریفتہ ہو گئی تو تم نے یہ بازی جیت لی۔ دیکھو کہ دلاور کی اگلی چال کب ہوتی ہے اور کیا ہوتی ہے۔

"ڈیڈ! ایک بات اور سن لیں۔" کملا نے کہا۔

تریوینی نے پلٹ کر اسے دیکھا اور زبانِ خاموشی میں پوچھا۔ کیا؟

"میرے ساتھ دھوکا کیا گیا۔ اور آپ نے کوئی چکر چلایا... تو..." اس نے ریوالور کو کنپٹی پر رکھ کے ٹریگر دبا دیا۔

"کملا...!" مشینی انسان کی طرح بے حس نظر آنے والا، چلنے اور بولنے والا یک لخت باپ بن کے چلایا۔

کملا ہنس پڑی۔ "ابھی نہیں ڈیڈ۔ مجھے معلوم تھا کہ ریوالور پر سیفٹی کیچ ہے۔ مگر میں سیفٹی کیچ ہٹا بھی سکتی ہوں۔ آپ سب کچھ کر سکتے ہیں لیکن مجھے سیفٹی کیچ ہٹا کے ٹریگر دبانے سے کیسے روک سکتے ہیں۔ گزشتہ بار آپ جیت گئے تھے۔ اس ہار نے مجھے اپنی نظر سے گرا دیا تھا۔ میں دوسری بار اپنی شکست قبول نہیں کروں گی۔ اس بار آپ ہار جائیں گے۔ اور تب آپ کو احساس ہوگا کہ ہار کیا ہوتی ہے۔ آپ ہر بار جیت کر یہ سمجھنے لگے ہیں کہ ہار ہمیشہ دوسروں کی ہوتی ہے تو آئندہ بھی ہوتی رہے گی۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس بار آپ کو شکست ہو جائے۔ آپ کو اس کا تجربہ نہیں ہے۔ آپ کو احتیاط سے کام لینا ہوگا ورنہ آپ خود اپنے لیے عذاب مول لیں گے۔"

"بس یا کچھ اور...؟" تریوینی پھر روبوٹ بن گیا۔ احساس سے عاری۔ غیر جذباتی۔ مشینی انسان۔

دروازہ بند ہو جانے کے بعد بھی چند سیکنڈ سکوت کی کیفیت میں گزر گئے۔ پھر کملا نے پلٹ کے مجھے دیکھا اور مسکرائی۔ بے اختیار میں ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس سے پہلے جب تک تریوینی اور دلاور ایک چیلنج بن کر میرے سامنے تھے، کملا میرے سامنے میرے اتنے قریب تھی کہ اس کی پشت سے میں بہت کچھ دیکھ اور محسوس کر سکتا تھا مثلاً بالوں کے ریشم سے پھوٹنے والی مہک کو اور ان کی دھندلی سی سنہری چمک کو۔ اس کے شانوں کی گولائی سے نیچے بتدریج کم ہونے والے کمر کے خم کو اور کمر سے اوپر بلاؤز

کے نصف دائرے میں روشن جلد کو۔ وہ تقریباً مجھ سے لگ کر کھڑی ہوئی تھی مگر مجھے اس سے ڈر نہیں لگا تھا۔ اب مجھے یوں لگا جیسے میں نے مدافعت نہ کی تو اسی جذباتی لمحے کی طاقت سے وہ مجھ پر غالب آجائے گی۔ یہ احساس اس کو تقویت دے گا کہ محبت میں جان دینے کا دعویٰ کیے بغیر اس نے ثابت کر دکھایا ہے کہ وہ میری خاطر کیا کچھ کر سکتی ہے۔

"کیا مجھے تمھارا شکریہ ادا کرنا چاہیے؟" میں نے کہا۔

"مجھے کھوکھلے الفاظ کی ضرورت ہی نہیں۔" وہ بولی اور اپنے ریوالور کو بڑی مہارت سے تھوڑا سا اُچھال کے پھر کیچ کرنے لگی۔ "جو کچھ کیا میں نے اپنی مرضی سے کیا۔"

"کافی مشق ہے تمھیں اس کھیل کی۔" میں نے اسے ریوالور کو ہوا میں دو تین بار گھما کے بالکل صحیح پوزیشن میں پکڑتے دیکھا۔

"ہاں۔ کھلونا اچھا ہے یہ۔" وہ بولی۔ "ڈیڈی بھی جانتے ہیں کہ میں جان پر کھیل جاتی۔ بہت ضدی لڑکی ہوں میں۔"

میں بیڈ کے کنارے پر ٹک گیا۔ "ایک بار تم ہار چکی ہو، جیتنے سے ہارنا زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ پھر تمھیں یہ احساس کیوں تھا کہ تم اپنی نظر سے گر گئی ہو؟"

وہ میرے قریب بیٹھ گئی۔ "یہ بات تو بہت پرانی ہوگئی ہے مگر مجھے کل کی بات لگتی ہے۔ ایک مہینہ دس دن بعد پورے چار سال ہو جائیں گے۔ اُس وقت میں بی اے کے فائنل ایئر میں تھی اور ایسی نہیں تھی جیسی اب ہوں۔ میں بہت خوبصورت تھی۔"

"تم اب بھی خوبصورت ہو۔"

وہ تلخی سے ہنسی۔ "اور کیا کہہ سکتے ہو تم۔ سب یہی کہتے ہیں میرے منہ پر۔ مگر میں جھوٹ نہیں بول رہی ہوں۔ میں واقعی بہت حسین تھی۔ اس وقت تم نے مجھے دیکھا ہوتا تو۔۔۔"

"تو کیا؟" میں نے اس سے نظر چرا کے کہا۔

"تو مجھے یوں مسترد نہیں کر سکتے تھے۔" وہ بولی۔ "تم آرزو کرتے میری۔ مجھے چاہنے کی، جیسے اور سب کرتے تھے۔ تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ مجھ سے ایک مسکراہٹ کا نذرانہ پانے والے خود کو کتنا خوش نصیب جانتے تھے۔ ٹھہرو، میں تمھیں ایک تصویر دکھاتی ہوں۔"

اس نے گلے میں پڑا ہوا لاکٹ میرے سامنے کیا اور پھر ایک چٹکی سے اسے کھول دیا۔ دل کی شکل کا لاکٹ کسی کتاب کی طرح کھل گیا۔ اس کے ایک حصے میں خود کملا کا مسکراتا ہوا چہرہ تھا۔ دوسرے حصے میں ایک نوجوان کا جس کی آنکھوں بڑی عجیب سی پُرکشش اُداسی تھی۔ تصویر دیکھ کے مجھے کملا کے سچ کا احساس ہوا۔ بلاشبہ وہ پہلے قیامت تھی۔ اس کا حسن پہلے اگر شعلہ تھا تو اب ایک بجھتی ہوئی چنگاری۔ صرف چار سال میں اس کا آفتابِ حُسن گہن میں آگیا تھا۔ وہ اب بھی پُرکشش تھی لیکن وہ فرق بہت نمایاں تھا جو چار سالوں میں پڑ گیا تھا۔

"یہ کون ہے؟" میں نے کہا حالانکہ میں پوچھنا چاہتا تھا کہ یہ کیوں ہوا۔ اس عمر میں جب حسن کے ماہِ کامل پر شباب کا سمندر چڑھتا ہے۔ اس کی تابانی اور کشش کو کیا ہوا۔

"یہ میری بدصورتی کا ذمّے دار ہے۔" کملا نے کہا۔ "یہ بھی ایک سکندر تھا جس نے مجھے فتح کیا۔ پہلی بار۔ کسی کوشش کے بغیر۔ اس سے پہلے جتنے آئے منہ کی کھا کر گئے۔ بڑے خوبرو نوجوان، ذہین اور باصلاحیت۔ شریف زادے اور باکردار لوگ۔ انھیں مجھ سے ایسی محبت ہوئی کہ وہ تقریباً پاگل ہوگئے۔ وہ رُسوا ہوئے اور خوار ہوئے۔ مگر میں کیا کرتی؟ مجھے ان سے محبت نہیں ہوئی۔ بہت افسوس ہوا مجھے ان کے حال پر اور ان کے ساتھ اپنے رویّے پر۔ لیکن میں زبردستی نہیں کر سکتی تھی اپنے ساتھ۔ ان سب کی بددعا لگی مجھے۔ میں اس شخص کی محبت میں گرفتار ہوگئی جو ایک معمولی آدمی تھا۔ بالکل گمنام سا شخص تھا جو ایک بار کسی شو کے سلسلے میں میرے پاس آیا تھا۔ میں کالج کی ہیروئن تھی۔ ہر ڈرامے میں حصّہ لیتی تھی۔ اور بہت کامیاب تھی۔ میری کامیابی کے دو اسباب واضح تھے۔ ایک تو میرے مقابلے پر کوئی بھی نہیں تھا۔ اداکاری کیسی ہے، یہ بعد میں دیکھتے ہیں لوگ۔ پہلے اداکارہ کو دیکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ میری وجہ سے ڈرامے کرنے والوں کو ہزاروں کے چیک ملتے تھے، میرے ڈیڈی کی طرف سے۔ جب وہ میرے سامنے آیا تو میرا خیال تھا کہ میں اس پر برس پڑوں گی کہ آخر کیا سمجھ رکھا ہے تم نے مجھے؟ میں کوئی ایکسٹرا ہوں جو بمبئی میں خوار پھرتی ہیں چانس کے لیے۔ میں ایکٹریس بننا چاہتی تو میرا باپ خود فلم پروڈیوس کر سکتا تھا میرے لیے۔ اور شو کے لیے پیسہ چاہیے تو اسی کے پاس جاؤ۔ مگر جب میں نے اسے دیکھا تو۔۔۔ بس دیکھتی رہ گئی۔ میں نے اس سے کچھ بھی نہیں کہا۔ اس کی سُنتی رہی۔ اس نے کہا کہ وہ ایک اسٹیج آرٹسٹ ہے اور ویسے تو بہت سے کھیل کر چکا ہے مگر ان دنوں ایک چیریٹی شو کے انتظام میں مصروف ہے جو ماضی کے ایک نامور اداکار کی مدد کے لیے ہوگا۔ بمبئی میں یہ ہوتا رہتا ہے۔ اپنے وقت کے بہت سے کامیاب لوگ جو فلمی دُنیا کے جگمگاتے اُفق پر روشن ستارے تھے، فٹ پاتھ کی دُھول میں پڑے دکھائی دیتے ہیں اور کوئی نہ انھیں جانتا ہے نہ پہچانتا ہے۔ کبھی اچانک کسی کے دل میں ہمدردی کی لہر اُٹھتی ہے اور وہ کسی ایسے ہی بھولے بسرے دنوں کے فنکار کی خاطر چیریٹی شو کا اسٹنٹ چلا دیتا ہے۔ جو ملتا ہے جیب میں ڈالتا ہے اور بھاگ جاتا ہے۔ مجھے تو یاد نہیں پڑتا کہ ایسے خیراتی شو سے واقعی کسی کو خیرات ملی ہو۔ خیر، جب اس نے یہ باتیں بتائیں تو میں جواب میں اسے بتا سکتی تھی کہ یہ سب ڈھونگ ہے۔ اوّل تو وہ مدد کے مستحق نہیں جو کبھی اتنے دولتمند تھے کہ دُنیا ان پر رشک کرتی تھی۔ اب دُنیا ان کی حالت سے عبرت پکڑتی ہے تو عبرت کے ایسے نمونوں کو اسی حال میں رہنے دو تاکہ آج کے بڑے فنکار اپنا آنے والا کل دیکھ سکیں۔ پھر یہ کہ وہ فنکار تمھارا کیا لگتا ہے؟ تم کیوں پریشان ہو اس کے لیے؟ کیا اسٹیج سے جو پیسہ مل رہا ہے، وہ کم ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ مگر میں نے اس سے کچھ بھی نہیں کہا اور آخر میں جب اس نے پوچھا کہ بتائیے آپ کام کریں گی؟ تو میں نے کہا، کام کی بات تو بعد میں ہوگی۔ پہلے یہ بتاؤ کہ عطیہ کتنا دوں؟ وہ حیران رہ گیا۔ اس نے کہا کہ آپ کا تعاون ہی سب سے بڑا عطیہ ہے۔ مگر میں نے اسے پانچ ہزار کا چیک دیا اور کہا کہ میں مزید عطیات بھی دلوا سکتی ہوں اور خود بھی کاسٹ میں شامل ہو سکتی ہوں بشرطیکہ میرے ساتھ وہ خود بھی ہو۔ اس کا چہرہ اُتر گیا کیونکہ مرکزی کردار تو کوئی اور کر رہا تھا۔ میں نے ابھی تک نام نہیں بتایا اس کا؟ اصل نام تو تھا جان محمد مگر اسٹیج پر وہ جانی کے نام سے کام کرتا تھا۔ میری کوشش سے جان کو مرکزی کردار مل گیا۔ اور بس۔ وہیں سے تقدیر کا چکّر شروع ہوا۔ میں اس سے ملنے لگی۔ صبح دوپہر شام۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ شادی شدہ ہے۔ اس کے دو بچے ہیں اور وہ مسلمان ہے۔ میں نے پروا نہیں کی اور اس سے کہا کہ سب کو چھوڑ دو میرے لیے۔ اس نے کہا کہ تم سب کو چھوڑ سکتی ہو میرے لیے؟ میں نے عملاً یہ کر کے دکھا دیا۔ پیسے کی مجھے کمی نہ تھی۔ میں نے اپنے لیے اور اس کے لیے الگ فلیٹ لے لیا۔ میرے ڈیڈی کی بہت بدنامی ہوئی۔ وہ بہت چیخے چلّائے مگر میں نے صاف کہہ دیا کہ اب میں زندہ رہوں گی تو صرف جان کے لیے ورنہ مر جاؤں گی۔ میرے ڈیڈی نے اسے میری دھمکی سمجھا اور مجھے اُٹھوا لیا۔ مرنا کون سا مشکل کام ہے۔ میں نے واپس آتے ہی خودکشی کی کوشش کی جو تقریباً کامیاب ہوگئی تھی۔ لیکن بڑے بڑے ڈاکٹروں نے مل کے مجھے بچا لیا۔ جانی کی بیوی نے اس سے طلاق لے لی تھی۔ اسے بھی جانی کے اور میرے مراسم کا علم ہو گیا تھا۔ جانی میرے ساتھ رہنے کے لیے آزاد ہو گیا۔ لیکن یہ آزادی اسے راس نہ آئی۔ ایک رات ڈیڈی نے اسے بُلایا۔ انھوں نے ظاہر کیا کہ وہ میری ضد کے سامنے ہار گئے ہیں اور اب یہ چاہتے ہیں کہ جانی مجھ سے شادی کر لے مگر شادی سے پہلے یہ ضروری ہے کہ وہ معاشرے میں اپنا کوئی مقام بنا لے جو تریوینی کے داماد کے شایانِ شان ہو۔ انھوں نے جانی کو اپنے کاروبار میں شریک کر لیا اور اسے اہم ذمّے داریاں سونپ دیں۔ وہ باہر کے دورے کرنے لگا اور بے حد مصروف ہوگیا۔

صرف چھ مہینے میں اس کا رہن سہن اور اس کے انداز بدل گئے۔ وہ دولتمند ہوگیا اور اس نے دولت مندوں والے سب شوق اختیار کر لیے۔ مجھے یہ سب بعد میں معلوم ہوا۔ میرے ڈیڈی نے اسے آزمایا تھا۔ اُنھوں نے اسے دولت فراہم کی اور آزاد چھوڑ دیا، یہ دیکھنے کے لیے کہ دولت آجانے کے بعد اس کے دل میں کتنی محبت رہتی ہے۔ وہ اس آزمائش میں پورا نہیں اترا۔ جُوا، شراب اور عورت اس کے شوق بن گئے۔ میرے لیے وہ بالکل فکرمند نہیں تھا۔ میں تو اس کے لیے گھر کی مرغی تھی۔ دال برابر۔"

"اور یہ سب کچھ تمھیں کیوں معلوم نہیں ہوا؟" میں نے کہا۔

"مجھے کیسے معلوم ہو سکتا تھا۔" وہ بولی۔ "میں تو اندھے اعتماد میں آنکھیں بند کیے بیٹھی ہوئی تھی اور اپنی کامیابی پر بہت خوش تھی اور اس خیال پر نازاں تھی کہ میں نے سب کو شکست دے کر جسے چاہا اسے حاصل کر لیا۔ میں نے اپنے اَن گنت طلب گاروں کو شکست دی جو اپنی قوتِ خرید یا قوتِ تسخیر سے مجھے حاصل کر لینے کے یقین میں مبتلا تھے۔ میں نے جانی کے غرور کو شکست دی۔ اس کی بیوی بچوں کے ساتھ وابستگی اور ان کے حقوقِ ملکیت کو شکست دی اور۔۔۔ میرا خیال تھا۔۔۔ کہ میں نے اپنے ڈیڈ۔۔۔ ناقابلِ شکست تریوینی کو بھی شکست دی۔ اور ایسے ہی بہت سے باطل خیالات تھے جو میرے ذہن پر حاوی تھے۔ میں نے کئی بار ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ اپنے عشق کا تجزیہ کیا اور یہ سوچا کہ آخر جانی میں ایسی کیا بات ہے جس نے مجھے دیوانہ کر دیا ہے۔ عقل کی کسوٹی پر پرکھنے سے جانی ایک بہت معمولی صلاحیت رکھنے والا، اوسط سے بھی کم ذہین، نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والا بے نام و نسب لاوارث نوجوان تھا جس کا مقابلہ میرے کسی بھی پرستار یا دعوے دار سے کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ بس مجھے اس میں ایک عجیب سی بے بس کر دینے والی، مقناطیسی یا حیوانی کشش محسوس ہوتی تھی، جس کے خلاف مزاحمت ناممکن تھی۔ اور جس کے بغیر میں اپنی زندگی کا تصوّر کرتی تھی تو ڈر جاتی تھی۔ اس پاگل پن کو محبت کا نام دینا غلط تو نہ تھا۔"

میں نے کہا۔ "یہ نام تو بہت پہلے دیا جا چکا ہے۔ کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا۔ یہ سچ ہے۔"

"میں بھی یہی سمجھتی تھی۔ اور بھی بہت سی باتوں پر یقین تھا میرا۔ مثلاً یہ کہ دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔ اور یہ کہ جذبۂ عشق سلامت ہو تو محبوب کچے دھاگے سے بندھا چلا آتا ہے اور عشق سچا ہو تو پتھر کو بھی موم کر دیتا ہے۔ یہ افسانوی فلمی تصورات میں

نے کالج کے زمانے میں قائم کیے تھے۔"

"شعر بھی بہت یاد کیے ہوں گے۔۔۔"

"ہاں۔ بیت بازی اور مباحثوں میں کام آتے تھے۔ مجھے خبط تھا کہ میں سب کچھ کروں اور ایسے کروں کہ سب دنگ رہ جائیں۔ کوئی یہ نہ کہے کہ خدا نے بس صورت ہی دی۔ دولت بن مانگے مل گئی۔ اوپر کا خانہ تو خالی پڑا ہے۔ عورت ذات ہونے کے ناتے ناقص العقل تو طے شدہ طور پر تھی۔ بعد میں سارے تصورات غلط ہو گئے۔ ایک کڑوا سچ باقی رہا جس کو میرے جہاں دیدہ، تجربے کار اور قابلِ رشک عقل رکھنے والے ڈیڈی جانتے تھے اور مانتے تھے۔ ان کی نظر نے سچ کا یہ روپ پہلے ہی دیکھ لیا تھا مگر انھوں نے اس سچ کو مجھ سے تسلیم کرانے کے لیے کوئی لیکچر نہیں دیا اور کسی سقراط کا حوالہ نہیں دیا۔ انھوں نے تھوڑا سا پیسہ خرچ کیا۔ لاکھوں کی رقم ان کے لیے تھوڑا سا پیسہ تھی۔ یہ پیسہ انھوں نے جانی کو دیا اور سچ کو جمع کرتے گئے۔ سچ سننے سے کچھ نہیں ہوتا۔ سچ دیکھنے اور سچ کے تجربے سے گزرنے میں جو عملی سبق ملتا ہے وہی قائل بھی کرتا ہے۔ یہ سچ اچانک میرے سامنے آ گیا۔ اپنی تمام کراہیت اور بدنمائی کے ساتھ۔ کچھ ماہ کے بعد ڈیڈ نے مجھے بلایا اور کہا کہ 'جانی کے بارے میں اب میرا کیا خیال ہے؟' میں نے کہا کہ 'خیال کوئی بدل جانے والی چیز ہے؟' وہ مسکرائے اور انھوں نے کہا کہ 'ہاں خیال بدل جاتا ہے۔ تمھارا خیال بھی بدل جائے گا جب تم اپنے جانی کا اصل چہرہ دیکھو گی۔ آدمی کی فطرت کو حالات کے آئینے میں دیکھنا چاہیے۔ اگر آئینہ بدل جانے کے باوجود فطرت نہ بدلے تو یہ ہے کمال کی بات۔ مگر ایسا آدمی ملتا نہیں۔ ملے تو پھر وہ فرشتہ ہی ہوتا ہے۔ غربت میں خودداری اور قناعت کا فلسفہ بگھارنے والے کو دولتمندی سے روشناس کرا کے دیکھو۔ مزدور اور محنت کی عظمت کا پرچار کرنے والے سوشلسٹ شاعر کو سرمایہ دار بنا کے دیکھو۔ رشوت اور بدعنوانی کے خلاف وعظ کرنے والے کو عیش و عشرت کی زندگی کے مواقع فراہم کر کے دیکھو۔ محبت اور وفاداری کے دعوے کرنے والے کو اندر سبھا میں لے جا کر دیکھو۔ سارا بھید کھل جائے گا۔ اصل فطرت سامنے آ جائے گی۔' ڈیڈی کا یہ بھاشن سن کے میں نے کہا کہ 'بیشک آپ نے ایسی ہی دنیا دیکھی ہے۔ یہ آپ کے تجربات ہیں چنانچہ آپ نے جو نتائج اخذ کیے ہیں ان سے میرا اتفاق کرنا ضروری نہیں۔' انھوں نے کہا کہ 'چلو تم بھی یہ دنیا دیکھ لو اور دیکھو کہ کیا میرا تجربہ غلط تھا؟' اس کے بعد انھوں نے جانی کی زندگی کی ایک فلم دکھائی جو انھوں نے بڑی محنت سے تیار کروائی تھی۔ اس میں کوئی کیمرہ ٹرک نہیں تھی مگر میں نے اس پر یقین کرنے سے انکار کر دیا۔"

"کیا تمھارے ڈیڈی کے کیمرہ مین سائے کی طرح اس کے پیچھے لگے رہتے تھے؟" میں نے کہا۔ "آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ ہر جگہ پہنچ گئے! اور شوٹنگ کرتے رہے۔"

وہ ہنس پڑی۔ "وہ کوئی حقیقی فلم نہیں تھی۔ میرا مطلب ہے سینما فلم نہیں تھی۔ وہ تو میں اصطلاحاً کہہ رہی تھی۔ جو کچھ میں نے دیکھا وہ اس کی زندگی کا عکس تھا۔ وہ زندگی جو میرا جانی دولتمند بن جانے کے بعد گزار رہا تھا۔ فلم بھی تو ایک عکس ہی ہوتی ہے۔ فلم میں کیمرہ ٹرک چل جاتی ہے۔ جو کچھ میں نے دیکھا اس میں کیمرہ ضرور استعمال ہوا تھا مگر ٹرک کوئی نہیں تھی۔ گزشتہ تین ماہ میں میرے ڈیڈی نے اپنے نظریے کی صداقت آزمانے کا جو تجربہ کیا تھا وہ کامیاب رہا تھا۔ انھوں نے جانی کو وافر پیسہ دیا جسے وہ اپنی مرضی سے خرچ کر سکتا تھا اور جس کا حساب دینا ضروری نہیں تھا۔ یوں سمجھ لو کہ ڈیڈی نے اسے غبن اور فراڈ کرنے کے مواقع فراہم کیے اور اس نے میرے ڈیڈی کو مایوس نہیں کیا۔ وہ چھ سات ایسے شہروں میں رہا جو بڑے رنگین ہیں۔ ظاہر ہے اسے بھیجا گیا تھا۔ یہ پیسہ اس نے کہاں صرف کیا، اس کا ثبوت تصویروں کی صورت میں موجود تھا۔ یہ تصویریں کچھ تو باہر لی گئی تھیں۔ مگر کچھ ہوٹلوں کے اندر اتاری گئی تھیں۔ وہ کس بار میں کس نائٹ کلب میں یا جوئے خانے میں گیا۔ کس کے ساتھ گیا۔ وہاں اس نے کیا کیا۔ اس سب کی ایک مفصل رپورٹ میرے سامنے رکھ دی گئی تھی۔ ہر قسم کے ثبوت کے ساتھ۔ مگر میں نے کہا کہ یہ سازش ہے۔ جانی کو جان بوجھ کر پھنسایا گیا ہے۔ اسے ورغلایا گیا ہے۔ اس کے پیچھے شکاری عورتیں لگائی گئی ہیں۔ وہ کون سا عابد و زاہد اور متقی و پرہیزگار ہونے کا دعوے دار ہے۔ وہ انسان ہے آخر! یہ سب دلائل میں خود کو بچانے کے لیے استعمال کر رہی تھی۔ جانی کا دفاع کرنے کے لیے نہیں۔ مگر ڈیڈی بھی جانتے تھے کہ میرا یہی ردِ عمل ہوگا۔ انھوں نے مجھے چند لڑکیوں سے ملوایا۔ وہ سب عام قسم کی لڑکیاں تھیں جن کو جانی نے محبت اور شادی کا جھانسا دیا تھا۔ انھیں اپنے بارے میں یہ بتایا تھا کہ وہ غیر شادی شدہ ہے اور بہت بڑے بزنس کا مالک ہے۔ کسی بھی شریف اور اچھی لڑکی کو ورغلانے کے لیے جس قسم کا جھوٹ ضروری ہوتا ہے وہ اس نے بولا تھا اور ان سب کو ایک جیسا دھوکا دیا تھا۔ ان میں سے دو اس کی پرسنل سیکریٹری بن کر بیرونِ ملک سفر میں بھی ساتھ رہی تھیں۔ چنانچہ وہ چشم دید گواہ تھیں۔ میں آخری وقت تک مزاحمت کرتی رہی اور سچ کو جھوٹ کہہ کے خود کو شکست سے بچاتی رہی مگر بالآخر یہ سب ناممکن ہو گیا۔ ڈیڈی نے مرحلے وار مجھے شکست دی۔ آخری مرحلے میں انھوں نے مجھے جائے واردات پر بھیج دیا جہاں جانی رنگے ہاتھوں پکڑا

گیا۔ اس کے لیے کسی بھی بات سے مکرنے کی گنجائش ہی نہ رہی۔ وہ ایک بہت بھیانک اور بدصورت، انتہائی شرمناک منظر تھا جب جانی 'میرا محبوب' میرے سامنے ایک مجرم بنا کانپ رہا تھا اور اپنے ہر جرم کا خود اقرار کر رہا تھا۔ ہر سچ اتنا ناقابلِ تردید تھا کہ اس کے لیے انکار کی گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔ ڈیڈی کی تھیوری پھر درست ثابت ہوئی تھی۔ میرے اعتماد کی یہ شکست اتنی عبرت ناک تھی کہ اس نے مجھے پاگل کر دیا۔ محبت اتنا بڑا فریب دے سکتی ہے۔ محبت کرنے والا پستی کی اس انتہا تک جا سکتا ہے، یہ میرے لیے ناقابلِ برداشت اذیت دینے والا تجربہ تھا۔ معلوم نہیں کیوں میں سچ کو جھوٹ کہتے کہتے ڈرنے لگی تھی کہ اگر یہ بعد میں سچ نکلا تو کیا ہوگا۔ جیسے جیسے ثبوت میرے سامنے آ رہے تھے، میرے اندر بے یقینی کا خلا بڑھتا جا رہا تھا۔ زبان سے اقرار نہ کرنے کے باوجود شکست کا آسیب مجھ پر مسلط ہوتا جا رہا تھا۔ چنانچہ فلم کا آخری سین اپنی آنکھوں سے دیکھ لینے کے بعد وہی ہوا جس کا فیصلہ میں پہلے ہی کر چکی تھی۔ پھر بھی مجھے شک تھا کہ وقت آنے پر میں شاید اپنے فیصلے پر عمل نہ کر سکوں۔ مگر جب وقت آیا تو میرے لیے کوئی مسئلہ پیدا نہ ہوا۔ میں نے ریوالور نکالا اور اسے گولی مار دی۔ خود اپنے ہاتھوں سے۔ اس سے پہلے میرا خیال تھا کہ میں اسے قتل نہ کر سکی تو خود کو گولی مار لوں گی۔ مگر اس کے جرم کی سزا میں اپنے آپ کو نہ دے سکی۔ میں نے سوچا کہ یہ تو بڑی ہی بے وقوفی کی بات ہوگی کہ جس نے میرے ساتھ اتنا بڑا دھوکا کیا وہ زندہ رہے اور اس کا یہ کھیل بھی اسی طرح جاری رہے۔ ویسے یہ پکی بات ہے کہ اگر میں اسے وہیں سزا نہ دیتی تو بعد میں ڈیڈی میرا یہ کام خود کر دیتے اور ان کے لیے کوئی مشکل پیدا نہ ہوتی۔ جو میری بے وقوفی کے باعث ہوئی۔ مگر وہ مشکلات کو خرید لیتے تھے۔ مسائل کے بارے میں وہ کبھی جذباتی نہیں ہوتے تھے۔ ان کا تو سیدھا اصول یہ تھا کہ پیسہ ہے تو فکر مت خریدو۔ بے فکری خریدو۔ اپنی فکریں دوسروں کو دے دو۔ مثلاً پیسہ کمانے کی فکر۔ بچانے کی فکر۔ جمع کرنے کی فکر۔ ان سب کے لیے ہی تو یہ سارے ملازم رکھے ہیں میں نے۔ گھر اور گھر سے باہر خود کیا کرنا۔ جو کام ہو اس کے لیے ملازم رکھ لو۔ جو چیز چاہیے وہ خرید لو۔ مکان، کاروبار، عیش و عشرت کے اسباب۔ انسان اور اس کا ایمان وغیرہ۔ قانون اور انصاف کرنے والے۔ سب کو خرید لو اور بس۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ یہی انھوں نے میرے لیے بھی کیا۔ میں نے ان کے لیے ایک مشکل پیدا کی۔ انھوں نے مشکل کو خرید لیا۔ جانی کو وہ مارتے تو میں ان کے لیے مزید مشکلات پیدا کرتی۔ جب میں نے اسے مار دیا تو ایک چھوٹی سی قانونی مشکل پیدا ہوئی۔ اس مشکل کو انھوں نے آسانی سے خرید لیا۔ میرا نام تک کسی کی زبان پر نہیں آیا۔ کسی نے پوچھا بھی نہیں کہ جانی کدھر گیا۔"

خاموشی کا ایک مختصر وقفہ آیا جس میں کملا کھلی کھڑکی سے باہر اندھیرے میں اپنے ماضی کی متحرک پرچھائیاں دیکھتی رہی اور میں اسے دیکھتا رہا۔ معصوم نظر آنے کے باوجود وہ کتنی خطرناک عورت تھی۔ نڈر اور بے باک۔ نہ جلنے سے ڈرنے والی نہ مرنے سے۔ جانی تو اس کی محبت کی بھینٹ چڑھ گیا تھا۔ میرا کیا بنے گا؟ میں نے تو اسے کوئی دھوکا نہیں دیا۔ اس سے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ میں نے اسے صاف بتا دیا ہے کہ میرے لیے اس کی محبت کو قبول کرنا ممکن ہی نہیں اور میں رابعہ سے محبت کرتا ہوں۔ کیا وہ میرے انکار کو اور اس توہین کو برداشت کرے گی؟ کہیں سچ میرا جرم تو نہیں بن جائے گا؟

"معلوم ہے میں نے بعد میں کیا کیا؟" وہ اچانک بولی۔ "میں نے بدصورتی اختیار کر لی۔ خوبصورتی تو محبت کا نام ہے۔ جب آدمی نفرت میں ڈوب جائے تو وہ بدصورت ہو جاتا ہے۔ میری طرح۔۔۔"

"خدا کے واسطے کملا! خود کو بدصورت سمجھنا چھوڑ دو۔۔۔"

"شٹ اپ۔" وہ چیخ کر بولی۔ "مجھے جھوٹ کی طرف لے جانے کی کوشش مت کرو۔ تین سال سے میں اس گٹر میں ہوں۔ نفرت اور غلاظت کے گٹر میں۔ اپنی مرضی سے میں نے خود کو اس میں گرایا تھا۔ کیونکہ اسی میں ڈوب کر جانی مر گیا تھا۔ کملا اس کے ساتھ ستی ہو گئی تھی مگر میں زندہ ہوں۔ تین سال سے زائد ہو گئے مجھے مرتے ہوئے مگر میں زندہ ہوں۔ محبت چھوڑ کر نفرت اختیار کرنے کے بعد میں نے وہی کیا جو میرا جانی کرتا تھا۔ جب اسے دولت ملی تو وہ عیاشی کرنے لگا تھا۔ میں نے سوچا کہ میں کیا بے وقوف ہوں کہ اتنی دولت مند ہونے کے باوجود عیش نہیں کرتی۔ خواہ مخواہ اس شرافت اور عزت۔ محبت اور شادی کے چکر میں اپنی خوبصورتی اور جوانی پر خود ہی پہرے دار بنی رہی۔ سب کا دل توڑتی رہی۔ دل توڑنا کوئی اچھی بات ہے۔ بس جناب! اس کے بعد میں نے سب پر اپنے دل کے دروازے کھول دیے اور وہ سب جو میرے پرانے پرستار تھے ایک دم امڈ آئے۔ جیسے نئی ریلیز ہونے والی فلم پر لوگ ٹوٹ پڑتے ہیں۔ میں نے کہا کہ سب آؤ مگر باری باری۔ بلیک نہیں چلے گی۔ لائن بناؤ لائن۔" وہ قہقہہ مار کے ہنسی۔ "میرے ڈیڈی نے مجھے ماہرِ نفسیات کے سپرد کیا۔ وہ بھی میرے پرستاروں میں شامل ہو گیا۔ میں نے کہا کہ یہ حسن اور جوانی اب کسی کی ملکیت نہیں۔ یہ تو بہتی گنگا ہے۔ آؤ۔ ہاتھ دھو کے پوتر ہوتے جاؤ۔ اس کے بعد تم نے مجھے دیکھا۔ اس جہاز پر میں اپنی مرضی سے سوار ہوئی تھی۔ اور میرے ڈیڈی ابھی یہ فیصلہ نہیں کر سکے کہ تم نے مجھے واپس پہنچا کے کوئی نیکی کی ہے یا نہیں۔ بے شک میں نے دلیل سے انھیں قائل کر لیا تھا کہ تم نے نیکی کی

ہے۔ مگر وہ جانتے ہیں میری نیکی بدی کو۔ وہ میری خاطر اپنا نقصان نہیں کریں گے۔ میں نے تو اپنا جو نقصان کیا وہ کسی کھاتے میں نہیں۔ ۔ ۔"

"کملا دیوی۔ ۔ ۔"، میں نے پریشان ہو کے کہا۔ "مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ نقصان نہ تمھارا ہوگا نہ تمھارے ڈیڈی کا۔ نقصان مجھے ہوگا۔ حالانکہ میں نے کوئی جرم کوئی گناہ نہیں کیا کہ اس لانچ کو واپس لے آیا جس پر بدقسمتی سے تم سوار تھیں۔ مجھے بمبئی پہنچنا تھا اور اس کی یہی ایک صورت تھی۔ میرا مقصد ہرگز تمھاری ذاتی زندگی میں مداخلت نہیں تھا۔ یہ تمھاری زندگی ہے۔ اسے تم جیسے چاہو گزارو۔ جس کو چاہو خیرات میں دو اور جسے چاہو انعام میں۔ تم جب اسے نہ گزارنا چاہو تو ختم کرنے کا اختیار بھی رکھتی ہو۔ لیکن خدا کے لیے مجھے یہ بتا دو کہ میں کیا کروں۔ ۔ ؟"

"تم کیا چاہتے ہو؟"

"میں یہاں سے جانا چاہتا ہوں۔ نکلنا چاہتا ہوں اس پاگل خانے سے جہاں صرف خرید و فروخت ہوتی ہے۔ نہ میں خریدار ہوں اور نہ برائے فروخت۔"

"تم جا سکتے ہو۔ میرے ساتھ۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

میں نے سر پر ہاتھ مار کے کہا۔ "سمجھنے کی کوشش کرو کملا۔ میں ایک ایسا شخص ہوں جس کی زندگی مسلسل فرار کے علاوہ کچھ نہیں۔ ہر جگہ شکاری میرے تعاقب میں ہیں۔ وہ یہاں بھی پہنچ گئے ہیں اور میں جان بچا کے بھاگ جانا چاہتا ہوں۔ تم کہاں تک بھاگ سکتی ہو میرے ساتھ؟"

وہ ہنس پڑی۔ "جب تک زمین تم پر تنگ نہ ہو جائے۔"

میں نے کہا۔ "تنگ تو آج بھی ہے۔ لیکن میں پھر بھی اس طرح پکڑا جانا نہیں چاہتا جیسے چوہے دان میں چوہا پکڑا جاتا ہے۔ مجھے تم سے بہت ہمدردی ہے۔ تمھاری زندگی کے دکھ یقیناً بہت بڑے ہیں لیکن میں انھیں بانٹ نہیں سکتا۔ تم اپنے ڈیڈی کی بات چھوڑ دو۔ اپنی کہو کہ جو کچھ میں نے کیا، وہ اچھا تھا یا برا۔ تم اسے کیا سمجھتی ہو؟ کیا تمھارے نزدیک مجھے اس کی سزا ملنی چاہیے؟"

"میں تمھیں کوئی سزا نہیں دے رہی ہوں۔ تم خود سزا مانگ رہے ہو۔" وہ بگڑ کے بولی۔

"کملا، کاش یہ ممکن ہوتا۔ میرے پاس کوئی جگہ ہوتی۔ کوئی گھر ہوتا، میرا یا دوست ہوتا یہاں کوئی میرا۔ پھر شاید میں تمھیں لے جاتا اور تمھاری مدد کرتا۔ ۔ ۔"

"مجھے تمھاری مدد کی نہیں، تمھاری ضرورت ہے۔" وہ چلّا کے بولی۔

اُف میں نے سخت پریشان ہو کے سوچا، یہ میں کہاں پھنس گیا۔ وہ لڑکی ایک نفسیاتی مریض تھی۔ ایک ایسی لڑکی جو اپنی ذلت کے انتقام میں سب دنیا کو شریک کر رہی تھی۔ اس کی ذہنی حالت دیکھتے ہوئے کوئی بھی اسے پاگل نہیں کہہ سکتا تھا مگر جو کچھ خود اس نے مجھے بتایا تھا اس سے میں یہی اندازہ کر سکتا تھا کہ شکست نے اسے بری طرح توڑ پھوڑ دیا تھا۔ اسے اپنے عورت ہونے پر غرور تھا۔ اپنے حسن پر ناز تھا اور اپنی پاک دامنی پر فخر تھا۔ ایک شخص جسے کملا نے پسند کیا اس نے دوسری عورتوں کو فوقیت عطا کر دی جو بدصورت تھیں، بدکردار تھیں اور بدنام تھیں۔ احساسِ ذلت نے کملا کی شخصیت کو اسی طرح مسخ کر دیا جیسے مصوّر کے ہاتھوں خود اس کا شاہکار مسخ ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی اس کے حسن کو سراہنے کے بجائے کسی گھٹیا فلمی رسالے کے سرورق کو اس سے بہتر قرار دے دے۔ کملا نے اپنے آپ کو تباہ کر دیا۔ وہ عورت سے فاحشہ بن گئی۔ اور اگر میں یہ کہوں کہ کسی حد تک جنسی جنون میں مبتلا ہو گئی تو غلط نہ ہوگا۔

معلوم نہیں تریوینی کی دولت اس کی بیٹی کے لیے ذہنی سکون اور شخصیت کا توازن کیوں نہ خرید سکی۔ وہ تو ہر چیز کو خرید لینے کا قائل تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ کملا کے لیے مجھے بھی خرید لے! یہ بات اس نے دلاور کے سامنے بھی کہی تھی کہ میں اپنی بیٹی کی کسی فرمائش کو رد نہیں کر سکتا۔ بیٹی نے کہا کہ مجھے سکندر چاہیے تو وہ کہے گا کہ رکھ لو۔ اور پھر سکندر کیا کرے گا؟ ایک طرف دلاور کا جال دوسری طرف کملا کی جیل۔ جس میں قیدِ بامشقت بھی جسمانی سے زیادہ ذہنی تھی۔ آگے کنواں پیچھے خندق۔ اس پاگل خانے میں کہیں میں بھی پاگل نہ ہو جاؤں۔ میری آنکھوں سے نیند بہت دور تھی حالانکہ رات کے دو بج چکے تھے۔ ابھی تک مجھے معلوم نہ تھا کہ اس شب کی سحر کیسے ہوگی۔ مجھے یہاں سے نکلنا نصیب ہوگا تو کس حال میں ہوگا۔ میں چاہتا تھا کہ رابعہ کے بارے میں سوچوں کہ وہ کب ملے گی۔ محسن کے اور غالب کے بارے میں سوچوں کہ وہ کہاں ہوں گے لیکن میرا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔

"کافی پیو گے؟" کملا نے ایک انگڑائی لے کر کہا۔

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پھر گھبرا کے نظر دوسری طرف کر لی۔ "خداوندا مجھے اس امتحان سے بچا!" میں نے دل ہی دل میں کہا۔ میں وہی جنت سے نکالا ہوا انسان ہوں جس کے لیے گناہ کی ترغیب سے لڑنا مشکل ہو گیا تھا۔ میں اس حوا کی بیٹی سے کیسے بچوں گا اگر میں اسی طرح محصور رہا۔

میری دعا کا جواب فوراً ایک خیال بن کے آیا۔ میرے دل نے کہا۔ "سکندرِ اعظم۔ گھبرانے کی کون سی بات ہے۔ ایک عورت کو طاقت سے شکست نہیں دے سکتے تو کیا ہوا۔ عقل استعمال کرو۔ سوچو، حالات کو سمجھو۔ اور پھر اپنا راستہ بناؤ۔"

میں نے مسکرا کے کہا۔ "کیا تمھیں نیند نہیں آ رہی ہے؟"

اس نے کہا۔ "وہ تو اب اکثر نہیں آتی۔ رات ایسے ہی گزر جاتی ہے۔ خواب آور گولیاں بھی اثر نہیں کرتیں۔ اکیلے تو بالکل نہیں آتی۔ ۔ ۔"

"وہ۔ ۔ ۔ کافی۔ ۔ ۔ میرا خیال ہے۔ ۔ ۔"، میں نے کہا۔ "کوئی حرج نہیں اگر ہم دونوں پی لیں۔ ۔ ۔"

اگر میں فوراً اپنا رویّہ بدل لیتا تو اسے ضرور شک ہوتا کہ یہ میری چال ہے۔ میرے لیے محتاط رہنا ضروری تھا ورنہ وہ لڑکی کچھ بھی کر سکتی تھی۔ اس کے لیے ناممکن کچھ نہیں تھا۔

"کیا تمھارے ڈیڈی سو گئے ہوں گے؟" میں نے کافی پینے کے بعد سگریٹ جلا کے کہا۔

"معلوم نہیں۔ ان کی فکر کیوں ہے تمھیں؟"

"میرا مطلب تھا کہ۔ ۔ ۔ وہ واپس کیوں نہیں آئے۔ انھوں نے مجھے کچھ نہیں بتایا کہ میرے بارے میں انھوں نے کیا فیصلہ کیا ہے۔ ۔ ۔؟"

"فیصلہ تو میں نے بتا دیا تھا۔ ان میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ اس فیصلے کے خلاف کچھ کر سکیں۔" وہ بولی۔

"کیا دلاور واقعی چلا گیا ہوگا؟"، میں نے کہا۔

"بھاڑ میں جائے دلاور۔ وہ اندر بھی ہے تو تمھیں ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ تمھارے سامنے آئے تو اسے گولی مار دینا۔ بلا تکلف۔ تمھیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔" وہ بولی۔ "لاش میں اٹھوا دوں گی۔"

"میں اپنا اطمینان چاہتا تھا کہ اب اس کی طرف سے مجھے کوئی ڈر نہیں۔" میں نے کہا۔ "وہ بہت عیّار آدمی ہے۔"

"یہ ضمانت میں آخر کیسے دوں؟"

"ضمانت کی کوئی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔ "تم نے کہا ہے کہ اسے گولی مار دینا مگر میں سوچ رہا ہوں کہ خالی ہاتھوں اُسے میں گولی کیسے ماروں گا۔ اگر وہ اچانک آ گیا۔ ۔ ۔"

"یہ لو۔ ۔ ۔ میرا ریوالور۔ ۔ ۔" اس نے کہا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "اسے اپنے ہی پاس رکھو۔ تم خود مار دینا گولی۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ تمھارے گھر میں کسی کو قتل کر سکوں۔ خواہ وہ میرا دشمن ہی کیوں نہ ہو۔ میرا خیال ہے کہ اب نکلنے کی سوچنا چاہیے۔"

"سوچنے کی تو اس میں کوئی بات نہیں۔ ہم صبح ہوتے ہی نکل جائیں گے۔" اس نے کہا۔

"صبح! یعنی ابھی نہیں جا سکتے؟"

"ابھی کیسے جا سکتے ہیں۔ ۔ ۔ سارے گیٹ بند ہیں۔ کوئی گاڑی گیراج سے نہیں نکل سکتی جب تک ڈیڈی کا حکم نہ ہو۔ گارڈن میں چاروں طرف بڑے خونخوار قسم کے کتے پھر رہے ہیں۔"

"کیا وہ تمھیں بھی نہیں پہچانتے؟"

"وہ کسی کو نہیں پہچانتے۔ سوائے اس شخص کے جس کے ہاتھوں میں ان کی زنجیر ہوتی ہے۔" کملا نے کہا۔ "اگر وہ زنجیر کھول دے تو کتے کسی کو بخشنے والے نہیں۔ اس کے علاوہ دیواریں تم نے شاید نہیں دیکھیں۔"

"جس حالت میں مجھے لایا گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "وہ تم نے تو دیکھی ہوگی۔ کیا میں کچھ دیکھ سکتا تھا؟"

"دیواروں کے اوپر بالکل جیل جیسا حفاظتی حصار ہے۔ خاردار تاروں والا۔ جن میں برقی رو رہتی ہے۔" وہ بولی۔

"صبح ہم کیسے جائیں گے؟"

"صبح کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ گیراج کھل جائے گا۔ میری گاڑی آ جائے گی۔ میں تمھیں لے جاؤں گی، جہاں تم کہو گے۔" وہ بولی۔

"میرے پاس تو کوئی بھی ایسی جگہ نہیں۔ ۔ ۔ تم لے جا سکتی ہو مجھے کہیں؟"، میں نے کہا۔ "جہاں میں کچھ عرصہ روپوش رہ سکوں۔ اور کسی کو بلکہ تمھارے ڈیڈی کو بھی معلوم نہ ہو۔"

"ایسی تو کوئی بھی جگہ نہیں ہو سکتی۔" وہ سوچ کے بولی۔ "بہت سے فلیٹ ہیں۔ ساحلِ سمندر پر کاٹیج ہے۔ مگر وہاں ڈیڈی سے چھپ کے رہنا ناممکن ہی سمجھو۔ انھیں تو میری ہر سہیلی، ہر بوائے فرینڈ اور آشنا کا پتا ٹھکانا بھی معلوم ہوگا۔"

میں نے کہا۔ "بمبئی بہت بڑا شہر ہے۔ ایسے ہزاروں مقامات ہوں گے جہاں تمھارے ڈیڈی کا خیال بھی نہیں جا سکتا۔"

"تمھیں معلوم ہے تو مجھ سے کیوں پوچھ رہے تھے؟"

"صرف معلوم ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ کوئی بھی جگہ مفت تو نہیں ملتی اور پیسہ میرے پاس ہے نہیں۔ جو تھا وہ تمھارے ڈیڈی نے چھین لیا۔"

"پیسہ میرے پاس ہے۔ میرے بینک اکاؤنٹ میں ہے۔"

وہ اس خیال سے جذباتی ہونے لگی تھی کہ میں اسے ساتھ رکھنے پہ آمادہ ہو گیا ہوں۔

"بینک کو گولی مارو۔ نقد کی بات کرو جو اس وقت تمھارے پاس ہے۔" میں نے کہا۔

"نقد۔ ۔ ۔ ہوگا آٹھ دس ہزار۔ لیکن میرے زیورات بھی ہیں۔ کئی لاکھ کے۔ ۔ ۔"

"زیورات کے بدلے مکان نہیں ملتا۔ اور انھیں بیچنے گیا تو دھر لیا جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "کہاں ہے یہ رقم۔ لاؤ نکالو۔"

"یہاں کیا ہے میرے پاس۔ بیڈروم میں ہے۔"

"کیا ہم وہاں نہیں جا سکتے؟" میں نے کہا۔

وہ ہنسی۔ "میں اپنے بیڈروم میں نہیں جا سکتی؟ کیسی باتیں کرتے ہو۔ آؤ میرے ساتھ۔۔۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "اگر کسی نے دیکھ لیا؟"

"کون دیکھے گا؟" وہ بولی۔

"کوئی محافظ۔۔۔ نوکر۔"

"اندر کوئی نہیں ہوتا۔ سب باہر پہرا دیتے ہیں۔"

"یہاں تو خفیہ کیمرے اور مائیکروفون سب کچھ ہیں۔ کہیں یہ گفتگو بھی کوئی سُن نہ رہا ہو۔"

"کیمرے تو ہیں۔ لیکن میں تم کو محفوظ راستے سے گزار کر لے جاؤں گی۔" وہ بولی۔ "یہ باتیں کوئی نہیں سُن رہا ہے۔"

"پھر تمھارے ڈیڈی کیسے آ گئے تھے۔۔۔؟"

"وہ میرے پاس نہیں آئے تھے، تمھارے پاس آئے تھے۔ اور باتیں کچھ بھی نہیں سُنی تھیں اُنھوں نے۔ سب کچھ تو آف ہے۔" کملا نے کہا۔ "بس راستے میں مت بولنا۔"

"کیا تمھارا بیڈروم محفوظ ہے؟" میں نے کہا۔

وہ بڑے معنی خیز طریقے پر مسکرائی۔ "ہے تو نہیں۔ مگر میں اپنی پرائیویسی کی حفاظت کرنا جانتی ہوں۔ چلو آؤ۔" اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

باہر کے حفاظتی انتظامات کے بارے میں کملا مجھے بہت کچھ بتا چکی تھی۔ اب میں اندر کا نقشہ دیکھنا چاہتا تھا اور باہر نکلنے کی کوشش کرنے سے پہلے باہر جانے کا راستہ سمجھنا چاہتا تھا۔ دروازے سے نکلتے ہی میں نے ایک بہت بلند چھت والی وسیع راہداری دیکھی جس میں یکساں فاصلے سے تین فانوس آویزاں تھے۔ اس وقت یہ فانوس روشن نہیں تھے۔ راہداری میں لیمپ جیسی وال لائٹس کا دھندلا اُجالا تھا۔ میرے قدموں کے نیچے دبیز قالین تھا جو مجھے مدھم روشنی میں گہرا سبز لگا۔ راہ داری میں چار دروازے کھلتے تھے۔ دو ایک طرف اور دو دوسری طرف۔ کملا نے مجھے دیوار سے لگ کر چلنے کو کہا اور ایک انگلی سے فانوس کی طرف اشارہ کیا۔ اس کا مطلب واضح تھا۔ فانوس میں یہاں بھی کیمرے پوشیدہ تھے۔

کملا نے آخری دروازے کو کھولا اور مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ یہ ایک اور مختصر سا کوریڈور یا لاؤنج تھا جس میں اوپر سے زینہ اُترتا تھا۔ زینے کا کٹہرا جگمگاتے سنہرے پیتل کا تھا اور ریلنگ پر چاندی جیسی سفید دھات کی پالش تھی۔ گھوم کر اوپر جانے والے زینے پر بھی وہی گہرے سبز رنگ کا قالین تھا اور اسے تھوڑے تھوڑے فاصلے سے لگی ہوئی وال لائٹس نے روشن کر رکھا تھا جن کی شکل بالکل مٹی کے تیل سے چلنے والے لیمپ جیسی تھی۔

میں گرد و پیش کا جائزہ لینے کے ساتھ اس پلان پر بھی غور کرتا جا رہا تھا جو میرے ذہن میں فائنل ہو چکا تھا۔ ابھی تک میں نے کسی بھی ملازم یا محافظ کی صورت نہیں دیکھی تھی اور پورے ماحول پر ایک پُرہیبت خاموشی مسلط تھی۔ کملا دبے پاؤں کوئی آہٹ کیے بغیر چلتی جا رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ اس قصرِ عالی شان میں کملا کے اور اس کے باپ کے ساتھ رہنے والے کون لوگ ہیں؟ صرف ملازم اور محافظ۔ کملا کی ماں، ترلوچن کی بیوی، اس کے بھائی بہن، وہ سب کہاں ہیں؟

اچانک کملا نے ایک دروازے کو ہینڈل گھما کے کھولا اور مجھے ہاتھ پکڑ کے اندر کھینچ لیا۔

بیڈروم کی شان و شوکت دیکھ کے میں دنگ رہ گیا۔ کملا بڑی احتیاط کے ساتھ کچھ سوئچ آف کر رہی تھی اور میری طرف چور نظروں سے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ بیڈروم میں نے پہلے بھی دیکھے تھے جو بہت عالی شان تھے۔ کچھ فلموں میں اور کچھ حقیقی زندگی میں۔ لیکن یہ ان سب پر بازی لے گیا تھا۔ یہ ایک ایسی خواب گاہ تھی جو شاید میں خواب میں بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ایسی خواب گاہ کا کچھ لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ مثلاً وہ جو فٹ پاتھ پر یا پھر کسی پارک کی بینچ پر۔ کسی مال گاڑی کے ڈبے میں۔ کھنڈر میں، یا قبرستان کی چار دیواری کے سائے میں اور فرشِ خاک پر راتیں گزار لیتے ہیں۔ قدرت کی کیا ستم ظریفی ہے کہ وہ تو کسی پریشانی کے بغیر گہری نیند سوتے ہیں اور جو اپنی خواب گاہوں کو عیش و عشرت کے سارے لوازمات۔ آرائش کے تمام اسباب۔ آرام و آسائش کے ساز و سامان اور دولت کی قوتِ خرید میں آنے والی ہر خوبصورت چیز سے بھر لیتے ہیں، وہ خواب آور گولیاں کھاتے ہیں۔ ڈپریشن میں مبتلا ہوتے ہیں اور کروٹیں بدل کے راتیں گزارتے ہیں۔

"بیٹھ جاؤ۔ کیا سوچ رہے ہو؟" اس نے مجھے ہاتھ سے پکڑ کے بیڈ پر دھکیل دیا۔

میں فوراً اٹھ بیٹھا۔ "میں سوچ رہا تھا کہ تمھارے اس محل میں ایسی کتنی خواب گاہیں ہوں گی؟"

وہ ہنس پڑی۔ "ایسے سات بیڈروم ہیں۔"

"اور پوری بمبئی میں ایسے کتنے محل ہیں؟" میں نے کہا۔ "تمھاری صرف ایک خواب گاہ کی آرائش پر جتنا پیسہ خرچ ہوا ہوگا اس سے ایک ہزار افراد کو سونے کے لیے ایک کمرے کی چھت تو ضرور فراہم کی جا سکتی تھی۔ اور پورے بمبئی شہر کو دیکھا جائے تو۔۔۔"

"ایسی باتیں کہاں سے آ گئیں تمھارے دماغ میں۔ ایک بھی

بات کیوں کرتے ہو؟" وہ ایک الماری کھولتے ہوئے بولی۔ "ساری دنیا کو دیکھو۔ نیویارک۔ پیرس۔ سوئٹزرلینڈ۔۔۔"

ہاں۔ میں نے اپنے آپ سے کہا۔ ہر دولت مند شہر ایسے ہی تضادات کا تجربہ ہوتا ہے۔ بمبئی میں لوگ فٹ پاتھوں پر سوتے ہیں تو کیا کراچی میں جھگیوں میں نہیں رہتے؟ کیا نیویارک میں۔۔۔ غریب بستیاں نہیں ہیں؟ امرا کے محل بھی کھڑے ہوئے ہیں اور ان کے مقابل لاوارث بے خانماں لوگوں کا بسیرا بھی ہے جہاں زندگی میں صرف بدصورتی ہے۔ غربت اور غلاظت ہے۔ بھوک اور بیماری ہے۔ معلوم نہیں وہ غریب کہاں ہیں جن کو علامہ اقبال نے کہا تھا کہ اٹھو۔ کاخِ اُمرا کے در و دیوار ہلا دو۔ کیا ان کا احساس تک مر چکا ہے اور ان کے خون میں اتنی کم ہمتی سرایت کر چکی ہے کہ وہ مقدر پر قانع رہتے ہیں اور انسانوں کی طرح جینے کا حق تک نہیں مانگتے۔ چنانچہ اُمرا بھی محفوظ ہیں۔ ان کے کاخ بھی اور در و دیوار بھی۔۔۔

"یہ لو۔ اس وقت یہی ہے میرے پاس۔" کملا نے ایک بیگ میرے سامنے اُلٹ دیا۔ پھر اس نے دوسرا بیگ خالی کیا۔ پھر تیسرا اس مخملی سطح والے بیڈ پر نوٹ ہی نوٹ پھیل گئے۔ میں نے خود کو سنبھالا اور نوٹ گننے لگا، بے ارادہ بہک جانے والی نظروں اور خیالات کے انتشار سے بچنے کے لیے۔

"یہ تقریباً بارہ ہزار روپے ہیں۔" میں نے کہا۔

اس نے وارڈروب کی طرف دیکھا۔ "صبح اور مل جائیں گے۔ میں اپنی چیک بک ساتھ لے چلوں گی۔"

میں نے کہا۔ "کیا تمھارے ڈیڈی اتنے ہی بے وقوف اور بے بس ہیں۔ کہ تم کو میرے ساتھ جاتے دیکھ کر کچھ نہیں کہیں گے اور کچھ نہیں کریں گے؟"

"اُن کو جو کہنا تھا کہہ چکے اور وہ کر کیا سکتے ہیں؟ ہاں وہ کچھ کریں تو پھر میں بھی کچھ کر سکتی ہوں۔" اس نے پھر اپنا ریوالور نکالا۔ ابھی سر کی طرف ہاتھ بڑھا ہی رہی تھی کہ میں نے جھپٹ کر ریوالور اپنے قبضے میں کر لیا۔

"یہ کیا بے وقوفی ہے۔" میں نے کہا۔ "مذاق بھی نہیں کرنا چاہیے اس قسم کا۔"

وہ ہنسنے لگی۔ "اتنا ڈرتے کیوں ہو۔ سیفٹی لاک۔۔۔"

"مجھے معلوم ہے۔ مگر رسک لینے سے فائدہ؟" میں نے کہا۔ اور ریوالور اپنی جیب میں رکھ لیا۔ "تمھارے پاس ہونا ہی نہیں چاہیے ایسا خطرناک کھلونا۔ میں حیران ہوں کہ تمھارے ڈیڈی منع نہیں کرتے۔"

"انھیں تو آج پتا چلا ہوگا۔ کہ ریوالور بھی ہے میرے پاس۔"

"وہ کہاں سوتے ہیں؟ اوپر کہ نیچے؟" میں نے کہا۔

"اوپر آخری بیڈروم اُنھی کا ہے۔" وہ بولی۔

میں نے ایک کھڑکی پر پڑے ہوئے پردے کی طرف اشارہ کیا۔ "ادھر کیا ہے۔ پائیں باغ؟"

اس نے پردہ ہٹا دیا۔ "ادھر سے بمبئی نظر آتا ہے۔ وہ دیکھو۔ ادھر ایک میل کے فاصلے پر سمندر ہے۔ میرین ڈرائیو۔ تم کو روشنیاں نظر آ رہی ہیں؟"

مجھے ہر سمت روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ یہ بڑا دلفریب نظارہ تھا۔ زمین پر جگمگانے والی اسٹریٹ لائٹس، سمندر میں روشن جہاز، آسمان پر نظر آنے والے ستارے۔ سب مل کے ایک ہو گئے تھے۔ مگر میں نے زمین کو آسمان سے الگ کر کے دیکھا اور اپنے سامنے پھیلے ہوئے شہر کے جغرافیے کو سمجھ کر ذہن نشین کرنے لگا۔ سمندر کے صرف ایک میل دور ہونے کی اطلاع ایک حوصلہ افزا بات تھی۔ دور سے آنے والی ایک کار کی ہیڈلائٹس سیدھی مجھ پر پڑیں۔ کار قریب آئی اور پھر دائیں طرف گھوم گئی۔ اس سے مجھے یہ اندازہ کرنے میں مدد ملی کہ ترلوچن کے محل کی بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ بھی سڑک چل رہی ہے اور غالباً بالکل سامنے وہی سڑک ہوگی جو مجھے ساحل تک پہنچا دے گی۔

کلاک نے اپنی سُریلی آواز میں تین بجائے تو میں چونک کے پلٹا۔ جب میری نظر کملا پر پڑی تو میں پھر پلٹا۔ اس نے اپنا لباس بدل لیا تھا مگر اب جو لباس پہنا تھا وہ کہنے کو شب خوابی کا لباس تھا مگر درحقیقت کچھ نہیں تھا۔ وہ شفاف جالی والا کپڑا تھا جس کی ہر شکن کملا کے جسم کی ایک نئے انداز سے نمائش کرتی تھی۔

میں نے کملا کی کھنکتی ہنسی سُنی۔ "اب کیا ساری رات باہر ہی دیکھتے رہو گے۔"

"کملا! تمھیں کچھ معلوم ہے۔ میرا سامان کہاں ہے؟" میں نے اس کھیل کو ختم کر دینے کا فیصلہ کیا۔

"کون سا سامان؟ کوئی سوٹ کیس وغیرہ تھا۔"

"نہیں۔ ایک پاسپورٹ تھا، ریوالور تھا۔ اور کچھ نقد رقم تھی جو ایک بیلٹ میں لپٹی ہوئی تھی۔"

"مجھے نہیں معلوم۔ ڈیڈی کے پاس ہوگا اگر ہوا۔" وہ ایک توبہ شکن انگڑائی لے کر بولی۔ "مل جائے گا صبح۔"

"سوری کملا دیوی!" میں نے اُس کے قریب جا کے کہا۔ "صبح تک میں نہیں ٹھہر سکتا۔ میں جا رہا ہوں۔ ابھی، اسی وقت۔"

کملا کا رنگ فق ہو گیا۔ "جا رہے ہو؟ اکیلے؟"

"ہاں۔ میں مجبور ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں تم کو ساتھ نہیں لے جا سکتا۔۔۔"

"مگر... تم نے... کہا تھا..."

"میں نے جھوٹ بولا تھا۔ بے وقوف بنایا تھا تمھیں۔" میں نے کہا۔

"ذلیل... کمینے..." کملا چلائی۔

میں نے اسے ایک دم دبوچ لیا۔ میرا ہاتھ اس کی نازک گردن پر جم گیا۔ "میں تم کو مار کے جانا نہیں چاہتا۔ لیکن یہ مت سمجھنا کہ میں ایسا کر نہیں سکتا۔ کیا تم نے سُنا نہیں تھا کہ تمھارے ساتھ جانے پر میں نے دلاور کے ساتھ جانے کو ترجیح دی تھی۔ اس کے باوجود تم نے اعتبار کر لیا مجھ پر؟ تم اتنی آسانی سے بے وقوف بن جاؤ گی، یہ امید نہیں تھی مجھے۔ مگر تم نے خود کو بالآخر وہی عورت ثابت کر دیا جس کو مرد ناقص العقل کہتے ہیں تو غلط نہیں کہتے۔"

وہ میری گرفت میں کسمائی اور اس نے سانس لینے کی جدوجہد میں مُنہ کھول دیا۔ اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں دہشت سے مجھے دیکھتی رہیں۔ میں نے اسے بستر پر پھینک دیا۔ وہ زخم خوردہ شیرنی کی طرح اُٹھی اور مجھ پر حملہ آور ہوئی۔ میرا اُلٹا ہاتھ حرکت میں آیا اور وہ گھوم کر پھر بستر پر جا گری۔ میں نے اسے اُٹھنے نہیں دیا۔ میں نے اسے ایک گھٹنے سے دبا لیا اور پھر اس کے مُنہ میں اپنا رومال ٹھونس دیا۔ اس کے نائٹ گاؤن کو پھاڑ کے اسی کے ہاتھ پیر باندھنے میں مجھے کوئی دُشواری پیش نہیں آئی کیونکہ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

کملا کی طرف سے بے فکر ہو جانے کے بعد میں نے اپنی حالت درست کی۔ رہائی کی جانب اگلا قدم اُٹھانے سے پہلے میں نے پُرسکون ہو جانا بہتر سمجھا۔ وہیں بیڈ کے کنارے پر ٹک کر میں نے ایک سگریٹ سلگائی اور مجموعی صورتِ حال کا جائزہ لیا۔ مجھے کملا کی زندگی کے مسائل سے ہمدردی تھی مگر اس ہمدردی کی خاطر میں عملاً کچھ بھی کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ مجھے اس کی بالکل فکر نہیں تھی کہ بعد میں اس کا ردِ عمل کیا ہوگا اور وہ خودکشی کرے گی یا پھر کسی 'بھانومتی' پر سوار ہو جائے گی۔

کملا کے دیے ہوئے بارہ ہزار روپے میری جیب میں تھے۔ اس سے کہیں زیادہ وہ رقم تھی جو مجھے اغوا کرنے کے بعد مجھ سے چھین لی گئی تھی۔ اس میں پانچ ہزار تو انڈین کرنسی تھی اور پانچ ہزار ڈالر بھی تھے۔ اس طرح بارہ ہزار وصول کرنے کا مجھے بہر حال حق تھا۔ اب سوال تھا لاکھوں کی مالیت کے زیورات کا۔ جو کملا کی وارڈروب میں پڑے ہوئے تھے۔ یہ دُشمن کا مال تھا اور دُشمن کی حلال کمائی کا بھی نہیں تھا۔ دوسری طرف پیسہ ہمارے بہت سے مسائل حل کرسکتا تھا لیکن میں 'اخلاقی جواز' سے مطمئن نہیں ہو پا رہا تھا۔ مجھے یہ چوری لگتی تھی۔

بالآخر میں نے زیورات کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا۔ میں نے ایک نظر وارڈروب میں ڈالی۔ اس میں سے دلآویز خوشبو کا ایک معطر جھونکا آیا۔ سائیڈ کی دراز کھولنے پر مجھے فرانس کی اعلیٰ ترین پرفیوم کی رنگا رنگ دلکش ڈیزائن والی شیشیاں صف بستہ دکھائی دیں۔ اس کے ساتھ ہی مختلف قسم کی کریم اور درجنوں شیڈ کی لپ اسٹک، نیل پالش وغیرہ بھری پڑی تھیں۔ نیچے کی دراز کھول کر دیکھنے پر مجھے خطوط اور تصاویر کا ایک بنڈل ملا۔ یہ سب کملا کے پرستاروں کے خطوط تھے۔ ان پرستاروں کے جو اسے محبت کے نام پر دھوکا دے کر دُنیا کی ویرانی میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ کر چلے گئے۔ ان میں کچھ کے ساتھ کملا نے تصویریں بھی بنوائی تھیں۔ ہر تصویر کے پس منظر سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ تصویر کہاں لی گئی ہوگی۔ تاہم ان میں کوئی بھی تصویر قابلِ اعتراض یا ایسی نہیں تھی جس پر کوئی اسے بلیک میل کرسکتا۔

بیڈ سائیڈ ٹیبل کی درازوں میں مجھے واہیات کتابوں اور تصویروں کا ایک افسوس ناک ڈھیر ملا۔ یہ سب بھی کملا کی ذہنی بے راہ روی کا سبب بنے ہوں گے۔ میں نے اسے پھر بند کر دیا۔ مزید وقت ضائع کرنے کا اب کوئی فائدہ نہ تھا۔

میں نے کملا کو دیکھا تو وہ سر کو ادھر سے اُدھر پٹخ رہی تھی اور اس کی بے چینی یہ ظاہر کر رہی تھی کہ وہ ہوش میں آنے ہی والی ہے۔ اس حالت میں کملا کا بے ہوش پڑے رہنا ہی بہتر تھا چنانچہ میں نے اس کو اپنے ہاتھ کے ہلکے سے وار سے بے حس کیا اور پھر بیڈ سے اُٹھا کے باتھ روم میں لٹا دیا۔ دروازے کو باہر سے لاک کرنے کے بعد میں مطمئن ہو گیا کہ اب کم سے کم دو گھنٹے تک کملا کسی کو کچھ نہیں بتا سکے گی۔ اسے تلاش کرنے کوئی نہیں آئے گا۔ اگر آ گیا تو کمرا خالی دیکھ کے چلا جائے گا۔ وہ خود صبح چھ بجے تک ہوش میں آئے گی۔ پھر دروازہ پیٹے گی اور یہ شور سُن کر کوئی آئے گا تو اسے دروازہ توڑنا پڑے گا۔ اگر میں باہر نکلنے میں کامیاب رہا تو میرے لیے اتنی مہلت کافی ہوگی۔

کمرے سے باہر آکے میں نے نقشے کو ذہن میں رکھا اور بائیں جانب چل پڑا۔ راہ داری کے آخر میں ایک دروازہ تھا جو بند تھا۔ میں نے اس کا ڈور لاک گھما کے دیکھا۔ دروازہ باہر سے مقفل کیا گیا تھا۔ ابھی میں نے واپس جا کے کسی دوسرے دروازے پر قسمت آزمائی کا سوچا ہی تھا کہ باہر سے قفل میں چابی گھمانے کی آواز سُنائی دی۔

میں دیوار کے ساتھ چپک کے کھڑا ہو گیا۔ کوئی شخص دروازہ کھول کے اندر آیا۔ اس کے کندھے سے ایک مشین گن لٹکی ہوئی تھی۔ اندر کسی کو نہ پا کے وہ حیران ہوا۔ شاید وہ اسی طرح اندر سے خفیف سی آواز سُن کے دروازہ کھول دینے کا عادی تھا۔ اس کا اصل کام یہ تھا کہ باہر سے کسی غیر متعلقہ فرد کو اندر نہ جانے دے لیکن اندر والوں کے لیے ضرورت پڑنے پر فوراً دروازہ کھولنا بھی اس کے فرائض میں شامل تھا۔

اسے زیادہ حیرانی ہوئی جب میں نے پیچھے سے کملا کا دیا ہوا ریوالور اس کی گُدّی پر رکھ دیا۔ "بالکل خاموش کھڑے رہو۔" میں نے اسے حکم دیا۔

خوف سے زیادہ اسے حیرت نے منجمد کیا۔ "کون ہو تم؟"

"موت کا فرشتہ۔ یم دوت۔" میں نے کہا۔ "واپس باہر چلو۔ آہستہ آہستہ پلٹ کے اور ہاتھ اوپر اُٹھا کے۔ پھُرتی اچھی چیز ہے مگر اس کا غیر ضروری مظاہرہ تمھاری وفات کا سبب بن سکتا ہے۔ میں تم کو سلو موشن میں احکامات کی تعمیل کرتے دیکھنا پسند کروں گا۔ پہلے یہ مشین گن اُتار دو۔"

اس نے ہاتھ سیدھا کیا اور میں نے مشین گن خود اُتار کے اپنے شانے پر ڈال لی۔ وہ پلٹ کے دروازے سے گزرا اور میں نے پوری طرح مستعد رہتے ہوئے ریوالور کا دباؤ کم نہیں ہونے دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ میں بھی گھومتا گیا اور باہر آ گیا۔

"اس کا کوئی فائدہ نہیں۔" وہ بولا۔ "تم باہر نہیں جا سکو گے۔ یہ دروازہ بھی باہر سے بند ہے۔"

میرے سامنے اب ایک اور دروازہ آ گیا تھا۔ اس مختصر سے کمرے کو جس میں آٹھ دس فٹ کے فاصلے سے آگے پیچھے دو دروازے تھے، حفاظتی نظام کا ایک حصّہ سمجھا جا سکتا تھا۔ ایک شخص کو میں نے قابو کر لیا تھا مگر دوسرا محافظ جو باہر تھا، بالکل آزاد تھا۔

"کیا تم اپنے ساتھی سے نہیں کہو گے کہ وہ دروازہ کھول دے؟" میں نے کہا۔

"وہ میرے کہنے سے دروازہ نہیں کھولے گا۔"

"پھر کب کھولے گا۔ جب فائر کی آواز اور تمھاری دردناک چیخ سُنے گا؟" میں نے کہا۔ "میں اس مشین گن سے دروازے کا تالا توڑ سکتا ہوں۔ وہ بھی خواہ مخواہ باہر مارا جائے گا۔"

"تم چور، ڈاکو۔ جو بھی ہو۔ شاید یہ نہیں جانتے کہ..."

"میں سب جانتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں اسی دروازے سے گزر کے اندر گیا تھا۔ میں کوئی اجنبی نہیں ہوں۔"

وہ شاید قائل ہو گیا۔ اس نے آگے بڑھ کے دروازے پر دستک دی۔

باہر سے کسی نے کہا۔ "کیا بات ہے؟"

"دروازہ کھول یار۔" میرے قیدی نے کہا۔ باہر والا اسی کا ساتھی تھا چنانچہ آواز پہچانتا تھا۔ اُس نے دروازہ کھلوانے کی وجہ پوچھنا ضروری نہیں سمجھی۔ اُسے یہ شک کیسے ہو سکتا تھا کہ کوئی دُشمن اندر سے بھی آ سکتا ہے۔

میں نے جیسے ہی دروازے میں چابی لگنے کی آواز سُنی، اپنی پوری قوت کے ساتھ ریوالور سے سامنے کھڑے ہوئے شخص کے سر پر وار کیا۔ ریوالور بڑا ہوتا تو اس کا سر پھٹ جاتا۔ اس چھوٹے سے زنانہ ریوالور کی ضرب نے اسے ناک آؤٹ کر دیا لیکن وہ گرتے گرتے پُراذیت آواز میں چلایا۔

باہر والا اس چیخ پر ضرور کھٹک گیا ہوگا مگر میں نے اسے دوبارہ چابی لگا کے دروازہ مقفل کرنے کی مہلت نہیں دی۔ میں نے ہینڈل گھما کے دروازہ اپنی طرف کھینچ لیا۔ ایک جھٹکے سے وہ بھی اندر آ گیا۔ میں نے مشین گن کا رُخ اس کی طرف کر دیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے اور اپنے ساتھی کو دیکھنے لگا جو میرے قدموں میں لیٹا ہوا تھا۔

"یہ... کیا ہے آخر... کون ہو تم؟"

"میں تمھارا دوست نہیں ہوں۔" میں نے کہا۔ "دُشمن ہوں۔ مجھ سے کسی رعایت کی اُمید مت رکھنا۔"

"تم نے... اسے مار دیا ہے؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "میں اسے مارنا نہیں چاہتا تھا مگر اس نے وعدہ خلافی کی۔ تم اپنی جان بچا سکتے ہو، اگر مجھے یہاں سے باہر نکلنے کا راستہ بتا دو۔ اور باہر نکلنے میں میری مدد کرو۔"

اس نے بڑی مشکل سے تھوک نگلا۔ "میں... یہ میں کیسے کر سکتا ہوں؟"

"کیوں نہیں کر سکتے۔ کیا تمھیں راستے معلوم نہیں؟ یا اپنی جان عزیز نہیں؟" میں نے کہا۔

"میرا مطلب تھا... باہر جانے کے لیے... میں کیا مدد کروں۔ اور بھی بہت سے لوگ ہیں... اور اس وقت تو کتے بھی کھلے ہوئے ہیں۔ پھر باہر کا گیٹ بجلی سے کھلتا ہے۔"

"مین گیٹ کو چھوڑو۔ پیچھے سے جانے کا بھی تو کوئی راستہ ہوگا؟" میں نے کہا۔ "جہاں چوکیدار اور کتے نہ ہوں۔"

"راستہ تو ہے۔" وہ بولا۔ "لیکن اس دیوار کو تم کیسے عبور کرو گے۔ جس پر تار لگے ہوئے ہیں۔ بجلی ہے ان میں۔"

"تم مجھے دیوار تک پہنچا دو۔" میں نے کہا۔ "اس کے بعد تمھارا کام ختم۔"

وہ مجھے واپس اندر لے گیا۔ ایک اسٹور اور کچن سے گزرنے کے بعد میں عمارت کے عقبی حصّے میں نکلا۔ وہ مجھ سے آگے تھا اور میں اس کی ایک ایک حرکت پر نگاہ رکھے پیچھے چلتا جا رہا تھا۔ ایک باغ سے گزرنے کے بعد سرونٹ کوارٹر آ گئے۔

جو شخص میرے آگے آگے بظاہر بڑے صبر و سکون اور

سعادت مندی کے ساتھ چل رہا تھا مگر میری توقع سے زیادہ چالاک ثابت ہوا۔ اس نے ابتدا ہی سے مزاحمت نہیں کی تھی اور یوں لگتا تھا کہ اسے واقعی جان پیاری ہے۔ مجھے اس کی ایک جیب کے اوپر جو اُبھار سا نظر آ رہا تھا وہ ریوالور کا تھا جسے اس نے مشین گن کا مقابلہ کرنے کے لیے نکالنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔

چلتے چلتے وہ ایک دم بیٹھ گیا۔ میں اس کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اس حد تک ضرور مستعد تھا کہ وہ ریوالور نکالے یا پلٹ کر مجھ پر حملہ کرے تو مشین گن کا بٹ مار کے اس کا سر توڑ دوں۔ اس کے اور میرے درمیان مشکل سے دو فٹ کا فاصلہ تھا اور اپنی چال کو کامیاب بنانے کے لیے اس نے ابتدا ہی سے رفتار زیادہ رکھی تھی۔ میں بھی کم سے کم وقت میں خطرناک علاقے سے نکل جانے کا خواہش مند تھا چنانچہ اس کے قدم ایک مشینی انداز میں تیز اُٹھ رہے تھے تو میں بھی اس کی رفتار کا ساتھ دے رہا تھا۔

وہ اچانک میرے سامنے سنگِ راہ کی طرح حائل ہوا تو میں اپنی تیز گامی پر فوراً قابو نہ پا سکا۔ میں اس سے ٹکرایا اور پھر اوپر سے گزر کے اس کے سامنے چت ہو گیا۔ وہ اس ایکشن کے لیے ذہنی طور پر پہلے سے تیار تھا۔ نیچے بیٹھتے ہوئے اس نے اپنا ریوالور نکال لیا تھا۔

میں نے اُٹھنے میں ایک سیکنڈ کی تاخیر بھی نہیں کی مگر اس سے پہلے ہی حریف نے ریوالور مجھ پر مار دیا۔ گولی چلانے کے لیے یہ فاصلہ بہت کم تھا۔ اس نے میرے سر کا نشانہ لیا ہوگا لیکن میری پھرتی میرے کام آئی۔ ریوالور کا دستہ میرے شانے پر لگا۔ وار سخت تھا اور ہڈی پر پڑا تھا۔ درد کی ٹیس نے ذرا سی دیر کے لیے میرے بازو کو مفلوج کر دیا۔ پھر صورتِ حال کی سنگینی کے خیال نے مجھے ایک وحشیانہ جذبے کی قوت دی اور میں نے مشین گن کو ایک ہاتھ سے پکڑ کے گھمایا۔ دستہ اس کی پیشانی پر یوں پڑا کہ میں نے ہلکی سی چٹ کی آواز سنی۔ اس کی پیشانی کی ہڈی سامنے سے چٹخ کے اندر دھنس گئی۔

اس نے ایک بھیانک آواز نکالی اور باغ کے درمیان میں بنی ہوئی سنگِ مرمر کی روش پر گر گیا۔ اس کے ماتھے سے پھوٹنے والا خون سفید سنگِ مرمر کو سرخ کرنے لگا۔ میں نے اس کی قمیص کے سامنے والے حصے میں ہاتھ ڈالا اور وہ ریوالور کھینچ لیا جو اس نے پتلون کی بیلٹ اور پیٹ کے درمیان دبا رکھا تھا۔ شاید اس کی پتلون کی جیب میں کوئی نقص ہوگا۔ ضرورت پڑنے پر وہ جیب میں ہاتھ ڈالتا اور اوپر لگا ہوا ریوالور کھینچ لیتا۔

میں نے اس کو خاموش کرنے کے لیے ایک بار پھر مشین گن اس کے سر پر ماری۔ وہ اپنا سر دونوں ہاتھوں سے پکڑ کے چیخ رہا تھا۔ دوسرا وار اس کے مُنہ پر پڑ گیا۔ اس کے جبڑوں کی ہڈی کے ساتھ کچھ دانت بھی ٹوٹے ہوں گے اور شاید ناک بھی چورا ہو گئی ہو۔ ایک بار پھر وہ اذیت سے چلایا۔ اس کا چہرہ سامنے سے بگڑ گیا تھا مگر یہ غلط نشانے بازی کا نتیجہ تھا۔ ایک صحیح وار اگر اس کی کھوپڑی کے پیچھے یا سائیڈ میں پڑ جاتا تو وہ آواز نکالے بغیر بے ہوش ہو سکتا تھا۔

دور سے میں نے ایک تیز سیٹی کی آواز سُنی۔ پھر ایسی ہی سیٹی دائیں اور بائیں جانب سے سُنائی دی۔ اس شخص کی چیخ محافظوں نے سُن لی تھی اور وہ ہر سمت سے خطرے کا سگنل دے رہے تھے۔ سیٹی کے ساتھ ہی کُتے بھونکنے لگے۔ رات کی خاموشی میں ان کی خونخوار آواز بہت قریب اور زیادہ خطرناک محسوس ہوتی تھی۔

اب میں نے ناپ تول کے وار کیا تا کہ اس شخص کی اذیت بھی ختم ہو اور ہنگامہ آرائی بھی۔ گردن کے ٹوٹتے ہی وہ خاموش ہو گیا۔ اس کی ناک اور مُنہ سے اُچھلنے والے خون کے چھینٹے سنگِ مرمر پر ہی نہیں مجھ پر بھی پڑے تھے۔ سیٹی بجانے والے بار بار ایک دوسرے کو خبردار کر رہے تھے اور کُتوں کے بھونکنے کی آواز سے پتا چلتا تھا کہ وہ بھی ادھر ہی دوڑتے ہوئے آ رہے ہیں۔

میں اُٹھ کے بھاگا اور سامنے آ جانے والے پہلے ہی سرونٹ کوارٹر کی دیوار پر چڑھ کے اندر کُود گیا۔ بیرونی احاطے کی دیوار مزید پچاس گز دور تھی۔ اگر میں دوڑ کر یہ فاصلہ طے کر بھی لیتا تو اس فصیل کو عبور نہیں کر سکتا تھا جس پر ہزاروں وولٹ کی برقی رو والے تار پھیلے ہوئے تھے۔

یہ بھی ایک اچھا فیصلہ ثابت ہوا۔ میں اندر کُودا ہی تھا کہ باہر دن نکل آیا۔ یہ سرچ لائٹس کی روشنی تھی۔ معلوم نہیں کتنی سرچ لائٹس بیک وقت آن ہو گئی تھیں۔ میں باہر ہوتا تو میرے لیے خود کو پوشیدہ رکھنا ناممکن ہو جاتا۔ میری خفیف سی حرکت کے ساتھ ہر سمت میں میرا سایہ متحرک نظر آتا اور چند قدم دوڑنے سے پہلے ہی ہر طرف سے آنے والی گولیاں مجھے چھلنی کر دیتیں۔

سرونٹ کوارٹر کے مختصر سے آنگن میں اندھیرا تھا۔ یہ ایک کمرے کا کوارٹر تھا۔ کمرے کے سامنے والے برآمدے میں ایک طرف شاید کچن تھا اور دوسری طرف باتھ روم۔ دروازہ وسط میں کُھلتا تھا اور یہ باہر سے مقفل نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ اندر کم سے کم ایک شخص ہوگا یا اس کے بیوی بچّے ہوں گے۔ باہر کی شورش سے کوئی بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ کمرے کا دروازہ کُھلا اور نیند سے جاگ اٹھنے والی ایک عورت نے باہر جھانک کے دیکھا۔ میں ایک کونے میں تھا چنانچہ اس کی نظر مجھ پر نہیں پڑی لیکن وہ باہر آ گئی تو میرے لیے اس جائے پناہ سے نکلنا ضروری ہو گیا ورنہ ایک سیکنڈ بعد وہ چیخ مارتی تو خطرے کی گھنٹی بج جاتی۔ [ابتدائی حروف کٹے ہوئے] ...دی کر دیتی۔ اس نے نیند سے بوجھل لہجے میں کہا۔ "آدھی رات کو کیا آفت آ گئی ہے؟"

پھر میں نے اس کے مُنہ پر پیچھے سے ہاتھ رکھ دیا اور اسے کھینچ کے واپس اندر لے گیا۔ مشین گن اب میرے کندھے پر تھی اور ریوالور کو میں نے دوسری جیب میں ڈال لیا تھا چنانچہ میں اپنے دونوں ہاتھ آزادی سے استعمال کر سکتا تھا۔

عورت قدرے فربہ تھی۔ اسے اندر لانے کے لیے مجھے بھی قوت صرف کرنی پڑی کیونکہ وہ خود کو چھڑانے کے لیے ہاتھ پیر مار رہی تھی اور جسم کی ساری طاقت لگا رہی تھی۔ کمرے کے اندر زیرو واٹ کا نیلا بلب جل رہا تھا۔ اس مدھم سے اُجالے میں مجھے عورت کے وحشت زدہ چہرے کا سیاہی مائل سانولا رنگ نظر آیا۔ وہ تیس سال سے زیادہ عمر کی لگتی تھی اور یقیناً کسی ملازم کی بیوی تھی۔ بمبئی کے مخصوص لباس یعنی بالشت بھر کی چولی اور لہنگے میں اس کا کسا ہوا بدن بہت نمایاں تھا۔ ایک چھوٹے سے تخت پر چھ سات سال کی ایک بچّی بڑی معصومیت سے مُنہ کھولے نیند میں بے سُدھ پڑی ہوئی تھی۔ وہ خود جس بستر سے اُٹھ کر آئی تھی وہ فرش پر لگا ہوا تھا۔ میں نے اسے وہیں لٹا دیا۔

"اگر تم نے ذرا بھی آواز نکالی تو میں تم کو اور اس بچّی کو گلا گھونٹ کے مار دوں گا۔" میں نے لہجہ خطرناک بنا کے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ "تریوبی کے علاوہ میں اندر تین آدمی مار کے آیا ہوں۔ دو خون اور کرنے سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ سمجھ میں آئی بات یا نہیں؟" میں نے اس کی گردن کو ایک جھٹکا دیا۔

اس نے سخت خوفزدہ انداز میں سر کو ہلا کے مجھے یقین دلایا کہ وہ بات سمجھ گئی ہے۔ اس کی مزاحمت اب ختم ہو چکی تھی۔

"یہ جو آوازیں تم سُن رہی ہو نا" یہ سب لوگ مجھے تلاش کر رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "جب تک اس مشین گن کی آخری گولی ختم نہیں ہوتی۔ اور میرے دونوں ریوالور خالی نہیں ہو جاتے کسی کا باپ بھی میرے نزدیک نہیں آ سکتا۔ جو اندر آئے گا اس کی لاش تمھارے آنگن میں گرے گی۔ سب کا خون اسی مٹی میں ملے گا مگر تم چاہو تو اپنے گھر کو لاشوں کے ڈھیر اور خون کے سیلاب سے محفوظ رکھ سکتی ہو۔ سمجھ میں آئی بات؟" میں نے پھر اسے جھٹکا دیا۔

اس نے زیادہ خوف کی کیفیت میں سر ہلایا اور دم سادھے پڑی رہی۔ لاشوں کا اور خون کا تذکرہ اس کی رہی سہی ہمّت کو ختم کرنے کے لیے ضروری تھا۔ عورت عام طور پر چور، ڈاکو یا قاتل کی نفسیاتی دہشت میں زیادہ مبتلا ہوتی ہے۔ فوری ردِ عمل کے طور پر وہ کچھ بھی کر سکتی تھی مگر دو چار منٹ گزر جانے کے بعد جب اس نے سمجھ لیا کہ مجھ سے تعاون کر کے وہ خود کو، اپنی بچّی کو اور اپنے گھر کو بچا سکتی ہے تو اس کا خوف کچھ کم ہوا۔ اسے یہ اطمینان حاصل ہو گیا تھا کہ وہ مجھ سے سودا کر سکتی ہے۔ میں نے اسے آزاد کر دیا۔ اس کے مُنہ پر سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے میں محتاط ضرور تھا لیکن وہ چیخ مار دیتی تو یہ احتیاط مجھے بچا نہیں سکتی تھی۔ شکاری اور ان کے کتے سیدھے ادھر آ جاتے۔ پھر اس عورت کو یا اس کی بچّی کو مارنے کا بھی کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ میں محصور ہو جاتا اور محاصرہ کرنے والے اطمینان سے سامنے آئے بغیر ساری کارروائی کرتے۔

"ڈرو نہیں بہن!" میں نے نرمی سے کہا۔ "میں کسی غریب کی جان کا دُشمن نہیں ہوں۔ میرا دُشمن تریوبی تھا۔ اسے میں نے مار دیا۔"

"تم... سیٹھ کو مار دیا...!" وہ کانپتے ہوئے بولی اور ایک ہاتھ کے سہارے آہستہ آہستہ اُٹھ بیٹھی۔

میں نے محسوس کیا کہ اس کے لہجے میں دُکھ یا پریشانی، صدمہ یا حیرانی نہیں ہے۔ اس نے مجھ سے کوئی سوال اس لیے نہیں کیا تھا کہ اسے اپنے کانوں سے سُنے ہوئے الفاظ پر شک تھا یا پھر وہ دوبارہ مجھ سے جواب سُن کے ناممکن کے ممکن ہونے کا یقین کرنا چاہتی تھی۔ اس کے لہجے میں نامعلوم سے اطمینان کا اظہار تھا جو آہستہ آہستہ اس کے لبوں پر ایک خفیف سی زہر بھری مسکراہٹ بن کے پھیل گیا۔

اس نے آہستہ سے سر ہلایا۔ "یہ تو ہونا ہی تھا ایک نہ ایک دن... بلکہ بہت پہلے ہو جانا چاہیے تھا۔"

میں نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ "کیوں؟"

اس نے ایک گہری سانس لے کر چولی کو ٹھیک کیا اور اوڑھنی لے لی۔ "کیا تم نہیں جانتے؟ یہ تو وہ خود بھی جانتا تھا۔ اسی لیے تو اتنی بڑی فوج رکھتا تھا اپنی حفاظت کے لیے۔ پر بھگوان نہ چاہیں تو کوئی کیسے جی سکتا ہے۔ بے شک قلعے کے اندر بیٹھ جائے۔ دیکھ لو آخر تم نے کر ہی دیا وہ کام۔ جو پہلے کوئی نہیں کر سکا۔"

باہر ایک شور مچا ہوا تھا۔ کُتے مسلسل بھونک رہے تھے اور سیٹیاں بجانے والے آپس میں چلّا چلّا کے کچھ کہہ رہے تھے۔ ان کی ساری دوڑ دھوپ اسی سرونٹ کوارٹر سے کچھ فاصلے پر ہو رہی تھی۔ وہ مجھے باغ کی ایک ایک جھاڑی میں تلاش کر رہے ہوں گے۔ یہ میں جانتا تھا۔ وہ درختوں کی شاخوں میں جھانک کر دیکھیں گے۔ محل کے اندر باہر کوئی گوشہ نہیں چھوڑیں گے اور بالآخر سرونٹ کوارٹر کی طرف بھی آئیں گے۔ ...لاش نے ان کو کچھ نہیں بتایا ہوگا مگر ایک بے ہوش محافظ کی مشین گن اور لاش کا ریوالور غائب پا کے وہ سمجھ گئے ہوں گے کہ دُشمن جو بھی ہے خالی ہاتھ نہیں ہے۔ اب تک تو شاید تریوبی نے انھیں اس دُشمن کے بارے میں تفصیل...

سے بتا چکا ہوگا۔ ممکن ہے اس نے کملا کی تلاش بھی شروع کر دی ہو اور پولیس کو بھی اطلاع کر دی ہو۔

"تم نے کیوں مارا اسے؟" وہ بولی۔

"تم اسی کے گھر میں رہتی ہو۔ کیا تمھیں نہیں معلوم کہ وہ کیسا آدمی تھا؟" میں نے کہا۔

"وہ آدمی نہیں راکھشس تھا" وہ نفرت سے بولی۔

"پھر تو تمھارا بھی فرض بنتا تھا اسے مارنا۔ مگر ظاہر ہے یہ تمھارے بس کی بات نہیں تھی" میں نے کہا "یہ نیک کام میں نے کر دیا۔ اب ایک نیکی تم میرے ساتھ کر سکتی ہو۔ کسی طرح مجھے ان شکاری کتوں سے بچاؤ اور یہاں سے نکال دو۔"

"ابھی ... ابھی تو بہت مشکل ہے" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"ابھی نہ سہی۔ کچھ دیر بعد" میں نے کہا۔ اور دروازے کی طرف دیکھا۔ ایک کتا بہت قریب آگیا تھا۔ اس کے بھونکنے کی آواز صحن میں سے آتی محسوس ہوتی تھی۔

"وہ ادھر آگئے ہیں" میں نے کہا "وہ ہر سرونٹ کوارٹر میں جا کے دیکھیں گے۔ ان کو اندر مت آنے دو۔ باہر ہی سے جواب دے کر لوٹا دو۔ اور مجھے بتاؤ میں کہاں چھپوں؟"

وہ ایک دم اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کے باہر کی طرف کھینچا۔ "جلدی کرو۔ آؤ۔"

"مگر باہر ..." میں نے پریشانی اور تذبذب کا شکار ہو کے کہا۔ اس عورت کی باتوں نے مجھے یہ اطمینان ضرور عطا کیا تھا کہ وہ ترلوسنی کے قتل پر میرے خلاف اپنے دل میں عناد کے جذبات نہیں رکھتی۔ میرا ایک غیر ارادی اور بے مقصد جھوٹ میرے تحفظ کی ضمانت بن گیا تھا۔ اب مجھے اس عورت یا اس کی بچی کے ساتھ زبردستی کی کوئی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اس کے نزدیک میں نے واقعی اچھا کام کیا تھا چنانچہ مجھے بچانے کی کوشش وہ پورے خلوص سے کرنا چاہتی تھی۔

"جیسا میں کہہ رہی ہوں ویسا کرو" اس نے مجھے صحن کے ایک کونے میں بٹھا دیا۔ پھر بڑی پھرتی سے اس نے میرے اوپر میلے کپڑے پھینکنے شروع کیے۔ یہ میلے کپڑے ہر طرف پھیلے ہوئے تھے اور ان کی چھوٹی چھوٹی ڈھیریاں سی بنی ہوئی تھیں۔ جب پہلی کھیپ میں مجھ پر پتلونیں اور دوسری کھیپ میں قمیصوں کا ڈھیر لگا اور میری ناک نے میل اور پسینے کی بو محسوس کی تو میرے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل نہ رہا کہ میں کسی دھوبی کے گھر میں ہوں۔ دھوبی اس کا شوہر تھا یا وہ خود دھوبن تھی۔ یہ سب کپڑے اس نے خود ہی الگ الگ کیے ہوں گے جو اب پھر ایک ساتھ مجھ پر گر کے ڈھیر کی صورت اختیار کر رہے تھے۔

"ہلنا مت بالکل" اس نے میرے قریب سے سرگوشی کی۔ "اور بھگوان کے لیے چھینک مت مار دینا۔ تمھارے ساتھ میں بھی اپرادھی بن جاؤں گی۔ خود میرا گھر والا میری ناک چوٹی کاٹ دے گا کہ یار تھا تیرا وہ جسے چھپایا تھا" وہ کپڑے پھینکتے ہوئے بولتی جا رہی تھی۔ میں گندے کپڑوں کے ڈھیر کے نیچے غائب ہو جانے کے بعد کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا کہ وہ اتنے کپڑے کہاں سے لا رہی ہے اور اندر باہر کتنی تیزی سے آجا رہی ہے۔ میرا دھیان باہر کی آوازوں پر تھا۔ مجھے تلاش کرنے والے کم سے کم چار آدمی تھے اور چار ہی کتے تھے۔

جب کسی نے دروازے پر دستک دی تو میرا دل تیزی سے دھڑکا۔ میلے کپڑوں کے متعفن ڈھیر کے نیچے میں گھٹنوں کے بل جھکا ہوا تھا۔ میرا سر زمین سے لگا ہوا تھا اور کہنیاں مشین گن کو سنبھالنے کی کوشش میں چھل رہی تھیں۔ کیا دھوبن کی ہوشیاری ایک قاتل کی تلاش کرنے والوں کو دھوکا دے سکے گی۔ انسانوں کو تو وہ زبان سے قائل کر سکتی تھی کہ ادھر کوئی نہیں آیا۔ مگر کتے تو بو پر آئیں گے۔ پھر ایک خیال نے مجھے بڑی اُمید دی۔ دھوبن کے ذہن میں تو شاید صرف یہی ہوگا کہ مجھے میلے کپڑوں کا ڈھیر بنا کے تلاشی کے لیے آنے والوں کو مطمئن کر دے۔ اس کے مختصر سے گھر کے کمرے، غسل خانے یا باورچی خانے میں ایسی کوئی جگہ نہیں تھی جہاں وہ مجھے چھپا سکتی۔ لیکن میلے کپڑوں کے ڈھیر میں مجھے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا تھا کہ میرے جسم کی بو کم سے کم سو استعمال شدہ کپڑوں کی بو میں شامل ہو گئی تھی۔ یہ مختلف جسموں کی بو تھی۔ اس میں محل کے اندر کام کرنے والے سب ہی لوگوں کا میل اور پسینہ تھا۔ ترلوسنی اور اس کے خاندان کے کپڑے ان کپڑوں میں شامل ہوتے تو مجھے بہترین قسم کی خوشبو بھی آتی۔ لیکن کسی دھوبن کو ان کے کپڑے کیسے دیے جا سکتے تھے۔ یا تو وہ ایک لباس کو دوبارہ استعمال کرتے ہی نہیں ہوں گے یا سال چھ مہینے بعد کوئی لباس دوبارہ پہنا جاتا ہوگا تو بمبئی کے کسی ٹاپ کلاس ڈرائی کلینر کو ہی اسے دھونے کا اعزاز حاصل ہوتا ہوگا۔

دروازہ دوسری بار زیادہ زور سے بجایا گیا اور کسی نے چیخ کر باہر سے کہا۔ "مر گئی ہے کیا؟"

"جیو دھوبن مہارانی" میں نے دل ہی دل میں خوش ہو کے کہا۔ اس نے فوراً دروازہ کھول دیا ہوتا تو یہ سمجھا جاتا کہ شاید وہ جاگ رہی تھی اور صحن میں ہی تھی۔ مگر وہ مجھے دفنانے کے اندیشے چلی گئی تھی اور دوسری دستک پر بھی جب اس نے جا کر کواڑ کھولے تو خاصی آواز کے ساتھ۔

"کون ہے رے۔ آتی رات کو۔ کواڑ توڑے گا کیا؟" وہ خواب آلود لہجے میں بڑبڑاتی ہوئی باہر آئی۔ پھر اس نے باہر کا دروازہ کھولا۔ "کیا ہے؟" وہ چلائی۔ "بیل کی طرح منہ اُٹھائے چلا آرہا اندر۔" پھر اس نے چیخ ماری۔ "اپنے باپ کو ساتھ کیوں لایا ہے؟"

"چپ کر حرام زادی" کسی نے غرا کے کہا "ہم ایک قاتل ڈھونڈ رہے ہیں۔ ادھر تو نہیں آیا کوئی۔"

"آیا تھا۔ اندر سو رہا تھا میرے ساتھ" دھوبن نے چیخ کر کہا۔

"چل ڈبو۔ بھونکنے دے اس کتیا کو۔"

ڈبو غالباً وہ کتا تھا جس کو دھوبن نے بیل کا باپ قرار دیتے ہوئے چیخ ماری تھی۔ میں دم سادھے پڑا رہا۔ دھوبن عقل کی نہیں زبان کی بھی بڑی تیز تھی۔ میں نے کتے کے اندر جانے کی اور غرانے کی آواز سنی۔ چند سیکنڈ میں وہ پھر باہر آگئے۔ تلاشی کے لیے آنے والے نے دھوبن سے ایک بڑی بے شرمی کی بات کی۔ دھوبن نے جواب میں اپنے میاں کا نام لے کر کہا کہ اپنی اماں کو بھیج دے اس کے پاس ٹائم کے لیے۔ غالباً اس نے دھوبن سے ملاقات کا وقت مانگا تھا۔

"ادھر... ادھر ڈبو..." وہ ہنسا "دیکھ میلے کپڑوں میں تو نہیں ہے وہ..." اس نے مجھے ایک خاصی اشتعال انگیز گالی دی۔ کتا میرے بہت قریب آگیا۔ میرے دل کی دھڑکن رکنے لگی اور ٹرائیگر پر میری انگلی کی گرفت سخت ہو گئی۔ کشیدگی سے میرے اعصاب چٹخنے لگے۔ کتے کا کیا بھروسا۔ اس کی تربیت اور مہارت کا تقاضا تھا کہ وہ میری بو کو گرد و پیش کی ہر بو سے الگ کر کے بتائے۔

انتظار و اضطراب، خوف اور دہشت کی سنسنی سے معمور وہ چند سیکنڈ میرے لیے زندگی اور موت کے درمیان کے خلا کی طرح تھے۔ اگر وہ کتا مجھے بہت سے جسموں کے میل اور پسینے کی بو سے الگ بو رکھنے والی چیز سمجھ کے ان میلے کپڑوں سے نکال لیتا تو میری ذہن کو شکست ہو جاتی کہ مارنے والے سے بچانے والا ہاتھ زیادہ طاقت ور ہوتا ہے۔ میں اس ڈھیر میں دریافت ہوتے ہی کھلی جنگ کے لیے نکلتا۔ شاید فوراً اس کتے کے ساتھ آنے والے کو مار دیتا۔ اس کے بعد خود بھی مارا جاتا۔

لیکن کتے کی ناک کو اس عورت کی عقل نے شکست دی جو محض ایک دھوبن تھی اور جو مجھے کسی رشتے سے نہیں جانتی تھی سوائے ہمدردی کے رشتے کے۔ اس نے ایک حقیقت کو پہلے ہی تسلیم کر لیا تھا کہ ترلوسنی ایک شیطان ہے۔ دوسری حقیقت کو اس نے میرے کہنے پر تسلیم کر لیا کہ میں مجرم نہیں ہوں کیونکہ برائی کو مٹا کے میں نے نیکی کی ہے۔ بس اسی پر ناقص العقل سمجھی جانے والی اس عورت نے اپنی جان کی بازی لگا کے ایک جُوا کھیلا، اور جیت گئی۔

جب شکاری اور کتا دونوں چلے گئے تو اس نے دروازہ بند کیا۔ میرا خیال تھا کہ اب مجھے اس کی آواز سنائی دے گی۔ وہ کہے گی کہ چلو اب نکل آؤ، خطرہ ٹل گیا مگر میں نے اندر کے کمرے کا دروازہ بند ہونے کی آواز سنی۔ میں اسی طرح بے حس و حرکت پڑا رہا اور سوچتا رہا کہ آخر اس میلے کپڑوں کے ڈھیر کی قید با عفونت کب تمام ہوگی۔ پھر میں دھوبن کی چالاکی سمجھ گیا۔ وہ کوئی رسک نہیں لینا چاہتی تھی۔ اسے ڈر ہوگا کہ باہر کے بند دروازے کی جھری سے کوئی جھانک نہ رہا ہو یا دیوار کے اوپر سے نہ دیکھ لے۔ اس نے نارمل طریقے پر نیند خراب کرنے والے کو کوسا اور گویا پھر سو گئی۔ کتے اب قریب نہیں بھونک رہے تھے، وہ فصیل کے شمال اور مغرب کی جانب چلے گئے تھے۔ باتیں کرنے والوں کی بھی اب کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ تقریباً دس منٹ بعد جو میرے لیے دس گھنٹوں سے کم نہیں تھے، دروازہ پھر کھلا اور میں نے اس کے قدموں کی آہٹ سنی۔

"باہر آجاؤ بابو" اس نے میلے کپڑے ہٹا کے کہا۔

میں بڑی مشکل سے اٹھا۔ تازہ ہوا میں ایک گہری سانس لے کر میں نے کمر کو سیدھا کیا اور مشین گن کو پھر کندھے پر ڈال لیا۔

"تم کمال کی عورت ہو، سمجھ میں نہیں آتا کہ تمھارا کس طرح شکریہ ادا کروں" میں نے اس کا موٹا بھدا ہاتھ چوم کے کہا۔

وہ مسکرائی۔ "اندر آجاؤ۔ ان کا کوئی بھروسا نہیں، پھر آجائیں۔"

میں نے کہا۔ "وہ پھر آگئے تو تم کیا کرو گی؟"

"جواب کیا تھا" اس نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔

"تمھارا گھر والا..... دھوبی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں بابو، یہ کام تو میں کرتی ہوں۔ میرا باپ اور میرے سارے بھائی دھوبی گھاٹ پر اکھٹے کام کرتے ہیں" وہ بولی۔

"یہ بیٹی ہے تمھاری؟"

"کیا تمھیں بیٹا نظر آتا ہے؟" وہ بولی "آرام سے بیٹھ جاؤ اب۔"

"آرام سے میں کیسے بیٹھ سکتا ہوں مس دھوبن" میں نے کہا۔ "مجھے جانا ہے" اور تخت کے کونے پر آرام سے بیٹھ گیا۔

"ابھی کیسے جاؤ گے؟" وہ بولی۔

"صبح کیسے جاؤں گا؟" میں نے کہا "ابھی تو رات ہے۔"

"دن رات سے کیا ہوتا ہے۔ باہر کون سے راستے سے جاؤ گے؟ ان کو معلوم ہے کہ تم اندر ہی ہو" وہ بولی۔

"کچھ بھی ہو۔ یہاں تم کب تک چھپائے رکھو گی مجھے اپنا راستہ مجھے خود ہی بنانا پڑے گا" میں نے کہا "یا میں مارا جاؤں گا یا سب

کو مار کے نکل جاؤں گا۔"

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ میں اچھل پڑا۔ میرے لیے یہ آواز بم کے دھماکے سے کم نہ تھی۔ میں گھبرا کے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"اب کون آگیا؟" میں نے کہا۔

"میرا گھر والا ہوگا۔" وہ بولی۔ "تم ایسا کرو اس تخت کے نیچے چلے جاؤ، جلدی....."

میں نے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔ 'یا مظہر العجائب' آج تقدیر میں کیا ہے۔ سحر ہونے تک کس کے ہاتھوں مرنا ہے مجھے۔ میں نے تخت کے نیچے چوروں کی طرح پناہ لے کر سوچا۔ اب اس وقت شامتِ اعمال کے باعث چھینک آجائے مجھے تو دھوبی کا اپنی باوفا دھرم پتنی پر شک میں مبتلا ہونا بڑی مہلک غلط فہمی بن جائے گا۔ وہ بلا وجہ جوشِ رقابت میں اتنی سمجھ دار بیوی کو مار ڈالے گا اور مجھے مار نہیں سکا تو مروا دے گا یا پھر میرے ہاتھوں مارا جائے گا۔

میں اس بدکردار شخص کی طرح تخت کے نیچے چھپا ہوا تھا جس نے کسی دوسری عورت کے ساتھ ناجائز مراسم استوار کر لیے ہوں۔ ایسی کوئی بات نہ ہونے کے باوجود نظر آتی تھی۔ آدمی کی آنکھ تو ظاہر کو دیکھتی ہے۔ سچ کو سمجھنے یا پرکھنے سے پہلے غیرت میں آجانے والے خون کر بیٹھتے ہیں۔

باہر دھوبن نے چلّا کے کہا۔ "ارے ایسی کیا آفت آگئی...؟"

مرد نے ہی ہی کر کے خوشامدانہ انداز میں کہا۔ "لے تو ایسے ہی غصّے ہو وے ہے۔ میں تو بتانے آیا تھا....."

"معلوم ہے معلوم ہے مجھے۔ ابھی آیا تھا تیرا وہ سگا بھی۔ کُتّا نے کر سیدھا گھس آیا گھر میں۔" دھوبن نے کہا۔ "اسے سمجھا دے کُتّے کو، میرے ساتھ لفنگا پن کرتا ہے۔ بھٹی چڑھا دوں گی کسی دن اور کلف ڈال کے استری پھیر دوں گی۔"

"پھر کچھ کہا اس نے....؟"

"ہاں مگر اب جھگڑا مت کرنا اس کے ساتھ۔ اس کی تو عادت ہے۔ سارے کپڑے الگ الگ کیے تھے۔ سب ملا گیا۔ میں نے کہا کپڑے کیا جھاڑ جھاڑ کے دیکھتا ہے۔ جیبوں میں بھی دیکھ لے کہیں وہ ہتیارا اندر نہ ہو۔ چل اب جا مجھے سونے دے، اُفوہ....."

"دروازہ بند رکھیو۔" اس نے عاجزی سے کہا اور کھی کھی کرتا ہوا چلا گیا۔ میں نے پھر خدا کا شکر ادا کیا اور تخت کے نیچے سے نکل آیا۔

"تو نے کچھ کھایا پیا ہے؟" دھوبن نے اندر آکے کہا۔

"ہاں، کسی چیز کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔ "بس اب میں جاؤں گا۔"

"کہاں؟ ابھی نہیں۔" وہ مجھے ڈانٹ کر بولی۔ "صبح میں خود نکال دوں گی تجھے باہر۔ دو گھنٹے رُک نہیں سکتا۔"

"رُک تو سکتا ہوں۔" میں نے پھر تخت پر بیٹھ کے کہا۔ "مگر مِس دھوبن، تم کیسے نکالو گی مجھے؟"

"میں یہ کپڑے لے جاؤں گی دُھلائی کے لیے۔ کل بھٹی چڑھیں گے۔" وہ بولی۔ "جیسے یہاں چھپایا تھا ایسے ہی نیچے دبا کے لے جاؤں گی۔"

"مگر..... کیسے...؟ میرا مطلب ہے کیا مجھے گٹھڑی میں باندھو گی اور سر پر اٹھا کے لے جاؤ گی؟"

وہ ہنس پڑی۔ "کیسی بے عقلی کی باتیں کرتا ہے تو بابو۔ کوٹ پتلون ٹائی لگا لی ہے۔ ہاتھ میں بندوق اٹھا لی ہے۔ ہے بے وقوف۔"

میں نے تسلیم کیا۔ "یہ سچ فرمایا آپ نے بی بی...!"

"میں لے جاؤں گی اپنی گدھا گاڑی میں۔" وہ بولی۔ "کوئی نہیں روکے گا مجھے۔ بھٹی والے دن صبح صبح نکل جاتی ہوں میں۔ کپڑے چھوڑ کے پھر آجاتی ہوں۔"

میں نے کہا۔ "تم کو مجھ سے ڈر نہیں لگتا۔ آخر میں ایک قاتل ہوں۔"

"مجھے کیوں ڈر لگے گا۔ میں نے کیا بگاڑا ہے تیرا۔ تو بُرا آدمی ہوتا تو اب تک انتظار کرتا نا۔" وہ بولی۔ "چور ڈاکو ہوتا تو ایسی شکل نہ ہوتی۔ تو نے تو دیکھا بھی نہیں اِدھر اُدھر۔ اتنا زیور تو میں نے پہن رکھا ہے۔"

میں حیران رہ گیا۔ "اچھا... کتنا زیور پہن رکھا ہے تم نے؟ میں نے تو غور ہی نہیں کیا۔ خیر چھوڑو، ایک بات بتاؤ۔ تم نے یہ کیوں کہا تھا کہ میں نے تریویدی کو قتل کیا تو اچھا کیا۔"

"بُرے آدمی کو قتل کر دینا اچھی بات ہے۔ ہمت کی بات ہے۔" وہ بولی۔ "تیرا کیا نقصان کیا تھا اس نے؟"

"یہ تو میں نہیں بتا سکتا۔ تمھارا کیا نقصان کیا تھا اس نے؟" میں نے کہا۔ "تم اس کا نمک بھی کھاتی ہو۔"

"چل رہنے دے نمک کی بات۔ میں بھی نہیں بتا سکتی کہ میرے پاس کیا تھا جو اس نے لے لیا۔" وہ بگڑ کے بولی۔

اس کے بعد میں نے بھی کچھ نہیں پوچھا۔ عورت ہر بات نہیں بتا سکتی۔ نمک اور عزت کی قیمت بھی برابر نہیں ہو سکتی کہ کوئی بارٹر سسٹم میں سودا کر سکے۔ تریویدی سے اس کی عداوت کے ایک سو ایک اسباب ہو سکتے تھے جو میں فرض کر سکتا تھا۔ میرے لیے ان کا جاننا قطعی ضروری نہیں تھا۔ قابلِ تعریف یہ عورت تھی جس کے اعصاب اتنے مضبوط تھے کہ اس نے تریویدی جیسے شخص کے دشمن کو پناہ دی اور اس کے لیے سارے خطرات مول لیے۔

میرا دل چاہتا تھا کہ اب اس سے اجازت لوں اور باقی کام اپنے رسک پر کروں لیکن مجھے کملا کی بات یاد آگئی تھی جس نے کہا تھا کہ اس قلعے کے حفاظتی انتظامات کو میں شکست نہیں دے سکتا۔ دھوبن بھی مجھے منع کر رہی تھی اور سمجھا رہی تھی کہ میرے لیے یہ کام مشکل تھا اس لیے کہ وہ اسی قلعے میں رہتی تھی۔ وہ بھی محرمِ رازِ درونِ مے خانہ۔ اسے باہر نکلنا بھی آتا تھا اور نکالنا بھی۔ مجھے تذبذب تھا تو صرف اس لیے کہ میں اس کے احسانات کا بدلہ اس کے لیے مزید مسائل پیدا کر کے نہیں ادا کرنا چاہتا تھا۔ خدانخواستہ کسی نے اسے چیک کر لیا تو میرا جو ہوگا سو ہوگا وہ بڑی مشکل میں پھنس جائے گی۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش بھی کی مگر وہ نہیں مانی۔ پھر مجھے اپنے جھوٹ پر افسوس ہونے لگا۔ یہ سب کچھ وہ محض اس لیے کر رہی تھی کہ اس کے خیال میں تریویدی کو قتل کر کے میں نے اس کا کوئی پرانا حساب برابر کر دیا تھا جو وہ خود نہیں کر سکتی تھی۔ بعد میں جب اسے معلوم ہوگا کہ وہ ایک جھوٹ تھا اور اسے تریویدی زندہ نظر آئے گا تو اسے کتنا صدمہ ہوگا۔ وہ یہی سمجھے گی کہ میں نے اسے بے وقوف بنایا تھا۔ اسے اپنی تمام جدوجہد کے رائیگاں جانے پر افسوس ہوگا جو وہ مجھے بحفاظت باہر پہنچانے کے لیے کر رہی تھی۔

ایک بار مجھے خیال آیا بھی کہ کیوں نہ اس سے سب سچ کہہ دوں مگر پھر میں ڈر گیا۔ اگر میں نے ایک سچ بولا تو مجھے سو جھوٹ بھی بولنے پڑیں گے کہ میں یہاں کیوں آیا تھا اور کیسے آیا تھا۔ مجھے بہت کچھ چھپانا بھی پڑے گا۔ مثلاً وہ جو میں نے کملا کے ساتھ کیا اور جو کملا کے ساتھ نہیں کیا۔ سچ اور جھوٹ کا یہ سلسلہ بہت دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اسے چھیڑنا خود کو پریشانیوں کے جال میں اُلجھانے کے مترادف ہوتا۔ نہ اتنا وقت تھا کہ میں اپنی جیون کتھا اوّل تا آخر اس کے ساتھ سنا سکوں اور نہ اس میں کوئی عقلمندی ہوتی۔ یہ ایک جھوٹ بہتر تھا جس سے میری جان بچ سکتی تھی اور اس دھوبن کو اعتماد میں دھوکے کا صدمہ اُٹھانے کے سوا کوئی نقصان نہیں ہوتا تھا۔

صبح ہونے تک ڈیڑھ گھنٹا میں نے اس سے غیر متعلقہ باتیں کرتے گزارا جو درحقیقت متعلقہ باتیں ہی تھیں۔ میں نے اس سے شادی، شوہر اور بچّی کے بارے میں پوچھا اور اس نے جو کچھ بتایا اس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ جب میری باری آئی تو میں نے بھی ایک بے ضرر سی کہانی سنانے پر اکتفا کیا۔ ایک بیوی اور بچے کی کہانی اور ایک گھر کی کہانی۔ اس میں دھوبن کے لیے کوئی خاص بات نہیں تھی۔ دونوں کی کہانی میں فرق صرف سوشل اسٹیٹس کا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ تریویدی کا دشمن اور قاتل کوئی غریب کمزور اور معمولی آدمی نہیں ہو سکتا۔ میں نے اس سے اتفاق کیا اور کہا کہ میں تریویدی کی طرح دولت مند تو نہیں ہوں لیکن طاقت صرف دولت سے ہی نہیں آتی۔ جذبات کی شوریدہ سری سے بھی حاصل ہوتی ہے۔ اور تریویدی کو میں نے بھی اپنا انتقام لینے کے لیے قتل کیا ہے۔

صبح ساڑھے پانچ بجے اس نے مجھے چائے بنا کے پلائی اور خود بھی پی۔ وہ چائے مجھے اس لیے بہت اچھی لگی کہ اس میں اعتماد اور خلوصِ نیّت کی مہک تھی۔ اس نے مجھے تقویت دی اور یقین عطا کیا کہ جدوجہد ختم نہیں ہوئی۔ شکاری جو تدبیر چاہیں کریں تقدیر نے ان کا ہر جال کاٹ دیا ہے اور ان کی ہر چال ناکام کر دی ہے لیکن یہ بات وہ ابھی نہیں جانتے۔ شاید انھیں کبھی معلوم نہ ہوگا کہ ایسے سخت حفاظتی انتظامات کو ایک دھوبن کی عقل نے بے مصرف کر دیا تھا۔

میں نے میلے کپڑے باندھنے میں اس کی مدد کی۔ اتنی دیر تک وہ گدھے کو گاڑی میں جوت کے لے آئی۔ گٹھڑی کو گاڑی میں رکھنے کے بعد اس نے کہا۔

"اب تو اس کے بیچ میں بیٹھ جا بابو۔"

"کیا... یعنی مجھے بھی گٹھڑی میں باندھو گی؟" میں نے کہا۔

"اور کیا گٹھڑی کے اوپر سجا کے لے جاؤں گی۔" وہ بولی۔ "اسی طرح ہر جمعے کی صبح گٹھڑی لے جاتی ہوں میں۔"

"اچھا... یہ دیکھ لو کہ کسی نے چیک کر لیا تو..."

"ارے کچھ نہیں ہوگا تو بیٹھ بیچ میں۔" وہ بولی۔

"تمھاری بچّی تو ابھی سو رہی ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ سوتی رہے گی۔" اس نے کہا۔ "میں واپس آجاؤں گی دو گھنٹے میں۔"

"تم اسے کوارٹر میں ایسے ہی چھوڑ جاؤ گی۔ وہ ڈرے گی نہیں اور جاگ کے رونے لگی تو؟"

"ابھی اس کا باپ آجائے گا گھنٹا بھر بعد سات بجے۔" وہ بولی۔

میں کچھ دیر سوچتا رہا پھر میں نے کہا۔ "تمھارا شکریہ تو میں کیا ادا کروں، میرے پاس الفاظ ہیں مگر بے کار ہیں۔ یہ احسان ایسا ہے کہ میں اس کا بدلہ کبھی چکانے کی کوشش بھی نہیں کر سکتا۔ میں کبھی پھر ادھر سے گزروں گا بھی نہیں، لیکن میں تمھیں یاد رکھوں گا ہمیشہ۔ اب بُرا مت ماننا ایک بات کا۔" میں نے جیب میں سے ایک ہزار روپے نکال لیے اور سوتی ہوئی بچّی کی مٹھی میں پکڑا دیے۔ "جب یہ سو کر اُٹھے نا تو اسے بتا دینا کہ تمھارا ایک ماما آیا تھا، بہت دور سے، وہ دے گیا۔"

اس نے احتجاج کے لیے مُنہ کھولا اور پھر نہ جانے کیا سوچ کے چپ رہی۔ رشتوں کا بھرم رکھنے کے لیے آدمی بہت کچھ برداشت کر جاتا ہے۔

"خدا حافظ۔" میرے مُنہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"مسلمان ہو تم؟" اس نے چونک کر کہا اور اس کا چہرہ اُتر گیا۔

"ہاں، بمبئی میں اور سارے ہندوستان میں مسلمان بہت

ہیں!" میں نے اس کی مایوسی پہ حیران ہو کے کہا۔
"میں تم سے پہلے پوچھ لیتی تو اچھا تھا۔۔۔"
مجھے تھوڑا سا افسوس ہوا۔ "کیا تم نے ہندو سمجھ کے میری مدد کی تھی؟ اگر تم کو پہلے ہی معلوم ہو جاتا کہ میں مسلمان ہوں تو مجھے پکڑوا دیتیں؟"
"معلوم نہیں، چلو چھوڑو اب۔"
"نہیں، مجھے بتاؤ کیا ہے یہ بات؟ تم ہمت والی اور مضبوط کردار کی عورت ہو۔ تمہارا دل بہت بڑا ہے۔"
"وہ بھی ایک بڑا ہمت والا مسلمان مرد تھا اور بڑا نیک سمجھا جاتا تھا اسے بھی، جس نے میری ماں کو اغوا کر لیا تھا۔" وہ زہر آلود لہجے میں بولی۔ "اتنی بڑی داڑھی تھی اس کی ایک بالشت کی۔ وہ بھی مضبوط کردار کا مالک تھا۔"
"میں نے کہا۔ "تالی ایک ہاتھ سے تو نہیں بجتی۔"
اس نے مجھے نفرت سے دیکھا۔ "تم میری ماں پر الزام لگا رہے ہو کہ وہ اپنی مرضی سے بھاگ گئی تھی۔ اپنے گھر اور بچوں کو چھوڑ کے۔"
"نہیں، یہ مطلب نہیں تھا میرا۔" میں نے دل ہی دل میں سخت شرمندہ ہو کے کہا۔ "کب کی بات ہے یہ؟"
"اس وقت کی جب ہم جان بچا کر بھاگ رہے تھے۔ اس نے ہماری مجبوری سے فائدہ اٹھا لیا۔ ہمیں سرحد پار پہنچانے کے بہانے لوٹ لیا۔ میری ماں کو مجھ سے جدا کر دیا۔ اسے وہ دھوکے سے واپس لے گیا اور ہمیں بھی سرحدی لٹیروں کے سپرد کر گیا۔۔۔ معلوم نہیں اس پر کیا بیتی، ضرور اس نے خودکشی کر لی ہو گی۔" وہ بے حد مغموم نظر آنے لگی تھی۔
میں نے کہا۔ "تم نے یا تمہارے باپ نے بعد میں کبھی اس کے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کی؟"
"کہاں جاتے، کس سے پوچھتے۔۔۔ اور کیسے معلوم کرتے آخر میں یہی معلوم ہوتا کہ مر گئی وہ۔"
"یہ سب واقعی افسوس ناک ہے۔ جو کچھ اس زمانے میں کسی کے ساتھ بھی ہوا برا ہوا۔ ایک ایسا ہی دور تھا وہ، جب انسانوں پر بھی شیطان سوار تھا۔ میں کسی کی صفائی پیش نہیں کرتا لیکن سب لوگ ایک سے نہیں ہوتے۔ اچھے برے دونوں طرف تھے۔ اب میں تم کو کیا بتاؤں کہ میرے ساتھ کیا ہوا تھا۔ میرا تو پورا خاندان کٹ گیا تھا جس میں میری ماں تھی اور بہنیں تھیں، چھوٹے بھائی تھے۔ میں لاشوں کے نیچے پڑا رہ گیا تھا۔ میری ایک بہن نے کنوئیں میں کود کے جان دے دی تھی۔ کیا اس بنیاد پہ مجھے ان سب سے نفرت ہونی چاہیے جو مسلمان نہیں ہیں۔ ہر ہندو سکھ کو دشمن سمجھنا چاہیے؟"
وہ حیرانی سے مجھے دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں نفرت کا زہریلا رنگ اب باقی نہیں رہا تھا۔ "لوگ اونٹ کے بارے میں کہتے ہیں کہ جب تک پہاڑ کے نیچے سے نہ گزرے خود کو سب سے بڑا سمجھتا رہتا ہے۔ آدمی بھی خود کو سب سے زیادہ مظلوم اور مصیبت زدہ سمجھتا ہے مگر پھر کوئی اس سے زیادہ بدقسمت مل جاتا ہے تو اسے احساس ہوتا ہے کہ ایک میرے ہی دل کا زخم خونچکاں نہیں۔ یہاں اور بھی دل ہیں جو زخموں سے لہو فشاں ہیں۔ اپنی کتاب عمر سے ماضی کا ایک خونی اقتباس سنا کے میں نے کسی حد تک اپنا مقصد حاصل کر لیا تھا۔ اب وہ قدرے شرمندہ نظر آ رہی تھی۔
"اور تم خوش قسمت یوں بھی ہو۔" میں نے کہا۔ "کہ اب آباد ہو۔ میرے ساتھ تو ابھی تک بدقسمتی کا سفر جاری ہے۔ پہلے میرے باپ کو قتل کیا گیا۔ وہ ایک شریف آدمی تھا۔ اس کے دشمنوں نے پہلے اس کا سارا کاروبار ہتھیا لیا پھر اسے اپنے راستے سے ہٹا دیا۔ آج کل وہ میرے پیچھے ہیں۔ ترلوچن بھی انہی کا ساتھی تھا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں تم کو ساری کہانی نہیں سنا سکتا۔ یہ سمجھ لو کہ جو کچھ میں نے کہا اس کا ایک ایک لفظ سچ ہے۔ ہاں، ایک جھوٹ بولا تھا میں نے تم سے ضرورت کے تحت۔ میں ترلوچن کو قتل کرنے ضرور آیا تھا مگر میں اس کوشش میں ناکام رہا۔ پہلے میں اس کی پاگل بیٹی کے چکر میں پھنس گیا تھا۔ اس سے جان چھڑا کے بھاگا تو ایک شخص میرے ہاتھوں مارا گیا۔ جس نے مجھے روکنے کی کوشش کی تھی۔ ایک کو میں نے زخمی کر دیا تھا۔"
"تو ترلوچن۔۔۔ زندہ ہے؟" وہ آہستہ سے بولی۔
"ہاں، وہ ابھی زندہ ہے۔ ابھی اس کے لیے خدا کی طرف سے ملنے والی زندگی کی مہلت تمام نہیں ہوئی۔ اس کے ساتھ وہ شخص ہے جس کو میں اپنے باپ کا قاتل سمجھتا ہوں۔ یہ میں نے تم کو اس لیے بتا دیا کہ بعد میں تم مجھے دھوکے باز نہ کہو۔"
"کیا تم پاکستان سے آئے ہو؟" وہ بولی۔
میں نے کہا۔ "یہ اندازہ کیسے کیا تم نے؟"
"تم نے خود ہی تو بتایا ہے ابھی کہ تمہارا خاندان مارا گیا تھا۔ ان کو مارنے والے ہندو یا سکھ ہوں گے۔ جیسے ہم ادھر آ رہے تھے۔ تم ادھر جا رہے ہو گے۔"
میں نے کہا۔ "جب تم نے ساری بات سمجھ ہی لی ہے تو میں کیوں انکار کروں۔ اس سے میرے اور تمہارے درمیان دشمنی کا رشتہ زیادہ پکا ہو گیا۔"
وہ حیران ہو کے بولی۔ "وہ کیوں؟"
"بھئی، ایک تو میں مسلمان اور تم ہندو، پھر میں پاکستانی اور تم بھارتی۔ اب تم چاہو تو مجھے پکڑوا دو۔"
اس نے ایک گہری سانس لی۔ "چھوڑو بابو، کیا رکھا ہے اس

دستی میں۔ ویسے بھی چھوٹے آدمی کی دشمنی کیا اور بڑے آدمی [...]ستی کیا۔ جو بھلائی کر لی کسی کے ساتھ وہی بہت، برائی کیا [...]گی ہیں، دل کا چین بھی نہیں رہے گا، چلو اب سمے ہو گیا۔"
[...]یں بھونچکا رہ گیا۔ اس نے اپنی سیدھی سادی زبان میں [...]یت کا سارا فلسفہ سمیٹ لیا تھا اور ساری الہامی کتابوں کی [...]تعلیمات کا نچوڑ پیش کر دیا تھا اور وہ نظریہ مسیحیات پیش کر [...]تھا جس پر عمل کیا جاتا تو یہی دنیا آج کے آدمی کے لیے جنت [...]خواب کی حقیقی تعبیر بن جاتی۔ اس دھوبن کو احساس نہیں تھا [...]وہ کوئی بہت بڑی بات کہہ رہی ہے۔ اس نے تو جو دل میں [...]کہہ دیا۔
میں خاموشی سے گٹھڑی کھول کے بیٹھ گیا اور اس نے میرے [...]پر اور چاروں طرف میلے کپڑے جما کے گٹھڑی کو پھر ایسے باندھ [...]کہ باہر سے دیکھنے والوں کو شک بھی نہ ہو کہ ایک دھوبن ان [...]آنکھوں میں دھول جھونک کے ان کے دشمن کو لے کے جا [...]رہی ہے۔ وہ سب بہت ہوشیار، تجربہ کار اور مستعد لوگ تھے [...]دھوبن صرف دھوبن تھی۔ جاہل، بے حیثیت اور ناقص العقل۔ [...]ہفتے کی صبح ہفتے بھر میں جمع ہونے والے میلے کپڑوں کی گٹھری [...]لے کے صبح صبح اپنی گدھا گاڑی پہ لے جاتی تھی۔ آج بھی وہ اسی [...]معمول پر عمل پیرا تھی۔ کسی کو کیسے خیال آ سکتا تھا کہ وہ ایسی زبردست [...]ہوشیاری اور اداکاری کا مظاہرہ بھی کر سکتی ہے کہ سب دیکھتے ہی [...]رہ جائیں۔
گدھا گاڑی جھٹکا لے کر آہستہ آہستہ چلی۔ اس گاڑی کی ڈرائیور [...]خود تھی اور بچپن سے حاصل ہونے والی ٹریننگ کے مطابق [...]گدھے کو چاق و چوبند رکھنے اور رواں رکھنے کے لیے بڑی روانی [...]سے ہاتھ اور زبان چلا رہی تھی۔ میری پیکنگ بڑے شاک پروف [...]طریقے سے ہوئی تھی۔ اتنے بڑے کپڑوں کے ڈھیر میں مجھے کوئی [...]پریشانی نہیں تھی۔ میں خود کو کم سے کم جگہ میں سمیٹ چکا تھا اور [...]کافی حد تک میری پوزیشن شکم مادر میں پرورش پانے والے بچے [...]جیسی تھی۔
میرا خیال تھا کہ گیٹ پر ترلوچن سے ملاقات ہو سکتی ہے [...]پانچ منٹ بعد یہ ملاقات ہوتے ہوتے رہ گئی۔
میں نے پہلے دھوبن کی آواز سنی۔ "سلام سیٹھ جی۔"
اس سلام کا کسی نے جواب نہیں دیا۔
"کون ہے یہ، کیا لے جا رہی ہے؟" یہ آواز دلاور کی تھی۔ میرا [...]دل دھک سے رہ گیا۔ وہ خبیث ابھی تک اندر ہی تھا۔ اس کا [...]مطلب یہ تھا کہ ترلوچن اور اس کے درمیان کاروباری مذاکرات [...]ختم نہیں ہوئے تھے۔ دلاور بہت ہوشیار بزنس مین تھا۔ ترلوچن اس کے مقابلے میں بہت بڑا حرامزادہ تھا۔ کملا جیسی بیٹی کے لیے وہ سب کچھ کر سکتا تھا مگر اس طرح کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ دلاور ہاتھ میں آئے ہوئے شکار کو چھوڑ کر جانے والا شکاری نہیں تھا۔ اس نے بولی بڑھا کے ترلوچن کو بھی شکار کر لیا ہو گا۔ اور ان کے درمیان معاملات خوش اسلوبی سے طے پا گئے ہوں گے کہ صبح سب ٹھیک ہو جائے گا۔
"ارے کھول دروازہ، منہ کیا دیکھ رہا ہے میرا۔ اتنی خوبصورت تو نہیں ہوں میں۔" دھوبن نے کہا۔
"ترلوچن!" دلاور نے کہا۔
"یہ دھوبن ہے، جانے دو اسے۔" ترلوچن بولا۔
"میں کہتا ہوں چیک کر لو، اس گٹھڑی میں۔۔۔"
"فضول باتیں مت کرو، میں کسی ملازم پہ شک کرنے کا عادی نہیں۔"
"کیا ملازم نمک حرام نہیں ہوتے؟" دلاور نے خفگی سے کہا۔
"میرے ملازم نہیں ہوتے۔" ترلوچن نے مختصر جواب دیا۔
شاید دلاور کی اس بات سے تسلی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے اپنے چاروں طرف دباؤ محسوس کیا۔ یہ دلاور کے ہاتھ تھے جو گٹھڑی کو ٹٹول رہے تھے۔ اسٹین گن میرے سینے سے لگی ہوئی تھی۔ میں کسی بھی ناخوش گوار صورتِ حال کے لیے بالکل تیار تھا۔ اپنے دریافت کر لیے جانے کے امکانات کو میں نے ایک لمحے کے لیے بھی نظر انداز نہیں کیا تھا۔ اور اس بارے میں میرے ذہن میں کوئی ابہام نہ تھا۔ اگر دلاور اس گٹھڑی کو کھولتا یا شک کا اظہار بھی کرتا تو میں خود ہی باہر نکل آتا اور پھر جو بھی سامنے نظر آتا، اسے بھون دیتا۔ مشین گن کا ایک راؤنڈ ان سب سے نمٹنے کے لیے کافی ہوتا جو گیٹ پر موجود تھے۔
"ہائے رام! تم کیا دیکھ رہے ہو اس میں صاب؟" دھوبن نے کہا۔ "تمہارا کوئی جانگیہ آ گیا ہے کیا، ہم دھو دیں گے۔"
"بہت بدتمیز عورت ہے۔" دلاور نے برہمی سے کہا مگر اس کا ہاتھ گٹھری پر سے ہٹ گیا۔
"چل دفع ہو جا۔" یہ آواز ترلوچن کی تھی۔
میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور اپنے اعصاب کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ جو چند منٹ کی شدید آزمائش میں سخت کشیدہ ہو گئے تھے۔ سکون کا اور تحفظ و عافیت کا خیال میرے سارے وجود میں راحت اور مسرت کا احساس بن کے پھیلنے لگا۔ گدھا گاڑی نے پھر جھٹکا لیا اور آگے بڑھی۔ مجھے فرار کی ان گنت کہانیاں یاد آ گئیں۔ کیسے کیسے ناممکن طریقے اختیار کر کے لوگ ان قید خانوں سے نکل گئے تھے جن کے بارے میں مشہور تھا کہ وہاں سے جسم کے ساتھ روح نہیں نکل

سکتی۔ ہاں روح نکل جائے تو پھر جسم باہر جا سکتا ہے۔ میرا طریقہ سب سے انوکھا رہا۔ شاید جب تک انسان میں زندہ رہنے اور آزاد رہنے کی خواہش ہے، قید کرنے والے ناممکنات کے زنداں تعمیر کرتے رہیں گے مگر ارادے رکھنے والے ان کی شکست کے نئے سامان نئے انداز سے حاصل کرتے رہیں گے اور یہ مقابلہ جاری رہے گا۔

ایک بار پھر میں اپنی جدوجہد کے کامیاب ہو جانے کی خوشی میں خدا کے سامنے شکر گزاری کے جذبات کا اظہار کرنے پر مجبور تھا۔ اس نے مجھے ہمت اور طاقت دی اور پھر وسائل دیے اور راستہ دیا۔ گدھا گاڑی جیسے ایک طلسماتی سواری بن گئی تھی اڑنے والے قالین کی طرح۔ جس پر سوار ہو کے میں اپنے دشمنوں کے سامنے سے گزر گیا۔ اور وہ مجھے دیکھ بھی نہ سکے۔ ”میں آ رہا ہوں۔ میں آ رہا ہوں،“ میں نے زبانِ خاموشی میں چلا کے اپنے دوستوں سے کہا۔ ”یہ ایک شب کی جدائی تو کوئی بات نہیں۔“ میں نے رابعہ سے کہا۔

بالآخر گدھا گاڑی ٹھہر گئی۔

دھوبن نے کہا۔ ”آجاؤ باہر بابو۔ خطرے کی اب کوئی بات نہیں ہے۔“

میں نے ہاتھ پیر ہلا کے میلے کپڑوں کو اِدھر اُدھر کیا اور اس گٹھڑی میں سے ایسے باہر آیا جیسے انڈے کے خول میں سے چوزہ برآمد ہوتا ہے۔

”یا آ آ..... ہو و و.....“ میں نے چلا کے کہا۔ ”دھوبن دی گریٹ، وومن آف دی ایئر۔ تم کو ایم آر ایس کی طرف سے اکتیس گن کا سیلوٹ۔“

وہ مجھے ایسے دیکھنے لگی جیسے میں پاگل ہو گیا ہوں۔ اس کا ایسا سمجھنا غلط بھی نہ تھا۔ میرے جذبات کی کیفیت میں پاگل پن نمایاں تھا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں دھوبن کی کمر میں ہاتھ ڈال کے ایک زبردست بھنگڑا ڈالوں اور کوئی فضول سا گانا بھی گاؤں مثلاً دھوبن تیرے حوصلے کا بول بالا۔ کر دیا دشمنوں کا منہ کالا... وغیرہ۔

لیکن گدھا گاڑی سے چھلانگ مارنے کے بعد میں نے صرف اس کا ہاتھ پکڑ کے دوسری بار چوما اور اپنی آنکھوں سے لگا کر کہا۔ ”خدا کرے کبھی تمھاری زندگی میں کوئی غم نہ آئے۔ میرا خدا اور تمھارا بھگوان تمھیں وہ سب کچھ دے جس سے خوشی ملتی ہے۔“

وہ ہنسی۔ ”اب کہاں جاؤ گے تم؟“

”جہاں سینگ سمائیں۔“ میں نے کہا۔ ”کیا سینگ ہیں میرے سر پر؟ نہیں، گدھے کے سر پر سینگ کہاں۔ میرا مطلب ہے کہ جہاں تقدیر لے جائے۔ تم اب جاؤ، خدا حافظ!“

اس نے ہاتھ جوڑ کے کہا۔ ”بھگوان رکھشا کریں تمھاری۔“

اچانک مجھے ایک خیال آیا۔ ”مس دھوبن، یہ کپڑے..... تو خیر چل جائیں گے مگر ایک چادر دے دو مجھے، جس میں یہ چھپا لوں میں۔“ میں نے مشین گن کو اٹھا کے کہا۔

اس نے کہا۔ ”کپڑے بھی بدلنے ہیں تو دیکھ لو اس ڈھیر میں۔“

میں نے کہا۔ ”نہیں، بس یہ چادر کافی ہے۔“ اور اس میں سے ایک چادر نکال کے بُکل مار لی۔ اس طرح میرا اسلحہ ہی نہیں سوٹ بھی نمایاں نہ رہا۔ اب نیچے صرف پتلون دکھائی دیتی تھی۔ جزوی طور پر چادر نے میرے چہرے کو بھی چھپا لیا۔ فضا میں آغازِ سحر کی معمولی سی خنکی اور نمی تھی۔ آسمان کے کنارے روشن ہونے لگے تھے۔

گدھا گاڑی آگے بڑھی اور میں نے اس کے پیچھے پیدل چلنا شروع کیا۔ وہ سڑک ابھی ویران تھی۔ اس کے دونوں جانب بہت عالی شان کوٹھیاں تھیں۔ چنانچہ اس سڑک پر عام پبلک کا گزر نہ تھا۔ اِکا دُکا سائیکل سوار اخبار ڈالنے والے تھے۔

جب تک دھوبن دکھائی دیتی رہی میں اسے ہاتھ ہلا کے خدا حافظ کہتا رہا۔ پھر میں نے سامنے سے پولیس کی گاڑی آتے دیکھی اور ایک درخت کی اوٹ میں ہو گیا۔ میرے اندازے کے مطابق ابھی میں ترویدی ہاؤس سے ایک میل دور تھا۔ شاید اس سے بھی کم، چنانچہ یہ ممکن تھا کہ پولیس کی اس گاڑی کو وہیں بلایا گیا ہو جہاں ایک قتل کی واردات بہرحال ہو چکی تھی۔ ترویدی اور اس کے نمک خواروں نے اپنے برسوں کے تجربے اور مہارت سے حاصل ہونے والی مستعدی کے ساتھ میری تلاش میں محل کا چپہ چپہ چھان مارا تھا لیکن وہ مجھے برآمد کرنے میں ناکام رہے تھے۔

ان کی ناکامی کا احساس میرے لیے بے حد مسرت کا باعث تھا۔ وہ اس یقین میں مبتلا ہوں گے کہ میں ان کے زبردست حفاظتی انتظامات کے باعث اندر ہی کہیں روپوش ہوں اور اپنی چالاکی یا خوش قسمتی کے باعث ان کی نظر مجھے تلاش کرنے میں ناکام ہے۔ لیکن بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ چوہدری دلاور نے اپنے مخصوص انداز میں کہا ہو گا کہ اپنے ترویدی صاحب کیا کہتے ہیں اسے، بڑی ہی خبیث روح ہے یہ سکندر بھی۔ آپ نہیں جانتے اسے، جن بھوت کو چمٹ جائے تو وہ بھی پناہ مانگتے ہیں۔ اور ترویدی نے بھی اپنے مخصوص میکانکی لہجے میں مختصر جواب دیا ہو گا کہ ہم اسے زمین سے بھی کھود نکالیں گے۔

اب یہ ہو سکتا تھا کہ انھوں نے پولیس کو طلب کر لیا ہو کہ وہ اپنے پیشہ ورانہ انداز میں تفتیش کریں کہ قتل ہوا کیسے اور پھر کہاں گیا قاتل۔ کملا کا بیان، اس محافظ منروَن کا بیان جو پہلے ناک آؤٹ ہو گیا تھا اور جس سے میں نے مشین گن کا تحفہ حاصل کیا تھا۔ بیان تو پولیس ان کا بھی لے سکتی ہے جن کا واردات سے دور کا تعلق بھی نہ ہو۔

وہ جو فرمایا ہے شاعر نے کہ جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا۔ تو پولیس کے تیرہ منبر پاپوش کی ضرب سے تو زبانِ خنجر بھی بولنے لگی۔

میری جیب میں گیارہ ہزار سے زیادہ کی رقم محفوظ تھی چنانچہ مالی مسائل کسی قسم کے نہ تھے۔ مسئلہ سب سے بڑا تھا اپنے یارانِ کہن سے رابطہ، رابعہ سے تجدیدِ وفا، کچھ ایسا انتظام کہ اب کبھی ہم نہ بچھڑیں اور موت بھی جدا کرے تو اگلے جہاں میں ملانے کے لیے مگر کیا یہ اپنے اختیار کی بات تھی؟ اتنا اختیار ہوتا تو پھر بچھڑنے کی نوبت ہی کیوں آتی؟

چلتے چلتے میں ایک نسبتاً آباد سڑک پر آ نکلا تھا۔ میں نے ایک ٹیکسی کو گزرتے دیکھا اور اس کے پیچھے دوڑا۔ میری چیخ و پکار پر وہ رُک گیا۔

”ابھی کاہے کو اتنا لفڑا کرتا پڑا ہے۔“

”وہ... کچھ نہیں، ٹیکسی خالی ہے؟“ میں نے عادتاً سوال کر لیا کیونکہ کراچی میں تو یہ تھا کہ خالی ٹیکسی نظر آ جاتی تھی اور ڈرائیور اچھے موڈ میں اسے روک بھی لیتا تھا تو پھر یہ سوال لازماً کرنا پڑتا تھا اس لیے کہ ڈرائیور اُدھر نہ جانا چاہتا ہو جو آپ کی منزل ہے تو پھر وہ کھوپڑی ہلا کے بڑی رعونت سے کہتا تھا کہ خالی نہیں ہے۔ عذر ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے۔

لیکن بمبئی میں ایسا نہیں تھا۔ ڈرائیور میرے سوال پر حیران ہوا۔ ”خالی نظر آتا پڑا ہے تیرے کو یا بھرا ہوا؟“

میں پیچھے بیٹھ گیا۔ اسٹین گن کو میں نے ناجائز اولاد کی طرح سینے سے لگائے رکھا مگر دنیا سے چھپائے رکھا۔

”ابھی تیرے پاس سے گزرا میں تو کیا سوتا پڑا تھا؟ ابھی بول کہ کدھر جانے کا ہے؟“ ڈرائیور نے کہا۔

”جانا ہے مجھے للی کے گھر۔“ میں نے کہا۔ اور پھر ڈرائیور کی غصہ بھری نظریں دیکھ کر اسے پورا پتا سمجھایا۔ راستے میں ڈرائیور نے مجھے نصیحت کی کہ میں کم پیا کروں لیکن ابھی پیا کروں اور میں نے بھی وعدہ کیا کہ اگر پی تو اس نصیحت کو ذہن میں رکھ کے پیوں گا مجھے اس وقت بھی بہت حیرانی ہوئی جب ٹیکسی آدھے گھنٹے تک دوڑتی رہی مگر اس کا میٹر اتنا تیز نہیں بھاگا۔ صرف دس روپے دے کر میں اتر گیا تو ایک روپیہ ٹپ رکھنے والے ڈرائیور نے شکریہ ادا کرتے ہوئے ہاتھ ہلا کے مجھ سے رخصت لی۔

میں بڑی پھرتی سے سیڑھیاں چڑھ گیا۔ خیال کہتا تھا کہ غالب لوٹ کر ضرور آیا ہو گا۔ ممکن ہے وہ اپنے ساتھ محسن کو بھی لایا ہو۔ ملک ایک جگہ تھی جہاں میرا واپس پہنچ جانا یقینی تھا اور جہاں مجھے ان کی خبر مل سکتی تھی۔ گزشتہ شب کے سارے واقعات بہت تھکا دینے والے تھے۔ ایک دھوبن کی ہمت سے مجھے رہائی نہ ملتی تو شاید میں اتنی آسانی سے یہاں نہ پہنچ پاتا..... یہ فتح کا احساس تھا جس نے میری ساری کلفت اور تھکن مٹا دی تھی۔ میں بڑا پُرامید اور خوش تھا۔ جس خدا نے اتنی بڑی آفت سے بچا لیا، وہی بچھڑ جانے والوں کو ملانے کے اسباب بھی مہیا کرے گا۔

ڈرانے والا خیال صرف ایک تھا کہ کہیں گزشتہ رات میری گرفتاری کے لیے آنے والوں نے ایم آر ایس کے دیگر نامی گرامی اراکین کو بھی نہ دھر لیا ہو۔ میری اطلاع کے مطابق شام کے بعد وہاں ہمارے تعاقب میں تین شکاری تھے۔ ایک وہ تھے جن کو ہم نے تازہ تازہ زخم دیا تھا، اور ان کے کاروبار کا بیڑا تقریباً غرق کر دیا تھا وہ ہمیں صورت سے نہیں جانتے تھے مگر ان کی لانچ ”بھانومتی“ کی واپسی ایک اشتعال انگیز کارروائی تھی۔ جس کی سزا دینے کے لیے انھوں نے اپنے گوریلے بھیجے تھے کہ وہ جہاں بھی ملیں انھیں پکڑ کے لاؤ۔ دوسرے شکاری، بقول اس روبوٹ نما ترویدی کے، اس نے ہمیں بچانے کے لیے بھیجے تھے اور وہ ہمیں بچا تو نہ سکے تھے، ہم نے انھیں اچھی طرح بجا دیا تھا، وہ رات کو پھر آئے تھے اور مجھے اغوا کر کے لے گئے تھے۔ تیسرے پرانے شکاری تھے یعنی اپنے چوہدری دلاور اور ان کا دستِ راست استاد پیڈرو۔ غالباً وہی تیسرے گروہ کی قیادت کر رہا ہو گا۔ یہ امر باعثِ حیرت تھا کہ وہ دوسری بار بھی ڈوب کے نہیں مرا تھا۔ بلکہ اتنا زخم خوردہ ہونے کے باوجود ہم سے پہلے بمبئی کے ساحل پر پہنچنے میں کامیاب رہا تھا۔ کیا انھوں نے میرے علاوہ دیگر لوگوں کو بھی دیکھا ہو گا؟

اوپر پہنچنے تک سارے خدشات و امکانات میرے ذہن سے گزر رہے۔ پھر میں نے خود کو للی کے دروازے پر پایا۔ پوری بلڈنگ میں ابھی تک صبح کا سکوت طاری تھا۔ سامنے والے فلیٹ میں سے البتہ ریڈیو سیلون کی نشریات سنائی دے رہی تھیں اور پرانے فلمی گانے چل رہے تھے۔ میں نے دستک دی تو دروازہ تھوڑا سا پیچھے ہٹا۔ میں نے اندر جانے کا سوچا مگر بلا اجازت اور اطلاع دیے بغیر ایسا کرنا خلافِ آداب تھا۔ للی اکیلی رہنے والی عورت تھی۔ اکیلا مرد بھی ہو تو خلوت میں نسبتاً آزادی سے رہتا ہے اوپر کال بیل کا بٹن تھا۔ میں نے اسے دیر سے دیکھا۔ بٹن دبا کے میں نے واضح سُروں میں ڈِنگ ڈانگ کی آواز سنی لیکن اندر سے نہ کوئی جواب آیا اور نہ للی نے دروازے تک آ کے جھانکا۔ میں نے دوبارہ بٹن دبایا اور پھر انتظار میں دو منٹ گزار دیے۔

عام حالات میں میرا ذہن اندیشوں سے دور رہتا۔ میں فرض کر لیتا کہ وہ باتھ روم میں ہو گی اور اس کے لیے کال بیل کے جواب میں فوراً آنا ممکن نہیں، لیکن ان واقعات کے تناظر میں جو میرے

ساتھ پیش آچکے تھے، میں پریشان کن خیالات میں گھر گیا۔ وہ باہر کا دروازہ کھلا چھوڑ کے باتھ روم میں کیوں گھُسے گی۔ اور اگر بھول سے ایسا ہوا تو وہ باتھ روم میں سے پکار کے کہہ سکتی ہے کہ ذرا ٹھہر جاؤ۔ یا اس نے دانستہ دروازہ کھلا چھوڑا تھا تو اندر آکے بیٹھنے کے لیے کہنا کیا مشکل تھا؟

میں نے گھبرا کے دروازے کو دھکیلا اور اندر داخل ہوتے ہی دروازہ اپنے پیچھے بند کر دیا۔ نہ جانے یہ چھٹی حس بھی کیا چیز ہے جو بالکل صحیح وقت پر آدمی کو خبردار کر دیتی ہے۔ آٹومیٹک الارم کی طرح خطرہ خطرہ چلّانے لگتی ہے۔

"للّی!" میں نے آواز دے کر کہا۔ "مس للّی!" خاموشی، سرد سفاک، پُرآسیب سناٹا، خوف کی سرگوشی سے گونجتا ہوا جواب کوئی نہیں، میری آواز کی بازگشت ابھی تک فضا میں لرزاں تھی۔ کون ہے جو اس پکار پہ آئے۔ "للّی... للّی...!" میں نے آگے بڑھ کے کہا۔ اگلا کمرا وہی تھا جس میں گزشتہ شام میں بیٹھا ہوا تھا۔

اس کی ساری آرائش و زیبائش ایک پُرہیبت بدصورتی میں بدل چکی تھی۔ کرسیاں اُلٹی ہوئی تھیں۔ صوفے بے ترتیب اور داغ دار تھے۔ یہ داغ بہت بھیانک تھے۔ ان کا رنگ بڑا بے رحم تھا، گہرا سرخ

"للّی!" میں نے چلّا کے کہا اور اس کے بیڈ روم میں گھُس گیا۔ وہ وہاں قالین پر اُلٹی پڑی ہوئی تھی۔ زرد قالین پر اس کا سرخ خون جم کے کالا پڑنے لگا تھا۔ اس کا بے لباس جسم زخموں کا لالہ زار تھا۔ یہ سب زخم انسان نما درندوں کی وحشت اور بربریت کی مُنہ بولتی تصویر تھے اور اس ظلم کی داستانِ خونچکاں تھی جو للّی کے جسم پر توڑا گیا۔

اس کو سگریٹوں سے داغا گیا تھا اور بجلی کے تار کے کوڑے سے مارا گیا تھا۔ یہ تار کا لمبا ٹکڑا ابھی وہیں موجود تھا۔ جس نے للّی کے بدن پہ آڑی ترچھی سیاہ لکیروں کا جال بنا دیا تھا۔ اس کے بکھرے ہوئے بال بتاتے تھے کہ انھیں کس بے رحمی سے نوچا گیا ہو گا۔ اس کا مُنہ دوسری طرف تھا لیکن میری ہمّت نہیں پڑی کہ میں ادھر جا کے اس کی کھلی آنکھوں میں دیکھ سکوں۔ اس کے مُنہ میں ٹھونسا جانے والا کپڑا ابھی مجھے دکھائی دے رہا تھا۔

میں ایک دم اُٹھا اور پیچھے ہٹا۔ میرے پاؤں کے نیچے آنے والی کوئی چیز چٹخ کے ٹوٹ گئی۔ نیم روشن کمرا اچانک آسیب زدہ ہو گیا تھا۔ میں نے گھبرا کے پیر اُٹھا لیا اور نیچے دیکھا۔ یہ ایک تصویر کا فریم تھا جو اُلٹی پڑی ہوئی تھی۔ میں نے تصویر کو اُٹھا کے دیکھا۔ ٹوٹے ہوئے شیشے کی چند کرچیاں اب بھی فریم میں اٹکی ہوئی تھیں۔ شیشے کی تیز دھار نے اس تصویر کو بھی زخمی کر دیا تھا جو شکستہ فریم میں ایسے لگتی تھی جیسے دھنسی ہوئی قبر میں سے دکھائی دینے والا کسی لاش کا ڈھانچا۔

کسی دُشواری کے بغیر میں نے اپنے آپ کو پہچان لیا۔ یہ چہرہ کسی اور کا نہیں تھا۔ گزشتہ شام اسے غالب نے دیکھا تھا اور مجھے بتایا تھا کہ للّی کی مجھ سے جذباتی وابستگی کا سبب کیا ہو سکتا ہے۔ اس وقت میں نے غالب کا مذاق اُڑایا تھا مگر اب مجھے کوئی شک نہیں رہا تھا کہ للّی نے میری صورت میں ایک گمشدہ چہرے کے خدوخال تلاش کر لیے تھے اور اسے احساس تھا یا نہیں تھا۔ لیکن وہ اپنی کمزوری پر قابو پانے میں ناکام رہی تھی۔

میرا سارا وجود ایک دم سُلگنے لگا تھا۔ للّی کی پُرسکون زندگی کے سفر کو اس ہولناک انجام سے دوچار کرنے کی تمام ذمّے داری مجھ پر تھی۔ میں نے اسے نہیں مارا تھا لیکن میں نے اسے مروا دیا تھا۔ اس طرح اخلاقی طور پر اس کے قتل میں بالواسطہ طور پر میں بھی شریک تھا۔ ترلوچنی کے سامنے اس کے حکم کے غلاموں نے صاف بتا دیا تھا کہ اُنھوں نے للّی سے میرا پتا پوچھنے کے لیے کوئی تشدّد کا حربہ استعمال نہیں کیا تھا۔ انھوں نے جذباتی دباؤ ڈال کے اسے بلیک میل کیا تھا۔ جسمانی تشدّد کرنے والے چوہدری دلاور کے ایجنٹ ہی ہو سکتے تھے۔ وہ بعد میں وہاں پہنچے۔ جب انھیں ترلوچنی کے کسی آدمی سے معلوم ہوا کہ ہم للّی کے ساتھ تھے۔ وہ ایک طرح سے ترلوچنی کے گروہ کے پیچھے اجنبی کے چھوڑے ہوئے سراغ کی مدد سے للّی کو تلاش کرنے میں کامیاب ہوئے ہوں گے۔ اس بات نے للّی کو ضرور پریشان کیا ہو گا کہ آخر اس نقلی چہرے والے کے کتنے دُشمن ہیں۔ ان میں نقلی کتنے ہیں اور اصلی کتنے۔ بعد میں اس سے میرا پتا پوچھنے والوں کا طریقہ کار مختلف تھا۔ اُنھوں نے للّی سے ہمارے بارے میں معلومات حاصل کر لینے کے بعد اسے ہماری میزبانی کی سزا بھی دی۔

مجھے اب وہ ساری باتیں یاد آ رہی تھیں جو للّی نے ہم سے کہی تھیں اور وہ سارے وعدے یاد آ رہے تھے جو ہم نے للّی سے کیے تھے۔ وہ سب کھیل ختم ہو گیا تھا اور صرف پچھتاوا رہ گیا تھا۔ معذرت، معافی، تلافی سب بے معنی الفاظ ہو گئے تھے۔ للّی کے آنجہانی شوہر کی تصویر مجھے پُرملامت دُکھی نظروں سے گھُور رہی تھی۔

کال بیل بجی تو میں اُچھل پڑا۔ یکلخت مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ مجھے تو یہاں ایک منٹ بھی نہیں رُکنا چاہیے تھا۔ جو ہونا تھا، ہو چکا تھا۔ سوچنے اور انتقام کی آگ میں جلنے سے اور اس قتل پر آنسو بہانے سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ دیر کی صورت میں میرا یہاں اس لاش کے ساتھ پکڑے جانے کا امکان زیادہ تھا۔ گھنٹی کی آواز نے میرے خوف کو یقینی خطرے سے دوچار کر دیا۔

یہ کون ہو گا؟ کوئی پڑوسی؟ دودھ والا یا اخبار والا؟ پولیس؟

گھنٹی پھر بجی۔ دروازہ میں نے بھی اندر سے مقفل نہیں کیا تھا۔ کوئی میری طرح شکوک میں مبتلا ہو کے اندر بھی آ سکتا تھا۔ اس کے شناسا ایسے بھی ہوں گے جو للّی کی عادات کو اور اس کے معمولات کو سمجھتے ہوں گے۔ کسی کو یہ بات خلافِ معمول لگے گی تو وہ حقیقت جاننے کے لیے اجازت کا انتظار نہیں کرے گا۔

میں تیزی سے دروازے کی طرف گیا اور ایک کونے میں سمٹ کے کھڑا ہو گیا۔ اسی وقت ہینڈل گھُوما۔

"للّی!" کسی عورت نے دروازے کو تھوڑا سا کھول کے آواز دی۔ "کہاں ہو تم؟" وہ انگریزی بول رہی تھی اور للّی سے بے تکلّف معلوم ہوتی تھی۔ کوئی جواب نہ پا کے اس نے زور سے "ڈیم اٹ" کہا اور اندر آ گئی۔

ایک لمحہ ضائع کیے بغیر میں نے اس کو شانے سے پکڑ کے کھینچا اور آگے دھکیل دیا۔ وہ مُنہ کے بل گر گئی۔ میں نے بڑی پھُرتی سے اپنا چہرہ دوسری طرف کیا اور دروازے سے نکل گیا۔ باہر کی طرف وہ کنڈی بھی تھی جس کو کھینچ کر بند کیا جاتا ہے۔ کنڈی لگاتے وقت میں نے اس عورت کی چیخ سُنی۔ میں نے اس کا چہرہ واضح طور پر نہیں دیکھا تھا لیکن یہ دیکھ لیا تھا کہ وہ بھی جوان عورت تھی اور شاید اینگلو انڈین تھی کیونکہ اس نے اسکرٹ پہن رکھا تھا۔

اپنے بارے میں مجھے اطمینان تھا کہ وہ میرا چہرہ بالکل نہیں دیکھ سکی ہو گی۔ للّی کی لاش دیکھ لینے کے بعد اس کے لیے شک کی کوئی گنجائش نہیں رہے گی کہ وہ للّی کا قاتل ہی تھا جو اندر موجود تھا اور جو ایک چادر میں چہرہ چھُپا کے کھڑا ہوا تھا اور اسے دھکّا دینے کے بعد باہر سے کنڈی لگا کے فرار ہو گیا تھا۔

جب وہ پولیس کے سامنے بیان دے گی تو سو فیصد یقین کے ساتھ حلفیہ کہے گی کہ قاتل وہی شخص تھا۔ اس کا یقین بے بنیاد ہو گا مگر آدمی جو کچھ دیکھتا ہے اسی پر یقین کی بنیاد رکھتا ہے۔ بعض اوقات ایک جھوٹ ہی سب سے بڑا سچ دکھائی دیتا ہے اور جو سچ ہوتا ہے وہ نظر سے اوجھل رہتا ہے۔ میرا رویّہ میرے مجرم ہونے کی تصدیق کرتا تھا اور میرے سوا جائے واردات پر تھا بھی کون۔ للّی کے آنجہانی شوہر کی تصویریں اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس کی اور بھی بہت سی تصویریں ہوں گی اور اسے اپنی زندگی میں للّی کے سب دوست احباب نے دیکھا ہو گا۔ مگر اب کوئی یہ بتانے والا نہ ہو گا کہ وہ قاتل بالکل ویسا ہی چہرہ رکھتا تھا جیسا للّی کے شوہر کا تھا۔ جو تصویر میرے ہاتھ آ گئی تھی وہ میری یوں مددگار ثابت ہو سکتی تھی کہ اسے دیکھ کر میں ایک بالکل مختلف اور نیا چہرہ بنوا سکتا تھا۔

جس عورت کو میں للّی کے فلیٹ میں للّی کی لاش 'دریافت' کرنے کے لیے چھوڑ آیا تھا، وہ اب مجبور تھی کہ اس واردات کی خبر دوسروں کو دے۔ اس کی اپنی رہائی کی یہی صورت تھی کہ وہ شور مچائے، دروازہ بجائے اور پولیس کو للّی کے گھر سے ہی فون کرے۔ رات بھر للّی کی لاش بے کفن اور لاوارث پڑی رہی۔ یہ میری بدبختی تھی کہ سب سے پہلے میں نے ہی للّی کو اس حال میں دیکھا۔ میرے لیے ممکن ہوتا تو میں اس کی تدفین کی رسوم میں آخر تک شریک ہو کے اظہارِ عقیدت کرتا۔ لیکن گردشِ وقت نے مجھے روپوش ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔

میں بلڈنگ سے باہر آیا تو صبح کے ساڑھے سات بج چکے تھے۔ سڑکوں پر ٹریفک کا رش زیادہ ہو گیا تھا۔ اپنے اپنے کام پر جانے والے سب ہی لوگ گھروں سے نکل آئے تھے اور بسوں ٹراموں کے لیے قطاریں بنائے کھڑے ہوئے تھے یا ٹیکسی تلاش کر رہے تھے۔ میں جلد از جلد اس جگہ سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ ایک مشین گن کو بغل میں چھُپا کے بس یا ٹرام میں سفر کرنا دانش مندی نہ ہوتی لیکن مجھے کوئی بھی ٹیکسی خالی نظر نہیں آ رہی تھی۔

اچانک میری نظروں نے غالب کو دیکھا۔ وہ سڑک کے دوسرے کنارے پر ایک سائن بورڈ کی آڑ لیے کھڑا تھا۔ اگر وہ چہرے کے سامنے سے اخبار نہ ہٹاتا تو میری نظر چُوک جاتی اور شاید اگلے لمحے میں کسی خالی ٹیکسی میں بیٹھ کے نکل جاتا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہاں اس طرح چھُپ کے وہ میرا ہی انتظار کر رہا تھا۔ میں نے اوپر کے حصّے پر چادر لپیٹ لی تھی اور کسی حد تک اپنی صورت کو بھی ڈھانپ لیا تھا چنانچہ مسلسل نگرانی کرنے کے باوجود

غالب نے مجھے اوپر جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اسے یقین ہوگا کہ مجھے موقع ملا تو میں وہاں ضرور جاؤں گا۔ اس کا حلیہ بالکل بدلا ہوا تھا۔

میں نے اطمینان سے سڑک پار کی حالانکہ اس وقت میں تھوڑا سا نروس تھا۔ میں آسمان سے گر کے کھجور میں اٹکتے اٹکتے رہ گیا تھا۔ تریوینی کے گھر سے تو میں نکل آیا تھا۔ اب للی کے گھر میں پھنس جاتا تو ناکردہ گناہ کی سزا پاتا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس اجنبی دیس میں ایسی کوئی بات ہو جس سے رسوائی یا تشہیر کے اسباب پیدا ہوں۔ میں گمنام اور روپوش رہنا چاہتا تھا مگر میری خواہش کے برعکس واقعات کا سلسلہ میری مشکلات میں اضافہ کر رہا تھا۔

غالب مجھے دیکھ کے بھونچکا رہ گیا "یعنی آپ... ؟"

"ہاں۔ میں یہاں سے فرار ہو رہا ہوں" میں نے رُکے بغیر کہا۔

وہ میرے ساتھ چل پڑا "کمال ہے یار! تم نے مجھے دیکھ لیا۔ حالانکہ مجھے یہاں اسی لیے کھڑا کیا گیا تھا کہ تمھیں دیکھتا رہوں"

"مگر تم اخبار دیکھ رہے تھے؟" میں نے اسے ڈانٹ کر کہا۔

"اخبار تو ایک پردہ تھا" اس نے مجھے بندی میں چھپا ہوا اخبار دکھا کے کہا "مگر تم کیوں باپردہ فرار ہو رہے ہو؟ اور آخر یہ کیا نیا شوق ہے تمھارا۔ کل رات بھی تم فرار ہو گئے تھے، بغیر کچھ بتائے"

"میں اغوا ہو گیا تھا" میں نے اس کی تصحیح کی۔

"او ہو بھائی اغوا ہونے سے کون روکتا ہے تمھیں" مرزا غالب نے اخبار کا ڈنڈا سا بنا کے ہلایا "مگر کچھ بتا کے تو جایا کرو تاکہ تمھارے یہ لواحقین پریشان نہ پھریں۔ ساری رات کہاں رہے تم آخر...؟ اور بقول نمی شاعر۔ چن کتھے گزاری آئی رات وے..."

"مرزا! کیا تمھیں معلوم ہے کہ للی کا قتل ہو گیا ہے...؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ اسی لیے تو میں کھڑا ہوا تھا یہاں۔ کہ تم کو اوپر نہ جانے دوں" مرزا غالب نے کہا۔

"میں اوپر ہو آیا۔ سب کچھ دیکھ لیا میں نے... تم بھی گئے تھے للی کے فلیٹ میں؟"

"نہیں۔ وہ خود نیچے آئی تھی، مجھے یہ بتانے کے لیے کہ میں قتل ہو گئی ہوں" مرزا نے کہا۔

"میں جانتا ہوں اس کا جرم کیا تھا جس پر اسے سزائے موت دی گئی"

"جرم تو میں بھی جانتا ہوں۔ بلکہ میں تو اس کے نادیدہ قاتل سے بھی واقف ہوں" غالب نے کہا "جب سے میں نے فلیٹ میں جا کے دیکھا ہے میرا خون کھول رہا ہے۔ اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس شیطان کو کہاں جا کے قتل کروں۔ اور کیسے قتل کروں"

"تجھے کیا معلوم کہ اسے کس نے قتل کیا ہے؟"

"معلوم ہے مجھے" غالب نے کہا "یہاں اور کون دشمن ہے ہمارا۔ ہماری وجہ سے جن کا کاروبار چوپٹ ہوا۔ جن کا وہ سب مال واپس آگیا جو لانچ پر تھا..."

میں نے نفی میں سر ہلایا "یہ ٹھیک ہے کہ وہ لوگ ہمیں تلاش کر رہے تھے۔ انھیں ناکامی نے زیادہ مشتعل بھی کیا تھا اور وہ للی کی کار کے ذریعے اس کے فلیٹ تک رسائی حاصل کرنے میں بھی کامیاب رہے تھے۔ لیکن انھوں نے للی پر کوئی جسمانی تشدد نہیں کیا تھا۔ اس کے بغیر ہی للی نے ان کو بتا دیا تھا کہ ہم کہاں ہوں گے"

"مگر یار... للی... یہ اس نے کیوں کیا؟"

"مجبوری۔ یہاں کون ہے جو مجبور نہیں ہے۔ اور اس کے پاس جانے والوں نے بھی ایک مجبوری سے فائدہ اٹھایا۔ لیکن للی کے ساتھ یہ بربریت کا سلوک بعد میں جانے والوں نے کیا" میں نے کہا۔

"بعد میں کون گیا تھا؟"

"ہمارے دیرینہ دشمن۔ چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کے شکاری کتے" میں نے کہا۔

غالب چلتے چلتے رک گیا "کیا؟... وہ یہاں؟"

میں نے اقرار میں سر ہلایا "یہ لمبی بات ہے"

"لمبی بات ہے تو کہیں بیٹھ جاتے ہیں۔ چائے پی لیتے ہیں" غالب نے کہا۔

"چائے سے کام نہیں چلے گا۔ ناشتا چاہیے پورا۔ ساری رات کا تھکا ہوا ہوں"

"ناشتا کیا ملے گا یہاں۔ سب ایرانی ہوٹل ہیں"

"بھوک لگی ہے لہٰذا ایرانی ہو یا تورانی۔ جو بھی ملے گا چلے گا" میں نے کہا "تو یہ بتا کہ... وہ اپنی..."

"رابعہ کیسی ہے... اور کہاں ہے؟" غالب نے طنز سے کہا۔ "بڑی جلدی خیال آگیا اس کا۔ وہ منتظر ہے آپ کی۔ کہ آپ آئیں تو آپ کو قتل کر دے"

میں نے خوش ہو کے کہا "قتل تو ہم ہوتے رہتے ہیں مگر یہ اچھی بات ہے کہ اب اسے انتظار ہے۔ ہم نے بھی بہت انتظار کیا"

"انتظار میں تو سب ہی ہیں کہ اس نامعقولیت کے مظاہرے پر آپ کی گوشمالی کی جائے" غالب نے خفگی سے کہا "ایسے تو شاید گدھے کے سر سے سینگ بھی غائب نہیں ہو سکتے جیسے آپ غائب ہوئے تھے"

"میں کوئی پکنک پر نہیں گیا تھا" میں نے بھنا کے کہا۔

غالب نے ایک ریسٹورنٹ کی طرف اشارہ کیا جو نسبتاً صاف ستھرا تھا اور کچھ خالی خالی نظر آتا تھا "یہاں بیٹھ کے بات کرتے ہیں۔ تو یہ چادر تو ہٹا دے اب۔ اس جگہ سے ہم بہت دور ہیں جہاں خطرہ تھا"

"خطرہ تو میں ساتھ لیے پھر رہا ہوں" میں نے چادر کا کونا ہٹا کے اسے مشین گن کی زیارت کرائی "اس کے علاوہ بھی کچھ نوادرات لایا ہوں"

ناشتے کے دوران اور پھر اس کے بعد بھی میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ غالب حیرانی سے سنتا رہا۔ مشین گن کو میں نے اب چادر میں لپیٹ کر رکھ دیا تھا کیونکہ ہم ایک کیبن میں تھے جہاں سب کی نظریں ہمیں نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ غالب نے پہلے سوٹ کی تعریف کی۔ پھر دھوبن کی اور آخر میں میری۔ کملا کے بارے میں اس نے خاصے نامناسب خیالات کا اظہار کیا جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ شاید میں نے اصل واقعات کو سنسر کر دیا ہے۔

"تم لوگ آخر کیسے بچ گئے؟" میں نے کہا "مجھے تو خاصی امید تھی کہ اغوا کرنے والوں نے سبھی کو دیکھا ہوگا۔ گل کے سوا وہ سب کو پہچانتے ہیں"

"میں تو حیران ہوں کہ یہ استاد پیڈرو آخر کیا چیز ہے۔ کس مٹی کا بنا ہوا ہے" غالب نے کہا "وہ پھر بھی غرق نہیں ہوا؟"

"اسے وقت مل گیا تھا۔ کسی جہاز نے بچا لیا ہوگا۔ وہ ہم سے پہلے بمبئی پہنچ کے اپنے چوہدری صاحب کو پوری رپورٹ دے چکا تھا۔ ظاہر ہے کہ چوہدری صاحب بہت مشتعل تھے"

"لیکن انھیں ہمارے بارے میں کس نے بتایا؟"

"ان سب نے جن کو ہم واپس لے آئے تھے" میں نے کہا "لانچ کی واپسی نے خاصی سنسنی پھیلائی ہوگی۔ دلاور نے سمجھ لیا کہ یہ کارنامہ ہمارا ہے"

"ان عورتوں کے بیان سے ہماری تصویر سامنے آگئی ہوگی" غالب نے کہا۔

"ہاں۔ دلاور کے بندے وہیں پھر رہے تھے۔ انھوں نے سنا یا خود دلاور نے سنا اور اس کے بعد ان کا کام آسان ہو گیا۔ وہ ان کے پیچھے لگ گئے جو ہمارے پیچھے تھے۔ جو لڑکی لانچ کو ساحل تک لے گئی تھی اس نے بتا دیا ہوگا کہ وہ دونوں ہیرو کہاں اُترے تھے۔ لانچ کے مالکان کے ایجنٹ وہاں پہنچے تو چوہدری دلاور کے بندے ان کے پیچھے گئے۔ وہ للی کے گھر پہنچے تو جو لوگ سائے کی طرح ان کے تعاقب میں تھے وہ بھی للی کے گھر گئے اور وہاں سے حاجی علی کی درگاہ کا پتا بتا دیا گیا تو شکاری نمبر ایک اور دو آگے پیچھے تھے۔ آگے والے مجھے اٹھا کر لے گئے۔ پیچھے والے پھر پیچھے رہے اور ان سے میری ملاقات تریوینی کے بنگلہ پیلس میں ہوئی"

"ویری سمپل" غالب نے اتفاق کیا "کیا اس سے یہ وضاحت نہیں ہو جاتی کہ باقی سب گرفتار کیوں نہیں ہوئے تھے۔ اگر تیرے ساتھ میں ہوتا تو ضرور اٹھا لیا جاتا۔ لیکن ساری بات ہے اعمال کی"

"یعنی آپ نازو کے ساتھ بحرِ ہند کے ساحل پر عشق فرما رہے تھے تو یہ نیک عمل تھا" میں نے کہا "یہ کیوں نہیں کہتے کہ میری قربانی کے صدقے میں سب بچ گئے۔ وہ مجھے اٹھا کر لے گئے اور دلاور اینڈ کمپنی کے شکاری کتے جو ان کے پیچھے لگے ہوئے تھے، انھیں بھی پیچھے دوڑ لگانی پڑی۔ تم سب کو تلاش کرنے کی مہلت ہی نہیں ملی ان کو"

"وہ اپنے دلاور صاحب ابھی تک اندر ہی ہیں؟"

"بالکل ہوں گے" میں نے کہا "سالا پاگل ہو جائے گا کہ بندہ آخر کیسے غائب ہو گیا۔ فصیل کو عبور کر کے نکلنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ تاروں میں بجلی تھی۔ اگر میں تار کاٹ دیتا۔ جو کہ خالی ہاتھوں سے ایک ناممکن کام تھا، تب بھی الارم چلانے لگتے لیکن کسی الارم نے شور نہیں کیا۔ اس کے علاوہ ایک ہی مین گیٹ تھا۔ وہاں وہ دونوں بعلم خود موجود تھے۔ دلاور اور تریوینی"

"تو مان یا نہ مان۔ وہ دھوبن بالآخر ماری جائے گی۔ پولیس والے بہت خبیث ہوتے ہیں۔ جب وہ تفتیش کریں گے اور ایک منٹ کی رپورٹ لیں گے تو یہ بات نوٹ کر لیں گے کہ صبح صبح دھوبن ایک گٹھری لے کر گئی تھی جس کو چیک نہیں کیا گیا تھا"

"تریوینی کے حکم پر"

"ہاں تریوینی کے حکم پر۔ مگر اس سے بعد میں بھی تو پوچھ گچھ کی جا سکتی ہے۔ تریوینی بالکل معترض نہیں ہوگا اور دھوبن کتنی بھی بہادر ہے یا چالاک ہے۔ پانچ منٹ میں ساری اسٹوری اُگل دے گی۔ اس پر جب تشدد کے وہ حربے آزمائے جائیں گے جو صرف عورتوں کے لیے مخصوص ہیں تو زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ وہ بولے گی۔ اور نہیں بولے گی تو بہت عذاب جھیلے گی"

میں نے ایک سرد آہ بھری "معلوم نہیں ہماری وجہ سے کس کس پر عرصۂ حیات تنگ ہو رہا ہے۔ ان سب کا بار ہمارے سر پر ہے۔ میں اس خیال سے اتفاق کرنے پر مجبور ہوں کہ اس دھوبن پر ایک اور مسلمان کی وجہ سے بُرا وقت آئے گا۔ ممکن ہے اس کی عزت یا متاعِ حیات لُٹ جائے"

غالب نے نفی میں سر ہلایا "اگر وہ اتنی نفرت کرتی تھی ہم

مسلمانوں سے۔ تو وہ کیوں عذاب میں ڈالے گی خود کو۔ ٹھیک ہے، آپ نے اپنی کہانی سُنا کے اسے قائل کر لیا کہ اچھے بُرے لوگ دونوں طرف ہوتے ہیں۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ اگر چالاک عورت ہوگی تو خود کو بچالے گی۔ جھوٹ بول دے گی کہ سرکار میں کیا کرتی۔ اس مُسلے نے کٹھری کے اندر میری بچّی کو دبوچ رکھا تھا۔ میں بولتی تو وہ اس کو مار ڈالتا۔"

"بالکل درست۔" میں نے مطمئن ہو کے کہا۔ "وہ ایسا ہی کرے گی کیونکہ میں نے ایسا ہی کیا تھا جب میں اس کے گھر میں کُودا تھا تو میں نے اسے جان سے مار ڈالنے کی دھمکی دی تھی۔ یہ بات اس کے ذہن میں ہوگی۔ اس کی جان بچ سکتی ہے۔"

"چل اب باقی باتیں بعد میں۔" غالب نے کہا۔ "اس مشین گن کے علاوہ کیا تحائف دیے ہیں تریوینی نے؟"

میں نے اسے ریوالور دکھایا۔ پھر کملا کا زنانہ پستول۔

"بہت نفیس چیز ہے۔" غالب نے اسے ہاتھ میں لے کر اور اُلٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"گیارہ ہزار روپے سلامی بھی ملی تھی۔" میں نے کہا۔ "مگر یار، وہ سب اسی کے پاس رہ گیا۔ میرا ریوالور اور پاسپورٹ۔"

"پاسپورٹ بھی؟"

"ہاں۔ ویسے وہ اب بے کار تھا۔" میں نے کہا۔ "میرا یہ چہرہ اور نام دونوں مشتہر ہو گئے ہیں۔ پولیس کو میری وہی تصویر فراہم کر دی جائے گی جو پاسپورٹ پر تھی۔ نام کے ساتھ یہ تصویر ان کے ریکارڈ پر آجائے گی۔ فی الحال ایک قتل کا الزام تو ثابت ہے۔ ڈکیتی چوری وغیرہ بھی کی ہے میں نے زبردستی مجرمانہ عزائم کے ساتھ تریوینی کے گھر میں داخلے کا مجرم بھی ہوں۔"

غالب نے مجھ سے اتفاق کیا۔ "امیر چند ہی کو نہیں بلکہ اس کے بھائی فقیر چند ولد دمڑی لال کو بھی نیا نام اور نیا حُلیہ اختیار کرنا پڑے گا ورنہ ایک نہ پکڑا گیا تو دوسرا پکڑا جائے گا۔"

"یہ کام ہوگا کیسے ...؟"

"جیسے اپنے وطن میں ہوتا تھا۔ یہاں بھی پیسہ ہی سارے بگڑے کام سنوارے گا۔" غالب نے کہا۔ "ہم کون سے ولایت میں آگئے ہیں۔ رشوت کا سکّہ دونوں طرف ایک جیسا چلتا ہے۔"

"رشوت کا سکّہ ساری دُنیا میں چلتا ہے۔ کہیں کم اور کہیں زیادہ۔" میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

اب دھوپ تیز ہونے لگی تھی۔ معلوم نہیں وہ کون سی سڑک تھی اور ہم کس بازار سے گزر رہے تھے۔ مزاج کے اعتبار سے یہ شہر کراچی جیسا ہی لگتا تھا۔ کم سے کم سڑکوں اور نئی پرانی عمارتوں کی حد تک کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا تھا۔ موسم بھی وہی تھا۔ ہوا میں نمی۔ مچھلیوں کی بُو۔ دُھواں۔ آسمان مٹیالا نیلا غبار آلود۔ لوگ قدرے مختلف دکھائی دیتے تھے تو اس کی وجہ اس معاشرے کا آزادانہ اختلاط تھا۔ مرد عورت یہاں عملاً ایک گاڑی کے دو پہیے لگتے تھے۔ کہیں کوئی تفریق نہ تھی۔ سڑکوں بازاروں کی بھیڑ میں عورتوں کا تناسب برابر کا تھا۔ بسوں میں ان کے لیے کوئی سیٹ مخصوص نہ تھی۔ سب ملے جُلے بیٹھے ہوئے تھے۔ کیا عورتیں کیا مرد۔ عورتوں میں ساری اور اسکرٹ زیادہ نظر آتا تھا۔ بلکہ شلوار قمیص میں تو عورتیں خال خال ہی تھیں۔ عورتوں کی مجموعی حالت سے ابتری ظاہر ہوتی تھی۔ ساریاں میلی اور بدنما لگتی تھیں۔ ان کی جسمانی صحت کا معیار بھی افسوس ناک تھا۔ خوبصورتی عنقا تھی اور اچھی صورت کہیں سیکڑوں میں ایک دکھائی دیتی تھی۔ مرد مجھے سب کولھو کے بیل لگے۔ کام میں مگن۔ اپنی دُھن میں رواں۔ تاہم ڈسپلن کے اعتبار سے وہ قدرے بہتر معاشرہ تھا۔ لوگ ہر جگہ قطار بنانے کے عادی تھے۔ بغیر ٹکٹ کے بس میں سفر کرنا مشکل تھا۔ بسوں اور ٹراموں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ آبادی کے تناسب سے کاریں کم تھیں اور ٹیکسیاں زیادہ۔ سفر کے مختلف مراحل میں مشاہدے سے میں نے بہت کچھ جان لیا۔

ہم ابھی کسی راستے سے واقف نہیں تھے چنانچہ ہر جگہ لوگوں سے کچھ پوچھنا پڑتا تھا تو زیادہ تر لوگ ہم سے بھی زیادہ ناواقف ثابت ہوتے تھے یا کسی ناقابلِ فہم زبان میں حقّے کی طرح گڑگڑا کے نکل جاتے تھے۔ ایک بازار سے میں نے اپنے سائز کے جوتے لیے۔ پھر قمیص اور پتلون خریدی اور یہ لباس ایک سینما کے ٹائلٹ روم میں جا کے بدلا۔ تریوینی کا عطا کردہ قیمتی سوٹ میں نے وہیں چھوڑ دیا۔ مشین گن کو بھی ہم نے ایک لمبوترے کینوس کے بیگ میں ڈال لیا تھا۔ یہ آلاتِ موسیقی فروخت کرنے والے ایک بنگالی نے ہمیں بہت مہنگا دیا تھا کیونکہ درحقیقت یہ وائلن کا کور تھا۔ اگر اسے معلوم ہو جاتا کہ اس میں مشین گن رکھی جائے گی تو شاید صدمے سے اس کا ہارٹ فیل ہو جاتا۔

اپنے 'قاتلانہ' حُلیے کو فوراً آسانی سے بدلنے کے لیے لباس کا بدل لینا کافی نہیں تھا۔ غالب کے مشورے پر میں نے ایک چوگوشہ نیپالی ٹوپی خرید کے سر پر سجالی۔ غالب تو مُصر تھا کہ ان جھوٹے بالوں سے نجات کا آسان اور سب سے سستا نسخہ استعمال کر دل یعنی کسی بھی فٹ پاتھ پر کسی بھی خلیفہ کے اُسترے کے سامنے سرنگوں ہو جاؤں اور اس سے کہوں کہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہاتھ کی صفائی دکھا دے۔ تاہم میں نے اس شہر میں گنجا ہونا قبول نہیں کیا جہاں ہیئر اسٹائل کی بنیاد پر فلمی ہیرو بننے کے امکانات بھی روشن تھے۔

گلے میں ایک رنگین اسکارف باندھ کے اور آنکھوں پر دھوپ کا کالا چشمہ چڑھانے کے بعد میں نے غالب سے رائے مانگی تو اس نے حاسدانہ لہجے میں کہا کہ ہیرو کا نہیں البتہ اب وِلن کا چانس دے سکتا ہے کوئی کاٹھ کا اُلّو پروڈیوسر ڈائریکٹر ورنہ جوکر کا رول تو میں کر ہی رہا ہوں۔ مجھے اب بے چینی ہو رہی تھی۔ اپنی حفاظت کا خیال بھی ضروری تھا لیکن جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا لالعبہ سے ملنے کی خواہش غالب آرہی تھی اور مجھے غالب پر جھنجلاہٹ ہونے لگی تھی جو بڑی بے فکری سے گھوم رہا تھا۔ پہلے یہ کام کر لیں۔ وہ چین لے لیں وغیرہ وغیرہ۔

تنگ آکے میں نے کہا۔ "مرزا... تم نمٹاتے رہو ضروری کام اگر دل چاہے تو آجانا۔ ورنہ میدانِ حشر میں تو ملاقات ہوگی ہی... میں چلا۔"

غالب نے کہا۔ "یہ بھوری داڑھی بھی خطرے کی علامت ہے۔"

"اسے میں خود کتر لوں گا قینچی سے یا پھر شیو کر لوں گا۔" میں نے کہا۔

"نیک کام میں دیر کیوں۔ یہ دیکھ اپنے مولانا صاحب کیسی پیار بھری متوقع نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔" غالب نے کہا اور مجھے کھینچ کر فٹ پاتھ پر رکھی ہوئی کرسی میں فٹ کر دیا۔ "دو منٹ کی بات ہے۔"

مولانا نے شیو کے سوال پر سخت ناراضی کا اظہار کیا۔ "اس کو شیو بولتا ہے؟ اتنا بڑا جھاڑی کاٹے گا۔"

"یہ جھاڑی نہیں ' داڑھی ہے۔" میں نے بھی خفگی سے کہا۔

"او بابا جاتا ہم۔ یہ چار آنہ شیو کا ریٹ ہے۔ ایک روپیہ منظور تو بیٹھو ورنہ کرسی خالی کرو۔" اس نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

ایک روپیہ اس محنت کے عوض بہت کم تھا جو اسے میرے چہرے کے جنگل سے میری صورت برآمد کرنے کے لیے کرنی پڑی۔ اس سے زیادہ مسرت مجھے اپنی جلد پر ٹھنڈی ہوا کے لمس سے ہوئی اور پھر اپنے گالوں پر ہاتھ پھیر کے ہوئی۔ میں نے اسے پانچ روپے کا نوٹ پیش کیا تو اس نے نوٹ کو روشنی کے رُخ کر کے واٹر مارک دیکھا۔ چونکہ ہم نشے میں نہیں تھے اس لیے پروپرائٹر "نیو ہالی وُوڈ گولڈن اسٹار ہیئر ڈریسنگ سیلون" کو یہ شک ہونا فطری امر تھا کہ نوٹ جعلی تو نہیں۔ جتنا لمبا اس کا بقلم خود لکھا ہوا سائن بورڈ تھا وہی اس کے حصّے کی فٹ پاتھ تھی جس کا بھتّا وہ تھانے والے کو دیتا ہوگا۔ ملحقہ سرحد ایک کیفے ڈی فٹ پاتھ کی تھی جہاں سے 'باہر والا' بار بار چھ گلاس ایک ہینگر میں لٹکا کے دوڑ لگاتا تھا۔ 'باہر والا'۔ بمبئی میں چائے کی آؤٹ ڈور سروس فراہم کرنے والا کہلاتا ہے جو عموماً بارہ پندرہ سال کا لڑکا ہوتا ہے۔

اب دوپہر کے بارہ بج رہے تھے۔ میں نے کالے رنگ کی ایک گاڑی کو دیکھا جو غیر معمولی طور پر لمبی تھی۔ اس کے اوپر پھول رکھے ہوئے تھے۔ یہ جنازہ گاڑی تھی جو بمبئی کی ٹریفک کے درمیان رواں تھی۔ زندہ انسانوں کا سفر اپنی اپنی راہوں پر اپنے اختیار کے ساتھ جاری تھا۔ ان کے ساتھ ایک لاش آخری بار بمبئی کی سڑکوں پر سے گزر رہی تھی اور کسی کو خیال نہ تھا کہ کل تک یہ بھی انھی کی طرح زندہ' جیتا جاگتا متحرک انسان تھا۔ نہ جانے کب میرا دھیان للّی کی طرف چلا گیا۔ اس کی لاش کہاں ہوگی۔ شاید کسی سرکاری اسپتال میں، مُردہ خانے کی بینچ پر یا پتھریلے فرش پر۔ کل اسی وقت وہ اپنی کار میں کہیں سے آرہی تھی پھر کار رُک گئی۔ اس کا چلتے رہنا ہی زندگی تھا۔ وہ کار بھی کہیں لاوارث پڑی تھی۔

"معلوم نہیں للّی کا دُنیا میں اپنا کون تھا!" میں نے کہا۔

غالب نے حیرانی سے مجھے دیکھا۔ "میں بھی اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اس کی آخری رسوم میں کون شریک ہوگا۔"

"ہم بہرحال نہیں جا سکتے۔" میں نے کہا۔ "اگر یہ معلوم ہو بھی جائے کہ رسوم کہاں ادا کی جائیں گی۔ مگر کون بتائے گا...؟"

"ہم آر کے اسٹوڈیو سے پوچھ سکتے ہیں۔ للّی نے راج کپور کا حوالہ دیا تھا۔ اور اس کے باپ پرتھوی راج کا۔ انھیں یقیناً اطلاع ملے گی۔" غالب نے کہا۔

"کون اطلاع دے گا؟"

"اس کے جاننے والے' پڑوسی۔ سب جانتے ہوں گے کہ وہ کون ہے اور کیا کرتی ہے۔" غالب نے کہا۔

"جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔ "چوہدری دلاور بڑا کائیاں شکاری ہے۔ وہ اپنے شکار کی نفسیات کو سمجھتا ہے۔ زندگی کے تلخ حقائق کے بارے میں بھی ہم ایک جذباتی ردِّعمل کا شکار ہو جاتے ہیں' انسانی رشتوں کو بہت اہم سمجھتے ہیں۔ اس کو سب معلوم ہے۔ للّی کو اسی نے مروایا ہے اور دلاور سمجھتا ہے کہ ہم اس پر جتنے چراغ پا ہوں گے اتنے ہی افسردہ بھی ہوں گے۔ اگر ہم للّی کی آخری رسوم میں شریک ہونے پہنچے تو یہ دلاور کی توقعات کے عین مطابق ہوگا۔ وہ للّی کو گارا بنالے گا۔ گارا سمجھتے ہو؟"

"ہاں۔ وہ قربانی کا بکرا یا بیل جسے شیر سے مروانے کے لیے رکھا جاتا ہے اور پھر شیر کو شکار کر لیا جاتا ہے۔" غالب نے کہا۔

"ہاں۔ اس چکّر میں مت پڑنا بھائی۔ دلاور ہر طرف سے محصور کرے گا۔ تریوینی کے آدمی الگ ہوں گے اور ان سب کو دلاور بریف کرے گا کہ خیال رکھنا۔ وہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے کے ماہر ہیں۔ مشکوک حلیے کا کوئی بھی شخص نظر آئے اسے دھر لو۔ عین ممکن ہے' وہ للّی کے دوست احباب کو فرداً فرداً شناخت کریں اور ان سے کہیں کہ جو ناآشنا چہرہ ہو اس کی نشان دہی کر دیں۔

تلی کے لیے ہم دور رہ کے بھی دعا کر سکتے ہیں۔"

"دعا... !" غالب نے افسردگی اور تلخی سے کہا۔

دوپہر ڈھلنے لگی تھی جب ہم پھر حاجی علی کی درگاہ کے پیچھے ساحل سمندر پر پہنچے۔ وہ جگہ اب مجھے محفوظ نظر آتی تھی۔ جانور بھی جہاں ایک بار پکڑا جائے وہاں رہائی کی صورت میں پھر نہیں جاتا نہ دلاور رنہ ترلوچن کو یہ خیال آسکتا تھا کہ چھٹکارا پاتے ہی میں پھر وہیں پہنچوں گا۔ یہ ایک طرح سے اچھا ہی ہوا تھا کہ میں اکیلا گرفتار ہوا تھا۔ وہاں 'ایم آر ایس' کی ساری فورس نظر آتی تو گمان ہو سکتا تھا۔ بمبئی میں یہ ہمارا مستقر نہ ہو۔

عمداً میں نے سوات کے حاجی صاحب کا سامنا کرنے سے گریز کیا اور ہم مسجد کے عقب سے گھوم کر گئے۔ دھوپ ریت پر چمک رہی تھی اور سمندر کی موجوں میں تحلیل ہو رہی تھی۔ رطوبت اتنی بڑھ گئی تھی کہ میرے جسم پر پسینہ بھی پانی کی طرح بہہ رہا تھا حالانکہ تیز ہوا سمندر کی جانب سے مسلسل آ رہی تھی۔

سمندر کے ساحل پر بہت سی پرانی شکستہ کشتیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ ان میں سرکنڈوں اور چٹائیوں کی چھت ڈال کے پورے پورے خاندان آباد تھے۔ لانچ کا صرف ایک ہی ڈھانچا تھا جو تقریباً آدھا میل دور ایک کھنڈر کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ یہ خاصی بڑی لانچ تھی۔ اس کے اوپر رنگین پھریرے سے لہرا رہے تھے۔ یہ مکینوں کے کپڑے تھے جو دھوپ میں سوکھنے کے لیے ڈالے گئے تھے۔ غالب نے مجھے بتایا کہ یہ لوگ پینے کے لیے پانی ایک میل دور سے لاتے ہیں۔ اور جب پانی لینے جاتے ہیں تو وہیں نہا کے کپڑے بھی دھو لیتے ہیں۔ لانچ میں چار خاندان آباد تھے لیکن اس کا 'مالک' ایک تھا۔ اس نے ہی سب سے پہلے لانچ کا قبضہ حاصل کیا تھا اور موجودہ کرائے داروں نے اس کے حق ملکیت کو چیلنج نہیں کیا تھا۔ ان میں اتنی ہمت ہی نہیں تھی۔ کرائے دار بدلتے رہتے تھے۔ اوپر نیچے کی منزلوں کو چار خاندانوں نے ایک پُرامن تقاضے باہمی کے سمجھوتے کے تحت تقسیم کر لیا تھا۔ کیا چیز مشترک ہو گی اور کیا نہیں ہو گی، یہ سب پہلے سے طے تھا۔

"کل رات میری لینڈ لارڈ صاحب سے بات ہوئی۔" غالب نے کہا۔ "بہت اکڑفوں دکھا رہا تھا کہ ایسے نہیں چلیں گا۔ کون چھوکری لوگ ہے یہ اور کیا دھندا ہے تمہارا۔ ادھر شریف لوگ رہتا پڑا ہے۔"

"تم نے مارا نہیں سالے کے ایک جھانپڑ۔"

"یار، ہر جگہ جھانپڑ نہیں چلتے۔ میں نے پتا لگایا تھا کہ اس کا اصل مسئلہ کیا ہے۔" غالب نے کہا۔ "اسے پیسہ چاہیے اور بس۔"

"پیسہ دیے بغیر تو تم بھی نہیں رہتے۔"

"ہاں۔ لیکن روز کا کرایہ دینے والے کی پوزیشن ہوٹل کے مسافر جیسی رہتی ہے۔" غالب نے کہا۔ "میں نے اسے بتایا کہ استاد اپن بھی ایک دم شریف لوگ ہے پر ادھر رہنے کے واسطے جگہ ملے تو جائیں۔ تم ادھر جگہ بنا دو اپن ادھر خوش۔ پھر اس کا رویہ بدل گیا۔ اس نے کہا کہ یہ مہنگا جگہ ہے۔ ابھی تم کسی سے بات کر لو۔ اس کا مطلب تھا کہ جو لوگ اب وہاں مقیم ہیں۔ ان میں سے کوئی جگہ بیچنے کو تیار ہو تو اسے کوئی اعتراض نہیں۔ رات کو ہی میں نے ایک سے بات کر لی۔ اس نے پانچ ہزار پگڑی مانگی۔ میں نے فوراً پانچ سو بیعانہ دے دیا۔"

"کیوں۔ کیا یہاں مستقل رہنا ہے؟"

"نہیں۔ بیعانہ دیتے ہی ہم جگہ کے مالک ہو گئے۔ لیکن قبضہ ملے گا پندرہ دن بعد۔" غالب ہنسا۔ "میں نے ہی یہ مہلت دی ہے۔ ظاہر ہے اب پندرہ دن تک ہمیں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ پانچ سو میں 'پکے' کرائے دار ہو گئے۔ اس سے پہلے ہی بھاگ جائیں گے تو وہ بہت خوش ہو گا کہ چلو مفت میں پانچ سو ملے۔ جگہ بھی خالی نہیں کرنی پڑی۔ اس کے نقطۂ نظر سے تو ہم ہیں احمق۔"

میں ہنس پڑا۔ "دُنیا کے سب عقلمندوں کی رائے ہمارے بارے میں ایک جیسی ہے۔"

ایک طرف سے لانچ کا ڈھانچا پانی کے تھپیڑوں کی زد میں تھا مگر دوسری طرف خشکی تھی اور اوپر سے نیچے آنے کے لیے ایک سیڑھی بھی لگا دی گئی تھی۔ لانچ کو سمندر کا شورزدہ پانی اور مرطوب ہوا مل کے کھا رہے تھے۔ اس کا فولادی جسم زنگ میں ڈھل رہا تھا اور گل رہا تھا۔ رات کے وقت اس کے دوسری جانب بھی پانی آ جاتا تھا۔ اس کے باوجود لوگ یہاں اطمینان سے رہتے تھے اور 'جائیداد غیر منقولہ' سمجھ کے اس کی پگڑی وصول کر لیتے تھے۔ حالانکہ اس بات کا امکان ہر وقت موجود تھا کہ کسی دن لانچ کی قوتِ برداشت اور مزاحمت بالکل ختم ہو گئی تو اچانک سمندر اس کو کھینچ لے گا یا اس کا ڈھانچا سمندر کی یلغار کے سامنے بکھر جائے گا۔

میرا دل اب عجیب سی بے قراری کا شکار تھا۔ میری نگاہیں لانچ پر رہنے والوں کو دیکھ رہی تھیں۔ ایک کھڑکی کے شگاف کا پردہ ہٹا کے کوئی عورت جھانک رہی تھی۔ وہ رابعہ نہیں تھی۔ اوپر کوئی عورت بال سکھا رہی تھی۔ وہ بھی رابعہ نہیں تھی۔ ان میں نازو کی جھلک بھی نہ تھی۔ میرے قدم میرے دل کی دھڑکن سے ہم آہنگ ہونے لگے تھے۔ اسے کب دیکھا تھا۔ جب دیکھا تھا تب کیا تھا۔ آج پھر حسنِ دلآرا کی وہی دھج ہو گی۔ میں کیا کہوں گا۔ کل ایفائے عہد کیوں نہ ہوا؟ اس سے پوچھوں گا کہ فرقت کے روز و شب میں جو میرا حال تھا۔ کیا اس کا بھی وہی حال تھا؟

غالب نے ایک بوسیدہ سیڑھی کے پاس رک کے مجھے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "پہلے آپ۔"

میں رک گیا۔ میری گھبراہٹ اچانک بڑھ گئی تھی۔ میں نے سوچا بھی کہ یہ کیا ہو گیا ہے مجھے۔ میں کوئی آغازِ شباب کے اوّلین تجربۂ عشق سے دوچار ہونے والا نوجوان لڑکا نہیں ہوں۔ رابعہ اور میں تو ایک ہیں۔ قربت میں بھی اور دوری میں بھی۔ حقیقتِ منتظر اور رہائی مجاز کا ایک ہی روپ۔ جیسے صبح سے رات جدا نہیں ایسے ہی محبت کا سورج تو بہر حال چمکتا ہے۔ کبھی اِدھر تو کبھی اُدھر۔ اس کا نہ ملنا یا ملنا کون سی انوکھی بات ہے۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ یہ میرا خوف ہے جو دامن گیر ہے۔ اب تک بارہا اس نے فریبِ آرزو دے کر بہلایا تھا۔ وہ بھی تو خواب کی صورت ایک جھلک دکھا کے اوجھل ہو گئی۔ میں خواہش کے سراب سے خائف تھا۔ کہیں وہ نہ ملی تو جیسے کل رات مل کے ٹل سکی تھی۔ ایسے ہی میرے لیے احساسِ پشیمانی چھوڑ کے پھر نہ کھو گئی ہو۔ میں اندر جاؤں تو بس وہی محرومی کے خلاء کا تسلسل ہو۔

"کیا ہو گیا۔ حوصلہ جواب دے گیا؟" غالب نے قہقہہ مار کے کہا۔ "لخلخہ سنگھاؤں؟"

میں نے کہا۔ "یار، عجیب سی کیفیت ہے دل کی۔ ڈر لگتا ہے۔"

"تو ابھی سے ڈرنے لگا ہے آشنا۔ تف ہے تیری مردانگی پر۔ تو رسوا کرے گا سب غیرت مند شوہروں کو جو اپنی جوتی کی نوک پر رکھتے ہیں بیویوں کو۔" غالب نے کہا۔ "مثلاً میں..."

"یہ بات نہیں ہے۔ مرزا..."

"چل، میں ساتھ ہوں تیرے۔ نہیں مارے گی وہ تجھے۔" غالب نے کہا۔

میں نے بھنا کے کہا۔ "وہ نازو نہیں ہے۔ اور میں غالب نہیں ہوں کہ مار سے ڈروں۔" اور سیڑھی پر چڑھ گیا۔

مجھے ایک شگاف کو دروازہ فرض کرتے ہوئے اندر جانے کے لیے سرنگوں ہونا پڑا ورنہ میرا سر تن سے اوپر لگتا۔ تاہم اس سے زیادہ فرق نہیں پڑا۔ میں اندر قدم رنجہ فرماتے ہی کسی چیز سے ٹکرا گیا جو مخالف سمت سے شہابِ ثاقب کی طرح نمودار ہوئی تھی۔ اندر اندھیرا تھا چنانچہ تصادم کے بعد میں نے ایک زنانہ چیخ سنی۔

"نازو!" میں نے کہا۔ "یہ کیا حرکت ہے؟"

وہ ہنسی۔ "ایسے بلائنڈ کارنر پر عموماً ایکسیڈنٹ ہو جاتے ہیں۔ آپ آ گئے۔ خیر سے۔"

میں نے سر سہلا کے کہا۔ "تمہیں چوٹ تو نہیں آئی؟"

اس نے میری ٹوپی اٹھا کے مجھے پکڑائی۔ "میں بہت دیر سے دیکھ رہی تھی۔ آپ سیڑھی پر قدم رکھتے ہوئے ڈر رہے تھے یا کوئی فلسفیانہ نکتہ تھا جس پر غور فرما رہے تھے۔ یہ مرزا غالب والی ٹوپی کا اثر تھا؟"

غالب میرے پیچھے اندر آ گیا تھا۔ "اس ٹوپی کو بھلا مجھ سے کیا نسبت۔ تم کو اگر میرے سر پر اچھی لگتی ہے تو دوسری بات ہے۔"

نازو آگے چلنے لگی۔ "برتن خالی ہو تو اس پر ڈھکنا لگانے کی کیا ضرورت ہے۔"

میں نے کہا۔ "گُل کیسی ہے؟"

"بہت اچھی ہے۔ مجھے تو بہت اچھی لگتی ہے پہلے سے۔ تم کو بہت یاد کرتی تھی۔" نازو نے کہا۔ "کل بہت انتظار کرتی رہی تمہارا۔ جب ہم نے واپس آ کے بتایا کہ وہ تو کہیں چلے گئے..."

"لاحول ولا قوۃ۔ یہاں جسے دیکھو یہ سمجھتا ہے کہ میں سند باد جہازی کی طرح منہ اٹھا کے گھومنے چلا گیا تھا۔" میں نے کہا۔

نازو نے ایک پردہ ہٹا کے کہا۔ "ادھر تشریف لائیے۔ یہ ہے فی الحال ہمارا دولت خانہ۔"

اندھیرا وہاں بھی تھا مگر اب میری آنکھیں اس اندھیرے میں دیکھنے کی عادی ہو گئی تھیں۔ مجھے تعجب ہوا کہ آخر اس اندھیرے میں لوگ زندگی کیسے گزار رہے ہیں! باہر اتنا اجلا دن ہے اور اندر ہر وقت رات۔ نمی۔ سیلن اور بُو۔

"بھائی سکندر!" گُل کی آواز پر میں چونکا اور میں نے پلٹ کے دائیں طرف دیکھا۔ وہ ایک کونے میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی حالت یقیناً پہلے سے بہت بہتر تھی۔ میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔

"تم کو پھر صحت مند دیکھ کے مجھے بہت خوشی ہوئی ہے۔" ۔۔۔ یہاں اور اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ ایک کوریڈور سا تھا جو تقریباً بیس فٹ لمبا اور دس فٹ چوڑا تھا۔ اس میں عجیب خانہ ویرانی کی کیفیت تھی۔ میری آنکھیں جسے تلاش کر رہی تھیں۔ میرے کان جس آواز کے لیے ترس رہے تھے، اس کے بغیر وہ اندھیرا دور نہیں ہو سکتا تھا جو باہر سے زیادہ میرے دل کے اندر پھیلا ہوا تھا۔

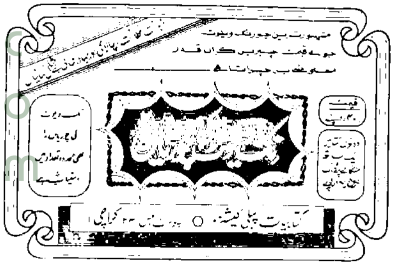

میں نے نازو کی طرف دیکھا اور کہا۔ "رابعہ کہاں ہے؟"

نازو نے نفی میں سر ہلایا۔ "مجھے تو نہیں معلوم۔"

میں نے غور سے اس کی صورت کو دیکھا۔ وہ بالکل سنجیدہ تھی اور کسی شرارت پر مائل نظر نہ آتی تھی۔

"تمھیں نہیں معلوم تو پھر کسے معلوم ہوگا؟ محسن کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

"ان کے بارے میں بھی یہی عرض کر سکتی ہے بندی۔۔۔"

"نازو، خواہ مخواہ پریشان مت کرو مجھے۔ میرا دماغ خراب ہو رہا ہے۔" میں نے برہمی سے کہا۔

"دماغ خراب ہو رہا ہے تو پاگل خانے جائیں۔ یا نکل جائیں کسی صحرا کی طرف رابعہ رابعہ چلاتے۔" نازو نے کہا۔ "مجھے مت ڈرائیے۔ میں کیا ان کی پرائیویٹ سیکریٹری ہوں کہ ان کے پروگرام کی خبر رکھوں۔"

گل ہنسنے لگی۔ "بھائی سکندر! وہ دونوں کہیں اکٹھے گئے ہیں۔ رابعہ ہی کا کوئی کام تھا۔ کہہ رہے تھے کہ دوپہر تک لوٹ آئیں گے لیکن شام بھی ہو جائے تو فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور کسی کو ان کی تلاش میں جانے کی ضرورت بھی نہیں۔ وہ خود آ جائیں گے۔ بہتر ہے سب اسی جگہ رہیں تاکہ یہ نہ ہو کہ ایک آ گیا تو دوسرے کی تلاش میں نکل گیا اور دوسرا آیا تو تیسرا غائب۔"

میں نے مفصل معلومات حاصل ہو جانے کے بعد محسوس کیا کہ وہ سب اندیشے جو میرے احساس پر دھند کی طرح چھائے ہوئے تھے چھٹ گئے ہیں۔ میں نے نازو کو شرمندہ کرنے والی نظروں سے گھورا۔

نازو نے گل کو ڈانٹا۔ "چپ نہیں رہ سکتی تھیں تم۔ کوئی ضرورت نہیں تھی اپنے بھائی سکندر کو کچھ بتانے کی۔ ہوتے یہ پریشان تو اچھا تھا۔ ہم کیا کم پریشان رہے رات بھر۔"

"آپ کہاں چلے گئے تھے؟" گل نے کہا۔

"یہ میں فرداً فرداً ہر ایک کو نہیں بتا سکتا۔ شام کو ایک پریس کانفرنس سے خطاب کروں گا۔" میں نے کہا۔ "اس میں وہ سنسنی خیز تفصیلات بیان کروں گا کہ سب پر چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔"

"کل چودہ طبق یا فی کس چودہ طبق؟" نازو نے کہا۔ "میرے حصے کے طبق ابھی روشن کر دیں۔"

"ابھی تو میری آنکھوں کے آگے بھی اندھیرا چھا رہا ہے۔۔۔"

"وہ ایسا ہے۔۔۔ کہ یہاں اندھیرا ہی ہے۔ قصور آپ کی آنکھوں کا نہیں ہے۔" غالب نے کہا۔

"قصور ہے میرے پیٹ کا جس میں دوڑنے والے چوہے بھی بھوک سے نڈھال پڑے ہیں۔" میں نے کہا۔

"آپ لوگ کیا خالی ہاتھ آ گئے ہیں؟" نازو نے کہا۔ "کھانے کے لیے کچھ نہیں لائے۔"

"گھر میں کچھ نہیں ہے؟" میں نے مایوسی سے کہا۔

"گھر، یہ گھر ہے؟" نازو نے بگڑ کے کہا۔ "آپ لوگوں نے کیا سمجھا تھا کہ واپس جائیں گے تو گرم گرم کھانا تیار ملے گا۔ ہم ہانڈی چولھے میں لگ جائیں گے بغیر ہانڈی چولھے کے۔۔۔"

غالب نے کہا۔ "اسی لیے میں نے کہا تھا کہ لنچ کر لو۔ مگر نہیں مانے اپنے سکندر اعظم۔ ہجر و فراق کا مروڑ اٹھ رہا تھا نا پیٹ میں۔ محبت کی پیچش ہو گئی تھی۔ اچھا ہوتا اگر دعوت اڑا کے آتے اور لمبی تان کے سو جاتے۔ ان پھوہڑ عورتوں سے توقع رکھنا ہی عبث ہے۔ ان کے پاس دس بہانے ہیں حرام خوری کے۔"

"غالب کے بچے! ہمیں پھوہڑ اور حرام خور کہتے ہو۔" نازو نے بگڑ کے کہا۔ "کچھ لا کے دیا تھا پکانے کو۔ کچن ہے یہاں؟ اور ہو بھی تو ہم کیا اسی کام کے لیے رہ گئے ہیں۔ نوکر ہیں تمھارے۔"

"نوکر نہیں۔ کنیز اور کنیز بھی زر خرید۔ بے شک تمھارا یہی کام ہے کہ پکاؤ۔ پھر ہمیں کھلاؤ۔ خود بچا ہوا کھاؤ اور خدمت کرو ہماری صبح سے رات تک۔ تھوڑی سی لفٹ کیا دے دی تمھیں تم تو سر چڑھ گئی ہو۔ اوقات بھول گئی ہو اپنی۔ زبان چلاتی ہو ہمارے سامنے گستاخ کنیز۔ پاؤں کی جوتی۔" ظاہر ہے اس اشتعال انگیزی کے نتیجے میں فساد ہی ہو سکتا تھا۔ نازو نے جتنی بات سُن لی تھی وہی بہت تھی۔ خود غالب کا بھی مقصد یہی تھا کہ نازو اس پر دست درازی کرے۔ ایسی ہی محبت اچھی لگتی تھی اسے۔ وہ اس وقت میری پناہ میں خود کو محفوظ سمجھ رہا تھا چنانچہ اس نے بارود کی بنی ہوئی نازو کے ساتھ آتش بازی جاری رکھی یہاں تک کہ نازو کو آگ لگ گئی۔ جگہ کم تھی اور غیر محفوظ بھی تھی چنانچہ میں نے نازو کو روک لیا۔

"یہ کیا کرتی ہو۔ موقع محل تو دیکھا کرو۔ یہاں تماشا بن جائے گا۔" میں نے کہا۔ "تمھارے لیے تو دل لگی ہے۔"

"یہ دل لگی کی بات نہیں ہے۔" نازو نے کہا۔

"یہ دل کو لگنے والی بات ہے۔" غالب نے کہا۔ "کیونکہ سچی بات ہے اس لیے مرچیں لگ گئی ہیں۔ مگر ہم حق گو ہیں۔ مر جائیں گے مگر بات منہ پر کہیں گے۔ ابھی تو خاموش ہیں ہم۔"

"یار غالب!" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "خوب ہے یہ خاموشی بھی۔ اس میں کتنی زندگی ہے۔ بہت دن بعد مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میں واقعی اپنوں میں ہوں۔ اور جہاں اپنے ہوں وہی تو اپنا گھر ہوتا ہے۔ کل رات میں ایک بہت عالی شان محل میں تھا مگر وہاں یہ سکون، یہ اپنائیت کی خوشی اور یہ راحت کا احساس نہیں تھا، جو یہاں ہے۔ کاش یہ ممکن ہوتا کہ ہم آج کے دن پر قناعت کر سکتے۔ اگلے دن کی ضرورت کو نظر انداز کر سکتے۔"

"قناعت۔ سکون۔ ٹھہراؤ۔ شاید یہ ہماری فطرت کے خلاف ہیں۔ کائنات کا نظام ایک مسلسل حرکت سے ہے۔" غالب نے کہا۔ "ہر دن گزر جاتا ہے، اچھا ہونے کے باوجود۔"

"میرے لیے تو ہر آنے والا دن اچھا ہے۔" گل نے کہا۔ "اس دن سے جو گزر چکا۔"

میں ہنس پڑا۔ "ہم سب بھی تو آنے والے اچھے دن کی امید کے سفر میں ساتھ ہیں۔ اتنا سیریس ہونے کی کیا ضرورت ہے۔"

غالب نے چٹکی بجا کے کہا۔ "میں ابھی کھانا لے کر آیا۔ بمبئی بریانی مسالے والی۔"

"سنو جی، میرے لیے کھیر بھی لے آنا۔" نازو نے کہا۔

غالب رک گیا۔ اس کی فرمائش کے انداز محبوبی نے غالب کو ریشہ خطمی کر دیا۔ وہ کہہ سکتی تھی کہ کھیر بھی لے آنا۔ یا ہم سب کی بات کر سکتی تھی۔ اس نے کہا 'میرے لیے' تو غالب کے دل پر گویا چھری چلا دی۔ اس نے ہاتھ سینے پر رکھا اور جھک کر بولا۔ "کھیر کے بغیر اب میں واپس نہیں آؤں گا۔ خواہ اس کے لیے مجھے جانا پڑے کراچی۔" نازو بے ساختگی یا بے خیالی میں جو کہہ جاتی تھی اسے ادائے حسن کی معصومیت کے سوا کچھ نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ جب ہم ہنسے تو اس کا رنگ گلابی ہو گیا۔

"میرا مطلب۔۔۔ تھا۔۔۔ سب کے لیے۔۔۔" وہ گھبرا کے بولی۔

"اب یہ ناممکن ہے کہ وہ سب کے لیے کھیر لائے۔ شرط لگا لو۔" میں نے کہا۔

آدھے گھنٹے بعد میں شرط جیت گیا۔ غالب باقی سب کے لیے حاجی علی کی درگاہ کے بازار سے بمبئی بریانی لایا تھا اور حلوا پوری۔ کھیر کا وہ صرف ایک پیالہ لایا تھا جو اس نے بڑی عاشقانہ نیاز مندی کے ساتھ نازو کو پیش کر دیا۔

"یہ ہم بھی کھائیں گے۔" میں نے کہا۔

"ایمان سے کھیر بنا دوں گا اس کی جس نے ادھر آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا۔ یہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔" غالب نے کہا۔ "یہ میرے جذبات کی کھیر ہے۔"

گل ہنسنے لگی۔ "اگر کھیر نہ ملتی تو۔۔۔"

"میں اپنی کھیر بنا کے پیش کر دیتا۔ آج زندگی میں پہلی بار تو اس نے کچھ مانگا مجھ سے۔ صرف اپنے لیے۔" غالب بہت خوش تھا۔ شرماتے ہوئے نازو نے خاصا تکلف اور احتجاج کیا لیکن غالب نے پروا نہیں کی۔ کھیر اسے ہی کھانی پڑی۔ پھر میں سو گیا، یہ تاکید کر کے کہ جیسے ہی رابعہ اور محسن آئیں مجھے جگا دیا جائے۔

"کتنے شرم کی بات ہے۔ تم کو خود جاگ اٹھنا چاہیے آواز پا کے ساتھ۔ تمھارے دل کے آٹومیٹک الارم میں محبت کی چابی

نہیں رہی کیا؟" غالب نے کہا۔

"یہ جاپانی والی محبت نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "تم اتنی دیر کیا کرو گے؟ فارغ مت بیٹھو۔ دیکھو جسے دل چاہے مگر زبان سے میرا رات کا فسانہ بھی سناتے جاؤ۔"

"پھر تم کیا بتاؤ گے پریس کانفرنس میں؟"

"یہی سب کچھ۔ رش ذرا کم ہو جائے گا نا۔" میں نے کہا۔

جب میں سو کر اُٹھا تو ہر سو اندھیرا تھا اور خاموشی تھی۔ پہلے تو مجھے گمان ہوا کہ یہ وہی اندھیرا ہے جو دن رات کی قید سے بے نیاز ہے۔ مگر ایک کونے میں جلنے والی لالٹین نے مجھے رات کی خبر دی۔ میں نے کلائی کی گھڑی دیکھی اور پھر دوبارہ دیکھی۔ اس میں رات کے دس بج رہے تھے۔ میں ساڑھے چھ سات گھنٹے تک سوتا رہا تھا۔

قدرتی طور پر سب سے پہلے مجھے رابعہ کا خیال آیا۔ کیا وہ ابھی تک نہیں آئی؟ اس کمرے میں جسے ایک حجرہ کہنا زیادہ مناسب تھا اب میں اکیلا تھا۔ گل بھی اپنے بستر پر موجود نہ تھی۔ میں نے اس خرابے میں آباد دوسرے خاندان کے افراد کی آوازیں سنیں۔

کہیں ایک مرد اور عورت ایک دوسرے پر چلا رہے تھے۔ ایک بچہ ایک سُر اور لے میں مسلسل ریں ریں کر رہا تھا۔ کسی نے ہارمونیم کے ساتھ زیادتی کرنے کی قسم کھالی تھی۔ ہارمونیم بھی ریں ریں کر رہا تھا۔

میں اُٹھ کے باہر آیا اور راستے کو ذہن میں رکھتے ہوئے لانچ سے نیچے اُترا۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر وہ تینوں ریت پر بیٹھے ہوئے تھے لیکن قریب جا کر دیکھنے کے بعد وہ اجنبی ثابت ہوئے۔ میں نے دوسری طرف نظر ڈالی۔ سمندر کے کنارے اندھیرا ابھی گہرا نہیں ہوتا۔ وہی دھندلکا یہاں بھی تھا جو کراچی کے ساحل کی تاریک راتوں میں نظر آتا تھا۔ مجھے دور کچھ سائے سے متحرک دکھائی دیے۔

یہ غالب اور نازو تھے۔ وہ بڑی بے فکری سے ریت پر ٹہل رہے تھے۔

"ہیلو چیف کے ٹو۔" غالب نے کہا۔ "نیند پوری ہو گئی؟"

میں نے کہا۔ "وہ لوگ نہیں آئے؟"

"کون لوگ؟ چوہدری دلاور وغیرہ۔ نہیں وہ نہیں آئے۔" غالب نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ وہ دونوں ننگے پاؤں تھے۔

"غالب! میں سمندر میں پھینک دوں گا۔" میں نے بھنا کے کہا۔ "کہاں ہے؟" اور پھر اپنے جوتے بھی اتار دیے۔

"لاحول ولا قوۃ۔ بھائی ہم سے پوچھو کہ نازو کہاں ہے تو ہم بتا دیں گے۔" غالب نے کہا۔ "رابعہ کی خبر تم کو ہونی چاہیے۔"

میں اس کے پیچھے دوڑا اور وہ پلٹ کے بھاگا مگر بیس پچیس قدم دوڑ کے میں نے اسے پکڑ لیا اور اُٹھا کے پانی کی طرف چل پڑا۔ نازو نے بالکل مداخلت نہیں کی۔ اس نے تو کہا کہ ذرا آگے لے جا کر پھینکنا کسی شارک کے سامنے۔

غالب نے شور مچایا۔ "یار کیا دھاندلی ہے۔ ایک میں ہی رہ گیا ہوں۔ مجھ سے نازو نے کہا تھا کہ مت بتانا۔ اسے پھینکو۔"

مگر میں نے اسے پانی میں پھینکنے کے بعد کہا۔ "اب بولو۔"

غالب کو تیرنا نہیں آتا تھا۔ ایک بہت بڑی لہر کو اپنی طرف آتے دیکھ کے وہ واپس دوڑا۔ میں نے اسے پھر پکڑ لیا۔ "یار میں ڈوب گیا تو۔۔۔"

"کوئی بات نہیں۔ ایم آر ایس ٹوٹے گی نہیں۔ نازو بھی خوش رہے گی تمہارے بغیر۔" میں نے کہا اور اسے پھر اُٹھا لیا۔

"یار۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ اُدھر۔۔۔" غالب نے چلا کے کہا۔ "گل کے ساتھ ہے۔" مگر اس وقت تک میں پھر اس کو پانی میں اچھال چکا تھا۔ وہ سخت بکتا جھکتا باہر آیا اور اس کی نازو سے لڑائی شروع ہو گئی۔

"مروا دیا تھا ابھی مجھے۔ خوب دانت نکال رہی تھیں۔ کہہ رہی تھیں شارک کے سامنے ڈالو۔ تم کم ہو کسی شارک سے۔"

"میں شارک ہوں؟" نازو نے چلا کے کہا۔

میں آگے نکل گیا اور سمندر کے شور میں ان دونوں کی آواز دب گئی۔ یا شاید خود سمندر کا شور اس تلاطم سے دب گیا جو میرے وجود میں اچانک برپا ہو گیا تھا۔ ساحل پر اکا دکا لوگ اور بھی تھے۔ ان میں بیشتر اسی علاقے کے رہنے والے تھے جو اپنے لباس اور حلیے سے پہچانے جاتے تھے۔ میری نگاہیں بہت آگے تک دیکھنے کی کوشش کر رہی تھیں اور میرے قدم تیز سے تیز تر ہوتے جا رہے تھے۔ دل کی دھڑکن کی طرح۔

وہ اچانک نمودار ہوئی۔ بالکل ایسے جیسے دیومالائی قصوں کی کوئی مخلوق جو سمندر کے جھاگ سے سطح آب پر کشش خیال کی طرح تیرتی ہوئی آئے اور مجسم ہو جائے۔ اس نے سفید ساری باندھ رکھی تھی جو تیز ہوا میں بادل کے ٹکڑے کی طرح لگتی تھی جس نے چاندنی کو سمو لیا ہو۔ میں خواب زدہ شخص کی طرح چلتا گیا یہاں تک کہ اس کے اور میرے درمیان کوئی فاصلہ نہ رہا۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات گیارہویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں

جاسوسی ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ

شکاری

گیارہواں حصہ

معاشرے کے اُن ناسوروں کی رُوداد جو گوشت و پوست سے گزر کر انسانی ہڈیوں میں اُتر رہے تھے۔ ایک کفن بردوش نوجوان کی کہانی جس کے شب و روز موت کی بستی میں گُزر رہے تھے۔ جلتے دن، سُلگتی راتیں، آس و یاس، خوف و ہراس، تلخ حقیقتیں، شیریں خواب۔

ایک روایت شکن

رابعہ

بڑی خاموشی سے روتی رہی اور سسکیاں لیتی رہی۔ میرے شانوں پر اس کے آنسو آتشِ سیال کی طرح بہتے گئے۔ اس کے بال ہوا کے ساتھ اُڑ کے میرے چہرے پر آتے رہے اور اس کی خوشبو میرے وجود میں ایسے اترتی گئی جیسے بہار کی خوشبو فضا میں پھیلتی جاتی ہے۔ میں نے اس کے ملنے سے پہلے بھی کچھ نہیں سوچا تھا کہ جب وہ سامنے ہوگی تو اس سے کیا کہوں گا۔ اور اس کے ملنے کے بعد بھی میری سمجھ میں نہ آیا کہ میں اس سے کیا پوچھوں۔ کیا کہوں۔ الفاظ یکلخت اپنے وجود کی اہمیت کھو بیٹھے تھے۔ غیر ضروری ہو گئے تھے۔ چنانچہ میں نے سوچا کہ خاموشی سے بڑھ کے کون سی زبان میں گفتگو ہو سکتی ہے؟ یہ خاموشی تو محرمِ راز ہے۔ اس کی اور میری آواز ہے۔ جو دلوں کی دھڑکنوں میں شامل ہے۔

میں آہستہ آہستہ اس کے سر کو تھپکتا رہا اور اس کے بالوں کو سہلاتا رہا۔ میرے اور اس کے قدموں کے نیچے پانی سرسراتا آتا تھا اور سنسناتے جھاگ کے بلبلے نچھاور کر کے لوٹ جاتا تھا۔ نرم ٹھنڈی ریت ہمارے پیروں پر آ گئی۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس طرح ہم کتنی دیر کھڑے رہے اور اس عرصے میں کتنے لوگوں نے ہماری اس دیوانگی کی بے خودی کا نظارہ کیا۔

مجھے تو یہ بھی پتا نہیں چلا تھا کہ کل جو رابعہ کے ساتھ تھی کب ہمیں تنہا چھوڑ کے فرار ہو گئی تھی۔

بالآخر اس نے سر اٹھایا اور مجھے دیکھا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے ستارے روشن نظر آئے۔

"کل کہاں چلے گئے تھے؟" اس نے رُندھی ہوئی آواز میں کہا۔

میں اسے دیکھتا رہا۔ وہ شاید پہلے سے زیادہ حسین ہو گئی تھی۔ مگر یہ احساس تو مجھے اس سے ہر بار مل کے ہوتا تھا۔ کبھی درمیان میں جدائی کا وقفہ آیا تو اس کا تصور ضرور ساتھ رہا لیکن وہ ملی تو اس کے حسن کی تصویر زیادہ حسین نظر آئی۔

"ناراض ہو گیا؟" رابعہ نے کہا۔ "بولو گے نہیں؟"

"کیا بولوں؟" میں نے کہا۔ "ڈر لگتا ہے، یہ خواب بھی ختم ہو جائے گا۔ اچھا ہے جتنی دیر تمہیں دیکھ لوں۔ اس روشنی کو دل میں اتار لوں۔"

وہ مسکرائی۔ "میں اب نہیں جاؤں گی۔"

"یہ تو پہلے بھی کہا تھا تم نے۔ ایسا کیوں ہے رابعہ؟ پہلے تو ایسا ممکن ہی نہیں تھا۔ مگر اب تم چھوڑ جاتی ہو

مجھے اور۔ دور رہ سکتی ہو مجھ سے۔ یہ احساس بھی نہیں ہوتا تم کو۔ کہ جدائی کتنی بڑی سزا بن جاتی ہے میرے لیے "

"صرف تمھارے لیے ؟"

"ہاں ۔صرف میرے لیے۔ تم بے رحم ہو گئی ہو۔ تم نے بے رحمی کا یہ چلن کیوں اختیار کر لیا ہے ؟" میں نے کہا۔" مجبوری کی بات مت کرنا۔ میں نہیں سنوں گا "

" میں کچھ نہیں کہوں گی۔ صرف تمھاری سنوں گی۔ جو چاہو کہو مجھے۔ مجھے معلوم ہے تم بہت خفا ہو مجھ سے "

میں نے کہا۔" جان ! خفا ہونا کیسا۔ اگر خفا ہو سکتا میں تو پھر پریشان کیوں ہوتا۔ میں روٹھ جاتا۔ بے نیاز ہو جاتا۔ کم سے کم بے نیازی کا اظہار کر سکتا۔ کوشش کر سکتا کہ تمھیں بھول جاؤں لیکن یہ سب تو میرے لیے اتنا ہی ناممکن ہے، جتنا زندگی کے احساس سے زندگی کو الگ کرنا "

" بہت کچھ اپنے اختیار میں نہیں ہوتا۔" اس نے جیسے خود سے کہا۔" جیسے محبت کرنا۔ یا نہ کرنا "

میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔" آج کے بعد۔ پھر کوئی ایسی رات آئے گی جب اپنی تنہائی کے سوا رفیق کوئی نہ ہو گا۔ تو میں اِس وقت کو یاد کروں گا۔ آج سے پہلے کی چند راتیں بھی ہیں جو تصویر بن گئی ہیں جن کے سارے رنگ تازہ ہیں اور سب نقش اَنمٹ ہیں۔ اکثر میں ان کو دیکھتا رہتا تھا۔"

وہ پلٹ کے میرے ساتھ چلنے لگی۔ ہوا اس کے پیکر کو چھُو کے مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ خنکی میں اب مہک بھی شامل ہو گئی تھی۔ اس کے بال اڑتے تھے تو میرے چہرے کو چھُو لیتے تھے۔ آنچل اُڑتا تھا تو مجھ سے لپٹ جاتا تھا۔ اس کے قرب کی ساری آنچ مجھ تک پہنچ رہی تھی اور میرے حواس پر اس رات کا طلسم طاری تھا۔

"محسن بھی تمھارے ساتھ تھا۔ وہ کہاں گیا ؟"

"کھانا لینے گیا ہو گا۔ آیا تو میرے ساتھ ہی تھا۔" رابعہ نے کہا۔

"تم نے مجھے جگایا نہیں "

"محسن تو جگانا چاہتا تھا۔ میں نے روک دیا۔ پھر غالب نے کہا کہ ابھی سونے دو "

"غالب نے بتایا ہو گا کہ رات کیا ہوا تھا ؟"

"ہاں ۔ کچھ بتایا تھا۔ بس ایک منٹ کی تاخیر سے فرق پڑ گیا ورنہ کچھ نہ ہوتا " وہ بولی۔

"کیا نہ ہوتا ؟" میں نے کہا۔" وہ سب جو ہوا واقعی نہ ہوتا مگر اس سے بُرا ہوتا۔ میرے ساتھ تم کو بھی اٹھا لیا جاتا۔ میں اکیلا تو کسی نہ کسی طرح نکل آیا۔ تمھارا ساتھ ہوتا تو رہائی کی صورت ہی کوئی نہ رہتی "

" مجھے تم سب کے بارے میں معلوم ہوتا رہتا تھا۔ بس درمیان میں یہی ایک وقفہ تھا جب میں یہاں پہنچ گئی تھی اور تم نہیں پہنچے تھے تو مجھے بہت تشویش تھی "

" میں وعدے کے مطابق جمعرات کی شام کو پہنچ گیا تھا۔ حالانکہ بعض اوقات حالات میرے راستے کی دیوار بنے"

" مجھے بتایا ہے غالب اور محسن نے "

"کیا تمھیں کبھی یہ خیال آیا کہ میں نہیں پہنچ سکا تو کیا ہو گا ؟" میں نے کہا۔" اگر جمعرات کی رات کو تمھیں یہاں کوئی نہ ملتا ؟"

رابعہ نے کہا۔" خیال تو آتا تھا لیکن اس سے یقین میں فرق نہیں پڑتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ تم ملو گے۔ اگر میں نہ آتی تو کیا ہوتا ؟"

" معلوم نہیں کیا ہوتا " میں نے کہا۔" سچ پوچھو تو مجھے امید کم تھی۔ خوف زیادہ تھا "

" مجھ پر اعتماد نہیں تھا ؟"

" بات اعتماد کی نہیں۔ اختیار کی تھی۔ تم آزاد نہیں تھیں " میں نے کہا۔

" مگر اب میں آزاد ہوں " رابعہ نے قطعی لہجے میں کہا۔

"کیا تم تسلیم کر رہی ہو کہ چاند بھائی نے تمھیں قید کر رکھا تھا ؟" میں نے کہا۔" تم اس کی مرضی کی پابند تھیں ؟"

اس نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔" ہاں۔ میں اس کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کر سکتی تھی "

"آخر کیوں رابعہ ؟" میں نے کہا۔" جب تم میرے پاس آتی تھیں تو نہ تمھارے ہاتھوں میں زنجیر ہوتی تھی اور نہ تمھارے ساتھ کوئی محافظ آتا تھا۔ تم خود کیوں چلی جاتی تھیں ؟"

" میں نے بتایا تو تھا کہ میں مجبور تھی "

میں نے کہا۔" لیکن یہ کبھی نہیں بتایا تھا کہ مجبوری کیا تھی۔ کون تھا یہ خبیث چاند بھائی، جو میرے اور تمھارے درمیان آ گیا تھا ؟"

رابعہ مسکرائی۔" میں نے سنا ہے تم کو سخت حسد ہو گیا تھا۔ پاگل پن کی حد تک "

" یہ ٹھیک ہے۔ میرا بس چلتا تو میں اس کو قتل کر دیتا۔ کچھ تم نے مجھے روکا۔ کچھ حالات نے۔ وہ میرے سامنے ہی نہیں آیا "

" تم تو میرے بارے میں بھی۔۔" وہ رنجیدہ لہجے میں بولی۔

میں شرمندہ ہو گیا۔" دیکھو رابعہ ! محبت میں یہی ہوتا ہے۔ آدمی پاگل ہو جاتا ہے۔ شکّی اور حاسد ہو جاتا ہے۔ تم تو اس کے ساتھ تھیں۔ میں اس کی وہ نظر برداشت نہیں کر سکتا تھا، جو تم کو میری طرح دیکھے۔ جب تمھاری یاد کا دورہ پڑتا تھا تو مجھے تم سے بھی شکوہ ہوتا تھا کہ تم جانتے بوجھتے میرے آزار میں اضافہ کر رہی ہو۔ تم نے بتا دیا ہوتا کہ تمھاری مجبوری کیا ہے تو میں سمجھ لیتا۔ یا سمجھنے کی کوشش ضرور کرتا۔ مگر یہ تو میں اب بھی نہیں جانتا کہ چاند بھائی کیا چاہتا تھا۔ کیا وہ تمھیں چاہتا تھا ؟"

رابعہ نے کہا۔" چاند بھائی بے وقوف نہیں تھا کہ مجھے چاہنے لگتا۔ اسے معلوم تھا کہ میں اور تم کسی اور کے نہیں ہو سکتے۔ بہت اچھی طرح جانتا تھا وہ یہ بات۔ ویسے بھی چاہت اور محبت کا کھیل اس کی سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ وہ کسی بھی عورت سے اس طرح محبت کر ہی نہیں سکتا جیسے سب کرتے ہیں "

" پھر کیوں دور رکھا اس نے ۔ تم کو مجھ سے ۔۔۔؟ کیا ملا اسے ۔ ہمیں جدا کر کے ؟" میں نے کہا۔

رابعہ نے کہا۔" پہلے اس کا ایک مقصد تھا۔ اس کے اور دلاور کے درمیان ایک کاروباری معاہدہ تھا۔ تم دلاور کے دشمن تھے۔ اس کے دشمن ہو جاتے تو اس کا بھی بہت نقصان ہوتا "

" وہ بھی اس کاروبار میں شریک تھا ؟"

" نہیں ۔ یہ اسلحے کی اسمگلنگ کا دھندا تو دلاور کا ہے۔ چاند بھائی ہر غیر قانونی کام کرتا ہے مگر وہ وطن فروش نہیں ہے۔ یہ بات اس نے بھی تم کو بتا دی تھی۔ وہ دلاور سے الگ ہونا چاہتا تھا اور تمھاری مدد بھی کرنا چاہتا تھا لیکن وہ کاروباری معاہدے کا پابند تھا اور میعاد ختم ہونے تک دلاور کا ساتھ دینے پر مجبور تھا۔ اگر دلاور کو معلوم ہو جاتا کہ وہ تمھاری مدد کرتا ہے تو دلاور اسے نقصان پہنچا سکتا تھا۔ وہ تمھیں کسی مخبر کے ذریعے چاند بھائی کے بارے میں معلومات فراہم کر سکتا تھا۔ اس کے بعد شاید تم ہی چاند بھائی کی تباہی کا سبب بن جاتے، جوشِ رقابت میں۔ چاند بھائی نے مجھے اپنے ساتھ رکھا لیکن دلاور کو یہ تاثر دیا کہ اس نے مجھے قید کر رکھا ہے اور وہ دلاور کی مدد کرنا چاہتا ہے۔ اس نے مجھ سے کہا کہ جب تک دلاور کے ساتھ معاہدے کی میعاد پوری نہ ہو جائے تم میرا ساتھ دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس کے بعد نہ صرف یہ کہ دلاور سے الگ ہو جاؤں گا بلکہ بے خوف ہو کے تم سب کی زیادہ مدد کر سکوں گا۔ یہ اس کی مجبوری تھی کہ وہ سامنے آ کے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ کوئی شریف آدمی نہیں ہے۔ اس کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ کوئی شریفانہ کاروبار اختیار کر سکے اور غیر قانونی دھندوں میں جو اس کے دوست ہیں یا ساتھی ہیں وہی اس کے دشمن بھی ہو سکتے ہیں۔ مثلاً پولیس اس کا دیا کھاتی ہے اور یہ مال کس کس کو پہنچتا ہے، نیچے سے اوپر تک کس کا حصہ کتنا ہے، سب جانتا ہے چاند بھائی۔ اسے کون اجازت دے گا کہ اچانک اپنے سارے کالے دھندے چھوڑ دے ؟ اسے اب مجرموں کے درمیان انھی جیسا بن کے رہنا پڑے گا۔ ورنہ وہی لوگ اسے مروا دیں گے۔ پولیس ہی نہیں اس کے ہم پیشہ بھی اس اندیشے میں مبتلا ہو جائیں گے کہ جس شخص کو آج شرافت اور نیکی کا دورہ پڑا ہے، کل تک تو وہ ہمارا ساتھی تھا۔ وہ ہمارے بارے میں سب کچھ جانتا ہے۔ کہیں اس دورے کی کیفیت میں وہ سب کا بھید نہ کھول دے۔ پولیس بھی ڈرتی ہے کہ ایسا شخص خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ چنانچہ جو اندھیرے میں ہے، وہ روشنی میں نہیں آ سکتا۔ شاید روشنی کو چھوڑ کے اندھیرے میں جانا اتنا مشکل نہیں ہوتا۔ چاند بھائی کو اپنی جان کی بازی لگا کے ہماری مدد کرنے کا کوئی شوق نہیں۔ زندگی کے تجربات نے اسے اتنا پختہ کر دیا ہے کہ اب وہ جذباتی باتیں نہیں کرتا۔ وہ حقائق کو تسلیم کرتا ہے۔ یہ تسلیم کرتا ہے کہ وہ مجرم ہے۔ اس کے سارے کاروبار غیر قانونی اور غیر اخلاقی ہیں اور اس کے پاس سب حرام کی کمائی ہے۔ وہ منافق نہیں ہے، حاجی عبداللہ جیسے لوگوں کی طرح جو اتنی لمبی داڑھی رکھ کے اور دو بار حج کر کے دنیا کے سامنے مومن اور پاکباز بنتے ہیں۔ ہاتھ میں تسبیح اور زبان پر سبحان اللہ اور جزاک اللہ رکھتے ہیں لیکن کاروبار وہی کرتے ہیں جو چاند بھائی کرتا ہے۔ وہ تو صاف کہتا ہے کہ مجھے کسی کے سامنے نیکی کا ذکر کرتے ہوئے بھی شرم آتی ہے اور گناہ میرے اتنے ہیں کہ شیطان کے بعد شاید میں ہی مردود ہوں۔ معلوم نہیں، خدا کب توفیق دے گا۔ ابھی تو مجھ میں ہمت ہے نہیں خدا کے سامنے جا کے سر جھکانے کی یا خانۂ خدا سے حاجی کا خطاب لانے کی۔ میرا دل ایسی چیزوں کی طرف مائل ہی نہیں ہوتا تو میں کیا کروں "

آہستہ آہستہ رابعہ کا لہجہ متوازن ہوتا جا رہا تھا اور اس کی باتوں میں ربط پیدا ہو رہا تھا۔ ہم چلتے چلتے بہت دور آ گئے تھے۔ نہ جانے کب اس نے میرے بازو کا سہارا لے لیا تھا۔ اب وہ مجھ سے لگ کے اپنا سر میرے شانے پر رکھے چل رہی تھی۔ میرا ایک ہاتھ اس کے دوسرے شانے

تک پہنچا ہوا تھا' اسے سہارا دینے کے لیے اور اپنے قریب رکھنے کے لیے۔

اچانک اس نے کہا۔" ہم تو بہت آگے آ گئے۔" پھر اس نے پیچھے مڑ کے دیکھا۔" وہ لوگ... انتظار کریں گے۔"

"نہیں۔ انھیں معلوم ہے کہ اتنے انتظار کے بعد ہم ملے ہیں۔ ہمیں بہت باتیں کرنی ہوں گی۔" میں نے کہا۔

"چلو پھر کہیں بیٹھ جائیں۔ میں تھک گئی ہوں۔"

میں نے بائیں جانب ایک چٹان سی دیکھی۔ اس کا سیاہ سایہ دور سے سائبان کی طرح لگتا تھا۔ ساحل اب بالکل ویران تھا۔ کہیں کہیں کیکڑے بھی نظر آنے لگے تھے جو ہمیں دیکھتے ہی پھر پانی میں غائب ہو جاتے تھے۔ ایک جگہ بہت بڑا کچھوا دیکھ کے رابعہ ڈری تھی ورنہ وہ پُرسکون تھی۔ میں نے اس چٹان تک پہنچ کے دیکھا تو وہ لانچ مجھے کہیں دکھائی نہ دی جو ہمارا عارضی گھر تھی۔ اس کے پیچھے حاجی علی کی درگاہ کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں اور بہت پیچھے بمبئی کا پورا شہر تاروں بھرے روشن آسمان کی طرح لگتا تھا۔

مجھے دو چٹانوں کے درمیان ایک ایسا پلیٹ فارم سا نظر آیا جو قدرے ہموار اور محفوظ تھا۔ میں نے رابعہ کو اٹھایا اور اوپر بٹھا دیا۔ وہ مجھے پہلے کی طرح ہلکی پھلکی لگی۔ وہ ہنسی اور تھوڑا سا شرمائی مگر پھر پیر لٹکا کے بیٹھ گئی۔ میں دونوں ہاتھوں اور کہنیوں کے بل اوپر چڑھا تو میری ہتھیلیاں رابعہ کی کمر کے نرم ریشمی لمس کے بعد پتھر کی سخت کھردری سطح پر پھسل گئیں۔

میں نے اپنے ہاتھوں کو دیکھا تو رابعہ نے کہا۔" یہ گھڑی کس کی ہے؟"

میں نے کہا۔" یہ تحفہ ہے کسی کا۔"

وہ شرارت سے بولی۔" کس کا؟ کملا کا یا... للّی کا؟"

" اچھا جی۔ آپ کو نام بھی معلوم ہو گئے۔" میں نے کہا۔

" اور فوراً استعمال بھی کر لیے آپ نے طعنے کے طور پر۔"

وہ شرمندہ ہو گئی۔" میں مذاق کر رہی تھی۔ طعنہ کیسا۔"

" کملا تو خیر پاگل تھی۔ للّی کا مجھے بہت رنج ہے۔ کاش، ہم اس سے نہ ملے ہوتے۔" میں نے کہا۔" تمھارے لیے ضرور ایک تحفہ ہے کملا کی طرف سے۔"

" میرے لیے؟" رابعہ نے حیران ہو کے کہا۔

میں نے جیب میں سے وہ زنانہ ماڈل کا ریوالور نکالا جس کے ہاتھی دانت سے بنے ہوئے دستے پر سنہرے نقش و نگار تھے۔

رابعہ نے ریوالور کو الٹ پلٹ کے دیکھا۔ میں نے سگریٹ جلا کے دیا سلائی کو روشن رکھا۔

" یہ کملا کا ہے؟" رابعہ نے کہا۔" کیا وہ خود بھی ایسی ہی ہے؟"

" کیا مطلب؟" میں نے دیا سلائی پھینک دی۔

" خوبصورت، مہلک، آٹومیٹک۔" رابعہ ہنسی۔

" وہ پہلے بہت خوبصورت تھی، جب میں اس سے نہیں ملا تھا۔ یہ تو میں نہ مان سکتا ہوں اور نہ کہہ سکتا ہوں کہ تم سے بڑھ کر کوئی اور حسین بھی ہو سکتا ہے اس کائنات میں۔"

" چلو چلو۔ ایسے ڈائیلاگ سننے کا شوق نہیں ہے مجھے۔"

میں نے کہا۔" جان! یہ سچ ہے۔ تم جو چاہو کہو۔ ممکن ہے کوئی اسے میری نظر کا قصور کہے لیکن قصور تو دل کا ہے۔ کملا پہلے واقعی بہت حسین تھی لیکن تم سے کیا موازنہ اس کا۔ اس نے مجھے اپنی پہلے کی تصویریں دکھائیں۔ وہ خود کہتی تھی کہ اس وقت تم دیکھتے مجھے تو یہ ناممکن تھا کہ مجھ پر فریفتہ نہ ہوتے۔"

رابعہ ہنسی۔" کیا تمھیں افسوس ہوا کہ اس سے پہلے نہیں ملے ہم؟"

" یہ تو ایسی ہی بات ہو گی جیسے میں کہوں کہ مجھے سوئٹزرلینڈ میں پیدا نہ ہونے کا افسوس ہے۔ یہ ایک احمقانہ خواہش ہو گی بلکہ دیوانگی کی بات ہو گی اگر میں کہوں کہ کاش، میں پرنس آف ویلز ہوتا۔ اس کے علاوہ۔ یہ تو کملا کا غرور تھا۔ کیا پتا میں اس کے مقابلے میں اس کی خادمہ پر فریفتہ ہو جاتا۔ فریفتہ ہونے کے لیے کسی کے ملکۂ حسن ہونے کی شرط کس مجنوں نے رکھی ہے آج تک۔"

" اس کا ریوالور تمھارے ہاتھ کیسے لگ گیا؟"

" مجھے اس سے چھیننا پڑا تھا۔ پہلے وہ پاگل خودکشی کی دھمکی دے چکی تھی اپنے باپ کو۔ پھر مجھے ڈرا رہی تھی۔ ایسا خطرناک کھلونا کسی دیوانے کے ہاتھ میں نہیں رہنا چاہیے۔" میں نے کہا۔

" میرے ہاتھ میں تو ہے۔" رابعہ نے کہا۔" کیا میں پاگل نہیں ہوں؟"

میں نے کہا۔" اس لحاظ سے ضرور ہو کہ میری خاطر تم نے خود کو برباد کر لیا۔ سب کچھ گنوا دیا اپنا۔"

" نہیں۔ ایسا مت کہو۔ میں نے خود کو پا لیا۔ پھر سے دریافت کر لیا۔ ورنہ میں خود کو بھی ایسا کہاں جانتی تھی۔"

اس نے تھوڑا سا پیچھے کھسک کے چٹان سے پشت لگا لی۔ میں بھی پیچھے کھسک گیا۔ وہاں صرف اتنی ہی جگہ تھی کہ ہم دونوں پیر پھیلا کے بیٹھ سکتے تھے۔ رابعہ نے میرے کندھے پر اپنا سر رکھ دیا۔

" تمھیں سردی تو نہیں لگ رہی ہے؟" میں نے کہا۔

اس نے آہستہ سے سر کو نفی میں ہلایا۔" تمھیں بھوک لگ رہی ہو گی۔"

میں نے کہا۔" نہیں۔" پھر ہم دونوں چپ بیٹھے رہے اور ایک دوسرے کے قرب کے احساس کی خوشی سے دل کو بھرتے رہے۔

" تم سب سے بچھڑ کے میں بے گھر ہو گئی تھی۔" رابعہ نے کہا۔" میرا اپنا گھر جب تباہ ہوا تھا تب مجھے یہ احساس نہیں ہوا تھا۔ تم سب کی مجھے بہت یاد آتی تھی۔ اکثر رات کو میں سوچتی تھی کہ تم لوگ کہاں ہو گے' کیا کر رہے ہو گے؟ ہر صورت میرے سامنے آ جاتی تھی۔ محسن اور شہلا کی، غالب اور نازو کی۔ میں سوچتی تھی کہ تم سب نہ جانے کیا سمجھتے ہو گے' کیا کہتے ہو گے کہ رابعہ یہ کیا کر رہی ہے اور کیوں کر رہی ہے۔ تم سب اکٹھے ہو کے میرے بارے میں کیا باتیں کرتے ہو۔ چاند بھائی کے ساتھ رہنے میں بس یہی ایک ذہنی اذیت تھی ورنہ آرام اور آسائش کے تو سب اسباب تھے وہاں۔ اس نے مجھے ایک جگہ نہیں کئی جگہ رکھا۔ ہر جگہ ایک علیٰحدہ حصہ میرے لیے مختص رہا۔ وہ دن میں ایک آدھ بار چکر ضرور لگاتا تھا میری طرف لیکن بیشتر وقت تو وہ غائب رہتا تھا۔ اپنے چکروں میں پڑا رہتا تھا۔ جب اسے فرصت ہوتی تھی تو وہ مجھ سے کہتا تھا کہ چلو کہیں گھوم آئیں۔ گھر کے اندر اس نے رسالے' اخبار' ریکارڈر' ریڈیو گرام اور ٹی وی وغیرہ ہی کا نہیں فلموں کا بھی بندوبست کر رکھا تھا۔ آٹھ ملی میٹر پر بے شمار اچھی فلموں کا ذخیرہ تھا۔ ایک چھوٹا سا پرائیویٹ سنیما کہہ لو اسے جس میں وہ فلمیں دیکھی جا سکتی تھیں لیکن میرا دل کسی چیز میں نہیں لگتا تھا۔ وہ بے حد معذرت کرتا تھا کہ مجھے یہ قیدِ تنہائی کاٹنی پڑ رہی ہے اور بعد میں وہ میرا بہت شکر گزار تھا کہ میں نے اس سے تعاون کیا۔ میری وجہ سے اس کو نقصان نہیں اٹھانا پڑا اور دلاور کے ساتھ اس کے کاروباری معاہدے میں خلل نہیں آیا۔"

" کبھی دلاور آیا تھا وہاں۔ جب تم وہاں تھیں؟" میں نے کہا۔

" ہاں۔ دو بار۔ اسے میں نے دور سے دیکھا۔ پھر ایک بار ملاقات ہو گئی۔ وہی تیور تھے اس کے۔" رابعہ نے کہا۔" کہنے لگا کیا حال ہیں اپنے ہیرو کے ہیروئن کے بغیر۔ میں نے کوئی جواب دینا مناسب نہیں سمجھا اور یہی ظاہر کرتی رہی جیسے میں اپنی مرضی کے خلاف چاند میاں کی قید میں ہوں۔ جب وہ دونوں تمھارے خلاف بولنے لگتے تھے تو میں دلاور کو مشتعل کرنے کے لیے کوئی بات کہہ دیتی تھی۔ مثلاً ایک بار اس نے چاند بھائی سے کہا کہ اس... کو اچھی طرح قابو میں رکھنا۔ پھر اس نے کیا کہا تھا مجھے، یہ میں نہیں دُہرا سکتی۔ اس نے کہا کہ فکر ہی نہ کرو چوہدری صاحب۔ یہ چڑیا اپنے جال سے اڑنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ اس کی آواز پر چڑا خود آئے گا چوں چوں کرتا۔ چڑیا چڑے کی کہانی سے وہ اکثر مثالیں دے کر ہمارا مذاق اڑاتے تھے کہ ہاں بھئی۔ چڑا لایا چاول کا دانہ، چڑیا لائی دال کا دانہ۔ دونوں نے کہا کہ مل کے کھچڑی پکائیں گے کیسی پکی پھر کھچڑی۔ تو میں نے کہا کہ اس کھچڑی میں جب تم دونوں کو ڈال کے گھوٹا جائے گا تو پھر بنے گا حلیم۔ جو سکندر کھلائے گا اپنے کتوں کو۔ چاند بھائی نے میرے ایک ہاتھ مار دیا کہ بھونکنے کی ضرورت نہیں ورنہ وہی کل والا حشر کروں گا۔ اب یہ دلاور کیا جانے کہ کل کی بات تو فقط زیبِ داستان کے لیے تھی۔ میں نے بھی چاند بھائی کو گالیاں دیں اور ان دونوں کو رو رو کے خوب کوسا۔ بعد میں چاند بھائی مجھ سے ہاتھ جوڑ کے معافی مانگتا رہا کہ وہ نشے میں تھا۔ دلاور کو یہ شک کبھی نہیں ہوا کہ اسے بے وقوف بنایا جا رہا ہے۔ اس نے چاند بھائی سے کہا تھا کہ اسے بمبئی تک سنبھال کے لے جانا اور نہ سنبھال سکو تو میرے حوالے کر دینا۔" میں نے کہا۔" اگر دلاور کبھی اڑ جاتا کہ رابعہ کو میرے سپرد کر دو۔"

" چاند بھائی اس کی ماننے والا نہیں تھا۔ دلاور کو ہمیشہ چاند بھائی کی ماننی پڑتی تھی۔" رابعہ نے کہا۔" درمیان میں جب دلاور کراچی میں موجود نہیں ہوتا تھا تو وہ میری اور تمھاری ملاقات کا اہتمام کر دیتا تھا۔ انتہائی راز داری سے بعض اوقات وعدے کے باوجود چاند بھائی مجبور ہو جاتا تھا اور میں نہیں آ پاتی تھی۔"

" تمھیں کبھی شک نہیں ہوا کہ چاند بھائی دھوکا نہ دے رہا ہو، وہ ایکٹر تو بہت اچھا ہے۔"

" میں نے اسے ہر طرح آزما لیا تھا۔ اس کے علاوہ حالات ایسے تھے کہ وہ چاہتا تو سب کچھ کر سکتا تھا۔" رابعہ نے نظر جھکا کے کہا۔" میں بالکل بے بس تھی — اور اس کے رحم و کرم پر تھی۔ اسے کون روکنے والا تھا اور کس کا ڈر تھا۔ دراصل اس کے کردار کا ایک مضبوط پہلو یہی تھا کہ وہ دوغلا نہیں تھا۔ وہ خود کو قانون کا مجرم اور گناہ گار ضرور مانتا تھا لیکن

اپنے پاکستانی ہونے پر فخر کرتا تھا۔"

"بالکل شیش ناگ کی طرح۔" میں نے کہا۔ "گل کا بھائی بھی ایک ڈاکو تھا۔ مگر کیسی عجیب بات ہے کہ اس نے پاکستان کی خاطر جان دے دی۔ میں اس کا موازنہ شہیدانِ آزادی سے ہرگز نہیں کر سکتا۔ مگر سوچو کہ اس نے جان کیوں دی اور کس کے لیے دی؟ صرف ہمیں بچانے کے لیے اور ہمیں اس نے کیوں بچایا؟ صرف اس لیے کہ ہم وطن کے دشمنوں کے خلاف لڑتے ہوئے محصور ہو گئے تھے۔ ڈاکو، چور، اسمگلر اور مجرم ہونا ایک الگ بات ہے اور غدار ہونا بالکل مختلف بات ہے۔"

"ایسا ہی کیس چاند بھائی کا تھا۔" رابعہ نے کہا۔ "اس نے بالواسطہ طور پر تمھاری کئی بار مدد کی۔ دوست محمد کے ذریعے۔ مثلاً لانچ فراہم کرانے میں اسی کا ہاتھ تھا۔"

"دوست محمد ایک پُراسرار شخص تھا۔"

"بہت عجیب آدمی تھا وہ بھی۔ وہ کہاں رہ گیا؟"

"وہ ساتھ ہی تھا ہمارے۔ مگر راستے میں حالات ایسے ہو گئے کہ اسے الگ ہونا پڑا۔" میں نے کہا۔ "اس کے ساتھ کریم بلوچ اور مشتری بھی ہیں۔ انھوں نے کہا تھا کہ حاجی علی کی درگاہ پر ملیں گے۔"

رابعہ نے کہا۔ "کریم بلوچ کا نام تو سنا ہے۔ یہ مشتری کون ہے؟"

"بڑی دلچسپ چیز ہے۔" میں نے کہا۔ "کریم تو اسے مستری کہتا ہے۔ اس کی بڑی بہن تھی مُرلی، مگر کریم بھول جاتا تھا تو اسے بانسری کہتا تھا۔ کریم اور مشتری بھی لیلیٰ مجنوں ہیں مگر بدقسمتی یہ ہوئی کہ مشتری کو اس کے باپ نے پیسہ لے کر اپنے داماد موشن میاں کے حوالے کر دیا۔"

"موشن میاں۔" رابعہ کھلکھلا کے ہنس پڑی۔

"ہاں۔ اس خبیث نے بڑی بہن سے شادی کی تھی۔ وہ کچھ ذہنی طور پر معذور تھی مگر خوبصورت تھی۔" میں نے کہا۔ "اس پر بڑا ظلم ہوا۔ وہ بھاگ جاتی تھی۔ موشن میاں پھر پکڑ لاتا تھا۔ بالآخر ایک دن اسے بیچ دیا اور جو پیسہ ملا اس سے مشتری کو خرید لیا۔ کریم بلوچ کو پتا چلا تو اس نے جا کے موشن میاں کو ذبح کر دیا اور اپنی لیلیٰ کو بوری میں ڈال کے اور سر پر اٹھا کے لانچ پر لے آیا۔ وہ ایک پٹاخا چیز ہے۔ کریم تو اس کے سامنے دم نہیں مار سکتا۔ دُم ہلاتا رہتا ہے اور وہ جب بولنے پر آتی ہے تو خدا کی پناہ۔ قینچی کو مات کرتی ہے اس کی زبان۔"

رابعہ کو بہت ہنسی آئی۔ "کیا ہم ان کا انتظار کریں گے؟"

میں نے کہا۔ "نہیں۔ انتظار تو نہیں کریں گے۔ اچھا ہے اگر وہ آ جائیں لیکن ہمیں جانا پڑا کہیں تو پھر چلے جائیں گے۔"

رابعہ نے کہا۔ "وہ پریشان ہوں گے۔"

میں نے کہا۔ "نہیں۔ وہ بمبئی میں بھی اسی طرح رہ سکتے ہیں جیسے کراچی میں رہتے تھے۔ استاد بھی ہے ان کے ساتھ دوست محمد۔"

"چاند بھائی مجھے بمبئی پہنچا کے چلا گیا — سنگاپور۔" رابعہ بولی۔ "کہہ گیا تھا کہ واپسی میں دیکھ لوں گا۔ یہ پتا نہیں واپسی کب ہو گی۔ شاید ہانگ کانگ چلا جاؤں اور وہاں سے واپس کراچی۔"

"اور تم۔ اکیلی تھیں یہاں؟"

"اکیلی یوں کہ نہ تم تھے اور نہ کوئی جاننے والا تھا۔ لیکن رہتی اکیلی نہیں تھی۔" رابعہ نے کہا۔ "چاند بھائی نے بہت اچھا انتظام کر دیا تھا۔"

"کسی ہوٹل میں؟"

"ہوٹل میں کیسے رہ سکتی تھی میں؟ اس کے کوئی جاننے والے تھے۔ ایک بہت شریف پارسی فیملی تھی۔ معلوم نہیں ان کے چاند بھائی جیسے شخص سے ذاتی مراسم کس طرح استوار ہوئے۔ رشتے دار وہ ہو نہیں سکتے تھے۔ پرانے خاندانی تعلق کی گنجائش بھی نظر نہ آتی تھی۔ چاند بھائی کا کوئی خاندان ہی نہیں ہے۔"

"وہ کاروباری شریک ہوں گے۔" میں نے کہا۔

"ایسے لگتے تو نہیں تھے۔۔۔"

"چاند بھائی کیا صورت، رکھ رکھاؤ اور ادب آداب سے کوئی ایسا آدمی نظر آتا ہے جو اتنا بڑا اسمگلر ہو۔ سارے غیر قانونی دھندوں میں ملوث ہو اور خطرناک مجرم ہو؟" میں نے کہا۔

"یہ بات تو ہے۔ اگر چاند بھائی خود نہ بتاتا کہ وہ کیا کرتا ہے تو ہم اندازہ نہیں کر سکتے تھے۔ وہ بہت مہذب، شریف، تعلیم یافتہ اور ذہین آدمی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی بے حد خطرناک بھی۔ منفی رجحانات رکھنے والا اور اُلجھی ہوئی شخصیت کا مالک۔"

"دُہری شخصیت کا کیس۔" میں نے کہا۔

"وہ فیملی بہرحال دُہرے کردار کی مالک نہیں تھی۔ سب بہت وضع دار، مخلص لوگ تھے۔" رابعہ نے کہا۔ "یہ ہو سکتا ہے کہ مرد چاند بھائی کے بزنس پارٹنر ہوں مگر ان سے میرا واسطہ ہی نہیں رہا۔ ایک ہی کوٹھی میں دو بھائی تھے۔ دو ان کی بیویاں۔ دونوں کے دو دو بچے۔ اور دونوں کی ایک حقیقی ماں۔ اوپر نیچے رہتے تھے۔ نوکر چاکر مشترک۔ گاڑیاں سب کے پاس اپنی اپنی لیکن جس کا جو دل چاہے لے جائے۔ ایک گاڑی فیملی کے لیے تھی۔ ایک انھوں نے کہیں سے لا کے میری تحویل میں دے دی تھی۔ مجھ سے پوچھا کہ تم ڈرائیونگ کر لیتی ہو؟ میں نے کہا کہ ہاں تو انھوں نے گاڑی کا بندوبست کر دیا کہ جہاں چاہو جاؤ۔ مجھے کہاں جانا تھا۔ بمبئی کے راستے ہی معلوم نہ تھے۔"

میں نے کہا۔ "اس تمام عرصے میں تمھاری دیگر ضروریات کون پوری کرتا رہا؟"

"جل جاؤ گے سن کے۔" رابعہ نے کہا۔ "چاند بھائی نے ایک لاکھ روپے رکھوائے تھے میرے پاس۔ ذاتی مصارف کے لیے۔"

"اور تم نے رکھ لیے؟" میں نے کہا۔

"دیکھا۔ بُرا لگا نا؟" رابعہ نے کہا۔ "میں نے کیا مانگے تھے اس سے؟ کیا کرنا تھا مجھے ایک لاکھ کا؟ مجھے کسی بھی چیز کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ بہت انکار کیا میں نے لیکن وہ نہیں مانا۔ جوں کے توں رکھے تھے بمبئی آنے تک۔"

"اس کے مُنہ پر مارنے تھے۔ وہ کون ہوتا تھا۔۔۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو۔ اس کا سلوک اتنا شریفانہ رہا۔ اس نے ایک طرح سے میری حفاظت کی۔ تمھاری مدد بھی کی۔ تم کو میری طرف سے کوئی پریشانی نہیں ہونے دی۔"

"یہ غلط ہے۔ اس نے پریشان رکھا مجھے، تم کو مجھ سے دور رکھ کر۔" میں نے کہا۔ "تم اس کی تعریف کر رہی ہو۔"

"خیر، میں اچھائی کو تو بُرائی نہیں بنا سکتی۔ وہ خود بُرا آدمی ہو گا دوسروں کے لیے۔ اس کے دھندے بُرے ہوں گے۔ مگر میرے ساتھ اس نے کوئی بُرائی نہیں کی۔ مجھے بُری نظر سے دیکھا تک نہیں۔ اس کے جواب میں میرے لیے یہ کیسے ممکن تھا کہ میں بداخلاقی سے پیش آتی۔ اس کے حسنِ سلوک۔۔۔"

"میں نہیں مانتا کہ اس کا حسنِ سلوک بے سبب تھا۔ وہ ضرور اپنے دل میں تمھارے لیے پسندیدگی کے جذبات رکھتا ہو گا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ پتھر میں جونک لگانے کی کوشش کر رہا تھا اور تم پر کوئی اثر نہیں ہوا۔۔۔"

"سکندر! دل کا حال تو خدا بہتر جانتا ہے۔ لیکن فرض کرو کہ ایسا ہی تھا۔ تو میں کیا کر سکتی تھی۔ دیکھو نا تمھارے لیے بھی تو پسندیدگی کے جذبات رکھتی تھی فوزیہ۔ اس کے بعد نازو، پھر موہنی۔ اور اب ایک نام کملا کا سُنا میں نے۔ سب نے اپنے جذبات کا اظہار بھی کیا۔ تمھاری طرف سے میں نے کبھی اتنا حسد محسوس کیا؟ مجھے معلوم تھا کہ تم پر میرے اعتماد کو شکست نہیں ہو سکتی۔ بہت اُداس تھے تم موہنی کی موت کی خبر ملنے پر۔ میں نے تو کچھ نہیں کہا تھا تم سے۔ خود مجھے رنج تھا۔"

مجھے یوں لگا جیسے رابعہ نے میرے مُنہ پر تھپڑ مار دیا ہو۔ شرمندگی سے میرا بُرا حال ہو گیا۔ مجھے احساس ہوا کہ زیادتی میری تھی اور میں اپنے جذبات کے اظہار میں معقولیت کی حد سے آگے بڑھ گیا تھا جس کے ردِعمل میں رابعہ بھی مجھ سے وہ بات کہنے پر مجبور ہوئی جو وہ کہنا نہیں چاہتی تھی چنانچہ اب خود بھی پشیمانی کا شکار تھی۔

کچھ دیر میں چُپ بیٹھا رہا۔ پھر اچانک میرے اس ہاتھ کی پُشت پر جو رابعہ کے ہاتھ میں تھا گرم پانی کا ایک قطرہ گرا۔

میں نے ایک دم اس کا چہرہ اوپر کیا۔ "تم۔۔۔ یہ کیا ہے رابعہ۔۔۔ یہ آنسو۔۔۔"

"مجھے معاف کر دو۔۔۔ ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا مجھے۔"

"حد ہو گئی۔ اتنا کم حوصلہ ہے تمھارا۔" میں نے اس کی بھیگی ہوئی پلکوں سے ستارے چُن لیے۔ "کچھ تو سزا دینی تھی مجھے۔ تھوڑی دیر کے لیے روٹھ جاتیں۔ رخسارہ کے دیکھتیں۔ کم سے کم مجھے موقع تو ملتا تمھیں منانے کا۔"

"میں کیسے خفا رہ سکتی ہوں تم سے۔"

میں نے کہا۔ "جان! یہ روٹھنا منانا بھی تو آنا چاہیے تمھیں۔ ادائے حسن میں اتنی معصومیت بھی کیسی، مجھے احساس تو ہوتا کہ میں نے کتنی زیادتی کی۔ لیکن میں بھی کیا کروں۔ تمھاری محبت کا معاملہ ایسا ہے کہ اس میں جذبات کی یلغار کے سامنے میری عقل خبط ہو جاتی ہے۔ میں اعتراف کرتا ہوں اپنی کمزوری کا۔ میں یہ بھی برداشت نہیں کر سکتا کہ تمھارے متعلق کوئی ایسے سوچے۔۔۔ جیسے میں سوچتا ہوں یا کوئی تم کو ایسے دیکھے، جیسے میں دیکھتا ہوں۔ یا کسی کی زبان پر تمھارا نام یوں آئے جیسے میری زبان پر آتا ہے۔ یہ وقت ہی ایسا تھا۔ حالات پر اختیار نہیں تھا میرا اور تم سے دور رہ کے اپنے خیالات کے انتشار سے بچنا زیادہ مشکل ہو گیا تھا۔ میں نے دل دکھایا تمھارا۔۔۔ تم کو حق ہے مجھ سے روٹھنے کا۔ مجھ سے لڑنے کا۔"

"یہ حق تو تم کو بھی حاصل ہے۔" وہ بولی۔

"چلو ٹھیک ہے۔ کبھی کبھی یہ حق بھی استعمال کر لیا کریں گے دونوں۔ ظاہر ہے جب یہ زندگی ساتھ گزرے گی تو پھر سب کچھ ہی ہو گا۔ لڑائی بھی ہو گی۔ ظاہر ہے ایک ہو تو لڑے گا کس سے۔ ہم دونوں ہی پاگل۔ وہ کیا فرمایا ہے اسی مسئلے پر شاعر نے کہ
بڑا مزا اس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر۔"

"تم لڑو گے مجھ سے؟" رابعہ ہنس پڑی۔

"نہیں۔ لڑنا تم۔ مناؤں گا میں۔" میں نے کہا۔

پھر خاموشی کا ایک پُرسکون وقفہ آیا۔ میں نے نصف شب کے آسمان کی وسعت میں سکوت اور ٹھہراؤ کو محسوس کیا۔ خمار میں کھوئے ہوئے ستارے خوابیدہ سے لگتے تھے۔ پیچھے سمندر کی سرسراہٹ مدھم پڑ گئی تھی۔

بہت دیر بعد رابعہ نے کہا۔ "کیا محسن یاد کرتا ہے شہلا کو؟"

میں نے کہا: "وہ بھولتا ہی کب ہوگا۔"

رابعہ نے کہا: "مجھے دُکھ ہوتا ہے شہلا کے اکیلے پن کے خیال سے۔"

میں نے کہا: "وہ بہت باہمت لڑکی ہے۔ صبر کا اتنا حوصلہ مجھ میں تو نہیں ہے۔"

رابعہ نے کہا: "تم نے اس کے بچّے کو دیکھا؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "خود محسن نے ایک ہی بار دیکھا ہے۔"

"وہ باپ کو پہچانتا ہی نہیں ہوگا۔"

"ہاں۔ محسن کو ماما۔ ماما کہتا رہا۔" میں نے کہا۔ "پاپا کہنا کیسے سیکھتا۔ اس کے آس پاس جو بھی ہے ماما ہے۔"

"یہ وقت نے ہمیں کہاں پہنچا دیا ہے۔" رابعہ نے کہا۔ "جہاں کچھ بھی اپنا نہیں ہے۔ نہ زمین نہ آسمان۔ سب چہرے اجنبی ہیں۔ پرانے راستے پیچھے رہ گئے ہیں۔ ہم آگے بڑھتے جا رہے ہیں۔ کہاں جائیں گے بالآخر ہم سکندر؟"

"ہم پھر وہیں پہنچ جائیں گے جہاں سے چلے تھے۔ کیونکہ زمین گول ہے۔" میں نے کہا۔ "شرط چلتے رہنے کی ہے۔ اگر ہم رُک گئے تو اکیلے رہ جائیں گے۔"

"ہم واپس بھی تو جا سکتے ہیں۔۔۔" رابعہ نے حسرت سے کہا۔

"نہیں جان۔ واپسی کے راستے پر نہ کوئی ہمسفر ملے گا اور نہ کسی کا نقشِ پا۔ کیا تم تھک گئی ہو؟"

رابعہ نے کہا۔ "مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں میں اکیلی نہ رہ جاؤں۔ یہ دُنیا ہو یا وہ دُنیا۔ میرا ساتھ کہیں مت چھوڑنا۔" اس کے ہاتھ کی انگلیوں نے میری انگلیوں کو مضبوطی سے جکڑ لیا۔

میں خاموشی کے طلسم میں اسیر ہو گیا۔ اس خاموشی کا ہر لمحہ اس کے قرب کی کیفیت کا احساس تھا جس نے مجھے ہر احساس سے بیگانہ کر دیا تھا۔ نہ مجھے یہ خیال آیا کہ رات کتنی گزر چکی ہے، نہ کسی کی یاد آئی۔ غالب اور محسن۔ نازو اور گل سب ہمارے لیے متفکر ہوں گے، یہ بھی میں نے نہیں سوچا۔

مجھے نہ بھوک نے ستایا نہ پیاس نے۔ مجھے چائے سگریٹ کی طلب نے بھی بے قرار نہیں کیا۔ یہ عجیب بے خودی و سرشاری تھی جس نے بیک وقت مجھے اور رابعہ کو تمام مادّی ضروریات کے احساس سے بھی بے نیاز رکھا۔ ہم ایک دوسرے کی قربت کے احساس سے اتنے مدہوش تھے کہ ہمیں کسی اور چیز کا ہوش نہ تھا تاہم اس خلوت میں بھی جہاں مخل ہونے والا کوئی نہ تھا، مجھے ایک لمحے کے لیے بھی یہ خیال نہیں آیا کہ وہ ایک عورت ہے اور میں ایک مرد ہوں۔ وہ رابعہ تھی۔ میری محبّت تھی اور میں اس محبّت کے تقدّس کا امانت دار تھا۔ اس محبّت کی ایک خوشبو تھی اور ایک روشنی تھی جس کو محسوس تو کیا جا سکتا تھا، چھو کر میلا نہیں کیا جا سکتا تھا۔

ہم اس محدود سی جگہ میں بمشکل سمٹ کر بیٹھے تھے۔ ہمارے پیچھے اور دائیں بائیں پتھر کی چٹان تھی جس کے اوپر آسمان کا تھوڑا سا حصّہ دکھائی دیتا تھا۔ سامنے تاحدِ نگاہ بمبئی کے شہر کی جھلملاتی روشنیاں تھیں اور اس چٹان کے پیچھے سمندر جاگ رہا تھا۔ اندھیرا ہر سمت میں تھا اور رات کے ساتھ تھا۔ پھر اچانک منظر بدل گیا۔ شفق کا سنہرا اُجالا میری پلکوں پر جھلملایا۔ میں نے سورج کا آتشیں گولا دیکھا جس کی ہر کرن سونے کا تار تھی۔ آہستہ آہستہ میری آنکھیں کُھلیں تو میں نے دیکھا کہ میرا سر پتھّر پر ٹکا ہوا ہے۔ میرا ایک ہاتھ رابعہ کے شانوں کے گرد حمائل ہے اور وہ میرے شانے پر سر رکھے سو رہی ہے۔ اس کی خوابیدہ آنکھوں پر پلکوں کی چلمن پڑی ہوئی تھی زرتار روشنی میں اس کے بال جھلملا رہے تھے اور اس کے رخسار دہک رہے تھے۔ یہ اتنا دلفریب منظر تھا کہ میں پلک جھپکائے بغیر اسے دیکھتا رہا۔ میں خفیف سی جنبش سے بھی گریز کرتا رہا کہ کہیں میری حرکت سے اس کی یہ نیند ٹوٹ نہ جائے۔ میں اس نقشِ رعنائی کو دل میں اتار لینا چاہتا تھا۔

مجھے تعجّب ہوا کہ رات گزر گئی۔ اور افسوس ہوا کہ یہ رات بھی گزر گئی۔ لیکن یہ رات میرے دامن کو اتنی خوشیوں سے بھر گئی تھی کہ ہجر کی سب راتوں کے رنج و غم کا حساب برابر کر گئی تھی۔ مجھے پیچھے سے آوازیں سُنائی دے رہی تھیں۔ یہ ساحلِ سمندر پر پھرنے والے لوگ تھے یا وہ تھے جو کشتیوں سے آتے جاتے رہتے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی ہمیں نہیں دیکھ سکتا تھا۔

شور مچانے والے آبی پرندوں کی ایک ڈار بہت بلندی پر اُڑتی ہوئی سامنے سے گزری۔ رابعہ نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔ بوجھل پلکوں کے نیم وا دریچوں سے اس نے مجھے محوِ نظارہ دیکھا تو اس کا گلابی رنگ لال ہو گیا۔

"ہائے اللہ! صبح ہو گئی۔" اس نے خفّت اور پریشانی سے کہا اور اپنے پریشان بالوں کو سمیٹا۔

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "ہاں۔ صبح ہو گئی۔"

"تم کب سے جاگ رہے ہو؟" اس نے اپنی مسکراہٹ کو دبا لیا۔

"معلوم نہیں۔ میں تو تمھیں دیکھ رہا تھا۔"

اس نے مصنوعی خفگی کا اظہار کیا۔ "مجھے جگایا کیوں نہیں؟"

"جگا دیتا تو یہ کیسے دیکھتا کہ سوتے میں تم کیسی لگتی ہو؟" میں نے کہا۔

"حد کرتے ہو تم بھی۔ ذرا خیال نہیں تمھیں کہ وہ لوگ کیا کہیں گے۔" رابعہ نے کہا۔

"وہی جو ہمیشہ کہتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور بقول فلمی شاعر ہم خود کہہ دیں گے ان سے کہ۔ پیار کیا کوئی چوری نہیں کی۔۔۔"

رابعہ نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔ "مجھے تو اب شرم آ رہی ہے ان کے سامنے جاتے ہوئے۔"

میں نے کہا۔ "اچھا تم یہاں بیٹھ کے شرماتی رہو۔ میں جا کے بتا دیتا ہوں کہ بھئی رابعہ ساتھ اس لیے نہیں آئی کہ وہ شرمیلی لڑکی ہے۔ تمھارے سسرالی خود آ جائیں گے تمھیں لے جانے کے لیے۔ میں تو اب چلتا ہوں۔ میرے ناشتے کا وقت ہے یہ۔" میں نیچے کود گیا۔

رابعہ نے خود اُترنے کی کوشش کی اور پھر اِدھر اُدھر دیکھا۔ میں نے کہا۔ "کوئی نہیں دیکھ رہا ہے۔ آ جاؤ۔" میں نے ہاتھ پھیلا کے کہا۔ اس نے کچھ تذبذب کیا تو میں نے اس کی ٹانگ پکڑ کے کھینچی۔ رابعہ نے ایک چیخ ماری پھر ہنسی اور میرے ہاتھوں میں آ گئی۔ میں نے اسے نرمی سے ریت پر اُتار دیا۔

"کیسی عجیب بات ہے۔" رابعہ نے میرے ساتھ چلتے چلتے کہا۔ "رات گزر گئی اور وقت کے گزرنے کا احساس تک نہیں ہوا۔ میں نے ایک بار گھڑی دیکھی تھی تو ساڑھے گیارہ سے کچھ اوپر وقت تھا۔"

"مجھے تو خیال ہی نہیں آیا گھڑی دیکھنے کا۔" میں نے کہا۔

"پتا نہیں نیند کس وقت آ گئی۔ میں نے سوچا تھا کہ بارہ بجے تک واپس چلے جائیں گے۔" رابعہ اس خیال سے سخت پریشان نظر آتی تھی کہ وہ محسن اور غالب کو کیا جواب دے گی۔ ہم نے انھیں باتیں بنانے کے لیے بہترین موضوع فراہم کر دیا تھا۔

میں نے کہا۔ "ابھی دیکھنا میں کیسی خبر لیتا ہوں سب کی۔"

"یعنی چوہدری ڈانٹے گا کوتوال کو؟"

"ہاں۔ کیا یہ ان کا فرض نہیں بنتا تھا کہ ہماری خبر لیتے؟"

رابعہ مسکرائی۔ "خبر تو وہ اچھی طرح لیں گے اب۔"

"رات کو کیوں خیال نہیں آیا انھیں ہمارا؟ کوئی تو آتا ہمیں تلاش کرنے کے لیے۔ ان کو سوچنا چاہیے تھا کہیں ہم دونوں کے ساتھ کوئی واردات تو نہیں ہو گئی۔"

رابعہ نے دبی زبان سے کہا۔ "کیا پتا۔۔۔ وہ آئے ہوں۔"

میں نے اس بات پر غور کیا اور ہنس پڑا۔ "تمھارا مطلب ہے۔۔ اچھا۔۔ ہاں۔۔۔ یہ ہو سکتا ہے۔"

رابعہ نے بالکل ٹھیک سوچا تھا۔ صبح کے سات بجے صرف گل اور نازو جاگ رہی تھیں مگر انھوں نے ہمیں دیکھ کر کسی قسم کی حیرانی یا پریشانی کا اظہار نہیں کیا۔ غالب اور محسن غائب تھے۔

"ختم ہو گئیں آپ دونوں کی باتیں؟" نازو نے کہا۔

"باتیں کہاں ختم ہوتی ہیں بی بی۔" میں نے کہا۔ "رات ختم ہو گئی قبل از وقت۔"

"باتوں سے پیٹ بھی بھر گیا بھائی سکندر؟" گل نے کہا۔ "تمھیں تو خیال بھی نہیں آیا کہ ہم بھوکے پیاسے بیٹھے ہیں۔ کوئی آ کے پوچھ لیتا کہ کچھ چاہیے۔"

میں نے کہا۔ "ہم تو آ نہیں سکتے تھے اتنی ضروری باتیں چھوڑ کے۔"

"میں نے تو کہا تھا کہ وہیں پہنچا دو انھیں چائے بھی اور کھانا بھی۔" نازو ہنسی۔ "تمھارے دوست ہی مخالف ہو گئے۔"

"کون، غالب اور محسن۔" میں نے کہا۔ "وہ میرے دوست کب سے ہو گئے۔ دونوں ماتحت ہیں اور بہت چھوٹے لوگ۔ لیکن وہ ہیں کہاں؟"

"یہاں تو ناشتے کھانے کا کوئی انتظام ہے نہیں۔" نازو نے کہا۔ "تھرمس لے کر گئے ہیں۔ اخبار بھی لائیں گے۔"

"کب سے گئے ہوئے ہیں؟" میں نے کہا۔

نازو نے رابعہ کی طرف دیکھا جو گل سے باتوں میں مصروف تھی اور معلوم نہیں کس بات پر دونوں ہاتھ مُنہ پر رکھ کے کھی کھی کر رہی تھیں۔ نازو نے مجھے آنکھ سے اشارہ کیا۔ "کافی دیر ہو گئی ہے۔"

"میں آتا ہوں ابھی۔" میں نے کہا۔

"اب آپ بھی جا رہے ہیں؟" نازو نے شکایت کے انداز میں کہا۔

"کوئی ولایت نہیں جا رہا ہوں بھئی۔ سگریٹ ختم ہو گئے ہیں۔ تمھارے پاس ہے کچھ تو دے دو۔ میں نہیں جاتا۔" میں نے کہا۔

"میں سگریٹ نہیں پیتی۔"

"اچھا! بُری بات ہے۔ پیا کرو۔" میں نے کہا اور باہر نکل گیا۔

پانچ منٹ تک میں لانچ کے ڈھانچے سے ذرا فاصلے پر پیچھے کی طرف ٹہلتا رہا۔ پھر نازو نمودار ہوئی۔ یہ تمام وقت میں نے نازو کے خفیہ اشارے کا مطلب نکالنے کی ناکام کوشش میں صرف کر دیا تھا۔ آخر ایسی کون سی بات تھی جو اس نے گل اور رابعہ کے سامنے کہنا مناسب نہیں سمجھا۔

"تم کچھ پریشان ہو؟" میں نے نازو کے قریب آنے کے بعد کہا۔

"پریشانی کی وجہ ہے۔ معلوم ہے رات کیا ہوا؟" نازو بولی۔ "مگر آپ کو کیسے معلوم ہو سکتا تھا۔"

"چلو اب بتا دو۔" میں نے جھینپ کر کہا۔

"جب آپ دونوں واپس نہیں آئے تو محسن اور غالب نے بارہ بجے تک تو انتظار کیا۔" نازو بولی۔ "محسن کا خیال تھا کہ چھوڑو جتنی باتیں کر سکتے ہیں کر لیں۔ باتوں سے پیٹ تو نہیں بھرتا۔۔۔ آ جائیں گے خود ہی جھک مار کے جب بھوک لگے گی۔ مگر غالب اسے کھینچ کر لے گیا کہ چلو دیکھ تو آئیں کہ لیلیٰ مجنوں ہیں کہاں۔"

"لیلیٰ کیسے کہا تھا اس نے اور مجنوں کسے؟ یہ بھی بتا دو۔"

نازو مسکرائی "میں ابھی کہاں سمجھتی ہوں ایسی باتیں۔" اس نے کہا۔ "وہ دونوں گئے ادھر بقول ان کے، جو کچھ انھوں نے دیکھا وہ خدا دشمن کو نہ دکھائے۔"

"دوست دیکھ لیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔"

"جی۔ وہ بھی یہی کہتے تھے۔" نازو ہنسی۔ "لیکن واپسی میں ایک شخص نے ان کا تعاقب کیا۔ معلوم نہیں وہ کہاں سے ان کے پیچھے لگا تھا۔ وہ پہلے تو سمجھے تھے کہ ایسے ہی کوئی ساحل پر بھٹک رہا ہے لیکن اس کی نقل و حرکت پر غالب کو شبہ ہوا۔ اس نے محسن سے کہا کہ کوئی ہمارے پیچھے ہے۔ تصدیق کے لیے انھوں نے واپسی کا راستہ بدل دیا اور مخالف سمت میں نکل گئے۔ انھوں نے بے مقصد چکر کاٹے اور اس شخص کو ڈاج کرنے کی کوشش کی مگر وہ بہت چالاک بھی تھا اور بے وقوف بھی۔ صرف چالاک ہوتا تو تعاقب ایسے کرتا کہ انھیں معلوم ہی نہ ہو۔ رات کا وقت تھا اور اندھیرا تھا۔ وہ خود کو روپوش رکھ سکتا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ مسئلہ بھی تھا کہ لوگ بہت کم تھے اور بعض مقامات پر وہ چھپ کر بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ مزید یہ کہ غالب کے بارے میں اسے یہ علم نہیں تھا کہ اس کی نظر اندھیرے میں بھی دیکھتی ہے۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ "بی بی! یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟ اس بات کا تو ہمیں بھی علم نہیں۔"

نازو نے مجھے بے یقینی کے ساتھ دیکھا۔ اسے شک ہوا تھا کہ شاید میں مذاق میں اسے بے وقوف بنا رہا ہوں۔ مجھے سنجیدہ دیکھ کر اس کا شک حیرانی میں بدل گیا۔ "آپ لوگوں کو... واقعی نہیں معلوم؟"

میں نے کہا۔ "کیا عرض کرے یہ بندہ حقیر و پُرتقصیر۔ مقام شرم کا ہے لیکن بخدا... ایسی کسی پُراسرار صلاحیت کا علم ہوتا ہم میں سے کسی کو بھی تو سب کو یہ بات معلوم ہوتی۔ تم نے اس کی آنکھوں کی گہرائی میں جھانک کر۔ بلکہ ڈوب کر دیکھا ہے۔ تم بتاؤ۔"

وہ ہنسی۔ "آپ کے دوست نے خود بھی یہ بات نہیں بتائی؟ حیرت ہے! خیر وہ اندھیرے میں دیکھنے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتا ہے۔ اسے پُراسرار نہیں کہا جا سکتا۔ بہت سے لوگ اندھیرے میں بالکل نہیں دیکھ سکتے۔ کچھ زیادہ دیکھ سکتے ہیں۔ اس نے ہی محسن کو متوجہ کیا تھا۔ جب تصدیق ہو گئی کہ کوئی پیچھا کر رہا ہے تو وہ دونوں اس کو بہت دور ویرانے کی سمت میں لے گئے اور پھر ایک جگہ چھپ گئے۔ غالب نے اسے سو گز دور سے دیکھا اور پہچان لیا۔ اس نے محسن کو بتایا کہ یہ تو انہی میں سے ایک ہے جو بمبئی پہنچتے ہی استقبال کے لیے آ گئے تھے۔"

میں چونک پڑا۔ "کون؟ تریوینی کے آدمی؟"

"ہاں۔ غالب نے بڑے وثوق سے کہا کہ جو لوگ ایک بلیک سیڈان میں آئے تھے یہ انہی میں سے ایک ہے۔" نازو بولی۔

"وہ تو چار تھے۔" میں نے کہا۔ "ایک مارا گیا تھا۔ باقی دو مجھے تریوینی کے گھر میں نظر آئے تھے۔"

"غالب نے بتایا کہ اسے تم بے ہوشی کے عالم میں چھوڑ آئے تھے۔" نازو نے کہا۔ "محسن نے یہ بات ماننے میں تامل کیا اور کہا کہ اتنی دور سے کیا پتا چلتا ہے۔ غالب نے کہا بھی کہ میں دیکھ کے بتا رہا ہوں۔ یہ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے غالب تو اس کی صورت صاف دیکھ رہا تھا مگر محسن کو اتنے فاصلے سے وہ ایک آدمی کا سایہ دکھائی دے رہا تھا اور بس۔"

"محسن کو بھی یہ بات کہاں معلوم ہے کہ غالب اندھیرے میں دیکھتا ہے۔" میں نے کہا۔

"تصدیق سے یہ تو ثابت ہو گیا تھا کہ وہ تعاقب میں ہے۔ اب انھوں نے اس کو پکڑنے کا سوچا۔" نازو بولی۔ "پھر معاملہ اُلٹا ہو گیا یعنی وہ آگے بھاگنے لگا اور یہ دونوں اس کے تعاقب میں۔ تاہم وہ زیادہ چالاک نکلا۔ جیسے ہی اسے اندازہ ہوا کہ اس کا راز فاش ہو گیا ہے، وہ جان بچا کے نکل بھاگا۔ اس نے آبادی کا رُخ کیا اور آسانی سے خود کو گم کرنے میں کامیاب رہا۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ وہ جاسوسی کر رہا تھا۔ صرف یہ معلوم کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا کہ اس علاقے میں ہماری موجودگی کا سراغ لگائے اور اس مقصد میں وہ یقیناً کامیاب رہا۔" میں نے کہا۔ "لیکن سوال یہ ہے مس نازلی! کہ اس نے غالب اور محسن کا تعاقب کیوں کیا؟"

"اگر وہ ملتا تو شاید بتاتا۔" نازو نے طنز سے کہا۔ "ممکن ہے آٹوگراف لینا چاہتا ہو۔ ذرا شرمیلا تھا اس لیے دور دور رہا۔"

"کم عقل لڑکی... تم سمجھ نہیں رہی ہو ایک عقل کی بات۔" میں نے کہا۔ "وہ محسن کو نہیں پہچانتے۔ اور غالب اپنا حلیہ بالکل بدل چکا ہے۔"

"رات بھر آپ کی عقل بھی گھاس چرتی رہی ہے۔" نازو نے برہم ہو کے کہا۔ "آپ کی سمجھ میں یہ موٹی سی بات کیسے آ سکتی ہے کہ ابھی تک محسن نے اپنا حلیہ نہیں بدلا ہے۔ وہ ابھی تک امیر چند کا بھائی فقیر چند بنا ہوا ہے جو کہ دمڑی لال کی اولاد تھے اور ایک سی شکل کے تھے۔ جو بھی محسن کے تعاقب میں تھا وہ محسن کو امیر چند یعنی سکندر بخت سمجھے ہوئے تھا۔ آئی عقل شریف میں یہ بات؟"

وہ پیر پٹخ کے چل پڑی۔

میں اس کے پیچھے لپکا۔ "ارے نازو! خدا کی قسم تم کو جو ناقص العقل کہے وہ غالب... میرا مطلب ہے گدھا کیا دودھ کی کوڑی لائی ہو تم۔ وہ واقعی محسن کو سکندر سمجھا ہو گا اور اس کا مقصد بھی وہی ہو گا جو تم نے فرمایا۔ یہ تو بڑی غلط بات ہو گئی۔ اس نے جا کے رپورٹ دی ہو گی کہ جناب مفرور کا سراغ مل گیا ہے۔"

"خدا کا شکر ادا کرو کہ وہ جاسوس تم تک نہیں پہنچا۔ وہ پیچھے تھا اور پیچھے ہی رہا۔" نازو دوڑنے لگی۔ "اگر غالب اور محسن آگے نکل جاتے تو وہ بھی دیکھ لیتا۔"

"کیا دیکھ لیتا؟"

"لیلیٰ مجنوں کا گوشۂ عافیت اور کیا۔" نازو نے کہا۔

"لیلیٰ مجنوں کس کو کہہ رہی ہو۔ کون ہے لیلیٰ۔ اور مجنوں...؟"

"جاؤ انھیں دیکھو۔" نازو نے مجھے دھکا دیا۔ "بہت دیر ہو گئی ہے۔"

ایک اجنبی شخص جو پاگل تھا یا نشے میں تھا قہقہہ مار کے ہنسا اور بولا۔ "ارے دھکا کیوں دیتی ہے سالی۔ پیسہ چاہیے تیرے کو؟"

نازو کا منہ لال ہو گیا۔ غصہ مجھے بھی بہت سخت آیا تھا مگر وہ پاگل وہیں لیٹ گیا اور مٹھی میں ریت بھر بھر کے گرانے لگا۔ "یہ... یہ ہوتا ہے سالا پیسہ۔ اِدھر آیا۔ اُدھر گیا۔"

"چھوڑو اسے۔" میں نے کہا۔ "پاگل ہے کوئی۔ تم اندر جاؤ اور ذرا چوکس رہو۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ تریوینی کو اس ٹھکانے کا شاید پتا نہ چلا ہو۔ مگر یہ بہرحال معلوم ہو گیا ہو گا کہ میں اسی علاقے میں ہوں۔ دلاور کو بھی یہ بات معلوم ہو جائے گی تو ہمارا یہاں رہنا مشکل ہو گا۔ تمھارے پاس ریوالور ہے؟"

نازو نے اقرار میں سر ہلایا۔ "تم دور مت جانا۔"

"ریوالور گل کے پاس بھی ہو گا۔ رابعہ کے پاس نہیں تھا میں نے دے دیا ہے۔" میں نے کہا۔ "ویسے تو مشین گن بھی ہے لیکن ابھی خون خرابے سے گریز کرنا ہی بہتر ہے۔"

"مجھے لگتا ہے کہ تم لمبے جا رہے ہو۔ دیکھو جانا ہو تو ہمیں بتا کے جانا۔ ایسے مت نکل جانا کہ پتا ہی نہ چلے کسی کا۔ ہم کہاں تلاش کرنے جائیں گے۔"

میں نے کہا۔ "گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ میں نہ پھر اغوا ہونے کے موڈ میں ہوں اور نہ فرار ہونے کے۔ تم جا کے رابعہ اور گل کو کسی بہلانے بہلاؤ۔ جیسے اب تک انھیں کچھ پتا نہیں چلا، ایسے ہی کچھ دیر مطمئن رکھو۔"

جب نازو لوٹ گئی تو میں نے حاجی صاحب سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ نازو سے باتیں کرتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ ان حالات میں مجھے کیا قدم اُٹھانا چاہیے۔ اگر غالب اور محسن نہ ملے تو میں کیا کروں گا؟ کس سے معلوم کروں گا اور کہاں جاؤں گا؟ پولیس سے مدد لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ راہ چلتے لوگ بھی کچھ نہیں بتا سکتے تھے۔ صرف سوات کے حاجی صاحب کا جوس سینٹر ایک ایسی جگہ تھی جہاں سے راہنمائی حاصل ہونے کی امید کی جا سکتی تھی۔

میرا موجودہ حلیہ کسی حد تک مجھے تحفظ فراہم کرتا تھا۔ اب مجھ سے زیادہ خطرہ محسن کو تھا جو بدستور فقیر چند بنا گھوم رہا تھا اور جیسا کہ نازو کی بات سے ظاہر ہوتا تھا، وہ کسی نامعلوم جاسوس کی نظر میں بھی آ چکا تھا۔

حاجی صاحب کی دُکان تک پہنچنے کے لیے میں نے نسبتاً لمبا مگر محفوظ راستہ اختیار کیا۔ دُکان ابھی کھلی ہی تھی چنانچہ نوکر اندر کی جھاڑ پونچھ میں مصروف تھے۔

میرا خیال تھا کہ حاجی صاحب مجھے شناخت نہ کر پائیں گے۔ میں نے انھیں سلام کیا۔

"آہا۔ وعلیکم السلام۔ تو یہ تم ہو۔" اُنھوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ "کمال ہو گئی...!"

"آپ نے پہچان لیا مجھے؟" میں نے کہا۔

"آواز سے پہچانی بھئی۔" وہ بولے۔ "لیکن کمال کی بات یہ نہیں ہے۔ کہ تم کو میں کیسے پہچان لی۔ کمال یہ ہے کہ تم کیسے آ گئی؟"

میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔ "جی؟... کیسے آ گیا...! بس آ گیا۔"

"وہی تو میں نے بھی کہی۔ کہ کیسے آ گئی۔" حاجی صاحب نے عادتاً میرے لیے بھی مؤنث کا صیغہ استعمال کیا۔ "ابھی میں تمھارے بارے میں ہی سوچتا تھی۔ ادھر تم حاضر۔ کیا نام بتائی تم میرے کو؟"

میں نے کہا۔ "نام تو میں نے جو بتایا تھا، کچھ اور تھا۔ لیکن یہ بتائیں کہ آپ نے کیسے یاد کیا تھا اس وقت؟"

انھوں نے ایک رقعہ کھول کے دیکھا۔ "ابھی کچھ دیر پہلے کوئی خدا کا بندہ آئی۔ وہ میرے کو بولتی کہ تمھارا ملک سے دو بھائی ادھر آتی۔ ایک جیسا شکل کا ہوتی۔ ایسا بھورا داڑھی۔ مہندی والا۔ اور بھورا بال۔ بس میرے کو یاد آ گئی۔ میں اس کو بولتی کہ ہاں آیا تھی لیکن میرے کو کچھ پتا نہیں ہوتی۔ بس جناب صاحب وہ بولتی کہ آپ یہ رقعہ ان کو دو۔ جو بھی آتی۔ اور میں یہ رقعہ پڑھ کے سوچتی کہ ابھی کیا کرے؟ تم کبیر خاں ہوتی یا تمھارا بھائی؟"

"کبیر خاں میں ہوں۔" میں نے کہا۔

انھوں نے رقعہ مجھے پکڑا دیا۔ "ہو گئی نا کمال۔"

میں نے کہا۔ "وہ کون تھا... میرا مطلب ہے کیا آپ نے پہلے کبھی اس کو دیکھا؟"

حاجی صاحب نے دونوں ہاتھ پھیلا کے لاعلمی کا اظہار کیا۔ "ادھر اتنی دُنیا آتی اللہ کے حکم سے۔ ہم سب کو کیسے پہچانتی؟"

میں نے رقعہ کھول کے پڑھا۔ اس میں صرف ایک سطر کا

پیغام تھا۔" تمھارے دونوں دوست سلام کہتے ہیں۔ ڈی + ٹی "۔ اُردو کا یہ جملہ انگریزی حروف میں لکھا گیا تھا یعنی پیغام رومن اُردو میں دیا گیا تھا۔ کسی تذبذب کے بغیر میں نے ڈی + ٹی کا مطلب دلاور + تریوینی اخذ کرلیا۔ انھوں نے مشترکہ طور پر مجھے یعنی محسن عرف فقیر چند سمجھتے ہوئے یہ اطلاع دی تھی کہ وہ دونوں جو اصل بدمعاش تھے، "ایس ایس کراتی بھترڈ" کو غرق کرنے اور "بھانومتی" کو واپس لانے کے ذمّے دار تھے وہ ہماری تحویل میں ہیں۔

آگہی کو دام شنیدن بچھانے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ میں واضح طور پر دلاور کی آواز سُن سکتا تھا اور تریوینی کی آواز بھی مجھ تک صاف پہنچ رہی تھی۔ ان کے عالم تقریر کا مدّعا بہت واضح تھا۔" اپنے سکندر صاحب۔ یہ تو خوب ہوئی۔ کیا کہتے ہیں وہ۔ احمد کی پگڑی محمود کے سر۔ تمھاری جگہ آگئے تمھارے دو جگر کے ٹکڑے۔ اب آپ بھی آجاؤ خیر سے۔" اور تریوینی نے اپنے میکانکی لہجے میں کہا۔" تو تم ہو فقیر چند۔ اور یہ کیا تمھارا باپ ہے دمڑی لال؟"

حاجی صاحب نے مجھے اورنج جوس کا گلاس پیش کیا۔

"بسم اللہ کرو جناب صاحب۔ حاجی کا دل خوش کرو۔"

میں نے کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا کہ یہ تکلّف کیوں کرتے ہیں یا اس کی کیا ضرورت تھی۔ میرا دل کچھ کھانے پینے کو نہیں چاہتا لیکن حاجی کے خلوص کو ٹھکرانا مشکل تھا اور اس کا دل خوش کرنا بے حد ضروری تھا چنانچہ میں نے وہ 'بڑا والا' جوس کا گلاس ایک سانس میں خالی کردیا۔ بلاشبہ اس کا منفرد ذائقہ وہی تھا اور اس مشروب کی 'فرحت بخشی' بھی کم نہ تھی مگر میرا اپنا ذوق و شوق کا جذبہ بے کیف ہوگیا تھا۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔

"آپ ہمارا ہم وطن۔ حاجی آپ کا خادم۔" اُنھوں نے دل پر ہاتھ رکھ کے کہا۔" ادھر آؤ۔ دل ٹھنڈا کرو تو ہمارا دل خوش۔"

"حاجی صاحب! ابھی ہمارا یہاں کوئی پتا ٹھکانا نہیں ہے۔ آپ کی بہت مہربانی ہوگی اگر ہمارے نام کوئی خط یا پیغام آئے تو رکھ لیں۔ آپ کو تکلیف تو ہوگی۔ لیکن یہ ہمارے لیے رابطے کی ایک جگہ ہے۔ کوئی میرے بارے میں پوچھے تو بس یہی بتا دیں کہ آیا تھا۔"

"کیوں نہیں جناب صاحب۔" اُنھوں نے مجھ سے ہاتھ ملا کے کہا۔

اس انکشاف نے کہ محسن اور غالب کو دلاور یا تریوینی کے آدمی لے گئے ہیں، مجھے سخت ذہنی خلفشار اور مایوسی کا شکار کر دیا تھا۔ نہ صرف یہ کہ میں اکیلا رہ گیا تھا بلکہ پیغام میں واضح طور پر بتا دیا گیا تھا کہ میں سلام کا جواب دوں۔ دوستوں کی رہائی منظور ہے تو خود جاؤں اور ان کی شرائط پر ان سے بات کروں۔ بات

وہ کیا کریں گے، دلاور کہے گا کہ" اپنے سکندرِ اعظم صاحب۔ بہت لمبا ہوگیا تمھاری فتوحات کا سلسلہ۔ اب کچھ آرام کرو۔" اور آرام کا ان کی زبان میں یہ مطلب بھی ہوسکتا تھا کہ سو جاؤ کسی بے نشان مدفن میں ابدی نیند اور حق و انصاف کے لیے صورِ اسرافیل کے پھونکے جانے کا انتظار کرتے رہو۔ اس دُنیا میں تو یہ ممکن نہ تھا چنانچہ یہاں سے روانگی پکڑو۔

میں نے وہیں سے ایک تھرمس خریدا جو غیر ملکی تھا چنانچہ بہت مہنگا ملا۔ اس میں اُبلتی ہوئی چائے بھروانے کے بعد میں نے ناشتے کے لیے پوری حلوہ خریدنا ہی مناسب سمجھا کیونکہ ڈبل روٹی، مکھن یا انڈے فراہمی کرنے کا ہمارے پاس کوئی انتظام نہ تھا۔ وہیں سے مجھے "ٹائمز آف انڈیا" کا تازہ شمارہ مل گیا۔ دوسرے سب اخبار ہندی زبان کے تھے یا گجراتی کے۔ اردو کا ایک اخبار اتنا خراب چھپا ہوا تھا کہ مجھے افسوس ہوا۔ عین ممکن تھا کہ میں اسے نہ خریدتا لیکن اس کی سُرخیاں دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ اس اُردو اخبار کی وجہِ اشاعت اس کی سنسنی خیزی ہے۔ عُرفِ عام میں یہ زرد صحافت کا علمبردار یعنی چیتھڑا اخبار تھا جو جرائم اور اسکینڈل کی خبروں پر بکتا ہے۔ اس میں مجھے اندر کا صفحہ دیکھتے ہی للّی کی خاصی بڑی تصویر کے ساتھ پوری خبر اور اس کے بارے میں ایک فیچر دکھائی دیا۔ میں نے اس کی قیمت بھی ادا کردی اور واپس لوٹ گیا۔

اس وقت تک میں طے کرچکا تھا کہ میرا لائحہِ عمل کیا ہونا چاہیے اور کیا ہوگا۔ میرے ذہن کے اندر مختلف اور متضاد خیالات کی جنگ ایک منطقی انجام کو پہنچ چکی تھی۔ خود کو دلاور یا تریوینی کے حوالے کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مجھے ہر قیمت پر محسن اور غالب کو ان بدمعاشوں کے قبضے سے چھڑانا تھا۔ اس کام کو آسان نہیں سمجھا جاسکتا تھا اور مجھے کچھ کرنے سے پہلے مشورہ کرنا تھا اور سوچنا تھا کہ یہ مشکل کیسے آسان ہوگی۔ طریقہ وہ ہونا چاہیے کہ چھوٹی مشکل بڑی مشکل نہ بنے یعنی سانپ مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

نازو بھی تشویش میں مبتلا تھی لیکن اس کا اظہار نہیں کر رہی تھی۔ رابعہ اور گل کے چہرے ان کی پریشانی کی تصویر بنے ہوئے تھے۔

"کیا ہوا... محسن...؟"

"محسن اس میں ہے۔" میں نے ایک لفافہ رابعہ کو تھما دیا جس میں حلوہ تھا۔" اور غالب اس میں۔" گل کو میں نے پوریوں والا لفافہ پکڑا دیا۔ پھر کندھے سے لٹکا ہوا تھرمس نازو کے حوالے کیا۔" اور اس کے اندر میں خود ہوں۔ یعنی میری جان ہے۔ رفتار چائے نہ ملی تو سمجھو میں گیا..."

"یہ کیا فضول باتیں کر رہے ہو۔" رابعہ نے برہمی سے کہا۔

"بھائی سکندر! محسن اور غالب کہاں چلے گئے؟" گل نے تقریباً روتے ہوئے کہا۔

"بھئی آپ لوگ کیوں پریشان ہونے پر مُصر ہیں۔ وہ دونوں مجھے نہیں ملے۔" میں نے کہا۔" لیکن مجھے اُن کے بارے میں معلوم ضرور ہو گیا ہے کہ وہ کہاں چلے گئے ہیں۔ ایسا اکثر ہوتا ہے کہ آدمی گھر سے نکلتا ہے نیک ارادے کے ساتھ۔ مگر آگے تقدیر کھڑی مل جاتی ہے کہیں اور لے جانے کے لیے۔ مثلاً جو لوگ ولایت جاتے تھے تعلیم کے لیے، وہ ڈگری کی جگہ میم لے آتے تھے..."

"سیدھی طرح بتاتے کیوں نہیں... ناشتا لینے گئے تھے وہ۔ کہاں چلے گئے؟"

"ایک زیادہ اہم کام یاد آگیا۔" میں نے کہا۔" تم لوگ اگر دوپہر تک بھی کھائے پیئے بغیر بیٹھی رہو گی تو کچھ نہیں ہوگا۔"

"مجھے لگتا ایسا ہے کہ آپ جانتے بوجھتے کچھ چھپا رہے ہیں۔" گل نے باقاعدہ رونا شروع کردیا۔" آپ کو آخر کیسے معلوم ہوا...؟"

"لاحول ولا قوۃ۔ ابھی تو میرا بیان بھی ادھورا ہے۔ درمیان میں رونے کی اجازت نہیں ہے۔" میں نے کہا۔" مجھے حاجی صاحب نے اطلاع دی ہے کہ وہ دونوں بندرگاہ کی طرف گئے ہیں اور دوپہر تک واپس آئیں گے۔ تم ناشتا وغیرہ کرو۔ گل بانو! ایسے بات بات پر رونے سے مسائل نہ کبھی حل ہوئے ہیں، نہ ہوں گے۔ بفرضِ محال وہ کسی مصیبت میں پڑ گئے ہوتے تو کیا تمھارے آنسو اُن کو لا سکتے تھے یا ان کی مدد کرسکتے تھے؟ اتنا کم ہمت تو نہیں سمجھتا تھا میں تمھیں۔ آخر تم ناگ منی تھیں۔ گل بانو بنتے ہی یہ حال ہوگیا؟ تم تو بڑے دعوے سے آئی تھیں ساتھ کہ میں یہ کروں گی اور وہ کروں گی۔ مردانہ لباس میں یہاں سے وہاں تک سب دُشمنوں کا پتّا کر دوں گی اور کشتوں کے پشتے لگا دوں گی۔ تم تو دوسروں کو بھی بزدل بنا رہی ہو۔"

میری بات کا اثر ہوا۔ میں نے لہجہ بھی سخت اختیار کیا تھا۔ گل شرمندہ نظر آنے لگی۔ نازو نے سب کے لیے ناشتے کا اہتمام شروع کیا۔ بھوک جتنی مجھے تھی، وہ ایک سطر کی اطلاع نے ختم کردی تھی۔ رہی سہی کسر حاجی صاحب نے جوس پلا کے پوری کی۔ پھر بھی ان سب کے ساتھ مجھے بھی ناشتے میں شریک ہونا پڑا۔ ورنہ ان کا شک پکّا ہو جاتا کہ کوئی بات ضرور ہے اور میں پریشانی کے باعث کچھ نہیں کھا سکتا۔

'ٹائمز آف انڈیا' میں للّی کے حوالے سے کوئی خبر نہیں تھی۔ قتل اور دیگر جرائم کی مختصر خبریں اندر کے ایک ہی کالم میں دی گئی تھیں۔ اعلانات کے ایک باکس میں للّی کی ایک انچ کی تصویر کو بھی میں فوراً نہ پہچان سکا۔ یہ تصویر پرانی تھی اور غالباً کسی گروپ میں سے نکالی گئی تھی تاکہ صرف چہرہ دیا جاسکے۔ مرنے والوں کے لواحقین نے اطلاعِ عام کے لیے اپنی اپنی استطاعت اور ضرورت کے مطابق یہ اعلانات شائع کروائے تھے۔ للّی کی موت کی اطلاع دینے والے نے اپنے نام کی جگہ صرف 'ایک دوست' شائع کرایا تھا اور یہ بتایا تھا کہ ایک افسوس ناک، ناگہانی موت کا شکار ہونے والی ہم سب کی دوست للّی کی آخری رسوم کہاں اور کب ادا کی جائیں گی۔

یہ 'ایک دوست' کون تھا؟ اس کا اندازہ کرنا میرے لیے ناممکن تھا۔ للّی کے بہت دوست ہوں گے مگر میں کسی سے واقف نہ تھا۔ یہ ہوسکتا تھا کہ اطلاع واقعی کسی دوست کی طرف سے دی گئی ہو مگر میں اس بات کو خارج از امکان قرار نہیں دے سکتا تھا کہ اطلاع دینے والے شکاری ہیں جنھوں نے یہ جال ہمارے لیے پھیلایا ہے۔

خواتین نے اتنی دیر میں اُردو اخبار کی سنسنی خیز باتصویر خبر اور متعلقہ فیچر کا مطالعہ کرلیا تھا۔ گل نے اب للّی کی دردناک موت کو رونے کا بہانہ بنالیا تھا اور اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ رابعہ اور نازو اداس تھیں مگر رونے پر آمادہ نہ تھیں۔ میں سمجھتا تھا کہ گل پر رقت طاری ہونے کے اسباب میں سرِ فہرست محسن ہے جس کی طرف سے وہ اندیشہ ہائے دور و دراز کا شکار ہے، اور یہ سب اس کی محبت کی ون وے ٹریفک کا نتیجہ تھا جس کو میں معاشرے کا کانسٹیبل بن کر کنٹرول نہیں کرسکتا تھا۔

باتصویر فیچر کو میں نے بھی پڑھا۔ اس میں واردات کی تفصیل کے ساتھ کرائم رپورٹر نے زیبِ داستاں کے لیے بہت کچھ بڑھا دیا تھا اور نمک مرچ لگا کے متعدد ممکنات اور ناممکنات پر روشنی بھی ڈالی تھی۔ اس میں للّی کی داستانِ ماضی کے کچھ حوالے تھے اور اس کے بارے میں چند قریبی جاننے والوں کے تاثرات تھے۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ ایک معمولی عورت کے بارے میں جو میک اپ کرتی تھی، اتنا بڑا فیچر لگانے سے اخبار کو کیا فائدہ ہوگا۔ للّی کوئی بہت بڑی اداکارہ ہوتی۔ گلوکارہ ہوتی یا کسی اسکینڈل سے ہی منسوب ہوتی تو مشہور کہلاتی۔ مگر وہ گمنام عورت تھی۔ بمبئی کے شہر میں اس جیسی لاکھوں تھیں اور ہزاروں ایسی تھیں جن کو زمانہ للّی سے زیادہ جانتا تھا مگر وہ مر جاتیں تو ان کے بارے میں اتنی بڑی خبر نہ بنتی اور ایسا فیچر شائع نہ ہوتا۔

میں نے یہ بھی نوٹ کیا کہ فیچر میں راجکپور فیملی کے کسی فرد کے تاثرات شامل نہیں۔ للّی نے راج کپور کے پتا شری پرتھوی راج کا ذکر بڑی عقیدت کے ساتھ کیا تھا اور یہ بھی بتایا تھا کہ اس کی عزت پوری فیملی کرتی ہے۔ وہ آر کے اسٹوڈیوز میں بہرحال اہمیت رکھتی تھی لیکن کرائم رپورٹر نے آر کے اسٹوڈیو کا ذکر تک نہیں کیا تھا۔

پھر بات میری سمجھ میں آگئی۔ یہ فیچر نہیں ایک اشتہار تھا۔

اس کے لیے معاوضہ ادا کیا گیا ہوگا۔ للّی کی موت کی خبر کو پھیلانے اور زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کے لیے ٹائمز آف انڈیا کوئی مضمون نہ لکھتا۔ نہ یہ خبر ریڈیو سے نشر ہوتی اور نہ کسی اچھے اخبار میں نمایاں جگہ پاتی۔ ایک اخبار میں اس کے لیے جگہ بنائی گئی۔ اور وہ اردو کا اخبار تھا۔ اردو میں اسے ہم پڑھ سکتے تھے اور اس کا مقصد بھی ہمیں، ہی وہ سب کچھ پڑھوانا تھا جو مضمون میں غیر ضروری نظر آتا تھا۔

اخبار رکھ کے میں نے کہا۔ ”خوا۔۔۔تین۔ آپ تین ہیں اور میں اکیلا آپ سب کے آنسو نہیں پونچھ سکتا اور نہ سب سے گلے مل کے رو سکتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”سوائے۔۔۔“ میں نے رابعہ کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”خیر۔۔۔“

نازو ہنسنے لگی۔ رابعہ کا چہرہ لال ہوگیا۔

”اب گزارش اس فدوی کی یہ ہے۔“ میں نے کہا۔ ”کہ آپ لوگ کمرِ ہمّت کس لیں۔ مانا کہ آپ تینوں کی کمر اتنی کم ہے کہ بقول شاعر صنم سُنتے ہیں تیری بھی کمر ہے۔ کہاں ہے کس طرف کو ہے کدھر ہے۔ مگر پھر بھی آپ لوگ کمر باندھیں۔ کس لیے؟“ میں نے سر پر ہاتھ رکھ کے سوچنے کی اداکاری کی۔ ”یہ تو میں بھول گیا کہ کمر کسنے کے بعد کیا کرنا تھا۔“

گل ہنسنے لگی۔ میرا مقصد بھی ان کا موڈ شگفتہ رکھنا تھا۔ نازو اور رابعہ ہنسی کو دبانے کی کوشش میں مسکرا رہی تھیں۔

”ہاں۔ یاد آیا۔“ میں نے چٹکی بجا کے کہا۔ ”وہ کیا نام ہے تمہارا بی بی؟ رابعہ۔ مس رابعہ آپ نے ایک فارسی فیملی کا ذکر کیا تھا۔“

”فارسی نہیں پارسی۔“ رابعہ ہنسی۔

”ایک ہی بات ہے۔ پارس یا فارس۔“ میں نے کہا۔ ”اس پارسی فیملی کے اوصافِ حمیدہ کا بھی ذکر ہوا تھا۔ تو کیا یہ ممکن ہے کہ آپ واپس وہیں تشریف لے جائیں؟“

”کیا مطلب؟“ رابعہ نے مسکرانا چھوڑ کے کہا۔

”مطلب یہ کہ میری جان بخشی کریں۔ میں ہر رات اتنی باتیں نہیں کر سکتا اور اتنے ڈائیلاگ نہیں بول سکتا۔ اور بھی غم ہیں زمانے میں محبّت کے سوا۔“ میں نے کہا۔ ”جس دن میرا موڈ پھر رومانٹک ہوگا اور فرصت ہوگی مجھے تو میں آپ کو بلا لوں گا۔“

”دماغ خراب ہوگیا ہے تمہارا کیا؟“ رابعہ نے بگڑ کے کہا۔ ”میں کیوں واپس جاؤں۔ آپ خود چلے جائیں واپس وہیں۔ کراچی یا بھاڑ میں جائیں۔“

”بی بی! خفا کیوں ہوتی ہو۔“ میں نے عاجزی سے کہا۔ ”ہم بھاڑ میں ہی جانا چاہتے ہیں۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ آپ کی طرف سے کوئی فکر نہ ہو۔ اپنے ساتھ گل کو بھی لے جاؤ۔ تمہارا پتا دل پر نقش ہے میرے۔ جیسے ہی میں اور نازو فارغ ہوں گے۔۔۔“

”میں؟“ نازو نے گڑبڑا کے کہا۔

”جی آپ۔ آپ کو چلنا ہوگا میرے ساتھ۔ اُٹھا لیں اپنا سارا توپ خانہ۔ خنجر، تلوار، حُسن کی شمشیر۔ سب ساتھ لے کر چلیں اور سمجھ لیں کہ دوسروں کی جان ہتھیلی پر رکھ کے جانا ہے۔ ہتھیلی کے وار سے جان لینا یا تمہیں آتا ہے یا مجھے۔ چنانچہ میں ان دو نالائق۔۔۔ سوری۔ ان معزز۔۔۔ پھر سوری کیونکہ معزز تو تم بھی ہو۔ ان نازک قسم کی صرف طپنچہ چلانے والی یا زبان چلانے والی خواتین کے ساتھ نہیں جانا چاہتا۔“

”کچھ پتا بھی تو چلے کہ جانا کہاں ہے؟“ نازو نے کہا۔

”بھئی تم جاؤگی اپنے ان کو لینے، مرزا غالب کو۔ اور میں لے آؤں گا محسن کو۔ انھیں وہ ولن تریوینی اور دلاور اُٹھا کر لے گئے ہیں۔“ میں نے کہا۔

اس انداز سے ایک انکشاف کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ تینوں کچھ دیر ہکّا بکّا کھڑی رہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ بولنا شروع کرتیں، میں نے انھیں مختصر ترین الفاظ میں ساری بات بتادی۔ رابعہ بہت بگڑی اور گل نے بھی بُرا مانا کہ یہ بات بتانے سے پہلے میں نے اپنا رویّہ اتنا غیر سنجیدہ کیوں رکھا۔

”کمال ہے سکندر! کتنی بے فکری سے تم ہنسی مذاق میں لگے ہوئے ہو۔“ رابعہ نے کہا۔

”حد ہے بھائی سکندر۔ آپ ذرا سیریس نہیں ہیں۔“ گل نے بھی خفگی کا اظہار کیا۔

”بی بی گل! اور مس رابعہ! میرے سیریس ہونے یا نہ ہونے سے کتنا فرق پڑتا، یہ میں جانتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”کیا ہوتا اگر میں ہائے ہائے کرتا اُٹھتا اور سینہ کُوٹ کے دھاڑیں مار مار کے رونے لگتا۔“

”آپ نے اتنا وقت ضائع کردیا۔“

”کتنا وقت ضائع کردیا؟“ میں نے سنجیدہ ہو کے کہا۔ ”اور اس وقت میں کیا ہو سکتا تھا؟ ظاہر ہے اب جو کچھ کرنا ہے مجھے ہی کرنا ہے اور میرے سامنے مقصد بہت واضح ہے۔ میں ان دونوں کو چھڑا لاؤں گا۔ میں خود کو ان کے حوالے تو کرنے سے رہا۔ اُنھوں نے بڑے جال پھینکے ہیں میرے لیے۔ یہ جو اطلاع ہے ایک دوست کی طرف سے۔ ٹائمز آف انڈیا۔ یہ میرا دُشمن بھی ہو سکتا ہے۔ اس طرح مجھے للّی کی تدفین اور آخری رسوم میں شرکت کے لیے بلایا گیا ہے۔ مگر میں وہاں نہیں جاؤں گا۔ وہاں نازو جائے گی۔ جو وہاں ہوگا وہ میں کیا بتاؤں۔ اگر موقع ملا تو ہم بھی کسی کو اُٹھا لائیں گے ورنہ دیکھیں گے کہ کون کون آتا ہے۔ کسی سے تریوینی کے بارے میں معلوم کریں گے۔“

”لیکن نازو کو دلاور پہچانتا ہے۔۔۔“ رابعہ نے کہا۔

”نازو ماتمی لباس میں جلائے گی۔“ میں نے کہا۔ ”چہرے پر کالا جالی دار نقاب ڈالے۔“ میں نے کہا۔ ”اور دوسری خواتین کے درمیان رہ کے جائزہ لے گی کہ دلاور ہے یا نہیں۔ میں اس جگہ سے دور مگر نازو کے قریب ہی موجود رہوں گا۔ اس کے علاوہ میرا ارادہ راج کپور فیملی سے مدد لینے کا بھی ہے۔“

”ان کو کہاں فرصت ہوگی۔ اور وہ کیوں کریں گے تمہاری مدد؟“ رابعہ نے کہا۔

”میں کوشش ضرور کر کے دیکھوں گا۔“ میں نے کہا۔ ”اس کام میں بھی نازو میرا ہاتھ بٹائے گی۔“

”میں بھی ساتھ چلوں گی۔“ گل نے کہا۔

”تم ابھی فِٹ نہیں ہو۔“ میں نے کہا۔

”میں بالکل فِٹ ہوں۔“ اس نے ضد کی۔ ”میں مردانہ کپڑے پہن کے جاؤں گی۔“

”گل بی بی! ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں۔ تم کو بہت مواقع ملیں گے اپنی ہمّتِ مردانہ سے کام لینے کے۔ لیکن ابھی اس کی ضرورت نہیں۔ ساری فوج کو ایک دم محاذ پر نہیں جھونک دیا جاتا۔ ریزرو دستے پیچھے تیار رہتے ہیں۔ تم بھی تیار رہنا۔ ہم کسی وقت بھی آجائیں گے۔ یا بلالیں گے۔“

رابعہ نے کہا۔ ”کیسے بلالوگے؟“

میں نے کہا۔ ”تمہارا پتا یاد ہے مجھے۔ فون نمبر بھی دے دو۔ اور ہاں، یہ بتاؤ کہ نقد رقم اب کتنی ہے تمہارے پاس؟“

”وہ۔۔۔ ایک لاکھ۔۔۔ ایسے ہی پڑے ہوئے ہیں۔“

”جزاک اللہ۔ آپ بولو بی بی۔“ میں نے پیشہ ور چندہ جمع کرنے والوں کی طرح کہا۔ ”دس ہزار میرے سمجھو۔ پانچ تمہارے پاس تھے اور پانچ گل کے پاس۔ یہ ہوئے ایک لاکھ بیس ہزار۔“

”پانچ پانچ ہزار ڈالر بھی ہیں۔ ہم سب کے پاس۔“ نازو نے مجھے یاد دلایا۔

”ماشاء اللہ! اس فقیر کے پاس ڈالر نہیں رہے۔ سب لُٹ گیا۔ خزانہ۔“ میں نے کہا۔ ”یہ ہوئے پندرہ ہزار ڈالر۔ چلو اب یوں کرو کہ ڈالر تو دے دو مجھ فقیر کو۔ تم لے جاؤ سوا لاکھ اپنے ساتھ اور کوشش یہ کرو کہ اس رقم سے کہیں کوئی عارضی ٹھکانا مل جائے۔ پگڑی چلتی ہے یہاں ۔۔۔۔۔۔ پگڑی پر ایک کمرا بھی ملے تو لے لو جس میں فون ہو۔ بمبئی میں کوئی نہیں پوچھتا ذات حولے۔ اکیلی عورتیں بہت رہتی ہیں۔ خود کو جو چاہو کہو۔ سب سے آسان یہ کہنا ہے کہ فلموں میں کام کرنے آئی ہوں۔ یا کرتی ہوں۔ ایکسٹرا ہوں۔“

”کیا میں ایکسٹرا لگتی ہوں؟“ رابعہ نے سخت بُرا مان کے کہا۔

”تم ایکسٹرا آرڈینری لگتی ہو۔“ میں نے کہا۔ ”بیوٹی فل۔ لیکن کیا ہے کہ بمبئی میں چانس کی بات ہے۔ سو تم کو بھی چانس نہیں ملا۔ کوئی تم سے نہیں پوچھے گا کہ کیوں نہیں ملا اور نہیں ملا تو گھر کا بھاڑا کون دیتا ہے اور خرچہ کدھر سے پورا ہوتا ہے۔ کوئی نہیں پوچھے گا کہ کہاں سے آئی ہو اور کب آئی ہو۔ اوّل تو ہم ساتھ ہی ہوں گے مگر ساتھ نہ ہوں تو ڈرنا نہیں۔ ہم آجائیں گے بعد میں۔ تم کوئی بھی چھوٹا موٹا فلیٹ لے کر آباد ہو جانا۔“

”سوا لاکھ پھنسا دیں؟ کیا مستقل رہنا ہے یہاں؟“

”نہیں۔ مستقل کون رہ سکتا ہے دُنیا میں۔ ہم بھی مہمان ہیں۔ یہ جگ رین بسیرا بندے نہ تیرا نہ میرا۔“ میں نے کہا۔ ”پگڑی پر فلیٹ لیں گے تو پگڑی پر اُٹھا کے جب چاہیں گے رختِ سفر باندھ لیں گے۔ مگر ابھی تو جگہ چاہیے۔ اس پارسی فیملی کی نیکی کو ان کے لیے سزا بنانے سے کیا فائدہ۔ للّی کے انجام سے عبرت پکڑو۔ اپنا ٹھکانا الگ بناؤ تاکہ جو مصیبت ہم پر نازل ہو اس سے دوسرے محفوظ رہیں۔ رابطے کے لیے فون ہونا ضروری ہے۔ نہ ملے تو مجبوری۔“

میرے ذہن میں پوشیدہ خوف کا ایک اور پہلو بھی تھا جس کو میں نے خواتین کے سامنے لانے سے گریز کیا۔ مجھے یہ خیال جلد از جلد یہاں سے نکل جانے پر اکساتا تھا کہ کہیں محسن اور غالب کو لے جانے والے پھر نہ آجائیں اور دوسرے پھیرے میں ایم آر ایس کے پسماندگان کو نہ سمیٹ لیں۔ اپنی غلطی کا اندازہ تو انھیں ہو ہی گیا ہوگا کہ جسے وہ امیر چند یعنی سکندر بخت سمجھ کے اُٹھا لائے ہیں وہ درحقیقت اس کے روپ میں محسن ہے۔ یہ فرق دلاور محسوس کرے گا اور کارکردگی کے اس مظاہرے پر انعام کی توقع رکھنے والوں کو شرمندہ لوٹنا پڑے گا۔ دلاور کہے گا کہ ”جاؤ، وہیں دیکھو، تمھیں دوسرے بھی مل جائیں گے۔“ یہ تو تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا کہ محسن یا غالب انھیں کچھ بتائیں لیکن ایک چھوٹی کامیابی ان کو بڑی کامیابی کے لیے حوصلہ دے گی۔ وہ زیادہ تیاری کے ساتھ واپس آئیں گے اور اس علاقے کی ناکابندی کردیں گے۔

میرا خیال یہ بھی کہتا تھا کہ جب تک ہم محفوظ ہیں، محسن اور غالب بھی محفوظ ہیں۔ اور ان کو اغوا کرانے والے اس وقت تک خود کو غیر محفوظ سمجھنے پر مجبور ہوں گے جب تک وہ ایم آر ایس کی قوت کو بالکل ختم کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے۔ میں چاہتا تھا کہ ان کے لیے خطرے کے احساس کی شدّت کو بڑھا دوں۔ اس حد تک کہ وہ بھی اپنے آپ کو میری دسترس سے دور رکھیں اور میرے سامنے نہ آئیں۔

گل اور رابعہ کی تیاری مکمل ہو گئی تو میں نے ان سے پہلے نکل جانے کو کہا اور پھر تاکید کی کہ وہ اپنی حفاظت کے خیال سے غافل نہ ہوں۔ جب تک ہم ان سے پھر رابطہ قائم نہیں کرتے، وہ اسی گھر میں رہیں جہاں رابعہ رہ رہی تھی۔ یہ نہ ہو کہ وہ گھبرا کے ہماری تلاش میں نکل کھڑی ہوں اور جب ہم جائیں تو پتا چلے کہ وہ خود گم ہو چکی ہیں۔ گل کی صحت اب تقریباً ٹھیک ہو چکی تھی۔ اس کے زخم مندمل ہونے لگے تھے اور امید کی جا سکتی تھی کہ دو چار دن علاج اور آرام جاری رہا تو وہ بالکل پہلے جیسی صحت مند ہو جائے گی۔

"کیا خیال ہے اب ہم بھی چلیں؟" نازو نے کہا۔

"میں سوچ رہا ہوں کہ بعد میں محسن یا غالب میں سے کوئی یہاں آیا تو کیا ہوگا؟ فرض کرو انھیں کوئی موقع مل گیا یا تائیدِ ایزدی سے کوئی قید سے فرار ہونے میں کامیاب رہا۔ تو یہاں کوئی بھی نہیں ہوگا۔"

نازو نے کہا۔ "پھر کیا کریں؟ پیغام چھوڑ جائیں۔"

"ویسے تو حاجی صاحب کے پاس میں نے پیغام چھوڑ دیا ہے۔ مگر کیا حرج ہے اگر اس لانچ کے لینڈ لارڈ یا دوسرے کسی مکین کو بتا جائیں کہ ہم سے رابطے کے لیے رابعہ کے پتے پر رجوع کیا جائے۔ رابعہ نے اپنا فون نمبر بھی دیا ہے۔"

نازو نے کہا۔ "کیوں اس گھر کا پتا بتلاتے ہو کسی کو جو ابھی تک محفوظ ہے۔ غالب یا محسن کے علاوہ بھی تو کوئی آ سکتا ہے ہماری تلاش میں یہاں۔"

میں نے قائل ہو کے سر ہلایا۔ "چلو رہنے دو۔ حاجی صاحب کا پتا کافی ہے۔"

"تم نے ابھی تک بتایا نہیں کہ جانا کہاں ہے؟"

"تم... کیا تم ضرورت سے زیادہ خوبصورت نہیں ہو؟... مس نازو۔" میں نے کہا۔

"یہ کون سا موقع ہے...؟"

"موقع محل تو دیکھنا پڑتا ہے۔ اس چہرے اور حلیے کے ساتھ تم جس راستے سے گزرو گی نگاہوں کو خیرہ کرو گی۔ لوگ سر گھما گھما کے اور دیدے پھاڑ پھاڑ کے دیکھیں گے۔"

"پھر کیا کروں میں؟ برقع اوڑھ لوں؟" نازو چڑ کے بولی۔

"بمبئی شہر فلمی ستاروں کی کہکشاں ہے اور اس اعتبار سے پریوں کا نگر ہے کہ یہاں سارے ہندوستان کا حسن خود کھنچ کر آ جاتا ہے۔ ورنہ حسن شناس کھینچ لاتے ہیں۔ یہاں وہ جوہری ہیں جن کی نگاہ ہمہ وقت کسی جوہرِ نایافت کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہے۔ میری مراد اُن فلم سازوں سے ہے جو نیا چہرہ متعارف کرانے کے لیے خوب سے خوب تر کی جستجو کو اپنی کامیابی کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ کیا تم میری بات کا مطلب سمجھ رہی ہو؟"

"ابھی تک تو نہیں سمجھی۔" نازو نے کہا۔

"مجھے بھی یہی امید تھی۔ عقل کی بات ہے نا۔" میں نے کہا۔ "اب ایک بات اور عرض کرتا ہوں جو تمھیں بے محل لگے گی اور ممکن ہے اس کا غلط مطلب نکال کے تم بے سروپا باتیں بھی کرنے لگو۔ لیکن میں دور اندیشی کو حالات کا تقاضا سمجھتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے نازو کہ اس وقت جو خواتین فلمی اُفق کے روشن ترین ستاروں میں شامل ہیں اور اپنے حسنِ بے مثال کی جلوہ سامانی سے کروڑوں پرستاروں کے دلوں پر قیامت ڈھاتی ہیں، وہ کچھ بھی نہیں۔"

"کچھ بھی نہیں کا مطلب یہ کہ آپ کی نظر میں...۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں ایک حقیقت بیان کر رہا تھا عزیزہ۔ وہ تمھارے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ ذرا سُن لو، خفا بعد میں ہونا۔ وہ پردۂ اسکرین کی بجلیاں جو سات سے ستر برس کے ہر فرد کے دل کی دھڑکن بنی ہوئی ہیں، پچاس فیصد حسن ضرور رکھتی ہیں۔ باقی پچیس فیصد کمال ہے میک اپ کا اور پچیس فیصد کیمرے کی آنکھ کا جو ذرّے کو آفتاب کر کے دکھاتی ہے۔ بلکہ اصل حسن وہی ہے جو کیمرہ مین پیش کرتا ہے۔ چہرے فوٹو جینک ہوتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم ان سب کے مقابل آ جاؤ تو ان فلمی ستاروں کی چمک دمک اسی طرح ماند پڑ جائے جیسے...۔"

"جیسے چاند کے سامنے ستاروں کی روشنی ماند پڑ جاتی ہے۔" نازو نے میری بات کاٹ دی۔ "میں سمجھ گئی۔ لیکن...۔"

"لیکن کیا۔ تم خاک بھی نہیں سمجھی ہو میری بات کو۔"

"تم کیا چاہتے ہو میں فلموں میں کام کرنے لگوں؟ تمھارے ساتھ چلی جاؤں اسکرین ٹیسٹ دینے کے لیے؟" نازو نے بگڑ کے کہا۔

"پھر میں کہوں گا ناقص العقل تو تمھیں سچ کڑوا لگے گا۔ ارے بابا! میرا کیا دماغ خراب ہے کہ تم کو ہیروئن بننے کا مشورہ دوں، ہم یہاں فلمی دُنیا میں تہلکہ مچانے آئے ہیں؟ تم سے پہلے تو میں رابعہ سے کہہ سکتا تھا یہی بات۔ لیکن میں تو تمھیں بچانا چاہتا ہوں۔ ابھی ہم یہاں سے نکلیں گے تو آر کے اسٹوڈیو جائیں گے۔ وہ فلمی دُنیا کا ایک برِاعظم ہے۔ قدم قدم پر تم کو حسن کے شکاری جال پھیلاتے نظر آئیں گے۔ خود راج کپور فیملی پتھر کو ہیرا بنا دینے کا ہنر جانتی ہے اور تم تو پہلے ہی ہیرا ہو۔ تم کو ان سب سے بچ کے رہنا ہوگا۔"

"تم میری فکر مت کرو۔ اپنی حفاظت میں خود بھی کر سکتی ہوں۔" نازو نے تلخی سے کہا۔ "تم کیا سمجھتے ہو کہ اچانک بمبئی کے پروڈیوسر کنٹریکٹ بغل میں دبا کے لائن لگا لیں گے؟"

"ان کے ایجنٹ ضرور تمھارے پیچھے لگ سکتے ہیں۔ تم جتنا چاہو بچو۔ شہرت سے کیسے بچو گی؟ جو خود بخود ہوگی۔ جہاں بھی تم جاؤ گی پرکھنے والے تم کو پرکھ لیں گے کہ ان کے لیے تم چلتا پھرتا خزانہ ہو۔ کامیابی کی کنجی ہو۔ تم فلمی دُنیا میں قدم رنجہ فرما کے وحیدہ رحمان کا مستقبل تاریک کر سکتی ہو۔ کیا تمھیں معلوم ہے کہ تم وحیدہ رحمان سے کافی مشابہت رکھتی ہو۔"

"مجھے وحیدہ رحمان سے کوئی دلچسپی نہیں اور اس سے دُشمنی بھی نہیں۔" نازو نے کہا۔ "اب شہرت ہوتی ہے تو ہوا کرے۔ جو میرے پیچھے آئے گا ہڈیاں تڑوا کے جائے گا۔"

"ہاں۔ یہ ہوئی نا بات۔" میں نے کہا۔ "اس سے کیا ہوگا بھلا۔ تمھاری شہرت کو چار چاند لگ جائیں گے۔ دھوم مچ جائے گی کہ کیا چھوکری آئی ہے۔ اس لفظ کا بُرا مت ماننا۔ یہاں یہی مستعمل ہے۔ ایک دم فٹ۔ اور حسن ایسا بمباٹ۔ ارے بابا فلم میں ڈالے تو ایک دم سُپر ہٹ۔ باکس آفس کا ریکارڈ ٹوٹ جاوے۔ تمھاری یہ شہرت تمھارا بمبئی میں رہنا محال کر دے گی۔"

"پھر میں کیا کروں؟ یہ بھی بتا دو۔ اپنی صورت تو میں بگاڑنے سے رہی۔"

"یہ کون کمبخت چاہے گا۔ میں تو چاہتا ہوں کہ تم اس سے پورا فائدہ اُٹھاؤ۔ وہ فائدہ جس میں ہم سب کا فائدہ ہو۔ ہم اب چلتے ہیں۔ ہمیں تریوینی کا پتا معلوم کرنا ہے۔ تم کو تھوڑا سا میک اپ کرنا ہوگا۔ ایک تو یہ شلوار قمیص چھوڑ کے ساری باندھو۔"

"ساری تو میں نے کبھی نہیں باندھی۔"

"اب باندھو۔ ایک دم انڈین اسٹائل میں... ساری ہم راستے میں لے لیں گے۔" میں نے کہا۔ "ماتھے پر لگا لو بندیا۔ بالوں میں گجرے۔"

"میں یہ سب نہیں کر سکتی۔"

"تم کو وہی کرنا ہوگا جو میں کہوں گا۔ اور نہیں کرنا تو تم بھی جاؤ رابعہ کے ساتھ گھر بیٹھو۔ میں گل کو لے جاتا ہوں۔ وہ خود سر تو نہیں ہے تمھاری طرح۔" میں نے برہمی سے کہا۔ "ایسے تو کچھ نہیں ہوگا اگر ہر معاملے میں بحث اور دلائل کا سلسلہ شروع ہو گیا۔"

یہ دھمکی کام کر گئی۔ نازو کچھ شرمندہ نظر آنے لگی۔

"لعنت بھیجتا ہوں میں بھی اس فلمی دُنیا کی دلدل پر جس میں ہر سال سیکڑوں شریف گھروں کی لڑکیاں اپنی عزت ڈبو دیتی ہیں۔" میں نے کہا۔ "میرا مشن کچھ اور ہے۔ یہ تو ہم پھنس گئے ہیں یہاں۔ ہمیں آگے جانا ہے۔"

"آئی ایم سوری۔" نازو نے کہا۔

میں نے وہ مشین گن اُٹھا لی جو وائلن کے کور میں تھی۔ "تم ایک ہندو لڑکی بن کے میرے ساتھ چلو گی۔ میں تم کو اپنی دھرم پتنی کہوں گا۔ میری بات پر یقین کسی کو نہیں آئے گا۔ فلمی دُنیا میں داخل ہونے کے لیے جو بھی آتا ہے اپنے ساتھ کوئی نہ کوئی حسین سہارا رکھتا ہے اور ایسا ہی بدصورت جھوٹ بولتا ہے۔ یہ لوگ جانتے ہیں کہ حقیقی میاں کبھی اپنی بیوی کو فلم نگری کے ہوس پرست بھیڑیوں کے سامنے لا کر نہیں ڈالتا۔ وہ گھر سے بھاگے ہوئے لوگ ہوتے ہیں۔ یا محض مرد اور عورت۔ مرد ہوتا ہے ایجنٹ جو کامیابی کی صورت میں تمام مالی مفادات کی نگرانی کرتا ہے اور اپنی سونے کا انڈا دینے والی مرغی کی حفاظت کرتا ہے۔ یہی مجھے بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ ڈونٹ مائنڈ آل دس۔ میں تریوینی کو تلاش کرنے کے لیے اور اس کی طاقت کا مقابلہ کرنے کے لیے خود کو کافی نہیں سمجھتا۔ مجھے کسی بڑی طاقت کی پشت پناہی بے غرض حاصل نہیں ہو سکتی۔ غرض مند کو تم مجبور کر سکتی ہو کہ اپنی طاقت اور اپنے وسائل تمھارے قدموں میں ڈال دے۔ کیا تمھاری سمجھ میں آ رہی ہے بات؟"

نازو نے اقرار میں سر ہلایا۔ "میں کون ہوں؟ پہلے کیا کرتی تھی؟ کہاں سے آئی ہوں؟"

میں نے خوش ہو کے کہا۔ "فرض کرو کہ میرا نام ہے... ہیرا لال اور تم ہو... بندیا۔ کیسا نام ہے؟"

"ایک دم فلمی۔"

"تم آگرہ میں پڑھتی تھیں۔ بی اے میں۔ اداکاری کا شوق تھا۔ تم کو مجھ سے پریم ہو گیا اور ہم دونوں بیاہ کر کے بمبئی آ گئے۔ ہندی کے جتنے زیادہ الفاظ استعمال کر سکو اتنا بہتر۔" میں نے کہا۔

یہ سب نازو کو سخت ناپسند تھا مگر اس نے مجبوری میں میرے کہنے کے مطابق عمل کیا۔ اس کو ساری باندھنی نہیں آتی تھی۔ اس کام میں ایک بیوٹی پارلر کی خدمت حاصل کرنے سے سارے مسائل حل ہو گئے۔ بیوٹی پارلر کی مالک ایک خرانٹ عورت تھی۔ اس نے فوراً تاڑ لیا کہ ہم بمبئی میں نووارد ہیں۔ میں صورت سے احمق نظر آنے کی کوشش بھی کرتا رہا اور باتوں سے خود کو چغد بھی ثابت کرتا رہا۔

میں نے کہا۔ "یہ دھرم پتنی ہے ہماری۔ بندیا۔ اس کو بالکل وحیدہ رحمان بنا دو۔"

اس نے مجھے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا۔ "ہیرا لال! یہ تو ہم کرے گا۔ تم بولا ابھی اس چھوکری...۔"

"ہماری دھرم پتنی...۔"

"اچھا بابا! تمھارا دھرم پتنی کو ادھر فلم لائن میں کام مانگتا؟"

میں نے خوش ہو کے کہا۔ "اوش مانگتا۔ ہم اسی لیے تو آئے ہیں۔ آج ایک اسکرین ٹیسٹ ہے۔"

"اچھا؟ کدھر۔۔۔؟" وہ کچھ مایوس ہوئی۔

"راج کا مندر جانا ہے۔" میں نے کہا۔

"تم ہمارا بات مانے گا تو ادھر مت جاؤ۔ ہمارا پاس بوہت بڑا بڑا ڈائریکٹر، پروڈیوسر، ایکٹر لوگ آتا ہے۔ اپنا دلیپ کمار کا بال ہم سیٹ کرتا۔ کیسا ظالم ہیئر اسٹائل بنایا اس کا۔ اور بھی بوہت لوگ آتا۔ ہم ان کو بولے گا۔ وحیدہ رحمان کیا چیز ہوتا۔ یہ چھوکری۔۔۔"

"ہماری دھرم پتنی۔۔۔"

اس نے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔ "میرا لال! ایسا بار بار بولے گا تو کوئی چانس نہیں دے گا تیرے کو۔ بولو یہ سسٹر ہے ہمارا۔ کزن ہے۔"

"رام رام۔۔۔" میں نے کانوں کو چھو کے کہا۔ "ایسا پاپ۔۔۔ ہم نہیں کر سکتے۔"

وہ مجھے قائل کرنے کی کوشش کرتی رہی اور بندیا کو میرے خلاف اُکساتی رہی کہ تم اس کاٹھ کے اُلّو کو چھوڑ دو۔ تم تو ہو سونے کی چڑیا۔ اس کا تمہارا کیا میل۔ یہ تم کو کچھ نہیں کرنے دے گا۔ نازو بڑی معصومیت سے ہر بات میں کہتی رہی۔ "جو یہ کہیں۔ یہی میرے سوامی ہیں۔"

بالآخر اس کا حوصلہ جواب دے گیا۔ اس نے میک اپ کر کے نازو کو وحیدہ رحمان تو بنا دیا مگر مجھ پر واضح کر دیا کہ میں بہت بڑا احمق ہوں جو کسی چالباز کے جھوٹے وعدے پر اعتبار کر کے اپنی دھرم پتنی کو اسکرین ٹیسٹ کے لیے لے جا رہا ہوں اور مجھے بمبئی کے ہر احمق کے عبرتناک انجام سے بھی ڈرایا۔ "تمہارا سب کچھ لٹ جائے گا ادھر۔۔۔"

"اب تو اوکھلی میں سر دے دیا ہے ہم نے۔" میں نے کہا۔ "ہم کو پیسے بتاؤ۔"

اس نے دو سو روپے مانگے اور جب میں نے ڈالر نکالے تو اس کی صورت قابلِ دید ہو گئی۔ اسے یقیناً افسوس ہوا ہو گا کہ اس کام کے دو سو روپے کیوں مانگے۔ دو سو ڈالر کیوں نہیں کہے۔ بیوٹی کلینک کی ہر بد صورت ملازمہ اور وہاں آنے جانے والوں کی نظر کا میں نے بڑی دلچسپی سے مشاہدہ کیا تھا۔ لوگ نازو کی صورت آئینے میں دیکھتے ہی ٹھٹک کر رک جاتے تھے۔ جب میں اس کے ساتھ باہر نکلا تب بھی یہ ردِعمل مختلف نہ تھا۔ ساری نے اور میک اپ نے بلا مبالغہ نازو کے حسن میں محشر کی ساری فتنہ گری کے اسباب پیدا کر دیے تھے ـــــ خود میں نے بھی کھدر کا کرتا اور دھوتی اور پگڑی باندھ کے میں نے ایک سادہ لوح دیہاتی کی وضع قطع اختیار کر لی تھی۔

آر کے اسٹوڈیو کا میں نے صرف نام سنا تھا۔ بمبئی پہنچنے کے بعد یہ نام للّی کی زبان سے بھی سنا۔ وہ للّی اب اپنی آخری رسوم کے مراحل سے گزر رہی تھی۔ وہ جو تماشا دیکھنے والوں کے لیے صورتیں بناتی اور بگاڑتی تھی خود تماشا بنی کسی تابوت میں پڑی تھی اور شاید اس کی روح اس تماشا گاہِ عالم میں للّی کے دوستوں اور دُشمنوں کی مہربانیاں دیکھ رہی تھی۔ کون آتا ہے۔ کون نہیں آتا اور کون کس کے لیے آتا ہے۔

آر کے اسٹوڈیو میں روزمرہ کے معمولات کے مطابق کام جاری ہو گا۔ فلموں کی شوٹنگ للّی کی وجہ سے ایک منٹ کے لیے بھی نہیں رکی ہو گی۔ کسی کا سنگِ دل متاثر نہیں ہوا ہو گا۔ کسی میک اپ روم میں کسی نے شکایتاً کہا ہو گا کہ آج للّی کہاں مر گئی۔ اور جواب میں کسی نے کہا ہو گا کہ وہ سچ مچ مر گئی۔ مر گئی؟ کب؟ کیسے؟ اچھا چلو کسی اور کو بلاؤ۔ میک اپ تو ہو گا۔

اسٹوڈیو میں داخلہ امریکی ایوانِ صدر میں داخلے سے زیادہ مشکل کام تھا۔ مسلح گورکھے جو صورت سے پیشہ ور قاتل نظر آتے تھے اور ہر آنے جانے والے کو مشتبہ نظروں سے دیکھتے تھے، بار بار گیٹ کھولتے تھے تو راستہ صاف کراتے ہوئے بہت شور مچاتے تھے۔ مشتاقانِ دید کا اجتماع الگ تھا جو اندر سے آنے والی ہر کار میں راج کپور یا ششی کپور کو دیکھنا چاہتے تھے یا کسی بھی نامور ہیروئن کو۔ فلم میں کام تلاش کرنے اور مقدر آزمانے کے شوقین لڑکے لڑکیاں الگ تھے جو مختلف حیلوں حوالوں سے منت سماجت سے یا زر اور زور سے اندر داخلے کی اجازت چاہتے تھے مگر گورکھے بہت سخت مزاج اور ٹس سے مس نہ ہونے والے تھے۔ وہ بہت تنگ آ جاتے تھے تو ہاتھ جوڑتے تھے کہ بابا! ہماری نوکری کے پیچھے کیوں پڑے ہو۔

یہ صورتِ حال میرے لیے قدرے غیر متوقع تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ للّی کے حوالے سے راج کپور یا اس کے باپ تک پہنچ سکا تو ان کو بتاؤں گا کہ للّی کا قاتل کون ہے اور ان سے کہوں گا کہ تریویدی تک پہنچنے میں میری مدد کریں۔ لیکن وہاں کوئی سننے والا ہی نہ تھا۔ گاڑیاں آتی تھیں اور زن سے گزر جاتی تھیں۔ گیٹ کھلتا تھا اور پھر بند ہو جاتا تھا۔ مجھے رشوت کی طاقت پر بڑا اعتماد تھا جو سارے بند دروازے کھلوانے میں ہمیشہ میرے کام آئی تھی مگر یہاں محافظ مجبور تھے۔ وہ رشوت لے کر کسی کو اندر جانے دیتے اور وہ گھس جاتا راج کپور کے آفس میں تو محافظ کو کھڑے کھڑے نوکری سے برخواست کر دیا جاتا۔ یہ رسک کوئی بھی نہیں لے سکتا تھا۔ گورکھا اپنی جگہ سے ایک انچ ہٹ کے میری بات سننے کے لیے تیار نہ تھا۔

خود نازو پریشان تھی کہ اس طرح ہم کب تک خوار ہوں گے اور ایسے خوار ہونے کا فائدہ کیا۔ پھر اچانک ایک ایسی بات ہوئی کہ دروازہ ہمارے لیے کھل گیا۔ دو افراد اندر سے پیدل چلتے ہوئے آئے اور چھوٹے دروازے سے باہر آ گئے۔ ان کے ہاتھ میں وہی اُردو کا اخبار تھا جو میں نے دیکھا تھا۔ وہ صفحہ موڑ کر للّی کی تصویر دیکھتے ہوئے آ رہے تھے اور شاید اسی کے بارے میں بات بھی کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک کا چہرہ مجھے جانا پہچانا لگا۔ حافظے نے بروقت میری مدد کی اور میں نازو کو وہیں چھوڑ کے ان کے پیچھے لپکا۔ وہ ایک موسیقار تھا۔ اس نے بہت کم فلموں میں موسیقی دی تھی لیکن وہ موسیقاروں میں اپنا ایک مقام رکھتا تھا۔ اس کی پرانی فلموں کے بہت سے گانے سپرہٹ ہوئے تھے۔

اس کے بالکل قریب پہنچ کے میں نے کہا۔ "جناب! ایک بات سن لیں میری۔ کوئی نہیں سن رہا۔ آپ اتنے بڑے موسیقار ہیں۔"

وہ رک گیا۔ اس نے خاصے تلخ لہجے میں کہا۔ "میں ایک بڑا موسیقار۔۔۔ تھا۔ مجھے تو حیرت ہے کہ تم نے مجھے پہچان لیا۔"

"آپ کو بھلا کون نہیں پہچانتا۔" میں نے کہا۔ "کیا سُندر سنگیت دیا تھا آپ نے۔" میں نے اس کی چند فلموں کے نام لیے۔

"وہ پرانی بات ہو گئی۔ اب میں جھک مارتا ہوں۔ اندر گیا تھا بڑی مشکل سے لیکن دُنیا بدل گئی ہے۔"

"چھوڑیں سجاد صاحب! دل چھوٹا مت کریں۔" دوسرے شخص نے کہا اور پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "کیا بات ہے؟ بولو۔"

میں نے کہا۔ "مجھے اس کے بارے میں بات کرنی تھی۔" میں نے للّی کی اخباری تصویر کی طرف اشارہ کیا۔

"للّی کے بارے میں۔۔۔ کیا بات کرنی تھی۔ اور کس سے؟"

"راج صاحب سے یا ان کے پتا جی مل جاتے تو اچھا تھا۔ شری پرتھوی راج۔۔۔" میں نے کہا۔ "للّی نے ان کا ذکر کیا تھا۔"

وہ شخص میری بات سے محظوظ ہوا۔ "ذکر تو سب ہی کرتے ہیں ان کا۔ مگر دیکھو بھیّا۔ ان سے کوئی بھی ایسے نہیں مل سکتا۔ مجھے بتاؤ کیا بات ہے؟"

"پھر آپ ملوا دو گے ان سے؟" میں نے کہا۔

"نہیں بھائی۔ نہ میں وعدہ کر سکتا ہوں اور نہ کوشش۔"

"کوشش بھی نہیں کر سکتے تو پھر کیا فائدہ۔" میں نے کہا۔ "وہ مر گئی۔ اب کون سنے گا اس کی بات۔"

"بات سن رہا ہوں میں۔ ایسی کوئی بات ہو گی تو۔۔۔ میں کچھ کروں گا۔ کسی سے کہوں گا۔ پھر بھی یہ بہت مشکل ہے۔" وہ بولا۔ "میں اسی جگہ کام کرتا ہوں جہاں للّی کام کرتی تھی۔"

"اچھا۔ تو آپ اکیلے میں سن لو میری بات۔" میں نے کہا۔

موسیقار سجاد نے سخت بُرا مانا۔ "ہاں بھئی۔ میں اب نا قابلِ اعتبار جو ہو گیا ہوں، ایسے جاہل گنواروں کے لیے بھی۔ میں چلتا ہوں۔"

دوسرے شخص نے افسوس سے سر ہلایا۔ "اس آدمی کو خراب کیا اس کی زبان نے۔ سب کو دُشمن بنا لیا اپنا۔ خیر اب بتاؤ۔"

"بات یہ ہے جناب۔۔۔" میں نے کہا۔ "کہ للّی کو قتل کیا گیا ہے۔"

اس نے مجھے غصّے سے دیکھا۔ "حد ہو گئی۔ یہ بات کہنے کے لیے۔۔۔"

میں نے جلدی سے کہا۔ "یہ بات نہیں۔ بات یہ ہے کہ میں۔۔۔ میں جانتا ہوں اس کو کس نے قتل کیا ہے۔"

اس نے مجھے ایسے دیکھا جیسے میری دماغی حالت کے درست ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں فیصلہ کرنا اس کے لیے دُشوار ہو گیا ہے۔ پھر اس نے کہا۔ "تم یہ بات جانتے ہو تو پولیس کو بتاؤ۔"

میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ "یہ بات کہنا تو بہت آسان ہے۔ میں آپ کو قاتل کا نام بتا دوں تو کیا آپ چلے جاؤ گے پولیس کے پاس؟"

اس نے میرے پیچھے کھڑی ہوئی نازو کو غور سے دیکھا۔ "کون ہے وہ؟ تم نے کیسے جان لیا کہ وہی قاتل ہے؟"

"دیکھو جی۔ آپ بھی کچھ نہیں کر سکتے۔ میں نے جو بات آپ سے کی اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ پولیس مجھے اور آپ کو پھانسی گھاٹ پہنچا دے گی اگر میں نے وہ نام لیا اور آپ نے پولیس کو بتایا۔ ہاں، راج صاحب کا پولیس کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔"

"تمہارا دماغ خراب ہے۔ راج صاحب کیا فالتو بیٹھے ہیں ایسی باتیں سننے کے لیے۔ وہ میری استاد تھی۔ مجھے میک اپ کرنا سکھایا تھا اس نے۔ مجھے بہت دُکھ ہے اس کی موت کا۔ لیکن۔۔۔"

"لیکن کو چھوڑو۔ دُکھ ہے اس کے مارے جانے کا تو میری مدد کرو۔ میں قاتل پر ہاتھ ڈال سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں یہاں اسی لیے آیا تھا مگر کوئی میری بات تک سننے کو تیار نہیں۔ میں کہتا ہوں ایک بار اندر جا کے کسی سے بات تو کرو۔ میں نے تم سے کہا۔ تم کسی اور سے کہو۔ کانوں کان یہ بات راج صاحب تک پہنچ سکتی ہے۔ ان کے پتا تک پہنچائی جا سکتی ہے۔ وہ للّی کا بہت خیال رکھتے تھے۔"

وہ کچھ دیر مجھے اور نازو کو گھورتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔ "دیکھو مجھے دھوکا دینے کی کوشش مت کرنا۔ اندر جا کے اگر تم نے کہا نا کہ میں اس چھوکری کو۔۔۔"

"یہ دھرم پتنی ہے ہماری۔ بندیا"، میں نے کہا۔

"اور تمہارا کیا نام ہے؟"

"ہیرالال"، میں نے کہا۔ "اگر میں اندر جاکے کہوں کہ اس کو چانس دلوانے کے لیے جھوٹ بولا تھا میں نے۔ تو مجھے جوتے لگوا کے باہر کرا دینا۔"

وہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر چھوٹے دروازے سے گزر کے اندر گیا۔ اس نے گیٹ کے اندر جاتے ہوئے کمرے میں جا کے کسی سے بات کی اور چند منٹ کے بعد باہر آکے مجھے اشارہ کیا کہ میں چھوٹے گیٹ سے گزر کے آجاؤں۔ اس نے گورکھا چوکیدار کو بھی ہاتھ کے اشارے سے کہا کہ آنے دو۔

میں اور نازو ایک ایسی دُنیا میں داخل ہوئے جہاں کوئی بھی چیز اصلی نہیں لگتی تھی۔ ہر چیز کسی سیٹ کا حصہ نظر آتی تھی۔ ہر شخص اداکاری کرتا محسوس ہوتا تھا۔ مجھے آر کے پروڈکشن کی بہت سی فلمیں یاد آئیں۔ 'برسات' اور 'آگ' سے لے کر 'میرا نام جوکر' تک۔ میں ہونقوں کی طرح اس شخص کے پیچھے چلتے ہوئے چاروں طرف دیکھتا گیا کہ کہیں میری دیکھی ہوئی کسی فلم کا کوئی سین نظر آجائے مگر وہاں سب کچھ اجنبی تھا۔ اسٹوڈیوز سے پہلے ہی وہ شخص دوسری طرف چل پڑا۔ بہت خوبصورت پھولوں اور سبزہ زاروں کے سامنے کاریں کھڑی ہوئی تھیں اور یہ وہ حصہ تھا جہاں انتظامی امور کے دفاتر تھے۔ اس نے مجھے اور نازو کو ایک کمرے میں بٹھا دیا۔

میں نے باہر سے اس کی آواز سُنی۔ عملاً وہ اونچی آواز میں کسی سے کہہ رہا تھا۔ "یہ جو دو نمونے اندر رکھے ہیں میں نے، ان کو اِدھر اُدھر مت ہونے دینا۔ یہ نہ ہو کہ سالے پہنچ جائیں کسی سیٹ پر اور مصیبت میرے گلے پڑ جائے۔"

جواب میں کسی نے کہا۔ "ان کی تو۔۔۔" اور قہقہہ مار کے ہنسا۔ میں نے غصے کی ایک لہر کو اُٹھتے ہی دبا لیا۔

"کیا تم ایسے ہی کہہ دوگے راج کپور سے بھی؟" نازو نے کہا۔

"نہیں۔ فارسی میں کہوں گا۔ یا گاکے سناؤں گا"، میں نے کہا۔

نازو کا موڈ آف ہوگیا۔ "خود تو بنے ہو کارٹون۔ مجھے بھی تماشا بنا دیا۔ کیسے دیکھ رہے ہیں سب کمینے۔ ندیدے لوگ۔"

میں نے دانت نکال کے کہا۔ "ان کی نظر خراب معلوم ہوتی ہے مجھے۔ ابھی تک کسی نے تمہیں وحیدہ رحمان نہیں سمجھا۔"

"وحیدہ رحمان کے ساتھ ہوگا دلیپ کمار۔ کوئی ہیرا لال یا کھیرا لال نہیں۔"

"میں یہ ثابت کر چکا ہوں کہ میری اداکاری کا معیار کسی طرح بھی ان سے کم نہیں جو اپنے نام کا سکہ چلاتے ہیں۔ رہ گئی صورت تو ماشاءاللہ لاکھوں میں ایک ہوں۔ تم تو ہو نقلی۔ اصلی وحیدہ رحمان

دیکھ لے تو پٹ سے گرے بے ہوش ہو کے۔"

"ہاں۔ سُنا ہے بہت بزدل ہے۔ جن بھوت سے ڈرتی ہے۔"

جو شخص ہمیں اندر لایا تھا وہ ایک خاصے خطرناک قسم کے باکسر ٹائپ شخص کے ساتھ نمودار ہوا۔ اس کا رنگ کالا تھا اور جسم بے ڈول۔ رہی سہی کسر چیچک کے داغوں نے پوری کر دی تھی۔ سگریٹ کا دھواں نتھنوں سے خارج کرتے ہوئے اس نے میرا اور نازو کا ایسے جائزہ لیا جیسے تفتیش کا آغاز کرنے سے پہلے تھانیدار ملزم کو دیکھتے ہیں کہ اس پر کتنی محنت درکار ہوگی۔

"یہ پرتھوی راج کی گاڑی چلاتے ہیں"، اس شخص نے کہا جو ہمیں اندر لانے کا ذمّے دار تھا۔ اس نے پیچھے سے مجھے اشارہ کیا کہ احتراماً مجھے کھڑا ہو جانا چاہیے۔ جب میں بیٹھا رہا تو اس نے دانت پیس کے زیرِ لب کچھ کہا۔

"ہیرالال، یہ کیا معاملہ ہے؟" شوفر صاحب نے کہا۔ "تم نے کیسے دیکھ لیا للّی کے قاتل کو؟"

میں نے کہا۔ "جو بات مجھے راج صاحب کو یا ان کے پتا کو بتانی ہے وہ میں کسی اور کو نہیں بتا سکتا۔ جانے کو میں پولیس کے پاس بھی چلا جاتا مگر مجھے اپنی زندگی عزیز ہے اور اپنی گھر والی کی عزت۔"

نازو نے سخت ناپسندیدگی کا اظہار مجھے گھور کے کیا۔

"تم مجھے نشے میں تو نہیں لگتے"، شوفر نے سوچ کے کہا۔ "لیکن ایک بات اچھی طرح سمجھ لو بیٹا ہیرالال۔ اندر آنا جتنا مشکل ہے، باہر جانا اس سے زیادہ مشکل ہے۔ جاؤ گے تو اسٹریچر پر یا ایمبولینس میں اگر یہ بات جھوٹ ہوئی۔ پرتھوی جی خود پریشان ہیں صبح سے۔ جب سے یہ خبر سنی ہے۔ میں تم کو ان کے آفس میں لے چلتا ہوں۔ پہلے ان کے سیکریٹری سے بات کرلو۔ اس کی مرضی ہے آگے۔"

"کہ اسٹریچر پر واپس کرے یا ایمبولینس میں"، میں نے کہا۔

اس نے مجھے خوں آشام نظروں سے گھورا لیکن کچھ بولا نہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ صورت کا جتنا بُرا ہے دل کا اتنا بُرا نہیں ہے۔ ہمیں اس مقام تک پہنچانے والا سخت مایوس تھا کہ ہم نے اسے اتنا غیر اہم سمجھ کے نظرانداز کر دیا۔ ہم اس کا شکریہ ادا کیے بغیر شوفر صاحب کے پیچھے چل پڑے۔ اس سے پہلے ہم نے شوفر کے لیے اس کی خواہش کے مطابق کھڑے نہ ہو کر بھی خاصی معیوب حرکت کی تھی۔

پرتھوی راج کے سیکریٹری کا آفس ہی اتنا شاندار تھا کہ میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ ان کا یہی ایک سیکریٹری نہیں ہے۔ مختلف معاملات مختلف سیکریٹری

طے کرتے تھے جو کسی حد تک منیجر بھی سمجھے جا سکتے تھے۔ شوفر صاحب نے سیکریٹری کے کان میں کچھ سرگوشی کی۔ بنگالی ٹائپ گنجے دھوتی پوش سیکریٹری کی آنکھیں ایک دم حلقوں سے باہر آنے لگیں اور مجھے اندیشہ لاحق ہوا کہ کہیں وہ چلّانے نہ لگے یا اسے دل کا دورہ نہ پڑ جائے۔

جب شوفر چلا گیا تو اس نے دراز سے کوئی گولی نکال کے مُنہ میں رکھی۔ پانی کا ایک گھونٹ پیا اور حلق سے گڑگڑ کی آواز نکالی۔ نازو نے مجھے اشارہ کیا کہ بلا رہے ہیں۔ گڑگڑ کی آواز انگریزی کا ایک جملہ تھا جو اس نے مرہٹہ لہجے میں بولا تھا۔ جب میں نے جواب میں انگریزی بولنا شروع کی تو گلاس اس کے ہاتھ سے نیچے گر گیا۔

ایک بار پھر مجھ سے میرے نام اور میرے ساتھ نظر آنے والی حسینہ کے رشتے کا سوال ہوا۔ پھر یہ پوچھا گیا کہ میں للّی کو کب سے اور کیوں جانتا تھا۔ اس کے قاتل کو میں جانتا ہوں تو میں نے صرف راج کپور اور ان کے پتا کو قابلِ اعتماد کیوں سمجھا، لوگ تو پولیس کو بتا دیتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

بنگالی سخت نروس ٹائپ شخص تھا مگر حُسن پرست بھی واقع ہوا تھا چنانچہ اس کے کان میری طرف تھے اور آنکھیں نازو کی طرف۔

"یہ تمہاری دھرم پتنی تو نہیں لگتی"، اس نے بالآخر شکوک کا اظہار کر دیا۔

"پھر کیا لگتی ہے۔ تمہاری دھرم پتنی؟" میں نے کہا۔

اس نے کہا۔ "تم مجھے وائلن بجانے والے بھی نہیں لگتے۔"

"میں تو ریڈیو بھی بجا سکتا ہوں"، میں نے کہا۔ "وائلن کیا چیز ہے؟"

اس نے مجھے گھور کے دیکھا۔ "اس میں کیا ہے؟"

میں نے وائلن کا کور کھول کے مشین گن نکال لی۔ "کیا ہے یہ؟"

بنگالی سیکریٹری نے ایک چیخ ماری جو پرانے کالے انجن کی وِسل جیسی تھی۔ وہ کھڑا ہو کے تھر تھر کانپنے لگا کچھ غصّے سے کچھ خوف سے۔ پھر اس نے ان سب پر چلّانا شروع کیا جو آنکھوں کے اندھے تھے اور مسلح قاتلوں، ڈاکوؤں اور دہشت گردوں کی جوڑی کو سیدھا اندر لے آئے تھے۔

اچانک درمیان والا دروازہ کھلا اور پرتھوی راج کا غصّے سے بھرا ہوا چہرہ نمودار ہوا۔ اس کے ماتھے پر گہری شکنوں کا جال تھا اور جلالی آنکھوں میں ایک سوال کہ یہ سب ہنگامہ کیسا ہے۔ بنگالی کے شور نے سب کو بوکھلا دیا تھا اور کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ سیکیورٹی کے قواعد کی ایسی زبردست خلاف ورزی

پر مالکان ان کے خلاف کیا اقدام کریں گے۔

"کیسا شور ہے یہ؟" پرتھوی راج نے اپنی بھاری رُعبدار آواز میں بنگالی کو مخاطب کیا مگر نگاہ مجھ پر اور نازو پر رکھی۔

میں نے براہِ راست مداخلت کی۔ "سر! ہم للّی کے قاتل کے بارے میں صرف آپ کو بتانا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ کہتے ہیں مت بتاؤ۔"

بنگالی نے ہڑبڑا کے کہا۔ "یہ۔۔۔ نہیں۔۔۔ ہم کب روکا؟"

میرا مقصد پورا ہوگیا تھا۔ پرتھوی راج آہستہ آہستہ میرے سامنے آکھڑا ہوا۔ اس کی عقابی نظریں بغور میرا جائزہ لے رہی تھیں۔ وہ یہ طے کرنے میں مصروف تھا کہ میں کس حد تک احمق یا خطرناک ہوں۔

"یہ مشین گن لے کر کیوں آئے تھے؟"

میں نے مشین گن بنگالی کو تھما دی۔ "اسے ہم اپنی دھرم پتنی کی طرح ساتھ رکھتے ہیں۔ بندیا نمسکار کرو بڑے صاحب کو۔"

نازو نے اٹھلا کے ہاتھ اُٹھائے۔ "نمستے جی۔"

پرتھوی راج نے کہا۔ "تم جانتے ہو للّی کے قاتل کو؟"

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ "ہم اکیلے میں بتائیں گے آپ کو۔"

پرتھوی راج نے کہا۔ "ان کی تلاشی لو۔ اور اندر بھیج دو۔"

پھر وہ میری طرف پلٹا۔ "دس منٹ بعد۔"

بنگالی نے مشین گن کو ایک ہاتھ سے ایسے پکڑ رکھا تھا جیسے وہ خود بخود چل جائے گی۔

"لاؤ ہم اسے بند کر دیں"، میں نے کہا۔ "واپس پنجرے میں۔"

"پنجرے کا بچّہ"، شوفر نے غرّا کے کہا اور کور مجھ سے چھین لیا۔ پھر اس نے میری تلاشی یوں لی کہ صرف جسم کے اندرونی اعضاء نہیں دیکھے۔ وقت ہوتا تو وہ میرا ایکسرے بھی کراتا کہ کہیں میں دستی بم نگل کے تو نہیں آگیا ہوں جو میرے اندر جاتے ہی پھٹ جائے۔ نازو کی تلاشی لیتے ہوئے اس نے خاصی بدمعاشی کی مگر میں نے نازو کو بھی مشتعل نہ ہونے کا اشارہ کر دیا تھا۔ شوفر صاحب ہی ہمیں اندر لائے تھے اور ایک طرح سے حفاظتی انتظامات میں ایسی سنگین کوتاہی کے ملزم ثابت ہوئے تھے۔

دس منٹ کے بعد میں نے راج کپور کو باہر آتے دیکھا۔ وہ ہمارے پاس سے گزرتے گزرتے رُک گیا۔ اس کی نظر نازو پر جم گئی تھی۔

"یہ کون ہے؟" وہ بولا۔ "کیا اسے بلایا تھا میں نے؟"

بنگالی نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں سر۔ یہ تو۔۔۔"

"کسی اور نے بلایا تھا۔ کوئی ٹیسٹ وغیرہ لیا؟۔۔۔"

"یہ ہماری دھرم پتنی ہے سرکار۔ بندیا۔ ہم ہیں ہیرالال۔"

میں نے کہا۔

اسی وقت بزر بجا اور ہمیں اندر طلب کر لیا گیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ راج کپور کس چکر میں پڑ گیا ہے۔ اس نے معمولی لڑکیوں کو ہیروئن بنا کے راتوں رات فرش سے عرش پر پہنچا دیا تھا اور یہاں نازو کے روپ میں اس کے سامنے ایک غیر معمولی حسن کی مالک لڑکی کھڑی تھی۔ راج کپور کی نظر یقیناً اسے اپنی اگلی فلم کے مرکزی کردار کے لیے منتخب کر چکی تھی۔ ہماری طرف سے کسی درخواست کے بغیر۔

پرتھوی راج کے سامنے بیٹھتے ہی میں نے حماقت کا وہ نقاب اُتار دیا جو میرے چہرے پر نظر آتا تھا۔

میں نے کہا، "بات یہ ہے سر کہ میں بمبئی میں نووارد ہوں۔ مجھے یہاں کوئی بھی نہیں جانتا تھا، سوائے للّی کے۔ اس سے میری ملاقات اتفاقیہ ہوئی تھی۔ وہ ترس کھا کے ہمیں اپنے گھر لے گئی۔ اور ہم اس کے گھر میں صرف ایک رات رہے۔"

"اور اسی رات للّی قتل ہو گئی؟" پرتھوی راج نے کہا۔

"جی۔ یہ سب ہمارے سامنے ہوا۔" میں نے کہا۔ "ہم نے سب کچھ دیکھا۔ مگر ہم اس کی مدد نہیں کر سکتے تھے۔ ہم بہت ڈرے ہوئے تھے اور بیڈ کے نیچے گھس گئے تھے۔ ہمیں ڈر تھا کہ... اُنھوں نے ہمارے سانس لینے کی آواز بھی سن لی تو وہ ہمیں بھی قتل کر دیں گے۔"

"وہ کون؟"

"وہ چار آدمی تھے۔ ان میں سے ایک کا نام ہی سُنا ہم نے۔ للّی کا اسی سے جھگڑا ہو رہا تھا۔ اس کا نام تریوینی تھا۔"

پرتھوی راج ایک دم سنبھل کے بیٹھ گیا۔ "تریوینی... حلیہ بتاؤ اس کا؟"

میں نے خاصی کوشش کی اور کم سے کم الفاظ میں تریوینی کی تصویر پیش کر دی۔ پرتھوی راج سر ہلاتا رہا۔ میں اسے قائل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

"ہیرالال! تم نے جھگڑے کی وجہ بھی سُنی ہو گی۔"

میں نے کہا، "وہ للّی سے کسی کا پتا پوچھ رہے تھے۔ تریوینی بار بار کہہ رہا تھا کہ ان دونوں کو تو نے چھپا کے رکھا تھا۔ تو ان کو اپنے ساتھ لے کر آئی تھی۔ سچ سچ بتا دے وہ کہاں گئے؟ للّی نے بہت کہا کہ مجھے نہیں معلوم لیکن اس نے اعتبار نہیں کیا۔ اس کے ساتھ آنے والا دوسرا آدمی بھی یہی سوال کرتا تھا۔ للّی کے انکار پر باقی دو نے اسے مارا۔ بہت مارا۔ بہت ظلم کیا اس پر سر! میں بتا نہیں سکتا کہ اس وقت میری کیا حالت تھی۔ یہ مشین گن اس وقت میرے پاس نہیں تھی ورنہ میں انھیں بھون دیتا۔"

پرتھوی راج کی نظریں مجھ پر جمی رہیں۔ "یہ مشین گن کہاں سے حاصل کی تم نے؟"

"میں نے خریدی تھی سر۔" میں نے کہا۔

"کیوں؟ اسے چلا بھی سکتے ہو؟" وہ حیران ہو کے بولا۔

میں نے کہا، "ایسے ہی تو نہیں اُٹھائے پھر رہا ہوں اسے۔ آپ نشانہ آزما لو۔"

اس نے کہا، "یہ بازار میں ملنے والی چیز تو نہیں ہے۔ اور آسانی سے ملتی بھی نہیں۔ سچ بتاؤ یہ کیا چکر ہے؟ تم اسے کس کے خلاف استعمال کرنا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا، "سر! یہ بہت لمبی کہانی ہے۔ آپ رہنے دیں اسے۔ یوں سمجھ لیں کہ میرا کوئی دُشمن ہے یہاں۔ ابھی میں اسے تلاش کر رہا ہوں۔ جس دن بھی مجھے ملا میں اس کو مار دوں گا۔ میں نے اپنی ساری زمین بیچ دی۔ مکان بیچ دیا اور یہ چیز لے لی۔"

"آخر کون ہے وہ۔ کیا بگاڑا ہے اس نے تمھارا؟"

"یہ پوچھیں سر کہ کیا چھوڑا ہے اس نے میرے پاس۔ وہ ایک راکشس ہے۔ وہ میری بہن کو اغوا کر کے لے گیا۔ مجھے پتا چلا کہ وہ بمبئی میں ہے۔ یہاں آنے سے پہلے ہی مجھے اپنی بہن کا ایک پیغام ملا کہ اسے کسی بردہ فروشوں کے ایجنٹ نے اغوا کیا تھا۔ اس کے ساتھ کچھ اور لڑکیاں بھی ہیں۔ ان سب کی عزت پہلے یہاں لُوٹی گئی۔ معلوم نہیں ان کو کس کس سیٹھ کے پاس بھیجا گیا۔ لیکن بعد میں انھیں باہر لے جا کر بیچنے کے لیے ایک اور بدمعاش کے حوالے کر دیا گیا۔ اس کا نام ہے فروش۔ صرف فروش۔ ان کو کسی لانچ پر اکٹھا کر کے باہر بھیجا جا رہا تھا۔ لانچ کا نام بھی معلوم ہے مجھے۔ بھانومتی۔"

پرتھوی راج ایک دم چونکا۔ "یہ... کس نے بتایا؟"

"اسی پیغام میں سب کچھ تھا۔"

"کون لایا تھا وہ پیغام؟ اور کیسے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ بس مجھے ایک خط ملا ڈاک سے۔ اس میں لکھا تھا کہ میں نے یہ باتیں اور تمھارا پتا ایک شخص کو بتا دیا ہے۔ اور اس سے کہا ہے کہ خط میں لکھ دے۔ ظاہر ہے اسے بڑی مشکل سے بات کرنے کا موقع ملا ہو گا۔ وہ خود تو نہ خط لکھ سکتی تھی اور نہ مجھے بھیج سکتی تھی۔ جس شخص سے بھی اس کی بات ہوئی تھی، وہ تھا نیک آدمی۔ اس نے اپنا وعدہ پورا کیا اور مجھے خط ڈال دیا۔ بس اس کے بعد میں روانہ ہو گیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ وہ لانچ گئی ہوئی ہے۔ اب مجھے اس کی واپسی کا انتظار ہے۔"

پرتھوی راج نے آگے جُھک کر کہا۔ "کیا تم اخبار نہیں پڑھتے؟"

میں نے کہا، "نہیں۔ دو دن سے ویسے بھی میں سفر میں تھا۔ ایک جگہ میں نے دیکھا کہ للّی کی گاڑی خراب ہو گئی۔ میرے دھکا لگانے سے گاڑی اسٹارٹ ہو گئی۔ للّی نے ہمیں بٹھا لیا اور راستے میں پوچھا کہ کہاں جاؤ گے۔ میں نے کہہ دیا کہ ابھی تو کوئی جگہ نہیں۔ کہیں بھی اُتار دو۔ وقت ہی گزارنا ہے۔ دن گزاریں گے بندرگاہ کے علاقے میں۔ رات کو کہیں پڑ کے سو جائیں گے۔ اس نے کہا کہ بے وقوف۔ اپنا نہیں تو اپنی بیوی کا ہی خیال کرو۔ اسے بھی فٹ پاتھ پر سلاؤ گے؟ یا کسی پارک میں؟ اوّل تو کوئی سونے نہیں دے گا۔ اور کسی نے سونے دیا تو اسے اٹھا لیا جائے گا۔ تم کبھی نہیں اُٹھو گے۔ بس جناب، اس نے ہمیں فلیٹ میں رہنے کو کہا۔"

پرتھوی راج نے ایک گہری لمبی سانس لی۔ "شی واز اے گڈ وومن۔ خیر۔ مجھے بتاؤ کہ تریوینی کے ساتھ جو لوگ آئے تھے ان سب کو پہچان سکتے ہو تم؟ کسی کا نام سُنا ہو تو یاد کرو۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "نام تو بس ایک ہی سُنا تھا۔ ہاں، ایک نام اور تھا۔ کملا کا۔ وہ تریوینی کی بیٹی ہے۔ تریوینی نے کہا تھا کہ میں اپنی پاگل بیٹی کی وجہ سے مجبور ہوں۔ باقی لوگوں کو میں صورت سے پہچان لوں گا۔ سامنے آتے ہی۔ وہ سب شیطان تھے۔ اُنھوں نے بہت ظلم کیا للّی پر۔"

"یہ کس وقت کی بات ہے؟"

میں نے کہا، "رات گیارہ بارہ بجے کے بعد آئے تھے وہ لوگ۔ اور صبح تین چار بجے گئے ہوں گے۔ ان کے جاتے ہی ہم نے بھی اپنی جان بچا کے نکل جانا بہتر سمجھا۔"

"یہ سب بات میری سمجھ میں آتی ہے۔ ایک تو میں تریوینی اور کملا کے درمیان دُشمنی کا سبب سمجھنے سے قاصر ہوں۔" پرتھوی راج نے کہا۔ "للّی نے کسے پناہ دی تھی اور کیوں؟ اور اگر وہ تریوینی کے دُشمن تھے تو للّی کا ان سے کیا تعلق؟ اسے معلوم ہوتا کچھ تو وہ ضرور بتا دیتی۔ کیوں چھپاتی وہ۔ ایک بات اور بتاؤ۔ یہ تم میرے پاس کیسے پہنچ گئے؟"

میں نے کہا، "للّی نے آپ کی بہت تعریف کی تھی۔ اس نے سب بتایا تھا کہ آپ اس کا کتنا خیال رکھتے ہیں۔ مجھے یہ معلوم تھا کہ آپ بہت بڑے آدمی ہیں۔ آپ میری مدد کر سکتے ہیں۔"

"تمھاری کیا مدد کر سکتا ہوں میں؟"

"سر! ہم پولیس کے سامنے بیان نہیں دے سکتے۔ وہ ہمیں بھی پکڑ لیں گے۔ تریوینی کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ وہ مجھے مروا دے گا۔ میری یہ مشین گن بھی ضبط ہو جائے گی۔ اس سے بہت کام لینا ہے مجھے۔"

پرتھوی راج نے کہا، "تم فکر مت کرو۔ پولیس کمشنر سے میں خود بات کر لیتا ہوں۔ تمھاری حفاظت کی جائے گی۔ تم بے خوف ہو کے بیان دو۔ پولیس تم کو سب کی صورت دکھا دے گی۔"

میں نے انکار میں سر ہلایا۔ "میں کوئی بیان نہیں دوں گا پولیس کے سامنے سر۔ مجھے تو آپ تریوینی کا پتا بتا دیں۔ اور اس کے پاس پہنچنے کے لیے کسی کو ساتھ کر سکتے ہوں تو اس سے ملوا دیں۔ بدمعاشی کا مقابلہ قانون سے نہیں کیا جا سکتا۔"

"تم کیا کرو گے؟"

"میں خود نمٹ لوں گا اس سے۔ جو کچھ میں نے دیکھا ہے، وہ کسی نے بھی نہیں دیکھا۔ قانون نے بھی نہیں دیکھا اور آپ نے بھی نہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہمارے جیسے گواہ ختم کر دیے جاتے ہیں۔ پھر قاتلوں کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ وکیل اور جج سب کچھ نہیں کر سکتے۔ لیکن ہم پورے وشواس کے ساتھ یہ کام کر سکتے ہیں کہ ایک قاتل کو سزائے موت دے دیں۔ ہمیں تو کوئی شک نہیں ہے۔"

"کیا تمھیں... معلوم ہے... کہ وہ لانچ واپس آ گئی ہے؟" پرتھوی راج نے کچھ دیر مجھے گھورنے کے بعد کہا۔

میں اُچھل پڑا۔ یعنی کھڑا ہوا اور پھر بیٹھ گیا۔ "آ گئی ہے... کب؟"

"کل۔ اور وہ سب لڑکیاں بھی واپس آ گئی ہیں۔" پرتھوی راج بولا۔ "یہ سب اخبار میں آ چکا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے میری بہن بھی آ گئی ہو گی۔" میں نے بڑے جوش سے کہا۔ "اب میں نہیں چھوڑوں گا اسے۔"

"لیکن فروش مارا جا چکا ہے۔" پرتھوی راج نے کہا۔ "اخبار میں ہی یہ بھی تھا کہ اس لانچ کو واپس لانے میں دو نوجوانوں کا ہاتھ تھا جو لانچ کے عملے کو مار کے لانچ پر قابض ہوئے اور ان سب کو واپس لے آئے۔"

"ہوں گے وہ بھی کوئی غیرت مند بھائی۔" میں نے کہا۔

"مجھے شک پڑتا ہے کہ کہیں تریوینی کو انھی دونوں کی تلاش نہ ہو۔ مگر ان کا للّی سے کیا تعلق؟ للّی کے پاس کیسے جا سکتے تھے وہ؟ اور للّی ان کو کہاں چھپا سکتی تھی؟ پھر بھی یہ ہو سکتا ہے کہ تریوینی کو لانچ واپس لانے والے دونوں بہادر اور غیرت مند نوجوانوں کی تلاش ہو۔"

"کیا... تریوینی کا بھی کوئی تعلق ہے لانچ سے؟"

پرتھوی راج نے اقرار میں سر ہلایا۔ "وہ خود بھی ایک بردہ فروش ہے۔ ایسے کام کرتا ہے وہ بھی۔ یہ اسی کی لانچ ہو گی۔"

میں نے کہا، "بس تو سر۔ اب آپ کچھ مت کریں۔ اگر وہ ایک ہی شخص ہے جس نے میری بہن کی عزت خراب کی اور للّی کو قتل

کیا۔ تو آپ مجھے اس کے ٹھکانے تک پہنچا دیں۔ اور مجھے کسی ایسے شخص سے ملوا دیں۔ جو ہماری عملی مدد کر سکے۔"

"عملی مدد تو صرف بدمعاش ہی کر سکتے ہیں۔"

"آپ تو ساری بمبئی کو جانتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"لیکن میں فلمساز ہوں۔ بدمعاش نہیں۔ قتل نہیں کروا تا پھرتا لوگوں کو۔" اس نے برہمی سے کہا۔

"آپ کچھ مت کریں۔ ہمیں کسی کے پاس بھیج دیں۔ ہم خود تو کسی کو بھی نہیں جانتے۔ اور راہ چلتے کسی سے پوچھ بھی نہیں سکتے۔" میں نے کہا۔

پرتھوی راج نے کہا۔ "ہاں۔ یہ ہو سکتا ہے۔ لیکن دیکھو، میرا نام بھی نہیں آنا چاہیے تمہاری زبان پر۔ میں نے تمہاری بات سُن لی۔ اس لیے کہ مجھے للّی کے قتل ہو جانے کا افسوس ہے اور میں بھی یہ سمجھتا ہوں کہ اس قتل کے الزام میں کوئی نہیں پکڑا جائے گا۔ اگر میں چاہتا تو تم کو سیدھا پولیس کے حوالے بھی کر سکتا تھا۔ تم جو کچھ کرو گے اپنی ذمّے داری پر کرو گے اور آئندہ مجھ سے ملنے کی کوشش بھی نہیں کرو گے۔ کبھی ایسی بات ہوئی تو یہ سمجھ لو کہ میں صاف انکار کر دوں گا کہ میں نے تمھیں پہلے کبھی دیکھا ہی نہیں۔ میرا کچھ نہیں بگڑے گا کیونکہ بات تمہاری نہیں میری مانی جائے گی۔"

"ہم بے وقوف ضرور ہیں مگر پاگل نہیں ہیں کہ آپ کا ذکر کر کے اپنی مشکلات میں اضافہ کریں۔" میں نے کہا۔ "مجبوری آپ کے پاس لے آئی تھی۔ ہم کسی اور کے پاس جا کے یہ بات نہیں کہہ سکتے تھے۔"

"اچھا۔ تم لوگ باہر بیٹھو۔ میں کچھ کرتا ہوں۔"

میں اور نازو باہر آ کے بنگالی کے سامنے بیٹھ گئے۔ اس نے مشین گن کو غلاف پہنا کے کافی دور رکھ دیا تھا مگر اس کی نظر بار بار اُدھر جاتی تھی۔ یوں جیسے وہاں کوئی پاگل کُتّا بیٹھا ہے جو اس کے غافل ہوتے ہی اسے کاٹ لے گا۔ اس نے مجھے اور نازو کو بڑے دُکھی دل کے ساتھ دیکھا۔ میری طرف سے وہ اس لیے دُکھی تھا کہ میں بیک وقت قتلِ عام کے دُہرے اسباب رکھتا تھا۔ ایک حسینہ طرح دار اور ایک خطرناک مشین گن۔ نازو سے اس کو شاید یہ شکایت ہو گی کہ اس نے کیسے جُغد کے ہاتھوں میں اپنی قسمت کی باگ ڈور دے دی۔ جو اسے کچھ بھی نہیں دے سکتا سوائے خواری کے۔

میں نے اس کے سامنے بیٹھ کر کہا۔ "بابا ذرا چائے تو منگواؤ ہمارے لیے۔ ڈبل ملائی۔"

اس نے ایک فون کا ریسیور نیچے پٹخ دیا۔ "رانگ نمبر سالا پھر رانگ نمبر۔ اور تم سالا کیا ہم کو بابا بولتا۔ بابو بولو ہم کو۔ ہم سالا کیا فرینڈ ہے تمہارا کہ چائے منگوائے گا...۔"

"وہ پرتھوی راج نے کہا تھا... کہ باہر بیٹھ کے چائے پیئو۔ ابھی وہ پھر بلائیں گے ہمیں۔"

بنگالی نے خون کا گھونٹ پی کے مجھے دیکھا۔ اسی وقت نازو نے منمنا کے کہا۔ "سُنو جی۔ بھوک بھی لگی ہے مجھے۔"

"تم پوچھ لو فون کر کے۔" میں نے کہا۔ بنگالی کے لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ فون پر کچھ معلوم کر سکتا۔ اس نے مجبوراً چائے اور بسکٹ لانے کا آرڈر دیا۔

پھر اس نے سر پہ ہاتھ مارا۔ "ابھی ہم ایک دم بھول گیا، ہمارا مغز خراب ہو گیا۔"

"کیا پہلے ٹھیک تھا تمہارا مغز؟" میں نے کہا۔ "اور تم کو کیا معلوم کہ مغز تھا بھی یا نہیں تھا۔"

بنگالی نے میز پر مُکّا مارا۔ "ابھی ایک بات پوچھتا ہوں میں۔ سیدھا جواب دو ہاں یا نہیں۔ راج بابو بولا کہ اس چھوکری..."

"یہ دھرم پتنی ہیں ہماری۔" میں نے کہا۔

بنگالی نے پھر ضبط سے کام لیا۔ "اچھا اچھا۔ ابھی نہیں بھولے گا ہم یہ بات۔ تم بولو کہ اپنا اس دھرم پتنی کو فلم لائن میں لانے کا ہے۔ راج بابو چانس دے گا۔ ایک نمبر ہیروئن بنائے گا۔"

میں نے کہا۔ "چانس ایک شرط پر لے سکتا ہوں میں۔"

"شرط۔ اُف۔" بنگالی نے سر پکڑ لیا۔ "ادھر سارا دُنیا ماتھا پھوڑتا ہے ایک چانس کے لیے۔ سارا عمر لوگ دھکّے کھاتا ہے۔ تھرڈ کلاس لوگ کا سامنے ناک رگڑتا ہے اور تو راج بابو کے لیے شرط کا بات کرتا ہے۔ جو پتھر کو ہیرا بنا تا ہے۔"

"میری شرط یہ ہے کہ مجھے ہیرو لیا جائے گا۔" میں نے کہا۔

اس سے پہلے کہ بنگالی پاگل ہو جاتا اندر سے وہی شوفر برآمد ہوا جو ہمیں یہاں لایا تھا۔

"آؤ میرے ساتھ۔" اس نے بڑے دوستانہ لہجے میں کہا۔

"وہ... ہم ذرا چائے پی لیں۔" میں نے کہا۔

"چائے کو گولی مارو۔" اس نے میری مشین گن اُٹھالی۔ "ہم تمہیں باہر بہترین چائے پلوائیں گے۔"

میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ "ہمارے ریوالور۔"

بنگالی نے دراز میں سے میرے اور نازو کے وہ ریوالور نکالے جو تلاشی کے وقت برآمد ہو گئے تھے۔ بنگالی کی مایوسی قابلِ دید تھی۔ اس کی سمجھ میں بہت سی باتیں نہیں آئی ہوں گی مثلاً یہ کہ اتنا اسلحہ لے کر اسٹوڈیو میں داخل ہونے کے جُرم میں، ہمیں پولیس کے حوالے کیوں نہیں کیا گیا تھا۔ وہ سارا اسلحہ ہمیں واپس کیوں دیا جا رہا تھا۔ راج کپور نے میری 'دھرم پتنی' کو جو گولڈن چانس دیا تھا وہ میں نے ایک احمقانہ شرط پر کیوں قربان کر دیا تھا (جبکہ احمق میں نہیں تھا) اور پرتھوی راج نے مجھے اتنی لفٹ کیوں دی تھی؟

شوفر صاحب نے چلتے چلتے بنگالی کے کان میں کچھ کہا۔ اس نے سر ہلا کے مجھے دیکھا۔ پھر مجھے دیکھ کے سر ہلایا اور پھر سر پکڑ کے کُرسی پر بیٹھ گیا۔ "نہیں بولے گا۔ ہم کچھ نہیں دیکھا سالا تو کسی کو کیا بولے گا۔" غالباً اسے تاکید کی گئی تھی کہ ہمارے آنے اور جانے تک جو کچھ ہوا وہ سب بھول جائے۔

اس مرتبہ باہر آنے کے بعد ہماری پوزیشن مختلف تھی۔ شوفر صاحب نے بھی اپنا رویّہ بدل لیا تھا۔ اگر یہ معاملہ میری توقع کے برعکس سنگین ہو جاتا تو اس کا خمیازہ بھی اسی کو بھگتنا پڑتا کہ اس نے غیر ذمّے داری کا ثبوت دیا اور ہمیں چیک کرنے میں ناکام رہا۔

"تم نے تو مروا دیا تھا مجھے۔" اس نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ "بہت خطرناک آدمی ہو تم۔ اور چالاک بھی۔ یہ بتاؤ کہ کیا واقعی تمہارا نام ہیرا لال ہے؟"

"اور کیا ہو سکتا ہے؟" میں نے کہا۔ "کھیرا لال؟"

وہ ہنسنے لگا۔ "نہیں۔ یہ مطلب نہیں تھا میرا...۔"

"تم نے تو ابھی تک اصلی نقلی کوئی نام ہی نہیں بتایا ہے اپنا۔" میں نے کہا۔

"میں... میرا نام ہریش چندر سمجھ لو۔" وہ بولا۔

صاف ظاہر تھا کہ اس نے اپنا اصل نام نہیں بتایا۔ لیکن مجھے نام سے نہیں کام سے غرض تھی۔ ایک قطار میں کھڑی ہوئی بہت سی ایک سی گاڑیوں میں سے ایک کا دروازہ کھول کے اس نے مجھے آگے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ نازو پیچھے بیٹھ گئی۔

"یہ جو تمہاری دھرم پتنی ہے۔" وہ معنی خیز لہجے میں مسکرا کے بولا۔ "اس کو گولی چلانی آتی ہے؟"

میں نے بُرا مان کے کہا۔ "معلوم نہیں یہاں سب لوگ اتنے شکّی مزاج کیوں ہیں۔ ہر بات میں شک۔ مجھے ہیرا لال نہیں ملتے۔ اسے میری دھرم پتنی نہیں ملتے۔ تمہارے سیٹھ کو شک تھا کہ میں مشین گن نہیں چلا سکتا۔ تم کہتے ہو یہ گولی نہیں چلا سکتی۔ میں کہتا ہوں آزما کے کیوں نہیں دیکھ لیتے۔ تم اپنے سر پر سیب رکھ کے کھڑے ہو جاؤ دس گز دور۔"

"نہ بھائی۔ اپن کو بالکل شوق نہیں ہے...۔"

"سیب اچھے نہیں لگتے تو... کچھ اور رکھ لو سر پر۔ مثلاً کشمش یا الائچی۔ تمہارا بال بیکا نہیں ہو گا...۔"

گاڑی جب باہر نکلی تو شائقین کے ایک ہجوم نے ہمیں پہچاننے کی کوشش کی۔ ایک نے چلّا کے کہا۔ "ارے، وہ دیکھو پیچھے وحیدہ رحمان۔" دوسرے نے مجھے بھی ایک ہیرو قرار دیا جبکہ اس کے ساتھی نے ایک مشہور وِلن۔

"میں تم کو شیام دادا کے پاس لے جا رہا ہوں۔" ہریش چندر نے کہا۔

"تمہارے دادا سے مل کر میں کیا کروں گا۔" میں نے کہا۔

"شیام دادا بہت زبردست آدمی ہے۔ اپنا استاد بھی ہے۔ تم اس کو کچھ مت بتانا۔ یہ سب کہ تم آ کے اسٹوڈیو گئے تھے اور وہاں کیا ہوا تھا۔" ہریش چندر نے اپنی بات جاری رکھی۔ "میں یہ کہوں گا کہ انھیں ترلوچن سے ملوا دو۔ اس کے بعد میں واپس چلا جاؤں گا اور تم اسے سب بتا دینا۔ جو بھی تمہارا مسئلہ ہے۔ لیکن اچھا ہوتا اگر تم اکیلے جاتے۔ وہاں عورت کا جانا ٹھیک نہیں۔"

میں نے کہا۔ "یہ عورت کہاں ہے۔ دھرم پتنی ہے ہماری۔ بندیا نام ہے اس کا۔ یہ ہر جگہ ہمارے ساتھ جاتی ہے۔"

اس نے بُرا سا منہ بنا کے مجھے دیکھا مگر کچھ بولا نہیں۔ گاڑی نامعلوم راستوں سے گزری اور ایک جگہ رُک گئی۔ ہریش چندر چاہتا تھا کہ مشین گن کو میں گاڑی میں ہی چھوڑ دوں لیکن میں نے یہ رسک نہیں لیا کہ اعتبار کے چکّر میں مشین گن گنوا دوں۔

یہ کوئی غربت زدہ علاقہ تھا جہاں پرانی عمارات کا سلسلہ کراچی کے کھارادر کی یاد دلاتا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ یہاں ہر عمارت کی بالکونی میں کوئی عورت کھڑی ہوئی تھی یا نیچے لٹک رہے تھے اور کپڑے سوکھ رہے تھے۔ یہی کیفیت گلی میں تھی۔ سوکھی، کالی پیلی یا بہت موٹی عورتیں، اسکرٹ یا معقول سی ساڑی باندھے پھر رہی تھیں یا دروازوں کے سامنے بیٹھی ہوئی تھیں۔ کام میں مصروف تھیں یا باتیں کر رہی تھیں۔ انھیں آس پاس کسی مرد کی موجودگی کا احساس تک نہ تھا۔

وہ انہی عورتوں کے پیدا کیے ہوئے بچّے تھے جو گلی میں کنکروں پتھروں کی طرح بکھرے پڑے تھے اور آپس کے کھیل یا لڑائی کی چیخ و پکار میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے نظر آتے تھے۔ ان کے میلے کپڑے، بے رونق چہرے اور غلط اطوار ان کی زندگی کا عکس پیش کرتے تھے جس میں غربت، سختی اور محرومی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ گلی میں ہی چھابڑی والے، خوانچہ فروش، ریڑھی والے بھی بھٹک رہے تھے اور بے کار نوجوان اور بیزار بوڑھے بھی۔

دراصل یہ سب بے گھر لگ تھے۔ ان کے گھر اتنے تنگ تھے کہ نہ ہونے کے برابر تھے۔ اگر یہ سب گھر کی خلوت میں بند ہو کے بیٹھ جاتے تو دم گھٹ کے مر جاتے۔ ایک کھولی (مختصر کمرے یا کوٹھری) کے گھر میں ماں باپ بھائی بہن سب کیسے رہتے ہوں

گے؟ اس کا تصور میرے جیسے شخص کے لیے محال تھا جس نے آنکھ کھولی تھی تو گھر میں کمرے ہی کمرے دیکھے تھے۔ سونے کا کمرا۔ کھانے کا کمرا۔ مہمانوں کا کمرا۔ ڈرائنگ روم۔ اسٹڈی۔۔۔

ہریش چندر ایک ایسے دروازے کے سامنے ٹھہر گیا جس کے وسط میں دو دو فٹ لمبے پٹ جھول رہے تھے۔ اوپر نیچے سے دروازے کی چوکھٹ خالی تھی۔ اس سے اندر کا منظر راہ چلتے آدمی کو دکھائی نہیں دیتا تھا مگر دروازے کے کھلے حصے سے دھواں اور بُو باہر خارج ہوتے رہتے تھے۔

یہ ایک بار یا شراب خانہ تھا۔ ویسے تو غلاظت کی بُو اس پورے ماحول پر حاوی تھی مگر اس تھرڈ کلاس بار کے سامنے کی بد بُو سے متلی محسوس ہوتی تھی۔ اندر ایک ہنگامہ بپا تھا۔ ایک آدمی اندر گیا اور دوسرا اسی وقت باہر آیا تو مجھے وہ شرابی نظر آئے جو گندی بینچوں اور کرسیوں پر بیٹھے سستی ترین شراب کا زہر اپنے حلق میں انڈیل رہے تھے اور احساس کو فنا کرنے والی اس لعنت پر خوش تھے جو انھیں غمِ زمانہ سے بے نیاز کر دیتی تھی۔

ہریش چندر نے رُک کر مجھے دیکھا۔ "ابھی تم کچھ خیال کرو اس چھوکری۔۔۔"

"یہ دھرم پتنی ہے ہماری۔۔۔" میں نے کہا۔

"سالا پاگل۔" ہریش چندر بھڑک گیا۔ "میں تیرے فائدے کی بات بولتا ہوں۔ دھرم پتنی ہے تو اندر کاہے کو لے جاتا ہے۔ کون سا دھرم شالا ہے یہ۔ نشے میں کوئی چمٹ جائے گا بھوت کا مافک تو میرے کو مت بولنا۔ ادھر سب شراب کا نشہ کرکے بیٹھا ہے۔۔۔"

بات فوراً میری سمجھ میں آ گئی۔ میں نے کہا۔ "پھر ہم کیا کریں؟ کیا اس کو اکیلا چھوڑ دیں یہاں؟"

"اچھا تو بھی ٹھہر ادھر۔ ہم جاتا ہے اور شیامو دادا کو ادھر ہی بُلا کے لاتا ہے۔"

"شیامو دادا؟ یا شیام دادا؟" میں نے چونک کر کہا۔

"شیام اور شیامو میں کیا فرق ہے ابھی؟ اور ہے بھی تو تیرے کو کیا۔" وہ بولا اور اندر گھس گیا۔

میں نازو کے ساتھ دروازے سے چند قدم کے فاصلے پر ٹھہر گیا۔

"مس نازو! کیا کمال کی بات ہے کہ شیامو دادا بھی وہی ہے جو شیام دادا ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ لطیفہ میں سمجھی نہیں۔" نازو نے کہا۔

"جب ہم نے بمبئی میں نزول فرمایا تھا۔" میں نے کہا۔ "تو سب سے پہلے جو وفد ہمارے استقبال کے لیے بھیجا گیا تھا وہ شیامو دادا نے ہی بھیجا تھا۔ ان میں سے ایک کو ہم نے فوت کر دیا تھا لیکن تین میں سے دو نے بے ہوش ہو کے جان بچائی تھی مگر چوتھے نے رضا کارانہ طور پر تعاون کیا تھا اور اس نے اپنے بیان سے ثابت کیا تھا کہ ان چاروں کی خدمات انھی شیامو دادا نے حاصل کی تھیں۔ یہ دادا ہیں۔ وہ پوتے تھے یعنی محض بدمعاش۔"

"کیا پتا یہ کوئی اور شیامو دادا ہو۔"

"ہاں۔ ہونے کو کیا نہیں ہو سکتا۔ بمبئی شہر میں کچھ سکندر دادا بھی ہو سکتے ہیں۔ اور نازو دادی بھی۔" میں نے کہا۔ "لیکن یہ وہی ہوئے تو خوب ملاقات ہوگی۔"

"اگر اسے معلوم ہو گیا کہ تم نے ہی اس کا بیڑا غرق کیا تھا اور اس کی لانچ 'بھاگ متی' کو واپس لانے والے تم ہی تھے تو سوچو وہ تمھارا کیا حشر کرے گا؟"

"یہ اس کو میری صورت دیکھ کے کیسے معلوم ہو سکتا ہے بھلا؟" میں نے کہا۔ "وہ مجھے نہیں پہچانتا۔ ہاں اس کے بھیجے ہوئے تینوں کرائے کے گوریلوں میں سے کوئی ساتھ آ گیا تو پھر معاملہ سنگین ہو جائے گا۔ خیر۔ اس معاملے سے بھی نمٹ لیں گے۔ ابھی تو یہ دیکھو کہ قدرت کیا کر رہی ہے۔ شیامو دادا کی خدمات حاصل کرنے والا خود تریونی تھا۔"

"یہ شیامو دادا تریونی کا آدمی ہے؟"

"یہ آدمی کسی کے نہیں ہوتے۔ پروفیشنل لوگ ہیں۔ پیسہ لے کر کام کرتے ہیں۔ جس کا جو دل چاہے وہ کام کرا لے۔ تریونی نے اس کے ذمے یہ کام کیا تھا کہ مجھے اور غالب کو اٹھا کر لے آؤ مگر ہم ان کے ہاتھ نہ آئے۔ جو بچ بچا کے واپس پہنچے انھوں نے تریونی کو بتایا کہ وہ دونوں للّی کے ساتھ تھے۔ چنانچہ تریونی نے للّی سے معلوم کیا کہ ہم کہاں دستیاب ہوں گے اور دوسری کوشش میں خاکسار اغوا ہوا۔"

"تمھارا کیا خیال ہے کہ یہی قاتل ہے للّی کا؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "ابھی تک حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق شیامو دادا کی ٹیم نے للّی پر کوئی تشدد نہیں کیا تھا یہ کام دلاور کی ٹیم نے بعد میں پہنچ کر کیا۔ مگر ان معلومات کے صحیح یا غلط ہونے کے بارے میں سو فیصد یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں خود شیامو دادا سے ملنا چاہتا تھا۔ اور اس کے لیے مجھے بار بار جانا پڑتا۔"

"بار بار کہاں جانا پڑتا؟"

"بار بار۔" میں نے کہا۔ نازو کی جھنجلاہٹ دیکھ کے مجھے ہنسی آئی۔ "دراصل ایک مسماۃ ہیں بار برا۔ ان کا مے خانہ یعنی بار انھی کے نام پر بار بار کہلاتا ہے۔ شیامو دادا کا ٹھکانا وہی تھا۔"

"کیا یہ بار بار ہے؟"

"اس پر لکھا ہوا تو کہیں بھی کچھ نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن قسمت کی خوبی دیکھو کہ پیاسا سیدھا کنوئیں تک آ گیا۔ اور اس بار بساط پلٹ گئی ہے۔ پہلے تریونی نے شیامو دادا کو ہمارے خلاف استعمال کیا تھا۔ اب ہم اس کو تریونی کے خلاف استعمال کرنا چاہتے ہیں۔"

"کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔"

"ہم نہ کچھ لینے آئے ہیں نہ دینے۔ ہمارے پاس ایک جان ہی ایسی چیز ہے جو ہم لے بھی سکتے ہیں اور دے بھی سکتے ہیں۔"

"میرا مطلب تھا کہ یہ تریونی کے خلاف نمک حرامی کرے گا؟" نازو نے کہا۔

"معاف کرنا۔ ایسے لوگ صرف حرامی ہوتے ہیں۔ ان کا آقا اور دیوتا ہے پیسہ۔ آج جس کو سلام کرتے ہیں کل اسی کو خلاص بھی کر سکتے ہیں۔ تریونی کا کام کر دیا کیونکہ اس نے پیسہ دیا تھا۔ اب پیسہ ملے گا اس کا کام تمام کرنے کا تو یہ بھی کریں گے۔ ہمارے لیے اس سے اچھی بات کیا ہو سکتی تھی کہ ایک دشمن کو دوسرے دشمن کے خلاف استعمال کرنے کا موقع مل جائے۔"

ہریش چندر دس منٹ کے بعد باہر نکلا تو کچھ مایوس سا دکھائی دیتا تھا۔ ہمارے قریب آ کے اس نے زیرِ لب ایک گالی دی۔

میں نے کہا۔ "کیا بات ہے۔ شیامو دادا نے گھاس نہیں ڈالی تمھیں؟"

اس نے غصے سے مجھے دیکھا۔ "گھاس تو میں ڈالنے گیا تھا اس کو۔ یہ دیکھو۔ یہ ہے اس کا چارا۔" اس نے جیب میں سے نوٹوں کی دو گڈیاں نکال کے پھڑ پھڑائیں۔ "مگر بیچ میں آ رہی ہے اس کی ماں۔"

"گویا تمھاری پردادی۔ شیامو دادا کی ماں۔۔۔"

"میرے ساتھ فالتو بات کریں گا تو تیرا تھوبڑا سجا دیں گا۔ ہم سالا تمھارے ساتھ اس لیے نہیں آیا ہے کہ۔۔۔"

"ہریش چندر! تم خواہ مخواہ ناراض ہو رہے ہو۔" نازو نے فوراً صورتِ حال کو سنبھالا۔ "یہ تو مذاق کر رہے تھے۔ کون ہے اس کی ماں۔ کیا کہتی ہے؟"

"کہتی ہے اپن ففٹی پرسنٹ لے گا۔" اس نے ایک گالی دے کر کہا۔ "کس بات کا ففٹی پرسنٹ بابا۔ ہم ہزار چھوکٹ میں دے سکتا ہے۔ اس سے زیادہ نہیں۔ بولتی ہے کہ جاؤ پھر خود تلاش کرو شیامو دادا کو۔"

"ففٹی پرسنٹ تو بہت زیادہ ہے۔" میں نے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ "آخر تم کو اپنا حصہ بھی تو نکالنا ہوگا۔"

اس نے مجھے گھور کے دیکھا اور پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "ابھی تم آدمی سمجھدار ہے۔ دیکھو یہ جو سالا شیامو دادا ہے نا۔ یہ کوئی دادا نہیں ہے۔"

"پھر کیا ہے۔ نانا؟" میں نے کہا۔

"ارے بابا کیسا آدمی ہے تم۔ ادھر بمبئی میں دادا بولتا بدمعاش کو۔ جو بہت بڑا بدمعاش ہو جاتا ہے اس کو موالی لوگ دادا بنا دیتا ہے مگر یہ شیامو چھوکٹے میں دادا گیری کرتا ہے۔ یہ عورت سارا چکر چلاتی ہے جس کا یہ ڈربہ کا اڈا ہے۔"

"تمھاری مراد ہے باربرا؟۔۔۔"

وہ چونکا۔ "تم جانتا ہے باربرا کو۔ سالی ایک دم۔۔۔" وہ کچھ کہتے کہتے نازو کی طرف دیکھ کے خاموش ہو گیا۔ "ہم کیا کرے۔ اپنا زبان میں بولتا ہے تو تیرا دھرم پتنی لال پیلا ہو جاتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "کیا شیامو دادا کے بغیر کام نہیں چل سکتا؟"

ہریش چندر نے نازو کی طرف دیکھا۔ "چل سکتا ہے۔ ایک دم چل سکتا ہے۔ تیرا یہ چھوکری ہمت کرے تو۔"

میں نے کہا۔ "اچھا ہم یہاں سے کہیں اور چل کے بات کرتے ہیں۔"

گاڑی میں بیٹھ کے ہم پھر اجنبی راستوں پر چل پڑے۔ فی الحال میں ان راستوں کو یاد رکھنے کی کوشش بھی نہیں کر رہا تھا۔ گاڑی ایک ریسٹورنٹ کے سامنے رُک گئی۔

میں نے کہا۔ "یہ کون سی جگہ ہے؟"

"چرچ گیٹ۔" ہریش چندر نے مختصر ترین جواب دیا۔

ایک جگہ میں نے ویر نریمان روڈ کا سائن بورڈ بھی دیکھا تھا۔ ریسٹورنٹ کا نام 'گے لارڈ' تھا اور یہ مے فیئر بلڈنگ کے ایک حصے میں واقع تھا۔ مجھے یہ خیال پریشان کر رہا تھا کہ تریونی تک پہنچنے کے لیے ہم نے جو راستہ اختیار کیا تھا وہ لمبا ہوتا جا رہا ہے۔ آر کے اسٹوڈیو میں داخل ہونے کی کوشش میں ہی کافی وقت ضائع ہو گیا تھا۔ مجھے امید تھی کہ پرتھوی راج براہِ راست تریونی کا پتا بتا دے گا یا مجھے اس کے ٹھکانے تک پہنچا دے گا مگر اس نے براہِ راست اس معاملے میں ملوث ہونے سے گریز کیا اور مجھے ہریش چندر کے حوالے کر دیا۔ اب ہریش چندر مجھے شیامو دادا کے سپرد کرنا چاہتا تھا تو بیچ میں باربرا حائل ہو گئی تھی۔ سہ پہر کے تین بجنے والے تھے لیکن ابھی تک ہم اپنی منزل کا تعین بھی نہیں کر سکے تھے۔

"ابھی کھانا کھائے گا پہلے۔" ہریش چندر نے ایک گوشے میں ٹیبل سنبھالتے ہوئے کہا۔ "تم بمبئی میں نیا ہے؟"

میں نے کہا۔ "نیا ہی سمجھو۔"

"پھر تم مہمان۔ بولو کیا کھائے گا؟" اس نے بیک وقت مجھے اور نازو کو مخاطب کیا۔

میں نے بلاتکلف چائنیز کا آرڈر دیا اور تین چار نام ایسے لیے کہ ہریش چندر بوکھلا گیا۔ ایک دیہاتی سے اس کو یہ توقع ہرگز نہ تھی کہ وہ منتخب چینی کھانوں کے مشکل تلفظ والے کھانوں کے نام اس روانی سے لے گا جیسے وہ چائنیز مینو کا عادی ہے۔

"تم سالا... دیہاتی لگتا تو نہیں۔" اس نے ویٹر کے جانے کے بعد کہا۔ "صاف بتاؤ یہ کیا چکر ہے؟"

"تم بتاؤ یہ کیا چکر ہے؟ شیاموداوا کی ایسی تیسی۔ مجھے تریوینی کا پتا چاہیے۔" میں نے کہا۔ "شیاموداوا سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ اس سے ملنا ہوگا تو میں خود براہِ راست بھی مل لوں گا۔ تم مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟"

اس نے دانت نکال کے کہا۔ "ایک دم گولی ہے تو یار۔ ابھی دیکھ صبح سے ایسے ہی پھرتا پڑا ہے۔ پیٹ خالی ہووے تو اپنا یہ کھوپڑی بھی خالی ہو جاتا ہے۔ ابھی تو بالکل ٹھیک بولا۔ ہم تیرے کو تریوینی کا پتا بتانے کا واسطے ادھر لایا ہے۔"

"کیا یہ اس کا ریسٹورنٹ ہے؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ ادھر سے تھوڑا فاصلے پر کولابا میں اس کا جیولر شاپ ہے۔" ہریش چندر نے کہا۔ "سیسل کورٹ دیکھا ہے؟"

میں نے کہا۔ "آج تک میں کسی کورٹ میں نہیں گیا۔"

وہ ہنسنے لگا۔ "ایک بلڈنگ ہے۔ مہاکوی بھوشن مارگ پر ایک جیولر شاپ ہے۔ ٹی کشن چند۔ وہ تریوینی کا فرنٹ ہے۔ ابھی تم فرنٹ کا مطلب جانتا ہے۔ سامنے کا دھندا۔ پیچھے کچھ اور ہوتا ہے۔"

"دُکان کے پیچھے؟"

"نہیں۔ دھندے کا نام کچھ اور ہوتا ہے۔ اس کی آڑ میں کام کچھ اور ہوتا ہے۔ تریوینی کشن چند ایک نہیں دو آدمی ہے۔ ادھر تو جیولری کا بزنس میں کوئی گھپلا نہیں۔ مگر کشن چند کا پارٹنر تریوینی باہر سے ہیرے اسمگل کرتا ہے۔ قیمتی پتھر لاتا ہے۔ خود نہیں لاتا۔ منگواتا ہے۔ اس کا کیریئر سب چھوکری لوگ ہے۔ دیسی ولایتی سب ایک نمبر کا چھوکری ہے۔ جو بائی ایئر آتا ہے اور جاتا ہے۔ باہر سے جو ٹورسٹ آتا ہے وہ ادھر آ کے پیسہ خرچ کرتا ہے۔ کبھی کنگلا ہو جاتا ہے۔ یا کنگلا کر دیا جاتا ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"دیکھ۔ اپنا مغز حاضر کر۔" ہریش چندر نے کہا۔ "بمبئی میں بہت ٹورسٹ لوگ آتا ہے۔ وہ اکثر جوہو بیچ پر کسی ہوٹل میں ٹھہرتا ہے۔ ادھر بہت ہوٹل ہے۔ ہوٹل سی سائیڈ۔ سن این سینڈ۔ پام گرو و بیچ ہوٹل۔ اختیار۔ بہت اچھا ہوٹل ہے سب۔ تریوینی کا آدمی ادھر پھرتا ہے۔ کسی ایک ہوٹل میں نہیں۔ بہت سے ہوٹل میں دیکھتا رہتا ہے کہ کون سا غیر ملکی چھوکری شوقین ہے۔ کس کا پاس مال کم ہے۔ کون اکیلا ہے۔ وہ تریوینی کو بتاتا ہے اور تریوینی ایسا انتظام کرتا ہے کہ وہ پھنس جاتا ہے۔ اس کو پیسہ مل جاتا ہے.... اور پھر وہ تریوینی کا کوئی بھی کام کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ ابھی ہم کیا بات بتاوے تم کو۔ اکیلا چھوکری تو ایسے ہی اُٹھ جاتا ہے۔ اس کو گاڑی میں ڈالا اور لے گیا۔ ایک دم کنگلا کر کے چھوڑ دیا۔ یا اس کا فوٹو موٹو اتار لیا اور بس . . . ."

میں نے کہا۔ "یہ نکتہ واضح ہو گیا مجھ پر۔ آگے چلو۔"

"پھر تریوینی اس کو اپنا خرچ پر باہر بھیجتا۔ ادھر کشن چند کا دُکان سے اس کو نقلی جیولری دیتا۔ اصلی کا رسید۔ امیٹیشن دیکھا ہے تم؟ نقلی ہیرے کا ہار نیکلس وہ گلے میں ڈال کے باہر جاتی ہے تو ویسا ہی اصلی ہیروں کا ہار ساتھ لاتی ہے۔ کوئی پکڑے تو اس کا ہینڈ بیگ میں رسید موجود۔ گواہی کے لیے کشن چند حاضر کہ یہ جیولری ہم فروخت کیا تھا..."

"میں سمجھ گیا۔ لیکن اس معاملے کا ہمارے مسئلے سے کیا تعلق ہے؟" میں نے کہا۔

"ابھی غصہ مت کرنا۔ ایک بات بولتا ہوں تیرے کو۔ تیرا فائدے کا واسطے۔" ہریش چندر نے کہا۔ "تیرا یہ . . . دھرم پتنی۔ ادھر کشن چند کا پاس جا کے بولے گا کہ میرے کو تریوینی صاحب سے ملنے کا ہے۔"

"کشن چند اتنا بے وقوف تو نہیں ہے کہ یہ بات سُن کے کہے جائیے، وہ آپ ہی کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ پوچھے گا نہیں کہ تم کون ہو اور کس نے بھیجا ہے تم کو . . . ؟"

"بتاتا ہوں ... بتاتا ہوں . . . ابھی کھانا بھی ساتھ کھاؤ۔" ہریش چندر نے کہا۔ "اٹلی کا ایک چھوکری ہے جینا۔ اس کا ساتھ یہ ہوا کہ تریوینی اس کو اُٹھا لیا۔ ایک نمبر چھوکری تھا۔ تریوینی اس کا کچھ فوٹو موٹو بنایا۔ اپنا ساتھ رکھا اس کو ایک ہفتہ۔ پھر اس کو ادھر سے کچھ جیولری گفٹ کیا۔ ایک دم امیٹیشن۔ نقلی مال۔ لیکن اس کو کیا پتا۔ وہ چُپ ہو گیا کہ دس لاکھ کا جیولری کا فی ہے۔ اس کو صرف دو چیز اصلی دیا۔ ایک ٹاپس اور ایک انگوٹھی۔ جب وہ ہوٹل واپس گیا تو کشن چند اس کے خلاف چوری کا رپورٹ لکھوا دیا۔ کہ ایسا جینا نام کا لڑکی ہمارا شاپ پر آیا اور دھوکے سے دس لاکھ کا جیولری لے گیا۔ وہ فلاں ہوٹل میں ملے گا۔ پولیس معلوم کیا تو ادھر اس نام کا کوئی چھوکری نہیں۔ پھر دوسرا ہوٹل میں پتا کیا۔ ایک جگہ وہ مل گیا۔ پولیس اس کو گرفتار کر کے رکھا۔ اس نے بہت شور کیا کہ یہ ہم نے خریدا ہے لیکن اس کا پاس کوئی رسید نہیں تھا۔ وہ کشن چند کو نہیں پہچانا۔ کشن چند نے اپنا مال پہچان لیا۔ اس نے کہا کہ بس دو چیز اصلی ملا ہے۔ اصلی نیکلس کدھر ہے۔ اب اس کا بات کون مانے گا۔ آخر اس نے بتایا کہ جیولری کسی نے گفٹ کیا تھا۔ پولیس نے پوچھا کہ کس نے گفٹ کیا تھا اور کیوں؟ تو وہ لڑکی جو نام بتایا وہ غلط۔ اس نے اپنا پتا بھی غلط بتایا تھا۔ خریداری کا ثبوت کوئی نہیں۔ پولیس نے پوچھا کہ صرف جیولری پر دس لاکھ کا شاپنگ کیا وہ تو اس کا پاس اتنا پیسہ کدھر سے آیا۔ بس وہ پھنس گیا۔ اصلی نیکلس وہ کدھر سے لاتا۔ اس پر الزام آیا کہ اس نے کشن چند کو دھوکا دیا اور اصلی نیکلس کسی اور کو بیچ دیا۔"

"اس کے بعد تریوینی نے مدد کی ہو گی؟" میں نے کہا۔

"تریوینی بولا کہ میرا واسطے کام کرو تو میں چھڑا سکتا ہوں۔ وہ مان گئی۔ باہر آتے ہی اس نے کوئی ایسا چکر چلایا کہ تریوینی پاگل ہو گیا۔ اس نے جینا سے شادی بنا لیا۔ وہ بہت چالاک چھوکری تھا۔ دو تین مہینہ ادھر وہ تریوینی کا ساتھ رہا۔ اس نے اپنا سب فوٹو واپس لیا۔ تریوینی کا سیف کا ڈپلی کیٹ چابی بنوایا اور ایک دن سب کچھ لے کر بھاگ گیا۔ کوئی بولتا ایک کروڑ کا مال لے گیا کوئی بولتا دو کروڑ کا۔ اور بھی بہت کچھ لے گیا وہ چھوکری۔ جس سے تریوینی پھنس سکتا ہے۔ وہ ابھی واپس نہیں گیا ادھر بمبئی یا دہلی میں ہے۔"

"یہ کوئی یقین کے ساتھ کیسے کہہ سکتا ہے؟"

"اس کا پاسپورٹ ویزا ختم ہو گیا تھا۔ تریوینی کو پکا پتا ہے کہ ابھی وہ دوسرا ویزا نہیں لیا۔ اندر باہر سفارت خانے میں بھی تریوینی کا آدمی سب معلوم کیا۔ جینا کا فوٹو سب جگہ دیا۔ وہ نہیں ملا۔ اس کو دو مہینے بعد جینا کی طرف سے ایک خط ملا کہ نقد رقم اور جیولری کو بھول جاؤ۔ کاغذات وغیرہ کا سودا کرنا ہے تو ٹیلی فون کا انتظار کرو۔ لیکن اس کے بعد کچھ نہیں . . . ."

"یہ سب تم کیسے جانتے ہو؟"

"ہم۔ اس کا مدد کیا تھا۔" ہریش چندر بولا۔ "جب وہ تریوینی کے گھر سے نکلا تو اپنا گاڑی چھوڑ کے ہمارا گاڑی کی ڈکی میں چھپ گیا۔ ہم کو کیا معلوم۔ ہم گاڑی سروس کرا کے لایا تھا اور ادھر سگریٹ لینے کا واسطے رُک گیا تھا۔ وہ لڑکی اسٹوڈیو پہنچا۔ ادھر سے راج صاحب کا گھر۔ راج کپور صاحب کے گھر سے ہم گیا نرگس کا گھر۔ فلمسٹار نرگس کو دیکھا ہے تم؟ ادھر آدھے راستے میں ٹائر فلیٹ ہو گیا تو ہم نے ڈکی کھولا۔ جینا ادھر لیٹا ہوا تھا۔ ہم نے پولیس کے حوالے کرنے کا دھمکی دیا تو وہ ہاتھ جوڑا کہ تم کو سب بتا دے گا۔"

"اگر ٹائر فلیٹ نہ ہوتا تو کیا کرتی وہ؟"

"وہ رات کو کہیں نکل جاتا۔ اندر سے لاک کھول کر۔" ہریش چندر نے کہا۔ "خیر ہم اس کو گھر لے گیا۔ ابھی وہ کوئی شریف لڑکی نہیں تھا۔ مگر اس نے ہم کو سب بتایا۔ اپنا سب فوٹو بھی دکھایا جو تریوینی اتارا تھا۔ ہم نے کہا کہ تم اچھا کیا۔ اس بدمعاش کو اچھا سزا دیا۔ ایک مہینہ وہ ہمارے ساتھ رہا کیونکہ ہم اس کا واسطے دوسرے نام سے پاسپورٹ بنوایا اور ویزا حاصل کیا۔ ابھی وہ اٹلی میں ہے لیکن تریوینی سمجھتا ہے کہ ادھر بھارت میں ہے۔"

اس کے خاموش ہو جانے کے کچھ دیر بعد میں نے کہا۔ "اب یہ بھی بتا دو کہ مس جینا کی اس کہانی میں ہمارے لیے کیا ہے؟"

"تم کو تریوینی کا پاس جانا ہے نا۔" ہریش چندر بولا۔ "یہ تمھارا دھرم پتنی، کشن چند کے پاس جاوے اور بولے کہ ہم جینا کا فرینڈ ہے۔ تریوینی کا واسطے پیغام لایا ہے۔ تریوینی جدھر بھی ہوئیں گا اس کو پہنچا دیا جائے گا۔"

"اور واپسی کیسے ہو گی اس کی؟" میں نے کہا۔

"واپسی کیا مشکل ہے۔" ہریش چندر نے کہا۔ "یہ بولے گا کہ جینا ہم کو سودا کرنے کا واسطے بھیجا ہے۔ تمھارا سب چیز تم کو واپس مل جائے گا۔ ہم کو بتاؤ کتنا مال دے گا۔ ہم واپس جا کے جینا کو بتائے گا اور ہم واپس نہیں جائے گا تو جینا تمھارا بیڑا غرق کر دے گا۔"

"کیا وہ پوچھے گا نہیں۔ کہ جینا سے تمھارا کیا رشتہ ہے اور تم خود کون ہو۔ فرض کرو ثبوت مانگا اس نے۔"

"جینا کا سارا اسٹوری ہم سنا دیا۔ جو کسی کو نہیں معلوم۔ یہ اسٹوری کافی ہے۔ اس کا فوٹو بھی دکھائے گا ہم۔ ایک انگوٹھی ہے جو تریوینی اس کو دیا تھا۔ وہ نقلی ہیروں کا نیکلس بھی ہے جو پولیس نے برآمد کیا تھا۔ جینا بعد میں تریوینی کے گھر سے لے آئی تھی۔ اگر یہ سب دکھائے گی تو تریوینی کا باپ بھی مانے گا۔"

"تم نے بالکل ٹھیک کہا۔ میں جاؤں گی۔" نازو بولی۔

میں نے اسے گھور کے دیکھا۔ "کہاں جاؤ گی؟ تمھارا دماغ...؟"

"دماغ ٹھیک ہے میرا۔ میں تریوینی سے ملنے اس کے گھر میں جاؤں گی۔ میری فکر مت کرو۔" نازو نے کہا۔

"ابھی میری بھی ایک بات سُن لو۔" ہریش چندر بولا۔ "میں نے تم کو طریقہ بتا دیا۔ ہم پرتھوی راج سے بولے گا کہ ان دونوں کو ہم شیاموداوا کے پاس چھوڑ دیا تھا۔ اس کے بعد ہم نہیں جانتا کیا ہوا۔"

میں نے کہا۔ "اگر پرتھوی راج خود تصدیق نہیں کرے گا تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ مجھے تو کام سے غرض ہے۔ کام تم نے کر دیا۔ مال پر بھی تمھارا حق بنتا ہے۔"

"مال ... کیسا مال ...؟" اس نے کہا۔

"وہی جو تمھارے باس نے دیا ہو گا کہ شیاموداوا کو دے دینا۔ مجھے معلوم ہے وہ کرائے کا دادا ہے۔ پیسہ لیے بغیر کسی کا باپ تک نہیں بن سکتا۔" میں نے کہا۔

ہریش چندر نے جھینپ کر کہا۔ "بہت سیانا ہے تو میرا لال۔ خطرناک حد تک سیانا ہے۔"

میں نے کہا۔ "تم کو مجھ سے کوئی خطرہ نہیں ہونا چاہیے کیونکہ تم نے میرے ساتھ برائی کوئی نہیں کی۔ میری مدد ضرور کی ہے لیکن شیامو دادا سے مجھے پرانا حساب برابر کرنا ہے۔"

"تم... جانتے تھے اسے۔ پہلے سے؟"

"زیادہ پرانی واقفیت نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "چنانچہ حساب بھی پرانا نہیں ہے۔ میں یہ کبھی نہیں چاہوں گا کہ میرے وسیلے سے اس کو کسی قسم کا فائدہ حاصل ہو۔ کسی بھی ذریعے سے۔ تمہارے فائدے کو میں ترجیح دوں گا۔"

اس نے مطمئن ہو کے کہا۔ "کبھی پھر میری ضرورت محسوس ہو تو آ کے اسٹوڈیو آجانا۔"

میں نے کہا۔ "چوکیدار بھگا دے گا مجھے کہ یہاں کوئی ہریش چندر نہیں ہے۔"

وہ ہنسا۔ "تم کہنا ریش چونا سے ملنا ہے۔"

میں نے کہا۔ "چونا۔ کون سا چونا۔ چھالیہ کتھے والا...؟"

وہ بولا۔ "نام پڑ گیا ہے میرا خواہ مخواہ کہ میں سب کو چونا لگا دیتا ہوں۔"

"خواہ مخواہ تو نہیں۔ ابھی ابھی تم نے شیامو دادا کو چونا لگا دیا۔" میں نے کہا۔ "اور سچ تو یہ ہے کہ اپنے پاپا کو بھی۔"

"سچ بولنے کی کیا ضرورت ہے... تم کو کس نے بتایا کہ پرتھوی راج کو پاپا کہتے ہیں سب؟"

"کیا یہ غلط ہے؟ ساری فلم انڈسٹری میں وہ پاپا ہیں۔ موسیقار ایس ڈی برمن ہیں دادا برمن۔" میں نے کہا۔

"ابھی تیرے کو سب معلوم ہے اور تو بولتا ہے کہ بمبئی میں نیا آیلا ہے۔" وہ پھر بمبئی کے لہجے پر آگیا۔ "اچھا اب اپن چلیں گا۔"

"ایک منٹ۔ مجھے کوئی ایسا پتا ٹھکانا بتا دو تم جہاں ہم پھر مل سکیں۔" میں نے کہا۔ "اسٹوڈیو کے باہر۔"

اس نے سوچ کے کہا۔ "میرے کو ڈر لگتا ہے یار۔"

"یار بھی کہتے ہو اور ڈرتے بھی ہو۔" میں نے کہا۔ "اچھی ہے یہ یاری۔ ہم ایسے ہوتے تو تمہارا فائدہ کیسے برداشت کرتے۔ تم سے بار بار لے ففٹی ففٹی کی بات کی تھی۔ ہم نے تو نہیں کی حالانکہ ہم بھی کر سکتے تھے۔"

وہ قائل ہو گیا۔ اس نے مجھے کولابا کا ایک پتا لکھ کر دیا جس پر فون نمبر بھی تھا۔ "یہ بھی اپنا گھر ہے۔ تم میرا نام لو گے تو جگہ مل جائے گی۔ لیکن دیکھو، اس کو مشکل میں مت ڈال دینا۔"

"کس کو...؟"

"وہی جو اس پتے پر ملے گی۔ رات کو نہیں ملتی وہ۔ دن میں جاؤ تو دہلیز کے اوپر سے چابی اٹھا لینا۔ دائیں کونے میں ہو گی۔" وہ بولا۔

"اس کا نام تو بتا دو یار۔ ہم ایسے ہی گھس جائیں گھر میں۔"

"نام تو پارو ہے۔ پاروتی۔ ایکسٹرا ہے ابھی کسی دن تقدیر مہربان ہو گئی تو سب کو پیچھے چھوڑ دے گی۔"

میں نے کہا۔ "تم اچھی خاصی صاف اُردو بولتے بولتے بمبئی کی بولی پر کیوں آجاتے ہو؟"

وہ اُٹھتے ہوئے بولا۔ "عادت پڑ گئی ہے کچھ۔"

میں نے کہا۔ "ہم مہمان تھے۔ جاتے ہوئے بل دے جانا۔"

جب وہ چلا گیا تو میں نے نازو سے کہا۔ "تم بہت خاموش رہی ہو دھرم پتنی۔"

"میرا لال! یہاں سے میرے اور تمہارے راستے جدا ہوں گے۔" نازو نے کہا۔ "کشن چند کے پاس میں اکیلی جاؤں گی۔"

"کہیں بھی اکیلے جانا مشکل نہیں ہوتا۔ یہ سوچا ہے کہ واپسی کیسے ہو گی؟" میں نے کہا۔

"میرا راستہ کون روک سکتا ہے؟" اس نے اپنا ریوالور میرے حوالے کر دیا۔ "یہ بازو میرے آزمائے ہوئے ہیں۔"

"دریں چہ شک۔" میں نے کہا۔ "ہم بھی جانتے ہیں کہ زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے۔ مگر تم نے ابھی تک تریوینی کا قلعہ نہیں دیکھا ہے۔"

"میں نے تریوینی کو بھی نہیں دیکھا ہے۔ مگر دیکھ لوں گی۔ تم بالکل فکر مت کرنا۔" نازو نے کہا۔ "اور دیر ہو جائے تو رونا مت۔"

"میں کیوں رونے لگا۔ روئے گا غالب۔" میں نے کہا۔ "ایک بات میں بھی کہتا ہوں۔ مجھے بھی دیر ہو سکتی ہے لیکن میں اسی جگہ ملوں گا۔"

"یہاں۔ اس ریسٹورنٹ میں؟" وہ بولی۔ "یہاں میں تریوینی کو کیسے لا سکتی ہوں؟"

"تم اسے اغوا کر کے لاؤ گی؟"

"نہیں۔ بیاہ کر لاؤں گی۔" نازو نے جھنّا کے کہا۔ "اسے ساتھ لائے بغیر میں خود کیسے آؤں گی؟"

میں نے ہنس کے کہا۔ "میں سمجھ گیا۔ ذرا دیر سے سمجھا۔ تم پھول کی پتی سے ہیرے کا جگر کاٹنے جا رہی ہو۔ سلیس اُردو میں اس کو درغلا کے اُلّو بنا کے۔ خیر۔ یہ ناز و انداز اور یہ حسن خدا نے ہمیں دیا ہوتا تو ہم بھی یہی کرتے۔ اس میں تمہارا کیا کمال ہو گا۔ محسن، غالب کو میں لے کر آؤں گا۔"

"چلو یہ بھی شرط لگا لو۔" اس نے ہاتھ بڑھا کے کہا۔

"شرط کس بات پر؟" میں نے کہا۔

"ایک دعویٰ تم نے کیا ہے۔ دوسرا میں نے۔"

میں نے ہاتھ ملا لیا۔ "ٹھیک ہے۔ ہم پاروتی کے فلیٹ میں ملیں گے۔"

"ہار گئے تو کیا ہو گا؟"

"تم ہار جاؤ گی۔ تم بتاؤ۔" میں نے کہا۔ "بعد میں پریشانی نہ ہو تمہیں۔"

"ناک سے لکیریں نکالنی پڑیں گی۔ سات بار۔"

میں نے کہا۔ "نہیں۔ ناک کو سیاہی میں ڈبو کے فرش پر لکھنا پڑے گا۔ ناک کی نوک سے کہ میں اُلّو ہوں۔"

"چلو اب چلتے ہیں۔" وہ بولی۔

باہر نکلنے کے بعد میں نے اس کے لیے ٹیکسی روکی اور ٹیکسی ڈرائیور کو پتا سمجھا کے نازو سے کہا۔ "محتاط رہنا۔ وہ بہت خطرناک آدمی ہے۔ بہتر ہوتا اگر تم خالی ہاتھ نہ جاتیں۔"

"میں شک پیدا ہونے کا رسک نہیں لے سکتی۔ تم اب کہاں جاؤ گے؟ للّی کی آخری رسوم میں...؟"

"نہیں۔ میں بار بار جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "اگر اس کے ساتھ مجھے کسی اور جگہ جانا پڑا تو ممکن ہے کہ مجھے واپسی میں بہت دیر ہو جائے۔ یا میں رات کو نہ آسکوں۔ ایسی صورت میں کہیں بھی مت جانا۔ یہیں رہنا۔"

"رابعہ اور گل...؟"

"وہ محفوظ ہیں۔ موقع ملا تو ان کو بھی بتا دوں گا میں...!"

سکھ ٹیکسی والے نے کہا۔ "او جی بے کے گلاں کرو بادشاہو۔ یا فیر سانوں جان دیو۔"

میں نے کہا۔ "سردار جی! میں تے تانوں نئیں چے روکیا۔"

ٹیکسی ایک دم روانہ ہو گئی۔ میں کچھ دیر وہیں کھڑا سوچتا رہا کہ میں نے نازو کو اکیلا بھیج کے غلطی تو نہیں کی؟ بے شک وہ اپنی حفاظت کر سکتی ہے۔ اور میرے منع کرنے سے وہ کب مانتی۔ لیکن ہے تو وہ عورت ذات۔ بعض اوقات حد سے زیادہ خود اعتمادی بھی نقصان کا سبب بن جاتی ہے۔ مگر پھر میں نے خود کو اس خیال سے تسلّی دی کہ جو لڑکی ایک بحری جہاز پر اتنا عرصہ اکیلی رہی اور حوصلہ نہیں ہاری۔ اس کی خود اعتمادی میں جذبات کو دخل نہیں۔ وہ عقل سے بھی اتنا ہی کام لے سکتی ہے جتنا اپنے ہاتھوں کی ہلاکت خیز مہارت سے یا اپنے حسن و شباب کی غارت گر قوت سے۔ اسے کوئی شکست نہیں دے سکتا سوائے تقدیر کے۔ اور تقدیر سے تو میں بھی نہیں لڑ سکتا۔ اوّل تو میں اس کے ساتھ جا نہیں سکتا تھا۔ اور چلا جاتا تو باہر رہ کے اس کی کیا مدد کرتا۔

آہستہ آہستہ میں واپس چلنے لگا۔ صورتِ حال خاصی پُر امید اور حوصلہ افزا تھی۔ غالب اور محسن کے اغوا نے کچھ دیر کے لیے مجھے ناامیدی کے خلا میں چھوڑ دیا تھا لیکن اب میں راستہ دیکھ سکتا تھا۔

بیس منٹ بعد میں نے بار بار میں قدم رکھا تو مجھے اندر کا منظر زیادہ تفصیل سے دیکھنے کا موقع ملا۔ شراب پینے والے ایک ہال میں جمع تھے اور ان کی حالت ایسی تھی کہ اس پر صرف افسوس کیا جا سکتا تھا۔ وہ انسان ضرور تھے مگر شراب نے انھیں انسانیت کی سطح سے بہت نیچے گرا دیا تھا۔ ہوش و حواس سے بیگانگی کو وہ نجات سمجھتے تھے۔ نجات غمِ دوراں سے۔ سختیٔ حالات کے احساس سے۔ اپنی بے چارگی کے دُکھ بھرے خیال سے۔ لیکن ہوش کھو کے وہ بہت کچھ کھو بھی دیتے تھے۔ جس کا انھیں احساس ضرور ہوتا ہو گا نشہ اُترنے کے بعد۔ وہ سب قابلِ رحم لوگ تھے جو اتنے مجبور تھے کہ خود اپنے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔

دائیں اور بائیں جانب لکڑی کے کیبن تھے جن پر میلے پردے پڑے ہوئے تھے۔ صرف دو کیبن ایسے تھے جن کے پردے ہٹے ہوئے تھے۔ ان میں دو بدصورت اور مظلوم نظر آنے والی عورتیں اداس بیٹھی تھیں۔ ان کا میک اپ ایسا تھا جیسے کوئی دھوئیں سے کالی ہو جانے والی دیوار پر پہلے چونے کی کوچی پھیر دے۔

اندر تاڑی اور گھٹیا شراب کے بھبکے تھے اور غلیظ جسموں سے اُٹھنے والی بُو تھی۔ سگریٹ کا دھواں تھا اور شاید محبوس اندھیرے میں بسنے والے دِق کے جراثیم تھے جو بیمار پھیپھڑوں نے کھانسی کے ساتھ پھیلائے تھے۔ آخری حصّے میں مجھے شیشے کی پارٹیشن نظر آئی۔ اس شیشے کے پیچھے ٹیوب لائٹس کا نیلگوں اُجالا تھا اور میں واجبی طور پر آراستہ کمرے میں گھومنے والی کرسی پر بیٹھی ہوئی عورت کو دیکھ سکتا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ بار بار ہے۔

میں شرابیوں کے درمیان سے گزرا تو کسی نے مجھے نظر اُٹھا کے بھی نہیں دیکھا۔ ابھی میں اس کیبن کے دروازے سے دور تھا کہ ایک شخص نے میرا راستہ روک لیا۔ وہ بزعمِ خود ٹارزن اور دادا وغیرہ تھا۔ اپنے اطوار سے وہ یہی ظاہر کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ وہ چُست پتلون پر جسم سے چپکی ہوئی بنیان پہنے ہوئے تھا۔ لال پتلون کے دونوں پائنچوں پر اوپر سے نیچے تک سفید دھاری تھی اور لال بنیان پر سفید حروف کو نیم دائرے میں پھیلا کے لکھا گیا تھا "مائی لو از ڈیتھ" جس کے دونوں مطلب نکالے جا سکتے تھے کہ مجھے موت سے محبت ہے۔ یا میری محبت موت ہے۔ وہ گٹھے ہوئے بدن والا، ادھیڑ عمر کا اور موٹا آدمی تھا اور اپنی بدمعاشی کو واضح کرنے کے لیے بیل کی طرح جبڑے ہلا ہلا کے چیونگم چبا رہا تھا۔ غالباً یہ دانت پیسنے کا ویسٹرن اسٹائل تھا۔

اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔ "کدھر کو کھسکتا جاتا ہے کدّو؟"

میں نے سہم کے کہا۔" بائی جی سے ملنا تھا۔ ۔ ۔" اور پارٹیشن کی جانب اشارہ کیا۔

اسی نمونے کا ایک اور دادا پیچھے سے نمودار ہوا۔" چل بھٹ سالا۔ دارو چاہیے تو ادھر بیٹھ ورنہ بھاگ ادھر سے۔"

میں نے پھر کہا۔" ہم بائی جی سے ملے بغیر نہیں جائیں گے۔ ہم کو بہت ضروری کام ہے۔"

پہلے دادا نے مجھے ایک ہاتھ سے دھکا دیا۔" جا ادھر سے کنگلا کا بچہ۔ بائی جی سے تیرے کو کیا ضروری کام پڑ گیا۔ اُدھار کا بات کرے گا۔"

" ہم دارو نہیں پیتے۔ ہم کو شیامو دادا نے بھیجا ہے وائلن بجانے کے لیے۔" میں نے کور اٹھا کے کہا جس میں مشین گن تھی۔

" وائلن بجائے گا؟ ادھر مستک پھر یلا ہے کیا تیرا۔ گنگارام۔" دوسرے دادا نے کہا۔" تو ادھر کاہے کو آ گیا؟ جا بابا کاشی جا۔"

دوسرا قہقہہ مار کے ہنسا۔" گنگارام۔ ابھی دارو مانگتا ہے تو میرے کو بول۔ ایک پٹیالہ پیگ ہم دے گا تیرے کو۔ ۔ ۔ پھوکٹ۔ ۔ ۔"

میں آگے بڑھا۔" بائی جی!" میں نے چلا کے کہا۔" دیکھ لو یہ روک رہے ہیں ہم کو۔"

میری آواز اندر بیٹھی ہوئی عورت نے سنی اور کچھ حیران ہو کے میری طرف دیکھا۔ پھر اس نے چٹکی بجا کے ایک بدمعاش کو طلب کیا۔ دوسرا میری راہ میں دیوار بنا کھڑا رہا۔ اندر کیا گفتگو ہوئی، یہ میں نہ سن سکا مگر دو منٹ کے بعد مجھے اندر پیش کر دیا گیا۔ بدمعاش نمبر ایک اور دو میرے دائیں بائیں ایسے کھڑے ہو گئے جیسے وہ میرے باڈی گارڈز ہوں۔

" کون ہے تم، کاہے کو ہلا کرتا پڑا ہے؟" باربرا نے کہا۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ خرانٹ، جہاندیدہ عورت میرے شریفانہ حلیے اور میری صورت پر برسنے والی حماقت سے محظوظ ہو رہی ہے۔

" بائی جی ہم وائلن بجانے آئے ہیں۔" میں نے کہا۔

" ٹومیل وِد بائی جی۔ ہم باربرا ہے۔" وہ جھلا کے بولی۔" کس ایڈیٹ نے بولا تم کو یہ بات کہ ادھر جا کے وائلن بجاؤ۔ یہ تمہارا باپ لوگ سننے گا کیا؟" اس نے شرابیوں کے ہجوم کی طرف اشارہ کیا۔

" ہم کو شیامو دادا نے کہا تھا کہ باربرا کو وائلن سننے کا بہت شوق ہے۔" میں نے کہا۔

وہ شاید چالیس سال کی عورت تھی لیکن جسم کے تجربات کو عمر سمجھا جائے تو شاید سو برس گناہ کی زندگی کے ضرور گزار چکی تھی۔ ظاہر ہے، وہ تیس کی نظر آنے کی بھونڈی کوشش کرتی تھی۔ بھونڈے میک اپ سے اور بھدے جسم کی بے باکانہ نمائش سے وہ کسی بدصورت دیوار پر کسی شفاخانے کے اشتہار سے زیادہ فحش نظر آتی تھی۔

اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔" یو باسٹرڈ۔ ہم سے مذاق کرتا تم، ابھی بولو شیامو دادا کا نام کیوں لیا تم؟ وہ ایسا بات نہیں بولے گا سالا۔ اپن کیا جانے وائلن کو۔ ۔"

میں نے کہا۔" تم شیامو دادا کو تو جانتی ہو۔ کہاں ہے وہ تمہاری ماں کا خصم۔"

میرا لہجہ اور میری بات سن کر کچھ دیر وہ سب دم بخود بیٹھے رہے۔ ان کو میرے جیسے گاؤدی سے ایسی گستاخانہ جرأت کی امید بالکل نہ تھی۔

" سالا۔ حرامی۔" باربرا نے چیخ کر کہا۔

مجھے اندازہ تھا کہ میری بات کا ایسا ہی ردِ عمل ہو گا۔ میرے دونوں طرف کھڑے ہوئے بدمعاش ابھی کچھ کرنے بھی نہ پائے تھے کہ میں نے دونوں ہاتھوں کی کہنیوں سے پیچھے کی طرف وار کیا۔ کہنیوں کی ہڈی ان کے سینے کے وسط میں لگی۔ میں نے ان کے حلق سے سانس کے ساتھ خارج ہونے والی آواز بھی سنی۔ میں نے انھیں سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکے ہی تھے کہ پہلے میرا ایک پیر پیچھے کی طرف اُٹھا پھر دوسرا۔ دونوں جوتوں کی ایڑیاں ان دونوں کی ٹانگوں کے درمیان اتنی قوت سے لگیں کہ وہ ایک ساتھ بلبلائے۔

میں نے جست لگائی اور میز کو عبور کر کے باربرا کے ساتھ جا کھڑا ہوا۔ وہ اپنی گھومنے والی کرسی چھوڑ کے اُٹھی ہی تھی کہ میں نے اس کا شانہ دبا کے واپس بیٹھ جانے پر مجبور کر دیا۔ باربرا کا رنگ فق ہو گیا تھا۔ اس کو جن محافظوں پر ناز تھا، وہ سخت اذیت میں دُہرے ہو کے مجھے گالیاں بک رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے بالآخر حقِ نمک ادا کرنے کے لیے آگے بڑھنے کی کوشش کی مگر باربرا نے ہاتھ کے اشارے سے اس کو روک دیا۔

" یہ تم نے اچھا کیا بائی جی۔ ورنہ ہم ہیں غصے والے آدمی جب غصہ آ جاتا ہے تو سامنے جو بھی آ جائے اسے باہر پھینک دیتے ہیں۔ ایک دفعہ ماموں پر غصہ آ گیا تھا۔ انھیں ہم نے بند کھڑکی میں سے باہر گلی میں پھینک دیا تھا۔ اسے بھی ہم باہر پھینکتے تو یہ شیشے کی دیوار میں سے گزر جاتا۔" میں نے کہا۔

" گنگارام۔ ۔ ۔ کیا مانگتا ہے تم۔ کاہے کو لفڑا کرتا۔ ۔" باربرا نے بوکھلا کے کہا۔

میں نے اس نام پر کوئی اعتراض نہیں کیا جو مجھے ازراہ تمسخر

عطا کیا گیا تھا۔ میں نے کہا۔" ہمارے سوال کا جواب دے دو، ہم چلے جائیں گے۔"

" کون سا سوال؟ دیکھو وائلن۔ ۔"

" وائلن کو گولی مارو۔ ہم نے پوچھا تھا شیامو دادا کدھر ہے؟"

" مگر۔ ۔ ۔ تم تو بولا۔ ۔ ۔"

" ہم کو بھی گولی مارو۔ شیامو دادا کا پتا بتاؤ۔ ہمارے ساتھ چل کے۔" میں نے کہا۔

وہ مجھے بے یقینی کے ساتھ دیکھتی رہی۔ وہ یہ طے کرنے سے قاصر تھی کہ میں سنجیدہ ہوں تو کس حد تک اور خطرناک ہوں تو کس حد تک؟

" شیامو دادا کے پاس جا کے کیا کرے گا؟"

میں نے کہا۔" وائلن بجائے گا اور تمہارا ڈانس دیکھے گا۔ سنا ہے شیامو دادا طبلہ بہت اچھا بجاتا ہے۔ وہ سنگت کرے گا۔"

باربرا نے میز پر زور سے ہاتھ مارا۔" شٹ اپ۔" پھر اس نے اپنے اسی محافظ کو اشارہ کیا جس کی محبت کا نام موت تھا۔

" اس حرامی کو جوتا مار کے باہر گلی میں ڈالو۔"

وہ ایک دم آگے آیا۔ میں نے اسے قریب آنے کا موقع دیا۔ جب اُس نے مجھ پر جست لگائی تو میں نے تول کر ہاتھ مارا جو اس کی کنپٹی پر صحیح جگہ پڑا۔ وہ ایسا گرا کہ پھر نہ اُٹھ پایا۔ باربرا نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس بے ہنگم گوشت کے ڈھیر کو دیکھا جواَب بالکل ساکت تھا۔

" تم۔ ۔ ۔ مار دیا۔ ۔ ۔ مرڈر کر دیا۔ ۔ ۔ اوہ گاڈ۔ ۔ ۔" وہ کانپنے لگی۔

" گاڈ کو یاد مت کرو۔ اس سے تمہارا تعلق بہت پہلے ختم ہو چکا تھا۔ ہاں شیطان کو یاد کر سکتی ہو تم جو تمہارا یار ہے۔" میں نے انگریزی میں کہا۔

باربرا کرسی پر گر گئی۔ اس نے سامنے رکھی ہوئی قیمتی شراب کی بوتل کانپتے ہاتھوں سے کھولی اور بوتل سے منہ لگا کے ایک گھونٹ پی لی۔

" ابھی تک باہر کسی نے کچھ نہیں دیکھا۔ اور کچھ نہیں سنا۔ اپنے اس دوسرے بلڈاگ کو اشارہ مت کرنا۔ ورنہ اس کا بھی یہی حشر ہو گا۔ بہتر ہو گا اگر تم اس کو اپنے ساتھ رکھو۔ لیکن پٹا ڈال کے۔ کیا تمہارے پاس گاڑی ہے؟"

باربرا نے آہستہ سے سر ہلایا۔

" تمہارا یہ بلڈاگ ڈرائیو کرے گا۔" میں نے کہا۔" میں اور تم پیچھے بیٹھ کے باتیں کریں گے۔ میں تم کو بتاؤں گا کہ اور کس کس کو میں غصے میں پھینک چکا ہوں۔ اس کو سمجھا دینا کہ سیدھے راستے پر چلے ورنہ میں اس کو چلتی گاڑی سے باہر پھینکنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔ کیسے؟ یہ تم دیکھو گی تو تمہیں یقین آ جائے گا۔"

" ابھی۔ ۔ ۔ بولو کدھر جانے کو مانگتا گنگارام۔ ۔ ۔!"

" شیامو دادا کے پاس اور کہاں۔" میں نے کہا۔

" ہم نہیں جانتا بابا۔ ۔"

" تم سب جانتا ہے بی بی۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ " ہو سکتا ہے کہ ابھی تم کو یاد نہ آ رہا ہو۔ راستے میں جب سوچنے کا موقع ملے گا تو یاد آ جائے گا کہ شیامو دادا کے کتنے ٹھکانے ہیں اور وہ کس وقت کہاں ملتا ہے۔ رائٹ۔ اب چلو۔"

اس نے پریشانی سے نیچے پڑے ہوئے شخص کی طرف دیکھا۔

میں نے کہا۔" یہ مرا نہیں ہے۔ کچھ دیر میں اپنے پیروں پر ایسے کھڑا ہو جائے گا جیسے گدھے کا بچہ پیدا ہونے کے بعد کھڑا ہو جاتا ہے۔ کسی کو اس کے پاس بٹھا جانا۔ جو اسے بتا دے کہ تم گنگارام کے ساتھ گئی ہو اور جلد ہی خیریت سے لوٹ آؤ گی۔ اگر اس نے چند باتوں سے پرہیز کیا مثلاً شور مچانے سے۔ فون کرنے سے۔"

باتیں کرتے کرتے میں نے پُرسکون ڈرامائی انداز میں وائلن کور کھولا اور مشین گن برآمد کر لی۔" کیسا ہے یہ وائلن؟ اس پر موت کی دُھن اتنی خوبصورت بجاتا ہوں میں کہ۔ ۔ ۔"

باربرا نے ایک چیخ ماری جو شیشے کی دیوار کے پار شرابیوں کے شور میں کسی نے نہیں سنی۔" ہم۔ ۔ ۔ ہم چلے گا۔ اس کو۔ ۔ اس کو اندر ڈالو۔ کوئی دیکھے گا تو بہت بُرا ہوئیں گا۔ بہت لفڑا ہوئیں گا۔ پولیس آ جائے گا۔"

میں نے مشین گن کو واپس کور میں ڈال دیا۔ اس چیز کا نظارہ کرانا ضروری تھا۔ استعمال کے لیے ریوالور یا صرف میرے ہاتھ ہی کافی تھے۔ مشین گن کو میں نے کندھے پر ڈال لیا اور جیب سے ریوالور نکالا۔

" یہ تمہارے لیے نہیں، شیامو دادا کے لیے ہے۔ ویسے تو میں خالی ہاتھوں سے گردن بھی توڑ سکتا ہوں۔ یقین نہ ہو تو اپنے اس کتے سے کہو کہ مجھ پر حملہ کرے۔" میں نے کہا۔

کتا ایسا دُم دبا کے کھڑا ہوا تھا کہ چوہا لگتا تھا۔ وہ غرانا بھی بھول گیا تھا۔

" کیا۔ ۔ ۔ مرڈر کرے گا تم شیامو کو؟" باربرا نے ہکلا کے کہا۔

" پتا نہیں۔" میں نے کہا۔" مگر تم اس کی نہیں اپنی فکر کرو۔ تمہارا کام صرف اتنا ہے کہ مجھے اس کے پاس پہنچا دو۔ پھر تم واپس آ جاؤ گی اور تمہارا یہ دھندا ایسے ہی چلتا رہے گا۔ تم اپنی کرسی پر اسی طرح بیٹھ جاؤ گی جیسے میرے آنے سے پہلے بیٹھی

ہوئی تھیں۔ تمہارے دونوں بلڈاگ بھی اپنی اپنی ڈیوٹی دیتے رہیں گے۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں ہوگا کہ تم کس کے ساتھ کہاں گئی تھیں۔"

"وہ . . . پوچھے گا مجھ سے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس دُنیا میں وہ تم سے کچھ نہیں پوچھے گا اور نہ اس جنم میں۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ تم سب گنگارام کو بھول جاؤ۔ نہ یہاں کوئی گنگارام آیا۔ نہ اس نے کسی سے کچھ کہا، نہ کچھ کیا۔ نہ اس نے شیامو دادا کا پتا پوچھا اور نہ تم نے بتایا۔ تم تو کہیں گئی بھی نہیں۔"

"اس کا میرا سامنا تو ہوگا گنگارام۔"

"پھر کیا ہوا۔ وہ دیکھ لے گا کہ تم مجبور تھیں۔ تم اسے نرمی سے اور شرافت سے سمجھا دینا کہ اپنی دادا گیری نہ دکھائے۔ اسے بتا دینا کہ گنگارام کون ہے اور وائلن پر موت کا گیت کتنا اچھا بجاتا ہے۔ اگر شیامو دادا نے عقلمندی کا ثبوت دیتے ہوئے خاموشی سے میرے ساتھ چلنا منظور کیا تو تمہارا کام ختم۔ تم واپس جانے کے لیے آزاد ہوگی۔ بس یہ خیال رکھنا کہ واپسی یہیں ہو۔ راستے میں کوئی پولیس اسٹیشن دیکھ کے جذباتی مت ہونا۔ گنگارام کا تم سے پھر ملنے کا کوئی ارادہ نہیں مگر وہ اپنا ارادہ بدل بھی سکتا ہے۔ کیا خیال ہے اب ہم چلیں؟ بی اے گڈ گرل۔ بالکل نارمل نظر آؤ۔ رائٹ؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔ غیر ارادی طور پر اس کا ہاتھ اپنے ہینڈ بیگ کی طرف گیا۔ وہ باہر جانے سے پہلے عادت کے مطابق اپنا میک اپ درست کرنا چاہتی تھی۔

میں نے کہا۔ "تم خاصی حسین نظر آ رہی ہو۔ اگر میری نظر سے نہ دیکھو۔"

"اس میں . . . کوئی ریوالور نہیں ہے۔" اس نے مجروح لہجے میں کہا۔

"ہوگا بھی تو مجھے کیا فرق پڑے گا۔" میں نے کہا۔

جب ہم باہر آئے تو مے خواروں کے شغل اور ہنگامے میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ لکڑی کے وہ کیبن جو ہال کے دونوں جانب خلوت فراہم کرتے تھے کچھ اور خالی ہو گئے تھے۔ اب چار عورتیں اپنی بجھی ہوئی صورتوں اور لٹے ہوئے جسموں کی ساری بے حیائی کے ساتھ پُرحسرت نظروں سے ہر آنے والے کو تک رہی تھیں کہ شاید وہ آسامی "مال دار" ہو کہ ہر جامِ شراب کے ساتھ نشۂ شباب کی عیاشی کا متحمل بھی ہو سکے۔ میں نے افسوس اور دُکھ کے ساتھ سوچا کہ آخر اب ان کو کیا ملتا ہوگا اور جو کچھ ملتا ہوگا اس میں سے کتنا وہ اپنی ذات پر خرچ کرتی ہوں گی کتنا ان گِدھوں کے سامنے ڈالتی ہوں گی جو اُن کے گرد منڈلاتے رہتے ہیں تاکہ ان کے جسموں پر اپنی اجارہ داری برقرار رکھ سکیں۔ آنے والے دن کے لیے ان کے پاس کیا ہے؟ کیا ان کو آنے والے دن کا تصوّر ڈراتا نہیں ہوگا؟

باربرا چھوٹے قد کی عورت تھی چنانچہ بہت اونچی ایڑی کے سینڈل استعمال کرتی تھی۔ اس کے پیچھے چلتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ اپنے وقت میں وہ بھی مجسم فتنۂ محشر رہی ہوگی۔ آثار کہہ رہے تھے عمارت عظیم تھی۔ اس نے جسم کے خدوخال کی دلکشی کو برقرار رکھنے کی کوشش ترک نہیں کی تھی۔ مجھے انگریزی کا ایک مقولہ یاد آیا۔ تم شعلے کی لَو جتنی زیادہ رکھو گے شمع کی زندگی اتنی ہی کم ہوگی۔ وہ شمعِ محفل کی جگہ چراغِ خانہ ہوتی تو ابھی مزید بیس تیس سال اس کے آفتابِ حُسن کو گہن نہ لگتا مگر اس نے زندگی میں ملنے والی خوشیوں کے چراغ کی لَو بہت اونچی رکھی تھی۔ اس نے یقیناً بہت نظروں کو خیرہ کیا ہوگا مگر اب خوشیوں اور لذّتوں سے ضیا پانے والے چراغ میں کچھ نہیں رہا تھا۔ شعلۂ حُسن ایک بجھتی ہوئی چنگاری رہ گیا تھا۔

اس کے ساتھ چلنے والا بلڈاگ ظاہری بے نیازی کے ساتھ آگے بڑھتا جا رہا تھا اور شاید دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ گنگارام جیسے کاٹھ کے اُلّو کے اشارے پر دُم ہلانے سے اس کی عزّتِ نفس سخت مجروح ہو رہی تھی مگر میں اس پر واضح کر چکا تھا کہ وہ خود بہادری کے جوہر دکھائے، گلا پھاڑ کے مجمع لگائے یا پولیس کو بلائے۔ ہر صورت میں میرے وائلن پر موت کا گیت باربرا سُنے گی۔ مالکن کی جان بچانی ہے تو وہ مجھ سے تعاون کرے اور اس کی لاش واپس لانی ہے تو جو اس کا دل چاہے کرے۔

باربرا کی گاڑی دروازے سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑی ہوئی تھی۔ باربرا نے بلڈاگ کو چابی دی اور خود میرے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

"امید ہے تم اپنی نظر سامنے سڑک پر رکھو گے مسٹر شوفر۔" میں نے کہا۔ "اور کان اپنی مالکن کی آواز پر۔ یہ تم کو بتاتی رہیں گی کہ کہاں جانا ہے۔"

"وہ جانتا ہے کہ اسے کہاں جانا ہے۔" باربرا نے انگریزی میں کہا۔ "کیا ایک سگریٹ دو گے مجھے؟"

میں نے اسے سگریٹ دی۔ جب میں لائٹر سے اس کے لبوں میں دبی ہوئی سگریٹ جلا رہا تھا تو اس کی آنکھیں مجھے بہت غور سے دیکھ رہی تھیں۔

"ابھی کچھ دیر پہلے بھی کوئی آیا تھا شیامو دادا کو پوچھتا ہوا۔" اس نے ایک کش لے کر کہا۔

"موت کا فرشتہ ہوگا۔" میں نے بھی سگریٹ جلاتے ہوئے مختصراً کہا۔

"تم اسے کیوں قتل کرنا چاہتے ہو؟" وہ بولی۔

"اس لیے کہ آج تک قانون اسے سزائے موت نہیں دے سکا۔ کیا یہ غلط ہے کہ اس نے زندگی میں ان گنت جرائم ایسے کیے ہیں کہ ہر جُرم پر اسے پھانسی ہو سکتی تھی۔ لیکن وہ بچتا رہا . . ."

"ایسے تو سیکڑوں، ہزاروں لوگ ہیں۔ کیا سب کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لیے خدا نے تمہیں دُنیا میں بھیجا ہے؟ کہ جاؤ دُنیا میں انصاف نہیں ہو رہا ہے۔ تم کر دیکام۔ خدائی فوجدار ہو تم۔" وہ برہمی اور تلخی سے بولی۔

"خدائی فوجدار تو سب ہی ہیں۔ جو بھی اپنے نام کے ساتھ دادا کا لقب اختیار کرتا ہے، یہی سمجھتا ہے۔ اور یہ بھول جاتا ہے کہ خدا کے نظام میں ایک توازن ہے۔ بدی کے وجود کو ختم کرنے والی طاقتوں کا پلّہ ہمیشہ بھاری رہا ہے۔ چنانچہ ہر فرعون کے لیے ایک موسیٰ پیدا ہوا۔ سانپ کے لیے لاٹھی بنائی گئی۔ اندھیرا مٹانے کے لیے بلب ایجاد ہوا۔ دُنیا میں پیغمبر اور ولی، مصلح اور مبلغ، فلسفی اور حق پرست آتے رہے۔"

"تم کیا ہو؟" وہ جل کے بولی۔

"خدائی فوجدار۔ جیسا کہ ابھی خود تم نے کہا تھا۔ سیکڑوں ہزاروں کی بات میں نہیں کرتا۔ لیکن جب بھی اور جہاں بھی شیامو دادا جیسا کوئی شیطان میرے راستے میں آ جاتا ہے تو میں اس سے راستے کی بھیک نہیں مانگتا۔ میں اسے اپنے راستے سے ہٹا دیتا ہوں۔ دُنیا میں شیامو دادا ہزاروں ہیں تو گنگارام جیسے خدائی فوجدار بھی ہزاروں ہیں اور یہی وجہ ہے کہ دُنیا اب تک قائم ہے۔ اور زندہ رہنے کے قابل ہے۔"

"مجھے تمہارا چہرہ بھی جانا پہچانا سا لگ رہا ہے۔"

میں نے کہا۔ "کیا ہم پچھلے جنم میں پریمی تھے؟"

وہ مسکرائی۔ "تم ایک پُراسرار شخص ہو۔ بے حد پُراسرار۔"

"ایک بات کا خیال رکھنا مِس باربرا۔" میں نے کہا۔ "اگر کبھی غلطی سے بھی تم کو یاد آ جائے تب بھی تم گنگارام کے بارے میں کسی سے کچھ مت کہنا۔ کہ درحقیقت وہ کون تھا۔ بعض اوقات سچ نہ بولنا ہی بہتر ہوتا ہے۔ ایک بار سچ بولنے پر میں نے اپنے ماموں کو گلی سے اندر پھینک دیا تھا۔ کھڑکی کے راستے کمرے میں۔"

"انہی کو تم نے کھڑکی کے راستے گلی میں بھی پھینکا تھا۔" وہ میرا تمسخر اُڑانے کے انداز میں بولی۔

"وہ منجھلے ماموں تھے۔" میں نے کہا۔

"اُئی سی۔ بڑے ماموں نے کیا سچ بولا تھا؟"

"اُنھوں نے مجھے گنجا کہہ دیا تھا۔" میں نے کہا۔ "حالانکہ میں سر پر اُسترا پھروا کے آ رہا تھا۔"

گاڑی ایک سہ منزلہ عمارت کے سامنے رُک گئی۔ اس کے گراؤنڈ فلور پر دُکانیں تھیں۔ پہلی اور دوسری منزل پر غالباً دفاتر تھے۔ سب سے اوپر چوڑائی کے برابر نیون سائن لگا ہوا تھا۔ اس پر برقی حروف سے ایک ڈانسر بنائی گئی تھی جو اس وقت ساکت تھی۔ مجھے کراچی کا بمبینو سینما یاد آیا جس پر ایک ایسی ہی رقاصہ متحرک نظر آتی تھی مگر وہ بہت چھوٹی تھی۔

یہ ایک نائٹ کلب تھا۔ شیامو دادا جیسے لوگوں کا ٹھکانا ایسی ہی جگہ ہو سکتا تھا۔

"جاؤ دیکھو وہ ہے یہاں یا نہیں۔" باربرا نے کہا۔

میں نے کہا۔ "ہم سب چلتے ہیں۔ نہ ملا تو واپس آ جائیں گے۔ تین زینے چڑھنے اور اُترنے میں کوئی رسک نہیں۔"

باربرا نے بُرا سا منہ بنایا مگر پھر نیچے اُتر آئی۔

"کیا شیامو دادا کے بیوی بچے ہیں؟" میں نے کہا۔

"کیا رحم کے جذبات پیدا ہو رہے ہیں تمہارے دل میں؟" باربرا نے طنز سے کہا۔ "یا انھیں بھی قتل کرنے کا سوچ رہے ہو؟"

"ان سے میری کیا دُشمنی۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ شیامو دادا کے ساتھ ہی اس کا یہ کاروبار بھی ختم ہو۔ اگر تم نے معاملات کو صحیح طور پر سنبھالا اور شیامو دادا نے جنگ نہ چھیڑی تو ان کے لیے آمدنی کا یہ ذریعہ باقی رہے گا۔ ورنہ یہ سمجھ لو کہ گنگارام اس پوری بلڈنگ کو راکھ کر دے گا۔"

باربرا کے لیے میرے لہجے سے میری نیّت پر شک کرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ میرے پاس عام اسلحہ نہیں ہے۔ اس نے یقیناً مجھے پیشہ ور دہشت گرد سمجھا ہوگا جو لامحدود وسائل رکھتے ہیں۔

زینے پر قدم رکھنے سے پہلے باربرا نے پلٹ کے دیکھا۔ "مجھے یہیں سے واپس جانے دو۔ وہ موجود ہے۔"

"تم نے کیا اس کی بُو سونگھ لی ہے؟" میں نے کہا۔

"اس کی گاڑی نیچے موجود ہے۔" وہ بولی۔ "اچھا ہے اگر وہ یا کوئی اور مجھے نہ دیکھے۔ اور کسی کو معلوم نہ ہو کہ تم کو یہاں تک میں نے پہنچایا تھا۔ میں ان کی دُشمنی مول نہیں لے سکتی۔"

"او کے۔ تم واپس جاؤ۔" میں نے کہا۔ "مجھے اس بند دروازے کے پیچھے کا نقشہ سمجھا دو۔"

"اس دروازے کے پیچھے ہال ہے۔ بالکل سامنے بار ہے۔ اور دائیں جانب پہلا کمرا شیامو کا ہے۔" وہ بولی۔

"واپسی میں یہ بات یاد رکھنا کہ تم نے کسی گنگارام کو دیکھا بھی

نہیں ہو؟" میں نے کہا۔" یہ ہو سکتا ہے کہ کسی نے تمھاری گاڑی دیکھی ہو۔ تم کہہ سکتی ہو کہ تم شاپنگ کے لیے آئی تھیں۔"

" زندہ رہنے کے لیے مجھے بہانوں کی کمی نہیں۔ تم اپنی فکر کرو۔ تم کو ابھی اندازہ نہیں ہے کہ۔۔۔"

" کہ شیامو دادا کتنا بڑا دادا ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹ کے کہا۔" دادا نہیں وہ پر دادا ہو تب بھی مرے گا تو ایک ہی گولی سے میڈم۔"

" کبھی تم دوسری گولی کے بارے میں بھی سوچتے ہو؟ جو تمھیں نشانہ بنا سکتی ہے؟"

" ہاں۔ اس گولی سے کون بچ سکتا ہے جس پر کسی کا نام خود دستِ قضا نے لکھا ہو۔" میں نے کہا۔" میں اس گولی کے بارے میں کیوں سوچوں۔ مرنا مجھے بھی ایک ہی بار ہے۔ صرف اتنا میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ شیامو دادا کو اپنے وائلن پر موت کے گیت کی دُھن سُنائے بغیر میں نہیں مروں گا۔ اب جاؤ۔"

میں نے اس کی آنکھوں میں ستائش کے جذبات دیکھے۔" یُو آر اے بریوین گنگارام۔" وہ بولی۔" آئی وِش۔۔۔ کہ تم محفوظ رہو۔ اور اسے مار ڈالو۔"

میں نے کہا۔" تم میری کامیابی کے لیے دعا کر رہی ہو؟ کیوں؟"

اس نے اعصابی کشیدگی کے اضطراب میں ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔" اس لیے کہ۔۔۔ میں نفرت کرتی ہوں اس سے۔۔۔ ہی از اے باسٹرڈ۔ بیس سال پہلے کوئی گنگارام اس کے وجود سے دُنیا کو پاک کر دیتا۔۔۔ تو بار بار آتم کو وہاں نہ ملتی جہاں آج ہے۔ وہ کسی گھر کی محفوظ چار دیواری میں ہوتی۔ ایک شوہر اور چند بچّوں کی محبّت سے ملنے والی خوشیوں کے درمیان۔ لیکن تم بہت دیر سے آئے۔ اب تو میں نے خود سے بھی سمجھوتا کر لیا تھا اور انتقام کی وہ آگ بھی سرد پڑ چکی تھی جو کبھی میرے دل میں روشن تھی۔ اب تم شیامو دادا کو مار ڈالو تب بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا مجھے۔ میری اس زندگی کے معمولات وہی رہیں گے۔ پھر بھی اس کی لاش دیکھ کر مجھے خوشی ہوگی۔"

" وہ ایک بردہ فروش ہے۔" میں نے کہا۔

" ضرور اس نے تمھاری کسی بہن، منگیتر یا بیوی کو بھی اپنے مال تجارت میں شامل کر لیا ہوگا۔ اسی لیے تم اتنے جذباتی ہو گئے ہو۔" باربرا نے کہا۔

میں نے کہا۔" بیوی یا منگیتر تو نہیں۔ لیکن ایک رشتے سے وہ سب میری بہنیں ہی ہیں۔"

" کس رشتے سے؟" وہ پلٹ کے جاتے جاتے بولی۔

میں نے کہا۔" انسانی رشتے سے۔" اور اوپر بڑھ گیا۔

زینے کے آخری حصّے میں برما ٹیک کا مضبوط دروازہ تھا جس پر نائٹ کلب کا مونوگرام زیادہ سنسنی خیز تفصیلات کے ساتھ بنا ہوا تھا۔ یہ نیون سائن کا نہیں کسی پینٹر کے برش اور رنگ کا کمال تھا کہ دروازے پر قدِ آدم عورت جیتی جاگتی نظر آتی تھی۔ اس کا نیم مستور جسم آتشِ شوق کو ہوا دیتا تھا کہ تابِ نظارہ ہے تو اس حد سے گزر کر دیکھو۔

میں نے دروازے کو بجایا۔ اس کے اوپر لگے ہوئے اسپیکر نے غرا کے کہا۔" کون ہے؟"

میں نے کہا۔" ہم ہیں گنگارام۔ وائلن بجاتے ہیں۔"

" یہاں کیا لینے آئے ہو؟"

" ہم اپنے شیام چاچا سے ملنے آئے ہیں۔" میں نے معصوم لہجے میں کہا۔

غالباً کسی نے 'ڈور آئی' سے جھانک کر دیکھا کہ شیامو کو دادا کہنے والے تو بہت آتے ہیں، یہ چاچا کہنے والا کون آ گیا۔ پھر دروازہ کُھل گیا۔

ایک ویٹر نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔" کیا تمھیں شیامو دادا نے بُلایا تھا؟"

وہ دادا ہیں تمھارے۔" میں نے مسّرت سے کہا۔" پھر تو ہم بھی تمھارے چاچا ہوئے۔"

اس کا چہرہ بگڑ گیا۔" کیا کام پڑ گیا ہے تمھیں ان سے؟"

" ماتا جی نے کہا تھا کسی اور کو مت بتانا۔" میں نے احمقانہ صورت بنا کے کہا۔" وہ تمھارے دادا ہیں تو کیا۔"

اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔" ادھر جاؤ میرے چاچا۔ میرے باپ۔ وہ ہے شیامو دادا کا کمرا۔"

کمرا میں نے پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔ اگر میں چاہتا تو اپنے بھتیجے کے ایک ہاتھ مار کے بھی اس کمرے کے دروازے تک پہنچ سکتا تھا مگر قبل از وقت اپنے جارحانہ عزائم کا اظہار کرنا مناسب نہ ہوتا۔ میں نے ہال میں بہت سے لوگوں کو مصروفِ کار دیکھا۔ اب شام ڈھل چکی تھی۔ یہ سب رات کے شو کی تیاری میں مصروف تھے۔ مجھے دو لڑکیاں بھی دکھائی دیں۔ وہ ہال کے آخری حصّے میں کرسیوں پر آمنے سامنے بیٹھی ہوئی کچھ پی رہی تھیں۔ اُنھوں نے مجھے نظر اُٹھا کے بھی نہیں دیکھا۔

شیامو دادا کے کمرے کے باہر ایک گنجے سر اور براؤن داڑھی والا جن اسٹول پر زرہ بکتر ٹائپ ڈریس پہنے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی چمڑے کی جیکٹ میں درجنوں پیتل کے چمکتے ہوئے بٹن تھے۔ سینے پر اس نے میگزین سجا رکھا تھا۔ جینز کے تنگ پائنچے فل بوٹ میں غائب ہو گئے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ بگل بجنے کے انتظار میں ہے اور بگل بجتے ہی سر پر خود رکھ کے نیزہ یا تلوار لے کر گھوڑے

پر بیٹھے گا اور ہوا ہو جائے گا۔ مجھے دیکھ کر اس میں سے عجیب سی گڑگڑاہٹ نکلی۔ غالباً اس نے جنوبی ہندوستان کی بھاشا میں مجھ سے کوئی سوال کیا تھا۔ میں نے سلام کر کے عاجزانہ لہجے میں اپنا تعارف کرایا۔ اس نے بھی شیامو دادا کے کسی بھتیجے کو پہلے کہاں دیکھا ہوگا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اس نے مجھے اپنی جگہ اسٹول پر بٹھا دیا۔

" ہم دادا کو بولے گا۔ کیا نام بولا تم اپنا؟"

" گنگارام ولد جمنا داس۔" میں نے سکون سے کہا۔ میرے رویّے سے بالکل ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ میں کیا کرنے والا ہوں۔ شیامو دادا کے باڈی گارڈ نے مجھے یہ بتانا ضروری نہیں سمجھا کہ اس کی واپسی تک مجھے یہیں بیٹھ کر انتظار کرنے کے سوا کچھ نہیں کرنا چاہیے۔ وہ اندر گیا ہی تھا کہ میں نے کور سے مشین گن نکالی اور خود بھی دروازہ کھول کے اندر داخل ہو گیا۔

شاندار طریقے پر آراستہ کمرے کا آدھا حصّہ شیامو دادا کا آفس سمجھا جا سکتا تھا۔ اس حصّے میں ایک بہت بڑی آفس ٹیبل پر چار فون رکھے ہوئے تھے اور سامنے چار کرسیاں تھیں۔ پھر ایک صوفہ سیٹ تھا اور درمیان میں بیضوی کافی ٹیبل۔ دوسرا حصّہ پرائیویٹ تھا جس میں بھاری پردوں کے پیچھے ایک بیڈ لگا ہوا تھا۔ شیامو دادا کو اس کے بھتیجے گنگارام کی آمد کی اطلاع دینے والا اس پردے تک پہنچ چکا تھا۔ شیامو دادا ابھی ابھی پردہ ہٹا کے باہر آیا تھا کہ اس نے مجھے دیکھا اور مشین گن کا رخ اپنی جانب دیکھا۔ اس کا محافظ دروازہ کُھلنے کی آواز پر پہلے ہی پلٹ کر یہ منظر دیکھ چکا تھا۔ اب وہ دونوں اپنی اپنی جگہ منجمد کھڑے ہوئے تھے۔

اندر سے کسی عورت نے نشے میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔" شیام! کہاں چلے گئے۔" مجھے اس کی آواز کچھ مانوس سی لگی۔

شیامو دادا نے کہا۔" چپ چاپ بیٹھی رہو۔ باہر آنے کی ضرورت نہیں۔"

شیامو دادا کی عمر کا اندازہ میں نے پچاس برس لگایا۔ وہ درمیانے قد کا اور بھاری جسم والا آدمی تھا جس کی صحت یقیناً قابلِ رشک تھی۔ صحت سے زیادہ اس کی صورت نے مجھے حیران کیا۔ وہ کسی طرح بھی ایک بدمعاش نظر نہیں آتا تھا۔ اس کا رنگ صاف تھا اور کلین شیو چہرے پر وہ درشتی نہیں تھی جو پرانے مجرموں کی صورت پہ ان کے اعمال کا عکس بن کے نظر آتی ہے۔ اس نے بے داغ سفید قمیص کے ساتھ سلیٹی رنگ کی پتلون پہن رکھی تھی اور اس کے گھنے بال درمیان سے بنے ہوئے تھے۔ کالے فریم والے چشمے کے ساتھ وہ دادا نہیں کوئی پروفیسر یا ڈاکٹر نظر آتا تھا۔

" کیا بات ہے۔ کون ہو تم؟" اس نے متانت سے کہا۔" کیا مقصد ہے آخر اس طرح یہاں آنے کا؟"

" دادا! ہم اس کو روکا تھا۔۔۔" محافظ نے اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی اور مجھے خوں آشام نظروں سے گھورا۔ شیامو دادا کے ہاتھ کا اشارہ پا کے وہ چپ ہو گیا۔

" اسے خود بتانے دو۔" شیامو دادا نے کہا۔" تم جاؤ باہر بیٹھو۔"

" اور خیال رکھو کہ کوئی اندر نہ آنے پائے۔" میں نے کہا۔" میں بلاوجہ خون خرابے کا قائل نہیں لیکن ضرورت پڑنے پر سب کچھ کر سکتا ہوں۔"

" کیا تم بیٹھ کے بات کرنا پسند کرو گے؟" شیامو دادا نے انگریزی میں کہا اور صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے جواب میں انگریزی میں کہا۔" میں زیادہ لمبی بات نہیں کروں گا۔"

" آل رائٹ۔ کیا پیئو گے؟۔۔۔" اس نے اپنا پُرسکون انداز برقرار رکھا۔

" کاش میں تمھارا خون پی سکتا۔" میں نے کہا۔" لیکن میں ایک انسان ہوں اور چونکہ تمھارا دُشمن بھی ہوں اس لیے تمھارے ہاتھوں سے پانی کا ایک گھونٹ بھی نہیں لوں گا۔ تم نے مجھ سے تین سوال کیے ہیں شیامو دادا۔ یہ کہ میں کون ہوں؟ میں وہی ہوں جس کو اُٹھانے کے لیے تم نے چار آدمی بھیجے تھے۔ ایک دُنیا سے اُٹھ گیا۔ باقی کو میں نے واپس کر دیا۔ پھر تم نے پوچھا تھا کہ بات کیا ہے؟ بات یہ ہے شیامو دادا کہ میں تو تریوینی کی قید سے نکل آیا۔ لیکن اس نے میرے دو ساتھیوں کو اُٹھوا لیا ہے اور میں انھیں رہا کرانا چاہتا ہوں۔ تمھارے آخری سوال کا جواب یہ ہے کہ میرے اس طرح یہاں آنے کا مقصد تم کو اپنے ساتھ لے جانا ہے۔"

" کہاں؟" شیامو دادا نے کہا۔

" تریوینی کے پاس۔ تم چاہو تو اس کو یہاں بھی بُلا سکتے ہو۔" میں نے کہا۔" وہی بتائے گا کہ میرے دونوں ساتھی کہاں ہیں۔"

شیامو دادا ہنسنے لگا۔ عورت نے ایک بار پھر اسے آواز دی۔ میرے کان پھر کھڑے ہوئے۔ وہ نشے میں بول رہی تھی لیکن اس کے باوجود میں آواز کے لہجے کو کسی حد تک شناخت کر سکتا تھا۔ میرے شکوک کی بنیاد کوئی نہیں تھی۔ پھر بھی میرے یقین کی بنیادیں ہلنے لگی تھیں۔ شیامو دادا نے ایک ڈوری کو کھینچا اور ریشمی پردہ سمٹ کر ایک طرف ہو گیا۔

ایک لڑکی بستر پر بے ترتیب پڑی ہوئی تھی۔ سبز ریشمی چادر کی شکنوں کے درمیان اس کا گلابی جسم کسی شوخ رنگین تصویر کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ اس نے بکھرے ہوئے بال ہٹا کے نیم باز آنکھوں سے مجھے دیکھا۔

جب سے میں نے اس کی آواز سنی تھی، میرے دل میں ایک کانٹا سا چبھ گیا تھا۔ یہ ایک رُسواکن اندیشے کی پھانس تھی جس نے میرے وجود کو خوف کے عذاب میں مبتلا کر دیا تھا۔ جب میں نے اس کا چہرہ دیکھا تو میری روح کا آزار تمام ہوا اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ نازو نہیں تھی۔ صرف اس کی آواز نازو کی آواز سے حیرت انگیز حد تک مشابہ تھی اور اس سے مشابہت کے اندازنے مجھے ڈرا دیا تھا۔ کیونکہ میں اور نازو ایک ساتھ ایک سے عزائم لے کر نکلے تھے اور اگرچہ ہمارے راستے جدا تھے مگر منزل وہی ایک تھی۔

شیامو دادا تک پہنچنے کے لیے مجھے پہلے ’بار بار‘ جانا تھا اور وہاں سے شیامو دادا کے ساتھ تریوینی تک رسائی حاصل کرنا تھی۔ نازو نے تریوینی تک پہنچنے کے لیے کشن چند کو ذریعہ بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ تریوینی تک پہنچنا آسان کام نہیں تھا چنانچہ میں اس خیال کو بعید از امکان سمجھ کے نظر انداز نہیں کر سکتا تھا کہ کہیں نازو کسی شیطانی چکر میں پھنس کر یہاں نہ پہنچ گئی ہو۔

شیامو دادا نے میرے انہماک سے غلط نتیجہ اخذ کیا۔ وہ کیسے اندازہ کر سکتا تھا کہ اس لڑکی کو دیکھ کر مجھے کیسی ذہنی اذیت سے نجات مل گئی ہے۔ اس نے یہی سمجھا کہ میری نظر کو اس حسن و شباب کے نظارۂ بے حجاب نے خیرہ کر دیا ہے۔

”کیوں بھئی گنگارام!“ اس نے معنی خیز لہجے میں مسکرا کے کہا۔ ”قدم رُک کیوں گئے؟ سوچنے کی تو کوئی بات نہیں ہے۔“

میں نے چونک کر کہا۔ ”رام رام کرو بھیا۔ گنگارام نے اس راستے پر چلنے کا کبھی نہیں سوچا۔ تم کیا سمجھتے ہو آخر، ہم نے شراب نہیں پی تمہاری، تو کیا ہم اس پر پھسل جائیں گے؟“

”میں کچھ نہیں سمجھتا۔“ وہ عیاری سے بولا۔ ”جو کچھ بھی سمجھ رہے ہو تم خود سمجھ رہے ہو اور غلط سمجھ رہے ہو۔ تم ملنا چاہتے تھے تریوینی سے۔ میں تم کو وہیں لے جا رہا ہوں، چلو ادھر بھی ایک راستہ ہے۔“

اس نے سامنے والی دیوار کی طرف اشارہ کیا تھا لیکن مجھے اُدھر کوئی راستہ دکھائی نہ دیا۔ دیوار اوپر سے نیچے تک بھاری پردوں کی شکنوں میں چھپی ہوئی تھی۔ پس پردہ کسی دروازے کی موجودگی ناممکن نہیں تھی۔ شیامو دادا جیسے لوگوں کے لیے ہر جگہ ایک دروازہ آمد و رفت کے لیے ضروری ہوتا ہے تو دوسرا چور دروازہ فرار کے لیے اس سے بھی زیادہ ضروری ہوتا ہے۔ لیکن میں کسی ایسے راستے سے گزرنے کا رسک لینے پر آمادہ نہ تھا جو میرا دیکھا ہوا نہ ہو۔

میں نے ایک آہ بھر کے کہا۔ ”ہم دیوار میں سے گزر سکتے تو بہت پہلے ان دیواروں سے گزر گئے ہوتے جو ہمارے اور ہماری صوفیہ لارین کے بیچ حائل رہیں۔ پرکھوں نے کہا کہ ایسا منتر کوئی نہیں۔“

وہ ہنسا۔ ”ایسا تو واقعی کوئی منتر نہیں...!“

”لیکن...!“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”پرکھوں نے کہا کہ بیٹا گنگارام! انجانے راستے پر تب جاؤ جب راستہ بھول جاؤ۔“

اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ ”وہ دراصل..... میرا مقصد کچھ اور تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کسی کو کچھ معلوم ہو۔ ادھر سے جائیں گے تو سب دیکھیں گے۔“

”ارے دیکھیں گے تو دیکھا کریں۔ شرم کی کون سی بات ہے اس میں؟“ میں نے کہا۔ ”آخر اس بے شرم کے ساتھ بھی تم کو آتے جاتے دیکھا ہوگا لوگوں نے۔ گنگارام کے سنگ کیا ہے؟“

”تم سمجھتے کیوں نہیں، وہ ماتحت ہیں میرے۔ تم چاہتے ہو کہ میں چوہے کی طرح دُم دبا کے چل پڑوں تمہارے ساتھ۔ میرا امپریشن خراب ہو جائے گا۔“

”امپریشن خراب مت کرو۔“ میں نے کہا۔ ”تم کُتے کی طرح دُم ہلاتے چلو، غراتے چلو۔ ہم تمہارے پیچھے چلتے ہیں ہاتھ باندھ کر۔ بس اتنا خیال رکھنا کہ ہمارے یہ ہاتھ بھی آٹومیٹک ہیں جو ایک بار چل جائیں تو پھر رُکتے نہیں۔ اِدھر کوئی غلط خیال آیا تمہاری کھوپڑی میں اُدھر ہاتھ چالو۔ تم تو ان ہاتھوں کا کھیل دیکھ چکے ہو۔“

شیامو دادا غصے اور بے بسی کی کیفیت میں اپنے ہونٹوں کو دانتوں سے کاٹتا رہا۔ ”وہ اور بات تھی، یہاں تمہاری بدمعاشی نہیں چلے گی۔“

”چھوڑو بدمعاشی کو۔ یہ بتاؤ تم خود چلو گے یا ہم ڈرائیو کریں تمہیں؟“ میں نے کہا۔

معلوم نہیں شیامو دادا نے اس عورت کو اشارہ کیا تھا یا وہ مکار اور بے حیا عورت اس حد تک ہوش میں تھی کہ ہماری گفتگو سُن کے صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ کر چکی تھی۔ اس نے بیڈ پر حرکت کیے بغیر اپنا ایک ہاتھ آگے بڑھانا شروع کیا۔ اس کے ہاتھ کی یہ خفیف سی حرکت ہرگز میری نظر میں نہ آتی اگر خود شیامو دادا کی نظر یہ راز فاش نہ کرتی۔ شیامو دادا نے اضطرابی کیفیت میں دو بار مجھ سے بات کرتے کرتے دوسری طرف دیکھا اور پھر فوراً نظر چُرا کے مجھ پر یوں نظر ڈالی جیسے وہ میری صورت سے کچھ اندازہ کرنا چاہتا ہے۔ مجھے شک ہوا۔ تیسری مرتبہ اس کی نگاہ بھٹکی تو میں نے بھی ادھر دیکھا۔ اس عورت کا ہاتھ تکیے کی ریشمی سطح پر ایک ایک انچ آگے سرک رہا تھا، ایک پتلی سی ڈوری کی طرف جو بیڈ کے سرہانے دیوار پر آویزاں تھی۔ یہ یقیناً کال بیل کا سوئچ تھا۔ مجھے معلوم بھی نہ ہوتا اور اندر کہیں گھنٹی بج جاتی۔ کوئی اچانک اندر آ جاتا اور اس کے بعد کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا۔ میں اندر آنے والے کو مار دیتا تب بھی باہر والوں کو خبر مل جاتی کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔ وہ بچ کے نکل جاتا تب بھی مشکلات پیدا کرتا۔ باہر والے پولیس کو بُلا لیتے یا شور مچا کے مجمع اکٹھا کر لیتے۔ میں ہر صورت میں محصور ہو جاتا۔

میں نے اچانک شیامو دادا کے ایک لات ماری۔ وہ سیدھا اس عورت کے اوپر جا گرا۔ اس نے بے اختیار مجھے ایک گالی دی۔

”اونچی آواز مت نکالنا، ورنہ بہت لوگ مارے جائیں گے۔“ میں نے ایک جھٹکے سے کال بیل کا تار کھینچ کے توڑ دیا۔

شیامو دادا نے اس عورت کو بھی ایک گالی دی۔ ”پیسہ لینے کے لیے ہاتھ کتنی تیزی سے آگے بڑھتا ہے۔“

اس نے کانپتے ہوئے شیامو دادا کے پیچھے چھپنے کی کوشش کی۔ شیامو دادا اسے دھکیل کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے اطوار کی ساری شائستگی اب رُخصت ہو چکی تھی۔ وہ ناکامی اور خطرے کے احساس سے بپھرا ہوا ایک سفاک اور کمینہ شخص نظر آنے لگا تھا۔ اس کی صورت میں کرختگی کی بدصورتی آ گئی تھی۔

”گنگارام کو بے وقوف بنانے یا اس کی آنکھوں میں دُھول جھونکنے کا خیال اپنے دل سے نکال دو شیامو دادا۔“ میں نے مشین گن کو خطرناک انداز میں پکڑ لیا۔ ”کوئی تمہاری مدد بھی نہیں کر سکتا، چاہو تو کوشش کر کے دیکھ لو۔ کہو اپنی ہمشیرہ صاحبہ سے کہ میری طرف سے انھیں باہر جانے کی اجازت ہے۔ بُلا لیں جسے چاہیں۔ سب کی لاشیں یہیں پڑی رہ جائیں گی اور میں بہرحال تم کو لے کر نکل جاؤں گا۔ تم کیوں اپنا یہ بزنس اپنی حماقت کی وجہ سے ختم کرنا چاہتے ہو۔ سب ایسے ہی چلتا رہے تو اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔ باقی لوگ اپنا کام کرتے رہیں۔ نائٹ شو جاری رہے، تم خاموشی سے میرے ساتھ نکل چلو۔“

اس نے بند مُٹھی سے میز پر مُکا مارا۔ ”اوکے، اوکے، چلو۔ لیکن اس طرح نہیں۔ اپنا یہ اسلحہ ہٹا لو سامنے سے۔“

میں نے مشین گن کو پھر کوٹ میں ڈال دیا۔ ”میری برداشت کا حوصلہ آزمانے کی تیسری کوشش مت کرنا۔ میں تمھیں وضاحت کا موقع بھی نہیں دوں گا اور تمہارے ساتھ سب کو فنا کر دوں گا۔ اس کلب کو تباہ کر دوں گا آگ لگا کے۔ میں جان ہتھیلی پر رکھ کے آیا ہوں اور مرنے سے ڈرتا بھی نہیں۔ میری موت سے تم کو ڈرنا چاہیے۔ کیونکہ میں مرنے سے پہلے ان سب میں موت تقسیم کروں گا جو تمہارے داداگیری کے کاروبار کو چلاتے ہیں۔ تمہاری بدمعاشی کی بساط کے وزیر، فیل اور پیادے سب مارے جائیں گے شیامو دادا۔“

میرا بدلا ہوا لہجہ یکسر مختلف تھا۔ اب گنگارام نہیں سکندر بول رہا تھا۔ چنانچہ شیامو دادا واقعی خوفزدہ نظر آنے لگا تھا۔ وہ عورت بھی پوری طرح ہوش میں آ گئی تھی اور اس نے اِدھر اُدھر سے اٹھا کے پورے کپڑے بھی پہن لیے تھے۔

شیامو دادا دروازے کی طرف بڑھا۔ ”میری واپسی تک تم یہیں رہو گی۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں ہونا چاہیے۔“ اس نے عورت کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

”اگر کوئی بہت اصرار کرے؟“ میں نے کہا۔ ”تو تم کہہ سکتی ہو کہ شیامو دادا اپنے بھانجے کے ساتھ گئے ہیں اور یہ بھانجا گنگارام کسی فلمی میوزک ڈائریکٹر کے آرکسٹرا میں وائلن بجانا چاہتا تھا۔“

صورتِ حال پوری طرح میرے قابو میں تھی اور میں کسی قسم کی رخنہ اندازی یا ہنگامہ آرائی کے بغیر شیامو دادا کو ساتھ لے کر جا سکتا تھا۔ لیکن تجسس کا جذبہ جو میری فطرت میں شامل تھا، ایک سوال بن گیا۔ میں نے کہا۔ ”شیامو دادا، اگر میں تمہاری بات مان لیتا اور ہم اس طرف سے جاتے تو کیا ہوتا؟“

شیامو دادا نے کہا۔ ”کچھ بھی نہ ہوتا۔“

معلوم نہیں کیوں اس کے جواب کو میں نے چیلنج سمجھ لیا۔ حالانکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے ایسا لگا جیسے شیامو دادا کے سرسری جواب میں کوئی تضحیک کا پہلو ہے۔ وہ میرا مذاق اُڑا رہا ہے یا مجھ پر طنز کر رہا ہے کہ زبانی دعوے تو میں بہت بڑے کر لیتا ہوں لیکن درحقیقت ڈرتا ہوں اور ایک بُزدل آدمی ہوں۔ پھر مجھے یہ شک بھی ہوا کہ وہ مجھے ٹال رہا ہے اور مجھ سے کچھ چھپانا چاہتا ہے۔

میں نے کہا۔ ”بس تو پھر ہم اُدھر سے ہی چلتے ہیں۔“

شیامو دادا کا چہرہ بگڑ گیا۔ ”نہیں، اس کا کوئی فائدہ نہیں، جب میں چاہتا تھا تو تم اَڑ گئے تھے۔ اب میں نہیں چاہتا۔“

میں نے کہا۔ ”افسوس کی بات یہ ہے شیامو دادا! کہ تمہارے چاہنے یا نہ چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ سمجھ لو کہ میں پھر

اَڑ گیا ہوں اور تم پھر مجبور ہو۔"

اس سے پہلے کہ شیامو دادا کے ردِ عمل کا اظہار ہوتا، دروازہ دھڑ سے کھلا اور ایک خوف ناک سکھ اندر آگیا۔ اس کی گھنی داڑھی اور مونچھوں کے سیاہ بالوں میں چہرہ تقریباً چھپ گیا تھا۔ ناک کے اوپر دو خون آشام آنکھیں نظر آرہی تھیں۔ سر کے بالوں کو اس نے جوڑے کی شکل میں باندھا تھا اور اس طرح اپنے ساڑھے چھ فٹ قد میں مزید اضافہ کر لیا تھا۔ اپنے فربہ جسم کے باعث وہ ایک دیو زاد لگتا تھا۔ اس نے میلی پتلون کے ساتھ ڈھیلی ڈھالی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے ساتھ مگر ایک قدم پیچھے رہ کر چلنے والے دو ایسے افراد بھی کمرے میں گھس آئے جن کو بمبئی کی زبان میں موالی کہا جا سکتا تھا۔

میں نے ان کے اندر آتے ہی محتاط پوزیشن لے لی تھی جہاں سے میں ان سب پر نظر رکھ سکوں اور ضرورت پڑے تو کنٹرول بھی کر لوں۔ پہلے میں یہی سمجھا تھا کہ میری وارننگ کے باوجود شیامو دادا نے باہر سے حمایتی بلوا لیے ہیں اور آنکھیں کھُلی رکھنے کے باوجود میں یہ نہ دیکھ سکا کہ اندر سے رابطہ کس نے قائم کیا اور کیسے کیا؟ لیکن میرا یہ تاثر فوراً ہی ختم بھی ہو گیا۔

سکھ نے مجھے نظر انداز کرتے ہوئے شیامو دادا کی طرف پیش قدمی کی۔ ایک موالی نے لات مار کے دروازہ بند کر دیا۔

"شیامو! کیا بات ہے پُتّر۔ اب تیرے اتنے نخرے ہو گئے ہیں کہ دروازہ بند ہو تو ہم بھی نہیں آسکتے؟" سکھ نے بگڑے ہوئے پنجابی لہجے میں کہا۔ "وہ جو تیرا پیو باہر بیٹھا ہے اس کو میں نے کہا کہ مار کے ہتھ بوتھا لگاڑ دوں گا...!"

"وہ... دراصل میں کہیں جا رہا تھا۔" شیامو دادا نے میری طرف دیکھ کے کہا۔

"اوئے کنجر! اب ہم آئے ہیں تیرے پاس تو پھر تُو کہاں جا رہا ہے؟" سکھ نے اس کو شانے پہ ہاتھ مار کے دھکّا دیا۔ "روز باہر ہی ہوتا ہے تُو۔ کی مخول اے؟ چکّر بازی ہمارے ساتھ.....؟"

"کوئی چکّر بازی نہیں۔" شیامو دادا نے پریشان ہو کے کہا۔ "ایسا ہوا دو تین بار کہ تم آئے تو میں واقعی نہیں تھا۔"

"اچھا چھوڑ پچھلی باتیں۔ صاف بات کر کہ مال کدھر ہے؟"

سکھ نے ننھی سی کرپان سے دانتوں میں خلال شروع کیا۔

"دیکھو سردار جی، تم بیٹھو یہاں، میں ابھی آتا ہوں پھر اطمینان سے بات کریں گے۔" شیامو دادا نے میرا اشارہ سمجھ کے کہا۔ "مجھے بہت ضروری کام ہے۔"

سکھ نے اسے دھکّا دے کر بیڈ پر گرا دیا۔ "سوُر دا پُتّر، تجھے ضروری کام ہے تو ہم کیا کھیل کرنے آئے ہیں ادھر؟ جواب دے میری بات کا ورنہ....." اس نے جُملہ ادھورا چھوڑ کر ساتھ آنے والوں کی طرف دیکھا۔ وہ پوری ریہرسل کر کے آئے تھے۔ ورنہ کا لفظ سُنتے ہی انھوں نے کمانی والے خنجر نکال لیے۔ ایک بار ان کو کھول کے خطرناک آواز کا ڈرامائی تاثر پیدا کیا اور پھر انھیں یوں واپس جیب میں ڈال لیا جیسے فی الحال انھوں نے سب کو گاجر مولی کی طرح کاٹنے کا ارادہ ملتوی کر دیا ہو۔

شیامو دادا نے خشک حلق کو تھوک نگل کے تر کیا۔ وہ میری موجودگی میں سردار جی سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا مگر یہ دیکھ رہا تھا کہ مطمئن ہوئے بغیر سردار جی بھی ٹلنے والے نہیں۔ اس نے کہا۔ "سردار جی! مال کہیں نہیں جاتا۔ آپ کے میرے درمیان کبھی بھی ہیرا پھیری والی بات ہوئی ہے؟"

"پھر اس بار کیوں ہو رہی ہے؟ چکّر کیوں دے رہا ہے مجھے؟" سردار جی نے غرا کے کہا۔

"چکّر کیسا سردار جی، مال تھوڑا ہے....."

"چل تھوڑا ہے تو تھوڑا ہی دے۔ سوُر دے پُتّر، دینا نہیں تو دکھا ہی دے۔ ورنہ۔" سردار جی نے کہا۔

ورنہ پر سردار جی کے چیلوں نے ایک بار پھر اپنے اپنے خنجروں کے اسپرنگ چیک کیے۔ اب میرے لیے دخل در معقولات کا جواز پیدا ہو گیا تھا۔ ان کی وجہ سے ہماری روانگی مؤخر ہو گئی تھی اور... کچھ میرے ہاتھوں میں بھی کھُجلی ہونے لگی تھی۔

میں نے کہا۔ "کیا بات ہے؟ یہ خنجر خراب ہیں یا ان کا دماغ خراب ہے؟"

سردار جی نے مجھے گھورا۔ "کیا مطلب ہے اس کا اوئے؟"

میں نے کہا۔ "تمہارے اشارے کو خوب سمجھتے ہیں تمہارے دونوں بندر۔ ان کے خنجر اصلی ہیں یا نقلی؟"

سکھ نے حلق سے ریچھ جیسی آواز نکالی۔ "بہت لمبی زبان ہے تیری پاگل دے پُتّر۔"

میں نے کہا۔ "زبان تو اتنی ہی لمبی ہے جتنی تمہاری مگر ہم بلا وجہ بولتے نہیں۔ اتنی دیر سے چُپ تھے ورنہ....."

"ورنہ..... ورنہ کیا اوئے؟ دھمکی دیتا ہے؟" سردار جی نے اپنے ہاتھ سے میرے شانے کو دھکّا دیا۔

میں نے کہا۔ "سردار جی، ہم تو کام سے جا رہے تھے۔ پر آپ نے بہت وقت برباد کر دیا ہمارا۔ اب آپ ہمارا راستہ چھوڑ دیں ورنہ....."

دوسری بار "ورنہ" کی دھمکی سُن کے سکھ کے غصّے کی انتہا نہ رہی۔ اس نے چیخ کر مجھے ایک گالی دی۔ "ورنہ دے پُتّر... تیری تو....."

اس کے دونوں چمچے ایک ساتھ مجھ پر جھپٹے۔ میں نے غوطہ مار کے خود کو بچایا لیکن اس طرح کہ سیدھا سردار جی میں گھس گیا۔ وہ شیامو دادا سے ٹکرائے۔

میں نے چلاّ کے کہا۔ "اوئے سردار، تیرے تو میں بارہ بجا دوں گا۔ روک اپنے بندروں کو ورنہ....."

سردار جی نے چیخ کر کہا۔ "مار واس...کو... اس کی ہڈیاں توڑ دو، بُوتھا لگاڑ دو اس کا۔"

وہ دونوں جن کو میں نے بندر کہا تھا سخت مشتعل ہو کے پھر حملہ آور ہوئے۔ میری پھُرتی نے ان کے پہلے حملے کو ناکام بنا دیا تھا اور انھیں کچھ حیران بھی کیا تھا۔ دوسری کوشش کے لیے انھوں نے مجھے دو طرف سے محصور کیا اور آہستہ آہستہ آگے آئے۔ میں ایک ایک قدم پیچھے ہوتا گیا۔

سردار جی نے کہا۔ "ٹوٹے کر دو اس..... کے۔"

شیامو دادا نے سخت پریشان ہو کے کہا۔ "سردار جی... جھگڑا چھوڑیے۔ معاملہ بگڑ جائے گا۔" وہ سمجھ رہا تھا کہ حملہ آور جب خنجر نکالیں گے تو میں مشین گن نکال لوں گا۔ اور اس کے بعد جو خون خرابا ہو گا، اس میں نقصان صرف اسے ہو گا۔

میں نے کہا۔ "تمہاری ماں بندریا تھی یا باپ بندر تھا؟"

حسبِ توقع وہ ایک ساتھ اُچھل کر آگے آئے۔ میں نے بھی اُچھل کے ایک کے لات ماری اور دوسرے کا سر اپنی بغل میں دبا کے اسے یوں گھمایا کہ اس کے پیر اوپر اُٹھ گئے۔ ایک پورا چکّر دے کر میں نے اُسے دیوار پہ دے مارا۔ اتنی دیر میں لات سے دُور جا گرنے والا پھر اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ وہ خنجر نکال کے آگے آیا اور میں نے وار کا انتظار کیا۔ جیسے ہی اس کا ہاتھ اُٹھا میرا بھی ہاتھ اُٹھا۔ میں نے خنجر والے ہاتھ کی کلائی پکڑ کے ایک جھٹکا دیا۔ وہ ایک دم نیچے جُھکا تو میں نے اس کی ٹھوڑی پر گھُٹنا مارا اور پھر اس کی بیلٹ میں ہاتھ ڈال کے اسے اُلٹا اُٹھا لیا۔ جب میں نے اسے ایک چکّر دیا تو اس کے دونوں ہاتھ پھیل گئے اور اس نے کہا۔ "ہو... ہو... ہو۔" پھر وہ اس جہاز کی طرح اُڑتا ہوا گیا جس کا پائلٹ اندھا ہو۔ میں نے اسے پردوں کے پیچھے چھُپی ہوئی دیوار سے سر ٹکراتے دیکھا۔ تصادم اتنا شدید تھا کہ اس کا سر چپٹا ہو گیا ہو گا۔ یا کچّے ناریل کی طرح چٹخ گیا ہو گا۔ دھماکے کی آواز پہلے آئی پھر اس نے چلاّ کے کہا۔ "ہائے اماں" اور وہیں گر گیا۔ پردوں اور بیڈ کے درمیانی خلا میں۔

میری مصروفیت کے وقفے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شیامو دادا نے دروازے کی طرف دوڑنے کی کوشش کی۔ اسے دوڑ کے نہیں پکڑ سکتا تھا چنانچہ میں نے کور سمیت مشین گن پھینک کر اس کی ٹانگوں پہ ماری۔ وہ اُلجھ کے مُنہ کے بل گرا۔ اس کے اُٹھنے سے پہلے میں اس پر ایسے گرا کہ وہ میرے بوجھ سے دب گیا۔ مشین گن کو میں نے لات مار کے دُور کیا اور شیامو دادا کو کالر سے پکڑ کر کھینچ لیا۔ ایک بھرپور لیفٹ پنچ نے اسے سردار جی کے قریب لمبا لٹا دیا۔

"سردار جی...!" شیامو دادا نے اُٹھتے ہوئے چلاّ کے کہا۔ "کھڑے مُنہ کیا دیکھ رہے ہو؟ یہ ہم دونوں کا دشمن ہے۔ دونوں کو تباہ کرنے آیا ہے۔"

سردار جی پر دیوانگی کی کیفیت طاری تھی۔ یہاں وہ اپنے دو بندے مروانے نہیں آئے تھے لیکن آدھے منٹ میں ایک چُغد صورت آدمی نے اس طاقت کو شکست دے دی تھی جس پر انھیں غرور تھا۔

شیامو دادا کی آواز پہ وہ چونکے۔ "مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا پاگل دے پُتّر۔ میں تو سمجھا تھا یہ کوئی نوکر ہے تیرا۔"

"میں آپ کا بھی خادم ہوں سردار جی۔" میں نے دونوں ہاتھوں کو مل کے انھیں مقابلے کی دعوت دی۔ شیامو نے ایک صوفے کے اوپر سے جست لگائی اور میرے سینے پہ مُکّا مارا۔ اس فولادی مُکّے نے ذرا سی دیر کے لیے میری نظروں کے سامنے اندھیرا کر دیا۔ مجھے سر کو جھٹک کر سنبھلنے میں چند سیکنڈ لگے۔ اس مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سکھ مجھ سے چمٹ گیا۔ اس نے میری کمر کے گرد دونوں ہاتھ ڈال کے مجھے اٹھا لیا۔ میرے قدم زمین سے چند انچ اوپر تھے جب شیامو دادا نے وہ مشین گن اٹھا لی جو میں نے کچھ دور چھوڑی تھی۔ یہ غلطی مجھے بہت مہنگی پڑتی اگر شیامو دادا اطمینان سے کور ہٹاتا اور گن کا رُخ میری طرف کر کے مجھے ہینڈز اپ کرا لیتا لیکن بدحواسی یا عجلت میں اس نے مشین گن کو ڈنڈے کی طرح استعمال کیا اور اس کا دستہ میرے سر پر مارنے کی کوشش کی۔

میں نے سردار جی کی گرفت سے نکلتے ہوئے ایک ٹانگ تیزی سے گھمائی——میرے جوُتے کی ایڑی اس کی ناک کے نیچے لگی۔ وہ ایک جھٹکے سے پیچھے گیا۔ سردار جی اپنے سر سے میرے سینے پر گُرز کی طرح دھم دھم وار کر رہے تھے۔ میں نے ان کے کیس کا جوُڑا پکڑ لیا۔ اور پیچھے کی طرف ایسا جھٹکا دیا کہ سردار جی کا مُنہ کھل گیا۔ ان کے ہاتھوں کی گرفت کچھ ڈھیلی ہوئی تو میں نے دوسرا ہاتھ ان کے نرخرے پر مارا۔

سردار جی کے حلق سے ایسے آواز نکلی جیسے کوئی ریچھ غرا رہا ہو۔ وہ فرش پر لوٹنے لگے۔

ان کی گرفت سے آزاد ہوتے ہی میں شیامو دادا کی طرف پلٹا۔ وہ مشین گن کو نکال چکا تھا لیکن اسے اتنی مہلت نہ ملی کہ اس کا رُخ میری سمت میں کر سکتا۔ میں اسے ساتھ لیتا ہوا دیوار تک ایک طوفانی قوت کے ساتھ گیا۔ شیامو دادا میرے اور دیوار کے درمیان دَب کے بلبلایا۔ ایک جھٹکے میں اس کے ہاتھ سے مشین گن چھین کر میں نے اس کی گردن دبوچ لی۔ میرا گھٹنا اوپر اُٹھا اور اس کے پیٹ سے ذرا نیچے لگا۔ وہ درد سے دُہرا ہوا تو میں نے اس کے سر کو پھر دیوار پہ مارا۔ میرا پاؤں پھر اُٹھا۔ اس مرتبہ گھٹنا صحیح جگہ پہ زیادہ قوت کے ساتھ لگا۔ شیامو دادا تڑپا مگر اس کی آواز حلق میں گھُٹ کے رہ گئی۔ وہ تکلیف اور درد کی شدت سے میرے اوپر گرنے لگا۔ میں نے اسے دیوار سے دور کھینچا اور لات اڑا کے مُنہ کے بل فرش پہ گرا دیا۔ پھر میں نے اس کی پسلیوں کے درمیان بوٹ کی ٹھوکریں ماریں اور اسے لڑھکاتا ہوا اُدھر لے گیا جہاں سردار جی اب اپنے قدموں پر کھڑے ہو چکے تھے۔

میں نے سردار جی کے ہاتھ میں ایک فٹ لمبی چمکتی ہوئی کرپان دیکھی۔ اس کی آنکھوں میں خون اُترا ہوا تھا۔ ایک جنونی کیفیت میں اس نے "ست سری اکال" کا نعرہ لگایا اور مجھ پہ وار کیا۔ کرپان لہراتی ہوئی میری گردن کی طرف آئی۔ میں نے سر کو پیچھے کیا۔ پیچھے دیوار تھی۔ میرا سر دیوار پہ لگا۔ کرپان میرے نرخرے کو تقریباً چھوتی ہوئی گزر گئی۔ دیوار پہ لگنے سے میرا سر چکرانے لگا تھا لیکن میں نے حواس بحال رکھے۔ دوسری بار ست سری اکال کہہ کر سکھ نے کرپان کو میری پسلیوں میں گھسیڑنے کی کوشش کی اور یہ وار بہت قریب سے کیا گیا تھا۔

میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ کرپان کا یہ وار کارگر ہوتا تو میری آنتوں کو اُدھیڑ دیتا۔ خود کو بچانے کے لیے میں نے آگے کی طرف جست لگائی اور کرپان نیم دائرے میں لہرا کر دیوار پر لگی۔ میں سردار جی کے سینے سے لگ گیا۔ میرے ایک ہاتھ کی کھڑی ضرب نے سردار جی کے اس بازو کو مفلوج کر دیا... جس میں کرپان تھی۔ سردار جی نے وحشیانہ انداز میں اپنا سر مار کے مجھے پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ وہ سمجھ چکے تھے کہ اب یہ فنا و بقا کی جنگ ہے جس میں کسی کی مدد کرنے والا کوئی نہیں، ہارنے والا زندگی ہار جائے گا۔

پلک جھپکتے میں سردار جی نے جھک کر کرپان دوسرے ہاتھ میں اٹھا لی۔ میں قدم جما کے کھڑا ہو چکا تھا۔ میں نے پہلا وار خالی دیا۔ کرپان شائیں سے میرے سر کے بالوں کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ پھر میں نے ایک دم اٹھ کے سیدھے ہاتھ کی ہتھیلی کا بھرپور وار کیا جو اُن کی گردن پہ پڑا اور فیصلہ کن ثابت ہوا۔ سکھ کی سانڈ جیسی گردن ایسے ٹوٹی جیسے کوئی خشک ٹہنی چٹختی ہے۔ اس نے ایک بھیانک آواز نکالی اور ہاتھ پھیلا کے فرش پر سیدھا گرا۔

شیامو دادا نے بیڈ کی سائیڈ پکڑ کے اپنے وجود کو گھسیٹا اور جس بیڈ پہ وہ کچھ دیر پہلے دادِ عیش دے رہا تھا، اسی پر گر کے لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ اس کی ناک سے اور مُنہ سے خون رِس رہا تھا اور وہ ایک ہاتھ پسلیوں پہ رکھے کراہ رہا تھا۔

میں ساڑھے چھ فٹ قد والے دیوزاد کو نزع کے کرب میں ایڑیاں رگڑتے دیکھتا رہا۔ اس جنگ کو جو شاید پانچ سات منٹ جاری رہی تھی، ایک عورت نے بھی خاموش تماشائی کی حیثیت سے دیکھا تھا۔ اس تمام عرصے میں میرا دھیان صرف ایک بار اس کی طرف گیا تھا۔ اسے بے نیازانہ انداز میں خاموش دیکھ کے مجھے حیرانی ہوئی تھی۔ اگر وہ چاہتی تو اس وقفے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چیخ و پکار کر سکتی تھی یا دروازے سے بھاگ سکتی تھی لیکن ایسا نہیں ہوا۔

وہ اب بھی بیڈ کے ایک کنارے پہ سمٹی بیٹھی تھی۔ اس کی صورت پہ خوف اور دہشت کی جگہ نفرت کے زہر میں بجھی ہوئی مسکراہٹ دیکھ کے تعجب ہوا۔ وہ شیامو دادا کو خاصی انتقامی دلچسپی کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔

شیامو دادا نے سر اٹھا کے مجھے دیکھا۔ "گنگارام! سچ بتاؤ تم کون ہو؟ کس نے بھیجا تھا تم کو؟"

لڑکی اچانک ہنسنے لگی۔ "مجھ سے پوچھو شیامو۔ یہ ہے تمہاری شامتِ اعمال۔ اس کھیت کی فصل جس کو تم بوتے رہے، اب کاٹنے کا وقت آگیا ہے شاید۔"

شیامو نے اس کے مُنہ پہ اُلٹا ہاتھ مارا۔ "تو کیوں بھونکنے لگی ہے کتیا..."

لڑکی نے ایک دم اس کے بال پکڑ لیے اور اس کے سر کو زور زور سے ہلانے لگی۔ "تو اب کیسے کاٹے گا کتے۔ تیرا تو بھونکنا بھی مشکل ہوگا۔ ایک نہ ایک دن یہ ہونا ہی تھا۔ سانپ کا سر بھی کوئی لاٹھی کچل دیتی ہے۔ آگ لگانے والے بھی ایک دن جل جاتے ہیں۔" وہ دیوانہ وار قہقہے لگانے لگی۔ یہ اس کے ہسٹریا کا اثر تھا۔ اس کی ہنسی درحقیقت وہ آنسو تھے جن کو بہنے کی عادت نہیں رہی تھی۔

شیامو دادا غصّے میں پھنکارتا اُٹھا۔ "پہلے میں تجھ سے ہی نمٹ لوں..."

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "اگر اب بھی دم ہے ان ہاتھوں میں تو آؤ، مجھ سے دو دو ہاتھ کر لو۔ عورت سے مقابلہ تم جیسے دادا کہلانے والے کو زیب نہیں دیتا۔"

شیامو دادا نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ "دیکھو گنگارام تم جو بھی ہو، تم نے بڑی مصیبت میں ڈال دیا ہے مجھے۔ دیکھو یہ کیا کر دیا ہے تم نے۔ تم اتنے بھولے بن کے ترلوینی کا پتا پوچھنے آئے تھے۔ میں نہیں مانتا، ضرور کسی دشمن نے بھیجا تھا تم کو۔ مجھے تباہ کرنے کے لیے۔ سچ بتاؤ، تم مجھے کہاں لے جانا چاہتے تھے...؟"

میں نے کہا۔ "جب تم میرے ساتھ جاؤ گے تو تمھیں اس سوال کا جواب بھی مل جائے گا۔ میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا تھا تم سے۔"

"مگر اب میرا کیا ہوگا... یہ لوگ مجھے چھوڑنے والے نہیں ہیں۔" اس نے فریادی لہجے میں کہا۔

میں نے کہا۔ "ان سے اب کیوں ڈرتے ہو۔ مُردے تمھارا کیا بگاڑ سکتے ہیں؟"

لڑکی پھر ہنسی۔ "اس سے مت پوچھو گنگارام۔ اسے بھی انھی کے ساتھ کر دو۔ پھر اس کے لیے ڈرنے کی بات کوئی نہیں رہے گی۔ اسے کیوں بخش دیا تم نے؟ مار ڈالو اس کو بھی اور بھاگ جاؤ یا وہ کرپان اٹھا کے مجھے دو۔ میں اس کُتّے کے ٹکڑے کر دوں۔ تم وہ ٹکڑے کُتّوں کے سامنے ڈال دینا۔"

میں نے نرمی سے کہا۔ "اگر اتنی ہمت تھی تم میں تو آج تک تم کیوں خاموش رہیں؟"

شیامو دادا نے اسے حقارت سے دیکھا۔ "یہ پیسہ چوس کے پلنے والی جونک ہے۔ اس پہ بھروسا مت کرنا۔ یہ تمھارا خون تک چوس جائے گی مگر اس کی پیاس نہیں بجھے گی۔"

عورت ایک دم اس پہ حملہ آور ہوئی۔ "میں... میں جونک ہوں۔ کتنا پیسہ دیا ہے تو نے مجھے؟ کہاں ہے وہ پیسہ۔ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔ سب تو نے چھین لیا۔ میرا جسم تک میرا نہیں..." اس نے دیوانہ وار شیامو دادا کا چہرہ نوچ لیا۔ اس کے بال کھینچے اور اس کے کپڑے پھاڑ دیے۔ اس نے شیامو دادا کے جسم کو دانتوں سے یوں کاٹا کہ جگہ جگہ سے خون رِسنے لگا۔ وہ ایک زخم خوردہ، پاگل ہو جانے والے وحشی درندے کی طرح شیامو دادا پر ٹوٹ پڑی تھی۔

میں نے سخت جدوجہد کے بعد شیامو دادا کو اس سے الگ کیا۔ وہ بستر پر گر کر رونے لگی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے یوں اُبلنے لگے جیسے برسوں کے سوئے ہوئے آتش فشاں سے لاوا اُبلتا ہے۔ اس کا وجود ان آنسوؤں کی یلغار میں بہہ گیا۔ وہ ہچکیاں لیتی رہی۔ اور اس کا جسم جھٹکوں سے لرزتا رہا۔

شیامو دادا اب سخت خوفزدہ تھا۔ اس نے التجائیہ انداز میں کہا۔ "گنگارام، چلو جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب تم میرا ساتھ دو... تو ہم اس مصیبت سے بچ سکتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "کون سی مصیبت...؟"

اس نے کہا۔ "تم نے تین قتل کر دیے ہیں اور... پھر بھی یہ پوچھتے ہو کہ کیسی مصیبت... کیا تمھیں معلوم ہے، یہ کتنے خطرناک لوگ تھے؟"

"چلو اب تو خطرناک نہیں رہے۔" میں نے کہا۔ "مُردے کسی کے لیے خطرہ پیدا نہیں کرتے۔ تم نے تو بہت مُردے ٹھکانے لگائے ہوں گے۔ کئی قتل کیے ہوں گے۔ بھاڑ جھونک کے تو دادا نہیں بنے ہو گے تم۔"

اس نے کہا۔ "معلوم ہے ان کو کس نے بھیجا تھا؟ بہت بڑا دادا ہے وہ۔ ہم تم مل کے اس کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ تم میرے ساتھ رہو۔ اس میں ہم دونوں کا فائدہ ہوگا۔"

میں نے اسے بالوں سے پکڑ کے اٹھا لیا۔ "یہ سکھ تم سے کس مال کی بات کر رہا تھا؟"

لڑکی نے روتے ہوئے اپنا سر اٹھایا۔ "میں ہوں وہ مال، مجھے دیکھ لو۔ مجھ سے پوچھو کہ میری قیمت کیا ہے۔ میری مجبوری کی اور میری خاموشی کی قیمت کیا ہے۔ تم نے پوچھا تھا نا کہ میں آج تک خاموش کیوں رہی؟ خاموش نہ رہتی تو کیا کرتی۔ میں بک جو چکی تھی۔ میں بھلا کیسے بول سکتی تھی۔ بولتے تھے میری بولی لگانے والے۔"

میں نے شیامو دادا کے سر کو ایک مرتبہ بیڈ کے کنارے پہ مارا۔ "کیا یہ سچ ہے؟"

"ہاں ہاں، میں جو تمھیں بتا رہی ہوں کہ سچ کیا ہے۔ باقی سچ بھی سن لو مجھ سے۔" اس نے سسکیوں کے درمیان کہا۔ "کوئی نئی کہانی نہیں ہے میری۔ سوتیلے بھائی نے بیچا تھا مجھے۔ مجھ سے تین گنا عمر کے بڈھے نے پندرہ سو میں مجھے دھرم پتنی بنا لیا تھا۔ تین کو وہ مار چکا تھا۔ ایک اسے مارنے کی کوشش کے جرم میں جیل کاٹ رہی تھی۔ دو بھاگ گئی تھیں۔ پھر وہ مجھ پہ کیسے بھروسا کر سکتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ میں کچھ نہ کچھ ضرور کروں گی۔ اسے مار دوں گی یا کسی جوان کے ساتھ بھاگ کر چلی جاؤں گی۔ اور اس کا یقین غلط نہیں تھا۔ موقع ملتا تو میں یہی کرتی۔ لیکن

چھ مہینے گزر گئے، وہ مجھے مقفل رکھتا تھا۔ رات کو بھی میرے ایک ہاتھ کو اپنے ہاتھ سے باندھ کر سوتا تھا۔ ہتھکڑی ڈال دیتا تھا۔ میں ذرا بھی حرکت کرتی تو وہ اُٹھ بیٹھتا مگر بھگوان نے میری سُنی۔ وہ خود ایک رات سوتے میں مرگیا۔ میں رات بھر ایک لاش کے ساتھ بندھی پڑی رہی۔ صبح میری چیخ و پکار سن کے لوگوں نے گھر کا دروازہ توڑا اور اندر آئے تو انھوں نے دیکھا... کیا دیکھا... خیر چھوڑو۔ بڈھے کی خباثت تو مرنے کے بعد ظاہر ہوئی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ ہر رات وہ تکیے کے نیچے کوئی خط رکھ کے سوتا ہے۔ وہ خط پولیس کے ہاتھ لگ گیا جس میں لکھا ہوا تھا کہ مجھے اپنی بدچلن جوان بیوی کے ہاتھوں قتل ہو جانے کا ڈر ہے۔ اگر مجھے کچھ ہو جائے تو اس سے ضرور پوچھ گچھ کی جائے۔ تم تو جانتے ہو گے کہ تھانوں میں پوچھ گچھ کیسے ہوتی ہے۔ ایک مہینے بعد کوئی میرا ضامن بن کے آیا اور مجھے تھانے سے چھڑا کے لے گیا۔ چھ ماہ میں کتنی بار بکا ہے یہ مال۔ مجھے نہیں معلوم۔ ہاں ایک بات مجھے یہاں آنے کے بعد معلوم ہوئی کہ غلاظت کے اس گٹر میں بہہ کر یہاں پہنچنے والی صرف میں ہی نہیں ہوں۔ اس گندگی میں میرے ساتھ بہنے والی بہت ہیں۔ تم بھی مال دیکھنا چاہتے ہو۔ جاؤ اس دروازے کے پیچھے جا کے دیکھو... ابھی مال تھوڑا ہے۔ لیکن کل اور مال آئے گا۔ پرسوں بھی آئے گا... اس کے بعد بھی آتا رہے گا... گٹر لائن چالو ہے...''

شیامو دادا کا خوف سے بُرا حال تھا۔ وہ لڑکی کو پھاڑ کھانے والی نظروں سے گھور رہا تھا۔ اور اپنی بے بسی پہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ اب انکار سے کچھ نہیں ہوگا۔ تقدیر نے، ستاروں نے چال بدل لی ہے۔ اور اس کے ہر گھناؤنے کاروبار کا بھانڈا پھوٹ چکا ہے۔ وہ صرف اس عورت کو ذمے دار قرار نہیں دے سکتا تھا۔ اس کی تباہی کا آغاز میری تشریف آوری سے ہوا تھا۔ پھر اس کا رخ کو ان تین افراد نے آگے بڑھایا تھا جو اب اس دُنیا میں نہیں رہے تھے۔ انتہا اس عورت نے کی تھی کہ جو ظاہر نہ تھا وہ بھی افشا کر دیا تھا۔

میں نے اسے نظر جما کے دیکھا تو وہ نروس ہوگیا۔ "دیکھو گنگارام! ان معاملات کو مت چھیڑو۔ سب کا اپنا اپنا دھندا ہے۔"

"شیامو دادا! کیا تم دُنیا میں اکیلے ہو؟ تمھارا کوئی خاندان ہے؟" میں نے کہا۔ "خاندان میں سب ہی شامل ہوتے ہیں۔ ماموں، چچا، بھانجے، بھتیجے، قریب اور دور کے رشتے دار۔"

اس نے کنفیوز ہو کے کہا۔ "خاندان... ہاں ہے..."

میں نے کہا۔ "تو یار پھر پریشانی کیا تھی۔ مال کم تھا تو اپنے اسی خاندان کی عورتیں شامل کر کے بات ختم کرتے بہنوں یا بیٹیوں کے علاوہ بھی تو جوان عورتیں ہوں گی۔ بھانجیاں اور بہنوں کی نندیں... اور بھتیجوں کی سالیاں... جیسی ایک عورت ویسی دوسری عورت۔ گھر کے مال کی اچھی قیمت ملتی تو رقم تمھاری ہی جیب میں جاتی۔"

اس کا چہرہ غصّے کو ضبط کرنے کی کوشش میں اور بگڑ گیا۔ "فالتو بات مت کرو۔ تم کو تریوینی کے پاس چلنا ہے تو چلو۔"

میں نے کہا۔ "دیر تو اب ہو ہی گئی ہے۔ اس بک بک میں تم نے ایک گھنٹا تین بندے، اپنا تھوڑا مستقبل اور بہت کچھ بے سبب ہی ضائع کیا۔ دیر سے کام بگڑ بھی جاتے ہیں تم شروع میں ہی اس تعاون کے جذبے کا مظاہرہ کرتے اور فوراً میرے ساتھ چل پڑتے تو یہ سب کچھ نہ ہوتا جو بعد میں ہوا۔ لیکن اس وقت تم اپنی داداگیری کے زعم میں تھے اور گنگا رام تمھارے سامنے ایک کاٹھ کا اُلّو تھا۔"

"چلو غلطی ہوئی مجھ سے۔ میں اپنا قصور مانتا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "ایک بات میرے لیے الجھن کا سبب ہے۔"

"وہ کیا؟"

"اتنی دیر سے تقریباً ایک گھنٹا ہوگیا، نہ کوئی اندر آیا نہ کسی نے تم سے انٹرکام پہ بات کی اور نہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ کیا یہ خاموشی تم جیسے معروف اور اہم آدمی کے معمولات میں غیر معمولی نہیں لگتی۔ تم نے میرے سامنے کسی کو منع بھی نہیں کیا کہ اندر نہ آئے۔"

شیامو دادا کا رنگ اُڑ گیا۔ "وہ سب لوگ جانتے ہیں کہ ایک وقت میں ایک پارٹی سے بات کرتا ہوں میں..."

"جو ٹیلی فون کرتے ہیں تھیں، ان کو کیسے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس وقت تمھارے ساتھ کون ہے۔ ایک پارٹی تو اس وقت بھی اندر تھی۔ جب تمھارے دربان نے بھانجے کی آمد کا اعلان کیا تھا۔ اندر آکے۔"

"صاف کہو، کیا کہنا چاہتے ہو...؟"

"مجھے یہ خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ محسوس ہوتی ہے تمھارا کیا خیال ہے؟ باہر سب ٹھیک ہے۔ ہر کام روز کی طرح ہو رہا ہے؟ کسی کو کچھ معلوم نہیں کہ گزشتہ ایک گھنٹے میں یہاں کیا کچھ ہوا؟ سب کو یقین ہے کہ شیامو دادا کے آفس میں سب خیریت ہے؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا لیکن اس کا انداز بے یقینی کا مظہر تھا۔ اعتماد سے خالی اور مصنوعی۔

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ آگے چلو اور دروازہ کھولو۔ میرا خیال ہے کہ یہاں جو کچھ ہوا وہ کسی نہ کسی نے سُنا ضرور ہے، دیکھا چاہے نہ ہو۔ اگر میرا خیال ٹھیک نکلا تو سمجھ لو کہ بہت سے لوگ مارے گئے۔ وہ سب جو خاموشی سے باہر کوئی جال پھیلا رہے ہیں یا حفاظتی حصار قائم کر چکے ہیں۔ نہ وہ تم کو بچا سکتے ہیں اور نہ خود کو۔ لاشوں کے اوپر سے گزر جانا گنگارام کے لیے مشکل ضرور ہوگا مگر ناممکن نہیں۔ تم چاہو تو خونریزی کو روکنے کے لیے اور مکمل تباہی سے بچنے کے لیے ابھی کچھ کر لو۔ میں تم کو ایک منٹ کی مہلت دیتا ہوں۔"

میں نے قیاس کی بنیاد پر صحیح فیصلہ کیا تھا۔ شیامو دادا کو یکلخت بدترین شکست کا سامنا تھا۔ یہ اس کی دانست میں آخری ٹرمپ کارڈ تھا۔ جو مجھ سے پوشیدہ تھا اور جو پلک جھپکنے میں میری فتح کے غرور کو نقشِ باطل کر دیتا۔ وہ ڈوب رہا تھا مگر اسے ایک تنکے کا سہارا تھا۔ یہ سہارا بھی چھن گیا تو اس کی مایوسی ایک دم جنون و وحشت کی وہ کیفیت بن گئی جو آدمی کو پاگل کر دیتی ہے۔

اس نے چیخ کر مجھے ایک فحش گالی دی۔ اور مجھ پر دیوانہ وار وہ سب چیزیں پھینکنے لگا جو اس کی دسترس میں تھیں۔ اس نے چلاّ چلاّ کے کہا۔ "گنگارام! میں بھی شیامو دادا ہوں۔ تم مارنا ضرور چاہتے ہو مجھے مگر ابھی میں مرا نہیں ہوں۔ میں زندہ ہوں، میں دیکھوں گا تم زندہ نکل کے کیسے جاتے ہو۔ اگر میری لاش گرے گی تو مجھ سے پہلے تمھاری بوٹیاں ہو جائیں گی۔ تم میرے قلعے میں چوروں کی طرح گھس آنے کے بعد بہادری کا ڈنکا بجاتے ہوئے واپس جانا چاہتے تھے۔"

پھر اس نے چیخ چیخ کے ان سب کو پکارنا شروع کیا جو باہر پوری جنگی تیاری کے ساتھ صف بستہ تھے اور مجھے تہس نہس کر دینے کے لیے خاموشی سے مناسب وقت کا انتظار کر رہے تھے۔ "چلو، آ جاؤ سب... گھیر لو اس کو... ہر طرف سے اس کو چھلنی کر دو..." اس نے گلدان، ٹیبل لیمپ، کرسی، ہر چیز اٹھا اٹھا کے میری طرف پھینکتے ہوئے اپنی دیوانگی کا تماشا جاری رکھا۔ میں پہلے خود کو بچاتا رہا۔ جب تک اس کی عقل ساتھ تھی، وہ میرے لیے قابلِ توجہ تھا لیکن اس کیفیت میں وہ محض ایک بپھرا ہوا وحشی جانور تھا۔ کسی جانور سے وہ انسان نہیں ڈر سکتا جو ہر قسم کے خطرناک اسلحے سے لیس ہو۔ میں جانتا تھا کہ بہت جلد تھک کے وہ بے دم ہو جائے گا لیکن جب اس نے مددگاروں کو پکارنا شروع کیا تو میں اپنے دفاع کے لیے مستعد ہوگیا۔

میں نے مشین گن کو اس کے کور سے نکال کے ایک ہاتھ میں پکڑ لیا۔ دوسرے ہاتھ میں ریوالور تھام کے میں نے شیامو کے سر پہ وار کیا۔ اس کے گرتے ہی میں نے کونے میں پوزیشن سنبھال لی۔ جہاں سے دائیں اور بائیں ہاتھ کے دونوں دروازے میری نظر میں تھے۔

سب سے پہلے دو آدمی اندر آئے جن کے ہاتھوں میں ریوالور تھے۔ وہ اسی دروازے سے داخل ہوئے تھے جس سے گزر کے پہلے میں آیا تھا اور بعد میں سردار جی کی موت انھیں کھینچ لائی تھی۔ وہ دونوں ضرورت سے زیادہ جوشیلے تھے۔ چنانچہ وہ اپنے زور میں کمرے کے وسط تک آ گئے۔ وہ فحش گالیاں بکتے ہوئے مجھے للکار رہے تھے۔

"سامنے آ گنگارام..... تیری تو....''

میں کونے میں دیوار سے لگ کے ساکت کھڑا ہوا تھا۔ چنانچہ ان کی نظر براہِ راست مجھ پہ نہیں پڑی۔ انھوں نے سب سے پہلے سردار جی کی لاش کو دیکھا۔ پھر ان کے ایک ساتھی کو۔ شیامو دادا سے ہوتی ہوئی ان کی نظر اس لڑکی پہ گئی جو ایک ہی جگہ بیٹھی ہوئی تھر تھر کانپ رہی تھی۔

مجھے کافی مہلت مل گئی تھی۔ میں اپنے نشانے کی مہارت کا موازنہ غالب کی مہارت سے بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے باوجود میں نے ان دونوں کو براہِ راست سر یا سینے میں گولی مار کے ہلاک کرنے سے گریز کیا۔ میں نے ان کے ہاتھوں کا نشانہ لیا۔ اس میں میری کامیابی کا اوسط پچاس فیصد رہا۔ ایک کے ہاتھ کی پشت پہ گولی لگی اور اس کا ریوالور ہاتھوں کے طوطے کی طرح اڑ گیا۔ دوسرے نے فائر کیا مگر یہ ایک اضطراری فعل تھا۔ فائر کی آواز سنتے ہی اس نے پلٹ کے گولی چلا دی۔ اس نے نشانہ لیا ہی نہیں تھا۔ گولی میرے سر کے اوپر سے گزر گئی۔ اور دیوار میں پیوست ہوگئی۔ پھر میں نے دوسری گولی چلائی جو اس کی بدقسمتی کے باعث پسلیوں میں گھس گئی۔ اس نے ایک چیخ ماری اور فرش پہ پیچھے کی طرف گرا۔

پہلا شخص زخمی ہاتھ سے بہتے ہوئے خون کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا اور بُری طرح چلاّ رہا تھا۔ گولی نے اس کی ہتھیلی میں سوراخ کر دیا تھا۔ میں نے بیڈ کے اوپر سے چھلانگ لگائی اور اس کو درد کے عذاب سے نجات دلا دی۔ میں نے اس کو بھی سر پہ ریوالور کا دستہ مار کر بے ہوش کر دیا۔

باہر اب خاصی افراتفری کا شور تھا۔ میں نے اس لڑکی سے کہا۔ "یہ پردے ہٹاؤ، دروازہ کھولو۔"

اس نے سر ہلایا اور پردے کھینچ دیے۔ "تالا...'' وہ

بڑی مشکل سے ہکلا کے بولی۔

میں پھر بیڈ پر چھلانگ مار کے چڑھا لیکن اپنے پیچھے والے دروازے کو بھی دیکھتا رہا۔ ایک فائر سے میں نے تالے کو توڑ دیا اور لات مار کے دروازہ کھولا۔ اسی وقت میری نظر شیامو دادا پر گئی۔ وہ فرش پر گھٹنوں کے بل گھسٹتا ہوا ریوالور تک پہنچ گیا تھا۔ یہ ریوالور اسی کا تھا جس کی ہتھیلی میں چھید ہو چکا تھا۔ اگر میری نظر چوک جاتی یا میں آگے بڑھتے وقت پیچھے کی طرف سے غافل ہو جاتا تو میرا کام وہیں تمام ہو جاتا۔ شیامو تھوڑا سا اوپر اٹھ کے گولی چلاتا تو میں اسے بہترین ٹارگٹ فراہم کرتا۔ بیڈ کے اوپر چڑھا ہوا اور کھلے دروازے کے فریم میں میرا جسم پس منظر کی روشنی میں بہت نمایاں تھا۔

میں نے سر کو جھکاتے ہوئے گولی چلائی اور پھر شیامو دادا کو اچھل کر لٹو کی طرح گھومتے اور دیوار سے ٹکرا کر گرتے دیکھا۔ خون کا جو دھارا اس کی پیشانی سے پھوٹا تھا، اس نے دیوار کو قوس کی شکل میں سرخ رنگ دیا تھا۔

باہر والے دروازے میں ایک سیاہ پوش نمودار ہوا۔ اس کا چہرہ سیاہ نقاب میں تھا اور وہ اوپر سے نیچے تک کالے رنگ کے ڈانگری ٹائپ لباس میں تھا جو اس کے بدن سے چپکا ہوا تھا۔ میں نے اس لڑکی کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا اور اسے اپنے ساتھ لے کر دروازے سے گزر گیا۔ ہم دوسرے کمرے کے فرش پر گرے۔ یہ کمرا اخلافِ توقع خالی پڑا تھا۔ سیاہ پوش نے مشین گن کا جو راؤنڈ چلایا، وہ ہمارے اوپر سے گزرا۔ کچھ گولیاں دروازے سے داخل ہوئیں اور چھت سے آویزاں شیشے کا خاصا بڑا گلوب ایک چھناکے سے بکھر گیا۔ اس کے ساتھ ہی اندھیرا پھیل گیا۔ میں نے درمیانی دروازے کو اندر سے بند کرنے میں دیر نہیں کی اور لڑکی کو کھڑا کر دیا۔ میں نے کہا۔ "تم کو راستے کا کچھ علم ہے؟"

لڑکی نے میرا ہاتھ پکڑ کے کھینچا۔ "میرے ساتھ آؤ۔"

میں نے اندھیرے میں بھاگنا شروع کیا۔ "تم ریوالور چلا سکتی ہو؟"

"میرے پاس ریوالور نہیں ہے۔" وہ بولی۔ اس کی سانس پھول گئی تھی۔

میں نے اسے ریوالور تھما دیا۔ "اس میں ابھی دو گولیاں ہیں جو بھی سامنے آئے اسے بغیر سوچے مار دینا۔"

"دیکھو، آگے زینہ ہے۔" اس نے کہا۔ اور ایک چٹخنی کھولی۔ ہمارے پیچھے دروازے پر تڑا تڑ گولیاں لگیں۔ میں نے اپنے سامنے نیم روشن زینے کو دیکھا۔ یہ لوہے کا چکر دار زینہ تھا۔ اس پر تمام روشنی باہر سے پڑ رہی تھی۔ زینے کا اوپر والا دروازہ بھی لوہے کا تھا۔ میں نے اسے بھی کھینچ کے بند کیا۔ باہر سے اس کی کنڈی مدت سے نہیں لگائی گئی تھی اور زنگ سے جام ہو رہی تھی۔ مگر میں نے اسے بند کیا اور مشین گن کا دستہ مار کے ٹائٹ کر دیا۔

ہم دونوں تیزی سے نیچے اترنے لگے۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ زینہ کہاں جا کے ختم ہو گا۔ اپنے دائیں بائیں دوسری ایسی ہی عمارات سے اندازہ ہوتا تھا کہ شاید ہم کسی عقبی گلی میں اتریں گے۔ وہ لڑکی جو کچھ دیر پہلے رو رہی تھی اور دہشت سے کانپ رہی تھی، اب بجلی کی طرح لپکتی ہوئی زینے پر گھومتی جا رہی تھی۔ میں اس کے جسم کی لچک اور توازن کی حیثیت کا کیسے مقابلہ کر سکتا تھا۔ مجھے تو یوں لگتا تھا جیسے وہ ایک ایک زینہ نہیں اتر رہی ہے، اس کے نازک پاؤں رقص میں ہیں۔ وہ اس تنگ سی جگہ میں تیرتی جا رہی تھی جہاں مجھے سنبھل کے قدم رکھنا پڑ رہا تھا۔ ہر زینہ ایک طرف سے چوڑا تھا۔ دوسری طرف اس کی چوڑائی مسلسل کم ہوتی تھی۔ چنانچہ میں چوڑے حصے کی طرف رہنے پر مجبور تھا۔ یہ چکر دار پرانی طرز کے زینے ہنگامی ضرورت میں استعمال کے لیے رکھے جاتے تھے۔ اور ہنگامی ضرورت آج مجھے درپیش تھی۔

لڑکی بار بار پلٹ کے کہتی تھی۔ "جلدی، جلدی چلو۔" اور میں صرف گردن ہلاتا تھا کیونکہ میں اس سے زیادہ جلدی کا مظاہرہ کرتا تو لڑھکتا ہوا نیچے پہنچتا۔ اوپر لوہے کے دروازے پر مسلسل دھم دھم ہو رہی تھی لیکن وہ ٹوٹنے والا دروازہ نہیں تھا اور اس پر گولیاں برسانے کا بھی کوئی فائدہ نہ تھا۔

"یہ ہم کہاں آ گئے؟" میں نے ایک مختصر سے صحن میں پہنچ کے کہا۔

لڑکی نے کہا۔ "انھیں گھوم کر آنے میں وقت لگے گا۔ وہ آئیں گے دوسری طرف سے۔ تم ادھر آؤ، میرے پیچھے۔"

اس کی خواہش کے مطابق میں پیچھے رہا۔ وہ ایک دروازے سے گزری جو صرف دو فٹ چوڑا تھا۔ اندر پہنچ کے میں نے اسے اور خود کو ایک ایسے باتھ روم میں پایا جس کی لمبائی چوڑائی ہم دونوں کے لیے کافی تھی۔ چنانچہ وہ مجھ سے تقریباً چمٹ کر کھڑی ہوئی تھی۔

مجھ سے صرف ایک فٹ اوپر روشن دان تھا۔ اس میں پہلے کبھی شیشہ بھی لگایا گیا ہو گا۔ اب مضبوطی اور بار بار کے خرچ سے بچنے کے لیے تاروں کی باریک فلائی پروف جالی لگا دی گئی تھی۔ جالی خاصی پرانی تھی اور بمبئی کے ساحل کی مرطوب آب

ہواؤں میں زنگ سے گل چکی تھی۔

کسی دشواری کے بغیر میں نے جالی کو چاروں کناروں پر مشین گن کی فولادی بیرل مار کے توڑ دیا۔ وہ میرے اٹھے ہوئے ہاتھوں کے اور دیوار کے درمیان دبی رہی۔ اس کا جسم نرم تھا چنانچہ دیوار پر جھکتے ہوئے مجھے کوئی رگڑ نہیں لگی لیکن میرے وزن کے ساتھ اس کا کھردری دیوار نے کیا حال کیا ہو گا، اس کا اندازہ مجھے فوراً نہ ہوا۔

جب جالی ہٹ گئی تو میں نے اس کے کراہنے کی آواز سنی۔ میں نے کہا۔ "معاف کرنا، میں نے تو تمھیں سینڈوچ کر دیا۔"

وہ بولی۔ "میرے جسم کے ساتھ اس سے کہیں زیادہ سفاکانہ سلوک ہوا ہے، تم نے تو پناہ دے رکھی تھی مجھے۔"

میں نے کہا۔ "چلو اب تم پہلے نکل جاؤ۔ میں تم کو اٹھاتا ہوں۔"

میں نے مشین گن کو کندھے پر ڈال کے اس کی کمر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑا اور اسے اوپر اٹھا لیا۔ اس کی کمر بہت پتلی تھی مگر ریشمی ساٹن کی قمیص پھسلنے لگی، وہ نیچے آنے لگی۔

"اوپر سے روشن دان کی دہلیز کو پکڑو اور ہاتھوں کا زور لگاؤ۔" میں نے کہا۔

"میں ایسے... نہیں جا سکتی..." اس نے کہا۔ "سر باہر نکال کے اتروں گی تو باہر سر کے بل گروں گی۔"

میں نے کہا۔ "اچھا، پھر میں مرغا بنتا ہوں۔ تم میری کمر پر چڑھو اور پلٹ کے روشن دان میں داخل ہو جاؤ۔"

"تم... کیسے آؤ گے؟" اس نے کہا۔

"میں آ جاؤں گا۔" میں نے جھکتے ہوئے کہا۔ وہ تھوڑے سے تذبذب کے بعد ننگے پاؤں میری کمر پر چڑھ گئی لیکن اب اس کے لیے روشن دان میں اپنے پیر داخل کرنا مسئلہ بن گیا۔ مجبوراً میں نے اسے نیچے اتارا۔ اور ایسے پلٹ دیا کہ اس کا سر نیچے ہو گیا۔ اس کے بال فرش کو چھونے لگے۔ وہ تھوڑا سا گھبرائی لیکن میں نے اسے کمر سے تھام کے اونچا کیا اور اس کے شانوں کے نیچے سے ہاتھوں کا سہارا دے کر اٹھاتا گیا۔ یہاں تک کہ اس کے پاؤں روشن دان سے باہر نکل گئے۔ ظاہر ہے، اس حالت میں وہ اپنے کپڑے نہیں سنبھال سکتی تھی۔ اس کی قمیص نے خاصا مسئلہ پیدا کیا لیکن بالآخر میں اسے باہر اتارنے میں کامیاب ہو گیا۔ آخر میں اس کے ہاتھ میرے ہاتھوں میں رہ گئے تھے جو میں نے اس کی آواز سن کر چھوڑے۔

اس نے کہا۔ "بس اب تم آ جاؤ۔"

میں نے کہا۔ "یہ پکڑو۔" اور مشین گن روشن دان سے باہر لٹکائی۔ پھر میں نے اپنے جسم کو ہاتھوں کے زور پر کھینچا اور اپنا سر روشن دان سے گزارنے میں کامیاب ہو گیا۔ دیوار کی دوسری طرف مجھے الٹا لٹک کے اترنا پڑا۔ میرے پیر ایک ہک کی طرح روشن دان کے کنارے پر جم گئے تھے۔ توازن کا صحیح اندازہ ہوتے ہی میں نے پیروں کو چھوڑا اور ایک قلابازی کھا کے سیدھا کھڑا ہو گیا۔

اب ہم ایک گلی میں تھے۔ اندھیرا ہونے کی وجہ سے کسی نے بھی ہمیں روشن دان سے طلوع ہوتے نہیں دیکھا تھا۔

"ان کو چکر لگا کے ادھر آنے میں کتنا وقت لگے گا؟" میں نے اس کے ساتھ دوڑتے ہوئے کہا۔

ایک بڈھا کسی دروازے سے نکلا اور مجھ سے ٹکرا گیا۔

"اے... اے بابا... ارے پاگل ہو گیا ہے کیا؟"

میں نے کہا۔ "کتا... پاگل کتا..."

وہ فوراً واپس ہو گیا۔ "کدھر ہے پاگل کتا؟" ایک اور شخص نے کہا جو اپنے دروازے پر آلتی پالتی مارے ہوئے بیٹھا تھا۔

"کتا نہیں... کتے۔" میں نے کہا اور اس کو ہکا بکا چھوڑ کے آگے بڑھ گیا۔ کتے میرے تعاقب میں تھے مگر وہ پاگل کتے نہیں تھے، شکاری کتے تھے۔ اگر میں سیدھا چلتا جاتا تو وہ مجھے پکڑ لیتے۔ میرے لیے ضروری تھا کہ میں غائب ہو جاؤں۔

اچانک گلی دو حصوں میں بٹ گئی۔ دائیں جانب مڑتے ہی میں نے ایک دروازہ دیکھا۔ یہ سب چھوٹے چھوٹے فلیٹ تھے۔ پرانی عمارتوں میں ایک ایک دو دو کمروں کے ایسے ہزاروں لاکھوں فلیٹ بمبئی میں ہر طرف نظر آتے ہیں۔ کہیں بہ یک وقت دو دو کمروں میں دو دو خاندان بھی رہتے ہیں۔ بمبئی کی زبان میں ہر کمرا ایک کھولی تھا اور وہ بھی ایک کھولی کا دروازہ تھا جس پر دستک دیے بغیر میں اندر چلا گیا۔ اور دروازہ پھر بند کر دیا۔ ایک دبلے پتلے نوجوان نے جو چھوٹی سی میز پر بلب لٹکائے کرسی پر بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا، پلٹ کے مجھے دیکھا۔ ایک مرد ایک عورت اور ایک مشین گن کو دیکھ کر وہ اپنی جگہ منجمد ہو گیا۔

میں نے کہا۔ "ڈرو نہیں... میں..."

"کون ہے تم...؟" اس نے بنگالی لہجے میں کہا۔ "ایسے اندر آتا ہے...."

میں نے کہا۔ "میں اور میری بیوی سخت مصیبت میں ہیں۔ غنڈے ہمارے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔"

اس نے مشین گن کو دیکھ کر کہا۔ "تم خود کیا غنڈہ نہیں ہے شالا؟"

میں نے کہا "ابھی تم کچھ بھی سمجھ لو لیکن تھوڑی دیر خاموش رہو۔ ہم یہاں ایک طرف بیٹھ جاتے ہیں۔"

"کیسا بات بولتا تم۔ تمھارا جان لینے آئے گا شالا غنڈہ تو اپن کو بھی مار دے گا۔۔۔۔" وہ کرسی پر ٹک گیا۔ اور اس لڑکی کو گھورنے لگا جو اپنی اداکاری سے میری بیوی نظر آنے کی کوشش میں مصروف تھی۔ بلاشبہ وہ دلکش جسمانی نقوش رکھنے والی لڑکی تھی اور گہرے نیلے رنگ کی ریشمی قمیص میں خوفزدہ ہونے کے باوجود چمک رہی تھی۔ قمیص کی آستین انتہائی مختصر تھی تو گلا انتہائی فراخ، لیکن اس افراتفری میں اسے ہوش بھی نہ تھا کہ شرماتی۔

میں نے کہا "جلدی میں بھاگے۔۔۔۔ اس لیے نہ جوتے پہن سکی بے چاری، نہ دوپٹہ لے سکی۔"

"یہ۔۔۔ تمھارا بیوی نہیں ہے۔" بنگالی لڑکے نے کافی غور و خوض کے بعد صحیح نتیجہ اخذ کیا۔

میں نے کہا "اور کیا تمھاری بیوی ہے؟" اور مشین گن کا رخ اس کی طرف کر دیا۔ "بولتا جا رہا ہے۔ ہماری سنتا ہی نہیں۔ اب بیٹھ جا چپ کر کے اور کام کرا اپنا ورنہ۔۔۔" میں نے مشین گن کے میگزین کو نکال کے پھر لگا دیا۔

بنگالی کی گھگی بندھ گئی۔ اس نے بڑی مشکل سے کہا "اچھا۔۔۔ اچھا۔۔۔ بیٹھو۔۔۔"

میں نے کہا "اگر کوئی پوچھنے آئے تو۔۔۔؟"

"ہم بولے گا ادھر کوئی نہیں آیا۔"

"شاباش، اب عقل آئی ہے نا۔ آدمی کو موقع محل دیکھ کے اور سوچ سمجھ کے بات کرنی چاہیے۔ اب اس وقت اگر تم افلاطون بنتے یا ہیرو بنتے تو تمھاری زندگی کا سفر اسی جگہ ختم ہو جاتا۔ تم وکیل، انجینئر یا ڈاکٹر، جو کچھ بھی بننا چاہتے ہو، کبھی نہ بن پاتے۔" میں نے کہا۔ اور کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھا ایک تین فٹ چوڑے تخت کے علاوہ وہاں ایک صندوق تھا۔ دیواروں پر مجھے گاندھی کے ساتھ ایک اور شخص کی تصویر نظر آئی جو دھوتی اور کرتے کے ساتھ دوپلی ٹوپی اوڑھے کھڑا تھا۔

"یہ ہمارا فادر ہے۔" لڑکے نے کہا۔

میں نے دوسری دیوار پر رابندر ناتھ ٹیگور کی تصویر دیکھی اور اس کے ساتھ شرمیلا ٹیگور کی۔

"یہ کون ہے؟" میں نے کہا "تمھارے دادا؟ اور ماتاجی۔ آئی مین، مدر۔"

بنگالی نوجوان نے سخت برا مانا۔ باہر ایک دم شور اٹھا۔

کسی نے چلا کے کہا "ادھر کوئی نہیں آیا۔"

"آیا کیسے نہیں۔ ایک مرد ہے ایک عورت۔ ادھر بھاگتا ہوا آیا۔ پھر کیا ہوا میں غائب ہو گیا؟"

"ہم کیا جانے، بھوت پریت ہم کو نظر نہیں آتا۔"

"چلو یار، اس کو تو دن کے اجالے میں آئینہ دیکھ کے اپنی صورت نظر نہیں آتی ہو گی۔"

وہ شیا موداد کے شکاری کتے تھے جو اس کے قاتلوں کو تلاش کر رہے تھے۔ ان کے درمیان سخت بحث جاری تھی۔ ایک شخص کا خیال تھا کہ انھیں ہر گھر کی تلاشی لینی چاہیے۔ دوسرے نے اسے ناقابلِ عمل قرار دیا۔ اور گلی کے دونوں سروں پر ناکا بندی کی تجویز پیش کی۔ یہ تجویز قبول کر لی گئی۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کو ہدایات دیتے رہے۔ 'خیال رکھنا، آنکھیں کھلی رکھنا۔ کہاں جائیں گے آخر وہ۔ کبھی تو نکلیں گے، دیکھتے ہی گولی مار دینا۔'

بنگالی سخت وحشت زدہ بیٹھا رہا۔ ہم آوازوں پر کان لگائے دروازے سے لگے کھڑے تھے مگر اس کی طرف سے غافل نہیں تھے۔ میں نے اس پر اشاروں کی زبان میں واضح کر دیا تھا کہ وہ چپ رہے۔ مشین گن کے مقابل بڑے بڑے طرم خاں بولنا بھول جاتے ہیں۔ وہ بے چارہ کیا بولتا۔

آدھے گھنٹے بعد میں نے کہا "تمھارے گھر میں داخل ہونے کا یہی ایک راستہ ہے؟"

اس نے کہا "یہ گھر نہیں ہے۔ کھولی ہے اور کوئی راستہ تم کو نظر آتا ہے؟"

ظاہر ہے میرا سوال ہی احمقانہ تھا۔ اس کھولی کے دائیں بائیں اور اوپر بھی ایسی ہی کھولیاں تھیں۔ ان سب میں آنے اور جانے کے لیے ایک ہی راستہ تھا۔ پھر بھی میں نے حوصلہ نہیں ہارا۔ مجھے ایک دروازے میں قفل نظر آیا۔

میں نے کہا "یہ پیچھے والا دروازہ کس کا ہے؟"

"ایک فقیر کا کھولی ہے۔ پارٹ ٹائم کرتا ہے۔ رات کا شو کر کے آئے گا۔"

میں نے کہا "یہ پارٹ ٹائم فقیر کیا ہوتا ہے؟"

"وہ آدھا دن بھیک مانگتا ہے۔ صبح چھ بجے سے دو بجے تک۔" بنگالی نے کہا "بہت کمائی کر لیتا ہے۔"

میں نے حیرانی سے کہا "پھر دو بجے تک ہی کیوں کرتا ہے یہ کام؟ کیا دو بجے کے بعد بھیک مانگنا بری بات ہے؟"

"دو بجے وہ لنچ کرتا ہے اور آرام کرتا ہے۔ تین بجے دوسرا ڈیوٹی سینما پر دیتا ہے۔"

"کس قسم کی ڈیوٹی؟ وہ گیٹ کیپر ہے یا آپریٹر؟"

بنگالی نے نفی میں سر ہلایا "ٹکٹ بلیک کرتا ہے اس میں زیادہ کمائی ہے۔ بہت سمجھ دار آدمی ہے۔ عیش کرتا ہے۔"

میں نے کہا "اگر تم ایسا سمجھتے ہو۔ تو پھر اس کے ساتھ مل کے کام کیوں نہیں کرتے؟ تم بھی پارٹ ٹائم فقیر بن سکتے ہو اور اس کے بعد عیش کر سکتے ہو۔"

بنگالی نے میری بات کاٹ دی "شالا ہمارا فادر بولتا کہ تم ابھی پڑھے گا، ڈاکٹر بنے گا۔ ہمارا ماں بھی بولتا۔ ہم کیا کرے۔ فادر کو کیسے سمجھائے کہ عیش کا واسطے کیش مانگتا۔ اور کیش ڈاکٹر کا پاس کیسے آئے گا۔ شب شالا بیمار لوگ غریب ہوتا۔"

میں نے کہا "ہاں غریب ہی بیمار ہوتے ہیں۔"

اس نے کہا "وہ علاج کا واسطے جاتا سرکاری اسپتال۔ یا سنت سادھو کے پاس، پیر فقیر کے پاس۔ یا پھر ایسے ہی مر جاتا۔ امیر آدمی بیمار نہیں ہوتا۔ ہوتا تو بڑا بڑا ڈاکٹر کے پاس جاتا یا لندن جاتا۔۔۔ یا ایک دم مر جاتا۔ ہارٹ فیل۔"

میں نے کہا "واقعی بڑی زیادتی کی بات ہے۔ تم جیسے غریب ڈاکٹر بن بھی جائیں تو صرف دکھی انسانیت کی خدمت کر سکتے ہیں، عیش نہیں کر سکتے۔ خیر، یہ بتاؤ اس کمرے کی چابی کیا تمھارے پاس ہے؟"

وہ چونکا "تم شالا کیوں پوچھتا؟"

میں نے کہا "گھبراؤ نہیں، میں اس فقیر کا خزانہ لوٹ کر نہیں لے جاؤں گا۔ مجھے معلوم ہے اس نے ساری کمائی اندر گاڑ رکھی ہو گی یا گھڑوں میں بھر رکھی ہو گی۔ میری ضرورت پیسہ ہوتا تو یہ مشین گن میرے کام آ سکتی تھی۔۔۔ مجھے صرف پناہ چاہیے۔"

"اندر پناہ لے گا؟"

میں نے کہا "اس وقت پارٹ ٹائم فقیر ٹکٹ بلیک کر رہا ہو گا۔ دوسرے شو کے کر چکا ہو گا۔ شاید آخری شو باقی ہے۔"

بنگالی نے کہا "آخری شو کا ٹائم ختم ہو گا تو وہ حساب کتاب کرے گا۔ پھر ڈنر کرے گا۔ دس بجے آئے گا۔"

میں نے کہا "اس کا فقیری لباس اندر ہی ہو گا۔"

بنگالی فوراً سمجھ گیا کہ میں کیا چاہتا ہوں "تم فقیر بن کے جائے گا ادھر سے۔"

"اور کوئی صورت نظر نہیں آتی مجھے جان بچا کے نکلنے کی۔" میں نے کہا "ہر طرف جان کے دشمن کھڑے ہوئے ہیں۔"

"مگر وہ کیا کرے گا صبح؟"

میں نے کہا "کل وہ چھٹی کرے گا تو مر نہیں جائے گا فاقوں سے۔ کل وہ کہیں سے دوسری یونیفارم لے آئے گا۔ تم دروازہ کھولو۔" میں نے ڈانٹ کر کہا۔

بنگالی سہم گیا "اچھا۔۔۔ مگر دیکھو، اس کا کسی چیز کو ہاتھ مت لگانا۔ ہمارا نوکری چلا جائے گا اور یہ جگہ بھی نہیں رہے گا۔"

میں نے کہا "تم اس کے نوکر ہو؟ کیا کام کرتے ہو اس کے لیے؟"

بنگالی نے کہا "ہم اس کا حساب کتاب کرتا۔ بینک اکاؤنٹ آپریٹ کرتا۔ انویسٹمنٹ کرتا۔ تم سمجھتا ہے انویسٹمنٹ؟ ہم اس کا پیسہ کاروبار میں لگاتا۔ شیئرز خریدتا۔ اس کا وہ پانچ سو روپے دیتا ہم کو۔ اور ادھر رہنے کا واسطے یہ جگہ بھی۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ ایک فقیر آدھا دن بھیک مانگ کے اور باقی آدھا دن سینما کے ٹکٹوں کی بلیک کر کے اتنا کما رہا تھا کہ اس نے مستقبل کے ایک ڈاکٹر کو ملازم رکھ لیا تھا اور آہستہ آہستہ وہ اپنی کمائی کو بزنس میں لگا رہا تھا۔ شاید آئندہ پانچ دس سال میں اس کا شمار صنعت کاروں میں ہو گا۔

بنگالی نے میرے خوف سے تالا کھول دیا اور اس کمرے میں لائٹ جلا کے چپ چاپ کھڑا ہو گیا جس کی آرائش نے مجھے دنگ کر دیا۔ یہ خاصا بڑا کمرا تھا جس میں نفیس قالین بچھا ہوا تھا۔ پرانے صوفے، ایئر کنڈیشنز اور فریج کے علاوہ اس کمرے میں جو کچھ تھا وہ اس پارٹ ٹائم فقیر کی دولت اور عیش پرست فطرت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ ایک شیشے کے کپ بورڈ میں مجھے قیمتی شراب کی تین بوتلیں بھی نظر آئیں سب سے زیادہ پریشان کن وہ رنگین تصاویر تھیں جو چاروں طرف دیواروں پر چسپاں تھیں۔ یہ سب بڑے بڑے فحش پوسٹر تھے جن کی طرف ایک عورت کی موجودگی میں نظر نہیں اٹھتی تھی۔

میرے ساتھ آنے والی کوئی شریف عورت نہیں تھی۔ اسے حالات نے یا مجبوری نے جسم فروش بنا دیا تھا لیکن وہ بھی نظر فرش پر جمائے پیر کے انگوٹھے سے قالین کو کرید رہی تھی۔ مجھے ایک فقیر کی اس پرفریب زندگی اور دھوکا دہی پر اتنا طیش آیا کہ ممکن ہوتا تو میں اس کمرے کو آگ لگا دیتا۔ صبح یہ فقیر اپنی آواز میں مظلومیت کا سارا درد بھر کے ہر آتے جاتے کے سامنے فریاد کرتا ہو گا کہ میں لاوارث ہوں، بیمار ہوں۔ میرے بیوی بچے فاقے کر رہے ہیں، ماں اسپتال میں پڑی ہے۔ باپ کی ارتھی اٹھانے کے لیے پیسہ چاہیے اور دل میں درد رکھنے والے پگھل جاتے ہوں گے۔ انسان کو کچھ نیکی بھی کرنا چاہیے۔ خیرات زکوٰۃ دان پن کی ہر مذہب کے ماننے والوں کے لیے اہمیت ہے ثواب تو وہ بھی خریدنا چاہتے ہیں جو شیا موداد کی طرح صرف

گناہوں کی تجارت کرتے ہیں مگر وہ اس فقیر کی زندگی کا یہ دوسرا رُخ دیکھ لیں تو ان کے جذبات کی کیا کیفیت ہو۔

اپنے مطلب کا سامان مجھے بیڈ کے نیچے سے ملا۔ اس فقیر کے دو پھٹے پرانے پیوندوں سے بنے ہوئے چُغے سخت بدبودار تھے۔ ان کو اس نے ایک تھیلی میں باندھ کے رکھا تھا۔ شاید وہ انھیں بدل بدل کے استعمال کرتا ہوگا۔ پیشہ ورانہ ضرورت کا دیگر سامان بھی وہیں موجود تھا جس میں ٹوپیاں، کشکول، لاٹھی، گلے میں ڈالے جانے والے منکے سب کچھ شامل تھا۔

میک اپ سے چہرے بدلتے مجھے اتنا زمانہ ہوگیا تھا کہ اب یہ کام میرے لیے مشکل نہیں رہا تھا۔ اس وقت میک اپ سے چہرہ تو نہیں بدلا جا سکتا تھا مگر حلیہ بدلنا کوئی مشکل کام ثابت نہیں ہوا۔ ایک چُغہ میں نے پہنا اور پھر دوسرا اپنے ساتھ آنے والی لڑکی کو پہنا دیا۔ مجھے وہ کچھ چھوٹا رہا اور اسے لمبا رہا۔ اس میں وہ اوپر سے نیچے تک چھُپ گئی۔ میں نے اس کے بالوں کو سمیٹ کر باندھا اور اوپر لمبی سی ٹوپی اوڑھا دی۔ گلے میں منکوں کے ہار ڈالنے کے بعد مجھے صورت کا خیال آیا۔ بنگالی نے مجھے سیاہی فراہم کی جو میں نے ہاتھوں پر پھیلا کے چہرے پر مل لی۔ پھر یہ رنگ کالا کرنے والی کریم میں نے اس عورت کو پیش کی جو میری صورت اور میرا حُلیہ دیکھ دیکھ کے ہنس رہی تھی۔

میں نے کہا۔ ”ہنسنے کی فرصت نہیں ہے اور اجازت بھی نہیں ہے۔ ذرا اپنی صورت دیکھو۔“

ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں خود کو دیکھ کر وہ اور زیادہ ہنسی۔ ”کیا ہوا ہے صورت کو؟“

میں نے کہا۔ ”کیا یہ صورت کسی فقیرنی کی ہو سکتی ہے؟“

اس نے ہاتھوں پر تھوڑی سی سیاہی ڈالی اور میری طرح مُنہ پر پھیلا کے پھر آئینہ دیکھا۔ اس کا گورا رنگ کالا نظر آنے لگا تھا۔

”ایسے نہیں، ہاتھوں پر اور گردن پر بھی ملو۔“ میں نے کہا۔

”یہ نہ ہو کہ ہم منہ بھی کالا کریں اور پکڑے بھی جائیں۔“

میرا مطلب کچھ اور تھا مگر الفاظ غلط ہو گئے۔ وہ کچھ حیران ہوئی اور شرمائی۔ پھر اس نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ بنگالی ہماری شخصیت میں رونما ہونے والی تبدیلی سے ذرا بھی محظوظ نہیں ہوا۔ اسے زیادہ فکر اس بات کی تھی کہ وہ اپنے ”باس“ کو کیا بتائے گا کہ اس کا کام والا باس کہاں گیا۔

میں نے کہا۔ ”تم اسے سب سچ سچ بتا دینا۔“

”سچ تو بتائے گا لیکن وہ شالا مانے گا؟“ بنگالی نے روانے کے انداز میں کہا۔

”تم اس کو قائل کرنا کہ یہ چوری کا کیس نہیں ہے اور ڈکیتی بھی نہیں ہے۔ کوئی چور ڈاکو آتا تو وہ پھٹے پرانے چُغے اور کشکول لے جاتا؟ تم پہ وہ شک کر نہیں سکتا۔ اس سے کہہ دینا کہ اپنی ایک ایک چیز دیکھ لے۔“

”وہ شالا بہت حرامی ہے۔ وہ ہم کو جھوٹا بولے گا۔“

میں نے کہا۔ ”اچھا، پھر تو اسے یقین دلانے کی ایک ہی صورت رہ جاتی ہے۔“ اور ایک ہاتھ مار کے بنگالی کو ناک آؤٹ کر دیا۔

لڑکی سہم گئی۔ ”اسے مارنے کی کیا ضرورت تھی؟“

میں نے کہا۔ ”مرا نہیں ہے، گھنٹا بھر بعد ہوش میں آجائے گا۔ اس کا باس آئے گا تو یہ اسی حالت میں پڑا ہوا ملے گا۔ پھر اس کی کہانی قابلِ یقین ہو جائے گی۔ اب چلو۔“

میں نے درمیانی دروازہ بند کیا اور ہم واپس بنگالی نوجوان کے کمرے میں آ گئے۔

”اب تم کو تھوڑی سی اداکاری بھی کرنی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”کمر کو جھکا لو تاکہ تمھارا چہرہ نیچے کی طرف رہے۔ آواز کو بدل کے بھیک مانگتی ہوئی میرے ساتھ چلتی جاؤ۔ دیکھنے والوں کو ایسا لگنا چاہیے جیسے ہم دونوں بوڑھے اپاہج فقیر ہیں۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ ان کا باپ بھی ہمیں نہیں پہچان سکتا۔“

”اور اگر انھیں شک ہو گیا۔۔۔؟“

”بفرضِ محال ایسا ہوا تو ان کا شک یہ چیز دور کر دے گی۔“ میں نے مشین گن پہ ہاتھ مار کے کہا۔ جو اب میرے چُغے کے اندر محفوظ تھی۔

”مجھے ڈر لگتا ہے۔“

”دیکھو، ہم کو صرف یہ گلی پار کرنی ہے۔ وہ گلی کے آخری حصّے میں ہوں گے۔“ میں نے کہا۔ ”ان کے سامنے سے گزرتے وقت حوصلہ رکھنا۔ ذرا مجھے چل کے دکھاؤ۔“

وہ تھوڑا ہچکچائی۔ پھر اس نے چند قدم چل کے دکھایا اور آواز بدل کے کہا۔ ”بھگوان کے نام پہ اندھی مائی کو کچھ دے۔“

”یہ ٹھیک ہے، تم اندھی بن جاؤ۔ میرا بازو تھام کے چلو۔“ میں نے کہا۔ ”خدا نے چاہا تو خون ریزی کی نوبت نہیں آئے گی۔“

وہ چونکی۔ ”تم مسلمان ہو؟“

میں نے کہا۔ ”انسان کہو یا مسلمان۔ کیا فرق پڑتا ہے؟ ہم دونوں کے لیے اس وقت زیادہ اہم اپنی اپنی زندگی ہے۔“

میں نے دروازے کی اوٹ سے سر نکال کے گلی میں جھانکا تو موقع مناسب تھا۔ دو عورتیں خاصے فاصلے پر زبانی

جنگ میں مصروف تھیں۔ دوسری طرف، عین گلی کو روشن کرنے والے کھمبے کے نیچے چار افراد تاش یا چوسر قسم کی بازی جمائے بیٹھے تھے اور دُگنی تعداد میں تماشا دیکھنے والے یا مفت مشورے دینے والے ان کے گرد جمع تھے۔ مجھے دونوں طرف چادر تان کے سونے والے بھی نظر آئے۔ شاید ایک بمبئی کے فٹ پاتھوں پر اور سڑکوں کے کنارے جتنے لوگ کھلے آسمان کے نیچے رات گزارتے ہیں، پورے پاکستان میں اس کا دسواں حصّہ بھی بے گھر افراد نہیں ہوں گے۔

میں نے اس لڑکی کو اشارہ کیا اور ہم ایک دم ایسے باہر آ گئے کہ کوئی دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ ہم زمین سے اُگے ہیں یا آسمان سے ٹپکے ہیں۔ دروازے کو بند کر کے ہم نے گلی کے آخری حصّے کی جانب چلنا شروع کیا۔ وہ خمیدہ کمر بُڑھیا کی طرح رکوع کی حالت میں چل رہی تھی۔ اور میں نے اسے بائیں ہاتھ کا سہارا فراہم کر رکھا تھا۔

”ارے بابا۔۔۔ کچھ اندھی عورت کو بھی دو۔۔۔“ اس نے بیٹھی ہوئی آواز میں پکارنا شروع کیا۔

”ارے اپنی حرام کی کمائی میں سے کچھ تو نکالو۔۔۔ کوئی نوٹ سو پچاس کا تو نہیں مانگتے ہم۔۔۔ پانچ دس میں بھی دُعا مہنگی نہیں ہوتی۔ بلیک میں پانچ کا دس لگاتے ہو۔۔۔ دیس میں ایک کے سو لگاتے ہو۔۔۔ شراب پی جاتے ہو اتنے کی جتنے میں تمھاری چتا کی لکڑی آ جائے گی۔ تمھارا کفن بنے گا۔۔۔؟“ میں نے کشکول میں چند سکے ڈال کے بجاتے ہوئے ہنکارنا شروع کیا۔ بہت سے لوگ ہنسنے لگے۔

ایک نے کہا۔ ”سالا چریا ہے۔“

دوسرے نے کہا۔ ”فقیر کے مزاج دیکھو۔ سالا پانچ دس کا نوٹ مانگتا ہے۔“

”سب کی کمائی کو حرام کی کمائی بولتا ہے۔“

”کہتا ہے چتا کی لکڑی۔۔۔“

”کفن بنے گا۔ سالا۔۔۔ پاگل کا بچّہ۔“

ظاہر ہے یوں بھیک کسے ملتی ہے۔ مجھے بھی لوگوں کی باتیں ہی سننے کو ملیں۔ میں چاہتا بھی نہیں تھا کہ کوئی مجھے خیرات دینے کے لیے قریب بلائے یا میرے قریب آئے۔ ہم نے اس گلی کا آدھے فرلانگ سے کچھ کم فاصلہ دس منٹ میں طے کیا۔ جہاں یہ گلی سڑک سے ملتی تھی، وہاں تین چار افراد گلی کی طرف مُنہ کیے کھڑے تھے۔

میں کچھ نہیں جانتا تھا کہ ان میں سے شکاری کون ہیں۔ شیا مو دلو کے نائٹ کلب سے میرے تعاقب میں کتنے افراد روانہ ہوئے تھے اور وہ کہاں کہاں ناکا بندی کیے کھڑے تھے؟

”لے بُڈھا! کیا کرے گا پانچ کا نوٹ لے کر؟“ ایک شخص نے کہا۔ ”اندھی کو سینما دکھائے گا؟“

دوسرا قہقہہ مار کے بولا۔ ”اپن ولایتی شراب پیتا ہے اور سالا اپن جب مریں گا تو نہ کفن نہ چتا۔ اپن کو ادھر سمندر میں ڈال دو۔ ہم مچھلی کو کھایا۔ مچھلی ہم کو کھا جائے۔“ وہ نشے میں تھا، اس کا ساتھی ابھی ہوش میں تھا مگر کسی بوتل سے مُنہ لگا کر پی رہا تھا۔ ان دونوں کو میں نے خطرناک افراد کی فہرست سے خارج کر دیا۔ ہمارے گلی کے نکڑ تک پہنچنے سے قبل ہی وہ ایک دوسرے کے گلے میں ہاتھ ڈال کے گاتے ہوئے چل پڑے۔

”جائے گا جب یہاں سے کچھ بھی پاس نہ ہو گا۔“ ایک نے اپنی بے سُری آواز میں ہانک لگائی۔

”ارے فقیر کی دُعا سے سٹے کا نمبر نکلے گا۔ فلم میں چانس ملے گا۔ ماشوک مہربان ہوئیں گا۔۔۔“

ایک شخص نے غرّا کے کہا۔ ”بکواس بند کر سالا اور چل ہٹ ادھر سے، ڈرامے باز۔“

دوسرے نے کہا۔ ”کیسا کیسا فقیر ادھر پیدا ہو گیا ہے۔“

”وہ کدھر مر گیا۔۔۔؟“ پہلے والے نے جھنجلا کے کہا۔ ”کیا ہم ایسے ہی کھڑا رہے گا رات بھر۔“

”میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ اب کوئی فائدہ نہیں۔ وہ سالا کسی اور طرف سے نکل گیا۔“

”کدھر سے نکل گیا۔ سارا راستہ ہم دیکھ لیا۔ وہ ضرور کسی کے گھر میں گھُسا ہے۔ ماں قسم ہم کو پتا چلیں گا کہ اس کو کس نے چھُپایا تھا۔ ہم اس کا۔۔۔“

”ابھی ایسے کاہے کو خالی پیلی بوم مارتا ہے۔ اکھا گلی کو قتل کرے گا؟ وہ جس گھر میں جائے گا اس کا خانہ خراب کرے گا۔ زبردستی کرے گا سب کے ساتھ اور بولے گا۔ ہم کو چھپاؤ، نہیں چھپائے گا تو مارے گا۔“ دوسرے نے کہا۔

”اور چھپائے گا تو ہم مارے گا۔“ پہلے نے کہا۔

ہم دونوں اپنی اپنی صدا لگاتے کشکول ہلاتے سڑک پر آ گئے۔ یہ خاصی پُر رونق سڑک تھی۔ دونوں طرف پیدل چلنے والوں کا اژدہام تھا۔ درمیان سے ٹرام کی پٹری گزر رہی تھی جس پر مخالف سمت سے آنے والی ٹرام ایک ہی جگہ رُکی ہوئی تھی۔ پھر ایک دو منزلہ بس آئی اور ایک ہی جگہ بہت سے مسافر اترے اور بہت سے مسافر اس میں سوار ہونے کے لیے بڑھے۔ میں نے اپنے ساتھ صدا لگانے والی فقیرنی کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا اور ہم دونوں ٹرام پر چڑھ گئے۔

مجھے یقین تھا کہ ہم گلی کے آخر میں کھڑے ہوئے دونوں بدمعاشوں کو دھوکا دینے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ میں نے نظر اٹھا کے تو نہیں دیکھا تھا لیکن ان کی باتوں سے کوئی کوئی اندازہ نہیں ہوا تھا کہ انھیں شک ہو گیا ہے۔ مگر وہ ہم پر نظر رکھے ہوئے تھے اور ہماری حرکات و سکنات کو غور سے دیکھ رہے تھے۔

جیسے ہی میں ٹرام پر سوار ہوا میری نظر گلی کی طرف گئی۔ ان میں سے ایک نے دوسرے کو متوجہ کر کے کچھ کہا تھا شاید اس نے ہمیں دوڑ کر ٹرام میں سوار ہوتا دیکھ لیا تھا۔ ہم جب ان کے سامنے سے گزرے تھے تو کمر جھکا کے ایسے چل رہے تھے جیسے ہمارے لیے ایک کے بعد دوسرا قدم اٹھانا بھی ضعف اور نقاہت کے باعث مشکل کام ہے۔ اندھی معذور فقیرنی اور بوڑھے فقیر نے ٹرام پر چڑھتے ہوئے جوانوں جیسی پھرتی اور مستعدی دکھائی تھی۔ چنانچہ ان کے شک کا یقین میں بدلنا جائز تھا۔

ٹرام کی رفتار خاصی بڑھ چکی تھی۔ میں اس کے فٹ بورڈ پر کھڑا ہوا تھا اور سہارے کے لیے میں نے ایک ڈنڈا پکڑ رکھا تھا۔ گلی کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے اپنا ہاتھ ہلایا۔ میری اس حرکت نے ان کے لیے تذبذب کی گنجائش باقی نہ رہنے دی۔ وہ مشتعل ہو کے دوڑے۔ ان میں سے ایک کے راستے میں ایک سائیکل سوار عورت حائل ہو گئی۔ میں نے انھیں ایک ساتھ سڑک پر گر کے آپس میں الجھتے دیکھا۔ دوسرا ایک کار کے نیچے آ کے مرتے مرتے بچا۔ تاہم اس کو کار کی ٹکر نے لنگڑا کر دیا تھا۔

اگر یہ حادثات پیش نہ آتے تب بھی وہ دوڑ کر ٹرام کو نہیں پکڑ سکتے تھے۔ میں نے پیچھے آنے والی ٹریفک کو دیکھا۔ تو مجھے سب رکشا ٹیکسی بھرے ہوئے نظر آئے۔ پھر بھی میں اس امکان کو مسترد نہیں کر سکتا تھا کہ ان کو سواری مل جائے اور وہ ٹرام کے پیچھے لگ جائیں۔ چنانچہ اگلے ہی اسٹاپ پر میں اتر گیا۔

بہت سی نامعلوم گلیوں سے گزرنے کے بعد بالآخر ایک جگہ پہنچ کے مجھے یقین ہو گیا کہ اب میرے تعاقب میں کوئی نہیں ہے اور ہم محفوظ ہیں۔ وہ لڑکی جس کا میں نے ابھی تک نام بھی نہیں پوچھا تھا، میرے ساتھ تھی۔ میں نے گھڑی دیکھی تو رات کے نو بج کر چالیس منٹ ہوئے تھے۔ میرا ترلوچن تک پہنچنے کا مشن ناکام رہا تھا اور شیامو داوا جو مجھے بردہ فروشوں کے گروہ تک پہنچا سکتا تھا، مارا جا چکا تھا۔ اب میرے لیے واپسی کے سوا چارہ نہ تھا۔

میں نے چلتے چلتے اس لڑکی سے کہا "تم اب کہاں جاؤ گی؟"

اس نے مجھے بڑی عجیب نظروں سے دیکھا "جہاں تم لے جاؤ گے۔"

میں نے کہا "میں کیوں لے جاؤں گا بھلا اور کہاں لے جاؤں گا۔ مجھے خود اپنے ٹھکانے کا علم نہیں۔"

"ٹھکانا تو میرا بھی کوئی نہیں۔"

"لیکن میں تمھاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔" میں نے کہا۔ "میں نے تمھیں اس جگہ سے نکالا اور تم نے مجھے۔ وہاں میں تم سے ملنے نہیں گیا تھا۔ میں شیامو داوا کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے پہنچا تھا۔ مگر قسمت نے تم کو ساتھ کر دیا۔ اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔"

"میں نے تمھیں اپنی زندگی کی ساری کہانی سنا دی تھی۔"

"وہ سب ٹھیک ہے۔ لیکن میرے بھی حالات ایسے ہیں کہ میں تم کو ساتھ نہیں رکھ سکتا۔ اس میں تمھارے لیے بھی خطرہ ہے اور میرے لیے بھی۔ میرا کوئی گھر ہوتا یا میرے کسی دوست یا رشتے دار کا گھر ہوتا تو میں تم کو وہاں چھوڑ دیتا لیکن اس شہر میں ایسی کوئی جگہ نہیں ہے۔ میں ایک اجنبی ہوں یہاں۔"

وہ اب رونے کے قریب ہو گئی تھی۔ "وہ لوگ جن سے تم مجھے بچا کے لائے ہو۔ بہت خطرناک لوگ ہیں کیا تم چاہتے ہو کہ وہ پھر مجھے پکڑ کے لے جائیں۔ میں خودکشی کر لوں گی..."

میں نے کہا "تم جذباتی ہو رہی ہو۔ خودکشی تم بہت پہلے بھی کر سکتی تھیں۔ تمھیں کون روکنے والا تھا۔ اس کے مواقع بھی حاصل تھے تم کو، پھر اب ایسا کیوں سوچتی ہو۔ تم دلدل سے نکل آئی ہو۔ قدرت نے مجھے وسیلہ بنایا یا تمھیں ہمت دی کہ مقابلہ کر سکو، پھر یہ بزدلی کیسی۔ اپنا گھر نہ سہی، تمھارے خاندان کے دوسرے لوگ ضرور ہوں گے جو تمھاری مدد کر سکتے ہیں۔ رشتے کے ماموں یا چچا اور کزن سب تو برے نہیں ہو سکتے۔"

"تم سمجھتے کیوں نہیں۔ پہلے وہ سب مدد کر سکتے تھے مگر اب نہیں کریں گے۔ اب میں عورت نہیں گناہ کی پوٹ ہوں۔ معاشرے کی پاک دامنی پر بدصورتی اور رسوائی کا ایسا داغ ہوں جس سے سب بچنا چاہتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "اچھا چلاؤ نہیں، لوگ متوجہ ہوں گے۔ یہ فقیری لباس اتار دو۔"

"کیسے اتار دوں؟ چلتے چلتے...؟"

میں نے کہا "ایسے... کیا کسی نے دیکھا؟ اور دیکھا تو کیا ہوا۔ کوئی مجھ سے پوچھ کر دیکھے۔ میں صاف کہہ سکتا ہوں کہ جناب ڈیوٹی کا وقت ختم ہوا۔ میں نے یونیفارم اتار دی، آپ کو کیوں اعتراض ہے؟"

وہ مسکرائی اور اس نے بھی چغہ اتار کے گٹھڑی سی بنا لی۔ سر کی ٹوپی اور منکے، کشکول وغیرہ سب اس گٹھڑی میں سما گئے۔ ہم ان گٹھڑیوں کو بغل میں دبائے کچھ دیر خاموشی سے چلتے رہے۔ پھر میں نے ادھر ادھر دیکھا اور سب کی نظر بچا کے گٹھڑی کو ایک گٹر کے کھلے مین ہول میں ڈال دیا۔ اس نے میری تقلید کی۔

اب ہم پھر شریفانہ لباس میں تھے۔ صرف سیاہی تھی جو ہمارے چہروں پر باقی رہ گئی تھی۔ مشین گن کا کور شیامو داوا کے اڈے پر ہی رہ گیا تھا۔ چنانچہ اس خطرناک اسلحے کو چھپانے کے لیے میں نے دوپٹہ استعمال کیا۔ وہ دوپٹے کے بغیر میرے ساتھ اطمینان سے چلتی رہی۔

رات کے دس بج رہے تھے اور میں اب اس لڑکی سے پیچھا چھڑا کے واپس پہنچنا چاہتا تھا۔ مجھے بھوک بھی لگ رہی تھی۔ میں اسے ایک درمیانے درجے کے ریسٹورنٹ میں لے گیا۔ جس کے ایک دروازے پر "فیملی" کے حروف نمایاں تھے۔ دروازے کے پیچھے لکڑی کے تختوں کا زینہ تھا۔ اوپر والے حصے میں دونوں جانب لکڑی کی پارٹیشن والے کیبن تھے۔ ہر قطار میں بوسیدہ پردوں والے چھ کیبن تھے۔ درمیان میں مشکل سے چھ فٹ چوڑی گلی تھی۔ چنانچہ وہ سب جو کسی بھی کیبن میں بیٹھے تھے، آہستہ آواز میں گفتگو کرنے پر مجبور تھے۔ اس کے باوجود چوڑیوں کی اور دبے دبے قہقہوں کی کھنک سارے راز افشا کرتی تھی۔

چھ فٹ لمبے اور چوڑے کیبن کے اندر درمیانی میز بھی لکڑی کی دو فٹ چوڑی اور پانچ فٹ لمبی بینچ تھی۔ اس کے دونوں جانب بیٹھنے والوں کے لیے بھی ڈیڑھ فٹ چوڑی بینچ تھی جس پر کشن لگا دیے گئے تھے۔ کشن میلے تھے اور دبے ہوئے تھے۔ جب میں بینچ پر بیٹھا تو مجھے کیبن کے اندر عجیب سی ناخوشگوار بدبو کا احساس ہوا۔ کسی ارادے کے بغیر میں نے کیبن کی دیواروں کو دیکھا تو میری نظریں شرمندگی سے جھک گئیں۔ ان کا حال کسی پبلک لیٹرین سے مختلف نہ تھا۔ یہاں آنے والوں نے قلم، پنسل، چاک یہاں تک کہ چاقو کی نوک سے اپنے نام لکھے تھے۔ کسی کے نام پیغامات لکھے تھے اور وہ سب لکھا تھا جو لکھا تو جا سکتا ہے مگر شائع نہیں کیا جا سکتا۔ اصل فحاشی کے نمونے، مصوری کے نامکمل اور بھونڈے شاہکار وہاں پینٹ کیے گئے تھے۔

مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ جہاں ہم بیٹھے ہیں یہ کوئی شریفانہ جگہ ہرگز نہیں ہے اور یہاں سب کھانا کھانے اور چائے پینے کے لیے ہی نہیں آتے۔ کرسیوں کی جگہ بینچوں کی فراہمی مالک ریسٹورنٹ ہذا کی انتظامی اور کاروباری صلاحیت کا واضح ثبوت تھی۔ میرے ساتھ جو لڑکی آئی تھی وہ کوئی پاک دامن شریف نہیں تھی۔ اس کے باوجود میرے سامنے اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔

میں نے کہا "چلو کہیں اور چلتے ہیں۔"

وہ تلخی سے مسکرائی "چھوڑو، میری اپنی زندگی اس سے زیادہ نفرت کے قابل ہے..."

میں نے اس کی بات کاٹ دی "زندگی کبھی نفرت کے قابل نہیں ہوتی۔ کچھ لوگ دنیا میں برے ہیں یا دوسروں کی زندگی میں برائی کا زہر بھرتے ہیں تو ایسے سانپوں کو مار دینا چاہیے۔ چادر پر ایک داغ لگ جائے تو اسے دھویا جا سکتا ہے۔ اسے جلانے کی کیا ضرورت ہے؟"

"تم صرف باتیں کر سکتے ہو، اچھائی کی اور نیکی کی۔"

میں نے خفت سے کہا "دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے اور کیا اچھی بات نہیں کرنی چاہیے؟"

ویٹر نے پردہ ہٹا کے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا "ابھی کیا کریں گا؟"

میں نے کہا "پہلے کھانا کھائیں گا۔ پھر بل ادا کریں گا۔ اور چلا جائیں گا۔"

"بس؟" اس نے لڑکی کو معنی خیز انداز میں گھورتے ہوئے مایوسی سے کہا۔ "اچھا بولو، کیا مانگتا؟"

"جو بھی ایک نمبر چیز ہے لے آؤ۔" میں نے کہا۔ کیونکہ وہ لمبی سانس لے کر پورا مینو پڑھنے کے موڈ میں تھا۔ "ہم دونوں کے لیے۔"

جب ویٹر غائب ہو گیا تو میں نے کہا۔ "تم نے کچھ اور لڑکیوں کا بھی ذکر کیا تھا جو شیامو داوا کے پاس تھیں مگر وہاں تو ایک بھی نظر نہیں آئی۔"

"نظر کیسے آتیں۔ وہ سب کچھ باہر سن رہے تھے۔"

"کیسے سن رہے تھے؟ کسی دیوار یا چھت میں خفیہ مائیکرو فون تھا؟" میں نے کہا "تھا تو کہاں تھا؟"

"یہ مجھے نہیں معلوم۔ لیکن اندر کی ساری باتیں باہر کہیں سنی جاتی ہیں۔" وہ بولی "انھوں نے سب لڑکیوں کو ہٹا دیا۔"

"اگر ایسی ہی بات تھی تو انھوں نے پولیس کو کیوں طلب نہیں کیا تھا؟" میں نے کہا۔

"وہ پولیس پر بھروسا نہیں کرتے۔ پولیس نے ان کو بدمعاشی

کا لائسنس دے دیا ہے لیکن خون خرابا ہو جائے تو یہ لائسنس کام نہیں آتا۔ معاملہ اوپر چلا جاتا ہے اور قابو سے باہر ہو جاتا ہے تم سے وہ خود ہی نمٹنا چاہتے تھے۔"

"خون خرابا تو وہاں ہو گیا۔ اب وہ کیا کریں گے؟"

"وہ کچھ بھی نہیں کریں گے۔ لاشوں کو ہٹا کے کہیں ڈلوا دیں گے اور قتل اپنے کسی دشمن کے کھاتے میں ڈالنے کی کوشش ضرور کریں گے۔ کل سب ویسے ہی ہو گا جیسے آج تھا۔"

میں نے کہا "تم کب سے یہاں تھیں؟"

"مجھے ایک مہینہ دو دن ہو گئے۔" وہ بولی۔ "پورے بتّیس دن۔"

"اسی لیے تم اتنا جانتی ہو۔" میں نے کہا۔

"تم وہاں کس چکر میں پہنچے تھے؟"

میں نے کہا "تم نے سنا ضرور ہو گا۔ تم سن رہی تھیں۔ تم نے میرا بیڑا غرق کرنے کی بھی کوشش کی تھی۔ اگر تم وہ کال بیل کا بٹن دبانے میں کامیاب ہو جاتیں تو میں مارا جاتا۔"

"میں... کیا کرتی؟ اس کے اشارے کو کیسے نظر انداز کرتی۔ یہ سب بہت سفّاک لوگ ہیں۔ کیا تم ان کی سفّاکی کے نمونے دیکھو گے؟"

میں نے گھبرا کے کہا "نہیں، میں تمھاری بات ایسے ہی مان لوں گا۔ ثبوت دیکھے بغیر۔"

وہ تلخی سے مسکرائی۔ "ڈر گئے؟ عورت کا جسم خوبصورت ہو تو ہر نگاہ اندر تک اُتر جاتی ہے۔"

"فضول باتیں مت کرو۔" میں نے برہمی سے کہا۔ "بتا سکتی ہو تو یہ بتاؤ کہ ان سب کو کہاں لے جایا گیا ہو گا؟"

"تم کیا ان سب کو چھڑاؤ گے؟" وہ بولی۔ "اس سے کیا ہو گا؟ ممکن ہے یہ پندرہ بیس لڑکیاں بچ جائیں لیکن بمبئی کے بازار میں پندرہ بیس روز آ جاتی ہیں۔ یہ تو ایک منڈی ہے۔ سارے ہندوستان کا مال یہاں پہنچتا ہے۔ کچھ یہاں رُک جاتا ہے۔ باقی آگے چلا جاتا ہے۔ ان کے بیوپاری، آڑھتی، ہول سیلر، سپلائر سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ ان سے اُلجھنے کی کوشش بھی کوئی نہیں کرتا کیونکہ ان کے پیچھے پولیس ہے اور کالے دھن والے ہیں۔ شیامو جیسے بہت سے دادا ہیں۔ تم ان سب کو ختم نہیں کر سکتے۔ وہ تمھیں بڑی آسانی سے ختم کر دیں گے۔"

اس کی بات نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ یہ تو میرا مشن نہیں تھا۔ مجھے اس چکر میں پڑ کے مرنے کی کیا ضرورت ہے۔ بمبئی جیسے دنیا میں نہ جانے کتنے شہر ہیں۔ بردہ فروشوں کے علاوہ ایسے شہروں میں ہر قسم کے غیر قانونی اور غیر اخلاقی دھندے کرنے والے بھرے پڑے ہیں۔ چور، ڈاکو، اسمگلر، جوئے خانے اور شراب خانے چلانے والے، منشیات فروش اور خرکار۔ میں جہاں بھی جاؤں گا ایسے لوگوں سے واسطہ پڑے گا۔ میں ہر قدم پر بھٹک گیا تو منزل سے دور ہو جاؤں گا۔ میں مجبور ہوں کہ ہر بُرائی سے نظر بچا کے گزرتا جاؤں۔ میرا مقصد اپنے ملک کے ایک غدار اور اپنے باپ کے قاتل کو کیفرِ کردار تک پہنچانا ہے، جب تک یہ نہ ہو جائے مجھے کچھ اور سوچنا ہی نہیں چاہیے۔ ہاں اس کے بعد جو فرصتِ عمر ہے سو وہ رابعہ کے اور اپنے گھر کی تعمیر کے لیے ہے جس کی حسرت کو میں نے مجبوریوں کے طاقِ نسیاں میں رکھ دیا ہے۔

"کیا میں نے غلط کہا؟ اور تم نے فیصلہ کر لیا ہے..."

میں نے کہا "نہیں، فیصلہ تو میں بہت پہلے کر چکا تھا اور وہ فیصلہ کچھ اور تھا۔ میں کسی بھی ایسے جھگڑے میں نہیں پڑ سکتا۔"

"پھر تم شیامو دادا کے پاس کیوں گئے تھے؟ کیوں اس کو ترلوینی کے پاس لے جانا چاہتے تھے...؟" وہ بولی۔

میں نے کہا "ترلوینی میرا دشمن ہے۔ اس نے میرے دوستوں کو قید کر لیا ہے۔ اس نے مجھے بھی قید کر لیا تھا مگر میں خوش قسمت تھا کہ فرار ہونے میں کامیاب رہا۔"

"ترلوینی کے بارے میں جو کچھ میں نے سنا ہے، اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کسی سے نہیں ملتا۔ اس کے بارے میں کوئی نہیں جانتا کہ وہ کب کہاں ہو گا۔ شیامو دادا تمھارے ساتھ جاتا تب بھی کچھ نہ ہتا پاتا۔"

"کیا وہ ترلوینی سے ملتا ہی نہیں تھا؟"

"ملتا تھا جب بھی ترلوینی اسے طلب کرتا تھا۔ وقت اور جگہ خود ترلوینی بتا دیتا تھا۔ شیامو دادا کو وہاں سے ایک گاڑی لے جاتی تھی۔"

کھانا کھاتے ہوئے میں اِدھر اُدھر سے سُنائی دینے والی آوازوں سے بے خبر نہیں تھا۔ ان آوازوں کو نظر انداز کرنا بھی مشکل تھا۔ میں چاہتا تھا کہ جلد از جلد اس فحاشی کے اڈے سے نکل جاؤں۔ اچانک میں نے ایک ساتھ کئی بھاری قدموں کی آواز سُنی۔ وہ سب لکڑی کے تختوں والے زینے پہ دھم دھم کرتے اوپر آ رہے تھے۔

میرا ہاتھ بے اختیار اپنی مشین گن پر گیا۔ اسی وقت ایک عورت چلائی۔ اس کی چیخ میں خوف سے زیادہ غصّہ شامل تھا۔ کسی مرد نے کہا۔ "سالا دیکھتا نہیں پردہ ہے۔"

کسی اور نے کہا "آگے چلو، آگے دیکھو۔"

تیسری آواز نے کہا۔ "میں ادھر دیکھتا ہوں، وہ ادھر ہی آئے ہیں۔"

میری چھٹی حس نے مجھے پہلے ہی خطرے سے آگاہ کر دیا تھا۔ میں نے ایک دم مشین گن کو فائر کی پوزیشن میں لے لیا اور بنچ پر کھڑا ہو گیا۔ میرے ساتھ آنے والی لڑکی بُری طرح خوفزدہ نظر آنے لگی تھی۔ میں نے اسے چُپ رہنے کا اشارہ کیا اور پردے سے لگ کر کھڑا رہا۔

پردہ ہٹا کے ایک شخص نے اندر جھانکا۔ وہ صورت سے ہی موالی نظر آتا تھا۔ ریوالور اس کے ہاتھ میں تھا اور مجھے دیکھتے ہی اس کی صورت کا تاثر بدل گیا۔ اس نے چلّانے کے لیے مُنہ کھولا ہی تھا کہ میں نے مشین گن کا بٹ اس کے سر پہ مارا مگر اسے پیچھے نہیں گرنے دیا۔ میں نے اسے آگے کھینچ لیا۔ اور وہ درمیان کی بنچ نما میز پر اس طرح اوندھا گر گیا کہ اس کے دونوں ہاتھ بنچ کے دونوں طرف لٹکے ہوئے تھے اور وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہوا تھا۔

دوسرے کیبنوں میں بیٹھے ہوئے سب جوڑے اس ہنگامے کی لپیٹ میں آ گئے تھے۔ ان کی خلوت گاہوں میں خون کے پیاسے، وحشی درندے دندناتے ہوئے گھس آئے تھے۔ اب میزیں گر رہی تھیں۔ برتن ٹوٹ رہے تھے اور عورتوں کی چیخوں سے کہرام سا مچ گیا تھا۔

میں نے بنچ پر چڑھ کے کیبن کی دیوار کے اوپر سے باہر جھانکا تو دو افراد نے ایک دم پلٹ کے مجھے دیکھا۔ ان میں سے ایک نے کوئی گالی دی اور میرا نشانہ لیا۔ اگر میں مشین گن کا فائر کھول دیتا تو سامنے والے کیبن میں سے نکل کر بھاگنے والے مردوں عورتوں میں سے بھی کوئی مارا جاتا۔ ایک ریوالور جس میں صرف دو گولیاں تھیں، میں اپنے ساتھ آنے والی لڑکی کو دے چکا تھا۔ دوسرا نکالنے میں مجھے چند ہی سیکنڈ لگے ہوں گے لیکن اتنی دیر میں میرا ایک حریف ٹریگر دبا چکا تھا۔

میں نے اپنا سر نیچے کر لیا اور پھر فوراً اُٹھ کے جوابی فائر کیا۔ میرا نشانہ لینے والا اُچھل کے پیچھے والی دیوار سے ٹکرایا۔ اس کا دوسرا ساتھی شامتِ اعمال کے باعث مارا گیا۔ اس نے مجھ پر گولی چلائی لیکن گولی اس کے ریوالور سے نکلی ہی نہیں۔ یہ ریوالور کی فنی خرابی تھی یا وہ ریوالور میں گولیاں ڈالنا بھول گیا تھا۔ مجھے دوسری بات بعید از امکان لگی۔ تقدیر نے یا بچانے والے ہاتھ کی طاقت نے مجھے چند سیکنڈ کی مہلت عطا کی اور میں نے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے غلط پر بھروسا کرتے ہوئے اور خدا کا نام لے کر گولی چلائی۔ میرے ایک اور دشمن کا خاتمہ ہوا۔

آخری شکاری کو میری جوابی کارروائی نے دفاعی پوزیشن لینے پر مجبور کر دیا۔ اس کے تین ساتھی تیس سیکنڈ میں اس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے حالانکہ وہ سب مسلح تھے اور اس یقین کے ساتھ یہاں پہنچے تھے کہ وہ مجھے محصور کرنے کے بعد کسی دشواری کے بغیر پکڑ لیں گے۔ چوتھا شخص اب کسی خوش فہمی کا شکار نہ تھا۔ پہلے چار کا مقابلہ ایک سے تھا تو اب ایک کا ایک سے۔ تین کے مارے جانے سے وہ کچھ خوفزدہ ہو گیا تھا۔ اس نے پہلے کیبن کو مورچا بنا لیا تھا اور اب انتظار کر رہا تھا کہ میں فرار ہونے کی کوشش میں اس کے سامنے سے گزروں تو وہ مجھے شوٹ کر دے۔

میں خود یہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا لیکن میرا راستہ مسدود تھا۔ ریسٹورنٹ سے فرار ہونے والے زینے کی طرف دوڑ رہے تھے۔ عورتیں لباس سنبھالتے ہوئے گر رہی تھیں اور چلّا رہی تھیں۔ مرد انھیں دھکیل کر خود پہلے نکل جانے کی فکر میں لیڈیز فرسٹ کے اصول کو بھول چکے تھے۔ اس ہنگامہ آرائی سے ریسٹورنٹ کی نچلی منزل کے دیوانِ عام میں بھی افراتفری پھیل گئی تھی۔ کرسیاں میزیں اُلٹنے، برتن اور شیشے ٹوٹنے کے علاوہ لوگوں کے چلّانے سے کان پڑی آواز سُنائی نہ دیتی تھی۔ فائرنگ کی آوازوں نے انھیں دہشت زدہ کر دیا تھا۔ وہ جان بچا کے نکل جانا چاہتے تھے۔ انھیں ڈر تھا کہ پولیس آ گئی تو انھیں گواہی میں دھر لے گی۔ لوگ نہیں جانتے تھے کہ فائرنگ کیوں ہو رہی ہے تاہم اتنا اندازہ ضرور کر سکتے تھے کہ یہ بدمعاشی کی دُنیا کے دو بادشاہوں کی جنگ ہے۔ جب سانڈ لڑ رہے ہوں تو حقیر اور کمزور حشرات الارض کو رزم گاہ سے دور اپنے اپنے بلوں میں چھُپ جانا چاہیے۔ اسی میں ان کی سلامتی ہے۔

وہ لڑکی بھی خوف سے منجمد بیٹھی ہوئی تھی۔ ایسا کشت و خون اس نے پہلے کہاں دیکھا ہو گا۔ اگر وہ چاہتی تو اس ریوالور سے میری مدد کر سکتی تھی جس میں ابھی دو گولیاں باقی تھیں اور جو میں نے اسے سنبھال کر رکھنے کے لیے نہیں دیا تھا لیکن وہ گل بانا ز د نہیں تھی۔ اس میں نہ مرنے کا حوصلہ تھا اور نہ مارنے کا۔

خاموشی کے ایک مختصر وقفے سے میں نے سمجھ لیا کہ میرا حریف سامنے آ کے مقابلہ کرنے سے گریز کر رہا ہے۔ اگر وہ کچھ بھی نہ کرتا تب بھی مجموعی صورتِ حال سے فائدہ اُٹھا سکتا تھا۔ میرے لیے اپنے کیبن سے نکلنا اور آخری کیبن میں جا کے اسے تلاش کرنا اور پھر شوٹ کر دینا اتنا مشکل کام تھا کہ اس میں میری ناکامی کے امکانات نوّے فیصد تھے تو کامیابی کے صرف دس فیصد۔ بہادری کا مظاہرہ خودکشی کی کوشش کے مترادف تھا۔ کچھ نہ کرنا اس مہلت کو ضائع کرنا تھا جس سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے میں فرار ہو

سکتا تھا۔ میرے حریف نے کچھ نہیں کیا تھا۔ اس نے کسی کو بھی قتل نہیں کیا تھا چنانچہ پولیس کا جلد از جلد آجانا اس کے حق میں تحفظ کی ضمانت ہو سکتا تھا۔ شاید وہ یہی چاہتا بھی تھا۔

میرے لیے بلا تاخیر اس جگہ سے بھاگ جانے ہی میں عافیت تھی جہاں میرے جرم کا ہر ثبوت موجود تھا۔ آلۂ قتل میرے پاس تھا۔ تینوں لاشیں بھی وہیں موجود تھیں اور گواہ بہت تھے۔ پکڑے جانے کی صورت میں میرا تختۂ دار تک پہنچنا لازمی تھا۔ ان سب عوامل کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے بینچ پر کھڑے ہو کے پیچھے دیکھا۔

دشمن کے اور میرے درمیان تین کیبن حائل تھے۔ مشین گن کا برسٹ لکڑی کی تین دیواروں سے گزر جاتا تب بھی اس کا نشانہ بن جانا غیر یقینی تھا۔ میں نے ریوالور سے دو فائر کیے اور ایک دم بیٹھ گیا۔ جواب میں نہ کوئی چیخ سنائی دی اور نہ کوئی گولی چلی۔ میں نے ایک دم اُٹھ کے پہلے کیبن کی دیوار کو عبور کیا اور دوسرے کیبن میں جا اُترا۔ وہاں درمیان کی میز پر برتن پھیلے ہوئے تھے۔ میں میز سمیت گرا تو دوسرے کیبن کی دیوار ٹوٹ گئی۔ مورچے میں ڈیک کرنے بیٹھنے والے دشمن نے سمجھ لیا کہ میں دیواریں گراتا اس کی طرف آرہا ہوں۔ اس کے اور میرے درمیان اب ایک ہی پتلی سی دیوار حائل رہ گئی تھی۔

اس نے بیک وقت کئی فائر جھونک دیے۔ اگر میں سیدھا کھڑا ہوتا تو کوئی نہ کوئی گولی ضرور میرے جسم میں اُتر جاتی۔ گولیوں نے پارٹیشن میں سوراخ کر دیے تھے۔ میں نے تھوڑا سا سر اُٹھا کے ایک سوراخ میں سے جھانکا تو مجھے ایک کونے میں سایہ نظر آیا۔ جس زاویے سے یہ سایہ پڑ رہا تھا اس سے دشمن کی پوزیشن واضح ہو جاتی تھی۔ اسی اندازے کو بنیاد بنا کے میں نے پارٹیشن پر گولی چلائی۔

گولی پلائی ووڈ کو چیرتی ہوئی گئی۔ اس نے ایک چیخ ماری اور ایک دم کیبن سے بھاگا۔ میں نے کیبن سے نکل کے دیکھا تو وہ زینے پر قدم رکھ چکا تھا۔ اس نے پلٹ کے گولی چلائی۔ میں اس ردِ عمل کے لیے پہلے سے تیار تھا۔ غوطہ مار کے میں نے خود کو نشانہ بننے سے بچا لیا لیکن اس کے ساتھ ہی ایک دلخراش چیخ سنائی دی اور میں نے اس لڑکی کو ہاتھ سینے پر رکھ کے اُبلتے ہوئے خون کے ساتھ فرش پر لوٹتے دیکھا۔

اب احتیاط بے سود تھی۔ میرے اندر کا سفاک درندہ بھی جاگ اُٹھا تھا۔ اس عورت کے خون نے میرے وجود میں انتقام کی آگ بھڑکا دی تھی جسے میں اپنی دانست میں بچا لایا تھا۔ یہ اس کا گوشت نوچ کھانے والے خون آشام بھیڑیوں کا غول تھا جو اس کے تعاقب میں یہاں تک آگیا تھا۔ میری تمام جدوجہد ناکامی کی نذر ہو گئی تھی اور وہ مظلوم عورت بالآخر میری نظروں کے سامنے قتل کر دی گئی تھی۔

میں نے زینے کی جانب جست لگا کے مشین گن کا برسٹ مارا۔ فرار ہونے والا آخری شکاری منہ کے بل گرا۔ اس کے جسم کے ہر سوراخ سے خون اُبل رہا تھا اور وہ تختوں کو اپنے لہو سے داغدار کرتا ہوا نیچے لڑھکتا جا رہا تھا۔

ایک بار پھر شور اُٹھا۔ ریوالور کے فائر ہی کم نہ تھے کہ اب مشین گن کی تڑتڑ نے ہر شخص کو دیوانہ وار پناہ کے لیے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ میں اپنے آخری شکار کی لاش کے اوپر سے چھلانگ لگا کے ہال میں پہنچا تو مجھے عجیب حیران کر دینے والا منظر دکھائی دیا۔ یہاں کوئی لڑائی نہیں ہوئی تھی اور ایک بھی گولی نہیں چلی تھی مگر ہر طرف لوگ مُردوں کی طرح پڑے ہوئے تھے۔ ان کے حلق سے کوئی آواز تک نہیں نکل رہی تھی۔ وہ بالکل ساکت تھے اور خوف سے نیم جاں ہو گئے تھے۔ کرسیاں اور میزیں گرنے سے ہال ایسے لگتا تھا جیسے وہاں سے کوئی طوفان سب کچھ تہس نہس کرتا گزرا ہے۔

صرف ایک شخص تھا جو کاؤنٹر کے پیچھے بالکل سیدھا کھڑا ہوا مجھے دیکھ رہا تھا۔

"ابھی میرے کو مارنا ہے تو مار دے۔ اور جانا ہے تو جا اِدھر سے چلا جا۔" اس نے ہاتھ سے عقبی حصے کی طرف اشارہ کیا۔ "باجو والے دروازے سے کچن میں جا اور۔۔۔"

"اِدھر کوئی نہیں ہوگا؟" میں نے کہا۔

"ہوئے گا یا نئیں ہوئے گا، میرے کو کیا پتا بابا۔ اپن تیرے کو راستہ بتاتا ہے اس لیے کہ ٹیم جائع کریں گا تو پولیس آجائیں گا پھر تو پولیس کو بھی ماریں گا۔ دروازے کے سامنے جو ہوگا اس کو ماریں گا۔۔۔ کاہے کو۔۔۔"

"تم نے فون کیا ہے پولیس کو؟" میں نے غرّا کے کہا۔

"ارے نئیں یار۔ کاہے کو ڈراتا ہے میرے کو۔ میں کچھ نئیں کیا۔ یہ دیکھ اپن کا تو فون بھی سالا ڈیڈ ہے۔" وہ فون میرے سامنے رکھ کر بولا۔ "پر کوئی اور جرور کر دیے گا فون کہ اِدھر بڑا پھڈا ہوئیلا ہے۔ پھر پولیس تیرے کو پکڑیں گا۔ اور تیرا ساتھی اپن کو پکڑیں گا۔ تو جا بابا بھاگ جا۔ اپن بولے گا پولیس کو کہ وہ سب وادا لوگ بھاگ گیا۔ ماں قسم اور کچھ نئیں بولے گا ہم۔ بالکل کچھ نئیں بتائے گا کہ اِدھر کون آیا تھا۔ اپن کسی کو نہیں دیکھا۔"

میں نے اطمینان کے انداز میں سر ہلایا اور اُدھر دوڑا جہاں ایک بند دروازے کے شیشے پہ لال رنگ سے 'پرائیویٹ' لکھا ہوا تھا۔ دروازے سے گزرتے ہی میں نے خود کو کچن میں پایا۔ وہاں تین حضرات ہکا بکا سانس روکے کھڑے ہوئے تھے۔ انھیں یقین

آچکا تھا کہ ہوٹل میں قتلِ عام ہو رہا ہے۔ ایک نے چیخ ماری اور ہکلا ہکلا کے کچھ کہنے لگا۔ دوسرا ہاتھ میں خاصا بڑا کفگیر لیے کھڑا تھا۔ اس نے فوراً ہتھیار ڈال دیے۔ کفگیر اس کے ہاتھ سے چھوٹا تو سیدھا اس کے پاؤں پر گرا۔ تیسرا شخص چپاتیاں پکانے پر مامور تھا لیکن اس میز کے نیچے سجدے کے انداز میں پڑا کوئی منتر پڑھ رہا تھا جس پہ وہ چپاتیاں بناتا ہوگا۔

میں نے ڈانٹ کر پوچھا۔ "اِدھر سے راستہ ہے؟"

جس شخص کے پاؤں پر کفگیر گرا تھا وہ زخمی پنجہ پکڑے ایک ٹانگ پر ناچ رہا تھا۔ "ہائے۔۔۔ اُدھر جاؤ۔۔۔ اُدھر۔۔۔ ہائے۔"

میں نے کہا۔ "اچھا جاتا ہوں۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا۔"

ہکلانے والے نے کہا۔ "ہم دو۔۔۔ دو۔۔۔ دو بات یاد رکھے گا۔"

میں نے کہا۔ "پہلی بات یہ ہے کہ تم نے فائرنگ کی صرف آوازیں سنی ہیں اور تم کو اپنی جان پیاری تھی اس لیے تم باہر نکلے ہی نہیں۔ تم نے کچھ نہیں دیکھا۔ دوسری بات یہ کہ تم نے مجھے بھی نہیں دیکھا۔ اگر کسی نے کہا کہ وہ دھمکی دے کر اِدھر کچن میں سے نکلا تھا تو جانتے ہو کیا ہوگا؟"

میز کے نیچے سے ایک کانپتی ہوئی باریک سی آواز سنائی دی۔ "جانتا ہے۔۔۔ جانتا ہے۔ تم پھر آجائے گا۔"

"ہاں۔ لیکن یہاں نہیں۔ میں تمھارے گھر پہنچ جاؤں گا۔ سمجھے۔" میں نے دہاڑ کر کہا۔ "اور اس کے بعد۔۔۔"

"رام نام ست ہے۔۔۔ رام نام ست ہے۔" چپاتی بنانے والے نے مرغا بنے بنے کہا۔

میں لپک کے دروازے کی طرف گیا۔ ایک کھونٹی پر میلا تولیا لٹکا ہوا تھا۔ اس کا رنگ میل سے کالا پڑ رہا تھا لیکن مجھے صرف مشین گن کو چھپانے کے لیے ایک کپڑا درکار تھا۔ مشین گن کو اس میں لپیٹ کر میں نے بنڈل کو بغل میں دبایا اور باہر نکلا۔ گلی کے پچھلے حصے میں بہت کم لوگوں نے فائرنگ کی آواز سنی تھی۔

ایک بڈھے نے جو گھٹنوں پر سر رکھے بیٹھا تھا مجھ سے کہا۔ "اندر کیا لفڑا ہوئیلا ہے۔ گولی کون چلاتا پڑا ہے؟"

میں نے مسکرا کے کہا۔ "گولی! یہاں کون گولی چلائے گا۔ بچے اُدھر دوسری طرف پٹاخے چلا رہے ہیں۔"

"میرا چھوکرا ابھی ہوئیں گا۔ آج آدے سالا اس کی تو میں ٹانگ توڑتا ہوں۔" اس نے بڑبڑانا شروع کیا۔ "جوتا مار کے سر پر پٹاخا چلاتا ہوں۔"

دس قدم چلنے کے بعد میں دوڑنے لگا۔ اس بات کی پروا کیے بغیر کہ کوئی دیکھ رہا ہے یا نہیں۔ چند منٹ بعد میں اس جگہ سے بہت دور نکل آیا تھا۔ دونوں جانب فٹ پاتھوں پر رات کی مخلوق براجمان تھی۔ بیشتر لوگ سو چکے تھے۔ کچھ جاگ رہے تھے اور بیڑیاں پی رہے تھے یا آتے جاتے لوگوں کو دیکھ رہے تھے۔ ایک بار پھر مجھے اس شہر کی ساری آبادی کو دیکھ کر دُکھ ہوا جو ایک چھت کے سائے سے محروم تھی۔ بچے اور عورتیں۔ جوان اور بوڑھے۔ سب آسمان کی چھت کے نیچے ایک اچھے دن کی اُمید میں خواب دیکھ رہے تھے۔ ایک گھر کے خواب جو ان کا اپنا ہو۔ یہ لوگ دن کے اُجالے میں کوٹھیاں اور بنگلے بھی دیکھتے تھے مگر اپنے خوابوں کو کسی کھولی یا فلیٹ تک محدود کر لیتے تھے۔ کیا کبھی ان کے خواب سچ ہوں گے؟ میں نے چلتے چلتے سوچا، یا ان کی ساری عمر فٹ پاتھ پر ایسے ہی گزر جائے گی۔ پھر ان کے بچوں کی۔۔۔

ایک اجنبی شہر میں رات کے وقت میں کسی سے کچھ پوچھے بغیر چلتا جا رہا تھا اور مجھے یہ علم نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں۔ مجھے شدت سے اپنے مشن کی ناکامی کا احساس ہونے لگا تھا۔ میں نے نازو سے شرط لگائی تھی کہ محسن اور غالب کو لے کر آؤں گا۔ اب میں اکیلا واپس جا رہا تھا۔ نازو شاید انھیں لے آئے گی۔ یا پہلے ہی لے آئی ہوگی اور اب وہ میری واپسی کے منتظر ہوں گے۔

میں شیا مو دادا کے اڈے تک ضرور پہنچ گیا تھا لیکن اس سے کچھ حاصل نہیں ہوا تھا۔ نہ میں اس بردہ فروش تک رسائی حاصل کر سکا تھا جس کے گروہ میں شیا مو دادا بھی تھا اور وہ سکھ بھی۔ اور نہ میں اس سے تریوینی کا پتا معلوم کر سکا تھا۔ شاید میری پلاننگ ہی غلط تھی۔ مجھے شیا مو دادا سے کسی ایسے معاملے پر بات کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی جس سے میرا براہِ راست کوئی تعلق نہیں تھا۔ اگر میں اس کو اُٹھا لاتا تو اچھا ہوتا۔ وہ شرافت سے نہ آتا تو زبردستی سے آتا۔ میں اس کو ناک آؤٹ کر کے بھی لا سکتا تھا۔ جب وہ ہوش میں آتا تو اسے تریوینی کا پتا بتانا پڑتا۔ تریوینی سے دلاور کے بارے میں پوچھا جا سکتا تھا پھر دلاور سے محسن اور غالب کے متعلق۔

لیکن شیا مو دادا کو مار کے اور اس کے اڈے پر آنے والے دوسرے لوگوں کو مار کے بھی مجھے کچھ حاصل نہیں ہوا تھا۔ اُلٹا میں نے اپنی ہی تباہی کا سامان کر لیا تھا۔ وہاں سے میرے پیچھے لگ جانے والے بھی بالآخر مارے گئے لیکن اس سے مجھے کیا ملا۔ میں اس ایک لڑکی کو بھی نہ بچا سکا جو اپنے ساتھ مجھے بھی نکال لائی تھی۔ وہ سب جو میرے ہاتھوں مارے گئے تھے شریف لوگ بہرحال نہیں تھے مگر بمبئی میں ایسے ہزاروں بدمعاش ہوں گے۔ دو چار کے کم ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میری شہرت کل تک سارے شہر میں ہوگی۔ واقعات کی کڑیاں خود بخود مل جائیں گی۔ بار بر سے شراب خانے سے شیا مو دادا کے نائٹ کلب تک اور اس بدنام

ریسٹورنٹ تک ہر جگہ گنگا رام ہی کا ذکر ہوگا۔ معلوم کرنے والے معلوم کرلیں گے کہ گنگا رام ہی کا نام ہیرالال بھی تھا اور وہی سب قتل و غارت گری اور خونریزی کا ذمّے دار تھا۔

ہیرالال یا گنگا رام کے خلاف گواہی دینے والا کوئی نہیں تھا لیکن اسے پہچاننے والے بہت ہوں گے۔ آر کے اسٹوڈیو میں کم سے کم چار افراد جن میں پرتھوی راج بھی شامل ہے۔ بچھہ بار بار کے 'بار بار' میں اس کے محافظ اور خود بار بار۔ شیاموداد کا چوکیدار اور اس نائٹ کلب کے دوسرے بہت سے لوگ۔ اس ریسٹورنٹ کا مالک۔ کچن کے ملازم اور بہت سے گاہک۔ جن کو میں نے غور سے نہیں دیکھا تھا مگر اُنھوں نے یقیناً مجھے دیکھا ہوگا۔ پولیس ہر جگہ تفتیش کرے گی۔ ہر جگہ میرا ہی حُلیہ بیان ہوگا۔

کہیں کلاک نے رات کے بارہ بجائے تو میں چونکا۔ نازو میرا انتظار کر رہی ہوگی اور اگر سچ مچ وہ محسن اور غالب کو لے آئی ہوگی تو سب کو میری طرف سے تشویش لاحق ہوگی۔ میں نے ہریش چندر کا بتایا ہوا پتا یاد کرلیا تھا۔ اس فلیٹ میں آج رات کوئی خطرے کی بات نہیں تھی۔ میں نے ایک ٹیکسی کو روکا اور اسے پتا بتایا۔

اس نے مجھے غور سے دیکھا۔ "مذاق کرتا ہے؟"

میں نے کہا۔ "جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے تم میرے دوست نہیں ہو۔ میں تم سے کیوں مذاق کروں گا؟"

"اِدھر نیا آیا ہے؟"

میں نے کہا۔ "ہاں۔ بالکل نیا۔ بمبئی میں ایک دم نیا ماڈل ہے ہم۔"

وہ مسکرایا۔ "ہم تیرے کو چکر بھی دے سکتا تھا۔ دس میل سیر کرا کے اُدھر چھوڑ دیتا۔"

میں نے سڑک کی دوسری جانب دیکھا۔ "وہاں؟"

"ہاں۔ اس گلی سے جاؤ۔ تیسرا بلڈنگ ہے۔" ٹیکسی ڈرائیور بولا۔

میں نے کہا "—— تم ہر گلی کی ہر بلڈنگ سے واقف ہو؟"

اس نے ٹیکسی بند کرتے ہوئے کہا۔ "ہم اسی بلڈنگ میں رہتا ہے۔ تم کس کو ملنے کا ہے؟"

آج قسمت میں نہ جانے کیا تھا۔ اتنے بڑے شہر میں جس سے پتا پوچھا وہ بھی گلے پڑ گیا۔ میں نے کہا۔ "اِدھر اپنا ایک یار ہے۔ تیسرے ملے پر۔ اس نے پتا لکھ کے دیا تھا کہ کہیں میں راستہ نہ بھول جاؤں۔ اب میں پہنچ جاؤں گا۔" میں اس کی جرح سے بچنے کے لیے فوراً چل پڑا حالانکہ وہ جرح نہیں میری مدد کرنا چاہتا تھا۔

کسی دُشواری کے بغیر میں نے پارو تی کا فلیٹ تلاش کرلیا۔ آدھی رات کے وقت اگر مجھے معلوم ہوتا کہ مجھے پندرہ بیس میل دور جانا ہے اور پھر پتا تلاش کرنا ہے تو مجھے تعجب نہ ہوتا لیکن ذہنی و جسمانی طور پر میں اتنا خستہ حال تھا کہ میرا حوصلہ مزید پست ہو جاتا۔ خود کو اچانک اور غیر متوقع طور پر منزل پر پا کے میرا حوصلہ دو چند ہو گیا اور میری ساری تھکن دور ہو گئی۔

وہ بہت پرانی عمارت تھی جس کے تنگ اور تاریک زینے پر اوپر جاتے ہوئے میں نے کھلے دروازوں اور کھڑکیوں سے اندر سونے والوں کی پوری زندگی کو دیکھ لیا۔ ہر خاندان کے حصّے میں دو چھوٹے چھوٹے کمرے آئے تھے اور انھی دو کمروں میں ماں باپ بھی تھے۔ بھائی بہن بھی اور بیوی بچے بھی۔ کسی امتیاز اور تفریق کے بغیر وہ سب فرش پر ایک دوسرے میں گھُس کر سو رہے تھے۔ سونے کے لیے صرف وہی جگہ دستیاب تھی جو چھت تک ٹھونسے جانے والے سامان کے بیچ میں بچ گئی تھی۔ اس ماحول میں حفظانِ صحت کے اصول تو ایک طرف، اخلاقی اصول تک پامال ہو رہے تھے۔

ہر دروازے کی چوکھٹ پر ایک نمبر لگا ہوا تھا۔ دھات کے ہندسوں کو عمارت کی تعمیر کے وقت دہلیز میں ٹھوک دیا گیا ہوگا چنانچہ نمبر اب بھی پڑھے جا سکتے تھے۔ تیسری منزل تک میں نے کئی بار نمبروں کو ہاتھ سے چھُو کر بھی پڑھا کیونکہ ان پر چوکھٹ کا رنگ چڑھ گیا تھا اور برائے نام روشنی میں میری آنکھیں یہ کام کرنے سے قاصر تھیں۔ نمبر اوپر کی طرف بڑھتے جا رہے تھے۔ ایک دروازے پر کوئی نمبر نہیں تھا۔ میرے حساب اور اندازے کے مطابق یہ وہی فلیٹ تھا جہاں میں نے نازو سے ملنے کو کہا تھا۔

باہر سے دروازے کے مقفّل ہونے یا نہ ہونے کا پتا نہیں چلتا تھا۔ میں نے ہینڈل گھُما کے دیکھا اور پھر آہستہ سے دستک دی۔ نازو شاید دروازے کے قریب ہی ٹہل رہی تھی۔

اس نے سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔ "کون ہے؟"

میں نے بیٹھی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "بھُوت۔"

نازو نے دروازہ کھولے بغیر کہا۔ "کس کا بھُوت؟"

میں نے کہا۔ "ایک شریف آدمی کا بھُوت۔ مثلاً سکندر کا۔"

اس نے دروازہ کھول دیا۔ "باقی بھُوت کہاں ہیں؟" وہ سر نکال کے بولی۔ "اکیلے کیوں آئے ہو؟"

میں نے کہا۔ "وہ لاتوں کے بھُوت میری باتوں میں نہیں آئے۔" اور دروازے کو دھکیل کر اندر گھُس گیا۔ اس نے مجھے باہر رکھنے کی واجبی سی کوشش کی۔

"یعنی یہ کیا حرکت فرما رہے ہیں آپ؟" میں نے کہا۔ "کوئی دیکھ لیتا کہ ایک بھُوت اور بھُوتنی باقاعدہ زور آزمائی کر رہے ہیں تو اس کا کیا حال ہوتا صدمے سے۔ کیا مجھے ساری رات باہر رکھنے کا ارادہ تھا؟"

نازو نے کہا۔ "تم تو واقعی بھُوت ہو۔" اور میری صورت پر ملی ہوئی سیاہی کو دیکھ کے بے ساختہ ہنسنے لگی۔ "یہ کہاں سے مُنہ کالا کر کے آ رہے ہو؟"

میں نے جملے کے مفہوم کو نظر انداز کر دیا۔ "مقدر میں ہی روسیاہی ہو مس نازو تو بندہ کیا کر سکتا ہے؟"

"لیکن یہ ہوا کیا؟ بڑے بے مروّت ہیں اس شہر کے لوگ۔ سلوک کرتے ہیں مہمانوں کے ساتھ۔ کیا تمھیں وہ شاہی سواری پر اُلٹا بٹھا کے بمبئی دکھاتے رہے؟" وہ ہنس ہنس کے بے حال ہو رہی تھی۔ "گلے میں کس چیز کے ہار ڈلے تھے؟ ہمارے پاکستان میں ایک علاقہ ہے ایسا جہاں رمضان کے مہینے میں سرِ عام کھانے پینے والے کو گدھے پر اُلٹا بٹھاتے ہیں۔ دُم کی طرف مُنہ کر کے۔ اور ہار ہوتا ہے جوتیوں کا۔"

میں اس فلیٹ میں آجانے کے بعد خود کو بہت محفوظ محسوس کر رہا تھا۔ فلیٹ چھوٹا ضرور تھا مگر صاف ستھرا تھا۔ اس کے دونوں کمروں میں دو بیڈ تھے اور غیر ضروری سامان نہ ہونے کی وجہ سے ایک کمرے میں صوفے کی اور دوسرے میں چار افراد کے لیے کھانے کی میز کے لیے گنجائش نکل آئی تھی۔

"تم نے کب قدم رنجہ فرمایا یہاں عزیزہ؟" میں نے بیڈ پر جوتوں سمیت لیٹتے ہوئے کہا۔

"جوتوں کی کوئی بات نہیں۔ لیکن تکیے پر چہرہ مت رکھنا ورنہ پرنٹ آجائے گا پورا۔" نازو نے کہا۔

"اور جس کا تکیہ ہے وہ سوچے گی کہ اس سے کس گدھے نے مُنہ پونچھا ہے۔ یہ لطیفہ میں نے بچپن میں پڑھا تھا۔" میں نے کہا۔ "یہ بتاؤ۔۔۔"

"میں تو آگئی تھی۔۔۔ نو بجے۔" نازو نے کہا۔

"کیوں؟ آدھے راستے میں ہی ارادہ بدل گیا تھا کیا؟" میں نے کہا۔ "چھوڑ دیا خیال ان دونوں کا؟"

"انھیں لانے کے لیے تو آپ گئے تھے۔" نازو نے کہا۔ "اور بڑے دعوے کے ساتھ گئے تھے۔"

"میرے دعوے کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ غالب نے آنے سے ہی انکار کر دیا۔ کہنے لگا کہ اب میری آنکھیں کھُل گئی ہیں۔ اس نے تو خیر اور بھی بہت کچھ سچ کہا تھا جو میں بتا نہیں سکتا۔ تم نے بھی اسے بھُلا ہی دیا ہے۔ اللہ اللہ خیر صلا۔"

نازو نے کہا۔ "میرا پروگرام بدلنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ میں اس جیولر کے پاس پہنچ گئی تھی۔ وہاں میں نے کہا کہ مجھے جینا نے بھیجا ہے اور میں تریوینی سے معاملے کی بات کرنے آئی ہوں۔ اس نے کہا کہ کیسا معاملہ۔ میں نے کہا کہ ہے اس کا اور جینا کا کوئی معاملہ۔ تم کو نہیں بتا سکتی میں۔ اس نے کہیں فون کیا۔ وہاں سے اس کو دوسرا نمبر ملا۔ اس دوسرے نمبر سے تیسرا نمبر حاصل ہوا۔ بالآخر تریوینی سے میری بات ہوئی۔ اس نے کُرید کُرید کے سوالات پوچھے۔ یہ کہ جینا کہاں ہے۔ میں کون ہوں۔ اور معاملہ میں کیسے طے کرا سکتی ہوں۔ میں نے کہا کہ میں یہ سب فون پر نہیں بتا سکتی۔ اس نے کہا کہ اچھا فون اسے دو۔ میں نے ریسیور جیولر کو تھما دیا۔ وہ کچھ سُنتا رہا اور سر ہلاتا رہا۔ اس کی نظریں مجھے عجیب طرح سے دیکھ رہی تھیں۔ مجھے شک تو تھا کہ معاملہ گڑبڑ بھی ہو سکتا ہے۔ جب اس نے ریسیور رکھ کے کہا کہ تریوینی ملنے کو تیار ہے اور کچھ دیر میں یہاں پہنچ جائے گا۔ اس نے کہا ہے کہ تمھیں روک لیا جائے۔ اس سے میں نے کہا کہ مجھے تو خیر تمھارا باپ بھی نہیں روک سکتا۔ اور اس کا ہاتھ پکڑ کے ایک جھٹکا دیا تو وہ اوپر اُٹھ گیا۔ میں نے اسے اپنی طرف کھینچا اور وہ شوکیس کے اوپر سے گزر کے میرے قدموں میں آگرا۔ میں نے اسے اُٹھالیا اور کہا کہ ایک بار پھر فون کرو۔ وہ اتنا گھبرا گیا کہ اس کے حلق سے آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔ اس کے ایک محافظ نے آگے بڑھ کر مجھے ریوالور سے ڈرانے کی کوشش کی تھی۔ میں نے کہا کہ کیوں اپنے مالک کی جان کے دُشمن ہو گئے ہو۔ جس کا کھاتے ہو اسی کو مرواتے ہو۔ اس کی خیریت چاہتے ہو تو چُپ چاپ کھڑے رہو۔ خدا نے اسے عقل دی اور وہ پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے مالک نے دو چار پنڈ کھانے کے بعد پھر فون کیا اور تریوینی سے کہا کہ یہ عورت رُکنے کو تیار نہیں۔ بہتر ہے تم اس سے مل لو۔ اس نے جواب میں کچھ کہا جو میں نے نہیں سُنا۔ فون رکھنے کے بعد اس نے کہا کہ سیٹھ کل صبح ملے گا۔ تم کو اس کی لانچ پر جانا پڑے گا۔ میں نے کہا کہ لانچ پہ کیا راکٹ پر بھی جانا پڑے تو کوئی حرج نہیں۔ اس کے بعد میں نے اجازت چاہی تو اس نے کہا کہ جاؤ۔ میں نے کہا یہ تو بہت بُری بات ہے کہ تم مجھے کچھ دور تک چھوڑنے بھی نہیں جا رہے ہو۔"

میں نے ہنس کے کہا۔ "یعنی تم اسے ساتھ لے آئیں؟"

"اس کے بغیر میں خود کیسے نکلتی۔" نازو نے کہا۔ "اس نے مجھے اپنی گاڑی میں ایک جگہ چھوڑ دیا۔ وہاں سے وہ پیدل واپس گیا ہوگا۔ یا شاید ٹیکسی لے لی ہو۔ میں نے اس کی کار میں زیادہ سیر نہیں کی۔ چار یا پانچ میل چلا کے اسے سڑک کے کنارے کھڑا کر دیا تھا۔ بہت کھٹارا قسم کی کار تھی۔"

میں نے کہا۔ "نازو بی بی! تم کو اپنے اسیر دفا کی کوئی فکر نہیں؟"

"ان کی فکر کرنے سے کیا ہوگا۔" نازو نے کہا۔ "وہ چوہدری صاحب کے مہمان ہیں۔ انھیں وہ گھر داماد بنا کے رکھنے کے لیے نہیں لے گئے ہیں۔ چوہدری دلاور تو خود انتظار میں ہوگا کہ ہم اس سے رابطہ قائم کریں یا ہماری تلاش میں ہوگا۔"

"چوہدری دلاور ان کی اچھی خاطر تواضع بھی کر رہا ہوگا۔ ان

سے باقی لوگوں کا پتا ٹھکانا معلوم کرنے کے لیے۔" میں نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ وہ ایسی کوشش اب نہیں کرے گا۔ وہ بہت اچھی طرح جان چکا ہے ہم سب کو۔" نازو نے کہا۔ "اسے معلوم ہے کہ ایم آر ایس والے بہت ڈھیٹ ہیں۔ نہ مرنے سے ڈرتے ہیں نہ مار کھانے سے مرتے ہیں۔ غالب اور محسن کو وہ ٹریپ کے طور پر استعمال کر رہا ہے۔ وہ چاہے گا کہ ہم خود ان کی تلاش میں وہاں پہنچ جائیں ــــ اسیروں کو آزاد کرانے کی کوشش میں خود اسیر ہو جائیں۔ اس کے سوا ہم سب کے گرفتار ہونے کی کوئی صورت بھی نہیں۔ میرا دوسرا خیال یہ ہے کہ وہ ہم سے سودے بازی کرے گا۔"

"کس قسم کا سودا کرے گا؟"

"وہ ہمیشہ سودا کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ کہ کسی طرح ہم اپنے مقصد سے تائب ہو جائیں۔ ہمیں طاقت کے ذریعے اپنے راستے سے ہٹانے کی ہر کوشش کا نتیجہ اُلٹا نکلتا آیا ہے۔ ہر بار اسے پہلے سے زیادہ نقصان اُٹھانا پڑا۔ ان حالات میں اگر وہ سمجھتا ہے کہ ایم آر ایس کی طاقت بہت بڑھ چکی ہے اور بڑھتی جا رہی ہے تو اس کے سامنے صرف مذاکرات کا ہی راستہ کھلا رہ جاتا ہے۔"

"بی بی! اس وقت اپنی فہم و فراست اور دانائی کی باتوں سے تم نے ہمیں انگشت بدنداں کر دیا ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم اپنی اس رائے کو بدلنے کے امکانات کا جائزہ لینے پر غور کرنے کی تجویز کو مسترد نہیں کریں گے کہ آپ ناقص العقل ہیں۔" میں نے کہا۔ "اب اسی بات پر سگریٹ تو پلا دو ایک۔"

نازو نے سر ہلایا اور سرہانے کی طرف بیڈ کے نیچے سے سگریٹ کیس اور لائٹر نکال کے میرے سامنے رکھ دیے۔" اور بولو۔"

میں نے کہا۔ "یہ تو کمال کر دیا تم نے۔ اتنی دیر میں تلاشی بھی لے لی تھی گھر کی؟ کس کے ہیں؟"

"کسی کے بھی ہوں، تمھیں کیا۔ میزبان کے ہوں گے یا اس کے کسی مہمان کے۔" نازو نے کہا۔

میں نے سگریٹ جلا کے ایک لمبا کش لیا۔ "میری دُکھ بھری کہانی بہت لمبی ہے۔ کلیجی تھام لو پہلے سنو پھر داستاں میری۔"

"پہلے تم ہاتھ منہ دھو لو۔" نازو نے کہا۔ "اس سیاہی کو صاف کرنے کی کوشش تو کرو۔ کھانا تیار ہے۔"

میں دم بخود رہ گیا۔ "کھانا تیار ہے؟ کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ میں نے پکایا ہے۔ تمھارا انتظار کر رہی تھی۔ سوچا تھا سب مل کے کھائیں گے۔"

"حد کر دی تم نے۔ ہم زبردستی کے مہمان۔ یہ تمھاری سسرال تو نہیں ہے کہ گھر پر اپنا راج قائم کر لیا ہے۔"

وہ تنک کر بولی۔ "فارغ بیٹھ کے کیا کرتی۔ پکانے کو جو ملا پکا لیا۔ نہ پکاتی تو اس وقت جانا پڑتا واپس کھانا لانے کے لیے۔ سب ہوتے تو تھوڑا پڑتا۔ ہم دونوں کو کافی ہوگا۔"

میں نے کہا۔ "بی بی! مجھے معاف رکھو۔ مجھے جان پیاری ہے۔ میں کھا کے آیا ہوں۔۔۔"

نازو نے چلّا کے کہا۔ "تم کھانا کھا کے آئے ہو؟ اور وہ جو میں نے اتنی محنت کی؟ میں کیا اکیلی تمھارے سامنے بیٹھ کے کھاؤں۔ میں کچھ نہیں جانتی۔ تم کو کھانا پڑے گا دوبارہ۔۔۔"

میں نے گھبرا کے کہا۔ "اچھا بابا۔ کھا لوں گا۔ ایسے مت چلّاؤ کہ لوگ آجائیں اور ہم دونوں کو پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دیں۔"

جب میں ہاتھ منہ دھو کے آیا تو وہ میز پر کھانا سجانے میں مصروف تھی۔ اس کھانے کو دیکھ کر میری روح فنا ہو گئی۔ اگر میں بھوکا ہوتا تو اسی کھانے کو من و سلویٰ سمجھ کر قبول کرتا مگر بھوک پہلے ہی نہیں تھی اور میز پر صرف دال چاول رکھے ہوئے تھے۔ دال کی کیفیت یہ تھی کہ اوپر پانی تھا اور نیچے دال یوں نظر آتی تھی جیسے دریا کی گہرائی میں سنگریزے پڑے ہوں۔ چاولوں کا حال پانی زیادہ پڑ جانے سے پتلا ہو رہا تھا۔

میری منت سماجت سب رائیگاں گئی۔ سزا کے طور پر مجھے اس کا ساتھ دینا پڑا۔ یہ کھانا کھاتے ہوئے میں نے وہ سب واقعات اسے بتائے جو میرے ساتھ پیش آئے تھے۔ درمیان میں اس نے کئی بار کہا۔ ایک غلطی تم نے یہ کی۔ دوسری غلطی یہ کی۔ یہ بھی غلطی کی۔ تنگ آ کے میں نے کہا۔ "سب سے بڑی غلطی میں نے یہاں آ کے کی۔ چلا جاتا کسی ہوٹل میں تو آرام سے سو جاتا۔"

"کھانا مت چھوڑو۔" اس نے متاثر ہوئے بغیر کہا۔

میں نے کہا۔ "آدھا کھا لیا۔ اب تو رحم کرو۔ دن کیسے گزرے گا میرا۔"

وہ بولی۔ "کیا ہاضمے کی دوا تلاش کر کے لاؤں؟"

میں نے کہا۔ "دوا کے لیے جگہ کہاں رہی ہے۔ پیٹ پہلے ہی بھرا ہوا تھا۔ معلوم نہیں یہ دال چاول کا کیچڑ دل میں جمع ہو رہا ہے یا پھیپھڑوں میں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تم چائے کافی کچھ نہیں پی سکتے۔ حلق سے ڈالو گے تو کان یا ناک سے باہر نکل آئے گی۔" نازو نے عیاری سے کہا۔ "ناک کان اور گلے کے راستے اندر کہیں ملتے ہیں۔"

"تم لاؤ کافی۔" میں نے کہا۔ "میں ناک اور کان بند کرتا ہوں کسی طرح۔"

نازو ہنسی اور برتن اُٹھا کے کافی بنانے کے لیے کچن میں چلی گئی۔ میں اس صورتِ حال سے خاصا لطف اندوز ہو رہا تھا کہ ہم مہمان ہیں لیکن میزبان کو علم نہیں۔ نہ ہم اسے جانتے ہیں اور نہ وہ ہمیں پہچانتی ہے۔ اس کے باوجود ہم کتنی بے تکلفی سے گھر میں گھسے ہوئے ہیں اور ہر چیز کو بے دریغ استعمال کر رہے ہیں۔ صبح جب وہ گھر آئے گی تو کتنی حیران ہوگی۔

پھر مجھے خیال آیا کہ کیا صبح تک ہم یہاں ہوں گے؟ صبح نازو پھر تریوینی سے رابطہ قائم کرنے کے لیے جائے گی۔ اسے تریوینی نے اپنی لانچ پر بلایا ہے مگر کیا اس نے کوئی وقت مقرر کیا ہے؟ یہ بتایا ہے کہ وہ لانچ کہاں ہوگی؟

میں اُٹھ کر کچن تک گیا جہاں نازو برتن دھو کر رکھنے کے بعد کافی کے لیے پانی اُبال رہی تھی۔ منی کچن چار فٹ لمبا اور چوڑا تھا۔ اس میں صرف ایک آدمی کے لیے کام کرنے کی جگہ تھی جو دو فٹ جگہ میں چاروں طرف گھوم سکے۔ ایک ایک فٹ چوڑے تین شیلف کچن کی ہر دیوار کے ساتھ اوپر نیچے بنے ہوئے تھے اور ضرورت کا سب سامان ان میں ایک خاص ترتیب سے رکھا گیا تھا۔ مثلاً مرچ مسالے کے اور دال چاول کے سب ڈبے ایک شیلف پر دائیں طرف تھے تو دیگر اشیائے ضرورت کو بائیں جانب رکھا گیا تھا۔ چینی کے سب برتن ایک طرف تھے تو دھات کے دوسری طرف۔

میں نے کہا۔ "مس نازو! کسی کے گھر میں اس کی اجازت کے بغیر گھس جانا سخت غیر اخلاقی بات ہے۔"

نازو مسکرائی۔ "غیر اخلاقی بات۔ میزبان چاہے تو ہمیں پولیس کے حوالے کر سکتی ہے۔ ٹریس پاس ایک سنگین قانونی جرم ہے۔"

"اس کے علاوہ میزبان کے مذہبی جذبات بھی مجروح ہو سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اگر وہ سمجھے کہ رسوئی میں کھانے پینے کے برتنوں کو ہاتھ لگا کے ہم نے انھیں بھرشٹ کر دیا ہے۔"

"کیا کر دیا ہے؟" نازو نے حیران ہو کے کہا۔

"بھرشٹ۔ ناپاک کر دیا ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ ایسی انتہا پسند ہوتی تو جس نے ہمیں یہاں بھیجا تھا وہ یہ بات ہمیں سمجھا دیتا۔" نازو نے کہا۔ "تم یہ کافی پیئو۔ ہم صبح اس سے معذرت کر لیں گے۔"

میں نے کافی کا مگ لیتے ہوئے کہا۔ "معلوم نہیں وہ کیا سمجھے۔"

"جو چاہے سمجھے۔" نازو کا رنگ کچھ لال ہوا۔

"میرا خیال ہے کہ ہمیں صبح کا انتظار نہیں کرنا چاہیے۔" میں نے کہا۔

نازو کافی لے کر واپس کمرے میں آگئی اور صوفے پر بیٹھ گئی۔ "پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

میں بیڈ پر نیم دراز ہو گیا۔ "دل تو میرا بھی چاہتا ہے کہ آنکھیں بند کروں اور سو جاؤں۔ تھکن سے میرا بُرا حال ہے۔ لیکن میری ایک چھٹی حس بھی ہے۔"

"اچھا!" نازو نے سخت تعجب کا اظہار کیا۔

"جی۔ میری چھٹی حس کا فرمان ہے کہ جو سوتا ہے وہ کھوتا ہے۔ یعنی گدھا ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے ایک بات بتاؤ۔ صبح تم تریوینی سے کیسے ملو گی؟"

"اس کی لانچ پر جا کے۔"

"کیا تم نے اس کی لانچ دیکھی ہے؟" میں نے کہا۔

"نہیں دیکھی تو کیا ہوا۔ دیکھ لوں گی۔" نازو بولی۔

"بابا کیسے دیکھ لو گی؟ مجھے بھی تو بتاؤ۔" میں نے کہا۔ "لانچ تک کیسے جاؤ گی اور کب جاؤ گی؟"

اس نے کافی کا گھونٹ لے کر کہا۔ "کب کے بارے میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتی۔ صبح کا مطلب ہے صبح۔ جو شاید طلوعِ آفتاب سے دوپہر تک رہتی ہے۔ رہا سوال یہ کہ کیسے جاؤں گی تو جواب اس کا یہ ہے کہ جیسے پہلے گئی تھی۔"

"تمھارا دماغ خراب ہے۔ ایک بار تم بغیر بتلائے پہنچ گئی تھیں۔" میں نے کہا۔ "اس لیے واپس بھی آگئیں۔ بتلا کے جاؤ گی تو لوٹ کر آنا تمھارے اختیار کی بات نہیں رہے گی۔"

"مجھے کون روک سکتا ہے؟"

"مانا کہ تم قیامت سے کم نہیں ہو۔" میں نے کہا۔ "اور قیامت کو آنے سے واقعی کوئی نہیں روک سکتا۔ لیکن عزیزہ! کیا وہ قیامت کے قائل ہیں جن سے تمھارا معاملہ ہے؟ وہ سب تمھارے استقبال کے لیے دیدہ و دل فرشِ راہ کیے ملیں گے۔ تم کو بڑے تزک و احتشام کے ساتھ لانچ پر لے جائیں گے۔ پھر لانچ کو جہاں چاہیں گے لے جائیں گے۔ تم بند دروازوں اور بند راستوں میں محصور ہو جاؤ گی۔ عین سمندر کے بیچ جہاں کوئی تمھاری مدد کے لیے بھی نہیں پہنچ سکتا۔"

"بس جی۔ بہت ڈرا لیا آپ نے۔ اس سے زیادہ دہشت زدہ ہونے کے لیے میں تیار نہیں۔" نازو نے بگڑ کر کہا۔ "آپ آخر کیا سمجھتے ہیں خود کو؟ یہ سب باتیں آپ ہی کے دماغ میں آ سکتی ہیں۔ میری ذاتی عقل تو گویا ہے ہی نہیں۔"

"اچھا۔ اگر ہے تو اس کا ثبوت پیش کرو۔ مجھے بتاؤ کہ تم نے کیا سوچا تھا۔" میں نے ہنس کے کہا۔

"میں جب لانچ پر جاؤں گی تو کیا اکیلی جاؤں گی؟"

میں نے کہا۔ "کتنی پیادہ فوج۔ کتنے سوار۔ توپخانہ اور لاؤ لشکر ساتھ ہوگا؟"

"کیا تم کچھ نہیں کرو گے؟"

میں نے کہا۔ "میں کیا کروں؟ جب تم لانچ پر پہنچ جاؤ تو میں بھی نعرۂ تکبیر لگا کر میدانِ کارزار میں کود پڑوں! اسٹین گن سے سب کو بھون ڈالوں اور کشتوں کے پشتے لگا دوں؟ یا جب لانچ روانہ ہو جائے تو 'المدد المدد' چلاتا ہوا سمندر میں دوڑتا آؤں۔ بحرِ ظلمات

کے گھوڑے کی طرح۔"

نازو کا موڈ رو دینے والا ہو گیا۔" اچھا میں نہیں جاتی تم چلے جاؤ۔"

" لاحول ولا قوۃ۔ میں کیوں مروں حرام موت۔ سمجھوں گا کہ دو دوست تھے جو بچھڑ گئے۔" میں نے آہ بھر کے کہا۔" آدمی کو صبر آہی جاتا ہے۔ ویسے بھی یہ جنگ ہے۔ اس میں وہی نظریہ چلتا ہے کہ مرنے سے شہید اور زندہ رہ جانے سے غازی... میں اور رابعہ سال کے سال ان کی برسی کریں گے۔ ہاں تم اپنی سوچ لو۔ تم کیا کرو گی؟"

نازو ایک دم اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اور کوئی ہوتا تو وہ اپنے غصّے کا اظہار دو ہاتھ مار کے کرتی اور غالب کی برسی کی بات کرنے والے کی برسی کا انتظام کر دیتی۔ لیکن میرے سامنے وہ کچھ بے بس تھی۔ شاید میں مذاق میں حد سے گزر گیا تھا۔ نازو کے جذبات کا آئینہ ایسے سفاک الفاظ کے پتھروں کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ ایک دم بکھر گئی اور روتی ہوئی دوسرے کمرے میں جا کے بیڈ پر گر گئی۔

پھر مجھے وہ سب کچھ کرنا پڑا جو کسی بھی لڑکی کو منانے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ اسے چُپ کرانے منانے اور پھر سے مسکرانے پر مجبور کرنے کے لیے مجھے شرمندگی کا اظہار کرنا پڑا۔ معافی مانگنی پڑی اور خود کو بہت کچھ کہنا پڑا جو نازو نہ کہہ سکی تھی۔ دل ہی دل میں مجھے شدّت سے احساس ہوا کہ محبّت کیا ہوتی ہے۔ یہی ردِّ عمل رابعہ کا بھی ہوتا اگر محسن اس کے سامنے میری برسی کی بات کرتا۔ شہلا بھی ایسے ہی روتی اگر غالب اس سے محسن کے مرنے کا ذکر بھی کرتا۔ نازو یوں بڑی سخت جان تھی اور اس کا دل بہت مضبوط تھا۔ جہاز پر غالب کے ساتھ اکیلے رہ کر جس خطرے سے کھیلتی رہی تھی، وہ جان کی بازی لگانے سے کم نہ تھا۔ اس نے اکرام شیخ جیسے بھائی سے دوری کو بھی برداشت کر لیا تھا اور مرنے مارنے پر تو وہ ہر وقت تُلی رہتی تھی۔ لیکن میرے ایک جملے نے اس کی بہادری کے سب دعوے باطل کر دیے تھے اور اسے ایک کمزور، کم عقل اور کم ہمّت عورت ثابت کر دیا تھا جو محبّت کے معاملے میں اتنی ہی حسّاس، نازک اور بے بس ہوتی ہے۔

جب اس کا موڈ ٹھیک ہو گیا تو میں نے کہا۔" تمہارا دل ویسے ہی رونے کو چاہ رہا تھا۔ میری بات کو بہانہ بنا لیا۔ میں بتاؤں گا..."

وہ کچھ خفّت سے بولی۔" دیکھو۔ غالب کو کچھ مت بتانا۔"

" کیوں نہ بتاؤں۔ سارا پول کُھل جائے گا تمہاری بہادری کا۔"

میں نے کہا۔" سب کو بتاؤں گا میں تو۔"

" وہ۔ باقی سب تو خیر مذاق ہی اڑائیں گے تمہاری طرح۔ مگر وہ۔ چڑھ جائیں گے سر پر۔" نازو نے شرما کے کہا۔

ایسے شرماتے ہوئے۔ محبّت میں اپنی کمزوری کا اعتراف کرتے ہوئے وہ مجھے بہت اچھی لگی۔ میں نے ہنس کے کہا۔" اچھا بابا نہیں بتاؤں گا۔ اب وہ بات سُنو جو میں کہنا چاہتا تھا۔ بیچ میں تمہارے آنسوؤں کا دریا آ گیا اور بات بہہ گئی۔ میرا مطلب ہے رہ گئی۔ اس وقت بجے ہیں رات کے ڈھائی۔ ہم دو ڈھائی گھنٹے تو سو سکتے ہیں۔"

" پانچ بجے صبح کیا ہو گا؟"

" پانچ بجے صبح اندھیرا ہو گا۔" میں نے کہا۔" ہم اپنی میزبان کے واپس آنے سے قبل ہی یہاں سے نکل جائیں تو اچھا ہے۔ میری چھٹی حس کا ایک اشارہ تو یہ ہے کہ ان حالات میں ہمیں روپوش ہی رہنا چاہیے۔ کسی کو بھی معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ ہم کہاں ہیں۔"

" اس جگہ کے بارے میں کس کو معلوم ہے؟"

" ہریش چندر کو۔ اگر شیامو دادا کے چیلے اور بار برا کے گُرگے ہمارے پیچھے لگ گئے تو ان کے لیے ہمارا سراغ لگانا کوئی ناممکن بات نہیں ہو گی۔ ہریش چندر بھی ہمارا دوست یا ہمدرد بہر حال نہیں ہے۔ وہ پیسے کے لیے ہمیں بیچ بھی سکتا ہے۔ اگر اسے معلوم ہوا کہ میں نے بار برا کے اڈّے پر کیا کیا۔ پھر شیامو دادا کے نائٹ کلب میں کتنی خونریزی کی۔ تو وہ کسی سے بھی سودا کر سکتا ہے۔ اس سکھ کے گروہ کے لوگ بھی ہمارا پتا بتانے کی مُنہ مانگی رقم ادا کر دیں گے۔ لیکن یہ سب صبح ہونے کے بعد ہو گا۔ جب اخبارات کے ذریعے خبر پھیلے گی۔ فرض کرو صبح اخبار دیکھتے ہی ہریش چندر نے فون کر کے کہا کہ تمہارے مجرم کو میں پکڑوا سکتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ اس وقت وہ کہاں ہو گا۔ بتاؤ مجھے کیا ملے گا۔ تو سمجھ لو کہ ہم سورج نکلنے کے بعد ایک گھنٹے کے اندر اندر اسی جگہ پکڑ لیے جائیں گے۔"

نازو نے سر ہلایا۔" صبح پانچ بجے تک بھی انتظار کیوں؟ کیا ہم اسی وقت نہیں جا سکتے؟"

میں نے کہا۔" تھوڑا سا آرام بھی کام کے لیے بہت ضروری ہوتا ہے۔ پھر ہمارا تو کام بھی بہت سخت ہے جو ہمیں صبح کرنا ہو گا۔ ہم پانچ بجے نکل گئے تو مُنہ اندھیرے ہی رابعہ اور گل کے پاس پہنچ جائیں گے۔"

" مگر وہ کسی فیملی کے ساتھ مقیم ہیں۔"

" پھر کیا ہوا۔ ہم صبح صبح انھیں جگانے پر معذرت کر لیں گے ہم کچھ بھی کہہ سکتے ہیں۔ ٹرین لیٹ پہنچی دہلی سے۔ یا فلائٹ لیٹ آئی لکھنؤ سے۔"

" کیا مسافر ایسے خالی ہاتھ آتے ہیں؟"

" کیا خالی ہاتھ سفر کرنا جُرم ہے؟" میں نے جھنجلا کے کہا۔" ان کا جو دل چاہے سمجھ لیں۔ سمجھ لیں کہ ہم دونوں ہی گھر سے بھاگے ہیں۔ اصل مقصد تو رابعہ اور گل کے پاس پہنچنے کا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ صبح ہوتے ہی وہ بھی وہاں سے اسباب سمیٹ لیں۔"

" چلو سامان اُٹھا لیا۔ سامان ہے ہی کہاں۔ اس کے بعد؟"

میں نے کہا۔" اس کے بعد ہم تریوینی کے پاس جائیں گے۔ ہم سب۔"

" ہم سب؟ ایک ساتھ؟"

" یہ میں نے کب کہا ہے کہ ایک ساتھ۔ مجھے ایک فیصد بھی شبہ نہیں کہ اس جیولر کی دُکان میں شکاری تمہارے لیے جال بچھائے بیٹھے ہوں گے، ہر طرف سے محاصرہ کیے۔ جب اس جیولر نے تریوینی کو بتایا ہو گا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ تو ممکن ہے تریوینی نے دلاور کو بتایا ہو۔ دلاور تو فوراً سمجھ جائے گا کہ ایسی نازک اور ایسی قاتل حسینہ بھلا نازو کے سوا اور کون ہو گی۔"

نازو اخلاقاً کچھ شرمائی اور مسکرائی۔

" ظاہر ہے اس کے بعد ان کے لیے مختلف واقعات کی کڑیاں ملا کے نتائج اخذ کرنا بالکل مشکل نہ ہو گا۔ وہ بہت خوش ہوں گے کہ ان کا شکار خود چل کے ان کے پاس آ رہا ہے۔"

" پھر کیا ہو گا۔ کیا میری جگہ تم جاؤ گے؟"

" ہرگز نہیں۔ وہاں نہ تم جاؤ گی اور نہ میں جاؤں گا۔" میں نے کہا۔" میرے ذہن میں ایک پلان ہے جس کے مطابق وہاں جائیں گی گل اور رابعہ۔"

" پلان کیا ہے؟" نازو نے کہا۔

" پلان ابھی نہیں بتایا جا سکتا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم سے خدانخواستہ رازداری ہے۔" میں نے کہا۔

" پھر کیا ہے؟" نازو نے بُرا مان کے کہا۔" کیا میں سمجھوں گی نہیں؟"

" یہ بھی نہیں۔" میں نے نفی میں سر ہلایا۔" بات لمبی ہے۔ ایک بار شروع ہو گئی تو پھر ختم نہیں ہو گی۔ تم بھی چُپ بیٹھ کے سُننے والی نہیں ہو۔ بیچ میں بولو گی۔ دس سوال کرو گی۔"

" صاف کہو نا کہ بتانا نہیں چاہتے۔"

" لاحول ولا قوۃ۔ آج تک ہم نے جو کچھ بھی کیا ہے آپس میں مشورے سے کیا ہے۔" میں نے کہا۔" آئندہ بھی جو ہو گا وہ تم کو بھی معلوم ہو گا۔ خدا نے چاہا تو کل غالب اور محسن واپس آ جائیں گے۔"

نازو نے صرف اُداسی سے سر ہلایا۔

میں نے کہا۔" انشاء اللہ۔ یا آمین۔ کچھ تو کہو۔"

" سکندر! ہم یہاں کیوں رُک گئے ہیں؟ اس فلم نگری میں ہمارا کیا کام؟"

میں نے کہا۔" دماغ پر زیادہ زور مت ڈالو۔ نیند نہیں آ رہی ہے کیا؟"

" نیند تو آ رہی ہے۔"

" بس تو پھر آنکھیں بند کرو اور سو جاؤ۔" میں نے کہا۔" مگر ایسا نہ ہو کہ غالب کے ساتھ نکل جاؤ دُنیا گھومنے۔ وقت کم ہے۔"

وہ مسکرائی۔" میں الارم لگا دیتی ہوں۔"

میں نے کہا۔" ہاں۔ اگر ہم ساڑھے پانچ بجے بھی نکل جائیں تو اچھا ہے۔ رابعہ کے پاس پہنچتے پہنچتے چھ سات بج جائیں گے۔ پھر ان کے ساتھ نکلیں گے تو دو تین گھنٹے میں بہت کچھ کرنا ہو گا۔ ساڑھے دس گیارہ بجے سے پہلے جیولر اپنی دُکانیں نہیں کھولتے۔ گیارہ بجے تک گل کو لباس بدلنا پڑے گا۔ اور شاید رابعہ کو بھی۔ ہمیں بھی کچھ حُلیہ ضرور بدلنا ہو گا۔ مگر اس صورت کا میں کیا کروں؟"

نازو نے چٹکی بجا کے کہا۔" ہے ایک آئیڈیا۔ پہلے کہو مانا اُستاد۔"

میں نے کہا۔" کہنے سے کچھ نہیں ہو گا۔"

" نہیں ہو گا تو جاؤ پھر یہ کالا مُنہ لے کر رابعہ کے سامنے..."

میں نے کہا۔" اچھا اُستانی جی۔ آپ کو مانا میں نے اُستاد۔"

نازو ہنسی اور اُٹھ کر باتھ روم تک گئی۔ وہاں سے وہ ایک شیشی کے ساتھ نمودار ہوئی۔

" یہ کیا ہے؟" میں نے بے رنگ محلول کی شیشی کو کھول کے سونگھا اس کی تیز بُو میرے دماغ میں چڑھ گئی۔

" یہ رنگ کاٹ ہے۔ بلیچنگ لوشن۔ پانی میں ملا کے چہرے پر لگاؤ اور دیکھو کیسا اُجلا چہرہ نکل آتا ہے۔"

" کہیں کورے لٹھے کی طرح نہ ہو جاؤں۔" میں نے کہا۔" مجھے گورا بننے کا کوئی شوق نہیں ہے۔"

" ذرا احتیاط سے لگانا۔ آنکھیں بچا کے۔ جلن لگے تو دھو ڈالنا۔" نازو نے کہا۔

بلیچ لوشن نے واقعی وہ سب سیاہی صاف کر دی جو میرے چہرے، میرے ہاتھوں اور گردن پر پھیلی ہوئی تھی۔ آدھے گھنٹے بعد میری اصل جلد کا رنگ تقریباً بحال ہو چکا تھا مگر میرے چہرے پر جلن سی محسوس ہو رہی تھی۔ صابن لگا کے مُنہ دھونے اور کریم لگانے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑا۔

نازو مذاق کرتی رہی اور پھر سو گئی۔ میں بھی نیند کو ایک ضرورت سمجھ کے قبول کرنے پر مجبور تھا۔ دو گھنٹے کی یہ نیند بے ہوشی سے کم نہ تھی۔ میں نے کوئی خواب نہیں دیکھا۔ میری آنکھ اس وقت کُھلی جب نازو نے مجھے جھنجوڑنا شروع کیا۔

میں آنکھیں ملتا اُٹھ بیٹھا۔" کیا الارم نہیں بجا؟"

" اب کل بجے گا۔" نازو بولی۔" کل صبح ساڑھے پانچ بجے۔"

" یعنی شام کو ساڑھے پانچ بجے نہیں بجے گا؟" میں نے اپنی

صورت کو آئینے میں ملاحظہ کرتے ہوئے کہا۔ میرے منہ پر چھالے سے پڑ گئے تھے سارا منہ لال ہو رہا تھا۔

"یہ ہے تمہاری اُستادی؟" میں نے نازو کو گھور کے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ ایک دو دن میں یہ بھی ٹھیک ہو جائیں گے لیکن سوچو اتنا کالا رنگ لے کر رابعہ کے سامنے جاتے تو وہ ہنستی یا روتی۔" نازو نے ہنستے ہنستے کہا۔

"کیا خیال ہے اگر ایک کپ کافی پی لیں چلتے چلتے۔ نیند اُڑ جائے گی۔" میں نے کہا۔ "اور کیا حرج ہے اگر میں اتنی دیر میں غسل بھی فرما لوں۔ نہ جانے کب سے میل تہ در تہ جسم پر جمع ہو رہا ہے۔ میزبان کے ساتھ تھوڑی سی زیادتی اور سہی۔"

نازو نے کہا۔ "میں نے تو رات ہی کو غسل کر لیا تھا۔ یہاں آتے ہی۔"

وقت کم تھا پھر بھی میں دل کھول کے نہایا۔ دو گھنٹے کی نیند نے بھی اپنا اثر دکھایا تھا۔ جسم کی توانائی کو اسٹور کرنے والی بیٹری پھر چارج ہو گئی تھی۔ ٹھنڈے پانی سے غنودگی کا اثر بھی زائل ہو گیا اور میں نے فرحت و انبساط کی کیفیت میں گانا شروع کیا۔ "او موری ناجک کمریا میں بل آئی گوا۔ ہائے اماں۔ ناجک کمریا۔"

باہر نازو نے ہنسنا شروع کیا۔ "کیوں لوگوں کی نیند خراب کرتے ہو۔ لوگ سمجھیں گے۔۔۔"

میں نے باہر نکل کے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا۔ "کیا سمجھیں گے جی؟"

نازو نے کہا۔ "سمجھیں گے پڑوس کے گھر میں کوئی مر گیا ہے۔ لو اب جلدی سے کافی پی لو۔"

میں نے کافی کا مگ ہاتھ میں لے کر بال بناتے ہوئے کہا۔ "مس نازو! میرا اور محسن کا شمار لندن کے بہترین باتھ روم سنگرز میں ہوتا تھا۔"

"یہی درد بھرا نغمہ گاتے تھے آپ دونوں؟" نازو نے کہا۔

میں نے کہا۔ "نہیں۔ وہ دوسرا گانا تھا۔ آگ لگی تن من میں دل کو پڑا تھامنا۔ اوئے۔ یہ اوئے ہم ایک ساتھ نعرے کی طرح حلق سے نکالتے تھے۔ انگریز لڑکیاں اس سے بہت محظوظ ہوتی تھیں۔"

"مگر۔۔۔ اس باتھ روم میں۔۔۔"

میں نے اسے افسوس ناک نظروں سے دیکھا۔ "مخلوط ذریعہ تعلیم کے باوجود وہ باتھ روم کیا ہوسٹل تک الگ تھے۔ لیکن ہماری شہرت کا ڈنکا ہر جگہ بج رہا تھا۔ معلوم ہے ایک بار کیا ہوا؟ ایک متعصب انگریز نے کہہ دیا کہ یہ کیا گیدڑ کی طرح چلاتے ہو۔ اوئے۔ بس میں اور محسن بھڑ گئے اس سے کہ ہمارے قومی جذبات مجروح ہوئے ہیں۔ اوئے ہمارا قومی نعرہ ہے جو ہم صبح نہاتے وقت ضرور لگاتے ہیں اور کوئی مائی کا لال ہمیں اس حق سے محروم کرے گا تو ہم اپنے سفیر کے ذریعے وزارتِ داخلہ کو احتجاجی مراسلہ دیں گے۔ ہوسٹل سپرنٹنڈنٹ نے اس لڑکے کو خاصا ڈانٹا۔ اس واقعے کے بعد ہی لڑکیاں باتھ روم کے باہر ہماری 'اوئے' سننے کے لیے آئیں۔ اور ہم نے انھیں مایوس نہیں کیا۔"

نازو نے ہنستے ہنستے مگ رکھ دیا۔ "اپنی حرکتوں کی وجہ سے نکالے بھی گئے تھے۔"

میں نے کہا۔ "نکالے تو ہم جنت سے بھی گئے تھے۔"

"اب نکلو یہاں سے بھی۔" نازو نے کہا۔

ہم نے اپنے اس ایک رات کے غمگسار پناہ دینے والے گھر پر آخری نگاہ کی۔ اس کے اجنبی در و دیوار بھی اچھے میزبانوں کی طرح ہمیں کلماتِ خیر کے ساتھ الوداع کہتے محسوس ہوتے تھے۔ باہر آ کے میں نے تالا لگایا اور چابی پھر وہیں رکھ دی جہاں سے نازو نے اُٹھائی تھی۔

"شاید ہم کبھی لوٹ کر یہاں نہیں آئیں گے۔ لیکن یہ گھر ہمیں یاد رہے گا۔" نازو نے کہا۔

"ان مسافروں کی طرح جو کہیں ملے۔ کچھ دیر شریکِ سفر رہے اور جُدا ہو گئے۔" میں نے کہا۔

دبے پاؤں جب ہم زینے سے نیچے جا رہے تھے تو صبح کا اندھیرا کچھ دھندلانے لگا تھا۔ رات بھی ہمارے ساتھ ہی رخصت ہو رہی تھی۔ دو زینے اُتر کے میں گھوما تو مخالف سمت سے اوپر آنے والی ایک لڑکی مجھ سے ٹکرا گئی۔ وہ بھی دبے پاؤں بہت تیزی سے اوپر آ رہی تھی اور اسے بالکل توقع نہیں تھی کہ اس وقت کوئی نیچے بھی آ سکتا ہے۔ میں نے اسے فوراً سنبھال لیا ورنہ وہ واپس جاتی۔

"آئی ایم سوری!" میں نے کہا۔ "آپ کو چوٹ۔۔۔"

"نہیں نہیں۔" وہ جلدی سے بولی اور میری طرف دیکھے بغیر اوپر چڑھ گئی۔ خوشبو کا ایک جھونکا سا تھا جو پل بھر میں گزر گیا۔

زینے میں اندھیرا تھا چنانچہ میں اس کی صورت غور سے نہیں دیکھ سکا۔ میں نے اسے زینے پر گھوم کے اوپر غائب ہوتے دیکھا۔

"کیا۔۔۔ یہ روپ وتی تھی؟" نازو نے کہا۔

"روپ وتی نہیں۔ پاروتی۔" میں نے کہا۔ "ہماری میزبان۔"

اوپر ایک دروازہ کھلا اور بند ہو گیا۔ میں اور نازو نیچے اُتر کے گلی میں آ گئے اور پھر سڑک پر۔

"اب تک اس نے دیکھ لیا ہو گا کہ فلیٹ میں کوئی آیا تھا۔" نازو نے کہا۔

"اچھا ہوا کہ اس نے ہماری صورت نہیں دیکھی۔ وہ کسی کو کچھ نہیں بتا سکتی۔"

نازو نے کہا۔ "پھر بھی۔ وہ سوچے گی کہ کہیں وہ ہم ہی تو نہیں تھے۔ اس کے بن بلائے مہمان۔"

میں نے کہا۔ "اس کے کچھ مہمان ضرور ایسے ہوں گے جو اس کی عدم موجودگی میں بھی آ جاتے ہوں گے۔ جن سے اس کا بہت قریبی تعلق ہو گا۔ انھی کو معلوم ہو گا کہ تالے کی چابی کہاں رکھی ہوئی ملے گی۔"

"اچھا ہوتا اگر ہم اس سے مل لیتے۔" نازو نے کہا۔

میں نے ہاتھ پکڑ کے اسے آگے کھینچ لیا۔ "تم جذباتی ہو رہی ہو۔"

نازو نے کہا۔ "کتنی بداخلاقی کی بات ہے کہ ہم رات بھر اس کے گھر میں رہے۔ گھر کی ایک ایک چیز کو استعمال کرتے رہے اور اس سے ملے تک نہیں۔ شکریہ تک ادا نہیں کیا۔"

"ہمارے لیے تو بہت پہلے فرما دیا گیا تھا کہ حق ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو۔ ہم للّی سے ملے تھے تو کیا ہوا تھا۔ اسے کیا خوب صلہ ملا تھا ہماری میزبانی کا۔ پاروتی کے حق میں اچھا یہی ہے کہ ہم اس کے لیے اجنبی ہوں۔ تاکہ وہ پورے یقین کے ساتھ آشنائی کے ہر رشتے سے انکار کر سکے۔"

سڑک پر ٹریفک برائے نام تھی۔ سبزیوں اور پھلوں سے لدے ہوئے ٹرک جو منڈی سے دکانوں تک مال سپلائی کرتے تھے، وقفے وقفے سے گزر رہے تھے۔ سائیکلوں اور موٹر سائیکلوں پر یہاں بھی کراچی کی طرح اخبار فروش اور دودھ والے ہی سب سے زیادہ دکھائی دیتے تھے۔ فٹ پاتھوں پر سونے والے ہر طرف بکھرے ہوئے تھے چنانچہ پیدل چلنے والے سڑک پر چل رہے تھے۔ ٹن ٹن کرتی ایک ٹرام ہمارے قریب سے گزری۔ رات بھر کھلے رہنے والے ایرانی ہوٹلوں میں لوگ کرسیوں پر پاؤں رکھے اکڑوں بیٹھے چائے کی پیالیاں خالی کر رہے تھے۔

میں اور نازو خاموشی سے چلتے گئے۔ اجنبیت اس شہر کے مزاج میں شامل تھی۔ لوگ ایک دوسرے سے بے تعلق رہنے کے عادی تھے اور کوئی کسی کو نظر اُٹھا کے بھی نہیں دیکھتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ہر آدمی یہاں اکیلا ہے اور دوسرے ہر آدمی سے بیزار ہے۔ کسی کو غرض نہیں کہ کون کیا کر رہا ہے اور کیوں کر رہا ہے۔ جی رہا ہے تو کیوں جی رہا ہے اور کیسے جی رہا ہے۔ اور مر رہا ہے تو کیوں مر رہا ہے اور کیسے مر رہا ہے۔

مجھے اور نازو کو بھی کسی نے قابلِ توجہ نہیں سمجھا۔ یہاں تک کہ گشت کر کے واپس جانے والی ایک پولیس پارٹی کے دو مستعد ارکان بھی ہمارے سامنے سے یوں گزر گئے جیسے ان کی آنکھوں نے ہمیں دیکھا ہی نہیں۔ موڑ پر ٹیکسی اسٹینڈ تھا مگر سب ٹیکسیاں بند کھڑی ہوئی تھیں۔ میں نے ہر ٹیکسی میں جھانک کر دیکھا کہ شاید بند شیشوں کے پیچھے کوئی ڈرائیور نظر آئے۔

میں مایوس ہو گیا تھا کہ کسی نے پیچھے سے پکار کے کہا۔ "کدھر جانے کا ہے؟"

یہ ٹیکسی ڈرائیور ابھی ابھی ایرانی ہوٹل سے گرما گرم چائے پی کے نکلا تھا اور بڑے اسٹائل سے سگریٹ کے کش لے رہا تھا۔

میں نے کہا۔ "ہم مسافر ہیں۔۔۔"

اس نے کہا۔ "تم جو بھی ہے۔ ابھی بولو کدھر جانے کا ہے؟"

میں نے اسے پتا سمجھایا اور ہم ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ بمبئی میں ٹیکسی کا نظام بہت اچھا تھا۔ کوئی ڈرائیور انکار نہیں کرتا تھا۔ کوئی میٹر سے زیادہ کچھ نہیں مانگتا تھا۔ مسافروں کے ساتھ بدتمیزی کا سوال ہی نہ تھا۔ اصل وجہ یہ تھی کہ پولیس کا کنٹرول سخت تھا اور پبلک کی شکایات کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔ پولیس اگر بھتّا لیتی ہو یا ٹیکسیاں خود پولیس افسروں کی ملکیت ہوں تو پھر پبلک کی کون سنتا ہے۔

میں نے مختلف راستوں سے گزرتے ہوئے سڑکوں کے نام یاد کرنے کی بے سود کوشش کی۔ وہ نام بہت لمبے اور مشکل تھے۔ مزید یہ کہ ٹیکسی ڈرائیور گلیوں سے شارٹ کٹ لے رہا تھا۔ میں نے کولابا کا نام سنا تھا۔ وہاں ایک سڑک شہید بھگت سنگھ روڈ تھی۔ بھگت سنگھ کے ساتھ شہید کا لفظ عجیب سا لگتا تھا مگر بھگت سنگھ آزادی کی تاریخ کا ایک باب تھا۔ پھر وڈہاؤس روڈ آ گئی۔ کولابا کارپٹ انڈسٹری کے پاس سے گزرتے ہی ٹیکسی ایک اور گلی میں مُڑ گئی۔

ٹیکسی ڈرائیور نے پیچھے مُڑ کے کہا۔ "کدھر رکنے کا ہے؟"

میں نے کہا۔ "کیا ہم پہنچ گئے ہیں؟"

اس نے مجھے پھر دیکھا۔ "ابھی تمھارا گھر تو ہم نہیں دیکھا۔"

میں نے کہا۔ "چلو ہم تلاش کر لیں گے۔ تم ہمیں اسی جگہ اُتار دو۔"

"تم نیا آیا ہے بمبئی میں؟" ڈرائیور نے کہا اور میرے اقرار میں سر ہلاتے ہی نیچے اُتر آیا۔ صبح صبح ہمیں پتا بتانے والے بھی بہت کم تھے مگر ڈرائیور نے ہماری مدد کی۔ اس نے ایک گھر کا دروازہ بجایا۔ اندر سے دروازہ کھول کے باہر آنے والا مدراسی بوڑھا سخت سڑیل مزاج تھا۔ مگر اس نے ٹیکسی ڈرائیور کو جتنی گالیاں دیں جواب میں اتنی ہی سُن کے وہ بے مزہ نہیں ہوا۔ اس نے دروازہ دھڑ سے بند کرنے سے پہلے صحیح پتا سمجھا دیا۔ میں نے اور نازو نے کوشش کی کہ وہ ہماری مدد سے باز آ جائے لیکن وہ صبح کا آغاز ایک نیکی سے کرنے کا قائل تھا۔ اس نے ہمیں اس گھر تک پہنچا کے ہی دم لیا جہاں رابعہ اور گل کا قیام تھا۔

دروازہ ایک عمر رسیدہ عورت نے کھولا۔ اس کی ضخامت نے مجھے دم بخود کر دیا۔ اتنی موٹی عورت میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس کے بازو شاید میری رانوں سے بھی زیادہ موٹے تھے۔ اس کا جسم ہر سمت میں ناقابلِ یقین حد تک پھیلا ہوا تھا۔

رابعہ کے نام پر اس نے مجھے شک کی نظر سے دیکھا "تم کون ہے؟ اس کو کیوں پوچھتا ہے؟"

"میں اس کا پھپھیڑ ہوں۔" میں نے کہا "پنڈ دادن خان۔"

"ویل دادن خان۔ وہ ادھر نہیں ہے۔" پارسی عورت نے کہا اور دروازہ بند کرنے لگی۔

میں نے کہا "سنو سنو۔ میرا نام تو کبیر خان ہے۔"

وہ رک گئی۔ "کبھی کیا بولتا، کبھی کیا۔ کون ہے تم اس کا۔ کیا بولا تم۔ پوپڑ یا پاپڑ؟"

میں نے کہا "کزن سمجھ لو۔ گل اس کی کزن ہے۔"

اس نے اطمینان کے انداز میں نازو کی طرف دیکھا۔ "وہ ادھر سے چلا گیا۔"

"چلا گیا؟ کدھر چلا گیا؟" میں نے ڈوبتے دل کے ساتھ کہا۔ "کوئی پتا چھوڑا ہے انھوں نے؟"

پارسی عورت نے سر ہلایا۔ "ہاں۔ پتا دیتا ہم تم کو۔ تم اندر آئیں گا؟"

میں نے کہا "نہیں۔ ہم جائیں گا۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے مجھ سے مصافحہ کر کے کہا "میاں خیر سے مسلمان ہو تم۔ السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام۔" میں نے کہا "مگر اتنی دیر بعد۔"

"نیک کام دیر سے بھی ہو تو کیا برائی ہے۔" وہ بولا۔

میں نے کہا "تم نے تو لہجہ ہی بدل لیا۔"

وہ بولا "بمبئی میں ایسے ہی بولنے کی عادت ہو گئی ہے۔" پھر اس نے رازدارانہ انداز میں میرے کان کے قریب چہرہ لا کے کہا۔ "کیا اپنے پاکستان سے آئے ہو؟"

میں نے کہا "پاکستان سے؟ نہیں۔ کس نے کہا...۔"

وہ ہنسا "اب چھوڑو میاں۔ ہم سے مت چھپاؤ۔ یہاں لوگ اکثر پہچان جاتے ہیں کہ یہ پاکستانی ہے۔"

میں نے کہا "کیسے پہچان جاتے ہیں؟"

وہ بولا "بس ہے کچھ ایسی ہی بات۔ تم جہاں بھی جاؤ گے یہ تجربہ ہوگا تمھیں۔ کوئی نہ کوئی پوچھ بیٹھے گا کہ پاکستان سے آئے ہو؟ مسلمان تو خیر پہچانے جاتے ہیں۔ پاکستانی مسلمان الگ۔"

پارسی عورت نے اندر سے اپنا بھاری ہاتھ نکال کے ایک رقعہ سا مجھے تھما دیا۔ "ابھی ادھر ملیں گا تم کو تمھارا پاپڑ۔"

"پاپڑ نہیں۔ پھپھیڑ۔" میں نے تصحیح کی اور ڈرائیور کے ساتھ چل پڑا۔

ٹیکسی ڈرائیور ایک جذباتی آدمی تھا۔ یہ معلوم ہوتے ہی کہ ہم مسلمان ہیں اور پاکستان سے آئے ہیں اس کے مہمان نوازی کے جذبات جاگ اٹھے۔

جب ہم پھر اس کی ٹیکسی میں بیٹھے تو اس نے بولنا شروع کیا۔ وہ مسلسل ہمیں ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کے بارے میں بتاتا رہا۔ ان کی بہادری کے قصے سناتا رہا اور یہ یقین دلاتا رہا کہ دل سے وہ سب مسلمان پاکستان کے ساتھ ہیں، جو بمجبوراً بھارت میں رہتے ہیں۔ میں نے اس کی جذباتی تقریر میں مداخلت نہیں کی۔

اب سورج طلوع ہو چکا تھا۔ سڑکوں پر ہر قسم کی گاڑیوں کی آمد و رفت بڑھ گئی تھی۔ لوگوں کا ایک جمِ غفیر ہر سڑک پر رواں دواں نظر آتا تھا۔ آدھا گھنٹا گزر گیا۔ پھر ایک گھنٹا گزر گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور کی پُرمغز گفتگو نان اسٹاپ جاری رہی۔ اس نے مشرقی پاکستان میں بھارتی مداخلت کی مذمّت کی اور اس یقین کا اظہار بھی کیا کہ ملعون روس اور امریکا دونوں کی سازش ناکام ہو گی اور بالآخر وہاں امن ہو جائے گا۔

جب ٹیکسی رکی تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ نازو نے مجھے اشارے سے منع کر دیا کہ میں اپنے خیالات اور سیاسی نظریات کے اظہار کی کوشش نہ کروں۔ میں خود بھی احتیاط کے تقاضوں کو سمجھتا تھا۔ دیارِ غیر میں دوست نظر آنے والے کو بھی دوست سمجھنا نقصان کا سبب ہو سکتا تھا۔ دشمن تو خیر دشمن ہوتا ہی ہے۔ نازو کی زنانہ منطق یہ تھی کہ ٹیکسی ڈرائیور خفیہ پولیس کا آدمی ہو سکتا ہے جو ہر اجنبی پر نظر رکھتے ہیں۔

نازو نے ایک بار میرے کان میں کہا۔ "اسے اپنے بارے میں اور کچھ مت بتا دینا۔ کہیں جوش میں آجاؤ۔"

میں نے سر ہلا کے "اچھا" کہا۔

دوسری بار اس نے کہا "یہ تم سے پوچھے گا کہ بمبئی میں کب تک قیام ہوگا اور کہاں ٹھہرو گے۔ یہاں سے کہاں جاؤ گے؟"

میں نے کہا "نہیں بتاؤں گا۔"

تیسری بار اس نے کہا "یہ پوچھے گا کہ پاکستان میں کہاں سے آئے ہو...۔"

میں نے اس کی بات کاٹ کے کہا "یہ بھی نہیں بتاؤں گا۔"

جب ٹیکسی رکی تو میں نے کہا "کتنے پیسے ہوئے؟"

اس نے کہا "کچھ نہیں میاں۔ تم مہمان ہو۔ خدا حافظ۔" اور اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، وہ ٹیکسی سمیت غائب ہو گیا۔

میں نے نازو کو گھور کے کہا "یہ ہے تمھاری قیافہ شناسی۔ ایسے ہوتے ہیں خفیہ پولیس والے؟ اس نے کوئی سوال نہیں کیا؟"

نازو نے خفّت سے کہا "باتوں سے لگتا تھا۔"

میں نے کہا "مجھے تو لگتا ہے کہ تمھاری باتیں سن کے وہ برا مان گیا۔"

"میں تو تمھارے کان میں بات کر رہی تھی...۔"

"میں تو خیر بہرا ہوں۔ اس لیے تم اونچا بول رہی تھیں۔ مگر اس کے کان تیز تھے۔" میں نے کہا "تم نے اس کے جذبات کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ تم خاموش بھی تو رہ سکتی تھیں۔"

"کیا تم خاموش نہیں رہ سکتے؟" نازو نے خفگی سے کہا۔

ہم دونوں ایک دوسرے سے خفا چلتے رہے اور لوگوں سے پتا معلوم کرتے رہے۔ ٹیکسی ڈرائیور نے دوسری بار ہماری مدد نہیں کی تھی۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ برا مان گیا تھا۔ دس منٹ بعد میں نے ایک پرانی عمارت کی دوسری منزل کے فلیٹ کا دروازہ بجایا۔ نازو نے جہالت کے اس مظاہرے پر مجھے ملامت بھری نظروں سے دیکھا اور کال بیل کا سوئچ دبایا جو میں نے نہیں دیکھا تھا۔ سوئچ ٹوٹا ہوا تھا۔ نازو کو کرنٹ لگا تو اس نے چیخ ماری۔ اب میں نے اسے ملامت بھری نظروں سے دیکھا۔ وہ مزید خفا ہو گئی۔

گل نے دروازے تک آ کے پوچھا "کون ہے؟"

میں نے کہا "کوئی نہیں۔"

اس نے ایک دم پورا دروازہ کھول دیا اور نازو سے لپٹ گئی۔ رابعہ اندر سے بھاگی ہوئی آئی اور ٹھٹک کر رک گئی۔ خوشی سے اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔ میں نے دروازہ اندر سے بند کر دیا۔

"کہاں سے آ رہے ہو تم دونوں۔" رابعہ نے کہا۔

"دھکے کھا کے۔" میں نے کہا "تم کیا کھلاؤ گی ناشتے میں؟"

"پہلے بتاؤ ان دونوں کا کچھ پتا چلا؟"

"ہاں۔ یہ معلوم ہو گیا ہے کہ ان کے بارے میں کچھ معلوم کرنا بھی آسان کام نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ کیا بات ہوئی...۔" رابعہ نے کہا۔

"تم نے بڑی پھرتی دکھائی مکان تلاش کرنے میں۔ کیسے مل گیا یہ مکان؟ اور کیا سلسلہ ہے۔ پگڑی پر ہے یا کرائے پر؟" میں نے کہا "ویسے خاصی محفوظ جگہ ہے۔"

رابعہ نے کہا "یہ بھی انھی کے کوئی جاننے والے تھے۔ ایسے ہی بات ہوئی تو انھوں نے کہا کہ مہینے دو مہینے کے لیے چاہیے تو یہ فلیٹ لے لو۔ ظاہر ہے ہماری ضرورت اس سے زیادہ کی نہیں تھی۔ ہم کل شام کو ہی آ گئے تھے۔ اس فلیٹ میں جو میاں بیوی رہتے ہیں وہ ہنی مون پہ گئے ہوئے ہیں۔"

میں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا "دیکھنے سے تو اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ کسی نئے شادی شدہ جوڑے کا مکان ہے۔ نہ وہ سجا ہوا حجلۂ عروسی۔ نہ جہیز کا نیا سامان۔ نہ سہرے کے مرجھائے ہوئے پھول اور وہ خوشبو...!"

رابعہ ہنسی "یہ سب یہاں نہیں ہوتا۔"

نازو اور گل دوسرے کمرے میں ایک ساتھ بول رہی تھیں۔ میں نے رابعہ کے ساتھ کچن کا رخ کیا جہاں وہ ناشتے کی تیاری میں مصروف ہو گئی۔ فلیٹ پوری طرح آراستہ تھا چنانچہ ہمیں گھر گرستی کا اسباب خریدنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے رابعہ کو بتایا کہ گزشتہ رات بھی ہم نے ایک ایسے ہی فلیٹ میں گزاری تھی۔ وہ کھانے پینے کا سامان ساتھ لائی تھیں۔ جتنی دیر میں اس نے چائے بنائی، انڈے فرائی کیے اور سلائس گرم کیے میں نے اسے 'بار بار' سے پاروتی کے فلیٹ تک پہنچنے کی پوری کہانی سنا دی۔ وہ بڑی دلچسپی سے سنتی رہی۔

جب ہم اس فلیٹ میں فرش پر بیٹھ کے ناشتا کر رہے تھے تو صبح کے ساڑھے سات بجے تھے۔ نازو نے کہا "ان کی کھوپڑی میں کوئی زبردست پلان ہے۔ مجھے تو نہیں بتایا۔ تم پوچھو۔"

میں نے کہا "ان سے پوچھو کہ آس پاس خفیہ پولیس کا کوئی آدمی تو نہیں ہے۔"

رابعہ نے ہم دونوں کو غور سے دیکھا "تمھاری آپس میں بات چیت بند ہے۔ کوئی لڑائی ہوئی ہے؟"

"ایک بار نہیں دو بار۔" میں نے کہا "پہلی بار میں نے مروّت میں معافی مانگ لی تھی۔ اب اس کی باری ہے۔"

"معافی مانگتی ہے میری جوتی...۔" نازو نے چیخ کے کہا۔

"او کے۔ ہم نے تمھیں جوتی سمیت معاف کیا۔" میں نے کہا "اور اب میں آتا ہوں اپنے ماسٹر پلان کی طرف۔ گل بی بی! اس پلان کی کامیابی کا انحصار تمھارے حوصلے پر ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم ان دونوں سے زیادہ نڈر ہو۔ یہ بتاؤ گل خان کیسا آدمی ہے؟"

گل نے حیران ہو کے کہا "گل خان؟"

میں نے کہا "پاکستان سے تم ہمارے ساتھ گل خان بن کے آئی تھیں۔ اور اب جو مرحلہ درپیش ہے اسے گل خان ہی سر کرے گا۔"

"آپ کا مطلب ہے بھائی سکندر... کہ...۔"

"میرا مطلب تم نے بالکل ٹھیک سمجھا۔" میں نے کہا "اب سے کچھ دیر کے بعد تمھیں مردانہ گیٹ اپ میں رابعہ کے ساتھ جانا ہے اور ایک چھوٹا سا مگر خطرناک ڈراما کرنا ہے۔"

"پہیلیاں مت بجھواؤ۔ صاف بات کرو۔" رابعہ نے جھنجلا کے کہا۔

"تم نے شوہر تو دیکھے ہوں گے؟ نئے نویلے شوہر۔" میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ "بانکے چھبیلے۔ اپنی نئی نویلی دلہن کی ہر ادا پر سو جان سے فریفتہ نظر آنے والے اور نیا زندگی میں خلامی پر کمر بستہ۔ زبان سے ہی نہیں عمل سے بھی آسمان کے ستارے توڑ لانے پر آمادہ۔ فلموں، زنانہ رومانی ناولوں کے علاوہ آپ سب نے اپنے خوابوں میں بھی دیکھے ہوں گے۔"

گل کھلکھلا کے ہنس پڑی مگر رابعہ نے تنک کر کہا "خواہ مخواہ ہمیں بیچ میں مت لائیں۔ ہم نہیں دیکھتے ایسے خواب...۔"

"پھر کیا دیکھتی ہیں؟ کالا کلوٹا۔ موٹا۔ بھدا۔ گنجا اور گبرا۔ کھوں کھوں کرتا دُلہا۔" میں نے کہا۔ "یہی تو مشکل ہے تم لڑکیوں کی۔ سچ کو بھی جھٹلا دیتی ہو۔ ارے بھئی اگر میں نے مثال دے دی کہ تمھیں خواب میں ہم جیسے دُلہا دکھائی دیتے ہیں تو یہ کون سی معیوب بات ہے۔ اچھی بات ہے یہ تو۔ پتا چلتا ہے اس سے کہ آپ لوگوں کی نظر کمزور نہیں ہے اور عقل بھی ٹھیک ہے... خیر، یہ بات تو ضمنی تھی۔ تم دونوں زندگی کے سفر کا آغاز کرنے والے خوش باش، خوش پوش اور خوش شکل جوڑے کی قابلِ رشک زندگی کا کردار ادا کرو گے۔ آج کی ریہرسل کل کام آئے گی۔ انشاءاللہ تو کہو۔"

"یعنی کل بھی ڈراما ہی کریں گے آپ؟" رابعہ نے کہا۔

"تم آج کی فکر کرو۔ تمھیں گل خان کی زوجہ گل جان کا رول قبول ہے؟ بہ آوازِ بلند تین بار کہو قبول ہے۔"

نازو ہنسنے لگی۔ "تم قاضی بن کے پورا نکاح کیوں نہیں پڑھا دیتے۔"

"اچھا مذاق ختم۔" میں نے کہا۔ "گل! تم کو رابعہ کے ساتھ ایک جیولر کی دُکان پر جانا ہوگا۔ جیولر کا نام ہے ٹی کشن چند۔ کل نازو نے پہلے اسے سب کے سامنے اُچھالا اور نیچے گرا دیا۔ پھر کھڑا کیا اور اپنے ساتھ اغوا کر کے لے گئی۔ آدھے راستے میں اسے گاڑی سے بھی گرا کے پیدل کر دیا حالانکہ گاڑی اسی کی تھی۔ وہ بہت مشتعل ہوگا۔"

نازو ہنسی۔ "اب تک گاڑی مل گئی ہوگی اسے۔"

"نہیں ملی ہوگی تو دوپہر تک مل جائے گی تاہم وہ اپنی اس بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے بے تاب ہوگا۔" میں نے کہا۔ "نازو نے صبح پھر آنے کا وعدہ کیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اندر ہمارے استقبال کے لیے تریوینی ضرور ہوگا۔ دلاور کی موجودگی بھی خارج از امکان نہیں۔ دُکان کی ہر سمت سے نگرانی جاری ہوگی۔ میں اور نازو وہاں جا نہیں سکتے کیونکہ نازو کو کشن چند پہچانتا ہے اور مجھے تریوینی۔"

"اگر دلاور بھی ہوا تو کیا ہوگا؟" رابعہ نے کہا۔ "کیا وہ مجھے نہیں پہچانے گا؟"

"کیسے پہچانے گا۔ تم ایک غیرت مند مسلمان کی باپردہ، باحیا منکوحہ کی طرح برقع اوڑھ کے جاؤ گی۔" میں نے کہا۔

"برقع یہاں نہیں ملے گا۔" رابعہ نے کہا۔

"چلو برقع نہ سہی۔ چادر تو ملے گی۔ تم چادر سے مُنہ سر ڈھانپ کر جاؤ گی۔ اس طرح کہ صرف تمھاری آنکھیں دکھائی دیں۔ گل کا میک اپ صحیح ہونا چاہیے۔ ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ ہم کسی میک اپ مین کی خدمات حاصل کریں۔ گل کا مسئلہ یہ ہے... کہ یہ ہے خوبصورت... خیر خوبصورت نوجوان بھی ہوتے ہیں۔ لیکن اس کی آواز..."

"میں آواز کو تھوڑا بہت مردانہ بنا لوں گی۔" گل نے کہا۔

"کیسے؟ ذرا نمونہ پیش کرو۔ رابعہ سے کہو..."

"کیا کہوں؟" گل نے شرماتے اور ہنستے ہوئے کہا۔

"وہی بات کہو جو تم کو دُکان میں جا کے کرنی ہوگی۔ تم اسے ... بہت بیش قیمت سیٹ تحفے میں دینا چاہتے ہو۔ پیسہ تمھارے لیے کوئی مسئلہ نہیں۔ تمھاری بیوی کی پسند بہت اعلیٰ ہے۔ اب..."

گل نے جھینپتے مسکراتے ایک جملہ کہا۔ پہلی کوشش ... مضحکہ خیز تھی۔ ہم سب ہنسنے لگے۔ اس نے دوسری مرتبہ زیا... اعتماد کے ساتھ بات کی۔

میں نے کہا۔ "یہ چلے گا۔ اس میں شوہرانہ گھن گرج تو نہیں لیکن چلے گا۔ کچھ مردوں کی آواز پچاس فیصد زنانہ ہوتی ہے۔ اب یہ سمجھ لو کہ تمھیں اندر کچھ وقت گزارنا ہے۔ رابعہ کی اس چادر میں جو پر... کے لیے استعمال ہوگی مشین گن پوشیدہ رہے گی۔ تم بہتر سے بہ... فرمائش کرتے رہنا۔ ویسے تو خود سیلز مین بھی اچھے گاہک کا سا... ساری دُکان لا کے رکھ دیتے ہیں۔ کسی بھی چیز کو ایک نظر ڈال ... مسترد مت کرنا۔ دیکھ بھال کے اور آپس میں بات کر کے۔ مستر... کیونکہ تمھیں کچھ وقت گزارنا ہے۔"

"کتنا وقت گزارنا ہے آخر؟" رابعہ نے کہا۔

"یہ میں ابھی کیسے بتاؤں۔" میں نے کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ تم ... جاؤ اور تمھیں وہ دونوں یا تینوں شیطان ایک دم نظر آ جائیں۔ تریو... اور کشن چند کو بڑی بے چینی سے اس لڑکی کا انتظار ہوگا جو تریوینی ... نام جینا کا جھوٹا پیغام لے کر پہنچی تھی۔ اضطرابی کیفیت میں وہ اندر... باہر اور باہر سے اندر چکر لگاتے رہیں گے۔ وہ دُکان بند نہیں کر... گے اور دُکان میں گاہکوں کا داخلہ بھی بند نہیں کریں گے تاکہ ہمیں ... کچھ معمول کے مطابق اور نارمل دکھائی دے۔ تم کو موقع تلاش کرنا ... جیسے ہی ان میں سے دو قریب آئیں۔ تریوینی یا کشن چند۔ دلاور یا ...

"وہ ہمارے قریب کیوں آئیں گے؟"

"وہاں جا کے دیکھنا کہ کب ان کو آسانی سے قابو کیا جا سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "رابعہ مشین گن نکال لے گی اور گل اپنا ریوالور ... مشین گن کی نمائش صرف دہشت قائم کرنے کے لیے ہوگی۔ کرا... جیولر اپنی دُکان کے اندر خونریزی نہیں چاہتا۔ اس کی دُکان تو شیشے ... گھر ہوتی ہے۔ پھر اسے یہ ڈر بھی ہوگا کہ کہیں مال بھی نہ چلا جا... چنانچہ وہ تابعداری کو ترجیح دے گا۔ تریوینی ذرا خطرناک آدمی ہے ... اگر اسے گولی مارنی پڑے تو دریغ مت کرنا۔ ہر صورت میں اسے ... لانا ہے اور سب کو خبردار کر دینا ہے کہ کسی نے مداخلت کی یا ... کو اطلاع دی تو ان دونوں کی لاشیں بھی واپس نہیں کی جائیں گی۔ ... کرنے سے ان دونوں کی جان بھی بچ جائے گی اور یہ شام تک ... کر دیے جائیں گے۔ ان دونوں کو کسی گاڑی میں بٹھا کے لانا ہوگا۔ ... دونوں آگے بیٹھیں گے۔ ایک ڈرائیونگ کرے گا۔ بہتر ہوگا ... تریوینی کو ڈرائیور بنا دو تاکہ وہ کچھ نہ کر سکے۔ اس کے پیچھے گدی سے ریوالور لگا کے گل بیٹھے گی۔ کشن چند کو رابعہ سنبھالے گی۔"

"کار کس کی ہوگی؟"

"کار تریوینی کی بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن اس میں مت بیٹھنا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ تریوینی اپنی گاڑی کو ٹینک بنا کے لایا ہو۔ تم اس میں بیٹھو تو نکل نہ پاؤ۔ اندر اس کے کمانڈوز چھپے ہوئے ہوں۔ رسک لینے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس جیولر کی گاڑی استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں۔"

"مگر اس کی گاڑی..."

"بی بی! وہ سونے چاندی اور ہیرے جواہرات کا بیوپاری ہے۔ تمھارا کیا خیال ہے وہ اس کی اکلوتی کار تھی؟ اس کے پاس نہ جانے کتنی کاریں ہوں گی۔ وہ آج دوسری گاڑی میں آیا ہوگا۔ ان دونوں کو اغوا کر کے باہر تک لانے کے بعد سمجھ لو کہ میدان مار لیا۔ محسن اور غالب کے بدلے میں دو آدمی ہمارے پاس بھی آ گئے۔ ہم کہیں قریب ہی آخری سین کے منتظر ہوں گے۔ کسی دوسری کار میں اور جیسے ہی تمھاری کار وہاں سے روانہ ہوگی، ہم سائے کی طرح پیچھے ہوں گے۔ ابھی یہ بتانا مشکل ہے کہ انھیں کہاں لے جانا مناسب ہوگا مگر تم ان کو چلتے رہنے کی تاکید کرو گی۔ کسی ایک سمت میں چلنے سے تم بالآخر انھیں نسبتاً کم آباد علاقے میں لے جانے میں کامیاب رہو گی۔ ہم کسی بھی جگہ اوورٹیک کریں گے۔ اور پھر سارے معاملات کو ٹیک اوور کر لیں گے۔"

"اور اگر کسی وجہ سے تم نے ہمیں مس کر دیا تو ہم تو مارے جائیں گے اسی بھروسے میں کہ تم ساتھ ہو؟" رابعہ نے کہا۔

"بی بی! یہ ایک وار گیم ہے۔ اندازوں اور قیاس آرائیوں کی بنیاد پر ہم نے ایک پلان بنایا ہے۔ اندازے غلط ہوں تو پلان فیل بھی ہو سکتا ہے۔ عملی صورتِ حال اس کے برعکس بھی ہو سکتی ہے۔ تقدیر ساتھ نہ دے تو عین وقت پر کوئی غیر متوقع بات بھی ہو سکتی ہے جس کے لیے ہم اس وقت کوئی پیش بندی نہیں کر سکتے۔ ہم جیت کے لیے لڑتے ہیں۔ امید کی بنیاد پر۔ لیکن شکست کی حقیقت کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ تم دونوں کو میں کوئی ٹھوس ضمانت کیسے فراہم کر سکتا ہوں۔ اگر میری بات تمھاری سمجھ میں آ گئی ہے تو پھر اُٹھو۔ چلنے کی تیاری کرو۔"

تیاری کا سب سے دُشوار مرحلہ گل کے لیے اس کے سائز پر فٹ آنے والے مردانہ کپڑوں کی فراہمی کا تھا۔ جس نئے شادی شدہ جوڑے کا یہ فلیٹ تھا وہ ہنی مون پر جاتے وقت ضرورت کے کپڑے ہی لے گئے تھے۔ باقی سب پرانے اور فاضل کپڑوں سے الماریاں بھری پڑی تھیں۔ نازو اور رابعہ کو ان میں سے اپنے مطلب کے کپڑے تلاش کرنے میں کوئی دُشواری پیش نہیں آئی لیکن گل کے لیے پتلون اور کوٹ اس کے سائز سے بہت بڑے تھے۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے مجھے بازار جانا پڑا۔

بازاروں سے ناواقفیت بھی ایک مسئلہ تھی لیکن ٹیکسی ڈرائیور بہت مددگار ثابت ہوا۔

"ریڈی میڈ سوٹ کا ایک نمبر دُکان ہے ادھر اپنا کولابا میں۔" اس نے کہا۔ "لندن فیشن۔"

"کولابا میں کہاں..."

"ادھر اپنا ورلڈ ٹریڈ سینٹر ہے..." ڈرائیور نے کہا۔

ڈرائیور کے لیے سب کچھ اپنا تھا۔ جب مجھے لندن فیشن سے بھی گل کے سائز کا مردانہ سوٹ نہیں ملا تو اس نے کہا۔ "ابھی اپنا لندن فیشن کا دوسرا برانچ بھی ہے۔"

میں نے کہا۔ "وہ کہاں ہے؟"

"ادھر اپنا باندرہ میں۔ واٹر فیلڈ روڈ پر۔" اس نے کہا۔ "ابھی گولی کا مافک جائیں گا۔"

میرے پاس وقت کم تھا چنانچہ مطلوبہ سائز کا ایک سوٹ مل گیا تو میں نے جوتے خریدے۔ معلوم نہیں کیوں ٹیکسی ڈرائیور نے فرض کر لیا تھا کہ میں بہت بڑا سیٹھ ہوں۔ وہ مجھے نریمان پوائنٹ پر 'ڈولی شوز' والوں کے پاس لے گیا۔ ان کی دُکان اوبیرائے ہوٹل میں تھی اور وہاں واقعی سیٹھ یا غیر ملکی سیاح قیام کرتے تھے۔ جوتے مجھے توقع سے زیادہ مہنگے پڑے۔ دو گھنٹے بعد میں نے یہ سب کچھ گل کے حوالے کیا۔

جب وہ سوٹ بوٹ پہن کے میرے سامنے آئی تو مجھے خاصی مایوسی ہوئی۔ وہ اب بھی مردانگی کا تاثر پیدا کرنے میں ناکام تھی۔

"اب ان بالوں کا کیا ہوگا؟" رابعہ نے کہا۔

میں نے کہا۔ "انھیں کٹوا لو۔ بوائز کٹ۔"

"بالکل ہی صاف نہ کرا لوں؟ آپ بھی کمال کرتے ہیں بھائی سکندر۔" گل نے خفگی سے کہا۔

"ایک صورت اور ہے۔" رابعہ نے کہا۔ "کیا ضروری ہے کہ گل کو گل خان ہی بنایا جائے۔ اگر یہ سردار بوٹا سنگھ بن جائے۔"

"آفرین۔" میں نے کہا۔ "گل خان ہو یا بوٹا سنگھ۔ نام میں کیا رکھا ہے۔ تم سکھوں کی طرح جوڑا باندھ لو۔"

"سکھوں کا ایک خاص اسٹائل ہے۔ میں ان کی طرح جوڑا کیسے بناؤں؟"

"تو پھر پگڑی رکھ لو سر پر..."

"پگڑی کون باندھے گا؟" رابعہ نے کہا۔ "اس کا بھی ایک خاص اسٹائل ہے۔"

"مجھے یاد آیا۔" میں نے کہا۔ "جب میں واپس آ رہا تھا تو میں نے

کہیں ایک دکان دیکھی تھی۔ ہیڈ ویئر۔ ان کے پاس ہر چیز تھی جو سر پر رکھی یا اوڑھی جاتی ہے۔ ہر قسم کی ٹوپی اور ہیٹ۔ ان کے پاس ریڈی میڈ پگڑیاں بھی ہوں گی۔ مہاراجہ اسٹائل۔ دُلہا اسٹائل۔ اور سکھ اسٹائل کی۔ پگڑی ہم راستے میں خرید لیں گے۔"

"یہ بھی طے کرلو کہ سردار بوٹا سنگھ کی گھر والی کا نام کیا ہوگا؟" گل نے غیر موجود مونچھوں پر تاؤ دے کر کہا۔

"میں نے کہا۔" کیا سکھ خواتین نام لیتی ہیں اپنے شوہر کا؟"

"آج کل سب عورتیں نام ہی لیتی ہیں۔"

میں نے آہ بھر کے کہا۔" کیا زمانہ آگیا ہے۔ ایک ہمارے دادا کا وقت تھا کہ بیویاں نام لیتے ہوئے کانوں کو سو بار ہاتھ لگاتی تھیں کہ اس سے تو نکاح ٹوٹ جائے گا۔ خیر۔ تم دونوں کے لیے سہولت اس میں ہے کہ تم کہو، سردار جی۔ گل تے سنو، اور یہ کہے۔ 'سردارنی حکم کرو۔ اسی تے آں حکم دے غلام' کیسے؟ ذرا بات کر کے دکھاؤ۔"

"چلو جی۔ ہم کریں گے اپنی باتیں۔" رابعہ نے کچھ شرما کے کہا۔ "تمہارے سامنے کیوں کریں۔"

ٹھیک گیارہ بجے ہم ایک ساتھ نکلے اور ایک ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ رابعہ نے چادر کو یوں لپیٹا تھا کہ مشین گن دکھائی بھی نہ دیتی تھی۔ اس نے اپنا چہرہ بھی چھپا لیا تھا۔ گل اس کے ساتھ اکڑ کر چلتے ہوئے مجھے مضحکہ خیز لگی تھی مگر میں نے محسوس کیا کہ کوئی اور انھیں دیکھ کر نہ حیران ہوا ہے نہ پریشان۔ یہ نقلی چہروں اور نقلی جذبات کے منظر دکھانے والوں کا شہر تھا اور اداکاروں کا شہر تھا۔ کہیں کچھ بھی معمول کے مطابق ہو یا غیر معمولی نظر آئے تو لوگ فرض کر لیتے تھے کہ کسی فلم کی شوٹنگ ہو رہی ہے۔

سکھ اسٹائل کی پگڑی راستے میں ایک اور ویسی ہی دکان سے مل گئی جیسی میں نے دیکھی تھی۔ پگڑی سر پر دھر کھنے کے بعد گل ایک ہینڈسم نوجوان سکھ نظر آنے لگی۔ رنگ روپ کے اعتبار سے سکھ ایک خوبصورت قوم ہیں۔ لڑکے لڑکیاں نوجوانی کے آغاز میں ایک سے نظر آتے ہیں اور ان کی جنس کا تعین شہروں میں تو لباس سے ہو جاتا ہے لیکن دیہات میں جہاں کرتا لاچہ مشترک پہناوا ہے خاصی گڑبڑ ہوتی ہے۔

ٹیکسی ابھی کشن چند جیولر کی دکان سے دور ہی تھی کہ میں نے اور نازو نے اتر جانے کا فیصلہ کیا۔ سردار بوٹا سنگھ اور ان کی گھر والی کو بھی میں نے تاکید کی کہ وہ عین دکان کے سامنے جا کے نہ اتریں۔ بہتر یہ ہوگا کہ وہ شاپنگ اور تفریح ایک ساتھ کرتے ہوئے جائیں۔ دکانوں کے شوکیسوں میں جھانکتے اور باتیں کرتے۔ کشن چند کی دکان میں بھی وہ یوں داخل ہوں جیسے ان کا پہلے سے کوئی پروگرام نہیں تھا لیکن دکان سامنے آگئی ہے تو سردار بوٹا سنگھ جذباتی ہوگئے ہیں۔

جب ٹیکسی آگے بڑھ گئی تو میں نے نازو سے کہا۔" ہم اب کیا کریں؟ ہم ابھی تک بے کار ہیں۔"

"ہم ٹیکسی لے سکتے ہیں۔" نازو نے کہا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔" ٹیکسی بھروسے کے قابل نہیں ہوتی۔ ٹیکسی ڈرائیور اس سے بھی زیادہ ناقابلِ اعتبار ہوتا ہے۔ ہمیں ایک کار چاہیے۔"

"خرید لو۔ ایک سے بڑھ کر ایک نظر آرہی ہے ہر شوروم میں۔" نازو نے کہا۔

"ان میں سے دیکھو۔ جو ہمارے سامنے ہیں۔ سڑک پر۔" میں نے کہا۔" اگر کوئی شامت کا مارا لفٹ دے دے۔"

"یہاں کون لفٹ دے گا۔" نازو نے کہا۔" جہاں خالی ٹیکسی ہر وقت دستیاب ہے۔"

" فرض کرو ہماری جیب میں بھاڑا نہیں ہے ٹیکسی کا کیونکہ ہماری جیب کٹ چکی ہے۔" میں نے کہا۔" اب تم بحث مت کرو۔ کوشش کرو۔"

" کیا کہوں کسی رک جانے والے سے؟ کہ کہاں جانا ہے؟" نازو نے کہا۔

" یہ سوال ایسا ہے کہ اس کا جواب تم اپنی مرضی سے کچھ بھی دے سکتی ہو۔" میں نے کہا۔" بمبئی میں ایسی خواتین بھی ہیں، بمبئی میں کیا ساری دنیا میں ہیں۔ جو کہتی ہیں کہ جہاں آپ چاہیں لے جائیں۔ لیکن یہ جواب پسند نہیں تو پھر کچھ بھی مت کہو۔ دروازہ کھولو اور بیٹھ جاؤ۔ باقی چھوڑ دو اپنے اس خادم پر۔"

نازو نے ایک طرف سے آنے والی ہر کار کو بڑی معصومیت سے اشارہ کیا مگر اس کو گھور کر دیکھنے والے رکے بغیر گزر گئے۔ اتنے سب باذوق لوگ نہیں تھے۔ اصل خرابی میری موجودگی پیدا کر رہی تھی۔ نازو کے ساتھ مجھے دیکھ کر 'نیکی کرنے' کے جذبات پر اوس پڑ جاتی تھی۔ مجبوراً میں نے پرانا طریقہ استعمال کیا اور خود دور کھڑا ہو کے انتظار کرنے لگا۔

حسبِ توقع ایک شوخ لباس والے نوجوان نے اپنی اسپورٹس کار نازو کے لیے یوں روکی کہ پہلے وہ آگے نکل گیا پھر بریک لگا کے اور سیٹی بجا کے وہ ریورس میں واپس آیا۔

"کم آن بے بی۔" اس نے بڑے اسٹائل سے ایک ہاتھ بڑھا کے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

"کہاں جا رہے ہیں جی آپ؟" نازو نے اٹھلا کے کہا۔

"ارے جانی۔ جانا کہاں ہے۔ اب تو بس جان جانے گی۔"

اس نے سخت عاشقانہ اسٹائل میں سینے پر ہاتھ رکھا۔ نازو نے اس کا ہاتھ پکڑ کے کھینچ لیا۔ دوسری طرف میں پہنچ چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ نازو کے حسن پر فریفتہ ہو جانے والا نوجوان سنبھلتا، میں نے اسے بڑی صفائی سے ناک آؤٹ کر دیا۔ وہ ساتھ والی سیٹ پر جھکا اور ساکت ہو گیا۔ نازو کے جھٹکے نے اسے پہلے ہی ڈرائیونگ سیٹ سے دور کر دیا تھا۔ یہ سب کچھ اتنے کم وقت میں ہوا کہ ادھر اُدھر سے گزرنے والی کسی کار کے ڈرائیور نے کچھ نہیں دیکھا۔ اسپورٹس کار کے ایک دروازے کو میں نے بلاک کر رکھا تھا اور دوسرے کو نازو نے۔

گاڑی ایک جھٹکا لے کر بند ہو گئی تھی۔ میں نے چند سیکنڈ میں اسے پھر اسٹارٹ کیا۔ نازو کے بیٹھتے ہی کار پھر اسی طرح دوڑنے لگی جیسے اصل مالک کے اشارے پر دوڑ رہی تھی۔ جب میں نے کار کو ایک ٹرک کے پیچھے روکا تو نازو نے کار کے مالک کو پیچھے والی سیٹ پر الٹ دیا۔ کار کی ڈکی میں پیراشوٹ کے کپڑے کا بنا ہوا کار کور تھا۔ یہ کور نازو نے بے حس و حرکت پڑے ہوئے نوجوان پر ڈال دیا۔

ایک بار ہم کشن چند کی دکان کے سامنے سے اندر اور باہر کی صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہوئے گزر گئے۔ اندر بھی سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ جگمگاتے شوکیسوں کے پیچھے سیلز مین کھڑے ہوئے تھے اور ان کے سامنے اونچے اسٹولوں پر گاہک براجمان تھے۔ کوشش کے باوجود میں گل یا رابعہ کی جھلک بھی نہ دیکھ سکا۔ دکان کے باہر سیکڑوں کاریں صف بستہ تھیں لیکن ان میں ایک بھی پولیس کار نہیں تھی۔ یہ اندازہ کرنا تقریباً ناممکن تھا کہ کس کار میں ہمارے دشمن شکاری مورچا بند بیٹھے ہیں۔

ایک ون وے اسٹریٹ سے گزر کے اور دو بار دائیں ہاتھ پر گھوم کے میں پھر اسی سڑک پر پہنچا تو مجھے احساس ہوا کہ کہیں کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔

اس گڑبڑ کا احساس مجھے نازو نے دلایا۔" سکندر! کیا کوئی ہمارا تعاقب کر رہا ہے؟"

میں نے کہا۔" اس کا مطلب ہے کہ یہ میرا وہم نہیں ایک حقیقت ہے۔ شک مجھے بھی ہوا تھا۔"

لیکن اب شک کی گنجائش ہی نہ رہی تھی۔ وہ گاڑی جو مجھے مسلسل بیک ویو مرر میں نظر آرہی تھی ایک دم آگے بڑھی۔ اس نے ہماری اسپورٹس کار کو اوورٹیک کیا اور عین ہمارے سامنے آکے ہمارا راستہ روک دیا۔

گاڑی کو ایک نوجوان چلا رہا تھا۔ اس کی صورت نے مجھے ذرا سی دیر کے لیے چکرا دیا۔ اگر فرق لباس کا نہ ہوتا تو شاید میں پلٹ کر دیکھتا کہ کہیں وہ نوجوان سیٹ پر سے غائب تو نہیں ہو گیا ہے جسے ہم نے بڑی احتیاط کے ساتھ سیٹ کور کے نیچے چھپا دیا تھا۔ اس دوسرے نوجوان کی صورت ناقابلِ یقین حد تک اس کار کے مالک کی صورت سے ملتی تھی جسے ہم بڑے اعتماد کے ساتھ چلا رہے تھے۔ ایک شوخ طرح دار حسینہ اس کے ساتھ فلمی پلغز بنائے بیٹھی ہوئی تھی۔

جب وہ اُتر کے میرے قریب آیا تو میں نے کہا۔" جی۔ کیا تکلیف ہے آپ کو، راستہ کیوں بلاک کیا ہے میرا؟"

سوال انگریزی میں کیا گیا تھا۔ چنانچہ وہ محتاط ہو گیا اور اس کے تیور بھی پہلے جیسے جارحانہ نہیں رہے۔" آئی ایم سوری۔"

"انگریزوں کا مزاج یہ ہے کہ جب تک انھیں واقعی افسوس یا شرمندگی نہ ہو، وہ ایسا نہیں کہتے لیکن ہم تو اس جملے کا استعمال عادتاً کرتے ہیں۔ مجھے بالکل ایسا نہیں لگتا کہ آپ کو اپنی غلطی کا احساس بھی ہے۔" میں نے کہا۔

وہ مزید نروس ہو گیا۔ اس نے اپنی گرل فرینڈ کی طرف خفت سے دیکھا جس کی مسکراہٹ میں تمسخر کا رنگ اس کے جذبات کو مجروح کرتا تھا۔

"یہ گاڑی آپ کیوں چلا رہے ہیں؟" اس نے ایک احمقانہ سوال کیا اور میری گاڑی کی طرف دیکھا۔

"وہ گاڑی آپ کیوں چلا رہے ہیں؟" میں نے اسی کے لہجے میں کہا اور اس کی گاڑی کی طرف دیکھا۔

نازو کھلکھلا کے ہنس پڑی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ میں نفسیاتی غلبہ حاصل کر چکا ہوں اور وہ نوجوان جس نے شک کیا تھا تو کوئی غلطی نہیں کی تھی، خوامخواہ یہ سمجھنے لگا تھا کہ اس سے کوئی خلافِ تہذیب حرکت سرزد ہو گئی ہے۔ نازو کی ہنسی نے اسے نروس کر دیا۔

"دراصل... یہ کار میرے بھائی نریندر کی ہے۔" وہ بولا۔

میں نے گاڑی کو ریورس گیئر میں ڈالتے ہوئے کہا۔" اگر صرف یہی بات بتانے کے لیے آپ نے اتنی زحمت کی تھی تو شکریہ۔ نریندر میرا بھی دوست ہے۔ میرا نام ہے اگروال۔ آپ سے چھوٹا ہے نریندر؟"

اب وہ شائستگی سے مسکرانے لگا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔" نریندر مجھ سے پانچ منٹ بڑا ہے۔ میرا نام سریندر ہے۔ آج آپ سے اس کی ملاقات تو ہوگی؟"

میں نے کہا۔" ہاں۔ اسے ہم لنچ کے لیے پک کریں گے۔ بلکہ یوں سمجھیے کہ لنچ پر یہ گاڑی ہم اسے واپس کریں گے۔" نازو بولی۔

"بس اسے بتا دیں کہ میں پونا جا رہا ہوں۔ کل واپس آؤں گا۔ تھینک یو۔ اینڈ سوری وَنس اگین۔" وہ بولا۔

میں نے بھی مسکرا کے کہا "میں بتا دوں گا اسے۔"

پہلے میرا ارادہ گاڑی کو واپس لے جا کر آگے نکل جانے کا تھا، اب میں نے اسے موقع دیا کہ وہ سامنے سے گاڑی ہٹا لے اور پہلے روانہ ہو جائے۔ ہم ایک ساتھ چلے مگر وہ تیز رفتاری کا عادی تھا یا خفت مٹانے کے لیے بھاگ جانا چاہتا تھا کہ ایک منٹ میں ایک فرلانگ آگے نکل گیا۔ میں نے کار کو ایک فرلانگ کے بعد پارک کر دیا۔

"اس وقت تو بال بال بچے۔" نازو نے کہا۔

میں نے کہا "ہاں لیکن اگر بڑے بھائی صاحب کلبلانے لگتے یا آہ بھی کرتے تو ہمارا بنا بنایا کام بگاڑ دیتے۔"

"ہمارا کام کیا بگاڑتے۔ دخل در معقولات کی سزا چھوٹے کو ملتی۔ وہ خود بھی مارا جاتا اور بے چاری گرل فرینڈ..."

نازو بولی۔

"تم نے کیسے اندازہ کر لیا کہ وہ گرل فرینڈ تھی؟ بیوی یا بہن نہیں ہو سکتی کیا؟"

نازو ہنسی "نہیں۔ بیویوں کے یہ انداز نہیں ہوتے۔"

"اچھا، پھر کیا انداز ہوتے ہیں؟" میں نے کہا۔

نازو بولی "جب بیوی آئے گی تو معلوم ہو جائے گا۔"

میں نے کہا "تمہارے انداز بھی بدل جائیں گے۔ بیوی بننے کے بعد؟"

"صرف میری بات کیوں کرتے ہو۔ تم بھی یہ نہیں رہو گے۔ یہ نیاز مندی۔ یہ وارفتگی۔ اور یہ بے قراری تب تک ہے جب تک جذبات کی راہ میں فاصلے حائل ہیں۔" نازو نے کہا۔

"جب تک تم شوہر نہیں ہو۔"

میں حیران رہ گیا "کیا شوہروں کے جذبات نہیں ہوتے۔"

"ہوتے ہوں گے۔ مگر جذبات کی شدت اور نوعیت میں فرق تو پڑ ہی جاتا ہے بعد میں۔"

میں نے کہا "اور بیویوں کے بارے میں کیا ارشاد ہے۔ کیا تم وہی رہو گی جو آج ہو؟"

"نہیں۔ ظاہر ہے وقت بدلے گا اور حالات بدلیں گے۔ تو پھر میں بھی کیسے بچ سکتی ہوں۔" نازو نے کہا۔

"لیکن یہ تبدیلی تمہیں پسند نہیں؟ تمہارے لیے یہی وقت اور آج کے حالات ہی زیادہ قابلِ قبول ہیں۔" میں نے کہا۔

"قبول سب کرنا پڑتا ہے کیونکہ اس سے گریز عملاً ناممکن ہے۔ جو آج ہے وہ آج اچھا لگتا ہے۔ آنے والا دن ایک خواب ہے۔ اس کی تعبیر بھی اچھی ہوگی۔ ایسا نہ ہوتا تو ہم اپنے خوابوں کی تعبیر کیوں مانگتے۔ اس وقت وہ بھی اچھا لگے گا جو کل ہوگا۔"

میں نے کہا "میں بے حد مرعوب ہوا ہوں اس وقت۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنی حقیقت پسندانہ سوچ بھی رکھ سکتی ہو۔"

"آپ تو یہ سمجھتے ہیں نا کہ آپ مرد ہیں۔ صرف آپ ہی کی سوچ حقیقت پسندانہ ہو سکتی ہے۔ ہم بے چاری لڑکیاں رومان پرور خوابوں کی اسیر..."

میں نے کہا "میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔ آئی ایم سوری۔"

نازو نے کہا "انگریز قوم کا مزاج یہ ہے کہ..."

میں ہنس پڑا "اچھا۔ میرا ہی وار مجھ پر۔ میں تو اسے بھگانا چاہتا تھا۔ وہ میری توقع سے زیادہ بودا نکلا۔ اگر وہ پیچھے پڑ جاتا تو واقعی مشکل ہو جاتی۔"

ہم "دی کشن چند جیولرز" کی دکان سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر بہت سی دوسری کاروں کے درمیان اپنی کار پارک کیے بیٹھے تھے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ دور سے میری یا نازو کی صورت صاف نظر آئے چنانچہ میں نے سب شیشے بند کر دیے تھے۔ بہت قریب سے ہمیں دو افراد نے دیکھا۔ ان میں سے ایک نے ساتھ والی گاڑی نکالی تھی اور دوسرے نے فوراً اس کی جگہ کار کھڑی کر دی تھی۔ ان دونوں نے یقیناً ہمیں ان مبتلائے عشق میں شامل کیا ہوگا جو زمانے کی نظر سے یونہی چھپ چھپ کر ملنے پر مجبور ہیں کیونکہ ترقی پسند معاشرہ بھی اب تک عشق کرنے کا اوپن لائسنس نہیں دیتا۔

نازو کی نگاہ کشن چند جیولر کے شفاف شیشوں والے دروازوں تک جا کے لوٹ آتی تھی۔ دروازہ بار بار کھلتا تھا اور کسی کے اندر جانے یا باہر آنے کے بعد آہستہ آہستہ جھولتا رہتا تھا۔ دوسری سب دکانوں میں بھی خریداروں کی آمد و رفت جاری تھی۔ یہ سب دولتمندوں کی تفریح گاہیں تھیں اور یہاں شاپنگ صرف ایک تفریح تھی۔ ضرورت نہیں۔

میں نے کئی بار ان سب گاڑیوں کو دیکھا جو کشن چند جیولر کی دکان کے سامنے اور درمیانی سو گز کے فاصلے میں کھڑی ہوئی تھیں لیکن مجھے کہیں کسی گاڑی میں کوئی مشتبہ چہرہ نظر نہیں آیا۔ جیولرز کی دکان کے آس پاس اگر شکاری کہیں موجود تھے تو بڑی ہنرمندی سے خود کو چھپائے رکھنے میں کامیاب تھے۔

"وہ دونوں اندر ہی ہوں گی۔" نازو کچھ دیر بعد بولی۔

"ہاں۔ اور کہاں ہو سکتی ہیں۔" میں نے کہا۔

"فرض کرو سکندر۔ وہ دھوکا دینے میں ناکام رہیں۔ یا اندر دلاور بھی موجود ہوا۔ وہ رابعہ کو فوراً پہچان لے گا۔"

میں نے کہا "ہاں۔ یہ رسک تو ہے لیکن دلاور یہاں کیوں، اور کیسے ہوگا؟"

"میں تو کہہ رہی ہوں کہ فرض کرو وہ ہوا؟"

"اللہ مالک ہے۔" میں نے کہا "تریوینی اور کشن چند کے ساتھ اپنے دلاور صاحب بھی آجائیں تو چشم ما روشن دلِ ما شاد۔"

نازو نے نفی میں سر ہلایا "تریوینی اور کشن چند سے میں واقف نہیں۔ لیکن دلاور اتنی آسانی سے..."

میں نے غصے میں اس کی بات کاٹ دی "آخر تم کیا کہنا چاہتی ہو۔ اور کیا کہلوانا چاہتی ہو مجھ سے۔ میں غیب کا علم نہیں رکھتا۔ میں کیا بتاؤں کہ کیا ہوگا۔ میری آنکھیں اندر کچھ نہیں دیکھ رہی ہیں کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ لیکن کچھ نہ کچھ ہوگا ضرور۔ وہ تینوں ہاتھ نہ آئے تو یہ ہو سکتا ہے کہ مارے جائیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ گل اور رابعہ کو پکڑ لیں یا انہیں گولی مار دیں۔"

نازو کا رنگ اڑ گیا۔ اسے مجھ سے ایسے شدید ردِعمل کی توقع نہیں تھی۔

ایک گہری سانس لے کر میں نے کہا "بات یہ ہے نازو بی بی! کہ میری نظر کبھی صرف اجالے کو نہیں دیکھتی میں تاریک پہلو پر نظر ضرور رکھتا ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ ناکامی کا خیال میرا ارادہ نہیں بدلتا۔ جو کچھ تم سوچ سوچ کے خوف میں مبتلا ہو رہی ہو، وہ میرے ذہن میں اس وقت بھی تھا جب میں نے گل اور رابعہ کو اس مشن پر بھیجا تھا اور تمہارا کیا خیال ہے، خود انہیں اندازہ نہیں ہوگا کہ ان کا یہ کام کتنا مشکل ہے؟ کامیابی کی خواہش اور اس خواہش کی تکمیل کے لیے کوشش کی شرط ہے مگر کوشش بھی تو ناکام ہو سکتی ہے۔"

نازو باہر دیکھ رہی تھی اور جانتے بوجھتے یہ ظاہر کر رہی تھی جیسے اس کی توجہ کہیں اور ہے اور وہ میری بات سن ہی نہیں رہی ہے۔ اس نے اچانک میری طرف دیکھا اور بولی۔ "تم کچھ کہہ رہے تھے۔"

میں نے بھنا کے کہا "میں جھک مار رہا تھا۔"

وہ معصومیت سے بولی "خفا کیوں ہوتے ہو۔ وہاں تک تو سنا تھا میں نے، جب تم کسی تاریک پہلو کی بات کر رہے تھے۔ اس کے بعد والا پیراگراف پھر بول دو گے تو کیا زبان گھس جائے گی۔"

مجھے ہنسی آگئی "تم بہت چالاک لڑکی ہو۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "اس کے برعکس میں خود کو ایک بے وقوف اور عاقبت نااندیش لڑکی سمجھتی ہوں جس نے اپنے مستقبل کے بارے میں بے حد جذباتی اور غیر عملی اندازِ فکر اختیار کیا۔"

"اس بات کا احساس تمہیں آج اچانک کیوں ہوا؟"

"یہ بات نہیں۔ ایسے ہی کبھی ڈپریشن [illegible] میں خیال آتا ہے کہ میں ایک عام سی لڑکی ہوتی۔ [illegible] کیا۔ ہم سب جو ایک مشترک مقصد کی جدوجہد میں خوار ہو [illegible] عام قسم کے لوگ ہوتے تو آج اپنے اپنے گھروں [illegible] تم نے اپنا سب کچھ گنوایا۔ حالانکہ تمہیں [illegible] کہیں زیادہ مل سکتا تھا جو تمہارا حق تھا۔ پھر رابعہ نے اپنا گھر اور اپنا کیرئیر سب داؤ پر لگا دیا۔ میں نے والدین کو اور گھر کو چھوڑا اور ایک بھائی بچا تھا..."

"تم کو افسوس ہے کہ تم عام سی لڑکی کیوں نہ ہوئیں؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ یہ تو مقامِ شکر ہے۔ خدا نے ہمیں غیر معمولی بنایا کیونکہ وہ ہم سے غیر معمولی کام لینا چاہتا تھا۔" نازو نے کہا۔ "پھر کس خوبی سے اس نے ہمیں یکجا کر دیا۔ کوئی کہاں سے آیا، کوئی کہاں سے۔"

"ہاں۔ ابتدا میں تو صرف محسن تھا اور میں۔ پھر اتفاق..."

نازو نے میری بات کاٹ دی "میں اسے اتفاق نہیں سمجھ سکتی۔ یہ تو قدرت کا حسنِ انتظام تھا۔ پہلے سے طے تھا کہ کب کیا ہوگا اور کیسے ہوگا۔ اور اگر ہم چاہتے کہ ایسا نہ ہو۔ تو یہ ناممکن تھا۔"

تریوینی اچانک دروازے میں نمودار ہوا اس کے بالکل پیچھے میں نے گل کو دیکھا۔ ایک جوشیلے، جذباتی جوان مرد کی طرح اس نے اپنی سوہنی و وہٹی کے لیے دروازے کو تھامے رکھا۔ تریوینی کے تقریباً ساتھ ہی رابعہ بھی برآمد ہوئی۔ گل ان کے پیچھے رہی اور اس نے ایک بار پلٹ کے جھولتے ہوئے دروازے سے دکان کے اندر کا منظر بھی دیکھا مگر کوئی بھی ان کے بعد باہر نہیں آیا تھا۔

تریوینی بالکل مطمئن تھا۔ یوں بھی وہ جذبات سے عاری ایک مشینی انسان کی طرح بے حس نظر آنے کی پوری کوشش کرتا تھا اور اس کی مصنوعی شخصیت ہی اس کا اصل روپ بن کر رہ گئی تھی۔ وہ تھری پیس سوٹ میں تھا اور سگار پی رہا تھا۔

دور سے ہی میں نے گل اور رابعہ کی مستعدی کا اندازہ کر لیا۔ وہ ہر قسم کی غیر متوقع صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے پوری طرح چوکس تھیں۔ رابعہ کی زد میں تریوینی تھا۔ شاید گل نے اسے سمجھا دیا تھا کہ وہ اِدھر اُدھر کی فکر بالکل نہ کرے۔ یہ کام وہ خود کر رہی تھی۔ اس کی نظریں خاصی بے چین لگ رہی تھیں۔

وہ اپنے چاروں طرف موجود لوگوں کو اور ہر گاڑی کو دیکھتی جا رہی تھی۔ ان کے پُراعتماد انداز سے بالکل واضح ہو جاتا تھا کہ ترلوینی کی معمولی سی غلطی پر رابعہ اس سے کچھ پوچھے بغیر اپنے ریوالور سے اس کے سر میں سوراخ کر دے گی اور اگر کسی حمایتی نے کسی بھی سمت سے مداخلت کی تو وہ گل کے ہاتھوں مارا جائے گا۔

میں نے کار کا انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے نازو کی طرف دیکھا اور کہا۔ "دلاور ہاتھ نہیں آیا۔"

نازو نے سر ہلایا۔ "چلو۔ کوئی تو ملا۔"

میں نے کار کو ریورس کرتے ہوئے کہا۔ "ہاں۔ اصل کامیابی یہ ہے کہ گل اور رابعہ کا مشن ناکامی سے دوچار نہیں ہوا۔"

پلان کے مطابق ترلوینی کو ڈرائیونگ سیٹ پر بٹھا دیا گیا تھا۔ گل عین اس کے پیچھے رہی اور رابعہ اس کے ساتھ بیٹھی۔ میں نے ترلوینی کو تقریباً سو گز آگے رہنے کا موقع دیا۔ دونوں گاڑیوں کے آگے پیچھے روانہ ہوتے وقت میں نے بھی آگے پیچھے اور دائیں بائیں دیکھا۔ مگر نہ کوئی اور گاڑی عین اسی وقت قطار سے باہر نکلی تھی اور نہ ہمارے ساتھ روانہ ہوئی تھی۔

ڈی کشن چند کی دکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے نازو سے کہا۔ "تمھاری دونوں آنکھیں کھلی ہوئی ہیں نا؟"

اس نے چڑ کے کہا۔ "کیا تمھاری قریب کی نظر اتنی کمزور ہے؟"

میں نے کہا۔ "میری نظر کو نظر مت لگاؤ۔ کیا ہوا ہے میری نظر کو؟"

نازو نے کہا۔ "پھر تم کو میری آنکھیں کھلی ہوئی نظر کیوں نہیں آ رہی ہیں؟"

"اچھا۔ کیا تم یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہو کہ دخل درمعقولات کے لیے کسی نے بھی ہمارا تعاقب شروع نہیں کیا ہے؟"

"میں پچاس فیصد یقین کے ساتھ یہ دعویٰ کر سکتی ہوں۔ پچاس فیصد امکان اس بات کا بھی ہے کہ تعاقب بعد میں کیا جائے۔ یا وائرلیس پر دونوں گاڑیوں کی موومنٹ کے بارے میں اطلاع دی جا رہی ہو۔"

"کسے اطلاع دی جا رہی ہو؟"

"کسی کو بھی۔ جو سامنے تو نہیں ہے مگر دور بیٹھ کے بھی سب کچھ کر سکتا ہے۔ مثلاً دلاور۔" نازو نے کہا۔

آگے والی گاڑی کو ترلوینی بہت محتاط انداز میں چلا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ہماری آسانی کے لیے رفتار کم رکھنے پر مجبور ہے۔ محتاط میں بھی تھا لیکن نہ جانے کہاں سے دوسری جنگِ عظیم کے زمانے کی ایک گاڑی نمودار ہوئی جسے پہلی جنگِ عظیم میں ریٹائر ہو جانے والا فوجی افسر ٹائپ پارسی چلا رہا تھا۔ اس نے جوشِ جوانی میں ہم سے آگے نکلنے کی کوشش کی تو اس کے بوڑھے انجن کا سانس اکھڑ گیا اور کار لڑکھڑانے لگی۔ میں نے اسے بچانے کی کوشش کی۔ اس کے باوجود دونوں کاروں کے بمپر ٹکرا گئے۔

میرے خیال میں بمپر کا بمپر سے چھو جانا کوئی حادثہ نہیں تھا۔ مگر پارسی نے ایسی دلدوز چیخ ماری جیسے بمپر اس کے سر پر لگا ہے اور کار کو روک دیا۔ اس نے میرا راستہ مکمل طور پر بلاک کر دیا تھا۔ درمیانی فاصلہ اتنا کم تھا کہ میں اپنی گاڑی کو سائڈ سے نہیں نکال سکتا تھا۔ مزید یہ کہ میرے بالکل پیچھے ایک دم بریک لگانے سے ایک اناڑی خاتون ڈرائیور کی گاڑی بند ہو گئی تھی جو اب اسٹارٹ ہونے پر آمادہ نہ تھی چنانچہ میں بیچ میں بُری طرح پھنس چکا تھا۔

میں نے پارسی کو دل ہی دل میں ایک درجن ناقابلِ اشاعت گالیاں دیں لیکن زبان سے صرف اسے اُلّو کا پٹھا کہا۔ اس آفتِ ناگہانی نے نازو کو بھی پریشان کر دیا تھا۔ میں سخت مشتعل تھا اور اپنی بے بسی پر سخت پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ پارسی جلد از جلد اپنی گاڑی ہٹا لے مگر وہ انجن بند کر کے اپنی ہم عمر مجروح کار کے نقصانات کا جائزہ لینے کے لیے نیچے اتر آیا تھا۔

نازو نے اپنے سر پر ہاتھ مار کے کہا۔ "یہ کیا مصیبت نازل ہو گئی۔ آگے والی گاڑی تو سمجھو گئی۔"

میں نے کار کی کھڑکی سے سر نکالا اور چیخ کے کہا۔ "ابے بُڈھے پھونس! ہٹا سامنے سے اس ڈھانچے کو۔"

نازو نے چلّا کے پیچھے والی خاتون سے کہا۔ "خدا کے لیے تم ہی کچھ پیچھے کر لو اپنی گاڑی کو۔ میں اسٹارٹ کر دوں؟"

خاتون نے گھبرا کے کہا۔ "بیٹری! بالکل ڈیڈ ہے۔"

پارسی میری طرف لپکا۔ "سالا حرامی۔ نیا گاڑی کا ناس کیا۔ ابھی تیرے کو کیا معلوم، یہ رولز رائس ہے۔ جس کو تو ڈھانچا بولا۔"

نازو نے نیچے اتر کے خاتون ڈرائیور سے کہا۔ "آپ نیوٹرل کریں۔ دھکا لگانے سے گاڑی پیچھے ہو جائے گی۔"

ہاتھ جوڑ کر میں نے پارسی سے کہا۔ "اچھا میرے باپ، میرے دادا۔ تیری رولز رائس کا کتنا نقصان ہوا ہے۔ بول۔"

"ابھی دو سو روپیہ لگ جائیں گا۔۔۔"

میں نے فوراً دو سو روپے نکالے اور اسے تھما دیے۔ "چلو اب ہٹاؤ اپنی رولز رائس۔ ڈیوک آف ونڈسر کے پوتے۔"

ایک ٹریفک کانسٹیبل کاہلی سے چلتا ہوا آیا۔ "کس نے کیا ہے یہ ٹریفک جام۔ کس نے کس کو ٹکر ماری ہے؟" اس نے آواز میں قانون کی دہشت پیدا کر کے کہا۔

میں نے مسکرا کے کہا۔ "ٹکر؟ کیسی ٹکر۔ بس ہم جا رہے ہیں۔ تم بہت تھکے ہوئے نظر آ رہے ہو۔ یہ لو۔ جاؤ کہیں بیٹھ کے چائے ہی پی لو کم سے کم۔" اور دس کا ایک نوٹ اس کی مٹھی میں دبا دیا۔

لیکن یہ سب بے سود رہا۔ ترلوینی کی کار اتنی دیر میں غائب ہو چکی تھی۔ جب ہم پھر روانہ ہوئے تو سڑک پر دور دور تک اس کار کا کہیں پتا نہ تھا۔

"یہ تو بہت بُرا ہوا۔" نازو نے کہا۔ "سارا کام خراب ہو گیا۔"

"مگر میرا تو کوئی قصور نہیں اس میں۔" میں نے کہا۔

"تم محتاط نہیں تھے۔ تمھاری توجہ کہیں اور تھی۔" نازو نے کہا۔

"یہ غلط ہے۔" میں نے ڈیش بورڈ پر مُکّا مارا۔ "وہ بڈھا جان بوجھ کے سامنے آیا تھا اُسی طرح روز دو چار سو بناتا ہو گا وہ۔"

"تمھاری جگہ میں ہوتی تو۔۔۔"

"کیا کرتیں تم؟ اوپر سے گاڑی کو گزار کے لے جاتیں۔" میں نے چلّا کے کہا۔ "دیکھا نہیں اپنی اس خالہ کو جو پیچھے آ کے پھنس گئی تھی۔ افلاطون بنتی ہیں سب اور ہوتی ہیں ناقص العقل۔ رابعہ اور گل بھی ہیں ورنہ خیال رکھنا چاہیے تھا انھیں کہ ہم بھی پیچھے ہیں اور اگر نہیں ہیں تو کیوں نہیں ہیں۔ اتنی ٹریفک میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ان کے لیے کہیں رُک کے انتظار کرنا کیا مشکل تھا۔ وہ ترلوینی سے کہہ سکتی تھیں کہ رُک جاؤ۔"

نازو نے کہا۔ "یہی کیا ہے انھوں نے۔"

اسی وقت میں نے ترلوینی کی گاڑی کو سڑک کے بائیں کنارے پر دیکھا اور میرا تمام غصّے کا جوش و خروش صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

نازو نے مجھے پُر ملامت نظروں سے دیکھا۔ "ہو نا تم بھی ایک عام متعصب، جاہل قسم کے مرد۔ عورت کے بارے میں اپنی رائے تم کبھی نہیں بدلو گے۔ اب کہو گے سوری۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ مگر تمھارا شرمندہ ہونا بھی ڈھونگ ہو گا۔"

میں ہنس پڑا۔ "غصّے میں آدمی کے منہ سے سچ نکل جاتا ہے بلاارادہ۔ آپ کچھ قوتِ برداشت پیدا کریں خاتون!"

ترلوینی کی گاڑی میں سے رابعہ نے سر نکال کے دیکھا اور مجھے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ میں نے اپنی کار روک لی اور اُتر کے آگے گیا۔

"گڈ مارننگ مسٹر ترلوینی۔" میں نے خوش دلی سے کہا۔ "کیا عجیب اتفاق ہے کہ ہم پھر مل رہے ہیں۔"

ترلوینی کا چہرہ سپاٹ رہا۔ وہ سکون سے سگار پیتا رہا۔

رابعہ نے کہا۔ "ہمارے ساتھ آ جاؤ۔"

"بلّے بلّے سردار جی۔" میں نے گل سے کہا۔ "تیری وہوہٹی تے چن دا ٹوٹا اے۔"

گل نے غیر موجود مونچھوں پر تاؤ دے کر کہا۔ "اوئے میں ٹوٹے کر دیاں گا۔ چن دے پُتّر۔"

میں نے نہایت لوفروں والے انداز میں سیٹی بجا کے نازو کو انگلی سے اشارہ کیا۔ نازو بُرا سا منہ بناتی ہوئی آئی اور پچھلی سیٹ پر ہی فٹ ہو گئی۔ میں نے واپس جا کے اس کار کے شیشے چڑھائے جو مشکل سے ایک گھنٹا ہمارے پاس رہی تھی۔ اس کا مالک جو پیچھے والی سیٹ پر بے ہوش پڑا ہوا تھا اب کلبلا رہا تھا اور پندرہ بیس منٹ بعد اس کے ہوش میں آ جانے کے امکانات پیدا ہو چلے تھے۔ میں نے رومال سے اسٹیئرنگ وہیل کو اور اپنے اندازے کے مطابق ہر اس جگہ کو صاف کر دیا جہاں ہمارے ہاتھ لگے تھے۔ چابی اگنیشن سوئچ میں چھوڑ کے میں نے دل ہی دل میں اس شخص سے معذرت کی اور پھر دروازہ بند کر کے آگے چلا گیا۔

"کیا تم میری ڈرائیونگ کا کمال نہیں دیکھو گے؟" میں نے ترلوینی سے کہا۔

"کسی اور کو آج تک یہ گاڑی چلاتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔" اس نے کہا۔ "تم کو بھی ایسا نہیں کرنا چاہیے۔"

"مگر تم کو وہی کرنا چاہیے جو میں کہوں۔"

"ضد سے تمھیں نقصان ہو سکتا ہے۔" ترلوینی نے اپنی سیٹ پر رہتے ہوئے کہا۔ "ویسے تمھاری مرضی۔"

اس کے تذبذب اور انکار نے جہاں مجھے مشتعل کیا تھا، وہاں یہ سوچنے پر بھی مجبور کر دیا تھا کہ تعاون کا عملی مظاہرہ کرنے والا ترلوینی ایک معمولی سی بات پر کیوں اڑ گیا ہے۔ کیا اسے معلوم نہیں کہ اس کی مرضی نہیں چل سکتی اور ضد کا نقصان اگر ہو سکتا ہے تو اسے۔ وہ ہمارے رحم و کرم پر ہے اور بے بس ہے۔ یقیناً کوئی ایسی بات تھی جو میں فوری طور پر نہیں سمجھ سکا۔ ترلوینی نے مجھے بضد دیکھا تو وہ دوسری سیٹ کی طرف کھسکنے لگا۔ اس نے ہاتھ کی صفائی دکھانے کی کوشش کی لیکن میری نظروں سے وہ خفیف سی حرکت پوشیدہ نہ رہ سکی جو اس نے ایک باریک سے تار کو چھپانے کے لیے کی تھی۔

میں نے ظاہر یہ کیا کہ میں نے کچھ نہیں دیکھا اور اس کی شاندار گاڑی کو آگے بڑھا دیا۔ بمبئی میں غیر ملکی لمبی چوڑی

کاریں گنتی کی تھیں اور یہ کار یقیناً منفرد تھی۔ تریونی نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اس کار کو پہچاننے والے بہت ہوں گے اور انہیں ڈرائیور کی جگہ ایک اجنبی چہرہ نظر آئے گا تو ان کے دل میں شکوک جنم لیں گے مگر کیا تریونی جیسا دولت مند اپنی کار خود چلاتا ہو گا؟ نہیں،۔ وہ ایک نہیں دس شوفر رکھ سکتا تھا۔ اس کے محل یں بہت کاریں تھیں اور ان کاروں کو چلانے والے بھی تھے۔ ماں ہر کام نوکر کرتے ہوں، وہاں ڈرائیونگ جیسا مشکل کام ر دکون کرتا ہے۔ میں نے سوچا۔ اصل بات وہی تھی جو تریونی چھپانا چاہتا تھا مگر چھپا نہیں سکا تھا۔

وہ باریک سا تار اس کے کوٹ کی نچلی جیب میں غائب ہو چکا تھا۔ غور کرنے پر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ کسی واکی ٹاکی یا کار فون کا تار تھا جس کو تریونی کار کے بند دروازے سے باہر لٹکائے بیٹھا ہوا تھا اور اس کار فون یا ٹرانسمیٹر کے ذریعے وہ سب گفتگو کہیں سنی جا رہی تھی جو اس کے اور ہمارے درمیان ہوئی تھی۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ کار بیٹری سے لگایا جانے والا تار ہو اور تریونی کی جیب میں موجود کسی ٹیپ ریکارڈ کو چلاتا ہو۔

میں تریونی سے کچھ پوچھے بغیر بھی اس کی جیب میں ہاتھ ڈال سکتا تھا لیکن اندیشہ یہ تھا کہ وہ شور کرے گا اور اگر جیب میں ٹرانسمیٹر ہوا تو یہ شور بھی نشر ہو جائے گا۔ اس کے نادیدہ محافظ جان لیں گے کہ باس سے رابطے کا ذریعہ باقی نہیں رہا۔ پھر وہ براہِ راست رابطہ قائم کریں گے۔

تریونی نے خاموشی کے طویل ہو جانے والے وقفے کو ختم کیا "تمہیں کچھ معلوم ہے کہ جانا کہاں ہے؟"

میں نے کہا "کیا تم کو نہیں معلوم کہ ہم سب کو بالآخر کہاں جانا ہے؟"

"تم جو کچھ کر رہے ہو، بے سبب کر رہے ہو" وہ بولا۔

میں نے کہا "کیا تم بے سبب کچھ نہیں کرتے؟ میرا خیال ہے کہ پہلے تو تم پیدا ہی بلاوجہ ہوئے۔ تم جیسے شیطانوں کی دنیا کو کبھی بھی ضرورت نہیں رہی۔ اب تم بلاوجہ مُصر ہو کہ میں ہی تم کو جہنم رسید کروں۔"

"تم بالکل غلط سمجھ رہے ہو۔ میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔" تریونی بولا۔

میں نے تمسخر اڑانے کے لیے طنزیہ انداز میں کہا "آئی سی، پھر کیا ہو تم۔ میرے دوست؟"

"دوست کوئی کسی کا نہیں ہوتا۔ سب مشترک مفادات کے لیے ساتھی بن جاتے ہیں۔"

میں نے کہا "یہ تمہاری زندگی کا تجربہ ہے۔ اس بھی عبرت کا سامان ہے۔"

تریونی نے کہا "میں تمہاری مدد کرنا چاہتا تھا اسی لیے ان چھوکریوں کے ساتھ آ گیا تھا۔ ان کو یقیناً کہ انھوں نے ایسا زبردست کارنامہ سرانجام دیا کہ تریونی نہیں کر سکا اور چوہے کی طرح پکڑا گیا۔ صورتِ حال اس برعکس ہوتی اگر میں خود ایسا نہ چاہتا۔ خیر یہ ڈراما بُرا نہیں اس طرح کسی کو مجھ پر شک نہیں ہو گا کہ میں تمہاری مدد چاہتا تھا۔"

"اس لطیفے پر مجھے ہنسی نہیں آئی" میں نے کہا۔

"اسٹاپ دس نان سنس" تریونی بولا "اور جیسا میں ہوں ویسا کرو۔ میں کسی ایڈونچر میں وقت ضائع نہیں کر سکتا تم کو بھی احمقانہ ہنگامہ آرائی سے گریز کرنا چاہیے۔ مجھے بتاؤ آخر کس راستے پر جا رہے ہو تم؟"

"یہ نجات کا راستہ ہے" میں نے اس کی سنجیدگی کو نظر کرتے ہوئے کہا "دنیا کو تم سے نجات ملے گی اور تم کو اس گناہ گار اور مجرمانہ زندگی کے بوجھ سے۔"

"کیا تم یہ دیکھنا چاہتے ہو کہ اس راستے پر تمہاری پیش کو روکا جا سکتا ہے؟" وہ بولا "او کے۔ میں تم کو دکھاتا ہوں"

تینوں لڑکیاں خاموشی سے ساری گفتگو سن رہی تھیں اور ابھی تک انھوں نے آپس میں بھی کوئی بات نہیں کی تھی اس کا ایک سبب کشیدگی کی فضا تھی تو دوسرا سبب تریونی کی موجودگی۔ تاہم مجھے یقین تھا کہ وہ پوری طرح مستعد ہیں۔

جب تریونی نے جیب میں سے ایک پاکٹ ٹرانسمیٹر نکال کر میرے سامنے ڈیش بورڈ پر رکھ دیا... تو میں ذرا کنفیوز ہو گیا۔ ابھی تک میں اس خیال سے مطمئن تھا کہ جب یہ راز فاش کروں گا تو تریونی کی سٹی گم ہو جائے گی۔ میں انجانے راستوں سے گزرتے ہوئے سمت کا خیال رکھا تھا ایک ہی دائرے میں چلتے رہنے کا امکان نہ رہے۔ سمت مغرب کی طرف تھا اور میں آبادی سے دور کسی بھی ساحل پہنچنا چاہتا تھا۔ دوپہر کے وقت ساحل عموماً ویران ملتے ہیں ہم اب مضافات کی کسی نئی آبادی سے گزر رہے تھے۔ جدید وضع کی کوٹھیاں اور ان کے شاندار باغات مکینوں کی دولت کا منہ بولتا اشتہار تھے۔ بمبئی میں ایک ایک انچ زمین سونے کے بھاؤ ملتی ہے اور سونے کو بھی جگہ نہیں ملتی۔ یہاں باغات کے سبزہ و گل کو دیکھ کر وہ خاک نشین، خاک بسر بلاماں لوگ یاد آتے تھے جن کو جینے مرنے کے لیے فٹ

بھی میسر نہ تھا۔

فضا میں سمندر کی نمی اور بو کچھ زیادہ ہو گئی تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہی سڑک مجھے چند منٹ میں ساحل پر پہنچا دے گی۔ سڑک کے کنارے گاڑی روک کے میں تریونی سے کچھ نہیں پوچھ سکتا تھا اور ابھی تک مجھے کوئی زیرِ تعمیر عمارت بھی ویران نظر نہیں آئی تھی جہاں میں اپنے اطمینان کے مطابق تفتیش کر سکتا۔

اچانک سامنے کی کسی لین میں سے ایک واٹر ٹینکر نمودار ہوا۔ سڑک تنگ تھی مگر اتنی بھی نہیں کہ آمنے سامنے سے دو ٹرک آسانی سے نہ گزر پائیں مگر واٹر ٹینکر نے میرے سیدھے ہاتھ کی طرف سے گزرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ وہ بالکل سامنے آ گیا اور پھر تھوڑا سا گھوم کے ترچھا رُک گیا۔ میں نے زبردست بریک لگائے اور کار تقریباً ٹرک کو چھو کر رُک گئی۔

"انھوں نے میرا نہیں، تمہاری زندگی کا راستہ روکا ہے۔" میں نے غرا کے کہا۔

"ان سے کہو راستہ چھوڑ دیں" پیچھے سے نازو نے حکم دیا۔

"ورنہ تم مجھے گولی مار دو گی؟" تریونی سپاٹ لہجے میں بولا۔

ٹرک ڈرائیور نے خاصی بلندی سے مجھے دیکھا "کیا بات ہے؟ دارو پیے لا ہے سالا۔ اپنا سائڈ کا ہے کو چھوڑتا ہے!" وہ بمبئی کے بدمعاشوں کے روایتی حلیے میں تھا اور اسی لہجے میں بول رہا تھا۔

ٹرک ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے ہوئے دوسرے باقاعدہ بدمعاش نے میرے کچھ بولنے سے پہلے چیخ کر کہا "گالی دیتا ہے۔" اور نیچے اتر آیا۔ اس کے ہاتھ میں صرف ایک کمانی والا چاقو تھا۔ جسے اس نے ڈرامائی تاثر دینے کے لیے پوری آواز کے ساتھ کھولا۔

تریونی میری طرف دیکھ کے مسکرایا۔ پھر اس نے ایک ہاتھ سے ایسے اشارہ کیا جیسے ناک پر بیٹھی ہوئی مکھی کو اُڑا رہا ہو مگر یہ راستہ چھوڑ دینے کا اشارہ تھا۔ کمانی دار چاقو والے نے بلیڈ کو ہاتھ سے دبا کر سر ہلایا اور واپس ٹرک میں جا بیٹھا۔ ڈرائیور نے ٹرک کو تھوڑا سا پیچھے کیا اور پھر سائڈ سے گزار دیا۔ اتنی دیر میں دو کاریں پیچھے بھی آئی تھیں مگر ڈرائیور قریب آنے سے پہلے ہی راستہ بند دیکھ کے بھاگ گئے تھے۔ بمبئی میں بھی کوئی کسی پھڈے کا تماشائی یا گواہ نہیں بننا چاہتا اور یہ جاننے کی کوشش ہی نہیں کرتا کہ قانون کو کس نے اپنے ہاتھ میں لیا ہے۔ مظلوم کون ہے اور غلطی کس کی ہے۔

پانچ منٹ میں تریونی کے اشارے پر ہونے والا ڈراما ختم ہو گیا تھا اور اب وہ فاتحانہ انداز میں مسکراتے ہوئے میری

شکست کی خفت کو دیکھ رہا تھا۔

"اس واٹر ٹینکر میں پانی نہیں تھا" وہ بولا۔

میں نے کہا "ہاں۔ اس میں ایٹم بم ہوں گے۔"

"میں چاہتا ہوں کہ جو کام کی بات ہے وہ کی جائے" اس نے ٹرانسمیٹر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

میں نے ٹرانسمیٹر کو پہلے جھپٹ کر اپنی جیب میں ڈال لیا۔ "میں نے تم کو یہ تار سمیٹ کر جیب میں ڈالتے دیکھ لیا تھا تمہارے محافظ کتے اسی کے ذریعے ساری گفتگو سن رہے تھے۔"

"میں نے تم کو بتا دیا تھا کہ ڈرائیونگ تم کرو گے تو خطرہ مول لو گے۔" وہ بولا۔

"تمہاری جیب میں خود کار ریوالور بھی ہو گا۔ جو تم نے عمداً استعمال نہیں کیا۔" میں نے تلخی سے کہا۔

اس نے اقرار میں سر ہلایا اور دوسری جیب میں سے ریوالور نکال کے میرے سامنے رکھ دیا "یوسی۔ میں خود آنا چاہتا تھا اور میں تمہارے طریقۂ کار کی تعریف کرتا ہوں۔ اس سے میری پوزیشن خراب نہیں ہوئی۔ میرا ایک اشارہ بھی کافی ہوتا لیکن میں نے کہا کہ کسی کو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں خود جا کے دیکھتا ہوں کہ معاملہ کیا ہے۔ جب میں خیریت سے واپس پہنچ جاؤں گا، تو اس سے کیا ثابت ہو گا؟ یہی کہ میں تنہا بھی اپنے دشمنوں سے نمٹنے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔ ایک بزدل آدمی بدمعاشوں پر حکم چلانے کی پوزیشن میں نہیں ہوتا۔"

"تم بہادر ہوتے تو واقعی اکیلے آتے۔ مسلح فوج تمہارے پیچھے تھی!"

وہ بولا "بہادری اور بے وقوفی میں فرق ہے۔ میں اپنے دفاع سے کبھی غافل نہیں ہوتا اور ناکامی کے امکانات کو نظر انداز نہیں کرتا۔ مثلاً اس ٹرانسمیٹر میں فنی خرابی پیدا ہو جاتی تو معلوم ہے میں کیا کرتا۔ میں اس بٹن کو دبا دیتا۔"

میں نے ڈیش بورڈ کے اس بٹن کو دیکھا جس پر تریونی نے انگلی رکھی تھی "اس سے کیا ہوتا؟ اندر چھت میں سے مشین گنیں نمودار ہو جاتیں جن کا رخ ہماری طرف ہوتا یا ایسی طلسمی شعاعیں خارج ہوتیں کہ ہم بھک سے اُڑ جاتے۔"

وہ مسکرایا "سائنس فکشن میں جو کچھ بھی ہوتا ہے، سب خیالی اور ناممکن نہیں ہوتا لیکن میرا انتظام بہت سیدھا سادہ ہے۔ میں آدھے منٹ کے لیے سانس روک لیتا۔ اس سے پہلے ہی تم سب بے ہوش ہو جاتے۔ اس بٹن کو دباتے ہی اندر ایک گیس بھر جاتی ہے جس کی کوئی بُو بھی نہیں ہوتی۔ مجھے ایک منٹ تک سانس کو روکنے کی خاصی مشق ہے۔"

"آل رائٹ مسٹر تریوینی ۔" میں نے خاموشی کے ایک مختصر وقفے کے بعد کہا۔ "تم نے ثابت کر دیا ہے کہ تم ناقابلِ تسخیر ہو۔ چونکہ ہم ابھی مرنا نہیں چاہتے، اس لیے تم بھی زندہ رہو گے۔ ورنہ یہ سب انتظامات دھرے رہ جاتے۔ دلاور ہوتا تو تمھیں بتاتا کہ یہ زندگی ہم کتنی بار داؤ پر لگا چکے ہیں لیکن وہ مقصد مختلف ہے جس پر جان دینا ہمارا مقصد ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔ تم لوگ یہ سمجھتے ہو کہ جہاد کر رہے ہو۔ تم مرنا نہیں چاہتے۔ شہید کہلانا چاہتے ہو۔" تریوینی بولا۔

"گویا دلاور تمھیں سب کچھ بتا چکا ہے۔" میں نے کہا۔

"کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ہم آگے چلیں اور کہیں بیٹھ کے بات کریں۔" تریوینی بولا۔ "ساحل پر میری ایک ہٹ ہے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "کھلے ساحل پر میں خود کو زیادہ محفوظ سمجھتا ہوں۔"

وہ مسکرایا۔ "مسٹر سکندر بخت! جب تم میرے ساتھ ہو تو محفوظ ہو، ہر جگہ۔ ورنہ کہیں بھی محفوظ نہیں ہو۔ جیسا کہ تم نے ابھی دیکھا۔ تمھارے لیے کوئی چوائس نہیں ہے۔ مجھ پر اعتماد کے سوا۔ اور یہ اعتماد تمھارے حق میں اچھا ہوگا۔ میں جھوٹ بولنے کی ضرورت محسوس ہی نہیں کرتا۔ میں واقعی تمھاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔"

میں نے پلٹ کے پیچھے دیکھا۔ خواتین دم بخود بیٹھی تھیں اور شاید بہت پہلے قائل ہو چکی تھیں کہ تریوینی کے دستِ تعاون کو جھٹکنا کوئی عقلمندی کی بات نہیں ہوگی۔ انھوں نے بیک وقت سر ہلا کے اس خیال کا اظہار کیا تو میں نے رسک لینے کا فیصلہ کیا۔ دس منٹ کے بعد تریوینی کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے میں نے کار کو اس کی بیچ ہٹ کے احاطے میں روک لیا۔

بیچ ہٹ سرخ پتھروں اور شیشے کی بے حد خوب صورت عمارت تھی۔ سمندر کے رخ اس کی سب دیواریں بے داغ شیشے کی تھیں جن کے سامنے چھت سے فرش تک پہنچنے والے ریشمی پردے آویزاں تھے۔ اس نے ایک ڈوری کھینچی تو یکلخت سمندر اپنی تمام وسعت کے ساتھ میرے سامنے آ گیا لیکن اس کا تاثر بڑا عجیب تھا۔ سمندر متلاطم تھا اور جھاگ اڑاتی لہریں مسلسل ساحل سے ٹکرا رہی تھیں مگر یہ سمندر بالکل خاموش تھا۔ اس کی پُر ہیبت گونج کو شیشوں نے روک لیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے میرے سامنے سینما کے پردے پر سمندر کا منظر ہے مگر سینما ہال کے لاؤڈ اسپیکر خاموش ہیں۔

"مجھے افسوس ہے کہ اس وقت یہاں کوئی خدمت گار نہیں ہے۔" تریوینی بولا۔ "میں کسی پروگرام کے بغیر آ گیا ہوں لیکن کچن میں سب کچھ ہوگا۔ چائے کافی۔ اور وہ بھی جو مرد پیتے ہیں۔"

میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ "اگر شراب پینے والے ہی مرد ہوتے ہیں تو میں خواتین کی صف میں رہنا پسند کروں گا اور کافی کو کافی سمجھوں گا۔ مگر تم یہاں بیٹھو۔" میں نے نازو سے کہا۔ رالعہ اور گل اشارہ سمجھ کے کمرے سے چلی گئیں۔

"تریوینی! ہم پہلے ہی بہت وقت ضائع کر چکے ہیں، ہمارے دو ساتھی دلاور نے اغوا کر لیے ہیں۔" میں نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔ "ابھی تک کوشش کے باوجود ہمیں ان کا سراغ نہیں ملا۔ صرف تم ہی دلاور کے بارے میں بتا سکتے تھے کہ وہ کہاں ہوگا لیکن تمھیں تلاش کرنا بھی آسان نہیں تھا۔"

"چنانچہ اس کے لیے تمھیں مشکل راستہ اختیار کرنا پڑا۔" تریوینی نے کمرے کے قالین پر بے آواز قدموں سے ٹہلنا شروع کیا۔ "مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم بار بار گئے اور بار بار کے ساتھ شیامو دادا کے اڈے پر پہنچے۔ وہاں تم نے خاصا کشت و خون کیا۔"

"تمھاری انٹیلی جنس سروس بہت فعال ہے۔"

"ایسی باتیں چھپی نہیں رہتیں۔" وہ بولا۔ "باربرا بہت حرافہ ہے۔ اس نے پولیس کو مکمل رپورٹ دے دی ہے۔ خود کو شیامو دادا کے عتاب سے بچانے کے لیے۔"

"شیامو دادا اب کہاں ہے؟"

"اس کا گینگ تو ہے۔" تریوینی بولا۔

"کیا شیامو دادا تمھارا دشمن تھا؟" میں نے کہا۔

تریوینی نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہ دوست تھا نہ دشمن۔ اس کا اپنا کاروبار تھا۔ ہم ایک دوسرے کے راستے نہیں کاٹتے تھے۔ یہ بقائے باہمی کے لیے ضروری ہے۔ ایسے معاہدے ہم آپس میں اپنے فائدے کے لیے کرتے ہیں۔ دشمنی اس وقت شروع ہوتی ہے جب کوئی کسی کے کاروبار میں دخل دے۔ مجھے تعجب ہے کہ تم شیامو دادا کو مار کے زندہ کیسے نکل آئے!"

"قید تو تم نے بھی کر لیا تھا مجھے!"

تریوینی چلتے چلتے رک گیا۔ اس کے چہرے پر بدمزگی کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ "تم اپنی کوشش سے کامیاب نہیں ہو سکتے تھے لیکن تمھاری قسمت یقیناً اچھی تھی کہ ایک دھوبن نے تمھاری خاطر جان دینا منظور کر لیا تھا۔"

"... تم... تم نے اسے مار دیا۔" میں نے محسوس کیا کہ میرے حلق میں کڑواہٹ گھل گئی ہے۔

"ظاہر ہے۔" تریوینی بولا۔ "نمک حرامی کی سزا سب کے لیے ایک ہی ہوتی ہے۔ کیا تم آستین میں سانپ پالنے والے کو عقلمند کہہ سکتے ہو؟"

مجھے اس خبر سے صدمہ ہوا تھا۔ میرے لیے اس دھوبن نے جرأت اور ذہانت کا بے مثال مظاہرہ کیا تھا۔ اس نے بھی مجھ پر اپنی جان کا قرض چھوڑ دیا تھا جو میں اپنی جان دے کر یا تریوینی کی جان لے کر ادا نہیں کر سکتا تھا۔

"وہ ایک بہادر عورت تھی تریوینی۔" میں نے کہا۔ "یقیناً وہ جانتی تھی کہ تم کتنے طاقتور ہو اور تمھارے مقابلے میں وہ کتنی کمزور ہے۔ اسے بھی معلوم ہوگا کہ اس کا یہ جرم کتنا سنگین سمجھا جائے گا اور اس کی سزا کیا ہوگی۔ تم اسے آستین کا سانپ کہہ سکتے ہو مگر یہ بھی تو دیکھو کہ اس نے تم جیسے خوں آشام اژدہے سے ٹکر لی۔ کیا تم میں اتنی ہمت ہے؟ اپنے سے ہزار گنا زیادہ طاقتور حریف کے خلاف قدم اٹھانے کی؟ نہیں تریوینی۔ تم اسے سلام کرو گے۔ اس کا راستہ کبھی نہیں کاٹو گے۔ اپنی بقا کے لیے اس کے ساتھ کوئی سمجھوتا کر لو گے۔ تم طاقتور کے سامنے کمزور بن جاؤ گے۔"

"ہاں۔ اگر مجھے یا تمھیں زندہ رہنا ہو تو ایسے سمجھوتے کرنے پڑیں گے۔" وہ بولا۔ "قانونِ قدرت یہی ہے۔ بڑی مچھلی ہمیشہ چھوٹی مچھلی کو نگل جاتی ہے۔ بڑی مچھلیاں آپس میں نہیں لڑتیں۔ شیر اور چیتا ایک ہی جنگل میں شکار کرتے ہیں مگر کمزور جانور کا۔ وہ ایک دوسرے پر حملہ نہیں کرتے۔"

"یہ جنگل کا قانون ہے۔ میں انسانوں کی بات کر رہا تھا جو تم نہیں سمجھو گے۔" میں نے کہا۔ "مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے دلاور کے ساتھ بقائے باہمی کی بنیاد پر اپنے فائدے کا سودا کیوں نہیں کیا؟ اس کے مقابلے میں میری مدد کیوں کرنا چاہتے ہو تم؟ کیا تمھیں ڈر نہیں کہ اس کو معلوم ہوگا تو وہ تمھارا بھی دشمن ہو جائے گا؟"

تریوینی کچھ دیر خاموشی سے ٹہلتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔ "ہر آدمی کسی نہ کسی پہلو سے کمزور ہوتا ہے سکندر بخت۔ میں بھی بہت سخت آدمی ہوں۔ جتنا سخت باہر سے نظر آتا ہوں، اندر سے اس سے زیادہ سخت ہوں اور یہ سختی ایک دن یا ایک سال کی پیداوار نہیں ہے۔ یہ ساری عمر کی سختی ہے۔ سختی جھیلنے کی صلاحیت مجھ میں یقیناً پیدائشی تھی لیکن مجھ میں اضافی صلاحیت سختی اختیار کر لینے کی تھی چنانچہ آہستہ آہستہ میں اندر سے سخت ہوتا گیا۔ جیسے کوئلہ۔ جو بدصورت اور بے وقعت ہوتا ہے۔ زمین کے اندر کی سختی، حرارت.... اور دباؤ سے رفتہ رفتہ بدلتا جاتا ہے۔ ظاہر میں بھی اور باطن میں بھی۔ یہاں تک کہ وہ ہیرا بن جاتا ہے۔ پھر اس سے زیادہ قیمتی، روشن اور سخت چیز کوئی نہیں رہتی۔ مثال کے لیے تم سمجھ لو کہ میں بھی کوئلہ تھا۔"

"اور اب کوہِ نور ہیرا ہو؟" میں نے طنز سے کہا۔

"ہاں۔ میری یہ سب شان و شوکت۔ دولت اور طاقت مجھے ورثے میں نہیں ملی تھی۔ یہ میں نے خود حاصل کی اور اس کے لیے مجھے سخت ہونا پڑا۔ میں نیک، رحمدل اور جذباتی ہوتا تو تریوینی نہ ہوتا لیکن اب میں تریوینی ہوں۔ میرے نام کی دہشت ہے اور انسانی زندگی کی قیمت میرے نزدیک مٹھی بھر نوٹ ہیں جو میں کسی بھی پیشہ ور قاتل کی جھولی میں ڈال دوں تو وہ اپنے باپ کو قتل کر آئے لیکن میرا ایک اصول ہے۔ میں بے سبب قتل بھی نہیں کرتا۔ دلاور کیا چیز ہے۔ اسے میں یوں غائب کرا دوں۔" وہ چٹکی بجا کے بولا۔

"وہ ایک خطرناک دشمن ثابت ہو سکتا ہے۔"

"ہر دشمن خطرناک ہی ہوتا ہے جس سے خطرہ محسوس نہ ہو وہ دشمن کیا ہوا۔" تریوینی بولا۔ "مگر جب تک وہ خود میرے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھاتا، میں اسے نظر انداز کرتا رہوں گا اور میرا خیال یہ ہے کہ وہ بے وقوف نہیں ہو سکتا۔"

میں نے کہا۔ "میں تسلیم کرنے پر مجبور ہوں کہ وہ ذہین ہے۔ عیار اور مکار ہے۔"

"ظاہر ہے، پھر وہ مجھ سے دشمنی کے چکر میں نہیں پڑے گا۔"

"ہاں۔ یہ اس کا ہوم گراؤنڈ نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "پھر بھی میری مدد کر کے تمھیں کیا ملے گا؟ دلاور کی مدد کر کے تم جو فائدہ حاصل کر سکتے تھے، وہ کیوں ٹھکرا رہے ہو!"

"میں نے کہا نا۔ کہ ہر آدمی کسی نہ کسی پہلو سے کمزور ہوتا ہے۔" وہ بولا۔ "ایک کمزوری میری بھی ہے۔ میں کسی کا قرض نہیں رکھتا۔ احسان بھی ایک قرض ہوتا ہے۔ میں کسی کا احسان قبول ہی نہیں کرتا۔ اس لیے کہ میں قرض لینے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ میرا ہر کام برابری کی بنیاد پر یا نقد ہوتا ہے۔ شاید میں نے بتایا تھا تمھیں کہ میں پیسہ خرچ کر کے بے فکری خریدتا ہوں۔ کوئی پریشانی مجھے اس لیے نہیں ہوتی کہ اس کا حل کسی نہ کسی سے خریدا جا سکتا ہے لیکن اب مسئلہ یہ بن گیا ہے کہ تم نے مجھ پر ایک احسان کر دیا ہے۔"

"میں نے؟"

"ہاں۔ تم کملا کو۔ میری بیٹی کو بچا لائے۔ تم نے اس شخص کو بھی مار دیا جو اسے اغوا کر کے لے گیا تھا۔ یہ سب تم نے انجانے میں کیا۔ تم کو معلوم نہیں تھا کہ کملا کون ہے اور کس کی بیٹی ہے اور کیسے وہ اس انسانی ریوڑ میں شامل کر لی گئی ہے جو ایکسپورٹ کیا جا رہا تھا۔"

"تم بھی اس ایکسپورٹ کے کاروبار میں شامل ہو؟"

تریوینی نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور مجھ سے

نظر بھی نہیں ملائی۔ وہ شفاف شیشوں کے پار خاموش سمندر کے تلاطم کو دیکھتا رہا۔

"اس کاروبار میں ایسا تو ہو جاتا ہے ترلوینی۔" میں نے کہا "تم یہ کیوں بھول گئے تھے کہ تمھاری بھی ایک بیٹی ہے۔"

"اس بات کو چھوڑو۔ بات ہے تمھارے احسان کی جو تم مجھ پر کر چکے ہو۔" وہ پلٹ کے بولا "وہ سب کچھ نہ کر سکے جن کو میں نے اس کام پر مامور کیا تھا۔"

"اور کیا معاوضہ تھا تمھاری اس بیٹی کی عزت کا اور زندگی کا؟"

"معلوم نہیں۔ کم سے کم دس افراد نے کہا تھا کہ وہ کملا کا سراغ لگائیں گے۔ انھوں نے پوچھا تھا کہ انعام کیا ملے گا اور میں نے کہا تھا کہ ابھی بتا دو۔ کسی نے بھی دس لاکھ سے زیادہ کی بات نہیں کی تھی اور میں نے سب کو دس گنا دینے کا وعدہ کیا تھا۔"

"ان میں وہ بھی تو ہو سکتے تھے جو خود کملا کو اغوا کر کے لے گئے تھے۔"

ترلوینی نے نفی میں سر ہلایا "اتنی ہمت کس میں ہے کہ ترلوینی کی بیٹی کو اٹھا لے اور پھر معاوضہ لے کر چھوڑ دے۔ یہ ایک انتقامی کارروائی تھی۔ تم نے اسے ناکام بنا دیا اور کملا واپس گھر پہنچ گئی۔ اس احسان کا قرض میں تمھیں ایک کروڑ روپیہ دے کر اتار سکتا تو میرے لیے بہت آسان ہوتا۔ کوئی اور کملا کو لاتا تو میں اپنے وعدے کے مطابق زیادہ سے زیادہ اتنی ہی رقم ادا کرتا اور مجھ پر کوئی قرض باقی نہ رہتا لیکن مجھے معلوم ہے کہ تم ایک کروڑ کیا دس کروڑ لے کر بھی میرے منہ پر مار دو گے۔"

"یہ تم نے کیسے جانا؟"

وہ تلخی سے مسکرایا "تم کو لالچ ہوتا تو تم کملا کو نہ ٹھکراتے۔ وہ تمھارے لیے پاگل ہو گئی تھی۔ پاگل تو وہ ہے۔ مگر اسے میں نے کسی کے سامنے اتنا گرتے نہیں دیکھا تھا۔ اس نے کسی سے محبت کی بھیک کبھی نہیں مانگی تھی۔ تم اس سے شادی کر سکتے تھے۔"

"تمھیں کوئی اعتراض نہ ہوتا؟"

"نہیں۔ میرا تو مسئلہ حل ہو جاتا۔ یہ اس کا علاج ہوتا۔ اور ظاہر ہے پھر میرا سب کچھ تمھارا ہوتا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ مجھ پر تمھارا احسان باقی رہ گیا۔ احسان کے بدلے میں تم پر احسان کر سکتا ہوں۔"

"جہاں تک ہمارا تعلق ہے، ہم نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا تھا۔" میں نے کہا "لیکن تم اپنے کمپلکس سے بچنے کے لیے احسان کرنا چاہتے ہو تو ہمیں دلاور کے بارے میں بتا دو، وہ کہاں ملے گا۔"

"دلاور نے مجھے اپنے کاروبار میں شراکت دار بنانے کی پیشکش کی تھی۔" ترلوینی نے کہا "وہ بہت منافع بخش کاروبار کر رہا ہے لیکن میں بہت سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مجھے انکار کر دینا چاہیے۔"

"بہت منافع بخش سمجھنے کے باوجود۔ تم اس کاروبار میں شریک نہیں ہونا چاہتے۔"

"ہاں۔ منافع بخش تو بہت سے دھندے ہیں مگر میں ہر کام میں ہاتھ نہیں ڈالتا۔" وہ بولا۔

"یہ ضمیر اور شرافت کی بات تو ہو نہیں سکتی۔ ہر غیر قانونی اور غیر اخلاقی کام کرنے والا ترلوینی..."

اس نے میری بات کاٹ دی "یہ ایک سیاسی کاروبار ہے۔ میرا مطلب ہے اس کاروبار کے پیچھے دہشت گرد کی عالمی سیاست کا ہاتھ بھی ہے۔ اس خطے کی جنگ یا خانہ جنگی ٹوٹ پھوٹ، انتشار اور عدم استحکام میں سپر پاورز کو بہت دلچسپی ہے۔ معلوم نہیں گولہ بارود کے اس کھیل کا انجام کیا ہوگا۔ جیت کس کی ہوتی ہے، یہ کوئی نہیں جانتا۔ سیاست میں الٹ پھیر ہوتے رہتے ہیں۔ آج کے دشمن کل پھر دوست ہو جاتے ہیں اور دوست آپس میں لڑ سکتے ہیں۔ میرے حق میں یہی بہتر ہے کہ اس چکر میں نہ پڑوں جس کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میں سیاست کا وہ مہرہ نہیں بننا چاہتا جسے چلنے والے ہاتھ جب چاہیں پیٹ دیں۔ اس کے علاوہ وہی ایک بات ہے جو میں نے ابھی کہی تھی کہ میں بے سبب قتل کرنے کا قائل نہیں ہوں اور بے حساب منافع کا لالچ بھی قائل نہیں کر سکا کہ یہ قتل عام جائز ہے جو مشرقی پاکستان میں ہو رہا ہے۔ مجھے اس کے سیاسی اسباب سے سروکار نہیں اور نہ یہ سوچتا ہوں کہ مرنے والے ظالم ہیں یا مظلوم، لیکن وہ قتل عام میں بوڑھے، بیمار اور بچے، فاقہ کش عورتیں اور نادار لوگ سب شامل ہوں، بے سبب ہے۔ ان کو تو سیاست کا مطلب بھی نہیں پتا، نہ وہ مجیب کے چھ نکات کو سمجھتے ہیں اور نہ دو قومی نظریے کو۔ اپنے سیاسی حریف کو قتل کرنا میری سمجھ میں آتا ہے۔ وہ ایک طرح سے کاروباری حریف ہوتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کا دشمن کون ہے اور دشمنی کی وجہ کیا ہے۔ جیسے میں جانتا ہوں کہ کوئی مجھ پر گولی چلانے آئے گا تو کیوں آئے گا اور وہ میرا دشمن ہوگا تو کیوں ہوگا۔ میں بھی یہ نہیں کر سکتا کہ کسی کو ایک ہتھیار دوں اور کہوں کہ جاؤ کسی بھی جھونپڑ پٹی میں یا کسی بھی فٹ پاتھ پر سوتے ہوئے دس آدمی مار آؤ۔ اسلحہ کسی ایسے آدمی کے ہاتھوں میں نہیں جانا چاہیے جو اس کا جائز استعمال نہ کرے۔"

میں اسے حیرانی سے دیکھتا رہا۔ نہ صرف یہ کہ اس نے اپنی سیاسی سمجھ بوجھ کی معقولیت کا مظاہرہ کیا تھا بلکہ اپنی شخصیت کے ایک ایسے پہلو کو بھی بے نقاب کر دیا تھا جو شاید کسی نے نہیں دیکھا تھا۔

میں نے کہا "تم نے بالآخر مجھے قائل کر لیا ہے کہ تم شیطان نہیں ہو۔ شیطان اور آدمی کے درمیان فرق کتنا بھی کم ہو جائے مگر نہ شیطان کبھی انسان بن سکتا ہے اور نہ انسان پورا شیطان۔ تم احسان کو تسلیم کرتے ہو اور بے گناہ خون کے خلاف ہو۔ چنانچہ اپنی تمام ظاہری و باطنی سختی اور فطری خباثت کے باوجود تم آدمی ہو۔ بہت برے آدمی ہو مگر آدمی ہو۔"

اس کی صورت پر عجیب طرح کی طمانیت سے پُر مسکراہٹ پھیل گئی "تھینک یو۔"

رابعہ اور گل کافی بنا لائی تھیں۔ انھوں نے بھی ترلوینی کے خیالات سنے تھے اور متاثر نظر آ رہی تھیں۔ ترلوینی کے اور ہمارے درمیان کشیدگی کم ہو گئی تھی۔

"دلاور کو یہ سب معلوم نہیں ہونا چاہیے۔" ترلوینی نے بیٹھتے ہوئے کہا "ورنہ وہ میرا دشمن ہو جائے گا پھر مجھے اس کے خلاف کارروائی کرنی پڑے گی اور اگر میرا نقصان ہوا تو اس کا ذمے دار میں تمھیں سمجھوں گا۔"

"ہمارے پاس اتنا وقت ہی نہیں ہے کہ ہم یہاں کسی کی دوستی یا دشمنی کے چکر میں پڑیں۔" میں نے کہا "ہم مجبوراً یہاں رُکے تھے اور ہماری بدقسمتی کہ دلاور کو یہاں ہماری موجودگی کا علم ہو گیا۔ ہم اگر اس لانچ کو واپس نہ لاتے تو نہ اس کارنامے کی شہرت ہوتی اور نہ دلاور کو ہمارا سراغ ملتا۔ اس کے بعد ہمیں اس لیے رُکنا پڑ گیا کہ ہمارے دونوں ساتھی اغوا ہو گئے۔"

"اور تمھیں یقین ہے کہ انھیں دلاور کے سوا کوئی اغوا نہیں کر سکتا؟" ترلوینی بولا۔

"نہیں۔ ہمیں یہاں جانتا کون ہے؟" میں نے کہا۔

"انھیں اغوا کرنے کا مقصد؟"

"یہ معلوم کرنا کہ باقی لوگ کہاں ہیں اور ہمارا پروگرام کیا ہے۔" میں نے کہا "وہ جاننا چاہتا ہے کہ ہم اس کے پروگرام کے بارے میں کتنا جانتے ہیں۔"

"وہ ایک بین الاقوامی گروہ کا رکن ہے۔ اسلحے کے کاروبار میں ملوث لوگ بہت خطرناک ہوتے ہیں۔"

"ہم بھی ایک بہت بڑی طاقت ہیں۔ ایم آر ایس کا نام ضرور سنا ہوگا تم نے۔"

ترلوینی نے نفی میں سر ہلایا "میں اخبار نہیں پڑھتا۔ میرے کام کی خبر مجھے اپنے ذرائع سے مل جاتی ہے۔"

"یہ وطن پرست، انسانیت دوست اور انصاف پرور شوریدہ سر انسانوں کی تنظیم ہے۔"

"شوریدہ سر؟"

"جنونی اور خبطی۔ فینیٹک کہہ سکتے ہو تم۔" میں نے کہا۔

"اور کیا قوت ہے اس تنظیم کی؟" وہ بولا۔

"لامحدود۔ کیونکہ جذبے کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ ہم موت کی سرحد سے بھی آگے چلے جاتے ہیں — شہید ہو کر۔"

"میرا مطلب افرادی قوت سے تھا۔" ترلوینی نے کہا۔

"وہ بھی بہت ہے۔ ہر قدم پر ہر جگہ۔ جہاں بھی ہم جاتے ہیں ہمارے ساتھی، ہمارے حمایتی موجود ہوتے ہیں۔ جو عملاً ہماری مدد کرتے ہیں۔ اس حد تک ہمارے ہم خیال تم بھی ہو کہ تم اس قتل عام کے خلاف ہو جو مشرقی پاکستان میں ہو رہا ہے اور تم ہماری مدد بھی کر رہے ہو۔" میں نے کہا۔

ترلوینی متاثر نظر آنے لگا تھا۔ اس نے کہا "بات یہ ہے کہ دلاور تک پہنچنا آسان نہیں ہوگا۔ پہلے اس نے روم نمبر "فور زیرو فور ہوٹل سی سائڈ" دیا تھا۔ پھر نمبر یہی رہا مگر اس نے "ہوٹل پام گروو" بتایا۔"

"لیکن وہ دونوں جگہ نہیں ملا ہوگا۔"

"ہاں۔ ہوٹل سی سائڈ والوں نے کہا کہ اس کمرے میں کوئی چوہدری دلاور نہیں ہے۔"

میں نے کہا "کیا انھوں نے بتایا تھا کہ وہاں کون ہے؟"

ترلوینی نے نفی میں سر ہلایا "وہ کیوں بتلاتے۔ لیکن ہوٹل پام گروو کی آپریٹر نے غلطی سے بتا دیا تھا۔"

"تمھیں یاد ہے وہ نام۔" میں نے کہا۔

ترلوینی نے ذہن پر زور دیا "کسی نواب کا نام لیا تھا۔"

"نواب خسرو جمشید؟" میں نے کہا۔

"یس۔ یہی نام تھا۔ مگر تمھیں کیسے معلوم ہوا؟"

میں نے ذہانت کے اس مظاہرے پر داد طلب نظروں سے خواتین کی طرف دیکھا "یہ بھی چوہدری دلاور کا ایک مرحوم نام ہے۔"

"مرحوم نام؟"

"ہاں۔ ان کا ایک ساتھی تھا جو مارا جا چکا ہے۔ اگر تم ملنے جاتے تو تمھاری ملاقات ضرور دلاور سے ہو جاتی۔ ٹیلیفون پر وہ کیسے مل سکتا تھا۔" میں نے کہا "خیر اب ہم اسے تلاش کریں گے۔"

"ایک بات اور بتادوں۔" وہ بولا۔ "بمبئی کے ساحل سے مشرق کی جانب تیس پینتیس کلومیٹر کے فاصلے پر ایک ویران جزیرہ ہے۔ پہلے وہ ایک بہت دولت مند آدمی کی ملکیت تھا۔ اس نے وہاں ایک محل بنوایا تھا۔ کہتے ہیں اس میں ایک سو اٹھارہ خواب گاہیں تھیں۔ عام دنوں میں وہاں وہ خود رہتا تھا۔ اپنی کنیزوں اور سیکرٹیریوں کے ساتھ۔ کہا جاتا ہے کہ ان لڑکیوں کی مجموعی تعداد ڈھائی سو کے لگ بھگ تھی جو اس کے مہمانوں کی خدمت پر مامور تھیں۔ خدمت کا مطلب تو سمجھتے ہو نا۔ ہر چودھویں چاند کی رات کو وہ ایک ڈنر دیتا تھا جس کے شُرکا ٹاپ کے لوگ ہوتے تھے۔ اس جیسے بزنس مین، اسے کور دینے والے ٹاپ کے بیوروکریٹ، سیاستداں۔ میں خود کبھی وہاں نہیں بلایا گیا۔ کیونکہ میں نچلی سطح کا آدمی تھا لیکن میں نے سنا ہے کہ اس ڈنر کے لیے خفیہ دعوت نامے ارسال کیے جاتے تھے اور جو لوگ مدعو ہوتے تھے وہ اپنے آپ کو خوش قسمت تصور کرتے تھے۔ ظاہر ہے، اس رات کوئی خواب گاہ خالی نہیں رہتی تھی۔ میں کسی کا نام نہیں لے سکتا مگر میں نے سنا ہے کہ کچھ مہمان تو مستقل تھے، تقریباً نصف۔ باقی نصف بدلتے رہتے تھے۔ اس میں دہلی اور آسام تک کے لوگ بلائے جاتے تھے اور شاید بیرونی ممالک سے بھی۔ یہ ایک کاروباری تقریب ہوتی تھی لیکن عام آدمی اسے عیاشی کا نام دیتا تھا۔ حالانکہ جس قسم کے لوگ وہاں آتے تھے ان کو عیاشی کے لیے کہیں جانے یا جمع ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی، وہ عیاشی کے لیے روز ٹوکیو یا پیرس بھی جا سکتے ہیں اور ان کی زندگی میں عیاشی اتنی اہم بھی نہیں ہوتی۔ خیر یہ ایک دلچسپ کہانی تھی اس لیے سنادی۔ بتانا میں یہ چاہتا تھا کہ اب وہ محل ایک کھنڈر ہو گیا ہے۔ صرف دس سال پہلے جہاں پریاں رہتی تھیں، وہاں اب بھوتوں کا بسیرا ہے۔"

میں نے کہا۔ "کیا حکومت کی نظر میں آگئی تھی وہ جگہ؟"

ترلوینی پہلی بار ہنسا۔ "کبھی کبھی معقول آدمی بھی احمقانہ بات کر سکتا ہے، جیسے کہ تم نے ابھی کی۔ حکومت کرنے والے تو خود وہاں ہوتے تھے۔ سب نہیں مگر کچھ ایسے ضرور ہوتے تھے جو حکومت سمجھے جا سکتے تھے یا جن کے لیے حکومت کوئی چیز نہیں تھی۔ وہ محل آج بھی آباد ہوتا لیکن اسے قدرت نے اجاڑ دیا۔ اس ایک مربع کلومیٹر کے جزیرے کو جنوب کی طرف سے ایک چٹان نے بچا رکھا تھا جو دیوار کی طرح مغرب تک پھیلی ہوتی تھی۔ سمندر جب چڑھتا تھا تو یہی دیوار محل کو محفوظ رکھتی تھی۔ شاید ہزاروں لاکھوں سال سے لہریں اس دیوار سے سر ٹکرا رہی تھیں۔ بالآخر انھوں نے دیوار کو شکست دی اور ایک رات چٹان جزوی طور پر گر گئی۔ مجھے یہ بھی بتایا تھا کسی نے کہ ایسا سمندر میں زلزلے کی وجہ سے ہوا۔ وجہ کچھ بھی ہو، جو بات دلچسپ ہے وہ یہ ہے کہ اس رات بھی چودھویں رات کا جشن جاری تھا۔ جب سمندر کا پانی محل کی دیواروں سے ٹکرایا اور خواب گاہوں کے دروازے توڑ کے اندر داخل ہوا تو قیامت آگئی۔ محل کا ایک حصہ منہدم ہونے سے سات افراد تو دب کے مر گئے، تقریباً نصف کو سمندر بہا کے لے گیا۔ ہر موج جب واپس جاتی تھی تو اپنے ساتھ کسی کو لے جاتی تھی۔ جو لوگ دُور بھاگ گئے وہ بچ گئے۔ بھاگے وہی جو ہوش میں تھے۔ لوگوں نے کہا کہ خدا کا قہر تھا۔ گناہوں کی سزا تھی۔ لوگ ایسے واقعات سے اس قسم کے نتائج اخذ کر کے بہت خوش ہوتے ہیں۔ سیلاب کتنی غریب بستیوں کو ہر سال بہا کر لے جاتا ہے۔ محل کا مالک بھی مرنے والوں میں شامل تھا۔ اس کے بعد کسی نے ادھر کا رخ نہیں کیا۔ چٹان کی جگہ کنکریٹ کی دیوار بھی کھڑی کی جا سکتی تھی لیکن کسی نے توجہ ہی نہیں دی۔ بعد میں جسے موقع ملا وہ سازو سامان میں سے کچھ لے گیا۔ دروازے کھڑکیاں تک باقی نہیں رہے۔ اب بھی پانی وہاں اکثر یلغار کرتا ہے۔ محل آہستہ آہستہ گر رہا ہے۔ کچھ عرصہ وہاں اسمگلر اپنا مال اتارتے رہے۔ کسٹم والوں نے چھاپے مارنے شروع کیے تو یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ غالباً دلاور اسی جزیرے پر ہے۔"

میں نے پوری بات خاصی دلچسپی کے ساتھ سنی تھی مگر مجھے اندازہ نہ تھا کہ اس کا اختتام اتنا حیرت انگیز ہو گا۔

میں نے چونک کر کہا۔ "یہ خیال کیسے آیا تمھیں؟"

"اسے دیکھ کر۔" ترلوینی نے کہا۔

"تم نے اسے جزیرے پر دیکھا ہے۔ پھر شک کی کون سی بات ہے۔ ضرور محسن اور غالب وہیں قید ہوں گے۔"

"نہ میں نے اسے جزیرے پر دیکھا ہے اور نہ میں یقین کے ساتھ کچھ کہہ رہا ہوں۔" ترلوینی بولا۔ "ایک اطلاع تھی مجھے کہ دلاور کو جوہو بیچ پر دیکھا گیا ہے۔ اس کا تعاقب کرنے والے نے بعد میں بتایا کہ وہ کسی لانچ پر گیا تھا۔ جب لانچ واپس آئی تو وہ لانچ پر نہیں تھا۔ لانچ چلانے والے نے تصدیق کی کہ ایک شخص اس جزیرے پر گیا تھا۔ جاتے وقت اس نے آنے جانے کا معاوضہ طے کیا تھا۔ مگر وہاں پہنچ کر اس کا ارادہ بدل گیا۔ اس نے کرایہ دونوں طرف کا دے دیا معاہدے کے مطابق۔ مگر لانچ کو رخصت کر دیا۔ ظاہر ہے ایک لانچ کے ناخدا کو اپنے ارادے کے بدل جانے کی وجہ یا اپنا نام بتلانے کا پابند نہیں تھا۔ تاہم اس کے حلیے سے

ظاہر ہوتی تھی کہ وہ دلاور ہی ہو سکتا ہے۔ مزید یہ کہ میرے آدمی 'سی سائیڈ' اور 'پام گروو' دونوں ہوٹلوں کی نگرانی کر رہے ہیں۔ ان کی رپورٹ ہے کہ گزشتہ رات سے اب تک روم نمبر فور زیرو فور خالی ہے۔ دلاور کو ہوٹل میں آتے یا وہاں سے نکلتے ہوئے کسی نے بھی نہیں دیکھا۔ ایک روم میڈ نے تصدیق کی ہے کہ دلاور کے حلیے کا ایک آدمی اس کمرے میں کبھی کبھی آتا ہے۔ دونوں جگہ۔ مگر اس کے آنے کا اور جانے کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے اور اس کا نام وہی ہے، نواب خسرو جمشید۔"

"تمھاری سیکرٹ سروس کی رپورٹ میرے لیے بہت مددگار ثابت ہو گی۔" میں نے کہا۔ "یہ بتاؤ کہ ہم وہاں جانا چاہیں تو لانچ کے علاوہ بھی کسی ذریعے سے جا سکتے ہیں؟"

"لانچ پر جانے میں کیا ہے؟"

"اگر وہ وہاں ہوئے تو انھیں ہماری آمد کا علم ہو جائے گا اور وہ ہمارا استقبال گولیوں سے کریں گے۔" میں نے کہا۔

"تم رات کے وقت جا سکتے ہو۔ لانچ کی آواز بہرحال ان کے کانوں تک پہنچ جائے گی۔" ترلوینی نے کہا۔

"تم ہماری مدد کرنا چاہتے ہو تو ہمارے بحفاظت وہاں اُتر جانے کا کوئی بندوبست کر دو۔" میں نے کہا۔

"تم ابھی۔ اسی وقت جاؤ گے؟" ترلوینی نے کہا۔

"اگر یہ ممکن ہو تو اس سے بہتر بات کیا ہو گی کہ ہم جلد از جلد ان تک پہنچ جائیں۔" میں نے کہا۔

"لانچ کا بندوبست میں کر سکتا ہوں۔" اس نے اپنی رسٹ واچ دیکھ کر کہا۔ "ایک بجا ہے اس وقت۔ دو گھنٹے بعد تم جا سکتے ہو مگر... سوال وہی ہے کہ... اچھا دیکھو میں کوشش کرتا ہوں، اگر کسٹم کی کوئی لانچ مل جائے اور تم کسٹم والوں کی وردی میں وہاں اُتر سکو۔"

"یہ محفوظ ترین صورت ہو گی۔" میں نے کہا۔ "ہم اطمینان سے جزیرے کی اور پورے محل کی تلاشی بھی لے سکیں گے۔"

"پھر میں چلتا ہوں۔" ترلوینی اُٹھ کھڑا ہوا۔ "تم لوگ یہیں ٹھہرو۔ انجوائے کرو۔ اچھی خوبصورت لڑکیاں جمع کی ہیں تم نے، اور یہ لڑکی تو پٹاخہ ہے۔ ایکٹنگ اچھی کر لیتی ہے اور ہمت والی بھی ہے مگر لڑکا نہیں بن سکتی۔ کیوں سردار جی؟"

گل کا چہرہ گلابی ہو گیا۔ میں نے ترلوینی کی بات کا بُرا نہیں مانا۔ وہ ہم سب کو اپنی نظر سے دیکھ رہا تھا۔ ہم اسے کیا بتاتے کہ ہم دو گھنٹے میں کیا انجوائے کریں گے جب ہم نے اس زندگی کے لیے خود کانٹوں کی سیج سجالی ہے حالانکہ یہ عمر اور ہمارے حالات اپنے دامن میں خوشیوں کے سب پھول بھر لینے کے لیے بھی سازگار ہو سکتے تھے۔ جسے رابعہ جیسی عورت کی محبت اور زر زندگی پر کامل تصرف حاصل ہو اور جسے دلاور نے لاکھوں نہیں کروڑوں کے خزانے کی کنجی تھما دی ہو، وہ اپنے لیے دربدری اور حسرتِ تعمیر کے خواب منتخب کرے، وہ ترلوینی جیسے شخص کی نظر میں تو پاگل ہی ٹھہرے گا۔ مگر اپنی یہی دیوانگیِ عشق تو وہ انداز تھا جس پر مجھے بھی اتنا ہی ناز تھا جتنا رابعہ کو۔ یا غالب کو اور نازو کو۔

"تمھیں اور کچھ چاہیے تو بولو۔ آج جو چاہو، مانگ لو۔" ترلوینی نے کہا۔

"کل تم ہمیں پہچانو گے بھی نہیں۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں اپنا قرض بے باق کر رہا ہوں اور میں یہ نہیں پسند کروں گا کہ کل تم اس قرض کی دوسری قسط وصول کرنے آجاؤ۔ یکمشت مانگ لو مجھ سے کچھ بھی۔ نقد رقم۔ اسلحہ۔"

میں نے کہا۔ "سوچ کے بتاؤں گا۔"

ترلوینی نے سر ہلایا۔ "سوچ لو اور مشورہ کر لو۔ میں تین بجے سے پہلے ہی پھر آؤں گا۔"

اس کی شاہانہ بلیک شیورلٹ بے آواز چلتی ہوئی کاٹیج کے ڈرائیو وے سے گزر گئی تو میں نے اطمینان کا سانس لیا اور صوفے پر دراز ہو گیا۔ اسی کمرے میں رابعہ کے ساتھ گل بیٹھی ہوئی تھی اور نازو کنگ سائز بیڈ پر دراز تھی۔

"ساڈے دل وی تے ویکھو سوہنیو۔" گل نے رابعہ کے گالوں پر چٹکی لے کر کہا۔ "اسی تے مر گئے آں۔"

رابعہ کا رنگ سرخ پڑ گیا۔ "یہ کیا بیہودگی ہے۔"

نازو نے ہنسنا شروع کیا۔ "سردار جی! ہم چلے جائیں؟ بڑا پیار آ رہا ہے سردارنی پر۔"

میں نے سگریٹ جلاتے ہوئے کہا۔ "خاک پیار آ رہا ہے۔ ناک کٹوا دی مردوں کی۔ وہ جاتے جاتے پٹاخہ کہہ گیا۔"

اب گل کا رنگ گلابی ہونے لگا۔

رابعہ ہنسی۔ "تم سے نہیں ہو گا یہ مردانہ رول۔ تم وہ زنانہ رول کر لو۔ ورنہ ہر جگہ یہی ہو گا۔"

گل نے بگڑ کے کہا۔ "پتا نہیں کتنی بار میں مردانہ لباس میں بھیا کے ساتھ وارداتوں میں شریک ہوئی۔ کبھی کسی نے نہیں پہچانا۔"

میں نے کہا۔ "کہتی تم بھی ٹھیک ہو مس گل بانو۔ دراصل وہ تمھارا نہیں ناگ منی کا روپ تھا۔ جسے کسی نے نہیں پہچانا تھا۔ اب تم گل بانو بن کے سب بھول گئی ہو کہ مردوں کے کیا انداز ہوتے

ہیں۔ یاد ہے تمھیں کہ تم سگریٹ پیتی تھیں اور فراٹے سے مردانہ وار گالیاں بکتی تھیں۔ وہ گالیاں جو دوسرے لوگ بھی عام گفتگو میں استعمال کرتے تھے تمھاری زبان پر بھی چڑھی ہوئی تھیں۔ اب تو داڑھی مونچھ لگا کے بھی تم وہی ہائے اللہ اور اوئی اللہ سے بات کرو گی!"

گل کا شرم سے بُرا حال ہوگیا "اب میں ویسی تو پھر بن نہیں سکتی۔"

"بھئی تمھارے لیے کیا مشکل ہے۔ جب نمونہ سامنے ہو تو بس نقل ہی اتارتی ہے نا" نازو نے کہا۔

"نمونہ — کیسا نمونہ؟" رابعہ نے کہا۔

"بھئی تمھارے میاں کا کردار کرنا ہے تو میاں کو دیکھ لو" نازو شرارت پر تُلی بیٹھی تھی "اور اگر نہیں دیکھا تو کبھی چھپ کے دیکھو۔ بھئی سکندر! لڑکی ناتجربہ کار ہے۔ اس کے لیے ایک تربیتی مظاہرہ ہونا چاہیے" ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ اس کا ساتھ گل بھی دے رہی تھی۔ چنانچہ رابعہ کی حالت غیر تھی۔

"ہاں ہاں — تربیتی مظاہرے میں میرا رول تو کر لے۔ نازو کی بچی" رابعہ نے اسے نوچنا شروع کیا۔ مجھے بھی ہنسی آگئی۔

جب یہ طوفانِ بدتمیزی تھما تو میں نے کہا "کیا خیال ہے سوئمنگ کے بارے میں۔ کاسٹیوم تو مل جائیں گے۔"

انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر نازو نے چلّا کے کہا "آپ اپنی والی کو لے جائیں نا۔"

میں نے کہا "بھئی وہ دیکھو۔ ادھر۔ اس کے ساتھ تو چار ہیں اور ترلوینی کہہ گیا ہے کہ انجوائے...."

"میں بتاؤں گی غالب اور محسن کو" رابعہ نے کہا۔

"کیا بتاؤ گی؟" میں نے کہا "غالب اور محسن کی پاور آف اٹارنی بھی تو میرے ہی پاس ہے۔ ان کی عدم موجودگی میں ان کی سب اخلاقی اور غیر اخلاقی ذمّے داریاں میں پوری نہیں کروں گا تو کون کرے گا۔"

"بس آگئی مجھے غیرت" نازو ایک دم اُٹھ کھڑی ہوئی اور میرے سامنے آگئی "اُٹھو۔"

رابعہ نے تالی بجائی "شاباش نازو۔ ایسا دھوبی پٹخا دے کہ انجوائے ہم کریں۔"

میں نے نازو کے تیور دیکھے۔ وہ سچ مچ مقابلے کے موڈ میں تھی۔ چنانچہ مجھے اُٹھنا پڑا "خواتین کے لیے رعایتی شو۔"

"کوئی رعایت نہیں" نازو نے کہا اور بجلی کی طرح جست لگا کے آئی۔ میں نے وار خالی دیا مگر وہ پلٹی اور میں اس کی برق رفتاری پر حیران رہ گیا۔ یہ اس کے جسم کا لوچ تھا کہ وہ اس طرح گھوم گئی اور مجھ پر ایک بھرپور وار کرنے میں کامیاب رہی۔ میرا بایاں شانہ سُن ہوگیا۔ میں نے اگلے وار کو ہاتھ پر روکا، اس کی کلائی کو جھٹکا دیا اور اسے اوپر اٹھا کے بیڈ پر پھینک دیا۔ وہ اسپرنگ والے بیڈ سے اچھلی اور مجھے ایک فلائنگ کک مار گئی۔ میں پلٹ کے پیچھے گیا تو صوفے پر اُلٹ گیا۔ رابعہ نے خوب شور مچایا۔

"واہ۔ ایک بار پھر نازو۔ مکرّر ارشاد۔"

گل ہکا بکا کھڑی یہ تماشا دیکھتی رہی۔ اس نے کبھی تصوّر بھی نہیں کیا تھا کہ نازو اتنی اچھی کراٹیکا ہے۔ اس کی اور میری فائٹ خود رابعہ نے پہلی بار دیکھی تھی۔ مجھے یاد تھا کہ میرے اور نازو کے درمیان صرف ایک بار مقابلہ ہوا تھا۔ وہ بھی نازو کے والدین کے گھر میں۔ یہ بہت پرانی بات تھی۔

میں نے جتنی کوشش کی کہ معاملہ مذاق سے آگے نہ بڑھے نازو اتنی ہی سیریس ہوتی گئی۔ بالآخر مجھے بھی سیریس ہونا پڑا۔ رابعہ مذاق بھول گئی اور گل تو باقاعدہ چلاّ چلاّ کے رونے لگی کہ بظاہر مقابلہ بہت سخت ہو رہا تھا اور ہم دونوں ایک دوسرے کو بُری طرح مار رہے تھے۔ یہ صرف ہم جانتے تھے کہ ہم میں سے کوئی بھی غیر محتاط نہیں ہے۔ نہ میں نے نازو پر کوئی ایسا داؤ آزمایا تھا جس سے اسے نقصان ہوتا اور نہ اس نے مجھ پر۔ ہم ایک دوسرے کا پورا خیال رکھتے ہوئے لڑ رہے تھے۔

آخری بار جب میں نے نازو کو گھما کے بیڈ پر مارا تو میرا سانس بُری طرح پھولا ہوا تھا اور نازو بھی ہانپ رہی تھی۔ ایک دم گل نے اور رابعہ نے اسے دبوچ لیا اور وہیں بیڈ پر دبا لیا۔ نازو نے پہلے ہنسنا شروع کیا، پھر میں نے۔

"سردار جی! حد کر دی آپ نے۔ ہم تو کھیل رہے تھے۔ آپ کے بارہ کیوں بج گئے؟" میں نے کہا۔

"یہ کیا وحشیانہ کھیل ہے" گل نے چلاّ کے کہا "ابھی کسی کو چوٹ لگ جاتی پھر...."

رابعہ نے اسے سمجھایا "تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو گل۔ یہ تو بس پریکٹس تھی۔"

نازو نے کہا "ہاں۔ بہت عرصہ ہوگیا تھا۔ میں بالکل آؤٹ آف پریکٹس تھی۔ کہیں موقع ہی نہیں ملا تھا ہاتھ پیر چلانے کا۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا "آپس میں اس قسم کے مقابلے کرتے رہنا چاہیے پریکٹس کے طور پر۔"

گل اب مزید خفیف ہو کے نازو کو حیرت و استعجاب کے ساتھ تعریفی انداز میں دیکھ رہی تھی "ایسے لڑنا کہاں سے سیکھا تھا تم نے؟"

نازو نے بال سمیٹے اور کمر پر لپٹا ہوا دوپٹا کھول لیا "سیکھا تھا کالج کے زمانے میں۔"

"مجھے بھی سکھا دو" گل نے بڑی معصومیت سے کہا۔

نازو ہنس پڑی "سکھا دوں گی۔ مگر پہلے بہت پٹائی ہوتی ہے اور یہ دو چار دن کا کھیل نہیں ہوتا۔ کئی سال لگ جاتے ہیں اسے سیکھنے میں۔"

"کئی سال؟"

"ہاں۔ اور اتنی فرصت کہاں ہے اب۔ نہ تمھارے پاس اور نہ میرے پاس" نازو نے کہا۔

میں نے کہا "ہاں۔ اس سے پہلے ہی۔ چھوڑ بابل کا گھر۔ موہے پی کے نگر۔ تم کو جانا پڑا" میں نے گانا شروع کیا اور خواتین کے ردِ عمل سے پہلے ہی بھاگ کے باتھ روم میں گھس گیا۔

ڈھائی بجے ترلوینی آیا تو ہم سب فرصت کے وقت سے پورا فائدہ اُٹھاتے ہوئے نہا دھو کے تازہ دم ہو گئے تھے اور وہاں جو کچھ دستیاب تھا کھا پی چکے تھے، ہم نے تمام امکانات پر بھی غور کر لیا تھا جو ترلوینی کے نہ آنے یا اس کے دھوکا دینے سے پیدا ہو سکتے تھے۔

ترلوینی اپنی ہی گاڑی میں آیا تھا لیکن اس کے ساتھ دوسری عام استعمال ہونے والی ٹیکسی بھی تھی۔

"تم سب لوگ خاصے بدلے ہوئے لگتے ہو" ترلوینی نے کہا۔

میں نے کہا "ہم انجوائے کرتے رہے۔ تم نے کیا کیا؟"

"یہ ٹیکسی میری ہے اور ڈرائیور بھروسے کا آدمی ہے۔ یہ تم کو وہاں لے جائے گا جہاں سے کسٹم کی ایک لانچ روانہ ہوگی۔ انھیں بتایا گیا ہے کہ جزیرے میں غیر ملکی شراب کا اسٹاک رکھا گیا ہے۔ وہ ایک مخبر کو ساتھ لے جانے پر تیار ہیں اور حفاظت کے لیے اُسے وردی فراہم کرنے پر بھی آمادہ ہیں۔"

"صرف ایک کو؟"

"ابھی سے فوج ساتھ لے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ تم جا کے جزیرے کو اور محل کے کھنڈر کو کسٹم والوں کے ساتھ اچھی طرح کھنگالو۔ اگر تمھیں شک بھی ہو کہ دلاور نے تمھارے ساتھیوں کو وہاں قید کر رکھا ہے تو تم بعد میں پوری تیاری کے ساتھ جا سکتے ہو۔"

"بعد میں کب؟" میں نے کہا۔

"کسی بھی وقت۔ آج رات کو" وہ بولا۔

یہ تجویز مجھے قابلِ عمل لگی۔ میں نے کہا "رات کو تم لانچ کا بندوبست کر دو گے؟"

اس نے کہا "لانچ کے علاوہ کیا چاہیے؟ تم نے کہا تھا کہ سوچ کر بتاؤ گے۔"

اس وقت تک میں نے کچھ نہیں سوچا تھا مگر ایک اسکیم اچانک میرے ذہن میں آگئی چنانچہ میں نے کہا "ہم نے مل کے غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ کچھ چیزوں کی ہمیں اشد ضرورت پڑے گی۔"

"کوئی فہرست بنائی ہے تو مجھے دے دو۔"

میں نے کہا "لکھو۔ لائف جیکٹ چھ عدد...."

ترلوینی نے برہمی سے کہا "میں تمھارا مُنشی نہیں ہوں۔ اس ڈرائیور کو بتا دینا۔ وہ شام تک تمھارے ساتھ رہے گا۔ تمھاری واپسی تک۔"

میں نے کہا "اچھا اسے بلاؤ۔ تمھارے سامنے پوری فہرست ہوگی تو نہ تمھیں پریشانی ہوگی نہ ہمیں۔"

"مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوگی" ترلوینی نے کہا۔

میں نے کہا "فرض کرو ہم نے لکھوا دیں چھ اُڑن طشتریاں، چھ الٰہ دین کے چراغ۔ چھ سلیمانی ٹوپیاں جن کو اوڑھ کے آدمی غائب ہو جاتا ہے......!"

ترلوینی کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی "مجھے دلاور نے بتایا تھا کہ انتہائی خطرے میں بھی تم سیریس نہیں ہوتے۔ میں ڈرائیور کو بلاتا ہوں۔"

ڈرائیور ایک عجوبہ تھا۔ وہ اشرف المخلوقات کی مختصر ترین صورت تھا اور پانچ فٹ قد کا بے حد پورٹیبل آدمی تھا۔ اس کے کپڑے سائز سے بہت بڑے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وردی کے اندر کا آدمی اچانک سکڑ گیا ہے — حیرت انگیز طور پر اس کی آواز بڑی پاٹ دار تھی۔

میں نے کہا "لکھو لائف جیکٹ چھ عدد...."

اس نے مجھے ڈانٹ کر کہا "سائز؟"

میں گڑبڑا گیا "سائز... درمیانہ... میڈیم لکھو۔"

"ٹھیک ہے۔ رنگ بتاؤ۔"

"رنگ جو تمھیں پسند ہو" میں نے کہا۔

"مجھے کوئی رنگ پسند نہیں۔ سفید لائف جیکٹ نہیں ملتی" اس نے پھر مجھے ڈانٹا۔

"اچھا بھائی! ہر رنگ کی ایک لے آؤ۔ قوسِ قزح کے جتنے رنگ ہوتے ہیں۔" میں نے جھلا کے کہا۔

"اس میں سات رنگ ہوتے ہیں۔ دو نظر نہیں آتے۔" اس نے کہا "جیکٹ چھ ہیں۔"

میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ "اُف۔ تم سب زرد رنگ کی لے آؤ۔"

"چلو آگے بھی بولو۔"

میں نے کہا۔ "دو سیٹ واکی ٹاکی۔"

"کتنی رینج کے؟"

میں نے کہا۔ "خبردار جو اب میری بات کاٹی۔ شارٹ ویو۔ پانچ سے دس کلومیٹر رینج۔ نو وولٹ بیٹری یا بارہ وولٹ۔

پورٹیبل۔"

"آپ کی بات پوری ہو گئی؟"

میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ "ہاں۔ آگے لکھو۔"

"واکی ٹاکی کس کمپنی کے ہوں۔" اس نے قلم روک کے کہا۔

"کسی بھی اچھی کمپنی کے۔" میں نے عاجزی سے کہا۔

"کس ملک کی؟"

"جو بھی تمھیں پسند ہو۔" میں نے رو دینے والے انداز میں کہا۔

"مجھے کینیا پسند ہے۔ وہاں واکی ٹاکی نہیں بنتے۔"

"تریوینی! یہ تو مجھے پاگل کر دے گا۔" میں نے اس سے کاغذ قلم چھین لیا۔ "یا پھر شام تک اس کا خون ہو جائے گا میرے ہاتھوں۔"

نازو اور رابعہ اس صورتِ حال سے بہت لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ میری جھلاہٹ پر انھیں ہنسی آ رہی تھی۔ گل کچھ جھینپ رہی تھی کیوں کہ تریوینی اس میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی کا اظہار کر رہا تھا۔

رابعہ نے کہا۔ "تمھاری فہرست مکمل ہو جائے تو مجھے بھی کچھ چیزیں لکھوانی ہیں۔ میک اپ کا سامان۔ نیل پالش۔ لپ اسٹک، ان کے کلر شیڈ وغیرہ۔ تفصیل میں بتا دوں گی۔"

نازو نے کہا۔ "اور چوڑیاں، ہار، بُندے۔ رنگ، ڈیزائن، سائز سب میں لکھواؤں گی۔"

میں نے فہرست میں صرف ایک اور آئٹم کا اضافہ کیا۔ میں نے سائلنسر والے چھ آٹومیٹک ریوالور لکھے اور فہرست تریوینی کو تھما دی۔ میرا خیال تھا کہ اس آخری آئٹم پر وہ معترض ہو گا مگر اس نے صرف سر ہلایا۔ ہمارا کام تو کسی نہ کسی طرح چل ہی رہا تھا

مگر میں نے موقع سے فائدہ اٹھانے میں کوئی حرج نہ سمجھا۔ اگر تریوینی خود کو اتنا ہی صاحبِ اختیار سمجھتا ہے کہ ہمارے لیے سب کچھ کرنے کو آسان سمجھتا ہے تو یہ سامان فراہم کر دے جو ہم خود آسانی سے حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ سوائے لائف جیکٹ کے کوئی چیز بازار میں ملنے والی نہیں تھی لیکن مجھے یقین تھا کہ آگے چل کے ہمیں ان کی ضرورت پڑے گی۔

"شام تک یا رات تک تم اس گاڑی کو جہاں چاہو لے جاؤ۔" تریوینی بولا۔ "کسٹم والوں کی لانچ ساڑھے چار بجے کے بعد جائے گی۔ ظاہر ہے تم اس میں جاؤ گے۔"

"اس وقت تک یہ دماغ خراب کرنے والی چیز بھی ہمارے ساتھ رہے گی؟" میں نے ڈرائیور کی طرف اشارہ کیا۔

"اس کو ساتھ رکھنے میں تمھارا فائدہ ہے۔" وہ بولا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ تو ایسا شخص ہے کہ میں اس کو دائیں ہاتھ مڑنے کے لیے کہوں گا تو یہ پوچھے گا کس رفتار سے مڑنا ہے، کتنے زاویے پر موڑ کاٹنا ہے۔ بغیر دیکھے موڑ کاٹنا ہے یا دیکھ بھال کے۔ سگنل بند ہو تب موڑ کاٹنا ہے یا جب کھلا ہوا ہو۔ موڑ کاٹتے وقت کس کے اوپر سے گزرنا ہے۔ کسی سے ٹکرانا ہے یا نہیں۔ تم کہتے ہو فائدہ ہے۔"

تریوینی مسکرانے لگا۔ رابعہ، نازو اور گل بھی ہنس رہی تھیں مگر وہ شخص جس کا ذکر ہو رہا تھا، ایسے کھڑا ہوا تھا جیسے کوئی بات ہی نہیں ہو رہی ہے۔ تریوینی نے اُسے باہر بھیج دیا۔

"تم جزیرے پر جاؤ گے تو تین چار گھنٹے ضرور لگ جائیں گے۔ یہ اتنی دیر میں لڑکیوں کو بمبئی کی سیر کرائے گا۔"

میں نے کہا۔ "اور جب وہ سیر کر کے آئیں گی تو بال نوچتی ہوئی، پاگل ہو کے۔ میرا خیال ہے کہ ہم اس کے بغیر ہی گزارا کر لیں گے۔"

تریوینی کی نظریں گل پر جمی ہوئی تھیں۔ "تم کیا کہتی ہو؟"

گل کی ہنسی کافور ہو گئی۔ "کس بارے میں...؟"

"بمبئی کی سیر کرنا چاہتی ہو تم؟" تریوینی بولا۔

گل اس کے سوال کا مطلب مجھ سے پہلے سمجھ گئی کیوں کہ وہ بہرحال عورت تھی جو مرد کی نگاہ کو بھی سمجھ لیتی ہے۔ اس نے کہا۔ "مجھے کوئی شوق نہیں۔"

"تم بہت اچھی ایکٹریس ہو۔" وہ بولا۔ "بمبئی میں شاید ہی کوئی ہیروئن تمھارا مقابلہ کر سکے، اگر تم اس لائن میں آ جاؤ۔"

"کیا تم کوئی فلم پروڈیوس کر رہے ہو؟" گل نے کہا۔

تریوینی مسکرایا۔ "میں بھی کر سکتا ہوں، ورنہ جس پروڈیوسر سے میں کہوں وہ تمھیں سائن کر سکتا ہے۔"

"راج کپور سائن کرے گا؟" گل نے کہا۔

"وہ... ہاں... تم کو دلچسپی ہے تو بتاؤ۔ اور دلچسپی کیوں نہیں ہو گی۔ اس کیریئر میں سب کچھ ہے۔"

"بس تو پھر ٹھیک ہے۔" گل نے کہا۔ "ہم، میرا مطلب ہے میں اور میرا شوہر آپ سے ملیں گے۔ وہ بھی اتنا ہینڈسم ہے کہ دلیپ کمار اس کے جوتے صاف کرے۔ آپ دیکھیں گے تو قائل ہو جائیں گے۔ ہم دونوں کے لیے لیڈنگ رول سائن کرانے کا بندوبست آپ کر لیں۔ بڑی مہربانی ہو گی آپ کی۔ کوئی چائلڈ اسٹار کا رول ہو تو میرا بڑا لڑکا ہے نو دس سال کا۔ اس سے چھوٹی لڑکی ہے پانچ سال کی۔"

ہم سب بالکل سیریس رہے جتنے اعتماد کے ساتھ گل نے تریوینی سے بات کی اور یہ بات سُن کے تریوینی کی جو حالت ہوئی اس سے مجھے دلی خوشی ہوئی۔ اب تک گل اس کے گھورنے سے پریشان تھی۔ وہ شرما رہی تھی اور جھینپ رہی تھی، مگر بات جب حد سے گزر گئی تو گل نے اس کو ایک ہی بار میں چت کر دیا۔

تریوینی بے وقوف نہیں تھا کہ گل کے جھوٹ کو نہ سمجھتا لیکن وہ گل کو جھوٹا بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔

اس نے جان چھڑانے کے لیے کہا۔ "ہاں۔ ہاں دیکھیں گے بعد میں۔ اب میں چلتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہو گی۔ میں نے تمھارے احسان کا قرض چکا دیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "ہم نے کسی قرض کی ادائیگی کا مطالبہ نہیں کیا تھا۔ جو کچھ تم نے کیا اس کے لیے شکریہ۔ بُرا نہ مانو تو ایک بات کہوں۔"

"کہو۔" تریوینی بولا۔

"یہ احسان اور قرض والی بات مجھے ایک جھوٹ لگتی ہے۔ اصل بات کچھ اور ہے۔"

تریوینی کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ "کیا؟"

"میرا خیال ہے کہ تم اپنی بیٹی کملا کی وجہ سے مجبور ہوئے ہو۔ اس نے تمھیں بلیک میل کیا۔ یا تم پر دباؤ ڈالا اور تم سے سودا کیا کہ تم میری مدد کرو۔" میں نے کہا۔

تریوینی کا چہرہ سُرخ پڑ گیا۔ وہ کچھ دیر بے بسی سے اپنے ہونٹ کاٹتا رہا۔ سچ کے اعتراف کی تحریر کو میں اس کی جھنجلاہٹ میں پڑھ سکتا تھا۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس کچھ دیر سے ہوا۔ مجھے بھلا کیا ضرورت تھی اسے مُنہ پر جھوٹا کہنے کی۔ اس کے جھوٹ سے ہمیں کوئی نقصان نہیں ہو رہا تھا۔ وہ جھوٹ بول کے اپنی اَنا کا بھرم رکھ رہا تھا۔ اب یہ ہو سکتا تھا کہ وہ مشتعل ہو جائے اور ہماری مدد کا ارادہ بھی بدل دے۔ اس جیسا کینہ شخص ہمارا دشمن بھی ہو سکتا تھا۔

وہ ایک دم پلٹا اور کمرے سے نکل گیا۔ ہم نے اس کی گاڑی کے انجن کو غراتے سُنا۔ پھر گاڑی راکٹ کی طرح گیٹ سے نکل گئی۔ غصے میں اس کا گاڑی پر پورا کنٹرول نہیں رہا تھا۔ گیٹ سے گزرتے ہوئے گاڑی کا پچھلا حصہ دیوار سے ٹکرایا اور دیوار کا ایک کونا منہدم ہو گیا۔

"مجھے تو لگتا ہے کہ راستے میں ہی اس کا ایکسیڈنٹ ہو جائے گا۔" گل نے کہا۔ "خدا کرے ہو جائے۔"

"تم نے بلاوجہ اسے مشتعل کیا۔" رابعہ نے کہا۔ "ہر جگہ سچ کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

"سچ تو سچ ہے۔ کڑوا لگتا ہے۔" میں نے کہا۔

"میرا مطلب تھا کہ سچ کا اظہار موقع محل دیکھ کے کرنا چاہیے۔ اس سچ سے نقصان ہمارا ہی ہو سکتا تھا۔" رابعہ نے کہا۔

"کیا ہم اس پر بہت زیادہ بھروسا نہیں کر رہے ہیں؟" نازو بولی۔

گل نے اس کی تائید کی۔ "میرا تو خیال ہے کہ لعنت بھیجو اس کی مدد پر۔ جو کچھ کرنا ہے ہم خود کریں گے۔"

میں نے کہا۔ "لیڈیز! میں اپنی غلطی تسلیم کرتا ہوں مگر ڈرنے کی اور جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ لوگوں کو کیا معلوم کہ میرے ذہن میں کیا ہے۔ اب ہم کو یہاں سے نکل جانا چاہیے۔"

ٹیکسی ڈرائیور بڑے اسٹائل سے بیڑی پی رہا تھا۔ اس نے بیڑی کو بجھا کے کان پر اٹکایا اور بڑی مستعدی سے پیچھے والا دروازہ کھولا۔ میں آگے بیٹھ گیا تو اس نے ٹیکسی کو اسٹارٹ کیا۔

"تم کو معلوم ہے نا کہ ہمیں کہاں جانا ہے؟"

"معلوم ہے۔" اس نے کہا۔ "کس راستے سے جانا ہے؟"

"مختصر راستے سے۔" میں نے کہا۔

"مختصر کیا ہوتا ہے؟ ہندی میں بتاؤ۔"

"چھوٹے راستے سے۔" میں نے کہا۔

"چھوٹا راستہ شمشان سے گزرتا ہے۔ بیچ میں نالہ پڑتا ہے۔"

"تو پھر لمبے راستے سے چلو۔" میں نے زچ ہو کے کہا۔

"کتنے لمبے راستے سے۔ بہت سے لمبے راستے ہیں۔"

پیچھے نازو ہنسی مگر میں نے جوابی کارروائی کا فیصلہ کیا۔

"لمبے راستے کتنے ہیں؟ سب سے لمبا راستہ کون سا ہے؟"

اس نے مجھے سب سے لمبا راستہ بتایا۔ میں نے پوچھا یہ راستہ کتنے کلومیٹر لمبا ہے۔ اس راستے کے دونوں طرف کتنی دُکانیں کتنے مکان ہیں۔ سڑک پر کتنے مین ہول ہیں۔ بجلی کے کھمبے کتنے ہیں اور ٹیلی فون کے کتنے۔ وہ بوکھلا گیا۔ میرے ہر سوال کے جواب میں اسے معلوم نہیں کہنا پڑتا تھا۔

"خاک معلومات ہیں تمھاری۔ ڈرائیور ہو تم یا کاٹھ کے اُلّو۔ سڑک پر سے گزرتے وقت آنکھیں بند رکھتے ہو کیا؟ ابھی میں نے صرف ایک راستے کے بارے میں پوچھا ہے۔ مگر تم کچھ نہیں جانتے۔ باقی راستوں کے بارے میں کیا بتاؤ گے؟"

میں نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا "تم وقت ضائع کرتے ہو میرا۔ چار بجے تک مجھے نہ پہنچایا تم نے تو سمجھ لو تمھاری خیر نہیں۔

سمندر میں بیس کلومیٹر ٹیکسی چلا کے لے جانی پڑے گی کبھی چلائی ہے پہلے سمندر میں ٹیکسی؟ کس سمندر میں چلائی ہے؟

بحرالکاہل میں؟ اسی لیے اتنے کاہل ہو...؟"

وہ مجھ سے زیادہ زبان نہیں چلا سکتا تھا۔ اگر وہ میرے بے تکے سوالات کا جواب دینے کی کوشش کرتا تو خود پاگل ہو جاتا۔ اس نے خاموشی اختیار کی اور میں نے فاتحانہ نظروں سے پیچھے دیکھا۔ رابعہ نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا کہ بس اتنا کافی ہے۔ نازو نے اشارے سے کہا کہ بالکل ٹھیک ہے یہ سلوک، تماشا جاری رکھو۔ مگر میں اسے زیادہ پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔ کہ کہیں وہ جھنجلا کے ٹیکسی کھمبے میں نہ مار دے اور پھر کہے کہ اب بولو۔

پونے چار بجے اس نے ہمیں سمندر کے ساحل پر پہنچا دیا۔ یہ پورٹ کا آخری حصہ تھا جہاں کسٹم والوں کی ان گنت موٹر بوٹس اور لانچیں نظر آ رہی تھیں۔ یہ خاصی پریشان کُن صورتِ حال تھی۔ تریوینی نے مجھے اس لانچ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا جس پر مجھے جزیرے تک جانا تھا۔ میں رابعہ، نازو اور گل سے مشورہ بھی کرنا چاہتا تھا لیکن اس ڈرائیور کی موجودگی میں بات نہیں کی جا سکتی تھی۔

میں نے اس سے کہا "وہ لانچ کون سی ہے جس کا ذکر تریوینی نے کیا تھا؟"

"مجھ سے انھوں نے کسی لانچ کا ذکر نہیں کیا تھا۔" وہ بولا۔

"اچھا۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا "کیا نام ہے تمھارا؟"

"کون سا نام؟"

میں نے کہا "کیا نام بھی کئی ہوتے ہیں؟"

"میرے تین نام ہیں۔" وہ بولا

"تین نام کیوں ہیں؟" میں نے لطف لیتے ہوئے کہا

"لوگوں کی مرضی۔ ماں باپ نے غلام محمد کہا، لوگ گامو کہنے لگے۔ تریوینی صاحب غلام کہتے ہیں۔"

میں نے ہنس کے کہا "جوکر کیوں نہیں کہتے، وہ بھی تو ہی ہوتا ہے۔ خیر تم نیچے اُتر کے مشرق کی طرف تیس درجے کے زاویے پر بیس میل فی گھنٹا کی رفتار سے جاؤ اور چالیس [illegible] کے فاصلے پر رُک کے سمندر کو گھورتے رہو تین بج کر [illegible] منٹ تک۔"

اس نے قابلِ رحم نظروں سے میری طرف دیکھا اور نیچے اُتر کے میری بتائی ہوئی سمت میں چل پڑا۔

تینوں لڑکیوں نے اب ہنسنا شروع کیا۔ "وہ بے چارا عادت سے مجبور ہے، تم اسے کیوں پریشان کرتے ہو؟"

"اس لیے کہ میں پریشان ہونا نہیں چاہتا۔" میں نے کہا "یہ اگر ایک ہفتہ رہے میرے ساتھ تو اس کی عادتیں درست ہو جائیں۔ خیر اب وہ بات سنو جو میں اس کے سامنے کہنا نہیں چاہتا تھا۔"

رابعہ نے انگوٹھے کی مدد سے اس طرف اشارہ کیا جدھر اس ٹیکسی کا ڈرائیور غلام محمد یا گامو کھڑا ہوا تھا۔ میں نے اس کا مطلب سمجھ لیا۔ رابعہ مجھے خبردار کرنا چاہتی تھی کہ کہیں یہ گفتگو اس کے کانوں تک نہ پہنچ رہی ہو۔ وہ ٹھیک چالیس قدم کے فاصلے پر رُک گیا تھا۔ جو اندازاً چالیس گز ہی ہوتے ہیں۔ لیکن کسی معمولی سے واکی ٹاکی یا بچوں کے کھلونے جیسے ریڈیو کے لیے یہ فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ اگر کار میں کہیں خفیہ مائکرو فون ہوتے تو وہ آسانی سے ہماری ساری گفتگو سُن سکتا تھا۔ تریوینی کی گاڑی میں مواصلاتی رابطے کے مؤثر نظام کا مشاہدہ ہم سب کر چکے تھے۔ اس میں اپنے دفاع اور کسی ممکنہ دشمن کے خلاف کارروائی کا بھی غیر معمولی بندوبست تھا۔ یہ گاڑی بھی خود تریوینی ہی لایا تھا اور اس نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ ڈرائیور اس کا اپنا آدمی ہے چنانچہ یہ بات بعید از امکان نہ تھی کہ اس ٹیکسی میں بھی اس نے جاسوسی کے لیے خصوصی آلات نصب کرائے ہوں۔ تریوینی کی ملکیت ہونے کے باوجود یہ ٹیکسی تھی اسے تریوینی کی عیاری سمجھا جا سکتا تھا۔ ٹیکسی پبلک ٹرانسپورٹ ہوتی ہے، ہم اسے محفوظ سمجھ سکتے تھے۔ ٹیکسی کسی کی نظر میں بھی نہیں آتی کیوں کہ ایسی ہزاروں گاڑیاں ہر جگہ ہر وقت نظر

آتی ہیں۔

رابعہ کی دُور اندیشی نے ہمیں بچا لیا۔ میں نے غلام کی طرف دیکھا تو وہ بڑے فرماں بردارانہ انداز میں سمندر کو دیکھ رہا تھا۔ لیکن مجھے ایسا لگا جیسے اس کی توجہ پیچھے ہماری طرف ہے، اسے آزمانے کے لیے میں نے کہا "تم لوگ اس کے ساتھ بمبئی کی سیر کرنے جاؤ تو ذرا محتاط رہنا۔ یہ شخص مجھے پاگل لگتا ہے۔"

یہ بات کہتے ہوئے میری نگاہ ڈرائیور پر تھی۔ میں نے واضح طور پر اس کے جسمانی ردِعمل کو نوٹ کیا۔ اس کے سر کو جھٹکا سا لگا اور محاورے کے مطابق اس کے کان کھڑے ہو گئے۔

"پاگل تو نہیں۔ خبطی ہے۔" رابعہ نے کہا۔

میں نے کہا "نہیں۔ مجھے تو وہ ایک ایسا شخص نظر آتا ہے جس پر جنون کے دورے پڑتے ہوں گے۔ اس کے سائز پر مت جاؤ۔ اس کے اطوار بتاتے ہیں کہ وہ ایک جنسی جنونی ہے اور مجھے یہ موروثی مرض لگتا ہے۔ اس کا باپ پاگل ہوگا یا ماں جنسی جنون میں مبتلا ہوگی۔"

یہ بہت بڑی گالی تھی۔ باپ کی حد تک شاید وہ.... برداشت کر جاتا مگر ماں پر یہ تہمت بہت سنگین تھی۔ ضبط سے کام لینے کی پوری کوشش کے باوجود وہ سر گھما کے مجھے گھورے بغیر نہ رہ سکا۔ صرف ایک بار اس نے پلٹ کر دیکھا پھر شاید اسے اپنی غیر ارادی حرکت کی غلطی کا احساس ہو گیا۔ وہ پھر سامنے دیکھنے لگا۔

اب میرے لیے شک کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ ٹیکسی کے اندر یقیناً کہیں مائکروفون پوشیدہ تھا جو اس گفتگو کو ڈرائیور تک پہنچا رہا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا مگر مجھے اس کے کانوں میں کوئی ایئر فون یا پلگ دکھائی نہ دیا۔ اگر اس کی کسی جیب میں سے نکلنے والا تار کانوں تک جاتا تو اس سے تاثر یہی ملتا کہ وہ اونچا سنتا ہے اور "ہیرنگ ایڈ" استعمال کرتا ہے۔ مگر میں دھوکا نہ کھاتا۔ میں اسے رسیور ہی سمجھتا۔ لیکن ایسی کوئی بات نہ تھی۔

میں نے گلوز کمپارٹمنٹ کو کھول کے دیکھا۔ اس میں صرف کاغذات تھے۔ ڈیش بورڈ پر ایک پینسل بھی رکھی ہوئی نظر آئی۔

میں نے لکھا "تم اچانک عقلمند ہو گئی ہو۔ ڈرائیور واقعی سُن رہا ہے۔"

جواب میں رابعہ نے لکھا "اچانک کی کوئی بات نہیں، میں ہمیشہ سے عقلمند ہوں۔ دوسرا مشورہ یہ ہے کہ باتیں جاری رکھیے۔"

میں نے کہا "تفریح کے لیے کہاں کہاں جانے کا ارادہ ہے؟" کاغذ پر میں نے لکھا "میں گل کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ تم رابعہ کا بھی خیال رکھنا۔ اور اس پُراسرار ڈرائیور کا بھی۔" یہ تحریر میں نے نازو کو پیش کی۔

رابعہ نے کہا "دل تو چاہتا ہے سارا بمبئی دیکھ لیں۔"

میں نے کہا "دماغ خراب ہے تمھارا۔ تین چار گھنٹے ہیں تمھارے پاس، ایسا نہ ہو کہ وقت کا خیال ہی نہ رہے، یہاں میں انتظار کرتے کرتے دُنیا سے گزر جاؤں۔"

اتنی دیر میں نازو نے لکھا "مجھے شروع سے شک تھا کہ یہ آدمی جیسا نظر آنے کی کوشش کرتا ہے ویسا نہیں ہے۔"

میں نے زور سے کہا "میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اب کدھر جاؤں، آخر کس لانچ پر جانا تھا مجھے؟"

اس کے بعد میں نے کاغذ پر لکھا "غلام محمد کو آہستہ سے آواز دو۔"

نازو نے پکارنے کے انداز میں کہا "غلام محمد!" اس کی آواز اتنی کم تھی کہ گاڑی سے دو فٹ دور ہی سُنی جا سکتی تھی۔

لاشعوری طور پر اس نے پلٹ کے دیکھا۔ اس کے کانوں میں یہ آواز ایسے پہنچی جیسے اس کو سچ مچ کسی نے نام لے کر آواز دی ہو۔ وہ عیار آدمی تھا۔ آہستہ آہستہ ہماری طرف آیا۔

"آپ نے مجھے بلایا ہے؟"

میں نے دہاڑ کر کہا "کسی اُلّو کے پٹھے نے نہیں بلایا تمھیں۔ قریب آنے کا بہانہ ڈھونڈتے ہو؟ پرائیویٹ گفتگو سننا چاہتے ہو۔ چلو دفع ہو جاؤ یہاں سے۔"

احساسِ ذلت سے اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا مگر وہ بولا کچھ نہیں۔ اس کے لیے یہ اطمینان ہی کافی تھا کہ اس کا راز افشا نہیں ہوا۔ میں نے اتنی دیر میں اس کا بغور جائزہ لیا تھا اور یہ معلوم کر لیا تھا کہ آواز اس کے کانوں تک کیسے پہنچ جاتی ہے۔ اس نے اتنے ڈھیلے ڈھالے کپڑے اسی لیے پہنے تھے کہ وہ پھولے ہوئے حصوں میں اور خالی جگہوں پر کچھ بھی رکھ سکتا تھا۔ بشرٹ نما کوٹ کے اوپر اس نے ٹائٹ بیلٹ باندھی تھی۔ اس بیلٹ کے اوپر گردن تک وہ سینے اور پیٹ کے ساتھ کوئی بیٹری ٹرانسمیٹر رسیور یا اسلحہ باندھ کے رکھ سکتا تھا اور غالباً اس کے کندھے پر کوئی چھوٹا سا اسپیکر تھا۔ تاہم یہ سب میرے اندازے تھے جو غلط بھی ہو سکتے تھے۔

فوری مسئلہ یہ تھا کہ میں بیک وقت دو کام کیسے کروں، یعنی زبان سے بے معنی گفتگو جاری رکھوں اور پنسل سے لکھ لکھ کے کام کی باتیں بھی کروں۔ سب سے بہتر اور آسان طریقہ یہ تھا کہ ہم ٹیکسی چھوڑ کے باہر نکل جائیں اور کچھ فاصلے پر کھڑے ہو جائیں۔

اچانک کسٹم کی وردی میں ایک شخص تیز تیز قدم اُٹھاتا ہماری طرف آنے لگا۔ ابھی وہ پچاس قدم دُور تھا کہ ڈرائیور نے جو میرے حکم کی تعمیل میں سمندر کی طرف مُنہ کیے کھڑا ہوا تھا، چہرہ گھما کے اسے دیکھا اور سر کو خفیف سی جنبش دی۔ دوسرے شخص نے فوراً سر ہلا کے اس کا جواب دیا۔ یہ ایک لمحے کی بات تھی اور اگر میں ان دونوں کو غور سے نہ دیکھ رہا ہوتا تو اس نامعلوم اشاروں کی زبان میں ہونے والی خُفیہ اور پُراسرار گفتگو کو کیسے سمجھتا۔

یہ بات مجھے کچھ عجیب لگی۔ شاید ڈرائیور کے رویّے نے میرے ذہن میں شکوک کی دُھند پھیلا دی تھی چنانچہ میں جو کچھ دیکھ رہا تھا، شک کی نظر سے دیکھ رہا تھا یا پھر یہ اسی چھٹی حس کا اعجاز تھا جو خطرے کی گھنٹی بجا کے خبردار کر دیتی ہے کہ کچھ ہونے والا ہے جو اچھا نہیں ہوگا۔ مجھے فوراً خیال آیا کہ اگر یہ دونوں ایک دوسرے کو جانتے تھے تو انھوں نے کھل کے سلام دُعا کیوں نہیں کی۔ اس طرح چوری چھُپے اشاروں میں کچھ کہنا چہ معنی دارد؟ یقیناً کوئی بات ایسی تھی کہ وہ آشنا ہو کے بھی اجنبیت کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

میں چوکنا ہو گیا۔ وہ شخص جو کسٹم والوں کی وردی میں تھا، بڑی دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ آگے بڑھا۔ "آپ میں سے کون ہمارے ساتھ جائے گا؟" اس نے کسی تعارف یا تمہید کے بغیر کہا۔

"کون کہاں جائے گا۔ اور کیوں جائے گا؟" میں نے کہا۔

وہ ایسے جواب کے لیے تیار نہیں تھا۔ "میں... کسٹم سے تعلق رکھتا ہوں۔" اس نے اپنی آستین پر لگے ہوئے نشانات سے اپنا عہدہ واضح کیا۔

"بڑی اچھی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر یہ بات مجھے بتانے کا مقصد؟"

اس نے کنفیوز ہو کے کہا۔ "کیا آپ کو کسٹم کی لانچ پر رنگ محل نہیں جانا تھا؟"

"رنگ محل؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ راک سائڈ آئی لینڈ پر۔"

"وہاں جا کے میں کیا کروں گا بھائی۔ میں یہاں ٹھیک ہوں۔"

وہ اب گرم ہونے لگا۔ "تم وہ مُخبر نہیں ہو جس کے بارے میں تریوینی نے بات کی تھی؟"

"تریوینی کون سوّر کا بچّہ ہے؟" میں نے بھی گرم ہو کر کہا اور مجھے خاصی خوشی ہوئی جب میرے لبوں سے نکلنے والی گالی سُن کے ڈرائیور اُچھل پڑا۔ ہماری گفتگو سُن کے وہ پہلے ہی جز بز ہو رہا تھا اور بے بس تھا ورنہ چلّا کے کہتا کہ میں بکواس کر رہا ہوں اور جانتے بوجھتے جھوٹ بول رہا ہوں۔ کسٹم والا قدرے مایوس ہوا۔ "تو آپ سکندر بخت نہیں ہو؟"

میں نے کہا۔ "لعنت سکندر بخت پر بھی اور تم پر بھی۔ ارے بابا، ہم نواب واجد علی شاہ کے پڑپوتے، شہزادہ فراز خفتہ آتش فشاں۔ اپنی تین عدد زوجگان کے ہمراہ بغرض سیر یہاں آئے تھے۔ تم کہاں سے رنگ محل کا ذکر لے کر رنگ میں بھنگ ڈالنے آ گئے۔ بھنگی!"

وہ سخت پریشان بھی ہوا اور مشتعل بھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ آیا تھا تو صرف یہ کہ میں وہ نہیں ہوں جو وہ مجھے سمجھا تھا۔ یہ اس کے لیے ناقابلِ فہم بات تھی کیوں کہ میں مقررہ وقت پر مقررہ نشانیوں کے ساتھ وہیں موجود تھا جہاں اس کی اطلاعات کے مطابق مجھے ہونا چاہیے تھا۔ ڈرائیور نے تصدیق بھی کر دی تھی کہ سب ٹھیک ہے مگر میں بضد تھا کہ اسے غلط فہمی ہوئی ہے۔

پھر ایک بات ایسی ہوئی کہ ان کا بنا بنایا کھیل بگڑ گیا۔ جیسے ہی کسٹم والا غصّے اور جھنجلاہٹ میں پلٹا، نازو نے کندھے پر ہاتھ رکھ کے مجھے دوسری طرف متوجہ کیا۔ میں نے مخالف سمت میں دیکھا تو ایک لمحے کے لیے مجھے اپنی آنکھوں پر دھوکے کا گمان گزرا۔ ایک احاطے کی دیوار کے پیچھے سے کوئی ہاتھ ہلا رہا تھا۔ ہاتھ ہلانے والا پل بھر کے لیے سامنے آیا اور چھپ گیا۔ وہ کملا تھی۔ تریوینی کی پاگل بیٹی۔ وہ نہ جانے کب سے وہاں چھپی ہمیں متوجہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ہم سب کی نظر دوسری سمت میں تھی چنانچہ یہ محض اتفاق تھا کہ نازو نے اس کو دیکھ لیا۔ وہ کملا کو نہیں پہچانتی تھی چنانچہ وہ حیران ہوئی کہ ایک لڑکی اتنی شدت سے ہمیں کیوں اپنی جانب متوجہ کر رہی ہے اور اس نے مجھے بتا دیا۔

اس کے بعد مجھے کوئی شک نہ رہا کہ میری چھٹی حس نے مجھے بالکل صحیح اطلاع دی تھی۔ پلک جھپکتے میں سیٹ بدل کر میں ڈرائیور کی سیٹ پر آ گیا۔ ڈرائیور پھر سمندر کی جانب رُخ کیے ہوئے کھڑا تھا لیکن اسے معلوم تھا کہ کسٹم والا اس سے بحث کرے گا اور پوچھے گا کہ یہ کیا گھپلا ہے۔

میں نے پیچھے نازو پر ایک نظر ڈالی اور اسے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ ریوالور نکال لے۔ ایک ساتھ گل اور نازو نے ریوالور برآمد کیے۔ میں نے چابی کی طرف ہاتھ بڑھایا اور سر ہلا کے کہا۔ "فائر۔" ادھر کار کا انجن اسٹارٹ ہوا ادھر نازو نے گولی چلائی۔ ڈرائیور بڑی تیزی سے گھوما تھا مگر اس نے فائر کی آواز سُنی اور کسٹم کی وردی پہن کر آنے والے کو زمین پر پڑا دیکھا تو وہ خود بھی زمین پر اوندھے مُنہ گر گیا۔

گاڑی کو ریورس گیئر میں دوڑانے کے لیے میں نے ایکسیلریٹر اتنا دبا دیا تھا کہ انجن بہت شور کر رہا تھا اور گاڑی اُلٹے پاؤں اتنی تیز رفتاری سے بھاگ رہی تھی کہ میرے لیے اسے سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں پیچھے والے ونڈ اسکرین سے عقب کا پورا منظر صاف نہیں دیکھ پا رہا تھا۔ نتیجہ یہ کہ کار ایک اینٹ کے اوپر جھٹکا کھا کے چڑھی اور اُچھلی۔ پھر اس کا دوسرا یعنی آگے والا پہیہ اسی اینٹ پر سے گزرا۔

ان دو جھٹکوں نے گاڑی کے اندر سب کو اُلٹ پلٹ دیا۔ میں نے مسلسل ہونے والے فائروں کی آواز سُنی لیکن سامنے نہیں دیکھا۔ میں گاڑی کو ریورس گیئر میں دوڑاتا ہوا ادھر لے جا رہا تھا جہاں کملا دیوار کی اوٹ سے چلّا چلّا کے کچھ کہہ رہی تھی۔ مگر اس کی آواز انجن کی گھُوں گھُوں میں بالکل سُنائی نہیں دے رہی تھی۔

معلوم نہیں نازو، رالعہ اور گل نے خود کو کیسے سنبھالا۔ جھٹکوں سے ان کا توازن بھی برقرار نہیں رہا تھا۔ پھر اُلٹی دوڑنے والی گاڑی سے ان کو سامنے اس دشمن پر فائر کرنے تھے جس کا فاصلہ بڑھتا جا رہا تھا۔ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ نازو اور گل دونوں نے حواس بحال رکھتے ہوئے فائر کیے تھے مگر ان کی ایک ہی گولی نشانے پر لگی تھی جو سب سے پہلے نازو نے چلائی تھی۔ اس کے بعد ڈرائیور نے لیٹ کر اپنی بُشرٹ کے اندر سے ریوالور نکالا تھا اور جوابی فائرنگ شروع کر دی تھی۔

گاڑی کی ٹیڑھی ترچھی چال نے اور جھٹکوں نے ہم سب کو دشمن کا نشانہ بننے سے محفوظ رکھا۔ میں یہ فرض نہیں کر سکتا کہ وہ ڈرائیور اناڑی تھا۔ وہ ایک تربیت یافتہ اور مکّار شخص تھا جس نے ہمیں بے وقوف بنا کے مروانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اس نے لیٹ کر جوابی فائر کیے تھے تو یہ کوشش ضرور کی ہوگی کہ نشانہ مجھے بنائے کیوں کہ میں ہی گاڑی لے کر بھاگ رہا تھا۔

جب ایک گولی ونڈ اسکرین پر لگی اور شیشے میں سوراخ کے گرد مکڑی کا جالا سا پھیل گیا تو میں نے گاڑی کو نیوٹرل کیا اور پہلے گیئر میں ڈال کے اسٹیرنگ گھما دیا۔ پیچھے دوڑنے والی گاڑی ایک زبردست جھٹکے سے آگے بڑھی اور ابھی خواتین سنبھل بھی نہ پائی تھیں کہ گاڑی ایک طرف جھک کر گھوم گئی۔ وہ سب اسی طرف لڑھک گئیں۔ گولیاں اب بھی کار کے بونٹ اور مڈ سے ٹکرا رہی تھیں لیکن میں محفوظ تھا اور میری ہمت بڑھانے کے لیے یہی احساس کافی تھا۔

اچانک میں نے کملا کو دیوار کی اوٹ سے نکل کے اپنی طرف دوڑتے دیکھا۔ "بے وقوف۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "پاگل۔ واپس جاؤ۔ میں وہیں لا رہا ہوں گاڑی۔"

لیکن کملا بدحواس ہو کے گاڑی کی طرف دوڑ پڑی تھی۔ میں نے اسے بچانے کی پوری کوشش کی مگر وہ ایک سائڈ سے ٹکرائی اور گرتے گرتے اس نے گاڑی کا ہینڈل پکڑ لیا۔

"سُنو۔ وہاں مت جانا۔ ان کے ساتھ۔" کملا نے چیخ کر کہا۔

پھر نازو نے چیخ کر کہا۔ "گاڑی روکو سکندر۔ اس نے ہینڈل باہر سے پکڑ رکھا ہے۔ میں اندر سے کیسے دروازہ کھولوں؟"

کملا گاڑی کے ساتھ گھسٹتی آ رہی تھی۔ میں نے ایک دم بریک لگائے تو وہ جھٹکے سے گر گئی۔

میں نے چلّا کے کہا۔ "اسے کھینچ لو اندر۔"

نازو نے دروازہ کھولا اور کملا اُٹھ کے بھاگی مگر وہ زخمی ہو چکی تھی اور اس کی ٹانگیں جسم کا بوجھ اُٹھانے کے قابل نہیں رہی تھیں۔ پھر ایک دم وہ مُنہ کے بل گری۔ اس کے بعد فائر کی آواز سُنائی دی۔ میں نے دیکھا تو گولی کملا کے سَر میں گھُس چکی تھی۔ خون اس کے سَر سے اُبل کر زمین میں جذب ہو رہا تھا۔ اب میں اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اگر میں گاڑی روک کے نیچے اُترتا تو خود اپنی زندگی کو بھی داؤ پر لگاتا اور باقی سب کی زندگی کو بھی۔ کوئی گولی پیٹرول ٹینک میں بھی لگ سکتی تھی اور آگ لگتے ہی پیٹرول ٹینک پھٹ جاتا تو ہم سب جل کے خاک ہو جاتے۔

میں نے ایک لمحے میں ایک ایسا فیصلہ کیا جو بظاہر خودغرضی اور بے رحمی کا آئینہ دار تھا مگر اس کے حقیقت پسندانہ ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے نازو، رالعہ اور گل کے چیخنے چلّانے کی پروا نہیں کی اور مرتی ہوئی کملا کو وہیں چھوڑ کے گاڑی کو پوری رفتار سے دوڑاتا ہوا وہاں سے نکال لے گیا۔ اب ہم فائرنگ کی زد سے باہر آ چکے تھے اور اس بات کا کوئی امکان نہیں رہا تھا کہ کوئی گولی وہاں تک پہنچ جائے گی۔

میں نے گاڑی کی رفتار پر قابو پا کے کہا۔ "کیا ہوا؟"

نازو نے ہسٹیریا زدہ لہجے میں چلّا کے کہا۔ "وہ... اسے گولی لگ گئی۔"

میں نے کہا۔ "ہاں میں نے دیکھ لیا تھا۔"

رالبعہ نے کہا "یہ... کون تھی سکندر؟"

میں نے کہا "کملا"۔

"کون کملا، تریوینی کی بیٹی"، رالبعہ نے کہا اور اس کی آواز کے دکھ سے میں نے اندازہ کیا کہ وہ بھی نروس تھی اور رو رہی تھی۔

"تم رُکے بھی نہیں"۔ نازو نے کہا۔

میں نے کہا "کیا فائدہ ہوتا؟ کیا کر سکتا تھا میں یا کوئی اور اس کے لیے"۔

"اتنے سنگ دل ہو تم"۔ نازو نے کہا۔

میں نے بگڑ کے کہا "بند کرو یہ رونے کا ڈراما۔ ہوش میں آؤ نازو۔ میں نے اسے نہیں مارا۔ نہ میں نے اسے مروایا۔ میں تو اسے بچانے کے لیے ہی واپس گیا تھا۔ اس سے پہلے خود اس کے باپ نے قتل کر دیا کملا کو"۔

"باپ نے نہیں مارا اسے"۔

"اور کس نے مارا۔ کس کا آدمی تھا وہ۔ کس نے اس کے ہاتھ میں وہ ریوالور دیا تھا؟" میں نے کہا "کس نے حکم دیا تھا اسے کہ سکندر کو دھوکے سے وہاں سے لے جاؤ اور مار ڈالو۔ اگر گولی میرے بجائے اس کی اپنی بیٹی کو لگ گئی تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ گڑھا اس کے باپ نے میرے لیے کھودا تھا۔ اس کی بیٹی گر گئی اس میں۔ یہ تو ہوتا ہے۔ قدرت کے نظامِ انصاف کو کون بدل سکتا ہے۔ تریوینی نے اپنے کیے کی سزا پائی۔ حرامزادہ۔ دھوکے باز۔ مدد کرنے آیا تھا ہماری"۔

"کملا ہمیں یہی بتانے آئی تھی؟" رالبعہ نے کہا۔

"ہاں۔ اسے معلوم ہوا ہوگا کہ باپ نے کیا سازش کی ہے دلاور کے ساتھ مل کر"۔ میں نے کہا "کسی نہ کسی طرح وہ یہاں تک پہنچ ہی گئی"۔

"مجھے بہت رنج ہے اس کی موت کا"۔ نازو نے کہا۔

"رنج تو مجھے بھی ہے نازو۔ لیکن دیکھو کہ اس وقت ہم بال بال بچے ہیں"۔ میں نے کہا "اگر میں اس بدمعاش کے ساتھ چلا جاتا تو کیا ہوتا؟ شاید میں اور گل کبھی واپس نہ آتے۔ بعد میں تمھارے ساتھ خدا معلوم کیا ہوتا۔ ہم سب کو خدا نے بچا لیا۔ اس ڈرائیور پر ہمیں شک نہ ہوتا اور میں کسٹم آفیسر بن کر آنے والے کی اور ڈرائیور کی سازباز نہ دیکھتا تو ہم سب مارے جاتے"۔

"وہ دونوں تریوینی کے ایجنٹ تھے"۔

"اور کیا۔ انھیں بطورِ خاص مامور کیا گیا تھا کہ مجھے لانچ پر لے جائیں اور دلاور کے حوالے کر دیں۔ تم سے وہ بعد میں نمٹتے رہتے"۔

"خدا کے لیے کہیں گاڑی روکو"، رالبعہ نے اچانک گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کیوں۔ کیا ہوا؟"

"یہ گل تو بے ہوش پڑی ہے"۔ رالبعہ نے کہا۔

"حد ہے بھئی۔ تم لڑکیوں سے اپنا ہسٹیریا نہیں سنبھالا جاتا۔ ذرا کوئی بات ہوئی اور بس بے ہوش یا پاگل"۔ میں نے ٹیکسی کو سڑک کے ایک کنارے پر روک دیا "تمھیں بھی خیال نہیں آیا کہ یہ اتنی دیر سے خاموش کیوں ہے؟"

"اب بس کرو سکندر"۔ رالبعہ نے بگڑ کے کہا "کسی طرح اس ٹیکسی سے جان چھڑاؤ۔ دوسری کوئی ٹیکسی ملے تو روکو۔ کہیں وہ اس کا پیچھا کرتے ہوئے نہ آ جائیں"۔

"اس گاڑی میں ٹرانسمیٹر بھی تو ہے۔ نہ جانے اس کی آواز کس حد تک سنی جاتی ہے"۔ نازو بولی۔

میں نے کہا "ابھی تو یہ بھی معلوم نہیں کہ ٹرانسمیٹر ہے کہاں۔ خیر تم ایسا کرو کہ کوئی گاڑی روکو۔ میں گل کو اتارتا ہوں"۔

میں نے گل کو اُتار کے سڑک کے کنارے لٹا دیا اور خود ٹیکسی کے پیچھے چھپ کے بیٹھ گیا۔ رالبعہ اور نازو کے لیے چند منٹ بعد ایک کار رُک گئی جس کو ایک مدراسی چلا رہا تھا۔

"ابھی آپ لوگاں کو کیا ہوا جی؟" اس نے کبوتر کی طرح غٹرغوں کی۔

"وہ جی۔ ہماری ٹیکسی خراب ہو گئی"۔ رالبعہ نے بے حد مظلوم بن کے کہا۔

"یہ تو بوہت بُرا ہوا جی"، وہ بولا "اور اس کو کیا ہوا جی...؟"

"یہ بہن ہے میری"۔ رالبعہ نے کہا "ہم اسے اسپتال لے جا رہے تھے۔ ٹیکسی ڈرائیور چلا گیا ہے کسی میکینک کو بلانے، معلوم نہیں کب آئے گا"۔

"آپ بیٹھو جی ہماری گاڑی میں"۔ اس نے پیچھے والے دروازے کا لاک کھولتے ہوئے کہا۔

نازو پہلے بیٹھی۔ اس نے رالبعہ کی مدد سے گل کو اندر کھینچا۔ پھر رالبعہ بیٹھنے لگی۔ میں ٹیکسی کے پیچھے سے دیکھتا رہا۔ جب نازو نے خاموشی سے ریوالور نکالا اور اس کا دستہ کار والے کے سر پر کھینچ مارا تو میں لپک کر سامنے آیا۔ میں نے اسے دوسرے دروازے کی طرف سے کھینچا اور ٹیکسی میں ڈال کے دروازہ بند کر دیا۔

یہ سب کارروائی مشکل سے پانچ منٹ میں ختم ہو گئی۔

وہ ایک غیر آباد سڑک تھی۔ شاید تریوینی کا ایجنٹ ہمیں عمداً ایک ایسے راستے سے لایا تھا جو بہت کم استعمال ہوتا تھا۔ چنانچہ سڑک پر سے اِکا دُکا گاڑیاں ہی گزر رہی تھیں۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ گزرنے والی بیشتر گاڑیوں میں بیٹھے ہوئے لوگوں نے دیکھا تھا کہ سڑک کے کنارے ٹیکسی رُکی ہوئی ہے۔ دو عورتیں پریشان کھڑی ہیں اور تیسری لیٹی ہوئی ہے جو معلوم نہیں زندہ ہے کہ مر گئی ہے۔ مگر کسی نے رُک کر مدد کرنے یا کچھ پوچھنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ سب نظریں چرا کے گزر گئے تھے۔ بڑے شہر کی ایک افسوس ناک عادت لاتعلقی اور بے حسی کی ہوتی ہے اور شہر جتنا بڑا ہوتا ہے اتنا ہی اندھا بہرا ہوتا جاتا ہے۔ کوئی کیا کر رہا ہے، ان کی بلا سے۔ کوئی مر رہا ہے یا مدد کے لیے پکار رہا ہے، انھیں اپنے کام سے کام۔ کسی کے پاس دوسروں کے لیے فرصت نہیں۔ ضائع کرنے کے لیے ہمدردی کے دو بول تک نہیں۔ یہ بات میں نے لندن میں بہت زیادہ دیکھی تھی۔ سڑک کے کنارے، بس یا ٹراموں میں۔ تھیٹر یا ریسٹورنٹ میں نہ کوئی کسی کو دیکھتا تھا اور نہ کسی کی بات سنتا تھا۔ بمبئی میں یہ رویّہ نسبتاً کم شدت کے ساتھ محسوس ہوتا تھا مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ وہاں کے رہنے والے جذباتی طور پر ایک دوسرے سے دُور تھے۔ کسی کا عقیدہ کیا ہے، مذہب کیا ہے، لباس کیا ہے اور اخلاق کیا، اس سے دوسرے کو قطعی سروکار نہیں۔

یہی وجہ تھی کہ دیکھنے والے دیکھ کر گزرتے رہے اور وہاں کی زبان میں کوئی اس لفڑے میں نہیں پڑا۔ جو نسبتاً شریف یا جذباتی آدمی لفڑے میں پڑا اس کے ساتھ ہم نے وہ سلوک کیا کہ آئندہ کے لیے اُسے بھی نصیحت ہو گئی ہو گی۔ یہ قابلِ مذمت واقعہ وہ دس جگہ سُنائے گا اور یوں سو افراد انسانی ہمدردی کے جذبے سے تائب ہو جائیں گے۔ مجھے افسوس ہوا کہ مجبوری میں ہم نے ایک غلط رسم کے خلاف صحیح قدم نہیں اٹھایا اور شکریہ ادا کرنے کے بجائے مدد کرنے والے کو ناک آؤٹ کر دیا۔

گل نے اپنا راز افشا ہو جانے کے بعد سردار جی کے ٹریڈ مارک والی پگڑی تریوینی کی بیچ ہٹ میں ہی اُتار دی تھی۔ کسی باتھ روم میں سے اسے استعمال شدہ ساڑی مل گئی تھی جو اس نے قمیص کے اوپر ہی باندھ لی تھی۔

میرے سامنے نہ آنے کا ایک مقصد تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ہوش میں آتے ہی کار کا مالک پولیس اسٹیشن کی طرف دوڑ لگائے گا اور یہ بیان دے گا کہ اسے تین عورتوں نے مل کے دھوکا دیا۔ ایک بیماری کا ڈراما کیے جی۔ دوسرے ہم کو روکے جی۔ تیسری ہمارے سر پہ زور سے کچھ مارے جی۔

بعد میں جب تفتیش ہوگی تو مزید انکشافات ہوں گے اور تریوینی کو معلوم ہوگا کہ اس کے غلام کی اداکاری کا بھانڈا پھوٹ گیا اور اس کی سازش ناکام ہو گئی تو وہ سخت پیچ و تاب کھائے گا۔ وہ سمجھ جائے گا کہ اس ٹیکسی سے اُتر کے گاڑی چھیننے والی تین عورتیں کون ہو سکتی ہیں لیکن ان کے ساتھ کسی مرد کا نہ ہونا.... اسے کنفیوز کرے گا۔ کار والا حلفیہ بیان دے گا کہ مرد اُن کے ساتھ کوئی نہیں تھا اور خود تریوینی بھی سوچے گا کہ سکندر ساتھ ہوتا تو یہ ساری کارروائی عورتیں کیوں کرتیں۔ سوال یہ ہے کہ سکندر کہاں غائب ہو گیا؟

اس جگہ سے تقریباً دو میل دُور آ جانے کے بعد میں نے ایک دُکان کے سامنے گاڑی روکی۔ وہ دودھ دہی کی دُکان تھی جس پر ایک بہت بھاری بھرکم سکھ بیٹھا ہوا تھا۔

"صرف پانی۔ بادشاہو کوئی دُودھ لسّی...؟"

میں نے کہا "ایک لڑکی بے ہوش ہو گئی ہے۔ اس پر دودھ لسّی کے چھینٹے نہیں مارے جا سکتے"۔

"او ہو ہو۔ معاف کرنا"۔ اس نے مٹکے میں سے شیشے کا گلاس ڈبو کے بھرا اور مجھے پکڑا دیا۔ وہ خود بھی اُتر کر میرے ساتھ ہی آ گیا اور بولا "کی ہویا اے کاکی نوں؟"

میں نے کہا "اس پر جِن چاچا آتے ہیں"۔

"جِن چاچا!" وہ بھونچکا رہ گیا۔

"ہاں۔ اس کا ایک خبیث چاچا تھا۔ ساری زندگی پریشان کرتا رہا۔ مر کے بھی جان نہیں چھوڑ رہا ہے"۔ میں نے کہا۔ "تم اس گلاس کے پیسے لے لو۔ ہمیں اس کی ضرورت ہے"۔

"توبہ کر دجی۔ اَسی اِک اٹھانی لے کے سِر روچ سواہ پائیے، تُسی رکھو گلاس۔ گلاس وی کوئی شے ہوندی اسے"۔ وہ سخت بُرا مان کے واپس اپنی گدی پر جا بیٹھا۔

پانی کے چھینٹے پڑتے ہی گل ہوش میں آ گئی۔ رالبعہ اور نازو نے اسے ایک گھونٹ پانی پلا بھی دیا۔ جب میں نے اسے پلٹ کے دیکھا تو وہ اپنی جذباتی کمزوری کے مظاہرے پر خاصی شرمسار سی بیٹھی تھی۔ لیکن اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

میں نے کہا "آپ لوگوں کی جذباتیت میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اَب تک کیسے کیسے مقابلے کیے ہیں آپ سب نے۔ کتنی معرکہ آرائی کی ہے۔ کتنی سختی جھیلی ہے"۔

"دشمن کو گولی مارنا بہت آسان ہوتا ہے۔ کسی اپنے کو مرتے دیکھنا بہت مشکل کام ہے"۔ نازو نے کہا۔

"تم نے اسے اپنا بھی لیا؟"

"آخر وہ کس کی مدد کرتے ہوئے ماری گئی؟" رالبعہ نے کہا۔

اُسے پروانہ ہوتی ہماری تو وہ آتی ہی کیوں۔"

"افسوس تو مجھے بھی ہے۔ لیکن دیکھو نا، کبھی میدانِ جنگ میں اپنے ہاتھوں بھی اپنے مارے جاتے ہیں۔ غلطی سے یا مجبوری میں۔ اور جو گولی کملا کو لگی، وہ ہم میں سے کسی کو بھی لگ سکتی تھی۔ پھر کیا تم سب اسی طرح بے ہوش ہو جاتیں۔۔"

"میں۔۔۔ اس بھیانک منظر سے دہشت زدہ ہو گئی تھی۔" گل نے کہا۔

"موت کا منظر دہشتناک ہی ہوتا ہے۔ خوشگوار کبھی نہیں ہوتا۔ مگر اس وقت عقل و ہوش سلامت رہنے چاہئیں۔ ہمت سے کام لینا چاہیے۔" میں نے کہا۔

ان میں سے کسی نے اور کچھ نہیں کہا۔ میں اب سوچ رہا تھا کہ ترلوچنی کی مکاری کا بھانڈا تو پھوٹ گیا لیکن اب ایک خطرناک دشمن سامنے آ گیا تھا۔ اس نے فریبِ دوستی کی جو نقاب اوڑھ رکھی تھی وہ ہٹ گئی تھی چنانچہ ہمارے اور اس کے درمیان کھلی جنگ کا آغاز ہو چکا تھا۔ میں ترلوچنی کو سب سے زیادہ خطرناک سمجھنے پر اس لیے بھی مجبور تھا کہ اپنی گلی میں کتا بھی شیر ہوتا ہے پھر اس کا دلاور سے الحاق ہو گیا تھا اور وہ میری ہر کمزوری سے پورا فائدہ اُٹھا سکتا تھا۔ یہ بھی صاف ظاہر تھا کہ اسے اپنے نقصانات کی خبر پہنچے گی تو اس کے غیظ و غضب کا کیا عالم ہو گا۔ حکم کے غلام تو مرتے ہی ہیں۔ اس کی اکلوتی بیٹی کا مرنا سب سے بڑا نقصان تھا جس کا صدمہ اسے پاگل کر سکتا تھا۔ مجھے اس کے وسائل کا بھی اندازہ تھا۔ وہ میری تلاش کے لیے بمبئی کی ساری پولیس کو مستعد کر سکتا تھا۔ بمبئی کے سارے بدمعاش اور ان کے چیلے، سارے دادا اور ان کے سب پوتے اپنی متحدہ قوت کے ساتھ میرے دشمن ہو سکتے تھے۔

"اب کہاں چلتے جا رہے ہو؟" رالعہ نے کہا۔

میں نے کہا۔ "تم کہو تو میں کیا سارا زمانہ رُک جائے۔ ہوا اور فضا رُک جائے۔ سورج اور چاند ستاروں کی گردش رُک جائے۔"

"زیادہ تکلف مت کریں، بس اس گاڑی کو کہیں روک لیں۔" رالعہ نے کہا۔

"اس سے جلد از جلد جان چھڑا لینا ہی بہتر ہے۔" نازو نے اس کی تائید کی۔

"ایسی بھی کیا جلدی ہے۔"

"کہیں پولیس نے روک لیا تو معلوم ہو جائے گا کہ کار چوری کی ہے۔" رالعہ نے خفگی سے کہا۔ "جان بچ گئی، اس کا شکر ادا نہیں کرتے۔ مصیبت کو گلے لگانے کا شوق ہے۔"

"تم مصیبت کیوں سمجھتی ہو خود کو؟" میں نے کہا۔

ظاہر ہے اس کے بعد رالعہ کچھ نہیں بولی۔ نازو کی ہنسی نے مجھے بتا دیا کہ رالعہ کا چہرہ تصویرِ حیا بن گیا ہو گا۔

گل نے کہا۔ "رالعہ باجی ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہیں۔ بس اب کہیں چھوڑ دیں اس گاڑی کو۔"

میں نے کہا۔ "تم اور تمہاری باجی دونوں کی مخالفت میں مول نہیں لے سکتا مگر نیک بی بیو۔ بمبئی کو ایسے ہی سمجھو جیسے اپنا کراچی۔ ابھی تو اس گاڑی کا مالک آنکھیں کھولے گا پھر روتا دھوتا تھانے جائے گا اور تھانے میں جب اس کی سنی جائے گی تو رات ہو چکی ہو گی۔ وہ بھی کہیں گے کہ جلدی کیا ہے۔ اب صبح دیکھیں گے تمہاری گاڑی کون لے گیا۔ اور صبح وہ تلاش کے لیے پولیس کو الرٹ کریں گے تو یہ ایک ضابطے کی کارروائی ہو گی اور بس۔ وہ اتنے سیریس کبھی نہیں ہوتے کہ سچ مچ ہر چوری کا سراغ لگانا شروع کر دیں۔"

"آخر آپ یہ رسک کیوں لیتے ہیں؟" نازو نے کہا۔

میں نے کہا۔ "لاحول ولا قوۃ۔ میرے لیے کوئی رسک نہیں، رسک ہے تمہارا تینوں کا۔ میرا تو وہ نام بھی نہیں لے گا، تم تینوں کو البتہ پہچان لے گا۔"

اس سے پہلے کہ ان کا احتجاج عملی صورت اختیار کرتا، میں نے گاڑی کو ایک ایسی جگہ روک لیا جو شاید پہلے بس یا ٹرام کا اسٹاپ تھی۔ اس سڑک پر مجھے ٹرام کی پٹری دکھائی نہ دی چنانچہ میں نے فرض کیا کہ اس روٹ پر اب ٹرام نہیں چلتی۔ مسافروں کے لیے تعمیر کیا جانے والا شیڈ خالی پڑا ہوا تھا۔ بس اسٹاپ تقریباً پچاس قدم کے فاصلے پر نظر آ رہا تھا۔

"گاڑی اچھی ہے۔" میں نے اس کا انجن بند کرتے ہوئے کہا۔

"بے چارہ مالک نیکی کے چکر میں مارا گیا۔" نازو نے کہا۔

"نیکی کی بات مت کرو۔ ایک ساتھ تین خوب صورت لڑکیاں دیکھ کر کسی کے دل میں پاکیزہ خیالات پیدا نہیں ہوتے۔"

"اپنے جیسا سمجھتے ہو نا سب کو۔" رالعہ نے کہا۔ "زبان کے بریک خراب ہیں۔ اس کسٹم آفیسر کے سامنے واجد علی شاہ کے پڑپوتے بن کے خوب بول رہے تھے۔ زوجگان کے ساتھ بغرضِ عیش و نشاط آئے تھے۔" اس نے میری نقل اُتارتے ہوئے کہا۔

میں نے ڈھٹائی سے کہا۔ "وہ کون سا اصلی کسٹم آفیسر تھا۔ ایک جھوٹ اس نے بولا تو ایک میں نے بول دیا۔ بُرا ماننے کی کیا بات ہے اس میں؟"

"اس کا بریف کیس رکھا ہوا ہے پیچھے۔" نازو نے کہا۔

میں اس وقت گلوز کمپارٹمنٹ میں ہاتھ ڈال چکا تھا۔ اس میں ایک اخبار تھا جسے سولہ بار تہہ کیا گیا تھا۔ گاڑی کی رجسٹریشن بک کے ساتھ ایک ڈرائیونگ لائسنس تھا۔ میں نے ڈرائیونگ لائسنس کی تصویر کو غور سے دیکھا اور پھر اس پر لکھے ہوئے نام کو۔

"یہ تو وہ شخص نہیں ہے۔" میں نے لائسنس پیچھے دکھا کے کہا۔ "یہ تو کوئی صوفی یا سادھو ہے۔ گاڑی بھی اسی کی ہے۔" پھر میں نے اخبار کی تہوں کو کھولا۔ اس پر آج کی تاریخ تھی اور یہ شام کا اخبار تھا۔ اس کے پہلے ہی صفحے پر میری نظر پڑی تو میں چونک پڑا۔ میرے سامنے اسی شخص کا چہرہ آ گیا تھا جس سے ہم نے کار چھینی تھی۔

میں نے کہا۔ "مس رالعہ قاری! اخبار تو پڑھ لیتی ہیں آپ۔ ماشاء اللہ سے انگریزی بھی فر فر بولتی ہیں۔ ذرا یہ خبر پڑھ کر سنائیے۔"

رالعہ نے کہا۔ "ماشاء اللہ سے یہ ہندی ہے یا گجراتی جسے آپ انگریزی سمجھ رہے ہیں۔"

مگر نازو اور گل نے اتنی دیر میں اخبار لے لیا تھا۔ تصویر دیکھتے ہی وہ ایک ساتھ چلائیں۔ "یہ۔۔۔ یہ تو وہی ہے۔"

میں نے کہا۔ "دیکھا۔ یہ دونوں ہیں پڑھی لکھی لڑکیاں۔"

اب رالعہ نے بھی اخبار کو غور سے دیکھا۔ "مجھے تو دال میں کچھ کالا نظر آ رہا ہے۔ آخر کیا ہے یہ خبر؟"

"کسی سے پوچھ لیتے ہیں۔" میں نے کار سے اُتر کے کہا اور ایک مہاشے کو روک لیا جو بڑی شان سے دھوتی باندھے، سر پر دو پلی ٹوپی اوڑھے چھڑی گھماتے جا رہے تھے۔

"شو بمان!" میں نے کہا۔ "کرپا سے یہ سماچار پڑھ کے بتا دیں کہ یہ منش کون ہے؟"

اس نے جب غصے میں "رگرمم تگرمم پکرمم" شروع کی تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ مدراس کی کسی بھاشا میں اس بے ہودہ مذاق پر خفا ہو رہا ہے۔ وہ کیسے یقین کر سکتا تھا کہ میں واقعی اخبار تک نہیں پڑھ سکتا۔ اگر میں اصرار کرتا تو مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی چھڑی سے میری پٹائی کرتا۔ رالعہ، نازو اور گل نے میرا خاصا تمسخر اڑایا۔

"اور ہندی بولو۔"

"معلوم نہیں کیا کہہ گیا اپنی زبان میں۔ سوچتا ہو گا کیسا بزدل ہے کہ چوں تک نہیں کی۔"

ایک لڑکا ہاکی تھامے ایک ہاتھ سے سائیکل چلاتا نمودار ہوا۔ وہ راستے کے ہر پتھر کو بال کی طرح شاٹ مارتا جا رہا تھا۔ میں نے اسے روک کے کہا۔ "نورِ چشم سلمہٗ ذرا توقف فرمائیے۔"

وہ رُک گیا۔ "اُردو میں بتائیں کیا بات ہے۔"

میں نے کہا۔ "یہ شخص کون ہے؟" اور اخبار اس کے سامنے کر دیا۔

اس نے خبر پڑھی اور حیرت کے آثار اس کی صورت پر پھیل گئے۔ "کیا آپ جانتے ہیں اسے؟"

میں نے کہا۔ "میں نے آج دیکھا تھا اسے۔"

"کہاں دیکھا تھا؟" لڑکا جوش میں بولا۔

"جنوبی افریقہ میں جہاں میں شیر کے شکار کے لیے گیا تھا۔ اس کو ایک شیر نے میرے سامنے کھا لیا تھا۔ کیا یہ وہی خبر ہے؟"

لڑکے نے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ تو ایک ڈاکو ہے۔ صبح کسی شخص سے دس لاکھ روپے لے کر بھاگ گیا۔ بھاگتے وقت اس کی گاڑی بھی لے گیا اُسے مار کر۔" لڑکے نے کہا۔

میں نے اپنی صورت سے اپنے جذبات ظاہر نہیں ہونے دیے اور لڑکے سے اخبار لے لیا۔ "اچھا خیر تم جاؤ۔"

"چاچا، آپ اخبار نہیں پڑھ سکتے؟"

میں نے کہا۔ "گجراتی نہیں پڑھ سکتے بیٹا۔"

"مگر یہ تو ہندی ہے۔" وہ ہنسا اور بولا۔ "ہندی بھی نہیں سمجھتے؟"

میں نے آہ بھر کے کہا۔ "بس ایک دل کی زبان سمجھتے ہیں ہم۔"

مگر یہ بات اس لڑکے نے نہیں سُنی۔ وہ جا چُکا تھا۔ میں نے لڑکیوں کی طرف دیکھا تو ان کی حالت خوف سے غیر ہو رہی تھی۔

"دیکھا۔ یہ ہوتا ہے ضد کا نتیجہ۔" رالعہ نے کہا۔ "کب سے کہہ رہی ہوں میں کہ دفع کرو اس گاڑی کو۔"

نازو پیٹ سے بولی۔ "خدا نے ہی بچایا ورنہ سارے شہر کی پولیس کو تلاش ہو گی اس گاڑی کی۔"

گل نے کہا۔ "واقعی بال بال بچے۔ پکڑے جاتے تو ڈکیتی کا جُرم ہمارے سر منڈھ دیا جاتا۔"

میں نے کہا۔ "چلو اب باہر نکلو سب، اندر بیٹھ کے ڈانٹ رہی ہو مجھے۔"

جب وہ تینوں باہر نکل کے گاڑی سے کچھ دور چلی گئیں تو میں نے رومال سے گاڑی کے اندر کی ہر جگہ کو صاف کیا۔ اس انکشاف نے مجھے بھی نروس کر دیا تھا کہ میں بڑے اطمینان سے ایک ڈاکو کی گاڑی چلا رہا تھا اور جسے ہم نے چھینا تھا وہ پہلے سے چھینی ہوئی کار تھی۔ مجھے اس شخص کی صورت اور اس کا باتیں کرنے کا انداز یاد آتا تھا تو میری حیرت میں اضافہ ہوتا تھا کہ کیا ڈاکو ایسے بھی ہوتے ہیں؟ اتنے پُرسکون بھی رہ سکتے ہیں کہ راہ چلتے کسی کی مدد کر دیں۔ اور وہ ڈاکو ہی نہیں قاتل بھی تھا۔

میں نے گاڑی بند کرنے سے پہلے بریف کیس کو دیکھا۔

تو مجھے خیال آیا کہ اس کو بھی کھول کر دیکھ لینا چاہیے۔ یہ عام قسم کا بریف کیس تھا اور اس میں نمبروں والا تالا تھا لیکن تالا بند نہیں تھا۔ سائڈ کے کھٹکے والے قفل کھلتے ہی ڈھکنا اُٹھ گیا اور میری نگاہ نے ڈکیتی میں حاصل ہونے والے مال کو دیکھا۔ دس لاکھ روپے کے نئے پرانے نوٹ بریف کیس میں بھرے پڑے تھے۔ یہ سب سو کے نوٹ تھے جن کی سو گڈیاں بڑی ترتیب سے برابر برابر رکھی گئی تھیں۔

میں نے بریف کیس کو بند کیا اور اس کے نمبروں والے لاک کو دن ٹو تھری پر سیٹ کر دیا۔ بے شک یہ ایک ڈاکو کی دولت تھی دراصولاً اسے قانون کی تحویل میں دیا جانا چاہیے تھا مگر وہ ڈاکو ابھی پولیس کے ہاتھ نہیں آیا تھا۔ وہ گاڑی کی رپورٹ لکھوانے پولیس کے پاس نہیں جا سکتا تھا۔ ایک فی صد امکان اس بات کا تھا کہ ڈاکو خود ہی اس گاڑی کو تلاش کرے لیکن ننانوے فی صد امکانات یہ تھے کہ گاڑی پولیس کو مل جائے گی۔

ہندوستان یا پاکستان کی پولیس کی اہلیت کے بارے میں جو میری رائے تھی وہی ان کی ذہنیت اور نیت کے بارے میں بھی تھی۔ اگر یہ بریف کیس پولیس کے ہتھے چڑھ جاتا تو وہ اسے یوں غائب کرتے جیسے مداری سب کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ کی صفائی سے گولا غائب کرتا ہے۔ ہاتھ کی صفائی دکھانے میں ان سے بڑا مداری کوئی نہیں۔ مالِ حرام کو ہضم کرنے میں بھی ان کا جواب نہیں اور جب انھیں معلوم ہو کہ مال کسی ڈاکو کا ہے تو اسے وہ بڑے بھائی کا ترکہ سمجھ کے تقسیم کر لیتے ہیں۔

ان سے زیادہ پیسے کی ضرورت ہمیں تھی اور ان حالات میں جب بمبئی کی زمین ہم پر تنگ ہو رہی تھی اور ہمارے دشمن طاقتور بھی تھے اور دولت مند بھی۔ یہ دولت ہماری طاقت بن سکتی تھی۔ یہ سوچ کے میں نے بریف کیس اُٹھا لیا۔

اب مجھے ہر لمحہ خطرہ قریب آتا محسوس ہوتا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے کسی بھی وقت پولیس کی گاڑی اچانک میرے سامنے آ رُکے گی۔ اس میں سے رائفل تانے پولیس مین کود کے مجھے ہر طرف سے گھیر لیں گے اور مجھے رنگے ہاتھوں پکڑ لیں گے۔ احمد کی پگڑی محمود کے سر باندھنے میں کتنی دیر لگتی ہے۔ وہ فوراً مجھے بھی ڈاکو ثابت کر دیں گے اور اعلان کر دیں گے کہ ان سب کی نظر کمزور تھی جنھوں نے ڈاکو کو دیکھا تھا۔

اس کے باوجود مجھے ایک اور خیال آیا تو میں نے چابی نکالی اور پیچھے جا کے ڈکی کھولی لیکن میں نے ڈکی کو دیر تک نہیں اُٹھایا۔ اسے تھوڑا سا کھولتے ہی میری نظر نے اندر ایک لاش کو دیکھ لیا۔ مجھے لاش کی کھلی ہوئی آنکھیں اور اس کا چہرہ صرف ایک لمحے کے لیے دکھائی دیا مگر اس ایک جھلک سے بھی میرے لیے شک کی گنجائش باقی نہ رہی۔ یہ گاڑی کا مالک نہیں تھا۔

ڈکی بند کر کے گاڑی کو لاک کرتے ہوئے میں نے سوچا کہ یہ دوسرا شخص کون ہو سکتا ہے۔ اگر یہ گاڑی کا مالک نہیں تھا تو شاید اس ڈاکو کا کوئی ساتھی تھا۔ ڈکیتی کی واردات ایک پلان کے مطابق کی جاتی ہے اور اس میں کم سے کم بھی دو افراد شامل رہتے ہیں جن میں سے ایک ہولڈ اپ کراتا ہے تو دوسرا رقم سمیٹتا ہے پھر ایک رقم لے کر دوڑتا ہے اور دوسرا گاڑی نکال کے لے جاتا ہے۔ تین یا زیادہ افراد ہوں تو رسک کم ہو جاتا ہے مگر ایک آدمی کے لیے تو کامیابی کے امکانات نہ ہونے کے برابر رہتے ہیں۔ ان حقائق کے پیشِ نظر اس دوسرے شخص کا بھی ایک ڈاکو ہونا سمجھ میں آتا تھا۔ شاید وہ اعتماد میں مارا گیا۔ کامیابی صرف اس کے حصے میں آئی جس کی شامتِ اعمال نے اسے تین لڑکیوں کو لفٹ دینے پر مجبور کر دیا۔

رالبعہ نے کہا "کیا ہو گیا ہے تھیں؟"

میں نے آہ بھر کے کہا "تمھیں اب تک نہیں معلوم ہائے میری قسمت!"

"اتنی دیر سے گاڑی میں کیا تفتیش کر رہے تھے۔ آ جاتی اگر پولیس تو کیا ہوتا؟" رالبعہ کا پارہ اور چڑھ گیا "اور یہ کیوں اُٹھا لائے ہو؟"

"بس مجھے اچھا لگا۔ نیا بریف کیس تھا" میں نے کہا۔ رالبعہ سمجھ گئی کہ میں سیریس ہونے والا نہیں ہوں۔ اس کا موڈ خراب ہو گیا۔ اسی وقت ایک ٹیکسی گزری اور میں نے اسے چلا کے آواز دی۔ وہ آگے جا کے رُکا اور پھر واپس آیا۔

"کدھر جانے کو ہے سیٹھ؟" اس نے ہمارے بیٹھتے ہی پیشہ ورانہ انداز میں پوچھا۔

"چرچ گیٹ" میں نے کہا۔ اس وقت میرے ذہن میں یہی نام آیا۔

میرا خیال تھا کہ چرچ گیٹ سے ہم دوسری ٹیکسی پکڑ لیں گے اور دو چار مرتبہ ٹیکسی بدل کے ہم بمبئی شہر میں گم ہو جائیں گے۔ پھر کوئی ہمارا سراغ بھی لگانا چاہے گا تو نہ لگا سکے گا۔ حالات کی سنگینی تقاضا کرتی تھی کہ ہم روپوش ہو جائیں اور پیسہ ہاتھ میں آتے ہی ایک پلان بھی میرے ذہن میں آ گیا تھا۔

چرچ گیٹ پر ٹیکسی کو کرایہ ادا کرنے کے بعد میں نے وہیں سے دوسری ٹیکسی پکڑنا مناسب نہ سمجھا۔ ہم بازاروں کی رونق دیکھتے ہوئے چلتے گئے۔ دکانوں کے سائن بورڈ دیکھنے سے مجھے معلوم ہوا کہ وہ دیر تر یمان روڈ تھی۔ شام کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے اور مجھے چائے کی طلب بھی محسوس ہو رہی تھی مگر یہ صرف چائے کی طلب نہیں تھی کہیں رک کر دم لینے کی خواہش بھی تھی۔ گزشتہ چند گھنٹوں میں پیش آنے والے واقعات نے مجھے ہی نہیں خواتین کو بھی شدید ذہنی و جسمانی دباؤ میں رکھا تھا۔

ناکن محل پر مجھے "سپنا ریسٹورنٹ" کا نام بڑا پُرکشش محسوس ہوا۔ اندر سے بھی یہ ایک بہت پُرسکون اور پُرتکلف جگہ ثابت ہوئی اور اس کے شریفانہ ماحول میں مجھے تحفظ اور عافیت کا احساس بھی ملا۔

رالبعہ نے کہا "تم نے کچھ سوچا کہ۔۔!"

"اتنی دیر سے میں اور کیا کر رہا تھا؟" میں نے رالبعہ کی بات کاٹ کر کہا۔

"ہم بہت غلط معاملات میں اُلجھ کر رہ گئے ہیں" رالبعہ نے کہا۔

"ہم اپنی مرضی سے ان معاملات میں ملوث نہیں ہوئے سب سے پہلے دلاور یہاں پہنچ کے بھی ہمارے پیچھے پڑا رہا۔ اس نے تریوینی جیسے بدمعاش کی حمایت حاصل کر لی۔ محسن اور غالب کو اغوا کرایا اور آخری سازش یہ کی کہ ہم بھی اس کے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس جائیں مگر ہم بال بال بچ گئے۔ اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ہم غالب اور محسن کو چھوڑ کے آگے بڑھ جائیں۔"

نازو نے کہا "لیکن اب ہم ان تک پہنچ ہی نہیں پائیں گے۔ درحقیقت تریوینی کی نہیں یہ ہماری ناکامی ہے۔" نازو نے کہا "وہ ہمارے لیے جال پھیلا چکا تھا مگر اس نے ظاہر کیا کہ ہم اسے گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ اس نے اپنی طاقت کا مظاہرہ بھی کیا، یہ ثابت کرنے کے لیے کہ وہ مجبور نہیں تھا۔ اور اس طرح ہماری طرف داری کا ڈراما کر کے ہمارا اعتماد بھی حاصل کر لیا۔"

"اب وہ زخمی سانپ کی طرح خطرناک ہو گیا ہے۔" گل بولی۔

میں نے کہا "اتنا حوصلہ ہارنے کی ضرورت نہیں۔ میں پھر وہی بات کہتا ہوں کہ ہم ایک راؤنڈ ہار گئے ہیں لیکن ناک آؤٹ نہیں ہوئے ہیں۔ گیم ابھی جاری ہے۔ آج یا کل تک میں ایک فیصلہ کُن جوابی کارروائی کرنے کی سوچ رہا ہوں۔ خدا نے چاہا تو میں ایم آر ایس کی منتشر قوت کو پھر یکجا اور متحد کر دوں گا۔ میرے اندازے درست ہوئے تو غالب اور محسن پھر ہمارے ساتھ ہوں گے اور اندازوں کے غلط ہونے کا امکان مجھے کم نظر آتا ہے۔"

ویٹر نے اس گفتگو میں ذرا سی دیر کے لیے خلل ڈالا۔ میں نے گل اور نازو کے لیے چائے کا آرڈر دیا۔ رالبعہ کے لیے اور اپنے لیے کافی کا۔

جب وہ چلا گیا تو رالبعہ نے کہا "آخر تم کرنا کیا چاہتے ہو؟ کچھ ہمیں بھی تو پتا چلے۔"

میں نے کہا "سب سے پہلا کام تو روپوش ہونے کا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ابھی تک ہمارے گرفتار نہ ہونے میں خوش قسمتی اور تائیدِ ایزدی کو بہت دخل ہے۔ لیکن خود ہمارے لیے بھی احتیاطی اور حفاظتی تدابیر اختیار کرنا ضروری ہے۔ ایک یا زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے بعد ہمارا نام پتا حلیہ سب مشہور ہو جائے گا۔ شاید یہ بھی اعلان کر دیا جائے گا کہ ہم ڈکیتی کی اس واردات میں بھی شریکِ جرم ہیں۔"

"بطور ثبوت تم مالِ غنیمت ساتھ لے ہی آئے ہو۔" رالبعہ نے کہا۔

"بی بی! یہ اگر میں نہ لاتا تو وہ لے جاتے جن کو اس کی بالکل ضرورت نہیں مگر پھر بھی وہ ہر وقت ڈاکے ڈالتے رہتے ہیں، ہر مجبور و بے بس، شریف اور ایمان دار کی عزت پر اور جیب پر۔"

"شریف اور ایمان دار آدمی ہی مجبور اور بے بس ہوتا ہے۔" نازو نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

"اچھا؟ اس اطلاع کے لیے شکریہ۔" میں نے کہا "کہنے کا مطلب یہ تھا کہ اصل ضرورت مند ہم ہیں۔ پولیس کا کیا ہے، وہ اپنی ضرورت سارا سال پوری کرتی رہتی ہے۔ اس وقت ہم خالی ہاتھ بھی تھے چنانچہ اسے بھی میں نے غیبی امداد سمجھ کے قبول کیا ہے۔ پیسہ آدمی کو کتنا طاقت ور کر دیتا ہے، اس کا اندازہ تمھیں آج ہی رات ہو جائے گا۔ اس پورے شہر میں مجھے کوئی جگہ محفوظ نظر نہیں آتی سوائے ان گنے چُنے ہوٹلوں کے جہاں عام آدمی کا گزر نہیں۔ وہاں پولیس کے خیال کا بھی گزر نہیں ہوتا اور تریوینی جیسے بدمعاش وہاں شریف بن کے ہی داخل ہو سکتے ہیں۔ جوہو کے ساحل پر جو فائیو اسٹار ہوٹل ہیں وہ ہماری بہترین پناہ گاہ ہیں۔ اس لیے اب میری بات دھیان سے سُنو۔"

ویٹر چائے اور کافی لے کر آیا تو میں خاموش ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ رالبعہ نسبتاً پُرسکون تھی مگر نازو اور گل کی صورتوں سے خوف، بے یقینی اور کشیدگی کے آثار عیاں تھے۔

ویٹر کے جانے کے بعد میں نے کہا "اب ہم اس صورتِ حال سے بالکل مختلف انداز میں نمٹنے کی کوشش کریں گے۔ یہاں سے نکل کے ہم سب رئیس بن جائیں گے۔ ابھی راستے میں مجھے کپڑوں کی ایک بہت اچھی دکان نظر آئی تھی۔ وہاں سے اپنے اپنے لیے فائیو اسٹار ڈریس خرید لو۔ ممکن ہے تمھیں دو تین دن وہاں گزارنے

پڑیں۔ اب وہ معزز خواتین جو ایسے عالی شان ہوٹلوں میں قیام فرماتی ہیں، دن میں کتنی بار لباس بدلتی ہیں اور کس طرح رنگ بدلتی ہیں۔ میرا مطلب ہے نیل پالش اور لپ اسٹک وغیرہ کا رنگ۔ یہ آپ لوگوں کو ضرور معلوم ہوگا۔"

"تم بھی تو دیکھتے ہی ہوگے، تم بتا دو۔" رالعہ نے کہا۔

میں نے دونوں کانوں کو چھو کر کہا۔ "توبہ کرو جی۔ میں غیر عورت کی طرف نظر اُٹھا کے نہیں دیکھتا۔ بس ایسے ہی کبھی نظر خود اُٹھ جائے تو الگ بات ہے۔ آخر بندہ خطا کا پُتلا ہے۔ دیکھنے میں یہ آیا ہے معزز خواتین اکہ لباس عموماً دو طرح کے زیب تن فرمائے جاتے ہیں۔ تن اور دھن کے اعتبار سے مشرقی یا مغربی۔ گویا مختصر ترین اور مکمل ترین۔ میری طرف سے آپ پر کوئی پابندی نہیں۔ آپ وہ لباس پسند کریں جو برتری بارودت پہنتی ہے تو ناظرین زیادہ پسند کریں گے۔"

"بس بہک گئے۔ اُتر گئے ٹپری سے۔" رالعہ نے کہا۔

"اچھا بابا۔ شٹل کاک برقعے اوڑھ کے گھس جاؤ ہالیڈے ان میں۔ مجھے کیا۔" میں نے کہا۔

نازو ہنسی۔ "کیوں۔ تم بھی صوفیانہ لنگی اور پگڑی میں ساتھ ہو جانا۔"

میں نے کہا۔ "معاف کیجیے، میں کسی کے ساتھ نہیں رہوں گا۔ خواہ آپ لباس پہنیں یا نہ پہنیں۔"

"حد ہوتی ہے بے شرمی کی بھی سکندر۔" رالعہ نے کہا۔

"بھئی مجھے شرم آتی ہے اسی لیے تو کسی کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ تم خواہ مخواہ ڈانٹ رہی ہو مجھے۔" میں نے کہا۔ "میں بالکل الگ کسی دوسرے ہوٹل میں جاؤں گا۔ اور آپ سب بھی الگ الگ ہوں گی اسی طرح۔"

"الگ الگ کمروں میں؟ ڈر لگے گا مجھے۔" گل نے کہا۔

"میں نے کب کہا ہے کہ الگ الگ کمروں میں۔ الگ الگ ہوٹلوں میں رہو گی تم سب۔" میں نے ڈانٹ کر کہا۔

"مگر اس کا مقصد؟" گل نے کہا۔

"مقاصد دو ہیں۔ ایک تو یہ کہ آج رات اگر پولیس یا تریونی کے جاسوس ہماری تلاش میں ہوٹلوں کی خاک چھانیں تو انھیں کہیں سے بھی تین عورتوں کے ساتھ ایک مرد کے اکٹھے آنے کی اطلاع نہ ملے۔ وہ تم سے یہ توقع نہیں رکھیں گے کہ تم الگ الگ بالکل اکیلی کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں جا کے قیام کرنے کی ہمت کر سکتی ہو۔ مگر تم کو یہی کرنا ہوگا۔ تلاش کرنے والے اسی نکتے کو بنیاد بنائیں گے کہ کہیں اس قسم کے حلیے میں چار افراد ایک ساتھ پہنچے ہیں تو انھوں نے کہاں ڈبل کمرے لیے ہیں۔ ایک کمرے میں تین تو ٹھہر نہیں سکتے چنانچہ وہ فرض کر لیں گے کہ ہم دو ڈبل کمرے ضرور لیں گے۔ یہ ایک فائدہ ہے۔ سب ایک ایک کر کے جاؤ۔ ڈرنے کی قطعی کوئی بات نہیں۔ یہ بمبئی ہے اور یہاں یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں سمجھی جاتی اگر اکیلی عورت ہوٹل میں قیام کرے۔ سارا کھیل اعتماد کا ہے۔ ان ہوٹلوں میں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آ ہی نہیں سکتا۔ بفرضِ محال کچھ ہو، تو اللہ تمھارا نگہبان ہے اور پھر تمھارا حوصلہ۔ بے دریغ گولی مار دینا۔ موقع ملے تو گولی مارنے سے پہلے منیجر سے مشورہ کر لینا۔"

"چلو وہ ہمارا مسئلہ ہے۔" نازو نے کہا۔ "ہم گولی سے ماریں یا میٹھی چھری سے ذبح کر دیں۔ قتل کرنا آتا ہے ہمیں۔"

رالعہ اور گل کے لبوں پر بھی نازو کی بات سے مسکراہٹ پھیل گئی۔ "تم دوسرا فائدہ بتاؤ۔"

"دوسرا فائدہ؟ ... غالباً یہ تھا۔" میں نے سوچنے کی اداکاری کی۔ "کہ تم لوگوں کو اندازہ ہو جائے گا۔"

"کس بات کا؟"

"یہی کہ تم کتنے پانی میں ہو۔ واقعی جادو کر دیتی ہو اور ایسا ہی تباہ کُن حُسن ہے تمھارا۔ یا ہم احمق تھے جو تباہ ہوئے۔" میں نے کہا۔ "بے چارہ غالب اور میں۔ مروّت میں مر گئے۔"

"سب ڈرامے باز۔ پیشہ ور عاشق۔" نازو نے کہا۔

میں نے کہا۔ "اکیلا ہوں اس لیے جو چاہو کہہ لو۔ مگر اب سُن لو دوسرا فائدہ کیا تھا۔۔"

"تیسرا فائدہ کہو اب تو۔"

"اچھا تیسرا فائدہ۔ ان ہوٹلوں میں تمھارا قیام مختصر ہی ہوگا مگر پھر بھی چانس ہے کہ تمھیں دلاور نظر آ جائے۔ کوشش کرو تو معلوم بھی کر سکتی ہو۔ ان ہوٹلوں کی خادمائیں اور ویٹر عموماً وہ سب کام کر دیتے ہیں جو بعض اوقات آدمی خود نہیں کر سکتا۔ ان کو زبردست انعام دو اور زبردست رازداری کے ساتھ معلوم کروا لو کہ شکاری کہاں گھات میں بیٹھے ہیں۔ ٹپ تو مل ہی گیا ہے کہ دلاور نے نواب خسرو جمشید کا نام اختیار کیا ہے۔ بس یہی چیک ہو جائے۔ اب بتاؤ یہ کوئی مشکل کام ہے؟"

"بس یہی پلان ہے؟"

"نہیں۔ یہ تو اس کا دیباچہ ہے۔" میں نے کہا۔ "آج رات میں اور نازو اس جزیرے پر جائیں گے۔ آدھی رات کے بعد۔"

"آدھی رات کے بعد۔ کیسے؟" رالعہ نے کہا۔

"اس کے بہت سے مروّجہ طریقے ہیں۔ بذریعہ ڈاک ٹرین یا ہوائی جہاز سے۔" میں نے کہا۔

"یہ تو۔ خودکشی کرنے والی بات ہے۔" رالعہ نے کہا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔ "جب سے تمھیں دیکھا ہے، بس خودکشی کی عادت سی ہو گئی ہے۔"

"ہر وقت اچھی نہیں لگتیں یہ باتیں۔" رالعہ نے چڑ کے کہا۔

"شام چھ بجے تو اچھی لگتی ہیں؟" میں نے گھڑی دیکھ کے کہا۔ "کیا خیال ہے، چلیں۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس جزیرے پر جانے کی اب کیا ضرورت ہے۔" رالعہ نے کہا۔ "اس نے تو جھوٹ بولا تھا۔"

"بالکل۔" نازو نے کہا۔ "ایسے کسی جزیرے کا وجود ہوگا ہی نہیں۔"

میں نے کہا۔ "کوئی بھی عقل مند آدمی جھوٹ بولتے وقت یہ خیال رکھتا ہے کہ وہ بے سر و پا نہ ہو۔ بے بنیاد نہ ہو۔ وہ جھوٹ کو سچ بنا کے پیش کرتا ہے اور اس کو قابلِ یقین بنانے کے لیے کوئی بنیاد ضرور رکھتا ہے۔ تریونی سے ایسی حماقت کی توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ کوئی بچکانہ کہانی سُنائے گا تو اس خوش فہمی کا شکار ہو جائے گا کہ ہم نے کہانی کو حقیقت مان لیا ہے۔ میں شرط لگا سکتا ہوں کہ جزیرے اور محل والی کہانی سو فی صد درست ہوگی۔ اصل مقصد ہی یہ تھا کہ ہم اعتبار کریں۔ اور شک کریں تو اس کہانی کی تصدیق کے بعد ہمارا شک رفع ہو جائے اور تریونی پر ہمارا یقین پختہ ہو جائے۔"

"اچھا مان لیا کہ ویران محل اور جزیرہ سب کچھ ہیں، مگر اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ محسن اور غالب وہیں ہوں گے۔"

"یہ واقعی ثابت نہیں ہوتا۔ اس معاملے میں کچھ میں عقل سے تو کچھ وجدان سے رہنمائی حاصل کر رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "یہ خود تریونی نے بتا دیا تھا کہ اس جزیرے کو اسمگلر استعمال کرتے تھے۔ پھر وہاں چھاپے پڑنے لگے تو انھوں نے ٹھکانا بدل لیا۔ اب اگر وہاں کوئی نہیں جاتا تو چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کے لیے وہ آئیڈیل جگہ ہے۔ اسمگلروں کا مسئلہ یہ ہوگا کہ وہ سامان اُتارنے کے بعد بمبئی کے ساحل پر پہنچاتے ہوں گے اور اس مقصد کے لیے چھوٹی بڑی کشتیاں اور لانچیں آتی جاتی ہوں گی۔ اسی لیے وہ نگرانی کرنے والوں کی نظر میں آ گئے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ان کی کسٹم والوں سے لین دین کے معاملے پر اَن بن ہو گئی ہو۔ اگر وہ کسٹم والوں کو بھی منافع میں شریک رکھتے تو وہ اپنی آنکھیں بند رکھتے۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ جس کا جزیرہ ہے اس نے پولیس اور اعلیٰ حکام کے سامنے شور مچایا ہو کہ میری ذاتی جاگیر کو اسمگلرز نے اپنا گودام بنا رکھا ہے۔"

"جزیرے کا مالک تو شاید مر گیا تھا۔ اس کہانی میں۔"

"اس کے وارث تو ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "وہاں وہ محل نہیں رہا اور پریوں کے جھمگٹے نہیں رہے لیکن جزیرہ تو اپنی جگہ پر ہے۔ کروڑوں کی مالیت ہوگی اس کی۔ کل پھر کوئی اسے خرید کے ٹورسٹ ہوٹل کے نام سے عیاشی کا اڈہ کھولنا چاہے تو کھول سکتا ہے۔ خود تریونی نے بتایا تھا کہ جہاں سے چٹان ٹوٹی ہے وہاں کنکریٹ کی دیوار کھڑی کی جا سکتی ہے۔ یہ سب بتلانے کا مقصد یہ ہے کہ ایسا جزیرہ ان لوگوں کے لیے بہت کارآمد ہوگا جو اسمگلر نہیں ہیں۔ وہاں سے کوئی سامان بمبئی نہیں لاتے اور روز آتے جاتے بھی نہیں۔ شاید مہینے میں ایک یا دو بار کوئی چھوٹا موٹا بحری جہاز وہاں لنگر انداز ہو کے رات بھر میں اپنا اسباب اُتار دیتا ہوگا۔ اسباب سے میری مراد ہے اسلحہ۔ ایسا ہی ایک جہاز ہم نے غرق کر دیا ورنہ وہ بھی اسی جزیرے پر اَن لوڈ ہوتا۔"

"کسی بحری جہاز کو وہاں سامان اُتارنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ بحری جہاز سیدھا مشرقی پاکستان جا سکتا ہے۔" نازو نے اعتراض کیا۔

"تم نے ایک عاقلانہ سوال کر دیا ہے غلطی سے۔" میں نے کہا۔ "بات یہ ہے عزیزہ! کہ جس جہاز کو ہم نے غرق کیا وہ بمبئی ہی آ رہا تھا۔ وہ انڈین مرچنٹ نیوی کا شپ تھا۔ 'الیس الیس کرانتی تھرڈ' اس قسم کے بحری جہاز راستے میں کسی پورٹ کو ٹچ کرتے ہیں تو مقصد ہوتا ہے تازہ پانی کا اسٹاک لینا یا فیول لینا۔ کسی چھوٹی موٹی خرابی کو دُور کرانے کے لیے پورٹ کی ورکشاپ کی خدمات حاصل کرنا۔ کوئی بحری جہاز اگر آ گے... راس کماری تک چکر لگا کے مشرقی پاکستان جائے تو اُسے کولمبو بھی ٹچ کرنا پڑے گا۔ اور اس کا راستہ بہت طویل ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ اسلحے کی اطلاع پاکستانی بحریہ کو مل جائے تو خلیج بنگال میں بھی بیڑہ غرق ہو سکتا ہے۔ زیادہ محفوظ طریقہ یہ ہے کہ اسلحہ بمبئی کے ساحل پر یا آگے کسی ویران ساحل پر اُتار دیا جائے۔ اگلی رات اسے ٹرکوں پر لوڈ کیا جائے اور یہ ٹرک خشکی کے راستے روانہ ہو جائیں۔ مشرقی اور مغربی بنگال کی سرحد کے بارے میں یقیناً تمھیں علم ہوگا کہ جغرافیائی اعتبار سے وہ ایک مشکل سرحد ہے۔ جہاں ہر جگہ سرحدی پابندیاں عائد کرنا اور خلاف ورزیاں روکنا عملاً ناممکن ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ ہزاروں لوگ اب بھی روز معاش کے لیے کلکتہ جاتے ہیں اور روز واپس آ جاتے

ہیں۔ علاوہ ان کے جو شوقیہ جاتے ہیں۔ اسی طرح ادھر کے لوگ پاسپورٹ ویزا اور کسی قسم کی روک ٹوک کے بغیر ڈھاکا پہنچ جاتے ہیں۔ سرحدی دیہات میں تو یہ صورتِ حال زیادہ خراب ہے۔ بعض جگہ تو پتا ہی نہیں چلتا کہ ہندوستان کہاں ختم ہوا اور پاکستان کہاں شروع ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلحہ خشکی کے راستے جا رہا ہے۔ جہاں جتنی ضرورت ہوئی اتنا اسلحہ پہنچا دیا۔ ایک ٹرک کچے راستوں اور جنگلوں سے گزر کے دس جگہ اسلحہ تقسیم کر سکتا ہے۔ مجھے اس بات کا بھی یقین ہے کہ جزیرے کو استعمال کرنے کی اجازت حاصل کر لی گئی ہوگی۔ مالکوں کو اس کا کرایہ ادا کر دیا گیا ہوگا۔ مالکوں کو کیا کہ اس ویران جزیرے کا کرایہ کسی نے کیوں ادا کیا ہے۔ چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کے مقاصد سیاسی ہیں۔ انھیں سیاسی حمایت بھی حاصل ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کسٹم والے اور نیوی والے جانتے بوجھتے ان کو نظر انداز کریں۔ انھیں تاکید ہو کہ دخل در معقولات نہ کیا جائے۔"

"تمھاری بات میں وزن ہے۔" رالعہ نے مسکرا کے کہا۔

میں نے آہ بھر کے کہا۔ "ایک شعر عرض ہے یہ بھی وزن سے خارج نہیں۔"

"بالکل نہیں۔ یہ شعر کہاں سے آگیا بیچ میں۔" نازو نے احتجاج کیا۔ "بات جزیرے کی ہو رہی تھی۔"

"کیا جزیرے میں شیر نہیں ہو سکتا؟ اتنا ڈرتی ہو تم تو میں رالعہ کو لے جاتا ہوں ساتھ۔" میں نے کہا۔ "رالعہ کسی شیر سے نہیں ڈرتی۔"

"بجا ارشاد۔ مگر میں آپ کی شاعری سے ڈرتی ہوں۔" رالعہ نے کہا۔ "یہ تو غالب کو ہر شعر پہ داد دے سکتی ہے۔ عملاً۔ میں نہیں دے سکتی۔"

مجھے بے اختیار ہنسی آئی۔ "اچھا بھئی۔ جیسی تمھاری مرضی۔ نازو کو تو جانا ہی تھا ویسے بھی۔ میں جاتا یا نہ جاتا۔"

"چلو اب اٹھو۔ ایک گھنٹا گزار لیا یہاں۔" رالعہ نے کہا۔

میں نے بل ادا کیا اور ہم باہر آگئے۔ جس دکان کا میں نے ذکر کیا تھا وہ زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ "اسٹیڈیم ہاؤس میں" کے سنٹر ایک جدید ترین ملبوسات کا اسٹور تھا۔ مہذب اور خوش اطوار... سیلز گرلز نے ذرا سی دیر میں تاڑ لیا کہ گاہک بڑے ہیں اور انھوں نے بڑی پیشہ ورانہ مہارت سے ملبوسات کے ڈھیر لگانے شروع کیے۔ سر اور میڈم کہتے کہتے ان کے گلے خشک ہونے لگے۔ سر تو میں اکیلا تھا اور مجھے اپنے لیے تین سوٹ چند ٹائیاں شرٹس اور جوتے خریدنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ خواتین نے فطری تقاضوں کے مطابق ایک چیز خریدی تو دس مسترد کر دیں اور اس

کے بعد میچ کرنے کا سلسلہ شروع ہوا تو ہم ڈیڑھ گھنٹے بعد اسٹور سے نکلے۔ ہمارا اسباب ہماری خواہش کے مطابق الگ الگ سوٹ کیسوں میں پیک کر دیا گیا تھا۔ خواتین نے ڈریسنگ روم میں جا کے لباس بھی بدل لیے تھے اور واجبی سا میک اپ بھی کر لیا تھا۔ چنانچہ ہم عجیب حلیے میں اندر گئے تھے مگر جب باہر آئے تو ہماری شان ہی نرالی تھی۔ سوٹ کیس اٹھا کے لانے والے کا خیال تھا کہ اتنے بڑے لوگ کسی بہت بڑی گاڑی میں آئے ہوں گے جس کا مؤدب شوفر باہر اٹین شن کھڑا ہوگا۔

اگر ہم ٹیکسی میں جاتے تو سوٹ کیس اٹھانے والا بھی مایوس ہوتا اور ہماری شان بھی گھٹتی۔ اس صورتِ حال سے میں یوں نمٹا کہ دور کھڑی ہوئی ایک شاندار کار کے شوفر کو ہاتھ کے اشارے سے اور چٹکی بجا کے آواز دی اور سوٹ کیس لانے والے کو پچاس کا نوٹ ٹپ دے کر رخصت کر دیا۔ ظاہر ہے میرے بلانے سے وہ شوفر حاضر نہیں ہو سکتا تھا جسے میں نے اشارہ کیا تھا۔ سوٹ کیس لانے والا اسلام جھاڑ کے چلا گیا تو میں نے ایک ٹیکسی روکی۔

"تم دونوں جاؤ اس میں۔" میں نے گل اور رالعہ کو حکم دیا۔

"ہم... اکیلے...؟" گل نے کہا مگر پھر میری صورت دیکھ کر خاموش ہو گئی۔ میں نے سوٹ کیس ڈکی میں رکھوایا۔ "تم جس ہوٹل میں چاہو ٹھہرو۔" میں نے کہا۔ "نام کچھ بھی لکھوا دینا بس پُراعتماد رہنا۔ اور مجھے بتا دینا۔"

"تمھیں کیسے بتا دیں؟" رالعہ نے کہا۔

"میں یہیں جیمز گیٹ پر "ایمبیسیڈر ہوٹل" میں جا رہا ہوں۔ میں نازو کے بھیّا کے نام سے کمرا لوں گا۔ ایس آئی شیخ تمھیں یاد رہے گا۔"

"بس تو پھر میں بھی موہنی کے نام سے کمرا لوں گی تمھیں یاد رہے گا۔" رالعہ نے کہا اور ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔

میں نازو کے ساتھ وہیں کھڑا سوچتا رہ گیا کہ کیا یہ رالعہ کی غیر ارادی حرکت تھی اور اس وقت موہنی کا نام لینے میں حسد کا وہ جذبہ کارفرما تھا جو ہر عورت کے دل میں خلش بن کے رہتا ہے۔ موہنی مر چکی تھی۔ کیا رالعہ اب بھی محسوس کرتی تھی کہ اس کے ساتھ میری جذباتی وابستگی کا عرصہ زیادہ طویل تھا اور اس کی جڑیں میرے بچپن تک پہنچتی تھیں۔ عمر کے اس دور تک جہاں رالعہ کی کسی یاد کا گزر نہ تھا۔

نازو نے دوسری ٹیکسی روک کے کہا۔ "اب اسے بتاؤ کہاں جانا ہے۔ خلا میں مت گھورتے رہو۔ رالعہ تو گئی۔"

"کون گئی؟" میں نے کہا اور باقی دو سوٹ کیس ڈکی میں رکھے۔

"جس کے نام نے تمھیں افسردہ کر دیا۔" نازو نے کہا۔

میں نے برہمی سے کہا۔ "تمھارا ابھی دماغ خراب ہو رہا ہے۔ میں کیوں افسردہ ہونے لگا موہنی کے نام سے۔"

"میں نے کب موہنی کا نام لیا ہے؟" نازو نے بگڑ کے کہا۔

"پھر تم نے کیا کہا تھا؟" میں نے ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے رالعہ کا نام لیا تھا۔ تم نے موہنی کا نام کیوں سنا؟ اس کا مطلب ہے...."

"خاک مطلب ہے۔ کوئی مطلب وطلب نہیں اس کا..."

"صاب میرے کو بولو کدھر جانے کا ہے۔" ڈرائیور نے ہماری لڑائی سے اکتا کے کہا۔

"ایمبیسیڈر ہوٹل۔" میں نے کہا۔ "تم اجنتا ہوٹل چلی جاؤ۔" میں نے نازو کو مخاطب کیا۔

"میں ایمبیسیڈر ہوٹل جا رہی ہوں۔ تم چلے جاؤ اجنتا ہوٹل۔" نازو نے منہ پھلا کے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ کیا خواہ مخواہ کی ضد ہے۔ میں رالعہ اور گل سے کہہ چکا ہوں۔" میں نے کہا۔ "وہ فون کریں گی مجھے ایمبیسیڈر میں۔"

"پھر میں کیا کروں؟" نازو نے کہا۔ "تم کو کس نے منع کیا ہے ایمبیسیڈر میں ٹھہرنے سے؟"

"لیکن ہم نے طے کیا تھا کہ ایک ہی جگہ نہیں ہوں گے۔"

"ہو گئے تو کون سی قیامت آجائے گی۔ یہ کون سا آسمانی فیصلہ تھا۔" نازو نے کہا۔ "الگ الگ فلور ہو سکتے ہیں ہمارے اور اگر آج ہی رات کو ہمیں اکٹھے جانا بھی ہے تو پھر یہ کوئی عقلمندی نہیں کہ میں میلوں دور جا کے رہوں۔ آٹھ تو بج ہی گئے ہیں۔"

"اچھا بابا۔" میں نے جھنجلا کے کہا۔ "تم جاؤ ایمبیسیڈر میں۔ میں چلا جاتا ہوں کہیں اور۔"

لیکن یہ بات صرف ٹیکسی ڈرائیور کو سنانے کے لیے تھی۔ نازو کی بات نے مجھے قائل کر لیا تھا کہ تین چار گھنٹوں کے لیے نازو کا اور میرا الگ ہونا صرف باعثِ زحمت ہوگا۔ اتنے کم وقت میں نازو کچھ بھی معلوم نہیں کر سکے گی۔ میرا وقت بھی آنے جانے میں ہی صرف ہو جائے گا۔

میں نے نازو کے کان میں کہا۔ "میں آتا ہوں دس پندرہ منٹ کے بعد۔"

اور ڈرائیور سے چلا کے کہا۔ "ڈرائیور گاڑی روکو۔"

ڈرائیور نے گاڑی روک دی۔ میں نے اپنا سوٹ کیس نکال لیا اور نازو سے کہا۔ "میں جا رہا ہوں اجنتا ہوٹل۔"

"مجھے بتانے کی ضرورت نہیں۔" نازو نے چیخ کے کہا۔ "میری طرف سے تم بھاڑ میں جاؤ۔"

ڈرائیور نے یقیناً یہی سمجھا ہوگا کہ میاں بیوی یا محبت کرنے والوں میں لڑائی ہو گئی ہے۔ جذباتی لڑائیاں ایسی ہی فضول باتوں پر مگر اتنی ہی دھواں دھار ہوتی ہیں۔ جب ٹیکسی چلی گئی تو میں نے کچھ وقت گزارنے کے لیے تھوڑا سا فاصلہ پیدل طے کیا۔ ایک جگہ سے امپورٹڈ سگریٹوں کا کارٹن خریدا اور ایک لائٹر۔ سگریٹ جلا کے میں چند قدم ہی چلا تھا کہ ایک خبیث صورت شخص میرے پیچھے لگ گیا۔

"صاب تمبولا۔ ڈانس۔ بیوٹی فل گرل۔"

میں نے غرا کے کہا۔ "دفع ہو جاؤ۔"

لیکن وہ باز آنے والا نہیں تھا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے چلتا رہا اور بولتا رہا۔ "سی سائیڈ۔ فل مون سر۔ اسکاچ وہسکی۔ اینگلو انڈین۔ ویری بیوٹی فل لیڈی سر۔"

تنگ آکے میں نے اسے گالی دی اور مارنے کو دوڑا تو اس نے میری جان چھوڑی۔ میں بہترین سوٹ میں تھا۔ میرا بریف کیس بھی بہت قیمتی تھا اور میرے دوسرے ہاتھ میں غیر ملکی سگریٹ تھے لیکن میں پیدل تھا چنانچہ اس نے مجھے ٹورسٹ فرض کر لیا تھا اور اپنی سیلز مین شپ کے مظاہرے پر کمربستہ تھا۔ ہر بڑے شہر کی طرح جہاں انتہائی غربت کے ساتھ انتہائی دولت مندی بھی نظر آتی ہو اور جہاں آبادی کی کثرت نے معاش کے شریفانہ راستے مسدود کر دیے ہوں، غیر ملکی سیاحوں کی پذیرائی کے لیے ناؤ نوش کے سب لوازمات میسر ہوں وہاں نائٹ لائف کی رنگینی میں کاروبارِ حسن خود چمک اٹھتا ہے۔ بمبئی ابھی سنگاپور یا ہانگ کانگ اور بنکاک سے بہت پیچھے تھا مگر کراچی سے بہرحال آگے تھا۔

اس معمولی سے واقعے نے مجھے تھوڑا سا جذباتی اور قنوطی کر دیا تھا مگر ایمبیسیڈر ہوٹل پہنچتے پہنچتے میں نے اس خیال کو ذہن سے نوچ ڈالا۔ میں کسی بزنس ایگزیکٹو کی طرح کاؤنٹر پر پہنچا تو رجسٹر پر ایک نظر ڈالتے ہی میں نے نازو کے کمرے کا نمبر دیکھ لیا۔ وہ سیکنڈ فلور کے بارہ نمبر کمرے میں تھی۔ روم نمبر دو سو بارہ۔ وہ رجسٹر کا آخری اندراج تھا چنانچہ میں نے کسی دشواری کے بغیر نام بھی پڑھ لیا۔ نازو نے بھی اپنا نام موہنی دیوی لکھوایا تھا۔

کلرک نے مجھ سے میرا نام پوچھا تو میں نے کہا۔
"ایس آئی شیخ۔"
کلرک نے پوچھا "کہاں سے تشریف لائے ہیں؟"
میں نے رجسٹر کو دیکھ کر کہا "دہلی سے۔ مگر میں اپنا پتا سیکرٹ رکھوں گا۔"
کلرک کچھ پریشان نظر آنے لگا۔
میں نے کہا "بات یہ ہے ینگ مین کہ میری بیوی ناراض ہو کے آئی ہے اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ یہاں ٹھہری ہے۔ یقیناً اس نے بھی اپنا نام پتا غلط لکھوایا ہوگا۔ میں نہیں چاہتا کہ اسے میری یہاں موجودگی کا علم ہو۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی آئی ہوگی وہ۔ اکیلی۔"
کلرک مسکرانے لگا "موہنی دیوی... اور تو اکیلی خاتون آج کوئی نہیں آئیں۔"
میں ہنسا "مجھے معلوم تھا۔ خیر تم مجھے کسی دوسرے فلور پر جگہ دو۔ آئی وانٹ ٹو سرپرائز ہر۔ لیکن آج رات نہیں صبح۔"
کلرک نے سر ہلایا اور میرے نام کے سامنے وہی پتا لکھ لیا جو نازو نے لکھوایا تھا۔ پھر اس نے مجھے تیسرے فلور کا بارہ نمبر کمرا دے دیا۔
"بالکل اوپر والا کمرا سر۔ وِش یو گڈ لک۔" وہ مجھے چابی دے کر مسکرایا۔ میں نے چابی بیل بوائے کو دی جو میرے ہاتھ سے بریف کیس لینے کے لیے مستعد کھڑا ہوا تھا۔ اس نے کمرے تک میری راہنمائی کی۔ وہ پندرہ سولہ سال کا لڑکا تھا۔ ٹپ کے دس روپے لے کر سیلوٹ جھاڑنے کے بعد اس نے متوقع نظروں سے مجھے دیکھا۔ کہ اور کوئی خدمت؟ اب خدمت کے ہزار مفہوم نکلتے ہیں اور کوئی کچھ بھی مانگ سکتا ہے۔ یہاں استطاعت کی نہیں طبع خریدار کی بات تھی۔
میں نے کہا "تم اسمارٹ لڑکے ہو۔ کتنا عرصہ ہوا ہے یہاں؟"
"تین سال سر۔" اس نے پُرامید ہو کے کہا۔
"پھر تو تمھیں بہت تجربہ ہوگا۔" میں نے کہا "مجھے یہ بتاؤ کہ بھروسے کا آدمی کون ہے؟"
"میں سب کچھ کر سکتا ہوں سر۔ آپ بتائیے کیا چاہیے؟"
میں نے کہا "ہوٹل کے اندر تم یقیناً سب کچھ لا سکتے ہو۔ مگر یہ کام باہر کا ہے۔"
"باہر کا مال اندر لا سکتا ہوں میں سر۔" اس نے معنی خیز انداز میں مسکرا کے کہا۔
"یہ مال کی بات نہیں ہے۔ کام ایسا ہے جس کے لیے کسی کو باہر جانا پڑے گا۔" میں نے کہا "اور تم ڈیوٹی پر ہو۔"

"پھر میں اپنے چاچا کو بھیج دیتا ہوں سر۔" وہ خوش ہو کے بولا "وہ باہر کا ہر کام کر سکتا ہے۔ اور باہر ہی موجود ہے۔"
"باہر کہاں؟"
"کار پارکنگ میں۔" لڑکے نے کہا۔
"کسی کو کچھ معلوم نہیں ہونا چاہیے۔" میں نے پچاس کا ایک نوٹ دکھا کے کہا۔
"بالکل فکر مت کریں آپ سر۔"
"انعام میں بڑا دیتا ہوں۔ لیکن۔" میں نے دوسرے ہاتھ سے اپنا ریوالور نکال کے واپس جیب میں رکھ لیا "کام خراب ہوجائے تو خانہ خراب کر دیتا ہوں۔ کیا سمجھے؟"
"سب سمجھ گیا سر۔" لڑکے نے کہا۔ ریوالور دیکھ کے وہ ڈرا نہیں تھا۔ اس کا واسطہ ہر قسم کے لوگوں سے پڑتا ہوگا۔ خود اس کے دل میں کوئی بے ایمانی نہیں تھی اور بڑے انعام کا لالچ الگ تھا اس لیے وہ مطمئن رہا۔
"کیا نام ہے تمھارے چاچا کا؟ یہ کوئی رشتے کا چاچا ہے یا تم نے بنا لیا ہے چاچا؟" میں نے کہا۔
"اصلی۔ سگا والا چاچا ہے سر۔"
"کیا نام ہے اس کا؟" میں نے پچاس کا نوٹ اسے دے دیا۔
"تھینک یو سر۔ اس کا نام ہے اینڈی۔ اینڈریو۔"
جب اینڈریو نے دستک دے کر اپنا نام بتایا تو میں اطمینان سے صوفے پر پاؤں پھیلائے سگریٹ پی رہا تھا اور کاٹن میرے سامنے رکھا ہوا تھا۔ اینڈی کو اس کے بھتیجے نے یقیناً بتا دیا ہوگا کہ اسے کس قماش کے سیٹھ نے طلب کیا ہے۔ وہ تیس سال کا جوان آدمی تھا۔ اس نے براؤن شرٹ اور پینٹ کے ساتھ براؤن جوتے پہن رکھے تھے اور غالباً شوقیہ اپنے بال بھی براؤن کرا لیے تھے۔
میں نے کہا "اینڈی نہیں۔ تمھارا نام مسٹر براؤن ہونا چاہیے۔"
وہ مسکرایا "یو کین کال می براؤن سر۔"
میں نے کہا "مسٹر براؤن! ایک کام ہے جو خطرناک تو نہیں ہے لیکن بہت رازداری کا ہے۔" میں نے انگریزی میں کہا۔
"آپ مجھ پر بھروسا کر سکتے ہیں سر۔"
"اس کام کے پانچ ہزار بھی مل سکتے ہیں۔ اگر یہ کام میری مرضی کے مطابق ہوجائے۔" میں نے کسی بہت بڑے بدمعاش کی طرح دُھواں چھت کی طرف چھوڑتے ہوئے کہا اور براؤن کی طرف دیکھا تک نہیں۔

براؤن خاموش کھڑا رہا۔ اسی وقت فون کی گھنٹی بجنے لگی۔
"ہیلو۔ کس سے بات کرنی ہے؟" میں نے ریسیور اٹھا کے کہا۔
"تم سے۔" رابعہ کی آواز آئی "میں ہوٹل اجنتا میں ہوں۔"
"اوبابا گولی مارو لانچ کو۔" میں نے کہا "میں آدھی رات سے پہلے نہیں آسکتا۔" اور فون پٹخ دیا۔
"ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔" میں نے سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسل کے کہا "کہ کیا تم بہادر آدمی ہو؟"
"آپ مجھے آزما سکتے ہیں۔" وہ بولا۔ رابعہ تو یقیناً سمجھ گئی ہوگی کہ میری اس فضول بات کا مطلب کچھ نہیں۔ کسی وجہ سے میں فون پر بات کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن مؤدب کھڑے ہوئے مسٹر براؤن پر میرے ردِ عمل کا خاطر خواہ اثر ہوا۔
"مسٹر براؤن! رات بارہ بجے کے لیے ایک لانچ چاہیے کوئی چھوٹی سی لانچ۔ جس پر دو لائف جیکٹ ہوں۔"
اس نے کچھ دیر میری بات پر غور کیا اور پھر بولا "لانچ کو آپ کہاں لے جائیں گے سر؟"
میں نے ہنس کر کہا "لانچ مجھے لے جائے گی بیوقوف اور سمندر میں مجھے ایک جگہ چھوڑ کے واپس لوٹ جائے گی۔"
"کہاں چھوڑ کے سر؟"
اس سے میں نے جزیرے اور محل کے بارے میں سوالات کیے تو ثابت ہوگیا کہ تریونی کی کہانی غلط نہیں تھی۔ شاید بمبئی میں بہت سے لوگ یہ کہانی جانتے تھے۔ تھوڑے بہت فرق کے ساتھ سب ان پُراسرار واقعات پر روشنی ڈال سکتے تھے۔
"لانچ مجھے اس جزیرے سے ایک کلومیٹر کے فاصلے پر چھوڑ کے واپس چلی جائے گی۔" میں نے کہا "اس کے میں دس ہزار دوں گا۔"
"نو پرابلم سر۔" مسٹر براؤن کا چہرہ دمکنے لگا۔
"اس کے بعد۔" میں نے کہا "صبح جو لانچ سورج نکلنے کے بعد مجھے وہیں موجود ملے گی۔ اسے دُگنی رقم بھی مل سکتی ہے۔ اسے انتظار کرنا ہوگا۔"
"کتنی دیر تک سر؟"
"میرا خیال ہے کہ سورج نکلنے سے ایک گھنٹا پہلے اور پھر ایک گھنٹا بعد تک۔ دو گھنٹے لگ سکتے ہیں۔ ہم وہیں مل جائیں گے۔"
"آپ کے ساتھ اور کوئی بھی ہوگا؟"
میں نے اسے آنکھ ماری اور مسکرایا "یس۔ ایک عورت۔"
مسٹر براؤن نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ اب تک وہ سمجھ رہا تھا کہ معاملہ اسمگلنگ کا ہے مگر یہ تو بس اتنی سی بات تھی کہ کوئی سرپھرا کسی عورت کے ساتھ اس ویران جزیرے پر ایک رات گزارنا چاہتا تھا۔ معلوم نہیں وہ کس کی بیوی تھی کہ وہ اتنی رازداری اور ایسے احتیاطی انتظامات کر رہا تھا۔ ورنہ ہوٹل میں بھی کیا پتا چلتا ہے۔ کون آیا کون گیا!
ٹیلی فون کی گھنٹی پھر بجی۔ میں سمجھ گیا کہ اس بار گل کا فون ہوگا۔
ریسیور اُٹھا کے میں نے کہا "کیا بات ہے؟"
گل نے میری آواز شناخت کرلی "بہت غصے میں معلوم ہوتے ہیں آپ۔"
"معلوم ہوتے ہیں کیا مطلب! ہیں۔" میں نے کہا "تم کہاں ہو؟"
اُس نے کہا "مجھے رابعہ باجی نے "ریویرا" میں ٹھہرنے کو کہا۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا تھا۔"
"کیوں؟ ڈرنے کی کیا بات تھی؟"
"بس ایسے ہی۔ پہلے کبھی ایسے ہوٹل میں اکیلی نہیں رہی نا... میں نے نوزیہ لکھوایا ہے اپنا نام۔"
"کیا؟" میں نے کہا۔
"مجھ سے رابعہ باجی نے کہا تھا۔" گل میرے لہجے سے ڈر گئی۔
"تم کو معلوم ہے یہ کس کا نام تھا؟"
"نہیں۔ کوئی غلطی ہوگئی مجھ سے؟"
"تم سے غلطی نہیں ہوئی۔ اس کا دماغ خراب ہو رہا ہے کچھ شاید۔" میں نے برہمی سے کہا "خیر۔ ٹھیک کر دوں گا میں۔ تم اب دوبارہ فون مت کرنا۔"
اینڈریو عرف اینڈی یعنی مسٹر براؤن نے خاموشی سے اس گفتگو میں یکطرفہ طور پر صرف میرے ڈائلاگ سُنے تھے۔ اس سے یہ اندازہ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ میں کسی مرد سے مخاطب ہوں یا کسی عورت سے۔ تاہم میرے تحکمانہ بلکہ کسی حد تک متکبرانہ لہجے نے اسے یقیناً متاثر کیا ہوگا کہ میں بھی کوئی دادا قسم کی چیز ہوں جس سے شاید یہ رابطہ قائم کر رہے ہیں۔
"ہاں تو مسٹر براؤن۔" میں نے بریف کیس کھول کے کہا۔
"پھر گویا بات پکی ہوگئی۔"
مسٹر براؤن نے نوٹوں کی گڈیوں کو دہشت زدہ نظروں سے دیکھا کیوں کہ اس دولت پر سانپ تو نہیں ایک ریوالور نظر آرہا تھا جو سانپ سے زیادہ بے رحم پہریدار تھا۔ میں نے پانچ ہزار روپے نکالے اور اسے تھما دیے۔

"یہ تمھارا ایڈوانس ہے۔"

"یس... یس سر... تھینک یو سر۔" اس نے ڈرتے ڈرتے نوٹ جیب میں ٹھونس لیے۔ "ہم غریب آدمی ہے سر۔ ایسا کوئی بات ہے... تو بول دو۔ ہمارا فیملی ہے۔"

میں نے مسکرا کے کہا۔ "تمھارے لیے کوئی رِسک نہیں ہے مسٹر براؤن۔"

"آپ کس وقت جائیں گے سر؟"

"ابھی ایک گھنٹے کے اندر اندر۔" میں نے بریف کیس بند کر دیا مگر ریوالور کو جیب میں ڈال لیا۔

"پھر میں چلتا ہوں سر۔"

"ایک منٹ اور مسٹر براؤن۔" میں نے کہا۔ "میری بات ابھی پوری نہیں ہوئی۔ تم جانتے ہو ایسے معاملات میں راز داری کتنی اہم ہوتی ہے؟"

"میں آپ کو یقین دلا چکا ہوں سر کہ میری زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکلے گا۔"

میں نے سر ہلایا۔ "تم پر اعتبار ہے مجھے۔ اب مسئلہ ہے ہمارا۔ میرا اور اس عورت کا۔ ہم باہر کیسے جائیں کہ کسی کو معلوم نہ ہو؟"

وہ بھونچکا رہ گیا۔ میں نے اس کی صورت پر تذبذب کے آثار دیکھے۔ اس پُراسرار معاملے کا دوسرا پہلو اب سامنے آیا تھا۔ وہ بات پکی کر چکا تھا اور پانچ ہزار جیب میں بھی ڈال چکا تھا۔ اب پیچھے ہٹنا مشکل تھا اور جیب میں آ جانے والی رقم کو واپس کرنا اس سے بھی زیادہ مشکل۔

"کیا وہ... اسی ہوٹل میں ہے؟"

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ "اس سے زیادہ میں تم کو اس کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ اس ہوٹل سے باہر جانے کے کتنے راستے ہیں؟"

"راستے؟" وہ سوچ میں پڑ گیا۔

"ہاں۔ ہم سب کے سامنے سے گزر کر نہیں جا سکتے۔ کسی کو بھی معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ میرے ساتھ کون ہے۔"

"میں سمجھ گیا سر لیکن یہ کام میں اکیلا نہیں کر سکتا... میرا مطلب ہے کہ... کسی کو شریک کرنا پڑے گا۔"

"مثلاً کس کو؟" میں نے کہا۔

"کاؤنٹر کلرک۔ جہاں آپ باہر جاتے وقت چابیاں چھوڑ جاتے ہیں۔"

"اوہ نو۔" میں نے کہا۔ "اچھا تم یہ تو معلوم کر سکتے ہو کہ اس فلور پر اور اس کے نیچے والے فلور پر کون کون سے کمرے خالی ہیں؟"

وہ میرے سوال پر چکرا گیا۔ "یہ کوئی مشکل کام نہیں"

"اچھا۔ کسی کمرے کی چابی نہ ہو تو اسے کیسے کھولا جا سکتا ہے؟"

"میں سمجھا نہیں سر! آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "بھئی فرض کرو ہم اسی ہوٹل کے کسی کمرے میں ملنا چاہیں اور یہ بھی چاہتے ہوں کہ بات کسی کو معلوم نہ ہو۔ ایسی صورت میں ہمارا باہر جانا شاید ضروری نہ رہے۔ تم کو تمھارا معاوضہ بہر حال مل جائے گا۔"

وہ کچھ مطمئن نظر آنے لگا۔ "یہ ہو سکتا ہے سر لیکن اس کے لیے ڈپلی کیٹ کی ضرورت پڑے گی۔"

"وہ تو معلوم ہو جائے گا کہ ڈپلی کیٹ غائب ہے۔" میں نے کہا۔

وہ مسکرایا۔ "نہیں سر۔ وہ ڈپلی کیٹ اسپیشل ہے۔ کچھ خاص مہمانوں کے لیے۔ جو بکنگ کرائے بغیر کمرے لیتے ہیں۔ ان کا کے رجسٹر میں کچھ نہیں لکھا جاتا..... اور نہ ہوٹل والوں کو کچھ پتا ہے۔"

"پھر کیسے ملتا ہے؟"

"جس کے پاس بھی ڈپلی کیٹ ہو۔" وہ بولا۔ "زیادہ نہیں بس چار پانچ ایسی چابیاں ہیں۔ جو چوری چھپے بنوائی گئی ہیں۔ پانچ سو ایک رات کے مل جاتے ہیں۔ سب کی ضرورت پوری ہو جاتی ہے۔"

"اچھا انتظام ہے۔" میں نے کہا۔ "تم کو معلوم ہے کہ ایسی کوئی چابی آج رات کس سے مل سکتی ہے؟"

"آپ کے خادم کے پاس ایک چابی ہے سر۔"

"کس کمرے کی؟"

"روم فور ٹو زیرو۔ چار سو بیس۔ کوئی بھی یہ نمبر لینا پسند نہیں کرتا۔ جب تک مجبوری نہ ہو۔"

میں نے مسکرا کے کہا۔ "ظاہر ہے۔ چار سو بیس کا عدد ہی ایسا ہے کہ چار سو بیس کرنے والوں کے کام آ سکتا ہے۔ لیکن مسٹر براؤن! آج رات کوئی مجبوری تو درپیش نہیں ہے؟"

"نہیں سر۔ ابھی سیزن نہیں ہے ہر فلور پر کمرے دستیاب ہیں۔" وہ بولا۔ "اس کے علاوہ میں نے ایسا بندوبست کر رکھا ہے کہ مجبوری میں بھی وہ کمرا شاید کوئی نہ لے۔ اس کی لائٹس خراب ہو جاتی ہیں۔"

"خراب ہو جاتی ہیں یا ہیں؟"

"ہو جاتی ہیں۔ اگر کوئی استعمال کرے۔ فیوز اُڑ جاتا ہے خود ہی اور عموماً رات کے وقت خرابی کا پتا چلانا مشکل ہوتا ہے۔ الیکٹریشن دن میں آتا ہے تو کوئی خرابی نہیں ہوتی۔" وہ عیاری سے مسکرایا۔

"یہ کیا چکر ہے؟ تم اندھیرا فراہم کرتے ہو۔ خواہ کوئی اندھیرے میں نہ رہنا چاہے۔"

"ایمرجنسی لائٹ ہے کمرے میں۔ وہ ضرورت مندوں کو کافی ہوتی ہے۔ پانچ سو میں ایئر کنڈیشنر، فریج وغیرہ تو نہیں مل سکتے سر... مگر راز داری اور پرائیویسی ملتی ہے۔"

"یہ فیوز صرف رات کو کیسے اُڑتا ہے آخر؟"

"بس سر۔ ہاتھ کی صفائی ہے۔" وہ بولا۔ "ایک وال لائٹ کے یا ٹیبل لیمپ کے بلب پر پچیس پیسے کا سکہ رکھ کے بلب فٹ کر دیتا ہوں۔ آپ دس بار فیوز لگائیں وہ اُڑ جائے گا۔ صبح بلب ہٹا کے سکہ الگ کر لیتا ہوں۔"

"بہت چالاک آدمی ہو تم۔ خیر۔ یہ بتاؤ اس کمرے کی چابی کے پانچ سو الگ ہوں گے؟"

اب وہ سمجھ گیا تھا کہ مجھ سے پیسہ لوٹا جا سکتا ہے۔ اس نے عاجزی سے کہا۔ "آپ کی فیاضی ہو گی اگر مل جائیں۔"

میں نے اسے مزید ایک ہزار بخش دیے۔ "چلو تم خوش رہو۔ اب یہ بتاؤ کہ چابی کہاں ہے؟"

اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک چابی نکالی۔ "سر! ہمارے لیے کوئی مصیبت پیدا نہ ہو۔ ہم غریب لوگ ہیں۔"

میں نے دل ہی دل میں اسے اور اس جیسے بدمعاشوں کو گالی دی جو غریب کا نام مُفت میں بدنام کرتے ہیں اور مسکرا کے کہا۔ "تم بالکل بے فکر رہو۔"

"میں چابی صبح آپ سے لے لوں گا۔ اسی کمرے میں آ کے۔"

میں نے کہا۔ "صبح ذرا دیر سے آنا۔ نو بجے کے بعد۔ یہ نہ ہو کہ فجر کے وقت آ جاؤ۔"

وہ چونکا۔ "آپ مسلمان ہیں سر؟"

میرے مُنہ سے بے اختیار وہ الفاظ نکل جاتے تھے جو خود میری چغلی کھاتے تھے لیکن میں اپنی فطرت کو کیسے بدل سکتا تھا۔ عادات جب پختہ ہو جائیں تو فطرت میں شامل ہو جاتی ہیں۔ ایک مسلمان کو ماحول اور معاشرے نے گفتگو کا جو انداز عطا کیا تھا وہ بدل کیسے سکتا تھا۔

میں نے کہا۔ "تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

وہ گڑبڑا گیا۔ "سوری سر۔" اور کمرے سے نکل گیا۔

کمرا نمبر چار سو بیس کی چابی کے ہاتھ میں آتے ہی میرا پروگرام بدل گیا تھا۔ اب میں مسٹر براؤن کی مدد کا محتاج نہیں رہا تھا بلکہ مسٹر براؤن کے کندھے پر رکھ کے اپنی بندوق چلا سکتا تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی تو دس بج رہے تھے۔

ریسیور اُٹھا کر میں نے آپریٹر سے نازو کے کمرے کا نمبر مانگا۔ چند سیکنڈ بعد نازو نے کہا۔ "ہیلو۔"

میں نے کہا۔ "کیا میں تمھارے اعزاز میں عشائیہ دوں؟"

نازو نے کہا۔ "مجھے بھوک نہیں ہے۔"

"صاف کہو نا کہ بھوک ہڑتال ہے۔"

"بھوک ہڑتال کریں میرے دشمن۔ میں کھانا کھا چکی ہوں۔"

میں نے کہا۔ "کیا؟ ابھی تم کہہ رہی تھیں کہ بھوک نہیں ہے۔"

ظاہر ہے کھانا کھانے کے دس منٹ بعد میں تمھاری ڈنر کی دعوت کیسے قبول کر سکتی ہوں۔ جو میں نے کہا سچ تھا۔"

میں نے کہا۔ "اچھا تو اب یوں کرو، اوپر کمرا نمبر چار سو بیس میں آ جاؤ۔"

"میں یہ لطیفہ سمجھی نہیں۔"

"میں لطیفے سُناتا بھی نہیں۔ خصوصاً انھیں جو ہنستا نہ جانتے ہوں۔" میں نے کہا۔ "فورتھ فلور پر واقعی کمرا نمبر چار سو بیس ہے میں تم کو وہیں ملوں گا۔ آدھے گھنٹے بعد۔ تم آ کے مجھ سے چابی لے لو۔"

نازو پانچ منٹ بعد آئی تو میں نے اسے مختصراً اپنے پروگرام سے آگاہ کیا۔ اس کے جاتے ہی میں نے روم سروس کو ڈنر کے لیے آرڈر دیا۔ دس منٹ میں ایک ویٹر کھانے کی ٹرے سجائے ہوئے آ گیا۔ اس نے ایک ایک ڈش کھانے کی میز پر سجانی شروع کی۔

میں نے اسے غور سے دیکھ کر کہا۔ "تمھارا کیا نام ہے... مجھے یاد نہیں رہا۔"

اس نے پلٹ کے کہا۔ "ساون سر۔"

"ہاں ساون۔" میں نے خوش دلی سے کہا۔ "گزشتہ بار جب میں یہاں آیا تھا تو تم نے ایک کام کیا تھا میرا۔ اس کا انعام باقی رہ گیا تھا۔ مجھے اچانک جانا پڑا تھا اور تم اس وقت ڈیوٹی پر نہیں تھے۔ یہ لو۔"

میں نے اسے پانچ سو روپے دیے تو اس کا مُنہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ "تھینک یو۔ سر۔" اس نے بمشکل تمام کہا۔ اسے ہرگز یاد نہیں آ سکتا کہ وہ کیا کام تھا مگر سب ویٹر سب کے کام آتے ہیں اور ہر قسم کا کام کرتے ہیں۔

میں نے کہا "دراصل گزشتہ بار میرے دو... دشمن۔ دشمن ہی کہا جا سکتا ہے انھیں۔ میرا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک آ گئے تھے اور جیسے ہی مجھے یہ معلوم ہوا میں انھیں بتائے بغیر خاموشی سے چلا گیا لیکن تم یہ مت سمجھنا کہ اس بار بھی میں تمھارا انعام دیے بغیر بھاگ جاؤں گا۔"

"تو کیا... وہ پھر آ گئے ہیں سر؟"

میں نے کہا "میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا۔ میں نے ان سے بچنے کے لیے کمرا نمبر چار سو بیس بُک کرایا تھا۔ جو عموماً کوئی نہیں لیتا۔ لیکن ان کو معلوم ہو گیا۔ مجھے شک ہے کہ میرا ہی کوئی آدمی انھیں بتا دیتا ہے۔ خیر۔ میں نے یہاں آ کے دوسرا کمرا لے لیا۔ اب میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کہیں وہ کمرا نمبر چار سو انیس یا چار سو اکیس میں تو نہیں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ میں ان کا سامنا کرنا نہیں چاہتا۔ وہ ہوں گے تو میں ابھی چلا جاؤں گا۔ یہ معلوم کر کے خاموشی سے مجھے بتا دو۔" میں نے اسے مزید پانچ سو پکڑا کے کہا۔

"جی... یس سر... کیا نام ہے ان کا؟" وہ خوشی سے پاگل ہونے لگا۔ "میں ابھی معلوم کرتا ہوں سر۔"

میں نے کہا "تم یہ بتاؤ کہ ان کمروں میں کون لوگ ہیں۔ اگر وہ فرضی ناموں سے ٹھہرے ہوں گے تو مجھے معلوم ہو... جائے گا۔"

وہ گیا اور دس منٹ میں واپس آ گیا۔ اس نے کہا۔ "روم نمبر چار سو اکیس میں ایک بنگالی فلم ڈائریکٹر ہے اور اس کی سیکریٹری۔ روم نمبر چار سو انیس میں کلکتہ کی ایک ہیروئن۔"

میں نے کہا "شکر ہے۔" اور ایک گہرا سانس لے کر مسکرایا۔

"پورا فلم یونٹ تھا۔ باقی سب چلے گئے۔" ویٹر نے اضافی اطلاع فراہم کی۔ اتنے کم وقت میں ایسے معمولی سے کام کے اسے ایک ہزار کسی نے نہ دیے ہوں گے۔

وہ برتن اُٹھا کے جانے لگا تو میں نے کہا "تمھاری کب تک ڈیوٹی ہو گی؟"

اس نے کہا "صبح کے آٹھ بجے تک۔ کوئی کام ہے سر؟"

"نہیں۔ جو تمھاری جگہ آئے اسے بتا دینا کہ دس بجے سے پہلے مجھے ڈسٹرب نہ کرے۔ کوئی فون۔ کوئی وزیٹر۔ پیغام۔ کچھ نہیں۔"

"میں بتا دوں گا سر۔ گڈ نائٹ۔" وہ بولا اور جلدی سے باہر نکل گیا۔

میں نے دروازے کے ہینڈل پہ باہر کی طرف "ڈونوٹ ڈسٹرب" کا پیلے کارڈ لٹکایا اور کمرے کو مقفل کر دیا۔ میرے ہاتھ میں بریف کیس تھا جس میں رقم ایک ٹائٹ فٹ ٹی شرٹ اور پتلون تھی۔ چوں کہ پروگرام میرے ذہن میں اس وقت تھا جب میں خواتین کے ساتھ کپڑے خرید رہا تھا اس یہ لباس میں نے ضرورت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے خ ایسا ہی ٹائٹ لباس میں نے نازو کو بتائے بغیر اس کے بھی خریدا تھا۔ اگر میں اسے بتاتا تو شاید وہ وہاں راضی ہوتی۔ وہ دُبلی پتلی اور چھوٹی سی لڑکی تھی چنانچہ اس کے لیے ایک چودہ سال کے لڑکے کا سائز بتانا پڑا تھا جو وہ تھا۔ مجھے اب بھی اندیشہ تھا کہ وہ اس واہیات لباس سخت اعتراض اور احتجاج کرے گی مگر یہاں اس سے بات منوانا آسان تھا۔

کمرا نمبر چار سو بیس میں تقریباً اندھیرا تھا۔ ایک دیوار پر لگی ہوئی ایمرجنسی لائٹ اس کمرے کو روشن کرنے کے لیے قطعی ناکافی تھی۔

نازو نے بگڑ کے کہا "یہ کیا مصیبت ہے۔"

میں نے اس کے مُنہ پہ ہاتھ رکھ دیا۔ "آہستہ۔ یہ خصوصی انتظام کیا ہے میں نے۔ ہر ایک کو نہیں ملتا یہ کمرا۔ معلوم ہے یہاں کون لوگ آتے ہیں؟"

"کون آتا ہے؟"

"وہ جو اندھیرے سے پیار کرتے ہیں اور صرف پیار کرتے ہیں۔ ہم تو خیر بدقسمت ہیں شروع سے۔" میں نے کہا۔

"ہم کیا جانیں پیار کو۔"

"یہ فضول باتیں کرنے کے لیے بلایا تھا یہاں؟"

"نہیں بھائی۔ فضول باتیں میں اب شروع کروں گا۔ اس کمرے کے ساتھ اس طرف کمرا نمبر چار سو اکیس ہے۔ دوسری طرف کمرا نمبر چار سو انیس۔"

"واہ۔ کیا زبردست نتائج اخذ کیے ہیں۔"

میں نے کہا "ادھر ایک فلم ڈائریکٹر ہے۔ کلکتہ سے اپنا یونٹ اور اپنی سیکریٹری لے کر شوٹنگ کے لیے آیا تھا۔ یونٹ چلا گیا مگر سیکریٹری باوفا معلوم ہوتی ہے۔ وہ ابھی تک موجود ہے۔ ایک حیرت انگیز نتیجہ یہ بھی اخذ کیا ہے آپ کے اس خاکسار نے کہ فلم کی ہیروئن اس فلم کے ڈائریکٹر کو بالکل گھاس نہیں ڈالتی۔"

"یہ تم نے کیسے جان لیا؟" نازو مسکرائی۔

"بھئی سامنے کی بات ہے۔ ہیروئن گھاس ڈالتی تو ڈائریکٹر کی سیکریٹری بھی یونٹ کے ساتھ رخصت ہو جاتی۔" میں نے کہا۔ "ہیروئن یہ الگ کمرے کا خرچ تو نہ ہوتا۔ مگر ادھر مقیم ہے۔"

ممکن ہے سیکریٹری زیادہ خوب صورت ہو۔" نازو ہنسی۔

"ناممکن۔ ایسا ہوتا تو سیکریٹری ہی فلم کی ہیروئن بھی ہوتی۔ بیچاری ہیروئن اکیلی ہے۔" میں نے آہ بھر کے کہا۔

"اُفوہ۔ بڑا دُکھ ہے اس کی تنہائی کا۔ پوچھ لو جا کے حال۔ میں نہیں بتاؤں گی رابعہ کو۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "تم جاؤ اور پھر دکھاؤ اپنے ہاتھ کی صفائی۔ اس کے بعد مجھے درمیان کی دیوار بجا کے طلب کر دیں۔ آ کے اسے پیک کر دوں گا۔"

نازو نے کہا۔ "مگر اس کا مقصد؟"

میں نے کہا۔ "ہر بات کا مطلب سمجھانے کے لیے وقت نہیں ہے تم جاؤ۔" میں نے اسے باہر دھکیل کے دروازہ بند کر لیا۔ میں نے ساتھ والے دروازے پر ہلکی سی دستک سُنی اور کمرا نمبر چار سو بیس میں سگریٹ جلا کے ٹہلتا رہا۔ پانچ منٹ بعد نازو نے دیوار پر مکے مارنے شروع کیے تو میں نے سگریٹ فرش پر مسل کر دوڑا۔

بنگالی ہیروئن بیڈ پر سیدھی لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی زلفِ بنگالی اور چشمِ بنگالی کا سحر نازو نے ختم کر دیا تھا مگر پھر بھی دل و نگاہ کو دیوانہ کرنے کے اسباب موجود تھے اور بے حجابی میں نشۂ شراب سے زیادہ نشۂ شباب کا اثر تھا۔

"بُری بات۔" نازو نے مجھے ڈانٹ کر کہا۔

میں نے جھینپ کر نظر ہٹا لی۔ "میں دراصل۔ دیکھ یہ رہا تھا مطلب یہ کہ خاتون نشے میں تھیں۔ اسی لیے لباس میں نہیں تھیں۔"

نازو ہنسنے لگی۔ "آنا تم کو چاہیے تھا۔ خیر اب ان کا کرنا کیا ہے؟"

میں نے کہا "اسے تو میں پیک کرتا ہوں تم ذرا روم سروس سے کسی میڈ کو طلب کر دو۔ اور اس کے کپڑے پہن لو۔"

نازو حیران ضرور ہوئی مگر اس نے میری بات سمجھ لی۔ جب وہ فون پر بات کر رہی تھی تو اس کی آواز کچھ بدلی ہوئی اور شراب کے نشے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ میں نے بڑی عجلت میں بنگالی ہیروئن کو چادر میں لپیٹا اور باتھ روم میں اُٹھا کے لے گیا۔ وہاں میں نے اس کے ہاتھ پیر باندھے، اس کے مُنہ میں کپڑا ٹھونسا۔ اس کے لیے میں نے چادر ہی کو پھاڑا۔

اس وقفے میں میرے کان باہر کی آواز پر لگے رہے۔ میں نے دروازے پر دستک سُنی۔ دروازہ کُھلا اور کھٹ سے بند ہو گیا۔ غالباً روم میڈ سے نازو نے شراب منگوائی تھی کیوں کہ ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ میں نے بوتل کے ٹوٹنے کی آواز سُنی۔ پھر خاموشی چھا گئی۔

میں نے دروازہ بجا کے کہا "میں اندر آ سکتا ہوں؟"

نازو نے گھبرا کے جواب دیا "ابھی نہیں۔ ویسے تم اندر ہی ہو۔ اور اکیلے بھی نہیں ہو۔ باہر آ کے کیا کرو گے۔"

"تمھاری مدد۔" میں نے کہا "آ جاؤں؟"

"مجھے مدد کی ضرورت ہو گی تو میں آپ کو نہیں بلاؤں گی۔" وہ ہنسی۔

جب میں نے باہر آ کے دیکھا تو قالین پر شراب کی ایک بوتل ٹوٹی پڑی تھی اور دیوار سے لگ کے ٹوٹی تھی۔ دوسری بھی شراب کی بوتل سے کم نہ تھی۔ وہ بھی دیوار سے لگ کے پڑی ہوئی تھی۔ اسے میں نے ہاتھ لگانے سے گریز کیا اور نازو کو دیکھا۔ وہ روم میڈ کی پوری یونیفارم میں خاصی اسمارٹ لگ رہی تھی۔ میری درخواست پر اس نے روم میڈ کو بنگالی ہیروئن کے کپڑے پہنائے اور اسے باندھ کر بستر پہ یوں سلایا کہ کوئی آتا تو اسے شک کی کوئی بات نظر نہ آتی۔

"یہ سب تو ہو گیا۔" میں نے ہاتھوں کو آپس میں رگڑ کے کہا۔ "اُمید ہے خواتین اس وقت تک سکون سے سوتی رہیں گی جب تک ہم اس علاقے سے نکل نہیں جاتے۔"

"ہاں دو گھنٹے سمجھ لو۔ زیادہ وقت چاہیے تو ان کو صبح تک کے لیے بھی سلایا جا سکتا ہے۔"

"وہ کیسے؟" میں نے کہا۔

"خواب آور گولیاں ان خاتون کے پاس ہیں جن کے ساتھ آپ باتھ روم میں تھے۔" نازو نے کہا۔

میں نے کہا "شراب کے ساتھ خواب آور گولیاں مہلک بھی ثابت ہو سکتی ہیں۔"

نازو نے کہا "مگر وہ عادی معلوم ہوتی ہے۔"

میں نے کہا "اچھا۔ تو پھر ڈال دو ان دونوں کے حلق میں دو دو گولیاں۔ حل ہو کے حلق سے اُتر ہی جائیں گی۔ اور جب اس کارِ خیر سے فارغ ہو جاؤ تو تمھارے لائق ایک اور... خدمت ہے۔"

"جی۔ فرمائیے۔" نازو نے کارِ خیر سے فارغ ہو کے کہا۔

میں نے کہا۔ "اب روم سروس سے کسی ویٹر کو بلاؤ۔ بنگالی فلم ڈائریکٹر کی سیکریٹری بن کے۔"

"مجھے کیا معلوم وہ کیسے بولتی ہے۔"

"ابھی تم نے مدہوش اداکارہ کے ڈائیلاگ اچھے بولے تھے۔ اگر تم انگریزی میں بات کرو تو بات بن جائے

گی۔ روم سروس والوں کو یہ شک نہیں ہوگا کہ یہ تو وہی نغمہ ساز ہے۔"

نازو نے کہا۔ "رسک تمھارا۔" پھر روم سروس والوں سے مخاطب ہو گئی۔ "کافی پلیز۔ روم نمبر فور ٹو ون... صرف ایک کافی۔ ایک چائے۔ ارجنٹ۔"

میں نے دروازہ کھولا اور روم نمبر چار سو بیس میں چلا گیا۔ پانچ منٹ بعد ویٹر کافی کی ٹرے لیے گزرا تو میں دروازے کی جھری سے آنکھ لگائے بیٹھا ہوا تھا۔ اسے معلوم بھی نہ ہوا کہ کس نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کے اسے اندر گھسیٹ لیا۔ اس کے ہاتھ کی ٹرے کمرے میں اس وقت گری جب میں دروازے کو لات مار کے بند کر چکا تھا۔ ویٹر کو میری صورت دیکھنے کی یا آواز نکالنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ میں نے آڑی ہتھیلی سے اس کے کان کے پیچھے وار کیا اور وہ بے سُدھ ہو کے میرے ہاتھوں میں جھول گیا۔

میں واپس اس کمرے میں گیا جہاں نازو خاصی پریشانی کے عالم میں ٹہل رہی تھی۔ "یہ کیسا شور تھا؟"

میں نے کہا۔ "ٹرے گر گئی تھی۔"

نازو نے کہا۔ "ساتھ والوں نے ضرور سُنا ہوگا۔ آواز مجھ تک بھی آئی تھی۔"

میں نے کہا۔ "ہاں۔ اگر انھیں ہوش ہوا۔ اور سُننے کی فرصت ہوئی۔ اب آجاؤ میرے ساتھ۔ پہلے دیکھو باہر کوئی ہے تو نہیں۔"

"اس فلور پر تو ویرانی ہی ہے۔" نازو نے گردن باہر نکال کے جھانکا۔ "شاید پورا فلور فلم یونٹ نے لیا ہوگا۔"

میں نے کہا۔ "ہاں۔ وہ لوگ اکٹھے رہنا چاہتے ہوں گے اور عوام سے دُور بھی۔"

میں نے بنگالی ہیروئن کے دروازے کے باہر بھی وہی گتا لٹکا دیا جس پر انگریزی میں لکھا ہوا تھا کہ مداخلت نہ کیجیے۔ دو خواب آور گولیاں میری ہتھیلی پر تھیں۔ یہ میں نے کمرا نمبر چار سو بیس کے ویٹر کو کھلا دیں اور اس کے کپڑے اُتارنے لگا۔ نازو منہ پھیر کے کھڑی ہو گئی۔

ویٹر کے کپڑے پہن لینے کے بعد میں نے گھڑی دیکھی تو گیارہ بج کے دس منٹ ہوئے تھے۔

"اب تم کو پہلے باہر جانا ہے۔" میں نے کہا۔

"مین گیٹ سے؟"

میں نے کہا۔ "اگر کچن کے راستے سے نکل سکو تو بڑی اچھی بات ہے۔ یہ چادریں اور میلے کپڑے اُٹھا کر کندھے پر ڈال لو۔"

"تم کیسے آؤ گے؟" وہ بولی۔

"کیا میں ویٹر نہیں لگتا؟ ایسے آؤں گا میں۔" بریف کیس کو ٹرے میں رکھا۔ اس کے اوپر کپڑا ڈال... اٹھالی۔

"سکندر! کیا ضمانت ہے کہ ہم صبح سے پہلے... آئیں گے۔"

"یہ ضمانت کون دے سکتا ہے؟" میں نے کہا۔ "... ہے کہ ہم کبھی لوٹ کر نہ آئیں۔ لیکن یہاں ہم کون سی... چھوڑ کے جا رہے ہیں۔ نام پتا سب غلط ہے۔ سو... ہیں کپڑے ہیں۔ وہ کوئی بھی لے جائے۔ ہمیں ان کی ضرورت نہیں۔ نقد رقم میرے پاس ہے اور اپنی حفاظت کے... جتنا اسلحہ کام آسکتا ہے وہ ہم دونوں کے پاس..."

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ میں تو... پڑا اور میرے ہاتھوں سے ٹرے گرتے گرتے رہ گئی۔

"یہ... کون ہو سکتا ہے؟" نازو نے سرگوشی میں...

"معلوم نہیں۔ اس کمرے کے بارے میں تو کسی... معلوم نہیں کہ یہاں کوئی ہے۔" میں نے بھی سرگوشی میں جواب...

"اب کیا ہوگا؟" نازو نے گھبراہٹ میں کہا۔

اس سوال کا میں اسے کیا جواب دیتا۔ وہ ایک روم میڈ کی وردی پہنے کھڑی ہوئی تھی۔ میں ویٹر بنا ہوا... لیکن میرے ہاتھ میں جو ٹرے تھی اس میں نو لاکھ... رقم تھی اور ہم دونوں اس کمرے میں اپنی موجودگی کا... جواز نہیں پیش کر سکتے تھے۔

"کہیں یہ روم سروس والے نہ ہوں؟ ابھی تک... روم میڈ واپس نہیں پہنچی۔ پھر ایک ویٹر...!"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ دوسری بار دروازے... واضح دستک ہوئی۔ پھر کسی نے کہا۔ "آپ کو غلط فہمی... ہے جناب!"

"ہم خود سُنا۔ ادھر برتن گرتا۔" یہ کسی بنگالی کی آواز...

"نہیں سر۔ آپ یقین کریں یہ کمرا خالی ہے۔" اس... کو میں نے پہچان لیا۔ یہ وہی کاؤنٹر کلرک تھا جس نے... کمرا دیا تھا۔ میں نے اس سے بڑی اداکاری کے ساتھ... بڑا جھوٹ بولا تھا۔

"پتا نہیں شالا کیا گڑبڑ گھوٹالا ہے؟" بنگالی... بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کو کمرا کھول کے دکھا دیتا ہوں۔" کلرک...

کہا اور لہو میری رگوں میں منجمد ہونے لگا۔

بنگالی

نہ جانے کیا بڑبڑا رہا تھا اور اگر اسے فوراً واپس طلب نہ کر لیا جاتا تو وہ اپنا شک رفع کیے بغیر نہ جاتا۔ واپسی کا حکم دینے والی غالباً وہی لڑکی تھی جو روز روشنی میں بنگالی فلم ڈائریکٹر کی سیکرٹری کا رول کرتی تھی اور اسے اپنا باس بھی مانتی تھی۔ اس وقت رات تھی چنانچہ صورتِ حال برعکس تھی۔ بنگالی نے فوراً مراجعت اختیار کی۔ میں نے ساتھ والے کمرے کا دروازہ بند ہونے کی آواز سُنی۔

پھر منیجر ہنسا۔ "سالا نشے میں گول تھا۔"

کسی اور نے کہا۔ "بہت ڈرتا ہے بیوی سے۔"

"بیوی!" منیجر بولا۔ "بے وقوف۔ کتنا عرصہ ہو گیا تم کو اس ہوٹل میں کام کرتے؟"

"جی۔ آٹھ سال۔"

"آٹھ سال جھک ماری تم نے۔ تم کو آدمی کے رویّے سے سمجھ لینا چاہیے کہ وہ کیا ہے۔ شوہر، عاشق، باس یا صرف خریدار۔ چلو سب نیچے۔ خوامخواہ آدھی رات کو میلہ لگایا۔ سب بالکل ہی گول ہو عقل سے۔"

میں یہ سب آوازیں سن رہا تھا اور بالکل ساکت کھڑا ہوا تھا۔ غالباً میں سانس تک لینا بھول گیا تھا۔ بلا سر سے ٹل گئی تو میں نے ایک گہری سانس لی اور نازو کی طرف دیکھ کے مسکرایا اس کی صورت پر بھی ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ اگر دروازہ کھولنے کی نوبت آجاتی تو ہم دونوں کے لیے ایک ساتھ میدانِ کارزار میں کود پڑنے کے سوا چارہ نہ رہتا۔ ہمارے پاس اسلحہ بھی تھا اور ہم خالی ہاتھوں سے اسلحے کا کام لینا بھی جانتے تھے مگر مار دھاڑ کی صورت میں ہمارے لیے فرار کے راستے بالکل مسدود ہو جاتے۔ ہنگامہ شروع ہوتے ہی نیچے سے اوپر تک خبر پھیل جاتی۔ ہر فلور پر بدحواس اور تجسّس میں مبتلا ہونے والے جمع ہو جاتے۔ اوّل تو خود انتظامیہ ہم سے مؤثر طور پر نمٹ لیتی۔ ان کے پاس اس قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنی سیکورٹی فورس ہوتی ہے جس میں عموماً ریٹائرڈ کمانڈوز رکھے جاتے ہیں۔ انتظامیہ پولیس کو بھی اپنی کارکردگی دکھانے کا موقع فراہم کر سکتی تھی۔ غریبوں کی ایک پوری بستی لٹ جائے یا اس بستی میں قتلِ عام ہو جائے تو وہ سمجھتے ہیں کہ یہ تو کوئی بڑی واردات نہیں مگر کسی فائیو اسٹار ہوٹل کی انتظامیہ طلب کرے تو انھیں سر کے بل جانا پڑتا ہے۔

کمرے میں لگے ہوئے کلاک نے ایک گھنٹا بجایا تو میں اچھل پڑا۔ "گیا۔ ایک بج گیا؟" میں نے کہا۔

"ن... ن۔ نہیں۔" نازو نے کہا۔ "ساڑھے بارہ۔"

میں نے ہنس کے کہا۔ "خوف سے تمھاری زبان تک کانپ رہی ہے۔"

"تمھاری جرأت اور مردانگی کا نظارہ تو قابلِ تعریف رہا۔" نازو نے طنز سے کہا۔ "اب دانت نکال رہے ہو۔ اس وقت تو بتیسی بج رہی تھی۔"

"جب دونوں کی ایک سی حالت ہے تو پھر جھگڑا کیسا۔" میں نے دروازہ کھول کے باہر جھانکنا شروع کیا۔ کاریڈور سنسان پڑا ہوا تھا۔ بنگالی فلم ڈائریکٹر کے کمرے میں بھی خاموشی تھی۔ میں نے نازو کو انگلی سے اشارہ کیا اور وہ میرے پیچھے پیچھے باہر آگئی۔

"ہم دونوں کا ساتھ ساتھ جانا ٹھیک نہیں۔" میں نے سرگوشی میں کہا۔

"اچھا تم آگے چلو۔" نازو نے کہا۔ "مجھے تو راستہ معلوم نہیں۔"

"راستہ تو مجھے بھی معلوم نہیں۔" میں نے کہا۔ "مگر خیر۔ آخر میں مشن کمانڈر ہوں۔ مجھے آگے چلنا ہی پڑے گا۔"

گراؤنڈ فلور تک خیریت رہی۔ اگر کسی نے مجھے دیکھا بھی تو اہمیت نہیں دی۔ میں ویٹرز کی فوج کا ایک عام رکن تھا جن کی وردی ایک تھی۔ لوگ ویٹرز کو انسان نہیں ایک نمبر سمجھتے ہیں اور ان کے چہرے نہ دیکھتے ہیں اور نہ یاد رکھتے ہیں۔ ہر فلور پر میں نے پلٹ کر دیکھا تو روم میڈ کے انداز میں نازو میرے نقشِ قدم دیکھتی آرہی تھی۔ اس کے اور میرے درمیان آدھے فلور کی سیڑھیوں کا فرق برقرار تھا۔

گراؤنڈ فلور کا لاؤنج اس وقت خالی پڑا ہوا تھا۔ منیجر کا کمرا بند تھا۔ کاؤنٹر پر دو کلرک موجود تھے مگر وہ گھومنے والی کرسیوں پر ایک دوسرے کی طرف منہ کیے باتوں میں مصروف تھے۔ میں نے نازو کو سیدھا گزر جانے کا اشارہ کیا اور خود اس طرف چل پڑا جدھر سے ایک ویٹر ہاتھوں میں ٹرے لیے نکلا تھا۔ ٹرے میں جام و مینا کے لوازمات تھے اور اوپر ایک کپڑا ڈال دیا گیا تھا۔

شفاف شیشے کے جھومتے ہوئے دروازے سے گزرتے ہی میں نے خود کو بار میں پایا۔ ایک بہت موٹا بارمین ماتھے پر سے پسینہ خشک کر رہا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی بھاری فریم اور موٹے شیشوں والی عینک اتار کے کاؤنٹر ٹیبل پر رکھ دی تھی۔ اسی وقت ایک اور ویٹر مخالف سمت کے دروازے سے اندر آگیا۔ اس نے اندر آتے ہی بارمین پر چلّانا شروع کر دیا۔ "سالا یہ کیا دیا تم نے ہم کو؟ ہم وسکی مانگا اور تم دیا شیمپین۔ وہ تو ہم کو کاٹنے

کا واسطے دوڑا۔"

"تم کاہے کو نہیں دیکھا؟" بار مین نے عینک لگا کے جوابی حملہ کیا۔ "ایسا اندھا کا مافک کچھ بھی اٹھا کے لے جاتا تو پھر روتا کاہے کو۔ تیرے کو آنکھ کس واسطے دیا بھگوان۔ ہم غلطی کرتا اگر کبھی تو مانتا۔ تُو مانتا؟ بول؟"

ان کے جھگڑے کا مجھے فائدہ ہوا۔ انھوں نے میری طرف دھیان ہی نہیں دیا اور میں سامنے والے دروازے سے سیدھا گزرا تو میں نے اچانک خود کو سوئمنگ پول پر پایا۔ مجھے آدھی رات کے وقت سوئمنگ کرنے والوں کی تعداد نے متحیر کیا لیکن جیسا کہ میرا اندازہ تھا' وہ سوئمنگ پول میں سوئمنگ کرنے نہیں آئے تھے۔

مجھے بالکل معلوم نہیں تھا کہ اس سوئمنگ پول کے بعد کیا ہوگا۔ میں رُک کر کسی سے پتا پوچھتا تو خود اپنے اجنبی ہونے کا راز افشا کرتا۔ میں سوئمنگ پول سے دور لاؤنج کی بالکونی کے سائے میں چلتا گیا۔ سوئمنگ پول کے قریب سبزے پر رنگین چھتریوں کے نیچے اور ڈریسنگ روم میں مجھے خاصے ہیجان انگیز' جذباتی مناظر دیکھنے کو ملے۔ وہاں سب ایک دوسرے کی خلوت کا پورا احترام کرتے ہوئے کسی اور کو نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھتے تھے اور مطمئن تھے کہ کوئی ان کی پرائیویسی میں مخل نہیں ہو رہا ہے۔

سوئمنگ پول کے بعد ایک طرف مجھے ٹینس کورٹ نظر آئے۔ میں دوسری طرف مڑ گیا۔ ایک وسیع ہال کے چاروں طرف شاپنگ آرکیڈ تھا جہاں سے عام ضرورت کی تمام اشیا مل سکتی تھیں۔ یہاں لوگ ہر طرف سے آ جا رہے تھے۔ بڑے بڑے شفاف شیشوں کے پار مجھے سڑک پر ٹریفک دکھائی دی تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ دکانوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے میں نے ایک دروازے پر 'جینٹس' لکھا ہوا دیکھا اور اندر چلا گیا۔

جب میں باہر آیا تو میرے ہاتھ میں صرف میرا بریف کیس تھا۔ ٹرے کو میں نے ٹائلٹ میں ہی چھوڑ دیا تھا۔ باہر آنے تک کسی نے بھی مجھ سے سوال نہیں کیا کہ تم یہ کس کا بریف کیس اٹھا کے کہاں جا رہے ہو۔ ویٹر کی یونیفارم میں یہ بات شک پیدا کر سکتی تھی کہ کہیں میں نے کسی مسافر کا سامان تو چوری نہیں کر لیا ہے۔

باہر والے دروازے پر ایک گورکھا پہرا دے رہا تھا۔ اس نے مجھے للکارا۔ "اے ۔ کدھر جاتا پڑا ہے؟"

میں نے انگلی اٹھا کے کہا۔ "وہ صاحب ۔ اس کا ہے یہ ۔ بار میں چھوڑ گیا تھا۔"

گورکھے نے میری انگلی کی سمت میں دیکھنے کی کوشش کی مگر ادھر کاروں کا ایک ہجوم تھا جو قطاروں میں کھڑی ہوئی تھیں۔ وہ اندازہ نہ کر سکا کہ میں نے کس کار کی طرف اشارہ کیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتا یا پوچھتا' میں باہر نکل کے کاروں کے درمیان دوڑنے لگا تھا۔ ایک کار ابھی ابھی روانہ ہوئی تھی۔ میں اس کے پیچھے بھاگا۔ "صاب! صاب! آپ کا بریف کیس" میں نے چلّا کے کہا۔ ظاہر ہے کسی صاحب نے میری آواز نہیں سنی۔ اس طرح کار کے پیچھے دوڑتا ہوا میں گیٹ سے بھی نکل گیا۔ گیٹ پر جو مسلح گورکھا استادہ تھا' اس نے مجھے ایک فرض شناس اور ایماندار ویٹر تسلیم کر لیا اور میری راہ میں حائل نہیں ہوا۔ وہ کار گیٹ سے باہر نکل گئی تو میں رُک گیا۔

اب میں عام لوگوں میں شامل ہو چکا تھا۔ میرا اس ہوٹل سے تعلق صرف یونیفارم کی حد تک رہ گیا تھا۔ میں نے ایک اندازے سے سمت کا تعین کیا اور پھر اس گیٹ کی طرف چلنے لگا جہاں سے نازو باہر گئی تھی۔ ابھی تک مجھے صرف یہ فکر تھی کہ کسی قسم کی ہنگامہ آرائی کے بغیر میں ہوٹل سے نکل جاؤں۔ اب مجھے نازو کی فکر ہو گئی۔ خدا کرے اسے بھی کسی نے نہ روکا ہو۔ ایک ویٹر کے مقابلے میں روم میڈ کی پوزیشن بہتر ہوتی ہے۔ وہ کہہ سکتی ہے کہ ایک پرائیویٹ کام سے باہر جا رہی ہے۔

میں گیٹ سے کچھ دور ہی تھا کہ ایک ٹیکسی میرے کپڑوں کو چھوتی ہوئی تیزی سے گزری۔ میں نے جست لگا کے خود کو بچایا اور ٹیکسی ڈرائیور کو گالی دی۔ "سالا اندھا ہے کیا؟"

جواب میں نازو نے سر نکال کے کہا۔ "دارو پی کے سڑک کا بیچ میں کاہے کو چلتا ہے؟" اور ٹیکسی روک لی۔

"ارے واہ ۔ مان گئے تم کو استاد پارٹنر۔" میں نے دروازہ کھول کے ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کیا مان گئے۔ استاد یا پارٹنر؟" وہ ہنسی اور ٹیکسی کو آگے بڑھا دیا۔

میں نے پلٹ کے دیکھا تو اصل ٹیکسی ڈرائیور مجھے پیچھے سڑک پر لمبا پڑا نظر آیا۔ "بڑی پھرتی دکھائی تم نے۔"

"تم نے اتنی دیر کیوں لگا دی؟ میں تو پریشان ہو گئی تمھارا انتظار کرتے کرتے۔" نازو نے کہا۔

"تم سیدھے راستے سے نکلی ہو۔ مجھے بہت گھوم کے آنا پڑا۔" میں نے کہا۔ "کسی نے روکا تمھیں؟"

"روکا تھا گیٹ پر۔ معلوم نہیں کون تھا۔ کہنے لگا کہاں جا رہی ہیں آپ۔ میں نے کہا آپ کے باپ کے پاس۔ وہ اپنا سا منہ لے کر اندر چلا گیا۔ ایسے کہیں کھڑی رہتی تو شاید اور لوگ بھی یہی پوچھتے۔ شاید کوئی یہ بھی کہہ دیتا کہ باپ کو گولی مارو ہمارے ساتھ چلو۔ میں نے ایک ٹیکسی والے سے بات کی۔ اس نے میرے لہجے سے سمجھا کہ میں سخت نشے میں ہوں۔ کہنے لگا اتنی رات کو کہاں جاؤ گی بلبل۔ میں نے کہا کیا تو بلبلہ ہے؟ اگر تو بلبلہ ہے تو بلبل تیرے ساتھ جائے گی۔ مگر یہ بتا دے کہ تو پانی کا بلبلہ ہے یا ببل گم کا۔ بس وہ خوش ہو گیا۔ اس نے کہا کہ اچھا پیچھے بیٹھ جاؤ۔ میں اس کے ساتھ بیٹھی تھی تو اس کے اوپر گر رہی تھی۔ اس نے مجھے پیچھے بٹھانے کی بلکہ لٹانے کی کوشش کی۔ میں نے اسے ایک ہاتھ مار کے اپنی جگہ لٹا دیا۔"

"کسی نے تمھیں دیکھا تو نہیں؟"

"سب آنکھوں والے مجھے ہی دیکھ رہے تھے۔" وہ بولی۔

"میرا مطلب تھا کسی نے تمھیں ڈکیتی اور اغوا کی یہ واردات کرتے ہوئے تو نہیں دیکھا؟"

"اگر کوئی دیکھ رہا تھا تو میں نے اسے نہیں دیکھا۔" نازو نے کہا۔ "کوئی ہمارا پیچھا تو نہیں کر رہا ہے نا؟"

"کم سے کم ایک درجن گاڑیاں ہمارے پیچھے چل رہی ہیں۔ یہ کیسے معلوم ہو سکتا ہے کہ کون پیچھا کر رہا ہے۔"

"ابھی معلوم ہو جاتا ہے۔" نازو نے کہا اور ٹیکسی کو ریس کے گھوڑے کی طرح بھگانا شروع کیا۔ رات کے وقت سڑکیں خالی تھیں۔ بہت جلد ہم ایک سنسان راستے پر جا نکلے۔ میری نظریں پیچھے لگی ہوئی تھیں۔ صرف دس منٹ میں مجھے معلوم ہو گیا کہ ہمارے تعاقب میں کوئی نہیں ہے۔ آدھی رات کی فضا میں سمندر کی نمی اور بُو دن سے زیادہ محسوس ہوتی تھی۔

"ایسے سمت کا تعین کیے بغیر مت دوڑتی جاؤ۔" میں نے کہا۔

نازو بولی۔ "سمت کا تعین میں نے بہت پہلے کر لیا تھا۔ ہم سمندر کی طرف ہی جا رہے ہیں۔"

"تمھارا اندازہ غلط بھی ہو سکتا ہے۔"

"اچھا تم بتاؤ۔ قطب ستارے کی مدد سے دیکھو شمال کدھر ہے۔" نازو نے کہا۔

"پہلے تم بتاؤ کہ قطب ستارہ کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

نازو نے کہا۔ "ہو گا کہیں اِدھر ہی۔ آسمان پر بادلوں کا غبار ہے۔ اس لیے صاف نظر نہیں آ رہا ہے۔"

میں نے کہا۔ "تمھارا دماغ خراب ہے۔ کسی سے پوچھ لینا چاہیے۔"

"کیا ضرورت ہے۔" وہ بولی۔ "کیا تم سمندر کو سُن نہیں سکتے؟"

میں نے غور سے سُننے کی کوشش کی مگر مجھے کچھ سُنائی نہیں دیا۔ میں نے کان میں انگلی ڈال کے ہلائی اور کہا۔ "مجھے تو سمندر کی آواز سُنائی نہیں دے رہی ہے۔"

"کمال ہے۔" نازو نے کہا۔ "مجھے بھی سُنائی نہیں دیتی مگر کوئی بات نہیں۔ میری چھٹی حس کہتی ہے کہ ہم ٹھیک جا رہے ہیں۔"

"ایسی کی تیسی تمھاری..."

"خبردار جو میری چھٹی حس کو کچھ کہا۔ میں نے کبھی کچھ کہا ہے تمھاری چھٹی حس کو؟"

اسی وقت گاڑی نے ایک دو جھٹکے لیے۔ اس کا انجن کھانس کے بند ہوا۔ پھر چلا اور رُک گیا۔

"پیٹرول ختم ہو گیا۔" نازو نے معصومیت سے کہا۔

"یہ اطلاع نہیں دی تمھیں تمھاری چھٹی حس نے؟" میں نے کہا۔

"میری چھٹی حس کوئی فیول میٹر نہیں ہے۔" وہ خفا ہو کے بولی۔

"فیول میٹر تمھارے سامنے ڈیش بورڈ پر تھا۔" میں نے کہا۔

"اس کا کانٹا خراب ہے۔"

میں جھلّا کے نیچے اترا۔ سڑک کے دونوں جانب پام کے درختوں کی قطاریں تھیں اور جدید وضع کی کوٹھیاں تھیں۔ یہ خواص کے طبقے کا رہائشی علاقہ تھا۔ خواص اپنے ایئرکنڈیشنڈ بیڈرومز میں سو رہے تھے۔ کوٹھیوں کی بیرونی لائٹس جل رہی تھیں اور بند دروازوں کے پیچھے زندگی کے آثار مفقود تھے۔ میں نے ہمت کر کے ایک گیٹ کھٹکھٹایا۔

سینما کے ٹکٹ گھر جیسی کھڑکی کھول کے ایک گورکھے نے مجھے گھورا۔ "کیا مانگتا ہے؟"

میں نے کہا۔ "کچھ نہیں۔ بس یہ بتا دو کہ سمندر کدھر ہے؟"

وہ مجھے سخت مشکوک نظروں سے گھورتا رہا۔ "کیسا بات بولتا۔ سمندر ادھر ہی ہے۔ جدھر تھا۔ سمندر سالا کدھر جانے گا۔ ابھی تم بولو' تم کو یہ آسمان نظر آتا؟"

میں نے کہا۔ "مجھے آسمان پر نہیں جانا ہے فی الحال۔ سمندر کے کنارے پہنچنا ہے۔"

"بابا کون سا سمندر؟ سمندر کا بوہت نام ہے۔ چوپاٹی' جوہو' اپولو بندر' میرین ڈرائیو۔ صرف ڈوبنا ہے تو اسی سڑک پر سیدھا جاؤ۔" اس نے کھٹاک سے کھڑکی بند کر دی۔

میں نے اس حسنِ سلوک کا بُرا نہیں مانا کیونکہ راستہ اس نے بہرحال بتا دیا تھا۔ میں واپس سڑک پر پہنچا تو ٹیکسی کا انجن چل رہا تھا۔

"تم تو میکینک بھی ہو۔" میں نے کہا۔ "کیا خرابی ہو گئی تھی؟"

نازو نے کہا۔ "کوئی خرابی نہیں تھی۔ پیٹرول ختم ہو گیا تھا۔"

میں نے اس کے ساتھ بیٹھ کے دروازہ بند کیا۔ "پھر اتنی دیر میں تم نے تیل کہاں سے نکال لیا؟"

اس نے کہا۔ "ڈکی میں سے۔"

میں سمجھ گیا کہ ڈکی میں ٹیکسی ڈرائیور نے اس قسم کی صورتِ حال کے لیے فالتو پیٹرول کسی جیری کین میں ڈال کے رکھا ہوگا۔ وہ سب جن کی گاڑیوں کے فیول میٹر کام نہیں کرتے' اگر احتیاط پسند ہوں

تو یہی کرتے ہیں۔

"تمہاری چھٹی حس کے بارے میں وہ سب خیالات میں واپس لیتا ہوں جن کے اظہار پر تم نے پابندی لگا دی تھی۔ یہ سڑک واقعی سمندر کی طرف لے جاتی ہے۔ اب یہ نہیں معلوم کہ وہ کون سا سمندر ہے۔ بحرالکاہل یا بحرِ اوقیانوس۔"

"سمندر وہی ایک ہے۔ جیسے زمین ایک ہے۔ اس کو الگ الگ نام ہم نے دیا ہے۔" نازو نے فلسفیانہ لہجے میں کہا۔

"میں نے نہیں دیا۔" میں نے احتجاج کے انداز میں کہا۔

"میں انسانوں کی بات کر رہی تھی۔" نازو نے مسکرا کے کہا۔

رات کے پونے ایک بجے میں نے کسی ساحلی بستی کے آثار دیکھے اور نازو سے ٹیکسی وہیں روک دینے کے لیے کہا۔ دور سے نیم روشن اُفق کے پس منظر میں بیر مچھیروں کے جھونپڑے نظر آتے تھے۔ میں نے نازو کے اُتر جانے کے بعد ٹیکسی کا رُخ موڑا اور اسے واپسی کے راستے پر ایک فرلانگ دور لے گیا۔ اس طرح میں نے تھوڑا سا کنفیوژن پیدا کیا۔ بعد میں کوئی ہمارا سراغ لگانے کی کوشش کرتا تو اسے ٹائروں کے نشانات ایک خاص مقام سے واپس جاتے دکھائی دیتے۔ اس کے بعد کوئی سُراغ نہ ملتا کہ ہم دائیں طرف گئے یا بائیں طرف۔ اور سیدھے گئے تو کیسے گئے۔ تاہم مجھے اُمید تھی کہ ٹیکسی ڈرائیور عقلمند ہوگا تو ہوش میں آتے ہی خدا کا شکر بجا لائے گا کہ جان سمیت ہر چیز بچ گئی اور بھاگ جائے گا۔ بولے گا تو پولیس کے ہاتھوں بھی خوار ہوگا۔ سو پیاز کھا چکا۔ سو جوتے بھی کھائے گا۔

ایک فرلانگ دوڑ کر میں نازو کے پاس پہنچا تو بُری طرح ہانپ رہا تھا۔ نازو ہنسنے لگی۔

میں نے کہا: "ایک... فرلانگ... تو کیا... ایک گز دوڑ کر دکھاؤ۔ میں اور محسن۔ تین میل دوڑتے تھے۔"

نازو نے آہ بھر کے کہا: "ہائے کیا چیز تھی جوانی بھی۔"

مجھے بھی ہنسی آ گئی: "چلو اب دیر مت کرو۔ یہ لو کپڑے۔"

میں نے بریف کیس میں سے ایک بنڈل نکالا۔

"یہ کہاں سے آئے؟" نازو نے حیرانی سے ٹائٹ فٹ کالی پتلون اور ٹی شرٹ کو دیکھا۔

"جہاں سے یہ آئے۔" میں نے اپنے کپڑوں کی نمائش کی۔ "اب یہ لباسِ فاخرہ بدل لو۔ ویسے تو تم ہر لباس میں خوب ہو مگر یہ شب رنگ لباس بھی آزماؤ۔ جرأت کی ضرورت ہے۔"

نازو نے اِدھر اُدھر دیکھا: "اچھا۔ میں اِدھر والے ڈریسنگ روم میں چلی جاتی ہوں۔ تم اُدھر جاؤ۔"

میں نے کہا: "فکر مت کرو۔ میں خود بہت شرمیلا ہوں۔"

پانچ منٹ بعد میں نے اسے دیکھا تو وہ مجھے چست [illegible] میں زیادہ ہی مختصر لگی مگر اس کے جسم کے سارے قابلِ نظر [illegible] زیادہ نمایاں نظر آئے۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟" وہ شرما کے ہنسی۔

میں نے کہا: "تم خود تو غائب ہو مگر تمہارا چہرہ گیس ہنڈے کی طرح روشن ہے۔ تم آگے چلو تاکہ اس روشنی میں [illegible] راستہ نظر آتا رہے۔"

مچھیروں کی بستی میں کُتے بھونک رہے تھے۔ پس [illegible] میں سمندر کے پھنکارنے کی آواز اب بہت واضح تھی۔ سناٹا [illegible] ڈری ہوئی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور ہم دبے [illegible] آگے بڑھے۔ جھونپڑیوں کے درمیان ایک پتلی سی گلی [illegible] تھی۔ یہ گلی ایسی ہی تھی جیسے لاہور کی مال روڈ جو چھاؤنی [illegible] زمزمہ تک مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ میرا ارادہ تھا کہ کوئی مائی [illegible] ملے تو اس سے لانچ کرائے پر لینے کی بات کروں مگر [illegible] بستی پر نیند کا راج تھا۔

وہ گلی اچانک ختم ہو گئی اور میں نے اپنے سامنے [illegible] سمندر کو دیکھا۔ بستی قدرے بلندی پر واقع تھی۔ اس کے [illegible] چٹانوں کا سلسلہ تھا جو تقریباً ایک فرلانگ تک پھیلا ہوا [illegible] سمندر کی لہریں ان چٹانوں سے ٹکرا کر منتشر ہو رہی تھیں۔ بائیں جانب بہت سی کشتیاں اور لانچیں بندھی ہوئی تھیں۔ اس طرف سمندر کا ساحل ہموار تھا اور چٹانوں کی دیوار موجوں کی یلغار کو روک لیتی تھی۔

ہم پوری گلی سے گزر آئے تھے اور آوارہ کُتوں کے سوا کسی بھی ذی روح نے ہمارا استقبال نہیں کیا تھا۔ کُتوں سے میں خود بھی خاصا ڈرتا تھا مگر نازو کے ساتھ میں اپنی بے خوفی کا بھرم رکھنے پر مجبور تھا۔ وہ کُتے بھی کچھ بزدل تھے کہ فوراً پسپا ہو گئے۔

ابھی میں آگے جانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ ایک چٹان کی اوٹ سے ایک سیاہ ہیولا سا نکلا اور میرے سامنے آ گیا۔ نازو تو ایک دم سہم کے میرے پیچھے ہو گئی۔ وہ شخص بھوت کی طرح نمودار ہوا تھا اور لگتا بھی بھوت ہی تھا۔ اس نے کمر سے نیچے صرف گھٹنوں تک پہنچنے والا ایک کپڑا لپیٹ [illegible] ستر پوشی کے تقاضے پورے کیے تھے۔ اس کا باقی جسم رات کی طرح کالا تھا اور اندھیرے میں بھی چمک رہا تھا۔ وہ جوان آدمی تھا اور اس کا بدن فولاد کے سانچے میں ڈھلا ہوا تھا۔ میں نے اس کی بے قرار آنکھوں کا اندازہ پتلیوں سے کیا جو سفید پردے پر متحرک تھیں۔

"کون ہو تم؟" میں نے دوستانہ لہجے میں کہا۔

اندھیرے میں اس کے سفید دانت جھلملائے: "آپ کا خادم۔"

"اگر یہ تمہارا نام ہے۔ تو بہت اچھا نام ہے۔" میں نے کہا: "خادم! تم سے ایک کام ہے۔"

"آپ بولیں سر۔" اس نے باری باری میرا اور نازو کا جائزہ لیتے ہوئے کہا: "لانچ چاہیے؟"

"تم تو بہت سمجھدار اور ہوشیار ہو خادم۔ دل کی بات ہونٹوں پر آنے سے پہلے ہی سمجھ لیتے ہو۔" میں نے کہا۔

"اپنا کام ہی خدمت کرنا ہے سر اور یہاں آنے والے اور کوئی چیز نہیں مانگتے۔" وہ بولا۔

"یہاں۔ بہت لوگ آتے ہیں؟" میں نے متفکر ہو کے کہا۔

"وہی آتے ہیں سر۔ جو خادم کو جانتے ہیں۔ آپ پہلی بار آئے ہیں نا، اس لیے گھبرا رہے ہیں؟" وہ حیرت انگیز طور پر صاف اُردو بولتا تھا: "لیکن آپ خادم پر بھروسا کریں سر۔ کسی کو کبھی کچھ معلوم نہیں ہوگا۔"

"کیا معلوم نہیں ہوگا؟" میں نے کہا۔

"یہ... کہ آپ آئے تھے اور آپ نے ایک رات کے لیے ہم سے لانچ لی تھی۔" وہ بولا: "ہم کسی سے کچھ نہیں پوچھتے سر۔ اس کا نام پتا ہمارے لیے بے کار ہے۔"

"تمہیں دام سے کام ہے؟" میں نے کہا: "ہے نا یہی بات؟"

"بالکل ٹھیک بولا آپ نے سر۔ ہم دام لیں گے اور کام کریں گے۔ جیسا دام ویسا کام۔ اور جیسا کام ویسا دام۔ اب آپ بولو۔"

میں نے کہا: "تمہاری لانچ کیسی ہے؟"

"ایک دم فرسٹ کلاس۔ لگژری۔"

میں نے کہا: "مجھے لگژری سے زیادہ دوسری چیزوں کی ضرورت ہے۔ شاید لوگ تمہاری لانچ پر ایک رات گزارنے کے لیے آتے ہوں گے اور صبح ہونے سے پہلے چلے جاتے ہوں گے۔"

"یس سر۔ ہم لانچ کو سمندر میں لے جاتے ہیں۔ لانچ پر سب کچھ ہے۔ شراب بھی ولایتی ملے گی۔"

میں نے کہا: "لائف جیکٹ ہے؟"

وہ کچھ حیران ہو کے بولا: "ہے سر۔ ویسے لانچ ایک دم نیا ہے۔ ایسا کوئی خطرے کا بات نہیں۔ بیڈ روم بھی اچھا ہے۔"

میں نے کہا: "رات بھر کا معاوضہ تم کیا لیتے ہو؟"

"ایک ہزار روپے سر۔" وہ بولا: "آپ کل دن کا واسطے بولو تو ہم آگے چلے جائیں۔ دو رات کا پندرہ سو۔"

میں نے کہا: "تم نے راک سائیڈ آئی لینڈ دیکھا ہے؟"

وہ چونکا: "رنگ محل والا؟"

میں نے کہا: "ہاں۔ ہمیں اس جزیرے پر جانا ہے۔"

"اس وقت..!"

"ہاں ابھی۔" میں نے کہا: "اس جزیرے پر ایک طرف چٹانوں کی دیوار ہے جو لہروں کے زور سے ٹوٹ گئی تھی۔"

اس نے اقرار میں سر ہلایا: "دیکھی ہے ہم نے۔"

میں نے کہا: "ہم اسی سمت سے جائیں گے۔"

"وہ۔ بہت خطرناک جگہ ہے سر۔ آپ دوسری طرف سے جاؤ۔"

میں نے کہا: "تم ہمیں اس جگہ سے دور پانی میں چھوڑ دینا لائف جیکٹ کے ساتھ۔ دو سو گز دور۔ آگے ہم تیر کر جائیں گے۔"

"اور پھر ہم کیا کریں گے؟"

"تم واپس آ جاؤ گے اور صبح سورج نکلنے سے پہلے پھر وہیں ہو گے۔ جہاں ہمیں چھوڑو گے۔"

وہ تذبذب کی کیفیت میں کھڑا کچھ سوچتا رہا۔

میں نے کہا: "جانے کے تم کو پانچ ہزار ملیں گے۔ واپس لانے کے دس ہزار۔ اگر تم میں ہمت ہے پانچ چھ گھنٹے میں پندرہ ہزار کمانے کی تو بولو۔"

اس کے تذبذب پر بے یقینی غالب آ گئی: "پندرہ ہزار! آپ پندرہ سو بولا یا پندرہ ہزار؟"

"پندرہ ہزار۔" میں نے کہا: "لیکن ابھی میں صرف پانچ ہزار دوں گا۔ باقی صبح جب تم آؤ گے ہمیں لینے۔"

"ہم آئیں گے۔ کیوں نہیں آئیں گے سر۔" خادم نے خوشی سے کانپتی آواز میں کہا: "آپ ہمارے ساتھ چلیں۔ ہمارے پیچھے آئیں۔"

میں نے کہا: "ہم ساتھ نہیں جا سکتے۔ تم راستہ بتا دو اور جگہ بتا دو۔"

اس نے سر کھجایا۔ شاید وہ سمجھ نہیں سکا تھا کہ ہم اس کے ساتھ جاتے ہوئے ڈرتے کیوں ہیں اور جو کام آسانی سے ہو سکتا ہے۔ وہ مشکل طریقے پر کیوں کرنا چاہتے ہیں۔ میں اسے اپنا مسئلہ نہیں بتا سکتا تھا کہ سمندر میں لانچ پر قدم رکھنے سے پہلے میں اس بریف کیس کو کہیں چھپانا چاہتا ہوں

جس میں نولاکھ سے زیادہ کی رقم تھی۔
"اچھا۔ آپ ایسا کرو۔ ادھر آجاؤ" اس نے ہاتھ اٹھا کے انگلی سے کشتیوں اور لانچوں کے مختصر سے ہجوم کی طرف اشارہ کیا "ادھر سے گھوم کے نیچے جاؤ۔ پتھروں کے اوپر سے بھی گزر کے جا سکتے ہو لیکن مس صاحب کے واسطے مشکل ہوگا"
میں نے کہا "ٹھیک ہے۔ ہم گھوم کر آجائیں گے"
"یہ راستہ تھوڑا لمبا ہے لیکن محفوظ ہے"
"ہم چھوٹے راستے سے آئیں گے" نازو نے اعلان کیا۔
"پتھروں پر رات کے وقت چلنا خطرناک کام ہے۔ پیر پھسل جائے گا۔ موچ آجائے گی۔ پتھر چکنے ہیں اور... ہم تو کود جاتے ہیں"
نازو نے کہا "ہم بھی کود جائیں گے"
میں نے سخت لہجے میں کہا "جب میں نے کہہ دیا ہے کہ ہم محفوظ راستہ اختیار کریں گے تو بحث کرنے کی کیا ضرورت ہے"
نازو دوسری طرف دیکھنے لگی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ میرے ذہن میں کوئی ایسی بات ہے جو میں خادم کے سامنے نہیں کر سکتا۔
"ہماری چھوٹی سی لانچ ہے۔ گولڈن اور بلیک۔ اگر آپ کو نظر نہ آئے تو لائٹ کو دیکھنا۔ ہم ٹارچ سے فلیش دیں گے۔ ہمارے ساتھ چلتے تو..."
"تم جھکّی آدمی ہو" میں نے بگڑ کے کہا "ایک بار کہہ دیا کہ ہم ساتھ نہیں جا سکتے۔ پھر کیوں ضد کرتے ہو"
"جیسی آپ کی مرضی سر" اس نے ندامت سے سر جھکا کے کہا "آئی ایم سوری"
وہ پلٹ کے سمندر کی جانب روانہ ہو گیا۔ اندھیرے میں وہ چٹانوں اور پتھروں پر بندر کی طرح بڑی پھرتی سے قدم جماتا اور کودتا ہوا جا رہا تھا۔ یہ اس کا تجربہ تھا جو اس کے کام آرہا تھا۔ ذرا سی دیر میں اس کا تاریک ہیولا رات کے اندھیرے میں گم ہو گیا۔
"اب آجاؤ۔ ہم بھی ادھر سے ہی جائیں گے" میں نے کہا۔
"اس کے سامنے انکار میں کیا مصلحت تھی؟" نازو نے کہا۔
"مجھے یہ بریف کیس ادھر ہی کہیں چھپانا ہوگا۔ اتنی رقم لے کر ہم اس ویران جزیرے پر نہیں جا سکتے جو ویسے ہی جرائم پیشہ افراد کی آماجگاہ ہے۔ وہاں ہمارے دیرینہ دشمن بھی مل سکتے ہیں"
نازو نے میرے پیچھے پتھروں پر قدم جما کے اور سنبھل سنبھل کے آگے بڑھنا شروع کیا۔ جہاں بھی ضرورت پڑی میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے اسے سہارا دیا یا ہاتھوں سے تھام کے اتار لیا۔
"اگر میں اس بریف کیس کو کسی چٹان کے پیچھے رکھ دوں" میں نے دو فٹ مربع ہموار پتھر پر رک کے ادھر ادھر دیکھا۔
"پھر یاد کیسے رکھو گے کہ وہ کون سی چٹان تھی؟" نازو نے کہا۔
"ہاں۔ یہی الجھن میرے ذہن میں بھی ہے۔ نشانی نہیں رہے گی۔ یہاں تو سب ایک سے پتھر ہیں" میں نے کہا۔
نازو نے کہا "اس کے علاوہ۔ یہ کوئی عقلمندی بھی نہیں ہے۔ خادم فوراً سمجھ جائے گا کہ ہم اس کے ساتھ کیوں جانا نہیں چاہتے تھے۔ اس نے بریف کیس تمہارے ہاتھ میں دیکھا تھا۔ جب تم خالی ہاتھ نظر آؤ گے تو اس کے لیے کچھ بھی پوچھنا ضروری نہیں ہوگا"
"لیکن وہ بریف کیس کو تلاش کیسے کر سکتا ہے۔ فرض کرو میں اسے کسی بڑے پتھر کے نیچے رکھ دوں اور اس کے آس پاس پتھر ڈھیر کر دوں"
"وہ یہیں رہتا ہے۔ یہاں کے ایک ایک پتھر سے واقف ہوگا۔ اسے ایک بھی پتھر اپنی جگہ سے ہٹا ہوا نظر آیا تو وہ تاڑ جائے گا۔ پتھروں کا نیا ڈھیر تو اپنی خبر آپ دے گا۔ یہ شک تو ایک بچے کے ذہن میں بھی پیدا ہوگا کہ یقیناً اس بریف کیس میں کوئی ایسی چیز تھی جسے ہم ساتھ رکھتے ہوئے ڈرتے تھے۔ تم نے پندرہ سو کے پندرہ ہزار کر کے خود ہی اپنی رئیسانہ شان بگھاری ہے"
"اس نے کہا تھا۔ جیسا دام ویسا کام" میں نے اگلے پتھر پر کودتے ہوئے کہا۔
نازو نے میرے پیچھے چھلانگ لگائی اور گرتے گرتے بچی۔ میں نے اسے نہ پکڑ لیا ہوتا تو وہ ایک خاصے گہرے گڑھے میں جاتی۔
"خادم کا خیال ہے کہ ہم محفوظ راستے سے آرہے ہوں گے۔ وہ بریف کیس تلاش کرے گا تو ادھر ہی کرے گا"
"اس کی جگہ میں ہوتی تو معلوم ہے کیا کرتی؟"
"نہیں۔ مگر مجھے معلوم ہے کہ میں کیا کرتا۔ میں اب تک اس سے بریف کیس چھین لیتا۔ دو ہاتھ مار کے"
"اونہہ۔ دو ہاتھ مار کے" نازو نے کہا "آپ سخت احمق ہوتے اگر ایسا رسک لیتے۔ میں تو خود بریف کیس تلاش کرتی۔ ملتا تو اس پوری آبادی کے ہر جوان بوڑھے عورت مرد کو

ہر بچے کو بریف کیس تلاش کرنے پر لگا دیتی اور انعام مقرر کر دیتی کہ جس نے بھی وہ صندوق لا کر دیا اسے ایک ہزار روپے ملیں گے۔ ان کے لیے ایک ہزار کی رقم قارون کا خزانہ ہوتی... اور میں شرط لگا سکتی ہوں کہ تم نے بریف کیس یہاں چھوڑا تو خادم یہی کرے گا اور وہ تمہارے ہاتھ بھی نہیں آئے گا۔ تم کہاں تلاش کرو گے اسے۔ تمہارے پاس وقت بھی نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ اسے بھی اپنے ساتھ رکھو"
"اتنے دلائل دینے کی کیا ضرورت تھی" میں نے اسے ڈانٹ کر کہا "یہ فیصلہ تو میں بہت پہلے کر چکا ہوں"
"عورتوں کو زیادہ بولنے کی عادت جو ہوتی ہے" نازو نے طنز سے کہا "اب منہ اٹھائے کیا دیکھ رہے ہو۔ نیچے اتارو مجھے"
وہ چھ سات فٹ اوپر ایک چٹان پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے اس کی ایک ٹانگ پکڑ کے کھینچی تو اس نے چیخ ماری اور سیدھی میرے اوپر آئی۔ میں نے اسے بھی بریف کیس کے پاس رکھ دیا۔
"خوامخواہ ہیرو مت بنو" نازو نے خفگی سے کہا۔
"تم بھی خوامخواہ نخرے مت دکھاؤ۔ میں کیا کرتا آخر۔ سر آگے کر دیتا کہ جوتوں سمیت اتر آؤ" میں نے کہا "اوپر بیٹھ کے حکم دے دیا کہ اتارو مجھے۔ تھینک یو نہیں کہا جاتا؟"
ہم اب ساحل کی ریت پر اتر گئے تھے اور کشتیوں کے خاصے قریب پہنچ چکے تھے۔ ایک دوستانہ لڑائی کے بعد ہمارے درمیان بات چیت بند ہو گئی تھی۔
میں نے کشتیوں اور لانچوں کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا مگر رات کے اندھیرے میں گولڈن اور بلیک رنگ کی تمیز کرنا مشکل تھا۔
"اچھا ہوتا اگر اسی کے ساتھ آجاتے" میں نے کہا۔
نازو نے کوئی جواب نہیں دیا اور پلٹ کے ایک طرف چل پڑی۔ میں نے دیکھا تو تھوڑا سا دائیں جانب ایک فلیش لائٹ چمک رہی تھی۔ خادم کے سگنل کو نازو نے پہلے دیکھ لیا تھا۔
خادم نے کہا "آپ ادھر سے نہیں آئے" وہ لانچ سے اتر کے ساحل تک آگیا تھا۔
"ہاں۔ مس صاحب نے کہا کہ جب یہ بندر کا بچہ ادھر سے جا سکتا ہے تو ہم کیوں نہیں جا سکتے" میں نے جھنجھلا کے کہا۔
"میں نے بندر کا بچہ نہیں کہا" نازو بولی۔
"اوہ یس۔ تم نے بندر کہا تھا۔ مجھے یاد آگیا" میں نے کہا "مگر دیکھو مس صاحب کو بالکل موچ نہیں آئی۔ یہ بھی کم نہیں ہیں تم سے"
نازو نے مجھے خوں آشام نظروں سے گھورا۔
خادم نے آگے چلتے ہوئے کہا "آپ بھی تو ساتھ تھے مس صاحب کے۔ موچ کیسے آتی"
غالباً وہ چالاک آدمی چھپ کر ہماری پیش رفت پر نظر رکھے ہوئے تھا اور یہ دیکھتا رہا تھا کہ میں نے کتنی بار نازو کی مدد کی تھی۔ اگر میں بریف کیس چھپانے کی کوشش کرتا تو کسی دشواری کے بغیر وہ واپسی پر اسے اپنے قبضے میں کرتا اور غائب ہو جاتا۔
ہمارے لانچ پر چڑھ جانے کے بعد اس نے لانچ کو چپوؤں کی مدد سے آگے بڑھانا شروع کیا۔ اس نے کہا تو یہی کہ وہ انجن چلا کے سونے والوں کو جگانا نہیں چاہتا اور اپنی روانگی کو خفیہ رکھنا چاہتا ہے مگر بے خوابی کے شکار ایک بوڑھے نے۔ پھر ایک ناراض بڑھیا نے اور مڈنائٹ رومانس میں مصروف ایک نوجوان جوڑے نے لانچ کو دیکھا اور خادم سے سوال بھی کیا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ اس نے سب کو ایک ہی جواب دیا۔ جہاں میری مرضی۔
بالآخر اس نے لانچ کا انجن اسٹارٹ کیا اور لانچ تیز رفتاری سے راک آئی لینڈ کی طرف بڑھنے لگی۔
میں نے خادم سے کہا "وہ لائف جیکٹ کہاں ہیں؟"
"نیچے۔ بیڈ روم میں" خادم نے کہا۔
میں نے نازو سے کہا "میں لاتا ہوں" اور انگوٹھے سے خادم کی طرف اشارہ کیا جس کا مطلب تھا کہ اس کی طرف سے محتاط رہنا۔ نازو نے سر تک نہیں ہلایا اور افق کو گھورتی رہی۔ میں نیچے اتر گیا۔ اس چھوٹی سی لانچ پر مجھے کسی کی رہنمائی کی ضرورت نہیں تھی۔
بیڈ روم کا دروازہ بند تھا۔ میں نے باہر ہی سے اندازہ کیا کہ وہ کیبن شاید چھ فٹ چوڑا اور آٹھ فٹ لمبا ہوگا۔ اس کی اونچائی بھی چھ فٹ ہی تھی۔ اس لانچ پر زیادہ بڑے کمرے کی گنجائش تھی بھی نہیں اور بیڈ روم میں بیڈ کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے دروازے کو دھکیلا تو وہ کھل گیا۔
دروازے کے پیچھے اندھیرا دیکھ کر میں ٹھٹکا۔ بیڈ روم میں تھوڑی بہت روشنی تو ہونی چاہیے۔ خادم نے مجھے بتایا بھی نہیں تھا کہ اندر لائٹ نہیں ہے۔ لائٹ کے بغیر میں لائف جیکٹ کیسے تلاش کروں گا۔ میں نے دروازے کو لات مار کے پورا کھول دیا۔

ایک دم تین آدمی میرے سامنے آگئے۔ ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کے مجھے اندر کھینچ لیا۔ میں اسے رگیدتا ہوا اپنے ساتھ لے گیا اور کیبن کے فرش پر گرا۔ خادم کی ساری بدمعاشی میری سمجھ میں آگئی تھی۔ وہ نازو کی توقع سے زیادہ بدنیت اور خبیث ثابت ہوا تھا۔ اس نے تاڑ لیا تھا کہ میں نقد مال بھی ساتھ لیے پھر رہا ہوں۔ میں نے اسے پندرہ سو کے بجائے پندرہ ہزار دینے پر رضامندی ظاہر کی تھی تو اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ میرا بریف کیس مال سے بھرا ہوا ہے۔ اس کے لیے تو نازو بھی مال ہی تھی۔ چنانچہ اس نے مجھ سے جان و مال ہتھیانے کے لیے فوری طور پر بدمعاش اکٹھے کر لیے تھے۔

گڑبڑ یہ ہوئی کہ وہ سب جو ماہی گیروں کی اس بستی کے دادا سمجھے جاتے ہوں گے، بنیادی طور پر مچھیرے تھے۔ انھوں نے صحیح بدمعاشی سیکھی بھی نہیں تھی۔ پھر یہ کہ انھوں نے مجھے ایک عیاش سیٹھ سمجھنے کی غلطی کی۔ پیسے والے جو آدھی رات کو ایک چھوکری کے ساتھ سمندر کی سیر کے لیے آتے ہیں محض سیٹھ ہوتے ہیں اور سیٹھ لوگ لڑانا تو جانتے ہیں خود لڑنا نہیں جانتے۔ معلوم نہیں اس سے پہلے کتنے سیٹھ ان کے ہاتھوں لٹ چکے تھے اور چپ رہے تھے کیونکہ وہ کسی سے کچھ کہتے تو اپنی رُسوائی کی داستان سناتے۔ بالآخر خدا نے ان سب کا حساب برابر کرنے کے لیے مجھے بھیجا اور میرے ساتھ نازو کو بھی بھیج دیا۔

پہلا بدمعاش تو میرے نیچے دب کر ہی ہائے ہائے کرنے لگا تھا۔ میں نے اسے وہیں چھوڑا اور بڑی پھرتی سے پلٹ کے اٹھا۔ دوسرے بدمعاش نے اتنی دیر میں میرے سر پر ڈنڈا مار دیا۔ ذرا سی دیر کے لیے میرا سر چکرا گیا۔ میں ڈھیلا پڑا تو وہ تینوں مجھ سے چمٹ گئے۔ انھوں نے مجھے گرا لیا۔ ایک میرے سینے پر چڑھ بیٹھا اور دونوں ہاتھوں سے میرا گلا دبانے لگا۔ دوسرے نے احتیاطاً میرے پیر پکڑ لیے کہ میں نزع کے کرب میں لاتیں نہ چلاؤں۔ تیسرا ڈنڈا لیے میرے سر پر سوار رہا۔

ٹانگیں پکڑنے والا سب سے پہلے جوابی کارروائی کا شکار ہوا۔ میں نے اسے ایک جھٹکے سے دونوں پنجوں پر اٹھا کے اپنے سر کے پیچھے پھینک دیا۔ وہ ڈنڈا مارنے والے کے ساتھ ہی کیبن کی دیوار سے جا ٹکرایا۔ اب میں نے کمر کو ایک جھٹکا دیا اور میرا گلا دبانے والا آگے آیا تو میں نے اپنے ہاتھوں کی دو انگلیاں اس کی دونوں آنکھوں میں گھونپ دیں۔ وہ اذیت سے چلّایا اور اس کے ہاتھوں نے میری گردن کو چھوڑ دیا۔ وہ اندھا ہو چکا تھا اور دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھے بُری طرح چیخ رہا تھا۔

میں اٹھا ہی تھا کہ ڈنڈے والا مجھ پر حملہ آور ہوا۔ اس نے دوسرے وار کو فیصلہ کُن بنانے کے لیے ڈنڈے کو پُوری طاقت کے ساتھ گھمایا تھا مگر میں بیچ سے نکل گیا تو ڈنڈا اس اندھے ہو جانے والے ساتھی کے سر پر لگا۔ اس کی چیخ پکار دم ختم ہو گئی اور وہ بھد سے فرش پر گر کے ساکت ہو گیا۔ وہ پلٹ سکے میری طرف آیا۔ اس کے ساتھی نے مجھے پیچھے سے پکڑ لیا اور مجھے گرانے کے لیے زور لگانے لگا۔

میں نے ایک لات گھما کے اس کے پیٹ پر ماری۔ وہ ڈنڈا دونوں ہاتھوں میں اٹھا کے میرے سر پر مارنے کے لیے تیار تھا۔ وہ بلبلایا اور ڈنڈا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ میں نے اسے دُہرا ہو کے زمین پر لوٹتے دیکھا۔ مجھے پیچھے سے گرفت میں لینے والا میرے سر کو اپنے سر سے ٹکریں مار رہا تھا۔ میں نے جھٹکا دے کر اس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کی اور پھر کہنی پیچھے وار کیا۔ کہنی اس کی ناک پر لگی۔ میں نے پھر کہنی ماری۔ وہ مجھے چھوڑنے پر مجبور ہو گیا۔ شاید اس کی ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔

اس نے میرا بریف کیس اٹھا کے بھاگنے کی کوشش کی۔ میں نے اسے ٹانگ اڑا کے گرا دیا۔ اس کا منہ دہلیز پر لگا اور چوٹ پھر اس کی ناک پر ہی آئی۔ میں نے اسے ٹانگ سے پکڑ کے اندر کھینچ لیا۔ جھٹکے سے اوپر اٹھا کے ایک پورا راؤنڈ دیا اور چھوڑ دیا۔ اس کا سر کیبن کی دیوار پر یوں لگا جیسے غلیل سے نکلا ہوا پتھر دیوار سے ٹکراتا ہے۔ وہ وہیں گرا اور تڑپنے لگا۔

مجھے پہلا ڈنڈا مارنے والا اتنی دیر میں کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے مجھے ایک اور ڈنڈا رسید کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ پھر میں نے اسے سر سے اوپر اٹھایا اور فرش پر دے مارا۔ پھر اٹھایا اور پھر پٹخا۔ میرا خیال ہے کہ دوسری بار ایسا میں نے جوش میں کیا ورنہ وہ پہلی بار ہی گرا تھا تو بے ہوش ہو گیا تھا۔

میں نے ہاتھ جھاڑ کے ان تینوں کا طبی معائنہ کیا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ ان میں سے ایک تو خود اپنے ہی ساتھی کا ڈنڈا لگنے سے فوت ہوا تھا۔ دوسرا بے ہوش تھا اور تیسرا مرنے کی تیاری کر رہا تھا۔ میرے لیے حیرانی کی بات یہ تھی کہ اتنا شور غل سن کے بھی نازو نیچے نہیں آئی تھی۔ ان تینوں کی فریاد و فغاں سمندر کے شور سے کہیں زیادہ تھی۔ لانچ یوں اپنے سفر پر رواں تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

میں سمجھ گیا کہ ایسا کیوں ہے اور اوپر آ کے دیکھنے پر میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ ہمارا خادم غائب تھا اور ناخدا کے فرائض مس نازو نے سنبھال لیے تھے۔

"وہ کہاں ہے؟ آپ کا خادم۔"

نازو نے ہنس کر کہا "وہاں" اور ہاتھ سے پیچھے کی طرف اشارہ کیا "کوئی دو میل پیچھے۔"

"کوئی... بدتمیزی کی تھی اس نے؟"

"ہاں۔ وہ بھوت کی طرح چمٹ گیا تھا مجھ سے۔ میں نے اسے فوراً عالمِ ارواح میں بھیج دیا۔ بہت خستہ تھی اس کی گردن۔" نازو نے کہا۔

"تین شکار نیچے بھی پڑے ہیں۔" میں نے کہا۔

"آوازیں ابھی آ رہی تھیں اُوپر۔" نازو نے کہا۔

"تم نے آ کر دیکھا بھی نہیں؟"

"کیا کرتی میں دیکھ کر۔ اور پھر مجھے اس شپ کی کپتانی کا چارج بھی تو لینا تھا۔"

"آخر میں ان کا کیا کروں؟"

"لانچ اگر لاوارث رہ جائے تو اچھا ہے۔ کوئی وارث بچ گیا تو ہمارے خلاف گواہ بن جائے گا۔" نازو نے کہا۔

"یہ خطرہ یقیناً لاحق رہے گا۔" میں نے کہا "خیر ان کا بندوبست تو ہو جائے گا۔ ہمارا کیا ہو گا؟"

"کیا ہونا چاہیے؟" نازو نے کہا۔

"تم کہاں لے جا رہی ہو آخر مجھے؟ مجھے راک آئی لینڈ جانا تھا۔"

وہ ہنسی "انشاءاللہ وہیں جا کے دم لیں گے۔ خادم نے لانچ کی سمت مقرر کر دی تھی خودکشی سے پہلے۔ میں نے اس سمت کو ابھی تک بدلا نہیں ہے۔ تم ذرا دوربین سے دیکھو۔"

"دوربین کہاں سے لاؤں؟" میں نے کہا۔

"نیچے ہی جا کے دیکھو۔ لائف جیکٹ لینے گئے تھے تم۔ کچھ تو دیکھا ہو گا۔"

میں نے کہا "ہاں۔ ایک ڈنڈا دیکھا تھا سب سے پہلے۔ وہ سر پر لگا۔ پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی یہ ٹارچ دو مجھے تو میں دیکھوں چراغ ہیں کہاں۔"

ٹارچ لے کر میں نیچے گیا تو مجھے ایک دیوار پر بیٹری سے جلنے والی لائٹس نظر آئیں۔ میں نے سوئچ آن کیا تو ٹیوب لائٹس کا مدھم نیلگوں اجالا کیبن میں پھیل گیا۔ اس 'بیڈروم' میں فولڈنگ بیڈ تھا۔ جسے ایک دیوار کے ساتھ کھڑا کر کے فٹ کر دیا جاتا تھا۔ کیبن کی ہر چیز فولڈنگ تھی۔ کرسیاں، میز اور شیلف سب اوپر نیچے کیے جا سکتے تھے۔

تین آڑے ترچھے پڑے ہوئے افراد میں سے دو اپنی لالچ کی سزا پا چکے تھے، جنھیں شامتِ اعمال سوتے سے اٹھا کے یہاں لے آئی تھی جہاں ان کو تا ابد سونا تھا۔ میں نے ان کی لاشوں کو سمندر کے سپرد کیا اور تیسرے شخص کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ ابھی زندہ تھا۔ میرے لیے یہ فیصلہ کرنا دشوار تھا کہ اس کی بے ہوشی کی نوعیت معمولی ہے یا سنگین اور وہ ہوش میں آئے گا یا اسی کیفیت میں اپنے ساتھیوں سے جا ملے گا۔ اس حالت میں وہ میرے لیے خطرناک نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے اسے چھوڑ کے کیبن کا جائزہ لیا۔

چار لائف جیکٹ مجھے ایک الماری سے ملیں۔ اسی میں دوربین اور ایک ٹرانسسٹر ریڈیو، شراب کی بوتلیں اور کچھ کھانے پینے کا سامان بھی تھا۔ ایک ایک کر کے میں نے سب شراب کی بوتلوں کو سمندر میں پھینک دیا۔ یہ لانچ عیاشی اور بدکاری کا اڈا تھی۔ چنانچہ الماری میں وہ سب تھا جو عیاشی کے لوازمات میں شمار ہوتا تھا۔

دوربین کے ساتھ میں اوپر پہنچا تو نازو بڑی مہارت سے لانچ کو کنٹرول کر رہی تھی۔ اب لہریں بڑی ہو گئی تھیں اور پانی کی بوچھاڑ ہم دونوں کو شرابور کرنے لگی تھی۔ میں نے دوربین کو فوکس کیا اور چاروں طرف دیکھا۔ بمبئی کی بندرگاہ میں کھڑے ہوئے بحری جہازوں کی روشنیاں ایک دم میرے سامنے آگئیں۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ دوربین خاصی طاقتور ہے۔

بہت بڑے بڑے تجارتی جہاز ہر طرف لنگر انداز تھے لیکن ہم کسی کے قریب سے بھی نہیں گزر رہے تھے۔ میں نے لانچ کی سمت میں دوربین کو فوکس کیا تو مجھے تھوڑا سا بائیں جانب چٹانوں کی سرمئی لکیر نظر آنے لگی۔

"میرا خیال ہے کہ راک آئی لینڈ یہی ہو گا۔" میں نے دوربین نازو کو تھما کے لانچ کو سنبھال لیا۔

نازو نے دوربین آنکھوں سے لگا کے سر ہلایا "تھوڑا سا رُخ بدل لینا چاہیے۔"

"اگر ہمارا اندازہ غلط ہو گیا؟"

"تو ہم غلط جگہ جا اُتریں گے۔" نازو نے کہا "اس میں پریشانی کی کون سی بات ہے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "ہم غلطی کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ آج ہی رات ہمیں محسن اور غالب کے لیے کچھ کرنا ہو گا۔"

"رات آدھی سے زیادہ تو گزر چکی ہے۔" نازو نے کہا۔

"اس بات کو میں یوں کہوں گا کہ ابھی آدھی رات باقی ہے، صبح تک بہت وقت ہے ہمارے پاس۔" میں نے کہا "بس دعا کرو کہ ہم سیدھے اس جزیرے پر جا اتریں۔ پھر کچھ امید کی جا سکتی ہے کیونکہ جزیرہ زیادہ بڑا نہیں ہے اور ہمیں سارے جزیرے پر نہیں، صرف اس محل میں دیکھنا ہے۔"

"محل اب کہاں رہا ہے۔ کھنڈر ہے۔"

"کھنڈر ایسا پرانا بھی نہیں ہے۔ اس کا کچھ حصّہ سلامت ہے، کچھ زمین دوز کمرے بھی ہیں۔"

"زمین دوز کمروں میں پانی نہیں بھر جاتا ہوگا؟"

"جو معلومات مجھے حاصل ہوئی ہیں، اس کے مطابق محل کا صرف مشرقی حصّہ پانی کی زد میں آتا ہے۔ وہ بھی ایک خاص موسم میں۔ اس وقت جب سمندر چڑھتا ہے۔ جس سال یہ محل تباہ ہوا، سمندر میں غیر معمولی طوفان تھا۔ ویسا طوفان پھر کبھی نہیں آیا۔ اس طوفان کے اثرات بمبئی کے ساحل پر بھی محسوس کیے گئے تھے مگر یہی طوفان خلیج بنگال سے گزرا تو مشرقی پاکستان میں تباہی آگئی تھی۔" میں نے کہا۔

نازو نے دوربین آنکھوں سے ہٹا کے کہا "کیا ہم آخر تک لانچ میں ہی جائیں گے؟"

"تمھارا کیا اندازہ ہے۔ ہم کتنی دور ہیں اب؟"

"شاید ایک میل۔ لو تم دیکھو۔" نازو نے کہا۔

ایک لہر نے اسے اور مجھے بُری طرح بھگو دیا۔ میں نے شیشے صاف کر کے دوربین سے دیکھا۔ نازو کا اندازہ ٹھیک ہی معلوم ہوتا تھا۔

"ہم جب ایک فرلانگ دور رہ جائیں گے تو انجن بند کر دیں گے۔" میں نے کہا "پھر جہاں تک چپّو چلا کے جا سکیں گے جائیں گے۔"

"ایسی لہروں میں چپّو خاک کام دے گا۔"

"دیکھیں گے کوشش کر کے۔ ورنہ پھر لہریں جہاں تک پہنچا دیں۔" میں نے کہا "باقی فاصلہ تیر کر..."

لانچ شاید کسی چٹان سے ٹکرائی۔ ایک ساتھ میرے اور نازو کے قدم اُکھڑ گئے۔ اب لانچ ایک سائڈ پر جھکنے لگی۔ میں نے اسے بڑی مشکل سے سنبھالا۔ پھر کنٹرول نازو کے حوالے کر کے میں نیچے گیا اور لائف جیکٹ اٹھا لایا۔ لائف جیکٹ نازو کے لیے بڑی تھی مگر اس کا فائدہ تھا۔ اپنے کم وزن کے ساتھ وہ زیادہ آسانی سے تیر سکتی تھی۔ بریف کیس کو میں نے ایک بیلٹ کے ساتھ کمر پر باندھا۔ اس میں ہماری کُل رقم ہی نہیں ہمارا اسلحہ بھی تھا۔ جو ابھی تک بھیگنے سے اس لیے محفوظ رہا تھا کہ بریف کیس کے اندر پلاسٹک کور نے اسے تقریباً واٹر پروف بنا دیا تھا۔

میں نے پھر دوربین سے دیکھا تو راک آئی لینڈ کا پورا منظر میرے سامنے آ گیا۔ چٹانیں کسی چھوٹے سے سلسلۂ کوہ کی طرح دیوار بنی کھڑی ہوئی تھیں اور ان کے پیچھے محل کے آثار یوں دکھائی دیتے تھے جیسے گرے کینوس پر کالے رنگ میں بنی ہوئی تصویر۔

"کیپٹن! ہم صحیح جگہ پہنچ گئے ہیں۔" میں نے زور سے کہا "انجن بند کر دو۔"

نازو نے دوربین مجھ سے لے لی "میں کیپٹن ہوں انجنیئر نہیں۔ مجھے نہیں آتا انجن بند کرنا۔"

میں نے ٹارچ کی روشنی میں انجن کا معائنہ کیا اور سوئچ آف کرنے میں کامیاب رہا۔ یکلخت فضا خاموش ہو گئی اور مجھے احساس ہوا کہ یہ چھوٹا سا انجن کتنا زیادہ شور کر رہا تھا۔ سمندر کا شور اس کی آواز میں دب گیا تھا۔ لانچ کچھ دیر ایسے ہی چلتی گئی۔ پھر اس پر لہروں نے یلغار کی۔ اس کا کنارا کسی چٹان سے لگا اور جھٹکے نے نازو کو میرے اوپر گرا دیا۔ ابھی ہم سنبھلے بھی نہ تھے کہ ایک زبردست لہر ہمارے سر پر سے گزر گئی۔

میں نے نازو کا ہاتھ تھام کے کہا "ریڈی؟"

نازو نے چہرے سے پانی صاف کر کے سر ہلایا۔

میں نے کہا "میری بیلٹ پکڑ لو۔ اچھا ٹھہرو۔ میں دونوں کو ایک ساتھ باندھ دیتا ہوں۔ اب ہم ایک ساتھ پانی میں کُود کر ایک ساتھ تیرنا شروع کریں گے۔ لانچ اب بھی ڈوبنے ہی والی ہے۔ ون۔ ٹو۔ تھری۔"

میں اور نازو سمندر میں کُود گئے۔ پانی کی ایک لہر نے ہمیں بہت آگے پہنچا دیا۔ مجھے سب سے زیادہ ڈر کسی چٹان سے ٹکرا جانے کا تھا۔ جزیرے کا یہ ساحل چٹانوں سے پٹا پڑا تھا اور کوئی طوفانی لہر ہمیں اٹھا کے کسی چٹان پر دے مارتی تو ہماری ساری ہڈیاں چٹخ جاتیں۔ نازو بڑی بہادری سے موجوں کے خلاف نبرد آزما تھی۔ میں نے ایک چٹان کو اپنے بہت قریب دیکھا اور ایک ہاتھ پھیلا کے پکڑ لیا۔ نازو نے بھی ایک ہاتھ سہارے کے لیے آگے بڑھا دیا۔ ہم دونوں نے اپنی پھولی ہوئی سانسوں پر قابو پانے میں چند سیکنڈ صرف کیے۔ پھر آگے بڑھنا شروع کیا۔ اب پانی میں چٹانیں جگہ جگہ نمودار ہو گئی تھیں۔ چنانچہ میں زیادہ محتاط تھا۔ کسی بھی لہر کے آنے سے پہلے میں اور نازو قریبی چٹان کی اوٹ میں ہو جاتے تھے۔ لہر چٹان سے ٹکراتی تھی اور اس کا زور ٹوٹ جاتا تھا۔ جھاگ کے ساتھ پھوار سی ہمارے سروں پر برستی تھی۔ پھر ہم اگلی چٹان کی پناہ میں پہنچ جاتے تھے۔ اگر ہم ایسا نہ کرتے تو ہر لہر ہمیں اپنی قوت کے ساتھ کسی چٹان سے ٹکرا دیتی۔ خراشیں مجھے بھی آئی تھیں۔ میرے ہاتھوں کی پُشت پر اور کلائی سے اوپر تک جہاں بھی رگڑ لگی تھی، وہاں سمندر کے پانی سے جلن محسوس ہو رہی تھی۔ نمکین پانی سے میری آنکھوں میں بھی مرچیں سی لگ رہی تھیں۔ نازو کی حالت بھی مختلف نہیں ہو سکتی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں اس کی ہمت کی داد دی کہ وہ مُنہ سے ایک لفظ نکالے بغیر ہر تکلیف برداشت کر رہی تھی اور اس جدوجہد میں کسی طرح بھی مجھ سے پیچھے نہ تھی۔

بالآخر پانی اتنا رہ گیا کہ ہم ریت اور پتھروں پر قدم جما کے آگے بڑھ سکتے تھے۔ میں نے نازو کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے رکھا اور اسے چکنے، اونچے نیچے اور ناہموار پتھروں پر سے پھسلنے نہیں دیا۔ آہستہ آہستہ ہم پانی سے بھی نکل آئے اور ایک ایسی ہموار چٹان پر پہنچ گئے جہاں تھوڑی دیر بیٹھ کے دم لینے کی گنجائش تھی۔ میں نے نازو کی سیفٹی جیکٹ کا بک الگ کیا۔ پھر بریف کیس کے بوجھ کو الگ کیا تو مجھے خاصا سکون ملا۔ میں نے سمندر کو دیکھا تو مجھے اپنا زندہ سلامت کنارے تک پہنچ جانا کسی معجزے سے کم نہ لگا۔ پانی میں ان گنت سیاہ دھبّے سے نظر آ رہے تھے۔ یہ سب پتھر کی چٹانیں تھیں جو پھنکارتے ہوئے سمندر کے خونی دانتوں کی طرح دکھائی دیتی تھیں۔ میں نے صرف سمندری لہروں کی رست و خیز ہی کا مقابلہ نہیں کیا تھا، اپنے ساتھ نازو کو بھی سنبھالا تھا اور بریف کیس کو بھی کھینچا تھا۔ میں خالی ہاتھ اکیلا تیر کر آتا تب بھی یہ مشکل کام تھا۔ اتنی مزاحمت کے ساتھ خطرات کے ساتھ اور ذمّے داریوں کے ساتھ میری جدوجہد بہت زیادہ مشکل ہو گئی تھی۔ تھکن سے میرے جسم کا جوڑ جوڑ درد کرنے لگا تھا۔

چہرے اور بالوں سے پانی صاف کر کے میں نے نازو کی طرف دیکھا "تم بالکل ٹھیک ہو نا؟"

نازو نے سر ہلایا "تم ٹھیک ہو؟"

میں نے کہا "بس معمولی سی خراشیں ہیں ہاتھوں پر۔ تمھیں چوٹ تو نہیں آئی کہیں؟"

نازو نے جوتے اتار کے پانی اور ریت کو باہر جھاڑا۔ "نہیں، مجھے بھی خراشیں ہی محسوس ہوتی ہیں۔ یہ لباس بہت اچھا رہا۔"

"تم ایک حیرت انگیز لڑکی ہو۔" میں نے کہا "پہلے بھی تم نے بہت مشکل کام کیے ہیں۔ اس وقت بھی کمال کر دیا تم نے۔ آدھی رات کے اندھیرے میں ایسے خطرناک سمندر کو تیر کر عبور کرنا اچھے اچھے مردوں کے بس کی بات نہیں۔ تم کو ڈر بھی نہیں لگا۔"

وہ ہنسی "میں اکیلی نہیں تھی۔ تم پر اعتماد میری اصل طاقت تھا۔"

میں نے کہا "نہیں نازو۔ اصل طاقت تو آدمی کے اندر ہوتی ہے۔ باہر کے سہارے کوئی اہمیت نہیں رکھتے اگر یہ طاقت کام نہ آئے۔"

نازو نے کہا "کیا بات ہے۔ آج مُنہ پر بہت تعریف کر رہے ہو؟"

میں نے کہا "یہ میرے حقیقی جذبات ہیں۔"

نازو نے اِدھر اُدھر دیکھ کے کہا "غالباً یہی چٹان کی دیوار کا وہ حصّہ ہے جو شق ہو گیا تھا؟"

میں نے کہا "ہاں۔ ہمارے دائیں بائیں پتھریلی چٹانوں کا سلسلہ اور کسی جگہ سے ٹوٹا ہوا دکھائی نہیں دیتا۔"

"گویا وہ رنگ محل عین اس کے پیچھے ہوگا۔ کیا خیال ہے، چلیں؟"

میں نے کہا "اگر ہم ان کپڑوں کو ایسے ہی پہنے رہے تو یہ خشک نہیں ہوں گے۔ تم ادھر اس چٹان کے پیچھے جا کے انھیں نچوڑو اور پھر پہن لو۔ انھی کو تولیے کے طور پر بھی استعمال کر لینا۔"

وہ چٹان کے پیچھے غائب ہو گئی اور جب پھر واپس آئی تو میں بھی بدن خشک کر کے اور کپڑوں کو نچوڑ کے پہن چکا تھا۔ بریف کیس کھول کے میں نے پلاسٹک میں لپٹے ہوئے ریوالور نکالے۔ ریوالور بالکل محفوظ رہے تھے۔ بریف کیس میں بھرے ہوئے نوٹ بھی خشک تھے۔ میں نے ایک ریوالور نازو کو دیا اور بریف کیس پھر بند کر دیا۔

پندرہ منٹ بعد دو چٹانوں کے درمیانی راستے سے گزرتے ہی میں نے رنگ محل کو دیکھا۔ اس کی بُرجیاں اور بلند دیواریں، محراب نما راستے اور بالکونیاں۔ سب ایک کھنڈر تھے، خود اپنی ویرانی پر نوحہ خواں۔ عہدِ رفتہ کی شان و شوکت پر گریہ کناں۔ اب اس وقت کا تصوّر بھی محال تھا جب یہاں رنگ و نور کے سیلاب میں سیم و زر کے بدن جھلملاتے ہوں گے اور شباب کے جام چھلکتے ہوں گے تو شراب کی آتشِ سیال کا نشہ بھی دو آتشہ ہو جاتا ہوگا۔ دولت مندوں کی یہ جنتِ ارضی اب ایک پُرآسیب شہرِ خموشاں تھی جس کی سنسان فضا میں موت کی سرگوشیاں محسوس ہوتی تھیں۔

"کیا سوچنے لگے؟" نازو نے کہا۔

میں نے کہا "کچھ نہیں۔ سوچ رہا تھا کہ اس بریف کیس کو کہاں چھپاؤں۔"

نازو ہنسی "جھوٹ۔ تم ایک قنوطی فلاسفر بنے ہوئے تھے۔"

میں نے کہا "کیا تمھیں بالکل خیال نہیں آتا۔ کہ یہ کیا جگہ تھی اور اب کیا ہے۔ کیسے کیسے لوگ آتے تھے یہاں۔ کیسا تنگ محفل تھا۔ آج ان کی ہڈیاں اس جزیرے پر بکھری پڑی ہوں گی۔"

"ہمیں اپنی ہڈیوں کی فکر کرنی چاہیے۔" نازو نے کہا۔

"میں چاہتا ہوں اس خزانے کو کہیں دفن کر دوں۔" میں نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا "جہاں سے پھر اسے نکالا بھی جا سکے۔"

"اُدھر دیکھو۔ یہ دو ایک سے درخت ہیں۔ ایک ہی زاویے پر دائیں اور بائیں جھکے ہوئے۔" نازو نے کہا۔

میں نے دیکھا تو مجھے وہ درخت ایک بہت بڑے 'وی' کی طرح نظر آئے۔ یہ اچھی نشانی تھی۔ زمین پر دونوں درختوں کی جڑیں ایک ہی جگہ سے پھوٹی تھیں۔ میں نے قریب جا کے دیکھا تو مجھے کچھ مایوسی ہوئی۔ زمین پتھریلی تھی۔ خالی ہاتھوں کی مدد سے بریف کیس کو زمین میں دفن کرنا ناممکن تھا۔ چنانچہ میں نے اور نازو نے اسے دو بڑے بڑے پتھروں کے درمیان میں رکھا اور اس کے آگے پیچھے بھی اتنے ہی بڑے پتھر کھسکا دیے۔ جب تک کوئی اُوپر سے نہ جھانکتا ان چار پتھروں کی قبر میں پڑا ہوا بریف کیس نظر نہیں آ سکتا تھا۔ نازو کے مشورے پر میں نے درمیان کی خالی جگہ کو خود رو جھاڑیوں کی شاخوں سے بھر دیا اور پھر اُوپر بھی پتھر ڈال دیے۔ ہمارا خزانہ پوری طرح کیموفلاج ہو گیا تھا۔

سمندر کی جانب سے آنے والی تیز ہوا میں نمی زیادہ تھی۔ مگر اس نے ہمارے کپڑوں کی نمی کو جذب کر لیا تھا اور کپڑے اب جسم سے چپک نہیں رہے تھے۔ میرے ہاتھ بھی تقریباً خشک تھے۔ محل کے کھنڈر کی طرف بڑھتے ہوئے میں نے ٹارچ کو زمین سے لگا کے روشن کیا۔ اس کی روشنی چند انچ قطر کے دائرے میں محدود رہی۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ ضرورت پڑنے پر ٹارچ کام آئے گی یا نہیں۔

رنگ محل کی مغربی دیوار سلامت تھی اور ایک نصف دائرے کی صورت میں شمال کی جانب گھوم گئی تھی۔ یہ محل کا عقبی منظر تھا۔ مجھے ایک طویل قطار ان کھڑکیوں کی نظر آئی جن کے پٹ اور فریم سب نکالے جا چکے تھے۔ دیواروں کے شگاف سیاہ دھبّے سے دکھائی دیتے تھے۔ غالباً ہر کھڑکی ایک خواب گاہ کی علامت تھی۔ ان خواب گاہوں میں راتیں گزارنے والے کھڑکی سے سمندر میں اترنے والی چاندنی کا نظارہ کرتے ہوں گے اور اس کی سحر آفرینی میں انھیں رنگ محل کا ماحول زیادہ رومانٹک نظر آتا ہوگا۔ میں نے ایک ایک کھڑکی میں سے اندر جھانکتے ہوئے سوچا۔

اندر کچھ نہیں تھا۔ سوائے اندھیرے اور خانہ ویرانی کا۔ چمگادڑوں کے اور محبوس فضا کی بو کے، ملبے کے اور خود رو گھاس پھوس کے۔ ہر شگاف سے اندر جھانکنے کے لیے مجھے دیوار کی جڑ تک پہنچ کے خود کو پنجوں پر اوپر تک اٹھانا پڑ رہا تھا۔ نازو قد میں میرے شانے تک ہی پہنچتی تھی۔ وہ پنجوں پر اٹھ کے بھی اندر نہیں دیکھ پا رہی تھی۔

"اندر کچھ نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"کچھ نہیں ہے تو پھر تم کیا دیکھ رہے ہو؟" اس نے کہا۔ "میں بھی یہ سب دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"ضرور دیکھو۔" میں نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ نازو نے چڑھ کر ایک اینٹ پر دوسری اینٹ رکھی۔ اینٹوں کی وہاں کوئی کمی نہ تھی۔ ایک فٹ اونچا چبوترا سا بنا کے وہ مطمئن ہو گئی کہ اب وہ بہ آسانی شگاف تک پہنچ جائے گی۔ اس نے اوپر چڑھ کے ایک شگاف کے کنارے کو تھامنے کی کوشش کی مگر پیروں کے نیچے اینٹوں کا توازن بگڑ گیا۔ وہ خود کو سنبھال نہ سکی۔

میں گرنے کی آواز پر پلٹا اور دوڑ کر اسے اٹھانے گیا۔ مگر وہ خفّت مٹانے کے لیے خود ہی فوراً کھڑی ہو گئی۔

"کیا ہوا؟" میں نے کہا۔

"کچھ نہیں۔ میں کچھ نہیں دیکھ رہی تھی۔" وہ بولی۔

"ابھی ہڈی پسلی ایک ہو جاتی۔" میں نے کہا۔ "مر جاتی تو تمھارا بوجھ بھی ڈھونا پڑتا۔ جان بچا کے بھاگنا بھی مشکل ہو جاتا۔ مرتا تمھارے ساتھ میں بھی۔ غالب اور محسن کے لیے کچھ کرنے سے پہلے ہی۔" میری برہمی پر نازو شرمندہ نظر آ رہی تھی۔ اس سے زیادہ کچھ کہنا مناسب نہیں تھا۔ وہ رو پڑتی یا لڑنے لگتی۔ چنانچہ میں خاموش ہو گیا۔

اسی وقت میرے کانوں نے انسانی آوازیں سنیں۔ کسی نے بہت قریب سے پوچھا تھا "یہ کیا تھا؟"

جسے مخاطب کیا گیا تھا، اس نے معلوم نہیں کیا جواب دیا۔

"او یار۔ کیسا شور تھا یہ۔ جیسے دیوار گری ہو۔"

"ابے تو گری ہو گی دیوار۔" دوسرے نے کہا۔ "کیا باقی دیواریں ایسے ہی کھڑی رہیں گی۔"

میں نے اور کچھ نہیں سنا۔ ایک جھٹکے سے میں نے نازو کو اپنے ساتھ کھینچا اور کمر سے پکڑ کے اوپر اٹھا دیا۔ وہ ایک دیوار کے خلا میں سے اندر اتر گئی۔ پھر میں نے خود کو

ہاتھوں کے بل پر اوپر اُٹھایا اور اس اندھیرے ویران کھنڈر میں پہنچ گیا جس میں چمگادڑیں بھری پڑی تھیں۔ انھوں نے ہماری مداخلت بے جا پر سخت احتجاج کرتے ہوئے چلّانا اور اندھیرے میں چکر لگانا شروع کیا تو نازو سخت دہشت زدہ ہوئی۔ ان کی آواز انتہائی کرخت اور مکروہ تھی لیکن یہی آواز انھیں راستہ بناتی تھی۔ آواز نکالے بغیر چمگادڑ اُڑ نہیں سکتی اور دیکھ نہیں سکتی۔ اس اندھیرے کے مسافر اندھے پرندے نے انسان کے لیے راڈار کی ایجاد کو ممکن بنایا تھا۔

کئی بار چمگادڑیں پرواز کرتی ہوئی ہمارے سر کے اوپر سے گزریں اور ہم نے سر جھکا کے خود کو بچایا۔ یہ ایک غیر ارادی حرکت تھی۔ چمگادڑیں خود بھی ہم سے بچ کے نکل گئی ہوں گی۔ نازو بالکل مجھ سے چمٹی کھڑی تھی اور اس کا بدن واقعی خوف سے لرز رہا تھا۔

"یہ کیا بزدلی ہے۔" میں نے اسے آہستہ سے ڈانٹا۔ "چمگادڑ کاٹتی نہیں۔"

"میں... میں نے سُنا ہے دانت ہوتے ہیں اس کے۔" نازو نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہوں گے۔ مگر ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ یہ صرف اس لیے چلّا رہی ہیں کہ ڈسٹرب ہوئی ہیں۔"

اسی وقت ایک چمگادڑ تیزی سے آئی اور نازو کی پشت سے ٹکرا کے نیچے گر ہی۔ چمگادڑ کی طرح ہی نازو نے چیخ ماری۔ میں نے اس کے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیا "خدا کے واسطے۔ عقل سے کام لو۔" میں نے کہا۔

نازو نے سر ہلایا اور دہشت زدہ نظروں سے پیچھے دیکھنے لگی جہاں وہ چمگادڑ دیوار کے نچلے حصّے پر چپک گئی تھی۔ ایک اور چمگادڑ اپنی غلطی کے باعث میری گردن سے آ چپکی۔ میں نے ہاتھ مار کے اسے الگ کیا۔ نازو کا حال مزید خراب ہو گیا۔ مجبوراً میں نے اسے اپنے سامنے کیا اور نیچے بیٹھ جانے کو کہا۔ اس طرح میں نے نازو کو اپنے جسم کی پناہ میں لے لیا۔ وہ بچّوں کی طرح سر گھٹنوں میں دیے بیٹھی رہی۔ عورت کی ذات بھی مجموعۂ تضادات ہے۔ کہاں وہ نازو جو دشمنوں پر بجلی بن کے گرتی ہے۔ ایک وار میں گردن توڑ کے اپنے سے سو گنا قوی مرد کو موت کے گھاٹ اتار دیتی ہے۔ ریوالور اور مشین گن کی گولیوں سے دشمنوں کے جسم چھلنی کر دیتی ہے اور مسکراتی رہتی ہے۔ کہاں یہ نازو جو چمگادڑ جیسے بے ضرر جانور کے خوف سے مری جا رہی تھی۔ ایسا ہی ایک تماشا میں نے پہلے بھی دیکھا تھا جب رابعہ اور نازو کو ایک چوہے نے انتہائی دہشت میں مبتلا کر دیا تھا اور جب تک ہم نے اس چھوٹے سے چوہے کو مار نہیں دیا تھا، وہ بیڈ پر چڑھی چلّاتی رہی تھیں۔

اس پرانے واقعے کو یاد کر کے میرے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ باہر جھانکتے ہوئے میں نے پوری توجہ ان آوازوں پر مرتکز رکھی جو دوبارہ سنائی نہیں دی تھیں۔ معلوم نہیں وہ کون تھے جو شاید قریب آ کے دور چلے گئے تھے۔ اینٹوں کے گرنے کی آواز نے انھیں متوجہ کر لیا تھا۔ تو وہ نازو کی چیخ پر کیوں متوجہ نہیں ہوئے تھے؟ اینٹوں کے گرنے پر تو انھوں نے فرض کر لیا تھا کہ کھنڈر کی کسی خستہ حال دیوار کا کوئی حصّہ گرا ہوگا لیکن نازو کی چیخ کو انھوں نے کیوں نظر انداز کیا؟ انھیں شک کیوں نہیں ہوا کہ چمگادڑیں اچانک رات کو کیوں چلّانے لگی ہیں۔

کھڑکی کے اندر تاریکی نسبتاً گہری تھی۔ باہر کے نیم روشن اندھیرے سے کوئی اندر دیکھتا تو اسے کچھ نظر نہ آتا لیکن میں اندھیرے کی پناہ میں رہ کے باہر کا منظر بہتر طور پر دیکھ سکتا تھا۔ اچانک بائیں اور دائیں جانب سے دو سائے نمودار ہوئے۔ وہ بہت احتیاط کے ساتھ پھونک پھونک کر قدم رکھتے آگے آ رہے تھے۔

میں سمجھ گیا کہ نازو کی چیخ نے انھیں ہمارا سراغ دے دیا ہے۔ جزیرے پر کسی اجنبی کی موجودگی ثابت ہو چکی تھی۔ کوئی عورت چلّائی تھی تو اس سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جا سکتا تھا کہ اس کے ساتھ کوئی مرد ضرور ہوگا۔ وہ کون ہیں جو اس کھنڈر میں چھپے بیٹھے ہیں۔ مفرور مجرم، خلوت کے طلبگار یا دشمن۔ وہ اب یہی دیکھنے کے لیے آ رہے تھے اور انھیں تلاش کا مسئلہ درپیش نہیں تھا، چمگادڑوں کے شور نے انھیں ہمارا سراغ دے دیا تھا۔

میں نے نیچے جھک کر کہا "نازو! دو آدمی آ رہے ہیں۔ دونوں مسلح ہیں۔ میرا خیال ہے کہ دونوں کے پاس مشین گنیں ہے۔"

نازو کی حالت میں ایک انقلابی تبدیلی آئی۔ یکلخت وہ کوئی عام لڑکی نہیں رہی۔ وہ نازو بن گئی جس کی مدد پر میں پوری طرح انحصار کر سکتا تھا۔

"کس طرف سے آ رہے ہیں؟" اس نے کھڑے ہو کر کہا۔

"دونوں طرف سے آ رہے ہیں۔ تمھاری دعوت پر۔" میں نے کہا۔

"آنے دو۔ خاطر تواضع بھی ہو جائے گی۔" نازو نے مضبوط، پُریقین لہجے میں کہا۔

میں نے پھر باہر جھانک کے دیکھا تو مجھے دو کی جگہ ایک سایہ نظر آیا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کے زیادہ غور سے پس منظر کی تاریکی میں دوسرے سائے کو تلاش کرنے کی بے سود

کوشش کی۔ وہ اگر ہوتا تو ضرور نظر آتا۔ قریب آجانے کے بعد زیادہ نمایاں ہوتا مگر وہ غائب ہوچکا تھا۔ میں اسے بھوت یا آسیب نہیں تسلیم کرسکتا تھا جو پل میں نظر آئے اور پل میں اوجھل ہوجائے۔ وہ کسی خاص مقصد کے تحت روپوش ہوا تھا اور یہ مقصد تھوڑا سا سوچنے پر فوراً میرے ذہن میں آگیا۔ وہ بھی کسی کھڑکی میں داخل ہوگیا تھا۔ انھوں نے باہمی صلاح مشورے سے جو حکمتِ عملی اختیار کی تھی، وہ ہمیں دونوں طرف سے محصور کرنے کے لیے تھی۔ ایک ساتھ وہ دونوں ایک ہی راستے سے اندر نہیں آنا چاہتے تھے۔

میں نے پلٹ کے دیکھا تو مجھے اپنے سامنے کی دیوار میں ایسی ہی دوسری کھڑکی نظر آئی۔ یہ ایک چوکور شگاف تھا جو پرانے محل کی وسیع خوابگاہ کی دیوار میں باقی رہ گیا تھا۔ جب یہاں کھڑکیاں ہوں گی تو ان کی چوکھٹوں میں شیشے بھی ہوں گے اور شیشوں کے سامنے حریری پردے بھی سرسراتے ہوں گے۔ لوگ چوکھٹ نکال کے لے گئے تھے۔ چنانچہ کھڑکی اور اس کے ساتھ دروازہ اس دیوار کی وسعت میں خلا کی طرح رہ گئے تھے۔ کھڑکی ایک ایسا مستطیل تھی جو چوڑائی کے رُخ پھیلی ہوئی تھی۔ دروازہ اوپر سے نیچے کھڑی ہوئی مستطیل لگتا تھا۔ میرے لیے یہ اندازہ کرنا آسان تھا کہ میرے دائیں بائیں اور اس کے آگے دونوں جانب کی خوابگاہوں کا نقشہ مختلف نہیں ہوسکتا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جو شخص دوسری کھڑکی سے کسی خواب گاہ کے کھنڈر میں اترا تھا، وہ سیدھا دروازے سے گزر گیا ہوگا اور اب بیرونی برآمدے میں چلتا ہوا اس دروازے کی طرف بڑھ رہا ہوگا جو میرے سامنے تھا۔

"نازو! ہم اس موقع سے فائدہ اٹھاسکتے ہیں، اگر تم ہمت سے کام لو۔" میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کے سرگوشی کی۔

"میں — بالکل تیار ہوں۔"

"گڈ گرل — تم ادھر کھڑکی سے آنے والے کو سنبھالو۔ میں ادھر دروازے پر جاکے دوسرے کا استقبال کرتا ہوں۔" میں نے کہا اور پلٹ کے دروازے کی جانب لپکا۔ میں چاہتا تھا کہ برآمدے سے ہوکے ساتھ والے کمرے میں چلا جاؤں مگر میں نے جھانک کر دیکھا تو میری طرف آنے والا چار پانچ کمروں کی دوری پر تھا۔ میں باہر نکلتا تو ایک فاش غلطی کرتا۔ وقت کم تھا۔ خود کو چھپانے کے لیے میں کسی بھی گوشے کا انتخاب کرسکتا تھا۔ مگر میں جانتا تھا کہ اندر آنے سے پہلے وہ دروازے کے دونوں طرف دیکھے گا۔ میں کتنا بھی دیوار سے لگ کر کونے میں کھڑا ہوجاؤں اس کی نظر مجھے دیکھ لے گی۔

میں نے اس کونے کو ترجیح دی جہاں دیوار اور فرش ملتے تھے اور دروازے سے دور عین کھڑکی کے نیچے ہاتھ پاؤں اکڑا کے بالکل ساکت ہوگیا۔ میں نے سامنے والی دیوار کے ... میں نازو کو ایسے بیٹھا ہوا دیکھا کہ وہ مجھے فریم میں لگی ہوئی تصویر جیسی نظر آئی۔ میں اس کا سائڈ پوز دیکھ رہا تھا۔ سیاہ چست لباس میں اس کے بدن کے سب خطوط بہت واضح تھے۔ وہ پیر سمیٹ کر اپنا توازن قائم رکھتے ہوئے چوکھٹ میں یوں بیٹھی ہوئی تھی کہ اس کی پشت دیوار سے لگ گئی تھی۔ یہ مشکل سے ایک دس انچ چوڑی جگہ تھی جہاں وہ بڑے سکون سے بیٹھی قریب آنے والے کو دیکھ رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ اب وہ کیا کرے گی۔ وہ اپنے عورت ہونے کا فائدہ اٹھائے گی۔

"اے لڑکی! کون ہے تو؟" کسی نے درشت لہجے میں کہا۔ نازو کھلکھلا کے ہنس دی۔ "تم کو کیا لگتی ہوں میں؟"

"اور کون ہے تیرے ساتھ؟"

"اب یہ بھی میں بتاؤں۔ تم جو ہو۔" نازو پھر ہنسی۔

"بکواس مت کر — کوئی مرد تھا تیرے ساتھ۔"

"تھا کیا مطلب۔ اتنی جلدی تم مرد نہیں رہے؟" نازو نے بڑی بے شرم شوخی کے ساتھ کہا۔ پھر وہ باہر کود گئی۔

میں نے اچانک کھڑکی کے خلا میں ایک سایہ نمودار ہوتے دیکھا۔ "اندر کون ہے؟" وہ غرّا کے بولا۔ "سامنے آجاؤ ورنہ گولی مار دوں گا۔"

یہ ایسی ہی بات تھی جیسی ایک ماسٹر صاحب نے غصے میں کی تھی کہ جو بچے غیر حاضر ہیں وہ کھڑے ہوجائیں۔ جب بچوں نے کوئی حرکت نہیں کی تو اس نے ٹارچ روشن کی۔ ٹارچ کی تیز روشنی کا دائرہ ویران کھنڈر کمرے کی ایک دیوار سے دوسری دیوار تک گیا۔ چمگادڑوں نے پھر وحشت میں چیخنا اور گردش کرنا شروع کیا۔ میں اس روشنی کی زد میں نہیں آیا۔ چراغ تلے اندھیرا والی بات پھر درست ثابت ہوئی۔ میری تھوڑی سی دور اندیشی نے مجھے بچالیا۔ اس نے آگے جھک کر عین کھڑکی کے نیچے دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔

"کمال ہے۔" وہ بڑبڑایا۔ "کوئی بھی نہیں ہے یہاں تو!" باہر سے ایک ایسی آواز آئی جیسے کوئی ٹہنی چٹخی مگر پھر درخت زمین پر گر گیا۔ نازو کو ایک نازک حسین لڑکی سمجھنے کی غلطی کرنے والا اپنے انجام کو پہنچا۔ میں نے وہیں لیٹے لیٹے جان لیا۔

ٹارچ کی روشنی ایک لکیر کی صورت میں سامنے والی کھڑکی کے خلا سے گزری۔ روشنی کو باہر کی تاریکی نے جذب کرلیا۔ ٹارچ والا اب دروازے کی طرف سے کمرے میں آیا اور سیدھا آگے بڑھا۔ شاید وہ دیکھنا چاہتا ہوگا کہ اس کا ساتھی کہاں ہے۔ وہ اسے بتانا چاہتا ہوگا کہ ان کا اندازہ غلط ہوگیا اور اس کمرے میں کوئی نہیں ہے جس میں چمگادڑیں چلا رہی ہیں۔

میں نے اسے پیچھے سے جست لگا کے جالیا۔ اسے پلٹ کر دیکھنے اور حیران ہونے کا موقع بھی نہیں ملا۔ میرے ایک ہاتھ نے اس کی گردن کو شکنجے کی طرح جکڑ لیا۔ سانس رُک جانے سے وہ تڑپا مگر میری گرفت سے نکلنا ممکن ہی نہیں تھا۔ پیچھے سے ہاتھ مار کے میں نے اس کی گردن توڑ دی۔ اس کا سر ایک دم آگے جُھک کر جھولنے لگا تو میں نے اسے چھوڑ دیا اور وہ فرش پر سر کے بل گرا۔ میں نے اس کی مشین گن اٹھائی اور کھڑکی کی طرف لپکا۔

نازو کھڑکی کے نیچے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس نے مشین گن میری طرف اچھال دی۔ میں نے اسے بڑی مشکل سے کیچ کیا اور نیچے رکھ دیا، اس مشین گن کے ساتھ جو ابھی ابھی میں نے چھینی تھی۔ نازو نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے۔ میں نے اپنے ہاتھ نیچے بڑھائے اور وہ اسپرنگ کی طرح اچھل کے اندر آگئی۔

"یہ ٹارچ تو بجھا دینی تھی۔" نازو نے کہا۔

میں نے کہا۔ "دراصل یہ جب گرا تو ٹارچ اس کے ہاتھ میں ہی تھی۔ میں پہلے تمھیں دیکھنا چاہتا تھا۔"

"وہ بے چارا بھی بس دیکھتا رہ گیا۔ میں نے بڑے پیار سے بلایا تھا۔" نازو نے ٹارچ اٹھا کے آف کردی۔

"بے وقوف تھا کہ تم پر اعتبار کیا۔"

"اعتبار اس نے مجھ پر نہیں کیا تھا۔ اسے اپنی مردانہ شہ زوری پر اور مشین گن پر بھروسا تھا۔" نازو نے کہا۔ "کون ہیں آخر یہ لوگ؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ ظاہر ہے ان کو کسی نے پہرے داری پر مامور کیا تھا۔ یہ پوچھو کہ وہ کون ہیں جن کے یہ پہرے دار تھے۔" میں نے کہا اور نیچے بیٹھ کے لاش کے کپڑوں کی تلاشی لی۔ اس شخص نے خاکی بشرٹ اور پتلون پہن رکھی تھی۔ وہ چوبیس پچیس سال کا نوجوان تھا۔ مجھے اس کے یوں مارے جانے کا افسوس ہوا۔ اسے کب معلوم ہوگا کہ دستِ اجل عین جوانی میں اس پر یہاں شب خون مارے گا۔ اس کی جیب میں ایک پرس تھا۔ پرس میں سو روپے اور کچھ چھوٹے نوٹ تھے۔ قابلِ اعتراض تصاویر کا ایک البم تھا جس پر نظر پڑتے ہی نازو کا چہرہ لال ہوگیا۔ ایک اور تصویر کسی نوجوان لڑکی کی تھی۔ سیدھی سادی عام سی لڑکی۔ جو شاید اس کی محبوبہ، منگیتر یا بیوی تھی۔

"تم نے اس دوسرے آدمی کی جامہ تلاشی لی تھی؟"

"ہاں — مگر وہ اتنا اچھا ذوق نہیں رکھتا تھا۔" نازو نے کہا۔ "صرف پیسے تھے اس کی جیب میں۔ نام پتا کچھ نہیں۔"

"کیا کرنا ہے نام پتے کو۔ کون سا کتبہ لگے گا ان کے سرہانے۔" میں نے کہا۔ "آؤ اب چلیں اور دیکھیں ایسے کتنے محافظ اور ہیں۔"

ہم ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں چلتے گئے۔ یہ سب بالکل ایک سے کمرے تھے۔ سمندر کے رُخ کھلنے والی سب کھڑکیاں اپنی خواب گاہوں سے طلوع آفتاب کا منظر پیش کرتی ہوں گی۔ مگر شفق کا سنہرا اُجالا شیشوں تک پہنچ کے رُک جاتا ہوگا۔ اندر لذتِ خوابِ سحر میں ڈوبے ہوئے، خمارِ آخرِ شب کے ساتھ اپنی خلوت کے اندھیروں میں سوتے رہتے ہوں گے۔ میں نے سوچا کسی بھی قدیم تاریخی عمارت کو دیکھتے ہوئے ذہن ماضی کے جھروکوں سے جھانکنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔

ایک جگہ اچانک وہ برآمدہ ختم ہوگیا۔ میں نے کھلے آسمان کو ایک وسیع چار دیواری سے دیکھا۔ اس چار دیواری پر پہلے بھی چھت نہیں تھی۔ چھت گری ہوتی تو اس کا ملبہ اندر ہی موجود ہوتا۔ میں نے ٹارچ روشن کرکے دیکھا تو ایک دیوار کے ساتھ اوپر جانے کا راستہ نظر آیا۔ روشنی چند زینوں پر محدود رہی۔ میں نے روشنی کو آگے بڑھایا۔ اسی دیوار کے دوسرے کنارے پر زمین میں خلا سا تھا۔ لائٹ آف کرکے میں نازو کے ساتھ آگے بڑھا۔ پھر میرے کانوں نے آوازیں سنیں۔ وہ جگہ جو زمین میں ایک دھنسی ہوئی قبر جیسی نظر آتی تھی، کچھ روشن ہوگئی۔ یہ روشنی نیچے سے آرہی تھی۔ میں نے نازو کا ہاتھ تھاما اور پلٹ کے بھاگا لیکن بھاگ کر چھپنے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ زینے سے کوئی اوپر آرہا تھا۔

میں نے نازو سے کہا کہ وہ زمین پر لیٹ جائے۔ میں خود بھی لیٹ کر رینگتا ہوا واپس گیا۔ کوئی شخص ٹارچ ہلاتا بھاری قدموں سے چلتا اوپر آرہا تھا۔ جب اس کا سر زمین سے طلوع ہوا تو میں اس سے کافی دور تھا اور اگر رینگتا ہوا جاتا تو اس تک نہ پہنچ پاتا۔ چنانچہ میں نے پیچھے سے اسے قابو کرنے کا فیصلہ کیا۔ شاید نازو نے دور سے ہی اندازہ کرلیا تھا کہ مجھے دشواری کا سامنا ہے۔ اس نے بڑی ذہانت کا ثبوت دیا اور وہیں لیٹے لیٹے ہاتھ گھما کے ایک پتھر پھینکا۔ پتھر دیوار پر لگا تو اوپر آتے ہی اس شخص نے آواز کی سمت میں دیکھا

اور مجھے اُٹھنے کی مہلت مل گئی۔ میرے قدموں کی آہٹ پر وہ ایک دم گھوما۔ سیاہ لباس میں ایک شخص کو مشین گن کے ساتھ حملہ آور ہوتا دیکھ کر ایک لمحے کے لیے وہ مفلوج ہوگیا۔ پھر اس نے اپنی مشین گن اٹھانے اور منہ کھول کے چلانے کی کوشش کی مگر میں نے اسے دبوچ لیا۔ اس کے ہاتھ سے مشین گن چھوٹ گئی۔ آواز نکلنے سے پہلے ہی میرا ہاتھ اس کے منہ پر جم گیا۔ میں نے اس کی گردن کو بغل میں دبا کے ایک جھٹکا دیا۔ تو اس کے قدم اکھڑ گئے۔ میں اسے اپنے ساتھ گھسیٹ کرلے گیا۔

پہلے کمرے کے کھنڈر میں جاکے میں نے اس کو دیوار کے ساتھ لگا دیا اور ایک پاؤں اٹھا کے گھٹنے سے اس کا پیٹ دبا لیا۔ نازو میرے قریب ٹارچ روشن کیے کھڑی رہی۔ روشنی سیدھی اس کی آنکھوں میں پڑ رہی تھی۔

میں نے کہا۔ ”اگر تم زندہ رہنا چاہتے ہو تو اس کی ایک ہی صورت ہے۔ ہمیں اپنا نیا آقا مان لو۔“

”تمھارے دو ساتھیوں کی گردن ہم مولی گاجر کی طرح توڑ چکے ہیں ایسے۔“ نازو نے کہا اور ایک دلچسپ حرکت کی۔ اس نے وہیں کھنڈر کے ملبے سے ایک پرانا لکڑی کا تختہ اٹھا لیا تھا۔ یہ لکڑی کا تختہ بھی نہیں کسی چوکھٹ کا ایک فٹ لمبا ٹکڑا تھا۔ چھ انچ چوڑا اور تقریباً ایک انچ موٹا۔ نازو نے اسے پورے اعتماد کے ساتھ ایک ہاتھ سے تھاما۔ تھوڑا سا اوپر اچھا کے چھوڑا اور بڑی برق رفتاری سے دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی کا کھڑا وار کرکے دو ٹکڑے کر دیا۔

یہ ایک خطرناک مظاہرہ تھا۔ خطرناک اس لیے کہ نازو آؤٹ آف پریکٹس تھی۔ مشق جاری رہے تو آدمی ایک یا دس تختے ہاتھ مار کے توڑنے پر قادر ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایسے مظاہروں کے لیے توازن اور ارتکاز کی ضرورت پڑتی ہے۔ نازو نے یہ مظاہرہ اپنی طاقت سے حریف کو امپریس کرنے کے لیے کیا تھا مگر یہ مظاہرہ ناکام بھی ہو سکتا تھا — وار کے غلط پڑنے سے نازو کی کلائی ٹوٹ سکتی تھی یا اس کا ہاتھ زخمی ہو سکتا تھا لیکن حسنِ اتفاق سے تختہ دو ٹکڑے ہوگیا۔

”تمھاری گردن اس تختے سے زیادہ مضبوط نہیں ہو سکتی۔“ میں نے کہا۔ ”اور یہ تو کھیل تھا عورت کے نازک ہاتھوں کا۔ میرا ہاتھ تمھارے سر کو ناریل کی طرح پاش پاش کر دے گا۔“

دہشت اس شخص کی آنکھوں میں اتر آئی تھی۔ اس نے اقرار میں سر ہلایا تو میں نے اسے آزاد کر دیا۔

”یہ اچھی طرح سمجھ لو کہ تم نے آواز نکالی تو خود اپنی موت کو آواز دو گے۔ مدد کرنے والے تمھاری لاش ہی اٹھا سکتے ہیں۔ تمھیں بچا نہیں سکتے۔“ میں نے کہا۔

”تم — کون لوگ ہو؟“ اس نے مدراسی لہجے میں اردو کا کباڑا کرتے ہوئے کہا۔

”ہم سوال کریں گے۔ تم جواب دو گے۔“ میں نے کہا۔ ”جواب غلط ہوئے تو ذمے داری بھی تمھاری۔ ہم پیشہ ور قاتل ہیں اور بہت بڑے ٹھیکے بھی لیتے ہیں۔ پورے خاندان یا برادری کو صاف کرنا ہو، کسی گروہ کا خاتمہ کرنا ہو۔ تم کس گروہ سے تعلق رکھتے ہو؟“

”کسی... کسی گروہ سے نہیں۔“ وہ ہونٹوں پر زبان پھیر کے بولا۔

”بیوی بچے تو ہوں گے تمھارے؟“

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ ”ان کی بات مت کرو۔“

میں نے کہا۔ ”سوچنا تو پڑتا ہے نا کہ بعد میں ان کا کیا بنے گا۔ بعض لوگ اتنے بے وقوف ہوتے ہیں کہ ہم سے زیادہ چالاک اور بہادر بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ خود تو مر کھپ جاتے ہیں۔ بیوی خوار ہو جاتی ہے۔ آج کل کون مدد کرتا ہے کسی کی — بے غرض۔“

”خاص طور پر بمبئی میں۔ فوراً آجاتے ہیں گدھ۔“ نازو نے میری بات کی تائید کی۔

”بچے پھر ماں کی کمائی کھا کے پلتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ہماری باتوں کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ وہ ہاتھ جوڑنے لگا۔

”بھگوان کے واسطے دیا کرو مجھ پر۔ میرے دونوں بچے بہت چھوٹے ہیں۔“

”پھر تو بیوی جوان ہی ہوگی تمھاری۔“ میں نے سوچ کے کہا۔ ”بہت بُرا ہوگا اگر وہ کسی کوٹھے پر...“

”نہیں — ایسی نہیں ہے وہ۔“ وہ اذیت سے چلّایا۔

”چلّاؤ نہیں۔“ میں نے اس کی گردن دبوچ کے کہا۔ ”عورت کیسی بھی ہو، مجبور ہو جاتی ہے۔ مجبور کر دی جاتی ہے۔ کون مرنے دیتا ہے ایک جوان، خوبصورت عورت کو۔“

”اور تم کو اس کا اتنا ہی خیال ہے تو پھر بتاؤ کہ یہاں تم کیا کر رہے ہو؟“ نازو نے کہا۔

”میں... مجھے انھوں نے ملازم رکھا ہے۔“

”نام بتاؤ ان کا۔“ نازو بولی۔

”تریوینی نے — اور اس کے ساتھ جو تین آدمی یہاں آتے ہیں۔ میں ان کے نام نہیں جانتا۔“

”صورت تو دیکھی ہوگی ان کی۔ حلیہ بتاؤ۔“ میں نے کہا۔

اس نے کہا۔ ”ایک تو بہت بڑی داڑھی والا ہے۔ اس کا پیٹ بھی بہت بڑا ہے۔ ایک آنکھ میں کچھ فرق ہے۔ ایک پاؤں سے لنگڑا کے چلتا ہے۔ موٹے فریم کا بھاری شیشوں والا چشمہ لگاتا ہے۔“

میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”بات بات پر ’ماشا اللہ‘ سے ’سبحان اللہ‘ کہتا ہے۔“

اس کا چونکنا دلیل بن گیا کہ میں نے جو تیر اندازے سے چلایا تھا، وہ نشانے پر لگا ہے۔ ”ہاں۔ تم جانتے ہو اسے؟“

”میں نے کہا تھا کہ سوال مت کرنا۔“ میں نے غرّا کے کہا۔ ”دوسرے کا حلیہ بتاؤ۔“

”دوسرا کوئی نیگرو ہے۔ کالا۔ چوڑی ناک والا۔ سر کے بال سخت اور مڑے ہوئے۔“

میں نے کہا۔ ”کانوں میں پیتل کی بالیاں پہنتا ہے؟“

وہ پھر چونکا۔ ”ہاں — اور وہ گونگا ہے۔ بات سُن کر سمجھ لیتا ہے مگر جواب اشاروں میں یا پھر لکھ کر دیتا ہے۔“

میں چکّر میں پڑ گیا۔ پہلے اس نے حاجی عبداللہ کا حلیہ بیان کیا تھا۔ مگر اس میں ایک بات غلط تھی۔ حاجی عبداللہ کے کسی پاؤں میں لنگ نہیں تھا۔ دوسرا آدمی استاد پیڈرو کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر وہ گونگا نہیں تھا۔ جب اس نے تیسرے آدمی کی بات کی تو میرے اندازے کے مطابق وہ چوہدری ولاور ثابت ہوا مگر اس کے متعلق بھی ایک بات حقائق کے خلاف تھی۔ اس نے کہا کہ تیسرا شخص اندھا ہے اور ہر وقت گہرے سیاہ رنگ کا چشمہ لگاتا ہے لیکن وہ چھڑی کے بغیر بھی بڑے اعتماد کے ساتھ چلتا ہے۔

میں سمجھ گیا کہ یا تو جانتے بوجھتے یہ شخص حلیے کو غلط کر رہا ہے یا ان تینوں نے اپنی شخصیت کے ظاہری روپ کو بدل رکھا ہے۔

میں نے کہا۔ ”تم کچھ غلط بیانی کر رہے ہو۔ ابھی وقت ہے سوچ لو۔ اگر کچھ جھوٹ بکا ہے تو بتا دو۔“

”میں — میں نے سب ٹھیک بتایا ہے۔ بھگوان کی سوگند کھا کے کہتا ہوں میں۔“ وہ گڑگڑانے لگا۔

”اچھا — جھوٹ سچ سامنے آجائے گا تمھارا۔ یہ بتاؤ کہ یہاں تمھارا کیا کام ہے؟“

”جو سب چوکیداروں کا ہے۔ جزیرے کے ساحل پر پہرا دینا۔“ اس نے کہا۔ ”ہم چھ چوکیدار ہیں۔“

”جزیرہ ان چاروں میں سے کسی کے باپ کا نہیں۔ انھوں نے یہاں پہرا کیوں بٹھا رکھا ہے؟“ میں نے کہا۔

”جب مال آتا ہے۔ تو خیال رکھنا پڑتا ہے کہ ادھر کوئی بھی نہ آئے۔ کبھی کبھی لوگ ایسے ہی سیر کرنے آجاتے ہیں یا کسی کو ساتھ لے کر۔“ اس نے نازو کی طرف دیکھ کر کہا۔

”میں سمجھ گیا۔ یہ مال کیا ہوتا ہے؟“ میں نے کہا۔

وہ نفی میں سر ہلانے لگا۔ ”جب مال آتا ہے تو ہم ادھر نہیں جا سکتے۔ جہاز سے مال اتارنے والے دوسرے لوگ ہوتے ہیں۔“

”تم نے کبھی معلوم کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔“

”نہیں۔ ہم کو سیٹھ تریوینی نے سمجھا دیا تھا کہ فالتو بات کوئی نہیں کرے گا۔ فالتو کام کوئی نہیں کرے گا۔ مطلب یہ کہ زبان بند رکھو اور اپنا کام کرو۔ سب تریوینی سے ڈرتے ہیں۔ آپس میں بھی بات نہیں کرتے اور اِدھر اُدھر نہیں جاتے۔ سب کا اپنا اپنا علاقہ ہے۔ وہیں گھوم پھر کے دیکھتے رہتے ہیں۔“

”جو مال یہاں آتا ہے، وہ یہاں سے کہاں جاتا ہے؟“

”ہم کیا بتائیں۔ ہم سب دور رہتے ہیں۔“

”اچھا یہ مال جاتا کیسے ہے؟ لانچوں پر؟“

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ ”ایک رات میں مال اتارا جاتا ہے۔ دوسری رات لانچیں بھر بھر کے کہیں بھیج دیا جاتا ہے۔ دو دن سیٹھ لوگ بھی یہاں رہتے ہیں۔ ان کے ساتھ اور بھی بہت سے ہوتے ہیں۔“

”کیا آج یہاں مال نہیں ہے؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”پرسوں گیا ہے مال۔ اب پھر کوئی جہاز آئے گا پندرہ دن بعد۔ یا ایک مہینے بعد۔“

”گویا ابھی سیٹھ لوگ یہاں نہیں ہیں؟“

”آج آئے تھے۔ ابھی دو گھنٹے پہلے واپس گئے ہیں۔ سیٹھ تریوینی کی لانچ میں آئے تھے۔ اسی کے ساتھ چلے گئے۔“

”دو گھنٹے پہلے، یعنی بارہ بجے تک وہ سب یہاں تھے۔“ میں نے گھڑی دیکھ کے کہا۔ ”کیا کر رہے تھے وہ لوگ؟“

”نہیں معلوم۔ شاید کسی جہاز کا انتظار۔“

”مگر تم نے کہا ہے کہ جہاز تو پرسوں ہی خالی ہوا ہے اور اب پندرہ دن بعد ہی آئے گا۔ کہیں وہ ہمارا انتظار تو نہیں کر رہے تھے؟“

”نہیں معلوم۔“ اس نے سر ہلا کے کہا۔

”اچھا۔ تم نیچے سے آئے تھے۔ نیچے کیا ہے؟“ میں نے کہا۔

”کمرے ہیں۔“ اس نے قدرے تذبذب کے ساتھ کہا۔

”اندر یہ موٹر کہاں چل رہی ہے۔“ میں نے کہا۔

”یہ موٹر نہیں ہے۔ جنریٹر ہے۔“ وہ بولا۔ ”بجلی کے لیے۔“

”اندر کتنے لوگ ہیں اور وہ کیا کرتے ہیں؟“

”دو خاص آدمی پہلے کمرے میں رہتے ہیں۔“ وہ بولا۔

"آگے کیا ہے، یہ وہی جانتے ہیں۔ ہم آگے نہیں جاسکتے۔"

میں نے کہا "تم نے کبھی اندازہ کرنے کی کوشش بھی نہیں کی، آخر اندر کیا ہوسکتا ہے؟ کوئی مال خزانہ، اسلحہ یا سونا، ہیرے جواہرات، اسمگل کی ہوئی شراب۔ تم نے کچھ تو آتے جاتے دیکھا ہوگا۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "میں نے ایسی کوئی بھی چیز آتے جاتے نہیں دیکھی۔"

"کسی اور سے بھی کچھ نہیں سنا؟"

"میں نے بتایا ہے نا کہ ہم آپس میں ایسی کوئی بات نہیں کرسکتے۔ سب ایک دوسرے سے ڈرتے ہیں کہ وہ مالکوں کا مخبر نہ ہو۔"

"تم نے کہا تھا کہ چھ آدمی ساحل کی حفاظت کرتے ہیں۔ دو ہم نے ابھی کچھ دیر پہلے ٹھکانے لگا دیے۔ تیسرے تم ہو۔ باقی تین کہاں ہیں؟" میں نے کہا۔

"اپنے اپنے علاقے میں ہوں گے۔"

"تمھارا علاقہ کون سا ہے؟" میں نے کہا۔

نازو نے اس کے جواب دینے سے پہلے کہا "یہ علاقہ تمھارا نہیں ہوسکتا۔ یہاں تو دو آدمی پہلے سے موجود تھے۔ کیا تم اپنی ڈیوٹی چھوڑ کے آئے تھے؟"

نازو نے اچھا سوال کیا تھا۔ میں نے کہا "اور اگر ایسا ہی ہے تو یہ بھی بتاؤ کہ ایسا کیا ضروری کام تھا جس کی وجہ سے تم کو ڈیوٹی چھوڑ کے آنا پڑا؟"

وہ بدحواس نظر آنے لگا "کسی کی ڈیوٹی کسی خاص علاقے تک محدود نہیں رہتی۔ چاروں طرف سے ساحل کی کُل لمبائی تین میل کے قریب ہے۔ ہم چار چار فرلانگ کے فاصلے پر چلتے رہتے ہیں۔ ایک ہی سمت میں۔"

میں نے اس کے مُنہ پر لات ماری۔ وہ پیچھے جا گرا۔ اور مُنہ پر ہاتھ رکھ کے بلبلانے لگا۔

میں نے کہا "اپنی آواز کو خود روک لو۔ ورنہ میں آواز کا یہ راستہ ہمیشہ کے لیے بند کردوں گا۔" میں نے اس کی گردن کو دبایا۔

نازو نے کہا "تم نے جھُوٹ بولا تھا۔ یہ غلطی پھر مت کرنا۔"

میں نے کہا "تم سب الگ الگ ڈیوٹی نہیں دیتے اور چار چار فرلانگ کا فاصلہ درمیان رکھ کے گشت نہیں کرتے۔ وہ دونوں ہمیں ایک ساتھ ہی ملے تھے جو ایک ساتھ مارے گئے۔"

"وہ... بات یہ ہے... کہ جب خطرہ نہ ہو... تو سب تھوڑا سا آرام کرلیتے ہیں اور گپ شپ کرلیتے ہیں۔ پرسوں وہ مال گیا ہے جو ایک دن پہلے جہاز سے اتارا گیا تھا۔ مالک بھی چلے گئے ہیں۔ ابھی دس پندرہ دن ایسے ہی گزریں گے کوئی خاص کام نہیں ہوگا۔"

"چنانچہ تم یہاں ایسے ہی آگئے تھے تفریح اور گپ شپ کے لیے۔ کیا باقی لوگ بھی آرام کررہے ہیں گشت موقوف کرکے؟" میں نے کہا۔

اس نے اقرار میں سر ہلایا "شاید... کچھ تو کر ہی رہے ہوں گے۔"

"نیچے جو خاص آدمی ہیں، ان کا کام بھی خاص ہے جو تم نہیں جانتے۔ پھر ان سے تمھارا کیا تعلق ہے؟ آخر کیوں ملنے گئے تھے تم ان سے؟" میں نے کہا۔

"میں — شراب کی ایک بوتل مانگنے گیا تھا۔" وہ کچھ سوچ کے بولا "انھوں نے انکار کردیا۔ بے عزت کردیا مجھے۔ اور کہا کہ جاؤ ڈیوٹی پر ورنہ شکایت کردیں گے۔ وہ خود پی رہے تھے۔"

میں نے کہا "یعنی شراب کے نشے میں انھوں نے تم کو دھتکار دیا۔ نشے میں نہ ہوتے تو ایک بوتل تمھیں بھی خیرات کردیتے۔"

"پہلے دیتے ہی تھے۔ مفت کی جو ملتی ہے انھیں۔"

"اچھا — تم اب کہاں جاؤ گے؟ اگر ہم تمھیں چھوڑ دیں۔"

"میں — واپس — دیکھوں گا کہ باقی سب کہاں ہیں اور کیا کررہے ہیں۔ ہم نے پروگرام بنایا تھا رات بھر تاش کھیلیں گے۔ میں نے کہا تھا کہ ایک بوتل لے آؤں گا۔ وہ سب مایوس ہوں گے۔" وہ بولا۔

میں نے کہا "اچھا، اب تم پھر جاؤ۔ ان سے جھگڑا کرو اور کہو کہ تمھیں شراب نہ ملی تو تم بھی ان کی شکایت کردو گے۔" میں نے کہا۔

"وہ — گولی ماردیں گے مجھے۔" وہ خوفزدہ ہوکے بولا۔

"تمھارے پیچھے ہم ہوں گے۔ ہم انھیں ایسا نہیں کرنے دیں گے۔ تم دروازہ کھلوا سکتے ہو۔ ہم نہیں کھلوا سکتے۔" میں نے کہا "وہ مشتعل ہوں گے تو ایک دم گولی نہیں ماریں گے۔ پہلے وہ تمھیں گالیاں اور دھکے دے کر نکالنے کی کوشش کریں گے۔ اس وقت ان کا دھیان اپنے اسلحے کی طرف نہیں ہوگا اور تم سے جھگڑتے ہوئے ان کی توجہ دروازے کی طرف نہیں ہوگی۔ ہم موقع سے فائدہ اٹھائیں گے اور ایک دم اندر آجائیں گے۔"

"لیکن — کیا کرو گے تم اندر جا کے؟"

میں نے اس کے مُنہ پر الٹے ہاتھ سے جھانپڑ مارا "پھر سوال کیا تم نے! تم وہی کرو جو ہم کہیں۔ اگر زندہ رہنا چاہتے ہو۔ ورنہ —" میں نے اسے ایک دم اٹھا لیا۔ تھوڑا سا اوپر نیچے، دائیں بائیں کیا۔ گھمایا پھرایا اور فرش پر پھینک دیا۔ اس کی حالت غیر ہوگئی۔ وہ لمبے لمبے سانس لے رہا تھا اور پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

"میں تم کو دیوار پر دے مارتا تو تمھاری ایک ہڈی سلامت نہ رہتی۔" میں نے کہا۔

"میں... میں جاتا ہوں۔" وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔

میں اور نازو اس کے ساتھ سائے کی طرح لگے رہے۔ ہم دونوں کے ہاتھوں میں مشین گن فائر کے لیے بالکل تیار تھی۔ نیچے جانے والا راستہ باقی عمارت کی خستہ حالی کو دیکھتے ہوئے بہت صاف ستھرا نظر آتا تھا۔ ہر زینہ بالکل صحیح حالت میں تھا اور زینے کے دونوں جانب دیوار پر رنگ بھی کیا گیا تھا۔ آٹھ دس سیڑھیاں نیچے ایک موڑ تھا جہاں سیڑھیوں کے دونوں حصوں کو روشن رکھنے کے لیے لائٹ لگا دی گئی تھی۔ یہ دودھیا شیڈ والی لائٹ تھی اور بلب بھی بڑا نہیں تھا۔ چنانچہ اس کا اُجالا اوپر کے حصے میں صرف اتنا ہی تھا کہ اندھیرا نہیں رہا تھا اور راستہ صاف دکھائی دیتا تھا۔

موڑ تک ہم ساتھ رہے۔ پھر میں نے جھانک کر دیکھا تو مجھے صرف چار سیڑھیوں کے بعد ایک بند دروازہ نظر آیا۔ یہ شیشم کی لکڑی کا بہت مضبوط اور بالکل نیا دروازہ تھا۔ جو نئے حالات کے تقاضے پورے کرنے کے لیے خاص طور پر نصب کیا گیا تھا۔ عین دروازے پر ایک کیمرا نصب تھا اور اس کے پیچھے سرچ لائٹ تھی۔ یہ اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ جب کوئی دروازے پر دستک دیتا ہوگا تو سرچ لائٹ براہِ راست اس پر پڑتی ہوگی اور کیمرا آنے والے کی واضح تصویر اندر پہنچا دیتا ہوگا۔ ہمارے لیے اس حد سے آگے جانا خطرناک ثابت ہوسکتا تھا۔

"کیا میں جاؤں؟" پہرے دار نے کہا۔

"ایک منٹ رُکو۔ میں سوچ رہا ہوں کہ کہیں یہ اسکیم فیل نہ ہوجائے۔" میں نے کہا "فرض کرو انھوں نے جھگڑا نہ کیا۔ نشے میں کوئی شخص کیا کرے گا، اس کی پیش گوئی نہیں کرنی چاہیے۔ وہ اس کے برعکس بھی کرسکتا ہے۔ اگر انھوں نے تمھیں شراب کی بوتل تھما دی تو تمھیں خاموشی سے واپس آنا پڑے گا۔ یا انھوں نے دروازہ بند کرکے تمھیں اندر بُلا لیا اور مارنا شروع کردیا تو ہم یہ دروازہ کیسے کھلوائیں گے۔ ہم نے باہر سے فائرنگ کی تو وہ اندر سے اس کا جواب دیں گے۔ ان کے پاس وائرلیس یا ٹیلی فون تو ضرور ہوگا۔"

"وائرلیس سیٹ ہے۔ اس پر وہ کسی بھی وقت تریوینی سے بات کرسکتے ہیں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "پھر تو سارا معاملہ الٹا ہمارے گلے پڑ جائے گا۔"

"تم لوگ آخر چاہتے کیا ہو؟"

اس بار سوال کرنے کے جرم کی سزا اسے جھانپڑ کی صورت میں نہیں ملی۔ میں نے کہا "ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ اندر ایسی کیا چیز ہے جس کی حفاظت کی جاتی ہے۔ اندر لڑکیاں تو نہیں ہیں؟"

"لڑکیاں!" وہ بھونچکا رہ گیا۔

"ہاں — جو برآمد کی جاتی ہیں۔" میں نے کہا "ایکسپورٹ سے پہلے انھیں یہاں جمع تو نہیں کیا جاتا؟"

وہ زور زور سے نفی میں سر ہلانے لگا "ایسی کوئی بات ہوتی تو سب کو معلوم ہوتی۔"

میں نے کہا "خیر ہم دیکھ لیں گے۔ اب تم یوں کرو کہ اس دروازے پر دستک دو۔" پھر میں نے نازو کی طرف دیکھا "تم یہ مشین گن مجھے دو۔ میں اوپر جاتا ہوں۔ تم یہاں رُک کے دروازہ کھلنے کا انتظار کرو۔"

نازو نے مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھا "اور پھر؟"

"پھر فائدہ اٹھاؤ اپنے عورت ہونے کا۔ جیسے ہی دروازہ کھلے، تم چیخ مار کے اوپر بھاگو۔ جیسے تم اس کی گرفت سے نکل کے بھاگی ہو۔ یہ تمھارے پیچھے بھاگے گا تمھیں پکڑنے کے لیے۔ مجھے یقین ہے کہ پھر وہ دروازہ بند کرکے نہیں بیٹھ سکتے۔ وہ بھی تمھارے پیچھے اوپر آئیں گے۔"

نازو نے سر ہلایا اور مشین گن مجھے تھما دی "میں اسی جگہ بھی نمٹ سکتی ہوں ان سے۔"

"کیا ضرورت ہے رسک مول لینے کی۔ وہ اُوپر آگئے تو ہم آسانی سے نمٹ لیں گے۔" میں نے کہا۔ پھر میں اس شخص سے مخاطب ہوا "تم سمجھ گئے ہو نا کہ تمھیں کیا کرنا ہے؟ اس میں ذرا سی بھی غلطی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سب سے پہلے تم مارے جاؤ گے۔"

"میں... ویسا ہی کروں گا... جیسا تم نے کہا۔"

نازو نے کہا "میں دروازے تک تمھارے ساتھ جاؤں گی۔ تمھارے دستک دینے تک انتظار کروں گی۔ دروازہ کھلتے ہی میں واپس جاؤں گی چلّاتی ہوئی اور تم دروازے کو بھول کے میرے پیچھے آؤ گے مجھے گالیاں دیتے ہوئے۔ جیسی گالیاں چاہو دینا۔ میں بُرا نہیں مانوں گی۔"

اس نے سر ہلایا "میں سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہوں۔ مگر دیکھو۔ مجھے مارنا نہیں۔ میرے ساتھ دھوکا مت کرنا۔ یہ نہ ہو کہ وہ اوپر آجائیں تو ان کے ساتھ تم مجھے بھی گولی ماردو۔"

میں نے اس کے کندھے پر تھپکی دی "ہم جھوٹا وعدہ نہیں کرتے۔ تمھاری جان بخش دی تو بخش دی۔ تم ہماری مدد کر رہے ہو۔ ہم اس کا یہی صلہ دے سکتے ہیں۔"

میں دبے پاؤں اوپر چڑھ گیا لیکن زینے کے آخری حصے سے جھانکتا رہا تاکہ نیچے کا سارا ڈراما دیکھ سکوں اور سُن سکوں۔ مجھے سرنگ جیسے راستے سے ہر آواز صاف سنائی دینے کی اُمید تھی۔ دروازے پر دستک کی آواز میں نے صاف سُنی۔ پھر زینہ ایسے روشن ہو گیا جیسے دن نکل آیا ہو۔

"کون ہے؟" کسی نے غرّا کے کہا۔ یہ انسانی آواز اسپیکر سے گزر کر آئی تھی چنانچہ کچھ بدل گئی تھی۔

"ابے — یہ تو وہی — ہے" کسی دوسرے شخص نے درمیان میں فحش گالیاں فٹ کر کے کہا۔

"اب کیا ہے بے؟ تو دفع نہیں ہوا ابھی تک۔"

اسی وقت نازو نے چیخ ماری "چھوڑ — چھوڑ مجھے کمینے!" وہ پیر زور زور سے نیچے مارتے ہوئے بھاگی۔

"ٹھہر — جاتی کہاں ہے تیری تو . . ." وہ گالیاں بکتا ہوا نازو کے پیچھے لپکا۔

"یہ — کسی چھوکری کو لایا تھا؟" کسی نے چلّا کے کہا۔ اور دروازہ کھول دیا۔

"اسی لیے بار بار شراب مانگنے آ رہا تھا۔" دوسرا بولا اور باہر آ گیا۔ "او تے — ٹھہرو تم دونوں۔"

پہلے والے شخص نے کہا "پکڑ لے دونوں کو۔"

میں پیچھے ہٹ گیا تھا۔ آگے نازو اور اس کے پیچھے وہ شخص اوپر آ گیا جو اسے پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے تعاقب میں دونوں خاص آدمی دوڑتے ہوئے آئے۔ میں نے مشین گن نازو کی طرف اچھال دی جسے اس نے سائڈ میں رہتے ہوئے کیچ کر لیا۔ ابھی پیچھے آنے والوں کا سر ہی نمودار ہوا تھا کہ زینے کے دونوں جانب سے میں نے اور نازو نے مشین گن کا بٹ مار کے انھیں واپس لڑھکا دیا۔ وار بڑی عجلت میں کیا گیا تھا اور بھرپور تھا۔ ان دونوں کے حلق سے بھیانک چیخ نکلی۔ ان کے سر پھٹ گئے تھے۔ جب وہ پلٹ کے گرے تو رہی سہی کسر بھی پوری ہو گئی۔ وہ اپنے خون سے سیڑھیوں کو رنگتے ہوئے واپس گئے۔ اردگرد کی دیواریں بھی ان کے لہو کے چھینٹوں سے داغدار ہو گئیں۔ انھیں دھوکا دے کر اوپر بلانے والا انتہائی دہشت کے ساتھ یہ منظر دیکھتا رہا۔

دونوں خاص آدمی زینے کے موڑ پر یوں رُکے تھے کہ ایک دوسرے پر ڈھیر ہو گئے تھے اور تڑپتے ہوئے ایک دوسرے کو ہی نوچ رہے تھے۔ سرچ لائٹ کی تیز روشنی میں ان کے سر سے بہنے والا تازہ خون چمک رہا تھا اور قرمزی نظر آتا تھا۔ میں نے نیچے جا کے اپنا ریوالور نکالا اور ایک ایک فائر سے دونوں کے سر اُڑا دیے۔ وہ تڑپ کر ایک دوسرے میں گھس گئے اور پھر عجیب، بدصورت مضحکہ خیز ڈھیر کی صورت میں ساکت ہو گئے۔ زینے کا کونا لہو سے سُرخ ہو گیا۔

میرا خیال تھا کہ اب راستہ صاف ہے لیکن پہلے فائر کے ساتھ ہی ایک غیر متوقع بات ہوئی۔ اندر ایک الارم چلّانے لگا۔ اس کی آواز زیادہ تیز نہیں تھی لیکن جو الارم باہر شور کرنے لگے تھے، ان کی آواز اس سائرن سے کم نہ تھی جو ہوائی حملے کے وقت بجائے جاتے ہیں۔ یہ آوازیں قریب سے بھی آ رہی تھیں اور دور سے بھی۔ چنانچہ ایسا لگتا تھا کہ یہ ایک ہی آواز ہے جس کی بازگشت فضا میں پھیلی ہوئی ہے۔

میں نے ریوالور کا رُخ اس شخص کی طرف کیا۔ "یہ کیا ہے؟ تم نے ہمیں یہ کیوں نہیں بتایا تھا۔"

"مجھے . . . مجھے خود بھی معلوم نہیں تھا۔" وہ چلّانے لگا۔

"جھوٹ بکتے ہو تم۔ تم نے دھوکا دیا ہمیں۔"

"اگر مجھے دھوکا دینا ہوتا۔ تو میں تم سے بالکل تعاون نہ کرتا۔ یہ سب نہ بتاتا تمھیں جو مجھے معلوم تھا۔ مجھے مت مارو۔" وہ تھر تھر کانپتے ہوئے دھاڑیں مار مار کے رونے لگا۔

"اچھا جاؤ۔ بھاگ جاؤ جتنی دور جا سکتے ہو چلے جاؤ۔" میں نے کہا۔ نہ جانے کیوں مجھے یقین آ گیا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا ہے۔ یہ کوئی خودکار نظام تھا جس کے بارے میں وہ کوئی معلومات نہیں رکھتا تھا۔

جب وہ بھاگ گیا تو میں نے نازو کی طرف دیکھا۔ "غالباً یہ الارم اس فائر کی آواز پر اسٹارٹ ہوئے۔"

"اب یہاں سے نکلنے کی کرو۔ یہ الارم کسی نہ کسی کو متوجہ کرنے کے لیے لگائے گئے ہوں گے۔" نازو نے کہا۔ "ممکن ہے وائرلیس پر اس آواز کو ترلوینی بھی سن رہا ہو۔"

میں نے نازو کا ہاتھ پکڑا اور لاشوں کے اوپر سے پھلانگ گیا۔ شیشم کی مضبوط لکڑی کا دروازہ پورا کھلا ہوا تھا۔ اس کے اندر مجھے لوہے کی وہ گرل نظر آئی جو سمٹ جاتی ہے اور پھیل جاتی ہے۔ ہم نے اچھا کیا کہ چالاکی سے دروازہ کھلوا لیا اور اندر مورچا بند محافظوں کو باہر بلا کے مار دیا۔ اگر ہم طاقت استعمال کرتے تو لکڑی کے دروازے کو گولیوں سے چھلنی کر کے توڑ سکتے تھے۔ لوہے کی گرل سے ہم پھر بھی نہ گزر پاتے۔

وہ بالکل ویسی ہی خواب گاہ تھی جیسی اوپر بنائی گئی تھیں۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس میں عقبی کھڑکی شمال کی جانب کھلتی تھی۔ یہ کھڑکی بند نہیں تھی۔ اس میں سے مَیں نے سمندر کو بہت قریب دیکھا۔ غور کرنے پر نقشہ میری سمجھ میں آ گیا۔ اُوپر والی خواب گاہیں کسی بلند چٹان پر تعمیر ہوئی تھیں۔ محل کا یہ دوسرا حصہ اتنا نیچا تھا کہ سیڑھیاں اُتر کے آنا پڑتا تھا لیکن یہ تہ خانہ نہیں تھا۔

اس کمرے کی دیواروں کی حالت بہت اچھی تھی۔ اگر سمندر نے محل پر یلغار نہ کی ہوتی تو شاید ہر خواب گاہ ایسی ہی نظر آتی۔ یہ ایک بے سروپا خیال تھا۔ سمندر اس عشرت کدے کو برباد نہ کرتا تو اس خواب گاہ میں سکندر اور نازو کیوں آتے۔ یہاں کوئی کروڑ پتی، ارب پتی ہوتا اور اس کی شریکِ خواب ہوتی اور خواب گاہ بھی ایسی کہاں ہوتی۔ اس سے ہزار درجہ بہتر طور پر آراستہ ہوتی۔

کمرے میں آمنے سامنے دو بیڈ لگے ہوئے تھے۔ ایک طرف پرانا صوفہ سیٹ پڑا ہوا تھا اور درمیان میں پرانی سینٹر ٹیبل تھی جس پر تاش کے پتّے اور نوٹ نظر آ رہے تھے۔ دونوں خاص آدمی شغلِ مے کے ساتھ دل بہلانے کے لیے تاش کھیل رہے تھے اور تاش کے کھیل کو بھی سنسنی خیز بنانے کے لیے پیسے لگا کے کھیل رہے تھے۔ شراب کے خالی گلاس فرش کے گھسے ہوئے قالین پر اوندھے پڑے تھے۔ جنریٹر کی آواز اب زیادہ ہو گئی تھی اور شاید ساتھ والے کسی کمرے سے آ رہی تھی۔ ایک دیوار کے ساتھ لگی ہوئی میز پر مجھے وائرلیس سیٹ نظر آیا۔ اس کی ایک سرخ روشن آنکھ یہ بتاتی تھی کہ سیٹ آن ہے اور کسی سے اس کا مواصلاتی رابطہ قائم ہے۔ الارم کی آواز اسی ٹرانسمیٹر کے اسپیکر سے نکل رہی تھی۔ میں نے اس کو آف کرنے کی کوشش کی اور کامیاب رہا۔ اس کے ساتھ ہی باہر والے الارم بھی خاموش ہو گئے۔

"میرا اندازہ درست تھا۔ یہ خودکار الارم ہے۔" میں نے کہا۔ "یا تو دھماکے سے پیدا ہونے والے ارتعاش نے اسے چالو کر دیا۔ یا بارود کی بُو نے۔"

"میرا خیال ہے کہ ترلوینی کو ضرور معلوم ہو گیا ہو گا کہ یہاں کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔" نازو نے کہا۔

"وہ اتنی جلدی یہاں نہیں آ سکتا۔" میں نے کہا۔

"کوئی اور تو آ سکتا ہے۔ آخر جزیرے پر یہ الارم کیوں نصب تھے؟ سب کا ایک ہی کنٹرول تھا۔" نازو نے کہا۔

"جزیرے پر اب چار محافظ ہیں۔ ان میں سے ایک جان بچا کے فرار ہوا ہے۔ باقی تین کو اطلاع مل گئی ہو گی تو وہ ضرور آئیں گے۔"

"یہ ہو سکتا ہے سکندر کہ . . . ان لوگوں نے حفاظت کے غیر معمولی انتظامات کر رکھے ہوں جن کا اس چوکیدار کو پتا نہ ہو۔ جیسے اس کو ایمرجنسی الارم کا پتا نہیں تھا۔"

"تم بلاوجہ پریشان ہو۔ یہاں وہ اپنی فوج کو چھپا کے تو رکھنے سے رہے۔" میں نے کہا۔ "ممکن ہے یہ الارم سسٹم اس وقت کے لیے ہو جب کوئی جہاز لنگر انداز ہو اور اس پر سے اسباب اُتارا جا رہا ہو۔ فی الحال کوئی جہاز نہیں آ رہا ہے۔"

"پھر وہ آج یہاں کیوں موجود تھے؟"

"وہ ہمارا انتظار کر رہے تھے۔" میں نے کہا۔ "ترلوینی نے ہم سب کو کسٹم کی لانچ میں روانہ کرنے کا پکّا بندوبست کر لیا تھا۔ وہ تو ہماری قسمت تھی کہ ہم بچ کر فرار ہو گئے۔ مگر ترلوینی نے تو چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کو خوشخبری دے دی ہو گی کہ تمھارے مہمان آنے ہی والے ہیں۔ وہ آدھی رات تک راہ دیکھتے رہے اور مایوس ہو کے لوٹ گئے۔ اب تک انھیں پوری رپورٹ مل چکی ہو گی۔"

"اچھا چلو اندر بھی تو دیکھو۔" وہ بولی "ممکن ہے وہ بھی یہیں قید ہوں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "انھیں وہ ساتھ ہی لائے ہوں گے اور جاتے وقت ساتھ لے گئے ہوں گے۔ وہ ان کو یہاں قید رکھنے کا رسک نہیں لیں گے۔"

"رسک کیا ہے۔" نازو نے درمیانی دروازے کا پردہ ہٹا کے کہا۔ "انھیں تو یقین ہو گا کہ ہم یہاں پہنچ ہی نہیں سکتے اور آئیں گے بھی تو ساحل پر قدم رکھنے سے پہلے ہی مارے جائیں گے۔ یہ جو محافظ مشین گن لے کر چاروں طرف سے ساحل کی نگرانی کر رہے ہیں یہ اسی لیے ہے کہ ہم یہاں نہ آئیں۔"

"مگر ہم آ گئے ہیں اس طرف سے جدھر سے ان کو بالکل اُمید نہیں ہو گی کہ ادھر سے آنے والا زندہ سلامت کنارے پر اُتر سکتا ہے۔ پھر یہ کہ محافظ کچھ ڈھیلے تھے اور ہم کسی نہ کسی طرح اس جگہ تک آ پہنچے ہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ جنریٹر کی آواز تو اسی کمرے میں سے سنائی دے رہی ہے۔ اس دروازے کو کیسے کھولیں؟"

"اس کے قفل کی چابی تو ہو گی۔" نازو نے کہا۔ "لیکن اسے تلاش کرنا مشکل کام ہے۔ یا تو ان کی جیب میں ہو گی۔ جو زینے میں پڑے ہیں یا پھر اسی کمرے میں کہیں۔ تم توڑ نہیں سکتے؟"

میں نے کہا "بی بی — میں آدمی ہوں۔ ٹارزن نہیں۔"

"چلو گولی سے اڑا دو۔" نازو نے کہا۔ "اس طرح یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ الارم کیا واقعی فائر کرنے سے آن ہو جاتا ہے۔"

"پہلے میں وائرلیس سیٹ کو لگا دوں۔" میں نے کہا۔

ابھی میں نے تار لگایا بھی نہیں تھا کہ اندر کی ہر لائٹ آف ہو گئی اور یکلخت فضا پر بوجھل سکوت کا تسلّط ہو گیا۔

"جنریٹر بند ہوگیا۔" میں نے کہا۔

"جنریٹر مسلسل نہیں چل سکتے۔" نازو نے ٹارچ روشن کی۔ "ان کی دیکھ بھال کرنی پڑتی ہے۔ کبھی فیول ختم ہوجاتا ہے کبھی پلگ شارٹ ہوجاتا ہے۔ ایسا پہلے بھی ہوتا ہوگا۔"

"اگر وہی دونوں جنریٹر کو چلانے کے ذمّے دار بھی تھے تو پھر کچھ نہیں ہوسکتا۔" میں نے کہا۔ "اندھیرا ہی رہے گا یہاں۔"

اسی وقت جنریٹر چند سیکنڈ کے لیے بولا۔ لائٹ آئی اور ایک جھلک دکھا کے غائب ہوگئی۔

"اس کا مطلب تو یہ ہے کہ اندر کوئی ہے۔"

میں نے کہا۔ "ہاں۔ کوئی جنریٹر کو پھر چلا رہا ہے۔ انتظار کرو۔"

جنریٹر دوسری بار اسٹارٹ ہوگیا۔ کمرے کی ہر لائٹ پھر جل اٹھی۔ اس غیر متوقع صورتِ حال نے مجھے پریشان کردیا تھا۔

"آخر کون ہے اندر؟ اور وہ الارم سننے کے باوجود باہر کیوں نہیں آیا؟" میں نے کہا۔ "اگر وہ چل پھر سکتا ہے تو اندر سے دروازہ بھی کھول سکتا ہے۔"

"کیا میں دستک دے کر بلاؤں؟" نازو نے کہا۔

میں مشین گن لے کر ایک دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ "بلاؤ۔" میں نے کہا۔ "اس سے بھی نمٹ لیں گے۔"

نازو نے دروازے کو ہاتھ سے بجایا۔ ایک بار، دوسری بار، تیسری بار، کوئی بھی دروازہ کھولنے نہیں آیا۔ کسی نے اندر سے دستک دینے والے سے کوئی سوال بھی نہیں کیا۔

"کیا تم یہ آواز سن رہے ہو؟" نازو نے اچانک کہا۔

میرے کان کھڑے ہوئے۔ "یہ ۔۔ ہاں ۔ یہ ہیلی کاپٹر کی آواز ہے۔"

"جلدی کرو۔ کہیں یہ وہی لوگ نہ ہوں۔" نازو نے کہا۔

"کیا کروں؟ اچھا ہٹ جاؤ۔ میں تالے کو اڑاتا ہوں۔" میں نے کہا۔

نازو نے پیچھے ہٹ کر وائرلیس ٹرانسمیٹر کا پلگ لگا دیا۔ میں نے نشانہ لے کر گولی چلائی۔ الارم ایک دم چلّانے لگا۔ نازو نے گھبرا کے پلگ نکال دیا۔ میرا یہ خیال درست ثابت ہوا تھا کہ خودکار الارم فائر کی آواز سے آن ہوتا ہے۔ تالا ابھی ٹوٹا نہیں تھا۔ میں نے نازو سے کہا کہ پھر ٹرانسمیٹر کو آن کرے۔ دوسرے فائر سے تالا ٹوٹ گیا۔ الارم پھر شور کرنے لگا۔ میں نے اس پر ریوالور کی باقی گولیاں خالی کردیں۔ ٹرانسمیٹر کے اندر کی ساری مشینری ٹوٹ پھوٹ گئی۔ تار شارٹ ہونے سے چنگاریاں اڑیں اور کمرے میں تار جلنے کی بو پھیل گئی۔ سارے الارم ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئے۔

ہیلی کاپٹر کی آواز اب بہت صاف سنائی دے رہی تھی۔ نازو نے ہینڈل گھمایا تو ہینڈل اس کے ہاتھ میں آگیا۔ میں نے دروازے کو لات ماری۔ دروازے کا پٹ چوکھٹ سے جدا ہوگیا۔ میں نے اندر ایک اور کمرا دیکھا۔ کمرے میں ایک ہی بلب روشن تھا۔ اس کے آسیب زدہ اُجالے میں مجھے سامنے کی دیوار میں ایک کھڑکی سی نظر آئی۔ دو فٹ چوڑے اور ایک فٹ اونچے چوکھٹے میں کالے رنگ کا شیشہ فٹ کیا گیا تھا۔ میں نے قریب جا کے دوسری طرف کا منظر دیکھنے کی کوشش کی اور ناکام رہا۔ اس پوری دیوار میں یہی ایک روشندان سا تھا۔

"کیا ہے ادھر؟" نازو نے کہا۔

"پتا نہیں۔ ایسے کچھ دکھائی نہیں دیتا لیکن کچھ ہے ضرور۔ جنریٹر اس کمرے میں بھی نہیں ہے تو اُدھر ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ کھڑکی کھلتی نہیں ہے؟"

"مجھے تو ہر طرف سے بند دکھائی دیتی ہے اور جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں یہ پلیٹ گلاس ہے۔ یا پھر بلٹ پروف شیشہ۔" میں نے کہا۔ "اسے توڑنا بھی آسان نہیں۔"

نازو نے شیشے پر دستک دی۔ اس کا جواب آیا۔ فوراً کسی نے دوسری طرف سے شیشے کو بجایا۔ نازو کے لیے یہ اتنی غیر متوقع بات تھی کہ وہ ڈر کے پیچھے ہٹ گئی۔ ایک فوری خیال کے تحت میں نے آگے بڑھ کر شیشے کو انگلی سے بجانا شروع کیا۔ یہ بہت پرانی بات تھی۔ جب میں نے اور محسن نے مورس کوڈ سیکھا تھا اور اس کی اچھی خاصی پریکٹس بھی کرلی تھی۔ مورس کوڈ لفظوں اور لکیروں کی وہ بین الاقوامی زبان ہے جو وائرلیس سگنل دینے میں کام آتی ہے۔ اس کا سب سے عام استعمال تارگھر میں ہوتا ہے جہاں آپریٹر مسلسل 'ٹک' دبا کے ٹک ٹک کرتے رہتے ہیں۔ میں اور محسن اس زبان میں پیغام رسانی کے اتنے ماہر ہوگئے تھے کہ پینسل سے میز بجا کے کوئی بات کرلیتے تھے اور میز کے آس پاس بیٹھے ہوئے لوگ کچھ بھی نہیں سمجھ پاتے تھے۔

دھڑکتے دل کی امیدوں کے ساتھ میں نے انگلی سے شیشہ بجا کے مورس کوڈ میں پوچھا۔ "کیا تم محسن ہو؟" اور اس وقت میرا ہارٹ فیل ہوتے ہوتے رہ گیا جب جواب میں دوسری طرف سے مورس کوڈ میں جواب ملا۔ "نہیں۔ میں تمھارا باپ ہوں۔" سراب یکلخت حقیقت بن کے سامنے آگیا تھا۔ میں ذہنی طور پر اس کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے خود کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ یہ صرف آرزو کا فریب ہے۔ ورنہ درحقیقت مجھے کسی نے بھی میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔

نازو نے میری صورت پر رونما ہونے والے تغیّرات سے میری ذہنی و جذباتی کیفیت کا کچھ اندازہ کیا۔ "سکندر، کیا بات ہے؟" میں نے اس کی طرف دیکھا اور پھر شیشے کی طرف۔ شیشے نے کہا۔ "کیا ہوا۔ سکندر۔" اور یہ جملہ بھی مورس کوڈ میں ارسال کیا گیا تھا۔ دوسری طرف محسن کے سوا کوئی اور نہیں ہوسکتا تھا۔

نازو نے پریشانی سے باہر کی طرف دیکھا۔ "وہ ہیلی کاپٹر۔"

میں نے فرطِ جذبات میں ہکلاتے ہوئے کہا۔ "نازو... ہم... ہم پہنچ گئے... انھیں پالیا ہم نے۔"

نازو کا چہرہ فرطِ مسرت سے دمکنے لگا۔ "کیا؟ کہاں پالیا۔ کدھر ہیں وہ...؟"

"بے وقوف۔" میں نے کہا۔ "ادھر۔ اس شیشے کے پیچھے محسن کھڑا ہوا ہے۔ شاید غالب بھی ہوگا۔ وہ دونوں انتظار کر رہے ہیں کہ ہم انھیں اس قید سے نکال لیں۔" میں ہنسنے لگا اور پھر رونے لگا۔

"اچھا ۔ یہاں۔" نازو نے شیشے کے ساتھ کان لگا کے کہا۔ "یہاں ہیں وہ؟ محسن... غالب... دیکھو ہم آگئے۔" وہ شیشے پر ہاتھ مار کے چلّانے لگی۔ "تم سُن رہے ہو نا۔ جواب دو۔"

میں نے اسے کھینچ کر ایک طرف کیا۔ "تمھاری آواز نہیں سُن سکتے وہ۔ ہٹ جاؤ۔ میں پیغام دیتا ہوں انھیں۔"

نازو کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور وہ کانپ رہی تھی۔ "میں... میں بھی سنوں گی۔"

میں نے شیشے پر انگلیوں کی مدد سے پیغام دیا۔ "میں اور نازو تمھیں لے جانے کے لیے آئے ہیں۔ غالب کو بھی بتادو۔"

جواب میں شیشے نے کہا۔ کٹ کٹ... کٹا کٹ... کٹا کٹا کٹ کٹ۔ "غالب چلّا رہا ہے۔ کیا نازو اس کی آواز نہیں سُن رہی ہے۔"

میں نے کہا۔ "شیشے سے دور چلے جاؤ۔ میں اسے گولیوں سے چھلنی کردوں گا۔ اس کو توڑنا مشکل ہے۔ کیا تم نے یہ بات سمجھ لی ہے؟ ہاں کہو اور نیچے لیٹ جاؤ۔ میں اوپر کی طرف فائر کروں گا۔"

محسن نے کہا۔ "ہاں۔"

میں نے مشین گن کا رخ شیشے کی طرف کیا اور دس سیکنڈ شمار کیے۔ پھر مشین گن نے آگ اگلی۔ اس کی گولیاں شیشے کے پرخچے اڑاتی ہوئی دوسری طرف نکل گئیں۔ میں نے اس کے کنارے کاٹ دیے تھے۔ نازو کے ہاتھ سے ٹارچ چھین کر میں نے روشنی اس بے ہنگم خلا سے گزاری۔ دو اجنبی چہرے مجھے درمیانی خلا میں ایک ساتھ نظر آئے جو ایک ساتھ مجھے گھور رہے تھے۔ میں ڈر کے پیچھے ہٹ گیا۔ وہ چہرے بیچ کے خلا سے میری طرف بڑھے۔

نازو نے ایک دل دہلا دینے والی چیخ ماری۔ میں نے پھر انھیں ٹارچ جلا کے دیکھا۔ وہ محسن اور غالب ہی تھے۔ مگر ان کی حالت دیکھ کے میرا دل خون کے آنسو رونے لگا۔ وہ ہڈیوں کے ڈھانچے رہ گئے تھے۔ ان کی آنکھیں گہرے حلقوں کے گڑھوں میں دھنسی ہوئی تھیں۔ ان کے چہرے پر کھال کی ہر شکن میں اس تشدد کی داستان تھی جو اُن پر قید میں روا رکھا گیا تھا۔ ان کے سر کے اور داڑھی کے بال جھاڑ جھنکاڑ ہو رہے تھے اور وہ کسی وحشی انسان کی طرح ہمیں بھوکی، پُرآسیب خوف زدہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

آہستہ آہستہ میں نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ "محسن ۔ میری جان ۔ غالب۔" میں نے ان کے چہرے کو چھو کے کہا۔ "دیکھو ہم آگئے۔ اب فکر کی کوئی بات نہیں۔ آؤ ۔ ادھر سے ہی آجاؤ۔ میں تم کو کھینچ لیتا ہوں ۔ دیکھو یہ نازو ہے۔"

ان دونوں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا تھا اور اپنے چہرے پر مَل رہے تھے۔ ان کی آنکھوں کے ویران گڑھے آنسوؤں کی بارش سے بھر گئے تھے۔ پھر نازو نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور وہ پنجرے میں قید جانور کی طرح اس کے ہاتھ کو بھی چومنے لگے، چاٹنے لگے۔ نازو بھی ان سے کچھ کہتی رہی جو میں نے نہیں سُنا' مجھے یہ بھی احساس نہیں تھا کہ وہ کیسے رو رہی ہے۔

پھر اچانک مجھے ہوش آگیا۔ میں نے نازو کو بڑی سختی سے پیچھے کھینچا۔ "یہ کیا کر رہی ہو تم۔ ہٹ جاؤ۔ میں انھیں نکالتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "رونا دھونا بند کرو۔"

نازو سہم کر پیچھے ہوگئی۔ اس کے ہسٹیریا کا زور وہیں ٹوٹ گیا۔ ورنہ میں اسے بھی سنبھالنے پر مجبور ہوتا۔ ہیلی کاپٹر اب عین ہمارے سر پر آگیا تھا اور مجھے کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ اس میں کون آیا ہوگا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس میں تریوینی ہوگا۔ اس کے ساتھ باقی سب شکاری ہوں گے۔ ایمرجنسی سگنل ملتے ہی وہ روانہ ہوگئے تھے۔ ان کے پاس اُڑ کر آنے کے لیے وسائل تھے چنانچہ وہ کم سے کم وقت میں آپہنچے تھے۔ انھوں نے ہمیں باہر نکلنے سے پہلے ہی محصور کرلیا تھا۔

میں نے اندر جھانک کر کہا۔ "محسن! کیا اندر کی طرف کوئی اور دروازہ ہے۔"

محسن نے پیچھے ہٹ کر کہا۔ "ہاں ۔ وہ دروازہ ہے مگر اس میں باہر سے بھی قفل ہے اور اندر سے بھی تم کدھر سے آئے تھے؟"

میں نے کہا "ادھر سے اب راستہ نہیں رہا۔ ہم تمھارے پاس آجاتے ہیں۔ تم یہ جنریٹر بند کر دو۔"

محسن نے کہا "ہمارے لیے کپڑے لے کر آنا۔"

میں نے نازو کی طرف دیکھا۔ وہ میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی واپس بھاگی۔ پہلے بیڈ روم میں جہاں وہ محافظِ خاص رہتے تھے، ان کے استعمال کے کپڑے مل سکتے تھے۔ ورنہ بیڈ کی چادریں تھیں۔ نازو کے واپس آنے سے پہلے ہی میں نے تین مشین گنوں کو درمیانی کھڑکی سے اندر پھینک دیا۔ پھر میں نے اپنے ہاتھوں سے کنارے کو تھاما اور اس شگاف میں سے گزر گیا۔ میں نے پہلے اس میں اپنا سر ڈالا، پھر دھڑ کو آگے کھینچتے ہوئے...... اپنے ہاتھ فرش پر لگا دیے۔ ٹانگوں کے نکلتے ہی میں سیدھا کھڑا ہو گیا اور تب مجھے پہلی بار شدید بدبو کا احساس ہوا۔

میں نے خود کو ایک ایسے کمرے میں پایا جس میں کوئی کھڑکی نہیں تھی اور روشندان نہیں تھا۔ اس کی دیواریں سپاٹ تھیں اور تازہ ہوا یا روشنی صرف اس درز سے اندر آتی تھی جو بند دروازے کے نیچے نظر آ رہی تھی۔ درز مشکل سے تین انچ چوڑی تھی اور اس میں سے ایک ربر کا پائپ اندر آ رہا تھا۔ شاید اس پائپ سے انھیں پینے کے لیے پانی دیا جاتا ہوگا۔ اسی درز سے انھیں کچھ کھانے کو بھی مل جاتا ہوگا۔ میں نے ٹارچ جلا کے دیکھا تو مجھے فرش پر ہر طرف بول و براز کے ڈھیر نظر آئے۔ غالب اور محسن اسی کمرے کو حوائجِ ضروریہ سے فراغت کے لیے استعمال کرنے پر مجبور تھے اور اسی غلیظ متعفن فضا میں دن رات کے چوبیس گھنٹے گزارتے تھے۔ ان کے عذاب کی سختی کا تصور کر کے میرا دل لرزنے لگا۔

محسن نے کہا "دن میں تین بار پانی ملتا تھا۔ تھوڑا تھوڑا ہم دونوں پی لیتے تھے۔"

غالب نے کہا "ہر روز ایک سوکھی روٹی ملتی تھی۔"

محسن نے کہا "اس درز میں سے چوہے اندر آجاتے تھے رات کو۔"

غالب نے کہا "چیونٹے اور کاکروچ آجاتے تھے۔"

میں نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے "خدا کے لیے مجھے مت بتاؤ۔ میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں، وہی بہت ہے مجھے پاگل کرنے کے لیے۔"

غالب نے کہا "ہم تو پاگل نہیں ہوئے۔"

محسن بولا "ہم نے سوچا کہ اگر ہم نے ہمت ہار دی تو واقعی پاگل ہو جائیں گے۔"

نازو نے چلا کے کہا "سکندر! یہ کپڑے لو، اور مجھے بھی اندر آنا ہے۔ میں خود نہیں آسکتی۔"

میں نے اس سے کپڑے لیے اور محسن کو تھما دیے "لو، یہ پہن لو جلدی سے۔ پھر میں نازو کو کھینچتا ہوں۔"

نازو نے کہا "سکندر! وہ لوگ آرہے ہیں۔ جلدی کرو۔"

میں نے کہا "اپنا ہاتھ آگے بڑھاؤ۔"

نازو نے ہاتھ اوپر کیے تو میں نے اسے کھینچ لیا۔ وہ پھسلتی ہوئی اندر آئی اور میرے ہاتھوں سے نکل کے سیدھی فرش پر ٹک گئی۔ محسن اور غالب ابھی کپڑے پہن رہے تھے۔ میں نے ٹارچ کی روشنی دوسری طرف کی۔

نازو نے میرا بازو تھام لیا "اوہ میرے خدا! یہاں تھے یہ لوگ۔ کیسی بدبو ہے یہاں۔ اس میں چوبیس گھنٹے بند رہتے تھے یہ لوگ۔"

میں نے کہا "ہاں۔ کیڑوں مکوڑوں اور چوہوں کے ساتھ۔ ایک ایک روٹی کھا کے اور ایک ایک گھونٹ پانی پی کے مگر ان کے حوصلے کو شکست کون دے سکتا تھا۔"

"یہ اندھیرا کیوں ہو گیا؟ جنریٹر کیوں بند ہے؟"

"میں نے بند کرا دیا تھا۔" میں نے کہا "اندھیرا ٹھیک ہے۔ تم یہ مشین گن اٹھا لو۔ ہم دوسری طرف سے جائیں گے باہر۔"

نازو نے مشین گن اٹھالی "ہیلی کاپٹر کہیں قریب ہی اترا ہے۔"

میں نے کہا "تم اس دروازے کو اڑا دو۔ اس کے قبضوں کو نشانہ بناؤ۔ دروازہ گر جائے گا۔ تم غالب اور محسن کے ساتھ باہر نکلو۔ میں اس درمیانی کھڑکی سے انھیں دیکھتا رہوں گا۔ اگر وہ اندر آگئے تو انھیں روکنے کی کوشش بھی کروں گا۔"

"تم ہمارے ساتھ چلو گے۔" نازو نے کہا۔

"ہاں بابا۔ ساتھ ہی چلوں گا۔ تم تو نکلو۔" میں نے کہا۔

نازو نے اندازے سے فائر کیے۔ بند کمرے میں فائر کی آواز بم کے دھماکوں کی طرح سنائی دی۔ پھر دروازہ دوسری طرف جا گرا۔ میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ میرے کانوں نے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنی تھیں۔ باہر روشنیاں بھی نظر آنے لگی تھیں۔

"لائٹس کیوں آف ہیں؟" کسی نے چیخ کر کہا۔

کسی اور نے چلا کے کہا "ان کی تو لاشیں پڑی ہیں دونوں کی؟"

"کیا وہ نکل گئے؟ وہ اتنی جلدی کہاں جا سکتے ہیں؟"

زینے میں بیک وقت کئی ٹارچوں کی روشنی لہرا رہی تھی۔ میں نے پلٹ کے دیکھا تو غالب، محسن اور نازو دروازے سے گزر چکے تھے۔ دوسری جانب کے دروازے سے ایک ساتھ بہت سے لوگ اندر آگئے۔ میں نے مشین گن کا ٹریگر دبا دیا۔ پہلے راؤنڈ نے ہی ان سب کو مٹا دیا۔ ایک شخص جو بچ گیا تھا پلٹ کے بھاگا۔ مخالف سمت سے آنے والے دو اور آدمی اس سے ٹکرائے۔ مشین گن نے انھیں بھی چھلنی کر دیا۔ اوپر سے آنے والے شور مچاتے واپس ہوئے۔ انھیں غیر متوقع حملے نے بدحواس کر دیا تھا۔

اب میں پلٹ کے بھاگا۔ آخری راؤنڈ کو میں نے جنریٹر پر صرف کر دیا۔ دروازے سے گزرتے ہی میں نے ان تینوں کو دیکھا۔ وہ ایک کھڑکی کھولے میرا انتظار کر رہے تھے۔ نازو نے مجھے ایک مشین گن تھما دی۔ میں نے باری باری ان تینوں کو باہر اتارا۔ پھر خود باہر کود گیا۔ مجھے ڈر تھا کہ سامنے سے حملہ کرنے والے اب کسی اور سمت سے ہمیں روکنے کی کوشش کریں گے۔

محسن اور غالب ہانپنے لگے تھے۔ ان کی جسمانی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ ہمارے ساتھ دوڑ سکتے۔ ہمارے قدموں کے نیچے ریت تھی مگر آگے چٹانیں تھیں اور اس کے بعد سمندر۔ ابھی تک میں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ اس جزیرے سے ہم کیسے فرار ہوں گے جب کہ ہمارے پاس کوئی کشتی تک نہیں...... مجھے سمت کا کوئی اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔

اچانک محسن گر گیا "میں... میں تمھارا ساتھ نہیں دے سکتا۔ تم جاؤ۔ اپنی جان بچاؤ۔"

میں نے اسے اٹھا لیا "ہمت سے کام لے محسن۔ ہم مریں گے تو اکٹھے مریں گے۔"

نازو نے غالب کو سہارا دے رکھا تھا اور وہ ابھی تک بڑی ثابت قدمی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ میں نے محسن کو ایک طرف سے اپنے کندھے پر لٹکا لیا۔ پھر دوسرے ہاتھ سے غالب کو پکڑ لیا۔ نازو نے بھی غالب کو کھینچنا شروع کیا اور ہم پلٹ کر دیکھے بغیر آگے چلتے گئے۔ چٹانوں کے پاس پہنچ کے میں نے اپنے پیچھے دیکھا۔ کھنڈر کی مختلف کھڑکیوں سے تین ٹارچ لائٹس تاریکی میں لکیریں بناتی ہماری طرف بڑھ رہی تھیں۔ سمندر ابھی بہت دور تھا۔

"نازو! تم سب یہاں چھپ جاؤ۔" میں نے ایک چٹان کی طرف اشارہ کیا۔

"تم کیا کرنا چاہتے ہو؟" نازو نے کہا۔

"پہلے وہ کرو جو میں نے کہا ہے۔" میں نے دہاڑ کر کہا اور محسن کے ساتھ غالب کو بھی گھسیٹ کر لے گیا۔ انھیں چٹان کے پیچھے لٹا کے میں نے ایک گہری سانس لی۔ تھکن سے میرا بھی حال خراب ہو رہا تھا۔ ٹارچ کی روشنی چٹان کے آس پاس منڈلانے لگی تھی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ہم

صحیح وقت پر روپوش ہو گئے۔ ورنہ روشنی کے ساتھ ہی گولیوں کی بوچھاڑ آتی اور ہماری جدوجہد یہیں تمام ہو جاتی۔

"دیکھو نازو! ہم اس طرح کبھی جزیرے سے نہیں نکل سکتے۔" میں نے کہا "محسن اور غالب کی حالت بہت خراب ہے لیکن یہ ٹھیک ہوتے تب بھی سمندر کو عبور کر کے بمبئی پہنچنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ ہمارے پاس صرف دو لائف جیکٹ ہیں مگر وہ بھی یہاں نہیں ہیں۔ وہاں ہیں جہاں ہم نے بریف کیس چھپایا تھا۔"

"کیا تم اس بریف کیس کو لانے کے لیے جانا چاہتے ہو؟" نازو نے کہا "لعنت بھیجو۔"

"بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم سمندر کو تیر کر پار کر جائیں؟" میں نے کہا "اس حالت میں تو محسن اور غالب کا سمندر تک پہنچنا بھی ناممکن ہے۔ یہ جگہ بہت محفوظ ہے۔ میرا خیال ہے، وہ یہاں نہیں آئیں گے۔ میں انھیں نہیں آنے دوں گا۔"

"تم انھیں کیسے روکو گے؟"

"میں یہاں سے دور جا کے ایک فائر کروں گا اور انھیں ادھر بلا لوں گا۔" میں نے کہا "ان کے کافی ساتھی میں نے مار دیے ہیں۔ میرا خیال ہے چھ سات تو کم ہو چکے ہیں۔ ایک ہیلی کاپٹر میں آخر کتنے لوگ آئے ہوں گے۔ زیادہ سے زیادہ دس بارہ۔ ان میں تین چار تو وہی ہوں گے۔ تریونی، دلاور اور پیڈرو وغیرہ۔ سات آٹھ مسلح افراد کی فوج یقیناً بہت کافی ہوتی۔ مگر آدھے سے زیادہ تو اپنی بے وقوفی کے باعث پہلے ہی حملے میں مارے گئے۔ باقی بچے ہوں گے دو تین۔"

"اس جزیرے پر بھی چار گارڈ تھے۔"

"انھیں بھی شامل کر لو تو اب زیادہ سے زیادہ چھ سات افراد سے ہمارا مقابلہ ہے۔" میں نے کہا "اپنی مشین گن اور ریوالور دونوں مجھے دے دو۔ میں انھیں تلاش کرتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ وہ خود ہی میرے سامنے آتے جائیں گے۔ وہ ہمیں ڈھونڈ رہے ہیں ٹارچ لے کر۔ اس طرح وہ آسانی سے میرا نشانہ بن سکتے ہیں۔ میں چھپ کر ایک ایک کو ٹھکانے لگا دوں گا لیکن میرا اصل مقصد کچھ اور ہے۔ میں ہیلی کاپٹر تک پہنچنا چاہتا ہوں۔ ابھی مجھے معلوم نہیں کہ ہیلی کاپٹر کہاں ہے مگر جزیرہ زیادہ بڑا نہیں ہے۔ ہیلی کاپٹر مجھے نظر آجائے گا۔ تریونی اور دلاور ہیلی کاپٹر میں ہی ہوں گے۔ وہ نیچے اترنے کا رسک مول نہیں لیں گے۔ پائلٹ بھی وہیں ہوگا۔ اگر میں کسی طرح ہیلی کاپٹر کے قریب پہنچ گیا تو پھر سب کی ایسی تیسی کر دوں گا۔"

"تم ہیلی کاپٹر پر قبضہ نہیں کر سکتے، تم اس کے قریب بھی گئے

تو وہ گولی ماردیں گے تمھیں۔"

"مجھے معلوم ہے، میں دور ہی رہوں گا لیکن ایک بار ہیلی کاپٹر میری زد میں آگیا تو پھر وہ لوگ اس میں سے نکلنے پر مجبور ہوں گے، ورنہ میں دھمکی دوں گا ہیلی کاپٹر کو اڑانے کی، اس کے فیول ٹینک پر ایک گولی بھی لگ گئی تو دھماکے سے اس میں آگ لگ جائے گی۔"

"مجھے رشک آتا ہے تمھارے دماغ پر... ایسے حالات میں بھی تم نے کیا زبردست پلان بنایا ہے۔"

میں نے کہا "تھینک یو، مجھے تعریف کی نہیں تعاون کی ضرورت ہے۔"

"تعاون کے لیے ہی تو ساتھ آئی تھی میں اور تمھارے ساتھ ہی جاؤں گی۔" نازو نے کہا۔

"انھیں چھوڑ کر؟"

"وہ یہاں لیٹے رہیں گے، انھیں کچھ نہیں ہوگا۔" نازو نے کہا۔ "مگر جو کچھ تم کرنا چاہتے ہو، اس میں تمھارا ساتھ دینا زیادہ ضروری ہے۔"

"یہ تو ہے۔" میں نے کہا "ایک اکیلا دو گیارہ... تم ساتھ نہ ہوتیں تو میں کچھ بھی نہ کر پاتا، کم آن۔"

"ایک منٹ، میں ذرا محسن اور غالب کو سمجھا دوں کہ پریشان نہ ہوں۔" نازو نے کہا۔

صبح کے پونے چار بج رہے تھے۔ صبح کا اجالا پھیلنے میں زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ دو گھنٹے باقی تھے اور میں اس سے پہلے ہی اپنا کام ختم کر لینا چاہتا تھا۔ اندھیرے میں مجھے جو تحفظ حاصل تھا وہ دن کی روشنی میں باقی نہیں رہتا تھا۔ محسن اور غالب کی رہائی اس مشن کا ایک اہم حصہ تھی لیکن یہ کامیابی اس وقت تک ادھوری تھی جب تک ہم ان کے ساتھ اس جزیرے سے بخیر و عافیت رخصت نہ ہو جاتے۔ ابھی وہ صرف ایک کمرے کی قید سے باہر آئے تھے مگر ہمارے ساتھ اس جزیرے کی حدود میں قید تھے۔

ہیلی کاپٹر کے آنے سے پہلے میرے ذہن میں اس جزیرے سے نکلنے اور درمیان میں حائل پینتیس کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے بمبئی کے ساحل پر اترنے کا خیال بھی صرف ایک آرزو تھا۔ اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کی میرے ذہن میں کوئی واضح صورت نہیں تھی۔ سوچا میں نے بہت کچھ تھا مثلاً یہ کہ دو لائف جیکٹس پہنا کے غالب اور محسن کو سمندر میں ڈال دیا جائے اور وہ تیرتے بہتے کسی کشتی، لانچ یا بحری جہاز تک پہنچ جائیں، میں اور نازو کسی تختے کے سہارے سفر شروع کریں اور موجوں کے تھپیڑے کھاتے بالآخر ساحل پر جا لگیں یا ہمیں بھی کوئی دیکھ لے تو اٹھا لے۔ لائف جیکٹ کا رنگ روشن زرد ہوتا ہے چنانچہ دن اور رات کے وقت بھی زیادہ آسانی سے نظر آجاتا ہے۔ تختے کے سہارے پر سمندر میں لوگوں کے سیکڑوں میل تک جا پہنچنے کی حیرت انگیز داستانیں بر حقیقت ہیں۔

لائف جیکٹ یا تختے سے اتنا فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ آدمی ڈوبتا نہیں مگر اس کے ساتھ ہی سفر کی سختی برداشت کرنے کی قوت ایک شرط ہے۔ محسن اور غالب ویسے ہی جاں بلب تھے۔ ان کو لائف جیکٹ پہنا کے سمندر کے سپرد کر دینے کے بعد بھی ان کی بھلائی کے لیے صرف خدا کی مدد پر بھروسا کیا جا سکتا تھا۔ وہ خود تیرنے اور لہروں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں تھے۔ سمندر چٹانوں سے بھرا پڑا تھا اور اگر انھی چٹانوں میں مگرمچھ یا خطرناک سمندری مخلوق سے واسطہ پڑ جاتا تو ان کی آزادی ہی ان کی موت کا پیغام ثابت ہوتی۔

اب میں ہیلی کاپٹر پر قبضہ کرنے کی سوچ رہا تھا، یہ بھی ایک دیوانے کے خواب کی طرح ناممکنات اور مشکلات کا سلسلہ تصورات تھا۔ ہیلی کاپٹر پر قبضہ کرنا، اس میں محسن اور غالب کو ساتھ لینا، پھر اسے اڑانا اور بمبئی کے کسی ویران ساحل پر بحفاظت اتارنا کسی کی نظر میں آئے بغیر، یہ سب مرحلے کیسے سر ہوں گے، ان کا درست میں کوئی جواب نہیں دے سکتا تھا، میں نے اس کام میں ہاتھ ڈال دیا تھا تو اب اپنے ارادے کو ترک نہیں کر سکتا تھا خواہ انجام کچھ بھی ہو۔

میں اور نازو ایک مشترک لائحہ عمل طے کرنے کے بعد مخالف سمتوں میں روانہ ہوئے۔ ساحل سے کچھ دور رہتے ہوئے ایک دائرے میں اس کو سفر کرنا تھا، دوسرے نصف دائرے میں چل کے مجھے پھر اس سے جا ملنا تھا، اس طرح ہم چاروں طرف سے گھوم کے یہ دیکھ سکتے تھے کہ ہیلی کاپٹر کس جگہ سے قریب ہے اور اس کو کس سمت سے سر کرنا بہتر ہوگا۔

جزیرے کی لمبائی اور چوڑائی پون میل کے لگ بھگ تھی چنانچہ ساحل سے تین فرلانگ دور رہ کے ہیلی کاپٹر کو آسانی سے تلاش کیا جا سکتا تھا۔ میں دائیں طرف بھی تین فرلانگ تک دیکھ سکتا تھا اور بائیں طرف بھی۔ ایسے ہی نازو شمال اور مشرق کی طرف سے جائزہ لے سکتی تھی۔ جنوب اور مغرب کا حصہ مجھے دیکھنا تھا۔ ہیلی کاپٹر کوئی پرندہ نہیں تھا کہ کسی درخت کے پتوں میں چھپ کر بیٹھ جاتا یا گھنے جنگل کے کسی گوشے میں دکھائی نہ دے۔ یہ ایک بہت بڑی آہنی مشین تھی جس کو عموداً اترنے کے لیے کم سے کم سو گز قطر کا ہموار اور صاف میدان درکار تھا جہاں اس کے اوپر گھومنے والے بلیڈ کسی درخت سے نہ ٹکرائیں اور اس کی لمبی دُم کو خطرہ لاحق نہ ہو۔

تیز تیز قدموں سے اپنے اندازے کے مطابق جزیرے کا احاطہ کرتے ہوئے میں بہت محتاط بھی تھا۔ میرا ایک ہاتھ مشین گن کے ٹرائیگر پر تھا اور میری پوری کوشش تھی کہ میرے قدموں کی چاپ بھی سنائی نہ دے لیکن ایسا کرنا عملاً ناممکن تھا۔ کنکر، پتھر

سوکھی ہوئی مردہ ٹہنیاں اور خشک پتے میرے جوتوں سے دب کے تھوڑی بہت آواز ضرور پیدا کرتے تھے۔ یہ آوازیں مجھے اپنے اعصاب پر سوار خوف کے باعث زیادہ محسوس ہوتی تھیں۔ کچھ فاصلے پر شاید انھیں کوئی نہیں سن سکتا تھا کیونکہ پس منظر میں جاری رہنے والا سمندر کا شور سب آوازوں کو جذب کر لیتا تھا۔ میری آنکھیں اندھیرے کو چیر کر بہت آگے تک دیکھنے کی کوشش کر رہی تھیں اور میرے کان خفیف سی سرگوشی یا آہٹ بھی سننے کے لیے تیار تھے۔

پندرہ منٹ بعد جب اپنے اندازے کے مطابق میں اپنے حصے کا نصف فاصلہ طے کر چکا تھا، میں نے درختوں، جھاڑیوں اور اندھیرے کے درمیان ایک کھلی جگہ پر ہیلی کاپٹر کا ایک حصہ دیکھا، وہ دیوہیکل مشینی پرندہ اپنے فولادی بازو ہر طرف پھیلائے بڑی رعونت کے ساتھ ایک ہموار قطعۂ زمین پر استادہ تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ جگہ خاص طور پر اسی مقصد کے لیے درخت چھانٹ کر اور کاٹ کر بنائی گئی ہوگی۔ یہ ہیلی پیڈ اس وقت بھی جزیرے کی ضرورت ہو گا جب یہاں رنگ محل میں عیش و نشاط کے جشن ہوتے تھے اور اب ان کے کام آ رہا تھا جو رات کے پردے میں اپنے مجرمانہ کاروبار کو دنیا سے اوجھل رکھنا چاہتے تھے۔

ہمیں تلاش کرنے والے سمندر کی طرف نکل گئے تھے۔ میں ان کی ٹارچوں کو اندھیرے میں جلتا بجھتا دیکھ رہا تھا۔ انھوں نے ایک منطقی نتیجہ اخذ کیا تھا کہ ہم سمندر کی جانب فرار ہوئے ہیں تو یقیناً وہاں کوئی کشتی یا لانچ موجود ہے جس میں ہم جزیرے سے دور جانے کی کوشش کریں گے۔ اگر ایسا ہوتا تو ان کا کام بہت آسان ہو جاتا۔ وہ ہیلی کاپٹر میں اڑ کر کشتی یا لانچ کے اوپر پہنچتے اور اوپر ہی سے فائر کر کے اسے غرق کر دیتے۔ یہ خیال انھیں کیسے آ سکتا تھا کہ ہم جزیرے کے اندر کی طرف بھی جا سکتے ہیں۔

جب ترلوبنی کو وائرلیس پر خودکار ایمرجنسی الارم سنائی دیا ہوگا تو اس نے کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ فورس اکٹھی کی ہوگی۔ چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کو مطلع کیا ہوگا کہ غالباً تمھارے دشمن جزیرے پر پہنچ گئے ہیں اور معاملہ گڑبڑ دکھائی دیتا ہے۔ وہ جتنی قوت کے ساتھ آئے تھے، وہ ہمیں محصور کرنے کے لیے یقیناً کافی ہوتی مگر انھوں نے عجلت میں منصوبہ بندی نہیں کی، طاقت کے زعم میں وہ ایک لشکر جرار کی طرح حملہ آور ہو گئے اور یہ بھول گئے کہ ہم مورچے میں بیٹھے ملے تو انھیں بہت زیادہ نقصان اٹھانا پڑے گا۔

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ ترلوبنی کو یقیناً پہلی یلغار میں ہی نصف سے زیادہ سپاہ کے مارے جانے کا صدمہ ہوگا۔ اب اس کی طاقت آدھی بھی نہیں رہی تھی۔ مزید یہ کہ ہم پسپا ہو کے فرار ہو گئے تھے۔ اگر اسے اندازہ ہوتا کہ یہ فورس بھی ناکافی ہوگی تو وہ اپنے ساتھ شکاری کتے بھی لاتا جو اس جزیرے پر ہماری بو سے ہمیں تلاش کر لیتے لیکن اب شاید وہ ہیلی کاپٹر میں بیٹھا افسوس سے ہاتھ مل رہا ہوگا اور غصے سے دانت پیس رہا ہوگا۔ باقی ماندہ لوگوں کو ان کی نالائقی، نااہلی اور بے وقوفی پر گالیاں دے رہا ہوگا جو ابھی تک کچھ نہیں کر پائے تھے۔

میں نصف دائرہ مکمل کر چکا تھا اور اب نازو کے انتظار میں تھا۔ ہم کسی لکیر پر نہیں چل رہے تھے چنانچہ ایک دوسرے کو دائیں بائیں سے کراس کر گئے تھے۔ دس منٹ بعد میں نے ہیلی کاپٹر کو چھوڑ کر نازو کو تلاش کرنا شروع کیا، وہ خود بھی آگے جا کے لوٹ آئی تھی۔ میں نے اسے ایک سائے کی طرح حرکت کرتے دیکھا اور ایک درخت کی اوٹ سے آواز دی۔ اگر میں اچانک سامنے چلا جاتا تو شاید وہ دشمن سمجھ کر مجھ پر بھی مشین گن کھول دیتی۔

"تم نے دیکھا، ہیلی کاپٹر میں ترلوبنی ہے؟" وہ بولی۔

"یہ تو میں نے نہیں دیکھا۔" میں نے حیران ہو کے کہا۔

"وہ نیچے ٹہل رہا تھا پھر کسی نے اسے اوپر بلا لیا۔ میرا خیال ہے کہ اپنے چوہدری دلاور صاحب نے..." نازو نے سرگوشی کی۔

"کیا اسے بھی دیکھا تم نے؟"

"نہیں، آواز اسی کی لگتی تھی۔" نازو نے کہا۔

"تم اتنے نزدیک چلی گئی تھیں کہ آواز سن کے پہچان لی، وہ سن لیتے تمھاری آواز پھر...؟" میں نے خفگی سے کہا۔

"کیسے سن لیتے، جب میں نے آواز نکالی ہی نہیں۔"

"تم کو چھینک آ جاتی..."

"میں روک سکتی ہوں چھینک بھی۔" نازو نے کہا "اب یہی بحث کرتے رہو گے اور کچھ نہیں کرو گے؟"

میں نے کہا "تمھارے خیال میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟ فرض کرو کمان تمھارے ہاتھ میں ہے، یو آر دی باس... لیڈی۔"

"اچھا، بعد میں کچھ ہو جائے تو یہ مت کہنا کہ ناقص العقل عورت ذات نے مروا دیا۔"

میں نے کہا "نہیں کہوں گا، بتاؤ کیا پلان ہے تمھارے ذہن میں؟ اپنا پلان میں بعد میں بتاؤں گا۔"

نازو نے کہا "میں زمین پر لیٹ کر سانپ کی طرح آہستہ آہستہ رینگتی ہوئی ادھر سے ہیلی کاپٹر تک جانے کی کوشش کرتی ہوں۔ اندھیرے میں یہ کالا لباس انھیں نظر نہیں آئے گا اور میں ایک ایک انچ آگے بڑھوں گی تاکہ انھیں حرکت کا احساس بھی نہ ہو۔ تم جاؤ دوسری طرف۔ وہاں کچھ بھی کرو، حلق سے آواز نکالو کوئی یا کسی درخت کی شاخیں توڑو، بس ان کی توجہ دوسری طرف ہو جائے۔ اس کے بعد تم وہاں سے کھسک جاؤ، واپس اسی جگہ آ کے میرے پیچھے پیچھے آگے بڑھو۔ میرے اور تمھارے درمیان پچاس گز کا فاصلہ رہے تو اچھا ہے۔

تم مجھے کور کر سکتے ہو۔"

میں نے کہا "باس! میں کچھ عرض کروں؟"

"کیا یہ پلان ٹھیک نہیں ہے؟" وہ بولی۔

"پلان ایک دم ٹائٹ ہے" میں نے کہا "بس ایک معمولی سی ترمیم کی ضرورت ہے۔ میں ان کی توجہ دوسری طرف کرانے کے بعد واپس آنا مناسب نہیں سمجھتا۔ ہم ایک ہی جگہ سے ایک ہی لائن میں پیش رفت کریں گے تو ایک ہی وقت میں نظر بھی آجائیں گے۔ تم کو صحیح کور دینے کے لیے میرا کسی اور طرف ہونا زیادہ فائدہ مند رہے گا۔ ایک طرف سے تم جاؤ، میں دوسری طرف جا کے انھیں متوجہ کرنے کے لیے کچھ کرتا ہوں اور پھر خود تیسری طرف سے آتا ہوں۔"

نازو نے کہا "میں واقعی باس نہیں بن سکتی۔"

"بُرا مان گئیں۔ بابا اتنا اچھا پلان ہے تمھارا۔"

"میں نے بالکل بُرا نہیں مانا، تمھارا آئیڈیا یقیناً بہت بہتر ہے۔ اب میں جاتی ہوں۔"

"ایک منٹ۔ قریب جا کے کیا کرو گی؟"

"وہی جو تم کرو گے، میں ایندھن کے ٹینک کو زد میں رکھتے ہوئے انھیں للکاروں گی کہ سب نیچے آجائیں کیونکہ دس تک گننے کے بعد میں ہیلی کاپٹر کو اُڑا دوں گی۔" نازو نے کہا۔

"بالکل ٹھیک۔" میں نے اُس کے شانے پر تھپکی دی "گھبرانا بالکل نہیں، خدا تمھارا حامی و ناصر ہو۔"

اُس نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا "جاؤ، اللہ حافظ۔"

میں نے اُسے زمین پر پیٹ کے بل کیچوے کی طرح آگے بڑھتا دیکھا اور پلٹ کر اُسی طرف چل پڑا جدھر سے میں آیا تھا۔ تقریباً سو گز دُور جا کے میں نے ایک درخت کی پتلی سی شاخ کو زور زور سے ہلایا۔ اس سے درخت کے پتّے صدا دینے لگے پھر شاخ خاصی آواز کے ساتھ ٹوٹی۔ میں نے حلق سے ایسی آواز نکالی جیسے کوئی درخت کے اوپر سے گرا ہو یا شاخ اس کے سر پر آگری ہو۔

ہیلی کاپٹر میں سے سر نکال کر کسی نے کہا "کون ہے اُدھر؟"

پھر ایک فائر ہُوا، یہ آواز تریوینی کی تھی۔ گولی چلنے سے پہلے ہی میں اُس جگہ سے روانہ ہو چکا تھا۔ مزید سو گز دُور جا کے میں نے ہیلی کاپٹر کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ جہاں تک ممکن ہُوا میں نے خود رو پودوں اور جھاڑیوں کے پیچھے رہ کر درمیانی فاصلے کو کم کیا۔ ہیلی کاپٹر کی دُم مجھ سے پچاس گز دُور رہ گئی تھی جب مجھے ہموار زمین نظر آئی۔

اب میں نے الٹا لیٹ کر خود کو کھسکانا شروع کیا۔ مجھے بہت جلد اندازہ ہو گیا کہ یہ کام کتنا مشکل ہے۔ اس میں ایک طرف تو میری کہنیاں چھل رہی تھیں اور سخت پتھریلی زمین کی رگڑ سے میرا جسم کانٹوں پر محسوس ہو رہا تھا۔ دوسری طرف اس حرکت کو ... رکھنے کے لیے احتیاط کے تقاضوں پر عمل کرنے میں بڑی ... پیش آ رہی تھیں۔ مجھے مشین گن کو زمین سے چند انچ اوپر ... رہا تھا۔ زمین پر رینگنے والے کیڑے مکوڑے مجھے مسلسل کاٹ ... تھے۔ مچھر کی نسل کے اُڑنے والے کیڑے میری ناک کو ... دیکھنے پر آمادہ تھے اور میں جانتا تھا کہ میں چھینک کو نہیں ... مخالف سمت میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے ...

میں نازو کو ایک تاریک دھبے کی طرح دریافت کرنے میں کامیاب ... رہا۔ وہ مجھ سے پہلے روانہ ہوئی تھی مگر اُس نے نسبتاً کم فاصلہ ... کیا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ زیادہ محتاط ہے۔ پچاس گز ... وہ فاصلہ میرے لیے میلوں کی صبر آزما مسافت بن گیا۔ مجھے ... لمحہ یہ خیال تھا کہ ابھی ہیلی کاپٹر میں سے کوئی سر نکال کے چیلنج ... گا اور اس کے ساتھ ہی گولی میرے سر میں گھس جائے گی۔ زندگی ... جدّوجہد بھی کتنی بے یقینی کا سفر ہے۔ ایک انچ اِدھر یا اُدھر ... زندگی ہے یا موت ہے اور وہ خط جو اس یقین اور بے یقینی ... سرحد کے درمیان نظر نہ آنے کے باوجود حائل رہتا ہے، امید ... زندہ بھی رکھتا ہے چنانچہ جدّوجہد جاری رہتی ہے۔

اس اعصاب شکن سکوت کو اچانک نازو کی آواز نے ... دیا۔ اُس کی آواز مشین گن کے پہلے برسٹ کی طرح آئی جو کسی محاذ پر دو متحارب فوجوں کے سکوت کو ختم کر دے۔

"تریوینی! باہر آجاؤ۔" اُس نے چلّا کے کہا "خبردار گولی ... چلانا مجھ پر، میرے ہاتھ میں مشین گن ہے، مرنے مرتے بھی ... ہیلی کاپٹر کو اُڑا دوں گی، اس کے ساتھ ہی جل کے خاک ہو جاؤ ... تم بھی... "

پھر میں نے چلّا کے کہا "چوہدری دلاور! نیچے آجاؤ تم ... اگر کچھ اور زندہ رہنا چاہتے ہو، تم ہر طرف سے محصور ہو۔"

ہیلی کاپٹر میں سے کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میرا ... تھا کہ ہمارے اعلان نے ان کے حواس مختل کر دیے ہوں گے ... فتح کے یقین سے سرشار اپنی طاقت کے غرور میں مبتلا یہ سمجھے ... تھے کہ ہماری حیثیت تو اُس چوہے سے بھی بدتر ہے جو چوہے ... میں قید ہو۔ ہم سمندر سے گھرے ہوئے جزیرے کی حدود سے ... نکل کے کہاں جا سکتے ہیں۔ بالآخر ان کی مسلح فوج ہمیں گھیر لے ... گی اور زندہ یا مُردہ ان کی خدمت میں پیش کر دے گی۔ ایسے ... ہمارے الٹی میٹم کا ان پر کیا اثر ہُوا ہو گا۔ اس کا تصور کر کے میں ... بڑی مسرت اور طمانیت محسوس کی۔

"میں پھر تم کو وارننگ دیتا ہوں تریوینی۔" میں نے ... پھیپھڑوں کی ساری طاقت صرف کر کے آواز نکالی "اگر تم ... جوابی کارروائی کی تو اسی ہیلی کاپٹر کے ساتھ تباہ ہو جاؤ گے ... تک نہیں ملے گی تمھاری۔"

ہیلی کاپٹر کے کیبن کا دروازہ کھلا اور مجھے ایک سایہ سا نظر آنے لگا۔ اس کے کھڑے ہونے کا انداز اسے تریوینی ثابت کرتا تھا۔ وہ نیچے اُترا اور کھلے میدان میں میری طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔

"اگر تم یہاں سے جانا چاہتے ہو تو میں تم کو یہ ہیلی کاپٹر دے سکتا ہوں۔" تریوینی نے کہا۔

"ہیلی کاپٹر حاصل کرنے کے لیے مجھے تمھاری اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"میری اجازت کے بغیر تم کیسے جا سکتے ہو اور اگر چلے بھی گئے تو آگے کیا ہو گا۔" تریوینی نے کہا "کہاں اُترو گے تم اور کیسے اُترو گے؟"

میں نے کہا "وقت ضائع مت کرو، دلاور سے کہو کہ نیچے آجائے۔"

"میرے ساتھ دلاور نہیں آیا تھا۔" تریوینی نے کہا۔

"تریوینی! جھوٹ پر تم نے اپنی بیٹی کو قربان کر دیا، کیا ملا تمھیں اس کی جان لے کر؟" میں نے کہا۔

"اُس کے قاتل تم ہو..." وہ ایک گالی دے کر بولا۔

"شاید تمھیں یہی بتایا گیا ہو گا مگر تریوینی! اس کو تمھارے اپنے ہی آدمیوں نے مارا تھا کیونکہ وہ سچ بتلانے آئی تھی۔"

"جھوٹ کہتے ہو تم۔" وہ چلّایا۔

"میں تم سے ڈرتا نہیں ہوں کہ جھوٹ بولوں لیکن انھوں نے ڈر کی وجہ سے ہی جھوٹ بولا ہو گا جنھوں نے اس پر گولیاں برسائی تھیں۔" میں نے کہا "میں تم پر اعتبار نہیں کر سکتا تریوینی، تم پھر جھوٹ بول رہے ہو، تم چوہدری دلاور کو اپنے ساتھ لائے ہو۔ کل بھی تم اُس کے ساتھ یہاں موجود تھے۔ دلاور، اُس کا پالا ہُوا کتا پیڈرو اور وہ پاجی، جو خود کو حاجی کہتا ہے... حاجی عبداللہ، تم سب ہمارا انتظار کرتے رہے، دلاور سے کہو کہ ہیلی کاپٹر سے اُتر جائے۔"

دوسری طرف سے نازو نے چلّا کے کہا "چوہدری دلاور! میں دس تک گنوں گی، اپنے ساتھ اور جسے بھی لایا ہے تو، ان سب کے ساتھ نیچے آجا۔"

تریوینی نے پلٹ کے دیکھا پھر اس کی نگاہ سمندر کی طرف گئی۔ اس کے ساتھی فائر کی آواز پر متوجہ ہو گئے تھے اور واپس آ رہے تھے "دیکھو سکندر! محصور تم ہو۔"

نازو نے چلّا کے کہا "وَن... ٹو...!"

تریوینی نے گھبرا کے کہا "کیا یہ لڑکی پاگل ہے؟"

نازو نے وقفے وقفے سے گنتی جاری رکھی "تھری... فور...!"

میں نے کہا "ہم سب انتہائی خطرناک قسم کے پاگل ہیں تریوینی...!"

گالیاں بکتا ہُوا تریوینی ہیلی کاپٹر کی طرف دوڑا "دلاور! نیچے آجاؤ۔"

نازو نے کہا "فائیو... سکس..."

میں نے کہا "ہیلی کاپٹر میں کوئی نہیں رہے گا، پائلٹ بھی نہیں۔"

پانچ پانچ سیکنڈ کے وقفے سے نازو پکارتی رہی "سیون... ایٹ...!"

چوہدری دلاور کے ساتھ ہی پائلٹ نیچے آگیا۔

میں نے کہا "اب میں اوپر جا کے دیکھوں گا۔ اس پاگل لڑکی کی طرف سے ہوشیار رہنا۔ اس کے پاس مشین گن ہے اور اس کا نشانہ بھی بہت اچھا ہے۔ چلو ایک لائن میں آجاؤ سب اور ہاتھ سر کے اوپر رکھ لو۔" میں مشین گن کا رُخ اُن کی طرف کیے ہیلی کاپٹر تک گیا اور اوپر چڑھ گیا۔ اس کے پچھلے حصّے میں بھی اب کوئی نہیں تھا۔ میں نے دوسری طرف سے نازو کو آواز دی۔ نازو قریب آگئی۔

"ان دونوں کو باری باری میرے پاس بھیج دو۔ تریوینی کو اور دلاور کو..." میں نے کہا۔

اپنی ساری زندگی میں تریوینی اور دلاور نے خود کو اتنا بے بس محسوس نہیں کیا ہو گا اور اپنی ذلّت کو اتنی خاموشی سے برداشت بھی نہیں کیا ہو گا، وہ سر پر ہاتھ رکھے آگے بڑھے۔

نازو نے کہا "پہلے تریوینی جائے گا۔"

دلاور رُک گیا۔ تریوینی زخم خوردہ سانپ کی طرح پھنکارتا ہُوا اوپر آگیا۔ میں نے اُسے پلٹ کر کھڑے ہونے کا حکم دیا اور اس کی دو جیبوں میں سے دو ریوالور برآمد کر لیے پھر میں نے اسے آگے دھکیل دیا۔ اس کے آدمی مجھے تین طرف سے اپنی جانب بڑھتے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ ٹارچ کی روشنی میں چاروں طرف دیکھ رہے تھے جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ابھی تک وہ مایوس نہیں ہوئے ہیں۔

چوہدری دلاور اوپر آنے والا دوسرا شخص تھا۔ اُسے ایک بار پھر رُو بُرو پا کے مجھے بہت سی پُرانی باتیں یاد آئیں تو میرے حلق میں تلخی کا ذائقہ اُتر آیا۔ اس وقت میرے لیے اس کو چھلنی کر کے اس کی لاش کو اس جزیرے کے گِدھوں کے لیے چھوڑ جانا بہت آسان تھا لیکن ہم ایسے دُشمن تھے جو موقع ملنے پر بھی ایک دوسرے کے وجود کو ختم نہیں کر پائے تھے۔ کبھی اس کی مجبوریاں اسے روک لیتی تھیں تو کبھی ہم مجبور ہو جاتے تھے۔ اس وقت بھی میں چوہدری دلاور کو قتل نہ کر سکا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھے اس سے بہت کچھ معلوم کرنا تھا۔ دلاور ہی بتا سکتا تھا کہ اس کے باقی ساتھی کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ انھی سے یہ بھی معلوم ہو سکتا تھا کہ وہ دن

پہلے جو اسلحہ جہاز سے اُتارا گیا تھا وہ کہاں ارسال کیا گیا تھا۔

تریوینی کے برعکس دلاور بالکل نروس نہیں تھا۔ اُس نے بڑی طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا: ”چلو ایک اور بازی آپ نے جیت لی اپنے سکندر صاحب۔“

میں نے کہا: ”ہم آخری بازی بھی جیت لیں گے دلاور۔“

وہ ہنسا: ”چلو اچھا ہے، کیا کہتے ہیں وہ اپنے مرزا غالب کہ دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے۔“ وہ بولا: ”کیا تم اپنے دوستوں سے ملے ہو؟“

میں نے کہا: ”وہ ہمارے ساتھ ہی جائیں گے، باری اب تمھاری ہے چوہدری دلاور... انھوں نے تو اپنی سزا کاٹ لی اور وہ بچ بھی گئے کیونکہ اُنھیں بچانے والے دوست تھے، تمھیں کون بچانے آئے گا؟“

دلاور کی تلاشی لینے کے بعد میں نے اسے بھی تریوینی کی طرف دھکا دے دیا۔ آخری آدمی پائلٹ تھا۔ اُس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ اپنا اسلحہ اُس نے رضاکارانہ طور پر ہمارے حوالے کر دیا۔ نازو بھی اُس کے پیچھے پیچھے اوپر آ گئی تھی۔ میں نے ہیلی کاپٹر اُس کے چارج میں دے دیا۔

”یہ پائلٹ یہیں رہے گا۔“ میں نے کہا: ”ضرورت پڑے تو اسے تھوڑا سا سبق سکھا دینا، مگر مارنا نہیں۔“

”تم کہاں جا رہے ہو؟“ نازو نے کہا۔

میں نے کہا: ”میں، تریوینی اور دلاور کو ساتھ لے جا رہا ہوں۔ مجھے دو مزدوروں کی ضرورت ہے۔ میری عدم موجودگی میں کوئی قریب آنے کی کوشش بھی کرے تو اُسے گولی مار دینا۔“

ایک بار پھر دلاور اور تریوینی نیچے اُترے۔ اب وہ خالی ہاتھ تھے۔ ان کے ساتھ میں بھی خالی ہاتھ جا سکتا تھا اگر مجھے ان کے ساتھ آنے والوں کی طرف سے اندیشہ لاحق نہ ہوتا۔

”تریوینی! تم اس جزیرے کے جغرافیے سے تو واقف ہو، مجھے ایک ایسی جگہ کی تلاش ہے جہاں پام کے دو درخت انگریزی حرف 'وی' کی طرح کھڑے ہوئے ہیں۔“

تریوینی نے سر ہلایا: ”وہ جگہ اس طرف ہے۔“

میں نے کہا: ”تو پھر چلو... تم بھی آگے رہو دلاور، اگر اپنے تریوینی صاحب کوئی غلط حرکت کریں تو ان کو روک لینا۔ یہ مجھ سے اتنی اچھی طرح واقف نہیں ہیں جتنے تم ہو۔“

دلاور نے افسوس کے انداز میں سر ہلایا: ”تم بھی کب سے جانتے ہو مجھے لیکن پھر بھی پہچانتے نہیں۔ یہ جو کچھ تم کر رہے ہو وقتی طور پر تمھارے لیے بڑی خوشی کی بات ہے، بہت فخر ہو گا تمھیں اپنے اس بہادری کے کارنامے پر لیکن تم ابھی حقائق سے بے خبر ہو۔ تمھاری جیت ہی تمھاری ہار کا سبب بنے گی، تم بہت جلد جان لو گے۔“

تریوینی نے چلتے چلتے رُک کر دائیں اور بائیں جانب ... دو مسلح افراد ایک درخت کی اوٹ سے نکل کر سامنے آ گئے ...

میں نے کہا: ”تریوینی! ان سے کہہ دو کہ واپس چلے جائیں ... ایسا نہ ہو کہ تمھارے جاں نثار تمھاری جان تم پر قربان کر دیں ... کو یہ بھی سمجھا دو کہ تمھاری واپسی تک ہیلی کاپٹر کی حفاظت کریں ...“

تریوینی نے انھیں زبردست گالیاں دیں۔ اپنی بے بسی کا سارا غصہ اُس نے انھیں ذلیل کر کے اُتارا۔ وہ تریوینی کی توقع پر پورے نہیں اُترے تھے اور یہ انھی کی کمزوری تھی جس کا خمیازہ تریوینی بھگت رہا تھا۔ اُن کے سامنے تریوینی کو اپنی ذلت کا ... زیادہ گراں گزر رہا تھا جسے وہ باس سمجھتے تھے وہ غلاموں کی طرح تعمیلِ حکم پر مجبور تھا۔ جب وہ چلے گئے تو میں نے اچانک دائیں طرف نگاہ ڈالی اور وہ دونوں درخت دیکھ لیے جہاں میں نے ... بریف کیس چھوڑا تھا۔

میں نے کہا: ”اپنے چوہدری دلاور صاحب! اگر میں تم ... کہوں کہ ان پتھروں میں ایک خزانہ دفن ہے تو تم مانو گے؟“

دلاور نے بُرا سا منہ بنایا: ”تمھاری زندگی ایسے ہی خواب دیکھتے گزری ہے سکندرِ اعظم۔ تم بھی دُنیا کی تسخیر کی حسرت دل ... لیے جب دُنیا سے جاؤ گے تو تمھارے بھی دونوں ہاتھ خالی ہوں ...“

میں نے کہا: ”اچھا دیکھو یہ خواب ہے یا حقیقت۔ ان پتھروں کو ہٹاؤ۔“

اُس نے متذبذب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ وہ طے نہیں کر پا رہا تھا کہ میں عادت کے مطابق مذاق کر رہا ہوں یا سنجیدہ ہوں۔ میں نے اُس کے گھما کے لات رسید کی، وہ مُنہ کے بل گر پڑا۔

”ایک ایک کر کے یہ پتھر اُٹھاؤ۔“ میں نے کہا: ”احتیاط کے ساتھ ایک طرف رکھتے جاؤ۔ عدم احتیاط کی صورت میں اپنی موت کے ذمے دار تم خود کہلاؤ گے، میں نے تمھیں خبردار کر دیا ہے۔“

تریوینی نے شک آمیز نظروں سے مجھے دیکھا: ”یہ کیا کھیل ہے؟“

میں نے کہا: ”کھیل وہی پرانا ہے، زندگی اور موت کا کھیل۔ اپنے چوہدری صاحب پرانے شکاری ہیں، کبھی یہ ہمارے لیے جال بچھاتے ہیں اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ خود گرفتار ہو جاتے ہیں۔“

احساسِ ذلت سے چوہدری دلاور کا چہرہ بگڑ گیا تھا لیکن وہ مجبور تھا۔ میں نے اُس کے دل میں یہ خوف ڈال دیا تھا کہ ان پتھروں کے نیچے بم یا کوئی ایسی ہی تباہ کن چیز موجود ہے۔ میرا اصل مقصد یہ تھا کہ پتھروں کے نیچے سے بریف کیس نکالتے ہوئے دلاور مجھ پر حملہ کرنے کی نہ سوچے اور کوئی پتھر میرے سر پر ... کا خیال بھی دل میں نہ لائے۔

اس نے آہستہ آہستہ پتھروں کو ہٹایا اور بریف کیس نکال لیا۔ اس تمام عرصے میں ایک لمحے کے لیے بھی میں اُس کی طرف سے غافل نہیں ہوا۔ تریوینی خاموش کھڑا اپنے ہونٹ کاٹتا رہا اور شاید اس اُمید کو زندہ رکھنے کی کوشش کرتا رہا کہ اس کے جاں نثار اچانک اپنی کسی چال سے کھیل کا نقشہ بدل دیں۔ وہ بہت بڑا بدمعاش تھا۔ جوانی میں لڑنا بھڑنا اس کا شوق ہو گا۔ اسی شوق نے اس کے لیے بدمعاشی کے میدان میں ترقی کے امکانات روشن کیے۔ وہ دادا کہلایا اور اب پردادا قسم کی چیز تھا۔ نہ جانے کتنے دادا اس کو سلام کرتے تھے لیکن اب وہ خود اس قابل نہیں رہا تھا کہ لڑ سکے۔ اس نے نازو جیسی لڑکی کے ہاتھوں کمالِ فن دیکھا تھا، اور اچھی طرح جانتا تھا کہ میرے ہاتھ اس سے کہیں زیادہ سفاک ہیں۔

دلاور نے ماتھے سے پسینہ خشک کیا اور بریف کیس میرے سامنے رکھ دیا۔ اس کے ساتھ دونوں لائف جیکٹس بھی تھیں۔ ایک میں نے پہن لی اور دوسری کندھے پر ڈال لی پھر میں نے دلاور سے کہا کہ بریف کیس اُٹھا کے آگے چلے۔ ابھی تک میں اپنا لائحہ عمل مرتب نہیں کر پایا تھا۔ ارادہ تو میرا یہی تھا کہ میں محسن اور غالب کو ہیلی کاپٹر پر پہنچا دوں اور تحفظ کی ضمانت کے طور پر تریوینی اور دلاور کو اپنے ساتھ لے جاؤں۔ انھیں یہاں چھوڑ جانے کا سوال یوں بھی پیدا نہیں ہوتا کہ ہیلی کاپٹر کے پرواز کرنے سے پہلے ہی ان کی بچی کھچی سپاہ ہر طرف سے ہم پر فائر کھول دیتی۔ ایک ہیلی کاپٹر کی تباہی تریوینی جیسے شخص کے لیے کوئی بہت بڑا مالی نقصان نہیں تھی لیکن وہ ہمارے ساتھ ہو گا تو اس کی جان بچانے والے ہی ہمارے محافظ بن جائیں گے۔ پائلٹ اس کے حکم کے تابع ہو گا اور ہمیں دھوکا نہیں دے سکے گا۔

اصل مسائل بمبئی میں اُترنے کے بعد سامنے آئیں گے۔ یہ ممکن ہے کہ ہیلی کاپٹر سے اُترنے سے پہلے ہی پائلٹ نے مواصلاتی رابطے کے ذریعے ایس او ایس بھیج دیا ہو۔ تریوینی کے حکم پر اس نے پولیس کو اطلاع کر دی ہو کہ ایک آئی لینڈ پر چند پاکستانی دہشت گردوں نے ہیلی کاپٹر پر قبضہ کر لیا ہے اور ان سب کو یرغمال بنا لیا ہے جو اس پر سوار تھے۔ پولیس سے مقابلہ ہمارے بس کی بات نہیں تھی اور ہم ان سے بچ کر بھاگ بھی نہیں سکتے تھے۔ ہمارے سب سلامتی کی واحد اُمید یہ تھی کہ ہم جہاں بھی ہیلی کاپٹر کو اُتاریں وہاں اپنے ساتھ دلاور اور تریوینی کو بھی اُتار لیں اور ان کے ذریعے سب کو خبردار کر دیا جائے کہ ہمارا راستہ کوئی نہ روکے، ورنہ ہم مقابلہ کریں گے اور یرغمالی کو ٹھکانے لگا دیں گے۔

یہ ہو سکتا تھا کہ ہم کسی اجنبی ویران مقام پر اُتر جائیں اور جب ہیلی کاپٹر چلا جائے تو ہم دلاور اور تریوینی کے ساتھ کہیں روپوش ہو جائیں۔ یہ کام جتنا آسان نظر آتا تھا، درحقیقت اتنا ہی مشکل تھا۔ پہلا مسئلہ تو یہ تھا کہ ہم کہاں جائیں گے۔ دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ کیسے جائیں گے۔ نہ ہمارے پاس کوئی گاڑی تھی اور نہ کوئی ایسی جگہ جہاں ہم دلاور اور تریوینی کے ساتھ روپوشی اختیار کر سکیں۔ اس بات کے قوی امکانات تھے کہ ہمارا تعاقب ہیلی کاپٹر کریں۔ ہم جہاں اُتریں وہیں سے تعاقب کرنے والے سامنے آئے بغیر ہماری نگرانی شروع کر دیں اور موقع پاتے ہی ہمیں گھیر لیں۔

خطرہ صرف پولیس کی طرف سے ہی نہیں، تریوینی کی... حفاظت پر مامور جاں نثاروں سے بھی تھا جو سر دھڑ کی بازی لگا کے اپنے باس کو ہماری قید سے چھڑانے کی کوشش کریں گے۔ ان کے وسائل لامحدود تھے اور مجھے ابھی تک اس مسئلے کا کوئی حل نہیں سوجھا تھا۔ تریوینی اور دلاور پریشان ضرور تھے مگر مایوس نظر نہیں آتے تھے۔ اگر میں اُن سے پوچھتا کہ انھوں نے وائرلیس پر کسی کو اس صورتِ حال کی اطلاع دی ہے یا نہیں تو یہ خود اپنی کمزوری کا اعتراف کرنے کے مترادف ہوتا اور وہ مجھ پر مزید نفسیاتی غلبہ حاصل کرنے کے لیے مجھے بلف کرتے۔ انھیں یہ موقع فراہم کرنا خود اپنی شکست کا سامان کرنا تھا۔

زیادہ امکان مجھے اسی بات کا نظر آتا تھا کہ تریوینی نے وائرلیس پر پیغام دے دیا ہو گا۔ ہر جہاز اور ہیلی کاپٹر کا زمین سے رابطہ ضرور رہتا ہے۔ خود کو ہمارے حوالے کرنے سے پہلے تریوینی اور دلاور نے چند منٹ کی مہلت سے یہ فائدہ ضرور اُٹھایا ہو گا۔ ان کی جگہ ہم بھی ہوتے تو یہی کرتے۔ ایسی صورت میں دیگر امکانات یہ تھے کہ ہم اپنے ساتھیوں اور اسیروں کے ساتھ پرواز کرتے ہی چاروں طرف سے نرغے میں لے لیے جائیں۔ تیس پینتیس کلومیٹر کا فاصلہ کسی ہیلی کاپٹر کے لیے اور بھی کم ہو کے بیس پچیس کلومیٹر ہی رہ جاتا ہے۔ بمبئی کے ایئرپورٹ کے کسی کنٹرول ٹاور کا راڈار ہماری پرواز پر نظر رکھ سکتا ہے اور کسی بھی جگہ سے اُڑنے والے پولیس کے ہیلی کاپٹر دس منٹ میں ہمیں کہیں بھی لینڈ کرنے پر مجبور کر سکتے ہیں۔ دلاور اور تریوینی کو مار دینے کی دھمکی انھیں دُور رہنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔ ہم انھیں مار دیں یا چھوڑ دیں، ہر صورت میں بچ کر کہیں جا نہیں سکتے۔ ہیلی کاپٹر کھلی جگہ پر ہی اُتارا جا سکتا تھا اور کھلی جگہ ہمیں کوئی پناہ نہیں فراہم کرتی خصوصاً اس حالت میں کہ ہمیں دو بیمار ساتھیوں کو بھی اُٹھانا ہو۔ ہیلی کاپٹر بھی لامحدود پرواز نہیں کر سکتا۔ بالآخر اس کا فیول ختم ہو جائے گا اور ہمیں اُترنا پڑے گا۔

محسن اور غالب کی طرف جاتے ہوئے میرے ذہن نے تمام مسائل اور مشکلات کا جائزہ لیا مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ بالآخر میں نے انجام کو حالات پر چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا۔ سب سے پہلے

تو یہ ضروری تھا کہ ہم اس زنداں سے نکل جائیں جس کے چاروں طرف سمندر کا حصار ہے۔ ہیلی کاپٹر ایک عطیۂ خداوندی تھا جس کے بارے میں ہم نے سوچا تک نہ تھا۔ ہم تو سمندر عبور کرنے کی سوچ رہے تھے اور وہ بھی تختوں کے سہارے پر.. کسی دُشواری کے بغیر ہیلی کاپٹر پر قبضہ ہو جانا ایک اُمید افزا بات تھی، آگے کیا ہو گا، یہ بعد میں دیکھی جائے گی۔ سب کے مشورے سے کوئی ایسا راستہ نکل آئے گا جو میری عقل کو نہیں سوجھ رہا ہے۔ اللہ نے پہلے بھی مایوس نہیں کیا، آج بھی سب کچھ اُسی کی مدد سے ہو گا۔

میرے ذہن میں اُس جگہ کا نقشہ تھا جہاں ہم محسن اور غالب کو چھوڑ گئے تھے۔ یہ رنگ محل کے پچھلے حصّے میں واقع ایک چٹان تھی۔ دلاور اور تریوینی کا خیال پہلے یہ تھا کہ میں انھیں اسی قید خانے کی طرف لے جا رہا ہوں جہاں محسن اور غالب قید تھے پھر ان کا خیال بدل گیا۔ وہ سمجھے کہ میں اُنھیں کہیں دُور لے جا کے گولی مار دوں گا۔ میں نے اُنھیں مطلع کیا کہ میرے دل میں ایسی خواہش ہوتی تو اس کی تکمیل کے لیے وقت اور مقام کی کیا شرط، میں اُنھیں اسی وقت گولی مار سکتا تھا جب وہ ہیلی کاپٹر سے اُتر رہے تھے۔

وہ میری ہدایات کے مطابق چلتے گئے۔ اچانک ایک جگہ میں نے اُنھیں رُک جانے کا حکم دیا۔

"اس چٹان کے پیچھے تمھارے مہمان موجود ہیں تریوینی،" میں نے کہا: "جو اپنے چوہدری دلاور صاحب کے بھی دوست ہیں ایک کو تم اپنے کندھے پر اُٹھا لو، دوسرے کو چوہدری دلاور صاحب پر لاد دو۔ اور واپس چلو ہیلی کاپٹر کی طرف۔ وقت کم ہے۔"

"وقت کی کمی کا شکوہ تم کر سکتے ہو،" تریوینی نے تلخی سے کہا۔ "کیونکہ بہت موقع ضائع کر دیا ہے تم نے، تم کوشش کرتے تو شاید اس طرف سے نکل جاتے۔" اُس نے ہاتھ اُٹھا کے سمندر کی طرف اشارہ کیا۔

"چلو جی مرضی ان کی، ہمارے ساتھ ہیلی کاپٹر میں سیر کرتے ہوئے چلیں۔" دلاور نے اپنے مخصوص طنزیہ انداز میں کہا۔

"ابھی تو تم تھوڑی سی سیر کرا دو محسن کو، میرے پاس کیمرا ہوتا تو میں تصویر اُتار کے رکھتا۔"

"اور تصویر کا عنوان کیا رکھتے، گدھے پر سواری؟" دلاور نے کہا۔ اور اپنی بات پر خود ہی ہنسا۔

کھُلے آسمان کے نیچے لیٹے ہوئے محسن اور غالب کی ظاہری حالت اب پہلے سے بہتر نظر آتی تھی۔ ان کی ہمت بحال کرنے کے لیے یہ احساس ہی کافی تھا کہ ہم نے انھیں قید کے عذاب سے چھٹکارا دلا دیا ہے اور وہ بہت جلد پھر اپنوں کے درمیان ہوں گے۔ جب دلاور اور تریوینی ان کو کندھوں پر ڈال کے روانہ ہوئے تو ان کے پیچھے چلتے ہوئے میں غالب اور محسن کے بارے میں ہی سوچتا رہا۔ ابھی ان کی جسمانی حالت اتنی ابتر تھی کہ انھیں معالجے کے ساتھ کم سے کم ایک ہفتہ مکمل آرام اور ... کی ضرورت تھی۔ بالکل ٹھیک ہو جانے کے بعد بھی ... توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ کسی مشن میں شانہ بشانہ ہمارا ... اور سخت حالات کے خلاف نبرد آزما ہوں۔ اس کے لیے ... دو ہفتے بھی کم تھے۔ ویسے تو ان کا خیال رکھنے والے ہم سب تھے لیکن مشکل یہ تھی کہ آنے والے وقت کا کوئی بھروسا نہ ... نہیں بتا سکتا تھا کہ اسے اچانک کب اور کہاں جانا پڑے ... ایسی صورتِ حال ہوئی تو پھر گل یا رابعہ میں سے کوئی بھی ... کے لیے رُک جائے گی جب تک محسن اور غالب مکمل ... ہو کے ہم سے نہیں آملتے۔

تریوینی کے گوریلے ہیلی کاپٹر سے خاصے فاصلے پر ... ہوئے اپنی بے چارگی کا ماتم کر رہے تھے۔ ان کا اسلحہ اور ... طاقت سب بے مصرف ہو گئے تھے۔ انھوں نے تریوینی اور ... کو گدھوں کی طرح بوجھ ڈھوتے دیکھا۔ وہ جو اشارۂ ابروئے ... کی تقدیر بدل دینے کا دعویٰ رکھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ ان کی ... نظر سے زندگی اور موت کے فیصلے ہو جاتے ہیں۔ اس وقت ... زندگی پر اپنے اختیار سے بھی محروم تھے اور اتنے مجبور تھے ... ذلت کو خاموشی سے برداشت کر رہے تھے۔

تریوینی بُری طرح ہانپ رہا تھا، وہ غالب کو اُٹھا ... آہستہ آہستہ اوپر چڑھا تو اُس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں ... اُسے وارننگ دی تھی کہ غالب کو خفیف سی خراش بھی آئی ... اس کی ٹانگیں توڑ دوں گا اور اسے ساری عمر کے لیے اپاہج کر ... گا۔ اسے زندگی سے بہت پیار تھا۔ اس کی زندگی دولت کی ... اور عیش و عشرت سے عبارت تھی اور وہ سمجھتا تھا کہ کالے دھندوں ... کی جرائم کی اور بدنامی کی طویل جدّوجہد کے بعد بالآخر آج ... مقام پر ہے وہاں اس کے لیے پورے فخر اور غرور کے ساتھ زندہ ... رہنے میں مزہ ہے۔ وہ اس وقت نہیں مرا جب ایک معمولی ... تھا تو آج بدمعاشی کی سلطنت پر حکمرانی کے زمانے میں موت ... قبل از وقت کیوں قبول کرے۔ چنانچہ اُس نے ذلت کے ... سے بھی سمجھوتا کر لیا تھا اور ہماری غلامی کو کسی مزاحمت کے ... قبول کر لیا تھا۔ یہی سب چوہدری دلاور پر بھی صادق آتا تھا ... کو گلے لگانے سے نہیں ڈرتے ہم جیسے سر پھرے جو مقصد ... کو زندگی سے زیادہ اہم سمجھتے ہوں یا پھر زندگی سے لاتعلق ... ہوں کہ جینے کی ضرورت ہی نہ سمجھتے ہوں۔

محسن اور غالب کو پیچھے والے کیبن میں آرام سے لٹا ... تو میں نے نازو سے چارج لے لیا۔

"اب تم دیکھو یہاں کچھ کھانے پینے کے لیے دستیاب ... جو کچھ بھی ملے غالب اور محسن کو دے دو۔" میں نے کہا۔

نازو نے نفی میں سر ہلایا: "کچھ بھی نہیں ہے سوائے شراب اور سگریٹ کے۔"

محسن نے کہا: "ایک سگریٹ جلا دو مجھے۔"

میں نے اُسے منع کر دیا: "اس حالت میں سگریٹ زیادہ نقصان کرے گی۔"

محسن چلانے لگا: "نہیں مروں گا، اب تک زندہ ہوں یا نہیں..."

وہ نروس بریک ڈاؤن کا شکار تھا۔ میں نے اُسے انکار مناسب نہیں سمجھا اور سگریٹ سلگا دی۔ اُس نے کانپتے ہاتھوں سے ایک کش لیا اور کھانستے کھانستے بے دم ہو گیا۔ سگریٹ اُس نے خود ہی مسل کر بجھا دی۔ اُس کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔

"فکر مت کرو،" میں نے کہا: "بس تھوڑی دیر کی بات اور ہے۔"

دلاور ہنسا۔ اُس کی ہنسی میں طنز کی تلخی تھی۔ وہ محسن کی حالت پر اور میری بات پر ہنس رہا تھا۔ بڑے غلط وقت پر اُس نے ایک غلط حرکت کی تھی۔ اچانک غصّے سے میرا دماغ اُلٹ گیا۔ میں نے اُسے کالر سے پکڑ کے کھینچ لیا اور بڑی بے رحمی سے مارا۔ وہ میرا مقابلہ کر ہی نہیں سکتا تھا اس لیے کہ وہ تو کبھی لڑا ہی نہیں تھا اور لڑنا جانتا ہی نہیں تھا۔ اس کے کپڑے پھٹ گئے، اس کی ناک سے اور اس کے ہونٹوں سے خون بہنے لگا۔ تریوینی مجھے نہ روکتا تو شاید میں اسے جان سے مار دیتا۔

"سوری... سوری سکندر، دیکھو میں مانتا ہوں اس نے غلطی کی ہے،" تریوینی مجھ سے لپٹ گیا: "اس کو اندازہ کرنا چاہیے تھا تمھارے جذبات کا...!"

"کیا یہ حرامزادہ مجھے جانتا نہیں، اسے نہیں معلوم کہ یہ کون لوگ ہیں،" میں نے پھنکارتے ہوئے محسن اور غالب کی طرف اشارہ کیا: "ان کی ایک سانس پر میں ایسی دس زندگیوں کو قربان کر سکتا ہوں۔ میں چُپ تھا اور برداشت کر رہا تھا تو اس لیے کہ میں نے مصلحت کے تقاضوں کو قبول کر لیا تھا۔"

تریوینی درمیان میں آ کر خاصا پِٹا مگر وہ دلاور کو بچانے تک کامیاب رہا۔ نازو نے کوئی دخل نہیں دیا تھا اور پھر مشین گن لے کر کھڑی ہو گئی تھی تاکہ باہر کی صورتِ حال پر قابو رکھ سکے۔ محسن اس دوران صرف ہنستا رہا، قہقہے لگاتا رہا۔

"یہ بات تم بھی سمجھ لو تریوینی،" میں نے کہا: "اگر تم نے ہمارے لیے کوئی موت کا جال پھیلایا ہے تو اس سے تم بھی نہیں بچ سکتے۔ ہم اگر مریں گے تو تمھارے ساتھ... بہتر یہ ہو گا کہ تم ہمارے تحفظ کی سوچو۔ اس طرح تم خود بھی محفوظ رہو گے۔"

تریوینی نے سر ہلایا: "پائلٹ کو بلاؤ اور اس سے کہو کہ جلد از جلد یہاں سے نکل چلے۔"

پائلٹ ابھی تک نیچے کھڑا ہوا احکامات کا منتظر تھا۔ اُس نے دیکھ لیا تھا کہ جو حکم دینے والے تھے، وہ اب حکم کی تعمیل کر رہے ہیں چنانچہ اس نے بھی ہمیں حاکم تسلیم کر لیا تھا۔ میرے بلاتے ہی وہ کاک پٹ میں آ بیٹھا۔

میں نے کہا: "مسٹر پائلٹ! کیا تم جانتے ہو کہ تمھیں کہاں جانا ہے؟"

اُس نے پہلے تریوینی کو اور پھر مجھے دیکھا: "میں اپنی مرضی سے کہیں نہیں جاتا، صرف اس مشین پر اپنی مرضی چلاتا ہوں۔"

"او کے۔ اس مشین کو ایسی جگہ لے چلو جہاں ہمارے لیے خطرے کی کوئی بات نہ ہو۔" میں نے کہا۔

وہ حیرت سے مُنہ کھول کے بولا: "مجھے نہیں معلوم کہ خطرہ کہاں ہو گا اور کہاں نہیں ہو گا۔ ٹیک آف کرنے کے بعد مجھے ایئر کنٹرول سے رابطہ قائم کرنا پڑے گا۔"

میں نے کہا: "مزید ہدایات بعد میں دی جائیں گی... تم ٹیک آف کرو۔"

جہاز کے روٹر نے گھومنا شروع کیا۔ اس کی آواز ایک شور بن گئی۔ میں نے درختوں اور جھاڑیوں کی اوٹ سے انھیں باہر آتے دیکھا جو تریوینی کے ساتھ اُس کی حفاظت کے لیے آئے تھے اور ہمیں گرفتار کرنے.. سخت صدمے کی کیفیت میں وہ اپنی شکست کا انجام دیکھ رہے تھے کہ ہم اُن کے آقاؤں کو جنگی قیدی کی طرح لے جا رہے ہیں اور وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔

"تریوینی! یہ ہیلی کاپٹر کہاں سے پرواز کر کے آیا تھا؟" میں نے کہا: "اور اگر ہم قابض نہ ہوتے تو واپسی پر کہاں اُترتا؟"

"میرے اپنے ہیلی پیڈ پر، میرے پاس شہری ہوا بازی کے محکمے کا اجازت نامہ ہے۔"

"تم نے کبھی بلا اجازت کہیں اُتر کے دیکھا ہے؟ نہیں دیکھا ہے تو آج کوشش کرو۔" میں نے کہا۔

"میں تم کو خوش فہمی میں مبتلا رکھنا نہیں چاہتا،" تریوینی نے کہا۔ "میں پولیس کو اطلاع دے چکا ہوں اور وائرلیس فون پر اپنے گھر کے محافظوں کو بھی بتا چکا ہوں۔"

"مجھے پہلے سے اندازہ تھا کہ ایسا ہی ہو گا،" میں نے کہا۔

"اب تم کچھ بھی کر لو، اس ہیلی کاپٹر میں بچ کے کہیں جانا تمھارے لیے ممکن ہی نہیں،" تریوینی نے کہا: "تم مجھے بھی قتل کر سکتے ہو، دلاور کو بھی مار سکتے ہو مگر اس سے تمھیں کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ تم جہاں بھی جاؤ گے تمھیں راستے بند ملیں گے، پولیس زمینی راستوں سے بھی تمھارا تعاقب کرے گی اور فضا میں بھی۔"

یہ بات مجھے متفکر کر دینے کے لیے کافی تھی مگر میں نے اپنی بے نیازی کے انداز میں فرق نہیں آنے دیا۔ میں نے کہا "چلو اچھا ہے، جب تک ہم مقابلہ کر سکتے، کریں گے۔ مرنا ہوگا تو تمھارے ساتھ ہی مریں گے۔ ابھی تم اتنا کرو کہ ہیلی کاپٹر کو بمبئی سے پچاس کلومیٹر مشرق کی طرف ساحل سے تین میل اندر اُتارنے کے لیے احکامات جاری کر دو۔"

"یہ کون سی جگہ ہے؟" تریونی نے کہا۔

"یہ بھی معلوم ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔

میری بات نے اور میرے اعتماد نے تریونی کو اُلجھن میں ڈال دیا۔ وہ اب یہ سمجھنے پر مجبور تھا کہ ہم ہیلی کاپٹر کو اپنے کسی ٹھکانے پہلے جا رہے ہیں۔ اُس نے پائلٹ تک میرا پیغام پہنچا دیا۔ ہیلی کاپٹر نے کسی پرندے کی طرح پھڑپھڑاتے ہوئے رُخ بدلا اور سمندر کے اوپر مشرقی اُفق کی جانب اُڑنے لگا۔ صبحِ کاذب کے آثار ابھی ہویدا نہیں تھے۔ میں نے آسمان پر صبح کے ستارے کو تلاش کرنا چاہا مگر آسمان پر ہلکا سا ابر تھا۔

وقت بہت کم تھا۔ پچاس کلومیٹر کی پرواز دس پندرہ منٹ کی بات تھی۔ میں نے نازو سے مشورہ کیا۔ محسن آنکھیں بند کیے لیٹا ہوا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس کی ذہنی کیفیت بھی نارمل نہیں ہے، لیکن غالب بہت توجہ سے میری بات سن رہا تھا۔

"ہم پولیس کو ڈاج نہیں کر سکتے۔" میں نے کہا "پولیس تو تریونی جیسے لوگوں کی زر خرید ہوتی ہے، ان کے تعاون کے بغیر وہ سب نہیں ہو سکتا تھا جو جزیرے پر ہو رہا ہے۔ وہ زیرِ زمین کمرے، خودکار الارم، ساحلوں پر گشت کرنے والے سنتری، مال کا آنا جانا، یہ سب پولیس کے علم میں ہوگا، ورنہ جزیرہ کیا تریونی کے باپ کا ہے۔"

"پھر تو یہی ایک صورت رہ جاتی ہے کہ ہم انھیں یرغمال بنائے رکھیں۔" نازو نے کہا۔

"لیکن کب تک؟" میں نے کہا "یوں سمجھ لو کہ اس وقت بھی پولیس کی گاڑیاں اور موٹر سائیکلیں تیار ہوں گی۔ بس یہ اطلاع ملنے کی دیر ہے کہ ہم نے ہیلی کاپٹر کہاں اُتارا ہے۔"

"فرض کرو انھیں معلوم ہی نہ ہو؟"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہم بتائیں یا نہ بتائیں، وہ ہیلی کاپٹر کا سُراغ لگا لیں گے۔" میں نے کہا "راڈار سے، دوسرے ہیلی کاپٹر سے یا دوربین کی مدد سے۔ ہم جہاں اُتریں گے وہ پہلے سے موجود ہوں گے۔"

غالب نے کہا "تم نے ٹھیک سوچا ہے، ہم بھاگ کے نہیں جا سکتے اور بھاگ جائیں تو چھُپ کر نہیں رہ سکتے۔ بہتر ہے کہ تریونی اور دلاور کے ساتھ سودا کر لو۔"

میں اُس کی بات سمجھ گیا۔ سودا صرف زندگی کی ضمانت کے بدلے کیا جا سکتا تھا۔ جہاز کی پرواز جاری تھی مگر اس کی سمت کا اندازہ میں نہیں کر سکتا تھا۔ بمبئی کا شہر پیچھے رہ گیا تھا۔ بلند و بالا عمارات کا سایہ سا اُفق پر نظر آتا تھا۔ اسٹریٹ لائٹس دُور سے ستاروں کی طرح نظر آتی تھیں، بہت مدھم پڑ گئی تھیں۔

میں نے کلائی کی گھڑی دیکھی، سوا پانچ بج رہے تھے۔ جہاز نے نیچے اُترنا شروع کیا تو میں نے تریونی سے کہا "یہ وہی جگہ ہے نا جو میں نے بتائی تھی؟"

تریونی نے کہا "تم چیک کر سکتے ہو اور چاہو تو بدل سکتے ہو۔"

میں نے اقرار میں سر ہلایا "اب پائلٹ سے کہو کم بلندی پر پرواز کرے اور شمال کی طرف دس کلومیٹر چلے۔ راستے میں کئی سی چھوٹی سڑکیں ہیں، شاہراہ صرف ایک ہے۔"

تریونی نے کہا "پونا جانے والی سڑک؟"

میں نے اندھیرے میں تیر چلایا تھا جو کہیں تو لگنا ہی تھا۔ کے اطراف میں سڑکوں کا جال بچھا ہُوا تھا۔ تریونی نے ملاوٹ میں میری مدد یوں کی کہ مجھے صحیح جگہ بتا دی۔

"اسے پونا جانے والی سڑک سے دو فرلانگ مغرب کی طرف ایک جگہ اُترنا ہوگا۔" میں نے کہا "جگہ میں بتا دوں گا۔"

تریونی نے احکامات آگے ارسال کیے۔ پائلٹ نے فٹ اوپر رہ کے پرواز جاری رکھی۔ سمندر بھی پیچھے رہ گیا۔ اب کسی مضافاتی بستی کے اوپر سے گزر رہے تھے۔ پھر ایک جنگل ہو گیا۔ جنگل کے ختم ہوتے ہی میں نے ساکت اور متحرک روشنیوں کی قطاریں دیکھیں۔ ساکت روشنیاں سڑک کے کھمبوں کی تھیں، متحرک روشنیاں ان گاڑیوں کی تھیں جو سڑک پر رواں تھیں۔ میں نے اندازہ کیا کہ یہی بمبئی سے پونا جانے والی شاہراہ ہو گی۔ میں اب زمین کو واضح طور پر دیکھ رہا تھا۔ ایک جگہ میں نے اُنگلی کے اشارے سے کہا "ادھر... وہاں چلو۔" اور پائلٹ نے ہیلی کاپٹر کو تھوڑا سا موڑ لیا۔ یہ کوئی کھیت یا میدان تھا جو سڑک سے زیادہ دُور نظر نہیں آتا تھا۔ ہیلی کاپٹر جب سو فٹ اوپر تھا تو میں نے دوسری ذیلی سڑک کو دیکھا جو اُس میدان کے ساتھ ساتھ بڑی سڑک تک جا رہی تھی۔ میں نے پائلٹ کو حکم دیا کہ ہیلی کاپٹر اس سڑک پر اُتار لے۔

ہیلی کاپٹر نے سڑک کو چھُوا۔ پھر اُس کا انجن بند ہو گیا۔ شور جو میری سماعت کو متاثر کر رہا تھا، یکلخت تھم گیا اور مجھے گہرے سکوت کا اور سکون کا احساس ہوا۔

میں نے تریونی کی طرف دیکھتے ہوئے ریوالور نکال لیا "تریونی، وائرلیس پر پولیس سے رابطہ قائم کرو۔"

"اُن سے مجھے کیا کہنا ہوگا؟" تریونی نے کہا۔

"تم اُن سے کہو گے کہ اب خطرے کی کوئی بات نہیں، بحفاظت اُتر چکے ہو۔"

"میرے کہنے سے کچھ نہیں ہوگا، وہ محاصرہ ختم نہیں کریں گے اور تمہارا تعاقب بھی جاری رکھیں گے۔"

میں نے دلاور کے چہرے پر شاطرانہ، پُرتمسخر اور معنی خیز مُسکراہٹ دیکھی جو صاف یہ کہتی محسوس ہوتی تھی کہ اپنے سکندرِ اعظم صاحب... خیر سے آپ پریشان لگتے ہو۔ لہجہ بھی بدلا ہُوا ہے آپ کا...

میں نے دلاور کو نظر انداز کر دیا اور کہا "دیکھو تریونی، تمھاری زندگی کا انحصار اب ہماری زندگی پر ہے۔ جب تک تمھاری طرف سے ہمیں یہ اطمینان نہیں حاصل ہوگا کہ ہمارے لیے واقعی خطرے کی بات کوئی نہیں رہی، تم اور ہم جہاں جائیں گے، ایک ساتھ جائیں گے۔ ہم تمھیں اپنے تحفظ کی ضمانت کے طور پر ساتھ رکھیں گے، کب تک... یہ خود ہم بھی نہیں جانتے لیکن اس میں کوئی شک کی گنجائش نہیں کہ ہم اپنی آخری سانس تک ہتھیار نہیں ڈالیں گے اور خود کو پولیس کے اور تمھارے شکاری کتّوں کے حوالے نہیں کریں گے، اب تم سوچ لو کہ تم کب تک خوار ہو سکتے ہو ہمارے ساتھ... کتنا حوصلہ ہے تم میں ہمارے ساتھ ہر جگہ جانے کا۔"

"مجھے یہ بھی بتا دو کہ تم ہمیں اپنے ساتھ کیسے لے جاؤ گے؟" یہ دلاور تھا جس نے پھر میرا مذاق اُڑانے کی ہمت کی تھی۔ اس بار میں نے کچھ نہیں کیا۔ نازو نے اُسے پلک جھپکتے میں تین بار اُٹھک بیٹھک دی۔

"اب میں بتاتا ہوں کہ ہم تمھیں کیسے لے جائیں گے۔" میں نے کہا "ابھی میں ہیلی کاپٹر سے اُتر کے سڑک تک جاتا ہوں۔ دس پندرہ منٹ میں مجھے کوئی کار مل جائے گی۔ کوئی نہ کوئی مجھے لفٹ دینے کے لیے رُک جائے گا، یہ کام نازو بہتر طور پر کر سکتی ہے۔"

"تم سڑک تک جاؤ گے کیسے؟" تریونی نے کہا "اس سے پہلے ہی پولیس تمھارا راستہ روک دے گی۔"

میں نے کہا "ابھی تک مجھے گرد و نواح میں کوئی نظر نہیں آ رہا ہے جو میرا راستہ روکے۔"

"وہ نظر آئیں گے بھی نہیں مگر یقین کرو وہ آس پاس ہی موجود ہیں۔" تریونی نے کہا۔

"چلو میں مان لیتا ہُوں کہ ایسا ہی ہے لیکن ایک تو میں جاؤں گا سٹین گن لے کر، دوسری بات یہ کہ ابھی تم ہمارے قبضے میں ہو۔ ابھی پولیس کچھ کرے گی تو نقصان تمھارا ہوگا۔ زندگی تمھاری خطرے میں پڑ جائے گی۔"

تریونی سوچ میں پڑ گیا "تو تم کیا چاہتے ہو، میں پولیس سے کیا کہوں؟"

"اُن سے کہو کہ قریب نہ آئیں اور جب تک تمھاری طرف سے اشارہ نہ ملے، کوئی کارروائی نہ کریں۔" میں نے کہا۔

تریونی نے سر ہلایا اور وائرلیس کا مائک لے کر بولنے لگا۔ "ہیلو کوبرا تھری وَن زیرو... تریونی ہیئر۔"

"کوبرا تھری وَن زیرو۔" وائرلیس کے اسپیکر نے کہا۔

"اپنی لوکیشن بتاؤ۔" تریونی نے کہا۔

کوبرا تھری وَن زیرو نے جو شاید پولیس کوڈ تھا، اپنی پوزیشن کی وضاحت کی۔ اس سے مجھے اندازہ ہُوا کہ وہ واقعی ہم پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ پولیس کی دو گاڑیاں بمبئی پونا روڈ پر ہم سے تین کلومیٹر دُور کھڑی ہوئی تھیں۔ انھوں نے ہمارا سُراغ لگانے کے بعد آپس میں رابطہ رکھا تھا اور مسلسل ہمارا تعاقب کیا تھا۔

"اچھا فی الحال میں تمھاری مدد کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ تم لوگ واپس چلے جاؤ۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو، محاصرہ ختم کر دیں؟"

"جو میں کہہ رہا ہُوں، وہ سمجھنے کی کوشش کرو۔ میری زندگی خطرے میں ہے اور تم مجھے نہیں بچا سکتے۔" تریونی نے دہاڑ کر کہا۔

"ہم یہی کوشش کر رہے ہیں۔"

"تو ہیل وِد یوئر کوشش۔ تمھارے قریب آنے سے پہلے وہ مجھے گولی مار دیں گے۔" تریونی نے چیخ کر کہا "انھوں نے مجھے دھمکی دی ہے اور تم انھیں نہیں روک سکتے۔ ناؤ گیٹ لاسٹ۔"

"تم اُن پر اعتبار کرنے کی غلطی کر رہے ہو۔"

"میں وہی کر رہا ہُوں جو میری عقل کہتی ہے اور ابھی میرا دماغ خراب نہیں ہُوا ہے۔ جب میں پھر تمھاری ضرورت محسوس کروں گا تو تمھیں بُلا لوں گا۔" تریونی نے کہا "میں کسی قسم کی مداخلت نہیں چاہتا، سمجھے؟"

"جیسی تمھاری مرضی، ہمیں کوئی شوق نہیں ہے مداخلت کا۔"

تریونی نے وائرلیس سیٹ بند کر دیا "اب تم جو چاہو کرو، تم آزاد ہو۔" اُس نے شکست خوردہ لہجے میں کہا "تم وعدہ خلافی کرتے ہوئے مجھے گولی مار کے بھی جا سکتے ہو، تمھارا راستہ کوئی روکنے والا نہیں ہے، جہاں چاہو چلے جاؤ۔"

میں نے کہا "میں پیٹھ پر گولی مارنے کا قائل نہیں ہُوں، جب مجھے یقین آ جائے گا کہ اب واقعی ہمارا تعاقب کوئی نہیں کر رہا ہے تو میں بھی تمھیں اجازت دوں گا کہ جہاں چاہو چلے جاؤ۔"

"اور یہ یقین کیسے آئے گا تمھیں؟" وہ بولا۔

میں نے کہا "ہاتھ کنگن کو آرسی کیا... نازو! کیا یہاں سے ہمیں پونا جانے کے لیے کوئی سواری مل سکتی ہے؟"

"کیوں نہیں مل سکتی۔" نازو نے کہا "میں ابھی لاتی ہُوں۔"

میرے اندازے کے مطابق سڑک تک کا فاصلہ سو گز یا کچھ زیادہ

ہوگا جس چھوٹی سڑک پر ہم نے ہیلی کاپٹر اُتارا تھا اس پر سے ابھی تک کوئی گاڑی نہیں گزری تھی۔ یا تو یہ متروکہ سڑک تھی یا پھر کسی گاؤں کو جاتی تھی۔ نازو نے اسی سڑک پر چلنا شروع کیا اور اپنا رُخ شاہراہ کی طرف رکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ مین روڈ تک پہنچتی، میں نے کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس کو دیکھا جو مخالف سمت سے آ رہی تھی۔ دو منٹ بعد ایک پُرانا ٹرک ہمارے قریب سے گزر گیا۔ وہ سڑک کے بیچ میں ایک ہیلی کاپٹر کو دیکھ کر کچھ حیران ضرور ہُوا مگر ٹرک میں بیٹھے ہوئے چمرخ ڈرائیور نے ٹرک کو کچے راستے پر اُتار کے نکال لیا۔ یہ دُودھ لے جانے والا ٹرک تھا جس میں پیچھے دودھ کے ڈرم رکھے ہوئے تھے۔

ٹرک کی ہیڈ لائٹس نازو پر پڑیں تو میں نے اُسے سڑک کے بیچ میں آ کے زور زور سے ہاتھ ہلاتے دیکھا۔ ٹرک کے بچ کر نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ٹرک ذرا سی دیر کے لیے رُکا اور پھر واپس ہُوا۔ جب وہ پھر ہمارے سامنے آیا تو ڈرائیور کی جگہ نازو براجمان تھی۔ اُس نے مجھے دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔

میں نے مسکرا کے تریوینی کی طرف دیکھا۔ "کیسی شایانِ شان سواری لائی ہے تمہارے لیے۔"

تریوینی نے کہا۔ "یہ لڑکی ہے کہ قیامت!"

میں نے کہا۔ "اپنے چوہدری صاحب تم کو اس قیامت کے بارے میں زیادہ تفصیل سے بتا سکتے ہیں۔ اب چلو اور اطمینان سے ان صوفوں پر بیٹھ جاؤ۔" صوفوں سے میری مُراد دُودھ کے ڈرموں سے تھی۔

ٹرک دس منٹ بعد روانہ ہُوا تو اس کے آخری حصے میں محسن اور غالب یوں بیٹھے ہوئے تھے کہ نظر نہیں آتے تھے۔ میں ایک ڈرم پر بیٹھا ہُوا تھا اور میرے سامنے تریوینی اور دلاور کے ساتھ بدحواس پائلٹ موجود تھا۔ میرے ہاتھ میں جو ریوالور تھا اس کا رُخ اُن تینوں کی طرف تھا۔ ٹرک اب واپس گاؤں کی طرف جا رہا تھا۔ اُفق پر صبحِ کاذب کے آثار نمودار ہو کے ختم ہو چکے تھے۔ تھوڑی دیر میں اُجالا پھیلنے والا تھا۔

ایک میل چلنے کے بعد ٹرک رُک گیا۔ میں نے ... سے تریوینی کو اُترنے کے لیے کہا۔ "وعدے کے مطابق ہم تمہیں چھوڑ رہے ہیں۔"

تریوینی نے احتجاج کیا۔ "لیکن یہاں؟"

میں نے کہا۔ "صرف پائلٹ کو ہم اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ میں وائرلیس سیٹ کا مائکروفون بھی اُتار لایا تھا۔ رخصت کرنے سے پہلے میں تمہاری آنکھوں پر پٹّی باندھوں گا اور تمہارے ہاتھ بھی تمہاری کمر کے پیچھے باندھوں گا۔ اس کے لیے رسّی موجود ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ پندرہ بیس منٹ یا آدھے گھنٹے میں کوئی تمہاری مدد کرنے والا آ جائے گا یا تم چلتے رہے تو سڑک تک پہنچ جاؤ گے۔"

پہلے میں نے دلاور کی آنکھوں پر پٹّی باندھی پھر اس کے ہاتھ باندھے اور اس کو ایک لات رسید کر کے روانہ کر دیا۔ ... واپس ہُوا۔ تریوینی کی اُمید دل پر اوس پڑ گئی۔ اُسے شاید اُمید تھی کہ میں ان دونوں کو ایک جگہ چھوڑ دوں گا تو وہ آپس میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہوئے پہلے ہاتھ کھول لیں گے اور پھر آنکھوں سے پٹّی ہٹا دیں گے۔ آدھا میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد میں نے تریوینی کو اسی طرح رخصت کیا۔ پھر دو فرلانگ کے بعد پائلٹ کو۔ وہ اندھوں کی طرح مختلف سمتوں میں مُنہ اُٹھا کے چلتے گئے۔

اُفق پر صبح پھوٹ رہی تھی جب ہم ٹرک کے ساتھ مین روڈ پر پہنچے۔ ٹرک کے اصل ڈرائیور کو میں نے پیچھے لٹا دیا اور ڈرائیونگ خود سنبھال لی تھی۔ سڑک پر پہنچتے ہی میں نے نازو کو اُتار دیا۔ وہ سڑک کے کنارے پیدل چلنے لگی۔ میں ٹرک کو بستی کی جانب ڈرائیو کرتا گیا۔ دو میل جانے کے بعد میں نے ٹرک کو ایک سائڈ پر روکا اور اُس کا بونٹ آگے سے اُٹھا کے انجن پر نظر ڈالی۔

پروگرام کے مطابق نازو کو ایک کار لے کر میری طرف آنا تھا۔ اس کے لیے کسی سے لفٹ مانگنا اور پھر کار والے کو بے کار کر دینا کوئی مشکل کام نہیں رہا تھا۔ ایسا ہم کرتے ہی رہتے تھے۔ میں نے اُفق کو روشن ہوتے دیکھا پھر سورج کی ایک روشن قاش نے آسمان کے کنارے کو منوّر کر دیا۔ ہر قسم کی گاڑیاں میرے پاس سے گزرتی رہیں۔ ان میں کاریں بھی تھیں مگر وہ کار ابھی تک نہیں آئی تھی جس میں مجھے نازو کا چہرہ دکھائی دیتا۔ اب مجھے یقین تھا کہ دس پندرہ منٹ میں وہ ضرور پہنچ جائے گی لیکن آدھے گھنٹے سے زیادہ ہو گیا تھا اور اس کا کہیں پتا نہ تھا۔ آہستہ آہستہ اندیشے میرے ذہن میں بیدار ہو رہے تھے۔ کہیں تریوینی نے مجھے بے وقوف تو نہیں بنایا تھا یا پولیس نے تریوینی سے بھی جھوٹ تو نہیں بول دیا تھا کہ واپس جا رہے ہیں۔

میں سیاہ لباس میں، زرد رنگ کی لائف جیکٹ پہنے ذرا کم دُودھ والا نظر نہیں آتا تھا۔ لائف جیکٹ کو میں نے فوراً اُتار کے اندر ڈال لا مگر اُسی وقت میں نے دونوں جانب سے پولیس کی دو گاڑیوں کو قریب آتے دیکھا۔

مجھے سخت ترین آزمائش کا مرحلہ درپیش تھا۔ میں بیک وقت دونوں جانب سے پیش قدمی کرنے والے قانون کے علم برداروں کو بہ زورِ بازو نہیں روک سکتا تھا اور انھیں دھوکا دے کر بھی نہیں نکل سکتا تھا۔ جب پولیس کی ایک گاڑی سیدھی گزر گئی تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ آدھی بلا ٹلی۔ دوسری گاڑی اس طرح میرے سامنے آ کے رُکی کہ اُس نے میرا راستہ بلاک کر دیا۔ یہ جیپ اور ٹرک کے درمیانی سائز کی گاڑی تھی اور اس میں دو پولیس مین تھے جن میں سے ایک خود ڈرائیور تھا اور دوسرا اس کا تین فیتی والا افسر۔ ماتحت کم عمر اور پولیس میں نووارد لگتا تھا۔ جوانی کے جوش کے ساتھ اس میں نئی وردی کے ساتھ حاصل ہونے والے اختیارات کا بے پناہ جذبہ تھا چنانچہ اُس نے گاڑی رکتے ہی چلّا کے کہا۔ "خبردار! بھاگنے کی کوشش مت کرنا۔"

اس کا حکم سُننے سے پہلے میرا بھاگنے کا کوئی ارادہ نہ تھا مگر یہ بات سُن کے مجھے خیال آیا کہ میرے لیے سب سے محفوظ راستہ تو یہی ہے کہ میں بھاگ جاؤں۔ تین فیتی والا افسر یعنی حوالدار پولیس کے محکمے کی پُرانی چیز تھا اور وہ روایتی ہڈحرام، رشوت خور اور نااہلی کا شاہکار نظر آتا تھا، جن کی وجہ سے پولیس کا پورا محکمہ بدنام ہوتا ہے۔ اگر اس میں یہ صفات نہ ہوتیں تو اب تک وہ ترقی کر کے افسر بن چکا ہوتا۔ اس کی صورت کے نقوش کرخت تھے اور اس تاثر میں کلف لگی مونچھیں خاصا ناخوشگوار اضافہ تھیں۔ آخری چیز جو میں نے اس کے برآمد ہونے پر دیکھی، وہ اس کی عظیم توند کا نصف کُرہ تھا جس پر پتلون اسی طرح نہیں ٹھہرتی تھی جیسے چکنے گھڑے پر پانی کی بوند نہیں ٹکتی۔

اس کے زمین پر قدم رکھتے ہی میں نے دوڑ لگائی۔ یہ ان دونوں کو اس جگہ سے دُور لے جانے کی ایک خطرناک کوشش تھی۔ موٹا حوالدار خود تو میرے تعاقب میں دو قدم بھی نہیں بھاگ سکتا تھا لیکن اس کے ریوالور کی گولی بہرحال میرا راستہ روک سکتی تھی۔ میں نے اپنے سامنے دُور تک پھیلے ہوئے گھنے جنگل پر بھروسا کیا اور دوڑتے وقت لہراتا ہوا گیا۔ اس طرح نشانہ خطا ہونے کے امکانات بڑھ جاتے تھے۔

مجھے ایک فائدہ اور بھی ہُوا۔ نوجوان ڈرائیور کا حکم سُننے کے بعد میں اپنی جگہ پر منجمد ہو گیا تھا۔ میری صورت سے اور حالت سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ قانون کی دہشت سے میرا بُرا حال ہے۔ قدرتی طور پر موٹا حوالدار مطمئن تھا اور اس کے ذہن کے کسی گوشے میں یہ خیال نہیں تھا کہ میں فرار ہو جاؤں گا چنانچہ میرے دوڑ لگانے کے بعد وہ چند سیکنڈ تو حیرت اور صدمے سے دم بخود کھڑا رہا پھر غیر ارادی طور پر میرے پیچھے بھاگا۔ اُس نے اپنی مضحکہ خیز باریک آواز میں چلّا کے کہا۔ "اوئے رُک جا، نہیں تو گولی مار دوں گا۔" جب میں نہیں رُکا تو اُس نے رُک جانا بہتر سمجھا۔ اُس نے چیخ کر اپنے نوجوان ماتحت کو حکم دیا کہ میرا پیچھا کرے۔

نوجوان سرپٹ بھاگتا ہُوا آیا۔ میں ایک جھاڑی کے پیچھے رُکا ہُوا تھا۔ وہ میرے سامنے سے گزرا تو میں نے اسے یوں دبوچ لیا کہ اس کی آواز تک نہیں نکلی۔

میں نے کہا۔ "میں اس سے پہلے سات بار قتل کر کے جیل جا چکا ہوں۔ سات بار مجھے پھانسی ہو چکی ہے... میرا مطلب ہے سزا سُنائی جا چکی ہے اور ہر بار میں جیل سے نکل آیا ہوں۔ کیا تم چاہتے ہو کہ میں آٹھواں قتل کر دوں... تم کو فوت کر دوں؟"

اُس نے پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے سر کو تھوڑا سا دائیں بائیں ہلانے کی کوشش کی۔

میں نے کہا۔ "میں خالی ہاتھوں سے قتل کرتا ہوں، یہ میرا اصول ہے اور ہمیشہ گردن توڑتا ہوں گاجر مولی کی طرح... اس طرح مرنے والے کو تکلیف نہیں ہوتی اور مارنے والے کو بھی، گلا گھونٹنے میں دونوں کو پریشانی ہوتی ہے۔"

اُس کی آنکھیں حلقوں سے اُبلنے لگیں۔ میں نے اُسے پوری طرح دہشت زدہ کر دیا تھا اور اب میں اُمید کر سکتا تھا کہ وہ زندہ رہنا چاہے گا تو میرا کہا مانے گا۔

میں نے کہا۔ "ابھی تم پولیس مین بنے ہو... ابھی سے مر گئے تو خاک فائدہ ہوگا پولیس میں نوکری کرنے کا، زندہ رہو گے تو خوب ترقی کرو گے۔ سب انسپکٹر اور انسپکٹر بنو گے، خوب بندے پکڑو گے، خوب پھینٹی لگاؤ گے ان کی اور خوب کماؤ گے، خوب عیش کرو گے۔"

حوالدار نے دُور سے چلّاتے ہوئے کہا۔ "اوئے خبیث! کدھر مر گیا؟" غالباً وہ خراماں خراماں اِدھر ہی آ رہا تھا۔

میں نے کہا۔ "تم صرف اتنا کرو کہ اس موٹے حوالدار کو اِدھر بلاؤ، آواز دو، یوں جیسے تم اُسے مدد کے لیے پکار رہے ہو لیکن اتنا خیال ضرور رکھنا کہ تمہارے حلق سے غلط آواز نکلی تو اس کے ساتھ ہی تمہارے شریر سے تمہاری آتما بھی نکل جائے گی۔"

جیسے ہی میں نے اس کے مُنہ سے ہاتھ ہٹایا اُس نے فریاد کے انداز میں پُکار کے کہا۔ "حوالدار جی... اِدھر...!"

میں نے کہا۔ "تھینک یو۔" اور ایک ہلکا سا ہاتھ مار کے اُسے ناک آؤٹ کر دیا۔ موٹا حوالدار اب دوڑتا ہوا آ رہا تھا۔

"اوئے کیا ہو گیا، مُنہ سے تو بول۔" اُس نے ہانپتے ہوئے کہا اور اچانک میرے سامنے آ گیا۔

میں نے اُس کے پیٹ میں اُنگلی چبھو کے کہا۔ "موٹے! ساری عمر گزر گئی حرام کھاتے، اس نوجوان کو آگے بھیج دیا مرنے کے لیے۔"

وہ اُچھلا۔ "تم... کون ہو؟"

میں نے دوسری بار زیادہ قوت سے اُس کے گدّے دار

پیٹ میں انگلی ماری ہے میں... میرا نام ہے پیٹ پھاڑنے والا، سیٹھوں کے جو کالے دھندے کرتے ہیں اور تم جیسے حرام خوروں کے پیٹ پھاڑ کے مجھے بہت تسکین ملتی ہے۔ مالِ حرام پر پلے ہوئے ننانوے خوفناک پیٹ پھاڑ چکا ہوں اب تک، آج سنچری ہو جائے گی، ابھی ایک دھماکا ہو گا۔"

میرے اور اُس کے درمیان فاصلہ اتنا کم تھا کہ وہ ریوالور نہیں نکال سکتا تھا۔ میں تقریباً اُس سے چمٹا ہوا تھا، ہر بار وہ اُچھل کے ایک قدم پیچھے ہوتا تھا تو میں اتنا ہی آگے بڑھ جاتا تھا۔

موٹے حوالدار کی حالت غیر تھی۔ اُس نے کئی بار چلّا کے اپنے ماتحت کو مدد کے لیے پکارا اور بالآخر ریوالور نکالنے میں بھی کامیاب ہو گیا مگر کسی دُشواری کے بغیر وہ ریوالور میں نے لے لیا۔

موٹا حوالدار مجھے گالیاں دینے لگا۔ "میں جیل میں سڑا دوں گا تجھے، بڑے بڑے بدمعاشوں کو دیکھا ہے میں نے۔"

"پھر مجھے کیوں نہیں پہچانا، موٹے سُوّر۔" میں نے اُس کے پیٹ میں مُکّا مارا۔ "ساری زندگی جھک ماری پولیس میں، کسی مجرم کو صورت سے نہیں پہچانتے تو پکڑو گے کیسے۔ غور سے دیکھو مجھے... میں ہوں مشہور سیاہ پوش جس نے سات قتل کیے، سات بار پھانسی ہوئی، ہر بار میں جیل سے نکل آیا۔ آٹھویں بار بھی ایسا ہی ہو گا۔" میں نے فلمی ولن کی طرح قہقہہ مار کے کہا۔

موٹے حوالدار کی گِھگّی بندھ گئی، وہ ہاتھ جوڑنے لگا۔ "تم کو بھگوان کا واسطہ، مجھ پر دیا کرو، میری جوان بیوی ہے گھر میں۔"

میں نے ڈانٹ کر کہا۔ "کیا بکتا ہے، بیوی یا بیٹی؟"

"بیوی مائی باپ، بیٹیاں تو سب اپنے گھر کی ہو گئیں، ان سے فارغ ہو کے ہی اپنا گھر بسایا تھا میں نے۔" وہ دُہائی دینے لگا۔

"اس وجہ سے تم پر دیا کی جا سکتی ہے۔" میں نے غور کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن میری کچھ شرائط ہیں۔"

"مجھے ہر شرط منظور ہے۔" وہ تقریباً رو کے بولا۔

"اچھا تو پہلے یہ وردی اُتار کے میرے حوالے کر دو۔" میں نے کہا۔

"وردی!" اُس کا مُنہ کھلا رہ گیا۔ "اور میں خود کیا کروں؟"

میں نے کہا۔ "مجھے صرف وردی چاہیے، انڈرویئر نہیں۔"

اُس نے جیسے ہی وردی اُتار کے مجھے پکڑائی میں نے اُسے بھی لٹا دیا۔ بعد میں اُس کے بھاری بھرکم جسم پر سے وردی اُتارنا مشکل کام ہوتا۔ یہ وردی تو میرے ابھی کام آ سکتی تھی۔ اسے میں نے اپنے سیاہ ٹائٹ فٹ لباس پر چڑھا لیا۔ اتنی ڈھیلی وردی یقیناً میرے جسم پر مضحکہ خیز لگتی ہو گی لیکن پولیس والے عموماً پبلک کو مضحکہ خیز ہی نظر آتے ہیں۔ موٹے [illegible] کے نوجوان نائب کی وردی میں نے دو منٹ میں اُتار [illegible] پھر سڑک کی طرف دوڑا۔

میری واپسی تک تقریباً بیس منٹ گزر گئے [illegible] غالب اور محسن جو دودھ کے ڈرموں کے پیچھے چھپ [illegible] ہوئے تھے، خاصے پریشان تھے اور ان کی حالت بھی [illegible] تھی۔ میں نے انھیں تسلی دی کہ بس اب تھوڑی سی [illegible] بات اور ہے۔

میری نگاہیں نازو کو تلاش کر رہی تھیں اور میں ہر سمت سے آنے والی ہر کار کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ [illegible] نازو کو آنا تھا مگر وہ مخالف سمت میں میرے پیچھے سے [illegible] جب اُس نے بریک لگا کے کار روکی تو میں اُچھل کے ایک طرف ہوا۔

"ارے لڑکی! قانون پر قاتلانہ حملہ کرتی ہے۔"

اُس نے دروازہ کھول کے کہا۔ "معاف کرنا [illegible] ہو گیا۔"

"یہ تم کس طرف سے آ رہی ہو آخر، میں تمھارے لیے اس طرف چشم براہ تھا۔" میں نے کہا۔

"خاک چشم براہ تھے، میں دو بار چکر لگا کے چلی [illegible] پولیس کی گاڑی کو دیکھ کے اور پریشانی ہو رہی تھی۔"

"تم نے اتنی دیر کیوں لگا دی تھی؟" میں نے کہا۔

"گاڑی میرے گھر کے پورچ میں نہیں کھڑی ہو[illegible] تھی۔" وہ بگڑ کے بولی۔ "مجھے کسی سے چھین کر لانی تھی۔"

میں نے کہا۔ "گاڑی ہمیں پسند آئی، اس کا اصل [illegible] کہاں ہے؟"

"سو رہا ہے پیچھے، تم یہ بتاؤ کہ پولیس سے چھیڑ خانی کی کیا ضرورت تھی...؟ آ بیل مجھے مار۔"

"میں ایسی حماقت نہیں کر سکتا تھا۔ خود بیل نے سا[illegible] آ کے کہا کہ آ سکندر مجھے مار... مجبوراً میں بیل... دو [illegible] تھے۔ انھیں میں اُدھر جنگل میں لے گیا اور بس ایسے ہی [illegible] ایک ہاتھ مارا تو وہ لیٹ گئے۔ ایک کی وردی میں نے [illegible] رکھی ہے۔ دوسرے کی تم پہن لو، سیاہ پوش حسینہ۔" میں [illegible] وردی اس کی طرف اچھال دی۔

نازو نے وردی جھپٹ لی۔ "یہ جو وردی تم نے [illegible] ہے، یہ تم پر ذرا نہیں سج رہی ہے۔"

"چلو یہ تم لے لو، شاید تم پر سج جائے۔"

وہ ہنسی۔ "مجھے تو یہ بھی ڈھیلی ہے۔"

"معلوم ہے ہم دونوں کیسے لگیں گے؟ دو مزاحیہ [illegible]

کے اداکار تھے، ایبٹ اور کاسٹیلو۔" میں نے کہا۔ "میں نے ان کی ایک فلم دیکھی تھی کی اسٹون کاپس، بالکل وہی سین ہو گا۔"

"اچھا چلو اب باتوں میں وقت ضائع مت کرو۔ ان دونوں کی حالت خراب ہو گی، انھیں کار میں شفٹ کر دو، میں آتی ہوں، یہ وردی بدل کے۔"

میں نے کہا۔ "اب ہم کار میں نہیں جائیں گے۔"

وہ جنگل کی طرف جاتے جاتے رُک گئی۔ "کیوں؟"

"اس لیے کہ پولیس والے ایسی کاروں میں نہیں پھرتے۔"

"کار کی ضرورت نہیں تھی تو مجھے کیوں خواہ مخواہ ایک ایڈونچر کے لیے بھیج دیا تھا؟" اُس نے بگڑ کے کہا۔

"اُس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ پولیس ہمارے لیے خود گاڑی لے کر آ جائے گی۔"

"یہ کوئی عقل مندی کی بات نہیں ہو گی سکندر صاحب! وردی کی حد تک تو ٹھیک ہے، اس لیے کہ دن میں یہ سیاہ پوشی شکوک پیدا کرتی ہے اور مجبوری یہ ہے کہ بدلنے کے لیے اور کوئی لباس نہیں مگر پولیس کی گاڑی استعمال کرنے میں خطرہ بڑھ جاتا ہے۔" نازو نے کہا۔

میں نے کہا۔ "خطرہ کیسا، گاڑی پولیس کی اور ہم پولیس میں...!"

"اس کار کے چھینے جانے کی رپورٹ ابھی تک نہیں ہوئی... لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ اس پولیس موبائل وین کا دوسری گاڑیوں سے یا اپنے ہیڈکوارٹر سے رابطہ ہو۔ اگر کسی کو جواب نہ ملا تو اس گاڑی کی تلاش شروع ہو جائے گی۔ ہم چند منٹ میں پکڑے جائیں گے، اسی سڑک پر پولیس کی بہت سی گاڑیاں پھر رہی ہیں۔"

"تم نے تو مجھے دہشت زدہ کر دیا ہے۔" میں نے کہا۔ "اب دیر کیوں کر رہی ہو، کیا پکڑوانا چاہتی ہو مجھے، خدا کے لیے جلدی کرو۔"

میں نے ٹرک میں چڑھ کے غالب اور محسن کو ڈبّوں کے درمیان سے اُٹھایا اور سہارا دے کر کار تک لے گیا۔ آزادی کے احساس اور تحفظ کے یقین سے ان کا نفسیاتی اعتماد اس حد تک بحال ہو گیا تھا کہ وہ خوفزدہ نہیں تھے اور پُراُمید نظر آنے لگے تھے۔ ان کے چہروں پر نقاہت اور تھکن کے باوجود مُسکراہٹ تھی۔

"یہ پولیس کی گاڑی یہاں کیوں کھڑی ہوئی ہے؟" محسن نے کہا۔

میں نے کہا۔ "ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں۔"

لیکن اس جواب نے محسن کو مطمئن نہیں کیا۔ "پھر تم نے پولیس کی وردی کیوں پہنی ہے؟"

میں نے کہا۔ "بھیس بدلنے کے لیے... مگر تم اپنے دماغ پر بوجھ مت ڈالو، اب فکر کی کوئی بات نہیں رہی، بہت جلد ہم اپنے گھر پہنچ جائیں گے۔"

"ہمارا گھر کہاں ہے؟" محسن نے یوں کہا کہ نہ یہ سوال تھا اور نہ کسی محرومی کے خیال کا اظہار، یہ فقط ایک حقیقت کا اعتراف تھا۔

"میرا مطلب ہے اُس جگہ، جہاں ہم سب رہتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"ہم سب کون؟" محسن بولا۔

"میں، نازو، رابعہ اور گل، تم اور غالب۔"

"بس؟ اور کوئی نہیں؟" اُس کے لہجے میں مایوسی تھی۔

"اور کون؟" میں نے کہا۔

"شہلا کہاں رہتی ہے اور میرا بیٹا، وہ نہیں ہیں یہاں؟"

"وہ... نہیں...!" میں نے کہا۔ "تم تو جانتے ہو وہ لاہور میں ہیں۔"

"پھر میرا گھر تو لاہور میں ہے نا۔" محسن نے کہا۔

مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ ابھی تک وہ ذہنی طور پر نارمل نہیں ہوا ہے اور اس کے لیے حال کے تمام حقائق سے منقطع ہو جانے والے ہر رشتے کو حسبِ سابق استوار کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔

جب نازو پولیس مین کی وردی میں نمودار ہوئی تو میں ہنس پڑا۔ وہ کچھ جھینپ کر میرے ساتھ آگے والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

"تم ڈرتے نہیں مجھ سے؟" نازو نے پلٹ کے غالب سے کہا۔

غالب مُسکرایا۔ "تم جیسے پولیس والے ہوں تو قانون کا بس اللہ ہی حافظ ہے۔"

میں نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے آگے پیچھے دیکھا اور موقع ملتے ہی سڑک پر ٹریفک کے بہاؤ میں شامل ہو گیا۔ سورج کے طلوع ہو جانے کے بعد دونوں جانب سے گاڑیوں کی آمد و رفت میں بہت اضافہ ہو گیا تھا۔ کار کی سائڈ میں بونٹ پر لگے ہوئے آئینے میں مجھے پولیس کی وین اور دودھ والے کا ٹرک بھی دکھائی دے رہے تھے جو آہستہ آہستہ اتنے پیچھے رہ گئے کہ دوسری گاڑیوں کے درمیان غائب ہو گئے۔

غالب کی بات پر میں نے کہا۔ "قانون کا ویسے بھی بس اللہ ہی حافظ ہے۔"

غالب نے کہا۔ "تم جیسے گل اندام اور نازک بدن پولیس مین کے سامنے کس کافر کا دل نہ چاہے گا کہ کچھ کرے۔ کوئی قابلِ دست اندازیٔ پولیس جرم..."

میں نے کہا "تم جیسے عادی مجرم کا دل تو مچل رہا ہوگا مگر خدا کے لیے ابھی کچھ مت کرنا۔"

"نازو کو نازک سمجھا تو پھر وہی ہوگا جو پہلے ہوتا تھا۔" نازو نے ہنس کے کہا۔

"اور جو تمھیں دیکھ کے جی اٹھے ہیں اُن کو مار کے کیا ملے گا تمھیں؟" غالب نے سرد آہ بھر کے کہا۔

محسن بدستور گم صم بیٹھا ہوا نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔ اس کے سامنے میں اسیری کے دور کی کوئی بھی بات کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن وہ خود ابھی تک اپنے احساس کی اذیت سے نجات پانے کی کوشش میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ غالب کی حالت بہت بہتر تھی اور میں دیکھ رہا تھا کہ نازو کی موجودگی اس کے لیے کس حد تک اطمینانِ قلب کا باعث ہے۔ محسن نے بھی شہلا ہی کو یاد کیا تھا اور میں یقین سے کہہ سکتا تھا کہ وہ ہوتی تو محسن کا ذہن خوف کے آسیب سے نکل آتا۔

رات کے ساتھ ہی ایک بھیانک خواب ختم ہوگیا تھا۔ یہ ظلم و جور کی وہ شب تھی جو قربت کی سحر کے ساتھ ہی ختم ہو چکی تھی۔ بچھڑے ہوئے قافلے کے رفیقان سفر پھر ایک ساتھ تھے اور پھر سوئے منزل گامزن ہو سکتے تھے۔

مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ میں نے اور نازو نے جو دعویٰ کیا تھا اسے تائید خداوندی حاصل ہوئی اور ہم واقعی صبح ہونے سے پہلے محسن اور غالب کو دشمن کی قید سے نکال لائے۔ تریوینی جیسے عیّار اور دلاور جیسے سفّاک شکاری کا ہمارے خلاف متحد ہو جانا ہمارے خلاف تقدیر کی ایک خطرناک سازش ثابت ہونے لگی تھی۔ ان کے جال بہت مضبوط تھے اور انھوں نے بدمعاشی کے سارے وسائل ایک مشترک مقصد کے لیے استعمال کرتے ہوئے ہمارے راستے ہر طرف سے بند کر دیے تھے۔ ان کی شکارگاہ تک پہنچنا ہی بڑی بات تھی۔ ہم وہاں جا کے خود بھی سلامتی کے ساتھ لوٹ آئے اور اپنے ساتھ انھیں بھی لے آئے جو ناقابلِ تسخیر حصاروں میں مقیّد تھے۔

نازو نے اچانک کہا "کیا واپس اُسی ہوٹل میں جانے کا ارادہ ہے؟"

میں چونک پڑا "وہاں کیسے جا سکتے ہیں ہم...؟"

نازو نے کہا "جا تو اُسی راستے پر رہے ہیں آپ۔"

میں نے کہا "راستہ کہیں بھی بدل جاتا ہے بی بی! تم فی الحال یہ سوچو کہ اس فتح کی خبر گل اور رابعہ کو کیسے دی جائے؟"

"رابعہ اور گل کہاں ہیں؟" غالب نے کہا۔

"ہوٹل میں، وہ صبح سے سخت بے چین ہوں گی۔" میں نے کہا۔

"وہ رات بھر بے چین رہی ہوں گی۔ انھیں نیند کہاں ہوگی۔" نازو نے کہا "ایسا کرتے ہیں کہ خود جا کے انھیں لے آتے ہیں۔"

"اس حلیے میں؟" میں نے کہا۔

نازو نے افسوس سے اپنی وردی کو دیکھا "یہ حلیہ بھی تو جا سکتا ہے۔"

میں نے کہا "ابھی دکاندار سو کے بھی نہیں اٹھے۔ ایک آسان طریقہ ہے۔ کل جو اتنی ڈھیروں شاپنگ کی تھی سب نے، کیا وہ کپڑے کافی نہیں ہیں۔ رابعہ اور گل کو فون کر دیتے ہیں کہ جب وہ آئیں تو اپنے ساتھ لے آئیں۔"

"کہیں انھوں نے تم سے فون پر رابطہ قائم کرنے کی کوشش نہ کی ہو!" نازو نے کہا "بڑی پریشانی میں مبتلا ہوں گی ہیں وہ...؟"

نازو کا اندیشہ بے سبب نہیں تھا۔ ہم نے ہوٹل میں بہت گڑبڑ پھیلائی تھی۔ یہ ہو سکتا تھا کہ جو بھی مجھ سے رابطہ قائم کرے اسے میرا ساتھی تسلیم کر لیا جائے اور پولیس فون کال سے پتا چلا لے کہ فون کس نے کہاں سے کیا تھا۔ میرے لیے اس اندیشے کے خلاف اُمید کا سہارا بہت تھا۔ مجھے اس بات کا امکان بہت کم نظر آتا تھا کہ صبح ہونے تک ہوٹل کی انتظامیہ کو ہماری کارگزاری کا علم ہو جائے۔ بفرضِ محال ایسا ہوا تو ہوٹل والے فوراً پولیس کو اطلاع نہیں کریں گے۔ کسی بھی اچھے ہوٹل سے پولیس کو دُور ہی رکھا جاتا ہے اور انتظامیہ تمام قانونی و غیر قانونی معاملات سے خود نمٹنے پر قادر ہوتی ہے۔ ناگزیر حالات میں وہ پولیس کو بلانے سے پہلے تمام عواقب کا جائزہ لیں گے اور پولیس بھی جفا پیشہ محبوب سے بہرحال کم نہیں ہوتی کہ آتے آتے بھی نہ آنے کے ہزار بہانے تلاش کرتی ہے اور اس کا آنا بھی قیامت کے آنے سے کم نہیں ہوتا۔ آنے کے بعد جب وہ ضابطے کی کارروائی شروع کرتے ہیں تو ستم کش انتظار قسمت کو روتا ہے کہ مجھ پر احسان جو نہ کرتے تو یہ احسان ہوتا۔ اتنی مستعدی تو ابھی ولایتی پولیس کی تفتیش میں ملتی ہے کہ فون کال ختم ہونے سے پہلے کال کرنے والے کو جا پکڑتی ہے اور مجرم فون پر تین منٹ سے لمبی بات نہیں کرتے۔

ایک پی سی او کا بورڈ دیکھتے ہی میں نے کار کی رفتار کم کی اور ٹیلی فون کے نشان والے کھمبے سے چالیس قدم پر ہی روک لی۔

"تم کو میں اپنا جانشین بناتا ہوں۔" میں نے نیچے اُتر

تے ہوئے کہا "میرے جانے کے بعد خدانخواستہ کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے تو میری فکر مت کرنا، سب کو بھگا لے جانا۔"

"ایسی ویسی بات کیا ہوگی اور کیوں ہوگی؟" نازو نے کہا۔

میں نے کہا "بزرگوں نے آخر کیوں کہا ہے کہ مصیبت بھی بتا کے نہیں آتی۔"

نازو میری جگہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی "بزرگوں کا لحاظ کرتے ہوئے تمھاری بات مان لیتی ہوں مگر یہ تو بتا جاؤ کہ ان دونوں کو بھگا کے کہاں لے جاؤں بلکہ تینوں کو۔"

"یہ تیسرا کون ہوگا؟ میں تو فون کرنے جا رہا ہوں؟"

"تیسرا کار کا مالک ہے جو ڈکی میں رکھا ہوا ہے۔"

میں نے کہا "تم کو سپنا ریسٹورنٹ یاد ہے؟"

نازو نے سر ہلایا "چرچ گیٹ پر، راستہ تو یاد نہیں مگر میں راستہ پوچھ کے پہنچ سکتی ہوں۔"

"بس تو پھر وہیں پہنچ جانا، اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو۔"

"اور تم...؟"

"ظاہر ہے میں وہاں آجاؤں گا، ہم سب کو غیر متوقع صورتِ حال کے لیے بھی تیار ضرور رہنا چاہیے۔" میں نے کہا "اب رابعہ اور گل کی مثال لو۔ ایک اجنتا ہوٹل میں ہے تو دوسری ریویرا میں۔ ہم نے غلطی یہ کی تھی کہ ان کو کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔"

"کیا نہیں بتایا تھا؟"

"یہی کہ اگر ہم صبح تک لوٹ کے نہ آئیں تو پھر انھیں کیا کرنا چاہیے؟"

"اچھا اب تم جاؤ پہلے ہی بہت وقت ہو گیا ہے۔ میرا اور اپنا نہ سہی، ان دونوں کا ہی کچھ خیال کرو۔" نازو نے کہا۔

ٹیلی فون کال آفس تک جاتے ہوئے میں نے اپنی حالت پر غور کیا اور کن انکھیوں سے یہ دیکھنے کی کوشش بھی کرتا رہا کہ میری اس ہیئت کذائی سے لوگ کس حد تک محظوظ ہو رہے ہیں مگر مجھے مایوسی ہوئی۔ کوئی میری طرف متوجہ ہی نہیں تھا۔ اپنی اپنی مصروفیات کے جنجال میں پھنسے ہوئے لوگ راہ چلتے ہوئے ساری دنیا سے بے نیاز تھے۔ وہ اگر سوچ رہے تھے تو صرف اپنی ذات سے تعلق رکھنے والے مسائل کے بارے میں۔ ان کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں تو صرف راستہ دیکھنے کے لیے اور یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ صحیح سمت میں جائیں، کھلے گٹر میں نہ گریں اور پاگل کتے سے نہ ٹکرائیں۔ ان کے ذہن میں صرف یہ تھا کہ ان کو کہاں پہنچنا ہے، کس بس میں سوار ہونا ہے اور کس وقت کیا کرنا ہے۔ وہ کسی بھی دوسرے شخص کے چہرے یا حلیے کو نہیں دیکھ رہے تھے۔

میری پتلون اوپر سے بھی اتنی ہی ڈھیلی تھی جتنی نیچے سے۔ اوپر کے حصے کو میں نے بیلٹ ٹائٹ کر کے اپنی کمر کے مطابق کر لیا تھا مگر اس طرح پتلون درمیان سے پھول کر کسی جوکر کے لباس کی طرح ہو گئی تھی۔ اس طرح قمیص بھی سمٹ کر پتلون میں داخل تو ہو گئی تھی مگر دیکھنے والا اندازہ کر سکتا تھا کہ وہ میرے سائز سے کتنی بڑی ہے۔

فون ایک سکھ فوٹوگرافر کی دکان میں لگا ہوا تھا۔ سکھ اسٹول پر آلتی پالتی مارے بیٹھا ہوا گرنتھ صاحب کا پاٹھ کر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے گرنتھ صاحب کو ایک طرف رکھ دیا اور بڑے جارحانہ انداز میں کھڑا ہو گیا۔

"کیا بات ہے، فوٹو اُتروانی ہے مفت میں؟"

میں نے کہا "نہیں، مجھے فون کرنا ہے۔"

"مفت میں؟" اُس نے زیادہ جارحانہ لہجے میں کہا "اوئے سنتری بادشاہ، چل پھوٹ اِدھر سے، میں تیری وردی سے ڈرنے والا نہیں ہوں۔ تھانے چلنا ہے تو چل، میں پہلے بھی دو بار تھانے جا چکا ہوں مگر مفت کال نہیں کرنے دی کسی کو میں نے، خواہ کوئی پولیس کمشنر کا باپ ہو۔"

میں نے کہا "سردار جی! میں نے تو نہیں کہا کہ میں مفت میں فون کرنے آیا ہوں۔"

سردار جی نے تھوڑا سا لہجہ بدل کے کہا "اچھا تو پھر پہلے پیسے نکال، تیس پیسے رکھ اِدھر۔"

میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا مگر اس وردی کی ہر جیب تو میں نے خود ہی خالی کی تھی اور جیب سے نکلنے والی ہر چیز وہیں چھوڑ دی تھی سوائے ریوالور کے۔ میں نے ہر جیب ٹٹولی کہ شاید کسی میں سے ریزگاری نکل آئے یا کوئی ایک روپے کا مڑا تڑا نوٹ برآمد ہو جائے۔ سردار جی بڑی طنز آمیز اور معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ میری صورت کو دیکھتے رہے جس پر اب خفت کے آثار عیاں تھے۔ میں نے خود کو جھوٹا ثابت کر دیا تھا۔ میری جیب میں ایک پیسہ نہیں تھا اور میں نے دعویٰ کیا تھا کہ میں فون کال کے پیسے دوں گا۔

"کیوں، کیا ہوا؟" سردار جی بولے۔

"وہ... میرا خیال ہے۔" میں نے کہا۔

"کہ مجھے پیسے لانا یاد نہیں رہا۔" سردار جی نے میرا تمسخر اُڑاتے ہوئے کہا "گھر سے چلتے وقت پرس بھول گیا، ابھی کوئی اسامی نہیں پھنسی جس سے مال ملتا... اوئے! چل بھاگ اِدھر سے مفت خورے، میں تو دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا۔"

میں نے دھڑ سے کاؤنٹر پر ہاتھ مارا "سردار جی! قانون

کو مشتعل مت کرو، ہم سرکاری وردی میں ہیں اور سرکاری ڈیوٹی کے لیے سرکاری فون استعمال کرنے کا حق رکھتے ہیں۔"

"چل اوئے جا، حق دا پتر۔"

مَیں نے کہا "تم قانون کی راہ میں ٹانگ اڑا رہے ہو۔ پولیس کو اولئے فرض سے روک رہے ہو، یہ کتنا سنگین جرم ہے۔"

"سنگین جرم ہے تو مجھے چڑھا دے پھانسی لیکن فون تو مَیں مُفت میں نہیں کرنے دوں گا تجھے۔" سردار جی نے کہا۔

"مَیں یہ فون کٹوا دوں گا۔" مَیں نے دہاڑ کر کہا۔

سردار جی نے کہا "اوئے مَیں گردن کٹوا دوں گا۔"

مَیں نے کہا "اچھا تم میری کوئی چیز رکھ لو مثلاً یہ گھڑی۔"

"تاکہ تھوڑی دیر بعد تُو وارنٹ لے کر آجائے، چوری کی گھڑی برآمد کرنے۔ اوئے کاکا مَیں تیرے چکر میں آنے والا نہیں ہوں۔ بس بات ختم۔ . . تیس پیسے ہیں تو فون کر لے ورنہ دوڑ جا۔"

مَیں نے اسے سخت خوں آشام نظروں سے گھورا مگر وہ متاثر نہیں ہوا۔ مجھے سخت کوفت ہو رہی تھی کہ تیس پیسے کی حقیر رقم کی خاطر وہ مجھ پر اعتبار کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اگر مَیں پولیس کی وردی میں نہ ہوتا تو شاید وہ مجھے شریف آدمی سمجھ کے اُدھار بھی کر لیتا مگر پولیس کے معاملے میں وہ اعتبار کا رِسک لینے پر تیار نہ تھا۔ اب مجھے واپس گاڑی تک جا کے پیسے لانے تھے، ورنہ مَیں فون نہیں کر سکتا تھا۔ گرد و نواح میں دوسرا کوئی پبلک کال آفس نظر ہی نہیں آرہا تھا اور ہوتا تو وہاں خالی ہاتھ جانے سے یہ صورتِ حال پھر پیدا ہو جاتی۔

مَیں احتجاجی انداز میں مارچ کرتا ہُوا واپس گیا۔

"بات ہو گئی؟" نازو نے پوچھا۔

"ہاں، مگر بات بنی نہیں، وہ خبیث کہتا ہے کہ پہلے تیس پیسے لاؤ۔" مَیں نے کہا۔

"کون خبیث؟" نازو نے کہا۔

"جس کا فون ہے، ایک روپیہ دو مجھے۔"

"میرے پاس روپیہ کہاں ہے؟" نازو نے کہا۔

روپیہ غالب یا محسن کے پاس بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ مجبوراً مجھے سُوٹ کیس کھولنا پڑا جس میں نو لاکھ سے زیادہ کی رقم ابھی تک محفوظ تھی۔ ایک روپے کا نوٹ اس میں بھی نہیں تھا۔ سب سے چھوٹا نوٹ پچاس روپے کا ملا۔ مَیں پچاس کے نوٹ کو لہراتا ہُوا پھر سردار جی کی دُکان میں داخل ہُوا۔

"یہ لو پیسے۔" مَیں نے پچاس کا نوٹ کاؤنٹر پر رکھ کے فون اپنی طرف کھینچ لیا۔ سردار جی نے نوٹ کو روشنی کے رُخ کر کے اس کے اصلی، نقلی ہونے کی تصدیق شروع کی اور مَیں نے اجنتا ہوٹل کا نمبر ملایا اور پھر آپریٹر سے موہنی دیوی کے کمرے کا نمبر مانگا۔

چند سیکنڈ کے بعد رابعہ نے کہا "ہیلو۔"

مَیں نے کہا "اس کا کیا مطلب ہُوا، نہ سلام نہ دُعا۔"

رابعہ نے خوشی سے چیخ ماری "سکندر! کہاں ہو؟"

"ہم عالمِ بالا سے بول رہے ہیں۔" مَیں نے کہا۔

"یہ کیا مذاق ہے، محسن اور غالب کہاں ہیں؟"

مَیں نے کہا "وہ بھی اپنے ساتھ ہیں، تم کو نظر نہیں آ رہے، ساتھ ہیں تو بات کراؤ۔" رابعہ نے کہا۔

"بات کرنی ہے تو خود آجاؤ، فون پر بات نہیں ہو سکتی۔"

"کیوں نہیں ہو سکتی۔" رابعہ نے برہمی سے کہا۔

"ایک بڑی غلط چیز موجود ہے یہاں۔" مَیں نے سردار جی کی طرف دیکھ کے کہا "اس کے علاوہ ابھی تمھیں صرف یہ بتانا تھا کہ تم دونوں اب نکل آؤ، زیور کپڑے سب ساتھ لے کر۔ سپنار ریسٹورنٹ دیکھا ہے نا تم نے، فوراً آجاؤ۔"

سکھ نے مجھ سے ریسیور چھین کے نیچے رکھ دیا "تیس پیسے پورے ہو گئے پورے۔"

مَیں نے مشتعل ہو کے کہا "لائن کیوں کاٹی، مَیں تیس پیسے اور دوں گا۔"

"مَیں فون کا غلط استعمال نہیں کرنے دوں گا، تیس پیسے کیا تم تیس لاکھ روپے دو تب بھی۔" سردار جی نے کہا۔

"کیا غلط استعمال کیا ہے مَیں نے فون کا!" مَیں نے چلّا کے کہا "کیا مَیں نے فون اُلٹا پکڑ رکھا تھا؟"

"تم نے ایک لڑکی سے بات کی، اُس سے کہا کہ دوسرے کے ساتھ گھر سے بھاگ آئے، سارے زیور کپڑے لے کر۔ اور تم سے سپنار ریسٹورنٹ میں ملے۔ بدمعاشی کرتے ہو وردی پہن کے اور پرسے پوچھتے ہو فون کا کیا غلط استعمال کیا۔" سردار جی بھی چلّانے لگا۔

مَیں نے کہا "تم ماما لگتے ہو لڑکیوں کے؟"

اُس نے خفگی سے کہا "ہوش میں رہ کے بات کرو، بدمعاشی مت کرو۔"

"کیا؟" مَیں نے چلّا کے کہا "مَیں بدمعاش ہُوں؟ مجھے نہیں، تم نے اس وردی کو گالی دی ہے۔"

"یہ وردی تم کو کس اُلّو کے پٹھے نے دی ہے؟" سردار جی نے بھی چلّا کے کہا۔

"تم نے پولیس کمشنر کو اُلّو کا پٹھا کہا۔" مَیں نے ہوا میں مُکّا لہرا کے کہا "مَیں کیس کر دوں گا تم پر۔"

"مَیں پہلے ہی تین کیس لڑ رہا ہوں پولیس کے خلاف۔ پیسے واپس کرو۔" مَیں نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"اچھا! میرے پیسے واپس کرو۔" مَیں نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

سردار جی نے انچاس روپے مختلف درازوں میں سے اکٹھے کیے پھر جیب میں سے پچاس پیسے نکالے۔ اکیس پیسے اب بھی کم تھے۔

"جاؤ کہیں سے کُھلا لے کر آؤ۔" سردار جی نے کہا۔

"یہ میرا کام نہیں ہے۔" مَیں نے کہا "کُھلا نہیں تھا تو نوٹ لیا کیوں تھا؟"

"صبح صبح پچاس کا کُھلا کون دے گا، بیس پیسے بعد میں لے جانا۔" سردار جی نے کہا۔

"بیس میل دُور سے مَیں بیس پیسے لینے کے لیے پھر آسکتا ہُوں۔" مَیں نے کہا "ٹیکسی کا آنے جانے کا کرایہ دے دو تو آجاؤں گا ورنہ ابھی لے کر جاؤں گا۔"

"چلو تم ایک کال اور کر لو، بیس پیسے میں۔"

"ٹھیک ہے اپنے گھر کا نمبر بتاؤ۔" مَیں نے کہا۔

"میرے گھر کس کو فون کرو گے اور کیا کہو گے . . . ؟"

مَیں نے کہا "جو میرا دل چاہے گا کہوں گا۔"

سردار جی سخت اشتعال کے عالم میں دُکان سے باہر گئے اور بیس پیسے لے کر لوٹے، وہ سکّے میرے سامنے پھینکتے ہوئے انھوں نے کہا "خبردار! جو پھر کبھی میری دُکان میں قدم رکھا۔"

مَیں نے کہا "مَیں ابھی واپس آتا ہُوں اور دیکھتا ہُوں تم مجھے کیسے روکتے ہو، یہ پبلک فون ہے۔"

"تم پبلک نہیں، پبلک سرونٹ ہو۔"

مَیں نے کہا "مَیں سرکاری افسر ہُوں، تمھاری لائن کٹوا دوں گا۔"

"اوئے مَیں گردن کٹوا دوں گا مگر تیری ٹانگیں توڑ دوں گا اگر تو پھر یہاں آیا، سرکاری افسر دے پتر۔" ان کی یہ آخری بات مَیں نے دُکان سے باہر آنے کے بعد سُنی اور بڑی مشکل سے اپنی ہنسی کو ضبط کیا۔ سردار جی خبطی تھے اور گردن کٹوانے کے خاصے شوقین معلوم ہوتے تھے۔

نازو نے مجھے دیکھتے ہی خفا ہونا شروع کیا "آخر یہ کیا مصیبت ہے، اتنی دیر لگتی ہے ایک فون کال میں، آدھا گھنٹا لگا دیا۔"

مَیں نے اُس کے ساتھ بیٹھ کے کہا "اگر غالب تمھیں فون کرتا تو ایک گھنٹا بھی تمھیں کم لگتا۔"

غالب نے کہا "مَیں فون کیوں کرتا، ایک گھنٹے میں دو بار تو بِل آتا۔"

نازو نے گاڑی چلاتے ہوئے کہا "ہم عورتوں کو خواہ مخواہ بدنام کر دیا ہے کہ باتیں بہت کرتی ہیں۔"

مَیں نے کہا "اس آدھے گھنٹے کے بارے میں تم کیسے یہ کہہ سکتی ہو کہ صرف مَیں بولتا رہا۔ اُنتیس منٹ رابعہ بولی۔ مَیں نے اپنی بات ایک منٹ میں کہہ دی تھی۔ انصاف سے کہو کہ کیا مَیں اُسے بولنے سے روک سکتا تھا۔ غالب نے تو کہا ہے ؏ وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی۔"

"بھئی وہ مَیں نے اپنے لیے کہا تھا۔" غالب بولا "اور یہاں سے تو کچھ ایسا نظر آتا ہے جیسے تم اس سکھ کو مشرف بہ اسلام کرنے کے لیے دلائل دے رہے تھے یا وہ تمھیں سکھ بنانا چاہتا تھا پہلے۔"

"اور بعد میں؟" مَیں نے کہا۔

"بعد میں ممکن ہے گھر والا بنانے کی کوشش کرتا۔" نازو نے کہا "صورت سے تم اُسی کے ہم قوم نظر آرہے ہو اس وقت۔"

"وہ ایک اصول پرست سکھ تھا۔" مَیں نے کہا۔

سردار جی کی اور میری گفتگو کے احوال نے سب کو محظوظ کیا۔ نازو اپنے یقین کے سہارے سپنار ریسٹورنٹ کی طرف ہی جا رہی تھی اور کسی سے راستہ پوچھنے پر آمادہ نہ تھی۔

مَیں نے کہا "ایسے مت چلتی جاؤ، یہ نہ ہو کہ ہم مخالف سمت میں جا رہے ہُوں۔"

"پھر کیا ہُوا، دُنیا گول ہے۔ جب ہم زمین کے گرد چکر مکمل کریں گے تو راستے میں سپنار ریسٹورنٹ ضرور آئے گا۔ بس ذرا راستہ لمبا ہو جائے گا۔"

ابھی اس کی بات مکمل بھی نہ ہوئی تھی کہ پیچھے سے آنے والی ایک گاڑی نے بڑی تیز رفتاری کے ساتھ اور انتہائی خطرناک طور پر ہماری گاڑی کو اوورٹیک کیا۔ نازو نے تصادم کو بڑی مشکل سے بچایا۔ بریک لگا کے اُس نے گاڑی کو دائیں طرف کیا تو اُس کے اگلے پہیے فٹ پاتھ کی سائڈ سے ٹکرائے۔

میرے مُنہ سے اُس گاڑی والے کے لیے بے اختیار ایک گالی نکلی اور مَیں نے چلّا کے کہا "کیا نشے میں ہے اُلّو کے پٹھے؟"

اُلّو کا پٹھا ایک جاہل اور خونخوار قسم کا شخص تھا۔ اس نے مجھے گھُور کے دیکھا اور ایک دم بریک لگائے۔

"یہ تو لڑنے کے موڈ میں نظر آتا ہے۔" نازو نے تشویش کے ساتھ کہا۔

"غلطی اُس کی تھی . . ."

"تم کو کیا ضرورت تھی گالی دینے کی جب ہُوا کچھ نہیں۔" نازو نے کہا۔ اور اپنی گاڑی کو تھوڑا سا پیچھے کر کے سائڈ سے نکالنا چاہا مگر اتنی دیر میں وہ گاڑی سے اُتر کے سامنے آگیا۔ مَیں لڑنے بھڑنے کے موڈ میں بالکل نہیں تھا۔ اس کے تن و توش

اور خوفناک مونچھوں کے باوجود نازو بھی اس سے تیس سیکنڈ میں نمٹ لیتی۔

جب وہ سائڈ پر آیا تو میں نے کہا "دیکھو غلطی تم نے کی تھی مگر میں معافی مانگ لیتا ہوں۔"

جواب میں اُس نے بڑی غیر متوقع حرکت کی۔ اُس نے ایک دم پیچھے کا دروازہ کھولا اور محسن کو دھکیل کر اُس کے ساتھ فٹ ہو گیا۔ میں نے مشتعل ہو کے پیچھے دیکھا تو مجھے اس کے ہاتھ میں ایک انتہائی خطرناک قسم کا ریوالور دکھائی دیا، جس کا رُخ میرے سر کی طرف تھا۔

"گاڑی چلاؤ، میری صورت مت دیکھو کتے۔" اُس نے اکھڑ لہجے میں غرا کے کہا "ورنہ کھوپڑی سے دماغ باہر کر دوں گا، سمجھے، محمد خان نام ہے میرا لیکن خونی خان کہتے ہیں دُنیا والے مجھے، تم تو اچھی طرح جانتے ہو گے۔" اُس نے ایک فلمی ولن ٹائپ قہقہہ لگایا۔

بلاشبہ وہ آدمی صورت سے جرائم پیشہ اور خونی ہی نظر آتا تھا۔ نازو نے خاموشی سے اس کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی تھی۔ میں ابھی تک اُس شخص کو دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ ایک ہاتھ مار کے اس کی غلط فہمی دُور کر دوں لیکن اس کے تیور خطرناک نظر آتے تھے...... اُس کی بڑی بڑی آنکھوں کے لال ڈورے گواہی دے رہے تھے کہ وہ واقعی خونی خان ہے اور اگر میں نے اس سے ٹکر لی تو وہ میرا خون کرنے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کرے گا۔ اس کا چہرہ بھاری اور سیاہی مائل گندمی تھا۔ اس کی داڑھی گھنی سیاہ اور برابر تراشی ہوئی تھی اور اس کے چہرے کے جلال میں اضافہ کرتی تھی۔ یہ اُس کی مونچھیں تھیں جو اس کی صورت کو دہشت ناک بناتی تھیں۔ خود غالب اور محسن اس کو دلچسپی سے دیکھ رہے تھے، خوفزدہ وہ بھی نہیں تھے۔

"خونی خان! تم کہاں جانا چاہتے ہو؟" نازو نے پیچھے پلٹ کر دیکھے بغیر تمسخر آمیز انداز میں کہا۔

نازو کی آواز پر وہ چونکا "لڑکی... لڑکی ہے تُو؟"

میں نے کہا "اس میں اعتراض کی کون سی بات ہے؟"

"مذاق اُڑاتے ہو میرا تم لوگ، خدا کا شکر ادا نہیں کرتے کہ ابھی تک زندہ ہو، پولیس کے کتو۔" خونی خان نے غرا کے کہا "میں بے گناہ کو بے وجہ مارنے کا قائل نہیں۔ بائیں طرف چلو لڑکی۔"

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے کہ تم اصول کے قائل ہو مگر ایک غلط فہمی ہو گئی ہے تمھیں۔"

"تو نے یہ وردی کیوں پہن رکھی ہے؟" خونی خان نے میری بات سُنے بغیر نازو سے کہا "یہ لیڈی پولیس کی وردی نہیں ہے۔"

"ہم پولیس والے نہیں ہیں خان صاحب۔" میں نے کہا۔

"تم پولیس کے آدمی نہیں ہو؟" وہ بے یقینی سے بولا۔

"میں یہی غلط فہمی دُور کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن آپ نے میری بات نہیں سُنی۔" میں نے کہا۔

خونی خان نے غالب اور محسن کی طرف دیکھا "کیا یہ بھی زیرِ حراست مجرم نہیں ہیں، اب دائیں طرف موڑلو گاڑی کو۔"

میں نے مسکرا کے کہا "یہ زیرِ حراست تو ہیں مگر مجرم نہیں ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑی کہاں ہے۔"

"پھر یہ زیرِ حراست کیسے ہوئے، کیوں پکڑ رکھا ہے انھیں تم نے؟"

"ہم نے نہ انھیں پکڑ رکھا ہے نہ آپ کو۔" میں نے کہا "جس کا دل چاہے گاڑی رکوا لے اور اُتر جائے۔"

"تم پولیس والے نہیں ہو تو یہ وردی کہاں سے آئی، یہ کیا چکر ہے آخر، صاف صاف بات کرو۔" اس نے غرا کے اور کھنکار کے کہا "کون ہو تم لوگ؟"

میں نے کہا "بظاہر ہم اور آپ ایک ہی حمام میں نظر آتے ہیں۔ ہم بھی پولیس کی نگاہ میں مجرم ہیں اور یہ وردیاں ہم نے پولیس سے چھین کر پہن لی ہیں۔"

"جیل سے بھاگے ہو تم لوگ؟" اس نے ہم سب پر ایک مشتبہ نظر ڈال کے کہا "گاڑی تیز چلاؤ اور چوک سے سیدھے ہاتھ پر چلو۔"

میں نے اُس کی بات پر غور کر کے کہا "کچھ ایسا ہی سمجھ لو۔"

"تم نے کہا تھا یہ زیرِ حراست ہیں۔" وہ بولا۔

میں نے کہا "ہم سب دوست ہیں۔ دوستی کی زنجیر نے انھیں بھی ہمارے ساتھ باندھ رکھا ہے۔ یہ ریوالور اب جیب میں ڈال لو، باہر سے کسی نے دیکھا تو یہ صورتِ حال بہت غلط نظر آئے گی کہ خونی خان دو پولیس والوں کو گرفتار کر کے لے جا رہا ہے۔ یہ نہ ہو پولیس تمھیں پہچان لے یا ہمیں چھڑانے کے لیے پیچھے لگ جائے۔"

"پولیس میرے پیچھے لگی ہوئی ہے۔" خونی خان نے کہا "یہ لڑکی اچھی ڈرائیور ہے۔"

"میں نے کہا "یہ لڑکی نہیں، آسمانی بجلی ہے۔"

"کیا مطلب؟" وہ غرایا۔

میں نے کہا "جس پر گر جائے وہ کہیں کا نہیں رہتا۔ ابھی تک یہ تمھارے احکامات کی تعمیل کر رہی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ تم نے صرف خطرناک باتیں کی ہیں، کوئی خطرناک حرکت نہیں کی۔ اس ریوالور کا استعمال کر کے دیکھو پھر تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ خونی خان جس کی بالشت بھر لمبی مونچھیں ہیں، درحقیقت ایک چوہا ہے۔ اس کی مونچھیں بھی لمبی ہوتی ہیں۔"

"چوہا کہتا ہے مجھے۔" خونی خان نے چیخ کے کہا۔

"اگر تم اپنی طاقت آزمانا چاہتے ہو تو ہم گاڑی ایک طرف روک لیتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"خبردار جو گاڑی روکی۔"

"یہ لڑکی دو منٹ سے کم وقت میں ثابت کر دے گی کہ ریوالور تو بزدلوں کا کھلونا ہے۔ مقابلہ کرو گے اس سے خالی ہاتھ؟"

خونی خان مُسکرایا "بے وقوف بنانا چاہتے ہو مجھے باتوں سے، چالاک آدمی ہو تم مگر کسی خوش فہمی میں مت رہنا، چار قتل کر چکا ہوں میں....."

"صرف چار؟" میں نے مایوسی سے کہا "نام ہے خونی خان اور قتل صرف چار کیے ہیں۔"

اُس نے خفت کو چھپانے کے لیے کہا "چار تو میرے سامنے مر گئے تھے، جو زخمی ہو کے بعد میں مرے یا جن کو میں نے مرتے ہوئے نہیں دیکھا، ان کی تعداد بہت زیادہ ہو گی اور تم اسی طرح بک بک کرتے رہے تو پانچواں قتل تمھارا ہو گا، چھٹا اس لڑکی کا۔"

میں نے کہا "یعنی ان دونوں کو تم بخش دو گے جو تمھارے ساتھ بیٹھے ہیں، یہ تو بڑی غلط بات ہو گی۔ کیا تم ڈرتے ہو ان سے خان صاحب؟"

"بکواس بند کرو اپنی۔"

میں نے کہا "جب تمھیں اپنا اسکور آٹھ تک پہنچانے کا موقع مل رہا ہے تو تکلف کیسا، کُشتوں کے پُشتے لگا دو، سب کو صاف کر دو اور گاڑی لے جاؤ۔"

باتیں کرتے کرتے میں نے ایک ہاتھ مارا اور اس کا ریوالور اوپر اُچھل کے آگے آ گرا۔ اس کی کلائی پر خاصی چوٹ آئی تھی، ابھی وہ سنبھلا بھی نہ تھا کہ میں نے اُسے آگے کھینچ کر اُس کی گردن دبا لی۔ نازو نے اپنا ریوالور مجھے پکڑا دیا پھر اُس نے گاڑی روک لی اور خان کا ریوالور غالب کو دے دیا۔

"خونی خان! کیا خیال ہے اب؟" میں نے کہا "تھانے جاؤ گے یا اس لڑکی سے مقابلہ کرو گے؟"

خونی خان بُری طرح محصور ہو گیا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے حرکت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ایک طرف گاڑی کا دروازہ تھا اور دوسری طرف سے غالب نے اُسے دبا لیا تھا۔ وہ خود کو چھڑانے کے لیے پورا زور لگا رہا تھا اور گالیاں بک رہا تھا مگر اپنی کوشش میں ناکام تھا۔

"جلدی بولو۔" میں نے کہا "وقت کم ہے ہمارے پاس۔"

"مجھے چھوڑو تو سہی۔" اُس نے ہار مانتے ہوئے کہا۔

میں نے اس کی گردن چھوڑی تو اُس نے ایک لمبی گہری سانس لی۔ اسے اپنے سامنے اور بائیں جانب دو ریوالور دکھائی دیے۔ نازو نے ایک نقشہ اپنے سامنے پھیلا کے کچھ دیکھنا شروع کیا۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"بمبئی کا نقشہ۔" نازو نے سرسری انداز میں کہا۔

"یہ کہاں سے لیا تم نے؟"

"جب تم فون کرنے گئے ہوئے تھے تو ایک بک اسٹال پر نظر آ گیا تھا۔" غالب نے کہا "میں اخبار دیکھنے گیا تھا مگر یہاں تو سب اخبار ہندی میں چھپتے ہیں۔"

"پتا نہیں ہم کدھر آ گئے اس خبیث چوہے کی وجہ سے۔" نازو نے دانت پیس کر غصے سے خونی خان کو دیکھا۔

خونی خان کا چہرہ لال پڑ گیا "اگر یہ تیرے یار ساتھ نہ ہوتے اور ریوالور نہ ہوتے تو میں سبق سکھاتا تجھے۔"

میں نے اس کے مُنہ پر چانٹا مارا "چُوہے کی اولاد، ابھی جب تیرے ہاتھ میں تھا یہ ریوالور تو خونی خان بھی بہت بہادر بن رہا تھا مگر خیر، ہم یہ ریوالور ہٹا لیتے ہیں۔ اب یہ بتاؤ کہ تم کیا چاہتے ہو، انتخاب تمھارے ہاتھ میں ہے۔"

میں نے اور غالب نے ریوالور جیب میں ڈال لیے۔

"اب کچھ پتا نہیں چل رہا ہے راستوں کا۔" نازو نے کہا "میں نے نشان لگا لیا تھا نقشہ لینے کے بعد۔"

"لاؤ یہ مجھے دو۔" غالب نے کہا "میں دیکھتا ہوں۔"

"وہ انتظار کر رہی ہوں گی ہمارا۔" نازو نے نقشہ غالب کو تھما کے کہا اور خونی خان کی طرف دیکھا جو چانٹا کھانے کے بعد اپنا گال سہلانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خون اُترا ہوا تھا مگر وہ حیران تھا کہ ہم لوگ کون ہیں، جو نہ پولیس والے ہیں اور نہ رویے سے مجرم نظر آتے ہیں۔

میں نے کہا "چُوہے خان! مجھے تمھارے جواب کا انتظار ہے۔ بولو تھانے جاؤ گے یا مقابلہ کرو گے اس لڑکی سے؟"

خان پریشان نظر آنے لگا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں نے یہ سوال سنجیدگی سے کیا ہے۔ غالب بڑے انہماک سے سینار ریسٹورنٹ پہنچنے کا راستہ تلاش کر رہا تھا اور نازو کو نقشے کی مدد سے بتا رہا تھا کہ اب کس طرف سے وہاں پہنچنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ محسن بالکل خاموش تھا اور سیٹ کی پُشت پر سر رکھے آنکھیں بند کیے پڑا ہوا تھا۔ نازو نے پھر گاڑی اسٹارٹ کی۔

"دیکھو، میں تمھیں پولیس سمجھ کے غلطی سے تمھاری گاڑی

میں بیٹھ گیا تھا۔ خان نے کہا۔

"وہ غلطی ہم نے معاف کی" میں نے کہا "مگر یہ بات ناقابلِ فہم ہے کہ تم نے لفٹ لینے کے لیے پولیس کی گاڑی میں بیٹھنا پسند کیا جب کہ پولیس تمھارے تعاقب میں تھی۔"

"میرا مقصد یہ تھا کہ تمھیں یرغمال بنا لوں اور اگر پولیس مجھے روکے تو میں تمھیں جان سے مارنے کی دھمکی دے کر نکل جاؤں، جب وہ دیکھتے کہ دو پولیس والے میرے قبضے میں ہیں تو وہ گاڑی پر فائرنگ نہیں کر سکتے تھے۔"

میں نے سر ہلا کے کہا "تمھاری بات سمجھ میں آتی ہے، یہ ایک اچھا پلان تھا۔ میں تم سے یہ نہیں پوچھوں گا کہ پولیس تمھارے تعاقب میں کیوں تھی کیونکہ وقت نہیں ہے ہمارے پاس۔"

"میں ایک مشہور ڈاکو ہوں۔" خان نے کہا "کیا تم نے میرا نام کبھی نہیں سنا؟"

"افسوس کہ ہم اس سعادت سے محروم رہے۔ مجھے میرے سوال کا جواب چاہیے۔" میں نے کہا "کیا کرو گے تم اب؟ مقابلہ یا خود کو پولیس کے حوالے؟"

"پولیس کے حوالے کیسے کر سکتا ہوں میں خود کو۔" وہ زہریلے لہجے میں بولا "اور تم بھی مجھے پولیس اسٹیشن کیسے لے جا سکتے ہو؟"

"تمھیں پولیس کے حوالے کرنے کے لیے ہمارا پولیس اسٹیشن جانا ضروری نہیں۔" میں نے کہا "ہم تمھیں گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر دھکا دے سکتے ہیں۔ تمھیں ناک آؤٹ کرنے کے بعد۔ راستے میں کئی جگہ پولیس نظر آئے گی۔ پولیس کی چوکیاں بھی ہوں گی، وہ خود اُٹھا کے لے جائیں گے تمھیں۔"

"خدا کے لیے ایسا مت کرنا۔" وہ پہلی بار التجا کرنے پر مجبور نظر آیا۔

"ٹھیک ہے، تم اس لڑکی سے مقابلہ کر لو۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

میں نے بڑی تیزی سے اس کے دوسرے گال پر چانٹا مارا۔ "ابھی کچھ دیر پہلے کیا کہا تھا تم نے کہ تیرے یار ساتھ نہ ہوتے اور ان کے ہاتھ میں ریوالور نہ ہوتے تو تم اس لڑکی کو سبق سکھاتے۔ ہم تمھیں موقع دے رہے ہیں کہ جو کہا تھا وہ کر کے دکھاؤ۔ نہ ہم دخل دیں گے اور نہ ریوالور استعمال کریں گے۔"

"خونی خان ایک لڑکی سے مقابلہ کرے تو اس پر ہزار بار لعنت۔" وہ مشتعل ہو کے بولا "تم خود آؤ مقابلے پر۔"

میں نے کہا "میری باری بعد میں آئے گی، پہلے تم اس لڑکی سے نمٹ لو چوہے خان!"

"یہاں، سڑک پر؟"

"نہیں، اس کے لیے ہم جگہ تلاش کر لیں گے۔ ابھی نہیں، ابھی تو ہم کہیں جا رہے ہیں کسی سے ملنے کے لیے۔"

"تو تم جاؤ، مجھے چھوڑ دو۔" وہ بولا۔

"ایسے ہی چھوڑ دیں۔ کیا تم نے سُنا نہیں کہ آنا اپنی مرضی سے ہوتا ہے مگر جانا دوسرے کی مرضی سے۔" میں نے کہا۔

وہ بہت نامی گرامی ڈاکو تھا یا نہیں تھا، اس بارے میں ہم سب کچھ نہیں جانتے تھے کیونکہ ہم پردیسی تھے۔ ابھی جو شخص ہمارے سامنے تھا وہ صورت سے ضرور خطرناک لگتا تھا لیکن انتہائی بے بسی اور مجبوری نے اسے بزدل بنا دیا تھا۔ خونی خان کہلانے والا مجھ سے دو طمانچے کھا چکا تھا، اپنا اسلحہ کھو بیٹھا تھا اور اب ہمارے رحم و کرم پر تھا۔ شاید اس کے لیے سب سے مضحکہ خیز بات یہ تھی کہ اسے ایک لڑکی سے مقابلے پر مجبور کیا جا رہا تھا۔ اسے وہ اپنی مردانگی کی توہین سمجھتا ہوگا۔ بصورتِ دیگر اس کے لیے پولیس کا ہوا تھا۔ گویا آگے کھائی اور پیچھے خندق دکھا کے ہم اسے مجبور کر رہے تھے کہ کھڑے مت رہو، آگے چلو یا پیچھے جاؤ۔ شاید لوگ اس کے نام سے خوف بھی کھاتے ہوں گے مگر یہاں اس کا واسطہ ایسے لوگوں سے پڑا تھا جو اس کو چوہے خان کہہ کے مزید ذلیل کر رہے تھے۔

اس کے گاڑی میں بیٹھنے تک میرے ذہن میں کوئی ایسی ویسی بات نہ تھی۔ اگر وہ خود اپنا تعارف نہ کراتا تو میں بہت پہلے ہی اس کو چلتی گاڑی سے ڈراپ کر دیتا مگر اس نے بتایا کہ وہ ڈاکو ہے تو میں نے اُسے بلیک میل کر کے استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

"یہ آخر تم لوگ مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟" خونی خان نے کچھ دیر بعد پریشان ہو کے پوچھا۔

میں نے کہا "جب تم ہماری کشتی میں آ کودے ہو تو اب جو بھی ہو۔ نیا ڈوبے یا پار لگے۔"

اُس نے کہا "تم مجھے وہاں چھوڑ دو جہاں میں جانا چاہتا تھا، اس کا تمھیں منہ مانگا معاوضہ دوں گا میں۔"

میں نے کہا "اندازاً کتنا؟"

اُس نے کہا "تمھاری توقع سے بہت زیادہ۔"

میں نے کہا "ایک کروڑ، یا اس سے بھی زیادہ؟"

اس کا منہ کھلا رہ گیا "لاکھ سے اوپر کی مت سوچو۔"

"تم نے منہ مانگے کی بات کی تھی، پہلے ہی بتا دیتے کہ ایک لاکھ سے زیادہ کی اوقات نہیں ہے تمھاری۔"

"میری اوقات کی بات بھی مت کرو، دس لاکھ کا انعام ہے میری گرفتاری پر، مجھے زندہ یا مُردہ پیش کرنے پر۔"

بے اختیار نازو نے بھی اُسے پلٹ کر دیکھا اور ہنس پڑی۔

"ہنستی کیوں ہے لڑکی، کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں؟" وہ برہم ہو کے بولا۔

"ہنسی مجھے اس بات پر آ رہی ہے کہ تم جتنے بڑے ڈاکو ہو اتنے بڑے احمق بھی ہو۔" نازو نے کہا "تم ایک لاکھ دینے کی بات بھی کرتے ہو اور یہ بھی بتا رہے ہو کہ تمھارے سر کی قیمت دس لاکھ ہے جو ہمیں پولیس سے مل سکتی ہے۔"

وہ کچھ جھینپ کر بولا "مگر تم دس لاکھ پولیس سے کیسے لے سکتے ہو؟ میرا مطلب ہے لو گے کیسے؟"

میں نے کہا "تمھیں پیش کر کے، یہ کیا مشکل کام ہے؟"

"تمھارے لیے مشکل ہے۔" وہ بولا۔

"ہم سب کے لیے مشکل ہو سکتا ہے مگر ہمارے کچھ اور بھی ساتھی ہیں۔ وہ تمھیں لے جا سکتے ہیں اور شرط زندہ پیش کرنے کی نہیں ہے تو پھر کیا مشکل ہے، تمھارا جنازہ ہی تھانے لے جانا ہوگا۔"

نازو نے کہا "وہ بھی ہم نہیں اُٹھائیں گے، میونسپلٹی کی گاڑی یا گدھا گاڑی لے جائے گی۔"

یکلخت خان کو جلال آ گیا "اور اس کے بعد کیا ہوگا؟ یہ بھی سوچا ہے تم نے؟"

میں نے کہا "ہاں، دس لاکھ ہم آپس میں بانٹ لیں گے، بحساب دو لاکھ روپے فی کس۔"

"اگر یہ اتنا آسان ہوتا تو اب تک کئی لکھ پتی ہو جاتے مگر کس میں ہے اتنی ہمت کہ خونی خان کی زندگی کا سودا کرے۔ دس لاکھ تو بہت بعد میں ملیں گے کسی وارث کو، اگر کوئی وارث بچا۔ تین سُور کے بچوں نے لانچ میں مخبری کی تھی، راتوں رات اُن کا خاندان غائب ہو گیا۔ تم بھی پہلے آزما لو، کسی کو پولیس کے پاس بھیج کر دیکھو، وہ جا کے صرف اتنا کہے کہ اسے خونی خان کے بارے میں یہ معلوم ہے کہ وہ آج کل کہاں ہے، اگر وہ واپس آ جائے تو میرا ذمہ۔"

"کیا اُسے تھانے والے خود فوراً پھانسی چڑھا دیں گے؟" میں نے طنز سے کہا۔

"میری بات کو مذاق سمجھ رہے ہو تم۔" وہ بولا "پولیس کیا ہم سے الگ ہے، سرکار سے زیادہ وہ ہمارا دیا ہوا نمک کھاتے ہیں۔ حکومت پورے سال میں انھیں اتنی تنخواہ نہیں دیتی جتنا انعام ڈاکو انھیں ہر مہینے دیتے ہیں۔"

میں نے کہا "گویا یہاں بھی پولیس ڈاکوؤں کے ساتھ ہے۔"

"یہاں بھی کا کیا مطلب؟" اُس نے حیران ہو کے پوچھا۔

میرا ذہن غیر ارادی طور پر اپنے پاکستان کی طرف چلا گیا تھا جہاں زبانِ خلق یہی کہتی تھی۔ اس میں کتنا سچ تھا، کتنا جھوٹ، کتنی حقیقت تھی اور کتنا مبالغہ تھا، یہ کوئی کیسے جان سکتا تھا۔

میں نے کہا "چلو چھوڑو یہ بات۔"

"تم بھی دس لاکھ کے چکر میں مت پڑو۔" اُس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا "آدمی لانچ میں ہی مارا جاتا ہے۔"

میں نے کہا "تمھیں اپنے ساتھیوں پر بہت بھروسا ہے؟"

خان نے فخریہ لہجے میں کہا "ان میں سے ہر ایک میری خاطر اپنی زندگی ہزار بار قربان کر سکتا ہے، جہاں میرے خون کا ایک قطرہ گرے، وہاں وہ اپنا سر کٹا سکتے ہیں، میرے خون کے ہر قطرے کے بدلے میں وہ ایک خون کر سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "ہیں تو آخر وہ سب ڈاکو، تمھارے بیٹے تو نہیں ہیں۔"

اُس کے چہرے پر اذیت کے آثار نمایاں ہو گئے "ایسا مت کہو، وہ سب بیٹے ہی ہیں میرے، بیٹوں سے زیادہ عزیز ہیں مجھے، اگر میرے اپنے بیٹے ہوتے تو شاید میرے لیے اتنا نہ کر سکتے جتنا میرے یہ ساتھی کر سکتے ہیں، ہمارے درمیان خون کا رشتہ نہیں ہے تو کیا ہوا؟"

میں نے کہا "کچھ رشتے خون کے رشتوں سے زیادہ باوفا اور سچے ہوتے ہیں، میں تسلیم کرتا ہوں۔"

"دیکھو اب بات ختم کرو، میں تمھیں دو لاکھ دیتا ہوں۔" خان نے کہا۔

گاڑی سپنا ریسٹورنٹ سے کچھ فاصلے پر ایک سائڈ اسٹریٹ میں رُک گئی۔ میں نے غالب سے کہا "اندر سے ان دونوں کو اپنے ساتھ لے آؤ اور کسی ٹیکسی میں ہمارے پیچھے پیچھے آؤ۔ بھوکے ہم سب ہیں، اپنے ساتھ کھانے پینے کا جتنا سامان اُٹھا کے لا سکتے ہو وہ بھی لے آؤ۔"

غالب نے محسن کی طرف دیکھا جو اب تقریباً بے ہوش تھا اور میں نے اُس کی نگاہوں کے سوال کو سمجھ لیا۔

میں نے کہا "خان صاحب کی فکر مت کرو، یہ سمجھ دار آدمی معلوم ہوتے ہیں، خودکشی نہیں کریں گے۔"

غالب نے نازو کو اشارہ کیا "تم بھی آؤ۔"

پہلے نازو متذبذب میں پڑ گئی پھر اُس نے اپنا ریوالور بھی مجھے تھما دیا۔

میں نے کہا "اندر ٹائلٹ روم بھی ہوگا۔"

نازو نے میری بات فوراً سمجھ لی۔ میں اس سے کہنا چاہتا تھا کہ وہ اندر جائے تو اپنی یہ پولیس کی وردی اُتار دے۔ اس کے لیے لیڈیز ٹائلٹ روم بہتر جگہ تھی۔ میری ہدایات کے مطابق گل اور رابعہ اپنے ساتھ کپڑوں کا سُوٹ کیس ضرور لائی ہوں

گی — اس میں نازو کے لیے بھی نئے کپڑے تھے جن کو ابھی تک پہننے کی نوبت ہی نہیں آئی تھی۔ پولیس کی وردی میں وہ بے حد مضحکہ خیز نظر آتی تھی۔ دیکھنے والے اتنے نرم و نازک اور دُبلے پتلے پولیس مین کو دیکھ کر بھی حیران ہوتے تھے اور اس کی ڈھیلی ڈھالی وردی کو دیکھ کر بھی۔ پھر جب وہ بات کرتی تھی تو سارا پول کھل جاتا تھا اور اس کی وردی شکوک پیدا کرتی تھی کیونکہ زنانہ پولیس کی وردی ہی الگ تھی۔

غالب اور نازو ابھی چند قدم دُور ہی گئے تھے کہ پولیس کی ایک گاڑی ہم سے کچھ فاصلے پر آ کے ٹھہر گئی۔ اس میں آگے ڈرائیور کے ساتھ کوئی انسپکٹر کے عہدے کا افسر مائیک لیے بیٹھا ہُوا تھا اور نہ جانے کس سے وائرلیس پر گفتگو کر رہا تھا۔

جس گاڑی میں ہم بیٹھے ہوئے تھے اس کے شیشے سیاہی مائل سرمئی تھے چنانچہ گاڑی کے اندر سے باہر سب کچھ دکھائی دیتا تھا لیکن باہر سے دیکھنے والوں کو گاڑی میں صرف اندھیرا نظر آتا تھا۔ اگر گاڑی کے شیشے شفاف ہوتے تو میں اس طرح سرِعام ایک ڈاکو پر ریوالور تان کے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔

اچانک مجھے ڈاکو محمد خان عرف خونی خان کے چہرے پر تشویش اور پریشانی کے آثار نظر آنے لگے۔

"یہ تو... وہی گاڑی ہے!"

"کون سی گاڑی؟" مَیں نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیا۔

"جو میرے پیچھے لگی ہوئی تھی!"

"یہ سیدھے یہاں کیسے آ پہنچے؟" مَیں نے بھی فکر میں مُبتلا ہو کے سوچا۔

"معلوم نہیں، کسی نے مخبری نہ کی ہو۔" خان نے کہا اور اس وقت وہ مجھے واقعی خوف سے کونے میں دُبک جانے والا چُوہا لگا۔ پولیس کی گاڑی ہم سے بیس گز کے فاصلے پر رُکی ہوئی تھی اور اس کے پچھلے حصّے میں بیٹھے ہوئے بندوق بردار سپاہی بھی کُود کُود کے باہر آ رہے تھے۔

مَیں نے خان سے کہا: "خاموش بیٹھے رہو، یہ لوگ تمھیں دیکھ نہیں سکتے۔ شیشے بند ہُوں تو گاڑی خالی لگتی ہے۔"

اُس نے سر ہلایا مگر اس کے ماتھے پر تفکرات کی شکنوں کا جال بدستور گہرا رہا۔ اُس نے پھر کہا: "یہ یہاں کیسے پہنچ گئے؟"

مَیں نے کہا: "مجھے یقین ہے کہ ہمارے تعاقب میں کوئی نہیں تھا۔ وہ گاڑی کس کی تھی جو تم نے چھوڑ دی تھی؟"

"وہ مَیں نے چھینی تھی اور پولیس نے اتفاق سے مجھے اُس گاڑی میں دیکھ لیا تھا۔" خان نے کہا۔

"گاڑی چھینتے وقت دیکھ لیا تھا؟"

"نہیں، ایک چوک سے گزرتے ہوئے مَیں سگنل پر ٹریفک جام میں پھنس گیا تھا۔ وہاں پولیس کی یہ گاڑی مجھ سے کچھ دُور آ کے ٹھہری۔ ادھر سگنل کھلا، اُدھر ایک خبیث انسپکٹر نے انگلی سے میری طرف اشارہ کیا۔ اُسی نے جو اب مائیک لیے بیٹھا ہے۔"

"اسی لیے تم نے وہ گاڑی وہاں چھوڑی تھی؟"

"ہاں مَیں سمجھا تھا تم پولیس والے ہو، تمھیں اپنی ڈھال بنانا چاہتا تھا مَیں۔" خان نے کہا۔

مَیں نے کہا: "یعنی تم آسمان سے گر کے کھجور میں اٹک گئے۔"

"وہ کیسے؟" خونی خان نے بے خیالی میں کہا۔

"تم پولیس سے بچنا چاہتے تھے اور پھنس گئے ایسے لوگوں کے ساتھ جو پولیس کے بھی باپ ہیں۔"

"یہ معاملہ کچھ گڑبڑ ہے۔ ایک اور گاڑی بھی آگئی ہے پولیس کی۔" ڈاکو محمد خان نے پریشان ہو کے کہا۔

دوسری گاڑی سپنار ریسٹورنٹ سے بیس گز پیچھے ٹھہر گئی تھی اور اس میں آنے والوں نے بھی محاصرے کے انداز میں پوزیشن سنبھال لی تھی۔ پولیس والے جب اعلا افسران کی نگرانی میں کوئی کارروائی سنجیدگی سے کرتے ہیں تو ان کی مستعدی کا ڈراما قابلِ دید ہوتا ہے۔ دیکھنے والوں کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس محکمے کا کام چوری اور حرام خوری سے تو دُور کا بھی تعلق نہیں۔

بظاہر آگے پیچھے کھڑی ہوئی دونوں گاڑیوں کے درمیان رابطہ قائم تھا اور ان کے تیور بتاتے تھے کہ وہ سپنار ریسٹورنٹ کا محاصرہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ان کی نظریں بار بار ریسٹورنٹ کے دروازے کو دیکھ رہی تھیں۔ یہ خیال میرے لیے بھی باعثِ تشویش ہونے لگا تھا۔

اگر یہ کوئی عام ایرانی ہوٹل ہوتا تو وہ اتنا تکلف نہ کرتے، وہ بندوقیں اُٹھا کے دندناتے ہوئے اندر جاتے اور مطلوبہ ملزمان کے علاوہ بھی جو ہاتھ لگتا یا انھیں مشکوک نظر آتا اسے باندھ لاتے مگر یہ ایک فرسٹ کلاس ریسٹورنٹ تھا، جس کے باہر کاروں کی قطاریں گواہ تھیں کہ اندر عام لوگ نہیں ملیں گے اور کسی قانونی اختیار کے بغیر وہ اندر داخل ہوں گے تو خود پکڑے جائیں گے۔ شاید ابھی تک انھیں یہ قانونی اختیار حاصل نہیں ہُوا تھا۔

اب مَیں بھی سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ پولیس نے اتنے کم وقت میں سپنار ریسٹورنٹ تک رسائی کیسے حاصل کر لی اور وہاں وہ ڈاکو محمد خان کو پکڑنے کے لیے آئے ہیں یا 'ایم آر ایس' کے معزز ارکان کو گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔ پولیس کو ہماری تلاش بھی تھی اور شاید ایک ڈاکو کے مقابلے میں وہ ہمارے زیادہ بڑے دُشمن تھے۔ ڈاکوؤں سے تو انھیں کچھ نہ کچھ ملتا ہی تھا۔ ہم انھیں جُل دے کر نکل آئے تھے۔ تریویٹی اور دلاور نے مل کے ہمارے خلاف محاذ بنا لیا تھا اور اُنھوں نے اپنی دولت سے پولیس کی طاقت کو بھی خرید رکھا تھا۔ اتنی دیر میں وہ بھی اپنی آنکھوں پر بندھی ہوئی پٹی اتار کے اور بندھے ہوئے ہاتھ کھول کے سڑک تک پہنچ گئے ہوں گے تو سخت طیش میں ہوں گے۔ انھوں نے نیچے سے اوپر تک پولیس کے محکمے کو ہلا دیا ہوگا اور اپنی ذاتی غنڈہ فورس کو بھی سارے شہر میں پھیلا دیا ہوگا۔

مَیں ڈاکو محمد خان کی طرف سے بھی غافل نہیں تھا اور یہ بھی سوچ رہا تھا کہ پولیس نے سپنار ریسٹورنٹ میں داخل ہو کر رالعہ، نازو اور غالب کو دیکھ لیا تو کیا ہوگا؟ غالب مزاحمت کر نہیں سکتا تھا، وہ اپنا ریوالور بھی چھوڑ گیا تھا۔ رالعہ کے پاس ریوالور ہوگا مگر اُسے موقع بھی نہیں ملے گا کہ ریوالور نکال سکے اور اگر وہ ریوالور نکالنے میں کامیاب رہی تو ایک ریوالور سے کب تک سب کو بچائے گی اور کیسے بچائے گی۔ نازو بھی خالی ہاتھوں کی مدد سے کچھ دیر اپنا دفاع کر سکتی تھی مگر کسی ریسٹورنٹ میں پولیس سے مقابلہ کرنا بہت مشکل کام تھا۔ ان کے چاروں طرف میزیں اور کُرسیاں ہوں گی، لوگ ہوں گے اور فرار کا راستہ بھی مسدود ہوگا، انھیں یہ ڈر بھی ہوگا کہ فائرنگ کی زد میں بے گناہ لوگ نہ آ جائیں۔ بفرضِ محال وہ دروازے سے نکلنے میں کامیاب رہے تب بھی دروازے کا دونوں طرف سے پولیس کی گاڑیوں نے محاصرہ کر رکھا ہے۔

اب میرا باہر نکلنا بھی اتنا ہی ناممکن تھا جتنا میرے ساتھ بیٹھے ہوئے ڈاکو کا۔ میری وردی مجھے نہیں بچا سکتی تھی۔ تمام لوگوں نے یعنی سردار جی نے اس وردی کو مشکوک سمجھا تھا۔ پولیس والے تو فوراً تاڑ جاتے کہ نہ یہ وردی میری ہے اور نہ وردی کے اندر کوئی پولیس مین ہے۔ ڈاکو محمد خان کی پوزیشن بدتر تھی۔ وہ باہر نکل کے کیا کرتا جب کہ اس کے لیے فرار کے سب راستے مسدود تھے۔ ہمارے دائیں بائیں بہت کم فاصلے سے گاڑیاں ایک دوسرے کے ساتھ ملی ہوئی کھڑی تھیں اور آگے پیچھے لوگوں کا ایک ہجوم تھا جو سڑک پر اور فٹ پاتھ پر رواں تھا۔

جب محمد خان نے خود کلامی کے انداز میں تیسری بار کہا کہ آخر ان حرامزادوں کو یہاں کس نے بھیجا، تو میرا ذہن فوراً پلٹ گیا۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کسی نے مخبری کی ہو۔ مَیں نے سوچا اور معاملہ فوراً میری سمجھ میں آ گیا۔ انھیں فوٹوگرافر سردار جی نے سپنار ریسٹورنٹ کا پتا دیا ہوگا۔

مَیں نے کہا: "خان صاحب! تم نے اپنے ساتھ ہمیں بھی مروا دیا۔"

"مَیں نے! وہ کیسے؟"

مَیں نے کہا: "جہاں تم نے اپنی گاڑی چھوڑی تھی وہاں ایک سکھ فوٹوگرافر کی دُکان تھی۔"

"وہ مَیں نے نہیں دیکھی۔"

"مگر میرا اُس سے جھگڑا ہُوا تھا۔ مَیں نے اُس کی دُکان سے فون کیا تھا اور میرا خیال ہے کہ وہ میری گفتگو بہت غور سے سُن رہا تھا۔" مَیں نے کہا۔

"تم نے کِسے فون کیا تھا؟"

"مَیں نے کہا تھا کہ ہم سپنار ریسٹورنٹ پہنچتے ہیں، تم بھی پہنچ جاؤ۔ وہ کچھ خبطی تھا۔ کہنے لگا کہ کسے بلا رہے ہو سپنار ریسٹورنٹ میں۔ میرا جواب اسے پسند نہیں آیا اور جھگڑا ہو گیا۔"

"تم نے کسی لڑکی کو فون کیا تھا؟"

"مَیں نے دو لڑکیوں کو فون کیا تھا، وہ اندر ہوں گی اور اب آتی ہی ہوں گی۔" مَیں نے کہا۔ "سکھ نے مجھے تو خیر دیکھا ہی تھا، غالباً اُس نے تمھیں بھی اپنی گاڑی سے اُتر کے ہماری گاڑی میں بیٹھتے دیکھ لیا۔ وہ گاڑی تو وہیں کھڑی ہوگی، پولیس نے گاڑی کو قبضے میں لینے کے بعد اِدھر اُدھر کے لوگوں سے پوچھا ہوگا تو اُس خبیث سکھ نے بتا دیا ہوگا کہ جو شخص اس گاڑی میں سے اُترا تھا وہ ایک کارٹون ٹائپ پولیس مین کی گاڑی میں بیٹھ کے چلا گیا تھا۔"

"کیا اُس نے تمھاری گاڑی کا نمبر نہیں دیکھا تھا؟"

"اگر دیکھا ہوتا تو پولیس اب تک ہمیں باہر نکال چکی ہوتی۔ شاید اُس کی نظر کمزور ہوگی کہ وہ نمبر نوٹ نہیں کر سکا۔" مَیں نے ایک امکان ظاہر کیا۔

"پھر اب ہم یہاں سے کیسے نکلیں گے؟"

مَیں نے کہا: "اس گاڑی کے اندر تو کوئی خطرہ نہیں۔ ہاں گاڑی سے نکلے تو ہم دونوں پکڑے جائیں گے۔" مَیں نے کہا۔

"تم عجیب بے وقوف آدمی ہو، گاڑی لے کر نکل کیوں نہیں جاتے یہاں سے؟" خونی خان نے کہا۔

مَیں نے کہا: "تم مجھ سے بڑے بے وقوف ہو، چابی کہاں ہے گاڑی میں؟ خیریت اسی میں ہے کہ خاموش بیٹھے رہو۔ تم سے زیادہ مجھے اپنے ساتھیوں کی فکر ہے جو اندر گئے ہوئے ہیں۔ اب وہ لڑکی واپس آئے گی جو گاڑی چلا رہی تھی تو ہم جائیں گے یہاں سے۔"

"تم نے تو اسے کہا تھا کہ ٹیکسی میں آنا۔"

"اچھی بات یہ ہے کہ وہ بے وقوف نہیں ہے، جب وہ دیکھے گی کہ چابی اُس کے پاس ہے تو اِدھر ضرور آئے گی۔"

میں نے کہا۔ "اور وہی گاڑی نکال لے گی۔"

"وہ اُسی پولیس کی وردی میں ہوگی؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ دوسری اچھی بات ہے کہ وہ لباس بدل کے آئے گی۔ جب وہ کار نکالے گی تو کسی کو بھی شک نہیں ہوگا۔"

"اور اگر اس سے پہلے ہی وہ پکڑی گئی؟"

"آسمانی بجلی کو بھلا کون پکڑ سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ اُس کا اصل نام ہے؟"

میں نے کہا۔ "آسمانی بجلی کا اصلی نقلی نام کیا، بس ایک ہی نام ہے۔"

"آخر ابھی تک پولیس اندر کیوں نہیں گئی؟"

"ان کے پاس وارنٹ نہیں ہوں گے۔ وہ ہمیں باہر نکلتے ہی گرفتار کرنا چاہتے ہیں شاید۔" میں نے کہا۔ "یہ تیسری اچھی بات ہے۔ اگر یہ لوگ اسی طرح یہاں کھڑے رہے تو سمجھو ہم بچ گئے۔"

لیکن اُسی وقت ایک جیپ دونوں پولیس کی گاڑیوں کے درمیان اور ریسٹورنٹ کے دروازے کے سامنے آکے رُکی اور اس میں سے ایک پولیس افسر اُترا جسے میں نے شولڈر دیکھ کے ایس پی تسلیم کر لیا۔ اس کے ساتھ اُترنے والا دوسرا شخص سوٹ میں تھا اور چونکہ خود ایس پی صاحب اس کے سامنے باادب، باملاحظہ ہوشیار کھڑے تھے، اس لیے میرا قیاس کہتا تھا کہ وہ ایس ڈی ایم یا کمشنر قسم کا انتظامی افسر ہوگا۔

وہ دونوں ایک ساتھ ریسٹورنٹ کی طرف بڑھے تو میں نروس ہونے لگا۔ اب پولیس کے لیے معاملہ اختیار کا نہیں رہا تھا۔ بااختیار افسران خود اُن کی مشکل آسان کرنے کے لیے آگئے تھے، انھیں کوئی اندر جانے سے اور پھر پولیس کے ذریعے گرفتار کرنے سے نہیں روک سکتا تھا۔ وہ حکم دے سکتے تھے کہ تمام دروازے بند کر دیے جائیں اور اندر موجود سب افراد اندر ہی رہیں۔ یہ بہت خطرناک صورتِ حال بن سکتی تھی اور میں خاموش تماشائی بن کے اپنے ساتھیوں کی گرفتاری کا منظر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ڈاکو محمد خان کی مجھے زیادہ فکر نہیں تھی۔ اگر وہ بھاگ بھی جاتا تو مجھے پروا نہ ہوتی مگر اس کی وجہ سے میں گاڑی کے اندر چھپ کر ہرگز نہ بیٹھتا۔ میں باہر نکل کے پولیس سے ان کے ہتھیار چھینتا اور اپنے ساتھیوں کو چھڑانے کے لیے مجھے وہاں موجود ساری پولیس فورس کا مقابلہ کرنا پڑتا تو میں دریغ نہ کرتا۔

لیکن خدا نے مجھے آزمائش سے محفوظ رکھا۔ اس سے پہلے کہ ایس پی اور اُس کا افسرِ اعلا ریسٹورنٹ میں داخل ہوتے، سب سے پہلے رابعہ باہر آئی۔ اُس نے بڑے اہتمام کے ساتھ گلابی ساڑی باندھ رکھی تھی، جس پر گہرے سُرخ دائرے سے تھے اور دھوپ کا چشمہ لگا رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں میچ کرتا ہوا ہینڈ بیگ تھا اور غالباً اُس نے اپنے بال اسی ہوٹل کے ہیئر ڈریسر سے سیٹ کروا لیے تھے جہاں وہ مقیم تھی۔ اُس کے بالوں کا یہ انداز بھی میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنے حسن اور تمکنت کے ساتھ اس اندازِ آرائش نے رابعہ کی شخصیت کو بے حد بارُعب اور متاثر کُن بنا دیا تھا۔ ایس پی اور اس کا ساتھی از خود احتراماً ایک طرف ہو گئے۔ رابعہ کے پیچھے گُل آئی تو اس کی شان بھی نرالی تھی۔ وہ سر سے پیر تک سفید اُجلے لباس میں تھی۔ اس کی جارجٹ کی ساڑی، جوتے، ہینڈ بیگ اور جیولری سب سفید تھے۔ صرف اُس کے بال کالے تھے جن کو اُس نے دو حصوں میں تقسیم کر کے دونوں شانوں پر پھیلا دیا تھا۔ نازو نے عجلت میں لباس تبدیل کیا تھا مگر پھر بھی خاصا سلیقہ برتا تھا۔ بدوضع پولیس کی وردی شاید اُس نے ٹائلٹ روم میں ہی چھوڑ دی تھی۔ اب وہ سیاہ بلاؤز اور ساڑی میں تھی اور اُس نے بھی سیاہ فریم کا دھوپ کا چشمہ لگا رکھا تھا۔ اس سیاہی کے ساتھ اس کے اپنے گورے رنگ کی چمک دمک زیادہ خیرہ کُن لگتی تھی۔ دروازے سے اندر داخل ہونے کی کوشش کرنے والے اُن معزز خواتین کے لیے دروازہ تھامے کھڑے رہے اور میں سانس روک کے یہ منظر دیکھتا رہا۔ مجھے اب غالب کا انتظار تھا۔

غالب اوپر تلے چار ڈبے اُٹھائے نمودار ہُوا تو کسی نے بھی اُس کی طرف نہیں دیکھا۔ ہر نظر اِن تین محشر بداماں خواتین پر تھی جو اپنے حسن و جمال اور انداز سے پردۂ سیمیں کی اداکارہ لگتی تھیں مگر ان کو نہ کسی نے پہلے دیکھا تھا اور نہ ان کی صورتیں کسی بھی مشہور فلم سٹار سے ملتی تھیں چنانچہ دیکھنے والے محض رُعب حُسن میں مبہوت کھڑے ہوئے تھے، ایسے میں غالب کی طرف کون دیکھتا جو ویسے بھی ان کا یا ہوٹل کا ملازم نظر آتا تھا۔

ریسٹورنٹ کے سامنے ہی ایک ساتھ تین ٹیکسیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ رابعہ کے ساتھ غالب ایک ٹیکسی کی طرف بڑھ گیا۔ نازو نے موجِ خرامِ ناز سے گل کترتے ہوئے اور اپنا ہینڈ بیگ جھلاتے ہوئے سیدھا اس کار کی طرف رُخ کیا تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ اگر نازو بھی ٹیکسی میں بیٹھ کے چلی جاتی تو میں کیا کرتا لیکن اُسے احساس تھا کہ وہ غیر ارادی طور پر گاڑی کی چابیاں اپنے ساتھ لے گئی تھی۔

اس کی غلطی ہمارے حق میں نیکی بن گئی۔ وہ شاید مجھے چابی دینا چاہتی تھی مگر میں نے گاڑی کا شیشہ تھوڑا سا نیچا کر کے اسے کہا۔ "جلدی سے گاڑی نکال لو یہاں سے۔" اور پھر شیشہ بند کر دیا۔

نازو بے وقوف نہیں تھی کہ اُسے کچھ سمجھانے کی ضرورت پیش آتی۔ باہر آتے ہی اُس نے پولیس کی گاڑیاں دیکھی ہوں گی اور ایک ایس پی کو ریسٹورنٹ میں داخل ہوتے دیکھا ہوگا تو وہ فوراً سمجھ گئی ہوگی کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔ اُس نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے اور گاڑی کو اسٹارٹ کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ جب وہ گاڑی کو ریورس کرنے کے بعد پھر سیدھا کر رہی تھی تو میں نے ایس پی کو ریسٹورنٹ کے دروازے سے باہر آتے اور پولیس کو طلب کرتے دیکھا۔ میری نظر نے ایک ٹیکسی کو بھی حرکت میں آتے دیکھا۔ اس کے ونڈ اسکرین کے پیچھے مجھے ڈرائیور کے ساتھ دوسرا چہرہ غالب کا دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے شاید اندازہ کر لیا یا اسے احساس تھا کہ میں اسے دیکھ رہا ہوں کیونکہ میں اپنے پیچھے بیٹھے ہوئے ڈاکو محمد خان پر بھی نظر رکھے ہوئے تھا۔ غالب نے ایک انگوٹھا بلند کر کے مجھے سب ٹھیک ہے کا سگنل دیا۔

"آج تو خدا نے بال بال بچا لیا تمھیں۔" میں نے خان سے کہا۔

خونی خان بھی اب قدرے پُرسکون نظر آرہا تھا۔ "خدا نے تو تمھیں بھی بچا لیا، میرے ساتھ۔"

"مگر تمھیں شکر گزار ہمارا بھی ہونا چاہیے۔"

"کیوں، تم نے تو مجھے بھی اپنے ساتھ مروانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اپنا پتا چھوڑ آئے تھے اُس سکھ کے پاس کہ کوئی ملاقاتی آئے تو وہاں بھیج دینا۔" محمد خان بولا۔

میں نے نازو سے کہا۔ "بی بی! جلد از جلد اس علاقے سے نکل جاؤ، باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔"

نازو نے نگاہ سڑک پر رکھتے ہوئے کہا۔ "اتنا تو بتا سکتے ہو تم کہ اب میں کیسی لگ رہی ہوں؟"

میں نے کہا۔ "کیا غالب نے کچھ نہیں کہا، زبان سے یا نظروں سے؟ بہت غلط بات ہے، خیر... میں اس کی طرف سے مناسب ڈائیلاگ عرض کرتا ہوں۔ قصیدۂ در مدحِ حُسن...!"

نازو ہنس پڑی۔ "چلو چھوڑو، رابعہ کیسی لگی؟"

"یہ الفاظ میں کیسے بیان کیا جا سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "ہاں داد میں دے سکتا ہوں اس کی ذہانت کی... اس نے اپنا انداز خوب بدلا۔ میں نے بھی دل کی آنکھ سے پہچانا۔"

"اب چلنا کہاں ہے؟ محسن کی حالت ٹھیک نہیں لگتی۔ غالب نے تو وہیں کھڑے کھڑے کافی کا ایک کپ پی لیا تھا، جتنی دیر میں اُس کے آرڈر کی تعمیل ہوئی۔"

"اب ایسا کرو کہ گاڑی کہیں روک لو۔"

"یہ اُلٹے ہاتھ پر ایک میدان سا نظر آرہا ہے۔" نازو نے کہا۔

میں نے بائیں ہاتھ پر ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ پھیلا ہُوا سیمنٹ کا بنا ہُوا مگر ٹوٹا پھوٹا پلیٹ فارم سا دیکھا۔ یہ شاید پہلے مال گاڑی سے سامان اُتارنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہوگا۔ بہت سے تجارتی اور صنعتی ادارے ریلوے سے یہ سہولت حاصل کر لیتے ہیں کہ ایک لائن ان کے لیے مخصوص کر دی جائے جہاں ان کا سامان انھی کی نگرانی میں اُتارا جاسکے۔ اب نہ جانے کیوں یہ جگہ ویران پڑی تھی۔ آثار بتاتے تھے کہ مدت سے اس طرف کوئی ٹرین نہیں آئی۔ ریلوے لائن کے درمیان اور اوپر بھی خودرو گھاس اُگ آئی تھی۔ شاید وہ کمپنی جو اس جگہ ریلوے سے مال لیتی تھی، اب بند ہو چکی تھی یا انھوں نے اس سے بہتر انتظامات کر لیے تھے۔ اس وقت ان اسباب پر غور کرنے کی نہ ضرورت تھی اور نہ فرصت، مجھے یہ جگہ ہر لحاظ سے مناسب لگی۔

ریلوے لائن اور پلیٹ فارم جیسے میدان پر ابھی تک کسی نے ناجائز قبضہ نہیں کیا تھا۔ اس سے یہی ثابت ہوتا تھا کہ یہ جگہ لاوارث بہرحال نہیں تھی۔ نازو نے گاڑی روکی تو میں نے نیچے اُتر کے چاروں طرف نگاہ ڈالی لیکن مجھے کوئی چوکیدار بھی دکھائی نہ دیا۔

ہمارے پیچھے آنے والی ٹیکسی میرے قریب آکے رُکی۔ اس کے ایک دروازے سے گل برآمد ہوئی۔ میری طرف دیکھے بغیر وہ اس گاڑی کی طرف لپکی جس میں محسن خاموش لیٹا ہُوا تھا یا بے ہوش پڑا ہُوا تھا۔

رابعہ نے نیچے اُتر کے ایک نظر مجھے دیکھا۔ ایک دلنواز شرمیلی مُسکراہٹ عطا کی۔ اُس کے اندازِ حُسن کی نئی جلوہ سامانی نے مجھے مبہوت کر دیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میں وہ سب بھُول گیا جو ایک لمحہ پہلے میرے ذہن میں تھا۔ پھر غالب کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"کیا ٹیکسی چھوڑ دوں؟" غالب نے کہا۔

رابعہ نے کہا۔ "میں ذرا محسن کو دیکھ لوں۔"

میں نے کہا۔ "ہاں، اب اجازت ہے۔" اور پھر غالب کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "تھوڑی سی ہمت اور کرو دوست! اسی ٹیکسی میں جاؤ اور کہیں سے چائے لے آؤ یا کافی، گلوکوز

ملے تو وہ بھی لے آنا، چائے کے لیے تھرماس خرید لینا۔"

غالب نے کہا: "اس میں ایک سوٹ کیس ہے۔"

میں نے کہا: "وہ میں اُتار لیتا ہوں، مجھے معلوم ہے تمھاری تھکن اور کمزوری کے علاوہ بھوک پیاس سے کیا حالت ہو رہی ہے۔"

"تھوڑی سی قوتِ ارادی ابھی باقی ہے۔" غالب نے کہا اور پھر ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔

"دیر مت کرنا اور زیادہ دُور مت جانا۔" میں نے کہا اور غالب نے سر ہلایا۔ ٹیکسی ڈرائیور جو بالکل بے نیاز بیٹھا ہُوا تھا، گاڑی کو اس احاطہ نما میدان سے نکال لے گیا جس کے تین طرف نیم شکستہ دیواریں باقی تھیں چنانچہ چوتھی سمت کو دروازہ فرض کیا جا سکتا تھا۔

میں نے پلٹ کے دیکھا تو ڈاکو محمد خان عرف خونی خان بھی کار سے باہر کھڑا ہُوا میری طرف دیکھ رہا تھا اور بے حد فرض شناس اور مستعد نازو بظاہر ایک اندازِ محبوبی کے ساتھ کار کے بونٹ پر بیٹھی ہوئی تھی مگر درحقیقت وہ خان صاحب کی نگرانی کر رہی تھی اور اس نے ریوالور کو بڑی مہارت کے ساتھ چھپا بھی رکھا تھا۔ تاہم محمد خان اب بھاگنے کے موڈ میں نظر نہیں آتا تھا۔

"کیا گاڑی میں بیٹھے بیٹھے تھک گئے تھے؟" میں نے کہا۔

"گاڑی میں میرے لیے جگہ نہیں رہی تھی۔" اُس نے کہا۔

اور میں نے دیکھا تو مجھے اس کی بات پر یقین آیا۔ پہلے جس سیٹ پر وہ محسن کے ساتھ اکیلا تھا، اُس پر اب محسن کے ساتھ رابعہ اور گُل براجمان تھیں۔ گُل نے محسن کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا تھا اور بڑی محبت سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔ مجھے اُس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کے دُکھ ہُوا۔ آنسو رابعہ کی آنکھوں میں بھی تھے اور ایک ہی جذبے کی غمازی کرتے تھے۔ یہ جذبہ تھا دردِ مشترک کا اور غمگساری کے خلوص کا اور رفاقت کا۔ محبت ہم سب ہی محسن سے کرتے تھے مگر گُل اسے چاہنے لگی تھی اور ابھی تک اس حقیقت سے بے خبر تھی کہ محسن کی چاہت کے جملہ حقوق سنبلا کے نام پر محفوظ ہو چکے ہیں۔

میں نے کھڑکی میں سر ڈال کے کہا: "آپ لوگ تو سچ مچ رو رہی ہیں۔"

گُل نے مجھے پلٹ کے زخم خوردہ نظروں سے دیکھا: "یہ دیکھیں نا سکندر بھائی، کیا حالت ہو گئی ہے ان کی۔"

میں نے کہا: "بہت سختی جھیلی ہے اس نے۔"

رابعہ نے کہا: "تم نے واقعی کمال کر دیا۔"

میں نے کہا: "توفیق خدا دیتا ہے، حوصلہ تم دیتی ہو۔ جو ناممکن نظر آتا ہے، وہ بھی ممکن ہو جاتا ہے۔"

گُل نے کہا: "سکندر بھائی! یہ ٹھیک تو ہو جائیں گے؟"

میں نے کہا: "اگر تم چاہو گی تو مزید ٹھیک ہو جائے گا مگر یہ الگ بات ہے کہ بعد میں اس کا دماغ خراب ہو جائے، میری طرح۔"

"دماغ کیوں خراب ہو رہا ہے آپ کا؟" رابعہ نے کہا۔

"تمھارا یہ روپ دیکھ کر، چشمِ بددور۔"

اس سے پہلے کہ رابعہ کچھ کہتی، ایک شخص ڈنڈا لیے دوڑتا ہُوا آیا: "او ئے! کون ہے تم، کیا کرتا ہے اِدھر؟"

میں نے کہا: "ابھی تو کچھ نہیں کیا لیکن اب کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ کیا خیال ہے، یہاں کوٹھی بنائی جائے اپنی یا فیکٹری؟"

"چلو چلو، اِدھر سے روانہ ہو جاؤ، یہ تمھارے باپ کا جگہ نہیں ہے۔" اُس نے چلّا کے کہا: "یہ تریوینی صاحب کی جگہ ہے، وہ تمھارا سر لر شریف بنا دے گا اِدھر۔"

"یہ تریوینی صاحب کی جگہ ہے!" میں نے حیران ہو کے کہا: "وہ تو دولت مند آدمی ہیں، یہاں کُھلے آسمان کے نیچے کیوں پڑے رہتے ہیں؟"

محمد خان نے پیچھے سے اس کی گردن پکڑ کے کہا: "تم تریوینی سے جا کے کہو کہ ہم یہ جگہ خریدنا چاہتے ہیں، ابھی اور اسی وقت۔"

چوکیدار کا رنگ اُڑ گیا: "تم... تم تو ڈاکو ہے ڈاکو خونی خان...!" وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔

خونی خان نے کہا: "جب یہ بات جانتے ہو تو پھر جان بچا کے بھاگ کیوں نہیں جاتے، مرنا چاہتے ہو تو بتا دو۔"

چوکیدار کی گھگی بندھ گئی: "آپ... میرے کو معاف کر دو۔ ابھی ہم کیا کرے، تریوینی صاحب کا جہاز اُترتا ہے اِدھر اگر وہ دیکھے گا تم کو اِدھر تو ہمارا نوکری خلاص کر دے گا۔"

میں نے کہا: "اس کا ہیلی کاپٹر یہاں اُترتا ہے؟"

چوکیدار نے اقرار میں سر ہلایا: "آپ مہربانی کرو صاب!"

میں نے کہا: "کیا وہ آنے والا ہے؟"

"ہم کیا بولے صاب، وہ کسی وقت بھی آ سکتا ہے، آپ اپنا گاڑی اِدھر سے ہٹا لو۔"

میں نے کہا: "ہم یہاں زیادہ دیر قیام نہیں کریں گے۔ تم فکر مت کرو۔ اگر اس کا ہیلی کاپٹر نظر آیا تو ہم فوراً جگہ خالی کر دیں گے، تمھاری نوکری نہیں جائے گی۔"

وہ کچھ مطمئن ہُوا، کچھ نہیں ہُوا مگر ہم سے کچھ دُور جا کے چُپ چاپ کھڑا ہو گیا۔

"غریب آدمی ہے۔" میں نے خونی خان سے کہا۔

"لیکن اُس نے مجھے پہچان لیا ہے۔" خونی خان نے کہا۔

میں نے کہا: "تریوینی کا نام سُنا ہے کبھی؟"

اُس نے اقرار میں سر ہلایا: "بمبئی میں اس کو کون نہیں جانتا۔"

میں نے کہا: "ہم نہیں جانتے تھے لیکن اب تو اس نے بھی ہمیں جان لیا ہے۔ آج کی تاریخ یاد رکھنا اور کبھی موقع ملے تو اُس سے پوچھنا کہ وہ کل رات اک آئی لینڈ پر کیا لینے گیا تھا؟"

"تم خود ہی بتا دو۔"

"وہ ایک فوج کے ساتھ رنگ محل پر حملہ آور ہُوا تھا کیونکہ ہم وہاں اپنے دو ساتھیوں کو چھڑانے کے لیے جا پہنچے تھے۔ اُن میں سے ایک یہ ہے اور دوسرا پیچھے ٹیکسی میں آیا تھا۔"

ڈاکو محمد خان نے محسن کی طرف دیکھ کے سر ہلایا: "ان کو تریوینی نے کیوں قید کر رکھا تھا؟"

"یہ بہت لمبی کہانی ہے جس سے شاید تمھیں دلچسپی بھی نہ ہو۔ تریوینی کے ساتھ ایک اور شخص بھی تھا جو تریوینی کا بھی باپ ہے۔ وہ ہیلی کاپٹر میں بدمعاشوں کی ایک فوج لے کر آئے تھے۔ اب ان میں سے نصف کی لاشیں تو وہیں پڑی ہوئی ہیں اور جو باقی بچے تھے وہ اُسی جزیرے پر مقید ہیں۔ تریوینی اور دلاور...!"

"یہ دلاور کون ہے؟"

"ہے ایک شخص جسے شیطان نے اپنا جانشین نامزد کیا ہو گا۔" میں نے کہا: "ان دونوں کو ہم انھی کے ہیلی کاپٹر میں اغوا کر کے لے گئے تھے اور انھیں جنگل میں بھٹکتا چھوڑ کے بھاگ آئے تھے۔ پولیس نے ہمیں ہر طرف سے محصور کر لیا تھا مگر انھیں محاصرہ ختم کرنا پڑا، ورنہ ہم تریوینی کو مار دیتے۔ ہم نے دھمکی دی تھی۔ اس لڑکی نے یہ گاڑی چھینی تھی جس میں تم اس وقت موجود ہو۔ ہم نے تمھیں پناہ دی اگر ہم نہ چاہتے تو گولی مار کے تمھاری لاش کو چلتی گاڑی سے باہر پھینک دیتے یا ویسے ہی تمھیں دھکا دے کر سڑک پر گرا دیتے۔ ہم نے ابھی تک تمھیں پولیس سے بھی بچایا ہے۔ نہ ہمیں انعام کا لالچ تھا اور نہ پولیس کا خوف۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ تمھیں صرف پولیس تلاش کر رہی ہے مگر ہمیں پولیس کے علاوہ تریوینی کے شکاری کُتے بھی ڈھونڈتے پھر رہے ہوں گے۔"

"اگر یہ سب سچ ہے تو پھر ہم سب مصیبت کے ساتھی ہیں اور ایک دوسرے کی مدد کر سکتے ہیں۔"

میں نے کہا: "تم ہمارے لیے کیا کر سکتے ہو؟"

"اگر تم مجھے حفاظت کے ساتھ میرے ساتھیوں تک پہنچا دو تو میں تمھارا ہر مسئلہ حل کر سکتا ہوں۔" ڈاکو محمد خان نے کہا۔

"یہ بات تم نے پہلے بھی کہی تھی لیکن پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ تمھارے یہ ساتھی اب کہاں ہیں؟"

"اپنے ٹھکانے پر۔"

"کیا پولیس کو ان کے ٹھکانے کا علم نہیں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہم اپنے ٹھکانے بدلتے رہتے ہیں۔ پولیس کو علم نہ ہو تب بھی احتیاط تو کرنی پڑتی ہے۔ گیارہ مہینے پہلے میں پکڑا گیا تھا، میرے دو ساتھی مارے گئے تھے، باقی اِدھر اُدھر ہو گئے تھے۔ اب وہ پھر اکٹھے ہو گئے ہیں۔ انھوں نے منصوبہ بندی کی اور مجھے چھڑانے میں کامیاب رہے۔"

میں اُسے گاڑی کے پیچھے لے گیا۔ ڈکی کھول کے میں نے وہ سوٹ کیس نکالا جس میں تقریباً نو لاکھ روپے کی رقم تھی۔

"یہ دیکھو، وہ رقم جس کا میں نے ذکر کیا تھا۔" میں نے اُسے سوٹ کیس کھول کر دکھانے کے بعد کہا۔

وہ حیرانی سے نوٹوں کے انبار کو دیکھتا رہا: "میں ابھی تک سمجھ نہیں سکا کہ آخر تم لوگ کون ہو، کیا کرتے ہو؟"

میں نے سوٹ کیس واپس ڈکی میں رکھ دیا: "اگر میں تمھیں وہ سب بتا دوں جو ہم کر چکے ہیں یا کر سکتے ہیں تو سُن کر ہی تمھارے ہوش اُڑ جائیں گے۔ بس یہ سمجھ لو کہ یہاں بمبئی میں جتنے بھی دادا اور پردادا بنے پھرتے ہیں نا، وہ سب بچے ہیں ہمارے سامنے۔"

اُس کے لبوں پر ایک طنزیہ مُسکراہٹ نمودار ہوئی: "تو تم اُن سے بھی بڑے بدمعاش ہو؟"

"نہیں، ہم بدمعاش نہیں ہیں۔ ذاتی مفاد کے لیے چوری ڈکیتی اور قتل کچھ نہیں کرتے، ہم بڑے کام کرتے ہیں۔"

"اور بڑا کام کیا ہوتا ہے؟" وہ بولا۔

میں نے کہا: "بڑے کام ہیں کسی جلسے میں قتلِ عام کر دینا، مشین گن سے سو پچاس لاشیں گرا دینا، دستی بم پھینک کر یا بارودی سُرنگ لگا کے کسی جگہ کو اُڑا دینا، حکومت کے کسی مخالف کو ٹھکانے لگانا یا حکومت کا تختہ اُلٹنا۔ تم نے سُنا ہو گا کہ کچھ لوگ تربیت یافتہ دہشت گرد ہوتے ہیں، ہم تجربہ کار دہشت گرد ہیں۔"

اُس نے مجھے غور سے دیکھ کر کہا: "میں نہیں مانتا، تم صورت سے شریف اور تعلیم یافتہ نظر آتے ہو۔"

میں نے کہا: "یہی ہماری کامیابی کا راز ہے۔ خیر اَب باقی باتیں پھر کریں گے، ہمارا دوست واپس آ گیا ہے۔ پہلے کچھ کھا پی لیں، ہماری بھی حالت غیر ہو رہی ہے بھوک سے۔"

"تم بہت پُراسرار لوگ ہو۔" اُس نے کہا: "یہ لڑکی کیا لگتی ہے تمھاری؟"

میں نے کہا: "کچھ نہیں، ہم سب ایک دوسرے کے کچھ نہیں لگتے اور سب کچھ ہیں۔ سب سے تعارف یہاں نہیں ہو

سکتا۔ کیا خیال ہے اب چلیں تمھارے ساتھ؟"
"مجھے چھوڑ کے تم کہاں جاؤ گے؟" محمد خان نے کہا۔
"چھوڑ کے کیوں، اب تو معاملہ اُلٹا ہے یعنی تم کمبل کو نہیں چھوڑ سکتے۔ جہاں تم وہاں ہم" میں نے کہا۔
"میرا خیال ہے کہ تم ایسی غلطی نہیں کرو گے"۔
"میں جانتے بوجھتے یہ غلطی کر رہا ہوں۔ مجھے معلوم تھا کہ تم بھی اسے غلطی ہی کہو گے" میں نے کہا۔
"تمھارے ساتھ ایک نہیں تین لڑکیاں ہیں، بے حد خوبصورت اور شریف۔"
"اور تقریباً دس لاکھ روپے نقد ہیں" میں نے کہا "کیا تم ہمارے جان و مال اور ہماری عزت کی حفاظت نہیں کر سکتے؟"
"مجھے ڈر ہے کہ تمھاری وجہ سے کہیں ہم پکڑے نہ جائیں، کہیں کوئی مخبری نہ کر دے۔ ہمارا کیا ہے، ہمارے تو دن رات پولیس مقابلے چلتے ہیں۔ ہر جگہ، ہر وقت جان ہتھیلی پر لیے پھرتے ہیں۔ موقع ملے تو بھاگ بھی جاتے ہیں اور نہ مرنے سے گھبراتے ہیں، نہ مارنے سے"۔
میں نے کہا "پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہیں، یہی انداز ہماری زندگی کا بھی ہے لیکن ابھی ہمیں دو چار دن روپوشی کا مسئلہ درپیش ہے۔ اپنی حفاظت ہم خود کر سکتے ہیں بلکہ تمھاری حفاظت بھی کر سکتے ہیں ضرورت پڑنے پر" میں نے کہا "کیا خیال ہے اب چلیں؟"

اُس نے کہا "جیسی تمھاری مرضی" اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

ہم اس چوکیدار کو بالکل بھولے ہوئے تھے جس نے ہمیں یہاں سے فوراً دفع ہو جانے کا حکم دیا تھا۔ وہ نہ جانے کب غائب ہو گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مطمئن ہو کے چلا گیا ہے۔ ہم نے اُسے بتا دیا تھا کہ ہم اس جگہ پر قبضہ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے لیکن بمبئی میں شاید خالی زمین کی حفاظت کے معاملے میں لوگ کسی پر بھروسا کرنے کے قائل نہیں تھے چنانچہ چوکیدار نہ جانے کہاں سے خوفناک شکل والے مارپیٹ کے ماہرین کی ایک ٹیم اکٹھی کر لایا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ہم سب نے انھیں اس وقت دیکھا جب وہ سر پر پہنچ گئے تھے۔ سب سے پہلے رابعہ کی اُن پر نظر گئی۔
"سکندر! یہ کیا ہے؟" اُس کا رنگ سفید پڑ گیا۔
میں نے پلٹ کے دیکھا تو چھ افراد کو ایک نیم دائرے کی شکل میں ایستادہ پایا۔ ان میں وہ چوکیدار بھی شامل تھا جس کے احکامات کی تعمیل نہ کر کے ہم نے گویا ایک سنگین جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ اس کی فریاد پر فوری انصاف فراہم کرنے والے حکام فوراً تشریف لے آئے تھے۔

ان میں ایک قدرِ مشترک تو یہ تھی کہ وہ ایک ہی نیک مقصد رکھتے تھے یعنی ہماری مناسب گوشمالی۔ یہ بھی سمجھا جا سکتا تھا کہ وہ اتفاق و اتحاد کی برکات کے قائل تھے اور شاید ہم پیشہ بھی تھے۔ چوکیدار کے فرائض ہر جگہ جسمانی طور پر صحت مند اور صورت سے خونخوار نظر آنے والوں کے ہی سپرد کیے جاتے ہیں۔ اچھے اور بڑے ادارے سابق کمانڈوز کی خدمات سے استفادہ کرتے ہیں تو چھوٹے کاروباری بدمعاشوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ بمبئی میں عموماً پہرے دار اور محافظ گورکھے کہلاتے ہیں۔ یہ سب بھی آس پاس کے چوکیدار ہی تھے مگر ان میں کوئی گورکھا قوم کا نظر نہ آتا تھا۔
"یہی ہیں وہ داداگیر" ایک گنجے سر والے پستہ قد شخص نے لاٹھی زمین پر مار کے کہا۔
چوکیدار نے سر ہلا کے مجرمان کی شناخت کی۔
"یہ کس نے کہا تھا کہ وہ یہاں ہوٹل بنانا چاہتا ہے؟" دوسرے کپکپاتی آواز والے شخص نے حقارت سے زمین پر تھوک کے کہا۔
چوکیدار نے میری طرف انگلی سے اشارہ کیا۔
اتنی دیر میں ہم سب بھی ہوشیار ہو چکے تھے مگر ہم چاہتے تو معذرت کے ساتھ فوری روانگی بھی اختیار کر سکتے تھے۔ مگر مجھے ان سب کی صورتوں پر بھی ہنسی آ رہی تھی اور ان کی بھونڈی اداکاری پر بھی جس سے وہ خود کو دادا ثابت کرنا چاہتے تھے۔ انھیں رلوا اور دھلا کے بھی فرار ہونے پر مجبور کیا جا سکتا تھا مگر میرے ساتھ شاید نازو کا موڈ بھی تفریح کا تھا۔
"یہ پلاٹ تریوینی کا ہے" تیسرے شخص نے اپنی مونچھیں مروڑ کے کہا "خیریت چاہتے ہو تو فوراً خالی کر دو"۔
چوتھے شخص نے فقط سر ہلا کے اس بات کی تائید کی۔ وہ عادتاً کم گو معلوم ہوتا تھا مگر اس کی آنکھیں سانپ کی آنکھوں کی طرح گول تھیں۔
اچانک نازو نے کہا "اب تو ہم قبضہ کر چکے اس جگہ پر"۔
میں نے کہا "ہاں، جا کے بتا دو تریوینی کو"۔
گنجا ایک قدم آگے بڑھ آیا "تریوینی کو بتانے کی کیا ضرورت ہے"۔
"ہاں، اُسے بتا دیا تو وہ تمھارے گنجے سر پر جوتے سے طبلہ بجائے گا" نازو نے کہا۔
"اے چھوکری، بہت بڑھ کے مت بول" مشتعل ہو کے اُس نے پھر لاٹھی کو زمین پر مارا۔
نازو بڑے اطمینان سے اس کے سامنے چلی گئی اور اس سے چند انچ کے فاصلے پر ٹھہر گئی۔ محسن اور غالب نے مجھ سے دبے لفظوں میں کہا کہ جب جا ہی رہے ہیں تو پھر خواہ مخواہ کا جھگڑا کرنے کی کیا ضرورت ہے مگر میں نے انھیں اشارے سے

خاموش کر دیا کہ تھوڑا سا تماشا دیکھو۔
نازو چند سیکنڈ لاٹھی والے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتی رہی۔ وہ کچھ حیران تھا کہ آخر یہ لڑکی کیا چاہتی ہے۔ عورت پر ہاتھ اٹھانا اس کی شانِ مردانگی کے خلاف ہوتا چنانچہ اُس نے انتظار کیا۔ اس کے فرشتوں کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ چند سیکنڈ بعد کیا ہونے والا ہے۔
نازو نے ایک ہاتھ مار کے پہلے اُس کی لاٹھی چھینی اور دُور پھینک دی۔ اس کے لیے نازو نے صرف ایک ہاتھ اُس کی کہنی کے جوڑ پر مارا۔ وہ بلبلایا اور لاٹھی پر اُس کی گرفت باقی نہ رہی۔ غالباً اُس کی کہنی کا جوڑ ہل گیا تھا۔
پھر اس سے پہلے کہ لاٹھی والا کوئی جوابی کارروائی کرتا، نازو نے ساری میں ہونے کے باوجود زنانہ سینڈل سے اس کی پنڈلی پر زور سے کک رسید کی اور ایک ہاتھ کی دو انگلیاں اس کی آنکھوں میں گھسیڑ دیں۔ وہ پاگلوں کی طرح مُنہ پر ہاتھ رکھ کے چلانے لگا اور زمین پر گر گیا۔
دوسرے شخص نے صورتِ حال کی نزاکت کو فوراً سمجھ لیا اور وہ پیچھے سے نازو کی نازک کمر دبوچنے کے لیے لپکا ہی تھا کہ نازو نے گھوم کے اُس کی پشت پر ایک ہاتھ مارا اور وہ آگے جھکا تو اُسے ایک پاؤں اَڑا کے مُنہ کے بل گرا دیا۔ وہ بڑی پھرتی سے اُٹھ گیا تھا لیکن نازو نے اُس کا ہاتھ تھام کے ایک جھٹکا دیا۔ ایک گھٹنا اوپر اُٹھایا اور اُسے پلٹ کے زمین پر دے مارا۔
اب تک مقابلہ ایک اور ایک کا تھا۔ جب باقی چار نے نازو کو گھیرنے کی کوشش کی تو میرے لیے بھی جنگ میں کُود پڑنے کے سوا چارہ نہ رہا۔ غالب اور محسن کے لیے یہ کوئی غیر متوقع یا انوکھا مقابلہ نہیں تھا مگر ڈاکو محمد خان عرف خونی خان تو نازو کی چابک دستی، مہارت، فن اور ناقابلِ یقین تباہ کاری پر انتہائی حیرت سے مُنہ کھولے کھڑا بار بار کہہ رہا تھا۔
"واہ... بھئی کمال کر دیا... بھئی واہ...!"
میری شمولیت سے جنگ کا نقشہ بدلنے میں دیر نہیں لگی۔ چند منٹ بعد میں نے ہاتھ جھاڑ کے کہا "چلو کام ختم"۔
ڈاکو محمد خان حیرت اور ستائش کے جذبات کے ساتھ میری اور نازو کی کارکردگی کا نتیجہ دیکھ رہا تھا۔ چھ افراد فرش پر ٹوٹے پھوٹے شکستہ اعضا کے ساتھ بکھرے پڑے ہوئے کرب سے چلا رہے تھے، لوٹ رہے تھے یا بالکل ساکت پڑے ہوئے تھے۔ بہت دُور ریلوے لائن کے دوسری طرف جھونپڑپٹی کے مکینوں کا ایک مختصر سا ہجوم خاصی دہشت کے ساتھ اس مختصر سنسنی خیز مقابلے کو دیکھ رہا تھا — آس پاس کیمرہ کوئی نہیں تھا، ورنہ وہ فرض کر لیتے کہ یہ بھی کسی فلم

کی شوٹنگ کا سین ہے۔ اب انھوں نے سمجھ لیا ہو گا کہ یہ اقتدار کی جنگ تھی۔ بمبئی میں بدمعاشوں کے مختلف گروہ کسی نہ کسی دادا کی کمان میں اسی طرح ٹکراتے رہتے ہیں۔
"تم نے واقعی ٹھیک کہا تھا، یہ لڑکی آسمانی بجلی ہے"۔ خونی خان نے اپنی مونچھوں پر تاؤ دے کر کہا "ایسی ایک لڑکی میرے ساتھ ہوتی تو میں سارے ہندوستان کو فتح کر لیتا"۔
میں نے ہنس کے کہا "خدا گنجے کو ناخن نہیں دیتا"۔
رابعہ نے کہا "اب اس سے پہلے کہ پولیس بھی آ جائے یہاں سے نکل چلو"۔

میں نے کہا "اچھا۔ تم کہتی ہو تو چلتے ہیں، ورنہ کچھ دیر ٹھہرتے تو شاید تریوینی کا ہیلی کاپٹر بھی ہمارے سامنے اُتر جاتا"۔
"تم نے پھر کیا طے کیا ہے؟" نازو نے کہا۔
"تم گاڑی لے کر چلو، کتنی سواریاں ہیں تمھارے پاس؟"
"ہم سب پہلے دو گاڑیوں میں آئے تھے، ایک ٹیکسی بھی تھی۔" گل نے کہا۔
"اب بھی ایسا ہی کریں گے۔ تم گل کو چھوڑ جاؤ، وہ پیدل چل سکتی ہے کچھ دُور ہمارے ساتھ... چاہو تو رابعہ کو بھی چھوڑ دو اور صرف اپنے بیمار کو لے جاؤ"۔
"کہاں لے جاؤں، کچھ پتا بھی تو چلے" نازو نے کہا۔
"ابھی تو سڑک تک چلو، ہم پیدل پہنچتے ہیں، اس کے بعد پکڑ لیتے ہیں کوئی ٹیکسی۔" میں نے کہا "آئیے خان صاحب"۔
ڈاکو محمد خان جو خونی خان کے نام سے مشہور تھا اب کسی شریف آدمی اور پرانے شناسا کی طرح میرے ساتھ چل پڑا۔
"تم بھی آ جاؤ گل بانو" میں نے کہا "بہت ہو گئی تیمارداری"۔
"مجھ پر کیوں حکم چلاتے ہیں، رابعہ باجی کو لے جائیں ناساتھ"۔ گل نے کہا۔
نازو کو موقع مل گیا "ہاں، دل تو یہی چاہتا ہو گا جناب کا بھی۔"
میں نے کہا "بابا آخر ظاہر کی شرم و حیا بھی کوئی چیز ہے۔ تم دونوں کے تو دیدوں کا پانی ڈھل گیا ہے۔ چلو تم ہی آ جاؤ رابعہ، گل بھی نہیں چاہتی محسن کو چھوڑنا"۔
میں، رابعہ اور محمد خان ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ گاڑی ہمارے قریب سے دُھول اُڑاتی گزر گئی۔ ابھی ہم نے وہ سیمنٹ کا پختہ میدان جو تریوینی کا ہیلی پیڈ تھا عبور نہیں کیا تھا کہ میرے کانوں نے ایک مانوس آواز سُنی اور میں نے بے اختیار سر گھما کے پیچھے آسمان کی سمت میں دیکھا تو مجھے سہ پہر کے پُرتمازت

آسمان پر کوّوں اور چیلوں سے الگ ایک بہت بڑا پرندہ محوِ پرواز دکھائی دیا۔ یہ ہیلی کاپٹر تھا اور اس کا رُخ دیکھ کے

یہ اندازہ کرنا دشوار نہ تھا کہ تریوینی بالآخر اپنے پائلٹ اور اپنے نئے کاروباری رفیق چوہدری دلاور کے ہمراہ بڑی شان سے شکست قبول کر کے لوٹ آیا ہے۔

اچانک ہمیں سامنے سے خالی ٹیکسی آتی دکھائی دی۔ اس سے پہلے کہ میں اسے ہاتھ دے کر روکتا، ڈرائیور نے خود ہی بریک لگا کے اپنا سر باہر نکالا۔

"ایک عورت، دو مرد۔ ایک کی بڑی بڑی مونچھیں، دوسرا.... ٹھیک ہے۔" ڈرائیور نے بہ آوازِ بلند ہمارا حلیہ دیکھ کے کہا۔ "بیٹھ جاؤ۔"

میں سمجھ گیا کہ اسے نازو نے ہماری طرف بھیجا ہوگا۔ ٹیکسی کے آجانے سے ہم سڑک تک پیدل جانے کی پریشانی سے بچ گئے اور اس طرح خطرے کی حدود سے باہر نکلنے میں کامیاب رہے۔ چند منٹ بعد ہم اُس سڑک پر عین اُس جگہ پہنچے جہاں نازو نے گاڑی کو سڑک کے کنارے روک رکھا تھا۔ میں اُتر کے اُس کے پاس گیا۔

"اب تم آگے چلو۔" نازو نے کہا۔ "لیکن آگے پولیس بہت سخت چیکنگ کر رہی ہے۔"

"پولیس کیا چیک کر رہی ہے؟" میں نے کہا۔

"یہ تو مجھے نہیں معلوم مگر ممکن ہے چوری کی گاڑیاں دیکھ رہی ہو، کسی مفرور ڈاکو یا کسی سکندرِ اعظم کی تلاش میں ہو۔" نازو نے کہا۔

"پھر اب کیا کرنا چاہیے؟" میں نے کہا۔ "ہمارے پاس تو پکڑے جانے کے لیے بہت کچھ ہے، چوری کی گاڑی بھی ہے اور ایک ڈاکو بھی۔"

"آسان طریقہ یہ ہے کہ واپس چلیں۔"

میں نے محمد خان سے مشورہ کیا تو وہ پریشان نظر آنے لگا۔ "اگر راستے میں کہیں بھی چیکنگ ہوگی تو میرا بچ کے نکلنا ہی ناممکن ہوگا۔"

"یہ رِسک تو لینا ہی پڑے گا۔" میں نے کہا۔

"میں رِسک نہیں لے سکتا۔" محمد خان نے کہا۔ "بمبئی میں ایسا کوئی پولیس افسر نہیں جو مجھے نہ پہچانتا ہو۔"

"اتنی شہرت کے باوجود تم یوں پھر رہے ہو؟"

"میں پھر نہیں رہا ہوں، بھاگ رہا ہوں۔" وہ بولا۔ "آج ہی صبح تو میں جیل سے بھاگا ہوں۔"

"میرا مطلب تھا کہ تم کو اپنا چہرہ اور حلیہ بدل لینا چاہیے تھا اتنی دیر میں۔" میں نے کہا۔

"اس کا موقع ہی کہاں ملا مجھے، میں پھنس گیا تمھارے ساتھ۔" محمد خان نے کہا۔ "کوئی اور ہوتا تو میں اُسے ریوالور دکھا کے اُسی

کے گھر جاتا اور پھر وہاں سے نکلتا تو میرا باپ بھی نہ پہچانتا مجھے۔"

"ہم بھی جو گاڑی لیے پھر رہے ہیں۔" نازو نے کہا۔ "گاڑی اتنی اہم نہیں ہو سکتی جتنا خونی خان۔"

محمد خان نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "تم نہیں جانتے، ساری بمبئی کو الرٹ کر دیا گیا ہوگا۔ گاڑیاں تو روز نہ جانے کتنی چوری ہوتی ہیں۔"

"اس گاڑی کا معاملہ بھی ایسا ہے کہ پولیس اسے عام گاڑی نہیں سمجھ سکتی۔" میں نے کہا۔ "پولیس پر تریوینی کا دباؤ ہوگا اور خود پولیس کے افسر بہت مشتعل ہوں گے، ہم نے اُن کے محکمے کے ساتھ بھی تو بہت زیادتی کی تھی۔"

ٹیکسی والے نے چلّا کے کہا۔ "او یار، یہ کیا کانفرنس ہو رہی ہے کہیں جانا ہے یا نہیں جانا؟"

میں نے اُسے گھور کے دیکھا۔ "جلدی کیا ہے؟"

نازو نے کہا۔ "تم سے ہم نے کہا تھا کہ بمبئی کی سیر کرنی ہے۔"

"تو سیر کرو نا۔" وہ بولا۔

میں نے کہا۔ "ہم سیر ہی کر رہے ہیں، تم کو کرایہ میٹر سے نہیں گھنٹے کے حساب سے دیں گے۔"

محمد خان نے کہا۔ "میں تمھارے ساتھ نہیں جا سکتا۔"

میں نے کہا۔ "عقل سے کام لو، تم اکیلے کہاں جا سکتے ہو۔ اگر پولیس پرائیویٹ گاڑیوں کو بھی چیک کر رہی ہے تو کیا تم پیدل جاؤ گے؟ آج ایک دن میں بہت سے واقعات پیش آئے ہیں۔ پہلے تم جیل سے فرار ہوئے پھر تم نے ایک گاڑی چھینی، ہم نے تریوینی کا خانہ خراب کیا اور اس کے بعد پولیس کا... پھر ہم نے ایک گاڑی چھینی جو ابھی تک ہمارے پاس ہے اور صبح سے اب تک بمبئی میں یہ تمام سنگین جرائم کرنے والے ہیں ہم لوگ جو ایک ساتھ پھر رہے ہیں۔"

"ہمیں ایک ساتھ نہیں رہنا چاہیے۔" رابعہ نے مجھ سے اتفاق کیا۔

"یہ ٹھیک ہے ہمیں الگ الگ ہو جانا چاہیے۔" غالب نے کہا۔

"محمد خان صاحب!" میں نے کہا۔ "اب آپ کو صرف ہم بچا سکتے ہیں۔ اگر پولیس ہر چوک پر ہر گاڑی کو چیک کرے تب بھی تمھیں نہیں پکڑا سکتی۔"

"وہ کیسے؟" محمد خان بے حد متفکر نظر آرہا تھا۔

"ہے ایک طریقہ، پہلے تم یہ بتاؤ کہ تمھارا ٹھکانا کہاں ہے؟ بالکل صحیح نقشہ بنا کے سمجھا دو۔" میں نے کہا۔ "پرانے زمانے میں ڈاکوؤں کے ٹھکانے شہر سے باہر پہاڑوں کے غار ہوا کرتے تھے۔"

"فلموں میں اب بھی ہوتے ہیں۔" نازو نے کہا۔

"یہ لڑکی تم کو سیدھا وہاں پہنچا دے گی، جہاں تم سمجھتے ہو کہ تمھارے لیے کوئی خطرہ نہیں۔" میں نے کہا۔

محمد خان نے سر ہلایا مگر وہ تذبذب کا شکار تھا۔

میں نے کہا۔ "یہ تین لڑکیاں ہیں، تم ان کے ساتھ جاؤ۔"

محمد خان نفی میں سر ہلانے لگا۔ "اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ میرے ساتھ کون ہے۔ پولیس تو مجھے ایک نظر دیکھتے ہی ہر طرف سے گھیر لے گی۔"

میں نے کہا۔ "جب تم نظر ہی نہیں آؤ گے تو پولیس کیسے گھیرے گی؟"

"دیکھو، پہیلیوں میں باتیں مت کرو، میں جاہل آدمی ہوں اور پریشان بھی ہوں۔ اگر میں پکڑا گیا تو واپس جیل بھیج دیا جاؤں گا، میں آسانی سے گرفتار ہونے والا نہیں ہوں لیکن تمھارے ساتھ رہ کے میں کیا کر سکتا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "خان صاحب! طیش میں آنے کی ضرورت نہیں جو کام آسانی سے ہو جائے وہ مشکل میں پڑ کے نہیں کرنا چاہیے۔ تم بس یہ بتا دو کہ تمھارا وہ ٹھکانا کہاں ہے جہاں تم پہنچنا چاہتے تھے اور جہاں تمھارے ساتھی تمھارا انتظار کر رہے ہیں۔ اچھی طرح سمجھا دو نازو کو... ویسے تو یہ تم سے راستے میں بھی پوچھ سکتی ہے۔ اگر کہیں راستہ بھول گئی تو ڈکی کھولے گی اور تم سے بات کر لے گی۔"

"ڈکی... میں ڈکی میں جاؤں گا؟"

میں نے کہا۔ "ہاں، گاڑی میں یہ تین لڑکیاں ہوں گی۔ اگر پولیس نے انھیں غلطی سے روکا بھی تو ان کی آنکھیں چندھیا جائیں گی۔ اندر انھیں ڈاکو تو کیا کوئی مرد بھی نظر نہیں آئے گا۔ یہ ان کے لیے بعید از قیاس بات ہوگی کہ اتنی حسین اور معزز نظر آنے والی خواتین کسی ڈاکو کو ڈکی میں چھپا کے لے جا رہی ہیں۔ اس کار کی وہ تلاشی تک نہیں لے سکتے اور یہ خیال بھی انھیں نہیں آسکتا کہ کار چوری کی ہوگی۔"

"کہتے تو تم ٹھیک ہو۔" محمد خان نے کہا۔

"بس تو پھر دیر مت کرو، نازو کو پتا سمجھاؤ اور جاؤ۔" میں نے کہا۔

"اور تم لوگ...؟"

میں نے کہا۔ "ہمیں بھی بتا دو کہ کہاں پہنچنا ہوگا ہم کسی نہ کسی طرح راستہ بنا لیں گے اپنا۔ ہمیں تریوینی کے گرگے بھی تلاش کر رہے ہیں اور کسی حد تک ہم پولیس کو بھی مطلوب ہیں مگر ہماری شہرت ابھی ایسی نہیں ہے کہ ہر تھانے میں ہماری تصویر ہو اور بمبئی کی ساری پولیس ہمارے نام اور حلیے سے واقف ہو۔ ہم ابھی گمنام لوگ ہیں۔"

بات محمد خان کی سمجھ میں آگئی تھی۔ اُس نے کہا۔ "میں پتا زبانی سمجھاؤں یا لکھ کے دوں؟"

نازو نے کہا۔ "لکھ دو تو اچھا ہے، ہم کسی سے پوچھ بھی لیں گے۔"

"کاغذ قلم... میرے پاس کچھ نہیں ہے۔"

نازو نے کار کے گلوز کمپارٹمنٹ میں ہاتھ مارا اور ایک نوٹ بک برآمد کی جس کے اندر بال پوائنٹ پین لگا ہوا تھا۔ محمد خان نے اُس پر پتا لکھا پھر کچھ نقشہ سا بنایا اور صفحہ پھاڑ کے مجھے پکڑا دیا۔ یہی نقشہ اس نے دوسری بار بنا کے نوٹ بک نازو کے حوالے کر دی۔ میں نے پتے کو صرف پڑھا اور غور کیے بغیر جیب میں ڈال لیا۔

ٹیکسی ڈرائیور کے غیر معمولی تجسس نے مجھے چوکنا کر دیا۔ وہ بڑے غور سے محمد خان کی صورت دیکھ رہا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے کسی سوچ میں مبتلا ہے۔ میں نے گل کو کار میں منتقل ہونے کا اشارہ کیا اور کار میں سے غالب اور محسن نکل کے ٹیکسی میں بیٹھے تو شک کے سائے ٹیکسی ڈرائیور کی آنکھوں میں گہرے ہو گئے۔

میں نے کہا۔ "اب کیا سوچ رہے ہو، چلو؟"

ٹیکسی ڈرائیور چونکا۔ "آپ دوسری ٹیکسی لے لو۔"

میں نے کہا۔ "وہ کیوں؟"

"وہ... در اصل مجھے ایک بہت ضروری کام یاد آگیا ہے۔" اس نے کہا اور مجھے یقین آنے لگا کہ وہ ڈاکو محمد خان کو پہچان چکا ہے مگر میں نے اس خدشے کا اظہار نہیں کیا۔

"تم اب کہاں جاؤ گے، اپنے گھر؟" میں نے کہا۔

"نہیں، گھر تو نہیں جاؤں گا۔"

"تو پھر جہاں بھی جا رہے ہو ہمیں ساتھ لے چلو۔" میں نے کہا۔

"تمھیں کیا معلوم میں کہاں جانا چاہتا ہوں۔" ڈرائیور نے چڑ کے کہا۔

"ہاں، معلوم تو نہیں ہے لیکن ہمارا مقصد بھی سیر کرنے کے سوا کیا ہے۔ سیر کہیں بھی کی جا سکتی ہے۔ تم چلتے رہو، ہم نظارہ کرتے جائیں گے اور جہاں تم کہو گے، اُتر جائیں گے۔" میں نے کہا۔

"آخر تم دوسری ٹیکسی کیوں نہیں لیتے؟ میں یہ کرایہ بھی چھوڑتا ہوں جو ابھی میٹر میں ہے۔"

لہجہ بدل کے میں نے کہا۔ "اب ہم تمھیں چھوڑنے کے موڈ میں نہیں ہیں دوست! شرافت سے ٹیکسی کو واپس موڑ لو اور جہاں بھی ہم کہیں خاموشی سے چلتے جاؤ ورنہ...!"

"ورنہ... ورنہ کیا کرو گے؟"

"ورنہ ہم خود بھی ڈرائیونگ جانتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ ٹیکسی بھی چلا سکتے ہیں۔"

"تم دھمکی دیتے ہو مجھے، گاڑی چھینو گے تم میری۔" اُس نے مشتعل ہو کے گاڑی سے اُترنے کی کوشش کی۔ مَیں نے اُسے وہیں دبوچ لیا۔ اُس نے مدد کے لیے لوگوں کو بُلانے کی کوشش کی تو مَیں نے ایک ہاتھ اُس کے مُنہ پر رکھ دیا اور پھر اُسے سیٹ سے اُٹھا کے پیچھے کھینچ لیا۔ وہ تڑپا پھر اُس نے لاتیں چلائیں مگر میری گرفت سے نہ نکل سکا۔ میرا ارادہ اُس کو مارنے کا نہیں تھا چنانچہ مَیں نے کہا۔

"اب ہم سیر کرائیں گے تمھیں اور تم خاموش بیٹھو گے تو یہ تمھارے حق میں بہتر ہوگا، ورنہ ہم تمھیں خاموش بھی کر سکتے ہیں، کچھ دیر کے لیے یا ہمیشہ کے لیے۔"

غالب نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔ اُس نے احتیاط کے ساتھ ٹیکسی کو ریورس گیئر میں ڈالا اور پھر ایک نصف دائرہ بناتے ہوئے واپس موڑا۔ یہ سب کارروائی ایک ایسی جگہ پر ہوئی تھی، جہاں بہت کم لوگوں کی نظر پڑ سکتی تھی۔ سڑک پر ٹریفک کم نہیں تھی مگر نازو نے کار ایک عمارت کے عقبی گلی نما حصّے میں روکی تھی جس کے سامنے کسی میدان کی ہری بھری باڑھ تھی۔ باڑھ کے اُدھر کافی فاصلے پر بچّے فٹ بال کھیل رہے تھے۔ غالباً وہ کسی اسکول یا کالج کا پلے گراؤنڈ تھا۔ عمارت کے سامنے والے حصّے میں دُکانیں تھیں اور اوپر فلیٹ تھے مگر پچھلے حصّے کو لوگ صرف کوڑا کرکٹ پھینکنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ ہم وہاں دس پندرہ منٹ ہی رُکے تھے اور اس دوران میں عمارت کی مختلف منزلوں سے تین کھڑکیوں کے راستے باہر کوڑا پھینکا گیا تھا۔ یہ اتفاق تھا کہ ہم براہِ راست اس کی زد میں نہیں آئے۔

ڈاکو محمد خان نے خود کو ڈکی میں بند کر لیا تھا۔ کار واپس ہوئی لیکن واپس گھوم کر ہمارے پیچھے نہیں آئی۔ نازو، گُل اور رابعہ نے وہی راستہ اختیار کیا جس پر آگے چیکنگ ہو رہی تھی اور پولیس کی ناکہ بندی تھی۔ مَیں نے محمد خان کا دیا ہوا پتا غالب کے حوالے کر دیا۔

ٹیکسی اُس جگہ سے ایک کلومیٹر دُور آ چکی تھی۔ مَیں نے ڈرائیور کو آزاد کرنے سے پہلے ٹیکسی کے شیشے چڑھا دیے۔

ڈرائیور نے ایک لمبی گہری سانس لی اور پھر مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگا۔ "تم ڈاکو تو نہیں لگتے۔"

مَیں نے کہا "تمھاری بصارت اور بصیرت دونوں ہی ٹھیک ہیں۔"

"کیا مطلب، مَیں غلط کہہ رہا ہوں؟"

مَیں نے کہا "بالکل ٹھیک کہا تھا تم نے۔ ہماری سات پُشتوں میں کوئی ڈاکو نہیں تھا اور نہ آنے والی سات نسلوں میں کسی کے ڈاکو بننے کے امکانات ہیں۔"

"پھر تم ڈاکو محمد خان کے ساتھ کیوں پھر رہے ہو؟"

"کون محمد خان، کیسا ڈاکو؟" مَیں نے کہا۔

"وہ مونچھوں والا۔ وہ آج ہی جیل سے فرار ہُوا ہے، مَیں نے خود اخبار کا ضمیمہ پڑھا ہے۔ اس کی تصویر بھی چھپی ہے، سارے بمبئی کی پولیس ہر جگہ اسے تلاش کرتی پھر رہی ہے۔"

"اچھا، یہ بات ہے!" مَیں نے تعجب سے کہا۔

"ہاں، تمھیں شاید معلوم نہیں۔" ٹیکسی ڈرائیور کا حوصلہ کچھ بڑھ گیا۔ "اس کو گرفتار کرانے والے کے لیے دس لاکھ کے انعام کا اعلان بھی ہوا ہے۔"

"کمال ہے! آج ہی وہ فرار ہُوا ہے اور آج ہی انعام کا اعلان بھی ہو گیا۔"

"انعام پہلے بھی تھا مگر پھر وہ پکڑا گیا۔"

"اُس نے خود گرفتاری پیش کر دی تھی؟" غالب نے کہا۔

"نہیں، وہ بڑے سخت مقابلے کے بعد گرفتار ہُوا تھا۔"

"جس نے اس کا پتا بتایا تھا اُسے دس لاکھ ملے تھے؟"

"نہیں، میرا خیال ہے انعام تو کسی کو نہیں ملا تھا۔" ڈرائیور نے سوچ کے کہا۔

"کیوں؟ عموماً ایسی گرفتاریاں اور چھاپے پولیس کے مخبروں کی اطلاع کا نتیجہ ہوتے ہیں۔" مَیں نے کہا۔

غالب نے کہا "یار، وہ راہ چلتے مل گیا ہو گا کہیں اور بس پولیس نے کھٹ سے پکڑ لیا۔ مقابلہ تو ایسے ہی نمائشی ہُوا ہو گا؟"

"اُس وقت کی بات تو مجھے معلوم نہیں۔"

"مَیں بتاتا ہُوں تجھے ٹیکسی والے بھائی۔ خونی خان کو گرفتار کرانا اور پھر اس بہادری کے کارنامے پر انعام وصول کرنا اتنا ہی مشکل اور ناممکن ہے جتنا کسی آدم خور شیر کے غار میں خالی ہاتھ جانا، اُسے کان سے پکڑ کے باہر لانا اور اس کی کھال اُتار کے دس لاکھ میں فروخت کرنا۔ مجھے پہلے ہی شک ہو گیا تھا کہ تمھارے دماغ میں کیا ہے۔ تم پولیس کو اطلاع دینا چاہتے تھے نا؟ بے وقوف آدمی، خودکشی کے آسان طریقے بھی ہیں، خود شوق سے مرو، کم سے کم بیوی بچوں کی، ماں باپ کی اور بھائی بہن کی جان تو مت لو۔"

اُس کا رنگ فق ہو گیا۔ "یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"مَیں تم کو ایک ایسی بات سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں، جو تمھاری ناقص عقل میں اس لیے نہیں آ رہی ہے کہ تمھاری آنکھوں پر دس لاکھ کے لالچ کی پٹی بندھی ہوئی ہے۔" مَیں نے کہا "مجھے یہ بتاؤ کہ یہ دس لاکھ کیسے لو گے؟ تم خونی خان کو پکڑ کے تھانے لے جاؤ گے اور تھانیدار اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کے دس لاکھ نکالے گا اور تمھارے شانے پر تھپکی دے کر کہے گا، شاباش جوان... اور رقم تمھارے حوالے کر دے گا اور تم اس کے بعد عیش کرو گے، کوٹھی میں رہو گے اور کار میں گھومو گے۔ تم نے یہ بھی سوچا ہے کہ خونی خان کے کچھ ساتھی بھی ہیں، جو تمھیں چھوڑیں گے نہیں، خواہ تم قطب شمالی میں چلے جاؤ یا بحرالکاہل کی تہ میں جا بیٹھو۔"

"حکومت نے انعام کا اعلان کیا ہے تو حفاظت بھی کرے گی۔" ٹیکسی ڈرائیور نے کہا مگر اب اُس کا لہجہ اعتماد سے خالی تھا۔

"حکومت کب تک حفاظت کرے گی اور کس کس کی حفاظت کرے گی۔ بفرضِ محال کوئی خود کو انعام کا حق دار ثابت کر دے تب بھی انعام ملنے تک مہینوں تو ضابطے کی کارروائی میں لگ جاتے ہیں، اتنا عرصہ تم کہاں رہو گے؟ وہ تمھارے خاندان کے ایک ایک فرد کو ختم کر سکتے ہیں جو اپنے سردار کو جان ہتھیلی پر رکھ کے جیل سے نکال لائے ہیں۔ اس خیال کو دل سے نکال دو۔ ٹیکسی چلا کے کتنا کما لیتے ہو؟"

"سو سوا سو روپے روز کا مل جاتا ہے۔"

"ابھی اسی کو بہت سمجھو۔ اپنی اور اپنے سارے خاندان کی زندگی کے بدلے میں دس لاکھ لے کر کیا کرو گے؟"

وہ خاموش ہو گیا مگر مجھے ایسا لگتا تھا کہ میری بات نے اُسے مطمئن نہیں کیا ہے۔ اُس کی نظروں کے سامنے دس لاکھ گھوم رہے تھے۔ شاید وہ سوچ رہا ہو گا کہ دس لاکھ مل جائیں گے تو اپنے خاندان سمیت اس شہر سے یا اس ملک سے ہی چلا جائے گا۔ ڈاکو محمد خان کے ساتھی اسے کہاں تلاش کریں گے، دُنیا تو بہت بڑی ہے۔

بازاروں کی بھیڑ، لوگوں کے ہجوم اور ٹریفک کے اژدہام سے گزرتی ہوئی ٹیکسی نہ جانے کدھر رواں تھی۔ آگے غالب کے ساتھ محسن بھی بیٹھا ہُوا تھا اور صرف ایک گھنٹے میں اس کی حالت میں ایک معجزہ رونما ہُوا تھا۔ وہ اب بالکل نارمل تھا اور غالب کو نقشے کی مدد سے صحیح راستے پر چلتے رہنے میں مدد دے رہا تھا۔ شاک کی وہ ذہنی کیفیت ختم ہو چکی تھی جو اسیری کے پُرتشدد دور کا نتیجہ تھی۔ ہم سب کو اپنے قریب پا کے اور ہماری محبت اور توجہ دیکھ کے بالآخر اس کو تحفظ کا اعتماد حاصل ہو گیا تھا۔ تھوڑے سے آرام اور کچھ مناسب خوراک نے محسن کو اتنی توانائی بھی عطا کر دی تھی کہ وہ خوشگوار موڈ میں باتیں کرنے کے قابل ہو گیا تھا اور اگلی سیٹ پر سیدھا بیٹھا ہُوا سگریٹ کے کش لیتے ہوئے اس شخص سے بالکل مختلف نظر آ رہا تھا جسے مَیں نے اور نازو نے ایک پنجرہ نما قید خانے میں سے نکالا تھا۔

مَیں ٹیکسی ڈرائیور کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس شخص کو ڈاکو محمد خان کے ٹھکانے تک لے جانا خود ہمارے لیے بھی خطرناک ہو سکتا تھا۔ وہ میرے ڈرانے کے باوجود دس لاکھ کے خوابوں سے تائب نہیں ہُوا تھا۔ معلوم نہیں اس کے دل میں کتنی ناآسودہ خواہشوں اور حسرتوں نے طوفان بپا کر رکھا تھا اور عقل کی کوئی دلیل اس طوفان کو نہیں دبا سکتی تھی۔

مَیں نے ایک اور کوشش کرنے کا فیصلہ کیا "مسٹر ٹیکسی ڈرائیور! تم نے ڈاکو محمد خان کو ہمارے ساتھ دیکھا تھا۔ ہم ڈاکو ہوں یا نہ ہوں، اُس کے دُشمن بہر حال نہیں ہیں۔ دُشمن ہوتے تو تم سے پہلے دس لاکھ وصول کرنے کی کوشش ضرور کرتے۔ تمھیں ہم سے بھی ڈرنا چاہیے، ہم ایسا کبھی نہیں ہونے دیں گے کہ کوئی دس لاکھ کے لیے محمد خان کو پولیس کے ہاتھ بیچ دے۔"

"کیوں مغز کھپا رہے ہو اس اُلّو کے پٹھے کے ساتھ۔" غالب نے کہا "گولی مارو اور لاش باہر گرا دو۔"

"نہیں۔" ٹیکسی ڈرائیور چلّایا "تم ایسا نہیں کر سکتے۔"

مَیں نے کہا "یہ تو سب سے آسان کام ہو گا ہمارے لیے۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے ایک دم دروازہ کھول کے باہر کُودنے کی کوشش کی۔ دروازہ پورا کھل گیا لیکن مَیں ٹیکسی ڈرائیور کو دبوچ کر پیچھے کر دینے میں کامیاب رہا۔ ٹیکسی کی رفتار زیادہ تھی اور ہَوا مخالف۔ دروازہ ایک دم کُھلا تو اُس کی لپیٹ میں ایک موٹر سائیکل والا آ گیا جو ٹیکسی کو غلط سائڈ سے اوورٹیک کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دروازہ اُس سے ٹکرایا تو وہ موٹر سائیکل سمیت اُلٹ گیا۔ مَیں نے اُسے سڑک پر گرتے دیکھا۔ ٹیکسی اس وقت ایک چوک سے گزر رہی تھی۔ دروازہ بند کرتے ہوئے مَیں نے ٹریفک پولیس کی ایک گاڑی کو روانہ ہوتے دیکھا۔ جہاں وہ موٹر سائیکل سوار گرا تھا، وہاں بھی لوگ جمع ہو رہے تھے۔ یہ معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ کس حد تک زخمی ہُوا تھا۔ موٹر سائیکل کے حادثے میں بہت کچھ آدمی کی اپنی قسمت پر منحصر رہتا ہے۔ بعض اوقات صرف خراشوں پر بات ٹل جاتی ہے اور کبھی کچھ نہیں ہوتا مگر سر کی اندرونی چوٹ جان لے لیتی ہے۔

مَیں نے غصّے میں ٹیکسی ڈرائیور کے ایک ہاتھ مارا تو وہ دوسرے دروازے پر گرا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سخت خوفزدہ اور بدحواس ہونے کے باوجود اُس نے حوصلہ نہیں ہارا تھا۔ مجھے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ ایک ناکامی کے بعد اتنی جلدی دوسری کوشش کرے گا۔ شاید وہ سمجھ گیا تھا کہ اس نے اپنے عزائم کا اظہار کر کے خود اپنی سلامتی کو خطرے میں ڈال دیا ہے اور اگر اس نے خود ہی ہماری قید سے نجات حاصل کرنے میں کامیابی حاصل نہ کی تو ہم بالآخر اسے خونی خان کے حوالے

کر دیں گے۔ اس کے سر پر خاصی چوٹ آئی تھی لیکن اس نے خود کو سنبھال لیا۔ اس نے بڑی پھرتی سے دوسرے دروازے کو کھولا اور مجھے ایک لات بھی مارنے کی کوشش کی۔ میں نے آخری وقت میں اُسے پکڑنا چاہا تو اس کا ایک جوتا میرے ہاتھوں میں رہ گیا۔ وہ خود بھی صحیح طرح سے باہر نہ گر سکا۔ اس کا آدھا دھڑ باہر لٹک گیا اور سر تارکول کی سڑک پر لگنے کے بعد ٹیکسی کی رفتار سے رگڑ کھاتا گیا پھر باقی دھڑ باہر گرا اور ظاہر ہے اتنی دیر میں وہ ایک پُراذیت موت سے دوچار ہو چکا تھا۔ اس کا سر پھٹ گیا تھا اور شاید گردن بھی ٹوٹ گئی تھی۔

میں نے دروازہ بند کر کے پیچھے دیکھا تو پولیس کی جیپ ہمارے تعاقب میں تھی۔ غالب کو پیچھے دیکھے بغیر معلوم ہو گیا تھا کہ دس لاکھ کا انعام حاصل کرنے کی حسرت رکھنے والے ٹیکسی ڈرائیور نے خودکشی کر لی ہے۔ اس نے اپنی تمام توجہ ڈرائیونگ پر رکھی تھی۔ وہ ٹیکسی کو پولیس جیپ کی دسترس سے دُور لے جانے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ مجھے افسوس ہوا کہ غالب کو اس طرح شدید دباؤ میں ڈرائیونگ کی اعصابی اور جسمانی مشقت کرنی پڑی۔

ٹیکسی جو دیکھنے میں شکستہ حال تھی، اس ریس کے لیے بہترین ثابت ہوئی۔ اس کا انجن شاید نیا بنا ہوا تھا جب کہ سرکاری جیپ کا انجن سرکاری ملازم کی طرح ہی نااہل ہو گیا تھا۔ ٹیکسی کئی سڑکوں اور بازاروں سے طوفانی رفتار کے ساتھ گزری۔ نہ جانے کتنے لوگ حادثے کا شکار ہونے سے بال بال بچے، بہت سے لوگوں نے بھاگ کے اپنی جان بچائی۔ ٹیکسی نے دو کھڑی ہوئی کاروں کو سائڈ سے چھیل دیا۔ گلیوں میں اندھا دُھند گھسنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ غالب ایک جگہ ون وے ٹریفک میں پھنس گیا۔ اچانک ہم نے خود کو سامنے سے آنے والی گاڑیوں کے نرغے میں پایا۔

غالب نے کہا "اب کچھ نہیں ہو سکتا۔" اور ٹیکسی کا دروازہ کھول کے گاڑیوں سے بچتا، ان کے غضب ناک مالکوں کی گالیوں کو نظر انداز کرتا اور رُک کر تماشا دیکھنے والوں کی پروا کیے بغیر بھاگتا ہوا ایک گلی میں گھس گیا۔ محسن نے حیرت انگیز ہمت سے کام لیا اور اس کے پیچھے رہا۔ میرے لیے اُن دونوں کا تعاقب کرنا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ وہ ٹیکسی وہیں کھڑی رہ گئی تھی اور کاریں اس کے دونوں طرف سے گزر کے آگے جا رہی تھیں۔ پولیس والے خود قانون شکنی نہیں کر سکتے تھے چنانچہ ون وے ٹریفک کا اشارہ دیکھ کے رُک گئے تھے یا شاید دوسری طرف چلے گئے تھے تاکہ ہمیں مخالف سمت سے نمودار ہو کے پکڑیں۔ ان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ ہماری طرح قانون شکنی کرتے ہوئے تعاقب جاری رکھتے۔

مجھے ایک لطیفہ یاد کر کے ہنسی آئی جو بالکل حسب حال تھا۔ کوئی چور اپنی جان بچا کے بھاگا اور پولیس والا اُسے پکڑنے کے لیے بھاگا۔ چور ایک باغ میں داخل ہوا اور لان کراس کر گیا۔ اپنی ناکامی کا اعتراف کرتے ہوئے پولیس مین نے اپنے افسر سے کہا کہ جناب میں کیا کرتا، وہاں بورڈ جو لگا ہوا تھا کہ گھاس پر چلنا منع ہے۔

وہ گلی بہت تنگ تھی پھر ایک جگہ گلی چار حصوں میں منقسم ہو گئی۔ ہم دائیں جانب مڑ گئے۔ تین چار بار سوچے سمجھے بغیر دائیں بائیں مڑنے کے بعد اچانک ہم نے خود کو ایک سرسبز و شاداب علاقے کے سامنے سے گزرنے والی سڑک پر دیکھا۔ وہ کوئی پارک تھا جہاں بہت سے مرد اور عورتیں جمع تھے۔ گیٹ کے ساتھ ساتھ تین فٹ اونچی دیوار تھی اور دیوار پر آہنی سلاخوں والی گرل مزید تین فٹ بلند تھی۔ کاریں فٹ پاتھ کے ساتھ ساتھ قطار میں کھڑی ہوئی تھیں مگر سب خالی تھیں۔ ہم نے باؤنڈری وال کے ساتھ چلنا شروع کیا۔ پیچھے سے ایک کار آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ہمارے قریب سے گزری۔ اس کو ایک نوجوان چلا رہا تھا اور ساتھ والی سیٹ پر ایک اینگلو انڈین ٹائپ لڑکی بیٹھی تھی۔ جو اُس کی محبوبہ ہی ہو سکتی تھی۔ انھیں کار پارک کرنے کے لیے جگہ کی تلاش تھی۔

میں نے غالب کی طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھا اور غالب نے اشارے سے کہا کہ نیک کام میں دیر کیسی۔ اُدھر نشۂ عشق سے مخمور لڑکے نے گاڑی کو فٹ پاتھ کے متوازی کیا اور ایک خالی جگہ میں فٹ کر کے اُترنے کی کوشش کی۔ میں نے اُسے جا لیا۔ میرے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کے نوجوان کا نشہ ہرن ہو گیا۔

میں نے کہا "آواز اتنی ہی رکھنا کہ ہماری باتیں کوئی اور نہ سُن پائے۔"

"اچھا... اچھا... مگر تم...؟"

میں نے کہا "ایسے باتیں کرو جیسے ہم دوست ہیں۔"

اُس نے پھر کہا "اچھ... اچھا... مگر تم...؟"

میں نے کہا "مجھے تمھاری گاڑی چاہیے، جان نہیں... لیکن تم جان دینے کے بعد گاڑی دینا چاہتے ہو تو تمھیں اختیار ہے۔"

اُس نے چابی میرے ہاتھ پر رکھ دی "گاڑی میری نہیں ہے۔"

میں نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ غالب نے اسی قسم کی گفتگو سے اسے بھی قائل کر لیا تھا کہ شور مچانے یا بے ہوش ہونے سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔

"گاڑی چوری کی ہے تو بتا دو" میں نے کہا۔

"گاڑی اس کی ہے" اُس نے بہ مشکل تمام لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

"واہ بیٹا! گاڑی بھی اور لڑکی بھی... خیر... نصیب اچھا ہے تمھارا تو ہمیں کیا" میں نے کہا "گاڑی شام تک ہم کہیں چھوڑ دیں گے۔"

"شام تو ہو رہی ہے" لڑکے نے کہا۔

"ہمیں زیادہ دُور نہیں جانا ہے" میں نے کہا۔

"تم کوئی واردات کرو گے۔ ڈاکا ڈالو گے کہیں یا کسی کو اغوا کرو گے؟" وہ لرزتے ہوئے بولا۔

میں نے اُس کے گال پر پیار سے چپت لگائی "میری جان! ہم ایسے لوگ نہیں ہیں، بس ہمیں ٹیکسی میں سفر کرنا اچھا نہیں لگتا۔ اب تم جاؤ اور پولیس اسٹیشن سے حتی الامکان دُور رہو۔ چابی تم کو گاڑی میں ہی مل جائے گی۔ یہ بتاؤ تمھارا فون نمبر ہے کوئی؟"

"فون نمبر...؟"

"ہاں تمھیں بتا دیں گے کہ گاڑی کہاں کھڑی ہوئی ہے۔"

لڑکے نے کچھ دیر سوچا اور ایک جیب میں سے اپنا کارڈ نکال کے مجھے دیا "یہ میرے گھر کا نمبر ہے۔"

"بس تو تم فٹافٹ گھر پہنچ جاؤ، کہیں یہ نہ ہو کہ ہمارا پیغام تم سے پہلے پہنچ جائے" میں نے کہا "خاتون، آپ تشریف رکھیں اپنی سیٹ پر۔"

"تم اسے بھی لے جاؤ گے؟" نوجوان نے احتجاج اور فریاد کے انداز میں کہا۔

"زیادہ دُور نہیں" میں نے کہا۔

"یہ تو اغوا کا کیس ہو جائے گا۔"

"کیس کے بچے، اب دفع ہوتے ہو یا میں سوراخ کر کے تمھارے دماغ میں سے... سوری، دل میں سے سارا عشق نکال دوں۔ ہم اس لڑکی کو ٹھیک ایک کلومیٹر کے فاصلے پر ڈراپ کر دیں گے۔ یہ پندرہ بیس منٹ میں واپس آجائے گی۔"

"لیکن اسے تم کیوں لے جا رہے ہو؟"

"تاکہ تم گاڑی کے روانہ ہو جانے کے بعد شور نہ کرو۔ شور کیا تو پھر سمجھو، دونوں مزے گئے۔ نہ لڑکی ملے گی اور نہ گاڑی۔"

لڑکی کچھ حوصلہ مند اور پُرسکون تھی۔ خاموشی سے سیٹ پر بیٹھ جانے کے بعد اُس نے کہا "اٹ از او کے! یہ لوگ ایسے نہیں لگتے کہ مجھے نقصان پہنچائیں۔"

میں نے نوجوان کی جگہ بیٹھ کے پیچھے کے دونوں دروازے کھول دیے۔ غالب اور محسن اس کار میں بیٹھ گئے جو عام ڈبہ ٹائپ گاڑیوں سے مختلف تھی۔ جب میں نے کار اسٹارٹ کی تو لڑکی نے پلٹ کے دیکھا اور یوں ہاتھ ہلایا جیسے اُسے ہمیشہ کے لیے الوداع کہہ رہی ہو۔ میں نے بیک ویو مرر میں دیکھا تو لڑکا بھی سخت غمزدہ کار کے پیچھے چلتا آ رہا تھا۔

"سمجھ دار نوجوان ہے" میں نے کہا "وہیں کھڑا رہتا تو تمھیں ایک کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنا پڑتا۔ اب آدھا کلومیٹر وہ چل کر آ جائے گا۔"

"اس کو کہتے ہیں آدھے راستے پر ملنا۔" انگریزی میں غالب نے کہا۔

"تم سب پُراسرار لوگ ہو" لڑکی نے کہا۔

میں نے اقرار میں سر ہلایا "تم اگر خاموش بیٹھی رہو تو اچھا ہے۔ ہم ایک کلومیٹر کے ہمسفر ہیں۔ ایک دوسرے کے بارے میں زیادہ جاننے کی نہ ضرورت ہے نہ اس کا کوئی فائدہ ہے۔ ہم کیا ہیں اور تم کیا ہو، یہ سب بے کار تجسس ہے۔ ہاں ایک بات میں سب کی طرف سے کہہ دوں تو غلط نہیں ہو گی۔ تم اتنی حسین ہو کہ اگر فرصت ہوتی تو ہم میں سے ہر ایک اس نوجوان کو رقابت میں قتل کر دیتا۔"

"اور اس کے بعد ہم آپس کی رقابت میں ایک دوسرے کو مار ڈالتے۔ جو بچ جاتا، وہ تمھارے ہاتھوں مارا جاتا۔ ہم سب ایک دردناک انجام سے صرف اس لیے بچ گئے کہ ہمیں فرصت نہیں ہے۔" غالب نے کہا۔

لڑکی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی "مجھے اب شدید خواہش ہے یہ جاننے کی کہ تم نے یہ گاڑی کیوں چھینی ہے؟"

میں نے کہا "بس تمھارے ساتھ ایک کلومیٹر تک سفر کرنے کا اعزاز حاصل کرنے کے لیے۔ ایک کلومیٹر ہو گیا، اب تم جاؤ، اُس نوجوان کے ساتھ پارک میں سیر کرو، گھومو پھرو۔ گاڑی کی بالکل فکر مت کرنا، شام تک ضرور مل جائے گی۔"

وہ اُتر گئی اور واپس چل پڑی۔ اب وہ خوفزدہ بھی نہیں تھی اور اعصابی کشیدگی کا شکار بھی نہیں تھی۔ اُس نے کئی بار پلٹ کے دیکھا۔ غالب نے اُسے ہاتھ ہلا کے خدا حافظ کہا تو اُس نے بھی جواباً ہاتھ ہلایا۔

"کتنا اچھا ہو اگر سب لوگ ہماری خواہش کا احترام کرتے ہوئے اور ہماری ضرورت کو سمجھتے ہوئے اسی قسم کے دوستانہ جذبات اور فراخدلی کا مظاہرہ کریں۔ شرافت سے گاڑی دیں اور شرافت سے لے لیں" محسن نے کہا۔

"میاں شیروانی! دُنیا سے شرافت اُٹھتی جا رہی ہے" میں نے ایک آہ بھر کے کہا۔

غالب نے سر ہلایا "بس کچھ باقی ہے تو ہم ہیں۔"

میں ہنس پڑا "اب وہ نقشہ نکال مرزا غالب جس سے ہمیں پھر ہماری منزل کا پتا ملے۔"

غالب نے کہا "اب تو کسی سے پوچھنا ہی پڑے گا کہ ہم کہاں ہیں اور ہمیں کہاں جانا ہے۔"

"نقشے میں ایک اسپتال کا ذکر ہے۔" میں نے کہا۔

"بریچ کینڈی اسپتال۔" غالب نے کہا۔ "لیکن خونی خان کا ٹھکانہ اس سے بہت آگے ہے۔"

"یار، ہم کسی سے بریچ کینڈی اسپتال کا پتا پوچھ کے پھر نقشے کے مطابق چل سکتے ہیں، پورا نقشہ تو کسی کے سامنے نہیں رکھ سکتے۔" میں نے کہا۔

بریچ کینڈی اسپتال آدھے گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ بھولا بائی ڈیسائی روڈ بھی ختم ہو گیا تو غالب نے اس نقشے کے مطابق مزید نشانیاں تلاش کریں۔ دس منٹ بعد اُس نے گاڑی سڑک کے کنارے روک دی۔

"یہاں سے اگلے موڑ تک ہم پیدل جائیں گے۔" غالب نے اعلان کیا۔

میں نے کہا۔ "میں اس بدنصیب جوڑے کو اطلاع دے دوں کہ ان کی گاڑی کہاں ہے، جن کی رنگین شام کو ہم نے ایک سنگین مذاق سے خراب کیا۔ تم اتنی دیر میں گاڑی کو جھاڑ پونچھ دو۔"

میں ایک کیمسٹ کی دُکان پر گیا اور ٹیلی فون کرنے کی اجازت مانگی۔ یہ اینگلو انڈین انتہائی شریف آدمی تھا۔

"یہ پی سی او نہیں ہے مگر ایمرجنسی ہے تو تم کال کر سکتے ہو۔" اُس نے انگریزی میں کہا۔ "اندر چلے جاؤ۔"

میں نے شکریہ ادا کر کے فون ملایا۔ "کون بول رہا ہے؟"

میں نے کہا۔ "وہ گاڑی جو میں لے گیا تھا۔"

"یہ کیا بکواس ہے، کون سی گاڑی؟"

میں نے کہا۔ "آپ صرف میرا پیغام دے دیں۔ وہ گاڑی جان کیمسٹ کے سامنے کھڑی ہوئی ہے۔" اور فون بند کر دیا۔ میری گفتگو اُس کیمسٹ نے نہیں سُنی تھی۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ نوجوان ابھی واپس گھر نہیں پہنچا تھا اور فون ریسیو کرنے والا کوئی اور تھا۔ خیر... جب وہ گھر جائے گا تو اُسے یہ پیغام ضرور ملے گا۔ شاید اسے وضاحت بھی کرنی پڑی گی کہ اس پیغام کا مطلب کیا ہے۔

کیمسٹ نے فون کال کے پیسے لینے سے انکار کر دیا۔ اُس نے پھر کہا کہ یہ پبلک کال آفس نہیں ہے۔ "دُنیا کیا تماشا گاہ ہے۔" میں نے دُکان سے باہر آتے ہوئے سوچا۔ "یہاں بیک وقت سردار جی جیسے لوگ بھی ہیں اور اس اینگلو انڈین جیسے بھی لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا بھی غلط ہو گا کہ سب سکھ بداخلاق ہوتے ہیں اور تمام اینگلو انڈین مجسم اخلاق۔"

محسن اور غالب نے کار کے اندر اور باہر ہر اُس جگہ کو صاف کر دیا تھا جہاں ہمارے فنگر پرنٹ ملنے کا امکان تھا۔ ہم نے کار کی چابی سوئچ میں ہی چھوڑی اور پیدل روانہ ہو گئے۔ کار سڑک سے ہٹ کے کھڑی ہوئی تھی چنانچہ جب تک کوئی شیشے سے ناک لگا کے اندر نہ جھانکتا اسے چابی نظر نہیں آ سکتی تھی اور یہ بھی معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ گاڑی کھلی ہوئی ہے۔

اب شام کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے، سورج مغرب کی طرف ڈھل رہا تھا۔ سڑک کے دونوں جانب ہمارے آگے پیچھے قافلوں کی صورت میں کارخانوں کے مزدور اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ وہ سب غریب اور محنت کش لوگ تھے، میلے ہاتھوں اور میلے کپڑوں والے۔ بمبئی کی پُررونق چکا چوند والی دولت مندی کی تصویر کا دوسرا تاریک رُخ پیش کرنے والے۔ تھکے ہارے اور پژمردہ چہروں کے باوجود وہ آپس میں ہنستے مذاق کرتے جا رہے تھے کیونکہ ان کے سامنے اپنے گھر میں ایک آسودگی دینے والی رات کا تصور تھا اور وہ صبح ابھی بہت دور تھی جب انھیں پھر ہر روز کی طرح مشقت کے دن کا آغاز کرنا تھا۔ مجھے ان کو دیکھ کر وہ پرندے یاد آئے جو شام ڈھلے غول در غول آشیانوں کی جانب لوٹتے ہیں۔

مجھے یہ خیال بھی آیا کہ ان محنت کش انسانوں کی بستی میں کسی خونی خان کا کیا کام؟ اب ہم جس علاقے سے گزر رہے تھے وہ غریب، مفلوک الحال اور بے مایہ لوگوں کی بستی تھی، جس کے بیشتر مکان فقط سر چھپانے کا ٹھکانا تھے۔ نام کی چار دیواری اور سایہ فراہم کرنے والی چھت۔ ان میں جھونپڑے بھی تھے اور ایک کمرے والے کچے پکے مکان بھی۔ کہیں کہیں کارپوریشن کا کھمبا اعلان کرتا دکھائی دیتا تھا کہ گھروں میں نہ سہی، اس علاقے تک بجلی ضرور پہنچ چکی ہے۔ ہم اس آبادی کے وسط سے گزر رہے تھے۔ یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ مختصر سی سڑک کے دائیں جانب کتنی دُور تک یہ غریب خانے پھیلے ہوئے ہیں اور بائیں جانب کہاں تک۔ پہاڑوں کے غاروں کی پناہ گاہیں اب نہیں رہی تھیں، ڈاکو آبادیوں میں آ بسے تھے۔ پبلک یا حکومت کو لُوٹنے والے ڈاکو معززین اور شرفا میں شمار ہوتے تھے چنانچہ وہ عالی شان کوٹھیوں میں بے خوفی سے رہتے تھے۔ خونی خان جیسے پیشہ ور ڈاکوؤں نے غریبوں کی بستیوں میں پناہ گاہیں بنا لی تھیں جہاں کسی کو ان کی موجودگی کا شبہ نہیں ہو سکتا تھا۔ میں حیران تھا کہ یہاں وہ کس بھیس میں رہتے ہوں گے۔

وہ غریب آبادی اچانک ختم ہو گئی۔ ایک اور ریلوے لائن نے اس کی حد بندی کر دی تھی۔ بمبئی میں لوکل ٹرین کی وجہ سے ہر جگہ سڑک پر ریلوے کراسنگ نظر آتی ہے اور ٹرام کے ساتھ ریلوے لائنوں کا سلسلہ ہر جگہ پھیلا ہوا ملتا ہے۔

ریلوے لائن کو عبور کرتے ہی کوئی انتہائی متمول اور بااثر رہائشی علاقہ شروع ہو گیا۔ دو ریلوے لائنوں کے درمیان آباد غربت زدہ انسانوں کی بستی کے ساتھ ہی یہ امرا کے کاشانے دُنیا کی طبقاتی تقسیم کا وہ تضاد پیش کرتے تھے جو صرف ہندوستان یا پاکستان میں ہی نہیں ساری دُنیا میں نظر آتا ہے۔ عالی شان محلات کے سامنے بے خانماں لوگ فٹ پاتھوں پر زندگی گزار دیتے ہیں۔ خواص کے اسکولوں اور کالجوں کے غریب کے بچے ورثے میں ملنے والی جہالت کے اندھیرے میں بھٹکتے رہ جاتے ہیں۔ مسجد کے زیر سایہ خرابات نظر آتے ہیں۔

اس شاندار ہاؤسنگ سوسائٹی کی ہر کوٹھی کم سے کم ایک ہزار گز پر محیط تھی۔ تقریباً سب کوٹھیوں کے باہر دربان ایستادہ تھے۔ کھجور کے بلند قامت درخت نیلگوں آسمان کی وسعت میں اُترتے دکھائی دیتے تھے۔ خوبصورت رنگوں اور دلکش ڈیزائنوں والی ان کوٹھیوں میں رہنے والوں کی زندگی اتنی مصروف تھی کہ شاید انھیں کبھی ریلوے لائن کے پار حشرات الارض کی طرح زندگی گزارنے والے انسانوں پر نفرت اور حقارت کی نگاہ ڈالنے کی فرصت بھی نہیں ملتی ہو گی۔ اس وقت بھی یوں لگتا تھا کہ گھر میں مکین کوئی نہیں ہے۔

غالب نے نقشے کو مجھ سے بہتر طور پر سمجھ لیا تھا۔ اُس نے اچانک کہا۔ "لو بھئی مُبارک ہو، سفر تمام ہُوا۔"

میں نے کہا۔ "مرزا! کیا آج کل کے ڈاکو اسی طرح رہتے ہیں؟"

غالب نے ایک فلسفیانہ بات کی۔ "آج کل صرف ڈاکو ہی اس طرح رہ سکتے ہیں، شرفا نہیں۔"

ہم ایک بلند و بالا فولادی گیٹ کے قریب پہنچ کر کسی کال بیل کا سوئچ تلاش کر رہے تھے کہ کسی آہٹ کے بغیر گیٹ کھل گیا۔ گیٹ پر لائٹ کے قریب لگے ہوئے اسپیکر نے کہا۔ "اندر آ جاؤ۔" تو میں اچھل پڑا۔ آواز خونی خان کی سی تھی۔ وہ یقیناً اندر کہیں بیٹھا ہماری صورتیں کسی خفیہ کیمرے کی آنکھ کے ذریعے اپنے ٹی وی اسکرین پر دیکھ رہا تھا۔

ایک لمحے کے لیے مجھے خیال آیا کہ ہم سب عواقب پر غور کیے بغیر ایک ایسے طلسمی محل میں داخل ہو رہے ہیں جس کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اندر جانے کے بعد ہمیں اپنی غلطی کا احساس ہو، جب ہم محصور ہو جائیں اور واپسی کا راستہ ہی نہ ملے۔ سو فیصد یقین کے ساتھ کون یہ ضمانت دے سکتا تھا کہ ڈاکو محمد خان ہمارے ساتھ اب کیا سلوک کرے گا۔ پہلے وہ بے بس اور مجبور تھا لیکن یہاں صورتِ حال برعکس تھی۔

ہمارے اندر قدم رکھتے ہی دروازہ بند ہو گیا۔ میں نے اپنے سامنے ایک مربع عمارت دیکھی۔ اس کی لمبائی چوڑائی اور دونوں منزلوں کی اونچائی برابر تھی۔ اوپر نیچے ہر رُخ پر مجھے چھ کھڑکیاں دکھائی دیں جو سب بند تھیں اور ان میں گہرے سبز رنگ کے شیشے تھے جن میں سے باہر تو دیکھا جا سکتا تھا مگر باہر سے وہ روشنی کو منعکس کرتے تھے چنانچہ عین شیشے کے پیچھے کھڑے ہوئے شخص کو دیکھنا بھی ناممکن تھا۔

تعمیر کے اعتبار سے اس نقشے کو قابلِ تعریف نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ پوری عمارت بنانے کے لیے نقشے کی ضرورت محسوس ہی نہیں کی گئی۔ بنانے والے نے صرف یہ کہا کہ چھ کمرے نیچے بنا دو اور چھ ان کے اوپر، نہ سامنے کے حصّے میں کوئی پورچ تھا اور نہ برآمدہ۔ ہر کمرے کا دروازہ... براہِ راست باہر کی طرف کھلتا تھا۔ چھ کھڑکیوں کے درمیان نچلی منزل پر چھ دروازے بھی تھے چنانچہ ایک نظر دیکھنے سے نچلی منزل پر کھڑکیوں، دروازوں کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا۔ میں نے اُسے خصوصی حفاظتی انتظامات کا ایک حصّہ فرض کر لیا۔ ڈاکوؤں کے اڈّے کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ ضرورت پڑے تو ہر طرف سے نکلنے کے سب راستے استعمال کیے جا سکیں۔ میں عمارت کے پچھلے حصّے کو دیکھ تو نہیں سکتا تھا مگر میرا خیال تھا کہ ادھر کا نقشہ بھی مختلف نہیں ہو گا۔ نچلی منزل پر چوبیس دروازے اور چوبیس کھڑکیاں، مقابلے یا فرار کے لیے استعمال کرنے کی گنجائش رکھی گئی تھی۔ یہ دلچسپ بات تھی کہ ڈاکو محمد خان نے اپنی یہ رہائش گاہ اپنے پیشے کے تقاضوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے تعمیر کرائی تھی۔

دروازے سب بہت مضبوط تھے، شاہ بلوط کی لکڑی کے بنے ہوئے اور دُہرے لاک والے۔ اندر سے کسی کی آواز تک سُنائی نہیں دیتی تھی اور یہ خانہ ویرانی کا تاثر مجھے وحشت میں مُبتلا کرنے لگا تھا۔

محسن نے میرے قریب آ کے سرگوشی میں کہا۔ "سکندر! یہ عمارت تو مجھے جیل خانے کی طرح لگتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "جیل خانے کی دیواریں سپاٹ ہوتی ہیں۔"

"اب کیا کریں؟" غالب نے کہا۔ "کسی دروازے پر دستک دیں۔"

اُسی وقت ایک دروازہ کھُل گیا، یوں جیسے کوئی اس سوال کے انتظار میں بیٹھا ہُوا تھا۔ وہ ایک لمبا، چہرے کے کرخت نقوش والا آدمی تھا جس نے ہمیں ہاتھ سے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ ہمارے اندر جاتے ہی اُس نے دروازے کو مقفّل کر دیا۔ میں نے اپنے سامنے خونی خان کو دیکھا۔ وہ اپنا لباس بدل چکا تھا اور اس وقت وسیع گھیر والی شلوار پہنے ہُوئے تھا، جس میں شاید دس گز کپڑا استعمال ہُوا ہو گا اور پھر قمیص کے ساتھ سنہرے نقش و نگار والی سیاہ واسکٹ اور کلف لگے طرّے والی دستار کے ساتھ وہ بہت باوقار لگتا تھا۔ بالکل کوئی قبائلی سردار یا نواب۔ اُس کے چہرے کی خشونت دیکھ

کے میرا ماتھا ٹھنکا۔ نازو نے غالباً ٹھیک ہی کہا تھا، ہر ڈاکو شیش ناگ کی طرح بھروسے کے قابل نہیں ہوتا۔ اس کے پیچھے میں نے رابعہ کو دیکھا۔

"تو تم بھی پہنچ گئے!" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ یہ کوئی سوال نہیں تھا بلکہ تمسخر اڑانے کا ایک انداز تھا کہ دیکھا، شامتِ اعمال تمھیں خود یہاں کھینچ لائی۔

میں نے کہا: "کیا تم ہمارے آنے سے خوش نہیں ہوئے؟"

خونی خان نے قہر آلود نگاہوں سے رابعہ کو گھورتے ہوئے کہا: "اسے بھی پہنچا دو اُسی آسمانی بجلی کے پاس۔" یہ میرے سوال کا جواب نہیں تھا۔ اُس نے یہ حکم دو فرماں برداروں کو جاری کیا تھا۔ وہ خونی خان کے پیچھے خون آشام کتوں کی طرح اپنے شکار پر جست لگانے کے لیے تیار کھڑے تھے... اور نہ صرف یہ کہ خود بہت تندرست و توانا تھے بلکہ پوری طرح مسلح بھی تھے۔ میں نے رابعہ کی طرف بڑھنے کی کوشش کی۔

"تم چلو ادھر!" محمد خان نے گرج کے مجھے حکم دیا۔

"محمد خان! یہ تم کیا کر رہے ہو؟" میں نے احتجاجاً کہا۔

"معلوم ہو جائے گا تمھیں۔" اُس نے کہا۔

"یہ کوئی شرافت نہیں ہے۔" غالب نے کہا۔

"شرافت کا نام گالی ہے ہمارے لیے کیونکہ ہم ڈاکو ہیں۔" محمد خان نے کہا: "جو کچھ تم نے میرے ساتھ کیا..."

"ہم نے کیا بُرائی کی تھی تمھارے ساتھ، جس کا تم یہ صلہ دے رہے ہو؟" میں نے کہا۔

"اور تم نے وعدہ کیا تھا..."

"تم سے بڑا احمق کون ہوگا جس نے ایک ڈاکو کے وعدے کو قابلِ اعتبار سمجھ لیا تھا۔" اس نے کہا: "تم کیا دیکھ رہے ہو؟" اُس نے کڑک کر اپنے دونوں حکم کے غلاموں سے کہا۔

"چلو بی بی! ورنہ ہمیں زبردستی کرنی پڑے گی۔" اُن میں سے ایک نے مکروہ ہاتھوں سے رابعہ کا بازو پکڑ لیا۔

رابعہ نے اپنا بازو چھڑا لیا: "ہاتھ مت لگاؤ مجھے، چلو۔"

میں نے کہا: "خونی خان! اپنے گھر میں کتا بھی شیر ہوتا ہے، اس کا ثبوت تم نے دے دیا ہے، تم بہادر ہوتے تو..."

"بکواس بند کرو اور چلو۔" وہ گرج کے بولا۔

غالب نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا: "یہاں اس سے اُلجھنا ٹھیک نہیں، غلطی ہماری تھی کہ اس فریبی انسان کو سمجھ نہ سکے۔"

میں نے اپنے آپ کو بہت بڑا بے وقوف چوہا تصور کیا جو اپنی ہی غلطی سے خود بھی اس چوہے دان میں گرفتار ہونے چلا آیا اور اپنے ساتھ دوسروں کو بھی لے آیا۔ یہاں ہماری نہ منطق چل سکتی تھی نہ ہماری فریاد سننے والا کوئی تھا۔ شرافت اور انسانیت یا خدا رسول کا واسطہ دینے سے بھی کچھ حاصل نہ ہوتا اور ہم مقابلہ کرتے تو اندر ہی مارے جاتے۔ وہاں ڈاکوؤں کا ایک پورا گروہ موجود تھا جن کی طاقت ان کی تعداد تھی اور ان کا خطرناک اسلحہ تھا۔ ہم دو چار کو مار گراتے تب بھی کیا ہوتا، جانے کے سارے راستے بند ہو چکے تھے، محسن کا کہا ہو گیا تھا۔ یہ عمارت واقعی ایک جیل خانہ بن گئی تھی۔

محسن، میں اور غالب پلٹ کر ڈاکو محمد خان کے اشارے پر بڑھے۔ اندر ہی اندر میرا خون ایسے کھول رہا تھا جیسے زمین کی تہہ میں آتش فشاں کا پگھلا ہوا لاوا اُبلتا رہتا ہے لیکن میں صبر سے کام لینے پر مجبور تھا۔ ابھی نہ سہی شاید بعد میں قدرت کوئی سبیل پیدا کر دے اور ہم ان ڈاکوؤں کے قلعے سے نکلنے میں کامیاب ہو جائیں۔

"بس، ادھر سیدھے ہاتھ والا دروازہ کھولو۔" ڈاکو محمد خان نے حکم دیا۔

میں نے دروازہ کھولا اور چند سیکنڈ بے وقوفوں کی طرح ہکا بکا کھڑا رہا۔ پھر میں نے گل اور نازو کو دیکھا۔ وہ ایک صوفے پر بڑی فراغت سے بیٹھی چائے یا کافی پی رہی تھیں۔ بیش قیمت قالین پر درمیان میں بچھی ہوئی ٹیبل انواع و اقسام کے لوازمات سے بھری پڑی تھی۔

میں نے پلٹ کے دیکھا تو ڈاکو محمد خان کو مسکراتے پایا۔ غالب کو شاید پہلے معلوم ہو گیا تھا کہ ہمارے ساتھ مذاق کیا گیا تھا۔ اُس کے لبوں پر بھی جھینپی ہوئی مسکراہٹ تھی۔

"کہو کیسی رہی؟" محمد خان نے کہا: "تم تو بس نام کے سکندرِ اعظم ہو یار، سب بھول گئے اپنی بہادری... شہ زوری۔"

میں نے کہا: "خان صاحب! یہ میری بھول نہیں... یہ دُور اندیشی تھی کہ میں نے مقابلہ نہیں کیا، ورنہ مذاق کا نتیجہ غلط بھی نکل سکتا تھا۔"

نازو نے برہمی سے کہا: "ان کے ساتھ بھی وہی حرکت کی تم نے؟"

میں نے کہا: "گویا یہی آپ کے ساتھ ہو چکا ہے؟"

گل نے کہا: "ہاں مجھے اور نازو کو پکڑ کے ایک طرف لے گئے، رابعہ کو دوسری طرف۔ رابعہ نے تو بہت گالیاں دیں۔ نازو کو میں نے روک لیا تھا، ورنہ وہ تو تل گئی تھی ہنگامہ آرائی پر۔"

ڈاکو محمد خان نے مسکراتے ہوئے کہا: "بھئی مذاق حد سے بڑھتا تو ہم سر جھکا دیتے پھر تم کیا کرتے۔"

میں نے کہا: "تمھارے وہ حکم کے غلام رابعہ کو کہاں لے گئے ہیں؟"

گل ہنسنے لگی: "گھبرائیں نہیں بھائی سکندر، ہم سب کا کمرا ادھر ہی ہے، خواتین ایک ہی کمرے میں ہیں، وہ ابھی نہیں آئی۔ تم نے اتنی دیر کہاں لگا دی؟ ہم سب نہا دھو کے کپڑے بھی بدل چکے۔" نازو نے کہا۔

"وہ بس کچھ گڑبڑ ہو گئی تھی راستے میں۔" میں نے کہا: "جو ہوتی ہی ہے، کوئی خاص بات نہیں۔"

ایک ڈاکٹر اور نرس کو دیکھ کر میں نے کہا: "یہ کیا سلسلہ ہے؟"

"کچھ نہیں، سب خان صاحب کا کمال ہے۔ انھوں نے یہاں آتے ہی فون کیا اور ڈاکٹر، نرس سب کو بلا لیا۔ یہ بھی ان کی مہمان نوازی کا ایک حصہ ہے۔" گل نے کہا: "ڈاکٹر کو نادر شاہی حکم دیا ہے کہ کل تک ہمارے بندوں کو گھوڑے کی طرح دوڑنا چاہیے۔ یہ تو بڑا ظلم ہے محسن!"

"تم بھی تیار ہو جاؤ۔" محسن نے غالب سے کہا: "ممکن ہے ایسا ہی سلوک تمھارے ساتھ بھی کیا جائے۔ کل تمھیں بھی میرے ساتھ دوڑنا پڑے۔"

"گدھے گھوڑے کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنا... میرا مطلب ہے ایک ساتھ دوڑانا تو غلط بات ہے۔" نازو نے کہا۔

غالب نے کہا: "آپ نے گدھا سمجھا، یہ بھی حسنِ ظن ہے آپ کا۔"

"ظن کو زَ سے پڑھا جائے۔" میں نے کہا۔

"چلو اب باقی باتیں بعد میں۔ آپ دونوں ساتھ والے کمرے میں جائیں اور تیار ہو کے آ جائیں۔" ڈاکو محمد خان نے کہا: "وہاں سب کچھ ہے پھر بھی کسی چیز کی کمی ہو تو بٹن دبا کے بتا دینا۔ میں نے تو کہا تھا کہ سب کے لیے الگ الگ کمروں کا انتظام بھی کیا جا سکتا ہے مگر انھوں نے کہا کہ ہم ایک ساتھ رہیں گے۔" اُس نے نازو اور گل کی طرف اشارہ کیا۔

"ہم بھی ایک ساتھ رہنے کو ترجیح دیں گے۔" میں نے کہا اور غالب کو اپنے ساتھ کھینچ کر لے گیا جو بڑی حریص نظروں سے کھانے پینے کی چیزوں کو دیکھ رہا تھا۔ نازو اور گل کتنے سکون اور اطمینان کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں، جیسے اپنے ہی گھر میں ہوں اور مسلسل کچھ نہ کچھ کھا رہی تھیں۔ کھانے پینے کی چیزیں دیکھ کر میرے پیٹ میں بھی مروڑ اُٹھنے لگے تھے مگر میں نے بہتر سمجھا کہ پہلے نہا دھو کے لباس بدل لیا جائے۔ کمرے کی آرائش اور تمام دستیاب سہولتوں کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہم ڈاکو کے ڈیرے پر نہیں کسی فور اسٹار ہوٹل کے کمرے میں ہیں۔

غالب نے کہا: "یار یہ پیشہ تو بڑا اچھا ہے۔"

میں نے کہا: "اور اب تک جو ڈاکو ملے ہیں وہ بھی اچھے ہی تھے۔"

غالب نے کہا: "کیا بدلا ہے زمانہ بھی، ہمارے ذہن میں وہی پرانے تصورات ہیں ڈاکوؤں کے اور ان کی پناہ گاہوں کے، ہم یہی سمجھتے آئے ہیں کہ ڈاکو جاہل اور بڑے سفاک ہوتے ہیں۔ دو چار آدمی تو شوقیہ مار دیتے ہیں ہر روز۔"

"ڈاکو تو اب بھی ڈاکو ہیں مگر بات وہی ہے کہ ڈاکو کی تعریف کیا ہے اور کون کس کے لیے ڈاکو ہے۔ ڈاکو دوسرے ڈاکو کا دوست ہے۔ جسے وہ لوٹ نہ سکے، اس کے لیے وہ ڈاکو نہیں ہے۔ بعض ڈاکو غریبوں کے دوست تھے۔ محمد خان ڈاکو بھی کوئی شریف آدمی نہیں ہے مگر ہمارا وہ کیا بگاڑ سکتا ہے۔ یہاں اس کا حسنِ سلوک محض قرض ادا کرنے کی ایک صورت ہے جو ہم نے نیکی کی صورت میں اس پر چھوڑ دیا تھا۔"

"چل بھائی اب باتیں چھوڑ، پہلے میں نہا کے آتا ہوں، مجھے بھوک بھی سخت لگی ہے اور آرام کی ضرورت بھی ہے۔" غالب نے کہا۔

محسن کے بعد جب غالب غسل سے فارغ ہو کے نکلا تو میں نے باتھ روم کا رُخ کیا۔ وہ ایک شاہانہ باتھ روم تھا۔ وقت ہوتا تو میں ایک گھنٹا اسٹیم باتھ لیتا اور جسم سے ساری تکان دھو ڈالتا۔ اب رات ہونے والی تھی اور میں بھی سکون سے سونا چاہتا تھا۔ ڈاکوؤں کی اس کمین گاہ پر کتنے لوگ تھے، اس کا مجھے ابھی اندازہ نہیں تھا۔ مجھے کہیں سے کسی کے بات کرنے کی آواز تک نہیں آ رہی تھی۔ اس کمرے میں عین میرے سائز کے کپڑے موجود تھے۔ صاف دُھلی ہوئی قمیص پتلون جن پر تازہ استری کی گئی تھی۔

میں واپس وہاں پہنچا جہاں نازو اور گل کے ساتھ اب رابعہ بھی موجود تھی تو ڈاکٹر نے غالب کا معائنہ شروع کر دیا تھا۔ اس کمرے میں دوسرا بیڈ لگا کے غالب کو لٹا دیا گیا تھا۔ ان دونوں بیماروں کا علاج جتنی توجہ اور محنت سے ہو رہا تھا، اس سے تو یہی لگتا تھا کہ محسن اور غالب واقعی دو چار دن میں بالکل صحت مند کر دیے جائیں گے۔ ڈاکٹر صورت سے سمجھ دار نظر آ رہا تھا اور یہ تو سمجھنے کی بات تھی کہ اس کی پیشہ ورانہ خدمات حاصل کرنے میں خونی خان کا خوف اور اس کا پیسہ دونوں کام آتے تھے۔

میں نے کھانے کی میز کو غور سے دیکھا۔ اس پر اب بھی بہت کچھ باقی تھا۔ رابعہ نے صرف ایک سینڈوچ لیا تھا اور اب کافی پی رہی تھی۔ اس نے جو کپڑے پہنے تھے وہ تقریباً اسی کے سائز کے تھے۔ یہی کیفیت گل کے لباس کی تھی۔ صرف نازو تھی جس کو اسی سائز کے کپڑے بہت ڈھیلے ہو گئے تھے۔ گل اور رابعہ کے جسم متناسب تھے اور ان کے قد و قامت میں بھی زیادہ فرق نہیں تھا۔ نازو اپنی جسامت میں ان سے بہت کم تھی۔ وہاں غالباً اوسط سائز کے زنانہ

اور مردانہ کپڑے سب کے استعمال کے لیے رکھے گئے تھے۔
یکلخت ہم سب بہت پُرسکون اور آسودہ ہو گئے تھے۔ وقتی طور پر تحفظ کا احساس سب کو ایک نعمت محسوس ہو رہا تھا اور یہ بات سب کی صورتوں سے عیاں تھی۔ میں بھی سینڈوچ اور بلیک کافی کا مگ لے کر رابعہ کے ساتھ قالین پر بیٹھ گیا۔ رابعہ انھیں بتا چکی تھی کہ ہمیں پہنچنے میں دیر کیوں ہوئی تھی۔

میں نے کہا "تمھیں راستے میں روکا تھا کسی نے؟"

گل نے کہا "دو جگہ بہت سخت چیکنگ ہو رہی تھی مگر ظاہر ہے ہمیں کون روکتا۔"

"محمد خان کہاں ہے؟"

"ڈاکٹر صاحب نے کچھ دوائیں لکھ کر دی تھیں، وہی لینے گیا ہے۔"

"خود گیا ہے؟" میں نے کہا۔

"نہیں، کسی کو بھیجے گا۔" گل نے جواب دیا "یہ بھی خوب آدمی ہے۔"

"سوچو کل رات اس وقت ہم کہاں تھے؟" میں نے کہا۔

"اور یہ کتنا عجیب لگتا ہے کہ ہم سب پھر اکٹھے ہیں اور کہاں آ کے اکٹھے ہوئے ہیں۔" نازو نے اُداسی سے کہا۔

"ہر کام کے لیے ایک وقت اور ہر وقت کے لیے ایک کام ہے۔ کل جو کچھ ہُوا اور اس سے پہلے جو بھی ہُوا یا جو آج ہے وہ سب اور جو کل ہو گا وہ بھی طے شدہ ہے۔" میں نے کہا۔

"اُف... میرا خیال ہے تم فوراً کچھ کھا پی لو، ورنہ ایسے ہی بولتے رہے تو ہم پاگل ہو جائیں گے۔" رابعہ نے کہا۔

"باری اب آپ ہی کی ہے، ہمیں تو بہت پہلے ہی پاگل کر دیا تھا آپ نے۔" میں نے کہا "تم کیوں اُداس ہو نازو؟"

نازو کی آنکھیں چھلک پڑیں "سب کو اکٹھا دیکھ کے مجھے بھیّا یاد آ گئے، معلوم نہیں وہ کہاں ہیں۔"

میں نے کہا "اکرام شیخ اکیلا رہ گیا، اُسے بھی ہم سب کی یاد آتی ہو گی۔ کل کوشش کروں گا کہ اُس سے رابطہ ہو جائے۔"

گل نے اُس کے آنسو پونچھ دیے "روتی کیوں ہو، ہم انھیں بھی بُلا لیں گے۔"

رات کے کھانے کے بعد محمد خان کے حکم پر غالب اور محسن کو اور میرے حکم پر خواتین کو سونے کے لیے جانا پڑا حالانکہ وہ سب اتنا عرصہ بعد مل کر بیٹھے تھے اور گپ لگانے کے موڈ میں تھے۔ غالب اور محسن کے بارے میں پہلے میرا یہی ارادہ تھا کہ انھیں مکمل صحت یابی تک محمد خان کی نگرانی میں چھوڑ دوں گا مگر ان کی بحالیٔ صحت کی رفتار دیکھتے ہوئے میں نے دو تین دن انتظار کر لینا بہتر سمجھا۔ ڈاکٹر اور نرس کی رات کو رکنے کی ضرورت نہ تھی مگر وہ محمد خان کا "فیملی ڈاکٹر" تھا۔ اس کی فیملی کے ساتھی ڈاکٹر کو ہر ماہ ایک خطیر رقم ایسے ہی کاموں کے لیے ادا کی جاتی تھی جو عام طور پر ڈاکٹر نہیں کرتے۔ چنانچہ وہ دونوں غالب اور محسن کے ساتھ رہنے پر مجبور تھے۔ ڈاکٹر نے مجھے یقین دلایا تھا کہ جسمانی تشدد، ایذارسانی، اعصابی کشیدگی اور کمزوری کے اثرات دو تین دن میں بالکل غائب ہو جائیں گے۔

رابعہ کو مجھ سے شکایت ہوئی کہ میں نے اس کے جذبات کا احترام نہ کرتے ہوئے اُسے بھی رخصت کر دیا۔ شاید اُس کی خواہش ہو گی کہ میں اور وہ کچھ دیر اپنی باتیں بھی کریں۔ اس کے لیے فراغت اور خلوت دونوں میسّر تھیں لیکن میرے ذہن پر جو کچھ تھا وہ میں سب کے سامنے اُسے نہیں بتا سکتا تھا۔ میں نے اُس کی آنکھوں میں شکایت دیکھی لیکن انجان بنا رہا۔

اس چوکور ڈبے جیسی عمارت کے عقبی حصے میں ایک مختصر سا گارڈن لان تھا۔ ڈاکو محمد خان وہاں پہلے سے ٹہل رہا تھا اور اگرچہ وہ مجھ سے اپنا اضطراب چھپانے کی کوشش کر رہا تھا مگر اس کی کیفیت مجھ سے پوشیدہ نہ تھی۔ اُس نے کھانے کے دوران کسی کو احساس نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ کھانے کے موڈ میں نہیں ہے۔ اُس نے سب کا ساتھ دیا تھا لیکن میں نے نوٹ کر لیا تھا کہ اُس نے برائے نام کھانا کھایا تھا۔ اب وہ جس انداز سے سگریٹ پھونک رہا تھا اس سے بھی اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ پریشان ہے۔

میں نے اُس کے قریب جا کے کہا "محمد خان صاحب! کیا بات ہے، تم کس پریشانی میں مبتلا ہو، کیا اس کی وجہ ہم ہیں؟"

اُس نے زبردستی مُسکرا کے کہا "نہیں یار، اپنی تو ساری زندگی ایسی ہی پریشانیوں میں گزری ہے، تم تو محسن ہو میرے اور مہمان ہو۔"

میں نے کہا "تمھارے ساتھی کہاں ہیں؟"

"ساتھی؟"

"ہاں، تمھارے علاوہ مجھے یہاں کوئی نظر آیا ہے تو وہ تمھارے ملازم ہیں۔ کیا تمھیں چھاپا پڑنے کا ڈر ہے؟"

اُس نے کہا "یہاں کون چھاپا مار سکتا ہے؟"

"پولیس... سُراغ رسانی کرنے والے۔" میں نے کہا۔

"کوئی مخبری کر دے کہ خونی خان جیل سے فرار ہو کے یہاں پہنچا ہے؟"

اُس نے نفی میں سر ہلایا "تمھیں معلوم نہیں یہ کوٹھی کس کی ہے؟"

میں نے کہا "نہیں معلوم تو تم بتا دو۔"

وہ کچھ دیر مجھے تکتا رہا پھر بولا "یہ کوٹھی پولیس کے بے وزارتِ داخلہ کے ڈائریکٹر جنرل کی... اُس کے سالے جو انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات ہے۔"

میں بھونچکا رہ گیا "تم انھی کے گھر میں بیٹھے ہو جو تمھاری گرفتاری پر مامور ہیں۔"

"گرفتاری پر مامور ہیں نچلے درجے کے اہلکار، وہ خاک چھانتے پھریں سارے شہر کی، یہاں تو پولیس کمشنر بھی قدم نہیں رکھ سکتا۔ میں محفوظ ترین مقام پر بیٹھا ہُوا ہوں اور حقیقت تو یہ ہے کہ اگر ان کی مدد شاملِ حال نہ ہوتی تو میرے ساتھی مجھے جیل خانے سے نہیں نکال سکتے تھے۔"

"اس کا تم انھیں معاوضہ ادا کرتے ہو گے؟"

"باقاعدگی سے۔"

"پھر تو تمھاری پریشانی کی کوئی وجہ نہیں۔"

"میں اپنے ساتھیوں کی طرف سے پریشان ہوں۔" اُس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "وہ ابھی تک واپس کیوں نہیں آئے۔"

"کیا وہ... وہ کسی کام سے گئے ہیں؟" میں نے واردات کا ذکر کرنے سے گریز کیا۔

"میری رہائی کے ڈرامے میں اُن کا ایک مصنوعی پولیس مقابلہ ہُوا تھا پھر وہ سب تتر بتر ہو گئے تھے۔ انھوں نے کہا تھا کہ سب یہاں پہنچ جائیں گے۔ خیر، چھوڑو مجھے کچھ اپنے بارے میں بتاؤ۔"

"کیا بتاؤں اور کیا نہ بتاؤں۔" میں نے کہا "پہلے میرا خیال تھا کہ نہ میں تم سے تمھارے ماضی اور حال کے بارے میں پوچھوں گا اور نہ اپنے متعلق کچھ بتاؤں گا، جیسے ٹرین میں لوگ ملتے ہیں ایسے ہی ہم بھی رخصت ہو جائیں گے لیکن مجھے تمھاری مدد کی ضرورت ہے اور اب تو میرا خیال ہے کہ تم میرے لیے بہت کچھ کر سکتے ہو۔"

"مجھے دہشت گردی کا کوئی تجربہ نہیں۔" وہ مُسکرایا۔

"تمھیں اب بھی یقین نہیں کہ ہم دہشت گردی میں ملوّث نہیں ہیں؟"

اُس نے کہا "اپنی صورتوں سے، گفتگو سے اور انداز و اطوار سے تم ذرا بھی دہشت گرد نہیں لگتے لیکن میں نے تمھیں ایکشن میں بھی دیکھا ہے، تم لوگ خطرناک بھی ہو۔"

میں نے کہا "ہم یاروں کے یار ہیں اور دشمنوں کے بدترین دشمن۔"

"تمھارا دشمن کون ہے؟" اُس نے اچانک سوال کیا۔

میں نے جواب تفصیل سے اور اختصار سے دیا۔ تفصیل سے یوں کہ میں نے سب کے بارے میں سب کچھ بتایا۔ ایم آر ایس کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی۔ اپنے دشمنوں کے عزائم کا نقشہ کھینچا، پھر اب تک کی کامیابیوں اور ناکامیوں کا ذکر کیا اور پھر مستقبل کے پروگرام کی بات کی لیکن میں نے... اپنی اور اپنے ساتھیوں کی زندگی اور اپنے تجربات و حادثات کے بیان میں اختصار برتا۔ وہ خاموشی سے سُنتا رہا اور ہم اس لان پر ٹہلتے ہوئے سگریٹیں پیتے رہے۔ میں نے محسوس کیا کہ ڈاکو محمد خان کی دلچسپی میں ایک قدر آفریں اور پُرستائش حیرت شامل ہے۔ وہ بار بار کہتا تھا "بھئی یہ تو کمال ہو گیا" یا "اچھا! حد ہو گئی بھئی۔"

جب میں نے اپنی بات ختم کی تو خاموشی کا ایک مختصر وقفہ آیا جس میں ہم دونوں لان کے ایک کنارے پڑی ہوئی بینچ پر بیٹھے رہے۔

پھر اُس نے کہا "تم نے بہت اچھا کیا جو یہ سب بتا دیا۔ تمھارے سچ نے تمھاری جان بچا لی۔"

میں نے حیران ہو کے کہا "جان بچا لی؟ تو کیا تم نے...؟"

"ہاں، میں نے تم سب کو قتل کرنے کا سوچ لیا تھا۔ یہ بہت ضروری تھا۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو میرے ساتھی تمھیں مار دیتے۔ ان کے اصرار پر میں مجبور ہو جاتا۔ خونی خان کے کسی ٹھکانے سے کوئی واقف حال اجنبی لوٹ کر نہیں گیا۔ تم بہت جان چکے تھے اور ایک چشم دید گواہ تھے۔ اس کے علاوہ تم عام لوگ نہیں تھے، تم نے مجھے ذلیل بھی بہت کیا تھا۔"

"خان صاحب! پھر یہ سب کیا تھا، تمھارا حسنِ سلوک... مہمان نوازی کا ایسا شاندار مظاہرہ...؟"

"تمھیں مطمئن رکھنے کے لیے یہ ضروری تھا تاکہ تم بھاگنے کی کوشش نہ کرو۔ تمھیں اپنے ساتھ لانے کا فیصلہ میں نے نہیں کیا تھا، تم زبردستی میرے ساتھ آئے تھے اور زبردستی مجھ سے کام لینا چاہتے تھے۔"

میں اُسے تعجب سے دیکھتا رہا "تم واقعی خونی خان ہو اور ایک ڈاکو ہو، بالکل عام ڈاکو... گو دیکھنے میں تم ایک مہذب اور شریف آدمی لگتے ہو۔ آخر تم نے اپنا ارادہ کیوں بدل دیا؟ اس لیے کہ ہم بھی مسلمان ہیں۔"

"اونہہ، مجھے کسی کے مذہب سے کوئی سروکار نہیں۔"

"پھر کیا تمھیں ہمارے مشن سے دلچسپی ہے، کوئی نرم گوشہ پیدا ہو گیا ہے تمھارے دل میں مشرقی پاکستان کے لوگوں کے لیے...؟"

وہ ہنسا "ڈاکو کے پاس دل کہاں ہوتا ہے اور ہو تو اس میں کسی کے لیے نرم گوشہ کیسے پیدا ہو سکتا ہے! کیا پتھر کبھی موم ہو سکتا ہے؟"

میں نے کہا "پھر یہ جان بخشی کا خیال کیسے آیا تمھیں؟"

"ایک لڑکی ہے تمھارے ساتھ۔" وہ سوچتے ہوئے بولا۔

میرا دل ڈرنے لگا۔ کیا محمد خان ڈاکو نے رابعہ، گل اور نازو میں سے کسی کو اپنے لیے پسند کر لیا ہے؟ اگر وہ اتنا ہی

بے رحم اور سفّاک تھا جتنا کہ اُس کا نام تو وہ کسی کو بھی روک سکتا تھا اور ایسا ہوتا تو اُس کی نگاہِ انتخاب میں پہلے وہ آسمانی بجلی آتی جس نے اس کی عقل کو حیران کردیا تھا۔ اُس نے صاف کہا تھا کہ یہ لڑکی اس کے گروہ میں شامل ہوجائے تو وہ سارا ہندوستان فتح کرلے۔

جب اُس نے کہا "تمھیں یقیناً شکر ادا کرنا چاہیے اُس لڑکی کا جس کے طفیل تم سب نے آج نئی زندگی پائی ہے"

"مَیں سمجھا نہیں تم کس کی بات کررہے ہو؟"

"مَیں شیش ناگ کی بہن ناگ مُنی کی بات کررہا ہوں۔ وہ بھی ایک عظیم ڈاکو تھا۔ نہ مَیں اُس سے کبھی ملا اور نہ میرا اُس سے کسی قسم کا کوئی تعلق تھا لیکن وہ میرا ہم پیشہ تھا اور جب اُس نے تمھاری جان بچانے کے لیے اپنی جان دینے کے بعد تم پر اتنا اعتماد کیا کہ اپنی بہن کو تمھارے حوالے کردیا، تو اب یہ میرا بھی اخلاقی فرض بنتا ہے کہ اس ڈاکو کی بہن کو جہاں تک ممکن ہے تحفظ فراہم کروں۔ وہ میری بھی بہن ہے، اس رشتے سے کہ مَیں اُس کے بھائی کی طرح ڈاکو ہوں۔"

رشتوں کی نفسیات اور پیشے کی اخلاقیات کے اس فلسفے نے مجھے دم بخود کردیا۔ اس ڈاکو کے لیے آسمانی صحیفوں کے فرمان، پیغمبروں کے فرمودات، شرافت اور انسانیت کی تبلیغ کرنے والوں کے ارشادات، نیکی اور راستبازی کی سب ترغیبات بے معنی اور لاحاصل تھے۔ اس کے لیے ہم، ہمارا احسان، ہمارا مذہبی تعلق، ہمارا مشن سب کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ اس کو صرف ایک احساس نے مغلوب کرلیا تھا کہ گل بانو ایک ڈاکو کی بہن ہے، وہ اس ڈاکو کو ایک بڑا آدمی مانتا تھا۔ ایک پاکستان کا ڈاکو تھا تو دوسرا ہندوستان کا ڈاکو تھا مگر دو سیاسی و نظریاتی سرحدوں سے بے نیاز... صرف ایک رشتے کو تسلیم کرتے تھے اور ڈاکوؤں کی عالمی برادری کے حوالے سے ایک دوسرے کے ساتھ اپنے ضابطۂ اخلاق کے مطابق یگانگت رکھتے تھے۔

مَیں نے خاموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد کہا "تو کیا اب مَیں اُمید رکھوں کہ تم ہماری مدد کروگے؟"

"ہاں اگر ہماری بہن ناگ منی کہے گی۔"

میں نے کہا "وہ اب گل بانو ہے۔"

"گل بانو ہوگی تمھارے لیے۔ ہمارے لیے ناگ منی کا نام اہم ہے۔ جاؤ اب بے فکر ہوکے سو جاؤ۔ صبح بات ہوگی۔"

میں واپس اپنے کمرے میں آیا لیکن میرا ذہن اتنا پریشان تھا کہ میں سو نہ سکا۔ محسن اور غالب کو خواب آور دوا دے دی گئی تھی۔ یہ بات مجھے خود ڈاکٹر نے بتائی تو مجھے خیال آیا کہ یہی ڈاکٹر ایک ڈاکو کے حکم پر محسن اور غالب کو سمِ قاتل کا ایک انجکشن بھی دے سکتا تھا۔ بہت دیر تک میں کروٹیں بدلتا رہا اور سوچتا رہا کہ کیوں نہ رابعہ کو جگالوں۔ رات کے دو بجے میں نے باہر آنے والی کسی گاڑی کی آواز سنی اور بند کھڑکی کے شیشوں سے جھانک کر دیکھا۔ ایک جیپ ویگن سے چھ سات مسلح افراد کود کے اُترے تھے۔ دور سے میں ان کے تاریک سائے بھی دیکھ سکتا تھا۔ جیپ سے اُترنے والے آخری آدمی کے ہاتھ پیر رسّی سے بندھے ہوئے تھے۔ ڈاکو اسے بڑی بے رحمی سے گھسیٹتے ہوئے اندر لے گئے پھر جیپ کے پچھلے حصّے سے کسی عورت کو اُتارا گیا۔ دو ڈاکو اسے بھی دھکیلتے ہوئے اندر لے گئے۔ عورت کے صرف ہاتھ بندھے ہوئے تھے لیکن مُنہ میں کپڑا ٹھونس کے بند کردیا گیا تھا۔

اشتعال کی ایک لہر اٹھی جس نے وقتی طور پر مجھے ان نامعلوم مظلوموں کی حمایت پر اُکسایا مگر میں نے اپنے جذبات پر قابو پالیا۔ مجھے کیا ضرورت ہے ان ڈاکوؤں سے محاذ آرائی کی جواب تک ہمیں بھی ٹھکانے لگا چکے ہوتے، اگر ہمارے ساتھ ایک ڈاکو کی بہن نہ ہوتی۔ اب مجھے جلد از جلد اپنا کام نکال کے خود یہاں سے نکلنے کی فکر کرنی چاہیے اور بس۔ میں پھر بستر پر لیٹ گیا۔ دل پھر رابعہ کے لیے مچلنے لگا۔ دوسری بار سونے کی کوشش میں ناکام ہوکے میں نے گھڑی میں وقت دیکھا تو رات کے ڈھائی بجے تھے۔ میری گزشتہ رات بڑی سخت آزمائش میں گزری تھی اور تھکن سے میرے جسم کا جوڑ جوڑ دُکھ رہا تھا۔ میں نے جو اسپرین کھائی تھی اب اس کا اثر بھی ختم ہورہا تھا۔ میں مزید اسپرین کھانے اور کافی پینے کے موڈ میں تھا۔ خونی خان نے کہا تھا کہ جس چیز کی ضرورت ہو گھنٹی بجا کے کہہ دینا۔ گھنٹی کا بٹن ایک دیوار کے سوئچ بورڈ پر نظر آرہا تھا۔ کوشش کرلینے میں کیا ہرج ہے، میں نے سوچا اور بٹن دبا دیا۔ گھنٹی نہ جانے کہاں تھی کہ میں نے اس کی خفیف سی آواز بھی نہیں سُنی مگر سوئچ کے اوپر کی جالی سے کسی نے کہا۔

"یس سر!"

میں نے کہا "کافی مل سکتی ہے اور اسپرین۔"

"یس سر۔ اور کچھ؟" اسی سپاٹ مشینی لہجے میں پوچھا گیا۔

"فی الحال اتنا ہی کافی ہے۔ تھینک یو۔"

دس منٹ بعد کسی نے دروازے پر دستک دی اور میں نے جا کے دیکھا تو مجھے کوریڈور میں عین دروازے کے سامنے ایک ٹی ٹرالی نظر آئی۔ اس میں کافی تھی۔ کچھ بسکٹ تھے اور اسپرین کا ایک پیکٹ تھا۔ ٹرالی لانے والا کون تھا۔ یہ میں اندازہ نہ کرسکا کیونکہ کوریڈور خالی پڑا ہوا تھا۔ میں نے ٹرالی کو اندر کھینچ لیا اور یہ جاننے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ کیا خونی خان نے بھوت بھی ملازم رکھ لیے ہیں۔

جب دوسری بار دستک ہوئی تو میں اچھل پڑا۔ میں

دروازہ اندر سے بند نہیں کیا تھا۔ ہینڈل آہستہ سے گھوما اور رابعہ مسکراتی ہوئی اندر آگئی۔

"تو گویا۔ بقولِ شاعر۔ دونوں طرف ہے پیاس برابر لگی ہوئی" میں نے کہا "مُراد کافی کی پیاس سے ہے۔"

وہ ہنسی اور میرے پاس بیٹھ گئی "نیند کیوں رات بھر نہیں آتی؟"

میں نے کہا "بہت خوب۔ میں ٹیلی پیتھی وغیرہ کا قائل تو نہیں ہوں۔ مگر مان گیا کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ تمھیں جگاؤں۔ تمھاری یاد پریشان کررہی تھی۔"

"ایسے جھوٹ کی ضرورت تو نہیں تھی" رابعہ نے کہا "مزے سے بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ مجھے دیکھا تو ڈائلاگ بول دیا۔"

میں نے آہ بھر کے کہا "کیا محبت میں آدمی اپنا اعتبار بھی کھو دیتا ہے۔ اور تو خیر سب کچھ گنواتا ہی ہے۔"

رابعہ نے کہا "خان صاحب سے کیا باتیں ہورہی تھیں؟"

"لو۔ کافی پیو۔ اور خدا کا شکر ادا کرو کہ اس وقت تم میرے پاس ہو۔ اللہ میاں کے پاس نہیں ہو" میں نے کہا۔

"یہ تو ایک ہی مگ ہے" رابعہ نے کہا۔

میں نے کہا "لب تو دو ہیں۔ براہِ راست نہ ملیں تو کیا اس مگ کے وسیلے سے تو مل سکتے ہیں۔"

رابعہ نے شرما کے کافی کے مگ سے ایک گھونٹ لیا۔ میں نے دوسرا گھونٹ لے کر کہا "اس کا تو مزہ ہی بدل گیا ہے تمھاری خوشبو شامل ہونے سے۔"

"فضول باتیں مت کرو" رابعہ نے کہا اور پھر ایک گھونٹ لیا۔

"بقولِ شاعر۔ ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں۔ کافی میں تم نے نشہ گھول دیا ہے۔ میں کیا کروں۔"

"اس سے زیادہ نشے میں کچھ کہا تو میں چلی جاؤں گی" رابعہ نے کہا۔ اور مگ میرے ہاتھ سے لے کر پھر ایک گھونٹ لیا۔

میں نے مگ واپس وصول کرتے ہوئے کہا "ایسی جان لیوا دھمکی مت دو۔ چلو میں خاموش ہوجاتا ہوں ـــ اور تمھیں دیکھتا ہوں۔"

"تم نے دیکھا ابھی کچھ لوگ جیپ سے اُتر کے آئے ہیں؟"

میں نے کہا "تم بھی دیکھ رہی تھیں۔ وہ ساتھی ہیں محمد خان عرف خونی خان کے۔ گل نے اس کے ہاتھوں ہمارا خون ہونے سے بچالیا۔"

"گل نے...؟" رابعہ بولی۔ اور میں نے اسے تفصیل سے اپنی اور محمد خان کی گفتگو کے بارے میں بتایا۔

اس نے سب کچھ سُن کے کہا "ہمیں صبح ہوتے ہی یہاں سے نکل جانا چاہیے۔"

میں نے کہا "اب کوئی خطرے کی بات نہیں۔ اس کے علاوہ مجھے خونی خان سے وہ کام لینے ہیں جو میں خود نہیں کرسکتا۔"

"ایسا کون سا کام ہے اور اس کی کیا ضمانت ہے کہ وہ تمھارا کام کردے گا؟"

"گل کے حکم پر وہ سب کچھ کرے گا۔ مجھے تریوینی کے ذریعے دلاور کے بارے میں معلومات درکار ہیں۔ خونی خان کے ساتھی شہر بھر میں اپنے تعلقات رکھتے ہیں اور خود خان صاحب کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔" میں نے کہا "چھوڑو یہ بات۔ کوئی اور بات کرو۔"

"اور کیا بات کروں؟"

"اچھا میں باتیں کرتا ہوں تم اسی طرح بیٹھی رہو..."

صبح میں نے ڈاکو محمد خان کو محسن اور غالب کے کمرے میں دیکھا۔ وہ ڈاکٹر سے مریضوں کی پروگریس رپورٹ لے رہا تھا۔

ان دونوں کی حالت اتنی اچھی نظر آرہی تھی کہ مجھے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ نازو اور گل اپنے اپنے بیماروں کے سرہانے پہلے سے موجود تھیں۔

میں نے کہا "اب ایسی تیمارداری سے کیا فائدہ کہ رات آنکھوں میں کاٹ دی۔ پھر خود لیٹ جاؤگی بیمار بن کے..."

"آپ جائیں، پہلے انھیں تو جگالیں جو ابھی تک سوتی بنی پڑی ہیں" نازو نے کہا "معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی صورت دیکھے بغیر آنکھیں نہیں کھولیں گی۔"

گل نے مسکرا کے معنی خیز لہجے میں کہا "حالانکہ پوری رات انھوں نے سو کے ہی گزاری ہے۔"

میں نے کہا "خدا بچائے تم لڑکیوں کی زبان سے" اور محمد خان کے ساتھ باہر نکل گیا۔

"خان صاحب! کیا آپ گل سے مل چکے ہیں؟"

"ہاں۔ ابھی تھوڑی سی بات ہوئی تھی۔ مگر میں نے اس کے بھائی کی بات نہیں کی" محمد خان نے جواب دیا۔

"رات کو تمھارے ساتھی تو آگئے۔ میں نے آوازیں سُنی تھیں" میں نے کہا۔

"رات کو میری تریلوینی سے بات ہوئی تھی" محمد خان نے کہا۔

میرے ذہن کو بجلی کا جھٹکا لگا "تم نے خود فون کیا تھا؟"

"ہاں" اس نے بے نیازی سے کہا "اور مجھے ایک بڑی عجیب بات معلوم ہوئی۔ وہ جو دلاور ہے نا ـــ وہ تم سے ملنا چاہتا ہے۔"

میں نے چلّا کے کہا "خان صاحب! آپ نے اسے یہ بھی بتادیا کہ ہم یہاں ہیں؟"

محمد خان کے لبوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

محمد خان نے کہا: "پریشان ہونے یا ڈرنے کی بات کوئی نہیں۔"

مَیں نے کہا: "خان صاحب! تم ہماری پوزیشن کو نہیں سمجھتے۔ تمھیں کیا معلوم کہ کتنی پریشانی اٹھا کے ہم نے اس مردود سے پیچھا چھڑایا تھا۔"

"تم کس مردود کی بات کر رہے ہو؟"

"چوہدری دلاور کی۔ ہم نے خدا کا شکر ادا کیا تھا کہ اُس کا شکاری ٹولا ہمیں کسی جال میں گرفتار نہ کر سکا اور انھوں نے ہمارے خلاف سازشوں کے جتنے جال پھیلائے وہ انھی کی شکست کا سامان بنتے چلے گئے۔ یہ ہمارا کمال نہیں تھا۔ خدا کی مہربانی تھی اور مدد تھی۔ اب اسے ہماری بے وقوفی سمجھو یا بدقسمتی کہ بمبئی پہنچ کے ہم خود کو روپوش نہ رکھ سکے۔ ہم سے ایک ایسا کارنامہ سرزد ہو گیا۔"

"کارنامے سرانجام دیے جاتے ہیں۔"

"مگر یہ کارنامہ ہماری راہ میں آ گیا اور ہمارے لیے ناگزیر ہو گیا۔ ہم کیا کرتے؟ کوئی شخص ساحل پر ٹہل رہا ہو اور اچانک کسی کو ڈوبتا ہوا دیکھ لے تو کیا کرے گا؟ ٹہلتا رہے گا اور دیکھتا رہے گا؟ نہیں، اگر وہ انسان کا بچّہ ہے تو سوچے سمجھے بغیر اپنی جان خطرے میں ڈال کے سمندر میں کود جائے گا اور اُسے بچا لایا تو اُس کی یہ غیرارادی حرکت بھی ایک کارنامہ کہلائے گی۔ ہمارا تو یہ ہے کہ ہر خطرے میں بغیر سوچے سمجھے کود پڑنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ ہم ڈوب رہے تھے کہ ایک لانچ کے عملے نے ہمیں بچا لیا۔ تم کہہ سکتے ہو کہ اللہ نے ہمیں اُن کی شامت بنا کے بھیجا تھا۔ ہمیں بچانا اُن کو مہنگا پڑا۔ وہ لانچ میں اغوا شدہ لڑکیاں لے کر کہیں بیچنے جا رہے تھے۔ جب یہ بات معلوم ہوئی تو بس ہماری غیرت نے جوش مارا۔ پھر ہم نے اُن سب کو مارا اور لانچ کو واپس بمبئی لے آئے۔ اس واقعے کی بہت شہرت ہوئی اور یہی شہرت ہمیں لے ڈوبی۔ جب دلاور کے کانوں تک اس شہرت کا چرچا پہنچا تو وہ فوراً سمجھ گیا کہ یہ کام ہمارے سوا کسی کا نہیں ہو سکتا۔ جیسے پولیس واقعی تفتیش کرے تو طریقۂ واردات سے اندازہ کر لیتی ہے کہ مجرم نو آموز ہے یا پرانا پاپی اور بعض اوقات تو صحیح مجرم تک پہنچ جاتی ہے۔ ایسے ہی دلاور سیدھا تریوینی کے پاس جا پہنچا جہاں ہم ایک طرح سے قید میں تھے۔"

"یہ تم بتا چکے ہو مجھے، کہ تم وہاں سے نکلے کیسے تھے؟"

"خان صاحب! ہم تو یہ بھی بتا چکے ہیں کہ ہم پھر گرفتار کیسے ہوئے تھے اور اپنے ساتھیوں کو گزشتہ رات کیسی خونریزی کے بعد ایک ویران جزیرے کی قید سے نکال کر لائے تھے۔

بڑی مشکل سے ہم اکٹھے ہوئے تھے اور جلد از جلد بمبئی سے نِ... جانا چاہتے تھے۔ یہ ہماری منزل نہیں تھی۔ بمبئی راستے میں ... ہم تقدیر کے چکّر میں پھنس گئے اور . . . ابھی تک پھنسے ہوئے ہیں۔"

"لوگ تو بڑے شوق سے بمبئی آتے ہیں۔" خان ہنس...

"لعنت ہو بمبئی پر اور اُن لوگوں پر جو یہاں خوار ہونے آتے ہیں۔ ہمارے سامنے فلمی دنیا میں چانس حاصل کرنے سے کہیں زیادہ عظیم اور اہم مقصد ہے۔ ہمارا بہت وقت ضائع ہو چکا اور ہماری وجہ سے خواہ مخواہ کچھ لوگ اپنی جان سے گئے۔ اب سوچا تھا کہ خاموشی سے نکل جائیں گے تو تم نے تریوینی کو ہمارا پتا بتا دیا۔ یوں لگتا ہے خان صاحب کہ ابھی کچھ اور لوگ مارے جائیں گے ہمارے ہاتھوں، پھر راستہ صاف ہو گا۔"

ڈاکو محمد خان نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا: "نروس ہو، اسی لیے تمھارا دماغ میدانِ جنگ بنا ہوا ہے۔ بتایا میں نے کس کو دیا ہے تمھارا پتا؟"

"جب تم نے فون پر بات کر لی تریوینی سے تو باقی کیا رہا؟"

"میں نے اُسے اپنا فون نمبر تو نہیں دیا۔ یہ بھی نہیں بتایا کہ میں بمبئی سے بول رہا ہوں یا دہلی سے . . ."

"وہ اندازہ کر لے گا، معلوم کر لے گا۔ اُسے معلوم ہو گا پہلے سے تمھارا ہر نمبر۔" میں نے کہا۔

محمد خان نے نفی میں سر ہلایا: "اوّل تو یہ محال ہے لیکن فرض کرو وہ فون نمبر بھی معلوم کر لے تو اُس سے پتا کیسے معلوم ہو گا میرا؟"

"ہر فون نمبر سے ایڈریس معلوم ہو جاتا ہے۔"

"لیکن وہ فون یہاں سے پانچ کلومیٹر دُور ایک خالی بنگلے میں لگا ہوا ہے اور اُس کا مالک ایک ڈاکٹر ہے جو دو سال سے لندن میں ہے۔ مَیں اُس کورڈلیس فون پر بات کر رہا تھا۔" محمد خان نے جیب میں سے ایک پاکٹ سائز ہینڈ فون نکالا: "تم سمجھتے ہو نا اس نظام کو۔ اس کے دو حصّے ہوتے ہیں۔ ایک میرے ہاتھ میں ہے۔ دوسرا پانچ کلومیٹر دور اس ٹیلی فون کے ساتھ منسلک ہے۔ ہر کال اسی فون سے گزر کے جاتی ہے اور اسی سے گزر کر مجھ تک پہنچتی ہے۔"

"وہ کون ڈاکٹر ہے جس نے اپنا فون تمھیں دے رکھا ہے؟ تمھارا کوئی ساتھی؟"

خان مُسکرایا: "اُس بے چارے کو معلوم بھی نہیں کہ اُس کا فون کون استعمال کر رہا ہے۔"

"کتنا عرصہ ہو گیا تمھیں یہ فون استعمال کرتے؟"

"شاید چھ مہینے . . ."

"چھ مہینے سے تمھاری ہر کال اُس ڈاکٹر کے بل میں لگ رہی ہے؟ وہ تو مارا جائے گا جب واپس آنے کے بعد اُسے معلوم ہو گا کہ فون واجبات ادا نہ کرنے کے باعث کٹ گیا اور واجبات ہیں ایک لاکھ . . ."

محمد خان بولا: "یار تم بعض اوقات بالکل بچّوں کی طرح سوچنے لگتے ہو۔ جب ہم وہ فون آزادانہ استعمال کر رہے ہیں تو کیا اس کا بل ادا نہیں کریں گے۔ فون تو کب کا کٹ چکا ہوتا اگر ہم نے ادائیگی نہ کی ہوتی۔ ہر ماہ ہم بل کو لیٹر باکس میں سے نکال لیتے ہیں۔"

"ایسے تو لوگ تمھیں آتے جاتے بھی دیکھتے ہوں گے؟"

"اوّل تو کوئی دیکھتا ہی نہیں . . . پھر ہم یہ کام رات کو کرتے ہیں۔"

میں نے کہا: "اگر وہ ڈاکٹر واپس آ گیا تو؟"

"اُسے واپس آنے سے کون روک سکتا ہے۔ وہ سمجھ جائے گا کہ اُس کا فون کوئی استعمال کرتا رہا ہے۔ کورڈلیس فون کا جو حصّہ اس فون کے ساتھ منسلک ہے وہ ہم واپس نہیں لا سکیں گے۔ وہ کوئی بہت بڑی قیمتی چیز نہیں ہے۔ پانچ دس ہزار تو ہم ایسے ہی ادھر اُدھر پھینکتے رہتے ہیں۔ اگر ہم کوئی فون نمبر خریدیں یا نیا فون لگوائیں تو ہمارا خرچ زیادہ ہو گا اور رِسک اس سے بھی زیادہ۔ جو طریقہ ہم نے اختیار کیا ہے اس میں کوئی رسک نہیں۔ ڈاکٹر کو معلوم ہو جائے گا کہ جس نے بھی فون استعمال کیا وہ بل باقاعدگی سے ادا کرتا رہا۔ وہ مطمئن ہو جائے گا۔ ہم اپنا بندوبست کہیں اور کر لیں گے۔ ہم ویسے بھی ہر چھ ماہ بعد فون نمبر بدل دیتے ہیں۔"

"اپنی مرضی سے؟"

"ہاں جیسے ہی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص گھر خالی کر کے باہر گیا ہے اور یہ معلوم کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ ہم فوراً اپنا سیٹ پہلی جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ منتقل کر دیتے ہیں۔ اب تک ہمارے دو سیٹ ضائع بھی ہوئے ہیں۔"

مَیں یہ تفصیلی معلومات ایسے ہی نہیں حاصل کر رہا تھا۔ مجھے مواصلاتی رابطے کا یہ طریقہ پسند آیا تھا۔ ٹیلی فون سے بہتر اور مؤثر ذریعۂ پیغام رسانی کا کوئی اور ذریعہ اب تک ایجاد نہیں ہوا۔ ایک ٹیلی فون لائن آدمی کو ہر شہر اور قصبے سے ہی نہیں ساری دنیا سے منسلک کر دیتی ہے۔ آج تک ہم بندروں کی طرح کسی ٹیلی فون کے کھمبے پر چڑھ کے ڈائریکٹ لائن استعمال کرتے رہے تھے مگر ظاہر ہے یہ طریقہ ہر وقت اور ہر جگہ آسانی سے استعمال نہیں کیا جا سکتا تھا۔ پہلے تو ایسا کھمبا تلاش کرنا پڑتا تھا جس پر چڑھتے ہوئے ہمیں کوئی بھی نہ دیکھے۔ اس کے بعد دوسرا خطرہ جو ہر وقت لاحق رہتا تھا اچانک نیچے ٹپک پڑنے کا تھا لیکن تیسرا سب سے بڑا نقصان یہ تھا کہ کھمبے پر چڑھ کے صرف ہم تینوں یعنی میرے علاوہ محسن اور غالب ہی گفت و شنید کرتے تھے۔ ہنوز خواتین کے لیے یہ طریقہ کارآمد نہیں تھا کیونکہ ٹیلی فون کے محکمے میں رابعہ، نازو اور نگل جیسی تو کیا کوئی لیڈی پولیس جیسی بھیانک شکل والی . . . . لائن وومین نہیں ہے۔ خونی خان نے ٹیلی فون کے بے ضابطہ استعمال کا جدید اور محفوظ طریقہ اختیار کیا تھا۔

"تم کس سوچ میں پڑ گئے؟"

مَیں نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا: "میں سوچ رہا تھا کہ دلاور آخر مجھ سے کیوں ملنا چاہتا ہے؟"

"یہ بات تریوینی بھی نہیں جانتا۔"

"کیا تم نے اُس سے پوچھا تھا؟" مَیں نے کہا۔

خان صاحب نے سر ہلایا: "ہاں، مَیں نے پوچھا تھا کہ بات کیا ہے تو اُس نے کہا کہ خان صاحب، مجھے اُس نے نہیں بتائی۔"

مَیں نے کہا: "خان صاحب! تریوینی جھوٹ بھی تو بولتا ہو گا؟"

"دُنیا میں کون جھوٹ نہیں بولتا۔" خان نے کسی فلسفی کی طرح کہا: "اگر کوئی خود کو دنیا کا سب سے سچّا آدمی کہے تو یہ بھی جھوٹ ہو گا۔ میرا خیال یہ ہے کہ ہر روز دنیا میں جتنا جھوٹ بولا جاتا ہے اُس کا دسواں حصّہ بھی سچ نہیں بولا جاتا۔"

مَیں نے کہا: "مَیں تم سے اتفاق کرتا ہوں۔ آہستہ آہستہ سچ اور کم ہوتا جا رہا ہے۔ آج تناسب ایک اور دس کا ہے تو کل ایک اور بیس کا ہو گا۔ مگر مجھے دنیا میں سچ کے سکّے کی گرتی ہوئی قیمت کے بارے میں نہیں تریوینی کے سچ کے بارے میں بتاؤ۔"

"تریوینی مجھ سے جھوٹ نہیں بولتا۔" ڈاکو محمد خان نے بڑے وثوق کے ساتھ کہا جیسے ہر ماں اپنے بچّے کے بارے میں پڑوسی کی شکایت پر یقینِ کامل کے ساتھ آستین چڑھا لیتی ہے کہ 'میرا بچّہ ایسا نہیں ہے'۔

مَیں نے کہا: "لوگ اپنے آپ سے بھی جھوٹ بولتے ہیں۔"

محمد خان نے کہا: "تریوینی اچھی طرح سمجھتا ہے کہ اس کا جھوٹ مَیں نے پکڑ لیا تو موقع ملتے ہی مَیں اُسے پکڑ لوں گا بلکہ پکڑ لاؤں گا اور اُسے جھوٹ کی نقد قیمت چکانی پڑے گی۔"

مَیں نے کہا: "وہ جھوٹ بولے تو تم جرمانہ کر دیتے ہو؟"

"ہاں۔ جھوٹ اُسے مہنگا پڑتا ہے چنانچہ وہ سچ بولنے میں ہی اپنی عافیت سمجھتا ہے۔"

"یہ تو عجیب بات ہے۔ آخر کیوں ڈرتا ہے وہ تم سے؟"

محمد خان نے مونچھوں کو تاؤ دیا: "اس لیے کہ میرا نام خونی خان

ہے اور یہ نام کمانے کے لیے مجھے کتنی محنت کرنی پڑی عاس کا اندازہ تم نہیں کر سکتے۔ میں عام ڈاکو نہیں ہوں۔"

میں نے اُسے غور سے دیکھا۔ "تم خاص ڈاکو ہو؟ تم نے کوئی کورس کیا ہے رہزنی کا۔ . . جیسے عام ڈاکٹر اسپیشلسٹ بن جاتے ہیں۔"

محمد خان زور سے ہنسا۔ "مثال اچھی دی تم نے، لیکن میں اپنے کام کی نوعیت کو عام نہیں سمجھتا۔ عام ڈاکو بینک لوٹتے ہیں، سیٹھوں کی تجوریاں لوٹتے ہیں اور نقد سونا چاندی ہیرے جواہرات جو ملے چھین کر لے جاتے ہیں۔ یہ خطرناک کام ہے اور اس میں چانس کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کسی کے ظاہری ٹھاٹ باٹ ایسے ہوں کہ وہ لکھ پتی یا کروڑ پتی لگتا ہو لیکن اندر سے کنگال ہو۔ یا کسی سیٹھ کی تجوری تو الماری سے بڑی ہو مگر اس میں سے ملیں ساڑھے تین روپے۔ سیٹھ بھی بڑے عیار ہو گئے ہیں اب تو۔ سارا مال گاڑ دیتے ہیں کہیں کسی شمشان میں یا کسی مندر میں مہالکشمی کی مورتی کے نیچے تہ خانہ بنوا لیتے ہیں۔ مندر بھی اُن کا اپنا ہوتا ہے اور پروہت درحقیقت خزانے کا محافظ ہوتا ہے۔ گنجے سر کی بودی، تلک اور جنیو کے باوجود وہ کوئی سابق کمانڈو ہوتا ہے۔"

"مندر میں خزانہ محفوظ رہتا ہے؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ مندر پر تو ڈاکو بھی حملہ نہیں کرتے، نہ وہاں چور جاتے ہیں۔ بس ایک احساس ہوتا ہے کہ پاپ کریں تو بندے کے ساتھ اور بھگوان کے ساتھ بنی رہے۔ بھگوان کی مدد کی ضرورت بھی تو پڑ جاتی ہے سب ہی کو۔"

مجھے نیکی بدی کے اس تصور پر بہت ہنسی آئی۔ "کیا سب سیٹھ ایسا کرتے ہیں؟"

"نہیں یہ بات عام ہو جائے تو پھر ڈاکو بھی سمجھ جائیں گے کہ بھگوان کے نام پر اُن کو دھوکا دیا جا رہا ہے اور وہ بھگوان کے گھر میں بھی گھس جائیں گے۔" خان نے کہا۔ "ممبئی میں دو تین ہی ایسے عیار بھگت ہیں بھگوان کے۔ اُن میں ایک تریوینی ہے اُس نے دس لاکھ کے خرچ سے مہالکشمی کا مندر بنوایا۔ وہاں کے سب پنڈت، پروہت خود اپنے اعتماد کے لوگ رکھے۔ ایک لاکھ روپیہ سالانہ دان دیتا ہے سب کے سامنے، مگر وہ دان لوٹ کے تریوینی کے پاس ہی تو آتا ہے۔ گھی کہاں گیا؟ کھچڑی میں اور کھچڑی کہاں گئی؟ اپنے پیٹ میں۔"

میں نے کہا۔ "یہ تو آمدنی کا دھندا بھی ہو گا اچھا خاصا۔"

"بالکل ہے۔ لوگ جو چڑھاوے لاتے ہیں، دان پُن کرتے ہیں وہ بھگوان کو نہیں اُس کے بھگتوں کو پہنچتا ہے۔ تریوینی کی طرف سے اجازت ہے کہ جتنا مال جنتا سے ملے آپس میں برابر بانٹ لیں۔ ایک اور سیٹھ نے ہنومان جی کا مندر بنوایا ہے۔ کبھی جا کے دیکھنا وہاں انسانوں سے زیادہ بندر رہتے ہیں۔ تیسرے سیٹھ کے بارے میں میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ گنیش جی اور کالی مائی کے جن مندروں میں پرارتھنا کے لیے جاتا ہے وہ بھی کالے دھن کے خزانے ہیں یا واقعی اُسے عقیدت ہے۔"

"جب تمہیں معلوم ہو جائے گا تو تم کیا کرو گے؟"

"وہی جو میں نے تریوینی کے ساتھ دو بار کیا اور جس کی وجہ سے میں اپنے آپ کو عام ڈاکو نہیں کہتا۔" محمد خان بولا۔ "پہلی بار میں نے اُسے اٹھوا لیا۔ وہ رات کے وقت مندر کی سیڑھیوں پر سے اُتر رہا تھا کہ میرے آدمی اُسے گاڑی میں ڈال کے لے آئے۔ میں نے اُسے بتا دیا کہ مہالکشمی کے مندر کی ساری حقیقت مجھے معلوم ہو چکی ہے اور میں نے یہ بات سرکار اور جنتا کو بتا دی تو تم پر بھگوان کی مار پہلے ہی ہے، پولیس کی مار الگ پڑے گی اور عقیدت مندوں کی الگ لیکن سب سے بڑی مار ہو گی پیسے کی۔ تمہاری ٹریژری حکومت صاف کر دے گی۔ سب سے بڑی چور تو خود حکومت ہے جو انکم ٹیکس، دولت ٹیکس، سپر ٹیکس اور درجنوں دوسرے ٹیکسوں کی صورت میں سب کچھ چھین لیتی ہے۔ تمہارا کالا دھن جائے گا سرکار کے خزانے میں اور تم جاؤ گے سرکار کی جیل میں۔ میرے ساتھ سودا نہیں کرو گے تو یہی ہو گا اور ممکن ہے کہ اتنا بڑا صدمہ تم جھیل نہ سکو۔ مجھے پچاس لاکھ دے دو اور محفوظ ہو جاؤ۔ دین اور دنیا کی خدمت کرتے رہو۔" اُس نے کہا کہ "تمہارا کیا ہے؟ سال چھ مہینے بعد مجھے پھر اُٹھا لاؤ گے۔" تو میں نے کہا کہ "ایک تو میں مسلمان . . . پھر پٹھان اور مرد۔ قول دے کر میرے لیے پھرنا ایسا ہی ہے جیسے لحم خنزیر کھانا یا سگی بہن سے شادی کرنا۔ اب تم اعتبار کرتے ہو تو بتاؤ۔ نہیں کرتے تو کوئی بات نہیں۔ میں اپنے کمانڈو دستے کو آج رات بھیجتا ہوں کہ مہالکشمی کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں اور سونے کی ایک ایک اینٹ اور چاندی کی ایک ایک مورتی اٹھا لائیں۔ میں نے تو سنا ہے کہ مندر کا گھنٹا خالص سونے کا ہے اور اُس کا کلس بھی۔" بس اس کے بعد تریوینی مجبور ہو گیا۔ اُس نے پچاس لاکھ منگوائے اور میرے حوالے کر دیے۔ میں نے اُسے چالیس لاکھ واپس کیے اور کہا کہ اپنے پاس رکھے، جب ضرورت پڑے گی لے لیں گے۔ وہ بڑا حیران و پریشان واپس گیا۔ عقل مند ہوتا تو کسی سے بات نہ کرتا۔ پچاس لاکھ میں ساری زندگی کے لیے ایک ضمانت حاصل ہو گئی تھی لیکن اُس کا کوئی ساتھی پولیس کمشنر تھا ممبئی کا۔ اُس نے دس لاکھ لُٹ جانے کا رونا پولیس کمشنر کے سامنے رویا اور جب پولیس حرکت میں آئی تو مجھے معلوم ہو گیا۔ مجھے کوئی کیسے پکڑ سکتا تھا۔ میں نے پھر تریوینی کو پکڑ لیا۔ دوسری بار میں اُس سے ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے بار میں ملا۔ وہ ذرا سی دیر کے لیے اکیلا ہوا اور میں اُس کے ساتھ صوفے پر جا بیٹھا۔ اُس وقت میں تھری پیس سوٹ میں تھا۔ مجھے پہچانتے ہی شراب اور آواز دونوں اُس کے حلق میں پھنس جانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ بے ہوش ہوتے ہوتے بچا۔ میں نے کہا کہ تریوینی! بڑی بُری بات ہے وعدہ توڑنا۔ میں نے چالیس لاکھ امانت رکھوائے تھے تمہارے پاس۔ اتنا اعتبار کیا تھا تم پر اور تم دس لاکھ کی شکایت لے کر پولیس کے پاس چلے گئے۔ اب مجھے بتاؤ کہ یہاں پولیس تمہاری کیا مدد کر سکتی ہے، میرا ریوالور تمہارے دل کو چھو رہا ہے۔ اس میں سائلنسر بھی لگا ہوا ہے۔ لوگ سمجھیں گے کہ تم زیادہ پی کے گر گئے۔ بینڈ بھی تو اتنے زور سے بج رہا ہے۔ تمہاری آواز سن کر یقیناً کچھ لوگ آ جائیں گے مگر اتنی دیر میں خونی خان غائب ہو جائے گا۔ ایسی بے وقوفی کی اُمید نہیں تھی مجھے تم سے، کہ پچاس لاکھ میں دنیا سے جانا منظور کر لو گے۔ تمہارے پاس تو کروڑوں ہیں، شاید اربوں ہوں۔ تمہاری زندگی بہت قیمتی ہے تریوینی۔ اور اُس نے مجھ سے اتفاق کیا۔ اُس کے بعد ہم دوستوں کی طرح باتیں کرتے رہے۔ مختلف وقتوں میں تیس لاکھ لے چکا ہوں میں اُس سے۔ ایسا ہی معاملہ دوسرے سیٹھ کا ہے لیکن اُس نے کبھی بد عہدی نہیں کی۔ بڑی عزت کے ساتھ پیش آتا ہے۔ اُس کے بچے مجھے ماما کہتے ہیں۔ پچھلے سال اُس کی بچی نے بی اے پاس کیا تھا اور باپ سے کار کے لیے ضد کر رہی تھی۔ باپ سالا ایک نمبر کا کنجوس ہے کہہ رہا تھا کہ جہاں تیری سگائی ہوئی ہے اُن کے پاس کار ہے وہ تیری ہی ہو گی چند دن بعد۔ میں نے کہا کہ یار، بچی کا دل توڑنا بُری بات ہے اور کار میں نے اُسے گفٹ کر دی۔ اُس کی ماں ہر سال مجھے راکھی باندھتی ہے۔"

میں دم بخود یہ سب کچھ سُن رہا تھا۔ عام ڈاکو اور خاص ڈاکو کا فرق میری عقل خبط کرنے کے لیے کافی تھا۔ "تم . . . اُسی کو لُوٹتے رہتے ہو اور ماما بھی ہو اُس کے بچوں کے۔ کار بھی تحفے میں دے ڈالی تم نے . . .؟"

وہ ہنسا۔ "بہت سے ماما تو ایسے خبیث ہوتے ہیں کہ تمام عمر لُوٹتے ہیں اور دیتے کچھ نہیں . . . اب یہ تو ایک رشتہ قائم ہو گیا ہے۔"

"لُوٹنے والے کا لُٹنے والے سے رشتہ۔" میں نے کہا۔

"ہاں، تریوینی کی بیوی کا جنم دن تھا تو میں نے ہیروں کا نیکلس دیا تھا تحفے میں۔ ہو گا شاید ایک لاکھ کا۔ تریوینی بڑا تلملایا۔ اُس کی بیوی نشے میں مجھ سے لپٹ گئی سب کے سامنے اور کیا بتاؤں اس نے سب کے سامنے مجھے کِس کر کے کتنا شرمندہ کیا۔"

"تریوینی نے قتل نہیں کیا اپنی بیوی کو؟"

خان ہنسا۔ "وہ ایک ایم ایل اے کی بہن ہے۔ اُس کا ایک بھائی ہارڈ سیکیورٹی فورس میں میجر ہے۔ تریوینی کے باقی حالے بھی ایک سے ایک طرم خاں ہیں۔ سب سالے حرامی نمبر وَن۔ تریوینی اُن کے سامنے دُم ہلاتا ہے مگر انھی سالوں کی مدد سے اُس نے مجھے اندر کروا دیا تھا۔ رات میں نے اُسے صرف یہ بتانے کے لیے فون کیا تھا کہ میں جیل سے آ گیا ہوں۔ مجھے معلوم ہے دوسری طرف اُس کی دھوتی گیلی ہو گئی ہو گی میری آواز سُن کر۔"

"یہ دلاور کا ذکر کیسے آ گیا تمہاری گفتگو میں؟"

محمد خان نے کلائی کی گھڑی میں وقت دیکھا۔ "خود میں نے ہی پوچھا تھا اُس سے کہ یہ چودھری دلاور کون ہے تمہارا باپ؟ میں تصور کر سکتا ہوں کہ اس سوال پر تو شاید دھوتی کُھل ہی گئی ہو گی اُس کی۔ وہ اندر سے بہت بزدل آدمی ہے۔ دولت سے حاصل ہونے والی طاقت پر اکڑتا ہے۔ غنڈے، بدمعاش پال رکھے ہیں، اسلحہ ہے اور بیوی کے خاندان کا اثر و رسوخ ہے ورنہ وہ خود کچھ نہیں۔ کہنے لگا کہ تم کیسے جانتے ہو چودھری دلاور کو؟ میں نے کہا۔ "میں تمہاری پچھلی سات نسلوں کو بھی جانتا ہوں اور آنے والی سات نسلوں کو بھی۔ جو سوال میں نے پوچھا ہے اُس کا جواب ہاں یا نہ میں دو۔" اُس نے اقرار کیا تو میں نے اُسے سمجھا دیا کہ دلاور سے اُس کے تعلقات خود اُس کے حق میں کتنے تباہ کُن ہو سکتے ہیں۔ میں نے کہا کہ تریوینی! تم نے جو حرامی پن کیا تھا مجھے جیل پہنچا کے، اُسے میں معاف کر سکتا ہوں اور ہمارے تعلقات اعتماد کی بنیاد پر پہلے جیسے ہی رہیں گے لیکن اس کے لیے ایک شرط ہے۔ جب اُس نے شرط پوچھی تو میں نے کہا کہ ایک تو تم چودھری دلاور کا ساتھ چھوڑ دو کیونکہ اُس کے دشمن میرے دوست اور مہمان ہیں۔ ہم پٹھان جب کسی کو مہمان بنا لیں تو پھر اپنی روایات کے مطابق جان دے کر بھی اُس کی حفاظت کرنا ہمارا فرض بنتا ہے۔"

"تم نے ہم سب کے بارے میں بتا دیا؟ کہ تمہارے مہمان کتنے ہیں اور کون کون لوگ ہیں؟"

"نام تو نہیں لیا تھا میں نے کسی کا، مگر ظاہر ہے وہ سمجھ گیا ہو گا۔" ڈاکو محمد خان نے کہا۔ "تریوینی نے کہا کہ میرا دلاور سے صرف ایک کاروباری تعلق ہے۔ میں نے کہا کہ یہ تعلق تمہیں مبارک، مگر اس کی وجہ سے کہیں میرے اور تمہارے تعلق میں گڑبڑ نہ ہو جائے۔ تمہارے مہمان نے میرے مہمانوں کو پریشان کیا تو پریشانی تمہیں بھی ہو گی۔ تم خود کو اس جنگ سے دُور رکھو اور دلاور سے اپنی جان چھڑا لو۔ اُس نے وعدہ کیا کہ وہ ایسا ہی کرے گا اور میں نے اُسے یاد دلایا کہ مہالکشمی کے مندر کی طرف ہم نے کبھی نظر اٹھا کے نہیں دیکھا حالانکہ ہمارے اور اس کے معاہدے کو ایک سال سے زیادہ عرصہ بیت چکا ہے مگر اُس

نے جھوٹ بولا یا پھر دھوکا دینے کی کوشش کی تو مہالکشمی جی اس کی مدد نہیں کر سکے گی۔"

"یہ اچھا حربہ ہاتھ آیا ہے تمھارے . . . اُس کو بلیک میل کرنے کا۔" مَیں نے ہنس کے کہا۔ "لیکن فرض کرو وہ مندر بدل دے، اپنا خزانہ کسی دوسری جگہ منتقل کر دے؟"

محمد خان نے عادتاً مونچھ مروڑی۔ "خونی خان نے کبھی کچّا کام نہیں کیا۔ جب تریوینی سے معاہدہ ہوا تھا تو ایک چھوٹی سی شرط یہ بھی شامل کی گئی تھی کہ میرا ایک پروہت بھی وہاں رہے گا جو کسی معاملے میں دخل نہیں دے گا لیکن مجھے پل پل کی خبر دے گا کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ میرا وہ پروہت اس وقت بھی مندر میں موجود ہے۔ تریوینی جانتا ہے کہ مَیں جب چاہوں مندر کو لُوٹ سکتا ہوں لیکن مَیں نے ایسا نہیں کیا۔ معاہدے کی خلاف ورزی اُس کی طرف سے ہوئی تھی۔"

"جتنا عرصہ تم جیل میں رہے، کیا تریوینی نے اس عرصے میں کوشش نہیں کی کہ مہالکشمی کے مندر سے خزانہ منتقل کر دے؟"

"اُسے میرے ساتھیوں کی طرف سے پیغام مل گیا تھا کہ ہم سب دیکھ رہے ہیں۔ تم یہ خزانہ آکاش پر لے جاؤ یا پاتال میں رہے گا ہماری نظر میں۔ رات کو جب مَیں نے اُسے اپنے مخصوص انداز میں کہا کہ تریوینی صاحب! السلام علیکم ورحمتہ اللہ برکاتہ، تو اُس نے بڑی مشکل سے کہا تھا۔ "خان صاحب! ایک ہندو کو مسلمان کبھی سلام نہیں کرتا، آداب کہتا ہے۔" میرا خصوصی سلام ایک کوڑے کا کام بھی کرتا ہے۔ اُس کی جان میں جان آئی ہو گی جب مَیں نے کہا تھا کہ تمھاری پہلی وعدہ خلافی کو مَیں نے معاف کیا۔ ظاہر ہے اس کے بعد میری شرط ایک حکم بن گئی۔ اُس نے فوراً ہی کہا کہ 'چودھری دلاور تمھارے ایک مہمان سکندر بخت سے ملنا چاہتا ہے'۔ میرا خیال ہے کہ تم مل لو اُس سے۔"

مَیں چونک پڑا۔ "چودھری دلاور سے مل لوں؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کوئی چوہے سے کہے کہ بلّی سے ملاقات کر لو اور بلّی سے کہے کہ کُتّے سے مل لو . . ."

محمد خان ہنس پڑا۔ "اگر بلّی پنجرے میں ہو تو چوہے کو اُس سے ہینڈ شیک کرتے ہوئے ڈرنا نہیں چاہیے۔ ویسے . . . کیا تمھیں یاد ہے کہ تم نے مجھے چوہا کہا تھا۔ چوہے خان کا خطاب دیا تھا مجھے۔"

مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ "نئی ملاقات ہو تو غلط فہمی کی بنیاد پر بہت سی غلط باتیں بھی مُنہ سے نکل جاتی ہیں۔"

"تم دلاور سے یہاں ملو گے،" محمد خان نے کہا۔ "یا کہیں اور ملنا پسند کرو گے؟"

مَیں نے کہا۔ "خان صاحب! آپ کی یہ بات بھی ایک پہیلی ہے۔ کسی سے اگر یہ پوچھا جائے کہ آپ میرٹھ جیل میں پھانسی چڑھنا پسند فرمائیں گے یا دہلی کی جیل میں۔ تو بتاؤ وہ کیا جواب دے گا؟"

"یہ مثال اس لیے غلط ہے کہ جب خونی خان تمھارے ساتھ ہو گا، تمھارے میزبان کی حیثیت سے، تو کس مائی کے لال میں اتنی ہمت ہے کہ وہ تمھاری طرف غلط نگاہ سے بھی دیکھ سکے۔" ڈاکو محمد خان جلال میں آ گیا۔ "خدا کی قسم گل بانو کو بہن کہا ہے تو ایسے ہی نہیں کہا ہے۔ میری بہن کے گھر میں جو آئے گا نظر جھکا کے آئے گا اور شرافت سے آئے گا۔ ورنہ اپنے پیروں پر چل کے نہیں، چار کندھوں پر جائے گا۔ کیا تم اپنی بہن کے گھر میں بدمعاش برداشت کر سکتے ہو؟"

مَیں نے کہا۔ "مجھے موقع دو کہ میں اپنے ساتھیوں سے مشورہ کر لوں۔"

"مشورہ ضرور کرو، لیکن ڈرو نہیں۔"

مَیں نے کہا۔ "فرض کرو مَیں تمھاری بات مان لیتا ہوں پھر تم کیا کرو گے، دوبارہ تریوینی سے رابطہ قائم کرو گے؟"

"ہاں۔ مَیں اُسے پھر فون کروں گا۔ تریوینی خود ملاقات کا انتظام کرے گا۔ وہ خود دلاور کو سمجھا دے گا کہ اس کی پوزیشن کیا ہے۔ تریوینی مجبور ہے میری وجہ سے اور اُس کے سالے مجبور ہیں اپنی بہن کی وجہ سے۔ مَیں نے تو صاف کہا تھا تریوینی سے کہ جو ہوا اُسے بھول جاؤ۔ مَیں نے اب تک تمھاری حفاظت کی۔ آئندہ تم میری حفاظت بھی کرو گے . . . اب کی بار کسی نے مجھ پر ہاتھ ڈالا تو یہ سمجھ لینا کہ تمھاری بیوی اور سات بھائیوں کی بہن بیوہ ہو جائے گی۔ تم اپنی حفاظت کہاں تک کرو گے! کیا ہر جگہ ٹینک میں بیٹھ کے جاؤ گے؟ پھر بھی کہیں تو باہر آؤ گے . . . وہ سخت دہشت زدہ ہو گیا تھا۔ اُس کا باپ بھی اب میری بات نہیں ٹال سکتا۔"

"اچھا تو پھر تم اپنی ذمّے داری پر میری ملاقات کا بندوبست کر دو لیکن پہلے اُس سے پوچھ تو لو کہ وہ کیوں ملنا چاہتا ہے؟" مَیں نے کہا۔ "میری بات کرا دو دلاور سے۔"

محمد خان نے کچھ سوچا اور پھر اقرار میں سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے۔ تم پہلے فون پر بات کر لو۔"

"تمھیں یقین ہے نا کہ فون کال کے ذریعے کوئی ہمارا سراغ نہیں لگا سکتا؟" مَیں نے کہا۔

"تم کسی پر بھروسا کرنے کے عادی معلوم نہیں ہوتے۔" وہ کچھ برا مان کے بولا۔

مَیں نے کہا۔ "تمھارے اور ہمارے پیشے میں احتیاط کی بہت اہمیت ہے۔ میرے کہنے پر کوئی قدم اٹھانے سے پہلے تم بھی دس بار سوچو گے اور تاریک پہلو پر نظر رکھنا اچھی بات ہے۔ مارے وہ جاتے ہیں جو صرف روشن پہلو کو دیکھتے ہیں۔"

اُس نے میری بات کا جواب نہیں دیا اور مجھے دوسرے کمرے میں لے گیا۔ اُس کمرے کی دیواریں سپاٹ تھیں۔ چھت سے فرش تک کسی بھی دیوار پر نہ پردے تھے اور نہ آرائش کے لیے کوئی تصویر لگائی گئی تھی۔ کمرے کے وسط میں ایک میز لگی ہوئی تھی جس پر ٹیبل کور تک نہیں تھا۔ اس میز پر ایک ٹیلی فون سیٹ رکھا ہوا تھا اور ایک سیاہ رنگ کا چوکور ڈبّا جو شاید ایک فٹ لمبا اس سے آدھا چوڑا اور اونچا تھا۔ اس ڈبّے سے نکلنے والے ایک تار کو دیوار پر نصب بورڈ میں پلگ کر دیا گیا تھا ایک اور پتلا سا تار کھڑکی سے گزر کر کہیں باہر جا رہا تھا۔ اچانک لائٹ جلی گئی اور کمرا تاریکی میں ڈوب گیا۔ محمد خان نے جھک کر ٹیبل کے نیچے کی سطح پر ہاتھ پھیرا اور کچھ مطمئن ہو کے سر ہلایا۔ پھر اُس نے باہر کھلنے والی کھڑکی سے جھانک کر دوبارہ سر ہلایا۔

مَیں نے کہا۔ "خان صاحب! اِس کا کیا مطلب ہے؟"

"تمھارے اور ہمارے پیشے میں احتیاط کی بہت اہمیت ہے۔" اُس نے میری بات دُہراتے ہوئے کہا۔

"اس کمرے میں سامان کیوں نہیں ہے۔ کیا یہ بھی احتیاط میں شامل ہے؟"

"ہاں۔ ایک بار ایک غدار شامل ہو گیا تھا ہم میں۔ اُس نے ایک خفیہ مائیکرو فون لگا دیا۔ ٹیلی فون ایکس چینج میں الگ ہر بات ریکارڈ ہوتی رہی۔ اسی خفیہ مائیکرو فون کے ذریعے اسی گھر میں ایک ٹیپ ریکارڈر پر الگ ریکارڈ ہو گئی۔ پہلے دو بار ایسا ہوا تھا کہ پولیس نے شک کی بنیاد پر ٹیلی فون نمبروں کو آبزرویشن پر رکھا لیکن جب چھاپا مارا گیا تو وہاں ٹیلی فون کے سوا کچھ نہ ملا۔ جس کے نام پر ٹیلی فون تھا اُسے کوئی کیسے پکڑتا۔ ایک شہر سے باہر تھا اور دوسرا ملک سے۔ جو شہر سے باہر تھا وہ لکھنؤ کے ایک اسپتال میں پڑا ہوا تھا اور بالآخر وہیں مر گیا۔ جو ملک سے باہر تھا وہ حج پر گیا ہوا تھا لیکن جب خفیہ مائیکرو فون نصب ہوا تو معاملہ گڑبڑ ہو گیا۔ چھاپا مار کے پولیس نے وہ ٹیپ ریکارڈر بھی قبضے میں لے لیا جس میں کیسٹ لگا ہوا تھا اور وہ سب گفتگو بھری ہوئی تھی۔ ٹیلی فون ایکس چینج والا ٹیپ بھی ان کے پاس تھا لیکن اس میں میری آواز خاصی مختلف تھی۔ تاہم دونوں کے الفاظ بالکل ایک تھے اور یہ ٹیپ میرے خلاف ایک مضبوط، ناقابلِ تردید اور واضح شہادت فراہم کرتے تھے۔"

"ٹیپ کی ہوئی گفتگو کو عدالت بطور ثبوت تسلیم نہیں کرتی۔" مَیں نے کہا۔

"اسی لیے انھوں نے دُہرا انتظام کیا تھا۔ ایک ٹیپ انھوں نے ٹیلی فون ایکس چینج سے حاصل کیا۔ دوسرا اُس جگہ ملا جہاں اُس زمانے میں میرا ٹھکانا تھا۔ دونوں کے ایک ہونے سے بہت کچھ ثابت کیا جا سکتا تھا۔"

مَیں نے کہا۔ "پھر کیا تمھیں سزا ہو گئی تھی؟"

خان ہنسا۔ "سزا اُس وقت ہوتی جب معاملہ عدالت تک جاتا۔ پہلے مَیں نے چھاپا مارنے والوں سے ٹیپ خرید لیا پھر ایکس چینج والوں سے۔ آٹھ دس لاکھ سے زیادہ خرچ کرنے پڑے مجھے لیکن ظاہر ہے آزادی کی قیمت اس سے کہیں زیادہ تھی۔ تین لاکھ تو مجسٹریٹ نے لیے جو چھاپا مار پارٹی کے ساتھ آیا تھا۔ ایک لاکھ انسپکٹر نے اور پچاس پچاس ہزار ہر پولیس مین نے لیے۔ اسی تناسب سے ٹیلی فون ایکس چینج والوں نے بھی مانگا اور مَیں نے دیا۔"

"تمھیں اُس غدار کا پتا چلا جس نے یہ حرکت کی تھی؟"

"پھر وہ کیسے چھُپا رہ سکتا تھا۔" محمد خان کے چہرے پر ایک سفاک مُسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "اُس کی لاش مَیں نے بہت اچھی طرح پیک کرا کے گورنر کو بھجوا دی تھی۔ یہ تحفہ سنگاپور سے بھیجا گیا تھا اور گورنر کی بیوی کے لیے تھا۔ باہر سے یہ نظر آتا تھا کہ اندر بہت بڑا رنگین ٹی وی ہو گا۔ لاش کے ساتھ ایک سطر کا پیغام تھا کہ کیا تم اپنے شوہر کا پارسل اسی طرح وصول کرنا پسند کرو گی؟"

"یہ گورنر کی بیوی کا انتخاب کیوں کیا تھا تم نے؟"

"اُس نے اپنے شوہر کے اثر و رسوخ کو استعمال کرتے ہوئے بھائی کی جے پور سے بمبئی پوسٹنگ کرائی تھی۔ وہ پولیس کمشنر تھا اور بڑا جوشیلا افسر تھا۔ اُس نے سوچا کہ بہنوئی گورنر ہے تو ڈر کیسا۔ اُس نے شہر کے چھوٹے بڑے بدمعاشوں کو پکڑنا شروع کیا۔ مقصد کچھ نہیں تھا، سوائے اپنا بھتّہ بڑھوانے کے۔ بھتّہ ہر پولیس کمشنر کو ملتا ہے۔ اُس نے کہا کہ میں کوئی عام پولیس کمشنر نہیں ہوں، مَیں گورنر کا سالا ہوں۔ چنانچہ اُسے خاص بھتّہ ملنے لگا۔ خاص شرح پر۔ بڑے بڑے سُورما دب گئے اُس سے، اور بدقسمتی سے اُسی زمانے میں مجھ سے ایک غلطی ہو گئی۔ مَیں نے ایک نئے آدمی کو گروہ میں شامل کر لیا۔"

"تم چھان بین اور اپنا اطمینان کیے بغیر بھرتی کر لیتے ہو؟"

"نہیں، مَیں نے اُسے چھ مہینے ساتھ رکھا۔ ہر وقت اُس پر نگاہ رکھی۔ وہ ہر جگہ ہمارے ساتھ گیا اور کبھی پیچھے نہیں رہا۔"

مَیں نے کہا۔ "اُسے لایا کون تھا؟"

"کوئی نہیں لایا تھا اُسے۔ ایک رات وہ میری جیپ سے ٹکرا کے زخمی ہو گیا۔ میں اُسے اپنے ساتھ لایا۔ یہی غلطی ہوئی مجھ سے کہ مَیں نے اُسے سرکاری اسپتال کے دروازے پر نہیں چھوڑا۔ جب وہ ہوش میں آیا اور اُس کی حالت کچھ بہتر ہوئی تو مَیں نے اُس سے پوچھا کہ وہ کون ہے؟ کہاں رہتا ہے اور اُس کے گھر اطلاع دینی

ہو تو کسے دی جائے۔ اُس نے رونا اور چلّانا شروع کیا اور ڈاکو محمد خان کو گالیاں دینے لگا جس نے اُس کو یتیم اور لاوارث کر دیا تھا۔ باپ اُس کی گولی سے مارا گیا تھا اور ماں نے بعد میں پاگل ہو کے خودکشی کر لی تھی۔ وہ اُسی گھر میں آگ لگا کے جل مری تھی جس میں وہ سب رہتے تھے۔ قانونی طور پر شوہر کی چِتا کے ساتھ جل کر مرنا اُس کے لیے ناممکن تھا۔ مَیں اُس کی بات سن کے حیران رہ گیا کیونکہ مَیں نے ایسی کوئی واردات نہیں کی تھی۔ کسی اور نے ڈاکا ڈالتے وقت میرا نام استعمال کیا تھا۔ جو کچھ اُس نوجوان نے بتایا تھا، لفظ بہ لفظ درُست تھا۔ مَیں نے تصدیق کرا لی تھی۔ مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ وہ ڈاکو جاتے وقت چلّا چلّا کے اعلان کر رہا تھا کہ 'خبردار جو کسی نے خونی خان کا نام لیا۔ . . . مَیں خونی خان ہوں، خون پی جاؤں گا اُس کے سارے خاندان کا، جس نے گواہی دی۔' لوگ بند دروازوں کے پیچھے دم سادھے سنتے رہے۔"

"وہ خونی خان نہیں تھا تو پھر کون تھا؟ اور اُس نے تمھارا ہی نام کیوں لیا؟"

"مَیں بتاتا ہوں وہ جنوبی ہندوستان کا ایک ڈاکو تھا جو مدراس کے علاقے سے ممبئی آ گیا تھا۔ اُسی نے مجھے خونی خان مشہور کیا۔ ورنہ مجھے کوئی جانتا تک نہیں تھا۔ اُس نے جہاں واردات کی یہی اعلان کیا۔ اس کے علاوہ اُس نے ہر جگہ بے گناہ لوگوں کو بھی مار دیا اور ایک جگہ تو اُس نے سب کے سامنے لاش کا تازہ بہتا ہوا خون پیا۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ "کیا وہ آدم خور تھا؟ انسانی خون پی لیا اُس نے؟"

محمد خان نے نفی میں سر ہلایا۔ "اُس نے صرف ڈراما کیا تھا۔ خوف زدہ تھرتھر کانپتے ہوئے لوگوں میں کون غور سے دیکھ سکتا تھا کہ اُس نے واقعی خون پیا ہے یا صرف ہونٹوں کو خون سے لال کر لیا ہے۔ سب سے پہلے یہ ڈراما ایک پارسی کے گھر میں ہوا۔ پارسی کا خاصا بڑا خاندان تھا۔ چار جوان بیٹے تھے۔ اُن میں کوئی پولیس افسر بھی تھا لیکن وہ ڈیوٹی پر تھا۔ باقی گھر والوں میں سے بڈھے نے مزاحمت کی تھی اور بندوق تان لی تھی چنانچہ وہ مارا گیا۔ اُس ڈاکو نے زمین پر پڑی ہوئی لاش کے زخم سے خون ایسے پیا جیسے درندہ دریا سے پانی پیتا ہے لیکن مَیں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اُس نے نیچے جھک کر مُنہ سے ایسی آوازیں نکالیں جن سے یقین آ جائے کہ وہ واقعی خُون چوس رہا ہے اور پھر اپنے خون میں لتھڑے ہوئے ہونٹ سب کو دکھا کے شک کی گنجائش ہی نہ چھوڑی۔ پارسی کی بیوی تو وہیں صدمے یا ہارٹ اٹیک سے مر گئی۔ اُس کی ایک لڑکی پاگل ہو گئی تھی۔ ہر وقت چلّاتی رہتی تھی، کسی کو قریب نہ آنے دیتی تھی۔ کہتی تھی کہ 'تم خونی خان ہو، میرا خون پی جاؤ گے۔'

اُس کے گھر والوں نے جو پاگل نہیں ہوئے تھے یہی بیان دیا کہ ڈاکو محمد خان کوئی انسان نہیں بلکہ ایک خونی درندہ ہے جو تازہ انسانی خون پیتا ہے۔ یہ بات اخباروں میں آئی اور ایسی پھیلی کہ خونی خان کا نام لے کر عورتیں اپنے بچّوں کو ڈرانے لگیں۔"

"مگر وہ تھا کون؟" مَیں نے محسوس کیا کہ میرے بدن پر خوف اور دہشت کی سنسنی خیزی سے ٹھنڈا پسینہ بہنے لگا ہے۔ میں نے افریقہ کے جنگلی آدم خور قبائل کے بارے میں سُنا ضرور تھا مگر یہ کبھی نہیں سنا تھا کہ مہذب دنیا کے کسی حصے میں کوئی انسان ایسا بھی ہو سکتا ہے جو اپنے ہم جنس کا خون پی سکے۔ محمد خان بتا چکا تھا کہ یہ بات بے بنیاد تھی مگر مَیں تصوّر میں ایک ڈاکو کے انسانی خون سے لتھڑے ہوئے لب دیکھ کر بھی لرزاں تھا۔

"مجھے آج تک نہیں معلوم ہو سکا کہ وہ کون تھا اور اُس نے مجھے ہی درندہ اور شیطان کیوں ثابت کیا۔"

"کیا تمھارے دشمن نہیں ہیں؟" میں نے طنز سے کہا۔

"دشمن بہت ہیں، مگر مجھے معلوم ہے کہ وہ کون ہیں۔ مَیں یہ سمجھتا ہوں کہ دشمنی میں آدمی قتل کر سکتا ہے۔ لاش کو بے عزت کر سکتا ہے۔ بیوی بچّوں سے انتقام لے سکتا ہے مگر یہ خون پینے والی بات مجھ سے منسوب کر کے کسی کو کیا ملا؟"

"محمد خان کسی اور کا نام بھی تو ہو سکتا ہے؟"

"یہ بھی معلوم کیا تھا میں نے لیکن اُس ڈاکو کا تو مشن ہی یہ معلوم ہوتا تھا کہ صرف مجھے خونی خان مشہور کرے۔ اُس نے تین وارداتوں میں تازہ انسانی خون پینے کا ڈراما کیا۔ خون پی کے ڈکار بھی لی اور کہا کہ مزہ آ گیا۔ مجبور اور محصور دیکھنے والوں نے اخبارات اور پولیس کے سامنے یہ سب بتایا۔ اُس حرامزادے نے صرف اپنی دہشت قائم کی اِس علاقے میں، میرے نام سے فائدہ اٹھا کے۔"

"کیا اُس کی صورت تم سے ملتی تھی؟"

"یہ کسی کو نہیں معلوم۔ دو آنکھیں، دو کان، ایک ناک تو تمھارے چہرے پر بھی ہیں۔ لوگوں کے ذہنوں میں صرف محمد خان کا نام رہ گیا۔ باقی تفصیل خود اُن کے ذہن نے فراہم کر دی اور میرا حُلیہ لکھوا دیا۔ آخری حرکت اُس ڈاکو نے کی یا کسی اور نے، یہ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ اُسے جائے واردات پر اُتاری ہوئی ایک تصویر قرار دیا گیا۔ بیک وقت اخبارات کو اور پولیس کو میری ایک تصویر موصول ہوئی۔ یہ رنگین تصویر تھی جس میں میرے ہونٹوں پر خون لگا ہوا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ لال رنگ ہے اور ایک تصویر سے دوسری تصویر بنائی گئی ہے۔ مزید یہ کہ چہرہ ضرور میرا تھا لیکن باقی جسم میرا نہیں تھا۔ تصویر میں میرے ہاتھوں میں ایک کٹا ہوا سر دکھایا گیا تھا۔ مَیں نے سر کو بالوں سے پکڑ رکھا تھا اور گردن سے ٹپکنے والا خون فرش پر گر رہا تھا۔ میرے ہاتھوں پر بھی یہی خون تھا اور ہونٹوں پر بھی۔ تصویر کیمرا ٹرک کا شاہکار تھی۔ پولیس نے تو اس کو جعلی قرار دے کر نظر انداز کر دیا۔ مگر بھلا ہو سنسنی پھیلا کے اخبار بیچنے والوں کا۔ یہ بھیانک تصویر کچھ اخبارات نے ہُو بہو چھاپ دی۔ سوچو تم اس کا کیا اثر ہوا ہو گا۔ خود میں نے وہ تصویر دیکھی تو میرے دماغ پر اور اعصاب پر اس کا اثر کئی دن رہا۔ رنگین تصویر میں خون زیادہ دہشت ناک نظر آتا تھا۔ سُنا ہے اُس تصویر کو دیکھ کے عورتیں بے ہوش گئیں اور کئی بچے نفسیاتی مریض ہو گئے۔ پھر حکومت نے اس کی اشاعت پر پابندی لگا دی۔ اُس وقت تک وہ ڈاکو غائب ہو چکا تھا اور مَیں خونی خان کا لقب پا چکا تھا۔"

میں نے کہا۔ "تم نے کوئی کوشش نہیں کی تردید کی؟"

محمد خان ہنس پڑا۔ "ایک ڈاکو کے تردیدی بیان کو شائع کون کرتا، اور قبول کون کرتا۔ پبلک کے سامنے میں جا نہیں سکتا تھا۔ فرداً فرداً میں نے بہت سے اعلیٰ پولیس افسروں کو فون کر کے اپنی پوزیشن کی وضاحت کی مگر وہ پہلے ہی سے جانتے تھے کہ میں صرف محمد خان ہوں۔ خونی خان کون ہے، اس کی انھیں بھی تلاش تھی۔ اُن پر مرکزی حکومت کا دباؤ الگ تھا، پریس اور پبلک کا الگ۔ سب چلّا رہے تھے کہ آدمی کا خون پینے والے اس راکھشس کو گرفتار کرو۔ وہ شخص اگر ممبئی میں رہتا تو کبھی نہ کبھی ضرور پکڑا جاتا۔ مجھ سے ڈاکو بھی ہمدردی رکھتے تھے۔ میری ڈاکو برادری سخت مشتعل تھی اور ذاتی دشمنی کو بھلا کے وہ بھی اُس ڈاکو کو تلاش کر رہے تھے جس نے مجھے درندے سے زیادہ قابلِ نفرت بنا دیا تھا۔ پولیس کے مشورے پر اُن دنوں میں بالکل روپوش رہا۔ ڈر یہ تھا کہ کسی نے پہچان لیا تو گرفتاری سے پہلے ہی لوگ میری تکّا بوٹی کر دیں گے۔ وہ سؤر کا بچّہ جس طرح اچانک نمودار ہوا تھا ایسے ہی اچانک غائب ہو گیا۔ اُس نے آٹھ دس وارداتیں کی ہوں گی جس میں بیس پچیس آدمی ہلاک ہوئے تھے اور تین بار اُس نے ناقابلِ اعتبار کمزور دل قسم کے چشم دید گواہوں کے سامنے خون پینے کا عملی مظاہرہ کیا تھا۔ آخری چیز وہ تصویر تھی جس کے بعد اکثریت کے لیے محمد خان کا نام خونی خان ہو گیا تھا۔ خیر یہ تو کئی سال پہلے کی بات ہے۔ مَیں تمھیں بتا رہا تھا اُس غدار کے بارے میں۔ اُس کا خاندان واقعی خونی خان کی بربریت کا شکار ہوا تھا۔ کمال کی بات یہ تھی کہ وہ محمد خان کو یعنی مجھے پہچانتا نہیں تھا مگر اس سے انتقام لینے کے چکر میں پاگل ہو رہا تھا۔"

"یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ کیا اُس نے تمھاری تصویر تک نہیں دیکھی تھی؟ تمھاری تصویر تو ہر جگہ ہو گی . . . خصوصاً وہ تصویر . . ."

"بس اُس وقت میرے ذہن میں یہ بات نہیں آئی۔ وہ یقیناً مجھے پہچانتا تھا لیکن اپنی اداکاری سے اُس نے مجھے قائل کر لیا کہ وہ کچھ نہیں جانتا۔ کچھ عرصہ پہلے مرکزی حکومت کی طرف سے اعلان ہوا تھا کہ مجھے زندہ یا مُردہ پیش کرنے والے کو دس لاکھ روپے نقد انعام کے ساتھ جاگیر بھی دی جائے گی۔ وہ ذہین اور جرأت مند آدمی تھا اور اتفاق سے گورنر ہاؤس میں ملازم تھا۔ اُس نے گورنر کی بیوی سے بات کی۔ اُسے بتایا کہ وہ کون ہے۔ عورتیں زیادہ جذباتی ہوتی ہیں۔ اُس نے شوہر سے بات کی اور پھر اپنے بھائی سے۔ بھائی نے اُسے ایک اسکیم سمجھائی کہ ایک محمد خان ہے تو سہی مگر وہ تو عام ڈاکو بھی نہیں ہے۔ وہ انسانی خون پینے والا کوئی اور تھا مگر تم اپنی تسلی کرنا چاہو تو اُس کے گروہ میں شامل ہو کے دیکھ لو۔ چند وارداتوں کے بعد ہی تمھیں یقین آ جائے گا کہ محمد خان وہ خونی خان نہیں ہے جس نے تمھارے باپ کو مارا تھا۔ اُس نوجوان نے میری جیپ سے ٹکرا کے ڈراما شروع کیا اور مجھ سے وہی غلطی ہوئی جس کا مَیں نے پہلے ذکر کیا تھا۔ میں اُسے اپنے ساتھ لے آیا۔"

"اگر تم اُسے اپنے ساتھ نہ لاتے تو وہ کیا کرتا؟"

"معلوم نہیں کیا کرتا۔ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ وہ میرے گروہ میں شامل ہونے کی درخواست کرتا اور مَیں منظور کر لیتا۔" محمد خان بولا۔ "اُس نے وارداتوں میں میری مرضی سے حصّہ لیا۔ میں خود زبان سے کچھ کہے بغیر اُسے قائل کرنا چاہتا تھا کہ میں خونی خان نہیں ہوں۔ مَیں کسی انسان کا خون پینے کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا۔ جب وہ قائل ہو جاتا تو مَیں اُسے بتا دیتا کہ مجھے کسی نے بدنام کرنے کے لیے ایک ناٹک رچایا تھا اور وہ بھی صرف ظاہر کرتا تھا کہ خون پی رہا ہے۔ پیتا نہیں تھا لیکن اُس کی نوبت آنے سے پہلے ہی اُس کے دل میں دس لاکھ اور جاگیر کے لالچ نے گھر کر لیا۔ وہ انتقام کو بھول گیا یا شاید خود ہی سمجھ گیا کہ میں واقعی خونی خان نہیں ہوں۔ اُس نے چوری چھپے گورنر کی بیوی سے رابطہ قائم کیا کہ وہ مجھے گرفتار کرا سکتا ہے اور اُس کی بیوی نے پھر بھائی سے کہا ہو گا۔ بھائی انکار کیسے کرتا۔ اُس نے ٹالنے کے لیے مائیکروفون فراہم کر دیے۔"

"ٹالنے کے لیے کیوں؟ کیا پولیس کمشنر نہیں چاہتا تھا کہ تمھیں گرفتار کرے؟"

"سکندر صاحب! پولیس کو مجھ سے کوئی دشمنی نہیں تھی اور نہ مجھے پولیس سے۔ مَیں تو تریونی جیسے سیٹھوں سے خراج وصول کرتا تھا اور حصّہ پولیس کو بھی باقاعدگی سے پہنچاتا تھا۔ میں نے کبھی امن و امان کا مسئلہ پیدا نہیں کیا تھا اور بلاوجہ خون خرابا نہیں کیا۔ پانچ سات بڑی اسامیاں ہیں اپنے پاس۔ اُنھی سے بہت مل جاتا ہے۔ پولیس کمشنر کو کیا پڑی ہے کہ اپنی اور اپنے خاندان کی زندگی کے لیے خطرہ مول لے۔ اُس نے تو مجھے پہلے ہی خبردار کر دیا

تھا کہ میرے خلاف مخبری ہو رہی ہے اور ممکن ہے چھاپا بھی پڑ جائے لیکن میں نے اُس کی وارننگ کو زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ اُدھر گورنر نے یہ انتظام کیا تھا کہ چھاپا مار پارٹی دہلی سے آئے۔ اُسے مقامی پولیس پر بھروسا نہیں تھا۔ اسی لیے میرے اتنے پیسے خرچ ہوئے اور مجھے غدار کی لاش گورنر کی بیوی کو بھجوانی پڑی۔ اس کے بعد بھی کئی جعلی محمد خان ڈاکو پکڑے جا چکے ہیں۔ معلوم نہیں میری بدنامی سے کیوں فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں سب۔ میں چاہتا ہوں یہ نام پبلک بھول جائے مگر پھر اچانک کسی خبر میں میرا نام آ جاتا ہے حالانکہ واردات کسی اور کی ہوتی ہے تم اجنبی تھے ورنہ خونی خان کا نام سُن کر بے ہوش ہو جاتے خوف سے۔ میں نے اس نام کی دہشت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی۔"

"تم آخر پکڑے کیسے گئے تھے؟" میں نے کہا۔

"اُسی گورنر کی وجہ سے جس کی بیوی کو میں نے ایک لاش کا تحفہ بھیج دیا تھا۔" محمد خان بولا۔ "اس کی بیوی نیم پاگل ہو گئی تھی، اُس نے کھانا پینا، سونا چھوڑ دیا تھا۔ اُس کی زبان پر ایک ہی رٹ تھی: خونی خان کا سر لاؤ میرے سامنے۔ گورنر بھی بہت چراغ پا تھا۔ اُس نے پولیس کو نیچے سے اوپر تک ہلا کر رکھ دیا۔ وزارتِ داخلہ کا سیکرٹری اُس کا کزن تھا۔ اُس نے پولیس اور انتظامیہ کے سب اعلیٰ افسروں کو ٹرانسفر کرا دیا۔ اُن سے میرے اچھے مراسم تھے۔ وہ جانتے تھے کہ میں کس قسم کا آدمی ہوں۔ نئے لوگ مجھے جانتے نہیں تھے اور اُن پر بے پناہ دباؤ تھا۔ پولیس کا اصل مددگار مخبری کے نظام کا جال ہوتا ہے۔ اُن کی بیشتر کامیابیاں عقل و ذہانت کی مدد سے سراغ رسانی کا نہیں کسی مخبر کی اطلاع کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ بس کسی نے مخبری کر دی۔ میں تو نکل گیا چور دروازے سے لیکن اس بار پولیس نے یہ کمینگی کی کہ واپس جاتے ہوئے میری بیوی کو ساتھ لے گئے۔ اُن کا باپ بھی مجھے گرفتار نہیں کر سکتا تھا۔ گرفتاری خود میں نے دی اس شرط پر کہ میری بیوی کو چھوڑ دیا جائے۔"

"تم صرف بیوی کی بات کر رہے ہو۔ بچے نہیں ہیں؟"

وہ مسکرایا۔ "بچے اپنے وقت پر ہوں گے۔ میری شادی کو چند دن ہی ہوئے تھے کہ میں پکڑا گیا۔"

"بُرا نہ مانو تو ایک بات کہوں؟"

"ہم جیسے بُرے لوگ کسی کی بات کا بُرا نہیں مانتے۔ تم یہی پوچھو گے نا کہ وہ کون بدبخت تھی جس نے میری شریکِ حیات بننا قبول کیا؟"

میں نے کہا۔ "جوڑے تو قدرت آسمانوں پر بناتی ہے جن کو ملنا ہوتا ہے انھیں تقدیر کسی بہانے ملا دیتی ہے۔ صرف اس لیے تمھاری بیوی کو بدبخت نہیں کہہ سکتا کہ تم ڈاکو ہو، تمھارا پیشہ خراب ہے لیکن تم خود اچھے آدمی ہو۔"

وہ ہنسا۔ "یہ تو وہی فلمی بات ہو گئی کہ نماز میرا فرض ہے اور چوری میرا پیشہ۔ بھائی جب پیشہ ہی بُرا ہو تو آدمی اچھا کیسے ہوا؟"

میں نے کہا۔ "میں ایک حاجی صاحب کو جانتا ہوں۔ سفید ریش عمر رسیدہ۔ نام بھی عبداللہ۔ اُس کا پیشہ بہت ہی بُرا ہے لیکن اس کے ساتھ وہ خود بھی مجسمہ بُرائی ہے۔ میں تم کو اُس کے مقابلے میں فرشتہ قرار دوں گا۔"

"میری بیوی بھی، بس کمال کی چیز ہے۔ واقعی خدا نے اُسے میرے جیسے شخص کے لیے بنایا تھا۔ مگر تم کیا پوچھنا چاہتے تھے؟"

میں نے کہا۔ "ہاں، پوچھنا مجھے یہ تھا کہ تم جیسے شخص کو شادی کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ گھر تو زندگی کی گاڑی کا ایک اسٹیشن ہے بلکہ جنکشن ہے، جہاں سے مستقبل کا سفر ذمے داریوں اور سہاروں کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔"

"تم نے ٹھیک کہا۔ ایک ڈاکو کو گھر بسانے کا کوئی حق نہیں جب زندگی مسلسل فرار ہو تو ٹھہراؤ کی گنجائش نہیں نکلتی۔"

"تمھاری دل آزاری ہوئی۔ یہ میرا مقصد نہیں تھا۔ خود ہم نے ابھی تک گھر نہیں بنایا کیونکہ ہم سفر میں ہیں مگر اس اُمید کے ساتھ کہ ایک دن یہ سفر ضرور ختم ہو گا۔ کہاں؟ یہ ہم نہیں جانتے اس سفر کا اختتام ایک گھر کی صورت میں بھی ہو سکتا ہے اور موت کی صورت میں بھی لیکن تم گھر کیسے بساؤ گے۔ صرف کسی عورت کے ساتھ نکاح پڑھوانے سے تو گھر نہیں بنتا۔ کیا تم اس کی خاطر یہ پیشہ چھوڑ دو گے؟"

"میں نے ابھی سوچا نہیں۔" محمد خان بولا۔ "لیکن تم نے جو کچھ کہا وہ غلط نہیں ہے۔ اب میں پہلے کے مقابلے میں خود کو زیادہ مجبور اور کمزور محسوس کرتا ہوں۔ اکیلا تو میں کہیں بھی جا سکتا تھا اور مہینوں روپوش رہ سکتا تھا۔ اب مجھے اس کی فکر رہتی ہے، اور یہ بھی احساس رہتا ہے کہ کہیں پہلے کی طرح اس کے ذریعے مجھے واپس جیل جانے پر مجبور نہ کر دیا جائے۔ میں نے اُسے یہ سب کچھ بتا دیا تھا اپنی زندگی کے بارے میں اور خطرات کے بارے مگر وہ پھر بھی نہیں مانی۔"

"جو عورت اتنی محبت کرتی ہے تم سے، وہ تم سے تمھارا پیشہ نہیں چھڑا سکتی۔" میں نے کہا۔

اِس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا بجلی آ گئی۔

محمد خان نے کہا۔ "چلو تم بات کر لو تریوینی سے۔"

"اُس سے میں کیا بات کروں گا۔ ۔ ۔ مجھے دلاور سے بات کرنی ہے۔"

محمد خان نے وائرلیس ریسیور پر ایک نمبر ملاتے ہوئے کہا۔ "دلاور سے بھی تریوینی کی معرفت ہی بات ہو گی۔"

پھر اُس نے ایک بٹن دبا دیا۔ وائرلیس فون کا چھوٹا سا اسپیکر آن ہو گیا۔ اور میں دوسری طرف بجنے والی گھنٹی کی آواز صاف سننے لگا۔

"یس سر،" کسی عورت نے اپنی نرم، لوچدار آواز میں شائستگی اور مٹھاس بھر کے کہا۔ میں نے اُسے ایک اچھی سیکرٹری تسلیم کر لیا۔ اگر وہ تریوینی کی بیوی ہوتی تو اُس کے لہجے کا تکبّر خود بولتا۔

"مجھے تریوینی سے ملاؤ۔" محمد خان نے حکم دیتے ہوئے کہا۔

"آپ ہولڈ کریں، میں دیکھتی ہوں۔"

"مجھے معلوم ہے وہ کہیں نہیں گیا ہے۔ اُس سے کہو کہ خان تم سے فوراً بات کرنا چاہتا ہے۔"

ریسیور پر ہاتھ رکھ کر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "تم نے دیکھا ہے اس عورت کو؟"

"نہیں،" میں نے کہا۔ "کون ہے یہ؟ تریوینی کی سیکرٹری؟"

"کچھ بھی سمجھ لو،" محمد خان بولا۔ "مگر دو دھاری تلوار ہے یہ اور تریوینی کی ایک طاقت۔ جو کام دولت یا بدمعاشی کی طاقت سے نہ نکلتا ہو تو یہ تیسری طاقت کام آتی ہے۔"

"خان!" تریوینی کی آواز اسپیکر کی زبان سے نکلی۔

"ہاں، تمھارا نیا یار کہاں ہے؟" محمد خان نے کہا۔

تریوینی نے انجان بننے کی کوشش کی۔ "کون نیا یار؟"

"جس سے تم کوئی کاروباری معاہدہ کرنے کی سوچ رہے ہو۔ اگر تم نے ابھی تک معاہدہ نہیں کیا ہے تریوینی! تو اس ارادے سے باز آ جاؤ۔ تمھارے پاس کس چیز کی کمی ہے؟"

"مگر کاروبار کو پھیلانے اور نئے معاہدے کرنے میں کون سی غلط بات ہے؟" تریوینی نے کہا۔

"غلط بات نہ ہوتی تو میں تم کو منع کیوں کرتا۔ پہلے کبھی میں نے تمھیں منع کیا ہے کسی کام سے؟ تمھارے سب کاروبار میرے سامنے ہیں تریوینی،" محمد خان بولا۔

"تم کو میرے کاروباری معاملات میں دخل دینے کا کوئی اختیار نہیں،" تریوینی نے برہمی سے کہا۔

"میں چاہتا ہوں کہ تم اچھی طرح سوچ لو۔ میں تمھیں حکم نہیں دے سکتا، مشورہ دے سکتا ہوں۔ دلاور جو کچھ کر رہا ہے اُسے کاروبار مت سمجھو۔ وہ سیاست کر رہا ہے۔ دہشت گردی اور تخریب کاری کی سیاست۔ اس آگ سے اپنا دامن بچاؤ تریوینی! ورنہ اس کی لپیٹ میں تم بھی آ جاؤ گے۔"

"کیا تم دھمکی دے رہے ہو مجھے؟ ایسا لگتا ہے کہ تم پر اُن لوگوں کا جادو چل گیا ہے۔ تم انھی کی زبان بول رہے ہو۔"

"میرے منہ میں اپنی زبان ہے اور خونی خان پر کسی کا دباؤ نہیں چلتا۔" محمد خان برہم ہو کے بولا۔ "دلاور نے تمھیں تصویر کا ایک ہی رُخ دکھایا ہو گا کہ اس کا ساتھ دینے میں کتنا فائدہ ہے۔ یہ اُس نے نہیں بتایا ہو گا کہ تمھیں نقصان کیا ہو سکتا ہے اور اس طرح کس قسم کے لوگ تمھارے دشمن ہو جائیں گے۔ خیر تم فیصلہ کر ہی چکے ہو تو مجھے کیا، بس اتنا خیال رکھنا کہ میرے اور تمھارے درمیان براہِ راست دشمنی نہ ہو۔ ہم دونوں کو اِسی شہر میں رہنا ہے۔"

"اس وقت کیوں فون کیا تھا؟"

"دلاور سے بات کرنی تھی۔" محمد خان نے کہا۔

"تم بات کرو گے؟" تریوینی نے عیاری سے کہا۔

"نہیں۔ اُن سے میرے مہمان بات کریں گے۔" محمد خان نے اس عیاری کا جواب بہت ہوشیاری سے دیا۔ "یہ بات تم بھی ذہن میں رکھنا اور اپنے دوست کو بھی سمجھا دینا کہ ہم پٹھان لوگ اپنے مہمانوں کے معاملے میں سخت جذباتی ہوتے ہیں اور مہمانوں کی جان و مال کی حفاظت آج بھی اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ بیسویں صدی ہے اور یہ بمبئی شہر ہے۔ لیکن ہماری رگوں میں دوڑنے والا خون وہی ہے جو ہمارے آبا و اجداد کا تھا۔ نہ یہ خون سرد پڑا ہے اور نہ سفید ہوا ہے۔"

"چوہدری دلاور تو اس وقت نہیں ہے خان۔ ۔ ۔" تریوینی نے خان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"کہاں گیا ہے؟"

"مجھے بتا کے نہیں گیا اس لیے میں یہ بھی نہیں بتا سکتا کہ وہ کب واپس آئے گا،" تریوینی نے کہا۔ "تمھارے مہمان تو تمھارے ساتھ ہی ہیں نا۔ مجھے فون نمبر دے دو اپنا۔ ۔ ۔"

میں نے انگلی کے اشارے سے محمد خان کو انکار کرنے کے لیے کہا۔

"وہ لوگ یہاں نہیں ہیں۔" محمد خان نے میری بات سمجھتے ہوئے کہا۔ "کیا اُن کا پتا اور فون نمبر دے دوں؟"

"خان! ایک حد ہوتی ہے ہر بات کی۔ تم کب سے مجھے بلیک میل کر رہے ہو، میری مجبوری سے فائدہ اٹھا رہے ہو۔ میں کمزور نہیں ہوں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جنگ کی صورت میں دونوں کا بہت نقصان ہے۔ اسی لیے میں نے تمھارا مقابلہ کرنے سے ہمیشہ گریز کیا لیکن اب تم میرے حوصلے کو آزما رہے ہو۔ تم نے ایسے لوگوں کو اپنے مہمان کا درجہ دے دیا ہے جو میری بیٹی کے قاتل ہیں۔"

"جھوٹ مت بولو تریوینی۔ تمھاری بیٹی کو قتل کرنے والے تمھارے اپنے آدمی تھے۔"

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد تریوینی نے کہا۔ "یہ بھی سکندر نے ہی بتایا ہو گا تمھیں، اور کیا بتایا ہے؟"

"اور یہ تبلایا ہے کہ وہ تمھاری بیٹی کو بردہ فروشوں کے جنگل سے چھڑا لایا تھا۔ اُس نے احسان کیا تھا تم پر مگر تم احسان فراموش ہو۔ تم نے اُسے قتل کرانے کی کوشش کی . . ."

"خان!" تریوینی مشتعل ہو کر بولا۔ "میری بیٹی اُس کو بچانے کی کوشش میں ماری گئی تھی، میں اسی کو ذمے دار سمجھتا ہوں اپنی بیٹی کی موت کا۔ وہ یتیم پاگل، نفسیاتی مریض تھی۔ سکندر نے اُس کو پریم جال میں پھنسا لیا . . ."

"پریم جال؟" محمد خان طنز سے ہنسا۔ "اس بمبئی شہر میں یہ لفظ کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اور تمھاری بیٹی کے معاملے میں تو یہ لفظ بہت بدنام تھا۔ کون نہیں جانتا تھا کہ وہ ایک جنسی جنونی تھی، جس کے جسم کی آگ کبھی سرد نہیں پڑتی تھی۔ اُسے دن رات ہر جگہ ہر وقت نئے تجربات کرتے رہنے کی رسوا کُن بیماری تھی . . ."

"چھوڑو یہ بات کہ کملا کو کیا بیماری تھی۔ وہ جیسی بھی تھی میری بیٹی تھی،" تریوینی چیخ کر بولا۔ "اور تمھارے اس سکندرِ اعظم کی اولاد نے تو میرا اتنا نقصان کیا ہے کہ میں اُسے معاف نہیں کر سکتا۔ اس کی وجہ سے میرے کتنے آدمی مارے گئے۔ وہ سب پُرانے وفادار اور بہت کام کے لوگ تھے۔ تم میرے کسی دشمن کو پناہ دو گے تو یہ انتہا ہو گی خان! یہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ تمھارا مہمان ہے تو ہوا کرے۔ میں اُسے چھوڑوں گا نہیں۔"

"تم بھی اچھی طرح سمجھ لو تریوینی! کہ میرا نام خونی خان ہے۔ میرے کسی مہمان پر آنچ آئی تو میں بھی تم کو نہیں چھوڑوں گا۔ میں تمھارے اعلانِ جنگ کے جواب میں خیرسگالی کے جذبات کا مظاہرہ نہیں کر سکتا۔ یہ بمبئی شہر جہاں تمھاری بدمعاشی کا راج ہے۔ کہاں کہاں تمھارے جوئے خانے، شراب خانے اور قحبہ خانے ہیں — مندر ہیں اور پاٹھ شالا ہیں۔ ودھوا آشرم اور اناتھ آشرم ہیں۔ کون کون سی بلڈنگ تمھاری ہے اور تمھارے کالے دھندے کا پیسہ کہاں لگا ہوا ہے۔ یہ سب میں بھی جانتا ہوں۔ اسی شہر میں جہاں تمھارے نام کی دہشت سے بڑے بڑے موالی کانپتے ہیں، میں تم کو اور تمھارے حکم کے غلاموں کو کُتّے کی موت مار سکتا ہوں، ایسے کہ سارا زمانہ تماشا دیکھے۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں کیونکہ تمھارا جو کچھ ہے میرے سامنے ہے۔ تم نہ خود چھپ سکتے ہو نہ کچھ چھپا سکتے ہو، جب کہ میں کسی کے سامنے نہیں ہوں اور آؤں گا بھی نہیں۔"

یکلخت تریوینی کا لہجہ بدل گیا۔ "خان . . . کیا فائدہ آپس میں لڑنے کا۔"

"لڑنے کی دھمکی تم نے دی تھی۔"

"چلو میں وہ دھمکی واپس لیتا ہوں،" تریوینی ڈر گیا تھا۔ "ہم آپس میں معاہدہ کر لیتے ہیں۔ میں دلاور کا ساتھ چھوڑ دیتا ہوں۔ تم اُن کا ساتھ چھوڑ دو جو میرے دشمن ہیں۔"

"تریوینی! پہلی بات تو یہ کہ دلاور میرا دشمن نہیں ہے ورنہ میں کہتا کہ چلو ٹھیک ہے۔ تم میرے دشمن سے قطع تعلق کر لو تو میں تمھارے دشمن کی حمایت سے دستبردار ہو جاؤں گا لیکن یہ ذرا مختلف صورتِ حال ہے۔ دلاور تمھارا مہمان نہیں بزنس پارٹنر ہے۔ اس کے برعکس سکندر اور اُس کے ساتھی میرے مہمان ہیں، کاروباری شریک نہیں ہیں۔ دلاور نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا مگر مجھ پر سکندر کے احسان کا قرض بھی ہے اس لیے یہ بات بھول جاؤ کہ میں کسی لالچ یا خوف کے باعث اپنے مہمانوں سے کنارہ کشی اختیار کر لوں گا۔ تم دلاور کے مددگار رہو تو میں ان کے ساتھ ہوں۔ آئندہ کیا ہو گا، یہ دیکھا جائے گا۔"

جب خان نے ریسیور رکھا تو اس کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا اور وہ سخت طیش میں تھا۔ اُس نے تریوینی سے جو گفتگو کی تھی، مہذب لب و لہجے میں نہیں کی تھی۔ دونوں طرف سے حسبِ ضرورت گالیاں بھی فراخدلی سے دی گئی تھیں اور دھمکی دینے کا انداز بھی ایسا شریفانہ نہیں تھا۔ یہ اُن کے اصل الفاظ میں ہونے والی گفتگو کا متن تھا جو میں نے پیش کیا۔ ایک ڈاکو اور ایک بدمعاش کیسے بات کرتے ہیں یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

میں نے خان کے کندھے پر تھپکی دے کر کہا۔ "تم واقعی بہادر ہو اور مہمان نوازی میں ایک وضعدار پٹھان لیکن ہماری وجہ سے اپنے لیے مشکلات پیدا مت کرو۔ ہمارا تم پر کوئی احسان نہیں ہے۔"

خان نے تریوینی کو چند اور ناقابلِ اشاعت گالیاں دینے کے بعد کہا۔ "تم اسے جانتے نہیں یہ صرف گیدڑ بھبکیاں ہیں۔ لیکن میں اب یہ سوچنے پر مجبور ہوں کہ کہیں یہ تریوینی کی چال نہ ہو۔"

"کیسی چال؟"

"یہی . . . کہ دلاور تم سے ملنا چاہتا ہے۔ اس طرح وہ خود تمھارے خلاف کوئی شیطانی سازش کر رہا ہو۔"

"ہم نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں خان! وہ دلاور ہو یا تریوینی، اس کے نام یا چہرے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہم ایسے لوگوں سے نمٹنا جانتے ہیں۔ وہ دشمن تو بہت آسانی سے شکست کھا جاتا ہے جو اپنے عزائم کا پہلے سے ڈھول پیٹنے لگے۔ دلاور جیسا شاطر دشمن زیادہ خطرناک ہوتا ہے جو اپنی ظاہر کی چال کچھ اور رکھتا ہے لیکن اُس کے ذہن میں بالکل مختلف حکمتِ عملی ہوتی ہے۔ بُرا نہ مانو تو میں تمھیں بھی ایک مشورہ دوں، بالکل مفت۔"

خان نے سر ہلایا۔ "نہ مانوں تو تم بھی بُرا مت ماننا۔"

میں نے کہا۔ "تریوینی جیسے دشمن کو طاقت سے نہیں سیاست سے زیر کرنا چاہیے۔ اس سے کیا فائدہ کہ فون پر تم اُسے گالیاں دو اور وہ تمھیں دے۔ تم دھمکی دے کر اپنی طاقت سے اُسے ڈرانے کی کوشش کرو اور وہ تمھیں ڈرائے۔ نہیں جو کرنا ہے سوچ سمجھ کے، عقل سے کام لے کر خاموشی سے کرو، کیونکہ عقل ہمیشہ بھینس سے بڑی تھی، ہے اور رہے گی۔ آدمی کی اصل طاقت اُس کی عقل ہے۔ تمھیں اپنے جذبات پر اتنا کنٹرول ہونا چاہیے کہ دشمن تمھارے سامنے آئے تو دھوکا کھا جائے۔ تمھارے لبوں پر مسکراہٹ ہو اور تم اُسے گولی مار دو۔"

خان نے نفی میں سر ہلایا۔ "معاف کرنا دوست! میرے نزدیک یہ منافقت ہے۔"

"یہ جنگی حکمتِ عملی ہے کہ جیسا دشمن ہو، اُس کے ساتھ ویسا ہی طرزِ عمل رکھو۔ کیا تریوینی کوئی بااصول اور شریف دشمن ہے؟" میں نے کہا۔

"وہ تو ہندو ہے سکندر! سدا کا مکار اور دھوکے باز، لیکن میں پٹھان ہوں۔ ہم پٹھان دشمن کو بھی للکار کے مارتے ہیں، دھوکے سے اس کی پیٹھ پر وار نہیں کر سکتے۔ دوست بن کے دغا دینا ہماری فطرت کے خلاف ہے۔"

میں حیرت سے اُس کی صورت دیکھتا رہا جو پیشے کے اعتبار سے ڈاکو تھا لیکن اُس نے اپنی فطرت کو حالات کے تقاضوں کا سانچہ نہیں بننے دیا تھا۔ میرے نزدیک یہ بے وقوفی تھی، اُس کے نزدیک وضعداری۔ اسے سمجھانے کی کوشش کرنا بے کار تھا، میں نے بحث نہیں کی۔

"اب دلاور سے رابطہ کیسے ہو گا؟" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔

"شام کو یا رات کے وقت پھر فون کر کے دیکھیں گے۔"

میں نے کہا۔ "میں ایک غیر ملکی کال کر سکتا ہوں؟"

"کیوں نہیں۔ جب ٹیلی فون ہے تو ساری دنیا میں بات کر سکتے ہو۔"

میں نے کہا۔ "اس کے لیے کال بُک کرانی پڑے گی؟"

"ہاں، اوورسیز کال کی بُکنگ ہو جاتی ہے،" خان نے کہا۔

"مگر کال بُک کرنے والے کو بھی اپنا نمبر دینا پڑتا ہے اور وہ بھی جہاں بات کرنی ہو۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

"تم کہاں اور کس سے بات کرنا چاہتے ہو آخر؟ اگر نام بتانا نہیں چاہتے تو مت بتاؤ لیکن نمبر تو دونوں ہی دینے پڑیں گے۔ ورنہ کال کیسے ملے گی؟" خان نے کہا۔

میرے ذہن میں ایک نام عبدالودود منظر ایڈووکیٹ کا تھا۔ جس سے رابطہ قائم کر کے میں لاہور کے بارے میں مفصّل معلومات حاصل کر سکتا تھا کہ وہاں معاملات کس نہج پر جا رہے ہیں اور سب کی خیریت دریافت کر سکتا تھا۔ سب میں شہلا اور اس کا بیٹا، مسز رضوی اور اُن کے بچے وغیرہ شامل تھے۔ اُس سے یہ بھی پوچھا جا سکتا تھا کہ کراچی سے اکرام شیخ نے رابطہ قائم کیا ہے یا نہیں۔ رابطہ اُس نے یقیناً قائم کیا ہو گا۔ ہم سب کے لیے منظر کے گھر کا فون نمبر ایک ٹیلی فون ایکس چینج تھا۔ مجھے مسز رضوی کے اسکول کا نمبر بھی یاد تھا لیکن انھیں فون کرنا اپنے لیے اور اُن کے لیے جذباتی مسائل پیدا کرنے کے مترادف ہوتا۔ شوہر کے انتقال کے بعد وہ بڑی محنت سے اسکول چلا کے عزّت و آبرو کے ساتھ بچّوں کی پرورش کر رہی تھیں اور یہی نہیں، وہ شہلا اور اُس کے بچّے کی محافظت کے فرائض بھی قبول کیے ہوئے تھیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ادائے فرض کی راہ میں اُن کے لیے ہمارے دشمنوں کی طرف سے کتنے خطرات درپیش ہوں گے۔ انھوں نے خود غرضی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا ورنہ وہ کہہ سکتی تھیں کہ اب میں اکیلی ہوں اور شہلا کی وجہ سے میری اور میرے بچّوں کی سلامتی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ اسے کہیں اور لے جاؤ۔ آخر منظر بھی تمھارا دوست ہے۔ اُس کے گھر میں رکھو یا کہیں اور۔ مگر روزِ اوّل سے اُن کے دل میں ہمارے لیے وہی جذبات تھے جو اپنے بچّوں کے لیے تھے۔ بُرے وقت میں اُن کے شوہر انکل رضوی نے جہاں تک ممکن ہو سکا تھا ہماری حفاظت کی تھی لیکن جب اُن کے انتقال کے بعد مسز رضوی پر بُرا وقت آیا تو ہم نے اُن کی کوئی مدد نہیں کی، اُلٹا ہم نے شہلا کو اُن کی ذمّے داری بنا دیا۔ شہلا کے لیے وہ گھر میکہ بن گیا تھا، جہاں وہ مجبوراً سینے پر صبر کی چٹان رکھے اپنے شوہر کی واپسی کا انتظار کر رہی تھی۔ اصل آزمائش اُس کے حوصلے کی تھی جو سب سے بچھڑ کے پیچھے رہ گئی تھی، جس کے ساتھ صرف اندیشے تھے، وسوسے تھے اور خواب تھے جن کی تعبیر پر اُس کا اختیار نہ تھا۔

"تم کس سوچ میں پڑ گئے؟" خان نے کہا۔

میں نے چونک کر کہا۔ "سوچ میرے پیچھے پڑ جاتی ہے خان صاحب! میں کیا کروں۔"

"تم فون کرنا چاہتے تھے کسی کو؟"

میں نے اُسے منظر کے گھر کا فون نمبر دیا۔ مجھ میں ہمت نہ تھی کہ میں مسز رضوی یا شہلا کے جذباتی ردِّعمل کا مقابلہ کر سکوں چنانچہ میں نے منظر سے ہی اُن کی خیریت دریافت کر لینا بہتر سمجھا۔

"ایسے کب تک کھڑے رہو گے؟" خان نے ٹیبل پر پاؤں لٹکا کے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اوورسیز کال ملنے میں کچھ وقت لگے گا۔"

میں نے کہا۔ "میں ذرا اُن سب کو دیکھ آؤں۔ بہت دیر سے غائب ہوں میں۔"

میں اس کمرے سے نکلا تو بھول گیا کہ مجھے کس کمرے میں جانا تھا۔ سب کمرے ایک سے تھے اور کسی دروازے پر پہچان کے لیے بھی کوئی نشانی نہ تھی۔ اس عمارت میں جاننے والے یقیناً جانتے ہوں گے کہ دائیں ہاتھ پر تیسرا دروازہ کس کمرے کا ہے اور چوتھا کس کا مگر میں نو وارد تھا۔ اپنے اندازے کے مطابق میں نے

ایک دروازے کا ہینڈل گھمایا اور اندر داخل ہوگیا ۔ لیکن یہ وہ کمرا نہیں تھا جس میں غالب اور محسن کو رکھا گیا تھا۔ یہ ایک اسلحہ خانہ تھا جس میں ہر قسم کا جدید اور خطرناک ترین اسلحہ یوں ڈھیر ہوا پڑا تھا کہ کمرا کباڑی کی دکان لگتا تھا۔ کونوں میں آٹومیٹک رائفلوں کے ساتھ مشین گنوں کو دیوار کے سہارے کھڑا کر دیا گیا تھا۔ انھی دیواروں پر کیلوں کے ساتھ ریوالور اور میگزین لٹکے ہوئے تھے۔ نیچے فرش پر دستی بم اور بدیسی ساخت کے کارتوس بکھرے ہوئے تھے۔

ایک عام آدمی اِن چیزوں کو دیکھ کر دہشت زدہ ہو جاتا اور وہاں سے بھاگ جاتا لیکن ایک مدّت سے اپنا تو کاروبارِ شوق بھی یہی اسلحہ تھا۔ میں نے دروازہ بند کر کے لائٹ جلائی اور اسلحہ خانے کا غور سے معائنہ کیا۔ پہلے جو میرا شک تھا وہ یقین میں بدل گیا۔ میں نے مشین گنوں اور دستی بموں پر وہ مارکنگ دیکھ لی جو بڑی محنت سے کُھرچنے کے باوجود نظر آتی تھی، سو آٹومیٹک رائفل اور ریوالور پر سے اُن نشانات کو رگڑ رگڑ کر مٹایا گیا تھا لیکن میں نے کسی دشواری کے بغیر مخصوص شناخت رکھنے والے تمام اسلحے کو پہچان لیا۔ یہ وہی غیر ملکی اسلحہ تھا جو چوہدری دلاور اینڈ کمپنی جیسے غدار اور ضمیر فروش باہر کے آقاؤں سے لے کر بھارت کے راستے مشرقی پاکستان پہنچا رہے تھے اور اس خدمت کے معاوضے سے اپنی تجوریاں بھر رہے تھے۔

وہاں زیادہ دیر رُکنا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ معلوم نہیں وہ دروازہ کسی لیے کیوں کُھلا چھوڑ دیا تھا۔ ڈاکوؤں کے اڈے پر اسلحے کی موجودگی کوئی غیر متوقع بات نہیں سمجھی جا سکتی لیکن اسلحہ یوں کھلا بھی نہیں چھوڑا جاتا کہ جس کا جی چاہے لے جائے اور چھاپا پڑ جانے کے امکان کو بہر حال نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ حیرانی مجھے اس بات پر زیادہ تھی کہ یہ اسلحہ جو مخصوص سازشی مقاصد کے تحت مشرقی پاکستان کے تخریب کاروں کو اور علیحدگی پسندوں کو فراہم کیا جاتا تھا وہ اِن ڈاکوؤں کے ہاتھ کیسے لگا؟ میرے ذہن میں اس سوال کے دو ہی جواب آتے تھے یا تو ڈاکوؤں نے چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کے کسی ٹھکانے کو لُوٹا یا کسی درمیانی ایجنٹ کو لُوٹا جہاں یہ اسلحہ موجود تھا۔ دوسرا جواب زیادہ قرینِ قیاس لگتا تھا کہ مشرقی پاکستان جانے والے مال کا کچھ حصّہ خورد بُرد ہوا اور یہ مال بلیک میں مجرموں کے ہاتھ فروخت ہوا۔ بمبئی میں ہر چیز بلیک میں مل جاتی ہے۔ اسلحہ سب سے کم یاب چیز ہے۔ اُس کی قیمت بھی اسی حساب سے زیادہ ملتی ہوگی۔ میں نے مناسب وقت پر یہ سوال خود محمد خان سے پوچھنے کا فیصلہ کیا۔

غالب اور محسن کو آرام کے لیے خود ڈاکٹر نے سونے کی دوا دے دی تھی مگر اُسی کمرے میں ایک صوفے پر نازو اور دوسرے پر گل بھی سوئی پڑی تھیں۔ ڈاکٹر اس وقت موجود نہیں تھا۔ نرس کرسی پر اُونگھ رہی تھی۔ وہاں اُس کے کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا لیکن وہ ڈیوٹی پر موجود رہنے کی پابند تھی۔

میں نے اشارے سے رابعہ کو بلا لیا اور وہ دبے پاؤں باہر آگئی۔ "اتنی دیر سے کہاں غائب تھے؟" رابعہ نے کہا۔

"غائب ہوتے ہیں جن بھوت۔" میں نے کہا۔ "میں اس عمارت کے اندر اور غالباً تمھارے خیالوں میں بھی موجود تھا۔"

"غلط، میں شہلا کے بارے میں سوچ رہی تھی۔" رابعہ نے کہا۔

"کیا تم شہلا سے بات کرو گی؟" میں نے چلتے ہوئے کہا۔

"شہلا سے بات ہو سکتی ہے۔ . . کیسے؟" رابعہ نے جذباتی لہجے میں کہا۔

"ٹیلی فون کے ذریعے اور کیسے؟"

"ٹیلی فون ہے یہاں؟ . . . پھر تو میں ضرور بات کروں گی۔ میں اُسے کہوں گی کہ فوراً آجائے۔" رابعہ نے بڑے جوش کے ساتھ کہا۔

"ایسی بے وقوفی مت کرنا۔"

"بے وقوفی کی کیا بات ہے اس میں؟ اس کے آنے سے محسن کی حالت سنبھل جائے گی۔" رابعہ نے کہا۔

"لیکن خود شہلا کی حالت کیا ہوگی یہاں آکے؟ یہ مت بھُولو کہ اُس کا ایک بچّہ بھی ہے۔ وہ ہمارا ساتھ نہیں دے سکتی اور بچّے کو چھوڑ کر بھی نہیں آسکتی۔ وہ صبر و سکون کے ساتھ جدائی کے صدمے سہنے کی عادی ہوگئی ہے۔ اُسے ڈسٹرب کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"یہ بہت ظلم ہے اُس کے ساتھ۔"

"بعض اوقات ظلم کرنا بھی پڑتا ہے اور سہنا بھی پڑتا ہے۔ کیونکہ مصلحت کے تقاضے ایسے ہی ہوتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "مجھ میں تو ہمّت ہے نہیں اُس سے بات کرنے کی۔ وہ کہے گی کہ محسن کو بلاؤ۔"

"محسن کیسے بات کر سکتا ہے۔" رابعہ نے اُداسی سے کہا۔

"اسی لیے میں نے رسک نہیں لیا۔ اگر ہم شہلا سے کہتے کہ محسن کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور وہ سو رہا ہے، تو کیا وہ مانتی؟ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ عام حالات میں شہلا سے فون پر بات کرنے کا موقع ملے تو محسن سوتا رہے؟ وہ خدانخواستہ بسترِ مرگ پر بھی ہوگا تو شہلا کے نام پر کھڑا ہو جائے گا۔"

رابعہ نے تائید کے انداز میں سر ہلایا۔ "تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اگر اُس کی بات محسن سے نہ ہوئی تو وہ نہ جانے کیا سمجھے گی، بہت کچھ فرض کرے گی۔ جب آدمی اکیلا ہو اور سب سے دُور ہو تو اُس کے دل میں صرف بُرے خیال ہی آتے ہیں۔"

"محمد خان صاحب کوشش کر رہے ہیں کہ منظر کا نمبر مل جائے۔"

"منظر بتا دے گا سب کے بارے میں۔" رابعہ نے کہا۔ "اور خیریت کی اطلاع بھی دوسروں تک پہنچا دے گا۔"

میں نے کہا۔ "محسن کو معلوم ہی نہیں ہونا چاہیے کہ ہم نے فون پر کسی سے بات کی ہے۔"

"تم خان کو منع کر دینا۔ وہ اتنا بھی نہ بتائے کہ اس عمارت میں کوئی فون ہے جو استعمال ہو سکتا ہے ورنہ ممکن ہے محسن اصرار کرے کہ شہلا سے بات کروں گا ـــــ اس سے مسئلہ پیچیدہ ہو جائے گا ویسے تو گل کا مسئلہ بھی بہت پیچیدہ ہو گیا ہے۔" رابعہ نے کہا۔ "اُسے سچ بتانا بھی مشکل ہے۔ سچ نہ بتانے میں زیادہ خرابی کا امکان نظر آتا ہے۔"

"تمھارا کیا خیال ہے کہ ابھی تک اس کو شہلا کے بارے میں کچھ معلوم نہیں؟"

"ہم سب نے آج تک یہ بات چھپائی ہے . . ."

چھپانے سے کچھ نہیں ہوتا۔ ہر عورت کی ایک چھٹی حس ہوتی ہے جو اُسے مرد کے دل کا حال بتا سکتی ہے، اندر جھانک کر دیکھ لیتی ہے کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے یا سچ اور اس سے محبت کرتا ہے یا نہیں۔"

"تم اتنے یقین کے ساتھ دعوے کر رہے ہو جیسے یہ خصوصی زنانہ حس تم میں بھی پیدا ہو گئی ہے۔" رابعہ نے کہا۔ "یا پچھلے جنم میں تم عورت تھے۔"

میں نے کہا۔ "اچھا اپنے ایمان سے کہو، کیا یہ غلط ہے؟"

"رابعہ مسکرائی۔ "نہیں۔ . . غلط تو خیر نہیں ہے۔"

"بات یہ ہے۔" میں نے رازدارانہ انداز میں کہا۔ "میں ایک عورت کو بالکل اسی طرح جانتا ہوں جیسے میں اپنے آپ کو جانتا ہوں۔ میں اُسے کچھ بتاؤں یا نہ بتاؤں، اُسے معلوم ہو جاتا ہے۔ وہ میرے خیالات تک پڑھ لیتی ہے اور انتہا تو یہ ہے وکیل صاحب کہ اُس نے میرے خوابوں تک پر اجارہ داری قائم کر لی ہے۔ کہتی ہے صرف میرے خواب دیکھو ورنہ . . ."

"ورنہ کیا؟" رابعہ نے شوخی سے کہا۔

"ورنہ میرے خیال میں جاگتے رہو . . ." میں نے مظلوم لہجے میں کہا۔

"یہ تو واقعی بڑا ظلم ہے۔ تم احتجاج کیوں نہیں کرتے۔" رابعہ نے مصنوعی ہمدردی کا اظہار کیا۔

"اجی کون سنتا ہے فغانِ درویش۔"

"درویش صاحب! مجھے بتائیں وہ کون ہے، کہاں رہتی ہے؟ میں کہوں گی اُس سے کہ عقل سے کام لے۔"

میں نے کہا۔ "رہتی ہے وہ میرے دل میں اور اُسے دیکھنا ہے تو جھانک کر دیکھو میری آنکھوں میں، لیکن یہ جو آخری بات کی آپ نے تو اس سلسلے میں کہنا صرف یہ ہے کہ جو چیز اُس کے پاس ہے ہی نہیں، اُس سے وہ کام کیسے لے سکتی ہے۔"

رابعہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر میں دروازہ کھول کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ خان اپنے دونوں ہاتھ باندھے اُسی طرح میز پر بیٹھا ہوا تھا۔

"کیا ہوا؟ کامیابی نہیں ہوئی؟" میں نے کہا۔

"کال تو بک ہو گئی ہے۔ اب یہ آپریٹر صاحب کی مرضی ہے کہ وہ کتنا انتظار کراتی ہیں۔" خان نے کہا۔

"کمال ہے کہ تم جیسا شخص بھی بے بس ہے۔" میں نے کہا۔

"ہم کیا۔ ان جیسے بہت سے چھوٹے چھوٹے لوگ ہیں جن پر کسی وزیر کا زور نہیں چلتا۔ پبلک اُن کے رحم و کرم پر ہے۔" خان نے کہا۔

اس سے پہلے کہ میں نچلی سطح پر بدانتظامی کے خلاف اپنے تجربے کی بات کرتا فون کی گھنٹی چلّانے لگی۔ خان نے ریسیور اٹھا لیا۔

"لاہور کون بات کرے گا؟" کسی آپریٹر نے کہا۔

خان نے ریسیور مجھے تھما دیا۔ "میں بات کروں گا اور میرے گھر والے بات کریں گے۔ تم نمبر ملاؤ اور دیکھو، کال درمیان میں کاٹنی نہیں ہے اگر لائن کٹ جائے تو پھر ملا دینا۔"

معلوم نہیں آپریٹر نے میری ہدایات سُنی تھیں یا نہیں۔ کچھ دیر وہ لاہور کے آپریٹر کو ہیلو ہیلو، کرتی رہی۔ محمد خان خاموشی سے باہر چلا گیا۔ پھر اچانک منظر کی آواز آئی۔ "میں منظر ایڈووکیٹ بول رہا ہوں۔"

آپریٹر نے کہا۔ "بمبئی سے کال ہے بات کریں۔"

میں نے دھڑکتے دل کو سنبھال کے کہا۔ "منظر!" پھر میری آواز فرطِ جذبات سے گلے میں پھنس گئی۔

"کون؟" منظر چلّایا۔ "سکندر! . . . ابے تُو ہے بھوتنی کے . . . سکندر!"

میں نے کہا۔ "ہاں یار! اچھا ہوا تو گھر پر مل گیا۔"

"گھر کے بچّے۔" منظر نے مجھے مزید گالیوں سے نوازنے کے بعد کہا۔ "میں تو ہر روز گھر پر ہوتا ہوں، رات کو کبھی گھر سے باہر رہا ہوں؟ چودہ بچّے اِس کا ثبوت ہیں۔"

"کیا؟ ابھی تک صرف چودہ ہی ہیں؟" میں نے کہا۔

"میرا جی چاہتا ہے کہ اتنے جُوتے ماروں تیرے سر پر کہ تیرے چودہ طبق روشن ہو جائیں۔ تیرا سر بھنیس کے انڈے جیسا ہو جائے۔ کہاں مر گیا تھا تُو؟ ہر رات میں سوتے وقت تجھے گالیاں دیتا تھا پھر آنکھ کُھلتے ہی دیتا تھا۔ سالے سب شیطان ہو۔ کسی کو ایک فون کرنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ یہ مت کہنا کہ فرصت نہیں ملی اور موقع نہیں ملا۔ میرا بلڈ پریشر پہلے ہی بہت بڑھ چکا ہے میں فکر سے مر جاتا تو تمھارا کیا جاتا، سب بے مہار پھر رہے ہو۔ بیوی تو میری یتیم ہوتی . . . بچّے میرے بیوہ ہو جاتے۔"

میں نے کہا۔ "بس کر یار! بہت غصّے میں ہے تو مجھے معلوم ہو گیا۔ مگر تیرے مُنہ سے یہ گالیاں سُن کے بڑا اقرار ملا ہے دل کو

ہم سب واقعی قصوروار ہیں۔"

"ہم سب کون؟ مجھے کیا معلوم کہ کون کہاں ہے؟ کون سے زمین پر اور کون آسمان پر۔ ۔ ۔؟ پہلے یہ تو بتا دے کہ سب ٹھیک تو ہیں نا؟"

"سب ٹھیک ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور اکٹھے ہیں۔"

"اتنا عرصہ کیا کرتے رہے؟ کہاں رہے۔ ۔ ۔؟"

"یہ سب ٹیلی فون پر نہ بتایا جا سکتا ہے اور نہ بتانا چاہیے۔ بس یوں سمجھ لے کہ سفر جاری ہے۔ خدا کی مدد اور اپنے حوصلے کے سہارے پر ابھی تک سب زندہ و سلامت ہیں اور پُرامید ہیں۔" میں نے کہا۔

"خدا کا شکر ہے۔ یہاں اُلٹے سیدھے خیالات نے زندگی عذاب کر دی تھی۔ پاکستان کی بات اور تھی۔ کچھ بھی ہو جاتا تھا تو ہم سب مل کر سنبھال لیتے تھے۔ وہاں سے تمھاری کوئی خیر خبر تک نہیں ملی۔ یہ سوچ سوچ کر دماغ خراب ہونے لگتا تھا کہ معلوم نہیں تم سب کہاں ہو۔ کوئی پکڑا تو نہیں گیا، مارا تو نہیں گیا؟ تم سب بچھڑ تو نہیں گئے؟"

"ایسی کوئی بات نہیں۔ ہم سب نے بہت سختی جھیلی لیکن ہمت نہیں ہاری۔ تمھیں ہر روز رپورٹ دینے سے کچھ حاصل نہ ہوتا۔ تم ہمارے لیے فکر کرنے کے سوا کیا کر سکتے تھے۔ آج کا دن غنیمت تھا کہ ہم سب یکجا ہوئے اور اتنی فرصت ملی کہ تم سے بات کر لیں، خیال تو ہمیں بھی رہتا تھا تمھارا، مگر رابطے کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوتی تھی۔"

"باقی سب لوگ کہاں ہیں؟"

"مس رابعہ قاری سابق ایڈووکیٹ ہائی کورٹ تو میرے قریب ہی موجود ہیں اور تمام گفتگو سُن رہی ہیں۔" میں نے کہا۔

رابعہ نے کہا۔ "منظر بھائی آداب!"

"جیتی رہو خوش رہو۔" منظر نے کہا۔ "مگر بی بی! تم نے بہت مایوس کیا۔ اتنی پڑھی لکھی افلاطون قسم کی لڑکی اور ابھی تک تم نے اس جانور کو انسان نہیں بنایا۔ وکالت تو شاید تم بھول گئی ہو ورنہ اب تک اسے شرع کے مطابق عمر قید تو ہو ہی جاتی۔ بمبئی کی فلم نگری سے دُور رکھنا اسے۔ یہ آدمی بھروسے کے قابل نہیں ہے۔"

رابعہ ہنسی۔ "میں اکیلی نہیں ہوں، آپ فکر نہ کریں۔"

"غالب اور محسن کہاں ہیں؟ میں اُن سے بات کرنا چاہتا چاہتا ہوں۔"

رابعہ نے ریسیور مجھے دے دیا۔ "اس وقت تیری بات نہیں ہو سکتی، وہ سوئے ہوئے ہیں۔"

"سکندر! میرے ساتھ ایسا جھوٹ تو مت بول، بھوتنی کے۔ آخر میں وکیل ہوں، چودہ بچّوں کا باپ ہوں کوئی بچہ نہیں ہوں۔ اتنے عرصے بعد رابطہ ہوا ہے اور بات اس لیے نہیں ہو سکتی کہ وہ سو رہے ہیں۔ اتنے بے نیاز ہو گئے ہیں وہ، تعلق کی ضرورت سے کہ وہ مجھ سے بات کرنے کے لیے جاگنا پسند نہیں کرتے؟ یا تم میں ہمت نہیں ہے اُن کو جگانے کی۔"

"یار ایسی کوئی بات نہیں۔ کل رات ہی ہم انھیں ایک قید خانے سے چھڑا کے لائے ہیں۔ وہ جسمانی طور پر بہت خراب حالت میں تھے مگر انھیں فوری طور پر بہترین طبّی امداد فراہم کر دی گئی۔ اب وہ تیزی سے صحتیاب ہو رہے ہیں۔ انھیں ڈاکٹر نے دوا دے کر آرام کے لیے سُلا دیا ہے۔ اگلی بار ہم فون کریں گے تو اُن سے بھی بات کر لینا۔"

"تو چکر دے رہا ہے نا مجھے؟"

یار، آخر میں کیسے یقین دلاؤں تجھے کہ وہ بالکل ٹھیک ہیں۔"

"نازو اور گل کہاں ہیں؟"

"وہ بھی سو رہی ہیں مگر انھیں میں ابھی جگا کر بلواتا ہوں۔ پہلے تُو یہ بتا کہ کس حال میں ہیں یارانِ وطن۔"

منظر نے کہا۔ "اکرام شیخ اکثر فون کرتا رہتا ہے اور ظاہر ہے تمھاری طرف سے اسے بھی تشویش لاحق رہتی ہے۔ وہ مجھ سے پوچھتا ہے اور میں اُس سے معلوم کرتا ہوں کہ کوئی خبر ملی؟ اُس کو تم نے کراچی میں اکیلا کیوں چھوڑ دیا آخر۔ ایک دن رو رہا تھا بہن کو یاد کر کے۔"

میں نے کہا۔ "کل تو نازو بھی رو پڑی حالانکہ وہ جذباتی کمزوری کا مظاہرہ نہیں کرتی، لیکن دل آخر دل ہے، پتھر تو نہیں۔ اکرام شیخ ہے کہاں؟"

"وہیں کراچی میں۔ ۔ ۔ ٹیکسی چلا رہا ہے۔ ۔ ۔ کہہ رہا تھا کہ اب آخر میں کیا کروں؟ نہ یہ کام چھوڑ سکتا ہوں نہ کہیں جا سکتا ہوں۔ یہ خیال آجاتا ہے کہ جب تم لوگ واپس آؤ گے تو مجھے اور میری ٹیکسی کو تلاش کرو گے۔ ٹیکسی کے نمبر کی مدد سے کراچی میں کوئی ڈاکٹر جھگی والا ہے؟"

"ہاں، کیا اکرام اُس کے ساتھ رہتا ہے؟"

"ہاں، ڈاکٹر جھگی والا کے نمبر پر تم اُس سے رات دس بجے کے بعد بات کرنا چاہو تو کر سکتے ہو۔" منظر نے کہا۔

"اچھا شہلا کا کیا حال ہے؟" میں نے کہا۔ "میں نے سوچا تھا کہ اسے فون کروں لیکن ہمت نہیں پڑی۔ وہ اصرار کرتی کہ محسن سے بات کراؤ۔ تُو نے تو مان لی ہماری بات۔ وہ کبھی نہ مانتی۔ محسن کل پرسوں تک خود اسے فون کر لے گا۔"

"کہاں فون کرے گا وہ؟" منظر نے کہا۔ "شہلا اب وہاں نہیں ہے۔"

میرے ذہن کو اس صدمے سے جھٹکا لگا۔ "کیا مطلب؟ کیا وہ انکل رضوی کا گھر چھوڑ کے کہیں اور رہنے لگی ہے؟"

منظر نے کہا۔ "نہیں، یہ بات نہیں۔"

"تو پھر کیا بات ہے۔ کیا فون کٹ گیا ہے انکل رضوی کے گھر کا؟"

منظر نے رُکتے رُکتے کہا۔ "نہیں۔ ۔ ۔ فون تو ہے وہاں۔ ۔ ۔"

"کیا بات ہے منظر؟ اب تُو کچھ چھپا رہا ہے مجھ سے۔ صاف بات کیوں نہیں کرتا؟" میں نے کہا۔

"صاف بات میں کیا بتاؤں جب کہ خود مجھے اصل بات معلوم نہیں۔" منظر نے کہا۔ "مسز رضوی نے وہ گھر چھوڑ دیا ہے اور کسی کو بھی معلوم نہیں کہ وہ کہاں چلی گئی ہیں۔"

"لیکن اُن کا اسکول تو ہے۔ ۔ ۔"

"اسکول سے بھی کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ وائس پرنسپل نے کہا کہ مسز رضوی نے تین دن پہلے فون پر اطلاع دی کہ وہ مکان بدل رہی ہیں۔ اس کے بعد نہ وہ اسکول گئیں اور نہ اُن کا کوئی پیغام ملا ہے۔ ظاہر ہے شہلا انھی کے ساتھ چلی گئی ہو گی۔"

"لیکن کہاں۔ ۔ ۔ اور کیوں۔ ۔ ۔؟ وہ گھر تو مسز رضوی کا اپنا تھا۔ کرائے کا مکان تو نہیں تھا۔" میں نے کہا۔

"ہاں، عجب بات یہ ہے کہ انھوں نے مکان بیچ دیا ہے۔ اُس میں کوئی اور رہتا ہے اب۔ میری اُس سے فون پر بات ہوئی تو اُس نے کہا کہ مکان خالی تھا اور سودا کسی بروکر کی معرفت ہوا۔ اُسے نہیں معلوم کہ مالک مکان کہاں ہے، خود میرے لیے یہ بات ناقابلِ یقین تھی۔ آخر مسز رضوی نے یہ فیصلہ کیوں کیا اور مجھ سے اتنی رازداری برتی جیسے میں غیر ہوں۔ سودا ایک بروکر کے ذریعے ہوا۔ کیا میں یہ کام نہیں کرا سکتا تھا اور شہلا کو بھی خیال نہیں آیا کہ مجھے اطلاع کر دیتی۔"

"منظر یہ معاملہ کچھ اور ہے۔" میں نے محسوس کیا کہ کسی نامعلوم خطرے کا خوف میرے دل کو مایوسی کے شکنجے میں جکڑ رہا ہے۔

"ہاں، مجھے بھی دال میں کالا نظر آتا ہے۔ بیگم رضوی نے کسی مجبوری یا دباؤ کے تحت وہ گھر چھوڑا ہو گا۔ لیکن یہ بات میری سمجھ میں بھی نہیں آتی کہ یہ سب مجھ سے چھپانے میں کون سی مجبوری کا دخل تھا؟ مجھ پر اعتماد کیوں نہیں کیا انھوں نے؟ شہلا نے بھی مجھے نہیں بتایا کہ وہ مکان بیچ رہی ہیں اور اُن کا ارادہ کہیں اور جا کے رہنے کا ہے۔ آخر کیوں؟ اگر وہ مکان غیر محفوظ ہو گیا تھا تو یہ بات مجھے معلوم ہونی چاہیے تھی۔ شہلا پر لازم تھا کہ کوئی پریشانی تھی تو مجھے بتاتی۔ میں اُن کی مدد کرتا، لیکن مجھے تو کسی نے بعد میں بھی فون کر کے نئے گھر کا پتا دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ بیگم رضوی اور شہلا کا رویّہ بالکل ناقابلِ فہم ہے میرے لیے۔"

"منظر! یہ کوئی بہت سنگین معاملہ ہے۔ تُو نے کیسے یقین کر لیا کہ وہ مکان بیچ کر گئی ہیں؟" میں نے کہا۔

"مکان کی فروخت کے سلسلے میں تمام قانونی اور کاغذی کارروائی ہوئی ہے۔" منظر نے کہا۔ "ابھی کوئی ثبوت نہیں میرے پاس کہ بیگم رضوی نے وہ مکان اپنی مرضی سے بیچا یا جبر کے تحت اور جبر کس نے کیا؟ ڈر کی کوئی بات تھی تو مجھے کیوں اطلاع نہیں دی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ابھی تک کسی کو علم نہیں کہ وہ کہاں شفٹ کر گئی ہیں۔"

"منظر، اس میں شک کی کون سی بات ہے کہ وہ لاپتا ہو گئی ہیں۔" میں نے کہا۔ "ممکن ہے انھیں کسی نے اغوا کر لیا ہو، قتل کر دیا ہو، کہیں قید میں ڈال دیا ہو۔ اِن امکانات کی طرف تیرا ذہن کیوں نہیں گیا؟" میں نے برہمی سے کہا۔

"یار یہ سب کچھ ہے میرے ذہن میں۔ میں تو رہتا ہی جرائم کی دنیا میں ہوں۔ میرا ذہن غیر معمولی طور پر شک پرست ہے۔ مجھے تمھارا ابھی خیال آیا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ محسن نے اپنی بیوی سے بات کرنے کی کوشش کی تو اُسے ناکامی ہو گی۔ اُس کی بیوی نے ایسا کیوں نہیں سوچا؟ لیکن ابھی اس بات کو صرف تین دن ہوئے ہیں۔ میں نے ایس پی سے بات کی تھی۔ اُس نے کہا کہ گمشدگی کی رپورٹ تو ہر وقت درج کرائی جا سکتی ہے مگر جب اسکول والے کہتے ہیں کہ بیگم رضوی نے مکان بدل لیا ہے اور مکان خود انھوں نے کسی بروکر کے ذریعے فروخت کیا ہے تو اس سے یہ نتیجہ کیسے اخذ کیا جا سکتا ہے کہ انھیں اغوا کر لیا گیا ہے؟ یا یہ کہ وہ لاپتا ہو گئی ہیں۔ بروکر نے بتایا کہ مسز رضوی نے خود ہی مکان فروخت کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ سودا بھی انھوں نے ہی کیا تھا اور رقم بھی خود ہی وصول کی تھی۔ بروکر نے صرف گاہک سے ملوا کے اپنا کمیشن لیا تھا۔ ہاں ایک بات اور۔ ۔ ۔ مکان کا خالی قبضہ دینے کے لیے بیگم رضوی نے ایک ہفتے کی مہلت لی تھی لیکن اس سے پہلے ہی قبضہ دے دیا گیا۔"

"قبضہ کس نے دیا تھا؟"

"بروکر نے، اُس کا کہنا ہے کہ کوئی شخص اس کی عدم موجودگی میں مکان کے تالے کی چابی دے گیا تھا۔"

"یہ کوئی شخص کون تھا؟ خود بیگم رضوی؟"

"بروکر کچھ نہیں جانتا تاہم پولیس کو اس سارے معاملے میں کوئی شک کی بات نظر نہیں آئی۔" منظر بولا۔ "ایس پی نے مجھ سے کہا کہ وکیل صاحب! اگر انھوں نے آپ کی خدمات سے فائدہ نہیں اُٹھایا اور آپ کو اطلاع نہیں دی تو اُن کی مرضی۔ اس میں خلافِ قانون کون سی بات ہے۔ ممکن ہے ابھی تک انھیں فرصت نہ ملی ہو یا خیال نہ آیا ہو آپ کو نئے پتے سے مطلع کرنے کا۔ میں اس

اُلّو کے پٹھے کو کیسے سمجھاتا کہ میرے شکوک کی بنیاد کیا ہے جو بات مجھے ناقص لگتی تھی، وہ اِس کے لیے کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔"

مَیں نے کہا "پھر اب تُو کیا کرے گا؟ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھا رہے گا؟"

"نہیں، مَیں انھیں تلاش کر رہا ہوں۔ دو چار دن بعد مَیں تمام اخبارات میں یہ اعلان شائع کرا دوں گا کہ بیگم رضوی جہاں بھی ہوں، مجھ سے رابطہ قائم کریں۔ کوئی جواب نہ ملا تو مَیں مجبور ہو جاؤں گا پولیس میں گم شدگی کی رپورٹ لکھوانے پر۔"

"تُو نے سخت تشویش میں مبتلا کر دیا ہے مجھے۔"

"ابھی محسن کو کچھ مت بتانا بلکہ کسی کو بھی کچھ مت بتانا۔ رابعہ کو سمجھا دینا کہ زبان بند رکھے۔" منظر نے کہا "جب تک کہ صورتحال واضح نہ ہو جائے۔ خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"نہیں منظر، مجھے یہ معاملہ ٹھیک ہوتا نظر نہیں آتا۔ ابھی تو ہم محسن سے یہ بات چھپا لیں گے، لیکن سوال یہ ہے کہ کب تک؟ اگر خود محسن نے کبھی لاہور فون کیا اور خود شہلا سے بات کرنے کی کوشش کی تو کیا ہوگا۔"

"ظاہر ہے حقیقت کبھی نہ کبھی سامنے آ جاتی ہے۔ لیکن ابھی تم اس معاملے کو گول کر جاؤ۔"

"ہم ذکر ہی نہیں کریں گے اس گفتگو کا۔ تُو انھیں تلاش کر منظر، مَیں کل پھر فون کروں گا، اگر موقع ملا۔ ہاں ایک بات اور بتا۔ تُو نے اکرام شیخ سے آخری بار کب بات کی تھی؟"

"کوئی ایک ہفتہ پہلے۔ . . اسی روز میری شہلا سے بھی بات ہوئی تھی۔ وہ پوچھتی رہتی تھی مجھ سے کہ کسی کی کوئی خبر آئی؟ تقریباً ہر روز ہی اُس کا فون آ جاتا تھا اور مجھے ہر روز بڑا دُکھ ہوتا تھا اور شرمندگی ہوتی تھی یہ کہتے ہوئے کہ میرے پاس اس کے لیے کوئی خوش خبری نہیں۔ اکرام شیخ بھی شہلا سے اور مجھ سے پوچھتا تھا۔ اب پھر فون کرے گا تو پوچھے گا۔"

"اسے ہمارے متعلق بتا دینا کہ ہم خیریت سے ہیں مگر یہ مت بتانا کہ شہلا اور بیگم رضوی لاپتا ہو گئی ہیں۔ اگر کال مل گئی تو آج رات مَیں اس سے بات بھی کر لوں گا۔"

"اس وقت تم کہاں سے بات کر رہے ہو؟"

"ہمارے ایک دوست ہیں، محمد خان صاحب، اُن کے گھر سے۔ ابھی محسن سو رہا ہے اور اُسے یہ معلوم نہیں کہ اس گھر میں فون بھی ہے۔"

"اُسے معلوم ہونے بھی مت دینا۔ تمھارا فون نمبر کیا ہے؟"

مَیں نے کہا "مجھے نہیں معلوم، یہاں ہمارا قیام عارضی ہے۔"

منظر نے کہا "وہ ایس پی سراج تھا نا۔"

مَیں نے کہا "تھا کا کیا مطلب، کیا اس پر خدا کا قہر نازل ہو گیا؟"

"وہ معطل ہو گیا تھا۔ پھر خبر آئی کہ گرفتاری سے بچنے کے لیے روپوش ہو گیا۔ اس کا سرحد پار کے اسمگلروں سے رابطہ ثابت ہو گیا تھا۔ رینجرز نے اسے پکڑ لیا تھا مگر وہ اپنی وردی اور عہدے کے اختیار سے فائدہ اٹھا کے نکل آیا۔ اب کچھ پتا نہیں اُس کا۔"

"چوہدری دلاور تو ہمارے پیچھے یہاں بھی پہنچ گیا ہے، باقی شکاری کتّے کہاں ہیں؟ پیٹرو اور حاجی عبداللہ۔"

"لاہور میں تو نہیں ہیں۔" منظر نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ وہ بھی ہمارے تعاقب میں ہیں، اور یہیں ہیں۔ بمبئی میں بھی انھیں ایک اپنے جیسا شیطان مل گیا ہے جو دلاور کا بھی باپ ہے۔"

"کس کی بات کر رہے ہو تم؟"

"تریوینی کی۔ یہاں بدمعاش ہوتے ہیں، پھر بڑے بدمعاش اور اُن سے بڑے بدمعاش دادا کہلاتے ہیں۔ تریوینی کو تم پردادا سمجھ لو، لیکن خدا نے ہر فرعون کے لیے موسےٰ کا بندوبست کر رکھا ہے۔ ہماری مدد کے لیے اُس نے محمد خان کو بھیج دیا۔ اس کے بارے میں تفصیل سے پھر کبھی بتاؤں گا بشرطِ زندگی۔"

"تم لوگ ابھی بمبئی میں ہو نا؟"

"آج اور کل کے بارے میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ دو دن اور یہاں گزریں گے، لیکن اس کے بعد کا کچھ پتا نہیں۔ ہم تو بمبئی میں ایک دن بھی رُکنا نہیں چاہتے تھے مگر حالات نے روک لیا۔ اب کوشش یہی ہے کہ جلد از جلد نکل جائیں۔"

"کہیں جانے سے پہلے بتا دینا۔"

"مَیں وعدہ نہیں کر سکتا۔ وہاں تو ہم کسی بھی ٹیلی فون کے کھمبے پر چڑھ کے کہیں بھی بات کر لیتے تھے۔ یہاں سے فون کرنا آسان نہیں ہے، پھر بھی کوشش کریں گے کہ رابطہ رہے۔ تُو نے مجھے سخت پریشانی میں مبتلا کر دیا ہے شہلا کی طرف سے۔"

"وہ کہاں جائیں گی یار! ہوں گی لاہور ہی میں۔ جب ملیں گی تو سب معلوم ہو جائے گا کہ بات کیا تھی۔" منظر نے میری تسلی کے لیے کہا مگر اُس کے جھوٹ سے مَیں کیسے مطمئن ہو سکتا تھا۔ مَیں نے اُسے خدا حافظ کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

رابعہ کا چہرہ اُتر گیا تھا۔ اب مجھے خیال آ رہا تھا کہ مَیں نے منظر کو فون کر کے غلطی کی۔ اس سے مجھے کوئی خوشی نہیں ملی اور سکون حاصل ہوا۔ مَیں نے رابعہ کو بُلا کے بھی غلطی کی۔ بہتر ہوتا اگر مَیں خود ہی اس سے بات کر لیتا اور وہ خلش میری ذات تک محدود رہتی جو شہلا کے بارے میں ایک غیر متوقع اطلاع سے پیدا ہو گئی تھی۔ میرے ساتھ اب رابعہ بھی دُکھی تھی اور میرے پاس اُس کے دُکھ کا مداوا نہیں تھا۔

"رابعہ، تم نے سب سُنا؟" مَیں نے کہا۔

رابعہ نے اقرار میں سَر ہلایا "مَیں کسی کو نہیں بتاؤں گی۔"

"تم زبان سے نہیں بتاؤ گی مگر تمھاری صورت چغلی کھائے گی کہ تم کسی غم کو چھُپا رہی ہو۔" مَیں نے کہا "ایسے نہیں جان۔"

"پھر مَیں کیا کروں؟" رابعہ نے آنکھوں میں آنسو بھر کے کہا۔

"رونے لگی ہو ابھی سے؟" مَیں نے اُس کے سر کو سینے سے لگا کے آنسو اپنے ہاتھوں سے صاف کیے "ابھی تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ ہونے کو کیا نہیں ہو سکتا۔ مَیں اور تم آزمائش کے کیسے کیسے مرحلوں سے گزر چکے ہیں۔ ہم سب نے بہت بڑی قربانیاں دی ہیں اور ہمت نہیں ہاری ہے۔ مجھ سے میرا گھر اور میرے سر سے باپ کا سایہ چھِن گیا۔ تم سے تمھارا گھر اور تمھاری ماں کی محبت چھِن گئی۔ محسن کے والدین نہیں رہے۔ نازو کے ماں باپ اس دنیا سے صدمے اٹھاتے رخصت ہوئے اور بھائی بچھڑ گیا۔ گل کے بھائی نے اپنی جان دے دی۔ ہم سب سختئ حالات کی بھٹّی میں تپ کے کُندن ہوئے ہیں لیکن ابھی ہمارے لیے آزمائش کے کتنے مرحلے باقی ہیں، یہ ہم نہیں جانتے۔ ہمیں آنے والے وقت کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ خواہ وقت اچھا ہو یا بُرا۔"

رابعہ نے نظر اُٹھا کے مجھے دیکھا "مَیں نے کب کہا ہے کہ مَیں تیار نہیں ہوں، لیکن مَیں اکیلی نہ رہ جاؤں۔ یہ خوف میرے دل سے نہیں نکلتا۔ بس تم مجھے اتنا یقین دلا دو۔ . . کہ ہم جہاں بھی ہوں گے ساتھ ہوں گے۔"

مَیں نے کہا "مَیں اپنی مرضی سے اکیلا مَرنا بھی نہیں چاہتا مگر تقدیر میں کیا لکھا ہے، یہ کون بتا سکتا ہے۔ چلو اب ایسی مایوسی کی باتیں چھوڑو۔ سب کے سامنے مسکراتے ہوئے جائیں گے، بھلا کیسے؟"

رابعہ زبردستی مُسکرائی۔ مَیں اُس کا ہاتھ تھام کے باہر آ گیا۔ محمد خان باہر کہیں بھی نہیں تھا۔ اُس نے اخلاقاً کمرے سے نکل جانا بہتر سمجھا تھا تاکہ ہم آزادی سے بات کر لیں۔ اب سہ پہر کے تین بج رہے تھے اور کھانے کا وقت گزر چکا تھا۔ مَیں نے ٹیلی فون پر منظر سے تقریباً آدھا گھنٹا بات کی تھی یا شاید اس سے بھی زیادہ دیر تک مگر کوئی ہمیں تلاش کرتا ہوا نہیں آیا تھا۔

محسن اور غالب جاگ رہے تھے اور بے حد صحت مند ہی نہیں خوش و خرم بھی نظر آتے تھے۔ تکلف کو بالائے طاق رکھتے ہوئے نازو نے غالب کی تیمارداری کے فرائض سنبھال لیے تھے اور گل نے محسن کا چارج لے لیا تھا۔ نرس اب نظر نہیں آ رہی تھی۔

خلافِ توقع کسی نے بھی ہم سے نہیں پوچھا کہ اتنی دیر سے ہم کہاں تھے۔ وہ لوگ اپنی اپنی باتوں میں مصروف تھے چنانچہ انھوں نے فرض کر لیا تھا کہ ہم بھی کہیں مصروف راز و نیاز ہوں گے۔ اور انھیں وقت کے گزرنے کا احساس بھی نہیں ہوا تھا۔ غالب اور محسن کو چلنے پھرنے کی آزادی ہوتی تو وہ کب ایک کمرے تک محدود رہتے۔ نازو اور غالب اپنے لیے کوئی گوشۂ خلوت تلاش کر لیتے اور گل کو کوشش کیے بغیر ہی تنہائی میسّر آ جاتی۔ ویسے سارا کھیل جذبات کا ہے۔ آدمی چاہے تو بھری محفل میں تنہا ہو جائے۔ اور چاہے تو خلوت میں محفل آباد کر لے۔

مَیں نے محسن کے پاس جا کے کہا "کیا حال ہے؟"

محسن نے محض شرارت میں مُسکرا کے گل کی طرف دیکھا اور بولا۔ "وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے۔"

شہلا کے لاپتا ہو جانے کی خبر کا بوجھ ابھی میرے دل پر تھا۔ چنانچہ محسن کی یہ شوخی مجھے اُس سہاگن کی چوڑیوں کی کھنک، اس کی مانگ کی افشاں کی چمک اور اُس کے سنگھار کے رنگوں کی دمک جیسی لگی جس سے کوئی منحوس خبر چھُپالی گئی ہو۔ مَیں نے بے سبب خود کو مجرم محسوس کیا اور میرا دل آزردہ ہوا مگر مَیں نے فوراً خود کو سنبھال لیا۔

"اور دوسرے بیمار کے بارے میں دوسرے مسیحا کا کیا خیال ہے؟" مَیں نے غالب کی طرف دیکھا۔

آہ بھر کے غالب نے کہا "ہم مَرے جا رہے ہیں وہ کہتے ہیں حال اچھا ہے۔"

نازو نے کہا "سب بھوک سے مرے جا رہے ہیں اور کچھ نہیں۔"

گل نے کہا "رابعہ باجی کا پیٹ تو شاید باتوں سے ہی بھر گیا ہے۔"

مَیں نے بات کو ٹالنے کے لیے کہا "کسی کو خان صاحب کا بھی علم ہے؟"

"کیا وہ آپ کے ساتھ نہیں تھے؟" گل نے کہا۔

مَیں نے نفی میں سر ہلایا "ہم تو باہر ٹہل رہے تھے خیر میں دیکھتا ہوں۔"

اتنی بڑی کوٹھی میں کہیں کوئی آواز نہ تھی۔ گزشتہ رات مَیں نے جن لوگوں کو اندر آتے دیکھا تھا وہ بھی ارواح کی طرح کہیں غائب ہو گئے تھے۔ ایک ایک کر کے مَیں نے مختلف کمروں کے دروازے کھول کر دیکھنے کی کوشش کی لیکن سب دروازے بند تھے۔ وہ دروازہ بھی اب بند تھا جس میں مجھے گولہ بارود کا اور اسلحے کا ذخیرہ نظر آیا تھا۔

یہ کوٹھی جو دیکھنے میں بہت سادہ نظر آتی تھی اندر سے پُراسرار ہوتی جا رہی تھی۔ گھنٹی بجا کے یہاں ہر چیز طلب کی جا سکتی تھی اور گزشتہ رات مَیں نے کافی منگوا کے اس کا تجربہ بھی کیا تھا

لیکن نہ مجھے خادم دکھائی دیے تھے اور نہ کوئی کچن نظر آیا تھا۔ یہاں آنے کے بعد مَیں نے جو دو چار چہرے دیکھے تھے وہ بھی پھر دکھائی نہیں دیے تھے۔ ڈاکٹر اور نرس بھی غائب تھے اور یُوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کوٹھی میں صرف ہم چھ افراد رہ گئے ہیں۔ ساتواں ڈاکو محمد خان کچھ دیر پہلے میرے ساتھ تھا لیکن اب اُس کا بھی کہیں پتا نہ تھا۔

مَیں غیر ضروری تجسس کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتا تھا اور مجھے ڈاکوؤں کی اس پناہ گاہ کے اسرار و رموز کو سمجھنے کے چکر میں جاسوسی کرتے ہوئے پکڑے جانا منظور نہ تھا۔ چنانچہ مَیں واپس آگیا۔

"یہاں تو کوئی ہے ہی نہیں۔" مَیں نے کہا۔

"پھر۔۔۔ کھانے کا کیا کریں؟" نازو نے کہا۔ "کیا وقت ہوگیا ہے؟"

مَیں نے کہا۔ "خان صاحب نے تو بہت آسان طریقہ بتا دیا تھا کہ جس چیز کی ضرورت ہو، اِس بٹن کو دبا کے کہہ دو۔ یوں۔"

بٹن دبانے کے چند سیکنڈ بعد کسی نے کہا۔ "یس سر!"

مَیں نے کہا۔ "محمد خان صاحب کہاں ہیں؟"

"آپ پیغام دے دیں، انھیں بتا دیا جائے گا۔" اُسی آواز نے کچھ تذبذب کے بعد کہا۔

"پیغام بہت مختصر ہے۔ ہم اُن کے ساتھ لنچ کرنا چاہتے ہیں۔ فوراً۔" مَیں نے کہا اور بٹن کو چھوڑ دیا۔

"یہ کون تھا اور کہاں سے بول رہا تھا؟" نازو نے کہا۔

مَیں نے کہا۔ "یہ کوئی آدمی تھا اور اسپیکر میں سے بول رہا تھا۔"

"عجیب پُراسرار جگہ ہے یہ بھی۔" رابعہ نے کہا۔ "مجھے تو وحشت ہونے لگی ہے۔"

مَیں نے کہا۔ "شوق سے یہاں کون ٹھہرا ہوا ہے۔ غالب اور محسن سفر کے قابل ہو جائیں۔ یہی انتظار ہے۔"

نازو نے کہا۔ "ویسے بھی باہر کی نسبت ہم اندر زیادہ محفوظ ہیں۔"

"لیکن صرف حفاظت کے خیال سے ہم کب تک نظر بند رہیں گے؟" رابعہ نے کہا۔

"یہ مُہلت غنیمت ہے۔" مَیں نے کہا۔ "جب تک میسر ہے۔"

دروازے پر آہستہ سے دستک ہوئی اور محمد خان اندر آگیا۔ اُس کے پیچھے دو افراد ٹرالیاں دھکیلتے ہوئے اندر لے آئے۔ ایک دم کمرا کھانوں کی خوشبو سے بھر گیا۔ آخر میں نرس اپنے ہاتھوں میں ایک ٹرے لیے آئی۔

محمد خان نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔ "معاف کرنا، کھانے میں کچھ دیر ہوگئی۔ دراصل ان مریضوں کے لیے خصوصی بندوبست کوئی نہیں تھا۔ یہاں تو ہم جیسے لوگوں کے سوا کوئی رہتا ہی نہیں اور ہم کچھ بھی کھا لیتے ہیں۔"

دونوں خادم دروازہ بند کر کر خاموشی سے غائب ہوگئے تو مَیں نے کہا۔ "یہ خصوصی اور عمومی بندوبست کون کرتا ہے خان صاحب؟"

خان نے کہا۔ "یہی لوگ۔"

مَیں نے کہا۔ "مجھے نہ یہاں لوگ نظر آتے ہیں نہ زندگی کے آثار، لیکن اس جادو کے بٹن کو ہاتھ لگاتے ہی سب کچھ ہو جاتا ہے۔"

خان ہنسا۔ "اگر نہ ہو تو مجھے بتانا۔۔۔ آؤ اب کھانے کی طرف۔"

صاف ظاہر تھا کہ وہ مجھے یا کسی اور کو بھی اپنے خفیہ انتظامات کی پُراسرار نوعیت کے بارے میں کچھ بتانا نہیں چاہتا۔ اس رویّے کا یہ مطلب تھا کہ ہمیں اپنے کام سے کام رکھنا چاہیے۔ نازو اور گل نے ٹرے کور کو ہٹا کے کھانا نکالنا شروع کیا تو مَیں حیران رہ گیا۔ خان کے دسترخوان پر ہر وہ چیز موجود تھی جس کی ہم خواہش کر سکتے تھے تاہم غالب اور محسن کو مُرغن اور مسالے والی چیزوں میں سے کچھ بھی نہیں ملا۔ وہ اپنے سوپ اور اُبلے ہوئے کھانے کو نگلتے ہوئے بڑی حسرت سے قورمے، بریانی اور کباب کو دیکھتے رہے۔ پھر ڈاکٹر آگیا۔ اُس نے دونوں کا معائنہ کیا اور نرس کو کچھ دوائیں دے کر چلا گیا۔ خان کی موجودگی میں ہم نے بھی کھانا خاموشی سے کھایا۔

غالب اور محسن کے لیے آرام ضروری تھا اور سکون آور دواؤں کی بھاری مقدار کے زیرِ اثر وہ جاگتے میں بھی مضمحل نظر آتے تھے۔ نرس انھیں دوا دینے کے بعد وہیں کرسی پر بُراجمان ہو گئی تھی۔

گل نے کہا۔ "تم جاؤ۔ ہم ان کی دیکھ بھال کر لیں گے۔"

"تمھیں دیکھ بھال نہیں کرتا، باتیں کرتا ہے۔" نرس نے شکایت کے انداز میں خان کی طرف دیکھا اور نازو کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔

خان نے کہا۔ "خود آپ بھی آرام کریں۔"

نازو نے چڑ کے کہا۔ "ہم یہاں آرام کرنے نہیں آئے ہیں۔" مگر اس کی بات کا کسی پر اثر نہیں ہوا۔

جب کھانے کے بعد ہم نے کافی بھی پی لی تو خان اُٹھ کھڑا ہوا۔ "مَیں ایک کام سے جا رہا ہوں۔ شام کو ملاقات ہوگی۔"

مَیں اُس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن اچانک مجھے غنودگی نے آلیا۔ پہلے مَیں نے اُسے مرغن خوراک کا نتیجہ سمجھا لیکن گل اور نازو پر بھی نیند غالب آ رہی تھی جو بڑی عجیب بات تھی کیونکہ وہ کھانے سے کچھ دیر پہلے تک سوتی رہی تھیں۔ قالین پر دراز ہونے کے بعد مجھے یہ خیال آیا کہ شاید ہمیں بھی کافی میں خواب آور دوا دے دی گئی ہے، پھر مجھے نیند نے آلیا۔

میری آنکھ کُھلی تو کمرے میں ویسا ہی دن کا اُجالا تھا مگر گھڑی میں آٹھ بج رہے تھے۔ اگر رات کے آٹھ بجے کا وقت ہوتا تو اندھیرا ہوتا۔ مَیں نے گھڑی کو پھر غور سے دیکھا اور کھڑکی سے باہر جھانکا تو مجھ پر انکشاف ہوا کہ صبح کا سورج خاصا اُوپر اٹھ چکا ہے۔ مَیں مسلسل سولہ سترہ گھنٹے سو کے اٹھا تھا۔ یہ بات میرے لیے ناقابلِ یقین تھی مگر غلط نہیں تھی۔

غالب اور محسن کا سوتے رہنا اُن کے حق میں یقیناً اچھا تھا مگر مَیں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ خان صاحب نے ہم سب کو ان کے ساتھ ہی کیوں سُلا دیا تھا۔ خواتین میں صرف گل جاگ رہی تھی اور عجب بے خودی کی کیفیت میں محسن کے بیڈ سے لگی اُسے دیکھے جا رہی تھی۔

میرے کھنکارنے پر وہ چونکی۔ "آپ اُٹھ گئے سکندر بھائی۔ مجھے تو ایسی ٹوٹ کے نیند آئی۔۔۔"

مَیں نے کہا۔ "اِن دونوں کو بھی اُٹھاؤ۔ حد ہوتی ہے گھوڑے بیچ کر سونے کی۔۔۔ ہم اصطبل بیچ کر سوتے رہے۔"

نازو اور پھر رابعہ نے آنکھیں کھولنے کے بعد مجھ سے وقت پوچھا اور جب مَیں نے بتایا کہ صبح ہوئے بھی دیر ہوئی۔ تو انھیں یقین نہ آیا لیکن گل نے تصدیق کی۔

"یعنی شام گزر گئی۔ پھر رات بھی گزر گئی اور ہم سب کی آنکھ ہی نہیں کُھلی۔" نازو نے جماہی لے کر آنکھیں ملتے ہوئے کہا اور اپنے پریشان بال سمیٹنے لگی۔

مَیں نے کہا۔ "مَیں اپنی مرضی سے اتنی دیر سو ہی نہیں سکتا۔"

"پھر کیا رابعہ باجی نے حکم دیا تھا؟" گل نے کہا۔

"یہ حرکت خان کی ہے۔ مجھے کھانے کے کچھ دیر بعد ہی شک ہوگیا تھا۔" مَیں نے کہا۔ "کافی کے تلخ ذائقے میں کوئی خواب آور دوا شامل کر دی گئی تھی۔"

"لیکن کیوں؟" رابعہ نے پلکیں جھپکا کے کہا۔

"خان سے پوچھے بغیر مَیں کیا بتا سکتا ہوں۔ میرے نزدیک یہ سخت قابلِ اعتراض بات ہے۔" مَیں نے برہمی سے کہا۔ "اگر اُس کا مقصد ہمیں اپنی کسی کارروائی سے بے خبر رکھنا تھا۔۔۔ تو وہ ہم سے کہہ سکتا تھا کہ ہم اس کمرے سے باہر نہ جائیں۔"

"یہ تو دیکھ لو کہ۔۔۔ سب ٹھیک ہے۔ میرا مطلب ہے ہمارے ساتھ کوئی دھوکا تو نہیں ہوا؟" نازو نے کہا۔

"دھوکا کیا ہو سکتا ہے؟" گل نے کہا۔

"آپ لوگ جائیں اپنے کمرے میں۔ نہا دھو کے کپڑے بدل لیں۔ مَیں خان کو تلاش کرتا ہوں۔" مَیں نے کہا۔ "وہ سوٹ کیس بھی تو آپ لوگوں کے پاس تھا جس میں ہمارا سب کچھ ہے۔"

وہ تینوں چلی گئیں تو مَیں کچھ دیر اندر ہی اندر تاؤ کھاتا رہا۔ رات کو مجھے چوہدری دلاور سے بات کرنی تھی۔ رات دس بجے کے بعد مَیں نے کراچی فون کر کے ڈاکٹر جھگی والا کی معرفت اکرام شیخ سے بات کرنے کا پروگرام بھی بنایا تھا مگر نہ جانے کیوں محمد خان نے میرے سارے ارادوں کو خوابِ غفلت میں ڈبو دیا تھا۔ یقیناً اس کے سامنے کوئی مقصد تھا۔ کوئی ایسا مقصد جس کے بارے میں وہ نہ ہم سے بات کر سکتا تھا اور نہ یہ چاہتا تھا کہ ہمارے کانوں میں اس کی بھنک بھی پڑے۔ رات بھر مَیں اُس نے اپنا کام کر لیا اور ہم پڑے سوتے رہ گئے۔

خواب آور دوا کی کسل مندی کا اثر ابھی تک باقی تھا۔ مَیں نے مصلحت کے تقاضوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے خان کے ساتھ ٹھنڈے دل و دماغ سے بات کرنا مناسب سمجھا اور دماغ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے خود بھی باتھ روم میں گھس گیا — سولہ گھنٹے کی نیند کے بعد جب مَیں نے گرم پانی سے غسل کیا تو اچانک مجھے بے حد فرحت اور تازگی کا احساس ہوا۔ اس کے ساتھ ہی میری بھوک چمک اُٹھی۔

رابطے کا واحد ذریعہ ایک پش بٹن تھا۔ مجھے یوُں محسوس ہوتا تھا جیسے ہم ایک بہت بڑے قید خانے میں اکیلے ہیں۔ اس قید خانے کے دوسرے سب کمرے خالی پڑے ہیں اور یہ قید خانہ بھی ساری دنیا سے الگ کسی ویرانے میں واقع ہے۔ بظاہر ہم یہاں مہمان تھے اور ہماری خاطرداری میں کسی قسم کی کمی نہیں تھی لیکن اب مجھے بھی احساس ہونے لگا تھا کہ یہ خوف سے تحفّظ کی بات نہیں ہماری نقل و حرکت پر قدغن کا احساس ہے اور خودمختاری کے اعتماد کی کمی ہے جس نے ہمیں اسیر بنا دیا ہے۔

بٹن دبا کے مَیں نے کہا کہ پہلے مجھے فوراً بلیک کافی فراہم کی جائے اور پھر ہم سب کے لیے ناشتا لایا جائے۔ دوسری طرف سے ایک سپاٹ فرمانبردارانہ لہجے میں "یس سر" کے سوا کچھ نہیں کہا گیا۔ کافی پانچ منٹ میں آگئی اور اس کے ساتھ ہی وہ ڈاکٹر بھی آگیا جس کو ابھی تک مَیں نے بات کرتے نہیں سُنا تھا۔

مَیں نے اسے روک لیا۔ "ایک منٹ ڈاکٹر۔۔۔ کیا نام ہے تمھارا؟"

"مَیں صرف ڈاکٹر ہوں۔" اس نے بے رُخی سے کہا۔

"اچھا مسٹر ڈاکٹر! میرے یہ دوست جو تمھارے زیرِ علاج ہیں۔ ان کی پروگریس کے بارے میں تمھاری کیا رپورٹ ہے؟" مَیں نے انگریزی میں کہا۔

"تم کیوں پوچھتے ہو؟"

"تم کیوں بتانا نہیں چاہتے؟" میں نے کہا۔ "یہ میرے دوست ہیں اور میرا مطمئن ہونا ضروری ہے۔"

"میں صرف خان کو جواب دہ ہوں۔"

"خان کو گولی مارو۔" میں نے تلخ، تیز کافی کا گھونٹ لے کر کہا۔ "میری مرضی کے بغیر تم اپنا علاج جاری نہیں رکھ سکتے۔ میں تمھاری صلاحیت پر عدم اعتماد کا اظہار نہیں کر رہا ہوں۔ تمھیں صرف یہ سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ میرے دوستوں کے بارے میں خان کو مجھ سے زیادہ تشویش نہیں ہوگی۔"

"اُن کی حالت بہت اچھی ہے اور ان کا رسپونس میری توقعات سے بہت زیادہ حوصلہ افزا ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"کیا یہ چل پھر سکتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"ہاں . . . اُن کی اپنی قوتِ ارادی اور جسمانی صحت پر منحصر ہے۔"

"میرا مطلب یہ تھا کہ کسی نقصان کا احتمال تو نہیں ہے؟ ان کی قوتِ ارادی سے میں واقف ہوں۔ اگر تم ان کے بارے میں سمجھتے ہو کہ یہ چل پھر سکتے ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہمالیہ پر بھی چڑھ سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اگر انھیں ظاہری بیماری یا اندرونی خرابی کی کوئی پرابلم نہیں ہے تو پھر یہ علاج کیسا ہے؟ تم انھیں کس قسم کی دوائیں دے رہے ہو؟"

"یہ صرف سکون بخش اور جسمانی صحت یابی کے عمل کو تیز کرنے والی کچھ دوائیں ہیں۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "ان کا اصل علاج زیادہ سے زیادہ آرام اور اچھی خوراک ہے۔"

"یہ ہماری طرح صحت مند کب تک ہوں گے؟"

"ویسے تو میں ان کو صحت مند ہی سمجھتا ہوں۔ بیمار نہیں۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "آرام کا مطلب بستر پر لیٹے رہنا بہر حال نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔ "ایسی صورت میں آپ ان کا آخری بار معائنہ کر لیں اور مجھے بتا دیں کہ بعد میں انھیں کس قسم کے علاج اور احتیاط کی ضرورت ہوگی۔ شاید کل ہم آپ کو یہاں نہ ملیں۔"

گل نے کہا۔ "اس نرس کی بھی چھٹی۔"

ڈاکٹر نے بُرا سا منہ بنایا۔ "میں محمد خان سے ہدایات لیتا ہوں۔" اور پھر محسن کا معائنہ کرنے لگا۔ اس نے نبض دیکھی۔ بلڈ پریشر چیک کیا اور غیر شعوری طور پر سر ہلا کے

طمینان کا اظہار کیا۔

"اس نرس کو میں بھی برداشت نہیں کر سکتا۔" محسن نے کہا۔ "اسے دیکھ کر میرا بلڈ پریشر بہت گر جاتا ہے۔ یہ ایک نفسیاتی نکتہ بھی ہے۔ نرس ہونی چاہیے مریض کی پسند کی۔"

غالب نے کہا۔ "میں اتفاق کرتا ہوں۔ لوگ کہتے ہیں پرہیز علاج سے بہتر ہے۔ میں کہتا ہوں ایک خوب صورت نرس علاج اور پرہیز دونوں سے بہتر ہے۔ یہ نرس تو اتنی بدصورت تھی کہ زنانہ پولیس میں بھرتی ہو سکتی تھی۔"

میں نے کہا۔ "تم دونوں کو اب کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ بہت ناز برداری کرا چکے ہو اور نہیں چلے گا یہ بیماری کا ڈراما۔"

"یہ تو بڑا ظلم ہے۔ زبردستی ہمیں بسترِ مرگ سے اٹھایا جا رہا ہے۔" محسن بولا۔

غالب نے آہ بھر کے کہا۔ "بن گیا طبیب آخر تھا جو رازداں اپنا۔"

ڈاکٹر نے مجھے ان دونوں کے لیے ایک ہی نسخہ لکھ کر دیا۔ اس میں چند ملٹی وٹامن کیلشیم اور آئرن کی گولیاں تھیں جن کے نام مختلف تھے۔ پاکستان میں یہ دوسرے نام سے دستیاب تھیں۔ ابھی ڈاکٹر رخصت ہو رہا تھا کہ رابعہ، نازو اور گل بھی لوٹ آئیں۔ یکلخت ان سب کے حسن کی تابندگی میں

تازگی اور شگفتگی کا دل نشیں انداز شامل ہو گیا تھا۔

میں نے رابعہ کو ناشتے کی طرف کھینچ لیا۔ "آؤ بھئی ہم تو شروع کریں۔"

رابعہ نے کہا۔ "یہ کیا بدتمیزی ہے۔ کچھ صبر کرو۔"

میں نے کہا۔ "بھئی غالب اور محسن بیمار ہیں۔ ممکن ہے ان کی وجہ سے تیماردار بھی کچھ نہ کھائیں۔ ہم کیوں بھوکے رہیں ان کی خاطر۔"

غالب نے کہا۔ "نازو سب کچھ کر سکتی ہے میری خاطر۔"

"کیوں نہیں۔" نازو نے غالب کی جانب پیش قدمی کی۔ "میں تم کو اُٹھا کر اپنے پیروں پر کھڑا کر سکتی ہوں۔ تھوڑی سی ورزش کرا سکتی ہوں جس سے تم بالکل فٹ ہو جاؤ گے — تمھارے جسم کے سارے کل پرزے بالکل ٹھیک کام کرنے لگیں گے۔ تمھارا صحیح علاج یہی ہے۔"

جب غالب نے دیکھا کہ نازو کا موڈ قاتلانہ ہے تو اس نے بستر سے اُٹھ کر باتھ روم کی طرف دوڑ لگاتے ہوئے کہا۔ "میں آج ہی خان سے کہوں گا اس نرس کو نہ جانے دے۔ وہ بدصورت ہے تو کیا۔ شرافت تو ہے اس میں۔"

نازو نے کہا۔ "تم پانچ منٹ میں غسلِ صحت کر کے نہ آئے تو میں کر لوں گی ناشتا۔"

غالب نے باتھ روم کے دروازے سے سر نکال کے کہا۔ "اتنی جلدی ہے تو اپنا اور میرا ناشتا اندر لے آؤ۔" اور پھر فوراً دروازہ بند کر لیا۔

گل محجوب انداز میں کھڑی ہنستی رہی۔ رابعہ نے سمجھ لیا تھا کہ وہ بھی محسن کے ساتھ ہی ناشتا کرے گی چنانچہ اس نے میرا ساتھ دیا۔

رابعہ نے آہستہ سے کہا۔ "کسی بہانے محسن کو بتا دینا چاہیے۔ صاف نہ سہی، اشاروں میں۔"

میں نے کہا۔ "ابھی نہیں۔"

رابعہ نے کہا۔ "تم دیکھ نہیں رہے ہو گل کس طرح خوش فہمی کے جال میں گرفتار ہو رہی ہے۔"

"محسن کا رویّہ غلط ہے۔ کیا وہ خود نہیں سمجھتا یہ بات؟" میں نے کہا۔

"میرا خیال ہے قصوردار ہم بھی ہیں۔ ہم نے گل کو شہلا کے وجود سے بے خبر رکھا۔ پہلے تو خیر ایک مصلحت تھی۔ یا ضرورت تھی مگر اب اسے معلوم ہو جانا چاہیے۔"

میں نے تائید میں سر ہلایا۔ "گل کو سمجھا دینا بہتر ہے مگر ایسے کہ وہ آسانی سے سمجھ لے۔ کوئی مشکل پیدا نہ ہو اس کے لیے یا ہمارے لیے۔"

محمد خان ایک دم اندر آ گیا۔ "اچھا۔ ابھی ناشتا ہی چل رہا ہے۔"

اسے دیکھتے ہی میں اپنی بات بھول گیا۔ میں نے کہا۔ "سب آپ کا حسنِ انتظام ہے خان صاحب! ہم اپنی مرضی سے کیا کر سکتے ہیں؟"

"جو آپ کا جی چاہے کریں۔" خان نے کہا۔

"ہم یہ کب چاہتے تھے کہ اگلے دن سو کر اٹھیں۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "کیا مقصد تھا آخر تمھاری اس حرکت کا؟"

اس نے حیران ہو کے کہا۔ "میں سمجھا نہیں۔"

میں نے کہا۔ "کل دوپہر کے کھانے کے بعد تم نے کافی میں خواب آور دوائیں ملوائی تھی۔ کیا ضرورت تھی اس کی؟"

اس نے انجان نظر آنے کی بہترین اداکاری کی۔ "یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ میں خود یہاں موجود تھا۔ تمھارے ساتھ وہی کافی میں نے بھی پی تھی۔"

بحث کے باوجود خان نے میرا یہ الزام درست تسلیم نہیں کیا کہ اس نے کسی خاص مقصد کے تحت کوئی غلط حرکت کی تھی۔ رابعہ نے مجھے بروقت اشارے سے روک دیا، ورنہ شاید نوبت تلخ کلامی تک آ جاتی۔ ابھی ہم محمد خان کے مہمان تھے لیکن ہم اپنے پیروں پر یوں کلہاڑی مار سکتے تھے کہ ہماری حیثیت بن بلائے مہمان سے بدتر ہو جائے اور محمد خان بگڑ جائے تو سچ مچ خونی خان بن جائے۔ ابھی بہت سے معاملات میں ہم اس کی مدد کے محتاج تھے۔ وہ بمبئی میں ہمارا پہلا دوست تھا جو حقیقی معنوں میں ہمارا مددگار ثابت ہو سکتا تھا۔ موجودہ حالات میں ایک دوست کو دشمن بنا لینا سخت نادانی ہوتی۔

ناشتا ختم کرتے ہی میں نے سگریٹ جلائی اور خان کے ساتھ باہر چلا گیا۔ "مجھے ایک ضروری بات کرنی تھی تم سے۔"

خان نے باہر آتے ہوئے دروازہ بند کر دیا۔ "میرے کمرے میں آ جاؤ۔"

میں نے خان کا کمرا ابھی تک نہیں دیکھا تھا۔ ویسے تو یہاں جو کچھ تھا اسی کا تھا مگر پھر بھی میرے ذہن میں ایک تجسس تھا کہ اس شخص کا ذاتی کمرا دیکھوں جو ایک نامی گرامی ڈاکو کی حیثیت سے خونی خان کہلاتا ہے لیکن خود کو عام ڈاکو نہیں سمجھتا۔ جس کی مٹھی میں تریوینی جیسے کروڑ پتی گرگے رہتے ہیں اور جو دعوے کرتا ہے کہ مقامی انتظامیہ میں نیچے سے اوپر تک سب اس کے ساتھ ہیں۔ اس کا رہن سہن شاہانہ اور ہمارے ساتھ اس کا رویّہ شریفانہ تھا۔ اس کی بہت سی باتیں میرے لیے ناقابلِ فہم بھی تھیں۔

اس کا کمرا دیکھ کر مجھے مایوسی ہوئی۔ اس میں شان و شوکت کے اسباب مفقود تھے۔ خان لکڑی کے تخت پر سونے کا عادی تھا۔ اس کے علاوہ کمرے میں ایک معمولی صوفہ سیٹ تھا اور ایک سینٹر ٹیبل۔ اس ٹیبل پر ایک جانماز دیکھ کر میں چونکا لیکن میں نے اس بارے میں خان سے کوئی سوال نہیں کیا۔

"کل رات میری دلاور سے بات نہیں ہو سکی۔" میں نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"میری بات ہوئی تھی۔" خان نے کہا۔ "تریوینی نے اسے بتا دیا تھا کہ تم اس سے براہِ راست بات کرنا چاہتے ہو۔"

"پھر اس نے کیا کہا؟"

"کچھ نہیں، اس نے آج دوپہر بارہ بجے کے بعد تریوینی کی دکان میں موجود رہنے کا وعدہ کیا ہے، بارہ بجے کے بعد تم اس سے فون پر بات کر لینا۔"

"اس نے یہ نہیں بتایا کہ آخر وہ کیوں ملنا چاہتا ہے؟"

"اس نے کہا تھا کہ وہ تمھیں کوئی تحفہ دینا چاہتا ہے اور اس کے لیے ضروری ہوگا کہ تم اس سے ملو۔"

"تحفہ!" میں نے کہا۔ "وہ حرام زادہ مجھے تحفہ دینا چاہتا ہے اب تک جتنے تحفے ملے ہیں مجھے اس کی طرف سے، اتنے ہی میں نے بھی پیش کیے ہیں۔ وہ کوئی نیا جال پھیلا رہا ہے تو ٹھیک ہے۔ میں بھی تیار ہوں۔"

"سوچے سمجھے بغیر کوئی قدم مت اٹھانا . . . میں نے اسے

یہ تو بتا دیا تھا کہ میں اپنے مہمانوں پر آنچ نہیں آنے دوں گا اور ان کے خلاف کوئی سازش کی گئی تو نتیجہ سازش کرنے والوں کے حق میں بُرا ہوگا۔ دلاور نے مجھے یقین دلایا تھا کہ اس میں کوئی دھوکے فریب والی بات نہیں ہے۔ سکندر بخت جہاں چاہے جیسے چاہے مجھ سے مل لے۔"

میں جانتا تھا کہ دلاور جیسے مکار اور بے ضمیر شخص کی زبان سے نکلے ہوئے کسی لفظ کو قابلِ اعتبار نہیں سمجھا جا سکتا۔ وہ خان کو بے وقوف بنا سکتا تھا، مجھے نہیں۔ اس کے شیطانی ذہن میں کیا تھا۔ یہ اس سے گفتگو کے بعد ہی معلوم ہو سکتا تھا۔ دلاور کے موضوع پر خان سے مزید کچھ کہنے کا فائدہ نہیں تھا۔

میں نے اچھی طرح غور کرنے کے بعد محتاط انداز میں کہا۔ "خان صاحب! میں کل ہی ایک بات پوچھنا چاہتا تھا لیکن ہوا یہ کہ آپ نے ہمیں سلا دیا۔"

خان مسکرایا۔ "اب تمہارے سامنے یہ اعتراف کرنے میں کوئی حرج نہیں کہ میں نے ایسا ڈاکٹر کے مشورے پر کیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ یہ سب لوگ تھکن اور اعصابی کشیدگی میں مبتلا ہیں۔ ان کو آرام کی ضرورت ہے۔ ویسے تم آرام نہ کرتے۔ تم سب نے اپنی اپنی فکریں پال رکھی ہیں۔"

میں نے کہا۔ "اس وضاحت کے بعد مجھے کوئی شکایت نہیں رہی۔ یہ نیک نیتی پر مبنی دوستانہ اقدام تھا۔ کل دوپہر مجھ سے نادانستگی میں ایک غلطی ہوئی۔ میں جانا چاہتا تھا اپنے کمرے میں لیکن کمرے ایک سے ہیں۔ میں کسی اور کمرے میں چلا گیا۔ معلوم نہیں وہ کمرا ایسے ہی کھلا رہتا ہے یا غلطی سے کھلا رہ گیا تھا۔"

خان نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "کون سا کمرا؟"

میں نے کہا۔ "وہ کمرا شاید اسلحہ خانہ ہے، وہاں میں نے سب کچھ دیکھا۔ مشین گن سے آٹومیٹک رائفل، ریوالور، دستی بم اور ہر قسم کے کارتوس تک۔"

خان نے کچھ دیر بعد کہا۔ "اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔"

میں نے کہا۔ "میں اسلحہ دیکھ کر حیران یا پریشان نہیں ہوا۔ یہ سب ہمارے لیے بھی وہ کھلونے ہیں۔ جن سے ہم دن رات کھیلتے رہتے ہیں۔ اگر میں طبلہ سارنگی اور ستار دیکھتا تو ضرور حیران ہوتا کہ ان چیزوں کا یہاں کیا کام؟"

محمد خان نے کہا۔ "میں ستار بہت اچھا بجاتا تھا۔ بہت عرصہ ہوا ریاض کیے۔ روی شنکر، استاد عبدالحلیم، جعفر خان اور پاکستان کے محمد شریف کو میں نے بہت سنا ہے۔"

میں اس انکشاف پر سخت حیران ہوا مگر میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ "اس کمرے میں کچھ اسلحہ میرا دیکھا ہوا تھا۔ میرا مطلب ہے وہ عام اسلحہ نہیں تھا۔"

"عام اسلحہ ہم استعمال بھی نہیں کرتے۔ عام آدمی کے لیے خنجر بھی اسلحہ ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ ریوالور رکھتا ہے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ اسلحہ غیر ملکی ساخت کا تھا اور اس پر مخصوص شناختی نشانات تھے جن کو بڑی محنت سے مٹا دیا گیا تھا، ریتی سے رگڑ کے یا کسی اور چیز سے گھس کر لیکن میری نظر نے پھر بھی پہچان لیا کہ یہ اسلحہ کہاں سے آیا ہے۔ میں نے تمہیں چوہدری دلاور کے بارے میں اور اس کے کاروبار کی نوعیت کے متعلق ساری بات بتا دی تھی۔ یہ بھی بتا دیا تھا کہ اس کے اور میرے درمیان پہلے ذاتی دشمنی تھی کیونکہ وہ میرے باپ کا قاتل تھا لیکن اس کے بعد ہماری دشمنی کی سطح بدل گئی۔ ہم سب دوستوں اور جاں نثاروں نے چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کے خلاف محاذ قائم کر لیا۔ ہم نے اس کے اسلحے کے متعدد ذخائر تباہ کیے اور اس کے کاروبار کو ختم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ہمارے حساب میں بہت سی کامیابیاں ہیں مگر ہم یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ ہم دلاور کو روکنے میں کامیاب رہے۔ اس نے بہت نقصانات اٹھائے مگر ابھی تک اس کا گروہ ختم نہیں ہوا اور اس کا کاروبار ختم نہیں ہوا۔ ہم اس کے پیچھے لگے ہوئے ہیں اور لگے رہیں گے۔ وہ مختلف راستوں سے اسلحہ مشرقی پاکستان بھیج رہا ہے اور ان کا ایک راستہ یہ بھی ہے جس پر چلتے ہوئے ہم یہاں تک آ گئے۔ ہمارے پیچھے وہ سب شکاری آ گئے جو شرافت، انسانیت اور آدمیت کے ضمیر کے شکاری ہیں۔ یہاں تریوینی جیسے شکاری ان کے ساتھ مل گئے ہیں لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہمارا خدا ہمیں کہیں تنہا اور بے یار و مددگار نہیں چھوڑتا۔ یہاں اس نے تمہیں ہماری مدد کے لیے بھیج دیا۔"

محمد خان نے اپنے دونوں کانوں کو چھوا۔ "میں بہت گنہگار ہوں بابا! خدا مجھ سے کوئی نیک کام نہیں لے گا۔ وہ جانتا ہے کہ میں تو شیطان کا چیلا ہوں۔"

"ایسا مت سوچو محمد خان! تمہارا اعتراف گناہ ہی اسے پسند آیا ہوگا۔ وہ جسے چاہے نیکی کی توفیق دے۔ مجھے بتاؤ کیا تم مسلمان نہیں ہو؟"

"خدا یہ ضرور جانتا ہے کہ میں اس کا بندہ ہوں۔"

"بھارت میں کروڑوں مسلمان آباد ہیں۔ میں ان کی سیاسی وابستگی اور جذباتی ہمدردی کی بات نہیں کرتا۔ وہ اپنی اپنی وفاداری خود استوار کرتے ہیں۔ ذہنی طور پر وہ پاکستان کے ہی نہیں دنیا بھر کے مسلمانوں کے ساتھ ہیں مگر عملاً وہ بھارتی شہری ہیں اور کوئی انھیں پاکستان کا ایجنٹ یا ففتھ کالم کہے تو یہ محض تہمت ہے۔ میں تم سے بھی یہ توقع نہیں رکھتا کہ تم اس مشن میں ہمارا ساتھ دو، جس کو ہم ایک جہاد سے کم مقدس نہیں سمجھتے۔ لیکن میں تم سے ایک سوال ضرور کروں گا جس کا جواب تم صرف ایک مسلمان کی حیثیت سے دے سکتے ہو۔ احادیث اور قرآن کے فرمودات اپنی جگہ، تم اس شخص کو کیا سمجھتے ہو جو صرف نام کا مسلمان ہو، خود کو مسلمان بھی کہتا ہو مگر اس کا وجود مسلمانوں کے درمیان کشت و خون کا باعث ہو۔ جو خود مسلمانوں کے ہاتھ میں خنجر دیتا ہو کہ دوسرے مسلمان کی پیٹھ میں گھونپ دے۔ جو بھائی کو بھائی کے ہاتھوں قتل کراتا ہو اور اس خونی کاروبار سے اپنے خزانے بھرتا ہو۔"

"خدا کی قسم، وہ مسلمان نہیں شیطان ہے۔" محمد خان بولا۔

"چوہدری دلاور اور اس کے ساتھی آخر کیا کر رہے ہیں؟ وہ کس کے ہاتھ میں اسلحہ دے رہے ہیں، مشرقی پاکستان میں مارنے والے بھی مسلمان ہیں اور مرنے والے بھی۔ پاکستان اور مسلمانوں کے دشمن یہ اسلحہ چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کو فراہم کر رہے ہیں کہ یہ آگے پہنچاؤ۔ یہ کام کافر اور یہودی کریں تو ان سے کیا گلہ مگر یہ تو خود مسلمان ہیں مگر جیسا کہ تم نے کہا، یہ شیطان ہیں، یہ اس کاروبار میں خوب کمائی کر رہے ہیں۔ یہ اسلحہ لا رہے ہیں، بنا رہے ہیں اور بیچ رہے ہیں۔ یہ مخصوص گروہ اور سیاسی طاقت کے آلۂ کار ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ اسلحہ کہاں سے آ رہا ہے۔ میرے لیے پریشانی کی بات یہ ہے خان صاحب کہ وہی اسلحہ تمہارے پاس کیسے پہنچا؟"

خان چونکا۔ "میرے پاس؟"

میں نے کہا۔ "ہاں، تمہارے پاس وہ اسلحہ ہے جو چوہدری دلاور نے اسمگل کیا اور کچھ خود بنا کے اس پر مخصوص شناختی نشان کے ساتھ مشرقی پاکستان میں خانہ جنگی کو ہوا دینے کے لیے بھیجا۔"

خان ایک دم کھڑا ہو گیا۔ "تمہیں غلط فہمی ہوئی ہوگی۔"

میں نے کہا۔ "بیٹھ جاؤ، میں کوئی فیصلہ عجلت میں نہیں کرتا۔ میں نے اس اسلحے کا غور سے معائنہ کیا تھا۔ خدانخواستہ میں تم پر یہ الزام عائد نہیں کر رہا ہوں کہ تم چوہدری دلاور کے ساتھی ہو یا تمہارے ساتھیوں میں کوئی ایسا بدبخت ہے۔"

"پھر کیا کہہ رہے ہو تم؟" خان کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔

"یہ بہت تھوڑا سا اسلحہ ہے خان! وہ لوگ بحری جہازوں میں بھر بھر کے بھیجتے ہیں۔ ٹرک بھر بھر کے روانہ کرتے ہیں۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تمہارے کسی آدمی نے یہ اسلحہ لوٹا ہے یا خریدا ہے؟ لوٹا ہے تو معلوم کرو کہاں سے اور خریدا ہے تو کس سے؟ مجھے شک نہیں یقین ہے کہ اتنے لمبے راستے میں اسلحہ خورد برد بھی ہو جاتا ہوگا۔ تھوڑا بہت چور بھی نکال لیتے ہوں گے۔"

خان نے سر ہلایا۔ "آؤ میرے ساتھ، پہلے مجھے بتاؤ کہ تم نے کیسے شناخت کی۔"

ایک بار پھر میں خان کے ساتھ اس کمرے میں پہنچا جہاں میں نے وہ اسلحہ دیکھا تھا۔ یہ کمرا اب مقفل تھا مگر خان نے قفل کو جیب سے ایک چابی نکال کر کھول لیا۔ دروازہ اندر سے بند کرکے اور لائٹ جلا کے میں نے ایک ایک چیز اٹھائی، اور خان کو وہ مخصوص نشانات دکھائے جو بڑی محنت سے مٹانے کی کوشش کی گئی تھی۔

خان نے کہا۔ "ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ آخر اسلحہ فراہم کرنے والوں کو شناختی علامات بنانے کی کیا ضرورت ہے؟"

میں نے کہا۔ "ایک وجہ تو یہ ہے کہ اسلحہ ساز فیکٹریوں میں یہ نشانات خود مشینیں لگا دیتی ہیں۔ اس مقصد کے لیے الگ کارخانے قائم نہیں کیے گئے ہیں جہاں بغیر مارک کے اسلحہ بنایا جائے۔ ان کے پاس پرانے ذخائر بھی بہت ہیں۔ بیشتر اسلحہ انھی پرانے ذخیروں کو ختم کرنے کے لیے اِدھر اُدھر بھیج دیا جاتا ہے۔ پھر یہ نشانات خورد برد کو روکنے میں بھی معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اسلحہ فراہم کرنے والوں کو فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ اسلحہ راستے میں غائب ہو رہا ہے۔ ان کے مخبر اطلاع کر دیتے ہیں کہ مخصوص نشانات والا اسلحہ غیر متعلقہ لوگوں کے پاس بھی دیکھا گیا ہے۔ ظاہر ہے اس کے بعد وہ حفاظتی انتظامات سخت کر دیتے ہیں اور چوروں کو پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چوہدری دلاور نے ذاتی مفاد میں ایک کام یہ کیا کہ دیسی ساخت کے اسلحہ پر ایسے ہی نشانات بنا دیے۔ میں بتا چکا ہوں کہ میرے والد کی فیکٹری میں زرعی مشینری کے آلات اور پرزے بنتے تھے۔ جب وہاں انھی مشینوں پر اسلحہ بننے لگا اور میرے والد کو پتا چلا تو انھیں راستے سے ہٹا دیا گیا۔ پھر میں بیچ میں کود پڑا اور وہ میرے ضمیر کا سودا نہ کر سکے تو میرے دشمن ہو گئے۔ اب تو خیر چوہدری دلاور نے وہ فیکٹری ختم کر دی ہے اور مشینوں کو کہیں اور شفٹ کر دیا ہے۔ اس فیکٹری کی جگہ اس حرام زادے نے ایک خیراتی اسپتال بنانے کا اعلان کیا ہے اور وہ بھی میرے باپ کے نام پر۔ لیکن دیسی اسلحے پر غیر ملکی نشانات لگانے کا سلسلہ شاید ابھی تک جاری ہوگا۔ اس طرح وہ زیادہ منافع کماتا ہوگا۔"

"یہ اسلحہ غیر ملکی ہے یا غیر ملکی نشانات والا دیسی؟"

"یہ دیسی اسلحہ ہے۔" میں نے پورے یقین کے ساتھ فیصلہ دیا۔ "جو چوہدری دلاور کے کسی کارخانے میں ڈھالا گیا ہے اس پر غیر ملکی ساخت کے نشانات عین اس جگہ پر نہیں ہیں جہاں برآمد شدہ اسلحے پر ہوتے ہیں۔ دوسری چیز ہے سیریل نمبر، وہ ان پر نہیں ہیں۔ یہ سو فیصد چوہدری دلاور کا مال ہے۔"

خان نے سر ہلا کے کہا۔ "میں معلوم کر لوں گا۔" پھر اس نے کمرے کو اسی طرح مقفل کیا اور ہم اسی کمرے میں لوٹ آئے

میں نے کہا۔ "اس میں کوئی شک نہیں کہ تمھاری ذات بہت پُراسرار ہے۔ تم خود کو عام ڈاکو نہیں سمجھتے، خاص ڈاکو کہتے ہو۔ خدا سے ڈرتے بھی ہو اور زبان سے ہی نہیں عمل سے بھی ثابت کرتے ہو کہ تم مسلمان ہو۔ شاید مجھ سے بہتر مسلمان ہو۔ میں خدا کو یاد ہر وقت کرتا ہوں لیکن تمھاری طرح جانماز پر بیٹھنے کی توفیق مجھے نہیں ہوتی۔ ویسے تو ہر آدمی کی ذات مجموعہ ہوتی ہے تضادات کا لیکن یہاں مجھے سارا ماحول بڑا ہی آسیب زدہ اور پُراسرار محسوس ہوتا ہے۔"

اس نے کہا۔ "ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

میں نے کہا۔ "ایک تو ہر وقت یہاں اُلّو بولتے رہتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی مہمان کی حیثیت سے ہماری خاطر کرنے والے ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ کال بیل بجاتے ہی نہ جانے کہاں سے نکل آتے ہیں۔"

"وہ سب یہیں ہوتے ہیں۔" خان نے سرسری انداز میں کہا۔

"اور تمھارے ساتھی؟" میں نے کہا۔ "کل رات میں نے دیکھا تھا...."

"کیا دیکھا تھا؟" وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

"کچھ لوگ جیپ میں آئے تھے۔ ایک مرد اور عورت ان کے ساتھ تھے۔" میں نے کہا۔ "جو قیدی معلوم ہوتے تھے۔"

خان نے کسی ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا۔ یوں جیسے اس نے میری بات کو قابلِ یقین نہیں سمجھا یا یقین کیا تو کوئی اہمیت نہیں دی۔ اس نے انٹرکام جیسے ایک بٹن کو دبا کے کہا۔ "سلیمان کو بھیج دو۔" اور پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "سلیمان بہت ذہین آدمی ہے۔ پولیس کا مخبر بھی ہے۔"

سلیمان گھنی داڑھی والا کوتاہ قامت شخص تھا۔ ساڑھے پانچ فٹ قد کے ساتھ اس کا پھیلا ہوا جسم زیادہ بے ہنگم نظر آتا تھا۔ اس کے سر پر ایک بھی بال نہیں تھا اور اُسترا پھری ہوئی سر کی جلد پر ایک گہرے زخم کا نشان صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق یہ کلہاڑی کے وار کا نشان تھا۔

"سلیمان! پرسوں تم لوگ کہیں گئے تھے؟"

سلیمان نے چونکنا ہو کے مجھے دیکھا۔ "ہاں شاہ جی! مگر میں اکیلا نہیں تھا۔"

"اپنے ساتھ کیا لے گئے تھے تم؟"

"اپنا اپنا زیور شاہ جی!" سلیمان نے کہا۔

"اور جب واپس آئے تھے تو فالتو زیور کہاں سے لائے تھے؟ کچھ مال دیکھا ہے میں نے، جو نیا تھا۔"

سلیمان تذبذب کا شکار نظر آنے لگا۔

"ڈرنے کی کوئی بات نہیں، یہ مال چھینا تھا کسی سے؟"

سلیمان نے کہا۔ "نہیں شاہ جی! ملا تھا ایک گھر سے۔ گھر والوں کو ہم ساتھ لے آئے تھے۔"

"وہی میاں بیوی؟"

"ہاں جی، بڑے سخت جان تھے دونوں۔ کچھ نہیں بتاتے تھے پہلے تو مگر ہم نے اگلوا لیا۔ انھوں نے یہ سب ایک پروہت سے خریدا تھا۔ ایک ہزار نقد دیے تھے اور زیور دیا تھا۔"

محمد خان نے کہا۔ "کس لیے؟"

"انھیں کسی سے بدلہ لینا تھا۔ ان کی ایک بیٹی، شوہر کی ایک اور بیوی کی دو بہنوں کو باری باری اٹھا لیا گیا تھا۔ مقابلے پر ایک دادا تھا اور کوئی سیٹھ تھا۔"

"بے وقوف، پھر انھیں کیوں لے آئے تھے اپنے ساتھ؟" محمد خان نے برہمی سے کہا۔

"ان سے معلوم تو کرنا تھا شاہ جی کہ اس قسم کا اسلحہ کیوں جمع کیا تھا انھوں نے۔ اسی سیٹھ کے گھر میں موجود تھے وہ دونوں جہاں ہم گئے تھے۔ شوہر تو پاگل ہو گیا تھا۔ کہنے لگا کہ تم لوگ چلے جاؤ۔ ورنہ تم بھی مارے جاؤ گے۔ دستی بم نکال لیا تھا اس نے لیکن ہم نے اسے قابو کر لیا اور ساتھ لے آئے۔ اس سیٹھ کے گھر پھر جائیں گے تو انھیں ساتھ لے جائیں گے۔ ہم نے ان سے وعدہ کیا ہے۔ ان کے بتانے پر ہم پروہت کو لے آئے تھے پروہت نے ایک ہزار بھی واپس کر دیا اور زیور بھی اور ہاتھ جوڑتا رہا کہ یہ بات کسی کو معلوم نہ ہو۔ اس نے چوری کی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ مال کس کا ہے اور کہاں جا رہا ہے۔ اس نے تو بس موقع سے فائدہ اٹھایا تھا۔ ان میاں بیوی سے پیسے لے کر جگہ بتا دی تھی کہ ان کو اپنے دشمنوں سے نمٹنے کے لیے اسلحہ چاہیے تو خود نکال لیں۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ میاں بیوی نے کتنا مال نکالا۔"

"اچھا، وہ پروہت کہاں ہے؟"

"اسے بھی واپس چھوڑ آئے ہم۔" سلیمان نے کہا۔

"مگر وہ رہتا کہاں ہے۔ اگر دوبارہ ملنا ہو اس سے تو وہ کہاں ملے گا؟"

"اسی مندر میں، جہاں سے ہم اسے لائے تھے۔ شہر کے باہر اشوکا اسٹیل اور جنتا کیمیکل کے پیچھے والی آبادی میں۔ دونوں طرف نالہ ہے جس میں فیکٹری کا گندا مال بہتا ہے۔ درمیان میں چار پانچ ہزار مزدور رہتے ہیں۔" سلیمان نے کہا۔

اب میں نے کہا۔ "کیا آج رات کسی وقت ہم وہاں جا سکتے ہیں۔ ایسے کہ کسی کو بھی پتا نہ چلے۔ میں اس پروہت سے ملنا چاہتا ہوں۔"

جواب محمد خان نے دیا۔ "ہم آج رات اس سے ضرور ...ں گے۔" پھر اس نے سلیمان کو جانے کا اشارہ کیا۔

میں نے کہا۔ "یہ آدمی واقعی ہوشیار ہے۔ اس نے میرے ...نے سب کچھ بتا دیا اور بہت کچھ گول کر گیا۔"

"میرا خیال ہے کہ اس نے کچھ چھپایا نہیں۔"

"اس نے کسی کا بھی نام نہیں لیا۔" میں نے کہا۔ "نہ ان ...یاں بیوی کا جن کو یہ لوگ اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ نہ ان کی ...ی کا نہ کسی بہن کا اور نہ اس بدمعاش کا اور سیٹھ کا جو اصل ...رم ہیں۔"

محمد خان نے کہا۔ "نام غیر ضروری تھے۔ وہ سب سچ ...ا جو اس نے بتایا۔"

میں نے کہا۔ "کیا رات کو تم بھی ہمارا ساتھ دو گے؟"

محمد خان نے کہا۔ "اگر تم نہیں چاہتے تو نہ سہی۔"

"یہ بات نہیں۔ ہم وہاں بھیس بدل کے جائیں گے اور ...بی ہو سکتا ہے کہ لوٹ کر نہ آئیں۔"

"کیا مطلب، تم یہاں سے جانا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا۔ "ظاہر ہے ہم یہاں تمھارے مہمان بن کے ...ب تک رہ سکتے ہیں۔ ہمارے پاس وقت کم ہے اور ہمارے کام ...ی نوعیت بھی ایسی ہے کہ خود ہم اپنے بارے میں یقین کے ساتھ ...چھ نہیں کہہ سکتے۔ ہمارا واپس آنا یا نہ آنا حالات کے رحم و کرم پر رہتا ہے۔ ہم اس حقیقت سے بھی آنکھ نہیں چراتے کہ خوش قسمتی کے ...فاقات پر انحصار غلط بھی ہو سکتا ہے اور موت ہم میں سے کسی کا ...استہ کہیں بھی روک لے تو سارے ارادوں کو خاک میں ملا سکتی ہے۔ ...کثر یہ بھی ہوا ہے کہ ہم ایک ساتھ گئے مگر ایک ساتھ واپس نہ آ سکے ...ساتھ نہ رہ سکے۔ تقدیر کے راستے کہیں سے کہیں لے گئے۔"

"میں تمھارے مسائل کو سمجھتا ہوں لیکن آج رات کیا سب کا ...انا ضروری ہے؟" خان نے کہا۔ "میں غالب اور محسن کے معاملے میں ...سے اتفاق نہیں کر سکتا۔ ان کو ابھی یہاں رہنے دو، پھر یہ باتیں ہوتی ...ہیں گی۔ پہلے تم دلاور سے بات کر لو۔"

"اگر مجھے دلاور سے ملاقات کے لیے جانا پڑا۔ تو مجھے تمھاری ...دد کی ضرورت ہوگی خان صاحب!" میں نے کہا۔

"کیسی مدد؟ ...مل کے بات کرو۔"

"دلاور بہت مکّار آدمی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ تحفے سے اس ...کی مراد ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم ترلوینی سے میری حفاظت کے ...اور واپسی کی ضمانت لو۔ کوئی ایسا جال پھیلاؤ کہ دلاور چاہے بھی ...تو کوئی نقصان نہ پہنچا سکے اور ایسی کوشش کرے تو خود ...جال میں پھنس جائے۔"

خان نے میرے کندھے پر تھپکی دی۔ "تمھیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ دلاور سے تمھاری ملاقات میں تمھارے لیے کوئی خطرے کی بات نہیں ہوگی۔ تم خان کے مہمان ہو۔ یہ بات میں ترلوینی کو اپنے طور پر اچھی طرح سمجھا چکا ہوں۔ چودھری دلاور کو ترلوینی سمجھا دے گا۔"

"تم اسے نہیں جانتے۔ وہ شیطان کو بھی چکّر دے سکتا ہے۔ اپنے باپ کے ساتھ بھی دھوکا کر سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"حفاظتی انتظامات کی ذمّے داری مجھ پر چھوڑ دو۔ کیا تم اکیلے جاؤ گے؟"

"ہاں، دلاور سے ملنے کے لیے میں اکیلا ہی جاؤں گا لیکن آج رات اس پروہت کے ساتھ ملاقات کے لیے میرے ساتھ کون کون جائے گا، اس کا فیصلہ میں مشورے کے بعد کروں گا۔" میں نے کہا۔

ایک بار پھر خان نے وائرلیس فون پر ترلوینی کا نمبر ملایا۔ ریسیور اسی خوش آواز آپریٹر یا سیکریٹری نے اٹھایا۔ چند سیکنڈ بعد میں نے ترلوینی کی آواز سنی۔

"میں سکندر بخت بول رہا ہوں۔" میں نے بے خوفی سے اپنے اصلی نام کا اعلان کیا۔

"چودھری دلاور سے بات کرو۔" ترلوینی نے بیزاری سے کہا۔

"کیا حال ہے اپنے سکندر صاحب!" چودھری دلاور نے خوش دلی سے کہا۔ "کہاں سے بول رہے ہو؟"

"اپنے منہ سے، تمھاری آواز کہاں سے برآمد ہو رہی ہے؟" میں نے کہا۔

وہ ہنسا۔ "تمھاری قسمت پر مجھے واقعی رشک آتا ہے۔ کوئی نہ کوئی آسرا مل ہی جاتا ہے تمھیں۔"

میں نے کہا۔ "خدا نے ہمیں سہاروں سے کبھی مایوس نہیں کیا۔ کیونکہ ہم نے کبھی اس سے امید کا رشتہ نہیں توڑا۔"

"یہ سب کہنے کی بات ہے اپنے سکندر صاحب! بکرے کی ماں بھی خیر مانگتی رہتی ہے لیکن اسے چھری سے ہمیشہ نہیں بچا سکتی۔"

"یہی بات میں تمھارے لیے کہوں گا تو بکرے کا نہیں، سؤر کا حوالہ دوں گا۔" میں نے کہا۔ "اب یہ بتاؤ کہ اچانک تمھیں مجھ سے ملنے کی ضرورت کیوں پیش آگئی؟ ہماری ملاقات کو زیادہ عرصہ تو نہیں گزرا۔"

"بات کچھ بھی نہیں سکندر صاحب! آپ کے لیے کسی نے وطن سے ہماری معرفت تحفہ بھیج دیا۔" دلاور بولا۔ "ویسے تو ہم دشمن ہیں مگر کبھی کبھی مروّت بھی کر جاتے ہیں۔ جیسے تم نے بس مروّت میں اپنے وعدے کا لحاظ رکھا۔ تم ہمیں گولی بھی مار سکتے تھے۔ ترلوینی حیران ہوا تھا لیکن میں نہیں۔"

"چنانچہ جواب میں تم خیر سگالی کے جذبات کا مظاہرہ کرنا

چاہتے ہو؟" میں نے طنز سے کہا۔

"ہاں یہی سمجھ لو، ویسے بھی جو تحفہ کسی نے تمھارے لیے بھیجا ہے وہ اپنے کس کام کا۔" دلاور نے کہا۔

"میں نے کبھی تمھارے الفاظ کا مطلب وہ نہیں سمجھا جو تم نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ میں نے تمھاری نیت کو سمجھا اور دھوکے میں نہیں آیا۔ یہ تحفے والی بات بھی کوئی فریب کاری ہے۔ لیکن میں پیچھے نہیں ہٹوں گا۔ میں یہ تحفہ وصول کرنے آؤں گا اس کا فیصلہ وقت کرے گا کہ جواب میں تمھیں کیا تحفہ دیا جائے۔"

"تم اپنے ایم آر ایس کے لشکر کے ساتھ آؤ، اگر تمھیں کوئی ڈر ہے۔" دلاور نے کہا۔

میں نے کہا: "میں اکیلا آؤں گا مگر وقت اور مقام کا تعین میں کروں گا۔ آج میں مصروف ہوں۔"

دلاور ہنسا: "تمھارے کمانڈوز ابھی اس قابل نہیں ہوں گے کہ اپنی ٹانگوں پر سیدھے کھڑے ہو کے چل سکیں۔"

میں نے کہا: "میں پھر واضح کر دوں کہ میرے ساتھ کوئی نہیں آئے گا۔"

"وہ کیا نام ہے ان کا؟ اپنے شیروانی صاحب، انھیں تو لے ہی آؤ۔ ان کے بغیر تمھاری جوڑی پوری نہیں ہوتی۔" دلاور بولا۔

میں نے کہا: "یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اکیلا آ جائے لیکن تمھیں بہت مایوسی ہو گی اسے دیکھ کر۔ دل چاہے تو اس سے مقابلہ کر کے دیکھ لینا۔ محسن کا حوصلہ بھی وہی ہے اور محسن بھی۔"

"اس کا حوصلہ ہم ضرور دیکھیں گے اپنے سکندر اعظم صاحب! اور تمھارا حوصلہ بھی۔ بہت جلد تمھیں احساس ہو جائے گا کہ وقت اب کس کا ہے۔ تم بہت آگے نکل آئے تھے۔ شاید اب تمھاری واپسی کا سفر شروع ہو گا۔ بشرطیکہ تم نے واپسی کا یہ آخری راستہ بھی خود ہی بند نہ کیا۔" دلاور نے کہا اور لائن کٹ گئی۔ اس نے ریسیور رکھ دیا تھا اور اس کے آخری الفاظ کی بازگشت باقی رہ گئی تھی... یکلخت دلاور کے لہجے میں اس کی فطرت کی تمام سفاکی اور درندگی بولنے لگی تھی۔ اس کی دھمکی میں چھپا ہوا الٹی میٹم کسی نامعلوم خطرے کا الارم بن گیا تھا۔

محمد خان نے کہا: "تم پریشان ہو گئے ہو؟"

میں نے کہا: "ہاں، میں اس کی بات سمجھ نہیں سکا۔ یہ اندازہ نہیں کر سکا کہ اس کے ذہن میں کیا ہے۔ خیر، معلوم ہو جائے گا وقت آنے پر۔ تم کل اس سے میری ملاقات کا بندوبست کراؤ۔"

"میں ترلوینی سے بات کر لوں گا۔" خان نے کہا۔

"اب شام تک میرے کچھ کام ہیں۔ جو تم کرا سکتے ہو۔ ایک تو ہم سب کے لیے یہاں سے نکلنے کا انتظام کرنا ہو گا۔ ہم آپس میں مشورہ کر کے تمھیں بتا دیں گے کہ سفر کے لیے کس قسم کی گاڑی درکار ہو گی۔ ہم پیسہ خرچ کر سکتے ہیں مگر بمبئی میں گھوم پھر کر اپنے سارے کام خود نہیں نمٹا سکتے۔"

خان نے کہا: "تمھارے سب کام ہو جائیں گے۔ کام بتاؤ۔"

میں نے کہا: "ہم سب اپنا یہ حلیہ کئی بار بدل چکے ہیں۔ کراچی اور لاہور میں ہم میک اپ کرنے والوں کی خدمات حاصل کر لیتے تھے۔ ایک عورت نے یہاں بھی ہماری مدد کی تھی لیکن وہ بیچاری اس جرم کی پاداش میں اپنی جان سے گئی۔"

"میک اپ کرنے والے یہاں بہت ہیں۔"

میں نے کہا: "ہمارا چہرہ، لباس سب کچھ ایسا ہو جائے کہ ہم آسانی سے کہیں بھی چلے جائیں۔ میں اور محسن فرانسیسی روانی سے بولتے ہیں۔ انگریزی سب کو آتی ہے۔ اگر ہم غیر ملکی سیاح بن جائیں تو ہمارے لیے سارے ہندوستان میں کہیں کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہو سکتا لیکن ہمارے پاس غیر ملکی پاسپورٹ ہونے چاہئیں۔ کیا وہ بازار میں ملتے ہیں؟"

"خریدار کو بازار میں سب کچھ مل جاتا ہے۔ مانگنے والے کو جینے کا حق بھی نہیں ملتا۔" خان صاحب نے ایک فلسفیانہ سی بات کی۔

میں نے کہا: "آج رات کسی خاص تیاری کی ضرورت نہیں۔ میرے ساتھیوں میں سے کوئی ایک میرے ساتھ جائے گا۔"

"ساتھ جائے گی۔" خان صاحب نے تصحیح کے انداز میں کہا۔

میں نے تسلیم کرتے ہوئے کہا: "چونکہ ہمیں ایک ہندو پروہت سے ملنا ہے اس لیے ہم سیدھے سادے ان پڑھ ہندو نظر آنا پسند کریں گے۔ سلیمان کا کام ہمیں اس کے گھر تک پہنچانے کے بعد ختم ہو جائے گا۔"

خان نے سر ہلایا: "جیسی تمھاری مرضی، میں اب شام کو ملوں گا۔"

میں لوٹ کر اپنے کمرے میں آیا تو رابعہ صوفے پر فراغت سے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے پیر سامنے سینٹر ٹیبل پر پھیلا رکھے تھے اور وہ بیکاری اور بیزاری کا شکار تھی۔

میں نے کہا: "کیا بات ہے، شاخِ آشیاں پر تنہا بلبل کی طرح اداس کیوں بیٹھی ہو؟"

رابعہ نے کہا: "اور کیا کروں، تمھارا کچھ پتا چلتا ہے کہ کہاں ہو اور کیا کرتے پھر رہے ہو۔"

میں نے کہا: "دیگر طائرانِ خوش نوا کیا ہوئے جن کو صحنِ چمن میں نغمہ سرا چھوڑ گیا تھا تمھاری دلنوازی کے لیے۔"

رابعہ نے مجھے گھور کے دیکھا: "اتنی مشکل شاعری کیوں سوجھ رہی ہے؟"

میں اس کے قریب قالین پر بیٹھ گیا: "خان نے پوچھا تھا رابعہ کون ہے۔ میں نے کہا رابعہ عنوان ہے اس کتابِ عشق کا جس کا ہر باب ایک دفترِ بے حساب ہے۔ اگر میں اس کے جمالِ لب و رخسار کی بات کروں، اس کے حسنِ بے مثال کے، اندازِ ناز اور ادائے عشوہ گری کے کمال کا ذکر کروں، اس کے نظارۂ جمال کا اور رعنائیِ خیال کا بیان کروں تو قصیدہ در قصیدہ، غزل در غزل، ہر موضوعِ سخن پر ایک دیوان مرتب ہونے میں عمر تمام ہو جائے۔"

رابعہ نے اپنا سر پکڑ لیا: "جھوٹ بولنے اور بے مقصد بولنے میں تم نے واقعی کمال حاصل کر لیا ہے۔"

میں نے کہا: "کبھی کبھی تو آمد ہوتی ہے اور تم ٹوک دیتی ہو حالانکہ دل ہی دل میں تم بہت خوش ہو میری باتوں سے۔"

رابعہ بگڑ کے کھڑی ہو گئی: "اچھا تم بولتے رہو، میں جا رہی ہوں۔"

میں نے اُسے ہاتھ سے پکڑ کے اپنے پاس بٹھا لیا: "دراصل غصے میں تم زیادہ اچھی لگتی ہو مجھے۔ بہت عرصہ ہو گیا تھا تمھیں آتش فشاں دیکھے، یہ لوگ کہاں ہیں؟"

"باہر نکلے ہیں۔" رابعہ نے کہا: "کہتے تھے لیٹے لیٹے اور ایک ہی کمرے میں پڑے پڑے تھک گئے ہیں۔"

"آج رات ہم بھی نکلیں گے، میں اور تم۔"

"کہیں گھومنے چلیں گے؟" رابعہ نے پُرامید لہجے میں کہا۔

"یہی سمجھ لو۔"

رابعہ کی آنکھوں میں شوق اور تجسس کی چمک ماند پڑ گئی۔ "صاف کہو نا کہ کسی کام سے جانا ہے؟"

میں نے کہا: "کام تو برائے نام ہے اور ہم دونوں ہوں گے تو کام سے پہلے اور کام کے بعد باتیں ہوں گی اور فرصت ہوئی تو ساری رات ملے گی گھومنے پھرنے کے لیے۔ اجنبی شہر کی سڑکوں پر آوارہ گردی کریں گے۔"

رابعہ کی دلچسپی پھر جاگ اُٹھی۔ میں نے اُسے خان سے ہونے والی گفتگو کا مختصر احوال سنایا۔ دلاور سے ہونے والی بات سن کے وہ متفکر ہو گئی۔

"تم واقعی اکیلے جاؤ گے؟"

"ہاں میری حفاظت کی ذمے داری خان نے قبول کر لی ہے۔"

"سکندر! ابھی دو دن پہلے ہی دلاور اور ترلوینی تمھارے ہاتھوں زک اُٹھا چکے ہیں۔ وہ زخم خوردہ سانپ کی طرح وار کرنے کے لیے تڑپ رہے ہوں گے۔ تم ان کے اکسانے پر مت آؤ، یہ سب جھوٹ ہے، بھلا پاکستان سے تمھارے لیے کیا تحفہ آ سکتا ہے اور وہ بھی دلاور کی معرفت؟"

میں نے کہا: "مجھے دلاور کی بات بے معنی نہیں لگتی۔ اس کی بات کو جتنا میں سمجھ رہا ہوں اتنا کچھ ہے۔ میرا ذہن تمام پُرخطر امکانات کو شمار کر سکتا ہے۔ ایک دشمن جو میرے خون کا پیاسا ہو مجھے پھول بھی بھیجے گا تو میرے سہرے کے لیے نہیں۔ وہ سہرا بھی بھیجے گا تو میں سمجھوں گا کہ اس نے میری قبر پر چڑھانے کے لیے پھولوں کی چادر ارسال کی ہے۔ اس کا تحفہ کیسا ہو گا اور کیا ہو گا، یہ میں تصور کر سکتا ہوں۔"

"مجھے بھی تو کچھ بتاؤ۔" رابعہ نے کہا۔ اس کا چہرہ خوف کے احساس نے بے جان کر دیا تھا۔

میں نے کہا: "نہیں، تم خود بھی تو سوچ سکتی ہو۔ ہو سکتا ہے میرا خیال بے بنیاد ہو، میں کیوں تمھیں دہشت زدہ کروں۔"

اچانک رابعہ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کی گرفت اتنی سخت تھی کہ میں اس کی اعصابی کشیدگی کا اندازہ کر سکتا تھا: "سکندر! کہیں... کہیں وہ... انھیں تو اغوا نہیں کر لائے ہیں؟"

میں نے پورے اعتماد کے ساتھ جھوٹ کا سہارا لیتے ہوئے کہا: "تمھارا مطلب ہے شہلا کو..."

"ان سے کچھ بعید نہیں۔" رابعہ نے کانپتے ہوئے کہا۔ "آخر بیگم رضوی اور شہلا غائب کیسے ہو گئی ہیں۔ اتنے پُراسرار طریقے پر۔"

میں ہنس پڑا: "پُراسرار بات کیا ہے ان کے مکان بدلنے میں؟ انھوں نے کسی وجہ سے وہ مکان فروخت کر دیا۔ پُرانا مکان تھا۔"

"تم مجھے جھوٹ سے بہلا رہے ہو... اگر یہ تشویش کی بات نہ ہوتی تو منظر پریشان کیوں ہوتا؟"

میں نے مزید جھوٹ بولتے ہوئے کہا: "منظر پریشان کہاں تھا، خفا تھا کہ مجھے غیر سمجھا۔ شہلا بے وقوف نہیں ہے کہ ایسے منظر کو بھی اطلاع نہ دے اور لاہور میں روپوش ہو جائے۔"

"یہی تو میں بھی کہہ رہی ہوں، شہلا ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ گیا ہو گا۔"

"کیسا حادثہ؟ خواہ مخواہ خود کو پریشان مت کرو۔"

"سکندر! بیگم رضوی اور شہلا کی حفاظت کرنے والا کون تھا؟ ہمارے یہاں آ جانے کے بعد کیا ہوا، یہ ہم نہیں جانتے۔" رابعہ نے کہا۔

"دیکھو، ایسی باتیں تم محسن کے سامنے کرو گی تو خود سوچو کہ نتیجہ کیا نکلے گا؟" میں نے کہا۔

"مگر ایسا ہو سکتا ہے۔"

"خدا کرے کہ ایسا نہ ہو لیکن موجودہ حالات میں ہر بُری خبر سننے کے لیے میں ہر وقت تیار رہتا ہوں۔ جب منظر سے بات ہوئی تھی تو قدرتی طور پر سب سے پہلے میرے ذہن میں یہی خیال آیا تھا کہ کہیں شہلا اور بیگم رضوی کسی خوف سے

روپوش نہ ہوگئی ہوں۔ ممکن ہے انھیں دلاور اینڈ کمپنی کی طرف سے دھمکی ملی ہو یا کوئی خطرہ محسوس ہُوا ہو۔ وہ پولیس کے پاس نہیں جاسکتی تھیں۔"

"مگر منظر کے پاس تو جاسکتی تھیں۔"

"ہاں، یہی ایک بات مجھے بھی کھٹکتی ہے یہ ہوسکتا ہے کہ خاموشی سے مکان بیچنے کے بعد ان کا یہی ارادہ ہو لیکن وہ اپنے ارادے میں ناکام رہی ہُوں۔ منظر بھی بے وقوف نہیں ہے بس اُس نے ہماری حوصلہ شکنی سے اجتناب کیا اور ایسی کوئی بات کہنے سے گریز کیا جو ہمیں پریشان کردے یا ہماری مشکلات میں اضافے کا سبب بن جائے۔"

رابعہ کو سمجھانا بے سود تھا۔ اپنے طور پر اُس نے مفروضے کو یقین بنالیا تھا اور یہ تسلیم کرنے پر تیار نہ تھی کہ شہلا خیریت سے بھی ہوسکتی ہے۔ ڈر مجھے بھی تھا لیکن میں دیگر امکانات کو یکسر نظر انداز بھی نہیں کرسکتا تھا۔

میں نے کہا "رابعہ! تم بنا بنایا کھیل بگاڑ دوگی۔ بڑی مشکل سے محسن ٹھیک ہُوا ہے، وہ پاگل ہوجائے گا۔"

رابعہ نے آنسوؤں کو پینے کی ناکام کوشش کی۔ باہر سے محسن اور غالب کے ہنسنے کی آواز پر وہ ایک دم اُٹھی اور باتھ رُوم میں گھس گئی۔ میں قالین پر دراز ہو کے چھت کو گھورنے لگا۔

"تو یہاں اکیلا کیوں پڑا ہے بھائی؟" محسن نے اندر آکر کہا۔

میں اُٹھ بیٹھا "مجھے کسی کے ساتھ کہاں پڑا ہونا چاہیے اس وقت؟"

غالب نے افسوس سے سر ہلایا "تجھ سے کسی نے نہیں کہا کہ چلتے ہو تو چمن کو چلیے۔"

میں نے کہا "گل و بلبل چہک رہے تھے وہاں... کہیں اُلو بول رہے تھے۔ ہم شرفا کی طرح باتیں کر رہے تھے یہاں۔"

محسن نے رابعہ کو آتے دیکھ کر کہا "ہم تو گندی باتیں کرتے ہی نہیں کہ بعد میں مُنہ دھونا پڑے۔"

"آئینہ دیکھ، تیرا ابھی مُنہ لال ہو رہا ہے" میں نے کہا۔

جو اثر محسن کی بات کا رابعہ پر ہُوا تھا، اس سے زیادہ گل پر میری بات کا ہُوا، وہ بالکل غیر ارادی طور پر ایک انگلی سے اپنی لپ اسٹک کو چھُو کر دیکھ رہی تھی جو ایک بے ضرر سی زنانہ عادت کے سوا کچھ نہ تھا۔ جب نازو اور غالب نے کھی کھی کرکے ہنسنا شروع کیا تو گل کو احساس ہُوا، رابعہ کے ساتھ وہ بھی جھینپ گئی۔

"تم لوگوں کی زبان جب چلنے لگتی ہے تو بے مہار ہو جاتی ہے۔" رابعہ نے مصنوعی غصّے سے کہا۔

مگر گل نے بُرا مانے بغیر کہا "چھوڑیں باجی! آپس کا مذاق ہی تو ہے۔" اُس نے بالواسطہ طور پر تسلیم کرلیا اور ہم سے بھی تسلیم کرالیا کہ اس کے نام کو محسن سے وہی نسبت ہے جو رابعہ کو میرے نام سے یا نازو کو غالب کے نام سے ہے۔ اس اعلان کے لیے ہم میں سے کوئی تیار نہ تھا۔ رابعہ کے لیے میری چاہت اور غالب کی نازو سے محبت واقعی ناقابلِ تردید حقیقت تھی لیکن اچانک گل نے خود کو محسن کے ساتھ ہماری صف میں شامل کرلیا تھا۔

ایک لمحے کے لیے ہم سب خاموش ہوگئے۔ میں نے رابعہ کی طرف دیکھا کہ کہیں اس کا ردِ عمل حد سے نہ بڑھ جائے، جس اندوہ ناک خبر کو ہم نے مصلحت کا تقاضا سمجھ کے چھپا لیا تھا وہ مجھے بھی احساسِ جُرم میں مُبتلا کر رہی تھی اور ان حالات میں گل کا رویّہ یقیناً زیادہ تکلیف دہ محسوس ہوتا تھا۔

اس سے پہلے کہ خاموشی کا وقفہ ناگواری کا تاثر پیدا کرتا، میں نے اپنے لہجے میں بشاشت پیدا کر کے کہا "تم سب تو عقل کے ساتھ گھاس چر آئے ہو مگر ہم نے تو چمن کی ہوا بھی نہیں کھائی۔ میرا حال بھُوک سے پتلا ہو رہا ہے۔"

محسن نے کہا "واقعی، بھُوک تو مجھے بھی لگ رہی ہے۔ کیوں بھئی گل، تمھیں بھُوک لگ رہی ہے نا؟"

گل نے شرما کے کہا "جب مجھے لگ رہی ہے تو تمھیں بھی لگ رہی ہوگی۔"

میں نے کہا "طلب فرماتے ہیں داروغۂ مطبخ کو..." اور بٹن دبا کے کہا "کیا کھانا تیار رہے ؟"

"یس سر!" کسی نے جواب دیا "آپ حکم کریں۔"

"حکم کے بغیر ہی لے آؤ تو اچھا ہے۔" میں نے کہا اور بٹن چھوڑ دیا "کیا زبردست روم سروس ہے۔"

"اتنی اچھی سروس تو اُس ہوٹل میں بھی نہیں تھی، جہاں میں رات ٹھہری تھی۔" رابعہ نے کہا "نیند تو آئی نہیں تھی تین بار کافی منگوائی۔ ہر مرتبہ یاد دہانی کرانے کے باوجود انھوں نے انتظار کرنا پڑا۔"

گل نے کہا "میں کافی تو پیتی نہیں، جاگ رہی تھی تو سوچا چائے پی لوں۔ میں نے روم سروس سے کہا کہ کسی کو لے آؤ چائے وغیرہ۔ شاید انھوں نے آدھی بات سُنی تھی دیر بعد ویٹر آیا اور ٹرے رکھ گیا۔ تین چار قسم کی شراب پتا نہیں کیا تھا۔ میں اُس کے پیچھے دوڑی کہ اے بھائی! یہ بیہودہ حرکت ہے۔ وہ کاریڈور میں تھا اور میں ننگے پاؤں گئی تھی۔ وہ مجھے غور سے دیکھتا رہا اور پھر بولا "میرا مشورہ ہے بس کہ آپ اور نہ پیئیں، چلیں میں آپ کو کمرے میں چھوڑ آؤں۔"

گل نے اتنے بھولے پن سے یہ بات سُنائی کہ ہم سب ہنستے ہنستے بُرا حال ہوگیا۔ کسی بڑے ہوٹل میں وہ کبھی اکیلی نہیں رہی تھی۔ شاید کسی بھی ہوٹل میں قیام کا یہ پہلا موقع تھا۔

نازو نے اچانک کہا "سکندر رہتم نے فون نہیں کیا؟"

میں نے سنبھل کے کہا "فون... نہیں... یہاں تو فون ہے ہی نہیں۔"

"لائن تو آرہی ہے۔" نازو نے کہا۔

"ہاں پہلے تھا۔" میں نے کہا "خان نے بتایا ہے کہ پہلے جو یہاں رہتا تھا، وہ اچانک باہر چلا گیا ادائیگی کیے بغیر، آج رات کو باہر جا کے کہیں کوشش کریں گے۔"

"میں چلوں گی تمھارے ساتھ۔"

"کیوں، تمھارے بھیّا نے فون لگوالیا ہے کیا کہ نمبر ملاتے ہی وہ کہیں گے ہیلو!"

"ہم منظر سے بات کریں گے، کسی بھی کال آفس سے کال بُک کرالیں گے۔" نازو نے کہا۔

گل اپنے پیر کے انگوٹھے کو بلاوجہ کھُرچ رہی تھی چنانچہ مجھے نازو کو اشارے سے خاموش کرنے کا موقع مل گیا۔ اُس نے پہلے میری اور پھر رابعہ کی صورت کو حیرانی سے دیکھا۔ اسی وقت دروازہ کھول کے کھانا لانے والے نازل ہوگئے اور محسن نے یہ سمجھا کہ شاید انھی کی وجہ سے میں نے نازو کو خاموش ہوجانے کے لیے کہا ہے، ورنہ نازو سے زیادہ وہ حیران ہوتا کہ میری اس حرکت کا کیا مقصد تھا۔

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ شہلا کا ذکر آنے سے پہلے ہی بات ٹل گئی۔ کھانے کے دوران میں نے انھیں اپنے تمام کے پروگرام کی تفصیلات سے آگاہ کیا۔ غالب اور محسن نے میرا یہ مشورہ خاموشی سے مان لیا کہ انھیں فی الحال آرام کے سوا کچھ نہیں کرنا چاہیے۔ گل اور نازو نے بھی اپنے اپنے بیماروں کا خیال رکھنے کی تجویز سے اختلاف نہیں کیا اور یوں مجھے اور رابعہ کو ایک معمولی سے کام کے لیے ساتھ جانے کی اجازت مل گئی۔ میں نے انھیں یقین دلایا تھا کہ فی الحال اس بلڈ ہاؤنڈ سے مل کر اس کا گھر دیکھنے کے سوا ہم کچھ نہیں کریں گے۔

شام کو سورج غروب ہونے کے بعد سلیمان نے دروازے پر دستک دی۔ میں نے اُس سے باہر جا کے بات کی۔

"شاہ جی نے کہا ہے کہ آپ تیار ہوجائیں۔"

"میں نے کہا "ابھی سے؟"

سلیمان نے کہا "جائیں گے تو ہم رات نو بجے لیکن ایک آدمی آیا ہے، کچھ سامان لے کر... آپ نے ہی کہا تھا شاید..."

میں نے کہا "میں سمجھ گیا، وہ آدمی کہاں ہے؟"

سلیمان بولا "آپ میرے ساتھ آئیں۔"

رابعہ اور میں اس کے پیچھے چلتے ہوئے محمد خان کے کمرے میں گئے۔ راستے میں سلیمان سے مجھے ایک سوال کرنے کا موقع مل گیا "سلیمان! یہ تم اپنے استاد کو شاہ جی کیوں کہتے ہو، نام تو محمد خان ہے اُن کا؟"

سلیمان نے مجھے سپاٹ نظروں سے دیکھا "یہاں سب کے لیے وہ شاہ جی ہیں۔"

میں نے اس نکتے پر اختلاف نہیں کیا۔ ابھی خود ہم یقین کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ وہ محمد خان ہے اور شاہ جی نہیں ہے۔

خان کے کمرے میں ایک عجیب الخلقت چیز صوفے پر رکھی ہوئی تھی۔ یہ چیز قد میں ساڑھے چار فٹ سے زیادہ نہ تھی، اس کے جسم پر ایک شیروانی تھی جو شاید بیس تیس سال پہلے اس کے جسم پر فٹ ہوگی مگر اس عرصے میں وہ خود سکڑ کر نصف رہ گیا تھا یا پھر شیروانی کسی اور کی تھی جو سائز میں دُگنا تھا۔ یہ بھی سمجھا جاسکتا تھا کہ اتنی قدیم شیروانی ایک خاندانی ترکہ تھی اور اس کے مقابلے میں آبا و اجداد یقیناً بہتر صحت کے مالک تھے۔ شیروانی کے اصل رنگ کا اندازہ کرنا بھی مشکل تھا۔ امتدادِ زمانہ کے باعث رنگ اُڑ گیا تھا اور جو باقی تھا اس میں میل کا رنگ شامل ہوچکا تھا۔ شیروانی کے ساتھ اُس نے اپنے سر پر ایک ترکی ٹوپی رکھی تھی جس کا پھُندنا نہ جانے کس دَور میں ٹوپی سے جُدا ہوگیا تھا۔ اس کی جگہ اب نوک سی باقی رہ گئی تھی۔ شیروانی کے نیچے جو پتلون تھی، وہ بھی کثرتِ استعمال سے پاجامے کی شکل اختیار کرچکی تھی۔ یہ پتلون بھی شیروانی کے رنگ کی نظر آتی تھی۔ نہ جانے کیوں مجھے خیال آیا کہ اس شیروانی کے نیچے قمیص نہیں ہوگی۔ اس کی کوئی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اس کی ہیئت کذائی میں ٹھوڑی پر آویزاں بکرے جیسی چُگی داڑھی ایک دلچسپ اضافہ تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک پتلی سی چھڑی تھی جسے بغل میں دبا کے وہ بڑی پھُرتی سے مصافحہ کرنے کے لیے اُٹھا۔

"بندگی حضور... بندگی... تسلیمات بیگم صاحبہ!" اُس نے جھُک کر کورنش بجا لاتے ہوئے کہا۔ اُس نے بڑی عقیدت سے میرا ہاتھ تھام کر چھوڑ دیا۔

میں نے محظوظ ہوکے خان کی طرف دیکھا جو تخت پر نیم دراز مُسکرا رہا تھا "آپ کی تعریف؟" میں نے کہا۔

"آپ کا بندۂ بے دام۔" اُس نے اپنی منحنی کپکپاتی آواز میں کہنا شروع کیا۔ "کہلاتا ہے شہزادہ گلفام۔"

میں نے اپنی ہنسی کو روک لیا۔ "شہزادہ گلفام ہے تمھارا نام؟"

"والدین نے جو رکھا نام، بن گیا وہ ایک الزام۔" اُس نے شعر پڑھنے کے انداز میں کہا۔ "جہاں میں ہُوا بدنام جیسے ہُوا مقبولِ خاص و عام۔"

میں نے کہا۔ "بہت خوب! طبیعت شاعرانہ پائی ہے تم نے۔"

اُس نے خوش ہو کے پہلے لال دانتوں کی نمائش کی۔ "گرچہ کلام اپنا نہیں لافانی۔ فدوی تخلص کرتا ہے یوسف ثانی۔ طبیعت ہے ایسی طوفانی جیسے طوفان میل کی روانی، آپ سمجھیں تو بڑی قدردانی۔"

"واہ واہ...!" میں نے لطف لیتے ہوئے کہا۔ "نام کی رعایت سے تخلص بھی خوب ہے... یوسف ثانی۔ شاعری کے علاوہ آپ کیا کرتے ہیں؟"

"گر حاصل ہو یہ سعادت، فدوی کر سکتا ہے ہر خدمت۔" اُس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر سر جُھکایا۔ "غلط بیانی نہیں اپنی عادت، دیں گے شاہ صاحب شہادت۔"

محمد خان نے جو تخت پر نیم دراز اس تماشے کو بے نیازانہ دیکھ رہا تھا، مجھے قریب بلا کر کان میں کہا۔ "بھئی اس میں کوئی شک نہیں، یہ بہت کام کا آدمی ہے اور بہت بھروسے کے قابل۔ اس کی صورت اور حُلیے پر مت جاؤ، یہ جن ہے جن، بالکل الٰہ دین کے چراغ کا جن۔"

"دیکھنے سے تو مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ کارٹون ہماری کیا مدد کر سکتا ہے۔" میں نے حیرانی سے کہا۔ "لیکن تم کہتے ہو تو مان لیتا ہوں۔"

"چلو تم اس سے میک اَپ کرا کے دیکھو۔" خان نے مشورہ دیا۔

میں نے واپس آ کے کہا۔ "حضرت یوسف ثانی! آپ اس ناچیز کا چہرہ بدل سکتے ہیں، اس طرح کہ کوئی ہمیں شناخت نہ کر پائے؟"

یوسف ثانی نے پھر آغا حشر کے ڈرامے کے کسی کردار کی طرح بولنا شروع کیا۔ "ہمارے ہاتھوں میں ہے وہ ہُنرمندی، بڑھا دیں یا گھٹا دیں آپ کی بُلندی۔ خدا کے بندے کو بنا دیں خدا کی بندی۔"

رابعہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تو دکھایئے اپنا کمال۔"

یوسف ثانی نے چاروں طرف سے میرا جائزہ لیا جیسے میں آدمی نہیں مینارہ ہُوں جسے وہ چٹکی بجا کے گنبد بنا دے گا۔ وہ نیم پاگل نظر آنے والا شخص نہ اس بات کی پروا کرتا تھا کہ دیکھنے والے اسے کس نظر سے دیکھتے ہیں اور کیا کہتے ہیں۔ بات کرتے ہوئے اس کی متانت میں ذرا فرق نہیں آتا تھا اور اگرچہ وہ اسٹیج کا ایک چلتا پھرتا مضحکہ خیز کردار تھا مگر اس کردار کو وہ نہ جانے کب سے نبھا رہا تھا۔ اب جو کچھ وہ کرتا تھا وہ اداکاری نہیں اس کی عادت اور فطرت بن چکی تھی۔ مجھے اب اس پر ہنسی نہیں آ رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ آخر وہ کیا حالات ہوں گے جس نے اس کی شخصیت کو ایک کارٹون بنا دیا۔ ماں کے پیٹ سے تو کوئی بھی کارٹون بننے کے لیے پیدا نہیں ہوتا۔

اُس نے صوفے کی سائیڈ سے ایک سوٹ کیس اُٹھایا جو ابھی تک میری نظر سے اوجھل تھا۔ یہ سوٹ کیس بھی اُس کی مجموعی شخصیت سے میچ کرتا تھا اور قدامت میں بھی اس کی شیروانی یا ترکی ٹوپی سے کم نہ تھا۔ چمڑے کی اس صندوقچی کے اوپر اُس نے واضح سفید حروف میں لکھا تھا۔ "شہزادہ گلفام خادم خاص و عام، التخلص بہ یوسف ثانی بقلم خود۔"

میں نے کہا۔ "یہ بقلم خود کیا ہے، یہ دستخط ہیں آپ کے؟"

اُس نے رنجیدہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ "اپنے ہاتھوں سے لکھا ہے احقر نے یہ نام، کسی خوش نویس نے نہیں کیا ہے یہ کام۔"

میں حیران بھی ہُوا اور شرمندہ بھی کیونکہ بلاشبہ نام کسی پینٹر کے ہاتھ کا لکھا ہُوا لگتا تھا۔ اُس نے اپنی بقچی میں سے نہ جانے کیا کچھ نکالا۔ وہ ایک ٹیوب یا کوئی ڈبیا نکالتا تھا اُس میں سے کچھ میرے چہرے پر لگاتا تھا اور اسے واپس رکھ دیتا تھا۔ اس کی تشکی نظریں بار بار اپنی صندوقچی کی طرف جاتی تھیں جیسے اسے ڈر ہے کہ کہیں رابعہ اسے کھول کر نہ دیکھ لے یا اس میں سے کوئی چیز نہ نکال لے۔ وہ اب خاموشی سے اپنے کام میں لگا ہُوا تھا۔ رابعہ کی صورت پر نظر آنے والی حیرانی سے میں اندازہ کر سکتا تھا کہ میری صورت کیسے بدلتی جا رہی ہے۔ آخری کام اُس نے یہ کیا کہ میرے سر پر ایک جھلی سی منڈھ دی اور پھر کناروں پر کوئی لوشن لگا دیا۔ رابعہ بے اختیار ہنس پڑی مگر یوسف ثانی کے انہماک میں فرق نہ آیا۔ اس نے میرے ماتھے پر تلک لگا کے مجھے آئینے کے روبرو کر دیا۔

"واہ مہاشے، کیا روپ نکالا ہے۔" رابعہ نے کہا۔ "پرنام کرو اپنے گرو کو۔"

میں اپنی بدلی ہوئی صورت اور گنجے سر کو دیکھتا رہا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اب گلے میں جینو ڈال کے اور دھوتی پہن کے میں کسی بھی مندر میں جا بیٹھتا تو پجاری نظر آتا۔

"تم نے تو کمال کر دیا مسٹر یوسف ثانی۔" میں نے کہا۔

اُس نے چونک کر کہا۔ "مسٹر نہ کہیں مجھے جناب عالی، بندہ سمجھتا ہے اسے گالی۔ اس میں کیا بات ہے کمال والی۔ ...ں نے آپ کی صورت بدل ڈالی، فقیر کی جھولی تو ابھی تک ...خالی۔"

میں اُس کا مطلب سمجھ گیا۔ "یوسف ثانی! تمھیں حقِ محنت ...یم حاتمانہ اتنا ملے گا کہ تمھیں کوئی شکوہ نہیں رہے گا لیکن ...لے اپنا کام ختم کر لو۔"

رابعہ پر اسے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی۔ اس کی ضرورت ...ی نہیں تھی۔ اُس نے رابعہ کے رنگ و روپ میں کچھ تبدیلی ...ں رہا تی کام لباس نے کیا۔ میرے اور رابعہ کے لیے اس ...یک اَپ کے مطابق پُرانے کپڑوں کا بندوبست خود ...خان نے کیا تھا۔

خان نے مجھے ایک طرف لے جا کر کہا۔ "یہ آدمی بہت ...ابھی ہے بس یہی اس کی ایک کمزوری ہے کہ پیسے کے پیچھے ...جان دیتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "کیا کرتا ہے یہ پیسے کا؟"

"کچھ نہیں، خرچ ایک دھیلا نہیں کرتا۔ مانگ کے کپڑے پہن لیتا ہے، مانگ کے کھا لیتا ہے، نہ کوئی گھر ہے نہ خاندان۔"

میں نے مزید حیران ہو کے کہا۔ "یہ چلتا پھرتا عجوبہ تمھارے ہاتھ کیسے لگ گیا؟"

"یہ پھر کبھی بتاؤں گا، تم اسے چلتا کرو۔ یہ دس ہزار سے ...ابھی خوش ہونے والا نہیں ہے۔ ایک ہزار کافی ہیں۔ شور ...کرے تو برداشت کرنا۔"

اور ایسا ہی ہُوا۔ میں نے اس کو ہزار روپے نذر کیے تو وہ واویلا کرنے لگا۔ "حضور کا سلامت رہے دم لیکن یہ ...ہے انتہائے ستم۔ ہم تو رکھتے تھے اُمیدِ کرم، سمندر سے ...ملے پیاسے کو شبنم۔"

میں نے کہا۔ "بھئی میں اس سے زیادہ نہیں دے سکتا اور میرے خیال میں یہ بھی بہت ہے۔"

وہ نفی میں سر ہلانے لگا۔ "انصاف کا نہیں ہے یہ وطیرہ ...اونٹ کے مُنہ میں دیا جائے زیرہ، پتھر کے مول بِک ...جائے ہیرا۔"

نہ جانے کیوں رابعہ نے کھٹ سے اسے پانچ سو روپے ...بخش دیے۔ "یہ لو اب تو خوش ہو۔"

اُس نے نوٹ فوراً جیب میں ٹھونس لیے۔ "خدا رکھے ...آپ کو شاد و آباد، عطا کرے ہر سال نیک اولاد لیکن ناچیز ...کی ہے یہ فریاد..."

میں نے اُسے ڈانٹ کے کہا۔ "یہ بد دعا ہے کہ فریاد؟ ...اگر ہو جائیں گے برباد، گر سال کے سال ہوتی رہی اولاد۔"

رابعہ کی ہنسی روکے نہ رُکتی تھی۔ اُس نے کہا۔ "اب جانے بھی دو۔"

میں نے کہا۔ "یعنی تمھیں کوئی اعتراض نہیں اس کی دعا پر؟"

شہزادہ گلفام عرف یوسف ثانی نے اپنی بقچی۔ لول اٹھائی جیسے اسے بیدخلی کے حکم پر سامان اٹھانا پڑ رہا ہے۔ "اچھا حضور کی عنایت کہ یاد فرمایا پھر ملیں گے اگر خدا لایا۔"

جب وہ چلا گیا تو میں اور رابعہ اپنے نئے روپ میں سب کے سامنے جلوہ گر ہوئے۔ جتنا وہ ہم پر ہنسے اس سے زیادہ شہزادہ گلفام عرف یوسف ثانی کی باتوں پر ہنسے۔ میں نے اُس کے اندازِ گفتگو کی نقل کرنے کی کوشش کی مگر اس کا لہجہ اور اس کی حرکات و سکنات کا نمونہ نہ پیش کر سکا۔

محسن نے کہا۔ "یار ایسی نادرِ روزگار چیز ہمیں نہیں دکھائی۔"

نازو نے کہا۔ "اسے پھر بلاؤ کسی کام سے، ہم بھی تو دیکھیں۔"

میں نے کہا۔ "خان نے کہا تھا کہ وہ الٰہ دین کے چراغ کے جن کی طرح ہر کام کر سکتا ہے۔"

غالب نے کہا۔ "پھر تو اُسے ضرور بلاؤ۔ کام کا آدمی ہے تو ایک ٹکٹ میں دو مزے، تفریح الگ اور کام الگ۔"

"ابھی تو ہم سلیمان کے ساتھ جا رہے ہیں۔ اُس پر وہ بہت سے صرف اتنا معلوم کرنا ہے کہ وہ اسلحہ اس نے کہاں دیکھا تھا جو اس کے بتانے پر ان میاں بیوی نے چوری کیا۔ اگر خود اُس نے کچھ نہ بتایا تو ہم ان میاں بیوی کا پتا پوچھیں گے۔"

"یہ آسان کام شاید نہ ہو۔" محسن نے کہا۔

"اتنا مشکل بھی نہیں ہو گا۔" میں نے کہا۔

"بہتر ہوتا اگر ہم بھی ساتھ چلتے یا تمھارے پیچھے رہتے۔" نازو نے کہا اور غالب نے تائید کی۔

میں نے کہا۔ "میں ضرورت محسوس کرتا تو تمھیں بھی لے جاتا۔"

"ہاں، تیری ضرورت تو تیرے ساتھ ہی ہے۔" محسن نے کہا۔ "ہم سب اسی لیے غیر ضروری ہو گئے ہیں۔ خیر جاؤ۔"

میں نے رابعہ سے کہا۔ "اجازت مل گئی، اب تو چلو۔"

ایک ریوالور میں نے اپنی دھوتی میں لپیٹ کے اڑس لیا تھا کہ ضرورت پڑنے پر فوراً ہاتھ میں آ جائے۔ دوسرا رابعہ نے اپنے ہاتھ میں رکھا تھا۔ اس کی چنری میں اتنی گنجائش تھی کہ وہ مشین گن بھی ساتھ لے کر چلتی تو کسی کو پتا نہ چلتا۔ سلیمان باہر ہمارے انتظار میں ایک جیپ کے مڈگارڈ پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ اُس نے کہا۔ "جیپ کو ہم ایک میل دور چھوڑ دیں گے۔"

میں نے کہا۔ "چابیاں سیٹ کے نیچے رکھ دینا۔ ہم اگر دو گھنٹے تک لوٹ کر نہ آئیں تو جیپ وہیں چھوڑ کے واپس

پچلے جانا۔"

جیپ میں ہم دونوں آگے بیٹھ سکتے تھے۔ سلیمان کے ساتھ میں بیٹھا اور دوسری کھڑکی سے لگ کے رابعہ بیٹھ گئی۔ جیپ کوٹھی سے نکلی اور نامعلوم راستوں پر ایک گھنٹا دوڑتی رہی۔ کچھ دیر میں نے راستوں کے ہر موڑ کو ذہن میں رکھنے کی کوشش کی لیکن پھر سب گڈمڈ ہو گیا۔ مجھے یہ پریشانی لاحق ہو گئی کہ کسی وجہ سے خود مجھے جیپ ڈرائیو کر کے واپس لوٹنا پڑا تو میں یقیناً راستے سے بھٹک جاؤں گا۔ میں نے اس خدشے کا اظہار سلیمان سے کیا تو اُس نے مجھے چند سڑکوں کے نام بتائے۔ ان سڑکوں پر نمایاں مقامات کی نشاندہی کی۔

میں نے کہا "بس اتنا کافی ہے اگر میں ان جھونپڑیوں تک پہنچ گیا تو پھر درمیان سے گزر کے ریلوے لائن کراس کرتے ہی خان کی کوٹھی ہے۔" سفید شٹل کاک برقع میں ایک عورت ہمارے قریب سے گزر گئی۔ اس وقت جیپ کو سلیمان نے ایک بند گیراج کے سامنے بہت سی زیرِ مرمت گاڑیوں کے درمیان کھڑا کر دیا تھا۔ ہم کسی صنعتی علاقے سے گزر آئے تھے۔ جہاں ہر طرف چھوٹے بڑے کارخانے تھے۔ فضا میں اونچی اونچی چمنیوں سے خارج ہونے والے زہریلے دھوئیں اور بخارات کی بدبو تھی۔ یہ بدبو اس وقت انتہائی شدید ہو گئی جب ہم نے ایک نالے پر بنا ہُوا لکڑی کا پُل عبور کیا۔ اس نالے میں ارد گرد پھیلے ہوئے کارخانوں کا کیمیکل ویسٹ بہہ رہا تھا یعنی وہ کیمیائی فضلہ جو مختلف مصنوعات کی تیاری کے دوران استعمال ہونے کے بعد ناکارہ ہو جاتا ہے۔

نالے کے کنارے تک بنی ہوئی جھونپڑیاں دیکھ کر مجھے زمین پر بسنے والی خدا کی مخلوق پر ترس آیا جو بے بسی اور مجبوری کے دو پاٹوں میں اتنی پس چکی تھی کہ اس عفونت زدہ زہریلے اور متعفن ماحول میں بھی جی رہی تھی، جہاں شاید میں ایک دن رہتا تو بیمار پڑ جاتا لیکن آدمی بڑی سخت جان مخلوق ہے اور ہر قسم کے ماحول میں زندگی گزارنے کے لیے ذہنی اور جسمانی قوتِ مدافعت پیدا کر لیتی ہے۔ شاید اب ان لوگوں کو صاف ستھرے ایئرکنڈیشنڈ کمرے میں رکھا جائے تو یہ بیمار پڑ جائیں، میں نے سوچا۔

آبادی اور جگہ بمبئی شہر کے دو سب سے بڑے اور زندگی کے تضادات کی سب سے نمایاں تصویر پیش کرنے والے مسائل ہیں۔ اس شہر میں جہاں لاکھوں انسان حشرات الارض کی طرح جیتے ہیں۔ لاکھوں ایسے بھی ہیں جن کے کتے اور گھریلو ملازم تک ایئرکنڈیشنڈ کوٹھیوں اور کاروں میں رہتے ہیں۔ انسانی معیارِ زندگی کی یہ پست ترین صورت میں نے کراچی کی کچی آبادیوں اور جھگیوں میں بھی دیکھی تھی لیکن جو میں یہاں دیکھ رہا تھا، وہ میرے لیے رہائش کا ناقابلِ تصور ماحول تھا۔ یہ جھونپڑیاں اتنی تنگ تھیں کہ شاید ان میں ایک اوسط قد کا آدمی پیر پھیلا کے نہیں سو سکتا تھا مگر ان میں پورے پورے خاندان آباد تھے۔ ظاہر ہے ان کی جسمانی صحت بھی قابلِ رحم تھی اور اخلاقی حالت بھی۔ ایسی جان لیوا مفلسی میں اخلاقیات کی ساری قدریں انسانیت کے ساتھ مذاق اور آسودہ حال لوگوں کی ذہنی عیاشی محسوس ہونے لگتی ہیں۔

سلیمان نے ایک جگہ رُک کے کہا "وہ دائیں طرف آپ مندر کا کلس دیکھ رہے ہیں۔ اسی کے احاطے میں کونے والا گھر پروہت کا ہے۔"

میں نے کہا "احاطے میں اور بھی لوگ رہتے ہیں؟"

"احاطے کے اندر اور باہر دیوار کے ساتھ ساتھ کمرے بنے ہوئے ہیں، آپ سیدھے ہاتھ والے کونے کے کمرے میں جائیں۔ اس کے باہر تلسی کا پودا ہے۔ دروازے کے اوپر گہرے رنگ سے 'اوم' لکھا ہوا ہے۔" سلیمان نے کہا۔

رابعہ نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا "ہم ان بھول بھلیوں سے باہر کیسے جائیں گے؟"

سفید شٹل کاک برقعے میں دوسری عورت ہمارے پاس سے گزری تو میں حیرت کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکا۔

"کیا یہاں مسلمان تعداد میں زیادہ ہیں؟"

سلیمان نے نفی میں سر ہلایا "سب ملے جُلے لوگ ہیں۔ ان کا مذہب بھی ملا جُلا ہے۔"

"یہ دوسری پردے دار خاتون دیکھ رہا ہوں میں۔"

"میں نے خود یہ برقعہ پہلی بار دیکھا ہے یہاں بمبئی میں کون پردہ کرتا ہے۔" سلیمان نے کہا "ہوں گے دو چار کٹر مُلّاؤں کے گھرانے، واپسی پر کسی سے بھی پوچھ لینا کہ سورج گجراتی ڈسپنسری کہاں ہے، گیراج اس کے سامنے ہی ہے۔"

سلیمان چلا گیا تو میں نے رابعہ سے کہا کہ حوصلہ رکھے ابھی تک کسی نے ہمیں نظر اُٹھا کے بھی نہیں دیکھا تھا۔ بمبئی کے لوگوں کا عام رویّہ یہی ہے۔ کوئی کسی کو دیکھ کے حیران نہیں ہوتا۔ ہم انھی لوگوں جیسے نظر آتے تھے پھر کوئی ہماری طرف کیسے متوجہ ہوتا۔

مندر کے گیٹ سے مرہٹہ لڑکیاں بالوں میں پھول لگائے نکل رہی تھیں۔ انھوں نے مجھے ہاتھ جوڑ کے پرنام کیا۔ رابعہ مسکرائی۔ ایک پاگل نظر آنے والی بڑھیا نے جو دروازے کے قریب پڑی ہوئی تھی چلّا کے کہا۔

"بھگوان کرے تجھے کالا ناگ ڈسے، تیری پتنی رانڈ ہو جائے، تیرے گھر میں آگ لگے۔" معلوم نہیں وہ آتے جاتے سب لوگوں کو ایسی خوفناک بددعائیں کیوں دیتی تھی۔ رابعہ ڈر کے مجھ سے چمٹ گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ کانپ رہی ہے۔

"اس پاگل کی باتوں سے ڈر گئی ہو۔" میں نے کہا۔

"اس کے ساتھ کچھ تو ہوا ہو گا۔" رابعہ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"ہاں مگر ہم نے تو کچھ نہیں کیا۔" میں نے اس کا ہاتھ دبا کے اُسے تسلی دی۔

آخری کونے میں تلسی کا پودا عین دروازے کے سامنے گملے میں لگا ہُوا تھا۔ کواڑ پر گیرِدے رنگ میں 'اوم' کے حروف بھی چمک رہے تھے۔ دونوں نشانیاں بہت واضح تھیں... کواڑوں کی جھری سے لالٹین کا برائے نام سا اُجالا جھلکتا تھا۔ اندر مکمل سکوت تھا۔

میں نے دروازے کی کنڈی بجائی۔ ایک شخص نے گزرتے گزرتے تامل یا ملیالم میں کچھ کہا۔ میں نے سر ہلا دیا۔ وہ شخص آگے بڑھ گیا۔ میں نے پھر دستک دی تو دروازہ پیچھے کو ہٹ گیا کواڑ اندر سے بند نہیں تھے۔ میں نے پٹوں کو آہستہ سے دھکیلا اور رابعہ کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔

دوسرے لمحے جیسے اس مختصر نیم تاریک بوسیدہ اور متعفن کمرے کی چھت مجھ پر آ گری۔ رابعہ نے بے اختیار ایک چیخ ماری اور میں نے اس کے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ معلوم نہیں کیسے مجھے اندر سے کنڈی لگانے کا خیال آ گیا اور میں نے رابعہ کو سنبھالتے ہوئے دیوار سے ٹیک لگا کے اس لاش کو دیکھا جو کمرے کے ایک کونے میں سر کے بل پڑی ہوئی تھی۔ اس بے لباس لاش کے ہر حصۂ جسم پر خنجر کے زخم تھے اور خون لاش کے آس پاس فرش پر جمع ہو کے جم گیا تھا مگر ابھی کالا نہیں پڑا تھا۔ لالٹین کی روشنی میں اس کی سُرخی میں تازگی نظر آتی تھی۔ اسے کسی نے بڑی بے رحمی سے کچھ ہی دیر پہلے قتل کیا تھا۔

میں نے رابعہ کے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے تھپتھپا کے کہا "رابعہ ہوش میں رہنا، دروازہ بند ہے۔ کوئی آ جائے تو جواب تم کو ہی دینا ہے کہ پروہت جی کہیں گئے ہوئے ہیں۔" رابعہ نے اپنی آنکھیں ایک ہاتھ چہرے پر رکھ کے بند کر لی تھیں اور وہ بُری طرح لرز بھی رہی تھی مگر میری بات پر اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ میں نے دوسری جانب رکھے ہوئے مٹی کے چھوٹے سے مٹکے میں سے تھوڑا سا پانی ایک کانسی کی کٹوری میں نکالا اور رابعہ کو چند گھونٹ پلانے کے بعد خود بھی پیا۔ مٹکے کے قریب ہی ایک بوڑھی عورت رسوئی کی پیڑھی پر بیٹھے بیٹھے لڑھک گئی تھی مگر وہ زندہ تھی۔ میں نے اندازہ کیا کہ وہ پروہت کی گھر والی ہو گی مگر وہ بوڑھی عورت تھی اور لاش دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ پروہت کی عمر تیس سال بھی نہیں۔ شاید وہ اس کی ماں تھی جو اپنے سامنے بیٹے کا بہیمانہ قتل نہ دیکھ سکی تھی اور اب خود بھی جانکنی کی کیفیت میں تھی۔

یہ ایک الگ سوال تھا کہ پروہت کو کس نے مارا اور کیوں مارا؟ حیرت مجھے اس بات پر تھی کہ اس مختصر سے کمرے میں تشدد کی ایسی واردات کا ارتکاب ممکن کیسے ہُوا۔ پروہت نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ اُس نے یا اس کی ماں نے کسی کو مدد کے لیے نہیں پکارا۔ پروہت کے حلق سے کوئی چیخ نہیں نکلی۔ ساتھ والے کمروں کی دیواریں مشترک تھیں کیا ان دیواروں کے پار کسی کے کانوں نے کچھ نہیں سُنا؟ چھوٹے سے کمرے میں توڑ پھوڑ کے آثار بالکل نہیں تھے۔ اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ کسی نے پروہت کو اچانک وار کر کے مار ڈالا۔ شاید اسی وقت کسی نے اس کی ماں کو مُنہ بند رکھنے کی کارروائی کی۔ اگر وہ اجنبی ہوتے تو ان کے اندر آتے ہی پروہت چوکنا ہو جاتا اگر وہ انھیں اپنا دشمن سمجھتا تو انھیں اچانک وار کرنے کا موقع نہ ملتا لیکن وہ ایسے لوگ تھے جن سے پروہت واقف تھا اور کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتا تھا۔ انھوں نے اسے ایک دم دبوچ لیا اور مار دیا۔ میرے خیال کے مطابق یہ کام کم سے کم تین افراد نے مل کے کیا۔ دو نے پروہت کو قتل کیا۔ تیسرے نے اس کی ماں کی آواز دبا دی۔ وہ ناتواں بڑھیا ان کا کیا مقابلہ کرتی، وہ وہیں بے ہوش ہو کے گر گئی۔

"سکندر! کھڑے کیوں ہو، نکل چلو۔" رابعہ نے مجھے جھنجوڑ کے کہا۔

"ابھی چلتے ہیں، گھبراؤ نہیں کسی نے ہمیں نہیں دیکھا۔"

"دیکھا ہے سکندر! وہ جو مدراسی میں کچھ کہہ گیا تھا۔" رابعہ نے سرگوشی کی لیکن میرے ذہن میں سلیمان کی ایک بات تھی جو اب اہمیت اختیار کرنے لگی تھی۔ "میں نے خود یہ برقع پہلی بار دیکھا ہے۔ بمبئی میں کون پردہ کرتا ہے۔"

اچانک رابعہ نیچے جھکی۔ وہ کاغذ کا ایک کونا نظر آتا تھا جو لاش کے نیچے سے جھانک رہا تھا مگر یہ ایک تصویر تھی جس پر خون لگ گیا تھا۔ رابعہ نے تصویر مجھے تھما دی۔ میں نے ایک کپڑے سے خون کو صاف کیا تو تصویر واضح ہو گئی۔ یہ زیادہ پُرانی تصویر نہیں تھی۔ اس کے رنگ بالکل واضح تھے۔ تصویر میں شیشے کا ایک باکس نظر آ رہا تھا اور اس تابوت جیسے باکس میں کوئی سو رہا تھا۔ میں نے تصویر کو لالٹین کے قریب لے جا کر دیکھا تو اُس کی صورت کے نقوش روشن ہو گئے مگر میرے ذہن میں اور میرے آس پاس گھُپ اندھیرا پھیل گیا۔

رابعہ سے میری حالت کا تغیر چھپا نہ رہ سکا۔ "سکندر... کیا ہے یہ؟" اس نے تصویر میرے ہاتھ سے چھین کر کہا "کس کی تصویر ہے؟"

میں فوراً ہوش میں آگیا۔ "کچھ نہیں..."

لیکن اس وقت تک رابعہ نے تصویر دیکھ لی تھی اور اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں تصویر پر جم کر رہ گئی تھیں۔ اس نے اپنی چیخ کو منہ پر ہاتھ رکھ کر دبالیا تھا لیکن وہ اپنے خوف، دہشت اور اذیت کے جذبات کو کیسے دبا سکتی تھی۔

"یہ... یہ تو... شہلا..."

میں نے کہا "ہاں... پہلے میں بھی یہی سمجھا تھا... لیکن یہ شہلا کیسے ہو سکتی ہے۔ تم خود ہی سوچو۔"

رابعہ نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں "یہ شہلا ہی ہے سکندر۔"

میں نے کہا "بلاشبہ اس عورت میں... جو اس شیشے کے تابوت میں نظر آرہی ہے اور شہلا میں صورت کی مشابہت... بہت زیادہ ہے۔"

رابعہ کا ہسٹریا اب اس کے کنٹرول سے باہر ہونے لگا تھا۔ "مشابہت کہتے ہو تم اسے؟" اس نے چلا کر کہا۔

میں نے اسے جھنجوڑا "یہ کیا کر رہی ہو تم۔ یہ دیکھو کہ ہم کہاں کھڑے ہوئے ہیں۔ تم نے میرا ساتھ دیا تھا میری مدد کرنے کے لئے... میری مشکلات میں اضافہ کرنے کے لئے نہیں۔ اتنا حوصلہ نہیں تھا تو وہیں اشارہ کر دینا تھا۔ میں نازو کو ساتھ لے آتا۔"

رابعہ نے ایک ہچکی لی اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو قطرے ٹپک پڑے۔ ہاں میں بزدل... اور کم ہمت ہو گئی ہوں.... تمہاری نظر میں۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ میں انسان ہوں۔ نازو کیا چلتی پھرتی پتھر کی مورت ہے؟ کوئی فولادی اعصاب رکھنے والی مشین ہے۔ یہ تصویر دیکھ کر اس پر کوئی اثر نہ ہوتا اور وہ تمہارے جھوٹ سے بہل جاتی؟"

میں نے ندامت سے کہا "آئی ایم سوری۔ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ اور میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔ اپنے ایک خیال کا اظہار کر رہا ہوں کہ اس تصویر میں جو عورت ہے وہ شہلا نہیں ہو سکتی۔ تم خود ہی سوچو نا کہ شہلا کو اس طرح شیشے کے تابوت میں بند کر کے اس کی تصویر کون اتارے گا؟ اور پھر یہ تصویر یہاں... اس پروہت کے گھر میں۔ یہ کوئی چکر ہے رابعہ۔ یہ کیمرہ ٹرک ہے۔ میں کوئی فوٹوگرافر نہیں ہوں کہ وضاحت کر سکوں، مگر تم نے فلموں میں ایسے سین ضرور دیکھے ہوں گے کہ تصویر کسی شیشے میں... بوتل اور گلاس میں... انگوٹھی کے نگینے میں نظر آتی ہے۔ ایک نہیں سو عکس بن جاتے ہیں۔ الٹے سیدھے۔ ڈبل رول میں ایک ہی کردار خود سے مخاطب نظر آتا ہے۔ یہ بمبئی ہے جان۔ یہاں کی فلم نگری میں ایسے نظر فریب شعبدے دیکھے بھی جا سکتے ہیں اور دکھائے بھی جا سکتے ہیں۔"

رابعہ اب قدرے پرسکون ہو گئی تھی لیکن وہ پلک جھپکائے بغیر مجھے دیکھ رہی تھی "میں تمہارے دلائل سے قائل ہو جاتی، اگر اس عورت نے وہی کپڑے بھی نہ پہن رکھے ہوتے جو شہلا پہنتی تھی۔ کیا اسے بھی تم اتفاق کہو گے؟ ہندوستان میں بھی کسی نے بالکل وہی کپڑا۔ وہی ڈیزائن اور پرنٹ اسی رنگ میں لیا تھا۔ اور اس عورت نے جسے تم شہلا کی ہم شکل قرار دینے پر مصر ہو، شلوار قمیص ہی بنوایا اس کپڑے سے؟ کہاں پہنا جاتا ہے اس قسم کا شلوار قمیص، بمبئی میں، کتنی عورتیں پہنتی ہیں شلوار قمیص۔"

میں نے خود اپنی کوتاہیٔ نظر کا اور ناقص قوت مشاہدہ کا اعتراف کیا لیکن اس میں میرا زیادہ قصور نہیں تھا۔ میں ایک عورت کی نظر کہاں سے لاتا جو فوراً فیشن سے ڈیزائن اور پرنٹ تک کو پہلے دیکھ لیتی ہے اور پہچان لیتی ہے۔

میں نے تصویر واپس اپنے ہاتھ میں لے کر کہا "کیا واقعی!"

رابعہ نے کہا "واقعی کیا۔ اس کے ٹاپس دیکھو۔"

میں نے بیوقوفوں کی طرح تصویر کو نظر جھکا کر دیکھا مگر مجھے یاد نہ آیا کہ شہلا کے کانوں میں کبھی میں نے ایسے ٹاپس بھی دیکھے تھے۔

"یہ ٹاپس میں نے اسے دیئے تھے۔" رابعہ نے کہا "اور مجھے یہ بھی یاد ہے کہ کب دیئے تھے۔ ایک دن اسے میچ کرنے ہوئے ٹاپس نہیں مل رہے تھے۔ جو اتفاق سے میں نے پہن رکھے تھے۔ میں نے اتار کر اسے دے دیئے تھے۔"

میں نے کہا "میں... مجھے ثبوت کی ضرورت نہیں۔ میں مان لیتا ہوں کہ یہ شہلا ہے۔ لیکن رابعہ! اس میں بھی ٹرک ہو سکتی ہے۔ ایک تصویر کو دوسری تصویر کے ساتھ ملایا جا سکتا ہے۔ بلیک میلر تو یہ دھندے کرتے ہی ہیں۔ کسی بھی شریف عورت کی تصویر کسی غلط قسم کے آدمی کے ساتھ جوڑ دی۔ دو تصویروں سے تیسری تصویر گھڑ لی۔ ڈبل ایکسپوژر سے شریف آدمی کو حوالات کی سلاخوں کے پیچھے، کسی لور کی خواب گاہ میں، ہر جگہ دکھلایا جا سکتا ہے۔ ایسے ہی یہ شیشے کا تابوت الگ ہوگا جس میں شہلا کو دکھایا گیا ہے۔"

"یہ بحث کرنے کی جگہ نہیں ہے۔" رابعہ نے تصویر میرے ہاتھ سے لے کر اپنے بلاؤز میں غائب کر دی "میں مان لیتی ہوں کہ ایسا ہی ہوگا لیکن اس تصویر کا اس لاش کے نیچے ملنا۔ یہ کیا ہے۔"

میں نے کہا "ہاں.. اس بات کا میں کوئی جواب نہیں دے سکتا۔"

"ابھی کچھ نہیں بگڑا۔ یہاں سے بھاگ چلو۔" رابعہ نے دروازے کی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔

باہر سے کسی نے دروازے پر ہاتھ مار کر کہا "اے بھیا کا ہوگئے؟"

رابعہ نے دروازے کے پاس جا کر آواز بدل کے کہا "کون ہے رے؟"

"اجی ہم پروہت جی کے پاس آئے تھے۔ جنم کنڈلی لے کر۔ ہری بٹیا کا مہورت نکال دیویں۔"

رابعہ نے کہا "جرا دیر میں آویں گے۔ بول گئے تھے۔"

"اچھا ہم بھور بھئے آجائیں گے۔ رام رام۔"

میں نے مصیبت کے ٹل جانے پر خدا کا شکر ادا کیا۔ رابعہ نے بڑے اعتماد کے ساتھ خطرے کو ٹال دیا تھا۔ میں کان دروازے سے لگائے جانے والے کے قدموں کی چاپ سنتا رہا۔ جھری میں سے جھانکنے پر مجھے اندھیرے کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔

"رابعہ! تم اس بڑھیا کو ہوش میں لاؤ۔ کوشش کرو۔ شاید کچھ بتائے۔"

"کچھ بتانے سے پہلے اگر یہ چلانے لگے۔ ہم بھی تو اجنبی ہیں اس کے گھر میں۔" رابعہ نے کہا۔

لیکن میں نے اب تھوڑی سی تفتیش کا رسک لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ چنانچہ رابعہ مجبور ہو گئی۔ اس نے مٹکی میں سے تھوڑا سا پانی کٹوری میں انڈیل کر بڑھیا کے منہ پر چھینٹے مارے اور ایک چمچے سے تھوڑا سا پانی اس کے حلق میں اتارا۔

میں نے پروہت کی لاش کو احتیاط سے پلٹا۔ اس کی کھلی آنکھوں میں مجھے زیست کا آخری لمحہ منجمد محسوس ہوا۔ موت سے پہلے اس کے دل میں آنے والا خیال ایک مبہم سا سایہ بن کے ایسے ٹھہر گیا تھا جیسے کسی حادثے میں مرنے والے کے ہاتھ کی گھڑی میں رک گیا ہو۔ یہ کوئی انوکھی بات نہ تھی۔ میرے علاوہ بھی اس کیفیت کا مشاہدہ بہت سے لوگوں نے کیا تھا۔ اس وقت مجھے یوں لگا جیسے پروہت خوف زدہ نہ تھا۔ وہ حیران تھا، اس کی آنکھوں کی بے یقینی کا تاثر یہ ظاہر کرتا تھا کہ جو کچھ اس کے ساتھ ہوا انتہائی غیر متوقع تھا۔ وہ اپنے قاتل سے ایسی سفاکانہ حرکت کی ہرگز امید نہیں رکھتا تھا۔

اس تاثر کو اہمیت دینے سے کچھ معلوم نہیں ہوتا تھا۔ نہ قاتل کا نام نہ پتا نہ حلیہ نہ نشان۔ وہ آلہ قتل بھی چھوڑ کر نہیں گیا تھا اور قتل کی وجہ معلوم کرنے کی ذمے داری بھی پولیس کو سونپ گیا تھا۔ تاہم ایک بات میں نے پورے وثوق کے ساتھ سمجھ لی تھی۔ یہ قتل ہمارے آنے سے کچھ دیر پہلے ہی ہوا تھا۔

اس قتل کا ہم سے کوئی نہ کوئی تعلق بھی تھا ورنہ شہلا کی وہ تصویر وہاں یوں نہ رکھی جاتی۔ ایسا نہیں تھا کہ تصویر قاتل کی جیب سے نکل کر گر گئی ہو۔ تصویر وہاں عمداً چھوڑی گئی تھی۔ اس طرح کہ چھپی نہ رہے۔

بڑھیا نے کراہ کے آواز نکالی تو میں اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"یہ ہوش میں آنے لگی ہے۔" میں نے کہا۔

رابعہ نے اس کے منہ پر کچھ اور پانی کے چھینٹے مارے۔ اس نے آہستہ آہستہ بڑھیا کو ماتا جی کہہ کر بھی پکارا۔ میں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ بڑی بی کو مزید پانی نہ پلائے۔ بیہوشی کی حالت میں بعض اوقات پانی سانس کی نالی میں اتر جاتا ہے تو موت کا سبب بن جاتا ہے۔

"تم سامنے سے ہٹ جاؤ۔" رابعہ نے کہا "تاکہ ہوش میں آنے کے بعد اس کی نظر تم پر نہ پڑے۔"

"مانا کہ تم بے حد حسین ہو۔ مگر کیا میری شکل اتنی بھیانک ہے؟" میں نے احتجاج کیا۔

"کسی عورت کو اپنے سامنے پا کے یہ خوف زدہ نہیں ہوگی۔" رابعہ نے کہا "گھر کے اندر کسی مرد اجنبی کا چہرہ نظر آیا تو چلانے لگے گی۔"

رابعہ کی دلیل میں معقولیت تھی۔ میں پھر پروہت کی لاش کا جائزہ لینے لگا۔ اس نے صرف دھوتی پہن رکھی تھی چنانچہ جامہ تلاشی بے سود تھی۔ اس مختصر سے کمرے کے اسباب میں بھی مجھے ایسی کوئی چیز ملنے کی امید نہ تھی جس سے قاتلوں کے بارے میں یا قتل کے اسباب کا پتا چل سکتا۔ مثلاً خطوط، ڈائری یا ٹیلیفون بک۔ کمرے کی کل کائنات چند برتن اور ایک ٹین کا صندوق تھے۔ صندوق میں تالا لگا ہوا تھا۔

چابیوں کا ایک گچھا بڑی بی کے ایک پلو سے بندھا ہوا تھا۔ اس میں پانچ چابیاں تھیں جو بظاہر فالتو ہی لگتی تھیں۔ اس کمرے میں واحد قفل صندوق کا تھا۔ دوسرا قفل شاید وہ کہیں جاتے وقت دروازے میں ڈالتے ہوں گے۔

ایک چابی سے میں صندوق کا تالا کھولنے میں کامیاب رہا۔ اس کا ڈھکن اٹھانے سے پہلے میرا خیال یہ تھا کہ شاید اس میں تھوڑا بہت نقد اندوختہ ہوگا اور کچھ زیورات۔ باقی گزرے

وقتوں کی نشانیاں ہوں گی۔ بڑی بی کی شادی کا زری گوٹے والا' کافور کی خوشبو سے مہکتا جوڑا یا نصف صدی پرانے سہرے کے سوکھے ہوئے پھول۔ ایک آدھ پرانی تصویر' اپنے شوہر کی یا ان بچوں کی جو اب پاس نہیں تھے کپڑوں کے نیچے ہوگی لیکن ڈھکن کھلتے ہی میری نظریں اوپر رکھے ہوئے نئے پرانے نوٹوں کی گڈیوں پر جم کے رہ گئیں۔ اس صندوق میں ایک 'پانچ' دس اور سو کے نوٹ الگ الگ دھاگے باندھ کر رکھے گئے تھے۔ ان کی مجموعی مالیت کا میں کوئی اندازہ نہ کرسکا۔

میں صندوق بند کرنے ہی والا تھا کہ میری نظر ڈھکنے میں اندر کی جانب بنی ہوئی پاکٹ پر پڑی۔ اس میں کچھ خطوط تھے جو لفافوں سمیت رکھے گئے تھے۔ میں نے وہ لفافے نکال کر صندوق کو دوبارہ مقفل کردیا۔

ایک کو چھوڑ کر باقی سب لفافے پرانے تھے۔ ان پر لکھی ہوئی تحریر کی روشنائی کا رنگ بھی پھیکا پڑ گیا تھا۔ یہ سب خطوط ہندی میں تھے۔ چنانچہ میں کسی کا مضمون نہ پڑھ سکا۔ نئے لفافے پر تین دن پہلے کی مہر تھی اور انگریزی میں تھی۔ یہ خط مقامی ڈاک سے آیا تھا اور بمبئی ہی میں پوسٹ کیا گیا تھا مگر اس کے اندر سے کوئی کاغذ نہیں نکلا۔ لفافے کی پشت پر لکھنے والے نے اپنا نام پتا بھی ہندی میں تحریر کیا تھا۔ کسی وجہ کے بغیر میں نے اسے رکھ لیا۔

بڑی بی نے ہوش میں آتے آتے بیس منٹ لگادیئے۔ اس تمام عرصے میں میرا دھیان باہر کی ہر آہٹ میں اٹکا رہا۔ خطرہ ہمارے سر پر تلوار کی دھار بن کر لٹک رہا تھا اور یہ تلوار ایک لمحے کے نازک رشتے سے بندھی ہوئی تھی۔ جو سوت کے کچے دھاگے کی طرح ایک دستک سے ٹوٹ سکتا تھا۔ اگلے لمحے شکاری دروازے کو توڑ کر اندر آسکتے تھے' قانون کے محافظوں کے ساتھ۔ یا کوئی اجنبی ہمارے جرم کا گواہ بن کے نازل ہوسکتا تھا۔ اور شور مچا کے چشم دید گواہ اکٹھے کرسکتا تھا۔ میں طے کرچکا تھا کہ یوں رنگے ہاتھوں آسانی سے پکڑے جانے پر میں مقابلے کو ترجیح دوں گا۔ یہ بات میں نے رابعہ کو بھی سمجھا دی تھی کہ ہم ماریں گے اور مرجائیں گے مگر جب تک ہمارے ریوالور میں ایک بھی گولی ہے اور ہاتھوں میں دم ہے ہم کسی کے ہاتھ نہیں آئیں گے۔ مقابلہ کرتے ہوئے نکل جانے کی کوشش کرنے میں تھوڑا بہت چانس تھا۔ بلا مقابلہ ہتھیار ڈال دینے کی صورت میں یہ چانس بالکل نہیں تھا۔

ہوش میں آتے ہی بڑی بی نے کراہ کے کچھ کہا جو نہ میری سمجھ میں آیا نہ رابعہ کی۔

رابعہ نے کہا "موسی! یہ کیا ہوا؟"

ماتا جی کے بجائے موسی کا رشتہ مجھے بھی زیادہ مناسب لگا۔ رابعہ نے اپنی آواز میں دکھ اور ہمدردی کے جذبات سمونے کے لئے اداکاری کا سہارا نہیں لیا تھا۔ یہ جذبات فطری تھے چنانچہ اس کی آواز بھی گلوگیر ہورہی تھی۔

بڑی بی نے چند اور الفاظ کہے جو اتنے ہی ناقابل فہم تھے اور رابعہ کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ رابعہ نے اس کا سر اپنی گود میں رکھا ہوا تھا۔ شاید اسی لئے بڑی بی نے اجنبی عورت کے وجود کو تحفظ کی علامت سمجھ کر قبول کرلیا۔ میں نے خود کو پیچھے والی دیوار کے قریب رکھا جہاں بڑی بی کی نظر مجھ پر نہیں پڑسکتی تھی۔

رابعہ نے کٹوری میں پانی ڈال کر بڑی بی کو سہارا دیا اور اس نے ایک گھونٹ پی کے دہشت زدہ نظروں سے لاش کی طرف دیکھا۔

"یہ کس نے کیا ہے موسی؟"

بڑی بی نے کانپتی ہوئی آواز میں کچھ کہا۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ وہ تامل یا تلنگو بول رہی تھیں۔

"پروہت جی کو کس نے مارا ہے موسی؟" رابعہ نے اپنی کوشش جاری رکھی۔

بڑی بی نے دو انگلیوں سے اشارہ کیا "کیرتی۔ چی دمو سودن ۔" پھر اس نے چاقو مارنے کے انداز میں ہاتھ چلا کے مفہوم واضح کردیا کہ ان دو نے پروہت کو مارا ہے۔

اب میں دونوں ہاتھ جوڑ کے بڑی بی کے سامنے آگیا۔ میں نے ہندوؤں کے رواج کے مطابق ان کے پیروں کو رسمی طور پر چھو کے اپنی نیک نیتی کے جذبات کا اظہار کیا تاکہ وہ مجھے اپنا برخوردار اور سعادت مند تسلیم کرلیں۔

ان کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ کے میں نے کہا "موسی! یہ میری دھرم پتنی۔" میں نے رابعہ پر ہاتھ رکھ کے کہا "ہم پروہت جی کے پاس آئے تھے۔ ان کو اپنے ساتھ لے جانے کے لئے۔"

بڑھیا نے زار و قطار رونا شروع کردیا۔ رابعہ نے گھبرا کے میری طرف دیکھا کہ "اب بتاؤ' اسے چپ کیسے کرایا جائے؟" اس سے صرف نام معلوم ہوئے تھے جو پتے کے بغیر بیکار تھے اور پتا پوچھنا بہت مشکل کام تھا۔ نہ وہ ہماری زبان سمجھتی تھی اور نہ ہم اس کی۔

اچانک میں نے وہ نیا لفافہ نکال کے اسے دکھلایا اور اس پر لکھے ہوئے پتے پر انگلی رکھ کے پروہت کی طرف اشارہ کیا۔ بڑی بی نے اقرار میں سرہلایا۔ اس سے میں نے نتیجہ اخذ کیا کہ لفافے پر نام اور پتا پروہت کا تھا۔ پھر میں نے اسے الٹ کر ...

بڑی بی نے روتے روتے کہا "کیرتی۔ مدھو سودن۔"

میں نے پتے پر انگلی رکھ کے کہا "یہ مدھو سودن کا پتا ہے؟"

بڑی بی نے اقرار میں سرہلایا اور سینہ کوٹ کے رونے لگی۔ اب میرے بھی ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ بڑی بی کو جیسے جیسے ہوش آتا جارہا تھا اس کا احساس غم شدت اختیار کررہا تھا۔ وہ کچھ چلانے بھی لگی تھی۔ شاید وہ ہم سے پوچھ رہی تھی کہ آخر ہم کون ہیں اور اس کے گھر میں گھس کے دروازہ کیوں بند کئے بیٹھے ہیں۔ ہم لوگوں کو کیوں نہیں بلاتے۔ انہیں بتاتے کیوں نہیں کہ پروہت کو کسی نے قتل کردیا ہے۔ پولیس کو اطلاع کیوں نہیں کرتے؟

بڑی بی سے خاموش رہنے کی یا آہستہ بولنے کی التجا کرنا بے کار تھا۔ ان حالات میں میرے ذہن نے فوری فیصلہ کیا اور میں نے یکلخت سعادت مندی کا جھوٹا لبادہ اتار کے سفاک دشمن کا چہرہ بنالیا۔ میں یہ ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ اس بڑھیا پر ظلم کروں۔ جو پہلے ہی بہت مظلوم تھی۔ اس کی جان ناتواں معمولی سے تشدد کی تاب بھی نہیں لاسکتی تھی۔

اسے چپ کرانے کے لئے میں نے خوفناک شکل بنا کے اور آنکھیں نکال کے اسے گھورتے ہوئے ایک انگلی ہونٹوں پر رکھی' اپنے دونوں ہاتھوں کا شکنجہ سا بنا کر اس پر واضح کرنے کی کوشش کی کہ میں اس کا گلا بھی دبا سکتا ہوں۔ اس کے بعد بڑی بی کی یہ خوش فہمی باقی نہ رہی کہ ہم اس کے ہمدرد بھی ہوسکتے ہیں۔ ہمارے شریفانہ رویئے کا بھرم کھل گیا اور ظاہر ہے اس کے بعد ہم صفِ دشمناں میں شامل ہوگئے۔

میرے خون آشامی کے مظاہرے نے بڑھیا کو فوراً خوفزدہ کردیا اور وہ ایک دم چپ ہوگئی۔

"یہ تم نے کیا کیا؟" رابعہ نے شکایت کے لہجے میں کہا۔

اور کیا کرتا میں۔ اس کی آواز باہر پہنچ جاتی تو دروازے پر مجمع لگ جاتا۔ ہمارا باہر نکلنا مشکل ہوجاتا۔"

"اب کیسے باہر نکلیں گے ہم؟" رابعہ نے کہا "اس سے تو کچھ معلوم ہوگا نہیں۔ پھر ٹھہرنے کا فائدہ۔"

میں نے کہا "مجھے یہ بڑھیا پروہت کی ماں بھی نہیں لگتی۔"

"بھی کا کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ بیوی تو ہو نہیں سکتی۔ ماں ہوتی تو اپنے جوان بیٹے کی خون آلود لاش ایسے نہ دیکھ سکتی۔ اگر صدمے سے اس کا ہارٹ فیل نہ ہوتا تو دماغ ضرور خراب ہوجاتا۔ اسے بس اتنا ہی صدمہ ہے جتنا کسی بھی عورت کو ایک لرزہ خیز قتل کی واردات دیکھ کر ہوسکتا ہے۔"

"اب اس سے کیسے پوچھیں کہ یہ کون ہے؟" رابعہ نے بے بسی سے کہا۔

"یا تو بڑھیا کسی کام سے آئی ہوگی یا پڑوس میں کہیں رہتی ہوگی یا پھر پروہت کی موسی وغیرہ ہوگی۔ کوئی بے آسرا عورت جو یہاں رہتی ہوگی اور پروہت کے کام کردیتی ہوگی۔ خیر اب اسے کیا فرق پڑتا ہے کہ مرنے والے سے اس کا کیا رشتہ تھا"

رابعہ نے کہا "جو رشتہ تھا وہ تو ٹوٹ گیا۔"

میں نے کہا "پہلے تم باہر جھانک کر دیکھو لائن کلیئر ہے اور نکل جاؤ۔"

"تم کیسے نکلو گے؟" رابعہ نے تشویش سے کہا "یہ شور نہ مچادے۔"

میں نے کہا "میں اسے اشاروں کی زبان میں سمجھادوں گا کہ چپ پڑی رہے۔ ناگزیر ہوگیا تو اس کو خاموش کرنے کے لئے کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔"

"کیا کرو گے؟ پھر بیہوش کردو گے اسے؟" رابعہ نے کہا۔

میں نے کہا "نہیں۔ یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا میں۔ خواہ مخواہ قتل کا الزام نہ آجائے مجھ پر۔ میں اسے تھوڑا سا باندھ کر اور اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کے کام چلالوں گا۔ پہلے تو باہر کا جائزہ لو اور اگر آس پاس کوئی نہیں ہے تو مجھے سگنل دو۔ میں ایسے ہی دوڑ کے باہر نکل جاؤں گا۔ اگر باہر سے کنڈی لگا کر ہم رات کے اندھیرے سے فائدہ اٹھائیں اور ان گلیوں میں گم ہوجائیں تو کیا حرج ہے؟"

"کوئی حرج نہیں" رابعہ نے دروازے کی طرف جاتے ہوئے کہا مگر وہ دروازے سے صرف ایک قدم کے فاصلے پر تھی جب کسی نے باہر سے دروازے پر زور سے ہاتھ مارا۔ رابعہ اچھل پڑی۔ میں نے بڑی بی کو دبوچ کر اس کا منہ پکڑ لیا۔

"کون ہے؟" اس نے بمشکل تمام کہا اور پیچھے ہٹ گئی۔

"تم کون ہو؟ دروازہ کھولو۔" کسی نے ڈانٹ کر کہا۔

میں نے یہ آواز ابھی کچھ دیر پہلے ہی سنی تھی "یہ تو وہی معلوم ہوتا ہے جو اپنی بٹیا کی جنم کنڈلی لے کر آیا تھا" میں نے رابعہ کے کان میں سرگوشی کی۔

رابعہ نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "معلوم ہوتا ہے اسے شک ہوگیا تھا۔ بڑھیا ہندی اردو جانتی ہی نہیں۔"

باہر کم سے کم تین افراد گفتگو کررہے تھے۔

"ارے ہم ابھی آئے تھے۔ پروہت جی سے ملنے۔ اس وقت بھی یہ ناری اندر تھی۔"

"کون ناری ہے؟" کسی دوسرے شخص نے کہا۔

"پروہت کی کھولی میں ناری۔" تیسرا بولا۔

"تم نے ابھی سنا نہیں؟" پہلے والے شخص نے کہا۔ "اندر کیوں چھپ کر بیٹھی ہے آخر؟ دروازہ کیوں نہیں کھولتی۔"

"اور پروہت اندر ہے تو وہ کیوں چپ ہے؟" دوسرے شخص نے اپنے شک کا واضح اظہار کیا۔

"معاملہ گول مال ہے۔"

میں نے رابعہ سے کہا۔ "جاؤ دروازہ کھول کر ان سے بات کرو۔ ان کا شک رفع کرو۔"

"میں۔ کیا کہوں ان سے؟"

"کہہ دو کہ پروہت تمہیں یہاں چھوڑ کر مندر گیا ہے۔ کہہ گیا تھا کہ ابھی واپس آتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "ان کو مندر بھیج دو کہ پروہت کو تلاش کرلائیں تاکہ تم گھر جاسکو۔"

"ارے ہم بولتے ہیں دروازہ کھول دے۔ پروہت!" پہلے شخص نے پھر دروازہ بجاتے ہوئے کہا۔

میں نے رابعہ کو دھکیلا۔ "جاؤ ورنہ اور لوگ جمع ہوجائیں گے۔ باہر جاکے بات کرنا۔"

رابعہ نے کہا۔ "وہ اندر ضرور جھانک کردیکھیں گے۔ ہوسکتا ہے سیدھے اندر آجائیں۔"

اچانک میں نے محسوس کیا کہ میں بلاوجہ بڑی بی کے منہ پر ہاتھ رکھے بیٹھا ہوں۔ کیونکہ وہ پھر بیہوش ہوگئی ہے۔ میں اسے چھوڑ کر اٹھا۔

"چلو تم دروازہ کھولو۔" میں نے دروازے کے پیچھے دیوار سے لگ کر کہا۔ "آنے دو جو آتا ہے۔"

رابعہ نے کنڈی کھول کر دروازے کا پٹ تھوڑا سا کھولا۔ "یہ کیسا شور ہے۔"

"ہم پروہت سے ملنے آئے ہیں۔"

"پروہت نہیں ہے۔ ہوتا تو اب تک آجاتا۔" رابعہ نے کہا۔ "پروہت گھر میں نہیں ہے تو تم اندر کیا کررہی ہو؟" شکی مزاج شخص نے کہا۔ "تم کون ہو؟"

"پروہت مجھے بٹھا کر مندر گیا تھا۔"

"مگر تم ہو کون سندری؟" پہلے شخص نے کچھ طنز سے کہا۔

"یہ خود پروہت بتائے گا تجھے۔" رابعہ نے چمک کر کہا۔ "جا اسے بلا کے لے آ۔ زیادہ بک بک مت کر۔"

"ہاں ہاں' ابھی دیکھ کر آتا ہوں مندر میں۔" رابعہ سے ڈانٹ کھانے والے نے مشتعل ہو کے کہا۔

"میں بھی چلتا ہوں تمہارے ساتھ۔" دوسرے شخص نے کہا۔

"میں کہتا ہوں چھوڑو۔ ایسی کوئی بات نہیں۔" معلوم نہیں یہ کون صلح پسند شخص تھا۔

"جاؤ جاؤ' سب جاؤ۔ میں کھڑا ہوں یہاں۔" ایک اکھڑ لہجے والے شخص نے کہا۔ "مجھے کچھ گول مال لگتا ہے۔"

"گول مال کے بچے! تیری مونچھیں اصلی ہیں یا نقلی مونچھیں لگاکے اکڑتا پھرتا ہے" رابعہ نے غرا کے کہا۔ "گول مال کرتی ہوگی تیری بہن۔"

عورت جات ہے اس لئے لحاج کررہا ہوں سالی۔"

"سالی بنا اپنی ماں کو۔" رابعہ نے اسے مزید مشتعل کردیا۔

"جوتیاں مار مار کے شکل اور بگاڑ دوں گی تیری۔ کتے..."

اس کے بعد وہ شخص پاگل بیل کی طرح اندر آگیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ خود رابعہ بھی یہی چاہتی ہے۔ اندر میں نے اس کے استقبال کی تیاری کرلی تھی۔ رابعہ ایک قدم پیچھے ہٹی اور میں نے اسے اندر اپنی طرف کھینچ لیا۔ اس کے لئے یہ سب اتنا غیر متوقع تھا کہ وہ حلق سے احتجاج بھی نہ کرسکا۔ میرے سیدھے ہاتھ کے بھرپور وار نے اسے ہوش سے بیگانہ کردیا۔ اس نے منہ کھول کے ایک ادھوری سانس اندر کھینچی اور دھڑام سے فرش پر گرا۔

"ارے کا ہوئی گوا؟" باہر سے کسی نے پکار کے کہا۔ رابعہ ہنسی۔ "اندر آکے دیکھ لے نا۔ آ۔ ڈرتا کیوں ہے۔"

دوسرا شخص بادلِ ناخواستہ اندر آگیا۔ ایک عورت کا چیلنج قبول کرنا اس کی مردانہ انا کے لئے ضروری ہوگیا تھا۔

"اور بھی ہے کوئی؟" میں نے دوسرے آدمی کو بھی لمبا لٹانے کے بعد ہاتھ جھاڑ کے کہا۔

اس سے پہلے کہ رابعہ جواب دیتی' وہ عورت اندر آگئی جس کو میں دوبار شٹل کاک برقع میں دیکھ چکا تھا لیکن پلک جھپکتے ہی اس نے نقاب اٹھادیا اور میں اتنا حیران ہوا کہ میں نے ہکلا کے کہا۔ "تم! لاحول... ولا قوہ..." اور مجھ سے زیادہ حیرت کا شکار ہونے والی رابعہ نے تقریباً چلا کر کہا۔ "یوسف ثانی!"

برقع میں سے جھانکنے والا چہرہ شہزادہ گلفام عرف یوسف ثانی کا ہی تھا جو میری بوکھلاہٹ سے لطف اندوز ہورہا تھا۔ اس نے اپنا برقع اتار کے رابعہ کے حوالے کیا اور بولا۔ "اس میں ہوجایئے روپوش۔ باقی مسئلوں کو کردیجئے فراموش۔ قائم رکھئے حواس و ہوش۔"

میں نے کہا۔ "یوسف ثانی! تم یہاں کیسے آگئے؟"

اس نے کہا۔ "حضور وقت نہیں حجت کا۔ کام ہے یہ عجلت کا جب وقت ملے گا وضاحت کا۔ تو انعام بھی لوں گا اس خدمت کا۔"

اس نے اچھل کے برقع رابعہ کے سر پر ڈالا اور پھر اسے باہر دھکیل کر میری طرف لپکا مگر میں پہلے ہی رابعہ کے ساتھ نکلنے کے لئے پر تول چکا تھا۔ وہ مجھ سے ٹکرایا اور باہر جاگرا۔ اس کی ترکی ٹوپی گلی میں جاپڑی لیکن اس نے حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کیا۔ وہ بجلی کی طرح لپک کے اٹھا۔ جلدی سے ٹوپی کو جھاڑ کے سر پر رکھا اور منہ اٹھا کر باہر جانے والے راستے کی طرف چل پڑا۔ ڈھیلی شیروانی اور پتلون میں اس کی چال کچھ زیادہ ہی مضحکہ خیز لگتی تھی۔

ہم چند قدم ہی گئے تھے کہ میں نے سامنے سے چار پانچ افراد کو تیز تیز قدموں سے اپنی طرف آتے دیکھا۔ ان کے تیور جارحانہ لگتے تھے اور میں نے ان کے قریب سے گزرتے ہوئے انہیں آواز سے شناخت کرلیا۔ ان میں ایک تو وہی تھا جس نے رابعہ کو سندری کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ اور جواب میں رابعہ نے اسے بک بک بند کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ وہ مندر میں پروہت کو تلاش کرنے گیا تھا۔ اور ناکامی نے اسے مزید مشتعل کردیا تھا۔

"اجی وہ ناری ہے کوئی ایسی ویسی۔ ہم تو صورت سے پہچان لیتے ہیں۔" اس نے میرے پاس سے گزرتے ہوئے کہا۔

"یہ بدماسی۔ ابھی پوچھ لیتے ہیں پروہت سے۔" اس کے حمایتی نے اعلان کیا۔

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اپنی دھن میں وہ ہم پر غور کئے بغیر گزر گئے۔ انہوں نے صرف رابعہ کو دیکھا تھا جو اب برقع میں ملفوف تھی۔ پھر بھی میرے جیسے پنڈت ٹائپ شخص کے ساتھ ایک خالص برقع پوش خاتون کا ساتھ اس مندر کے احاطے میں شکوک پیدا کرسکتا تھا۔

یوسف ثانی بار بار مڑ کر ہمیں ہاتھ کے اشارے سے تیز چلنے کا اشارہ کررہا تھا۔ اس شخص نے جن کی طرح نمودار ہوکے مجھے قائل کردیا تھا کہ محمد خان غلط نہیں کہتا تھا۔ الہ دین کے چراغ کا جن بن بلائے نہیں حاضر ہوتا تھا۔ اسے بلانے کے لئے چراغ بہرحال رگڑنا پڑتا تھا لیکن یہ شخص تو خود نازل ہوا تھا۔ میرے ذہن میں اس کا خیال تک نہ تھا ورنہ میں سمجھتا کہ خدا نے میری سن لی اور اسے بھیج دیا۔

اتنی ہی حیران کن اور عقل میں نہ آنے والی بات اس کا برقع میں نمودار ہونا تھا۔ اسے میں نے دو مرتبہ دیکھا تھا اور میں یہ سمجھا تھا کہ شاید اس کا پروہت کے قتل سے کوئی تعلق ہوگا جبکہ اصل صورت حال اس کے برعکس تھی۔ وہ ہمارا تعاقب کررہا تھا اور ہم پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ اس نے کسی طرح اندازہ کرلیا تھا کہ ہم مشکل میں پڑ چکے ہیں اور بالکل وقت پر فرشتہ غیب کی طرح ہمیں وہاں سے نکال لانے میں کامیاب رہا تھا۔ ایسے حالات میں بھی وہ اپنی قافیہ پیمائی نہیں بھولا تھا اور اس نے گفتگو مختصر کی تھی مگر اپنے شاعرانہ انداز میں اور ہم پر یہ بھی واضح کردیا تھا کہ اس خدمت کا معاوضہ محض شکریے کے الفاظ اور جذبۂ احسان مندی کا اظہار نہیں ہوگا۔

ہم جس راستے سے آئے تھے وہ پیچھے رہ گیا تھا۔ وہ اب ہمیں کسی اور راستے سے نکال کر لے جانا چاہتا تھا۔

میں نے کہا۔ "آخر یہ کدھر جارہا ہے؟"

رابعہ نے برقع کے اندر سے کہا۔ "مجھے کیا معلوم مجھے تو اندر سے خود اپنے سر پیر کا پتا نہیں چل رہا ہے۔"

"بال بال بچ گئے آج۔" میں نے کہا۔

رابعہ نے مجھے ٹھوکا دیا۔ "آگے چلو۔ لوگوں کو شک ہوگا کہ یہ باپردہ بی بی اس پجاری کے ساتھ کیا باتیں کررہی ہے۔"

میں چند قدم آگے ہوگیا مگر پھر مجھے رک کر رابعہ کو اٹھانا پڑا جو برقع میں الجھ کر گر گئی تھی۔ ہم مندر سے کافی دور آگئے تھے اور سوائے ایک شخص کے جو جھونپڑی کے سائے میں لیٹا شراب پی رہا تھا' کسی نے یہ منظر نہیں دیکھا۔ وہ زور سے ہنسا مگر میں نے اسے نظر انداز کردیا

"چوٹ تو نہیں آئی؟" میں نے کہا۔

رابعہ نے لنگڑاتے ہوئے میرے پیچھے چلنا شروع کردیا۔ "گھٹنا چھل گیا ہے۔"

"ذرا سنبھل کے چلو۔" میں نے کہا۔

"بالکل آؤٹ آف پریکٹس ہوں۔ برقع کبھی اوڑھا ہی نہیں۔ اور یہ کوئی برقع ہے۔ چلتا پھرتا خیمہ ہے۔" رابعہ نے شکوہ شکایت کے انداز میں بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ "معلوم نہیں وہ کیسے پہن کے مزے سے گھوم رہا تھا۔"

"اندر کا موسم کیسا ہے؟" میں نے اسے چھیڑا۔

"اس یوسف ثانی سے پوچھنا کہ آخری بار کب نہایا تھا۔ ایسی بدبو بھری ہے اندر کہ معلوم ہوتا ہے میں گٹر میں چل رہی ہوں۔" رابعہ نے کہا۔

ایک جگہ پہنچ کے یوسف ثانی رک گیا۔ "آج اللہ کو نہ ہوتا منظور۔ تو ہوجاتے مرحوم حضور مگر اب نہ ہوں رنجور۔ خطرہ ہوگیا ہے دور۔"

میں نے کہا "یوسف ثانی! تم نے آج کمال کردیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم کیسے ہمارے پیچھے پیچھے آگئے... اور تم نے برقع اوڑھ کے ہمارا تعاقب کیوں جاری رکھا؟"

رابعہ نے جھنجلا کے کہا۔ "وہ کہہ تو چکا ہے کہ بعد میں وضاحت کردے گا۔ تمہیں ابھی اسی جگہ سب بتانے کھڑا ہوجائے۔"

میں نے کہا۔ "معاف کرنا۔ مجھے خیال نہیں رہا کہ تم ابھی

تک قید میں ہو۔ چلو نکل آؤ باہر۔"

"نہیں ابھی نہیں سرکار! برقع سے ابھی نہ ہوں نمودار" یوسف ثانی نے کہا۔ "آپ ہیں ایک بی بی پردہ دار۔ لیکن یہ آپ کے شوہر نامدار۔ حلیے سے نظر آتے ہیں مثل کفار۔"

میں نے کہا "یہ تو بڑا ٹیڑھا مسئلہ ہے۔ رابعہ کا برقع میں رہنا ضروری ہے۔ میں اس کے ساتھ غلط نظر آتا ہوں۔ الگ ہم ہو نہیں سکتے۔"

یوسف ثانی نے تھوڑا سا اچھل کے میرے سر پر ہاتھ مارا۔ اس نے میرے سر کے اوپر سے وہ جھلی سی اتارلی جس کی وجہ سے سر منڈا ہوا گنجا نظر آتا تھا۔ جھلی کے کنارے بالوں کے ساتھ کسی لوشن سے چپکائے گئے تھے چنانچہ اس نے جھلی کو نوچ کے الگ کیا تو میرے بال بھی ساتھ ہی چلے گئے۔

"ابے آہستہ۔" میں نے کہا "سارے بال بھی ساتھ ہی اتارنے ہیں کیا۔"

یوسف ثانی نے میری بات کا برا نہیں مانا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے نصف دائرے میں گھمادیا "اب بدل دیں یہ صورت ہندوانی۔ اس نلکے میں آرہا ہے پانی۔ دھوڈالیں کفر کی ہر نشانی۔ تہمد سے کرلیں تکمیل مسلمانی۔"

پریشانی کے باوجود مجھے اس کی بات نے ہنسنے پر مجبور کردیا اور منہ دھوتے ہوئے میں اس کی آخری بات پر بے اختیار ہنس پڑا۔ اس شخص کی قافیہ دانی کی نہ کوئی حد تھی نہ انتہا۔ بس وہ بولتا جاتا تھا اور جو کچھ وہ کہتا تھا اس میں نہ بحر ہوتی تھی اور نہ وزن ہوتا تھا۔ چنانچہ اسے آزاد شاعری بھی نہیں کہا جاسکتا تھا۔ مگر اس کا کمال یہ تھا کہ بات کتنی بھی لمبی ہو اور کیسی بھی ہو اس کے جملے ہم قافیہ رہتے تھے۔ آغا حشر کے اسٹیج کا یہ زندہ کردار بلاشبہ ایک عجوبہ تھا۔ تہمد کا اشارہ اس نے ایک خاص انداز میں کیا تھا جس کا مطلب یہ نکلتا تھا کہ میں اسی دھوتی کو کھول کر پھر باندھوں اور تہمد بنالوں۔ اس طرح میں مسلمان نظر آنے لگوں گا۔ مگر تکمیل مسلمانی کی 'اصطلاح ایسی تھی کہ شاید برقع کے اندر خود رابعہ کو بھی ہنسی آئی ہوگی۔

وہ تاریک سا گوشہ جہاں نلکا لگا ہوا تھا ایسی جگہ نہ تھی جہاں میں آسانی سے "تکمیل مسلمانی" کرسکتا۔ ایک کے بعد ایک وہاں سے مرد عورتیں ' بچے پانی کی بالٹیاں اور ڈول بھرنے آرہے تھے۔ کچھ فاصلے پر تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چند حضرات غسل فرماتے ہوئے اس اصول پر عمل کررہے تھے کہ اصل پردہ تو آنکھ کا ہوتا ہے۔ دوسری طرف شاید زنانہ باتھ روم تھے ادھر چٹائیاں کھڑی کردی گئی تھیں اور اگرچہ لیڈیز اینڈ جینٹس کو الگ الگ کردیا گیا تھا مگر پھر بھی ایک حمام والا محاورہ دونوں پر لاگو ہوتا تھا۔ میں نے بھی اس اوپن ایئر حمام کی سہولت سے استفادہ کرتے ہوئے دھوتی کو تہمد کے انداز میں باندھا اور تکمیل مسلمانی کرکے واپس آیا تو رابعہ مخالف سمت میں منہ کئے کھڑی تھی۔ اس کا اندازہ مجھے اس کے پیروں سے ہوا ورنہ اوپر سے تو پتا بھی نہ چلتا کہ وہ کدھر دیکھ رہی ہے۔

"بندہ چاہتا ہے اب جازت۔" یوسف ثانی نے میری صورت اور میرے حلیے پر اطمینان کی نگاہ ڈال کے کہا "فکر کی آپ کو نہیں ہے حاجت۔ اللہ نے کی آپ کی حفاظت۔ ہوگی پھر ملاقات کی حاصل سعادت۔" پھر وہ لنگڑ بگڑ کی طرح چلتا ہوا اندھیرے میں غائب ہوگیا۔

"کیا چیز ہے یہ۔ میں ابھی تک سمجھ نہیں پایا کہ یہ پاگل بنتا ہے یا بناتا ہے" میں نے کہا "بیک وقت اتنا بیوقوف اور اتنا ہوشیار آدمی کیسے ہوسکتا ہے۔"

رابعہ نے کہا "آج وہ نہ آتا تو ہم پھنس گئے تھے۔ اب خدا کا شکر ادا کرو اور چلو۔ وہ کون سی خیراتی ڈسپنسری تھی؟"

میں نے کہا "اب ڈر کیسا۔ کام ختم کرکے چلیں گے۔"

رابعہ نے کہا "ایسے کام نہیں ہوگا۔ تم خود تو حلیہ بدل کے بے خوف ہوگئے ہو۔ میں کیا کروں۔ مجھ سے برقع میں نہیں چلا جاتا۔"

میں نے کہا "مجھے احساس ہے تمہاری دشواری کا لیکن یہ بھی تو سوچو کہ تمہارا چہرہ جس نے بھی دیکھا ہوگا وہ فوراً پہچان جائے گا۔ ایک تو خدا نے صورت لاکھوں میں ایک دی ہے۔ پھر یہ کہ پروہت کے گھر میں تمہیں جو لوگ دیکھ چکے ہیں وہ اب تک تمہارا حلیہ سب کو بتا چکے ہوں گے کہ پروہت کو قتل کرنے والی ایک دودھاری تلوار تھی۔ حسن بے مثال تو زبان میں بھی لاجواب۔ مجھے وہاں کسی نے نہیں دیکھا تھا اور جنہوں نے دیکھا تھا وہ میرے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتے۔"

رابعہ احتجاجی انداز میں میرے ساتھ چلتی رہی "تو کیا واپس وہیں جانا ہے؟"

میں نے کہا "خیر اب اتنا بھی عقل سے پیدل مت سمجھو مجھے۔ وہاں ایک مجمع ہوگا۔ ممکن ہے پولیس بھی آگئی ہو۔ لاشیں تو کسی کو کچھ نہیں بتائیں گی مگر وہ بڑھیا ہوش میں آنے کے بعد سب کی غلط فہمی دور کردے گی۔ کہ قاتل ایک حسن کی دیوی ہے۔ وہ حسن کی دیوی کے ساتھ ایک پجاری کا ذکر بھی کرے گی۔ مگر ہم دونوں کا ان سے کیا تعلق۔ ہم کیوں ذہن

"میری مانو تو واپس چلو۔ سلیمان نے جہاں جیپ چھوڑی تھی وہ جگہ معلوم کرلو۔" رابعہ نے کہا۔

میں نے کہا "سلیمان کو میں نے سمجھا دیا تھا کہ ہمیں واپسی میں دیر ہو تو جیپ چھوڑ کے چلا جائے اور چابیاں سیٹ کے نیچے رکھ جائے۔ پھر جلدی کیا ہے؟"

"تم کو پروہت سے تو کچھ معلوم نہیں ہوسکا۔"

"مگر میرے پاس دو نام ہیں۔ مدھو سودن اور کیرتی۔ اور ان کا پتا بھی ہے جو ہندی میں لکھا ہوا ہے۔ میں کسی سے پڑھوا سکتا ہوں۔"

"اس بڑھیا نے انہیں قاتل قرار دیا تھا وہ پروہت کے قاتل ہوں گے تو ہمارے ساتھ ہی پولیس بھی پہنچ جائے گی۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "ہماری پولیس اتنی جلدی قاتلوں کو گرفتار کرنے لگے تو خواہ مخواہ ایف بی آئی اور اسکاٹ لینڈیارڈ والے شرمندہ ہوں۔ میں پولیس سے پہلے پہنچ کے ان میاں بیوی سے بات کرلینا چاہتا ہوں۔"

"میاں بیوی؟"

"کیرتی اور مدھو سودن۔ ان کا آپس میں اور کیا رشتہ ہوسکتا ہے؟"

"تم خواہ مخواہ شادی کرا رہے ہو ان کی۔ اس لئے کہ ایک نام عورت کا ہے اور ایک مرد کا۔" رابعہ نے کہا۔

"میں شرط لگا سکتا ہوں اس بات پر اور جیسا کہ تم جانتی ہو' یقین کے بغیر میں شرط نہیں لگاتا۔ بولو شرط لگاتی ہو؟"

"جی نہیں' مجھے معلوم ہے آپ کی شرط کیا ہوگی۔" رابعہ نے کہا۔

"یہ تو وہی مشہور لطیفے والی بات ہوگئی۔ میرے جیسے کسی شریف اور بے ضرر آدمی کے پیچھے پڑگئی تھیں کوئی خاتون کہ تم تو مجھے چھیڑو گے۔ وہ بیچارہ تردید کرتا رہا مگر خاتون بضد کہ نہیں مجھے معلوم ہے کہ تم مجھے چھیڑو گے۔ وہ قسم کھانے لگا تب بھی وہی بات کہ جھوٹی قسم مت کھاؤ۔ مجھے پتا ہے کہ تم مجھے ضرور چھیڑو گے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

رابعہ برقع کے اندر تھی اس لئے میں اس کی خفت اور لاجواب ہوجانے کی ادائے برہمی نہ دیکھ سکا۔ اس نے بھنا کے کہا "خود ہی مطلب نکالتے رہتے ہو... فضول قسم کے۔"

میں نے جیب میں سے لفافہ نکال کے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ ایک اسٹریٹ لیمپ کے نیچے مجھے ایک لڑکا نظر آیا جو ہاتھ میں کتاب لئے کچھ یاد کررہا تھا۔ شاید اس کے گھر میں بجلی کی روشنی نہیں تھی مگر یہ مجبوری اسے علم کی روشنی کے حصول سے باز نہ رکھ سکی تھی۔

میں نے کہا "بیٹا! یہ پتا بتا سکتے ہو مجھے؟"

لڑکے نے مجھے اور برقع میں ملفوف رابعہ کو غور سے دیکھا اور بولا "مدھو سودن۔ یہی نام ہے نا؟"

میں نے کہا "بالکل ٹھیک۔ تم جانتے ہو اسے؟ اس کی بیوی ہے کیرتی۔"

لڑکے نے نفی میں سر ہلایا "میں کیسے جان سکتا ہوں لیکن یہ جگہ قریب ہی ہے۔ تم پیدل جاسکتے ہو۔"

میں نے کہا "اچھا مجھے سمجھا دو۔ یا کاغذ پر نقشہ بنادو۔"

"آسان پتا ہے۔ میں سمجھا دیتا ہوں۔" اس نے کہا "کیا تم ہندی نہیں پڑھ سکتے؟"

میں نے کہا "ہندی پڑھ سکتا تو تم سے کیوں پوچھتا۔ تم ایسا کرو کہ انگریزی میں پتا لکھ دو۔"

لڑکے نے کان پر لگی ہوئی پنسل سے نام اور پتے کا ترجمہ کردیا۔ پھر میری آسانی کے لئے اس نے زبانی ہدایات دیں اور تاریخ کو رٹنے میں مصروف ہوگیا۔ میں نے اسے پاس ہونے کی دعا دی اور واپس چل پڑا۔ باتوں باتوں میں ہم کلائی آگے نکل آئے تھے۔ اگر میں نے پہلے کسی سے معلوم کیا ہوتا تو ہم بلاوجہ کی مسافت طے کرنے سے بچ جاتے۔"

جھونپڑیوں کے علاقے سے نکل کے ہم نے وہی گندہ بدبو دار نالا عبور کیا جس میں کارخانوں کا فاضل مواد بہتا تھا۔ یہاں ہوا بھی مجھے زہریلی لگی۔ اس میں نہ جانے کون کون سی گیسیں شامل تھیں۔ میرے دماغ کو امونیا اور کلورین جیسی تیز چبھنے والی اور دم گھونٹنے والی بو نے چکرا دیا اور نالہ پار کرنے کے بعد جب تازہ ہوا کا جھونکا آیا تو میری جان میں جان آئی۔ مجھے ان کی قوتِ برداشت پر تعجب ہوا جو اس ہوا میں سانس لے کر زندہ تھے اور ان بچوں پر ترس آیا جن کے لئے اس لاکھوں کی آبادی والے' سرمایہ دار شہر میں خالص ہوا تک میسر نہ تھی۔ رابعہ نے پل کراس کرتے ہی برقع ہٹادیا۔ اسے متلی سی محسوس ہورہی تھی۔ وہ سر پکڑ کر ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔

نالے کے پار ساری بو اور کیمیائی گیسوں کی سڑاند اس طرف محسوس ہوتی تھی جدھر سے ہوا آتی تھی۔ دوسرے کنارے پر رہنے والے یقیناً خوش قسمت تھے کہ انہیں اس صنعتی علاقے کی کثافت و غلاظت کا تحفہ شرط زندگی کے طور پر قبول نہیں کرنا پڑتا۔

جب رابعہ کی طبیعت کچھ بحال ہوئی تو میں نے کہا "اب ہٹاؤ یہ نقاب' کوئی دیکھنے والا نہیں ہے یہاں۔"

"میں تھک گئی ہوں سکندر!" رابعہ نے برقع اتار کر سمیٹا اور بغل میں دبالیا۔ ہم پھر چلنے لگے۔

میں نے کہا "مجھے یہاں ایسی کوئی جگہ نظر نہیں آتی جہاں ہم آرام کرلیتے۔ کوئی ریسٹورنٹ بھی تو نہیں ہے۔"

"کیا ہم اسی طرف نہیں جارہے ہیں۔ جہاں، ہم نے

جیپ چھوڑی تھی ؟" رابعہ نے کہا "وہاں ریسٹورنٹ تھا۔"

میں نے مدھو سودن کے گھر کا پتا تلاش کرنے کا ارادہ کچھ دیر کے لئے ملتوی کر دیا۔ ہماری جیپ وہیں بہت سی خراب گاڑیوں کے درمیان موجود تھی۔ کچھ گاڑیاں ڈینٹ پینٹ ہو رہی تھیں۔ باقی شاید کسی اور خرابی کے باعث گیراج کے باہر چھوڑ دی گئی تھیں۔ میں نے سیٹ کے نیچے سے چابی نکالی اور جیپ کو ریورس میں چلا کے سڑک پر لے آیا۔

ایک ملباری ریسٹورنٹ سے چند قدم کے فاصلے پر جیپ میں بیٹھ کے میں نے رابعہ کے ساتھ کڑک چائے کے دو گلاس پیئے اور آدھا کیک بھی حلق سے اتارا۔ ایک سگریٹ پینے کے بعد میں۔ نے جیپ کو مدھو سودن کے مکان سے پچاس قدم دور لے جا کر کھڑا کر دیا۔ پتا جو اس ہونہار طالب علم نے سمجھایا تھا' میرے ذہن میں گڈ مڈ ہو گیا تھا لیکن میں نے ملباری کے ہوٹل سے نئی ہدایات حاصل کر لی تھیں۔

ہم جس صنعتی علاقے میں موجود تھے وہ کئی میل تک پھیلا ہوا تھا۔ مدھو سودن خود بھی ایک کمپنی کی طرف سے ملے ہوئے چھوٹے سے کوارٹر میں رہتا تھا۔ یہ رہائشی کالونی فیکٹری کی دیوار کے ساتھ ساتھ پھیلی ہوئی تھی اور اس کے سامنے سے گزرنے والی سڑک بالکل سنسان تھی۔ اس پرائیویٹ روڈ پر سے صرف وہی لوگ گزرتے تھے جو یہاں رہتے تھے۔ کوارٹروں کی قطار کے آخر میں روشن چند بلب ان دکانوں کے تھے جو مقامی ضروریات پوری کرنے کے لئے کافی تھیں۔

ہر کوارٹر کے باہر مکینوں نے ذاتی شوق پورا کرنے کے لئے چھوٹا سا باغیچہ لگانے کی کوشش کی تھی لیکن زمین پودوں کی نشوونما کے لائق نہیں تھی چنانچہ گھاس اور پھولوں کے بجائے جھاڑ جھنکاڑ زیادہ اگا تھا۔ مدھو سودن کا کوارٹر اس قطار میں ساتواں تھا۔

میری ہدایات کے مطابق رابعہ نے دروازے پر دستک دی "بابو مدھو سودن یہاں رہتے ہیں ؟" رابعہ نے کسی جاہل عورت کی طرح سوال کیا۔ میں کچھ پیچھے دیوار کے ساتھ لگا کھڑا رہا۔

"تم کون ہو؟" کسی عورت نے ترش لہجے میں کہا "کیا کام ہے مدھو سودن سے ؟"

"تمہارا نام کیرتی ہے نا؟" رابعہ نے کہا "تم دھرم پتنی ہو مدھو سودن بابو کی۔"

"تم نے کیسے جانا؟" وہ کچھ نرم پڑ گئی۔

"بابو مدھو سودن نے کہا تھا کہ میری پتنی بڑی سندر ہے۔ گھر کے کام کاج کے لئے نوکرانی چاہئے تمہیں ؟"

"تم... تم کو میں کیسے نوکر رکھ سکتی ہوں ۔" مدھو سودن کی بیوی کا موڈ اپنے سے زیادہ حسین اور پرکشش خادمہ کے تصور سے خراب ہو گیا" اور ویسے بھی ہم نوکرانی کیا رکھیں گے؟ اپنے کھانے کو تو پورا ہوتا نہیں۔ کیوں زبردستی اندر آ رہی ہو۔"

موقع پاتے ہی رابعہ اندر گھسی اور اس کے پیچھے میں بھی ریوالور ہاتھ میں لئے اندر داخل ہو گیا۔ کیرتی جوان عورت تھی مگر اسے ایک عورت سے یہ امید نہ تھی کہ وہ زور آزمائی کر کے اس کو پیچھے دھکیل دے گی۔ اس نے اپنے شوہر کو پکارا۔

"سنو جی! یہ کون ہے تمہاری چہیتی... گھسی چلی آ رہی ہے۔" مدھو سودن بیوی کی آواز سن کے آگے آیا ہی تھا کہ اس نے مجھے ریوالور کے ساتھ دیکھا اور وہیں منجمد ہو گیا۔

میں نے کہا "اپنی بیوی کی اور اپنی آواز قابو میں رکھنا۔ ورنہ اس سے پہلے کہ کوئی تمہاری مدد کے لئے آئے' ہم تمہیں گولی مار کر چلے جائیں گے اور جو مدد کے لئے آئے گا وہ بھی مارا جائے گا۔"

انہیں مزید دہشت زدہ کرنے کے لئے رابعہ نے بھی ریوالور نکال لیا۔ کیرتی اور مدھو سودن کے چہرے لاش کی طرح سفید پڑ گئے۔

"تم... کون ہو... کیا چاہتے ہو؟" مدھو سودن نے بیوی کو اپنے قریب کر لیا جو بیہوش ہونے کے موڈ میں تھی۔

"چند سوالوں کے جواب... صحیح جواب دو گے تو فائدے میں رہو گے۔ ہم جتنی خاموشی سے آئے ہیں اتنی ہی خاموشی سے واپس چلے جائیں گے۔"

"دیکھو' ہمارے بچے... اور گھر کے لوگ دوسرے کمرے میں سو رہے ہیں۔"

مدھو سودن نے لجاجت سے کہا "کیا میں یہ بیچ کا دروازہ بند کر دوں ؟"

میں نے کہا "ضرور کر دو لیکن چالاکی سے کام لے کر اپنے لئے زندگی کے دروازے بند مت کرنا۔"

"تم بھی اتنی کرپا کرو کہ مارنے سے پہلے ہماری بات سن لو' ہمیں بتا دو کہ ہمارا اپرادھ کیا ہے ؟"

میں نے کہا "اگر میرا یہ ارادہ نہ ہوتا تو میں اب تک تمہیں پرلوک پہنچا کے واپس چلا گیا ہوتا۔"

مدھو سودن نے اپنی بیوی کو تسلی دی "کیرتی! چنتا مت کر۔ مجھے یہ لوگ ان جیسے نہیں لگتے۔"

معلوم نہیں 'ان لوگوں' سے اس کی مراد کیا تھی۔ کیرتی کا خوف اس حد تک ضرور کم ہو گیا کہ ہسٹریا کے دورے کی نوبت نہیں آئی۔ وہ ایک چارپائی پر بیٹھ گئی جس پر صاف ستھری' کاڑھے ہوئے پھولوں والی چادر بچھی ہوئی تھی۔ تکئے پر ہندی میں کچھ کاڑھا گیا تھا جو انگریزی میں 'ہیپی ڈریم' اور اردو کے 'شب بخیر' کا متبادل ہو سکتا تھا۔

مدھو سودن درمیانی دروازے کو بند کر کے بیوی کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ چارپائی کے دائیں بائیں دو بید کی بنی ہوئی آرام کرسیاں تھیں اور بالکل سامنے ایک نیا صوفہ سیٹ۔ میں نے کرسی کو ترجیح دی تو رابعہ نے دوسری کرسی پر پوزیشن سنبھال لی۔

میں نے کہا "مدھو سودن! پرسوں رات تم کہاں تھے ؟"

مدھو سودن کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر اس نے کہا "تم سیٹھ جگدیش کو اور جگو دادا کو جانتے ہو ؟"

"میں نے ایک سوال کیا تھا۔ سوال کے جواب میں سوال مت کرو۔"

"یہ دونوں ایک ہی راکھشس کے دو روپ ہیں۔" مدھو سودن نے کہا "ہم اسی کے گھر میں تھے۔ اس کا گھر ایک نہیں ہے لیکن ہم نے معلوم کر لیا تھا کہ وہ اس رات وہاں ہو گا۔"

"تم جسے گھر کہہ رہے ہو' وہ کوٹھی ہو گی اور اس میں داخل ہونا بھی آسان نہیں ہو گا۔ تم کیسے اندر پہنچ گئے تھے؟"

مدھو سودن نے کہا "اسی کوٹھی کے ایک ڈرائیور نے ہماری سہائتا کی تھی۔ ہم اس کی ڈکی میں چھپ کر بیٹھ گئے اور اندر جا کے رات ہونے تک چھپ کر بیٹھے رہے۔" مدھو سودن نے کہا۔

"تم سیٹھ جگدیش یا جگو دادا کو قتل کرنے گئے تھے؟"

"ہم اسے ہی نہیں' اس کے سارے خاندان کو مار دیتے اس کی کوٹھی کو آگ لگا دیتے یا دھماکے سے اڑا دیتے۔"

"لیکن تمہیں اس کا موقع نہیں ملا؟"

"ہاں' اسی رات وہاں کچھ ڈاکو آ گئے۔ وہ ہمیں پکڑ کر لے گئے۔ انہوں نے ہماری بات کا وشواس نہیں کیا کہ ہم ان کے خلاف نہیں' ان کے ساتھ ہیں" مدھو سودن نے کہا۔

"تم جانتے ہو' وہ کون ڈاکو تھے ؟"

"وہ خونی خان کی آدمی تھے۔" مدھو سودن بولا "جب ہم نے اسے اپنی بپتا سنائی تو اس نے کہا کہ جاؤ اب اس سے ہم نمٹ لیں گے۔ میں نے کہا بھی کہ اس سے مجھے شانتی نہیں ملے گی۔ تو اس نے کہا کہ شانتی کے بچے' آتمہ ہتیا کر کے تمہیں کیا ملے گا۔ تمہارے بچے اناتھ ہو جائیں گے۔ تم خود بھی مارے جاؤ گے یا بچ گئے تو پھانسی چڑھ جاؤ گے۔ ایسے بدلے سے فائدہ۔ بدلہ لینا ہے تو ایسے لو کہ دشمن کا خاتمہ ہو جائے مگر خود پر آنچ نہ آئے۔ تم ایک پاپی کا برا انجام دیکھنے کے لئے زندہ رہو۔ خونی خان کے بہت قصے سنے تھے میں نے۔ کوئی کہتا ہے کہ وہ بات سنتا ہی نہیں۔ اسے خون کر کے مزہ آتا ہے۔ وہ انسان نہیں درندہ ہے۔ انسانی خون پیتا ہے۔ کوئی کہتا تھا کہ وہ بروں کے حق میں برا ہے۔ اسے بدنام کر دیا گیا ہے کیونکہ اس کا نام سن کے جگو دادا جیسے بدمعاشوں کی نیند اڑ جاتی ہے۔ اس کی بات سن کے مجھے عقل آ گئی۔ اس نے بہت اچھی طرح بات کی تھی۔ اب کوئی کچھ بھی کہے' میں اسے بہت اچھا آدمی سمجھتا ہوں۔"

میں نے ساری بات سن کے کہا "ایسی باتیں بہرام ڈاکو اور رابن ہڈ کے بارے میں مشہور ہیں۔"

"خونی خان کے بارے میں کوئی سنی سنائی بات نہیں بتا رہا ہوں میں۔" وہ بولا۔

میں نے کہا "خیر' ہمیں کوئی سروکار نہیں خونی خان کی اچھائی برائی سے۔ مجھے یہ بتاؤ کہ جو اسلحہ تم اپنے ساتھ لے کر گئے تھے وہ تم نے کہاں سے حاصل کیا تھا؟"

مدھو سودن کے چہرے کا رنگ اڑ گیا "تمہیں کیا معلوم کہ ہم کیسا اسلحہ لے کر گئے تھے ؟"

میں نے کہا "تم نے دوسری بار سوال کے جواب میں سوال کرنے کی غلطی کی ہے۔ پھر ایسا کیا تو میں تمہارے دانت توڑ کے تمہاری بیوہ کے ہاتھ پر رکھ دوں گا۔ تم مشین گن اور دستی بم لے کر گئے تھے ؟"

مدھو سودن نے اقرار میں سر ہلایا "وہ ہم نے چرائے تھے۔"

میں نے کہا "کہاں سے چرائے تھے ؟ تم ہمیں وہ جگہ دکھا سکتے ہو ؟"

مدھو سودن نے بے بسی سے کیرتی کی طرف دیکھا۔ اس سوال کا جواب کیرتی نے اقرار کے انداز میں سر ہلا کے دیا۔ پھر مدھو سودن نے کہا "دکھا دیں گے۔"

"اس جگہ کا پتا تمہیں کس نے بتایا تھا ؟"

"ایک پروہت نے۔" مدھو سودن نے تلخ' نفرت آمیز لہجے میں کہا "دھرم کے ایک بیوپاری نے۔"

کیرتی نے دیوار کو گھورتے ہوئے کہا "یہ بھی تو پوچھو کہ ہم نے یہ سب کس کارن کیا۔" اس کے لہجے میں دبے ہوئے طوفان کا شور تھا جو اس کے وجود کو اندر سے تہس نہس کرنے کے لئے بے تاب تھا۔

میں نے کہا "اب میں یہی پوچھنے والا تھا۔ تم سیٹھ جگدیش کو اور اس کے سارے خاندان کو ختم کر کے کس ظلم کا بدلہ لینا چاہتے تھے ؟"

"یہ میں بتاؤں گی۔" کیرتی نے کہا۔

مدھو سودن نے کہا "کیرتی ' تم پر پھر دورہ پڑ جائے گا۔"

کیرتی نے کہا "نہیں ' اب وہ آگ بجھ رہی ہے جو میرے شریر کو بھسم کرتی تھی۔ خان نے بالکل ٹھیک کہا تھا کہ اسے سزا دینی ہے تو اس کو جینے دو۔ ان سب کو مار دو جن سے جگو دادا پیار کرتا ہے۔ ساری دنیا اس سے نفرت کرتی ہے اور وہ ساری دنیا سے نفرت کرتا ہے۔ بس ایک اس کا خاندان ہی تو نفرت کے سمندر میں محبت کا چھوٹا سا جزیرہ ہے جس کے سہارے پر وہ زندہ ہے۔ اس جزیرے کو ڈبو دو پھر وہ خود ہی اس نفرت کے سمندر میں غوطے کھاتا رہے گا اور مدد کے لئے پکارتا رہے گا مگر کون ہے جو اس کی مدد کرے گا؟"

مدھو سودن کے مقابلے میں اس کی بیوی زیادہ صاف اور روانی سے اردو بولتی تھی۔

"اب وہ اکیلا زندہ ہے۔ اس کے چار بچے تھے۔ ایک لڑکا اور تین لڑکیاں۔ لڑکا بڑا تھا اور جیتا تو اچھا آدمی بنتا۔ چار چھ سال بعد ڈاکٹر کہلاتا۔ جگو دادا نے اپنے خاندان پر اپنے اعمال کا سایہ نہیں پڑنے دیا تھا۔ اس نے انہیں اپنی اپرادھ کی زندگی سے دور رکھنے کے لئے سخت محنت کی تھی۔ اولاد کے معاملے میں وہ صرف ایک باپ تھا۔ کون باپ یہ چاہتا ہے کہ اس کا جیون ایک دلدل میں بیتا ہو تو اس کے بچے بھی اس دلدل میں رہیں۔ کسی چور کی خواہش نہیں ہوتی کہ اس کا بیٹا اور آگے بڑھ کے ڈاکو بنے۔ کلرک چاہتا ہے کہ اس کا بیٹا افسر ہو۔ ان پڑھ رہ جانے والا اپنی بدنصیبی کا ورثہ اپنی اگلی نسل کو منتقل نہیں کرنا چاہتا۔ سیٹھ جگدیش اور جگو دادا دونوں نہیں چاہتے تھے کہ ان کے پاپ کا پھل ان کی اولاد کھائے۔ یہ ثبوت تھا اس بات کا کہ اس ایک شیطان کے لئے اپنے دونوں روپ ایک سے تھے۔ نفرت کے قابل۔ وہ بچوں کو اس نفرت کے احساس سے بھی بچانا چاہتا تھا کیونکہ وہ ان سے واقعی محبت کرتا تھا۔ یہ اس کی ضرورت یا مجبوری تھی۔ وہ جانتا ہو گا کہ اس کے ساتھی ' اس کے حکم کے غلام ' اس سے ڈرنے والے ' سب اس کی طاقت اور دولت کے سامنے بے بس ہیں۔ کوئی سیٹھ جگدیش کو اچھا نہیں سمجھتا ' کوئی جگو دادا سے محبت نہیں کر سکتا۔ لیکن گھر ایک ایسی جگہ تھی جہاں وہ ایک عورت اور چار بچوں سے عزت و احترام ' محبت اور لگاؤ سب کچھ چاہتا تھا..... جو اسے بے غرض چاہتے تھے۔ خان نے محبت کے اس جزیرے کو غرق کر دیا۔ اس نے جگو دادا کے پیروں کے نیچے سے زمین کھینچ لی [illegible] وہ نفرت کے جوہڑ میں اکیلا ڈبکیاں کھا رہا ہے۔ اگر اس کی سب دولت چھن جاتی تو اسے یہ صدمہ پاگل نہ کرتا۔ وہ دولت پھر حاصل کر لیتا مگر وہ گھر جس میں اسے عزت اور محبت حاصل تھی ' اسے کہیں سے نہیں ملے گا۔ وہ یہ اذیت برداشت کرتا رہے گا ' روتا رہے گا اور پاگلوں کی طرح چلاتا رہے گا۔ پتی کو دیوتا سمان ماننے والی ایک عورت اور باپ کو پیار کا آسمان سمجھنے والے چار بچوں کی محبت اسے کون دے گا؟ اس پر کوئی ترس کھانے والا بھی نہیں۔ مجھے مدھو سودن نے بتایا ہے کہ کوئی اس سے ہمدردی کرے تو وہ اسے مارتا ہے ' کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ تم سب جھوٹ بولتے ہو۔ تم سب خوش ہو اندر سے ' میری بدقسمتی کا تماشہ دیکھ کر مزے لے رہو۔ تم سمجھتے ہو کہ مجھے ٹھیک سزا دی ہے بھگوان نے۔ میرے کرم ہی ایسے تھے۔" وہ قہقہہ مار کے ہنسی۔

"کیرتی!" مدھو سودن نے اسے تنبیہہ کے انداز میں گھورا۔

کیرتی نے اپنا ہاتھ منہ پر رکھ لیا "میں پاگل ہوں نا۔ تم یہی سمجھتے ہو گے۔ بہت بولتی ہوں میں۔ کیا تمہیں معلوم تھا یہ سب؟ ضرور معلوم ہو گا۔ تمہاری باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم سب کچھ پہلے سے جانتے ہو۔ ہر بات کا پتا کر کے آئے ہو تم مگر کوئی بات نہیں ' مجھ سے سب پھر سن لو۔ میں تو چاہتی ہوں کہ ایک ایک شخص کے سامنے بیٹھ کے اسے خود پوری بات بتاؤں۔ سب سے مزے کی بات ہے۔ پہلے میں نے بہت دکھ جھیلے ' بہت تڑپایا مجھے اس راکھشس نے۔ اب وہ خود تڑپ رہا ہے اور مجھے بہت خوشی ہے۔ اس نے جو کچھ میرے ساتھ کیا....."

"کیرتی! بس کرو۔ تمہاری طبیعت خراب ہونے لگی ہے۔ جاؤ اندر جا کر مہمانوں کے لئے چائے بنا لاؤ۔" اس نے میری طرف اجازت طلب اور التجا آمیز نظروں سے دیکھا۔

میں نے کچھ سوچ کے کہا "اگر مہمان سمجھا ہے تو پھر ایسی کوئی بات نہ ہونے دینا جو ہمارے اعتماد کو ٹھیس پہنچائے۔ ابھی تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ ہم کس حد تک بے رحم اور سفاک بھی ہو سکتے ہیں اور اب تک کتنے خون کر چکے ہیں۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہو گی۔" مدھو سودن نے کہا "کہ کیرتی تمہیں چائے میں زہر دے دے یا رسوئی میں جلنے کے بہانے باہر نکل جائے اور کسی کو بلا لے۔ میں جو یہاں موجود ہوں۔ جاؤ کیرتی ' شاباش ' ذرا دھیان سے کام کرنا۔ آہٹ بھی نہ ہو اور کوئی جاگ اٹھے تو کہہ دینا ' مہمان بیٹھے ہیں۔"

کیرتی جانا نہیں چاہتی تھی مگر اس نے شوہر کی بات کو حکم سمجھ کے قبول کر لیا اور آہستہ سے درمیانی دروازہ کھول کے غائب ہو گئی۔ میں سوچ رہا تھا کہ کہیں جذبات کی رو میں بہہ کر میں نے غلطی تو نہیں کی۔ یہ میاں بیوی نہ بیوقوف تھے ' نہ بزدل۔ اگر بہادر بننے کی کوشش میں کیرتی نے کوئی غلط قدم اٹھایا تو ہم جوابی کارروائی پر مجبور ہوں گے۔ پھر ہمارے ہاتھ سے کتنے مارے جاتے ہیں ' ہمارے لئے اس کی کوئی اہمیت نہیں ہو گی۔ میاں بیوی پہلے ہی مظلوم تھے ' ان پر مزید ظلم کرنا مجھے گوارا نہ تھا۔ رابعہ نے بروقت مجھے اس الجھن سے یوں نجات دلائی کہ خود بھی اٹھ کے کیرتی کے پیچھے اندر چلی گئی۔

مدھو سودن نے مجروح نظروں سے مجھے دیکھا "تمہاری پتنی بہت شکی ہے۔ اعتبار نہیں کرتی۔"

میں نے کہا "عورت ذات فطرتاً شکی ہوتی ہے۔ ویسے احتیاط میں حرج بھی کیا ہے۔ تمہارے ساتھ جو ظلم ہوا تھا ' اس کا مجھے علم ہے۔ اگر تمہاری بیوی موجود رہتی تو میں اخلاقاً اس سے تفصیل سنتا۔ اس کی بات اور ہے۔ عورت دل کا بوجھ ہلکا نہ کر سکے تو ہسٹریا کے دورے کا شکار ہو جاتی ہے۔ وہ سب تمہیں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ تم مجھے کچھ زیادہ اہم سوالوں کے جوابات دے سکتے ہو۔ تم نے کہا تھا کہ تمہیں ایک دھرم کے بیوپاری نے کسی اسلحے کے ذخیرے کا پتا بتایا تھا۔ وہاں سے تم نے کچھ اسلحہ نکال لیا۔ پھر اس پروہت کو تم نے کیوں قتل کیا؟"

وہ ایسے چونکا جیسے میں نے ریوالور نکال کے فائر کر دیا ہے۔

"میں..... میں نے۔" وہ زور زور سے انکار کے انداز میں گردن کو ہلاتا رہا "یہ غلط الزام لگا رہے ہو تم مجھ پر۔"

میں نے کہا "میرے پاس ثبوت ہے اور گواہ ہیں کہ پروہت کو تم نے اور تمہاری بیوی نے ' دونوں نے مل کر قتل کیا ہے۔"

"نہیں ' ہم اسے کیوں قتل کریں گے؟"

میں نے کہا "تم قتل کے اسباب جاننا چاہتے ہو ' مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے اسے کتنا معاوضہ ادا کیا تھا؟"

مدھو سودن نے بے بسی سے ادھر ادھر دیکھا مگر اب اس کی بیوی مدد کے لئے موجود ہی نہیں تھی۔

"نقد کے علاوہ تم نے اس کے پاس اپنی بیوی کا تمام زیور بھی رکھوا دیا تھا۔" میں نے کہا "رکھوا دیا تھا میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ تمہارا ارادہ بالآخر وہ سب واپس لینے کا تھا۔"

مدھو سودن کے لب کانپنے لگے "یہ..... ٹھیک ہے کہ ہم اس سے وہ سب واپس لینے گئے تھے لیکن اس نے انکار کر دیا۔"

"تم مجھے اتنے احمق تو نہیں لگتے۔ کیا مانگنے سے وہ تمہارا روپیہ اور زیور واپس کر دیتا؟ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ بھی انکار کرتا کہ تم نے ایک سودا کیا تھا۔ یہ مال کے بدلے مال کا سودا تھا۔ تمہیں اپنا مال مل گیا تو پھر قیمت کی واپسی کا کیا سوال۔ تم کو تسلیم کر لینا چاہئے کہ تم اس سے زیور اور پیسہ مانگنے نہیں ' چھیننے گئے تھے اور جب اس نے مزاحمت کی تو تم دونوں نے مل کر اسے مار دیا۔ شاید تم نے اسے پکڑے رکھا اور تمہاری بیوی نے اس پر خنجر سے وار کئے۔"

"خنجر سے..... کیرتی کر سکتی ہے ایسا! وہ تو اتنی بزدل ہے کہ کاکروچ نہیں مار سکتی۔"

میں نے طنز سے کہا "لیکن جگو دادا کو اور اس کے سارے خاندان کو مشین گن سے بھون سکتی ہے اور اس کے گھر دھماکے سے اڑا سکتی ہے؟"

"وہ..... وہ دوسری بات تھی۔ اپنے کے بچوں لئے بلی بھی شیر بن جاتی ہے۔ وہ انتقام کے جذبات تھے جو اس کے جنون کا کارن بن گئے تھے۔"

میں نے کہا "دیکھو ' میں خود اس پروہت کی لاش دیکھ چکا ہوں اور اس پروہت کے گھر میں ایک بڑھیا رہتی ہے۔ اس نے سب کچھ دیکھا تھا۔ اس نے مجھے بتایا ہے کہ تم نے پروہت کا خون کیا۔"

"وہ بڑھیا غلط کہتی ہے۔ ہم نے پروہت سے کہا تھا کہ وہ ہمارا پیسہ اور زیور واپس کر دے کیونکہ ہم نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔ ہمیں اب اسلحہ کی ضرورت نہیں رہی۔ وہ کہنے لگا کہ میں نے بھی پیسہ خرچ کر دیا ہے اور زیور بیچ کے جو پیسا ملا تھا ' وہ بھی اڑا دیا ہے۔ اب میں کچھ واپس نہیں کر سکتا۔ جاؤ ' جو کرنا ہے ' کر لو۔ پولیس کے پاس جاؤ یا کہیں اور۔ صاف ظاہر ہے ' وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ اس کی بات پر مجھے غصہ آیا اور میں نے اس کی گردن پکڑ لی۔ وہ چلانے لگا۔ اس کے ساتھ ہی وہ بڑھیا کیرتی کو گالیاں دینے لگی۔ کیرتی نے اسے دھکا دیا تو وہ چوکی سے لڑھک گئی اور اس کا سر زمین پر لگا۔ کیرتی سمجھی ' وہ مر گئی۔ میں نے بھی پروہت کے سر پر پیتل کی گڑوی مار دی تھی اور وہ سر پکڑ کے لیٹ گیا تھا لیکن وہ دونوں زندہ تھے۔ اس میں شک کی کوئی بات نہیں۔ ہم دونوں بہت ڈر گئے تھے ' اس لئے وہاں سے بھاگ آئے۔"

میں بڑے غور سے مدھو سودن کی شکل دیکھ رہا تھا۔ اس کا لہجہ ہی نہیں ' چہرہ بھی سچ کی گواہی دے رہا تھا۔ یہ بات میری ذہنی الجھن میں اضافے کا سبب بن رہی تھی۔ اگر پروہت کو مدھو سودن اور کیرتی نے قتل نہیں کیا تھا تو پھر اس کا خون کس کے ہاتھوں ہوا تھا اور اس بڑھیا نے ہوش میں آتے ہی ان میاں بیوی کا نام کیوں لیا تھا۔ وہ پورے یقین کے ساتھ انہیں قاتل کیوں قرار دے رہی تھی؟

اگر میں مدھو سودن کے بیان کی حقیقت کو تسلیم کر لیتا تو

پھر میرے لئے یہ بھی ماننا لازمی ہوتا کہ وہ بڑھیا جھوٹ بول رہی تھی مگر اسے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس سوال کا ایک جواب ہی ممکن تھا۔ جب تک وہ ہوش میں رہی‘ اس نے مدھو سودن کو پروہت سے دست و گریباں دیکھا تھا۔ پھر کیرتی نے اسے دھکا دیا اور وہ بے ہوش ہوگئی۔ اسے نہیں معلوم کہ بعد میں کیا ہوا۔ پھر ہوش میں آنے کے بعد اسے پروہت کی لاش نظر آئی اور اس نے دونوں میاں بیوی کو غائب دیکھا تو قدرتی طور پر اس کے ذہن نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ وہ پروہت کو قتل کرکے فرار ہوگئے جبکہ درمیانی وقفے میں کوئی اور بھی وہاں گیا اور اس نے پروہت کو قتل کردیا۔ میرے ابتدائی اندازے کے مطابق یہ کام تین افراد کا تھا۔ اب مدھو سودن نے یہ تسلیم کرلیا تھا کہ بڑھیا کو کیرتی نے دھکا دے کر گرایا تھا جس سے وہ بے ہوش ہوگئی تھی۔ اس حد تک کیرتی کا جرم قابل معافی تھا اور میرے نزدیک یہ کوئی جرم بھی نہیں تھا تاہم یہ بات میرا ذہن بھی قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوتا تھا کہ بڑھیا کے بے ہوش ہوجانے کے بعد مدھو سودن نے پروہت کو پکڑ لیا اور کیرتی نے اس پر خنجر کے پے در پے وار کئے۔ عورت ریوالور یا مشین گن تو چلا سکتی ہے مگر کسی مرد کی طرح خنجر نہیں چلا سکتی۔ یہ ہو سکتا تھا کہ وہ ایک بار ہمت کرکے خنجر گھونپ دے مگر پروہت پر کئی وار ہوئے تھے۔ کیرتی نازک سی عورت تھی۔ وہ عام عورت کی طرح کاکروچ نہیں مار سکتی تھی یا چھپکلی کو دیکھ کر چیخ مارتی تھی تو یہ بات سمجھ میں آتی تھی۔

کیرتی چائے کی ٹرے اٹھائے اندر آئی تو میں چونکا۔ رابعہ نے پھر بیچ کا دروازہ بند کردیا۔

”کیرتی‘ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے پروہت کو خنجر سے مار دیا۔ میں نے اسے پکڑا اور تم نے اس پر وار کئے۔“ مدھو سودن شکایت اور فریاد کے انداز میں بولا۔

کیرتی نے چائے کی ٹرے میز پر نہ رکھی ہوتی تو ضرور اس کے ہاتھ سے نیچے گر جاتی۔

اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا تو اس کی پھٹی پھٹی آنکھوں میں مجھے یہی سوال نظر آیا کہ دیکھو.... کیا میں ایسی ہوں؟ ایسا کرسکتی ہوں میں؟

میں نے کہا۔ ”ابھی تک حالات اور واقعات کی شہادت صرف تم دونوں کے خلاف ہے لیکن بعض اوقات آدمی کی نظر ہی نہیں‘ عقل بھی دھوکا کھا جاتی ہے۔“

”کیرتی! یہ کہتے ہیں.....“

میں نے اسے ٹوک دیا۔ ”جو میں نے تم سے پوچھا تھا‘ وہ میں خود بھی کیرتی سے پوچھ سکتا ہوں اور سچ کسی اور کی زبان پر آکے بدلتا نہیں۔“

”ہاں‘ پوچھ لو‘ کیرتی سے پوچھ لو۔“

رابعہ جب چائے بنانے لگی تو کیرتی ایسے پلنگ پر بیٹھی ہوئی تھی جیسے میں نے اس پر فرد جرم ہی عائد نہیں کی‘ اسے سزائے موت بھی سنادی ہے۔ اسے تسلی دینے کے لئے میں نے کہا۔ ”میں مدھو سودن کی بات مان لیتا ہوں۔“

”کیا پروہت کو واقعی قتل کردیا ہے کسی نے؟“ کیرتی نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔“

”تم سے غلط کہا ہوگا کسی نے۔“

”ہم دونوں اس کے گھر میں وہ لاش دیکھ کر آئے ہیں جس پر خنجر کے کم سے کم چھ مہلک زخم تھے۔“ میں نے درشتی سے کہا۔ ”میں سنی سنائی بات نہیں کررہا ہوں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ تمہارے واپس لوٹ آنے کے بعد پروہت کا کوئی اور دشمن وہاں پہنچا ہو اور اس کا کام تمام کردیا ہو لیکن اس کو کسی نے بھی نہیں دیکھا۔ تمہیں اس عورت نے دیکھا تھا.... اچھا! کچھ دیر کے لئے یہ ذکر موقوف۔ تم بھی پہلے چائے پی لو۔“

دراصل میں کیرتی کی لحہ بہ لحہ بگڑتی حالت کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا شوہر پہلے ہی دوبار تشویش کا اظہار کرچکا تھا کہ اس کی طبیعت بگڑ جائے گی۔ شاید مسلسل صدمات جھیلنے کے بعد اس کے اعصاب اتنے کمزور پڑ گئے تھے کہ اب وہ معمولی سا ہیجانی دباؤ برداشت نہیں کرسکتی تھی۔ مدھو سودن نے میری بات سن کے نظروں ہی نظروں میں شکر گزاری کے جذبات کا اظہار کیا اور بڑی محبت‘ توجہ اور اصرار کے ساتھ بیوی کو خود چائے پلانے لگا۔

چائے پینے کے بعد کیرتی کی حالت میں بہتری کے نمایاں آثار نظر آنے لگے۔ اس نے میرے رویئے سے یہ بھی اندازہ کرلیا تھا کہ میری پوچھ گچھ کا مقصد یہ ہرگز نہیں ہے کہ میں انہیں قانون کے حوالے کرنا چاہتا ہوں اور میں ان کے کسی دشمن کی نمائندگی کرنے بھی نہیں آیا۔

”اب ایک آخری بات تم سے اور معلوم کرنی رہ گئی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے یہ بتاؤ کہ اسلحہ حاصل کرنے کے لئے تم نے ایک پروہت سے رابطہ قائم کیوں کیا؟“

”رابطہ ہم نے نہیں‘ اس نے قائم کیا تھا۔“

”کیا مطلب؟ اس نے آکے کہا تم سے کہ مدھو سودن مشین گن اور دستی بم کی ضرورت ہے تو بتاؤ‘ کیا وہ اسلحے کا ڈیلر تھا اور ہر ایک سے یہ بات پوچھتا پھرتا تھا؟“ میں نے کہا۔

”دراصل پروہت سے میرا بچپن کا یارانہ تھا۔ وہ شروع سے فراڈ تھا۔ اس نے کئی بھیس بدلے‘ کئی بار جیل بھی گیا اور جب باہر آیا تو ایک نئے روپ میں۔ اس کو تم دوستی مت کہو‘ بس وہ مجھے اس وقت سے جانتا تھا جب میں بارہ سال کا تھا اور اتنی ہی عمر اس کی تھی۔ جو کچھ سیٹھ جگدیش یا جگو دادا نے ہمارے ساتھ کیا‘ اس کے بعد میں اور میری بیوی دونوں ہی کچھ عرصہ پاگل رہے۔“

”کسی پاگل خانے میں رہے؟“ میں نے کہا۔

”نہیں‘ ہم ایسے پاگل نہیں تھے کہ کسی کو نقصان پہنچاتے۔ بس ہمیں اپنا ہوش نہیں تھا۔ اسی زمانے میں یہ پروہت مل گیا مجھے۔ اس کے سامنے میں نے پہلی بار کھل کر اپنے ارادے کا اظہار کیا کہ میں اس حرامزادے جگو دادا کا خانہ خراب کردوں گا۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں اس کے ٹکڑے کردوں۔ اس کے سارے خاندان کا نام ونشان مٹادوں۔ اس کی کوٹھیوں کو آگ لگادوں۔ پروہت نے مجھے سمجھایا کہ پاگل مت بن‘ کسی اور کے سامنے یہ بات مت کرنا‘ ورنہ اپنا ہی نقصان کرے گا۔ ایسے کام سوچ سمجھ کر کئے جاتے ہیں۔ موقع دیکھ کر۔ اور خالی ہاتھوں سے تو آدمی چڑیا کا بچہ بھی نہیں مار سکتا۔ جگو داد کو کیا سمجھا ہے تونے آخر؟ میں نے کہا کہ پروہت! اگر تیری چودہ سال کی بیٹی اس درندگی کا نشانہ بنتی اور تجھے اس کی لاش سڑک پر پڑی ملتی تو میں دیکھتا کہ تیری عقل کیا کہتی ہے۔ تم تو جانتے ہی ہوگے‘ میں نے جگو دادا کے خلاف پرچا کٹوانے کی کوشش کی تھی۔ اس نے میری چھوٹی بہن کو اٹھوالیا۔ میں اخبار والوں کے پاس گیا۔ لیڈروں کے پاس گیا۔ کسی نے کچھ نہیں کیا۔ جگو نے ایک رات اس کی بہن کو اٹھوالیا۔“ مدھو سودن نے کیرتی کی طرف اشارہ کیا۔

”ان تکلیف دہ باتوں کو دہرانے سے کیا فائدہ مدھو سودن“ میں نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

”کچھ عرصے بعد اچانک پروہت میرے پاس آیا۔ اس نے کہا کہ مدھو سودن جگو دادا سے بدلہ لینا ہے تو بتا۔ میں نے کہا کہ کیسے؟ میں تو آج بھی خالی ہاتھ ہوں۔ اس نے کہا کہ کیا چاہئے تجھے اپنے خالی ہاتھوں کے لئے۔ مشین گن‘ دستی بم؟ میں پہلے یہ سمجھا کہ وہ مذاق کررہا ہے مگر اس نے کہا کہ پیسہ نکال میں تجھے سب دلواسکتا ہوں۔ میں یہ سمجھا کہ شاید کوئی شخص یہ چیزیں بیچ رہا ہوگا۔ پیسے سے بمبئی میں کیا نہیں ملتا۔ لیکن اس نے تو دوسری ہی بات کی۔ اس نے کہا کہ کل میں ایک جگہ پوجا پاٹ کے لئے گیا تھا۔ وہاں بہت سے پجاری آئے ہوئے تھے۔ بھوجن کے بعد مجھے بڑی زور کی نیند آئی۔ میں وہاں سے کھسک گیا اور ایک ایسی جگہ جاکے سوگیا جہاں مجھے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ جب میری آنکھ کھلی تو آدھی رات گزر چکی تھی۔ میں بڑا گھبرایا۔ سب لوگ جاچکے تھے اور میں اندر بند ہوگیا تھا۔ خیر‘ میں نے چوروں کی طرح دبے پاؤں اندر گھوم پھر کے باہر نکلنے کا ایک راستہ تلاش کرلیا مگر وہاں میں نے عجیب منظر دیکھا۔ ایک ٹرک پر کچھ لوگ سامان لاد رہے تھے۔ مجھے حیرانی ہوئی کہ یہ آدھی رات کو کیا ہورہا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ ضرور کوئی گول مال ہے۔ سارے کالے دھندے آدھی رات کے بعد ہی ہوتے ہیں۔ موقع پاتے ہی میں ٹرک پر چڑھ گیا کیونکہ باہر نکلنے کا اور کوئی طریقہ نہ تھا۔ میرا خیال تھا کہ راستے میں کہیں ٹرک کی رفتار کم ہوگی تو اتر جاؤں گا لیکن رات کے وقت سڑکیں خالی تھیں۔ ٹرک کے ساتھ میں ایک گودام تک جاپہنچا۔ اس ٹرک سے اتر کر میں نے پہلے تو بھاگ جانے کا سوچا لیکن اتنی دور سے میں واپس کیسے آتا۔ میں چھپ کر دیکھتا رہا۔ کچھ لوگوں نے ٹرک سے سامان اتار کر گودام میں رکھا لیکن انہوں نے ہر پیٹی کو چیک کیا اور اس وقت مجھے پتا چلا کہ ان پیٹیوں میں کیا ہے۔ اب تمہیں کچھ چاہئے تو میرے ساتھ چلو اور اس گودام سے لے لو۔ میں نے کہا کہ یہ اتنا آسان کام ہے کیا۔ وہاں چوکیدار بھی ہوں گے تو پروہت نے کہا کہ میں نے تو نہیں دیکھا۔ ٹرک خالی ہوگیا تھا تو میں اسی میں واپس شہر آگیا تھا لیکن جہاں تک مجھے یقین ہے‘ اس ٹرک ڈرائیور نے خود ہی گودام کو تالا لگایا تھا اور اپنے پیچھے کسی کو بھی نہیں چھوڑا تھا۔ شہر پہنچنے کے بعد مجھے ٹرک سے اترنے کا موقع مل گیا اور میں صبح گھر پہنچا۔“

”تمہارے اس پروہت دوست کا کہنا ہے۔“ میں نے ساری بات سننے کے بعد کہا۔ ”کہ ٹرک پر سامان چند افراد نے مل کے لادا تھا۔ کیا شہر سے باہر واقع گودام میں سامان اتارنے کے لئے یہی لوگ ساتھ گئے تھے؟“

”یہ.... تو نہیں معلوم۔ میں نے نہیں پوچھا تھا۔“

”اگر وہی لوگ ٹرک میں گئے تھے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ پروہت کیسے سوار ہوا؟ انہوں نے پوچھا نہیں کہ تم کون ہو اور اس ٹرک میں کیا کررہے ہو۔ ڈرائیور کے ساتھ ایک آدمی بیٹھ سکتا ہے‘ باقی ضرور پیچھے ہوں گے اور پروہت بھی پیچھے ہی سوار ہوسکتا تھا۔“

”ہاں۔“ مدھو سودن کنفیوز ہو کے بولا۔

”ہم فرض کرلیتے ہیں کہ ٹرک کو صرف ایک ڈرائیور لے گیا تھا اور گودام میں مال اتارنے والے لوگ دوسرے تھے۔ اگر واپسی میں وہ بھی ٹرک پر آئے تھے تو پروہت ان میں شامل ہو کے کیسے آیا؟“

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہاں صرف ٹرک ڈرائیور ہو۔"

میں نے کہا "کیا ایک آدمی ایک پورے ٹرک کا سامان اتار کے گودام میں پہنچا سکتا ہے؟ اس کے علاوہ خود پروہت نے تمہیں بتایا تھا کہ وہاں کچھ لوگوں نے ہر پیٹی کو چیک کیا تھا۔"

مدھو سودن نے تسلیم کیا "یہ بات اس نے کہی تھی۔"

میں نے کہا "اس کا مطلب یہ ہوا کہ پروہت نے تم سے جھوٹ بولا تھا۔ یا تو وہ ٹرک میں واپس نہیں آیا تھا یا پھر اس نے یہ غلط کہا تھا کہ گودام میں کوئی نہیں رہا تھا اور خود ٹرک ڈرائیور تالا لگا کے گودام کو لاوارث چھوڑ آیا تھا۔"

"لیکن جب ہم وہاں گئے تھے۔ میں اور کیرتی۔ تو وہاں واقعی کوئی چوکیدار نہیں تھا۔" مدھو سودن نے کہا "ورنہ وہ ہمیں گولی نہ ماردیتا۔"

میں سوچ میں پڑ گیا "پھر تو ایک ہی صورت ہو سکتی ہے کہ جو لوگ وہاں ٹرک سے سامان اتروانے کے لئے پہلے سے موجود تھے' وہ کام ختم کرنے کے بعد چلے گئے تھے۔ وہ قریب ہی کسی بستی میں رہتے ہوں گے یا انہیں خاص طور پر ایک خاص کام کے لئے وہاں بلایا گیا ہوگا اور پھر معاوضہ دے کر رخصت کردیا گیا ہوگا۔ خیر' یہ بتاؤ کہ اس گودام کے آس پاس کیا ہے؟"

"اور بہت سے گودام ہیں۔ صنعتی علاقے میں آنے جانے والا مال وہیں اتارا جاتا ہے اور وہیں سے جہازوں پر چڑھایا جاتا ہے۔ ٹرکوں کے علاوہ وہاں سے مال لانے لے جانے کے لئے ریل کی پٹڑی بھی ہے اور مال گاڑی بھی چلتی ہے۔ گودام سے بندرگاہ تک۔"

میں نے کہا "رات کے وقت دوسرے گودام بھی ایسے ہی کسی محافظ یا چوکیدار کے بغیر رہتے ہیں۔"

"میں سب کے بارے میں نہیں بتا سکتا۔ کچھ گوداموں کے چوکیدار میں نے دیکھے تھے۔" مدھو سودن بولا۔

"تم گودام میں کیسے داخل ہوئے؟"

مجھے پروہت نے دور سے ہی بتادیا تھا کہ وہ گودام ہے۔ پیچھے کی طرف سے جاکر دیکھنے پر ہمیں ایک کھڑکی نظر آئی۔ ہم نے اس کا اوپر والا شیشہ توڑا اور کنڈی کھول لی۔"

"کیرتی تمہارے ساتھ تھی؟"

مدھو سودن نے کچھ خفت سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا مگر کیرتی نے اس سے نظر نہیں ملائی "کیرتی کو میں نے سامنے چھوڑ دیا تھا کہ اگر کوئی چوکیدار آجائے' تو اسے باتوں میں لگائے۔"

"یعنی ورغلائے۔ اپنے عورت ہونے کا فائدہ اٹھائے"

مدھو سودن نے اقرار میں سر ہلایا لیکن منہ سے کچھ نہیں بولا۔

"پھر کیا ہوا' کیا کوئی چوکیدار آیا؟"

مدھو سودن نے اعتراف جرم کے انداز میں کہا "ایک بدمعاش چوکیدار آگیا تھا آواز سن کے لیکن کیرتی نے اسے روک لیا۔"

میں نے کیرتی کی طرف دیکھ کے کہا "یہ کسی شریف آدمی کو بھی روک سکتی ہے.... اپنے حسن کی طاقت سے۔ کیا اس شخص نے اپنے کسی عمل سے خود کو بدمعاش ثابت کیا یا کرنے کی کوشش کی؟"

کیرتی کا چہرہ سرخ ہونے لگا۔

مدھو سودن نے کہا "اس نے سمجھا کہ کیرتی اکیلی بھٹکتی پھر رہی ہے وہاں۔"

"کیا وہاں کیرتی جیسی عورت کا نظر آنا اسے عجیب نہیں لگا' اس نے پوچھا نہیں کہ وہ کیا لینے آئی تھی وہاں؟"

"کیرتی نے کہا.... کہ وہ اپنے شوہر کی تلاش میں آئی تھی اور اب بھول گئی ہے کہ وہ گودام کدھر ہے۔ سب گودام ایک سے لگتے ہیں اسے۔ چوکیدار نے کمپنی کا نام پوچھا تو کیرتی نے کہا کہ عمارتی سریئے کا گودام ہے۔ شاید اس پر وہ شک میں پڑ گیا اور اس نے کیرتی پر دست درازی کی کوشش کی لیکن میں اتنی دیر میں کھڑکی کے راستے واپس نکل آیا تھا اور میرے ہاتھ میں مشین گن تھی۔"

"چنانچہ تم نے اس پر فائر کھول دیا۔"

"نہیں' میں نے دستہ مار کے اس کا سر پھاڑ دیا۔ پھر ہم بھاگ آئے۔"

"کیسے بھاگ کر آئے' پیدل؟ مشین گن اور دستی بم اٹھا کے؟"

مدھو سودن نے نفی میں سر ہلایا "اس سامان کو ہم نے ایک پوٹلی میں باندھ لیا تھا۔ وہ پوٹلی میں نے اٹھا رکھی تھی۔ تین چار میل پیدل چلنے کے بعد ہمیں ٹیکسی مل گئی تھی۔"

خاموشی کے ایک مختصر وقفے کے بعد میں نے کہا "اس کا مطلب تو یہ ہے کہ پروہت نے تم سے جھوٹ بھی نہیں بولا تھا۔ تمہارے ساتھ کوئی بے ایمانی بھی نہیں کی تھی اور اپنا وعدہ پورا کیا تھا۔ پھر تم اپنا پیسہ اور زیور کیوں واپس لینا چاہتے تھے؟ کیا جواز تھا تمہارے پاس؟"

"وہ..... ہم نے استعمال کہاں کیا۔"

میں نے کہا "پروہت نے صرف اس بات کی قیمت وصول کی تھی کہ وہ تمہیں ایک جگہ دکھائے گا جہاں سے تم اسلحہ حاصل کرسکتے ہو۔ تم ناکام رہتے یا پکڑے جاتے' اسلحہ راستے میں پھینک دیتے یا استعمال نہ کرتے' ان سب

...لات سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا اور نہ اس نے تمہاری ...رف سے کوئی ذمے داری قبول کی تھی۔ بے ایمانی تمہارے ...ن میں آئی۔"

"تم پھر یہ کہہ رہے ہو کہ ہم نے اسے قتل کیا ہے۔"

"تم میرا شک رفع نہیں کرسکے۔"

"یہ ٹھیک ہے۔" کیرتی نے اچانک کہا "بتادو مدھو کہ ہم ...ے کیا سوچا تھا۔ ہم کو یہ خیال پریشان کرنے لگا.... کہ ہم نے اپنا ...ب کچھ اس بدمعاش کو دے دیا۔ سارا پیسہ.... جو ہم نے ...سالوں میں جمع کیا تھا اور سب زیور...." وہ پھوٹ پھوٹ کے ...رونے لگی۔

مدھو سودن نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "مت رو ...کیرتی! بھگوان نے اس کو بھی نرک میں پہنچا دیا ہے۔"

پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا "کیرتی نے تھوڑا تھوڑا کرکے ...وہ زیور اپنی بیٹی کے لئے بنوایا تھا۔ اس کی شادی کے لئے۔ اس ...کی شادی طے ہوگئی تھی۔ ایک سال بعد وہ بیاہی جاتی۔ وہ پیسہ ...بھی اور کہاں کام آتا مگر جب وہ خود ہی نہ رہی تو ہم بیاہ کے لئے ...پیسہ اور زیور رکھ کے کیا کرتے۔ ہم نے اس کے خون کا بدلہ ...لینے کے لئے وہ سب کچھ داؤ پر لگا دیا۔ ہمیں بعد میں صدمہ ہوا ...کہ بیٹی بھی گئی اور ساری عمر کی کمائی بھی۔ پروہت کو اس کی کوئی ...ضرورت نہیں تھی۔ اس کے پاس پہلے ہی بہت ہے اور وہ ...ادھر ادھر سے جائز ناجائز کی پروا کئے بغیر اور اپنے پرائے کا فرق ...رکھے بغیر مال کھینچتا رہتا ہے۔ یہی سوچ کے ہم اس سے اپنا پیسہ ...اور زیور لینے گئے تھے لیکن میں اپنی اس بیٹی کی سوگند کھاکے ...کہہ سکتا ہوں کہ ہم اسے قتل کرنے کا ارادہ لے کر نہیں گئے ...تھے۔ نہ ہم نے مارا اسے۔"

وہ اتنا جذباتی ہوگیا تھا کہ اپنی بیٹی کی قسم کھاتے ہوئے اس ...کی آواز بھرا گئی تھی۔ اس نے بڑی مشکل سے خود کو آنسو ...بہانے سے روکا مگر پھر بھی' ایک قطرہ اس کی آنکھ سے پھسل گیا۔

میں نے کہا "آئی ایم سوری! کہ میں نے تم پر شک کیا۔ ...مجھے یقین ہے کہ قتل کسی اور نے کیا ہوگا لیکن تمہارے ذہن ...میں کوئی نام آتا ہے۔ آخر کون ہو سکتا ہے اس کا قاتل؟"

مدھو سودن نے نفی میں سر ہلایا "اس کے دوست کم تھے' ...دشمن زیادہ کیونکہ جیون میں اس نے لوگوں کے ساتھ بھلائی ...کم کی' برائی زیادہ۔"

میں نے گھڑی دیکھی اور کہا "اب ہم چلتے ہیں لیکن ...جانے سے پہلے تمہیں ایک بات سمجھا دینا چاہتے ہیں.... ہم ...تمہاری بے گناہی کے قائل ہوگئے ہیں مگر پولیس ایسا نہیں ...سمجھے گی۔ ان کو تم صرف ایک قسم کھا کے قائل نہیں کرسکتے

کیونکہ ان کے پاس ثبوت ہوگا اور گواہ ہوں گے۔ ایک گواہ چشم دید ہے' باقی وہ بنالیں گے۔"

مدھو سودن نے بے بسی سے کہا "اگر ہم نے اپرادھ نہیں کیا ہے تو ہمیں ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

میں نے کہا "انصاف کے حق پر بھروسا مت کرو۔ کمزور کو انصاف کہاں ملتا ہے۔ طاقتور انصاف چھین لیتا ہے یا خرید لیتا ہے۔ تم پکڑے جاؤ گے تو تمہیں یہ سب کچھ پولیس کو بھی بتانا پڑے گا جو تم نے ہمیں بتایا ہے۔ جانتے ہو' اس کے بعد کیا ہوگا؟ تمہارے دشمن کچھ ایسے لوگ ہو جائیں گے جو شاید خود کو بھگوان سے زیادہ بھگوان سمجھنے لگے ہیں۔ ان کا مقابلہ تم نہیں کرسکتے اور ان جیسے دشمنوں سے نہ کوئی رعایت حاصل کرسکتے ہو اور نہ خیرات میں جینے کا حق...."

"اگر بھگوان کو یہی منظور ہے...."

میں نے اس کی بات کاٹ دی "بھگوان کو نہ کچھ منظور ہے' نہ نامنظور۔ وہ دنیا کے معاملات میں دخل نہیں دیتا۔ میرا مشورہ مانو تو بھاگ جاؤ۔ اب بھی وقت ہے۔"

اس نے کہا "بھاگ کے ہم کہاں جاسکتے ہیں؟"

میں نے کہا "کہیں بھی چلے جاؤ جان بچانے کے لئے۔"

"میں اکیلا تو نہیں ہوں۔"

میں نے کہا "کیرتی کو بھی ساتھ لے جاؤ۔"

مدھو سودن نے نفی میں سر ہلایا "تم سمجھتے کیوں نہیں؟ یہ گھر ہے میرا' بچے ہیں.... ماں باپ ہیں...."

خود کو قانون کی تحویل میں دے دو۔ پولیس سے کہو' تمہیں جان کا خطرہ ہے۔ تمہاری حفاظت کی جائے۔ عدالت میں جاکر بیان دے دو کہ تمہاری ضمانت منظور کی جائے۔ قبل از گرفتاری' کیونکہ تمہیں کچھ لوگوں کی طرف سے اس بات کا ڈر ہے کہ وہ تمہیں قتل کے جھوٹے مقدمے میں پھنسا دیں گے۔"

مدھو سودن نے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا "ہم یہ بھی نہیں کرسکتے۔ پولیس کے پاس جانے کی تو بات ہی فضول ہے۔ وہ صرف مجرموں کی حفاظت کرتے ہیں۔ اور بے گناہوں کو مجرم بنا کے چھوڑ دیتے ہیں۔ عدالت سے انصاف کی اپیل کی جاسکتی ہے لیکن انصاف بھی مفت تو نہیں ملتا۔ وکیل ہے کوئی ایسا جو فیس لئے بغیر میرا مقدمہ عدالت میں پیش کرے؟ اور وکیل کی بات چھوڑو... عدالت نے اگر ضمانت منظور کرلی تو ضامن کون ہوگا میرا؟ نقد ضمانت طلب کرلی تو میں کیا کروں گا؟ اور ان سب باتوں کے بعد آخری بات یہ کہ عدالت صرف حکم دے سکتی ہے کہ ہماری حفاظت کی جائے۔ خود حفاظت نہیں

کرسکتی ۔ اور حفاظت کرنے والے ہی ہمیں قتل کرادیں تو عدالت ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی ۔"

میں نے کہا" بس تو پھر اللہ ہی رحم کرے تمہارے حال پر"

وہ چونکا" تم مسلمان ہو ؟"

میں نے کہا" میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب میں اللہ کا نام لیتا ہوں تو لوگ چونکتے کیوں ہیں ۔ کیا یہاں مسلمان نہیں رہتے اور وہ اللہ کا نام نہیں لیتے ؟"

مگر مدھوسودن پر میری بات کا الٹا اثر ہوا" تمہارا ستیاناس ہو۔ ہمارا دھرم بھرشٹ کردیا تم نے ۔ پہلے کیوں نہیں بتایا تھا کہ تم مسلمان ہو ۔ ہم نے تمہارے ساتھ کھا پی لیا ۔"

میں نے تلخ لہجے میں کہا" تم نے ہمارا جھوٹا تو نہیں کھایا' یہ برتن اگر ناپاک ہوگئے ہیں تو ہمیں دے دو اور ہماری غلطی کے باعث تم سے انجانے میں جو پاپ ہوگیا ہے اس کے لئے بعد میں کفارہ ادا کرتے رہنا۔ مگر مدھوسودن ! ایک غلطی تم نے بھی کی جس کی وجہ سے ہم مجبور ہیں ۔ تم نے ہمیں مہمان بنالیا تھا ہم تم سے دشمنی نہیں کرسکتے ۔ ورنہ تم پر اعتبار کرنے کے بجائے تم کو خود قانون کے حوالے کردیتے ۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا ۔ مدھوسودن کے ہندو ذہن نے کے پرتعصب رویّے نے مجھے سخت دکھ پہنچایا تھا ۔

" تمہاری بیوی نے رسوئی تک میں قدم رکھ دیا ۔" مدھوسودن نے انتہائی افسوس کے ساتھ سرہلایا ۔

" تم بے عزتی کررہے ہو ہماری ۔" اس کی بات نے مجھے مشتعل کردیا" یہ سب نتیجہ ہے تم کو رعایت دینے کا اور تمہارے ساتھ شریفانہ برتاؤ رکھنے کا ۔ بہتر ہوتا کہ تم سے کوئی بات کئے بغیر میں تم دونوں کو اپنے ساتھ لے جاتا اور پھر تمہارے دھرم کی طاقت آزماتا ۔ تمہارے گھر میں کسی لحاظ کے بغیر تم کو بے عزت کردیتا تو اچھا تھا ؟"

کیرتی نے کہا" بھائی صاحب ! اس کا باپ کٹر برہمن ہے ۔ مدھوسودن مذہب کے معاملے میں بہت حساس ہے ۔"

میں نے کہا" کس مذہب کے معاملے میں ؟ جو انسانوں کو انسانوں سے نفرت سکھاتا ہے ۔ ذات پات کے فرق سے کیا ہوتا' اگر یہ برہمن کا نہیں کسی شودر کا بچہ ہوتا ۔"

رابعہ نے کہا" چلو لعنت بھیجو ..."

اندر سے کسی نے سوتے میں بڑبڑا کر کہا" مدھوسودن ! یہ کیا ہورہا ہے آدھی رات کو ؟"

میں رابعہ کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ مجھے کچھ یاد آگیا ۔ میں نے مدھوسودن سے کہا" ایک آخری بات ۔"

اس نے مجھے ایک طرح سے باہر دھکیلنے کی کوشش کی" آخری بات تم کہہ چکے ۔" اور پریشانی سے درمیانی دروازے کی طرف دیکھنے لگا ۔

میں اپنی جگہ پر جم گیا" یہ بات کئے بغیر میں نہیں جاؤں گا" اور اسے وہ تصویر دکھائی جس کے بارے میں مجھے شک تھا کہ کیمرہ ٹرک سے شملا کو شیشے کے باکس میں سوتا ہوا دکھایا گیا ہے اور جو مجھے پروہت کی لاش سے ملی تھی ۔

" یہ کیا ہے ؟" مدھوسودن نے کہا" کس کی تصویر ہے ؟"

تصویر اس کے ہاتھ سے کیرتی نے لے لی" یہ تصویر !" اس نے بے اختیار حیرت سے کہا ۔

میں نے کہا" کیا ہے اس تصویر میں ؟"

کیرتی نے کچھ اجازت طلب' معذرت آمیز انداز میں اپنے شوہر کی طرف دیکھ کے کہا" ایسی ایک تصویر مجھے ملی تھی"

" ملی تھی کیا مطلب ...؟ کوئی دے گیا تھا ۔ ڈاک سے آئی تھی ۔" میں نے کہا ۔

" یہ نہیں معلوم ۔ دروازے کے نیچے سے کوئی اندر ڈال گیا تھا ۔" کیرتی نے کہا ۔

" تم نے مجھے نہیں بتایا تھا ۔" مدھوسودن خفگی سے بولا ۔

" ابھی تھوڑی دیر پہلے کی بات ہے ۔" کیرتی نے کہا" ان لوگوں کے آنے سے گھنٹا بھر پہلے کی بات ہے ۔"

" مجھے دکھاؤ ... کہاں ہے وہ تصویر ؟" میں نے فکرمند ہوکے کہا ۔

" اندر ... اس میں کوئی ایسی بات نہیں ۔ بالکل یہی تصویر ہے ۔ اس کی دوسری کاپی ۔" کیرتی نے وضاحت کی ۔

میں نے کہا" اس کے پیچھے کچھ لکھا ہوا تو نہیں تھا ؟ تمہارا نام یا کوئی پیغام ۔"

کیرتی نے نفی میں سرہلایا" بس تصویر تھی ۔ میں نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی فلمی پوسٹ کارڈ کی تصویریں بھی ملتی ہیں ایسی ہی ۔"

میں نے کہا" یہ کسی فلمی اداکارہ کی تصویر نہیں ہے ۔" میرا ذہن سخت الجھن کا شکار تھا ۔ ایک شک اچانک یقین کا درجہ اختیار کرگیا تھا ۔ حالانکہ مجھے اپنے شک کی بنیاد بھی بہت کمزور لگتی تھی ۔ یہ ایک بعید از امکان' بے سبب اور غیر ... خیال تھا کہ کہیں اس تصویر کو شکاری ایک جال کے طور پر استعمال نہیں کررہے ہیں ۔ کہ جہاں بھی ہمارے پہنچنے کا امکان ہو وہاں یہ تصویر پہلے سے موجود ہو ۔ پروہت کے گھر میں شک نے سر اٹھایا تھا تو میں نے رابعہ کو بھی" کیمرہ ٹرک" کے حوالے سے مطمئن کرنے کی ناکام کوشش کی تھی ۔ مگر اس کی دلیل ...

... مجھے لاجواب کردیا تھا کہ کپڑے اور ٹاپس شملا کے ہیں ۔ ... دوسری تصویر نے مجھے کسی حد تک بدحواس کردیا ۔ کیا ... ہمارے ساتھ اسی طرح کھیل رہے تھے جیسے بلی چوہے ... کھیلتی ہے ؟ انہیں معلوم تھا کہ ہم کہاں ہیں اور کہاں کہاں ... سکتے ہیں ۔ پروہت اور ان دونوں میاں بیوی کے درمیان ... تعلق بہت واضح تھا ۔ یہ میاں بیوی ڈاکو محمد خان کے ٹھکانے ... بھی ہو آئے تھے ۔ ڈاکو محمد خان کے ٹھکانے سے میں خود ... اور کے ساتھ فون پر بات کرچکا تھا ۔ بہت سے کونے اور ... ڈھانچے تھے جو آپس میں فٹ نہیں بیٹھتے تھے مگر ان کے باہمی ... سے جو خاکہ بن سکتا تھا وہ واضح ہوچکا تھا ۔

میں دروازہ کھولے کھڑا تھا اور مدھوسودن مجھے جلد از جلد ... نکال کر دروازہ بند کرنے کے لئے بے چین نظر آتا تھا ۔ ... رابعہ خود بھی یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ اب میں کیوں رک گیا ... ہوں ۔ میں اس وقت چونکا جب باہر گھپ اندھیرے کو چیرتی ... کسی گاڑی کی ہیڈلائٹس کی تیز روشنی کے ساتھ ہی میں نے جیپ کے ... انجن کی آواز سنی ۔ میری چھٹی حس نے چلا کے کہا' پولیس ۔

" پولیس ..." میں نے واپس اندر قدم رکھتے ہوئے ... دروازے کو بند کردیا ۔

کیرتی کا رنگ لاش کی طرح سفید پڑگیا" اب کیا ہوگا ؟"

میں نے کہا" پولیس تمہیں گرفتار کرنے کے لئے آئی ہے ۔" اور رابعہ کا ہاتھ پکڑ کے اندر کی جانب لپکا ۔

مدھوسودن نے میرا راستہ روکنے کی کوشش کی" اندر کہاں جارہے ہو ؟"

میں نے اسے دھکیل کر ایک طرف کیا اور رابعہ کے ساتھ دوسرے کمرے میں گھس گیا ۔ اس کمرے میں اندھیرا تھا لیکن درمیان کے کھلے دروازے سے تھوڑا بہت اجالا ہوگیا تھا ۔ میں نے فرش پر دو بچوں کو گٹھری بنے دیکھا ۔ ایک ... بیٹھا اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھتا رہا ۔ اس نے چلانے کے لئے منہ کھولا اور پھر میرے ہاتھ میں ... ریوالور دیکھ کے بند کرلیا ۔

کمرے کا دوسرا دروازہ برآمدے میں کھلتا تھا ۔ میں رابعہ کو کھینچتا ہوا اس دروازے سے گزر گیا ۔ میں نے مدھوسودن کو اپنے پیچھے آتے دیکھا مگر پھر وہ باہر والے دروازے پر دستک ... سن کے رک گیا' پولیس اپنے پورے اختیار کے ساتھ دروازہ ... پیٹ رہی تھی ۔ کیرتی نے ایک چیخ ماری ۔ میں نے برآمدے ... کے دروازے کو باہر سے کنڈی لگائی اور ہم پھر بھاگے ۔ ہمارے ... سامنے ایک مختصر صحن تھا ۔ یہ کوارٹر کا عقبی حصہ تھا اور مجھے ... اس کا اندازہ نہ تھا کہ ادھر سے کھلنے والا دروازہ کہاں لے جائے گا

مگر اس وقت فرار کے دوسرے سب راستے مسدود تھے ۔

گلی میں آتے ہی میں نے رابعہ کو ساتھ لے کر اندازے سے اس طرف دوڑنا شروع کیا جہاں ہماری جیپ کھڑی ہوئی تھی ۔ رابعہ بار بار پیچھے رہ جاتی تھی اور مجھے رک کر اسے ساتھ کھینچنا پڑتا تھا ۔ میرے لئے تھر ایک مسئلہ بن گیا ۔ ایک مرحلے پر میں نے دوڑتے دوڑتے اس کی گرہ کھول کے زیادہ مضبوطی سے باندھی ۔ مجھے ہر قدم پر یہ ڈر تھا کہ پولیس بھی اسی دروازے سے باہر آکے ہمارا پیچھا کرے گی ۔ انہیں یہ اختیار بھی حاصل ہوگا کہ وہ فرار ہونے والے مجرموں پر گولی چلادیں ۔ وہ ہماری گرفتاری کے لئے نہیں آئے تھے لیکن مدھوسودن سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ اپنے ساتھ ہمیں بھی پکڑوادے' پولیس سے کہے کہ اصل قاتل تو ابھی ابھی نکل کر گئے ہیں ۔ اور یوں ہمیں دھرم بھرشٹ کرنے کی سزا دلوانے کی کوشش کرے ۔

پہلا موڑ کاٹتے ہی میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ ہم گولی کا نشانہ بننے سے تو بچ گئے تھے ۔ اگلا مرحلہ جیپ تک بخیر و عافیت پہنچنے کا اور پھر جیپ لے کر نکل جانے کا تھا ۔ دوسرا موڑ کاٹتے ہی میں نے جیپ کو اپنی جگہ پر موجود پایا تو میرا حوصلہ بڑھ گیا ۔ پولیس کی جیپ کافی آگے تھی اور اگرچہ کھلے دروازے سے تھوڑی بہت روشنی گلی میں بھی پڑرہی تھی مگر ہم اس روشنی کی زد میں نہیں تھے ۔ پولیس والے شاید مجرموں کو اور ان کے لواحقین کو پکڑنے کے لئے اندر گھس گئے تھے اور ہمارے لئے میدان خالی چھوڑ گئے تھے ۔

میں نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان رابعہ سے کہا ۔" اس وقت پھر خدا نے بال بال بچالیا ۔"

اور رابعہ نے ہانپتے ہوئے کہا" تم نے خواہ مخواہ دیر کی ورنہ پہلے نکل جاتے ۔"

" کیا پتا راستے میں ہی پولیس سے مڈبھیڑ ہوجاتی ۔" میں نے کہا" یہ جو کچھ ہوا اچھا ہی ہوا ۔ اب دیکھنے والا کوئی نہیں ۔ چلو بیٹھو ۔"

" مجھ میں دوڑنے کا دم بھی نہیں رہا تھا اب تو ۔" رابعہ نے جیپ کی اگلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا ۔

میں نے ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھنے کے بعد جیب سے چابی نکالی اور اگنیشن سوئچ میں لگائی ۔ چابی گھمانے سے پہلے ہی جیپ تھوڑا سا ہلی اور مجھے اپنے پیچھے آہٹ محسوس ہوئی مگر سر گھما کر دیکھنے کی نوبت ہی نہ آئی ۔ اندھیرے میں میری آنکھوں نے ایک سائے کو متحرک دیکھا ۔ پھر میرے سر پر پیچھے سے ڈنڈا مارا گیا یا ایسی ہی کوئی چیز جس سے میری کھوپڑی

چیخ گئی۔ مجھے اندھیرے میں جگنو سے اڑتے نظر آئے۔ ہوش میں رہتے ہوئے میرے کانوں نے آخری آواز رابعہ کی سنی۔ اس نے چیخ مارنے سے پہلے شاید میرا نام لیا تھا۔

جب مجھے ہوش آنے لگا تو آہستہ آہستہ میری آنکھوں کے سامنے پھیلتے سمٹتے دھندلے سائے واضح شکل اختیار کرنے لگے اور روشنیاں بھی ایک جگہ ٹھہر گئیں جو پہلے میرے دائیں بائیں گھومتی محسوس ہوتی تھیں اور جلتی بجھتی نظر آتی تھیں۔ آوازوں کے مضطرب گرداب میں بٹا ہوا شور بھی ریڈیو کے رسیپشن کی طرح کلیئر ہو گیا۔

مجھے خود کو ایک خالی بیرک کے فرش پر لیٹا ہوا پا کے تعجب ہوا۔ یہ اونچی مخروطی چھت والی بیرک تھی جو ایئرپورٹ پر جہازوں کے ہینگر جیسی لگتی تھی۔ اس کا بیشتر حصہ تاریکی میں تھا اور کافی فاصلے پر میں ایک دروازہ دیکھ سکتا تھا۔ یہ دروازہ اتنا بڑا تھا کہ اس میں سے ٹرک گزر جائے۔ میرے سر کے عین اوپر پرانے طرز کے شیڈ میں ایک بلب معلق تھا۔

جب میں نے اپنا سر ہلانے کی کوشش کی تو مجھے ایسا لگا جیسے اصل سر کی جگہ میری گردن پر دس گنا بڑا تربوز رکھ دیا گیا ہے اور میری گردن کے نٹ بولٹ بھی ڈھیلے ہیں۔ میرا سر بہت بھاری ہو رہا تھا اور اس کے اندر کوئی مسلسل ہتھوڑے چلا رہا تھا چنانچہ درد کے بگولے سے اٹھ اٹھ کے سر کی دیواروں سے ٹکراتے تھے۔

آہستہ آہستہ میری یادداشت بھی بحال ہونے لگی۔ مجھے پہلے رابعہ کا خیال آیا۔ وہ میرے ساتھ ہی جیپ میں بیٹھی تھی۔ پھر... کیا ہوا تھا؟ میں نے جیپ اسٹارٹ کی تھی ... نہیں... میں اس کوشش میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ رابعہ نے چلا کے مجھ سے کچھ کہا تھا اور کسی نے مجھ پر پیچھے سے حملہ کیا تھا... ہاں ... وہ پہلے سے جیپ کی پچھلی سیٹوں کے درمیان موجود تھا لیکن اندھیرے میں میری نظر اسے نہیں دیکھ سکی تھی۔

میں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھاما اور اٹھ بیٹھا۔ اٹھنے کے بعد میری نگاہ نے رابعہ کو دیکھا۔ وہ گھٹنے سمیٹے اور ان پر ٹھوڑی رکھے مجھے دیکھ رہی تھی اور رو رہی تھی۔

"رابعہ!" میں نے کہا "تم ٹھیک ہو؟"

جواب میں رابعہ نے فقط سر ہلایا۔ جواب کسی اور نے دیا۔

"آپ اپنی کہو۔ خیر سے سر کے اندر کا مال تو خراب نہیں ہوا اپنے سکندر صاحب۔"

"دلاور..." میں نے کہا۔ اور پھر رابعہ کی موجودگی کا خیال کئے بغیر اسے ایک سانس میں نصف درجن فحش گالیاں دیں۔

وہ قہقہہ مار کے ہنسا "اس کا مطلب تو یہ ہوا جی۔ کہ اندر کا مال مسالہ بچ گیا۔ آپ کے پاس اور تھا بھی کیا۔ مجھے تو بڑی مایوسی ہو رہی تھی۔ کیا کہتے ہیں اسے ... تشویش ... کہ ہوش میں آنے کے بعد آپ نے چیخ مار کے کہا آپا رابعہ ... ہیں جی... ڈیڈی کہہ کے مجھ سے لپٹ گئے تو بڑی گڑبڑ ہو جائے گی۔ دماغ درست کرنا ہمارا کام ہی نہیں۔"

میں نے کہا "ہاں، تمہارا کام تو وہ ہے جو شیطان کر سکتا ہے یا تم کر سکتے ہو۔"

اندھیرے میں سے ایک شخص مجھ پر حملہ آور ہوا۔ اس نے میرے کک مارنے کی کوشش کی۔ اگر یہ کک لگ جاتی تو میرے جبڑے ٹوٹ جاتے یا سر گھوم کر الٹا ہو جاتا۔ میں نے خود بھی بچایا اور اس حملہ آور کی ٹانگ پکڑنے کی کوشش بھی کی۔ وہ شخص بڑی پھرتی سے پیچھے ہٹ گیا۔ اسے اندازہ تھا کہ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا تو اس کی خیر نہیں۔ یہ شخص استاد پیڈرو تھا۔ اب وہ گالیاں بک رہا تھا اور ان سب گالیوں میں کسی نہ کسی طرح رابعہ کو بھی شریک کر رہا تھا۔

رابعہ نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کے آہستہ سے دبایا اور مجھے ضبط سے کام لینے کا اشارہ کیا۔

"ڈرتے کیوں ہو پیڈرو؟ ایک حملہ اور کر کے دیکھو۔ ذرا قریب آؤ۔" میں نے کہا "ویسے شوق تھا خود کو بہادر ثابت کرنے کا تو جتنی دیر میں بیہوش رہا، تم اپنی حسرت نکال سکتے تھے۔"

پیڈرو نے پھر رابعہ کے بارے میں غلاظت سے بھرپور جملوں کے ساتھ حملہ کیا اور دور کھڑا مجھے بتاتا رہا کہ مجھے کتے کی موت مار دینے کی بعد وہ رابعہ کے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔ وہ اکیلا نہیں تھا۔ میں ایک حلقے میں کھڑے ہوئے کم سے کم چھ افراد کو دیکھ سکتا تھا۔ جو سب مسلح تھے۔

ان غیر متحرک غیر واضح خدوخال رکھنے والے اور اجنبی پرچھائیوں میں جو روشنی کے حلقے سے دور تھیں مجھے ہر ایک پر دلاور کا شبہ ہوا مگر دلاور ان میں شامل نہیں تھا۔ میں نے اس کی آواز سنی تھی جو کسی لاؤڈ اسپیکر سے نہیں آئی تھی۔ یہ اس کی قدرتی آواز تھی۔ اس کے بعد جیسے ڈرامے کے کردار جاتے اور آتے ہیں۔ دلاور پس منظر میں چلا گیا تھا اور پیڈرو نے سامنے آکے وہ پرفارمنس دی تھی جو دلاور کے شایان شان نہ تھی۔ جیسے یہ سزائے موت سنانے والے جج کے مرتبے اور وقار کے خلاف ہو گا۔ اگر وہ خود ہی جلاد کے فرائض سرانجام دے۔ یہ اس کے لئے ناممکن نہیں ہوتا مگر ناپسندیدہ فعل۔ ایسے ہی دلاور بھی صرف حکم دیتا تھا اور سارے گھٹیا، شیطانی اور غیر انسانی کام اس کے حکم کے غلام کرتے تھے۔

استاد پیڈرو گالیاں دینے اور مغلظات سے تمام انسانی رشتوں کی بے حرمتی کرنے کے اشتعال انگیز کام میں ید طولیٰ رکھتا تھا۔ اسکی باتوں کو سن کے نظرانداز کر دینا اور پرسکون رہنا ایک اعصاب شکن مرحلہ تھا مگر رابعہ نے مجھے مشورہ دیا۔ "سمجھ لو کہ کتے بھونک رہے ہیں۔ ان پر بھونکنا ہمارا کام نہیں ہے۔ یہ چاہتے ہیں کہ تم ان پر مشتعل ہو کے حملہ کرو تو انہیں مل کے اپنی طاقت آزمانے کا بہانہ مل جائے۔ جب تک یہ خود کچھ نہ کریں تم بھی بیٹھے رہو۔"

میں نے کہا "میرا خون کھول رہا ہے اس کی باتوں سے۔ یہ میرے ہاتھ آجائے تو میں اپنے ہاتھوں سے اس کے دونوں جبڑے چیر دوں اور اس کی زبان کھینچ کر باہر کر دوں۔"

"یہ تمہاری قوت برداشت کا امتحان ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔ لیکن اپنی فطرت سے لڑنا زیادہ بڑا امتحان ہے۔ گالی ویسے تو بس ایک لفظ ہے مگر یہ انسان کے احساس پر تازیانہ ثابت ہوتی ہے۔ عزت نفس اور غیرت رکھنے والے ہر انسان کے لئے احساس کو مصلحت کے تقاضوں پر قربان کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔"

"تم اس کی طرف دھیان ہی مت دو۔ کچھ اور سوچو... یا مجھ سے باتیں کرو۔" رابعہ نے کہا۔

اس وقت بلاشبہ رابعہ نے بڑی بہادری کا ثبوت دیا۔ استاد پیڈرو نے اسے وہ سب کچھ کہا جو نہ بیان کیا جا سکتا ہے اور نہ تصور کیا جا سکتا ہے۔ نہ جانے کیوں اس کی فحش کلامی کا ہدف رابعہ تھی۔ یہ یقیناً ایک نفسیاتی حربہ تھا جسے ہم نے مل کے ناکام کر دیا تو پیڈرو نے اس عمل کو زیادہ تکلیف دہ بنا دیا۔ جیسے کوئی آواز کا والیوم بڑھا دے۔ انجن کی رفتار میں اضافہ کر دے یا درجۂ حرارت کو زیادہ کر دے۔ ان میں سے ایک حبشی قسم کا گوریلا نما انسان آگے بڑھا اور اس نے گالی گلوچ کے ساتھ خاصی جسمانی فحاشی کا مظاہرہ بھی کیا۔ اب میں نے رابعہ سے کہا کہ وہ آنکھیں بند کرے اور اس منظر کو تصور سے خارج کر دے۔ یہ ایک مشکل بلکہ ناممکن مطالبہ تھا۔ لیکن رابعہ نے ظاہر یہی کیا کہ وہ ایسا کر سکتی ہے۔

شاید ایک گھنٹے کے بعد یہ ذہنی اذیت پہنچانے کا انسانیت سوز عمل ختم ہوا اور میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو منظر بدل گیا تھا۔ وہ سب پھر خاموش کھڑے ہوئے تھے لیکن فضا اب بھی درد و کرب کے خونی لمحوں سے اور وحشی جذبوں کی گونجتی چیخوں سے لبریز تھی۔ یہ سکوت ڈراتا تھا کہ اب کیا ہو گا۔ آزمائش کا اگلا مرحلہ کیا ہو گا۔ کتنا پرعذاب ہو گا۔

لیکن خلاف توقع اس شرمناک خاموشی کے حصار سے دلاور برآمد ہوا۔ یوں جیسے غلاظت سے ابلتے گٹر کے تعفن میں سے اچانک ایک زہریلا سانپ پھن اٹھا کے سامنے آجائے۔

اسے گالی دینے کے بجائے میں نے اس کے منہ پر شرافت کا طمانچہ مارنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے تمام آتش فشاں جذبات پر بے حسی کا پردہ ڈال کے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آپ اپنی آواز سنا کر کہاں غائب ہو گئے تھے چوہدری صاحب؟"

دلاور نے عیاری سے کہا "میں ایک کال سننے چلا گیا تھا۔ تمہیں کسی نے پریشان تو نہیں کیا؟"

"نہیں چوہدری صاحب! یہ سب شریف لوگ لگتے ہیں مجھے۔ آپس میں ہنسی مذاق کرتے رہے۔ ہم اپنی باتیں کرتے رہے۔"

ایک شخص نے کرسی لا کر رکھ دی۔ چوہدری دلاور ہم سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا۔

"سچی بات تو یہ ہے اپنے سکندر اعظم صاحب! کہ کچھ ہماری منصوبہ بندی ناقص تھی۔" دلاور نے کہا "کچھ تقدیر نے تمہارا ساتھ دیا جس کی وجہ سے معاملات پر ہمارا کنٹرول نہیں رہا اور تمہارے حوصلے بڑھتے رہے۔ خیر آدمی اپنی غلطیوں سے ہی تجربہ حاصل کرتا ہے ناجی... تم بھی سیکھ سکتے تھے۔ نہیں سیکھا موقع ملنے کے باوجود... تو یہ بدقسمتی تمہاری۔ اب دیکھ لو کہ تم یہاں کیسے بیٹھے ہو، جیسے چوہے دان میں چوہا۔ ہیں جی۔ اور تمہیں کچھ معلوم نہیں اپنے انجام کے بارے میں۔"

میں نے کہا "ہم اپنے آخری انجام سے ڈرتے تو گھر سے ہی کیوں نکلتے... اور اس وقت یہاں کیوں ہوتے۔"

دلاور نے کرسی میں پہلو بدلا "ہاں، تم نے مجھ سے تعاون کیا ہوتا تو اس وقت لندن، پیرس یا سوئٹزرلینڈ میں عیش کر رہے ہوتے۔"

میں نے کہا "پرانی بات کا ذکر کرنے سے کیا حاصل ہو گا دلاور! جو نہیں ہوا وہ آئندہ بھی نہیں ہو گا۔"

ایک شخص نے پیچھے سے کہا "سر! آپ کی ٹیلی فون کال ہے۔"

"ابھی تم کچھ نہیں جانتے۔" دلاور بات کرتے کرتے خاموش ہو گیا اور اٹھ کے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ اس کے جاتے ہی وہ شیطانی ٹولہ آگے آگیا۔ اس بار وہ اسلحہ لے کر میری طرف بڑھے۔ ان میں سے ایک نے مجھے ہاتھ اوپر اٹھانے کا حکم دیا۔ دوسرے نے پیچھے سے مجھ پر ایک جال پھینک دیا جو نائیلون کی مضبوط رسیوں کا بنا ہوا تھا۔ اسے توڑ کر رہائی حاصل کرنے کی کوشش کا تصور بھی محال تھا۔ جال کی رسی کھینچ کر انہوں نے مجھے کسی جنگلی جانور کی طرح بے بس کر دیا جس کی

خون آشامی کی دہشت ان کے اعصاب پر گرفتاری کے بعد بھی سوار ہو۔ میں نے کوئی مزاحمت نہیں کی اور انجام کو خدا کی رضا پر چھوڑتے ہوئے رابعہ کو بھی صبر کی تلقین کرتا رہا۔

لیکن اس کے بعد وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ انہوں نے رابعہ کو دبوچ لیا۔ رابعہ نے چیختے چلاتے ہوئے مزاحمت کی مگر وہ بیک وقت چھ تنومند مردوں سے نہیں جیت سکتی تھی۔

میں نے کئی بار آنکھیں بند کرلیں لیکن پھر مجبور ہو کے کھول دیں۔ اچانک ایک خیال نے مجھے وقتی حوصلہ دیا۔

انہیں اپنی وحشت میں حد سے بڑھنے کی اجازت نہیں تھی اور رابعہ کے ساتھ اشتعال انگیز چھیڑ میں بھی وہ پابند تھے کہ اس کارروائی میں رابعہ کو گزند نہ پہنچے چنانچہ وہ نوچنے کاٹنے سے گریز کررہے تھے جس سے جسم پر تشدد کی کوئی علامت نمودار ہو جائے، کوئی خراش آئے یا کہیں زخم رسنے لگے۔

یہ یقین بڑا سکون دینے والا تھا کہ رابعہ کی عزت پر حملہ نہیں ہوگا۔ دشمن کسی ضابطۂ اخلاق کا پابند نہیں ہوتا... اور دلاور جیسے دشمن تو دوستی میں بھی اخلاقیات سے دشمنی کا وتیرہ رکھتے تھے۔ پھر یہ حد سے نہ گزرنے کی پابندی کیوں؟ ابھی کچھ دیر پہلے دلاور دھمکی دے رہا تھا کہ ہمیں انجام سے ڈرنا چاہئے کیونکہ ہماری حیثیت چوہے دان میں بند چوہے سے بھی زیادہ عبرت ناک ہے۔ اس کے آنے سے پہلے بھی ایک اعصاب شکن وحشیانہ کھیل ہوا تھا۔ کیا یہ بھی فقط ایک کھیل ہے؟ میری ذہنی شکست کے لئے... نہیں... یہ دلاور کی کوئی اور چال ہوگی جسے میں سمجھنے سے قاصر ہوں۔ شاید اس نے میرے "انجام" کو مختلف مرحلوں میں تکمیل تک پہنچانے کا سوچا ہوگا۔ انجام بدترین ہوگا مگر ایک طویل عرصے کے عذاب کے بعد۔

دلاور اچانک واپس آگیا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟" اس نے دہاڑ کر کہا۔ "بے مہار ہو جاتے ہو سب۔"

وہ سب کٹھ پتلیوں کی طرح رک گئے۔ چوہدری دلاور پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ پھر جال میرے اوپر سے ہٹا لیا گیا۔ اس وقت تک رابعہ بھی شکستہ حال میرے پاس آبیٹھی تھی اور زار و قطار رو رہی تھی۔ میرے اندر کا وحشی انسان چاہتا تھا کہ دلاور کو گردن سے دبوچ لے اور اس سے پہلے کہ محافظوں کی گولیاں میرے جسم کو چھلنی کریں میں اس کی گردن توڑ دوں لیکن اس وحشی انسان کی لگام ابھی عقل کے ہاتھوں میں تھی۔ میں دلاور کو مار دیتا اور اس کے ساتھ خود بھی مارا جاتا تو اس سے رابعہ کو کوئی فائدہ نہ ہوتا اور میرے ساتھی وہ جنگ ہار جاتے جو ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ میں یہ سمجھنے کی کوشش کررہا تھا کہ دلاور کا فون ریسیو کرنے کے بہانے اٹھ کر جانا بھی اس ڈرامے کا ایک حصہ تھا۔ اس کے جاتے ہی جو کچھ رابعہ کے ساتھ ہوا وہ بھی دلاور کی ہدایات کے مطابق تھا۔ اس کے کسی حکم کے غلام کی مجال نہ تھی کہ اپنی مرضی سے یہ سب کرسکتا۔ اگر وہ سچ مچ غصے میں ہوتا تو ان کی کھال ادھیڑ دیتا۔ لیکن وہ بڑے سکون سے کرسی میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے اشتعال کے رسمی مظاہرے کا وہی نتیجہ نکلا تھا جو وہ چاہتا تھا۔ حکم کے غلام پھر دور جا کھڑے ہوئے تھے۔

"یہ سب بڑے حرامی ہیں۔" دلاور نے کہنا شروع کیا۔

"بکواس بند کرو اپنی کتے! سب سے بڑے حرامی تم ہو۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "انہیں میں نہیں جانتا لیکن تمہارے خمیر کو بھی پہچانتا ہوں۔ تمہاری رگ رگ سے واقف ہوں اور ان رگوں میں دوڑنے والے ہر بے غیرت، بے حیا اور نجس خون کے ہر قطرے کی سرشت کو سمجھتا ہوں۔"

دلاور نے تالی بجائی۔ "واہ واہ۔ کیا زور بیاں ہے اپنے سکندر اعظم صاحب کا۔ ہم تو ایسی گاڑھی اردو بول نہیں سکتے، بس کچھ سیکھ ہی لیتے ہیں سن کے۔"

میں نے ایک گہری سانس کو آہستہ آہستہ خارج کیا اور پھر رابعہ کو اپنے قریب کرلیا۔ وہ ایسے لرز رہی تھی جیسے اسے جاڑا بخار ہونے والا ہے۔

"تم اپنا وقت ضائع کررہے ہو دلاور! ہم ایسی باتوں سے پہلے بھی نہیں ڈرتے تھے۔ تجربات نے ہمیں زیادہ بے خوف کردیا ہے۔ تم ہمارے جسموں کے ساتھ جو چاہو کرو۔ کوڑے مارو یا خنجر سے کاٹو۔ آگ سے جلادو یا روڈ رولر کے نیچے پیس دو۔ اس جسم سے قطرہ قطرہ خون کشید کرلو۔ اس کی عزت اور حرمت کو پامال کرو۔ مرنے کے بعد بھی اس پر ہوس کے دانت تیز کرو۔ ہمارا گوشت یا ہڈیاں چبالو یا اپنے کتوں کو ڈال دو۔ ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس کے لئے ہم ہمیشہ تیار ہیں مگر کیا اس طرح تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤ گے؟ میرے یا رابعہ کے جسم کے لئے فنا ہے مگر ہم کوئی جسم نہیں، ایک جذبہ ہیں، ایک عقیدہ ہیں اور ایک یقین ہیں جو ناقابلِ شکست رہا ہے اور رہے گا سکندر یا رابعہ ان جسموں کے نام ہیں۔ یہ تمہارے اختیار میں ہے مگر وہ فتح تمہارے اختیار میں نہیں ہے جس کی تم تمنا رکھتے ہو..."

دلاور نے میری بات میں دخل نہیں دیا۔ وہ اپنے لبوں پر اپنے مخصوص اندازِ بے نیازی کی، عیاری کی اور خباثت کی طنز آمیز مسکراہٹ سجائے بیٹھا تھا۔ ایک بار پھر اس نے تالی بجائی خالی بیرک کے سکوت میں اس کی آواز نے زیادہ گونج پیدا کی۔

"واہ جی واہ۔ اس کو کہتے ہیں۔ کیا کہتے ہیں؟" اس نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ "ہاں۔ رسی جل گئی پر بل نہ گیا۔ ہیں جی کوئی شعر یاد نہیں آرہا ہے آپ کو، یاد ہو تو سناؤ ہماری طرف سے۔ نہیں تو میں ایک خبر سناتا ہوں.... آپ کو اپنے سکندر صاحب! آپ بھی کیا یاد کرو گے۔ ایسی خوش خبری ملی ہے آپ کے لئے۔ یہ جو ابھی فون سننے گیا تھا میں۔ تو اطلاع یہ ملی کہ خیر سے اپنے مرزا غالب اور شیروانی صاحب بھی آرہے ہیں۔ ہیں جی... اپنی اپنی معشوقاؤں کے ساتھ۔ ایک بات کا بڑا افسوس ہوا مجھے۔ اپنے شیروانی صاحب بڑے بے وفا نکلے۔ لگتا ہے شہلا سے جان چھڑانا چاہتے تھے خود بھی۔ ہم نے ان کی مشکل آسان کردی۔ مقصد تو کچھ اور تھا ہمارا لیکن ہمیں کیا معلوم تھا کہ شیروانی صاحب نے معشوق ہی بدل لیا ہے۔ وہ بے چاری شہلا خواہ مخواہ ماری گئی۔"

میں نے کہا۔ "اب تم اس تصویر کی بات کرو گے۔" وہ ایک بچکانہ حرکت تھی تمہاری۔ ایسی تصویریں کون نہیں بنوا سکتا۔ مگر ایک بچہ بھی ایسی کیمرہ ٹرک سے متاثر نہیں ہوتا۔"

اس سے پہلے کہ دلاور جواب دیتا، سامنے والے دروازے سے تیز روشنی اندر آئی۔ دلاور نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک جیپ سیدھی اندر آگئی۔ اس کی خیرہ کن روشنی سیدھی مجھ پر اور رابعہ پر پڑی۔ انجن بند ہونے کے ساتھ ہی لائٹس آف ہوئیں تو چند سیکنڈ کے لئے میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا رہا۔ پھر میں نے پولیس کی وردی میں دو افراد کو دیکھا۔ جیپ سے اترنے کے بعد ان میں سے ایک سیدھا دلاور کی طرف آیا۔

دلاور نے اٹھ کر اس سے مصافحہ کیا۔

"کیا خبر لائے ہو سب انسپکٹر؟"

سب انسپکٹر ہنسا۔ "آپ خود ہی سمجھ لیں جناب!"

میرا دل ڈوبنے لگا۔ کیا واقعی وہ ہمارے باقی ساتھیوں کو لے آئے تھے؟ لیکن جیپ کے پیچھے میں نے مدھو سودن کے ساتھ کیرتی کو دیکھا تو جہاں میرے دل کو اطمینان ہوا وہیں حیرت بھی ہوئی۔ ان دونوں کے ہاتھ میں ہتھکڑی تھی۔ دو پولیس والے انہیں دھکیلتے ہوئے قریب لے آئے۔ مدھو سودن خاموش تھا مگر کیرتی رو رہی تھی۔

"یہ کون ہیں انسپکٹر؟" دلاور نے حیرانی سے کہا۔

"یہ بڑے فنکار لوگ ہیں جناب!" انسپکٹر نے کہا۔ "ان پر قتل کا الزام ہے۔"

دلاور نے مصنوعی حیرانی سے کہا۔ "تو انہیں تھانے لے جاتے۔ یہاں لانے کا مقصد؟ میں کوئی جج ہوں کہ انہیں سزائے موت دے دوں۔"

"آپ حکم دیں۔ سزائے موت آپ کے سامنے دی جاسکتی ہے۔" سب انسپکٹر نے کہا۔ "دراصل یہ آپ کے بھی مجرم ہیں۔ آپ کا کچھ مال نکل گیا تھا گودام سے۔"

دلاور نے کہا۔ "ہاں۔ میرا خیال ہے وہ چوکیدار کی حرکت تھی۔ ہم نے اسے چوری کا علم ہوتے ہی سزا دے دی تھی۔"

"آپ نے بہت جلدی کی سر سزا دینے میں۔" سب انسپکٹر نے افسوس سے سر ہلایا۔ "پہلے تفتیش تو کرلینے دیتے ہمیں۔"

"ارے چھوڑو انسپکٹر! ہمیں معلوم ہے تم لوگ کیا تفتیش کرتے ہو۔" دلاور نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔ "کوئی ہمالیہ پہاڑ چوری کرکے لے جائے تو تفتیش کے بعد تم صرف اتنا معلوم کرتے ہو کہ یہ کام کسی چور کا ہے۔"

"نہیں جناب! یہ دیکھ لیں۔ اصل مجرم یہ ہیں۔ انہوں نے گودام سے مال نکالا تھا۔" سب انسپکٹر نے کہا۔ "کتنی جلدی پکڑ لیا انہیں ہم نے۔"

دلاور نے حیران ہو کے کہا۔ "یہ... نہیں اپنے انسپکٹر صاحب۔ یہ تو بڑے غریب اور مظلوم بندے ہیں۔ غلط آدمی پکڑ کے لانا واقعی بہت آسان کام تھا۔"

"آپ پوچھ لیں ان سے جناب..."

"بھئی ان سے کیا خاک پوچھوں۔ جو تم نے کہا ہوگا وہی یہ کہہ دیں گے۔ اقبالِ جرم کرا لیتے ہو تم لوگ۔ مگر میں نہیں مان سکتا۔ بابا وہ مشین گن اور دستی بم ان کے کس کام کے؟ یہ کوئی ڈاکو ہیں؟ مجھے تو پتا چلا تھا کہ وہ سب مال محمد خان کے ڈیرے پر موجود ہے۔"

اس وقت کیرتی نے بڑی عقل مندی کا مظاہرہ کیا۔ وہ ہتھکڑی سمیت دلاور کے پیروں سے لپٹ گئی۔ "حضور۔ مائی باپ! ہم نے کچھ نہیں کیا، ہم شریف لوگ ہیں۔ آپ جس سے چاہو پوچھ لو۔ ہم نے کسی کو قتل بھی نہیں کیا۔ انسپکٹر خواہ مخواہ ہماری جان کا دشمن ہو گیا ہے۔ رشوت مانگتا ہے ہم سے۔ ہم دس ہزار کہاں سے لائیں۔"

سب انسپکٹر نے مشتعل ہو کے کیرتی کے ایک لات رسید کی اور ایک گالی دے کر بولا۔ "بکواس کرتی جارہی ہے... بھونکتی جارہی ہے..."

کیرتی نے ایک دلدوز چیخ ماری۔ "دیکھ لیں سرکار! ایسے ہوتا ہے غریبوں کے ساتھ۔ ہمیں بچالیں۔ ہم ساری عمر غلامی کریں گے۔ ہمارے بچے دعائیں دیں گے۔"

خلاف توقع دلاور نے کیرتی کو لات مار کے دور نہیں پھینکا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ کیرتی کی آہ و زاری سے پسیج گیا ہے۔ اس نے

نرمی سے ہاتھ پکڑ کر کیرتی کو اٹھایا۔ "اٹھو' آرام سے بات کرو۔ کیا تم نے چوری کی تھی؟"

کیرتی نے رو کے کہا۔ "بھگوان کی سوگند سیٹھ صاحب! ہم نردوش ہیں۔"

سب انسپکٹر اسے مارنے کے لئے بڑھا تو دلاور نے روک دیا۔ "بس کرو سب انسپکٹر جانے دو انہیں۔"

سب انسپکٹر نے احتجاج کیا۔ "انہوں نے ایک پروہت کی ہتھیا قبول کی ہے۔"

دلاور نے غصے سے کہا۔ "بکواس بند کرو۔ تمہیں دس ہزار چاہئیں۔ یہ لو دس ہزار۔" اس نے اپنی جیب سے ایک گڈی نکال کے سب انسپکٹر کی طرف پھینک دی۔ "اب چھوڑو انہیں کھول دو ان کی ہتھکڑی۔"

سب انسپکٹر نے تذبذب اور احتجاج کے انداز میں کچھ سوچتے ہوئے گڈی اٹھائی۔ اسے جیب میں رکھنے سے پہلے ہاتھ پر مارتا رہا۔ پھر اس نے اپنے سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ مدھو سودن اور کیرتی آزاد ہو گئے۔ وہ دلاور کو دیوتا قرار دیتے ہوئے اس کے پاؤں چھو رہے تھے اور دعائیں دے رہے تھے۔ دلاور ایک شان استغنا کے ساتھ انہیں دلاسا دے رہا تھا۔ میں اور رابعہ یہ نئے انداز کا ناٹک دیکھ رہے تھے۔ دلاور جیسے شیطان نے صرف دس ہزار میں خود کو فرشتہ ثابت کر دیا تھا۔ اپنے رحمدل' نیک اور سخی ہونے کا ثبوت فراہم کر دیا تھا۔ صرف میں ہی جانتا تھا کہ یہ دکھاوا ہے' جھوٹ ہے اور ڈراما ہے۔ لیکن میں اس ڈرامے کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ آخر دلاور کو کیا ضرورت تھی شرافت کی سند حاصل کرنے کی؟ وہ شک پر بھی اپنے کسی مجرم کو معاف نہیں کرتا تھا۔ مگر یہاں اس نے خواہ مخواہ انصاف کے عمل میں دخل دے کر دو مجرموں کی جاں بخشی کرا دی تھی۔ یہ سب کچھ ہمارے سامنے کیا گیا تھا۔ دلاور اتنا بے وقوف ہرگز نہیں تھا کہ ہمیں متاثر کرنے کی کوشش کرتا۔ وہ جانتا تھا کہ ہم شیطان کی شرافت اور نیکی کے قائل ہو سکتے ہیں مگر چوہدری دلاور کو شریف اور نیک تسلیم نہیں کر سکتے۔

"چلو اب جاؤ اپنے گھر۔" دلاور نے مدھو سودن اور کیرتی سے کہا۔ ان دونوں کے لئے رہائی کی خوشی ناقابل برداشت تھی اسے وہ ایک معجزہ سمجھ رہے تھے کہ ایک اجنبی' رحمدل سیٹھ نے دس ہزار میں انہیں عزت اور آزادی خرید کر دان کر دی۔ میری طرح رابعہ بھی اس وقت اتنی حیران تھی کہ رونا دھونا بھول گئی تھی۔۔۔ ہم دونوں نے مدھو سودن اور کیرتی کو ایسے فرار ہوتے دیکھا جیسے پنجرہ کھلا پا کے ایک دم قیدی پرندے پرواز کرتے ہیں۔

"اچھا اس دوسرے معاملے کا کیا ہوا؟" دلاور نے کہا۔

سب انسپکٹر نے کہا۔ "وہ کام بھی ہو گیا۔ میں ادھر ہو کے آیا ہوں خونی خان مقابلے میں مارا گیا ہے۔"

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ "جھوٹ بکتے ہو تم۔"

رابعہ نے بے اختیار ایک چیخ ماری۔ "نہیں... یہ نہیں ہو سکتا۔"

سب انسپکٹر نے ہمیں گھور کر دیکھا "یہ کون ہیں؟"

دلاور نے کہا "ان کی طرف دھیان مت دو اپنی بات کرو۔"

"اور کیا بات کروں جناب'! خونی خان کے چار ساتھی بھی مارے گئے۔ انہیں زندہ پکڑ کر کیا کرنا تھا۔ خواہ مخواہ کی ذمے داری اور پریشانی تھانے میں رکھو تو مصیبت' عدالت میں لے جاؤ تو خطرہ۔"

"ہاں ایسے لوگوں کا فیصلہ تو فوراً ہی کر دینا چاہئے۔" دلاور نے کہا۔ "مگر انسپکٹر! وہاں اور بھی کچھ لوگ تھے۔"

"ہاں جی۔ خونی خان کے مہمان اب سرکاری مہمان ہیں۔" انسپکٹر نے کہا اور پھر معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔

ابھی تک میرے لئے اس سب انسپکٹر پر شک کرنے کی وجہ کوئی نہ تھی۔ میں اس کی ہر بات پر یقین نہ کرنے کی خواہش کے باوجود یقین کرنے پر مجبور تھا۔ لیکن اب یکلخت میں نے اس کے جھوٹ کو پکڑ لیا۔ ابھی دو منٹ پہلے ہی میرے رد عمل پر اس نے خاصی بے اعتنائی کے ساتھ اظہار ناشناسائی کیا تھا اور دلاور سے پوچھا تھا کہ یہ کون ہیں۔ اگر ہم اس کے لئے اتنے ہی اجنبی تھے اور وہ ہمارے نام تک نہیں جانتا تھا تو پھر ہمارے ساتھیوں کے بارے میں اطلاع دیتے وقت اس کا ہماری طرف فاتحانہ نظروں سے دیکھ کے مسکرانا چہ معنی دارد۔ یقیناً وہ جانتا تھا کہ خان کے مہمانوں سے ہمارا کیا تعلق ہے چنانچہ ان کی گرفتاری کی اطلاع پر وہ میرا رد عمل دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے دلاور کے لئے ایک بڑا کارنامہ سر انجام دیا تھا۔ اور اس کا اعلان کرتے ہوئے وہ بہت خوشی محسوس کر رہا تھا۔

ہر جگہ پولیس کے سب بے ضمیر اور بد کردار لوگ ہی برائے فروخت نہیں ہوتے۔ دولت کی قوت خرید کا دائرہ ہر محکمے اور ہر معاشرے کے سب طبقوں تک اور بلا لحاظ مذہب و ملت تمام افراد کو محیط کرتا ہے۔ میرے اپنے وطن میں ایس پی سراج کو وطن دشمنوں نے خرید لیا تھا۔ حاجی کہلانے والے اور عبداللہ نام رکھنے والے کو خرید لیا تھا۔ دلاور نے اگر بمبئی کے ایک پولیس سب انسپکٹر کو اور اس کے فرض کو خرید لیا تھا تو میرے لئے تعجب کی کوئی بات نہ تھی لیکن انسپکٹر کے جھوٹ نے میرے لئے امید کے بند ہوتے نظر آنے والے دروازے کھول دیئے۔ اگر وہ خریدا ہوا پولیس افسر ہوتا تو اس اطلاع پر دلاور اسے انعام دیتا۔ یا شاباش دیتا۔ ابھی ابھی اس نے اپنی دریا دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کو دس ہزار کی بخشش دی تھی' ایک ایسے معاملے میں جس سے اس کا براہ راست تعلق نہیں تھا۔ مدھو سودن اور کیرتی مجرم تھے یا نہیں تھے اور انہوں نے قتل کیا تھا یا نہیں کیا تھا' دلاور کو کیا ضرورت تھی کہ وہ اپنی انصاف پروری کا مظاہرہ کرتا مجرم جانیں اور قانون جانے۔ مگر وہ بھی ڈراما تھا اور اب میرے سامنے اس ڈرامے کا دوسرا ایکٹ پیش کیا جا رہا تھا۔ وہ نقلی پولیس افسر تھا جو اپنا پارٹ بہت اچھا نبھا رہا تھا۔ اور ڈرامے میں واقعی بہت جان تھی۔ کیونکہ اس کا ہدایت کار خود چوہدری دلاور تھا۔ اس سے پہلے میں اس کے پیش کئے ہوئے بہت سے کامیاب ڈرامے دیکھ چکا تھا۔ معمولی صورت حال کو اپنی ضرورت کے مطابق ڈرامائی بنانے میں اس کا ثانی نہیں تھا۔

ان تمام حقائق کا تجزیہ میرے دماغ کے کمپیوٹر نے پہلے سے دستیاب حقائق کی روشنی میں فوراً کر لیا۔ دلاور کو معلوم تھا کہ ہم پروہت کے یا مدھو سودن کے گھر ضرور جائیں گے۔ اس نے وہاں پہلے سے ایک تصویر فراہم کر دی جو ایک طرح سے ہمارے لئے پیشگی اطلاع تھی کہ ہم سے پہلے شکاری وہاں پہنچ چکے ہیں۔ اور اب آزاد ہونے کے باوجود ہم ان کی شکار گاہ میں ہیں۔ کسی وجہ سے شکاری پروہت کے گھر میں نہ پہنچ سکے ورنہ یہ انسپکٹر ہمیں جائے واردات سے رنگے ہاتھوں پکڑ لیتا اور دلاور کی خدمت میں لا کے پیش کر دیتا۔ یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ ہم خوش قسمتی کے باعث زیادہ مضبوط جال سے بچ کر نکل گئے ہیں' وہ مدھو سودن اور کیرتی کے گھر پہنچا مگر ہم وہاں سے بھی فرار ہونے میں کامیاب رہے تو اس نے دونوں میاں بیوی سے معلوم کیا کہ ہم کہاں گئے ہوں گے اور پھر ان کے ساتھ ٹھیک جگہ پر آ پہنچا۔ مدھو سودن اور کیرتی کی گرفتاری کوئی ڈرامہ نہ تھی۔ وہ اپنے اصل مشن میں ناکام رہا تھا۔ اس سے پہلے ہی دوسرے لوگ ہمیں لے آئے تھے۔ یہ دوسرے لوگ دلاور کے اپنے آدمی تھے یا تریونی کی غنڈہ فورس کے ارکان تھے جو ہمارا سراغ مل جانے کے بعد ہمارے پیچھے لگ گئے تھے۔ دلاور محتاط آدمی تھا اور کبھی ناکامی کے امکانات کو نظر انداز نہیں کرتا تھا۔ جیسے ہی اسے اطلاع ملی ہو گی کہ پروہت کے گھر میں وہ ہاتھ نہیں آئے اور پراسرار طور پر وہاں سے غائب ہو گئے۔ یہ غنڈا فورس دوسری جگہ پر بھیج دی گئی۔

میرے اس ذہنی حساب کتاب میں کچھ سقم ضرور تھے۔ ایک سب سے اہم سوال تو یہ تھا کہ مخبری کس نے کی۔ محمد خان نے بڑے وثوق سے کہا تھا کہ تریونی کا باپ بھی اس جگہ کا سراغ نہیں لگا سکتا۔ اور زیادہ سے زیادہ وہ اس ٹیلی فون تک پہنچ سکتے ہیں جو کہیں اور لگا ہوا ہے لیکن تریونی دلاور اینڈ کمپنی نے اندر کے حالات تک جان لئے ہیں۔ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ مدھو سودن اور کیرتی کو وہاں لے جایا گیا اور پھر چھوڑ دیا گیا۔ انہیں محمد خان کے اڈے پر اپنے چوری ہو جانے والے اسلحے کی موجودگی کا علم تھا اور انہیں پروہت کے اس چوری میں ملوث ہونے کا بھی علم تھا۔ یہ سب انہیں کس نے بتایا؟ یقیناً خان کے وفاداروں میں کوئی غدار مخبر تھا۔ میرا ذہن شہزادہ گلفام عرف یوسف ثانی کو ڈبل ایجنٹ کے طور پر پیش کرتا تھا۔

خود محمد خان نے کہا تھا کہ وہ لالچی آدمی ہے۔ پیسے کے لئے سب کچھ کر سکتا ہے۔ وہ بیک وقت دونوں کے کام آ رہا تھا۔ محمد خان کے ساتھ بھی تھا اور تریونی کے بھی۔ اسے دونوں کی مدد کرنے پر انعام مل رہا تھا۔ اور ابھی تک' اس کی ذات شک سے بالاتر تھی۔ اس کا جرم ثابت نہیں کیا جا سکتا تھا' جب تک کہ وہ محمد خان تریونی یا دلاور کی مشترکہ عدالت کے سامنے پیش نہ ہو اور اس پر دونوں طرف سے فرد جرم عائد نہ کی جائے۔ جو ایک ناممکن کام تھا۔ لیکن جیسا کہ محاورہ مشہور ہے' دو کشتیوں کا مسافر بالآخر ڈوب جاتا ہے۔ جو ایک قدم ایک کشتی میں رکھتا ہو اور دوسرا قدم دوسری کشتی میں۔ دھوکا تو ایک دلاور کو دینا بھی مشکل کام تھا۔ وہ بیک وقت تریونی اور محمد خان جیسے خطرناک لوگوں کو ڈبل کراس کر رہا تھا۔ اس کا عبرت ناک انجام زیادہ دور نہیں تھا۔ عشق اور مشک کی طرح جھوٹ بھی نہیں چھپتا۔

اچانک جیپ اسٹارٹ ہوئی اور ہیڈ لائٹ نے مجھ پر یلغار کی تو میں چونکا اور مجھے احساس ہوا کہ اس ڈرامے کے دوسرے ایکٹ کا بھی ڈراپ سین ہو چکا ہے۔ وہ نقلی سب انسپکٹر اپنے ماتحتوں کے ساتھ واپس جا رہا تھا۔ شاید باہر جا کر نئی زندگی کے لئے خوش خوش دوڑنے والے مدھو سودن اور کیرتی کو مفرور قیدی کی طرح راستے میں ہی گولی مارنے کے لئے۔ اس ویرانے میں رات کے اندھیرے سے ان کو موت کے اندھیرے میں دھکیلنا بہت آسان اور بہت ضروری تھا۔

دلاور نے کلائی کی گھڑی دیکھ کے کہا۔ "اگر تمہیں نیند آ رہی ہے تو سو جاؤ۔ وہ تحفہ ابھی وصول کرو گے؟ یا اپنے ساتھیوں کا انتظار کرو گے' اپنے سکندر صاحب؟"

میں نے کہا۔ "تمہارے اس سارے جھوٹ پر مبنی ڈرامے نے مجھے بالکل متاثر نہیں کیا۔ سب انسپکٹر نقلی تھا۔ وہ نوٹ تو

اصلی تھے نا جو تم نے اسے دیئے تھے۔"

"میں جعلی نوٹ چھاپنے کے چکر میں نہیں پڑتا۔" دلاور بولا۔ "تمہیں بھی اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ سب انسپکٹر اصلی تھا یا نقلی؟"

"ہاں۔ فرق تو ان بدنصیبوں کو پڑے گا جن کو تم نے ہمارے سامنے بڑی فیاضی سے انصاف کی آہنی گرفت سے چھڑا دیا تھا۔ وہ اب مارے جائیں گے۔ جب انہیں زندہ رہنے کی خواہش پوری ہونے کا یقین آگیا ہوگا۔ یہاں تو وہ آئے ہی مرنے کے لئے تھے۔ مگر اذیت پسند شکاری کے لئے اس میں زیادہ لطف ہے کہ شکار کو فرار کا موقع دے اور پھر اسے مار کے دہرا مزہ لے۔ اس کے خون کا اور اس کی جھوٹی خوشی کے خون کا۔"

چوہدری دلاور کے چہرے پر طاری مصنوعی خوشی آہستہ آہستہ جھنجلاہٹ اور فرسٹریشن میں بدل رہی تھی۔ اس کی صورت کی نرمی ایک پرانے اصلی چوہدری دلاور کے چہرے کی سفاکی میں ڈھل رہی تھی۔ عیاری کے نقاب کے نیچے سے اس کی شکست خوردہ انا کا سانپ پھنکارنے لگا تھا۔

"سکندر! بہت بول چکے تم۔" اس نے دانت پیس کر اور مٹھی بند کر کے کہا۔ "کیوں مجھے مجبور کرتے ہو کہ تمہارے سامنے میں رابعہ ...."

میں نے اسے ایک گالی دی "بھونکنے والے کتے۔ کاٹتا کیوں نہیں آخر۔ میں چیلنج قبول کر چکا ہوں۔"

دلاور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ وہ اپنے غیظ و غضب کی آگ کے شعلوں پر قابو پانے کی جدوجہد کر رہا تھا۔

"بزدل' بے غیرت۔ چھوڑ دے اپنے ان کتوں کو مجھ پر" میں نے چیخ کر کہا "تیری اپنی ساری ہمت اور طاقت ایک غبارہ ہے جو خود فریبی اور جھوٹ کی ہوا میں اُڑ رہا ہے۔ تو خود کیا ہے؟ مجھ سے نہیں' اس عورت سے مقابلہ کر کے دیکھ لے۔ میں تیری مردانگی کے دعوے کو چیلنج کرتا ہوں دلاور۔ ایک چوہے کی طرح ادھیڑ دے گی یہ عورت تجھے۔ صرف نازو ہی نہیں' رابعہ بھی تجھے چیر کر پھینک سکتی ہے اب ....."

اس سے زیادہ تذلیل وہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ یکلخت اس پر دیوانگی سوار ہوگئی۔ اس نے حکم دیا کہ مجھے پکڑ لیا جائے۔ جب میں بے دست و پا ہوگیا تو اس نے قریب آکر میرے منہ پر طمانچہ مارا۔ میں نے ایک قہقہہ لگایا۔ اس نے دوسرا طمانچہ دوسری طرف مارا۔ میں پھر ہنسا۔ وہ مارتا گیا۔ باری باری ہر گال پر یہاں تک کہ میرے گال دہکنے لگے اور چٹخنے لگے مگر میں بھی ضد پر آگیا تھا۔ میں اس پر قہقہے لگاتا رہا۔ پھر مجھے موقع ملا اور میں نے اس کے منہ پر تھوک دیا۔

جواب میں اس نے بہت ذلیل حرکت کی۔ اس نے اپنے کتوں کو حکم دیا کہ وہ میرے چہرے پر باری باری تھوکیں۔

میں نے یہ ذلت بھی برداشت کی کیونکہ اب میرا یقین ہوگیا تھا کہ دلاور کسی وجہ سے مجبور ہے۔ وہ مجھے جسمانی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ میرے ساتھ تشدد کے وہ طریقے آزمائے جا رہے تھے جو پولیس مخصوص حالات میں آزماتی ہے۔ جب ملزم کو اذیت دینے کے بعد یہ بھی ثابت کرنا مقصود ہو کہ اسے کچھ بھی نہیں کہا گیا۔ عدالت میں طبی معائنے سے اس کے جسم پر ایک بھی علامت سے تشدد کا پتہ نہ چلے۔

خدا نے مجھے سخت تر آزمائش میں شکوہ بلب نہیں دیکھا تھا میں نے ہی کیا رابعہ نے بھی ہر عذاب جھیلا تھا لیکن اس کی رحمت سے مایوسی کو غالب نہیں آنے دیا تھا۔ آج کی رات پھر اس کے اور میرے لئے ایک مشترک دکھ میں رفاقت کا امتحان تھا اور میں خوف کی بازگشت میں امید کا پیغام صاف سن سکتا تھا کہ .... یہ رات اس درد کا شجر ہے جو مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے۔ اور اس پیغام کا حاصل یقین تھا۔

میرے یقین نے بالآخر دلاور کے فریب آمیز اعتماد کو پارہ پارہ کر دیا۔ وہ تھک کر کرسی پر گر گیا۔ ہار جانے کے باوجود وہ ہار ماننے والا آدمی نہیں تھا۔ اس نے فوراً اپنی ہار پر دوسرے فریب کی چادر ڈال دی۔ فریب کا ایک پردہ چاک ہو جانے پر اسے فرق نہیں پڑتا تھا۔

"دیکھو اپنے سکندر صاحب' تم کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے۔" اس نے لہجہ بدل کے کہنا شروع کیا۔

"میں تو خدا کا شکر ہر حال میں ادا کرتا ہوں۔"

اس نے اپنی بات جاری رکھی "یہ جو تم ابھی تک بک بک کر رہے ہو۔ ہیں جی' اور زندہ سلامت بیٹھے ہو۔ تو ایسا خیال مت کرنا کہ مجھے ڈر ہے کسی ...... کا۔" اس نے ایک گالی کو مجھ سے منسوب کر کے کہا "یا دلاور اب وہ پرانا دلاور نہیں رہا۔ میری اور تمہاری دشمنی کی وہ... کیا نام ہے اس کا... نوعیت..." نہیں بدلی۔"

"کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ اچانک تم رحمدل اور با مروت ہو گئے ہو؟" میں نے طنز سے کہا "جس کو تم نے ابھی ثابت کیا۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "بات بس اتنی سی ہے کہ مجھ پر ایک چانس کا قرض ہے۔ چانس تم نے دیا تھا۔ اس وقت مار سکتے تھے مجھے۔ لیکن تم نے بس ہمیں ذلیل کیا۔ اور چھوڑ دیا۔ اپنے وعدے کا پاس رکھتے ہوئے تم نے ہماری جان نہیں لی۔"

"چنانچہ تم یہ قرض یوں ادا کرو گے کہ اچھی طرح ذلیل ...نے کے بعد ہماری جاں بخشی کر دو گے۔" میں نے کہا "چھوڑو ...یہ چکر اسے دینا جو تمہیں جانتا نہ ہو۔ اصل بات یہ ہے ...تم مجبور ہو۔"

"چلو آپ ایسا سمجھ کے خوش ہوتے ہو... تو ٹھیک ہے... ہم ...ور ہیں اور تم مختار ہو۔" دلاور نے کہا "تمہیں پیغام تو مل گیا ...ہمارا۔ کہ میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ تمہارے نام لاہور سے ...تحفہ بھیج دیا ہے کسی نے۔ میری معرفت۔"

"مجھے معلوم ہے وہ تحفہ کیا ہوگا۔"

"تصویر دیکھ کے تم نے سمجھ لیا ہوگا۔" دلاور بولا۔

"مجھے اس سے پہلے ہی اطلاع مل گئی تھی تمہارے ...رماؤں کے کارنامے کی۔ انہوں نے ایک بیوہ کو اور اس کے ...بچوں کو اغوا کر لیا ہے ...."

"تمہیں غلط اطلاع دی ہے کسی نے۔" دلاور بولا "مرحوم ...ضوی صاحب ایس ایس پی ہمارے دشمن ضرور تھے۔ لیکن ...وی نیک اور اصول پرست تھے۔ پرانے وقتوں کے کچھ ...نے کہیں کہیں نظر آجاتے ہیں اب بھی۔ مگر وہ سب ختم ...تے جا رہے ہیں رضوی صاحب کی طرح۔ وضعداری کا ...ن نہیں رہا۔ ویسے آج کوئی ترکی ٹوپی شیروانی پہن کے بازار ...ں آجائے تو تماشا بن جائے۔ کارٹون نظر آئے۔"

"مثلاً شہزادہ گلفام عرف یوسف ثانی؟"

"یہ کون ذات شریف ہیں؟ ہیں جی۔" دلاور بولا۔

"اور کس کا حوالہ دے رہے تھے تم؟" میں نے طنز سے کہا۔

"وہ تو... بس ایسے ہی ایک مثال تھی... خیریات تھی رضوی ...حب کی فیملی کی۔ تو ان سے ہماری اب کیا دشمنی۔ رضوی ...حب کی زندگی میں ہم نے انہیں استعمال نہیں کیا۔ وہ بالکل ...ٹھیک ٹھاک اور خیریت سے ہیں۔"

...میں نے کہا "یہ جھوٹ ہے۔ وہ اپنا مکان بیچ کر کسی اور کو ...ہو بتائے بغیر کہیں چلی گئی ہیں۔ ان کا ایسے لاپتا ہونا تمہاری ...داستانی ہے دلاور!"

دلاور نے نفی میں سر ہلایا "خواہ مخواہ الزام مت لگاؤ۔ ایسی ...بات ہوتی تو میں مان لیتا تمہارے سامنے۔ انہوں نے ...ضرور بیچا تھا مگر وہ لاپتا نہیں ہوئی ہیں۔"

"پھر کہاں ہیں وہ؟"

"وہ... جہاں بھی ہیں... بالکل خیریت سے ہیں۔ انہیں کوئی ...تکلیف نہیں۔ ہر طرح کا آرام ہے۔"

"یعنی تمہاری جیل میں انہیں اے کلاس دی گئی ہے۔"

دلاور ...نے کہا "انہوں نے دوسرا مکان پسند کر لیا تھا۔ میرا خیال ہے کل وہ اس میں شفٹ ہو جائیں گی۔" دلاور نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہارے مذموم عزائم کا شکار ہوئی صرف شہلا؟" میں نے کہا۔

دلاور نے میرے سوال کا جواب گول کر دیا "وہ تصویر کیمرہ ٹرک نہیں تھی۔"

"کیا... یہی تحفہ لائے ہو تم میرے لئے؟" میں نے کہا۔

"تحفہ تھا تو اپنے محسن شیروانی صاحب کے لئے.... اچھا تھا اگر وہ خود آجاتے ... مگر خیر۔"

میں نے دل کو پتھر کر کے کہا "میں محسن کی طرف سے شہلا کی لاش وصول کرنے کے لئے تیار ہوں۔"

رابعہ نے پھر رونا شروع کیا "میں نے کہا تھا نا تم سے ... وہ شہلا ہی تھی... اس کے کپڑے اور ٹاپس وہی تھے... ان لوگوں کو کیا ملا اسے مار کے۔"

"لو جی وکیل صاحب! یہ آپ سے کس نے کہا کہ ہم نے اسے مار دیا ہے' خدا نخواستہ۔" دلاور نے بے حد حیرانی کا اظہار کیا

"جھوٹ مت بولو ... کمینے ... ذلیل ..." رابعہ چلانے لگی۔

میں نے اس کا کندھا سختی سے دبا کے کہا "یہ کیا بے وقوفی ہے۔ تم میرے لئے باعث ندامت بن رہی ہو۔ شرم آنی چاہئے تمہیں۔"

رابعہ میرے کندھے پر سر رکھ کے سسکیاں لینے لگی "میں کیا کروں سکندر؟"

"ابھی کیوں اپنے آنسو ضائع کر رہی ہیں مس رابعہ قادری ایک دن شاید آپ اسے رونے پر مجبور ہوں۔ اگر وہ دن آیا تو اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں ہوگا۔" دلاور نے کہا "ہم اسے زندہ لے آئے ہیں۔ اور زندہ رکھیں گے۔ آپ کی امانت رہے گی ہمارے پاس۔ ہیں جی' اور جیسی ہوگی آپ کے حوالے کر دی جائے گی۔ لیکن یہاں نہیں۔"

رابعہ رونا بھول گئی "وہ زندہ ہے؟"

دلاور مسکرایا "ہاں جی' اتنی ہی زندہ ہے جتنی آپ ہو مگر اس کو زندہ رکھنا صرف ہمارا کام نہیں... کچھ تھوڑا سا تعاون آپ کا بھی چاہئے۔"

میں نے کہا "تم معاملے کو پراسرار بنا کے پیش کرنے کے عادی ہو لیکن میں نے تم سے غلط نہیں کہا۔ جب مجھے معلوم ہوا تھا کہ مسز رضوی اور شہلا غائب ہیں اور اس کے بعد تمہاری طرف سے شہلا کی ایک تصویر ملی تھی۔ میں نے اپنے دل کو شہلا کے بارے میں بدترین خبر کے لئے تیار کر لیا تھا۔ اب احساس ہوتا ہے کہ انہیں ہم غیر محفوظ چھوڑ آئے تھے۔

ہماری ایک کمزوری تمہاری شہزوری بن سکتی تھی۔ تم جیسے دشمن سے ہر کمینگی کی توقع کی جاسکتی ہے۔"

"جنگ میں شرافت کا کیا سوال؟ جو کچھ تم نے کیا' میرے نزدیک وہ کوئی شریفانہ عمل نہیں تھا" دلاور نے کہا "تم اگر میرے بیوی بچوں کو مار دو تو میں تسلیم کروں گا کہ میں ان کی حفاظت نہیں کرسکا۔ تم سے نہیں کہوں گا کہ یہ کوئی شرافت ہے..... شملا اب ہمارے قبضے میں ہے اور زندہ ہے۔ ابھی کچھ دیر بعد تم اسے دیکھ لوگے۔"

"صرف دیکھنے کی اجازت ہوگی؟"

رابعہ نے کہا "کیا ہم مل نہیں سکتے شملا سے؟"

دلاور نے اسے غور سے دیکھنے کے بعد نفی میں سرہلایا "ابھی نہیں۔ ملاقات بھی کرادیں گے .... لیکن چند دن بعد۔"

"اس سے بات بھی نہیں ہوسکتی؟" رابعہ نے مضطرب لہجے میں کہا "ٹیلی فون پر ہی سہی۔"

میں نے کہا "میں بتاتا ہوں تمہیں .... وہ تمہیں اسی شیشے کے تابوت میں سوتی ہوئی نظر آئے گی۔ اب میں سمجھ گیا ہوں کہ وہ کوئی کیمرہ ٹرک نہیں تھی۔ انہوں نے اسے کسی شیطانی عمل کے ذریعے اس شیشے کے قفس میں قید کرلیا ہے۔ ممکن ہے' شملا کو خواب آور دواؤں کے انجکشن دے کر محو خواب رکھا گیا ہو مگر میں اس امکان کو بھی مسترد نہیں کرتا کہ یہ اس کی لاش ہو جسے انہوں نے مصری ممی کی طرح بہ حفاظت رکھا ہو۔"

رابعہ پھر رونے لگی۔ اس کا نروس بریک ڈاؤن ہو رہا تھا اور وہ اپنے آنسوؤں کو بہنے سے روکنے کی کوشش میں ناکام تھی۔

دلاور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے میری بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

"اب وقت کم ہے" اس نے کلائی کی گھڑی دیکھ کر کہا "اس لئے میں ڈائریکٹ بات کرتا ہوں۔ تمہارے ساتھ صلح صفائی یا سودے کی بات میں وقت ضائع کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اب تک ہم ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح سمجھ چکے ہیں۔ ہم اپنا کاروبار نہیں چھوڑ سکتے اور تم یہ خبط نہیں چھوڑ سکتے جس نے تمہیں کہیں کا نہیں رکھا۔ ہم تو اپنا نقصان پورا کر بھی لیں گے۔ تمہیں بہت وقت گزر جانے کے بعد احساس ہوگا کہ سب کچھ گنوا کے تم نے کچھ نہیں پایا۔"

"نفع اور نقصان ایسے الفاظ ہیں جن کا مطلب تمہارے لئے کچھ اور ہے' ہمارے لئے کچھ اور۔"

"یہ بھی تمہاری خام خیالی ہے۔ نفع دنیادی کاروبار میں دو مطلب نہیں رکھتا .... اور حساب کتاب میں نقصان کو نفع سمجھنے کا مطلب ہے خود فریبی' بے وقوفی .... میں آخرت کے

حساب کی بات نہیں کررہا ہوں' بزنس کے ہی کھاتوں کے حوالے سے بات کررہا ہوں۔ اس کے علاوہ ایک وقت آئے گا جب تم اپنی عمر کے اس سب سے اچھے وقت کے زیاں پر پچھتاؤ گے جو تم نے وقت کی سمت بدلنے کی سعی لاحاصل میں گنوادیا۔"

اب میں نے تالی بجائی "بہت خوب! اچھی اردو بولنے لگے ہو تم بھی۔"

"یہ میری بدقسمتی ہے" دلاور نے میرے طنز کو نظرانداز کردیا "اور تمہاری بھی ..... کہ ہم ابھی تک مقابل ہیں۔"

"تم میرے بارے میں کیسے فیصلہ کرسکتے ہو؟"

"بیچ میں مت بولو" دلاور نے برہمی سے کہا "میں سمجھا تھا کہ تم سے جان چھٹ گئی لیکن تم نحوست بن کے چمٹ گئے ہو ہم سے۔ حالات سازگار ملتے رہے تم کو اور تم سرحد پار کرکے یہاں آنے کے بعد بھی ایک روگ بنے ہوئے ہو۔"

میں نے ہنس کے کہا "تم اس روگ سے چھٹکارا کیوں نہیں پالیتے؟"

"کسی دن تمہاری یہ خواہش بھی پوری ہوگی۔ ابھی نہ سہی۔ ہر جگہ تمہیں کوئی محمد خان نہیں بچاسکے گا۔"

یہ بات غصے میں اس کے منہ سے نکل گئی تھی۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ وہ وجہ محمد خان تھا جو میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ اس نے کوئی ایسا بندوبست کرلیا تھا کہ دلاور مجھے اور رابعہ کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچاسکے۔ کوئی ایسی ضمانت حاصل کرلی تھی کہ دلاور ہمیں حفاظت اور سلامتی کے ساتھ واپس کرنے پر مجبور تھا۔ ڈاکو محمد خان کا یہ بندوبست کیا تھا اور یہ ضمانت کیا تھی' اس کے بارے میں دلاور یقیناً جانتا تھا مگر میں نے اس سے پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ میرے لئے یہ اطمینان ہی بہت کافی تھی کہ دلاور اپنی من مانی کرنے کے لئے آزاد نہیں ہے۔ اس اطمینان نے مجھے بہت حوصلہ دیا۔ اب میں اس سے آنکھ ملا کے برابری کی سطح پر بات کرسکتا تھا۔

میں نے کہا "ہمارا اصل محافظ کوئی اور ہے دلاور .... جو سب سے بڑا محافظ ہے اور سامنے آئے بغیر اسی طرح اپنے بندوں کی حفاظت کے لئے کسی ڈاکو کو بھی وسیلہ بنادے تو یہ اس کی قدرت کا ایک کرشمہ ہے۔ تمہیں اگر تریونی جیسے ملتے ہیں تو تم سمجھتے ہو کہ اب کون تمہارے سامنے ٹھہر سکتا ہے .... لیکن دیکھو .... وہ محمد خان جس کو دنیا ڈاکو اور خونی خان کہتی ہے ..."

"ایسی کی تیسی اس خونی خان کی" دلاور نے چیخ کر کہا۔ اس کو غصہ اپنے آپ پر آرہا تھا کہ اس نے قبل ... وقت اپنی

کمزوری کا اعتراف کرلیا "جو میں کہہ رہا ہوں وہ سنو .... ہم اپنا کاروبار بند نہیں کرسکتے اور مزید نقصان بھی برداشت نہیں کرسکتے۔ کل یا پرسوں .... دو چار دن میں ہمارا مال یہاں سے جائے گا۔ تریونی کو یقین ہے کہ یہ بات کسی کو معلوم نہیں ہوسکتی لیکن میں یقین کی خود فریبی سے بچنا چاہتا ہوں' اس لئے میں نے ایک ایسا بندوبست کیا ہے کہ تمہاری طرف سے کوئی خطرہ نہ رہے۔"

"تم شملا کو اپنے ساتھ رکھوگے" میں نے کہا۔

دلاور مسکرایا "آؤ .... میں تم کو شملا سے ملواؤں۔ یہ پوری ملاقات نہیں ہوگی کیونکہ تم صرف اسے دیکھ سکوگے۔"

میں نے کہا "میں اس ملاقات کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔"

لیکن رابعہ نے میرا بازو تھام کے کہا "سکندر ...."

میں نے کہا "رابعہ! اسے دیکھ کے ہمیں دکھ کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ پھر تمہارے لئے اس کے تصور سے دامن چھڑانا مشکل ہوجائے گا۔ ابھی یہ سمجھ لو کہ دلاور نے جو بھی کہا ہے' جھوٹ ہے۔"

رابعہ نے کہا "میں اپنے آپ کو یہ دھوکا نہیں دوں گی۔ میں اسے ضرور دیکھوں گی ایک بار۔"

اس کی ضد کے سامنے مجھے سرجھکانا پڑا۔ دلاور جاتے جاتے پلٹ کے رک گیا تھا۔ اس کی صورت پر اضطراب کی تحریر سے اندازہ ہوتا تھا کہ اسے میرے انکار سے کتنی تشویش تھی۔ اگر رابعہ میری بات مان لیتی تو شاید وہ ہم دونوں کو زبردستی پکڑ کے لے جاتا۔ اب وہ مطمئن ہوکے آگے بڑھا۔ ہر طرف سے حصار قائم کرنے والے مسلح محافظوں کی کمان استاد پیڈرو نے سنبھال لی۔

اس نے مجھے پولیس کے انداز کی چند گالیاں دینے کے بعد کہا "تمہارا دماغ کسی دن میں درست کروں گا۔"

میں نے پرسکون رہتے ہوئے کہا "پیڈرو! میں بھی دوسرے معاملات میں الجھا ہوا ہوں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں اپنے بے گناہ اور مظلوم والد کے قتل کو بھول گیا ہوں۔ ان کے قاتل تم ہو اور تمہارے ساتھ میں اپنا حساب ضرور برابر کروں گا۔"

پیڈرو نے فلمی ولن اسٹائل میں ایک بے ہنگم قہقہہ مارا۔ "کتنے دن اور جیوگے سکندر اعظم؟ کسی دن کتے کی موت مارے جاؤگے۔"

"کتے کی موت تم بھی مارے گئے ہوتے .... اگر تمہارا وقت آجاتا لیکن خدا کی طرف سے تمہیں جو مہلت ملی تھی وہ ابھی

تمام نہیں ہوئی۔ جب وقت آئے گا تو میں اچانک فرشتہ اجل کے ساتھ ہی آؤں گا اور تم سے پوچھوں گا کہ اب وزیر خان کی ہڈیاں کہاں دفن ہیں۔ پھر اسی کے پیروں میں تمہیں گاڑ دوں گا۔"

"میرے ساتھ اسے بھی گاڑ دینا .... اپنی بہن کو" اس نے رابعہ کی طرف اشارہ کیا "کیوں جانی .... میرے ساتھ دفن ہونا منظور ہے؟"

پلک جھپکتے میں میری عقل کا فیوز اڑ گیا۔ میں نے نتائج کی پروا کئے بغیر جست لگائی۔ پیڈرو کے ساتھ چلنے والے محافظ ہماری گفتگو سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور انہیں مجھ سے ایسی پھرتی کی توقع بھی نہ تھی۔ ان کے مخل ہونے سے پہلے میں پیڈرو کو اٹھا چکا تھا۔ میں نے اسے گھما کے پوری قوت سے فرش پر دے مارا۔ اس کی چیخ نے دلاور کو بدحواس کردیا۔ مسلح محافظوں نے مجھے دبوچ لیا۔

"کیا ..... کیا ہوا؟" وہ دوڑ کر واپس آیا۔ پیڈرو فرش پر بل کھا رہا تھا۔ اس کے منہ سے مغلظات ابل رہی تھیں لیکن وہ اٹھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

میں نے کہا "میری بات یاد رکھنا پیڈرو .... چلو دلاور!"

دلاور نے غصے سے پیڈرو کو دیکھا "تو بھی بھونکنے سے باز نہیں آتا۔ کیا سمجھایا تھا میں نے ...."

پھر وہ میری طرف پلٹا "تم بھی زیادہ سورما مت بنو۔ یہ نہ ہو کہ تمہیں اکیلے واپس جانا پڑے۔"

میں نے کہا "تم رابعہ کو روکنے کی دھمکی دے رہے ہو؟ روک لو .... مجھے بھی روک لو .... اگر تم خود کو اتنا بااختیار سمجھتے ہو"

دلاور کچھ دیر ہونٹ کاٹتا رہا۔ پھر واپس چل پڑا "ان دونوں کو گھیر کر لاؤ اور اب اگر کوئی بھی ایسی ویسی بات ہو تو میری طرف سے اجازت ہے' انہیں چھلنی کردینا۔"

استاد پیڈرو کے پاس دو افراد رک کر اسے اٹھنے میں مدد دے رہے تھے۔ میں اور رابعہ محافظوں کے نرغے میں آرام سے چلنے لگے۔

"اپنے غصے کی بریک ٹھیک رکھو" رابعہ نے کہا جو میرے فوری اور پرخطر اقدام سے پریشان ہوگئی تھی۔

"اس نے جو بات کی تھی وہ ناقابل معافی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"اس سے پہلے بھی بہت کچھ ہوچکا تھا" رابعہ نے کہا۔

"ہاں یہ سمجھ لو کہ برداشت اور کنٹرول کی حد تھی جو گزر گئی تھی ..... بریک فیل ہوگئے تھے" میں نے کہا۔

اس نے کہا "مجھے ڈر لگ رہا ہے سکندر۔"

میں نے کہا "چلو اچھا ہے' ڈر دور ہوجائے گا .... جب میں

نے منع کیا تھا تو بہت بہادر بن رہی تھیں۔ اب ہم انکار بھی نہیں کرسکتے۔"

"انکار اس وقت بھی نہیں کرسکتے تھے۔" رابعہ نے کہا۔

بیرک سے باہر آتے ہی میں نے رات کو دیکھا جو تاحد نگاہ افق تا افق محیط تھی۔ اپنے سکوت اور ہمہ گیری کے احساس کے ساتھ۔ آسمان پر اکادکا ستارے تھے۔ سمند کے بخارات بمبئی کے آسمان پر غبار بن کے پھیلے ہوئے تھے چنانچہ کم روشن ستارے روپوش تھے۔

مجھے اپنے چاروں طرف ویسی ہی بیرک ٹائپ عمارات پھیلی ہوئی نظر آئیں جیسی بیرک سے میں باہر آیا تھا۔ یہ سب گودام تھے چنانچہ سارا علاقہ سنسان پڑا تھا۔ بیشتر گوداموں کے دروازے بند تھے اور کہیں کہیں خالی ٹرک بھی کھڑے ہوئے تھے۔ صرف حد بندی کے لئے ہر گودام کے گرد خاردار تاروں کی باڑھ لگادی گئی تھی۔ اس کا مقصد حفاظتی انتظامات کو یقینی بنانا نہیں تھا۔ گودام کی بلند' بے رنگ دیواروں پر باہر کے حصے کو روشن رکھنے کے لئے بلب بھی لگائے گئے تھے مگر ان کی روشنی ناکافی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی کو بھی گودام میں رکھے ہوئے مال کے چوری ہونے کا ڈر نہیں ہے چنانچہ چوکیدار بھی بہت کم نظر آرہے تھے۔

اس علاقے کا جائزہ ایک نظر میں لینے کے بعد مجھے کبرتی اور مدھ سودن کے بیان کا خیال آیا۔ انہوں نے کہا تھا کہ اسلحہ چرانے کے لئے وہ ایسے ہی کسی گودام میں گئے تھے۔ زیادہ امکان یہی تھا کہ جس گودام سے ہم نکلے تھے' اسی کو دلاور اینڈ کمپنی اپنا مال جمع کرنے کے لئے استعمال کرتی تھی۔ وہ کھیپ جاچکی تھی جس میں سے ان میاں بیوی نے تھوڑا سا اسلحہ چرالیا تھا۔ اس جرم کی سزا انہیں بیرک سے باہر جانے کے بعد ہی دے دی گئی ہوگی' ورنہ ان سے مزید تصدیق کی جاسکتی تھی۔ دلاور نے کہا تھا کہ کل پرسوں یا دو چار دن میں مزید مال جائے گا اس کا صاف مطلب یہ نکلتا تھا کہ آج کل میں یہ گودام پھر بھر جائے گا۔

دلاور اب دوسرے گودام میں داخل ہو رہا تھا جو بیس گز دور بنا ہوا تھا۔ دونوں گودام ایک ہی کمپنی کی ملکیت نظر آتے تھے کیونکہ دونوں کے گرد ایک ہی تاروں کی باڑھ تھی۔ اس باڑھ میں ایک ایک فٹ کے فاصلے سے تاروں کی تین قطاریں ساتھ چلتی تھیں اور تقریباً ہر دس فٹ کے فاصلے پر اینگل آئرن کا ایک کھمبا انہیں سہارا دیتا تھا۔ دوسرے گودام کی تعمیر بالکل ویسی ہی تھی جیسی مدھو سودن نے بیان کی تھی یعنی اس کی چھت اونچی اور مخروطی تھی۔ یہ نسبتاً قدیم بیرک تھی اور اس کی چھت آر سی سی سے نہیں بنائی گئی تھی۔

ایک بہت بلند فولادی گیٹ سے گزرتے ہی دلاور دائیں جانب مڑگیا۔ بیرک کے اندر تاریکی تھی۔ پھر بھی میں نے وہ کریٹ دیکھ لئے جو دیواروں کے ساتھ ساتھ اوپر تک بھرے ہوئے تھے۔ یہ سب اسلحہ نہیں ہوسکتا تھا کیونکہ یہ چھ فٹ لمبے اور چوڑے ہزاروں کریٹ تھے جن کو لے جانے کے لئے سو ٹرک بھی کم پڑتے۔ اس وقت میں کوشش کے باوجود اس کمپنی کا نام نہ دیکھ سکا جو اس گودام کی مالک تھی' ورنہ مجھے یہ بھی پتا چل جاتا کہ آخر ان ہزاروں کریٹس میں کیا چیز مشرقی پاکستان جاتی ہے۔ تاہم طریقہ واردات میری سمجھ میں آگیا تھا۔ ہزاروں کریٹس میں سیکڑوں کریٹ اسلحہ کے اس طرح شامل کرنا کہ وہ پکڑے نہ جائیں' کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ سو کریٹس میں اسلحے کے دس کریٹ بہ آسانی چھپائے جاسکتے ہیں انہیں کسی ٹرک میں سب سے آگے والی قطار میں سب سے نیچے رکھ دیا جائے اور پھر ان کے اوپر اور آس پاس نوے کریٹ ڈھیر کردیئے جائیں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ تلاشی لینے والے پہلے پورا ٹرک خالی کرائیں اور پھر نیچے دبے ہوئے کریٹ کھول کے دیکھیں۔ ان کے پاس اتنا وقت کہاں ہوتا ہے۔ ویسے بھی ایسے دھندے اشتراک سے چلتے ہیں۔

دلاور کے پیچھے میں اور رابعہ ایک ساتھ اترے۔ زینے میں نیچے سے کافی روشنی آرہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ رابعہ کانپ رہی ہے اور اس کا ہاتھ برف کی طرح ٹھنڈا ہو رہا ہے۔

"دیکھو' بیہوش ہونے یا رونے دھونے کا پروگرام نہیں چلے گا۔" میں نے اسے زینے میں روک کے کہا۔ "تم اپنی مرضی سے آئی ہو۔"

رابعہ نے فقط اقرار میں سرہلایا۔ میں نے شیشے کا دروازہ کھولا جو زینے کے آخری حصے میں واقع تھا۔ اندر قدم رکھتے ہی میں نے ایک اور شیطان کو دیکھا۔ یہ حاجی عبداللہ تھا۔

"لاحول ولاقوہ۔" میں نے زور سے کہا۔

حاجی عبداللہ کی ایک آنکھ ضائع ہوگئی تھی اور اس کا ایک کان بھی اڑ گیا تھا۔ اس کا نورانی چہرہ اب مکروہ اور بدوضع ہوگیا تھا۔ اس نے قہر آلود نظروں سے مجھے دیکھا اور لنگڑاتا ہوا آگے آیا۔

"ماشاء اللہ سے چاند سورج کی جوڑی پھر نظر آرہی ہے۔ افسوس کا مقام ہے برخوردار کہ ہم تمہاری صحیح مزاج پرسی نہیں کرسکتے' ورنہ تم نے جس طرح سے ہماری صورت بگاڑی ہے......"

"بگاڑی کہاں ہے حاجی...... جیسے اعمال تھے' ویسی ہی کردی ہے۔" میں نے کہا۔ "دیکھو' کیا لعنت برس رہی ہے۔"

"بشرط زندگی.... ہم بتائیں گے تمہیں۔" حاجی دانت پیس ...لا۔ "آئینے سے ڈرو گے برخوردار!"

"انشاء اللہ سے کہنا بھول گئے تم۔" میں نے کہا۔

دلاور نے کہا۔ "شہلا ادھر تمہارے لئے وہ ہے..... کیا کہتے ہے.... چشم براہ! لیں جی اپنے سکندر اعظم صاحب!"

میں نے دروازہ آہستہ سے دھکیلا جس کی طرف دلاور نے ...رہ کیا تھا اور اپنی جگہ پر منجمد ہوگیا۔ شہلا میرے سامنے تھی۔ ...کے شفاف تابوت میں بالکل اس طرح ساکت وصامت خوابیدہ جیسے وہ تصویر میں نظر آتی تھی۔ اس نے کپڑے ...وہی پہن رکھے تھے اور اس کے کانوں میں وہی ٹاپس تھے ...ے رابعہ نے دیئے تھے لیکن وہ اکیلی نہیں تھی۔ اس کے ...ذ ہی وہ بچہ سو رہا تھا جسے میں اور رابعہ پہلی بار دیکھ رہے تھے۔ شہلا اور محسن کی محبت کا ثمر تھا۔

رابعہ بے اختیار چلائی۔ "شہلا!" اور دوڑ کر ان آہنی ...خوں سے چمٹ گئی جو ہمارے اور شہلا کے درمیان حائل ...ں۔ شہلا اور اس کے بچے کے لئے مصنوعی طور پر بنوایا ...نے والا تابوت اس کمرے کی آخری دیوار کے ساتھ رکھا ہوا ...۔ مضبوط' فولادی سلاخوں کی دیوار اس کمرے کو درمیان ...، دو حصوں میں تقسیم کرتی تھی جس کی لمبائی تقریباً اٹھارہ ...اور چوڑائی بارہ فٹ ہوگی۔

شہلا اور اس کا بیٹا ہمارے ساتھ اسی کمرے میں موجود ...ے مگر اس کے باوجود ہماری دسترس سے اتنے ہی دور تھے جتنی ...رلاہور میں تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ پہلے ہم انہیں چشم ...مور سے بھی نہیں دیکھ سکتے تھے مگر اب اپنی آنکھوں سے ...ہ رہے تھے۔

اس نصف حصے کو جس میں شہلا اور اس کا بیٹا سو رہے ...تھے' اس طرح روشن کیا گیا تھا کہ ایک اسپاٹ لائٹ صرف ...شیشے کے تابوت پر چھ فٹ قطر کے دائرے میں پڑ رہی تھی۔ ...س دائرے کا نصف حصہ تابوت پر تھا اور بقیہ نصف دیوار پر ...ڑا ہوا تھا۔ بقیہ کمرے میں وہی اجالا تھا جو دیوار یا تابوت سے ...عکس ہونے والی روشنی نے پھیلا دیا تھا۔ یہ ایک بھیانک' ...آسیب اور دل دہلانے والا منظر تھا جس کے المناک تاثر کو ...اجاگر کرنے کے لئے سلاخوں' سپاٹ دیواروں کی ویرانی ...اور اسپاٹ لائٹ سے مدد لی گئی تھی۔ یہ "اسپیشل افیکٹ" ...چوہدری دلاور ہی دے سکتا تھا اور وہ مجموعی صورتحال سے ...ہمارے حوصلے پست کرنے اور ہمیں مایوسی میں مبتلا کرنے کی ...کوشش میں یقیناً کامیاب رہا تھا۔

میں سلاخوں کو اپنی انگلیوں سے جکڑے' پلک جھپکائے بغیر شہلا کو دیکھتا رہا۔ شیشہ اتنا شفاف تھا کہ نظر کی راہ میں ذرا بھی حائل نہیں ہوتا تھا۔ میں شہلا کو ایسے دیکھ سکتا تھا جیسے وہ میرے سامنے اپنے بیڈ پر محو خواب ہو۔ روشنی میں اس کی صورت کا ہر نقش روشن اور واضح تھا۔

اس عرصے میں جب ہم اس سے دور تھے اور وہ تنہا تھی' ہجر کے دن اور فراق کی راتوں کا سب درد اپنے دل میں سمیٹ کر' لبوں پر حوصلہ مندی اور امید کی مسکراہٹ کو روشن رکھنے پر مجبور تھی۔ خوف اور اندیشوں سے نبرد آزما تھی اور بے یقینی کے عذاب آفریں لمحوں میں محصور تھی۔ اس نے اپنی ذمے داری کیسے نبھائی تھی' اس کا اندازہ شہلا کے بیٹے کی صحت سے ہوتا تھا۔ وہ بے حد خوبصورت' معصوم اور صحت مند بچہ تھا جسے باپ کی شفقت سے محروم رہنا پڑا تھا۔ شاید اس کمی کو ماں نے اپنی محبت سے پورا کردیا تھا کہ وہ سوتے میں بھی مطمئن اور آسودہ لگتا تھا اور اس کے لبوں کی بے نام سی شوخ مسکراہٹ بھی پر اعتماد تھی۔ وہ نیکر اور قمیص پہنے ہوئے تھا اور اس کے پیروں میں جرابوں کے ساتھ اسپورٹ شوز تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے سوتے سوتے وہ اچانک اٹھے گا' شہلا کو جھنجوڑے گا اور چلانے لگے گا۔ "ماں.... مجھے بھوک لگی ہے.... اور مجھے کھیلنے بھی جانا ہے۔" میں اس کی آنکھوں کا رنگ نہ دیکھ سکا لیکن مجھے یقین تھا کہ اس کی شفاف' صحت مند آنکھوں میں اس محبت کی چمک بھی شامل ہوگی جو اسے ماں باپ سے ورثے میں ملی تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ وقتی طور پر رنج' بے بسی اور مایوسی کے جذبات نے مجھے مغلوب کرلیا تھا۔ میں احساس جرم میں مبتلا ہوگیا تھا کہ شہلا اور اس کے بیٹے پر ظلم کرنے والا دلاور نہیں' میں ہوں۔ یہ جنگ میں نے چھیڑی تھی جس نے آج شہلا اور اس کے بیٹے کو ہم سے اتنا دور کردیا تھا کہ ان کا پھر ہم سے ملنا محال اور ناممکن لگتا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میں شہلا کو آخری بار دیکھ رہا ہوں..... اس کے بیٹے کو پہلی اور آخری بار دیکھ رہا ہوں۔ بالکل اسی طرح جیسے تدفین سے پہلے میت کا آخری دیدار کرایا جاتا ہے..... جیسے لوگ چرچ میں رکھے ہوئے تابوت میں سونے والے کو آخری بار دیکھ کر تعظیم سے سر جھکاتے ہیں اور اس آخری نقش کے ساتھ جو ان کے ذہن میں ثبت رہتا ہے' گزرتے جاتے ہیں۔

پھر مجھے خیال آیا کہ میں کتنے بڑے گناہ کا مرتکب ہو رہا ہوں۔ میں مایوس ہو رہا ہوں حالانکہ خدا کی رحمت کے سارے در کھلے ہیں اور مجھ پر تو اس کا خاص کرم ہمیشہ رہا ہے.... حالانکہ میں ایک بندہ گناہ گار ہرگز اس کا استحقاق نہیں رکھتا مگر وہ کریم

اور غفور الرحیم 'بخشش کرنے والا' دلوں کا اور نیتوں کا حال جانتا ہے۔

میں نے آہستہ آہستہ سلاخوں کو چھوڑا۔ میرے ہاتھوں کی انگلیاں ٹیڑھی ہوگئی تھیں۔ ان فولادی سلاخوں کو موم کی طرح پگھلا کے توڑ مروڑ دینے کی لاشعوری کوشش صرف ایک جذباتی دیوانگی تھی۔ میں خود سے اتنا بے خبر تھا کہ میں نے رابعہ کو سلاخوں سے سر ٹکراتے' چلاتے اور گرتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ میرے پیروں کے پاس بے حس و حرکت پڑی ہوئی تھی اور اس کے ماتھے سے خون بہہ رہا تھا۔

میں نے کہا تھا' سمجھایا تھا رابعہ..... کہ اسے مت دیکھو۔ اپنے دل میں اس دکھ کے ناسور کو تم کیسے پالو گی.... اس کی ٹیس کو کیسے چھپاؤ گی..... اپنے لہو کو اشکوں میں ڈھلنے سے کیسے روکو گی..... تمہارے اپنے غم پہلے ہی کیا کم تھے نادان لڑکی۔

میں نے اسے نرمی سے دونوں ہاتھوں میں اٹھالیا اور واپس چل پڑا۔ ان سب نے مجھے راستہ دے دیا جو میرے پیچھے بندوقیں تانے ہوئے کھڑے تھے۔ میں نے ان کی طرف نہیں دیکھا مگر ان کی مجرم خاموشی کا احساس چھپا نہ رہ سکا۔ مجھے باہر نکلتے ہی وہ جیپ نظر آگئی جس میں ہم یہاں آئے تھے۔

دلاور نے کہا "اب تم جاسکتے ہو۔"

میں نے رابعہ کو سیٹ پر لٹا کے اس کے ماتھے پر سے خون صاف کیا۔ چند قطرے پیشانی کی جلد پھٹ جانے سے بہہ کر رخسار پر آگئے تھے۔

دلاور نے کہا "اب تمہیں کوئی غلط فہمی نہ ہو تو اچھا ہے۔ شہلا اور اس کا بیٹا' دونوں کی زندگی کا انحصار تمہارے ارادوں پر ہے۔ جب ہم اپنے مال کی اگلی کھیپ ارسال کریں گے تو یہ دونوں ہمارے ساتھ جائیں گے۔ تم اپنے طور پر یہ معلوم کرنے کی کوشش ضرور کرو گے کہ وہ مال کب جائے گا اور کس راستے سے جائے گا۔ شاید تم معلوم بھی کرلو گے اور پھر ہمارا تعاقب بھی کرو گے۔ میں تمہیں روک نہیں سکتا۔ پہلے کی طرح تم اس مال کی کھیپ کو تباہ کرنے کے لئے ہمارا تعاقب بھی کرو گے۔ تم بہت ہوشیار اور بہت نڈر ہو۔ موت کا خوف

تمہارے عزائم کی راہ میں حائل نہ ہوگا مگر اس مرتبہ یہ مت بھولنا کہ تمہارے جگری دوست محسن کی بیوی اور اس کا بیٹا بھی مال میں شامل ہیں۔ جب تمہیں معلوم ہو جائے کہ کسی ٹرک میں اسلحہ روانہ کیا گیا ہے تو یہ بات ذہن میں رکھنا کہ ہم تحفظ کی ضمانت ساتھ لے جارہے ہیں۔ ٹرک ایک ہوگا یا تین ہوں گے یا پانچ۔ درمیان کے ٹرک میں آتش گیر ڈھیر میں کہیں یہ شیشے کا نازک تابوت بھی رکھا ہوگا۔ سب ٹرک ایک دوسرے

کے آگے پیچھے اتنے قریب ہوں گے کہ کسی ایک میں دھماکا ہوا تو باقی سب خود اس کی لپیٹ میں آجائیں گے۔"

میرے کان اس کی آواز سن رہے تھے لیکن میرے ذہن میں خلا تھا "کیا شہلا زندہ ہے؟" میں نے کہا۔

"تم کو غور سے دیکھنا چاہئے تھا کہ وہ سانس لے رہی تھی اور اس کا بیٹا بھی" دلاور نے کہا "کیا تم پھر دیکھو گے؟"

میں نے نفی میں سرہلایا "میں اس کا آخری دیدار کرچکا۔"

دلاور کا چہرہ ذرا سی دیر کے لئے بدلا "یہ ہوسکتا ہے کہ تم پھر اس سے ملو اور وہ تم سے ایسے ہی ملے جیسے پہلے ملتی تھی۔ محسن کو اس کا بیٹا مل جائے۔"

میں نے کہا "مجھے نہیں معلوم کہ خدا کی مرضی کیا ہے۔"

"یہ تمہاری اپنی مرضی' ارادے اور اختیار کی بات ہے۔"

میں نے نفی میں سرہلایا "زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے' تمہیں کیا معلوم کہ کل کیا ہوگا۔ یہ ہوسکتا ہے کہ شہلا اور اس کا بیٹا زندہ رہیں مگر محسن نہ رہے۔ میں نہ رہوں یا تم نہ رہو' اس لئے جو تم کو کرنا ہے' تم کرو۔ جو ہمیں کرنا ہے' ہم کریں گے۔"

دلاور نے سرہلایا "مجھے اندازہ ہے کہ تم محسن کو کچھ نہیں بتاؤ گے۔"

میں نے کہا "تم بتادو اسے.... اور دیکھو' کیا وہ بلیک میل ہوتا ہے' ہمارا ساتھ چھوڑ کے تم سے شہلا کی زندگی کی بھیک مانگتا ہے یا اپنے بیٹے کی جاں بخشی کے لئے تمہارے سامنے سر جھکاتا ہے.... تمہیں مایوسی ہوگی۔"

"مایوسی تمہیں نہ اٹھانی پڑے سکندر! وہ تمہارا دوست ضرور ہے' لیکن دوستی ایک طرف ہو اور بیوی بچوں کی زندگی دوسری طرف تو پہاڑ بھی راستہ نہیں روک سکتے۔ آدمی بیوی بچوں کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ یہ بات تم ابھی اس لئے نہیں سمجھ سکتے کہ تم ان جذباتی رشتوں سے محروم ہو۔"

میں نے کہا "کیا اب میں جاسکتا ہوں؟"

"میں تمہارا راستہ نہیں روک سکتا" دلاور نے کہا۔

"مجھے حیرت ہے تمہارے اس اعتراف پر۔"

"اب تمہیں یہ بتادینے میں کوئی حرج نہیں کہ میں مجبور تھا' میں نے تمہاری حفاظت کے ساتھ واپسی کا وعدہ کیا تھا اور درمیان میں ایسے لوگ ضامن تھے جو یہاں مجھ پر پورا اختیار رکھتے ہیں۔"

میں نے کہا "تریونی کا نام لیتے ہوئے ڈرتے کیوں ہو؟" پہلے میرا خیال تھا کہ ان سے تھوڑا سا پانی مانگوں مگر دشمن کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہوئے مجھے شرم آئی۔ میں نے سوچا

کہ یہاں سے نکل جانے کے بعد مجھے کسی بھی گھر یا دکان سے پانی مل جائے گا۔ رابعہ کی بے ہوشی چوٹ کا نتیجہ نہیں تھی۔ وہ صدمے سے اور جذباتی دباؤ سے بے ہوش ہوئی تھی۔

جیپ میں بیٹھنے کے بعد میں نے کہا "یہ ہوسکتا ہے کہ ابھی میں چابی گھماؤں تو جیپ دھماکے سے اڑ جائے..... یا اس سے پہلے کہ میں روانگی اختیار کروں' تمہارے حکم سے ہمارے جسم چھلنی کردیئے جائیں لیکن میں خدا پر بھروسہ رکھتے ہوئے جارہا ہوں۔ تم پر مجھے اعتبار نہیں ہے دلاور کہ تم نے واقعی مجھے جانے کی اجازت دیدی ہے۔"

میں نے انجن اسٹارٹ کیا اور جیپ آگے بڑھی۔ اس کی ہیڈ لائٹس نے تاروں کی باڑھ کے متوازی باہر جانے والے راستے کو روشن کردیا۔ جیپ گیٹ سے باہر نکل گئی اور پھر سڑک پر آگئی۔ میرے پیچھے کسی نے مشین گن کا برسٹ بھی نہیں مارا۔ افق پر ایک بہت روشن ستارہ مجھے دیکھ کر مسکرانے لگا۔ شاید وہ صبح کا ستارہ تھا۔

مجھے معلوم نہ تھا کہ میں کدھر جارہا ہوں۔ جیپ تیزی سے سڑک پر دوڑتی جارہی تھی۔ ہر سو پھیلی ہوئی خاموشی اور تاریکی میں ابھی تک اجالے کے آثار مفقود تھے۔ میرا پہلا مقصد اس جگہ سے دور جانا تھا۔ مجھے ایسا لگتا تھا جیسے میں رکا تو شہلا میرا راستہ روک لے گی۔ اس کی آواز میرا تعاقب کررہی تھی "سکندر بھائی! کہاں جارہے ہو تم؟ صرف مجھے دیکھنے کے لئے آئے تھے تم بھی۔ رابعہ' تم بھی کچھ نہیں کہو گی؟ یہ نہیں بتاؤ گی کہ مجھے اس شیشے کے قفس سے نکالنے کے لئے کون آئے گا؟ کب رہائی ملے گی مجھے' مجھے اس انتظار سے جو موت کے کرب سے زیادہ بے رحم ہے۔ کیا میں کسی کے لئے اہم نہیں رہی۔ سارے رشتوں کی زنجیر وت کے کچے دھاگے سے بھی زیادہ کمزور تھی کہ دوری سے ٹوٹ گئی۔ یاد اس کو استوار نہ رکھ سکی۔ تم سب بھول گئے مجھے۔ بیگانے ہوگئے۔ بولو رابعہ' بولو سکندر!" پھر ایک بچہ چلانے لگا "ماما جی... سکندر ماما! مجھے ساتھ لے چلو... پاپا کے پاس... مجھے اکیلا چھوڑ کے مت جاؤ... امی نے کہا تھا کہ وہ ناراض ہوگئے ہیں کیونکہ تم انہیں بھی ماما کہتے ہو... وہ تو پاپا ہیں تمہارے... میں انہیں پاپا کہوں گا... انہیں بتادینا کہ میں ان کا انتظار کررہا ہوں" اور پھر شہلا کی آواز بچے کی آواز پر غالب آگئی "نہیں نہیں... انہیں کچھ نہ بتانا تمہیں میری قسم سکندر بھائی... مجھے یقین ہے تم نہیں بتاؤ گے... لیکن رابعہ کا خیال رکھنا... کہیں اس کے منہ سے ایسی ویسی بات نہ نکل جائے... بے خیالی میں یا بے ہوشی میں یا نیند میں... محسن سے کچھ مت کہنا... ماما جی... ماما جی۔"

میرا خیال ہے کہ اس وقت میں ہوش میں نہیں تھا۔ اچانک ایک موڑ پر میرے سامنے ایک سائیکل والا آگیا جو سڑک کے بیچ میں جارہا تھا۔ میں نے اسے بچانے کی پوری کوشش کی' اس کے باوجود جیپ نے اسے چھولیا۔ پھر جیپ ایک دکان کے تھڑے سے ٹکرا کے رک گئی۔ سائیکل والا نیچے گر گیا تھا اور مجھے گالیاں بک رہا تھا۔

میں نے نیچے اتر کے اسے اٹھایا "معاف کرنا بھائی! میں پریشانی میں اسپتال جارہا تھا۔ میری بیوی زخمی ہے..... اور بیہوش ہے۔"

دکان کے تھڑے پر سونے والے دو آدمی بھی ہڑبڑا کے نیچے آگئے تھے "سالا' دارو پی کے گاڑی چلاتا ہے۔ پولیس کو بلاؤ۔"

میں نے ہاتھ جوڑ کے کہا "بابا' غلطی ہوگئی۔ دیکھو میری بیوی کی حالت خراب ہے۔"

انہوں نے جیپ میں پڑی ہوئی رابعہ کو دیکھا اور مجھے معاف کردیا۔ میں پھر جیپ لے کر روانہ ہونے ہی والا تھا کہ مجھے ان سے راستہ معلوم کرنے کا خیال آگیا۔ سائیکل والے نے مجھے قریب ترین اسپتال کا راستہ بتایا اور واپس جانے کو کہا۔

"ادھر تو آگے کچھ بھی نہیں ہے۔ تم نئے ہو بمبئی میں؟"

میں نے اقرار میں سرہلایا اور جیپ کو واپس موڑ لیا۔

ابھی میں نے بمشکل آدھے میل کا فاصلہ طے کیا تھا کہ ہیڈلائٹس نے ایک موڑ کے منظر کو ایک لمحے کے لئے روشن کیا اور میں نے سڑک سے کچھ دور کسی کو اٹھ کر ہاتھ ہلاتے اور پھر گرتے دیکھا۔ میں نے ایک دم بریک لگائے اور جیپ کو موڑ کر واپس لے گیا۔

میری نظر نے غلط نہیں دیکھا تھا۔ وہ مدھوسودن تھا۔ میں نے جیپ کو اس کے قریب لے جاکر روکا تو اس نے پھر اٹھنے کی کوشش کی۔ وہ زخمی تھا۔ اس نے ایک ہاتھ اپنے پیٹ پر رکھا ہوا تھا لیکن یہ ہاتھ خون میں تر تھا اور زخم سے بہنے والے خون کو روکنے میں ناکام تھا۔ کیرتی اس کے قریب ہی چت پڑی آسمان کی تاریکی سے آگے عدم آباد میں اپنی روح کو بے چین دیکھ رہی تھی..... میں اکیلی ہوں مدھوسودن..... آخر تم آتے کیوں نہیں۔'

میں نے مدھوسودن کے پاس بیٹھ کر کہا "تم نے دیکھا اس حرام زادے' شیطان کا انصاف' اس کی رحم دلی اور سخاوت؟ مجھے معلوم تھا کہ تمہارے ساتھ یہی ہوگا۔"

مدھوسودن نے بڑی مشکل سے کہا "میں.... میں نے بہت کوشش کی..... مگر کوئی رکا نہیں..... سب بھاگ گئے.... مجھے

کچھ کہنا تھا ....."

میں نے کہا "تم ایک مسلمان پر اعتبار کرسکتے ہو تو مجھے بتادو۔"

اس کی نظر میں ندامت کا دکھ بھی شامل ہوگیا "میرے .... میرے بچے .... اناتھ ہوگئے .... میری ماں اندھی ہے .... باپ صدمے سے مرگیا .... اس وقت جب یہ مجھے پکڑ کے لائے تھے ...."

"مجھے بہت افسوس ہے کہ اس وقت تم نے میری بات نہیں مانی تھی" میں نے کہا "میں نے تم سے کہا تھا کہ بھاگ جاؤ۔"

"اب .... چھوڑو .... ایک کام .... کردو گے ؟"

میں نے کہا "کوشش ضرور کروں گا۔"

مدھو سودن پر نقاہت طاری تھی۔ اس کے جسم کا سارا خون تو وہیں بہہ گیا تھا۔ معلوم نہیں وہ اب تک کیسے زندہ تھا۔ شاید کسی کو یہ بات بتائے بغیر وہ مرنا نہیں چاہتا تھا اور اپنی قوت ارادی کے بل پر اپنی زندگی کی آخری سانسوں کو طویل سے طویل تر کر رہا تھا۔

"یہاں ..... میرا کوئی نہیں .... ان کو ..... میرے بھائی کے پاس ..... پہنچادینا ..... ورنہ ..... یہ لوگ ...."

میں نے کہا "تمہارا بھائی کہا رہتا ہے ؟"

"وہ ڈاکٹر ہے ..... دہلی میں .... مدن موہن نام ہے .... اس کا"

اس نے ایک دم منہ سے خون اگلا اور خاموش ہوگیا۔

"مدھو سودن !" میں نے چلا کے کہا "اس کا پتا بتاؤ"

مدھو سودن بڑبڑایا "آصف علی روڈ ....." مگر یہ اس کے آخری الفاظ تھے۔ پھر وہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگیا۔

میں چند سیکنڈ ان دونوں کی لاشوں کے پاس بیٹھا رہا۔ موت سے کون بچ سکتا ہے اور کون کسی کو بچا سکتا ہے؟ میں ان کی کوئی مدد نہیں کرسکا تھا لیکن مجھے ایک اطمینان ضرور حاصل ہوا تھا کہ مرنے سے پہلے مجھے اس کے ذہن سے تعصب دور کرنے کا موقع ملا اور انسانیت کے رشتے سے اس کی آخری خواہش پوری کرنے کا بھی۔

میں پلٹ کر جیپ کی طرف جانے کے ارادے سے اٹھا ہی تھا کہ مجھے اپنی نظر کے سامنے کوئی نوٹ بک سی نظر آئی لیکن یہ نوٹ بک نہیں تھی، چھوٹا سا پرس تھا۔ اس پر خون لگا ہوا تھا جو میرے ہاتھوں پر بھی چپک گیا۔ میں نے جیپ میں پڑے ہوئے میلے کپڑے سے ہاتھوں کو بھی رگڑ رگڑ کر صاف کیا اور پھر پرس کو اسی میں لپیٹ کر سیٹ کے نیچے دبادیا۔

ابھی تک اس سڑک پر سے کوئی گاڑی نہیں گزری تھی، ورنہ مجھے دو لاشوں کے پاس دیکھ کر کسی کو بھی شک ہو سکتا تھا۔ کوئی رکتا یا نہ رکتا مگر وہ جیپ کا نمبر نوٹ کر سکتا تھا۔ اب میں نے ایک نظر رابعہ پر ڈالی اور پھر جیپ کو گھما کے سڑک پر لے آیا۔ ایک میل سے زیادہ چلنے کے بعد مجھے ایک فیکٹری کے باہر چھوٹا سا چائے خانہ نظر آیا۔ یہاں سے آبادی شروع ہوتی تھی لیکن رات کے آخری پہر میں صرف وہی چند لوگ جاگ رہے تھے جو ایک میز کے گرد بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ انہوں نے مجھے غور سے دیکھا۔

میں نے ریسٹورنٹ کے مالک سے کہا "مجھے ایک گلاس میں پانی چاہیے۔"

وہ ایک سوکھا سڑا، بدمزاج بوڑھا تھا "میاں، تمہارے ہاتھوں پر خون لگا ہوا ہے۔ یہ کس کی لاش لے جارہے ہو؟ اپنی بیوی کو قتل کردیا ہے کیا؟"

میں نے کہا "چچا، وہ زندہ ہے۔"

"خبردار، جو مجھے پھر چچا کہا۔ مجھے کسی خبیث بھتیجے کی ضرورت نہیں۔ پہلے ہی کیا کم ہیں۔"

میں نے ہنس کے کہا "میری بیوی کے سر میں معمولی سی چوٹ لگی ہے۔ آپ خود دیکھ لیں، وہی خون میرے ہاتھ پر لگ گیا ہے۔"

بوڑھے نے قریب آکے رابعہ کا معائنہ کیا اور مطمئن ہونے کے بعد بولا "اسے اسپتال لے جارہے ہو ؟"

میں نے کہا "وہیں لے جارہا ہوں۔ پانی اس لئے مانگا تھا کہ ہوسکتا ہے یہ ہوش میں آجائے۔"

"چوٹ لگی کیسے ؟"

میں نے کہا "ایک سائیکل والے کو بچانے کی کوشش میں۔ وہ نشے میں تھا اور بیچ سڑک میں سائیکل چلا رہا تھا۔ جیپ ایک کھمبے سے ٹکرا گئی۔"

اس نے پانی کا گلاس بھرا "سرکاری کھمبا گرادیا ہوگا۔ اور ہاں، یہ تو بتادو کہ تم ہو کون ..... ہندو یا مسلمان ؟"

اس کی گفتگو سے میں نے اندازہ کرلیا تھا کہ وہ مسلمان ہوگا۔ اس کے ماتھے پر نماز کے سجدوں کا نشان بھی نظر آرہا تھا۔

میں نے کہا "الحمداللہ، مسلمان ہوں میں۔"

اس نے پانی کا گلاس مجھے دے دیا "بس تو میاں، اب چائے بھی پی کے جانا ...... اور دیکھو، اپنی زوجہ کو اندر لے آؤ۔ ادھر سے میرے گھر کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ ڈرو نہیں، اندر کوئی نہیں ہے۔"

"ارے چاچا، ایک سنگل اور مار و اپنے کو" ایک چائے پینے والے نے کہا۔

"سالے! پھر وہی چاچا" وہ بگڑ گیا۔ اندر بیٹھے ہوئے لوگ ہنسنے لگے۔ شاید چاچا اس کی چڑ تھی۔

میں رابعہ کو ایک نظر نہ آنے والے دروازے سے اندر لے گیا۔ دروازہ ٹاٹ کے پیچھے تھا اور کھلا پڑا تھا۔ یہ چاچا کا اسٹور بھی تھا اور گھر بھی۔ اندر چائے کی پتی کے ڈبے اور زمانے بھر کا کباڑ جمع تھا اور اس کے درمیان ایک جھلنگا چارپائی پڑی تھی۔ میں نے رابعہ کو اس پر ڈال دیا اور خود اس کے پاس پٹی سے لگ کر بیٹھ گیا۔

پانی کے چند چھینٹے ڈالنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ اس کے سانس کی رفتار معمول پر آگئی ہے۔ بے ہوشی میں جیپ کی سیٹ پر پڑے رہنے سے اس کی حالت بہتر نہیں ہو سکی تھی۔ پھر اس نے کراہنا شروع کیا تو میں نے اسے جھنجوڑا۔

"رابعہ! ہوش میں آؤ" میں نے کہا اور اس کے گالوں پر احتیاط سے طمانچے مارے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ ہوش میں آئے اور شور مچانے لگے۔ رابعہ نے آنکھیں کھولیں اور مجھے غور سے دیکھا۔

میں نے کہا "خدا کے لئے شور مت کرنا۔ ہم کسی اور کے گھر میں ہیں۔"

اس نے اقرار میں سرہلایا تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ رابعہ کی آنکھوں میں دہشت کے آثار باقی تھے لیکن اس نے میری بات سمجھ لی تھی اور اب چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ چاچا اپنے ہاتھوں میں دو گلاس چائے لئے اندر آئے اور رابعہ کو ہوش میں دیکھ کر خوش ہوئے "بھئی واہ۔ ہوش آگیا زوجہ کو، لو انہیں گرما گرم چائے پلاؤ۔"

میں نے کہا "رابعہ! اٹھ کے بیٹھو۔"

رابعہ نے اپنے سر پر ہاتھ رکھ کے کہا "میرے سر میں درد ہے سکندر!"

میں نے کہا "ہاں، چوٹ جو لگی ہے۔ وہ شرابی سائیکل والا ایک دم سامنے آگیا۔ اسے بچایا تو گاڑی کھمبے سے ٹکرا گئی۔ خدا کا شکر ہے، زیادہ چوٹ نہیں آئی تمہیں۔"

"میں دیکھتا ہوں، اسپرین شاید ہو" چاچا نے کہا اور واپس دکان میں غائب ہوگئے۔

میں نے رابعہ سے کہا "بڈھے کو میں نے یہی بتایا ہے۔ اچھا آدمی ہے مگر چاچا کہنے سے چڑتا ہے۔"

"لو میاں، مل گئی" چاچا نے بڑی مسرت کے ساتھ اطلاع دی اور اسپرین کی دو گولیاں میرے ہاتھ پر رکھ دیں۔ پھر کسی نے باہر سے ہانک لگائی "چاچا" اور وہ بکتا جھکتا باہر لپکا۔ میں نے رابعہ کو پانی کے ساتھ اسپرین نگلنے کو دیں۔ اس وقت یہ پانچ پیسے کی دو گولیاں اور یہ چائے کا گلاس خدا کی وہ نعمت ثابت ہوئے جس کی قدر کا اندازہ وہی کرسکتے ہیں جو ہمارے جیسے حالات سے دوچار ہوئے ہوں۔

ہوش میں آنے کے بعد رابعہ بھی پرسکون تھی۔ کہتے ہیں، بے ہوشی درحقیقت جسم کے دفاعی نظام کا ایک حصہ ہے۔ غالب نے اسے یوں کہا تھا کہ .... درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہوجانا۔ جب انسان کے لئے جسمانی یا ذہنی عذاب قوت برداشت سے باہر ہونے لگتا ہے تو جسم فوراً بے ہوشی کی پناہ میں چلا جاتا ہے۔ بے خبری اور آرام کا یہ وقفہ اس کو پھر تختیٔ حالات سے نبرد آزما ہونے کے لئے توانائی فراہم کرتا ہے۔

چائے پینے کے بعد رابعہ کی حالت میں نمایاں تبدیلی آئی میں نے اسے مختصراً بتادیا تھا کہ ہم دلاور کی قید سے نکل آنے کے بعد اب واپس جاتے ہوئے یہاں رک گئے ہیں اور میں نے چاچا کو ایک اسٹوری سنائی ہے۔ ایک کونے میں نلکا نظر آرہا تھا مگر اس کے حلق سے صرف خرخراہٹ برآمد ہورہی تھی۔ پانی ایک ڈرم میں تھا جسے ایک فٹ اونچا چبوترا بنا کے کونے میں رکھ دیا گیا تھا اور ٹونٹی لگادی گئی تھی۔ رابعہ نے نیچے بیٹھ کے ماتھے کا خون صاف کیا اور زخم کو اچھی طرح دھوڈالا۔ چاچا دوبار آئے اور رابعہ کی صحت یابی پر خوشی کا اظہار فرما کے چلے گئے۔

اب صبح قریب تھی۔ جب آوازِ اذان میرے کانوں میں آئی تو میں کچھ حیران ہوا یہ اپنا وطن نہیں تھا جہاں ہر قدم پر مسجد تھی اور موذن دن میں جتنی بار پکارتا تھا، اس کی آواز کانوں تک ضرور پہنچتی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ سننے والے اسے سن کے دوسرے کان سے باہر نکال دیتے تھے۔ یہ آواز ان کے دل تک نہیں پہنچتی تھی۔ دل کے بند دروازوں پر دستک دے کر لوٹ جاتی تھی۔ یہاں اس آواز نے مجھ پر مختلف اثر کیا۔ ایسے مواقع پہلے بھی آئے تھے جب میں نے شکر کے ایک سجدہ نیاز کی ضرورت کو صمیم قلب کے ساتھ محسوس کیا تھا۔

میں نے وہیں بیٹھ کے وضو کیا جہاں بیٹھ کے رابعہ نے اپنا زخم دھویا تھا۔ میں وضو سے فارغ ہوا ہی تھا کہ چاچا اندر آئے۔

"میاں جزاک اللہ، خیر سے نماز کا ارادہ ہے ؟"

میں نے شرمندہ ہو کے کہا "بس چاچا، کبھی وقت پڑتا ہے تو خدا یاد آتا ہے۔"

اس بار انہوں نے چاچا کہنے پر خفگی کا اظہار نہیں کیا "بندہ تو بھول جاتا ہے اسے۔ مگر وہ نہیں بھولتا بندے کو۔ آؤ میرے ساتھ۔"

میں نے کہا "کہاں ؟"

"مسجد اور کہاں۔ نماز مجھے بھی پڑھنی ہے۔ جماعت کے ساتھ پڑھنے کا ثواب کیوں چھوڑتے ہو؟"

میں ان کے چائے خانے سے گزرا۔ وہاں اب دوسرے لوگ براجمان تھے۔ چاچانے کاؤنٹر کے اوپر ایک بورڈ رکھدیا تھا جس پر تحریر تھا "وقفہ برائے نماز" اور نیچے "بحکم پروپرائٹر بقلم خود" سب انہوں نے واقعی اپنے ہاتھ سے لکھا تھا۔ میں نے اس اعلان کو حیرت اور عقیدت کے ساتھ دیکھا۔ شاید دن میں پانچ بار چاچا اس اعلان کو اذان کے ساتھ ہی نمایاں جگہ پر رکھ دیتا تھا اور پھر کسی خوف ندامت یا احساس زیاں کے بغیر اپنے زیادہ اہم فرض کی ادائیگی کے لئے چل پڑتا تھا۔ یہ ایک مشکل کام تھا جس کے لئے اخلاقی جرأت اور ڈسپلن کی ضرورت تھی۔ آس پاس سب مسلمان نہیں تھے اور جو تھے' وہ میرے جیسے تھے لیکن اسے کسی کی پروا نہیں تھی۔

میں نے کہا "دکان ایسے ہی کھلی رہے گی؟"

چاچانے کہا "وہاں کیا ہے؟ کیا لے جائے گا کوئی؟"

میں نے کہا "تم جانتے ہو انہیں .... جو وہاں بیٹھے ہیں؟"

اس نے نفی میں سرہلایا "یہ پہلی دفعہ آئے ہیں۔"

میں نے کہا "انہی میں سے کوئی کچھ نہ سہی' کیش نکال کرلے گیا تو؟"

"لے جائے میاں! اگر ہم سے زیادہ ضرورت مند ہے۔ اپنا کیا ہے' روز کنواں کھودتے ہیں پانی پی لیتے ہیں۔ دن بھر میں اللہ بہت دے گا۔ آج کا دن ابھی شروع ہوا ہے۔ کل کی فکر ہم کرتے نہیں۔ اوپر والا کرتا ہے۔ اکیلی جان ہے' وہ بھی جب چاہے لے لے۔ اس کے لئے تیاری پوری ہے۔ مدینے سے آب زم زم میں دھلا ہوا کفن لا کے رکھ لیا ہے۔ اور کیا چاہئے؟ جب تک زندگی ہے میرا مقدر تو کوئی چھین کے نہیں لے جاسکتا" وہ تیز تیز چلتا ہوا اپنی دھن میں بولے جارہا تھا۔ ایک درویش کامل۔ توکل کا پیکر۔ بندگی کے آداب کو سمجھنے اور نباہنے والا .... جس نے مجھے شرمسار کردیا تھا۔ کتنی محدود اس کی خواہشات تھیں اور کتنا لامحدود اس کا یقین تھا۔

مختصر سے صحن اور ایک حجرے پر مشتمل مسجد چاروں طرف سے کوٹھریوں کی دیواروں میں پھنسی ہوئی تھی۔ حجرہ بھی مشکل سے دس بارہ گز کا تھا۔ حجرے پر کوئی گنبد نہیں تھا مگر صحن کے محرابی دروازے کے دونوں جانب استادہ مینار اعلان کرتے نظر آتے تھے کہ یہ عبادت گاہ ہے اور مسلمانوں کی مسجد ہے۔ بمبئی میں انسانوں کے رہنے کو انچ انچ جگہ کم تھی مگر خدا کے نام لیواؤں نے پھر بھی مسجد کے لئے جگہ نکال لی تھی۔

"میاں! خود اپنے ہاتھوں سے بنائی ہے ہم نے یہ مسجد" چاچانے بڑے فخر سے بتایا۔

مسجد کی تعمیر بتاتی تھی کہ دیواریں اٹھانے والے پیشہ ور معمار نہیں تھے۔ دیواریں ٹیڑھی تھیں اور پلاستر ناہموار تھا لیکن اصل چیز وہ جذبہ تھا جس نے اس گھر کو بنایا تھا۔ اس پر تازہ چونے کی سفیدی چمک رہی تھی۔

"کیا یہ مسلمانوں کی آبادی ہے؟" میں نے کہا۔

"نہیں میاں! بہت ہوئے تو پچاس گھر مسلمانوں کے ہوں گے' وہ بھی نام کے مسلمانوں کو ملا کے۔"

میں ان کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ اس مسجد کی سپاٹ دیواروں پر کسی قسم کی آرائش نہ تھی۔ نہ اس میں سنگ مرمر کا استعمال ہوا تھا اور نہ اس کا فرش موزیک کا تھا۔ اس میں خطاطی اور نقاشی کے اسلامی فن کا کوئی کمال نظر نہ آتا تھا۔ نہ ٹائلوں پر اللہ تعالیٰ کے ننانوے ناموں کی جلوہ گری تھی اور نہ آیات قرآنی کے طغرے آویزاں تھے۔ پھر بھی یہاں تقدس کی وہ فضا تھی جس میں آدمی خود کو اپنے خدا سے قریب تر محسوس کرسکتا تھا۔ مجھے اپنے وطن کی بہت سی مساجد یاد آئیں جن کی ظاہری شان وشوکت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ جھاڑ فانوس' آرائشی اسباب' پنکھے' کلاک' اسپیکر سسٹم' قیمتی صفیں' پر شکوہ مینار اور وسیع گنبد اور حسن تعمیر کے شاہکار محرابی در.... لیکن نمازی کم سے کم ہونے والے۔

دیکھتے دیکھتے حجرے میں بیس پچیس افراد آگئے۔ معلوم نہیں کون تھا جو اذان دے کر چلا گیا تھا۔ اب امامت چاچانے سنبھالی تو میں پہلی صف میں مقتدی بن کے شامل ہوگیا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میرے دائیں کون ہے اور بائیں کون۔ نہ کسی نے مجھے دیکھ کر کسی تعجب کا اظہار کیا۔

واپسی پر میں نے کہا "یہ گھر آپ نے کب خدا کے نام کیا؟"

وہ چونکے "میاں! کیا بکتے ہو؟ گھر تو وہ پہلے بھی خدا کا ہی دیا ہوا تھا۔ یہ پوچھو کہ میں نے وہاں رہنا کیوں چھوڑا۔ تو میاں' جب گھر والی کو اللہ میاں نے بلالیا اور بچوں نے اپنے اپنے گھر بسالئے تو ہم نے سوچا کہ اب اتنے بڑے کارخانے میں رہ کے کیا کرنا ہے۔ اب وہی گھر ہے اپنا جہاں پیٹ کا دھندا ہے۔ وہ بھی کب تک بالآخر تو اسی گھر میں جانا ہے .... جو معلوم نہیں کہاں ہوگا۔"

میں نے کہا "بچے یہیں ہیں .... بمبئی میں؟"

"ہاں .... ان کے بھی بچے بڑے ہیں اب تو۔"

"آپ ان کے ساتھ کیوں نہیں رہتے" میں نے ایک احمقانہ سوال کیا۔

وہ دکھ سے مسکرائے "وہ میرے ساتھ نہیں رہتے۔ میرا مطلب ہے' خوش نہیں رہتے۔ میں نے کہا کہ بھئی جہاں رہو' خوش رہو۔ ہم اولاد کے لئے یہی چاہتے ہیں۔ بڑا والا خفا ہے کہ میں نے گھر کو مسجد کیوں بنادیا۔ اس کی نظر تھی گھر پر۔ میں نے کہا کہ بہت کیا تمہاری خاطر' کچھ اس کے لئے بھی تو کرنے دو جس کے پاس مجھے جانا ہے۔"

شاعر مشرق نے کہا۔ سنا میاں سکندر بخت سے دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں۔ کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں۔ شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی.... جہانداروں کی۔ کلمہ پڑھتے تھے ہمیں چھاؤں میں تلواروں کی تو دیکھو کہ یہ نحیف و ناتواں بوڑھا انہی میں سے ایک ہے۔ تم کیا ناز کرتے ہو اپنے جہاد پر۔ اس کے جہاد کو دیکھو اور جذبہ ایمانی کو دیکھو۔ کیسے مخالف حالات میں' کیسی دلیری سے' کتنی قربانی دے کر اس نے اسلام کے چراغ کو روشن رکھا ہے۔

اور میں نے اس آوازِ غیب کو ایسے سنا جیسے میں نے آواز اذاں کو سنا تھا۔ میں اب اتنا پُرسکون تھا کہ مجھ پر گزشتہ رات کے واقعے کا اثر بھی باقی نہ رہا تھا۔ اب صبح کا اجالا پھیلنے لگا تھا۔ دکان میں آٹھ دس گاہک چاچا کی واپسی کے منتظر تھے۔ انہوں نے شور مچادیا۔

"ارے چاچا! اپن مرگیا۔ چائے ڈالو میرے اندر جلدی سے۔"

بکتے جھکتے چاچانے کہا "ارے تو نہیں مرنے کا میرے بھتیجے۔ تو مجھے مار کے مرے گا حرامی۔ ابھی دیتا ہوں چائے۔ پانچ منٹ چپکا بیٹھ۔"

اندر میں نے رابعہ کو ہنستے دیکھا۔ اس نے دوپٹہ یوں سر پر اوڑھ رکھا تھا کہ بغیر پوچھے میں نے جان لیا کہ وہ بھی نماز پڑھ رہی تھی۔

"بس اب چاچا سے اجازت لے کر چلتے ہیں" میں نے کہا۔

"چلو" رابعہ نے کہا "میں تیار ہوں۔"

"اب ایسی بھی کیا جلدی۔ ایک ایک گلاس اور پی لیں اس چائے کا جو پھر کبھی نصیب نہ ہوگی" میں نے کہا۔

اسی وقت باہر سے کسی نے چلا کے کہا "یہ جیپ کس کی ہے؟"

چاچانے کہا "کیا بات ہے تھانیدار صاحب؟ بڑے گرم ہورہے ہو۔"

تھانیدار کا لہجہ رکھنے والے نے اسے گالی دی "جو میں نے پوچھا ہے اس کا جواب دے۔"

"اندر مت جانا .... پردہ ہے" چاچانے چیخ کر کہا۔

میں ایک دم سنبھل گیا۔ میں نے رابعہ کو چارپائی کے نیچے گھسا دیا اور خود ایک کونے میں کھڑا ہوگیا۔

تھانیدار نے پھر گالی دی "ہٹ راستے سے" اور شاید چاچا کو دھکا دیا۔ میں نے میز کرسیوں کے گرنے کی اور لوگوں کے بھاگنے کی آوازیں سنیں۔ چاچا کی دلخراش چیخ نے مجھے دہلادیا۔

"ارے مار دیا ظالم ...."

پولیس کی وردی میں ایک شخص بگولے کی طرح اندر آیا مگر اس کی نظر مجھے فوراً نہ دیکھ سکی۔ میں نے اسے پیچھے سے یوں دبوچا کہ اس کی آواز حلق میں ہی گھٹ کے رہ گئی۔ اس کی گردن میرے بازو کے شکنجے میں تھی۔ وہ تھوڑا سا تڑپا۔ پھر میں نے ایک جھٹکا دیا اور اس کی گردن چیخ گئی۔ اس کے پیچھے آنے والا منحنی سا بنگالی ٹائپ ماتحت بڑی تیزی سے پلٹا تھا مگر چارپائی کے نیچے سے ہاتھ بڑھا کے رابعہ نے اس کی ٹانگ کھینچ لی۔ وہ منہ کے بل گرا۔ پھر میں نے اسے نہ اٹھنے دیا۔ تھانیدار کا ریوالور لے کر میں نے بیچ کے دروازے میں سے دکان میں جھانکا تو میری رگوں میں میرا لہو منجمد ہوگیا۔ چاچا فرش پر بے حس وحرکت پڑے تھے اور ان کی کھلی آنکھیں مجھے دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھیں "میاں .... اپنی تو تیاری پوری تھی.... ہم چلے اپنے آخری گھر۔ تم بھی جاؤ .... دیر مت کرو۔"

بھاگنے والے میزیں کرسیاں گرا کے بھاگ گئے تھے۔ انہوں نے وہ چائے بھی نہیں پی تھی جس کے لئے چاچانے چولھا جلا کے کیتلی چڑھادی تھی۔ چولھا اب بھی جل رہا تھا۔

چاچا کے ہاتھوں کی بنی ہوئی چائے کا آخری گلاس ہمارے نصیب میں نہ تھا۔

اندر جاکے میں نے رابعہ سے کہا "ابھی راستہ روکنے والا کوئی نہیں ہے۔ دو منٹ میں نکل چلو۔ اور دو منٹ میں یہ کپڑے بدل لو۔"

"کپڑے ..... کیا پہنوں؟" رابعہ نے کہا۔

میں نے بے ہوش پڑے ہوئے بنگالی سپاہی کی طرف اشارہ کیا "ہمارے نکلنے کی یہی ایک صورت ہے۔"

دو کے بجائے پانچ منٹ بعد میں تھانیدار کی وردی پہن کے باہر نکلا تو سپاہی کی وردی رابعہ نے پہن لی تھی۔ ریسٹورنٹ کے باہر مجمع اکٹھا ہوگیا تھا۔ سورج نکل آنے کے بعد بمبئی کی مخلوق حشرات الارض کی طرح ابل کے سڑکوں پر آرہی تھی۔ روانگی سے پہلے میں نے اپنی جیب میں سے وہ پرس نکال لیا۔ پھر میں نے ایک زبردست ڈانٹ لگا کے کہا "چلو.... دفع ہو جاؤ سب۔ کیا تماشا ہورہا ہے یہاں؟" اور ریوالور نکال کے لہرایا۔

ایک دم مجمع منتشر ہوگیا۔ وہ لوگ سہمی ہوئی نظروں سے اندر دیکھ رہے تھے مگر کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ پولیس کی

موجودگی میں چاچا کو دیکھ سکے کہ وہ زندہ ہیں یا نہیں ۔ میں نے اطمینان سے پولیس کی جیپ میں افسرانہ شان کے ساتھ بیٹھ کے رابعہ کو ڈرائیور کی سیٹ سنبھالنے کا موقع دیا۔ ماتحت کی موجودگی میں افسر کا گاڑی چلانا کچھ مناسب نہ لگتا۔ رابعہ نروس تھی اور مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ ایکسیڈنٹ نہ کردے لیکن اس نے پرانے تجربے کو بروئے کار لاتے ہوئے جیپ کو خاصی رفتار سے دوڑایا اور تنگ سڑکوں کی ٹریفک میں سے گزار کے لے گئی۔

"اف" میں نے گہری سانس لے کر کہا "یہ بھی ہونا تھا"

رابعہ نے افسوس سے سرہلایا "مجھے ہمیشہ احساس رہے گا کہ اس کی موت کے ذمے دار ہم تھے۔"

میں نے نفی میں سرہلایا "کوئی کسی کی موت کا سبب نہیں بنتا۔ اگر چاچا سے پوچھا جاتا تو وہ یہی کہتا اور وہ میدان حشر میں بھی یہی کہے گا..... کہ میاں بس ہمارا وقت آگیا تھا۔ وہاں بھی میں نے اسے چاچا کہا تو وہ چلانے لگے گا۔ مگر ہم پر الزام نہیں آنے دے گا۔ اللہ اس کی مغفرت کرے۔ مجھے صرف یہ احساس جرم ہے کہ ایک روشن چراغ تھا' نہ رہا۔ مگر اس کی روشنی رہے گی۔"

"کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ یہ لوگ یہاں کیسے پہنچے؟"

میں نے کہا "غالباً کسی نے اس وقت جیپ کو دیکھ لیا تھا جب میں مدھو سودن کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔"

"مدھو سودن .... وہ کب ملا تھا تمہیں؟"

اب مجھے رابعہ کو ان کے متعلق بھی سب کچھ بتانا پڑا۔

"تم کیوں رکے تھے وہاں؟" رابعہ نے کہا۔

"اس نے مجھے رکنے کا اشارہ کیا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ جیپ میں چلا رہا ہوں۔ وہ پہلے بھی چند گاڑیوں کو روکنے کی کوشش کرچکا تھا۔"

"تمہیں یقین ہے کہ وہیں سے کوئی ہمارے پیچھے لگ گیا تھا؟"

میں نے کہا "یقین نہیں' شک ہے۔ اور پیچھے کوئی نہیں لگا تھا۔ پیچھے لگا ہوتا تو ہمارے ساتھ ہی وہ بھی یہاں پہنچ جاتا۔ ہمیں دو گھنٹے کی مہلت نہ ملتی۔ یوں لگتا ہے کہ کسی نے گزرتے گزرتے سب دیکھ لیا لیکن مجھے معلوم نہیں ہوا۔ اس نے پولیس کو اطلاع دی اور پولیس نے تلاش شروع کی تو انہیں جیپ کا سراغ مل گیا۔ پھر بھی پولیس کی یہ مستعدی ناقابلِ فہم ہے۔ دو گھنٹے میں اگر وہ قاتلوں کو پکڑنے کی صلاحیت حاصل کرلیں تو یہ معجزہ ہی ہوگا۔"

"تم نے انسپکٹر کی جامہ تلاشی لی تھی؟"

"جامہ میرے بدن پر ہے" میں نے کہا "تلاشی کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ اب دیکھ لیتا ہوں۔"

رابعہ نے کہا "مجھے مدھو سودن اور کیرتی پر ترس آتا ہے۔ ان کے ساتھ تقدیر نے بڑا ظلم کیا۔ گھر کی عزت گئی۔ پھر ساری عمر کا اندوختہ گیا اور بالآخر جان گئی۔"

"میں انصاف کے معاملے میں قدرت کو جانبدارانہ... بے رحمی کا الزام نہیں دے سکتا۔ میرا خیال ہے کہ جب کسی کو سزا ملتی ہے تو کہیں ماضی میں یا درپردہ اس کا سبب ضرور ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ سبب ہمیں دکھائی نہ دے۔ ہماری ان سے سرسری واقفیت تھی۔ ہم جھوٹ سچ کا تجزیہ کیسے کرسکتے ہیں۔ صرف اس کی بیٹی پر مجرمانہ حملہ کیوں ہوا؟ اس کی بہنوں کو کیوں اٹھایا گیا؟ یہ کہنا تو غلط ہوگا کہ بمبئی میں کسی کی عزت اور جان محفوظ نہیں اور بدمعاش حکومت سے زیادہ طاقتور ہیں اور قانون کا صرف نام ہے' ورنہ لاقانونیت کے سوا کچھ نہیں۔ ننانوے فیصد لوگوں کے جان ومال اور آبرو کو تحفظ حاصل ہے۔ لڑکیاں اور عورتیں گھروں میں' دفتروں میں اور بازاروں میں' بسوں میں اور پارکوں میں' کہاں نظر نہیں آتیں لیکن کیا ان میں سے کسی کو خیال بھی آتا ہے کہ وہ غیر محفوظ ہیں؟"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو آخر؟"

"میرا مطلب یہ ہے کہ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔ کوئی بات ضرور ہوگی کہ مدھو سودن کے گھر کی عورتیں اٹھائی گئیں۔ کسی سے ذاتی دشمنی' کسی کی جوابی کارروائی' کوئی غلط کاروبار۔ اس کے آس پاس اتنے لوگ اور بھی رہتے ہیں' انہیں تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ یہ مدھو سودن اور اسکی بیوی خاصے پراسرار لگتے تھے مجھے۔ ان کا اسلحہ چرانا اور اس سیٹھ کی کوٹھی میں ڈاکوؤں کے ہاتھ لگ جانا۔ اس کے پیچھے کوئی اور بھی کہانی ہے۔ شریف عورتیں اور عام مزدور پیشہ مرد ایسے دھندوں میں ملوث نہیں ہوتے۔"

وردی کی تلاشی لے کر میں نے انسپکٹر کی مختلف جیبوں میں سے چودہ ہزار روپے اور کچھ کاغذات نکال لئے تھے۔ کاغذات میں ایک تو اس کی ذاتی نوٹ بک تھی جس میں فون نمبر اور پتے لکھے ہوئے تھے۔ ایک ڈرائیونگ لائسنس تھا جس کی تجدید نہیں ہوئی تھی۔ ایک فوٹو شاپ کی رسید تھی جہاں اس نے کوئی فلم دھلوانے کے لئے دی تھی اور ایک اس کی بسن کارڈ تھا۔ ان کاغذات سے اس کا نام پتا تو معلوم ہوتا تھا مگر یہ ثابت نہیں ہوتا تھا کہ وہ پولیس انسپکٹر تھا بھی یا نہیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں ایک جعلی سب انسپکٹر دیکھ چکا تھا۔ یہ دوسرا بھی جعلی ہوسکتا تھا اس کی جیب میں سے کوئی سرکاری شناختی کارڈ برآمد

نہیں ہوا تھا۔

یہی پوزیشن رابعہ کی وردی سے ملنے والے کاغذات کی تھی۔ وہ ماتحت تھا چنانچہ اس کی جیب میں صرف دو ہزار روپے تھے کوئی ٹیلی فون نمبروں کی نوٹ بک نہیں تھی اور ڈرائیونگ لائسنس نہیں تھا تاہم اس کی جیب میں ایک لڑکی کی تصویر ملی آفت کی پرکالہ بنگالن تھی۔ چشم بنگال' زلف بنگال اور سحر بنگال کا دلکش نمونہ۔

"یہ اس کی بیوی نہیں ہوسکتی" میں نے کہا "اور نہ محبوبہ"

"کیوں نہیں ہوسکتی؟"

"وہ اتنا خوش قسمت نہیں تھا' ورنہ سپاہی کیوں رہتا اور بے مارا کیوں جاتا" میں نے کہا۔

"تصویر کا دوسرا رخ بھی تو دیکھو۔ لڑکی بدقسمت تھی کہ شادی ہوئی تو کہاں اور پھر بیوہ ہوگئی۔"

"میں نے کہا "خواہ مخواہ اسے بیوہ مت کرو۔ صرف تھانیدار مارا گیا تھا۔ وہ تو بیہوش تھا جس کی وردی تم نے اتار رکھی ہے۔"

رابعہ ہنسی "پھر تو اس سے دوبارہ مل کے یہ بات معلوم کی جاسکتی ہے۔"

"کیا بات؟"

"یہی کہ تصویر کس کی ہے۔"

میں نے کہا "تمہاری بات نے مجھے کچھ اور سوچنے پر مجبور کردیا ہے۔ ہم اس بنگالی سے پوچھ سکتے ہیں کہ انہیں شامت اعمال وہاں کیسے لے آئی تھی؟"

"مگر اس کا تو نام پتا کچھ بھی نہیں ہے۔ تم وہ نوٹ بک تو دیکھو جو مدھو سودن کے پاس پڑی ہوئی تھی۔"

میں نے کہا "یہ خوب یاد دلایا" اور وہ نوٹ بک اٹھالی جسے میں نے اب تک ہاتھ لگانے سے گریز کیا تھا۔ یہ اسی کپڑے میں لپٹی ہوئی تھی اور اب پولیس کی جیپ میں بھی نیچے رکھی ہوئی تھی۔

یہ نئی نوٹ بک تھی لیکن اس کی بیرونی جلد پر خون کچھ سوکھ گیا تھا اور گہرے سرخ رنگ کی جلد میں یہ سیاہ دھبے الگ نظر آتے تھے۔ ڈائری مٹی میں پڑی رہی تھی اور جب میں نے اسے رگڑ کے صاف کیا تھا تو خون اور مٹی کا رنگ جلد پر ایسے پھیل گیا تھا کہ نئی نوٹ بک بھی پرانی نظر آنے لگی تھی۔ خون نے اس کے کچھ صفحات کے کونوں کو بھی رنگین کیا تھا مگر اس کے اوراق صاف تھے اور مندرجات پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔

نوٹ بک پاکٹ سائز کی تھی اور اس کے پہلے صفحے پر ہندی میں کچھ لکھا ہوا تھا۔

میں نے رابعہ سے کہا "بی بی! اس زبان نے بہت تنگ کیا ہے ہمیں۔"

"ہاں' جاو بے جا چلنے لگتی ہے اور بھکنے لگتی ہے۔"

میں نے جھلا کے کہا "میں اس قینچی کی بات نہیں کررہا تھا جو تم بے زبان عورتوں کے منہ میں چلتی رہتی ہے' ہندی کی بات کررہا تھا۔ یہ زبان سیکھے بغیر ہمارے لئے قدم قدم پر مسائل پیدا ہوں گے۔"

"تھوڑی بہت ہندی مجھے آتی ہے۔ میری شاگردی اختیار کرلو۔"

میں نے کہا "تم سے زیادہ میں بول سکتا ہوں اور سمجھ سکتا ہوں لیکن پڑھ نہیں سکتا۔ ذرا مجھے بتاؤ' یہ کیا لکھا ہوا ہے استاد جی؟"

رابعہ نے کہا "پہلے ثابت کرو کہ یہ ہندی ہے' گورکھی نہیں ہے۔"

میں نے اگلا ورق الٹتے ہوئے کہا "بازار سے کوئی کتاب ضرور مل جائے گی ایسی کہ ہم کسی کی مدد کے بغیر تحریر پڑھنے کے قابل ہوجائیں۔ جو ہندی بولی جاتی ہے وہ تو اردو ہی ہے۔ انہوں نے اس پر زبردستی ہندی کا لیبل لگا رکھا ہے۔ دل کے خوش رکھنے کو ...."

"شدھ ہندی آکاش وانی بولتا ہے۔"

"میں اسے سنسکرت قرار دیتا ہوں لیکن یہ کیا ہے؟" میں نے نوٹ بک کے اگلے صفحے اور اس کے بعد آٹھ دس صفحات کے اندراجات پر حیران ہوکے کہا۔

"یہ تعویذ ہے کوئی" رابعہ نے کہا۔

لیکن میں پہلے صفحے پر سطروں میں لکھے ہوئے اعداد کو دیکھ رہا تھا جو بظاہر ٹیلی فون نمبر یا حساب کتاب کے انداز میں لکھے گئے تھے مگر غور کرنے پر میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یہ فون نمبر نہیں ہوسکتے جہاں تک مجھے معلوم تھا' بمبئی میں ٹیلی فون کے نمبروں میں چھ ہندسے تھے۔ یہ ہوسکتا تھا کہ کہیں سات ہندسے بھی ہوں مگر چار یا پانچ ہندسوں والے ٹیلی فون نمبر کا کوئی امکان نہ تھا۔ یہ حساب کتاب بھی نہیں تھا۔ مثلاً پہلے صفحے کی پہلی سطر کچھ ایسے تھے۔

(۷-۴-۲۲-۱۳-۷-۲)-(۸-۲۲-۵-۲۲-۷-۱۹)-(۱۴-۱۸-۱۵-۲۲)

میں نے سمجھ لیا کہ وہ کوڈ ہیں۔ خفیہ زبان میں کچھ لکھا گیا ہے جس کو میں اتنی آسانی سے نہیں سمجھ سکوں گا۔ کوڈ کا استعمال کرنے والے اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ کوڈ بچوں کا کھیل نہ ہو۔ یہ تحریر کسی نے اپنی یادداشت کے لئے محفوظ کی تھی۔

سب سے محفوظ جگہ آدمی کا دماغ ہوتا ہے مگر کچھ لوگ اپنے حافظے پر بھروسا نہیں کرتے یا جو طبعی طور پر اس قابل نہیں ہوتے کہ ہر بات یاد رکھ سکیں۔ ایسے ہی کسی شخص نے خفیہ زبان میں خود کچھ لکھا تھا یا اسے لکھ کر سمجھا دیا تھا کہ ضرورت پڑنے پر وہ اصل مطلب کیسے اخذ کر سکتا ہے۔

چار صفحات کے بعد مجھے دوسرا کوڈ نظر آیا۔ یہ تحریر ہندسوں کی زبان میں نہیں تھی۔ اس میں اصل انگریزی حروف تہجی استعمال کئے گئے تھے یا پھر ہندسوں کو حروف کے ساتھ ملا کے لکھا گیا تھا۔ مثلاً پہلی عبارت کچھ یوں تھی۔

TLOWVM UZOXLM

ILZW - 8 - R - 23 - VNLGVO

یہ میرے نزدیک لاطینی، روسی کچھ نہیں تھی۔ میں نے عبارت رابعہ کو دکھائی تو اس نے بھی مجھ سے اتفاق کیا کہ اس خفیہ زبان کا مطلب نکالنے کی لئے خاصی ذہنی مشقت درکار ہوگی۔

"مجھے اچانک اس نوٹ بک کی اہمیت کا احساس یہ سوچنے پر مجبور کر رہا ہے مس رابعہ .... کہ ہمارے تعاقب میں آنے والے دراصل یہی نوٹ بک واپس لینے آئے تھے۔" میں نے کہا۔

"ہو سکتا ہے۔" رابعہ نے غور کرتے ہوئے کہا۔

"جو کچھ اس میں لکھا ہوا ہے، وہ ان کے نزدیک ٹاپ سیکرٹ ہے۔ مدھو سودن یا کیرتی کے قتل پر مامور کسی شخص نے گھبراہٹ یا جلدی میں نوٹ بک گرا دی جس کا اسے فوراً پتا نہیں چلا اور جیسے ہی پتا چلا، دلاور نے ایک اور جعلی پولیس پارٹی ہمارے پیچھے روانہ کی۔"

"ہر بار وہ پولیس کی وردی سے کام کیوں لیتا ہے آخر؟"

"پولیس کی وردی میں کہیں کچھ بھی کیا جا سکتا ہے۔ پولیس لامحدود اختیارات رکھتی ہے رکھتی تو نہیں مگر سمجھتی ہے کہ انہیں حاصل ہیں چنانچہ یہ کسی کے بھی گھر میں وارنٹ کے بغیر گھس سکتے ہیں اور کسی کو بھی گرفتار کر کے لا سکتے ہیں۔ ان کا راستہ کوئی نہیں روکتا اور یہ شک تو کسی کو ہوتا ہی نہیں کہ پولیس بھی جعلی ہو سکتی ہے۔"

اگر میں نے محمد خان کے آدمی سلمان سے واپسی کا راستہ نہ سمجھا ہوتا تو شاید ہم سارا دن بمبئی کی سڑکوں پر بھٹکتے رہتے۔ پولیس کی وردی نے اس علاقے سے نکلنے میں ہماری مدد کی تھی جہاں چاچا مرحوم کے چائے خانے کے باہر متجسس اور برہم لوگوں کا جم غفیر جمع ہو گیا تھا۔ پولیس کہیں بھی جائے، لوگوں کے ذہن میں قانون کا احترام نہیں، لاقانونیت کے مظاہرے کا خوف پیدا کرتی ہے اور پھر جب یہ اندیشے ان آنکھوں کے سامنے درست بھی ثابت ہو جائیں تو نفرت کا ردِ عمل مظلوم اور مجبور لوگوں کے چہرے پر پڑھا جا سکتا ہے اور ان کے انداز میں نمایاں نظر آتا ہے۔ ایسے میں ایک چنگاری ہجوم کے اشتعال کو تخریبی سوچ میں بدل دیتی ہے۔ وہ پولیس کو حکومت کی مشینری کا ایک پرزہ سمجھتے ہوئے حکومت سے انتقام لیتے ہیں۔ سرکاری دفتروں پر حملہ کرنا، سرکاری گاڑیوں کو نقصان پہنچانا اور سرکاری املاک کو تباہ کرنا اسی ردعمل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اگر ہم اس وقت اپنے انہی کپڑوں میں فرار ہونے کی کوشش کرتے تو ہجوم ہمیں نہ جانے دیتا۔ وہ پولیس کا غصہ ہم پر اتارتے۔ پولیس کا راستہ روکنے کی ان میں ہمت نہیں تھی۔ ویسے بھی میں نے ریوالور ہاتھ میں رکھا تھا اور میرے جارحانہ انداز نے بے بس لوگوں کو دفاعی انداز میں پیچھے ہٹ جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ بعد میں وہاں کیا ہوا ہوگا، اس کا مجھے بخوبی اندازہ تھا۔

تاہم اب وہی پولیس کی وردی ایک مسئلہ پیدا کر رہی تھی۔

ہم کسی سے بھی راستہ نہیں پوچھ سکتے تھے ورنہ لوگ شک کرتے کہ یہ کیسی پولیس ہے جو شہر کے راستوں سے واقف نہیں۔ اس کے علاوہ رابعہ نے اپنے بال بڑی کوشش سے پولیس کی وردی میں چھپا تو لئے تھے مگر اس کے زنانہ خدوخال اور اس کے حسن کی آب و تاب پولیس کی بدنما وردی سے چھپائے نہ چھپتے تھے۔

سلیمان نے جو راستہ مجھے بتایا تھا وہ میرے ذہن میں تھا اور میری ہدایات کے مطابق رابعہ جیپ ڈرائیو کر رہی تھی لیکن اس کی حالت بتاتی تھی کہ وہ تھک چکی ہے۔ رات بھر جاگنے کے علاوہ اس نے میرے ساتھ جو ذہنی اذیت برداشت کی تھی وہ اب اس پر اثرانداز ہونے لگی تھی۔

میں نے نوٹ بک کو جیب میں رکھ کے کہا۔ "گاڑی کہیں روک لو۔ اب میں ڈرائیونگ کروں گا۔"

رابعہ نے کہا۔ "تم نہ کہتے تب بھی میں یہی کرتی۔"

میں نے اس کی جگہ سنبھال کے کہا۔ "اب تم چاہو تو آنکھیں بند کر کے تھوڑا سا آرام کر لو۔"

"کیوں، کتنا سفر باقی ہے ابھی؟"

"یہ تو خود مجھے بھی نہیں معلوم۔" میں نے کہا لیکن اسی وقت اچانک میری آنکھوں نے شناخت کی پہلی علامت دیکھ لی۔ میں نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ "لیکن اب معلوم ہے۔"

رابعہ نے کہا۔ "آپ کو معلوم ہے کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "وہی جو تمہارے دل میں ہے۔ سمجھ لو کہ ہم پہنچ گئے۔"

جیپ جھونپڑیوں کے درمیان سے گزری۔ گلیوں میں کھیلتے ہوئے بچے ٹھٹک کے جیپ کو دیکھنے لگے۔ عورتیں جو لڑ رہی تھیں یا شاید باتیں کر رہی، تھیں خاموش ہو گئیں۔ چند لڑکے جو زمین پر پتے بچھائے بیٹھے تھے ایک دم غائب ہو گئے۔ جب ہم نے ریلوے لائن پار کر لی تو میں نے بیک ویو مرر میں دیکھا۔ پتے باز لڑکے پھر آ گئے تھے۔ گلی کی رونق بحال ہو گئی تھی۔ انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا ہوگا کہ قانون کا قہر و غضب کسی پر نہیں ٹوٹا۔

میں نے کہا۔ "خیر سے بدھو گھر کو آئے۔"

رابعہ نے کہا۔ "بدھو بڑے گھر نہیں پہنچے۔ خدا نے بچا لیا۔ ورنہ اب تک ساری بمبئی کی پولیس کو خبر مل گئی ہوگی کہ پولیس کی وردی میں دو مجرم فرار ہو گئے ہیں۔ جیپ کا نمبر یہ ہے۔"

میں نے کہا۔ "جیپ پر کوئی نمبر ہے تو پڑھا نہیں جاتا۔ یہ میں نے وہیں دیکھ لیا تھا۔"

جیپ گیٹ میں داخل ہوئی تو صبح کے ساڑھے آٹھ بج چکے تھے۔ عمارت کے تمام کھڑکی دروازے اسی طرح بند تھے جیسے ہم نے پہلی بار دیکھے تھے اور خاموشی یہ ظاہر کرتی تھی کہ یہاں کوئی رہتا ہی نہیں۔ حفظ ماتقدم کے طور پر میں جیپ کو عقبی حصے میں لے گیا اور اس طرح کھڑا کر دیا کہ سڑک پر سے دکھائی نہ دے۔

پیچھے کا ہر دروازہ بند تھا۔ میں نے سامنے آ کے مرکزی دروازے پر دستک دی اور کچھ دیر انتظار کیا۔ کسی نے بھی مقفل دروازے کو اندر سے نہیں کھولا۔ میں نے گھنٹی بجائی اور پھر بار بار ہر دروازے پر اور ہر کھڑکی پر مکے مارے لیکن یوں لگتا تھا کہ اندر تو کوئی ہے ہی نہیں۔

"سب مردے کی طرح سوئے پڑے ہیں۔" میں نے کہا۔

رابعہ نے کہا۔ "اب تک کسی کی آنکھ نہیں کھلی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔" میں نے کہا اور ایک بار پھر پوری طاقت سے دروازوں کھڑکیوں کو بجایا۔ خاموشی اب مجھے خوفزدہ کرنے لگی تھی۔ یہ واقعی ناممکن تھا کہ اتنے شور ہنگامے کو سن کر بھی سونے والے بیدار نہ ہوں۔ محسن نیند کے معاملے میں گھوڑے بیچ کر سونے کا عادی تھا مگر غالب کی نیند بہت چوکنی تھی۔ وہ قدموں کی آہٹ پر اٹھ بیٹھتا تھا۔ اسی طرح نازو کی نیند کچی تھی تو گل کی آنکھ بھی خفیف سی آواز پر کھل جاتی تھی مگر اس وقت تو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اندر سب بے ہوش پڑے ہیں۔ نیند کیسی بھی ہو ایسی نہیں ہو سکتی تھی۔ میرا ذہن یہ قبول نہیں کرتا تھا کہ میرے سب ساتھی ہم دونوں کی طرف سے اتنے بے فکر ہو کے سو جائیں گے۔ انہیں تو شاید رات بھر نیند نہیں آئی ہوگی۔

"کیا سوچ رہے ہو سکندر؟" رابعہ نے مجھے جھنجھوڑ کے کہا۔

میں نے خالی خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ "وہی جو تم سوچ رہی ہو۔ یہ آثار اچھے نہیں ہیں۔"

رابعہ کا رنگ اڑ گیا۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ "گھبرانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ آؤ میرے ساتھ۔"

"کہاں؟" اس نے بڑی مشکل سے کہا۔

"پیچھے سے اندر جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ سامنے سے کسی نے دیکھ لیا تو شک کرے گا۔"

"یہ سب لوگ کہاں چلے گئے اچانک؟" رابعہ نے کہا۔

میں نے پریشانی میں چڑ کے کہا۔ "واپس کراچی چلے گئے صبح کی فلائٹ سے۔ احمقانہ سوالات سے دماغ مت خراب کرو میرا۔ میں بھی تو تمہارے ساتھ ہی تھا۔ مجھے کیا معلوم۔" میں نے چلتے ہوئے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔

رابعہ کو مجھ سے اتنے سخت جواب کی توقع نہیں تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو اتر آئے۔ "آئی ایم سوری۔"

"یہی تو مصیبت ہے تم عورتوں کی۔ فالتو آنسو لئے پھرتی ہو اور موقع محل دیکھے بغیر بہانا شروع کر دیتی ہو۔ رونے سے کیا ہوگا؟ اور رونا کس بات کا۔" میں نے برہمی سے کہا۔ "قبل از مرگ واویلا۔"

رابعہ نے مجھے کوئی جواب نہیں دیا اور اپنے آنسو آستین سے صاف کر لئے۔ میں نے ایک کھڑکی سے اندر جھانکنے کی کوشش کی۔ پھر دوسری کھڑکی تک گیا۔ ریوالور سے میں نے اس کا سب سے نیچے کا اور پھر اوپر کا شیشہ توڑ کے اندر ہاتھ ڈالا اور اوپر نیچے کی چٹخنی کھولنے میں کامیاب رہا۔ کھڑکی کے پٹ کھول کے میں اندر اترا اور دروازے تک جا کے لوٹ آیا۔ دروازہ مقفل تھا۔ اسے بجا کے دیکھنے کی میں نے ضرورت محسوس نہیں کی۔ میں طے کر چکا تھا کہ کوئی بھی دروازہ کھلا نہ تو میں لاک کو گولی سے اڑا دوں گا۔

میں نے دوسری کھڑکی کا شیشہ توڑا اور اپنے ساتھ رابعہ کو بھی اندر کھینچ لیا۔ مجھے اب کوئی شک نہیں رہا تھا کہ اندر کوئی غیر متوقع بات ہوئی ہے ورنہ کھڑکی کے شیشوں کے ٹوٹنے کی

آواز پر کوئی ضرور آجاتا۔ دوسرے کمرے میں اترنے کے بعد میں نے باہر کاریڈور میں کھلنے والے دروازے پر لاتیں ماریں مگر خالی کمرے میں کھڑکی کے پٹ کی آواز گونج کر رہ گئی۔

میں نے رابعہ سے کہا "پیچھے ہٹ جاؤ۔ میں لاک توڑ رہا ہوں" اور نشانہ لے کر لاک کو اڑا دیا۔ خالی کمرے میں اعشاریہ چار پانچ کے سروس ریوالور کا دھماکا کسی بم کے دھماکے سے کم نہیں تھا۔ تالا ٹوٹ گیا اور میں نے ریوالور ہاتھ میں رکھتے ہوئے کاریڈور میں قدم رکھا۔ اندر اب بھی موت کا سا سکوت تھا۔

آہستہ آہستہ میں اس کمرے کی طرف بڑھا جس میں غالب کے ساتھ محسن زیرِ علاج تھا۔ میں نے ہینڈل گھما کے دروازے کو لات ماری۔ دروازہ ایک دم کھل گیا۔ رابعہ نے چیخ ماری اور مجھ سے چمٹ گئی۔ اس کمرے میں اب کچھ بھی نہیں تھا۔ خالی دیواریں مجھے اجنبی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ اس کمرے میں رہنے والے ہی نہیں کمرے کا تمام ساز وسامان راتوں رات ایسے غائب ہوگیا تھا جیسے وہ سب فریب نظر تھا۔ فریب خیال تھا۔

میں پلٹ کے بھاگا اور خان کے کمرے میں گیا۔ پھر اس کمرے میں جہاں سے میں نے فون پر دلاور سے بات کی تھی۔ سب کمروں کی ویرانی ایک ہی طرح میری دیوانگی کا مذاق اڑاتی رہی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں پاگل ہوگیا ہوں۔ یا اندھا ہوگیا ہوں کہ سب کچھ موجود ہے مگر مجھے نظر نہیں آرہا ہے۔ یا میں غلط جگہ آگیا ہوں۔ میں نے وہ پش بٹن دبا کے دیکھے جو میں چائے' کافی یا کھانا طلب کرنے کے لئے استعمال کرتا تھا۔

میں نے چلا کے کہا "ہیلو' کوئی ہے؟ میری آواز سن رہا ہے کوئی۔ جواب دو مجھے۔ محمد خان کہاں ہے؟"

میری آواز کی بازگشت خالی دیواروں سے ٹکرا کے لوٹ آئی۔ میں صدر دروازے کی طرف لپکا۔ رابعہ میرے ساتھ ہے یا نہیں' میں نے یہ بھی نہیں دیکھا۔ مجھ پر دیوانگی غالب آچکی تھی۔ میں غالب اور محسن کو چلا چلا کے آواز دے رہا تھا۔ میں اور نازو کو پکار رہا تھا۔

"کہاں ہو تم سب لوگ؟ جواب کیوں نہیں دیتے؟" میں نے چیخ کر کہا اور پھر باہر نکل گیا۔ ایک کار گیٹ میں سے اندر آئی جو بالکل نئی مرسیڈیز تھی۔ میں نے رابعہ سے کہا "لو وہ آگئے" اور کار کی طرف دوڑا لیکن کار کو ایک غیر ملکی چلا رہا تھا۔ کار کی نمبر پلیٹ ڈپلومیٹک تھی۔ اگلی سیٹ پر میں نے ایک انگریز عورت کو اور پچھلی سیٹ پر دو بچوں کو دیکھا جو مجھے حیرت اور خوف کے ساتھ دیکھ رہے تھے البتہ غیر ملکی خاصا برہم دکھائی دیتا تھا۔

کار سے اترتے ہی اس نے چلانا شروع کیا تو ذرا سی دیر کے لئے میں بد حواس ہوگیا۔ ابھی میں ایک صدمے سے نہ سنبھلنے پایا تھا۔ رات کے چند گھنٹوں میں ڈاکو محمد خان اپنے اور میرے ساتھیوں سمیت کہیں غائب ہوگیا تھا جیسے وہ سب شہر طلسمات میں رہتے تھے اور کسی جادوگر نے پلک جھپکتے میں انہیں اُڑن چھو کردیا تھا۔ یا وہ کسی خواب کا قصہ تھے جسے صبح ہونے کے بعد صرف یاد کیا جاسکتا تھا لیکن خیال سے حقیقت کے پیکر میں نہیں ڈھالا جاسکتا تھا۔

یہ نئی مصیبت تھی۔ میں اور رابعہ پولیس کی وردی میں تھے لیکن اس غیر ملکی نے شاید اپنی زندگی میں ہم جیسے پریشان حال اور حواس باختہ پولیس مین نہیں دیکھے ہوں گے۔ حقیقت کچھ بھی تھی' زیادہ دیر چھپی نہیں رہ سکتی تھی مگر ہماری مشکلات میں ہمارے غلط رویئے سے اضافہ ہی ہوسکتا تھا۔ چنانچہ میں نے بڑی کوشش سے خود کو سنبھال لیا۔

غیر ملکی فرنچ میں چلا رہا تھا اور محض دھمکیاں ہی نہیں' گالیاں بھی دے رہا تھا۔ اگر وہ انگلش یا اردو جانتا تھا تب بھی ظاہر یہی کررہا تھا کہ وہ اپنی مادری زبان کے سوا کچھ نہیں سمجھتا حالانکہ عموماً برِصغیر کے ممالک میں سفارتی عملہ دونوں زبانوں سے نابلد ہو تو کام نہیں چلا سکتا اور سفارتی عملے میں ان افراد کو ترجیحاً بھیجا جاتا ہے جو اس ملک کی زبان تھوڑی بہت ضرور جانتے ہوں' ورنہ وہ سیکھ لیتے ہیں۔ اس سے انہیں دو فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ کچھ سفارت کار ایک فائدہ حاصل کرتے ہیں اور کسی ترجمان کے بغیر کہیں بھی بات کرسکتے ہیں۔ کچھ دوسرا فائدہ یہ حاصل کرتے ہیں کہ انجان بنے سب کی سنتے رہتے ہیں اور سمجھتے بھی رہتے ہیں مگر پھر بھی ترجمان ساتھ رکھتے ہیں۔ میرے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ اگر یہ شخص سفارتی عملے میں ہے تو اس ملک میں کیسے کام چلا رہا ہے جہاں انگریزی کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔

اسے جواب دینے سے پہلے میں نے اصلیت سے واقف ہونے کے لئے ایک بے ضرر سا کھیل کھیلا۔

میں نے رابعہ سے کہا "اس کتے کے بچے کو دیکھو' یکطرفہ بولتا جارہا ہے۔" پھر میں نے لہجہ بدل کے بڑی متانت کے ساتھ روئے سخن اس کی طرف کیا اور کہا۔

"تمہارا باپ کس نسل کا کتا تھا؟ صرف بھونکنے والا یا کاٹنے والا بھی تھا۔ حرامی یا غیر حرامی؟"

اس کے ردِ عمل نے مجھے دلی مسرت عطا کی۔ وہ اردو جانتا تھا لیکن عیاری سے کام لے رہا تھا۔ اپنے آباؤ اجداد کی روح کو آزار پہنچتا دیکھ کے وہ تلملایا مگر کچھ بولا نہیں۔ ایک لمحے میں اس کا رنگ دوبار بدلا۔ وہ مشتعل ہوا اور پھر نارمل ہوگیا۔

اس نے نفی میں سرہلا کے فرنچ میں مجھ سے تقریباً وہی سوال کیا جو میں نے اس سے کیا تھا لیکن اس کی اداکاری ایسی تھی جیسے وہ کہہ رہا ہو "سوری' میں اردو نہیں جانتا۔"

اب میں نے سرہلا کے رابعہ سے انگریزی میں کہا "لک ایٹ دس سن آف اے بچ" اور اس میں ناقابلِ اشاعت جملے کا اضافہ کیا جس پر رابعہ دوسری طرف دیکھنے لگی۔

میں نے اس سے انگریزی میں کہا "ضرور تمہاری ماں نے ... کسی شیطان سے شادی کی ہوگی کہ تم جیسا خبیث روح والا سؤر پیدا ہوا؟"

جب اس کی شکل واقعی سؤر جیسی ہوگئی تو میرا دل باغ باغ ہوا۔ ان سفید فاموں سے مجھے اور محسن کو ازلی بیر تھا۔ جس کا بدلہ ہم نے اپنے قیامِ انگلستان کے چار سالہ دور میں خوب لیا تھا اور کوشش کی تھی کہ زیادہ سے زیادہ سفید فام' متعصب اور تنگ نظر "شرفا" کی لڑکیوں سے دوستی کریں' انہیں شادی کا جھانسا دیں اور ذلیل کرکے خود اپنی نظر میں دو کوڑی کا کردیں۔ یہ جذبہ آج پھر بیدار ہوا تھا اور میں اس بزعم خود ہوشیار سفارت کار کو وہ گالیاں دے چکا تھا جو اسے کسی ہم وطن نے دی ہوتیں تو وہ اس کے دانت توڑ کے جیل چلا جانا پسند کرتا۔

اس نے یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ وہ انگریزی بھی نہیں جانتا' عین فرانسیسی انداز میں کندھے اچکائے۔ ہونٹ سکیڑے اور ہاتھ پھیلا کے مایوس لہجے میں مجھے فرنچ میں ایسی شاندار گالیاں دیں کہ کار میں بیٹھی ہوئی اس کی بیوی کا چہرہ لال پڑ گیا اور اس کے بچے اپنے ڈیڈی کی فصاحت وبلاغت کا یہ نمونہ دیکھ کر دنگ رہ گئے۔

اب وقت آگیا تھا کہ میں اسے آخری جھٹکا دے کر دھوبی پٹخا دوں اور چاروں شانے چت کردوں۔

میں نے ریوالور نکال کے شستہ رواں فرانسیسی میں اس سے کہا "جو کچھ تم نے بکا ہے وہ اتنا سنگین جرم ہے کہ میں تمہیں گولی بھی مار سکتا ہوں۔ میں ہندوستان کے قانون کا نمائندہ ہوں جسے تم نے گالیاں دی ہیں۔ سفارتی مراعات میں یہ شامل نہیں ہے کہ تم اس ملک کے قانون کو ذلیل کرو۔ میں تمہیں گرفتار کرتا ہوں۔ تمہیں سفارت خانے واپس چلنا ہوگا۔ اگر میں نے تمہیں ناپسندیدہ شخص قرار دلوا کے چوبیس گھنٹے کے اندر اندر اس ملک سے نکل جانے کے احکامات جاری نہ کروائے تو استعفا دے دوں گا۔"

میری اس زبان دانی سے فرنچ ڈپلومیٹ کی حالت اس شخص سے بھی بدتر ہوگئی جس نے سویٹ ڈش سمجھ کے لال مرچوں کی چٹنی چمچہ بھر کے کھالی ہو۔ چند سیکنڈ تو وہ منہ کھولے کھڑا رہا اور اس کے حلق سے حیرت یا ندامت کے الفاظ کے بجائے خاموشی برآمد ہوتی رہی جو خود ایک اعترافِ جرم تھی۔ پھر اس کی نصف بہتر نے صورتِ حال کو بدتر ہونے سے یوں بچایا کہ وہ اپنے گورے بدن کی ساری حشر سامانی کے ساتھ ایک کالے پولیس افسر کی عقل کو مفلوج کرنے اور اسے اپنی ادائے دلبری سے ہپناٹائز کرنے کے لئے کار سے نکل آئی۔

اس نے پہلے سے عریاں شانوں کو مزید عریاں کرتے ہوئے مسکرا کے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور فرنچ میں کہا۔ "غصہ تھوک دو ڈیئر۔ یہ میرے لئے ایک بے حد خوشگوار حیرت کی بات ہے کہ یہاں ہمارا ہم زبان بھی کوئی ہے۔ ہم دوست بن سکتے ہیں۔"

میں نے اس کی طرف بے وقوفوں کی طرح دیکھ کے کہا۔ "کیا تم مجھے ورغلا رہی ہو۔ اچھا پہلے میں اسے بند کردوں۔ پھر ہم دوستی کریں گے۔"

فرانسیسی نے چلا کے اپنی بیوی سے کہا "کیوں مزید ذلیل ہوتی ہو اس کے ہاتھوں۔"

لیکن بیوی بہت دور اندیش ثابت ہوئی۔ اس نے کہا۔ "آفیسر! میں اپنے شوہر کی طرف سے معافی مانگتی ہوں۔ اس نے بہت نامناسب باتیں کہی ہیں۔"

میں نے کہا "جو نامناسب سلوک میں اس کے ساتھ کرنے والا ہوں' اس کا یہ اندازہ بھی نہیں کرسکتا۔ ہمارا خصوصی آلۂ تفتیش تیرہ نمبر کا چھتر اس نے پہلے کہاں کھایا ہوگا۔"

آلۂ تفتیش کے کھانے کا ذکر سن کے وہ حیران ہوئی مگر اس نے اپنی کوشش جاری رکھی "بے شک یہ اس کی غلطی تھی۔ اس نے سخت اشتعال انگیزی کی لیکن تم خود سوچو کہ اپنے گھر میں پولیس کو دیکھ کر کیا تمہیں غصہ نہیں آئے گا۔"

میں نے کہا "آئے گا لیکن میں جرمن پولیس کو فارسی میں اور برطانوی پولیس کو عربی میں گالیاں نہیں دوں گا۔"

وہ بڑی ادا سے ہنسی جس کا رابعہ نے خاصا برا مانا "دیکھو نا' یہ تو انتہائی غیر متوقع بات تھی۔ یہاں کون فرنچ جانتا ہے؟ لیکن تم فرنچ بول سکتے ہو تو تمہیں فرنچ ایٹی کیٹس کا بھی خیال ہونا چاہئے۔ اول تو معذرت قبول کرلینی چاہیے اور پھر ایک معزز خاتون کی درخواست کو ٹھکرانا تو بہت ہی غلط ہوگا۔"

میں نے سرہلا کے ریوالور جیب میں رکھا جیسے اس دلیل نے مجھے قائل کرلیا ہے۔ پھر میں نے کہا "ہماری دوستی تو ہوئی نا' یہ لباس جو تم نے پہن رکھا ہے' بلاشبہ سنسنی خیز ہے۔"

نہ صرف رابعہ نے بلکہ اس عورت کے شوہر نے مجھے شعلہ فشاں نظروں سے گھورا۔

عورت نے حسن کی قوتِ تسخیر سے مطمئن ہوکے کہا۔ "کیا میں پوچھ سکتی ہوں ہینڈسم آفیسر! کہ تم ہمارے گھر میں

کررہے ہو ؟ "

میں نے کہا " حسین خاتون! مجھے شک ہے کہ آپ یہاں رہتی ہیں ۔ کیا اس بارے میں یہ بد شکل شخص بہتر وضاحت نہیں پیش کرسکتا جو خود کو تمہارا شوہر کہہ کے تمہاری توہین کررہا ہے ۔ "

فرانسیسی تلملایا " میں اس کا حقیقی شوہر ہوں ۔ "

میں نے مسکرا کے کہا " کوئی ثبوت ہے اس دعوے کا ؟ "

" یہ دو بچے " اس نے دہاڑ کر کہا ۔

" یہ تمہارے بچے ہیں ؟ " میں نے بے حد مشکوک انداز میں کہا ۔

" تم ان بچوں سے پوچھ سکتے ہو ۔ "

" بچے کچھ نہیں جانتے ۔ یہ ثابت کرو کہ تم ہی اس عورت کے شوہر اور ان بچوں کے باپ بھی ہو " میں نے کہا ۔ " میرا مطلب ہے ، حقیقی باپ ۔ "

حسبِ توقع اس نے مشتعل ہوکے مجھ پر حملہ کیا اور میں نے ایک مکا مار کے اسے واپس لوٹا دیا ۔ وہ گھوم کر گاڑی کی ڈکی پر گرا ۔ ایک چیخ عورت نے ماری ۔ دو اس کے بچوں نے ۔

میں نے کہا " میں نے تمہیں معاف کردیا تھا ۔ لیکن تم نے قانون پر ہاتھ اٹھایا ۔ یہ بہت سنگین جرم ہے ۔ "

عورت چلّانے لگی " پلیز! یہ ہوش میں نہیں ہے ۔ اسے چھوڑ دو ۔ یقین کرو ، ہم میاں بیوی ہیں ۔ سفارت خانہ اس کی تصدیق کرسکتا ہے ۔ بلکہ پاسپورٹ ہیں ہمارے پاس " اس نے اچانک سنبھل کے اپنا ہینڈ بیگ دیکھا ۔ پھر کار کی طرف لپکی اور ایک بریف کیس میں سے پاسپورٹ نکال لائی ۔ اس کا شوہر بونٹ پر بیٹھا ہونٹ کاٹتا رہا ۔ اس نے سگریٹ جلا کے اپنے غصے کا بخار دھوئیں کی صورت میں خارج کرنے کے لئے لمبے لمبے کش لئے ۔

" اسے میں کیا سمجھوں ؟ کیا تم جانتے بوجھتے بدتہذیبی کا مظاہرہ کرکے مجھے ذلیل کرنا چاہتے ہو ۔ تم نے مجھے سگریٹ کیوں پیش نہیں کی ؟ " میں نے کہا ۔

فرانسیسی نے مجھے خونخوار نظروں سے گھورا مگر سگریٹ کا پیکٹ میری طرف بڑھادیا ۔ سگریٹ جلا کے میں نے پیکٹ اور لائٹر دونوں جیب میں ڈال لئے اور خود کو عمل سے بھی ایک پولیس مین ثابت کیا جو زبردستی نذرانے وصول کرتا ہے اور چھوٹی موٹی چیزوں کو بھی چھوڑتا نہیں ۔ پاسپورٹ دیکھنے کے بعد میں نے اپنی تحویل میں رکھے ۔

" یہ افسوسناک اور شرمناک بات سہی ۔ مگر میں مان لیتا ہوں کہ تم اس کی بیوی ہو تاہم پاسپورٹ واپس لینے کے لئے ضروری ہے شوہر صاحب کہ آپ میرے چند سوالات کا جواب دیں ۔ "

اس نے کہا " پوچھو ، کیا پوچھنا ہے ؟ "

میں نے کہا " تم ڈاکو محمد خان کو جانتے ہو جو خونی خان مشہور ہے ؟ "

وہ مشتعل ہو کے بولا " ایسے سوالات کا کیا مقصد ہے آخر ؟ "

میں نے کہا " یہاں سوال کے جواب میں سوال کروگے تو میں پوری قانونی کارروائی کروں گا ۔ "

اس نے خون کا گھونٹ پی کر کہا " میں ایک سفارت کار ہوں ۔ میرا کسی ڈاکو محمد خان سے کوئی واسطہ نہیں ۔ "

" اور یہ مکان جسے تم اپنا کہتے ہو ، تم نے اسے کیوں کرائے پر دیا تھا ؟ کرائے کے بدلے تم اس سے کیا لیتے تھے ۔ نقد رقم یا خدمت ؟ "

" یہ کیا بکواس ہے ؟ جب میں کہہ چکا ہوں کہ میرا ڈاکو محمد خان سے دور کا بھی تعلق نہیں تو پھر مکان کرائے پر دینے کا کیا سوال ؟ "

اس کی بیوی نے کسی خطرناک صورتحال کا اندازہ کرتے ہوئے خود کو کچھ اور نمایاں کیا ۔ لبِ لعلیں پر ایک قاتل مسکراہٹ سجائی اور لہجے میں شیرینی گھول کر کہا " آفیسر! کون ڈپلومیٹ اپنا گھر کرائے پر دیتا ہے ۔ پھر کسی ڈاکو کو دینے کا کیا سوال ؟ "

میں نے کہا " لیکن وہ یہاں رہتا تھا ۔ کیا اس کا میں یہ مطلب لوں کہ وہ مفت رہتا تھا ۔ ظاہر ہے ، اس عنایت کے بدلے وہ تمہارے لئے کچھ تو ضرور کرتا ہوگا ۔ "

" یہ غلط ہے " فرانسیسی چلّایا " یہاں کوئی ڈاکو نہیں رہتا ۔ "

میں نے سرد مہری سے اس کی طرف دیکھا " میں اور میرا ساتھی پولیس افسر اس سے یہاں مل چکے ہیں ۔ بے شک وہ فرار ہوگیا ہے لیکن یہاں اس کی موجودگی بہت سے چشم دید گواہوں کے ذریعے ثابت کی جاسکتی ہے ۔ "

فرانسیسی اب واقعی پریشانی میں مبتلا ہوگیا تھا ۔ اس نے سگریٹ کو نیچے پنخ کے جوتے سے کچلا اور بولا " مجھے پوری بات بتاؤ ۔ "

میں نے کہا " جو بات مجھے معلوم تھی اگر وہ پوری نہیں ہے تو باقی تم بتادو ۔ مثلاً یہ کہ کب سے یہ تمہارا گھر ہے ، اور اگر تم یہاں رہتے ہو تو اس وقت کہاں سے آرہے ہو ؟ "

" میں اپنی فیملی کے ساتھ ایک مہینے کے لئے اپنے ملک گیا ہوا تھا ۔ اس سے پہلے میں یہاں تھا ۔ "

" کتنے عرصے سے ؟ " میں نے اس کی بات پر غور کرتے ہوئے کہا ۔

" ڈیڑھ سال سے " اس نے اپنی بیوی کی طرف دیکھ کے کہا ۔

" بیس ماہ اور ... سات دن ۔ " عورت نے انگلیوں پر حساب کرکے بتایا " ساتواں دن آج ہے ۔ "

" یہ رہائش تمہیں سرکاری طور پر فراہم کی گئی ہوگی ؟ "

" ظاہر ہے اتنا بیہودہ مکان میں خود نہ بنواتا ۔ "

میں نے کہا " اوپر نیچے کے بارہ کمرے چار افراد پر مشتمل خاندان کے لئے کم تو نہیں تھے ۔ "

اس نے جزبز ہوکے کہا " یہاں میں اکیلا نہیں رہتا تھا صرف اپنی فیملی کے ساتھ ۔ ہم دو افراد اوپر نیچے الگ الگ رہتے تھے ۔ "

" دوسرا کون تھا ؟ " میں نے کہا ۔

" وہ بھی ایک ڈپلومیٹ تھا ۔ گزشتہ ماہ چلا گیا واپس ۔ اس کی جگہ آنے والے نے میرے ساتھ رہائش کو پسند نہیں کیا ۔ "

" گویا تمہارے اپنے ہم وطن بھی تم سے اتنے ہی نالاں ہیں ؟ "

" وہ اپنی پرائیویسی کو زیادہ اہم سمجھتا ہے اور اسے حق حاصل تھا اپنی مرضی کی جگہ حاصل کرنے کا ۔ تو وہ اس حق کا استعمال کیوں نہ کرتا " اس نے برہمی سے کہا ۔

" تمہارا سابقہ ساتھی کیا چور تھا ؟ "

" فضول باتوں کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ۔ "

" اچھا ۔ دوسرا بے فضول سوال سنو ..... تم اپنے ملک گئے تھے تو کیا گھر کی ہر چیز ساتھ لے گئے تھے ؟ پردے ، قالین ، فرنیچر تک اور صرف خالی دیواریں چھوڑ گئے تھے مکان میں ۔ کالے چوروں کے لئے دیواریں لے جانا بہرحال مشکل تھا ۔ "

" کیا مطلب ہے آخر تمہارا ؟ "

" یا تم بغیر سامان کے رہنے کے عادی ہو " میں نے اس کی بات کو نظرانداز کرکے کہا " فرش پر سوتے تھے اور اپنی فیملی کو بھی اتنے بڑے گھر میں ایسے ہی رکھتے تھے جیسے ہم مجرموں کو جیل میں رکھتے ہیں ؟ "

اب عورت نے کہا " آفیسر ، ہم یہاں بہت آرام سے رہتے تھے ۔ ہمارے پاس ہر چیز ہے ۔ جو فرانس میں ہمارے معیار زندگی کے مطابق ہے ۔ "

میں نے کہا " آپ کا مطلب ہے کہ تھی ؟ کیونکہ اب تو اندر صرف سپاٹ دیواریں ہیں ۔ "

" یہ ، یہ کیسے ہوسکتا ہے " وہ چلّائی " کیا میں اندر جاسکتی ہوں "

میں نے کہا " ضرور جائیں ۔ اپنے ہی گھر میں جانے کے لئے آپ کو مجھ سے اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے مادام ؟ "

وہ ایک عام گھریلو عورت کی طرح پریشان ہوکے اندر جانے کے لئے لپکی ۔ فرانسیسی نے بھی گاڑی آگے بڑھائی اور دروازے کے سامنے روک دی ۔ نیچے اتر کے وہ اندر چلے تو میں اس کے ساتھ خالی گھر میں داخل ہوا ۔ اندر قدم رکھتے ہی وہ ٹھٹک کے رک گیا اور بے یقینی سے خانہ ویرانی کے آسیب کو دیکھنے لگا ۔ اس کی بیوی اندر کسی بدروح کی طرح بھٹک رہی تھی اور چلّا رہی تھی " آخر یہ سب کیا ہے ۔ یہ میرا گھر ہے کہ قبرستان .... کون لے گیا ہے سارا سامان ؟ "

میں نے فرانسیسی میں کہا " تمہارے ساتھ یقیناً بہت زیادتی ہوئی ہے ۔ "

اس نے مٹھیاں بند کرکے کہا " میں سفارتی سطح پر احتجاج کروں گا ۔ "

میں نے کہا " اس سے پہلے تمہیں رپورٹ درج کرانی ہوگی کہ تمہاری عدم موجودگی میں کوئی یہاں جھاڑو پھیر گیا ۔ "

" کیا نام بتایا تھا تم نے اس کا ؟ محمد خان ۔ "

میں نے کہا " وہ ڈاکو ہے ۔ کباڑیا نہیں کہ پرانا سامان لے جائے ۔ اس کا تو نام بھی مت لینا ۔ ایک تو اس لئے کہ وہ خونی خان ہے ۔ اس کا نام لینے سے تم خواہ مخواہ لمبے چکر میں آجاؤ گے کہ آخر وہ یہاں کیسے مقیم تھا ۔ چونکہ اس بات کے گواہ ہیں ، اس لئے بہتر ہے کہ تم اپنی رپورٹ کو چوری تک محدود رکھو ، نام کسی کا مت لو ۔ تمہیں سارا سامان خود حکومت فراہم کرے گی ۔ "

" تم نے ٹھیک کہا ۔ کیا تم میری مدد کروگے ؟ " اس نے درخواست کی ۔

" میں یہ مدد کرسکتا ہوں کہ ڈاکو محمد خان کی یہاں موجودگی کا کسی سے بھی ذکر نہ کروں ۔ میں ہی ایک معتبر سرکاری گواہ ہوں یا میرا یہ ساتھی ۔ بات یہ ہے مسٹر ڈپلومیٹ کہ خطرے سے دور رہنے کی کوشش ضرور کرنی چاہئے ۔ تم جانتے ہو ، یہ انڈیا ہے ۔ یہاں کی پولیس کتنی مستعد ہے ، یہ بھی جانتے ہوگے ۔ کیا فائدہ کہ دشمنی میں خونی خان تمہارے خاندان کو سابق خاندان کردے ۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ وہ واقعی آدمی کا خون پی لیتا ہے ؟ "

خوف سے اس کا رنگ اُڑ گیا " خون پی لیتا ہے! انسانی خون ! یہ ناممکن ہے ۔ "

" تم اپنے طور پر جب تفصیلی معلومات حاصل کروگے تو تمہیں یقین آجائے گا کہ میں نے غلط نہیں کہا تھا ۔ خود پولیس تمہیں بتائے گی اور ممکن ہے تصویریں بھی دکھائے ۔ ایسی ہولناک تصویریں جن میں اسے خون پیتے ہوئے دکھایا گیا ہے "

" خدا کے لئے یہ ذکر چھوڑو ۔ میری مدد کرو ۔ یہ تو بہت سنگین واردات ہے ۔ چوروں نے گھر صاف کردیا اور کسی کو خبر بھی نہیں ہوئی ۔ کیا اسی طرح حفاظت کی جاتی ہے سفارت کاروں کی ؟ "

میں نے کہا " تم سفارت کار ہو تو تمہارے گھر پر جھنڈا کیوں نہیں لہرا رہا ہے فرانس کا ؟ گیٹ پر چوکیدار کیوں نہیں

ہے ؟ "

" اس لئے کہ میں نہ سفیر ہوں نہ کونسلیٹ ۔ میں سفارتی عملے کا ایک عام رکن ہوں " وہ بولا ۔

اس نے گھر میں گھوم پھر کے مجھے تفصیل سے بتایا کہ کہاں کیا تھا' جو اَب نہیں ہے ۔ اس کی بیوی نے کئی بار روتے روتے دخل در معقولات کیا اور کہا کہ فلاں چیز بھی تو تھی ۔ تم یہ بھول گئے ' وہ بھول گئے ۔ تنگ آ کے شوہر نے بیوی کے ساتھ وہی سلوک کیا جو عموماً ہم مشرقی شوہر پاؤں کی جوتی کے ساتھ روا رکھتے ہیں ۔ اس نے آدابِ سفارت کو بالائے طاق رکھ کے کہا " اگر تم نے کُتیا کی طرح بھونکنا بند نہ کیا تو..... " باقی دھمکی سنسر کی زد میں آتی ہے ۔

چلتے وقت میں نے اسے تسلی دی ۔ اس نے ہاتھ ملا کے مجھ سے معذرت کی کہ اس نے میرے ساتھ بہت غلط رویّہ اختیار کیا ۔

" ایک فرنچ جاننے والا پولیس افسر یقیناً میرے بہت کام آسکتا ہے ۔ آئندہ بھی ۔ "

" اور ہم دوست بھی ہوسکتے ہیں " میں نے اس کی بیوی کی طرف دیکھ کے کہا " بے شک اس خود غرض دنیا میں کوئی غرض کے بغیر کسی کا دوست نہیں ہوتا " اس کی بیوی اب بھی جامے سے خاصی باہر تھی ۔

رابعہ نے کہا " اتنا دل للچا رہا ہے تو دوستی کیا ' نکاح کرلو "

میں نے کہا " اہلِ کتاب سے نکاح بھی جائز ہے ۔ اس امکان پر بعد میں غور کریں گے عزیزہ ۔ تجویز ہمیں اچھی لگی " ظاہر ہے ' معاملہ رابعہ کی برداشت سے باہر ہوگیا تھا ۔

" تمہیں قتل کردے گا اس کا خصم ۔ "

میں نے کہا " یہ لوگ جذباتی نہیں ہوتے ۔ مجھے معلوم ہے ۔ ویسے بھی قتل تو ہم ہوتے ہی رہتے ہیں ۔ ہر جگہ ۔ چُھری پھیر دی ہے ظالم نے ۔ "

فرانسیسی اور اس کی بیوی کچھ حیران تھے کہ ہمارے درمیان یہ کیا مکالمہ ہورہا ہے ۔ رابعہ کی آواز کی نسوانیت اور اس کے لہجے کا حاسدانہ جذبہ شکوک پیدا کرنے کے لئے کافی تھا لیکن وہ خبیث غالباً اردو کچھ کچھ سمجھتا بھی تھا ۔ رابعہ کا منہ سوج گیا تھا چنانچہ میں نے فرار اختیار کرنے میں ہی عافیت جانی ۔

جیپ میں بیٹھ کے باہر آتے ہی مجھ پر ہنسی کا دورہ پڑا " بس اتنا ہی حوصلہ تھا ۔ ابھی تو پیغام نگاہوں نے بھی نہیں دیا تھا "

رابعہ نے جل کے کہا " میں دیکھ رہی تھی تمہاری نگاہوں کی آوارگی کو ۔ نظریں خیرہ ہوئی جارہی تھیں ۔ "

میں نے کہا " تم بھی شادی کے بعد ایسا ہی لباس بنوالینا ۔ ڈیزائن تو دیکھ لیا ہے نا تم نے ۔ خصوصاً گلے کا ۔ یہ شلوار قمیص ' غرارہ ' شرارہ ۔ یہ کوئی لباس ہیں.... لاحول ولا قوۃ عورت کو اوپر سے نیچے تک غرق کردیا کپڑوں میں ۔ خواہ مخواہ کی فضول خرچی ۔ چھ گرہ کپڑے سے کام چلتا ہو تو چھ گز کیوں آخر....؟ "

رابعہ نے اب جواب دینے سے گریز کیا اور مسکراہٹ کو چھپانے کے لئے دوسری طرف دیکھنے لگی ۔ میں اسے مخاطب کرکے کچھ زیادہ گرما گرم بات کہنا چاہتا تھا کہ اچانک خالی سڑک کے بیچ میں کوئی چیز آئی اور گزر گئی ۔ میں نے ایک دم بریک لگائے ۔ جیپ تھوڑا سا دائیں طرف گھوم کے رک گئی ۔

" یہ کون الّو کا پٹھا خودکشی کرنے والا تھا ؟ " میں نے کہا ۔

بائیں جانب سے یوسفِ ثانی نے کہا " اجی حضور ! ہے یہ بندے کا قصور.... لیکن تھا روکنا آپ کو منظور ۔ "

میں نے بھنّا کے کہا " اور اگر ہوجاتے آپ مرحوم و مغفور یا ہوجاتیں ہڈیاں چور چور ۔ میں تو ہوجاتا مفرور ۔ "

اس نے اب وہی شیروانی اور ترکی ٹوپی پہن رکھی تھی لیکن جانے کہاں سے اس پر ایک پُھندنا بھی ٹانک لیا تھا ۔ لال ٹوپی پر یہ کالا پُھندنا اس کے سر کی حرکت کے ساتھ جھولتا تھا ۔ وہ بندر کی طرح اچھل کے جیپ کے پچھلے حصے میں چڑھ گیا ۔

" آپ نے تو جناب حد کردی " وہ ہاتھ لہرا کے شکایتی انداز میں بولا " جسم پر چڑھالی پولیس کی وردی ۔ حالانکہ ابھی کہاں ہے سردی "

" سردی ؟ " میں نے کہا " یہ صرف قافیہ ملایا ہے تم نے "

رابعہ نے کہا " یہ ٹھیک کہہ رہا ہے ۔ یہ وردی پولیس کو موسمِ سرما میں دی جاتی ہے اور ابھی گرمی چل رہی ہے ۔ "

میں نے یوسفِ ثانی جیسے چغد کے مقابلے میں خود کو الو محسوس کیا (حالانکہ چغد بھی لغت کے مطابق چھوٹا اندر الو ہی ہوتا ہے) ۔ جس بات کا مجھے کئی گھنٹے وردی پہن کر پھرنے کے بعد بھی احساس نہ ہوا تھا' اسے وہ ایک دم تاڑ گیا ۔ یہ بہت بڑی غلطی تھی ۔ ایک فرانسیسی ڈپلومیٹ نے یہ غلطی نوٹ کی تھی یا نہیں ' اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا مگر اور بہت سے لوگوں نے ہمیں اس وردی میں دیکھا تھا ۔ ہم مرحوم چاچا کے گھر سے نکلے تھے تو ایک پورا مجمع ہمارے راستے میں حائل تھا ۔ ان میں سے کسی نہ کسی کی نظر نے یہ فرق ضرور دیکھا ہوگا ۔ اس کے ساتھ ہی مجھے چاچا کی مزاحمت کا خیال آیا ۔ کیا انہوں نے اندازہ کرلیا تھا کہ یہ اصلی نہیں ' نقلی پولیس ہے ۔ چنانچہ انہوں نے ہمیں بچانے کی کوشش کی تھی اور اس کوشش میں اپنی جان دے دی تھی ۔ یوسفِ ثانی کی بات نے میرے اس شک کو یقین میں بدل دیا تھا کہ ہماری گرفتاری کے لئے آنے والے درحقیقت شکاری تھے جو ہم سے وہ نوٹ بک لینے آئے تھے ۔

میں نے اس کی ٹوپی پر دھپ سے ہاتھ مار کے کہا " یار تم بھی کمال کی چیز ہو ۔ کہاں چھپے بیٹھے تھے اتنی دیر سے ؟ "

وہ چلایا " آہ ! یہ آپ نے کہاں وار کردیا ۔ سر کی عزت کے ساماں کو خوار کردیا ۔ یہ کیا غضب آپ نے میرے سرکار کردیا ؟ "

میرے ساتھ رابعہ بھی ہنس پڑی کیونکہ دھپ سے ٹوپی کچھ دب گئی تھی ۔ کچھ نیچے اُتر کے اس کی پیشانی سے آگے آنکھوں تک پہنچ گئی تھی اور اس کا پُھندنا جو شاید اس نے حال ہی میں گوند سے چسپاں کیا تھا ایسے الگ ہوگیا تھا جیسے جوتا لگتے ہی چھپکلی کی دُم الگ ہوجاتی ہے ۔

میں نے کہا " سوری یار ' میرا مقصد دل آزاری نہیں تھا "

اس نے بڑے دکھی لہجے میں کہا " اب آپ سے کیا بات چُھپانی ۔ والدِ مرحوم کی ہے یہ نشانی ۔ آج ایک قوال نے کی مہربانی کہ بخش دیا یہ پُھندنا لاثانی ۔ آپ نے پھیر دیا اس کے حسن پر پانی ۔ "

میں نے کہا " چلو یار پھر جوڑ لینا ۔ یہ بتاؤ پہلے تو کہ سب لوگ کہاں گئے ؟ ہم صبح سے پریشان ہورہے ہیں ۔ رات تک تو کوئی ایسی بات نہیں ہوئی تھی کہ مکان چھوڑنا ہے ۔ "

اس نے ٹوپی میں ہاتھ ڈال کے اسے سیدھا کیا اور پھر اپنے سر پر آہستہ سے جما کے پُھندنے کو بڑے ملال سے دیکھتا رہا ۔ پھر ایک آہ بھر کے بولا " صبح دم سے کر رہا تھا انتظار ۔ آپ کا یہ خاکسار.... مگر آپ مثلِ شترِ بے مہار ' جیپ میں ہو کے سوار ۔ اندر تشریف لے گئے بے اختیار ۔ پھر آگیا وہ گورا نابکار اور آپ فرمانے لگے اس سے تکرار ۔ "

" اور میم پر فریفتہ ہوئے دیوانہ وار " رابعہ نے لقمہ دیا ۔

میں ہنس پڑا " اس پر لعنت ہزار بار ۔ آپ کے دل میں ابھی تک ہے غبار ۔ معافی کا ہے یہ بندہ طلبگار ۔ "

رابعہ بھی ہنسنے لگی " چلو کام کی بات کرو اس سے ۔ مسخری چھوڑو ۔ "

میں نے کہا " میاں یوسفِ ثانی ! اب زیادہ مت تڑپاؤ ۔ یہ بتاؤ کہ ہمارے ساتھی کہاں چلے گئے ہیں ؟ "

وہ بولا " بس اب یہاں سے نکلئے ۔ مطابق میری ہدایات کے چلئے ۔ "

میں نے جیپ اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا " مگر یہ سب اچانک ہوا کیسے ؟ "

" اچانک تو انتقالِ پُرملال ہوتا ہے سر ۔ اس بات کا تو بہت پہلے سے تھا ڈر " یوسفِ ثانی نے کہنا شروع کیا " کل رات جب آئی یہ خبر ۔ کہ آرہا ہے وہ جس کا ہے یہ گھر ۔ تو کیا کرتے جو رہتے تھے یہاں پر ۔ سوائے اس کے کہ باندھ لیں بستر ' ورنہ سب ہی ہوجائیں گے اندر ۔ پس محمد خان نے کہا مجھ سے کہ اے بشر ۔ اب کوئی دوسرا ٹھکانا تلاش کر ۔ یہ بندہ حقیر تو ہے سب کا نوکر ۔ کیسے ہونے دیتا سب کو دربدر ۔ ڈالی اس شہر پر ایک طائرانہ نظر ۔ تو دیکھا ایک مقام خوب تر ۔ جہاں رہ سکتے تھے بے خوف و خطر ۔ وہیں ہیں سب قصہ مختصر ۔ "

میں نے اپنا سر پکڑ لیا " یوسفِ ثانی ! کوئی قافیہ بچا ہے تو تمہیں اجازت ہے ۔ عرض کرتے رہو ۔ "

رابعہ نے کہا " کیسے بدذوق آدمی ہو ۔ داد نہیں دے سکتے ۔ کیسے شاعرانہ پیرائے میں بات کرنے والا آدمی ملا ہے ۔ کوئی بے ربط یا فضول بات نہیں کی اور جو ضروری تھا' سب کچھ کہہ دیا لیکن قافیہ تنگ نہیں ہوا ۔ "

میں نے کہا " اسے اگر اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی میں اپنا نمائندہ بنا کے بھیج دیا جائے تو اس کی تقریر ختم ہوگی ' نہ قافیے ۔ اجلاس ختم ہوجائے گا ۔ ممکن ہے اقوامِ متحدہ ہی ختم ہوجائے "

یوسفِ ثانی کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ کسی بات کا بُرا کبھی نہیں مانتا تھا ۔ عرفِ عام میں اسے ڈھیٹ ہونا بھی کہتے ہیں ۔ مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر ۔ وہ مردِ ناداں تو خیر نہیں تھا مگر ڈھیٹ بلا کا تھا ۔ راستے میں اس نے میری ناقدری کی پروا کئے بغیر مجھے اپنی بے مہار شاعری میں ہدایات دینے کا عمل جاری رکھا اور بالآخر مجھے اس جگہ پہنچا دیا جہاں محمد خان کا نیا ٹھکانا تھا ۔ اپنے دوستوں سے پھر ملنے کی مجھے جتنی خوشی ہوئی ' اس سے زیادہ یوسف ثانی کی قافیہ آرائی سے بچ جانے کی ہوئی ۔

محمد خان باہر ہی ٹہل رہا تھا ۔ یہ ایک بہت قدیم انداز کی حویلی تھی جس کو باہر سے دیکھ کر مقبروں کی ویرانی ' قدیم قلعوں کی پُراسراریت ' شان و شوکت کی بے ثباتی کا تصور ابھرتا تھا ۔ معلوم نہیں یہ تاریخی عمارت کس کی ملکیت تھی اور کب سے مکینوں کے انتظار میں تھی ۔ اس کی بیرونی دیوار سلامت تھی مگر اس کا پلستر جگہ جگہ سے اُکھڑ رہا تھا ۔ احاطے کے اندر کا باغ ایک جنگل سا بن گیا تھا ۔ اسے دیکھ کر مجھے بے اختیار اپنا گھر یاد آیا جو رابعہ نے پھر خرید لیا تھا ۔ شاید ایسی ہی پُر آسیب فضا وہاں بھی آتے جاتے لوگوں کو اپنا فسانۂ عبرت کہتی ہوگی ۔ مجھے نواب خسرو جمشید کا آبائی محل یاد آیا جو اَب ایک جل کے خاکستر ہوجانے والا کھنڈر تھا ۔

جب محمد خان نے کہا " اتنی دیر کیوں ہوئی ؟ قسم اللہ کی ' میں تو پریشان ہوگیا "

میں نے برہمی سے کہا " یہ کیا طریقہ ہے خان صاحب ؟ راتوں رات ایسے غائب ہوئے جیسے کہ اونٹ کے سر سے سینگ "

محمد خان مسکرایا " یہ تو ہوتا رہتا ہے ۔ مسافروں کے ٹھکانے بدلتے رہتے ہیں ۔ چلو اندر چلو ۔ "

غالب اور محسن گھٹنوں سے اونچی خشک گھاس کے درمیان پتھر کی بینچ پر بیٹھے ہوئے تھے " ادھر ان پر آجاؤ " محسن نے کہا ۔

میں نے آواز پر پلٹ کے دیکھا تو جھاڑ جھنکاڑ کے درمیان ان کی جھلک سی نظر آئی ۔ وہ جس بینچ پر بیٹھے ہوئے تھے اس کے سامنے ایک شکستہ خشک فوارہ تھا ۔ آس پاس گر...

اسی نوع کے دوسرے حشراتُ الارض پریشان پھر رہے تھے کہ یہ دو ٹانگوں پر چلنے والے جانور کہاں سے آگئے۔

غالب نے کہا "کیسے پھول لہلہا رہے ہیں اور فوارہ چلنے سے تو لطف دوبالا ہوگیا ہے۔" پھر وہ دونوں کِھی کِھی کرکے ہنسنے لگے۔

میں نے کہا "کیا تمہاری عقل گھاس چر رہی ہے؟"

غالب نے کہا "تم بھی چھوڑدو اپنی عقل کو۔ گھاس بہت ہے۔"

میں نے کہا "مجھے بات کرنی تھی تم سے۔"

غالب ہنسا "صرف ہم سے بات کرنی ہے تو یہ محفوظ ترین مقام ہے۔ یہاں وہ نہیں آئیں گی۔ دونوں بلائیں۔"

"کیونکہ یہاں گرگٹ، چھپکلی جیسے خونی درندے پھر رہے ہیں۔ اندر انہیں بھوت وغیرہ نے پریشان کر رکھا تھا اور انہوں نے ہمیں پھر ہم کیا کرتے؟" محسن بولا۔

میں نے اندر جاتے ہوئے کہا "ابھی بتاتا ہوں جا کے کہ غالب تمہیں 'بلا' کہہ رہا تھا۔"

"ہاں، کہہ دو۔ میں کوئی ڈرتا ہوں؟" غالب سینے پر ہاتھ مار کے بولا "اور یہ بھی کہہ دینا کہ ہمت ہے تو یہاں آکے بات کرے۔"

رابعہ پہلے ہی اندر جاچکی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ محسن اور غالب جان بوجھ کے نازو اور گل کو پریشان کرنے کے لئے اس اُجاڑ جگہ پر آبیٹھے ہیں۔ محمد خان میرے انتظار میں تھا۔

"مجھے اس شاعرِ بے مہار نے بتا تو دیا ہے کہ تمہیں رات کو اچانک وہ جگہ چھوڑنی پڑی اور صبح میری اصل مالک سے بھی خاصی نوک جھونک ہوئی۔"

"وہ ملا تمہیں!" محمد خان حیران ہوکے بولا "قسم اللہ کی، مجھے نہیں معلوم۔"

"ہاں۔ مجھے بچالیا اس موذی نے اور میری فرنچ نے۔ اسے بچالیا اس کی بیوی نے، ورنہ گڑبڑ ہوجاتی۔ وہ سخت پریشان تھے کہ ان کا تمام سامان کیسے غائب ہوگیا۔ تم سب اٹھالائے؟"

"قسم اللہ کی مجبوری تھی۔ یہاں کچھ بھی تو نہیں تھا۔ اسے سب کچھ مل جائے گا۔" محمد خان نے دروازہ کھول کے کہا۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوگیا اچانک کہ وہ آرہا ہے؟"

"بھئی اتنا باخبر تو رہنا پڑتا ہے۔" محمد خان نے اندر جانے کے کے بعد ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا "ابھی سب کمرے رہائش کے قابل نہیں تھے۔ اس میں تم لوگوں کے لئے انتظام کردیا ہے۔"

"اور تمہارے ساتھی؟"

"وہ بھی یہیں ہیں مگر وہ آرام جو وہاں تھا، یہاں نہیں ہے۔ چند دن میں سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

"ہمارا مطلب ہے، روم سروس جیسی وہاں تھی کہ بٹن دباتے ہی چیز حاضر۔ وہ یہاں نہیں ہے؟"

"ہاں۔ ویسے کھانے پینے کی کسی چیز کی کمی نہیں البتہ خود بھی کچھ کرنا پڑے گا۔ لڑکیاں کرلیتی ہیں، میں نے دیکھا ہے۔" محمد خان نے کہا اور دوسری طرف بڑھ گیا۔ بات مجھے اس سے بھی کرنی تھی لیکن میں نے بہتر سمجھا کہ پہلے گل اور نازو سے مل لوں۔

جیسے ہی میں نے اندر قدم رکھا، وہ تینوں چونک کے الگ ہوگئیں۔ ان کے درمیان نہ جانے کیا راز و نیاز ہو رہے تھے۔ تینوں سر جوڑے چپکے چپکے باتوں میں مصروف تھیں۔

مجھے دیکھتے ہی گل نے کہا "بھائی سکندر! یہاں بھوت ہیں۔"

"اچھا؟" میں نے دلچسپی سے کہا "صرف بھوت میرا مطلب ہے کہ یہ بیچلر بھوتوں کا ہوسٹل ہے؟ بھوتنی کوئی نہیں؟"

"مذاق سمجھ رہے ہو نا ہماری بات کو۔" نازو نے بگڑ کر کہا۔

رابعہ نے بھی سر ہلایا "واقعی سکندر۔ جو کچھ انہوں نے بتایا ہے مجھے....."

میں نے کہا "خدا کے واسطے! کیا تم چاہتی ہو کہ میں بھی ان دونوں کے ساتھ جابیٹھوں۔ اپنی بات کرو۔ لعنت بھیجو بھوتوں پر۔"

"تمہیں کیا معلوم کہ رات کیا ہوا ہمارے ساتھ" نازو نے کہا۔

میں نے کہا "اور جو ہمارے ساتھ ہوا، اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ بھوت ہم سے زیادہ اہم ہیں۔ رابعہ، تم سنو ان کی اور اگر یہ تمہاری سننا چاہیں تو ان کی مرضی، میں جارہا ہوں باہر۔"

محسن اور غالب مجھے واک آؤٹ کرتا دیکھ کے بہت خوش ہوئے "آگیا نا تو بھی آخر؟" محسن نے کہا۔

"وہ تو پاگل ہوگئی ہیں۔ بھوت کے سوا کوئی بات ہی نہیں کرتیں" میں نے گرد سے اٹی ہوئی بینچ پر بیٹھ کے کہا۔

"ہم بھی پاگل ہوجاتے اگر یہاں پناہ نہ لیتے۔"

"کیا تمہیں کوئی بھوت نظر نہیں آیا؟" میں نے کہا "کیا واقعی کچھ چکر ہے یہاں؟"

"ہے تو سہی یار" محسن سر کھجا کے بولا "مگر اب ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔ وہ پرانے رہنے والے ہیں۔ انہیں کیسے نکالیں یہاں سے۔ غالب نے بھی کہا کہ چند دن کی بات ہے۔ مل جل کے رہ لیں گے۔"

ان کی باتوں سے اندازہ کرنا مشکل تھا کہ وہ کس حد تک سیریس ہیں۔ میں نے جیب سے غیر ملکی سگریٹ نکال کے کہا۔ "لو، تم بھی عیش کرو۔ مالِ غنیمت میں سب کا حصہ برابر ہوتا ہے۔"

محسن نے نعرہ لگایا "ابے، یہ ٹرکش سگریٹ کہاں مارے؟"

میں نے متانت سے کہا "مارے کیا مطلب؟ فرانسیسی سفیر نے تحفے میں دیئے ہیں۔"

"اور یہ وردی کیا پولیس کمشنر کا تحفہ ہے؟"

میں نے انہیں مختصراً رات بھر کے واقعات سے آگاہ کیا۔ محسن کے سامنے مجھے بہت محتاط رہنا پڑا۔ میں نے نہ شہلا کی تصویر کا ذکر کیا اور نہ اس کے بچے کا۔ یہ بہت مشکل کام تھا۔ میری نظر میں پھر وہ منظر تازہ ہوگیا تھا جب میں نے انہیں دیکھا تھا لیکن میرے لئے یہ جھوٹ بولنا بہت ضروری تھا۔ محسن کی حالت اتنی اچھی تھی کہ وہ بالکل پہلے والا محسن نظر آتا تھا۔ اگر میں اسے حقیقت بتادیتا تو شاید یہ صدمہ اس کے ذہنی توازن پر ہی اثر انداز نہ ہوتا، اس کی جسمانی صحت کو بھی متاثر کرتا۔ رات بھر کے واقعات کو اختصار سے پیش کرتے ہوئے مجھے بارہا احساس ہوا کہ میں کامیابی سے جھوٹ بولنے میں ناکام ہوں اور محسن شک میں مبتلا ہوگیا ہے لیکن وہ میرا وہم تھا۔ غالب اور محسن دونوں ہی بڑے انہماک اور پوری توجہ سے ہر بات سن رہے تھے۔

"یہ تو عجیب بات ہے۔ اس سالے دلاور نے کیسے اغوا کرالیا تم دونوں کو۔ اسے کیسے پتا چلا تمہارے پروگرام کا؟"

میں نے کہا "میں خود یہ نہیں سمجھ سکا۔ پہلے مجھے شک تھا اس کارٹون شاعر یوسفِ ثانی پر کہ یہ ڈبل ایجنٹ ہے مگر ایسی بات نہیں۔ اپنے محمد خان صاحب کو خود پر ضرورت سے زیادہ ہی اعتماد تھا کہ کسی کو ان کے ٹھکانے کا علم نہیں ہوسکتا۔ انہیں معلوم تھا....."

"کسے معلوم تھا؟"

میں نے کہا "خان کے ساتھیوں میں کوئی مخبر ہے۔ یا پھر تریویدی اپنے وسائل رکھتا ہے۔ معلومات حاصل کرنے کے۔"

"کہیں ایسا تو نہیں کہ رات کو اچانک کسی نوٹس کے بغیر روانگی کا یہی مقصد ہو۔" غالب نے کہا "کہ تریویدی کو پتا نہ چلنے پائے؟ اگر اسے ایک ٹھکانے کا علم ہوگیا تھا تو دوسرے کا پتا چلانے میں وقت لگے گا اور پھر ایسا ہوگا تو خان اسی طرح دوبارہ غائب ہوجائے گا۔ آنکھ مچولی جاری رہے گی۔" محسن بولا۔

میں نے کہا "ہاں، یہ بھی ہوسکتا ہے۔ خان صاحب کسی ڈپلومیٹ کے گھر میں گھسے ہوئے تھے۔"

"یہ ایک احمقانہ اور خطرناک حرکت تھی۔ ڈپلومیٹ عام آدمی نہیں ہوتا۔" غالب نے کہا۔

"خان کو یہ پہلے سے معلوم ہوگا کہ وہ کتنے دن کے لئے گیا ہے اور کب واپس آئے گا۔ اس کی واپسی سے پہلے وہ جگہ چھوڑنی ضروری تھی لیکن وہ آخری وقت تک سکون سے بیٹھا ر[illegible] ... رات دو بجے اعلان کردیا کہ مرزا جی اٹھو، اب کوچ کرو۔"

غالب نے کہا "سوتے سے جگا کے یہ خوش خبری سنائی۔"

"ہم نے کہا کہ ایسی کیا آفت آگئی ہے۔ تو ہمیں ڈانٹ دیا کہ بحث کے لئے وقت نہیں ہے۔ چلو۔" محسن بولا "میں نے کہا کہ ان دونوں کا کیا بنے گا جو یہاں واپس آئیں گے تو دیکھیں گے کہ نہ چمن ہے نہ آشیانہ اور ویرانے میں اُلّو تک نہیں بول رہے ہیں۔"

غالب نے کہا "احتجاج میں نے بھی کیا تھا، مگر اس نے کہا کہ ان کی فکر مت کرو۔ وہ تمہارے دوست ہیں تو میرے مہمان بھی ہیں اور میں نے پورا بندوبست کرلیا ہے۔ وہ جب بھی لوٹیں گے ہمارے پاس آجائیں گے۔ ظاہر ہے، اس کے بعد میں خاموش ہوگیا۔"

"نازو اور گل بھی بہت برہم تھیں کہ یہ کیا آدھی رات کو کوچ کا بگل بجادیا۔ جانا تھا کہیں تو رابعہ اور سکندر کو بھی بتادیتے۔ انہیں بھی خان نے یہی جواب دیا کہ تم لوگ صرف باتیں کرتے ہو۔ شک کرتے ہو اور اعتراض کرتے ہو۔ باقی سب کو احمق سمجھتے ہو۔ میرے دم سے ہی ان دونوں کو حفاظت اور سلامتی کی ضمانت حاصل ہے اور وہ صبح خیریت کے ساتھ نہ آئیں تو پھر مجھے الزام دینا۔"

میں نے کہا "اس میں تو کوئی شبہے کی بات نہیں۔ یہ محمد خان ہی تھا جس کی وجہ سے ہم محفوظ رہے۔ دلاور، پیڈرو اور وہ پاجی عبداللہ..... سارے شیطانی لشکر کے شکاری اکٹھے تھے مگر وہ ہمیں شکار نہ کرسکے۔ انہوں نے ہمیں مارا پیٹا بھی تو احتیاط کے ساتھ۔ ذلیل بہت کیا۔ ذہنی اذیت جتنی دے سکتے تھے، دی۔ مگر محمد خان نے کچھ ایسا بندوبست کیا تھا کہ وہ صبح سے پہلے ہماری بخیر و عافیت واپسی کی شرط پوری کرنے کے پابند تھے۔"

"تجھے کچھ نہیں بتایا تھا اس نے؟"

"نہیں۔ میں نے اس سے کہا ضرور تھا کہ دلاور سے ہماری ملاقات کرادے اور تریویدی سے ہمارے زندہ سلامت واپس لوٹ آنے کی ضمانت حاصل کرلے۔ معلوم نہیں، اس نے کیا بندوبست کیا تھا۔ اس سے پوچھوں گا موقع ملنے پر۔" میں نے کہا۔

"خان بہت گہرا اور پُراسرار آدمی ہے۔" غالب نے کہا۔

محسن نے اس کی تائید کی "رات دو بجے میں نے کہا کہ یہ نقلِ مکانی کیا سہولت کے ساتھ دن میں کسی وقت نہیں ہوسکتی تھی۔ تو مجھے اس نے جواب دیا کہ یہ رازداری کا تقاضا ہے۔"

"اور مجھ سے کہا کہ دن میں کہاں جاتے۔ ٹھکانا ہی کوئی نہیں تھا۔ ابھی ابھی ایک جگہ کا پتا چلا ہے جو ہمارے مطلب کی ہے۔" غالب نے کہا۔

"میں نہیں مانتا کہ آدھی رات کے بعد اسے یہ جگہ ملی ت[illegible]

اس نے فوراً سامان اٹھانے کا فیصلہ کرلیا۔ یہ سب پہلے سے طے شدہ تھا مگر خان کے سوا کسی کو بھی اس کے پروگرام کا علم نہیں تھا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ وہ کسی پر بھروسا نہیں کرتا۔"

میں نے کہا "مجھے تو یوسفِ ثانی نے ایک نظم سنا کے مطلع کیا کہ خان صاحب نے نئے ٹھکانے کی تلاش پر اسے مامور کیا تھا اور اس نے یہ جگہ دیکھ کے خان سے کہا کہ چلئے' نیا گھر آباد کیجئے۔"

"یوسفِ ثانی پراپرٹی ڈیلر ہے؟"

میں نے کہا "وہ سب کچھ ہے۔ یہ پوچھو' کیا نہیں ہے۔ بقول خان' وہ الہ دین کے چراغ کے جن سے زیادہ مستعد ہے"

"وہ آیا تو تمہارے ہی ساتھ تھا۔ پھر کہاں گیا؟"

میں نے کہا "یہ تو میں نے بھی نہیں دیکھا۔ کہیں غائب ہوگیا بغیر بتائے۔"

"وہ نوٹ بک کہاں ہے جس میں خفیہ زبان لکھی ہوئی ہے؟"

میں نے نوٹ بک پیش کی اور انہوں نے اسے باری باری ملاحظہ کیا۔ اسے سمجھنے کے لئے اپنی عقل کے گھوڑے دوڑائے جو بحرِ ظلمات میں بھٹکتے رہ گئے۔ اس نوٹ بک کی بے سروپا عبارت سے کوئی مربوط تحریر اخذ کرنا اتنا آسان بہرحال نہیں تھا۔ غالب اور محسن مجھ سے پروہت کے بارے میں اور اس کے قتل کی واردات کے پیچھے خفیہ ہاتھ کے بارے میں پوچھتے رہے۔ میں نے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ میرے کسی جواب میں غلطی سے بھی اس تصویر کا حوالہ نہ آنے پائے جو شہلا کو ایک شیشے کے تابوت میں بند کرنے کے بعد اُتاری گئی تھی۔ مدھوسودن اور کیرتی کا ذکر کرتے ہوئے بھی میں اس احتیاط سے دستبردار نہیں ہوا۔ اب دھوپ سر پر آگئی تھی اور تمازت ناقابل برداشت ہونے لگی تھی۔

میں نے کہا "اس بھوتوں کے ڈیرے میں نہانے دھونے کا کوئی بندوبست ہے؟"

"ہاں۔ پرانے وقتوں کے ایک باتھ روم میں ہینڈ پمپ ہے۔ چلایئے اور غسل فرمایئے۔ ورزش کے فوائد بونس میں" غالب نے کہا۔

"یہ محل ہے کس کا اور بھوتوں کا کیا چکر ہے؟ اس کی بھی کوئی اسٹوری ہوگی۔ پرانے مکینوں کی روحیں تو نہیں ہیں؟"

محسن نے کہا "ایک سانس میں تُو نے اتنے سوال کرڈالے۔ ارے بھائی! ہم خود یہاں آدھی رات کو وارد ہوئے تھے۔ دس گھنٹے میں اتنی تاریخی ریسرچ کیسے کرسکتے تھے؟ رہیں گے تو کچھ معلوم ہو ہی جائے گا۔"

غالب نے کہا "بھوت البتہ ہیں۔ میری تو ان سے سلام علیک نہیں ہوئی لیکن خواتین سے انہوں نے خاصی چھیڑ چھاڑ کی۔"

"بہت لوفر قسم کے جن ہیں" محسن بولا۔

"حسن پرست اور عاشق مزاج ہیں یار" غالب نے کہا۔ "ہماری طرح۔"

"ہم جن نہیں' بھوت ہیں" محسن بولا۔

میں نے کہا "یار' اگر وہ جنات عاشق ہوگئے خواتین پر۔ جیسے کہ یہ اکثر ہو جاتے ہیں تو ہم کیا کریں گے؟ آخر خواتین کو یہ وہم ہوا کیسے؟"

"وہم! بھائی ایک جن خود نازو نے دیکھا۔ تم تو جانتے ہو' وہ کوئی وہمی لڑکی نہیں ہے۔ میں نے مذاق اُڑایا اور کہا کہ کہیں میرے سسر تو نہیں تھے۔ اب ملیں تو مودبانہ سلام عرض کرنا میرا۔ وہ اگر لڑکا دیکھنا چاہیں تو میں حاضر ہوں۔ بس وہ بگڑ گئی"۔ غالب نے کہا "تم جانتے ہو اس کا بگڑنا۔"

میں نے کہا "ہاں' اس نے تمہاری خراب صحت کا لحاظ بھی نہیں کیا' زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟"

غالب جھینپ کر مسکرانے لگا "بس بال بال بچ گیا"

محسن نے اسے حقارت سے دیکھا "صاف بتاؤ ناکہ تم ہی لیٹ گئے تھے۔ چلّانے لگے تھے کہ جنیوا کنونشن کے تحت بیماروں پر دست درازی کی ممانعت ہے۔ تمہاری آہ وزاری کا بھی اس پر اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ تمہیں ملوانا چاہتی تھی سسر سے مگر گل نے جان بچالی تمہاری۔"

میں نے کہا "گل نے کوئی جن بھوت نہیں دیکھا؟"

"اس نے تو حد کردی۔ ایک بھوت کے بارے میں اس کا بیان ہے کہ سرکس کے جوکر کی طرح ہوا میں اُلٹی قلابازیاں کھارہا تھا۔ دوسرے کو اس نے دیکھا کہ تربوز کی طرح گول تھا۔ پھر گھڑی کی طرح لمبا ہوا اور تار کی طرح کھنچتا چلا گیا اور جلیبی بن کے غائب ہوگیا" محسن بولا "میں نے کہا کہ تم بھی شامل ہو جاؤ اس سرکس میں۔ اچھا وقت گزرے گا۔ تب سے روٹھی ہوئی ہے۔"

"اچھا۔ اسی لئے تم دونوں یہاں سڑ رہے ہو دھوپ میں"۔ میں نے کہا "میں کیوں بیٹھا ہوں یہاں۔ جا کے نہا دھولوں۔ صبح سے کچھ کھایا بھی نہیں ہے۔"

اسی وقت گل نے باہر آکے چلّانا شروع کیا "غالب! کیا بات ہے' اندر نہیں آؤ گے؟ ناشتا بھی نہیں کرو گے؟"

نازو نے چلّا کے محسن سے کہا "دماغ خراب ہوگیا ہے کیا؟ سیدھی طرح اندر آجاؤ' ورنہ"

"دیکھا' کیسی چالاک ہیں دونوں" محسن نے کہا "نازو نے غالب سے بات نہیں کی۔ گل نے مجھ سے۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے بھئی۔ تم عیش کرو بیٹھ "اور اٹھ کے اس جھاڑ جھنکاڑ سے باہر آگیا۔

"بھائی سکندر! سمجھا دو ان دونوں کو" گل نے کہا۔

میں نے کہا "اجی لعنت بھیجو دونوں پر۔ چلو ہم اندر چل کے ناشتا کرتے ہیں۔ بھوکے رہیں گے تو خود آئیں گے' ورنہ گھاس کھائیں گے۔"

گل کی شکل رونے والی ہوگئی۔ نازو سمجھ گئی کہ میں اس مشن میں ان کی مدد کے نیک کام سے عمداً گریز کررہا ہوں۔

اس نے پھر محسن سے کہا "اب باہر آتے ہو یا نہیں؟"

محسن بولا "تم آجاؤ نا یہاں۔ گرگٹ اور نیولے تمہیں کھا تو نہیں جائیں گے۔"

غالب نے کہا "ورنہ جو کہنا ہے' وہیں سے کہہ دو۔"

"محسن! سنا نہیں' میں کیا کہہ رہی ہوں؟" نازو نے کہا۔

"نہیں سنا۔ جاؤ' جو کرنا ہے کرلو۔ ہم بہرے ہیں۔"

نازو نے ایک پتھر اٹھایا پھر دوسرا۔ اس کا نشانہ خاصا صحیح رہا۔ گل نے اس کی تقلید کی۔

"ارے۔ رے۔ ارے پاگل ہوگئی ہو۔ یار سکندر' پکڑنا اس بھوت کی بچی کو" غالب نے گھاس میں اِدھر اُدھر دوڑ لگاتے ہوئے کہا۔ ایک پتھر اس کی کمر پر لگا تو وہ بلبلایا۔

"اے گل! یہ کیا ہو رہا ہے؟ سنگسار کرے گی مجھے! میں بھی آجاؤں گا بھوت بن کے۔ بھوت سرکس میں۔" محسن نے خود کو پتھروں کی یلغار سے بچانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ایک چھوٹا سا پتھر اس کی گردن پر بھی لگا۔ پتھروں کی وہاں کمی نہیں تھی بالآخر ان دونوں کو باہر آنا پڑا۔ گل نے غالب کو اور نازو نے محسن کو مجبور کردیا۔

غالب نے کہا "اچھا' میں آتا ہوں لیکن میں ایک گرگٹ کے ساتھ آرہا ہوں۔"

"اور میں ایک نیولا ساتھ لے کر آؤں گا۔"

وہ دونوں ہنسنے لگیں "تم میں سے کون نیولا ہے اور کون گرگٹ؟" میں نے ان سے ایک منطقی سوال کیا۔ رابعہ اور خان میرے پیچھے کھڑے مسکراتے رہے۔

محمد خان اور اس کے ساتھی نہ جانے کدھر غائب ہوگئے تھے۔ میں نے اپنے کمرے میں جاکے دیکھا تو عجیب بے سروسامانی تھی۔ اُدھڑے ہوئے فرش پر بستر لگادیئے گئے تھے اور ہمارے سامان کے سوٹ کیس بوسیدہ دیواروں کے ساتھ کھڑے ہوئے تھے۔ دیواروں پر شاید بیس سال سے رنگ نہیں ہوا تھا۔ پرانا زرد رنگ مٹیالا ہو رہا تھا چنانچہ سب وال لائٹس جلانے کے باوجود اُجالا کم محسوس ہوتا تھا۔

جتنی دیر میں غالب اور محسن کے ساتھ باتوں میں مصروف رہا تھا' رابعہ نے گل اور نازو کو رات بھر کے واقعات کا سنانے کے علاوہ بھوتوں سے ملاقات کے سنسنی خیز واقعات بھی سن لئے تھے اور پھر ہینڈ پمپ والے غسل خانے میں نہا دھو کے کپڑے بھی بدل لئے تھے۔ میں خود چاہتا تھا کہ اب پولیس کی وردی اتار کے انسان بن جاؤں۔

رابعہ نے باتھ روم تک میری رہنمائی کی "خیال رکھنا۔ اندر کہیں بھوت نہ آجائے' بھوت سے ملنے۔"

میں نے سہم کے کہا "اچھا' تو تم ساتھ ہونا۔ مجھے ڈر لگتا ہے" اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"ہٹو۔ بے شرم" رابعہ نے اپنا ہاتھ چھڑایا اور بھاگ گئی۔ اس کے شرمانے اور مسکرانے کی ادا نے میرے دل کا قیمہ کردیا۔

گل اور نازو نے بڑی محنت سے ناشتا بنایا تھا اور بہت بنایا تھا مگر جب ہم کھانے بیٹھے تو سب چٹ کرگئے۔ کسی کو خیال ہی نہیں آیا کہ تکلف اور خدمت گزاری میں لڑکیوں نے تو کچھ بھی نہیں کھایا۔

جیسے ہی مجھے اس کا احساس ہوا' میں نے سب کو ڈانٹا۔ "سب ادب آداب بھول گئے ہو شریف آدمیو۔ اصول ہے کہ لیڈیز فرسٹ۔"

"بھاڑ میں گیا شریف آدمی۔ کون ہے ان میں لیڈی؟ وہ جس نے میری کمر پر سوا سیر کا پتھر مارا تھا" غالب نے نازو کو آنکھیں نکال کے گھورا۔

"نشانہ چوک گیا تو میں کیا کروں" نازو نے بھی جواب میں اسے گھورا "میں نے تو سر پر مارا تھا۔ تم آرام سے نہیں کھڑے رہ سکتے تھے۔"

"اور اسے دیکھو۔ نام ہے گل اور پھینکتی ہے شرفا پر پتھر" محسن نے کہا "یقیناً میرا منکا ٹوٹ چکا ہے گردن کا۔ دیکھو سر کیسے ہل رہا ہے" اس نے سر کو دائیں بائیں ہلا کے دکھایا۔

میں نے کہا "چلو جھگڑا ختم۔ صلح کرلو۔"

نازو نے کہا "غالب کو ماننا پڑے گا کہ یہاں بھوت ہیں!!"

گل نے سر ہلایا "اور محسن کو بھی۔"

غالب نے کہا "بابا' میں نے کب انکار کیا تھا۔ بھوت تو ہے لیکن ہے وہی۔"

نازو لپک کے اٹھی "میں بتاتی ہوں تمہیں کہ وہ کون ہے"

غالب چھلانگ لگا کے میرے پیچھے آگیا "خود تم نے ہی بتایا تھا اس کا حلیہ۔ اس سے وہ میرا سسر ہی ثابت ہوتا ہے اور میں اپنے سسر کو جن کہوں یا بھوت' تم کیوں چڑتی ہو۔ تم دس دفعہ کہو اپنے سسر کو بھوت۔ مجھے کیا۔ زبردستی گلے کیوں پڑ رہی ہو میرے؟"

ہم سب ہنسنے لگے تو نازو کا چہرہ جو پہلے شرم سے گلابی ہوا تھا' غصے سے لال ہوگیا۔ اس نے پیر پٹخ کر گل سے کہا "چلو گل' اٹھاؤ یہ برتن۔ مل کے دھو لیتے ہیں۔ تم نل چلانا' میں برتن صاف کرلوں گی۔"

"ہائے ہائے۔ برتن بھی دھونے پڑیں گے بے چاریوں کو۔ ان کی حیثیت تو واقعی کنیزوں جیسی ہو گئی۔" محسن بولا۔

میں نے کہا۔ "تمہاری بک بک کی سزا یہ ہے کہ تم جاؤ گل کے ساتھ برتن دھلواؤ۔"

"چلو غلام!" گل نے بڑی شوخی سے حکم دیا۔ میرا مقصد گل اور محسن کو کچھ دیر کے لئے رخصت کرنا تھا تاکہ میں باقی سب کو شہلا کے بارے میں بتا سکوں۔ اس طرح گل اور محسن کی صلح بھی ہو جاتی اور باتوں میں غالب اور نازو بھی اپنا جھگڑا بھول جاتے لیکن گل کی تو دل کی مراد بر آئی۔ محسن کا چہرہ اتر گیا مگر اسے جانا پڑا۔ عمارت میں انڈر گراؤنڈ ٹینک بھی تھا اور اوپر بھی لیکن برسوں سے استعمال نہیں ہوا تھا چنانچہ پانی کی موٹر بھی زنگ لگنے سے جام ہو چکی تھی۔ غالب نے بتایا کہ ہینڈ پمپ بھی خراب پڑا تھا مگر اسے کسی نے تیل ڈال کے چلا دیا تھا۔

میں نے کم سے کم الفاظ میں غالب اور نازو کو شہلا کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ صدمہ غالب کو بھی شدید پہنچا مگر نازو کا تو رنگ پیلا پڑ گیا۔ اس کا جسم ٹھنڈا ہو کر کانپنے لگا۔

"شہلا باجی.... تابوت میں.... بچے کے ساتھ!" اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ اس پر خوف کا ہسٹریا غالب آنے لگا تھا۔ غالب نے اسے فوراً سنبھال لیا "اے نازو! یہ کیا ہو رہا ہے؟" اس نے نازو کو جھنجوڑا اور پھر اس کے منہ پر ایک طمانچہ مارا۔ نازو ایک جھٹکے سے ہوش میں آ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"خدا کے واسطے نازو! ابھی وہ دونوں آ جائیں گے۔" غالب نے کہا۔

اگرچہ مجھے امید تھی کہ گل برتن دھونے کے بہانے محسن کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے کی کوشش کرے گی مگر میں نے بھی کہا۔ "عقل سے کام لو نازو۔ سوچو، محسن کا کیا حال ہو گا اگر اسے یہ بات معلوم ہو گئی؟"

غالب نے نازو کے دوپٹے سے اس کے آنسو صاف کئے۔ "اتنا ظلم مت کرو مجھ پر۔ میں تمہیں روتا نہیں دیکھ سکتا نازو۔"

رابعہ میری طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرائی۔

"میں کیا کروں غالب؟ لگتا ہے، میرا دل پھٹ جائے گا۔"

غالب نے کہا۔ "پاگل۔ ابھی کچھ ہوا تو نہیں ہے شہلا کو۔ ہم سب مل کے اسے بچا لیں گے۔"

نازو نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا اور ایک لمبی ہچکی سسکی لی۔ کچھ دیر پہلے دشمنوں کی طرح لڑنے والے اب سراپا ناز و نیاز تھے اور ہماری موجودگی کو بھی بھولے ہوئے تھے۔

میں نے کہا۔ "ہمت سے کام تو لینا ہو گا ہم سب کو۔ اور یہ ایک بہت کٹھن کام ہے۔ معلوم نہیں، آگے کیا ہو۔ اس سے بھی زیادہ سخت آزمائش کا سامنا ہو۔ جذبات کو ہمارے مقصد کی راہ میں حائل نہیں ہونا چاہئے۔ ہم شہلا کو بچانے کے لئے جان کی بازی بھی لگا دیں گے کیونکہ وہ محسن کی جان ہے۔ لیکن محسن کو بچانا بھی اتنا ہی ضروری ہے۔"

"ہم محسن کو دھوکے میں رکھیں گے؟ آخر کب تک؟" نازو نے کہا۔

میں نے کہا۔ "جب تک ہم شہلا کو حاصل نہیں کر لیتے۔"

"اور اگر......"

میں نے کہا۔ "اس سے آگے مت سوچو کیونکہ سوچ کی اس خندق میں بڑے خونی عفریت نظر آتے ہیں۔ سفاک اور دہشت زدہ کر دینے والے خیالوں کے عفریت۔ ان سے اپنے آپ کو بچاؤ تاکہ ہم ٹھنڈے دل اور دماغ کے ساتھ۔ امید کے ساتھ اور نیک خواہشات کے ساتھ ہر قدم اٹھانے کے قابل ہوں۔"

نازو سر جھکائے بیٹھی رہی۔ رابعہ سپاٹ دیوار کو گھورتی رہی۔ غالب اپنے ناخنوں کو کاٹتا رہا۔ ہم سب کے لئے نہ سوچنا ممکن نہیں تھا اور جو کچھ ہم سوچ رہے تھے، وہ دوسروں سے چھپانا چاہتے تھے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ایسا ہی دوسرے بھی سوچ رہے ہیں۔ ہمارے ساتھ اپنے اپنے دکھی دل تھے۔ اپنا اپنا احساسِ جرم و بے بسی تھا اور اپنی اپنی مجبوریاں تھیں۔ کوئی نہیں جان سکتا تھا کہ کل کیا ہو گا اور کیسے ہو گا۔ صرف یہ چاہنے سے کہ ایسا نہ ہو، کوئی فرق نہیں پڑ سکتا تھا۔ مستقبل کے اندھیرے میں کچھ دیکھنے کے لئے تصور بھی ناکام تھا۔

گل کی ہنسی پر ہم سب سنبھل گئے۔ وہ کام ختم کر کے آ رہے تھے۔

محسن نے کہا "ورزش اچھی ہے۔ آئندہ ہم ہی برتن دھوئیں گے۔"

گل کھلکھلا کے ہنسی "تمہیں تو بس بہانے کی تلاش تھی۔"

میرا دل بیٹھنے لگا۔ نادان لڑکی۔ اس کھیل میں کتنی آگے نکل گئی تھی۔ قصور اس کا نہیں تھا۔ ہمارا تھا کہ ہم نے اسے سراب عطا کئے۔ اس راستے پر چلتے چلتے ایک دن اچانک اسے احساس ہو گا کہ وہ تنہا رہ گئی ہے۔ محسن تو شہلا کے ساتھ اور اپنے بچے کے ساتھ اپنی دنیا بسانے کے لئے جا چکا ہے۔ ہم نے محسن سے کہا تھا کہ اس لڑکی نے بہت دکھ جھیلے ہیں۔ اسے یادوں کے پُر عذاب ماضی سے نکالنے کے لئے اور اس کی تنہائی کے احساس کو مٹانے کے لئے اسے محبت دینا ہو گی۔ یہ پڑھی لکھی لڑکی اپنے بھائی کے ساتھ ڈاکو بنی تھی اور ڈاکوؤں میں رہی تھی۔ اس کو حالات کے گرداب سے نکالنا ضروری تھا۔ اس کا بھائی مرتے وقت ناگ منی کو ہمارے سپرد کر گیا تھا جسے ہم سب نے پھر گل بانو بنا دیا تھا اور اگرچہ محنت ہم سب نے کی تھی مگر سب سے زیادہ محسن نے کی تھی کیونکہ گل نے اسی سے محبت مانگی تھی اور محسن نے ہمارے مجبور کرنے پر اسے انکار نہیں کیا تھا۔ اب یہ کھیل بہت خطرناک ہوتا جا رہا تھا لیکن اسے ختم کرنے کی فوری طور پر کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ پہلے محسن اس سے ایک جھوٹ نبھاتا رہا تھا۔ اب ہم اس سے بڑے جھوٹ کو نبھانے پر مجبور تھے۔

ہم سب کی خاموشی محسن کو بہت خلاف توقع محسوس ہوئی "کیوں دوستو! ایسے رونی صورتیں بنائے کیوں بیٹھے ہو؟"

غالب نے ایک پرانا مذاق دہرایا "صورت ہی ایسی ہے بھائی۔"

محسن نے نازو کو دیکھا جس کی پلکوں پر آنسوؤں کی نمی اب بھی باقی تھی۔ وہ قہقہہ مار کے ہنسا "گویا روٹھنا منانا، رونا دھونا سب ہو چکا۔"

میں بھی زبردستی ہنسا "ڈراما تو پورا ہوتا ہے شیروانی صاحب!"

"بہت ناشکرے ہو سب" گل نے کہا "آنسوؤں کی بھی قدر نہیں کرتے۔ یہ بھی ڈراما ہے تمہارے لئے۔ چل چھوڑ نازو۔"

محسن نے بھی کہا "چل چھوڑ غالب۔ جذباتی مت ہو۔ لڑکیاں تو موقع بے موقع آنسوؤں سے بلیک میل کرتی ہیں۔ بہت آنسو ہوتے ہیں ان کے اسٹاک میں۔"

میں نے کہا "چلو یار، اپنے مقبرے کی سیر تو کر لیں۔"

"ہاں چلو، شاید وہ بزرگ پھر مل جائیں غالب کو" محسن نے نازو کو چھیڑنے کی کوشش کی۔ اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

ہم باہر نکلے تو سامنے سے محمد خان آتا دکھائی دیا۔

"کہاں کی تیاری ہے؟" اس نے خوشدلی سے کہا۔

میں نے کہا "کفن باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں۔"

خان نے مونچھوں پر تاؤ دے کر کہا "قسم اللہ کی۔ ایسا مت کہو۔ ابھی تو ہنسنے کھیلنے کے دن ہیں تمہارے۔"

میں نے کہا "ابھی تو زندگی ایسے ہی گزر رہی ہے۔ آج کے دن کی صبح دیکھنے کو ملی۔ یہ بھی غنیمت ہے۔"

اس نے کہا "دلاور سے ملاقات ہوئی؟"

میں نے کہا "ہاں، اس کا قرض بڑھ گیا۔"

"کیا مطلب؟ اس نے تو کوئی تحفہ دینے کو کہا تھا۔"

میں نے کہا "اس کا ہر تحفہ ایک دن اسے لوٹانا ہے۔ ذلت و رسوائی، دل کے داغ اور روح کے زخم۔ عزتِ نفس کا خون اور ہمارے جذبۂ حب الوطنی کے منہ پر طمانچے یہی سب تحفے دیتا ہے وہ ہر ملاقات میں جن کا میرے پاس پورا حساب ہے۔"

"قسم اللہ کی!" خان ایک دم سنجیدہ ہو گیا "مجھے بتاؤ، اگر تمہارے ساتھ کوئی زیادتی ہوئی ہے۔ ادھر آؤ۔ اب وہ ہے میرا کمرا۔"

اس کا کمرا راہداری کا آخری کمرا تھا۔ اس کے اندر کا نقشہ بالکل ویسا ہی تھا جیسا پرانی رہائش گاہ کے کمرے کا۔ وہ تخت پر بیٹھ گیا اور میں نے اس کے ساتھ بیٹھنے کو ترجیح دی۔ غالب اور محسن سامنے بیٹھ گئے تو میں نے اسے ابتدا سے انتہا تک اپنے ساتھ پیش آنے والے سارے واقعات بتا دیئے۔ درمیان میں کئی بار خان طیش میں آیا۔ اس نے دلاور کی ماں بہن کو یاد کرتے ہوئے بہت کچھ کہا لیکن میں نے اسے ٹھنڈا کر دیا۔

"میں تو شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا تمہارا۔"

"شکریہ!" وہ حیران ہو کے بولا "کس بات کا؟"

"ہاں۔ تم نے بڑا اچھا انتظام کیا تھا ملاقات کا۔ ورنہ ہم بچ کے نہ آتے۔" میں نے کہا۔

"خدا کا شکر ادا کرو کہ مجھے اطلاع پہنچ گئی۔ میں نے تو تمہیں دلاور سے ملاقات کے لئے نہیں بھیجا تھا اور نہ کوئی انتظام کیا تھا تمہاری حفاظت کا لیکن جیسے ہی مجھے معلوم ہوا کہ وہ تمہیں لے گئے ہیں، میں نے بھی دیر نہیں کی قسم اللہ کی۔"

میں نے کہا "تمہیں کیا فرشتوں نے اطلاع کر دی تھی؟"

وہ بولا "ہاں۔ فرشتہ کہو اسے یا کچھ اور۔ میں نے یوسفِ ثانی کو تمہارے پیچھے لگا دیا تھا۔ اس سے کہا تھا کہ دور ہی سے ان پر نظر رکھنا اور اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو تو مجھے فوراً بتانا۔"

میں بھونچکا رہ گیا "یعنی.... یہ سب معلوم تھا تمہیں؟"

"تمہارے اغوا ہونے تک کی رپورٹ میرے پاس تھی۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ تمہیں کہاں لے جایا گیا ہے" محمد خان نے مونچھوں پر تاؤ دے کر کہا "قسم اللہ کی، میں تو باجا بجا دیتا سب کا۔"

میں نے کہا "اس جوکر نے کیسے اندازہ کر لیا کہ ہمیں دلاور لے گیا ہے اور کہاں لے گیا ہے؟"

"یہ تو اسے واقعی معلوم نہیں تھا لیکن اس نے ٹیلی فون کر کے بتا دیا کہ انہیں کوئی اغوا کر کے لے گیا ہے تو میں سمجھ گیا کہ ایسی حرکت دلاور کے سوا کون کر سکتا ہے۔ بس اسی وقت میں نے چار وفادار ساتھ لئے اور پہنچ گیا سیدھا تریونی کی دکان پر۔ تیور تو پہچانتا ہے وہ میرے۔ میں نے ریوالور اس کے سامنے رکھ دیا اور کہا کہ قسم اللہ کی! اگر میرے مہمانوں کو کچھ ہوا تو سمجھ لو، تمہارا بھی کریا کرم ہو گیا۔ وہ اپنے کمرے میں تھا۔ میرا ایک آدمی گیٹ پر رک گیا۔ باقی تین نے اندر پوزیشن سنبھال لی۔ تریونی پہلے تو بڑا اچھلا کہ مجھے کچھ نہیں معلوم۔ لیکن میں نے کہا کہ معلوم کرو بیٹے۔ ہم یہیں بیٹھے ہیں اور جانے کے ارادے سے نہیں آئے ہیں۔ جب تک ہمارے مہمان واپس نہیں آ جاتے، ہم بھی گھر نہیں جا سکتے۔ کوئی باہر نہیں جا سکتا!

اور اندر نہیں آسکتا۔ وہ کہنے لگا کہ دکان میں گاہک ہیں۔ میں نے کہا کہ انہیں ہم نے کچھ نہیں کہا اور تم نے بھی کچھ نہ کہا تو وہ جیسے آئے تھے، ویسے ہی چلے جائیں گے، ورنہ قسم اللہ کی، وہ بھی روک لئے جائیں گے۔ خیر، اس نے دکان کا دروازہ بند کرکے شیشے پر لٹکی ہوئی تختی کو الٹادیا۔ ایک طرف لکھا ہوا ہے اوپن۔ دوسری طرف کلوزڈ۔ باہر کی لائٹس بھی میں نے بند کرادیں تاکہ اور گاہک اندر نہ آئیں۔ ویسے بھی دکان بند کرنے کا وقت تو ہوگیا تھا۔ گاہک رخصت ہوگئے تو چار سیلز مین رہ گئے تریوینی نے کہیں فون کیا۔ پھر ایک سیلز مین کو کہیں بھیجا۔ دوسرے کو کسی اور سمت میں روانہ کیا۔ میں نے اسے سمجھادیا تھا کہ بیٹے، اپنی زندگی اور اپنے اتنے بڑے کاروبار کا جُوا مت کھیلنا میرے ساتھ۔ قسم اللہ کی، یہ سب ایک دھماکے سے اُڑ جائے گا۔ میرے تین ساتھیوں نے اسے تین دستی بم دکھائے تو اس کا پیشاب خطا ہوگیا۔ ایک تو سالا بنیا ویسے بھی بزدل ہوتا ہے۔ پھر پیسہ آجائے تو..... ہوجاتا ہے۔" خان نے ایک ناشائستہ مثال دے کے کہا۔ اس نے موٹی مرغی سے متعلق ایک محاورہ بھی بولا۔

میرے ساتھ غالب اور محسن بھی ہنس پڑے "یہ تو آپ نے ٹھیک کہا خان صاحب۔ پیسے والے کی جان اس کے مال میں پھنس جاتی ہے۔ جان لینی ہو تو مال لے لو۔"

خان نے کہا "قسم اللہ کی، اگر وہ چالاک یا بہادر بننے کی کوشش کرتا تو مارا جاتا۔ میں نے اسے بتادیا تھا کہ میرے ریوالور میں چھ گولیاں ہیں۔ سب اتاردوں گا اندر اور ہم یہ تین دستی بم اندر پھینک کر نکل جائیں گے۔ پولیس کے آنے تک تم پہنچ جاؤ گے پرلوک اور ہم ہوں گے اپنے ٹھکانے پر۔ خونی خان کے سائے کا بھی سراغ نہیں لگاسکتی پولیس۔ تریوینی بولا کہ میں دلاور کو تمہارے حوالے کردیتا ہوں۔ میری طرف سے وہ جہنم میں جائے۔ اس کے ساتھ کاروبار ضرور ہے میرا۔ کوئی جنم مرن کا ساتھ نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ قسم اللہ کی، تم بنیے دنیاوی معاملات میں بڑے سیانے ہوتے ہو۔ کاروبار پر دوستی کو اور رشتوں کو کتنی آسانی سے قربان کردیتے ہو۔ خیر۔ کوئی آدھے گھنٹے میں پہلا سیلز مین لوٹ آیا۔ اس نے دلاور کا سراغ لگالیا تھا۔ تریوینی نے وہیں میرے سامنے بیٹھ کے دلاور کو فون کیا۔"

میں نے کہا "اچھا وہ تمہارا ہی فون ہوگا۔ وہ بات کرتے کرتے اٹھ کر گیا تھا۔ اور واپس آیا تھا تو اس کی ہوا کچھ نکلی ہوئی تھی۔ حالانکہ ظاہر اس نے نہیں ہونے دیا تھا۔ خیر کیا بات ہوئی ان کی؟"

خان نے کہا۔ "وہ ہینڈ فری ٹیلی فون تھا جس میں آواز اسپیکر سے نکلتی ہے۔ تریوینی نے کہا۔ دلاور.... تم رابعہ اور لے گئے ہو؟ دلاور نے کہا "نہیں" تریوینی نے اسے گالی دے کر کہا کہ "جھوٹ مت بولو ورنہ میں آرہا ہوں" دلاور نے کہا "کہاں آرہے ہو سیٹھ صاحب۔ ہم بھی استقبال کے لئے تیار ہوجائیں۔" اس پر تریوینی نے کہا "دلاور اس شہر میں تم کہیں بھی جاکے دیکھو۔ مجھے معلوم نہ ہو تو تریونی نہیں، یہ سمجھنا کہ میں بمبئی کی گلی کا کتا ہوں۔ یہ میرا شہر ہے دلاور اور میرا نام ہے تریوینی۔ کسی سے پوچھ کے دیکھو اس نام کا مطلب۔" وہ کہنے لگا "ہاں۔ اپنی گلی میں تو کتا بھی شیر ہوتا ہے۔" تریوینی نے کہا "تو یہ بات سمجھ لو کہ بمبئی میری گلی ہے تمہاری نہیں۔ آنکھ بند کرکے میں کسی پر بھروسا کرنے کا قائل نہیں ہوں اور تمہارے جیسے آدمی پر تو شیطان بھی بھروسا نہیں کرسکتا۔ تم کس وقت کہاں ہو اور کیا کررہے ہو اس کی خبر مجھے ملتی رہتی ہے۔ اس وقت بھی میرے آدمی وہاں موجود ہیں" وہ کہنے لگا کہ "پھر۔ کیا چاہتے ہو تم" اس نے کہا "تم جن کو اٹھاکر لے گئے ہو۔ انہیں خراش بھی نہیں آنی چاہئے ورنہ...." دلاور نے کہا "ورنہ کیا ہوگا؟" تریوینی نے کہا "ورنہ خونی خان میرا خون پی جائے گا۔ وہ اس وقت میرے سامنے موجود ہے اپنی فوج کے ساتھ۔ اس نے کہا ہے کہ وہ چھ سوراخ میرے جسم میں کرے گا اور تین دستی بم میری دکان میں پھینک کر چلا جائے گا۔ اب سمجھے کہ میں کیا چاہتا ہوں اور کیوں چاہتا ہوں؟" دلاور نے مجھے بہت گالیاں دیں اور اپنا تو دماغ ہے پٹھان کا دماغ۔ بھنق سے اُڑ گیا میں نے کہا "قسم اللہ کی! تو دلاور ہے تو وہیں ٹھہر۔ میں آتا ہوں تیرا بھی باجا بجانے" بس اس کے بعد وہ بھی دلاور نہیں رہا۔ بزدل ہوگیا۔ اس نے کہا "خان صاحب! آپ کے مہمان ہمارے مہمان۔ صبح واپس آئیں تو اندر باہر سے اچھی طرح چیک کرلینا ایک ایک اسکریو اور پیچ ٹائٹ ملے گا۔ سارے کنکشن ٹھیک ہوں گے۔ کوئی بتی فیوز نہیں ہوگی۔ بیٹری ڈاؤن نہیں ہوگی۔ ٹیوننگ فرسٹ کلاس اور گاڑی چلتی ہوئی جیسے آئی تھی ویسے ہی رواں ملے گی" میں نے کہا۔ "سالے مکینک کی اولاد۔ میں بندوں کی بات کررہا ہوں۔ قسم اللہ کی۔ ان کا بال بھی بیکا ہوا تو تیری زندگی کے سارے ٹائر فلیٹ کردوں گا۔ انجن سیز ہوجائے گا اور چیسس سے پتا نہیں چلے گا کہ یہ آدمی تھا یا سُور کا بچہ" بس اس کے بعد میں نے فون بند کردیا۔"

ہم سب درمیان میں کئی بار ہنسے تھے۔ خان آج موڈ میں تھا اور بات بھی ایسی ہی تھی۔ درمیان میں اس نے جو غیر پارلیمانی زبان استعمال کی اسے میں نے حذف کردیا ہے۔

اس کی بات ختم ہوئی تو میں نے کہا "کیا واقعی تمہارے آدمی وہاں پہنچ چکے تھے؟"

"تم کیا سمجھتے ہو، خونی خان ایسے ہی گیدڑ بھبکی دیتا ہے؟"

میں نے کہا "مجھے تو کوئی نظر آیا نہیں۔ وہاں سے

کے بعد۔"

خان نے کہا "اپنے ساتھی ایسے احمق ساتھی نہیں ہوتے، قسم اللہ کی!"

میں نے کہا "تم رات بھر وہاں بیٹھے رہے۔ تو پھر انتقال کیسے ہوا سرکار۔"

"کس کا انتقال ہوا؟" خان نے حیرانی سے کہا۔

میں نے کہا "میرا مطلب تھا سامان کیسے منتقل ہوا؟"

محمد خان نے مسکراتے ہوئے کہا "تم نے تو ڈرا ہی دیا تھا مجھے۔ میں وہاں رات بھر نہیں رکا تھا۔ تریوینی البتہ بیٹھا رہا اور اس کے سیلز مین بھی۔ بھوں بھوں کرکے روتا رہا۔"

"ان کی چھٹی کب ہوئی؟"

"صبح جب یوسفِ ثانی نے اطلاع دی کہ تم واپس پہنچ گئے ہو۔ اسے میں نے باہر کھڑا کیا تھا۔ پتا نہیں اونگھ گیا تھا اُنچی کا بچہ۔ کہ تم سیدھے اندر چلے گئے تھے۔ بڑی بری عادت ہے اسے۔"

میں نے کہا "افیون سے شغل فرماتے ہیں شہزادہ گلفام!"

غالب نے کہا "مجھے بھی صورت سے ایسا ہی لگتا تھا۔ اگر وہ اینچی نہ ہوتا تو مجھے حیرت ہوتی۔ بلکہ افسوس ہوتا۔"

دلاور کے ساتھ ملاقات کا تذکرہ کرتے وقت میرے ذہن میں ایک خوف جاگزیں رہتا تھا کہ کہیں غیر ارادی طور پر میں شہلا کے بارے میں کسی سچائی کا اشارہ نہ کرجاؤں۔ مجھے اور میرے ساتھ سب کو ایک سی مجبوری کا سامنا تھا۔ ہم سب شہلا کے خیال کو ذہن سے جھٹک نہیں سکتے تھے۔ اور میری حالت تو یہ تھی کہ ہر وقت ہی اس شیشے کے تابوت کا روح فرسا تصور بہت سے سوالوں کے عذاب کو مجھ پر مسلط رکھتا تھا جس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا کہ ہم شہلا کو کیسے بچائیں گے۔ کیا ہم شہلا کی خاطر اپنے عزائم سے دستبردار ہوجائیں گے، اس سے جذباتی وابستگی ہمارے ارادوں کی راہ میں دیوار بن جائے گی۔ یا ہم محسن کی پروا کئے بغیر اس کی بیوی کو، اور بیٹے کو، اسے بتائے بغیر اپنے مشن کی بھینٹ چڑھادیں گے؟ اور پھر انہیں ایسے بھول جائیں گے جیسے وہ رشتوں کی زنجیر سے منسلک جیتے جاگتے انسانوں کی دنیا سے تعلق رکھنے والے اور محسن کے خوابوں کے تعبیر نہیں۔ فقط ایک سنگ گراں تھے جو ہماری راہ میں حائل ہوا تو ہم نے اسے ہٹادیا، یا دیوار تھے جسے ہم نے گرادیا اور آگے بڑھ گئے۔ وہ پتھر یا دیوار نہیں تھے۔ خود ہماری زندگی کا ایک حصہ تھے۔ یہ ناممکن تھا کہ ہم محسن کے ساتھ وہ کریں جو کوئی اپنے بدترین دشمن کے ساتھ بھی نہیں کرسکتا۔ کہ اسے بتائے بغیر خود اس کی موجودگی میں اور اسی کے ہاتھ، اس کے خاندان کا وجود ختم کرادیں اور اپنے اس جرم پر، جھوٹ پر اور فریب پر کسی بے رحم حقیقت کا پردہ ڈالے رکھیں کہ یہ حالات کا تقاضا تھا اور سفاکی اور سنگدلی کے اس مظاہرے کو ادائے فرض کی ضرورت کا جواز عطا کریں اور مطمئن ہوجائیں۔ کیا بعد میں شرمندگی، افسوس اور دلی رنج کا اظہار محسن کے لئے کافی ہوگا؟"

میرا خیال ہے کہ اپنی تمام زندگی میں میرے لئے ایسا سخت ترین امتحان نہیں آیا۔ میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ ہم شہلا کو بچالیں گے۔ نہ بچاسکے تو کبھی محسن کے سامنے اعترافِ جرم کرسکیں گے اور اس کے بعد محسن کو یقین دلانے کے قابل ہوں گے کہ ہم اب بھی اس کے دوست ہیں اور اس کی زندگی حسب سابق جینے کے قابل ہے۔ بظاہر یہ ناممکن لگتا تھا۔ تاہم اس احساس کے سامنے ابھی سے شکست تسلیم کرلینا بھی غلط تھا۔ ہم خدا سے دعا کرسکتے تھے کہ وہ ہم پر اپنا کرم رکھے اور ہمیں حوصلہ دے کہ ہم اس امتحان سے گزر جائیں یا حالات کے دھارے کا رخ ہماری خواہشات کے مطابق رکھے۔ وہ قادرِ مطلق تھا اور اس کے قبضۂ قدرت میں سب کچھ تھا۔

غالب نے مجھ سے کہا "اے بھائی، کیا بیٹھے بیٹھے سوگیا؟" تو میں چونکا "آنکھیں تو کھلی ہوئی ہیں۔"

"اپنے سکندر صاحب سوچ بچار کے ڈونگے سمندر میں غوطہ زن تھے۔ ہیں جی؟" محسن نے دلاور کے انداز میں کہا۔ "ہم تو یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ کس کے خیال میں غرق تھے۔"

مجھے یوں لگا جیسے محسن نے میری چوری پکڑ لی ہے اور اسے معلوم ہوگیا ہے کہ میں شہلا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ مجھے آرام کی اشد ضرورت ہے" اور اٹھ کھڑا ہوا "میرا دماغ کام نہیں کررہا ہے۔"

"کوئی بھی چیز بیکار پڑی رہے تو ناکارہ ہوجاتی ہے۔" محسن نے کہا "کچھ یاد ہے کہ آخری بار دماغ کب کام آیا تھا۔"

غالب نے کہا "بچپن کی بات ہے۔ اب کہاں یاد ہوگی۔"

محسن نے کہا "ہاں، اس کے بعد تو دلِ خانہ خراب کو اختیار رہا۔"

میں نے ان کو جواب نہیں دیا اور کمرے میں آکے فرشی بستر پر لیٹ گیا جہاں نازو اور گل چپ بیٹھی تھیں۔ شہلا کے تصور کا آسیب ان کے اعصاب پر بھی مسلط ہوگیا تھا۔ رات بھر کی تھکی ہوئی رابعہ ایک کونے میں سمٹی پڑی ہوئی تھی۔ میں سگریٹ جلاکر دھوئیں کو نیم تاریک چھت کی طرف اٹھتا دیکھتا رہا۔ دھوئیں کے مرغولوں میں رہ رہ کے شہلا کا چہرہ ابھر آتا تھا۔ اس کے چہرے کے ہزار روپ تھے جو میں نے دیکھے تھے۔ پہلی ملاقات سے اب تک میں نے اسے ہنستے مسکراتے

بہاتے ' محبت کرتے ' روٹھتے مناتے ' شرماتے لجاتے ' ماتا کی روشنی سے جگمگاتے ' خوابوں کی تعبیر پالینے کی خوشی سے دمکتے اور وردِ فرقت میں آنے والے دن کے یقین سے بہلتے دیکھا تھا۔ مگر یہ سب لمحوں کے عکس تھے جو آج میری یادوں کے نہاں خانوں سے نکل کر تصور سے چلا پا رہے تھے ۔ لیکن وہ نقش آخر جس سے مفر نہ تھا اس زخمِ لادوا کی طرح تھا جس کی ٹیس چھپائی نہ جاسکتی ہو۔ نازو اور گل کچن کی طرف چلی گئی تھیں۔ اچانک میں نے رابعہ کو سسکی لے کر روتے دیکھا۔ وہ آہستہ سے سر جھٹک کر چلّائی " نہیں۔ شہلا کو اس کا بچّہ دے دو ۔ اس کے بچے کو مت بیچو ۔ "

میں نے اسے شانے سے پکڑ کے جھنجوڑا " رابعہ ! "

رابعہ نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں خوف کا سانپ کنڈلی مارے نظر آیا " انہیں ... تم خرید لو سکندر ۔ "

میں نے کہا " کیا فضول بولے چلی جارہی ہو ۔ "

رابعہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے " انہیں خرید لو شہلا کو اور اس کے بیٹے کو ۔ "

" یہ کیا کہہ رہی ہو تم رابعہ ۔ ہوش میں آؤ " میں نے برہمی سے کہا " اپنی زبان پر ہی نہیں خیالوں پر بھی قابو رکھو ' خوابوں کو اپنے کنٹرول میں رکھو ۔ "

رابعہ اٹھ بیٹھی " میں ٹھیک کہہ رہی ہوں ۔ "

" خاک ٹھیک کہہ رہی ہو۔ تم ابھی تک ہوش میں نہیں ہو۔ اگر تم نے سوتے جاگتے بولنا شروع کردیا تو ہم سب کے کوشش کرنے سے کچھ بھی نہیں ہوگا۔ محسن کو سب معلوم ہوجائے گا ۔ "

" سکندر ' میری بات سن لو پہلے " رابعہ نے لجاجت سے کہا " دیکھو ' ہمارے پاس پیسہ کم تو نہیں ہے ' پیسہ اور بھی حاصل کرسکتے ہیں ہم۔ محمد خان ہماری مدد کرسکتا ہے۔ دس بیس لاکھ "

میں نے کنفیوز ہو کر کہا " آخر کیا کرنا ہے پیسے سے ؟ "

رابعہ نے کہا " شہلا کی اور اس کے بچے کی زندگی خرید لو "

میں نے کہا " کیسے خرید لوں ' کیا انہوں نے کوئی قیمت مانگی ہے ؟ "

رابعہ نے کہا " قیمت تم لگا کر دیکھو۔ جو کچھ وہ کر رہے ہیں ' پیسے کے لئے کر رہے ہیں۔ انہیں اس مال کی قیمت ادا کردو۔ اسلحے کے وہ سب ٹرک لے لو ان سے اور انہیں منہ مانگی قیمت دے دو ۔ "

میں نے کہا " رابعہ ڈارلنگ ' کاش یہ ممکن ہوتا ..... "

رابعہ نے میری بات کاٹ دی " ابھی سے مت کہو کہ یہ ناممکن ہے ۔ پہلے کوشش کرو ۔ بات کرو ان سے ۔ "

" کس سے بات کروں اور کیا بات کروں ؟ ایسی احمقانہ بات کون سنے گا ؟ دلاور ؟ " میں نے نفی میں سر ہلایا " اس کا مقصد ہمارے عزائم کو شکست دینا ہے ' وہ ہمیں روکنا چاہتا ہے ۔ اس کے لئے بالآخر وہ ہماری یہ کمزوری پکڑنے میں کامیاب ہوگیا ہے ۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ اپنی اس کامیابی کا سودا کرے گا؟ تاکہ ہمیں کوئی خطرہ نہ رہے تو ہم پھر اس کے لئے خطرہ بن جائیں ۔ آج اس کے پاس تحفظ کی ایک ضمانت آگئی ہے جسے وہ کل بھی استعمال کرسکتا ہے ۔ اسے وہ ہمارے حوالے کرسکتا ہے ؟ "

رابعہ نے کہا " دلاور سے نہیں ' تریونی سے سودا کرو۔ اس ایک ٹرک کا جس میں وہ شہلا کو لے جانا چاہتے ہیں ۔ "

یکلخت مجھے احساس ہوا کہ رابعہ نے کتنی دور کی سوچی ہے ۔ اس کی بات میں ایک چیلنج تھا ' ہماری ذہانت اور ہمت کے لئے ۔ یہ ایک زبردست جنگی حکمتِ عملی کا منصوبہ تھا جسے انتہائی مشکل تو سمجھا جاسکتا تھا مگر ناممکن سمجھتے ہوئے ناقابلِ عمل قرار نہیں دیا جاسکتا تھا۔ عیّاری ' مکاری ' دغا فریب ' دھوکا اور چال بازی ۔ یہ سب بھی ایسے جنگی طریقے تھے جو دلاور جیسے دشمن کے خلاف استعمال کئے جاسکتے تھے ۔ بے شک جنگ کی بھی کچھ اخلاقیات ضرور ہوتی ہیں ۔ مسلمانوں نے کبھی عورتوں ' بچوں ' بوڑھوں اور بیماروں کو جنگ کرنے والوں میں شامل نہیں سمجھا تھا۔ آج بھی جنیوا کنونشن کے تحت اسپتال اور ریڈ کراس کا عملہ اور متعدد دیگر اداروں کو متحارب فوجوں کی کارروائی سے تحفظ حاصل ہے ۔ یہ الگ بات ہے کہ خود وُہی ایسی اخلاقی پابندیوں کی دھجیاں اڑاتے ہیں جو انہیں عائد کرانے میں پیش پیش نظر آتے ہیں اور " جنگ میں سب جائز ہے " کا جواز لے آتے ہیں ۔

مگر جو کچھ رابعہ نے کہا تھا ' اس میں کوئی ایسی غیر اخلاقی یا غیر انسانی بات نہیں تھی ۔ تریونی ایک کاروباری ذہن رکھنے والا ' لالچی اور بے ضمیر آدمی تھا۔ اس نے خود ہی کہا تھا کہ میری طرف سے دلاور جائے جہنم میں کیونکہ خود اس کے کاروباری مفادات اور اس کی زندگی کو خطرہ لاحق ہوگیا تھا۔ اس سے یہ سودا کیا جاسکتا تھا۔ دو دشمنوں کے اتحاد میں رخنہ ڈالنے کے لئے پیسے کی طاقت کو آزمانے کا خطرہ مول لیا جاسکتا تھا۔ تریونی کا اس میں کوئی نقصان نہیں تھا۔ وہ منہ مانگی قیمت لے کر ایسا بندوبست کرسکتا تھا کہ ہم اس سارے مال پر قابض ہوجائیں جس کے ساتھ شہلا کو یرغمال بنا کے روانہ کیا جاتا تھا۔ وہ ایک ٹرک کی نشاندہی کرسکتا تھا اور اس ٹرک کے اغوا میں ہماری مدد کرسکتا تھا۔ اس طرح کہ دلاور کو اس پر شک بھی نہ ہو۔ دلاور یہی سمجھتا رہے کہ شہلا کو بحفاظت نکال لانے کا سارا پلان ہم نے اپنے طور پر بنایا تھا اور اس میں تریونی کا کوئی ہاتھ نہیں۔

" سکندر ' کیا سوچ رہے ہو ؟ " رابعہ نے کہا۔

میں نے مسکرا کے کہا " ایسی بات کی ہے آج تم نے ۔ دل تو یہی چاہتا ہے کہ تمہارا منہ ... "

" بکو مت " رابعہ نے بگڑ کے کہا۔

" موتیوں سے بھر دادوں " میں نے ہنستے ہوئے کہا " اس میں کیا بری بات ہے جو خفا ہو رہی ہو ۔ محاورہ ہے یہ تو ۔ "

" تم تو سمجھ رہے تھے بڑے پاگل پن کی بات کی ہے میں نے " وہ طنز سے بولی ۔

" اب تو نہیں سمجھ رہا۔ یہ بھی مانتا ہوں کہ میری سمجھ میں یہ عقل کی بات دیر سے آئی ۔ دراصل تم سے توقع نہیں تھی ایسی عقل مندی کی ۔ "

" عقل کے معاملے میں تم مردوں کا جھوٹا احساسِ برتری کبھی ختم نہیں ہوگا " رابعہ نے خفا ہو کے کہا " ہمیں تم ناقص العقل ہی سمجھتے رہو گے ۔ "

" انشاء اللہ ! " میں نے ڈھیٹ بن کے دانت نکالتے ہوئے کہا " میرا مطلب تھا کہ تمہارے ساتھ زیادہ معاملہ ہے دل کا۔ خیر ' اب تمہارے نکتہ رس ذہن کی داد دیتے ہوئے میں اس تجویز پر مزید غور فرماتا ہوں۔ تو مجھے دیگر عواقب بھی نظر آتے ہیں ۔ بے شک ایسا ہوسکتا ہے کہ ہم رشوت دے کر تریونی کو دلاور سے غداری پر آمادہ کرلیں ۔ ایسے لوگوں کا ضمیر ' دین ' ایمان سب پیسہ ہی ہوتا ہے اور یہاں بالادستی حاصل ہے تریونی کو ۔ بفرضِ محال اسے بعد میں پتا چل جاتا ہے کہ شہلا کو ہم تریونی کی مدد سے نکال کر لے گئے تھے تو وہ تریونی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا ۔ "

" بس تو پھر کوشش کرو ۔ آج ہی ۔ "

" بی بی رابعہ ' ہتھیلی پر سرسوں نہیں جمتی ۔ پہلا مسئلہ تو قیمت کا ہے ۔ تریونی اگر مان گیا تو وہ کیا قیمت طلب کرے گا اور ہم اسے کیا دینے کے قابل ہوں گے ؟ "

" ہمارے پاس تقریباً دس لاکھ ہیں ۔ "

" ہاں ۔ دس کے بیس بھی ہوسکتے ہیں ۔ شہلا کی جان بچانے کے لئے ہم ایک ڈاکا بھی ڈال سکتے ہیں ۔ محمد خان سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ کچھ بندوبست کردے ۔ اس کے قبضے میں چار پانچ موٹی مرغیاں ہیں ۔ "

" مرغیاں ! "

" ہاں ۔ سونے کا انڈا دینے والی ۔ وہ ان سے انڈے وصول کرتا رہتا ہے ۔ شاید وہ بیس تیس لاکھ فراہم کردے ۔ "

" اتنی رقم کافی ہونی چاہئے ۔ "

" تم اپنے ذہن سے مت سوچو ۔ تریونی کے ذہن سے سوچو گی تو قیمت کا تعین تمہارے لئے ممکن ہی نہیں رہے گا۔ وہ ایک کروڑ بھی مانگ سکتا ہے اور کہہ سکتا ہے کہ شہلا کی اور کی زندگی کی میرے نزدیک یہی قیمت ہے ۔ میں انہیں اس قیمت پر بحفاظت تمہارے حوالے کرنے کی ذمے داری قبول کرتا ہوں ۔ تمام خطرات کو قبول کرتا ہوں لیکن تمہیں یہ قیمت منظور نہیں ہے تو جاؤ ان پر فاتحہ پڑھ لو ۔ "

رابعہ کا رنگ فق ہوگیا " یہ نہیں ہوسکتا ۔ "

" عزیزہ ' کیا ہوسکتا ہے اور کیا نہیں ہوسکتا ' اس کا فیصلہ وقت کرے گا۔ فرض کرو کہ اس نے صرف دس لاکھ ہی مانگے یا ہم نے ایک کروڑ دے دیئے ' تب بھی یہ جُوا ہوگا جس میں ہمارے بے وقوف بن کے ہارنے کے امکانات زیادہ ہوں گے۔ تریونی سے اگر ہم یہ امید رکھیں گے کہ وہ دلاور کو دھوکا دے تو یہ امید بھی رکھنی چاہئے کہ وہ الٹا ہمیں دھوکا دے ۔ وہ قیمت لے کر مکر جائے ۔ وعدہ پورا کرنا اس کے اختیار میں ہوگا اور اس نے وعدہ خلافی کرتے ہوئے ہمیں کچھ نہ بتایا ۔ یا قیمت لے کر یہ بات دلاور کو بھی بتادی تو ہم کیا کریں گے ؟ سوائے صبر کے اور اپنی بے وقوفی پر رونے کے ۔ "

" کوئی بات نہیں ۔ ہم یہ جُوا کھیلیں گے ' خواہ اس میں ہماری جیت کا امکان ایک فیصد ہو " رابعہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا ۔

" رائٹ ۔ لیکن اب میرے دماغ کے دوسرے دروازے بھی کھل گئے ہیں ۔ جو پہلا دروازہ تم نے کھولا تھا ' یہ اس کے اندر والے دروازے ہیں ۔ "

" پہیلیوں میں بات مت کرو ۔ "

" میں دیگر امکانات پر غور فرمانے لگا ہوں ۔ مثلاً یہ کہ رشوت سے صرف تریونی کو ہی خریدنے کی کوشش کیوں کی جائے اور بھی تو لوگ ہیں اس گودام میں جہاں سے اسلحہ لوڈ کیا جائے گا ۔ "

" ہاں ۔ تم محمد خان سے کہو کہ وہ اپنے کسی آدمی کے ذریعے ان کے کسی آدمی سے بات کرادے ۔ یہ معلوم ہوجائے کہ ٹرک کس کمپنی کے ہیں تو ٹرک ڈرائیوروں کو بھی رشوت دی جاسکتی ۔ وہ صرف اتنا بتادیں کہ کس ٹرک میں ہوگی شہلا ۔ پھر ہم ان کا تعاقب کریں اور موقع ملنے کا انتظار ۔ "

" آج تو تم ہول سیل میں دانش مندی کی باتیں کر رہی ہو۔ مجھے رشک آرہا ہے ۔ بلکہ ڈر لگ رہا ہے کہ کہیں نظر نہ لگ جائے ۔ صدقے میں کالا بکرا قربان کرتا میں ۔ مگر.... " میں نے اس کے شانے پر ہاتھ مارا ۔

رابعہ نے بگڑ کے کہا " یہ کیا بدتمیزی ہے ؟ "

" اردو میں اسے چیونٹا کہتے ہیں " میں نے اس کے شانے پر رینگنے والے چیونٹے کو نیچے گرا کے کہا " فی الحال کالا چیونٹا ہی قربان کرتا ہوں ۔ ویسے بھی یہ گستاخ نہ جانے کیا دست درازی کرتا آگے جاکے ۔ "

" بس شروع ہوگئی بک بک ۔ اتر گئے چڑی سے

میں نے کہا" پھر پٹڑی پر آتے ہوئے عرض کرتا ہوں کہ میں آج ہی خونی خان صاحب سے مذاکرات کرتا ہوں۔"

رابعہ نے کہا" یہ کام تو یوسفِ ثانی کرسکتا ہے۔"

میں اچھل پڑا" واہ۔ کیا زبردست بات کی ہے۔ خاکسار کی عقل مات کی ہے۔ گویا بن بادل برسات کی ہے۔ دوپہر بارہ بجے رات کی ہے۔ آمد آمد بارات کی ہے۔ دلہن شاید گجرات کی ہے۔"

رابعہ ہنسنے لگی" چھوڑو یہ کوشش۔" وہ تک بندی نہیں کرتا اور بے مطلب قافیے نہیں ملاتا۔"

میں نے کہا" واقعی' بہت مشکل کام ہے اس کی زبان بولنا"

گل نے دروازے میں نمودار ہو کے کہا" چلو بلاؤ سب کو کھانے کے لئے۔"

میں نے کہا" سب کو گولی مارو۔ میں اکیلا ہی سب کھاجاؤں گا۔ پکایا کیا ہے ؟"

" مسور کی دال ..... چاول۔"

میرا منہ لٹک گیا" اچھا۔ پھر مجھے گولی مارو۔ میں سب کو بلا لاتا ہوں۔ میرے حصے کا بھی وہی کھالیں۔"

کھانے کے بعد غالب اور محسن سر جوڑ کے بیٹھے اور اس نوٹ بک کے کوڈ کو ڈی کوڈ کرنے لگے۔ اس خفیہ زبان کا مطلب نکالنا کسی مشکل معمے کو حل کرنے سے زیادہ دماغ سوزی کا کام تھا چنانچہ میں خان کے کمرے میں تخت پر جا کے سو گیا۔ تھوڑی دیر بعد غالب اور محسن کی بک بک سے میری آنکھ کھلی۔

" اس طرح تو مطلب نکلتا ہے۔طوطے نے کریلا کھایا۔"

غالب نے کہا" اور جو مطلب تم نے نکالا تھا' بندر کے انڈے میں بلبل۔"

مجھے ہنسی آرہی تھی اور غصہ بھی " چلو بھاگو یہاں سے۔ یہ کیا ٹرٹر لگا رکھی ہے۔ دیکھتے نہیں' کوئی شریف آدمی سو رہا ہے۔"

" یہ عجیب شرافت ہے" محسن نے کہا" ادھر سے نکال دیا تمہاری اس شریفن نے کہ خاموشی سے باتیں کرو۔"

" آخر ہم کام کر رہے ہیں۔ ایک کمرے میں شریف' دوسرے میں شریفن! ہم کہاں جائیں ؟"

میں نے کہا" شریفن نے ٹھیک کہا تھا' خاموشی سے باتیں کرو۔ آواز نہ نکلنے پائے۔"

" چل یار' ہم ہی کہیں منہ کالا کر جاتے ہیں" محسن نے اٹھتے ہوئے کہا۔

" کہیں منہ کالا کرکے مت آنا" میں نے پھر منہ لپیٹ کر کہا۔

" منہ کالا برا چاہنے والوں کا" غالب نے کہا۔

میں شام تک سوتا رہا لیکن یہ نیند پُرسکون نہیں تھی۔ خیالات کے عفریت اور لاشعور میں بیٹھے ہوئے خوف کے ناگ میرے خوابوں میں بھی پھنکارتے رہے۔ میں کئی بار جاگا اور کوشش کرکے پھر سو گیا۔ آخری خواب بہت ڈراؤنا تھا۔ میں نے دلاور کو ایک بلند پہاڑ کی چوٹی پر دیکھا۔ میں نیچے سے چلا رہا تھا" نہیں دلاور.... نہیں" اور وہ اوپر کھڑا زور زور سے ہنس رہا تھا۔ اس کی بھیانک' مکروہ ہنسی کی بازگشت ویران پہاڑوں کی پتھریلی سطح سے ٹکرا کر لوٹ رہی تھی۔ میں پسینے میں تر تھا مگر چوٹی تک پہنچنے کی جان توڑ کوشش کر رہا تھا۔ میرے ہاتھوں سے خون بہنے لگا تھا اور میرے گھٹنے چھل گئے تھے۔ دلاور کے سامنے ایک چٹان کے کنارے پر شیشے کا تابوت رکھا ہوا تھا اور وہ اسے آگے دھکیل رہا تھا۔ میں اس کے بہت قریب پہنچ گیا تھا۔ جب اس نے تابوت کو نیچے گرادیا تو ایک زبردست چھناکے کے ساتھ شیشے کی کرچیاں بکھر کر اُڑنے لگیں۔ سیکڑوں' ہزاروں ٹکڑے تیز ہوا کو کاٹتے ہوئے ہزاروں فٹ کی گہرائی تک گئے۔ ہر ٹکڑا جب کسی پتھر سے ٹکرا کے ٹوٹتا تھا تو ایک دلخراش چیخ سنائی دیتی تھی اور اردگرد کے پتھر لہو کی بوچھاڑ سے بھر جاتے تھے۔

محمد خان نے مجھے کندھے پکڑ کے ہلایا" اٹھ جاؤ سکندر!"

میں ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ میرا جسم پسینے میں تر تھا اور ایک بھیانک خواب کا اثر ہنوز میرے اعصاب پر طاری تھا۔ میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔

" تم نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا تھا" خان نے کہا" لو یہ پانی پی لو۔"

میں نے پانی پی کے کہا" کیا میں نے سوتے میں کچھ کہا؟"

محمد خان نے سر ہلایا" دو بار تم نے کہا' دلاور' نہیں۔"

میں متفکر ہوگیا۔ ابھی کچھ دیر پہلے رابعہ نیند میں بول رہی تھی۔ اب میں بول رہا تھا۔ یہ لاشعور کی گڑبڑ تھی۔ مگر اس پر قابو پانا بے حد ضروری تھا' ورنہ یہ ہو سکتا تھا کہ کسی دن محسن کسی سے وہ بات سن لے جو ابھی تک ہم سب نے مصلحت کے کفن میں لپیٹ کر اپنے اپنے دلوں کے مدفن میں چھپا رکھی تھی۔

" تم کب آئے اور گئے کہاں تھے ؟" میں نے کہا۔

" میں ایک کام سے گیا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے آیا تو تم سو رہے تھے۔"

" تم کچھ پریشان ہو۔ جب سے ہم یہاں آئے ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں۔"

محمد خان نے آہستہ سے سر ہلایا" میں تم سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔"

میں نے کہا" خان صاحب! میں سمجھ گیا' آپ کی پریشانی ہم لوگ بن رہے ہیں۔"

اس نے تردید کرتے ہوئے کہا" قسم اللہ کی' یہ بات نہیں ہے۔ تم لوگوں سے ملاقات میری زندگی کا بڑا عجیب واقعہ ہے۔ پہلی بار مجھے یہ احساس ہوا کہ لوگ صرف اپنے لئے' اپنی خوشیوں اور اپنی ذات کے فائدے کے لئے نہیں جیتے حالانکہ میں بھی اسی دنیا میں تھا جس میں تم سب ہو لیکن میں نے جسے دیکھا' وہ صرف اپنے لئے زندہ تھا۔ میں بھی ان میں شامل ہوں۔ میں نے خود غرضی دیکھی تھی۔ ہوس دیکھی تھی' محبت بھی دیکھی تھی مگر بے غرض نہیں۔ ماں باپ یا بھائی بہن سے' اولاد سے' بیوی سے' سارے رشتوں کے پیچھے مقصد تھا۔ ماں باپ اگر اولاد کو پالتے ہیں تو اس امید میں کہ بڑھاپے میں بے آسرا نہ ہوں۔"

" سب رشتے غرض مندی کے رشتے نہیں ہوتے خان صاحب' مثلاً ماں کا بچے سے رشتہ۔"

" ہاں۔ میں کب کہتا ہوں کہ سب رشتے جھوٹے ہیں۔ میں تو اپنے تجربے کی بات کر رہا تھا۔ اپنی دنیا میں جو کچھ میں نے دیکھا تھا' وہ بہت مختلف تھا۔ مرد اور عورت کے رشتے کو میں نے سب سے زیادہ بدنام پایا اور یہ بھی دیکھا کہ اس رشتے کو بدنام کرنے والے بھی وہی لوگ ہیں جن کی نظر میں عورت بازار کی جنس ہے۔ یا ایک خوشنما کھلونا ہے۔ کہ جب چاہا خریدا' جتنے دن چاہا' اس سے کھیل کے بھلادیا۔ عورت ایک تماشا ہے' کوٹھے پر بھی' سنیما اسکرین پر بھی' اشتہار میں بھی۔ اگر وہ بیوی ہے تو اس کی حیثیت ایک باندی جیسی ہے۔ گھر کا کام کرے' شوہر کو خوش رکھے' اس کے لئے بچے پیدا کرے اور پھر انہیں پالے۔ اگر وہ کسی ایک کام میں کوتاہی کرے تو تم جانتے ہو' کیا ہوتا ہے ؟ اسے کسی بھی بہانے' کسی بھی وقت گھر سے نکالا جاسکتا ہے۔ وہ واقعی پاؤں کی جوتی ہے کہ جب چاہا بدل لی۔ اولاد نہ ہوئی تو صرف وہی قصوروار۔ حالانکہ قصوروار مرد بھی ہوسکتا ہے اور برابر کا۔ اس نے بیٹا نہ دیا' صرف بیٹیاں دیں تو بھی وہی مجرم۔ بڑے بڑے مذہبی قسم کے لوگوں کو دیکھا ہے میں نے۔ اسے وہ مشیتِ ایزدی نہیں سمجھتے' عورت کا جرم سمجھتے ہیں۔ میرے کہنے کا مقصد کچھ اور تھا۔ تم جانتے ہو کہ میں نے ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی شادی کی ہے۔ تم نے کہا تھا کہ مجھ جیسے شخص کو شادی نہیں کرنی چاہئے۔ ٹھیک کہا تھا تم نے لیکن بعض اوقات آدمی اپنی مرضی سے کچھ نہیں کرپاتا۔ شادی تم نے بھی نہیں کی۔ اس لئے کہ شادی کے بعد گھر بنانا اور بسانا پڑتا ہے جس کے لئے تمہارے پاس ابھی وقت نہیں تھا۔ اس کے باوجود تم ایک دوسرے کے ساتھ ہو۔ شریکِ حیات اور رفیقِ سفر ہو۔ تمہارے درمیان محبت اور اعتماد کا وہ رشتہ ہے جس کے سامنے بھی تعظیم کے لئے جھک جاتا ہے۔"

میں نے ہنس کے کہا" ایسی کیا بات ہے خان صاحب ؟"

" ہے سکندر! جب میں تم سے ملا تھا تو تمہیں نہیں جانتا تھا۔ پھر تم نے سب کا تعارف کرادیا کہ کون کیا ہے اور کس کو کس سے رسم و راہ ہے۔ میں شک میں پڑ گیا تھا۔ معاف کرنا' میرے دل میں بدگمانی نے سر اٹھایا تھا۔ میں نے چھپ کر تم سب کو دیکھا اور مجھے اس وقت تمہارے سامنے شرمندگی کا اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں کہ وہ میری گندی سوچ تھی۔ ہر آدمی کی سوچ میں اس کے ماحول کا عکس بھی ہوتا ہے۔ جو میں اپنے آس پاس کی دنیا میں دیکھتا آیا تھا' وہی میں نے دیکھنے کی کوشش کی۔ مگر تمہارے رشتوں کے تقدس نے مجھے تصویر کا دوسرا رخ دکھایا کہ کردار کی مضبوطی کیا ہوتی ہے اور نیت کا خلوص کیا ہوتا ہے۔ تم ایک دوسرے کو چاہتے ہو۔ باہم زندگی کے ساتھی بننے کے عہد و پیمان بھی رکھتے ہو۔ ہر وقت' ہر جگہ ساتھ بھی رہتے ہو لیکن اپنی محبت پر الزام نہیں آنے دیتے۔ انگشت نمائی کچھ لوگوں کا پیشہ ہے' کچھ لوگوں کی عادت یا فطرت۔ وہ کچھ بھی کہیں' تم سب کے کردار کا آئینہ جتنا شفاف ہے' رہے گا۔"

" آج تو بڑی سنجیدہ اور فلسفیانہ باتیں کر رہے ہیں آپ خان صاحب ؟" میں نے کہا۔

" ہاں۔ میں ایک انقلاب سے گزر رہا ہوں۔ میں نہیں جانتا میرے الفاظ میرے خیالات کی صحیح ترجمانی کرسکتے ہیں یا نہیں لیکن جو کچھ میں کہہ رہا ہوں' میری دلی کیفیت ہے۔ تم سے ملنے کے بعد میں وہ نہیں رہا' جو تھا۔ ڈاکو محمد خان' خونی خان۔ بہت سوچنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مجھے اپنی زندگی کی یہ روش ترک کردینی چاہئے اور تمہارا ساتھ دینا چاہئے۔"

میں حیرت اور خوشی سے دنگ رہ گیا" آپ.... ہمارا ساتھ دیں گے خان صاحب!"

" مجھے تمہارا ساتھ دینا چاہئے۔ آخر میں بھی تو مسلمان ہوں۔ ہاں یہ ایک الگ کہانی ہے کہ میں پاکستانی ہونے کے باوجود پاکستان میں نہیں رہ سکا۔ تقسیم کے بعد میں بھی اپنے خاندان کے ساتھ بڑے جوش اور ولولے سے پاکستان گیا تھا۔ خاندان تو راستے ہی میں بچھڑ گیا تھا۔ ہم نے قافلے کے ساتھ پیدل سفر کیا تھا۔ میرے تین چھوٹے بہن بھائی اور میری بیمار ماں سفر کی صعوبت' بھوک پیاس کی تاب نہ لاکے دم توڑ گئے۔ انہیں ہم نے کچے راستے سے ہٹا کے ایک طرف رکھ دیا تھا۔ تدفین ممکن ہی نہیں تھی۔ نہ کفن تھا' نہ کوئی غسل دینے والا۔ خود ہم اتنے کمزور تھے کہ کدال مل جاتی' تب بھی قبر نہیں کھود سکتے تھے اور قافلہ بھی چلتا جارہا تھا چنانچہ ہم نے انہیں خدا کو سونپا اور چلتے گئے۔ پاکستان پہنچنے کے بعد کیا ہوا' یہ زیادہ دکھ بھری کہانی ہے۔ اچھے برے لوگ کہاں نہیں ہوتے۔

بدقسمتی کہ میرا واسطہ بُرے لوگوں سے پڑ گیا جنہوں نے مجھے برائی کے راستے پر ڈال دیا۔ جب میں نے پھر سیدھے راستے پر چلنے کی کوشش کی تو انہوں نے وہ سب راستے بند کردیئے۔ میں ان کے چنگل سے نکل کے فرار ہوگیا مگر فرار ہو کے میں کہاں جاسکتا تھا۔ وہ میرے تعاقب میں رہے اور اس وطن کی زمین مجھ پر تنگ ہوگئی جس کی خاطر میں نے پا پیادہ سیکڑوں میل کا سفر طے کیا تھا۔ حالانکہ اس وقت میری عمر تیرہ چودہ سال کی تھی۔ تم سے کچھ ملتے جلتے حالات میرے بھی رہے تھے۔ فرق صرف یہ ہے کہ تم نے مقابلہ کیا اور میں نے فرار اختیار کیا۔ میں واپس آگیا اور ایک نئے نام سے نئی زندگی کا آغاز کیا۔ افسوس اس بات کا ہے کہ یہ نئی زندگی بھی اچھی زندگی نہیں رہی۔ خواہش کے باوجود میں نیکی کے راستے پر نہ چل سکا۔ تن آسانی اور حرام خوری کی عادت کو ترک کرنا آسان نہیں ہوتا۔ ہاتھ میں ریوالور ہو تو کسی کو لُوٹ لینا آسان ہے۔ صبح سے شام تک محنت کرکے روزی کمانا مجھے بہت مشکل لگا۔ سیدھے راستے پر چلنے والے کی راہ میں روڑے اٹکانے والے بہت ہوتے ہیں جو اس کے لئے قدم قدم پر نئی آزمائش لے آتے ہیں۔ "

" یہ تو ٹھیک ہے۔ شرافت کی زندگی گزارنے کے لئے آدمی کو پہلے خود سے لڑنا پڑتا ہے۔ لالچ اور ہوس اور نفس کی ترغیبات سے گریز کرنا پڑتا ہے اور یہ کوئی آسان کام نہیں "میں نے کہا۔

"بس میں اسی کمزوری کا شکار ہوگیا۔ میری قوتِ ارادی کمزور تھی۔ کچھ دن بعد محنت ایک مصیبت محسوس ہونے لگی۔ رفتہ رفتہ میں پھر برائی کے آسان راستے کی طرف راغب ہوگیا جہاں میری رہنمائی کرنے والے بہت تھے۔ برائی کی دنیا میں یہ عجیب بات ہے کہ وہاں ہر نووارد کو فوراً تاڑ لیا جاتا ہے۔ اسے خوش آمدید کہا جاتا ہے۔ وہ چور۔ گرہ کٹ کچھ بھی بننا چاہے۔ اس کے لئے ایسے افراد ہیں جو ادارے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ اسے اپنا لیتے ہیں اور پھر ساری عمر وہ ان کے سائیہ عاطفت میں رہنے پر مجبور ہوتا ہے۔ میں کراچی میں رہ کے یہ تجربہ حاصل کرچکا تھا۔ بمبئی میں بدمعاشی کا کاروبار زیادہ منظم طریقے پر ہوتا ہے۔ ہر بدمعاش کا اپنا گروہ ہے' حلقۂ اثر ہے' دائرۂ اختیار ہے' اپنا کاروبار ہے۔ کوئی چھوٹا ہے' کوئی بڑا اور کوئی بہت بڑا۔ لیکن یہ سب بدمعاشی کا دھندا کرنے والے بمبئی کے آسمان پر اسی طرح موجود ہیں جیسے آسمان پر ستارے اور سیارے ایک دوسرے کے سہارے پر قائم' اپنی اپنی جگہ گردش کرتے ہوئے اور ایک ہی مدار پر رہنے والے۔ یہاں کے بدمعاشوں کی دنیا کے بھی اصول و ضوابط ہیں۔ جیسے کبھی کبھی کوئی ستارا ٹوٹ کے بکھر جاتا ہے' ایسے ہی بدمعاشوں کے گروہ بھی آپس میں ٹکراجاتے ہیں اور بکھر جاتے ہیں۔ مگر بیشتر گروہ ایک دوسرے کے معاملات میں دخل نہیں دیتے۔ خیر' یہ تو میں نے تمہیں لمبا ہی لیکچر دے دیا۔ بدمعاشیات پر۔ میں اپنی بات کررہا تھا۔ یہاں میں نے کسی کے حلقۂ اثر میں رہنا قبول نہیں کیا بلکہ آہستہ آہستہ اپنا ایک گروہ منظم کرلیا۔ یہ برسوں پرانی واردات ہے۔ آج تمہیں اس لئے بتارہا ہوں کہ ایک بار پھر مجھے پچھتاوے نے گھیر لیا ہے۔ تم سب کو دیکھ کر میں اپنے آپ سے شرمندہ ہوں کہ آخر وہ سب میں کیوں نہیں کرسکتا جو تم لوگ کررہے ہو۔ میرا وطن اب بھی پاکستان ہے۔ کچھ حالات ایسے تھے کہ میں واپس نہیں جاسکتا تھا۔ مگر مجھے جانا تو ہے ایک دن۔ کیوں نہ میں تمہارے ساتھ چلوں۔ جب تم واپس جاؤ تو میں بھی سر اُٹھا کے تمہارے ساتھ جاؤں۔ حالات ہمیشہ ایک سے نہیں رہتے۔ وقت بدلتا رہتا ہے۔ تمہارے ساتھ مجھے تحفظ کی ضمانت نظر آتی ہے۔ شاید اب وہ لوگ باقی نہ ہوں جن کی وجہ سے مجھے جلاوطن ہونا پڑا تھا یا شاید وہ مجھے بھول گئے ہوں۔ نہیں بھولے ہوں گے تو کوئی بات نہیں۔ میں دوبارہ فرار اختیار نہیں کروں گا۔ اس بار میں ان کا مقابلہ کروں گا۔ لیکن اس سے پہلے میں اپنے گزرے ہوئے وقت کی ہر غلطی' ہر بھول اور گمراہی اور نادانی کا کفارہ ادا کروں گا۔ تمہارے ساتھ اس جہاد میں شریک ہونا چاہتا ہوں۔ کسی بھی حیثیت میں اپنے وطن کے لئے کچھ کرنا چاہتا ہوں جو میرے ماضی کا کفارہ بن سکے۔ تمہیں دیکھ کے یہ خواہش پیدا ہوئی تو سوچتا ہوں کہ اس موقع سے فائدہ اٹھاؤں' ورنہ تم لوگ چلے جاؤ گے تو پھر وہی زندگی ہوگی جس کو برائی نے مکڑی کے جالے کی طرح لپیٹ رکھا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے؟ "

میں نے اٹھ کر محمد خان کو گلے لگالیا "کیوں ممکن نہیں خان صاحب۔ آدمی ارادہ کرتا ہے۔ توفیق خدا دیتا ہے۔ اس سے بڑی خوشی کی بات ہمارے لئے کیا ہوگی' اگر ہمیں تم جیسا نڈر ساتھی مل جائے۔ "

"لیکن تمہارے ساتھی۔ وہ مجھے قبول کرلیں گے؟ میں کوئی نیک نام آدمی نہیں ہوں قسم اللہ کی۔ "

میں نے کہا " خان! نیک آدمی ہمیشہ نیک رہتا ہے۔ یہ نیکی اس کے وجود میں ایسے پوشیدہ رہتی ہے جیسے خاک میں مل جانے والے موتی کی آب۔ اگر اس کی سرشت میں یہ آب ہو تو وقت کی گرد کسی موتی کو کنکر نہیں بناتی۔ وہ سب میرے ساتھی ہیں اور ہم ایک خاندان ہیں۔ تم پر اس خاندان کا دروازہ کھل گیا تو سمجھو' سب کے دل کا دروازہ کھل گیا۔ تم سے پہلے بھی ہم ایک ڈاکو سے ملے تھے۔ اس کا ہمارا ساتھ چند گھنٹے

کا تھا لیکن اتنی کم رفاقت کے باوجود وہ ہم پر اپنی جان کا قرض چھوڑ گیا۔ تم سمجھ گئے ہوگے کہ میں شیش ناگ کی بات کررہا ہوں۔ وہ ڈاکو ضرور تھا لیکن بڑا محبِ وطن تھا۔ وہ غدار نہیں تھا' دلاور کی طرح جو دنیا کی نظر میں معتبر اور شریف بنا ہوا ہے اور ناگ منی اس کی بہن تھی جسے وہ ہمارے سپرد کر گیا تھا۔ چند گھنٹوں کی رفاقت میں ہم نے اس کے دل میں اتنا اعتماد پیدا کردیا تھا اور خدا کا شکر کہ ہم اس سے کئے ہوئے وعدے پر قائم ہیں۔ اس کی بہن ہماری ذمے داری ہے بلکہ ہم سب کی مشترکہ ذمے داری ہے۔ ہم نے آہستہ آہستہ اسے گل بانو بنادیا ہے۔ "

"قسم اللہ کی' میں بھی ڈاکو نہیں رہنا چاہتا۔ اس زندگی سے تنفر تو میں پہلے ہی ہوگیا تھا۔ یاد ہے' ایک بار تم نے پوچھا تھا کہ گھر بسانے کے بعد میں نے اپنی زندگی کی اس روش کو کیوں نہیں بدلا۔ اور میں نے کہا تھا کہ شاید ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔ حقیقت یہ ہے کہ شادی کے بعد میں محسوس کرنے لگا تھا کہ میں بیک وقت ڈاکو اور ایک اچھا شوہر نہیں رہ سکتا۔ کل کو مجھے ایک اچھا باپ بھی بننا پڑے گا۔ ابھی ایک عورت کے لئے میں مجازی خدا ہوں۔ مجازی خدا میں وہ صفات تو ہونی چاہئیں جو خدا کی ذات کا کچھ عکس تو ہوں۔ اس میں خدا کے پیدا کئے ہوئے انسان کی تھوڑی بہت انسانیت تو ہو تاکہ بیوی میری عزت کرسکے۔ ویسے تو ہر عورت مجبور ہوتی ہے' شوہر کو شوہر سمجھنے پر۔ اس کی اطاعت کرنے پر اور اس کی خوشی کو اپنی خوشی سمجھ کے قبول کرنے پر۔ مگر اب میری خواہش ہے کہ وہ دل سے میری عزت کرے اور جب میرے بچے ہوں تو وہ اپنے باپ پر شرمندہ نہ ہوں کہ ان کا باپ ڈاکو ہے۔ یہ تبدیلی تو پہلے ہی آنے لگی تھی۔ ہر کام کے لئے ایک وقت مقرر ہے اور جب وہ وقت آتا ہے تو اسباب پہلے سے پیدا ہونے لگتے ہیں۔ شادی ایک سبب بنی۔ اس نے میرے وجود کے جمود کو توڑا۔ مجھے احساس دلایا کہ میں ڈاکو ہوں۔ جو کوئی شریف آدمی نہیں ہوتا۔ مجھے اپنی بیوی سے نظر ملاتے ہوئے ندامت محسوس ہونے لگی کہ کیا سوچتی ہوگی دل میں وہ عورت جو میری بیوی بنی ہے کہ میرا شوہر ڈاکو ہے۔ ہائے ری قسمت! تمہارا آنا دوسرا سبب بن گیا۔ "

میں نے کہا " خان صاحب! کیا تم نے اس کی مرضی کے خلاف اس سے شادی کی تھی؟ "

وہ کچھ سوچ کے بولا " قسم اللہ کی' ایسی بات تو نہیں تھی۔ "

" اس نے پسند کیا تھا تمہیں تو پھر وہ اپنی تقدیر سے کیسے گلہ کرسکتی تھی " میں نے کہا۔

" گلہ زبان سے تو نہیں کرسکتی مگر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک شریف عورت کے دل میں یہ خیال بھی نہ آئے کہ کاش' میرا شوہر بھی شریف آدمی ہوتا۔ تم بتاؤ' کیا کبھی ایسا خیال نہیں آتا ہوگا اسے؟ "

" خیال.... ضرور آتا ہوگا " میں نے تسلیم کیا " کیا کبھی اس نے تم سے کچھ کہا؟ "

" کیا؟ "

" یہی کہ کوئی اور کام کرو۔ یہ پیشہ بُرا ہے۔ "

" نہیں اس نے زبان سے کبھی نہیں کہا لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ وہ خاموشی کی زبان میں یہ سب کہتی رہتی ہے۔ شاید یہ میرے دل کا چور ہو۔ "

" تم نے اسے اپنے ارادے سے آگاہ کردیا ہے؟ "

" قسم اللہ کی' ابھی نہیں۔ میں نے سوچا' پہلے تم سے بات کرلوں۔ مجھے معلوم ہے' جب میں اسے یہ بات بتاؤں گا تو وہ کتنی خوش ہوگی " خان کی مسکراتی ہوئی آنکھیں تصور میں اپنی بیوی کا دمکتا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔

" خدا تمہارے ارادوں کو تقویت دے۔ تمہارا ایم آر ایس میں آنا مبارک " میں نے کہا۔

" ایم آر ایس! یہ کیا بلا؟ "

" مائٹ از رائٹ سوسائٹی " میں نے کہا " یہ نام بس ایسے ہی پڑ گیا۔ کیونکہ ہم خدائی فوج دار کہلانے لگے تھے۔ ایسا نہیں ہے کہ ہم قانون پر لاقانونیت کو ترجیح دیتے ہیں۔ دل سے ہم قانون کا احترام کرنے والے لوگ ہیں لیکن جہاں قانون مجبور' کمزور اور بے بس ہوجاتا ہے' وہاں ہم بھی مائٹ از رائٹ کے اصول کو اپنا لیتے ہیں کیونکہ جو ہمارے حریف ہیں وہ بھی تو "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" کے قانون پر عمل کررہے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ لاقانونیت کو فروغ دیتے ہیں۔ ہم انہیں اپنی لاٹھی سے ہانک کر قانون کے دائرے میں لانے کے لئے لاقانونیت کا سہارا لیتے ہیں۔ جب تم ہمارے ساتھ رہو گے تو ہمارا یہ فلسفۂ حیات بھی سمجھ لوگے۔ ابھی تو مجھے یہ بتاؤ کہ اس فیصلے کا تمہارے ساتھیوں پر کیا اثر پڑے گا؟ "

" میرے بیشتر ساتھی میرا ساتھ چھوڑ گئے ہیں۔ ان کو مجھ سے اب یہ شکایت پیدا ہوگئی تھی کہ میں پہلے جیسا محمد خان نہیں رہا۔ ایک عورت نے مجھے بزدل بنادیا ہے۔ انہیں مجھ سے کبھی شکایت نہیں ہوئی تھی۔ وہ میرے ساتھی اور دوست تھے۔ میرے ماتحت نہیں۔ میں نے اس الزام کو تسلیم کیا اور کہا کہ شاید آگے چل کے میں ان کا ساتھ دینے کے قابل بھی نہ رہوں۔ وہ اپنے طور پر جہاں جانا چاہیں' چلے جائیں۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ اس پرانی رہائش گاہ میں سناٹا رہتا تھا۔ وہاں تھا ہی کون۔ صرف چار جاں نثار رہ گئے تھے۔ پرانے ساتھی اب بھی عزت کرتے ہیں۔ ضرورت پڑنے پر میرے لئے جان

بھی دے سکتے ہیں۔ انہی کی مدد سے میں نے تمہاری حفاظت کی تھی۔"

"اس پرانے گھر میں تو ایسا لگتا تھا کہ سب کچھ ہے۔ نوکر چاکر اور سارے انتظامات چلانے والے۔ ہم نے تو جب بھی بٹن دبا کے کچھ مانگا' فوراً آگیا۔ وقت پر ناشتا' کھانا۔"

"قسم اللہ کی' ملازم صرف ایک تھا جو کچن سے کھانا لاتا تھا۔ وہ بٹن تو پہلے سے لگے ہوئے تھے۔ ظاہر ہے' ایک سفارت کار رہتا تھا اس میں تو اس کی سہولت کے یہ سامان پہلے سے موجود تھے۔"

"کچن میں کون رہتا تھا؟ بٹن دباتے ہی بڑی میٹھی' سریلی اور شائستہ آواز میں کہتی تھی' یس سر۔"

"وہ۔ ہاں۔ کوثر کی آواز ایسی ہی ہے۔" وہ ہنسا۔

"کون کوثر' کوئی ملازمہ تھی؟"

"نہیں۔ میری بیوی کا نام کوثر ہے۔"

مجھے یوں لگا جیسے محمد خان نے اچانک مجھ پر ٹھنڈے' یخ پانی سے بھرا ہوا مٹکا انڈیل دیا ہو۔ "تمہاری.... بیوی....؟" میں نے بمشکل تمام کہا۔ "وہ کرتی تھی سب کے لئے کھانا پکانا جسے ہم حکم دیتے رہتے تھے۔"

ہاں"

میں نے کہا۔ "خان صاحب! یہ تم نے اچھا نہیں کیا ہمارے ساتھ۔ اگر ہم مہمان تھے تمہارے تو تم نے خاتونِ خانہ سے ملوایا کیوں نہیں؟ اگر وہ پردہ کرتی تھی تو کم سے کم رابعہ کو' گل اور نازو کو اس سے ملوا دیتے۔"

"پردہ تو کرتی ہے وہ لیکن اب تم سے کیا پردہ!"

"پھر یہ بات کیوں چھپائے رکھی تم نے؟ ہم اسے خادمہ سمجھ کے اس پر حکم چلاتے ہے۔ اسے پریشان کرتے رہے وقت ناوقت۔" میں نے سخت شرمندہ ہو کے کہا۔ "وہ تینوں اس کی مدد کر سکتی تھیں۔ اس کا ہاتھ بٹا کے وہ بہت خوش ہوتیں۔"

"بھئی کیا ہوا اگر اس نے مہمانوں کی کچھ خاطر مدارات کر لی؟"

میں نے کہا۔ "خاطر مدارات کرنا اس کا حق تھا مگر جواب میں ہم نے کیا کیا؟ ہم نے اسے خاتونِ خانہ کی عزت دی؟ ہم نے اس کے ساتھ توہین آمیز رویّہ اختیار کیا۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم نے کوئی بدتمیزی نہیں کی۔ ہمیں عادت ہے مذاق کی۔ کوئی بیہودہ بات کہہ بیٹھتے اس سے تو خواہ مخواہ تمہارے ہاتھوں ہمارا خون ہوتا۔"

"قسم اللہ کی۔ ایسا کیسے ہو سکتا تھا۔"

"ہو سکتا تھا خان صاحب۔ تم ٹھہرے پٹھان۔ وہ تم سے شکایت کر دیتی تو تمہارا غیرت مند خون جوش میں آجاتا۔ ہم انجانے میں مقتول ہو جاتے۔" میں نے کہا۔

"وہ ایسی نہیں ہے۔ برا ماننے والی" خان ہنسنے لگا۔

میں نے کہا۔ "اچھا اب جیسی بھی ہے' ہمیں اس کی خدمت میں پیش کرو تاکہ ہم اس سے دست بستہ معافی مانگیں۔ اپنی بھابی کو ہم نے اپنی ملازمہ سمجھا۔ اس کی جو سزا وہ دے' ہمیں منظور۔"

محمد خان کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا "چھوڑو یار سکندر۔ ایسی باتیں مت کرو۔ ہم پٹھان بہت بڑا دل رکھتے ہیں مہمانوں کے لئے اور دوستوں کے لئے اور میری بیوی ویسی ہی ہے جیسا میری بیوی کو ہونا چاہئے۔"

"ٹھیک ہے۔ رابعہ' گل اور نازو کو بلاتا ہوں میں۔ تم یہ بتاؤ کہ اسے یہاں کس طرف چھپا کے رکھا ہے؟"

خان نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہاں وہ نہیں آئی۔"

"پھر کہاں گئی؟"

"میں اسے اس کے گھر چھوڑ آیا تھا۔ یہ جگہ مناسب نہیں تھی اس کے رہنے کے لئے۔" خان نے کہا۔ "وہ ہوتی تو کیا نازو اور گل کو یہ سب کام کرنے پڑتے؟"

"خان صاحب! ایسا کون سا تیر مارا ہے انہوں نے؟ ان کے کرنے کے کام یہی ہیں۔ آج نہیں کر رہی ہیں تو کیا ہوا۔ کل کریں گی جب اپنا گھر سنبھالیں گی۔ ہر لڑکی کرتی ہے۔ وہ کوئی مریخ کی مخلوق نہیں ہیں' عام لڑکیاں ہیں۔"

"نہیں سکندر! عام لڑکیاں نہیں ہیں وہ۔ میں نے دیکھی ہے یہ دنیا۔ تم خاص لوگ ہو اور اللہ کا خاص احسان ہے تم پر کہ تمہیں ایسی شریکِ سفر ملیں۔" خان نے کہا۔

"کوثر کہاں رہتی ہے؟" میں نے بے تکلفی میں ایک قدم آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اپنے باپ کے گھر میں۔ اس کا باپ ایک مسجد سے متصل حُجرے میں رہتا ہے۔ حافظ ہے اور پیش امام ہے لیکن نابینا ہے۔"

"تمہارا سُسر حافظ اور پیش امام ہے!" میں بھونچکا رہ گیا۔

"ہاں' کوثر ایک ہی بیٹی تھی اس کی۔ ماں پہلے مر چکی تھی۔"

میں نے کہا۔ "تم سے کیسے شادی ہو گئی اس کی؟"

محمد خان نے انگلی اوپر اٹھائی۔ "کہتے ہیں' وہ جوڑے اوپر بناتا ہے۔ یہ بھی اسی کا فیصلہ ہو گا۔ جب اس نے طے کیا کہ اس گناہ گار کو اب توفیق عطا ہونی چاہئے نیکی کی تو اس نے مجھے کوثر سے ملوا دیا۔ پھر تمہیں بھیج دیا۔"

میں نے کہا۔ "کیا حافظ جی کو معلوم ہے؟"

"قسم اللہ کی' انہیں معلوم ہے کہ ان کا داماد ایک ڈاکو ہے۔"

"اس کے باوجود! یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی خان صاحب۔" میں نے کہا۔

"میری سمجھ میں بھی نہیں آئی تھی۔ جب حافظ جی نے بیٹی کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا تھا کہ ضرور اس میں بھی کوئی مصلحت پوشیدہ ہوگی میری مولا کی اور انہوں نے غلط نہیں کہا تھا۔"

"کیا تم ان کے پاس خود گئے تھے شادی کی درخواست لے کر؟"

"میری اتنی کہاں مجال تھی۔ میں تو ایک رات پولیس سے بچنے کے لئے مسجد میں گھس گیا تھا۔ پولیس مسجد میں بھی آگئی۔ تم جانتے ہو' یہاں مسجدوں کی بے حرمتی کے واقعات ہوتے ہی رہتے ہیں۔ وہ جوتوں سمیت اندر آگئے میرے تعاقب میں مگر میں حافظ جی کے حجرے میں گھس کے اندر سے کنڈی لگا کے بیٹھ گیا۔ اس وقت کوثر کو میں نے نہیں دیکھا تھا۔ وہ سر تک چادر اوڑھے سو رہی تھی۔ حافظ جی جانماز پر تسبیح لئے بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے پوچھا۔ "کون ہو میاں؟" میں نے محسوس کیا کہ میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔ معلوم نہیں ایسا کیوں ہوا۔ شاید یہ اس ماحول کا اثر تھا۔ میں چاہتا تو اس نابینا حافظ کے سینے پر ریوالور رکھ کے کہہ سکتا تھا کہ خبردار جو آواز نکالی۔ اگر پولیس آئے تو اس سے صرف یہ کہنا ہے کہ یہاں کوئی نہیں آیا لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں نے کہا۔ "حافظ جی' میں ایک ڈاکو ہوں۔ ڈاکو محمد خان۔" انہوں نے کہا۔ "ڈرو نہیں۔ یہ بھی خدا کا ہی گھر ہے۔ یہاں تمہیں کوئی خطرہ نہیں۔ مسلمان ہو۔ کلمہ سناؤ ذرا۔" اور میں نے انہیں کلمہ سنایا تو انہوں نے زیرِ لب جزاک اللہ کہا۔ کچھ دیر تسبیح کے دانے گھماتے رہے۔ پھر بولے۔ "خدا کے گھر آئے ہو تو خدا کو سلام ہی کر لو۔ کسی کے گھر جاتے ہو تو سلام کرتے ہو یا نہیں؟" میں نے کہا۔ "جی' کرتا ہوں۔" انہوں نے کہا۔ "نماز آتی ہے؟" میں شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ میں نے کہا۔ "جی' آتی ہے لیکن کبھی پڑھی نہیں بچپن کے بعد۔" وہ مسکرائے۔ "ہاں۔ بچپن میں پڑھتے ہیں لوگ نماز یا پھر بچپن میں۔ درمیان میں جوانی جو آجاتی ہے۔ خیر' آؤ میری جگہ۔" اور ان کی بات میں نہ جانے کیا جادو تھا کہ میں مجبور ہو گیا۔ میں نے کہا۔ "حافظ جی' وضو نہیں ہے میرا۔" انہوں نے کہا۔ "اللہ سے کہہ دینا۔" یہ بڑی عجیب بات تھی لیکن میں بے وضو ہی نماز کے لئے کھڑا ہو گیا۔ میں اسے معجزہ ہی کہوں گا۔ اچانک میرے دل سے سارا خوف دور ہو گیا۔ مجھے پولیس کا خیال تک نہیں رہا اور میں نے بڑے سکون سے نماز ادا کی۔ وہ دن اور آج کا دن' میں نے نماز صرف حالتِ مجبوری میں چھوڑی ہے۔ مجھے کسی نے مجبور نہیں کیا بعد میں اور کسی کا ڈر بھی نہیں تھا مجھے۔ میرے ساتھی ہمیشہ کہتے رہے' میری اس عادت پر کہ ادھر ڈاکے ڈالے' ادھر سجدے کرے لیکن میں نے کبھی کسی کی پروا نہیں کی۔ بس ایک عجیب نشے جیسی لت پڑ گئی تھی۔ جیسے نشہ نہ ملے تو نشہ کرنے والا بے چین ہو جاتا ہے' ایسے ہی نماز کا وقت ہوتے ہی میرے اندر ایک بے کلی سی ہونے لگتی تھی۔ اللہ معاف کرے مجھے' میں نماز کو نشے سے تشبیہہ دے رہا ہوں لیکن مجھے اور کوئی مثال نہیں سوجھتی' نماز پڑھتے ہی مجھے قرار آجاتا تھا۔ جیسے نشے کے عادی کو نشہ مل جائے تو وہ پُرسکون ہو جاتا ہے۔ یہ عادت ابھی تک چل رہی ہے۔ مجھے کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ وہ نابینا حافظ کوئی قطب یا ابدال ہے جس نے چند الفاظ میں میرے اندر کے آدمی کو پہچان لیا۔ ڈاکو محمد خان کو اس نے ایک بار جانماز پر بٹھایا اور وہ پھر جانماز کو چھوڑ نہ سکا۔ تم نے اولیاء اور بزرگوں کے واقعات سنے ہوں گے کہ انہیں غیب سے حکم ملا کہ فلاں کی خدمت میں حاضر ہو جاؤ۔ یہ بھی کوئی غیب کا فرمان ہی تھا جس نے مجھے وہاں پہنچا دیا تھا۔ اس حافظ نابینا کو بھی یقیناً پہلے سے معلوم تھا کہ ایک گناہ گار اور راستے سے بھٹکا ہوا ڈاکو آنے والا ہے جس کو صراطِ مستقیم دکھانی ہے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا' وہ ہونا تھا۔ وہ خدا کا حکم تھا جو ٹالا نہیں جا سکتا تھا۔"

میں دریائے حیرت میں غرق ایک ڈاکو سے وہ باتیں سن رہا تھا جو پہلے کسی صوفی' پیر' فقیر اور کسی پہنچے ہوئے بزرگ سے بھی نہیں سنی تھیں۔ ایک ڈاکو خدا کے معجزے کا اقرار کر رہا تھا۔ میں اس معجزے کی صداقت کو دیکھ رہا تھا۔ جانماز میں نے پہلے بھی محمد خان کے کمرے میں دیکھی تھی اور اس وقت بھی میری نظریں اسی کو دیکھ رہی تھیں۔

"پھر کیا ہوا؟ پولیس وہاں نہیں آئی؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "قسم اللہ کی' ضرور باہر بھی کوئی کرامت ہوئی ہو گی۔ ان کی آنکھوں کے سامنے اندھیرے کی چادر آگئی ہو گی۔ یا کوئی دیوار۔ انہیں وہ حجرہ نظر ہی نہیں آیا ہو گا۔"

"تم کتنا عرصہ رہے وہاں؟"

محمد خان نے کہا۔ "تین دن۔ میں جب جانے کی بات کرتا تھا' حافظ جی مجھے روک دیتے تھے۔ "ابھی نہیں میاں۔ مجھے خطرہ نظر آرہا ہے تمہارے لئے۔" کیسی عجیب بات ہے یہ سکندر! کہ ایک نابینا جو اپنے سامنے کی چیز نہیں دیکھ سکتا' وہ کہتا ہے کہ اس کی آنکھیں باہر خطرہ دیکھ رہی ہیں اور ایک ڈاکو اس کا مذاق نہیں اڑاتا۔ اسے غلط نہیں سمجھتا بلکہ اس کی بات مان لیتا ہے۔ ان تین دنوں میں کوثر نے میرے لئے سب کچھ کیا۔ کھانا پکانا اور کھلانا۔ وہ بہت کم بولتی تھی۔ کھانا کھا لیں' اٹھ جائیں' ادھر بیٹھ جائیں' مجھے جھاڑو دینی ہے۔ حافظ جی پانچ بار نماز پڑھانے جاتے تھے۔ میں اس کے ساتھ اکیلا رہ جاتا تھا۔ نہ حافظ جی نے کبھی مجھ سے کچھ کہا' نہ کوثر نے۔ مجھ عجیب

کیفیت سی سوار رہتی تھی۔ معلوم نہیں کیوں، مجھے کوثر کے بارے میں سوچتے ہوئے بھی ڈر لگتا تھا کہ حافظ جی کو معلوم ہو جائے گا اور ایسا ہی ہوا۔ تیسرے دن مجھے خیال آیا کہ کوثر جیسی بیوی ہو تو میری زندگی سنور جائے۔ میں اس سے متاثر تو ہو ہی چکا تھا۔ شام کو یہ خیال میرے ذہن میں آیا اور رات کو حافظ جی نے کہا کہ "میاں، میں چاہتا ہوں کہ اب اس فرض سے بھی سبکدوش ہو جاؤں۔ اب جیسا تم چاہتے ہو، ویسا ہی ہو گا۔ خدا کی مرضی یہی ہے۔" اور میں نے ان سے بحث نہیں کی۔ یہ نہیں پوچھا کہ انہیں خدا کی مرضی کا علم کیسے ہوا۔ خدا کی یہ کیا مرضی ہوئی کہ ایک ڈاکو کے ساتھ تم اپنی بیٹی کو رخصت کر رہے ہو۔ جسے نہ تم نے دیکھا ہے، نہ تم اس کے بارے میں کچھ جانتے ہو کہ وہ تمہاری بیٹی کو خوش رکھ سکے گا یا نہیں؟"

میں نے کہا۔ "وہ جانتا ہو گا۔"

"قسم اللہ کی۔ وہ جانتا ہو گا۔ تم نے ٹھیک سمجھا۔" محمد خان بولا۔

"تمہارے لئے خدا کا حکم ہو چکا تھا۔ تمہارا اس حجرے میں جانا ضروری تھا اور اس کے بعد بھی جو کچھ ہوا، سب ناگزیر تھا۔ اس حکم کے تحت تم ہم سے ملے اور ہم تمہارے مہمان ہوئے۔ خدا کی مرضی پوری ہوئی۔ اس میں ہمارا کوئی کمال نہیں ہے محمد خان۔ کمال تمہاری اپنی فطرت کی اس صلاحیت کا ہے جو نیکی کو جذب کر سکتی ہے۔"

"آج حافظ جی سے ملنے جاؤں گا تو انہیں بتا دوں گا کہ میرے مولا نے مجھے راستہ دکھا دیا۔"

"اور تمہاری بیوی۔ وہ کہاں رہے گی؟"

"ہمارے ساتھ۔" خان نے بڑے جوش سے کہا۔ "اس کی تم فکر مت کرو۔ وہ کسی معاملے میں دخل نہیں دے گی۔ بالکل اللہ میاں کی گائے ہے وہ۔ کچھ نہیں کرے گی، سوائے خدمت کے۔"

میں نے کہا۔ "بات یہ ہے خان صاحب کہ یہ کام ذرا مختلف قسم کا ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"مطلب یہ کہ ہر عورت کے بس کا نہیں ہے اور پھر جو عورت اللہ میاں کی گائے ہو، کچھ نہ کر سکتی ہو، وہ ایک غیر ضروری ذمے داری بن جائے گی کیونکہ خدمت کی کسی کو ضرورت نہیں ہے۔ سب اپنی خدمت آپ کرتے ہیں، اگر فرصت ملے۔"

میں نے دیکھا کہ خان کا چہرہ اتر گیا۔ "آپ آزما کے دیکھئے۔"

میں نے کہا۔ "اچھا یہ بتاؤ، اس نے کبھی ریوالور یا پستول سے گولی چلائی ہے؟"

"نہیں۔ ایک پیش امام کی بیٹی کا ایسی چیزوں سے دور کا بھی تعلق نہیں ہو سکتا۔"

میں نے کہا۔ "مشین گن چلا سکتی ہے، دستی بم پھینک سکتی ہے؟"

"آپ مذاق کرتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "نہیں۔ یہ مذاق نہیں ہے۔ یہ جو تین لڑکیاں ہمارے ساتھ ہیں، یہ ہر قسم کا اسلحہ استعمال کر چکی ہیں۔ مقابلے پر آنے والے نہ جانے کتنے دشمنوں کی لاشوں کے چیتھڑے بکھیر چکی ہیں۔ یہ خود بھی گولیوں کی بوچھاڑ سے گزرنا جانتی ہیں۔ بارودی سرنگ، ٹائم بم اور ڈائنامائٹ لگا سکتی ہیں۔ دستی بم پھینک سکتی ہیں اور ان میں خاص طور پر گل کا نشانہ بہت اچھا ہے۔ نازو کے ہاتھوں کا کمال تم دیکھ ہی چکے ہو۔ اس نازک سی لڑکی کا مقابلہ چار مرد نہیں کر سکتے۔ وہ چاروں کی ہڈیاں توڑ دے گی۔ یا انہیں جان سے مار دے گی۔ رابعہ ایک وکیل بھی ہے۔ بہت اونچے درجے کی۔ نازو ایک نرس بھی ہے، مرہم پٹی کر لیتی ہے۔ اب بتاؤ، تمہاری کوثر کو ایسا کوئی کام آتا ہے تو ہم اسے ساتھ رکھ سکتے ہیں۔"

محمد خان نے نفی میں سر ہلایا۔ "قسم اللہ کی، وہ تو کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ تم نے ٹھیک کہا۔ اس کا پیچھے رہ جانا ہی اچھا ہے، ورنہ وہ تو گولی کی آواز پر غش کھا جائے گی۔ لاش گرتے دیکھ لے گی تو بیہوش ہو جائے گی۔ میں سمجھا دوں گا اسے۔"

میں نے کہا۔ "صبر کرنا بھی تو جہاد سے کم نہیں۔ وہ تمہاری سلامتی کے لئے دعا کر سکتی ہے اور فاتحانہ واپسی تک انتظار کر سکتی ہے۔"

محمد خان نے کہا۔ "میں اسے بتا دوں گا۔"

"اس کے علاوہ تمہارے وہ ساتھی جو ابھی تک ساتھ نبھا رہے تھے، شاید تمہارے فیصلے سے مایوس ہوں گے۔"

"انہیں میں رخصت کر دوں گا۔" خان نے کہا۔

"کیا کہو گے ان سے؟"

"یہی کہ بس اب ہمارے راستے الگ ہو گئے ہیں۔ یہیں تک ساتھ تھا ہمارا۔"

"وہ وجہ نہیں پوچھیں گے؟"

"وجہ وہ جانتے ہیں۔ انہیں پہلے سے اندازہ ہے کہ مجھے شادی کے بعد شرافت کا بخار ہو گیا ہے کیونکہ میں نے ایک ملا جی کی بیٹی سے شادی کر لی۔ اس لئے یہ تو ہونا ہی تھا۔"

"ٹھیک ہے۔ انہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ تم ہمارے ساتھ جا رہے ہو۔" میں نے مطمئن ہو کے کہا۔

"کیا میں کوثر کو بھی کچھ نہ بتاؤں؟"

میں نے کہا۔ "مجھے نہیں معلوم، تمہاری بیوی کس حد تک راز کو راز رکھنے کی اہل ہے۔ عام طور پر عورتیں اس معاملے میں بدنام ہیں۔"

"میں حافظ جی کو بتا دوں گا، وہ بعد میں خود سمجھاتے رہیں گے اسے۔" محمد خان بولا۔ "کھانا میں اس کے ساتھ ہی کھاؤں گا۔"

میں نے کہا۔ "حافظ جی سے یہ بھی کہنا کہ ہمارے لئے دعا ضرور کریں۔"

محمد خان چلا گیا تو میں کمرے سے نکلا۔ باقی سب لوگ ایک ہی کمرے میں جمع تھے۔ غالب اور محسن ایک کاپی کے صفحے پھاڑ پھاڑ کے پینسل سے کچھ لکھتے جا رہے تھے۔ فرش پر چرمر کاغذوں کی گولیاں بکھری پڑی تھیں جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کتنی محنت کر چکے ہیں۔

"اٹھ گئے بھائی شریف۔" محسن بولا۔

"شریفن کئی بار یاد کر چکی ہیں۔" غالب نے کہا۔ "میں نے تو کہا کہ صورِ اسرافیل پھونکو، پھر اٹھے گا۔"

"میں گزشتہ ڈیڑھ گھنٹے سے ایم آر ایس کی رکنیت کے ایک امیدوار کا انٹرویو کر رہا تھا۔" میں نے زمین پر آلتی پالتی مارتے ہوئے کہا۔

"اب کسے بھرتی کر لیا۔ اس شاعرِ بے مہار کو؟"

میں نے انہیں محمد خان سے گفتگو کے کچھ اقتباسات سنائے۔ رابعہ، نازو اور گل اپنی باتیں چھوڑ کے میری طرف متوجہ ہوئیں تو محسن اور غالب نے انہیں ڈانٹا۔

"یہ آپ لوگوں کی باتیں نہیں ہیں۔ چلیں، اپنے بھوتوں کی باتیں کریں۔"

غالب نے کہا۔ "ہاں، رات ہو گئی ہے۔ وہ آتے ہی ہوں گے ملاقات کے لئے۔ اب خواہ مخواہ مت گھورو مجھے۔ میں نے اپنے کسی سسر کا نام نہیں لیا ہے۔"

گل نے کہا۔ "ہم کسی بھوت سے نہیں ڈرتے جی۔"

نازو نے کہا۔ "ہاں جب تم سے نہیں ڈرتے تو بھوت کیا ہیں۔"

میں نے کہا۔ "میری بات سنو گے یا آپس میں لڑتے رہو گے؟"

"ہم سن رہے ہیں اور بڑی خوشی کی بات ہے کہ خونی خان نے عملاً ہمارا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔" محسن بولا۔

ایک سنسنی خیز خبر ہمارے پاس بھی ہے۔" غالب نے کہا۔

میں نے کہا۔ "تم نے اس خفیہ زبان سے پھر کوئی مطلب نکال لیا ہو گا۔ جیسے پہلے نکالا تھا۔"

محسن نے مجھے قابلِ ملامت سمجھتے ہوئے کہا۔ "دوپہر کے بعد سے آپ تو سوئے پڑے تھے گھوڑے بیچ کے۔ ہم اپنی عقل کے گھوڑے دوڑا رہے تھے۔"

"ایک دائرے میں۔" میں نے کہا۔

غالب اپنی کامیابی پر ضرورت سے زیادہ خوش تھا۔ اس نے ایک کاغذ میری طرف بڑھا کر کہا۔ "اسے دیکھو چیف کے تو، ہم نے دشمن کا کوڈ پکڑ لیا ہے۔"

میں نے کاغذ کو غور سے دیکھا۔ "مجھے سمجھاؤ کہ آخر یہ کیا گورکھ دھندا ہے۔"

غالب نے کہا۔ "پہلی تحریر تھی ہندسوں میں۔ ہم نے غور کیا تو اس میں سب سے بڑا عدد چھبیس کا تھا۔"

محسن نے کہا۔ "اور شاید آپ نے انگریزی پڑھی ہو۔ اس میں چھبیس حروفِ تہجی ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "آفرین۔"

غالب نے کہا۔ "اس کے بعد ہم نے فرض کیا کہ چھبیس کا مطلب ہے زیڈ۔ پچیس ہو گیا وائی۔ اور اس طرح ایک نمبر ہو گیا اے۔ چوبیس۔"

"مگر اس طرح اعداد کی جگہ الفاظ لکھنے سے جو عبارت بنی وہ کچھ یہ تھی۔" محسن نے ایک کاغذ مجھے تھما کے کہا۔

میں نے ایک بے معنی عبارت کو پڑھنے کی بے سود کوشش کی۔

اس پر جو تحریر تھی وہ کچھ یوں تھی۔

GDVMGB HVEVMGS NROV

میں نے کہا۔ "لاحول ولا قوہ۔ تمہاری عقل کے گھوڑے کیا بھنگ پی کر دوڑ رہے تھے۔ اور وہ گھوڑے تھے یا گدھے؟"

غالب ہنسا۔ "یہ بھی پوچھ لو کہ ہم کس طرف منہ کر کے بیٹھے تھے۔ دم کی طرف یا منہ کی طرف۔"

محسن نے کہا۔ "یہ عقل آپ کی نہیں تھی جس سے ہم نے مدد لی۔ یہ کمال ہے ہمارے ان اعلیٰ دماغوں میں محفوظ سپر فائن گریڈ عقل کا۔"

غالب نے کہا۔ "ظاہر ہے اس نتیجے نے ہمیں بھی مایوس کیا تھا مگر ہم نے ہمت نہیں ہاری۔ اور دوسرا فارمولا وضع کیا۔"

"وہ میرا فارمولا تھا۔" نازو نے کہا۔

"خواہ مخواہ عقل مند بننے کی کوشش مت کرو۔ فارمولے کا مطلب معلوم ہے؟" غالب نے کہا۔

"تم نے کیا پیٹنٹ کرا لیا تھا اپنا فارمولا؟" محسن بولا۔

"غالب کے بچے، کھاؤ قسم کہ میں نے نہیں کہا تھا۔" نازو نے کہا۔

"لاؤ، کدھر ہے قسم میں کھا کے دکھاتا ہوں۔ تم اس کی باتوں پر مت جاؤ۔ ہم نے اعداد کو الٹ کر دیکھا۔ یعنی یہ کہ نمبر چھبیس اگر انگریزی حرف اے کا ہو اور گنتی الٹی چلے تو ایک نمبر ہو گا زیڈ کا۔"

محسن نے ایک کاغذ کو فتح کے جھنڈے کی طرح لہ...

"یوں حضرات وخواتین جو مطلب نکلا وہ آپ کے سامنے ہے۔"

میں نے کاغذ لے کر دیکھا۔ اس پر انگریزی میں لکھا ہوا تھا۔ ستائیسواں میل

(TWENTY SEVENTII MILE)

میں ان کی ذہانت کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا "یہ تو واقعی کمال کردیا تم نے۔ اگرچہ فارمولا مس نازو کا استعمال کیا۔"

نازو نے چمک کے کہا "صداقت چھپ نہیں سکتی بناوٹ کے اصولوں سے۔"

غالب نے اسے گھور کے کہا "کہ خوشبو آ نہیں سکتی کبھی کاغذ کے پھولوں سے۔ ذرا دور ہٹ کے بیٹھو۔ لہسن کی بو آرہی ہے۔"

نازو کا موڈ آف ہو گیا "چلو گل، کھانے کا کچھ کریں۔" اس نے احتجاجی انداز میں واک آؤٹ کرتے ہوئے کہا۔

"دوسری عبارت کا مطلب کیا نکلا؟" میں نے کہا۔

رابعہ نے مسکرا کے کہا "میں یہ نہیں کہوں گی کہ اس کا فارمولا میں نے بتایا تھا۔"

"کمہ بھی دوگی تو کیا فرق پڑے گا" محسن جھلا کے بولا۔

غالب نے کہا "دوسری عبارت میں کتنی سیدھی تھی۔ لیکن کہیں کہیں کوڈ نمبر بھی استعمال ہوا تھا۔ تاہم اس کا مطلب ہم نے کئی بار کوشش کرکے یہ نکالا۔"

"سنہرا شاہین" میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

(GOLDEN FALCON)

"سنہرا شہباز۔ میری معلوماتِ عامہ کے مطابق شکاری باز کی ایک انتہائی کمیاب قسم ہے جس کی قیمت لاکھوں تک جاتی ہے۔"

میں نے کہا "مگر یہ بات تو ایسی نہیں کہ اتنے پُراسرار طریقے پر لکھی جائے۔"

غالب نے کہا "ظاہر ہے اصل مطلب کچھ اور ہو گا۔ جو ابھی ہم معلوم نہیں کرسکے۔"

"اسی طرح ستائیسواں میل چہ معنی دارد؟" میں نے کہا۔

"تم بھی تو کچھ کرو چیف۔ ہم نے تالے کی چابی تلاش کرلی، تم کم سے کم تالا کھول کر دیکھو" محسن نے کہا۔

"اوکے۔ میں معلوم کرلوں گا کہ یہ راز کیا ہے" میں نے کہا "مگر پہلے میں معلوم کرنا چاہوں گا کہ اس رات کا مینو کیا ہے؟"

"وہی مسور کی دال + چاول" رابعہ نے کہا۔

میں نے بگڑ کے کہا "پھر دال۔ بنیوں کے دیس میں آکے کیا ہم نے بھی گوشت کھانا چھوڑ دیا ہے۔"

غالب نے کہا "گوشت نہ کھانے سے مسلمان کا ایمان کمزور نہیں پڑتا۔"

میں نے فریادی لہجے میں کہا "مگر مسلمان خود تو کمزور پڑ جاتا ہے۔"

محسن نے کہا "اب کیا ہو سکتا ہے۔ انہوں نے ہول سیل میں چاول پکائے ہیں ہفتے بھر کے لئے۔ لنچ اور ڈنر میں اور کچھ نہیں ہو گا۔"

میں نے کہا "تین وقت مسلسل دال کھانے کے بعد اگر میں اس تشدد سے ہلاک ہوجاؤں تو کم سے کم میرے سوئم میں قورمہ پلاؤ پکوالینا۔"

غالب نے کہا "ان پھوہڑ خواتین میں سے کسی کو آتا ہے قورمہ پکانا؟ نازو پوچھ رہی تھی کہ کیا قورمے میں گوشت پڑتا ہے۔"

رابعہ نے ہنستے ہوئے کہا "وہ سامنے نہیں ہے اس لئے جو چاہو کہو۔"

غالب نے کہا "بی بی! ہم ڈرتے نہیں ہیں کسی سے۔ تم سامنے ہو۔ تم بتاؤ، کیا تم نے نہیں پوچھا تھا؟ کیا پوچھا تھا یار محسن؟"

محسن نے کہا "یہی کہ قورمہ پکاتے وقت چمچہ دائیں سے بائیں چلانا چاہئے یا بائیں سے دائیں۔"

"اور دیگچی اُلٹی رکھنی چاہئے یا سیدھی" غالب نے کہا۔

رابعہ نے کہا "باتیں کرلو قورمے کی۔ کھانی تو دال ہی پڑے گی۔"

لیکن اسی وقت نازو اور گل ٹرے اٹھائے اندر آئیں تو خوشبو نے سارا راز فاش کردیا۔ انہوں نے چکن روسٹ کیا تھا اور چکن بریانی پکائی تھی اور ثابت کردیا تھا کہ وہ اچھا پکا سکتی ہیں۔

میں نے کہا "یہ اچانک مرغیوں کی افراط کیسے ہو گئی؟"

غالب نے محسن کی طرف اور محسن نے غالب کی طرف دیکھ کے کہا "ہم خود لے کر آئے ہیں۔"

میں نے کہا "تم لوگ بازار گئے تھے؟"

"نہیں۔ بازار تو خیر نہیں گئے تھے۔"

"پھر یہ مرغیاں کہاں سے آئیں؟" میں نے کہا۔

"یار، آم کھانے والے کو پیڑ نہیں گننے چاہئیں" غالب نے کہا۔

"چکن قورمہ اور چکن بریانی کھانے والے کو فضول سوالات سے گریز کرنا چاہئے" محسن بولا۔

غالب نے کہا "اور دال کے وبال سے بچ جانے پر خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے۔"

رابعہ اور گل نے ہنسنا شروع کیا تو میں سمجھ گیا "کس کی مرغیاں پکڑی ہیں؟" میں نے کہا۔

سب سے زیادہ غالب اور نازو مجرم بنے ہوئے تھے۔ نازو نے کہا "سکندر، وہ خود ہی آگئیں اندر۔"

"ہم کوئی انہیں پکڑنے کی نیت کرکے نہیں گئے تھے۔ ہم تو بس ایسے ہی ٹہلنے کے لئے نکلے تھے" غالب نے کہا۔ "ویسے تو ہم نے بھی یہ کام کئے تھے بچپن میں مگر نازو کی مہارت کا جواب نہیں۔ ایسی زبردست مرغی چور ہے۔"

نازو بگڑ گئی "مجھے تم نے مجبور کیا تھا۔"

"میں نے صرف یہ کہا تھا کہ یہ مرغی پکڑ کر دکھاؤ ذرا" غالب نے ڈھیٹ بن کے کہا "یہ نہیں کہا تھا کہ اسے پکڑ کے کچن میں لے جاؤ۔"

"ذبح کس نے کی تھی؟ اور صاف کس نے کی تھی۔ کس نے کہا تھا کہ بڑا جی چاہتا ہے چکن روسٹ اور چکن بریانی کھانے کے لئے۔"

اب جو جنگ شروع ہوئی تو اس میں گل اور محسن بھی فریق بن گئے۔ مرغی محسن نے ذبح کی تھی اور گل نے صاف کی تھی اور اس جرم کے ایڈونچر میں سب برابر کے شریک تھے۔ جب کھانا ختم ہوا تو سب کا موڈ بہت خوشگوار تھا۔ طے یہ کیا گیا تھا کہ مرغی کی قیمت کے برابر رقم سب اپنے اپنے طور پر صدقہ دیں گے تاکہ کفارہ ادا کیا جاسکے۔ معلوم نہیں یہ فیصلہ کس حد تک درست تھا۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ مرغی کو چوری کی نیت سے نہیں پکڑا گیا تھا۔ اگر مالک سامنے ہوتا تو اسے قیمت ادا کرکے بھی مرغی خرید لی جاتی۔ کچن میں دال چاول کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ مرغی نے چکن بریانی کے امکانات کو روشن کیا اور اس دعوت کو ممکن بنادیا۔

چائے رابعہ نے بنائی۔ گل اور نازو نے ہینڈ پمپ چلا کر برتن دھوئے اور اس وقفے میں سگریٹیں پھونکتے ہوئے میں نے غالب نے اور محسن نے اس نوٹ بک کے باقی صفحات کی تحریر پر غور کیا۔ اگلے چند صفحات پر کچھ نام تھے۔ ایک نام تھا "بی آر ملہوترہ" جس کے آگے بریکٹ میں "بالک رام" بھی لکھا ہوا تھا۔ دوسرا نام "کرن شا" تھا۔ جس سے یہ اندازہ کرنا بھی مشکل تھا کہ اگر یہ عورت ہے تو ہندو ہے، مسلمان یا عیسائی۔ دو صفحات پر ایک نقشہ بنا ہوا تھا۔ یہ ایک ٹیڑھی میڑھی شکستہ لکیر تھی جو دائیں بائیں اوپر نیچے بہت سے گول دائروں کو آپس میں ملاتی تھی۔ ہر دائرے پر ایک نام تھا۔

میں نے کہا "یہ لکیر کسی راستے کو ظاہر کرتی ہے؟"

محسن نے مجھ سے اتفاق کیا "اور غالباً یہ سڑک ہے۔ جس پر بنے ہوئے دائرے مختلف مقامات کی نشاندہی کرتے ہیں۔"

غالب نے کہا "کیا یہ شہر نہیں؟"

میں نے کہا "شہر، قصبے، گاؤں کچھ بھی ہوسکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ ان کے ٹھکانے ہیں۔"

محسن نے کہا "کیا یہ معلوم نہیں کیا جاسکتا کہ یہ ٹھکانے کہاں ہیں؟"

میں نے کہا "اس کے لئے خاصے بڑے نقشے کی ضرورت پڑے گی جس میں تمام چھوٹے بڑے شہر اور قصبے اور انہیں آپس میں ملانے والی سڑکیں دکھائی گئی ہوں۔ لیکن اس سے بھی صرف اندازہ ہی کیا جاسکتا ہے۔ بالکل صحیح مقام کا پتا چلانا تقریباً ناممکن ہے۔"

"ناممکن کیوں ہے۔ نقشہ سامنے ہو تو ہم دیکھ سکتے ہیں کہ کون سا دائرہ کس شہر یا قصبے کی جگہ بنایا گیا ہے۔"

میں نے کہا "نقشے میں ایک چیز ہوتی ہے اسکیل یعنی یہ کہ ایک سینٹی میٹر یا ایک انچ کتنے فاصلے کو ظاہر کرتا ہے۔ مثلاً ایک انچ اگر تین سو میل کے برابر ہو تو دو شہروں کا درمیانی فاصلہ معلوم کرنا کوئی مشکل کام نہیں اور فاصلہ معلوم ہو تو یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ بمبئی سے ایک انچ کے فاصلے پر شمال مغرب میں کون سا شہر یا قصبہ ہے اور تین انچ شمال مشرق میں کوئی نشان کس آبادی کو ظاہر کرتا ہے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ اس ڈائری میں جو راستہ بنایا گیا ہے وہ کسی اسکیل کے مطابق ہے یا نہیں۔ ہم یہ نہیں معلوم کرسکتے کہ دو دائروں کے درمیان جو فرق دکھایا گیا ہے وہ اصل فاصلے کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ تو بس کسی ڈرائیور کی رہنمائی کے لئے ہے کہ یہاں سے چل کر وہاں جانا ہے۔ ایک منزل سے دوسری منزل تک کس طرح پہنچنا ہے۔"

غالب نے میری بات سب سے پہلے سمجھ لی "یہ بالکل ٹھیک ہے۔ قصبے، شہر کا نام اس لئے درج نہیں کیا گیا ہے کہ کسی کو راستے کا علم نہ ہوسکے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ ہر دائرے پر ایک نام ہے۔ کسی شخص کا جو غالباً کوئی درمیانی آدمی ہے۔ رابطے کا ذریعہ ہے یا مال وصول کرکے آگے ترسیل کا ذمے دار ہے۔"

محسن نے کہا "پھر تو یہ بہت اہم چیز ہے۔"

میں نے کہا "اہم نہ ہوتی تو اس کی تلاش میں لوگ ہمارا تعاقب کرتے ہوئے کیوں آتے۔ یہ نوٹ بک غلطی سے گر گئی تھی۔ انہیں بعد میں پریشانی ہوئی کہ کہیں اہم معلومات ہمارے ہاتھ نہ لگ جائیں۔ مدھوسودن اور کیرتی کو قتل کرنے والے نوٹ بک کی تلاش میں واپس گئے اور جب انہیں نوٹ بک نہیں ملی تو انہوں نے یہ سراغ لگانے کی کوشش کی کہ اسے کون لے جاسکتا ہے۔ جب مدھوسودن اور کیرتی کی لاش کے پاس ہماری موجودگی ثابت ہوئی تو انہوں نے ہمیں تلاش کیا۔ اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوجاتے، اگر ہم مرحوم چاچا کے چائے خانے کے پیچھے ان کے گھر میں نہ چھپے ہوئے ہوتے۔"

رابعہ نے کہا "پولیس کی وردی سے انہوں نے پورا فائدہ اٹھایا۔"

میں نے کہا "بھیس بدلنے کے لئے پولیس کی وردی سے

بستر کوئی لباس نہیں، میں بھی اس نتیجے پر پہنچا ہوں۔ ایک تو پولیس ہر جگہ ہے اور وردی کسی سے بھی چھینی جاسکتی ہے۔ پھر یہ وردی پہن کے آدمی آسانی سے پولیس میں شامل ہو جاتا ہے اور کسی حد تک گم ہو جاتا ہے۔ وہ پبلک میں شامل نہیں رہتا اور پولیس کے لئے یہ بہت مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے ہی ساتھیوں پر شک کرے اور ان سب کو چیک کرنے لگے۔ آئندہ ہم بھی پولیس کے تعاون سے ہی کام چلائیں گے۔"

"اور انہیں مزید بدنام کریں گے۔" محسن بولا۔

"نہ وہ بدنامی سے ڈرتے ہیں اور نہ انہیں بدنامی سے کوئی فرق پڑتا ہے۔" میں نے کہا۔ "کوّے کو کیا ڈر کہ اس کے بدن پر کالک نہ لگ جائے۔"

غالب نے ایک بہت پتے کی بات کی۔ "اگر یہ نقشہ اور اس میں دیئے گئے نام اتنے ہی اہم ہیں تو اس کی ایک ایک نقل ہم سب کے پاس ہونی چاہئے۔ تاکہ اصل گم ہو جائے یا چھن جائے تو فرق نہ پڑے۔"

نازو نے کہا۔ "یہ میں نے کہا تھا۔"

غالب نے خفت میں جھلّا کے کہا۔ "ہاں ہاں۔ ہر عقل کی بات جو میرے منہ سے نکلتی ہے تمہارے دماغ کی پیداوار ہوتی ہے۔ اپنا دماغ تو میں نے فرائی کر کے کھالیا ہے اور تمہارے بھیجے سے کام چلا رہا ہوں۔"

"یعنی مس نازو کا دماغ فی الحال خالی ہے ایک دم۔" محسن بولا۔

"خالی دماغ شیطان کا ورکشاپ ہوتا ہے انگریزی محاورے کے مطابق۔" میں نے کہا۔

"اسی لئے تو بھوت نظر آتے ہیں اسے۔"

"خبردار جو تو نے بھوت کو اپنا سسر کہا۔" محسن بولا۔

"میری بیوی کا باپ بھوت ہو یا جن، کسی کو کیا۔" غالب نے نازو کی طرف دیکھ کے کہا۔ "میں کسی بھوت کی بچی سے نہیں ڈرتا۔"

اس مرتبہ غالب نہ بچ سکا۔ نازو نے اسے ہاتھ پکڑ کے بیٹھے بیٹھے کھینچا اور ایک جھٹکے سے اوپر اٹھا کے اپنے پیچھے پھینک دیا۔ اس سے پہلے کہ نازو مزید جارحانہ کارروائی کرتی محسن ان کے بیچ میں آگیا۔

"آخر یہ کیا غنڈا گردی ہے مس نازو۔ ہمارا یار اپنے سسر کو بھوت کہتا ہے تو تم کیوں خفا ہوتی ہو؟" محسن نے ڈانٹ کر کہا۔

"سکندر کیوں نہیں کہتا اپنے سسر کو بھوت، تم کیوں نہیں کہتے؟" نازو نے لال پیلا ہو کے کہا۔

"اس لئے کہ میرا سسر بھوت نہیں تھا۔ وزارتِ خارجہ میں ڈپٹی سیکریٹری تھا۔" محسن نے کہا۔ "اب اگر وہ بھوت بننا چاہے تو کیا میں روک سکتا ہوں اسے۔"

میں نے کہا۔ "اور سسر سچ مچ بھوت بن کر سامنے آجائے تب بھی میں اسے بھوت نہیں کہوں گا۔"

"پھر کیا کہو گے؟" غالب نے سوچ کر کہا۔

"میں اسے گھوسٹ کہوں گا۔" میں نے متانت سے کہا۔

اس کے بعد رابعہ اور نازو احتجاجاً چادر میں منہ لپیٹ کر سو گئیں لیکن مجھے پتا تھا کہ وہ جاگ رہی ہیں۔ میں محمد خان کی باتیں کرتا رہا۔ میں نے تفصیل سے اس کی شادی کے بارے میں بتایا اور کوثر کے نابینا والد کے کشف و کرامات کا ذکر کیا جس نے ایک ڈاکو کو شرافت کی زندگی سے روشناس کرانے میں پہل کی تھی اور اس کے دل کے تاریک گوشوں کی روشنی کی پہلی کرن دی تھی۔

میں دن میں نیند پوری کر چکا تھا۔ غالب کو کچھ بے خوابی کی شکایت تھی۔ محسن اونگھنے لگا تو میں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ سو جائے۔

"چلو ہم بھوتوں سے مل آئیں۔" میں نے تجویز پیش کی۔ "عام طور پر وہ آدھی رات کے وقت ملتے ہیں۔"

"لیکن ہم ان سے ملیں گے کہاں؟"

"گھوم پھر کے دیکھتے ہیں اس ویرانے میں۔ شاید کہیں ملاقات ہو جائے۔" میں نے کہا۔

"چلو۔ ممکن ہے میرا سسر بھی مل جائے۔" غالب نے زور سے کہا تاکہ نازو بھی سن لے۔

نازو نے جانتے بوجھتے خراٹے لینے شروع کر دیئے۔ یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ وہ گہری نیند میں کچھ نہیں سن رہی ہے۔

"مل گیا تو کیا کہو گے؟" میں نے کہا۔

"کہوں گا کہ اپنی بیٹی کو سنبھالو ورنہ میں دماغ درست کرنا جانتا ہوں۔ اور مجھے کوئی کمی بھی نہیں ہے لڑکیوں کی۔"

میں نے کہا۔ "اس میں کیا شک ہے۔ اپنی وحیدہ رحمان ہے اور صوفیہ لورین ہے اور رانی ہے...."

نازو چادر کے اندر سب سن کے یقیناً بہت تاؤ کھا رہی ہوگی مگر اس نے سوتا بن کے ہماری بک بک کا جواب نہ دینا بہتر سمجھا۔

"تم بھی چلو گل۔" غالب نے ہنستے ہوئے کہا۔ "بھوت دیکھنے"۔

"میں ... نہیں ... آپ لوگ جائیں۔" گل کی حالت غیر ہونے لگی۔ "میں یہیں ٹھیک ہوں۔"

میں اور غالب باہر نکلے تو میں نے کہا "میں بات کرنا چاہتا تھا شہلا کی۔ کل رات سے اب تک چوبیس گھنٹے گزر گئے ہیں۔"

"پھر؟" غالب نے کہا۔

"کیا ہمیں وہاں جا کے صورتحال کا جائزہ نہیں لینا چاہئے؟" میں نے کہا۔ "یہ نہ ہو کہ وہ روانہ کر دیں مال اور ہمیں بتا

بھی نہ چلے۔"

"تمہیں راستہ یاد ہے۔ وہ کیا جگہ تھی؟"

میں نے کہا۔ "راستہ تو بالکل ذہن میں نہیں لیکن گودام تھے وہاں۔"

"گودام شہر کے ہر علاقے میں ہو سکتے ہیں۔ مشرق میں بھی ہو سکتے ہیں اور مغرب میں بھی۔"

ہم دونوں پرانی حویلی کے بند کمروں میں جھانکتے ہوئے چلتے گئے۔ محمد خان نے کہیں کہیں بلب لگوا دیئے تھے، اس کے باوجود تاریکی جو اس عمارت کے در و دیوار سے کالک بن کے چمٹی ہوئی تھی، دور نہیں ہوئی تھی۔ بیچ کی راہداری کی چھت شاید بیس فٹ بلند تھی اور اس پر خوبصورت نقش و نگار والے ٹائل تھے۔ لیکن یہ ٹائل اُکھڑ رہے تھے اور خالی جگہ اب کسی زخم کی طرح نظر آتی تھی جو وقت کے ہاتھوں نے اس تاریخی عمارت کے جسم پر لگا دیئے تھے۔ دیواروں کا پلاستر بھی جگہ جگہ سے اکھڑ کر گر چکا تھا اور اس کے نیچے سے پرانی چھوٹی اینٹیں نظر آنے لگی تھیں۔

باتھ روم اور کچن کے راستے سے ہم باہر کی طرف آ گئے۔ میں نے کہا۔ "اگر وہ یوسفِ ثانی مل جاتا تو ہماری رہنمائی کر سکتا تھا۔"

"آخر وہ گیا کہاں؟"

"مجھے اس کے جانے کا بالکل پتا نہیں چلا۔ یہاں تک وہ ہمارے ساتھ ہی آیا تھا۔ بلکہ ہمیں وہی لے کر آیا تھا۔ اس کے بعد غائب۔ وہ آدمی نہیں چھلاوا ہے۔"

غالب نے کہا۔ "کیا محمد خان واپس آئے گا؟"

"پتا نہیں۔ اس نے کہا تھا کہ وہ حافظ جی سے بات کرے گا اور کھانا اپنی بیوی کے ساتھ کھائے گا۔ وہ بھی لے جا سکتا ہے ہمیں۔" میں نے کہا۔ "اس کا ساتھ ایک بہت بڑا سہارا ہوگا۔"

"ہاں وہ اس سارے علاقے کو اچھی طرح جانتا ہے۔"

"اور ایک عام آدمی کے مقابلے میں ایک ڈاکو خفیہ راستوں سے اور خفیہ مقامات سے زیادہ واقف ہوتا ہے۔"

"اسے اب ڈاکو مت کہو۔" غالب نے کہا۔

"وہ ڈاکو تھا تو سہی۔ اس کا تجربہ...." بات کرتے ہوئے میں نے رک کر پیچھے دیکھا۔

غالب نے کہا۔ "یہ آواز تو نے سنی؟"

میں نے کہا۔ "ہاں۔ چوڑیوں کی جھنکار، پائل کی کھنکار۔"

میں نے ایک سایہ دیکھا جو تیزی سے پرانے درخت کے تنے کے پیچھے چھپ گیا۔ میں نے اونچی آواز میں کہا۔ "کون ہے؟" پھر غالب اور میں دوڑ کر ایک ساتھ درخت تک پہنچے مگر وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں اسے فریبِ سماعت یا فریبِ نظر اس نہیں سمجھ سکتا تھا کہ جو میں نے دیکھا اور سنا تھا وہ غالب نے بھی دیکھا اور سنا تھا۔

"یار، یہ کیا چکر ہے۔ پرانی انڈین فلم 'محل' شروع ہونے والی ہے کیا؟" غالب نے کہا۔

میں نے کہا۔ "ابھی مدھوبالا اچانک گانا گاتی ہوئی نمودار ہوگی۔ آئے گا۔ آئے گا۔ آنے والا۔"

ہمارے پیچھے کوئی آہستہ سے ہنسا۔ یہ پُر متانت مردانہ ہنسی کی آواز تھی۔ پھر کسی نے کہا۔ "کیا زندگی فلم نہیں ہوتی؟ یا فلم میں حقیقی زندگی کی کوئی بات نہیں ہوتی؟"

میں کچھ دیر ہکا بکا کھڑا رہا۔ ابھی چند سیکنڈ قبل وہاں کوئی بھی نہیں تھا جہاں اب ایک شخص ہاتھ میں گول مٹھ والی چھڑی لئے کھڑا ہوا تھا۔ اس کے سر پر پگڑی تھی، اس نے دھوتی پر کوٹ پہن رکھا تھا اور قمیص کے ساتھ ٹائی باندھ رکھی تھی۔ اس حلئے کے لوگ بہت پرانی تصویروں میں نظر آتے تھے۔ وہ بھاری بھرکم آدمی تھا اور اس کے چہرے کی مناسبت سے گول شیشوں والا چشمے کا فریم یقیناً چھوٹا تھا۔ وہ کلین شیو تھا لیکن اس کی مونچھیں تلوار مارکہ تھیں۔

آپ کون ہیں؟" میں نے کہا۔ "اور اس وقت یہاں کیا کر رہے ہیں؟"

وہ آہستہ آہستہ آگے آیا۔ "اصولاً تو یہ سوال کرنے کا حق مجھے حاصل ہے۔ کیونکہ میں اس حویلی کا مالک رائے بہادر پرشاد او بی ای ہوں۔ او بی ای کا مطلب سمجھتے ہو؟"

"جی۔ آرڈر آف دی برٹش ایمپائر۔" میں نے طنز سے کہا۔ "میں چار سال برطانیہ میں رہ چکا ہوں۔"

"او آئی سی۔ شاید اسی لئے تم جانتے ہو۔ ورنہ آج کل کے نوجوان عموماً گزرے ہوئے کل کی تاریخ کو اتنی اہمیت نہیں دیتے، وہ آنے والے کل میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "رائے بہادر صاحب! کیا ایسا کرنا غلط ہے؟"

"بالکل غلط رویّہ ہے یہ۔ آنے والے کل کی بنیاد گزرے ہوئے کل کے تجربے پر نہ ہو تو وہی ہوتا ہے جو اَب ہو رہا ہے۔ روایات کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ وضعداری باقی نہیں رہتی۔ اولڈ از گولڈ والی بات لطیفہ بن جاتی ہے۔" رائے بہادر نے بڑے دکھ سے کہا۔

"خود آپ نے اپنے ماضی سے رشتہ توڑ لیا ہے۔"

"میں نے ...؟" رائے بہادر نے نفی میں سر ہلایا۔

"اگر ایسا نہیں ہے تو پھر آپ نے اس حویلی میں رہنا کیوں ترک کیا۔ یقیناً آپ نے جدید طرز کا بنگلا یا محل بنوا لیا ہوگا جو ہو پر یا میرین ڈرائیو پر۔" میں نے کہا۔ "حالانکہ آپ میری نظر سے دیکھیں تو جو حسن اس حویلی میں ہے...."

غالب نے کہا۔ "کیا طرزِ تعمیر کی اس روایات کو آپ نے اپنے نئے محل میں برقرار رکھا ہے؟"

رائے بہادر نے نفی میں سرہلایا۔

"پھر آپ نئی نسل کو کیا الزام دیتے ہیں۔ اگر وہ روایات سے ہٹتے جارہے ہیں۔"

رائے بہادر نے کہا "کبھی کبھی میں یہی دیکھنے کے لئے آجاتا ہوں کہ میرے ماضی کی یہ نشانی سلامت ہے یا نہیں۔ اکثر میں نے دیکھا کہ یہاں فقیر آوارہ گرد گھسے ہوتے ہیں۔ دو دو ٹکے کی عورتوں کو فٹ پاتھ سے اٹھا کر یہاں لے آتے ہیں۔"

"آپ پولیس کو کیوں نہیں بتاتے۔ چوکیدار سے بازپرس آپ کیوں نہیں کرتے؟" غالب نے کہا۔

"چوکیدار ہی تو بدمعاشی کرتا ہے۔ دس دس روپے لیتا ہے ان سے۔ مجھے معلوم ہے۔ دوسرا رکھوں گا تو وہ بھی یہی کرے گا اور پولیس کو لانا بھی مشکل ہے۔ پولیس کے آنے سے پہلے تو بدمعاش بھاگ جاتے ہیں۔ تم نے دیکھا، شراب کی کتنی خالی بوتلیں پڑی ہیں یہاں۔ ایک شرابی نے کسی عورت کو قتل بھی کردیا تھا یہاں۔ نشے میں۔ وہ بھی کوئی طوائف ہی تھی۔"

"دیکھئے۔ ہم بہر حال شریف لوگ ہیں۔" میں نے کہا۔

رائے بہادر ہنسے "بھئی تم سے کچھ کہا میں نے؟"

"ہم چلے جائیں گے کل تک" غالب نے کہا۔

"نہیں۔ رہو جب تک رہنا ہے۔ اگر کوئی جگہ نہیں ہے تمہارے پاس تو رہو۔ میں کون سا کرایہ مانگ رہا ہوں۔ میں نے تو بہت سے لوگوں کو بالکل مفت پیشکش کی کہ وہ یہاں اپنے خاندان کے ساتھ رہیں۔ اسے آباد کریں۔ اس کی حالت ٹھیک کریں۔ رنگ و روغن کرائیں۔ یہ تو ایسی جگہ ہے کہ راجے مہاراجے رہیں۔ ٹھاٹ سے۔ مگر کوئی نہیں آتا۔"

"کیوں نہیں آتا؟"

"بس وہمی لوگ ہیں۔ کہتے ہیں یہ جگہ آسیب زدہ ہے۔ ہے تو نہیں مگر مشہور ہوگئی ہے۔ خود میرے بچے یہاں رہنے کو تیار نہیں۔"

میں نے کہا "کتنے بچے ہیں آپ کے؟"

انہوں نے کہا "آؤ ادھر بیٹھ کے باتیں کرتے ہیں" اور پھر ایک پرانے درخت کے گرد لگی ہوئی بینچ پر بیٹھ گئے۔

غالب نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میرے کان میں کہا "یہ بھوت ہے۔ حویلی کے اصل مالک کی روح۔"

میں نے سرہلا کر اس کی تائید کی اور ہم اس کے ساتھ بیٹھ گئے۔ اس نے جیب میں سے سگریٹ کا ایک پیکٹ نکالا "پیو گے؟"

میں نے کہا "ضرور" اور سگریٹ لے کر کہا "شکریہ۔"

غالب نے کہا "میں سگریٹ نہیں پیتا۔"

"اچھا تو لو ٹافی کھاؤ۔ بچوں کے لئے میں کچھ نہ کچھ ضرور رکھتا ہوں اپنی جیب میں" انہوں نے دوسری جیب میں سے ٹافی نکالی۔

غالب نے کچھ جھینپ کر ٹافی لے لی لیکن اسے منہ میں نہیں رکھا۔

"بہت جلد یہاں ریزر بلیڈ بنانے کی فیکٹری قائم ہوجائے گی" رائے بہادر بدری پرشاد نے اداسی سے کہا۔

میں نے سگریٹ کا ایک کش لے کر کہا "بہت عمدہ سگریٹ ہیں یہ۔ ہندوستانی تو نہیں لگتے" بلاشبہ ان کی خوشبو کمال کی تھی۔

وہ خوش ہوا "نہیں، بدیسی مال ہے۔"

غالب نے کہا "اس کھنڈر کی جگہ بلیڈز کی فیکٹری بنانے پر آپ کو اعتراض ہے تو آپ منع کیوں نہیں کردیتے؟"

اس نے آہ بھر کے کہا "کون سنتا ہے اب میری۔"

غالب نے کہا "ویسے بھی، جب یہاں رہنے پر کوئی تیار نہیں تو اس جگہ کا کچھ استعمال تو ہوگا۔ ہر نقشِ کہن مٹ جاتا ہے بالآخر۔"

اس نے طنز سے کہا "پھر تو تاج محل کی جگہ بھی ایک دن کوئی الیکٹرونکس انڈسٹری قائم ہوجائے گی۔"

غالب نے خفت سے کہا "مگر... یہ تاج محل تو نہیں ہے۔"

"تمہارے لئے واقعی نہیں ہے" رائے بہادر نے خلاء میں دیکھتے ہوئے دکھی لہجے میں کہا "میرے لئے ہے۔"

میں نے ہمت سے کام لے کر کہا "وہیں تو ممتاز محل کا مدفن ہے۔ جس سے شاہ جہاں کو محبت تھی۔"

رائے بہادر نے سگریٹ کا دھواں آہستہ آہستہ خارج کرتے ہوئے کہا "یہاں مدھومتی دفن ہے۔ جس سے میں محبت کرتا تھا۔ وہ میری بیوی تھی۔ تیس سال اس نے میرا ساتھ دیا۔"

غالب نے کہا "آئی ایم سوری۔ رائے بہادر صاحب، میرا مطلب تو یہ نہیں تھا۔"

اس نے سرہلایا "فارگیٹ اِٹ۔ میں اس سے ملنے آتا ہوں یہاں۔"

اب میں چونکا اور بے اختیار سرک کر کچھ دور ہوگیا۔ "آپ... مگر آپ نے تو کہا تھا... کہ وہ مرچکی ہے۔"

اچانک میں نے پھر چوڑیوں کی کھنک سنی۔ پھر پائل کی جھنکار آئی۔ اس بار یہ آواز اندر سے سنائی دی تھی۔

رائے بہادر اٹھ کھڑا ہوا "تم لوگوں کے سامنے نہیں آئے گی وہ" اس نے ہنس کے کہا "اب بھی شرماتی ہے" پھر اس نے اپنا ہاتھ مصافحے کے لئے بڑھایا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اس سے ہاتھ ملایا۔ وہ ہاتھ برف کی طرح سرد تھا۔ یہ ٹھنڈک میرے جسم میں ریڑھ کی ہڈی تک اتر گئی۔ غالب سے ہاتھ ملا کے وہ چل پڑا۔ اپنی مٹھ والی چھڑی ہلاتا اور نپے تلے قدم اٹھاتا وہ سیدھا گیا۔ پھر مجھے یوں لگا جیسے وہ دیوار میں سے گزر گیا یا دیوار میں جذب ہوگیا۔ وہاں کوئی دروازہ نہیں تھا۔ اس کے باوجود وہ رکا نہیں تھا۔ لمحہ بھر پہلے وہ نظر آرہا تھا۔ اگلے پل وہ غائب ہوچکا تھا۔ شاید وہ آیا بھی ایسے ہی تھا کیونکہ ہم نے تو اسے اچانک دیکھا تھا۔ وہ اسی سمت سے نمودار ہوا تھا۔ اب میں اور غالب ہکا بکا اور خوف زدہ کھڑے تھے اور مجھے ایسا لگتا تھا جیسے میرا جسم پتھر کا ہوگیا ہے۔

"یار... یہ تو واقعی بھوت تھا" غالب نے بالآخر کہا۔

میں نے اس سگریٹ کو دیکھا جو ابھی تک میرے ہاتھ میں سلگ رہی تھی۔ اس کے دھویں کی حیرت انگیز مہک کو میں محسوس کرسکتا تھا اور یقین کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ اعلیٰ ترین سگریٹوں میں بھی مجھے یہ ذائقہ نہیں ملا تھا۔

"رائے بہادر بدری پرشاد بی اے" میں نے زیرِ لب دہرایا۔

"کیا وہ مرچکا ہے؟"

"شاید بہت پہلے" غالب نے کہا۔

"اور اب وہ اپنی بیوی مدھومتی سے ملنے یہاں آتا ہے۔ جو اس سے بھی پہلے مر چکی تھی۔"

"ہم نے اس کی چوڑیوں کی کھنک اور پائل کی جھنکار سنی تھی" غالب نے کہا "تم نے بھی اور میں نے بھی۔"

"لیکن غالب... یہ سگریٹ... اور یہ ٹافی جو تیرے ہاتھ میں ہے؟"

اب غالب نے اپنی بند مٹھی کو دیکھا اور پھر ٹافی کو ایک دم ایسے پھینک دیا جیسے ابھی تک وہ مٹھی میں بچھو کو دبائے کھڑا ہوا تھا۔

میں نے ٹافی اٹھالی "آ اندر چلتے ہیں۔"

غالب نے کہا "یار، کیا یہ سچ ہو سکتا ہے؟"

میں نے کہا "یہ کوئی خواب نہیں تھا۔"

"ابھی... جو ہم سے ملا وہ زندہ آدمی نہیں فقط ایک روح تھی۔ میں نہیں مان سکتا" غالب نے کہا "بھوت سگریٹ کے پیکٹ اور ٹافیاں جیب میں لے کر نہیں پھرتے۔"

"کیا تو نے اسے غائب ہوتے نہیں دیکھا تھا؟"

"وہ... دھوکا ہوا ہوگا میری نظر کو۔ وہ کسی اور طرف نکل گیا ہوگا۔" غالب نے بے بسی سے کہا۔

"بیک وقت ہم دونوں کی نظر کو دھوکا ہوگیا" میں نے کہا۔ "نہیں غالب! حقیقت کو تسلیم کرلینا چاہئے۔ وہ ایک روح تھی۔ روح کا وجود ثابت ہوتا ہے۔"

غالب نے کہا "میں روح کے وجود سے کب انکار کررہا ہوں۔ لیکن یہ سگریٹ اور یہ ٹافی؟"

"دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے عقل سب کی توضیح نہیں رکھتی لیکن رائے بہادر نے ہم سے جو کچھ کہا، ہم اس کی تصدیق ضرور کرسکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"ایک بات اور۔ اس نے کہا تھا کہ یہاں مدھومتی دفن ہے۔ ہندو دفناتے کہاں ہیں۔ مرگھٹ لے جاتے ہیں اور شمشان گھاٹ پر جلا دیتے ہیں۔" غالب نے کہا۔

میں نے غور کرنے کے بعد کہا "ممکن ہے مدھومتی کی راکھ کو یہاں رکھا گیا ہو۔"

"راکھ بھی گنگا میں بہادی جاتی ہے۔"

"کچھ لوگ محبت وعقیدت میں اسے محفوظ بھی رکھتے ہیں۔ میں نے سنا ہے۔ چل اب اندر چلیں" میں نے اس کا ہاتھ پکڑا تو وہ بھی برف کی طرح ٹھنڈا ہو رہا تھا۔

"اس کا مطلب ہے یار، لڑکیاں ٹھیک ہی کہہ رہی تھیں" غالب نے کہا

میں نے کہا "مل گیا نا آخر تیرا سسر۔ بہت مذاق اڑا رہا تھا نازو کا۔"

ہم اندر پہنچے تو نازو جو چادر میں منہ لپیٹ کر پڑ گئی تھی، گل سے باتیں کرتی پائی گئی۔

ہم دونوں کی صورت دیکھ کر اس نے کہا "سکندر! کیا بات ہے۔ ہوائیاں کیوں اڑ رہی ہیں چہرے پر؟"

میں اب سگریٹ کا کش لیتے ہوئے ڈر رہا تھا چنانچہ میں نے اسے مسل کر بجھا دیا اور اس کے برانڈ کو غور سے دیکھا۔

"غالب! اتنا پسینہ تمہارے ماتھے پر" گل نے کہا۔

"چپ کیوں ہو تم دونوں" نازو نے کہا۔

میں نے کہا "پہلے پانی پلاؤ تھوڑا سا۔"

نازو میرے لئے پانی لائی۔ دو گھونٹ پی کر میں نے گلاس غالب کی طرف بڑھا دیا۔

"ہم ایک بھوت دیکھ کر آئے ہیں" میں نے کہا "بلکہ اس سے مل کے باتیں کرتے رہے۔" میں نے کہا۔

نازو اور گل نے ایک دوسرے کی طرف بے یقینی سے دیکھا۔ ان کے لئے یہ طے کرنا دشوار ہو رہا تھا کہ ہم مذاق کررہے ہیں یا سنجیدہ ہیں اور اداکاری کررہے ہیں یا واقعی خوف زدہ ہیں۔

میں نے غالب سے کہا "یہ سگریٹ میں نے آج تک نہیں دیکھا، اس کا [illegible] تار تک نہیں دیکھا اور نہ کسی سے اس کا ذکر سنا۔ حالانکہ میں اور محسن اتنا عرصہ لندن میں رہے۔ وہاں سے ہم فرانس اور وینس بھی چلے جاتے تھے۔ آسٹریا اور کبھی سوئٹزر لینڈ بھی گئے۔"

"پچاس سال پہلے شاید ہوتے ہوں گے۔" غالب نے کہا۔

اب میں نے ٹافی کے ریپر کو غور سے دیکھا۔ برطانیہ کی بنی

ہوئی یہ ٹافی اب ملتی تھی یا نہیں، اس بارے میں میری معلومات محدود تھیں مگر جس چیز نے مجھے حیران کیا وہ اس کے ریپر کے کناروں پر لکھے ہوئے الفاظ تھے۔ ایک کنارے پر کمپنی کا نام تھا مگر دوسرے کنارے پر تھا "نلٹ فار سیل" (برائے فروخت نہیں) اس کے بعد لکھا ہوا تھا "صرف محاذ پر اتحادی افواج کے لئے۔"

میں نے وہ کاغذ غالب کو دیا "یہ دوسری جنگ عظیم میں، محاذِ جنگ پر لڑنے والے فوجیوں کے لئے بھیجی گئی تھیں۔ ایسی بہت سی چیزیں جو فوج کی سپلائی میں شامل تھیں، چوری ہو کے بازار میں بھی پہنچ جاتی تھیں۔ تاہم فوج کی سپلائی کا محکمہ ان پر ایسی مہریں لگا دیتا تھا یا ان کی مخصوص پیکنگ ہوتی تھی۔ تاکہ غبن ہو تو پتا چل جائے۔"

"او مائی گاڈ... یہ انیس سو پینتالیس سے قبل کی ٹافی ہے۔" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "دوسری جنگ سن انتالیس سے پینتالیس تک جاری تھی۔"

اب نازو نے ٹافی کے ریپر کو ملاحظہ کیا۔ پھر میں نے انہیں رائے بہادر بدری پرشاد سے ملاقات کا احوال سنایا۔ وہ اتنی خوف زدہ ہوئیں کہ ہمارا مذاق اُڑانے کے بجائے خود تماشا بن گئیں۔ ہم نے انہیں بڑی مشکل سے سلایا اور کہا کہ "فکر مت کرو۔ ہم جاگ رہے ہیں۔" لیکن ان کے لئے سونا مشکل ہو رہا تھا۔ میں نے سامان میں ویلیم تلاش کی اور انہیں زبردستی کھلائی۔ دو بجے تک غالب بھی سو گیا تھا لیکن میرا ذہن خیالات کے انتشار کا شکار تھا۔ میرے خیالوں کی رو کبھی بھٹک کر شہلا کی طرف چلی جاتی تھی اور میں تصور میں وہی شیشے کا تابوت دیکھتا تھا جس میں شہلا اپنے بچے کے ساتھ محوِ خواب تھی اور سوچنے لگتا تھا کہ اس تابوت میں ہوا کی آمد و رفت کا کیا بندوبست تھا؟ اسے زندہ رکھنے کے لئے وہ کھانے پینے کو کیا دیتے تھے؟ ممکن ہے دلاور نے ہمیں یہ دکھانے کے لئے کہ شہلا کو کیسے لے جایا جائے گا، اس وقت خاص طور پر اسے شیشے کے تابوت میں ڈالا ہو۔ بعد میں ہوش آنے پر انہیں نکال لیا ہو۔

شہلا سے میرا ذہن پھر رائے بہادر بدری پرشاد کی طرف آجاتا۔ وہ یقیناً ایک روح تھی۔ شاید وہ اسی حویلی میں مر گیا تھا اور تب سے حویلی ویران پڑی ہوئی تھی۔ اگر وہ بھوت تھا تو ایک بے ضرر بھوت تھا۔ لیکن یہ بہت مضحکہ خیز بات تھی اِیک بھوت مجھے سگریٹ اور غالب کو ٹافی آفر کر کے غائب ہو گیا۔

اچانک ایک آہٹ نے مجھے اٹھ کر بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ باہر کا دروازہ چرچرا کے کھلا تھا۔ میں نے چوڑیوں کی کھنک بھی بہت صاف سنی تھی۔ جن بھوت کا میں کبھی قائل نہیں رہا تھا لیکن آج ایک ایسا تجربہ ہوا تھا جس نے میرے یقین کی عمارت کو منہدم کر ڈالا تھا اور اس کی بنیادوں کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا تھا۔ میرے ذہن پر اور اعصاب پر آسیب کا اثر باقی تھا چنانچہ قدرتی طور پر مجھے خیال آیا کہ کیا پھر کوئی بھوت آگیا۔

آیت الکرسی پڑھ کر میں نے دائیں بائیں پھونک ماری اور اٹھ کھڑا ہوا۔ باہر آنے کے بعد میں نے پھر چوڑیوں کی آواز سنی حالانکہ راہداری میں کوئی بھی نہیں تھا۔ پھر راہداری کے آخری حصے میں ایک سایہ سا نظر آیا۔ یوں جیسے اندھیرا سمٹ کر گہرا ہو گیا اور ایک انسانی قالب میں ڈھل گیا۔ اس نے تاریکی سے ہی جنم لیا تھا۔

"رائے بہادر صاحب!" میں نے کہا اور آگے بڑھا۔

راہداری میں ایک بازگشت سی سنائی دی "مت نام لو میرے سامنے میرے قاتل کا۔"

مجھے ایک جھرجھری سی آئی۔ میں نے سوچا کہ واپس بھاگ جاؤں لیکن کوئی نادیدہ قوت تھی جس نے مجھے آگے دھکیل دیا۔ میں سحر زدہ شخص کی طرح چلتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔ وہ تقریباً میرا ہم عمر جوان آدمی تھا۔

"تم کون ہو؟"

"میں نے بتایا نا کہ مجھے رائے بہادر نے قتل کر دیا تھا۔" وہ بولا۔

"مگر کیوں؟"

"اس لئے کہ میں اس کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔" وہ بولا۔ اور اسی وقت میں نے سناٹے میں کسی عورت کی پُردرد سسکی سنی۔ خوف کی خنک لہر سے میرے جسم کا رُواں رُواں کھڑا ہو گیا۔

"رائے بہادر کو کیا اعتراض تھا اس پر؟" میں نے کہا۔

"وہ ایک تنگ نظر، کمینہ اور متعصب شخص تھا۔"

میں نے کہا "کیا اس کی بیٹی بھی شادی کرنا چاہتی تھی تم سے؟"

"ہم دونوں ایک دوسرے سے اتنی محبت کرتے تھے کہ جب بالکل مایوس ہو گئے تو ہم نے ایک ساتھ مرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک رات ہم نے خود کو ایک دوسرے کے ساتھ باندھ دیا۔ مضبوط رسّی سے۔ پھر ہم نے خود کو جمنا کی لہروں کے سپرد کر دیا۔"

کسی عورت کی درد بھری سسکی پھر سنائی دی۔

"رائے بہادر تمہیں کیوں ناپسند کرتا تھا؟" میں نے کہا۔

"وہ اونچی ذات کا برہمن تھا۔ میں ایک شودر کا بیٹا تھا۔"

"تم مجھے یہی بتانے کے لئے آئے ہو؟"

"میں یہاں رہتا نہیں ہوں۔ اپنی پریتما کے درشن کرنے آجاتا ہوں۔ مگر میں اسے دیکھ نہیں سکتا۔ وہ قید میں ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔ کیا روح کو بھی قید میں رکھا جا سکتا ہے اور تم دونوں تو ایک ساتھ مر گئے تھے۔" اب میرا خوف دور ہونے لگا تھا اور میں اس سے باتیں کرتے ہوئے گھبرا نہیں رہا تھا۔

"انہوں نے ہماری لاشیں نکلوالی تھیں۔ مجھے پریتما سے الگ کر کے وہیں جلا دیا گیا تھا۔ میری پریتما کی ارتھی کو جمنا کے گھاٹ پر آگ لگا کر اس کی راکھ کو وہ یہاں لے آئے تھے۔"

"پریتما نام تھا اس کا؟"

"پریتما کہتے ہیں محبوبہ کو۔" وہ بولا "اس کی راکھ یہاں سونے کے ایک راکھ دان میں رکھ دی گئی تھی۔ تب سے اس کی آتما یہاں قید میں ہے۔ وہ باہر نہیں نکل سکتی اور میں اسے نہیں دیکھ سکتا۔ کیا تم میری مدد کرو گے؟"

وہ سسکی پھر سنائی دی۔ میں نے گھبرا کے کہا "میں... مجھے کیا معلوم کہ وہ راکھ دان کہاں ہے۔"

"اسی حویلی میں ہے کہیں۔" وہ مایوسی سے بولا "تم نے سنا، وہ رو رہی ہے۔ اور کوئی اس کی مدد نہیں کرتا۔"

اب میرے لئے وہاں کھڑا رہنا مشکل ہو گیا۔ میں پلٹ کر بھاگا۔ واپس کمرے میں جانے سے پہلے میں نے دیکھا تو راہداری خالی پڑی تھی، وہاں اب کوئی نہیں تھا جہاں میں ایک عاشقِ نامراد سے باتیں کرتا رہا تھا۔ جس کا عشق ذات پات کے مذہب کی بھینٹ چڑھ گیا تھا۔

واپس کمرے میں آنے کے بعد میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا رہا اور لمبی لمبی سانسوں کی مدد سے اپنے اعصاب پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا۔ سگریٹ جلاتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ میرے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ پہلے غالب کے ساتھ اور پھر اکیلے میں نے مافوق الفطرت واقعات کا جو تجزیہ کیا تھا، وہ میرے لئے ناقابلِ فہم، ناقابلِ یقین اور ناقابلِ تسلیم تھا۔ مگر میں خود کو بھی قائل نہیں کر سکتا تھا کہ میرے ذہن پر سنی سنائی باتوں کا اثر تھا یا اس پرانی حویلی کے آسیب زدہ ماحول نے میرے حواس کو اس حد تک مختل کر دیا تھا کہ مجھے جن بھوت جیتے جاگتے انسانوں کی طرح نظر آنے لگے تھے۔ آج تک میں ایسے واقعات سنانے والوں کا مذاق اڑاتا رہا تھا۔ اب مجھے یقین تھا کہ غالب کے علاوہ میرے سب ساتھی میرا تمسخر اُڑائیں گے اور میں ان کی کسی بات کا جواب نہ دے سکوں گا۔ نازو، رابعہ اور گل تو ہمارا جینا عذاب کر دیں گی۔ ابھی رابعہ کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ گل اور نازو خوف زدہ ہو گئی تھیں لیکن یہاں سے جانے کے بعد جب یہ خوف باقی نہیں رہے گا تو، نہیں ایک موضوعِ سخن ہاتھ آجائے گا۔

میں اب سو نہیں سکتا تھا چنانچہ ایک کے بعد ایک سگریٹ جلاتا رہا۔ معلوم نہیں کلاک نے کہاں رات کے دو گھنٹے بجائے تو میں اُچھل پڑا۔ اس قدیم عمارت میں جہاں برسوں سے کوئی رہنے نہیں آیا، یہ کلاک کیسے زندہ ہے؟ اسے چابی دینے والا کون تھا کہ اس کی سوئیاں اب تک متحرک تھیں؟ گھنٹوں کی بازگشت رات کے سناٹے میں ابھی تک لرزاں تھی یا شاید میرے کان بج رہے تھے۔ پہلے میں نے غالب یا محسن کو جگانے کا ارادہ کیا پھر مجھے خیال آیا کہ ان کی پُرسکون نیند میں خلل اندازی سے کیا فائدہ۔ خود مجھے کوشش کرنی چاہئے کہ ان واقعات کو بھلا کر سو جاؤں۔ ایک سکون آور گولی میں پہلے کھا چکا تھا۔ لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ دوسری گولی نہ کھانے کے خلاف میری ذہنی مزاحمت کام نہ آئی اور میں نے شیشی کی آخری گولی کو پانی کے ساتھ حلق سے اتار لیا۔

جب میں گلاس رکھ رہا تھا تو پانی کا ایک قطرہ رابعہ پر ٹپک گیا۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور پھر اٹھ بیٹھی۔

"کیا بات ہے؟ تم سوئے نہیں؟" اس نے سرگوشی میں کہا۔

میں نے کہا "ہاں، نیند نہیں آئی۔"

رابعہ نے کہا "تم نے پھر سکون آور گولی کھائی ہے؟"

میں نے کہا "ایک ہی گولی تھی اس میں۔ میں تو پوری شیشی کھا جاتا۔"

رابعہ نے پریشان ہو کے کہا "کیا ہو گیا ہے تمہیں سکندر؟"

میں نے کہا "کچھ نہیں۔ تم سو جاؤ۔"

"نہیں۔ پہلے مجھے بتاؤ بات کیا ہے۔"

میں نے کہا "اچھا باہر آؤ۔"

باہر لے جا کر میں نے اسے وہ جگہ دکھائی جہاں میری اور غالب کی ملاقات رائے بہادر سے ہوئی تھی۔ میں نے ثبوت کے طور پر وہ آدھی بجھی ہوئی سگریٹ اور دوسری جنگِ عظیم کے زمانے کی ٹافی پیش کی۔ پھر تازہ ترین واردات کے بارے میں بتایا کہ مجھے بدری پرشاد کی بیٹی کے چاہنے والے نے محبت کے ایک المناک انجام کی ایک داستانِ خونچکاں سنائی تھی۔ میں نے اس بدبخت لڑکی کی بے چین روح کی سسکیوں کا تذکرہ بھی کیا۔ حیرت انگیز طور پر رابعہ پُرسکون رہی۔

اس نے کہا "فرض کرو، وہ ان کی روحیں تھیں جن سے تم ملے۔ اس میں پریشانی کی کون سی بات ہے؟"

"میں... ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتا۔ میرا خیال ہے کہ میرا دماغ خراب ہو جائے گا۔"

"وہ بدروحیں تو نہیں تھیں۔ تمہیں کیا نقصان پہنچایا انہوں نے؟ ہم سب سے کوئی شکایت تو نہیں ہوئی ان کو۔"

"رابعہ! میں یہاں سے نکل جانا چاہتا ہوں۔ اس سے پہلے کہ کوئی ایسی ویسی بات ہو۔ میرا ذہن شہلا کی طرف سے بھی پریشان ہے۔ آج رات ہم کچھ نہ کچھ ضرور کر سکتے تھے۔ ایسے بیٹھے نہیں رہنا چاہئے ہمیں۔"

رابعہ نے کہا" ہر کام اپنے وقت پر ہوتا ہے۔ ہمیں بہت سی باتیں معلوم ہوگئی ہیں جو بنیادی اہمیت رکھتی ہیں۔ محمد خان بھی ہمارے ساتھ اس مہم میں شامل ہوجائے گا ہم اکٹھے ہوں گے تو ہر کام آسان ہوجائے گا۔ ابھی تک محسن اور غالب کا مسئلہ تھا۔ اب وہ بھی فِٹ ہیں۔"

رابعہ کی باتوں نے میرا اعتماد بحال کردیا۔ آہستہ آہستہ میرا خوف بھی دور ہونے لگا۔ مجھے یہ احساسِ بھی پشیمانی میں مبتلا کررہا تھا کہ رابعہ ایک لڑکی ہونے کے باوجود دہشت زدہ نہیں ہے۔ مجھے تو زیادہ حوصلہ مندی کا مظاہرہ کرنا چاہئے۔

رابعہ نے کہا" چائے پیو گے؟ بنا کے لاؤں۔"

میں نے کہا" اکیلے ڈر نہیں لگے گا کچن میں؟ دل تو چاہ رہا ہے۔"

وہ ہنسی اور اٹھ کھڑی ہوئی" تم یہیں بیٹھو۔ ڈرنا نہیں۔" اس نے یوں کہا جیسے میں کوئی بچہ ہوں۔ میں پتھر کی گرد آلود بینچ پر بیٹھا رہا۔ رائے بہادر بدری پرشاد کا تصور میرے سامنے رہا مگر اس نے مجھے خوف زدہ نہیں کیا۔

رابعہ چائے لے کر آئی اور مجھے ایک مگ پکڑادیا۔ آخرِ شب کے چاند نے ایک ٹنڈ منڈ درخت کی شاخوں سے جھانک کر ویرانی کے تاثر میں مزید اضافہ کرنے کی کوشش کی۔ پھر تاریکی میں ایک ہیولا سا نمودار ہوا اور ہماری طرف بڑھا۔ میں چوکنا ہوگیا لیکن قریب آنے پر محمد خان کے نقوش واضح ہوگئے۔

میں نے کہا" خان صاحب! تم اس وقت؟"

خان نے مسکرا کے کہا" ہاں! اس وقت مجھے یہاں آنا تو نہیں چاہئے تھا۔"

رابعہ نے جلدی سے کہا" چائے پئیں گے آپ؟"

خان نے نفی میں سرہلایا" نہیں۔ ابھی پی کر آرہا ہوں"

"کہاں سے آرہے ہیں اس وقت؟" رابعہ نے کہا۔

"کوثر کو خدا حافظ کہنے گیا تھا۔"

"تم نے بتادیا اسے کہ تم ہمارے ساتھ جاؤ گے؟"

"قسم اللہ کی' پہلے ارادہ نہیں تھا میرا لیکن حافظ جی نے کہا کہ اچھا ہے یہ خوشخبری اسے تم سے ملے کہ تم نے راہِ حق کی مسافت قبول کرلی ہے۔ چنانچہ میں نے اسے بتادیا کہ ہو سکتا ہے' میں لمبے عرصے تک لوٹ کر نہ آؤں۔"

"بہت روتی دھوتی ہوگی وہ؟"

محمد خان نے نفی میں سرہلایا" اداس ضرور ہوگئی تھی کہنے لگی کہ آؤ گے تو سہی" میں نے کہا" نہیں آؤں گا تو کہاں جاؤں گا" اس نے کہا" یہ وعدہ ہے تو پھر جاؤ۔ فی امان اللہ! میں تمہاری واپسی کا انتظار کرتی رہوں گی۔ زندگی کی آخری سانس تک۔ میں مایوس ہونے والی نہیں ہوں۔"

"بڑی بہادر لڑکی ہے۔ بہت بہادر۔"

"اس کا یقین اور ایمان بہت مضبوط ہے۔ اسے آزمانے کے لئے میں نے کہا کہ فرض کرو' میں اپنا وعدہ نبھا نہ سکا اور واپس نہ آسکا؟ تو اس نے کہا کہ تمہیں آنا پڑے گا۔ میں نے تمہیں خدا کے سپرد کیا ہے۔ اسی شرط پر کہ میرا بیٹا اپنے باپ کو ضرور دیکھے گا۔"

میں نے حیران ہو کے کہا" وہ خدا سے مشروط معاہدے کرتی ہے"

محمد خان مسکرانے لگا۔ "ہے نا پاگل؟ کہتی ہے خدا نے میری بات مان لی ہے اور اس کی گواہی میرے دل نے دی ہے۔ قسم اللہ کی' وہ بڑی عجیب لڑکی ہے۔"

رابعہ نے کہا" وہ ماں بننے والی ہے؟"

محمد خان نے کہا" ہاں بہن۔ آج میں پورے ایک ہفتے کے بعد گیا تھا۔ یہی امید لے کر کہ میں اپنے بیٹے سے بھی مل کے آؤں گا۔"

میں نے کہا" محمد خان! تم اور تمہاری بیوی۔ اتنے پُر امید ہو تم دونوں کہ وہ بیٹا ہی ہوگا۔ کیا بیٹی نہیں ہوسکتی؟"

"پتا نہیں۔ وہ دراصل حافظ جی نے کہا تھا مجھ سے کہ محمد خان۔ میں نے بچے کا نام فتح محمد رکھنا ہے' جو ٹیپو سلطان کا نام تھا۔ اس وقت یہ خیال آیا تھا میرے دل میں کہ بیٹی ہوگی تو اس کا نام رضیہ رکھوں گا۔ لیکن حافظ جی کی بات ایسے ہی نہیں ہوتی۔ قسم اللہ کی۔"

میں نے کہا" تم نے حافظ جی سے کہا تھا کہ ہمارے لئے دعا کریں۔"

اس نے اقرار میں سرہلایا" اور معلوم ہے انہوں نے کیا کہا ہے؟"

"کیا کہا" میں نے اس کی خاموشی پر اسے غور سے دیکھا۔ وہ کچھ متفکر نظر آتا تھا۔ انہوں نے کہا" دیر مت کرو۔ ابھی چلے جاؤ گے تو محفوظ رہو گے بہت بڑی آفت سے" میں نے پوچھا کہ آفت کیسی؟" تو انہوں نے کہا" بھئی آفت تو بس آفت ہوتی ہے۔ جاؤ انہیں بھی بتاؤ۔"

میں محمد خان کی بات سن کے پریشان ہونے لگا۔ نہ جانے کیوں اس سے حافظ جی کے کشف و کرامات کا ذکر سن سن کے میں بھی قائل ہونے لگا کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں' کسی الہامی کیفیت میں کہتے ہیں اور ان کی بات پتھر پر لکیر ہوتی ہے۔

"انہوں نے کہا تھا کہ اسی وقت روانہ ہوجائیں۔ رات کے وقت؟"

محمد خان نے کہا" ہاں۔ یہی کہا تھا انہوں نے مگر اس وقت ہم کہاں جاسکتے ہیں؟"

میں نے بادلِ ناخواستہ کہا" ہاں۔ صبح ہی جائیں گے اب تو۔

ورنہ میرا ارادہ تھا کہ تمہارے ساتھ وہاں جا کے دیکھوں کہ وہ لوگ روانگی کے لئے کیا تیاری کررہے ہیں۔ مجھے راستہ معلوم نہیں تھا۔ یوسفِ ثانی ہوتا تو میں اسے ساتھ لے جاتا۔"

"اس کا کچھ پتا نہیں ہوتا کسی کو بھی۔"

اچانک رابعہ نے جو اَب تک خاموش تھی' کہا" خان صاحب! یہ عمارت کس کی ہے؟"

"معلوم نہیں اب کون مالک ہے اس کا" وہ بولا۔

"پہلے کون مالک تھا؟" میں نے کہا۔

"پہلے کوئی ہندو تھا۔"

میں نے کہا" رائے بہادر بدری پرشاد او بی اے۔"

وہ چونکا" جب تمہیں یہ بات معلوم تھی تو مجھ سے کیوں پوچھ رہے تھے؟"

میں نے کہا" تصدیق کے لئے۔ وہ اب کہاں ہے؟"

خان نے کہا" مرکھپ گیا کب کا۔ اس کا نام اب بھی لکھا ہوا ہے باہر ایک تختی پر۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ عمارت انیسویں صدی کے آخر میں بنی تھی۔"

"یہ بدری پرشاد کون تھا؟"

"ایک غدار تھا ویسے تو۔ ہندوستانی حریت پسندوں کی بہت مدد کرتا تھا لیکن اس طرح ان کے ٹھکانوں کی اور ان کے عزائم کی خبر رکھتا تھا۔ اس کی اطلاع پر نہ جانے کتنے آزادی کے متوالے پکڑے گئے۔ کچھ کالے پانی گئے' کچھ پھانسی پر لٹکائے گئے۔ ہندو مسلمان دونوں۔ اسے انگریزوں سے انعام میں جاگیریں ملتی رہیں۔ یہ بات کب تک چھپی رہ سکتی تھی۔ دوسری جنگِ عظیم میں اسے بڑے بڑے ٹھیکے ملے۔ وہ یہاں سے بھاگ گیا تھا اور برما چلا گیا تھا۔"

"ٹھیکے سپلائی کے تھے" میں نے کہا" مثلاً سگریٹوں اور ٹافیوں کی سپلائی کے۔"

"یہ تو مجھے نہیں معلوم" محمد خان حیران ہو کے بولا" وہ سنگاپور اور برما کے محاذ پر فوجوں کو راشن سپلائی کرتا تھا۔ اس میں بہت ہیر پھیری کی اس نے۔ لاکھوں بنائے۔ پھر جاپانیوں کی بمباری میں وہ زخمی ہوگیا تھا اس کی جان بچ گئی لیکن آنکھیں ضائع ہوگئی تھیں۔"

میں نے کہا" اس کی بیوی کا نام مدھومتی تھا"

"قسم اللہ کی' یہ بات تو میرے باپ کو بھی معلوم نہیں ہوگی۔ تمہیں کس نے بتائی ہیں یہ باتیں" خان نے کہا۔

میں نے اسے مختصراً بدری پرشاد کے بارے میں بتایا۔ وہ مجھے آنکھیں پھاڑ کر دیکھتا رہا۔

"کوئی اور کہتا مجھ سے ایسی بات تو قسم اللہ کی میں اسے جھوٹا سمجھتا" خان نے کہا" اور مجھ سے ملاقات ہوجاتی اس کی تو ہارٹ فیل ہوجاتا۔"

میں نے ہنس کے کہا" ہارٹ فیل تو میرا بھی ہوجاتا اگر اس وقت مجھے معلوم ہوجاتا کہ وہ زندہ آدمی نہیں بلکہ بھوت ہے۔ تمہاری زندگی بمبئی میں گزری ہے۔ یہ بتاؤ اور کیا مشہور ہے اس بدری پرشاد کے بارے میں؟"

"اس کا ایک ہی بیٹا ہے۔ بدری انڈسٹری کا مالک۔ وہ میرین ڈرائیو کے ایک اپارٹمنٹ میں رہتا ہے۔ کسی ایکٹریس سے شادی کی ہے اس نے۔"

"کیا اس کا ارادہ اس عمارت کو گرا کے ریزربلیڈز کی فیکٹری لگانے کا ہے؟"

"ہوگا۔ اگر بدری پرشاد نے تمہیں بتایا ہے تو میں کیسے اس کو غلط کہہ سکتا ہوں" محمد خان نے کہا۔

"اس کی کوئی بیٹی تھی؟"

ہاں' یہ بات میں نے سنی ہے کہ وہ کسی چمار کے لونڈے پر عاشق ہوگئی تھی۔ بدری پرشاد اونچی ذات کا ہندو تھا۔ وہ کیسے

برداشت کر سکتا تھا کہ کسی چمار سے رشتہ جوڑے۔ لڑکی اور لڑکے نے خودکشی کرلی تھی۔ اس پر کوئی فلم بھی بنی ہے۔"

میں نے کہا "فلم تو نہیں دیکھی میں نے۔ لیکن میں اس چمار کے لونڈے سے بھی مل چکا ہوں۔"

پھر میں نے اسے اپنے دوسرے تجربے کے بارے میں بتایا۔ محمد خان بزدل آدمی نہیں تھا لیکن جن بھوت کا معاملہ ایسا ہے کہ ایسے واقعات اچھے خاصے معقولیت پسند اور بہادر آدمی کو بھی دہشت زدہ کردیتے ہیں۔

"قسم اللہ کی، مجھے معلوم ہوتا کہ سب بدروحیں بھری پڑی ہیں یہاں۔ تو میں ادھر کا رخ بھی نہ کرتا۔" وہ بولا "مجھے تو اس شہزادے گلفام نے مروادیا۔"

میں نے کہا "اسے بھی کہاں معلوم ہوگا؟"

"اسے نہیں معلوم ہوگا!" محمد خان نے کہا "اسے تو شہر کے ہر جن بھوت کے آباؤ اجداد کا شجرۂ نسب تک معلوم ہوگا۔ وہ خود جن ہے۔ میں نے بتایا تھا تمہیں۔ اس سے جن بھوت بھی پناہ مانگتے ہوں گے۔ رات کو شمشانوں میں پھرتا رہتا ہے۔ کبھی کوئی کھوپڑی اٹھا لاتا ہے۔"

"وہ کس لئے؟"

"پتا نہیں۔ کہتا ہے عمل کراس گا۔ یہ ہندو بنئے بڑے چالاک ہوتے ہیں۔ اپنی دولت گاڑ دیتے ہیں کہیں۔ اور بعض اوقات کسی کو بتائے بغیر مرجاتے ہیں۔ ایسے کسی کروڑپتی کی روح قابو میں آگئی تو اس سے پوچھ لوں گا کہ اس کی دولت کہاں دفن ہے۔"

رابعہ نے کہا "وہ پاگل ہے کیا؟"

میں نے کہا "ایسا مت کہو۔ میں اور تم پاگل ہیں اس کی ہوش مندی کے سامنے۔"

محمد خان نے کہا "پرسوں معلوم ہے کیا ہوا؟ خود اس نے بتائی تھی یہ بات مجھے۔ وہ کسی قبر میں لیٹا ہوا کوئی وظیفہ پڑھ رہا تھا۔"

رابعہ سہم کر میرے قریب ہوگئی "پرانی قبر تھی؟"

محمد خان نے کہا "نہیں۔ تازہ کھدی ہوئی قبر تھی۔ گورکن تیار رکھتے ہیں کہ اچانک کوئی مردہ آجائے تو پریشان نہ ہوں۔ وہ رات کو گیا اور قبر میں اتر کر لیٹ گیا۔ کہہ رہا تھا اندر ایسی ٹھنڈک تھی کہ مجھے وظیفہ پڑھتے پڑھتے نیند آگئی۔ اس سے وظیفہ خراب ہوا۔ اوپر سے کسی نے میرے اوپر مردہ پھینک دیا۔ آدھی رات کے بعد۔ وہ تو مجھ پر بھی مٹی ڈال دیتے مگر میں نے شور مچایا کہ یہ کیا کرتے ہو۔ پہلے مجھے تو نکلنے دو۔ معلوم نہیں وہ کون تھے۔ ایسے بھاگے ڈر کر کہ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔"

"مگر ایسے کون پھینکتا ہے مردے کو؟" میں نے ایک جھرجھری لے کر کہا۔

"وہ کسی کی لاش کو ٹھکانے لگانے آئے تھے۔ معلوم نہیں، کون تھا جسے قتل کیا گیا تھا اور وہ قاتل تھے یا محض لاش غائب کرنے پر مامور تھے۔ یوسفِ ثانی تو مردے کے نیچے سے نکل کے اور کپڑے جھاڑ کے آگیا۔ اس سے کچھ بعید نہیں کہ اس وقت بھی کسی قبر میں پڑا ہو۔"

رابعہ چلائی "خدا کے لئے کوئی اور بات کریں۔"

میں نے محسوس کیا کہ وہ کانپ رہی ہے اور اس کا جسم ٹھنڈا پڑ گیا ہے۔ میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ "او کے۔ لعنت یوسفِ ثانی پر۔ چلو ہم اندر چلتے ہیں۔ تھوڑی دیر میں صبح ہوجائے گی۔"

"آؤ، میرے کمرے میں آجاؤ" محمد خان نے کہا۔

میں نے بھی باقی سب کی نیند میں مخل ہونا مناسب نہیں سمجھا۔ ابھی ہم محمد خان کے کمرے میں جاکے بیٹھے ہی تھے کہ ایک کھڑکی کے دھندلے شیشے پر تیز روشنی پڑی اور غائب ہوگئی۔ چند سیکنڈ کے وقفے سے روشنی کی جھلملاہٹ۔ پھر نظر آئی۔

"یہ کیا ہے آخر؟" محمد خان نے کہا۔ اور کھڑکی کھول کر باہر دیکھنے کی کوشش کی۔ لیکن کنڈیاں زنگ سے جام ہوچکی تھیں۔ اس نے اوپر کے ایک ٹوٹے ہوئے شیشے سے جھانک کر دیکھا۔ پھر اس نے مجھے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ میں بھی ... نظر دیکھوں۔ محمد خان بہت گھبرایا ہوا تھا۔ اور جب میں نے شیشے سے باہر دیکھا تو ایک لمحے کے لئے میری رگوں میں بھی خون منجمد ہونے لگا۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات بارھویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں

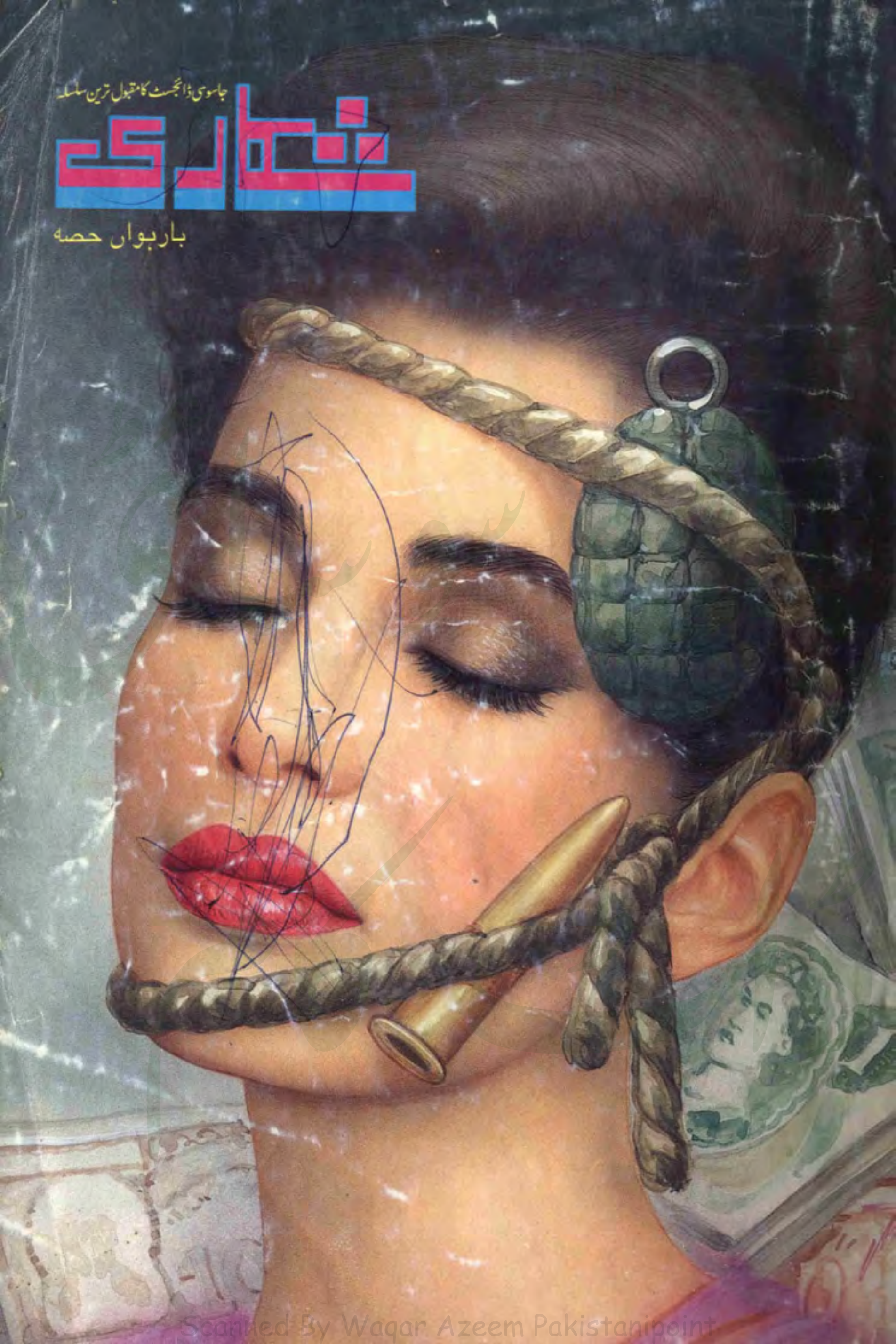
جاسوسی ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ
شکاری
بارہواں حصہ

معاشرت کے ان ناسوروں کی روداد جو گوشت و پوست سے گزر کر انسانی ہڈیوں میں اتر رہے تھے۔ ایک کفن بردوش نوجوان کی کہانی جس کے شب و روز موت کی بستی میں گزر رہے تھے۔

اندھیرے

میں دو گاڑیوں سے آٹھ دس آدمی اتر چکے تھے۔ یہ انہی گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس تھیں جو شیشے پر نظر آئی تھیں۔ برائے نام چاندنی میں ان کے سائے بڑے پراسرار انداز میں حرکت کررہے تھے۔ میں نے ایک شخص کو ہاتھ ہلا کر ہدایات جاری کرتے دیکھا۔ اس کی صورت میری نگاہ سے اوجھل تھی لیکن پہلے اس کے قد و قامت سے اور پھر ایک دھندلی سی چمک سے مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ استاد پیڈرو ہے۔ یہ چمک اس کے دونوں کانوں میں پڑی ہوئی پیتل کی مندریوں کی تھی۔ وہ اپنی سپاہ کو بڑی خاموشی سے اٹھا کر لایا تھا اور اب انہیں ہر طرف پھیلا رہا تھا۔

میں رابعہ کے ساتھ پلٹ کر بھاگا۔ محصور ہونے سے پہلے ہمارا نکل جانا ضروری تھا۔

میں نے غالب اور محسن کو وحشیانہ انداز میں جھنجوڑ ڈالا۔ "اٹھو جلدی کرو۔ غالب! محسن!"

"آخر کیا ہوگیا؟" غالب نے کہا "یہ کیا وحشت سوار ہے؟"

محسن نے کہا "یہ کیا بیہودگی ہے؟"

میں نے کہا "پیڈرو آٹھ دس مسلح افراد کے ساتھ آیا ہے۔ وہ گھیرا ڈال رہے ہیں ہر طرف سے۔"

غالب اور محسن پر ان الفاظ کا وہی اثر ہوا جو ریوالور کے فائر کا ہوسکتا تھا۔ اتنی دیر میں رابعہ نے گل اور نازو کو بیدار کردیا تھا۔

میں نے کہا "سب باہر نکل جاؤ پیچھے کی طرف باغ میں۔"

"اور تم؟" رابعہ نے کہا۔

میں نے کہا "سب کچھ چھوڑ دو۔ بس یہ سوٹ کیس اٹھا لو اور جاؤ۔ نازو! تم میرے ساتھ رہوگی۔"

محمد خان نے کہا "میرے پاس ایک ریوالور ہے۔"

"گڈ۔ تم کسی ایک دروازے پر پوزیشن سنبھال لو" میں نے کہا "گل! تم میرا ریوالور لے لو۔"

مگر گل سے پہلے ریوالور غالب نے لے لیا "گل کو جانے دو۔"

میں نے کہا "اچھا۔ تم دوسری طرف سے انہیں روکو۔"

"میں کیا کروں؟" محسن نے کہا۔

"تم کھڑے ہو ابھی تک۔ جاؤ رابعہ اور گل کے ساتھ۔ باہر چھپ جاؤ۔ وہ اندر آئیں گے تو ہم ان سے نمٹ لیں گے۔"

میں نے محسن کو دھکیل کر کہا "ادھر کچن سے نکل جاؤ۔ خان، اندر آنے کے لئے وہ کون سا راستہ اختیار کریں گے؟"

خان نے کہا "وہ کسی طرف سے بھی آسکتے ہیں۔"

میں نے محسن سے کہا "تم ان کا راستہ مت روکنا۔ انہیں پتا نہ چلنے پائے کہ تم باہر چھپے بیٹھے ہو۔ وہ تمہارے پاس سے بھی گزریں تو گزر جانے دینا۔ بہت جھاڑ جھنکاڑ ہے تمہارے چھپے رہنے کے لئے۔"

پھر میں نے نازو سے کہا "تم غالب کے ساتھ رہو۔ اگر کوئی اندر آجائے تو اس سے نمٹ لینا۔"

نازو نے میرا مطلب سمجھ لیا۔ میں اب محمد خان کی طرف لپکا۔ وہ دروازے کے پیچھے کھڑا ایک شیشے میں سے جھانک رہا تھا۔ اچانک اس نے فائر کیا۔ باہر کوئی دلخراش آواز میں چلایا۔ خان نے دوسرا فائر کیا۔

"قسم اللہ کی، بھاگنے نہیں دوں گا ایسے کسی کو۔"

میں نے خود کو دیوار کے ساتھ لگالیا "کتنے مارے گئے ؟"

"دو۔ ایک تو بالکل سامنے آگیا تھا۔"

میں نے کہا "اب تم تیسری طرف چلے جاؤ۔ یہاں میں ہوں۔"

باہر سے مشین گن کا ایک برسٹ آیا۔ دروازے میں سوراخ ہوگئے لیکن میں دیوار کی اوٹ میں تھا اس لئے محفوظ رہا۔ محمد خان بھی صرف چند سیکنڈ پہلے ہٹ گیا تھا ورنہ چھلنی ہوجاتا۔ دوسری طرف سے غالب نے بھی یکے بعد دیگرے دو فائر کئے۔ میں نے اس سے چلا کے جگہ بدلنے کو کہا۔ اس طرح وہ بھی بچ گیا ورنہ ادھر بھی جواب میں گولیوں کی بوچھاڑ آئی تھی۔

"تم مت ہلنا اپنی جگہ سے" میں نے نازو سے کہا۔

میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ مشین گن سے فائر کرنے والے نے ایک اور برسٹ مارا جس کا جواب میں نے ایک بھیانک چیخ سے دیا۔ وہ مطمئن ہو کے سیدھا دروازے کی طرف آیا۔ اسے یقین تھا کہ جو بھی دروازے کے پیچھے سے فائر کررہا تھا وہ مشین گن کی گولیوں نشانہ بن گیا ہے۔ میں اسے دھوکا دینے میں کامیاب رہا تھا۔ وہ شکستہ دروازے کو دھکے سے توڑ کر اندر آیا تو میرا ہاتھ اس پر وار کرنے کے لئے تیار تھا۔ دروازہ بیچ میں گرنے سے میں اس وار سے حملہ آور کی گردن توڑنے میں ناکام رہا۔

وہ میری طرف پلٹا ہی تھا کہ میں نے اس پر جست لگادی اور ہم دونوں ایک ساتھ گرے۔ مشین گن ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھی اور وہ پوری کوشش کررہا تھا کہ اس کے دستے سے میرا سر پھاڑ دے لیکن میرے ہاتھ اس کی گردن پر شکنجہ بن چکے تھے۔ وہ تڑپا لیکن خود کو چھڑا نہ پایا۔ میرے دونوں گھٹنوں نے اس کے بازوؤں کو دبا رکھا تھا۔ چنانچہ وہ لاتیں چلاتا رہا۔ آہستہ آہستہ اس کا تڑپنا ایک تشنج کی صورت اختیار کرگیا اور وہ ڈھیلا پڑنے لگا۔ میں نے مشین گن چھین کر اس کے سر پر ایک ضرب لگائی جس نے اس کا خاتمہ کردیا۔

افسوس مجھے یہ دیکھ کر ہوا کہ مشین گن خالی ہوچکی تھی۔ پھر بھی یہ ایک ہتھیار تھا۔ غالب اور محمد خان کے ریوالور سے کئے جانے والے فائروں کی آوازیں مجھ تک پہنچ رہی تھیں اور باہر سے سنائی دینے والی چیخوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کا نشانہ خطا نہیں جارہا ہے۔ نازو نے میری حکمت عملی اختیار کرتے ہوئے ایک شخص کو یہ تاثر دیا تھا کہ مشین گن کی گولیوں نے کسی عورت کو ختم کردیا ہے۔ جو دروازے کے پیچھے سے فائر کررہی تھی۔ جب وہ کامیابی کی خوشی میں پھنکارتا ہوا اندر آیا تو نازو نے بجلی کی طرح تڑپ کے اس پر وار کیا اور اس کی سانڈ جیسی گردن کو اپنے نازک ہاتھوں کی ایک جنبش سے توڑ ڈالا۔ اب وہ بھی مشین گن اٹھائے کھڑی تھی۔

میرے اندازے کے مطابق آدھے حملہ آور ضرور ختم ہوچکے تھے۔ یکلخت غالب نے چلا کر کہا "پیڈرو! سامنے آ مردار، کتے کی اولاد" اور میں اس کھڑکی کی طرف لپکا جسے غالب نے مورچا بنا رکھا تھا۔

"یار، میرا ریوالور خالی ہوگیا ہے" اس نے آہستہ سے کہا۔

میں نے نازو کو اشارہ کیا "تم ادھر آجاؤ۔ کیا پیڈرو سامنے ہے؟"

غالب نے کہا "میں نے اسے دیوار سے کود کر جاتے دیکھا تھا۔"

میں نے نازو سے مشین گن لے لی۔ اس میں اب ایک ہی راؤنڈ باقی رہ گیا تھا۔ سوچے سمجھے بغیر میں نے وہ راؤنڈ چلادیا کوئی جھاڑیوں میں سے خرگوش کی طرح اچھل کر گرا اور زمین پر لوٹنے لگا۔ باہر سے جیپ کا انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔

"وہ بھاگ رہے ہیں" میں نے کہا "خان! یہ ریوالور مجھے دو۔"

"ٹھہرو۔ میں اسے لوڈ تو کرلوں" خان نے کہا "حملہ آور یہ سمجھ کر آئے تھے کہ ہم انہیں سوتے ہوئے ملیں گے۔ ابھی وہ مقابلے کے لئے تیار نہیں تھے۔ وہ حویلی کو ہر طرف سے گھیرے میں لینے کے بعد ایک ساتھ اندر داخل ہو کے اپنے اسلحے کی طاقت سے ہمیں قابو میں کرلیتے لیکن ہم نے ان کے شبخون کا سارا منصوبہ خاک میں ملادیا۔ اگر ہم جاگ نہ رہے ہوتے تو ہمارا انجام برا ہوتا۔"

میں نے ریوالور سے فرار ہونے والوں پر مسلسل فائر کئے مگر ان کو ضرورت سے زیادہ مہلت مل گئی تھی۔ ان کے لئے ہماری جوابی کارروائی انتہائی غیر متوقع تھی۔ ہم نے ان ہی کی مشین گن استعمال کی تھی لیکن یہ بات انہیں کیسے معلوم ہوسکتی تھی۔ وہ یہی سمجھے کہ ہم پوری طرح مسلح ہیں۔ اپنے پلان کی ناکامی نے انہیں پہلے ہی بدحواس کردیا تھا۔ انہیں یہ اندازہ بھی تھا کہ ہم مورچا بند ہیں اور وہ باہر کھلی جگہ میں ہونے کی وجہ سے ہمارا نشانہ بن رہے ہیں چنانچہ وہ جان بچا کر فرار ہونے پر مجبور ہوگئے۔ ان کی طرح ہمیں بھی مرنے والوں کی صحیح تعداد معلوم نہ تھی۔ میں یہ جاننے کے لئے بے چین تھا کہ استاد پیڈرو مارا گیا یا پھر بچ کے نکل گیا۔ لیکن اب خود ہمارا فرار ہوجانا ضروری ہوگیا تھا۔ صبح دم فائرنگ کی آوازوں نے سارے علاقے میں ہل چل مچادی تھی۔

میدان صاف ہوتے ہی میں نے خان سے کہا "خان صاحب، اب یہاں سے نکلنے کی فکر کرو۔ پولیس آنے ہی والی ہوگی۔"

خان مجھ سے زیادہ فکر مند تھا "مجھے تو راستے بھی نہیں معلوم۔ خیر آؤ۔ پیچھے سے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

غالب اور نازو کے ساتھ میں نے اس طرف کا رخ کیا جہاں میرے اندازے کے مطابق رابعہ، گل اور محسن چھپے ہوئے تھے۔ یہ حویلی کا عقبی حصہ تھا جس میں لمبی لمبی گھاس

اور جھاڑیوں کے درمیان درخت کسی جنگل کا نقشہ پیش کرتے تھے۔ سڑک کی طرف سے میں لوگوں کی آوازیں سن رہا تھا۔ جو شاید آس پاس کے گھروں سے نکل کر گیٹ کے سامنے جمع ہوگئے تھے۔ میری نظریں پریشانی کے عالم میں اپنے ساتھیوں کو تلاش کررہی تھیں۔

"آخر کہاں چھپے ہیں یہ لوگ" میں نے کہا۔

نازو نے کہا "مجھے بھی کوئی دکھائی نہیں دیا۔"

غالب نے کہا "عجیب احمق ہے یہ محسن بھی۔ ایسا دبک کر بیٹھا ہے کہیں کہ سر اٹھا کر نہیں دیکھتا۔"

نازو نے کہا "ہاں۔ ہم تو سامنے ہیں۔ انہیں دیکھ لینا چاہئے۔"

میں نے چلا کر کہا "محسن! نازو!"

باہر کہیں دور سے پولیس کی گاڑی کے سائرن سنائی دینے لگے تو میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اسی وقت گھاس میں سے کوئی پھدک کے باہر آیا۔ میں نے برائے نام اجالے میں بھی ترکی ٹوپی کے پھندنے کو لہراتے ہوئے دیکھ لیا اور بھونچکا رہ گیا۔ "یوسف ثانی! تم؟"

یوسف ثانی نے ہاتھ بلند کرکے نچاتے ہوئے کہا۔ "جلدی کیجئے بندہ پرور، دشمن آپہنچا ہے سر پر۔ نہ ماریئے کلہاڑی اپنے پاؤں پر۔ سوچ بچار میں وقت جائے نہ گزر۔"

میں نے دل ہی دل میں کہا "سالا اس وقت بھی بنا ہوا ہے شاعر" اور پھر دوڑ کر گھٹنوں تک آنے والی لمبی گھاس میں گھس گیا جس میں سے صرف یوسف ثانی کا سر اور ترکی ٹوپی دکھائی دیتے تھے۔ غالب اور نازو مجھ سے آگے تھے۔ میں نے یوسف ثانی کی موجودگی پر حیرت کا اظہار کرنے کے لئے پلٹ کر محمد خان کی طرف دیکھا ہی تھا کہ یوسف ثانی چلایا۔

"اجی توقف نہ فرمایئے، میرے پیچھے پیچھے آیئے۔"

محمد خان نے کہا "دیکھا تم نے۔ یہ کیسے جن کی طرح نمودار ہوا ہے۔ بھلا اس وقت کوئی سوچ سکتا تھا کہ یہ ایسے ٹپک پڑے گا۔"

میں نے کہا "میری تو خود عقل حیران ہے۔"

دوڑتے دوڑتے اچانک یوسف ثانی کو ٹھوکر لگی۔ وہ منہ کے بل گرا تو اس کی ٹوپی اڑ کر دور گئی۔

وہ چلایا "آہ یوسف ثانی کی تقدیر۔ ایسی کیا تھی میری تقصیر۔ کہ بنادیا مجھے عبرت کی تصویر" وہ کراہتا، لنگڑاتا اٹھا اور اپنی ٹوپی کو تلاش کرنے لگا جس کا پھندنا پھر الگ ہوگیا تھا۔ اس نے ان دونوں کو الگ الگ اٹھا کے ایسے دیکھا جیسے اپنے نقصان عظیم کا اندازہ کررہا ہو۔ پھر اس نے پھندنا سر پر رکھ کے ٹوپی کو ایسے جمالیا کہ پھندنے کے پھر کہیں گر جانے کا احتمال نہ رہا۔ پھر وہ لنگڑاتا ہوا آگے بڑھا۔

میں نے کہا "یوسف ثانی! یہ تم کہاں لے جارہے ہو ہمیں؟"

"حضور! بھروسا کیجئے ناچیز پر، دکھا رہا ہوں آپ کو وہ راہ گزر۔ جہاں جا نہیں سکتی کسی بدخواہ کی نظر۔ عرف عام میں کہتے ہیں اس کو گٹر۔ جس کی لائن ہے زمین کے اندر۔ لیکن پہنچا دیتی ہے باہر۔ آپ کے ساتھی ہیں وہیں منتظر۔ لیجئے ہم پہنچ گئے اس مقام پر۔"

"خدا سمجھے تمہاری قافیہ دانی سے" میں نے کہا اور کچھ دیر اس سوراخ کے کنارے تذبذب کی کیفیت میں کھڑا رہا جس میں مجھے اندھیرے کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

پھر محسن نے نیچے سے کہا "کود جاؤ اندر۔ گہرائی زیادہ نہیں ہے، پہلے نازو کو اتار دو۔"

غالب نے نازو کا ہاتھ پکڑ کے اسے مین ہول میں لٹکادیا۔

"اب میں چھوڑ رہا ہوں" غالب نے کہا اور اس کے ہاتھ چھوڑ دیئے اور پھر نیچے جھانک کر کہا "چوٹ تو نہیں آئی؟"

"نہیں۔ تم بھی آجاؤ۔ سیدھے اترنا" نازو نے کہا۔

باری باری غالب، محمد خان اور یوسف ثانی اندر اتر کر اندھیرے میں غائب ہوگئے۔ میں نے اترنے سے پہلے مین ہول کے ڈھکنے کو قریب کرلیا اور پھر اندر اتر گیا۔ نیچے سے مجھے محمد خان نے اپنے کندھوں کا سہارا فراہم کیا۔ اس کے شانوں پر قدم جماکے میں نے گٹر کے ڈھکن کو کھینچا اور برابر کردیا۔

اب میں گھپ اندھیرے میں تھا اور ایک عجیب سی بدبو میرے حواس کو مختل کررہی تھی۔ محسن نے لائٹر روشن کیا تو اس کے بے نام اجالے میں مجھے رابعہ، گل اور نازو کے متوحش چہرے دکھائی دیئے۔ ہم سب کسی پرانی گٹر لائن میں کھڑے ہوئے تھے جو شاید برسوں سے استعمال نہیں ہوئی تھی۔ اس میں کوڑے کرکٹ کے ڈھیر تھے جن پر چوہے دوڑ لگا رہے تھے۔

اتنے بڑے اور پلے ہوئے چوہے میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ برسوں بعد کسی نے ان کی خلوت پر یلغار کی تھی چنانچہ وہ پریشان بھی تھے اور برہم بھی۔ ان میں سے کچھ ہمیں اپنی ننھی ننھی آنکھوں سے گھور رہے تھے اور ان کے تیور بہت جارحانہ تھے۔

میں نے کہا "دیکھو، یہ چوہے حملہ بھی کرسکتے ہیں۔ میرے ہاتھ میں یہ خالی مشین گن ہے جس سے میں ڈنڈے کا کام لے سکتا ہوں۔ میں آگے چلتا ہوں، میرے پیچھے رابعہ پھر محمد خان، اس کے پیچھے گل پھر محسن اور نازو۔ آخر میں غالب رہے گا۔"

غالب نے دوسری خالی مشین گن کو ڈنڈے کی طرح لہرایا۔

"ہم ایک قطار میں چلیں گے۔ تاکہ چوہوں کو دونوں طرف سے نکل جانے کا راستہ مل جائے" میں نے کہا "ہم بھیڑ کی شکل میں چلیں گے تو یہ آگے بھاگنے کی کوشش کریں گے یا پلٹ کر حملہ آور ہوں گے۔"

یوسف ثانی مجھ سے بھی چند قدم آگے تھا اور چوہوں کی موجودگی سے بے نیاز اپنی ٹوپی اور پھندنے کو بڑی الیہ نظر

سے دیکھ رہا تھا۔ ایک بار میں نے ہاتھ مار کر انہیں الگ کر دیا تھا تو اسے سخت صدمہ ہوا تھا۔ اب ایک حادثے نے پھر ٹوپی کو لنڈورا کر دیا تھا جسے اس نے یقیناً بڑی محنت سے دوبارہ پھندنے کے ساتھ منسلک کیا تھا۔ اچانک ایک چوہے نے اس کی طرف چھلانگ لگائی۔ جس صفائی سے اس نے چوہے کو کک مار کے دور پھینکا اس نے مجھے حیران کر دیا۔ یہ ماجد خان جیسے کسی بیٹسمین کا شاٹ تھا جو بال کو آسانی سے باؤنڈری کے باہر پہنچادے۔

میں نے کہا "دیکھو' یہ ہے صحیح طریقہ۔"

لیکن بہادری کے اس مظاہرے سے اور میرے الفاظ سے خواتین کی دہشت کم نہیں ہوئی تھی۔ اگر حالات اجازت دیتے تو وہ ضرور چیخ مار کے بے ہوش ہو جاتیں۔ ایک بار صرف ایک چوہے نے انہیں تگنی کا ناچ نچا دیا تھا۔ یہاں ایک نہیں درجنوں چوہے تھے لیکن جائے فرار کوئی نہ تھی۔ جیسے ناگزیر خطرات میں ہر جانور اپنی جان بچانے کے لئے استطاعت سے بڑھ کر جرات کا مظاہرہ کرتا ہے اور جان کی بازی لگا دیتا ہے ایسے ہی رابعہ' گل اور نازو نے بھی خود کو ان خونخوار چوہوں سے مقابلے کے لئے تیار کر لیا تھا۔ گٹر لائن میں صرف چوہے ہی نہیں تھے۔ فرش پر ہزاروں کی تعداد میں کاکروچ پھر رہے تھے۔

انہیں سگریٹ لائٹر کی معمولی سی روشنی نے مضطرب کر دیا تھا اور وہ اندھیرے کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ کئی بار کاکروچ ہمارے پیروں پر چڑھے۔ میں نے تو خیر انہیں ہاتھ مار کر جھٹک دیا لیکن خواتین نے بدحواسی میں اچھا خاصا ڈانس کیا۔ تاہم اس وقت کسی کو ان کی حالت پر ہنسی نہیں آئی۔

ہم آہستہ آہستہ آگے بڑھے تو گٹر کی چھت سے چپٹی ہوئی ساکت رہنے والی چھپکلیاں تیزی سے ادھر ادھر ہوئیں۔ رابعہ تقریباً مجھ سے چپٹی ہوئی تھی۔ اسی طرح غالب سے نازو چپٹی ہوئی تھی اور محسن کے ساتھ گل۔ ان کی حالت غیر تھی اور ایک کو دوسرے کا ہوش نہیں تھا۔ وہ بار بار چیخ مارتی تھیں۔ جیسے رابعہ میرا نام لیتی تھی' ایسے ہی نازو بے اختیار غالب کو پکارتی تھی اور گل خود بخود محسن کو۔ ہم سب ایک ہی طرح انہیں ڈانٹتے تھے' حوصلے سے کام لینے کی تلقین کرتے تھے اور پھر ان کی ڈھال بن کے انہیں تحفظ فراہم کرتے تھے۔

میں آگے تھا چنانچہ جتنی مرتبہ وہ خوں آشام چوہے مجھ پر حملہ آور ہوئے میں نے مشین گن کو ڈنڈے کی طرح استعمال کیا یا اپنے پیروں سے انہیں کک لگائی۔ حقیقت یہ ہے کہ میں خود بھی کم خوف زدہ نہ تھا۔ وہ مجھے آدم خور چوہے لگے تھے۔ دراصل وہ چوہے کی نسل اور شکل کے جانور تھے جو "گھوس" کہلاتے ہیں اور ان کا ٹھکانا گٹر لائنوں میں ہی ہوتا ہے۔ ان کے دانت اتنے تیز ہوتے ہیں کہ سیمنٹ کی پائپ لائنوں کو کاٹ دیتے ہیں۔ وہ ڈرین پائپ میں پانی کے بہاؤ کے مخالف اوپر چڑھ سکتے ہیں اور نالی کے آخری سرے پر لوہے کا ٹریپ نہ ہو تو باتھ روم یا کچن میں داخل ہو کے خاصی تباہی پھیلا دیتے ہیں۔

یوسف ثانی اپنی مخصوص شیروانی اور پتلون میں ٹیڑھا میڑھا چلتا ہوا ہماری رہنمائی کر رہا تھا اور ہمیں اپنی تھیٹر کے انداز کی شاعرانہ زبان میں یقین دلا رہا تھا کہ اس زمین دوز راستے سے بہت جلد ہم بخیر و عافیت باہر نکلنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ محمد خان نے جب اسے جن قرار دیا تھا تو شاید اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا تھا۔ جن وہ سب کچھ نہیں کر سکتے تھے جو یوسف ثانی کے لئے کھیل تھا۔ وہ کارٹون قابل رشک صلاحیتوں کا مالک تھا اور اب تک کئی بار اپنی افادیت اس طرح ثابت کر چکا تھا کہ میں اسے ہر قیمت پر ساتھ رکھنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

میں نے ایک ہاتھ رابعہ کے شانے کے گرد ڈال کے اسے اپنے قریب ایک طرح سے اپنے جسم کی پناہ میں لے رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ سے مشین گن کو الٹا پکڑ کے آہستہ آہستہ قدم بڑھا رہا تھا۔ یہی کیفیت غالب کی تھی۔ مگر رابعہ کے مقابلے میں نازو زیادہ بزدلی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ وہ بار بار چیخ مارتی تھی اور پھر غالب اس پر چلاتا تھا کہ اب آواز نکلی تو جھانپڑ مار دوں گا۔ خالی ہاتھوں سے مردانہ وار لڑائی کے جوہر دکھانے والی اور موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے زندگی کی جدوجہد میں پیش پیش رہنے والی نازو اس وقت چوہوں' کاکروچوں اور چھپکلیوں کے درمیان گھری ہوئی انہیں خاصی تفریح کا سامان فراہم کر رہی تھی۔

گل سب سے بہادر ثابت ہوئی تھی۔ محسن کے ہاتھ میں لائٹر تھا جو بار بار بجھ جاتا تھا اور ہم سب اندھیرے میں کھڑے رہ جاتے تھے۔ اندھیرا ہوتے ہی رابعہ اور نازو چلّانے لگتی تھیں "لائٹ جلاؤ" اور محسن بھنا کے کہتا تھا "اب کسی نے شور مچایا تو میں لائٹر پھینک دوں گا۔"

متعدد چوہے ہمارے دائیں بائیں بھاگ رہے تھے۔ جو ان میں زیادہ دلیر تھے وہ دوسروں کے لئے درس عبرت بن گئے تھے۔ ان کے زخمی جسم ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے اور ان کا خون شکستہ حصوں سے ابل رہا تھا۔ یہ بڑا کراہیت پیدا کرنے والا منظر تھا چنانچہ رابعہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا تھا اور صرف میرے سہارے پر چل رہی تھی۔ مشکل یہ تھی کہ بار بار کاکروچ اس کے پیر پر چڑھ جاتے تھے اور اسے ہاتھ ہٹا کے یا پیر پٹخ کے انہیں جھاڑنا پڑتا تھا۔ کئی بار میں نے اس سے کہا 'جان' بس تھوڑا سا فاصلہ اور ہے۔ شاباش ہمت نہ ہارنا۔ ڈرنے کی کیا بات ہے۔ کاکروچ کاٹتے تھوڑا ہی ہیں۔ اور یہ چھپکلیاں کیا کہہ رہی ہیں' کچھ نہیں۔ یہ تو خود ڈری ہوئی ہیں۔ بس ادھر سے ادھر ہو جاتی ہیں۔ اب تو چوہے بھی راستہ دے رہے ہیں دیکھو کیسے دم دبا کے بھاگ رہے ہیں" میرا خیال ہے کہ ایسے ہی الفاظ سے غالب نے نازو کا اور محسن نے گل کا حوصلہ بحال رکھنے کی کوشش کی ہوگی۔

گٹر لائن کی دیواروں پر مکڑی کے جالے بھی تھے جن میں معلق مکڑیوں کو ہٹانے کے لئے مجھے اسٹین گن کو ڈنڈے کی طرح گھمانا پڑتا تھا۔ کئی جگہ جالے میرے ہاتھوں پر بھی چمٹ گئے۔ یوسف ثانی اس زیر زمین خفیہ راستے پر بڑے اعتماد کے ساتھ ہماری رہنمائی کرتا ہوا چلتا جا رہا تھا۔ تقریباً سو گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم سب کے خوف کی شدت میں خاصی کمی آگئی تھی اور یہ ماحول ہمیں غنیمت محسوس ہونے لگا تھا جس نے ہمیں وقت پر خطرے کی حدود سے نکالنے میں بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔

عام حالات میں وہ بُو ناقابل برداشت ہوتی جو زیر زمین' برسوں سے بند پڑی ہوئی گٹر لائن میں بھری ہوئی تھی۔ لیکن جب ذہن زیادہ بڑے مسائل سے دوچار ہو تو چھوٹے اور غیر اہم مسائل خود پس منظر میں چلے جاتے ہیں۔ سب سے بڑا خطرہ پولیس کے ہاتھوں گرفتاری کا تھا جو اب ٹل گیا تھا۔ اگر ہم پکڑے جاتے تو نہ جانے کتنے قتل ہمارے نام لکھے جاتے۔ ہمارے ہاتھوں مارے جانے والوں کی صحیح تعداد کا علم خود ہمیں بھی نہیں تھا۔ اصل مجرم فرار ہو گئے تھے اور لاشیں چھوڑ گئے تھے۔ یہ بتانا اور ثابت کرنا عملاً ناممکن تھا کہ وہ حملہ آور تھے اور ہم نے صرف اپنا دفاع کیا تھا۔

گرفتاری سے بچ جانے کے بعد اس گٹر لائن کے ذریعے فرار کا راستہ مل جانا یقیناً تائید ایزدی تھا اور یوسف ثانی کو ہم فرشتہ غیب سمجھ سکتے تھے جسے خدا نے بروقت بھیجا اور ہمیں بچا لیا۔ اس راستے پر اصل پریشانی کا سبب وہ خونخوار چوہے تھے جو ہر طرف سیکڑوں کی تعداد میں پھر رہے تھے اور اتنے نڈر تھے کہ حملہ کرنے سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ اگر وہ ایک منظم فوج ہوتے اور مل کے حملہ کرتے تو شاید ذرا سی دیر میں ہمارے جسموں کی جگہ صرف ہڈیوں کے ڈھانچے پڑے رہ جاتے جن پر گوشت کا ایک ریزہ نہ ہوتا۔ ہم نے چوہوں کا مقابلہ کیا اور اپنا راستہ بناتے آگے بڑھتے گئے۔ کاکروچ اور چھپکلیاں بے ضرر تھیں لیکن چوہوں کی طرف سے ہوشیار رہنا ضروری تھا۔ کوئی چوہا اگر اپنے تیز دانت کسی کے گوشت میں گاڑ دیتا تو اسے وہی انجکشن لگوانے پڑتے جو پاگل کتے کے کاٹنے کا علاج ہیں۔ میں نے سنا تھا کہ کوئی بھی گوشت خور جانور (بشمول حضرت انسان) کسی کو کاٹ لے تو اس کے دانتوں کا مخصوص زہر خون میں سرایت کر جاتا ہے چنانچہ چوہے بلی اور کتے سے لے کر آدمی اور شیر تک سب کے کاٹے کا ایک ہی علاج ہے۔

ان تمام خطرات کی موجودگی میں غلاظت اور بو کی طرف کون توجہ دیتا۔ مجھے اندر اترتے وقت ایک خیال ضرور آیا تھا کہ کہیں گٹر لائن میں زہریلی گیس نہ ہو۔ ایسے بہت سے واقعات میں نے سنے اور پڑھے ہیں کہ لوگ کسی پرانے بند کنوئیں یا گٹر لائن میں اترے اور زہریلی گیس کے باعث ہلاک ہو گئے۔ ابھی تک میں نے اس زہریلی گیس کے اثرات کو محسوس نہیں کیا تھا۔ صاف ہوا میں گیس کی بو پہچانی جاتی ہے مگر وہاں اتنی بو تھی کہ اس میں ہائیڈروجن سلفائیڈ۔ کلورین یا امونیا جیسی گیس کا بھی پتا نہیں چل سکتا تھا۔

رفتہ رفتہ مجھے حبس کا اور دم گھٹنے کا احساس ہونے لگا۔ ہم نے زمین کے نیچے ہی نیچے تقریباً ایک فرلانگ کا فاصلہ طے کر لیا تھا۔ درمیان میں کئی موڑ بھی آئے تھے اور جنکشن بھی جہاں سے گٹر لائن دو یا تین حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ یوسف ثانی جیسا لیڈر نہ ہوتا تو ہم بھٹک کر نہ جانے کدھر نکل جاتے۔ وہ زمین دوز راستوں سے اس طرح واقف معلوم ہوتا تھا جیسے زمین کے اوپر سڑکوں اور گلیوں سے۔ ان زیر زمین خفیہ راستوں سے اس کی واقفیت کیوں تھی؟ اس کا جواب حاصل کرنا ضروری نہیں تھا۔ جو شخص رات کو قبرستان میں خالی قبروں میں لیٹ کر وظیفے پڑھتا ہو اور شمشان گھاٹ سے کھوپڑیاں اکٹھی کرتا ہو وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔

یوسف ثانی کی قیادت پر اعتماد کے باوجود میں بھی اس مسافت کے اختتام پذیر نہ ہونے سے پریشان ہو گیا تھا۔ چلتے چلتے میں نے محسوس کیا کہ رابعہ کا بوجھ کچھ زیادہ ہو گیا ہے۔ اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ پھسل کر گرتی' میں نے اسے تھام لیا۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ جب میں نے پلٹ کر دیکھا تو غالب نے بھی نازو کو ایسے ہی سنبھال رکھا تھا۔ آخر حصے میں صورتحال اس کے برعکس تھی اور گل نے محسن کو سہارا دے رکھا تھا اور اسے محمد خان نے نہ پکڑا ہوتا تو وہ بھی گر جاتا۔

چوہے پیچھے رہ گئے تھے اور جو اکا دکا چوہا سامنے آتا تھا وہ بھی جان بچا کے بھاگنے کی کوشش کرتا تھا۔ اسی طرح چھپکلیاں اور کاکروچ بھی غائب ہو گئے تھے اور راستہ پہلے کے مقابلے میں آسان ہو گیا تھا چنانچہ رابعہ' نازو اور محسن کی بیہوشی کو میں حبس' تازہ ہوا کی کمی یا کسی زہریلی گیس کا نتیجہ ہی قرار دے سکتا تھا جو آہستہ آہستہ سب کے جسموں میں سرایت کر گئی تھی۔

میں نے یوسف ثانی سے چلا کے کہا "یار' یہ راستہ ہے کہ شیطان کی آنت۔ ختم ہونے میں ہی نہیں آتا۔ کیا ہمیں سیدھا جہنم میں پہنچا کر دم لو گے۔"

یوسف ثانی نے برا ماننے کے بجائے اپنے پیلے دانتوں کی نمائش کی اور بولا "دو چار ہاتھ اب تو لب بام رہ گیا۔ یوں عقل و ہوش کھونے کا کیا کام رہ گیا۔"

میں نے کہا "میں دو چار ہاتھ تمہیں مار دوں گا' دیکھتے نہیں سب کا کیا حال ہو رہا ہے۔"

اس نے سر جھکا کر کہا "فدوی کا اس میں ہے کوئی قصور' تو دس جوتے ماریئے سر عزیز پر ضرور۔ آپ کو لایا ہوں خطرات سے دور۔ تحسین و انعام دیتا ہے زمانے کا دستور لیکن آپ کا مزاج عالی ہے برہم حضور۔"

میں نے بھنا کے کہا "حضور کے بچے' باہر نکالو ہمیں پہلے۔

ورنہ تمہارا انعام یہ ہوگا کہ تخلص کے ساتھ مرحوم بھی لگانا پڑے گا۔"

اس نے چند قدم چل کے نیچے سے زور لگایا اور ایک ڈھکن کھول دیا۔ پھر اچھلا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اوپر کا کنارہ پکڑ کے لٹک گیا۔ اس کی ترکی ٹوپی اس سے پہلے اچھل کے باہر نکل گئی تھی۔ یوسف ثانی نے خود کو اسپرنگ کی طرح اوپر کھینچا اور باہر نکل گیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ سرنگ کا سفر ختم ہوا۔

یوسف ثانی نے زمین پر لیٹ کر ہاتھ نیچے پھیلائے اور رابعہ کو اوپر کھینچ لیا۔ رابعہ ایک صحت مند لڑکی تھی۔ نازو کی طرح دھان پان نہیں تھی۔ اس کا وزن ایک سو بیس پونڈ تھا لیکن جتنی آسانی سے یوسف ثانی نے اسے ایک ہاتھ سے اٹھالیا اس پر مجھے حیرانی ہوئی کیونکہ وہ خود سوکھا اور مریل ہڈیوں کا ڈھانچہ نظر آتا تھا۔ میں اس کی مدد کے بغیر ہی اوپر آگیا اور تازہ ہوا میں ایک گہری، لمبی سانس لے کر میں نے نازو کو اوپر کھینچا۔ ایک ایک کرکے سب اس گٹر کے مین ہول سے نکل آئے تو یوسف ثانی نے گٹر پر ڈھکن لگا دیا۔

میں زمین پر لیٹ گیا۔ بو سے پاک، خالص، خنک اور ہلکی ہوا ایک ٹانک ثابت ہوئی۔ چند منٹ میں رابعہ اور نازو کو بھی ہوش آگیا مگر میں نے انہیں لیٹے رہنے کی تاکید کی اور گرد وپیش کا جائزہ لیا۔ ابھی رات باقی تھی اور جہاں ہم زمین سے برآمد ہوئے تھے وہ جگہ غیر معمولی طور پر ویران تھی۔ مجھے اپنے سامنے ایک پرانی ریلوے لائن دکھائی دے رہی تھی جو نہ جانے کب سے استعمال نہیں ہوئی تھی۔ اس کا کچھ حصہ ٹوٹ چکا تھا۔ باقی حصے میں گھاس اگ آئی تھی جہاں پر ریلوے لائن ختم ہوتی تھی وہاں ایک بیریئر سا بنا ہوا تھا۔ عموماً ایسی ریلوے لائن شنٹنگ کے لئے استعمال ہوتی ہے مگر یہ سلسلہ بھی برسوں سے موقوف نظر آتا تھا۔

ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ دونوں جانب جھونپڑیاں تھیں۔ یہاں رہنے والوں نے اتفاق رائے سے ریل کی پٹڑی کو اس آبادی کی گزرگاہ تسلیم کرلیا تھا۔ درمیان کے سلیپر اکھاڑ لئے گئے تھے اور شاید کسی نے اپنے گھر کی تعمیر میں استعمال کرلئے تھے، مگر بیچ کا حصہ ایک صاف سڑک کے طور پر موجود تھا۔ اس سڑک کا اختتام مال گاڑی کے ایک ڈبے پر ہوتا تھا جو بیریئر سے ملا ہوا کھڑا تھا۔ معلوم نہیں ریلوے والے اس ڈبے کو یہاں کب اور کیوں بھول گئے تھے اور اس ڈبے کی گمشدگی کا احساس انہیں کیوں کر نہیں ہوا تھا۔ آثار بتاتے تھے کہ زنگ کے رنگ کا یہ ڈبا سالہا سال سے اسی جگہ موجود ہے۔ یہ شہزادہ گلفام کا قصرِ عالی شان تھا۔ جھونپڑیوں کی آبادی میں لوہے کا بنا ہوا ایک وسیع و عریض ہال نما ڈبا یقیناً ایک محل سے کم نہ تھا۔ اتنی جگہ میں چار خاندان رہ سکتے تھے۔ اس کے علاوہ ڈبے کی فولادی دیواریں اور اس کا مقفل ہوجانے والا دروازہ اسے ایک ناقابل شکست قلعہ بناتے تھے۔

یوسف ثانی نے شیروانی کو اوپر اٹھاکر پتلون پر بندھا ہوا ازار بند نکالا۔ یہ ازار بند پتلون کی بیلٹ کا کام بھی دیتا تھا۔ اس کے آخری سرے پر چابیوں کا ایک گچھا لٹک رہا تھا۔ اس نے ایک چابی لگا کے ایک سیروزن کا قفل کھولا اور پھر بوگی کے دو میں سے ایک پٹ نیچے گرادیا۔ دوسرا پٹ اس نے اوپر اٹھا کے کسی ہُک سے اڑا دیا۔ میں حیرانی سے یہ سب کارروائی دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ آخر یوسف ثانی نے ریلوے کی اس بوگی پر قبضہ کیسے کیا اور اب تک اس قبضے کو برقرار رکھنے میں کیسے کامیاب ہے۔ لیکن جیسا کہ محمد خان نے کہا تھا کہ وہ جن ہے۔ وہ سب کچھ کرسکتا تھا۔

"یہ ہے اس ناچیز کا ٹھکانا۔ شہزادہ گلفام کا غریب خانہ۔ مبارک ہے آپ کا تشریف لانا" اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکتے ہوئے اشارہ کیا۔ میں نے نازو کو اور غالب نے رابعہ کو سہارا دے کر اوپر چڑھادیا۔ گل حیرت انگیز طور پر تازہ دم تھی۔ وہ خود ہی اندر چلی گئی۔ میں آخر میں اندر پہنچا تو یوسف ثانی مٹی کے تیل کا لیمپ روشن کر رہا تھا۔

میرا خیال تھا کہ جتنا غلیظ، بے ہنگم اور بے قرینہ خود یوسف ثانی ہے ویسا ہی اس کا ٹھکانا بھی ہوگا مگر روشنی ہوتے ہی میں نے اندر کا نقشہ دیکھا تو میں دم بخود رہ گیا۔ بوگی کے آخری حصے میں صاف بستر بچھا ہوا تھا۔ آمنے سامنے کی دیواروں کے ساتھ کرسیاں رکھی ہوئی تھیں جو پرانی ضرور تھیں مگر صاف تھیں۔ درمیان میں میز پر سادہ میز پوش تھا لیکن ایک گلدان میں کاغذ کے خوش نما پھول نظر آرہے تھے۔ دوسری طرف بوگی کے دو حصے تھے۔ یہ پارٹیشن چوڑائی کے رخ ہارڈ بورڈ سے کی گئی تھی۔ اس طرح آخر میں دو کمرے بن گئے تھے۔ ہر کمرے کی چوڑائی بوگی کی چوڑائی سے نصف تھی۔ ایک یوسف ثانی کا کچن تھا اور دوسرا باتھ روم، دونوں کے دروازے پر بھاری پردے لٹک رہے تھے۔ دیواروں پر سفید رنگ بے داغ تھا اور لوہے کے نٹ بولٹ کو چھپانے کے لئے فلم ایکٹرسوں کی تصویروں والے بڑے بڑے پوسٹر لگادیئے گئے تھے۔ ان میں کچھ پوسٹر غیر ملکی تھے اور قابلِ اعتراض سمجھے جاسکتے تھے۔ مگر یہ یوسف ثانی کا ذوقِ حسن تھا جس پر ہم اعتراض نہیں کرسکتے تھے۔ اسے یہ حق حاصل تھا کہ وہ اپنے گھر کو جیسے چاہے سجائے۔

رابعہ، نازو اور گل فرشی بستر پر دراز ہوگئی تھیں۔ محسن، غالب اور محمد خان کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور اس بے سروپا آدمی کے مکمل گھر کو دیکھ رہے تھے۔ جس میں تحفظ، آسودگی، سلیقہ اور حسن سب کچھ تھا۔ اندر داخل ہونے سے پہلے میں تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ یہ ریلوے کی پرانی، بوسیدہ بوگی اندر سے اتنی آرام دہ اور خوبصورت ہوگی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس وقت یہ ہم جیسے بے سہارا اور بے گھر لوگوں کے لئے محفوظ ترین جگہ تھی جہاں ہمارے دشمنوں کے تصور کی رسائی بھی ممکن نہ تھی۔

صبح ہونے ہی والی تھی۔ ہم سب تھکن اور بے آرامی سے زیادہ شدید اعصابی دباؤ کا شکار تھے۔ رات کے آخری پہر میں جو کچھ ہم پر بیتی وہ ایک بھیانک خواب سے کم نہ تھا، جس کی دہشت ابھی باقی تھی۔ ہم موت کے منہ سے بچ کر نکلے تھے اور ایک انتہائی خوفناک اور آسیب زدہ سفر کے بعد کسی میں اتنا حوصلہ بھی نہیں تھا کہ اپنی زبان سے کچھ کہے۔ کلمۂ شکریا صرف تسلی یا کوئی بھی بات جو اعتماد کو بحال کرسکے۔ ہم سب اپنے اپنے خیالوں کے گرداب میں غوطہ زن تھے اور زبان خاموشی میں ہمکلام تھے۔

تینوں لڑکیاں ایک بیڈ پر نڈھال پڑی چھت کو گھور رہی تھیں اور شاید ان کے تصور کی اسکرین پر ابھی تک اسی فلم کے مناظر چل رہے تھے جو شاید ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ رات کے اندھیرے میں ہم سب کو محصور کرنے والے شکاری غیر متوقع ناکامی سے دوچار ہوکر لوٹ گئے تھے۔ ہر حملہ آور کے لئے ناکامی کا احساس دُہرا ہوتا ہے۔ ایک صدمہ جان و مال کے زیاں کا ہو تو دوسرا اپنے یقین کی شکست کا ہوتا ہے۔ اچانک اسے احساس ہوتا ہے کہ اس نے کامیابی کے لئے جو منصوبے بنائے تھے ان کی بنیاد غلط تھی۔ اس کے اندازے غلط تھے اور وہ یقین نہیں تھا اس کی خوش فہمی تھی۔

مجھے استاد پیڈرو کا خیال آیا۔ اس وقت وہ کہاں ہوگا؟ کیا اس کی لاش رائے بہادر کی حویلی کے آس پاس مرجانے والوں میں شامل ہوگی اور اس وقت پولیس کی تحویل میں ہوگی یا اپنے باس کے سامنے بچے کھچے شکست خوردہ لشکر کے ساتھ اپنی ناکامی کی ذمے داری پر تقدیر کو کوسنے میں مصروف ہوگا۔ دوسروں کی غلطی اور بزدلی کو سبب بنا کر پیش کررہا ہوگا، یا غلط منصوبہ بندی کرنے پر اسی کو موردِ الزام ٹھہرا رہا ہوگا؟

وقت کے اسٹیج پر اب منظر تیزی سے بدل رہے تھے اور ہم سب جو تماشا بھی تھے اور تماشائی بھی، یہ نہیں جانتے تھے کہ آنے والے دن کے جانے سے پہلے زندگی کے سفر کا اگلا پڑاؤ کہاں ہوگا۔ کل تک ہم ڈاکو محمد خان کے مہمان تھے اور اس کے تحفظ کی امان میں تھے۔ آج وہ ہم میں سے ایک تھا اور ہمارے قافلۂ سخت جان کے ساتھ قدم ملا کے چلنے لگا تھا۔ اب وہ خود بھی غیر محفوظ تھا۔

ہمارا اس پرانی حویلی سے نکل آنا ایک معجزے سے کم نہ لگا تھا۔ میری عقل ان اسباب کو سمجھنے سے قاصر تھی جو خود بخود پیدا ہوئے تھے۔ میرا عقیدہ بھوت پریت کے وجود کو تسلیم نہیں کرتا تھا چنانچہ میں اسے اپنے ایمان کے مطابق انتظام دستِ غیب کہہ سکتا تھا کہ پہلے خود لالہ بدری پرشاد صرف اس لئے تشریف لائے تھے کہ ہمیں باتوں میں لگا کے سونے نہ دیں۔ پھر ان کی بیٹی کا عاشق جاں نثار نمودار ہوگیا جس نے اس محبت کی دردناک داستان صرف اس لئے سنائی کہ میں جاگتا رہوں، حملہ آوروں کے آنے تک اور یہ حقیقت ہے کہ بھوت نظر نہ آتے تو ہم غافل پڑے سوتے رہ جاتے اور استاد پیڈرو کے ساتھیوں کے بجائے ہماری لاشیں اس وقت پولیس کی تحویل میں ہوتیں۔

لیکن سب سے زیادہ حیران کن حضرت شہزادہ گلفام عرف یوسف ثانی کا نمودار ہوتا تھا۔ اگر وہ وہاں موجود تھا تو کیوں موجود تھا۔ محمد خان نے اس کے بارے میں ہمیشہ یہ کہا تھا کہ معلوم نہیں کہاں بھٹک رہا ہوگا مگر وہ ہمیشہ ہمارے آس پاس ہی پایا گیا۔ ہر وقت مدد کے لئے بالکل کسی جن کی طرح نمودار ہوا اور ہمیں مصیبت سے بچالایا۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ جن محمد خان کے قبضے میں تھا، اسی کے احکام کا پابند تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں بھوتوں کے وجود کو تسلیم کرنے پر تیار تھا مگر میں یہ نہیں تسلیم کرسکتا تھا کہ آدھی رات کے بعد یوسف ثانی کا آنا اور ایک خفیہ راستے سے گزار کے ہمیں اپنے ریلوے کے اس "ریسٹ ہاؤس" تک لے آنا کوئی اتفاقیہ بات تھی۔

اچانک اس فولادی کمرے کا دروازہ نیچے گرا۔ دھماکے سے میں ہی نہیں وہاں موجود ہر شخص اچھل پڑا۔ گل ایک چیخ مار کر رابعہ اور نازو کے ساتھ اٹھ بیٹھی۔ ان سب کی پھٹی پھٹی آنکھیں یوسف ثانی پر جم گئی تھیں۔ وہ بڑے مکروہ، معنی خیز انداز میں مسکرا رہا تھا۔ پھر ایسی آواز آئی جیسے کسی نے اس ناقابلِ شکست دروازے کو باہر سے کنڈی لگا کے مقفل کردیا ہو۔ اس فولادی دیواروں والے زنداں سے باہر جانے کا یہی ایک راستہ تھا جو اب بند ہوچکا تھا۔ تحفظ اور سلامتی کا خیال ایک سراب ثابت ہوا تھا۔ یوسف ثانی کے روپ میں وہ ہماری شامت اعمال تھی جو ہمیں گھیر کر یہاں لے آئی تھی اور جس عقل پر ہمیں ناز تھا، وہ دام ہمرنگ زمیں کے فریب میں آگئی تھی۔ ہم سب اسی طرح پکڑے جاچکے تھے جیسے بلی کے پنجوں سے بچ نکلنے والا چوہا اپنی گردن خود ہی چوہے دان میں پھنسالے۔

میرے لئے یہ ماننا مشکل ہورہا تھا کہ ایک ساتھ ہم سب کی نظر دوستی کے پردے میں نہاں دشمن کو پہچاننے سے قاصر رہی۔ لیکن آہنی دروازے کو کھولنے کی احمقانہ، دیوانہ وار کوشش میں ناکامی کے بعد میرے لئے اس حقیقت کو تسلیم کئے بنا چارہ نہ رہا کہ ہم نے محمد خان اور یوسف ثانی پر بھروسا کرنے میں عجلت نہ کی ہوتی تو دلاور اور تریوینی جیسے شکاری اتنی آسانی سے کامیاب نہ ہوتے۔

باہر سے اجنبی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔ میں نے ریوالور نکال لیا۔ ان حالات میں ہم سب کسی مشورے کے بغیر ایک ہی مقصد کے حصول پر متفق ہوچکے تھے اور یہ مقصد اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ مقابلے کے بغیر ہم خود کو دشمن کے حوالے نہ کریں اور خود مرنے سے پہلے انہیں مار ڈالیں جو... مارِ آستیں ثابت کرچکے تھے۔

یوسف ثانی کی ہنسی نے مجھے مشتعل کردیا "یہ ٹھیک ہے کہ تم کو پہچاننے میں ہم سے غلطی ہوگئی تھی ..."

محسن نے تلخ لہجے میں کہا "لیکن اس کا خمیازہ ہم اکیلے ادا نہیں کریں گے ..."

محمد خان نے سر پر ہاتھ مار کے کہا "خدا کے لئے عقل سے کام لو۔ میری بات تو سن لو پہلے۔"

میں نے پلٹ کر کہا "ذلیل۔ بے ضمیر ڈاکو... تیری کیا بات سنوں میں... تو نے ہی پشت میں یہ خنجر گھونپا ہے۔"

میں نے یوسف ثانی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ پٹاخے کی طرح اچھل کر بولا "آج آپ نے فرمایا ہے خنجر۔ اب نظر آتا ہے مجھے یہ ڈنجر۔ کہ کسی دن آپ مجھے بتادیں نے پسر کنجر...."

محسن نے کہا "کنجر ہی نہیں، تم کمینے اور دغاباز بھی ہو۔ تم نے ہمارا اعتماد حاصل کیا اور پھر یہاں لے آئے۔ گرفتار کرانے کے لئے۔"

محمد خان نے کہا "تم لوگ غلط فہمی میں عقل سے ہی ہاتھ دھو بیٹھے ہو۔"

میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہا "ہم عقل سے کام لیتے تو یہ نوبت ہی کیوں آتی خان صاحب!"

غالب نے جو اب تک خاموش تھا۔ آگے بڑھ کر کہا۔ "تریوینی اور دلاور سے کتنا مال ملا تجھے؟ لالچی کتے؟"

"اور تیرے اس پلے کو کیا ملا؟" محسن نے یوسف ثانی کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے کہا "تم نے ان سے اپنی زندگی کی قیمت وصول کرلی۔ ضمانت حاصل نہیں کی۔ اب جو بھی ہم تک پہنچے گا پہلے تمہاری لاش پر سے گزرے گا۔"

"پھر بھی وہ ہمیں گرفتار نہیں کرسکے گا۔ ہماری لاشوں پر انتظار ہوگا اس کا۔"

محمد خان نے پھر کچھ کہنے کی کوشش کی مگر میں نے ریوالور ہلا کے اشارہ کیا "تم دونوں ادھر آجاؤ۔ دروازے کے سامنے۔"

یوسف ثانی جو منہ کھولے کھڑا ہوا تھر تھر کانپنے میں مصروف تھا، ایک دم چلانے لگا "توقف جناب عالی... یہ ہے آپ کی خام خیالی..."

اب نازو بھی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے پیچھے سے یوسف ثانی کے ایک لات ماری "خام خیالی کے بچے... اب تو ہمیں اور بے وقوف نہیں بناسکتا۔"

یوسف دروازے کے قریب جاکے سجدہ ریز ہوا۔ اس کی ٹوپی اس صدمے کی تاب نہ لاتے ہوئے بے بال وپر سرکا ساتھ چھوڑ گئی اور دور جاگری۔ پھندنا جو ٹوپی کے نیچے چھپا ہوا تھا، نہ جانے کیسے ایک فٹ اوپر کسی کیل میں اٹک کے لہرانے لگا۔

یوسف ثانی نے ایک ایسی چیخ ماری جو پرانے زمانے سے چلنے والے ریلوے کے کالے انجن کی سیٹی کی طرح تھی سین

وہ حیرت انگیز پھرتی کے ساتھ کھڑا بھی ہوگیا۔ اس نے پھندنے کو پھر اپنے سر پر رکھا اور ٹوپی کو جھاڑ کے سر پر ڈھکنے کی طرح جمادیا "آہ! اگر یہ کاسۂ سر ٹوٹ جاتا... ہمارا آپ کا ساتھ بھی چھوٹ جاتا... یہ پانی کا بلبلہ پھوٹ جاتا..."

میں نے کہا "بند کرو یہ بکواس کمینے، لالچی، پیسے کے غلام۔"

اس نے خود پر رقت طاری کرلی "فیصلے میں عجلت سے نہ لیں کام... سر کو پاپوش مبارک سے بجائیں سر عام... ناچیز کا ہزار بار کریں قتل عام... لیکن اس پر نہ دھریں ایسا الزام... کہ لالچ میں بندہ کرتا ہے نیلام... آباواجداد کا نیک نام... اور کہلا سکتا ہے نمک حرام۔"

معلوم نہیں اس کی جذباتی اپیل میں کیا بات تھی جس نے مجھے روک لیا اور میں اس کے جھانپڑ مارنے سے باز رہا۔ وہ حد درجہ بے وقوف نظر آنے والا ایسا معصوم بن گیا تھا کہ میں نے اس کی تک بندی سن لی اور یہ مہلت بھی میرے غصے کی آگ کو سرد کرنے کا سبب بن گئی۔

میں نے کہا "اگر ایسا نہیں ہے تو پھر یہ کیا ہے؟" میں نے بند دروازے کی طرف اشارہ کیا "کس نے بند کیا ہے یہ دروازہ؟"

"ایسے تو سب ہیں یہاں مفلس وقلاش۔ لیکن ان میں چند ایسے ہیں بدمعاش... فدوی کو ستانے کے بہانے رہتے ہیں تلاش..." یوسف ثانی نے فریاد کرتے ہوئے کہا۔

اب میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا "تمہارا مطلب ہے کہ کسی نے شرارت میں باہر سے دروازہ بند کیا ہے؟"

"اس کے قبضے ہیں اتنے ڈھیلے سرکار... کہ دروازہ ہوگیا ہے خود کار... دن میں گر پڑتا ہے سو بار... کبھی سن لے آواز کوئی نابکار... تو کنڈی لگا کے ہوجاتا ہے فرار... حضور اتنے نہ ہوں بے قرار... کچھ دیر فرمائیں انتظار... ابھی آجاتا ہے چوکیدار۔"

یوسف ثانی کی وضاحت نے اس صورت حال کو یکلخت ہم سب کے لئے باعث شرمندگی بنادیا تھا۔ نازو سب سے زیادہ خفیف تھی جس نے مشتعل ہوکے اسے لات رسید کردی تھی۔ وہ اب رابعہ اور گل کے ساتھ بیٹھی اپنے ہونٹ کاٹ رہی تھی اور مجھ سے زیادہ پشیمان نظر آرہی تھی۔ گل مسکرارہی تھی اور رابعہ خاموش تھی۔ خود میں نے یوسف ثانی کے علاوہ محمد خان سے بہت کچھ کہہ دیا تھا۔ جو مجھے نہیں کہنا چاہئے تھا۔ یوسف ثانی اب ایک فٹ لمبے لوہے کے پائپ سے دروازے کو مسلسل بجارہا تھا اور اس کی کرخت آواز اندر ایسے گونج رہی تھی کہ سب کے کان خراب کررہی تھی۔ شاید وہ ہر بار قید ہوجانے کے بعد اپنے محلے والوں کو اسی طرح "ایس اوایس" دینے کا عادی تھا۔

ایک منٹ بعد کسی نے باہر سے چلا کے کہا "اب سن لیا بھوت کے بچے۔ جرا دم لے۔"

یوسف ثانی نے ویگن کی دیوار کوٹنے کا عمل موقوف کیا تو مجھے بڑا سکون محسوس ہوا۔ ایک منٹ کا وہ شور سخت اعصاب شکن ثابت ہوا تھا۔ لڑکیاں تو باقاعدہ دونوں کانوں میں انگلیاں ڈالے بیٹھی تھیں۔ باہر سے کسی نے کنڈی کھسکائی اور پھر دروازے کو تھوڑا سا اٹھایا۔

"آدھی رات کو بلہ مچا کے سارا محلّہ کو جگائے دئے ہو"

کسی نے سخت لہجے میں کہا۔ "ابھی ہم تم کا اندر آئی کے..." اس نے نہایت نامناسب الفاظ میں بتایا کہ اندر آکے وہ کیا کرے گا۔

"حضرت یہ آپ کیسی کرتے ہیں بات۔ یہ صبح صادق ہے یا آدھی رات... ہمارے ساتھ کس نے کی ہے یہ واردات؟ ... ہمارے مہمان ہیں کچھ معزز خواتین وحضرات... باہر سے سب کو بند کرگیا کوئی بدذات..."

اندر جھانکنے والے نے غور سے ہمیں دیکھا اور کچھ حیران ہوا... تاہم اس کے دوسرے ساتھی بھی جو یوسف ثانی کے الارم سے جاگ اٹھے تھے، ناشائستہ گفتگو کررہے تھے اور جواب میں یوسف ثانی انہیں قافیے کے ساتھ مادر پدر آزاد شاعری سے نواز رہا تھا۔

بالآخر وہ لوگ چلے گئے اور دروازہ پھر کھل گیا۔ اس مرتبہ یوسف ثانی نے اس لوہے کے پائپ کی مدد سے ایسا بندوبست کیا کہ دروازہ پھر گرے تو بند نہ ہو۔ باہر ابھی اندھیرا غالب تھا لیکن صبح کا اجالا تیزی سے بڑھتا جارہا تھا۔ ریلوے لائن کے آس پاس کی آبادی میں کہیں کہیں ہلچل نظر آنے لگی تھی۔

ریوالور کو بہت پہلے ہی میں نے جیب میں رکھ لیا تھا۔ اب میں نے محمد خان کی طرف دیکھا تو اس کا چہرہ مجھے رنجیدہ نظر آیا۔

میں نے کہا "خان صاحب! تم یقیناً بہت ناراض ہو۔ اور تمہیں حق حاصل ہے ناراض ہونے کا۔"

محمد خان پھٹ پڑا "قسم اللہ کی! بہت برداشت کیا میں نے اس لئے کہ اب میں وہ نہیں ہوں جو تھا۔ میں خونی خان نہیں رہا۔ تمہارا ماتحت ہوں۔ تم باس ہو۔ میں نے خود اپنے ہاتھ پاؤں باندھ لئے ہیں۔"

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "تم دوست ہو ہمارے۔"

اس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا "نہیں... الو کا پٹھا ہوں میں، قسم اللہ کی... اپنا سب کچھ چھوڑ دیا۔ یار بیلی، گھربار، لوٹ مار کا دھندہ اور... اور اس کا اچھا صلہ دیا تم نے... کہ اعتبار بھی نہیں کیا۔ اتنی جلدی بتادیا کہ تمہاری نظر میں میرا مقام کیا ہے؟"

میں نے کہا "خان! ہم سب شرمندہ ہیں۔ مجھ سے غلطی نہیں گناہ ہوا ہے کہ میں نے تم پر شک کیا۔ تمہیں گالیاں دیں۔"

غالب نے کہا "میں مجرم ہوں تمہارا۔ تم معاف کرسکتے ہو تو کردو۔"

محسن نے کہا "خان بھائی! ایک بار ہمارا قصور بخش دو۔"

خان نے نفی میں سر ہلایا "قسم اللہ کی اپن کون ہوتے ہیں کسی کو معاف کرنے والے۔ اپن تو خود بہت گناہ گار ہیں۔ سوچا تھا کہ سب کے ساتھ رہنے سے عزت ملے گی۔ لیکن ایک ذلیل، بے ضمیر ڈاکو، لالچی کتا۔ اس کو خونی خان ہی رہنا چاہئے۔"

یہ گل تھی جس نے محمد خان کے پتھر ہوجانے والے دل کو موم کیا۔ وہ ایک دم اٹھی اور محمد خان کے سامنے آگئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے "تم واپس جانا چاہتے ہو تو جاؤ میں تو سمجھی تھی کہ تمہیں میرا اتنا ہی خیال ہے جتنا میرے بھائی شیش ناگ کو تھا۔"

"مجھے... مجھے بہت خیال ہے تمہارا" محمد خان نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے گل سے نظریں بچانے کی کوشش کی۔

"ٹھیک ہے۔ پھر میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔ تم پھر خونی خان بن جاؤ۔ میں ناگ منی بن کے اپنے بھائی کا ساتھ دوں گی۔ ہم دونوں مل کے ڈاکے ڈالیں گے۔"

"گل بانو!" محمد خان چلایا "قسم اللہ کی اب ایسا نہیں ہوسکتا۔ ایسی بات پھر مت کرنا میرے سامنے۔ میں نہیں جاؤں گا۔ کبھی واپس نہیں جاؤں گا، خواہ تم سب مل کے مجھے ذلیل کرو۔ مجھے گالیاں دو یا مجھے مارو۔ کتے سے بدتر سلوک کرو میرے ساتھ مگر میں تمہارے ساتھ ہی رہوں گا تاکہ تو گل بانو ہی رہے۔ میں تجھے کبھی ناگ منی نہیں بننے دوں گا۔ جان سے ماردوں گا تجھے اگر پھر ایسی بات کی۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ گل بانو کی وجہ سے ہی محمد خان نے ہماری جان بخش دی تھی اور اس دن سے ہی اس ڈاکو کے دل میں ایک ڈاکو کی بہن کے لئے احترام کے جذبات پیدا ہوگئے تھے مگر اس وقت جو کچھ میں نے دیکھا اور سنا وہ ناقابل یقین تھا۔ محمد خان نے گل کو بالکل بڑے بھائی کی طرح گلے سے لگالیا تھا اور اسے بڑی شفقت اور محبت کے ساتھ دلاسے دے رہا تھا۔ گل رو رہی تھی۔ اور یہ ایسا منظر تھا جس نے ذہنی طور پر مجھے بھی سخت جذباتی کردیا تھا۔ میں، غالب اور محسن ایک ساتھ محمد خان سے چمٹ گئے۔ وہ ہر طرف سے محصور ہوگیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو ہیں اور لبوں پر مسکراہٹ۔

"ارے بھئی چھوڑو مجھے۔"

میں نے کہا "ہم تمہیں اس وقت چھوڑیں گے جب تم کہو گے کہ تم نے ہمیں معاف کردیا۔"

"قسم اللہ کی جب تم نے کچھ کیا ہی نہیں... تو معافی کیسی۔ اور ہم سب یار بیلی ہیں۔ بھائی ہیں۔ آپس میں جھگڑا بھی ہوجاتا ہے ساتھ رہنے میں" وہ ہنسنے لگا۔

غالب بولا "نہیں۔ ایسے نہیں۔"

"تم کہو کہ معاف کیا" محسن نے کہا۔

محمد خان نے بڑی مشکل سے "اچھا معاف کیا" کہہ کے جان چھڑائی تو ایک اور دلچسپ صورت حال پیدا ہوگئی۔ حضرت یوسف ثانی ابھی تک دم بخود کھڑے تھے اور یہ طے کرنے سے قاصر تھے کہ اس صورتِ حال میں جو اُن کی وجہ

سے پیدا ہو گئی تھی انہیں کیا کرنا چاہئے۔ وہ آدمی ڈھیٹ تھا یا لوگوں کی ہر زیادتی کو برداشت کرنے کا غیر معمولی حوصلہ رکھتا تھا کہ اس نے ابھی تک نازو کے جارحانہ رویے کے خلاف کسی قسم کا احتجاج نہیں کیا تھا۔ محمد خان نے غلط فہمی کو بھی عدم اعتماد کا مظاہرہ سمجھا تھا اور اگر اسے گل کا خیال نہ ہوتا تو شاید وہ ہمیں چھوڑ کر اپنی دنیا میں لوٹ جاتا۔ لیکن یوسف ثانی نے نازو کی لات کے جواب میں کوئی بات تک نہ کی تھی۔

خود نازو نے آگے بڑھ کر اسے پکڑ لیا اور اوپر اٹھا لیا۔ وہ ساڑھے چار فٹ کا آدمی خود کو نازو کی گرفت سے چھڑانے کے لئے ہوا میں لاتیں چلا رہا تھا۔ ایک بار پھر اس کی ٹوپی اتر گئی اور پھندنا سر سے پھسل کے فرش پر جا گرا۔ "مجھے معاف کردو یوسف ثانی" نازو نے کہا۔

"ابی یا کرتی ہیں خاتون ... ناحق ہو جائے گا اس غریب کا خون... خدارا لیجئے ہوش کے ناخن..." اس نے اپنی منحنی آواز میں بلبلاتے ہوئے کہا "کیا آپ پر سوار ہے جنون؟"

نازو نے کہا "ایسے نہیں چھوڑوں گی، کہو کہ تم نے معاف کیا۔"

یوسف ثانی کا خفت اور گھبراہٹ سے برا حال تھا۔ ایک لڑکی نے اسے یوں اٹھا رکھا تھا جیسے وہ چھوٹا سا بچہ ہو "آہ... اف ... اے ستم پسند دراز دست حسینہ... اب تو آنے لگا ہے موت کا پسینہ ... آغوش محبوب میں جان سے گزر جائے یہ کمینہ... دریائے حسن میں غرق ہو اپنا سفینہ... اسی مقصد کے لئے تھا اپنا جینا... مگر..."

نازو نے گھبرا کے اسے چھوڑ دیا۔ اس کا رنگ لال پڑ گیا تھا۔
"بڑے ڈھیٹ ہو جی تم تو..."

میں نے قہقہہ مار کے غالب سے کہا "لے بھئی تیرا تو ایک رقیب پیدا ہو گیا۔ کیا حسن پرست نگاہ پائی ہے شہزادہ گلفام نے۔"

محسن نے کہا "اور کیا جاں نثار پرستار ملا ہے نازو کو۔ یہیں مرجانے پر تیار تھا۔ واہ! آغوش محبوب میں جان سے گزر جائے یہ کمینہ۔ اسی مقصد کے لئے تھا اپنا جینا۔ کیا جذبات ہیں۔"

غالب نے آہ بھر کے نازو کی طرف دیکھا "اچھا بھئی، تمہیں ہم سے بھی زیادہ چاہنے والا مل گیا۔ تو استعفا مرا باحسرت ویاس۔"

نازو کا رنگ اور گلابی ہونے لگا۔ اب کی اس حالت پر رابعہ اور گل بھی ہنس رہی تھیں اور محمد خان مسکرا رہا تھا۔ صرف یوسف ثانی تھا جس کو احساس نہیں تھا کہ کون کس سے کیا کہہ رہا ہے اور کیوں کہہ رہا ہے۔ وہ اپنے پھندنے اور ٹوپی کو جھاڑ رہا تھا اور زیرِ لب ٹوپی سے نہ جانے کیا کہہ رہا تھا۔

غالب نے کہا "یار یوسف ثانی، تمہاری خاطر ہم تو اپنے عشق سے دستبردار ہو سکتے ہیں [illegible] اب [illegible] وقت [illegible] انتخاب تینوں کو اچھی طرح دیکھ کر کرو، کہیں بعد میں دل کسی اور پر آجائے۔"

میں نے کہا "ویسے تمہیں تینوں پسند ہوں تب بھی کوئی بات نہیں۔ ہم سب دوستی میں قربانی دے سکتے ہیں۔ تم تینوں کے عشق کا چارج لے سکتے ہو۔"

محسن نے کہا "اور شرع کی رو سے تمہارے لئے مزید ایک کی گنجائش باقی رہے گی۔ فی الحال یہ تین مبارک...."

یوسف ثانی نے پھندنے کو پھر ٹوپی کے نیچے یوں رکھ لیا جیسے محمد شاہ رنگیلا نے نادر شاہ کی دستبرد سے بچانے کے لئے کوہ نور ہیرے کو اپنی پگڑی میں چھپا لیا تھا۔ پھر اس نے کورنش بجالا کے اپنے لال پیلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا "اب ناچیز کیسے کرے انتخاب، جہاں ایک سے ایک ہو لاجواب، ہر ذرہ ہو آفتاب، سب پہ آتا ہے یہ دل خانہ خراب، عشق میں کیا شریعت کا حساب... اور کیسا حجاب..."

یوسف ثانی کی بات پر سب کو اتنی ہنسی آئی کہ کچھ دیر پہلے کی ساری کشیدگی اور کلفت دور ہو گئی۔ ہم پرسکون ہو کے بیٹھے تو خواتین نے یوسف ثانی کے ساتھ کچن کا رخ کیا اور ذرا سی دیر میں گرم چائے آگئی۔ ہم سب تازہ دم ہو گئے۔ میں نے بھی جوتے اتار کے پاؤں پھیلائے اور وہ سگریٹ لے لی جو محسن نے مجھے جلا کر دی تھی۔ ایک بار پھر ہمیں تحفظ کی آسودگی کا احساس ملا۔ ریلوے کی ایک بوگی پر مشتمل اس گھر کی فضا میں اجنبیت نہیں تھی اور کسی آسیب کا خوف نہیں تھا۔ گزری ہوئی رات کے واقعات کا تصور اب کسی دہشت ناک خواب کی طرح لگتا تھا۔ اس رات کے ختم ہونے تک ہم اپنی زندگی کے ایسے تجربات سے گزرے تھے جو ناقابل یقین بھی تھے اور حقیقی بھی۔ میں نے غالب اور محسن کو بتایا تھا کہ کس طرح ہماری ملاقات پہلے رائے بہادر بدری پرشاد سے اور ان کی بیوی کی بھٹکتی روح سے ہوئی تھی اور پھر ان کی بیٹی کے ایک چاہنے والے کی روح سے۔ ہم سب میں سے کوئی بھی جن بھوت اور ارواح کے مادی وجود کا قائل نہ تھا اور کسی کو زندگی میں ایسا کوئی تجربہ نہیں ہوا تھا کہ وہ میری بات کو سمجھ کے تسلیم کرلیتا مگر وہ مجھے اور رابعہ کو جھوٹا بھی نہیں کہہ سکتے تھے۔ اسے میرا واہمہ اور رابعہ کے تصور کا کرشمہ بھی قرار نہیں دے سکتے تھے کیونکہ جو کچھ بھی ہم نے دیکھا اور سنا تھا، اس کی تصدیق حالات اور واقعات سے ہوتی تھی۔ محمد خان نے بہت سی ایسی باتیں بتائیں جو اس نے دوسروں سے سنی تھیں، اس آسیب زدہ حویلی سے منسوب تھیں لیکن ہمیں خود بدری پرشاد نے بتائی [illegible]۔

سب سے زیادہ سنسنی ایک پرانی ٹافی اور آدھی بجی ہوئی سگریٹ نے پھیلائی۔ یہ مادی شہادت تھی جسے وہم کا کرشمہ یا تصور کی پیداوار نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ باری باری سب نے سگریٹ کا اور ٹافی کا معائنہ کیا۔ خواتین دم بخود بیٹھی رہیں۔ محسن نے کہا "بھائی اپنی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی!

"عقل کی کوئی بات پہلے کب سمجھی ہے تم نے" غالب نے کہا۔

"تم کوئی عقل کی بات کرکے دیکھو پہلے" محسن نے فورا جواب دیا "آج تک تو کی نہیں کہ میں سمجھنے کی کوشش کرتا۔"

"تمہاری ناقص عقل اس حقیقت کو تسلیم کیوں نہیں کرتی کہ اس حویلی میں بھوت تھے" غالب نے کہا "خواتین مل چکی ہیں ان سے۔"

"میں نے آج تک کوئی بھوت نہیں دیکھا۔"

"تم نے تو بہت کچھ نہیں دیکھا مثلاً ایٹم بم۔ مگر ایٹم بم ہوتا ہے۔" غالب نے میز پر مکا مار کے دلیل دی۔

"میں نے ایٹم بم کی تصویر دیکھی ہے" محسن نے میز پر مکا مار کے کہا۔ "تم مجھے بھوت کی تصویر دکھا دو، میں مان لوں گا۔"

"میں تمہیں آئینہ دکھا سکتا ہوں۔ تمہاری تصویر اس وقت نہیں ہے میرے پاس۔"

میں نے کہا "حضرات، ہمارا مسئلہ بھوت نہیں ہیں۔ جس کا دل چاہے اعتبار کرے، جو تجربہ کرنا چاہے وہ آج رات پھر اس حویلی میں جاکر دیکھ لے۔"

"میں ایسے کسی بھوت سے نہیں ڈرتا" محسن نے غالب کو گھورتے ہوئے اعلان کیا "جو سگریٹ اور ٹافیاں پیش کرتا ہو۔"

"سگریٹ اور ٹافی ٹھوس شہادت ہیں" غالب نے کہا۔

"مگر یہ کیسے ثابت ہوگا کہ یہ کسی بھوت کا تحفہ ہے؟"

"تو کیا سکندر اور رابعہ دوسری جنگ عظیم میں شرکت کرنے گئے تھے؟ یہ چیزیں ان کے پاس کہاں سے آئیں؟"

"یہ ان کو حویلی میں کہیں پڑی ہوئی ملی ہوں گی" محسن بولا۔

"بھوت ہم نے بھی دیکھا تھا" نازو نے کہا "کیوں گل؟"

"ہاں" گل نے کہا۔

"چلو تم دونوں بھوت کا حلیہ بتاؤ۔ الگ الگ۔"

"لاحول ولا قوۃ" میں نے بیزار ہو کر کہا "آخر کب تک یہ بحث چلے گی بھوتوں پر؟ بھاڑ میں گئے بھوت۔"

"میں بھوتوں کی توہین برداشت نہیں کر سکتا" غالب نے کن انکھیوں سے نازو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "کیونکہ میرے خسر محترم خود ایک بھوت ہیں۔"

اب اندیشۂ نقضِ امن پیدا ہو گیا تھا، چنانچہ میں نے فوراً خواتین کو حکم دیا کہ وہ ناشتا بنائیں۔ محمد خان بستر پر لیٹا تھا اور اب سو چکا تھا۔

نازو نے اٹھتے ہوئے کہا "پہلے میں غالب کا آملیٹ بناؤں گی۔"

غالب نے دفاعی پوزیشن لے لی "صحیح جملہ یہ ہوگا عزیزہ کہ میں اپنے ہاتھوں سے اپنے غالب کے لئے مرغی کے دو انڈوں کا آملیٹ بناؤں گی اور بقلم خود اسے کھلاؤں گی۔"

"یہ حضرت یوسف ثانی کہاں ہیں؟" محسن نے اچانک کہا۔

میں نے کہا "ہاں... میزبان کہاں گیا؟"

غالب نے کہا "طاقت مہماں نداشت... خانہ بہ مہماں گذاشت۔ مطلب یہ ہوا کہ مہمانوں کا بوجھ اٹھا نہیں سکتا تھا، گھر چھوڑ کر چلا گیا۔"

رابعہ نے کہا "وہ ناشتا لینے گیا ہے۔"

"اچھا تم لوگ اتنی دیر میں نہا دھو کے کپڑے وغیرہ بدل لو تاکہ ہماری باری آئے" محسن نے کہا۔

ریلوے ویگن کا دروازہ تھوڑا سا اوپر اٹھا ہوا تھا جس میں سے دن کا اجالا صاف نظر آرہا تھا۔ صبح کی سنہری دھوپ اب روپہلی ہو چکی تھی۔ ارد گرد رہنے والوں کو اطلاع مل گئی تھی کہ شہزادہ گلفام کے گھر مہمان آئے ہیں۔ کئی بار میں نے متجسس عورتوں اور بچوں کو بوگی کے اندر جھانکتا پایا۔ وہ چوری چھپے قریب آکر سر کو تھوڑا سا اٹھا کے اندر کے نیم تاریک ماحول میں اجنبی چہروں کا جائزہ لینے کی کوشش کرتے تھے اور جیسے ہی یہ احساس ہوتا کہ ہم میں سے کسی نے انہیں دیکھ لیا ہے وہ غائب ہو جاتے تھے۔ یوسف ثانی اپنے اس "محلے" میں شہزادہ گلفام کے نام سے مشہور تھا، یہ نام میں نے کئی بار سنا۔

آدھے کھلے ہوئے دروازے سے خاصی روشنی اندر آرہی تھی۔ اگر اسے پورا کھول دیا جاتا تو وہ فولادی دیواروں والا کمرا زیادہ روشن ہو جاتا مگر ہماری پرائیویسی کا احساس باقی نہ رہتا۔ دروازے کو پورا کھولنے میں یہ اندیشہ بھی تھا کہ کہیں وہ پھر نہ گر پڑے چنانچہ میں نے اور محسن نے اس کے خود کار نظام کو نہ چھیڑنے کا فیصلہ کیا۔ حالانکہ خواتین کی طرف سے مطالبہ بھی کیا گیا تھا کہ کچن اور باتھ روم میں اندھیرا ہے۔ نازو اور رابعہ کچن میں گھسی ہوئی چائے بنانے کے کام میں مصروف عمل تھیں مگر اس سے زیادہ وہ بھوتوں پر یقین کامل کا اظہار کر رہی تھیں اور ان کا موضوع سخن کبھی بھوت ہو جاتے تھے اور کبھی چوہے۔ رابعہ کا خیال تھا کہ وہ بھی بھوت تھے۔ نازو نے اس خیال کی تائید کی کہ بھوت کسی بھی شکل میں آسکتے ہیں۔

گل ابھی باتھ روم میں ہی تھی کہ کسی نے باہر سے ہانک لگائی۔ پھر دروازہ بجایا۔ اس سے دروازے کو روکنے والا لوہے کا پائپ نکل گیا۔ دروازہ پھر گرا اور اندر اندھیرا ہو گیا۔

میں نے دروازے کو اٹھا کے پھر پائپ کا سہارا فراہم کیا اور اس شخص کو دیکھا جو ننگ دھڑنگ اپنے کالے سیاہ پسینے سے چمکتے جسم کو دوہرا کئے کمر پر پانی سے بھری ہوئی مشک لئے کھڑا ہوا تھا۔ وہ نصف دھوتی جو کمر سے گھٹنوں تک پہنچتی تھی، پانی میں بھیگ چکی تھی۔ اس نے سلام کے انداز میں ہاتھ اٹھا کے کہا۔ "وڑکم" چنانچہ میں نے جواب میں وڑکم کہنے میں کوئی حرج نہ سمجھا۔ یہ سلام تھا، جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا۔ اس کی باقی باتیں میرے سر پر سے گزر گئیں مگر میں نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔ اس نے مشک پہلے اوپر رکھی۔ پھر خود اوپر آیا اور مشک اٹھا کے باتھ روم کی طرف مڑا۔ گل باہر آچکی تھی اور بہت

نکھری ہوئی لگتی تھی۔ ماشکی نے مشک کو تارکول کے ایک ڈرم میں خالی کیا جو باتھ روم کے کونے میں رکھا ہوا تھا اور بڑبڑ کچھ کہہ گیا۔

"کیا یہ پیسے مانگ رہا تھا؟" محسن سر کھجا کے بولا۔

"نہیں' کچھ اور بات تھی" میں نے کہا۔

ماشکی نے پلٹ کے کہا "ہم بولا' پانی اور لائے گا' ایک دم فری" اور چلا گیا۔ ہم دونوں شرمندہ ہوئے۔ ماشکی نے ... کم الفاظ میں بھی اپنی مہمان نوازی کے جذبات کا اظہار ... تھا۔

پانی یہاں مفت میں ملنے والی چیز نہیں تھی۔ دور دور کے نلکوں سے صرف ماشکی ہی واٹر سپلائی کا ذریعہ تھے لیکن ان کی خدمات صرف وہی حاصل کرتے تھے جو استطاعت رکھتے تھے۔ بیشتر لوگ اپنے بچوں کو یا عورتوں کو صبح شام پانی حاصل کرنے کے لئے نلکوں پر قطاروں میں کھڑا رکھنے پر مجبور تھے۔ اس منّے نے ہمیں بتادیا کہ ہمیں پانی کی کمی نہیں ہوگی۔ مہمانوں کے لئے یہ سروس وہ مفت فراہم کرے گا۔

غسل کرتے ہوئے میں نے باتھ روم کی بناوٹ پر غور کیا۔ یوسف ثانی نے جو گوشہ نہانے کے لئے مختص کیا تھا اس کے فرش میں ایک سوراخ تھا جس کو دیگر مقاصد کے لئے بھی استعمال کیا جاسکتا تھا اور میں نے کیا۔ غالباً غسل کے دوران استعمال ہونے والا پانی نیچے غلاظت کو جمع نہیں ہونے دیتا تھا اور بہا کے کہیں لے جاتا تھا۔ اگرچہ اس میں شاور یا نلکے نہیں تھے مگر یہ ہر لحاظ سے ایک مکمل اور صاف ستھرا باتھ روم تھا۔ اسے اٹیچ باتھ بھی قرار دیا جاسکتا تھا۔ پانی وافر تھا چنانچہ نہا کے مجھے بڑی فرحت محسوس ہوئی۔

میں باہر نکلا تو ایک بچی کو بڑی پھرتی کے ساتھ عمومی صفائی میں مصروف پایا لیکن وہ بچی نہیں تھی' چار فٹ کی دبلی پتلی عورت تھی جس نے ہندو اسٹائل میں سفید سوتی ساری باندھ رکھی تھی اور بندیا بھی لگا رکھی تھی۔ اس کا رنگ سانولا تھا لیکن بال حیرت انگیز طور پر لمبے تھے۔ اس کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں مگر اس نے کاجل اور سرمے کی لکیر سے انہیں قابل قبول بنا دیا تھا۔

رابعہ نے مجھے مسکراتے ہوئے بتایا "یہ ہے ... کہا"

... بولے کہا۔ ... وہ ... کہا" ...

"... ہمار نام بابو" عورت نے پلٹ کے کہا "... جانے"

مجھے بے اختیار ہنسی آئی "زلیخا' یوسف زلیخا' ارے واہ"

زلیخا کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس کے نام میں ایسی کیا بات ہے جس پر ہم سب یوں دانت نکال کے کھی کھی کررہے ہیں۔

اس نے جھاڑو لہرا کے متانت سے کہا "کا بات ہے جی؟ کا ہم تم کا اُلو لگت ہیں؟ سینگ نجر آوت ہیں ہمارے سر پر؟"

رابعہ نے کہا "تم یوسف کی کیا لگتی ہو؟"

"ہم کوئی یوسف کا ناہی جانت ہیں" اس نے غصیلے لہجے میں کہا۔

نازو نے کہا "شہزادہ گلفام سے کیا تعلق ہے تمہارا؟"

اس نے ایک آہ بھر کے کہا "ہم پیار کرت ہیں اس سے"

اس دو ٹوک اظہارِ محبت اور اعترافِ عشق نے ہم سب کو چونکا دیا۔ اس کے بعد مذاق کی کوئی بات نہ رہی۔ ہم سب اس کی صورت کو دیکھتے رہے جس پر حسرت وملال کا سایہ سا پھیل گیا تھا۔

"تم .... پیار کرتی ہو اس سے؟" رابعہ نے بالآخر کہا۔

"ہاں ... کا تم کسی سنگ پریم ناہی کرت ہو؟" زلیخا نے ہماری صورتوں کو دیکھ کر کہا۔ ہمارے لئے یقیناً یہ ایک حیرت انگیز اور ناقابلِ یقین سی بات تھی کہ کوئی اس کارٹون سے بھی محبت کرسکتا ہے جس کا نام بھی اس کے ساتھ تقدیر کا ایک مذاق لگتا تھا۔ وہ بدصورت تھا اور بد اطوار تھا۔ ایک تماشا تھا اور عجوبہ تھا لیکن وہ انسان تھا۔ اگر کوئی عورت اس کے لئے دل میں چاہت کے جذبات رکھتی تھی اور اس عشق کی تہمت کو سرعام تسلیم کرتی تھی تو یہ کوئی انہونی بات نہ تھی۔ لوگ کہتے ہیں کہ لیلیٰ کو مجنوں کی نظر سے دیکھو... کیا مجنوں کو لیلیٰ کی نظر سے نہیں دیکھنا چاہئے؟

نازو نے کہا "معاف کرنا زلیخا... ہم کو ہنسی تمہارے پیار پر نہیں آئی تھی۔"

"ہم کا پتا ہے..." وہ اداس ہو کے بولی "تم اس بے چارے کا شکل پر ہنست ہو۔ جمانہ کا جانے' او کتنا کھب صورت ہے!"

رابعہ نے کہا "تمہاری باتوں سے ایسا لگتا ہے کہ... گلفام تمہارے پیار کی قدر نہیں کرتا۔"

نازو نے کہا "ہاں' ورنہ وہ تم سے شادی کرلیتا۔ تم سے اچھی بیوی اسے کہاں مل سکتی ہے۔"

زلیخا کی صورت پر اطمینان اور مسرت کے آثار نظر آنے لگے "آپ ٹھیک بولت ہو جی۔ ہم ہی مورکھ اس کا پیار کرت ہیں۔ او تو پتھر ہے' پتھر۔ روج کہت ہے' بولے کہا' بیاہ تیرے سنگ ہی کروں گا پر ابھی نہیں۔ ایک گھر بناؤں پہلے... اتا بڑا... مورکھ ہماری ایک ناہی مانت ہے۔ پریم بنگلا کو تھی میں ہووت ہے کا؟ ہم جھونپڑیا میں بھی کھس ہیں۔ تیرے کنے تو یہ گھر ہے۔ پر او کہت ہے کہ اے ریل کا ڈبا سرکار کا ہے۔ جس روج کھیال آئی گوا سرکار کا' ہم کا باہر نکال' ہمار سامان پھینک جاویں گے۔ ہم بولے کہ دس سال ہوئی گوا' آج تک کوئی ناہی آیا۔"

میں نے حیرانی سے کہا "اسے دس سال ہوگئے یہاں رہتے ہوئے!"

زلیخا نے اقرار میں سر ہلایا "جیادا..."

رابعہ نے کہا "تم دس سال سے انتظار کررہی ہو؟"

زلیخا کے جواب دینے سے پہلے ہی یوسف ثانی نمودار ہوا۔ اسے دیکھتے ہی زلیخا کا رنگ اڑ گیا۔ وہ ایک دم سر جھکا کے کام میں لگ گئی۔ جیسے ہم سے اس نے کوئی بات ہی نہیں کی۔

یوسف ثانی نے صرف ایک بار اسے گھور کے دیکھا تھا اور اس پاگل عورت کی سٹی گم ہوگئی تھی جو یوسف ثانی کے آنے سے پہلے چٹاخ پٹاخ بول رہی تھی۔ وہ یوسف ثانی سے ڈرتی تھی۔ جیسے وہ آج بھی اس کا شوہر ہے جو گزشتہ دس سال سے اس کے لئے ایک آرزو کا خواب تھا۔ اور وہ اس امید پر یقین کے ساتھ جی رہی تھی کہ ایک نہ ایک دن اسے اپنے خواب کی تعبیر بھی ملے گی۔ محمد خان نے مجھے بتایا تھا کہ یوسف ثانی بہت لالچی ہے۔ اب اس کے لالچ کی وجہ میرے سامنے آگئی تھی۔ شاید وہ اسی گھر کے لئے پیسہ جمع کررہا تھا جس میں وہ اپنی زلیخا کو شادی کے بعد لے جانا چاہتا تھا۔ بمبئی میں گھر بنانا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ ایک جھونپڑی سے ایک کھولی' ایک کمرے کے فلیٹ اور مکان تک لاکھوں کی مسافت ہے۔ یوسف ثانی بڑی مستقل مزاجی سے یہ مسافت طے کررہا تھا۔ اس عشق کے کتنے رنگ ہیں اور کیسے انوکھے روپ ہیں۔

یوسف ثانی نے ہانپتے ہوئے دو بھاری لفافے رابعہ کے سپرد کئے "بندہ لینے گیا تھا گرم گرم پوریاں' لیکن حلوائی جو ہے مشہوریاں' غریب خانے سے ہیں اس کی دوریاں... اور پھر قطاروں کی مجبوریاں..."

میں نے کہا "تم نے خواہ مخواہ تکلیف کی۔ اتنی دور گئے۔ ظاہر ہے' صبح بہت رش ہوتا ہوگا۔"

"بندہ پرور' آپ بھی اٹھ جایئے" وہ محمد خان کے قریب جا کے بولا "غسل کیجئے' ناشتا فرمایئے۔"

غالب نے کہا "یار یہ خدا نے بھی کیا جوڑی ملادی ہے۔ ایک کی زبان دوسرا کیسے سمجھتا ہوگا؟ زلیخا اردو سے ناواقف... یوسف مجسم اردو شاعری! زبان یار من ترکی..."

میں نے کہا "دل کی بات کہنے کیلئے اور سمجھنے کے لئے کسی زبان کی ضرورت نہیں پڑتی۔"

"وہ تو ہے۔ مگر کیسے گزرے گی ان کی زندگی؟ یہ ایسے ہی ہروقت قافیہ پیمائی کرتا رہے گا۔ زلیخا تو پاگل ہوجائے گی۔"

میں نے کہا "بھائی! وہ آج بھی پاگل ہے اس کے پیچھے۔ اور یہی پاگل پن ان کے کام آئے گا۔ ان کی زندگی ویسی ہی گزرے گی' جیسی ہماری۔ ہم کیا پاگل نہیں ہیں؟"

صبح کے ساڑھے نو بج چکے تھے اور نہانے کے بعد میری بھوک شدت سے بیدار ہوگئی تھی۔ پوریوں کی خوشبو نے مزید حالت خراب کی۔ محمد خان بھی اپنی باری کے انتظار میں تھا۔ کیونکہ غالب اندر گھسا ہوا تھا۔ میں نے اور محسن نے ادب آداب کو بالائے طاق رکھا اور ناشتے پر ٹوٹ پڑے۔ رابعہ اور گل نے مجبوراً ہمارا ساتھ دیا۔ نازو اس وقت شریک ہوئی جب غالب باتھ روم سے نکل کر تیر کی طرح آیا اور ہمارے ساتھ شامل ہوگیا۔ یہ دیکھے بغیر کہ نازو اس کے انتظار میں تھی۔ تاہم اسے فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوگیا اور وہ نازو کو روٹھنے سے پہلے منالایا۔ یوسف ثانی اور زلیخا ہمارے اصرار کے باوجود دست بستہ کھڑے رہے اور میزبانی کے آداب نبھاتے رہے۔ انہوں نے محمد خان کے ساتھ ناشتا کیا۔

ناشتے سے فراغت پانے کے بعد میں نے محمد خان سے کہا۔ "آج کے دن تمہیں بہت سے کام کرنے ہیں جو ہم نہیں کرسکتے۔ میرا مطلب ہے' آسانی سے نہیں کرسکتے۔"

محمد خان نے مونچھوں پر تاؤ دے کر کہا "قسم اللہ کی' تم حکم کرو' کیا چاہئے؟"

میں نے کہا "ہمیں ایک عام قسم کی گاڑی چاہئے جو کہیں بھی کھڑی ہو تو نمایاں نہ ہو۔"

"یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ کوئی بھی سفید رنگ کی پرانی کار لے لو' سال دو سال چلی ہوئی۔"

"بس گاڑی بھروسے کے قابل ہو جو وقت پر دھوکا نہ دے۔" میں نے کہا "اس کا رنگ کالا ہونا چاہئے۔"

"کس کے نام پر ہو؟"

"کسی کے نام پر نہیں' اوپن لیٹر پر" میں نے کہا۔

"اور کیا چاہئے؟"

"اس کار کی ایک اصلی نمبر پلیٹ ہوگی... دو تین ایسے نمبر مل جائیں جن کا وجود ہی نہ ہو۔ ضرورت پڑنے پر نمبر پلیٹ بدلی جاسکے۔"

محمد خان نے کہا "میں سمجھا نہیں۔"

میں نے کہا "بہت سی گاڑیاں حادثات میں تباہ ہوجاتی ہیں لیکن ان کے نمبر منسوخ نہیں ہوتے۔ کچھ دوسرے صوبوں میں چلی جاتی ہیں جہاں انہیں نئے رجسٹریشن نمبر مل جاتے ہیں۔ ایسے ہی چند نمبروں کی پلیٹ بنوالو۔ اسکریپ میں گاڑیاں خریدنے والے کباڑی تمہاری مدد کرسکتے ہیں۔ دو نمبر بمبئی کے ہوں' ایک دہلی کا یا مدراس کا۔ کسی بھی جگہ کا۔"

محمد خان نے سر ہلایا "آگے بولو۔"

میں نے کہا۔ "اس گاڑی کی ڈکی میں ایک اسپرے مشین ہو اور وہ پیلا رنگ جو ٹیکسی کا رنگ ہے' جب ضرورت محسوس ہو ہم اس کی چھت اور اوپر کا حصہ پیلا کردیں اور وہ ٹیکسی نظر آنے لگے۔"

"مگر ٹیکسی کے نمبر دوسرے ہوتے ہیں۔ کمرشل۔"

میں نے کہا "جو نمبر پلیٹیں تم لاؤ گے' ان میں ایک کمرشل بھی شامل کرلو اور زرد رنگ کے علاوہ کالا رنگ بھی چاہئے۔ تاکہ دوسری بار ٹیکسی کو پھر کالا کیا جاسکے۔ اور پرائیویٹ گاڑی میں تبدیل کیا جاسکے۔"

محمد خان نے تعریفی انداز میں سر ہلایا "اچھا آئیڈیا ہے۔"

میں نے کہا "یہ تو تھی ایک گاڑی کی بات۔"

محمد خان نے کہا "تو کیا دو گاڑیاں چاہئیں؟"

اب غالب اور محسن بھی ہمارے ساتھ شریک گفتگو ہوگئے تھے۔

"میرا خیال ہے کہ تین گاڑیوں کی ضرورت ہوگی" ...

بولا۔

میں نے اس کی تائید کی "ہاں، دوسری گاڑی کوئی ٹیکسی ہو، اس میں بھی اسپرے مشین ہو۔"

محسن نے کہا "بالکل چھوٹی سی... جو کار کی بیٹری سے چل جاتیں ہیں اور آسانی سے ہاتھ میں اٹھائے استعمال کی جاسکتی ہیں۔"

غالب نے کہا "معلوم نہیں، یہاں ملے گی کہ نہیں!"

"قسم اللہ کی، یہ بمبئی ہے۔ یہاں سب کچھ مل جاتا ہے جو یورپ اور امریکا میں یا دنیا میں کہیں بھی ملتا ہو" محمد خان بولا۔ "بس پیسہ چاہئے۔"

میں نے کہا "پیسہ بہت ہے۔ اور اسی کام کے لئے ہے۔ ایک پورا سوٹ کیس بھرا ہوا ہم اسی لئے ساتھ اٹھائے پھر رہے تھے۔"

محمد خان نے کہا "تیسری گاڑی کیسی ہو؟"

"ایک ٹرک لے لو۔ جیسے کہ عام ماڈل ہیں۔ مال یہاں سے وہاں لے جانے والے۔ ٹرک سب ایک جیسے ہوتے ہیں سامنے سے۔ بس بونٹ اور مڈگارڈ کا رنگ مختلف ہوتا ہے اور یہ رنگ برش سے ہی بدلا جاسکتا ہے۔"

محسن نے کہا "ٹرک ہمیشہ کمپنی کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ جو عموماً دونوں سائیڈوں پر لکھا ہوا نظر آتا ہے۔"

میں نے کہا "یہ تو نے ٹھیک کہا۔"

محسن بولا "اس کو مٹانا بھی آسان نہیں ہوتا اور لکھنا بھی۔ یہ کام پینٹر کرتے ہیں۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے، جب ضرورت پڑے گی تو ہم راستے میں کسی پینٹر کی خدمات بھی حاصل کرلیں گے۔ ابھی تم کوئی بھی اچھا سا ٹرک لے آؤ۔ اصل بات یہ ہے خان صاحب کے ہمارے سامنے ایک طویل سفر ہے۔ ہمیں دشمن کے پیچھے جانا ہے۔"

محمد خان نے حیران ہو کے کہا "کہاں جانا ہے؟"

میں نے کہا "یہ وقت آنے پر سب کو معلوم ہوجائے گا۔ تاہم سفر ایسا ہے کہ اس میں بہت سے خطرات کا سامنا ہوگا۔ سب سے بڑا خطرہ یہ ہوگا کہ کہیں دشمن ہمیں پہچان نہ لے۔ اس کو پتا نہیں چلنا چاہئے کہ ہم تعاقب میں ہیں۔ اور یہ تب ہی ممکن ہے جب ہم اپنا حلیہ بھی باربار بدلتے رہیں اور اپنی گاڑی کا بھی۔"

"قسم اللہ کی، میں سمجھ گیا" محمد خان بولا "اب یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔"

"اس سفر میں ہم سب الگ بھی ہوں گے اور ساتھ بھی رہیں گے۔ کبھی ہم آپس میں گاڑیاں بدلیں گے۔ کار والے ٹرک میں چلے جائیں گے اور ٹرک ڈرائیور، کلینر آجائیں گے کار میں۔ دوسرا طریقہ بھیس بدلنے کا ہے۔"

"اس کے لئے یوسف ثانی ہے۔" محمد خان نے کہا۔

میں نے کہا "نہیں، ہم یہ رسک نہیں لے سکتے۔ وہ اپنی مضحکہ خیزی کے باعث ہر جگہ فوراً پہچان لیا جائے گا۔"

"تم نہیں جانتے، وہ کتنے کام کا آدمی ہے۔"

میں نے کہا "ہمارے باقی کام ذرا مختلف ہیں۔ نوعیت کے اعتبار سے ان کے لئے وہ قطعی ناموزوں ہے۔ اس کے علاوہ ہم پورا جلوس لے کر نہیں چل سکتے اپنے ساتھ۔ یوسف کے ساتھ زلیخا بھی جائے گی، ورنہ وہ یوسف کو نہیں جانے دے گی۔"

"یوسف اسے بتائے بغیر جاسکتا ہے" محسن نے کہا۔

میں نے کہا "مشکل ہے، تم آزمالو۔"

"اگر زلیخا بھی ساتھ جائے تو کیا حرج ہے؟"

میں نے جھنجلا کے کہا "یار ہم اپنی حفاظت کریں گے یا ان کی؟ ہم سب مرنا بھی جانتے ہیں اور مارنا بھی۔ وہ شاعری اور قافیہ آرائی کے سوا کچھ نہیں جانتا۔ صرف زبان چلا سکتا ہے، بازو نہیں۔ ہم سختی برداشت کرسکتے ہیں، تشدد جھیل جاتے ہیں۔ یونوں کی اس جوڑی سے کیا توقع کی جاسکتی ہے۔"

اچانک میں نے محسوس کیا کہ محسن کی صورت کا تاثر بہت عجیب ہوگیا ہے۔ پلٹ کر دیکھا تو مجھے یوسف کا بجھا ہوا مایوس اور دکھی چہرہ نظر آیا۔ بات کرتے وقت میں یہ بھول گیا تھا کہ وہ بھی سن رہا ہوگا۔ زلیخا اس کے ساتھ کھڑی ہوئی تھی۔ میری زبان سے نکلنے والے الفاظ یقیناً دل آزار تھے مگر اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ میں نے کوئی غلط بات نہیں کہی تھی اور اب اس پر جھوٹی معذرت کا پردہ ڈالنے سے کچھ حاصل نہ ہوتا۔ چنانچہ میں نے دل کڑا کے ان کی طرف سے نظر پھیر لی۔

"یہ سارے کام آج کرسکتے ہو تم محمد خان؟" میں نے کہا۔

محمد خان نے اقرار میں سر ہلایا "شام تک ہو جائیں گے۔"

میں نے کہا "ان کے لئے دو لاکھ کافی ہوں گے؟"

"بہت کافی ہوں گے" محمد خان نے کہا۔

میں نے رابعہ کی طرف دیکھا جو گل اور نازو کے ساتھ ہمارے قریب بیٹھی خاموشی سے ساری باتیں سن رہی تھی۔

"خان صاحب کو دو لاکھ نقد دے دو۔ سرکاری بینک سے" رابعہ نے کہا "خان صاحب خود لے سکتے ہیں، وہ سامنے رکھا ہوا ہے بینک۔"

"خان صاحب یہ کام تم خود کیسے کروگے؟"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ شہر میں کیسے پھروگے؟ پولیس کے علاوہ بھی تمہیں پہچاننے والے بہت ہیں" میں نے کہا "ہمارے ساتھ رہنے کا نقصان یہ بھی ہوا ہے کہ جو ہمارے دشمن تھے وہ تمہارے بھی دشمن بن گئے ہیں۔"

محسن نے کہا "ہاں، میرا خیال ہے کہ اب تمہیں تریوپنی سے ڈرنا چاہئے۔"

محمد خان تلخی سے مسکرایا "قسم اللہ کی! ابھی وہ وقت نہیں آیا۔"

میں نے کہا "خوش فہمی کے جال سے نکل آؤ خان صاحب۔ کل تریوپنی تم سے اس لئے ڈرتا تھا کہ تم خونی خان تھے۔"

"اسے کیا معلوم کہ اب میں وہ پہلے والا محمد خان نہیں رہا اور اب میں تمہارے ساتھ ہوں؟"

"اسے یقیناً معلوم ہوگیا ہے، چنانچہ اس نے بھی دلاور سے اتحاد کرلیا ہے اور دلاور کی شہ پر ہی وہ شیر ہوگیا ہے۔ دلاور نے ہی اسے کہا ہوگا کہ ایسے کب تک ڈرتے رہو گے اور ایک ڈاکو کے ہاتھوں بلیک میل ہوتے رہو گے۔ چلو ہم دونوں مل کے اپنے اپنے دشمنوں کو ٹھکانے لگادیتے ہیں۔ تم بتاؤ وہ کہاں ملے گا اور باقی کام مجھ پر چھوڑ دو۔"

محمد خان نے حیرانی سے کہا "یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟"

میں نے کہا "گزشتہ رات تمہارے ٹھکانے پر حملہ کرنے والے آخر کون تھے اور وہاں کیسے آپہنچے تھے؟ ان کی رہنمائی کرنے والا تریوپنی کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ جیسے تم ہر جگہ، ہر وقت اس پر نظر رکھتے تھے، ایسے ہی وہ تمہاری نگرانی کرتا ہوگا، تمہاری نقل و حرکت پر نظر رکھتا ہوگا۔"

"یہ ناممکن ہے۔"

"تو پھر یہ مان لو خان صاحب کہ تمہارے اپنے وفاداروں میں کوئی تریوپنی کا مخبر بھی تھا۔"

"میں اپنے ہر ساتھی کو جانتا ہوں۔"

"آدمی کی نیت بدلتے دیر نہیں لگتی۔ جب تک تم ان کے سردار تھے، وہ تم سے ڈرتے تھے، تمہارے خلاف ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ لیکن پھر تم نے انہیں مایوس کیا۔ تمہارے ارادوں کا علم ہوتے ہی انہیں احساس ہوا ہوگا کہ اب وہ بے سہارا ہوگئے ہیں۔ انہیں یہ ڈر پہلے سے ہوگا کہ شادی کرنے کے بعد شاید تم بدل جاؤ۔ پھر تم جیل چلے گئے اور جب رہا ہوئے تو ہمارے ساتھ واپس پہنچے۔ تم واقعی بدل گئے تھے۔ انہیں تم نے کچھ بھی کہا ہو، وہ سمجھے یہی ہوں گے کہ سردار اب سرداری کے قابل نہیں رہا۔ خونی خان بزدل ہوگیا ہے۔ تمہارے کچھ بتانے سے پہلے ہی وہ اپنی وفاداریاں بدلنے کا فیصلہ کرچکے تھے اور غالباً ان میں سے کسی ایک نے اپنی وفاداری کا سودا تمہارے اس دشمن سے کرلیا تھا جو اس کی سب سے زیادہ قیمت لگا سکتا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو رات کے اندھیرے میں ہمارے اور تمہارے دشمن اس طرح حملہ کرسکتے تھے۔"

"شاید تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو" محمد خان نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا "انہوں نے میری شادی کی مخالفت کی تھی دبے دبے انداز میں۔ ان کا بھی یہی خیال تھا کہ گھر گرہستی کی زنجیر میں الجھ کے میں اپنے مقصد سے دور ہو جاؤں گا۔ اس وقت میں نے انہیں یقین دلا دیا تھا کہ ایسا نہیں ہوگا۔ پھر بھی کچھ لوگ چلے گئے تھے۔"

"کہاں چلے گئے تھے؟"

"بس وہ میرا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ انہوں نے اپنا گروہ بنالیا ہے۔"

"کیا تم لوگوں کے ضابطۂ اخلاق میں یہ بغاوت نہیں سمجھی جاتی؟"

"قسم اللہ کی! وہ میرے مقابلے پر آتے تو میں انہیں باغی کہتا۔ انہوں نے تو کہلوایا تھا کہ وہ بہت شرمندہ ہیں۔ اگر وہ چاہتے تو مجھے مار دیتے اور انہی میں سے کوئی سردار بن جاتا مگر وہ مجھے استاد سمجھتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ یہ رشتہ باقی ہے اور باقی رہے گا۔ وہ میرے علاقے سے دور رہیں گے۔ وہ میرے دوستوں کو اپنا دوست اور دشمنوں کو اپنا دشمن تصور کریں گے۔" محمد خان نے کہا

"اور کیا بعد میں ایسا ہی ہوا؟"

"ہاں، جب میں جیل کے اندر تھا تو گروہ تقریباً ختم ہوگیا تھا۔ لیکن انہوں نے ایک دوسرے سے رابطہ قائم کیا اور ایک مقصد کے لئے اکٹھے ہوگئے۔ قسم اللہ کی، انہوں نے جان کی بازی لگادی اور مجھے نکال لائے۔ حق ادا کردیا شاگردی کا۔ میں انہیں کیسے باغی کہوں؟ کیسے سمجھوں کہ ان میں سے کوئی غدار ہوگیا ہے؟"

میں نے کہا "بات یہ ہے خان! کہ جس مقصد کے لئے وہ اکٹھے ہوئے اور جان کی بازی لگائی، کیا وہ مقصد پورا ہوا؟ انہوں نے تمہاری عدم موجودگی میں محسوس کیا ہوگا کہ تمہارے بغیر وہ ایسے ہی ہیں جیسے خاندان کا سربراہ نہ ہو، انہیں رہنمائی اور قیادت کے لئے تمہاری ضرورت نے مجبور کیا تھا کہ وہ تمہیں چھڑا لائیں اور خونی خان کی دہشت پھر قائم ہوجائے۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ شاید اسی مایوسی نے کسی کو اتنا بددل کیا کہ وہ باغی ہوگیا۔"

خان کے لئے اس تلخ حقیقت کو تسلیم کرنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ اس نے سر جھکالیا "اب تو بس چار وفادار ہی رہ گئے ہیں۔"

میں نے کہا "خود سوچو، ان میں سے کون ہوسکتا ہے جس سے ایسے شدید ردِ عمل کی امید کی جاسکتی تھی۔ کسی کو یقیناً بہت دکھ پہنچا تھا کہ تم نے ان کی امیدوں کو خاک میں ملا دیا۔ انہوں نے تو جاں نثاری میں کمی نہیں کی۔ خود کو خطرے میں ڈال کے اور اپنی جان پر کھیل کے تمہیں جیل سے نکالا مگر تم نے ان کے جذبے کی قدر نہیں کی۔ کسی کو تمہارے فیصلے سے سخت صدمہ پہنچا اور اس بات نے بہت مشتعل کیا کہ اس نے ایک ایسے شخص کی خاطر جان کی بازی لگائی جو اب سردار تو کیا، ڈاکو کہلانے میں بھی شرم محسوس کرتا ہے۔"

محمد خان کو جیسے اچانک کچھ یاد آگیا "میں... میں سمجھ گیا... وہ کون ہوسکتا ہے... وہ آخری آدمی تھا جو میرے گروہ میں شامل ہوا تھا۔"

محسن نے مذاق میں کہا "کیا گروہ میں خالی جگہ کو پُر کرنے

کے لئے تم اخبار میں اشتہار دیتے تھے؟ یا کوئی مقابلے کا امتحان ہوتا تھا؟"

محمد خان نے صرف ایک بار محسن کی طرف دیکھا اور اپنی بات جاری رکھی "اس کا بڑا بھائی میرا سب سے پرانا ساتھی تھا۔ وہی لایا تھا اسے... مگر مجھے رہائی دلانے کی کوشش میں وہ خود مارا گیا۔"

میں نے کہا "پھر تو شک کی بات ہی نہیں۔ یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ چھوٹے بھائی نے تم سے انتقام لینے کی کوشش کی۔ اسے دہرا صدمہ ہوگا۔ ایک بھائی کے مرنے کا، دوسرا اس بات کا کہ بھائی نے اپنی جان بے سبب گنوائی۔ ایک بزدل آدمی کے لئے۔"

"قسم اللہ کی، جو مجھے بزدل کہے..." خان بھڑک اٹھا۔

میں نے کہا "یہ اس کا خیال ہوگا جو غلط ہے۔ تم نے پہلے سے زیادہ بہادر ثابت کیا ہے خود کو۔ برائی کے راستے کو چھوڑ کر نیکی کی راہ اپنانا بہت مشکل ہے، بہت محنت چاہئے اس کے لیے۔ اور ہمارا ساتھ دینا صرف اخلاقی جرأت کی بات نہیں۔ واقعی زیادہ بہادری ہے کیونکہ اس میں خطرات زیادہ ہیں۔ اب تم ڈاکو نہیں، ایک مجاہد ہو۔ ڈاکو تو جان دینے سے ڈرتا ہے، مجاہد خود آگے بڑھ کے موت کو گلے لگاتا ہے۔ خیر چھوڑو اس بات کو۔ تم نے جو فیصلہ کیا صحیح تھا۔"

"شاید اس نے بھی جو فیصلہ کیا صحیح تھا۔" محمد خان بولا۔ "اگر اس طرح میرا بڑا بھائی مارا جاتا.... تو قسم اللہ کی میں بھی غصے میں پاگل ہوجاتا۔ مجھے اس سے کوئی گلہ نہیں"

"لیکن اب تمہیں اس سے محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ وہ پھر کہیں وار نہ کرے۔"

محمد خان تلخی سے مسکرایا "ابھی وہ بچہ ہے...."

غالب نے کہا "خان صاحب! اب وہ دشمن ہے اور دشمن کو کمزور سمجھنے والا ہی مارا جاتا ہے۔ اسے تریوینی نے اپنی طاقت بنالیا اور اسے احساس ہے کہ تریوینی کی حمایت حاصل ہوجانے کے بعد وہ اتنا طاقتور ہوگیا ہے کہ خونی خان سے اپنے بھائی کے خون کا بدلہ لے سکتا ہے۔"

میں نے کہا "اور اس میں کیا شک ہے کہ گزشتہ رات ہم سب مارے جاتے۔ اگر اتفاق سے یوسف ثانی نہ آجاتا۔"

خان مسکرایا "تم اتفاق سمجھتے ہو اسے؟ کمال ہے!"

میں نے کہا "تو... کیا...؟"

"قسم اللہ کی، اپنی صورت سے بے وقوف نظر آتے ہوں تو وہ اور بات ہے لیکن اپنی زندگی جھک مارنے میں نہیں گزری۔ آنے سے پہلے ہم جانے کا راستہ دیکھنے والے لوگ ہیں۔ کبھی بند گلی میں گھر نہیں تاکتے اور وہ گھر نہیں ہے جس کا دروازہ ایک ہو۔"

مجھے اس نے خفت میں مبتلا کردیا "یعنی تمہیں سب معلوم تھا کہ یوسف ثانی تمہیں نکال لے جائے گا؟"

محسن نے کہا "تمہارے اور یوسف ثانی کے تعلق کی نوعیت ابھی تک واضح نہیں ہوئی۔ تم کہتے ہو کہ وہ جن ہے۔ پتا نہیں کہاں ہوگا؟"

غالب نے کہا "وہ جس چراغ کا جن ہے... وہ خان صاحب کے پاس ہے۔ چراغ کے رگڑتے ہی نمودار ہوجاتا ہے۔"

"قسم اللہ کی" خان صاحب نے کہا "وہ میرے لئے سب سے زیادہ بھروسے کا آدمی ہے۔ اس نے کبھی مجھے مایوس نہیں کیا۔ میں نے اسے کہا کہ یوسف! ہمارے یہ مہمان اس شہر میں اجنبی ہیں۔ ان کا خیال رکھنا۔ اور تم دیکھو کہ اس نے کیسے تمہارا خیال رکھا۔ ایک لمحے کے لئے تمہیں اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ میں نے کہا یوسف! اب ایک نیا ٹھکانہ چاہئے۔ اور اس نے کہا کہ جو حکم آقا... اور جب ہم اس حویلی میں گئے تھے تو میں نے پوچھا تھا کہ یوسف کیسی جگہ ہے یہ، تو اس نے کہا تھا کہ یہ بھوتوں کا ڈیرا ہے۔ ادھر کوئی نہیں آتا اور آلیا تو ہم خود بھوت بن کے غائب ہوجائیں گے۔ پھر اس نے مجھے وہ آہنی دروازہ دکھایا تھا تو قسم اللہ کی میں اس کی دور اندیشی کا قائل ہوگیا تھا۔"

میں نے تائیدی نظروں سے یوسف ثانی کو دیکھا تو اس کا چہرہ فخر و مسرت سے چمک رہا تھا "دشمن واقعی حیران ہوں گے کہ ہم اچانک کیسے غائب ہوگئے۔ ہمیں زمین نگل گئی، یہ تو وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔"

محسن نے کہا "حیرت تو یہ ہے کہ پولیس بھی اس خفیہ راستے کا سراغ نہیں لگا سکی۔ کیا پولیس نے بھی مان لیا ہوگا کہ حویلی میں بھوت فائرنگ کررہے تھے؟"

غالب نے کہا "وہ بھی تو اس زمین دوز راستے سے آسکتے تھے۔"

خان بولا "اول تو اس جھاڑ جھنکاڑ میں وہ مین ہول تلاش نہیں کرسکتے... اور دیکھ لیں، تب بھی یہاں نہیں پہنچ سکتے۔"

"کیوں نہیں پہنچ سکتے؟"

"وہ آدھے راستے سے پہلے ہی طے کرلیں گے کہ اس طرف کسی کا جانا مشکل ہے۔ پھر اس راستے سے کئی راستے نکلتے ہیں۔ یہ پرانے شہر کی لائن تھی جس سے ہم گزر آئے، اب کوئی گزر کے نہیں آسکتا۔"

میں نے کہا "سراغ لگانے والے بہرحال پولیس کے لوگ ہیں۔ ان کو اتنا بے وقوف اور نااہل نہیں سمجھنا چاہئے۔"

"قسم اللہ کی" خان نے کہا "اب تو ہم بھی اس راستے سے واپس نہیں جاسکتے کیونکہ وہ راستہ بند ہوگیا ہے"

"بند ہوگیا ہے!" میں نے اور محسن نے ایک ساتھ۔

"ہاں۔ ایک جگہ نئی لائن عین پرانی لائن کے اوپر سے گزر رہی تھی، تم نے نہیں دیکھا مگر یوسف ثانی نے تاڑ لیا تھا۔ میں تم سب کے پیچھے تھا چنانچہ تم نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ میں نے وہاں ایک چھوٹا سا ٹائم بم رکھ دیا تھا جو ایک گھنٹے بعد پھٹ گیا ہوگا۔ اس سے اوپر کی گٹرلائن ٹوٹ گئی ہوگی اور پانی نیچے بھر چکا ہوگا۔"

میں نے کہا "یہ تو کمال کردیا تم نے! ٹائم بم تھا تمہارے پاس؟"

خان نے کہا "کیا تم نے میرا اسلحہ خانہ نہیں دیکھا تھا؟ ایسی چیزیں نہ ہوتیں تو میرے ساتھی مجھے جیل سے کیسے نکالتے؟"

محسن نے کہا "دھماکا دور دور سنا گیا ہوگا۔"

غالب نے کہا "پولیس کو رپورٹ بھی مل گئی ہوگی۔"

خان نے کہا "ہاں، مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ وہ سمجھیں گے، دھماکا گٹرلائن ٹوٹنے سے ہوا... پرانی گٹرلائن میں گیس بھر گئی ہوگی۔ پھر یہ کون شک کرسکتا ہے کہ گٹرلائن کے نیچے کسی نے ٹائم بم رکھا تھا؟"

رابعہ نے مجھ سے کہا "چلو یہ اچھا ہوا، ان موذی چوہوں کا بھی خاتمہ ہوا۔ ڈوب مریں گے سب کمینے۔"

ہم سب ہنس پڑے کیونکہ خواتین اب تک خاموش بیٹھی تھیں۔

غالب نے کہا "خان صاحب! برا نہ مانیں تو ایک بات پوچھوں؟"

خان نے کہا "قسم اللہ کی! جو برا مانے وہ یار کیسا؟"

اس کی بات پر مجھے استاد ٹیڈی یاد آگیا۔ وہ بھی بات بات پر کہتا تھا "قسم مولا علی کی..." وہ یاروں کا یار تھا۔ ایسا پیارا، مخلص دوست تھا کہ ہم سب اس کی شیخی کا مذاق اڑاتے رہ گئے۔ وہ منصب شہادت پر آگے بڑھ کے فائز ہوگیا۔

غالب نے کہا "ٹائم بم میں ایک گھنٹے کی مہلت دینے کی مصلحت میری سمجھ میں نہیں آئی۔ کیا دس منٹ کافی نہیں تھے؟ پولیس اگر ہمارے پیچھے آجاتی۔ یا دشمن بھی وہی راستہ اختیار کرلیتے تو انہیں آدھا گھنٹا بھی بہت تھا۔"

خان نے نفی میں سر ہلایا "دس منٹ میں کوئی کیسے آسکتا تھا۔ انہوں نے پہلے تو آس پاس کے سارے علاقے کو چھان مارا ہوگا۔ قسم اللہ کی، یہ تو ان کی کھوپڑی میں آہی نہیں سکتا کہ فرار ہونے والے زمین میں گھس گئے جیسے سانپ اپنے بل میں غائب ہوجاتا ہے۔ انہوں نے تو آس پاس کے لوگوں سے پوچھا ہوگا اور اردگرد کی گلیوں اور سڑکوں پر دیکھا ہوگا کہ آخر وہ کس طرف جاسکتے ہیں۔ اگر بات صرف فائرنگ کی ہوتی تو پولیس کہتی کہ دو گروہ لڑ رہے تھے جو پولیس کے آتے ہی فرار ہوگئے۔ شاید لوگوں کی یہ بات بھی سن لیتے کہ اس بھوتوں کے ڈیرے سے تو عجیب و غریب آوازیں سنائی دیتی رہتی ہیں۔ بھوت ہی آپس میں لڑ رہے ہوں گے۔ انسان ہوتے تو نظر آجاتے لیکن یہ معاملہ بہت سنگین ہے۔ پولیس کو وہاں سے لاشیں بھی ملی ہوں گی۔"

"کتنی لاشیں ملی ہوں گی؟"

"قسم اللہ کی، میں نے بھی گنی نہیں" محمد خان بولا۔

"چار تو ضرور مارے گئے ہوں گے" غالب نے کہا۔

"میرا خیال ہے، زیادہ" نازو نے لقمہ دیا۔

"بی بی! کتنے زیادہ؟ ساڑھے چار، پونے پانچ؟"

"چھ سات، کم سے کم" نازو نے غالب کی بات کا برا مانے بغیر کہا۔

میں نے کہا "کیا ان میں پیڈرو بھی شامل ہے؟"

نازو نے کہا "یہ میں کیسے بتاسکتی ہوں۔"

محسن نے کہا "میرا اندازہ ہے کہ وہ خبیث بچ کے نکل گیا۔"

غالب نے اس کی تائید کی "انہوں نے ایک بھرپور حملہ کیا تھا جو خلافِ توقع مزاحمت کے باعث ناکام ہوگیا، ورنہ وہ چند منٹ میں سب کو ٹھکانے لگا کے نکل جاتے۔ زیادہ دیر رکنا ان کے پروگرام میں شامل نہیں تھا۔ انہیں معلوم ہوگا کہ پولیس آجائے گی۔ فائرنگ کی آوازیں سن کر آس پاس رہنے والے پولیس کو فون کردیں گے۔ اسے ان کی بدقسمتی ہی کہا جاسکتا ہے کہ ہم مقابلے کے لئے تیار تھے اور ہمیں بے خبری میں شکار کرنے والے خود اپنی بے خبری میں مارے گئے۔ وہ اس نقصان سے بوکھلا گئے اور بدحواسی میں بھاگ کھڑے ہوئے۔"

محسن نے کہا "انہیں اپنے ساتھیوں کی لاشیں تک اٹھاکر لے جانے کا موقع نہیں ملا۔"

محمد خان نے کہا "سب معلوم ہوجاتا ہے قسم اللہ کی۔ مگر پولیس جن کا دیا کھاتی ہے، انہیں بچاتی ہے۔ وردی وہ سرکار کی دی ہوئی پہنتے ہیں اور سرکاری خزانے سے تنخواہ بھی لیتے ہیں مگر عیش تو تریوینی جیسے لوگ ہی کراتے ہیں۔ پولیس ان پر حرف نہیں آنے دے گی۔"

"تریوینی اور دلاور کی طرف سے بھی تو پولیس پر دباؤ پڑے گا کہ جیسے بھی ہو، انہیں پکڑ کے لاؤ جو ہمارے ساتھیوں کو مار کے نکل گئے۔ آخر وہ کہاں جاسکتے ہیں ایسے۔ ہوں گے وہیں کہیں۔ پریس اور پبلک کی طرف سے بھی پولیس کو اس کی نااہلی پر لعن طعن کی جائے گی تو وہ مجبور ہوجائیں گے کہ وہ جیسے بھی ہو، ہمارا سراغ لگائیں۔"

محمد خان نے کہا "رات کے اندھیرے میں تو ان کے باپ کو بھی وہ جگہ نظر نہیں آسکتی۔"

میں نے کہا "دن کے اجالے میں تو وہ دیکھ ہی لیں گے کہ ہم کس راستے سے فرار ہوئے تھے۔"

غالب نے کہا "اگر وہ چاہیں تو کتوں سے مدد لے سکتے ہیں۔ کتے اس جگہ کی نشاندہی کردیں گے جہاں سے ہم زمین میں اترے تھے۔"

محمد خان نے مونچھوں پر تاؤ دیا "ہاں ہاں... وہ جیسے چاہیں، پتا لگالیں مگر اس سے فائدہ کیا ہوگا؟ وہ نیچے اتریں گے اور آگے آئیں گے تو انہیں گٹرلائن میں پانی بھرا ہوا ملے گا۔ جتنا آگے جائیں گے، پانی زیادہ ہوگا۔ انہیں خود ہی یقین آجائے گا کہ ادھر سے کسی کے لئے فرار کا راستہ ہی نہیں ہے۔ یہ تو ناممکن ہی

بات ہے کہ کوئی گٹر کے پانی میں سے تیر کر گزر جائے۔ وہ بھی عورتوں کے ساتھ۔"

محسن بولا "انہیں کیا معلوم کہ ہمارے ساتھ عورتیں بھی ہیں۔"

میں نے کہا "انہیں سب معلوم ہوگا۔ نہیں معلوم ہوگا تو بتادیا جائے گا۔"

اس مسئلے پر مزید بحث کرنا لاحاصل تھا۔ اصل اور اہم بات یہ تھی کہ خدا نے ہمیں بچالیا تھا اور ہم پر اس کا شکر ادا کرنا لازم تھا۔ وہ انسان کی نیت اور اس کے ارادوں کے مطابق فیصلے کرتا ہے اور وسائل و اسباب فراہم کرتا ہے۔ اس نے ہمیں ڈاکو محمد خان کی زندگی کے اطوار بدل کے اسے صراط مستقیم پر لانے کا وسیلہ بنایا۔ ڈاکو محمد خان کو ہمارے تحفظ و سلامتی کا ذمے دار کیا اور یوسف ثانی جیسے کارٹون کی عقل و ذہانت کو اس کا سبب بنایا۔

یہ رات اتنی ہنگامہ خیز تھی کہ جب بالآخر صبح اپنے ساتھ سکون کا پیغام لائی تو شب بھر بقا کی جنگ لڑنے والے تھکن کی بے عملی کا شکار ہوگئے تھے۔ اور جیسے جیسے زندگی پر یقین کے ساتھ اعتماد بحال ہو رہا تھا' میرا ذہن حال اور مستقبل کے مسئلوں کی طرف متوجہ ہو رہا تھا۔ مجھے احساس ہونے لگا تھا کہ وقت گزر رہا ہے اور ہم سب باتوں کے سوا کچھ بھی نہیں کر رہے ہیں۔ میرے تصور میں پھر شہلا کی اور اس کے بچے کی تصویر ابھر آئی تھی۔ وہ شیشے کے ایک تابوت میں لیٹے منتظر تھے کہ ہم انہیں جفاشعار اجنبی دشمنوں کی اسیری سے نکال کے پھر اپنی چاہتوں کے مضبوط حصار میں لے آئیں اور انہیں محبت کی روشنی دے کر موت کے اندھیرے سے واپس زندگی کی طرف آنے والا راستہ دکھائیں کیونکہ وہ خود اپنے لئے کچھ نہیں کرسکتے تھے اور ان کی بے بسی میں ہمارے لئے ایک چیلنج تھا کہ ہم ان کے لئے کیا کرسکتے ہیں۔ وقت کم تھا اور ابھی تک ہم نے کوئی لائحہ عمل مرتب کرنے پر اتفاق نہیں کیا تھا۔

اچانک یہ مسئلہ اپنی پوری سنگینی کے ساتھ ابھر آیا۔

میں نے کہا "خان صاحب! تم کو اب کس کا انتظار ہے؟"

میرے لہجے نے خان کو تھوڑا سا حیران کیا۔ "کچھ نہیں .... بس میں جا رہا ہوں۔"

میں نے کہا "تم اپنے ساتھ محسن کو بھی لے جاؤ۔"

خان سے پہلے گل نے کہا "میں بھی ..."

میں نے اس کی بات کاٹ دی "کیوں؟ یہ لوگ گھومنے پھرنے تو نہیں جا رہے ہیں۔ پکنک منانے کی سوجھ رہی ہے تمہیں۔"

گل کا چہرہ اتر گیا۔ اسے مجھ سے ایسے سخت اعتراض کی توقع نہیں تھی۔ مجھے رابعہ اور نازو کی صورت پر بھی ناگواری کے آثار نظر آئے۔ محسن کو میں اس لئے خان کے ساتھ بھیج رہا تھا کہ اس کی عدم موجودگی میں ہم شہلا کے مسئلے پر کھل کے بات کرسکتے تھے۔ اس کے علاوہ کسی بھی جلد نم میں کسی کا اکیلے جانا خلاف احتیاط تھا۔ ایک اکیلا اور دو گیارہ۔ چنانچہ محمد خان کا بہترین ساتھی محسن ہی ثابت ہو سکتا تھا۔ ... کام خان کے سپرد کئے تھے' ان میں محسن کے ساتھ رہنے سے اسے بھی مدد مل سکتی تھی اور وہ ایک دوسرے کی محافظت بھی کرسکتے تھے۔ اب مجھے خیال آیا کہ مسئلہ گل کے جذبات کا نہیں۔ یہ بھی نہیں کہ وہ محسن پر بار ہوگی۔ ابھی تک ہم نے گل کو بھی شہلا کے وجود سے بے خبر رکھا تھا۔ وہ ہمارے ساتھ ہوگی تو آج ہی اسے سب کچھ بتانا پڑے گا۔ اس کے بعد کیا ہو؟ یہ سوچ کر ہی مجھ پر گھبراہٹ طاری ہونے لگی۔

میں نے کہا "گل بانو! ہم نے اپنا فیصلہ بدل دیا ہے۔ تم جاسکتی ہو" مگر گل کا موڈ آف ہوچکا تھا۔

اس نے کہا "میں نہیں جا رہی ..."

رابعہ نے مجھے غصے سے دیکھا "پہلے اسے اتنی سختی سے ڈانٹ دیا ..."

میں نے کہا "حد ہوگئی' میں تو مذاق کر رہا تھا۔"

نازو نے کہا "بہتر ہو' اگر آپ ہر بات پہلے فرمادیا کریں۔ کیونکہ ہم سب مذاق کو نہیں سمجھتے۔"

ظاہر ہے' نازو بھی مجھے اتنا ہی سمجھتی تھی جتنا رابعہ' غالب یا محسن سمجھتے تھے۔ لیکن گل نے مان لیا کہ میں واقعی مذاق کر رہا تھا۔ اجازت ملتے ہی اس کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا لیکن محسن نے میرے دوسرے فیصلے کو پسند نہیں کیا۔ تاہم اس نے احتجاج نہیں کیا۔ اس نے اندازہ کرلیا تھا کہ اتنی جلد میرے فیصلے کی تبدیلی کا کوئی سبب ضرور ہے جو میں ظاہر نہیں چاہتا۔

ایک بار پھر یوسف ثانی کا کمال صورت گری کام آیا۔ اس نے بہت کم وقت میں محسن اور گل کو اس حد تک بدل دیا کہ انہیں پہچاننا ممکن نہ رہا۔ جب وہ اپنے کام میں مصروف تھا تو محمد خان نے مجھے ایک کاغذ پر نقشہ بنا کے اس گودام تک جانے کا راستہ بتایا جہاں میرے اندازے کے مطابق دلاور کا اسلحہ ... کیا جاتا تھا۔ میں نے اس نقشے کو بھی سامنے رکھا جو ہم نے ... سے خریدا تھا اور جس میں بمبئی کی چھوٹی بڑی تمام سڑکیں اور تمام نمایاں مقامات دکھائے گئے تھے۔ محمد خان نے اپنے ... میں ہر موڑ اور وہاں کی کسی خاص جگہ کا حوالہ دیا تھا۔ میں نے اسے ذہن نشین کرلیا اور کاغذ پھاڑ دیا۔

ابھی مجھے قطعی اندازہ نہ تھا کہ جو منصوبہ بندی میں ... ہوں' وہ کس حد تک مؤثر ثابت ہوگی اور ہمارے کام آئے گی یا نہیں۔ یہ ہوسکتا تھا کہ عین وقت پر دلاور اینڈ کمپنی کا پروگرام بدل جائے تاہم جو کچھ مجھے آج معلوم تھا' میں اسی کو بنیاد بنا کے اپنی حکمت عملی وضع کر رہا تھا۔ وہ پیسہ جو ہم ایک بوجھ کی طرح اٹھائے پھر رہے تھے اور کہاں کام آتا۔ جب سوٹ کیس سے

کے رابعہ نے دو لاکھ روپے خان کو دیئے تو اسے بھی احساس تھا کہ یہ کاغذ کے ٹکڑے ہیں اور کچھ نہیں۔ ان سے سکون' آرام' تحفظ اور سلامتی ... سکھ چین اور خوشی نہیں خریدے جاسکتے تھے۔

اس نے نوٹوں کی گڈیاں پھینکتے ہوئے کہا "بھئی خان صاحب! آپ گن سکتے ہیں تو گن لیں۔ میرے بس کی بات نہیں۔"

میں نے کہا "اندازے سے یا تول کے دے دو۔ دو تین کلو۔ ہمیں کون سا حساب سے خرچ کرنا ہے۔"

رابعہ نے کہا "خدا کا شکر ہے۔ ایک چوتھائی بوجھ تو کم ہوا۔ جان کے ساتھ اسے بھی بچا بچا کے رکھنا پڑتا ہے۔"

خان نے سارے نوٹ کپڑے کی ایک تھیلی میں ڈال لئے "واپسی میں دیر ہوجائے تو گھبرانا نہیں" محسن بولا۔

میں نے کہا "خان تمہارے ساتھ نہ ہوتا تو میں ضرور پریشان ہوتا کیونکہ گل بھی تمہارے ساتھ ہے۔"

"میں راستہ نہیں بھول سکتا" محسن نے کہا۔

"خان ساتھ نہ ہوتا تو تم پوری کوشش کرتے" غالب نے کہا۔ "اب تو واپس آنا ہی پڑے گا۔"

رابعہ نے کہا "لالہ' بچوں پر نظر رکھنا۔"

گل نے ہنستے ہنستے کہا "یہ لالہ تو ہندو بولتے ہیں۔"

محمد خان نے نفی میں سر ہلایا "ہمارے پشاور میں بڑے بھائی کے لئے استعمال ہوتا ہے یہ لفظ۔"

"اچھا۔ تو پھر آج سے تم سب کے لالہ ... لالہ جی" میں نے کہا۔ اور محمد خان کا چہرہ کھل اٹھا۔

"اچھا لالے دی جان ... دا خدائے پہ امان ..."

میں نے کہا "خدائے پہ امان ... پہ ما خادے خا ..."

میری پشتودانی نے گل کو حیران کیا اور محمد خان کو بہت متوحش۔ باقی سب لوگ جانتے تھے کہ میری علمیت چند ہی جملوں تک محدود ہے۔

اب صبح کے گیارہ بجنے والے تھے۔ یوسف ثانی رات بھر کا جاگا ہوا تھا چنانچہ دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھا تھا تو بیٹھے بیٹھے ہی سوگیا تھا اور وہیں لڑھک کر گٹھری بنا پڑا ہوا تھا۔ اس کی زلیخا نے جملہ امور خانہ داری سنبھال لئے تھے اور صفائی میں مصروف تھی۔ جب رابعہ نے سوٹ کیس کھول کے نوٹوں کے بنڈل نکالے تھے تو میں نے ان دونوں کا ردعمل چوری چھپے دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ کوئی اور ہوتا جس نے اپنی زندگی تنگ دستی میں بسر کی ہوتی تو اتنی دولت دیکھ کے اس کی آنکھیں پھٹی رہ جاتیں اور سانس رک جاتا لیکن ان دونوں پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ ان کی خواہشات کا افق بہت وسیع تھا۔ عام انسانوں کی طرح طاقت پرواز ست بہت آگے تک پھیلا ہوا۔ لیکن ان کے جذبات بے لگام نہیں تھے۔ ان کے دل میں ایسی کوئی خواہش نہیں تھی کہ وہ ناجائز طریقے سے دوسروں کی دولت چھین کر امیر ہوجائیں چنانچہ ہماری دولت کی طرف انہوں نے پرہوس نگاہ بھی نہیں ڈالی تھی۔

جب میرے ساتھ رابعہ' غالب اور نازو رہ گئے تو نہ جانے کیوں مجھے بے بنیاد اندیشے پریشان کرنے لگے۔ میں نے سوچا کہ اگر اس شہر بے کنار کے اجنبی راستوں پر گل' محسن اور خان کے پیچھے شکاری لگ گئے تو کیا ہوگا؟ خان ان سے بچھڑ گیا تو کیا ہوگا؟ دلاور اینڈ کمپنی کے سب شکاری کتے بھی انہی سڑکوں پر پھر رہے ہوں گے۔ تریونی کے چیلے بھی ہوں گے' پولیس بھی ہوگی۔ ان سب کو خونی خان کی اور ہماری تلاش ہوگی اور کیا ان سب کی نظروں کو دھوکا دینا آسان ہوگا؟ یا ان کی واپسی سے پہلے شکاری یہاں آپہنچے تو کیا ہوگا؟

غالب نے کہا "کس سوچ میں پڑ گیا ہے بھائی؟"

میں نے چونک کر کہا "کچھ نہیں ... یہ کیا ہے؟"

"یہ وہی نوٹ بک ہے" غالب نے کہا "میں نے کچھ اور عبارت حل کی ہے۔"

"کوڈ تو ہم نے سمجھ لیا ہے لیکن اب اس کی کوئی اہمیت نہیں رہی" میں نے کہا "وہ اپنا کوڈ بدل دیں گے۔ انہیں معلوم ہے کہ یہ ڈائری گم ہوچکی ہے۔"

"ہاں' مگر انہیں یہ تو نہیں معلوم کہ ڈائری ہمارے پاس ہے۔"

"یہ بھی انہیں معلوم ہے" میں نے کہا۔

"خیر کوڈ بدلنے سے حقائق تو نہیں بدلتے۔ جو بات ہمیں معلوم ہوچکی ہے ..."

"ابھی تک ایسی کوئی بات معلوم نہیں ہوئی جس سے ہم فائدہ اٹھاسکتے ہوں" میں نے کہا "ستائیسواں میل ... گولڈن فالکن ... بی آر ملہوترہ ... یہ سب کیا ہے؟"

"فرض کرو بمبئی سے ستائیس میل دور کوئی جگہ ہے۔ ہوٹل یا ریسٹورنٹ یا بار ... گولڈن فالکن ... جس کا مالک کوئی بی آر ملہوترہ ہے" غالب نے کہا۔

"فرض کرلیا ... اب یہ فرمایئے کہ ستائیس میل مشرق میں یا مغرب میں؟" میں نے کہا۔

رابعہ نے کہا "میرا خیال ہے کہ یہ ان کا روٹ ہے۔ مخصوص راستہ جس پر وہ سفر کرتے ہیں۔"

پہلے مجھے یہ بات مضحکہ خیز لگی تھی لیکن پھر مجھے اس کے مفہوم میں امکانات کا روشن پہلو نظر آنے لگا۔

رابعہ نے کہا "ایسے کیا دیکھ رہے ہو دونوں مجھے؟"

غالب ہنسنے لگا "کوئی بہت باریک نکتہ پیدا کیا ہے آپ نے وکیل صاحب ... جو میری موٹی عقل میں نہیں آیا۔"

میں نے کہا "وکیل صاحب نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ ان کا ایک مخصوص راستہ ہوگا۔ نقشہ نکال۔"

غالب نے نقشہ پھیلا دیا "اس میں تو راستے ہی راستے ہیں سر۔"

میں نے کہا "غور سے دیکھیے۔ شہر سے باہر جانے والے راستوں پر واضح نشاندہی کی گئی ہے کہ کون سی سڑک کس شہر کی طرف جاتی ہے۔ اب ہمیں انڈیا کا نقشہ دیکھنا ہوگا۔"

غالب نے کہا "انڈیا کا روڈ میپ ادھر ہے" اس نے نقشے کو پلٹ کر پھیلا دیا۔

میں نے اس پر جھک کر غور کیا اور ایک انگلی سے راستہ ٹریس کرتا گیا "اگر آپ کو مشرقی پاکستان یا کلکتہ جانا ہو تو آپ کی سمت کیا ہوگی' یہ صاف ظاہر ہے" میں نے کہا "آپ براستہ جالندھر' امرتسر یا دہلی' احمد آباد نہیں جاسکتے۔ شمال یا جنوب کی طرف جانے کا بھی کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ راستہ ہوگا شمال مشرق کی طرف۔ غور فرمایئے۔ کلکتہ جانے کے دو راستے ہوسکتے ہیں۔"

اب غالب بھی نقشے میں دلچسپی لینے پر مجبور ہوگیا "ایک تو یہ سڑک ہے" اس نے نقشے پر انگلی رکھ کے کہا "ناگپور... وہاں سے رائے پور' بسال پور اور کلکتہ۔"

میں نے کہا "یہ سب سے مختصر راستہ ہے۔"

غالب نے کہا "یہ دوسری سڑک بھی ہے۔"

میں نے کہا "مگر یہ چھوٹی سڑک ہے۔ ہائی وے نہیں ہے اور ٹرک عموماً ہائی وے پر چلتے ہیں۔ یہ ہوسکتا ہے کہ وہ لوگ ہمیں دھوکا دینے کے لئے لمبا راستہ اختیار کریں۔ شاہراہ پر تقریباً ساڑھے تین چار سو کلو میٹر کے بعد ایک بڑی سڑک اندور کی طرف نکل جاتی ہے۔ وہ جبل پور' الہ آباد' بارہ ماسی اور پٹنہ کے راستے بھی کلکتہ پہنچ سکتے ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ اس طرح انہیں چار پانچ سو کلو میٹر کا فاصلہ زیادہ طے کرنا پڑے گا لیکن حفاظت کے خیال سے وہ گھوم کر جانا پسند کریں تو یہ بعید از امکان نہیں ہے۔"

غالب نے کافی دیر غور کرنے کے بعد کہا "مقصد ہمیں دھوکا دینا ہی ہو تو وہ لمبے سے لمبا راستہ اختیار کرسکتے ہیں اور ان کی جگہ میں ہوتا تو خلیج بنگال کے ساتھ ساتھ سفر کرتا۔ پونا سے مدراس۔ پھر یانم' برہم پور' کٹک اور کلکتہ۔ یہ راستہ دگنے سے بھی لمبا ضرور ہے مگر ان کے نقطۂ نظر سے محفوظ ہے۔"

"تو نے ٹھیک کہا۔ وقت کا مسئلہ نہ ہوتا تو میں بھی طویل اور محفوظ راستے کو ترجیح دیتا۔ مگر ہماری وجہ سے ان کے مال کی ترسیل میں رخنہ پڑگیا ہے۔ ان کا ایک بحری جہاز اسلحے سمیت غرق ہوگیا۔ اس کے بعد اگر کوئی جہاز آیا ہے تو اس کا مال بمبئی میں رکا ہوا ہے۔ وہ بھی ہماری وجہ سے۔ انہیں یہ خدشہ لاحق تھا کہ ہم راستے میں گڑبڑ کریں گے۔ اب انہیں اس کا ڈر نہیں رہا۔"

رابعہ نے کہا "انہوں نے ایک ضمانت حاصل [illegible] شہلا اور اس کے بیٹے کی صورت میں۔ وہ وقت [illegible]

کریں گے۔"

نازو نے اداسی سے کہا "اس صورت میں ہم کیا کرسکتے ہیں؟"

رابعہ نے کہا "ہمیں کچھ کرنا بھی نہیں چاہیے۔ اگر مال کی ایک کھیپ نکل جائے اور شہلا کی جان بچ جائے تو اچھا ہے۔"

میں نے ان دونوں کی صورت کو غور سے دیکھ کر کہا "اس معاملے میں میرے جذبات بھی وہی ہیں جو آپ دونوں کے ہیں۔ میں کب چاہتا ہوں کہ ہماری غلطی کی سزا محسن کو بیوی یا ماں سے محرومی کی صورت میں ملے۔"

نازو نے کہا "شہلا نے تمارہ کے جدائی کے بڑے صدمے جھیلے تھے۔ اس کی آزمائش بہت بڑی تھی۔"

رابعہ نے کہا "اس نے اپنے شوہر کو اور اپنے بچے کے باپ کو ہمارے حوالے کرتے ہوئے کسی جذباتی کمزوری کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ اس کا صلہ کیا ملا اسے؟"

نازو نے کہا "کچھ نہیں۔ آج وہ زندگی اور موت کے پل صراط پر بھی تنہا ہے۔ اس کا مستقبل دوستوں اور دشمنوں کی کامیابی یا ناکامی سے مشروط ہے۔"

میں نے کہا "دیکھو' ابھی شہلا زندہ ہے۔ اور وہ زندہ رہے گی۔"

"اگر ہم بھی اسے بچانے کی کوشش نہیں کریں گے تو اسے مرنا ہی پڑے گا" رابعہ نے تلخی سے کہا۔

میں نے کہا "میں کب چاہتا ہوں کہ مجھ پر اپنے ا[illegible] دوست کا قاتل کہلانے کا الزام آئے جس سے زیادہ مجھے کوئی عزیز نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ شہلا مرگئی تو محسن بھی زندہ نہیں رہے گا۔ جو کچھ میں کررہا ہوں' شہلا کو بچانے کے لئے ہی کررہا ہوں۔ اور آخر کیا کروں میں؟"

رابعہ نے کہا "تم دلاور کو یقین دلا دو کہ ہم کچھ نہیں کریں گے۔"

"بشرط کہ وہ شہلا کو ہمارے حوالے کردے" نازو نے [illegible]

میں نے کہا "تمہارا کیا خیال ہے' اس شرط پر وہ راضی ہوجائے گا؟ اور کہے گا کہ ٹھیک ہے... لے جاؤ شہلا کو... کیا اعتبار کرے گا ہمارے وعدے پر یا اعتبار کیا جاسکتا ہے [illegible] میں؟"

غالب نے کہا "دلاور جیسے لوگ نہ اعتبار کرسکتے ہیں [illegible] ان پر اعتبار کیا جاسکتا ہے۔ فرض کرو ہم اس سے آج ایک معاہدہ کرلیتے ہیں کہ ہم تمہاری راہ میں حائل نہیں ہوں گے اس بار۔ تو وہ کہے گا کہ اپنے سکندر صاحب! فلاں تاریخ کو مشرقی پاکستان میں فلاں جگہ آکے شہلا کو اپنے ساتھ لے جانا۔ [illegible] ہمارا مال تو پہنچ جائے۔"

"اور اس کے بعد کیا ہوگا... یہ میں بتاتا ہوں۔ [illegible] کھیپ ہماری مداخلت کے بغیر مشرقی پاکستان پہنچ جائے گی تو [illegible] ضمانت کے ساتھ وہ ایک اور کھیپ لے جانے کی بات کرے گا اور یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوگا اگر ہم نے کمزوری دکھائی۔ ہر بار شہلا اور اس کا بیٹا ایک گارنٹی بن کے مال کی ہر کھیپ کے ساتھ آتے جاتے رہیں گے اور دلاور کا کھلا چیلنج ہوگا کہ ہمت ہے تو کچھ کرکے دیکھو۔ نہیں۔ اس طرح ہم بلیک میل الگ ہوں گے اور ادائے فرض میں مجرمانہ کوتاہی کا بوجھ ہمارے ضمیر پر الگ ہوگا۔ اسلحہ کی ہر کھیپ جو ہماری اس کمزوری کی وجہ سے مشرقی پاکستان پہنچے گی' ہماری شکست کی گواہ ہوگی۔ اس سے جتنی خون ریزی ہوگی اس کی ذمہ داری براہِ راست ہم پر عائد ہوگی۔"

رابعہ نے کہا "کیا ہم سارا اسلحہ روک سکتے ہیں۔ جو وہاں پہنچ چکا ہے... یا پہنچ رہا ہے؟"

میں نے کہا "نہیں۔ جو ہمارے علم میں نہیں اس معاملے میں ہم پر کوتاہی کا الزام نہیں آسکتا لیکن جانتے بوجھتے ہم اسلحہ کی کھیپ نکل جانے دیں یہ ناممکن ہے۔ میں دلاور کو اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ میری کمزوری سے مجھے اس طرح بلیک میل کرتا رہے۔"

رابعہ نے کہا "شاید اس لئے کہ شہلا سے تمہارا کوئی جذباتی تعلق اتنا مضبوط نہیں ہے۔"

یہ خاصی اشتعال انگیز بات تھی لیکن میں نے رابعہ کی طبیعت کے جذباتی ابال کو سرد کرنے کے لئے ٹھنڈے دماغ سے کام لیا "اگر شہلا کی جگہ تم ہوتیں' تب بھی میرا فیصلہ یہی ہوتا اور شاید میرے لئے زیادہ آسان ہوتا۔"

غالب نے کہا "پھر تو جانبداری کا الزام مجھ پر بھی آتا ہے۔ لیکن میں اس معاملے میں سکندر سے ایک سو ایک فیصد متفق ہوں۔ قرعۂ فال اگر شہلا کے نام نکل آیا ہے تو اسے بدقسمتی ہی کہا جاسکتا ہے۔ محسن کی جگہ میں ہوتا تو کیا فرق پڑتا؟ کیا میں اپنی تقدیر سے لڑسکتا تھا؟"

میں نے کہا "اور اگر اس کے باوجود تمہیں یہ احساس ہے کہ میں بے رحمی کا مرتکب ہورہا ہوں تو فیصلہ خود محسن کو کرنے دو۔ جو ہم پر گزرنی ہے' ایک بار گزر جائے۔ آج نہ سہی کل اسے حقیقت کا سامنا کرنا ہوگا۔ اس مرحلے کو ہم آج ہی سر کیوں نہ کرلیں؟ اسے بتادیتے ہیں کہ ہم کس مشکل صورت حال سے دوچار ہیں۔"

"میں شرط لگا سکتا ہوں کہ وہ ہنس کر کہے گا... یار سکندر... میں اتنا کمزور بھی نہیں ہوں۔ اور شہلا یا میرے بیٹے کے نصیب میں شہادت کا درجہ حاصل کرنا لکھا ہے تو کیا میں انہیں اس سعادت سے محروم کرنے کی سوچ سکتا ہوں؟ اور وہ بھی فرض سے کوتاہی کرکے۔ بیک وقت گناہ گار اور مجرم بن کے...!"

رابعہ نے اپنی آنکھوں تک آجانے والے آنسوؤں کو پی لیا "میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا سکندر۔"

"مجھے معلوم ہے" میں نے نرمی سے کہا "تم جذبات سے مغلوب ہوگئی تھیں۔ یقین کرو' میرے سامنے پہلا مقصد شہلا اور اس کے بچے کے تحفظ کا ہے۔ پہلے ہم انہیں بچائیں گے' ہماری تمام کوشش' جدوجہد اور تمام [illegible] مقصد میں کامیابی کے لئے ہے... اور خدا نے چاہا تو بہت جلد شہلا ہمارے ساتھ ہوگی۔ ہم حالات کے مطابق منصوبہ بندی کررہے ہیں مگر یہ نہیں جانتے کہ آگے جاکے کیا ہوگا۔ ہر صورت میں ہم جو کچھ کریں گے' شہلا اور محسن کے مستقبل کو داؤ پر لگا کے نہیں کریں گے۔"

زلیخا نے ہمارے قریب آکے کہا "اب ہم چلت ہیں جی۔"

میں نے دیکھا تو وہ کام سے فارغ ہونے کے بعد ہاتھ منہ دھو چکی تھی اور بال بنا کے آنکھوں میں مزید کاجل بھر چکی تھی۔

میں نے کہا "تم رہتی کہاں ہو؟"

اس نے ایسے ہی ہاتھ سے اشارہ کیا "اپنا گھر میں رہت ہیں جی۔"

رابعہ نے کہا "پھر کب آؤ گی؟"

"ابھی آئے جاوت ہیں جی۔ باجار سے سودا لائی کے۔ تمہار واسطے کیا کھانا بنانے کا ہے؟"

رابعہ نے کہا "تم صبح سے شام تک یہاں یہی کام کرتی ہو؟"

"اور کا کریں۔ عورت جات کا اور کون [illegible] ہے جی" زلیخا نے کہا۔

نازو نے کہا "بس رات کو سونے کے لئے گھر جاتی ہو؟"

"اور کا ادھر سو جادیں" وہ منہ پر ہاتھ رکھ کے بولی "سادی تو ہوئی نا۔ بچے ہوئی گئے تو کا ہوگا؟ توبہ توبہ۔"

اس کی سادگی اور بے باکی نے نازو کا رنگ لال کردیا۔ اسے سوال کرتے وقت اندازہ نہ تھا کہ جواب کیا ہوگا تاہم یہ زلیخا کی محبت کا ایک انداز تھا جس میں عورت کی عفت و عصمت کے مشرقی تصور' شادی کی روایت کے احترام اور اس رشتے کی تقدیس کے احساس کا سارا فلسفہ آگیا تھا۔ جب وہ چلی گئی تو نازو کے ساتھ رابعہ بھی منہ دبا کے ہنسنے لگی۔

میں اور غالب پھر نقشے کی طرف متوجہ ہوگئے۔ ہمارا متفقہ فیصلہ یہ تھا کہ ناگپور سے رائے پور اور بسال پور کا راستہ ہی دلاور اینڈ کمپنی کا وہ مخصوص روٹ ہوسکتا ہے جس کے ستائیسویں میل پر "گولڈن فالکن" یا بی آر تھوترہ کا سراغ ملنے کے امکانات ہیں۔

"ستائیس میل کا مطلب ہے تقریباً چالیس کلو میٹر" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "ناگپور ہائی وے پر متبادل راستہ تین سو کلو میٹر کے بعد آئے گا۔ اگر ہم پہلے سے وہاں موجود ہوں تو ہمارے لئے بہتر ہے۔"

غالب نے کہا "ہم دو حصوں میں تقسیم ہوکے دونوں راستوں پر نگاہ رکھ سکتے ہیں۔"

"پھر آپس میں رابطے کی کیا صورت ہوگی؟"

"وائرلیس... بقول خان کے بمبئی میں پیسہ ہو تو سب [illegible]

ہے۔ اگر طویل فاصلے کے شارٹ ویو ٹرانسیٹر والے وائرلیس سیٹ مل جائیں تو ہم ایک دوسرے کو اپنی پوزیشن بھی بتاسکتے ہیں اور یہ اطلاع بھی دے سکتے ہیں کہ کانوائے کس راستے پر ہے" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "اگر یہ ہوجائے تو پھر ہمارا کام بہت آسان ہوجائے گا۔ آج خان جب شام کو واپس آئے گا تو اس سے بات کریں گے۔ ابھی میرا ارادہ ہے کہ ہم تھوڑا سا ابتدائی کام کرلیں۔ میں اور تم چل کے اس جگہ کو دیکھ آتے ہیں جہاں سے کانوائے کی لوڈنگ اور روانگی متوقع ہے۔"

"لیڈیز کے ساتھ؟"

میں نے کہا "نہیں۔ لیڈیز جائیں اور کچھ سیر تفریح کر آئیں۔"

"ہم کہاں سیر کرنے جائیں۔ خواہ مخواہ" رابعہ نے کہا۔

میں نے کہا "ہمارے پاس خواہ مخواہ کچھ کرنے کے لئے وقت نہیں ہے۔ آپ دونوں کے سپرد ایک آسان سا کام ہے۔ یہ اپنے پاس رکھیں اور ناگپور چلی جائیں۔"

نازو اور رابعہ نے ایک ساتھ کہا "ناگپور؟"

"میرا مطلب تھا کہ ناگ پور ہائی وے تک ہو آئیں۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ آپ لوگ لفٹ بھی لے سکتی ہیں اور ٹیکسی سے بھی جاسکتی ہیں۔"

رابعہ نے کہا "بمبئی کی ٹیکسی ناگپور کیسے جاسکتی ہے؟"

میں نے کہا "بمبئی سے چالیس پچاس کلومیٹر دور تو جاسکتی ہے۔ یہ دیکھو کہ اس سمت میں آخری جگہ کون سی ہے۔ وہاں تک ٹیکسی ڈرائیور ہنسی خوشی جائے گا۔ اسے میٹر سے دس روپے اوپر دینے کی بات کروگی تو وہ ہر جگہ چلا جائے گا۔"

نازو ہنسی "اور انکار کرے گا تو مار کھائے گا، ٹیکسی بھی گنوائے گا۔"

"شوق پورا کرنا ہے تو اور بات ہے" رابعہ نے کہا "ورنہ بلاوجہ مار دھاڑ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

نازو ایک ایڈونچر کے خیال سے خاصی خوش تھی "رابعہ باجی، چھوڑو ٹیکسی کو۔ ہم کار لے لیں گے کسی سے۔"

غالب نے کہا "بابا تم ہوائی جہاز لے لو، بحری جہاز لے لو۔ کون روک سکتا ہے تمہیں؟"

رابعہ نے کہا "بس جانا اور آنا ہے؟"

میں نے کہا "نہیں، اصل کام تو میں نے ابھی بتایا ہی نہیں۔ ایک تو تمہیں یہ معلوم کرنا ہے کہ گولڈن فالکن کیا بلا ہے۔ اور یہ شری لھوترہ کیا چیز ہیں۔ یہ سراغرسانی تمہیں ایسے کرنی ہے کہ کسی کو پتا نہ چلے۔"

نازو نے کہا "اگر شری لھوترہ ہمارے ساتھ آنا چاہیں تو کیا ہم انہیں بھی لے آئیں اپنے ساتھ؟"

غالب نے کہا "یہ نہ ہو کہ وہ تمہیں اپنے ساتھ لے جائے۔"

میں نے کہا "چلو، اب تم دونوں روانہ ہوجاؤ۔"

"کیا ایسے ہی چلے جائیں۔ اسی حلیے میں؟" رابعہ نے کہا۔

میں نے بنظرِ غائر ان کا جائزہ لیا "یوسف ثانی کو جگا کے کہو کہ تھوڑا سا میک اپ کردے۔"

"تم لوگ کیسے جاؤ گے اور کب تک واپس آؤ گے؟"

میں نے کہا "ہمارے پاس پولیس کی وردیاں ہیں۔ مجھے اور محسن کو فٹ آئیں گی۔ واپسی کے بارے میں ابھی سے کیسے بتائیں؟"

رابعہ نے کہا "تم کسی لمبے چکر میں مت پڑنا۔"

میں نے کہا "ویسے تو ہمارا کام دو گھنٹے کا ہے۔ مگر کیا معلوم شام ہوجائے۔"

"دو گھنٹے میں ہم بھی واپس آسکتے ہیں۔ کیوں نازو؟"

نازو نے کہا "کیا کریں گے اتنی جلدی آکے۔ یہاں بیٹھ کے بور ہوں گے۔ کوئی بھی تو نہیں ہوگا یہاں۔"

میں نے کہا "میری طرف سے اجازت ہے کہ شام تک گھومو پھرو۔"

غالب نے کہا "کوئی دھر لے گا آوارہ گردی کے الزام میں"

میں نے کہا "یہ بمبئی ہے۔ یہاں کوئی کسی کی پروا نہیں کرتا۔ ہر جگہ عورتیں اور مرد برابر نظر آتے ہیں۔ بسوں، ٹراموں میں عورتیں اور مرد ساتھ ساتھ بیٹھتے ہیں اور بھیڑ میں ایک ساتھ کھڑے ہوتے ہیں۔ ان کے لئے کوئی الگ جگہ نہیں۔ الگ قطار نہیں۔"

رابعہ نے کہا "سائیکل اور اسکوٹر چلاتی ہیں عورتیں۔"

نازو نے کہا "سنا ہے، ٹیکسی ڈرائیور بھی ہیں۔"

میں نے کہا "ہاں، یہاں حد سے زیادہ آزادی ہے۔ ان لوگوں کی معاشرت مختلف ہے لیکن جو بمبئی کا ماحول ہے وہ سارے ہندوستان کا ماحول نہیں ہے۔ چھوٹے شہروں اور قصبوں میں اتنی آزادی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔"

میں نے یوسف ثانی کو جگانے کے لئے ہاتھ لگایا ہی تھا وہ اچھل کے بیٹھ گیا۔ اس نے سب سے پہلے تو اپنی ٹوپی کو ... کی جس کا پھندنا اب الگ نہیں تھا۔ شاید یہ زلیخا کے ہاتھوں بخیہ گری تھی جس نے اسے ٹوپی کے ساتھ جوڑ دیا تھا۔ یوسف ثانی نے خاصے اطمینان کے ساتھ ٹوپی کو سر پر جمالیا۔

"ناچیز تھا کچھ محو آرام، لیکن اس میں نہیں کوئی کلام" اس نے عادت کے مطابق ہاتھ ہلا کے کہا "کہ آپڑا ہے اگر کوئی کام... تو حاضر ہے یہ بندۂ بے دام۔"

میں نے کہا "بے دام کچھ نہیں ہوگا۔ تمہاری سب خدمات کا معاوضہ ادا کیا جائے گا۔ جو تم نے کل سے اب تک سرانجام دی ہیں۔"

"اور آئندہ بھی سرانجام دو گے" غالب نے کہا۔

اس نے فریاد کے انداز میں کہا "ایسا نہ کیجئے مہربان، یہاں آپ ہیں معزز مہمان... گرچہ حقیر و فقیر ہے میزبان... لیکن یہ نہیں ہے اس کی شان..."

میں نے کہا "یوسف ثانی! ہم قدر کرتے ہیں تمہارے جذبات کی مگر ہم کسی طرح بھی تم پر بار نہیں بن سکتے۔ جیسے تم پہلے کام کرتے تھے اور حقِ محنت وصول کرتے تھے..."

وہ چلانے لگا "حضرت! اب اور نہ کریں اصرار... ناچیز ہے پہلے ہی شرمسار... یہ امر ہے از حد باعثِ آزار... پہلے کی بات اور تھی سرکار، جب بنائے تعلق تھا کاروبار..."

بلاشبہ وہ عجیب آدمی تھا۔ محمد خان نے اسے لالچی قرار دیا تھا۔ اس کے لالچ کی وجہ جانے بغیر اور میں نے اسے اپنے ساتھ رکھنے کی تجویز کو سختی سے مسترد کردیا تھا۔ اس کے خلوص کی پروا کئے بغیر... مگر اس نے کبھی کسی کا برا نہیں مانا تھا۔ الٹا اپنے رویئے سے اس نے مجھے شرمسار کردیا تھا۔

اس نے واجبی سے میک اپ کے ذریعے رابعہ اور نازو کے چہروں کو بدلا۔ لباس کا مسئلہ آیا تو وہ دس منٹ میں تین سے دو ساریاں خرید لایا جو دو سو روپے میں بہت سستی تھیں۔ اس نے بتایا کہ یہ سیلون اور بنگال کی ساریاں ہیں جو کچھ لوگ اسمگل کرکے لاتے ہیں اور پھر کشتیوں میں لے جاکے بحری جہازوں کے مسافروں کو بیچتے ہیں۔ باتک کے کام کی یہ ساریاں بہت مہنگی فروخت ہوجاتی ہیں لیکن ان کے منافع سے کسٹم اور پولیس کے حکام زیادہ لے جاتے ہیں۔

جب وہ تیار ہوگئیں تو ایک لمحے کے لئے میری قوتِ فیصلہ پر ایک بے نام سا خوف غالب آنے لگا۔ جن حالات سے ہم دوچار تھے، وہ تقاضہ کرتے تھے کہ سوچے سمجھے بغیر ہم کوئی قدم نہ اٹھائیں، کوئی خطرہ مول نہ لیں اور اپنے دفاع سے کبھی غافل نہ ہوں۔ کیا ان حالات میں جبکہ ہمارے چاروں طرف نئے اور پرانے شکاری ہر قسم کے جال پھیلا رہے تھے، دو عورتوں کو ایک خطرناک مہم پر بھیجنا مناسب ہوگا؟ بظاہر یہ کام معمولی تھا اور اس میں خطرے کا وجود محسوس نہیں ہوتا تھا لیکن غیر متوقع واقعات اور نادانستہ سرزد ہونے والی غلطیاں کسی بھی صورتِ حال کو اچانک پلٹ سکتی تھیں۔ رابعہ اور نازو نے کبھی بزدلی یا بدحواسی اور اعتماد کے فقدان کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ مذاق کی بات اور تھی کہ انہیں کمزور، کم ہمت یا ناقص العقل قرار دے کر چھیڑا جائے۔ وہ کسی طرح بھی ہم سے کم تر نہ تھیں۔ پھر بھی انہیں رخصت کرتے ہوئے مجھے یہ خیال رہا کہ وہ اکیلی ہیں اور ان کے ساتھ کسی مرد کے نہ ہونے سے کوئی ایسی بات نہ ہوجائے جو بنائے نہ بنے۔ پھر میں نے اس خیال کو اپنا وہم اور تعصب سمجھ کے ذہن سے جھٹک دیا۔

جب رابعہ نے کہا "ہم چلتے ہیں" تو مجھے اپنی جذباتی کمزوری پر شرم آئی۔

میں نے کہا "جاؤ خدا حافظ۔ ریوالور لے لیا ہے نا؟"

رابعہ نے کہا "اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

میں نے کہا "احتیاطاً لے لو۔ مجھے یقین ہے کہ جہاں تک ممکن ہوگا تم اس کے استعمال سے گریز کروگی۔ ہر مشکل صورتِ حال سے نکل آنے کے لئے تمہارے پاس ایک طاقت تو عقل و ذہانت کی ہے جس سے تم پہلے بھی فائدہ اٹھاتی رہی ہو۔"

رابعہ نے نازو کی طرف دیکھا "تم نے سنا نازو! یہ ہمیں عقل مند اور ذہین ہونے کی سند دے رہے ہیں۔"

نازو نے طنز سے کہا "جذباتی ہو رہے ہیں شاید۔"

میں نے کہا "تمہاری دوسری طاقت ہے تمہارا عورت ہونا، خدا نظرِ بد سے بچائے۔ حسن و شباب کا جوہری اسلحہ۔"

"جس سے ہم مرد بیچارے محروم ہیں" غالب نے کہا۔

میں نے اپنی بات جاری رکھی "تاہم بعض اوقات عورت کا عورت ہونا ہی اسے محصور کردیتا ہے۔ مقابلے پر جاہل اور وحشی انسان ہوں تو پھر ریوالور کی ایک چھوٹی سی گولی بہت بڑی طاقت بن جاتی ہے۔ تمہارے دفاع کو کسی پہلو سے بھی کمزور نہیں ہونا چاہئے۔"

رابعہ نے مجھ سے ریوالور لے لیا "اصلی طاقت تو انسان کا یقین ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "بجا ارشاد۔ مگر یقین کی بنیادوں کو استوار رکھنے کے لئے وسائل کو بروئے کار لانا پڑتا ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ ایک اور طاقت بھی ہاتھ میں رکھو یعنی دولت کی طاقت کو۔ کہنے کو پیسہ ہاتھ کا میل ہے لیکن کچھ لوگ اسی کے لئے اپنا سب کچھ بیچ دیتے ہیں۔ جہاں کسی بھی مقصد کے حصول کے لئے کامیابی خریدی جاسکتی ہو تو وہاں جدوجہد کا خطرہ مول لینے کی ضرورت نہیں۔"

غالب نے میری تائید کی "ہاں۔ وقت اور توانائی کیوں ضائع کی جائے، اگر یہ ضائع ہوجانے والی دولت کام آسکتی ہو۔ جو ہمارے کسی مصرف کی نہیں۔"

میرے اصرار پر انہوں نے اپنے اپنے بیگ میں دس دس ہزار روپے ڈال لئے۔ غالب نے خاصی مہارت سے دس دس ہزار کی نوگڈیوں کو ایک دسترخوان جتنے کپڑے پر قطار میں رکھا اور اسے لپیٹ کر بیلٹ سی بنادی جس کو رابعہ نے اپنی ساری کے نیچے کمر پر باندھ کے دونوں کناروں کو ایک پن سے جوڑ لیا۔ کسی اور لباس میں بھی شاید یہ بیلٹ نظر نہ آتی کیونکہ یہ مشکل سے آدھا انچ موٹی اور چار انچ چوڑی تھی۔ ساری کے نیچے تو اس کا وجود محسوس تک نہ ہوتا تھا اور نہ اس سے رابعہ یا نازو کو نقل و حرکت میں کسی دشواری کا سامنا ہوسکتا تھا۔ اس طرح ان دونوں کے پاس ایک ایک لاکھ ہوگئے۔

غالب نے نازو کو غور سے دیکھا "تمہاری کمر اب کچھ نظر آنے لگی ہے۔ پہلے تو تھی ہی نہیں۔"

نازو نے کہا "کیا ایک لاکھ کی کمر بھی نظر نہیں آئے گی؟"

رابعہ ہنسی "ایک کلو وزن تو ہوگا۔"

غالب نے نازو کو ڈانٹ کر کہا "کسی سے اتنا بے تکلف ہونے کی ضرورت نہیں کہ وہ تمہاری کمر میں ہاتھ ڈال دے۔ اب تم ایک خوبصورت نجوری بھی ہو۔"

نازو نے کہا "اتنی ہمت ہے کسی میں۔"

"ہاں مجھ میں ہے۔ لیکن اس کا مظاہرہ میں ابھی نہیں کروں گا۔"

میں نے کہا "اگر بفرض محال ایسا ہو کہ ہم واپسی پر یہاں نہ ملیں یا کسی کے ساتھ بھی ایسی ویسی کوئی بات ہوجائے تو ...."

رابعہ نے گھبرا کے کہا "خواہ مخواہ ایسی ویسی بات مت نکالو منہ سے۔ کچھ نہیں ہوگا کسی کو۔ چلو نازو۔"

وہ ریلوے ویگن سے اتر کے اسی راستے پر روانہ ہوگئیں جس سے ہم یہاں پہنچے تھے۔ وہاں کھیلنے والے بچوں اور مقامی عورتوں نے انہیں حیرت اور رشک و حسد کے ساتھ دیکھا۔ ان کالے، سوکھے، ننگ دھڑنگ بچوں کے اور ان کی ماؤں کے مقدر میں مفلسی کی ساری بدصورتی کا عذاب جھیلنا لکھا گیا تھا۔ رابعہ اور نازو جیسی تمام حسین اور خوش پوش عورتیں ان کے لئے کسی آسمانی مخلوق سے کم نہ تھیں جن سے وہ ایک ردِعمل کے طور پر نفرت کرتے تھے اور خوف کھاتے تھے۔ وہ ابھی ہماری نظر سے اوجھل بھی نہیں ہوئی تھیں کہ میں نے زلیخا کو آتے دیکھا۔ زلیخا نے انہیں سلام کیا۔ جواب میں شاید رابعہ نے یہ کہا ہوگا کہ وہ اس بستی کے باہر تک ان کی رہنمائی کرے کیونکہ۔ اس کے بعد زلیخا واپس چل پڑی۔

میں نے کہا "عورت کی ذات بھی کیسا مجموعۂ تضادات ہے۔"

"یہ کسی دانا فلسفی کے اقوال زریں ہیں یا رابعہ کے بارے میں آپ کی ذاتی رائے ہے" غالب نے کہا "معاف کرنا میں اس وقت اتفاق کرنے کے موڈ میں ہوں۔"

میں نے کہا "رابعہ ہو یا نازو، دونوں بیک وقت انتہائی نڈر بھی ہیں اور حد درجہ بزدل بھی۔ انہوں نے بڑی ہمت اور ثابت قدمی کے ساتھ ہمارا ساتھ دیا ہے۔ قید و بند کی صعوبت برداشت کی ہے۔ قتل و خوں ریزی، سفاکی اور درندگی دیکھی ہے۔ تشدد کی ذلت اٹھائی ہے اور وفا کی راہ میں سارے رشتوں کو قربان کرکے یہ زندگی اختیار کی ہے جس میں ہر قدم پر موت ہم رکاب ہے۔ اس کے برعکس دیکھو کہ یہی اندھیرے میں اپنے سائے سے ڈرتی ہیں۔ چوہے اور چھپکلی کو دیکھ کر دم نکلتا ہے ان کا۔ ابھی میں نے کچھ کہا بھی نہیں تھا مگر رابعہ نے کہہ دیا کہ بری بات منہ سے مت نکالو۔ بات سے ڈر گئی۔"

غالب ہنس پڑا "ایک دن میں نے بھی نازو سے کہہ دیا کہ مجھے کینسر ہوگیا ہے۔ اس کی حالت تو ایسی ہوگئی تھی جیسے میں نے اپنی تاریخ وفات کا اعلان کردیا ہو۔ میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا کہ مذاق میں بھی یہ منحوس لفظ مت کہنا۔ میں نے کہا کہ یہ

تمہاری محبت کا کینسر ہے اور ظاہر ہے میں نے تو ایک شاعرانہ بات کی تھی۔ مقصد تھا اپنے عشق کی شدت کا اظہار۔ مگر وہ ایک لفظ سے ڈر گئی۔"

میں نے گھڑی دیکھ کے کہا "اس میں تو ایک بجنے والا ہے۔ چل یار! ہم بھی نکلتے ہیں۔ بہت دیر ہوگئی ہے پہلے ہی۔"

"ہاں، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ کانوائے نکل جائے۔"

"دلاور نے کہا تھا کہ دو چار دن میں ٹرک روانہ ہوں گے۔ کل تک وہاں کچھ نہیں تھا۔ رات بھر میں کیسے پانچ ٹرک لوڈ ہوسکتے ہیں؟"

غالب نے سرہلا کے کہا "یار! کیا ہوگیا ہے تیری عقل کو۔ تو دلاور کی بات پر کیوں یقین کرتا ہے؟ معلوم نہیں اس کے دل میں کیا بات ہوگی جس کو چھپانے کے لئے اس نے ایک جھوٹ بول دیا۔ ہوسکتا ہے ٹرک کچھ دیر بعد ہی روانہ ہوگئے ہوں۔ یا کسی اور جگہ لوڈ ہوکر نکل جائیں۔"

میں نے مایوسی کے غلبے سے بچنے کے لئے کہا "وہ ہم سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔ وہ جانتا ہے کہ ہم سچ کا پتا چلالیں گے۔"

"ٹھیک ہے، چل کے دیکھتے ہیں" غالب نے کہا۔

یوسف ثانی ایک گوشے میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا ہوا تھا اور بظاہر کچھ نہیں سن رہا تھا مگر مجھے اندازہ تھا کہ وہ دیوانہ نظر آنے والا کتنا ہوشیار ہے۔ وہ کبھی گرد و پیش سے غافل نہیں ہوتا تھا بلکہ مجھے تو شک تھا کہ سوتے میں بھی اس کی آنکھیں سب کچھ دیکھتی ہیں اور اس کے کان ہر آہٹ اور سرگوشی کو سنتے ہیں۔ جب سے میں نے اسے اپنے ساتھ لے جانے کی تجویز کو مسترد کیا تھا وہ کچھ دل گرفتہ اور اداس نظر آنے کی کوشش میں مصروف تھا مگر میں نے جو فیصلہ کیا تھا سوچ سمجھ کے کیا تھا اور اسے بدل نہیں سکتا تھا۔

یوسف ثانی نے میرا اور غالب کا میک اپ کیا۔ پولیس مین کی جو وردی رابعہ کو ڈھیلی تھی وہ مجھے فٹ آگئی اور جو وردی میرے لئے کچھ تنگ تھی وہ غالب کے قالب پر پوری اتری۔ یوسف ثانی کو ہیئر اسٹائل بدلنے میں کمال حاصل تھا۔ اس نے میرے سر کے بالوں پر نہ جانے کیا محلول چھڑکا۔ اس سے میرے بال مخالف سمت میں آسانی سے سیٹ ہوگئے اور ان کا رنگ سیاہ سے براؤن ہوگیا۔ میرا خیال ہے اور تجربہ ہے کہ صورت کے نقوش کو بدلنے میں سب سے نمایاں کردار بال ہی ادا کرتے ہیں۔ اس نے مجھے یقین دلایا کہ جب تک میں بالوں کو اچھی طرح نہیں دھوتا ان کا رنگ نہیں اترے گا اور اسٹائل نہیں بدلے گا۔ غالب کے بالوں کو اس نے درمیان سے دو حصوں میں تقسیم کیا تو غالب کا چہرہ مجھے اجنبی سا محسوس ہونے لگا۔ پھر یوسف ثانی نے مجھے ایک چشمہ دیا جو نظر کا چشمہ لگتا تھا مگر اس کے شیشوں کا نمبر صفر تھا۔ غالب کو اس نے مشورہ دیا کہ وہ بازار سے دھوپ کا چشمہ خرید کر لگالے کیونکہ اس کی وردی افسرانہ تھی اور گہرے رنگ کے شیشوں والے

چشمے سے اس کی شان بڑھ سکتی تھی۔

پوری تیاری کے بعد میں نے آئینہ دیکھا تو یوسف ثانی کی کوشش کی تعریف کئے بغیر نہ رہ سکا "استاد! تم نے یہ فن کہاں سے سیکھا؟"

یوسف ثانی نے خوش ہونے کے باوجود ایک آہ بھر کے کہا "کلکتہ میں جب تھا خادم کا قیام۔ ایک تھیٹر میں کیا تھا برسوں کام۔ ایک صاحب کہ تھے اس فن کے امام۔ ہرچند کہ تھے موروثی حجام۔ رکھتے تھے آرائش گیسو میں شہرتِ عام۔ میک اپ میں اب عالی مقام۔ نہیں محتاج تعارف ان کا نام۔"

میں نے کہا "تم کیوں نہیں گئے فلموں میں؟ تم تو ہیرو بھی بن سکتے تھے۔"

"ابی اپنے بس میں نہیں اپنی تقدیر" وہ بولا "الٹی ہوجاتی ہے اپنی ہر تدبیر۔ جس نے دیکھی کبھی اپنی تصویر۔ اس نے کی ہر جگہ تشہیر۔ یہ بدنمائی بنی اپنی تقصیر۔"

غالب نے کہا "یار! وہ حاسد لوگ ہوں گے جو نہیں چاہتے تھے کہ تم ترقی کرو۔ ورنہ تم لاکھوں میں ایک ہو۔ یقین نہیں تو زلیخا سے پوچھ کے دیکھو۔"

میں نے سوٹ کیس میں سے مزید ایک لاکھ روپے نکالے۔ دس ہزار اپنی چار جیبوں میں تقسیم کرکے رکھے۔ ایسی ہی نو گڈیوں کو میں نے بھی ایک کپڑے کی بیلٹ بنا کے کمر کے گرد لپیٹ لیا۔ یہ بیلٹ پتلون کے اوپر تھی مگر شرٹ کے نیچے اور اسے میں نے پنوں کی مدد سے بیلٹ کے ساتھ ہی جوڑ دیا تھا تاکہ دوڑنے بھاگنے کی نوبت آئے تو بیلٹ کھل کر نہ گر پڑے اور ڈھیلی بھی نہ ہو۔ اس سے میری نقل و حرکت کی آزادی میں بھی فرق نہیں آتا تھا۔ غالب نے بھی ایسا ہی کیا۔ یوسف ثانی نے یہ سب کچھ دیکھا مگر کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔ سوٹ کیس میں اب شاید دو ڈھائی لاکھ بچے تھے۔

میں نے کہا "اس میں سے تم جتنی رقم چاہو لے سکتے ہو۔ اگر معاوضہ منظور نہیں تو سمجھو دوستوں کی طرف سے۔"

غالب نے کہا "ہمیں بہت خوشی ہوگی اگر یہ رقم تمہارے کام آجائے اور تم وہ گھر بنانے میں کامیاب ہوجاؤ۔ جس کے لئے تم پیسہ پیسہ جوڑتے چلے جارہے ہو۔ جو تمہارے لئے زلیخا کا خواب ہے اور تمہاری منزل ہے۔"

میں نے کہا "ہاں، ایسا نہ ہو کہ تم منزل کے پیچھے دوڑتے رہو اور عمر کی آخری منزل آجائے۔ زلیخا کا کیا ہے، وہ انتظار کرتی رہے گی لیکن اچھا ہے کہ اب تم اسے اپنالو۔ اس سے اچھی شریکِ حیات تمہیں نہیں ملے گی مسٹر یوسف ثانی۔"

وہ کبھی میری صورت کو دیکھتا تھا اور کبھی غالب کی۔ ہماری فراخدلانہ پیش کش سے زیادہ وہ اس بات پر حیران تھا کہ ہم اس کے رازِ عشق سے آشنا ہیں۔ یعنی میں۔ سرہلاتے ہوئے اس نے کہا "ناقص العقل ہے عورت کی ذات۔ کھول بیٹھتی ہے دفترِ شکایات۔ سنانے لگتی ہے اپنی حکایات۔ نہیں سمجھتی

یہ معمولی سی بات۔ کہ اس مال و زر کی نہیں ہے اوقات۔ جو حاصل ہوکر کے کوئی واردات۔ یا ملے کسی سے از راہِ خیرات۔"

"اچھا بھئی جیسے تمہاری مرضی" میں نے کہا "تم اپنی محبت کی کمائی سے تاج محل بناتے رہو۔ ہم چلتے ہیں۔ شام تک ضرور لوٹ آئیں گے۔ اگر خدا لایا۔ اس درمیان میں خدا سے بس خیرت مطلوب ہے۔"

میرے پاس وہی ریوالور تھا جو مجھے وردی کے ساتھ ملا تھا۔ میں نے یہ ریوالور غالب کو دے دیا کیونکہ میں اپنے خالی ہاتھوں سے ہتھیار کا کام لے سکتا تھا۔ ہم اس بستی سے گزرے تو اچانک بھگدڑ سی مچ گئی۔ لوگ ایسے بدحواس ہوگئے تھے جیسے جنگل میں شیر کے نووارد ہونے سے دوسرے کمزور اور حقیر جانور بدحواس ہوجاتے ہیں۔ پولیس بھی اس برِصغیر میں آدم خور شیر سے کم دہشت ناک مخلوق نہیں ہے کہ جس بستی میں دکھائی دیتی ہے وہاں لوگ سہم جاتے ہیں کہ نہ جانے کس بدبخت کی شامت آئی ہے۔ معلوم نہیں وہ وقت کب آئے گا جب عوام پولیس کو اپنا محافظ اور قانون کا نمائندہ سمجھنے لگیں گے۔ ابھی تو وہ لاقانونیت کے علم بردار، زبردست کے دوست اور کمزور کے دشمن سمجھے جاتے ہیں۔

ایک سڑک پر آجانے کے بعد میں نے غالب سے کہا۔ "آخر ہم ہیں کہاں اس وقت اور کب تک پیدل چلتے رہیں گے؟"

غالب نے سرہلایا "مجھے تو سمت کا اندازہ بھی نہیں ہورہا .... سورج سرپر ہے۔ کوئی ٹیکسی بھی نہیں آرہی ہے"

"کسی سے پوچھا تو لوگ شک کریں گے کہ پولیس کو شہر کے راستے نہیں معلوم۔"

"نقشہ تم نے سمجھا تھا۔ تم بتاؤ کہ کدھر جانا ہے۔ ویسے بھی تم ہی چیف ہو" غالب نے کہا "چیف کے ٹو۔"

میں نے کہا "یہ بات ہے تو پھر دیکھو" اور ایک کار ڈرائیور کو رکنے کا اشارہ کیا لیکن وہ چالاک آدمی تھا۔ اس نے کار کی رفتار کم کی اور پھر ایک دم بڑھا کے فرار ہوگیا۔

"سرجی! کیا لوگ باغی ہورہے ہیں؟ پولیس کی وردی دیکھ کے بھی نہیں ڈرتے" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "بیوقوف! کیا تم نے نہیں دیکھا کہ وہ ڈر کے ہی بھاگا تھا اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ مجرم تھا۔"

"کیا جرم کیا تھا اس نے سرجی؟"

"بیشتر ڈرائیور کاغذات سے مار کھاتے ہیں۔ لائسنس نہیں ہے، یا ہے تو تاریخ گزر چکی ہے۔ ٹیکس نہیں بھرا۔ انشورنس نہیں ہے۔ محض عجلت کی عادت کے باعث۔ یہ دیکھو" میں نے ایک کار کو تقریباً سامنے آکے روک لیا جسے سولہ سترہ سال کا ایک چھیل چھبیلا نوجوان چلا رہا تھا۔

"ڈرائیونگ لائسنس ہے؟" میں نے غرا کے کہا۔

نوجوان کی حالت غیر ہونے لگی "وہ جی۔ گھر پر رہ گیا ۔۔"

"تم خود کیوں نہیں رہ گئے گھر پر؟" میں نے پھاڑ کھانے والے انداز میں کہا "اب کیا خیال ہے، تمہارے گھر چلیں یا تھانے چلیں؟"

"جی... تھانے وار صاحب۔ میں تھانے نہیں جاسکتا.... میں اپنی غلطی مانتا ہوں... آئندہ لائسنس رکھوں گا....."

میں نے کہا "لائسنس ہوگا تو رکھو گے نا۔ تمہاری عمر کتنی ہے بھلا، پندرہ یا سولہ؟ تم تو بالغ بھی نہیں ہوئے ابھی۔"

غالب نے کہا "اور آئندہ کی آئندہ دیکھی جائے گی۔ ابھی کی بات کرو شہزادے۔"

شہزادے نے غالب کی بات کا مطلب کچھ اور سمجھا "جی میں جرمانہ ادا کرنے کے لئے تیار ہوں" اسی وقت اس نے ایک بہت پھولا ہوا پرس نکالا "آپ جتنا جرمانہ چاہیں رکھ لیں۔"

"ہمیں رشوت" میں نے چلاّ کے کہا "ایک اور جرم!"

غالب نے سفارش کے انداز میں کہا "غالباً گاڑی کے کاغذات نہیں ہیں اس کے پاس؟"

"کیا کاغذات بھی نہیں ہیں؟ اف تیرا جرم! کیا پتا گاڑی چوری کی ہو، اب تو گرفتاری لازمی ہے۔ نکالو ہتھکڑی فوراً۔"

غالب نے کہا "سر! رہنے دیں، بچہ ہے۔ غلطی سے ہمیں بھی عام پولیس والوں کی طرح سمجھ بیٹھا۔ ہم کہاں رشوت لیتے ہیں۔"

"مگر ہم مجرموں کو چھوڑتے بھی تو نہیں ہیں" میں نے کہا۔

"یہ شریف خاندان کا... آنکھ اور لیپ لگتا ہے سر۔"

"آنکھ اور لیپ؟"

"میرا مطلب ہے چشم و چراغ سر" غالب نے کہا "اور چور تو بالکل نہیں لگتا۔"

"تو پھر یہ چور ڈاکو کی اولاد ہوگا" میں نے اسے غور سے ملاحظہ فرمایا۔

"میرے ڈیڈی کسٹم میں انسپکٹر ہیں" اس نے احتجاجی انداز میں کہا۔

میں نے غالب کے کندھے پر ہاتھ مارا "دیکھا، ہم نے کیسا پہچانا۔"

غالب نے مجھے خون آشام نظروں سے گھورتے ہوئے کندھا سہلا کے کہا "آپ کی کیا بات ہے سر۔ آپ تو گدھے کو دیکھ کر زعفران کا بھاؤ جان لیتے ہیں۔"

ہندی پڑھنے والا نوجوان اردو کے اس محاورے سے نابلد تھا۔ غالباً اس نے فرض کرلیا ہوگا کہ گدھا اسے ہی کہا گیا ہے وہ مجرمانہ معصومیت کے ساتھ اپنی قسمت کے فیصلے کا انتظار کررہا تھا۔ اچانک میں نے ایک ٹیکسی کو آتے دیکھا اور سوچا کہ اس نوجوان کو جانے دوں مگر اتنی دیر میں ٹیکسی قریب آگئی اور مجھے اندازہ ہوگیا کہ اس میں پہلے سے کوئی مسافر موجود ہے۔ میں نے کار کے دروازے کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ ٹیکسی سامنے سے گزری اور مجھے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص کے چہرے کی ایک جھلک نظر آئی۔ یہ چہرہ سابق ایس ایس پی سراج کا تھا۔

میں تقریباً اچھل پڑا۔ پھر میں نے غالب کی طرف دیکھا تو وہ بھی ہکا بکا کھڑا ہوا تھا۔

"تم... تم نے دیکھا؟"

"یس... یس سر... فور تھری ٹو ون..." غالب نے کسی مستعد ماتحت کی طرح جواب دیا۔

"شاباش!" میں کار کا دروازہ کھول کے سیٹ پر بیٹھ گیا "یہ وہی سؤر کا بچہ تھا نا؟"

"بالکل وہی تھا سر" غالب نے میرے ساتھ بیٹھ کے دروازہ بند کردیا "کھڑے کیوں ہو؟ چلو" وہ نوجوان کی طرف دیکھ کر دہاڑا۔

"کہاں چلوں؟" نوجوان نے گھبرا کے کار اسٹارٹ کی۔

"احتیاط سے اس ٹیکسی کے پیچھے چلو۔ جو ابھی گزری ہے، اسے نظر سے اوجھل مت ہونے دینا۔ گاڑی کیسی ہے تمہاری؟ سمجھو کہ مقابلہ ہے اس ٹیکسی سے" میں نے کہا۔

نوجوان جوش میں آگیا "یہ اسپورٹس کار ہے۔"

"اور تم ڈرائیور کیسے ہو؟" میں نے کہا۔

"ابھی پتا چل جائے گا آپ کو" نوجوان نے گاڑی کی رفتار بڑھاتے ہوئے جواب دیا۔

گاڑی واقعی بہت جاندار تھی۔ دیکھتے دیکھتے رفتار بتانے والی سوئی اسّی، نوے اور پھر سو کے ہندسوں سے آگے بڑھ گئی۔ گاڑی کا طاقت ور انجن کچھ زیادہ ہی شور کررہا تھا مگر اسٹیئرنگ پر نوجوان کا مکمل کنٹرول تھا۔ رفتار ٹیکسی کی بھی کم نہ تھی۔

"اس ٹیکسی میں کون ہے؟" اس نے چلاّ کے کہا اور اپنی نظر سڑک پر رکھی۔ ٹیکسی تقریباً دو فرلانگ آگے نظر آرہی تھی۔

"ایک بہت خطرناک مجرم..." میں نے کہا "ہم اسی کو گرفتار کرنے کے لئے آئے تھے۔ بدمعاش جل دے کر نکل گیا تھا۔"

"کیا پیدل آئے تھے آپ لوگ؟ گاڑی کے بغیر اس کا پیچھا کیسے کرتے؟"

میں نے اس سوال کا جواب گول کردیا "شاباش... اگر تم نے ٹیکسی کو مس نہیں کیا تو تمہارے سارے قصور معاف۔"

"اور اگر ٹیکسی نکل گئی تو یہ تمہارا ایک اور جرم ہوگا۔ جرمانہ غفلت اور اعانتِ مجرمانہ" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "تم بھی بند... تمہاری گاڑی بھی بند۔"

لڑکے نے گھبرا کے پیچھے دیکھنے کی کوشش کی۔ گاڑی لہرا کے سڑک کے نیچے اتری اور ایک کوڑے کے ڈرم کو ناک آؤٹ کرتی ہوئی پھر سڑک پر آگئی۔ اس کی رفتار ایک سو بیس کلو میٹر سے زیادہ دیکھ کے مجھے فلموں میں کاروں کے الٹنے کے

خوفناک مناظر یاد آئے۔

میں نے کہا "آہستہ نوجوان! ایسے تو تم ٹیکسی سے آگے نکل جاؤ گے اور وہ بدمعاش ہمارے پیچھے لگ جائے گا۔"

"یا تم اپنے ساتھ ہمیں بھی پرلوک پہنچا دو گے۔ وہ بدمعاش بچ جائے گا اور ہم مارے جائیں گے" غالب نے...

نوجوان نے ڈر کے رفتار کم کی "اگر اس نے ریوالور سے فائرنگ شروع کردی؟"

میں نے کہا "کرنے دو... اس کا نشانہ خطا ہوگا۔ جیسے کہ فلموں میں ہوتا ہے۔ ولن ایک ہزار راؤنڈ چلاوے۔ پھر بھی ہیرو بچ جاتا ہے۔ ہیرو صرف ایک گولی چلاتا ہے اور ولن کے ساتھ دوسرے بدمعاشوں کو بھی مٹا دیتا ہے۔ ویسے بھی اس بدمعاش کی نظر کمزور ہے۔"

لڑکے نے کہا "نام کیا ہے اس بدمعاش کا؟"

میں نے سوچ کے کہا "ہیڈ نوڈے..."

"ہیڈ نوڈے؟" لڑکا حیران ہوکے بولا "یہ کیا نام ہوا سر جی؟"

میں نے غالب کی طرف دیکھا تو اس نے تائید میں سر ہلا کے میرے خیال کی تصدیق کی۔ میرا خیال تھا کہ ٹیکسی میں مجھے سراج کے چہرے کی جھلک دکھائی دی تھی مگر اس وقت میں نے اس کا نام لینے سے گریز کیا تھا۔ شک کی گنجائش پہلے بھی نہ تھی۔ اس سابق ایس ایس پی کے چہرے کو میں کیسے بھول سکتا تھا جس کے ظلم و تشدد سے میرے اس دور پر آشوب کا آغاز ہوا تھا۔ اذیت کے اس پہلے تجربے کی یاد آج بھی میرے جسم پر کپکپی طاری کردیتی تھی۔ حالانکہ اس کے بعد جو کچھ ہمارے ساتھ ہوا، وہ اس سے کہیں زیادہ ہولناک تھا۔

میں نے کہا "اس کے نام پر مت جاؤ۔ اس بدمعاش کے سامنے تو گرگٹ بھی شرمندہ ہے۔"

"گرگٹ؟" نوجوان بھونچکا رہ گیا۔

"ہاں وہ تو صرف رنگ بدلتا ہے۔ یہ اپنا نام بدل لیتا ہے۔ چہرہ بدل لیتا ہے۔ آواز بدل لیتا ہے۔ گھر، مذہب اور قومیت تو کوئی چیز نہیں اس کے سامنے۔ وہ جنس بھی بدل سکتا ہے۔ ایک منٹ میں۔ ابھی ہم اس کے پیچھے تو لگ گئے ہیں مگر یہ ہوسکتا ہے کہ جب ہم اس ٹیکسی کو روک کر دیکھیں تو اس میں سے کوئی لال مرچ نکلے۔"

"لال مرچ؟" لڑکا مزید بھونچکا رہ گیا۔

"میرا مطلب تھا کوئی ایسی لڑکی جو...."

"جو لال رنگ کے اسکرٹ میں ہو۔ منی اسکرٹ میں۔ اس کے ہونٹوں پر گہرے لال رنگ کی لپ اسٹک ہو اور اس کے گال کشمیری سیب کی طرح لال ہوں" غالب نے کہا۔

میں نے اسے ڈانٹا "افسر کی بات کاٹتے ہو۔ ہمارا مطلب تھا لال مرچ کی طرح مزاج کی تیز۔ جو بات کرنے سے پہلے ہاتھ چلاتی ہو اور ہاتھ چلانے سے پہلے زبان چلاتی ہو۔"

"مگر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ راہ چلتے اس کی جنس بدل جائے؟" نوجوان نے کہا "ٹیکسی میں بیٹھے ہوئے وہ زنانہ کپڑے پہن لے اور میک اپ سے اپنا حلیہ بدل لے۔"

میں نے افسوس سے سر ہلایا "نوجوان! تم نے ابھی دنیا میں کچھ نہیں دیکھا۔ انسانوں کی نظریں بدل جاتی ہیں، دل بدل جاتے ہیں، خون بدل جاتا ہے۔ رشتے بدل جاتے ہیں۔ عورتیں شوہر بدل لیتی ہیں۔ مرد بیویاں...."

"ولدیت تک بدل جاتی ہے سر جی۔"

"ہاں۔ اس بدمعاش کا بس چلے تو مجھے باپ بنالے" میں نے کہا۔

غالب نے سرد آہ بھر کے کہا "زمانہ ہی ایسا ہے۔ لوگ گدھے کو بھی باپ بنالیتے ہیں ضرورت کے وقت۔"

"نوجوان! تم اپنا دھیان سڑک پر رکھو اور ٹیکسی کی رفتار پر رکھو" میں نے متانت سے کہا "بس یہی فاصلہ رہنا چاہئے ہمارے درمیان۔"

"اور اسے پتا نہیں چلنا چاہئے کہ ہم اس کا تعاقب کررہے ہیں" غالب نے کہا۔

"وہ بیک ویو مرر میں سب دیکھ چکا ہوگا یا دیکھ لے گا" نوجوان نے تشویش سے کہا۔

"اگر ایسا ہوگا تو ہمیں معلوم ہوجائے گا۔ ٹیکسی ڈرائیور ہمیں ڈاج کرکے نکلنے کی کوشش کرے گا" میں نے کہا۔

"ٹیکسی ڈرائیور گلیوں کے شارٹ کٹ سے اور پُر پیچ راستوں سے واقف ہوتے ہیں۔"

"لیکن یہ بدمعاش کہاں جارہا ہے آخر؟"

"اگر یہ بات ہمیں معلوم ہوتی تو ہم پہلے سے وہاں توپ اور ٹینک لے کر اس کا استقبال کرنے کے لئے موجود ہوتے" میں نے کہا۔

جو نقشہ محمد خان نے مجھے سمجھایا تھا وہ میرے ذہن میں تھا چنانچہ مجھے اپنی اور سراج کی منزل ایک ہی نظر آرہی تھی۔ اگر وہ رہنمائی کے لئے آیا تھا تو اسے حسن اتفاق قرار دیا جاسکتا تھا اور وہ ہمیں اپنے پیچھے لگا کے کسی دام فریب کی طرف لے جارہا تھا تو یہ ہماری شامت اعمال تھی۔ وہ ایک فریب کار شکاری تھا جس کی کسی چال کو سمجھنا آسان نہ تھا۔ یہ ہوسکتا تھا کہ وہ آخری وقت تک انجان بنا رہے اور یہ بھی ہوسکتا تھا کہ اچانک فائرنگ سے کار کے ٹائر یا ہمارے جسم چھلنی کرکے نکل جائے چنانچہ غیر سنجیدہ باتوں میں مصروف رہنے کے باوجود میں ایک لمحہ کے لئے بھی سراج کی طرف سے غافل نہیں ہوا تھا اور مؤثر جوابی کارروائی کے لئے بالکل تیار تھا۔

اچانک کار دوڑتے دوڑتے لڑکھڑانے لگی۔

"یہ کیا ہوا؟" میں نے سر پر ہاتھ مار کے کہا۔

"ٹائر... ٹائر فلیٹ ہوگیا" لڑکے نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"... اور یہ فلیٹ نہیں ہوسکتا تھا۔ جب ہم آبادی میں تھے یا کچھ دیر انتظار نہیں کرسکتا تھا" میں نے بھنا کے کہا۔

لڑکے نے کہا "میں ابھی... دو منٹ میں ٹائر بدل دیتا ہوں۔"

"دو منٹ؟" میں نے دور نظروں سے اوجھل ہوتی ٹیکسی کو دیکھ کے سرد آہ بھری "دو منٹ میں تو بندہ فرش سے عرش پر پہنچ جاتا ہے۔"

غالب نے نوجوان کی مدد کی اور دو کے بجائے پانچ منٹ میں ٹائر واقعی بدل گیا مگر میرے حوصلے کا ٹائر بدستور فلیٹ رہا۔ ٹیکسی اتنی دیر میں نہ جانے کہاں پہنچ چکی تھی۔ سراج کسی کوشش کے بغیر بچ کے نکل گیا تھا اور قسمت کی رخنہ اندازی نے ہماری امیدوں کو خاک میں ملا دیا تھا۔

ہم دوبارہ روانہ ہوئے تو لڑکا خاصا شرمندہ تھا جیسے ٹائر اس کی غلطی سے فلیٹ ہوا تھا۔ میں نے اسے تسلی دی۔

"اس میں بھی کوئی مصلحت ہوگی خدا کی۔"

"اب... کیا آپ واپس جائیں گے؟" وہ بولا۔

میں نے کہا "نہیں۔ آگے چلو۔ راستہ میں بتاؤں گا" لڑکے نے کار کی رفتار پھر بڑھائی۔

میں نے کہا "اب جلدی کی ضرورت نہیں۔ آرام سے چلو۔"

دس منٹ بعد میں نے محسوس کیا کہ راستہ کچھ جانا پہچانا سا لگتا ہے۔ میں نے بہت سی نشانیوں کو شناخت کرلیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ رابعہ کے ساتھ میں اسی راستے سے گزر کے واپس گیا تھا۔ کچھ آگے جا کے وہ علاقہ شروع ہوگیا جہاں ... تک گودام ہی گودام پھیلے ہوئے تھے۔ یہ سب بند، آہنی دروازوں والی وسیع و عریض، ایک سی بے ہنگم اور بے رونق عمارات تھیں اور میں سوچ رہا تھا کہ آخر میں اس ایک بیرک کو کیسے شناخت کروں گا جہاں میں نے رابعہ کے ساتھ شہلا اور اس کے بیٹے کو ایک شیشے کے تابوت میں دیکھا تھا۔

اس سڑک پر آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ اتنی دیر میں صرف دو ٹرک ہمارے سامنے سے آئے تھے جو اوپر تک سامان سے لدے ہوئے تھے۔ گودام بھی ویران پڑے تھے، نہ کہیں چوکیدار تھے نہ سامان اتارنے چڑھانے والے مزدور۔ فولادی دروازے بند تھے اور احاطوں کے اندر ٹرک بھی خالی کھڑے ہوئے تھے۔ اس خانہ ویرانی کا سبب مجھے گھڑی دیکھ کے سمجھ میں آیا۔ آج اتوار تھا۔ کارخانے اور دفاتر بند تھے۔ چنانچہ گودام بھی سونے پڑے تھے۔ لوگوں کی آمد و رفت بھی موقوف تھی۔

اچانک سراج کو لے کر جانے والی ٹیکسی سامنے سے نمودار ہوئی تو میں نے غالب سے کہا "کیا خیال ہے، اگر اسے روک لیں؟ یہ وہی ٹیکسی ہوگی۔"

غالب نے کہا "اچھا خیال ہے سر جی، ڈرائیور بتادے گا کہ اس نے مسٹر ہیڈ ٹو دے کو کہاں اتارا ہے۔"

ٹیکسی ابھی ایک فرلانگ دور تھی کہ میں نے اس کا دروازہ کھلتے اور پھر کسی کو باہر چھلانگ لگاتے دیکھا۔ چھلانگ مارنے والا گرتے ہی قلابازی کھا کے اٹھا اور ایک دیوار کی طرف دوڑا جو سڑک کے متوازی چل رہی تھی۔ پلک جھپکتے ہی وہ دیوار کے اوپر سے اندر کود گیا۔ ٹیکسی اب بھی سیدھی آرہی تھی مگر اس کی چال ایسی ہوگئی تھی جیسے ڈرائیور نشے میں اسٹیئرنگ کو سنبھالنے میں ناکام ہے۔ گڑبڑ کا اندازہ غالب نے بھی کرلیا تھا۔

جب میری نظر نے ڈرائیور کو اسٹیئرنگ پر سر رکھے دیکھا تو ٹیکسی بالکل سامنے آچکی تھی اور بہت زیادہ لہرانے لگی تھی۔

میں نے چلا کے کہا "کار کو روک لو" اور پھر دروازہ کھول کے باہر گر گیا۔ شاید غالب نے بھی کسی خطرے کی بو سونگھ لی تھی یا اس نے محض میری تقلید کی تھی۔ وہ کار کا دوسرا دروازہ کھول کے باہر نکل گیا۔ میں نے سڑک پر گرتے ہی اٹھ کے بھاگنے کی کوشش کی مگر توازن برقرار نہ رکھ سکا اور منہ کے بل گرا۔ اس کے ساتھ ہی ایک خوف ناک دھماکا سنائی دیا اور ایک لمحے کے لئے میرا جسم مفلوج ہوگیا کیونکہ یہ صرف کاروں کے تصادم کی آواز نہیں تھی۔ یہ بم کا دھماکا تھا۔ اگر میں گرا نہ ہوتا تو اتنے کم فاصلے پر ہونے کی وجہ سے مارا جاتا یا شدید زخمی ہوتا۔ قدرت نے مجھے بال بال بچالیا تھا۔

حواس بحال ہوئے تو میں پھر اٹھ کے بھاگا۔ میرا مقصد اس جگہ سے زیادہ سے زیادہ دور ہونا تھا۔ دھماکے نے کاروں کے پرخچے اڑادیئے تھے اور گولی کی رفتار سے سفر کرنے والے لاتعداد دہکتے ہوئے تیز دھار والے فولادی ٹکڑے میرے سر کے اوپر سے گزر گئے تھے۔ میں نے غالب کو بھی باہر کودتے ضرور دیکھا تھا مگر اس کے بعد کی مجھے خبر نہ تھی۔ اب میں نے پلٹ کے دیکھا تو مجھے وہ کہیں دکھائی نہ دیا۔ سڑک کے درمیان میں کار اور ٹیکسی کے شکستہ ڈھانچے کسی الاؤ کی طرح جل رہے تھے۔ اسی الاؤ میں ایک نوجوان بھی جل رہا تھا جس کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ شوق میں اپنے باپ کی گاڑی لے کر نکل آیا تھا۔ موت نے اسے ہمارے راستے پر پہنچادیا تھا اور ہم اسے ایک پُر اذیت مرگِ ناگہاں تک لے آئے تھے۔ ہم نسبتاً آزاد تھے کہ خطرہ محسوس کرتے ہی جان بچانے کی کوشش میں کامیاب رہے، وہ اسٹیئرنگ وھیل کے پیچھے پھنسا ہوا تھا کہ فوراً نہ نکل سکا اور تصادم سے بچنے کی کوشش ناکام کی نذر ہوگیا۔

"غالب!" میں نے چیخ کے کہا اور اس طرف دوڑا جدھر غالب گرا تھا۔ وہ سڑک کی دوسری جانب ہی جاسکتا تھا۔ یہ خیال میرے دل میں دکھ کا نشتر بن کے اترنے لگا تھا کہ شاید غالب کو اتنی مہلت نہیں ملی ہوگی جتنی مجھے ملی تھی۔ مجھے تو ایک حادثے نے بچالیا تھا۔ میں منہ کے بل گرا تھا اور محفوظ رہا تھا۔

سڑک کو عبور کرتے ہی میں نے پھر غالب کو آواز دی اور جب وہ اچانک ایک درخت کے تنے کی اوٹ سے نکل آیا تو میں اس کی طرف دیوانہ وار بڑھا۔

"تو... ٹھیک ہے؟" میں نے اسے ٹٹول کے کہا۔

غالب کی آنکھوں میں وحشت تھی اور اس کی نظریں شعلوں اور دھوئیں کے مرغولوں پر جمی ہوئی تھیں "مجھے.... مجھے کچھ نہیں ہوا۔"

"چل یہاں سے نکل جائیں" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا۔ غالب میرے ساتھ چل پڑا۔ ہم دونوں کے جسموں پر معمولی خراشوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ غالب کو ایک درخت نے بچالیا تھا جو چند فٹ کے فاصلے پر موجود تھا۔ اس برگد کے درخت کا تنا کئی فٹ چوڑی ڈھال بن گیا تھا۔ مجھے صورتِ حال کی سنگینی کا احساس تھا۔ دھماکا یقیناً دور دور تک سنا گیا ہوگا۔ جو لوگ گوداموں کے اندر ہوں گے وہ جائے حادثہ پر پہنچنے میں دیر نہیں لگائیں گے۔ چوکیداروں کے علاوہ بہت سے مزدور بھی احاطے کے آس پاس کی جھونپڑیوں میں آباد تھے۔ شاید خالی نظر آنے والے ٹرکوں میں ڈرائیور کلینر سو رہے ہوں گے۔ لوگوں نے دو پولیس والوں کو حادثے کے بعد فرار ہوتے دیکھا تو انہیں شک ہوگا۔ یہ سوچ کے میں نے سڑک سے زیادہ سے زیادہ دور جانے کی کوشش کی اور اپنی کوشش میں کسی حد تک کامیاب رہا۔ ہم نے سڑک سے عمودی سمت میں دوڑنا شروع کیا اور چند منٹ بعد اس دیوار تک جا پہنچے جس کو ٹیکسی سے کودنے والے نے عبور کیا تھا۔

"وہ ادھر ہی گیا تھا" میں نے کہا "وہ سراج کے سوا کوئی نہیں ہوسکتا۔"

"کسی کو باہر چھلانگ لگاتے میں نے بھی دیکھا تھا۔ مگر کیا معلوم وہ سراج ہی تھا یا کوئی اور تھا" غالب نے کہا "مجھے تو ایک سایہ سا نظر آیا تھا اس دیوار پر۔"

میں نے ایک پتھر پر بیٹھ کے سگریٹ نکالی... "اسے معلوم ہوگیا تھا کہ کوئی اس کے پیچھے لگا ہوا ہے۔ آج چھٹی نہ ہوتی تو شاید ٹریفک میں شامل ہوکے ہم خود کو اس کی نظر سے اوجھل رکھتے۔ مگر اس وقت تو ایک ہی کار تھی" میں نے بڑے دکھ کے ساتھ سر ہلایا۔

"وہ.... بیچارا نوجوان! ہماری وجہ سے مارا گیا" غالب نے دل گرفتہ لہجے میں کہا "یہ کہنا کتنا آسان ہوگا کہ اس کا وقت پورا ہوگیا تھا اور اسے یہاں ایسے ہی مرنا تھا۔ لیکن ایسے مرنا کتنا مشکل ہوگیا ہوگا اسے۔ جس کی عمر ابھی مرنے کی نہ تھی۔ جو صرف زندگی کی خوبصورتی کے بارے میں سوچتا ہوگا۔ ہم سے ملنے کے بعد بھی اس کے دل سے موت کے خیال کا گزر تک نہ تھا۔"

"سراج نے ہمارے قتل کی سازش کی تھی لیکن ہم بچ گئے اور وہ مارا گیا جس کے بارے میں ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ کون تھا۔ ورنہ..."

"ورنہ کیا؟ کیا ہم یہ اطلاع دینے جاتے اس کے ماں باپ کو؟" غالب نے تلخی سے کہا "کہ جاؤ فلاں جگہ سے اپنے لختِ جگر کا سوختہ لاشہ اٹھالو۔ اس سے زیادہ آسان تو میرے لئے اعترافِ جرم ہوگا۔ خواہ اس کی سزا کوئی بھی ہو۔"

"یہ میرے لئے بھی ناممکن تھا کہ میں جیتے جاگتے انسان کو جلا کے مار سکوں۔ مگر اس وقت سراج میرے سامنے آجائے تو خدا کی قسم میں اسے باندھ کر اس پر پیٹرول چھڑک سکتا ہوں اور آگ لگا کے اس کے مرنے کا تماشا دیکھ سکتا ہوں" میں نے سگریٹ کو مسل دیا۔ اس کا ذائقہ مجھے خون جیسا لگا تھا۔ اس کے دھوئیں میں جلتے ہوئے لہو کی بو تھی۔

"سکندر!" غالب دیوار سے ٹیک لگا کے کھڑا ہوگیا "کیا تو نے دیکھا تھا کہ اس ٹیکسی کو ایک لاش چلا رہی تھی؟"

"مجھے بھی ایسا ہی لگا تھا۔ جس طرح وہ اسٹیئرنگ پر سر رکھ کے آگے جھکا ہوا تھا، اس سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ ڈرائیور زندہ نہیں تھا۔"

غالب نے دور اٹھنے والے دھوئیں کی لکیر کو دیکھا "سراج نے اسے مار کے ڈرائیور کی سیٹ پر بٹھادیا تھا۔ تاکہ کسی کو شک نہ ہو۔ پھر اسٹیئرنگ کسی اور نے سنبھالا۔ یہاں تک کہ ٹیکسی عین کار کے سامنے پہنچ گئی۔ جب اسے یقین ہوگیا کہ اب ٹیکسی سے کار کے تصادم کو بچانے کی گنجائش ہی نہیں رہی تو وہ خود باہر کود گیا۔ وہاں سڑک بھی تنگ تھی۔"

"دس منٹ میں یہ سب کیسے ممکن ہوا غالب؟"

"اس میں مشکل کیا تھی" غالب نے کہا "سراج نے تعاقب کرنے والی ایک کار کو دیکھا ہوگا تو پلان اس نے راستے میں بنالیا ہوگا۔ وہ انجان بنا ایسے ہی نہیں بیٹھا رہا تھا۔ اس کا شیطانی دماغ کام کر رہا تھا۔ ٹیکسی جیسے ہی رکی ہوگی اس نے ڈرائیور کا کام تمام کردیا ہوگا۔ پھر اس نے اپنے کسی ہوشیار آدمی کو دستی بم دے کر ٹیکسی میں بٹھا کے روانہ کردیا ہوگا۔ بے ہوش ڈرائیور نے یا اس کی لاش نے ٹیکسی کے ایکسیلیٹر کو دبائے رکھا اور ساتھ بیٹھے ہوئے شخص نے صرف اسٹیئرنگ سنبھالا۔ آج تو سڑک بھی خالی تھی۔ اسٹیئرنگ چھوڑنے کے بعد اس نے دستی بم کی پن نکالی اور بم کو وہیں چھوڑ کے خود باہر چھلانگ لگادی۔ دستی بم پانچ سیکنڈ کے بعد پھٹتا ہے۔ پانچ سیکنڈ میں وہ خود خطرے کی حد سے باہر ہوگیا تھا۔ پانچ سیکنڈ میں ٹیکسی کار سے ٹکرا گئی۔"

"ہاں۔ جیسے ہی اس نے چھلانگ لگائی تھی، ٹیکسی لہرا کر کار کے سامنے آگئی تھی" میں نے اس سے اتفاق کیا "ہم تو کود گئے مگر وہ نوجوان پہلے تو کچھ سمجھا ہی نہیں ہوگا پھر اس نے کوشش کی ہوگی کہ کار کو ایک طرف سے بچا کے نکال لے مگر اس کی گنجائش نہیں تھی۔ نہ اتنی جگہ تھی اور نہ اتنی مہلت۔"

غالب نے کہا "وہ آدمی بہت پھرتیلا تھا۔ سراج خود بھی کم پھرتیلا نہیں ہے لیکن ایسے کام وہ خود کیوں کرے گا۔ اس کے لئے کام کے غلام جو ہیں۔"

میں نے ایک گہری سانس لے کے کہا "اس کا مطلب یہ ہے مرزا کہ وہ کہیں بہت ہی قریب موجود ہیں۔"

"ہاں۔ انہیں دھماکے سے بھی خبر مل گئی ہوگی اور جو شخص اس کام کے لئے منتخب کیا گیا تھا وہ بھی پہنچ گیا ہوگا۔ اس نے بھی بتا دیا ہوگا کہ سراج صاحب کی اسکیم کامیاب رہی۔ دشمن مارے گئے۔"

میں نے کہا "سراج یا دلاور اتنی آسانی سے ماننے والے نہیں ہیں۔ وہ تصدیق ضرور کریں گے۔"

غالب نے کہا "ہوسکتا ہے کہ وہ تصدیق کی ضرورت محسوس نہ کریں۔ شک کی گنجائش ہی کہاں ہوگی۔ یقین دلانے والا قسم کھا کے کہے گا کہ ٹیکسی اور کار بالکل سامنے آکے ٹکرائی تھیں اور جب دھماکا ہوا تھا تو دشمن کار میں تھے۔ اس نے ہمیں باہر نکلتے ہوئے نہیں دیکھا ہوگا۔"

"پھر تو ہم اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں" میں نے کہا "اگر ہم اچانک پہنچ جائیں تو انہیں سنبھلنے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔ ابھی تو وہ اس یقین کی خوشی منا رہے ہوں گے کہ ان کی جان ہم سے چھوٹ گئی۔"

"تجھے کچھ اندازہ ہے کہ وہ جگہ کس طرف ہے اور کتنی دور ہے؟" غالب نے پوچھا۔

میں نے سوچ کے کہا "یار! کیوں نہ ہم بھی اسی دیوار کو پھاند جائیں۔"

غالب نے کہا "اب کیا فائدہ۔ دس منٹ میں وہ نہ جانے کہاں پہنچ گیا ہوگا۔ وہ یہاں چھپ کر بیٹھا نہیں رہ سکتا۔"

میں نے کہا "غالب' وہ اندھا دھند نہیں بھاگا ہوگا۔ اسے معلوم ہوگا کہ اس دیوار کے.... دوسری طرف کوئی خطرہ نہیں۔ یہ اس سے نزدیک ترین پناہ گاہ تھی جہاں وہ خود کو محفوظ تصور کرتا ہوگا یا سمجھتا ہوگا کہ اس راستے سے وہ بڑی آسانی سے فرار ہوجائے گا۔ ہمیں اندر جا کے ضرور دیکھنا چاہئے۔ یا تو یہ بھی ان کا ایک ٹھکانہ ہے یا ادھر سے ہم بھی کوئی راستہ تلاش کرسکتے ہیں۔"

میری دلیل نے غالب کو قائل کیا۔ دیوار نو دس فٹ اونچی تھی۔ میں نے اچھل کے اوپر کے کنارے کو گرفت میں لینے کی کوشش کی اور ناکام رہا۔ پھر غالب نے اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں جکڑ کے ایک جھولا سا بنایا جس پر پاؤں رکھ کے میں نے خود کو اوپر اٹھایا اور دیوار پر ہاتھ جما کے آہستہ آہستہ اپنے جسم کے وزن کو کھینچا۔ غالب نے مجھے نیچے سے سہارا دیا اور احتیاط کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے میں نے سر کو تھوڑا سا اوپر اٹھایا اور احاطے کے اندر جھانک کے دیکھا۔ بائیں جانب لکڑی کے ٹوٹے پھوٹے کریٹ ایک ڈھیر کی صورت میں پڑے ہوئے تھے۔ بائیں جانب ایک ریلوے پلیٹ فارم بھی تھا۔ ریلوے لائن پر مال گاڑی کے چار ڈبے کھڑے ہوئے تھے مگر پلیٹ فارم خالی تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ مال لادا جا چکا ہے یا ابھی پہنچا ہی نہیں ہے۔ دائیں جانب اس کے پیچھے ایک گودام تھے جن کے دروازوں پر نمبر پڑے ہوئے تھے اور اوپر "گلاب پلاسٹک اینڈ پینٹ انڈسٹری" کا نام لکھا ہوا تھا۔ جہاں سے میں جھانک رہا تھا وہ گودام کا آفس بلاک تھا۔ پانچ چھ کمروں پر مشتمل یہ عمارت احاطے کی دیوار سے آٹھ دس فٹ دور تھی اور اس کے عقبی حصے کی سب کھڑکیاں بند تھیں۔ اس کے عین مقابل گیٹ تھا جہاں مجھے چوکیدار کے خالی کیبن کے علاوہ قطار میں کھڑے ہوئے چھ خالی ٹرک بھی نظر آرہے تھے۔ ان سب کی سائیڈ پر بھی "گلاب پلاسٹک اینڈ پینٹ انڈسٹری" کا نام لکھا ہوا تھا۔ بہت غور سے دیکھنے پر بھی مجھے کہیں نقل و حرکت کے آثار دکھائی نہ دیئے۔

خدا کا نام لے کر میں دیوار پر چڑھ گیا۔ اگر کوئی کسی گودام کی کھڑکی یا کسی روشندان سے دیکھ رہا تھا تو روشن آسمان کے پس منظر میں میرا وجود اس کے لئے ایک بہت آسان ٹارگٹ تھا لیکن کسی بھی سمت سے نہ کسی نے مجھے للکارا اور نہ کوئی گولی مجھے گرانے آئی تو میں نے ہاتھ بڑھا کے غالب کو بھی اوپر کھینچ لیا اور کوئی آہٹ کئے بغیر ہم دونوں اندر اتر گئے۔

آفس بلاک کے پیچھے چلتے ہوئے میں نے ہر بند کھڑکی کے شیشے سے اندر جھانک کے دیکھا۔ ایک کمرے میں چار میزیں اور کچھ کرسیاں کسی ترتیب کے بغیر رکھی ہوئی تھیں۔ میزوں کی حالت سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہاں منشی ٹائپ کے لوگ بیٹھتے ہوں گے جو آنے اور جانے والے مال کا حساب رکھتے ہوں گے۔ کمرے میں دو ٹیلی فون بھی تھے لیکن کسی قسم کی آرائش نہیں تھی۔ یہاں تک کہ دیواروں کا رنگ بھی برسوں پرانا اور میل سے کالا ہو رہا تھا۔ اس کے دونوں جانب جو کمرے تھے وہ ریکارڈ روم نظر آتے تھے۔ ان میں دیواروں کے ساتھ لگی ہوئی فولادی الماریاں کھڑی ہوئی تھیں اور جتنے شیلف تھے ان پر بے ہنگم و بد صورت فائلوں کے ڈھیر پڑے ہوئے تھے۔ آخری دو کمرے فی الحال کسی کام نہیں آرہے تھے چنانچہ ریسٹ ہاؤس بنے ہوئے تھے۔ ان میں چارپائیاں پڑی ہوئی تھیں اور بستر لپیٹے ہوئے رکھے تھے۔

ہم گھوم کے سامنے گئے تو ایک طویل برآمدہ نظر آیا۔ ایک شخص خاکی وردی پہنے کمر سے ریوالور لٹکائے کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ دوسرا اس کے قریب زمین پر بیٹھا اپنے ایک پاؤں کے ٹخنے پر پٹی باندھنے میں مصروف تھا۔ تکلیف کے آثار اس کی صورت سے عیاں تھے۔ میں نے غالب کی طرف دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں سوال و جواب کرکے ہم نے ایک دوسرے کے خیال کی تائید کی۔ پاؤں کی مرہم پٹی کرنے والا شخص وہی تھا جس نے ٹیکسی کو کار سے بھڑانے کے لئے چلتا چھوڑ کے خود سڑک پر چھلانگ لگادی تھی اور پھر دیوار پھاند گیا تھا۔ اس کے ہاتھوں پر خراشیں تازہ تھیں اور شاید اس کے پاؤں میں بھی موچ آگئی تھی۔

ہم نے ان میں سے کسی کو سنبھلنے کی مہلت نہ دی۔ میں اور غالب ایک جست میں ان کے سر پر جا کھڑے ہوئے۔ کرسی پر بیٹھے ہوئے شخص نے اٹھنے کی اور ریوالور نکالنے کی واجبی سی کوشش کی۔ لیکن غالب کے ریوالور کا رُخ اپنی طرف دیکھ کے اور پولیس کی وردی پر نظر ڈال کے اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ اپنے ٹخنے پر پٹی باندھنے والا صورت سے زیادہ عیار نظر آتا تھا۔

اس نے ماتھے پر بل ڈال کے اپنی کنجی آنکھوں سے مجھے گھورتے ہوئے کہا "یہ کیا بدمعاشی ہے؟ چھٹی والے دن چھاپا مارنے آئے ہو اور وہ بھی چوروں کی طرح۔ آپ کے مطلب کی یہاں کوئی چیز نہیں ہے تھانے دار صاحب۔"

میں نے غرا کے کہا "مطلب کی چیز ہم پیدا بھی کرلیتے ہیں اور نکال بھی لیتے ہیں۔"

غالب نے سر ہلایا "مثلاً یہ جو چیز پیچھے رکھی ہوئی ہے' ہمارے مطلب کی ہے" اس نے پاؤں پر پٹی باندھنے والے کی طرف اشارہ کیا۔

کنجی آنکھوں والے نے غالب کو خوں فشاں نظروں سے گھورا "فضول باتیں مت کرو۔ یہاں نہ اسمگلنگ کا مال ہے نہ چوری کا۔ اور تم کو شک ہے تو سیٹھ سے بات کرو پہلے۔"

میں نے لات گھمائی "سیٹھ سے بھی بات کرلیں گے۔ پہلے تم سے تو تعارف ہوجائے۔"

وہ لڑھک کے چبوترے سے نیچے جا پڑا۔ کرسی پر بیٹھے ہوئے شخص نے ایک بار پھر اٹھنے کی کوشش کی لیکن غالب نے کندھے پر ہاتھ رکھ کے اسے روک دیا۔ میں نیچے کود گیا۔ میں نے اس کے ٹخنے پر ٹھوکر ماری "سیدھے کھڑے ہوجاؤ!"

کنجی آنکھوں والا بڑی مشکل سے اٹھا "آخر تم کیا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا "میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تمہارے پیر میں موچ کیسے آگئی؟"

اس کے ردِ عمل نے میرے شک کو یقین میں بدل دیا کہ وہی اصل مجرم ہے۔ وہ پہلے چونکا تھا مگر فوراً سنبھل کے انجان بھی بن گیا تھا۔ تاہم میرے سوال نے اسے خوف میں مبتلا کردیا تھا۔

"یہ... ٹھوکر لگنے سے پاؤں مڑ گیا تھا۔"

میں نے اسی پاؤں پر دوسری کک ماری۔ "ٹوٹا تو نہیں ہے نا؟"

وہ بلبلایا "ایسے... ایسے تو ٹوٹ جائے گا۔"

میں نے کہا "انشاء اللہ۔ اب خیر سے یہ فرماؤ کہ کہیں دیوار سے کودتے ہوئے تو یہ موچ نہیں آئی تھی؟ یا کسی چلتی ہوئی کار سے چھلانگ مارنے سے تو پیر نہیں مڑا تھا؟"

وہ درد سے کراہ رہا تھا اور ایک پاؤں پر لڑکھڑا رہا تھا "مجھے نہیں معلوم کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔"

میں نے اسے اوپر اٹھا کے چبوترے پر بٹھا دیا اور اس کی زخمی ٹانگ پکڑ لی "میں آسان زبان بول رہا تھا اور سوال تم نے سنا تھا۔ اب مجھے جواب چاہئے۔"

آہستہ آہستہ میں نے اس کے ٹخنے پر لپٹی ہوئی پٹی کو کھولنا شروع کیا۔ اس نے میری نیت کا اندازہ کرتے ہوئے مزاحمت کرنے کی کوشش کی۔ میں نے اس کے منہ پر الٹے ہاتھ سے ایک ایسا جھانپڑ رسید کیا کہ وہ چبوترے پر لیٹ گیا۔

"میں کم سے کم وقت میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ سراج کہاں ہے" میں نے اس کے پاؤں کو دائیں بائیں ہلاتے ہوئے کہا۔

وہ خود بھی دائیں بائیں کروٹیں لینے لگا اور ہائے ہائے کرنے لگا "میں کسی... سراج...."

"ہاں.... تم سراج کو نہیں جانتے۔ تم مجھے بھی نہیں جانتے" میں نے اس کے ٹخنے کو ایک جھٹکا دے کے موڑا۔

اس نے ایک چیخ ماری۔ درد کی شدت کا اظہار اس کے چہرے پر نظر آنے والی اذیت سے ہوتا تھا "ہائے میں مرگیا..!!"

میں نے کہا "مرنے میں ابھی دیر ہے۔ ابھی تمہارے اس پیر کے جوڑ الگ ہوں گے۔ تمہارا پنجہ گھوم کے پیچھے ہوجائے گا اور پھر تمام عمر ایسے ہی رہے گا جیسے چڑیل کے پاؤں ہوتے ہیں" میں نے اس کے پاؤں کو مزید بل دیا۔

وہ زمین پر ہاتھ مارتے ہوئے تڑپا۔ اس کا جسم پلٹنے لگا مگر پنجے پر میری گرفت اتنی مضبوط تھی کہ وہ ٹانگ نہ چھڑا سکا۔

"بولو.... سراج کہاں ہے؟ ورنہ اس پاؤں کے بعد دوسرے پاؤں کی باری ہے پھر دونوں ہاتھوں کی" میں نے کہا۔

کرسی پر بیٹھا ہوا شخص چلّانے لگا "تھانے دار جی! یہ مرگیا تو؟"

"تو کیا؟" میں نے سوال کیا "کیا فرق پڑے گا تمہیں یا مجھے یا اس دنیا کو.... یا سراج کو؟" میں نے محسوس کیا کہ کنجی آنکھوں والا جسمانی اذیت برداشت کرنے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتا ہے۔ شاید وہ ان لوگوں میں سے تھا جو مرجاتے ہیں مگر لب نہیں کھولتے۔ یہ آزمانے کے لئے میں نے ایک آخری جھٹکا دیا۔ اس کے ٹخنوں کی ہڈیاں کڑکڑائیں اور اس نے ایک دل خراش چیخ مار کے مجھ پر حملہ کیا۔ اس کا پنجہ اب واقعی لٹک کے مضحکہ خیز انداز میں گھوم گیا تھا۔

میں نے اس کے منہ پر بھرپور مکا رسید کیا۔ وہ ایسے واپس گرا کہ اس کا سر فرش سے ٹکرایا۔ ذرا سی دیر کے لئے اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ وہ بڑے بھیانک طریقے سے رو رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں کے کناروں سے رال بہہ رہی تھی اور آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے۔ اس کا چہرہ پسینے میں تر تھا۔ کرسی پر بیٹھا ہوا شخص اس کی حالت پر دہشت زدہ بیٹھا تھا۔ میں نے اس کا دوسرا پاؤں پکڑ لیا۔

"سراج کہاں ہے؟" میں نے کہا "جس نے تمہیں ٹیکسی میں بھیجا تھا۔ ایک بم دے کر اور ایک ڈرائیور کی لاش دے کر کہ جاؤ اس ٹیکسی کو اس کار سے ٹکرا دو" میں نے اس کے دوسرے پاؤں کو تھوڑا تھوڑا گھمانا شروع کیا مگر وہ آسانی

زیر ہونے والا شخص نہیں تھا اور مجھے یہ اندیشہ لاحق ہونے لگا تھا کہ اس کی قوتِ برداشت میرے ارادوں کو شکست دے سکتی ہے۔"

وہ پاگلوں کی طرح چیخنے اور مجھے گالیاں دینے لگا لیکن میں نے پروا نہیں کی۔ اس کی ضد نے مجھے زیادہ سفاک بنادیا تھا۔ ویسے بھی میں اس شخص کے ساتھ کوئی رعایت کیسے کرسکتا تھا جس نے ایک ساتھ بہت سے ایسے سنگین جرائم کا ارتکاب کیا تھا کہ ان میں سے ہر جرم کی سزا موت ہی ہوسکتی تھی۔ اس نے میری اور غالب کی جان لینے کی کوشش کی تھی اور ایک بے گناہ نوجوان کو زندہ جلادیا تھا۔ ایک ٹیکسی ڈرائیور کی لاش کو اپنے مذموم مقاصد کے حصول کے لئے استعمال کیا تھا۔ وہ ایک عام ٹیکسی ڈرائیور تھا جس کا کوئی خاندان بھی ہوگا۔ جس کے لئے وہ ٹیکسی ذریعۂ معاش تھی۔ اور وہ میرے وطن کے غداروں کا ساتھی بھی تھا۔

دوسرا پنجہ ٹوٹنے سے پہلے وہ بے ہوش ہوگیا۔ اب اس کی لاتیں چبوترے سے نیچے لٹکی ہوئی تھیں اور پیر صرف پنڈلی کی کھال سے جڑے ہوئے الگ جھول رہے تھے۔ اس کی پتلون بھی پیشاب خطا ہوجانے سے گیلی ہوچکی تھی اور اس کی زبان دانتوں کے درمیان دبی رہ گئی تھی چنانچہ تھوک کے ساتھ خون بھی بہہ کر باچھوں سے گر رہا تھا۔

کرسی پر بیٹھا ہوا شخص اس کی حالت کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے بھی بہت منت سماجت کی تھی اور ہاتھ جوڑے تھے لیکن نہ میں نے اس کی طرف دھیان دیا تھا اور نہ غالب نے۔ وہ کانپ رہا تھا اور ہمیں یقین دلانے میں مصروف تھا کہ وہ واقعی سراج کو نہیں جانتا۔

میں نے ہاتھ جھاڑ کے کہا "تم بھی نہیں جانتے سراج کو؟"

اس کی حالت غیر ہوگئی "آپ.... بولو.... میرے کو بتاؤ وہ کون ہے۔ کیسا ہے۔ پھر میں بتاؤں گا۔ اگر میرے کو معلوم دئیں گا۔"

اچانک مجھے احساس ہوا کہ بنیادی طور پر میرے سوال میں یک سقم تھا۔ یہ ضروری تو نہیں کہ یہاں بھی وہ سراج ہی کہلاتا ہو۔ یہ اس کا اصلی نام تھا جو صرف ہم جانتے تھے یا اس کے کالے دھندوں کے ساتھی۔ یہاں ضرور وہ کسی دوسرے نام سے مشہور ہوگا۔

میں نے کہا "یہ شخص ابھی کچھ دیر پہلے اس دیوار کو پھاند کے آیا تھا؟"

اس نے اقرار میں سرہلایا "آیا تھا۔"

میں نے کہا "تم نے اس کے آنے سے ایک منٹ پہلے لوئی دھماکا بھی سنا ہوگا؟"

"سنا تھا... ابھی ہم بولیں گا۔ آپ کو سب بولیں گا۔ جتنا اپن جانتا ہے وہ بتائیں گا مگر آپ مہربانی سے اپن کو مت مارو۔ اپنا کسی کے ساتھ کوئی دھندہ نئیں ہے۔ اپن اس کو بھی بوہت بولا کہ سالا کسی لفڑا میں مت پڑ۔ اپن چوکیدار لوگ ہیں۔ چور سے اپن کا کیا دھندا مگر یہ سالا شراب اور ریس کا واسطے اور چھوکری کا واسطے بوہت گول مال کرتا۔"

میں نے کہا "اس کی سوانح حیات کے اوراقِ رنگین سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں، مختصر بات کرو۔ دھماکے سے پہلے اس نے کچھ بتایا تھا تمہیں؟"

اس نے نفی میں سرہلایا "یہ ادھر سے آیا۔ اندر آکے ٹیلی پھون پر بولا کہ سب خلاص ہوگیا۔ پھر ادھر آکے اپن کو بولا کہ ابھی یہ آخری چانس تھا۔ اب اپن سالا دارو نئیں پئیں گا اور گوا بھاگ جائیں گا۔ ادھر اپنا ماما...."

"مامے کو گولی مارو۔ یہ بتاؤ اس نے فون کسے کیا تھا؟"

"اپن کو نئیں مالوم ماں قسم۔ ورنہ اپن بتاتا۔ اس نے ادھر بیٹھ کے بولا "ابھی سالا اپنا لاٹری بن گیا۔ سیٹھ اپن کو بولا کہ پانچ منٹ میں دس ہزار بنائیں گا؟ اپن بولا۔ ایک دم بنائیں گا۔ سیٹھ بولا کہ ڈریں گا تو مریں گا اپن بولا کہ ایسا مافک ایک بار مریں گا۔ ڈریں گا تو دس بار مریں گا۔ تم کام بولو۔ اس نے کام بولا۔ اور ابھی اپن اکھا کام خلاص کرکے آیا ہے" ہم پوچھا کہ کس کو خلاص کیا ہے؟ یہ بولا کہ اپن کو نئیں مالوم۔ اپن کام کیا۔ اب ادھر تیرا سامنے دس ہزار لیں گا۔ سیٹھ بولا کہ تم ادھر ٹھہرو۔ ہم آتا پڑا ہے۔"

"سیٹھ یہاں آکے دس ہزار دینے والا تھا؟" میں نے کہا۔

اس نے اقرار میں سرہلایا "یہ ایسا مافک ہی بولا تھا۔"

میں نے تشویش سے غالب کی طرف دیکھا "اس کا مطلب تو یہ ہے کہ وہ آنے ہی والا ہوگا۔ تم سیٹھ کو جانتے ہو؟"

اب اس نے نفی میں سرہلایا "ماں قسم، ادھر اپنا واسطے تو سب سیٹھ ہے۔ تم بھی سیٹھ ہے۔"

میں نے کہا "اچھا اندر چلو۔ اسے بھی اٹھاؤ۔"

وہ چلّانے لگا "تم اپن کو اندر لے جاکے گولی ماریں گا۔"

میں نے کہا "اگر تم نے تعاون نہیں کیا تو میں واقعی گولی ماردوں گا' جلدی کرو۔ اٹھاؤ اسے۔ کہیں سیٹھ نہ آجائے۔"

اس نے اپنے ساتھی کو کھینچ کر اٹھانے کی کوشش کی اور پھر گھسیٹ کے اندر لے گیا "سالا کاہے کو دس ہزار کا واسطے اتنا لفڑا کیا۔ ابھی کیا ملا تیرے کو۔ بول" وہ خود کلامی کے انداز میں اس سے باتیں کرتا رہا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ نہ سن سکتا ہے اور نہ جواب دے سکتا ہے۔

میں نے کہا "یہ دوست ہے تمہارا؟"

اس نے کہا "دوست سالا کون ہوتا ہے کسی کا۔ یہ اپنا ساتھی ہے۔ یہ بھی چوکیدار ہے۔ اپن بھی چوکیدار ہے لیکن اپن چوری کا دھندا نئیں کرتا۔ یہ چوری بدمعاشی سے مال کمایا کدھر گیا وہ مال؟ سب بدمعاشی میں چلا گیا۔ ابھی خود اتنا تکلیف میں ہے تو مرتا کیوں نئیں سالا۔"

میں نے کہا "تمہیں بہت احساس ہے اس کی تکلیف کا؟"

اس نے کہا "اپن کیا کرے؟ یہ سالہ ایسا لولا لنگڑا مافک کیسے جئیں گا۔"

میں نے کہا "یہ تو ٹھیک کہا تم نے۔ ایسی زندگی سے موت بہتر ہوگی۔ ویسے بھی اس کے لئے سزائے موت ناگزیر تھی۔ تمہاری خاطر میں اس کی تکلیف ختم کردیتا ہوں۔"

میں نے ٹوٹے ہوئے پنجوں والے شخص کا سر ایک ہاتھ میں بالوں سے پکڑ کے تھوڑا سا اٹھایا اور اس کی گردن پر دوسرے ہاتھ کی کھڑی ہتھیلی ماری۔ اس کی گردن ٹوٹ گئی۔ نیم تاریک کمرے کی خاموشی میں ہڈی کے چٹخنے کی آواز یوں سنائی دی جیسے کسی نے خشک ٹہنی کو توڑ دیا ہو۔ اس کے جسم نے ایک جھٹکا لیا اور ساکت ہوگیا۔

"یہ تم... کیا کردیا؟" چوکیدار نے بے خیالی میں کہا۔

"وہی جو تم چاہتے تھے۔ وہی جو اس کے ساتھ ہونا چاہئے تھا۔ یہ قاتل تھا۔ سزائے موت سے کیسے بچ سکتا تھا" میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

دور باہر سے کسی نے کار کا ہارن بجانا شروع کیا۔

غالب نے کہا "یہ شاید وہی سیٹھ ہوگا۔"

چوکیدار نے کہا "ابھی اپن... دیکھے گا..."

میں نے اسے گھور کے کہا "جاکے گیٹ کھول دو اور سیٹھ صاحب کو یہاں لے آؤ۔ اسے بالکل شک نہیں ہونا چاہئے۔"

غالب نے کہا "اگر اسے کچھ معلوم ہوا۔ یا ہمیں شک ہوا کہ تم نے اس سے کچھ کہا ہے تو ہم تمہیں بھی اسی طرح ختم کردیں گے۔ ابھی تم مرنا تو نہیں چاہتے نا؟"

"ماں قسم اپن کو مت مارو" وہ ہاتھ جوڑ کے بولا "جیسا تم بولیں گا اپن ویسا ہی کریں گا۔"

کار کا ہارن پھر سنائی دیا۔ چوکیدار کمرے سے نکل کے آگے بڑھا۔ چبوترے سے اترا اور احاطے کو عبور کرکے گیٹ تک پہنچا۔ غالباً گیٹ کی جھری میں سے کسی نے اس کو آتا ہوا دیکھ لیا تھا کہ کار کا ہارن پھر سنائی نہیں دیا۔ چوکیدار نے ایک چھوٹی سی کھڑکی کھول کے جھانکنے کے بعد فولادی گیٹ کا ایک پٹ کھول دیا۔ میں اور غالب بڑی بے چینی سے اس سیٹھ کی صورت دیکھنے کے لئے ایک کھڑکی کے پیچھے کھڑے ہوئے تھے۔ کھڑکی کے شیشے سے باہر کا پورا منظر واضح ہوتا تھا مگر اندر کی تاریکی میں کوئی ہماری موجودگی کو نوٹ نہیں کرسکتا تھا۔

کار گیٹ سے آگے آئی تو میرا دل کامیابی کی خوشی سے دھڑکنے لگا۔ سیٹھ وہی سابق ایس ایس پی سراج تھا جو اب ایک سفید رنگ کی کار میں ہمارے قاتل کو "انعام" دینے وہاں پہنچا تھا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ انعام کیا ہوگا۔ وہ بے وقوف جو ہمارے ہاتھوں مارا گیا تھا' اگر زندہ رہتا تو سراج کے ہاتھوں مارا جاتا۔ اس نے دس ہزار پیشگی لے کر اپنی موت کا خود سامان لیا تھا۔ سراج یہاں آکے اس سے تصدیق کرتا کہ واقعی وہ سب مارے گئے جو اس کا تعاقب کررہے تھے اور مطمئن ہوجانے کے بعد جیب میں ہاتھ ڈالتا۔ دس ہزار کے نوٹوں کی گڈی کے بجائے وہ ریوالور نکالتا اور صرف ایک گولی چلا کے کہتا کہ شاباش' تم نے تو کمال کردیا مگر اب تمہارا زندہ رہنا میرے حق میں نقصان دہ ثابت ہوسکتا ہے۔ پھر وہ دوسری گولی اس قتل کے عینی شاہد کو مارتا اور ہاتھ جھاڑ کے یہاں سے چلا جاتا۔

اس نے اپنی کار عین چبوترے کے سامنے روکی اور نیچے اتر کے چوکیدار کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔ چوکیدار گیٹ کو بند کرنے کے بعد بڑے مردہ قدموں سے واپس آرہا تھا۔ اس نے دور ہی سے اشارہ کرتے ہوئے سراج کو بتانے کی کوشش کی کہ وہ کمرے میں چلا جائے مگر سراج بہت مطمئن اور پُر اعتماد تھا۔ وہ کوئی رسک لینے کے موڈ میں نہیں تھا۔ چنانچہ وہ چوکیدار کے ساتھ ہی اندر آیا۔

باہر کی روشنی کے بعد اس کی آنکھوں کو کمرے کی تاریکی سے مانوس ہونے میں چند سیکنڈ لگے۔ وہ دروازے سے گزر کے رکا۔ پھر اس کی نگاہ نے کمرے کے وسط میں پڑی ہوئی لاش کو دیکھا۔

"یہ... اسے کیا ہوا ہے؟" سراج نے پلٹ کے کہا۔

اس وقت تک میں اس کے پیچھے پہنچ چکا تھا۔ شاید اپنی زندگی میں وہ کبھی اتنا حیران نہیں ہوا ہوگا جتنا مجھے وہاں دیکھ کے ہوا۔ کوئی آہٹ کئے بغیر میں اس کے اتنے قریب پہنچ گیا تھا کہ چاہتا تو آسانی سے اس کی گردن مروڑ سکتا تھا۔ حیرت اور صدمے کے بعد خوف نے سراج کو مفلوج کردیا تھا۔

"تم....؟" اس نے بڑی مشکل سے کہا۔

میں نے مسکرا کے کہا "کیا تم کسی اور سے ملنے کے لئے آئے تھے؟"

اب دوسرے گوشے کے اندھیرے سے غالب بھی سامنے آگیا "ہوسکتا ہے یہ مجھے گرفتار کرنے آئے ہوں؟"

آہستہ آہستہ سراج کی صورت پر مایوسی پھیل گئی۔ ریوالور نہ میرے ہاتھ میں تھا اور نہ غالب کے مگر سراج بہت اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کا اور میرا کوئی مقابلہ نہیں۔ اس نے ریوالور نکالنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس کوشش کا انجام کیا ہوگا۔ اس سے پہلے کہ وہ ریوالور نکالتا' میں اس کا ریوالور کی طرف بڑھنے والا ہاتھ توڑ دیتا۔

"جیسا کہ انگریز کہتے ہیں کہ یہ دنیا بہت مختصر سی جگہ ہے۔ دیکھ لو، ہم کتنی جلدی پھر مل رہے ہیں،" میں نے کہا "آج تم بڑے موقع سے آئے ہو سراج۔ ہمیں تمہارے جیسے ہی کسی آدمی کی ضرورت تھی۔"

سراج نے نفرت سے زمین پر مردہ پڑے ہوئے شخص کی طرف دیکھا "تو اس کتے نے تمہیں سب کچھ بتادیا ہے۔"

میں نے کہا "اب تم اسے انسان کہو یا کتا.... کیا فرق پڑتا ہے؟ یہ محض مردہ گوشت اور ہڈیوں کا ایک بے حس ڈھیر ہے

جو بہت جلد ڈی کمپوز ہو کے مٹی میں مل جائے گا۔ موت سب کو برابر کر دیتی ہے۔ اشرف المخلوقات اور حشرات الارض سے لے کر ہاتھی، شیر، ہوا میں اڑنے والے جانور اور سمندر کی مخلوق، پودے اور درخت سب خاک میں مل جاتے ہیں۔ کیسا دھوکا دیتی ہے موت آدمی کو... تم کسے مروانا چاہتے تھے اور مارا کون گیا؟ اور جسے اب تم خود مارنے آئے تھے وہ پہلے ہی ہمارے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچ چکا ہے۔ اجل کا اگلا شکار کون ہوگا؟ یہ فیصلہ وقت خود کرے گا۔"

سراج کا رنگ اڑ گیا تھا۔ شاید اس کی عقل ماؤف ہو گئی تھی اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اپنی جان بچانے کی کیا تدبیر کرے۔ اپنی کیا صفائی پیش کرے اور کس طرح ہمیں قائل کرے کہ وہ بے قصور ہے... اس میں جھوٹ بولنے کی ہمت بھی باقی نہ رہی تھی۔

غالب نے کہا "تم انعام کے دس ہزار روپے لائے ہو؟"

سراج چونکا "کیسا انعام؟"

میں نے کہا "جو تم اس کرائے کے قاتل کو اس کی بے مثل کارکردگی پر دینا چاہتے تھے۔ اس نے واقعی غیر معمولی ہمت، ذہانت اور پھرتی کا مظاہرہ کیا۔ اگر اسے چند سیکنڈ کی تاخیر ہو جاتی تو ہم اس کے ہاتھ میں ہی پھٹ جاتا یا یہ خود ٹیکسی ڈرائیور کی لاش کے ساتھ ہماری کار میں گھس جاتا۔"

سراج نے کہا "میں سمجھا نہیں۔"

میں نے اس کے منہ پر ایک مکا مارا "تم سمجھے نہیں کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں۔ تم واقعی بہت بھولے ہو... لیکن بہت جلد تم وہ سب کچھ سمجھ لوگے سراج جو آج تک تم نے نہیں سمجھا تھا اور کبھی تسلیم نہیں کیا تھا۔ کہ جب وقت بدلتا ہے تو جو اندھیرے میں ہیں وہ اجالے میں آ جاتے ہیں اور جو اندھیرے میں ہوتے ہیں وہ روشنی میں نظر آتے ہیں۔ ایسا پہلے بھی ہوا ہے کہ جو قید و سلاسل کے روز و شب کی سختی جھیل رہے تھے وہ انقلابِ زمانہ سے مالکِ تخت و تاج ہوئے اور وہ جو غاصب تھے اور بادشاہی کے زعم باطل میں بھولے ہوئے تھے کہ ع۔ ثبات.... ایک تغیر کو ہے زمانے میں.... وہ ان کی جگہ وراثِ زنداں ہوئے۔ یہ بات تمہیں بہت فلسفیانہ لگی ہوگی مگر آج تمہیں دیکھ کے مجھے نمرود کی خدائی یاد آ گئی۔ کیا تمہیں وہ وقت یاد ہے جب میں تمہارے اختیار اور اقتدار اور ظلم و ستم کی چکی کے دو پاٹوں میں پس گیا تھا؟ اس وقت میں ملزم تھا اور تم منصف بھی تھے اور جلاد بھی۔ آج ایک انگریزی محاورے کے مطابق۔ تم میرے جوتوں میں ہو اور میں تمہارے جوتوں میں۔"

سراج نے آستین سے وہ خون صاف کیا جو اس کا ہونٹ پھٹ جانے سے نکلا تھا "گویا تم اب انتقام لوگے مجھ سے؟ ضرور لو۔ لیکن یہ بھی یاد رہے کہ تم بچ نہیں سکوگے۔"

میں نے اس کی فضول دھمکی کو نظر انداز کر دیا "غالب! ایس ایس پی صاحب کی جامہ تلاشی لو۔ ان کے کپڑے اتار کے، جیسا کہ تھانے میں ہوتا ہے۔ میں اس جگہ کو ایم آر ایس کا تفتیشی مرکز قرار دیتا ہوں۔"

"میں نہیں ڈرتا کسی تفتیش سے۔ ایس پی سکندر صاحب" سراج نے تلخی سے کہا اور خود اپنے کپڑے اتار کے غالب کی طرف پھینک دیئے۔

"مجرم کے ہاتھ کمر کے پیچھے باندھ دو" میں نے کہا۔ "چوکیدار سے پوچھو یہاں کوئی رسی ہے۔"

غالب باہر گیا اور چند منٹ میں لوٹ آیا۔ اس نے ایک چارپائی سے پیروں کی جانب والی نائیلون کی رسی کھول لی تھی جو چارپائی کی بُنائی کو ٹائٹ رکھنے کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ یہ تقریباً دس گز لمبی رسی تھی۔

"ہمارے پاس بہت وقت ہے اور اتفاق سے آج چھٹی بھی ہے چنانچہ کسی کی مداخلت کا کوئی امکان نہیں" میں نے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جس میں پنکھے کا خالی ہک نظر آ رہا تھا۔

سراج نے کہا "دیکھو.... یہ سب غیر ضروری ہے۔ تم کو جو کچھ پوچھنا ہے پہلے ایسے ہی پوچھ لو۔"

"تم ایسے ہی بتا دوگے؟" میں نے کہا "چلو ٹھیک ہے، آسان کام کو مشکل طریقے سے کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

میں نے اسے دونوں کمروں کی درمیانی کھڑکی کے ساتھ کھڑا کر دیا اور باقی رسی کو اس کی کمر کے گرد اور کھڑکی کے فریم کی آہنی سلاخوں کے ساتھ ایسے باندھ دیا کہ اب وہ صرف سیدھا کھڑا رہ سکتا تھا۔ اس کے لئے سانس لینے کی گنجائش تھی مگر وہ جسم کو حرکت نہیں دے سکتا تھا۔ رسی کے آخری سرے کو میں نے سراج کی گردن کے اوپر سے یوں گزارا کہ اس کا سر دو سلاخوں کے درمیان پھنس گیا۔ رسی اتنی ٹائٹ نہیں تھی کہ اس کی سانس کی نالی پر دباؤ پڑتا مگر وہ سر آگے جھکاتا تو یہی ہوتا۔

"ایس پی صاحب، میرے سوالات اتنے مشکل بہرحال نہیں ہیں جتنے آپ کے حکم پر مجھ سے پوچھے گئے تھے۔ ایک اور فرق یہ ہے کہ میں ان سوالات کے جوابات واقعی نہیں جانتا تھا ورنہ جو مجھ پر اپنے وطن پہنچتے ہی تھانے میں ایک رات بیتی تھی، وہ میرے لئے ناقابلِ تصور اذیت تھی اور میری قوتِ برداشت سے بہت زیادہ تھی۔ تم سوالوں کے جواب دے سکتے ہو کیونکہ تمہیں سب معلوم ہے۔ تم آسانی سے بھی سب کچھ بتا سکتے ہو اور اگر اپنی قوتِ برداشت آزمانے کا ارادہ ہے تو اپنے آپ کو میری جگہ تصور کرو اور سمجھو کہ یہ ویسی ہی ظلم کی رات ہے۔"

سراج نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری "میں کہہ چکا ہوں کہ جو معلوم ہوگا ضرور بتاؤں گا۔ پھر یہ سب کیوں؟"

میں نے اس کے سامنے جا کے کہا "دلاور کا مال یہاں سے کب روانہ ہوگا؟ اس میں کتنے ٹرک ہوں گے اور وہ کہاں جائیں گے؟"

"نہیں... ابھی دلاور سے مال نہیں" سراج نے ہکلا کے کہا۔ "ورنہ بتا دیتا۔"

غالب نے مجھے ایک رسی کا ٹکڑا پیش کیا جو چار ٹکڑوں کو آپس میں بل دے کر ملانے سے ایک انچ موٹا رسّا بن گیا تھا۔

"سر جی! تیرہ نمبر کا چھتر بننے میں وقت لگے گا۔ آرڈر ابھی دیا ہے" غالب نے کہا "ایک چھ نمبر کا اور ایک سات نمبر کا چلے گا؟"

"چلے گا" میں نے ایک گز کے رسّے کو ہوا میں شائیں شائیں گھما کے تعریفی انداز میں سر ہلایا "پہلے اس کو پانی میں بھگو کے لاؤ۔"

سراج چلّانے لگا "میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔"

میں نے اِدھر اُدھر دیکھ کے ایک ہوائی چپل اٹھائی "یہ سات نمبر اور یہ بھی سات نمبر۔ ہمارے تھانے میں چودہ نمبر کا چھتر وہی کام کرتا ہے جو تمہارا روایتی تیرہ نمبر والا" میں نے اسے دونوں ہاتھوں میں ایک ایک چپل اٹھا کے دکھائی اور پھر اس کے گالوں پر پے در پے دونوں جانب سے وار کئے۔ چٹاخ چٹاخ کی آواز کے ساتھ سراج کا منہ دائیں بائیں ہوتا رہا۔ اس کے گال سرخ پڑ گئے۔

"کچھ یاد آیا کہ میں نے کیا پوچھا تھا؟" میں نے چپل پھینک کے سگریٹ جلائی اور ایک طویل کش لیا۔

"جو.... جو بات میں نہیں جانتا.... وہ مر کے بھی نہیں بتا سکتا" اس نے کراہ کے کہا۔

میں نے اس کے درد سے جلتے ہوئے گالوں پر ایک دم سگریٹ رکھ کے دبا دی۔ وہ تڑپا اور بلبلایا۔ میں نے پھر سگریٹ جلائی اور اس کے دوسرے گال پر رکھ دی۔ گالوں کے درمیان دو گہرے، سرخ خونی گڑھے سے نمودار ہو گئے۔

"تمہاری یادداشت بہت جلد بحال ہو جائے گی۔ تمہیں یاد آ جائے گا کہ مال کب جائے گا۔ کتنے ٹرکوں میں ہوگا اور ٹرک کس راستے سے جائیں گے" میں نے دوسری سگریٹ جلائی۔

غالب نے مجھے رسی کا بھیگا ہوا ٹکڑا پیش کیا جو اب ایک سخت کوڑا بن چکا تھا۔

"افسر کو تکلیف دیتے ہو؟" میں نے غالب کو ڈانٹا "کوئی کام خود بھی کر لیا کرو۔"

"آپ حکم کرو جناب۔ میں چمڑی، گوشت، ہڈی سب الگ کر کے رکھ دوں" غالب نے کہا اور گھوم کے پوری قوت سے سراج کے جسم پر وار کیا۔ سراج تڑپ کے چلّایا۔ رسی نے اس کے گوشت پر ایک خونی لکیر بنا دی تھی۔

"بڑی نازک کھال ہے ایس پی صاحب کی" غالب نے کہا۔

میں نے افسرانہ شان بے نیازی کے ساتھ سگریٹ کا کش لے کے سراج کی طرف دیکھا "ہاں بھئی، اپنے سراج صاحب! کیسا لگتا ہے آپ کو؟ کل جو مجرم تھا وہ آج تھانے دار ہے۔ اور آپ جو اتنے بڑے افسر تھے زیرِ تفتیش ہو۔ اسی مجرم کے سامنے۔"

"میرا خیال ہے ایس پی صاحب کی کھال ضائع نہیں کرنی چاہئے۔ ایسے ہی اتار لیتے ہیں۔ میں اپنی گھر والی کے لئے جوتے بنوا لوں گا۔"

"بے وقوف! حرام جانور کی کھال کے جوتے پہنائے گا اسے" میں نے کہا "اس کی کھال میں صرف بُھس بھرا جا سکتا ہے۔"

سراج کی حالت غیر ہونے لگی تھی "خدا کے لئے.... رحم کرو"

میں نے کہا "رحم کی درخواست کے ساتھ سوالوں کے جواب ہوں تو غور کیا جا سکتا ہے۔"

غالب نے دوسری طرف سے ایک اور وار کیا۔ شائیں کی آواز کے ساتھ ہی سراج کی چیخ نکلی اور اس کے جسم پر دوسری خونی لکیر ایسے بن گئی کہ ایک کراس نظر آنے لگا۔ اس کا سر ڈھلک گیا۔ میں نے بال پکڑ کے اس کے سر کو تھوڑا سا اوپر اٹھایا اور یہ دیکھنے کے لئے کہ وہ سچ مچ بے ہوش ہے یا مکر کر رہا ہے، سگریٹ اس جگہ رکھ دی جہاں کراس کی دونوں لکیریں ملتی تھیں۔ وہ ایک دم اچھلا اور اس کے منہ سے غلیظ گالیوں کا سیلاب امڈ آیا۔

میں قہقہہ مار کے ہنسا "ابھی تو کچھ نہیں ہوا سراج۔ سوچو، اس نوجوان نے کیسی اذیت برداشت کی ہوگی جو اپنی ہی کار میں زندہ جل گیا۔ تم اندازہ کر سکتے ہو کہ جسے تم نے دس ہزار کے انعام کا لالچ دے کر بھیجا تھا، اس کی موت کتنی پُرعذاب تھی۔ دیکھو اس کی لاش کو۔ یہ آدمی کہاں کہاں سے ٹوٹ چکا ہے۔ صرف دس ہزار کے جھوٹے وعدے پر اس نے اپنی جان دے دی لیکن کچھ بتایا نہیں۔"

"اگر یہ کچھ بتا دیتا تو شاید بچ جاتا" غالب نے کہا "مجرم تو یہ بھی تھا مگر مجبور بھی تھا۔ تم مجبور نہیں جابر ہو۔ جبر تم نے کیا تھا، تمہارے لئے رعایت نہیں ہے۔"

میں نے کہا "میرے پہلے سوال کو ذہن میں رکھو اور دوسرا سوال سنو۔ گولڈن فالکن۔ ستائیسواں میل پلھوترہ۔ یہ ایک معمہ ہے۔ کیا تم اس کا مطلب جانتے ہو؟"

سراج نے لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ "مجھے اور.... اور کچھ بھی بتاؤ تفصیل سے..."

"تفصیل ہی تو میں پوچھ رہا ہوں تم سے" میں نے کہا۔ "تمہارے پاس سوچ کر جواب دینے کے لئے پانچ منٹ ہیں۔"

میں غالب کے ساتھ باہر آیا تو مجھے وہ چوکیدار نظر آیا جس نے ہم سے تعاون کیا تھا۔ اس کا رنگ لاش کی طرح سفید ہو رہا تھا اور وہ دیوار سے ٹیک لگائے خلا میں گھور رہا تھا۔ وہ اتنا دہشت زدہ تھا کہ اس میں ہم سے کوئی سوال پوچھنے کا حوصلہ بھی نہ رہا تھا۔ ورنہ وہ ضرور پوچھتا کہ آخر یہ سب کیا ہے۔

" مرزا غالب! کیا خیال ہے اب ؟ "
غالب نے کہا " اس کو پہلے سوال کا جواب معلوم ہونا چاہئے۔ "

میں نے کہا " وہ ایک بزدل آدمی ہے۔ اگر اسے معلوم ہوتا تو بتادیتا مگر اس دوسرے سوال کے بارے میں میں زیادہ پُر امید ہوں۔ "

" چلو یہی پوچھو پہلے۔ "
" مجھے ایک بالٹی چاہئے یا ڈرم۔ "
" بالٹی " غالب نے کہا " وہ رہی بالٹی ! " اس نے ایک اسٹینڈ میں لٹکی ہوئی چار بالٹیوں کی طرف اشارہ کیا۔ لال رنگ کی ہر بالٹی پر " فائر " لکھا ہوا تھا اور یہ آگ بجھانے کے اسباب میں شامل تھیں۔

میں نے ایک بالٹی کو خالی کیا جس میں ریت بھری ہوئی تھی اور پھر اندر پہنچا۔ مجھے یقین ہے کہ میرے ہاتھ میں بالٹی دیکھ کے سراج نے فوراً سمجھ لیا ہوگا کہ اب کیا ہوگا۔

" اگرچہ تفتیش کے طریقے بہت بدل گئے ہیں " میں نے کہا " اور نئے طریقے زیادہ مؤثر بھی ہیں لیکن میں تم پر تمہارا ہی ایک داؤ آزمانے کو ترجیح دوں گا۔ کیا تمہیں یاد ہے کہ تم نے میری خود اعتمادی ' سرکشی اور قوتِ ارادی کو کس طرح شکست دی تھی ؟ "

سراج کی آنکھوں کی وحشیانہ بے قراری اور اس کی پُر خوف گھبراہٹ اعتراف کرتی تھی کہ اسے اپناوہ وقت یاد ہے جب وہ طاقتور تھا اور میں بے بس۔ لیکن آج معاملہ برعکس تھا اور اسے کچھ بھی نام دیا جاسکتا تھا۔ کرنی کا پھل۔ قدرت کا نظامِ انصاف۔ گردشِ حالات۔ تقدیر کا کھیل۔ کہ جو کل شکاری تھے وہ آج اپنے ہی تیر کا شکار تھے۔

میں نے بالٹی سراج کے سر پر الٹی جمادی۔ اس کا منہ بالٹی میں غائب ہوگیا۔ غالب اتنی دیر میں کہیں سے عمارتی سریئے کے دو زنگ خوردہ ٹکڑے ڈھونڈ لایا تھا۔ ان میں سے ایک تین فٹ لمبا تھا اور دوسرا کچھ زیادہ تھا۔ باری باری میں نے اور غالب نے سریے کو بالٹی پر مارا۔ سراج کا جسم ہلا اور اس کی ٹانگیں متحرک ہوئیں مگر یہ حرکت بہت محدود رہی۔ اس کے جسم کو اور گردن کو رسّی نے ایسے جکڑ رکھا تھا کہ وہ بالٹی کے اندر ہی سر مارنے اور چلّانے کے سوا کچھ نہیں کرسکتا تھا۔

" کچھ یاد آیا ؟ " میں نے اس کے قریب جا کے کہا۔

سراج نے مجھے ایک درجن کے قریب فحش گالیاں دیں مگر اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ میں نے اور غالب نے پھر بالٹی کو کوٹنا شروع کیا۔ ابھی ایک منٹ بھی نہیں گزرا تھا کہ سراج دیوانوں کی طرح چیخنے لگا۔ بالٹی کی کرخت آواز سے ہمارے اپنے کان بھی خراب ہو رہے تھے۔ بند کمرے کے اندر یہ شور زیادہ محسوس ہوتا تھا۔ چوکیدار کبھی اپنے ساتھی کی مسخ شدہ لاش دیکھتا تھا اور کبھی سراج کی طرف۔ وہ تشدد کی اس کارروائی کا مقصد سمجھنے سے قاصر تھا لیکن اس میں حوصلہ نہ تھا ہمیں روکے یا ہم سے کچھ پوچھے۔

جب میں نے بالٹی ہٹائی تو سراج کا چہرہ بھیانک ہو رہا اس کی آنکھیں حلقوں میں گردش کرنے لگی تھیں اور وہ سر کو سیدھا رکھنے میں ناکام تھا۔ مشکل یہ تھی کہ جب آگے جھکاتا تھا تو رسّی کا حلقہ اس کا گلا گھونٹنے لگتا تھا کرتا تھا تو اس کا سر دو آہنی سلاخوں سے ٹکراتا تھا۔

" دلاور کا اسلحہ کب جائے گا ' کتنے ٹرکوں میں جائے کس راستے سے جائے گا ؟ " میں نے سوال اس کے دُہرایا۔

" میں ... نہیں ... جا ... جانتا " اس کی لڑکھڑاتی زبان
" جان لوگے۔ بس ایک آنچ کی کسر ہے " میں نے بال اسے اڑھادی۔ کمرا پھر شور سے گونجنے لگا۔ ہر ضرب ساتھ سراج کا جسم کرب سے بل کھاتا تھا اور وہ ذبح والے بکرے کی طرح چلّاتا تھا۔ اس کی آواز بیٹھ گئی تھی وہ گالیاں نہیں دے رہا تھا۔ خدا اور رسول کے واسطے دے رحم مانگ رہا تھا۔

جب بالٹی دوسری بار ہٹائی گئی تو وہ تقریباً بے ہوش تھا اس کی زبان سے بے معنی الفاظ نکل رہے تھے۔ اسے براز پر قابو نہ رہا تھا۔ اور اس کی زبان باہر نکل آئی تھی آنکھوں میں اس رات کا نقشہ گھوم رہا تھا جب اس سے کہیں زیادہ بدتر حالت میری کی تھی۔ پرانی یادوں پرانے زخم ہرے کردیئے تھے۔ اپنے والد مرحوم وزیر کا چہرہ بار بار میرے سامنے آتا تھا جو انہی سفاک ' بے ضمیر دل شیطانوں ' درندہ صفت انسانوں اور ہوسِ زر کے ہوئے غداروں کے ٹولے میں گھر گئے تھے۔ انھیں کسی کی موت مارنے کے بعد انہی بھیڑیوں کے غول گھیر لیا تھا اور تب سے آج تک یہ انسانیت کے شکاری بربریّت کے سب حربے آزما چکے تھے۔ میں ' رابعہ اور اکرام ' گل اور غالب۔ شہلا اور نازو۔ ایسے ان گنت نام ان کے ستم کے ہر تیر کا نشانہ بنے تھے۔ اور ایسے سیکڑوں جو ان کے مذموم عزائم کی بھینٹ چڑھ گئے تھے۔ ان کے لئے میری لغت میں رحم یا رعایت کا لفظ شامل نہیں

غالب نے چلّا کے سراج کے کان میں کہا " گولڈن کیا ہے ؟ ستائیسویں میل کا کیا مطلب ہے ؟ لھوترا کون

وقتی طور پر وہ بہرا ہو چکا تھا مگر اس نے خاصی کوشش بعد اپنے سر کو اقرار میں جنبش دی " پ ..... پا ... پانی

غالب نے رسّی کھول دی۔ وہ دھڑام سے فرش پر ہی جسم کی غلاظت میں گر گیا۔ اس کا اعصابی نظام جواب چکا تھا۔ جب غالب نے اسے پانی کا گلاس پکڑایا تو اس نے مشکل سے ہاتھ بڑھایا لیکن اس کا ہاتھ رعشے سے رہا تھا کہ گلاس گر گیا۔ غالب نے تھوڑا سا بچا ہوا پانی حلق میں انڈیل دیا۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے افسوس ہوا کہ میرے پاس کیمرا نہیں ہے ورنہ میں اس منظر کو محفوظ کرلیتا اور تصویر کی ایک ایک نقل دلاور اینڈ کمپنی کے ہر شکاری کو ارسال کرتا جو نشۂ طاقت میں بزعم خود رستمِ دوراں اور غرور میں فرعونِ بے ساماں بنا پھرتا ہے۔ کہ دیکھو جب گرفت کا لمحہ قریب آتا ہے تو شیر کی طرح دہاڑنے والا ایس ایس پی بھی خارش زدہ پاگل کتے کی طرح خود اپنی ہی خارج کی ہوئی گندگی میں ایسے لوٹتا دکھائی دیتا ہے۔

پندرہ بیس منٹ کے بعد سراج کی حالت اس قابل ہوئی کہ ٹوٹے ہوئے الفاظ میں ہمارے سوالوں کے جواب دے سکے۔ اسے اپنی زبان کی لکنت پر پورا قابو نہ تھا اور جوبات اس کے کانوں میں انڈیلی جاتی تھی وہ بہت دیر میں فلٹر ہوکے اس کے دماغ تک پہنچتی تھی۔ وہ اب ہمارے ساتھ جاکے گولڈن فالکن کا اور لھوترہ کا پتا بتانے پر تیار تھا۔ میں نے غالب سے کہا کہ اسے کپڑے پہنا کے پھر انسان بنادے۔ اس نے مزید عقل مندی یہ کی کہ اس کا لباس خود پہن لیا اور پولیس کی وردی اس کے جسم پر چڑھادی۔

وہ چوکیدار جس نے ہم سے پوری طرح تعاون کیا تھا ' کمرے کے باہر دیوار سے لگا پتھر کے بت کی طرح کھڑا ہوا تھا۔ جب میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ اچھل پڑا۔

میں نے کہا " تم اچھے اور سمجھ دار آدمی ہو۔ تمہارا ساتھی واقعی بے وقوف تھا جو لالچ میں مارا گیا۔ لالچ سے زیادہ اسے غلط کام میں ' غلط لوگوں کا ساتھ دینے کی سزا ملی۔ تم کو ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ "

" اپن غریب آدمی ..... اپن کدھر جاوے گا صاب ... "
میں نے کہا " تم اپنا کام کرتے رہو۔ جیسے پہلے کرتے تھے۔ سمجھ لو کہ تم نے کچھ نہیں دیکھا ... " میں نے کہا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا " اپن کیا بولے گا۔ اس لاش کو دیکھیں گا تو پولیس اپن کو پھانسی دے دیں گا۔ "

میں نے اسے تسلی دی " فکر مت کرو۔ لاش ہم اپنے ساتھ لے جارہے ہیں۔ تم صرف یہ سمجھو کہ جو کچھ آج ہوا ' اس کے بارے میں تم بھول کر بھی کسی سے بات نہیں کروگے۔ ایک لفظ بھی تم نے کہا تو ذمے داری تمہاری ہوگی۔ ہم دوبارہ تم کو نظر ہی نہیں آئیں گے۔ ہم سب۔ تم سے کوئی کیا پوچھے گا اور کیوں پوچھے گا؟ جب کوئی گواہ نہیں ہوگا۔ تم فرض کرلو کہ آج سارا دن تم سوتے رہے۔ یہاں کوئی بھی نہیں آیا۔ تمہیں کچھ بھی نہیں معلوم کہ تمہارا یہ ساتھی کہاں رہا۔ "
اس نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا۔

میں نے اپنی چاروں جیبوں میں سے نوٹ اکٹھے کئے " یہ دس ہزار کی رقم ہے۔ یہ تمہارا انعام ہے۔ "
وہ ڈر کے پیچھے ہٹ گیا " نہیں ... اپن کو معاف کرو۔ "
میں نے کہا " ڈرو نہیں۔ یہ کسی غلط کام کا معاوضہ نہیں ہے یا رشوت نہیں ہے۔ کیا تمہیں پیسے کی ضرورت نہیں ہے ؟ "

اس کی مزاحمت کمزور پڑ گئی " اگر کسی کو مالوم ہوئیں گا !! "
میں نے کہا " کسی کو کیسے معلوم ہوسکتا ہے ؟ تم کہہ سکتے ہو کہ لاٹری نکلی ہے۔ یا سیٹھ نے انعام دیا ہے۔ راستے میں پڑے ہوئے ملے ہیں۔ "

اس نے کانپتا ہوا ہاتھ آگے بڑھایا اور نوٹوں کو مٹھی میں دبالیا۔ اس کے لئے یہ بہت بڑی دولت تھی۔ اتنی جس کا وہ تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ چنانچہ اس کی خواہش بھی نہیں رکھتا تھا۔ یہ دولت اسے بن مانگے مل رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں وہ سارے خواب جاگ اٹھے تھے جن کو اس نے مجبوری کا کفن دے کے محرومی کے قبرستان میں دفنا دیا تھا۔ ایک دم اس نے نوٹوں کو سینے سے لگالیا اور آنکھیں بند کرکے زیرِ لب کچھ کہنے لگا۔ آنسو اس کے رخساروں پر بہہ نکلے۔

میں نے اس کے شانے پر تھپکی دی " انہیں جیب میں رکھ لو اور ذرا ہماری مدد کرو۔ یہ لاش ڈکی میں ڈال دو۔ "

اس نے تعمیل کی اور لاش کو ایک بوری میں پیک کرکے ڈکی میں اتنی احتیاط کے ساتھ رکھا جیسے وہ اپنے ساتھی کو قبر میں لٹا رہا ہو۔

غالب نے مجھے ایک آٹومیٹک ریوالور پیش کیا جس پر سائیلنسر بھی لگا ہوا تھا " یہ مالِ غنیمت ہے " اور سراج کو پیچھے والی سیٹ پر دھکیل دیا۔

" بہت عمدہ چیز ہے " میں نے کہا " خصوصاً اس کا سائیلنسر۔ اور کیا ملا ؟ "

غالب نے کہا " کچھ نہیں۔ ایس پی صاحب صرف وہی چیز ساتھ لائے تھے جس کی ضرورت درپیش تھی۔ کسی جیب میں ایسی کوئی چیز نہیں جو غلطی سے بھی کسی کے ہاتھ لگ جاتی تو شناخت کا سبب بن جاتی۔ "

چوکیدار نے گیٹ کھول دیا۔ میں نے ڈرائیونگ کا فریضہ غالب کو سونپا اور خود اپنی تھانے دار کی وردی میں ملزم کے ساتھ بیٹھ گیا۔ گاڑی ابھی باہر بھی نہ نکلی تھی کہ مجھے ایک اور خیال آیا۔

میں نے غالب سے انگریزی میں کہا " کیا اس شخص کا زندہ رہنا ہمارے لئے خطرے کا سبب نہیں ہوگا ؟ "
غالب سمجھ گیا کہ میں نے ایسا کیوں کہا ہے " یہ بے ضرر نظر آتا ہے مگر پھر بھی چشم دید گواہ ہے۔ ہمیں شناخت کرسکتا ہے۔ "

" اچھا تم ٹھہرو۔ میں یہ کام بھی نمٹالوں۔ اسی ریوالور سے " میں نے سراج کا ریوالور اس کے چہرے کے سامنے لہرا کے کہا۔
سراج اب تقریباً نارمل تھا چنانچہ اس نے ہماری باتیں بڑے غور سے سنی تھیں۔ کن انکھیوں سے میں نے اس کی توجہ کو تاڑ لیا تھا۔ نیچے اتر کے میں چوکیدار کی طرف بڑھا ۔۔

دہشت زدہ ہو کے چلّانے لگا۔

میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا "دیکھو' ابھی میں ایک فائر کروں گا۔ تم پر نہیں۔ نشانہ میں تمہارا لوں گا لیکن گولی تمہارے کندھے پر سے گزر جائے گی۔ تم چیخ مار کے گر جانا۔"

"لیکن کیوں....؟"

میں نے کہا "تمہاری جان بچانے کے لئے۔ اگر میں نے ایسا نہ کیا تو یہ شخص بعد میں آجائے گا اور تمہیں سچ مچ مار جائے گا۔ شاباش۔ ڈرنا نہیں۔"

سراج کے ریوالور سے آواز نہ ہوتی چنانچہ میں نے اپنا ریوالور استعمال کیا۔ چوکیدار پر بے یقینی کا خوف طاری تھا مگر میں نے گولی چلائی تو اس نے ایک دلخراش چیخ ماری اور نیچے گر کے تڑپنے لگا۔ واپس لوٹتے ہوئے مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ سراج نے کار کے پیچھے ونڈ اسکرین سے قتل کے اس حقیقی نظر آنے والے منظر کو دیکھ لیا ہے۔

"اب جلدی سے نکل چلو" میں نے سراج کے ساتھ بیٹھتے ہوئے دروازہ بند کیا "کہیں گولی کی آواز پر کوئی آنہ جائے۔"

غالب نے کہا "اب آنے دو' ہمارا کوئی کیا بگاڑے گا۔ جو دیکھے گا' ایس پی صاحب کی کار کا نمبر دیکھے گا۔"

سراج کچھ مایوس تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ چوکیدار کے قتل سے خوش نہیں۔ یقیناً اس کا ارادہ تھا کہ موقع ملتے ہی اس کو اٹھوا لے اور اس سے ہمارے بارے میں پوچھے۔ اب چوکیدار بالکل محفوظ تھا۔

کافی آگے آجانے کے بعد میں نے پلٹ کر دیکھا تو گیٹ ابھی تک کھلا ہوا تھا۔ چوکیدار نے عقل مند ہونے کا ثبوت دیا تھا۔ وہ ہمارے رخصت ہوتے ہی اٹھ کھڑا ہوتا تو سارا معاملہ مشکوک ہو جاتا۔

شام کے سائے اب ڈھلنے لگے تھے۔ میں نے گھڑی دیکھی تو چار بج چکے تھے۔ میں نے صبح کے ناشتے کے بعد سے اب تک کچھ بھی نہیں کھایا تھا مگر مجھے بھوک کا خیال تک نہیں آیا تھا۔

"گاڑی میں پیٹرول ہے؟" میں نے کہا۔

غالب نے فیول میٹر پر نگاہ ڈالی "آدھا ٹینک ہے۔"

میں نے کہا "فل کرالو۔"

"تم قیدی کا خیال رکھنا۔ یہ نہ ہو کہ پیٹرول پمپ پر اس کا سائرن بجنے لگے" غالب نے کہا۔

میں نے سراج کی طرف دیکھا "فکر مت کرو۔ اس کے دل میں خیال بھی آیا کسی کو مدد کے لئے پکارنے کا تو مجھے معلوم ہو جائے گا۔"

سراج سخت اذیت میں تھا۔ اس کے جسم پر جو زخم آئے تھے وہ تکلیف دے رہے تھے۔ رسیّوں کے بل اس کے گوشت میں گڑ گئے تھے جن سے خون رس کر خشک ہو چکا تھا۔

غالب نے اس کی قمیص پتلون اور جوتے سب پہن لئے یہاں تک کی اس کی سنہری رولیکس گھڑی بھی پہن لی تو اور بدلے میں اسے اپنی خستہ و خراب پولیس کی وردی بخش دی تھی۔ غالب اس شاندار لباس میں واقعی کار کا مالک نظر آ تھا اور مجھے اس پر رشک آنے لگا تھا۔ میں پولیس کی اس منحوس وردی سے جان چھڑانا چاہتا تھا۔

سراج نے اس وقت بھی کچھ نہیں کیا جب میں نے غالب کو ایک سپر اسٹور سے کچھ فاصلے پر کچھ دیر کے لئے چھوڑ دیا تھا۔ کم سے کم وقت میں اپنے لئے پینٹ شرٹ خرید کرنے کے بعد میں نے اندازے سے اپنے لئے اور غالب کے لئے دو ٹریک سوٹ بھی لئے اور دھوپ کے دو چشمے بھی۔ مجھے تھرمس نظر آگئے اور غیر ملکی سگریٹ کے علاوہ وہ پر... بھی مل گئی جو مجھے پسند تھی۔ دکان دار کا خیال تھا کہ میں تھانے داری کے اختیارات کے چیک پر ساری خریداری کر رہا ہوں چنانچہ وہ بادلِ ناخواستہ میرے احکامات کی تعمیل کر رہا تھا۔ جب میں نے ادائیگی کی تو وہ شرمندہ ہوا' کیونکہ اس کا رویہ میرے ساتھ غیر مہذب نہیں تھا تو مہذب بھی نہ تھا۔

سراج نے ایک ڈرائیو اِن ریسٹورنٹ میں بھی کسی ہنگامہ آرائی یا فرار کی کوشش سے اجتناب کیا۔ بظاہر وہ خود کو ہمارے رحم و کرم پر چھوڑ چکا تھا اور نوشتۂ تقدیر سے لڑنے کا کوئی ارادہ نہ رکھتا تھا۔ اس نے خاموشی سے ہمارے ساتھ چائے پی لیکن کچھ کھانے سے انکار کر دیا۔ میں نے تھرمس کو چائے سے بھروا لیا اور کھانے کا جو سامان بچا وہ ساتھ لے لیا۔ اس وقفے میں غالب نے کار کی تلاشی لی اور یہ معلوم کیا کہ وہ کار بمبئی کی "درشن روپ انڈیا پرائیویٹ لمیٹڈ" کے نام پر رجسٹرڈ ہے جو شاید اسبابِ آرائش بنانے والا ادارہ تھا۔

شہر میں متعدد مقامات پر پولیس موجود تھی اور کئی بار ٹریفک سگنل پر بھی رکے لیکن سراج اسی شکست خوردہ ناامیدی کے ساتھ چپ بیٹھا رہا جو درحقیقت ایک دھوکا تھا۔ وہ موقع کے انتظار میں اس وقت تک رہا جب تک کہ اس نے ہمیں اپنی اطاعت و فرمانبرداری کا یقین نہیں دلا دیا۔ یہ موقع اسے پیٹرول پمپ پر ملا۔ غالب اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلتا رہا تھا اور تقریباً پون گھنٹے بعد ہم شہر کے مضافات میں ناگپور جانے والی شاہراہ پر رواں تھے کہ غالب کو پیٹرول کا خیال آیا اور اس نے کار کو ایک پیٹرول پمپ پر موڑ لیا۔ غالباً سراج کو احساس ہوا کہ اس نے اب بھی کچھ نہ کیا تو یہ آخری موقع بھی ہاتھ سے نکل جائے گا۔

اس نے ایک دم دروازہ کھول کے باہر چھلانگ مارنے کی کوشش کی اور چلّانے لگا "بچاؤ.... بچاؤ۔"

میں اتنا غافل بھی نہیں تھا کہ اسے نکل جانے دیتا۔ میرا ہاتھ اس کی گردن کے پیچھے قمیص کے کالر پر پڑا۔ ایک جھٹکے سے میں نے اسے واپس کھینچا۔ دروازہ ابھی کھلا ہوا تھا

غالب نے کار کا ایکسیلریٹر دبا دیا۔ پائپ کو فیول ٹینک میں ڈال کے میٹر کو دیکھنے والا نوجوان اتنا بوکھلا گیا تھا کہ وہ پائپ نہ نکال سکا اور خود بھی اسی میں الجھ کے گرا۔ یکلخت پیٹرول پمپ کے سارے ملازم سراج کی چیخ پکار پر متوجہ ہو گئے تھے۔ دو کاریں عین ہمارے پیچھے رکی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک نے ہمت سے کام لیا اور ہمارا تعاقب کرنے کی کوشش کی۔ میں نے ریوالور نکال کے پہلے اس کا دستہ سراج کے سر پر مارا اور پھر ایک ہاتھ نکال کے پیچھے ایک فائر کیا۔ پیچھے آنے والی کار لہرا کے سڑک سے اتر گئی۔

غالب نے چلّا کے کہا "دروازہ تو بند کر۔"

ابھی میں نے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ کھلے دروازے کا پٹ ایک ٹرک کی سائیڈ سے لگا جسے غالب اوور ٹیک کر رہا تھا اور ٹوٹ کے سڑک پر گر پڑا۔ سراج اب بے ہوش پڑا ہوا تھا لیکن کام بگڑ گیا تھا۔ اس کی ہنگامہ آرائی نے بہت سے لوگوں کو متوجہ کر لیا تھا۔ فائرنگ سے مزید خرابی پیدا ہوئی کیونکہ اس شاہراہ پر ہم اکیلے نہیں تھے' ہمارے آگے پیچھے گاڑیوں کی قطار تھی جس میں ٹرک' بسیں اور کاریں سب ہی شامل تھے۔

غالب نے جائے واردات سے فرار ہونے میں ڈرائیونگ کی تمام مہارت اور حاضر دماغی سے کام لیا۔ بہت جلد ہم ان گاڑیوں کو پیچھے چھوڑ آئے جو آس پاس موجود تھیں لیکن خطرہ اب بھی ہمارے ساتھ تھا۔ یہ بات یقینی تھی کہ اس کار کا نمبر ان سب نے نوٹ کیا ہوگا جن کو ہم اوور ٹیک کر کے آگے نکل آئے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی پولیس کو اطلاع دے سکتا تھا۔ پیٹرول پمپ والے تو فون کر ہی چکے ہوں گے۔ اب تک پولیس نے آگے وائرلیس پر رابطہ قائم کر لیا ہوگا چنانچہ پولیس کسی بھی وقت آگے سے اچانک نمودار ہو کے ہمارا راستہ روک لے گی۔ یہ بڑا پریشان کن خیال تھا۔ مشکل یہ تھی کہ اب تک غالب کو راستہ بدلنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ جب بالآخر ایک جگہ اس نے کار کو بائیں طرف موڑا اور ہم ایک نسبتاً تنگ سڑک پر آگئے تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ میں نے غالب کو ہدایت دینے سے گریز کیا تھا۔ وہ خود بھی جانتا تھا کہ ان حالات میں اسے کیا کرنا چاہئے۔ اگر میں مداخلت کرتا تو اس کی یکسوئی میں فرق آتا اور اس کی قوتِ فیصلہ بھی متاثر ہوتی۔

ذیلی سڑک نہ جانے کہاں جاتی تھی۔ غالب نے شاید بیک ویو مرر میں دیکھا کہ پیچھے سڑک صاف ہے' سامنے سے بھی کوئی نہیں آرہا تھا چنانچہ اس نے کار کو کچے راستے پر اتار دیا۔ کار جھاڑ جھنکاڑ کو روندتی ایک منڈیر کو توڑتی ہوئی کیلوں کے ایک باغ میں گھس گئی۔ لمبے لمبے پتوں اور نازک تنوں والے دو چھوٹے درخت گر گئے۔ اس سے پہلے کہ باغ کا مالی یا مالک نمودار ہوتا' میں نے سراج کو گھسیٹ کے باہر نکالا اور اپنے کندھے پر ڈال لیا۔

ہم نے ایک ساتھ واپس اسی سمت میں دوڑنا شروع کیا

جدھر سے کار کچے راستے پر اتری تھی۔ سراج کے بوجھ کو اٹھا کے اس ناہموار راستے پر بھاگنا آسان کام نہ تھا۔ میرا سانس پھولنے لگا لیکن میں نے رفتار میں فرق نہ آنے دیا۔ غالب نے کار کی چابیاں نکال لی تھیں اور وہ بیگ بھی اٹھا لیا تھا جس میں میری شاپنگ کا سامان تھا۔ سڑک پار کرتے ہی اس نے یہ بیگ مجھے تھمادیا اور سراج کو مجھ سے لے لیا۔ اس بوجھ کو باری باری ڈھو کے ہم آدھے گھنٹے میں اس جگہ سے دو میل دور آگئے جہاں اب کار لاوارث کھڑی ہوئی تھی۔ اب صرف کوئی ماہر کھوجی ہی ہمارے قدموں کے نشان دیکھ کے بتا سکتا تھا کہ جو لوگ کار میں تھے وہ آگے نہیں گئے ہیں۔ عام آدمی اور خود پولیس بھی اس کار کو دیکھنے کے بعد یہی رائے قائم کرتی کہ ملزم کیلے کے باغ میں روپوش ہوں گے یا سیدھے اسی سمت میں بھاگے ہوں گے۔

ہمارے چاروں طرف بھی کیلے اور ناریل کے باغ تھے۔ درمیان میں کہیں کہیں بے فصل زمین بھی آئی تھی جس پر خود رو نباتات کا قبضہ تھا۔ اب ہم دوڑ نہیں رہے تھے پھر بھی میری جسمانی قوت کا گراف زیرو پر آچکا تھا۔ ایک جگہ میں گڑھے میں پیر پڑ جانے سے گرا تو سراج دور جا پڑا اور میں اس وقت تک نہ اٹھ سکا جب تک غالب نے مجھے سہارا دے کر نہیں اٹھایا۔

"اس.... حرامزادے نے.... مروا دیا تھا ہمیں" میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔

غالب نے سر ہلایا اور میرے قریب ہی بیٹھ گیا "کچھ دیر رک کر آرام کر لیتے ہیں یہاں..."

وہ ایک وسیع قطعۂ زمین تھا۔ جس پر ناریل کے درخت سیکڑوں کی تعداد میں نظر آرہے تھے۔ ان کے بلند اور چکنے تنے ان گنت ستونوں کی طرح تھے۔ بہت اوپر درختوں کے پھیلے ہوئے پتوں کا سبز رنگ آسمان کی نیلاہٹ کو نمایاں کر رہا تھا۔ کچے ناریل دیکھ کے مجھے احساس ہوا کہ میرا حلق کتنا خشک ہو رہا ہے لیکن ناریل کا قدرتی ٹھنڈا میٹھا مشروب ہماری دسترس سے بہت دور تھا۔ پانی آس پاس کہیں بھی نہیں تھا' تھرماس میں صرف چائے تھی جو میں نے شوقیہ بھروالی تھی۔ اس وقت مجھے اندازہ نہ تھا کہ ہمارا گزر کسی ویرانے سے ہوگا جہاں نہ پینے کے لئے کچھ ہوگا اور نہ کھانے کے لئے۔ ناگپور ہائی وے پر دس بیس میل کے فاصلے پر کوئی ریسٹورنٹ ضرور آتا تھا۔ دونوں طرف سے آنے والی اور چوبیس گھنٹے رواں رہنے والی ٹریفک سے یہ سڑک آباد رہتی تھی۔

سراج بڑے بے ڈھنگے پن سے زمین پر پڑا ہوا تھا لیکن میں نے اسے نظر میں رکھا۔ اس کی بے ہوشی کے فریب سے نمٹنے کے لئے میں نے ریوالور کو بھی دسترس میں رکھا۔ غالب سیدھا لیٹ کے لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ نہ اسے کپڑوں کے مٹی سے خراب ہو جانے کا خیال تھا اور نہ کمر میں چبھنے...

گھاس اور پتھریلی زمین کا۔ اس کی نظر بھی ناریل کے گچھوں پر تھی۔ پھر وہ ایک دم اٹھا اور پتھر تلاش کرنے لگا۔ اس نے تین پتھر پھینکے۔ ایک نشانے پر لگا اور ناریل ٹوٹ کے نیچے آیا۔ غالب نے اسے باؤنڈری لائن کے فیلڈر کی طرح کیچ کرلیا اور اپنی اس کامیابی پر بچوں کی طرح کھلکھلا کے ہنسا۔

ناریل کا پانی دنیا کے اعلیٰ ترین مشروب سے زیادہ لذیز اور فرحت بخش ثابت ہوا۔ اس کی تازگی اور توانائی بخش مہک نے صرف پیاس ہی نہیں بجھائی سکون اور سرور بھی عطا کیا۔ اس کے بعد چائے کی باری آئی اور دس منٹ بعد میری ساری تھکن وغیرہ غائب ہوگئی۔ سگریٹ کا کش لیتے ہوئے میں نے غالب کو سراج پر نظر رکھنے کی ہدایت کی اور خود لیٹ کر اس نئی صورتِ حال پر غور کرنے لگا۔

ہم نے ایک چھوٹی سی کامیابی حاصل کی تھی جو کسی بڑی کامیابی کا پیش خیمہ ثابت ہوسکتی تھی۔ لیکن ہم اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گئے تھے۔ فوری طور پر ہماری واپسی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ سراج نے ابھی تک یہ نہیں بتایا تھا کہ دا اور اینڈ کمپنی کے ٹرک اسلحہ لے کر کب روانہ ہوں گے اور کس راستے پر سفر کریں گے۔ شاید وہ خود بھی یہ بات نہیں جانتا تھا لیکن وہ میرے دوسرے سوال کا جواب جانتا تھا۔ اور مجھے یقین تھا کہ یہ معلومات اہم ہوں گی۔ یہی معلومات حاصل کرنے کے لئے رابعہ اور نازو بھی نکلی تھیں۔ مجھے ان دونوں کی صلاحیت پر ذرا بھی شبہ نہ تھا مگر ان کا مشن ایک تفریحی دورے سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ انہیں کسی قسم کا خطرہ مول لئے بغیر اور تحفظ کو مقدم رکھتے ہوئے محض زبانی پوچھ گچھ کرنی تھی اور لوٹ آنا تھا۔ شاید اب تک وہ واپس بھی آچکی ہوں گی۔ میں نے سوچا۔ محمد خان بھی لوٹ آیا ہوگا۔ لیکن ہم سراج سے حاصل ہونے والی معلومات کی تصدیق کئے بغیر واپس جا نہیں سکتے تھے۔ خیر اب ارادہ کرکے جانے اور وعدے کے مطابق واپس نہ آنے میں کوئی بات خلافِ معمول نہیں رہی۔ سب انتظار کرنے اور امید کے ساتھ مطمئن رہنے کی مجبوری کو قبول کرچکے ہیں۔ وہ سمجھ لیں گے کہ ع۔ ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا۔

سراج کے کراہنے کی آواز پر میں اٹھ بیٹھا "شام ہو رہی ہے مرزا جی۔ معلوم نہیں ہم کہاں ہیں۔"

"ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی۔ کچھ ہماری خبر نہیں آتی۔"

"یار، اس مُردے کو اٹھا" میں نے کہا "یہ ہوش میں آئے تو اس سے کچھ پوچھیں۔"

غالب نے کہا "جب ہم روانہ ہوئے تھے تو میں نے آنے والی سڑک پر پہلا سنگِ میل دیکھا تھا۔ اس کے پیچھے۔ "بمبئی سات کلو میٹر" لکھا ہوا تھا۔ پھر میں نے سیدھے ہاتھ پر ویسے ہی انیس سنگِ میل اور شمار کئے تھے۔"

"اچھا۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہم بمبئی سے ستائیس کلو میٹر دور آگئے ہیں۔"

"میں نے بیسواں سنگِ میل نہیں دیکھا۔"

"لیکن ہم کہیں اس کے قریب ہی ہیں" میں نے کہا۔ "مین روڈ سے ہم کتنا اندر آئے تھے؟"

"شاید دو کلو میٹر" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "دو کلو میٹر تو زیادہ نہیں ہوتے۔ ہم پیدل واپس جاسکتے ہیں۔ سڑک سے دور رہتے ہوئے۔"

"اب تک پولیس الرٹ ہوچکی ہوگی۔ ممکن ہے ہمارا حلیہ اور کار کا نمبر بھی وائرلیس پر مشتہر کردیا گیا ہو اور وہ ذیلی سڑک پر ہمیں تلاش کررہے ہوں" غالب نے کہا۔

"میں نے کہا ناکہ ہم سڑک سے دور رہیں گے۔ یہاں آخر کب تک بیٹھے رہ سکتے ہیں ہم؟" میں نے کہا "رات ہوگئی تو راستے کا بھی پتا نہیں چلے گا۔"

غالب نے کہا "اچھا چائے پی کے چلتے ہیں۔"

میں نے کہا "یار، اس ایس پی کو بھی چائے پلادے تاکہ یہ خود اپنے پیروں پر چلے۔ میری تو کمر ٹوٹ گئی ہے۔"

"دو کلو میٹر تو میں بھی اسے اٹھا کر نہیں جاسکتا" غالب نے کہا۔

سراج اب ہوش میں آنے لگا تھا۔ غالب نے اس کے حلق سے چائے اتاری تو اس کی حالت کافی بہتر ہوگئی۔ دس منٹ بعد وہ اٹھ بیٹھا اور احمقوں کی طرح چاروں طرف دیکھنے لگا۔

میں نے کہا "بہت آرام کرلیا..... اب اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ اپنے پیروں پر" سراج نے سر کو اس جگہ سے چھو کر دیکھا جہاں میں نے ریوالور مارا تھا اور آہستہ سے کراہا۔

میں نے کہا "خدا کا شکر ادا کرو کہ سر سلامت ہے۔ صرف اس لئے کہ تمہارے سر کے لاکر میں ہمارے مطلب کی کچھ معلومات محفوظ ہیں۔"

"یعنی یہ معلومات..... حاصل کرنے کے بعد..... تم مجھے مار دو گے؟" سراج نے کہا

"تم کیا توقع رکھتے ہو ہم سے؟" میں نے کہا۔

سراج نے کہا "بہتر ہے کہ تم مجھے ابھی مار دو۔ کیا فائدہ تمہیں کچھ بتانے کا۔"

"کچھ نہ بتانے کا نقصان تو ہوسکتا ہے تمہیں۔"

"کیا نقصان؟ تم جان سے زیادہ کیا لے سکتے ہو" وہ تلخی سے بولا "لے لو جیسے چاہو لے لو لیکن مجھ سے کچھ نہ مانگو۔ میں تمہیں اور کچھ نہیں دوں گا۔ تم کو میرے دماغ کے لاکر میں سے جو چیز چاہئے اسے کھول کے نکال لو۔ تمہیں اختیار ہے۔"

میں نے کہا "کیا تم سودا کرنا چاہتے ہو؟"

معلوم نہیں سراج میں اتنی ہمت کہاں سے آگئی تھی۔ "ہاں۔ یہ میری زندگی کا سودا ہوگا۔ جو کچھ میں تمہیں بتاؤں گا وہ تمہارے لئے بہت اہم ہوگا۔ میرے لئے میری زندگی اہم ہے۔ تمہارے لئے شہلا کی زندگی اہم ہے۔ اس کی زندگی کے بدلے مجھے میری زندگی دے دو۔"

میں نے ریوالور اٹھایا "تم اتنے بااختیار نہیں ہو کہ سودا کرسکو۔"

اس نے بے خوفی سے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا "چلاؤ گولی۔ میں اب تیار ہوں۔ تم کو اگر یہ سودا منظور نہیں تو مجھے بھی کیا ضرورت ہے تمہیں کچھ بتا کے مرنے کی۔"

میں سوچ میں پڑ گیا "تم مجھے بلیک میل نہیں کرسکتے۔"

"ہاں میں کچھ نہیں کرسکتا۔ لیکن میری مدد کے بغیر تم بھی کچھ نہیں کرسکتے۔ مجھے معلوم ہے کہ شہلا کہاں ہے اور اسے کیسے بچایا جاسکتا ہے۔ میں اپنے ساتھیوں سے غداری کروں گا۔ اس کے بدلے میں تم سے بھی کچھ نہ ملے تو میں یہ گناہ بے لذت کیوں کروں۔"

"فرض کرو میں تم سے جھوٹا وعدہ کرلوں۔ کہ اگر تم نے شہلا کو بچانے میں میری مدد کی تو میں اس بار تمہیں زندہ چھوڑ دوں گا۔"

"ایسے نہیں سکندر! تم قسم کھاؤ گے... تین بار... ایک بار خدا کی... دوسری بار وزیر خان کے اس خون کی جس کے لئے تم انصاف طلب ہو۔ اور..."

میں نے اس کے منہ پر لات ماری۔ "میرے والد کا نام مت لے اپنی گندی زبان سے ... کتے۔"

"اور تیسری قسم تم کھاؤ گے رابعہ کی محبت کی" سراج نے گر کر اٹھتے ہوئے کہا "اس گارنٹی کو قبول کرلوں گا میں۔"

اچانک ہمارے پیچھے جنگل کی طرف سے پولیس کا سائرن سنائی دیا۔ خاموشی میں موٹر سائیکلوں کے انجن گرج رہے تھے۔ یہ پولیس تھی جو اب ہر طرف پھیل چکی تھی۔ شاید انہوں نے وہ کار دیکھ لی تھی جسے ہم چھوڑ آئے تھے۔ وہ ہم سے صرف دو کلو میٹر کے فاصلے پر تھے۔ ان کی جیپوں اور موٹر سائیکلوں کے لئے دس کلو میٹر کا علاقہ چھان مارنا بھی کوئی مشکل کام نہ تھا۔

سراج نے کہا "فیصلہ کرلو سکندر۔ تمہیں یہ سودا منظور ہے یا نہیں؟ تم شہلا کی جان بچانا چاہتے ہو نا۔"

میں نے محسوس کیا کہ سراج نے مجھے محصور کرلیا ہے۔ اب میں اس کو مار بھی نہیں سکتا۔ اگر میں گولی چلاتا تو وہ شکاری متوجہ ہوجاتے جو زیادہ دور نہیں تھے۔ پھر مجھے اس ریوالور کا خیال آیا جو مجھے غالب نے دیا تھا مگر سراج کی ملکیت تھا اور جس پر سائیلنسر لگا ہوا تھا۔ فیصلہ میں پہلے ہی کرچکا تھا۔

میں نے ریوالور کا رخ سراج کی جانب کردیا "صورتِ حال سے فائدہ اٹھانے کی کوشش مت کرنا۔ ورنہ تمہارے اپنے ریوالور کی گولی تمہاری جان لے لی گی۔"

سراج نے کہا "تم کو میری جان لینی ہے تو لے لو۔ بہانے کیوں تلاش کرتے ہو؟ جب میرے اور تمہارے درمیان معاہدہ ہوگیا ہے..."

میں نے کہا "میں تمہارے وعدوں اور معاہدوں کو خوب سمجھتا ہوں۔ تم انسانوں کے جس قبیلے سے تعلق رکھتے ہو وہ شیطان کے پیروکار ہوتے ہیں۔"

"اور ہم ان پر اعتبار کا رسک لیتے تو کب کے مرحوم و مغفور ہوچکے ہوتے" غالب نے کہا۔

میں نے سراج کو حکم دیا "اپنے ہاتھ اوپر اٹھالو، اور چلو۔"

سراج نے تعمیل کی "قانونی طور پر میری پوزیشن بھی وہی ہے جو تمہاری۔ میرے پاس بھی کوئی شناخت اور اس ملک میں داخلے کا قانونی اجازت نامہ نہیں ہے۔"

میں نے اسے پلٹ کر آگے دھکیلا "تمہارے مددگار تو ہیں یہاں جو تمہیں چھڑالیں گے، ہمارا کون ہے؟"

سراج نے آگے چلتے ہوئے طنز سے کہا "دنیا میں نہیں جن کا کوئی ان کا خدا ہے۔ کیا تم اس فلسفے کے قائل نہیں رہے؟"

میں نے کہا "یہ فلسفہ نہیں، عقیدہ ہے۔"

غالب نے کہا "یار، یہ پولیس ہے تو کیسی پولیس ہے۔ یہ آخر کس پر گولیاں چلا رہے ہیں؟ ایک دوسرے پر۔"

میں نے غالب کی بات پر غور کیا "پولیس بے سبب گولیاں ضائع نہیں کرتی۔ انہیں حکم ملتا ہے فائر کرنے کا تو فائر کرتے ہیں۔"

"اور حکم اس وقت ملتا ہے جب کوئی مقابلے پر ہو۔ یا انہیں نظر آرہا ہو کہ گولی نہ چلائی تو بھاگ جائے گا۔ پولیس اتنی غیر منظم اور بے مہار نہیں ہوسکتی۔"

میں غالب کی دلیل سے قائل ہوچکا تھا "ایسا لگتا ہے کہ پولیس کے ساتھ دوسرے شکاری بھی آئے ہیں۔"

"آئے کیا ہیں، وہی پولیس کو لائے ہیں" غالب نے کہا۔ "اور اب دنادن فائرنگ کرکے دہشت پھیلانے میں مصروف ہیں۔ احمق۔"

میں نے کہا "پولیس منع بھی تو کرسکتی ہے انہیں۔"

"جیسی روح ویسے فرشتے۔ پولیس ان کی خادم ہے اور وہ پولیس کے۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ خاموشی سے محاصرہ کرتے تو ہمارے اچانک.... پکڑے جانے کے امکانات زیادہ ہوتے لیکن اب تو وہ خود ہمیں خبردار کرتے آرہے تھے اور ان کے دوڑنے بھاگنے سے پیدا ہونے والی ہلچل ہمارے فرار کے راستے کا تعین کرنے میں مددگار ثابت ہورہی تھی۔ ہم اپنے پیچھے سنائی دینے والے شور و غل سے دور ہونے کی کوشش میں کھیتوں کے درمیان سے اور کیلے کے جنگل جیسے باغات سے گزرتے جارہے تھے۔ کھیت ویران تھے مگر کیلے کے گھنے درختوں میں نمی بہت زیادہ تھی۔ زمین کی مٹی زیادہ پانی سے کیچڑ جیسی ہورہی تھی جس میں ہمارے پیر دھنس جاتے تھے۔

ہم ایک چھوٹے سے قصبے کے قریب ہوتے جارہے تھے۔ کوتاہ قامت کیلے کے درختوں کے عقب میں ایک طرف دیکھنے پر کسی مسجد کے دو سفید مینار نظر آتے تھے۔ مخالف سمت میں کسی مندر کا سنہرا کلس دھوپ میں چمک رہا تھا۔ ... مجھے ایسا لگتا تھا کہ شکاری ہمارے نقشِ قدم دیکھتے ٹھیک اسی سمت میں آرہے ہیں جدھر ہم جارہے ہیں ... ہمارے اور ان کے درمیان ایک میل دور چلے آنے کے باوجود وہی فاصلہ تھا اور یہ ایک خطرناک بات تھی۔ یا تو ان کے ساتھ شکاری کتے تھے جو ہوا کے ساتھ ہماری بو سونگھتے آرہے تھے یا ان کی راہنمائی پیشہ ور کھوجی کررہے تھے۔ کبھی کبھی کوئی چلا کے کسی سے کہتا تھا "ادھر" یا شور مچاکے کسی کو منع کرتا تھا "ادھر نہیں"... بیشتر آوازوں کا مفہوم واضح نہیں تھا لیکن مقصد وہی تھا کہ لینا' پکڑنا' دوڑنا' جانے نہ پائیں۔

کچی' نرم زمین اور کیچڑ میں ہمارے نقشِ قدم اتنے نمایاں تھے کہ ازخود ہمارے دشمنوں کو ہمارا پتا دیتے تھے۔ سراج بڑے یقین کے ساتھ آگے دوڑ رہا تھا۔ اچانک ایک جگہ پہنچ کے وہ گھنے درختوں کا سلسلہ ختم ہوگیا۔

میں نے پلٹ کے دیکھا "وہ اسی طرف آرہے ہیں غالب"۔

غالب نے کہا "بھاگنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ہمیں کہیں مورچہ بند ہوکے ان کا مقابلہ کرنا چاہئے۔"

میں نے مایوسی سے سامنے پھیلے ہوئے سپاٹ میدان کو دیکھا "ہم کب تک مقابلہ کریں گے۔ صرف دو ریوالور ہیں ہمارے پاس۔"

پھر میری نظر نے ایک کنواں اور رہٹ دیکھا۔ غالباً اسی کے ذریعے کیلے کے باغ کو پانی دیا جاتا تھا۔ اس وقت وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ "غالب' ہم یہاں چھپ سکتے ہیں" میں نے کہا۔ "اس کنویں میں۔"

"کنویں میں!" غالب نے کہا۔

"ہاں۔ جوتے اتار دو یہاں" میں نے اپنے پلان پر عمل کرنے کا فیصلہ کرلیا "میں تھوڑا سا بائیں جانب جاکے واپس آتا ہوں۔ تم کچھ دائیں طرف نکل جاؤ۔ یہ جوتے ہمارا سراغ دے رہے ہیں۔ ان کے سول پر کیچڑ لگا ہوا ہے۔ انہیں گیلی زمین پر ہی چھوڑ دینا۔"

غالب نے میری بات فوراً سمجھ لی۔ اس کے دائیں جانب دوڑتے ہی میں نے سراج کو اپنے ساتھ دوسری سمت کھینچ لیا۔ ...تقریباً ۲۰ گز دور جاکے میں نے ایک پتھر پر قدم جمائے اور جوتے اتار کے پانی سے نرم ہوجانے والی زمین پر پھینک دیئے ... جوتے باغ کے اندر دس گز دور جاگرے جہاں کیلے کے درختوں کی جڑوں میں پانی ٹھہرا ہوا تھا۔ پھر میں نے ایک جست لگائی اور باغ کی منڈیر کو عبور کرتا ہوا خشک زمین پر جا اترا۔ .. سراج نے میری تقلید کی۔ مجھے یقین تھا کہ اس طرح میں وقتی طور پر اپنے پیچھے آنے والوں کو دھوکا دینے میں کامیاب ہوجاؤں گا۔ وہ ذرا سی دیر کے لئے ضرور چکرا جائیں گے کہ ہم جوتے وہیں چھوڑ کے آسمان کی طرف پرواز کرگئے یا ہوا میں تحلیل ہوگئے۔ لیکن ہم جن بھوت نہیں تھے۔ دشمن کو ہماری چالاکی کا اندازہ کرنے میں دیر نہ لگتی۔ آگے ہماری بقا کا انحصار اس کی رضا پر تھا جس کی رحمت نے ہمیں کبھی مایوس نہیں کیا تھا۔

غالب مخالف سمت سے نمودار ہوا۔ اس وقت کیلے کے باغ میں ہلچل کے آثار بہت واضح ہوگئے تھے اور دشمن کسی بھی لمحے ہمارے سامنے آسکتے تھے۔ پہل غالب نے کی۔ اس نے رہٹ کی رسّی کو تھاما اور اس مضبوط سیڑھی پر قدم جماتا نیچے اترنے لگا جس میں اوپر سے پانی کی سطح کے اندر تک چمڑے کے ڈول بندھے ہوئے تھے۔ جب رہٹ چلتا تھا تو چمڑے کے ڈول پانی سے بھرے ہوئے نکلتے تھے اور اوپر اٹھتے جاتے تھے۔ اوپر والے بڑے پہیے پر سے گزرتے ہوئے ڈول اپنا سارا پانی ایک نالی میں الٹ دیتے تھے اور پہیے کی گردش کے ساتھ ساتھ خالی ہوکے دوسری طرف سے پھر پانی میں غوطہ لگانے کے لئے اتر جاتے تھے۔

غالب کے غائب ہوتے ہی میں نے سراج کو اشارہ کیا۔ وہ پریشانی اور تذبذب کا شکار تھا "میں.... نیچے نہیں اتر سکتا۔"

"بکواس میں وقت ضائع مت کرو۔ اس میں کیا مشکل ہے۔ نیچے تک رسّی کی سیڑھی ہے ..."

"یہ بات نہیں.... مجھے پانی سے ڈر لگتا ہے۔ ہائیڈروفوبیا ہے مجھے ..."

میں نے مشتعل ہوکے کہا "میں کچھ نہیں جانتا۔ ایسے نہیں اترو گے تم تو میں تمہیں کنویں میں پھینک دوں گا۔"

فوبیا ایک نفسیاتی خوف کی بیماری ہے۔ کچھ لوگ بلندی سے ڈرتے ہیں' کچھ بند دروازوں اور کھڑکیوں سے' کچھ خون بہتا نہیں دیکھ سکتے تو کچھ اندھیرے میں نہیں جاسکتے۔ سراج کی حالت سے ظاہر تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا ہے لیکن میں اس کے ہائیڈروفوبیا کو عین وقت پر اپنی موت کا سبب بننے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ وہ ایک قدم آگے بڑھا اور کنویں کی منڈیر پر رک گیا۔ میں نے اسے پیچھے سے دھکا دیا۔ اس نے خود کو سر کے بل کنویں میں گرنے سے بچایا اور رسّی کو پکڑ لیا۔ آنکھیں بند کرکے نیچے پانی کی چمک کو دیکھنے سے گریز کرتے ہوئے سراج نے اپنے پاؤں ایک ڈول پر رکھے اور میرے لئے جگہ خالی کردی۔

میں سراج کے ساتھ ہی اتر گیا۔ وہ مجھ سے صرف ایک ڈول یا ایک سیڑھی کے فاصلے پر تھا۔ غالب بہت گہرائی میں اتر گیا تھا۔ کنویں کا اوپر والا حصہ قدرے روشن تھا۔ گہرائی کے ساتھ ساتھ تاریکی بڑھ رہی تھی۔ میں مٹی' گھاس اور کائی کی ملی جلی تیز مہک کو سونگھ رہا تھا اور ریوالور کو دانتوں میں دبائے دونوں ہاتھوں سے رسّی پکڑ کے اپنا بوجھ سنبھال رہا تھا۔ میری نظر سراج پر تھی۔ اگرچہ وہ خوف زدہ تھا لیکن اس کا دماغ کام کررہا تھا۔ اچانک اس نے ہاتھ بڑھا کے میری ٹانگ پکڑنے کی کوشش کی۔

اگر وہ اس کوشش میں کامیاب ہوجاتا تو میں ریوالور سمیت اس کے اوپر سے گزرتا' کنویں کی دیواروں سے ٹکراتا ہوا سیدھا پانی میں جاتا اور شاید اپنے ساتھ غالب کو بھی لے جاتا۔ ... پھر وہ ہماری طرف سے بے خوف ہوکے بڑی پھرتی سے باہر نکل جاتا اور آواز دے کر ہمارے دشمنوں کو بلالیتا کہ ادھر آؤ۔ جن کو تم ڈھونڈتے پھر رہے ہو وہ اس کنویں میں ہیں۔ اگر ڈوب کر مرے نہیں ہیں تو نکال لو یا اوپر سے پتھروں کی بارش کردو تاکہ وہ یہیں دفن ہوجائیں۔

لیکن سراج کو ناکامی ہوئی۔ میں نے اپنی ٹانگ بچائی اور پھر تیزی سے نیچے جاکے اس کے سر پر لات ماری۔ وہ اس جوابی کارروائی کے لئے تیار نہ تھا۔ جھٹکا لگا تو اس کے ہاتھ کی گرفت کمزور پڑگئی اور رسّی چھوٹ گئی۔ اس نے ایک چیخ ماری اور کنویں کی سائڈ سے ٹکرا کے نیچے گیا۔ میں نے اس کے پانی میں گرنے کا چھپاکا سنا اور اوپر دیکھا۔ کنویں کا کھلا حصہ ایک گول روشن دائرے کی طرح نظر آرہا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق تیس چالیس فٹ اوپر۔

باقی فاصلہ بھی شاید اتنا ہی تھا یا اس سے کچھ کم۔ جب سراج درمیان میں حائل نہیں رہا تو میں زیادہ تیزی سے نیچے اترا۔ شاید غالب نے سراج کو قابو میں رکھنے کی کوشش کی تھی مگر اس نے گھبراہٹ اور دیوانگی آمیز بدحواسی میں غالب کو بھی پانی میں کھینچ لیا تھا۔ سراج بری طرح چلا رہا تھا "ارے مرگیا میں! ...آہ۔ اوف ... میں ڈوب جاؤں گا۔"

میں نے کہا "غالب! اس کتے کی آواز بند کر۔"

"یہ... یہ تو مجھے بھی ڈبو دے گا یار" غالب نے پانی میں غوطے کھاتے ہوئے کہا۔

پانی سے دو فٹ اوپر ٹھہر کے میں نے ایک ہاتھ سے رسّی کو اپنی گرفت میں رکھا۔ دونوں پاؤں ڈول پر جمائے اور دوسرے ہاتھ میں وہ ریوالور لے لیا جو اب تک میرے دانتوں میں دبا ہوا تھا۔ میں نے اس کا دستا سراج کے سر پر مارا۔ اس کی آواز بند ہوگئی۔

"اسے ڈوبنے مت دینا" میں نے غالب سے کہا "تو خود بھی ڈول کی رسّی کو پکڑ کے ایک کنارے پر ہوجا۔ کوئی اوپر سے دیکھے تو اسے پانی میں کوئی حرکت یا ہلچل نظر نہ آئے' میری طرف مت آنا۔"

"ٹھیک بھی تھا۔ میں نے صرف چکھا' ٹھنڈک کا اندازہ ... ہونے والا ہے۔ پانی بہت ٹھنڈا تھا۔" کم ہوا۔"

"ہوجائے گا کسی دن۔ میں فریج میں سے رات بھر کا رکھا

میں نے کہا "کیا سراج مرگیا؟"

غالب نے کہا "نہیں۔ لیکن اس کا وزن کسی لاش سے کم تو نہیں ہے۔"

"پانی میں وزن کم ہوجاتا ہے۔ ایک ہاتھ سے اس کو سنبھال لے اور دوسرے ہاتھ سے رسّی کو پکڑ لے" میں نے کہا۔

"ابھی تو میں خود بھی پانی میں ہوں" غالب نے کہا۔

"یار' کیا تو بھی بدحواس ہورہا ہے؟ رسّی پکڑ کے خود اوپر چڑھ جا۔ پاؤں جمالے ڈول پر۔ اور اس کی قمیص کا کالر پکڑ کے صرف منہ کو پانی سے اوپر رکھ۔ تاکہ یہ سانس لیتا رہے۔ تھوڑی دیر کی بات ہے' اگر کوئی نہ آیا ادھر تو پھر سمجھو سب خیریت ہے۔"

غالب آہستہ آہستہ رہٹ کی رسّی کو پکڑنے کے لئے بڑھتا گیا۔ ایک ہاتھ سے وہ سراج کا بوجھ بھی کھینچ رہا تھا جو آسان کام بہرحال نہیں تھا لیکن میں اتنی دور تھا کہ اس کی کوئی مدد نہیں کرسکتا تھا۔ رہٹ کی وجہ سے کنویں کی چوڑائی زیادہ تھی۔ ڈول ایک طرف سے اوپر جاتے تھے تو دوسری طرف سے واپس نیچے آتے تھے۔ اوپر جانے والے ڈول سیدھے تھے۔ نیچے آنے والے الٹے۔ یہ دونوں قطاریں متوازی تھیں مگر ان کے درمیان سات آٹھ فٹ کا فاصلہ تھا۔ میں کنویں کی اس دیوار کے ساتھ لگ گیا تھا جس کے مقابل سیدھے ڈول تھے' جو پانی میں سے گزر آئے تھے چنانچہ بھرے ہوئے تھے۔ غالب دوسری طرف دس بارہ فٹ دور تھا۔ ہم دونوں سیاہ چمڑے کے ڈولوں کے پیچھے ایک ڈیڑھ فٹ کی خالی جگہ میں سما گئے تھے۔ اب کوئی اوپر سے جھانکتا تو اسے کنویں کا ... حصہ صاف نظر آتا۔ وہ روشنی کو منعکس کرنے والی ... سطح کو بھی دیکھ لیتا لیکن اس بات کا امکان کم تھا کہ کالے رنگ کے ڈولوں کی قطار کے آخر میں وہ دو کالے بالوں والے سر بھی دیکھ سکے۔ نیچے تاریکی تھی اور اوپر سے دیکھنے والے کی آنکھوں پر وہ چمک پڑتی تھی جو بیچ کے حصے میں کسی جھلمل کرتے آئینے کی طرح تھی۔ تو وہ کناروں کے اندھیرے میں ویسے بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

غالب نے چند منٹ کے بعد کہا "یار' یہ بہت مشکل کام ہے۔ اس طرح رسّی کو پکڑ کے ایک ہاتھ سے معلق رہنا اور دوسرے ہاتھ سے ایک ایس پی کو نہ ڈوبنے دینا۔"

میں نے کہا "میں آسان کام بتاؤں۔ آپ اللہ کا نام لے کر رسّی کو چھوڑ دیں اور دونوں کنویں کی تہہ میں جاکے بیٹھ جائیں یا لیٹ جائیں۔"

"بالآخر یہی ہوگا۔ کتنی دیر انتظار کریں گے ہم آخر۔"

"کم سے کم آدھا گھنٹا" میں نے کہا "ابھی صرف پانچ ..."

میرے منہ سے بے اختیار ...

"ہاں۔ بہت بھٹکنے کے بعد ہم یہاں پہنچ ہی گئے" غالب نے خوشی سے معمور لہجے میں کہا۔

"نوٹ گیلے ہونے سے خراب نہیں ہوتے" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "ریوالور بھی بے کار ہوگیا۔"

"ابھی تک میں اپنا ریوالور محفوظ رکھنے میں کامیاب ہوں۔"

ہم بہت آہستہ' سرگوشی میں بات کررہے تھے اور یہ کوشش بھی کررہے تھے کہ حرکت سے گریز کریں تاکہ اچانک اوپر سے جھانکنے والے کسی دشمن کی تیز نظر پانی میں تلاطم نہ دیکھ سکے۔ میری نظر بار بار اوپر جاتی تھی جہاں انتہائی بلندی پر آسمان ایک گول' روشن ٹکڑے تک محدود ہوگیا تھا۔ زمین کی اتنی گہرائی میں اتر کے میں نے کبھی پہلے دنیا اور کائنات کی وسعت کا تصور نہیں کیا تھا۔ اب مجھے یوں لگا جیسے میں کسی ٹیسٹ ٹیوب میں بند جرثومہ ہوں اور یہ ٹیسٹ ٹیوب ایک لیبارٹری میں رکھی ہوئی ہے۔

اچانک کسی نے اوپر سے ہنکار کے کچھ کہا۔ اس کی گونج نیچے تک پہنچی لیکن الفاظ میری سمجھ میں نہ آئے۔ میں نے اپنا سر اٹھاکے اوپر دیکھا تو گول' روشن دائرے کے ایک کنارے پر سیاہ نقطہ سا نظر آیا۔ یہ کسی کا سر تھا جو نیچے دیکھ رہا تھا۔ پھر اسی کے ساتھ دوسرا نقطہ نمودار ہوا۔

"وہ... نیچے..." کسی نے کہا اور میں نے اس کے ہاتھ کا اشارہ دیکھا۔

"کہاں؟" دوسرا آگے جھک آیا "کچھ نہیں ہے یہاں۔"

"ابے وہ... کالا کالا... سر ہے کسی کا۔"

"یہ کالے کالے سر لٹکے ہوئے ہیں" دوسرا زور سے ہنسا۔ "ابے یہ ڈول ہیں۔"

"ڈول کے بچے.... تو کانا ہے۔"

"چنڈول کے بچے تو اندھا ہے... صاف پانی نظر آرہا ہے مجھے' نیچے اتر کے دیکھ لے..."

"تو جاکے دیکھ... مجھے یہاں سے بھی نیچے تک صاف دکھائی دیتا ہے" دوسرا بولا۔

پھر کوئی تیسرا فیصلہ کرنے آگیا "کیا ہے؟"

"جھانک کر دیکھ..... وہ اندر اترے ہوئے ہیں" پہلا مصر رہا۔

میں دم سادھے ساکت وصامت رہا۔ اس وقت اگر مجھے ایک چھینک آجاتی تو دنیا یہ کہنے میں حق بجانب ہوتی کہ مرحوم کی موت زکام کے باعث ہوئی۔ تیسرے نے نظروں کو فوکس کرنے کے بعد کہا "میرا بھی خیال ہے کہ کچھ نہیں ہے نیچے۔ رہٹ ہے اور اس کا عکس ہے۔ ویسے کیا حرج ہے دیکھ لینے میں۔"

میرا دل بیٹھنے لگا۔ خ... د تہ رسّی پر جا اترا۔ سراج نے میری تقلید کی۔ مجھے یقین تھا کہ اس طرح میں

لیکن ان میں سے کوئی بھی نہیں آیا۔ انہوں نے پتھر لڑھکا کے دیکھ لینا کافی سمجھا۔ وہ خاصا بڑا پتھر تھا جو فو... ہوائی جہاز سے گرائے جانے والے بم کی طرح نیچے آیا... نے خود کو کنویں کی گیلی مٹی کے ساتھ چسپاں کرلیا لیکن... دفاعی بندوبست بے سود تھا۔ پتھر کی رفتار اتنی زیادہ تھی کہ... وہ وسط میں گرا تو مجھے دکھائی بھی نہ دیا۔ میں نے پانی کا ز... چھپاکا سنا اور بوچھاڑ میرے چہرے تک آئی۔ میری طرح... بھی بچ گیا تھا کیونکہ میں نے اس کی کوئی آواز نہیں سنی...

"دیکھا' میں نے کہا تھا نا...."

"ایسے نہیں پتا چلتا" پہلے شخص نے کہا جو بلاشبہ... سے تیز نظر رکھتا تھا اور سب سے زیادہ ہوشیار تھا۔

"ابے چل" تیسرے نے ایک گالی کے ساتھ کہا "اگر... اندر ہوئے بھی تو ان کی چٹنی بن گئی ہوگی۔"

"چلو' یہاں وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں"... نے کہا۔

میں نے روشنی کے دائرے سے تینوں کالے نقطو... غائب ہوتے دیکھا اور اطمینان کی گہری سانس لی۔

"مرزا جی' خیریت سے ہونا؟"

غالب نے کہا "خیریت کہاں یار..."

"کیوں؟" میں نے گھبراکے پوچھا "کیا ہوا ہے..."

"مجھے کچھ نہیں ہوا۔ میرا خیال ہے... یہ مرگیا..."

"مرگیا... کیسے؟"

"وہ پتھر... اس کی کمر پر لگا تھا" غالب نے کہا "میں... بالکل کنارے پر تھا۔ سراج پانی میں تیر رہا تھا۔ سر میری... تھا۔ ٹانگیں اور دھڑ ذرا دور تھے۔ کمر ٹوٹ گئی اس کی... میرے لئے کامیابی کی خوشی آدھی رہ گئی "یہ تو بہت... ہوا۔"

"ہاں' خواہ مخواہ اسے اتنا اٹھاکے پھرے۔ یہاں تک... اس امید میں کہ یہ کچھ بتائے گا" غالب سخت مایوس ن...

"خدا نے کہاں لاکے اسے کیسے مارا" میں نے کہا... نے تو اپنی طرف سے جاں بخشی کا وعدہ کرلیا تھا لیکن ہم... ہوتے ہیں فیصلہ کرنے والے۔"

"واقعی۔ آدمی کی موت اسے کھینچ لاتی ہے۔ زندگی... وہ تصور بھی نہیں کرسکتا اس جگہ کا" غالب نے کہا۔

"کتنا باعزت عہدہ تھا اس کا۔ کیا رعب اور دبدبہ تھا... وسیع اختیارات تھے" میں نے کہا "ایس پی ضامن رضو... تھے' ایس پی سراج بھی تھا۔ انکل رضوی کتنی آبرو کے... دنیا سے رخصت ہوئے۔ کہ انہیں رونے والے بھی غ...

دوں یا ایک سیڑھی کے فاصلے پر تھا۔ غالب کا نشانہ ہرن تھا۔ ... اتر گیا تھا۔ کنویں کا اوپر والا حصہ قدرے روشن تھا۔ گہرائی کے ساتھ ساتھ تاریکی بڑھ رہی تھی۔ میں مٹی' گھاس اور کائی کی

دے کر کہیں جلادے گی یا میڈیکل کالج کے طلبا کے سپرد کردے گی جو اس کے ٹکڑے کردیں گے اور ہڈیاں بانٹ لیں گے۔ ناکارہ اور بے مصرف حصے کوڑے میں ڈال دیئے جائیں گے۔"

غالب نے کہا "اگر ہم بھی کسی کو بتانا چاہیں کہ سراج کہاں مارا گیا تھا تو شاید صحیح نہ بتاسکیں گے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ تھا کوئی کنواں۔ معلوم نہیں کہاں۔ اوپر سے ایک پتھر آیا' معلوم نہیں کس نے پھینکا تھا۔"

میں نے کہا "مقامِ عبرت ہے۔ جو شخص دوسروں کے قاتلوں کا سراغ لگاتا رہا تھا' اس کے قاتل کے بارے میں کوئی بھی نہیں جانتا۔ خود قاتل کو بھی خبر نہیں کہ اس نے ایک سابق ایس پی کو قتل کردیا۔"

غالب نے کہا "کیا خیال ہے' اب نکل چلیں۔ کافی دیر ہوگئی ہے۔"

"ہاں' چلتے ہیں" میں نے کہا۔

غالب نے سراج کو بہت پہلے چھوڑ دیا تھا۔ شاید اس وقت جب سراج کی کمر پر پتھر لگا تھا۔ اب اس کی لاش کنویں کے ساکت پانی میں تیر رہی تھی۔ یہ میرا دوسرا دشمن تھا جس سے مجھے پرانا حساب بے باق کرنا تھا۔ پہلا دشمن استاد پیڈرو تھا جس نے میرے پاکستان پہنچتے ہی مجھے قاتل بنادیا تھا۔ اس کے بعد سراج نے مجھ پر ستم کے وہ پہاڑ توڑے تھے جن کی یاد سے آج بھی میرے جسم پر لرزہ طاری ہوتا تھا۔ میرا بدلہ کسی نامعلوم شخص نے لیا۔ جو سنگ میرے لئے تھا وہ سراج کے حصے میں آیا۔ دستِ اجل نے اس کا راستہ اور اس کی سمت بدل دی۔ سراج کا بے جان جسم کنویں کی گہرائی میں تیرتا رہا۔ آہستہ آہستہ میں اور غالب رہٹ کے مخالف حصوں کی رسّی کے سہارے پر اوپر چڑھتے گئے۔ کنویں کا روشن حصہ قریب آتا گیا' یہاں تک کہ میں نے اس کی منڈیر سے سر نکالا اور باہر چاروں طرف دور دور تک نظر دوڑاکے دیکھا۔ ہماری تلاش میں سرگرداں دشمن واپس لوٹ گیا تھا یا کسی اور طرف نکل گیا تھا۔

غالب نے بہت ڈبکیاں لگائی تھیں۔ اس کے کپڑے پانی میں شرابور تھے۔ میں صرف پانی کے چھپاکے سے بھیگا تھا۔ میں نے غالب کو مشورہ دیا کہ وہ کپڑوں کو اتار کے نچوڑ لے۔ پھر جو نمی رہ جائے گی وہ ہوا سے ختم ہوجائے گی۔

"اچھا ہے غسل کرلیا آپ نے' عید تو ابھی دور تھی" میں نے کہا۔

"مجھے ڈبل نمونیہ تو ہوچکا ہے" غالب نے سوں سوں کرتے ہوئے کہا "ٹرپل ہونے والا ہے۔ پانی بہت ٹھنڈا تھا۔"

"میٹھا بھی تھا۔ میں نے صرف چکھا' ٹھنڈک کا اندازہ نہیں ہوا۔"

"ہوجائے گا کسی دن۔ میں فریج میں سے رات بھر کا رکھا ہوا پانی آپ پر ڈال کے پوچھوں گا" غالب نے کانپتے ہوئے کہا۔

"واپس چل کے دیکھتے ہیں۔ شاید ہمارا زادِ راہ مل جائے' میری مراد اس تھرماس سے ہے۔"

"وہ اب کہاں چھوڑا ہوگا انہوں نے۔ جوتے ہی مل جائیں تو بہت غنیمت ہے" غالب نے کہا۔

اس نے ٹھیک کہا تھا۔ وہ ہمارے جوتے بھی اٹھاکر لے گئے تھے۔ اب ہم دونوں لکھ پتی ہونے کے باوجود ننگے پاؤں چلنے پر مجبور تھے۔ پانی میں پیروں کی کھال بھی نرم پڑگئی تھی۔ اب کھردری زمین بھی کانٹوں کی طرح پاؤں میں چبھتی تھی۔ جگہ جگہ گول گوکھرو جیسے کانٹے بھی تھے اور نوکیلے کنکر بھی۔ ہم ہمیشہ اچھے سے اچھے جوتے پہننے والے آج پہلی بار اس تکلیف کا تجربہ کررہے تھے جو ہندوستان' پاکستان کے افراد کی زندگی کا حصہ ہے۔ دنیا کے کروڑوں غربت زدہ انسان تمام عمر جوتے پہننے کی عیاشی کا خواب ہی دیکھتے ہیں' اس کی تعبیر نہیں پاتے۔ پاؤں کی راحت سے پہلے پیٹ کی آگ بجھانا ہی مشکل ہوجاتا ہے۔

اس وقت غالب کے خیالات بھی ایسے ہی تھے۔ اس نے چلتے چلتے اچانک کہا "میں نے بچپن میں سعدی کی ایک حکایت پڑھی تھی۔ کسی نے گلہ کیا تھا کہ اے خدا مجھے جوتے تک نصیب نہیں۔ اسی وقت ایک شخص سامنے آگیا جو معذور تھا۔ اس کے پاؤں ہی نہیں تھے۔"

میں نے کہا "ہم خوش قسمتی کو یاد نہیں رکھتے۔ خدا کا کوئی احسان نہیں مانتے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ زندگی میں جو راحت میسر ہے وہ تو ہمارا حق ہے۔ جب محرومی آتی ہے تو احساس ہوتا ہے کہ نعمت کیا ہے۔"

ہم جس آبادی کی طرف بڑھ رہے تھے اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ آبادی کا پہلا گھر نظر آیا تو میں نے کمر کے گرد لپٹی ہوئی بیلٹ کھولی اور اس میں سے تقریباً دس ہزار روپے نکال لئے۔ باقی رقم کو میں نے پھر اسی طرح بیلٹ کی صورت میں لپیٹا اور کمر کے اوپر باندھ لیا۔ جب میں اس کارروائی میں مصروف تھا تو غالب بستی پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال رہا تھا۔ یہ جگہ قدرے بلندی پر تھی۔ آگے نشیب تھا چنانچہ بستی کے سب مکانوں کا پھیلا ہوا منظر یہاں سے صاف دکھائی دیتا تھا۔

اچانک غالب نے میرا بازو پکڑلیا "سکندر..."

میں نے حیران ہوکے کہا "کیا ہے؟" اور پھر اس سمت میں دیکھا جدھر غالب کی نگاہیں جم کے رہ گئی تھیں۔

"وہ دیکھ...." اس نے انگلی سے اشارہ کیا "مسجد کے مینار سے دائیں جانب ... درخت ... اس کے بعد...."

میرے منہ سے بے اختیار نکلا "گولڈن فالکن۔"

"ہاں۔ بہت بھٹکنے کے بعد ہم یہاں پہنچ ہی گئے" غالب نے خوشی سے معمور لہجے میں کہا۔

یہ ایک وسیع سہ منزلہ عمارت تھی۔ مغرب میں غروب کے قریب پہنچنے والے سورج کی کرنیں اس کی بے داغ سفیدی پر براہِ راست پڑ رہی تھیں اور گردوپیش کے سرسبز ماحول میں یہ عمارت زیادہ ہی اُجلی اُجلی محسوس ہوتی تھی۔ یہ سارا علاقہ اونچا نیچا تھا۔ پتھریلی زمین کے بہت سے حصے باقاعدہ چٹانوں کی شکل میں پھیلے ہوئے تھے اور ایسی ہی ایک چٹان پر وہ عمارت ایستادہ تھی۔ بظاہر یہ رہائشی عمارت تھی۔ پرانے ڈیزائن کی نئی کوٹھی جس کی آرائش میں جالیوں اور محرابی کھڑکیوں کا بہت دخل تھا لیکن سب سے نمایاں ایک عقاب کی شبیہہ تھی جو عمارت کے ماتھے پر یعنی سب سے اوپر عین وسط میں سیمنٹ سے بنائی گئی تھی۔ بعد میں اس پر سنہرا رنگ کردیا گیا تھا جو اس وقت چمک رہا تھا۔ اس سنہرے شاہین کے نیچے سنِ تعمیر چار سال پہلے کا تھا۔

میں اور غالب دم بخود اس پرندے کی تصویر دیکھتے رہے جس نے اپنے سنہرے پر پرواز کے لئے پورے کھول رکھے تھے۔ ہم نے ایک خفیہ زبان کا مطلب اخذ کرنے میں بہت سر کھپایا تھا تب کہیں جاکے اس کا سراغ پایا تھا۔ پھر اس کی تلاش میں ہم سے پہلے رابعہ اور نازو نکلی تھیں۔ ہم بعد میں چلے تھے مگر بھٹک گئے تھے اور سراج کے ساتھ خوار ہوئے تھے۔ اس تلاش نے ہمیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔

میں نے کہا "مرزا جی، لو ہم منزل پر پہنچ گئے۔"

غالب نے کہا "کتنا آسان کام تھا یہ... کتنی مشکل سے ہوا۔"

میں ہنسا "کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ منزل ایسے ملتی ہے جیسے بھول بھلیوں سے باہر نکلنے کا راستہ۔"

"اب کیا کرنا چاہئے؟ معلوم کریں کہ یہ کیا ہے۔"

میں نے کہا "ایسے کہاں معلوم ہوگا اور اتنا تو رابعہ اور نازو بھی معلوم کرگئی ہوں گی کہ یہاں کون رہتا ہے۔ نہیں رہتا تو کیوں نہیں رہتا۔ یہ گھر ہے، ہوٹل یا کوئی ایسی ویسی جگہ۔"

"تو پھر ہم پہلے یہی معلوم کرتے ہیں کہ یہاں رابعہ اور نازو آئی تھیں یا نہیں" غالب نے کہا "آئی ہوں گی تو سب نے انہیں دیکھا ہوگا اور انہیں یاد بھی رکھا ہوگا۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا "ہم ننگے پاؤں پھرتے ہوئے خود کو مشتبہ بنالیں گے۔ پہلے کہیں سے جوتے مل جائیں تو اچھا ہے۔"

"ملیں گے کیوں نہیں۔ بستی ہے تو بازار بھی ہوگا۔"

"جوتے کھاکے... میرا مطلب ہے جوتے پہن کے پہلے چائے، اس کے بعد مزید چائے اور پیٹ کا خلا بھرنے کے لئے جو میسر آئے...."

غالب نے کہا "یہاں ہندو ہوٹل الگ ہوں گے، مسلم ہوٹل الگ۔"

میں نے کہا "ہم اپنا ایمان خراب نہیں ہونے دیں گے۔ ویسے اپنا ایمان اتنا کچا نہیں ہے کہ ہندو کے ہوٹل کی ... سے خطرے میں پڑجائے۔"

میں اور غالب نشیب سے اترے تو ایک تنگ سی گلی ... طلوع ہوئے۔ یہ اس بستی کا سب سے بڑا بازار معلوم ہو ... کیونکہ دُکانیں قطار میں تھیں اور خاصے خطرناک نظر ... والے دیہاتی مرد جتھوں کی صورت میں ہر طرف پھر ... تھے۔ مساوی تعداد میں خواتین شاپنگ کررہی تھیں۔ ... شاپنگ روز مرہ ضروریات کے دائرے تک محدود تھی ... پنساری کی دُکانوں پر گمان ہوتا تھا کہ یہاں کوئی واردات ... ہے یا ہونے والی ہے۔ سبزی فروش نسبتاً فارغ تھے اور دن ... کی بچی ہوئی سبزی کی کلیئرنس سیل کررہے تھے۔ نہ جا... کدھر سے ایک ہٹا کٹا مولوی سائیکل کو خچر کی طرح دوڑاتا آیا ... راکٹ کی طرح ہم دونوں کے درمیان سے گزر گیا جیسے ... نے قصداً ایسا کیا تھا اور کسی سے شرط لگائی تھی۔ ہم تو خیر ... مگر وہ ہمارے سامنے سائیکل سمیت لیٹ گیا۔

میں نے اٹھنے میں اس کی مدد کی "یہ کرتب آپ نے ... مرتبہ دکھایا ہے آج؟"

وہ کپڑے جھاڑ کے بولا "لاحول ولا قوۃ۔ کیسا کرتب! "آپ ہماری ٹانگوں میں سے گزرنا چاہتے تھے نا؟" نا... نے کہا۔

میں نے کہا "نہیں یار، یہ ہم دونوں کو گرانا چاہتے تھے ایک دفعہ میں۔"

کچھ لوگ جو آس پاس رک گئے تھے، ہنسنے لگے۔ مولا... مزید جزبز ہوگیا تاہم اس نے جواب دینے کے بجائے وہاں ... فوراً بھاگنے کی کوشش کی۔ وہ بڑی جلدی میں معلوم ہوتا ... یہ سارا علاقہ اونچا نیچا تھا۔ سڑک کی اترائی تھی اور سائیکل ... بریک نہیں تھے جس کی وجہ سے یہ حادثہ پیش آیا۔ مولا... لنگڑا رہا تھا اور سر کے ایک حصے کے بارے میں تشویش کا ... نظر آتا تھا لیکن اس کی سائیکل کو زیادہ چوٹیں آئی تھیں ... جب اس نے پھر اس پر سوار ہوکے روانگی کا ارادہ کیا تو ... پہیے نے گھومنے سے انکار کردیا۔ اس تاخیر کے بڑے ... نتائج برآمد ہوئے۔

پیچھے سے کوئی شخص شور مچاتا ہوا آیا اور اس نے ... ہمیں دھکیل کر ایک طرف کیا۔ پھر اس سے پہلے کہ مولا... فرار ہوتا، وہ اس سے بھوت کی طرح چمٹ گیا۔ وہ خاصے ... پیٹ والا دھوتی پوش بنیا تھا جو نہ جانے کہاں سے دوڑتا ہوا ... تھا کہ اس کا پیٹ دھونکنی کی طرح کام آرہا تھا۔ ہانپتے ہوئے ... نے مولوی کو قسطوں میں گالیاں دیں۔

"آج .... نہیں چھوڑوں گا .... اب کیسے .... بھاگے گا ... تیرے کپڑے اتروانا ہوں .... ابھی ... اسی جگہ ..."

مجھے بڑی حیرت ہوئی جب مولوی نے جواب ... منمنا کے بڑی عاجزی کے ساتھ کہا "لالہ جی، میری بات سن لو۔"

"ارے .... تیری سنتے سنتے... چھ مہینے اوپر ہوگئے..." لالہ جی نے اب اسے باقاعدہ مارنا شروع کیا۔ وہاں ایک مجمع اکٹھا ہوگیا لیکن ان میں سے کسی نے مولوی کی مدد نہیں کی۔

میں نے اپنے ساتھ کھڑے ہوئے ایک تماشائی سے کہا۔ "یار، یہ سب لوگ دیکھ رہے ہیں۔ کوئی بیچ میں نہیں پڑتا۔"

وہ ہنسا "یہ تو ہوتا رہتا ہے۔"

میں نے کہا "آخر لالہ جی کیوں مار رہے ہیں اس غریب کو؟"

"غریب!" مخاطب نے مجھے یوں دیکھا جیسے مولوی کی حمایت کرکے میں نے سخت احمق ہونے کا ثبوت دیا ہے "اس بدمعاش کے ساتھ تو جو بھی ہو کم ہے۔ چھ مہینے سے مکان کا کرایہ نہیں دیا۔ بیوی کے زیور تک بیچ ڈالے۔ کام کرتا نہیں، سب کو ٹھگتا پھرتا ہے۔ یہ سائیکل بھی نہ جانے کس کی اٹھائی ہوگی۔"

اب میں نے دخل دینا مناسب سمجھا۔ میں نے لالہ جی کا ہاتھ پکڑ کے کہا "لالہ جی، یہ کیا کررہے ہیں آپ؟ شرم آنی چاہئے۔"

لالہ جی حسبِ توقع اچھلے "شرم مجھے آنی چاہئے۔ تو کون ہے رے، اس کا حمایتی؟" انہوں نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا "نیا ہے کوئی۔"

"نیا تو ہوں، مگر پھر بھی یہ ظلم نہیں دیکھ سکتا۔ آخر یہ سب کیا ہے؟" میں نے کہا "اب آپ نے اس پر ہاتھ اٹھایا تو میں آپ کے ہاتھ توڑ دوں گا۔"

لالہ جی آپے سے باہر ہوگئے "میں تجھے اور اسے دونوں کو ابھی پولیس کے حوالے کرتا ہوں۔ فقیر کا حمایتی کنگلا" انہوں نے میرے جوتوں سے بے نیاز پیروں کی طرف اشارہ کرکے رائے عامہ کو اپنے حق میں کرنے کی کوشش کی۔

آٹھ دس افراد کے مجمع میں سے ایک مقامی "دادا" ٹائپ شخص آگے بڑھا اور اس نے لالہ جی کا ہاتھ چھڑانے کے لئے میرے ہاتھ کو جھٹکا دیا لیکن میری گرفت مضبوط تھی۔ جھٹکے سے لالہ جی گرتے گرتے بچے۔

"دیکھ بے، زیادہ بک بک کرنے کی ضرورت نہیں" وہ تقریباً مجھ سے چمٹ کے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا "بہت خیال ہے اپنے باپ کا تو اس کے لئے پیسے نکال کتنے ہیں جیب میں۔"

میں نے لالہ جی کا ہاتھ چھوڑ کے کہا "اچھا، تو یہ لین دین کا معاملہ تھا۔ کتنی رقم ہے؟ اس کے لئے بازار میں مارپیٹ اور گالی گلوچ کی کیا ضرورت ہے۔"

لالہ جی اچھلنے لگے "اور پھر کیا کروں؟ تھانہ کچہری کروں؟"

دادا بننے والے نے کہا "لالہ جی، آج لے ہی جاؤ اسے تھانے۔ اس کو بھی اور اس کے داماد کو بھی۔"

لوگ ہنسنے لگے۔ کسی نے کہا "داماد ہے کہ بہنوئی!"

میں نے سادگی سے کہا "بہنوئی تو اس کا ہوں" اور بدمعاش کی طرف دیکھا۔

"تیری تو....." وہ بھڑک کے مجھ پر حملہ آور ہوا۔ اس نے میرے سر پر مکا مارنے کی کوشش کی۔ میں نے جھکائی دے کر اس کی کلائی پکڑی۔ اسے ایک چکر دیا اور تھوڑا سا اوپر اٹھا کے الٹ دیا۔ ہنسنے والے ایک دم سنجیدہ اور خاموش ہوکے اس شخص کو دیکھنے لگے جو بازار میں چت پڑا اپنی بے بسی کی تصویر نظر آتا تھا۔ بھرے بازار میں اس کی دادا گیری کا بھانڈا پھوٹ گیا تھا اور ایک طرح سے اس منصب پر اب میں فائز تھا۔ لوگ خوف، حیرت اور خاصے احترام کے ساتھ مجھے دیکھ رہے تھے۔

میں نے کہا "چلو لالہ جی، حساب کرلیتے ہیں کہیں بیٹھ کے۔ کتنی رقم ہے کل؟" اور جیب میں سے دس ہزار روپے نکالے۔ لوگوں میں پہلے سے زیادہ حیرت کی لہر دوڑ گئی۔ مولوی اور لالہ جی دونوں دم بخود کھڑے رہے۔

میں نے اپنی بات دہرائی "اب کیا ہے؟ کھڑے کیوں ہو، چلو۔"

مولوی نے سخت شرمندگی کے ساتھ سائیکل کو اٹھایا اور اپنے ساتھ گھسیٹنا شروع کیا۔ لالہ جی نے احتجاجی انداز میں مارچ شروع کیا۔ کچھ لوگ شوقیہ پیچھے آئے تو میں نے ڈانٹ کے بھگادیا۔ میری دھاک پہلے ہی بیٹھ گئی تھی۔ لوگ فوراً ہی چمپت ہوگئے۔

ایک گلی میں ٹاٹ کا پردہ ہٹا کے مولوی نے کہا "اندر آجائیں۔"

لالہ نے کہا "ہم یہیں اچھے، تم حساب کرو۔"

میں نے کہا "میں کوئی معاملہ گلی سڑک پر طے نہیں کرتا۔"

مولوی نے ابھی تک اپنے محسن سے یعنی مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ نہ میرا شکریہ ادا کیا تھا اور نہ اخلاقاً یہ کہا تھا کہ آخر میں اس کا قرض کیوں ادا کرنا چاہتا ہوں۔ شاید وہ لالہ کے سامنے یہ ظاہر کرکے خوش ہورہا تھا کہ اسے لاوارث سمجھنے والے غلطی پر تھے، وہ اتنا گیا گزرا بھی نہیں تھا۔ کوئی آ ہی گیا اس کا ساتھ دینے والا۔

میں اور لالہ جی دو تپائی نما موڑھوں پر بیٹھے، غالب اور مولوی ایک کھاٹ پر۔ لالہ جی کی نظر بار بار ہمارے پیروں پر جاتی تھی۔

"آخر تم ہو کون؟ پہلے کبھی دیکھا نہیں۔"

میں نے کہا "آپ اگر گینڈا دیکھیں گے تو اس سے بھی یہی سوال کریں گے لیکن اس سوال کی گینڈے کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں۔"

غالب نے کہا "ہم مریخ کی مخلوق ہیں۔"

"وہ جوتے نہیں پہنتے کیا؟" لالہ نے طنزاً کہا۔

میں نے کہا "یہاں کے لوگ جوتے کھانے کے عادی معلوم ہوتے ہیں۔"

غالب نے کہا "شاید اور کچھ ملتا نہیں ...."

میں نے کہا "ہم نماز پڑھنے کے لئے مسجد میں گئے تھے، کسی بدبخت نے ہم دونوں کے جوتے اٹھالئے۔ خیر، اللہ معاف کرے اسے۔ شاید وہ ہم سے زیادہ ضرورت مند تھا۔"

اندازہ میں نے ابتدا ہی میں کرلیا تھا کہ مولوی مسلمان ہے۔

میری بات پر وہ چونکا "ماشاء اللہ۔"

میں نے کہا "میرا نام انشاء اللہ خان ہے۔ ماشاء اللہ اس کا نام ہے، میرے بھائی کا۔"

مولوی نے دانت نکال کے کہا "آپ مسافر ہیں؟"

میں نے کہا "ہم شکاری ہیں۔ ادھر سے گزر رہے تھے ایک شیر کا تعاقب کرتے ہوئے کہ گیدڑ اور کتے کی لڑائی دیکھ لی۔"

لالہ جی اور مولوی دونوں کی شکل اتر گئی کہ معلوم نہیں میں نے کس کو گیدڑ کہا ہے اور کسے کتا۔

"اس علاقے میں شیر تو نہیں ہے۔" لالہ جی نے کہا۔

"ہمارے ساتھ چلو، پتا چل جائے گا۔ بکرے کی جگہ تمہیں باندھ دیں گے۔"

غالب نے سرہلایا "شیر بھی تمہیں کھاکے خوش ہوگا۔ اچھا خاصا گوشت ملے گا۔"

لالہ جی نے تن کے کہا "بات ختم کرو جی۔ چھ مہینے کا کرایہ بارہ سو۔ بیاج تین سو۔"

"اور بیاج پر بیاج مزید پچیس فیصد... پچھتر روپے" میں نے کہا "یہ لو دو ہزار۔ چار سو پچیس واپس کرو۔"

لالہ جی کا منہ کھلا اور بند ہوگیا۔ انہوں نے بنڈی کی جیب سے چار سو پچیس روپے نکال کے مجھے پکڑائے۔

میں نے کہا "پچیس دے دو۔ چار سو رکھ لو۔ اگلے دو مہینے کا کرایہ۔ کہا سنا معاف۔ ہم ابھی چلے جائیں گے لیکن ہوسکتا ہے پھر کبھی ایسے ہی آجائیں۔"

لالہ جی نے ہاتھ جوڑ کے کہا "رام بھلی کریں۔"

میں نے کہا "کبھی خود بھی تو بھلائی کیا کرو۔"

جب لالہ جی چلے گئے تو مولوی ایک دم اٹھا اور اس نے میرے پاؤں پکڑ لئے "آپ کا یہ احسان ...."

میں نے اسے سیدھا بٹھا کے کہا "احسان کے بچے، تمہاری عزت غیرت سب مرگئی ہے! مسلمان ہوکے ہندو سے گالیاں جوتے کھاتے ہو۔ کام دھندا نہیں کرتے۔"

اب اندر سے کسی عورت نے اسے کوسنا شروع کیا "اجی اس سے تو یہ مرجائے، میرا عذاب ختم ہو۔ یہ سور کا جنا مجھے بھی بیچ دے گا کسی دن۔"

میں نے ڈانٹ کے کہا "یہ کیا بکواس لگا رکھی ہے۔ تمہارا شوہر ہے یہ" اس پر کوئی اثر نہ ہوا "اجی بھاڑ میں جائے ایسا شوہر۔

...اللہ کرے اس پر بجلی گرے، ہیضہ ہو اسے ... میں [..] کرلوں۔"

"پھر اس پر بجلی گرے، اسے ہیضہ ہو تاکہ تم تیرا [..]" غالب نے کہا "پھر چوتھا۔ علیٰ ھذالقیاس ..."

عورت کے واویلے سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مو[..] کو نشے کی لت ہے۔ وہ ہر شخص کا مقروض ہے اور اب [..] موٹی چوریاں بھی کرنے لگا ہے۔ اس نے واقعی بیوی کے [..] بیچ کھائے تھے۔ جس مقصد کے تحت میں نے یہ نیکی کی [..] پورا ہوتا نظر آتا تھا۔ ہم اس بے غیرت اور لالچی آدمی کو [..] سکتے تھے اور پیسے کے لئے وہ ہمارے جائز اور ناجائز سب [..] کرسکتا تھا۔ اس کی داڑھی کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں [..] وہ مولوی نظر آتا تھا مگر مولوی نہیں تھا۔ الٹا اس جیسے شخص [..] وجہ سے مولوی بدنام ہوسکتے تھے۔

میں نے کہا "بہن، کتنے کے زیور تھے تمہارے؟"

"تھے تو پورے پانچ ہزار کے۔ یہ دو ہزار میں گروی [..] اب دو ہزار میں اس کی میّا کو بیچ کر لاؤں؟"

میں نے اس زبان دراز، بیہودہ گوئی میں طاق اور بد[..] عورت سے کہا "میں دے کر جاؤں گا۔ اپنا زیور چھڑا لینا [..] آئندہ کا میں ذمے دار نہیں۔"

"اجی آئندہ یہ میرے گہنے کی طرف آنکھ اٹھا کے دیکھ[..] میں اس کی آنکھیں پھوڑ دوں۔" اس نے یہ اعلان کر[..] ہوئے خاصی مسرت کا اظہار کیا۔

غالب نے کہا "پھر یہ تمہیں کیسے دیکھے گا؟"

اب مولوی نے کہا "لعنت اس پر جو شکل دیکھنا چاہ[..] اس منحوس چڑیل کی۔ جو عذاب بن کے نازل ہوگئی ہے [..]"

ظاہر ہے اس کے بعد فریقین کے درمیان ایک خون[..] زبانی جنگ ہوئی جس میں ایک دوسرے کے لئے بدترین [..] ناقابلِ اشاعت الفاظ استعمال ہوئے۔ قصوروار اگر مرد تھا [..] مرد کو بگاڑنے کی ذمے دار عورت بھی تھی۔ اگر وہ چاہتی تو [..] عورت ہونے سے فائدہ اٹھا کے اپنے شوہر کو نرمی، پیار [..] محبت سے راہِ راست پر بھی لاسکتی تھی لیکن اب تو معاملہ [..] ... وہ ایک دوسرے سے بیزار تھے اور یہ بیزاری بڑھتی جا[..] تھی۔ ان کے ازدواجی مستقبل کی بہتری کے لئے ہم کچھ [..] نہیں کرسکتے تھے۔ خود کو اس کے بچپن کے دوست [..] کرتے ہوئے ہم نے مولوی کو اتنا دے دیا کہ اس کے سار[..] قرضے ختم ہوجائیں۔ شرمندگی، احسان مندی اور عاجزی [..] جذبات سے مولوی ہمارا غلام ہوچکا تھا۔ ہم نے وہاں غسل [..] مولوی کو بازار سے جوتے لانے بھیجا۔ اسی کے گھر میں [..] مرضی کی چائے بنواکے پی اور جب اس کی بیوی ہماری خد[..] سے فراغت پاکے دوڑی دوڑی اپنے گہنے چھڑوانے گئی تو [..] نے مولوی سے مطلب کی بات کی۔ اس کا نام شاکر علی [..]

میں نے کہا "شاکر علی، ہم نے تمہارے سب مسئلے حل کردیے۔ تم ہمارے لئے کیا کرسکتے ہو؟"

اس نے خوشامدانہ انداز میں کہا "میں آپ کا زر خرید [..] آپ کے لئے جان بھی نچھاور کرسکتا ہوں۔"

میں نے کہا "جان کو سنبھال کے رکھو۔"

غالب نے کہا "کرنا ہی ہے تو اپنی منکوحہ پر نچھاور کرو۔"

میں نے کہا "ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ اگر تم ہماری توقعات پر پورے اترے تو باقی سب تمہارے" میں نے دس ہزار میں سے بچ جانے والے نوٹوں کو لہرایا۔

شاکر کی آنکھوں میں لالچ کی چمک پیدا ہوگئی "آپ حکم کرو۔"

میں نے کہا "تم اس گاؤں میں کب سے ہو؟"

"پیدائش کے وقت سے۔ جس دن جنگِ عظیم شروع ہوئی تھی اسی دن میں پیدا ہوا تھا۔"

"کاش کہ تم پیدا ہونے کی غلطی نہ کرتے۔ یہ جنگِ عظیم پہلی تھی یا دوسری؟" غالب نے کہا۔

"کیا میں بچپن کا لگتا ہوں؟" شاکر جھینپ کر بولا۔

غالب نے کہا "اپنی حرکتوں سے تم سٹھیائے ہوئے یعنی ساٹھ کے لگتے ہو۔"

میں نے غالب کو گھور کے واضح کیا کہ میں سنجیدگی سے بات کرنے کے موڈ میں ہوں "شاکر، ہم یہاں ایک خاص مقصد سے آئے ہیں۔"

"وہ کیا مقصد ہے؟"

"تمہارے لئے مقصد جاننا ضروری نہیں" میں نے کہا۔ "ہم جلد از جلد یہاں سے جانا چاہتے ہیں۔"

"کہاں جانا ہے آپ کو؟"

"جہنم میں۔ اب بیچ میں مت بولنا ورنہ ہم یہ کام کسی اور کے سپرد کردیں گے۔ تمہارا پانچ ہزار کا نقصان ہوجائے گا" میں نے خفا ہوکے کہا "تم کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ اس نے تمہارے لئے غیب سے ہمیں بھیج دیا۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ بعد میں تم کسی سے کچھ نہیں کہوگے۔ سوائے اس کے کہ ہم بچپن کے دوست تھے اور یہ ملاقات ایک اتفاق کا نتیجہ تھی۔ ہم بمبئی کے کاروباری لوگ تھے اور واپس بمبئی چلے گئے۔ اگر اس سے زیادہ تم نے کسی کو کچھ بتایا تو یہ سمجھ لو کہ تمہاری بیوی کی سب دعائیں قبول ہوجائیں گی۔"

"کیا مطلب؟ ہیضہ ہوجائے گا مجھے یا بجلی گرے گی مجھ پر؟"

"نہیں، ہمارے دشمن تم کو بجلی لگا کے گرادیں گے" غالب بولا۔

"ہمارے دشمن تمہیں مار ڈالیں گے۔ وہ تم سے پوچھیں گے کہ وہ دونوں کہاں گئے۔ چونکہ تمہیں کچھ معلوم ہی نہیں ہوگا اس لئے تم انہیں کچھ نہیں بتا سکوگے۔ وہ سمجھیں گے، تم جھوٹ بول رہے ہو۔ جھوٹ بولوگے تو انہیں معلوم ہوجائے گا۔ ہر صورت میں تمہارا انجام برا ہوگا۔"

"اور پھر تمہاری بیوی وہی کرے گی جو اس کا پروگرام ہے۔ ... ٹھیک چار مہینے دس دن بعد وہ تمہاری بیوہ نہیں رہے گی" غالب نے کہا۔

اس خیال نے مولوی کو ملول کیا "میں وعدہ کرتا ہوں کہ کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ یہ بتاؤ کہ جس مکان پر سنہرے رنگ کا باز بنا ہوا ہے وہ کس کا ہے؟" میں نے کہا۔

"ملہوترہ کا" شاکر نے کہا "وہ تو بڑا خطرناک دشمن ہے۔"

میں نے کہا "میں نے یہ کب کہا ہے کہ وہ میرا دشمن ہے۔"

شاکر نے سٹپٹا کے کہا "وہ نہیں ہے .... پھر کون ہے؟"

میں نے اس کے سوال کو گول کردیا "وہ کیوں خطرناک ہے؟ کیا کرتا ہے؟"

"یہ تو معلوم نہیں کہ کیا کرتا ہے" شاکر نے سوچ کے کہا۔ "اس کے باپ ملہوترہ صاحب تو بڑے اچھے اور سچے آدمی تھے۔"

"وہ بھی ملہوترہ تھے" غالب نے کہا "باپ بیٹے کا ایک ہی نام!"

"یہ ذات ہے" میں نے کہا "آخر ہمارے بھی تو قریشی صدیقی ہوتے ہیں۔"

"انہوں نے بہت نیک کام کئے تھے پیسے سے" شاکر نے کہا "یہ مندر انہوں نے ہی بنوایا تھا۔ اس کے ساتھ ایک یتیم خانہ تھا جسے ہندو اناتھ آشرم کہتے ہیں۔"

میں نے کہا "صرف ہندوؤں کے لئے تھا ان کا پیسہ اور ان کا نیکی کا جذبہ؟"

شاکر نے کہا "نہیں۔ ایک خیراتی ڈسپنسری بھی تھی۔ ہندو مسلمان دونوں کے لئے۔ ادھار بھی دیتے تھے وہ سب کو۔"

"گویا مسلمانوں کو خیرات میں دوا مل جاتی تھی، بیمار ہونے کی شرط تھی۔ اور ادھار مل جاتا تھا، اس کے لئے محتاج ہونے کی شرط تھی۔ اس پر وہ سود لیتے ہوں گے۔ جائیدادیں قرق کرتے ہوں گے۔ تم اس کے باوجود انہیں اچھا اور سچا آدمی کہتے ہو۔"

شاکر بغلیں جھانکنے لگا "وہ ... دراصل ... مسلمان غریب تھے اکثر۔ ہندو کاروبار پر قابض تھے۔ ایک گھر سیّد صاحب کا تھا ... انہوں نے یہ مسجد بنوائی تھی۔ ان کی اولاد عیاشی میں پڑگئی۔ قالین کا کاروبار تھا۔ وہ بھی بیچ دیا۔ آج کل سنا ہے بمبئی میں بھیل پوری بیچتے ہیں۔ دو گھر اور تھے پیسے والے۔ ان کے درمیان بہت پہلے کارپوریشن کے انتخابات کے موقع پر آپس میں ٹھن گئی تھی۔ جو کچھ بچا وہ مقدمے بازی میں لگ گیا۔ ان کی جائیدادیں بھی ملہوترہ نے خرید لیں۔"

میں نے افسوس اور دکھ سے سرہلایا "یہی تو مسئلہ رہا ہے

ہم مسلمانوں کا۔ بے جا اسراف، جھوٹی شان و شوکت، آپس کی رنجش۔ اسی سے فائدہ اٹھا کے ہندوؤں نے ہمیں کنگال کیا۔ ...خیر، تم طہورترہ کے بیٹے کی بات کرو۔"

"بیٹا ایک نمبر کا لفنگا تھا۔ باپ کی زندگی میں بھی اس کی حرکتوں سے سب پریشان تھے۔ کہتے ہیں ایک بھائی کو اور اپنے باپ کو خود اسی نے قتل کیا۔ بھائی کو کنویں میں پھینک آیا۔ وہ شکار پر گیا تھا اور لوٹ کر نہیں آیا۔ ساتویں دن اس کی سڑی ہوئی لاش آئی۔ رات کو اس نے باپ کو گلا گھونٹ کے مار ڈالا۔ مشہور یہ کیا کہ صدمے سے اس کا ہارٹ فیل ہو گیا۔ پولیس کے ساتھ مل کے اس نے اپنے خلاف تفتیش ہونے ہی نہیں دی۔ اس کے خلاف شکایت کون کرتا۔ سبھی ڈرتے تھے۔ لیکن یہ بات سب کو معلوم ہے یہاں۔ بعد میں اس نے یتیم خانہ بند کر دیا۔

"اور یتیم بچے کہاں گئے؟"

"معلوم نہیں... اس کا کہنا تھا کہ سب کا بندوبست ہو گیا ہے۔ اچھے گھروں میں" شاکر بولا۔

"اس نے سب کو بیچ دیا ہو گا۔ وہ واقعی اچھے گھروں میں ہوں گے مگر غلامی کر رہے ہوں گے" میں نے کہا۔

"اب اس اناتھ آشرم میں کیا ہے؟" غالب نے ایک اچھا سوال کیا۔

شاکر بولا "گودام ہے اس کا۔"

"وہ خود کہاں ہے؟ کیا کرتا ہے؟"

"بمبئی میں کہیں رہتا ہے۔ مہینے میں چار چکر لگاتا ہے۔ کاروبار کا کسی کو علم نہیں" شاکر نے کہا۔

"کیا وہ اس کوٹھی میں قیام کرتا ہے؟"

"ہاں۔ جب آتا ہے تو وہیں رہتا ہے... ایک رات..."

"یہ کوٹھی تو نئی ہے۔ پہلے کیا تھا یہاں؟"

"وہی ڈسپنسری تھی جو باپ نے بنوائی تھی۔ جب اسے گرایا گیا تو کچھ لوگوں نے شور کیا تھا۔ اس نے سب کو اٹھوالیا۔"

"کیسے اٹھوالیا۔ کرین سے؟" غالب نے کہا۔

شاکر علی نے اسے افسوس سے دیکھا "اپنے غنڈوں کی مدد سے۔ اسی گاؤں کے دس لڑکے پال رکھے ہیں اس نے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ بدمعاش ہیں جو کسی کا لحاظ نہیں کرتے، کسی کو نہیں بخشتے۔ اس مندر کا جو پرانا پروہت تھا وہ ایسے ہی مارا گیا۔"

"کیسے مارا گیا؟"

"اس نے سب کے سامنے کہا تھا کہ مندر پوجا پاٹھ کی جگہ ہے۔ اسے کسی اور کام کے لئے استعمال نہیں کیا جا سکتا ور میرے جیتے جی ایسا نہیں ہو گا۔"

"یہ کب کی بات ہے؟"

"سال، ڈیڑھ سال پہلے کی" شاکر بولا۔

"تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ طہورترہ اسے کس مقصد کے لئے استعمال کرنا چاہتا تھا؟"

شاکر نے نفی میں سر ہلایا "ظاہر ہے کوئی غلط مقصد..."

"مندر کے ساتھ جو اناتھ آشرم تھا، وہ کب سے گو... کے طور پر استعمال ہو رہا ہے؟" میں نے محسوس کیا کہ ... سے مجھے صحیح نتائج حاصل ہو رہے ہیں۔

شاکر علی نے سوچ کے کہا "بہت پہلے سے۔ باپ ... مرنے کے بعد ہی طہورترہ نے یتیم خانہ خالی کرا لیا تھا۔"

"اور باپ کب مرا تھا اس کا؟ یہ تو سب جانتے ہوں..."

"ہاں۔ چار سال ہو گئے یا ہونے والے ہیں۔"

"پھر مندر کا جھگڑا کیسے طے ہوا؟" میں نے کہا۔

"طے کہاں ہوا... اس کے بدمعاشوں نے پروہت ... دھمکایا تو پروہت نے سب کی موجودگی میں کہہ دیا کہ ... دھمکیاں دی جا رہی ہیں لیکن یہ مندر کسی کی جاگیر نہیں۔ ... طہورترہ کے باپ نے بنوایا ضرور تھا مگر طہورترہ کا اس پر کو... نہیں۔ طہورترہ نے اسے ذلیل کیا کہ تو میرے باپ کے ... پر پلنے والا کتا آج مجھ پر بھونکتا ہے۔ پروہت نے کہا کہ تیرا ... تو میری اتنی عزت کرتا تھا اور تو مجھے کتا کہتا ہے۔ اس پر ... نے پروہت کے تھپڑ مار دیا اور کہا کہ میرے باپ نے تو اور ... ت سی غلطیاں کی تھیں۔"

"سب سے بڑی غلطی تو وہ خود تھا" غالب نے کہا۔

شاکر علی نے سر ہلایا "پروہت نے بھی کچھ ایسا ہی ک... لیکن اس وقت لوگ بیچ میں پڑ گئے تھے اور بات ختم ہو... طہورترہ بھی اگلے دن سب کی موجودگی میں آیا اور اس نے ... ڈ کے پروہت جی کے پیر چھوئے اور ان سے معافی ما... لہ کل میں نشے میں تھا لیکن یہ اس کی چال تھی۔ اس ... بھی مہینہ بھی نہیں گزرا تھا کہ پروہت کے خلاف ... سازش کی گئی۔ شہر سے کوئی بدنام عورت رات کے ... پروہت کے پاس پہنچی کہ مجھے پناہ چاہئے، بستی کے ... میرا پیچھا کر رہے ہیں۔ پروہت نے کہا کہ اندر آ جاؤ۔ ... کے گھر میں کس کی مجال ہے کہ تمہیں ہاتھ بھی لگا سکے... اندر پہنچتے ہی وہ خود بھگوان کے اس داس کے گلے ... پروہت جنم جنم کا برہمچاری تھا۔ یعنی شادی نہیں کی ... تھے۔

وہ گھبرا گیا۔ عورت نے خود کپڑے اتار دیے اور ... پا دیا۔ جب لوگ پہنچے تو پروہت بے چارے کی دھو... ل چکی تھی۔ اکثر لوگ جانتے تھے کہ وہ کیسا آدمی ... بھی کچھ لوگوں نے کہا کہ مرد تو مرد ہی ہوتا ہے۔ کیا پتا عور... ہی کہتی ہو۔ اس عورت کو گاؤں میں پہلے کبھی نہیں دیکھ... اور وہ بعد میں بھی نظر نہیں آئی لیکن پروہت کی ساری ... نیک نامی کو خاک میں ملا گئی۔ وہ کسی کو منہ دکھانے کے ...

نہیں رہا۔ ویسے سب کے سامنے اس نے کہا تھا کہ میرا من صاف ہے، میں الزام لگانے والوں سے نہیں ڈرتا۔ انہوں نے تو سیتا جیسی دیوی پر بھی الزام لگا دیا تھا تاہم اگلے دن صبح وہ مرا ہوا پایا گیا۔ اس نے مندر کے گھنٹے سے لٹک کر خودکشی کر لی لیکن یہ قتل تھا۔"

"یہ تم کہہ رہے ہو یا پولیس نے کہا تھا؟"

"پولیس!" اس نے طنز سے کہا "طہورترہ کے ٹکڑوں پر پلنے والے اس کی مرضی کے خلاف بول سکتے ہیں؟ پولیس اور بدمعاشوں کی مدد سے ہی تو اس نے اپنی دہشت پھیلا رکھی ہے اس سارے علاقے میں۔ یہ سب جانتے ہیں۔"

"سب کے جاننے سے کوئی فرق نہیں پڑ سکتا۔"

"ہاں" شاکر نے تسلیم کیا "طہورترہ نے یہی بات مشہور کی کہ پنڈت جی نے آتما ہتیا کر لی... خودکشی.. ان کے ضمیر نے ملامت کی اور وہ بدنامی سے ڈر کے مر گئے۔ لوگ یقین نہ کرتے تو کیا کرتے۔ اس کی جگہ دوسرا پروہت آ گیا جو اس بستی کا آدمی نہیں تھا۔ مندر میں ایک جوگی کا ڈیرا تھا۔ وہ بھی مر گیا۔ کہتے ہیں اسے سوتے میں سانپ نے ڈس لیا۔ تین سیوا کرنے والے جو مندر میں ہی رہتے تھے، خود اپنی جان بچا کے بھاگ گئے۔"

"لوگ اب پوجا پاٹھ کے لئے کہاں جاتے ہیں؟"

"جائیں گے کہاں، وہیں جاتے ہیں۔ سب کچھ پہلے کی طرح ہے۔"

"پھر بھی کچھ تو فرق پڑا ہو گا۔"

"یہ کسی کو نہیں معلوم۔ شروع شروع میں لوگوں نے باتیں کی تھیں۔ دو چار تجسس پسند نوجوان ٹوہ میں رہنے لگے تھے اور چھپ چھپ کر دیکھتے تھے لیکن وہ بھی ایک ایک کر کے مارے گئے۔ پہلے ایک مارا گیا۔ پولیس نے اس کے قتل کے الزام میں دوسرے کو پکڑ لیا اور پھانسی کے تختے تک پہنچا دیا۔ ... تیسرا رات کے اندھیرے میں کسی کی گولی کا نشانہ بن گیا۔ شاید بستی میں پہلی مرتبہ کسی کو گولی ماری گئی تھی۔ اس سے پہلے اشتعال میں قتل ہو جاتے تھے۔ کسی نے لاٹھی سے سر پھاڑ دیا، کسی نے درانتی سے پیٹ چاک کر دیا، کسی نے خنجر سے گلا کاٹ دیا۔ ایک شخص کا سر پتھر سے کچل دیا گیا تھا۔ اکثر اس کا سبب عداوت ہوتی تھی۔ زر، زمین یا زن میں سب سے زیادہ جان لینے والی چیز عورت تھی۔ ہمیشہ قتل کرنے والا پکڑا جاتا تھا۔ سب کو پہلے سے معلوم ہوتا تھا کہ قاتل کون ہے۔"

غالب نے کہا "یہاں سب سراغ رسانی کے ماہر ہیں۔"

"یہ بات نہیں۔ جب معاملہ عورت کا ہو تو دوسرے لوگ ضرور جانتے ہیں۔ ایک لڑکی کو چاہتا کوئی اور تھا، منگنی کسی اور سے ہو گئی۔ جب منگیتر قتل ہوا تو آشنا پکڑا گیا۔ دو شادی شدہ عورتوں کے ناجائز تعلقات کا سب کو علم تھا، سوائے ان کے شوہروں کے۔ ایک کا شوہر مارا گیا تو سب نے آشنا کا نام لے دیا۔ دوسری کا آشنا قتل ہوا تو الزام شوہر پر آیا لیکن اس کے بعد جو قتل ہوئے ان میں کوئی نہیں پکڑا گیا۔ لوگ جانتے ہوئے بھی قاتل کا نام لینے سے گریز کرنے لگے کہ کہیں اپنا نمبر نہ آ جائے۔ یہی طہورترہ بھی چاہتا تھا۔ اب لوگ اس سے دہشت زدہ ہیں۔ اس کے گھر کی طرف کوئی نہیں جاتا۔ بڑے خطرناک کتے پال رکھے ہیں اس نے۔"

غالب نے کہا "دو ٹانگوں والے یا چار ٹانگوں والے؟"

"میں دو ٹانگوں والے کی بات کر رہا تھا" شاکر نے دانت نکال کے کہا۔

"اچھا شاکر علی، یہ سب باتیں واقعی بہت مفید ہیں ہمارے لئے۔ یہ بتاؤ کہ اس پرانے یتیم خانے کو گودام بنانے کی مصلحت کیا تھی؟ تم نے کبھی کسی سے کچھ سنا؟"

"سنا تو بہت کچھ، دیکھا نہیں۔ کہتے ہیں مندر گاؤں کی حد سے باہر ہے اور سڑک قریب ہے۔ کوئی مندر کے پیچھے والے علاقے میں مکان نہیں بنوا سکتا۔"

"مندر کے پیچھے کیا ہے؟"

"زمین ہے، کھیت ہیں" شاکر علی نے کہا "وہاں بھی کوئی ہل نہیں چلاتا۔ جس کی زمین تھی اسے قیمت ادا کر دی گئی ہے کہ دوسری طرف زمین خرید لے۔"

میں نے کہا "مقصد یہ ہے کہ مندر ہمیشہ گاؤں کے آخری کنارے پر ہی رہے، کبھی آبادی کے بیچ میں نہ آئے۔ میں سمجھ گیا۔ آس پاس کا کتنا علاقہ مندر کے نام پر ہے۔"

"پیچھے کی طرف سے..... ہو گی ایک فرلانگ تک انہی کی زمین۔ اس کے بعد سڑک آ جاتی ہے۔"

"گویا سڑک سے مال براہِ راست گودام تک لانے میں کوئی رکاوٹ نہیں رہی؟ تم نے کبھی دیکھا مال آتے جاتے؟"

شاکر علی نے نفی میں سر ہلایا "رات کو آواز سنائی دیتی ہے ٹرک آنے کی۔ دور سے میں نے بھی دیکھے ہیں۔ ایک بات بہت عجیب تھی۔ آپ کسی سے کہو گے تو نہیں؟"

میں نے کہا "عجیب بات کرتے ہو تم بھی۔ ہم کیا تمہارے دشمن ہیں؟"

شاکر نے کہا "ٹرک جب سڑک سے اندر آتے ہیں تو لائٹ آف کر دیتے ہیں۔ اندھیرے میں یہاں تک پہنچتے ہیں۔ .. جب جاتے ہیں تب بھی لائٹ نہیں جلاتے۔ سڑک پر پہنچنے کے بعد جلاتے ہیں۔"

میں نے کہا "اس سے تو صاف یہی ثابت ہوتا ہے کہ اس گودام میں گھپلا ہو رہا ہے۔"

"بالکل جناب۔ بلیک مارکیٹ کا مال آتا ہے اور جاتا ہے۔ اسمگلر بن گیا ہے طہورترہ۔ بستی کے جتنے لوگ اس کا دیا کھاتے ہیں، وہ اس سے ڈرتے بھی ہیں اور لوگوں کو اس سے ڈراتے

بھی ہیں۔"

میں نے کہا "یہ جگہ سمندر سے کتنی دور ہے؟ میرا مطلب ہے بمبئی سے؟"

شاکر نے کہا "بمبئی کی طرف سے تو فاصلہ زیادہ ہے۔ ادھر دس گیارہ میل کے فاصلے پر ایک کریک ہے" شاکر علی نے کہا۔ "کچا راستہ ہے۔"

"اس پر ٹرک جاسکتے ہیں؟"

"جاتے ہیں جناب' اب تو صاف راستہ بن گیا ہے۔ پہلے صرف ماہی گیر آتے جاتے تھے اس راستے سے۔ انہیں بھی رخصت کردیا گیا ہے۔ ان کی پوری بستی اٹھاکے دوسری جگہ رکھ دی گئی ہے راتوں رات۔"

"وہ کیسے؟ ماہی گیروں نے احتجاج نہیں کیا؟"

شاکر علی نے کہا "وہ تو بہت خوش ہوئے۔ ہر ایک کو دو ہزار روپے نقد ملے اور نئی جھونپڑی بنانے کا پورا سامان۔ پرانی جھونپڑیاں بے ترتیب تھیں۔ نئی جگہ پر انہوں نے اس بات کا خیال رکھا کہ گلیاں سیدھی اور چوڑی ہوں۔"

"یعنی ٹاؤن پلاننگ کے اصول مدِ نظر رکھے گئے۔ مگر میاں شاکر علی' کیا کسی قانون کے تحت اس کی ممانعت نہیں تھی؟ جس کا جہاں بھی جی چاہے نیا نگر آباد کرلے" میں نے کہا۔

"سب راتوں رات ہوا جی' طے تو پہلے ہی تھا۔ لوگوں نے اپنی اپنی جگہ بھی دیکھ لی تھی اور نشان بھی لگادیے تھے۔ رات کو ادھر جھونپڑیاں بنانے کا سامان ٹرک سے اترنا شروع ہوا ادھر انہوں نے پرانی جھونپڑیوں سے سامان اٹھالیا۔ رات بھر میں نئی جھونپڑیاں بن گئیں۔ پرانی خالی ہوگئیں۔ ٹرک بھر کے مزدور لائے گئے تھے۔ وہ صبح ہونے سے پہلے واپس چلے گئے۔ ایک بلڈوزر آیا تھا۔ اس نے پرانی بستی کو دو گھنٹے میں کوڑے کی طرح صاف کردیا اور سمندر کے کنارے ڈھیر کردیا۔ پھر اس ڈھیر کو آگ لگادی گئی تو سب کچرا راکھ بن گیا۔ راکھ کو سمندر بہا کے لے گیا۔ دوپہر تک جس نے اس جگہ کو دیکھا حیران رہ گیا۔ وہاں ایک صاف میدان نکل آیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہاں کبھی کوئی بستی تھی ہی نہیں۔ دوسری طرف ایک نیا نگر آباد ہوچکا تھا۔"

میں نے کہا "کیا منظم طریقۂ واردات ہے۔ اب اس بستی کو بھلا کون ہٹا سکتا ہے۔"

شاکر علی نے کہا "ایک ہزار جھونپڑیاں تھیں۔ ایک ہزار ماہی گیروں کے گھروں کو گرانے کی کوشش بھی کی جائے تو سیاسی مسئلہ بن جائے گا۔ یہ لوگ بھوک ہڑتال کردیں گے۔ ان کی حمایت میں کئی لیڈر اٹھ کھڑے ہوں گے۔ اس کے علاوہ یہ سب اوپر والوں کی ملی بھگت سے ہوتا ہے۔ وہ سب جانتے ہیں لیکن کرتے کچھ نہیں۔ اپنی آنکھیں بند رکھنے کی قیمت جو وصول کرلیتے ہیں۔"

میں نے کہا "ماہی گیروں کو نئی جگہ جانے سے فرق نہیں پڑا؟"

"فرق کیا پڑے گا۔ پہلے کریک کے اس کنارے پر تھے۔ چٹان کے ایک طرف۔ اب دوسری طرف ہیں۔ اور زیادہ خوش ہیں کیونکہ ہر ایک نے جھونپڑی کے لئے کم سے کم دگنی جگہ گھیری ہے" شاکر علی نے کہا "بہت سے ماہی گیران کے ساتھ کام بھی کرتے ہیں۔"

"تم بہت باخبر آدمی ہو شاکر علی' ہر بات پر غور کرسکتے ہو۔ اپنی حالت پر غور کیوں نہیں کرتے۔ کام دھندا کیوں چھوڑ رکھا ہے؟"

"کیا بتاؤں جناب۔ اس چھنیا بیگم نے کہیں کا نہیں رکھا" وہ شرم سے سر جھکاکے بولا۔

غالب نے خفگی سے کہا "ایک سنبھالی نہیں جاتی تم سے' دوسری کے چکر میں پڑ گئے ہو۔"

میں نے ہنس کر کہا "شاکر علی کی مراد افیون سے تھی۔"

"میں بہت کوشش کرتا ہوں' عادت نہیں چھٹتی۔ اسی لئے کام بھی نہیں ملتا ورنہ میں درزی تھا" شاکر علی نے کہا۔ "اب بیوی کپڑے سیتی ہے لوگوں کے۔ وہ زبان کی بری ہے' دل کی بری نہیں ہے۔"

"عموماً ایسا ہی ہوتا ہے۔ جو زبان کے میٹھے ہوں وہ میٹھی چھری ثابت ہوتے ہیں" میں نے کہا "خیر اب تم ہمارا ایک کام کرو۔ ذرا بستی کا ایک چکر لگاؤ۔ لوگوں سے معلوم کرو کہ آج دن میں یہاں دو لڑکیاں آئی تھیں شہر سے؟"

"کون لڑکیاں تھیں وہ؟"

"فلم اسٹار تھیں۔ جس نے بھی دیکھا ہوگا انہیں' یہی سمجھا ہوگا۔"

"کسی فلم کی شوٹنگ کے سلسلے میں آئی تھیں؟"

"یہی سمجھ لو۔ تم یہ معلوم کرکے آؤ کہ وہ کب آئی تھیں اور کب واپس گئیں۔ انہوں نے بازار میں کہیں چائے پی ہوگی... یا کھانا کھایا ہوگا۔ ہم تمہارا یہیں انتظار کریں گے۔ ہمارے بارے میں کوئی پوچھے تو کہنا کہ وہ تو گئے۔ کچھ دیر بعد ہی چلے گئے تھے۔ یہ خیال رکھنا کہ کسی کو شک نہ ہو کہ تم جو کچھ معلوم کررہے ہو ہمارے لئے کررہے ہو" میں نے کہا "ورنہ تم خود اپنے لئے مسائل پیدا کرو گے۔ ہم تو چلے جائیں گے۔"

"آپ فکر نہ کریں جناب' میں یوں گیا اور یوں آیا" شاکر علی نے جاتے ہوئے کہا۔

شاکر علی کے جاتے ہی اس کی بیوی نے گھر میں قدم رکھا اور آتے ہی شاکر علی کو چلا چلا کے پکارنے لگی۔ "ارے کہاں لیٹ گیا جاکے۔ پھر گولی کھاکے گھس گیا ہے چارپائی کے نیچے۔ باہر آ...."

میں نے شور سے تنگ آکے کہا "بی بی! وہ ذرا کام سے گیا ہے۔"

"کام سے؟ ارے بھیا! شاکر اور کام کرے کسی کا۔ اس نے تو زندگی میں کبھی ہل کے پانی نہیں پیا" وہ تلخ لہجے میں بولی۔

"ہم نے اسے ایک کام سے بھیجا ہے" غالب نے اسے ڈانٹا۔

شاکر علی کی بیوی نے کہا "بھیا! احسان ہوگا تمہارا۔ اس مردود کو بھی کہیں لگادو کام سے ورنہ اسے جیل ہی بھجوادو۔"

غالب نے کہا "تم سے شادی کرنے کے جرم میں۔ اس جرم میں تو اسے عمر قید کی سزا مل چکی ہے۔"

عورت نے سخت برا مانا "میں نے کیا قید کر رکھا ہے اسے؟ جائے میری طرف سے جہاں چاہے" پھر وہ اپنے مرغی کے ڈربے جیسے باورچی خانے میں چلی گئی۔ اس کے دونوں بچے کمرے میں ہنگامہ کرتے رہے اور وہ انہیں وہیں سے گالیاں اور کوسنے دیتی رہی۔ مجھے شاکر علی اپنی تمام خرابیوں کے باوجود قابلِ رحم محسوس ہوا جو اس عورت کا شوہر بن کر رہنے پر مجبور تھا۔ وہ بیک وقت بدصورت' بدزبان اور جاہل تھی۔ عورت کی بدصورتی اس کا قصور نہیں سمجھی جاسکتی اور اگر وہ کوشش کرے تو حسنِ سیرت سے اس محرومی کی تلافی کرسکتی ہے۔ حسنِ اخلاق سے' سلیقے سے اور خوش اطواری و خوش لباسی سے دلکشی کا وہ انداز پیدا کرسکتی ہے جو کسی بھی مرد کو دیوانہ کردے۔ لیکن خوبصورت سے خوبصورت عورت کی جہالت' بد اطواری اور بدزبانی کے ساتھ نباہ کرنا کسی بھی طرح قیدِ بامشقت کے عذاب سے کم نہیں۔

"بدقسمت اور صابر و شاکر عورت ہی نہیں ہوتی۔ مرد بھی ہوتے ہیں" غالب نے جیسے میرے خیالات پڑھتے ہوئے تائید کی۔

"ہاں۔ مولوی شاکر علی اسم بامسمیٰ ہے۔ خدا ہی رحم کرے اس کے حال پر۔ ہم کچھ نہیں کرسکتے۔"

"کوئی بھی کچھ نہیں کرسکتا" غالب بولا۔

"گھر آدمی کے لئے جنت ہوتا ہے۔ مگر عورت اسے جہنم بنادے تو مرد کیا کرے' کہاں جائے؟"

"چلے بھی جاتے ہیں جانے والے۔ پہلے کوٹھوں کا رخ کرتے تھے۔ دوسری اب بھی انتقاماً یا پناہ کے لئے کرتے ہیں۔ کچھ بھی نہ کرپائیں تو خود کو شراب یا کسی بھی نشے کی خود فراموشی کے حوالے کردیتے ہیں۔ شاکر علی شراب نہیں پی سکتا تو افیون سے سکون حاصل کرتا ہے۔"

"زندگی کی تلخی سے فرار حاصل کرتا ہے۔ چند گھنٹوں کے لئے ہی سہی اسے دنیا کے رنج و الم سے نجات مل جاتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کو نشے کی عادت میں مبتلا کرنے والی بھی عورت ہے۔ قصوروار شاکر بھی ہے کہ اس نے مقابلہ نہیں کیا' فرار اختیار کیا اور ہار مان لی۔"

"ہاں۔ ورنہ صحیح چنگیز خانی شوہر بن کے جوتا سنبھال لیتا تو اس پاؤں کی جوتی کی کیا مجال تھی کہ زبان چلاتی۔"

شاکر علی کا گھر غربت اور بدحالی کی منہ بولتی تصویر تھا۔ اس ایک کمرے کے گھر میں سامان نہ ہونے کے برابر تھا۔ خوشی اس گھر سے روٹھ گئی تھی۔ اس کی جگہ دکھوں نے لے لی تھی جو سرطان کے خلیوں کی طرح پھیل رہے تھے۔

وقت گزارنے کے لئے میں نے اور غالب نے باہر نکل کے ایک سرسری سا جائزہ لیا۔ اب شام ڈھل چکی تھی اور آہستہ آہستہ بستی کے در و دیوار پر رات کے سائے منڈلانے لگے تھے۔ کہیں کہیں ٹمٹماتے بلب نظر آرہے تھے اور گھروں میں جلنے والے چولھوں کا دھواں اٹھ رہا تھا۔ مجموعی طور پر ہزار ڈیڑھ ہزار مکانوں کی یہ بستی بے ترتیبی اور عدم توازن کا شکار تھی۔ اس کی کوئی پلاننگ نہیں تھی چنانچہ جس نے جہاں چاہا تھا' جیسے چاہا تھا' گھر بنالیا تھا۔ ایک کا رخ مشرق کی جانب تھا تو دوسرے کا مغرب کی طرف۔ جگہ اونچی نیچی ہونے کی وجہ سے کچھ گھر الگ تھلگ بھی نظر آتے تھے۔ بیشتر مکان ایک منزلہ' تنگ اور مختصر تھے۔ بالکل شاکر علی کے مکان کی طرح۔ چند گھر پختہ اور اچھے بھی بنے ہوئے تھے۔

غالب نے گھڑی دیکھ کے کہا "ایک گھنٹا ہونے والا ہے اسے گئے ہوئے۔"

میں نے کہا "انتظار کے سوا ہم کیا کرسکتے ہیں؟"

"انتظار تو باقی سب لوگ بھی کررہے ہوں گے ہمارا" غالب نے کہا۔

"ہاں۔ رابعہ اور نازو پہلے پہنچی ہوں گی۔ پھر وہ تینوں آئے ہوں گے۔ گل' محسن اور محمد خان۔"

"کیا خیال ہے تیرا۔ وہ سب کچھ لے آئے ہوں گے؟"

"کیوں نہیں لائے ہوں گے۔ وہ بازار گئے تھے اور ان کی جیب میں پیسہ تھا" میں نے کہا "رہی کسی اتفاق یا حادثے کے امکان کی بات۔ تو ہونے والی بات ہوکر رہتی ہے۔ اس کا غم کیوں کریں جو ابھی ہوا نہیں۔"

"یہ غم نہیں' اندیشے ہیں" غالب بولا "خطرات کے وجود کو نظرانداز کرنا خود فریبی ہے۔"

میں نے کہا "خدا نے چاہا تو ہم بھی ایک دو گھنٹے میں واپس پہنچ جائیں گے۔"

"یہاں ہمارا کام ختم؟"

"ہاں۔ ابھی تو ختم ہی سمجھو۔ ہمیں جو معلوم کرنا تھا وہ معلوم ہوگیا۔ اب مشورے سے اور منصوبہ بندی کرکے پوری تیاری کے ساتھ آئیں گے۔"

غالب نے کہا "طوترہ ہمارا نیا حریف ہے۔ دلاور اور تریویدی کے سلسلے کی ایک اور کڑی۔ یہ ظلم و استحصال' ہوس

اور لالچ، تعصب اور نفرت کی سیاست کی زنجیر ہے جو نہ جانے کہاں تک پھیلی ہوئی ہے۔ جیسے جیسے ہم آگے بڑھتے جائیں گے ایسے چہرے بے نقاب ہوتے جائیں گے جو درحقیقت چوہدری دلاور ہی کے روپ ہوں گے۔ مختلف ناموں کے ساتھ مگر ایک جیسی سوچ اور ایک جیسے عزائم رکھنے والے۔"

"اب مجھے یقین آنے لگا ہے کہ بمبئی سے چل کے مال یہاں پہنچتا ہے۔ پھر اس گودام سے آگے روانہ کیا جاتا ہے" میں نے کہا "یہاں فیصلہ کن معرکہ ہو سکتا ہے۔ شہلا کی بازیابی کے لئے۔"

غالب نے مجھ سے اتفاق کیا "ہاں۔ راستے کی نسبت یہاں بہتر مواقع حاصل ہوں گے۔ ہم صورتِ حال اور امکانات کا صحیح اندازہ کرتے ہوئے قدم اٹھائیں گے۔"

"بظاہر حفاظتی اقدامات بہت سخت ہیں۔ اور گودام کے اندر یا ملہوترہ کے گھر میں گھسنا مجھے ناممکن نظر آتا ہے۔ لیکن ناممکن کچھ نہیں ہوتا۔ کوشش کی شرط ہے۔"

غالب نے کہا "کیوں نہ ہم ایک نظر دیکھ آئیں۔ اور کچھ نہیں تو راستہ ہی معلوم ہو جائے گا۔"

میں نے سوچ کے کہا "مندر اور گودام تو دور ہیں۔ بالکل مخالف سمت میں۔ اور وہ جگہ ایسی ہے کہ بستی کے لوگ بھی ادھر بے سبب نہیں جا سکتے۔ ایک طرح سے علاقہ ممنوعہ ہے۔"

"پوجا پاٹ کے لئے تو جاتے ہوں گے؟"

"معلوم نہیں یہ پوجا پاٹ کا وقت ہے یا نہیں۔ اور پوجا پاٹ ہم کر بھی نہیں سکتے" میں نے کہا "ملہوترہ کا گھر قریب ہے۔"

"وہاں تو شاید کوئی نہیں ہے۔ اندر باہر اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔"

"شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ملہوترہ موجود نہیں۔"

"مالک نہ ہو تو محافظ بھی زیادہ مستعد نہیں رہتے۔ کوئی خطرہ مول لئے بغیر ہم جہاں تک جا سکتے ہیں۔"

ہم نے اندازے سے راستے کا تعین کیا۔ ایک جگہ اچانک ہماری راہ میں ایک نالا حائل ہو گیا جس کے وجود سے اب تک ہم بے خبر تھے۔ یہ برساتی نالا تھا جس میں اب پانی برائے نام نظر آ رہا تھا مگر اس کے کنارے ناہموار تھے اور دونوں کناروں پر بستی کا کوڑا کرکٹ نہ جانے کب سے پھینکا جا رہا تھا۔ اس کے ڈھیر دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ نالے کے دوسرے کنارے پر نسبتاً بہتر اور بڑے مکانات یہ ظاہر کرتے تھے کہ نئی آبادی یہاں بھی دوسرے شہروں کی طرح خوشحال لوگوں کا علاقہ ہے اور اس کی پلاننگ بھی بہتر طور پر کی گئی تھی۔ دونوں حصوں کو ملانے والا پل بھی نیا تھا جسے ہم نے اندھیرے میں نظر آنے والی روشنیوں کی قطار دیکھ کے دریافت کیا۔

سنہرے باز والی عمارت کے گرد و نواح میں چھوٹی کوٹھیاں یا بڑے مکانات پھیلے ہوئے تھے لیکن ان سب کے درمیان

ملہوترہ کی شانِ امارت کی نشانی کے طور پر وہ سہ منزلہ عمارت اپنا سر پُر غرور اٹھائے کھڑی تھی۔ اس کی تعمیر ایک چٹانی میدان پر ہوئی تھی جو سطح مرتفع کی طرح تھا۔ چاروں طرف گھوم کر دیکھنے سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ ایک خاصی وسیع پہاڑی تھی جس کو اوپر سے کاٹ کر ہموار کیا گیا تھا۔ اس کے وسط میں عمارت تھی اور چاروں طرف پہاڑی کی ڈھلوان اب بھی موجود تھی جس پر سبزہ ہی سبزہ تھا۔ اوپر جانے کے لئے ایک ہی راستہ تھا جو بڑے فولادی گیٹ سے شروع ہوتا تھا۔ سیمنٹ سے بنا ہوا یہ راستہ بہت آہستہ آہستہ بلند ہوتا تھا اور کسی رسی کی طرح عمارت کے گرد لپٹا ہوا تھا۔ ایک دائرے کی شکل میں پیچھے سے چکر لگا کے یہ دس بارہ فٹ چوڑی سڑک دوبارہ وہیں آ جاتی تھی۔ گیٹ سے کھڑے ہو کر دیکھا جاتا تو اس راستے کی شکل نو کے ہندسے جیسی بنتی تھی۔

ڈھلوان کے آخری حصے پر پیڑ تھے جو اس ترتیب سے لگائے گئے تھے کہ ہر درخت دوسرے درخت سے پندرہ فٹ دور تھا۔ نیچے ان کے تنے خاردار تاروں کے لئے بہترین اور مضبوط کھمبے کا کام دیتے تھے۔ ان میں آٹھ فٹ کی بلندی تک کانٹوں والے تار کیلوں سے ٹھوک کر ایک جال سا بنا دیا گیا تھا۔ تاروں سے اوپر درختوں کی شاخیں پھیل کے ایک دوسرے تک پہنچتی تھیں چنانچہ سرسبز گھنے پتوں کی اس قدرتی فصیل کو آسانی سے عبور نہیں کیا جا سکتا تھا۔

غالب نے کہا "یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ ان تاروں میں کرنٹ ہو گا۔"

میں نے کہا "ہاں۔ دن میں نہ سہی رات کو ضرور چھوڑا جاتا ہو گا۔"

"رات کو محافظ کتے بھی چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔"

"کیا اس ڈر سے ہم اس قلعے کی تسخیر کا خیال چھوڑ دیں! مرزا جی! ان تاروں میں برقی رو کی فراہمی روکی جا سکتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ وہی بجلی ہو گی جو بستی میں سب کو سپلائی کی جاتی ہے۔ ان کا اپنا جنریٹر نہیں ہو گا؟" میں نے کہا۔

"ایسا فرض کرنے کی وجہ؟"

"وجہ کچھ نہیں۔ انھیں ضرورت محسوس نہیں ہوئی ہو گی۔ یہاں کون ہے جو اندر داخل ہونے کی سوچے۔ سب جانتے ہیں کہ انجام کیا ہوتا ہے۔"

"تار کاٹتے ہی اندر الارم چلانے لگتا ہو گا۔"

میں نے کہا "الارم بھی تو بجلی سے چلتا ہے۔ اگر کوئی تار کاٹے بغیر اس وقت اندر داخل ہو جائے جب لائٹ آف ہو تو کیسے پتا چلے گا؟"

غالب نے نفی میں سر ہلایا "ہنگامی ضرورت کے لئے جنریٹر ضرور ہو گا۔ کہ بجلی چلی جائے تو فرق نہ پڑے۔"

میں نے کہا "آپ توجہ فرمائیں میری بات پر۔ فرض کریں ہم کسی سب اسٹیشن یا پاور ہاؤس پر قبضہ کر کے لائٹ آف کر دیتے ہیں۔ پوری بستی میں اندھیرا پھیل جاتا ہے۔ یہ کوئی غیر معمولی واقعہ تو ہو گا نہیں۔ ہمارے ملک کی طرح یہاں بھی بریک ڈاؤن ہوتے ہیں اور لوگ اس کے عادی ہیں۔ سب اسٹیشن یا پاور ہاؤس کا عملہ محدود ہوتا ہے۔ انہیں آسانی سے قابو میں کیا جا سکتا ہے۔ ایک آدھ سنتری ہو گا تو کیا کرے گا۔ ہم صرف پانچ منٹ کے لئے سپلائی آف کر دیں۔ پانچ منٹ میں تاروں کی باڑھ عبور کی جا سکتی ہے۔ پانچ منٹ تو جنریٹر کو اسٹارٹ کرنے میں لگ جاتے ہیں۔ لائٹ جانے کے بعد ایک آدھ منٹ تو انتظار کرنے میں گزر جاتا ہے اور اس امید میں کہ شاید لائٹ آ جائے۔ پھر کوئی سوچتا ہے کہ اب جنریٹر چلایا جائے۔ ...جنریٹر عموماً الگ اور گھر کے آخری حصے میں دور لگائے جاتے ہیں کیوں کہ وہ شور بہت کرتے ہیں۔ جتنی دیر میں کوئی جنریٹر تک پہنچے گا اور اسے رسی کھینچ کے اسٹارٹ کرے گا، سپلائی بحال ہو جائے گی۔ کسی کو کیسے شک ہو سکتا ہے کہ چند منٹ کا یہ بریک ڈاؤن سازش تھی۔"

غالب نے کہا "تجویز قابلِ عمل ہے۔ چل اب واپس چلتے ہیں۔"

ہم اسی راستے سے واپس ہوئے جدھر سے گئے تھے۔

"میں سوچتا ہوں کہ پانچ منٹ بہت ہوتے ہیں۔ ہماری ٹیم کا ایک رکن پاور ہاؤس میں رہے اور باقی سب یہاں انتظار کریں۔ اندھیرا ہوتے ہی وہ اندر کود جائیں اور چٹان کی ڈھلوان چڑھ کے اوپر کوٹھی تک پہنچ جائیں۔"

"اندر خونخوار قسم کے کتے بھی ہیں۔"

میں نے کہا "کتے ہر وقت کھلے نہیں پھرتے ہوں گے۔ انہیں رات گئے کھولا جاتا ہو گا۔ ہم اپنا کام رات کے ابتدائی حصے میں کر سکتے ہیں۔ سورج غروب ہونے کے ایک گھنٹے بعد۔ اس وقت کتے بند ہوں گے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ لمبا بریک ڈاؤن ہو تو وہ کتوں کو چھوڑ دیں۔ مگر صرف پانچ منٹ بعد لائٹ آ جائے گی تو اندر جو لوگ موجود ہوں گے وہ مطمئن ہو کے بیٹھ جائیں گے اور ان پر اچانک حملہ کر کے..."

"ابھی تک اس حملے کی غرض و غایت میری سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ سب کرنے سے حاصل کیا ہو گا؟" غالب نے میری بات کاٹ کے کہا۔

میں نے سوچ کے کہا "ابھی میں کیا بتا سکتا ہوں۔ لیکن یہ بھی دشمنوں کا قلعہ ہے۔"

"اس میں تو شک کی کوئی بات نہیں"

"یہاں کچھ نہ ملا تب بھی وہ لوگ تو ملیں گے جو اس قلعے کی حفاظت کے لئے مامور ہیں۔ انہیں یرغمال بنایا جا سکتا ہے اور انہیں مجبور کیا جا سکتا ہے کہ وہ دوسرے ٹھکانے تک ہماری رہنمائی کریں۔ ان سے وہ سب کچھ پوچھا جا سکتا ہے جو ہمارے لئے جاننا ضروری ہے۔ براہِ راست مندر پر حملہ کرنا خلافِ مصلحت ہو گا لیکن دوسرے مرحلے میں ہم گودام تک پہنچ سکتے ہیں۔ پہلے مرحلے میں کامیابی سے ہمارا کام آسان ہو جائے گا۔"

غالب نے کہا "میں کوشش کر رہا ہوں کہ اس منصوبے میں کوئی خامی تلاش کر کے اسے مسترد کر دوں۔"

میں نے کہا "اس میں ناقابلِ عمل کوئی بات نہیں۔ رابعہ، نازو یا گل میں سے کوئی پاور ہاؤس میں آسانی سے داخل ہو سکتی ہے۔ اور ٹھیک وقت پر پاور کی سپلائی آف کر سکتی ہے۔ یا کرا سکتی ہے۔ بہتر ہو گا، اگر یہ کام رابعہ کو دیا جائے۔ گل اور نازو ہمارا ساتھ دیں۔"

"وہ گیٹ بھی کھلوا سکتی ہیں۔ اور ادھر سے اندر پہنچ سکتی ہیں" غالب نے کہا۔

"میں اس ترمیم سے اتفاق کرتا ہوں۔ پیچھے سے ہم تینوں داخل ہو جائیں تو سمجھو قلعہ فتح" میں نے کہا "اگر شہلا کو بچانا ہے تو اس کے لئے یہی سب سے موزوں جگہ ہے۔ اسے وہ یہاں لائیں گے تو کسی ایک جگہ رکھیں گے۔ یا اس پرانے یتیم خانے میں جو اب گودام ہے۔ یا ملہوترہ کی اس کوٹھی میں۔ گولڈن فالکن کے حوالے سے ان کا یہاں آنا قرینِ قیاس ہے۔ کتنا مزہ آئے اگر ہم پہلے سے ان کے استقبال کے لئے موجود ہوں۔"

شاکر علی کا گھر آ گیا تھا اور وہ دروازے میں کھڑا بڑی بے چینی سے ہماری واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔ پانچ ہزار روپے انعام میں ملنے کا خیال اس کو مضطرب رکھنے کے لئے کافی تھا۔

"آپ لوگ کہاں چلے گئے تھے؟" اس نے قریب آ کے کہا۔

"ہم ایسے ہی گھومنے گئے تھے" میں نے کہا "تم کیا خبر لائے ہو؟"

"وہ دونوں لڑکیاں آئی تھیں" شاکر علی نے کہا "انہیں کئی لوگوں نے دیکھا تھا۔"

"وہ کیسے آئی تھیں؟ ٹیکسی میں۔"

"یہ.... یہ تو کسی نے نہیں بتایا بس گاڑی کی بات کی تھی۔ گاڑی روک کے انہوں نے ایک جگہ چائے پی تھی۔ اور یہ معلوم کیا تھا کہ گولڈن فالکن نام کا کوئی ہوٹل یا ریسٹورنٹ ہے یہاں۔"

میں نے اپنے سر پر ہاتھ مارا "براہِ راست پوچھ لیا۔ حد ہے عقل مندی کی۔ خیر۔ پھر کیا ہوا؟"

شاکر حیران ہوا "لوگوں نے کہا کہ اس نام کا ہوٹل ریسٹورنٹ تو کوئی نہیں۔ ایک نوجوان نے کہا کہ کہیں یہ ملہوترہ صاحب کی کوٹھی کا پتا تو نہیں پوچھ رہی ہیں۔ وہ انگریزی سمجھتا تھا۔"

"اچھا پھر؟" میں نے تشویش سے کہا۔

"پھر وہ انہی کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا تھا، انہیں راستہ بتانے کے لئے۔ راستہ ادھر پل کے اوپر سے جاتا ہے۔"

میں نے کہا "پھر وہ کب واپس ہوئیں؟"

"یہ کسی نے نہیں دیکھا" شاکر علی بولا۔

"وہ نوجوان کون تھا؟ اس سے معلوم کرنا تھا۔"

"میں نے اسے تلاش کیا تھا مگر وہ ملا ہی نہیں۔ اس کے گھر بھی گیا تھا۔ دوپہر کے بعد سے وہ غائب ہے۔ کسی نے اسے نہیں دیکھا" شاکر علی بولا۔

غالب نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا "کہیں وہ مندر کی طرف تو نہیں گئی تھیں؟"

شاکر علی نے سرہلایا "بس اتنا ہی معلوم ہوا۔ لوگ آپ کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ میں نے کہا کہ دوست تھے۔ اسی وقت چلے گئے تھے۔ جس بدمعاش کو آپ نے مارا تھا، اس نے بہت گالیاں دیں مجھے۔ اور مجھے مارتا۔ لیکن میں نے کہا کہ میرا کیا قصور ہے۔ تم نے خود ہی لڑائی مول لی تھی ان سے۔"

میں نے کہا "شاکر علی، ہم اب واپس جائیں گے۔"

شاکر علی کا چہرہ اتر گیا "ابھی۔ اسی وقت؟"

میں اس کی مایوسی کی وجہ سمجھ گیا۔ میں نے کہا "تم ابھی تک بہت کارآمد ثابت ہوئے ہو اس لئے یہ لو اپنا انعام۔"

پانچ ہزار وصول کرتے ہی اس کا چہرہ روشن ہو گیا "مہربانی ہے آپ کی۔"

"لیکن ابھی تمہارا کام پورا نہیں ہوا" میں نے کہا۔ "اصل کام ابھی باقی ہے شاکر علی۔ اس کا معاوضہ الگ ہوگا۔"

"لیکن آپ تو جارہے ہیں۔"

"ہاں۔ ابھی ہم جارہے ہیں۔ مگر یہ ہوسکتا ہے کہ ہم آج رات کو کسی وقت لوٹ آئیں یا کل رات ہم آجائیں" میں نے کہا "ہم چھپ کر آئیں گے۔ کسی کو ہمارے آنے کی خبر نہیں ہوگی۔"

اس نے کہا "آپ فکر مت کریں۔ میں کسی کو بھی نہیں بتاؤں گا۔"

"یہ نہ ہو کہ پیسہ ہاتھ میں آتے ہی تم چنیا بیگم کے ہو جاؤ ہم آئیں تو تمہیں اپنا بھی ہوش نہ ہو۔ میں نے کہا "اگر ایسا کرو گے تو اپنا ہی نقصان کرو گے تمہیں پتا بھی نہیں چلے گا کہ ہم کب آئے اور کب چلے گئے۔ تم سوتے رہ جاؤ گے۔ دس ہزار گنوا دو گے۔"

شاکر نے کہا "ایسا نہیں ہوگا، آپ یقین کریں۔"

میں نے کہا "اور صرف دس ہزار کی بات نہیں۔ تم کس حد تک ہمارا ساتھ دیتے ہو، اس پر تمہارے انعام کا انحصار ہے۔"

"میں.. میں سب کچھ کرسکتا ہوں" اس کی آواز کانپنے لگی۔

میں نے اسے آزمانے کے لئے کہا "ہمیں گھر میں کے رکھ سکتے ہو؟"

"کیوں... کیوں نہیں" وہ بھڑک کر بولا۔

"کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونی چاہئے کہ ہم تمہارے گھر میں چھپے ہوئے تھے۔ یہ ذمے داری قبول کر سکتے؟"

اسے احساس ہونے لگا تھا کہ اس نے کسی خطرناک میں شرکت کے لئے رضامندی کا اظہار کردیا ہے۔ نوعیت کا بھی اسے صحیح علم نہیں۔ مگر اتنی بڑی رقم کا مجبور کرتا تھا کہ وہ سوچے سمجھے بغیر اقرار کرے۔

"تمہاری بیوی کس حد تک بھروسے کے قابل ہے؟"

"وہ... وہ کسی سے ذکر نہیں کرے گی۔ میں اسے دوں گا۔ جب اسے معلوم ہوگا... کہ یہ مکان خرید ا جا... تو وہ سب کچھ کرنے کے لئے تیار ہوجائے گی۔ اسے ہے کہ بچوں کے لئے چھت کا سایہ تو ہو۔ ہر مہینے کرایہ ہی سب سے مشکل ہوتا ہے۔ جتنا وہ محنت کرکے کما اس میں سے آدھا تو کرائے میں نکل جاتا ہے۔ پھر اسے نہیں رہے گی۔ ابھی وہ ڈرتی ہے کہ کچھ ہو گیا۔ تو میں دوسری کرلوں گا۔ اس کا قیاس ہے کہ مرد ایسے ہی ہوتے سب۔ میرے یقین دلانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہے تم تو جیتے جی مرگئے ہو سب کے لئے۔ بعد میں کیا کرو بچوں کے لئے، جب آج کچھ نہیں کررہے ہو۔ اور وہ اس سے بھی ڈرتی ہے کہ بیمار نہ پڑ جائے۔ ایک بار بڑی تھی چڑھ گیا تھا۔ لالہ جی روز سامان باہر رکھنے کی دھمکی دیتے اگر یہ فکر دور ہو جائے گی تو وہ بچوں کو پال لے گی۔ مجھے بھی لے گی اب بھی افیون کے پیسے دیتی ہے۔ کوسنے بھی مگر..." وہ بات کرتے کرتے رونے لگا۔

میں نے اور غالب نے اس کی بات بڑے دکھ کے ساتھ سنی تھی۔ مجھے اس آدمی کی بے بسی پر غصہ اور ترس بھی۔

میں نے کہا "شرم نہیں آتی روتے ہوئے۔ مرد روتے ہو۔ اتنا ہی احساس ہے تو کام کرو۔ اب بھی وقت ساری عمر پڑی ہے۔"

اس نے آنسو پونچھ کے کہا "آپ یہ بھی اسے دے میری بیوی کو۔ اور کل بھی جو دیں اسے ہی دیں۔ بھروسہ نہیں۔ کہیں اڑا دوں گا، گنواں دوں گا۔ کوئی چھین گا مجھ سے۔"

میں نے رقم اس سے لے لی "ٹھیک ہے۔ چاہتے ہو ویسا ہی ہوگا۔"

غالب نے کہا "تمہارا یہ مکان کتنی قیمت کا ہے؟"

"پہلے تو لالہ جی کسی سے پچیس ہزار میں سودا کرنے والے تھے۔ اب پتا نہیں کیا مانگ لیں" وہ بولا۔

میں نے کہا "خیر تم اس کی فکر مت کرو۔ مکان جتنی قیمت کا بھی ہوگا تمہیں مل جائے گا۔"

غالب نے کہا "لالہ جی بیچنے پر تیار ہوں گے؟ اور تم سے پوچھیں گے نہیں کہ کل تک تم کرایہ بھی نہیں دے سکتے تھے۔ آج مکان کیسے خرید رہے ہو۔"

"یہ تو سب ہی پوچھیں گے" وہ سر جھکا کے بولا "میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔ مجھے آپ کا بھی نام نہیں لینا پڑے گا۔ یہ کوئی نہیں مانے گا کہ میری لاٹری نکل آئی ہے۔"

میں نے کہا "تم کہنا کہ میرے دوست ہی پھر آکے سودا کریں گے۔ اور ہم لالہ جی سے معاملہ طے کرنے کے لیے خود نہ آئے تو اپنے کسی وکیل کو بھیج دیں گے جو سب قانونی معاملات ٹھیک کرلے گا۔ تمہیں بعد میں بھی پریشانی نہیں ہوگی۔"

شاکر علی نے کہا "ایک بات پوچھوں اگر آپ ناراض نہ ہوں تو؟"

"مجھے معلوم ہے کہ تم کیا پوچھو گے" میں نے کہا "تم پوچھو گے کہ آخر ہم اتنی فراخدلی سے پیسہ کیوں پھینک رہے ہیں۔ اور تم پر اتنے مہربان کیوں ہوگئے ہیں۔ جب کہ ابھی تک ہم نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ یہ بھی نہیں بتایا کہ ہم یہاں کیوں آئے تھے۔ ہمارے دشمن کون ہیں؟"

شاکر علی نے بہ مشکل تمام سرہلایا "آپ کو سب معلوم ہے۔ میں بہت غریب اور کمزور آدمی ہوں۔ میں کسی کی دشمنی مول لے کر زندہ نہیں رہ سکتا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ لالچ میں میرے بیوی بچوں کی جان بھی جائے اور یہ مکان ہی ان کا مزار بن جائے۔"

میں نے اسے تسلی دینے کے لئے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا "ابھی تک ہمارے دشمنوں کو بھی معلوم نہیں کہ ہم یہاں تک آگئے ہیں۔"

"آخر کون ہیں آپ کے دشمن؟"

"یہ ہم ابھی نہیں بتاسکتے شاکر علی۔ اور تمہارے لئے یہ سب جاننا قطعی غیر ضروری ہے کہ اس دشمنی کا سبب کیا ہے اور اس کا انجام کیا ہوگا۔ تم ان معاملات سے بالکل لاتعلق رہو تو اچھا ہے۔ یہ اتفاق ہے کہ تم ہمیں مل گئے۔ تم مسلمان بھی ہو اور تمہاری ضرورت پوری کرتے ہوئے ہمیں تھوڑا سا اطمینان قلب بھی حاصل ہوگا۔ تم نہ ملتے تو ہم کسی اور کی خدمات حاصل کرتے۔ نقد پیسہ خرچ کرکے سب کچھ مل جاتا ہے۔"

"میں اور میرے بچے جب تک زندہ رہیں گے...."

میں نے اس کی بات کاٹ دی "احسان کی بات مت کرنا، ہم کوئی احسان نہیں کررہے ہیں۔ تم سے ایک کام لے رہے ہیں اور اس کا معاوضہ ادا کررہے ہیں۔ آج رات یا کل ہمارا انتظار کرنا، ہم ضرور آئیں گے۔ اگر آج ہی لوٹ آئے تو کل کا دن چھپ کر تمہارے گھر میں گزاریں گے اور رات ہوتے ہی چلے جائیں گے۔ کل آئے تو چند گھنٹے تمہارے مہمان ہوں گے۔ اس کے بعد تم ہمیں ایسے بھول جاؤ گے جیسے ہم کبھی آئے ہی نہیں تھے۔ رازداری بہت ضروری ہے۔ تمہارے لئے بھی اور ہمارے لئے بھی۔"

غالب نے کہا "تم نے سب کو بتادیا ہے ناکہ ہم جاچکے ہیں؟"

"ہاں۔ لیکن آپ ابھی باہر گھوم کے آئے ہو...."

میں نے کہا "یہ رات کا وقت تھا۔ کسی نے ہمیں نہیں دیکھا۔ اس کے علاوہ۔ یہ ہوسکتا ہے کہ کل ہم آئیں تو ہمارا حلیہ بدلا ہوا ہو۔"

غالب نے کہا "ہمارے ساتھ کچھ اور ساتھی بھی ہوں گے۔ چند عورتیں۔"

"کون عورتیں؟ شاکر علی چونکا "وہی...."

ہاں۔ جو آج دن میں چکر لگا گئی ہیں۔"

"وہ... آپ کے گروہ میں شامل ہیں۔ آپ لوگ ڈاکو ہو؟ یا جاسوس؟" شاکر علی پریشان ہو کے بولا۔

میں نے اس کے اطمینان کی خاطر کہا "وہ بیویاں ہیں ہماری، ہم انہیں پیچھے نہیں چھوڑ سکتے۔"

غالب نے کہا "کیا ڈاکو ہم جیسے ہوتے ہیں۔ کہ کچھ لے جانے کے بجائے کچھ دے کر جائیں۔ اور جاسوس یہاں بھلا کیا لینے آئیں گے؟ کیا ہے یہاں آخر؟"

شاکر علی مطمئن ہو گیا "سب ملا کے کتنے لوگ ہوں گے؟"

میں نے کہا "زیادہ سے زیادہ چھ۔ لیکن تم مہمان داری کے چکر میں مت پڑنا ہم کھانا پینا خود کرلیں گے۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے؟"

میں نے کہا "ایک آخری بات۔ کیا تم ضرورت کا کچھ سامان یہاں سے لے کر رکھ سکتے ہو؟"

"کیسا سامان؟"

میں نے کہا "کچھ کپڑے ہمارے لئے۔ فرض کرو ہم ہندو برہمن وغیرہ بن کے جانا چاہیں۔ تم نے دیکھا تو ہوگا کہ ان کا حلیہ کیسا ہوتا ہے۔ پیسے ہم سے لے لو اور حلیہ بدلنے کا سامان خرید لاؤ یا کسی سے منگوالو۔ کسی دوسری جگہ سے لے آؤ تاکہ شک نہ ہو کسی کو۔"

شاکر علی اب دلچسپی لینے لگا تھا "میں یہ سب کرلوں گا۔"

غالب نے کہا "ایسے ہی تین عورتوں کے لئے مقامی لباس جس میں وہ یہاں کی رہنے والی نظر آئیں۔ پرانے کپڑے ہوں تو بہتر ہے۔"

"میری بیوی کے کپڑے ہیں..."

میں نے کہا "تمہاری بیوی کے کپڑے سب کے دیکھے بھالے ہوں گے۔ اپنے لئے خطرہ مول مت لو۔ تم نے ہماری

ساری بات سمجھ لی ہے نا؟ ہم یہاں چھپ کر رہیں گے۔ بھیس بدل کے دشمنوں پر حملہ کرنے جائیں گے کیوں کہ ہمارے دشمن ہندو ہیں۔ انہیں نیست و نابود کرکے ہم واپس یہیں آئیں گے تمہارے پاس... ٹھیک ہے؟"

اس نے سرہلایا اور ہم اس کی بیوی کو پانچ ہزار روپے دے کے وہاں سے روانہ ہوگئے۔ وہ بضد تھی کہ ہم کھانا کھا کر جائیں لیکن ہم مزید دیر کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اسے ساری بات سمجھانے کی ذمے داری شکار علی کو سونپ دی تھی۔ اس عورت کا مزاج اب بہت بدلا ہوا تھا لیکن وہ تجسس میں مبتلا تھی اور شاید ہم سے بہت سے سوال پوچھنے کے لئے بیتاب تھی۔

ہم نے ایک طویل راستہ اختیار کیا اور مندر کی جانب سے گزر کے سڑک پر پہنچے۔ مندر کے ساتھ والی عمارت کو دیکھنے سے ہی ہمیں اندازہ ہوگیا کہ یہی پہلے یتیم خانہ تھا۔ اور اب یہ گودام ہے۔ اس کے گرد چار دیواری تھی اور شاید گودام بنانے کے بعد اس کی بلندی بڑھا کر آٹھ فٹ کردی گئی تھی۔ پرانی دیوار صرف تین فٹ اونچی تھی۔ فصیل کی چار دیواری پر لائٹیں نصب تھیں جو اس وقت بھی جل رہی تھیں اور دیوار کے دونوں جانب کے علاقے کو روشن کررہی تھیں۔ گودام سے سڑک تک جانے والا کچا راستہ گیٹ کے سامنے سے شروع ہوتا تھا۔ ہم اس راستے سے بہت دور رہے اور بڑی سڑک تک پہنچ گئے۔

رات کے دس بجے تھے۔ دونوں جانب سے گاڑیاں مسلسل آجارہی تھیں۔ بس کے ذریعے سفر کرنا مناسب نہ تھا... اس میں وقت بھی ضائع ہوتا اور بس ہمیں نہ جانے کہاں اتارتی۔ وہاں سے پھر ٹیکسی ہی لینی پڑتی چنانچہ ہم کسی خالی ٹیکسی کے آنے کا انتظار کرتے رہے۔ ٹیکسی بمبئی کی طرف سے ہی آسکتی تھی مگر رات کے وقت ٹریفک نسبتاً کم تھا۔ اتنی دیر میں ناگپور کی طرف سے آنے والی بہت سی گاڑیاں گزریں لیکن واضح اشارے کے باوجود کسی نے لفٹ دینے کی درخواست کو قابلِ غور نہیں سمجھا۔ ایک شخص نے ہمیں بتایا کہ اگر کوئی ٹیکسی آئے گی تو کہاں کھڑی ہوگی۔ اس نے ایک ہوٹل کی طرف اشارہ کیا تھا جہاں خاصی رونق تھی۔ لوگ کرسیوں پر پاؤں رکھے چائے پی رہے تھے اور سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے بلند آواز میں لتا کے پرانے گانے سن رہے تھے۔

اتفاقِ رائے سے میں نے اور غالب نے ڈنر کا فیصلہ کیا۔ اگر ہم فوراً روانہ ہوجاتے تب بھی گیارہ ساڑھے گیارہ سے پہلے اپنے ٹھکانے پر نہیں پہنچ سکتے تھے اور وہاں پہنچ کر بھی کھانا ملنا غیر یقینی تھا۔

کونے کی ایک خالی میز کرسی پر قبضہ جما کے میں نے پیروں کو جوتوں سے نجات دلائی۔ نئے جوتوں نے میری ایڑی پر کاٹا تھا اور جلد کو چھیل دیا تھا۔ غالب اپنے دونوں انگوٹھوں پر پڑ جانے والے نشانات کو مسل رہا تھا۔

ایک ملباری نے ہمارے سر پر نازل ہوکے کہا...

غالب نے کہا "تم ہی کچھ بولو۔ آج غالب غزل سرا... ہوگا۔"

ویٹر نے غالب کی بات کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی... ایک غزل پڑھنی شروع کی جس کا قافیہ تھا گوشت... گوشت اور آلو گوشت... پالک گوشت۔ بھنا گوشت...

میں نے اسے وہیں روک دیا "یہ سب نہیں کھا... بس ایک اچھی چیز لے آؤ جو آسانی سے کھائی جا...

"اور جو انسان کھاتے ہوں" غالب نے کہا "آزاد... شادی شدہ یا قیدی نہیں۔"

ویٹر نے ہمیں عجیب سی نظروں سے دیکھا اور ... نہیں کیا کہہ گیا۔ جانے سے پہلے اس نے المونیم کا ج... گلاس دھڑ سے میز پر رکھا۔ صبح سے مسلسل استعمال ہ... والے جگ اور گلاس پر سب گاہک اپنے فنگر پرنٹ، ہا... میل اور پان سے لال ہونٹوں کے نشانات چھوڑ گئے... جراثیم نظر آتے تھے اور نہ ان کی اقسام کا شمار ممکن تھا۔ ... کے اندر مٹیالا پانی تھا۔ غالب نے اسے معدنیاتی پانی قرار...

کھانے کے بعد غالب نے کہا "یار، کیا کھایا تھا ہم...

میں نے کہا "میں دیکھ نہیں سکا تھا۔ بھوک اتنی لگی... تھی کہ بس کھالیا۔"

"اور کھانے کا معیار کیسا تھا؟"

میں ہنس پڑا "اس پر بھی غور کرنے کا خیال نہیں...

"ابھی ہم چائے کے نام پر ایک بدذائقہ گرم مشر... بہت خوش ہوکے پئیں گے" غالب بولا۔

میری نظر میز کے نیچے گئی۔ وہاں ہڈیوں، سگر... پیکٹوں اور بچے ہوئے ٹکڑوں کے درمیان ایک خ... اخبار بھی پڑا ہوا تھا جسے دن بھر میں درجنوں افراد کے ہاتھو... بڑی بے دردی سے استعمال کیا تھا۔ میں نے اسے کس... مقصد کے بغیر اٹھالیا۔ یہ ہندی کا اخبار تھا جو ہمارے لئے... سے کم نہ تھی۔

"معلوم نہیں آج کل دنیا میں کیا ہورہا ہے" میں...

"اور اپنے وطن میں کیا ہورہا ہے۔"

"ہماری مرضی سے کچھ نہیں ہورہا ہے" غالب نے... اور نہ ہوگا۔"

اچانک میں نے اخبار کے پہلے صفحے پر محمد خان کی... دیکھی۔ میں نے باکس میں لگی ہوئی خبر کو دیکھا اور کہا "... یہ دیکھ، محمد خان کی تصویر۔"

غالب نے تصویر دیکھ کے سرہلایا "محمد خان ایک... شخصیت ہے۔"

میں نے کہا "اگر یہ آج کا اخبار ہے تو ضرور کوئی بات... کسی سے پوچھیں؟

غالب نے اخبار مجھ سے لے لیا "تاریخ تو آج کی ہے۔ یہ دیکھ" اخبار کی لوح پر تاریخ انگریزی میں بھی درج تھی "کسی سے پڑھوا لیتے ہیں۔"

غالب نے کہا "گویا پھر اعتراف کریں کہ ہم ان پڑھ ہیں"

ویٹر نے ہمارا مسئلہ حل کردیا۔ وہ برتن اٹھانے کے لئے آیا تھا۔ میں نے اخبار اس کے سامنے کردیا "یہ تو ڈاکو خونی خان ہے"

ویٹر نے اقرار میں سرہلایا "مارا گیا سالا" اور تیزی سے میز پر گیلا کپڑا مارنے لگا۔

میرا دل ایک لمحے کے لئے دھڑکنا بھول گیا تھا "مارا گیا۔ کب؟"

"آج۔ پولیس نے مار دیا۔ اخبار میں آیا ہے۔"

میں نے آواز کی کپکپاہٹ پر قابو پانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا "ہم ہندی نہیں جانتے۔ ذرا مہربانی کرکے یہ خبر سنا دو۔"

ویٹر نے اسے اپنی عزت افزائی سمجھتے ہوئے ہماری درخواست کو شرفِ قبولیت بخشا اور مختصر سی خبر کو فوراً پڑھ دیا۔ اس خبر کے مطابق جیل سے فرار ہونے والے ڈاکو خونی خان کو اسپیشل پولیس کے ایک اسکواڈ نے اس وقت گولی مار کے ہلاک کردیا جب وہ کسی واردات کی نیت سے ایک کار ڈیلر کے شوروم میں داخل ہوا۔ کار ڈیلر نے اسے پہچان کے پولیس کو فون کردیا۔ خونی خان شوروم کے ایک ملازم کو یہ جھانسا دے رہا تھا کہ وہ ایک اچھی سی گاڑی خریدنا چاہتا ہے مگر درحقیقت وہ اس بہانے سے اندر گھس کر مالک کے سیف میں پڑی ہوئی کئی لاکھ کی رقم چھین کر بھاگنے کا موقع تلاش کررہا تھا۔ پولیس کو دیکھتے ہی اس نے بھاگنے کی اور فائرنگ کرتے ہوئے گھیرا توڑ کر نکل جانے کی کوشش کی مگر پولیس نے جوابی فائرنگ سے یہ کوشش ناکام بنادی۔ ڈاکو محمد خان تین گولیاں لگنے سے موقع پر ہی ہلاک ہوگیا۔ پولیس کا ایک نوجوان سب انسپکٹر بھی مارا گیا۔ تین پولیس والوں کو زخمی حالت میں اسپتال لے جایا گیا۔ زخمی ہونے والوں میں شوروم کے مالک کے علاوہ ایک مرد اور ایک عورت بھی شامل ہیں۔

آواز پڑتے ہی ویٹر نے اخبار میز پر پھینکا اور برتن لے کے بھاگ گیا۔ ہم نے خبر کا ایک ایک لفظ سنا تھا اور اب صدمے کی شدت سے سنبھلنے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ ذرا سی دیر میں گزر جانے والا جذباتی زلزلہ ہمارے حواس کو تہس نہس کرگیا تھا۔ خبر کا ہر لفظ چیخ چیخ کر اپنے سچ کو تسلیم کرانے پر مصر تھا اور خواہش کی آواز کہتی تھی کہ ایسا نہیں ہوسکتا۔

"یار، خونی خان مرگیا" غالب نے کھوکھلے، سپاٹ لہجے میں یوں کہا جیسے یہ بات مجھے معلوم نہیں تھی۔

"ڈاکو تھا نا۔ ڈاکا ڈالنے گیا تھا" میں نے تلخی سے کہا "ڈاکو کہیں بھی جاتا ہے اسی نیت سے جاتا ہے۔ اس سے کسی کو کچھ پوچھنے کی کیا ضرورت ہے کہ وہ کیا لینے آیا تھا۔ وہ بیمار بیوی کے لئے دوا لینے جاتا یا بچے کے دودھ لینے، اسی طرح مارا جاتا۔ کاروں کے شوروم میں تو اس کی موجودگی سے ہی اس کی نیت ثابت ہوجاتی ہے۔ وہ کسی بینک کے سامنے سے گزرتا یا جیولر کی دکان کے سامنے سے تب بھی یہی سمجھا جاتا۔"

"کاش کوئی اسے مہلت دیتا۔ اسے گرفتار کرکے کچھ پوچھتا" غالب نے دکھ سے کہا۔

"کیا ضرورت تھی اس سارے جھمیلے کی۔ آسان کام یہی تھا کہ اسے مار دیا جائے۔ پہلے بھی اسے پکڑا تھا تو کارروائی قانون کے مطابق ہوئی تھی اور سزا بھی۔ مگر حاصل کیا ہوا اس سے؟ وقت ضائع ہوا انصاف کرنے والوں کا۔ وہ جیل توڑ کے بھاگ گیا۔ اب دوبارہ کسی لمبے چکر میں پڑنے کی ضرورت کو نظرانداز کیا گیا۔ عمداً ایسے پولیس مقابلے انصاف کے نام پر ہمارے ملک میں بھی ہوتے ہیں۔"

غالب نے تلخی سے کہا "اب پولیس کو انعامی سند ملے گی... ترقی ملے گی۔ حالانکہ وہ قاتل ہیں۔ انہوں نے سامنے جاکے اس سے کچھ پوچھے بغیر اسے گولی ماری ہوگی۔ محمد خان نے ہرگز مقابلہ نہیں کیا ہوگا۔ اسے موقع ملتا تو وہ اپنی صفائی پیش کرتا، شاید یہ یقین دلانے کی کوشش کرتا کہ وہ تائب ہوچکا ہے۔"

"کون مانتا ہے کسی ڈاکو کی بات۔ کون موقع دیتا ہے اسے تائب ہونے کا۔ قتل وہ ہوتا ہے جو قتل ثابت کیا جائے۔ پولیس نے تو اپنے دفاع میں گولی چلا کے اپنا فرض ادا کیا۔"

"اسے ہم نے مروادیا سکندر" غالب نے افسوس سے سر ہلا کے کہا "ہم نے بھیجا تھا اسے۔ اتنا تو وہ بھی جانتا ہوگا کہ اس کے لئے تمام عمر پولیس کی نظر سے چھپ کر گزارنا مشکل ہوگا... لیکن اس نے ایک چانس لیا تھا۔ وہ اپنی سابقہ زندگی کے سارے جرائم کا کفارہ ادا کرنا چاہتا تھا۔ ایک اچھے مقصد کے لئے جان دینا چاہتا تھا۔ مقدر نے اسے یہ بھی نہ کرنے دیا۔ اس کی یہ خواہش پوری نہ ہوسکی کہ وہ شہید ہو۔ وہ ایک ڈاکو کی طرح ہی مارا گیا۔"

"اگر وہ ڈاکو رہتا تو شاید اتنی آسانی سے اور اتنی جلدی نہ مارا جاتا" میں نے کہا "ہمارا ساتھ دینے سے اس کی زندگی مختصر ہوگئی۔"

"زندگی کو طول دینا یا مختصر کرنا کس کے اختیار کی بات ہے... ہاں اب میں یہ سوچ رہا ہوں کہ جب اس نے ہمارا ساتھ دینے کا فیصلہ کرلیا تھا اور جان بھی اس نے ہمارے ہی لئے دی تو کیا اس کا مقصد پورا نہیں ہوگیا؟ وہ یہاں نہ مارا جاتا، کہیں اور ہمارے کسی دشمن سے مقابلہ کرتے ہوئے مارا جاتا۔ سمجھنے والے جو چاہیں سمجھتے رہیں۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ مرتے وقت وہ ڈاکو نہیں تھا۔ اتنا ہی مجاہد تھا جتنے ہم ہیں۔"

"ہم بعد میں اس کے لئے فتوے حاصل کریں گے۔ کہ ڈاکو اگر جہاد کرتے ہوئے مارا جائے تو شہید کہلاتا ہے یا نہیں' میں نے احساس کی تلخی سے مغلوب ہو کے کہا "اور اس کے لئے مغفرت کی دعا کرنی جائز ہے یا نہیں۔ ابھی سوچ محسن اور گل کے بارے میں۔ وہ زخمی ہو کے اسپتال میں پڑے ہوئے ہیں۔"

"ان کا نام تو نہیں تھا خبر میں" غالب بولا۔

"مگر اور کون ہو سکتا ہے، محمد خان کے ساتھ زخمی ہونے والا۔ ایک مرد اور ایک عورت۔ نام کیسے آسکتا ہے ان کا۔ "یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ کس اسپتال میں ہیں۔ اور پولیس نے انہیں بھی ڈاکو محمد خان کے ساتھی کی حیثیت سے حراست میں تو نہیں لے رکھا ہے۔ وہ اکٹھے گئے تھے۔ شاید اس وقت وہ بھی شوروم میں ہی ہوں گے۔ اور پولیس نے ان کے پاس [illegible] ایک ایک لاکھ بھی برآمد کر لئے ہوں گے۔"

مایوسی کے اندھیرے میں میرا دماغ دیوانہ وار بھٹکنے لگا۔ اگر ایسا ہوا تو ہم انہیں کیسے چھڑائیں گے؟ وہ کیا بتائیں گے پولیس کو۔ کہ اتنی بڑی رقم ان کے پاس کہاں سے آئی۔"

غالب نے اٹھتے ہوئے کہا "چل۔ وقت ضائع کرنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ رابعہ اور نازو کو بھی اب تک ساری بات معلوم ہو چکی ہوگی۔ وہ کتنی پریشان ہوں گی۔"

ویٹر ہمارے پیچھے دوڑا "اے بھائی! کھایا پیا اور کھسکنا مانگتا ہے کیا؟"

میں نے معافی مانگتے ہوئے اسے سو روپے کا نوٹ دیا۔ بل صرف ساڑھے آٹھ روپے بنا تھا۔ میں نوّے روپے واپس لیے اور باقی چھوڑ دیے۔ ہوٹل کے سامنے خالی جگہ میں اب ایک ساتھ دو ٹیکسیاں خالی کھڑی ہوئی تھیں مگر ڈرائیور کسی کا موجود نہ تھا۔ ہمارے قریب پہنچتے ہی ایک ٹیکسی کا ڈرائیور جانے کدھر سے نمودار ہو گیا۔

"کدھر جانے کو ہے صاحب؟" اس نے خوش دلی سے کہا۔

میں نے بیٹھنے کے بعد کہا "بمبئی۔"

"بمبئی... بمبئی میں کدھر؟" اس نے ٹیکسی اسٹارٹ کی۔

"یہ ہم بمبئی جا کے بتائیں گے" غالب نے کہا۔

"دراصل ہم اجنبی ہیں اس شہر میں۔ نام نہیں جانتے کسی بھی جگہ کا اور سڑک کا" میں نے کہا۔

ڈرائیور نے سر گھما کے پیچھے دیکھا "پھر کیسا پہنچے گا؟"

میں نے کہا "ہمارے پاس ایک نقشہ ہے۔ اسے سمجھ لو۔"

اس نے مجھ سے نقشہ لے کر اسٹیئرنگ پر رکھا اور اپنی نظر بھی سڑک کے بجائے نقشے پر رکھی۔ نتیجہ یہ کہ دو مرتبہ میں نے کلمہ پڑھا مگر سامنے سے آنے والے دونوں ڈرائیور بڑی ہوشیاری سے خود کو بچا کے نکل گئے۔

"ابھی آپ تسلی کرو" اس نے نقشہ مجھے واپس کیا "ادھر بمبئی میں سب سالا چور ہے۔ آپ بولے گا کہ اپن نیا آدمی ہے تو وہ آپ کو اکھا شہر گھمائے گا۔ بھاڑا بنائے گا اپنا۔"

اس نے یہ نہیں بتایا کہ وہ خود بھی انہی ڈرائیوروں کی صف میں شامل ہے اور تقریباً دگنا کرایہ بنانے میں کامیاب رہا۔ رات کی وجہ سے سڑکیں خالی تھیں چنانچہ اس کی رفتار بھی بہت زیادہ تھی۔ ایک گھنٹے بعد جب ہم نے ٹیکسی کو چھوڑا تو رات کے ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ ہم اب خاموش تھے اور اپنے اپنے طور پر رابعہ اور نازو کا سامنا کرنے کے خیال سے خائف تھے۔ محمد خان کی ہلاکت کی خبر شام کے ان اخبارات نے شائع کی تھی جو عام طور پر دوپہر ایک بجے تک بازار میں پہنچ جاتے تھے۔ اس کا یہ مطلب تھا کہ محمد خان گیارہ ساڑھے گیارہ بجے مارا گیا ہوگا۔ خبر کے اخبار تک پہنچنے اور شائع ہونے کا عمل کم از کم اتنے وقت کا متقاضی ہوتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جا سکتا تھا کہ ہم سے رخصت لے کر جانے کے بعد انہیں زیادہ فرصت نہیں ملی۔ رابعہ اور نازو نے واپسی پر یہ سنسنی خیز خبر ضرور سن لی ہوگی۔ اخبار فروش لڑکوں نے جو بازار میں ایسی ہی خبریں چلا چلا کے سناتے ہیں' انہیں بتا دیا ہوگا کہ ڈاکو محمد خان کی پولیس کے ہاتھوں ہلاکت۔ آج کی تازہ خبر۔ خونی خان کا خون ہو گیا۔ ڈاکا ڈالنے سے پہلے خونی خان کو گولی مار دی گئی۔ پڑھیے صاحب...

غریبوں کی بستی میں اندھیرا تھا اور خاموشی تھی۔ ہم کسی آشنا صورت کے انتظار میں گوش بر آواز ادھر اُدھر دیکھتے جا رہے تھے۔ اس امید میں کہ شاید وہ مرد عورت محسن اور گل نہ ہوں..... محسن ہمارے لیے اس راستے پر چشم براہ مل جائے۔ یوسف ثانی نظر آجائے اور کہے "کہاں چلے گئے تھے سرکار، اس درجہ تھا دل بے قرار۔ کب سے ہیں محو انتظار۔ آپ کے دوست اور یہ خاکسار۔ وسوسے تھے خیال میں ہزار....

اچانک غالب نے کہا "یار' ہم غلط جگہ آگئے۔"

میں خیالات کے انہماک میں چونک پڑا "غلط جگہ آگئے؟" میں نے ادھر اُدھر دیکھ کے کہا "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"یہ جگہ ویسی ہی لگتی ہے..." غالب نے کہا۔

"یہ وہی جگہ ہے غالب!"

"پھر... وہ ریل کا ڈبا کہاں ہے؟ یوسف ثانی کا گھر۔"

میں نے اس جگہ کو آنکھیں مل کے دیکھا جو اب ایک تاریک خلا کے سوا کچھ نہ تھی۔ ریلوے کی پرانی لائن اپنی جگہ موجود تھی۔ وہ سب نشانیاں اپنی جگہ پر تھیں جو ثابت کرتی تھیں کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں یوسف ثانی رہتا تھا۔

میں نے زمین کو چھو کے دیکھا۔ ریلوے کی پٹڑی کو ٹٹولا۔ "وہ ریل کا ڈبا کہاں جا سکتا ہے غالب؟ اسے تو جنات بھی چوری نہیں کر سکتے تھے۔"

غالب نے میرے ساتھ گھٹنوں کے بل بیٹھ کے پرانی پٹڑی کا جائزہ لیا اور اس پر ہاتھ پھیر کے دیکھا "وہ گھاس کٹ گئی ہے جو لائن کے اوپر تک آگئی تھی۔ دونوں طرف سے۔"

"کیا مطلب... اس کو ریلوے والے لے گئے چلا کے؟"

"ہاں۔ وہ ڈبا خود تو چل کے نہیں جا سکتا تھا۔ سو آدمی بھی اسے مل کے دھکا لگاتے تو اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتے تھے۔ اسے ہاتھی گھوڑے کھینچ کر نہیں لے جا سکتے تھے۔ کوئی ریلوے انجن اسے لے گیا۔"

میں نے چلا کے کہا "مگر کیوں؟ اتنے سالوں سے وہ ناکارہ ڈبا یہاں کھڑا ہوا تھا۔ خود ریلوے والوں کے ریکارڈ پر اس کا وجود نہیں تھا۔ ہوتا تو وہ اسے بہت پہلے لے جاتے۔"

"اب اس بات پر بحث کرنے سے کیا ملے گا۔ اسے ریلوے والے نہیں لے گئے تو کون لے گیا؟"

غالب نے برہم ہو کے کہا "جو بھی لے گیا۔ لے گیا۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ کہاں لے گیا۔ سانپ نکل جانے کے بعد لکیر پیٹنے سے کچھ نہیں ملے گا۔"

میں نے کہا "یہ کس سے پوچھیں؟ لوگوں سے۔"

غالب نے کہا "ہاں۔ سب ہی نے دیکھا ہوگا۔"

میں نے قریب ہی ایک جھونپڑی میں چراغ کی روشنی دیکھی اور اس کا ٹین کا دروازہ بجایا۔ ایک بڈھا جس نے صرف دھوتی باندھ رکھی تھی' کھانستا ہوا باہر آیا "کون آگیا آدھی رات کو جگانے؟ اتنی مشکل سے نیند آئی تھی۔"

میں نے معافی مانگنے کے بعد کہا "معلوم یہ کرنا تھا کہ یہاں جو ریلوے کا ڈبا کھڑا ہوا تھا وہ کہاں گیا؟"

بوڑھے نے ناگواری سے کہا "ریلوے کا ڈبا گیا ریلوے کے پاس۔"

میں نے کہا "لیکن اس میں تو یوسف ثانی رہتا تھا۔"

"رہتا تھا" بڈھا طنز سے بولا "کیا اس کے باپ کا چھوڑا ہوا گھر تھا وہ؟"

میں نے کہا "پھر بھی۔ اتنے سالوں کے بعد...."

"ارے بھائی اتنے سالوں کے بعد اگر وہ اپنا ڈبا لے گئے تو غلطی کیا کی۔ مجھ سے کیا بحث کرتے ہو۔ جا کے ریلوے سے بولو۔"

وہ دروازہ بند کر کے اندر چلا گیا۔

میں نے غصے کو ضبط کیا اور غالب کی طرف دیکھا۔ ہم دونوں کی نظروں میں ایک ہی سوال تھا۔ اب کیا کریں؟ کہاں جائیں۔

اچانک اندھیرے میں ایک سایہ نمودار ہوا۔ یہ کوئی رات کی شفٹ کے لئے جانے والا فرد تھا۔ غالب نے اس سے پوچھا۔ "وہ تو صاحب بڑا گڑبڑ ہوا۔ ادھر بہت پولیس آیا۔ بہت لفڑا ہوا۔ کالا انجن آیا اور ویگن کو لے گیا۔ پولیس لوگوں کو ڈنڈا مار مار کے بھگا دیا۔"

"اور وہ چھوٹا سا آدمی جو اس میں رہتا تھا؟"

اس نے افسوس سے سر ہلایا "وہ بھاگ گیا۔"

"جان بچا کے بھاگ گیا؟" میں نے کہا۔

"نہیں زناب۔ سالا حرامی اس رنڈی کا ساتھ بھاگ گیا"

اس نے یوسف ثانی اور زلیخا دونوں کو گالیاں دیتے ہوئے کہا میں بھونچکا رہ گیا۔ بات کچھ کچھ میری سمجھ میں آنے لگی تھی مگر میں نے صاف سن لینا بہتر سمجھا "کیا وہ خود لے کر آیا تھا ریلوے انجن؟"

مزدور نے اقرار میں سر ہلایا "لوگ ایسا مافک بات کرتا۔ وہ خود گیا اور انجن پر بیٹھ کر آیا۔ اس پر دونوں چلا گیا۔"

"دونوں' زلیخا اور یوسف۔ اس ڈبے میں چلے گئے" غصے سے میرا برا حال ہو گیا "اسپیشل سیلون میں بیٹھ کے نکل گئے ہنی مون پر۔"

غالب نے اسے مزید گالیاں دیں "سالا چور' بے ایمان۔"

مزدور حیران ہوا "آپ کا کچھ لے گیا وہ؟ ہمارا تو پیسہ لے گیا۔"

"کس چیز کا پیسہ؟"

"ہمارا دکان سے ادھار لیتا۔ ہم دن میں پرچون کا دکان چلاتا" مزدور فریاد کرنے لگا "آپ ان کو پکڑو صاحب۔ ریلوے میں جا کے۔"

میں نے کہا "ہم نہیں پکڑ سکتے... ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔"

غالب نے کہا "وہ عورت کہاں رہتی تھی۔ تمہیں کچھ معلوم ہے؟"

"ہاں۔ ادھر آگے اس کا کھولی ہے۔"

غالب نے کہا "چلو راستہ دکھاؤ۔"

میں نے کہا "وہاں اب کیا ملے گا غالب؟"

غالب نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔ اس نے کہا "دیکھنے میں حرج ہی کیا ہے۔"

میں نے مزدور کے پیچھے چلتے ہوئے کہا "یہ صرف اس کی نیت کی خرابی نے سب کام خراب کیا۔ ہم دو ڈھائی لاکھ پیچھے چھوڑ گئے تھے۔"

غالب نے اقرار میں سر ہلایا "وہ بہت جھوٹا اور دغاباز آدمی تھا۔ فراڈ۔ اب وہ کبھی ہاتھ نہیں آئے گا۔ وہ محمد خان کا آدمی تھا' ہمارا نہیں۔"

میں نے کہا "اور وہ موقع کی تلاش میں تھا۔ موقع اسے ہم نے فراہم کر دیا۔ اور اس نے سوچا کہ ایسا موقع پھر کہاں ملے گا۔"

"کیسا شیطانی دماغ تھا اس کا۔ گھر سمیت غائب ہو گیا۔"

"وہ تو خیر گیا۔ یہ رابعہ اور نازو کہاں گئیں؟"

غالب نے کہا "یہی معلوم کرنے تو جا رہے ہیں۔"

"زلیخا کے گھر۔ وہاں کون ہے اب ...."
ایک دم مزدور رک گیا" یہ اس کا گھر ہے۔ اب ہم جاتا ہے۔ ڈیوٹی میں دیر ہوتا۔"

اس تنگ گلی میں دور دور تک کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ زلیخا کا گھر بھی عام گھروں کی طرح ایک جھونپڑی پر مشتمل تھا جس پر ٹین کی چھت تھی اور ٹین کا ہی دروازہ تھا۔ دروازہ بند تھا مگر باہر سے مقفل نہیں تھا اور اندر مدھم سی روشنی نظر آرہی تھی۔

غالب نے آہستہ سے دستک دی "نازو!"

میں اس کی دستک پر حیران ہوا "پاگل ہوگیا ہے کیا؟"

لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے یوں لگا جیسے میں پاگل ہوگیا ہوں۔ اندر سے نازو نے پوچھا "کون ہے؟"

"ہم ہیں اور کون" غالب نے خوشی اور خفگی کے ساتھ کہا اور مسکرا کے میری طرف دیکھا "میرا اندازہ ٹھیک نکلا۔"

"یہ اندازہ تھا۔ یا وحی نازل ہوئی تھی۔ کیسے اندازہ کرلیا تو نے؟" میں نے کہا۔

غالب کے جواب دینے سے پہلے ہی دروازہ کھل گیا اور میں نے سچ مچ زلیخا کے گھر میں نازو کے ساتھ رابعہ کو دیکھا۔

"ہونا احمق۔ ناقص العقل۔ یہاں چھپ کر بیٹھنے کی بھلا کیا تک تھی؟" غالب نے بگڑ کے کہا۔

"اور... کیا کرتے ہم؟" نازو ڈر کے بولی "وہاں گئے تو نہ یوسف ثانی تھا نہ اس کا گھر۔ ہم نے سوچا زلیخا سے پوچھ لیں۔"

"اور جب زلیخا نہیں ملی تو اندر گھس کے بیٹھ گئیں اس کے گھر میں؟"

"اور کیا کرتے ہم؟ کہاں جاتے؟" رابعہ نے نازو کا دفاع کیا اور کہا "وہیں کھڑے رہتے آپ لوگوں کی واپسی تک۔"

نازو نے کہا "چھ سات گھنٹے کیسے گزارتے وہاں؟ تماشا نہ بن جاتا ہمارا۔"

"کسی سے پوچھا تو ہوتا کہ آخر ماجرا کیا ہے" میں نے کہا۔

"پوچھ لیا تھا" رابعہ بولی۔

تمہیں معلوم ہوگیا تھا کہ یوسف اپنی زلیخا کو لے کر بھاگ گیا؟"

"زلیخا! یہ تو اس وقت نہیں بتایا تھا کسی نے۔ صرف یہ کہا تھا کہ ریلوے والے اپنا ڈبا لے گئے" رابعہ بولی۔

"یہ نہیں بتایا تھا کہ خود یوسف ریلوے انجن پر بیٹھ کر ساتھ آیا تھا؟"

"نہیں۔ ہم نے جس عورت سے بات کی تھی۔ شاید اسے بھی معلوم نہیں ہوگا" رابعہ نے کہا۔

"ہم نے سوچا کہ زلیخا سے پوچھ لیں۔ یہاں آئے تو وہ گھر میں نہیں تھی اور دروازہ کھلا پڑا تھا۔ ہم اندر بیٹھ گئے۔" نازو نے کہا۔

"ہمارا خیال نہیں آیا؟ کہ ہم وہاں جھک مارنے آئیں گے اور جب کوئی نہیں ملے گا تو کتنے پریشان ہوں گے" غالب چلّا کے کہا۔

"تمہیں کتنا خیال تھا ہمارا؟" نازو نے بھی چلّا کے کہا "اس وقت آئے ہو' آدھی رات کو" اس نے رونے کی تیاری

غالب نے سر پر ہاتھ مارا "یہ لو۔ الٹے ہم قصوروار۔ دلیل جواب نہ ہو تو عورت آنسو لے آتی ہے۔ اچھا بابا غلطی میری میرے باپ کی۔ جو حماقت تم نے کی وہ بھی میری غلطی۔ نے تلاش کرلیا تمہیں یہ بھی میری غلطی۔"

ظاہر ہے اس معافی کا اثر الٹا ہوا۔ نازو پیر پٹختی ہوئی اندر چلی گئی۔ پڑوس میں سے کسی نے چلّا کے کہا "ارے یہ کیا تماشا ہے آدھی رات کو۔ سونے دو گے یا نہیں۔"

رابعہ نے کہا "شور مچانے کی عادت ہے تم لوگوں کو۔"

میں نے کہا "مجھے واقعی احساس ہورہا ہے اپنی غلطی کا کہ میں اور غالب یہاں کیوں آئے۔ کہیں چلے جاتے مایوس ہو کے۔ یہ تو معلوم نہیں کیسے غالب کے دماغ میں یہ بات آئی کہ تمہارا یہاں ملنا ممکن ہے۔ مجھے ایسا خیال کبھی نہ آتا۔"

"کیا اب تم لڑو گے مجھ سے؟ میں بالکل نہیں لڑوں گی" رابعہ نے کہا اور پلٹ کے اندر چلی گی۔

"ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے اخبار نہیں دیکھا۔ اور خبر نہیں پڑھی۔"

"انہیں بتانا تو پڑے گا" میں نے کہا۔

رابعہ اور نازو تنگ اور نیچی چھت والے کچے کمرے کے فرش پر احتجاجی انداز میں دھرنا دے کے بیٹھ گئی تھیں۔ زلیخا شاید بڑی جلدی میں گئی تھی کہ اپنا سب اثاثہ چھوڑ گئی تھی۔ اس کے کپڑے کھونٹیوں پر لٹکے ہوئے تھے۔ بستر بچھا ہوا تھا اور گھرداری کا دوسرا سامان بھی بڑے سلیقے سے رکھا ہوا نظر آرہا تھا۔ کچے کمرے کی دیواریں اور فرش زلیخا نے اپنے ہاتھ سے لیپ پوت کے صاف کئے ہوں گے۔ اس کی صفائی پسندی اور سلیقہ شعاری کا احساس ہر چیز سے ہوتا تھا۔ ایک طاق میں پیتل کا لیپ جل رہا تھا' سونے کی طرح چمک رہا تھا۔

میں نے کہا "تم دونوں نے کچھ کھایا پیا ہے۔ یا ابھی تک بھوکی بیٹھی ہو؟"

رابعہ اور نازو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ منہ پھلائے بیٹھی رہیں۔

"ہم نے تو کھالیا ہے بھئی' خوب ڈٹ کے" غالب نے پیٹ پر ہاتھ پھیر کے کہا "چکن بریانی' چکن قورمہ' نرگسی کوفتے۔ واہ واہ۔"

نازو نے اسے خوں آشام نظروں سے دیکھا "تمہارا کیا خیال تھا کیا؟"

رابعہ نے کہا "فاقے میں آدمی ایسی ہی باتیں کرتا ہے۔ ہم کیوں بھوکے بیٹھے رہتے؟ کسی کے محتاج نہیں ہیں۔

پکایا اور کھالیا۔"
"گویا قبضہ جمالیا یہاں بھی" میں نے کہا "خراب بوریا بستر گول کرو اپنا اور چلو' اس سے پہلے کہ محلے والے پکڑلیں۔"

غالب نے کہا "ہاں۔ یہ روٹھنے اور نخرے دکھانے کا پروگرام کسی اور وقت پر اٹھا رکھو۔"

رابعہ نے کہا "مگر وہ لوگ ...."

"کون لوگ؟" میں نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہوئے غالب کی طرف دیکھا مگر وہ دوسری طرف دیکھ رہا تھا۔

"گل' محسن اور خان صاحب" رابعہ نے کہا "وہ کہاں ہیں؟ تمہیں نہیں ملے؟"

میں نے کہا "وہ لوگ آئے نہیں ابھی تک؟ میں تو سمجھا تھا آکے پھر کہیں چلے گئے ہیں۔"

غالب نے پلٹ کے کہا "چھوڑو سکندر۔ تم نے ہی کہا تھا کہ انہیں بتانا ضروری ہے۔ اب ہمت نہیں پڑتی تو میں بتا دیتا ہوں۔"

"کیا... کیا بات ہے آخر؟" نازو نے کہا۔

غالب نے جذبات سے عاری' سپاٹ لہجے میں کہا "دیکھو اس وقت ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ تم عقل اور ہوش کا دامن نہیں چھوڑو گی۔ ایک بری خبر ہے مگر تمہیں صبر اور حوصلے سے سننی ہوگی۔"

"کیا فضول باتیں کئے جارہے ہو" رابعہ نے چلّا کے کہا۔ اصل بات کیوں نہیں بتاتے۔ کیا ہوا ہے انہیں؟"

"خان مارا جاچکا ہے پولیس کے ہاتھوں۔" غالب نے کہا۔

بیک وقت ان دونوں نے منہ پر ہاتھ رکھ کے چیخ کو دبالیا مگر ان کا جسم طوفان کی زد میں آجانے والے کمزور درخت کی طرح لرزنے لگا۔

"گل اور محسن کو کچھ نہیں ہوا" میں نے فوراً باقی بات مکمل کی۔

رابعہ نے کچھ دیر بعد سسکیوں کے درمیان کہا "یہ سب کیسے ہوا؟" آنسو اس کی آنکھوں سے بھی اسی طرح ابل رہے تھے جیسے نازو کی آنکھوں سے۔ عورتیں جتنی حساس اور جذباتی ہوتی ہیں قدرت نے اسی تناسب سے ان کو ہر صدمے کے خلاف دفاع کی مؤثر صلاحیت عطا کی ہے۔ وہ روتی ہیں اور غم کے احساس کو بہادیتی ہیں۔ اور صدمہ برداشت سے باہر ہو تو ہسٹیریا کا دورہ بن کے ختم ہوجاتا ہے۔ اس کا بوجھ اعصاب پر باقی نہیں رہتا۔

میں نے کہا "ہمیں بھی ابھی کچھ دیر پہلے معلوم ہوا۔ ایک ہوٹل میں کھانا کھا رہے تھے۔ وہاں شام کا اخبار پڑا تھا۔ اس میں خان کی تصویر تھی۔"

غالب نے ایک کٹورے میں پانی لاکے دیا "چلو رونا دھونا بند کرو اور یہ پانی پی لو' شاباش۔ ہمیں ابھی واپس جانا ہے۔" اس نے نازو اور رابعہ کو باری باری ایک ایک گھونٹ پینے پر مجبور کیا۔

...میں نے انہیں کم سے کم الفاظ میں ساری بات بتادی۔ آہستہ آہستہ انہوں نے اپنے آنسوؤں کو روک لیا اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ غالب کی پیش بندی کے باعث طوفان زیادہ تباہی لائے بغیر گزر گیا۔

"ہم اب کہاں جائیں گے؟" رابعہ نے کہا۔

میں نے کہا "معلوم کریں گے کہ محسن اور گل کو کہاں رکھا گیا ہے۔"

غالب نے کہا "ابھی امید کی گنجائش باقی ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ وہ گل اور محسن نہ ہوں۔"

نازو نے کہا "کیا فائدہ ایسی خوش فہمی سے۔ وہ سب ساتھ تھے۔"

غالب نے کہا "بعض اوقات راہ گیر بھی فائرنگ کی زد میں آکے زخمی ہوجاتے ہیں۔"

رابعہ نے کہا "خبر میں اسپتال کا نام نہیں تھا؟"

میں نے کہا "وہ ہندی کا اخبار تھا جو ہم نہیں پڑھ سکتے تھے۔ ...کسی نے خبر پڑھ کے سنائی تھی۔ اس میں اتنی تفصیل نہیں تھی۔"

"پھر کیسے معلوم ہوگا؟"

"پولیس سے یا پھر ان اسپتالوں سے جہاں پولیس کیس جاتے ہیں" میں نے کہا "ہم اخباری نمائندے بن کے فون کرسکتے ہیں۔"

غالب نے کہا "اخبار والے بھی بتادیں گے۔ اب تک کل صبح آنے والے اخباروں کو بھی تفصیل مل گئی ہوگی۔"

"ہاں۔ خان کوئی معمولی مجرم نہیں تھا۔"

"وہ بہت غیر معمولی آدمی تھا" میں نے کہا "چلو اب اٹھو۔ ...یہ بہترین وقت ہے خاموشی سے نکل جانے کے لئے۔"

غالب نے ایک نظر ان کے کپڑوں کو دیکھا "لباس بدل لو۔"

میں نے کہا "زلیخا کا قد چھوٹا تھا۔ ان کے لئے بے کار ہیں یہ کپڑے۔"

غالب نے کہا "ساری کا سائز چھوٹا بڑا نہیں ہوتا۔ دیکھو اگر اس کی پرانی ساریاں تمہیں آجائیں تو اچھا ہے۔"

رابعہ نے ایک چھوٹے سے ٹرنک کی طرف اشارہ کیا۔

"ساریاں تو ہیں لیکن ..."

میں اس کے تذبذب کی وجہ سمجھ گیا "بلاؤز کی جگہ یہی قمیص چلے گی۔"

ہم پندرہ بیس منٹ کے بعد اس آبادی سے نکلے تو ہر طرف ہُو کا عالم تھا۔ خاموش اور تاریک گلیوں سے نکل کے پیدل چلتے ہوئے ہم نے دو میل کا فاصلہ طے کیا۔ پھر کوئی اس

سڑک آ گئی جو اس وقت بھی آباد تھی۔ متعدد ریسٹورنٹ کھلے ہوئے تھے اور روشنی سے جگمگا رہے تھے۔ دونوں طرف سے بسوں اور ٹراموں کی آمدورفت بھی جاری تھی۔

مجھے ایک برانچ ٹیلی گراف آفس نظر آیا جس کے باہر لگے ہوئے بورڈ پر ٹیلی فون بنا ہوا تھا اور ہندی میں کچھ لکھا ہوا تھا۔

"یہ پبلک کال آفس معلوم ہوتا ہے" میں نے کہا "میں ابھی آتا ہوں فون کرکے۔"

"پہلے کسی اخبار کے دفتر فون کرنا' پھر اسپتال۔ آخر میں پولیس سے بات کرنا' اگر کہیں سے بھی کچھ معلوم نہ ہو" غالب نے مجھے نصیحت کی۔

میں نے کہا "مجھے تو اخباروں کے نمبر بھی معلوم نہیں۔"

غالب نے کہا "ڈائریکٹری میں دیکھ لینا۔ آخری حصے کے زرد صفحات میں سب اخبارات ورسائل کے نمبر مل جائیں گے۔"

لیکن اندر جانے کے بعد میرا واسطہ ایک ایسے شخص سے پڑا جو نیند میں تھا یا شاید نشے میں۔ اس نے مجھے ٹالنے کی کوشش کی "فون خراب ہے۔"

مجھے شک ہوا اور میں نے اس کے سامنے رکھے ہوئے فون کا ریسیور اٹھا کے کان سے لگالیا "جھوٹ بولتے ہو پبلک کے ساتھ" میں نے برہمی سے کہا "جانتے ہو میں کون ہوں' میں ٹائمز آف انڈیا کا رپورٹر ہوں۔"

اس پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ وہ کاؤنٹر پر سر رکھ کے سوتے ہوئے بولا "اچھا بھائی غلطی ہوگئی۔ کرو جتنے فون کرنے ہیں۔"

اس کے بعد ضروری ہوگیا کہ میں اخباری نمائندہ بن کے بات کروں۔ میں نے اس سے ڈائریکٹری طلب کی تو اس نے سر اٹھائے بغیر کہا "ڈائریکٹری نہیں ہے۔ لے گیا کوئی الو کا پٹھا۔ انکوائری سے پوچھ لو۔"

اتفاق سے میری نظر دیوار پر لگے ہوئے بوسیدہ چارٹ پر گئی جس پر کسی نے بقلم خود نہایت بدنمائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اہم فون نمبر لکھے تھے۔ اس میں پولیس کا نمبر بھی شامل تھا۔

یہ نمبر ملانے کے بعد میں نے کہا "میں ٹائمز آف انڈیا کا کرائم رپورٹر بول رہا ہوں۔ خونی خان کے کیس ....."

"آپ نے غلط نمبر پر ڈائل کیا ہے' یہ ایمرجنسی ہے۔"

میں نے کہا "وہاں کوئی اٹھا نہیں رہا ہے۔"

وہ میرے جھانسے میں آگیا "آپ دوسرا نمبر لکھ لیں۔ یہ ڈی ایس پی صاحب کی لائن ہے۔"

میں نے دوسرا نمبر ملایا اور کہا "میں ٹائمز آف انڈیا کا کرائم رپورٹر بول رہا ہوں۔ روبندر ناتھ ٹھاکر۔"

"کون .... وہ شرما جی کہاں گئے؟" کسی نے انگریزی [illegible] پوچھا۔

"وہ چھٹی پر ہیں۔ ان کی جگہ میں کام کررہا ہوں۔"

"اچھا جی ٹھاکر صاحب' کیسے تکلیف کی اس وقت؟"

"تکلیف تو آپ لوگ بے وجہ دیتے ہیں سب کو۔ [illegible] غلط بیانات جس کا جی چاہتا ہے دے دیتا ہے۔ کسی اخبار [illegible] کچھ چھپ جاتا ہے' کسی میں کچھ" میں نے کہا۔

"کیوں جی کیا ہوگیا؟ آپ تو بہت خفا ہیں۔"

میں نے کہا "دیکھئے نا' یہ جو آج ڈاکو مارا گیا ہے' خونی خان [illegible] اس کے بارے میں رپورٹ یہ تھی کہ وہاں فائرنگ میں [illegible] مرد اور عورت بھی زخمی ہوئے ہیں" میں نے کہا "آپ [illegible] ایک ذمے دار آدمی نے بتایا تھا کہ وہ ڈاکو کے ساتھ نہیں تھے۔"

"بالکل ٹھیک بتایا تھا ...."

میں نے اطمینان کا تھوڑا سا سانس لیا "چلیں یہ تو کنفرم ہوا۔ پھر مجھے خبر ملی تھی کہ وہ میاں بیوی ہیں۔"

"میاں بیوی ....." وہ کنفیوز ہونے لگا۔

"ہاں۔ ایک رپورٹ ہے کہ وہ وہاں موجود تھے۔ دوسری یہ ہے کہ باہر سے گزر رہے تھے۔"

"آپ ایسا کیوں نہیں کرتے کہ اسپتال فون کرکے [illegible] افسر سے پوچھ لیں۔ براہِ راست۔"

"یہ بھی سنا ہے کہ انہیں نازک حالت میں کہیں [illegible] شفٹ کردیا گیا ہے" میں نے اندھیرے میں تیر چلایا۔

"یہ تو میرے لئے بھی خبر ہے.... میرے خیال میں ایسا کوئی امکان تو نہیں ہے ...."

"اچھا مجھے ذرا بتائیں' ڈیوٹی افسر کا نمبر۔"

دوسرے نمبر پر ڈیوٹی افسر پہلے تو کچھ بتانے پر آمادہ نہ تھا' پھر میں نے اسے ڈی ایس پی کا نمبر دے کر کہا "تم ان سے بات کرو۔ انہوں نے تو کہا تھا کہ تم پریس میں شائع ہونے والی خبروں کے بارے میں صحیح صورتِ حال کی وضاحت کرسکتے ہو۔ ہمارا [illegible] ہے۔ ہم یہ بھی چھاپ دیں گے کہ پولیس کے محکمے میں ایک افسر کی بات دوسرا نہیں سنتا۔"

وہ مجھ سے متاثر ہوا "بات کیا ہے؟"

میں نے کہا "خونی خان کے ساتھ زخمی ہونے والے مرد [illegible] عورت آخر کون ہیں؟ میاں بیوی یا الگ الگ گزرتے ہوئے زخمی ہونے والے راہ گیر؟"

"ان کا آپس میں کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ بس اسٹاپ پر کھڑے ہوئے تھے۔ دونوں جوان ہیں اس لئے کسی نے [illegible] سمجھا ہوگا۔"

"اور.... یہ جو بتایا گیا ہے کہ ابھی تک انہیں ہوش نہیں آیا چنانچہ ان کے وارثوں کو اطلاع نہیں دی گئی۔"

"یہ کس نے بتایا ہے؟ بالکل غلط ہے یہ۔ ان کے وارث پہنچ چکے ہیں" ڈیوٹی افسر بولا۔

"نام بتائیں گے ان کے آپ؟"

"انیل ایک پارسی ڈاکٹر کی بیوی ہے۔ دوسرا شخص سورتی سیلز مین ہے اور ابھی شادی نہیں ہوئی ہے اس کی۔ اس کے والدین آگئے ہیں۔"

اس سے آگے مجھے کچھ سننے یا جاننے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ میرا دل جو اندیشوں اور دکھوں کی طنابوں میں جکڑا ہوا تھا پھر سے آزاد ہوگیا ہے۔ میرے لئے یہ اتنی بڑی خوش خبری بن گئی کہ میں نے دھڑ سے ریسیور رکھا۔ دس کا نوٹ سر اٹھا کے گھورنے والے کلرک کے سامنے پھینکا اور دوڑ کے باہر آیا۔ میں خونی خان کی موت کے صدمے کو بالکل بھول گیا تھا۔ بڑے جوش کے ساتھ میں نے باہر انتظار کرنے والے غالب' رابعہ اور نازو سے کہا "مبارک ہو' وہ گل اور محسن نہیں تھے۔ میں نے معلوم کرلیا ہے۔ وہ کوئی اور تھے۔"

ایک دم سب کے چہرے روشن ہوگئے "شکر ہے خدا کا" رابعہ نے کہا۔

نازو نے کہا "اللہ نے بچالیا بڑی پریشانی سے۔"

لیکن غالب نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کے کہا "اس کا مطلب ہے کہ بس ایک خونی خان ہی اپنے احساسِ شرمندگی کے ساتھ مرگیا۔"

"شرمندگی کیسی؟" میں نے کہا۔ ہم پھر چلنے لگے۔

"جان دی دی ہوئی اسی کی تھی۔ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔"

"اس نے دوستی کا حق ادا کردیا۔ جس حد تک زندگی نے مہلت دی۔ زندہ رہتا تو اور بہت کچھ کرتا" میں نے کہا "اللہ اس کی مغفرت کرے۔"

"اب گل اور محسن کو کہاں تلاش کریں؟" رابعہ نے موضوع بدل دیا۔

میں نے سوچتے ہوئے کہا "کہاں تلاش کریں!"

غالب نے کہا "ایک ٹھکانا تھا' وہ بھی نہیں رہا۔"

"شاید وہ گئے ہوں وہاں" نازو نے کہا۔

غالب نے اسے گھورا "مجھے غصہ مت دلاؤ باربار۔ تم جو چھپ کر بیٹھ گئی تھیں' یہ سب اسی وجہ سے ہوا۔"

نازو نے کہا "ہم پر الزام مت رکھو خواہ مخواہ۔ آخر تم نے بھی تو تلاش کیا ہمیں؟"

"میرے پاس ایک غیر معمولی دماغ ہے" غالب نے کہا۔ "جیسے کسی سرکش' بددماغ گھوڑے کے مزاج کو ایک ذہین ٹرینر ہی سمجھتا ہے۔ ایسے ہی میں اب تمہارے مزاج کو سمجھنے لگا ہوں۔"

اس سے پہلے کہ پھر جھگڑا ہوتا' رابعہ نے کہا "وہ انتظار تو کرسکتے تھے۔ وہیں یا آس پاس رہ کے۔ چکر لگاتے رہتے وہ تو کسی نہ کسی سے ضرور ملاقات ہوجاتی۔"

"کیا پتا انہوں نے کتنا انتظار کیا اور کتنے چکر لگائے۔ خان کے ساتھ گیارہ ساڑھے گیارہ بجے واردات ہوئی تھی" میں نے کہا۔

"یار' اس وقت وہ خان کے ساتھ کیوں نہیں تھے؟" غالب بولا۔

"کیا معلوم ساتھ ہی ہوں" میں نے کہا "لیکن خطرہ محسوس کرتے ہی نکل گئے ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی جگہ گل اور محسن الگ چلے گئے ہوں کہ ایک کام تم نمٹالو۔ دوسرا ہم نمٹاتے ہیں۔ یا وہ دوسرے شوروم دیکھ رہے ہوں" میں نے مزید کہا "ایسی صورت میں انہوں نے خود کو محفوظ رکھتے ہوئے خان کے قریب رہنے کی کوشش ضرور کی ہوگی۔ اگر وہ ساتھ نہیں تھے تو انہیں دوپہر کے اخبارات میں یہ خبر شائع ہونے سے قبل ہی پتا چل گیا ہوگا کہ خان پولیس کے نرغے میں مارا گیا۔"

"اس کے بعد وہ کیا کرتے رہے؟ کیا کرسکتے تھے آخر وہ خان کے لئے ... کچھ نہیں ... انہیں واپس آجانا چاہئے تھا۔"

میں نے کہا "میرا اندازہ ہے کہ وہ فوراً واپس آگئے ہوں گے اور ریلوے ویگن کو غائب پا کے انہوں نے کسی سے کچھ پوچھے بغیر سمجھ لیا ہوگا کہ یہ واقعات کا ایک ہی سلسلہ ہے۔ شاید ترویدی نے پھر محمد خان کا سراغ لگالیا تھا وہ ایک دوسرے کی نقل وحرکت پر نظر رکھتے تھے اور کوئی کسی کو دھوکا نہیں دے سکتا تھا۔ محسن نے سمجھا ہوگا کہ انہوں نے یوسف ثانی کو اور اس کے گھر کو ٹھکانے لگادیا۔ پھر انہی کی مخبری سے پولیس نے خونی خان کو ٹھکانے لگادیا۔ ہم ساتھ ہوتے تو ہمیں بھی ٹھکانے لگادیا جاتا۔ ظاہر ہے ایسی صورتِ حال میں وہ کیسے وہاں رکتے؟"

غالب نے کہا "انہیں رکنا چاہئے تھا' ہمیں خبردار کرنے کے لئے۔"

"ہم پہنچے بھی تو رات بارہ بجے تھے۔ وہ مایوسی اور پریشانی میں مبتلا ہوکے چلے گئے ..."

"سوال یہ ہے کہ کہاں چلے گئے؟"

ایک خیال کے تحت میں چلتے چلتے رک گیا "مجھے معلوم ہے۔ غالب! وہ وہیں گئے ہوں گے" میں نے چٹکی بجاکے کہا۔

غالب نے میری طرف دیکھا "وہیں..... جہاں سے ہم آئے تھے؟"

"ہاں۔ ہم سب کو وہاں پہنچنا تھا۔ محسن کو معلوم تھا کہ ہماری اگلی منزل کہاں ہے۔ گولڈن فالکن' ستائیسواں میل" میں نے کہا "اس خفیہ زبان کا مطلب سمجھ لینے کے بعد ہم نے یہی طے کیا تھا اور ساری تیاری آخر تھی کس لئے؟ ان کی

جگہ میں ہوتا تو یہی کرتا۔ وہاں جاکے بیٹھ جاتا اور انتظار کرتا۔"
"بالکل ٹھیک" نازو نے سب سے پہلے کہا۔
"بس تو پھر وہیں چلتے ہیں... واپس" غالب نے بھی کہا۔
آدھی رات کے بعد ایک ٹیکسی والے نے وہاں جانے پر رضامندی ضرور ظاہر کی لیکن دس روپے زیادہ مانگے جو کوئی غیر متوقع بات نہیں تھی۔ احتیاط کے پیشِ نظر کسی نے راستے میں کوئی بات نہیں لیکن خاموشی کی اپنی ہی زبان تھی جو سب کے دلوں کا ماجرا کہتی تھی۔ ہم سب خان کے انجام پر دل گرفتہ تھے اور اپنے ساتھیوں کی طرف سے فکر مند۔ میرے اندازے پر یقین کرلینا مجبوری بھی تھی اور ضرورت بھی۔ مایوسی میں جھوٹے سہارے بھی کام آتے ہیں۔ میری بات میں بے بنیاد امید پرستی نہیں تھی، عقل کا ایک جواز تھا۔
اس سڑک پر رات کے وقت بھی ٹریفک رواں تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس وقت پرائیویٹ کاروں اور مسافر بسوں کی تعداد کم تھی۔ ایک شہر سے دوسرے شہر سامان لانے لے جانے والے ٹرک زیادہ تھے۔ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش میں ڈرائیوروں نے ٹریفک کے سب قاعدے قانون بھلا دیے تھے۔ ڈرائیور نے بتایا کہ زیادہ حادثات رات کے وقت انہی ٹرک ڈرائیوروں کی تیز رفتاری اور غلط اوور ٹیکنگ کا نتیجہ ہوتے ہیں جس کی لپیٹ میں بعض اوقات وہ بھی آجاتے ہیں جن کی کوئی غلطی نہیں ہوتی۔ میں اسے کیسے بتاتا کہ یہی میرے وطن میں کراچی سے حیدر آباد اور لاہور سے پنڈی کے درمیان مختصر فاصلے کی دوڑ میں ہوتا ہے۔

ٹیکسی ڈرائیور بہت محتاط تھا اور جب تک راستہ صاف نہیں ملتا تھا اوور ٹیک نہیں کرتا تھا۔ میں آگے بیٹھا ہوا تھا چنانچہ غیر ارادی طور پر سامنے جانے والے ہر ٹرک پر میری نگاہ پڑتی تھی۔ کسی ٹریفک سارجنٹ کی طرح جو کسی نہ کسی بہانے چالان کرنے پر آمادہ ہو' میں نے ہر ٹرک میں نقائص دیکھے۔ کس کی ٹیل لائٹ نہیں ہے' کس کی بریک لائٹ خراب ہے' کس کے انڈی کیٹر کام نہیں کرتے۔ میں نمبر پلیٹوں کو بھی دیکھ رہا تھا۔ بہت سے نمبر عمداً ایسے کردیے گئے تھے کہ پڑھے نہیں جاتے تھے۔
میں نے بغیر نمبر والے بھی دو ٹرک دیکھے لیکن ان میں کوئی اور بات مشکوک نظر نہیں آئی۔ ایک خالی تھا اور دوسرے میں بھوسہ لدا ہوا تھا۔ پھر ایک جگہ مجھے سڑک سے ذرا ہٹ کے ایک قطار میں کچھ ٹرک کھڑے ہوئے نظر آئے۔ یہ چھ ٹرک تھے جو ایک کانوائے کی صورت میں ساتھ ساتھ سفر کر رہے تھے اور شاید کوئی ٹرک پیچھے رہ گیا تھا کہ وہ سب رک کر اس کے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ ایک ٹرک کے کیبن میں بیٹھا ہوا ڈرائیور سر نکال کے اپنے پیچھے والے ڈرائیور سے بات کر رہا تھا۔ جب ٹیکسی ان کے پاس سے گزری تو میں نے کسی کو گالی دیتے سنا۔ پھر کوئی اور بولا "آجائے گا یار..." مجھے یاد آیا کہ ابھی کچھ دیر پہلے ہم ایک ٹرک کے پاس سے گزر کے آئے تھے جس کی شافٹ ٹوٹ گئی تھی۔
شافٹ ٹوٹ جانے کی صورت میں ٹرک ہی نہیں' ہر گاڑی جہاں ہو وہیں رک جاتی ہے۔ انجن جتنا زور چاہے لگائے' پہیے نہیں گھومتے کیونکہ پہیوں کو انجن سے پچھلے پہیوں تک جانے والی شافٹ گھماتی ہے تو پچھلے پہیے حرکت میں آتے ہیں اور اگلے پہیوں کو دھکیلتے ہیں۔ سمجھدار ڈرائیور اس شافٹ کو تار کے ساتھ مضبوطی سے باندھنے کی احتیاط کرتے ہیں ورنہ یہ بھی ہوتا ہے کہ شافٹ ٹوٹ کے سڑک پر لگتی ہے اور وہیں گڑ جائے تو متحرک ٹرک الٹ جاتا ہے۔
جب میں نے پلٹ کے دیکھا تو غالب بھی پلٹ کے دیکھ رہا تھا۔
"کیا.... یہ وہی ٹرک ہوسکتے ہیں؟" غالب نے کہا۔
میں نے تائید میں سر ہلایا "بالکل ہوسکتے ہیں۔ سب ایک ساتھ ہیں۔"
"چھ ٹرک تھے" رابعہ نے کہا "ساتواں شاید پیچھے رہ گیا۔"
نازو نے ثابت کردیا کہ وہ سب بھی مستعد تھے "ہاں۔ ایک ٹرک خراب کھڑا ہوا تھا۔ راستے میں۔"
میں نے کہا "کسی نے نمبر دیکھا؟"
نمبر کسی نے نوٹ نہیں کیا تھا لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ باقی سب ٹرک ایک ایک یا دو دو جا رہے تھے۔ یہ چھ ٹرک تھے۔ ساتواں ٹرک فی الحال ان کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ شافٹ کی مرمت کئی گھنٹوں کا کام تھا لیکن یہ ہوسکتا تھا کہ اسے وہ کھینچ کر لے آئیں۔ سامان سے لدا ہوا کوئی ٹرک واپس جاکے خراب ٹرک کو نہیں لاسکتا تھا۔ زیادہ امکان اسی بات کا تھا کہ کوئی ڈرائیور یا کلینر واپس جاکے صورتِ حال معلوم کرے گا اور پھر خراب ٹرک کو کسی خالی ٹرک کے پیچھے باندھ کر لے جانے کا بندوبست کیا جائے گا۔ اس سارے کام کے لئے کم سے کم بھی ایک ڈیڑھ گھنٹا درکار تھا۔ اور ہم اس مہلت سے فائدہ اٹھاسکتے تھے۔
اگر یہ دلاور کا مال تھا تو میں یہ سمجھنے میں حق بجانب تھا کہ درمیان والے ٹرک میں شیشے کا وہ بکس یا تابوت بھی ہوگا جس کے اندر شہلا اور اس کا بیٹا محوِ خواب تھے۔ اسلحہ ہر ٹرک میں تھا... صرف اس ٹرک میں یا سب میں تھوڑا تھوڑا تھا' اس بارے میں قیاس آرائی پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ تاہم یہ بات یقینی تھی کہ درمیان والا ٹرک جو اب آگے سے چوتھا اور پیچھے سے قطار کا تیسرا ٹرک تھا' ہماری دخل اندازی کے خلاف سب سے بہتر تحفظ کی ضمانت فراہم کرتا تھا۔ دلاور اینڈ کمپنی نے ہمارے سامنے کھلا چیلنج رکھ دیا تھا کہ ہمت ہے تو کچھ کرکے دکھاؤ۔ عقل کے گھوڑے دوڑاؤ اور طاقت استعمال کرکے دیکھو۔ درمیان والے ٹرک کو ہائی جیک کرکے لے جاسکتے ہو تو لے جاؤ۔ کسی ایک ٹرک پر ایک گولی چلاکے دیکھو۔ میدانِ حشر میں شہلا تمہارا دامن تھام لے گی کہ سکندر بھائی' آپ نے یہ ظلم کیوں کیا؟ مارنا ہی تھا مجھے تو جانے سے پہلے مار جاتے۔ انتظار کے اتنے صبر آزما عذاب سے گزار کے مجھے کیوں مارا؟ اس کا بچہ سوال کرے گا کہ میرے ان دیکھے ماماجی' ممی تو بہت تعریف کرتی تھیں آپ کی۔ آپ سب کی۔ اور آپ سب نے مل کے.....
میں نے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کے کہا "نہیں...."
ٹیکسی ڈرائیور نے حیرانی سے مجھے دیکھا "کیا نہیں صاحب؟"
غالب نے پیچھے سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا "سب ٹھیک ہوجائے گا یار" اس نے مجھے تسلی دینے کی کوشش کی۔ لیکن اس کے لہجے کا کھوکھلا پن خود اس کے خلاف گواہی دیتا تھا۔
"ٹیکسی یہاں روک لو" میں نے کہا۔
ٹیکسی ڈرائیور نے تعمیل کی مگر اس کی حیرانی بڑھ گئی۔ جہاں ہم اترے تھے وہاں دور دور تک آبادی کا نشان نہ تھا۔ سڑک کے دونوں جانب تاریک رات میں جنگل سائیں سائیں کر رہا تھا۔ دو جوان عورتوں کے ساتھ دو مردوں کا اس ویرانے میں کیا کام ہوسکتا تھا؟ ڈرائیور کو ضرور شک ہوا ہوگا۔ ابھی ٹیکسی واپس بھی نہیں ہوئی تھی کہ میں مخالف سمت میں چل پڑا۔ باقی سب نے سمجھ لیا کہ میرا مقصد ٹیکسی ڈرائیور کو دھوکا دینا ہے۔ وہ میرے ساتھ ایسے چل پڑے جیسے ہماری منزل اسی سمت میں اور بہت قریب ہے۔
پچاس قدم چل کے میں واپس ہوا۔ اس وقت تک بمبئی کی طرف جانے والی ٹیکسی نظروں سے اوجھل ہوگئی تھی... سڑک عبور کرکے ہم نے تقریباً نصف فاصلہ خاموشی سے طے کیا۔
پھر ایک جگہ رک کے میں نے نازو اور رابعہ پر شاکر علی کے گھر۔ ملہوترہ کی سنہرے بازو والی کوٹھی اور اس کے مندر اور گودام کی پوزیشن واضح کی اور انہیں اپنا پلان سمجھایا۔
"اس وقت رات کے دو بجے ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق وہ ٹرک ایک گھنٹے سے دو گھنٹے کے درمیان ملہوترہ کے گودام میں پہنچ جائیں گے۔ اگر وہ چوہدری دلاور کا مال ہوگا تو وہ ٹرک سڑک سے اس طرف مڑجائیں گے" میں نے اشارے سے بتایا "گودام کا راستہ ایک فرلانگ دور ہے۔ ہم قریب جاکے بھی دیکھ سکتے ہیں لیکن اس کی ضرورت نہیں۔ ان کے یہاں پہنچنے سے قبل ہمیں بہت سے کام ختم کرنے ہیں۔"
"اور اگر وہ ٹرک کسی اور کے ہوئے؟"
"ٹرک کسی اور کے نہیں ہوسکتے لیکن ہوئے تو کوئی بات نہیں۔ ہم اپنا باقی پروگرام التوا میں رکھیں گے۔ کل تک۔"
غالب نے مجھ سے اتفاق نہیں کیا "کل کا بھی کیا بھروسہ... ہم آدھا کام کرکے بیٹھ جائیں اور اس کے بعد معلوم ہو کہ یہ ٹرک تو سیدھے گزر گئے۔ اصل ٹرک دو دن بعد آئیں یا چار دن بعد۔ ہمارا پلان ادھورا رہ جائے گا اور آدھی کامیابی سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا۔ مفروضے سے آغاز کرنا غلط ہے۔ کام شروع ہو تو پورا ہو ورنہ ہم انتظار کریں۔"
میں نے کہا "یو آر رائٹ۔ چلو پھر ہم فی الحال کچھ نہیں کرتے۔ چھپ کر دیکھتے ہیں کہ ٹرک کب یہاں سے گزرتے ہیں اور کدھر جاتے ہیں۔"
میں نے رابعہ کا ہاتھ پکڑلیا۔ وہ خاصی خوفزدہ اور نروس تھی۔ اس کا ہاتھ ٹھنڈا ہو رہا تھا۔
"یہ کیسی منحوس آوازیں ہیں؟" رابعہ نے کہا۔
میں نے کہا "یہ گیدڑ ہیں۔ تمہیں خوش آمدید کہہ رہے ہیں اپنی سریلی آواز میں۔"
نازو نے کہا "جب کُتے اس طرح اکٹھے روتے ہیں تو کوئی آفت آتی ہے۔ میں نے سنا ہے۔"
"ٹھیک سنا ہے تم نے" غالب بولا "انہیں تمہارے آنے کی اطلاع مل گئی ہوگی۔"
نازو کے بولنے سے پہلے ہی میں نے کہا "جسے تم نے رونے کا نام دے دیا ہے بی بی' یہ ان کا گانا بھی تو ہوسکتا ہے۔ کبھی کسی کُتے سے پوچھا ہے کسی نے؟"
غالب نے کہا "بہت سے انسان بھی گاتے ہیں تو ان کا گانا رونا ہی لگتا ہے۔ مثلاً چینی یا جاپانی۔"
رابعہ اور نازو ہنس پڑیں۔
غالب نے کہا "کیا غضب کرتی ہو۔ کوئی قریب سے گزرتے ہوئے سن لے گا تو بے ہوش ہوجائے گا۔ جنگل میں چڑیلوں کی ہنسی سن کے۔"
"بس اس سے آگے جانے کا کوئی فائدہ نہیں" میں نے کہا اور ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ آس پاس ایسے ہی بہت سے بڑے بڑے پتھر تھے جو چٹانوں کے ٹکڑے معلوم ہوتے تھے۔ چھ سات فٹ اونچی ایک چٹان نے ہمیں سڑک کی جانب سے دیوار کا تحفظ فراہم کردیا تھا۔ یہاں بیٹھ کے ہم سڑک پر سے گزرنے والی ٹریفک لائٹس کو حرکت کرتا دیکھ سکتے تھے۔
کُتے اب دور چلے گئے تھے۔ غالباً بستی کی طرف۔ گیدڑ بھی خاموش ہوگئے تھے۔ شاید دم لینے کے لئے۔ میں نے ایک سگریٹ سلگاکے پاؤں سیدھے کئے ہی تھے کہ اچانک ایک گیدڑ ہمارے سامنے آگیا۔ غالباً اس کے لئے بھی ہما

وہاں موجودگی کم تیر خیز نہ تھی۔ وہ کچھ دیر حیران کھڑا رہا۔ نازو یا رابعہ میں سے کسی نے اسے نہیں دیکھا۔ وہ ان کے پیچھے تھا لیکن غالب نے دیکھ لیا تھا۔ اگر وہ خاموشی سے واپس چلا جاتا تو کچھ نہ ہوتا مگر اس نے ایک چیخ ماری اور بھاگ گیا۔

اس کے ساتھ ہی رابعہ نے چیخ ماری اور مجھ سے چمٹ گئی۔ نازو نے چیخ مار کے غالب کے ساتھ یہی حرکت کی۔ مجھے رابعہ کے منہ پر ہاتھ رکھنا پڑا۔

"دماغ خراب ہے۔ گیدڑ تھا ایک' چلا گیا" میں نے محسوس کیا کہ اس کا پورا جسم کانپ رہا ہے "اتنا ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

غالب نے نازو کو تسلی بھی دی اور ڈانٹا بھی "تم تو مرواؤ گی ایسے۔ گیدڑ تھا وہ' کوئی شیر نہیں تھا۔ گیدڑ تو آدمی کی صورت دیکھ کے بھاگتا ہے۔"

"وہ بھولا بھٹکا' غلطی سے ادھر آنکلا تھا" میں نے کہا۔

"اگر سچ مچ شیر آجائے تو کیا چیخ سن کے ڈر جائے گا۔ یا چیخ سے مرجائے گا" غالب نے کہا۔

نازو اور رابعہ سخت خفت کے ساتھ الگ ہو کے بیٹھ گئیں۔ ان کی یہ حرکت غیرارادی تھی۔ ایک نفسیاتی خوف کا نتیجہ۔ گیدڑ کے بجائے کوئی دشمن خطرناک اسلحے سے لیس ہو کے سامنے آجاتا تو نازو کا ردِعمل بالکل مختلف ہوتا۔ میں اور غالب ان کی حالت پر ہنستے رہے اور ان کی بدحواسی سے لطف لیتے رہے۔ وہ جھینپ رہی تھیں اور مسکرا رہی تھیں۔ اگر تاریکی نہ ہوتی تو شاید روشنی گلابی ہو جاتی۔

غالب نے کہا "گیدڑ اچھی چیز ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ ایک پال لوں۔ داشتہ آید بکار۔"

میں نے کہا "ہاں۔ جب چاہا نکال بیوی کے سامنے کر دیا"

"بیوی کیا یار' کوئی بھی ہو۔ ہمیں کیا' جس کا دل چاہے چمٹ جائے۔"

رابعہ نے جل بھن کے کہا "ہاں۔ ستر سال کی کالی کلوٹی' سوکھی چمرخ بڑھیا ہو۔ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔ پوپلے منہ سے "بیٹا" کہہ کے چمٹ جائے۔"

نازو نے کہا "خواہ کوئی بھتنی چمٹ جائے۔"

غالب نے دانت نکال کے کہا "اور ابھی کون چمٹا تھا۔ کہیں اس سے پھر یہ ثابت نہیں ہوتا کہ میرے مرحوم سسر تھے۔"

رابعہ اور نازو کو خفا ہونے کا موقع نہیں ملا۔ سڑک کی جانب سے ایک دم تیز روشنی کا سیلاب سا آیا۔ روشنی چٹان کو اور آس پاس کے پتھروں' درختوں اور جھاڑیوں کو روشن کرتی گزر گئی۔ یہ پہلا ٹرک تھا جو سڑک سے اندر مڑ گیا تھا۔ اس کے بعد مزید پانچ ٹرک گزرے۔ ان سب نے گودام کی طرف

جانے والی سڑک پر آتے ہی ہیڈ لائٹس آف کر
اندھیرے میں ان کے متحرک سائے آگے بڑھتے گئے
ساتھ چھ طاقتور انجنوں کی آواز سے رات کا سکوت ٹو
رہا۔

"ساتواں ٹرک نہیں آیا" غالب نے کہا۔

میں نے سرہلایا "آجائے گا وہ بھی بعد میں.... چو

"چوتھے ٹرک پر ایک نیلی پٹی ہے" غالب بولا۔

"اندھیرے میں نیلا رنگ کیسے نظر آگیا تجھے؟"

"جب پانچواں ٹرک مڑا تھا تو اس کی روشنی اگلے
پڑی تھی.... میں سب کو دیکھتا رہا تھا۔ کسی اور پر نیلی
تھی" غالب نے پورے وثوق سے کہا جس کے بعد
لئے شک کی گنجائش نہ رہی۔

"اب چلو یہاں سے .... شاکر کی طرف۔"

غالب نے کہا "خدا کرے وہ اپنی چھپا بیگم کے ساتھ سورہا ہو۔"

"کیا؟" نازو نے خفگی سے کہا۔

میں نے فوراً وضاحت کی "افیون کو کہتے ہیں
نازو نے جھینپ کر کہا "میں نے بھی سنا ہے"

"تم سنو گی کسی دن مجھ سے کھری کھری۔ تم
غصہ ہر وقت ناک پر رہتا ہے نا' منشی کی عینک کی طرح
اچھی بات نہیں ہے" غالب نے آگے چلتے ہوئے
ٹھوکر ماری۔

نازو نے کہا "آئی ایم سوری۔ کسی اور پر تو غصہ
مجھے۔"

غالب کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی پگھل جاتا۔ چہرہ
ہو جاتا۔ اس نے پلٹ کے دیکھا اور ہنس پڑا۔

میں نے کہا "یہ وہ غصہ ہے جس کے بارے میں
فرمایا ہے۔"

"رہنے دو شاعر کے فرمائے ہوئے کو" نازو
لیکن میں نے بات جاری رکھی "کہ۔ ان کو آتا
غصہ۔"

"سکندر" نازو چلائی۔

میں نے ہنس کے کہا "ہم کو غصے پہ پیار آتا ہے
غصہ کیوں آتا ہے؟ مرزا غالب کے نام کا بھی اثر

رابعہ اور نازو اب پیچھے چلنے لگیں۔ راستہ مجھے
کو ہی معلوم تھا۔ ہم نصف دائرے میں بائیں جانب
اور بستی کے مرکزی علاقے سے بچتے ہوئے شاکر علی
کے پیچھے پہنچے۔ برساتی نالہ ہمارے بائیں ہاتھ پر
ہم نے دائیں طرف کی گلی پکڑی تو نالہ دور ہو گیا
پطرس بخاری کے مطابق کتوں کا مشاعرہ ہو رہا

مقام تھا جہاں سے میں اور غالب اپنی مردانگی کے دعوے کو داؤ پر لگا کے گزرے۔ بظاہر بے خوفی کے ساتھ اور اعتماد سے یہ ثابت کرتے ہوئے کہ "بھونکنے والے کتے کاٹتے نہیں۔ ان سے کیا ڈرنا" لیکن اندر ہی اندر خوف سے کانپتے ہوئے کہ کوئی اچانک غزل چھوڑ کے ٹانگ نہ پکڑ لے۔ غالباً کتا وہ واحد شہری مخلوق ہے جس سے بیشتر بہادر مرد بھی نفسیاتی خوف کھاتے ہیں۔ چور ڈاکو سے بھی زیادہ۔ خواتین کا یہ ہے کہ وہ کاکروچ سے چھپکلی تک سب گھریلو' بے ضرر قسم کے کیڑے مکوڑوں سے بھی شوقیہ ڈرتی ہیں۔

کتوں کے غول بیابانی کے پاس سے گزر آنے کے بعد غالب نے ایک لمبی سانس کھینچ کے کہا "بچ گئے آج بھی بائیس انجکشنوں سے۔"

میں نے کہا "کتے سے کون ڈرتا ہے؟"

رابعہ اور نازو کھی کھی کرنے لگیں "ہم نے دیکھا تھا۔ کتے ڈر کے ایک طرف خاموش اور باادب کھڑے ہو گئے تھے۔"

غالب نے مجھ سے کہا "سنا ہے کتے صرف چڑیلوں سے ڈرتے ہیں۔ انہیں دیکھ سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "شادی کے بعد ایک عدد کتا بھی پال کر دیکھ لیں گے کہ یہ بات کس حد تک سچ ہے۔"

شاکر علی کے گھر پہنچنے تک ہمیں کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ اس چھوٹی سی بستی میں رات کو جاگنے والا کوئی نہیں تھا۔ نہ یہاں کسی کارخانے کی نائٹ شفٹ چلتی تھی۔ نہ رات کو لوگ ہوٹلوں میں بیٹھتے تھے اور نہ ٹریفک ہوتی تھی۔ بے خوابی کا مریض بھی کوئی تھا تو اپنے بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ گلیوں میں چوکیدار کے گشت کرنے کا ثبوت بھی کہیں نہیں ملا۔

شاکر علی کے گھر میں مکمل اندھیرا اور سکوت تھا۔ میں نے آہستہ سے دروازے پر دستک دی تو دروازہ ہلا۔ میں نے اسے تھوڑا سا دھکیلا۔ اس کا پٹ پیچھے ہو گیا اور اوپر لٹکنے والی کنڈی بولنے لگی۔

"یہاں دروازے کھلے چھوڑ کے سوتے ہیں لوگ؟" میں نے کہا۔

"شاکر علی نے ہمارے لئے کھلا چھوڑا ہو گا" غالب بولا۔

"شاکر علی" میں نے آہستہ سے آواز دی۔ ان کے پاس ایک ہی کمرا تھا جو ان کی خواب گاہ بھی تھا۔ میں دستک دیے بغیر اندر داخل ہونے سے گریز کر رہا تھا۔ میں نے دوبارہ زیادہ بلند آواز میں اسے پکارا اور اوپر ہاتھ بڑھا کے کنڈی بجائی۔

"چل اندر یار" غالب نے کہا "وہ کوئی چڑھا کے سویا ہو گا"

"مگر یار کہیں.... میرا مطلب ہے ایسے سوتے میں ہم بر پر جا کھڑے ہوں۔ یہ اچھی بات نہیں ہو گی۔"

"پھر کیا رات بھر کنڈی بجاتے رہیں گے؟ اٹھ وہ صبح ہونے کے بعد جاگے تو صبح جائیں گے گھر میں" غالب بولا۔

"تم دونوں چلی جاؤ" میں نے کہا۔

رابعہ ہنسی "کیا ہمارے لئے یہ اچھی بات ہو گی۔"

میں نے تنگ آکے خود ہی پہل کی اور اندر داخل ہو گیا۔

صحن کے بعد ایک کمرا تھا۔ ہم سب صحن میں رک گئے۔ غالب نے باہر والا دروازہ بند کر دیا۔ میں نے پھر شاکر علی کو آواز دی۔ اس بار زیادہ زور سے مگر مجھے اندر سے کوئی جواب نہیں ملا۔

"کیا اصلی بیگم بھی چھپا بیگم کے ساتھ سو رہی ہیں؟" نازو نے کہا۔

میں نے اسے گھور کے دیکھا "نازو بیگم' مجھے دال میں کالا نظر آرہا ہے۔"

"اندھیرے میں کالا کیسے نظر آسکتا ہے" رابعہ نے کہا۔ وہ جتنی غیر سنجیدہ تھیں اتنا ہی میں کسی نامعلوم خوف میں مبتلا تھا شاکر علی نہ سہی اس کی بیوی کو بہرحال جاگ اٹھنا چاہئے۔ وہ ایسی بے فکری کی نیند کیسے سو سکتی ہے جس کی زندگی میں فکروں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

آہستہ آہستہ میں آگے بڑھا اور کمرے کی دہلیز پر رک کے میں نے اتنی اونچی آواز میں شاکر علی کو پکارا کہ جو سو رہا تھا وہ ضرور جاگ جاتا۔ پھر میں نے جیب سے ماچس نکالی اور ایک دیا سلائی روشن کی۔ شعلہ روشن ہوتے ہی بجھ گیا۔ ایک سیکنڈ کے لئے تاریکی سے ابھرنے والا ہولناک منظر میری آنکھوں کے سامنے آیا اور اپنا سفاک نقش چھوڑ گیا۔ میں پتھر کے بت کی طرح جامد کھڑا رہ گیا۔

غالب نے کہا "کیا بات ہے؟"

میں نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا "چلو۔ یہاں سے نکل چلو۔"

غالب نے میرے لہجے سے بات سمجھ لی "کیا...."

"ہاں۔ کرنے والے اپنا کام کر گئے" میں نے اپنا ریوالور نکال لیا "سب کو مار گئے۔"

رابعہ اور نازو نے بے اختیار ہائے اللہ کہا۔

میں نے کہا "اچھا ہوا کہ تم نے کچھ نہیں دیکھا۔ تم نے شاکر علی کو اور اس کی بیوی کو بھی نہیں دیکھا۔ اب چلو۔ میں نہیں بتاؤں گا کہ میں نے کیا دیکھا تھا۔"

میں نے شاکر علی کو دیکھا تھا۔ اس کی لاش کمرے کے وسط میں الٹی پڑی ہوئی تھی۔ اپنے ہی خون میں غلطاں۔ اس کی بیوی کو دیکھا تھا۔ وہ آدھی شوہر کے اوپر تھی۔ اس کا باقی دھڑ فرش پر تھا اور وہ چت پڑی ہوئی تھی۔ ان کے دونوں بچے چارپائی پر سو رہے تھے یا شاید مردہ لیٹے ہوئے تھے۔ ان کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا' صرف فرض کیا جاسکتا تھا کہ جن لوگوں نے شاکر اور اس کی صابر بیوی کو کسی ناقابل معافی

خطا کی سزا دی تھی انہوں نے بچوں کو کب بخشا ہوگا کہ وہ کسی کے سامنے ان کو شناخت کرلیں اور ان کے دامن پر اپنا لہو پہچان جائیں۔

گھر سے باہر آتے وقت ہم خطرے کو بہت قریب محسوس کررہے تھے۔ میں نے اور غالب نے ریوالور تیار رکھے تھے۔ اپنے ریوالور کے متعلق مجھے کوئی شک وشبہ نہ تھا کہ ضرورت پڑی تو اس کی باقی پانچ گولیوں کا نشانہ خطا نہیں جائے گا۔ ... غالب کو یقین نہیں تھا کہ ریوالور کی کارکردگی کا معیار اب کیا ہے۔ اس کا ریوالور پانی میں بھیگا تھا یا نہیں اور بھیگا تھا تو خشک ہوجانے کے بعد کار آمد تھا یا نہیں۔ پھر بھی اس ریوالور کا ہاتھ میں ہونا خالی ہاتھ ہونے سے بہتر تھا۔

حملہ آور شاید انتظار میں تھے۔ انہوں نے سوچا ہوگا کہ ہم اندر جائیں گے تو لائٹ بھی جلائیں گے اور اس کے بعد کسی کی چیخ سنائی دے گی تو انہیں معلوم ہوجائے گا کہ ہم محصور ہوگئے ہیں لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ہم اندر داخل ہونے سے پہلے ہی واپس ہوگئے۔

بیرونی صحن کی تین دیواریں قدِ آدم اونچی تھیں۔ ان پر تین افراد یوں سیدھے لیٹے ہوئے تھے کہ ان کی موجودگی کا احساس بھی نہیں ہوتا تھا۔ اندھیرے میں وہ دیوار کا ایک حصہ معلوم ہوتے تھے۔ ان میں سے ایک نے حرکت کی تو میں نے دیکھ لیا۔ اس نے نازو پر چھلانگ ماری تھی جو سب سے آگے اور باہر والے دروازے کے قریب تھی۔

میں نے چلا کے غالب کو خبردار کیا۔ دوسرے شخص نے اندر کودنے سے پہلے ہی ریوالور نکال لیا تھا۔ نسبتاً روشن آسمان کے پس منظر میں اس کی حرکات وسکنات بہت واضح تھیں۔ اس سے پہلے کہ وہ فائر کرتا' میرے ریوالور سے نکلنے والی بے آواز گولی نے اسے نشانہ بنالیا۔ وہ ہاتھ اوپر اٹھا کے منہ کے بل سیدھا اندر آیا اور صحن میں بڑی آواز کے ساتھ گرا۔ اس کا ریوالور ہاتھ سے چھوٹ کے دیوار پر لگا اور اچھل کے رابعہ کے قدموں میں آگرا۔

نازو نے سب سے پہلے حملہ کرنے والے کو ٹھکانے لگادیا تھا۔ مجھے یہی امید تھی۔ جیسا کہ اس نے بعد میں بتایا' پہلے تو وہ بھی گرگئی تھی۔ کیونکہ وہ اس غیر متوقع حملے کے لئے بالکل تیار نہیں تھی۔ اسے نازک اور کمزور عورت سمجھنے والے مرد نے سمجھا کہ میدان مار لیا اور اس نے نازو کا منہ چومنے کے لئے اپنی تھوتھنی آگے بڑھائی۔ نازو نے ہاتھ پیر چھوڑ کے ظاہر کیا کہ وہ مزاحمت کے قابل بھی نہیں اور جب فاتح مرد کا چہرہ اس کی دسترس میں آگیا تو اس نے بس ایک ہی وار کیا اور اس کی بیل جیسی گردن توڑ دی۔ اسے اپنے اوپر سے گرا کے وہ کھڑی ہوئی تو اس نے تیسرے شخص کو غالب کے ساتھ نبرد آزما دیکھا۔

غالب کا ریوالور دغا دے گیا تھا۔ اس نے آخری حربے کے طور پر ریوالور کے دستے سے کام چلانے کی کوشش کی مگر وار نہیں پڑا۔ اس نے غالب کو ٹکر ماری اور گرا کے اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا۔ نازو سے پہلے رابعہ نے غالب کی مدد کی۔ اس نے اپنے پیروں کے پاس آکر گرنے والا ریوالور اٹھا لیا تھا۔ تاہم اس نے بڑی عقل مندی کا مظاہرہ کیا اور گولی نہیں چلائی۔ اس نے غالب پر سوار شخص کے سر پر ریوالور کے دستے کے پے در پے وار کئے۔ یہاں تک کہ وہ سر پکڑ کے کراہتا ہوا گر گیا۔

یہ سب تین چار منٹ کی معرکہ آرائی تھی جس میں صرف ایک چلائی گئی تھی اور وہ بھی میرے سائیلنسر لگے ہوئے ریوالور سے۔ یہ سراج کا تحفہ تھا جو ہمارے کام آیا۔ اس میں اب بھی چار گولیاں موجود تھیں۔ تقریباً اسی وقت نازو نے دوسرے کو ختم کردیا تھا۔ آخری شخص رابعہ کے ہاتھوں مارا گیا مگر اس نے شور بہت کیا۔ سر پر پڑنے والی پہلی ضرب پر بھی اس نے ایک دل خراش چیخ ماری تھی۔ دوسری ضرب پر بھی وہ چلایا اور پھر کراہتے ہوئے بے ہوش ہوکر گر گیا۔ اس کی چیخ پکار نے باہر کھڑے ہوئے باقی دونوں افراد کو متوجہ کیا اور وہ بھی ان کی مدد کے لئے اندر آگئے۔

دروازے میں نمودار ہونے والا شخص باقاعدہ مشین گن کے ساتھ تھا۔ اس ہتھیار کی تباہ کاری پر اسے اتنا بھروسہ تھا کہ وہ بے خوفی سے اندر آگیا۔ باہر اس لئے کھڑا ہوا تھا کہ وہ تین کی قوت کو اس کام کے لئے کافی سمجھتا تھا۔ ان میں سے ایک کے پاس ریوالور بھی تھا۔ انہیں یقین تھا کہ ہم بچ کر نکل نہیں سکتے لیکن اندر تین منٹ میں نقشہ بدل گیا تھا۔ مشین گن والے کو ہدایات ملی ہوں گی کہ صرف اشد ہنگامی ضرورت میں وہ فائر کھولے۔ جب وہ دیکھے کہ دشمن غالب آگیا ہے اور فرار ہونے والا ہے۔

اپنے ساتھی کی آواز پر وہ اندر آیا اور اس نے صورت حال کا اندازہ کرنے کے لئے میدانِ کارزار پر ایک نگاہ ڈالی۔

اچانک نازو نے کہا "الو کے پٹھے' اندر آ..."

نازو نے اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے آواز لگائی تھی اور مجھے تھوڑی سی مہلت فراہم کرنے کے لئے۔ اس نے مشتعل ہو کے نازو کو دیکھا چنانچہ وہ مجھے ریوالور اٹھاتے نہیں دیکھ سکا۔ ڈز کی ہلکی سی آواز کے ساتھ گولی نے اس کے سینے میں سوراخ کردیا۔ وہ پیچھے کی طرف گرا۔ آخری آدمی عین اس کے پیچھے موجود تھا۔ اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی لیکن مشین گن والے کو آگے دھکا دے کر بھاگا۔

میں ایک جست میں مشین گن والے کے اوپر سے گزر کے دہلیز پھلانگ گیا۔ بھاگنے والے کا حوصلہ تو جواب دے چکا تھا کیونکہ اسے اپنے سب ساتھیوں کی

دیکھنے کے لئے زیادہ وقت ملا تھا۔ اب اس نے محسوس لیا کہ وہ بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتا۔ وہ ایک دم زمین پر لیٹ گیا اور رونے لگا "بھگوان کے لئے دیا کرو مجھ پر' مجھے مت مارو۔"

میرا اٹھا ہوا ہاتھ رک گیا "آواز بند کر اپنی پہلے۔"

اس کی آواز یوں بند ہوگئی جیسے کسی نے اس کے گلے کے اسپیکر کا تار کاٹ دیا ہو۔ وہ دم سادھے زمین پر پڑا پھٹی پھٹی آنکھوں سے ریوالور کی طرف اور میری طرف دیکھتا رہا۔

"خاموشی سے اٹھ کے اندر چل" میں نے اس کے ایک لات رسید کی.. وہ حلق سے آواز نکالے بغیر اٹھا۔ میرا ارادہ اس کو فوراً مارنے کا نہیں تھا۔ اس کا زندہ ہاتھ آجانا ہمارے حق میں بہتر تھا۔ ہم اس سے بہت سے سوالات کے جواب حاصل کرسکتے تھے اور اسے زندہ رکھنے یا نہ رکھنے کا فیصلہ اتفاق رائے سے بعد میں کیا جاسکتا تھا۔ معلوم نہیں اچانک اس کو کیا خیال آیا کہ وہ پھر بھاگ نکلا اور اس بار میں نے اسے رعایت نہیں دی۔ ... وہ دہلیز کے قریب گرا اور تڑپنے لگا۔ گولی اس کی گردن کے پچھلے حصے میں لگی تھی اور سامنے سے پار ہوگئی تھی۔ میں نے ٹانگ سے پکڑ کے اسے بھی اندر گھسیٹ لیا اور دروازہ بند کردیا۔ ...خون کی ایک لکیر باہر سے اندر تک بن گئی۔ رات کا اندھیرا ختم ہونے سے پہلے اس خون کا نظر آنا محال تھا لیکن لاش باہر پڑی رہتی تو شاید صبح ہونے سے پہلے ہی کسی کو متوجہ کرلیتی۔

اب راستہ صاف تھا۔ مکان ساتھ ساتھ ہوتے تو تھوڑا بہت ہنگامہ کسی پڑوسی کو بیدار کرسکتا تھا۔ مگر یہاں مکان الگ الگ تھے۔ بے ترتیب بنے ہوئے تھے اور ایک سطح پر نہیں تھے۔ شاکر علی کا مکان کچھ بلندی پر تھا۔ اس کے نزدیک دونوں جانب دو گھر تھے۔ ایک کا رخ مخالف سمت میں تھا اور دوسرا زیادہ بلندی پر دس گز دور تھا۔

میں نے اپنا ریوالور غالب کو دے دیا۔ اس کا نشانہ ہم سب سے اچھا تھا "جب تک اس کی تینوں گولیاں کام نہ آجائیں دوسرا ریوالور استعمال نہیں کرنا ہے" میں نے کہا۔ دوسرا ریوالور رابعہ کے پاس تھا۔ اس نے سرہلا کے ان ہدایات پر عمل کرنے کا اقرار کیا۔ مشین گن کو لاش کے نیچے سے کھینچ کر نکالنے کے بعد میں نے اسی کے کپڑوں سے صاف کیا تا۔ اس پر خون ہو تو میرے ہاتھوں پر داغ نہ آئے۔ اس کے ساتھ اضافی راؤنڈ بھی تھے۔ پھر ہم باہر نکلتے ہی مکان کے دونوں طرف سے چکر لگاتے ہوئے پیچھے جمع ہوئے۔ رابعہ میرے ساتھ الٹے ہاتھ کی طرف سے گئی تھی۔ غالب اور نازو سیدھے ہاتھ کا جائزہ لے کر آئے تھے۔

"ادھر کوئی نہیں" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "اب یہ کام ہمیں آج ہی رات ختم کرنا ہوگا۔ شاکر علی زندہ رہتا تو کل کرتے۔"

"اسے کس نے مار دیا؟ پورے خاندان کے ساتھ؟" غالب نے بڑے افسوس سے کہا۔

"یہ کارروائی اس بدمعاش کی بھی ہوسکتی ہے جس کو سب کے سامنے ذلت اٹھانا پڑی تھی" میں نے کہا "وہ شاکر کا دشمن ہوگیا تھا۔"

غالب نے کہا "مگر وہ بیوی بچوں سے انتقام نہ لیتا اپنی ذلت کا۔"

میں نے کہا "ہاں۔ اتنے حملہ آوروں کی موجودگی سے بھی ثابت یہی ہوتا ہے کہ شاکر علی کے دشمن شاید دوسرے ہیں۔ جو درحقیقت ہمارے دشمن ہیں۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ شاکر علی کے گھر میں ہماری موجودگی کا راز فاش ہوچکا ہے" غالب بولا۔

"ہاں۔ بستی میں یہ خبر تو اس وقت ہی پھیل گئی ہوگی جب ہم نے شاکر علی کو بچانے کی نیکی کی تھی۔ یہ نیکی اسے بھی مہنگی پڑی۔ میرا خیال یہ ہے کہ قاتل شاکر سے ہمارے بارے میں معلوم کرنے آئے تھے۔ یہ کہ ہم کون تھے اور اب کہاں گئے۔ شاکر کے جھوٹ نے انہیں مطمئن نہیں کیا ہوگا چنانچہ انہوں نے اس کے سارے خاندان کو مار ڈالا۔"

"ایک گھر بنانے کی خواہش پوری ہونے کا وقت آیا تو زندگی کی مہلت پوری ہوگئی۔ خوش نصیبی اس کے نصیب میں نہ تھی۔"

"کوئی کسی کی تقدیر بدل بھی نہیں سکتا" میں نے کہا "یہ لوگ اب ہماری واپسی کا انتظار کررہے تھے اور درحقیقت موت کا انتظار کررہے تھے۔"

"سکندر! کیا اس سے کچھ اور ثابت نہیں ہوتا؟" رابعہ نے کہا۔

"کیا؟" میں نے کہا۔

"یہی کہ شاکر علی نے انہیں سب بتادیا... اپنی جان بچانے کے لئے مگر جان پھر بھی نہ بچاسکا" رابعہ نے کہا "وہ اسے قتل کرنے کا تہیہ کرکے آئے تھے۔ اسے وہ آج قتل نہ کرتے تو کل کیا کرتے جب وہ سب کو پہچان جاتا۔"

غالب نے کچھ دیر سوچ کے کہا "وکیل صاحب کی بات دل کو لگتی ہے۔"

رابعہ نے کہا "شاکر علی سے یہ معلوم ہونے کے بعد کہ ہم آج ہی رات واپس آئیں گے' وہ یہاں گھات میں بیٹھ گئے۔ ... ورنہ وہ چلے جاتے۔"

رابعہ کی دلیل سے اب میں بھی قائل ہونے لگا تھا "یہ اچھا ہوا کہ ہم نے شاکر علی کے سامنے کسی کا نام نہیں لیا تھا۔ نہ لمبوترہ کا اور نہ دادا اور رائنڈ کمپنی کے کسی فرد کا۔ ہم نے تو اپنے نام بھی نہیں بتائے تھے۔ پھر اس نے کیا بتایا ہوگا؟"

"یہی کہ ... ہم اپنے دشمنوں سے نمٹنے کے لئے آئے تھے مگر دشمن کون ہے اور دشمنی کا سبب کیا ہے؟ یہ سب ہم نے نہیں بتایا تھا۔ انہوں نے سمجھا ہوگا کہ شاکر جھوٹ بول کے ہمیں بچانا چاہتا ہے چنانچہ اسے مارنے کے بعد وہ انتظار کرتے رہے" غالب نے کہا۔

"جس نے انہیں بھیجا تھا' وہ بھی تو انتظار کررہا ہوگا کہ میرے سورما واپس آکے دشمن کے خاتمے کی خوش خبری دیں"

"ہاں۔ لیکن وہ صبح تک انتظار کرے گا۔"

"وہ کون؟ بالک رام لھوترہ؟" میں نے سوچ کے کہا۔

غالب نے اقرار میں سرہلایا "میرے ذہن میں بھی اسی کا نام آتا ہے۔"

"لھوترہ شش وپنج میں ہوگا کہ یہ کون دشمن آگئے ہیں" میں نے کہا "اس کے تو سب ہی دشمن ہیں۔ جو اسے جانتے ہیں اور اس کے ہاتھوں زک اٹھاچکے ہیں۔"

"میں اس نئے شکاری سے ملنے کے لئے بے چین ہوں" غالب بولا "یہ کسی بھی طرح دلاور اور ترویدی سے کم نظر نہیں آتا۔"

"دلاور اپنے سے کم تر آدمی کا انتخاب نہیں کرتا۔ اس کی ایک مثال ترویدی ہے" میں نے کہا "یہ اس کے کاروبار کی نوعیت کا تقاضا ہے کہ جس سے وہ معاملہ کرے وہ اس کا ہم پلہ ہو۔"

آہستہ آہستہ باتیں کرتے ہوئے اب ہم اس پُل کی جانب جارہے تھے جو پرانی اور نئی آبادی کو ملاتا تھا۔ ہماری پوری کوشش تھی کہ ہماری نقل وحرکت پوشیدہ رہے چنانچہ ہم سب تاریکی میں گردوپیش پر نظر رکھنے کی پوری کوشش کررہے تھے اور خود بھی چھوٹی سی نیم پختہ سڑک کو چھوڑ کر کچے راستے پر چل رہے تھے جہاں ہمیں جھاڑیوں اور درختوں کے علاوہ اس علاقے میں ہر طرف پھیلی ہوئی چھوٹی بڑی چٹانوں کا تحفظ حاصل تھا۔ ابھی تک پُل کی جانب سے صرف ایک چوکیدار آیا تھا جس نے اپنی آمد کی اطلاع پہلے ہی دے دی تھی۔ ...اس کی لاٹھی کی ٹھک ٹھک کی آواز پل پر سنائی دی تھی تو ہم سب ٹھٹک کر رک گئے تھے اور اس وقت تک ساکت وصامت کھڑے رہے تھے جب تک کہ چوکیدار گزر کے پرانی بستی میں غائب نہیں ہوگیا تھا۔

اب پل ہمارے سامنے تھا۔ اسے عبور کرتے ہی لھوترہ کا قلعہ نما گھر تھا۔ اس پر حملہ کرنے سے پہلے میں نے ایک بار پھر اپنے منصوبے کی تفصیلات پر سب کی رائے لی۔ طے یہ پایا کہ میں رابعہ کے ساتھ بجلی کی سپلائی منقطع کرنے کے لئے جاؤں گا۔ اندھیرا ہوتے ہی غالب اور نازو دیوار پر چڑھ کے تاروں کی باڑھ پھلانگ جائیں گے اور اوپر چڑھ کے اندر جانے کا راستہ تلاش کریں گے۔ اتنی دیر میں ہم سامنے گیٹ کی جانب سے اپنا راستہ بنائیں گے اور جب ہم بھی اندر پہنچ جائیں گے تو پھر ایک ایک کرکے سارے محافظوں کو ختم کرتے ہوئے لھوترہ کو یرغمال بنانے کی کوشش کی جائے گی۔

غالب نے کہا "پلان میں ویسے تو کوئی خامی نہیں لیکن غیر متوقع کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ مثلاً یہ کہ لائٹ جاتے ہی جنریٹر خود چل پڑے یا الارم شور مچادے۔"

"اس کے علاوہ کُتے ..." نازو نے کہا۔

"یہ رسک تو لینے ہی ہوں گے۔ تاہم زیادہ امید یہ ہے کہ چند منٹ کا بریک ڈاؤن تمہیں اندر پہنچنے کے لئے کافی ہونا چاہئے۔ چند منٹ انہیں جنریٹر چلانے میں بھی لگ جائیں گے۔ عام طور پر جنریٹر خود کار نہیں ہوتے۔ انہیں اسٹارٹ کرنا پڑتا ہے۔"

نازو نے پھر کہا "کُتے تو خود ہی اسٹارٹ ہوجاتے ہیں۔"

میں نے کہا "یہاں درجن بھر کُتے تو ہو نہیں سکتے۔ دو تین۔ یا زیادہ سے زیادہ چار کُتے ہوں گے۔ وہ سب پیچھے کی طرف نہیں ہوں گے۔ چار میں سے دو سامنے والے حصے کی حفاظت کرتے ہوں گے۔"

"دو کُتے بھی کم تو نہیں ہوتے" غالب نے سر کھجایا۔

میں نے کہا "انہیں شوٹ کردینا۔ اور کوئی طریقہ نہیں۔ تمہارے پاس سائیلنسر والا ریوالور ہے۔"

"لیکن کتوں کے گلوں میں سائیلنسر نہیں ہوگا۔ وہ شور مچائیں گے تو سب کو متوجہ کرلیں گے۔ اور گولی لگنے کے بعد بھی خاموشی سے فوت نہیں ہوں گے۔"

میں نے کہا "ایک صورت اور ہے۔ تم ادھر نہیں جانا چاہتے تو رابعہ کے ساتھ چلے جاؤ۔ پانچ منٹ کے لئے بجلی بند رکھنا مشکل کام نہیں ہے۔"

رابعہ نے کہا "یہ ٹھیک ہے۔ میرے لئے اور غالب کے لئے آسان کام ہی بہتر ہے۔ ہم ریوالور تو چلا سکتے ہیں۔ ہاتھ نہیں چلا سکتے۔"

میں نے نازو کی طرف دیکھا "تم میں اتنی ہمت ہے؟"

نازو نے کہا "میں تو غالب جیسے شخص کے ساتھ بھی جا رہی تھی۔"

غالب نے سخت برا منایا "اس بیان میں خاصا توہین آمیز مواد ہے۔ میرے جیسے شخص سے آخر کیا مراد ہے تمہاری؟"

"یار! یہ کون سا موقع ہے لڑنے کا" میں نے ان کی جنگ چھڑنے سے پہلے روک دی "میں نازو سے یہ پوچھ رہا تھا کہ مردوں کو چت کردیتی ہو ہاتھ مار کے۔ اگر مقابلے پر کتا ہو' خونخوار قسم کا۔ تو ایک ہاتھ سے اسے بھی مار سکو گی؟"

"پتا نہیں" نازو نے کہا "کہ وقت آنے پر میں کیا کرسکوں گی۔ ایسا موقع پہلے کبھی نہیں آیا۔"

میں نے کہا "بس اپنے حواس پر قابو رکھنا۔ کُتا آدمی کے برابر چالاک ہوتا ہے نہ اپنا دفاع کرسکتا ہے اور نہ جوڈو کراٹے کے داؤ جانتا ہے۔ اس کی گردن آدمی کی گردن سے کمزور ہوتی ہے۔"

نازو نے کہا "یہ تربیتی لیکچر میرے کام نہیں آئے گا۔ شاید مجھے یاد بھی نہیں رہے گا۔ اپنے آپ کو بچانے کے لئے جو بھی مجھے کرنا پڑا وہ خود ہی ہوجائے گا۔ جان پر بن جائے تو بلی بھی شیر ہوجاتی ہے۔"

میں نے کہا "رابعہ! یہ ریوالور مجھے دے دو۔"

"تم یہ ریوالور بھی رکھو گے" رابعہ نے کہا "اور مشین گن بھی۔"

میں نے کہا "اندر پہنچ جانے کے بعد ریوالور نازو کو مل جائے گا۔ یعنی پہلے مرحلے سے گزرنے کے بعد۔ اگر کُتوں سے مقابلہ کرنا پڑا تو نازو بھی خالی ہاتھوں سے کرے گی۔ ہم دونوں گولی نہیں چلائیں گے۔"

"جب ریوالور ہی نہیں ہوگا میرے پاس تو مجھے گولی چلانے کا خیال بھی نہیں آئے گا۔" نازو نے کہا۔

"تمہیں ڈر نہیں لگ رہا ہے نازو؟ تم واقعی بہادر ہو" رابعہ نے کہا۔

"ڈر تو بہت لگ رہا ہے۔ مگر کیا ہوگا ڈرنے سے؟" نازو نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی "آخر تمہاری صورت کیوں اتر گئی ہے۔ ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟"

غالب خفت سے چونک کر مسکرایا "سوچ رہا ہوں کہیں یہ آخری ملاقات نہ ہو تم سے۔"

"کیوں؟ کُتے کھا جائیں گے مجھے کیا؟"

"نہیں۔ تمہیں ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ خطرہ تو میرے لئے ہے۔ چار سو چالیس وولٹ کی بجلی سے مقابلہ ہے ...ایک جھٹکے میں اچھے خاصے آدمی کا [illegible]۔"

میں نے کہا "بجلی گھر دیکھا ہے؟"

غالب نے کہا "بجلی گھر تو نہیں' ایک سب اسٹیشن دیکھا تھا۔ یہاں آتے ہوئے۔"

میں نے کہا "بس تو پھر جاؤ۔"

رابعہ نے کہا "وہ.... گل اور محسن نہیں پہنچے ابھی تک۔"

غالب نے کہا "ہم ان کا انتظار تو نہیں کرسکتے ایک مفروضے کی بنیاد پر۔ انہوں نے نہیں کہا تھا کہ وہ یہاں ملیں گے۔ یہ ہمارا خیال تھا۔"

"اور خیال غلط بھی ثابت ہوجاتا ہے" میں نے کہا "وہ کہاں جائیں گے۔ زندگی رہی تو پھر مل جائیں گے۔"

میری بات لبوں پر ہی تھی کہ کسی نے بھاری' بوجھل آواز میں کہا "........ ہاتھ اوپر اٹھائے بغیر یہ مشین گن نیچے رکھ دو۔ اپنے قدموں میں اور پھر چار قدم آگے جا کے ہاتھ اٹھالو۔ پیچھے مڑکے مت دیکھنا۔"

ریوالور کی نال میری ریڑھ کی ہڈی سے لگی ہوئی تھی۔ میں پیچھے مڑ کے کیسے دیکھتا۔ میں نے تو سر اٹھاکے نازو کی طرف دیکھنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ میری طرح اسے بھی بے بس کردیا گیا ہے۔ وہ کم سے کم دو افراد تھے جو میرے اور نازو کے پیچھے تاریک سائے کی طرح موجود تھے۔ اگر ان کے ساتھی اور بھی تھے تو کہیں چھپے ہوئے تھے۔

میں نے نازو سے کہا "مقابلہ مت کرنا۔"

"ہتھیار ڈال دو لڑکی" کسی عورت نے لہجے کو خوفناک بنا کے کہا۔

"تمہاری تو ایسی کی تیسی" نازو نے ایک دم کہا "بدمعاش!"

شک مجھے بھی ہوا تھا مگر مجھ سے پہلے نازو پلٹ چکی تھی۔ اس نے گل کو ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور تھوڑا سا اوپر اٹھایا ہی تھا کہ گل چلانے لگی۔

"ارے نازو' یہ میں ہوں گل..." اس نے چہرے پر سے کالی چادر ہٹانے کی کوشش کی۔ نازو نے اسے چھوڑ دیا۔

میں نے محسن کی طرف دیکھا جو ایسی ہی کالی چادر سر سے ہٹا رہا تھا۔

"اُلو کے پٹھے" میں نے کہا "تو نے کیا سمجھا تھا' ہم ڈر گئے؟ ابھی شہید ہوجاتا میرے ہاتھوں' بچ گیا بال بال۔"

محسن پیچھے ہٹ گیا اور ہنسنے لگا "تو بچ گیا بال بال۔ گل کی بے وقوفی کے باعث۔"

"ورنہ کیا کرتا تو؟" میں نے خفت مٹانے کی کوشش کی۔

"میں تجھے مرغا بناتا اور کہتا انڈا دو۔ اتنی فرمانبرداری دکھائی تو نے کہ میرے حکم پر تو اذان بھی دیتا اور انڈا بھی۔"

"اور میں پلٹ کے ہاتھ مار دیتا یا گولی مار دیتا؟"

محسن کی ہنسی مجھے مزید شرمندہ کررہی تھی "اتنی شرافت سے ہتھیار ڈال دیئے کہ شرم آرہی ہے گل کو بھی..."

"میری ہڈیاں ٹوٹ جاتیں ابھی" گل نے بگڑ کے کہا "میں نے منع کیا تھا کہ ایسا مذاق مت کرو۔"

"تم لوگ کیا نالے میں چھپے ہوئے تھے؟" میں نے بہتر سمجھا کہ موضوع بدل دیا جائے "کب سے بیٹھے ہوئے تھے؟ چلو آگے چلتے ہیں۔"

"ہم شام کو یہاں پہنچے تھے" محسن بولا اور میرے ساتھ چلنے لگا۔

"اور ہم نہ آتے تو کیا کرتے؟" میں نے کہا۔

"آج نہ آتے تو کل آتے" محسن بولا "ہمیں اتنا تو معلوم ہوگیا تھا۔"

"کیسے معلوم ہوگیا تھا؟ تم شاکر علی سے ملے تھے؟"

"ہم نے تو یہاں پہنچ کے بی آر لمھوترہ کو پوچھا تھا۔ ایک بوڑھے نے بتادیا کہ وہ ہے اس شیطان کا گھر" محسن بولا "جب ہم نے گھر دیکھا تو اس پر سنہرا باز نظر آگیا۔ بڈھے کی رائے سے اندازہ تو ہوگیا تھا کہ لمھوترہ کو خلقِ خدا کیا کہتی ہے۔ بستی میں ایک مسجد بھی ہے۔ ہم اذان کی آواز سن کے ادھر چلے گئے۔ نماز کے بعد وہاں سے چھ سات بوڑھے نکلے۔ اس سے یہ اندازہ ہوا کہ مسلمان یہاں بہت کم ہیں۔ جو شخص آخر میں نکلا وہ مسجد کا پیش امام تھا۔ میں نے السلام علیکم کہہ کے اس سے مصافحہ کیا تو وہ بہت خوش ہوا۔ ہم نے کہا کہ یہاں ایک دوست سے ملنے آئے تھے مگر پتا چلا کہ وہ بمبئی گئے ہوئے ہیں اور کل آئیں گے۔ کوئی ایسی جگہ بتایئے جہاں ایک رات قیام کیا جاسکے۔ ظاہر ہے ہوٹل یہاں کہاں۔ اس شریف آدمی نے اپنے گھر مدعو کیا۔ وہاں کھانا بھی کھایا۔ باتوں باتوں میں لمھوترہ کے متعلق پوچھا تو حیرت انگیز انکشافات ہوئے۔ پھر تمہارا ذکر آگیا۔"

"پیش امام ہمیں جانتا تھا؟"

"نہیں۔ اس نے لوگوں سے سنا تھا کہ آج دو ایسے فرشتہ سیرت نوجوان آئے تھے جنہوں نے بازار میں ایک ہندو کے ہاتھوں ایک مسلمان کو ذلیل ہونے سے بچایا اور اس علاقے کے سب سے بڑے بدمعاش کو سب کے سامنے ایسی پٹخنی دی کہ وہ پھر اٹھ نہ سکا۔ ہم نے کریدا تو اس نے بتایا کہ وہ کون تھا جس کی تم نے اور غالب نے مدد کی تھی۔ اس نے شاکر علی کا نام لیا۔ میں تھوڑی دیر بعد گل کو وہیں چھوڑ کے نکلا اور شاکر علی کا پتا پوچھتا ہوا اس کے گھر جا پہنچا۔"

"یہ کتنے بجے کی بات ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ... رات تین بجے کی۔"

"اس وقت وہ زندہ تھا؟"

"کیا مطلب؟" محسن چونکا "اب زندہ نہیں ہے؟"

میں نے نفی میں سرہلایا "اس کے خاندان کے ایک ایک فرد کو ماردیا۔"

"کس نے؟" محسن سکتے کی کیفیت میں بیٹھا رہا۔

"غالباً لمھوترہ کے غنڈوں نے۔"

"اس وقت وہ زندہ تھا۔ اس نے پہلے انکار کیا مگر صاف نظر آتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ خیر میں اسے یقین دلانے میں کامیاب ہوگیا کہ میں تمہارا دوست ہوں، دشمن نہیں۔ پھر اس نے سب بتادیا۔"

"یہ بتایا تھا اس نے کہ ہم لمھوترہ کے دشمن ہیں؟"

محسن نے کہا "نہیں۔ نام کسی کا نہیں لیا تھا اس نے۔ صرف یہ کہا تھا کہ ان کے کچھ دشمن ہیں یہاں۔ وہ انہیں ٹھکانے لگانے کے لئے آج ہی رات آئیں گے۔ یا کل۔"

میں نے افسوس سے سرہلایا "اس کا مطلب یہ ہے دوست کہ مولوی شاکر علی بے وقوف آدمی تھا۔ ہم نے رازداری کی اہمیت پر بہت زور دیا تھا مگر اس نے تمہیں ساری بات بتادی۔ لمھوترہ کے غنڈوں کے خلاف خاک مزاحمت کی ہوگی اس نے۔ خود اپنے پاؤں پر تو کلہاڑی ماری تھی۔ بیوی بچوں کو بھی مروایا۔"

"میں سمجھ گیا تھا کہ تم لمھوترہ سے نمٹنے کے لئے آؤ گے چنانچہ میں واپس گیا اور ساری بات گل کو بتادی۔ ہم مولوی صاحب کے سونے کا انتظار کرتے رہے۔ بارہ بجے کے قریب ہم کنڈی کھول کے نکل آئے۔ یہ دونوں کالی چادریں بھی انہی کی ہیں۔"

"میزبان کے گھر میں چوری کی، مہمان بن کے۔"

"کیا کرتے۔ خود کو چھپانے کے لئے یہ گناہ بھی کیا۔ مگر ہم سو روپے چھوڑ آئے تھے" محسن بولا۔

"اس شریف آدمی کو مزید شرمندہ کرنے کے لئے۔ خیر یہ بتاؤ کہ تم وہاں گئے تھے۔"

محسن سمجھ گیا کہ میں کہاں کی بات کررہا ہوں "ہاں۔ مگر وہاں تو میدان ہی صاف تھا۔ جو لوگوں سے معلوم ہوا وہ ناقابلِ یقین تھا....."

"وہ خبیث ڈھائی تین لاکھ لے گیا اور بڑی ہوشیاری سے نکل گیا" میں نے کہا۔

"اس کے لئے یہ اتنی بڑی رقم تھی۔ کہ میں سمجھتا ہوں ٹھیک ہی کیا اس نے۔ وہ تھوڑا تھوڑا کرکے جمع کررہا تھا۔ قسمت نے اسے ایک موقع دیا اور اس نے فائدہ اٹھالیا۔ میں اس لئے نہیں کہتا اسے کہ جب تک اس نے ہمارا ساتھ دیا نیک نیتی سے دیا۔ کوئی نقصان نہیں ہوا ہمیں بلکہ اس کی مدد سے ہم بچ گئے کئی بار۔ بعد میں شیطان نے بہکادیا تو گناہ اس کے سر۔ ہمارا کیا لے گیا وہ؟ مالِ حرام تھا۔"

میں نے محسن کے نقطۂ نظر سے اختلاف نہیں کیا "خان بھی تو ایک آدمی تھا۔ کتنا مختلف..."

"خان کا اس کارٹون سے کیا مقابلہ۔ خان تو ہم پر اپنی جان کا قرض چھوڑ گیا" محسن افسردہ لہجے میں بولا "بہت تھوڑے دن ساتھ رہا لیکن ہمارے لئے بہت کچھ کرگیا۔ افسوس یہ ہے کہ اپنے لئے کچھ نہ کرسکا۔ جو وہ کرنا چاہتا تھا۔"

"خیر اب تم تازہ صورت حال کو سمجھ لو" پھر میں نے ان کو اپنے نئے پروگرام کی تفصیل سمجھاتے ہوئے کہا "پروگرام کے مطابق رابعہ کے ہمراہ غالب کو روانہ ہونا تھا مگر اب تم آگئے ہو تو لائن بند کرنے کی ذمے داری تمہاری۔ تم فوراً روانہ ہوجاؤ۔"

محسن یا دیگر افراد میں سے کسی نے بھی میری رائے سے اس وقت اختلاف نہیں کیا۔

جب رابعہ اور محسن روانہ ہوگئے تو ہم نے ایک ساتھ پیش قدمی کی جانب بڑھنا شروع کیا۔ میرا اندازہ تھا کہ انہیں بجلی کے سب اسٹیشن تک پہنچنے میں کم سے کم تیس منٹ ضرور لگیں گے۔ سب اسٹیشن میں نے بھی دیکھا تھا۔ یہ ایک کمرے پر مشتمل عمارت تھی جس کے چاروں طرف خاردار تار لگا دیئے گئے تھے۔ یہ انسانوں سے زیادہ مویشیوں کو روکنے کے لئے تھے جو عموماً آس پاس کے علاقے میں چرتے پھرتے تھے۔ سب اسٹیشن کو میں نے اندر سے نہیں دیکھا تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ ایسے سب اسٹیشن پر عموماً ایک چوکیدار اور ایک الیکٹریشن کے سوا کوئی نہیں ہوتا۔ عموماً انہیں قریب ہی کوارٹر فراہم کردیا جاتا ہے اور ان کی کوئی خاص ذمے داری نہیں ہوتی۔ معمولی خرابی تو الیکٹریشن دور کر دیتا ہے لیکن سب اسٹیشن کا ٹرانسفارمر ہی اڑ جائے تو پھر انجینئر شہر سے ہی آتے ہیں۔ اندر پاور سوئچ بورڈ اور سرکٹ بریکر الگ ہوتے ہیں۔ جن سے ضرورت پڑنے پر سپلائی روکی جاسکتی ہے۔ محسن کا اصل کام چوکیدار یا الیکٹریشن کی دخل اندازی سے نمٹنے کا تھا۔

"اس سے آگے نہیں جانا چاہئے ہمیں" میں نے کہا۔ ہم اب لمھوترہ کے گھر سے چند گز کے فاصلے پر تھے اور وہ فصیل ہمارے سامنے تھی جس پر لائٹس روشن تھیں۔ ان لائٹس کے آف ہوتے ہی ہمیں عمل کے لئے مستعد ہونا تھا۔ چھپنے کے لئے ہمیں ایک گڑھا سا نظر آگیا۔ شاید یہاں سے لوگ مٹی کھود کر لے جاتے رہے تھے۔ ریت، کنکر اور پتھریلی چٹانوں کے اس علاقے میں چکنی مٹی بہت کم تھی۔ رابعہ اور محسن کو گئے ہوئے آدھا گھنٹا ہوگیا تھا۔ لائٹس اب کسی وقت بھی بجھ سکتی تھیں۔

نازو نے کہا "بہت دیر ہوگئی انہیں گئے ہوئے۔"

میں نے گھڑی دیکھی "ہاں۔ چالیس منٹ ہونے والے ہیں۔"

اسی وقت ایک دم اندھیرا پھیل گیا۔ بستی کی ہر لائٹ بجھ گئی۔ ہمارے سامنے فصیل کی ہر روشنی گل ہوگئی اور اندر بھی تاریکی پھیل گئی۔ میں اور غالب، ایک جست لگا کے باہر نکلے۔ میں نے گل کا ہاتھ پکڑ کے اوپر کھینچا اور غالب نے نازو کو۔ میں نے دیوار کی طرف دوڑتے ہوئے کہا "لائٹس آن نہیں ہوئیں۔ جنریٹر آٹومیٹک نہیں ہیں۔"

گل نے کہا "بھائی سکندر، آہستہ۔"

لیکن میں نے رفتار میں کمی نہ آنے دی "تیز دوڑو۔ تین منٹ پورے ہونے سے پہلے اندر اترنا ہے ہمیں۔"

غالب نے کہا "پہلے ہم اوپر چڑھ جاتے ہیں۔ پھر انہیں بھی کھینچ لیں گے۔"

میں نے کہا "انہیں تاروں کے اوپر سے پھینک دینا۔ دوسری طرف۔ ورنہ یہ تاروں پر سے گزرنے میں وقت ضائع کریں گی۔"

غالب نے کہا "تم ذرا ادھر جاؤ۔ مجھ سے دور رہو تاکہ کتے ایک وقت میں دو طرف جائیں۔"

دیوار کے پاس پہنچ کے میں نے ہاتھ دیوار پر جمائے اور اپنے جسم کے وزن کو اوپر کھینچا۔ فصیل کا یہ حصہ ایک فٹ چوڑا اور لمبا تھا اور اس کے ستون دس دس گز کے... فاصلے پر بنے ہوئے تھے۔ باقی دیوار کی موٹائی وہی چھ انچ تھی۔ ہر ستون پر ڈھائی تین فٹ اونچا اینگل آئرن نصب تھا جس نے تاروں کی باڑھ کو سنبھال رکھا تھا۔ اس ستون پر میرے قدم جما کے کھڑے ہونے کے لئے کافی جگہ تھی۔ میں نے جھک کر اپنا سیدھا ہاتھ نیچے بڑھایا اور الٹے ہاتھ سے سہارے کے لئے اینگل، آئرن کو پکڑلیا۔ گل نے ایک ہاتھ اوپر اٹھایا اور میں نے اسے کہا کہ جب میں "ون ٹو تھری" کہوں تو وہ اوپر جمپ لگائے۔ ...تھری کے ساتھ ہی گل اوپر اٹھی اور میرے ہاتھ نے اسے سنبھال کے اپنے پاس کھینچ لیا۔

گل کے پاؤں ستون پر جم گئے تو میں نے کہا "اپنی یہ چادر مجھے دے دو اور دیکھ لو ادھر چھلانگ لگانی ہے تم کو۔"

"اتنی بلندی سے!"

میں نے اسے اٹھایا اور تاروں کے اوپر سے گزار کے ستون کے دوسری طرف اتار دیا۔ وہ لڑکھڑائی اور پھر اندر کود گئی۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ میں نرم زمین پر اترا۔ یہ پھولوں کی کیاری تھی۔ نرم مٹی میں کودنے سے گل کو خراش تک نہیں آئی تھی۔ دوسرے ستون کے قریب میں نے نازو اور غالب کو ایسے اترتے دیکھا جیسے وہ پیراشوٹ کے بغیر جہاز سے کودے ہیں۔

ابھی تک کسی نے جنریٹر نہیں چلایا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق دو منٹ گزر گئے تھے۔ ابھی تک محافظ بھی نمودار نہیں ہوئے تھے۔ میں نے گل سے چادر لے کر اپنے الٹے ہاتھ پر انگلیوں سے کہنی تک لپیٹی اور سیدھے ہاتھ میں مشین گن اٹھا کے آگے دوڑا۔ اب ہمارے سامنے سبز گھاس کا ایک میدان تھا جو تقریباً پینتالیس درجے کے زاویے پر بلند ہو کے کوٹھی کے برآمدے تک پہنچتا تھا۔ ہمیں اس بلندی کو ایک منٹ میں سر کرنا تھا۔

اندر سے لوگوں کے شور مچانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ پھر اچانک کتوں کا ایک غول نمودار ہوا۔ وہ اپنی مکروہ آواز میں بھونکتے ہوئے اوپر سے نیچے کی طرف دوڑتے آرہے تھے۔ ایک کتا آگے تھا۔ میں نے مشین گن گل کی طرف پھینکی۔ اسی وقت کتے نے مجھ پر جست لگائی۔ وہ پانچ چھ گز دور سے اڑتا ہوا آیا۔ اس کے خون آشام جبڑوں میں سے بھیانک غراہٹ نکل رہی تھی اور وہ مداخلت بے جا کے مرتکب ہونے والوں کو ادھیڑ دینا چاہتا تھا۔

میں نے وہ ہاتھ ڈھال بنا کے آگے رکھا جس پر چادر لپٹی ہوئی تھی۔ کتے نے میرے ہاتھ کو دبوچ لیا اور اس میں اپنے دانت ایسے گاڑ دیئے کہ جب میں نے ہاتھ پیچھے کیا تو وہ بھی اس کے ساتھ لٹک گیا۔ اب میں نے اس کی گردن پر کھڑی ہتھیلی کا بھرپور وار کیا جو بالکل صحیح لگا۔ گردن کی ہڈی ٹوٹتے ہی اس کی آواز بند ہو گئی اور میرے بازو پر اس کے دانتوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

میں نے اسے جھٹکا اور ایک دم گل کو کھینچ لیا ورنہ دوسرا کتا اس پر جست لگا چکا تھا اور وہ خوف سے مفلوج ہو جانے کے بعد اس قابل بھی نہ رہی تھی کہ حرکت کر سکے یا خود کو بچانے کے لئے مشین گن کا دستہ ہی کتے کے سر پر مار سکے۔

دوسرا کتا بلا کا پھرتیلا تھا۔ اس نے ایک دم پلٹ کے مجھ پر حملہ کیا اور میں نے پھر وہی ٹیکنک استعمال کی۔ میں نے اسے اپنا کپڑے میں لپٹا ہوا بازو پیش کیا۔ اس نے کپڑے میں دانت گاڑے اور اسے اُدھیڑ کر رکھ دینے کے لئے زور لگایا۔ ایک لمحے کے لئے اس کی وحشیانہ قوت کے سامنے میرے قدم بھی اکھڑ گئے۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ میرے قدموں کے نیچے ہموار زمین نہیں تھی تاہم گرنے سے پہلے میں نے تول کے ہاتھ مارا اور دوسرے کتے کی آواز بھی خاموش ہو گئی۔ جب میں گرا تو پھڑکتا، دم توڑتا کتا میرے اوپر گرا۔ میں نے اسے ایک طرف پھینکا اور اٹھ کے اوپر کی طرف لپکا۔

گل نے میرا ساتھ دیا اور ہم نے بلندی کی طرف مائل باقی راستے کو طے کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ اوپر پہنچ کے میں نے دیکھا کہ نازو اور غالب مجھ سے پہلے اوپر موجود ہیں۔ ابھی تک لائٹس روشن نہیں ہوئی تھیں مگر اندر سے مختلف آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

"آخر یہ کیا ہو رہا ہے؟" کسی نے گرج کے کہا۔

"کتے کیوں بھونک رہے ہیں؟ کون گھسا ہے اندر؟"

"جا کے دیکھو، سُور کے بچے..."

"جنریٹر کیوں نہیں چلایا ابھی تک؟" پہلے شخص نے کہا۔

معلوم نہیں کس نے بڑی فرمانبرداری سے کہا "چلا رہے ہیں جی۔"

ایک سیکنڈ کے لئے لائٹس جل کے بجھ گئیں۔ اندر کسی نے جنریٹر کی ڈوری کھینچی تھی۔ میں نے غالب کو ہاتھ سے اشارہ کیا جس کا مقصد تھا کہ وہ دوسری طرف سے آئے۔ اس نے میری بات سمجھ لی۔ وہ اور نازو طویل برآمدے میں مغرب کی طرف چلے گئے۔ اسی وقت میں نے پہلا فائر سنا جو غالب کے سائیلنسر والے پستول سے کیا گیا تھا۔ کوئی شخص بری طرح چلایا۔ جنریٹر پھٹ پھٹ کر کے چلا اور بند ہو گیا۔

میں نے مشین گن گل سے لینے کا ارادہ کیا اور بدل دیا۔

"تیار رہنا" میں نے کہا "جو سامنے آئے اسے بھون...

گل نے سرہلایا اور ہم برآمدے کے مشرقی حصے کی... لپکے۔ اس برآمدے میں کھلنے والی سب کھڑکیاں اور در... بند تھے۔ آخری دروازے سے کوئی ایک دم میری را... حائل ہوا۔ میں نے اس کا ہاتھ اٹھتے دیکھا اور اسے... ساتھ دے مارا۔ اس نے فائر کیا مگر گولی نہ جانے کدھر... گل نے مشین گن کا لوہے کا دستہ مار کے اس کا سر... اب فائر دوسری طرف سے بھی ہو رہے تھے۔

"شاباش" میں نے کہا "بس میرے سر کا خیال..."

گل نے کہا "تم خود بھی اپنا سر بیچ میں مت لانا..."

میں اور گل کھلے دروازے سے اندر داخل ہوئے... کہ لائٹ آ گئی۔ جنریٹر ابھی تک اسٹارٹ نہیں ہوا... جانے کون جنریٹر چلانے والے کو ماں بہن کی گالیاں دے...

...اچانک میں نے خود کو ایک ہال میں پایا۔ گل کی گ... نے گولیاں اگلیں۔ ایک ساتھ تین آدمی اپنا پیٹ... چلاتے ہوئے زمین پر لوٹنے لگے۔ میں اور گل دوڑ... ہال سے گزرے تو سامنے ایک زینہ آ گیا۔ اوپر سے دو... دھم کرتے آ رہے تھے۔ ایک آخری زینے پر تھا کہ... اسے دبوچا اور اس کا سر زینے کی ریلنگ کے آخری کنا... مارا۔ ریلنگ مضبوط شیشم کی لکڑی کے ستون پر ختم ہو... ....اس ستون پر لگتے ہی اس کا سر پھٹ گیا اور وہ میرے... میں لڑھک گیا۔

دوسرے شخص نے ریوالور نکال کے گولی چلائی... نشانہ لینے کی مہلت نہیں ملی...... دوسرا فائر کرتے... گل نے اسے چھلنی کر دیا۔ ہال میں مشین گن کی ز... بڑے بھیانک انداز میں گونجی۔ اب سامنے کوئی نہیں... نے ان دونوں کے ریوالور بھی اٹھا کے جیب میں ٹھو... ایک ریوالور میرے ہاتھ میں رہا۔

میرے ذہن میں عمارت کا کوئی نقشہ نہیں تھا اور... یہ معلوم تھا کہ اندر کتنے افراد ہیں۔ زینے کے نیچے رک... نے دوسری جانب سے نازو اور غالب کے نمودار ہونے... کیا۔ وقفے وقفے سے میں نے فائرنگ کی آوازیں سنی... تین بار کسی کے چلانے کی آواز بھی آئی تھی مگر اس... سے خاموشی تھی۔

گل کی نگاہیں بھی برآمدے کا جائزہ لے رہی...

"غالب کہاں رہ گیا؟"

میں نے کہا "انہیں آ جانا چاہیے۔ کیا خیال ہے... دیکھیں؟"

گل کا جواب ملنے سے پہلے اوپر کی منزل پر... دیگرے دو فائر ہوئے۔ کسی عورت نے ہسٹر...

شروع کیا۔ اس کے ساتھ ہی ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے انگریزی محاورے کے مطابق۔ چینی کے برتنوں کی دکان میں بیل گھس گیا ہو۔

"وہ لوگ اوپر ہیں" میں نے کہا۔

گل اوپر جانے لگی "پھر ہم یہاں کیوں کھڑے ہوئے ہیں؟"

میں نے اسے روک لیا "جس راستے سے وہ اوپر گئے ہیں۔ ہم بھی ادھر سے ہی جائیں گے۔"

اوپر جانے کے لئے دوسرا راستہ شمالی سمت میں تھا۔ وہاں دو آدمی مرے پڑے تھے اور ان میں سے ایک یقیناً نازو کی دست درازی کا شکار ہوا تھا۔ دوسرے کے سر میں گولی لگی تھی اور وہ زینے میں ایسے پڑا ہوا تھا کہ اس کی ٹانگیں زینے پر تھیں اور سر نیچے فرش پر۔ سر کے سوراخ سے تازہ، سرخ خون مغز کی سفیدی کے ساتھ مل کے بہہ رہا تھا۔

میں نے خون سے بچتے ہوئے اوپر تک کا آدھا فاصلہ ایک جست میں طے کیا اور زینے کے موڑ پر رک گیا۔ میں نے گل کو ہدایت کی تھی کہ وہ مجھے کوَر کرے اور جب تک میں اشارہ نہ کروں وہ اوپر نہ آئے۔ اس نے میری جگہ لی تو میں اوپر چلا گیا۔ نیچے اور اوپر کے نقشے میں کوئی فرق نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ اوپر کمروں کے گرد برآمدہ نہیں تھا۔ صرف اس حصے میں ایک کاریڈور جیسی بالکونی تھی جس میں زینہ کھلتا تھا۔

اوپر اب مکمل خاموشی تھی۔ دیوانہ وار چیخنے والی عورت بھی خاموش تھی۔ میں نے لات مار کے پہلے کمرے کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر وہ اندر سے بند تھا۔ دوسرے کمرے سے کوئی ایک دم باہر آ گیا۔ اس کے ریوالور کا رخ میری طرف تھا۔ غیر ارادی طور پر میں جھک گیا لیکن یہ غالب تھا۔ غالب نے مجھے پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔

"یہ کیا بے وقوفی کی حرکت ہے؟" میں نے کہا "ابھی میں فائر کر دیتا پھر؟"

"دیکھے بغیر؟" غالب بولا "میں نے تو دیکھ لیا تھا۔"

"پھر باہر آنے سے پہلے آواز کیوں نہیں دی؟" میں نے کہا "نازو کہاں ہے؟"

"خانہ تلاشی میں مصروف ہے۔" غالب نے کہا۔

گل نے کہا "یہ کون عورت چیخ رہی تھی؟"

غالب نے کہا "اندر جا کے دیکھ لو، ڈرو نہیں۔"

گل اندر چلی گئی تو میں نے کہا "اور کوئی نہیں بچا؟"

"ابھی اوپر والی منزل نہیں دیکھی لیکن میرا خیال ہے کہ محافظ تو سب مارے گئے۔ تین میرے ہاتھوں جہنم رسید ہوئے لیکن نازو کا اسکور زیادہ رہا۔ اس نے دو کتے بھی ہلاک کئے۔ یوں" غالب نے ہوا میں ہاتھ چلا کے واضح کیا۔ "دونوں اسی پر حملہ آور ہوئے تھے۔"

"پہلے ایک آیا تھا۔ نازو نے چادر سامنے پھیلا دی۔ جیسے بل فائٹر کرتے ہیں۔ بیل کے سامنے لال کپڑا لہراتے ہیں اور بیل حملہ کرتا ہے تو ہٹ جاتے ہیں۔ کتا کپڑے سے ٹکرا کے گرا تو نازو نے لات مار کے گردن توڑ دی۔ دوسرے نے نازو کو گرا دیا تھا مگر نازو نے پلٹ کے ہاتھ مارا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ بالکل ناقابلِ یقین منظر تھا وہ۔ میں تو گولی چلانے ہی والا تھا۔"

"تم لوگ کیا باتوں میں لگ گئے" نازو نے ایک کمرے سے سر نکال کے ہمیں ڈانٹا۔

میں اور غالب باری باری دوسرے کمروں میں گئے مگر سب کمرے فضول سامان سے بھرے پڑے تھے۔ اوپر کی منزل پر چار بیڈ روم تھے۔ ان میں سے ایک طہوترہ کا تھا۔ اس کے وسیع بیڈ پر ایک عورت بے لباس پڑی ہوئی تھی۔ غالب نے مجھے بتایا کہ چیخنے والی عورت یہی تھی۔

"خود طہوترہ کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

"انہی میں سے کوئی ہو گا جو مارے جا چکے ہیں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "اتنے ملازموں اور محافظوں کے ساتھ رہنے والا خود سامنے آ کے مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یا تو وہ بھاگ گیا یا کہیں چھپ گیا۔"

"ہم اسے پہچانتے بھی تو نہیں۔" غالب نے کہا "میں نے سنا تھا کہ وہ آج کل یہاں نہیں ہے۔"

"ہم کسی سے پوچھ لیتے تو اچھا تھا۔ مارنے سے پہلے۔"

غالب نے نفی میں سر ہلایا "اتنی مہلت کسی نے نہیں دی کہ ہم سوال جواب کر سکتے۔ جو بھی سامنے آیا اس نے فوراً ہمیں مارنے کی کوشش کی اور خود مارا گیا۔ کسی نے ہم سے بھی تو نہیں پوچھا کہ آخر ہم کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں۔"

"چور پکڑا جائے تو سوال جواب سے بچ کے بھاگنے کی کوشش کرتا ہے اور بھاگ نہ سکے تو مرتا ہے یا مار دیتا ہے" میں نے کہا "مجھے بھی کسی نے موقع نہیں دیا کہ میں اسے خبردار کرتا یا کہتا کہ ہتھیار ڈال دے۔"

"آخر یہ کون لوگ تھے؟"

"مجرم کے ساتھی۔ مجرم کے محافظ اور مجرم۔ یہ کوئی شریف اور بے گناہ لوگ ہوتے تو براہِ راست حملہ نہ کرتے... خیر، اب دیکھتے ہیں کوئی بچا ہے یا نہیں۔"

نازو نے اعلان کیا "یہاں کوئی کام کی چیز نہیں ہے۔"

میں نے ان سب چیزوں کو دیکھا جو نازو اور گل نے تلاشی لیتے ہوئے الماریوں میں سے اور درازوں میں سے نکال کے باہر پھینک دی تھیں۔ بیش قیمت زیورات، سامانِ آرائش، ملبوسات اور پرفیومز۔

"یہ سب چیزیں آپ ہی کے کام کی ہیں" غالب نے کہا۔

"سیاہ حسن کے لئے اسباب قتل و غارت گری۔"

میں نے کہا "جہادِ زندگانی میں یہ ہیں عورتوں کی شمشیریں۔"
نازو مسکرائی "شعر کی مٹی تو مت پلید کرو۔"

ایک الماری میں شراب کی درجنوں خوبصورت بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔ یہ سب غیر ملکی شراب تھی۔ گل نے کہا۔
"یہ تمہارے کام کی چیز تو نہیں ہے؟"

میں نے کہا "لاحول ولاقوۃ ہم سارے خانہ [illegible] پی چکے ہیں۔ یہ حرام شے تو بہت حقیر ہے اس نشے کے سامنے جس سے ہم سرشار ہیں۔"

"چل یار، اب اوپر بھی دیکھ آئیں۔ ویسے اوپر کچھ ہے نہیں۔ زینے پر تالا پڑا ہوا ہے" غالب بولا۔

اس کا کہنا صحیح تھا۔ ہم دروازے کا تالہ توڑ کے اوپر پہنچے تو خالی کمروں کے سوا ہمیں کچھ نہیں ملا۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ اضافی منزل مستقبل کی ضروریات یا محض عمارت کی وسعت اور شان و شوکت بڑھانے کے لئے تعمیر کی گئی تھی۔ ہم لوٹ کر درمیانی منزل پر پہنچے تو گل اور نازو باقی کمروں کو بھی کھنگال چکی تھیں۔ اچانک لائٹ آف ہوگئی۔

میں نے کہا "سچ مچ کا بریک ڈاؤن۔"
غالب نے کہا "بستی کی لائٹس تو جل رہی ہیں۔"

میں نے گل سے مشین گن لے کر اسے ریوالور دے دیا اور غالب کے ساتھ نیچے اتر گیا۔ شک کی گنجائش ہی نہ تھی۔ لائٹ کسی نے اندر سے بند کی تھی اور جس نے بھی یہ حرکت کی تھی وہ تاریکی سے فائدہ اٹھا کے فرار ہونا چاہتا تھا یا ہمارے خلاف کوئی غیر متوقع کارروائی کرنا چاہتا تھا۔ میں نے غالب اور نازو کو اس طرف جانے کے لئے کہا جدھر سے ہم داخل ہوئے تھے۔ گل کے ساتھ میں نے سامنے والے حصے پر نظر رکھی۔ میری نظر تاریکی میں دیکھنے کی عادی ہوگئی تھی۔ کوٹھی کے سامنے والے حصے میں دو ڈھائی سو مربع گز کا لان تھا اور فصیل کا باقی حصہ تھا۔ وسط میں سفید سیمنٹ یا سنگ مرمر کا ایک فوارہ خاموش کھڑا ہوا تھا اور فصیل کے ساتھ ساتھ لگے ہوئے درخت بھی ساکت تھے۔ آخری حصے میں گیٹ تھا جس کے دونوں فولادی پٹ اس وقت بند تھے۔ گیٹ لائٹس کے بند ہو جانے کے باوجود آٹھ دس فٹ چوڑا سیمنٹ کا بنا ہوا راستہ صاف دکھائی دیتا تھا جو برآمدے کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ میں اس راستے سے چار سیڑھیوں کی بلندی پر برآمدے کے ایک ستون کی اوٹ میں تھا اور ایسے ہی دوسرے ستون کے پیچھے گل کھڑی ہوئی تھی۔

اچانک دائیں جانب ایک کار کا انجن اسٹارٹ ہوا۔ انجن کی آواز بہت کم تھی۔ کسی نے پوری کوشش کی تھی کہ اس کو اسٹارٹ کرنے کے بعد ریس نہ دے اور خاموشی سے نکال کے [illegible]۔ اس کا خیال تھا کہ ہم اوپر کی منزل پر مصروف ہیں اور وہ اس مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جان بچا کر [illegible] ہونے کی کوشش کر سکتا ہے۔ میں نے گل کو اشارے سے متوجہ کیا۔

"میرا خیال ہے کہ گاڑی یہاں سے گزرے گی۔ [illegible] سامنے سے۔ فائر کر کے اس کے دونوں پچھلے ٹائر پھاڑ [illegible]"
"آپ فکر ہی نہ کریں..."
میں نے کہا "اتنے کم فاصلے سے نشانہ خطا نہیں ہونا چاہئے۔"
اس نے پھر کہا "آپ فکر ہی نہ کریں۔"
اسی وقت کسی نے عقبی حصے میں چلانا شروع کیا [illegible]
"[illegible] لئے دیا کرو۔"
میں نے کہا "[illegible] غالب نے ایک شکار کو زندہ [illegible]"
گل نے کہا "آپ کو کیا معلوم۔ شکار نازو کا بھی ہو [illegible] ہے۔"

میں نے دائیں جانب اندھیرے کو گھورتے ہوئے [illegible] "ہاں بھئی تم لوگوں کے نشانے سے ہم نہ بچ سکے۔ شکار ہوگئے۔"

گل آہستہ سے ہنسی، پھر خاموش ہوگئی۔ دائیں [illegible] سے ایک سیاہ کار آہستہ آہستہ چلتی ہوئی آرہی تھی۔ [illegible] قریب پہنچ کے اس نے یکلخت اپنی رفتار بڑھادی۔ [illegible] ستون کی اوٹ میں ہمارے منجمد سائے دیکھ لئے تھے۔ [illegible] نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ جان کی بازی لگا کے گاڑی کو پوری [illegible] سے دوڑا کر لے جائے اور گیٹ سے ٹکرا کے رکے بغیر [illegible] جائے۔ کم رفتار سے گیٹ کو توڑتے ہوئے نکلنا مشکل [illegible]

گل نے ٹھیک وقت پر فائر کیا لیکن کار کی رفتار [illegible] کے باعث گولی ٹائر میں نہیں لگی تاہم ونڈ اسکرین [illegible] بیٹھے ہوئے شخص نے سمجھ لیا کہ نشانہ اسے ہی بنایا گیا [illegible] نے ایک آخری کوشش کے طور پر کار کا رخ بدل [illegible] راستے پر رہنے کے بجائے اس نے کار کو لان پر اتار دیا [illegible] شارٹ کٹ سے گیٹ کا رخ کیا۔ یہ ایک طاقتور [illegible] امپالا کار تھی۔ اس کا انجن اب اپنی قوت میں طوفان کی [illegible] گرج رہا تھا۔ گل نے گھبراہٹ میں دوسری گولی چلائی [illegible] پچھلا ونڈ اسکرین پاش پاش کر دیا۔ اب میں رسک نہیں [illegible] سکتا تھا۔ میں نے مشین گن کا برسٹ مارا اور پورا [illegible] کار نے لان کو تقریباً عبور کر لیا تھا کہ اس کے دونوں [illegible] گئے۔ دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا والی بات ہوئی [illegible] گیٹ پر پہنچ کے گاڑی رک گئی۔ ایک شخص آہستہ [illegible] دروازہ کھول کے باہر نکلا اور ہاتھ اوپر اٹھا کے کھڑا ہو [illegible]

"گولی مت چلانا" اس نے وہیں سے کہا۔
میں نے کہا "ایسے ہی ہاتھ اٹھا کر آگے آجاؤ [illegible]

تمہاری جیب میں ایٹم بم ہے تب بھی استعمال کرنے کی کوشش مت کرنا۔"

میرے پیچھے سے غالب کی آواز آئی "ایک پنچھی کو میں نے بھی اڑنے سے پہلے پکڑ لیا ہے۔"
میں نے کہا "اسے کہیں پنجرے میں ڈال دے۔ میں نے بابا باغی یا شیر کو اڑنے سے پہلے گرفتار کیا ہے۔"
[illegible] نازو سے کہا "اس کو کمرے میں لے جاؤ مگر ذرا سنبھال کے۔ نازک چیز ہے" پھر وہ میرے ساتھ آ کے کھڑا ہوگیا۔

"گل! تم جا کے مین سوئچ تلاش کرو اور لائٹ جلا دو" میں نے کہا۔

کار سے اترنے والا بالکل سیدھا چلتا ہوا ہماری طرف آرہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ اوپر اٹھے ہوئے تھے اور صاف نظر آتا تھا کہ اس نے شکست کو موت پر ترجیح دیتے ہوئے مزاحمت کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔ وہ مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر آکے رک گیا۔ وہ تیس بتیس سال کا جوان اور صحت مند آدمی تھا جس نے نائٹ سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بیڈ روم میں پڑی ہوئی عورت کے ساتھ تھا مگر وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب رہا تھا۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا بھی غلط نہ تھا کہ وہی بالک رام لھوترہ ہے۔

"شری بالک رام لھوترہ" میں نے کہا "اب پلٹ کے کھڑے ہو جاؤ۔"
اس نے پلٹ جانے کے بعد کہا "آخر یہ سب کیوں کیا ہے تم نے؟"

میں نے کہا "اس فضول سوال کا جواب ہم کیوں دیں، جب کہ خود تم اچھی طرح جانتے ہو کہ تمہارا جرم کیا ہے۔"

لائٹس جل گئیں تو غالب نے پیچھے جا کے اس کی جامہ تلاشی لی۔ اس کے پاس ایک ہی ریوالور تھا جو اس نے پاجامے کے نیچے دبا رکھا تھا۔ غالب اسے اندر لے گیا۔

"میں نے تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا" لھوترہ نے کہا۔
"کیسی عجیب بات ہے، ہم نے بھی پہلے ہمیں نہیں دیکھا" میں نے کہا "لیکن ہم تمہیں جانتے ہیں۔ تمہارے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے وہ جان لیں گے۔"

اس کا اعتماد اب بحال ہونے لگا تھا "تم کچھ بھی نہیں جانتے۔ تم نے بلاوجہ اتنے آدمی مار دیئے۔"
"اگر ہم ایسا نہ کرتے تو وہ ہمیں مار دیتے۔ بلاوجہ ہم نے آج تک ایک چیونٹی کو بھی نہیں مارا۔"
"آخر ان سب سے کیا دشمنی تھی تمہاری؟"
"ہماری تم سے بھی کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے۔ تم سب قانون اور معاشرے کے مجرم ہو لیکن یہ قانون اور معاشرہ تمہاری شیطانی ذہانت، تمہارے وسائل اور تمہاری طاقت کے سامنے بے بس ہو کے رہ گئے تھے چنانچہ تم ایسے سب لوگوں کے معاملات اب ہم نے اپنے ہاتھ میں لے لئے ہیں۔"
"مگر تم ہو کون؟"
"ہم انصاف کرنے والے لوگ ہیں لھوترہ...."
"دیکھو، میں تمہیں ایک موقع دیتا ہوں۔ ابھی وقت ہے۔ صبح ہونے سے پہلے نکل جاؤ" لھوترہ نے کہا۔
"ہم صبح کا انتظار بھی نہیں کریں گے۔ ہم ابھی اور اسی وقت جائیں گے۔ تمہارے ساتھ۔"
"ہاں۔ اگر تم جہنم میں جاؤ گے تو ہم بھی جائیں گے۔ دروازے تک چھوڑنے" غالب بولا۔
میں نے کہا "جا کے دیکھ دوسرے پنچھی نے کچھ بتایا ہے؟"
"تم.... اپنا بھی وقت ضائع کر رہے ہو۔" لھوترہ پریشان اور متفکر نظر آنے لگا "اور میرا بھی.... چلو جو ہونا تھا ہوگیا۔ اب مجھے بھی جانے دو اور خود بھی بھاگ جاؤ میرے ساتھ۔"
"یہ دعوت مجھے آج تک کسی لڑکی نے نہیں دی" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "اور میں حیران ہوں کہ آج سے پہلے کبھی تمہیں بھاگنے کا خیال کیوں نہیں آیا؟"
"دیکھو، وہ لوگ آتے ہی ہوں گے.... انہوں نے فائرنگ کی آوازیں سن لی ہوں گی" وہ چلا کے بولا۔
"کون لوگ؟" میں نے پرسکون لہجے میں کہا۔
"وہی جو کسی کو بخشتے نہیں ہیں" وہ اب بھی نام لینے سے گریز کر رہا تھا "یہ سب انہی کے آدمی تھے جن کو تم نے مار دیا ہے۔ وہ.... مجھے بھی مار دیں گے۔"
"تم نے کوئی غلطی نہیں کی۔ پھر تمہیں کیوں مار دیں گے؟"
"میں.... مجھے یہاں نہیں ہونا چاہئے" وہ بمشکل تمام بولا۔ "میں صبح ہونے سے پہلے نکل جاتا۔"
"چور کبھی نہ کبھی ایسے ہی پکڑا جاتا ہے۔ اس کی شامتِ اعمال اس کے لیے سارے راستے اچانک بند کر دیتی ہے" میں نے کہا۔

غالب کے ساتھ نازو اور گل افسردہ صورت بنائے اندر آئیں۔
"کیا ہوا؟" میں نے کہا۔
"وہ کچھ بتائے بغیر مرگیا" نازو نے کہا۔
"کیسے مرگیا؟ کوئی زہر تھا اس کے دانتوں کے کسی خلا میں یا اس نے کوئی کیپسول نگل لیا؟"
"وہ دوڑ کر کھڑکی سے کود گیا...." نازو نے کچھ یوں کہا جیسے اسے اپنی کوتاہی پر شرمندگی ہے۔

باہر سے میں نے رات کے آخری پہر کی خاموشی میں کسی جیپ کے انجن کی آواز سنی۔ ملہوترا کا چہرہ پیلا پڑ گیا "وہ... وہ آگئے۔"

نام لئے بغیر نازو نے رونی صورت بنا کے کہا "وہ... کیوں نہیں آئے ابھی تک؟ اب تو ایک گھنٹے سے زیادہ ہو گیا۔"

میں نے کہا "وہ نہیں آئے تو کیا ہوا۔ ہم چلتے ہیں ان کے پاس۔ مسٹر ملہوترا! تمہارا کیا خیال ہے؟ ہم کس طرف سے بحفاظت نکل سکتے ہیں۔ تمہیں اندازہ ہو گا کہ کون سا راستہ محفوظ ہے۔"

اس نے اقرار میں سر ہلایا "میرے ساتھ آؤ.... جلدی کرو... وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا... میری گاڑی...." اس نے تقریباً روتے ہوئے کہا۔

"ہاں گاڑی تو اب وہ دیکھ ہی لیں گے اور گاڑی کو ہٹایا بھی نہیں جا سکتا" میں نے کہا "اب تم جان بچاؤ اور بھاگ جاؤ۔"

"کہاں جا سکتا ہوں میں۔ اس سے بچ کے" وہ آگے آگے دوڑتے ہوئے بڑبڑایا "وہ تلاش کر لے گا مجھے... میں کیسے چھپ کے رہ سکتا ہوں اس کی نظر سے..."

خوف کی دیوانگی میں وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا۔

ملہوترا کے ساتھ ہم نے گیراج کی طرف دوڑ لگائی۔ جو جنوب کی فصیل کے ساتھ ساتھ بنے ہوئے تھے۔ یہ ایک جیسے چار گیراج تھے۔ ان کے دونوں جانب سرونٹ کوارٹر نظر آرہے تھے۔ ملہوترا ایک گیراج میں داخل ہو گیا۔ گیراج کا ایک دروازہ دوسری طرف بھی تھا۔ اس نے اندر سے بھاری کنڈی کھولی اور باہر نکل گیا۔ اچانک ہم نے خود کو ملہوترہ کے قلعہ نما گھر کے باہر پایا۔ یہ ایک طرح سے چور دروازہ تھا جو ہنگامی ضرورت کے لئے رکھا گیا تھا۔

گیراج کا اندر والا دروازہ ہم نے بھی بند کر دیا تھا چنانچہ فوری طور پر کسی کو شک نہیں ہو سکتا تھا کہ ہم چور دروازے سے فرار ہو گئے۔ باہر آنے کے بعد میں نے بیرونی دروازہ بھی بند کیا اور ملہوترا کے پیچھے دوڑنے لگے۔

وہ معلوم نہیں ہمیں کس طرف لے جا رہا تھا۔ اس کا اپنا مسئلہ کچھ اور تھا۔ افشائے راز کے بعد اس کے لئے اُن کے سامنے جا کے زندہ بچ جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ اپنی جان بچا کے فرار ہو رہا تھا۔ اسے ابھی اندازہ نہیں تھا کہ ہم نے اس کے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے۔

بالآخر ایک جگہ نازو اور گل کی ہمت جواب دے گئی۔ پہلے گل ایک دم بیٹھ گئی۔ پھر نازو۔ انہوں نے پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ بڑی مشکل سے چند الفاظ میں بتایا کہ وہ ہمارا ساتھ دینے سے قاصر ہیں۔

میں نے ملہوترا کو روک لیا "یہ تم کدھر بھاگے جا رہے ہو؟"

اس نے ریوالور کا رخ اپنی طرف دیکھا تو حواس باختہ ہو... سمجھا کہ ہم اس جنگل میں اسے گولی مار کے چلے جائیں...

"دیکھو، میں.... میں نے مدد کی تمہاری۔ میں نے تم... مقابلہ نہیں کیا۔ کوئی آدمی نہیں مارا..... الٹا تمہاری وجہ...

میں نے کہا "ہمیں مندر اور اناتھ آشرم کا راستہ دکھ... تمہیں جانے کی اجازت ہو گی۔"

وہ چلایا "میں... ادھر.... ادھر نہیں جا سکتا..."

میں نے کہا "تمہارا باپ بھی جائے گا۔"

اسی وقت دو طرف سے ہم تیز روشنی کی زد میں آ... یہ جیپ کی ہیڈ لائٹس تھیں جو دونوں سمت سے ہماری... بڑھتی آرہی تھیں۔ گل اور نازو کی حالت ایسی نہیں تھی... دوڑ سکیں۔ ویسے بھی جیپ کے مقابلے میں آدمی کہاں... دوڑ سکتا ہے۔ جیپ ایک مضبوط، کبھی نہ تھکنے والی تیز... مشین تھی اور ہم تھکے ہارے انسان جو اپنی جسمانی توانائی... کر چکے تھے۔ مشین گن کا راؤنڈ ختم ہو گیا تھا۔ اب ہم... پاس صرف ریوالور تھے لیکن ہمیں یہ معلوم نہیں تھا کہ ہم... محصور کرنے والے تعداد میں کتنے ہیں اور کتنے طاقتور...

"یہ انہی کے ساتھی ہوں گے" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "یہ تو قریب آنے پر ہی معلوم ہو گا لیکن... فوراً منتشر ہو جانا چاہئے۔ تم ادھر جاؤ۔ نازو! تم گل کے... رہو... جاؤ، شکل مت دیکھو میری۔"

نازو نے کہا "اب ایسی صورت بھی نہیں ہے تمہاری... میں جان کا خطرہ مول لے کر دیکھتی رہوں۔ آخر کدھر جاؤں؟"

"کچھ اپنی ذاتی عقل بھی استعمال کر لو۔ جیسی بھی ہے..." ... نے بھنا کے کہا "بس ادھر مت جاؤ، جدھر غالب گیا ہے۔"

گل نے اسے کھینچ لیا "جائیں آپ اپنی فکر کریں۔"

میں نے سر پر ہاتھ مار کے کہا "خدا کے لئے ایسے... لگاؤ۔ جھک کر جاؤ، لیٹ کر آگے بڑھتی رہو۔"

دونوں جیپوں کی ہیڈ لائٹس قریب آنے کے بعد آف... تھیں اور مجھے تقریباً سو گز کے فاصلے پر دونوں طرف متحرک... پیش قدمی کرتے نظر آرہے تھے۔ اندھیرے اور جنگل کی ر... کے باعث صحیح تعداد کا اندازہ مشکل تھا۔ شاید دو... سے تین تین افراد اترے تھے۔

میں نے بالک رام ملہوترہ کو کھینچ کر اپنے ساتھ زمین... میرا ریوالور اس کی پسلیوں سے لگا رہا "کون ہیں یہ لوگ؟" ... نے سرگوشی میں کہا۔

"میں... کیا بتا سکتا ہوں...." وہ بولا۔

میں نے کہا "اچھا مت بتاؤ۔ ایک بات میں بتا نا... سن لو۔ تمہارے محافظ، حمایتی یا مددگار اگر توپیں اور ٹینک بھی آجائیں تو وہ تمہیں اس ایک گولی سے نہیں... جو تمہارے دل سے دو انچ دور، میری انگلی کے ایک اشارے...

ٹھہرے ہے۔ اس ریوالور میں یہ آخری گولی ہے بالک رام۔"

"ابھی تک... کوئی ایسی بات کی ہے میں نے" وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔ اس کی آواز حلق میں پھنس رہی تھی۔ وہ ہانپ رہا تھا اور کانپ رہا تھا۔ اس کی آواز بھی کانپ رہی تھی۔

جھاڑیوں کی اوٹ سے میں نے ایک شخص کو نمودار ہوتے دیکھا جو ہاتھ میں ریوالور لیے بڑی احتیاط کے ساتھ ہر طرف دیکھتا ہوا اور پھونک پھونک کر قدم رکھتا آرہا تھا۔

"ادھر تو کوئی نہیں ہے" نہ جانے کس نے اچانک کہا۔

وہ شخص چونک کے پلٹا "کتے، مجھے معلوم تھا، پہلے تو ہی بھونکے گا۔ تیری زبان خاموش نہیں رہے گی۔"

جسے کتا کہا گیا تھا وہ سامنے آگیا "ابھی میرے پر کا ہے کو گرمی کھاتا ہے۔ اس سالے نے پوچھا تھا کہ ادھر ہے کوئی؟ میں نے بتا دیا استاد۔"

اب تیسرا شخص بھی اندھیرے کی اوٹ سے نکل آیا "ابے کیا یہ بھی میں نے بولا تھا کہ لاؤڈ اسپیکر کا مافک جواب دے؟"

"بند کرو دونوں اپنی بکواس... انہیں تلاش کرو۔ کہیں وہ نکل نہ جائیں تمہاری بک بک میں" پہلے شخص نے کہا۔ وہ اپنے لہجے اور رویّے سے خود کو اس شکاری ٹولے کا لیڈر ثابت کر چکا تھا۔

غالب، نازو اور گل ہم سے زیادہ دور نہیں تھے۔ یقیناً یہ گفتگو ان کے کانوں تک بھی پہنچی ہو گی لیکن وہ بھی دم سادھے پڑے رہے۔

"ٹارچ کہاں ہے؟" پہلے شخص نے اپنی ٹارچ کی روشنی سے گردوپیش کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"ٹارچ.... جل نہیں رہی ہے" ایک نے اعترافِ جرم کے انداز میں کہا۔

ان کے لیڈر نے انہیں ایک انتہائی نامناسب مشورہ دیا کہ جو ٹارچ جلتی نہ ہو اس کو کیسے استعمال کرنا چاہئے۔

دوسرے نے اپنی ٹارچ روشن کی تو اس کی روشنی سیل کمزور ہونے کی وجہ سے برائے نام رہی "ابھی سیل ڈاؤن ہے استاد....!"

استاد نے اسے دوسرا انتہائی نامناسب مشورہ دیا کہ جو سیل ڈاؤن ہوں ان کو کیسے استعمال کرنا چاہئے۔ وہ خود بھی کم بے وقوف نہیں تھا کہ میرے سامنے کھلی جگہ پر کھڑا ہوا تھا۔ کسی خاص دشواری کے بغیر میں ان تینوں کو گولی مار سکتا تھا لیکن میں نے خاموشی برقرار رکھی۔ میں انہیں اس طرح مارنا چاہتا تھا کہ ایک کے مرنے کی خبر دوسرے کو عالمِ بالا میں ہی ملے۔

شک و شبے کی اب کوئی بات نہیں رہی تھی۔ یہ سب ملہوترہ کے ساتھی تھے جو اس کے گھر کی طرف سے فائرنگ کی آوازیں سن کے مندر یا اناتھ آشرم سے بھیجے گئے تھے کہ صورتِ حال کا جائزہ لیں اور کہیں گڑبڑ نظر آئے تو اسے ختم کریں۔ یقیناً ان کی موجودگی سے ملہوترہ کے مایوس دل کو حوصلہ اور تقویت حاصل ہو رہی ہو گی مگر وہ انہیں متوجہ کر کے خودکشی کرنے سے گریز کر رہا تھا۔ دل ہی دل میں وہ ضرور دعا کر رہا ہو گا کہ وہ جلد از جلد اپنے مقصد میں کامیاب ہوں تاکہ اس کی جان سولی کے عذاب سے چھوٹے۔ میں اس کی عیاری کو سمجھتا تھا۔ مجھے یہ اندیشہ بھی لاحق ہونے لگا تھا کہ کہیں یہ سسپنس اس کے اعصاب کی شکست کا سبب نہ بن جائے۔ وہ پاگل پن میں کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کر بیٹھے کہ مجھے اس کو مارنا پڑے جس کے بعد ایک کھلی جنگ شروع ہو جائے۔ میرے لئے دونوں طرف توجہ میں فرق نہ آنے دینا مشکل تر ہوتا جا رہا تھا۔ میں اس کی طرف سے ذرا بھی غافل ہوتا تو وہ کوئی غلط حرکت کر بیٹھتا اور میں صرف اسے دیکھتا رہتا تو عین ممکن تھا کہ دشمن کی نقل و حرکت پر نظر نہ رکھ پاتا۔

اس دُہری پریشانی سے نجات پانے کے لئے میں نے حفظِ ماتقدم کے طور پر ملہوترہ کو خاموش کر دیا۔ میں نے اسے ایک دم دبوچا اور اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کے دوسرا ہاتھ اس کی گردن پر کان کے قریب مارا۔ وہ مزاحمت کرتے کرتے ایک دم ڈھیلا پڑ گیا... جب مجھے یقین آگیا کہ اس بے ہوشی میں ملہوترہ کی اداکاری کا کوئی دخل نہیں تو میں نے اسے سیدھا لٹا دیا اور اپنے دشمنوں کی طرف متوجہ ہو گیا جو اَب بھی میرے قریب ہی جھاڑیوں کو کنگھالتے پھر رہے تھے۔ ان کی باتیں سن کے اندازہ ہوتا تھا کہ انہوں نے ہیڈ لائٹس کی روشنی میں ہمیں دیکھ لیا تھا چنانچہ ہمارے غائب ہو جانے سے وہ جھنجلاہٹ میں مبتلا ہو گئے تھے۔ ان کی ناکامی میرے لئے باعث اطمینان تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ غالب کے علاوہ گل اور نازو نے بھی خود کو خاصی ذہانت سے کیموفلاج کیا تھا۔

پہلی آواز میں نے چند منٹ بعد سنی۔ یہ آواز کچھ ایسی تھی جیسے کسی نے ہچکی لی ہو۔ پھر کوئی دو چار قدم دوڑا۔ اس کے بعد خاموشی ہو گئی۔ جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا وہ پہلا شکار تھا جو نازو نے کیا تھا اور آخری ہچکی کے بعد وہ دوڑا نہیں تھا۔ اس نے زمین پر پاؤں مارے تھے۔

"کیا ہے.... یہ کیا ہے؟" میرے سامنے سے گزرتے ہوئے استاد نے بڑی تشویش سے کہا۔

میں نے اسے ایک دم پیچھے سے یوں دبوچا کہ میرا دایاں ہاتھ اس کے منہ پر جم گیا۔ میں نے اس کی کمر میں گھٹنا مارا اور وہ ایک جھٹکا کھا کے کمان ہوا تو میں نے منہ پر رکھے ہوئے ہاتھ سے پیچھے کی طرف جھٹکا دیا۔ اس کی گردن ٹوٹ گئی اور شاید ریڑھ کی ہڈی بھی کیونکہ وہ عجیب مضحکہ خیز طریقے پر انگریزی حرف ایس کی شکل بنا کے گرنے لگا۔ دو منٹ میں اس کی روح اس کے جسم سے جدا ہو گئی۔ دو منٹ تک میں نے اسے حرکت بھی نہ کرنے دی۔

اب اس ٹیم کا ایک ہی فرد باقی رہ گیا تھا۔ دوسری ٹیم نا...

آگے لھوترہ کے گھر کی جانب نکل گئی تھی۔ خاموشی سے دشمن کو ختم کردینے کا منصوبہ ابھی تک کامیاب تھا۔ پھر فضا کا سکوت ریوالور کی ایک گولی کی تیز آواز نے ختم کردیا۔ کوئی شخص چلایا۔

"استاد..." اور میں نے اس شخص کی آواز پہچان لی جس کی ٹارچ کے سیل ڈاؤن تھے۔ دوسری گولی چلنے کی آواز پر میں پریشان ہو کے بھاگا کیونکہ یہ آواز بالکل مختلف اور یقیناً دوسرے ریوالور کی تھی۔ کیا پہلی گولی کا نشانہ خطا ہوگیا تھا اور اس شخص نے جوابی فائر کیا تھا؟

میرے سیدھے ہاتھ کی طرف سے غالب نے کہا "نشانہ...!" میں رک گیا۔

"فائر تو نے کیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ پہلا فائر میں نے کیا تھا" غالب ایک بہت بڑے پتھر کی اوٹ سے نکل آیا "وہ اچانک سامنے آگیا تھا۔"

"تو ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں۔ اس نے گرتے گرتے گولی چلا دی تھی۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا "میں تو ڈر گیا تھا کہ شاید نشانہ چوک گیا۔"

"میرا نشانہ کبھی خطا ہوا ہے؟" غالب نے کہا۔

"مجھے کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ یہ گولی تو نے چلائی تھی۔"

"اور کون چلا سکتا تھا؟" نازو نے پیچھے سے کہا۔

میں اچھل پڑا "تم... تم کہاں تھیں؟"

نازو نے کہا "ادھر... ایک درخت پر۔ اوپر سے ڈائریکٹ لینڈ کرنے میں آسانی رہی۔ وہ بدبخت عین نیچے آگیا۔"

"تم دونوں درخت پر چڑھ کے بیٹھ گئی تھیں!" غالب نے حیران ہو کے کہا۔

"کیا درخت پر چڑھنا خلاف ضابطہ ہے" گل نے کہا۔

"خلاف عقل ضرور ہے" غالب نے کہا "کوئی کارنامہ سرانجام دیے بغیر ہی تمہاری ٹانگ ٹوٹ جاتی پھر؟"

"کیسے ٹوٹ جاتی۔ اور ٹوٹ جاتی تو میں لنگڑا کے بھی چل سکتی ہوں" نازو نے کہا۔

"چلو ٹوٹی تو نہیں۔ اب نکلو یہاں سے فوراً" میں نے کہا۔ "اُن کے باقی ساتھی آرہے ہیں واپس۔"

"کیوں نہ ان سے بھی نمٹ لیں" نازو نے کہا۔

"فرار ہو جانا بہتر ہے" غالب نے کہا "بچہ کہاں ہے؟"

"بچہ!" میں بھونچکا رہ گیا "کون سا بچہ، کس کا بچہ؟"

"بالک... بالک رام" غالب نے کہا "بالک بچے ہی کو کہتے ہیں ہندی میں۔"

میں نے مسکرا کے کہا "بچہ سو رہا ہے۔ رو رہا تھا، میں نے سلا دیا۔"

بالک رام لھوترہ کی حویلی کی طرف سے، دوسری ٹیم کے ارکان فائرنگ سن کے پلٹے تھے لیکن انہوں نے اندھا دھند دوڑنے سے گریز کیا تھا۔ وہ یقیناً سمجھ گئے ہوں گے کہ کوئی ان کے پیچھے ہے اور ان کے ساتھی مقابلہ کررہے ہیں یا فرار ہیں۔ ورنہ صرف دو گولیاں ہی کیوں چلائی گئیں۔

میں نے بالک رام کو کندھے پر ڈالا اور ہم جیپوں تک پہنچے۔ حسب توقع وہ چابیاں لگی ہوئی چھوڑ گئے تھے۔ اپنی تعداد اور طاقت پر یقین کے فریب کا شکار نہ ہوتے تو ایسا نہ کرتے۔ وہ ڈرائیور کو جیپ میں چھوڑ جاتے یا چابیاں نکال لیتے۔ میں نے لھوترہ کو ایک جیپ میں ڈالا اور جیپ کا انجن گرجا اور ایک دم دو فائر ہوئے۔ ہماری واپسی والے شاید سمجھ گئے تھے کہ ہم جیپ لے کر فرار ہورہے ہیں۔ ان کے اپنے ساتھی انہیں کچھ بتائے بغیر یوں چھوڑ کر نہیں گئے تھے۔

گولی کا نشانہ بننے سے بچنے کے لئے میں نے جیپ اسٹارٹ کرنے کے بعد بھی لائٹس نہیں جلائیں لیکن اندھیرے میں جھاڑیوں میں فرق کرنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ ونڈ اسکرین کی دوسری طرف اندھیرے کی کالی چادر تھی جس میں درختوں کے تنے بھی اس وقت نظر آتے تھے جب فاصلہ چند فٹ کا رہ جاتا... اور میں ایک درخت سے بچ کے نکلتا تھا تو کوئی دوسرا جیپ کی طرف دوڑتا محسوس ہوتا تھا۔ یہ دوسری جنگ عظیم کے زمانے کی ملٹری ماڈل جیپ تھی جو پتھروں کے اوپر سے گڑھوں کو پھلانگتی، درختوں سے رگڑ کھاتی اور جھاڑیاں روندتی ہوئی چلتی گئی۔ اس کی جگہ کار ہوتی تو اس کے الگ پرزے ہوتے اور مسافر الگ۔

مجھے صرف جیپ کو اور خود کو بحفاظت نکال لے جانے کا خیال تھا چنانچہ میں نے وہ فائر شمار نہیں کیے جو پیچھے والے اندھیرے میں نشانہ لئے بغیر کر رہے تھے۔ ظاہر ہے ان حالات میں بہترین نشانے باز بھی کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ افتاں وخیزاں بھاگ رہے تھے، جیپ الگ دوڑ رہی تھی۔ ناہموار زمین کا سامنا بھی دونوں کو تھا... اور اندھیرے میں تلاش کرنے کا مسئلہ بھی دونوں کو درپیش تھا۔ میں نے مڑ کر دوسری جیپ کو دیکھنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سامنے دیکھ رہا تھا۔ اگر میں پلک بھی جھپکتا تو جیپ کسی درخت پر چڑھ جاتی۔

دوسری جیپ کو میں نے روانہ ہوتے ضرور دیکھا تھا۔ مجھے یہ دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا کہ اسے کون ڈرائیو کر رہا ہے۔ میرے لئے ایک اطمینان کی بات یہ تھی کہ اس کی لائٹس بھی روشن نہیں تھیں۔ میں نے ایک جگہ رک کر آواز دی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ بھی چیخ کر جواب دے... میں وہ میری آواز کیسے سن سکتا تھا۔ اور اگر وہ خود ڈرائیو کر رہا تھا تو اس کی ساری جدوجہد بھی اتنی ہی سخت اور صبر آزما تھی جتنی میری۔

جنگل میں فائرنگ نے سارے پرندوں کو بیدار اور بدحواس کردیا تھا۔ وہ اب دیوانہ وار چلا رہے تھے اور فضا میں اپنے آشیانوں کے قریب منڈلا رہے تھے۔ گولیوں کے ساتھ گالیاں بھی کچھ دیر سنائی دیتی رہیں۔ پھر ایک جگہ میں نے محسوس کیا کہ ہم یہ رکاوٹوں کی دوڑ جیت گئے ہیں۔ وہ نسبتاً ہموار جگہ تھی چنانچہ میں نے جیپ کی رفتار کم کی اور پلٹ کے پیچھے دیکھنے کی کوشش کی کہ کہیں بچہ تو جھٹکے لگنے سے نہیں گر گیا ہے۔ گل کو دیکھ کر میں بھونچکا رہ گیا۔

"لی لی... تم... بیٹھی ہو... کب... میرا... مطلب ہے جیپ کے ساتھ تو نہیں ہونا؟" میں نے مختلف خیالات اور جملوں کا آملیٹ بناتے ہوئے کہا اور جیپ روک لی۔ "خدا کی قسم مجھے معلوم نہیں تھا...؟"

گل نے بڑی مشکل سے کہا۔ "آپ... حد کردی آپ نے۔ میں تو آیت کریمہ کا ورد کر رہی تھی... اف اللہ... میرا تو دل کانپ رہا ہے...؟"

میں نے بالک رام کو دیکھا۔ وہ سیٹ سے لڑھک گیا تھا "وہ لوگ کہاں رہ گئے؟" میں نے پریشانی سے کہا۔

گل نے پھولی ہوئی سانس کو قابو میں لاتے ہوئے پیچھے دیکھا اور کہا۔ "ساتھ ہی... آرہے تھے..."

"تم نے دیکھا تھا؟"

"ہاں..." گل نے سرہلایا اور "ہائے میں مرگئی" کہہ کے ثابت کیا کہ اس کی حالت جھٹکوں نے ابتر کردی ہے۔

میں نے کہا... "کوئی ہڈی... خدانخواستہ... ٹوٹی ہے کیا؟"

"نہیں... ٹوٹی تو نہیں... اپنی جگہ سے سب ہل گئی ہیں" اس نے فریاد کے انداز میں کہا۔ "یہ کوئی طریقہ ہے..."

"وہ... وہ آگئے" میں نے خوش ہو کر کہا۔

اندھیرے میں سے غالب اور نازو سرپٹ دوڑتے ہوئے نمودار ہوئے اور جیپ پر چڑھ گئے۔

غالب کی سانس اس کے قابو میں نہ تھی مگر اس نے آدھی آدھی کرکے مجھے ایک درجن گالیاں دیں۔ مثلاً۔ الو... کا پٹھا... نازو نے اس کے ساتھ ساتھ بولتے ہوئے کہا "آپ ہمیں چھوڑ کے بھاگ آئے..."

"لاحول ولا قوۃ..." میں نے جیپ کو اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ "تم خود ہی تو جیپ لے کر بھاگے تھے..."

"وہ... ایک پہاڑ پر چڑھ گئی..." غالب نے ایک گہری سانس لی۔

"پہاڑ نہیں... درخت تھا" نازو نے کہا۔

"چپ... تمہیں... تمہیں کیا معلوم... جیپ میں چلا رہا تھا" غالب نے ... کہا۔

"... بکھیر رہی تھی" نازو نے بھی چلا کے کہا۔

اب میں نے ہیڈ لائٹس جلا دیں "کوئی گولی وغیرہ تو نہیں لگی تمہیں، فائر ہو رہے تھے۔"

"نازو سے پوچھو... مجھے تو نہیں لگی" غالب نے کہا۔

"اچھا ہوتا، اگر لگ جاتی۔ جیسی ڈرائیونگ تم کر رہے تھے اس پر میں تمہیں گولی مار دیتی" نازو نے چراغ پا ہو کے کہا "اپنے ساتھ مجھے بھی مروا دیا تھا۔"

"ہاں۔ مال روڈ پر گاڑی چلا رہا تھا میں" غالب بھنا کے بولا۔ "اتنی نزاکت ہے تو بیٹھ جانا تھا ہوائی جہاز میں۔ میرے ساتھ مرنے کی کیا ضرورت تھی۔"

نازو نے ایک چیخ ماری "یہ... یہ کیا ہے؟"

غالب نے کہا "بچہ ہے... ہمارا بچہ..."

"غالب! میں پھینک دوں گی اٹھا کے باہر۔"

"وہ... میرا مطلب تھا ہم سب کا بچہ، بالک رام" غالب نے فوراً معذرت کرتے ہوئے دانت نکالے۔ گل پہلے ہی ہنس رہی تھی۔ اب مجھے بھی ہنسی آگئی۔ اس ہنسی نے اعصابی کشیدگی کو ایک دم بہت کم کردیا۔

"کہیں وہ جیپ لے کر نہ آجائیں ہمارے پیچھے" میں نے کہا۔

"جیپ کو تو گولی ماردی میں نے" غالب نے کہا "وہیں قتل کردیا نافرمان کو۔ میری مرضی کے خلاف وہ پہاڑ پر کیسے چڑھی۔"

"وہ پہاڑ نہیں تھا، درخت تھا" نازو نے شرافت سے کہا۔

غالب نے کچھ دیر اسے گھورنے کے بعد کہا "میں درخت کو پہاڑ نہیں مان سکتا، خواہ تم مجھے دس بار اٹھا کے جیپ سے پھینک دو۔"

"گیارھویں بار تو مانو گے نا؟" نازو نے کہا۔

میں نے اسے فوراً روک دیا "ہم بعد میں جا کے خود دیکھیں گے کہ وہ درخت تھا یا پہاڑ۔"

"اور تمہیں بھی پتا نہ چلا تو؟" گل نے بڑی معصومیت سے کہا۔

"تو ہم یہ معاملہ اقوام متحدہ میں لے جائیں گے۔ کشمیر کا مسئلہ حل کرتے ہی وہ ہمارا مسئلہ بھی حل کردیں گے" میں نے کہا۔ "ابھی تو یہ سوچو کہ ہم اس لاوارث بچے کو کہاں لے جائیں۔"

"جسے گود لینے والی بیوی تک نہیں رہی" غالب بولا۔

"اسے ہوش میں لا کے اسی سے پوچھ لینا بہتر ہوگا" نازو نے کہا۔

میں نے جیپ روک دی اور بالک رام کو سیٹ پر لٹا دیا۔ غالب نے جیپ کی تلاشی لی اور اس کی سیٹ کے نیچے سے مزید اسلحہ برآمد کیا۔ اس میں ایک چیز بہت کارآمد تھی۔ یہ غیر ملکی ساخت کا دستی بم تھا جو شاید ہنگامی صورت حال سے نمٹنے کے لئے رکھا گیا تھا۔ کہ اگر مقابلہ سخت ہوجائے اور ہم گولی کی زبان سمجھنے پر آمادہ نہ ہوں تو یہ گولا مار دیا جائے۔ لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ ریوالور اب ہر ایک کے پاس تھا۔ مجھے اپنا

والے ریوالور کے لئے گولیاں درکار تھیں۔ جیپ میں سے ملنے والی گولیاں میگزین میں ڈال کے میں نے غیر ضروری ریوالور دور پھینک دیئے۔

اتنی دیر میں نازو نے جیپ کا بونٹ کھولا جو عام کار کی طرح اشارے سے نہیں کھلتا۔ اسے خاصی قوت صرف کرکے دونوں طرف کے ہک ہٹانے پڑے۔ پھر اس نے ریڈی ایٹر کے پانی میں رومال بھگویا اور ٹھنڈا کرکے بالک رام کی پیشانی پر رکھا۔

نازو نے کہا "اٹھو بچے، آنکھیں کھولو... ہوش میں آجاؤ۔"

غالب نے اسے ڈانٹ کے کہا "اتنی محبت اور اتنے پیار کا مظاہرہ کروگی تو یہ کبھی آنکھیں نہیں کھولے گا۔"

میں نے کہا "ہاں۔ کیا کہا ہے وہ کسی شاعر نے کہ۔ تھامے ہوئے بیٹھے تھے آغوشِ محبت میں۔ بے ہوش ہی اچھا تھا ناحق مجھے ہوش آیا۔"

غالب نے کہا "بچہ لاتوں کا بھوت ہے، ممتا نچھاور مت کرو۔"

نازو نے کہا "پھر کیا کروں؟"

"اس سے کہو.. حرام زادے، اٹھ، نہیں تو لات مارتی ہوں. پھر لات مار کے کہو، الو کے پٹھے اٹھ۔ نہیں تو دانت توڑ دوں گی۔ پھر دانت توڑ کے کہو، سور کے بچے ہوش میں آجا، نہیں تو جہنم رسید کرتی ہوں..."

ابھی غالب کی بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ بالک رام طھوترہ نے کراہ کے کہا "ہائے میری ماں..."

ہم سب ہنس پڑے۔ غالب نے کہا "دیکھا، کیسا اثر ہوا ہے میری بات کا۔"

پھر وہ بالک رام پر جھک کے بولا "ماں نہیں، میں تمہارا باپ ہوں۔ نرکھ سے تمہیں لینے آیا ہوں بالک رام۔"

بالک رام اٹھ بیٹھا۔ اس نے ایک ہاتھ سر پر رکھ کے اندھیرے میں ادھر ادھر دیکھا "یہ کیا جگہ ہے..."

"یہ وہ جگہ ہے بیٹا، جہاں پہلے تیرا پیٹ پھاڑا جائے گا پھر تجھے زمین میں گاڑا جائے گا۔ اور تیری پتنی کا سہاگ اجاڑا جائے گا..."

بالک رام کو اتنی دیر میں پوری طرح ہوش آچکا تھا۔ اس نے پُروحشت انداز میں باری باری ہم سب کی صورتوں کو دیکھا۔ "تم مجھے مت مارو، میں تمہاری ہر شرط منظور کرتا ہوں۔"

میں نے کہا "شرائط بہت ہیں، ہم ساتھ ساتھ بتاتے جائیں گے اور منواتے جائیں گے۔"

غالب نے کہا "یار، یہ آوازیں..."

نازو اور گل نے سرہلایا "میرا خیال ہے..."

"تمہارا خیال درست ہے" میں نے کہا "لیکن اب فرار نہیں ہوں گے۔ ہم ان کا استقبال کریں گے... بالک رام! یہ تمہارے ہی پالے ہوئے کُتے ہیں۔ ان کے ساتھ مرنا پسند کروگے تم اب یا انہیں کُتے کی موت مارنے کے نیک کام میں ہماری مدد کروگے؟"

بالک رام کانپتے ہوئے بولا "تم... کیا کہہ رہے ہو؟ میں سمجھا نہیں!"

باقی بچ جانے والے ہمارا سراغ تلاش کرتے اسی راستے دوڑتے ہوئے ہم تک آپہنچے تھے۔ ان کے دوڑتے قدموں کی اور آپس میں باتیں کرنے کی آوازیں ہم تک پہنچ رہی تھیں۔

میں نے کہا "ہم نے تمہاری مدد کے لئے آنے والے آدھے لشکر کا صفایا کردیا ہے۔ جو باقی بچے تھے وہ مرنے کے لئے خود ادھر آرہے ہیں۔ تم انہیں مدد کے لئے بلاؤ۔ ہم چھپ کر دیکھتے رہیں گے۔"

"اور تمہاری گفتگو کا ایک ایک لفظ سنیں گے" غالب نے کہا۔

قریب ہی سے سنائی دینے والی سب آوازیں یکلخت بند ہوگئی تھیں۔ غالباً انہوں نے جیپ دیکھ لی تھی یا اندازہ کرلیا تھا کہ ہم کہیں قریب ہی موجود ہیں۔ جنگل میں جہاں خطرہ خود پکارتا ہے، شکار اور شکاری دونوں ہی چھٹی حس کی مدد سے یہ پکار سن لیتے ہیں۔

میں نے نازو اور گل کو چٹکی سے اشارہ کیا "تم دونوں غائب ہوجاؤ۔"

غالب نے کہا "جیسے جنگل میں چڑیلیں غائب ہوتی ہیں۔"

"تم نے دیکھا ہے کبھی؟" گل نے خفگی سے کہا۔

غالب نے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا "نہیں دیکھا تو کیا۔ ابھی دیکھ لیں گے۔"

نازو پھر درخت پر چڑھ گئی۔ اس کام میں مہارت کا مظاہرہ نازو نے پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔ اسے اپنے دبلے پتلے لچکدار جسم کو استعمال کرنا آتا تھا۔ وہ گلہری کی طرح پلک جھپکتے میں ایک شاخ پر پہنچ گئی جو زمین سے دس بارہ فٹ اوپر تھی۔ گل نے ایک جھاڑی کے پیچھے پناہ لی۔

میں نے دستی بم طھوترہ کو دکھا کے کہا "یہ چیز تم نے پہلے دیکھی ضرور ہوگی۔ تمہارے ہی اسٹاک کا مال ہے۔ ہم صرف دس گز دور بیٹھے ہیں۔ اگر تم نے حرامی پن کیا تو ہم تمہاری موت کا سامان وہیں سے ارسال کردیں گے۔"

"لیکن خود محفوظ رہیں گے" غالب نے سرگوشی میں کہا۔

میں نے کہا "انہیں یہ بتانا ہے کہ ہم تمہیں یہاں چھوڑ کے فرار ہوگئے اور تم کو ابھی ابھی ہوش آیا ہے۔"

"اس بیان کا آخری حصہ بہرحال سچ ہے" غالب نے کہا۔

پھر ہم دونوں بھی تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے روپوش ہوگئے۔

بالک رام کو اپنی زندگی سے اتنا پیار تھا کہ کسی تردد کے بغیر اس نے تین افراد کو خود موت کی راہ گزر پر بلالیا۔ وہ کراہنے اور چیخنے لگا۔

"ارے... کون ہے؟ ادھر آؤ.. ہائے... آہ..."

"کون؟ بالک رام جی" اندھیرے میں سے ایک آواز ابھری۔

"ارے ہاں، میں بالک رام ہوں... ستیاناس ہو ان کا" اس نے واویلا جاری رکھا۔ اندھیرے کی اوٹ سے تین سائے بڑی تیزی سے بالک رام کی طرف لپکے۔ ان سب کے ہاتھ یوں اٹھے ہوئے تھے کہ دور سے بھی ہم ان کے مسلح ہونے کا اندازہ کرسکتے تھے۔

"یہ کیا ہوا بالک رام جی؟"

"ارے... ہونا کیا تھا۔ نمک حرام، نالائق... گدھے... وہ میرا کام تمام کرگئے... آہ... بھاگ گئے مجھے یہاں ڈال کے..."

"آخر... کون تھے وہ؟" یہ دوسری آواز تھی۔

"گئے کدھر وہ..." تیسرے نے ہمارے لئے ایک گالی کو بطور نام کے استعمال کیا۔

"پاگل کے بچے، کیا میں پوچھتا ان سے کہ وہ کون ہیں؟ اور کیا پوچھنے پر وہ بتاتے... میں تو بے ہوش تھا۔ مجھے کیا معلوم وہ کہاں گئے..."

میں نے ایک پتھر اٹھالیا اور اس طرف پھینکا جدھر نازو درخت پر چڑھی بیٹھی ہوئی تھی۔

"یہ... کیسی آواز تھی یہ؟" کسی نے چونک کر کہا۔

"ادھر سے آئی تھی آواز..." دوسرا بولا۔

"دیکھو... ہوشیار۔ کہیں وہ دھوکا دینے کے لئے آس پاس ہی نہ چھپ گئے ہوں" تیسرے نے کہا۔

"میں دیکھتا ہوں ادھر" پہلے نے کہا "تم دوسری طرف جاؤ"

اس وقت نازو نے ایک دلچسپ حرکت کی۔ اس نے حلق یا ک سے کسی پرندے کی آواز نکالی لیکن یہ آواز بے حد مصنوعی سی لگتی تھی۔

"یہ کون بولا تھا؟"

"طوطا ہوگا" بالک رام نے کہا۔

نازو نے پیڑ پر سے طوطے کی طرح کہا "میاں مٹھو۔"

وہ شخص درخت کی جانب بڑھ گیا "میں نے جنگل میں کبھی رات کے وقت طوطے کو بولتے نہیں سُنا" وہ حیرانی سے بولا۔ "ابھی پکڑتا ہوں۔"

"ابے دیکھ لے، طوطا ہے کہ طوطی" دوسرا بولا۔

"یہ بھی پوچھ لینا کیوں جاگ رہا ہے" تیسرے نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

دوسرا شخص بڑی بے فکری سے چلتا ہوا مجھ سے چند فٹ دور تک آیا اور رک گیا۔ میں نے پہلو بدلا تھا اور اس نے آہٹ سن لی تھی۔

"کون ہے؟ سامنے آجا" اس نے ریوالور کا رخ میری طرف کرکے حکم دیا۔

اگر میں نے فوراً جگہ نہ بدلی ہوتی تو شاید نشانہ لئے بغیر چلائی جانے والی گولی مجھے لگ جاتی۔ اس سے پہلے کہ وہ پھر فائر کرتا، میں نے اس پر جست لگائی۔ لیکن اسے گرانے میں ناکام رہا۔ آخری وقت میں وہ پینترا بدل کے بچ گیا۔ اس نے پلٹ کر پہلے فائر کرنا چاہا اور پھر مجھے بالکل سامنے پاکے ریوالور سے میرے سر پر وار کیا۔ میں نے سر کو بچاتے ہوئے گھوم کر لات ماری جو اس کے پیٹ پر بڑے بھرپور انداز میں لگی۔ وہ بلبلایا اور درد سے دُہرا ہوگیا۔ میں نے اس کی گردن بغل میں دبائی اور ہاتھ سے کلائی تھام کے جھٹکا دیا تو اس کا ریوالور وہیں گرگیا۔ میں نے اسے دبا کے تھوڑی سی دوڑ لگائی اور پھر اسے آزاد کردیا۔ چھوڑنے سے پہلے میں نے اسے یوں دھکیلا کہ وہ اپنی ہی قوت میں سیدھا آگے گیا۔ اس نے خود کو سنبھالنے اور بریک لگانے کی ناکام کوشش کی لیکن خود کو اس درخت سے نہ بچاسکا جو اس کے سامنے آگیا تھا۔ اس کا سر درخت کے تنے پر یوں لگا جیسے کک لگنے سے فٹ بال گول میں نہ جائے اور پول سے ٹکرا جائے۔ اس کا سر پاش پاش ہوگیا۔

میں نے ایک فائر کی آواز اور سنی تھی۔ اب میں جیپ کی طرف متوجہ ہوا تو مجھے وہاں غالب کے ساتھ گل نظر آئی۔ پھر دوسری سمت سے نازو ہاتھ جھاڑتی نمودار ہوئی۔

"تمت بالخیر" میں نے کہا۔

"فنس" نازو نے کہا "بے چارہ بولنے والا طوطا پکڑنے آیا تھا۔"

"تمہارے اس بولنے والے طوطے کو آج میں نے بچالیا" گل نے ریوالور لہرا کے کہا "ورنہ یہ..."

"وہ... دراصل... ایک دم پیچھے آگیا" غالب نے اپنی خفت مٹانے کے لئے کہا "بزدل... سامنے سے آتا تو میں دیکھتا۔"

گل ہنسنے لگی "واقعی۔ بہت بہادر ہیں آپ۔ آج دیکھ لیا میں نے۔ سٹی گم ہوگئی تھی۔ کھڑے تھے بت بنے ہوئے۔"

"میں اسے ہپناٹائز کررہا تھا" غالب نے متانت سے کہا "تم نے خواہ مخواہ گولی چلائی، وہ میرے قدموں میں گرنے ہی والا تھا۔"

"اور درخواست کرنے والا تھا کہ لیجئے، مجھے میرے ریوالور سے قتل فرمایئے" نازو نے طنز سے کہا۔

"چلو اب باتوں کا وقت نہیں ہے" میں نے ڈرائیور کی جگہ بیٹھ کے کہا "بالک رام! ہم تمہارے باپ کے بنائے ہوئے مندر کے اندر جانا چاہتے ہیں۔"

"مندر میں... اس وقت!"

"ہاں۔ ہم جیپ کو دور چھوڑ دیں گے" میں نے جیپ کو اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا اور غالب اور نازو کی چخ چخ کو نظر انداز کردیا۔

"تم اندر کیسے جاؤ گے؟" بالک رام نے مایوسی سے انکار میں سرہلایا۔

"تم آخر کس مرض کی دوا ہو۔ یہ تمہیں سوچنا ہے کہ اندر جانے کے لئے کون سا راستہ محفوظ رہے گا اور کیا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔ ہم تو کچھ بھی نہیں جانتے" میں نے کہا۔

"یہ... بہت مشکل ہوگا..."

"مشکل اور ناممکن۔ ان دو الفاظ کو ہم اپنی ڈکشنری سے خارج کرچکے ہیں" میں نے کہا "ہم آسان کام ویسے بھی پسند نہیں کرتے ورنہ اس وقت یہاں نہ ہوتے۔ کہیں دادِ عیش دے رہے ہوتے۔ عیش کرنا ہمارے اختیار میں تھا۔"

غالب نے پیچھے سے ایک سرد آہ بھری "دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے۔ ورنہ یہ جھوٹ ہے۔ کیوں نازو؟"

"[illegible] مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی" نازو نے بھی آہ بھرے غالب کی تائید کی حالانکہ ایک منٹ پہلے دونوں میں لڑائی جاری تھی۔

میں نے کہا "واہ بھئی، آج تو تم نے بھی ایک پورا مصرع بالکل صحیح پڑھ دیا۔ ہوگیا نہ لاحق تمہیں بھی یہ شاعری کا مرض۔"

"یہ صحبت کی بیماری ہے۔ چھونے سے لگ جاتی ہے" گل نے کہا۔

"یہ جمال ہم نشیں والی بات ہے، جو تم نہیں سمجھوگی" غالب نے کہا۔

"آخر کیوں نہیں سمجھوں گی میں؟"

"اس لئے کہ یہ فارسی ہے" غالب نے کہا۔

"چلو تم اردو میں سمجھادو" گل نے اصرار کیا۔

"شعر نہیں سناتا، مطلب بتادیتا ہوں۔ مٹی سے پھول کی خوشبو آرہی تھی۔ مٹی نے کہا کہ اس میں میرا کمال نہیں، یہ خوشبو اس پھول کا عطیہ ہے جو خاک میں مل گیا۔ اب تم خاک فرض کرلو نازو کو اور گل مجھے۔"

"گل تو میں ہوں" گل ہنسنے لگی "تمہیں گل محمد فرض کرسکتی ہوں۔"

میں نے جیپ کو روک دیا کیونکہ اب مندر کی عمارت کا مخروطی سیاہ ہیولا سو قدم کے فاصلے پر نظر آرہا تھا۔

غالب نے اچانک سنجیدہ ہوکے کہا "سکندر! وہ دو افراد کہاں گئے؟ رابعہ اور محسن۔"

میں نے ابھی تک اس سوال پر ذہن کے سارے دروازے بند کررکھے تھے کیونکہ میرے پاس خود کو مطمئن رکھنے کے لئے بھی جواب کوئی نہیں تھا۔

میں نے کہا "وہ کہاں جاسکتے ہیں" اور غالب کو ٹالنے کی کوشش کی۔

لیکن غالب آسانی سے ٹلنے والا نہیں تھا "میں جانے کی بات نہیں کررہا ہوں۔ ظاہر ہے وہ ہمیں چھوڑ کے نہیں جاسکتے۔"

"لے جائے تو جاسکتے ہیں" نازو نے کہا۔

غالب نے کہا "اور وہ لوٹ کر نہیں آئے تو اس کا مطلب یہی ہوسکتا ہے کہ..."

میں نے اس کی بات کاٹ دی "یار، ہونے کو کیا نہیں ہوسکتا۔ اور میرا ذہن بھی اچھے اور برے ہر قسم کے امکانات سے بے نیاز نہیں ہے۔ مجھے بھی ان کی اتنی ہی فکر ہے جتنی تمہیں۔ لیکن فکر کرنے سے کیا ہوگا؟"

"یعنی ان کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہئے" نازو نے طنزیہ لہجے میں کہا "بھول جانا چاہئے ان کو۔ اگر قسمت نے یاوری کی ہوگا تو مل جائیں گے ورنہ پڑھ لیں گے ان پر فاتحہ..."

"بے وقوفی کی باتیں مت کرو" میں نے برہمی سے کہا۔

"تم کتنی جذباتی بے حسی کے ساتھ کہہ رہے ہو کہ فکر سے کیا ہوگا۔"

"ہاں۔ میں پھر کہتا ہوں کہ فکر کرنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ صرف ہمارا وقت ضائع ہوسکتا ہے اور ہمارا کام رک سکتا ہے" میں نے نازو کو سمجھانے کی کوشش کی جو باقی سب کی طرح جذبات کی رو میں بہہ گئی تھی "اگر وہ آزاد ہیں تو خود ہی کسی وجہ سے نہیں آئے۔ یہ وجہ کیا ہوگی؟ اس کا علم ان سے ملنے کے بعد ہوگا لیکن اندازہ بہرحال کیا جاسکتا ہے کہ وہ کوئی اہم وجہ ہوگی۔ کوئی ایسا کام ہوگا جو فوری توجہ کا طالب ہوگا۔ جسے التوا میں رکھنے کی گنجائش نہیں ہوگی۔ چنانچہ انہوں نے واپسی کا خیال ملتوی کردیا اور اس کام سے انہیں فرصت ہوگی تو وہ خود ہی آجائیں گے۔ انہیں معلوم ہے کہ ہم اس علاقے میں کہیں نہ کہیں مل جائیں گے۔ وہ بھی جانتے ہیں کہ ہم انہیں چھوڑ کے نہیں جاسکتے۔ لیکن بالفرضِ محال وہ دشمن کی قید میں ہیں۔ فکر کرنے سے زیادہ ان کے لئے عملاً کچھ کرنے کی ضرورت ہے اور وہ ہم کررہے ہیں۔ سر ہتھیلی پر رکھ کر ہم یہاں تک آگئے ہیں۔ اب دشمن کے حصار میں داخل ہونے کا مرحلہ ہے۔ یہاں جاکے ہی معلوم ہوگا کہ ہمارے راستے میں کتنی دیواریں حائل ہیں، انہیں کیسے گرایا جاسکتا ہے اور زنجیریں کیسے کاٹی جاسکتی ہیں۔ دشمن کس حد تک قوی ہے اور ہم اپنے محدود وسائل کے ساتھ اس کی طاقت سے کیسے ٹکرا سکتے ہیں۔ شہلا کو اور اس کے بیٹے کو بحفاظت کیسے نکالا جاسکتا ہے۔ یہی ہمارا مقصد ہے۔ اگر تم سب کی رائے ہے کہ پہلے رابعہ اور محسن کو تلاش کیا جائے تو ٹھیک ہے۔ ہم اپنا پلان بدل دیتے ہیں۔ لیکن کوئی مجھے یہ بتائے کہ رابعہ اور محسن کو کہاں جاکے تلاش کریں؟ اگر وہ آزاد ہوئے تو مل جائیں گے لیکن صورتِ حال اس کے برعکس ہوئی تو یہ وقت ضائع ہوجائے گا۔ اتنی دیر میں دشمن کا قافلہ جائے گا۔ وہ شہلا کو بھی ساتھ لے جائیں گے اور... انہیں ہم غبار دیکھتے رہ جائیں گے۔"

میں نے دل کا سارا غبار نکال دیا تھا اور خود بھی [illegible] رہنمائی میں ایک جذباتی بحران سے گزرنے میں کامیاب رہا۔ میں نے ایک واضح، منطقی سوچ کی مدد سے اپنے راستے کا [illegible] کرلیا تھا اور بہت مطمئن محسوس کررہا تھا کہ میں تذبذب اور بے یقینی، قوتِ فیصلہ کی کشمکش اور عدم اعتماد کی دلدل میں [illegible] رکھنے سے پہلے ہی سنبھل گیا۔

نازو اور گل کی صورتوں پر شرمندگی کے آثار بہت [illegible] تھے۔ گل سیدھی سادی لڑکی تھی۔ اس نے اپنی غلطی فوراً تسلیم کرلی۔ "آپ جو کررہے ہیں ٹھیک ہے سکندر بھائی۔ مجھے پورا بھروسا رکھنا چاہئے آپ پر۔"

پھر نازو نے کہا "آئی ایم سوری سکندر، میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ مجھے تم پر اعتماد نہیں رہا یا تم کوئی غلط فیصلہ [illegible] کررہے ہو ہم پر۔"

غالب نے خفت سے سر کھجاکے کہا "ہاں غلطی [illegible] کرسکتا ہے۔"

میں نے کہا "ایسی کی تیسی باس کی۔ نہ میں باس ہوں اور نہ یہ ممکن کہ غلطی نہ کروں۔ تم اختلاف کا حق رکھتے ہو کیونکہ تم سب اتنے ہی اہم ہو جتنا کوئی اور۔ میرا کوئی فیصلہ ذاتی فیصلہ نہیں ہونا چاہئے لیکن اس کے ساتھ ہی تم سے بھی میں ایک رعایت مانگتا ہوں۔ کہ اگر مجھ سے غلطی ہوجائے یا میرے غلط فیصلے سے نقصان ہوجائے تو مجھے معاف کردینا..."

غالب نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا "چل یار، اب جانے بھی دے۔ کیوں اتنا شرمندہ کررہا ہے مجھے سب کے سامنے؟"

میں نے بالک رام کو دیکھا جو احمقوں کی طرح منہ کھولے بیٹھا ہوا یہ ساری گفتگو سن رہا تھا اور اپنی عقل کے گھوڑے دوڑا کر اندازہ کرنے کی کوشش کررہا تھا کہ ہم کس پلان، منصوبے اور مشن۔ کس دشمن اور کس ساتھی کی اسیری و رہائی کی باتیں کررہے تھے۔ اس کے لئے ہم سب کے نام اور چہرے بھی اتنے ہی اجنبی تھے جتنے ہمارے مقاصد پُراسرار تھے۔

میں نے کہا "لالہ جی، اب آگے چلو۔"

بالک رام چونکا "میں نے کہا ہے نا... کہ یہ نہیں ہوسکتا۔"

میں نے کہا "ہمارا تجربہ یہ ہے بالک رام کہ دنیا میں سب کچھ ہوسکتا ہے۔ اور جو کام زر سے نہ بنتے ہوں وہ زور کی مدد سے کئے جاسکتے ہیں۔ انتخاب ہم تم پر چھوڑتے ہیں۔"

"میں... میں کچھ نہیں کرسکتا" اس نے خوف زدہ ہوکے کہا۔

"بالک رام! تم کو اس مندر میں جانے سے کون روک سکتا ہے۔ جو تمہارے باپ کی جاگیر ہے" میں نے ریوالور نکال لیا "تم کیا سمجھتے ہو؟ ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ کہ اس مندر کے پرانے پجاریوں کے ساتھ تم نے کیا سلوک کیا تھا۔ اناتھ آشرم کو تم ہی گودام بنایا تھا۔ مندر میں تمہارے اپنے آدمی ہیں جو پجاری کے بھیس میں تمہارے ایجنٹ ہیں۔"

بالک رام کا رنگ اڑ گیا "آخر... تم کون ہو؟ کیا چاہتے ہو مجھ سے؟ میں نے کیا بگاڑا ہے تمہارا؟ تم نے میرے سب آدمی ماردیئے۔"

میں نے کہا "تم بھی مارے جاتے۔ لیکن تم نے کہا تھا کہ تمہیں ہماری ہر شرط منظور ہوگی۔ ہم کون ہیں، اس کا اندازہ تمہیں اب تک ہوجانا چاہئے..."

"تم... تم جو بھی ہو، بہت خطرناک اور پاگل ہو۔"

میں نے کہا "ہاں۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ ہم مرنے مارنے سے نہیں ڈرتے۔ اور کوئی ہمارے راستے میں رکاوٹ بنے تو اسے ہم کتنی آسانی سے ہٹادیتے ہیں۔ اب بولو، مرنا چاہتے ہو؟"

"بھگوان کے لئے میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ اگر انہیں یہ معلوم ہوگیا کہ میں نے تمہاری مدد کی تھی... تو وہ چھوڑ دیں گے مگر وہ مجھے مار ڈالیں گے" بالک رام رونے لگا۔

"وہ کون؟" میں نے کہا۔

"میں تمہیں کچھ نہیں بتا سکتا، بتادوں تو زندہ نہیں رہ سکتا۔ میں نے اتنا نقصان برداشت کیا، تمہاری ہر بات مانی... آخر کس لئے؟ صرف اس لئے کہ میں مرنا نہیں چاہتا۔"

"ان سب کی زندگی کی کوئی قیمت نہیں تھی جو تمہاری خاطر جان سے گئے؟" غالب نے تلخ لہجے میں کہا۔

"قیمت تھی... ان کو ملتی رہتی تھی۔ باقاعدگی سے..."

"صرف اتنی ہی قیمت ہوتی ہے انسان کی زندگی کی، جتنی اس کی تنخواہ؟"

"اگر یہ قیمت کم تھی، تو انہیں قبول کرنے سے انکار کردینا چاہئے تھا۔ انہوں نے اپنی خوشی سے یہ ذمے داری لی تھی۔ میں نے کوئی زبردستی نہیں کی تھی۔ اور انہیں یہ بھی بتادیا تھا کہ اس کام میں جان بھی جاسکتی ہے۔ انہیں میری حفاظت کرنی ہوگی، مجھے میرے دشمنوں سے بچانا ہوگا۔ دشمن، چور ڈاکو بھی ہوسکتے ہیں۔ جب وہ گولی چلائیں تو یہ گولی مجھ تک نہ پہنچے، یہی ان کی ذمے داری تھی، اسی کا معاوضہ لیتے تھے وہ۔ اپنی مرضی اور خوشی سے... وہ مارے گئے تو یہ ان کی غلطی یا ان کا نصیب تھا۔ آج تک انہوں نے میرے لئے کسی پر گولی نہیں چلائی تھی۔ کتوں کی طرح وہ بھی پل رہے تھے۔ اب انہی کی طرح مارے گئے تو اس میں میرا کیا قصور؟ میں نے یہ سب انتظام اپنی زندگی کی حفاظت کے لئے کیا تھا۔ میں اتنا خرچہ اپنی جان بچانے کے لئے کرتا رہا تھا۔"

میں نے کہا "اس کے باوجود تم موت کے سامنے کیسے بے بس ہو!"

"مجھے جانے دو۔ میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔ کوئی رپورٹ درج نہیں کراؤں گا۔ کسی کا نام نہیں لوں گا... کہوں گا کہ ڈاکو آئے تھے، سب کو مار گئے... ہاں، میں تمہیں ایک طریقہ بتاسکتا ہوں۔ ایک آدمی تم کو اندر لے جاسکتا ہے، بہت لالچی آدمی ہے۔"

"وہ کون ہے؟"

"پروہت... راما راؤ۔ پیسے کے لئے وہ بھگوان کو بھی بیچ دے۔"

میں نے کہا "بھگوان کا ہم کیا کریں گے، ہمارے لئے ایک خدا بہت ہے۔"

وہ ایک دم چونکا "تم... مسلے ہو!"

میں نے کہا "الحمدللہ۔ ہم سب مسلمان ہیں۔ تم کو اب تک اندازہ ہو جانا چاہئے تھا۔ ہمارے ناموں سے۔"

"تم... بھگوان کے استھان کو بھرشٹ کرو گے۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا، میں ایسا نہیں کر سکتا۔"

میں نے ریوالور اس کے سینے پر رکھ کے کہا "بھگوان کے بھگت، یہ ہم جانتے ہیں کہ کیا ہو سکتا ہے اور کیا نہیں ہو سکتا۔"

"میں.... میں سمجھ گیا تم کون ہو۔ تم وہی پاکستانی ایجنٹ ہو" بالک رام نے بڑی مشکل سے کہا "میں بھی مورکھ ہوں، اتنی دیر سے سمجھا۔"

"نہیں لالہ! تم اب بھی نہیں سمجھے" میں نے کہا "ہمارا وقت برباد مت کرو۔ ہمیں راستہ دکھاؤ۔ آگے چلو۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "تم مار دو مجھے۔ جب مرنا ہی ہے تو یہ پاپ کر کے کیا مرنا۔ آج نہیں تو کل مجھے غدار سمجھنے والے زیادہ تکلیف دے کر ماریں گے۔ میں دیش کے دشمنوں کے ہاتھوں مرنا پسند کروں گا۔"

میں نے کہا "تمہاری مرضی۔ میں دس تک گنوں گا۔"

"اس کی کوئی ضرورت نہیں" وہ بولا۔

ایک بے ضمیر، بدکردار اور گناہ گار آدمی اچانک اپنے دھرم اور اپنے وطن کی خاطر جان دینے پر تیار ہو گیا تھا۔ یہ جذباتی دیوانگی تھی یا خوف کی انتہا کا رد عمل۔ لیکن آخری وقت میں بالک رام بہادر ہو گیا تھا۔ میں نے دس تک گن کر کسی تذبذب کے بغیر اس کے سر کا نشانہ لیا اور گولی چلا دی۔ وہ بالکل سیدھا کھڑا رہا اور زیر لب کچھ بڑبڑاتا رہا۔ جب میں دس پر پہنچا تو اس نے کہا "جے دھرتی ماتا" اور نیچے گر گیا۔ اس کا خون زمین پی گئی۔

"کیسی عجیب بات ہے؟" غالب نے افسوس سے کہا "اس شخص کے کردار میں اچانک اتنی بڑی تبدیلی آ گئی۔"

میں نے کہا "کیا تمہیں ڈاکو شیش ناگ یاد نہیں۔ اس نے اپنے وطن کی خاطر جان دے دی تھی۔ ایک ڈاکو کتنا بڑا محب وطن ثابت ہوا تھا اور پھر محمد خان۔"

"اپنی ساری زندگی کے جرائم اور سب گناہوں۔ کردار کی ساری خامیوں کے باوجود شیش ناگ، محمد خان اور بالک رام کی موت دلاور اور تریوینی جیسے لوگوں کی زندگی سے ہزار درجہ بہتر ہے۔"

سائیلنسر والے پستول کے فائر کی آواز بہت کم رہی تھی۔ تعجب مجھے بالک رام کی خاموشی پر ہوا۔ اگر وہ چاہتا تو مرنے سے پہلے چلا بھی سکتا تھا مگر اس نے تو مرتے وقت بھی آواز نہ نکالی تھی۔ گل قدرے افسردہ سی بالک رام کی لاش کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے بھائی ڈاکو شیش ناگ کا حوالہ دے کر میں نے اسے زیادہ ملول کر دیا تھا۔ خود نازو کے لئے آخری وقت میں بالک رام کا موت کو گلے لگانا حیرت سے زیادہ صدمے کا سبب بن گیا تھا۔ ہم آہستہ آہستہ مندر کی جانب چلنے لگے۔

"بے وقوف، مرنا تھا تو پہلے ہی مر جاتا" نازو نے کہا...

میں نے کہا "یہ وقت اور جگہ کا مسئلہ ہے بی بی۔ فیصلہ کوئی اور کرتا ہے۔"

غالب نے کہا "آدمی بہرحال احمق تھا کہ مرنے سے پہلے ایک راستہ دکھا گیا اور پھر مر گیا۔ نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم۔"

میں نے کلائی کی گھڑی دیکھی تو صبح کے چار بجنے والے تھے۔ "مڈگیٹ کا راستہ پروہت جی سے پوچھتے ہیں" میں نے کہا۔

"پروہت جی سو رہے ہوں گے" غالب نے کہا۔

"یہ دیویاں انہیں جگا دیں گی۔ انہیں دیکھ کر تو مردے آنکھیں کھول کر اٹھ بیٹھے" میں نے کہا "وہ دیکھتے رہ جائیں گے۔"

"اور پھر مندر کا ہی نہیں دل کا دروازہ بھی فوراً کھول دیں گے۔ اگر اندھے نہ ہوئے" غالب نے کہا۔

نازو نے گل کی طرف اور گل نے نازو کی طرف دیکھا۔ "تعریف کر رہے ہو ہماری یا...." نازو بولی۔

"یا بے وقوف بنا رہے ہو ہمیں؟" گل نے کہا۔

میں نے کہا "اب دیر مت کرو۔ سورج نکلنے سے پہلے پجاری آنے لگیں گے۔"

نازو نے کہا "راماراؤ کچھ مدراسی قسم کا نام لگتا ہے۔"

غالب نے کہا "کوئی بات نہیں۔ سب سے پہلے کہنا ہاتھ جوڑ کے۔ پھر اسے ترچھی نظر سے مسکرا کے دیکھنا۔ جس نے مجھے کبھی نہیں دیکھا... جب وہ پاگل ہو جائے میری طرح۔"

"فضول باتیں مت کرو" نازو نے شوخی اور خفگی کے ساتھ گل کا ہاتھ پکڑ کے مندر کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

میں نے پیچھے چلتے ہوئے کہا "ڈرنا مت، ہم ساتھ ہیں تمہارے۔ پروہت جی سے ہم خود نمٹ لیں گے۔"

مندر کے بیرونی احاطے میں پتھروں سے بنی ہوئی چار دیواری تھی جس میں ایک جگہ آٹھ دس فٹ تک کچھ نہیں تھا۔ یہ اندر جانے کا راستہ تھا۔ وسیع احاطے کے دونوں جانب گائیں پھر رہی تھیں۔ یہ غالباً مندر کی ملکیت تھیں۔ گائے ایک مقدس جانور سمجھی جاتی تھی چنانچہ یہاں بھی انہیں رسی سے باندھنے کا پاپ کوئی نہیں کر سکتا تھا۔

درمیان سے سیدھا مندر کے دروازے تک جانے والا راستہ بھی سنسان پڑا ہوا تھا۔ مندر کے عقبی حصے میں دیا جل رہا تھا۔ پیچھے روشنی نظر آ رہی تھی۔ وہ شاید پرانا یتیم خانہ تھا جو گودام کے طور پر استعمال ہو رہا تھا۔ پروہت کی رہائش گاہ احاطے میں دائیں جانب تھی۔

غالب نے چلتے چلتے کہا "یار، یہاں اتنی خاموشی کیوں ہے۔"

میں نے کہا "سب سو رہے ہیں اس لئے۔"

غالب نے کہا "کسی کو تشویش نہیں کہ دشمنوں کی سرکوبی کے لئے جو لشکر بھیجا گیا تھا اس کا کیا ہوا۔"

"لشکر بھیجنے والے مطمئن ہیں کہ لشکر کو کچھ نہیں ہو سکتا۔ اتنے بہت سے مسلح افراد کا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے۔"

"انہوں نے فائرنگ کی آوازیں تو سنی ہوں گی۔"

"ہاں۔ مگر اس میں بھی تشویش کی کوئی بات نہیں ان کے لئے۔ وہ فرض کیے بیٹھے ہوں گے کہ سب دشمن ہلاک کر دیے گئے چنانچہ اب خاموشی ہے۔ فاتح لشکر واپس آتا ہی ہوگا" میں نے سرگوشی میں کہا۔

نازو نے پلٹ کے کہا "اب بند کرو اپنی باتیں۔"

غالب نے سینے پر ہاتھ رکھ کے کہا "مگر میں تمہاری ہی باتیں کر رہا تھا۔"

ہم مندر کی طرف جانے والے راستے سے ہٹ کر دائیں جانب آخری حصے میں پہنچے۔ میں نے اور غالب نے ایک دروازے کے دونوں جانب پوزیشن سنبھال لی اور ہم مندر کی دیوار کے ساتھ چمٹ کر کھڑے ہو گئے تو نازو نے لوہے کی زنجیر والی کنڈی ہلائی۔ دروازے کے نیچے سے نظر آنے والی مدھم روشنی یہ ظاہر کرتی تھی کہ اندر کوئی جاگ رہا ہے۔ گل اور نازو مقامی لباس میں تھیں چنانچہ پروہت کو ان پر کوئی شک نہیں ہو سکتا تھا۔

نازو نے دوسری بار زیادہ زور سے کنڈی بجائی تو اندر سے وہی آواز آئی۔ اڑم ڈھم کڑم گم گڑم... مدراسی زبان نہ جانے کیوں مجھے ایسی ہی لگتی تھی۔ پروہت نے غالباً پوچھا تھا کہ آدھی رات کو یہ کون نامعقول دروازہ توڑ رہا ہے۔ پھر اس نے دروازہ کھولا اور مزید ڈم گڑم کی۔ اس کے لہجے میں خاصی بے زاری تھی جو نازو اور گل پر نگاہ پڑتے ہی دلچسپی میں بدل گئی۔ حسب ہدایت نازو نے ہاتھ جوڑ کے پرنام کیا اور مسکرا کے کہا "وڑکم راماراؤ جی۔"

ظاہر ہے اتنی محبت سے کسی کا نام نازو جیسی لڑکی لے تو وہ کیا کرے گا۔ راماراؤ جی بھی ریشہ خطمی ہو گئے۔ اسے اپنی ہم زبان سمجھتے ہوئے انہوں نے بے حساب مدراسی داغ دی اور دروازہ پورا کھول دیا۔ اس کا مطلب کچھ بھی لیا جا سکتا تھا۔ مثلاً یہ کہ خوش آمدید۔ چشم ما روشن دل ماشاد۔ تم میں سے کون پری ہے اور کون حور۔ کون کوہ قاف سے اتری ہے اور کون آسمان سے۔ عدم کا ایک شعر جو حسب حال تھا مجھے بہت وقت پر یاد آیا۔

بال بکھرائے سونی قبروں پر۔ جب کوئی مہ جبین روتی ہے
مجھ کو اکثر خیال آتا ہے۔ موت کتنی حسین ہوتی ہے

تو بے چارہ پروہت بھی کیسے اندازہ کر سکتا تھا کہ موت کتنی حسین ہوتی ہے۔ وہ اس پر بہت حیران ہوگا کہ آنکھ کھلتے ہی بھگوان نے کیسی صورتیں دکھائی ہیں اور یہ کیا طلسم ہے کہ اس بستی میں یہ اجنبی حسینان خوش اطوار جو پہلے کبھی نظر نہیں آئیں، اس کے نام سے بھی واقف ہیں۔ وہ چاہتا تھا کہ نازو اور گل بھی کچھ بولیں مگر ان کی تو ترکی تمام ہو گئی تھی، وہ کیا بولتیں؟ انہیں شدھ ہندی میں اپنا تعارف کرانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ ان کے ساتھ ہی ہم نے بھی اندر قدم رنجہ فرمایا۔ ایسے کہ پروہت کی آنکھیں جو ایک حسین خواب دیکھ رہی تھیں، دوسرے ہی لمحے ایک بھیانک خواب میں الجھ گئیں۔

وہ ریوالور کی شکل دیکھ کر گھگھیانے لگا "ارے... ارے گولی... گولی مت چلانا جی۔ مر جائیں گا اپن۔"

میں نے اپنے پیچھے دروازہ بند کر دیا "تم بھی شور مت مچانا جی۔"

اس کے دانت ایسے بج رہے تھے جیسے کڑاکے کا جاڑا پڑ رہا ہو۔ وہ سوتے سے اٹھا تھا چنانچہ صرف دھوتی میں تھا۔ اوپر گلے میں جینو کے سوا کچھ نہیں تھا۔ تاہم میں نے یہ نوٹ کیا کہ نہ وہ کوئی عمر رسیدہ آدمی تھا اور نہ ہی اس کی توند عام پنڈتوں کی طرح حلوے مانڈے کھانے سے پھولی ہوئی تھی۔ وہ جوان آدمی تھا اور اس کی کاٹھی مضبوط تھی۔ ظاہر ہے اسے بالک رام نے جس کام کے لئے رکھا تھا وہ کوئی بوڑھا، کمزور اور بزدل آدمی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا گھگھیانا اور خوف سے کانپنا مجھے اداکاری لگا۔ وہ ایک دھوکے باز تھا، یہ بات تو ہمیں پہلے سے معلوم تھی۔ اس کے طرز رہائش کو دیکھ کر مجھے یقین آنے لگا کہ وہ پروہت کے بھیس میں ایک مجرمانہ زندگی گزار رہا ہے۔ اس کے بیڈ روم میں کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ زیب و زینت اور عیاشی کے اسباب کا ایک پروہت کی فقیرانہ زندگی سے کیا تعلق؟ مگر یہاں کے پردے، قالین اور فرنیچر سب بیش قیمت تھے۔ بیڈ سائیڈ ٹیبل پر شیشے کے جام رکھے ہوئے تھے۔ میں نے انہیں سونگھا تو اسکاچ وھسکی کی بو آئی۔ بیڈ پر واہیات قسم کے انگریزی رسالے بکھرے ہوئے تھے۔

جب میں نے الماری کی طرف ہاتھ بڑھایا تو وہ بلبلانے لگا۔

"اجی کیا ہے اس میں۔ سونا گہنا نئیں ملیں گا جی۔"

میں نے غالب سے کہا "اس کتے کی زبان بند رکھ۔"

وہ اچھلا "کتا بولے۔ آپ کتا بولے جی میرے کو۔"

غالب نے اسے تخت پر بٹھا دیا اور نازو کے سپرد کر دیا "یہ پھر بولے نا جی۔ تو اس کی منڈی مروڑ دینا جی۔"

نازو نے بھی اس کی نقل اتاری "منڈی مروڑنے سے پنڈت مر جائیں گا۔ ایک دم مر جائیں گا جی۔"

میں نے الماری میں سے اسکاچ وھسکی برآمد کی۔ ایک بوتل آدھی استعمال شدہ تھی۔ دوسری مہر بند رکھی تھی۔

"مسٹر راماراؤ! اسٹاپ دس نان سنس" میں نے بوتل اٹھا کر کہا "ورنہ...."

راماراؤ کا رویہ ایک دم بدل گیا "ورنہ کیا؟ دھمکی دیتے ہو مجھے!" اس نے صاف انگریزی میں کہا "کون ہو آخر تم لوگ؟ جو اس طرح ہنومان جی کے مندر میں ڈاکو بن کے گھس آئے، یہ بالک رام جی کا مندر ہے۔"

میں نے کہا "ڈاکو تو بہت پہلے مندر میں گھس گئے تھے۔ آج ہم ان ڈاکوؤں سے تمہارے ہنومان جی کو نجات دلانے آئے ہیں۔"

غالب نے کہا "تمہارا کھیل ختم ہوا۔ بالک رام کی آتما اس وقت نرک میں ہوگی۔ اس نے مرنے سے پہلے سب کچھ قبول...

کرلیا تھا۔"

میں نے کہا "اگر وہ ہم سے تعاون کرتا تو مارا نہ جاتا۔"

راما راؤ نے مجھے گھورتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا "تم جھوٹ بولتے ہو۔"

میں نے اسے گردن پکڑ کے اٹھالیا اور دروازے کی طرف لپکا "چلو پھر سچ خود اس کی لاش سے معلوم کرلو۔"

غالب نے کہا "اگر اس کی لاش کو دیکھنے کے بعد بھی تمہارا شک دور نہ ہوا تو پھر تم اپنی لاش دیکھو گے۔"

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا "کیا چاہتے ہو تم مجھ سے؟"

میں نے کہا "تعاون؟"

"کس قسم کا تعاون؟"

"بالک رام نے مرنے سے پہلے ایک سچ بولا تھا" میں نے کہا۔ "کہ تم پیسے کے لئے بھگوان بھی بیچ سکتے ہو۔ تم ہوش سے کام لو تو ایک فائدے کا سودا کرسکتے ہو جس میں تمہاری زندگی بھی محفوظ ہوگی اور تمہارے لئے تعاون کا نقد معاوضہ الگ ہوگا۔ پورے ایک لاکھ۔"

وہ انگریزی بھی مدراس کے لہجے میں جھٹکے دے کر اپنے حلق سے برآمد کررہا تھا مگر صاف ظاہر تھا کہ ہندی میں وہ اتنی روانی سے بات نہیں کرسکتا۔ اس نے میری بات پر غور کرنے کے بعد کہا "معاوضے سے پہلے کام کی نوعیت معلوم ہونی چاہئے" اس نے باری باری کل اور تازو کی طرف دیکھا "کیا تم ان دونوں کو بھگا کر لائے ہو؟ اور بیاہ کرنا چاہتے ہو ان سے مندر میں؟"

میں نے کہا "جب ہم بیاہ کریں گے کسی سے تو تمہیں تکلیف نہیں دیں گے۔ ہمارا مسئلہ مختلف ہے۔ آسان کام ہوتا تو معاوضہ بھی کم ہوتا لیکن ایک لاکھ کم نہیں ہوتے۔"

"میں نہیں سمجھتا کہ تم میں سے کسی کے پاس اتنی رقم ہو..."

میں نے اس کے منہ پر چانٹا مارا "تم نے جھوٹا کہا ہے مجھے۔ پھر ایسی غلطی مت کرنا۔ ہم دو مرتبہ خبردار نہیں کرتے۔"

غالب نے کہا "پیسہ ہمارے لئے ہاتھ کا میل ہے۔ لیکن عزت کے لئے ہم اکثر جان کی بازی لگاتے رہتے ہیں۔ ہم نے قتل کرچکے ہیں اب تک؟"

میں نے سوچ کے کہا "ننانوے۔"

غالب نے کہا "اگر پنڈت نے پھر کوئی غلط بات کی تو سینچری ہوجائے گی۔"

میرے اشارے پر غالب نے بیلٹ کھولی اور اس میں سے وہ ایک لاکھ روپے نکالے جو بھیگنے کے بعد خشک ہوچکے تھے "یہ اصلی نوٹ ہیں اور بالکل پاک صاف۔ دھو کر لائے ہیں گنگا جل میں۔ کیونکہ یہ مالِ حرام تھا۔"

"پنڈت جی حرام حلال کا فرق باہر رکھتے ہیں۔ یہ اندر کا معاملہ ہے۔ آپس کی بات ہے" غالب نے دوستانہ لہجے میں کہا۔

راما راؤ نے ایک لاکھ کے نوٹوں کا بے یقینی کے ساتھ معائنہ کیا اور ہر گڈی کے کسی ایک نوٹ کو روشنی کے رخ کیا۔ اس کی آنکھوں میں لالچ کی چمک پیدا ہوئی۔ آہستہ آہستہ کے چہرے کی معاندانہ کینگی اور کشیدگی کم ہونے لگی۔ ایک گہری سانس لے کر نوٹ تخت پر رکھ دیئے۔

"میں نے تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ تم کون لوگ کہاں سے آئے ہو؟" راما راؤ نے کہا "یہ عورتیں..."

میں نے کہا "یہ سب سوالات غیر ضروری ہیں۔ ہم جواب نہیں دیں گے۔"

راما راؤ نے چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد کہا "تم ... نہیں ہو۔"

غالب نے کہا "مگر تم ڈاکو بھی ہو۔ پروہت ہونے کے ساتھ یہ تمہاری اضافی کوالی فکیشن ہے۔"

"میں تم پر کیسے بھروسا کرسکتا ہوں..."

میں نے کہا "اور تم کیا کرسکتے ہو آخر۔ تمہارے پاس چوائس کہاں ہے۔"

"اگر اعتبار کروگے تو رسک ختم ہوجائے گا۔ ہم اگر ... کرلیں تو نبھاتے ہیں۔ تم آزمالو۔" ... بولا۔

"اوکے۔ ایک لاکھ کے بدلے مجھے کیا کرنا ہوگا؟" اس نے آدھی بھری ہوئی شراب کی بوتل اٹھالی "پیو گے؟"

میں نے بوتل اس کے ہاتھ سے لے لی "ہم نہ پئیں گے، نہ پینے دیں گے۔ پہلے کام کی بات کریں گے۔"

اس نے حسرت سے بوتل کو دیکھا "مجھے اس کی ... تھی۔"

"صبح اٹھتے ہی!" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "بھگوان کا نام لینے سے پہلے؟"

وہ شرمندہ ہوئے بغیر بولا "ہر روز میں ایسا نہیں کرتا۔ ہر روز کوئی بھی مجھے اس طرح بیدار کرکے میرے سامنے ... نہیں لاتا۔ ایک لاکھ دیکھ کے بھی میرے اعصاب ... ہوئے ہیں۔"

میں نے بوتل اسے دے کر تعاون کے جذبے کو ...

"اس مندر سے ملحق ایک گودام ہے جو پہلے اناتھ آشرم تھا..." اس نے گلاس کو آدھا بھرا اور خالی کردیا۔

"اس گودام میں کس قسم کا مال آتا ہے؟"

"ہر قسم کا مال۔ جو سب غیر قانونی ہوتا ہے۔ اسمگلنگ کے ذریعے لایا جاتا ہے اور بلیک مارکیٹ میں فروخت ہوتا ہے۔"

"مثلاً؟"

"یہ شراب چھ مہینے پہلے آئی تھی۔ اس کے بعد..."

"خاموش کیوں ہوگئے؟ آج کل کیا آرہا ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم" وہ ہونٹوں پر زبان پھیر کے بولا۔

"تم تعاون نہیں کررہے ہو" میں نے کہا۔

"یہ حقیقت ہے۔ اب میں ادھر نہیں جاسکتا۔ مجھ پر یہ پابندی کس لئے لگائی گئی ہے مجھ پر۔ میں انہی کے لئے دنیا کو دھوکا دیتا ہوں۔ ان کا اعتبار قائم رکھتا ہوں۔ وہ پھر بھی مجھ پر بھروسا نہیں کرتے" اس نے شکایتی لہجے میں کہا "پھر ... شراب کا حلق میں انڈیلا۔

مزید ... "ممکن ہے انہیں تم سے زیادہ قابلِ اعتماد لوگ مل گئے ہوں۔ تمہاری ذمے داری محدود ہوگئی ہے" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "یہ احساس تمہیں کب ہوا کہ انہوں نے تم پر بھروسا کرنا چھوڑ دیا ہے۔"

"اس کتے کے بچے ملہوترہ نے مجھ سے کہا کہ پروہت تیرا ادھر کوئی کام نہیں۔ اگر پھر قدم رکھا تو نے گودام میں... تو ٹانگیں توڑ دوں گا تیری" پروہت پر خالی پیٹ پینے سے نشہ طاری ہونے لگا تھا "اور ایک دن ایسا بھی ہوا۔ انہوں نے مجھے مارا۔ اس کے کتے مجھ پر ٹوٹ پڑے۔"

میں نے کہا "آج کل وہ ایک خطرناک کھیل میں ملوث تھا، چنانچہ مارا گیا۔ اس کے سب کتے بھی مارے گئے۔ وہاں۔ اس کے گھر میں۔"

پروہت کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں "تم نے اس کے گھر پر حملہ کیا تھا؟ کتنے لوگ تھے تمہارے ساتھ۔"

"بس یہی لوگ تھے۔ اپنے ساتھی" میں نے کہا۔

"تم اس کے مخالف گروہ کے لوگ ہو؟ اسمگلر ایک دوسرے کے ساتھی بھی ہوتے ہیں۔ مگر دشمن بھی ہوجاتے ہیں اگر معاملات بگڑ جائیں۔" پروہت نے کہا "اگر تم نے واقعی سب کو ماردیا ہے تو پھر تم باس ہو۔ رائٹ؟"

"رائٹ قاعدہ یہی ہے۔ جو زبردست ہو وہی باس ہوتا ہے۔ مائٹ از رائٹ" میں نے کہا "ہم اس فلسفے کے قائل نہیں تھے۔ اب ہوگئے ہیں۔ لیکن ایک تصحیح ضروری ہے۔ ہم اسمگلر نہیں ہیں۔"

"تم اسمگلر نہیں ہو؟" اس نے زیرِ لب میرے الفاظ دہرائے "پھر کون ہو تم؟ سیکرٹ ایجنٹ زیرو زیرو سیون۔ جیمز بانڈ" وہ اپنی بات پر خود ہی ہنسنے لگا۔

میں نے اس کے پاس سے بوتل ہٹالی "اب تم ضرورت کا بہانہ نہیں کرسکتے۔ تم ضرورت سے کہیں زیادہ پی چکے ہو۔ سنجیدگی سے بات نہیں کررہے ہو۔"

"میں بالکل سنجیدہ ہوں" اس نے کہا "میں نے بھروسا کیا ہے تم پر کہ تم مجھ سے جھوٹ نہیں بول رہے ہو، تم قول دے کر پھرنے والے نہیں ہو۔ تم بالک رام کے دشمن ہو۔ میرے نہیں۔ تم مجھے مارو گے نہیں اور اگر میں نے تم سے تعاون کیا تو یہ ایک لاکھ مجھے ضرور دو گے۔ یہ سب طے ہے؟"

میں نے کہا "ان سب معاملات پر ہمارے درمیان اتفاق ہوچکا ہے۔"

"جب ہم ایک دوسرے پر بھروسا کرسکتے ہیں تو ایک دوسرے کے دوست سمجھے جاسکتے ہیں" وہ بولا۔

میں نے کہا "ہاں۔ سمجھے جاسکتے ہیں لیکن یہ عارضی دوستی کا رشتہ ہے۔"

"ہر رشتہ عارضی ہوتا ہے" اس نے ایک فلسفیانہ بات کی۔ "خون کا۔ زمین کا۔ زندگی کا اور کاروبار کا۔"

غالب نے اسے حیرانی سے دیکھا "تم تعلیم یافتہ ہو؟"

اس نے سرہلایا "اعلیٰ تعلیم یافتہ۔ سوشیالوجی اور سائیکالوجی میں ڈبل ایم اے۔ مدراس یونیورسٹی۔ فرسٹ کلاس گولڈ میڈلسٹ۔"

"اور تم... یہ کام کررہے ہو!"

"اور کیا کروں؟ کلرکی کروں؟ سفارش کے بغیر وہ بھی نہیں ملتی... مزدوری میں کر نہیں سکتا۔ لیکچرشپ کے لئے میں نااہل قرار دے دیا گیا کیونکہ میں ایک خطرناک ذہن رکھتا تھا اور اپنے باغیانہ خیالات سے طلبا کو ملحد اور گمراہ کررہا تھا۔ ابھی یہاں سوچ آزاد نہیں ہے۔ آپ وہ نہیں کہہ سکتے جو آپ کہنا چاہتے ہیں۔ معاشرہ، مذہب یا ریاست۔ کسی نہ کسی کی نظر میں آپ مجرم ہوجائیں گے۔ ان کے دائرے ہیں۔ حد بندیاں ہیں۔ آپ کو اس میں رہنا پڑے گا۔ نہ آپ ان حدود سے تجاوز کرسکتے ہیں نہ انہیں غلط قرار دے سکتے ہیں۔ میں اس معاشرے کی کمزوریوں سے واقف تھا۔ انسانی نفسیات کو سمجھتا تھا۔ میں نے اپنی ذہانت سے کام لیتے ہوئے بروقت سیدھے راستے کو ترک کردیا۔ اگر میں سیدھے راستے پر چلتا رہتا تو پردک پہنچ جاتا۔ یا پہنچا ... میں نے وہ راستہ اختیار کیا جو دس فیصد عقلمند استعمال کرتے ہیں۔ استحصال کا راستہ۔ چور ڈاکو۔ اسمگلر۔ سیاست داں۔ پیر۔ فقیر۔ جوگی درویش۔ سب نوے فیصد کم عقل نا سمجھ اور ان پڑھ انسانوں کو لوٹتے ہیں۔ باتوں سے۔ وعدوں سے۔ ریوالور سے۔"

اگر میں اسے نہ ٹوکتا تو وہ بولتا رہتا۔ میں نے کہا "راما راؤ! تم نشے میں ہو۔ میں نے غلطی کی جو تم کو پینے کی اجازت دے دی۔"

"تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ میں نشے میں ہوں؟"

"اس لئے کہ تم خالص سچ بول رہے ہو۔ جو آدمی ہوش میں نہیں بولتا" میں نے کہا "اس نشے سے نجات پانے کی کوئی صورت ہے؟"

"دیکھو، اب تم دوست ہو۔ عارضی ہی سہی۔ دوست ہو تو میرے مہمان ہو۔ یہ گھر تمہارا ہے" اس نے آواز کی لکنت پر قابو پا کے کہا۔

"کیا تمہارے گھر میں ہم محفوظ ہیں؟"

"بالکل محفوظ ہو تم۔ ادھر کوئی نہیں آسکتا۔ یہ میرا پرائیویٹ علاقہ ہے۔"

میں نے کہا "صبح ہونے والی ہے۔ لوگ پوجا پاٹ کے لئے آئیں گے۔"

"وہ ادھر جائیں گے، ہنومان جی کے پاس۔"

"کیا ہم آج کا دن یہاں گزار سکتے ہیں؟ اس طرح کہ کسی کو شک نہ ہو" میں نے کہا۔

وہ سوچ میں پڑ گیا "اگر تم نے ان سب کو مار دیا ہے۔ تو ظاہر ہے یہ بات چھپی نہیں رہ سکتی اور جب لاشیں ملیں گی تو بہت ہنگامہ ہوگا۔"

"اسی لئے ہمارا آج کے دن یہاں چھپے رہنا ضروری ہے۔ ہمارے لئے بھی سب سے محفوظ جگہ بھگوان کے ایک سیوک کا گھر ہی ہو سکتی ہے۔ ہم فرار ہو کے کہیں بھی جاتے پکڑ لئے جاتے۔"

"میرا خیال ہے کہ ادھر کوئی نہیں آئے گا۔ لیکن آیا تو میں تمہیں بچا لوں گا" اس نے بالآخر فیصلہ کر لیا۔

غالب نے کہا "کیسے بچاؤ گے؟ اگر وہ گھر کے اندر آ گئے۔"

"گھر کے اندر کوئی کچھ نہیں دیکھ سکتا۔ میں جانتا ہوں ہر ایسی جگہ کو جہاں تم کچھ دیر او جھل رہ سکتے ہو" وہ بولا۔

"ایک بات میں صاف صاف بتا دوں۔ اگر کوئی اندر آیا یا ہماری یہاں موجودگی کا راز افشا ہو جانے کا خطرہ پیدا ہوا تو یہ ناممکن ہوگا کہ کوئی ہمیں گرفتار کر لے۔ ہم مقابلہ کریں گے، جو اندر آیا اسے مار دیں گے۔"

"تمہیں سب سے پہلے ماریں گے" غالب نے کہا۔

"آخر میں ہم خود بھی مارے جائیں گے۔ اچھا ہے اگر اتنا خون خرابہ تمہارے گھر میں نہ ہو۔ بیس پچیس لاشیں ضرور گریں گی۔ خون سے تمہارا یہ صاف ستھرا، خوبصورت گھر خراب ہو جائے گا" میں نے کہا۔

"مجھے بلاوجہ دہشت زدہ مت کرو" پروہت بولا "جب میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ اندر کوئی نہیں آئے گا تو تم یقین کیوں نہیں کرتے۔ میری ذات شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ کوئی میرے دروازے تک یہ پوچھنے آ جائے گا کہ کسی ایسے ویسے شخص کو ادھر آتے تو نہیں دیکھا۔ ایسے ویسے کا مطلب ہے تم جیسے۔ میرا انکار کر دینا ہی کافی ہوگا۔"

"اگر پولیس ہوگی تو اندر آ کے دیکھے گی۔"

"اول تو یہ مشکل ہے۔ لیکن ایسا ہوا تب بھی وہ ناکام ہو جائیں گے۔ وہ زیادہ سے زیادہ گھر میں ایک نظر ڈالیں گے اور بس۔ مجھ پر بھروسا رکھو۔ میں تم کو چھپا سکتا ہوں۔"

"اوکے۔ اب میں مطمئن ہوں۔ باقی باتیں ہم بعد میں کریں گے۔ رات بھر جاگنے سے ہماری حالت خراب ہو رہی ہے۔ اور یہ صرف جاگنا ہی نہیں تھا، ہم بڑے جان لیوا مراحل سے گزر کے آئے تھے۔"

"دونوں لڑکیاں بہت تھکی ہوئی تھیں۔ اسی لئے سو گئی ہیں" راماراؤ نے کہا۔

میں نے پلٹ کے دیکھا۔ گل اور نازو بیڈ پر بیٹھی تھیں۔ پھر وہیں گر کر سو گئی تھیں، اس طرح کہ...... ان کے پیر اب بھی بیڈ سے نیچے لٹکے ہوئے تھے۔

"اتنی خوبصورت لڑکیاں کہاں سے ملیں تمہیں؟"

میں نے کہا "راماراؤ! تم کو ان لڑکیوں کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے بہت محتاط رہنا ہوگا۔ ہم ان کے لئے ذرا مختلف قسم کے جذبات رکھتے ہیں۔"

"مختلف کیسے؟"

"ہمارے لئے وہ ایک یقین اور اعتماد کی علامت ہیں۔ ایک مقدس امانت ہیں۔ کردار کے احترام اور رشتوں کے تقدس کی ضمانت ہیں۔ ممکن ہے تمہاری سمجھ میں یہ بات نہ آئے۔"

"تم ان سے محبت کرتے ہو؟"

"تم شاید محبت کے عام مفہوم کا حوالہ دے رہے ہو۔ فلموں اور ناولوں والی محبت یا وہ محبت جو اس عمر میں کسی بھی لڑکی یا لڑکے کو ہو جاتی ہے۔ کسی بھی پڑوسی، کلاس فیلو یا کزن سے۔ ایک سستا لفظ بن گئی ہے محبت۔ یہ اس سے بہت اعلیٰ و ارفع جذبہ ہے۔ ہم اس کی توہین برداشت نہیں کر سکتے" میں نے کہا۔

"یہ بات میں سمجھا تو نہیں۔ لیکن خیال رکھوں گا۔ اب تم زبردستی میرے مہمان بن گئے ہو تو میرا بھی فرض بنتا ہے کہ تمہارے لئے کچھ کروں۔"

"ہم پے اِنگ گیسٹ ہیں۔ جو کچھ تم کرو گے اس کا معاوضہ دنیا کے سب سے مہنگے، فائیو اسٹار ہوٹل کے ریٹ پر دیں گے" غالب نے کہا۔

"میں ایک برہمن ہوں" وہ آنکھ مار کے بولا "اپنا کھانا خود پکاتا ہوں۔ دراصل میں نہیں چاہتا کہ خواہ مخواہ خدمت کے لئے اس بستی کی سب بدصورت بوڑھیاں مجھ پر مسلط ہو جائیں۔"

میں نے کہا "کیا جوان اور حسین خادمہ نہیں ملتی؟"

وہ پھر آنکھ مار کے مسکرایا "ملنے کو سب کچھ ملتا ہے۔ مگر دنیا کے سامنے پردہ تو رکھنا ہی پڑتا ہے ایک پروہت کو۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ میرا یہ کوارٹر بالکل آخری حصے میں ہے اور اس کا ایک راستہ پیچھے کی طرف بھی کھلتا ہے۔"

"ہمیں معلوم ہوا تھا کہ مندر کے پیچھے سے نہ کوئی گزر سکتا ہے اور نہ کوئی وہاں کاشت کر سکتا ہے۔"

"ادھر پرندہ پر نہیں مار سکتا۔ محاورے کے مطابق" غالب بولا۔

"اب تم نہا دھو سکتے ہو۔ میرے کچن میں سب کچھ ہے۔"

کسی نے دروازے کی کنڈی بجائی تو میں اچھل پڑا۔ بے اختیار میں نے اور غالب نے ریوالور نکال لئے۔ ناز اور گل بھی چونک کر اٹھ گئیں۔

راماراؤ نے سکون سے کہا "گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ دودھ والا ہوگا۔"

"پروہت جی!" دودھ والے نے باہر سے صدا لگائی اور کنڈی کھڑکائی۔

راماراؤ نے گرج کے کہا "آتا ہوں جی۔ تم شور نہیں کرو نا۔" وہ اٹھا اور کچن سے ڈول لے کر واپس آیا۔ دروازے تک گیا، دروازہ تھوڑا سا کھول کے اس نے دودھ والے کو برتن پکڑایا اور رمی سلام علیک کی۔ اس تمام کارروائی کے دوران میں ریوالور لئے اس کے پیچھے موجود رہا۔ دروازہ بند کرنے کے بعد اس نے کہا "تم نے مجھے میرے گھر میں یرغمال بنا لیا ہے۔ یہ کیا ہے؟"

میں نے کہا "مجبوری ہے۔"

"تم ہر جگہ ایسے ساتھ رہو گے تو کام کیسے چلے گا؟" اس نے مایوسی اور خفگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا "بہت مشکل ہو جائے گی میرے لئے۔"

میں نے کہا "ہم کسی قسم کا رسک لینے کی پوزیشن میں نہیں ہیں راماراؤ۔ اعتبار کرنے میں بھی رسک ہوتا ہے۔ خصوصاً تم جیسے ناقابل اعتبار آدمی پر۔ جس کی زندگی صبح سے شام تک مسلسل جھوٹ اور فریب ہو اور اداکاری ہو۔"

اس نے ملول ہو کے سر ہلایا "شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔ خیر.... یہ لو دودھ۔ جا کے چائے بناؤ یا کافی، ناشتے کے لئے سب کچھ موجود ہے۔ میں یہاں بیٹھتا ہوں تمہارے نشانے پر۔"

میں نے نازو اور گل سے کہا "میں اور راماراؤ باتیں کریں گے۔ تم چاہو تو غسل کر لو۔ پھر ناشتا بنا لو۔"

"آٹا گوندھ کے روٹی پکائی ہے کبھی؟" راماراؤ بولا "یہاں ڈبل روٹی نہیں ملے گی۔"

میں نے کہا "راماراؤ! اس لڑکی کے ہاتھوں کو غور سے دیکھو۔"

نازو نے قریب آ کے اپنے ہاتھ پھیلا دیے "کیا کہتی ہیں ہاتھوں کی ریکھائیں؟"

راماراؤ اس کی انگریزی پر چونکا "یہ بہت نازک ہاتھ ہیں۔ ان ہاتھوں نے کبھی ایسے کام نہیں کئے جو عورتیں کرتی ہیں۔ جھاڑو دینا۔ برتن مانجھنا۔ کپڑے دھونا...."

"کیا ایسے نازک ہاتھوں سے یہ کوئی سخت، سفاکانہ یا زور طلب کام کر سکتی ہے؟ مثلاً کسی کی ہڈی پسلی توڑنا؟ تم جیسے مرد کی۔ یا خونخوار شکاری کتے کی گردن توڑنا جو اس پر حملہ کرے۔"

راماراؤ نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا۔ کہ میں مذاق کر رہا ہوں یا سیریس ہوں۔ نازو نے میری بات کا مطلب سمجھ لیا تھا۔ پلک جھپکنے میں اس نے پروہت کو جھٹکا دے کر اپنی طرف کھینچا، اوپر اٹھایا اور اپنے اوپر سے گزار کے بیڈ پر پھینک دیا۔ پھر وہ دودھ کا ڈول لے کر گل کے ساتھ اندر چلی گئی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ میں اور غالب بھی اطمینان سے بیٹھے رہے۔

بے وقوفوں کی طرح چھت کو گھورنے والا پروہت بالآخر اٹھا اور اس نے اپنی دھوتی کو پھر سے باندھا "او گاڈ! یہ سب کیا تھا؟ ایک دم آسمان نیچے آ گیا، زمین اوپر چلی گئی۔ اور اب پھر ویسا ہی ہے۔"

غالب نے کہا "یہ انہی ہاتھوں کا کمال تھا جن کو تم نازک سمجھے تھے۔"

میں نے کہا "اس سے ثابت یہ ہوتا ہے کہ آدمی کی آنکھ صرف ظاہر کو دیکھتی ہے۔"

غالب نے میری بات آگے بڑھائی "اب اگر تم انہی ہاتھوں کو آٹا گوندھ کے پراٹھے بناتے دیکھنا چاہو تو اندر جا کے دیکھو۔"

راماراؤ ابھی تک پوری طرح ہوش میں نہیں آیا تھا۔ اسے خراش تک نہیں آئی تھی مگر ذہنی صدمہ انتہائی غیر متوقع اور شدید تھا۔ وہ خاموشی سے ہمارے سامنے آ کے بیٹھ گیا۔

"اب میرے مندر جانے کا وقت ہے۔"

میں نے کہا "اگر ایک دن چھٹی کر لو گے تو کیا ہنومان جی خفا ہو جائیں گے؟"

"لوگ تشویش میں مبتلا ہو جائیں گے۔ مزاج پُرسی کے لئے آنے والوں کا تانتا بندھ جائے گا۔ سب کچھ معمول کے مطابق چلتا رہے تو اچھا ہے۔"

میں نے کہا "ایسی صورت میں تمہارے ساتھ کوئی جائے گا۔"

"ریوالور لے کر۔ مجھے ہینڈز اپ کرا کے لے جائے گا۔ کیا تم پاگل ہو گئے ہو؟" وہ بولا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا "اگر ایک پجارن تمہارے ساتھ ہو تو کیا حرج ہے؟"

"کون پجارن؟"

"وہی نازک ہاتھوں والی" غالب نے کہا۔

پروہت کچھ دیر خاموشی سے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے سر ہلایا۔ "تمہاری مرضی۔"

غالب نے کہا "اس کا نشانہ بھی بہت اچھا ہے۔ میری مراد ریوالور کی گولی سے ہے۔"

"وہ ریوالور لے کر جائے گی؟ مندر میں..."

میں نے اسے تسلی دی "نہ اس کا چہرہ نظر آئے گا کسی کو اور نہ اس کا ریوالور۔ وہ گھونگٹ نکالے چپ چاپ کھڑی رہے گی ایک طرف۔"

"آج اپنی عبادت کو مختصر رکھنا۔"

"اور تعاون کے جذبے سے کام لینا۔ ہمارے درمیان معاہدہ ہو گیا ہے اور اس کی خلاف ورزی کے نتائج..."

"مجھے دھمکی مت دو۔ رسک تمہارے لئے ہے۔ اگر کسی نے پوچھ لیا کہ یہ کون ہے۔ یا شک ہو گیا کسی کو۔ تو میری کوئی ذمے داری نہیں ہوگی۔"

"شک کیوں ہوگا؟ وہ اسی علاقے کی رہنے والی نظر آتی ہے... تم کہہ سکتے ہو کہ آس پاس کے کسی گاؤں کی رہنے والی ہے۔ صبح ہی آئی تھی اپنے پتی کے ساتھ۔"

"پتی کے ساتھ! پتی کہاں ہے؟"

غالب نے کہا "پتی گیا ہے اپنے کام سے۔ واپسی میں اسے

لے جائے گا۔"

"اس کے آنے کی وجہ کیا بتاؤں؟"

میں نے کہا "لوگ مندر کیوں جاتے ہیں؟ بھگوان سے کچھ مانگنے۔ عورتیں کیا مانگتی ہیں؟ تم تجربے کار آدمی ہو اور ہوشیار بھی۔ تمہاری سوشیالوجی اور سائیکالوجی کس کام آئے گی مسٹر راماراؤ!"

"اوکے، اوکے" وہ جھنجلا کے بولا "کہو اس مصیبت سے کہ میرے پیچھے لگ جائے۔"

نازو نے بڑی عجلت میں سیاہ کافی کا ایک کپ پیا۔ کافی اتنی گرم تھی کہ اسے پلیٹ میں ڈال کے ٹھنڈا کرنا پڑا۔ میں نے اسے مختصراً بتادیا کہ اسے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا۔ دس منٹ میں وہ پرانی سوتی ساری کو ہندو عورتوں کے انداز میں باندھ چکی تھی۔ ماتھے پر توے کی کالک سے بندیا لگا چکی تھی اور اپنے ریوالور کی نمائش کرچکی تھی۔ صرف راماراؤ پر یہ واضح کرنے کے لیے کہ وہ خالی ہاتھ نہیں ہے اور ریوالور بھی خالی نہیں ہے۔ اس نے ریوالور کا میگزین چیک کیا اور پھر ریوالور کو ساری کے نیچے اڑس لیا۔ پروہت راماراؤ نے یہ سب حیرت، خوف اور رشک کے ملے جلے جذبات کے ساتھ دیکھا۔

"باہر سے تالہ لگا دینا جاتے وقت" میں نے کہا۔

غالب نے نازو کو ڈانٹا "گھونگٹ نکالو۔ بہت شوق ہے یہ طباق سا چہرہ دکھانے کا غیر مردوں کو۔ بے شرم۔"

نازو نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا مگر کچھ بولی نہیں اور گھونگٹ میں چہرہ چھپا کے راماراؤ کے ساتھ باہر نکل گئی۔ باہر اجالا پھیل گیا تھا لیکن سورج نے ابھی شفق کا رنگ نہیں بکھیرا تھا۔ نازو نے اپنی چال تک بدل دی تھی اور بے حد مضحکہ خیز انداز میں راماراؤ کے ساتھ اس سے چند قدم پیچھے رہتے ہوئے چل رہی تھی۔ ایک جگہ اس نے پلٹ کے دیکھا اور مسکرائی۔ ہم سب دروازے کی جھری سے جھانک رہے تھے۔ یہ بات شاید اسے بھی معلوم تھی۔ جب وہ نظر سے اوجھل ہوگئے تو ہم نہانے چلے گئے۔

غسل کے بعد میں نے اور غالب نے پروہت کے گھر کا تفصیلی معائنہ کیا۔ اس کا دوسرا کمرا بھی بیڈ روم سمجھا جاسکتا تھا۔ بیڈ شاید بستی کے کسی ماہرِ فن بڑھئی نے محنت کے ساتھ عقیدت و احترام کے جذبات شامل کرکے تیار کئے تھے۔ ان میں وہ نزاکت اور جدت نہیں تھی جو شہر کے 'ماڈرن اسٹائل' میں نظر آتی ہے۔ یہ بھاری بھرکم اور مضبوط، شیشم کی لکڑی کے بھدے نقش و نگار والے بیڈ تھے جن پر پھول بوٹے کندہ کئے گئے تھے۔ پردے، بستر کی چادریں اور تکئے کے غلاف کھڈی کے کام کا اعلیٰ نمونہ تھے۔ صرف قالین شہر جیسے تھے۔ کوارٹر میں لائٹ ہی نہیں پنکھے بھی تھے اور ایک پرانا فریج تھا، واٹر سپلائی کے لئے پانی کا انڈر گراؤنڈ ٹینک، موٹر اور چھت کے اوپر ٹنکی۔ سب تھے۔

"ایک گاؤں کے پروہت کے یہ ٹھاٹ" غالب نے کہا۔

"پروہت کہاں ہے وہ؟" میں نے کہا۔

"تیرا کیا خیال ہے، وہ ہمارا ساتھ دے گا؟"

"ہاں۔ لمبوترہ نے ایک ہی سچ بولا تھا جو ہمارے لئے ثابت ہورہا ہے۔ راماراؤ نے اپنی مجبوری کے ساتھ سمجھوتہ کرلیا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ہم زبردستی بھی اس سے ہر کام لے سکتے ہیں چنانچہ اس نے معاوضے کی پیشکش کو فوراً قبول کرلیا۔"

ہم گھومتے ہوئے عقبی حصے میں چلے گئے۔ وہاں پروہت نے اپنے شوق کے لئے چھوٹا سا باغیچہ بنا رکھا تھا۔ فصیل کے پار جہاں تک نظر جاتی تھی ویرانی تھی۔

"پڑھا لکھا آدمی کس چکر میں پڑگیا!"

"مایوسی کا ردِعمل انتہائی ہوجاتا ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ شرافت سے پیسہ نہیں کمایا جاسکتا۔ فراڈ سے ساری خواہشات کی تکمیل ہوجاتی ہے۔"

"فراڈ ایک منظم پیشہ ہے۔ ہر جگہ۔ مگر اس سے ساری خواہشات کیسے پوری ہوسکتی ہیں۔ عزت کہاں ملتی ہے۔ سکون کی خوشی کہاں ملتی ہے۔ محبت کہاں ملتی ہے؟"

"دولت تو ملتی ہے۔ راماراؤ نے اسے مقصد بنالیا ہے اور اپنے مقصد میں کامیاب ہے۔ جس دن وہ محسوس کرے گا کہ اب لائن بدل لینی چاہئے۔ عزت خریدنی چاہئے۔ وہ کاروبار کرے گا، محبت کی ضرورت ہوگی تو شادی کرے گا۔"

غالب نے سر اٹھا کے گودام کی طرف دیکھنے کی کوشش کی۔ ادھر بالکل خاموشی تھی "میرا خیال ہے کہ رابعہ اور محسن پکڑے گئے۔"

"ہوسکتا ہے پکڑے گئے ہوں۔"

"اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ ان کے واپس نہ آنے کی اور وجہ نہیں ہوسکتی" غالب نے کہا۔

"چھڑالیں گے انہیں بھی، یہاں تک آگئے ہیں تو" میں نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ میں اس موضوع پر بات کرتے ہوئے ڈرتا تھا۔ جب گل نے ہمیں پکار کے اطلاع دی کہ ناشتا تیار ہے تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ رابعہ اور محسن کا خیال میرے دل کے اندر موجود تھا۔ اس نوکِ خار کی طرح جو ٹوٹ کر رہ جائے۔ ان کا ذکر اس زخم کو کریدنے کے مترادف تھا۔ غالب نے غلط نہیں کہا تھا لیکن ایک بات کہنے کی جرأت اس میں بھی نہیں تھی... کہ کہیں وہ مارے نہ گئے ہوں۔

نازو کے چلے جانے سے گل پھر امورِ خانہ داری کے میدان میں نقل نہ کرسکی تھی اور فیل ہوگئی تھی۔ اس نے ایک بار یہ بھی اعتراف کیا تھا کہ گھر میں جو تربیت ماں سے حاصل ہوتی ہے وہ اسے کبھی نہیں ملی تھی چنانچہ جو کام سب لڑکیاں بچپن سے شروع کردیتی ہیں تاکہ بڑی ہونے کے بعد اپنے گھر جاکے کریں، وہ اسے آتے ہی نہیں تھے۔

اس نے ہم سے نظر ملانے سے گریز کیا اور کہا "یہ بڑا... میں پراٹھے؟" اور چنگیر میں رکھی ہوئی

غالب نے بد شکل، بد وضع تلی ہوئی روٹی کو اٹھا کے دیکھنے لگا "یہ کیا چیز ہے؟"

میں نے کہا "تیرہ نمبر کے جوتے کا سول ہے شاید۔"

"جس سے حوالاتی ناشتا کرتے ہیں۔ ہم نے کیا جرم کیا ہے یار؟" غالب فریادی لہجے میں بولا۔

میں نے اپنی چنگیر سے دوسرا پراٹھا اٹھایا جس کی شکل سری لنکا کے جزیرے جیسی تھی "یہ دیکھ تیری شکل کا نقشہ صحیح بنایا ہے گل نے ویسا ہی اونچا نیچا ٹیڑھا ترچھا"

"یہ کالے کالے داغ کیسے ہیں؟"

"یہ تیرے دل کے داغ ہیں" میں نے کہا "یہ جگر کے آبلے ہیں۔"

گل مزے سے خالص مکھن کے ساتھ پراٹھا کھاتی رہی۔ "میں کچھ نہیں سن رہی ہوں۔ کھانا ہے تو کھاؤ، ورنہ جاؤ۔ ہوا کھاؤ۔"

غالب نے ایک سرد آہ بھر کے کھانا شروع کیا "یار! جو لڑکیاں اپنے شوہروں پر ظلم ڈھاتی ہیں۔ انہیں ایسی بدشکل روٹیاں کھلا کے، ٹنڈے اور کدو کریلے کھلا کے اور پانی سے پتلی دال کھلا کے، جس میں آدمی چاہے تو ڈوب مرے۔ انہیں تو کوئی کچھ نہیں کہتا۔"

"انہیں انسدادِ بے رحمیٔ حیوانات والے پکڑ کرلے جاتے ہوں گے" گل نے کہا "وہ جانوروں پر ظلم نہیں کرنے دیتے۔"

"عزیزہ، شادی سے قبل ہی تمہارے یہ گستاخانہ خیالات اور باغیانہ افکار جو تم اپنے مجازی خدا کے بارے میں رکھتی ہو، قابلِ مذمت ہیں" غالب نے کہا "اگر میں کبھی برسرِ اقتدار آیا۔ تو تم جیسی پھوہڑ لڑکی کے لئے قانون میں سخت سزائیں رکھوں گا، روٹی کچی تھی۔ چھ ماہ کے لئے لپ اسٹک بند۔ روٹی گول نہیں تھی، نیل پالش بند۔ گوشت گلا نہیں تھا۔ دو سال کے لئے زیور بند۔"

گل ہنسنے لگی "بیویاں جب بھتنی نظر آئیں گی یا کھانا پکانا ہی چھوڑدیں گی تو پتا چلے گا کہ سزا کسے ملی۔"

میں نے غالب کی طرف دیکھ کے سر ہلایا "یہ تو ہے مرزا جی۔ بہتر ہے چپ چاپ سب برداشت کرلو۔"

ناشتے میں مکھن نے بہت مزہ دیا۔ یہ ملاوٹ والا یا مصنوعی مزے والا مکھن نہیں تھا۔ بھوک میں ہم نازو کے حصے کا پراٹھا بھی کھا گئے۔ کافی نے اس سے زیادہ لطف دیا۔ پھر میں اطمینان سے لیٹ کر سگریٹیں پینے لگا اور گل نے برتن دھو کے رکھے۔ یہ انتظار اور احتیاطی نظربندی کا وقفہ کسی طرح کاٹنا ہی تھا۔ غالب خانہ تلاشی میں لگا رہا۔

اب سورج نکل آیا تھا اور اس کی دھوپ نے ماحول کو اُجلا بنادیا تھا۔ مجھے فکر لاحق ہونے لگی تھی کہ رات کو یہاں پہنچنے والے ٹرک کہیں صبح دم روانہ نہ ہوجائیں۔ تجسس کا آزار الگ تھا۔ میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ اس کانوائے میں شامل کسی ٹرک میں شہلا اور اس کا بیٹا بھی ہیں یا نہیں۔ شیشے کے تابوت میں ان کی نیند کا منظر میرے ذہن پر یوں نقش ہوگیا تھا کہ اب شہلا کا خیال آتے ہی مجھے یوں لگتا تھا کہ میری آنکھیں اسے دیکھ بھی رہی ہیں۔

"یار سکندر، اگر شہلا نہ ہوئی کسی ٹرک میں؟"

میں چونک پڑا "تو بھی اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔"

"ہاں۔ سب سے بڑی فکر یہی ہے کہ کسی طرح ہم اسے بچالیں۔"

"بچالیں گے یار۔ حالات خود موافق ہوتے جارہے ہیں۔ اس وقت ہمارے اور اس کے درمیان کتنا فاصلہ ہے۔ اور دشمنوں کو بالکل معلوم نہیں کہ ہم اتنے نزدیک ہیں؟"

"اب معلوم ہوجائے گا۔ لمبوترہ کی لاش سب سے پہلے نظر آئے گی۔ پھر ان سب کی لاشیں ملیں گی جو راستے میں مارے گئے تھے۔ ان کی جیبوں سے سراغ مل جائے گا۔ خود لمبوترہ کے گھر کا نقشہ ہماری یہاں موجودگی کا راز فاش کردے گا۔"

"وہ پروہت کے گھر تک نہیں آسکتے" میں نے کہا۔

"آبھی سکتے ہیں۔ دلاور اینڈ کمپنی میں ایک سے ایک عیار شامل ہے اب۔"

"وہ بستی کے ہر گھر میں ہمیں کیسے تلاش کرسکتے ہیں اور یہاں ہماری موجودگی کی طرف تو ان کا خیال بھی نہیں جاسکتا کہ ہم عین ان کی شکارگاہ کے سب سے غیر محفوظ مقام پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ ہم سے ایسی بے وقوفی کی توقع نہیں کرسکتے۔ اور راماراؤ کے بارے میں یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ وہ غداری کا مرتکب ہوسکتا ہے۔ انہی کے دشمنوں کو پناہ فراہم کرسکتا ہے۔"

غالب نے سر ہلایا "اچھا ہے اگر ان کی یہی غلط فہمی ہمارے تحفظ کی ضمانت بن جائے۔"

میں نے کہا "میں سمجھتا ہوں کہ وہ آس پاس کا سارا علاقہ چھان ماریں گے آج۔ ساری شکاری اکٹھے ہوجائیں گے۔ اس یقین کے ساتھ کہ ہم یہیں چھپے ہوئے ہوں گے۔ جب تک ٹرک روانہ نہیں ہوتے ہم بھی انتظار کریں گے۔ شاید ہم راستے میں کہیں کوئی کارروائی کریں گے۔ وہ ہماری تلاش جاری رکھیں گے اور جب تک کامیاب نہیں ہوں گے یہاں سے روانگی کا خطرہ مول نہیں لیں گے۔ ہم اپنے قیام کی مدت بڑھا بھی سکتے ہیں۔"

"یہ تو نے بالکل ٹھیک کہا۔ وہ خوفزدہ ضرور ہوں گے گزشتہ رات کی کارروائی سے" غالب نے کہا۔

"یہ بہت بڑا شبخون مارا تھا ہم نے۔ میرا خیال ہے سب ملا کے پندرہ بیس آدمی تو ضرور مارے گئے ہوں گے۔"

"زیادہ۔ اتنے تو لمبوترہ کے گھر میں پڑے ہوئے مل جائیں گے" غالب نے کہا۔

"پھر چار خونخوار کتوں کی لاشیں ہیں۔"

"اور شاکر علی کے گھر میں جو لوگ مارے گئے تھے" غالب نے کہا "دلاور اور تریونی یہ سوچنے پر مجبور ہوں گے کہ اتنے وسیع پیمانے پر خونریزی کرنے والے آخر کتنے لوگ تھے؟"

میں نے کہا "وہ... معلوم کرنے کی کوشش ضرور کریں گے۔ رابعہ اور محسن سے۔"

غالب چپ ہوگیا۔ اس نے یہ نہیں کہا کہ کوشش سے کیا ہوتا ہے۔ وہ کوشش کا مطلب سمجھتا تھا۔ کسی سے کچھ پوچھنا ہو تو کیسے پوچھا جاسکتا ہے۔ وہ اس کا تجربہ بھی رکھتا تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ رابعہ اور محسن پر تشدد کا سارا تجربہ آزمانے والے پرانے شکاری نہ پہلے کامیاب ہوئے تھے نہ اب ہوں گے مگر اس خیال کے ساتھ عذاب ناک تصورات کے سلسلے تھے اور اپنی بے چارگی کا احساس تھا کہ ہم ان کے لئے کچھ نہیں کرسکے۔

"کسی طرح یہ معلوم ہوجائے کہ وہ شہلا کو ساتھ لائے ہیں۔ تو ہم پورے یقین کے ساتھ کارروائی کریں" غالب نے کہا۔

"ابھی تک کوئی پلان نہیں ہے ہمارے پاس" میں نے کہا۔

"پلان' موقع محل اور حالات کو دیکھ کے بنایا جاتا ہے۔ ایسے ہوا میں تیر چلانے کے لئے کیا منصوبہ بندی کریں" غالب نے کہا۔

"شہلا کو وہ ضرور لائے ہوں گے۔ اسے روک کے انہیں کیا ملے گا۔ ان کا مقصد شہلا کی زندگی کو گارنٹی کے طور پر استعمال کرنے کا تھا اور یہ بات وہ ہمیں سمجھا چکے تھے کہ ہم نے ان کو نقصان پہنچایا تو خود ہی شہلا اور اس کے بیٹے کی جان لیں گے۔ اپنی طرف سے انہوں نے بہت مضبوط حصار قائم کیا ہے چنانچہ وہ ہمیں موقع دے کر دیکھنا چاہیں گے کہ ہم میں کتنی ہمت ہے۔ یہ سات ٹرک ہیں۔ بہت بڑی کھیپ ہے اسلحے کی۔ اسے وہ شہلا کو ڈھال بنا کے ہی نکالیں گے۔"

غالب نے کہا "میں شہلا کی زندگی کو زیادہ اہم سمجھتا ہوں"

"میں بھی" میں نے قطعی لہجے میں کہا "یہ فرض اور محبت کا امتحان ہے تو میں فیل ہوجانے سے نہیں ڈرتا۔"

"اگر وہ ہم سے سودا کرلیتے تو اچھا تھا۔ ہم شہلا اور اس کے بیٹے کو مانگ لیتے اور اس کے بدلے میں انہیں یہ کھیپ نکال لے جانے کی اجازت دیتے۔"

"اجازت!" میں نے تلخی سے ہنس کے کہا "ہم درخواست کرسکتے تھے اور وعدہ کرسکتے تھے کہ ہم ان کے راستے میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں بنیں گے۔ لیکن کیا وہ اعتبار کرتے؟ ہم خدا' رسولؐ اور سارے زمانے کی قسم کھا کے بھی انہیں یقین نہیں دلاسکتے تھے۔ کہ ہم قول نبھائیں گے۔ اس کے علاوہ بات صرف ایک کھیپ کی نہیں ہے۔ ممکن ہے وہ شہلا کو پھر استعمال کریں۔ اگلے پھیرے میں' پھر اس سے اگلی بار جانے والے قافلے میں۔

یہاں تک کہ ہمارے قول و قرار خود ہمارے لئے باعث عار ہوجائیں۔ ہمارا حال سو پیاز اور سو جوتے کھانے والے سے بدتر ہو۔ کہ ہم ضمیر کی رسوائی قبول کرلیں پھر مجبور ہوکے شہلا کے قتل کا الزام قبول کریں۔"

گل اب سر جھکائے ہمارے پاس بیٹھی دانتوں سے اپنے ناخن کاٹ رہی تھی۔ گھڑی کی سوئیاں جیسے رک گئی تھیں۔ کئی بار میں اٹھ کر دروازے تک گیا اور جھری میں سے جھانک کے مایوس لوٹ آیا۔ غالب نے باغیچے کی طرف جا کے فصیل دیکھنے کی بے سود کوشش کی۔ سناٹا اور سکوت ہمارے اعصاب کو شکست دے رہا تھا۔ نہ کوئی مہرباں خیال تھا کہ حوصلہ دیتا نہ صدا تھی کہ امید کی خبر دیتی۔ بس انتظار تھا۔ اذیت سے آزار سے بھرا ہوا۔ رابعہ اور محسن کے چہرے تھے جو سامنے آتے تھے۔ شیشے کے ایک تابوت میں شہلا اور اس کے بیٹے کے ساکت جسم تھے جو کہتے تھے۔ خموشی گفتگو ہے بے زباں ہے زباں میری۔ نازو کو گئے ہوئے دو گھنٹے سے زیادہ ہوچکے تھے وہ راما راؤ جیسے مکار اور فریبی شخص سے نمٹنا جانتی تھی مگر اکیلی تھی۔ ایک پروہت کو مار سکتی تھی مگر اس کے بعد کیا پاپ کی سزا سے بچ سکتی تھی؟

جب دروازے کا قفل کھلا تو میں اس کی آواز سے اچھلا گل اونگھ رہی تھی اور غالب آنکھیں بند کئے لیٹا ہوا تھا۔

راما راؤ اور نازو اندر آئے تو ہم سب پوری طرح مستعد اپنے ہاتھوں میں ریوالور لئے بیٹھے تھے۔

"اف۔ آج تو بس خدا نے ہی بچالیا" نازو دھڑام سے پر گرگئی۔

"کیوں' کیا ہوا؟" گل نے اور پھر میں نے کہا۔

"ہوا کچھ نہیں۔ مگر ہو سکتا تھا۔ مجھے کیا معلوم کہ مندر جا کے کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں کرنا چاہئے۔ آج پہلی بار میں قدم رکھا تھا۔ راما راؤ چپکے چپکے بتاتا رہا ورنہ بھانڈا پھوٹ جاتا" نازو نے ایک گہری سانس لی۔

راما راؤ کرسی پر سخت مشتعل بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ پھٹ پڑا "بہت افسوس کی بات ہے۔ تم نے بتایا کیوں نہیں تھا کہ تم سب مسلمان ہو۔"

"یہ دھرم کا معاملہ تھا۔ شاید تم جذباتی ہوجاتے اور انکار کردیتے تعاون کرنے سے" میں نے کہا۔

"میرا کیا دھرم ہے" اس نے کہا "تم اچھی طرح جانتے ہو خود میں نے بتادیا تھا تمہیں کہ یہ سب ڈھکوسلا ہے' ڈرامہ ہے دھوکا ہے۔ فراڈ ہے سب میرا یہ روپ۔"

"پھر بھی۔ تم ہندو ہو۔"

"کچھ نہیں۔ نہ میں ہندو ہوں نہ مسلمان۔ انسان بھی نہیں ہوں میں۔ میں خود بھی نہیں جانتا کہ میں کیا ہوں۔ مجھ سے ڈرنے کی کیا ضرورت تھی۔ تم مجھے سچ بتادیتے تو میرے لئے بھی پریشانی خطرے کی بات نہ ہوتی۔ میں یہاں سے سکھا پڑھا کے لے گیا سوچو ذرا کہ اس کی کسی غلطی سے یہ راز فاش ہوجاتا تو کیا یہ شریمتی مار دھاڑ کرسکتی تھیں وہاں؟ کتنے لوگوں کو مار گرانے ایک ریوالور کی گولیوں سے کتنی لاشیں ڈھیر کرتیں؟" اس نے افسوس سے نفی میں سر ہلایا "خیر۔ اس کو اور تمہیں بچالیا خدا اور مجھے میری عقل نے۔"

"ہنومان جی نے مدد کی ہوگی تمہاری" میں نے کہا۔

وہ شاید گالی دیتے دیتے رک گیا "دیکھو' مجھے اپنے بارے میں سچ بتادو۔ اگر تم ڈاکو بھی نہیں ہو' اسمگلر بھی نہیں ہو تو پھر کون ہو؟"

میں نے سوچ کے کہا "ہم شکاری ہیں۔"

"شکاری!"

"ہم سب شکاری ہیں" غالب نے بھی بے حد فلسفیانہ انداز میں کہا۔

"اگر تم غور کرو تو ساری دنیا شکاری ہے۔ کچھ سیاست کے میدان کے شکاری ہیں۔ ووٹرز کا شکار کرتے ہیں۔ کچھ حسن کے شکاری ہیں۔ عاشقی کو بدنام کرتے ہیں۔ دولت کے شکاری ہیں اور دھرم کے شکاری ہیں۔"

راما راؤ نے اپنا سر پکڑ لیا "اس کا مطلب ہے کہ تم بتانا نہیں چاہتے۔ تمہاری مرضی۔ میں نے تعاون کی پوری کوشش کی لیکن اب تم خود ہی عدم تعاون کی تحریک چلا رہے ہو۔"

میں نے کہا "یار' تم تو ذرا سی بات پر خفا ہوئے۔ بیٹھو میں تمہیں اصل بات کا عرق نکال کے پیش کرتا ہوں۔ پوری بات کل تک ختم نہیں ہوگی۔ یہ جو تمہارے ملہوترہ جی تھے۔ یہ بہت حرامی تھے۔"

"مجھے معلوم ہے۔"

"ظاہر ہے ان کے کاروباری تعلقات بھی ایسے ہی لوگوں سے ہوسکتے تھے۔ جو کم حرامی نہ ہوں" میں نے کہا "ان میں سے ایک ہے بمبئی کا سیٹھ ترویدی۔"

"میں اسے بھی جانتا ہوں۔ بہت اچھی طرح۔"

"ان لوگوں نے مل کے ایک عورت اور اس کے بچے کو اغوا کرلیا۔"

"کون تھی وہ عورت' تمہاری کیا لگتی تھی؟" پروہت بولا۔

"ایسے سوالات کروگے تو میری بات کیسے پوری ہوگی؟" میں نے کہا "فرض کرلو کہ میری بہن تھی۔ شادی کو اس کی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا لیکن اس کے شوہر کا زیادہ وقت گھر سے باہر گزرا۔ کاروبار کے سلسلے میں۔ اس کی عدم موجودگی میں بیوی اور بچے کو اغوا کیا گیا... جب وہ واپس آیا تو....."

"اغوا کرنے والے کون تھے۔ اور ان کا مقصد کیا تھا؟"

"اغوا کرنے والے دشمن تھے۔ دوست تو ہو نہیں سکتے" میں نے کہا "مقصد تھا اسے بلیک میل کرنا۔ اور چونکہ وہ میری بہن تھی اس لئے مجھے بھی بلیک میل کرنے کی کوشش کی گئی۔ ہم نے مقابلہ کرکے ان کا بیڑا غرق کردینے کا فیصلہ کیا۔ ہم نے انہیں بتادیا تھا کہ ہم خود بھی تباہ ہوجائیں گے اور تمہیں بھی تباہ کردیں گے۔ وہ بدمعاش تھے اور طاقت ور تھے۔ انہوں نے ہماری دھمکی کا مذاق اڑایا۔ نتیجہ یہ کہ اس عورت کا شوہر۔ میں اور میرا یہ دوست" میں نے غالب کی طرف اشارہ کیا۔

"تم کسی کا نام نہیں بتارہے ہو" راما راؤ نے کہا۔

"نام غیر اہم ہیں" میں نے کہا "فرض کرلو میں سکندر ہوں' یہ میرا دوست غالب ہے۔ مرزا غالب۔"

"مرزا غالب!" راما راؤ نے طنز سے کہا "سنا ہے اردو کا بہت بڑا شاعر تھا۔ آج دیکھا ہے پہلی بار۔"

میں نے اپنی بات جاری رکھی "وہ جو ناڈیا ٹائپ کی لڑکی ہے' ایک دن اپنے مرزا غالب کی ہوجائے گی۔"

"کیا ہوجائے گی؟"

"گھر والی اور کیا یار" میں نے کہا "سمجھا بھی کرو بات کو۔ کل رات میری بہن کا شوہر اپنی بہن کے ساتھ یہاں پہنچا تھا۔ اسے معلوم ہوا تھا کہ اس کے بیوی بچوں کو بالک رام ملہوترہ کے گھر میں رکھا گیا ہے۔ اس نے ہمیں اطلاع دی۔ ہم نے بالک رام کے گھر پر حملہ کیا اور وہاں اس کے جتنے ساتھی تھے وہ مارے گئے لیکن نہ مجھے اپنی بہن ملی اور نہ بہنوئی ملا۔ اب ہمیں معلوم ہوا ہے کہ انہیں اس پرانے اناتھ آشرم میں رکھا گیا ہے۔ چاروں کو۔"

"چار کون؟"

میں نے کہا "میری بہن۔ اس کا شوہر اور بچہ اور بچے کی پھوپی یعنی..."

"میں سمجھ گیا..."

میں راما راؤ کو ایک قابلِ یقین کہانی کے تانے بانے میں الجھا کے خوش ہوا۔ میں نے رابعہ کا ذکر گول کردیا تھا۔ گل کا حوالہ کسی رشتے سے نہیں آیا تھا۔ مجھے محسن اور شہلا کے نام بھی نہیں لینے پڑے تھے۔

"اب ہم کسی طرح انہیں یہاں سے نکال کرلے جانا چاہتے ہیں' ہمارے دشمنوں کو معلوم ہے کہ ہم ان کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک آپہنچے ہیں لیکن یہ معلوم نہیں کہ تمہارے گھر میں چھپے ہوئے ہیں۔ ہم ان کو دھوکے میں رکھ کے اچانک حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ہمیں آس پاس کے سارے علاقے میں تلاش کرتے پھر رہے ہوں گے۔ پولیس بھی انہی کے ساتھ ہوگی اور ان کی ساری غنڈہ فورس۔"

"پھر تو تمہارا کام بہت مشکل ہے۔ اور خطرناک بھی" پروہت فکر مند ہوکے بولا۔

"ہاں۔ ہماری اپنی جان کی کوئی بات نہیں۔ ہم تو نکلے ہی اس ارادے سے ہیں کہ ماریں گے اور مرجائیں گے۔ لیکن خدانخواستہ دشمنوں نے انہیں ماردیا۔ جن کو ہم بچانا چاہتے ہیں۔ تو ہماری ساری جدوجہد رائگاں جائے گی۔ ابھی ہمیں پورا یقین بھی نہیں کہ وہ سب اناتھ آشرم یعنی گودام میں ہیں یا نہیں۔"

"ابھی تک یہ تمہارا مفروضہ ہے؟"

"مفروضہ ہے لیکن حقیقت کے بہت قریب' اس بات کے امکانات بہت زیادہ ہیں کہ وہ یہیں ہوں گے۔ تصدیق بہرحال ضروری ہے۔ اور اس کام میں تم ہماری مدد کرسکتے ہو۔ اس کے

علاوہ تم کو کچھ بھی نہیں کرنا۔ باقی کام ہم خود کرسکتے ہیں۔"

"مگر میں کیسے تصدیق کرسکتا ہوں؟" راما راؤ پریشان ہو کے بولا۔

"اس احاطے میں کل رات کچھ ٹرک پہنچے ہیں۔ سات ٹرک ہیں۔ انہی میں سے ایک ٹرک میں میری بہن اور اس کا بیٹا ہے۔ ان بدمعاشوں نے انہیں ایک شیشے کے تابوت میں سُلا رکھا ہے۔ بے ہوش کرکے۔"

"یہ تم مجھے کسی فلم کی کہانی سنا رہے ہو!" راما راؤ نے کہا۔

"زندگی تقریباً ستر فی صد حقیقت ہے اور تیس فی صد فلم۔"

"چنانچہ فلم تقریباً ستر فی صد حقیقت نہیں ہے اور تیس فیصد زندگی۔ اسی فارمولے کو معکوس کرلو" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "کہنے کا مطلب یہ تھا کہ زندگی اتفاقات اور ناقابلِ فہم واقعات سے خالی نہیں ہے۔ کیا خود تمہاری زندگی کے دو رخ نہیں ہیں؟ ایک وہ جو نظر آتا ہے اور ایک وہ جو موجود ہونے کے باوجود دکھائی نہیں دیتا۔ کچھ تجربات تمہاری زندگی کے ہمارے لئے اتنے ہی حیرت انگیز ہوں گے جتنے ہماری زندگی کے کچھ واقعات تمہیں فلمی لگ رہے ہیں۔"

"لیکن یہ سب کیسے ممکن ہے؟ شیشے کے تابوت میں کسی کو کب تک بے ہوش رکھا جاسکتا ہے؟ کب تک سلا کے زندہ رکھنا ممکن ہے؟" راما راؤ بولا۔

"میں نے اس قسم کا تجربہ کبھی نہیں کیا اور نہ کبھی خود ایسے تجربے سے گزرا" میں نے کہا "تاہم میں وہ بتا رہا ہوں جو میں نے ایک بار دیکھا تھا۔ انہوں نے مجھے وہ منظر دکھایا تھا۔ تاکہ میں ان کی دھمکی کو محض دھمکی نہ سمجھوں۔ میری بہن واقعی شیشے کے ایک تابوت میں سو رہی تھی اور اس کا بیٹا بھی اسی تابوت میں سو رہا تھا۔"

"شیشے کا وہ تابوت بالکل بند نہیں ہوسکتا۔ اس میں تازہ ہوا کے لئے راستہ رکھا گیا ہوگا۔"

"یقیناً رکھا گیا ہوگا۔ مگر میں نے اس وقت دیکھا نہیں تھا۔ غور ہی نہیں کیا تھا۔ میں تو صرف اپنی بہن کو دیکھتا رہا تھا۔ وہ مجھ سے بہت دور تھی۔ آٹھ دس فٹ کے فاصلے پر۔ میں لوہے کے ایک جنگلے کے پیچھے سے تابوت کو چھو بھی نہیں سکتا تھا۔ انہوں نے مجھے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اگر میں نے ان کا مال لے جانے والے ٹرک تباہ کئے۔ جیسا کہ میرا ارادہ تھا۔ تو میں خود اپنی بہن اور اس کے بیٹے کے خون سے اپنے ہاتھ رنگوں گا۔ انہوں نے اس تابوت کو درمیان والے ایک ٹرک میں رکھا ہے اس کے پیچھے بارود ہے یا ڈائنا مائٹ یا کوئی ایسا ہی تباہ کن، آتش گیر مادہ۔ اب میں کتنا مجبور ہوں اس کا اندازہ کرلو۔"

اس نے سمجھنے والے انداز میں سر ہلایا "تم واقعی مجبور ہو۔"

"مگر میں لاچار نہیں ہوں۔ میں نے اسی وقت تہیہ کرلیا تھا کہ کچھ نہ کچھ ضرور کروں گا۔ میں نے ان سب لوگوں کو اکٹھا کیا

اور ہم ایک ساتھ اس مشن پر روانہ ہوگئے۔ پوری تیاری کے ساتھ۔ میرا مشن تھا اپنی بہن کو بچانا اور اپنے دشمنوں کی چال ناکام بنانے کے بعد ان کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانا۔ کل رات ہمارے دو ساتھی اسی چکر میں ان کے ہاتھ لگ گئے۔ اب ہمیں ان کو بھی چھڑانا ہے۔"

"یہ کام تم کیسے کروگے آخر؟"

میں نے کہا "بس ایک بار یہ معلوم ہو جائے کہ وہ کہاں ہیں۔ اگر وہ اس گودام میں ہیں تو پھر کوئی مسئلہ نہیں۔ ہم رات کو بے خبر کر حملہ کریں گے یا راستے میں کہیں روک لیں گے انہیں۔ ایک ایک کو ٹھکانے لگا دیں گے۔ اس طرح کہ ہمارے مقصد کو نقصان نہ ہو۔"

"اگر وہ ایک شیشے کے تابوت میں بے ہوش لیٹی ہوئی ہے اور تابوت رکھا ہوا ہے بارود کے ڈھیر پر تو مجھے بہت کم امکان نظر آتا ہے کہ تم اپنی بہن کو بچا سکو۔"

"امکان کم ہو یا زیادہ، ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھے رہیں گے۔ ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا ہے۔ احتیاط ہم پوری کریں گے۔"

"میرا ذہن ابھی تک ایک بات پر الجھن کا شکار ہے کہ کسی کو مسلسل تابوت میں بند رکھنا اور ساتھ لئے پھرنا کیسے ممکن ہے۔ آخر زندہ آدمی کو کھانے پینے کی ضرورت پڑتی ہے۔ خواہ اسے گلوکوز دیا جائے براہِ راست ڈرپ کے ذریعے۔ پھر آدمی کا نظام اخراج بھی کام کرتا رہتا ہے۔ اسے بیہوش رکھنے کے لئے چوبیس گھنٹے کے وقفے سے انجکشن بھی دینے پڑتے ہوں گے۔ یہ سب آسان کام نہیں ہے۔ ایک موبائیل میڈیکل یونٹ چاہئے اس کے لئے۔ ایک ڈاکٹر اور ایک نرس کے ساتھ۔ نو سر۔ میرا ذہن یہ تسلیم نہیں کرتا کہ وہ اتنا مشکل انتظام کریں گے..."

راما راؤ نے مجھے بھی سوچنے پر مجبور کردیا تھا "پھر کیا کریں گے؟"

"میں بتاتا ہوں۔ اگر میں ہوتا ان کی جگہ تو کیا کرتا۔ میں نے زندگی میں بہت پاپڑ بیلے ہیں۔ بڑے چکر چلائے ہیں اس لئے مجھے معلوم ہے۔ میں پیر، فقیر، جادوگر، جوگی۔ سب کچھ رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ انہوں نے تمہیں یقین دلانے کے لئے شیشے کے تابوت کا انتظام کیا اور تمہاری بہن کو اس میں ذرا سی دیر کے لئے بیہوش کرکے ڈال دیا۔ تمہارے رخصت ہوتے ہی انہوں نے اسے تابوت میں سے نکال لیا ہوگا۔ ایک شیشے کے تابوت کو ٹرک میں اٹھائے پھرنا کوئی آسان کام ہے! جو راستے میں جھٹکوں سے بکھر جائے۔ اس کے علاوہ میڈیکل پرابلم۔ جن کا میں نے ذکر کیا تھا۔ تمہاری بہن اور تمہارا بھانجا ان کے ساتھ ضرور ہوں گے لیکن اس تابوت میں نہیں۔ اس طرح نہیں جیسے تم نے دیکھا تھا اور جو اب تک تمہارے تصور میں ہے، وہ کسی ٹرک میں ہوں گے اور ممکن ہے ڈائنا مائٹ پر ہی بیٹھے ہوئے ہوں مگر وہ تابوت میں نہیں ہوسکتے۔ وہ ان کی قید میں ہیں۔ ان کی مرضی کے مطابق جی رہے ہیں اور مرنے کے لئے تیار ہیں۔ میں شرط لگا سکتا ہوں کہ کسی ٹرک میں کوئی شیشے کا تابوت نہیں ہوگا۔"

میں نے راما راؤ کو گلے لگا کے کہا "راما راؤ! یو آر اے جینئس۔ تم نے ثابت کردیا ہے کہ تم کتنے ذہین آدمی ہو۔ ایک نہ ایک دن تم بہت بڑے آدمی بنوگے۔"

"ہاں۔ بہت بڑا آدمی۔" وہ تلخی سے مسکرایا "میرے مقدر میں یا تخت ہوگا یا تختہ۔ یہ بات مجھے نجومی جوتشی بتا چکے ہیں۔ میں اس ملک کا صدر بھی بن سکتا تھا جس کا نام تاریخ میں سنہرے حروف میں لکھا جاتا۔ یا وہ مجرم جس کا ذکر تاریخ میں آتا۔ ان کارناموں کی تفصیل کے ساتھ جو بالآخر اسے تختۂ دار تک لے گئے۔ یہ دوسرا امکان اب واضح ہونے لگا ہے۔"

میں نے کہا "ابھی ایسا مت سوچو۔ ایک لمحہ آدمی کی ساری زندگی بدل دیتا ہے۔ اس کا راستہ اور اس کی منزل بدل دیتا ہے۔ اس وقت تم نے مجھے جس عذاب سے نجات دلائی ہے۔ اس پر میں تمہیں منہ مانگا انعام دے سکتا ہوں۔ اس ایک لاکھ کے علاوہ جو تمہیں دیا جا چکا ہے۔"

غالب نے کہا "ایک بات بتاؤگے؟ برا مانے بغیر۔"

"ہر برائی میں ملوث آدمی کس بات کا برا مان سکتا ہے!"

"تو تم یہ پیسہ کیوں جمع کر رہے ہو؟ ملہوترہ نے کہا تھا کہ تم لالچی آدمی ہو۔"

اس نے ملہوترہ کو ایک گالی دی "کیا وہ خود لالچی نہیں تھا۔ یہ سارے دھندے وہ کس لئے کرتا تھا؟ انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے۔"

"ہر شخص ایک مقصد سامنے رکھ کے کچھ کرتا ہے۔ ابھی حال ہی میں ایک شخص نے دوست بنا کے ہمیں لوٹ لیا۔ حالانکہ ہم خود لٹنے کے لئے بھی تیار ہو جاتے۔ اگر وہ کہتا کہ میں تمہیں لوٹنا چاہتا ہوں۔ اس کے سامنے بہت چھوٹا سا مقصد تھا۔ ایک عورت۔ لیکن اس ایک عورت کے لئے پہلے ایک گھر کا حصول۔"

"مقصد تو میرے سامنے بھی ہے۔ میں کسی دن صنعت کار بن جاؤں گا۔ اپنا کام اور اپنا نام۔ اپنا ماضی حال اور مستقبل، سب بدل ڈالوں گا۔ چالیس پچاس لاکھ سے میں کوئی کارخانہ قائم کروں گا۔ دہلی یا کانپور میں یا الہ آباد میں۔ سیٹھ کروڑی مل کہلاؤں گا۔ مجھے عزت مل جائے گی۔ رشتے مل جائیں گے اور وہ سب مل جائے گا جس کی میں نے زندگی سے توقع کی تھی مگر جو مجھے سیدھے راستے پر چل کر محنت کرنے سے نہیں ملا۔ اور نہ مل سکتا تھا۔" راما راؤ نے کہا۔

"میں نے بالکل یہی کہا تھا تمہارے متعلق۔ یہی اندازہ تھا میرا۔ چونکہ تم برا نہیں مانتے اس لئے تم یہ بھی بتادو کہ تم اپنے مقصد سے کتنے دور ہو یا کتنے قریب ہو۔"

"میں نے تین چوتھائی راستہ طے کرلیا ہے۔ اب اور باقی کے لئے مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ بس یہی دو تین سال۔ خیر۔ اب میری بات چھوڑو اپنی بات کرو۔ آج کے دن اور شاید کل بھی میں تمہارے لئے کچھ نہیں کرسکوں گا۔"

"کیوں؟" میں نے کہا۔

"میں بے حد مصروف رہوں گا۔ تم نے میری مصروفیات بڑھادی ہیں۔ اس وقت بستی پر پولیس نے یلغار کی ہوئی ہے۔ وہ گھر گھر تلاشی لینے اور ایک ایک آدمی سے پوچھ گچھ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔"

"تم سے آج بھی پوچھ گچھ ہوگی اور کل بھی!"

"سمجھنے کی کوشش کیا کرو۔" وہ جھلا کے بولا "میری پوزیشن بہت محفوظ ہے۔ میری مصروفیت کا سبب ہیں وہ لاشیں جو ابھی پولیس لے گئی ہے۔ قانونی کارروائی تو پوری ہونی ہے۔ شام تک سب لاشیں واپس آجائیں گی تو ان کا کریا کرم ہوگا۔ سب جگہ میں ہی جاؤں گا۔ یہاں اتنے لوگ کبھی نہیں مرے۔ ایک دو مردے ٹھکانے لگانے کا موقع ملتا ہے۔ ہفتے بھر میں۔"

"فی مردہ کیا لیتے ہو؟" غالب نے کہا۔

"اس میں ریٹ کہاں چلتا ہے۔ حیثیت دیکھنی پڑتی ہے لواحقین کی۔"

"یہ ہول سیل بزنس مل گیا تمہیں ہماری وجہ سے۔"

"ہاں چوبیس آدمی ہیں۔"

"چوبیس لاشیں ہیں۔ یا مردے ہیں" غالب نے تصحیح کی۔

"ان میں سے آٹھ یہاں کے نہیں تھے" راما راؤ بولا۔

"امپورٹ کئے گئے تھے۔ کرائے کے گوریلے۔"

"سولہ کا کریا کرم بہرحال مجھے کرنا ہے۔ اگر لاشیں شام کو دیر سے ملیں تو پھر رات کو فرصت ہوگی۔ کل کا دن مصروف گزرے گا۔ میں نے کہا ہے کہ سب ایک ساتھ شمشان گھاٹ لائے جائیں۔ ایک ساتھ جلانے کے لئے۔ پھر بھی دوسری رسوم تو الگ الگ ہوں گی۔ ابھی ہفتہ دس دن تک دان پن اور بھوجن چلے گا۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو پروہت جی۔ ہفتہ دس دن ہم یہاں کیسے قید رہ سکتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"صرف آج کے دن کی بات ہے۔ گیتا اور رامائن کا پاٹھ کرنے کے لئے تو میں نے چیلوں سے کہہ دیا ہے لیکن شمشان میں تو مجھے ہی سب کچھ کرنا ہوگا۔ ابھی میں بستی میں جاکر صورتِ حال دیکھوں گا کہ پولیس کیا کر رہی ہے۔ وہ مندر کی طرف بھی ضرور آئیں گے۔ میں ان سے مل لوں گا۔ تو وہ گھر نہیں آئیں گے۔ جو پوچھنا یا کہنا ہوگا وہیں پوچھیں گے اور کہہ دیں گے..."

باہر سے میں نے کسی موٹر سائیکل کی آواز سنی جو رفتہ رفتہ قریب آتی محسوس ہوتی تھی۔ میرا دھیان ایک دم پولیس کی طرف گیا۔

"راما راؤ! یہ موٹر سائیکل پر کون آیا ہے؟"

"موٹر سائیکل پر..... اور کون آسکتا ہے" وہ گھبرا کے اٹھا۔

"یہ پولیس ہے" غالب نے کہا۔

موٹر سائیکل عین دروازے کے سامنے آکر رک گئی۔

"ادھر... ادھر جاؤ" راما راؤ نے سرگوشی میں کہا۔ اور ہاتھ

کے اشارے سے ہمیں دھکیلنے لگا۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ یہ شریفانہ دستک نہیں تھی۔ کسی نے دروازے کو ڈنڈے سے بجایا تھا۔ یہ اختیار اور فرعونیت کا غرور اور طاقت رکھنے والوں کی دستک تھی۔

"انڈر گراؤنڈ ٹینک" راماراؤ نے سرگوشی میں کہا۔

"راماراؤ کیا بات ہے؟ دروازہ کھولو۔"

"آتا ہوں جی۔ جلدی مت د..... ابھی دھوتی تو باندھے گا جی پہلے" راماراؤ نے آواز بنا کے کہا۔

میں اور غالب انڈر گراؤنڈ ٹینک کی طرف لپکے جو ہم پہلے ہی دیکھ چکے تھے۔ اس وقت ہم نے یہ نہیں دیکھا تھا کہ اس ٹینک کی گہرائی کتنی ہے اور اس میں پانی کتنا ہے۔ میں نے اس کا ڈھکنا کھولا اور اندر اتر گیا۔ مجھے اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آیا تھا۔ اوپر سے کھلے حصے کی چمک بھی پڑ رہی تھی۔ مگر میرے پاؤں پانی کی سطح سے ٹکرائے تو مجھے اندازہ ہوا کہ ٹینک سات فٹ کے قریب گہرا ہے اور اس میں پانی چار فٹ تک بھرا ہوا ہے۔

غالب نے اتنی دیر میں نازو کو ہاتھ پکڑ کے لٹکا دیا تھا۔ گل خود ہی لٹک کے پانی میں گری۔ میں نے اسے سنبھال کر کھڑا کر دیا۔ غالب نے اندر آتے ہوئے ڈھکن اوپر کھینچا اور برابر کر دیا۔

اب ہم گھپ اندھیرے میں کھڑے ہوئے تھے۔ چار فٹ پانی میری کمر تک تھا لیکن نازو کی گردن تک پہنچ رہا تھا اور گل کے شانوں ... پانی ٹھنڈا تھا مگر اتنا بھی نہیں کہ سردی سے دانت بجنے لگتے۔ ... کے دانت خوف سے بج رہے تھے۔ وہ خود بھی لرز رہی تھی۔

میں نے ڈانٹا "یہ کیا بے وقوفی ہے۔ یہاں کسی کو بھی اجازت نہیں دی جا سکتی بے ہوش ہونے کی۔"

اس نے کانپتے ہوئے کہا "وہ.... دراصل ناک میں پانی چلا گیا۔"

غالب نے کہا "کس نے کہا تھا کہ بہادر بن کے خود کود جاؤ۔"

میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کے اسے اپنے قریب کر لیا "چند منٹ کی بات ہے۔ گرنے لگو تو مجھے نوٹس دے دینا۔"

"میں نہیں گروں گی..." گل نے کہا اور میرے بازو کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

نازو نے کہا "ادھر آ جاؤ گل، میرے پاس۔"

"تم کہاں ہو؟ پانی کے نیچے یا اوپر" غالب نے کہا۔

نازو ہنسی "ادھر۔ اس دیوار کے ساتھ لوہے کے ہک بھی لگے ہوئے ہیں اور اوپر سے آنے والا پائپ ہے سہارے کے لئے۔"

"اچھا بھئی۔ یہاں بھی مل ہی گیا تمہیں کوئی سہارا دینے والا" غالب نے سرد آہ بھر کے کہا۔

"کاش تم ایک پائپ ہوتے" نازو نے اسے چھیڑا "یا لوہے کا ہک ہی ہوتے۔"

"ہونا ہی تھا تو میں زلف ہوتا یا تیرے رخسار پہ تل ہوتا"

غالب نے یوں کہا کہ نازو سے جواب نہ بن پڑا۔ اس ... سنے میں نے اندازہ کر لیا کہ وہ جھینپ سی گئی ہو گی اور ... غالب کی چشم تصور نے تاریکی میں بھی اس کے عارض ... گلابی رنگ دیکھ لیا ہو۔

"آخر اور کتنی دیر تلاشی لیں گے پولیس والے؟" ... کہا۔

میں نے کہا "اگر تفصیلی تلاشی لی تو... تم لوگ تنگ ... ہو؟"

"اور... کیا... جوتے تلاش کرتے رہتے!"

"مروا دیا" میں نے کہا "زنانہ جوتے فوراً نظر آ جا... کیا بتائے گا راماراؤ پولیس کو کہ کس کے ہیں۔"

غالب نے کہا "تفصیلی تلاشی میں تو سینڈل سے ... خطرناک چیزیں مل جائیں گی۔ ریوالور سے دستی بم تک ..."

اب مجھے صورت حال کی سنگینی کا احساس پریشان کر ... یہ سب چیزیں کیا سامنے ہی پڑی ہوئی ہیں۔"

غالب نے کہا "قسمت اچھی تھی کہ تمہارے سا... دور اندیش آدمی آ گیا۔ یعنی یہ خاکسار۔ میں نے انہیں ..."

"تھینک یو مسٹر دور اندیش۔ تم نے کہاں رکھا تھا ..."

"بیڈ کے نیچے۔ صندوق کے پیچھے۔ صرف اس ... کہ اچانک کوئی آ جائے تو ہمیں پریشانی نہ ہو" غالب نے ...

"مسٹر دور اندیش! اگر ہمیں اچانک ریوالور کی ضرورت ... جاتی تو ہم کیا کرتے؟ جتنی دیر میں ہم بیڈ کے نیچے گھستے اور ... کے پیچھے سے ریوالور نکالتے۔ کیا ہمارے پیچھے ایک سوراخ نہ ہو جاتے؟" میں نے کہا۔

"وہ تو یہاں بھی ہو سکتے ہیں۔"

"خدا کے لئے مت کرو ایسی باتیں" گل نے کانپ... کہا۔

نازو نے کہا "ایسے ہم کتنی دیر کھڑے رہ سکتے ہیں ..."

غالب نے کہا "کس نے کہا ہے کھڑی رہو۔ بیٹھ جاؤ ..."

نازو کے سوال نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ ... اندازے کے مطابق ابھی صرف پانچ منٹ ہی گزرے ... اگر ایسے پانچ گھنٹے گزارنے تو کیا ہو گا؟ شاید ہم میں سے ... اتنی قوت برداشت نہیں رکھتا تھا۔ پانی کی قید کا عذاب ... تجربہ تھا جس سے کوئی پہلے نہیں گزرا تھا۔

ابھی سے ہمارے جسم سرد پڑ رہے تھے۔ شاید آدھ... بعد ہمارے پانی میں ڈوبے ہوئے جسم سن پڑ جاتے۔ ہمارا توازن قائم رکھنا مشکل ہو جاتا۔ ہماری ٹانگیں کانپنے لگتیں ... بالآخر ہم گر پڑتے۔ غالب کے سوا سب کو تیرنا آتا تھا ... ٹینک میں تیرنا بھی تو مشکل تھا۔ گھپ اندھیرے میں ... دوسرے کو دیکھ بھی نہیں سکتے تھے۔ یہ اندھیرا ابھی ایک مادی وجود رکھتا تھا۔ اس ٹھنڈک کی طرح جو پانی کی شکل ... ہوئی تھی۔ اتنا ہی ٹھوس احسا... ش کا بھی تھا۔ ...

اندھے اور بہرے ہو گئے تھے۔ خود کو اس بات کا یقین دلانے کے لئے کہ میں اندھا، بہرہ اور گونگا نہیں ہوا ہوں، میں نے کہا "نازو کدھر ہے؟"

"یہاں، میرے پاس۔"

"بھائی سکندر! مجھے وحشت ہو رہی ہے۔ ایسا لگتا ہے مجھے جیسے مجھے زندہ دفن کر دیا گیا ہے۔ یہ قبر ہے میری" گل نے ہسٹریائی کیفیت میں کہا "میں مر چکی ہوں۔"

"نہیں۔ ہم سب غرق ہو گئے ہیں۔ سمندر میں ڈوب گئے ہیں" نازو نے کہا "اور انتہائی گہرائی میں پڑے ہوئے ہیں... سورج کی روشنی بھی نہیں پہنچ سکتی۔ حالانکہ اوپر زمین روشن ہے، آسمان پر سورج چمک رہا ہے۔"

"نازو! بس تھوڑا سا انتظار اور میری جان" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "گل! ہمت سے کام لو۔ تم بہت بہادر ہو۔ ایک بہادر بھائی کی بہادر بہن۔"

خاموش پانی کا معمولی سا تموج اب مجھے یوں لگتا تھا جیسے میرے قدموں کے نیچے زمین ہل رہی ہے۔ زلزلے کی زد میں ہے، ہم سب ساکت تھے۔ لیکن ہمارے سانس لینے سے بھی جو خفیف سی حرکت ہوتی تھی وہ میرے وجود کی عمارت کو ہلا دیتی تھی۔ میں سنبھلتا تھا پھر گل کو سنبھالتا تھا۔ وہ اب گرنے لگی تھی۔ میں نے اسے ایک بغل میں ہاتھ دے کر سہارا فراہم کر رکھا تھا لیکن میرے ہاتھ پر اس کا بوجھ اثر انداز ہو رہا تھا۔ یہ بوجھ بڑھتا جا رہا تھا اور میرا ہاتھ سن ہوتا جا رہا تھا۔

پانی کی اس قید کا عذاب کب ختم ہوا؟ شاید ایک دن گزر گیا اور پھر ایک رات گزر گئی۔ وقت اگر احساس کی شدت کا نام تھا تو جو سختی ہم نے اس آدھے گھنٹے میں جھیلی وہ ناقابل بیان ہے۔

گل پہلے بے ہوش ہوئی۔ پھر نازو۔ میں اور غالب وقت سے لڑتے رہے۔ راماراؤ کو گالیاں دیتے رہے۔ سور کے بچے نے کہاں لا کے مارا۔ کیسا دھوکا دیا۔ ایسے ہی یوسف ثانی نے دھوکا دیا تھا۔

اوپر کا ڈھکنا ایک دم کھلا۔ یک لخت زندگی کا نیا سورج طلوع ہو گیا۔ میں نے اوپر دیکھا تو میری نگاہیں خیرہ ہو گئیں۔ روشنی کے اس سیلاب میں راماراؤ کا سایہ مجھے آسمان پر پھیلا ہوا لگا۔

"آئی ایم سوری..."

"سوری کے بچے!" میں نے چیخ کے کہا اور اسے ایک دو منٹ ایسی گالیاں دیں جو میں گل یا نازو کے سامنے ہی نہیں، کسی بھی عورت کے سامنے نہیں دے سکتا تھا۔ وہ ہوش میں نہیں تھیں اس لئے انہوں نے کچھ نہیں سنا۔ مگر میں بھی ہوش میں نہیں تھا۔

راماراؤ نے مجھے۔ پھر میں نے گل کو۔ اس کے بعد نازو کو اور پھر ہم دونوں نے غالب کو اوپر کھینچا۔ میں اور غالب پانی میں تر بتر زمین پر لیٹ گئے۔ دھوپ نے ہمارے جسموں میں حرارت بھر دی تھی۔ چند منٹ کے بعد ہم نے گل اور نازو کو اٹھایا اور اندر لے گئے۔

راماراؤ بہت نادم اور پریشان تھا "میں کیا کرتا۔ انہوں نے گھر کے اندر دیکھا اور شکر ہے زنانہ سینڈلوں کے بارے میں سوال نہیں کیا۔ وہ سمجھے ہوں گے کہ میری فیملی بھی ساتھ ہو گی۔ وہ انسپکٹر بڑا شکی تھا۔ مجھے مندر لے گیا۔ مندر کا کونا کونا دیکھا۔ پوچھتا رہا کہ کل سے آج تک میں نے کسی اجنبی کا چہرہ تو نہیں دیکھا۔ پھر اس نے کہا کہ ایک سنتری مندر کے باہر موجود رہے گا... ہر آنے جانے والے پر نظر رکھنے کے لئے اپنا کوئی ایسا آدمی اس کے ساتھ بٹھا دو جو بستی کے ہر شخص کو پہچانتا ہو۔ میں نے کہا کہ ایسا تو میرے سوا کوئی نہیں لیکن میں یہاں شناخت کے لئے بیٹھ گیا تو مرنے والوں کا کریا کرم کون کرے گا۔ تمہارا باپ۔ یہ آخری بات میں نے دل میں کہی۔ پھر وہ چلا گیا۔ جاتے جاتے کہہ گیا کہ آنکھیں کھلی رکھنا۔ میں نے کہا۔ میں پلک بھی نہیں جھپکاؤں گا۔ کہہ رہا تھا کہ وہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔ جو سامنے آ جائے اسے کچھ پوچھے بغیر مار دیتے ہیں۔ میں نے پوچھا کیا پاگل ہیں تو بولا کہ جنونی ہیں۔ مندر میں گھس گئے تو سمجھو مندر کی خیر نہیں۔ پروہت سے پجاری تک سب کو مار دیں گے۔ میں نے کہا، مندر کی حفاظت خود ہنومان جی کرتے ہیں، تم فکر مت کرو۔ بس اسی میں آدھا گھنٹا لگ گیا۔"

"آدھا گھنٹا!" میں نے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی جو سو فیصد واٹر پروف ثابت ہوئی تھی "مجھے تو ایسا لگتا تھا کہ آدھا دن گزر گیا۔"

غالب نے کہا "خیر۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم نہیں گزرے۔"

میں نے راماؤ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے معذرت آمیز لہجے میں کہا "پروہت جی! میں نے بڑا پاپ کیا ہے۔ تم کو وہ گالیاں دی ہیں جو صرف تھانے دار ہی اپنے مجرموں کو دیتے ہیں، تم تو مہربان اور مددگار ہو۔"

اس نے کہا "میں نے سائیکالوجی پڑھی ہے۔ تمہاری نفسیاتی اور ذہنی کیفیت کے پیش نظر تمہارا وہ ردعمل میرے لئے غیر متوقع نہیں تھا۔ ہاں اب تم کچھ کہو گے تو..."

"تو کیا؟" میں نے کہا۔

اس نے دانت نکال کے کہا "میں تمہیں مدراسی زبان میں وہ گالیاں دوں گا کہ تم کو اپنی دی ہوئی گالیاں بہت ہلکی محسوس ہوں گی۔ جیسے پتھر کے مقابلے میں پھول۔"

"میں نے کہا "مثلاً؟"

غالب نے بھی کہا "ہاں یار۔ حساب برابر کر لو۔ ہم بھی برا نہیں مانیں گے۔"

"راماراؤ نے کہا "چھوڑو یار۔ دیکھو یہ لڑکیاں آہستہ آہستہ ہوش میں آ رہی ہیں۔ ان کے گیلے کپڑے بدل دو۔"

"کیسے بدل دیں؟ ہمارے پاس دوسرے کپڑے نہیں ہیں!"

وہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر اس نے زمین پر جھک کے بیڈ کے نیچے سے پرانا ٹین کا صندوق گھسیٹ کر باہر نکالا۔ ایک چابی سے اس کا پرانا قفل کھولا۔ اس میں سے مجھے کافور کی مہک

راماراؤ نے بہت سی ساریاں نکالی۔ یہ سب پرانی تھیں اور شاید برسوں سے استعمال نہیں ہوئی تھیں۔ ان میں بنارسی ساریاں بھی تھیں لیکن اس نے دو پرانی سوتی ساریاں نکال لیں۔

"یہ سب میری ماں کی ہیں" وہ بولا "اس صندوق میں میرا بچپن بند ہے۔ میری ماں کی بہت سی ایسی نشانیاں ہیں جو عموماً کسی کے پاس نہیں ہوتیں۔ مثلاً اس کے بالوں کی ایک لٹ ہے۔ کاجل کی وہ ڈبیا ہے جو وہ استعمال کرتی تھی بہت خوبصورت تھی وہ"

"اور تمہارا باپ؟" میں نے انجانے میں اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"باپ!" اس کا چہرہ کسی اندرونی کرب سے مسخ ہوگیا "میں کسی باپ کو نہیں جانتا۔ میرا باپ تھا ہی نہیں۔ اگر کوئی مجھے اپنا بیٹا مانتا تو میں کہہ سکتا تھا اسے باپ۔ وہاں تو سارے ہی میرے باپ تھے۔ یوں سمجھو ہی۔ میری ماں ایک طوائف تھی۔ مجھے یہ بات بتاتے ہوئے کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی۔"

میں نے کہا "ماں صرف ماں ہوتی ہے۔ عورت صرف عورت ہوتی ہے۔ بعد میں وہ استانی بنتی ہے یا ڈاکٹر۔ بیوی بنتی ہے یا طوائف۔ اس کا الزام حالات کو دیا جاسکتا ہے۔ اس عورت کو نہیں۔"

وہ خاصا پُرسکون نظر آنے لگا "معلوم نہیں میں نے تمہیں یہ بات کیوں بتادی۔"

میں نے کہا "اس سے ہماری نظر میں تمہاری وقعت بڑھ گئی کم نہیں ہوئی۔"

غالب نے کہا "کیا تمہاری ماں چاہتی تھی کہ تم پڑھ لکھ کے بڑے آدمی بنو؟"

راماراؤ چونکا "تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"غالب نے کہا "مائیں تو ہم سب کی ایک ہی طرح سوچتی ہیں۔"

وہ کچھ دیر صدمے کی کیفیت میں بیٹھا رہا "اگر وہ زندہ رہتی تو میں ضرور بڑا آدمی بن جاتا۔ وہ مجھے سیدھے راستے سے بھٹکنے نہ دیتی۔ لیکن مجھے بہت افسوس ہے کہ وہ زندہ نہ رہی۔ میں نے ایک ایم اے کیا۔ پھر دوسرا۔ اس کی خواہش پر۔ وہ کہنے لگی کہ ایک ایم اے اور کرلے بیٹا۔ پاگل عورت! میں تیسرا ایم اے کرلیتا تو وہ کہتی ایک اور بیٹا۔ شاباش۔ جیسے میری ڈگریاں ہی اس کے کام آئیں گی۔ اس کے سارے پاپ کے پہاڑ کاٹ دیں گی اور اس میں سے وہ سکھ کی نہر نکلے گی جو اس کی گنگا ہوگی۔ پوتر پانی والی جس میں سب کے گناہ دھل جاتے ہیں۔ لیکن....." اس نے دکھ سے نفی میں سرہلایا "وہ اچانک مرگئی مجھے بتائے بغیر۔"

"کیا ہوا تھا اسے؟ کوئی مہلک مرض یا ہارٹ اٹیک؟"

"اس نے خودکشی کرلی تھی؟" غالب نے اسے خاموش دیکھ کے کہا۔

"نہیں۔ اسے میرے وجود کی شرمندگی نے ماردیا۔ سب طرح وہ بھی چاہتی تھی کہ ایک بہولائے۔ میں کہتا تھا کہ

ماں، بہو آئے گی تو تیرا بیٹا چھین لے گی۔ وہ ہنستی تھی کہ میں اس کے حوالے کردوں گی بیٹے کو۔ کہ لے، اب تو اسے سنبھال اور خود کاشی چلی جاؤں گی۔ ایک دن میں نے خود اس کو بتایا تیری خواہش پوری ہوگئی۔ جا اپنی بہو لے آ۔ وہ بہت خوش گئی۔ اور ذلت اٹھا کے واپس آگئی۔ جس لڑکی کو میں چاہتا تھا اس کے باپ نے میری ماں کو پہچان لیا۔ وہ خود اس کے پر جاتا رہا تھا۔ مگر وہ مرد تھا۔ گناہ تو صرف عورت کا ہوتا ہے۔ اس نے کہا دو ٹکے کی رنڈی تیری یہ مجال۔ خاندانی لوگوں کا رشتہ ہے۔ ہمارے منہ پر گٹر کی غلاظت ملنے آئی ہے۔ تیرا بیٹا اس کیڑا ہے جس میں سب اپنی غلاظت بہاتے ہیں۔ میری بیٹی سے اترنے والی گنگا ہے۔ میری ماں نے سب سنا لیکن مجھے بتایا۔ جب میں واپس آیا تو لوگ اس کی لاش اتار چکے تھے پنکھے سے لٹکی ہوئی تھی۔ میں نے اگلے ہی دن اس حال کو جس کو اپنی بلندی پر ناز تھا اور دعویٰ تھا کہ گنگا اس کے پاک پانی ہے۔ میں نے اس کا خون نالی میں بہایا۔ اسے گھر میں ذبح کرکے ڈال دیا۔ پھر میں بھاگ گیا۔ اب میں راماراؤ اونچی ذات کا برہمن۔ میں نے سب سے بدلہ لے لیا ماں کے ساتھ ہونے والے ظلم کا۔ میں نے شادی نہیں کی کروں گا۔ لیکن ہر اونچی ذات کا غرور رکھنے والے کی بیٹی ہے میری۔ میں نے طوائف بنادیا ہے سب کو۔ میرا کیا دھرم ایمان۔"

میں نے ساریاں اس سے لے لیں۔ وہ پٹی پر سر رکھے تھا۔ ایک مجبور، قابلِ رحم آدمی۔ اپنے انتقام کی آگ میں والا اور انتقام لینے کے بعد پشیمانی کے احساس کی اذیت جھیلے... بیک وقت ظالم اور مظلوم۔ خود اپنے خنجر سے زخم لگا اور پھر اس زخم کے آزار پر رونے والا۔ ایک ایم اے سائیکالوجی جو اپنی سائیکالوجی بگاڑ چکا تھا۔

کچھ دیر بعد جب نازو اور گل نے ہوش میں آنے کے کپڑے بدل لئے تھے، وہ ایک ٹرے میں چائے کے برتن اٹھائے مسکراتا ہوا اندر آیا۔ وہی پرانا راماراؤ۔ ذرا سی دیر کے اصل راماراؤ اس ٹین کے صندوق میں سے ایسے نکل آیا تھا جیسے بوتل میں قید جن آزاد ہوگیا ہو۔ اس جن کو راماراؤ نے پھر بند کردیا تھا۔

"یہ تم نے کیوں تکلیف کی؟"

"میں تو کھانا بھی خود ہی پکاتا ہوں اپنا۔ چائے بنانے میں کیسی تکلیف۔ لڑکیوں کو ضرورت تھی۔"

میں نے کہا "یہ نازو ہے۔ نازلی بیگم اس کا پورا نام تھا یہ گل بانو ہے۔ پہلے یہ ناگ منی تھی۔ اس کا بھائی شیش ناگ اور ایک بہت نامور ڈاکو تھا۔ یہ بھی ڈاکو تھی۔ اب دیکھ لو اور سوچو کہ ایک لڑکی ناگ منی سے گل بانو بن سکتی ہے تو راماراؤ وہ کیوں نہیں بن سکتا جو وہ بننا چاہتا تھا؟"

راماراؤ اسے یوں دیکھتا رہا کہ گل کا رنگ لال پڑنے لگا۔

"اور میرا نام واقعی مرزا غالب ہے۔ پہلے میں ایک صحافی تھا" غالب نے کہا

"اور وہ لڑکی جس کو ہم چھڑانے کے لئے آئے ہیں اس کا نام شہلا ہے۔" میں نے کہا "اس کے شوہر کا نام محسن ہے۔"

غالب نے کہا "محسن کے ساتھ جو لڑکی غالباً قید ہوگئی ہے اس کا نام رابعہ ہے۔ بہت بڑی وکیل تھی وہ۔ ایک دن وہ سکندر کی ہوجائے گی۔"

راماراؤ نے کہا "کیا ہوجائے گی؟"

"یار، سمجھا کرو بات کو۔ گھر والی اور کیا" غالب نے میری بات دہرائی۔

"اب میں سمجھ گیا۔ ساری بات سمجھ گیا" راماراؤ نے سر ہلایا "تم چائے پیو۔ میں مٹھائی لاتا ہوں۔"

"کہاں سے؟"

"مٹھائی کے ڈھیر آتے ہیں ہر روز۔ مجھے تو الرجی ہوگئی ہے مٹھائی کی صورت سے۔ لیکن آج کھاؤں گا تمہارے ساتھ۔ تازہ مٹھائی بہت اچھی ہوتی ہے یہاں۔ خالص دودھ سے بنتی ہے نا۔ میں ابھی گیا اور ابھی آیا" اس نے چٹکی بجا کے کہا "مندر تک ہی تو جانا ہے۔"

وہ واقعی پانچ منٹ میں واپس آگیا۔

"ایک خبر ہے تمہارے لئے" اس نے ہمارے ساتھ چائے پیتے ہوئے کہا "موقع نہیں ملا پہلے بتانے کا۔ وہ جو لڑکی ہے نا، تمہارے بھانجے کی پھوپی"

میں نے مسکرا کر کہا "رابعہ؟"

"ہاں اور وہ تمہارا بہنوئی۔ محسن نام بتایا تھا تم نے۔ وہ دونوں یہیں ہیں۔" راماراؤ بولا۔

میں نے چائے کا کپ رکھ دیا "یہ کیسے معلوم کیا تم نے؟"

"میں نے معلوم نہیں کیا۔ پولیس نے بتادیا ہے مجھے۔ وہ آپس میں باتیں کررہے تھے۔"

"کیا باتیں کررہے تھے؟"

"یہی۔ کہ دو ساتھی پکڑے گئے کل رات ان کے۔ بجلی گھر کے پاس سے۔ چوکیدار نے انہیں صبح پہچان لیا۔ اس نے کہا کہ انہی دونوں نے مجھے مجبور کیا تھا بجلی بند کرنے پر۔ دس منٹ کے لئے۔"

"وہ پکڑے کیسے گئے؟"

"سنا ہے گودام کی طرف گئے تھے" راماراؤ بولا۔

"مجھے اندازہ تھا کہ کچھ نہ کچھ ضرور کریں گے وہ۔ سب کو اپنی اپنی کرنے کی عادت ہے۔ شوق ہے۔" میرا پارہ چڑھ گیا۔ "کسی سے مشورہ نہیں کرنا۔ کسی سے پوچھنا نہیں۔ ایک ٹیم ہے تو سب اس میں کپتان ہیں۔ الگ الگ اپنا کھیل کھیلتے ہیں۔ ایسی کی تیسی ڈسپلن کی۔"

غالب، نازو یا گل میں سے کسی نے کچھ نہیں کہا۔ انہیں جیسے احساس تھا کہ رابعہ اور محسن نے غلطی کی۔ اور اس کے نتیجے میں ہمارے لئے پریشانی پیدا کی۔ تو خود بھی مصیبت میں گرفتار ہوئے۔ کچھ دیر بعد جب میرا غصہ کم ہوا تو میرے خیالات کی رو نے مخالف سمت اختیار کرلی۔ میں سوچنے لگا کہ شاید محسن کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی یہی کرتا۔ اگر میری بیوی.... لیکن محسن کو یہ بات کہاں معلوم تھی کہ شہلا اور اس کا بیٹا دشمنوں کی قید میں اتنے قریب موجود ہیں۔ معلوم ہوتا تو پھر اس کی بے قراری جائز ہوتی۔ کبھی آدمی جذبات کے سیلاب میں تنکے کی طرح بہہ جاتا ہے۔ ...کہیں رابعہ نے اسے بتا تو نہیں دیا تھا۔ غلطی سے کوئی ایسی بات تو نہیں کہہ دی تھی جس نے راز افشا کردیا ہو۔ پھر محسن نے اسے مجبور کردیا ہو کہ حقیقت کو نہ چھپائے۔ یا میرے خدا! اگر رابعہ نے ایسی غلطی کی تو پھر محسن کا کیا قصور؟ اگر وہ پاگل ہوگئے۔ بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق تو قصوروار عقل کو کیسے سمجھا جاسکتا ہے۔

غالب نے کہا "یار سکندر! جو ہونا تھا وہ ہوگیا۔"

"اب ہمیں کچھ کرنا چاہئے۔ میں نے کہا "آج ہی رات..."

"اتنی جلدی مت کرو" راماراؤ نے کہا "سوچ سمجھ کر قدم اٹھاؤ۔"

"میں نے سوچ لیا ہے اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آج کی رات ہی ہمارے لئے بہترین مواقع فراہم کرتی ہے۔"

"وہ کیسے؟"

میں نے کہا "آج سارا دن پولیس بھی زیادہ سے زیادہ دوڑ دھوپ کرے گی۔ ہمارے دشمن بھی سارا دن تلاش کرنے کے بعد یہ سمجھ لیں گے کہ ہم اس بستی میں بہرحال نہیں ہیں۔ آس پاس کے علاقے میں بھی نہیں ہیں۔ ورنہ پکڑے جاتے۔ وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہوں گے کہ فی الحال ہم کہیں دور چلے گئے ہیں۔ یا ایسی جگہ جاکر چھپ گئے ہیں جہاں تک کسی کا پہنچنا مشکل ہے۔ یہ تو وہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ ہم عین ان کی ناک کے نیچے موجود ہیں۔ چراغ تلے اندھیرا اسی کو کہتے ہیں۔ دشمن اب باہر سے بستی کی جانب آنے والے راستوں کی نگرانی کریں گے۔ اس خیال سے کہ ہم پھر لوٹ کے آئیں گے مگر کچھ وقت گزر جانے کے بعد یا ہم بستی میں موجود ہیں تو پھر باہر جانے کی کوشش کریں گے۔ ہر صورت میں اب شکاری اس بستی کے آس پاس رہ کے ہمیں تلاش کریں گے۔ آج رات وہ ہم سے کسی تازہ واردات کی توقع نہیں رکھیں گے۔"

غالب نے کہا "میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک نفسیاتی حربہ ہے۔ ہم اچانک، بے خبری میں ان پر غالب آجائیں۔ جب وہ اس کے لئے ذہنی طور پر بالکل تیار نہ ہوں۔"

"اس کے علاوہ۔ آج رات بستی میں خوف و ہراس کی فضا ہوگی۔ اتنے بہت سے گھروں میں سوگ ہوگا۔ اس سوگ میں سب ہی شریک ہوں گے۔ دن بھر کی مصروفیت کے بعد پولیس والے بھی رات کو کچھ آرام کریں گے کہ چلو جو ہونا تھا ہوگیا۔ آج کی قانونی کارروائی ختم ہوئی۔ اب رات کو کیا کرنا

آرام کرنے کے۔ ہماری یہ اسکیم زیادہ کامیاب ہوسکتی ہے اگر شہر کے اسپتال سے لاشیں جلد مل جائیں اور مرنے والوں کو آج ہی جلانے کا انتظام ہو۔ ظاہر ہے اس میں رات ہو جائے گی۔ شمشان میں سولہ ارتھیاں ایک ساتھ جلائی تو جاسکتی ہیں۔ ایک ساتھ لانا مشکل ہوگا۔ سب کے آتے آتے دیر لگے گی۔ اور چتا کو آگ تب ہی لگائی جائے گی جب آخری ارتھی بھی پہنچ جائے گی۔ میرا خیال ہے پوری نہ سہی آدھی بستی تو ضرور وہاں موجود ہوگی۔"

"پوری ہی ہوگی۔ شاید کچھ لوگ نہ جائیں۔ یہاں تو سب ہی ایک دوسرے کو جانتے ہیں" راما راؤ نے کہا۔

"شمشان کہاں ہے؟"

"بستی سے باہر۔ یہاں سے کوئی ایک میل۔"

میں نے کہا "رات کے وقت بستی سنسان ہوگی تو ہمارے لئے خطرات بھی کم ہوں گے۔ اس وقت ہم گودام میں داخل ہوسکتے ہیں۔"

"کیسے؟ کس طرف سے....." غالب نے کہا۔

"پہلے میری بات سن لو۔ گودام کے محافظوں کی پوزیشن بھی آج خراب ہوگی کیونکہ جو لوگ مارے گئے ہیں وہ سب مہوترہ کے گھر اور گودام کے مشترکہ محافظ تھے۔ وہ فوج تھی جو مہوترہ کے ناجائز کاروبار کو تحفظ فراہم کرتی تھی۔ سولہ مقامی آدمی تھے۔ آٹھ باہر سے بھی آئے ہوئے تھے۔ یہ باہر سے آنے والے کون تھے؟ ظاہر ہے تریونی کے آدمی۔ یا دلاور اینڈ کمپنی کے لوگ۔"

"دلاور اینڈ کمپنی کیا ہے؟" راما راؤ بولا۔

"یہ بھی تریونی کی ایک کمپنی ہے" میں نے کہا "جو سولہ افراد یہاں کے تھے ان کی جگہ آج ہی نئی بھرتی نہیں کرلی گئی ہوگی، ہوسکتا ہے کل پرسوں میں ان کی جگہ دوسرے آجائیں۔ مگر آج ان کی جگہ خالی ہوگی۔ متبادل حفاظتی فورس اتنی جلدی فراہم نہیں ہوسکتی۔ وہ دیکھ بھال کے اور بھروسے کے لوگ رکھتے ہوں گے۔ اناڑیوں کو نہیں رکھتے ہوں گے اور کم ہمت لوگوں کو نہیں رکھتے ہوں گے۔ اپنے مطلب کے آدمی مشکل سے ملتے ہیں اور انہیں بھی تربیت دے کر کام کی نوعیت اور فرائض کی اہمیت سمجھانے میں وقت لگتا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آج ان کی غنڈہ فورس اور حفاظتی فورس کی قوت کم سے کم ہے۔ مزاحمت بھی کم سے کم ملے گی۔ چنانچہ ہم آج رات حملہ کردیں تو ہماری کامیابی کے امکانات زیادہ ہوں گے۔"

نازو نے بڑے جوش سے کہا "بالکل ٹھیک۔"

میں نے کہا "اب سوال وہی آتا ہے جو سب سے اہم ہے یعنی یہ کہ ہم حملہ کب کریں گے؟ کیسے کریں گے اور کس طرف سے کریں گے؟ تو اس سلسلے میں ہم پہلے راما راؤ سے کہیں گے کہ ایک نقشہ بنائے اپنے اندازے کے مطابق۔"

"میں بالکل صحیح نقشہ بنا سکتا ہوں۔"

"او کے۔ نقشے میں اپنے گھر، مندر اور گودام۔ تینوں کی پوزیشن بتاؤ" میں نے کہا۔

راما راؤ نے ایک سادہ کاغذ پر پینسل سے نقشہ بنایا۔

"یہ ہے بیرونی احاطہ۔ یہ گیٹ۔ یہاں سے مندر کو جانے کا سیدھا راستہ۔ یہ میرا گھر" اس نے لکیروں سے مقامات کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا "یہ چوکور خانہ ہے مندر۔ یہ میرا گھر۔ مندر کے پیچھے یہ دوسری فصیل ہے۔ پہلے مندر اور اناتھ آشرم کی ایک ہی فصیل تھی۔ دونوں ایک ہی احاطے میں تھے۔ بیچ میں ایک اور دیوار اٹھا کر مندر کو الگ کردیا گیا اور اناتھ آشرم کو گودام بنادیا گیا۔"

میں نے غور سے نقشے کا معائنہ کرنے کے بعد کہا "تقسیم سے پہلے مندر اور اناتھ آشرم کی عمارتوں کے درمیان کتنا فاصلہ تھا؟"

"پہلے یہ ایک مربّع میدان تھا۔ سو گز لمبا اور سو گز چوڑا" راما راؤ نے وضاحت کرتے ہوئے کہا "مندر اور اناتھ آشرم جانے کے لئے ایک ہی راستہ استعمال ہوتا ہے۔ سامنے کی طرف سے۔ یہ راستہ اب صرف مندر کے لئے رہ گیا ہے۔ یا میرے گھر آنے کے لئے۔ جب مندر کو الگ کیا گیا تو دیوار اس کے پیچھے اٹھائی گئی۔ مندر تقریباً وسط میں تھا چنانچہ ساٹھ گز چوڑے حصے میں مندر اور اس کا احاطہ آگئے۔ چالیس گز کی چوڑائی اناتھ آشرم کو ملی۔"

"یعنی اب مندر والا احاطہ سو گز لمبا اور ساٹھ گز چوڑا ہے اور جو اب گودام بن گیا ہے اس حصے کی لمبائی تو سو گز ہی ہے مگر چوڑائی چالیس گز ہے" میں نے کہا۔

"دس ہزار مربع گز میں سے چھ ہزار مربع گز مندر کا علاقہ ہے۔ گودام کا رقبہ چار ہزار مُربع گز ہے" غالب نے حساب لگا کے بتایا۔

"اب گودام میں آنے جانے کے لئے دوسری طرف راستہ بنادیا گیا ہے" راما راؤ بولا "اور چونکہ درمیان میں دیوار حائل ہے اس لئے یہاں سے کچھ پتا نہیں چلتا کہ ادھر کیا ہو رہا ہے۔"

"مندر کی عمارت سے گودام کتنی دور ہے؟" میں نے سوال دُہرایا "اس نقشے سے واضح نہیں ہوتا۔"

"یہ فاصلہ تقریباً بیس گز کا ہوگا۔"

"درمیان میں کیا ہے؟"

"کھلا میدان۔ بیس گز چوڑا اور سو گز لمبا۔"

"دائیں بائیں کچھ نہیں، صرف فصیل ہے۔"

"دائیں جانب غسل خانے ہیں اور رسوئی ہے۔ جب یہاں اناتھ آشرم تھا غسل خانے بھی استعمال ہوتے تھے۔"

"اور اب؟" غالب نے کہا۔

"اب کون استعمال کرے گا؟" راما راؤ بولا۔

"محافظ جو رہتے ہیں وہاں؟"

"ان کے لئے جدید باتھ روم بنائے گئے ہیں۔ گودام کے اندر ہی آخری حصے میں۔ دائیں جانب۔ فلش سسٹم اور شاور وغیرہ کے ساتھ۔ جب یہاں یتیم بچے رہتے تھے تو پرانی وضع کے غسل خانے اور بیت الخلا تھے جو ایک لائن میں بنے ہوئے ہیں اور اب بند پڑے ہیں۔"

"کتنے باتھ روم، میرا مطلب ہے یہ پرانے غسل خانے اور بیت الخلا تعداد میں کتنے ہیں؟ کہاں تک پھیلے ہوئے ہیں" میں نے کہا۔

"دائیں جانب۔ میں دوسرا نقشہ بناتا ہوں۔ اس سے سب واضح ہوجائے گا" راما راؤ بولا۔

اس نے جو دوسرا نقشہ بنایا وہ کچھ یوں تھا۔

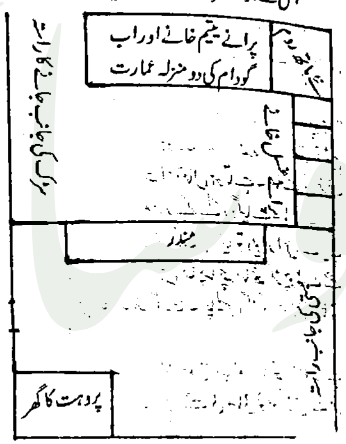

باری باری میں نے اور غالب نے نقشے پر غور کیا۔ نازو اور گل نے اس میں واجبی سی دلچسپی لی اور پھر نقشہ میرے سامنے رکھ دیا۔

"یہ کام ہوسکتا ہے" میں نے کہا "اس نقشے نے بہت بڑا مسئلہ حل کردیا ہے۔ مسئلہ تھا گودام تک پہنچنے کا۔ اور اس کے بیچ میں پڑنے والے میدان کو عبور کرنے کا۔"

غالب نے کہا "غالباً ٹرک اسی میدان میں کھڑے کئے جاتے ہوں گے۔"

راما راؤ نے کہا "ہاں۔ ٹرک عموماً گودام کے سامنے رہتے ہیں۔ وہاں ان کی حفاظت کرنا آسان ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "ایک اور اہم سوال۔ سنتری کہاں ہوتے ہیں؟"

راما راؤ نے کہا "دو گیٹ پر۔ ایک اندر اور دوسرا باہر۔ بائیں جانب کی فصیل کے اوپر خاردار تار ہیں۔ ادھر سے کوئی اوپر چڑھ نہیں سکتا۔ چڑھے گا تو مارا جائے گا۔"

"کیوں۔ تاروں میں بجلی ہے کیا؟"

"ہاں۔ تاروں میں ہر وقت کرنٹ رہتا ہے۔"

"عام کرنٹ۔ دو سو بیس وولٹ یا زیادہ؟" میں نے کہا۔

"میرا خیال ہے یہی۔ عام استعمال کی بجلی کا کرنٹ ہے۔"

"اس کے علاوہ کوئی الارم بھی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"الارم بھی ہے۔ کوئی تار کاٹے تو الارم بجنے لگتا ہے۔"

"ایسا ہی انتظام بائیں جانب بھی ہوگا؟" غالب نے کہا۔

"ہاں۔ پرانے غسل خانوں کی چھت پر تاروں کے علاوہ دو سرچ لائٹس لگی ہوئی ہیں جو اندر کے احاطے کو روشن رکھتی ہیں۔"

"اور درمیانی دیوار پر جو مندر کو گودام سے جدا کرتی ہے؟"

راما راؤ نے کہا "تم نے دیکھا کہ مندر کی عقبی دیوار احاطے سے ملی ہوئی ہے۔ مندر کا ایک دروازہ پہلے پیچھے بھی کھلتا تھا مگر جب دیوار اٹھائی گئی تو اسے بھی اینٹوں سے چُن کر بند کردیا گیا اور پلاستر کرکے برابر کردیا گیا۔ لیکن مندر کی چھت کے پچھلے حصے میں یعنی عین گودام کے سامنے ایک چوکی سی بنی ہوئی ہے۔ اس میں بھی دو مسلح محافظ ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ ان کے پاس دوربین بھی ہوتی ہے۔ وہ گیٹ سے اندر آنے والے ہر شخص کا اور ہر گاڑی کا جائزہ لیتے رہتے ہیں۔ گودام اور اس کے سامنے کھڑے ہوئے ٹرک بھی ان کی زد میں ہیں۔"

غالب نے مایوسی سے سرہلایا "ایسی صورت میں احاطے کو عبور کرکے گودام تک پہنچنا عملاً ناممکن ہے۔"

نازو نے اس کی تائید کی "خودکشی کرنا چاہے آدمی تو اور بات ہے۔"

گل نے بھی کہا "دونوں طرف سے اندر داخل ہونے کی کوئی صورت نہیں۔"

میں نے اس وقت انہیں اپنے پلان کی بنیادی تفصیلات بتانے سے گریز کیا۔ میں پہلے تمام معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا اور پھر اچھی طرح غور کرنے کے بعد راما راؤ کی عدم موجودگی میں سب سے مشورے سے اسے آخری شکل دینا چاہتا تھا۔

باقی سب خاصے مایوس تھے۔ سرچ لائٹس اور محافظوں کی موجودگی میں صحن کی ساٹھ فٹ چوڑائی سے گزرنا واقعی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ کھلے میدان میں ایک چوہا بھی حرکت کرتا تو انہیں نظر آجاتا۔ ہم کیسے چھپے رہ سکتے تھے۔

نازو نے کہا "یہ لائٹس آف نہیں ہوتیں: فرض کرو یہاں کی بجلی بھی بند کردی جائے۔"

میں نے کہا "ہر روز یہ کھیل نہیں ہوسکتا بی بی۔"

غالب نے کہا "ہوسکتا ہے۔ اس طرح کہ آج میں اور نازو جائیں اور پکڑے جائیں۔ کل تم اور گل جاؤ۔ سب اکھٹے ہوجائیں گے۔"

راما راؤ نے کہا "یہاں الگ جنریٹر ہے۔ بجلی جاتے ہی خود چل پڑتا ہے۔"

"یہ عمارت جو پہلے اناتھ آشرم تھی۔ اس میں کتنے کمرے ہیں اوپر نیچے؟"

"دس کمرے اوپر ہیں۔ دس نیچے بھی تھے مگر بعد میں دو کو ملا کر ایک بڑا کمرا بنادیا گیا۔ درمیانی دیوار نکال دی گئی۔"

"ظاہر ہے گودام کے لئے بڑے ہال بہتر رہتے ہیں۔ اور کیا

ہے؟"

"اوپر رہائشی کمرے ہیں۔ بالکل دائیں جانب پرانے غسل خانوں کی قطار میں نئے باتھ روم بنا دیئے گئے ہیں" رامارا ؤ نے کہا۔

"غالباً سیوریج لائن پیچھے سے گزرتی ہوگی۔"

"سیوریج کی کوئی لائن نہیں ہے۔ سپٹک ٹینک ہیں۔"

"سپٹک ٹینک کیا ہوتے ہیں؟" نازو نے کہا۔

میں نے کہا "سیوریج کا پرانا نظام۔ ایک کنواں کھود کے اس میں آٹھ دس فٹ تک پتھر بھر دیتے ہیں بڑے بڑے۔ اس کا منہ اوپر سے بند کر دیا جاتا ہے۔ سارے غسل خانوں اور بیت الخلا وغیرہ کی لائن کو اس ٹینک سے ملا دیا جاتا ہے۔ پانی نیچے اتر جاتا ہے اور زمین کی گہرائی میں جذب ہوتا رہتا ہے۔ پانچ سات یا دو چار سال میں ایک بار اسے کھول کے اوپر جمع ہو جانے والی غلاظت کو صاف کر دیا جاتا ہے۔"

"وہ کھاد بنانے میں کام آتی ہے۔ زمین میں دبا دیتے ہیں... کہیں گھاس پھوس، مویشیوں کے گوبر کے ساتھ۔"

رامارا ؤ نے اچانک گھڑی دیکھ کر کہا "اب میں جاتا ہوں۔ آج دوپہر کا کھانا تمہیں خود ہی بنانا پڑے گا۔ باغیچے میں سبزیاں میں خود اگاتا ہوں۔ جو پسند آئے نکال لو۔ ویسے دال چاول بھی ہیں۔"

"گوشت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا" غالب نے آہ بھر کے کہا۔

میں نے کہا "لوگ کہتے ہیں چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں۔ ایسے ہی برہمن کے گھر میں ماس کہاں۔"

رامارا ؤ ہنسا "اب تم سے تو کوئی بات بھی نہیں چھپائی میں نے۔ جب شراب پیتا ہوں میں اور دنیا کی ہر برائی میں ملوث ہوں تو گوشت کھانے کا گناہ کیا چیز ہے۔ لیکن دنیا والوں کے سامنے برہمن بن کر رہنا ہی پڑتا ہے۔ کبھی مرغی خود ہی کاٹ کے ذبح کر لیتا ہوں اور پکا کر کھا لیتا ہوں۔ اس کا بھی بہت خیال رکھنا پڑتا ہے کہ پر اور فالتو حصے نظر نہ آئیں۔ گڑھا کھود کے دبا دیتا ہوں۔"

"جب تم مرغی خریدتے ہو تو کوئی پوچھتا نہیں کہ پروہت جی کیا کرو گے اس کا؟"

"کیا تم مجھے اتنا بے وقوف سمجھتے ہو کہ میں مرغی خریدوں گا۔ مجھے تو ویسے بھی مفت کا کھانے کی عادت پڑ گئی ہے" وہ ہنسا "میں چلتا ہوں۔ ذرا گاؤں کی خبر لوں۔"

"اچھی طرح خبر لینا" نازو نے کہا۔

"تم مذاق سمجھ رہے ہو۔ تمہیں اندازہ نہیں کہ بستی والے تمہارے کیسے جانی دشمن ہو رہے ہیں۔ تمہیں را… کہا جا رہا ہے۔ ہر شخص تلسی کے پتے پر قسم کھا رہا ہے کہ وہ راکشس مل جائیں تو وہ خود ان کا خون کر دے گا۔ مرنے والے …ے کام کرتے تھے۔"

"اور برے کام کا برا انجام ہوتا ہے۔"

"ہاں۔ مگر ان کے رشتے اور جذبات تو نہیں بدلتے… میں انہیں روتے ہیں۔ کسی کے ماں باپ، کسی کے بھائی…"

"مجھے ان سے یقیناً ہمدردی ہے۔ شاید انہیں علم… تھا کہ ان کے بھائی اور بیٹے کس راہ پر چل رہے ہیں۔ یا علم… وہ بے بس تھے۔ یا اس لئے خاموش تھے کہ انہیں پیسہ… رہا تھا" غالب نے کہا۔

"میرا مطلب تھا کہ تمہیں بہت محتاط اور ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ میرے سوا یہاں تمہارا ساتھ دینے والا کوئی… ہے۔ سب تمہارے خون کے پیاسے شکاری ہیں۔ جیسا کہ… پہلے کہا تھا۔ ساری دنیا شکاری ہے۔ پھر شکار کون ہے؟ ظاہر ہے وہی شکار بھی ہیں جو شکاری ہیں۔ مثلاً تم۔"

"یہ ایک منطقی استدلال ہے جس کی صحت سے انکار نہیں کیا جا سکتا" میں نے کہا "تم واپس کب آؤ گے؟"

رامارا ؤ جاتے جاتے رک گیا "میں کچھ نہیں کہہ سکتا… جب بھی مجھے موقع ملا چکر لگا جاؤں گا۔ اگر کوئی خاص بات… ہوئی۔"

رامارا ؤ کے جاتے ہی میں نے نازو اور گل کو کچن کی جانب روانہ کیا اور خود غالب کے ساتھ نقشہ لے کر بیٹھ گیا۔

"میرے ذہن میں ایک منصوبہ ہے جو کامیاب ہو سکتا ہے اگر قسمت ساتھ دے۔"

"قسمت ساتھ دے تو آدمی بغیر منصوبے کے بھی کامیاب ہو جاتا ہے میاں سکندر اعظم۔"

"اس میں خطرے سے بچنے اور دشمن پر بے خبری میں… کر کے اسے زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانے کے مواقع… ہوتے ہیں۔ ذرا اس نقشے پر غور فرمایئے۔"

"میں غور فرما رہا ہوں۔"

"میرا پلان بہت سیدھا سادا ہے لیکن احتیاط طلب… مشکل ہے۔ ادھر دائیں جانب جو پرانے غسل خانے ہیں… اب استعمال نہیں ہوتے۔ اس طرف سے ہم اندر جا سکتے ہیں" میں نے کہا۔

غالب ایک دم ساری بات سمجھ گیا "واقعی۔ یہ تو… آسان ہے۔ افسوس ہے کہ یہ بات مجھے نہیں سوجھی۔"

"ایک تو یہ عقل کی کوتاہی کا مسئلہ ہے۔ دوسرے عقل… استعمال کا۔ چنانچہ ہر بات جو میرے ذہن میں آتی ہے وہ آپ… کھوپڑی میں نہیں آ سکتی۔ ہم اگر رات کے وقت اس دیوار… آغاز کریں۔ ہمیں ڈیڑھ سے دو فٹ مربع جگہ بنانے کے لئے… اینٹوں کو نکالنا ہوگا؟"

"ایک اینٹ کی لمبائی ہو آٹھ انچ۔ تو ایک قطار کی… اینٹوں کو نکالنے سے ۲۸ فٹ کی چوڑائی۔ پھر اوپر سے نیچے اگر… اینٹوں کو نکالا جائے تو یہ ہوئے تقریباً بارہ پندرہ انچ۔ چونکہ… اور پندرہ انچ کے خلا سے ہم سب گزر سکتے ہیں۔"

"بالکل گزر سکتے ہیں۔ تو اینٹوں کو نکالنے میں کتنا وقت صرف ہوگا؟" میں نے کہا۔

غالب نے اب کاغذ پنسل لے کر نقشے کی شیٹ پر حساب لگایا "اصل مسئلہ پہلی اینٹ نکالنے کا ہوتا ہے۔ اس کے بعد باقی اینٹوں کو ہلا کر نکالا جا سکتا ہے۔ پہلی اینٹ کے چاروں طرف چونے کا مسالہ ہوتا ہے اسے کھرچنا نسبتاً آسان ہوگا۔ سیمنٹ ہوا تو مشکل ہوگی۔"

"اس کے لئے پیچ کس بھی کافی ہیں۔ بیک وقت دو آدمی اس کام میں لگ جائیں تو ایک انچ کی چنائی کو دس پندرہ منٹ میں کھرچ لیں گے۔ ایک اینٹ نکل جانے کے بعد باقی آٹھ اینٹوں میں آٹھ دس منٹ سے زیادہ نہیں لگ سکتے۔"

"پندرہ اور دس ہوئے پچیس منٹ۔"

"پچیس منٹ کے بعد ہم پہلے غسل خانے یا بیت الخلا میں ہوں گے۔ اب پھر اس نقشے کی طرف آیئے۔ ایسی ہی سات دیواریں اور آئیں گی۔"

غالب نے پھر حساب لگا کے کہا "یہ تقریباً تین گھنٹے کا کام ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ وقت کچھ اور کم ہو جائے گا۔ اگر ہم نے ڈسپلن اور مستعدی سے کام کیا۔ ہمارے لئے خطرات کی بات تو کوئی نہیں ہوگی۔ ہم اندھیرے میں ہوں گے۔ باہر سے ویسے بھی کون دیکھ سکتا ہے۔ دروازے نہ جانے کب سے بند پڑے ہیں۔ چھت کے اوپر کوئی محافظ نہیں ہے۔ صرف سرچ لائٹس ہیں اس لئے یہ خطرہ بھی نہیں کہ کھرچنے کی آواز کسی کے کانوں تک پہنچ جائے گی۔ ہم کو صرف پہلی دیوار میں شگاف ڈالتے ہوئے خطرہ ہوگا۔ جب ہم مندر کی دوسری جانب ہوں گے۔ لیکن وہ آخری کنارہ ہے۔ وہاں ہمیں رات کے وقت کون دیکھنے آئے گا۔ الا یہ کہ ہماری شامت اعمال کسی کو بلا لے۔"

"آج رات چاندنی ہوگی۔"

"چاند کی کون سی تاریخ ہے آج؟" میں نے سر کھجا کے کہا۔ "مجھے تو مہینہ بھی یاد نہیں۔"

"عورتوں کو عموماً معلوم ہوتی ہے اسلامی تاریخ" غالب نے کہا اور نازو کو آواز دی۔

"ابھی کچھ نہیں پکا" نازو نے وہیں سے جواب دیا "ابھی تو ہم نے چولہا بھی نہیں جلایا۔"

"چولہے میں گیا چولہا۔ جب ہم پکار رہے ہیں تمہیں۔ تو تمہیں فوراً دست بستہ حاضر ہونا چاہئے کنیز" غالب نے چلا کے کہا۔ "ورنہ…"

"ورنہ کیا؟" نازو نے وہیں سے منع کیا۔

"ورنہ ہم بدولت خود تشریف لانے پر مجبور ہو جائیں گے" غالب نے کہا۔

انجام ویسا ہوا۔ شہنشاہ کو کنیز کی خدمت میں حاضر ہونا پڑا۔ لا علمی کا ہوا واپس آیا "ابھی سب جاہل ہیں۔ ان کا کیا واسطہ اسلام سے اور اسلامی تاریخ سے۔ ایک کہتی ہے ہوگی دس پندرہ تاریخ۔ دوسری نے فرمایا کہ چلو تیس چالیس کر لو۔ تاہم گل نے حلفیہ بیان دیا ہے کہ گزشتہ رات آسمان سے چاند غیر حاضر تھا۔ مطلع صاف تھا اور اسے اپنی نظر پر بھروسہ ہے۔"

"خیر دیکھیں گے رات کو۔ چاندنی نہ ہوئی تو خطرہ کم ہوگا۔ پہلے شگاف کی پہلی اینٹ نکالنے کے لئے ایک آدمی جائے گا۔ کالی چادر اوڑھ کے کام کرے گا اور جب وہ راستہ بنا لے گا تو باقی سب کو بلا لے گا۔ جو اینٹیں نکالی جائیں گی وہ اسی ترتیب سے واپس جما دی جائیں گی تاکہ بعد میں کسی کو خلا محسوس نہ ہو" میں نے کہا۔

"اگر ہم نے رات نو دس بجے کے درمیان اس کام کا آغاز کیا تو آدھی رات کے بعد بارہ ایک کے درمیان ہم عین آخری دیوار کے سامنے ہوں گے۔ پھر آئے گا اس دیوار کا مرحلہ جو گودام کے آخری کمرے کی وہ دیوار ہے جو آخری غسل خانے سے ملی ہوئی ہے۔"

میں نے کہا "رہائشی کمرے اوپر ہیں۔ اگر ہم احتیاط سے کام لیں تو اس دیوار سے گزر کے پہلے گودام میں داخل ہو سکتے ہیں۔ غسل خانوں کی سرنگ میں ہمارے لئے کوئی خطرہ نہیں۔"

"سوائے ایک خطرے کے۔"

"وہ کیا؟" میں نے کہا۔

"خطرہ یہ ہے کہ مسماۃ نازو اور گل بانو کے ازلی دشمن وہاں موجود ہوں گے۔ حشرات الارض اور کاکروچ۔ چھپکلی اور مکڑیاں وغیرہ۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا "یہ سب تو ہوں گے۔ غسل خانے اور بیت الخلا مدت سے بند جو پڑے ہیں۔"

"پھر وہ ماریں گی چیخ اور سارا منصوبہ ہو جائے گا چوپٹ۔"

میں نے کہا "انہیں سمجھا دیں گے۔ ویسے وہ خود ہی سمجھ دار ہیں۔"

"وہ بہادر ہیں۔ حسین ہیں۔ وفادار ہیں۔ سب کچھ ہیں لیکن چھپکلی اور کاکروچ کے معاملے میں بات سمجھداری کی نہیں، نفسیات کی ہے۔ خیر ہم انہیں اپنی جان کی قسم دے دیں گے۔ یا ان کے منہ بند کر دیں گے۔ کپڑا ٹھونس دیں گے۔ تم آگے بتاؤ۔"

"آگے کیا بتاؤں۔ جب ہم قلعے کے اندر داخل ہو گئے تو پھر قلعے کو تسخیر کرنا ہے" میں نے کہا "گودام باہر سے مقفل ہوں گے۔ پہلے تو یہ دیکھنا پڑے گا کہ گودام خالی نہیں ہیں تو مال کیا ہے۔ پھر یہ کہ ایک ہال کا راستہ دوسرے ہال تک ہے یا نہیں۔ اگر دروازے سب کمروں کو آپس میں ملاتے ہیں تو وہ کھلے ہوئے ہیں یا بند ہیں۔ بصورت دیگر ہمیں ایک ہال سے دوسرے ہال تک جانے کے لئے وہی نقب زنوں والا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔ مجھے امید تو یہی ہے کہ رات کے وقت کسی ہال میں کوئی بھی نہیں ہوگا۔ سب اوپر ہوں گے یا اپنی اپنی جگہ ڈیوٹی دے رہے ہوں گے۔ ان کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہوگی اور ہم اندر ہی اندر آخر…

ہاں تک پہنچ جائیں گے۔ اس کام میں مزید دو گھنٹے صرف ہوسکتے ہیں۔"

"اس کے بعد؟"

"اس کے بعد اصل مرحلہ شروع ہوگا۔ جب ہم اوپر جائیں گے۔ رابعہ اور محسن کو اوپر ہی رکھا گیا ہوگا۔ یہ نہیں معلوم کہ اوپر جانے کا راستہ کس طرف سے ملے گا۔"

"یہ ہم راما راؤ سے پوچھ لیں گے۔"

"ہاں۔ اگر زینہ باہر ہے تو پھر دیکھنا پڑے گا کہ باہر کیسے نکلا جائے۔ ممکن ہے اس کے لئے بھی دیوار میں سے راستہ بنانا پڑے۔ اگر کوئی غیر متوقع بات نہ ہوئی تو ہم رات کے دو ڈھائی بجے کے بعد اصل کارروائی کا آغاز کرسکتے ہیں۔"

"یعنی ٹرک میں سے شہلا کو نکالنے کی کارروائی؟"

"بے وقوف وہ ٹرک میں نہیں ہیں۔ راما راؤ نے جو بات ہمیں سمجھائی تھی وہ سو فیصد درست تھی۔"

"میں بھول گیا تھا۔ دراصل دماغ میں تو وہی شیشے کا تابوت رہتا ہے نا۔ مگر یار' کیا وہ ایک ہی جگہ ہوں گے؟"

"ہو بھی سکتے ہیں۔ اور نہیں بھی۔" میں نے کہا "دشمن اگر محسن کی جذباتی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کے لئے یہ کریں کہ اسے بیوی بچے کی ایک جھلک دکھادیں۔ تو مجھے کوئی تعجب نہیں ہوگا۔ لیکن وہ شہلا اور اس کے بچے کی موجودگی کو راز رکھنا چاہیں گے تو انہیں الگ رکھیں گے اور دور رکھیں گے۔ جہاں وہ ایک دوسرے کی آواز بھی نہ سن سکیں۔ ورنہ وہ آواز پہچان لیں گے۔ رابعہ اور محسن اگر پہلے کمرے میں ہوئے تو شہلا اور اس کا بیٹا آخری کمرے میں ہوں گے۔"

"فرض کرو ہم اوپر پہنچ گئے۔ پھر؟"

"پھر تو کھلی جنگ ہوگی۔ رات دو ڈھائی بجے سب سو رہے ہوں گے۔ مگر اس امکان کو مسترد نہیں کیا جاسکتا کہ کوئی جاگ رہا ہو۔ یہ سب ابھی سے طے نہیں کیا جاسکتا۔ تاہم اوپر پہنچ جانے کے بعد اس کے سوا کوئی واپسی کی صورت نہیں ہوگی کہ ہم دشمن کا صفایا کردیں۔ جو سامنے آئے اسے ماردیں۔ اپنے دوستوں کو نکالیں اور مقابلہ کرتے ہوئے نکل جائیں۔"

غالب نے کہا "بظاہر تو منصوبہ مکمل ہے۔ زبانی جمع خرچ کی حد تک۔"

میں نے کہا "اندر جانے سے پہلے ہمارے پاس صرف ریوالور ہوں گے اور ایک دستی بم بھی ہوگا لیکن اندر پہنچ جانے کے بعد سب کچھ مل جانے کی امید کی جاسکتی ہے۔"

"سب کچھ کیا؟"

"ہر قسم کا اسلحہ۔ صرف ایک دستی بم اور ریوالور تو مقابلے کے لئے کافی نہیں ہوسکتے۔ ان کے پاس مشین گنیں ہوں گی۔ گودام سے مل جائیں تو کیا بات ہے ورنہ ہم انہی سے چھین لیں گے۔ ناکامیابی کا انحصار ہماری بھرپور قوت پر ہے۔ ہم آدھی رات کو ان پر اچانک قہر الٰہی بن کے ٹوٹ پڑیں۔ وہ سوچتے ہی رہ جائیں کہ آخر ہم ان کے دفاعی نظام کو شکست دینے میں کامیاب ہوئے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔"

"میں سمجھتا ہوں کہ پلان میں کوئی خامی نہیں ... تائید خداوندی کی ضرورت ہے" غالب نے کہا۔

"ظاہر ہے اس کے بغیر ہم کیا اور ہماری کوششیں ..." نے کہا۔

آدھے گھنٹے کے بعد نازو نے اعلان کیا کہ لنچ تیار ہے ... نے منصوبے کی آخری جزیات پر بحث ختم کی۔ ... آٹے کی روٹیاں۔ مکھن اور مولیاں' خالص دیہاتی ... چار صحت بخش اجزا تھے۔ شہر میں تو ان نعمتوں کا تصور ... کیا جاسکتا۔ جہاں لوگ ناخالص چیزیں خوب مرچ مسالے کے ساتھ تل کے اور بھون کے ان میں ذائقہ پیدا کرتے ہیں ... چٹخارے پر صحت کو قربان کرکے بلڈ پریشر' ... اور انجائنا جیسی فیشن ایبل بیماریوں میں مبتلا ہوجاتے ہیں ... لمبی ڈگریوں والے اسپیشلسٹ ڈاکٹروں کی لمبی چوڑی فیس ادا کرکے دواؤں سے شوق کرتے ہیں اور ایک "اسٹیٹس ..." کے طور پر علاج کے لئے "اسٹیٹس" تک جاتے ہیں۔

زندگی میں پہلی بار میں نے مکئی کی روٹی کے ساتھ مکھن کے ذائقے کو محسوس کیا۔ ہم سب پیدائشی طور پر ... کسی نے اگر گاؤں دیکھا تھا تو فلموں میں یا سفر کرتے ... ٹرین کی کھڑکی سے۔ غالب نے بھی پہلے منہ تو بنایا تھا مگر ... اس نے بھی میری طرح زیادہ کھالیا۔ نازو کو پھر اٹھ کے ... اور روٹیاں پکا کے لانی پڑیں۔

دن بہت لمبا ہوگیا تھا۔ وقت کی سست رفتاری کا یہ عالم ... ابھی صرف ایک بجا تھا۔ نازو اور گل تو کھانے کے فوراً بعد ... دراز ہوتے ہی سوگئی تھیں۔ میں نے غالب کو بھی اجازت دی ... وہ دوسرے کمرے میں جا کے سوجائے۔ میرا ارادہ جاگنے کا ... تھا لیکن کچھ دیر بعد مجھ پر بھی غنودگی غالب آنے لگی۔ ... نہیں کب میں بھی قالین پر دراز ہوکے سوگیا۔ یہ رات ... تھکن کا اثر تھا کہ ہم سب مُردوں کی طرح پڑے رہے ... کوئی دشمن آجاتا تو کسی مزاحمت کے بغیر ہم سب کو گرفتار ...

میری آنکھ روشنی کی یلغار سے کھلی۔ میں گھبرا ... اپنے سامنے راما راؤ کو مسکراتے ہوئے دیکھا۔ لائٹ ا... تھی۔

"اندھیرا ہوگیا!" میں نے حیرانی سے کہا اور ... دیکھی۔

"سات بجے ہیں" راما راؤ نے مجھے مطلع کیا۔

"تم کب آئے؟"

"ابھی آیا ہوں۔ اندر اندھیرا دیکھ کر میں تو پریشان ... کوئی آواز بھی نہیں تھی اندر" وہ بولا۔

"سب سو رہے ہیں" میں نے کہا۔

"آئی ایم سوری۔ مجھے معلوم ہوتا تم ... لائٹ نہ جلا..."

"تم نے اچھا کیا کہ جگادیا۔ بہت دیر ہوگئی سب کو سوتے ہوئے۔ اب اٹھ جانا چاہئے۔"

باتوں کی آواز سن کے نازو اور گل بھی اٹھ بیٹھی تھیں۔ دوسرے کمرے سے غالب آنکھیں ملتا نمودار ہوا۔

"یہ صبح کے سات بجے ہیں یا شام کے؟"

راما راؤ نے کہا "صبح شام سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

غالب نے جماہی لے کر کہا "کوئی تازہ خبر؟"

راما راؤ نے کہا "خبریں ہی خبریں ہیں۔"

میں نے کہا "ذرا میں منہ دھولوں۔ آنکھیں اور کان کھل جائیں۔"

"دماغ تو چائے کے بغیر بیدار نہیں ہوگا" غالب نے کہا اور نازو کی جانب دیکھا "کیا اللہ کے نام پر یہ نیکی کروگی تم نیک بیبیو؟"

"اللہ اجر دے تمہیں" میں نے کہا "دعائیں تو اور بھی ہیں لیکن شاید قبل از وقت ہوں۔"

"مثلاً کہ یہ کہ سدا خوش رہو۔ جگ جگ جیو۔ سدا سہاگن رہو۔ دودھوں نہاؤ' پوتوں پھلو..." غالب نے بڑی بوڑھیوں کی طرح کہا۔

نازو اور گل ان دعاؤں کے ختم ہونے سے پہلے ہی واک آؤٹ کرگئیں۔ راما راؤ کچھ سمجھا نہیں مگر ہنسنے لگا۔ کچھ دیر بعد میں اور غالب ہاتھ منہ دھو کر آگئے۔ اب ہماری ساری تھکان دور ہوچکی تھی اور چھ گھنٹے کی نیند نے ہمیں آنے والی رات کی ہر آزمائش سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ عطا کردیا تھا۔

"میں بھی اب چلا جاؤں گا یہاں سے" راما راؤ نے کہا۔

"اتنی جلدی فیصلہ کرلیا؟"

"ہاں۔ میرا دل پہلے بھی بھر گیا تھا اس جگہ سے۔ میں اتنا عرصہ کہیں ٹک کر نہیں بیٹھا" وہ بولا "اس بستی کے سیدھے سادے لوگوں کو دھرم کے نام پر بے وقوف بنانے میں کوئی مزہ نہیں تھا۔ بالک رام کو میری ضرورت تھی اس لئے یہ کھیل چلتا رہا۔ یہاں مجھے جو کچھ ملا' اسی کے کاروبار کی وجہ سے ملا۔ لوگوں کے پاس دینے کے لئے کچھ تھا ہی نہیں۔"

"تم کچھ افسردہ اور نادم نظر آرہے ہو۔"

"ہاں۔ سولہ گھروں میں موت کا دکھ دیکھ کر میں بھی دکھی ہوگیا ہوں۔ مجبوری ہے ورنہ میں کریا کرم سے پہلے ہی بھاگ جاتا" وہ بولا "مرنے والوں کے لواحقین بڑی عقیدت کے ساتھ یہ چاہتے ہیں کہ ان کی آخری رسوم عین مذہبی روایات کے مطابق ہوں تاکہ مرنے والوں کی آتما کو شانتی ملے۔ اور وہ مکتی پا کے سیدھے پرلوک میں جائیں۔ مرنے والوں کے کرم کیسے تھے' یہ کوئی نہیں دیکھتا۔ یہ عقل کا نہیں جذبات کا معاملہ ہے اور مجھے بہت افسوس ہورہا ہے کہ میں نے جینے والوں کے ساتھ تو دھوکا کیا' مرنے والوں کے ساتھ بھی دھوکا کروں گا۔ جو کچھ میں کریا کرم کے نام پر کروں گا سب جھوٹ ہوگا۔ کوئی حقیقی پروہت ہوتا تو اسے یہ احساس نہ ہوتا۔ وہ نیک نیتی سے سب کچھ کرتا.."

"آج سے پہلے کبھی پچھتاوے کا احساس ہوا تھا تمہیں؟"

"نہیں۔ میں نے ایک سے ایک بڑا فراڈ کیا۔ لیکن ان کے ساتھ جو خود فراڈ تھے۔ جن کے پاس اتنا پیسہ تھا کہ ان کو لوٹ کر افسوس نہیں ہوتا۔ یہ اطمینان حاصل ہوتا تھا کہ کسی نے تو ان سے کچھ لیا۔ استحصال اور لوٹ مار سے پیسہ جمع کرنے والے لاشعوری طور پر احساس گناہ میں مبتلا رہتے ہیں۔ میں ان کی روح کی تسکین کے لئے ایسے ڈرامے کرتا تھا کہ وہ وقتی طور پر مطمئن ہوجاتے تھے۔ میں پیر فقیر کے بھیس میں انہیں خدمت کا موقع دیتا تھا۔ ہندو سیٹھ ہو۔ تو جوگی سنیاسی بن کے۔ مسلمان ہو۔ تو ... پیر یا مجذوب کے روپ میں... مت پوچھو ان کی نفسیاتی کمزوریوں سے میں نے کس طرح فائدہ اٹھایا۔ بڑی لمبی کہانی ہے مگر وہ سب اسی سلوک کے مستحق تھے۔"

نازو اور گل جب چائے لے کر آئیں تو وہ خاموش ہوگیا۔

"میں ابھی شام کی پرارتھنا سے فارغ ہوکر ادھر آگیا۔ مجھے واپس بھی جانا ہے" راما راؤ نے کہا "مندر میں لوگ بہت رنجیدہ اور ملول تھے۔ ڈرے ہوئے تھے اور مشتعل تھے۔ پولیس کے آدمی ان کے درمیان سادہ کپڑوں میں موجود تھے۔ سب نے دیکھ لیا تھا۔ اس لئے کوئی بولا نہیں۔"

"پولیس نے آج سارے دن کوئی بات معلوم کی؟"

"انہوں نے یہ معلوم کیا کہ یہ کارروائی تخریب کاروں کے کسی گروہ کی ہے" راما راؤ نے کہا "ایسے میں بے سروپا نتائج اخذ کرتے ہیں یہ لوگ۔ بھلا یہاں تخریب کاروں کا کیا کام۔ نہ کوئی اہم جگہ ہے دفاعی نقطہ نظر سے۔ نہ کوئی ایسا پروجیکٹ ہے۔ مثلاً ایٹمی ریسرچ کا۔ یہاں تو کوئی فیکٹری' ڈیم یا پاور پلانٹ تک نہیں ہے۔"

میں نے اور غالب نے کسی ردِعمل کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ پولیس کی رائے غلط نہیں تھی۔ یہ رائے انہوں نے بھی تفتیش کے بعد قائم نہیں کی تھی۔ انہیں پہلے ہی بتادیا گیا ہوگا کہ یہ کارروائی کس نے کی ہے۔

"پولیس نے کسی کو گرفتار کیا؟"

"ہاں۔ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا انہیں۔ خانہ بدوشوں کے ایک خاندان کو گھیرلائے تھے۔ سارا دن ان کو جوتے مارے پھر چھوڑ دیا۔ دو اعلیٰ افسر بھی آئے تھے' انہوں نے بستی کے آس پاس ہر طرف باہر جانے والے راستوں کی نگرانی کا حکم دیا اور واپس چلے گئے۔"

"کیا خیال ہے ان کا۔ قاتل کہاں ہیں؟"

راما راؤ نے کہا "وہ سمجھتے ہیں کہ تم لوگ راتوں رات بھاگ گئے۔ لیکن تم واپس آؤگے دو چار دن میں۔ اس وقت وہ تمہیں پکڑلیں گے۔ بستی کی طرف آنے والے سارے راستوں کی سخت نگرانی کی جارہی ہے۔ سادہ کپڑوں میں پولیس بھی ہے اور دوسرے لوگ بھی۔"

"دوسرے کون؟"

"تریونی نے کچھ لوگ بھیجے ہیں" رامارادَ نے کہا۔
"انہیں یہ شک بالکل نہیں کہ ہم بستی میں بھی ہو سکتے ہیں؟"
رامارادَ نے نفی میں سر ہلایا "یہ شک کیسے ہو سکتا ہے۔ انہوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تمہیں تلاش کرنے میں۔ لوگوں نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ مسلمان گھروں پر زیادہ سختی کی گئی۔"
"وہ کیوں؟"
"شاکر علی کی وجہ سے۔ کچھ لوگوں نے شاید یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ حملہ آوروں کی شاکر علی نے مدد کی۔ اس کو پیسہ دیا مگر بعد میں خود ہی مار گئے اسے۔"
"یہ کیسے ثابت ہوا؟" میں نے کہا۔
"اس کے گھر میں لاشوں کے ساتھ ہی وہ پیسہ بکھرا پڑا تھا۔ پولیس نے شاکر علی کے سب ملنے جلنے والوں کے گھروں میں گھس کر دیکھا۔ صندوق اور الماریاں تک کھلوائیں۔ اس بہانے وہ بہت کچھ مار گئے۔"
"یہ تو ہوتا ہے" غالب نے تلخی سے کہا۔
"یہ بتاؤ۔ لاشیں واپس مل گئی ہیں یا نہیں" میں نے کہا۔
"لاشیں ابھی تک واپس نہیں آئی ہیں۔ اب کل ہی ہو گا ان کا کریا کرم" رامارادَ نے کہا "اس وقت بستی میں عجیب سناٹا ہے۔ بازار بھی بند ہیں۔ لوگ گھروں میں چھپے بیٹھے ہیں، جیسے باہر نکلے تو وہ بھی مارے جائیں گے۔ پولیس نے الگ دہشت پھیلا رکھی تھی۔ وہ بھی اب تھک ہار کر بیٹھ گئے ہیں۔"
"کہاں بیٹھ گئے ہیں؟" میں نے کہا۔
"ایک مندر میں ہے۔ ایک کی ڈیوٹی ملہوترہ کے گھر پر لگی ہے۔ ... ایک شاید پیچھے گودام میں بھی بھیجا گیا ہے۔ دو گشت پر رہیں گے مگر مجھے معلوم ہے ان کو بھی گودام کی حفاظت کرنی ہے۔ وہاں آج محافظ کم پڑ گئے ہیں نا۔"
یہ سب میری توقعات کے عین مطابق ہوا تھا۔ حالات آج کی رات ہمارے مشن کے لئے سازگار ہوتے جا رہے تھے۔
"کیا تریونی خود آیا تھا یہاں؟" میں نے کہا۔
"سنا ہے کہ آیا تھا مگر فوراً ہی واپس چلا گیا۔"
"اس کے ساتھ اور کون تھا؟"
"یہ تو معلوم نہیں۔ لیکن ایک شخص اس کا ساتھی معلوم ہوتا ہے۔ صورت سے بھی دادا لگتا ہے۔ اور پولیس سے تو ایسے بات کرتا ہے جیسے اس کے زر خرید ہیں۔ اور پولیس جو بستی کے سیدھے سادے، غریب لوگوں کو تفتیش کے نام پر ہراساں کر رہی ہے، اس کے سامنے باادب، باملاحظہ، ہوشیار رہتی ہے۔"
میں نے کہا "اس کا نام کیا ہے؟"
"نام تو میں نے نہیں پوچھا لیکن معلوم ہو جائے گا۔"
"حلیہ بتا سکتے ہو...؟"
"ہاں۔ کالا رنگ ہے۔ چہرے کے نقوش سے جنوبی ہند کا لگتا ہے مدراسی، تیلگو یا ملیالم۔ کوئی زبان نہیں جانتا۔ لہجے سے بھی ساؤتھ انڈیا کا نہیں لگتا۔ موٹے ہونٹ ہیں، گھنگریالے سخت اور چھوٹے چھوٹے بال۔"
"کانوں میں پیتل کی مندریاں..." میں نے کہا۔
"مندریاں کیا؟" رامارادَ حیران ہو کے بولا۔
"بالیاں چھوٹی چھوٹی..."
"تم جانتے ہو اسے؟" رامارادَ نے کہا۔
"ہاں۔ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں" میں نے کہا۔
"پھر تو نام بھی معلوم ہو گا تمہیں اس کا۔"
"اس کے نام کی کوئی اہمیت نہیں۔ وہ ضرورت کے مطابق بدلتے رہتے ہیں۔ لیکن رامارادَ! اس سے ہوشیار رہنا۔ وہ خطرناک آدمی ہے۔"
"میرا کیا تعلق اس سے؟"
"بات تعلق کی نہیں۔ اس کی بھی ایک چھٹی حس ہے۔ کتے کی طرح سونگھ لیتا ہے اپنے دشمنوں کی بو کو۔ اسے ذرا شک ہوا تو وہ تمہارے پیچھے لگ جائے گا اور یہاں تک آ پہنچے گا۔ کیا تم واپس جاؤ گے؟"
"ہاں۔ میرا کچھ کام باقی ہے۔ لاشیں واپس آ جائیں تو بھی لوٹ آؤں گا نو دس بجے تک۔ میرا بھوجن تو باہر ہی ہو گا۔ پھر خود ہی کچھ کرنا ہو گا رات کے کھانے کے لئے۔"
میں نے کہا "وہ ہم کر لیں گے۔ آج کی رات ہم ایک کام کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ جو اصل کام ہے اور جس کے لئے ہم نے یہاں چھپ کے پورا دن گزارا تھا۔ ہم کل تک انتظار نہیں کریں گے۔"
غالب نے کہا "یہ ہو سکتا ہے کہ ہماری پھر ملاقات نہ ہو۔"
"کیا۔ تم لوگ ابھی جا رہے ہو؟"
میں نے کہا "ابھی کا مطلب ہے نو دس بجے تک۔ بہتر ہو گا کہ تم ساری بات سن لو" میں نے کہا اور اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کر دیا۔
وہ بڑی توجہ سے سنتا رہا "میں تمہیں روک نہیں سکتا۔ تمہاری کوئی مدد بھی نہیں کر سکتا۔"
"جتنی مدد تم نے کی ہے وہ کافی ہے" میں نے کہا۔
"اگر... سب کچھ تمہاری توقعات کے مطابق نہ ہوا اور وہاں پہنچ جانے کے بعد تمہیں معلوم ہوا کہ اب واپسی کا کوئی راستہ نہیں رہا؟"
"واپسی کا ہم نے ابھی تک سوچا بھی نہیں ہے۔ ہم اپنا راستہ خود بنائیں گے" میں نے کہا۔
غالب نے کہا "ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ سب کچھ توقعات کے مطابق نہیں ہو گا۔ ہم غیر متوقع کے لئے بھی تیار رہتے ہیں۔"
"تم سے ایک دو باتیں معلوم کرنی تھیں۔ ایک تو یہ کہ گودام میں اوپر جانے والا زینہ کہاں ہے۔ گیٹ کے پاس؟"
"نہیں۔ یہ گیٹ تو بعد میں بنایا گیا ہے۔ پرانے آشرم کا راستہ بھی وہی تھا جو اب مندر میں آنے کا راستہ ہے۔ یہ راستہ سیدھا اناتھ آشرم کی طرف جاتا تھا اور سیڑھیاں بھی سامنے ہی آ جاتی تھیں۔ غسل خانوں کی قطار کے بعد جہاں برآمدہ شروع ہوتا ہے وہیں سے زینہ اوپر جاتا ہے۔"
"اور اوپر والے نئے باتھ رومز کے قریب جا کے نکلتا ہے؟"
میں نے کہا "یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ دوسری بات یہ بتاؤ کہ گودام کی نچلی منزل کے سب کمرے آپس میں بھی ملے ہوئے ہیں یا نہیں؟"
رامارادَ نے نفی میں سر ہلایا "پہلے ہر کمرا الگ تھا اور اس میں ایک دروازہ تھا۔ ایک کھڑکی تھی۔ جب دو کمرے ملا کے ایک بنایا گیا تو اب ہر کمرے میں دو دروازے ہیں اور دو کھڑکیاں۔ دونوں باہر برآمدے میں کھلتے ہیں۔ کمروں کو ملانے والا بیچ میں کوئی دروازہ نہیں ہے۔"
میں نے یہ پوائنٹ بھی نوٹ کر لیا "بجلی کا مین سوئچ کہاں ہے؟"
"پیچھے۔ زینے کے موڑ کے نیچے کی خالی جگہ پر بورڈ لگا ہوا ہے" رامارادَ نے کہا "جس پر میٹر ہے اور مین سوئچ ہے۔"
"اور جنریٹر کہاں ہے؟" غالب نے ایک اچھا سوال کیا۔
"جنریٹر بھی وہیں ہے۔ بورڈ کے نیچے زمین پر رکھا ہوا ہے۔ وہاں سے اس کا کنکشن مین سوئچ کے تاروں سے ہے۔"
"ویری گڈ" میں نے کہا "تم بہت ہوشیار آدمی ہو رامارادَ، پڑھے لکھے اور ذہین بھی ہو۔ کبھی جنریٹر پر غور کیا؟"
"جنریٹر دیکھا ہے میں نے۔ پیٹرول سے چلتا ہے، سنگل فیز پانچ کے وی اے۔ دو سو بیس سے چالیس وولٹ۔ پچاس ساٹھ سائیکل۔ فور اسٹروک انجن ہے۔ اور کیا بتاؤں؟"
میں نے ہنس کے کہا "یہ تو تم نے ضرورت سے زیادہ ہی بتا دیا۔ اس جنریٹر کو چلانا پڑتا ہے بریک ڈاؤن کے بعد۔"
"نہیں۔ یہ سیلف اسٹارٹ ہے.... خود بخود ٹرپ ہو جاتا ہے۔"
"الارم کہاں کہاں ہے" میں نے کہا۔
"ایک گیٹ پر۔ دوسرا اوپر والی منزل پر۔"
"تھینک یو رامارادَ۔ اب ہماری معلومات مکمل ہیں۔ ہم خود یہ سب کچھ معلوم نہیں کر سکتے تھے۔ اب ایک آخری مسئلہ ہے کچھ سامان کا۔ ایک تو اینٹوں کا مسالہ کھرچنے کے لئے پیچ کس، جتنے بھی مل جائیں۔"
اس نے کہا "میرے پاس ایک بڑا پیچ کس ہے۔ ایک چھوٹا۔ تم ڈرل مشین کیوں نہیں لے جاتے؟"
"ڈرل مشین کہاں ملے گی؟" میں نے کہا۔
"اس کے علاوہ ڈرل مشین بجلی سے چلتی ہے اور بہت شور کرتی ہے" غالب نے کہا۔
"میرے پاس ہاتھ سے چلانے والی ڈرل مشین ہے۔ چھوٹی سی۔ گھر میں کیلیں لگانے، پردے لٹکانے یا کہیں سوراخ کرنے کے کام آتی ہے۔ وہ میری نہیں ہے۔ یہاں مندر میں کوئی شخص اپنا تھیلا بھول گیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ کوئی بڑھئی تھا۔ تھیلے میں اس کے اوزار تھے۔ چھ مہینے ہو گئے۔ ابھی تک تو وہ لوٹ کر نہیں آیا۔ اب کیا آئے گا۔"
میں نے اس سے ہاتھ ملایا "تم قدرت پر یقین رکھتے ہو؟"
"بالکل نہیں۔"
"خیر ہم رکھتے ہیں۔ ہمارا خیال۔ بلکہ ایمان ہے کہ قدرت کے کھیل نرالے ہیں۔ اللہ بڑا مسبب الاسباب ہے چنانچہ جب وہ کسی پر مہربان ہو تو اس کے حق میں حالات کو ہر سمت سے سازگار کر دیتا ہے۔ مثلاً یہ چھوٹی سی ڈرل مشین تائیدِ غیبی ہے۔ خدا نے یہ سب انتظام ہمارے لئے کیا تھا۔ اس بڑھئی کا یہاں آنا اور اپنے اوزاروں کا تھیلا بھول جانا۔ سب اسی کے حسنِ انتظام کا سلسلہ تھا کیونکہ وہ عالمِ غیب بھی ہے۔"
رامارادَ ہنسا "میں تمہارے عقیدے کا مذاق نہیں اڑاؤں گا۔ تاہم میرے لئے یہ محض اتفاق ہے۔ کیا تم کبھی کہیں کچھ نہیں بھولے؟"
"ضرور بھولا ہوں مگر وہ بھی مشیتِ ایزدی تھی۔ معلوم نہیں اس کا مقصد کیا تھا۔ ایک بار میں اپنا پرس پوسٹ آفس کے کاؤنٹر پر بھول آیا تھا۔ ممکن ہے وہ کسی ضرورت مند کو ملا ہو۔ یہ خدا کے انتظام کا حصہ تھا کہ میں پوسٹ آفس جاؤں اور وسیلہ بنوں۔"
"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ پرس کسی جواری یا شرابی نے اٹھا لیا ہو۔"
"ہم خدا کے تصور سے بھلائی اور نیکی کو منسوب رکھتے ہیں کیونکہ وہ اس کائنات کا خالق اور منتظم ہے۔ خیر چھوڑو۔ ان باتوں میں تمہارے لئے کچھ نہیں۔"
"میں تمہیں وہ سب چیزیں لا دیتا ہوں" رامارادَ نے کہا۔
اس تھیلے میں تیز دھار والی چھینی اور ہتھوڑی کے علاوہ دو مضبوط پیچ کس تھے۔ ڈرل مشین میں ایک چھوٹا سا پہیہ لگا ہوا تھا۔ اسے ایک ہتھی گھماتی تھی۔ چرخی کے ساتھ کاربن اسٹیل کے بنے ہوئے نوکیلے اور بلیڈ جیسی دھار رکھنے والے "بیٹ" تھے۔ پیچ کس کے فولادی حصے کی شکل کے ٹکڑے جو چھوٹا یا بڑا سوراخ کرنے کے لئے تبدیل کئے جا سکتے تھے۔ اس کو چلانے سے آواز پیدا ہوتی تھی مگر وہ آواز بند کمرے کے باہر نہیں سنی جا سکتی تھی۔ جہاں ہمیں اس ڈرل مشین سے کام لینا تھا وہاں تیس چالیس گز تک کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ محافظ گیٹ پر تھے۔ مندر کی چھت کے عقبی حصے پر تھے اور گودام کی دوسری منزل پر تھے۔
سیاہ چادر کوئی نہ مل سکی۔ رامارادَ نے ایک گہرے سرخ رنگ کی دھوتی اور ایک گہرے جامنی رنگ کی پرانی ساری پیش کی۔ میں نے دھوتی رکھ لی۔ اندھیرے میں گہرا سرخ رنگ بھی کیموفلاج کرنے کے کام آ سکتا تھا۔ پھر رامارادَ جانے کے لئے تیار ہوا۔ اس نے باری باری ہم سب سے ہاتھ ملایا۔
"ہم پھر ملیں گے" میں نے رسماً کہا۔
"دنیا بہت مختصر ہے" غالب نے انگریزی کا قول دہرایا۔

"ہاں۔ مگر ہمارے راستے جدا ہیں" راما راؤ بولا۔
"ممکن ہے وقت تمہارے اور ہمارے راستے ایک کردے"
"میں نہیں چاہوں گا کہ تم اس راستے پر چلو جس راستے پر میں چل رہا ہوں" راما راؤ ہنسا۔
"لیکن ہم چاہتے ہیں کہ تم ہمارے راستے پر چلو۔ یہ جنگ تو غربت اور غیرت کا مسئلہ ہے۔ ورنہ ہم صلح پسند محبت کرنے والے اور شریف لوگ ہیں" میں نے کہا "جیسے کہ عام لوگ ہوتے ہیں۔ جب یہ جنگ ختم ہو جائے گی تو ہم اپنے اپنے گھروں میں ملیں گے۔"
"لیٹ اس ہوپ فار دی بیسٹ" وہ بولا۔
میں نے کہا "ایک لاکھ روپے کے عوض جو معاہدہ ہوا تھا وہ پورا ہوا۔ اب ایک لاکھ ہماری طرف سے۔"
نازو نے اپنی بیلٹ کھولی اور راما راؤ کے حوالے کردی "میں نے تم کو اٹھا کے پٹخ دیا تھا' اس کے لئے سوری۔"
غالب نے کہا "ایک بے دین آدمی ہونے کے باوجود تم اچھے آدمی ہو۔"
"اگر میں کسی دین دھرم کو ماننے والا ہوتا تو ہم دشمن ہوتے۔ کوئی اصل پنڈت تمہیں کب کا تمہارے دشمن کے حوالے کرچکا ہوتا" وہ بولا۔
"یا مارا جاچکا ہوتا ہمارے ہاتھوں" میں نے کہا۔
جب وہ چلا گیا تو ہمارے پاس کہنے یا کرنے کو کچھ نہ رہا۔ ابھی آٹھ بھی نہیں بجے تھے چنانچہ ہمیں کم سے کم ایک گھنٹا انتظار کرنا تھا۔ نازو نے اس وقفے میں دوبار کافی پلائی۔ میں نے اور غالب نے ایک بار پھر منصوبے کا اول تا آخر جائزہ لیا۔ پونے نو بجے ہم نے اپنے اپنے ریوالور اٹھائے۔ ایک دستی بم کہاں کام آئے گا' یہ ابھی کوئی نہیں جانتا تھا۔ مگر اس تباہ کن ہتھیار کو ساتھ رکھنا ضروری تھا۔
سرخ چادر میں خود کو لپیٹ کر میں نے کہا "میں جاتا ہوں۔"
غالب نے کہا "ابھی ڈرل مشین استعمال مت کرنا۔"
"تمہیں بلانے کے لئے میں الو کی آواز نکالوں گا" میں نے کہا۔
"گویا اپنی اصل آواز میں بلاؤ گے" نازو نے کہا "ہم گوش بر آواز رہیں گے۔"
میں دروازے سے باہر نکلا اور دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ میں ایک قدم بڑھتا تھا اور رک جاتا تھا۔ اس خیال سے کہ کہیں سے کوئی دیکھ نہ رہا ہو۔ آسمان تاریک اور ابر آلود تھا چنانچہ چاند اگر کہیں تھا تو اس کی روشنی بادلوں کے اوپر ہی رک گئی تھی۔ گیٹ تک کا فاصلہ میں نے دس منٹ میں طے کیا۔ میرے الٹے ہاتھ پر مندر کی عمارت بھی سنسان پڑی ہوئی تھی۔ ہنومان جی کے خدمت گار بھی آج غیر حاضر تھے۔ وہ ایک ساتھ سولہ مُردوں کی آتما کو مکتی کرنے کے عمل میں مصروف تھے۔
گیٹ پر رک کے میں نے باہر بستی کی طرف ایک نظر ڈالی۔ بستی میں خاموشی تھی۔ بیشتر گھروں کے مکین حسب معمول سورج ڈھلتے ہی کھانا کھا لیتے تھے۔ اب سوچکے تھے۔ کہیں روشنی زندگی کی علامت تھی۔ گیٹ سے گزر کے دوسری دیوار کے ساتھ زیادہ بے خوفی سے سفر کیا اور پانچ منٹ بعد اس گوشے میں جا پہنچا جہاں عقبی دیوار تھی۔ مندر اور بستی کو الگ کرنے والی۔ دھرم اور دنیا کے کاروبار کو الگ رکھنے والی۔ ہنومان جی کے پجاری اور ان کے کارِ ثواب ایک طرف اور ان کے کالے دھن کا دھندہ دوسری طرف لیکن وہ بالکل ملہوترہ جس نے یہ تقسیم کی تھی۔ خود بھی دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ اس کا جسم ابھی دنیا میں تھا اور روح دوسری دنیا میں پہنچ چکی تھی۔
دیوار کی جڑ میں بیٹھ کے میں نے اپنی پشت مندر کی طرف رکھی اور اندازے سے ایک جگہ مقرر کی۔ زمین سے تین فٹ اوپر۔ دائیں طرف کی دیوار سے تین فٹ دور۔ میرے خیال میں یہ غسل خانے کی دیوار کے مرکز کی اینٹ تھی۔ جیب سے بڑا پیچ کس نکال کے میں نے دیوار پر ہاتھ پھیرا۔ اینٹوں پر پلاستر نہیں تھا اس لئے چنائی کی لائن تلاش کرنا بہت آسان ہوگیا۔ خدا کا نام لے کر میں نے پیچ کس سے لائنوں کو کرید نا شروع کیا۔ میرے سر کے اوپر عقبی سرچ لائٹس کا اجالا یوں تھا جیسے آسمان کا افق روشن ہو۔ مجھے بہت دور بائیں جانب مندر کے عقبی حصے میں چوکی ضرور نظر آرہی تھی۔ لیکن میں کسی کی نقل و حرکت نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میرے کان ہر آہٹ پر لگے ہوئے تھے۔
دوبار مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی دبے پاؤں چلتا ہوا میری طرف آرہا ہے۔ میرے ماتھے پر پسینے کی نمی آگئی لیکن میں نے پلٹ کر دیکھا تو رات کی تاریکی اور سکوت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔
آہستہ آہستہ ایک اینٹ کے چاروں طرف سے مسالہ نکل گیا اور لکیریں گہری ہوتی گئیں۔ میں نے اینٹ کو ہلانے کے لئے پیچ کس کو بطور لیور استعمال کیا۔ ہلنے والی اینٹ اچانک کھسکی ... میں نے اسے فوراً پکڑ لیا ورنہ وہ اندر جا گرتی اور تین فٹ کی بلندی سے پکے فرش پر اینٹ گرتی تو اس کا دھماکا دور تک جاتا۔ اس اینٹ کو نکال کے میں نے اپنے پاس رکھ لیا اور دوسری اینٹ کو ہلانے لگا۔ چنائی کا پلاستر اکھڑ کے گرا اور دوسری اینٹ بھی الگ ہوگئی۔ دس منٹ بعد میں نے دیوار کے شگاف کو خوشی اور امید کے ساتھ دیکھا۔ یہ کامیابی کی طرف پہلا قدم تھا۔ اس میں سے گزر کے میں نے باہر کی اینٹوں کو اکھاڑنے کا سوچا پھر یہ کام غالب کی مدد سے کرنے کا فیصلہ کیا۔ سوراخ سے سر باہر نکال کے میں نے دونوں ہاتھ منہ پر رکھے اور پوری قوت سے الو کی آواز سنائی۔ یہ بہترین الو کی آواز تھی۔ دوسری طرف سے بھی الو بولا تو میں ہنس پڑا۔ میرے سگنل کا جواب دینے والا دوسرا الو غالب کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔

غالب نے لیڈیز فرسٹ کے اصول پر عمل کیا۔ سب سے پہلے گل تانیہ میں نے شگاف میں سے اندر کھینچ لیا۔ اسنیڈ کے باوجود اس کی کہنیوں پر اور ٹانگوں پر خراشیں آئیں۔ جب وہ اندر آنے کے بعد اپنے پیروں پر کھڑی ہوئی تو نازو نمودار ہوئی۔ گل کے مقابلے میں اس کا جسم اور وزن دونوں کم تھے اور وہ تھی بھی بلی کی طرح مستعد اور پھرتیلی۔
اس نے اندر آکے غسل خانے کا معائنہ کیا۔ شگاف میں سے آنے والی روشنی بہت کم تھی مگر آہستہ آہستہ ہماری آنکھیں اندھیرے میں بھی دیکھنے لگی تھیں۔ غسل خانہ مشکل سے چھ فٹ لمبا اور چار فٹ چوڑا تھا۔ اس کی ایک دیوار کے ساتھ ٹونٹی لگی ہوئی تھی۔ نازو نے یہ بات ایک سروے کرتے ہوئے بتائی۔
"اف! یہ کیا مصیبت ہے" نازو نے کہا "جالے ہی جالے ہیں"
میں نے کہا "تم نے کہاں تفریح شروع کردی اندر آتے ہی!"
غالب نے سر اندر ڈال کے کہا "ہیلو' لیڈیز اینڈ جنٹلمین! ایک شریف آدمی کے لئے جگہ ہے؟"
"کوئی جگہ نہیں یہاں۔ بھرے پڑے ہیں ہر قسم کے جانور" نازو نے کہا "لال بیگ اور مکڑیاں۔"
"مگر آپ کے دل میں تو ہوگی خاتون" غالب نے اندر آتے ہوئے کہا "بہت نازک اور چھوٹا دل ہے مگر اپنا گزارا ہو جائے گا۔"
گل نے کہا "یہاں تو بہت بدبو ہے۔ دم گھٹ رہا ہے میرا۔"
"میں ابھی اسپرے کردیتا ہوں آپ کی پسندیدہ خوشبو کا۔ آپ تشریف رکھئے قالین پر۔ یا صوفے پر" میں نے کہا "اس کمانچے میں ایئر کنڈیشنر لگے گا۔"
غالب نے کہا "یہ تو تھا غسل خانہ۔ خوشبو تو آئے گی بیت الخلا پہنچنے کے بعد۔"
میں نے کہا "چھوڑ ان کی باتیں مت سن' چل یہ اینٹیں پکڑا مجھے۔"
"یعنی واپس باہر جاؤں؟" غالب نے کہا اور پھر باہر جا کے ایک ایک اینٹ اٹھا کر دینے لگا۔ میں ان اینٹوں کو اندر جمع کرتا گیا۔ غالب اندر لوٹ آیا تو ہم نے ان اینٹوں کو خاصی مہارت اور احتیاط کے ساتھ واپس دیوار کے شگاف میں رکھ دیا۔
میں نے اور غالب نے دوسری دیوار کی اینٹ دس منٹ سے کم وقت میں نکال لی۔ ایک طرف سے ... میں نے ڈرل مشین کو ہاتھ سے گھماتے ہوئے چنائی کو کھرچ دیا۔ دوسری طرف سے محسن نے یہی کام پیچ کس سے کیا۔ لیکن جتنی دیر میں اس نے ایک لکیر کو گہرا کیا میں تین لکیروں کو کھود چکا تھا۔
یہ اینٹ دوسری طرف جا گری۔ دھماکے کے ساتھ ہم سب کے دل دہل گئے لیکن اس کی گونج اندر ہی زیادہ محسوس ہوئی تھی۔ باہر اس کی آواز کا کسی نے نوٹس لیا ہوتا تو شور مچ جاتا۔
"جلدی کی ضرورت نہیں" میں نے کہا "یہ ہو سکتا ہے کہ کسی غسل خانے میں کوئی پرانی ٹین کی بالٹی بھی پڑی ہوئی ہو اور اینٹ اس پر جا لگے توپ کے کسی گولے کی طرح۔"
"بقول شاعر۔ لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام۔"
نازو نے ایک دبی دبی سی چیخ ماری مگر ہاتھ منہ پر رکھ لیا۔
"کیا ہوا؟ میں نے کہا تھا ناکہ چیخ مارنی ہو تو گلا یہیں چھوڑ جاؤ" غالب بگڑ کے بولا۔
"وہ چھپ... چھپ..." نازو نے ہکلاتے ہوئے کہا۔
"کیا چھپ' چھپ لگا رکھی ہے۔ صاف کہو چھپکلی۔ چھپکلی چاہئے۔ میں ابھی پکڑ کے لادیتا ہوں" غالب نے کہا "ذرا اینٹ نکال لوں۔"
"وہ.... میرے اوپر چڑھ گئی تھی" نازو نے خفا ہو کے کہا۔
"چلو اگلی دفعہ تم چھپکلی پر چڑھ جانا۔ آگے زیادہ بڑی اور صحت مند چھپکلیاں ہوں گی۔"
دوسری دیوار کے بعد بیت الخلا آگیا۔ اس میں بدبو واقعی ناقابلِ برداشت تھی۔ برسوں کی محبوس فضا میں رچ بس گئی تھی۔ یہاں کاکروچ بھی سیکڑوں کی تعداد میں جمع تھے جو سیپٹک ٹینک میں سے گزر کے آئے تھے۔ میں نے ماچس کی ایک تیلی جلانے میں کوئی حرج نہ سمجھا۔ اس کی روشنی باہر نہیں جا سکتی تھی۔ کاکروچ ایک دم بھاگے اور ڈبلیو سی میں گھس گئے۔ نازو اور گل ایک دوسرے سے چمٹی ہوئی پیر پٹختی رہیں۔ افراتفری میں بھاگنے والے کاکروچ کبھی ان کے پیروں پر بھی چڑھ جاتے تھے۔
"یار! ان کی حالت غیر ہو رہی ہے۔ ایک چھوٹی سی چیخ مارنے کی اجازت دے دیں؟" غالب نے کہا۔
میں نے کہا "اچھا ایک سیکنڈ کی چیخ کی اجازت ہے جو ایک فٹ سے آگے سنائی نہ دے۔"
ہماری پیش قدمی کی رفتار بہت اطمینان بخش تھی۔ اندر ہم بڑے سکون اور اعتماد کے ساتھ ایک کے بعد دوسری دیوار سے گزرتے جا رہے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ برسوں بند رہنے والے غسل خانے اور بیت الخلا انتہائی متعفن تھے۔ اندر گرد تھی اور مکڑیوں کے جالے تھے۔ مچھر تھے جو ہم پر مسلسل حملہ آور ہو رہے تھے۔ مجھے کاکروچ اور چھپکلی جیسے بے ضرر جانوروں کا ڈر نہیں تھا۔ ڈر یہ تھا کہ کہیں اندر بچھو نہ ہوں۔ جو اچانک ڈنک ماردیں۔ میں نے اس خوف کا اظہار نہیں کیا ورنہ اس کے بعد خواتین کو ہر کاکروچ بچھو نظر آنے لگتا۔
اس وقت رات کے ساڑھے دس بجے تھے جب ہم نے آخری غسل خانے سے گزر کے رسوئی یعنی پرانے باورچی خانے میں قدم رکھا۔ اس کے بعد والی دیوار پر پہنچ کے میں رک گیا۔ آگے فرش اچانک دو فٹ اوپر اٹھا ہوا نظر آیا۔
"مرزا جی! ایک بات بتاؤ۔ اس دیوار سے گزر کر ہم کہاں طلوع ہوں گے؟ برآمدے میں۔ زینے کے نیچے جہاں الیکٹرک سوئچ بورڈ اور جنریٹر لگے ہوئے ہیں۔ یا نچلی منزل کے آخری گودام میں؟"
غالب کی صورت پر بھی الجھن کے آثار نظر آنے لگے۔

"اچھا ہوتا اگر ہم یہ بات راما راؤ سے ہی پوچھ لیتے۔"
"اب ٹیلی فون کر کے پوچھ لو" نازو نے کہا۔
میں نے ہنس کے کہا "چلو اللہ مالک ہے۔ کچھ تو کرنا ہی ہے۔"
آخری دیوار پر ہم نے پھر ڈرل مشین کے استعمال سے گریز کیا اور پیچ کس کو بھی احتیاط سے استعمال کرتے رہے۔ یہاں پہلی اینٹ نکالنے میں بیس منٹ لگے۔ جیسے ہی اینٹ ہلی میں نے سوراخ میں سے جھانک کر دیکھا۔
دوسری طرف سے آنے والی تیز روشنی میرے منہ پر پڑی۔ میرے کانوں نے مکروہ آواز میں ایک بھیانک قہقہہ سنا۔
روشنی ساتھ والے کمرے سے آرہی تھی۔ اس کی چھت میں ٹین کے دو پرانے شیڈ آویزاں تھے۔ ان میں دو دو سو واٹ کے دو بلب روشن تھے۔ پہلے جب عمارت یتیم خانے کے طور پر استعمال ہوتی تھی تو ہر کمرے کے لئے ایک مرکزی لائٹ کافی سمجھی گئی ہوگی۔ پھر نقشے میں ضرورت کے مطابق ترمیم کی گئی اور درمیانی دیوار نکال کے دو کمروں کو بیس فٹ چوڑے' چوبیس فٹ لمبے ہال کی شکل دی گئی تو لائٹس دو ہو گئیں۔ یتیموں کے لئے شاید چالیس یا ساٹھ واٹ کے بلب کی روشنی کا خرچ بھی منتظمین کو ضرورت سے زیادہ لگتا ہوگا لیکن اب دو دو سو واٹ کے بلبوں کی خیرہ کن روشنی میں ہال بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔
میں نے جس شخص کی ہنسی کی مکروہ آواز سنی تھی وہ میری طرف پیٹھ کئے دروازے کی طرف جا رہا تھا۔ وہ گٹھے ہوئے جسم کا پستہ قد' سیاہ فام شخص تھا جس نے اپنا سر منڈوا رکھا تھا مگر وہ پھر بھی گنجا نہیں لگتا تھا۔ اس کے سر کی کالی چمڑی بالوں جیسی ہی نظر آتی تھی۔ مشین گن کو اس نے کندھے پر لٹکا رکھا تھا۔
"ارے پاگل کا بچہ... ادھر کیا ہے۔ سالا چڑی کا بچہ نئیں آئیلا ہے ادھر..."
اس کا دوسرا ساتھی لمبے قد اور دبلے پتلے جسم کا مالک تھا اور اس کی مونچھیں پرانے تلوار مارکہ اسٹائل کی تھیں "ہم خود سنا..."
"ابھی تو چریا ہو گیا اے۔ کان کھراب ہو گیا' تم بھی کنڈم ہو جائیں گا ایک دن" پہلے والے شخص نے دروازے کے قریب جا کے کہا۔
"ہولی فادر' ہمارا کان ایک دم ٹھیک ہے" تلوار مارکہ مونچھ والے نے برا مان کے خفگی سے کہا "ہمارا دماغ کو خراب بولتا سالا۔ تم خود دارو پی کے ایک دم ایڈیٹ ہو جاتا ہے۔ ہم بولتا ہے تیرے کو' یسوع مسیح کا قسم کھا کے بولتا ہے کہ کوئی دیوار کھودتا پڑا ہے۔ ایسا مافک آواز کو ہم جانتا ہے۔ ہم ناگپور جیل سے بھاگا تھا۔"
"یہ اسٹوری تم سو مرتبہ سنائیلا ہے۔"
"ہاں... مگر یہ سچ ہے۔ ہم جب دیوار سے اینٹ نکالتا تھا تو ہمارا کان یہ آواز سنتا تھا۔"

پستہ قد ہنسا "لیکن ابھی ادھر کیا ہے۔ بول... کون سا... نئیں اے؟"
"دیکھ' میں تیرے کو بتاتا ہے۔ ابھی تو ہنسے گا لیکن جرور کوئی گول مال ہے۔ اوپر کچھ نئیں ہے۔ لیکن..."
"لیکن کیا؟"
"نیچے کچھ ہوئیں گا" دراز قد سوچتے ہوئے بولا۔
"نیچے' زمین میں!" پستہ قد پہلے حیران ہوا اور پھر ... مار کے ہنس پڑا "اوئے چریا' نیچے کیا ہوئیں گا... سرنگ؟"
دراز قد نے اقرار میں سر ہلایا "ابھی کیا پتا' کوئی ... بنا لے تو۔ بائی گاڈ ہم ادھر تھا جب ہم آواز سنا... ابھی ... نئیں ہے۔"
"چل میرے باپ' یہ اچھا اسٹوری ہے۔ تو جیل ... توڑا۔ اس کا نیچے سرنگ بنا لیا۔ گٹر میں نکلا اور بھاگ گیا... ابھی یہ کوئی جیل نئیں اے۔ ادھر تیرا اسٹوری فیل ہے" ... نے اپنے ساتھی کو دروازے سے دھکیل دیا اور قفل لگا دیا۔
دراز قد کے نہ کان خراب تھے اور نہ اس کے دماغ ... تھا۔ ان کی گفتگو سے اندازہ ہوتا تھا کہ دراز قد اسی طرح اینٹیں نکال کر کسی زمین دوز سرنگ کے راستے کسی گٹر ... پہنچا تھا اور ناگپور جیل سے فرار ہونے میں کامیاب رہا تھا۔ سابقہ تجربے کی بنیاد پر اس کے کانوں نے جو آوازیں سنی تھیں غلط نہ تھیں اور اس نے بالکل صحیح نتیجہ اخذ کیا تھا مگر ہماری خوش قسمتی کہ جب انہوں نے دیکھا تو انہیں کچھ نظر نہ آیا۔ اس کی ایک وجہ غالباً یہ تھی کہ انہوں نے کمرے کی ہر دیوار کا معائنہ ... منٹ پہلے کیا ہوگا جب اینٹ اپنی جگہ پر موجود تھی۔ ... سے میں نے ساری چنائی کھرچ کر نکال دی تھی لیکن اینٹ ... نہیں تھا ورنہ کمرے کے اندر پلستر ٹوٹ کے گرتا اور ... شگاف سے مشین گن کی نال گزار کے ہم سب کو ایسے ... دیتے جیسے بھٹی میں مکئی کے دانے۔
ہم نے اس دیوار پر کام کرتے ہوئے خصوصی احتیاط ... تھی اور ڈرل مشین تو بالکل استعمال نہیں کی تھی۔ اس ... نے بھی ہمیں بچا لیا تھا لیکن ہماری اصل حفاظت ایک ... کی جو تھوڑے سے فاصلے پر بائیں جانب رکھی ہوئی تھی۔ ... ہمارے اور ان کی نگاہوں کے درمیان حائل رہی۔ ... دروازے کے قریب کھڑے ہوئے تھے اور میں نے ... فٹ کے فاصلے پر زمین سے ایک فٹ اوپر شگاف کیا تھا ... سامنے ہوتے تو ان کی نظریں سوراخ کے اندر تک دیکھ ...
جب میں نے دیکھا تو وہ واپس جا رہے تھے اور ان کا رخ دروازے کی طرف تھا۔
دو منٹ کا یہ وقفہ مجھ پر دو گھنٹے سے زیادہ بھاری گزرا۔ ... دم سادھے بیٹھا رہا اور ہر لمحہ گزران کے ساتھ ... انکشاف کے لمحے کا تصور کر کے کانپ ... نے اس

بھی واپس رکھنے کی کوشش نہیں کی کہ کہیں آہٹ انہیں متوجہ نہ کر لے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں اپنے دل کے دھڑکنے کی اور سانس لینے کی آواز سے بھی خوف زدہ تھا کہ اس خاموشی میں ان کے شک سے غیر معمولی طور پر حساس ہو جانے والے کان ہوشیار نہ ہو جائیں۔
کیفیت دوسروں کی بھی مختلف نہ تھی۔ گل' نازو اور غالب سب اپنی اپنی جگہ ساکت بیٹھے رہ گئے تھے۔ ہال میں گونجنے والی آوازیں اس شگاف سے گزر کے سب کے کانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ میری طرح وہ کچھ دیکھ نہیں رہے تھے چنانچہ تصورات سے دہشت زدہ تھے۔ یکلخت تحفظ کا احساس خیالِ باطل ثابت ہوا تھا۔ سات دیواریں عبور کر لینے کے بعد حاصل ہونے والے اعتماد اور کامیابی کے یقین کی خوشی لذتِ خواب سحر کی طرح مٹ گئی تھی۔
جب دروازہ بند ہوا اور میں نے اطمینان کا گہرا سانس لیتے ہوئے مسکرا کے پیچھے دیکھا تو آہستہ آہستہ سب کے بجھے ہوئے مایوس اور پُر خوف چہرے پھر امید کی روشنی اور شکر گزاری کے جذبات سے دمکنے لگے۔
"اللہ تیرا شکر ہے" سب سے پہلے نازو نے کہا اور ایک دم اپنے ہاتھ پاؤں چلانے لگی۔
پھر گل نے بھی نازو کے اسٹائل میں ڈانس کرتے ہوئے کہا۔ "میرا تو ہارٹ فیل ہونے والا تھا۔"
میں اور غالب پہلے حیران ہوئے اور پھر بڑی مشکل سے اپنی ہنسی کو ضبط کر سکے۔ گل اور نازو پر کاکروچ چڑھ گئے تھے اور اب وہ ہاتھ مار مار کے انہیں جامے سے باہر کر رہی تھیں۔ ان کی حالت خوف اور خفت سے قابل رحم ہو رہی تھی لیکن خطرہ ایک ایسی مجبوری بن گیا تھا کہ وہ نہ ہاتھ ہلا سکتی تھیں اور نہ پیر جھٹک سکتی تھیں۔ وہ بے حس و حرکت دانت پر دانت جمائے بیٹھی رہیں اور ہر لال بیگ نے ان کی مجبوری سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔
ہنسی کو ضبط کرنے کی کوشش میں میری اور غالب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ نازو اور گل بالآخر ہر کاکروچ کو بے دخل کرنے میں کامیاب ہو گئی تھیں اور اب ہمارے غیر ہمدردانہ رویّے پر سخت برہم تھیں۔
"بہت بدتمیز کاکروچ تھے" غالب نے کہا۔
"اب تم سوچ رہے ہو گے کہ کاش میں ایک کاکروچ ہوتا" ممانے کہا اور پھر باقی اینٹوں کو ہلانے لگا۔
"اسی طرح مارے بھی جاتے" نازو نے بگڑ کے کہا۔
"سکندر بھائی' آپ مذاق اڑا رہے ہیں۔ اللہ ہم نے کتنی مشکل سے اپنے آپ کو روکا۔ کہیں منہ سے چیخ نکل جاتی تو کیا ہوتا؟" گل نے کہا۔
ممانے کہا "رہنے دو بی بی' تمہارا چیخ مارنا محض ایک ادا ہوتی ہے خوف کی۔ خوف نہیں ہوتا۔"

"ہاں" غالب نے کہا "اس وقت کاکروچ کیا' تم پر چھپکلیاں یلغار کرتیں تب بھی تمہاری آواز نہ نکلتی۔"
"آواز نہ نکلتی' دم نکل جاتا تو؟" نازو نے کہا۔
"اللہ ایسی باتیں مت کرو' میرا دم نکل جائے گا" غالب نے ان کی نقل اتارتے ہوئے سینے پر ہاتھ رکھ کے کہا "سچ کہہ رہا ہوں۔"
"ایسے ہی سچے ہو تو دکھاؤ مر کے" نازو نے جل کے کہا۔
"میں مر گیا نا... تو بھوت بن جاؤں گا۔ اپنے سسر کی طرح" غالب نے کہا "یہ شرافت' انسانیت سب چھوڑ دوں گا۔ بھوت تو چمٹ جاتے ہیں۔"
میں نے کہا "چلو' راستہ بن گیا۔ پہلے تم مرزا جی۔"
غالب کے بعد میں نے گل اور نازو کو گزارا اور پھر خود بھی شگاف کے راستے ہال میں پہنچ گیا۔ اس ہال میں سب پرانا سامان بھرا پڑا تھا۔ پرانے پلنگ جو شاید پہلے یتیم خانے کی ملکیت تھے۔ اب بے مصرف ہو گئے تھے۔ ان کی پٹیاں ٹیڑھی ہو گئی تھیں اور بنائی لٹک رہی تھی۔ دوسری طرف ٹوٹی پھوٹی ڈیسکوں اور بینچوں کا انبار پڑا ہوا تھا۔ کچھ شکستہ کرسیاں اور میزیں بھی اپنا فسانۂ عبرت سناتی نظر آتی تھیں۔ مجھے ایک افسردہ کر دینے والا خیال آیا کہ آخر یتیم خانہ بند ہو جانے کے بعد وہ سب بچے کہاں گئے ہوں گے جن کے ماں باپ تو خیر دنیا ہی چھوڑ گئے تھے لیکن جن کے لئے دنیا میں کسی عزیز رشتے دار کے گھر میں بھی جگہ نہ تھی۔
کیا احساسات ہوں گے ان لاوارث اور مجبور بچوں کے؟ جب انہیں کہا گیا ہوگا کہ چلو خالی کرو یہ جگہ۔ ساری عمر مفت کھلانے اور جگہ فراہم کرنے کا ٹھیکا نہیں لیا تھا ہم نے۔ ان معصوموں نے ضرور پوچھا ہوگا کہ ہم آخر کہاں جائیں؟ تو انہیں یہی جواب ملا ہوگا کہ جہنم میں جاؤ ہماری طرف سے... اور کیا معلوم ان لوگوں نے جیتے جی خود انہیں جہنم میں جھونک دیا ہو۔ ان کی زندگی کو پیشہ ور گداگری کے ٹھیکے داروں کے ہاتھ فروخت کر دیا ہو اور اس وقت وہ مڑے تڑے ہاتھ پاؤں لئے کسی فٹ پاتھ پر پڑے دستِ سوال دراز کر رہے ہوں... بھگوان کے نام پر یتیم کو کچھ دے جاؤ... بھگوان تمہیں بہت دے گا... اور نہ دینے والے ان کا مذاق اڑاتے ہوں گے کہ آخر بھگوان نے تمہیں بہت کچھ کیوں نہیں دے دیا۔ وہ کسی کو کیسے بتا سکتے ہیں کہ بھگوان تو سب کو دیتا ہے مگر اس کے بالک رام' جیسے بھگت سب چھین لیتے ہیں
"آخر اس کباڑ خانے میں کیا ہے غور فرمانے کے لئے؟" غالب نے کہا۔
میں چونکا "کچھ نہیں' میں کباڑ خانے کو نہیں دیکھ رہا تھا۔"
نازو نے کہا "کیا دیوار کے پار کچھ نظر آ رہا تھا؟"
میں نے کہا "ہاں' وہ وقت جس کی یہ نشانیاں باقی رہ گئی ہیں جیسے جسم مٹی میں مل جاتا ہے مگر لوحِ مزار باقی رہتی ہے۔"
غالب نے کہا "تو طلبی ہونے کے مواقع پھر آئیں گے۔ آج

تو وقت کم ہے۔"
میں نے کہا "اب کیا کریں؟ شطرنج کے گھوڑے کی طرح ڈھائی گھر کی چال چلیں۔"
"میرا خیال ہے وہ تین ہی گھر ہوتے ہیں جن کو خواہ مخواہ ڈھائی گھر کہا جاتا ہے" غالب بولا "ویسے چال کی وضاحت فرمایئے اور یہ بھی کہ آخر ہم گھوڑے کب سے ہو گئے۔"
"ہاں ڈھینچوں ڈھینچوں تو اب بھی کرتے ہو" نازو نے کہا۔
میں نے کہا "ایک دیوار یہ ہے اس سے متصل کمرے کی۔ دوسری مقابل کی دیوار ہے۔ اس میں سے گزر کے ہم بجلی کے مین سوئچ اور جنریٹر تک پہنچ سکتے ہیں۔ تیسری یہ دیوار ہے۔ اس کی ایک اینٹ نکال کے باہر کا جائزہ لیا جاسکتا ہے اور یہ دیکھا جاسکتا ہے کہ کیا گیٹ کی طرف سے بھی حملہ ممکن ہے۔"
غالب نے کچھ دیر سوچا' پھر کہا "ساری بات وقت کی ہے۔"
میں نے کہا "فرض کرو ہم ایسے ہی دیواریں عبور کرتے گئے جیسے ابھی غسلخانوں سے گزر کر آئے ہیں۔ ایسے ہی ہر کمرے سے گزرتے ہوئے آخری کمرے میں جا پہنچے اور ایسے ہی ہر کمرا خالی ملا تو یہ محنت رائیگاں جائے گی۔ اس میں چار دیواروں سے گزرنے کا رسک بھی ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کسی دیوار کے کھرچے جانے کی آواز اوپر پہنچ جائے۔ اس کمرے میں جہاں محافظ موجود ہیں۔"
گل نے کہا "یہ رسک تو یہاں بھی ہے۔"
میں نے کہا "ہاں، مگر ایک بار رسک لینے اور چار بار رسک لینے میں بہت فرق ہے۔"
"رسک کم سے کم لینا چاہئے" نازو نے میری تائید کی۔
"اور اس کا طریقہ ہے براہِ راست گیٹ تک رسائی" میں نے کہا "ہم اسی طرح دیواریں کھودتے ہوئے گئے تو پانچویں دیوار کھود کے گیٹ تک پہنچ پائیں گے۔ بشرطیکہ اس سے پہلے ہی پکڑے نہ گئے۔"
"براہِ راست ہم کیسے جاسکتے ہیں؟" گل نے کہا۔
"اور پکڑے جائیں گے تو پھر کیسے بھی جائیں" نازو بولی۔
میں نے کہا "تم عجیب بے پیندے کی لوٹی ہو۔ کبھی میری حمایت کرتی ہو کبھی مخالفت۔"
"میں ایک غیر جانبدارانہ حقیقت پسندی سے کام لے رہی ہوں" نازو نے فلسفیانہ متانت سے کہا۔
"دیکھو' جتنا فرق رسک میں ہے۔ اتنا ہی پکڑے جانے میں بھی ہے" میں نے کہا "یہاں ہم ایسے مارے جائیں گے جیسے چوہے دان میں گرفتار ہونے والے چوہے مارے جاتے ہیں۔ اس صورتِ حال میں ہم کیا کریں گے اگر آخری دیوار کے شگاف سے طلوع ہونے کے بعد ہم نے نصف درجن مشین گنوں کا رخ اپنی طرف دیکھا؟ مقابلہ کر کے گرفتار ہونا بہتر ہے۔"
"تم نے ٹھیک کہا" نازو نے کہا "اب میں غیر مشروط حمایت کرتی ہوں تمہاری۔"
غالب نے اسے غصے سے دیکھا "سکندر نے صحیح خطاب دیا تھا تمہیں ابھی۔"
میں نے کہا "پہلے بات سمجھ لو میری۔ پانچ دیواروں کو کھودنے سے بہتر ہے کہ ہم صرف دو دیواروں پر قسمت آزمائی کریں۔ اسی کباڑ خانے میں۔ کسی اور کمرے میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پہلے سے محافظ موجود ہوں یا چکر لگاتے رہتے ہوں۔ یہاں دوبارہ کوئی نہیں آئے گا۔ ایک ٹیم ادھر سے باہر نکلنے کا راستہ بنائے گی۔ دوسری ٹیم برآمدے کی طرف شگاف ڈالے تاکہ بجلی کے سوئچ بورڈ اور جنریٹر تک رسائی حاصل ہو جائے۔"
غالب نے کہا "اندھیرا کر کے نعرۂ تکبیر......"
میں نے کہا "نہیں' ابھی ہم صرف بلیک آؤٹ کے انتظامات کریں گے۔ تاکہ جب ضرورت پڑے تو دشمن کے سارے حفاظتی انتظامات دھرے رہ جائیں۔ مین سوئچ آف کرنا تو کوئی مشکل کام نہیں مگر اس کے ساتھ ہی جنریٹر چل پڑے گا۔ اصل کام ہے جنریٹر کو ناکارہ بنانا۔"
"میں تو الیکٹریشن نہیں ہوں۔"
نازو نے کہا "خاموشی سے دستی بم ماردیں گے۔"
میں نے کہا "لڑکی' تم غالب کے ساتھ خاموشی سے ایک طرف کی دیوار کھودنے میں لگ جاؤ۔"
"بیک وقت دونوں کام نہیں ہو سکتے" نازو نے کہا "یا میں غالب کے ساتھ رہ سکتی ہوں یا خاموش رہ سکتی ہوں۔"
"پھر تم میرے ساتھ آجاؤ۔ گل! تم غالب کے ساتھ باہر کی طرف والی دیوار کھودو" میں نے اسے ایک پیچ کس پکڑاتے ہوئے کہا "یہاں ہم ڈرل مشین استعمال نہیں کر سکتے۔ پندرہ کی جگہ بیس منٹ لگ جائیں کوئی بات نہیں۔ کام بہت خاموشی اور احتیاط کے ساتھ ہونا چاہئے۔ ہم ایک گھنٹے سے زیادہ وقت بچا رہے ہیں۔"
"وہ کیسے؟" گل نے کہا۔
"باقی سب دیواروں کو بخش کے" غالب نے کہا "تم بھی ایسے ہی بک بک کرتی رہو گی نازو کی طرح یا کوئی کام بھی کرو گی۔ چلو۔"
اس سے پہلے کہ نازو پلٹ کر جواب دیتی' میں نے اسے اپنے ساتھ کھینچ لیا۔ ہم دونوں کے پاس بھی ایک ہی پیچ کس تھا چنانچہ میں نے بہتر یہی سمجھا کہ نازو کو محافظ مقرر کردوں۔ جتنی دیر میں اپنے کام میں مصروف رہا وہ ہاتھ میں ریوالور لئے کھڑی رہی۔ دوسری طرف غالب نے بھی گل کو یہی ذمے داری سونپ دی تھی جو درحقیقت فراغت تھی۔ وہ دونوں کچھ دیر تو کھڑی رہیں' پھر انہوں نے ٹہلنا شروع کیا۔ پانچ منٹ بعد وہ دونوں کمرے کے بیچ میں کھڑی ہوئی گپ لگا رہی تھیں۔
میں نے اپنا کام اتنی نزاکت اور احتیاط سے کیا جیسے یہ دیوار سے اینٹ نکالنے کا نہیں شیشے پر نقاشی کا کام ہے۔ نتیجہ یہ کہ ایک اینٹ کو ہٹانے میں میرے بیس منٹ سے زیادہ ہی صرف ہو گئے۔ تاہم اپنے منصوبے میں ترمیم کے بعد مجھے وقت کی کمی کا احساس نہیں رہا تھا۔ میں زیادہ مطمئن اور پُراعتماد تھا۔
ایک اینٹ ہٹانے کے بعد میں نے باہر جھانک کر دیکھا۔ شگاف برآمدے کے آخری حصے میں نکلا تھا۔ وائیں جانب وہ زینہ تھا جو نصف بلندی تک جا کے گھوم جاتا تھا۔ اس نصف بلندی کے نیچے ایک تکونی چھجے والی جگہ میں بجلی کا سوئچ بورڈ تھا جس میں سے تار نکل کے جنریٹر تک جا رہے تھے۔ راما راؤ کی اطلاعات بہت صحیح تھیں۔ جنریٹر ایک بیٹری سے چلتا تھا اور یہ غالباً کار کے انجن کی طرح سیلف اسٹارٹ تھا۔
زینے کے آغاز میں ایک ٹیوب لائٹ روشن تھی۔ اوپر جہاں سے زینہ گھومتا تھا' دوسری ٹیوب لائٹ کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ بجلی کے بورڈ پر ایک بلب لگا ہوا تھا مگر روشن نہیں تھا۔ اس کے قریب ہی دیوار پر وہ ایمرجنسی لائٹ لگی ہوئی تھی جس کی بیٹری چارج ہوتی رہتی ہے اور جو بجلی جاتے ہی خود بخود جل جاتی ہے۔ ان سب انتظامات کو ناکارہ کرنا معمولی کام تھا۔
جب شگاف اتنا بڑا ہو گیا کہ اس میں سے میں گزر سکوں تو میں نے دوسری طرف جا کے دیکھا۔ غالب کی پوزیشن نسبتاً محفوظ تھی کیونکہ وہ سارے کاٹھ کباڑ کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا مگر اسے جگہ بنانے میں دقت پیش آرہی تھی۔ پانچ منٹ کی تاخیر سے اس نے بھی اپنا کام ختم کر لیا۔ اب میں نے بھی باہر اس طرف دیکھا جدھر سڑک تھی۔ سڑک سے آنے والے راستے پر مرکری بلب جل رہے تھے۔ میں نے سر نکال کے بائیں طرف دیکھا تو مجھے دو محافظ نظر آئے۔ ان میں سے ایک مشین گن لے کر ٹہل رہا تھا لیکن دوسرا سر کے نیچے کہنی رکھے سویا پڑا تھا۔ غالباً یہ ان کا آپس کا طے کردہ دستور العمل تھا۔ دو افراد کو ساری رات جاگتے رہنے کی کیا ضرورت تھی۔ چوکیداری کا کام تو ایک آدمی بھی کر سکتا ہے جو ضرورت پڑنے پر دوسرے کو فوراً جگا سکتا ہے۔ یہ ایک پُرتحفظ معاہدہ تھا جس میں دونوں کے لئے بیک وقت کام اور آرام کی گنجائش نکل آتی تھی۔ وہ دونوں رات کو باری باری جاگتے اور سوتے ہوں گے۔
"راما راؤ نے کہا تھا کہ آج پولیس بھی ہوگی" غالب نے کہا۔
"جب اصل محافظ سو رہے ہیں تو پولیس جاگ کر کیا کرے گی" میں نے کہا "وہ آ گئے' ان کا فرض پورا ہو گیا۔"
"ویسے بھی جو ہونا تھا ہو گیا۔ روز روز تو ہوگا نہیں۔"
"اور جو ہونا تھا وہ تمام حفاظتی انتظامات کے باوجود ہو گیا" میں نے کہا "اب میں پہلے الیکٹرک بریک ڈاؤن سسٹم میں تھوڑا سا ردوبدل کر لوں' پھر باہر نکلتے ہیں۔"
بجلی کی رو کو صرف ایک لیور کھینچ کر بند کیا جاسکتا تھا۔ ابھی اس کی ضرورت نہیں تھی۔ اصلی خطرہ متبادل نظام کا تھا جو بجلی بند ہوتے ہی فعال ہو جاتا تھا۔ ایمرجنسی لائٹس کو میں نے اسی کے سوئچ سے آف کیا اور پھر بہتر یہ سمجھا کہ اسے وہاں سے ہٹا دیا جائے تاکہ ہنگامی صورتِ حال پیدا ہوتے ہی کوئی وہاں پہنچے تو اسے روشنی نہ ملے۔ ایمرجنسی لائٹ پلاسٹک کے چھوٹے سے خوب صورت پیکٹ میں تھی اور اسے آسانی سے کیل پر بھی لٹکایا جاسکتا تھا یا ہاتھ میں بھی اٹھایا جاسکتا۔ یہ عام گھریلو استعمال کی لائٹ تھی جو بجلی نہ ہونے کی صورت میں دو تین گھنٹے کام دے جاتی تھی۔ اسے میں نے اتار کے نازو کے سپرد کیا۔ نازو اسے اندر پڑے ہوئے کاٹھ کباڑ میں ڈال آئی۔
جنریٹر کو میں نے پہلے تو بیٹری سے الگ کیا تاکہ بجلی جانے کی صورت میں یہ خود اسٹارٹ نہ ہو۔ بیٹری کے پول سے سیلف اسٹارٹ یونٹ تک جانے والے تار ایک جھٹکا دینے سے الگ ہو گئے۔ انہیں بھی میں نے نازو کو تھما دیا۔
"انہیں بھی اندر پھینک آؤں؟" وہ بولی۔
"جو چاہو کرو" میں نے کہا "مگر آہستہ بولو۔"
"انہیں رکھ لیتی ہوں۔ مضبوط تار ہیں" نازو نے کہا۔
"تمہارے کس کام کے؟" میں نے جنریٹر پر غور کرتے ہوئے کہا۔
"اس سے ہتھکڑی کا کام بھی لیا جاسکتا ہے۔ مجرموں کو باندھا جاسکتا ہے۔ ان کی کھال بھی ادھیڑی جاسکتی ہے۔ بل دے کر دُہرا کر لیا جائے تو ایسا مضبوط کوڑا بن جاتا ہے" نازو نے کہا۔ "اور جناب اس سے تو پھانسی بھی دی جاسکتی ہے۔ یوں گردن میں ڈال کے ایک جھٹکا..."
"خدا کے لئے چپ ہو جاؤ... کوئی سن لے گا۔"
"میں نے تو کہہ دیا تھا کہ میں چپ نہیں رہ سکتی..."
"وہ تم نے غالب کے ساتھ رخصتی کے وقت شرط لگائی تھی میرے ساتھ نہیں" میں نے کہا "آخر آج کیا ہو گیا ہے تمہیں؟"
"کبھی کبھی دورہ پڑتا ہے مجھ پر بولنے کا" وہ بولی۔
"آج بہت غلط وقت پر اور غلط جگہ دورہ پڑا ہے" میں نے کہا۔
"میں تو اتنا آہستہ بول رہی ہوں کہ خود بھی صاف نہیں سن سکتی" نازو نے کہا "معلوم نہیں تم کیسے سن رہے ہو۔"
میں نے جنریٹر کے اسپارک پلگ کے اوپر لگی ہوئی پلاسٹک کیپ ہٹائی اور اس سے منسلک تار کو کھینچ کر توڑ دیا۔ اتنا کافی تھا' اب لائٹ آف ہونے کے بعد جنریٹر کے خود اسٹارٹ ہونے کا تو خیر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کوئی خود آ کے بھی اسے نہیں چلا سکتا تھا۔ اسے لائٹ نہ ملتی اور لائٹ مل جاتی تب بھی وہ اسپارک پلگ کا تار کہاں سے لاتا۔ ابھی ہم اس کارروائی سے فارغ بھی نہیں ہوئے تھے کہ اوپر سے دو افراد کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ وہ باتیں کرتے نیچے آرہے تھے۔
میں نے نازو کو اپنے ساتھ زینے کے نیچے کھینچ لیا۔ زینے

کے نیچے بھی بہت سا فاضل سامان پڑا ہوا تھا۔ مثلاً انجن آئل کے خالی ڈبے۔ ایک پرانا ٹائر اور پلاسٹک کے پائپ کا ایک لچھا۔ پھر بھی ہم دونوں کے لئے گنجائش موجود تھی۔

"یہ اچھی مصیبت پڑگئی ہے گلے" اوپر سے اترنے والے ایک شخص نے نیم خوابیدہ بیزار لہجے میں کہا۔

"چل یار ایک چکر لگانے میں کیا ہے" دوسرے نے کہا۔ "اپنی کارروائی پوری ہو جائے گی ورنہ افسر لوگ صبح کہیں گے کہ تم ساری رات سوتے رہے۔"

میں نے سر تھوڑا سا نکال کے دیکھا۔ وہ پولیس کے عملے کے لوگ تھے جن کو آج خاص طور پر یہاں حفاظتی انتظام کے لئے چھوڑا گیا تھا۔ وہ زینے سے اتر کے برآمدے کی جانب بڑھ گئے۔ میں نے دبے پاؤں پیچھے جا کے انہیں کونے سے جھانک کر دیکھا۔ وہ برآمدے میں ٹہلتے ہوئے بند کمروں کے سامنے سے گزرتے جا رہے تھے اور ہر تالے کو چیک کر رہے تھے۔ پھر ان میں سے ایک برآمدے سے اتر گیا اور اس طرف چلا گیا جہاں اب سات ٹرک ایک قطار میں کھڑے ہوئے تھے۔

"ابھی یہ لوگ واپس بھی آئیں گے" نازو نے کہا۔

میں نے چونک کر پیچھے دیکھا "ہاں' ایک چکر لگا کے آئیں گے۔"

"پھر ان کے بارے میں کیا خیال ہے؟" نازو نے کہا "اوپر واپس جانے دیں یا اوپر پہنچا دیں؟ جہاں سے واپسی ہی نہ ہو۔"

غالب نے شگاف میں سے سر نکال کے دیکھا "اب کیا ہو رہا ہے؟"

میں نے کہا "دو پولیس والے آگئے تھے۔ نازو کا خیال ہے کہ ان سے ابھی نمٹ لینا آسان ہے۔ ہم انتظار کر رہے ہیں ان کی واپسی کا۔"

"مگر میں کیا کروں یار؟ وہ گل تو باتیں بھی نہیں کرتی۔ کرتی ہے تو صرف محسن کی۔"

میں نے کہا "چل کچھ دیر تو بھی برداشت سے کام لے۔ مجھے اگر نازو سے کام نہ ہوتا تو میں ابھی تیرے حوالے کر دیتا۔ اس نے تو دماغ کھا لیا ہے میرا۔"

"ذائقہ تو مغز کا نہیں تھا' کچھ بھوسے جیسا تھا" نازو نے کہا۔

دونوں سپاہی پانچ منٹ بعد پھر نظر آئے۔ غالب اندر غائب ہو گیا۔

"یہ دونوں تو اکٹھے آ رہے ہیں" میں نے نازو کے کان میں کہا۔

"پھر کیا ہوا... آنے دو۔"

"دونوں کو ایک ساتھ قابو کرنا ضروری ہوگا۔"

"تم پسند کر لو ایک کو" نازو بولی۔

"لیڈیز فرسٹ' جو تمہیں اچھا لگ رہا ہے..." میں نے کہا۔

"موٹا مجھے زیادہ برا لگ رہا ہے" نازو نے کہا "چھوٹا تم لے لو۔"

"او کے' تیار ہو جاؤ... میں دیکھ رہا ہوں انہیں آتے ہو[ئے]"

"آواز میں بھی سن رہی ہوں" نازو نے دیوار کے ساتھ [لگ] کے کہا۔

"ان میں سے کسی کی آواز نکلی تو مصیبت ہو جائے گی" [میں] نے کہا۔

آخری وقت میں معلوم نہیں کیا ہوا کہ ایک ساتھ [آنے] والے دونوں پولیس مین آگے پیچھے نمودار ہوئے۔ چھوٹا [آگے تھا]۔ اسے میں نے یوں دبوچا جیسے شکاری باز اپنے پنجوں میں [شکار] پکڑتا ہے۔ اس کی آواز تو نہیں نکلی مگر اس کے پیر چلانے [سے] تھوڑی سی آہٹ ہوئی۔ میں اسے کھینچ کر پیچھے لے گیا۔

موٹے نے ابھی اتنا ہی کہا تھا "کیا ہے یار" کہ اسے [نازو] نے کمند ڈال کے گرا دیا۔ یہ کام وہ ہاتھوں سے بھی کر سکتی تھی [مگر] شوقیہ اس نے بجلی کے تار استعمال کئے۔ شاید مجھے یہ دکھانے [کے] لئے کہ وہ اپنے دعوے میں کسی حد تک حق بجانب تھی۔

میں چھوٹے کو گردن مروڑ کے ڈال چکا تھا جب میں نے [نازو] کو بجلی کے تاروں کا حلقہ موٹے کی گردن میں ڈال کر اس کے دونوں کناروں کو پکڑ کے جھٹکا دیتے دیکھا۔ موٹا لڑکھڑایا۔ ایک لمحے کے لئے تو میں نازو کی اس بے وقوفی پر گھبرا کے مشتعل [ہو گیا] تھا۔ آخر ایسے وقت میں ایک نیا کھیل دکھانے کی کیا ضرورت تھی۔ میرا خیال تھا کہ موٹا اب چلائے گا مگر نازو نے پھر جھٹکا [دیا] اس کی گردن کی ہڈی بڑی آواز کے ساتھ ٹوٹی۔ وہ اپنے دو من [کے] وزن کے ساتھ نیچے گرا۔ نازو نے اسے روکا اور چھوڑ دیا۔ [اس] کے گرنے کا شور نہیں ہوا۔ نازو نے تار کھینچ لیا "فنس۔"

"چلو اب اٹھاؤ اپنے شکار کو" میں نے کہا۔

"اس گینڈے کو میں اٹھاؤں؟"

"خوب' شکار آپ کریں۔ اٹھائے کوئی اور۔ بلاؤ اپنے [اس] غلام کو۔" میں نے چھوٹے پولیس مین کو اٹھا کے دیوار [کے] شگاف تک پہنچایا اور اندر ڈال دیا۔

"غالب' ذرا میری بات تو سنو" نازو نے بڑے پیار سے [کہا] "باہر آؤ نا' اندر کیا کر رہے ہو؟"

"میں اندر ہی ٹھیک ہوں" غالب نے بے نیازی سے [کہا] "جھک مار رہا ہوں اندر مگر خوش ہوں۔"

"دیکھو پھر میں روٹھ جاؤں گی" نازو نے ایسی ادا سے [کہا] [کہ] یہ شرارت نہ ہوتی تو غالب سر کے بل آتا۔

"چلو تم روٹھے' ہم چھوٹے" غالب نے کہا "لاشیں ڈھونے کا کام میں نہیں کرتا۔ میں نہیں آ رہا۔"

"اچھا' پھر میں اندر آتی ہوں" نازو نے ہاتھ جھاڑ کے [کہا]

"یار سکندر' روک لے اسے... یہ کوئی جگہ ہے بد[معاشی] دکھانے کی" غالب نے پیچھے ہٹ کے کہا۔

"بدمعاش کو بدمعاشی سے کون روک سکتا ہے دوست" نازو نے کہا۔

"اوئے میں بدمعاش نہیں' دادا ہوں دادا" نازو نے مونچھوں پر تاؤ دیا۔

"اچھا دادا جی" غالب نے ہاتھ جوڑ کے کہا "میں بے غیرت ہی آتا ہوں۔ خدا کی قسم محبت کی فلمی تاریخ میں آج تک ایسا بے غیرت ذلت اٹھانے والا عاشق نہیں ہوا۔ سب کچھ نہ کچھ عزت نفس رکھتے تھے۔ مجال ہے جو لیلیٰ نے کبھی مجنوں کو ڈانٹا بھی ہو یا شیریں نے فرہاد کو دھوبی پٹکا دیا ہو۔ ایسی غنڈہ گردی کی محبت سے تو بہتر ہے آدمی سو پیاز اور سو جوتے کھانے کی مشق کرے۔"

وہ سخت کھولتا ہوا باہر آگیا تھا۔ باہر نازو نے اس کے کان میں کچھ کہا جو میں نہ سن سکا۔ تاہم جب وہ واپس آیا تو اس کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ نازو مجسم ناز اور سراپا نیازی بنی ہوئی تھی۔ بہت بعد میں جب میں نے پوچھا تو غالب نے کہا کہ یار نازو نے بات ہی ایسی کہہ دی تھی۔ اس نے کہا کہ میرے سامنے لیلیٰ وشیریں کی بات مت کرو۔ انہوں نے تو جان لے لی تھی مجنوں کی اور فرہاد کی۔ میں کتنی محبت کرتی ہوں تم سے۔ اس کا اندازہ تمہیں اس وقت ہوگا جب نازو اپنی جان دے دے گی۔ اس کے بعد نازو کے جور و ستم کا گلہ کون کافر کر سکتا تھا۔

موٹے پولیس مین کی لاش کو دیوار کے شگاف سے گزارنا خاصا مشکل کام ثابت ہوا۔ میں اسے اٹھا کے کباڑ خانے میں چارپائیوں کے پیچھے لے گیا اور چند منٹ بعد اس کی وردی میرے جسم پر تھی۔ یہ وردی مجھے ڈھیلی ضرور تھی لیکن اس وقت بھیس بدل کے صف دشمناں میں شامل ہونے کی اس سے بہتر صورت کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کی جیب میں ایک پرس تھا جس میں کچھ نقد رقم تھی اور اس کا شناختی کارڈ تھا۔

غالب نے دوسرے پولیس مین کی لاش بھی وہیں ڈال دی جہاں اس کا ساتھی پڑا ہوا تھا۔ میری ہدایات کے مطابق غالب اس کی وردی بھی اتار لایا۔

"ان کے پاس نہ رائفلیں ہیں اور نہ ریوالور" نازو بولی۔

"اوپر ہی چھوڑ آئے ہوں گے سب کچھ" میں نے کہا "تم اب یہ دوسری وردی پہن لو۔ پھر میرے ساتھ چلو۔"

غالب نے کہا "اب کیا پروگرام ہے تمہارا؟"

میں نے کہا "ہم دونوں اس شگاف سے نکل کے سڑک کی طرف سے گیٹ تک جائیں گے۔ پولیس کی وردی سے محافظ دھوکا کھا جائیں گے اور مارے جائیں گے۔ ان کی مشین گنیں ہمیں مل جائیں گی۔"

نازو نے سر ہلایا اور اندھیرے میں غائب ہو گئی۔

"نازو کے ساتھ میں گیٹ کی طرف سے اندر جاؤں گا" میں نے کہا "گل کے ساتھ تم رہو گے۔ یہاں سے تم جھانک کر ساری کارروائی دیکھتے رہو گے۔ جب میں اور نازو مشین گن کے ساتھ اندر داخل ہو جائیں تو تم بجلی کا مین سوئچ آف کر دینا اور یہیں زینے کے نیچے انتظار کرنا۔ اندھیرا ہوتے ہی کھلبلی مچے گی۔ کوئی فوراً یہاں پہنچے گا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ جنریٹر کیوں نہیں چلا اور الارم کیوں خاموش ہے۔ اگر ایک آدمی ہو تو کوشش کرنا کہ فائر کئے بغیر ہی کام چل جائے۔ دو ہوں تو رسک مت لینا۔ دونوں کو فوراً گولی مار دینا۔"

"فائر ہوتے ہی سامنے والے گولیوں کی بوچھاڑ کر دیں گے۔"

"کرنے دو۔ آخر ان کے پاس کتنا اسلحہ ہوگا؟ اسلحہ ختم ہونے سے پہلے ہی ہم کوشش کریں گے انہیں ختم کرنے کی" میں نے کہا۔

"اندھیرے میں تم نشانہ کیسے لوگے؟"

"نشانہ لے کر تو وہ بھی فائر نہیں کر سکتے" میں نے کہا "ہم سیدھے ادھر ہی آئیں گے گیٹ کھلوانے کے بعد۔ ہو سکتا ہے کہ میں گیٹ پر نازو کو کھڑا کر دوں اور خود تمہارا ساتھ دینے کے لئے آجاؤں۔ پھر ہم اوپر چلیں گے۔"

"نازو گیٹ پر کیا کرے گی؟"

"وہ نہ کسی کو باہر جانے دے گی' نہ باہر سے کسی کو اندر آنے دے گی۔"

غالب نے کہا "پر یہ کام وہ کیسے کرے گی؟"

"اس کے پاس مشین گن ہوگی" میں نے کہا۔

"پھر یہ کام گل کو کرنے دو۔ نازو کو ہمارے ساتھ اوپر جانا چاہئے" غالب نے کہا۔

میں نے اس کی تجویز سے اتفاق کیا "ٹھیک ہے۔ گل... جیسے ہی ہم اندر داخل ہوں' تم دوڑ کر گیٹ پر آجانا۔ اس کے بعد تمہاری ڈیوٹی صرف گیٹ پر رہے گی۔ پھر کچھ بھی ہو جائے تم ہمارے آنے تک وہاں سے ہلو گی نہیں۔"

اندھیرے کی اوٹ سے نکل کے نازو نے کہا "میں تیار ہوں۔"

"چلو پھر نکلو" میں نے کہا اور خود بھی نازو کے ساتھ باہر آگیا۔

... ہم نے دو منزلہ عمارت کی عقبی دیوار کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کیا۔ ہم پہلے ایک فرلانگ تک سیدھے گئے۔ عین دیوار کے سائے میں اندھیرا تھا اور اس طرف سے کسی کی مداخلت کو ناممکن سمجھ لیا گیا تھا چنانچہ نگرانی کرنے والوں کی نظر ہمیں نہیں دیکھ سکتی تھی۔

ایک فرلانگ چلنے کے بعد ہم نے سڑک کا رخ کیا۔ سڑک مزید ایک فرلانگ دور بائیں جانب تھی۔ وہاں سے پھر بائیں ہاتھ گھوم کے ہم اس راستے تک پہنچ گئے جس پر مرکری بلب روشن تھے۔ یہ سیمنٹ کا بنا ہوا تقریباً دس فٹ چوڑا راستہ سیدھا گیٹ تک جا رہا تھا جو سڑک سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ ابھی تک ہم نے ایک ایسے مربع کے تین ضلعے طے کئے تھے جس کا ہر ضلع ایک فرلانگ لمبا تھا۔ چوتھا ضلع طے کرنے کے بعد آدھا میل پورا ہوتا تھا۔ یہ فاصلہ ہم نے تقریباً بیس منٹ میں طے کیا تھا۔

جیسے ہی ہم تاریکی سے نکل کے روشن راستے پر نمودار ہوئے' میں نے جاگنے والے محافظ کو ٹھٹک کر رکتے دیکھا۔ اس نے نیچے جھک کر اپنے ساتھی کو بیدار کیا اور اس سے کچھ کہا۔ اس نے ہماری طرف اشارہ بھی کیا تھا' دوسرا محافظ بڑی پھرتی سے اٹھا اور اپنی مشین گن لے کر کھڑا ہوگیا۔

میں نے نازو سے کہا "جاتے ہی حملہ مت کرنا' چند منٹ ان سے باتیں کروں گا میں۔ تم خاموش رہو تو اچھا ہے۔"

نازو نے سرہلایا "کیا انہیں شک ہوگیا ہے' ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں یہ لوگ ہمیں؟"

میں نے کہا "دیکھنے دو انہیں' ڈرو نہیں۔"

ہم بڑی بے فکری کے ساتھ تھکے تھکے انداز میں قدم اٹھاتے گیٹ کی طرف بڑھتے گئے۔ بالکل ان کے قریب پہنچ کے میں نے سگریٹ نازو کی طرف بڑھائی' اس نے بڑی بے تکلفی سے اور کسی جھجک کے بغیر دو کش لئے۔ ظاہر ہے اس نے دھوئیں کو حلق سے نیچے نہیں اتارا تھا مگر اپنے سگریٹ پینے کے انداز میں مردانگی کا پہلو نمایاں کردیا تھا۔

"کیا بات ہے سنتری بادشاہ؟" ایک محافظ نے محتاط لہجے میں کہا۔

میں نے کہا "بات کیا ہوگی بھیا' اپنی گشت کی ڈیوٹی ادھر ہے۔"

"سڑک کی طرف؟" دوسرے نے کہا۔

"ہاں بھیا' ادھر کریں تو کیا کریں" میں نے کہا "چائے تک نہیں ملی پینے کو۔ سوچا تم سے پوچھ لیں۔"

پہلے محافظ نے مشین گن کو کندھے پر لٹکا لیا۔ اس کی نظریں نازو پر جمی ہوئی تھیں۔

"چائے تو مشکل ہے اس وقت۔"

دوسرے محافظ نے اپنی مشین گن نیچے رکھ کے کہا "اب تم آگئے ہو تو سگریٹ ہی پلا جاؤ۔"

"کیوں نہیں بھیا' یہ لو" میں نے آگے بڑھ کے سگریٹ کا پیکٹ اس کی طرف بڑھایا۔ یہ میرے لئے بہترین موقع تھا۔ اسی وقت پہلے محافظ کو اس کی شامتِ اعمال نازو کی طرف لے گئی۔

"واہ بھئی' کیسا چھوکری ٹائپ معشوق لونڈا بھرتی کیا ہے" س نے بے شرمی سے آنکھ مار کے کہا اور نازو کی طرف بڑھا۔

ادھر ایک محافظ نے مجھ سے سگریٹ لینے کے لئے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا ہی تھا کہ میں نے پیکٹ چھوڑ کے اس کی گردن کو ایک جھٹکے سے اپنی بغل میں دبالیا۔ دوسرا ہاتھ اس کے منہ پر رکھا اور گھما کے تھوڑا سا اوپر اٹھایا تو اس کی گردن کی ہڈی جسم کے بوجھ سے ٹوٹ گئی۔ وہ میری گرفت میں تھوڑا سا تڑپا اور پھر ساکت ہوگیا۔

ایک منٹ سے بھی کم وقفے میں نازو بھی اپنے ہاتھوں کی ہلاکت آفریں مہارت کا مظاہرہ کرچکی تھی۔ اسے معشوق لونڈا

سمجھنے والا بھی آواز نکالے بغیر مرگیا تھا اور ایک بڑے مع انداز میں الٹا پڑا ہوا تھا۔

نازو نے سرگوشی میں کہا "گیٹ کے اندر بھی تو محافظ ہ

میں نے کہا "ہاں' راما راؤ نے یہی بتایا تھا کہ دو گا ہوتے ہیں اور دو اندر۔"

"ان سے دروازہ کیسے کھلوائیں گے ہم؟"

"ہم کہیں گے کہ اوپر ہمارے ساتھی ہیں۔ ان سے پولیس کو بھلا کون روکے گا۔"

"فرض کرو انہوں نے نام پوچھے یا کہا کہ تمہارے سا کو ہم گیٹ پر بلا لیتے ہیں' پھر؟"

"پھر کیا۔۔ گیٹ کھلوانا کوئی ایسا مسئلہ نہیں۔"

نازو نے کہا "اگر گیٹ کھولنے کے بعد انہوں نے ساتھیوں کو غیر موجود پایا تو کیا ہوگا؟ لیکن ہم انہی کے سا کے کسی ہنگامے کے بغیر اندر داخل ہوجائیں۔ ہمیں ایک بھی نہ چلانی پڑے تو کیا یہ بہتر نہ ہوگا؟"

میں نے کہا "بہتر! یہ تو بہترین حل ہے عزیزہ۔ جب باتیں کرنے کا دورہ پڑا ہے یہ تم نے پہلی عقل کی بات کی ہے"

میں ایک محافظ کو اٹھا کے گیٹ سے کچھ دور لے گیا اور ایک نسبتاً تاریک جگہ پر ڈال کے لوٹ آیا۔ یہ جگہ بالکل جڑ میں تھی اور اس پر ایک درخت کا سایہ بھی پڑ رہا دوسرے شخص کو میں دوسری طرف لے گیا۔ نازو کی آسا لئے میں نے خود ہی اس کی وردی بھی اتار لی۔ یہ گہرے نیلے کی وردی تھی۔

"یہ لو" میں نے وردی نازو کے حوالے کرتے ہوئے کہا چلو اس طرف' میں جاتا ہوں دوسری طرف۔"

نازو نے وردی لے کر قدرے تذبذب کے ساتھ کہا

میں نے کہا "یہاں ڈریسنگ روم تو ہے نہیں۔ میری مشرق کی سمت' تم مغرب کی طرف دیکھتی رہنا۔ اصل پر ہی ہوتا ہے اور ہمیں کون ہے یہاں دیکھنے والا۔"

نازو کچھ شرمائی مگر پھر راستے سے اتر کے اندھیرے کے لئے ایک جھاڑی کے پیچھے روپوش ہوگئی۔ میں نے طرف جا کے اطمینان سے پولیس کی وردی اتاری اور وردی پہن لینے کے بعد بھی کافی دیر انتظار کیا۔ پھر ڈرتے پلٹ کے دیکھا تو نازو ڈھیلی وردی میں کارٹون بنی کھڑی ہوئی اس نے ساری پر پولیس کی وردی چڑھائی تھی اور اب دو کی وردی پر ہی یہ نیلی یونیفارم پہن آئی تھی۔ اس کے جسم تلے تین لباس تھے چنانچہ وہ کچھ پھولی ہوئی اور پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے اور ہاتھوں کی نزاکت کی جسم کے پن سے کوئی نسبت نظر نہیں آتی تھی۔

گیٹ کے دوسری طرف بھی شاید ایسی ہی صورت حا ان دو میں سے ایک محافظ جاگ رہا تھا یا شاید دونوں ہی

تھے۔ باہر والوں کی طرح ان کے لئے اپنی آنکھیں کھلی رکھنا اتنا ضروری بھی نہیں تھا۔ اگر کوئی گیٹ بجاتا تو ان کی آنکھ خود ہی کھل جاتی۔ گیٹ توڑ کر کسی کے اندر جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

"کیا اندر والے کوئی رابطہ نہیں رکھتے باہر والوں سے؟" میں نے آہستہ سے کہا "اتنی دیر میں ایک بار بھی نہ کسی نے جھانک کر دیکھا نہ کوئی بات کی۔"

نازو نے سرہلایا "اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ رات کو بلاضرورت کوئی کسی کی خیر خبر نہیں لیتا۔"

"کیا خیال ہے میں گیٹ پر چڑھ کے دیکھوں؟"

"کیا ضرورت ہے اس اقدامِ خودکشی کی" نازو نے کہا۔

لوہے کے آٹھ فٹ چوڑے گیٹ میں ساڑھے پانچ فٹ کی بلندی پر ایک چھوٹی سی کھڑکی بنی ہوئی تھی۔ تقریباً چھ انچ لمبی اور اتنی ہی چوڑی۔ یہ اندر والے محافظوں کے استعمال کے لئے تھی۔ دروازہ کھولنے سے پہلے وہ اس کھڑکی کا شٹر اٹھا کے دیکھ لیتے ہوں گے کہ دروازہ بجانے والا حقِ داخلہ رکھتا ہے یا نہیں۔

نازو کو میں نے اس شٹر سے کافی فاصلے پر کھڑا کیا اور خود دروازہ بجانے لگا۔

"ابے کیا ہے یار" کسی نے بے زاری سے چلا کے کہا۔ "سونے بھی نہیں دیتا۔"

"سالا پھر زیادہ کھا گیا ہوگا۔ ہماری نیند حرام کرنے کے لئے۔"

دوسرے شخص نے میرے اس مفروضے کو درست ثابت کردیا کہ محافظ اندر سوئے پڑے ہوں گے' اس نے میری مشکل بھی آسان کردی۔

"ہائے... ہائے.. بڑا درد ہے پیٹ میں.." میں نے کراہتے ہوئے کہا اور ایک محافظ کی آواز کی نقل اتارنے کی پوری کوشش کی۔

"تیرے لئے تو باہر ہی بنوا دینی چاہئے لیٹرین" پہلے شخص کی آواز دروازے کے قریب سے سنائی دی۔ پھر قفل کھلا اور گیٹ ابھی تھوڑا سا کھلا تھا کہ میں اسے دھکیل کر اندر داخل ہوگیا۔ سامنے آجانے والے شخص کی صورت دیکھے بغیر میں نے اس کے سر پر مشین گن کا دستہ مارا۔ وہ چیخ مار کے وہیں گرگیا۔ دوسرے نے ہاتھ اپنی مشین گن کی طرف بڑھایا ہی تھا کہ میں نے اس پر چھلانگ لگادی۔ اسے چارپائی سے اٹھنے کا موقع بھی نہ ملا۔ میں نے اس کے سر پر بھی مشین گن ماری تو اس نے ایک دلخراش چیخ ماری اور سر پکڑ کے زمین پر گرگیا۔ دونوں پر میں نے پوری قوت سے وار کیا تھا۔ ان کے سر پھٹ گئے تھے۔ نازو نے میرے پیچھے اندر داخل ہوکے پہلے شخص کی گردن پر پاؤں مارا تھا اور اسے ختم کردیا تھا۔

دوسرے کا بھی کام تمام کردیتی لیکن احاطے کے دوسری جانب مندر کی عقبی چھت پر سے کسی نے چلا کے کچھ کہا۔ اسی وقت لائٹ آن ہوگئی۔ میں نازو کا ہاتھ پکڑ کے دوسری طرف بھاگا۔۔ اندھیرے میں سامنے سے گولیوں کی ایک باڑھ آئی لیکن ہم گیٹ سے کافی دور جاچکے تھے۔ اندر والے دونوں محافظوں کی مشین گنیں بھی اب ہمارے پاس تھیں۔ ایک مشین گن نازو نے اٹھالی تھی اور دوسری میں نے۔ یوں اب ہمارے دونوں ہاتھوں میں ایک ایک مشین گن تھی لیکن ہم رکے بغیر جوابی فائرنگ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔

"یہ کیا ہورہا ہے؟" اوپر سے کسی نے چیخ کے کہا "کون کررہا ہے یہ فائرنگ؟"

کسی اور نے کہا "لائٹ کس نے بند کی ہے؟ باہر کی لائٹس تو جل رہی ہیں۔"

"جنریٹر کو دیکھو..." پہلے والے شخص نے گالی دے کر کہا۔

سامنے سے محافظوں نے مشین گن کا دوسرا برسٹ مارا۔ اس کا رخ بھی گیٹ کی طرف تھا۔ سرچ لائٹس آف ہوجانے کے بعد وہ ہماری نقل و حرکت نہیں دیکھ سکتے تھے۔ میں اور نازو اب برآمدے میں دوڑ رہے تھے اور ہمیں ایک قطار میں کھڑے ہوئے سات ٹرکوں کی دیوار کا تحفظ حاصل تھا۔

"وہ ٹرکوں پر فائرنگ نہیں کریں گے" میں نے کہا "تم جا کے ایک مشین گن غالب کو دو۔"

"تم کہاں جارہے ہو؟" نازو نے کہا۔

"میں آتا ہوں" میں نے دو ٹرکوں کے درمیان گھس کے کہا۔

اسس تین فٹ کی گلی میں اگلے پہیوں کے پاس بیٹھ کے میں نے اطمینان سے نشانہ لیا اور مندر کی چھت پر بیٹھے ہوئے محافظوں پر پورا راؤنڈ چلا دیا۔ رات کے سناٹے میں گولیوں کی تڑتڑ کے ساتھ ہی کسی نے چیخ ماری۔ اس ایک چیخ میں دو آوازیں شامل تھیں۔ معلوم نہیں کون زخمی ہوا تھا اور کس حد تک۔ خالی ہوجانے والی مشین گن کو میں نے وہیں چھوڑدیا۔

مجھ پر اوپر کی منزل سے کسی نے ریوالور کی گولی چلائی۔ میں ایک دم پیچھے ہٹا اور ایک جست میں پھر برآمدے کی چھت کے نیچے پہنچ گیا۔ بالائی منزل پر اب کھلبلی مچ گئی تھی۔ بہت سے لوگ ایک دوسرے پر چیخ چلا رہے تھے۔ محافظوں کو گالیاں دے دے کر بلا رہے تھے اور اس ہنگامے کا سبب پوچھ رہے تھے۔ ایک دوسرے کو پکار رہے تھے اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کررہے تھے کہ اب تک جنریٹر کیوں اسٹارٹ نہیں ہوا لیکن کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ معاملہ کیا ہے۔ اوپر سے کوئی شخص اندھادھند فائر کرنے میں مصروف تھا۔

"ابے تیری..." کسی نے گالی دے کر کہا "کس پر گولیاں ضائع کررہا ہے؟"

"وہ... ادھر میں نے خود دیکھا ہے کسی کو استاد... ٹرکوں کے بیچ میں۔"

"استاد کے بچے' کوئی گولی ٹرک میں لگ جائے گی۔"

زینے کی طرف کوئی ریوالور سے فائرنگ کر رہا تھا۔ آوازوں سے میں نے اندازہ کیا کہ گولیاں چلانے والے کم سے کم دو افراد تھے۔ ان دونوں کے ریوالور مختلف "کیلی بر" کے تھے چنانچہ ان کی آوازوں میں بھی فرق تھا۔ ایک آواز کرخت اور بھاری تھی' دوسری تیز۔ ان آوازوں نے رات کے سکوت کو درہم برہم کر دیا تھا اور آشیانوں سے نکل آنے والے پنچھی پُر وحشت انداز میں چکر لگاتے ہوئے چلّانے لگے تھے۔

گودام کے اندر یکلخت قیامت آگئی تھی۔ اپنے حفاظتی انتظامات کو اطمینان بخش سمجھ کے سکون سے اس قلعے کے اندر بے خوف سو جانے والوں کے لئے یہ احساس کسی بھیانک خواب سے کم نہ ہوگا کہ دشمن اندر آ پہنچا ہے۔ ان کے حفاظتی انتظامات دھرے رہ گئے ہیں اور تاریکی میں ہر طرف سے موت کے سفاک سائے ان کی جانب بڑھتے چلے آ رہے ہیں۔ وہ تربیت یافتہ اور تجربہ کار لوگ تھے مگر حملہ اتنا اچانک' شدید اور غیر متوقع تھا کہ وہ بدحواس ہو گئے تھے۔ دشمن کس طرف سے اندر آئے؟ کیسے آئے؟ محافظ انہیں روکنے میں کیوں ناکام رہے؟ انہوں نے کس طرح بجلی کی سپلائی اور بریک ڈاؤن کے متبادل انتظام کو ناکارہ کر دیا اور انہیں خبر تک نہ ہو سکی؟ یہ سب ایسے سوالات تھے جو ان سب کے ذہن میں ہوں گے مگر ان کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ فنا و بقا کی جنگ آدھی رات کے بعد ایک دم شروع ہو گئی تھی' جب وہ اس کے تصور اور امکان سے بے نیاز اپنے خوابوں اور خیالوں کی دنیا آباد کئے بیٹھے تھے یا سو رہے تھے۔ انہیں ذہنی اور جسمانی طور پر تیار ہونے کی مہلت ہی نہیں ملی تھی۔ اس سنگین حقیقت کا اعتراف انہیں ذہنی طور پر مفلوج کر رہا تھا کہ وہ محصور ہو گئے ہیں۔ یہ خوف ان کے اعصاب کو شکست دے رہا تھا کہ وہ خطرناک دشمن جس نے گزشتہ رات چوبیس لاشوں کے انبار لگا دئے تھے' اپنی ساری ہلاکت خیز قوت کے ساتھ ایک طوفان بن کے ان پر ٹوٹ پڑا ہے۔

زینے کی طرف سے مشین گن نے ایک ساتھ کئی فائر کئے۔ ایک ہی موت کی لے میں کئی آوازوں' پُر اذیت چیخوں اور درد بھری کراہوں کا شور مجھ تک پہنچا۔ میں ایک کمرے کے دروازے سے چپک کے کھڑا ہو گیا تھا۔ بھاگتے ہوئے مجھے اندیشہ تھا کہ میں کسی بھی سمت سے آنے والی گولی کا نشانہ بن جاؤں گا۔ آہستہ آہستہ میری آنکھیں تاریکی میں دیکھنے لگی تھیں۔ باہر گیٹ سے سڑک تک جانے والے راستے پر لگی ہوئی مرکری لائٹس کا تھوڑا سا اجالا منعکس ہو کے اندر بھی پہنچ رہا تھا۔

میں نے بائیں جانب دیکھا جہاں اب کوئی کسی پر گولی نہیں چلا رہا تھا اور چلّا کے کہا "غالب!"

غالب کا جواب فوراً آیا "ادھر سب ٹھیک ہے۔"

"تم لوگ کہاں ہو؟"

"ہم اندر ہیں۔ پہلے کمرے میں۔ دروازہ کھول دیا ہے ہم نے" غالب نے کہا۔

"ٹھیک ہے' وہیں رہو ابھی۔"

"تم کیا کر رہے ہو اکیلے؟"

میں نے اندھیرے میں نظر جما کے کہا "میں ابھی..."

میری نظروں نے مندر کی چھت پر سے اتر کے اس طرف آنے والوں کو تاڑ لیا تھا۔ وہ احاطے کی دیوار کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔ وہ اب منظم ہو گئے تھے اور اندھا دھند میں نہیں دوڑ رہے تھے۔ وہ وقفے وقفے سے اٹھ کر فاصلہ ایک جست میں طے کرتے تھے اور پھر لیٹ کر ... ہو جاتے تھے۔ رینگ کر یا جھک کر چلتے ہوئے آہستہ آہستہ گیٹ کی طرف سے چکر لگا کے آ رہے تھے۔ میں نے چاروں کو باری باری اٹھتے اور دوڑ کر گرتے دیکھا۔ شاید مندر کی چھت پر چھ افراد کی چوکی تھی اور ان میں سے دو پہلے ہی مارے جا چکے تھے۔ برآمدے سے نکل کر میں پھر ٹرک کے پیچھے چلا گیا۔ پھر میں نے نشانہ لے کر انتظار کیا۔ وہ جیسے ہی اٹھے میں نے دوسری مشین گن کا راؤنڈ چلا دیا۔ وہ چاروں اٹھتے ہی گولیوں کی زد میں آ گئے۔ ایک ساتھ اچھلے اور چیخ مار کے گرے۔

"ویری گڈ" زینے کی طرف سے غالب نے نعرہ لگایا۔

"ادھر سے اب کوئی خطرہ نہیں رہا" میں نے کہا اور دوسرے دروازے تک چلا گیا۔ میرے اور غالب کے درمیان اب صرف چند فٹ کا فاصلہ حائل رہ گیا تھا۔ اوپر کی منزل پر مکمل خاموشی تھی۔ چیخ پکار اور اندھا دھند فائرنگ ختم ہو گئی تھی۔ تاہم اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط ہوتا کہ اوپر جتنے لوگ تھے سب مارے جا چکے ہیں۔ زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ باقی مورچہ بند ہو کے بیٹھ گئے ہیں اور یہ سب لوگ وہ ہیں جو مضبوط اعصاب کے مالک ہیں اور اتنی ہڑبونگ میں بھی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم نہیں ہوئے۔ یہی لوگ خطرناک بھی تھے جو اب خاموشی سے انتظار کر رہے تھے کہ ہم پیش قدمی کریں۔ وہ ہمیں دھوکا دے کر موقع فراہم کر رہے تھے کہ ہم میدان صاف سمجھتے ہوئے بے خوف ہو کے اوپر جائیں۔ انہیں اپنے شکاری ہونے کا یقین حوصلہ دیتا ہوگا لیکن یہ احساس بھی ضرور ہوگا کہ مقابلے پر اناڑی نہیں ہیں۔ گزشتہ رات کی کارروائی بہت موثر رہی تھی اور جیسا کہ راما راؤ نے بتایا تھا ہماری دہشت ایسی بیٹھی تھی کہ ساری بستی پر خوف و ہراس طاری تھا۔ اس ناقابلِ تسخیر سمجھے جانے والے قلعے پر کامیاب حملے نے یقیناً اس دہشت میں اضافہ کیا ہوگا اور بچ جانے والوں میں ایسے لوگ بھی ہو سکتے تھے جو نفسیاتی طور پر شکست تسلیم کر چکے تھے۔ اگر ہم انہیں موقع دیتے تو وہ ہتھیار ڈالنے کو ترجیح دیتے اور میں نے فیصلہ کیا تھا کہ کارروائی سے پہلے ایک اعلان ضرور کروں گا۔

اچانک میں نے گیٹ کی طرف اوپر سے ایک سایہ سا دیکھا۔ تاریکی میں وہ انسانی ہیولا جھولتا ہوا نظر آیا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ کوئی رسی سے لٹک کر اتر رہا ہے اور گیٹ سے نکل کر فرار ہو جانے کے چکر میں ہے۔

میں نے ریوالور نکال کے نشانہ لیا اور وہیں سے چلّا کے کہا۔ "خبردار' تم میری زد میں ہو۔ وہیں رک جاؤ۔"

وہ چلّانے لگا "بھگوان کے لئے' گولی مت چلانا... میں مر جاؤں گا۔"

میں نے کہا "نیچے اتر کے ہاتھ سر پر رکھو اور آہستہ آہستہ ادھر آ جاؤ۔ میری آنکھیں اندھیرے میں تمہاری ہر حرکت دیکھ رہی ہیں۔"

"میں ویسا ہی کروں گا' جیسا حکم کرو گے... لیکن دیکھو گولی مت مارنا مجھے" اس نے گڑگڑا کے کہا "میں مر جاؤں گا۔"

"میں پھر کہتا ہوں کہ اندھیرے میں تمہاری کھوپڑی کو نشانہ بنانا کوئی مشکل کام نہیں ہے میرے لئے" میں نے کہا "کیا میں گولی مار کے یہ رسی توڑ دوں' جس سے تم لٹکے ہوئے ہو۔"

"نہیں' ایسا ظلم مت کرنا۔ ہڈی پسلی ٹوٹ جائے گی میری" اس نے بلبلا کے کہا۔

"تمہارے پاس ہتھیار ہے تو نیچے پھینک دو" میں نے کہا۔

"پستول... جیب میں ہے' میں نکال نہیں سکتا... نیچے آ کے تمہیں دے دوں گا" وہ تقریباً رو کے بولا "بس گولی مت مارنا مجھے' میں مر جاؤں گا۔"

مجھے اس کی بات پر ہنسی آئی جو اس نے تیسری بار کی تھی لیکن میں نے اس میں اداکاری کے امکانات کو نظر انداز نہیں کیا... یہ ہو سکتا تھا کہ وہ بزدلی کا ڈراما رچا کے مجھے الّو بنانے کی کوشش کر رہا ہو اور جب میں اس کو بے ضرر تسلیم کر لوں تو وہ اپنی چالاکی سے کام لیتے ہوئے میرا کام تمام کر دے۔

میں نے کہا "نیچے اتر کے ہاتھ اوپر نہ کئے تم نے یا گیٹ کی طرف دوڑ لگانے کی کوشش کی تو چھلنی کر دوں گا۔"

وہ نیچے اتر کے ہاتھ اوپر کئے میری طرف بڑھا۔ میں نے ایک لمحے کے لئے اس پر سے نظر نہیں ہٹائی۔ میرے ریوالور کا نشانہ اس کا دل رہا اور میری انگلی ٹرائیگر دبانے کے لئے تیار رہی جب وہ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر رہ گیا تو میں نے اسے غور سے دیکھا اور بھونچکا رہ گیا۔ مجھے شک ہوا کہ شاید اندھیرے میں میری آنکھوں نے اس کی صورت میں آشنائی کے نقوش دیکھ کر دھوکا کھایا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ جس شخص کو خود میں نے اپنے ہاتھ سے گولی ماری تھی وہ پھر میرے سامنے زندہ سلامت آ جائے۔

میں نے کہا "بس... آگے مت آؤ۔ اپنا چہرہ دوسری طرف کر لو۔"

"اچھا۔ اچھا جی۔ مگر مجھے گولی مت مارنا' میں مر جاؤں گا" اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"میرا تو خیال تھا کہ تم مر چکے ہو" میں نے آگے بڑھ کے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا "بالک رام ملہوترہ۔"

"میں' میں تو زندہ ہوں جی... ابھی تک... بھگوان کی کرپا سے" وہ خوشامدانہ انداز میں بولا۔

میں نے اس کے کرتے کی جیب میں سے ریوالور نکال لیا۔ اب چلو میرے ساتھ' یہ فیصلہ تمہیں دیکھ کر دوسرے کریں گے کہ تم زندہ ہو یا مردہ۔ اور اگر تم بالک رام ہو تو کل مارا جانے والا کون تھا؟ بالک رام۔"

"میں بالک رام ہوں جی..."

"اچھا آگے چلو... تم جو بھی ہو" میں نے کہا اور اسے دھکیلا۔ خود اس کے پیچھے ہو گیا۔

جس کمرے میں داخل ہونے کے لئے ہم نے دیوار چاک کی تھی' اب اس کے دروازے کا قفل ٹوٹا پڑا تھا اور دروازے کا ایک پٹ کھلا ہوا تھا۔ دروازے کی طرف غالب ایک مشین گن لئے کھڑا ہوا تھا۔ عقبی راستے کی حفاظت پر گل مامور تھی۔ میں اور نازو اسی راستے سے باہر گئے تھے۔ تیسری طرف جدھر بجلی کا سوئچ بورڈ اور جنریٹر تھا وہاں نازو کا پہرہ تھا۔

"یہ کون ہے؟" غالب نے کہا۔

"یہ دوسرا بچہ ہے" میں نے کہا "سنبھالو اسے۔"

"بالک رام ملہوترہ ثانی" غالب نے حیران ہو کے کہا "یا پہلے بالک رام کا بھوت؟"

"ادھر کی صورتِ حال کیا ہے؟" میں نے نازو کے پاس جا کے باہر کا جائزہ لیا۔ دو افراد جنریٹر کے پاس پڑے ہوئے تھے۔ دو زینوں پر۔

نازو نے ایمرجنسی لائٹ جلائی "یہ دو لائٹ جلانے آئے تھے۔ وہ دونوں بعد میں اترے تھے۔"

میں نے کہا "زینے پر یا آس پاس کوئی چھپ کر تو نہیں بیٹھا ہوا ہے؟"

نازو نے نفی میں سر ہلایا "غالب کا کہنا ہے کہ دو بری طرح زخمی ہوئے تھے لیکن پلٹ کے اوپر بھاگ گئے تھے۔"

"اس کا کچھ اندازہ ہوا کہ اوپر اب کتنے آدمی باقی بچے ہیں؟"

"اندازے لگانے کی کیا ضرورت ہے۔ اس سے پوچھ لو۔ تم زندہ پکڑ لائے ہو" نازو بولی۔

"یہ بھی ٹھیک ہے۔ یہ اوپر سے ہی نازل ہوا تھا۔"

"کیا یہ واقعی بالک رام ہے؟"

میں نے کہا "نام کا پتا نہیں۔ صورت شکل میں اس کی کاربن کاپی ہے۔ چاہو تو اسے اصل سمجھ لو اور جو کل مارا گیا تھا اسے نقل۔"

"ہم شکل جڑواں بھائی۔"

"غالباً۔ ڈبل رول میں کوئی اور بھی ہو سکتا ہے" میں نے کہا۔

"کسی اور کو بالک رام بننے کا فائدہ؟"

"فائدہ بالک رام اپنا دیکھتا ہوگا۔ نواب خسرو جمشید آنجہانی بھی اپنا ہمشکل ضرور رکھتے تھے۔ جہاں خطرہ محسوس کرتے تھے اپنے نقشِ ثانی کو بھیج دیتے تھے۔ مقصد اصل کی حفاظت تھا۔ ضائع ہو تو نقل ضائع ہو' نقل ایک اور بھی بنائی جاسکتی ہے۔"

نازو نے قائل ہو کے کہا "شاید ایسا ہی ہو۔ بالک رام کا کوئی جڑواں بھائی ہوتا تو راماراؤ اس کا ذکر ضرور کرتا۔ اسے سب معلوم تھا۔"

"ہاں۔ اب تم جا کے مین سوئچ آن کردو۔"

"نہ بابا' یہ بجلی کا کھیل میں نہیں کھیلتی" نازو نے کان کو ہاتھ لگا کے کہا۔

"سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر تم ہو کیا چیز!" میں نے شگاف سے باہر جاتے ہوئے کہا "کسی آدمی سے نہیں ڈرتی ہو' خواہ اس کے ہاتھ میں مشین گن ہو یا بم۔ لڑتے وقت موت کو بھول جاتی ہو۔ مگر کاکروچ سے اور بجلی سے ڈرتی ہو۔ بجلی کیا کہتی ہے" میں نے لیور کو اوپر اٹھادیا۔

"بجلی کرنٹ مارتی ہے جناب" نازو نے خفت سے کہا۔

ایک دم اوپر نیچے کی ساری لائٹس جل اٹھیں۔ کمرے میں دو سو واٹ کے دو بلبوں کی خیرہ کن روشنی پھیل گئی۔ اوپر کی منزل پر تھوڑی سی ہلچل پیدا ہوئی۔ شاید گھات میں بیٹھے ہوئے دشمنوں نے جو اَب تک تاریکی سے فائدہ اٹھانے کا سوچ رہے تھے' اب اپنے مورچے بدل لئے تھے۔ پرانے غسل خانوں کی چھت پر لگی ہوئی سرچ لائٹس کے روشن ہوجانے سے احاطے کے اندر کا منظر واضح ہوگیا تھا۔ مندر کی چھت کے عقبی حصے کی چوکی پر اب کوئی نہیں تھا۔ گیٹ کی طرف سے چوڑائی کے رخ پھیلی ہوئی دیوار کے ساتھ چار لاشیں الٹی سیدھی پڑی ہوئی تھیں۔ ان کے خون کے چھینٹے تک دیوار پر صاف نظر آتے تھے۔

اب میں نے گھڑی دیکھی تو رات کے بارہ بج کر چالیس منٹ ہوئے تھے۔ ہم نے ساری کارروائی اپنے پروگرام کے مطابق مکمل کرلی تھی اور باقی مسائل سے نمٹنے کے لئے ہمارے پاس کافی وقت تھا۔

غالب نے اپنے طور پر بالک رام ثانی سے کچھ تفتیش کی تھی۔ اس کے آثار بالک رام کی آنکھ کے نیچے نیل اور ہونٹوں کے کنارے پر خون کے نشان کی صورت میں دیکھے جاسکتے تھے۔

"یہ بالک رام نہیں ہے" غالب نے اعلان کیا۔

میں نے پلٹ کے نازو کی طرف دیکھا "میرا بھی یہی اندازہ تھا۔ تم نے اتنی جلدی تفتیش مکمل کرلی۔"

"اس نے وعدہ معاف گواہ بننے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس کی فراہم کردہ معلومات درست ثابت ہوئیں تو اس کی جاں بخشی کردی جائے گی۔"

"بالکل ٹھیک" میں نے کہا پھر بالک رام ثانی سے مخاطب ہوا "تم نے یہ بہروپ کیوں اختیار کیا تھا؟"

"اپنی مرضی سے نہیں کیا تھا جی' مجبوری کی بات تھی۔ میری شکل کچھ ملتی تھی بالک رام سے۔ اس نے کہا کہ میرے ساتھ رہو۔ جو کام کہوں وہ کرو۔ اگر میرے کام کے آدمی ثابت ہوئے تو اچھا پیسہ دوں گا۔ میں بے روزگار تھا' قربانی کا بکرا بننے کے لئے بھی تیار ہوگیا۔"

"کتنے معاوضے پر تم نے اپنی زندگی رہن رکھی تھی؟"

"پہلے دو ہزار مہینہ طے ہوا تھا' کھانا پینا الگ۔ حادثے کی صورت میں بیوی بچوں کو پچاس ہزار اور موت کی صورت میں ایک لاکھ ملتے۔ بعد میں جب بالک رام نے دیکھا کہ میں بھروسے کا آدمی ہوں تو اس نے پانچ ہزار مہینہ کردیا' حادثے کے دو لاکھ اور موت کے پانچ لاکھ۔"

"حادثہ کبھی پیش نہیں آیا؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "ایسا کوئی حادثہ پیش نہیں آیا کہ میں معذور ہوجاتا۔"

"تمہیں یہ یقین تھا کہ اگر تم مرگئے... تو وہ تمہارے بیوی بچوں کو پانچ لاکھ ضرور دے گا؟" میں نے کہا "تمہاری زندگی اس کے لئے کارآمد تھی۔ اس کا معاوضہ وہ اچھا دے رہا تھا تو اسے بالک رام کی ضرورت یا مجبوری سمجھا جاسکتا تھا۔ مگر تمہارے مرنے کے بعد تمہارے بیوی بچوں پر وہ پانچ لاکھ کیوں لٹاتا۔ ایمان آدمی کا کوئی ایمان ہوتا ہے؟"

اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ نہ اقرار نہ انکار۔ غالباً یہ بات وہ خود بھی سمجھتا تھا مگر وہ پانچ ہزار ماہانہ نقد سے دستبرداری قبول نہیں کرسکتا تھا۔

"تم اس کا کیا کام کرتے تھے؟"

"جہاں وہ خود جاتے ہوئے ڈرتا تھا یا یہ سمجھتا تھا کہ اس کا جانا ضروری نہیں' وہاں مجھے بھیج دیتا تھا۔ میں اس کی بہت اچھی آواز بنالیتا تھا۔ اس کے سارے معاملات کو سمجھتا تھا اور فیصلے کرتا تھا۔ صورت میں جو معمولی سا فرق تھا وہ اس نے بمبئی لے جا کے دور کرادیا تھا۔"

"اس نے ناجائز فائدہ بھی اٹھایا ہوگا تمہارے تعاون سے۔"

وہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر اس نے تسلیم کیا کہ متعدد بار ہوا تھا۔ پہلی بار بالک رام نے اپنی کوٹھی میں دعوت کا انتظام کیا۔ اس میں علاقے کے سب معزز لوگ' پولیس افسر اور مجسٹریٹ وغیرہ موجود تھے۔ میزبانی کے فرائض نقلی بالک رام نے سرانجام دئیے۔ اصل بالک رام اپنے کمرے میں سوتا رہا اور نہ جانے کس وقت پیچھے سے نکل کے اپنی بیوی کے میکے جا پہنچا۔ اس کی دوسری بیوی بہت نقد اور زیور لے کر ماں باپ کے گھر جا بیٹھی تھی اور غالباً اسے بلیک میل بھی کررہی تھی۔ بالک رام نے بیوی کے متعلق کسی سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ دعوت والی رات اس نے اطمینان سے بیوی کو' ایک سالی کو اور اس کے ماں باپ کو قتل کیا۔ اپنا سب نقد اور زیور اٹھایا اور واپس آ کے کمرے میں سوگیا۔ قتل کے چشم دید گواہ اس نے مار دئیے تھے مگر بہت سے لوگوں نے اسے بیوہ کے میکے جاتے دیکھا تھا۔ وہ سب جھوٹے ٹھہرے اور پولیس نے ان کی دروغ گوئی پر انہیں سرکاری مہمان بنا کے خوب خاطر تواضع کی۔ بالک رام ملوث تو اس رات تمام وقت مہمانوں کے درمیان موجود رہا تھا اور وہ سب بڑے معتبر لوگ تھے جو پورے یقین کے ساتھ یہ بات تسلیم کرتے تھے۔

"ایسے تو بہت سے واقعات ہیں جی" وہ بولا۔

میں نے کہا "ایک مثال کافی ہے۔ ایک آخری بات یہ بتاؤ۔ تمہیں کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ تم بالک رام بن سکتے ہو۔ اصلی بالک رام کے وجود کو ختم کرکے؟"

اس نے پھر قدرے تذبذب کے بعد اقرار کیا کہ ایسا خیال اس کے دماغ میں اکثر آتا تھا۔ مگر یہ بات خود اصل بالک رام بھی سمجھتا تھا چنانچہ وہ اپنی حفاظت کے خیال سے کبھی غافل نہیں ہوتا تھا۔ تاہم یہ اس کی بزدلی تھی ورنہ مواقع تو مل ہی جاتے۔ وہ سب کچھ کرسکتا تھا مگر کسی کا خون نہیں کرسکتا تھا اور یہ بات اس نے بالک رام کو پہلے ہی بتادی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ قتل کرنے کے لئے وہ خود جاتا تھا۔

"ایک فائدہ ایسا تھا جو میں نے اٹھایا اور بالک رام کو خبر نہ ہوئی" اس نے مسکرانے کی کوشش کی "اور اسے کیسے خبر ہوسکتی تھی جب اس کی کسی دھرم پتنی کو نہیں ہوئی۔"

"یہ ناممکن ہے۔ کہ بیوی اصل اور نقل میں فرق محسوس نہ کرسکے۔"

"پھر وہ خود ہی خاموش رہی ہوں گی جی... اس سے خوش کون تھی جو خود کبھی کسی کا نہیں ہوا۔ بیوی تو پاؤں کی جوتی کی طرح بدل لیتا تھا۔ دوسری عورتیں الگ آتی جاتی رہتی تھیں۔"

میں نے کہا "لعنت بھیجو اس پر' اب یہ بتاؤ کہ اوپر کتنے لوگ ہیں؟"

"مجھے... نہیں معلوم جی' میں تو کل رات جان بچا کے بھاگا تھا اور یہاں آ کے چھپ گیا تھا۔ بالک رام جی ہمیشہ اس کمرے میں ٹھہرتے تھے۔ یہ ان کا اپنا کمرا تھا۔ میں اس کمرے سے باہر نکلا بھی نہیں تھا۔ ابھی نکلا تھا جی پھر جان بچانے کے لئے تو آپ نے جانے نہیں دیا۔"

میں نے دھمکی کے انداز میں کہا "تم کو یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ سچ کو چھپانا اور جھوٹ بولنا برابر ہوتا ہے۔ اس طرح تم خود کو ہر رعایت سے محروم کرلوگے۔"

"میں بھگوان کی سوگند کھا کر کہتا ہوں جی..."

"بھگوان کو بیچ میں مت لاؤ" میں نے کہا "جو کہنا ہے اپنی ذمہ داری پر کہو۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ داؤ پر تمہاری زندگی ہے۔"

"اگر تم بالک رام بن کے ٹھہرے ہوئے تھے۔ تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ تمہیں اوپر کے ہر کمرے میں موجود ہر شخص کے بارے میں معلوم نہ ہو۔ تم بالک رام ہو اس جگہ کے۔"

اچانک مجھے ایک اور خیال آیا "اگر تم بالک رام ہو۔ تو ایک بالک رام کی موت کو کیسے تسلیم کرلیا گیا ہے۔ اس کی لاش مل چکی ہے۔"

"یہی تو گڑبڑ ہوگئی تھی۔ اگر اس کی لاش غائب ہوجاتی تو میرے لئے کوئی مشکل نہ ہوتی۔ میں بالک رام بن جاتا جی۔ مگر رات کو جب میں بھاگ کے آیا تھا تو یہاں کسی کو شک نہیں ہوا تھا۔ میں بالک رام کے کمرے میں گھس کے بیٹھ گیا تھا۔ صبح اس کی لاش ملنے کے بعد یہ لوگ آ کے مجھے مارنے لگے۔"

"کون لوگ؟"

"ایک تو استاد پیڈرو ہے' کالا بھجنگ..."

"ہم جانتے ہیں اسے۔"

"اسی نے سب سے زیادہ مارا مجھے' کہنے لگا "بدمعاش' تم کون ہو جو بالک رام بنے ہوئے ہو؟ بالک رام تو مارا گیا رات کو۔ مجبوراً مجھے سب کچھ بتانا پڑا۔"

"استاد پیڈرو کے علاوہ کون آیا تھا؟"

"ایک بمبئی کا سیٹھ تریونی تھا۔ اس کے ساتھ ایک پولیس افسر تھا۔ اس نے کہا کہ ابھی اسے بند رکھو' باہر مت نکلنے دو۔ بعد میں اس سے اچھی طرح پوچھیں گے کہ بالک رام کب سے بے وقوف بنارہا تھا ہم سب کو' انہوں نے بالک رام کو بہت گالیاں دیں جو ڈبل رول سے دنیا کے ساتھ ان کی آنکھوں میں بھی دھول جھونکتا رہا۔"

"بس یہی تین آدمی تھے؟"

"دو تین آدمی بالک رام کے بھی تھے۔ وہ اوپر ہی ہوں گے۔ اس کے بعد میں ان کا قیدی بن گیا تھا۔ مجھے باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ باہر سے کنڈی لگی ہوئی تھی۔ کسی نے کھانے پینے کو بھی نہیں پوچھا مجھ سے۔ اس وقت بھگدڑ مچی تو شاید کسی نے غلطی سے کنڈی کھول دی۔ پھر مجھے ایک رسی مل گئی اور میں... موقع پا کے نکل آیا۔ زینے کی طرف سے جاتا تو سارے کمروں کے سامنے سے گزرنا پڑتا۔ اور زینہ تھا بھی گیٹ سے دور۔ معلوم نہیں نصیب میں کیا ہے۔ کل جان بچا کے نکلا تو یہاں پھنس گیا۔ آج آپ نے پکڑلیا۔"

"جیسا کھیل تم کھیل رہے تھے جی' اس میں ایسا تو ہوسکتا تھا جی" میں نے اس کی نقل اتار کے کہا۔

نازو نے کہا "کیا خیال ہے۔ اوپر چلیں؟"

میں نے کہا "جلدی کی ضرورت نہیں' وہ لوگ ہماری قید میں ہیں۔ ہم ان کی قید میں نہیں ہیں۔"

"فائرنگ کی آوازیں بستی میں بھی سنی گئی ہوں گی" گل بولی۔

"بستی والے محاصرہ کرنے کے لئے نہیں آئیں گے۔ جو مارے گئے ابھی ان کا کریا کرم بھی نہیں ہوا اور کسی کو کل سب کے ساتھ چتا میں جلنے کا شوق نہیں ہوگا۔ اپنے دروازے ہی نہیں کان بھی بند کرلئے ہوں گے سب نے۔ اپنی جان سب

بیداری ہوتی ہے۔گشت پر مامور پولیس والے بھی غائب ہو چکے ہوں گے۔ صبح تک کوئی مخل نہیں ہوگا ہماری کارروائی میں"
میرے بجائے غالب نے جواب دیا اور خواتین کو خاموش کردیا جو اوپر جاکے رابعہ اور محسن سے ملنے کے لئے زیادہ بے قرار تھیں۔
میں نے کہا "جتنی معلومات ہمیں حاصل ہوں گی ہماری منصوبہ بندی اتنی ہی بہتر ہوگی اور اتنے ہی کامیابی کے امکانات روشن ہوں گے۔"
"ہم کیا کریں؟ تم تو تفتیش میں مصروف ہو" نازو نے کہا۔
"تم بھی بے کار نہیں بیٹھی ہو' تمہارا کام زیادہ اہم ہے۔ یہ نہ ہو ادھر ہم بالک رام نمبر دو سے پوچھ گچھ کرتے رہ جائیں' ادھر کسی سمت سے اچانک دشمن حملہ کردے۔"
غالب نے کہا "اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھو۔ صرف زبان بند رکھو۔"
میں نے کہا "یہ مشکل ہے' آج اسے دورہ پڑا ہے باتیں کرنے کا۔"
نازو نے کہا "باتیں کس سے کروں؟ دیواروں سے' یا ان لاشوں سے جو سامنے پڑی مجھے گھور رہی ہیں۔ گل بھی تو اتنی دور بیٹھی ہے دوسری طرف منہ کئے۔"
غالب نے کہا "دورہ شدید ہے تو میرے تصور سے باتیں کرو اور وہ سب کہہ ڈالو جو آج تک شرم کی وجہ سے خود سنسر کرتی رہی ہو۔"
"ایسی بے شرمی کی باتیں تمہیں ہی سوجھتی ہوں گی" نازو نے کہا۔
"کیسی بے شرمی کی باتیں۔ میں نے کب کہا ہے کہ وہ بے شرمی کی باتیں ہوں گی" غالب ہنسنے لگا "اسے کہتے ہیں' چور کی داڑھی میں تنکا۔"
میں پھر اپنے قیدی کی طرف متوجہ ہوگیا "تم بالک رام نہیں ہو مگر ہم تمہارے لئے یہی نام استعمال کریں گے۔ ذرا سوچ کے بتاؤ' اس سوال کے جواب پر تمہاری زندگی کا انحصار ہے۔ جواب غلط مت دینا۔ کیا اوپر کسی کمرے میں کوئی قید ہے؟"
"میں نے سنا تھا جی' کل ایک مرد اور عورت پکڑے گئے تھے۔ انہوں نے بجلی گھر میں گھس کے بجلی بند کی تھی۔"
"تم نے انہیں دیکھا نہیں؟"
"نہیں۔ میں بتا چکا ہوں جی کہ پہلے میں کمرے سے نہیں نکلا تھا۔ پھر مجھے نکلنے نہیں دیا گیا تھا" بالک رام بولا۔
"کیا وہ اس وقت بھی اوپر موجود ہوں گے؟" میں نے کہا۔
غالب نے کہا "اور اگر موجود ہیں تو کس کمرے میں۔"
"میں کیا بتاؤں جی' کل رات تو تھے۔ آج دن بھر کی مجھے کوئی خبر نہیں کہ کون آیا کون گیا" وہ بولا۔
مجھے اس کی بات میں جھوٹ محسوس نہیں ہو رہا تھا "ان دونوں کے علاوہ یہاں کوئی قیدی نہیں تھا۔ پہلے سے؟"
بالک رام نے نفی میں سر ہلایا۔
میں نے کہا "اچھی طرح سوچ لو۔ ایک عورت کے کسی بچے کو دیکھا تھا تم نے؟"
"عورت اور بچہ!"
میں نے شہلا کا حلیہ بتایا "وہ ان میں سے کسی ٹرک [illegible] لائے گئے تھے۔"
"کب لائے گئے تھے؟"
"یہ ٹرک کب پہنچے تھے' تم جانتے ہو؟" میں نے [illegible] اس کے منہ پر الٹے ہاتھ کا جھانپڑ مارا اور ریوالور کا رخ [illegible] طرف کردیا۔
وہ نیچے گرا اور بلبلانے لگا "بھگوان کے لئے مجھے [illegible] مارو۔ میں مر جاؤں گا۔"
"تو پھر جو تم سے پوچھا ہے اس کا جواب دو۔"
"یہ ٹرک میرے سامنے نہیں آئے' میں ایک ہفتہ باہر تھا۔ پرسوں ہی بمبئی سے واپس لوٹا تھا۔ مجھے نہیں معلوم"
"بمبئی کس کام سے گئے تھے؟"
"سیٹھ تریویدی سے مال کی بات کرنے کے لئے اور [illegible] وصول کرنے کے لئے۔"
میں نے کہا "کیا مال لانا تھا وہاں سے؟"
"وہی جو ہمیشہ آتا تھا' اسمگلنگ کا مال۔" وہ بولا۔
میں نے کہا "ان ٹرکوں میں وہی مال آیا ہوگا۔ شراب [illegible] خوشبو سگریٹ۔"
"ہاں جی' بدیسی مال ہی اسمگل ہوتا ہے۔"
"اس کے علاوہ کچھ نہیں؟" غالب نے کہا۔
میں نے کہا "ہمیں معلوم ہے اس کھیپ میں کیا کچھ آیا [illegible] اور ہم دیکھ بھی لیں گے۔ تمہیں دکھا بھی دیں گے۔ جھوٹ [illegible] رہے ہو تو ابھی وقت ہے۔ ہم سچ بولنے کے لئے ایک موقع [illegible] سکتے ہیں۔"
اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا "کچھ... گولہ بارود۔ بم [illegible] بھی ہیں۔"
میں نے اس کے منہ پر ایک مکا رسید کیا "تم جانتے [illegible] تھے اسے کیوں چھپا رہے تھے؟"
وہ پیچھے کی طرف گرا اور پھر بڑی مشکل سے کھڑا ہوا [illegible] کے جبڑوں سے خون رسنے لگا تھا۔ "مجھے ٹھیک سے معلوم [illegible] تھا۔ میں نے صرف سنا تھا۔ دیکھا کچھ نہیں تھا۔ سنی سنائی [illegible] کیا بھروسہ۔ میں پورے یقین کے ساتھ ایک بات کہتا اور [illegible] میں غلط ثابت ہوتی" وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔
"کیا اس سے پہلے کبھی تم نے اسلحہ آتے نہیں دیکھا [illegible]"
"نہیں' میں سوگند کھا سکتا ہوں کہ پہلے ایسی کوئی چیز [illegible] آتی تھی۔ جو مال آتا رہا اس کے متعلق مجھے پہلے ہی معلوم [illegible] تھا۔ مجھے یہ بھی بتا دیا جاتا تھا کہ کتنا مال کہاں جائے گا۔ [illegible] مجسٹریٹ اور عدالت کے پیش کار۔ پولیس افسر اور خاص خاص لوگوں کے لئے تحفے میں ہی لے کر جاتا تھا۔ صاحب لوگوں کے لئے ولایتی شراب' ان کی بیویوں کے لئے خوشبو اور بچوں کے لئے کھلونے وغیرہ۔ اس مرتبہ بالک رام نے مجھے کچھ نہیں بتایا تھا۔ تریویدی کے پاس صرف یہ معلوم کرنے کے لئے بھیجا تھا کہ مال کب پہنچے گا۔ مال کی تفصیل سے مجھے بے خبر رکھا تھا۔ اور جب اس مرتبہ مال آیا تو وہ خود یہاں موجود تھا۔ ورنہ وہ مجھے بھیج دیتا تھا۔ اس نے مجھ سے یہ بھی کہا تھا کہ اس بار معاملہ خطرناک ہے چنانچہ میں گودام کی طرف نہ جاؤں۔"
"تم نے پھر اسلحے کی بات کس سے سنی؟"
"کل رات یہاں پہنچنے کے بعد' استاد پیڈرو نے اور دوسرے سب لوگوں نے مجھے بالک رام سمجھ کے بات کی اور کہا کہ معاملہ بہت گڑبڑ ہوگیا ہے۔ انہوں نے گالی دے کر کہا تھا کہ سکندر اور اس کے ساتھی یہاں بھی پہنچ گئے ہیں اور انہوں نے ہی یہ سب قتل و غارت گری کی ہے۔ کیا تم سکندر ہو؟"
سوال اتنا اچانک کیا گیا تھا کہ میں چونکے بغیر نہ رہ سکا "نہیں میں سکندر نہیں ہوں' اس کے ماتحتوں کا ماتحت ہوں' وہ بہت اونچی چیز ہے۔"
غالب نے معنی خیز طریقے پر کھنکار کے کہا "بالکل ہمالیہ پہاڑ سمجھ لو۔"
نازو نے کہا "بلکہ ہمالیہ پہاڑ کی سب سے بلند چوٹی پر کھڑا ہوا سمجھ لو' اس سے اونچی کیا چیز ہوگی۔"
میں نے بڑی مشکل سے بات بنائی "مطلب یہ کہ وہ ایسے چھوٹے چھوٹے کام خود نہیں کرتا۔ خیر تم بتاؤ اور استاد پیڈرو نے کیا کہا تھا؟"
"اس نے کہا تھا کہ جب تک وہ پکڑے نہیں جاتے یا ان کے بارے میں یہ معلوم نہیں ہو جاتا کہ وہ اس علاقے سے نکل گئے ہیں' ہم آگے اسلحہ روانہ کرنے کا رسک نہیں لیں گے۔ وہ راستے میں بھی حملہ کرسکتے ہیں۔ اس پر تریویدی نے کہا تھا کہ حملہ وہ کیسے کرسکتے ہیں۔ ہمارا انتظام پکا ہے۔ وہ اپنا زیادہ نقصان کریں گے۔ ناقابل تلافی نقصان۔ بہادر آدمی کتنا بھی بہادر کیوں نہ ہو اتنا بے وقوف بہرحال نہیں ہوتا۔"
میں نے کہا "اس پکے انتظام کے بارے میں انہوں نے کچھ نہیں بتایا تھا؟"
"نہیں' وہ جلدی میں تھا۔ اسے پولیس کے کسی بڑے افسر کا دماغ درست کرانے کے لئے کسی وزیر سے فون کرانا تھا۔ مہاراشٹر کے چیف منسٹر کا خاص آدمی ہے وہ۔ وہ اس سارے علاقے کی ناکابندی کرانا چاہتا تھا۔ جو پولیس افسران کے ساتھ تھا اس نے کہا تھا کہ مجھے نفری مل جائے تو میں اس علاقے کا چپہ چپہ چھان ماروں۔ وہ اگر چیونٹی بن کے بل میں گھس جائیں تب بھی انہیں ڈھونڈ نکالوں۔ اسے یقین تھا کہ تم لوگ پانچ سات میل کے اندر ہی آس پاس کہیں موجود ہو۔ ان کی باتوں سے ہی میں نے اندازہ کیا تھا کہ اس مرتبہ اسلحہ آیا ہے۔"
میں نے اس صورتِ حال پر کچھ دیر غور کرنے کے بعد جرح ملتوی کی اور غالب سے مشورہ کرنے کے لئے اسے الگ لے گیا۔ نقلی بالک رام کو میں نے دیوار کی طرف منہ کرکے کھڑا ہو جانے کا حکم دیا اور اسے بتا دیا کہ میرے ریوالور کی گولی سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے' وہ بے حس و حرکت کھڑا رہے۔
"اب کیا خیال ہے۔ پہلے کیا کرنا چاہئے' اوپر جاکے باقی سب کو بھی ٹھکانے لگا دینا چاہئے یا ٹرکوں اور گوداموں کو دیکھ لینا چاہئے۔"
غالب نے کہا "نیچے کا کام پہلے ختم کرلینا بہتر ہے۔ یہ معلوم تو ہو کہ اسلحہ کیا ہے اور کتنا ہے۔ ہمیں اپنے مطلب کی کوئی چیز مل جائے۔ مثلاً ٹائم بم یا مشین گن کے راؤنڈ' کوئی شیشے کا تابوت نظر آجائے۔"
میں نے نفی میں سر ہلایا "یار وہ سب دلاور کا ڈراما تھا۔ وہ شہلا کو ایسے ہی اپنے ساتھ لے آئے ہوں گے۔ اس وقت مجھے اور رابعہ کو دہشت زدہ کرنے کے لئے شہلا کو تابوت میں دکھایا تھا... تابوت اتنا نازک تھا کہ اسے وہ اٹھا کے نہیں پھر سکتے۔ شہلا اول تو ویسے ہی خاموش رہنے پر راضی ہوگئی ہوگی اور اس نے اپنے بیٹے کو بھی چپ رکھا ہوگا۔ شور مچانے سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ اسے بے ہوش کرکے یا باندھ کے ڈال دیتے۔"
"ہم اوپر کیسے جائیں گے یار؟ رابعہ' محسن اور شہلا نہ ہوتے تو کوئی مسئلہ ہی نہ تھا۔ ہم اپنا اکلوتا دستی بم پھینک کے سب کا ملبہ کردیتے لیکن سب کے ساتھ تو وہ بھی ہیں" غالب نے کہا "ہماری کارروائی سے انہیں بھی نقصان پہنچ سکتا ہے۔"
"اس مسئلے کا کوئی حل تو نکالنا ہی پڑے گا" میں نے کہا۔
"کیوں نہ ہم بالک رام کو ڈھال بنالیں۔"
میں نے کہا "اس کا کوئی فائدہ نہیں' ان کے نزدیک یہ نقلی بالک رام ایک بے وقعت چیز ہے جسے وہ خود ضائع کرنا چاہیں گے... اگر وہ کسی کی غلطی کے نتیجے میں فرار نہ ہوتا تو انہی کے ہاتھوں مارا جاتا۔ اس کا ہماری تحویل میں رہنا دشمنوں کے لئے باعث تشویش بن جائے گا۔ اسے وہ پہلے گولی ماریں گے کہ کہیں ہم اس سے وہ سب باتیں نہ اگلوالیں جو ان کے نقطہ نظر سے اہم ہیں اور ہمیں معلوم نہیں ہونی چاہئیں۔"
"چل ٹھیک ہے' ہم اس وعدہ معاف گواہ کو فی الحال زندہ رکھنے کے لئے نیچے ہی چھوڑ جائیں گے۔"
"یہ تو ابھی اور بہت کچھ بتائے گا۔"
"ٹرکوں کی تلاشی ہم سب کو مل کر لینی چاہئے۔ یہ سات ٹرک ہیں" میں نے کہا۔

"ہم گل کو یہاں چھوڑ دیتے ہیں' بچے کو سنبھالے" غالب نے اونچی آواز میں کہا "اگر ہم ایک ایک ٹرک دیکھیں گے تو ایک ہی وقت میں تین ٹرک دیکھ لیں گے۔"

گل نے اپنا نام سن کے سر گھمایا "میں بہت تھک گئی ہوں ایسے بیٹھے بیٹھے۔"

میں نے کہا "اچھا ادھر آجاؤ' بچے سے دل بہلاؤ۔"

غالب نے نازو کو بلالیا "تمہاری ناقص عقل کیا کہتی ہے بیچ اس مسئلے کے؟"

نازو نے ہماری باتیں سنی تھیں کیونکہ ہم اس کے بہت قریب کھڑے ہوئے تھے۔ اس نے کہا "ایسے منہ اٹھا کے ٹرک میں چڑھو گے تو وہ اوپر سے گولی ماردیں گے۔"

"نہیں" میں نے کہا "بارود کے ڈھیر میں چنگاری پھینکنے کی حماقت کوئی نہیں کرے گا۔ ایک ٹرک کو صرف ایک گولی اڑادے گی۔ اس ایک دھماکے سے باقی اسلحے کا ذخیرہ بھی تباہ ہوگا اور اس کے بعد کچھ بھی نہیں بچے گا۔ نہ یہ جگہ اور نہ وہ جو ابھی تک اس لئے مورچہ بند ہیں کہ انہیں اپنی شکست منظور نہیں۔ انہیں یقین ہے کہ وہ ہمیں روک سکتے ہیں اور اس وقت تک ہمارا مقابلہ کرسکتے ہیں جب تک کہ باہر سے ان کے مددگار نہ آجائیں۔ ابھی وہ محصور ہیں لیکن انہیں امید ہے کہ بالآخر ہم محصور ہوجائیں گے اور ہتھیار ڈال دیں گے۔"

"اسی لئے انہوں نے ٹرک کی سمت میں ابھی تک فائر کرنے سے گریز کیا ہے" غالب نے کہا۔

"ایک گولی نہیں چلائی مجھ پر۔ حالانکہ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ میں ٹرکوں کے بیچ میں سے فائر کررہا ہوں۔ یا برآمدے میں موجود ہوں۔ یہ ٹرک نہ ہوتے تو ایک برسٹ مار کے وہ میرا خاتمہ کردیتے" میں نے کہا۔

نازو نے کہا "اتنی دیر سے ہم خاموش ہیں۔ کہیں دشمن یہ نہ سمجھ رہا ہو کہ ہم جتنا نقصان کرسکتے تھے ایک حملے میں کرگئے اور جان بچا کے نکل گئے۔"

"اچھا ہے اگر ایسی غلط فہمی کا شکار ہوکے وہ اپنے مورچے سے نکل آئیں" غالب نے کہا "لیکن بے وقوف وہ ہوتا ہے جو دشمن کو بے وقوف سمجھے۔ ہمارے یہ دشمن نہ ہمیں کمزور سمجھتے ہیں اور نہ بے وقوف۔"

میں نے کہا "وہ صبح تک دم سادھے بیٹھے رہیں گے۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ ہماری خاموشی بھی کوئی چال ہے۔ ان کی دلی خواہش ہوگی کہ ہم بھی رات بھر ایسے ہی بیٹھے رہیں اور صبح ہوجائے کسی طرح۔"

غالب نے کہا "اب یہ عقل سے کام لینے کی اور صبر و ضبط کے حوصلے کی آزمائش ہے۔ جو گھبرا کے یا خوش فہمی کا شکار ہوکے پہلے اپنی کمین گاہ سے نکلے گا وہی مارا جائے گا۔"

"اپنی موجودگی کا ثبوت ہم ابھی فراہم کردیتے ہیں" مسکراتے ہوئے کہا۔

"تشریف لایئے خاتون" غالب نے کہا۔

"جی نہیں حضور' پہلے آپ۔"

"لیڈیز فرسٹ' میں ایک مہذب آدمی ہوں" غالب نے...

میں نے برآمدے میں آکے ریوالور سے سرچ لائٹ کا نشانہ لیا جو پرانے غسلخانے کی چھت پر میرے بالکل سامنے نصب نظر آرہی تھیں۔ فائر کی آواز کے ساتھ ہی معمولی چھناکا ہوا اور ایک سرچ لائٹ اندھی ہوگئی۔ ابھی میں نے دوسری کا نشانہ ہی لیا تھا کہ غالب نے فائر کردیا۔ اس کا نشانہ بڑے سے غیر معمولی اور ہم سب کے نشانے سے بہتر تھا۔ دوسری سرچ لائٹ بھی گل ہوگئی اور احاطے میں اندھیرا پھیل گیا۔

میں برآمدے میں چلتا ہوا دوسرے اور پھر تیسرے ہال کے دروازے تک گیا۔ ایک ایک گولی سے میں نے قفل توڑے اور ہم نے لائٹ جلا کے ہر گودام کا جائزہ لیا۔ ہر ہال میں سامنے کی طرف گندم اور چاول کی بوریوں کی دیوار تھی۔ اس دیوار کے پیچھے اسلحے کے بکس تھے۔ لکڑی کے ان صندوقوں کو بھی صابن' ٹوتھ پیسٹ چائے' ٹالکم پاؤڈر کے ڈبے اور گھٹیا قسم کی ہوئی کریم وغیرہ سے بھردیا گیا تھا۔ اسلحہ نیچے تھا۔ ہمارے لئے سب بکس کھول کر دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ جو چند بکس ہم نے دیکھے ان میں وہی پرانا اسلحہ تھا جو ہم پہلے کئی جگہ دیکھ چکے تھے۔ ملکی اور غیر ملکی ساخت کے پستول اور ریوالور' ان کی گولیاں' ملکی ساخت کے دستی بم جن پر غیر ملکی نشانات بنائے گئے تھے تاکہ ان کی زیادہ قیمت وصول ہوسکے۔ رائفلیں' مشین گنیں اور ان کے راؤنڈ۔

"کیا ٹائم بم نہیں ہیں اس کھیپ میں" غالب نے مایوسی سے کہا۔

"ہوں گے کسی کریٹ میں۔ سب تو نہیں کھولے ہم نے" میں نے کہا۔

"یہ تو بہت زیادہ اسلحہ ہے یار" غالب نے کہا "اس کے علاوہ ٹرک لدے کھڑے ہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ ٹرکوں پر سے مال اتار لیا گیا ہے" نازو نے کہا۔

"یہ بے سروپا خیال آخر تمہارے ہی دماغ میں کیوں آتا ہے؟" غالب نے کہا "کبھی ہمیں بھی موقع دیا کرو کوئی احمقانہ بات کرنے کا۔"

"اچھا میں اب نہیں بولوں گی" نازو نے برا مان کے کہا "پتا نہیں خود کو کیا سمجھتے ہو۔ دنیا کے سب سے بڑے احمق تم خود۔"

"اس میں کیا شک ہے۔ جو تم جیسی مصیبت کو گلے لگا کے بھی خوش ہو وہ اور کیا کہلائے گا" غالب نے کہا۔

معلوم نہیں نازو نے اسے کیا سمجھا۔ اعتراف محبت' تعریف یا تنقیص۔ میں نے اسے کچھ اور کہنے نہیں سنا۔ گودام سے باہر نکل کے میں نے پہلے ٹرک میں چڑھنے کا ارادہ کیا۔ اس کا پچھلا حصہ برآمدے سے لگا ہوا تھا لیکن اسے ترپال سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ پیچھے سے ترپال کے کناروں پر لگے ہوئے پیتل کے چھلوں میں سے ایک ہی رسی اس طرح گزاری گئی تھی جیسے ٹانکے لگا کے ترپال کو ٹرک کے ساتھ سی دیا گیا ہے۔

اس رسی کو کھولتے ہوئے میری نگاہ اوپر دیکھتی رہی اور میرے ہاتھوں کی انگلیاں اپنا کام کرتی رہیں۔ دوسرے ٹرک کا پردہ غالب ہٹا رہا تھا اور تیسرے ٹرک کے پاس نازو تھی۔ اگر اوپر سے کوئی ہمیں نشانہ بنانا چاہتا تو اس موقع سے پورا فائدہ اٹھا سکتا تھا جب ہمارے ہاتھ خالی تھے اور ہماری توجہ بھی بٹی ہوئی تھی۔ شاید فائرنگ کے بعد دشمن کی باقی ماندہ سپاہ نے باہر نکلنے اور ہماری موجودگی کے بارے میں اپنے شکوک رفع کرنے کے سارے منصوبے ختم کردئے تھے۔

ٹرک میں داخل ہونے سے پہلے میں بھی کسی حد تک نازو کے اس خیال سے متفق ہونے لگا جسے غالب نے احمقانہ قرار دیا تھا مگر جو بات صرف نازو کو چھیڑنے کے لئے کی گئی تھی وہ درست ثابت ہوئی۔ ٹرک میں نیچے سے اوپر تک وہ کریٹ بھرے ہوئے تھے جو عموماً پھل وغیرہ کی نقل و حمل میں استعمال ہوتے ہیں۔ میں نے اوپر چڑھ کے ایک کریٹ کھولا تو اس میں آلو نظر آئے۔ میں نے اندر ہاتھ ڈال کے دیکھا اور پھر کریٹ الٹ دیا لیکن اس میں صرف آلو تھے۔ دوسری لائن کے کریٹ میں بھی آلو تھے۔ اس کے نیچے والے میں پیاز تھے۔ ظاہر ہے یہ اصل مال کو چھپانے کی تدبیر تھی۔ آلو اور پیاز ضائع ہونے والی چیز نہیں تھے۔ ٹرک اگر ہفتہ بھر بھی یہاں کھڑا رہتا تو کوئی حرج واقع نہ ہوتا۔ بیشتر سبزیاں پھل اور انڈے خراب ہوکے سڑ جاتے ہیں اور بو دینے لگتے ہیں' آلو اور پیاز کے کریٹ بھرنا سستا بھی پڑتا ہے۔

ٹرک میں شاید دو ڈھائی سو کریٹ تھے۔ ہر کریٹ کو کھول کر دیکھنا ناممکن نہ سہی بہت دشوار کام تھا۔ پانچ منٹ بھی اگر ایک کریٹ کھولنے میں صرف ہوتے تو اس ایک ٹرک کے لئے شاید پندرہ بیس گھنٹے درکار تھے چنانچہ میں نے سامنے کے کریٹ نہ کھولنے کا فیصلہ کیا۔ اصل مال پیچھے ہوگا اور بہت نیچے ہوگا۔ اس فارمولے پر عمل کرتے ہوئے میں نے آخری حصے کی قطاروں میں سے اوپر کے کریٹ ہٹا کے دیکھا اور کامیاب رہا۔ نیچے کے پانچ کریٹ اسلحے سے بھرے ہوئے تھے۔

میں نے اپنی ریسرچ کے نتائج سے غالب اور نازو کو آگاہ کرنا بہتر سمجھا تاکہ وہ غیر ضروری طور پر وقت اور محنت کے نقصانات سے بچ جائیں مگر ابتدائی ناکامی کے بعد خود انہوں نے بھی دیکھ لیا تھا جو میں نے۔

"یہ تو بہت اسلحہ ہے یار سکندر" غالب نے پریشانی سے کہا۔

میں نے کہا "ہاں' یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جب گودام پہلے ہی بھرے ہوئے تھے تو ایک اور کھیپ یہاں کیوں لائی گئی۔"

"جو مال پہلے سے موجود تھا وہ اب تک آگے کیوں نہیں روانہ کیا گیا؟" غالب نے کہا۔

"غالباً یہی وجہ ہے کہ ٹرک بھرے ہوئے کھڑے ہیں۔ ہوگی کوئی ایسی بات کہ ابھی تک پچھلا مال نہیں نکلا۔"

"ایسی کیا وجہ ہوسکتی ہے؟"

"وجوہات کئی ہوسکتی ہیں۔ ٹرک نہ ملے ہوں۔ راستے میں کوئی خطرہ یا رکاوٹ ہو چنانچہ لائن کلیر ہونے کا سگنل نہ ملا ہو۔"

غالب نیچے اتر آیا اور نازو کی طرف گیا "کیا تم ثابت کرنے پر تلی ہوئی ہو کہ اس ٹرک میں صرف آلو او پیاز ہیں۔"

میں نے کہا "نیچے آجاؤ' جو ثابت ہونا تھا وہ ثابت ہوگیا ہے۔"

نازو نے پردے سے برآمد ہوتے ہوئے کہا "یہ پیاز تمہارے لئے بھیجے گئے ہیں۔ لو پہلے سو پیاز کھالو" اس نے غالب کو ایک پیاز پیش کیا۔

مجھے اچانک درمیان والے ٹرک کا خیال آیا۔ اس کے باہر نیلے کی رنگ کی وہ پٹی بھی موجود تھی جو شناخت کی علامت تھی۔ نازو نے میری نگاہوں کا مفہوم سمجھ لیا اور اس کے پردے کی ڈوریاں کھولنے لگی۔ نازو کے بعد غالب اور پھر میں نے اندر پہنچ کے دیکھا تو کریٹ مختلف انداز میں رکھے ہوئے نظر آئے۔ یہ کریٹ ایک قطار کے پیچھے دوسری قطار جما کے نہیں بھرے گئے تھے۔ اس میں درمیان کی جگہ کو خالی چھوڑا گیا تھا۔ یہ چار چھ فٹ کی جگہ اوپر سے ایک گہری قبر کی طرح نظر آتی تھی کریٹ اس کے چاروں طرف تھے اور انہیں گرنے سے بچانے کے لئے چاروں طرف لوہے کی مضبوط گرل کھڑی کی گئی تھی۔

کچھ کہے بغیر سب نے جان لیا کہ یہ انتظام کس کے لئے تھا۔ اس پنجرے میں شہلا کو اور اس کے بیٹے کو قید کرکے لایا گیا تھا لیکن اب وہ یہاں نہیں تھے۔ میں لوہے کی گرل پر قدم جما کے اندر اتر گیا۔ یہ ایک بے مقصد جذباتی حرکت تھی جس کے پیچھے شوق اور تجسس سے زیادہ محبت کے جذبات کارفرما تھے۔ ہم سب وہ جگہ دیکھنا چاہتے تھے جہاں شہلا کا تصور باقی تھا۔ اس کی مظلومیت اور بے بسی کا احساس باقی تھا۔ اس کی پر اذیت قید تنہائی میں گزرنے والے صبر آزما لمحوں کا لمس باقی تھا۔ جب میں رابعہ کے ساتھ دوبارہ اپنے والد وزیر خان مرحوم کے گھر میں داخل ہوا تھا تو اس وقت بھی میری جذباتی کیفیت کچھ ایسی ہی تھی

نازو نے نیچے جھک کر کوئی چیز اٹھالی۔ یہ روٹی کا ایک خشک ہوجانے والا ٹکڑا تھا۔ نازو نے اسے چوما اور منہ میں رکھ لیا۔ میں نے اور غالب نے اندھیرے میں بھی اس کے رخساروں پر

شانے پر ہاتھ رکھ کے اپنے قریب کرلیا۔

"اور کچھ دیر ان آنسوؤں کو سنبھال کے رکھو جان" غالب نے پیار سے کہا "ابھی کچھ دیر بعد اس سے گلے مل کے جتنا چاہو رولینا۔"

نازو نے ایک ادھوری سسکی کے ساتھ کہا "میں کہاں رورہی ہوں۔"

میں نے اور غالب نے اس کو جھوٹا نہیں کہا کیونکہ وہ واقعی نہیں رورہی تھی۔ آنسو خود اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے تھے۔ قصور نازو کا نہیں تھا۔ اس کے آنسوؤں کا تھا' قصور نازو کے حساس 'نازک دل کا تھا جو یادوں کی آنچ سے پگھل کر اشک بن گیا تھا۔ ہم زیادہ سخت دل رکھتے تھے کہ اس پر صرف نمی آئی جو پردۂ چشم تک پہنچ کے غائب ہوگئی۔

میں نے اور غالب نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کے اور ہاتھوں سے ٹٹول کے دیکھا۔ غالب کو ٹافیوں کے کچھ ریپر ملے۔

"انہوں نے بچے کو ٹافیاں دی تھیں" غالب نے تلخی سے کہا۔

"چپ کرانے کے لئے دی ہوں گی" میں نے کہا۔

"تو ان کی مہمان نوازی کو تسلیم نہیں کرتا..."

اچانک میرے ہاتھ میں کانٹا چبھا۔ میں نے اس چیز کو اٹھالیا۔ یہ کانوں کے ٹاپس میں سے ایک تھا۔ میں نے اسے روشنی کے رخ کرکے دیکھا۔

"یہ شہلا کا ہے؟" نازو نے کہا۔

"اور کس کا ہوسکتا ہے" میں نے اداسی سے کہا۔

تاریکی میں اس کا رنگ تو نظر نہیں آتا تھا لیکن نازو نے اس کے ڈیزائن کو پہچان لیا تھا۔ جب میں نے اسے شیشے کے ایک تابوت میں محو خواب دیکھا تھا تو اس نے یہی ٹاپس پہن رکھے تھے اور رابعہ نے مجھے بتایا تھا کہ یہ ٹاپس اس نے شہلا کو دئے تھے۔ اس نے ٹاپس کو تصویر میں بھی شناخت کرلیا تھا۔ اب یہ شہلا اور رابعہ دونوں کی نشانی تھا۔ میں نے اسے سنبھال کے رکھ لیا۔ اس کے علاوہ وہاں کچھ نہیں تھا۔ ہم تینوں نے اپنے ہاتھوں سے فرش کو گھس ڈالا مگر کچھ اور تلاش کرنے میں ناکام رہے۔

"معلوم نہیں یہ گر گیا تھا... یا گرادیا گیا تھا۔"

"گر گیا ہوگا" میں نے کہا "گرانے میں کوئی سینس نہیں' نہ شہلا یہ سوچ سکتی تھی کہ ہم یہاں پہنچ جائیں گے۔ نہ اس کو قید کرکے یہاں لانے والوں کے نزدیک اس کا کوئی امکان تھا۔ کوئی مقصد حاصل نہیں ہوسکتا تھا اسے عمداً یہاں چھوڑنے سے۔"

"خیر یہ تو ثابت ہوگیا کہ شہلا اسی ٹرک میں یہاں پہنچی تھی۔ اپنے بیٹے کے ساتھ" غالب نے کہا۔

"اور اب وہ یہیں ہیں" نازو نے کہا۔

میں کہنا چاہتا تھا کہ۔ نہیں... اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا'

لیکن میں نے بے سبب نازو کو مایوسی عطا کرنے سے گریز کیا۔ امید بہرحال ناامیدی سے بہتر ہے۔

"باقی ٹرکوں کو دیکھنا ہے؟" غالب نے باہر آکے سوال کیا۔

میں نے کہا "میرے خیال میں تو اب اس کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ ہم جو معلوم کرنا چاہتے تھے وہ کرچکے ہیں۔"

"ہاں۔ صرف آلو پیاز کے بھرے ہوئے ٹرک لے کر نکلے ہیں یہ لوگ" غالب نے کہا۔

نازو نے کہا "اتنے آلو پیاز کہاں جائیں گے آخر؟"

"چوہدری دلاور کے گھر اس کی ہولی فیملی باقی تمام عمر آلو پیاز خریدنے کی ضرورت سے بے نیاز ہوگئی" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "پیکنگ میٹریل بھی بک جاتا ہے۔ اصل مال اتار کے ڈرائیور چلے جاتے ہوں گے سبزی منڈی۔"

"رائٹ" غالب نے کہا "یہ لوگ سبزی منڈی میں کسی فرضی نام سے آلو پیاز کے آڑھتی بنے بیٹھے ہوں گے۔ بہت کما... ہوں گے ان کے بے ضرر کاروبار کے۔"

گولی چلنے کی آواز سن کر ہم سب اچھل پڑے اور پھر اس کمرے کی طرف بھاگے جہاں ہم نقلی بالک رام کو گل کی تحویل میں چھوڑ آئے تھے۔ اندر جاتے ہی میں نے بالک رام کو فرش پر ایڑیاں رگڑتے دیکھا۔ خون کا فوارہ اس کے سینے سے ابل رہا...

"اس نے بھاگنے کی کوشش کی تھی" گل نے مختصراً کہا۔

میں نے کہا "مجھے خوشی ہے کہ تم نے اس کی کوشش کو ناکام بنادیا۔"

"کیا تم نے کوئی رعایت دی تھی اسے؟" غالب نے کہا۔

گل نے اعتراف جرم کے انداز میں سرہلایا "اس نے... تھا کہ دیوار کے ساتھ لگ کر اور ہاتھ اٹھا کے کھڑے کھڑے تھک گیا ہے۔ میں نے بیٹھنے کی اجازت دے دی... یہ سمجھتے ہوئے کہ... رہے گا تو وہیں۔ اس نے قریب سے لکڑی کا ایک ٹکڑا اٹھایا... پتا نہیں کیسے اور مجھ پر کھینچ مارا۔"

"ارے! تمہارے سر سے تو خون نکل رہا ہے" نازو نے چونک کر کہا "تم نے بتایا نہیں۔"

گل مسکرائی "ایسے ہی' معمولی سی چوٹ ہے۔"

اب میں نے اور غالب نے بھی گل کی پیشانی پر دائیں جانب خون کے داغ کو دیکھا' ابھی تک ہماری ساری توجہ دم توڑتے ہوئے شخص کی طرف تھی۔

نازو نے قریب جاکے زخم کا معائنہ کیا "خون ابھی نکل رہا ہے مگر کوئی فکر کی بات نہیں' صرف کھال ہی پھٹی ہے۔ میں پٹی باندھ دیتی ہوں۔"

"پٹی کی ضرورت نہیں" گل نے کہا۔

"اچھا صاف تو کردوں" نازو نے کہا اور پھر جیب میں سے ایک رومال نکال لیا۔

میں نے کہا "یہ سب غیر ضروری وردیوں کا بوجھ تو اتار دو۔"

"واقعی' اس سے کچھ زیادہ ہی تھکن ہورہی ہے" نازو نے کہا اور محافظ کی پہلی وردی اتار پھینکی۔

"پولیس کی وردی کیسے چڑھالی تھی تم نے ساری پر" غالب نے حیران ہوکے کہا۔

"یہ مت پوچھو کیسے چڑھائی تھی" نازو نے کہا اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

گل نے کہا "ساری تو اوپر تک اٹھانی پڑی ہوگی... بالکل اوپر تک۔"

اب میں نے بھی نازو کی مشکلات پر غور کیا "اسی لئے چال بھی عجیب سی ہورہی تھی اس کی۔"

غالب ہنس پڑا "مرغی اگر بطخ کی طرح چلنے کی کوشش کرے تو ایسی ہی لگے گی۔"

نازو نے واپس آتے ہوئے یہ بات سن لی تھی۔ اس نے ساری غالب کے منہ پر ماری "ہنس تو رہے ہو۔ ذرا پہلے یہ باندھو اور پھر پتلون پہن کے دکھاؤ۔"

میں نے کہا "نہیں بھئی' ہم یہ نہیں کرسکتے۔"

غالب یہ چیلنج قبول کرنے کے موڈ میں آگیا "کیوں نہیں کرسکتے۔"

میں نے کہا "اچھا جب فرصت ہوگی تب دیکھیں گے۔ تم نے یہ پولیس کی وردی رکھی ہے' ساری پسند نہیں تھی کیا؟" میں نے نازو سے مخاطب ہوکے کہا۔

"پسند ناپسند کی بات نہیں' ساری کے ساتھ دوڑنے بھاگنے میں دشواری ہوتی ہے" نازو نے کہا۔

"اب ہم اوپر جائیں گے" میں نے کہا "لیکن سب ایک ساتھ نہیں۔ گل نیچے رہے گی۔"

"یہ کیا مصیبت ہے! میں اکیلی رہوں گی" گل نے احتجاج کیا۔

"اکیلی کیوں' مشین گن ہے تمہارے ساتھ" نازو نے کہا۔

"اور اتنی ساری لاشیں ہیں" غالب بولا۔

"کوئی اور کیوں نہیں رہتا؟"

میں نے کہا "گل... سب کا اپنا اپنا کام ہے۔ نازو درخت پر چڑھ سکتی ہے۔"

"میں کمند ڈال کے دیوار پر چڑھ سکتی ہوں۔ ہاں جوڈو کراٹے نہیں جانتی۔"

میں نے کہا "گل' کمند موجود ہے' اوپر چڑھ جاؤگی؟ اکیلی۔"

گل نے کہا "کیوں نہیں' بھائی کے ساتھ ایسے کام بہت کئے تھے میں نے' کہاں ہے کمند؟"

غالب نے میری بات کا مطلب سمجھ لیا "وہ رسی بھی دیکھ رہی ہے جس کے سہارے یہ اترا تھا۔ تمہارا کشتۂ ستم" اس نے نقلی بالک رام کی طرف اشارہ کیا۔

"اگر یہ اسکیم کامیاب رہی تو سمجھو کام بن گیا" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا "گل کے اوپر جانے سے پہلے ہم پھر اندھیرا کردیں گے۔ ایک طرف سے گل اوپر جائے گی۔ دوسری طرف سے میں جاؤں گا۔ زینے کی طرف سے۔ نازو تم نیچے سے گل کو پورا پورا کور فراہم کروگی۔ کسی کا سایہ دکھائی دے اوپر تو اسے شوٹ کردینا' نیچے سے۔"

"اتنا اچھا نشانہ نہیں ہے میرا" نازو نے کہا۔

"میں کرلوں گا یہ کام" غالب نے کہا۔

"ایسی صورت میں نازو مجھے کور کرے گی۔ گل' تم مشین گن کے ساتھ رسی پر چڑھ جاؤگی؟"

گل نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا "کیوں نہیں' اپنی کمر سے باندھ لوں گی" وہ خوش تھی کہ آج اسے بھی اپنی ایک غیر معمولی صلاحیت کے مظاہرے کا موقع ملا جو پہلے ناگ منی کے کام آتی تھی۔

"میں اوپر جاکے سب کو وارننگ دوں گا کہ وہ باہر آکے خود کو ہمارے حوالے کردیں۔ وہ ہر طرف سے محصور ہیں اور کسی کا بچ کر نکلنا ناممکن ہے۔ اس اعلان پر سب تو خیر نہیں نکلیں گے مگر یہ ہوسکتا ہے کہ کوئی نکل آئے۔ اس اعلان کے بعد میں واپس زینے میں چھپ جاؤں گا۔ تم ان سب کو چھلنی کردینا جو باہر آئیں۔"

"ایسے..... دھوکا دے کر..."

"یہ جنگ ہے بی بی" غالب نے برہمی سے کہا "ہر دشمن دھوکا دیتا ہے اور جنگی تاریخ کی ان گنت فتوحات دھوکا دے کر حاصل کی گئی تھیں۔ دشمن کو دھوکا دینے کا نام جنگی حکمت عملی کہلاتا ہے۔ مارے وہ جاتے ہیں جو دھوکا کھاتے ہیں۔"

میں نے کہا "تم نے ابھی کچھ دیر پہلے دھوکا کھایا تھا اور ایک رعایت دی تھی دشمن کو۔ اس کا انجام دیکھا تھا؟ خدا کا شکر ادا کرو کہ اس کے ہاتھ میں لکڑی کا ٹکڑا ہی آیا۔ پتھر ہوتا تو تمہارا سر پھٹ جاتا۔ وہ تمہاری مشین گن چھین لیتا اور ہماری ساری کامیابی ایک معمولی سی کوتاہی کے باعث ناکامی میں بدل جاتی۔"

"شکست ہوجاتی ہمیں" غالب نے کہا "وہ ہمیں کمرے میں قدم رکھتے ہی بھون ڈالتا۔"

"کمند ڈال کے اوپر چڑھتے ہوئے کیا تم دھوکا نہیں دوگی؟" نازو بولی۔

میں نے کہا "جنگ میں جذبات کو الگ رکھو۔ صرف عقل استعمال کرو اور ڈسپلن سے کام لو۔ ہر فوجی اگر سوال کرنے لگے حکم دینے والے سے یا جواز مانگنے لگے ہر کارروائی کا تو بیڑہ غرق ہوجائے فوج کا۔"

گل رونے کے قریب ہوگئی "میرا یہ مطلب نہیں تھا سکندر بھائی' مجھے معاف کردیں۔"

"ارے اب رونا مت شروع کر دینا" میں نے ہنس کے کہا "اس وقت دو بجے ہیں۔ ہمارے پاس زیادہ سے زیادہ ... گھنٹے ہیں۔ ہم چار بجے یہاں سے نکل جائیں تو پانچ بجے تک اتنی دور جا سکتے ہیں کہ پھر دشمن کے ہاتھ آنے کا ڈر نہ رہے۔ پانچ بجے کے بعد اجالے کے آثار پیدا ہونے لگتے ہیں۔ تم تیار ہو تو جاؤ غالب کے ساتھ۔"

گل نے مشین گن کو اپنی ... کے ساتھ باندھنے کے لئے نازو کی ساری سے پٹی پھاڑنے کے لئے ساری کو درمیان سے چیر دیا۔

"یہ راما نازو کی ماں کی نشانی تھی" غالب نے کہا۔

"جنگ میں جذبات کو الگ رکھو، صرف عقل استعمال کرو" گل نے میری طرف دیکھے بغیر میری بات دہرائی "کیا یہ حکم صرف میرے لئے تھا۔"

غالب نے خفت سے دانت نکالے "اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ تم مشین بن جاؤ۔"

"میں مشین گن بن گئی ہوں، چلئے" گل نے کہا اور باہر نکل گئی۔

"بہت حساس لڑکی ہے" نازو نے کہا اور غالب کو گل کے پیچھے جاتا ہوا دیکھتی رہی۔

میں نے باہر نکل کے مین سوئچ کو دوبارہ آف کیا۔ اوپر نیچے کی دونوں منزلیں تاریکی میں ڈوب گئیں۔ چند منٹ کے بعد جب میری آنکھیں پھر اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو مجھے گل اس رسی پر نظر آئی۔ اتنی ہی بلندی پر جتنی بلندی پر میں نے نقلی بالک رام کو دیکھا تھا۔ غالب سر اٹھائے اسے دیکھ رہا تھا۔ گل نے اندھیرے میں ہماری طرف دیکھ کے ہاتھ ہلایا تو میرے دل نے قلا... کھائی۔ ایک ہاتھ ہلاتے وقت گل نے رسی کو صرف ایک ہی ہاتھ سے تھاما ہو گا "بے وقوف۔ گرے گی" میں ... نے بے اختیار کہا۔

"اسے آج موقع ملا ہے سب کو امپریس کرنے کا" نازو بولی۔

"چلو، ورنہ وہ پھر ہاتھ ہلائے گی" میں نے کہا۔

میں نے زینے کا رخ کیا تو مجھے پہلی لاش عین پہلی سیڑھی کے سامنے پڑی ہوئی نظر آئی۔ اس نے اوپر جانے کا راستہ روک رکھا تھا۔ میں نے اسے عبور کرنے کے لئے لمبا قدم اٹھایا تو میرا پیر پھسل گیا۔ میرے قدموں کے نیچے اس کا خون تھا جو اتنی دیر میں جیلی کی طرح جم گیا تھا۔ میں نے ریلنگ کا سہارا لے کر خود کو گرنے سے بچایا اور نازو کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"ذرا دھیان سے، نیچے خون ہے" میں نے کہا۔

خون اوپر بھی تھا۔ چوتھی سیڑھی پر ایک اور شخص ایسے پڑا تھا کہ اس کا سر نیچے کی طرف تھا اور دھڑ اوپر۔ اس کی ٹانگیں ریلنگ کے نیچے کی گرل میں پھنس گئی تھیں۔ اندھیرے میں خون کے داغ نظر نہیں آتے تھے جو اوپر سے نیچے تک ... کراہیت کے شدید احساس سے نازو کو ابکائی سی آئی ... جی خون کی بو سے متلا رہا تھا اور مجھے اپنے ہم جنس ... لہو پر قدم رکھتے ہوئے چلنا بہت عجیب سا لگ رہا تھا ... و شکست کی جدوجہد سے گزرتے ہوئے ایسے سخت مقام ... آتے ہیں۔ یہ خون میرا بھی ہو سکتا تھا اور یہ بھی ہو سکتا ... خون ... سے دشمن جوتوں سمیت گزر جاتا۔ میں نے ... تسلسل پر خدا کے حضور شکر گزاری کے جذبات پیش ... تک میں کامیاب ہوں کیونکہ میں زندہ ہوں۔

معلوم نہیں نازو کے جذبات کیا تھے۔ ہم جہاں ... صرف اپنی خاموشی کی زبان میں ہی گفتگو کر سکتے تھے ... کئے بغیر ہم دبے پاؤں ایک ایک قدم اوپر کی جانب بڑھ ... شروع کی چند سیڑھیوں پر مجھے جوتوں کے سول کچھ چپکتے ... ہوئے تھے مگر اب سول پر لگ جانے والا خون صاف ہو ... زینے کے موڑ پر نازو نے رک کر دیوار کا سہارا لیا ... لمبے سانس لینے لگی۔ مجھے اس کا ہاتھ برف کی طرح ... اس کے ماتھے پر پسینے کی نمی تھی۔

میں نے اس کے کان میں کہا "نازو، ہمیں زندہ رہنا ہے ... ایسے مرنا نہیں ہے، ہمت سے کام لو۔"

نازو نے سر ہلایا اور پھر میرے ساتھ چل پڑی۔

تین سیڑھیاں ابھی باقی تھیں کہ میں نے نازو کو روک ... پھر میں نے آگے جا کے پہلے کمرے کی دیوار کی اوٹ سے جھا... کر دیکھا۔ اوپر کا نقشہ مختلف نہیں تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ ... جتنی جگہ زینے کے لئے چھوڑی گئی تھی وہ اوپر نئی طرز کے ... روم بنانے میں استعمال ہوئی تھی۔ یہ باتھ روم میرے بائیں ... پر تھے۔ دائیں جانب وہی طویل برآمدہ تھا جس میں سارے کمروں کے دروازے کھلتے تھے۔

برآمدے کے آخری حصے میں گل دیوار سے لگی کھڑی ... دیوار اسے کسی قسم کا تحفظ فراہم نہیں کرتی تھی۔ کسی بھی کمرے سے باہر آئے بغیر کوئی بھی شخص اسے دیکھ سکتا تھا۔ جہاں ... ختم ہوتا تھا وہاں ایک طرف آخری کمرے کی دیوار تھی ... طرف برآمدے کی حد بندی کرنے والی چار فٹ اونچی دیوار ... برآمدے کی چھت کو سہارا دینے والے ستونوں کو ... تھی چنانچہ اس کے چھپنے کے لئے وہاں کوئی گوشہ تک ... تھا۔ وہ انتہائی غیر محفوظ تھی اور پس منظر کی روشنی میں ... وجود ایک آسان ٹارگٹ تھا۔ گل کو اس خطرے میں ... ذمے دار ہم سب تھے مگر اب اسے واپس بھیجنا ہمارے ... بات نہ تھی۔

میں نے نازو کو قریب بلا کے کہا "یہ باتھ روم دیکھ ..."

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"یہ تمہارے لئے ایک محفوظ مورچہ ثابت ہو سکتے ہیں" میں نے اس کے کان میں کہا "اگر تم اندر جا سکو۔"

نازو نے میرے کان میں سرگوشی کی "میں جاتی ہوں۔ تم خیال رکھنا۔"

وہ پنجوں کے بل چلتی بلی کی طرح بے آواز قدموں سے آگے بڑھی تو میں نے دیکھا کہ اس نے اپنے خون آلود ... جوتے ... حاصل کر لی تھی۔ مقصد اپنے پیروں کے نیچے انسانی خون کی نجاست کے احساس سے نجات حاصل کرنا تھا۔ واپسی میں وہ کیا کرے گی جب گزرنا تو پھر اس خون پر سے ہو گا' میں نے سوچا۔

نازو نے باتھ روم کے بند دروازے کے ڈور لاک کو کھولنے کے لئے دستے کو گھمایا۔ ہلکا سا کھٹکا سنائی دیا۔ اس خاموشی میں معمولی سی آواز بھی بہت زیادہ تھی۔ جو بند کمروں میں چھپ کر بیٹھے ہوئے عیار دشمن کے کانوں تک بھی پہنچ سکتی تھی۔ نازو نے بڑی پھرتی سے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو کے بند کر دیا۔ میرے کانوں نے دوبارہ اس کے قبضوں کی چوں چوں سنی مگر میں ... دروازوں اور کھڑکیوں کی طرف دیکھتا رہا۔ اس مختصر وقفے میں کوئی اپنا ہاتھ یا سر نکالتا تو ٹرائیگر پر میری انگلی خود بخود دب جاتی۔

اطمینان کا گہرا سانس لے کر میں نے آستین سے ماتھے کا پسینہ صاف کیا اور پھر سامنے آئے بغیر لاؤڈ اسپیکر کی طرح کہا۔ "ہیلو۔"

میری آواز برآمدے میں گونجی اور اس اعصاب شکن سکوت کے آئینے پر بھاری پتھر بن کے گری۔

"ہیلو، تم سب لوگ جو میری آواز سن سکتے ہو" میں نے پکارتے ہوئے کہا "یہ تم سب کے لئے ایک وارننگ ہے۔"

میں نے کچھ توقف کیا۔ اب میرے اعتماد کا گراف بہت اونچا ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو کسی فاتح لشکر کے کمانڈر کی طرح محسوس کیا جس کی سپاہ نے واقعی دشمن کا کوئی قلعہ فتح کر لیا ہو۔

"تم لوگ اب کچھ نہیں کر سکتے" میں نے پر تحکم، جارحانہ لہجے اور غصیلی آواز میں دھاڑ کے کہا "تم جانتے ہو تمہارے سب محافظ اور ساتھی مارے جا چکے ہیں۔ یہ جگہ اور سارا اسلحہ خانہ ہمارے قبضے میں ہے۔ تمہاری مدد کے لئے کوئی نہیں آ سکتا۔ تم مقابلہ نہیں کر سکتے اور زندہ بچ کے نہیں جا سکتے۔ ہم نے نیچے ... سارے اسلحے کو اڑانے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس کے لئے ہم درمیان والے گودام میں ٹائم بم رکھ چکے ہیں لیکن ... ٹائم سیٹ نہیں کیا ہے۔ اس بم کے پھٹتے ہی یہاں کچھ نہیں بچے گا ... ایک دھماکے سے دوسرے سب گودام بھی اڑ جائیں گے۔ اسلحے سے لدے ہوئے ٹرک بھی اڑ جائیں گے لیکن ہم محفوظ رہیں گے۔ پانچ منٹ میں ہم بہت دور جا چکے ہوں گے مگر پانچ منٹ میں تم باہر بھی نہیں نکل سکو گے۔"

میں نے پھر ایک مختصر وقفہ دیا۔ ابھی تک میرے اعلان کے جواب میں نہ کوئی بولا تھا اور نہ کسی نے جوابی کارروائی کے طور پر کچھ کیا تھا۔ میں باقی اعلان شروع کرنے ہی والا تھا کہ تیسرے کمرے سے کسی نے چیخ کر کہا۔

"مجھے جانے دو، میں بات کرتا ہوں ان سے۔"

اس کے ... ایک فائر ہوا اور بات کرنے والا ایک چیخ مار کے خاموش ہو گیا۔

"تم سب کو خودکشی کی اجازت ہے۔ تم چاہو تو ایک دوسرے کو قتل کر سکتے ہو" میں نے پھر بلند آواز میں پکار کے کہا۔ "لیکن تم چاہو تو اپنی جان بچا سکتے ہو۔ خود کو ہمارے حوالے کر دو۔ اپنی شکست تسلیم کر لو۔ ہاتھ سر سے اوپر اٹھا کے باہر آنے والے کو کچھ نہیں کہا جائے گا۔ جو غلطی سے یا مجبوری میں ہمارے پرانے دشمنوں کے آلۂ کار بنے تھے ان سب کو ہماری طرف سے معافی مل گئی۔ ان کی جان بخش دی جائے گی اور وہ جہاں بھی جانا چاہیں گے انہیں جانے کی اجازت ہو گی۔ ہماری طرف سے تمہیں دس منٹ کی مہلت دی جا رہی ہے۔ اچھی طرح سوچ لو۔ دس منٹ بعد ہم اپنی کارروائی کا آغاز کر دیں گے۔ جو اس مہلت سے فائدہ نہیں اٹھائیں گے ان کے پرخچے اڑ جائیں گے۔"

ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ وقت کی رفتار سست پڑ گئی۔ ہر لمحہ ایک طویل، صبر آزما انتظار کی گھڑی بن گیا۔ ابھی تک میرے اعلان پر کسی قسم کے رد عمل کا فقدان ایک مایوس کن بات تھی۔ اگر کسی نے بھی ہتھیار نہ ڈالے۔ کوئی مورچے سے باہر نہ آیا اور کسی پر دھمکی کا اثر نہ ہوا تو ہمارا لائحہ عمل کیا ہو گا' یہ میں نے ابھی تک نہیں سوچا تھا۔ یہاں دشمنوں کے ساتھ ہمارے دوست بھی تھے۔ کسی کمرے میں رابعہ اور محسن قید تھے۔ شاید ان کے ساتھ شہلا بھی تھی اور اس کا معصوم بچہ بھی جسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ آخر اسے ہنسنے بولنے، یہاں تک کہ رونے کی آزادی بھی کیوں حاصل نہیں رہی۔ شاید ان سب کی آوازوں پر پہرے تھے۔ ان کے منہ بند کر دئے گئے تھے یا انہیں ہوش و حواس سے بے نیاز کر کے ڈال دیا گیا تھا ورنہ وہ جواب دیتے۔ اپنی موجودگی کا کوئی ثبوت فراہم کرتے۔

"دو منٹ گزر گئے ہیں" میں نے خاموشی کے تالاب میں اچانک پتھر پھینک دیا۔ نتیجہ پھر صفر۔ سب کمروں کے دروازے کھلے ہوئے تھے مگر کھڑکیاں بند تھیں۔ وہ تاریکی میں دبکے ہوئے منتظر تھے کہ ہم برآمدے سے گزرنے کی کوشش کریں تو ان کے کسی ریوالور یا مشین گن کی گولی کا آسانی سے نشانہ بن جائیں۔ صرف ایک شخص باہر آنے کے لئے اٹھا تھا۔ وہ ہم سے بات کرنا چاہتا تھا مگر اسے باقی لوگوں نے خود ہی مار ڈالا تھا۔ اس کے بعد کون ہمت کرے گا اس رعایت سے فائدہ اٹھانے کی۔

"چار منٹ گزر گئے ہیں" میں نے اعلان کیا۔ جب میں ایک طالب علم تھا تو سالانہ امتحانات میں سیٹوں کے درمیان پھر کے نگرانی کرنے والے وقفے وقفے سے بتاتے رہتے تھے 'ایک گھنٹا گزر گیا ہے' آدھا وقت گزر گیا ہے۔ اپنی محویت میں پرچہ حل کرنے والے چونک پڑتے تھے اور پھر زیادہ مستعدی کے ساتھ وقت کی تیز رفتاری کا ساتھ دینے کی کوشش میں لگ جاتے تھے۔ اس وقت یوں لگتا تھا جیسے وقت کو پر لگ گئے ہیں۔ ہر سیکنڈ کی رفتار منٹ کے برابر ہوگئی ہے اور ایک گھنٹا سمٹ کر ساٹھ سیکنڈ کا ہوگیا۔ اس وقت صورتِ حال برعکس ہوگئی تھی۔ سیکنڈ پھیل کر منٹ سے زیادہ طویل وقفہ بن گیا تھا۔ دس منٹ ایک گھنٹے کے برابر ہوگئے تھے۔ میں ممتحن تھا' انوجی لیٹر۔ شاید ان کے لئے جو محض نگرانی کرتے تھے' وقت کا بیزار کن وقفہ ایسے ہی طوالت اختیار کرلیتا ہوگا۔

میں دس منٹ تک خاموش بھی بیٹھ سکتا تھا مگر بار بار اعلان کرتے رہنا ان کے اعصاب کی قوتِ برداشت پر وار کرنے کے مترادف تھا۔ خطرے سے سب ڈرتے ہیں مگر کوئی چلانے لگے' خطرہ' خطرہ' تو خطرے کی دہشت بڑھ جاتی ہے اور اعصاب کے کشیدہ تار جھنجھنانے لگتے ہیں۔

اب میں نے سنجیدگی سے نئی حکمتِ عملی کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ پہلے کمرے کی کھڑکی مجھ سے دو قدم کے فاصلے پر تھی۔ اس کے بعد ایک دروازہ تھا۔ میں جھک کر' کھڑکی کی سطح سے نیچے رہ کر رینگتا ہوا دروازے تک جا سکتا تھا اور جھانک کے اندر کا منظر دیکھ سکتا تھا۔ مجھے نشانہ بنانے والے کو دروازے تک آنا پڑے گا یا کھڑکی سے جھانک کر دیکھنا پڑے گا۔ نازو آسانی سے اسے ہٹ کردے گی۔ کیا وہ اپنی گھڑیاں دیکھ رہے ہوں گے۔ میں ہر دو منٹ کے بعد گھڑیال کی طرح منادی کرتا ہوں۔ گردوں نے گھڑی عمر کی اک اور گھٹادی۔ اس دو منٹ کے وقفے سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے جب وہ کسی کارروائی کی توقع نہیں رکھتے۔

یہ خیال آتے ہی میں نے چلا کے کہا "چار منٹ باقی ہیں" اور پھر ایک دم جھک کے گھٹنوں کے بل رینگتا ہوا آگے گیا۔ میں نے دل ہی دل میں دو دعائیں مانگیں۔ ایک یہ کہ دور سے گل مجھ پر ہی مشین گن کا راؤنڈ نہ چلاوے۔ دوسری یہ کہ نازو کی نظر میری نقل و حرکت پر ہو اور وہ سمجھ لے کہ میرا ارادہ کیا ہے۔ میں فرش پر سرسراہٹ پیدا کئے بغیر آگے بڑھا یہاں تک کہ دروازہ مجھ سے چار انچ دور رہ گیا۔ ایک جست کا فاصلہ احتیاط کے باعث ایک منٹ میں طے ہوا۔ ایک منٹ اب بھی باقی تھا۔ دشمن سمجھ رہے ہوں گے کہ ابھی تو میں اپنی جگہ پر موجود ہوں۔ چوتھا اعلان کرنے کے لئے۔

میں نے آہستہ آہستہ سر کو جھکا کے آگے بڑھایا۔ ایسے کہ کسی کو حرکت کا احساس بھی نہ ہو۔ میں کسی جانور کی طرح چاروں ہاتھوں پیروں پر جسم کا توازن قائم رکھے خود اپنے دل کی دھڑکن کو بھی صاف سن رہا تھا اور ٹھنڈے پسینے کو اپنے وجود سے پھوٹتا محسوس کر رہا تھا۔ میری زندگی کا انحصار ایک لمحے کے ہزارویں حصے کی مہلت پر تھا جس میں اندر چھپے ہوئے طرح مستعد دشمن کی نگاہ میرے سر کی آؤٹ لائن کو بھی نہ دیکھ پائے مگر میں اسے دیکھ لوں۔

اسے میں نے کمرے کے وسط میں مشین گن کے ساتھ استادہ دیکھا...... سانس روک کے میں نے اپنا سر پیچھے کیا اور اپنا ریوالور نکالا۔ میری پوزیشن ایسی تھی کہ میں ریوالور الٹے ہاتھ میں پکڑ کے گولی چلا سکتا تھا۔ میرے دائیں ہاتھ پر دیوار تھی اور چوکھٹ تھی۔ مجھے نشانہ بھی اندازے سے لینا تھا اور سامنے جائے بغیر لینا تھا۔ یہ ضروری تھا کہ نشانہ خطا نہ ہو۔ گولی اس کے سر یا سینے میں نہ لگی تو وہ صرف زخمی ہوگا اور ردِ عمل کے طور پر حملہ کرے گا۔ شاید نازو اسے مار گرائے۔ مگر یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ مجھ پر پورا راؤنڈ چلادے اور پھر مارا جائے۔

میں نے آنکھیں بند کرکے خدا کو یاد کیا۔ پھر ایک دم بایاں ہاتھ سامنے کرتے ہوئے ٹرائیگر دبادیا۔ اس وقت گولی چلنے کی آواز بھی بم کے دھماکے سے کم نہ تھی۔ میں نے پلٹ کر ایک جست لگائی اور جب واپس دیوار کی پناہ میں جاکر گرا تو مجھے یقین آیا کہ میں زندہ ہوں۔ میں نے کسی کی بھیانک چیخ سنی تھی۔ پھر ایک دھما کا سنا تھا جو کسی کے گرنے کا تھا۔ دوسری آواز مشین گن کے فرش سے ٹکرانے کی تھی اور تیسری آواز میں تڑپ کے اٹھا' تیسری آواز رابعہ کی تھی' اس نے مجھے آواز دی تھی۔

میں نے چلا کے کہا "رابعہ؟"

رابعہ نے کہا "تم... تم ٹھیک ہو؟" اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

"ہاں... ہاں' میں ٹھیک ہوں۔ بالکل ٹھیک ہوں' تم۔ تم وہیں رہو' باہر مت آنا۔ سنا تم نے' میں ابھی آتا ہوں تمہارے پاس۔"

"ہاں' میں اندر رہوں گی... تم اکیلے ہو؟"

"نہیں' ہم سب ساتھ ہیں۔ فکر مت کرو' تھوڑی دیر کی بات اور ہے۔ ہم نکال لیں گے تمہیں' اور کوئی ہے تمہارے ساتھ؟"

"نہیں' اور کوئی نہیں۔ یہ ایک ہی تھا۔"

"مارا گیا وہ یا....."

"وہ مارا گیا' اس کی مشین گن میرے پاس ہے۔"

"ٹھیک ہے' مورچے سے مت نکلنا۔ محسن کہاں ہے؟"

"محسن یہاں تو نہیں ہے۔"

"یہاں نہیں ہے' پھر کہاں ہے" میں نے کہا۔

"مجھے نہیں معلوم' وہ بھاگ گیا تھا" رابعہ نے کہا۔

تیسرے کمرے سے استاد پیڈرو نے ایک مکروہ قہقہہ مارا جو بہت معنوی انداز میں خوفناک تھا "تمہارا یار یہاں ہے سکندر۔ ہمت ہے تو آؤ اور لے جاؤ۔"

نازو نے باتھ روم کا دروازہ کھول کے کہا "رابعہ کو نکال لو مگر خود آگے مت جانا۔"

میں نے کہا "تم یہ جگہ مت چھوڑنا' میں تمہارے کور پر بہت زیادہ انحصار کر رہا ہوں۔"

اچانک میں نے برآمدے کے آخری کنارے پر غالب کو نمودار ہوتے دیکھا۔ وہ غالباً نیچے بے کار کھڑا پریشان ہو رہا تھا۔ نازو کی آواز پر اس نے اوپر آجانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اس کی جگہ میں ہوتا تو میرے لئے بھی لاتعلق کھڑا رہنا ناممکن ہوتا۔ وہ رسی کے سہارے اوپر چڑھا تھا۔ یہ اس کے لئے مشکل کام ثابت ہوا ہوگا مگر اس نے برآمدے میں آکے مجھے ہاتھ ہلا کے اپنی آمد سے مطلع کیا۔ میں نے اسے ہاتھ ہلا کے جواب دیا۔ پھر میں نے ایک جست میں دروازے تک کا فاصلہ طے کیا اور کمرے کے اندر پہنچ گیا۔

رابعہ ایک دیوار کا سہارا لئے کھڑی ہوئی تھی۔ اندھیرے میں بھی اس کے حسن کی تابانی کو میں نے دل کی آنکھ سے دیکھا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ وہ کسی مورت کی طرح ساکت رہی یہاں تک کہ قریب جاکے میں نے اسے سمیٹ لیا اور اس کے وجود کی ساری آسودگی دینے والی نرمی اور سکون عطا کرنے والی بدن کی خوشبو اور اس کے قرب سے حاصل ہونے والی محبت کی بیکار حرارت میرے وجود میں بھر گئی۔

میں نے اس کی آنکھوں کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "بس جان' بس۔ ابھی سارے آنسو روک لو اور میرا ہاتھ تھام لو۔ مجھے بہت ضرورت ہے تمہارے سہارے کی اور تمہاری رفاقت کے تحفظ کی۔"

اس نے پھر مشین گن اٹھالی "مجھے اپنے ساتھ رکھنا سکندر' آئندہ کبھی' کسی اور کے ساتھ مت بھیجنا۔"

"ہم سب ایک ہیں' سب ساتھ ہیں۔"

"نہیں' میرا حوصلہ تم ہو' تمہارے بغیر حوصلہ ختم ہوجاتا ہے میرا۔ میں نہیں جاؤں گی کسی کے ساتھ۔"

"اچھا مت جانا" میں نے بہتر سمجھا کہ اس وقت بحث نہ کروں۔ اس کی عقل پر جذبات کا غلبہ تھا۔ وہ کوئی منطقی بات یا استدلال قبول کرنے کے لئے ذہنی طور پر تیار نہیں تھی۔

باہر ایک فائر کی آواز سنائی دی۔ میں نے ایک دم رابعہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ہم دونوں دروازے کی طرف بڑھے۔

"یہ کیا تھا؟" میں نے دروازے کی اوٹ سے نازو کو مخاطب کیا۔

"غالب نے وہی کیا جو تم نے کیا تھا" نازو بولی۔

"گولی غالب نے چلائی تھی؟"

"ہاں۔ وہ دونوں آخری کمرے میں ہیں" نازو نے مجھے مطلع کیا۔

"کوئی اور آواز سنائی نہیں دی؟" میں نے تشویش سے کہا۔ "گولی کس پر چلائی تھی اس نے؟"

"میرا خیال ہے کہ وہاں کوئی نہیں تھا" نازو نے کہا۔

"تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ محسن کو کہاں رکھا گیا ہوگا؟" میں نے رابعہ سے پوچھا۔

رابعہ نے نفی میں سر ہلایا "میں نے اس کمرے کے علاوہ کچھ نہیں دیکھا۔ میں اور محسن الگ الگ سمتوں میں بھاگے تھے۔ مجھے نہیں معلوم وہ پکڑا گیا تھا یا نہیں۔"

"غالباً استاد پیڈرو بلف کر رہا ہے" میں نے کہا "محسن اس کے کمرے میں قید نہیں ہے۔ تم سے جدا ہو کے وہ کدھر گیا تھا؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ کیا وہ تمہیں نہیں ملا؟"

"نہیں۔ ممکن ہے اس نے ہم سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی ہو مگر ہم تو خود روپوش تھے۔ ایک ایسی جگہ تھے جہاں اس کا خیال بھی نہیں جا سکتا تھا اور کسی کا خیال بھی نہیں گیا ورنہ ہم پکڑ لئے جاتے۔ ہم اسی بستی میں تھے لیکن محسن کو یہ بات بتانے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ خود بھی تو روپوش ہوگا کہیں اپنی جان بچانے کے لئے" میں نے کہا "مگر سوال یہ ہے کہ کہاں؟"

"اس کے بچ کر نکلنے کے امکانات بہت کم تھے" رابعہ نے کہا "ہم بجلی گھر سے روانہ ہوتے ہی چاروں طرف سے محصور ہوگئے تھے۔"

میں نے مایوسی سے کہا "اس کا مطلب ہے وہ پیڈرو کی قید میں ہو بھی سکتا ہے۔"

اب چھپانے کو کچھ نہیں رہا تھا۔ دونوں طرف سے شکاری کھل کے سامنے آگئے تھے۔ ہمیں معلوم ہوچکا تھا کہ ہمارا مقابلہ استاد پیڈرو سے ہے اور استاد پیڈرو نے بھی ان سب کے نام سن لئے تھے جو اس کے گرد اپنا حصار تنگ کرتے جا رہے تھے۔ پہلے ہم احاطے سے باہر تھے اور انتہائی خاموشی سے اور پُراسرار طریقے پر اچانک دشمن کے اس قلعے میں نمودار ہوگئے تھے جو حفاظتی انتظامات کی کثرت کے باعث کسی حد تک ناقابل تسخیر بھی تھا۔ خود استاد پیڈرو کی عقل کے لئے سب سے زیادہ حیران کن اور ناقابل فہم بات یہی ہوگی کہ آخر ہم اندر کیسے گھس آئے۔ اس کے بعد ہم نے نچلی منزل پر قبضہ کیا تھا۔ پھر زینے تک آگئے تھے۔ زینے سے اوپر آکے اب ہم اوپر دونوں کناروں پر واقع کمروں میں گھس کر مورچہ بند ہوگئے تھے اور اس طرح قریب سے قریب تر ہونے کے ساتھ ہم فرار کے راستے بند کرتے رہے تھے۔ اب تو پیڈرو کے لئے یہ بھی ممکن نہیں رہا تھا کہ وہ دوڑ کر کمرے سے نکلے اور برآمدے سے نیچے کود جائے۔ خواہ ایسی

کوشش کا نتیجہ ٹانگ ٹوٹنے کی صورت میں نکلے۔ ٹانگ ٹوٹنے کی نوبت آنے سے پہلے تو وہ دونوں جانب سے آنے والی گولیوں کا نشانہ بن جاتا۔ ہم دونوں طرف چوکیاں قائم کئے بیٹھے تھے اور پورا برآمدہ ہمارے سامنے تھا۔

تاہم اس محفوظ طریقے پر ہم اپنے اپنے مورچوں میں یہ انتظار نہیں کاٹ سکتے تھے کہ کبھی تو دشمن باہر آئے گا۔ ہمارے پاس اگر کوئی چیز کم تھی تو وہ وقت تھا۔ یہاں اسلحے کی کمی نہ تھی۔ لیکن خدا نے ہمیں لامحدود عطا کیا تھا جو وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا جارہا تھا۔ ہمارا حوصلہ بھی ختم ہونے والا نہ تھا لیکن رات اور وقت کی عطا کردہ مہلت ہر لمحہ گزرنے کے ساتھ کم ہورہی تھی۔

میں نے چلا کے کہا "غالب!" اس وقت میں دروازے کے قریب تھا۔

غالب نے آخری کمرے کے دروازے کے پاس سے جواب دیا "اب کیا حکم ہے باس۔"

براہ راست چلا چلا کے ایک دوسرے کو مخاطب کرنے کے سوا ہمارے پاس رابطے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اس طرح نہ راز داری برقرار رکھی جاسکتی تھی، ورنہ تفصیل سے منصوبے پر بحث ممکن تھی۔

"تمہاری پوزیشن کیا ہے؟"

غالب نے کہا "ہم محفوظ ہیں، آخری کمرے میں۔ یہ بالک رام جی کا عشرت کدہ تھا۔ فریج میں ٹھنڈا پانی ہے، دودھ ہے، پھل کھاؤ گے؟"

میں نے چلا کے کہا "بھیج دو، ہوائی ڈاک سے۔"

غالب نے ایک سیب پھینکا جو برآمدے کی مسافت طے کرتا ہوا سیدھا اس باتھ روم کے دروازے پر لگا جس میں نازو مورچہ بند تھی۔

میں نے کہا "نازو، سامنے مت آنا۔"

ابھی الفاظ میرے ہونٹوں پر ہی تھے کہ مشین گن کی تڑتڑ سنائی دی۔ باتھ روم کا دروازہ چھلنی ہوگیا۔ میں نے بایاں ہاتھ باہر نکال کے اندازے سے تین فائر کئے۔ پیڈرو نے ایک شیطانی قہقہہ بلند کیا۔

رابعہ نے بدحواسی میں نازو کو پکارا "تم ٹھیک ہو؟"

نازو نے پیڈرو کی کاپی کرتے ہوئے جوابی قہقہہ مارا "چلانے دو انہیں گولیاں اور گولے۔"

میں نے کہا "دروازے کے سامنے مت آنا۔"

"میں پہلے بھی کب دروازے کے سامنے تھی" نازو نے جواب دیا۔

"سیب کیسا تھا؟" غالب نے آواز دی۔

میں نے کہا "تو کتنے دستی بم لایا ہے بھیجنے؟"

غالب کوئی دستی بم لے کر نہیں آیا تھا مگر اس نے میرے سوال کے مقصد کو سمجھتے ہوئے جواب دیا "صرف دو، ایک میرے پاس ہے دوسرا اگل کے پاس۔"

میں نے کہا "ایک تو میرے پاس بھی ہے۔ وہاں کوئی تار یا پتلی رسی ہے؟"

"دیکھتا ہوں" غالب نے جواب دیا۔

میں نے کہا "اگر بجلی کا تار ہو تو کام چل جائے گا۔"

"کام کیا ہے؟"

میں نے کہا "ڈوری کو دستی بم کی پن کے ساتھ باندھ دو، جتنا لمبا کرسکتے ہو کرلو۔"

"ساری کی ایک ہی پٹی چھ گز لمبی ہوگی۔ پتلی پتلی دو پٹیاں ملا کے بارہ گز کی ڈوری بن جائے گی۔"

"فائن۔ یہ کام کرلو تو مجھے اطلاع دو۔"

"فرض کرو کام ہوگیا۔"

"اب ذرا ہوشیاری سے یہ دستی بم تیسرے کمرے کے دروازے سے اندر پھینکنے کی کوشش کرو۔"

"اس کے لئے تو مجھے باہر نکلنا پڑے گا۔"

"صرف ہاتھ باہر نکالنے سے کام نہیں بنتا؟ میں کور کررہا ہوں تمہیں پیچھے سے۔ اگر کوئی تم پر فائر کرنے کے لئے نکلا تو مارا جائے گا۔"

"لیکن باس، میں بھی تو مارا جاؤں گا" غالب نے کہا۔

"اوکے، باہر مت نکلو۔ دستی بم کو دروازے کے جتنا قریب پھینک سکتے ہو پھینک دو۔ ڈوری اندازے سے اتنی ہی لمبی رکھو جتنا دروازے تک فاصلہ ہے۔ پھر ڈوری کو ایک جھٹکے سے کھینچو، پن نکل جائے گی مگر اس سے پہلے اپنے آپ کو محفوظ کرلینا۔"

"ہم دستی بم کے دھماکے کے بعد بچیں گے؟ جب عمارت ہی اڑ جائے گی؟"

میں نے کہا "بےوقوفی کی باتیں مت کرو، ایک دستی بم سے یہ عمارت نہیں گر سکتی۔ آر سی سی اسٹرکچر ہے۔ پچھلی طرف کے کمرے تمام محفوظ رہیں گے۔ زیادہ سے زیادہ فرش میں سوراخ ہوجائے گا، ہونے دو۔ یہ نیچے والے برآمدے کی چھت ہے۔ بم دروازے کے جتنا قریب گرے گا اتنا ہی کمرے کے اندر زیادہ تباہی پھیلائے گا۔"

"اگر تھوڑا سا آگے گر جائے۔ آپ کے قدموں میں اور آپ شہید ہوجائیں تو اس معمولی سی خطا پر ناچیز کو معاف فرمائیں گا، عالم ارواح میں پہنچنے کے بعد" غالب نے کہا۔

"ایسے مت پھینکنا جیسے سیب پھینکا تھا" میں نے کہا "سیب اور دستی بم میں بہت فرق ہوتا ہے۔"

"اچھا کیا آپ نے بتادیا" غالب نے کہا۔

چلا چلا کے میرا گلا درد کرنے لگا تھا مگر مجھے اپنی اسکیم کی کامیابی کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ پیڈرو کی خاموشی اس بات کا ایک ثبوت تھی۔ وہ بیچ میں نہیں بولا تھا اور اس نے ہمارا مذاق بھی نہیں اڑایا تھا۔ وہ ہر لفظ کو غور سے سن رہا تھا اور سمجھ رہا تھا۔ اسے یہ منصوبہ یقیناً ہر لحاظ سے قابل عمل محسوس ہوا ہوگا۔

اصل صورت حال اس کے برعکس تھی۔ دستی بم میرے پاس تھا اور اسے ہم اب تک بڑی حفاظت سے ساتھ لئے پھررہے تھے۔ غالب سے چیخ چیخ کر باتیں کرتے ہوئے میں نے پتلون کی بیلٹ کے ساتھ بک سے لٹکا ہوا دستی بم رابعہ کے حوالے کردیا تھا اور اسے اشاروں کی زبان میں سمجھا دیا تھا کہ جو ہدایات میں غالب کو دے رہا ہوں وہ درحقیقت اس کے لئے ہیں۔ رابعہ نے اپنی ساری کے نچلے حصے کے کنارے سے ایک انچ چوڑی پٹی میرے ساتھ ساتھ پھاڑ لی تھی۔ ایسی ہی دوسری پٹی اوپر والے کنارے سے پھاڑنے کے لئے اسے اپنی ساری کھولنی پڑی اور کچھ دیر وہ منہ دوسری طرف کئے صرف پیٹی کوٹ اور بلاؤز میں کھڑی رہی۔ معلوم نہیں دوسری پٹی نیچے سے نہ پھاڑنے میں کیا مصلحت تھی۔ شاید وہ نہیں چاہتی تھی کہ نیچے سے ساری زیادہ چھوٹی ہو۔

"پیڈرو!" میں نے چند منٹ انتظار کرنے کے بعد اسے آواز دی "وہ دس منٹ کی مدت تو بیس منٹ پہلے ہی ختم ہوگئی۔ اب ایک موقع اور دیتا ہوں تمہیں۔"

پیڈرو نے پھر وہی مصنوعی قہقہہ مارا۔ وہ اس طرح یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ اس کے اعصاب پر خوف کا کوئی اثر نہیں ہے جبکہ ہنسی کا کھوکھلا پن ہی اس کے جھوٹ کی قلعی کھولتا تھا۔

"اس کے بعد کیا ہوگا سکندر اعظم کی اولاد؟"

میں نے کہا "تمہیں معلوم ہوجائے گا۔"

اس نے مجھے ایک غلیظ گالی دے کر کہا "تم کچھ نہیں کرسکتے، کچھ کرو گے تو یہ بھی مارا جائے گا۔"

"یہ کون؟ اپنے چوہدری صاحب بھی تشریف لے آئے ہیں کیا؟"

"تمہاری ماں کا یار، محسن" پیڈرو نے چیخ کر کہا۔

اب میں نے اسے زیادہ بڑی گالی دی "تو کیا سمجھتا ہے ہمیں، ہم بےوقوف ہیں یا پاگل ہیں۔"

میں نے رابعہ سے آہستہ سے کہا "پلیز ڈونٹ مائنڈ، اس وقت میں ایسی ہی زبان استعمال کرنے پر مجبور ہوں۔ اسے ڈی مورالائز کرنے کے لئے۔"

رابعہ میرے کندھے پر سر ٹکا کے ہنسی۔

میں نے کہا "محسن ہے تمہارے پاس تو مجھے اس کی آواز سناؤ پیڈرو۔"

"صرف محسن ہی نہیں، اس کی بیوہ بھی ہے یہاں" پیڈرو نے سنسنی خیز گالیوں کے ساتھ جواب دیا "اس کا بچہ بھی ہے۔"

میں نے بھی بہت سی ناقابل اشاعت گالیاں لڑھکانے کے بعد کہا "تو پھر تو کسی سے بات کرادے میری، محسن سے یا اس کی بیوی سے۔"

"اگر کرادی پھر؟"

"پھر ابھی تیری جان بھی بچ سکتی ہے ان کے طفیل۔ ان سے کہہ بات کریں مجھ سے" میں نے کہا۔

یہ ٹرمپ کارڈ کام کرگیا۔ اس نے پیڈرو کے سارے پتے کاٹ دئے۔ پیڈرو کی کتے کی طرح بھونکنے والی زبان خاموش ہوگئی۔

میں نے کہا "پیڈرو، تیرے دن پورے ہوگئے۔ کل تمہارے ایک بہت اہم مہرے کی باری تھی۔ اس پولیس افسر کی جو سب سے بڑا غدار تھا۔ ملک کے علاوہ اس نے اپنے فرض اور قانون سے بھی غداری کی تھی۔ ڈی سلوا مارا گیا۔ خسرو جمشید مارا گیا۔ کل سراج مارا گیا۔ اب تیری باری ہے۔"

"تم مجھے نکل جانے دو" پیڈرو نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ "میں محسن اور شملا کو چھوڑ دیتا ہوں۔"

میں نے اس کے انداز میں قہقہہ مار کے کہا "کھیل ختم ہوگیا پیڈرو، ہمت ہے تو باہر نکل کے مقابلہ کرو اور بہادری کے ساتھ جان دو۔ ورنہ کسی شرط کے بغیر خود کو ہمارے حوالے کردو۔"

"تمہیں محسن اور شملا کی بھی فکر نہیں؟"

"نہیں۔ یہ شہادت کی موت ان کا مقدر ہے تو انہیں مبارک باد، تم صرف اپنی فکر کرو پیڈرو۔"

آخری کمرے کی طرف سے پھر مشین گن گرجی، اس کا نشانہ بننے والے نے موت کی دہشت بھری چیخ ماری۔ میں نے دروازے کی اوٹ سے جھانک کر دیکھا۔ دو افراد نے برآمدہ عبور کرکے نیچے کود جانے کی یا رسی کے ساتھ لٹک کر فرار ہونے کا ناکام ہوجانے والا منصوبہ بنایا تھا۔ زندگی کی امید سے مایوس ہوکے انہوں نے جوا کھیلا تھا اور بازی ہار گئے تھے۔ ان کی لاشیں پر رفت اونچی برآمدے کی دیوار پر پھڑک رہی تھیں۔ وہ درمیانی کمرے سے نکل کر بھاگے تھے جو غالب کے مقبوضہ کمرے اور پیڈرو کے کمرے کے بیچ میں تھا۔ شاید وہ ساری گفتگو سنتے رہے تھے اور یہ محسوس کرنے کے بعد کہ ان کے کمانڈر ان چیف کے لہجے میں شکست بولنے لگی ہے، انہوں نے اپنی زندگی کو داؤ پر لگادیا تھا۔ وہ جو بھی تھے، پیڈرو سے زیادہ بہادر اور جری تھے کیونکہ وہ ہتھیار ڈالنے کی ذلت قبول نہ کرسکے تھے اور مرنے کا حوصلہ رکھتے تھے۔

میں نے غالب اور گل کی ایک جھلک دیکھی۔ انہوں نے بڑی پھرتی سے پیش قدمی کی تھی جو میرے نزدیک ایک غیر ضروری پر خطر اور احمقانہ فعل تھا۔ وہ پیڈرو کی گولی کا نشانہ بھی بن سکتے تھے۔ لیکن نشانہ اس لئے نہیں بنے تھے کہ پیڈرو نے جنگ میں اپنی ہار تسلیم کرلینے کے بعد جارحانہ حکمت عملی ترک کردی تھی۔ اب وہ دفاع کی حد سے بھی پیچھے جاچکا تھا اور پسپا ہونے کے بعد جان بچا کے نکل جانے کی فکر میں مبتلا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا

کہ اس نے خود کو میرے حوالے کردیا تو اس کا انجام کیا ہوگا۔ اگر میں کبھی دلاور اینڈ کمپنی کے ہر مجرم کو معاف کرنے پر تیار ہوجاتا۔ جس کا بظاہر عقل و ہوش کوئی امکان نہ تھا۔ تب بھی ایک شخص کو معاف نہ کرتا۔ استاد پیڈرو کے لئے میری لُغت میں رعایت و معافی جیسے الفاظ ہی نہیں تھے کیونکہ وہ میرے والد وزیر خان مرحوم کا سفاک قاتل تھا اور میری زندگی کے سارے عذاب اسی کے نام سے شروع ہوتے تھے۔

غالب اور گل اب اگلے کمرے میں پہنچ چکے تھے۔ ان کے اور پیڈرو کے درمیان صرف ایک دیوار حائل رہ گئی تھی۔ اگر پیڈرو کے ساتھ کوئی اور بھی تھا تو وہ مرنے کے لئے تیار تھا۔ تاہم ان میں محسن، شہلا اور ان کا بیٹا شامل نہیں تھے۔ یہ بیک وقت حوصلہ افزا اور حوصلہ شکن خبر تھی۔ محسن کے بارے میں رابعہ کے بیان سے ہی شکوک پیدا ہوگئے تھے کہ ممکن ہے وہ نہ پکڑا گیا ہو۔ اس کے نہ پکڑے جانے کے امکانات کو رابعہ نے کم بتایا تھا مگر قسمت ساتھ دے تو امکانات نہ ہونے کے باوجود زندگی کی ناؤ خطرات کے پُر آشوب سمندر سے سلامتی کے ساتھ نکل جاتی ہے۔ شہلا اور اس کے بیٹے کی عدم موجودگی البتہ ایک مایوس کن بات تھی اور ان کے بارے میں کوئی قیاس آرائی کام نہیں آسکتی تھی کہ انہیں کہاں لے جایا گیا ہوگا۔

"پیڈرو!" میں نے چلا کے کہا "اب میں صرف تین تک گنوں گا، تم ہاں یا نہیں میں جواب دو۔ اپنے آپ کو ہمارے حوالے کردگے؟ ایک..."

پیڈرو نے چیخ کر کہا "نہیں...." اور مجھے گالیاں دینے لگا۔

"دو...." میں نے کہا۔

پیڈرو نے پھر کہا "نہیں" اس کی آواز میں دیوانگی اور جنون کی کیفیت اس شخص کے ذہن کی آئینہ دار تھی جو خودکشی کا فیصلہ کرچکا ہو۔

"تین" میں نے کہا۔

"نہیں، نہیں، نہیں" پیڈرو نے چلا کے کہا۔

میں نے غلیظ گالیوں کے طوفان کو نظرانداز کرتے ہوئے غالب کو آواز دی "آر یو ریڈی؟"

"میں تیار ہوں" غالب نے جواب دیا۔

"گل سے کہو خود کو محفوظ کرلے۔ اسے سمجھا دو۔"

"میں نے اسے بتادیا ہے۔"

"اوکے، بم پھینک دو" میں نے کہا۔

اس کے ساتھ ہی میں نے باہر نکل کے دستی بم اس کمرے کے دروازے پر پھینک دیا جس میں پیڈرو بند تھا۔ میری چال کامیاب رہی۔ وہ غالب کے کمرے کی طرف دیکھ رہا تھا اور اگر غالب باہر آتا تو پیڈرو اس پر مشین گن خالی کردیتا۔ دستی بم اس کے پیچھے آگرا۔ مجھے واپس کمرے میں جست لگانے کی مہلت مل گئی۔

ڈوری کی لمبائی میں نے اندازے کے مطابق رکھی اصل فاصلے سے دو تین فٹ زیادہ۔ ڈوری کا دوسرا سرا اپنے بائیں ہاتھ کی کلائی کے گرد لپیٹ لیا تھا۔ جب میں کی طرف چھلانگ لگائی تو اس کے ساتھ ہی میں نے جھٹکا دیا۔ جھٹکا شدید نہ ہوتا تو پن نہ نکلتی۔ دستی بم کھنچا چلا آتا۔

جب ڈوری کھنچ کر ڈھیلی پڑ گئی تو مجھے یوں لگا جیسے دستی بم جگہ پر موجود ہے۔ اس کی پن بھی نہیں نکلی ہے بلکہ ڈوری ٹوٹ گئی ہے۔ لمحے بھر کی یہ مایوسی ایک زبردست دھماکے سے ختم ہوگئی۔ میں اور رابعہ فرش پر کہنیوں کے بل الٹے لیٹے تھے اور ہم نے ہتھیلیوں سے دونوں کان بند کرلئے تھے۔

اندازے کو بنیاد بناتے ہوئے میں نے اپنے ساتھ موت کا سامان کرنے میں کسر نہ چھوڑی تھی۔ اگر یہ اندازہ غلط ہوجاتا اور دستی بم کے دھماکے سے نچلی منزل پر اسلحے کے ذخیرے میں چنگاری جاگرتی تو دوسرے دھماکے کے ساتھ ہی ایم آر ایس اور اس کا جرأت مندانہ مقدس مشن سب داستان ہوجاتے جسے سنانے والا صرف محسن کا خاندان ہوتا۔

دھماکے سے عمارت لرز گئی تھی لیکن نہ ہم پر اس کی چھت گری تھی اور نہ دیواریں۔ میں ایک دم اٹھا اور دروازے کی طرف لپکا۔ برآمدے میں دھوئیں اور گرد کا بگولا سا ٹھہرا ہوا تھا جس کے پار کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ نازو باتھ روم سے نکل کر میرے قریب آکھڑی ہوئی۔

میں نے چلا کے غالب کو آواز دی اور گل کو پکارا "تم ٹھیک ہے نا؟"

غالب کی آواز سن کے میں نے اطمینان کا سانس لیا "ہم ٹھیک ہے۔"

میں نے نازو سے کہا "نیچے جا کے مین سوئچ آن کردو۔"

نازو نے منمنا کے کہا "وہ... دراصل.... بجلی..."

میں اسے گالی دیتے دیتے رک گیا۔ زیادہ سے زیادہ اسے الو کی پٹھی کہتا۔ پھر وہی زنانہ کم عقلی کا خوف۔ دستی بم سے نہیں ڈری۔ بجلی کا مین سوئچ آن کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ لیور بھی کرنٹ مارتا ہے۔ میں نے خود نیچے جاتے ہوئے ایک بار پھر میں خون پر پھسل کے گرتے گرتے بچا اور لاشوں کے اوپر سے گزر کے سوئچ بورڈ تک گیا۔

میں لائٹ جلا کے لوٹ رہا تھا کہ اوپر سے مشین گن کی آواز آئی۔ یہ فائرنگ نازو نے کی تھی۔ میں تیزی سے اوپر پہنچا۔

"کیا ہوا؟" میں نے باہر ہی سے آواز دے کر پوچھا۔

"وہ بھاگ گئے، دونوں۔"

"کون دونوں؟ کیسے بھاگ گئے؟" میں نے کہا۔

نازو نے اشارہ کیا "نیچے کود گئے۔"

ادھر سے برآمدے کے فرش میں ایک شگاف پڑ گیا تھا جو پہلے سے برآمدے کا تھا "تم یہیں رہنا، میں دیکھتا ہوں" میں تقریباً دو فٹ قطر کا تھا اتنی ہی تیزی سے پھر نیچے جانے کے لئے تیزی سے اوپر آیا تھا۔ میں نے غالب کو برآمدے کے دوسرے کنارے پر دوڑا۔ اس کے ہاتھ میں بھی مشین گن تھی۔ گل ریوالور دانتوں میں پکڑے رسی کے سہارے نیچے پھسلنے کے لئے دیوار پر سے اتر رہی تھی۔ میرے پاس وقت نہیں تھا کہ میں اسے روکتا اور فرار ہونے کی کوشش کرنے والوں کی راہ میں حائل ہونے کے خطرات بتاتا۔ جان بچا کے بھاگنے والا کسی کی جان کی پروا نہیں کرتا۔

میں زینے کے راستے چند سیکنڈ بعد پہنچا۔ گل رسی پر سے پھسل کر براہ راست لینڈ کرچکی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں صورت حال کو دیکھتا اور سمجھتا، میرے کانوں نے ایک فائر کی آواز سنی۔ پھر گل کی چیخ سنائی دی اور میرا دل ایک لمحے کے لئے دھڑکنا بھول گیا۔

آخری زینے پر سے میں نے ان دونوں کو دیکھا جو زخمی ہونے کے باوجود چھت کے شگاف سے نیچے ٹپک گئے تھے۔ اتنی بلندی سے پکے فرش پر گرنے کے بعد ان کے لئے بھاگ جانے کی کوشش کرنا بھی ممکن نہ رہا تھا۔ وہ خود کو گھسیٹ کر گیٹ تک لے جانے کی دیوانہ وار جدوجہد کررہے تھے کہ انہوں نے گل کو نشانہ بنا کر زخمی کردیا۔ ان میں سے کسی نے بچی کچی ہمت سے کام لے کر اس کو شوٹ کردیا تھا۔ وہ اب فرش پر پڑی ہوئی تھی۔

میں نے اطمینان سے نشانہ لے کر ان دونوں کے سر پاش پاش کردئے۔ پھر میں گل کی طرف دوڑا۔

اوپر سے نازو نے چلا کے کہا "کیا اسے گولی لگ گئی ہے؟"

میں نے رک کر اس کے فضول سوال کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا اور گل کے پاس جا کے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ گولی اس کے بازو میں لگی تھی جس کے بعد وہ اپنی گرفت برقرار نہ رکھ سکی تھی اور سیدھی نیچے جاگری تھی۔ میرے لئے یہ اندازہ کرنا دشوار تھا کہ اس کی ہڈی پسلی سلامت ہیں یا نہیں مگر میں نے یہ ضرور دیکھ لیا کہ بازو سے گزرنے والی گولی نے ہڈی کو نقصان نہیں پہنچایا ہے۔ گولی بازو کے گوشت میں سوراخ کرتی ہوئی نکل گئی تھی یہ بھی اچھی بات تھی۔ گولی اگر گوشت میں ہی پھنسی رہ جاتی تو اسے نکالنا مشکل ہوتا اور اس سے بعد میں بھی زیادہ خرابی ہوتی۔

گل غالباً صدمے یا گولی لگنے کی دہشت سے بے ہوش تھی۔ میں نے دل ہی دل میں دعا مانگی کہ یہ بے ہوشی دماغ کی کسی اندرونی چوٹ کا نتیجہ نہ ہو۔ مجھے بالکل اندازہ نہ تھا کہ وہ کتنی بلندی سے نیچے گری تھی۔

"تم سب جاؤ" میں نے اپنے پیچھے نازو کی آواز سنی "میں اسے سنبھال لوں گی۔"

"میں تمہیں اوپر چھوڑ کے آیا تھا" میں نے دہاڑ کے کہا۔

"غالب ہے اوپر" اس نے میرے غصے کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا اور زمین پر بیٹھ گئی۔ بلاشبہ وہ ایک تربیت یافتہ نرس تھی مگر یہ ایسا کام نہیں تھا جو میں نہ کرسکتا۔ اس نے ڈیوٹی چھوڑ دی تھی۔ یہ ایک جذباتی حرکت تھی۔ میں نے اسے اور گل کو بعد میں اچھی طرح جھاڑنے کا فیصلہ کیا۔ دونوں کی حرکت غلط تھی۔ ایسے اگر ہر شخص سوچے سمجھے بغیر خود فیصلے کرنے لگا ہے تو پھر ایم آر ایس کو کسی کمانڈر کی کیا ضرورت ہے۔ بھاڑ میں گیا ڈسپلن اور ایسی کی تیسی منصوبہ بندی اور حکمت عملی کی۔

میں اوپر گیا تو مرزا غالب مشین گن کے ساتھ وہیں موجود تھے "گل ٹھیک ہے؟"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر یہ گل کو تم نے کیوں اجازت دی تھی؟"

"نہ میں نے اجازت دی تھی اور نہ اس نے مانگی تھی" غالب نے کہا۔

"تم اسے روک تو سکتے تھے۔"

"میں نے روکا بھی تھا، مگر اس سے پہلے ہی وہ اتر گئی تھی۔"

رابعہ نے کہا "کیا پیڈرو بھاگ گیا؟"

میں نے نفی میں سرہلایا "وہ کوئی اور تھے۔ پیڈرو اندر ہی ہوگا۔"

"گل... زیادہ زخمی تو نہیں ہے؟"

"نہیں۔ زندگی تھی بچ گئی۔ بازو میں گولی لگی تھی۔ پار ہوگئی، کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے" میں نے کہا "نازو پٹی باندھ رہی ہے۔ ابھی کچھ دیر میں ہوش آجائے گا۔"

میں نے غالب کو ہاتھ سے پیچھے ہٹ جانے کا اشارہ کیا اور ایک دم دوڑ لگائی۔ شگاف سے بچ کے میں اس دروازے کے سامنے سے گزرا جس کے پیچھے پیڈرو موجود تھا یا اس کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ مجھے اندر سے کسی گولی کے آنے کی امید ضرور تھی۔ تاہم زخمی حالت میں پیڈرو کے لئے اتنی تیزی سے فائر کرنا آسان نہ ہوتا۔ اس امید کے آسرے پر میں خود گولی کی طرح دروازے کے سامنے سے گزرا اور جھک کر دوسری طرف جاگرا۔ اگر میں سیدھا جاتا تو اس کھڑکی کے سامنے سے بھی گزرتا جس کے شیشے ہی نہیں ٹوٹے تھے پٹ بھی غائب ہوگئے تھے۔

پہلے کمرے میں جا کے میں نے فریج کھولا اور ٹھنڈا پانی پیا۔

"پیڈرو کا کیا بنا؟" غالب نے کہا۔

"ہوسکتا ہے کہ وہ مارا گیا ہو۔ یا صرف زخمی ہو" میں نے سکون کا گہرا سانس لیا۔ اب مجھے اپنے ذہن پر کوئی بوجھ محسوس نہیں ہوتا تھا۔ حسب توقع بستی کی طرف سے کسی نے مندر کے پیچھے بم بندوق کے خونی کھیل کو دیکھنے کے لئے گھر سے نکلنے کی ہمت نہیں کی تھی۔ مجموعی طور پر ہمارا مشن کامیاب رہا تھا۔ گل

اپنی حماقت سے زخمی ہوئی تھی۔ باقی سب خیریت سے تھے۔ ہم نے رابعہ کو برآمد کرلیا تھا۔ محسن کے بارے میں امید کی روشنی باقی تھی کہ شاید وہ اب ہمیں ڈھونڈتا ہوا آجائے۔ ممکن ہے باہر نکلتے ہی مل جائے۔

اب رات کے سوا تین بج رہے تھے۔ میں نے ابھی تک سگریٹ کی طلب محسوس ہی نہیں کی تھی۔ اب میرا ہاتھ جیب میں گیا اور میں نے ایک سگریٹ جلا کے طویل کش لیا۔ میں زیادہ پرسکون ہو کے آخری قدم اٹھانا چاہتا تھا۔

"اس کمرے میں کوئی ایسی چیز ہے جسے ہم ڈھال کے طور پر استعمال کرسکیں" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "بیڈ' صوفے' قالین۔"

میں نے نفی میں سرہلایا "پیڈرو کو اندر سے نکالنا ہے۔ اگر وہ زندہ ہے۔"

"اگر وہ بے ہوش ہے تو اسے بچانا بھی ہے۔"

"یہ تو اندر جا کے دیکھے بغیر معلوم نہیں ہوسکتا" میں نے کہا

رابعہ نے چلا کے کہا "کیا میں نیچے جاؤں؟"

وہ گل کو دیکھنے کے لئے بے قرار تھی' میں نے کہا "جاؤ' دونوں مل کے اسے برآمدے میں لٹا دو۔"

غالب نے کہا "اگر ہم کوئی جلتی ہوئی چیز اندر پھینک دیں؟

"اس سے کیا ہوگا؟" میں نے بے خیالی میں پوچھا۔

"آگ لگ جائے گی کمرے میں۔ وہ بے ہوش نہیں ہوگا تو آگ کو بجھانے کی کوشش کرے گا یا باہر نکلنے پر مجبور ہوگا۔"

مجھے یہ تجویز پسند آئی "آگ نچلی منزل تک تو نہیں پہنچ سکتی"

غالب نے کہا "نہیں۔ ایک ہی کمرے تک محدود رہے گی۔

"جلتی ہوئی کیا چیز پھینکی جاسکتی ہے؟" میں نے کہا۔

غالب نے بیڈ پر سے چادر کھینچ لی۔ پھر اس پر شراب کی بوتل خالی کرنے لگا۔ غالب کا دماغ اچھا کام کررہا تھا۔ شراب میں الکحل ہوتی ہے جو فوراً آگ پکڑ لیتی ہے۔ چادر سوتی تھی' اس نے شراب کو جذب کرلیا۔ غالب نے اس پر دوسری بوتل توڑ کے خالی کی۔ چادر شراب میں تر ہوگئی تو اس نے مجھ سے ماچس لی۔

کمرے سے نکل کے وہ گھٹنوں کے بل چلتا ہوا کھڑکی تک گیا

میں نے اپنے ریوالور کو تیار رکھا۔ اگر پیڈرو اچانک نمودار ہوتا تو اچانک مارا جاتا۔ غالب نے ایک کونے کو دیا سلائی دکھائی۔ چادر نے فوراً آگ پکڑلی۔ غالب نے بڑی مہارت سے اس کا گولا سا بنایا اور بغیر پٹ والی کھڑکی سے اندر پھینک کر واپس بھاگا۔ آگ کا ایک گولا کمرے کے اندر جاگرا تھا۔ میں نے اور غالب نے انتظار کیا۔ یہ ہوسکتا تھا کہ چادر جل کے راکھ ہوجائے۔ کمرے کا دوسرا سامان جلنے سے محفوظ رہے۔

چند منٹ بعد کمرے میں شعلوں کا عکس نظر آنے لگا۔ روشنی باہر بھی کم زیادہ ہو رہی تھی۔ آگ کمرے میں پھیل چکی تھی لیکن

ابھی تک کمرے میں خاموشی تھی۔ میں نے غالب کو ... نظروں سے دیکھا۔

"کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ جل کے مرجائے" غالب ... نیچے سے نازو نے چیخ کر کہا "یہ آگ کیسی ...

غالب نے نیچے جھانک کر کہا "اک آگ ... اندر لگی ہوئی۔ جو تم نے لگائی ہے مس نازو۔"

"بکومت" نازو نے ایک پتھر اٹھا کے پھینکا۔

"دوسری آگ خود ہم نے کمرے میں لگائی ...

"نظر کا نشانہ جب اچھا ہے تو پتھر سے کام کیوں ...

میں نے کہا "غالب' میں اندر جاتا ہوں۔"

غالب پیچھے ہٹ گیا "چلو' ایک ساتھ کودتے ہیں نمرود میں۔"

آگ بہت پھیل گئی تھی۔ اس کی روشنی اب ... رہی تھی۔ بجلی کے تار جل گئے تھے اور بلب پھٹ ... کمرے میں صرف آگ کا اجالا تھا۔ میں نے کھڑکی سے سر اٹھا کے جھانکا۔ پھر میں دروازے کے سامنے ... مجھے پورا یقین آچکا تھا کہ پیڈرو مرچکا ہے یا بے ہوش ہوا ہے۔ آگ سے ایک بیڈ جل رہا تھا اور بیڈ پر ... جل رہی تھی۔ گوشت کے جلنے کی بو میرے حواس ... ہوئی مگر میں خود پر جبر کرکے آگے بڑھا تاکہ اس لاش ... سے دیکھ سکوں۔ آگ کی حدت مجھے اپنے چہرے ... محسوس ہوتی تھی۔ کمرا بھٹی بنتا جارہا تھا اور شعلوں ... پردوں تک پہنچ رہی تھی مگر میں نے اس شخص کی ... جو جسمانی ساخت کے فرق کی وجہ سے بھی پیڈرو ... لیکن میں اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اطمینان کرلینا ... واقعی پیڈرو نہیں تھا۔ غالباً اسے ہی پیڈرو نے ... مارا تھا کیونکہ وہ باہر نکلنا اور ہم سے بات کرنا چاہتا تھا

غالب نے کہا "سکندر' یہ کیا کررہا ہے تو؟ ... آگ کی لپیٹ میں آجائے گا۔"

میں نے کہا "ابھی تک پیڈرو نہیں ملا' کہیں ... نہ گھس گیا ہو..."

"باتھ روم کہاں ہیں ان کمروں کے ساتھ" ...

اچانک میری نگاہ عقبی دیوار کی کھڑکی پر گئی۔ ... شیشے ٹوٹ چکے تھے اور باہر کی طرف لگی ہوئی گرل ... قریب جا کر دیکھنے سے مجھ پر انکشاف ہوا کہ شیشے ہی ... سے کھڑکی کے پٹ تک ٹوٹ گئے تھے اور باہر لگی ... لوہے کے ٹکڑوں کو ویلڈ کرکے بنائی گئی تھی' کئی جگہ ... تھی۔

نیچے فرش پر خون کی ایک لکیر تھی جو بالکل تازہ ... کھڑکی کے قریب ایک خاصے بڑے دھبے کی صورت ...

... میں نے گرل کو ہلایا تو وہ درمیان سے جھولنے لگی۔ ... جو ابھی تک چوکھٹ کے ساتھ مضبوطی سے ... ایک رسی بندھی ہوئی تھی۔ یہ رسی بیڈ شیٹ کو پھاڑ ... کو آپس میں گرہ دے کر بنائی گئی تھی۔ چھ چھ فٹ کی ... ایک ایک بالشت سے بھی زیادہ چوڑی تھیں چنانچہ اتنی ... کہ بہ آسانی ایک آدمی کا بوجھ سہار لیں۔

"وہ حرامزادہ نکل گیا" میں نے چلا کے کہا۔

غالب آگ سے بچتا ہوا ایک جست میں میرے پاس پہنچا ... مجھے اپنے ساتھ گھسیٹ کرلے گیا "پاگل ہوگیا ہے کیا؟ دیکھتا ... کتنی تیزی سے پھیل رہی ہے۔ جہنم میں جائے پیڈرو۔ ... قالین کو کھا رہی تھی۔ الماری میں کپڑے جل رہے ... آگ لگی ہوئی تھی۔ میں نے غالب کے ساتھ ... دھوئیں اور شعلوں سے بھرے ہوئے کمرے کو عبور کیا تو میرا دم ... ایک لمحے کے لئے مجھے یوں لگا جیسے میں چکرا کے گر ... غالب کھانس رہا تھا اور مجھے کھینچتا جارہا تھا۔ بیڈ پر جلنے ... لاش کی چراند اب ناقابل برداشت ہوگئی تھی۔ خدا کا نام ... میں نے ایک آخری جست لگائی اور برآمدے میں آگرا۔ ... ٹھنڈی ہوا میرے چہرے سے ٹکرائی۔

پھر رابعہ نے مجھے سنبھال لیا۔ اس نے میرے ماتھے پر سے ... صاف کیا اور مجھے کھینچ کرلے جانے کی جدوجہد کرنے لگی ... میرے وزن کو گھسیٹنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ یہ نیم بے ... مختصر وقفہ تھا۔ ہوش میں آتے ہی میں اٹھ کھڑا ہوا۔ نازو ... فرج میں سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکال لائی تھی اور غالب ... رہی تھی۔ غالب نے سر جھکا اور ہاتھ بڑھایا۔ اس ... نازو کے ہاتھ سے بوتل لے کر منہ سے لگائی اور پھر میری ... طرف بڑھادی۔ پیاس سے میرا حلق بھی خشک ہورہا تھا۔ چند ... گھونٹ پیتے ہی میری جسمانی توانائی بحال ہوگئی۔

ہم زینے کے راستے نیچے اترے۔ اوپر ہمارا کام ختم ہوچکا ... تھا اور اگرچہ اس معرکے میں کامیابی کا دعویٰ غلط نہ تھا مگر آخری ... وقت میں پیڈرو کے نکل جانے سے فتح کی خوشی میں احساس زیاں ... ہو رہا تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی تو چار بجنے میں دس منٹ باقی تھے۔

"مجھے پیڈرو کے ہاتھ نہ آنے کا بہت ملال ہے" میں نے کہا

غالب نے اقرار میں سرہلایا "شاید ہم نے دیر کی۔"

میں نے کہا "نہیں' تقدیر نے اس کا ساتھ دیا۔ دھماکے سے ... ٹوٹ گئی۔"

"میرا خیال ہے کہ گرل دھماکے سے نہیں ٹوٹی۔"

"پھر کیسے ٹوٹی؟"

"اس نے مشین گن کا راؤنڈ چلا کے توڑدی۔ فرار کا پورا ... منصوبہ اس عیار آدمی کے ذہن میں پہلے سے تھا" غالب نے کہا۔

"پھر اس نے اتنی دیر کیوں کی؟"

"شاید اس امید میں کہ اسے کوئی موقع مل جائے اور وہ ہمیں ختم کردے۔ اسلحے کے اتنے بڑے ذخیرے کو بچالے۔"

میں نے غالب سے اتفاق کیا "شاید یہی بات تھی۔ چادر پھاڑ کے اس طرف سے نکلنے کی تیاری وہ پہلے ہی کرچکا ہوگا۔ اس کی آخری وقت تک جاری رہنے والی جدوجہد کا مقصد اس ذخیرے کو بچانے کے سوا کچھ نہیں تھا۔"

"اس کوشش میں وہ زخمی بہرحال ہوا" غالب نے کہا۔

"ہاں۔ شاید اس چالاک آدمی نے یہ سمجھا کہ ہم اسے دھوکا دے رہے ہیں۔ ہم دستی بم پھینکنے کی حماقت نہیں کریں گے اس اقدام خودکشی کی اسے ہرگز امید نہ تھی۔"

"ہاں' یہ بہت خطرناک قدم اٹھایا تھا ہم نے' اس سے یہاں موجود اسلحے کا سارا ذخیرہ اڑ سکتا تھا" غالب نے کہا۔

"وہ دستی بم پھٹنے کے بعد فرار ہوا۔ جب وہ زخمی ہوچکا تھا۔ میرا خیال ہے وہ اسی کا خون تھا جو کھڑکی تک بہتا گیا۔"

"کھڑکی کے اوپر اور باہر کی طرف بھی تھا۔ بستر کی چادر کی رسی پر بھی تھا" غالب نے کہا "اس نے دو افراد کو روک رکھا تھا کہ فکر کی کوئی بات نہیں' ہم جب چاہیں گے ادھر سے نکل جائیں گے مگر ان کے حوصلے نے آخری وقت تک ساتھ نہیں دیا دستی بم کی بات سن کے ان کا نروس بریک ڈاؤن ہوگیا۔"

ہم برآمدے میں لیٹی ہوئی گل کے پاس بیٹھ گئے۔ وہ اب ہوش میں تھی۔ نازو نے اس کے بازو پر کس کے پٹی باندھی تھی مگر خون کا داغ پٹی پر بھی نظر آرہا تھا۔

"مبارک ہو" میں نے اس کے پاس بیٹھ کے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

وہ مجھے دیکھنے لگی "کس بات کی؟"

"گولی تمہارے دل میں نہیں لگی' جگر میں نہیں لگی' سر میں نہیں لگی۔ تمہاری ہڈی تک نہیں ٹوٹی۔ تمہاری اس خوش قسمتی پر تمہیں مبارک باد نہ دوں تو کیا کہوں۔"

وہ شرمندہ نظر آنے لگی "غلطی میں نے کی تھی۔"

"اس غلطی کا خمیازہ ہم سب کو نہیں صرف تمہیں بھگتنا پڑتا۔ جان تمہاری جاتی۔ خدا نے تمہیں دوسری زندگی دی ہے۔ مبارک باد تو مجھے بھی دینی چاہئے" غالب بولا۔

"میں واقعی بہت بے وقوف لڑکی ہوں" وہ رونے لگی۔

میں نے اس کے بالوں کو سہلایا "چلو چھوڑو' یہ بتاؤ تم چل سکتی ہو؟"

اس نے اقرار میں سرہلایا۔

غالب نے کہا "پیڈرو کس حد تک زخمی ہوا ہے۔ یہ معلوم ہوجاتا..."

"نہیں۔ اگر یہ معلوم ہوجائے تب بھی ہم اس کے پیچھے

نہیں جائیں گے۔ ہم کوئی رسک نہیں لے سکتے۔ اس کا کیا بھروسہ' نیچے اترتے ہی کہیں چھپ کر بیٹھ گیا ہو۔ اس امید میں کہ ہم نکلیں گے تو اسی گیٹ کی طرف سے۔ مشین گن ہے اس کے پاس۔"

نازو نے کہا "ہمارے پاس وقت بھی نہیں ہے۔"

"تم دونوں جاؤ" میں نے کہا "جس راستے سے ہم یہاں پہنچے تھے اسی راستے سے۔"

"تم لوگ کیوں ساتھ نہیں چلتے؟" نازو نے کہا۔

"فضول جرح مت کیا کرو" میں نے برہمی سے کہا "ہم تفریح کے لئے نہیں رک رہے ہیں۔ کچھ کام باقی ہے' وہ ختم کرکے آئیں گے۔"

"واپسی میں جتنی چھپکلیاں وغیرہ نظر آئیں ان سے الوداعی ملاقات کرلینا" غالب نے کہا "چیخ مارنے پر پابندی بھی ہٹالی گئی ہے۔"

نازو نے گل کو سہارا دیا "چلو جی' انہوں نے تو مذاق بنالیا ہے۔ ہم نہیں ڈرتے کسی سے۔"

"بھوت سے بھی نہیں؟" غالب نے کہا۔

"ایسی کی تیسی بھوت کی" نازو نے کہا۔

"بھوت کی بچی' سوچ سمجھ کے بولا کرو' میرا سسر بھی بھوت ہے" غالب نے کہا۔ مگر وہ تینوں روانہ ہوچکی تھیں۔ ہم نے انہیں پہلے شگاف تک ساتھ جاکے سی آف کیا۔ پھر میں اوپر گیا اور وہ ساری اٹھالایا جو نازو نے اتار کے غالب کی طرف پھینکی تھی۔ ہم نے مل کے اس کی پتلی پتلی پٹیاں بنانا شروع کیں۔ ہر پٹی تقریباً دو انچ چوڑی تھی۔ ہم چھ گز لمبی پٹیوں کو آپس میں جوڑتے گئے۔ چار پٹیاں مل کے چوبیس گز لمبی رسی بن گئی۔ ایسی ہی ایک رسی غالب کے پاس تھی۔

"میرا خیال ہے کہ اتنی لمبائی کافی ہوگی۔"

غالب نے احاطے کا جائزہ لیا "ہاں۔ وتر کی صورت میں آخری غسل خانے تک کا فاصلہ کم ہوگا۔"

"ایک رسی کچھ لمبی ہونی چاہئے۔"

"میں نے پانچ پٹیاں جوڑی ہیں" غالب نے کہا "تیس گز سے کچھ کم لمبائی ہوگی۔"

"کم کیوں ہوگی؟"

غالب نے کہا "ہر ٹکڑے کا تقریباً چھ انچ حصہ گانٹھ باندھنے میں کم ہوگیا ہے۔"

"گانٹھیں مضبوط لگائی ہیں نا؟"

غالب نے اقرار میں سرہلایا اور بولا "میں اندر جاتا ہوں۔"

"کون سے گودام میں؟"

"درمیان والے" غالب نے کہا "دستی بم اسی میں تھے۔ مجھے یاد ہے۔"

"چل پھر میں بھی وہیں سے ایک لے لیتا ہوں۔ کسی اور چکر میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔"

ہم دونوں برآمدے سے گزر کے گودام تک گئے۔ بوریوں کی دیوار کے پیچھے ایک کھلی ہوئی پیٹی میں چار... طرح چھپائے گئے تھے کہ اوپر لائف بوائے صابن بھرا ہوا... میں ایک دستی بم لے کر باہر گیا اور چوتھے ٹرک کے نیچے گھس کر... دستی بم کو میں نے پیٹرول ٹینک پر باندھا اور اس کی مضبوطی... آزمانے کے لئے ہلا کے دیکھا۔ بم اب اپنی جگہ سے ایک... ادھر ادھر نہیں ہوسکتا تھا۔ پوری طرح مطمئن ہوجانے... میں نے پن کے گرد حلقہ بنا کے گرہ لگائی اور پوری طرح... اب میں باقی ڈوری کو احتیاط کے ساتھ نیچے سے نکال کر... میں نے اس بات کا خاص خیال رکھا تھا کہ جب میں... سے ڈوری کھینچوں تو وہ کسی چیز میں اڑ کر نہ ٹوٹے۔

غالب نے اپنا کام مجھ سے پہلے ہی ختم کرلیا تھا اور وہ... ڈور ہاتھ میں تھامے کھڑا ہوا تھا۔ ہم ڈور کے لچھے کو کھولتے... اور پیچھے ہٹتے گئے۔ احاطے کے میدان سے گزر کے ہم آخری... خانے تک پہنچے جو مندر کی عقبی دیوار کی طرف سے پہلا... خانہ تھا۔ اس کا دروازہ بند تھا۔

میں نے دستک دے کر کہا "ہیلو' ہیلو' ہیلو۔ خواتین..."

"کیا وہ ابھی تک سفر میں ہیں؟" غالب نے کوئی جواب نہ ملنے پر کہا۔

"ہم نے انہیں بہت پہلے رخصت کیا تھا اور سفر اتنا تو... بھی نہیں تھا" میں نے کہا۔

"یار وہ ایک ایک اینٹ نکال رہی ہوں گی" غالب نے...

"اب اس احتیاط کی کیا ضرورت ہے۔ دھکا دے کر... اینٹوں کو گرادیں جو ہم نے ایسے ہی واپس چن دیں تھیں۔"

"میں دیکھتا ہوں وہ کہاں' کس منزل پر ہیں" غالب نے... اور دوسرے غسل خانے پر دستک دی۔

"کیا مصیبت ہے" نازو نے چلا کے کہا۔

"ساری عمر گلے پڑنے والی مصیبت ہے" غالب نے... دروازہ کھولو۔"

"دماغ خراب ہے کیا۔ دروازہ باہر سے بند ہے" نازو... آواز آئی۔

"اچھا" غالب نے کہا "خفا ہونے کی کون سی بات ہے... میں' پیار سے بھی تو بتا سکتی ہو۔"

میں نے کہا "یار ہم نے بھی خود کو احمق ثابت کر دیا..."

"واقعی' دروازے تو سب باہر سے بند ہیں" غالب نے... صرف کنڈیاں لگی ہوئی ہیں۔"

میں نے زنگ اور گرد و غبار سے جام ہوجانے والی کنڈی... تھوڑی سی کوشش سے کھول دیا۔ اندر وہ تینوں اندھیرے... ایک دوسرے سے چٹی ہوئی کھڑی تھیں۔

"آگے چلو' یہاں کیوں جام ہوگئی ہو" میں نے کہا اور آخری دیوار میں رکھی ہوئی اینٹوں کو دوسری طرف گرادیا۔ وہ تینوں باری باری اس آخری شگاف سے گزر گئیں تو ہم بھی اپنی اپنی ڈور سنبھالے پھر مندر کے احاطے میں طلوع ہوئے۔

"تم لوگ جاؤ' راما راؤ کے کوارٹر کی طرف لیکن ہمارے آنے تک اندر مت جانا" میں نے کہا۔

"دھماکا بہت شدید ہوگا۔ دیوار سے دور رہنا۔ کھلی زمین پر پیٹ کے بل لیٹ کر کانوں میں انگلیاں دے لینا۔"

"سب معلوم ہے ہمیں' سول ڈیفنس کا کورس کیا تھا میں نے" نازو نے کہا "تم اپنا خیال رکھنا۔"

"رخصتی کے وقت ایسی جذباتی باتیں مت کرو' مجھ پر رقت طاری ہوجائے گی" غالب نے کہا "اب کے ہم بچھڑیں تو شاید بھوت بن کر ملیں۔"

"ایک عرض میری بھی ہے" میں نے کہا "مس رابعہ!"

رابعہ رک گئی "کیا بات ہے؟"

"آخری بار مسکرا کے دیکھ لو نا کہ..."

"سکندر' ایسی باتیں کروگے تو میں نہیں جاؤں گی" رابعہ چلائی۔

نازو نے اسے کھینچ لیا "بکنے دو انہیں۔"

میں نے ان کے دور جانے کے بعد کہا "ریڈی؟"

غالب نے کہا "سکندر' محسن کہیں آس پاس ہی نہ ہو۔"

میں نے کہا "ہم اسے خدا کی امان میں دیتے ہیں اور کیا کرسکتے ہیں ہم۔"

"وہ سور کا بچہ پیڈرو قریب ہی چھپا ہوگا تو مارا جائے گا۔"

میں نے کہا "نہیں' اسے اچھی طرح اندازہ ہوگا کہ ہم بعد میں کیا کریں گے۔ وہ محفوظ فاصلے پر پہنچ کے رکے گا۔"

"ہم محفوظ فاصلے پر نہیں ہیں" غالب بولا۔

"ہاں' تیس چالیس گز کچھ نہیں ہوتے۔ مگر ہم اور کتنی دور جاسکتے ہیں" میں نے کہا۔

"کاش ہم مل جاتا تو کام آسان ہوجاتا۔"

"مل جاتا' اگر ہم تلاش کرتے لیکن مسئلہ وقت کی کمی کا ہے' ہمیں یہاں سے نکلنا بھی ہوگا۔"

"ٹھیک ہے پھر" غالب نے کہا "ون' ٹو' تھری۔"

ہم رسی پکڑ کے بھاگے۔ رسی میں خاصی لچک بھی تھی۔ دستی بم پن نکلنے کے پانچ سیکنڈ بعد پھٹتا ہے۔ پانچ سیکنڈ میں ہم تقریباً حد کے باہر والے راستے تک پہنچ گئے تھے۔ جب دھماکا ہوا تو ہم منہ کے بل گر گئے۔ پہلا دھماکا باہر ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی دوسرا دھماکا ہوا۔ پھر زمین پر قیامت آگئی۔ پے درپے ہونے والے دھماکوں نے زمین آسمان کو تہ وبالا کردیا۔ میرے کان سن ہوگئے۔ ہر گودام میں رکھا ہوا اور ہر ٹرک میں رکھا ہوا تمام آتش گیر مادہ الگ الگ دھماکوں سے اڑتا جارہا تھا۔ یہ ایک "چین ری ایکشن" تھا۔ ایک بم سے دوسرا بم پھٹ رہا تھا۔ گولیاں پھٹ رہی تھیں اور شاید ڈائنامائیٹ سے عمارت گر رہی تھی۔ میں نے جو بم فیول ٹینک پر باندھا تھا اس نے ٹینک کو پیٹرول بم کی طرح پھاڑا ہوگا اور آگ نے ہر ٹرک تک چنگاری پہنچادی ہوگی۔ میں نے سر اٹھا کے دیکھا تو عجیب منظر تھا۔ آگ اور دھوئیں کا بادل اوپر اٹھ رہا تھا۔ اس میں سیکڑوں ہزاروں چھوٹے بڑے پتھر اور ریزہ ریزہ ہوجانے والے ٹرکوں کے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ میری نظروں کے سامنے ہنومان جی کے مندر کا بالائی حصہ ٹوٹ کر جھکا اور اس کے ساتھ ہی باقی عمارت منہدم ہوگئی۔ دھواں مٹی کا ایک اور بگولا اٹھا۔ بستی کی طرف شور محشر بپا تھا۔ غالباً دھماکے نے بہت سے گھروں کی دیواریں شق کردی ہوں گی۔ کچی دیواریں اس دھماکے سے لرز کے زمیں بوس ہوگئی ہوں گی۔ کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ گئے ہوں گے۔

چند منٹ بعد جب یہ طوفان تھما اور ختم ہوئی بارش سنگ تو میں نے اٹھ کے غالب سے ہاتھ ملایا۔ بہت عرصے کے بعد خدا نے پھر ہمیں سرخرو کیا تھا اور ہم نے آلام و مصائب کے بعد ایک بہت بڑی کامیابی کا انعام پایا تھا۔

"ایسی کی تیسی چوہدری دلاور کی اور تریویدی کی" غالب نے قہقہہ مار کے کہا۔

"بڑے شکاری بنے پھرتے ہیں" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ خوشی ایسی تھی کہ میں قہقہے لگانا چاہتا تھا۔ ایسے کہ ساری دنیا سنے۔ میں رقص کرنا چاہتا تھا اور قلابازیاں کھانا چاہتا تھا۔ کامیابی کی اس منزل تک پہنچنے سے پہلے ہم نے بہت انتظار کیا تھا اور بہت دکھ جھیلے تھے۔ ذہنی و جسمانی اذیت برداشت کی تھی اور جلاوطنی قبول کی تھی۔

غالب کے ساتھ میں گل اور نازو کی طرف گیا۔ وہ بھی دمکتے چہروں کے ساتھ اس طرف دیکھ رہی تھیں جہاں ایک آتش فشاں پھٹ چکا تھا اور اس کی تباہ کاری نے دشمنوں کے ایک ٹھکانے کا وجود حرف غلط کی طرح مٹادیا تھا۔ ان کی لاشیں بھی ریزہ ریزہ ہوکے خاکستر ہوگئی تھیں اور وہ عمارت جس میں انسانیت کے خون کی گرم بازاری کے شوق اور کاروبار میں مبتلا ہوس زر کے سوداگر موت کا سامان بیچتے تھے' صفحۂ ہستی سے ایسے نیست و نابود ہوچکی تھی جیسے پہلے بھی حق کی قوتوں کے سامنے باطل کی خدائی کے دعوے داروں کا غرور خاک میں ملتا رہا ہے۔

غالب نے کہا... "یہ کروڑوں کا نقصان تو ہوگا..."

"کروڑوں کا نہ سہی... لاکھوں کا تو ہے" نازو نے کہا۔

میں نے کہا "لاکھوں کا تو ایک خالی ٹرک ہوتا ہے... یہ سات ٹرک تھے۔ ان پر لدا ہوا اسباب خونریزی الگ تھا۔ پھر یہ عمارت اور اس کے اندر بھرا ہوا سامان قتل۔"

غالب نے کہا "سب ملا کے کروڑ کا تو ہوجائے گا۔"

"اسے پیمانہ زر کی قدر و قیمت سے مت دیکھو۔ متاعِ جاں کا کوئی مول نہیں۔ یہ سوچو کہ ہم نے کتنی زندگیوں کے چراغ روشن رکھے۔ کتنے گھروں اور کتنے خاندانوں کا نام و نشان مٹنے نہیں دیا۔ کتنے بچے یتیم ہونے سے رہ گئے اور کتنی عورتوں کا سہاگ نہیں اجڑا۔ یہ سب اسلحہ ضمیر فروشوں کی تجوریاں بھرتا مگر اس سے ہزاروں' شاید لاکھوں انسان' جن کا جرم صرف حب الوطنی ہے اور ایمان برحق ہے۔ لقمۂ اجل بنتے' زخمی ہوتے اور معذور ہوتے۔"

"جن میں بوڑھے اور بچے بھی شامل ہوتے۔ عورتیں بھی ہوتیں۔"

"ہم انہیں نہیں جانتے مگر وہ ہم جیسے ہیں' ہمارے ہم وطن اور ہم مذہب ہیں" میں نے کہا "نہ ہم نے ان پر احسان کیا۔ نہ ہم نے کوئی کارنامہ سرانجام دیا۔ بس خدا نے ہمیں وسیلہ بنایا اور توفیق دی۔ ہم نے وہ کیا جو ہمارا فرض تھا۔ جو ہمارے ضمیر نے کہا"

راماراؤ اندھیرے میں بڑے مشکوک طریقے پر چلتا ہوا ہماری طرف آیا "کون..... یہ تم لوگ ہو؟" اس نے کہا۔

"ہاں راماراؤ' یہ ہم ہیں۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں" میں نے انگریزی ہی میں جواب دیا۔

رابعہ نے کہا "یہ کون ہے؟"

میں نے کہا "اس مندر کا پروہت' مدراسی ہے۔ اردو ہندی روانی نہیں بول سکتا اس لئے انگریزی میں بات کرتا ہے"

"تم لوگ یہاں کیوں کھڑے ہو؟" اس نے قریب آ کے پروحشت آواز میں کہا "او مائی گاڈ!"

"اور کیا کرنا چاہئے ہمیں؟" میں نے کہا۔

"تم کو بھاگ جانا چاہئے۔ ایک منٹ ضائع کئے بغیر" وہ بولا۔ "کیا تم دیکھ نہیں رہے ہو کہ تم نے کیا کر دیا ہے۔ یہ سب دھماکے تم ہی کر رہے تھے نا؟ جتنی فائرنگ ہوئی تم نے کی؟"

میں نے کہا "یہ آتشبازی کا شوق بہت پرانا ہے۔"

"ساری بستی میں ہر شخص یہ سمجھ رہا ہے کہ آج رات دنیا کا خاتمہ ہو جائے گا۔ صبح تک کچھ نہیں بچے گا۔ عورتیں اور بچے سب رو رہے ہیں۔ مرد خوف کے مارے باہر نہیں نکلتے۔ لوگ پوجا میں مصروف ہیں۔ اپنے اپنے گناہوں کی معافی مانگ رہے ہیں اور تم یہاں کھڑے ہنس رہے ہو اور مذاق کر رہے ہو" اس نے برہمی سے کہا۔

میں نے کہا "ہم اس کھیل کے عادی ہیں۔"

"لیکن دوسروں کے لئے یہ کھیل نہیں ہے" اس نے چلا کے کہا "قتل و خونریزی ہے۔ تباہی و بربادی ہے۔ انسانوں کو آخر کیا سمجھتے ہو تم؟ انسانوں کی جان لینا کھیل ہے؟"

"جو مارے گئے وہ انسان نہیں شیطان تھے۔ ان کے چہرے انسانی تھے مگر ان کے اعمال..."

"دیکھو فضول باتوں میں وقت ضائع مت کرو۔ جن کو تم شیطان قرار دے رہے ہو' وہ کسی نہ کسی کے شوہر' بھائی ضرور تھے اور جو کسی سے خون کا رشتہ رکھتے ہیں وہ انہیں اور تم کو ان کا قاتل سمجھتے ہیں اور کچھ نہیں۔ اور اب تم نے بھگوان کا مندر بھی گرا دیا ہے۔ بھگوان نے کیا بگاڑا تھا"

میں نے کہا "جب کہیں سیلاب آتا ہے یا بم گرتا ہے تو صرف گھر ہی نہیں عبادت گاہیں' اسپتال اور اسکول بھی گرتے ہیں۔ شریف اور بے گناہ' معصوم اور بے خطا بھی مارے جاتے ہیں۔ ہم ہر مذہب کی عبادت گاہ کا احترام کرتے ہیں۔ قصور وہ ہیں جنہوں نے بھگوان کے گھر میں اپنے پاپ کا کاروبار کیا۔ اگر مندر کے ساتھ اناتھ آشرم بھی رہتا تو یہ تباہی کہاں آتی"

"میں سمجھتا ہوں کہ تم بے وقوف ہو جو اس وقت یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہو کہ قصوروار کون ہے۔ لوگوں کی نظر میں پاپی تم ہو جس نے بھگوان کا گھر گرایا اور جس نے قتل کئے۔ تمہاری دلیل سے کون قائل ہوگا۔ کون سنے گا تمہاری بات؟ کسی عدالت میں بھی تم اپنی بے گناہی ثابت نہیں کر سکتے' خواہ وہ عدالت بالکل غیر جانب دار ہو۔ یہ معاملہ ہے جذبات کا۔ اس سے پہلے کہ لوگ مشتعل ہو کے بدلہ لینے کے لئے اکٹھے ہو کے نکل آئیں یہاں سے دور چلے جاؤ۔ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ میرے سوا تم کو کسی نے نہیں دیکھا۔ میں کوئی مذہبی آدمی نہیں ہوں۔ ورنہ سب سے پہلے میں ہی تم کو مار ڈالتا لیکن میری پوزیشن پر غور کرو۔ میں تم کو مزید پناہ دینے کا رسک نہیں لے سکتا۔ میری عزت' میرا کاروبار' میری زندگی سب خطرے میں ہیں۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے راماراؤ' ہم جا رہے ہیں۔ یہ بتا دو کہ کون سا راستہ ہمارے لئے محفوظ ہوگا۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "میں سمجھتا ہوں کہ تمہارے لئے خطرہ ہر طرف موجود ہے۔ چاروں طرف سے پولیس نے گھیر رکھا ہے۔ ان کو یقین ہے کہ تم چار پانچ میل کے اندر ہی موجود ہو۔"

"پھر وہ آئے کیوں نہیں؟ یہ آوازیں تو سنی ہوں گی انہوں نے۔"

"ضرور سنی ہوں گی۔ شاید انہوں نے ناکافی اسلحے کی وجہ سے مقابلے پر آنے سے گریز کیا لیکن گودام میں ریوالور اور اسٹین گن سے ہونے والی فائرنگ کی اطلاع انہوں نے آگے تک پہنچا دی ہوگی۔ جدید اسلحے سے لیس پولیس اور پیرا ملٹری فورس روانہ کر دی گئی ہوگی۔ یہ جو اسلحہ تباہ کیا ہے تم نے اس کی آواز تو دس دس کوس تک سنی گئی ہوگی۔ میں کہتا ہوں خدا کا شکر کرو کہ تم خود زندہ بچ گئے ہو۔ ابھی تک مسلح دستے نہیں پہنچے اور رات باقی ہے۔ اندھیرے سے فائدہ اٹھاؤ اور نکل جاؤ ورنہ تمہارا انجام بہت برا ہوگا۔"

نازو اور گل کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ راماراؤ کی باتوں نے ان کی ساری خوشی کو پریشانی میں بدل دیا تھا۔

رابعہ نے کہا "تم نے بالکل صحیح مشورہ دیا ہے۔ ہم ابھی چلے جاتے ہیں۔ ہماری تھوڑی سی مدد اور کر دو۔"

"اور اب کیا چاہئے تمہیں؟"

رابعہ نے کہا "مجھے اپنے جیسے کپڑے لا دو۔ ہم دونوں کے لئے اور لڑکی کے لئے ایک ساری' جو پولیس کی وردی میں ہے۔"

"اس لڑکی کی ساری کہاں گئی جو میں نے دی تھی؟" وہ بولا۔

"وہ ساری ضائع ہو گئی' آگ لگ گئی تھی اس میں" میں نے کہا۔

وہ بولا۔ "اچھا' میرے ساتھ آؤ۔ جلدی کرو' صبح نہ ہو جائے کہیں۔"

راماراؤ نے مجھے اور غالب کو سفید دھوتیاں دیں اور سفید کرتے۔ اس نے ہمارے ماتھے پر تلک بھی لگایا اور ہمیں اپنی پرانی چپل اور ایک کھڑاؤں دی۔ نازو کو ایک اور پرانی ساری مل گئی۔

"ادھر سڑک کی طرف مت جانا" اس نے کہا "اگر پولیس اسلحے سے لیس ہو کے آئے تو ادھر ہی سے آئیں گے۔ مخالف سمت میں کھیتوں سے نکل جاؤ۔ ان لڑکیوں سے کہنا گھونگٹ نکالے رکھیں۔ کوئی ملے تو کہہ دینا کہ ہنومان جی کے مندر جانا تھا مگر ادھر تو لگتا ہے یدھ ہو رہی ہے۔"

"یدھ کیا؟" نازو نے کہا۔

"لڑائی' جنگ۔" میں نے کہا۔

"ادھر کوئی گاؤں ہے۔ کسی نے پوچھا کہ ہم کہاں کے رہنے والے ہیں تو کیا بتائیں؟"

"ادھر "مانی مراد" ہے اور "پوری بان" ہے" اس نے ہمارے ہاتھ میں پیتل کی تھالیاں اور ایک گڑوی پکڑا دی۔

رابعہ نے کہا "کچھ کھانے کو ہے تو لا دو۔"

راماراؤ نے سر پر ہاتھ مارا "تم جانتے ہو کہ کھانا میں خود نہیں پکاتا۔ یہاں پھل ہیں اور مٹھائی ہے۔ یہی لے جاؤ۔ اب جاؤ۔"

رابعہ نے پھل اور مٹھائیوں کا تھیلا پکڑ لیا "تمہارا احسان ہم کبھی نہیں بھولیں گے۔"

"اپنے ہندوانہ نام یاد رکھنا۔ کچھ بھی بتا دینا' اگر کوئی پوچھے مجھے کچھ مت بتانا۔ اس لڑکی کو میں نے پہلے نہیں دیکھا۔"

"یہ دھرم پتنی ہے میری' پریتما" میں نے کہا "کیسا نام ہے؟"

راماراؤ نے رابعہ کی طرف دیکھا جو سخت جز بز ہو رہی تھی مگر مسکرانے پر مجبور تھی۔

"اچھا ہے' ایسا ہونا بھی چاہئے اس کا نام" وہ بولا "آؤ ادھر سے نکل جاؤ' پیچھے سے۔"

رابعہ نے کہا "راستے میں شیر چیتے تو نہیں ملیں گے؟ ندی پہاڑ تو نہیں آئیں گے؟"

"ایک برساتی ندی آئے گی۔ ایک ڈیڑھ میل کے فاصلے پر... اس کے کنارے چلتے جاؤ گے تو محفوظ رہو گے۔ ندی دو پہاڑوں کے بیچ سے گزرتی ہے۔ سیدھے ہاتھ پر "مانی مراد" ہے۔ الٹے ہاتھ پر "پوری بان""

باقی سب لوگ آگے روانہ ہو گئے تھے۔ میں بھی ہاتھ ملا کے چلنے ہی والا تھا کہ مجھے ایک بات یاد آ گئی "راماراؤ' آج کوئی ہمارے بارے میں معلوم کرنے تو نہیں آیا تھا۔"

"تمہارے بارے میں پولیس سب سے معلوم کرتی پھر رہی ہے۔"

"میرا مطلب تھا' کوئی ہم جیسا' ہمارا ایک ساتھی بچھڑ گیا ہے۔"

"وہ... وہ تمہارا ساتھی تھا؟" اس نے پھر سر پر ہاتھ مارا۔

"کیوں کیا ہوا؟"

"وہ پوچھتا پھر رہا تھا تمہیں۔ اس نے نام تو نہیں لیا تھا تمہارا لیکن لوگوں کو شک ہو گیا تھا۔ انہوں نے اس کو پولیس کے حوالے کر دیا تھا۔"

"پولیس کے حوالے کر دیا تھا!" میں نے ڈوبتے دل کے ساتھ کہا "پولیس اسے کہاں لے گئی ہوگی؟"

راماراؤ نے نفی میں سر ہلایا "یہ تو مجھے نہیں معلوم۔"

"اچھا دیکھو' اگر اس کے بارے میں کچھ پتا چلے... کہ پولیس نے اس کو کہاں رکھا ہے... تو معلوم کرنا' میں کسی روز رات کو آ جاؤں گا تم سے پوچھنے۔"

اس نے سپاٹ لہجے میں کہا "میں ایک بات صاف بتا دوں۔ آج کے بعد میں نے تم کو دیکھا تو میں وہی کروں گا جو ایک اصلی پروہت کرتا۔ جتنا میں نے کیا اس سے زیادہ کی توقع بالکل مت رکھو۔ مجھے بھی زندگی عزیز ہے اور اگر تمہیں بھی جینا ہے تو پھر ادھر کا رخ مت کرنا۔ میں کوئی مروت لحاظ نہیں کروں گا' سمجھے" اس نے دھڑ سے دروازہ بند کر دیا۔

مجھے افسوس ضرور ہوا لیکن میں نے اس کی حرکت کا برا نہیں مانا۔ اس کی قوتِ برداشت ختم ہو گئی تھی۔ اس کا نروس بریک ڈاؤن ہو چکا تھا۔ وہ احساسِ جرم کے ردِ عمل کا شکار تھا۔

"کیا کہہ رہا تھا راماراؤ؟" غالب نے کہا۔

"کچھ نہیں' کہہ رہا تھا کہ جلد از جلد چلے جاؤ اور پھر کبھی ادھر کا رخ نہ کرنا" میں نے محسن کے بارے میں اس کی فراہم کردہ اطلاع کو فی الحال چھپا لیا۔

ہم گاؤں کی بیرونی حدود سے بھی دور دور رہتے ہوئے راماراؤ کے سمجھائے ہوئے راستے پر چلتے گئے۔ میری گھڑی میں چار بج کے بیس منٹ ہو رہے تھے اور میرے اندازے کے مطابق پانچ بجے صبح صادق کے آثار نمودار ہو سکتے تھے چنانچہ ہم نے اپنی

رفتار تیز رکھی۔ چپل غالب کے پاؤں میں تھی۔ کھڑاؤں میں نے پہن رکھی تھی جو پتھروں پر زیادہ آواز کرتی تھی۔ مجھے اس کے ساتھ چلنے میں خاصی دشواری بھی پیش آرہی تھی مگر خطرے کا احساس مجھے مجبور کرتا تھا کہ میں چھوٹی چھوٹی تکلیفوں کو نظرانداز کردوں۔ چالیس منٹ میں ہم دو میل دور جاسکتے تھے۔

بستی پر ایک پُر آسیب سناٹے کی حکومت تھی جس کو کبھی کبھی اچانک بلند ہونے والی نالہ وشیون کی صدا منتشر کردیتی تھی کسی گھر میں کوئی عورت چیخ مار کے رونے لگتی تھی۔ پھر اس کے ساتھ دوسری آوازیں مل کے ماحول کو زیادہ سوگوار اور ماتمی بنادیتی تھیں۔ بستی سے بالکل الگ تھلگ ایک گھر کے باہر دو چارپائیوں پر دو بوڑھے بیٹھے حقہ گڑگڑا رہے تھے۔

میں نے اور غالب نے گزرتے گزرتے ہاتھ جوڑ کے انہیں پرنام کیا۔

"نمستے' خوش رہو" ان میں سے ایک نے کہا "تم کہاں نکل آئے اس سمے عورتوں کے سنگ۔"

میں نے کہا "ہنومان جی کے مندر جانا تھا۔ ادھر تو یدھ کا سماں ہے۔ واپس جارہا ہوں۔"

"کل سے پتا نہیں کیا ہورہا ہے یہاں" دوسرے نے کہا کل رات دھائیں دھائیں ہوتی رہی۔ بالک رام کی حویلی پر ڈاکا پڑا۔ آج سنا ہے گودام لوٹ لیا۔"

"گودام لوٹ لیا! انہی ڈاکوؤں نے؟" میں نے دلچسپی سے کہا۔

"اور کون ہوگا۔ سارا دن پولیس نے کچھ نہیں کیا۔ گھروں میں گھس کر دیکھتے رہے۔ اس حرامی بالک رام کی وجہ سے ایک دن یہ بستی تباہ ہوجائے گی۔"

"آج دیکھو کتنے مرتے ہیں؟" دوسرے نے آہ بھری۔

میں نے اجازت لی "اچھا' رام رام۔"

"کون سے گاؤں جاؤ گے؟"

میں نے کہا "مانی مراد۔"

اس نے کہا "اچھا۔ گرداور کا لڑکا ہے مانک لال۔"

"وہ!" میں نے یوں کہا جیسے مانک لال میرا لنگوٹیا ہے "ہاں ہے۔"

"اس حرامی سے کہنا میرا کام کردے۔ آخر چاچا ہوں اس کا' سگا نہ سہی۔ وہ کیا چاہتا ہے میں اس کے پاؤں پکڑوں' چندو نام ہے میرا۔"

میں نے کہا "میں ضرور کہہ دوں گا' نمستے۔"

"جاؤ رام بھلی کریں" وہ بولا "ذرا ہوشیاری سے جانا۔"

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے مجھ سے مانی مراد کا حال احوال تفصیل سے نہیں پوچھا اور وہاں کے ہر فرد وبشر کی خیریت دریافت نہیں کی۔ اس کی گفتگو سے ایک کارآمد بات یہ معلوم ہوگئی تھی کہ بستی کے لوگ اس قتل وخونریزی اور جدال کو ڈاکوؤں سے منسوب کررہے ہیں اور ان کا خیال ہے مقابلہ ڈاکوؤں کے اور بالک رام کے درمیان چل رہا ہے۔ بالک رام اس علاقے میں کوئی اچھی شہرت نہیں رکھتا تھا۔ لوگ اس سے نالاں تھے اور اس کے کالے کرتوتوں سے واقف تھے۔

"خواہ مخواہ گپ لگانے کی کیا ضرورت ہے۔ کوئی غلطی کرجاؤ گے باتوں باتوں میں" رابعہ نے کہا۔

میں نے کہا "مانی مراد کے گرداور کے بیٹے کا نام مانک ہے اور یہ اس کا رشتے کا چچا تھا' چندو۔"

"پھر؟" رابعہ نے حیرانی سے کہا اور نازو نے مجھے نظروں سے دیکھا "ہمیں کیوں بتارہے ہو؟"

میں نے کہا "کمال ہے' تم اور ہم مانی مراد کے رہنے والے ہیں اور ضرورت پڑنے پر یہی حوالے سند ثابت ہوں گے ڈومیسائل سرٹیفکیٹ کی طرح۔ اس کے علاوہ یہ کتنی حوصلہ افزا بات ہے کہ اس ساری کارروائی کو لوگ ڈاکوؤں کا حملہ سمجھ رہے ہیں۔"

غالب نے کہا "اچھا' یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔"

"اس میں کیا اچھائی ہے جی؟" نازو نے کہا۔

"... پوچھ رہی ہیں کہ اس میں اچھائی کیا ہے" ... نے نازو کے انداز تخاطب کا مذاق ... اس نے بات ایسے کی تھی جیسے عموماً بیویاں اپنے شوہروں سے کرتی ہیں۔

"اچھی بات یہ ہے کہ ہم صورت سے بھلے مانس دکھائی دیتے ہیں۔ ہم پر ڈاکو ہونے کا شک کوئی نہیں کرسکتا" میں...

اچانک کسی نے چلاّ کے کہا "کون ہے' رک جاؤ ورنہ ماردوں گا۔"

ہم سب کا اچھل پڑنا اور خوف زدہ ہوجانا تو ایک قدرتی امر تھا۔ نازو اور گل نے چیخ مار کے خوف کی بہترین اداکاری کی۔ رابعہ نے میرا بازو تھام کے میرے پیچھے پناہ لی اور نازو نے غالب کے پیچھے' گل ہمارے بیچ میں رہی۔

پرانے زمانے کی بندوق تانے ایک پولیس مین سامنے ... مجھے اس بے چارے پر ترس بھی آیا اور ہنسی بھی آئی۔ وہ فرض ادا کررہا تھا اور یہ کوئی سڑک پر ٹریفک کنٹرول کرنے کا بخش کام نہیں تھا۔ اس کو ڈاکوؤں کا راستہ روکنے اور جان کی بازی لگا کے انہیں پکڑنے یا پکڑوانے کا مشکل فریضہ سونپا گیا مگر مقابلے کے لئے اور اپنے دفاع کے لئے جو ہتھیار دیا گیا اس کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ ایک ہاتھ مار کے نازو اس سے کارروائی رائفل چھین سکتی تھی۔

ہم تھر تھر کانپتے رہے "کیا ... سنتری صاحب" "کون ہو تم لوگ' کہاں گھوم رہے ہو؟" اس نے ڈانٹ کر کہا "کون ہیں یہ استریاں؟"

میں نے اسے پوری اسٹوری سنائی جو میں نے چندو چاچا کو ... اور ... کا نام بھی بتادیا۔ اس وقت بات مذاق کی نہیں تھی اور جب میں نے رابعہ کو اپنی دھرم پتنی کہا تو اس نے سرہلا کے تائید کی اور نازو نے بھی خود کو غالب کی بنالیا تسلیم کیا۔ گل کو میں نے اپنی سالی بنالیا۔ اس وقت جب ہمارے پاس اپنی شناخت کا ثبوت کوئی نہیں تھا' میں نے کہا "گرداور کا لڑکا مانک ... میرا سالا ہے 'اس کا بھائی... یہ اپنے چاچا کے پاس رک گئی تھی ذرا دیر کے لئے' وہ ہے ان کا گھر۔"

سپاہی نے اتنی تفتیش کو کافی سمجھا۔ ہم نہ صرف یہ کہ ہندو لگتے تھے اور حلئے سے بھی مسلمان نہیں لگتے تھے۔ بلکہ بے ضرر اور بزدل بھی نظر آتے تھے۔ ہم جیسے لوگ بھلا ڈاکو کیسے ہوسکتے تھے۔ اس نے ہمیں آگے جانے کی اجازت دے دی اور واپس لوٹ گیا۔

ابھی تک راستہ دونوں جانب ویران تھا اور دور تک بے ... خودرو جھاڑیوں اور اکا دکا درختوں کے سوا زمین سونی تھی۔ درخت کہیں کہیں جھنڈ کی صورت میں بھی دکھائی دے رہے تھے۔ یہ ناریل اور کیلوں کے باغات تھے جو اس سارے علاقے میں کثرت سے پائے جاتے تھے۔

میں نے رفتار بڑھائی اور غالب کے ساتھ کچھ آگے چلنے لگا۔ رابعہ' گل اور نازو تینوں تھکی ہاری اپنی باتوں میں مصروف تھیں۔ ایک سب سے زیادہ پریشان کن مسئلہ شہلا کا تھا جس پر ابھی تک ہم نے گل کے سامنے کوئی بات کرنے سے گریز کیا تھا۔ گل خود زخمی تھی اور یہ بات یقینی تھی کہ اسے فوراً مناسب طبی امداد فراہم نہ ہوئی تو اس کا زخم بگڑ جائے گا۔ ابھی تک وہ اپنی تکلیف کو برداشت کررہی تھی۔ نازو نے اس کے بائیں ہاتھ کو ... کے بعد دوسری پٹی کا جھولا سا بنا کے گلے میں لٹکا دیا تھا کہ حرکت سے زخم کا منہ نہ کھلے اور خون جو ابھی بہنے سے رک گیا تھا پھر نہ بہنے لگے۔

میں نے کہا "غالب' تیرے اور میرے لئے۔ بلکہ ہم سب کے لئے ایک بری خبر ہے۔"

غالب نے کہا "محسن کے بارے میں؟"

میں نے حیران ہوکے کہا "تو نے کیسے اندازہ کیا؟"

"ظاہر ہے اب خبر اسی کی مل سکتی ہے۔"

"کیوں' کیا شہلا کے بارے میں کچھ پتا نہیں چل سکتا؟"

"شہلا کے بارے میں صرف وہی لوگ بتاسکتے ہیں جو اسے اغوا کرکے لائے تھے اور اب اپنے ساتھ لئے پھر رہے ہیں۔ ان میں سے ہماری کسی سے ملاقات نہیں ہوئی۔ پیڈرو مل جاتا تو اس سے ہم اگلوا سکتے تھے کہ یہاں سے وہ شہلا کو کہاں لے گئے ہیں۔"

"تو نے ٹھیک کہا۔ مجھے محسن کے متعلق یہ معلوم ہوا ہے کہ اس کو پولیس نے پکڑلیا ہے۔"

غالب فکرمند نظر آنے لگا "یہ کس نے بتایا؟"

میں نے کہا "راما راؤ نے۔"

"اس سے یہ بھی پوچھ لینا تھا کہ محسن کا نام اسے کیسے معلوم ہوا۔ ممکن ہے پکڑا جانے والا کوئی اور ہو۔" غالب نے کہا۔

"ہمارے بارے میں اور کون پوچھے گا؟ اس کا کہنا ہے کہ وہ شخص ہمارے متعلق لوگوں سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ شک کی بنا پر اسے پولیس کے حوالے کردیا گیا۔"

"پھر پولیس اسے کہاں لے گئی؟"

"یہ راما راؤ کے علم میں نہیں تھا لیکن ہم معلوم کرسکتے ہیں۔ اس علاقے کا تھانہ دور نہیں ہوسکتا۔ عام طور پر دیہی علاقوں میں دس مربع میل میں ایک ہی تھانہ ہوتا ہے۔ گاؤں جتنے بھی ہوں۔"

"پھر اب کیا تھانے پر حملہ کرنا ہے؟"

میں نے کہا "یہ بھی کرسکتے ہیں۔ گاؤں دیہات میں تھانہ کوئی ناقابل تسخیر جگہ نہیں ہوتی۔ پہلے معلوم تو ہوجائے کہ وہ محسن ہی تھا جو پکڑا گیا تھا یا کوئی اور تھا۔ اگر محسن تھا تو پھر ایک سوال یہ بھی ہے کہ اسے شہر کی پولیس تو نہیں لے گئی۔"

مجھے باتوں میں بالکل پتا نہ چلا کہ رابعہ' گل اور نازو نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ ان کے اور ہمارے درمیان فاصلہ زیادہ ہوگیا ہے اپنی رفتار بڑھادی تھی۔

رابعہ نے اچانک کہا "کیا پولیس نے گرفتار کرلیا ہے محسن کو؟"

اب میرے لئے ان سے کچھ چھپانے کی گنجائش نہ رہی۔ ویسے بھی بالآخر ان کو یہ بات معلوم ہوجاتی۔ میں نے انہیں مختصراً راما راؤ سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتادیا۔ تشویش اور پریشانی میں مبتلا ہونا تو خیر ایک قدرتی امر تھا مگر گل پر اس خبر کا زیادہ ہی اثر ہوا۔ اس کے اعصاب پر ویسے ہی گولی لگ جانے کے بعد خوف سوار تھا۔ حالات کے پیش نظر اس نے اپنے خوف پر قابو پالیا تھا لیکن اس کی جذباتی مزاحمت کی صلاحیت کا گراف بہت گرچکا تھا۔ یہ خبر ایک بہانہ بن گئی۔

اس نے ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کردیا "محسن کو پولیس نے پکڑلیا ہے... اور آپ سب... کیسی بے فکری سے باتیں کرتے جارہے ہیں۔ جیسے یہ کوئی بات ہی نہیں" اس نے زاروقطار روتے ہوئے کہا۔

میں نے پریشان ہوکے کہا "گل' کیسی باتیں کرتی ہو۔ وہ ہمارا دوست ہے... ہمیں اس کی فکر نہیں ہوگی تو کسے ہوگی...؟"

"جھوٹ بولتے ہیں آپ سکندر بھائی" اس نے میری بات کاٹ دی "آپ کو صرف اپنی کامیابی کی فکر تھی' صرف فتح کی خوشی ہے آپ سب کو' کسی کے منہ سے میں نے محسن کا نام تک نہیں سنا۔ کسی نے بھی نہیں کہا کہ... اسے تلاش کرنا چاہئے۔ رابعہ باجی کیا ملیں آپ دنیا کو بھول گئے۔"

"گل" میں نے سخت لہجے میں کہا "فضول باتیں مت کرو۔"

"یہ فضول باتیں نہیں، سچ ہے جو آپ کو کڑوا لگ رہا ہے" وہ چلائی "آپ کو معلوم ہوگیا تھا کہ محسن پکڑا نہیں گیا۔ وہ کہیں آس پاس ہی موجود ہے۔ پھر اتنا بڑا دھماکا کرنے سے پہلے کسی نے اس کے بارے میں سوچا کیوں نہیں کہ کہیں وہ نہ مارا جائے۔"

رابعہ نے مجھے کچھ کہنے سے روک دیا اور گل کے آنسو پونچھتے ہوئے اس کے سر کو اپنے سینے سے لگالیا "گل، میری بہن غلط مت سمجھو ہمیں۔"

"نہیں باجی، مجھے بتائیں، کیا فکر کی اس کی کسی نے؟ کیا یہ ناممکن تھا کہ کوئی باہر جاکے اسے تلاش کرتا؟ آس پاس دیکھ آتا۔ وہ خود تو اس لئے قریب نہیں آیا ہوگا کہ اسے اندر کی صورت حال کا باہر سے صحیح اندازہ نہیں ہوسکتا تھا۔ مگر ہم سب کو کس کا ڈر تھا؟ کون تھا باہر ہمارا راستہ روکنے والا؟ سکندر بھائی اور غالب میں سے کوئی باہر جاکے اس کو بلا نہیں سکتا تھا۔"

"اسے ہم کیسے بلاتے گل، کہاں سے بلا کے لاتے؟" غالب نے کہا۔

"کیوں، اتنا چیخ چیخ کے باتیں کرسکتے ہو، اعلان کرسکتے ہو جو سارا زمانہ سن لے۔ باہر جاکے اسے آواز نہیں دے سکتے تھے۔ اس کا نام لے کر اسے پکارتے تو وہ سن لیتا۔ آدھے میل تک وہ جہاں بھی ہوتا تمہاری آواز اس تک پہنچ جاتی۔ مگر کس نے پروا کی؟ کون گیا باہر اسے بلانے کے لئے... اور اب اس کو پولیس لے گئی ہے" وہ پھر بڑی شدت سے رونے لگی۔

"ہم اسے چھڑالائیں گے گل" نازو نے اسے تسلی دی۔

"کیسے چھڑالائیں گے؟ کب چھڑالائیں گے؟" گل نے تند لہجے میں کہا "جب پولیس مار مار کے اس کی جان لے لیگی... مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔ پولیس کیا کرتی ہے۔ ڈاکوؤں کا ایک ساتھی ان کے ہاتھ لگ جائے تو اسی سے وہ باقی گروہ کا پتا ٹھکانا معلوم کرتے ہیں۔ یہاں یہی مشہور ہے کہ حملہ کرنے والے ڈاکو تھے۔ اسے پولیس نے ہمارا ساتھی مان لیا تو..."

ہم سب گل کی وجہ سے رکنے پر مجبور ہوگئے تھے۔ وہ زمین پر بیٹھ گئی تھی اور رو رو کے بے حال ہو رہی تھی۔ بے وقوف، انجام سے بے خبر، حقائق سے ناآشنا جذبات کی رو میں بہہ جانے والی لڑکی... جو محسن کو دیوانگی کی حد تک پیار کرنے لگی تھی۔ یہ اب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہی تھی۔ خود گل کو اس کا اقرار کرنا اچھا لگتا تھا۔ ابھی تک کسی نہ کسی طرح ہم محسن اور شہلا کے رشتے کی نوعیت کو چھپانے میں کامیاب رہے تھے اور گل کو یہ بتانے سے گریز کرتے رہے تھے کہ وہ سراب کے پیچھے دوڑ رہی ہے۔ محسن نہ کبھی اس کا تھا اور نہ ہوگا۔

رابعہ اور نازو اس کے پاس بیٹھی کوشش کررہی تھیں کہ کسی طرح اسے چپ کرادیں۔ میں اور غالب خاموش کھڑے

افق پر نمودار ہونے والے صبح کاذب کے اجالے کو دیکھ رہے تھے۔ اچانک میں نے دونوں جانب سے دوڑ کر آنے والے قدموں کی آواز سنی۔ دو جھاڑیوں کے پیچھے سے تین مسلح پولیس والے نمودار ہوئے۔

"کون ہو تم لوگ؟ سیدھے کھڑے ہو جاؤ" ایک حوالدار نے گرج کے کہا۔

"حوالدار صاحب، ہم شریف لوگ ہیں۔"

"شریف لوگ!" حوالدار نے میرے منہ پر ایک تھپڑ رسید کیا "وہ تو صورت سے نظر آرہے ہو تم لیکن ہم نے ساری بات سن لی ہے۔ تم اس ڈاکو کے ساتھی ہو جو پکڑا جا چکا ہے۔ اوئے، گرفتار کرلو ان کو بھی۔"

ایک سپاہی ہتھکڑی لے کر آگے بڑھا۔

میں نے کسی مظلوم دیہاتی کی طرح گھگھیانا شروع کیا۔

"تھانے دار صاحب... کیسی بات کرتے ہو جی آپ ہمارا کیا تعلق کسی ڈاکو سے۔ ہاں یہ جو سسری رو رہی ہے" میں نے گل کی طرف اشارہ کیا "یہ ضرور اس بدمعاش کی بدقسمت گھروالی ہے۔ دیکھو کیا حال کرلیا ہے اس نے اپنا رو رو کے۔"

"اوئے کم بخت، مت رو۔ نصیب ہی برے تھے تیرے، اس ڈاکو سنگ تیرے کو بیاہ دیا" غالب نے دکھ اور برہمی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ کہا۔

گل نے جواب تک محسن کی وجہ سے جذباتی ہو کے رو رہی تھی، اب صورت حال کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے رونا دھونا شروع کیا "ارے میرے نصیب کو کیوں الزام دیتے ہو، تم نے ہی دیکھا تھا اسے۔"

میں نے کہا "اس وقت وہ کام کرتا تھا۔ تھوڑا بہت محنت کرکے جتنا کمالیتا تھا اس میں خوش تھا۔ تو نے لالچ ڈالا اس کے دل میں۔"

"میں نے..." گل نے چیخ ماری "ہائے کیا میں دشمن تھی خود اپنی۔ کیا میں نے اسے برائی کے راستے پر ڈالا؟ بندہ خود بگڑے یا تم جیسے دوست اسے بگاڑتے ہیں" وہ دہاڑیں مارنے لگی۔ سپاہی جو ہتھکڑی لے کر آگے بڑھا تھا کچھ پیچھے ہٹ کر ٹھہر گیا۔

غالب نے برہم ہو کے کہا "ارے تو نے روز تنگ کیا اسے، یہ چاہئے وہ چاہئے۔ اس کے پاس اتنا گہنا ہے میرے پاس کیوں نہیں ہے۔ پھر وہ کیا کرتا! مجبور ہوگیا چوری چکاری پر۔"

میں نے اس کی تائید کی "اب اپنے تھانے دار صاحب سے پوچھ لو۔ یہ تو خیر رشوت لیتے ہی نہیں لیکن ان کے محکمے میں جو لوگ رشوت لیتے ہیں سب اپنی بیویوں کی وجہ سے مجبور ہیں۔ کیوں سرکار، کیا غلط کہا میں نے؟"

حوالدار نے جسے میں نے چند منٹ میں ترقی دے کر تھانے

دار بنا دیا تھا مونچھوں پر تاؤ دے کر تائید کے انداز میں سر ہلایا۔ [illegible]

"ہم نے کچھ نہیں کیا" [illegible] "او [illegible] حکم دیا تھا [illegible] سپاہی نے پوچھا "اب تو تمہارے ہتھکڑی لگا دیں۔"

[illegible] تھی کہ ہتھکڑی ایک تھی اور ملزمان ہم سے کم دو مشکل یہ تھی۔ اگر نازو، رابعہ اور گل کو عورت ہونے کی بنا پر چھوڑ دیا جاتا تب بھی ایک ہتھکڑی ناکافی تھی۔ سپاہی نے ہدایت [illegible] نہ میری طرف رکھا اور نہ غالب کی طرف... ہم دونوں [illegible]

"سرکار... اس کی کیا ضرورت ہے۔ ہم کوئی بھاگنے والے نہیں، عزت دار ہیں۔ ان سسریوں کو چھوڑ کے کہاں [illegible] کہا۔

"ہم آپ کے ساتھ چلتے ہیں" غالب نے لجاجت سے کہا "بس ایک بار میری بہن کی اس کمینے سے ملاقات کرادیں۔"

"بس تھانے دار جی... ایک نظر دیکھ لوں اسے" گل نے ہاتھ جوڑ کے کہا "جیسا بھی ہے... میرا گھر والا ہے... میرے بچوں کا باپ ہے۔"

بلاشبہ اداکاری میں حقیقت کا تاثر پیدا کرنے کے لئے گل نے جو کچھ کہا تھا ٹھیک تھا۔ پھر بھی نازو کے ساتھ رابعہ نے اسے چونک کر دیکھا، وہ زیر لب مسکرائیں اور شرمائیں۔

میں نے کہا "ہاں جی، ہم کو وہیں لے چلو... آپ کی بڑی مہربانی ہوگی، اس سور سے ملاقات کرادیں۔"

"ملاقات کرادیں" حوالدار نے غصے سے کہا "تمہارے باپ کا گھر ہے نا کہ جب جی چاہا مل کر آگئے۔ چلو اب سارے رہنا اس کے ساتھ۔"

میں نے ہاتھ جوڑ کے کہا "ہم تو گھر سے نہ نکلتے جی، اس کی خاطر نکلے تھے۔ ہم تو کہتے ہیں چھوڑ اسے۔ [illegible] نہیں چھوڑتی... اس نے دیا ہے بے عزتی کے سوا۔"

غالب بولا "چوری چکاری میں جو ملتا تھا وہ بھی اڑا دیتا تھا۔"

"اب سنا ہے ڈاکا ڈالا تھا اس نے یہاں۔ ہم نے سوچا تھا کہیں چھپا ہوگا۔ اسے ساتھ لے جائیں گے" میں نے کہا۔

رابعہ نے کہا "میں تو کہتی ہوں گھر چلو واپس۔"

گل نے پھر چیخ ماری "نہیں نہیں، میں ملے بغیر نہیں جاؤں گی اس سے۔ تھانے دار جی، میں چلوں گی آپ کے سنگ... ان کو جانے دیں۔"

نازو نے خفگی سے کہا "اب پاگل ہو رہی ہے اس کے پیچھے۔ گھر آتا ہے تو اس سے لڑتی ہے۔"

تھانے دار نے کہا "ایسا تو سب کرتی ہیں۔ کیوں تھانے دار جی، کیا غلط کہتے ہیں؟"

"ابے افلاطون کی اولاد، تو کیسے غلط بول سکتا ہے" تھانے

دار نے قدرے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔

میں نے کہا "سرکار، اس کو ملادو اس سے ایک بار۔ ہم آپ کی خدمت کریں گے۔"

"کیا خدمت کروگے؟" وہ براہ راست سودا کرنے پر اتر آیا۔

"کیا ہے تمہارے پاس... نہ گہنا نہ پیسہ۔"

"ہم پیسہ دیں گے جی، ہم کو بتادو وہ ہے کہاں" گل نے روتے روتے کہا "جتنا مانگوگے دیں گے۔"

"ہاں... جمع کرکے رکھا ہوگا ڈکیتی کا مال" تھانے دار کا لہجہ پھر بگڑ گیا "ارے وہ ہم خود نکلوالیں گے۔"

میں نے غصے سے گل کو گھورا "پاگل... مورکھ... سو پچاس دے گی انہیں؟ بڑا خزانہ ہے نا تیرے پاس۔ کہہ دیا، جو مانگو گے دیں گے" میں نے گل کی نقل اتاری۔

"سو پچاس!" تھانے دار بھڑک اٹھا "خیرات دے رہی ہے کیا۔"

غالب نے کہا "حضور، بے وقوف عورت ہے۔ ہم وعدہ کرتے ہیں پورا ہزار دیں گے... کیا کریں... بڑے بھائی ہیں [illegible]"

"یہ چھوٹی بہن ہے تیری" تھانے دار نے کہا "کیا نام ہے۔"

"جنت مار جی" غالب نے کہا۔

"اب اس کا... تیری بہن کا" تھانے دار گالی دے کر بولا۔

"بسنتی سرکار" میں نے کہا۔

حوالدار اب لالچ میں آگیا تھا۔ اس کی نظریں باری باری تینوں عورتوں کو دیکھ رہی تھیں۔ اسے ایک ہزار روپے کی پیشکش بھی اچھی لگی تھی۔

"ایک ہزار تو کم ہیں" اس نے کہا۔

"ہم غریب لوگ ہیں جی۔ وہ پتا نہیں کیسے چور ڈاکو بن گیا۔ ہماری عزت بھی مٹی میں مل گئی۔ ہمارے پاس اتنا دھن کہاں۔"

"کم سے کم پانچ سو اور نکال" تھانے دار بولا "ان سب کے لئے۔"

"نہیں حضور۔ اتنا نہیں ہے میرے پاس" غالب نے کہا۔

"اس کا گہنا ہوگا" تھانے دار نے گل کی طرف اشارہ کیا۔ اور یہ دونوں کون ہیں؟"

"یہ... ایک میری دھرم پتنی ہے، ایک اس کی۔" میں نے کہا۔

"تو یہ بھی کیا کسی کنگال کی بیٹیاں ہیں؟" حوالدار بولا۔

"لو... میں کیوں دوں گی اپنا گہنا" رابعہ نے تڑخ کے کہا۔

"بھگوان نہ کرے جو میرا باپ کنگلا ہو" نازو غصے سے بولی۔ "مگر ایسے حرام گنوانے کے لئے کچھ نہیں ہے میرے پاس... لو جی... چوری ڈکیتی کوئی کرے جرمانہ کوئی بھرے۔"

"اچھا اچھا... زیادہ بک بک مت کر" میں نے مشتعل ہو کے کہا "میں دے دوں گا... اپنا یار ہے۔ اس کے لئے جان بھی قربان۔"

"چل رہنے دے ... بڑا آیا جان قربان کرنے والا۔ اس کی ساری زندگی خراب کر دی ہے۔ بیوی بچوں کا خانہ خراب کر دیا" نازو نے [illegible]

"[illegible] سنبھالے اپنی [illegible] والی لو...." میں نے بلڑ کے کہا۔

"چپ چپ کر" غالب نے اسے ڈانٹ لگائی "تھانے دار سامنے کھڑا ہے اور تو بولے جاتی ہے۔ ابھی سارا [illegible] نکال دیں گے تیرا۔"

میں نے کہا "سرکار، جو آپ کا حکم... ہم آپ کے غلام..."

"بے غلام کی اولاد، بک بک کئے جاتا ہے" حوالدار نے گرم ہو کے کہا "پیسے نکال۔"

"[illegible] ضرور دیں گے سرکار، جب وعدہ لیا ہے تو پورا [illegible] گے لیکن ہم کو گھر سے پیسہ لانے کی مہلت دو" میں نے ہاتھ جوڑے "یا ہمارے ساتھ چلو۔"

حوالدار کچھ مایوس ہوا "کیا اب گھر جانا پڑے گا تیرے... نہیں۔ تو جا کے لے آ۔"

ایک سپاہی نے کہا "میں... میں چلا جاؤں اس کے ساتھ؟"

"اس کی کوئی ضرورت نہیں" حوالدار نے کہا۔

اسے شاید ڈر تھا کہ نوجوان کانسٹیبل وصول شدہ رقم "ایمانداری" سے اس تک نہیں پہنچائے گا۔ رقم ہمارے پاس تھی لیکن میں ان کے سامنے بیلٹ کھول کے ایک ہزار نکالتا تو باقی رقم وہ خود ہم سے چھین لیتے۔

"آپ ادھر انتظار کریں۔ میں بس یوں گیا اور یوں آیا" میں نے چٹکی بجا کے کہا۔

"کہاں کے رہنے والے ہو تم لوگ؟" حوالدار نے کہا۔

"مانی مراد کے جناب" غالب نے جواب دیا۔

"اچھا" حوالدار سوچ میں پڑ گیا "تمہارا آدمی تو دوسرے تھانے میں ہے۔"

میں نے کہا "پوری بانا کے تھانے میں؟"

"ہاں، ایسے چٹکی بجا کے کہنا تو آسان ہے کہ میں یوں گیا اور یوں آیا" حوالدار خفگی سے بولا "دو گھنٹے لگ جائیں گے۔"

غالب نے مجھے مخاطب کیا "وہاں مانک لال بھی تو ہے۔"

میں نے کہا "وہ گروا ور کا لڑکا؟"

حوالدار نے ہم دونوں کی صورت کو غور سے دیکھا "تم جانتے ہو مانک لال کو؟"

"لو جی، اپنا تو یار ہے" میں نے کہا۔

غالب نے تائید میں سر ہلایا "وہ دو ہزار کا بندوبست کر دے گا۔"

"ہم اسے کل واپس کر دیں گے" میں نے کہا۔

حوالدار کو یہ تجویز پسند آئی "ٹھیک ہے، ایسے کر لو تو اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔ ابھی تمہارا آدمی، کیا نام ہے اس کا، چمن لال۔"

"ہاں جی، چمن لال" میں نے فوراً کہا۔

"دیکھو ابھی اس کے خلاف نہ پرچا کاٹا گیا ہے اور نہ قانونی کارروائی ہوئی ہے" حوالدار بولا "[illegible] اسے۔ ابھی تم چاہو تو ان سے معاملہ طے کر سکتے ہو۔ بعد میں مشکل ہو جائے گا۔ آٹھ بجے تھانے دار آ [illegible] اسے چھڑانے کے لئے اپنا سب کچھ بیچ دو گے پھر بھی [illegible] ہو گا۔ تھانے دار دس ہزار سے کم کی بات ہی نہیں کرتا"

میں نے آنکھیں پھاڑ کے کہا "دس ہزار۔"

"ہاں، دس ہزار بھی چھوٹی موٹی چوری کے الزام [illegible] جانے والوں کے ہوتے ہیں۔ چمن لال پر تو شک ہے [illegible] کا ساتھی ہے۔"

میں نے سخت پریشان ہو کے کہا "تھانے دار جی [illegible] مدد کرو ہماری۔ آپ کو بھگوان کا واسطہ، ہم پر دیا کرو۔ [illegible] لال جیل میں چلا گیا تو یہ سچ مچ مر جائے گی۔"

"جیل تو جائے گا بعد میں۔ پہلے ہو گی تفتیش" حوالدار [illegible] کہا "تفتیش میں ہی ضائع ہو گیا..."

گل نے ایک چیخ ماری "ایسا مت کہو۔"

حوالدار نے بے رحمی سے کہا "تفتیش شروع ہو گئی تو تمہاری خیر نہیں۔ سارے گھر کو تھانے بلا لیں گے۔ ایک [illegible] مار نہیں جھیل سکو گے تم لوگ۔"

میں نے کانپتے ہوئے کہا "ہم آپ سے سچ کہہ رہے ہیں، ہم شریف، عزت دار لوگ ہیں۔"

"ہاں ہاں... ایسے ہی لوگوں کی عزت اتاری جاتی [illegible] تفتیش میں جو اپنی عزت پر اکڑتے ہوں، جیسے تم اکڑ رہے ہو۔"

غالب نے کہا "نہیں جی، ہم اکڑ تو نہیں رہے ہیں۔"

"اور کیا کر رہے ہو! بار بار ایک ہی بات کرتے ہو کہ عزت دار ہیں اور شریف ہیں۔ ارے بھئی، چمن لال [illegible] ساتھی ہے اور تم اس کے ساتھی ہو تو تم کیا ہوئے؟ پولیس [illegible] کو اس کے کہنے سے شریف عزت دار مان لیتی ہے؟ بے عزتی [illegible] اس وقت چلے گا جب تمہارے سامنے تمہاری ان [illegible] سندریوں کی...."

میں نے گھبرا کے کہا "نہیں جی... ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟"

حوالدار بگڑ کے بولا "ابے جب ہو گا تو دیکھ لینا کہ [illegible] ہے۔"

غالب نے کہا "سرکار، آپ کوئی اپائے بتائیں۔"

"اپائے بتا تو رہا ہوں... معاملہ صبح سے پہلے پہلے ختم [illegible] کی کوشش کرو" چالاک حوالدار نے مونچھوں پر تاؤ دیا۔ اسے یقین آ گیا تھا کہ وہ ہمیں ہراساں کرنے کے [illegible] طریقے آزمانے میں کامیاب رہا ہے اور اب ہم اس کی بات کریں گے۔ اسے منہ مانگی رقم دیں گے کہ ہمارے ساتھی کو چھڑا دو۔ اور وہ ہم پر یہ احسان کرے گا کہ دس بیس ہزار میں تفتیش ختم کرا دے گا۔ یقیناً یہ اس کے اختیار کی بات تھی اور وہ اپنے اختیارات کو ہمارے حق میں استعمال کرنے کی پوری قیمت وصول کرنا چاہتا تھا۔ اس نے ہمارے سامنے ایک صورت حال کو واضح کر دیا تھا کہ یا تو ہم اس کی معرفت عزت کی قیمت ادا کر کے سب کی عزت آبرو اور جان بچا لیں یا پھر جملہ اہل خانہ کے ساتھ۔ جن میں خواتین بھی شامل ہوں گی، تفتیش کے سنگین نتائج بھگتنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ اسے اس بات سے کوئی سروکار نہ تھا کہ ہم یہ منہ مانگی قیمت کیسے ادا کریں گے۔

ماتحت بھی بڑے سسپنس میں مبتلا اپنے ہوشیار افسر کے عیار ذہن کی کاروباری صلاحیت کا مظاہرہ دیکھ رہے تھے اور یہ سوچ رہے تھے کہ اس سودے میں بالآخر ان کو کیا ملے گا۔ شیر کے منہ سے اس کا نوالہ کون چھین سکتا ہے۔ وہ کتنا کھاتا ہے اور کتنا چھوڑ دیتا ہے یہ اس کی مرضی۔

حوالدار کے ساتھ سارے معاملات خوش اسلوبی سے طے کرانے کا سودا چالیس ہزار سے شروع ہوا اور پچیس ہزار پر طے پا گیا۔ اس نے چمن لال یعنی محسن کو حوالات سے نکال کے بحفاظت ہماری تحویل میں دینے اور ہمیں تفتیش سے تحفظ فراہم کرنے کی پوری ذمے داری قبول کر لی تھی۔ فی الحال دو ہزار نقد کے عوض اس نے ایک ملاقات کرانے پر رضامندی کا اظہار کیا تھا۔ باقی کے معاملات کا انحصار ہماری کوششوں کی کامیابی پر تھا کہ ہم مطلوبہ رقم کتنے عرصے میں فراہم کر سکتے ہیں۔ ہم نے وعدہ کیا کہ دو تین دن میں سب کا گہنا بیچ کے رقم اکٹھی کر لیں گے۔ نازو کے ساتھ رابعہ نے اس سودے کے خلاف احتجاج کیا۔

"ایک چھلا نہیں دوں گی میں" رابعہ نے کہا۔

"اپنی ماں کا زیور بیچ دو نا" نازو بولی۔

میں نے رابعہ کے ایک جھانپڑ رسید کیا "اب بولی تو تیرا گہنا کیا تجھے بھی بیچ دوں گا... سمجھی؟"

یہ جھانپڑ مارنا ازحد ضروری تھا۔ اصل شوہر اس قسم کی صورت حال کو ایسے ہی کنٹرول کرتے ہیں۔ میں نے ہاتھ زیادہ زور سے گھمایا تھا۔ جھانپڑ آہستہ سے مارا تھا۔ پھر بھی ایک مردانہ وار کا مقابلہ رابعہ نہ کر سکی اور نیچے گر گئی۔

میری اس حرکت پر جتنا تعجب کسی اور کو ہوا تھا اس سے کہیں زیادہ دکھ مجھے ہوا تھا لیکن جھوٹ کو سچ بنانے کے لئے دل پر جبر کرتے ہوئے ایک تکلیف دہ اور ناپسندیدہ فعل کا ارتکاب حالات کا تقاضا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ رابعہ نے برا نہیں مانا ہو گا، اس نے یقیناً سمجھ لیا ہو گا کہ فنا اور بقا کی جدوجہد میں ایسے مرحلے بھی آتے ہیں جہاں آدمی مجبور ہوتا ہے۔ وہ سب کچھ کرنے پر جو عام حالات میں اس کے لئے ناممکن ہوتا ہے۔ پھر بھی میں شرمسار تھا اور اس سے نظر نہیں ملا سکتا تھا۔

نازو نے میری مدد کی۔ اس نے میرے ذہنی کرب کا بخوبی اندازہ کر لیا تھا چنانچہ میرے احساسِ جرم کی شدت کو ختم کرنے کے لئے وہ غالب پر چلانے لگی۔

"میں صاف بتا دیتی ہوں ابھی سے، میں جان دے دوں گی مگر کسی نے میرے گہنے کی طرف نظر اٹھا کے بھی دیکھا...."

غالب نے اس کا مقصد بھانپ لیا اور میری تقلید کرتے ہوئے نازو کے منہ پر ایک تھپڑ مارا "بھونکتی جا رہی ہے۔ بھونکتی جا رہی ہے، زبان کھینچ کے ہاتھ پر رکھ دوں گا جو اب منہ سے ایک لفظ بھی نکالا۔ تیری بہن کا معاملہ ہوتا تو فٹ سارے گہنے رکھ دیتی میرے سامنے... یہ میری بہن کا معاملہ ہے، تیری کیا.... تیرے باپ کی جان کی پروا نہ کروں میں..."

دونوں بیویاں ایک ایک جھانپڑ کھا کے خاموش ہو گئیں۔ جیسے کہ شوہر کو مجازی خدا اور دیوتا سمان سمجھنے والی سب مشرقی بیویاں ہو جاتی ہیں۔ انہوں نے ظاہر کیا کہ ظلم کے خلاف احتجاج میں وہ اپنی حد سے آگے بڑھ گئی تھیں چنانچہ انہیں جو سزا ملی وہ مشرق کی جاہلانہ روایات اور فرسودہ اخلاقی اقدار کے معیار پر کسی طرح بھی غیر منصفانہ نہیں سمجھی جا سکتی۔

جب ہم نے حوالدار کی قیادت میں مانی مراد کی جانب سفر شروع کیا تو صبح کے آثار پیدا ہو چلے تھے۔ ہم اس بستی سے بہت دور آ گئے تھے جہاں ایک تاریک رات کے ساتھ ہی موت اور زیست کی خوں ریز جنگ کا بھی اختتام ہو گیا تھا۔ ہماری طویل جدوجہد کا انعام ایک اور فتح تھی۔ ہم اپنے پیچھے دشمن کے ایک مضبوط قلعے کا کھنڈر چھوڑ آئے تھے جس میں بکھری ہوئی لاشیں، جلے ہوئے ٹرک، شکستہ و سوختہ در و دیوار خود اپنی زباں سے ایک عبرت کی داستاں کہتے تھے۔ آسمان تک اٹھتا ہوا دھوئیں کا بادل گواہی دیتا تھا کہ یہ صرف تائید ایزدی ہے جس نے ایم آر ایس جیسی بے سروساماں تنظیم کو حوصلہ اور طاقت دی کہ وہ چوہدری دلاور اور تریوینی جیسے فرعون صفت شیطانوں کے غرور کو شکست دے۔ ازل سے یہ بندوبست خود خالق کائنات نے قائم رکھا ہے کہ دنیا میں جہاں بھی نیکی بدی کی قوتیں کسی رزم گاہ میں مقابل ہوں تو باطل کبھی حق پر غالب نہ آئے۔

آسمان روشن ہونے لگا تھا اور اس کے ساتھ ہی رات کا سکوت ختم ہو رہا تھا۔ آشیانوں میں پرندے ایک نئی صبح کے آغاز کا گیت شروع کر چکے تھے اور ان کے کورس میں ہر طرح کی آوازیں شامل ہوتی جا رہی تھیں۔ ساری فضا ان آوازوں کے شور سے گونجنے لگی تھی۔ پرندوں کے غول درختوں سے پرواز کے لئے پر تول رہے تھے۔

رات بھر گولیوں کی آوازوں، دھماکوں، میدان جنگ کی پُراذیت، سفاک اور دلخراش چیخ پکار، آگ اور دھوئیں، بارود کی

اور جلتی ہوئی لاشوں کی بو اور موت کی سرد سنسنی کو برداشت کرتے رہنے سے میرے اعصاب بالکل جواب دے چکے تھے۔ ظاہر ہے دوسروں کی حالت بھی ایسی ہی ہوگی۔ خطرے کا احساس اب زندگی کے روز و شب کا حصہ تھا۔ ایک خطرہ پیچھے رہ گیا تھا تو دوسرا ہمارے ساتھ تھا اور تیسرا آگے ہمارے انتظار میں تھا۔

ایک بہت بڑی فتح کی مسرت میں خوف کے ان گنت اندیشے شامل تھے چنانچہ ہم خوش ہونے کے باوجود رنجیدہ تھے کہ ہم نے شہلا اور اس کے بیٹے کی زندگی کو دشمن کے قبضۂ اختیار سے چھڑانے کی جو کوشش کی تھی وہ ناکام ہو گئی۔ اس ناکامی کا خیال میرے دل کا بوجھ تھا۔ میں شہلا کا تصور کرتا تھا تو ذہن میں ایک خلا نمودار ہو جاتا تھا جس میں ان گنت سوال سرگرداں تھے۔ بے رحم شکاری اب اسے کہاں لے گئے ہوں گے؟ کیا ہماری ناکامی کا خمیازہ بھی شہلا کو بھگتنا پڑے گا اور ہماری کامیابی کی سزا بھی اسے ہی ملے گی؟ اس کا سفر کہاں تمام ہوگا؟ وہ پھر کبھی محسن سے ملے گی تو کس حال میں؟ قید حیات سے نجات پانے کے بعد اگلے جہان میں یا اسی زندگی میں عشق کے ہر امتحاں سے گزر کے؟ کہیں اس کی اسیری کی طرح اس کی محرومی کے عذاب کے ذمے دار بھی ہم تو نہیں ہوں گے؟ جو اس کے اپنے تھے۔ جن پر وہ بھروسا کرتی تھی۔ کیا ہم ہی اس کے خواب چھین کر اسے موت کی ... کے پردے تھکیل دیں گے؟

یہ صبح کی تازگی اور ایک سکون بخش ماحول کا اثر تھا کہ میرا ذہن پھر سوچنے لگا تھا۔ رات بھر سوچنے کی مہلت ہی نہ ملی تھی۔ اب جدوجہد ایک کامیابی پر تمام ہوئی تھی تو دوسری بڑی ناکامی کا خیال سب کے احساس کو پریشان کر رہا تھا۔ میری طرح باقی سب بھی اداس تھے اور دل گرفتہ تھے۔ یوں لگتا تھا کہ سب کے خیالات کی رو متوازی خطوط پر ایک ہی سمت میں بہہ رہی ہے۔ جو میں سوچ رہا ہوں وہی سب سوچ رہے ہیں۔

حوالدار کے لئے تیز قدم اٹھانا ممکن نہ تھا۔ وہ پتھریلے ناہموار راستے پر ہانپتا ہوا چل رہا تھا۔ اس سے چند قدم پیچھے میں اور غالب تھے۔ ہم سے چند قدم پیچھے گل، رابعہ اور نازو تھیں اور حوالدار نے اپنی سپاہ کو سب کے پیچھے رکھ کر ثابت کیا تھا کہ وہ اتنا بے وقوف شکاری نہیں ہے جتنا نظر آتا ہے۔ وہ کسی ملزم کو فرار ہونے کا موقع کیسے دے سکتا تھا جب کہ انہی ملزموں سے اس کی معاشی خوشحالی وابستہ تھی۔ ملزم نہیں اس نے پچیس ہزار روپے پکڑے تھے۔ ایسا شکار اس علاقے میں روز کہاں ملتا ہے۔

ہم نے اس برساتی ندی کو عبور کیا جس میں آج کل پانی کا نام و نشان نہ تھا۔ ریت اور گول چکنے پتھروں کے فرش پر چل کے ہم نے بڑے نظم و ضبط اور خاموشی کے ساتھ سفر کیا۔ ہم نے آپس میں کوئی بات کرنے سے گریز کیا۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ... پولیس ہماری راہنمائی کر رہی تھی اور حفاظت بھی۔ ہماری اداکاری کا معیار اطمینان بخش نہ ہوتا تو وہ ہمیں ملزموں کی طرح پکڑ کے لے جاتے اور جامہ تلاشی میں وہ سب برآمد کر لیتے ... کی طرف ان کا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ وہ کیسے سوچ سکتے ... ایسے احمق نظر آنے والے دیہاتیوں کے پاس دولاکھ روپے ... اور جدید ترین ریوالور بھی ہو سکتے ہیں۔

پہاڑی ختم ہوتے ہی حوالدار نے کہا "اور بھی اب ... ہوشیاری سے ... کسی کو پتا نہ چلنے پائے۔"

غالب نے کہا "آپ فکر مت کریں تھانے دار جی ... بے وقوف ہیں۔"

میں نے ایک انگلی اٹھا کے کہا "سرکار، میں ابھی آیا ..."

حوالدار نے میرا مطلب سمجھتے ہوئے کہا "جا ... بھاگنے کی کوشش مت کرنا۔"

"اجی اب ہم کہاں جائیں گے بھاگ کے" میں نے ... سنبھال کے کہا "یہ سسری جانے دے گی ہمیں؟"

رابعہ نے ایک روٹھی ہوئی بیوی کی طرح کہا "میں ... روٹی ... جاؤ جس کے سنگ جانا ہے، میری بھی جان چھوٹے ..."

"بڑا غصہ ہے بھئی" میں نے دانت نکال کے کہا اور پہاڑی کی اوٹ میں چلا گیا۔ وہاں میں نے دھوتی کے نیچے سے وہ ... کی بیلٹ نکالی جس میں اب ہمارا باقی سرمایہ محفوظ تھا۔ ایسی ہی ایک بیلٹ غالب کے پاس تھی۔ میں نے اس میں سے دو ہزار روپے نکالے اور دھوتی کستا ہوا پھر قافلے سے جا ملا۔

سورج کے آتشیں گولے نے مشرق سے اپنا سر نکال لیا تھا اور خاصی تیزی سے اوپر اٹھ رہا تھا۔ سنہری دھوپ میں سفیدی بڑھتی جا رہی تھی۔ میں اب آدھے یا پون میل کے فاصلے پر ایک چھوٹے سے گاؤں کے آثار دیکھ سکتا تھا۔ کسی سے پوچھے بغیر میں نے سمجھ لیا کہ یہ مانی مراد ہے۔

حوالدار نے پھر پلٹ کے میری طرف دیکھا "دیکھ بے ... بات سمجھ لے اچھی طرح۔ کہ کسی کو اس معاملے کی خبر نہیں ہونی چاہئے۔"

"کس معاملے کی؟" میں نے احمقوں کی طرح کہا۔

حوالدار نے مجھے گالی دی "ابے یہ جو تیرے اور ہمارے درمیان ہوا ہے۔"

غالب نے کہا "آپ بالکل مطمئن رہیں جناب۔"

"یہ جو تمہارا یار ہے۔ گرداور کا لونڈا ... مانک لال سے بھی ذکر مت کرنا۔"

"کس بات کا؟" میں نے زیادہ احمق ہونے کا ثبوت دیا۔

حوالدار نے میرے جھانپڑ مارنے کی کوشش کی "ابے ... ذاتی تعلقات کی وجہ سے تمہاری مدد کر رہا ہوں۔ یہاں جو تھانے دار ہے نا۔ وہ میری سالی کا خصم ہے۔ وہ سمجھے گا میں اس کا ... گیا۔"

غالب نے میرا دفاع کیا "یہ ذرا مورکھ ہے جی، میں سمجھا ...

... سوچ رہا تھا کہ گاؤں میں پہنچنے کے بعد کیا ہوگا۔ نہ مجھے گرداور کا گھر معلوم تھا اور نہ میں کسی گرداور کے لڑکے مانک ... تھا کہ میں اس سے ملوں۔ اس کے لئے ... پہچانتا تھا۔ یہ ... معقول عذر تھا۔ میں مانک لال کو اس کے چاچا کا پیغام ... تھا اور واپسی پر کہہ سکتا تھا کہ میں دو ہزار اس سے مانگ ... لیکن مسئلہ یہ تھا کہ میں مانک لال کا پتا کس سے پوچھوں ... میں نے اسے اپنے بچپن کا یار کہا تھا۔ اگر میں اور ... پوچھوں ... مجھے اس کا گھر معلوم نہیں تو ایک دم حوالدار کا مجھ پر ... اعتبار ختم ہو جاتا۔

میری اس مشکل کو خود حوالدار نے آسان کیا۔

اس نے کہا "دیکھ میں ان کو لے کر جا تا ہوں تھانے کی طرف۔ ادھر سے" اس نے بائیں جانب ہاتھ سے اشارہ کیا "تو ... آ جانا۔"

مجھے غور سے دیکھنے کے باوجود اس سمت میں کوئی عمارت تھانے جیسی دکھائی نہ دی۔ تاہم مجھے اندازہ ہو گیا کہ حوالدار گاؤں میں داخل ہونے سے گریز کر رہا ہے اور باہر باہر سے چکر لگا کے تھانے تک پہنچنا چاہتا ہے۔

میں نے کہا "کیا میں اکیلا جاؤں؟"

"ابے وہ سامنے گھر ہے گرداور کا" حوالدار نے بگڑ کے کہا "کتنی دیر لگے گی تجھے۔ پانچ منٹ میں واپس آ جانا ہے۔"

میں نے گرداور کے گھر کی طرف دیکھا۔ بہت سے کچے، بدوضع گھروں کے درمیان مگر سب سے الگ ایک پختہ مکان نظر آ رہا تھا۔ یہی گرداور کا گھر ہو سکتا تھا۔ میں نے سر ہلا کے کہا "اچھا جی، میں ابھی آتا ہوں۔"

حوالدار نے کہا "میں ایسے کچھ نہیں کرنے کا۔ دو ہزار دینے ہیں تو چپ چاپ کے ورنہ ملاقات لمبی ہو جائے گی۔ سارے اندر ہی نظر آئیں گے۔"

غالب نے کہا "نہیں جی، پیسہ آپ کو پہلے ملے گا۔ مگر آپ بھی بات کر لینا سرکار۔ دو تین دن میں باقی بندوبست بھی ہو جائے گا۔ کہیں ایسا نہ ہو چمن لال کا پرچا کٹ جائے۔"

"تین دن اسے کچھ نہیں ہوگا۔ اس کے بعد میری ذمے داری نہیں۔ اگر اس کے ساتھ تم بھی پکڑے جاؤ" حوالدار بولا "اب کیا کھڑا سن رہا ہے۔ جاتا کیوں نہیں۔"

غالب نے کہا "ہاں، ہم انتظار کر رہے ہیں تیرا ... پیسے لے کر آنا اور سیدھا ادھر ہی آنا۔ ہم آہستہ آہستہ چلتے ہیں۔"

مشکل یہ تھی کہ وہ ایک لمحے کے لئے بھی میری نظر سے اوجھل نہیں ہوئے۔ اگر درمیان میں کوئی موڑ آتا تو مجھے گرداور کے گھر کا دروازہ بجانے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ میں چند منٹ انتظار میں گزار کے پھران کے پاس پہنچ جاتا مگر اب حوالدار کی پارٹی دور جانے کے باوجود مجھ پر نظر رکھے ہوئے تھی۔

مجبوراً میں نے گرداور کے دروازے پر دستک دی۔ موٹا حوالدار اسی علاقے کا رہنے والا لگتا تھا اور شاید آس پاس کے گاؤں میں رہنے والوں کو پہچانتا بھی ہوگا۔ اس کے باوجود ہمیں شناخت نہیں کر سکا تھا تو اس کی وجہ یہی ہو سکتی تھی کہ ہم عام لوگ نظر آتے تھے اور پولیس کے روابط ہمیشہ خاص لوگوں سے رہتے ہیں۔ جو بلحاظ عہدہ خاص ہوں یا اپنے کرتوتوں کے باعث خصوصی شہرت حاصل کر لیں۔

پہلے ایک ملازم قسم کا سڑیل بڈھا دروازے تک آیا۔ اس نے بڑی بے ... زبان میں کچھ کہا جس کا مطلب میں نے اندازے سے اخذ کیا۔

"مجھے مانک لال سے کام ہے" میں نے پولیس پارٹی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

موٹے حوالدار کی نظر مجھ پر نہ ہوتی تو میں بڈھے سے دعا سلام کر کے واپس چلا جاتا مگر اب ضروری ہو گیا تھا کہ میں اصلی مانک لال سے گفتگو کرتا ہوا دیکھا جاؤں تاکہ شک کی گنجائش نہ رہے۔

بڈھے نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا اور واپس چلا گیا۔ چند منٹ کے بعد ایک جوان آدمی نمودار ہوا جس نے صرف دھوتی باندھ رکھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ابھی تک لذت خواب سحر باقی تھی۔ اس نے آنکھیں ملتے ہوئے مجھے غور سے دیکھا اور پھر منڈی ہلائی جس کا مطلب تھا کہ کیا ہے؟

نمستے کرنے کے بعد میں نے اسے چاچا کا پیغام دیا۔

وہ مجھے دیکھتا رہا "بس... یہی بات تھی؟"

میں نے کہا "اور کیا کہوں... جتنا تمہارے چاچا نے کہا تھا اس سے زیادہ تو نہیں کہہ سکتا۔"

اس نے کہا "لعنت تم پر اور چاچا پر۔"

"میں یہ جواب پہنچا دوں گا" میں نے کہا "نمستے۔"

"خواہ مخواہ نیند حرام کی۔"

میں نے کہا "مجھے ایک روپیہ چاہئے۔"

وہ دم بخود رہ گیا "اس کے لئے چندو چاچا کا نام لیا تو نے، مجھے جگایا حرامی... ایک روپے کے لئے" وہ چلا کے بولا۔

میں نے کہا "مانک لال جی بھگوان کی سوگند...."

"سوگند کے بچے... بھکاریوں کی اولاد... جھوٹے..."

میں نے کہا "میں جھوٹ نہیں بولتا۔ میرے ساتھ خود چلو یا کسی کو بھیج دو۔ اگر چندو چاچا انکار کریں اور مجھے نہ پہچانیں تو جو چور کی سزا سو میری۔ اور میں بھکاری بھی نہیں ہوں۔"

"اور کیا تیرے باپ نے قرض دیا تھا میرے باپ کو۔ جو تو صبح صبح وصول کرنے آ گیا" مانک لال پیلا ہو گیا۔

میں نے اسے دو ہزار روپے دکھائے جو سو سو کے نوٹوں کی صورت میں تھے "مجھے بس کے کرائے کا ایک روپیہ کھلا چاہئے۔ ورنہ بس والا مجھے اتار دے گا کہ صبح صبح آ گیا سو کا نوٹ لے کر۔"

"تو کیا لگتا ہے چندو چاچا کا؟"

میں نے سوچ کر کہا "جب وہ چاچا ہیں تو پھر میں بھتیجا ہی ہوا ... یہاں اور کسی کو جانتا نہیں تھا اس لیے آپ سے ایک روپیہ مانگ لیا۔ آپ اتنے بڑے آدمی ہو۔ ایک روپیہ دیتے ہوئے دل دکھتا ہے تو رہنے دو۔ کسی فقیر سے مانگ لوں گا' نمستے۔"

حسبِ توقع وہ مجھے گالی دے کر بولا "ٹھہر... میں لاتا ہوں۔"

میرا مقصد بھی یہی تھا کہ وہ اندر جا کے پھر آئے تاکہ دور سے نظارہ کرنے والے حوالدار کو اس ایک ایکٹ کے کھیل میں ڈائریکشن کا سقم کا نظر نہ آئے۔ وہ یہ نہ سمجھے کہ مانک لال نے صرف دھوتی باندھ رکھی تھی اور اس نے دھوتی میں بھی ہاتھ نہیں ڈالا تھا ورنہ یہ مانا جا سکتا تھا کہ دھوتی میں کوئی جیب تھی۔

مانک لال پھر آیا تو اس کے ہاتھ میں واقعی ایک روپے کا نوٹ تھا "یہ لے۔ اور دیکھ' چندو چاچا سے وہ مت کہنا جو میں نے کہا تھا" وہ جماہی لے کر بولا اور دروازے کے پیچھے روپوش ہو گیا۔

میں نے دل ہی دل میں کہا کہ لعنت تم پر اور تمہارے چندو چاچا پر اور اس پر جو پلٹ کر جائے۔ آہستہ آہستہ میں نے واپسی کے لئے قدم بڑھائے۔ گاؤں میں خاصی ٹریفک شروع ہو چکی تھی جو ایک گاؤں کے معمولات کے عین مطابق تھی۔ حضرات بیلوں کے ساتھ کھیتوں میں موجود تھے۔ بچے گلیوں میں کھیل رہے تھے اور خواتین امورِ خانہ داری سے فراغت کے بعد دیگر مشاغل میں مصروف تھیں۔ مثلاً گوبر سے دیواروں پر اُپلے چپکانا۔ مٹی گارے سے رسوئی چوکی کو لیپنا' مویشیوں کی دیکھ بھال۔ ہر گاؤں کی عورت شاید مرد سے کئی گنا زیادہ کام کرتی ہے۔

حوالدار میری سست روی پر نالاں تھا "کیا ہوا؟"

میں نے مٹھی کھول کے روپے اسے پکڑا دیئے "کچھ بھی نہیں ہوا۔"

حوالدار نے نوٹ جھپٹ کے اطمینان کا سانس لیا "میں تو تیری روتی شکل دیکھ کے سمجھا تھا کہ کچھ نہیں ملا۔"

میں نے کہا "یہ بھی دیکھ لو ابھی کہ نوٹ اصلی ہیں۔ بعد میں کچھ مت کہنا۔"

حوالدار نے مجھے غصے سے دیکھا مگر بولا نہیں۔

غالب نے کہا "تھانے دار صاحب' ناراض مت ہونا.... ایک بات ہے۔"

"کیا بات ہے؟" حوالدار کا موڈ دو ہزار نقد صبح دم جیب میں آ جانے سے بہت خوشگوار ہو گیا تھا۔

"یہ تھانے والے کچھ نہیں لیں گے؟ ایسے ہی ملاقات کی اجازت دے دیں گے۔"

"ابے ہماری بات کون ٹال سکتا ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے جی۔ لیکن بعد میں کہیں بات بگڑ نہ جائے یہاں دوسرا تھانے دار ہے" غالب نے کہا "اگر اس نے آپ کی بات نہ مانی۔ یا اس نے بھی ہم سے پچیس ہزار مانگ لیے تو ہم کریں گے۔"

"یہ سب میرے سوچنے کی بات ہے" حوالدار بگڑ کے بولا "تو کیوں مرا جا رہا ہے۔ آخر وہ میری سالی کا گھر والا ہے۔ ہم آدمی لے جائیں تو اسے کیا۔"

"اپنا آدمی!"

"ہاں۔ اسے پکڑا بھی ہم نے ہی تھا" حوالدار بولا۔

"ہاں جی' ہماری مرضی ہے اسے یہاں رکھیں نہ رکھیں" ایک کانسٹیبل نے اپنے افسر کی تائید کی۔

حوالدار نے سر ہلایا "اور ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ رات غلطی سے غلط آدمی کو پکڑ لیا تھا۔"

اس انکشاف نے ہم سب کو حیران کر دیا۔ رابعہ ان سپاہیوں کو ایسے دیکھ رہی تھی جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو مگر یہ عملاً ناممکن تھا۔ پولیس والے ایک سی وردیوں میں ایک سے لگتے ہیں۔ رابعہ نے انہیں دیکھا بھی رات کے اندھیرے میں تھا اور اس وقت خود اسے ہوش کہاں تھا کہ کسی کی صورت یاد رکھنے کے لئے غور سے دیکھتی۔

میں نے کہا "تم ابھی نکال لاؤ گے اسے۔"

غالب نے کہا "پھر کہاں رکھو گے؟ اپنے گھر میں؟"

حوالدار نے مونچھوں پر تاؤ دے کر کہا "یہ ہماری مرضی ہے اسے جہاں چاہے رکھیں۔ تم فکر کرو اسے چھڑانے کی۔ تین دن میں تاوان ادا نہ کیا تو میں پھر اسے بند کرا دوں گا اور پکا پرچا کٹا دیا ایک بار تو تمہارا باپ بھی اسے نہیں چھڑا سکے گا۔"

میں نے کہا "ہاں جی' وہ بے چارہ کیسے چھڑائے گا جو کب کا مر چکا۔"

اب میں ساری بات سمجھ گیا تھا۔ یہ گاؤں کا تھانہ تھا۔ قاعدے قانون تو خیر شہر کے تھانے میں بھی نہیں چلتے مگر یہاں سب اپنی مرضی کی بات تھی۔ حوالدار نے اپنی گشتی پارٹی کے ساتھ محسن کو پکڑ لیا تھا اور اپنی سالی کے گھر والے کی حوالات میں لا کے بند کر دیا تھا۔ یہ گویا گھر کی بات تھی۔ اب اس نے ہم سے پکا سودا کر لیا تھا تو اپنا آدمی واپس لے جانے کے لئے آ گیا تھا۔ اس میں کوئی غلط بات نہیں تھی۔ تھانے والے جسے چاہیں پکڑ لیں اور جسے چاہیں چھوڑیں۔ یہ تو ایک سیدھی عام اصول کی بات ہے جس پر ہر جگہ عمل ہوتا ہے۔

یہ حوالدار کچھ زیادہ ہی لالچ میں آ گیا تھا کہ اب محسن کو واقعی اپنے گھر میں یرغمال بنا کے رکھنا چاہتا تھا۔ اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ ہم لاوارث اور گم نام لوگ ہیں۔ اگر ہم ذرا بھی اہم ہوتے تو وہ ہمیں نہ پہچانتا۔ اسے یہ بھی امید ہو گئی تھی کہ ہم خود کو بچا کر بھی اس کا مطالبہ پورا کریں گے۔ یہ بہت بڑی رقم تھی۔ ایک گاؤں میں کوئی قتل کر کے بھی جان بچانے کے لئے اتنا بڑا نذرانہ پیش نہیں کرتا۔ قتل ہر روز نہیں ہوتے اور ہر قاتل کے وارث دولت مند نہیں ہوتے۔ حوالدار کے نزدیک ہم شاید اتنے شریف تھے کہ اپنی عزت بچانے کے لئے گھر بار بیچ سکتے تھے۔ دنیا میں ایسے لوگ اب احمق سمجھے جاتے ہیں اور الو بنائے جاتے ہیں خواہ وہ شہر میں ہوں یا دیہات میں۔

میں دل میں اس موٹے حوالدار کو ایسی سزا دینے کا فیصلہ کر چکا تھا کہ اس کی سالی کا گھر والا ہی نہیں ان کی آنے والی نسلیں بھی اس مثال سے عبرت حاصل کریں۔ تاہم یہ سب کچھ محسن کی حوالات سے رہائی کے بعد ہی ممکن تھا۔

تھانہ اچانک آ گیا۔ وہ دو پکے کمروں پر مشتمل عمارت تھی جس کے سامنے مختصر برآمدہ تھا۔ ایک کمرا حوالات کے طور پر استعمال ہو رہا تھا۔ دوسرا مختصر تھا اور تھانے دار کا کمرا تھا۔ باہر برآمدے میں پڑی ہوئی بینچ پر ایک شخص گھٹنوں میں سر دیئے سو رہا تھا۔ اس نے وردی کے بجائے عام دھوتی کرتا پہن رکھا تھا مگر وہ حوالات کا نگراں ثابت ہوا۔

موٹے حوالدار نے اسے گالی دے کر جگایا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھا اور اپنی رائفل کی طرف لپکا۔ رائفل کسی بے ضرر ڈنڈے کی طرح دیوار کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔ یہ بے ضابطگی کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی مگر حوالدار نے اس پر ضابطے کے مطابق باز پرس ضروری سمجھی۔

"سو رہا تھا..." وہ گالی دے کر بولا۔ گالی دینا خواہ وہ کتنی ہی فحش کیوں نہ ہو' پولیس والوں کی عادت اور پھر فطرت بن جاتی ہے۔ اس کے بغیر وہ بات ہی نہیں کر پاتے اور انہیں احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ کہاں کس کے سامنے اور کسے گالی دے رہے ہیں۔

ہمارے ساتھ جو شہری خواتین تھیں ان کے چہرے شرم سے لال پڑ گئے "سوتا کہاں جناب' ایسے ہی ذرا سر جھکا لیا تھا" نگراں حوالات نے وضاحت کی۔ پھر ہم سب کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

حوالدار نے بینچ پر بیٹھنے کے بعد چند لمبے لمبے سانس لئے۔ "ابے کوئی رائفل لے جاتا تیری پھر؟"

"کیسے لے جاتا جناب' گولی نہ مار دیتا میں اسے" حوالات کے نگراں نے کہا۔

حوالدار نے اتنی وضاحت طلبی کو کافی سمجھا۔ اس نے نگراں حوالات سے یہ نہیں پوچھا کہ وہ وردی میں کیوں نہیں ہے۔ تینوں کانسٹیبل اس کے سامنے رائفلیں لئے کھڑے ہوئے تھے مگر خوبصورت لڑکیاں گھونگٹ نکالنے کے باوجود اپنے حسن کی آب و تاب چھپانے سے قاصر تھیں۔ میری اور غالب کی صورت میں دو کاٹھ کے اُلو دست بستہ کھڑے تھے۔ حوالدار کو یہ منظر اچھا لگ رہا تھا۔ وہ اکیلا بینچ پر بیٹھا اپنی تھکن دور کرتا رہا اور شاید اس دولت کے بارے میں سوچتا رہا جو اس کے نام لکھی جا چکی تھی۔

"یہ کون .... ہیں جناب؟" حوالات کے نگراں سے اپنے تجسس پر قابو پائے رکھنا مشکل ہو گیا "کیا جرم کیا ہے انہوں نے؟"

حوالدار نے اسے ناپسندیدہ نظروں سے گھورا "ابے کیا تھانے میں شریف لوگ نہیں آتے؟ اور یہ صورت سے مجرم لگتے ہیں تجھے؟"

"صورت سے تو بھلا بھگت لگتے ہیں" وہ ہمیں زیادہ غور سے دیکھنے لگا مگر اس کی توجہ کا اصل مرکز بالآخر نازو ہو گئی۔ ہم ضبط سے کام لیتے رہے اور نظروں ہی نظروں میں ایک دوسرے کو صبر و ضبط کی تلقین کرتے رہے۔ محسن کے سامنے لائے جانے تک ہمارا ایسے ہی مظلوم نظر آنا ضروری تھا۔

"وہ آدمی کہاں ہے؟" حوالدار نے بالآخر پوچھا۔

"کون آدمی سر؟" حوالات کا نگراں چونکا۔

"وہی... جس کو ہم نے یہاں رکھوایا تھا... چمن لال... ابے ادھر دیکھ میری طرف" حوالدار نے اسے جھاڑ لگائی۔

وہ پھر محویت سے چونکنے پر مجبور ہو گیا "چمن لال.... وہ.... وہ تو نہیں ہے۔"

"نہیں ہے کا کیا مطلب؟" گل نے چلا کے کہا "چونکے ہم سب تھے مگر اس کا جذباتی ردعمل زیادہ شدید تھا جو ایک فطری بات تھی۔

میں نے بھی کہا "ہاں ہاں' کیا مطلب ہے آخر اس بات کا؟"

موٹے حوالدار نے ہم دونوں کو گھورا اور صورت حال کو سنبھالنے کے لئے حوالات کے انچارج کو ڈانٹا "ٹھیک پوچھ رہے ہیں یہ لوگ۔"

"لیکن سر' آپ کے جاتے ہی... وہ بھی چلا گیا تھا۔"

اب حوالدار کا پارہ چڑھ گیا "کہاں چلا گیا تھا... اور کیسے چلا گیا جب میں نے اس کو خود حوالات میں بند کیا تھا... اور کہا تھا کہ..."

"وہ تو ٹھیک ہے جناب... مگر بعد میں انچارج صاحب نے حکم دیا کہ اسے چھوڑ دو... معلوم نہیں کون چھڑانے کے لئے آیا تھا۔"

حوالدار کے منہ سے گالیوں کا طوفان اُمڈ آیا "وہ... اس کی تو... وہ کون ہوتا ہے میرے معاملات میں دخل دینے والا... مجھ سے پوچھے بغیر اس نے کیسے چھوڑا ایک مجرم کو۔ جواب وہی اس کا باپ کرے گا۔"

میں نے کہا "وہ مجرم نہیں تھا حوالدار... اور اس کو تم نے گرفتار کیا تھا۔ کسی جرم کے بغیر۔ جواب وہی تم کرو گے۔"

میرے بدلے ہوئے لہجے نے حوالدار کو چونکا دیا "کیا بکتا ہے!"

میں نے اس کے قریب جاکے اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا "جو میں کہہ رہا ہوں وہ کان کھول کے سنو۔ یہ دو ہزار جو میں نے دئے ہیں کچھ بھی نہیں۔ مگر مجھے اپنا آدمی چاہئے۔ تم اور تمہاری سالی کا گھر والا... دونوں مل کے نہ میرا پیسہ ہضم کرسکتے ہو اور نہ میرا آدمی غائب کرسکتے ہو۔"

حوالات کے نگراں نے میری گدی پر ہاتھ مارا "بدتمیزی کرتا ہے حوالدار صاحب کے ساتھ۔ دھمکی دیتا ہے۔"

میں نے اس کی کلائی پکڑ کے ایک جھٹکا دیا تو وہ منہ کے بل گرا۔ میں نے اسے بالوں سے پکڑ کے اٹھایا اور بینچ پر پٹخ دیا۔ یہ سب اتنی تیزی سے ہوا تھا اور سب کے لئے اتنا غیر متوقع تھا کہ موٹے حوالدار کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ اس کے دونوں رائفل بردار ماتحت بھی ہکا بکا کھڑے رہے۔

پھر حوالدار نے گرج کے کہا "اوئے، پکڑلو اس بدمعاش کو۔ ابھی بتاتے ہیں اسے کہ تھانے میں کیسے بات کرنی چاہئے۔"

ایک رائفل والے نے مجھ پر حملہ کیا۔ دوسرے نے اپنی رائفل کا رخ میری طرف یوں کردیا جیسے مجھ پر واقعی گولی چلادے گا۔ میں نے حملہ کرنے والے کانسٹیبل سے اس کی رائفل چھین کر اسے ایک دھکا دیا اور موٹے حوالدار پر پھینک دیا۔ رائفل اب میرے ہاتھ میں تھی۔ اسے میں نے ڈنڈے کی طرح استعمال کیا اور دوسرے کانسٹیبل کی رائفل پر مارا۔

"اوئے تمہاری... دیکھتے کیا ہو، سب مل کے اس کی..." حوالدار پاگلوں کی طرح چیخنے لگا۔

میں نے اشارے سے نازو اور گل کے علاوہ غالب اور رابعہ کو بھی پیچھے کردیا۔ فی الحال ان میں سے کسی کو مداخلت کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ تینوں نہتے رہ جانے والے کانسٹیبل ایک ساتھ جست لگاکے میری طرف آئے۔ ایک کو میں نے گھٹنا مارکے اچھالا۔ وہ پیٹ پکڑ کے زمین پر لوٹنے لگا اور بلبلانے لگا۔ دوسرے کو میں نے ہاتھ گردن میں ڈال کے سیدھا گزار دیا۔ وہ دیوار سے ٹکرایا اور وہیں بیٹھ گیا۔ تیسرا مجھے ایک مکا مارنے میں کامیاب رہا۔ یہ مکا میرے پیٹ میں لگا اور کسی حد تک مؤثر ثابت ہوا۔ وہ طاقتور دیہاتی نوجوان تھا اور معلوم نہیں کس طرح اس نے ایک پیشہ ور باکسر والا پنچ مارا تھا۔ ذرا سی دیر کے لئے میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا آگیا۔ پھر میں نے اسے دو جوابی مکے مارے جو اس کی ناک پر اور ٹھوڑی کے نیچے لگے۔ وہ موٹے حوالدار کے قدموں میں جاگرا اور ناک سے بہنے والے خون کو دیکھ کر بدحواس ہوگیا۔ وہ حوالات کا نگراں تھا اور تھانے میں اس کی حیثیت ڈی آئی جی سے کم نہ تھی لیکن دھوتی نے اسے دغا دی۔ مزید یہ کہ اس نے ناک صاف کرنے کے لئے بھی دھوتی سے رجوع کیا۔ عادت کے مطابق... اور پھر ایک کونے میں [illegible]

ہوئی بالٹی کی طرف دوڑا۔ گل، رابعہ اور نازو خاموشی سے منہ پھیر کے کھڑی ہوگئیں۔ حوالدار شکست خوردہ لشکر کے کمانڈر کی طرح خوف زدہ ہونے کے باوجود اپنی خودی کو بلند رکھنے کی کوشش کرتا رہا۔

"دیکھو، دنگا فساد بڑا سخت جرم ہے" اس نے مجھے نرمی سے سمجھانے کی کوشش کی "سات سال کے لئے اندر ہو جاؤ گے تم۔"

میں نے کہا "رشوت لینے کے جرم کی سزا کیا ہے؟"

اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا "او یہ لے یار، اپنے دو ہزار اور ہماری جان چھوڑ۔"

میں نے دو ہزار کے نوٹ اس کے منہ پر مارے "فقیر خیرات دینے کے بعد اور کتے کو ہڈی ڈالنے کے بعد واپس نہیں لیتا... مجھے میرا آدمی چاہئے۔ ورنہ میں تیرا پیٹ پھاڑ دوں گا لات مار کے۔"

حوالدار کا رنگ فق ہوگیا "تم... تم کون ہو؟"

میں نے فلمی ولن کی طرح قہقہہ لگا کے کہا "ڈاکو چمن لال کے ساتھی۔ کہاں ہے وہ؟ اس سے پوچھو ورنہ میں اس کا خانہ خراب کردوں گا۔"

حوالات کا نگراں اب دھوتی باندھ چکا تھا اور مجھے خونی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے جھک کر ایک مگ پانی سے پھر ناک صاف کی "میں نے بتایا ہے ناکہ انچارج صاحب کے پاس کوئی آیا تھا۔ وہ لے گیا۔"

میں نے اس کے آگے بڑھ کر لات رسید کی۔ وہ دیوار سے ٹکرا گیا اور بالٹی سمیت فرش پر لڑھک گیا "انچارج کہاں ہے؟ اس نے کتنے پیسے لئے ہیں... اور کس کے ہاتھ بیچا ہے اسے۔"

لیکن حوالات کا نگراں اب جواب دینے کے قابل نہیں رہا تھا یا جان بوجھ کے مکر کررہا تھا اور بے ہوش نظر آتا تھا۔

میں نے غالب سے کہا "تم اس کو دیکھو... پوچھو اس سے کہ چمن لال کو لے جانے والا کون تھا۔"

غالب نے مجھ سے ماچس لی۔ ایک تیلی جلا کے بجھائی اور فوراً بے ہوش پڑے ہوئے شخص کی جامے سے باہر ہونے والی ٹانگ پر لگادی۔

وہ چیخ مار کے اٹھ بیٹھا "مجھے نہیں معلوم۔"

غالب نے میز پر سے ایک بید کی چھڑی اٹھالی جو وہاں آلۂ تفتیش کے طور پر استعمال کی جاتی ہوگی اور تھانے دار اسے بغل میں دبا کے اپنی شان بڑھاتا ہوگا۔

"معلوم نہیں ہے یا... یاد نہیں آرہا ہے" غالب نے شائیں سے لمبی پتلی چھڑی اس کے پیٹ پر ماری۔

وہ ہائے ہائے کرنے لگا اور پیٹ کو زور زور سے ملنے لگا۔

"آواز نہ نکلے" غالب نے اس پر مسلسل وار کئے۔ وہ چلاتا رہا اور اچھلتا رہا۔ [illegible] کو بچانے کی بے سود کوششیں کرتا رہا۔ اس چھڑی کو آج تک اس نے نہ جانے کتنے انسانوں کی چمڑی پر

[illegible] خود اپنی چمڑی پر اس کی ایک ضرب برداشت [illegible] کبھی نہ ہوا تھا۔

"کچھ یاد آیا... کون لے گیا ہے چمن لال کو؟"

ابھی صبح کا وقت تھا اور تھانہ گاؤں کی حدود سے باہر تھا [illegible] شور و غل کسی کو متوجہ نہیں کرسکتا تھا۔ تفتیش میں [illegible] کوئی مداخلت نہیں کرتا کہ کہیں وہ خود شامل تفتیش نہ [illegible] چیخ و پکار سے کسی کو یہ بھی کیسے معلوم ہوسکتا تھا کہ تفتیش کرنے والے خود آج زیر تفتیش ہیں۔ اور اگر معلوم [illegible] بیشتر لوگ اس بات سے دلی مسرت حاصل کرتے۔ ان کی [illegible] کوئی نہ آتا۔

حوالات کے نگراں کی امید بھری نظریں بار بار حوالدار صاحب کی طرف اٹھتی تھیں کہ شاید وہ خود کو افسر ثابت کرتے ہوئے ریوالور نکالے اور ان مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچادے جو چوری کے بعد سینہ زوری کے مرتکب ہو رہے تھے اور تھانے کے اندر تھانے والوں کا خون کرنے کے درپے تھے مگر میں حوالدار کے سر پر سوار تھا۔ اس کے دونوں وردی پوش ماتحت اب ہوش میں آچکے تھے لیکن وہ کچھ کرنے کے موڈ میں نہیں تھے۔ شاید موٹا حوالدار بھی انہیں حکم دیتا کہ اٹھو اور ہتھیار اٹھا کے جان کی بازی لگاتے ہوئے مجرموں کا قلع قمع کردو تب بھی وہ اتنی ہی بے حسی کے ساتھ بیٹھے [illegible] کی سزا کو جان کی بازی لگانے پر ترجیح دیتے۔ وہ حوالات [illegible] حالت سے خاصی عبرت حاصل کررہے تھے۔

حوالدار نے کہا "ابے [illegible] معلوم ہے۔ کیوں مرنا چاہتا ہے۔"

"بھگوان کی سوگند، سچ کہتا ہوں... مجھے نہیں معلوم..." وہ [illegible] طرح کراہتے ہوئے بولا۔

اس کے سارے بدن پر لال لکیریں ابھرنے لگی تھیں جن کو وہ کپڑے ہٹا [illegible] دیکھتا تھا۔ ایسی لکیریں اس نے بہت سے جسموں پر بنائی ہوں گی [illegible] کی اذیت کیا ہوتی ہے، اس کا اندازہ اسے نہ تھا۔ یہ اس [illegible] ناقابل تصور صورت حال تھی کہ دو ڈاکو جو صورت سے شریف آدمی لگتے تھے اور اپنے حلئے سے حوالدار کی آنکھوں میں دھول جھونک چکے تھے، اب تھانے کے اندر [illegible] مسلح افراد پر حاوی آچکے تھے۔ کوئی اس کی مدد نہیں کررہا تھا، مقابلہ کرنے والے حوصلہ تک ہار چکے تھے۔ ممکن ہے اسے احساس ہوا ہو کہ ڈاکو واقعی بڑے جیالے، طاقتور اور خطرناک لوگ ہوتے [illegible] وہ اتنے باہمت اور باصلاحیت نہ ہوتے تو ڈاکو نہ بنتے۔ پولیس میں بھرتی ہوجاتے۔

غالب نے اسے دوسری بار بڑی بے رحمی سے مارا اور عملاً اس کی کھال ادھیڑ دی۔ اس کی جلد کئی جگہ سے پھٹ گئی اور بید کی ضربات کے نشانوں سے خون رِسنے لگا۔ وہ لمبا چوڑا مرد ہونے

کے باوجود کم ہمت اور بزدل آدمی تھا۔ وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں فرش پر لوٹ رہا تھا اور غالب کے پاؤں پکڑ رہا تھا۔ ہاتھ جوڑ کے منت سماجت کررہا تھا۔ آج تک اسے اپنی جسمانی طاقت پر بہت غرور ہوگا اور پولیس میں بھرتی ہوجانے کے... بعد تو کڑوا کریلا نیم چڑھ گیا ہوگا۔ لوگ اس سے ڈرتے ہوں گے۔ وہ کسی سے نہیں ڈرتا ہوگا مگر وہ کتنا کمزور تھا، اس کا اندازہ اسے آج ہوا تھا۔ اس سے کمزور جسم کے مالک زیادہ قوت برداشت کے مالک ہوتے ہیں جو سخت ترین تشدد کو خاموشی سے جھیل جاتے ہیں۔

اب حوالدار کی حالت بھی غیر ہونے لگی تھی "ڈاکو صاحب! بھگوان کے لئے ہماری غلطی معاف کردو" اس نے اچانک ہاتھ جوڑ کے کہا "ہمیں معلوم نہیں تھا کہ وہ آپ کا ساتھی ہے۔"

"ورنہ تم اسے گرفتار نہ کرتے" میں نے اس کے منہ پر الٹا طمانچہ مار کے کہا "اصلی بات یہ ہے موٹے... کہ تمہیں دھوکا ہوا... ہماری صورت سے اور ہماری باتوں سے۔ تم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ چمن لال کے ساتھی یہاں پہنچ جائیں گے۔"

ماتحتوں کے سامنے گال پر طمانچہ کھاکے حوالدار کا چہرہ احساس ذلت کی تصویر بن گیا۔ اس نے خوں آشام نظروں سے بے غیرت ماتحتوں کو دیکھا جو اپنے افسر پر اپنی جان قربان کرسکتے تھے لیکن وہ خوف زدہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے اور اپنی اپنی جگہ دبکے بیٹھے اپنی جان کی سلامتی کے لئے فکرمند تھے۔

"میں کہہ رہا ہوں ان لوگوں سے ضد مت کر" حوالدار نے حوالات کے نگراں کو گالی دے کر کہا "کچھ تو دیکھا ہوگا تو نے۔"

حوالات کے نگراں نے بالٹی میں رہ جانے والے پانی کے چند قطرے مگ میں ڈال کے پی لئے۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا اور اس پر لرزہ طاری تھا۔

"میں مرجاؤں گا... مجھے مت مارو... میں نے... صرف اسے پیچھے سے دیکھا تھا" اس نے لڑکھڑاتی زبان کے ساتھ کہا۔

"پیچھے سے کیا دیکھا تھا؟" غالب نے کہا "جوان تھا یا بوڑھا؟ کپڑے کیسے پہن رکھے تھے۔ اکیلا آیا تھا یا کسی کے ساتھ؟"

"کسی کے ساتھ... آیا تھا" اس نے سوچ کے کہا "درمیانی عمر کا آدمی تھا۔ اچھے کپڑے پہن رکھے تھے... قمیص پتلون۔ نیلی دھاری والی قمیص، کالی پتلون۔"

"اس کے ساتھ کون تھا؟"

"اسے میں نے نہیں دیکھا... وہ گاڑی میں بیٹھا رہا تھا۔"

غالب نے کہا "گاڑی میں! وہ گاڑی میں آئے تھے۔ کیسی گاڑی تھی؟"

"کار تھی، رنگ نہیں دیکھا میں نے۔ گہرا نیلا تھا... یا کالا۔"

"نمبر دیکھا تھا؟" غالب نے کہا۔

حسب توقع اس نے نفی میں سر ہلایا "کار دور تھی،

اندھیرے میں تھی۔ وہ انچارج صاحب کے کمرے میں گیا اور وہیں بیٹھا رہا۔"

"انچارج صاحب اتنی رات کو یہاں موجود تھے؟" میں نے کہا۔

"نہیں... انہی کے ساتھ آئے تھے وہ بھی۔"

"میں سمجھ گیا... انہوں نے باہر ہی باہر تمہارے انچارج صاحب سے سودا پکا کر لیا تھا" میں نے کہا "اب ذرا سوچ کے اس شخص کے بارے میں بتاؤ، جو انچارج صاحب کے ساتھ آیا تھا۔ اس وقت تم کہاں تھے؟"

"میں... اسی جگہ۔"

"پھر تم نے اسے دیکھا کیوں نہیں؟" غالب نے بید لہرا کے کہا۔

وہ چلایا "میں... میں سو رہا تھا... ایسے ہی... جیسے آج... وہ معلوم نہیں کب آئے تھے۔ مجھے انچارج صاحب نے اٹھا کے کہا کہ چمن لال کو نکال لاؤ۔"

"پھر... جب تم چمن لال کے ساتھ گئے تھے" ...قت...

اس نے غالب کی بات کاٹ دی "میں اس کے ساتھ کمرے میں نہیں گیا تھا، انچارج صاحب میرے ساتھ حوالات میں گئے تھے اور چمن لال کو ساتھ لے گئے تھے۔ اتنی دیر میں وہ آدمی باہر جا چکا تھا۔ انچارج صاحب بھی چمن لال کے ساتھ نکل گئے تھے۔ میں نے حوالات کو تالا لگایا...."

"تالا کیوں لگایا جب اندر کوئی نہیں تھا؟"

وہ کچھ دیر بعد بولا "آرڈر ہے جناب، عادت ہو گئی ہے۔ جب میں باہر آیا تو وہ گاڑی کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے اسے پیچھے سے ہی دیکھا۔"

غالب نے کہا "اور دوسرا شخص جو گاڑی میں تھا۔"

"اسے میں نے بالکل نہیں دیکھا..."

بظاہر یہ ساری تفتیش بے نتیجہ رہی تھی۔ جو کچھ ہمیں معلوم ہو سکا اس سے ایک ہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا کہ کسی نے محسن کے بارے میں تھانے کے انچارج سے معلوم کیا یا کسی اور سے مگر وہ راتوں رات اسے حوالات میں سے نکال لے گئے۔ انہیں کس نے اطلاع دی؟ تھانے کے انچارج نے محسن کو ان کے حوالے کرنے کا فیصلہ دباؤ کے تحت کیا یا لالچ میں؟ محسن کو لے جانے والے کون ہیں اور اسے کہاں لے گئے۔ ان سب سوالات کا یقینی جواب کسی کے ذہن میں نہیں تھا۔ تھانہ انچارج سے بہت کچھ معلوم ہونے کی امید تھی لیکن وہ غائب تھا اور اس کی واپسی کے بارے میں کوئی کچھ نہیں بتا سکتا تھا۔

میرا قیاس کہتا تھا کہ محسن کو وہی لے گئے ہوں گے جن کے قبضے میں اس کے بیوی بچے پہلے سے تھے۔ وہ تھانے تک کیسے پہنچے ...اس بارے میں یہ مفروضہ قائم کیا جا سکتا تھا کہ جب محسن گرفتار ہوا تھا تو کوئی دیکھ رہا تھا۔ شاید بجلی گھر کے چوکیدار نے دیکھ لیا ہو کہ جس نے بجلی بند کی تھی وہ پکڑا گیا۔ اس سے بجلی والا اور اینڈ کمپنی یا ترپوینی کے کسی آدمی نے پوچھا ہوگا کہ بجلی کس نے بند کی تھی۔ اور اس نے بتا دیا ہوگا کہ اس بدمعاش کو تو پولیس لے گئی۔ پھر یہ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے اس علاقے کے تھانوں سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی ہو اور محسن کو حوالات میں بند دیکھا ہو تو انچارج کے گھر جا پہنچے ہوں۔ انہوں نے نقد سودا کیا ہو یا ریوالور دکھا کے انچارج کو تھانے لے آئے ہوں۔ یہ سوچ کر میرا دل ڈوبنے لگتا تھا کہ فی الحقیقت ایسا ہوا تو بہت برا ہوگا۔ ابھی شہلا کی رہائی کے لئے ہماری ناکام کوشش کا زخم ہرا تھا۔ یہ ایک اور زیادہ بڑی ناکامی کا داغ ہوگا۔ ہمارے دشمن پہلے ہی شہلا کو ہماری جذباتی کمزوری بنا کے ہمیں پوری طرح بلیک میل کر رہے ہیں۔ اگر محسن بھی ان کی تحویل میں چلا گیا تو ہم زیادہ مجبور اور بے بس ہو جائیں گے۔ خود محسن کے لئے یہ انکشاف کتنا بڑا صدمہ ہوگا کہ اس کی بیوی اور اس کا بیٹا پہلے سے یرغمال ہیں اور ان کی زندگی داؤ پر لگی ہوئی تھی لیکن ہم نے اس سے ہر بات چھپائی۔ وہ سمجھے گا کہ ہم اسے بتائے بغیر شہلا کی قربانی دینے پر تیار تھے۔ ہمیں اس کی جان کی قطعی پروا نہیں تھی اور محسن کے جذبات کا کوئی خیال نہ تھا۔ یا اسے افسوس ہوگا کہ میں نے اس پہ بھروسا نہیں کیا۔ اسے بزدل اور کمزور جانا۔ یہ فرض کر لیا کہ محسن اپنے بیوی بچوں کی خاطر ایم آر ایس کا ساتھ چھوڑ جائے گا یا مشن کو اپنی محبت پر قربان کر دے گا۔ ہر صورت میں اسے ہم سے گلہ ہوگا اور الزام ہماری ذات پر آئے گا۔ ہماری سوچ پر آئے گا اور ہماری بے اعتمادی پر آئے گا۔

غالب نے کہا "اب کیا کرنا ہے استاد؟"

میں چونکا "کیا کرنا چاہئے؟"

"انچارج صاحب کے گھر جانا چاہئے" غالب نے کہا۔

"بالکل ٹھیک، اور اگر وہ گھر پر نہ ملیں تو پھر یہاں رک کر ان کی واپسی کا انتظار کرنا چاہئے" میں نے کہا۔

صبح کے آٹھ بج کر چالیس منٹ ہو رہے تھے۔ مجھ پر مایوسی کے ساتھ تھکن غالب آنے لگی تھی۔ رات بھر کی معرکہ آرائی نے سب کو جسمانی طور پر بھی نڈھال کر دیا تھا اور ذہنی طور پر بھی... اگر شہلا مل جاتی اور محسن ساتھ رہتا تو ہمارے لئے کامیابی کی خوشی بہت بڑی ہوتی جو تھکن اور مایوسی کے احساس کو مٹا دیتی لیکن اب صورت حال یہ تھی کہ ہم نے اتنے کشت و خون کے بعد اسلحے کا ایک بہت بڑا ذخیرہ تو تباہ کر دیا تھا لیکن عیار دشمن نے ہمارے لئے شکست کے اسباب بھی پیدا کر دئیے تھے۔

گل، رابعہ اور نازو برآمدے میں فرش پر بیٹھ گئی تھیں اور بالکل خاموش تھیں۔ وہ آپس میں بھی کوئی بات نہیں کر رہی تھیں۔ محسن کے بارے میں تازہ اطلاع نے ان کے حوصلے بھی پست کر دئیے تھے۔ ان کو آرام کی ضرورت تھی۔ اس کا اندازہ مجھے اپنی حالت سے ہوتا تھا۔ میری ٹانگیں درد کر رہی تھیں اور آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ کچھ دیر سکون کے ساتھ مجھے چائے مل جاتی تو میری حالت بہت بہتر ہو جاتی۔

میں نے کچھ دیر اس صورت حال پر غور کیا اور پھر یہ طے کیا اس وقت انچارج کی تلاش میں نکلنا خود کو زیادہ تھکانے کے مترادف ہوگا۔ یہاں رک کے ہم آرام بھی کر سکتے تھے اور انچارج کے آنے تک ملنے والی مہلت میں کھانے پینے کے لئے بھی کچھ لا سکتے تھے یا منگوا سکتے تھے۔

"حوالدار، پیسے واپس کرو" میں نے کہا۔

حوالدار نے وہ نوٹ فوراً میرے حوالے کر دئیے جو اس نے گن گن کر پھر جیب میں رکھ لئے تھے۔

"ہر جیب خالی کر دو۔ جو کچھ ہے یہاں ڈال دو، اس ریوالور سمیت" میں نے کہا۔

"ریوالور... سرکاری ہے۔"

میں نے اس کے پیٹ پر لات ماری "سب کچھ سرکاری ہے۔ تم، تمہاری یہ وردی، تمہاری یہ مشک، تمہاری جان۔ ہم سب لے سکتے ہیں۔"

وہ کچھ دیر پیٹ پکڑ کے پاگل ہو جانے والے بکرے جیسی آوازیں نکالتا رہا۔ میں نے غالب سے بید کی چھڑی لی تو اس نے ہر چیز میرے سامنے ڈال دی۔

"چلو تم بھی" میں نے اس کے دونوں ماتحتوں کو اشارہ کیا۔

وہ بڑی پھرتی سے اٹھے۔ انہوں نے رائفلیں بھی میرے قدموں کے قریب حوالدار کے ریوالور کے پاس رکھیں۔ ہر جیب خالی کی اور سیدھے کھڑے ہو کے مجھے یوں دیکھنے لگے جیسے پوچھ رہے ہوں کہ اور کیا حکم ہے ہمارے لئے۔

"تم سب باری باری حوالات میں جاؤ گے" میں نے کہا۔

موٹے حوالدار نے پہل کرنے کی کوشش کی۔ یہ اس کے لئے اطمینان کی بات تھی کہ ہم نے تفتیش روک دی ہے اور اسے جسمانی طور پر کوئی گزند پہنچنے کے امکانات ختم ہو رہے ہیں۔ حوالات اس کے لئے بہت محفوظ مقام تھا۔

میں نے اس کے پیٹ پر ایک بید ماری "پوری بات سن لو پہلے" وہ تڑپ کے بیٹھ گیا اور آہستہ آہستہ پیٹ کو ملنے لگا۔

"جو اندر جائے گا، وہ اپنی وردی اتار کے باہر پھینک دے گا" میں نے کہا۔

میرے احکامات سن کے ان کو سکتہ ہو گیا۔ سب سے زیادہ صدمہ حوالدار کو پہنچا کیونکہ وہ بہرحال افسر تھا۔

"ایسا ظلم مت کرو۔ ہم کسی کو کیا منہ دکھائیں گے" اس نے [illegible] لہجے میں کہا۔

"ویسے بھی تم یہ اپنا منہ نہیں دکھانا چاہتے آئندہ کسی کو" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "ان کی مرضی، ہم ان کا منہ غائب کر دیں گے۔"

"اس کے لئے تو سر بھی کاٹنا پڑے گا" میں نے کہا۔

"کیا ہم نے پہلے کم سر کاٹے ہیں" غالب نے کہا۔

"ہم نے تو لاشوں کے کپڑے بھی اکثر اتارے ہیں۔ ان کی وردی بھی بعد میں اتار لیں گے" میں نے کہا اور حوالدار کا ریوالور اٹھا لیا۔

حوالدار کا ایک ماتحت حوالات کی طرف دوڑا "مجھے.... مجھے مت مارنا گولی، میں وردی دیتا ہوں۔"

دوسرے نے ہکلا کے کہا "میں.... میں... میں بھی۔"

ان دونوں نے نہایت پھرتی کے ساتھ حوالات میں جاتے ہی اپنی اپنی وردیاں باہر پھینک دیں۔ پھر تقدیر کو کوستا روتا بسورتا موٹا حوالدار بھی اٹھا۔ اس نے حوالات میں قدم رنجہ فرمانے سے پہلے آخری بار ہماری طرف رحم طلب نظروں سے دیکھا اور مایوس ہو کے اپنے ماتحتوں کے ساتھ انہی جیسا ہو گیا۔ فرق صرف وردی کی وجہ سے پڑ رہا تھا۔ لباس قدرت میں سب ایک سے اور برابر تھے۔ معلوم نہیں ماتحت مسکرائے تھے یا حوالدار اپنی خفت مٹانے کے لئے ان پر گرجنے برسنے کا فیصلہ کر چکا تھا کہ حوالات میں سے اس کے چیخنے دہاڑنے اور گالیاں بکنے کی آوازیں آنے لگیں۔

میں نے دروازے کے پاس جا کے کہا "یہ کون بھونک رہا ہے؟"

حوالدار ایک دم خاموش ہو کے بیٹھ گیا۔

"اب کسی نے چوں بھی کی تو کتے کی موت مار دوں گا" میں نے کہا۔

حوالات کا نگراں منتظر تھا کہ اب اسے جانا ہوگا مگر میں نے اسے روک لیا۔

"یہاں چائے پانی کا کیا انتظام ہے؟" میں نے کہا۔

"سب انتظام ہے، چائے میں خود بناتا ہوں" وہ بولا۔

"کیسے بناتے ہو، سامان کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

"انچارج صاحب کی الماری میں" اس نے کہا۔

"چلو پھر چائے بناؤ، ہم سب کے لئے" میں نے کہا "کھانے کو کچھ ملے گا؟"

"صرف بسکٹ ہوں گے جناب" وہ بولا۔

اس کمرے میں تین کرسیاں تھیں اور ایک لمبی سی بینچ تھی۔ گل کی حالت گولی کے زخم کی وجہ سے خراب ہونے لگی تھی۔ اس کے زخم کی فوری طور پر صفائی ضروری تھی اور اسے دوا کی بھی ضرورت تھی مگر فی الحال ہمارے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے اسے بینچ پر لٹایا تو مجھے احساس ہوا کہ اسے بخار چڑھ گیا ہے۔ نازو اس کے سرہانے اس کا سر اپنی گود میں رکھ کے بیٹھ گئی۔

رابعہ اس کے پیروں کی طرف بیٹھی۔ وہ خاصی فکر مند ہو رہی تھی۔
"یہاں اسپرین نہیں ملے گی؟"

حوالات کا نگراں الماری میں سے بجلی کا ہیٹر نکال چکا تھا۔ کیتلی نکالتے ہوئے اس نے پلٹ کے دیکھا "کیا چیز بیگم صاحب؟"

بیگم صاحبہ کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی "بخار کی گولی۔"

"ہوگی' میز کی دراز میں... انچارج صاحب رکھتے ہیں سر درد کے لئے" اس نے سرہلا کے کہا۔

اوپر والی دراز مقفل تھی۔ میں نے اس کا تالا دو جھٹکوں میں توڑ دیا۔ دراز میں سر درد کی گولیاں بھری پڑی تھیں۔ ہر نام اور ہر برانڈ کی' ان میں اسپرین بھی تھی اور پیرا سیٹامول بھی۔

"کیا انچارج صاحب کا سر خراب ہے... درد رہتا ہے اکثر" میں نے تین گولیاں نکال کے کہا۔

"ہاں جی' آدھے سر کا درد ہوتا ہے ان کو۔"

"پانی کہاں ہے؟"

"باہر' میں لاتا ہوں... پیچھے ہینڈ پمپ ہے۔"

میں نے کہا "لاؤ کیتلی مجھے دو... میں لاتا ہوں' تم جاؤ گے تو کیتلی سمیت بھاگنے کی کوشش کرو گے۔ پھر ہمیں تم پر گولی چلانی پڑے گی۔ تمہاری لاش اٹھانی پڑے گی' کیا فائدہ۔"

آدھے گھنٹے بعد میں گل کو وہ گولیاں دے چکا تھا اور وہ خاموشی سے آنکھیں بند کئے لیٹی ہوئی تھی۔ اس کا بخار ختم نہیں ہوا تھا مگر درد اور بے چینی کی کیفیت باقی نہیں رہی تھی۔ نازو نے اسے چائے بھی زبردستی پلائی تھی اور ایک بسکٹ بھی زبردستی کھلایا تھا۔ باقی سب نے بسکٹ کھانے میں مقابلہ کیا تھا اور سابق انچارج حوالات ایک ایک کر کے ڈبے ہمارے سامنے کھولتا گیا تھا۔ چار ڈبے ختم ہو گئے تو اس نے اسٹاک ختم ہو جانے کا اعلان ڈرتے ڈرتے کیا۔ اسپرین کی ضرورت سب کو تھی۔ باقی گولیاں ہم نے ساتھ رکھنے کے لئے جیبوں میں ڈال لیں۔ دراز میں اعلیٰ درجے کی سگریٹ بھی تھی اور ایک غیر ملکی ساخت کا ریوالور بھی تھا۔

نازو نے اچانک کہا "وہ تھیلا تو باہر ہی رہ گیا۔"

غالب نے کہا "جس میں پھل تھے اور مٹھائی تھی۔ بہت خوب۔"

میں نے کہا "ابھی رہنے دو' بعد میں کام آئے گا۔"

"ہم یہاں کب تک انتظار کریں گے؟" غالب نے گھڑی دیکھ کر کہا۔

"انچارج صاحب کے آنے تک۔"

"وہ کب آئیں گے؟"

"جب خدا لایا" میں نے کہا "مجھے نیند آ رہی ہے۔"

"نیند مجھے بھی آ رہی ہے۔"

"لیکن جو سوتا ہے وہ کھوتا ہے' یعنی گدھا ہے' چنانچہ ہم ایک کام کرتے ہیں" میں نے دوسری سگریٹ سے ... کہا "ہم یہ حلیہ بدل لیتے ہیں' اس حلئے میں مجھے کرداروں ... دیکھ چکا ہے۔"

غالب نے کہا "کام کی تو صرف دو وردیاں ہیں۔"

میں نے کہا "ہاں' موٹے حوالدار کی وردی ... سکتے ہیں۔"

"مثلاً میں اور نازو" غالب نے کہا۔

"ایک نیام میں دو تلواریں" میں نے کہا اور نازو کی طرف دیکھا۔

نازو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بھی رابعہ کی طرح ... کا شکار تھی۔ شہلا کے نہ ملنے' محسن کے غائب ہو جانے ... کی طبیعت بگڑ جانے سے ان دونوں کی صورتیں اتری ہوئی تھیں۔

وردیاں میں نے اور غالب نے پہن لیں۔ دراز میں سے نکلنے والا غیر ملکی ساخت کا ریوالور میں نے رکھ لیا۔ غالب ... مجھ سے بہت اچھا تھا اور وہ دیسی ساخت کے ریوالور سے بھی چلا سکتا تھا۔ حوالات کے نگراں کو میں نے حوالات کے باہر ... کر دیا تھا۔ حوالات میں ایسی خاموشی تھی کہ معلوم ہوتا تھا ... شرم اور غیرت سے مر گئے ہیں۔ موٹے حوالدار کی وردی ... نے پھاڑ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ تھانے میں ہتھکڑی ... ایک تھی۔ اضافی ملزموں کو باندھ کر رکھنے کے لئے رسی استعمال کی جاتی تھی۔

میں نے غالب کے ساتھ حوالات کا رخ کیا اور نازو کو ... نظر رکھنے اور انچارج صاحب کی تشریف آوری کی صورت میں سگنل دینے کی تاکید کی۔ انچارج حوالات کے لئے یہ ڈیوٹی ... باعثِ شرمندگی ثابت ہو رہی تھی۔ وہ اپنے ساتھیوں کی ... مدد کرنے سے قاصر تھا چنانچہ وہ ان سے نظر بھی نہیں ملا رہا تھا ... مار سب سے زیادہ اسی نے کھائی تھی اور اگرچہ اس کی جسمانی حالت بہت ابتر تھی مگر پھر بھی وہ ان کی طرح نہیں تھا ... حمام میں تھے۔

جب میں نے اسے حوالات کے اندر آنے کا حکم دیا تو ... پریشان ہو گیا "میں نے کیا قصور کیا ہے جناب؟"

"تم سب اسی لئے زندہ ہو کہ ہماری نظر میں بے قصور ..." میں نے کہا "نادانستگی میں تم سے ایک غلطی ہو گئی۔ حوالدار ... ہمارے ساتھی کو پکڑا اور تم نے غلط آدمی کے حوالے کر دیا ... کی معمولی سزا ہے۔"

وہ اندر آ گیا تو میں نے کہا "وردی کہاں ہے تمہاری؟"

"الماری میں" اس نے کہا "آپ بے شک لے لو۔"

میں نے کہا "تھینک یو۔ مجھے یہ دھوتی اور یہ کرتا ... آ رہا ہے۔"

... حوالدار' ادھر آ جاؤ" میں نے عقبی حصے کے روشندان ... جھانک کر کہا۔ روشندان میں مضبوط آہنی سلاخیں لگی ہوئی تھیں جن کو توڑنا' موڑنا یا اکھاڑنا عملاً ناممکن تھا۔ تھانے کی ہتھکڑی کو میں نے ایسے استعمال کیا کہ پہلے ایک حلقے میں ... روشندان کی سلاخ ڈالی۔ پھر اسی کے ساتھ حوالدار کی کلائی فٹ مقفل کر دیا۔ موٹا حوالدار اب اپنا ہاتھ سر سے اوپر ... رکھنے پر مجبور تھا۔ اس کی رہائی صرف اسی صورت میں ممکن تھی کہ ہتھکڑی' سلاخ یا کلائی میں سے کوئی ایک چیز کاٹی جائے۔

حوالات کے نگراں کو بھی میں نے اسی طرح روشندان کی سلاخ کے ساتھ منسلک کیا تو وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ یک جان دو قالب ہو گئے۔ موٹے حوالدار کا پیٹ اپنی حدود سے باہر تک نکلا ہوا تھا کہ دوسرے شخص کے لئے خود کو دور رکھنا ممکن ہی نہ تھا۔ وہ دونوں ایک ہاتھ اوپر اٹھائے ایک دوسرے سے چپکے ہوئے ذلت اور بے بسی کی تصویر بن گئے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ بعد میں کیا ہو گا۔ ہم چابی اپنے ساتھ لے جائیں گے چنانچہ گاؤں سے کوئی لوہار لایا جائے گا جو ہتھکڑی کو کاٹے گا۔ تب تک وہ سخت ترین جسمانی اذیت میں مبتلا رہیں گے اور یہ بات ایسی نہیں کہ چھپی رہ سکے۔ وہ بعد میں اپنے گاؤں والوں کی تضحیک کا نشانہ بنیں گے جن کے سامنے سے وہ مونچھوں پر تاؤ دے کر گزرتے تھے۔

میں ان دونوں کے آزاد ہاتھوں کو آزاد ہی چھوڑنا چاہتا تھا لیکن غالب نے ان کی زبان بندی پر اصرار کیا تو میں نے ان دونوں کے ہاتھ ایک ہی رسی سے باندھ دئے۔ ان کے منہ میں پھاڑی ہوئی وردی کے ٹکڑے ٹھونس کے میں نے باقی دونوں سپاہیوں کی طرف دیکھا۔ وہ گاؤں کے اجڈ لونڈے تھے اور شاید انہوں نے زندگی میں پہلے کبھی ڈاکو نہیں دیکھے تھے۔ وہ بے حد خوف زدہ تھے۔ انہوں نے اپنی اسیری کے عمل کو ہمارے لئے آسان بنانے میں ہم سے پورا تعاون کیا۔

"کیا یہ سب ضروری تھا؟" غالب نے واپس آ کے کہا۔

"ہاں۔ ایک تو اس لئے کہ یہ موقع ملتے ہی شور مچا کے ہمارے لئے مشکل نہ پیدا کریں" میں نے کہا۔

"معلوم نہیں یہ کب تک اسی طرح بند رہیں گے۔ کسی کو خبر نہ جانے کب ہو گی۔"

"خبر ہو جائے گی" میں نے کہا "رات تک ورنہ کل صبح تک۔"

غالب نے افسوس سے سرہلایا "یہ اس وقت تک زندہ رہیں گے؟"

"یہ اتنی جلدی مرنے والے لوگ نہیں ہیں' زیادہ سے زیادہ بے ہوش ہو جائیں گے۔ مگر مجھے امید ہے یہ اس سزا کو بھولیں گے نہیں۔ آئندہ کسی پر تشدد کریں گے تو انہیں دوسرے کی اذیت کا احساس ہو گا۔"

"دس بج گئے' نہ انچارج آیا نہ کوئی اور" نازو نے سخت بےزاری سے کہا۔

"کوئی اور تھانے کی طرف کیوں آئے گا" میں نے کہا۔

رابعہ نے کہا "گل کو پھر بخار ہو رہا ہے۔"

غالب نے کہا "اور گولیاں دے دو۔ اس سے زیادہ ہم یہاں کیا کر سکتے ہیں؟"

میں نے کہا "تم چاہو تو اسے گاؤں میں کسی سیانے کے پاس لے جاؤ۔ وید یا حکیم بھی شاید مل جائے۔ ڈاکٹر بہر حال نہیں ہو گا یہاں۔"

"تمہارے لئے خطرے کی کوئی بات نہیں" غالب نے کہا۔ "کس نے دیکھا ہے تمہیں... اور اس حلئے میں کون شک کر سکتا ہے تم پر۔"

"گل کو باقاعدہ علاج اور دیکھ بھال کی ضرورت ہو گی۔ دو چار دن" رابعہ نے کہا۔

"میرا مشورہ مانو تو بمبئی چلی جاؤ" میں نے کہا۔

"کس کے پاس؟"

"کسی بھی ہوٹل میں دو چار دن گزار لو' مثلاً اسی ہوٹل میں جہاں تم پہلے ٹھہری تھیں۔ ہم خیریت معلوم کرتے رہیں گے ٹیلی فون کر کے۔"

"جی نہیں' ہم جہاں جائیں گے ساتھ جائیں گے" رابعہ نے قطعی لہجے میں کہا۔

اس سے پہلے کہ میں مزید کچھ کہتا' تھانہ انچارج آ گیا۔ معلوم نہیں کس بات نے اسے شک میں مبتلا کیا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ وہ بالکل خاموشی سے اور دبے پاؤں ایک دم ہمارے سامنے آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا چنانچہ ہم جو اتنی دیر سے اس کی آمد کی تیاریاں کر رہے تھے' کچھ بھی نہ کر سکے۔

وہ ایک نوجوان اینگلو انڈین تھا۔ بہت اسمارٹ اور تیز طرار۔ اس کی آنکھوں میں عیاری کی چمک تھی۔ اس نے جو وردی پہن رکھی تھی وہ بہت صاف دھلی ہوئی تھی۔ اس پر استری بھی تازہ تھی۔ اس کے جوتوں پر بھی بہت اچھی پالش تھی۔

"خبردار' ہلے گا تو ہم شوٹ کر دے گا" اس نے گوراشاہی اردو میں کہا۔

میں نے انگریزی میں کہا "تم ایک ریوالور سے کتنے آدمی مار سکتے ہو؟ ایک یا دو' پھر بھی تین عورتیں بچ جائیں گی... اور ان میں سے کوئی بھی تمہیں مار دے گی' کوشش کر کے دیکھو۔"

"شٹ اپ" اس نے دہاڑ کے کہا "آخر کون ہو تم جو اس طرح میرے کمرے میں اور میری کرسی پر قبضہ جمائے بیٹھے ہو۔"

میں نے کہا "ہم بھی پولیس مین ہیں۔"

"جھوٹ بکتے ہو تم' یہ تمہاری وردی نہیں ہے۔ تم نے مجھے

دھوکا دینے کے لئے پہنی ہے۔ اگر تم سچ مچ پولیس مین ہوتے تو ایک افسر کو دیکھ کر خود بخود کھڑے ہو جاتے۔ تمہارا ہاتھ خود سیلوٹ کرتا۔ مجھے بتاؤ آخر کیا مقصد ہے یہ سوانگ رچانے کا؟"

میں نے غالب کی طرف دیکھ کر کہا "میں تمہاری ذہانت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوں۔"

"مجھے بالکل ضرورت نہیں ہے تمہارے کسی اعتراف کی۔ میں وضاحت چاہتا ہوں کہ یہ سب کیا ہے۔ کون ہیں یہ عورتیں؟ انہیں کیوں میرے کمرے میں بٹھا رکھا ہے تم نے اور یہ جو لیٹی ہوئی ہے....."

میں نے کہا "اگر تم سوالات کرتے رہے تو مجھے وضاحت کی مہلت کیسے ملے گی۔ بہتر ہو گا اگر تم اپنی کرسی پر بیٹھ کے بات کرو۔ میرا ارادہ ہرگز اس پر قبضے کا نہیں ہو سکتا۔"

میرے اٹھتے ہی وہ بڑے محتاط انداز میں آگے بڑھا' اس کی نظر بیک وقت ہم سب پر رہی اور وہ ایک لمحے کے لئے بھی کسی کی طرف سے غافل نہیں ہوا۔ مجھے وہ نوجوان افسر پسند آیا تھا۔ اس کی مستعدی اور ہوشیاری پسند آئی تھی اور میں حیران تھا کہ اس جیسا چاق و چوبند اور ذہین افسر اس فضول سے گاؤں کے تھانے میں کیا کر رہا ہے۔ جو تھانہ بھی نہیں صرف ایک پولیس چوکی تھا اور جہاں نگران حوالات جو اس کا واحد ماتحت تھا' اپنے افسر کے برعکس نالائق اور احمق تھا۔

"او مائی گاڈ! تم نے دراز میں سے سب نکال لیا۔ تم میرے سگریٹ پیتے رہے' چائے پی ہے تم نے' بسکٹ کھائے ہیں۔ بدمعاش' میں سب کو گولی مار دوں گا" اس نے مشتعل ہو کے کہا۔ "میرا ریوالور فوراً دے دو۔"

"یہ نہ ہو میں اسی ریوالور سے تمہیں گولی مار دوں" میں نے ریوالور نکال کے اس کے سامنے ڈالتے ہوئے کہا "مسٹر....."

"میرا نام سائمن ہے" اس نے ریوالور واپس دراز میں رکھ لیا۔

"مسٹر سائمن' یو سی! نہ میرا ارادہ تمہیں گولی مارنے کا ہے اور نہ میرے کسی ساتھی کا۔ ورنہ کم سے کم ایک ریوالور تو ہر شخص کے پاس ہے۔ خواتین سمیت" میں نے کہا۔

اس نے نازو کی طرف دیکھا جو بڑی صفائی سے ریوالور نکال چکی تھی۔ سائمن نے اسے غور سے دیکھا اور ایک گہری سانس لے کر اپنا ریوالور میز پر رکھ دیا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ میں نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔

میں اور غالب اس کے سامنے والی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

"تم محصور ہو مسٹر سائمن' کیا یہ غلط ہے؟" میں نے کہا۔ "ذہانت کے ساتھ تجربہ بھی ہوتا تو تم یہ غلطی نہ کرتے۔"

"میں کیسے تصور کر سکتا تھا کہ... اس قسم کی عورتوں کے پاس بھی ریوالور ہوں گے" اس نے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا "اس ملک میں کتنی عورتوں کو ریوالور چلانا آتا ہے اور کی... وہ اس گاؤں کی طرف کیسے آ سکتی ہے' اس حلیے میں ... محسوس ہوئی تھی۔"

"کیسے؟" میں نے کہا۔

"باہر ایک تھیلا رکھا ہوا تھا۔ اس میں مٹھائی ... تھے۔ آدمی مجھے کوئی نظر نہیں آیا۔ برآمدے میں بالٹی ... تھی۔ سارا پانی بہہ گیا تھا اور مگ پڑا ہوا تھا۔ دو رائفلیں فرش پر رکھی ہوئی تھیں۔"

"تم نے اپنے ماتحت کو آواز نہیں دی۔"

"وہ اس وقت نہیں ہوتا' کام چور۔ کاہل' غلیظ آدمی۔"

میں نے کہا "تم کو پہلے سے بتا دینا بہتر ہے۔ یہ انگریزی سمجھتی ہیں۔ بول بھی سکتی ہیں۔"

وہ پریشان نظر آنے لگا۔ اس نے ماتھے پر ہاتھ پھیرا ... میں کچھ تلاش کرنے لگا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے... کہ تم سب گولیاں کھا گئے۔"

میں نے اسے جیب میں سے گولیاں نکال کے دیں ... کب سے ہے آدھے سر کے درد کی شکایت؟"

وہ اچھل پڑا "تم... یہ بھی جانتے ہو' کیسے؟"

"تمہیں معلوم ہو جائے گا' اپنے وقت پر" میں نے ...

اس نے گولیاں کھائیں' گلاس میں پانی ڈال کے ... الماری کا جائزہ لینے لگا "اس میں سے اور کیا لیا ہے تم نے"

غالب نے کہا "تمہاری مراد کاغذات سے ہے ... ہمارے لئے بے کار ہیں۔"

"تم نے اپنے بارے میں نہ بتایا۔ تو میں پاگل ہو جا... تم بہت پراسرار لوگ ہو۔ یہاں تمہارا کیا کام؟ تم صو... بدمعاش اور مجرم بھی نہیں لگتے۔ پھر یہ سب ڈراما کس لئے"

میں نے کہا "سب انسپکٹر سائمن' صورت حال کچھ ... کہ ہم اپنے بارے میں کچھ بتا نہیں سکتے' ورنہ خود تمہارے ... بہت مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ نام کی تمہارے نزدیک ... اہمیت نہیں ہونی چاہئے۔ نام ٹک اور ہیری' سب ایک ... ہے۔ ہم کچھ بھی بتا سکتے ہیں مگر کیا فائدہ۔"

"او کے' اصل بات بتاؤ" وہ بولا۔

"اصل بات یہ ہے کہ ہم تمہارا انتظار کر رہے ہے ... نے کہا "ہم علی الصباح یہاں پہنچے تھے۔ اس وقت ... نااہل' کاہل اور غلیظ ماتحت دھوتی پہنے سو رہا تھا۔ ہم ... رائفل اٹھا کے چلے جاتے تو اسے پتا بھی نہ چلتا۔"

"کیا تم نے اسے مار دیا؟"

"اسے مار کے کیا فائدہ ہوتا... ایک رائفل اس کی ...

"اور دوسری؟"

"دوسری اس پولیس مین کی ہے جو ہمیں یہاں اپنی ... تھا لایا تھا۔"

"کہاں سے لایا تھا؟"

"یہ غیر اہم ہے" میں نے سوچ کے کہا۔

"اگر یہ انہی دونوں کی وردیاں ہیں تو وہ دونوں کہاں ہیں؟" سائمن نے کہا۔

"اچھا سوال ہے" میں نے کہا "مگر میں ایک گول مول جواب دوں گا۔ وہ زندہ ہیں اور خیریت سے ہیں۔ بہت جلد تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ جھوٹ نہیں ہے۔ یوں سمجھ لو کہ ہم نے ان کی وردی لے لی اور انہیں کہیں بھیج دیا۔"

"ایسے بات نہیں بنے گی' تم کچھ نہیں بتا رہے ہو۔"

میں نے کہا "اصل بات کے سوا میں کچھ بتاؤں گا بھی نہیں اور اصل بات سننے سے پہلے ہی تم نے سوالات اور جرح کا سلسلہ شروع کر دیا تو واقعی بات نہیں بنے گی۔ میں نے بتایا ہے کہ ہم تمہارا انتظار کر رہے تھے۔"

"آخر کیوں؟"

"اس لئے کہ تم سے ہم اپنے آدمی کے بارے میں پوچھنا چاہتے تھے۔ تمہارا ماتحت اس معاملے میں ہماری کوئی مدد نہیں کرے گا۔ اس نے صرف یہ بتایا کہ تم نے اسے کسی اور کے حوالے کر دیا ہے۔"

وہ میری صورت پر نظر جمائے بیٹھا رہا "تم اس ڈاکو کی بات کر رہے ہو...."

"وہ ڈاکو نہیں تھا" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"وہ ڈاکو تھا' اس کے ساتھیوں نے...."

میں نے چلا کے کہا "اس کے ساتھی ہم ہیں۔ کیا ہم ڈاکو ہیں؟ ایسے ہوتے ہیں ڈاکو؟ نوکری تو خیر نئی ہے تمہاری لیکن پولیس میں بھرتی ہونے سے پہلے بھی تم نے کبھی ہم جیسے ڈاکوؤں کے بارے میں سنا یا اخبار میں پڑھا! جو اپنی بیویوں کے ساتھ پھرتے ہوں۔ وہ خود ہی نہیں' ان کی بیویاں تک تعلیم یافتہ ہوں۔"

"بے شک میرے لئے یہ ایک نیا تجربہ ہے مگر میں پھر کہتا ہوں کہ وہ ڈاکو تھا اور تم اس کے ساتھی ہو تو ڈاکو ہو۔ اسی لئے تم حلیے بدل کے اور اسلحہ لے کر پھر رہے ہو۔ اور ڈاکو کیسے ہوتے ہیں؟ وہ جاہل ہوتے ہیں مگر تمہارے گروہ میں سب تعلیم یافتہ ہیں یہ ایک نئی بات ہے لیکن ناممکن نہیں۔ ابھی تمہاری شہرت نہیں ہوئی۔ ہو جائے گی۔ ابھی تک تم پکڑے نہیں گئے ہو' اس لئے کہ تم سب کی آنکھوں میں دھول جھونکتے رہے ہو۔ اس حلیے سے' اپنی رواں انگریزی سے اور ان خوب صورت تعلیم یافتہ عورتوں کی مدد سے۔"

"پلیز شٹ اپ" میں نے شائستگی سے کہا "تم بے بنیاد قیاسات قائم کر رہے ہو۔ میں مجبور نہیں کر سکتا تمہیں اپنی بات ماننے پر لیکن تمہارے دلائل سے ہم ڈاکو نہیں بن سکتے۔ مجھے بتاؤ کہ ہمارے ساتھی کو کیسے ڈاکو مان لیا تم نے؟ اس لئے کہ ایک موٹی عقل والا' موٹا گینڈے جیسا حوالدار اسے یہاں بند کرا گیا تھا۔ اس نے کہا اور تم نے مان لیا۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ ڈکیتی کی واردات یہاں سے چھ سات میل دور ہوئی ہے۔ وہ کسی راہ چلتے کو نہ پکڑ لایا ہو۔"

"ناؤ یو پلیز شٹ اپ" اس نے بھی میرے لہجے میں میری بات کاٹ دی "میں اس وقت یہاں تھا ہی نہیں جب اس ڈاکو کو لایا گیا تھا۔"

"وہ ڈاکو نہیں تھا" میں نے میز پر مکا مار کے برہمی سے کہا۔

"رات کو میرے گھر اسپیشل پولیس کے لوگ آئے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ تمہارے لاک اپ میں ایک ڈاکو چمن لال بند ہے۔"

"مسٹر سائمن' تم ایک ایڈیٹ ہو۔"

"بکواس بند کرو۔ میں نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ میں نے کہا کہ اس نام کا کوئی آدمی میری تحویل میں نہیں ہے لیکن انہوں نے اصرار کیا کہ میں چل کے دیکھوں۔ چنانچہ میں ان کے ساتھ آیا۔"

"اور تم نے کہا مسٹر ڈاکو' اپنا شناختی کارڈ پیش کرو جس پر تمہارا نام اور پیشہ صاف لکھا ہوا ہو۔ چنانچہ چمن لال نے شناختی دستاویزات پیش کر دیں اور ان میں صاف لکھا ہوا تھا کہ بلحاظ پیشہ وہ ڈاکو ہے۔"

"طنز کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں انہیں غلط نہیں کہہ سکتا تھا جو ڈاکو کو پہچانتے تھے۔"

"مجھے بتاؤ کہ کیا تم انہیں پہچانتے تھے" میں نے سر پکڑ کے کہا "تم کو معلوم تھا کہ وہ اسپیشل پولیس کے آدمی ہیں؟ کیا تم نے ان سے کہا تھا کہ اپنی شناخت کرواؤ؟"

"شناختی کارڈ تھے ان کے پاس" وہ بولا مگر اب اس کا لہجہ اعتماد سے خالی محسوس ہونے لگا تھا۔

"کیا نام تھے ان کے؟ عہدے کیا تھے؟ مسٹر سائمن' میرا خیال ہے کہ انہوں نے کارڈ نکال کے تمہارے سامنے کئے اور اس سے پہلے کہ تم غور سے دیکھتے انہوں نے واپس جیب میں ڈال لئے۔ تم مطمئن ہو گئے محکمے کا شناختی کارڈ دیکھ کر۔"

وہ سوچ کے بولا "میرے پاس کوئی وجہ نہیں تھی کہ شناختی کارڈ کو جعلی سمجھتا۔"

"مگر یہ ٹھیک ہے کہ تم نے ان کا نام' عہدہ کچھ نہیں پڑھا تھا؟"

"یس' یہ کوتاہی مجھ سے ہوئی۔"

"کوتاہی!" میں نے ایک دم آگے بڑھ کے اس کی گردن دبوچ لی "مجھے بے وقوف مت سمجھو مسٹر سائمن' اس لئے کہ میں تمہیں بے وقوف نہیں سمجھتا۔ تم جیسا چالاک اور ذہین آدمی اتنی بڑی غلطی نہیں کرے گا' کبھی نہیں۔ مجھے سچ سچ بتا دو گے تو

فائدے میں رہوگے ورنہ میں تمہیں اس نازک سی لڑکی کے حوالے کردوں گا جو تمہاری ہڈیوں کا سُرمہ کرسکتی ہے۔"

"مجھے چھوڑدو.... ورنہ۔"

"ورنہ کیا؟" میں نے اسے کرسی سے اٹھاکے اپنی طرف کھینچ لیا "آؤ میرے ساتھ، میں تم کو ایک نظارہ دکھاتا ہوں۔ کیا تم چاہوگے کہ تمہارے ساتھ بدتر سلوک کیا جائے"

میں اسے گھسیٹ کر حوالات کی طرف لے گیا۔ اندر کا منظر دیکھ کر اس کی عقل خبط ہوگئی۔

"یہ کیا ہے؟" وہ چلانے لگا "کیوں ایسا غیر انسانی سلوک کررہے ہو تم ان کے ساتھ، کیا جرم کیا ہے انہوں نے؟"

"جرم کی بات مت کرو، ان کے جرائم تو اتنے ہیں کہ یہ خود شمار نہیں کرسکتے۔ قانونی بھی اور اخلاقی بھی لیکن ابھی ان کو یہ سزا صرف اس لئے ملی ہے کہ انہوں نے ہمارے ایک دوست کو ڈاکو سمجھ کے پکڑا۔ حالانکہ وہ ان کے مقابلے میں ہزار درجہ بہتر انسان ہے۔ اور یہ انسان ہیں تو وہ فرشتہ سمجھا جاسکتا ہے۔ اگر تم نے اصرار کیا کہ وہ ڈاکو تھا اور تم نے اسے کسی انجانے اسپیشل پولیس والوں کے حوالے کرکے ٹھیک کیا ہے۔ تو پھر تمہارے ساتھ ہم جو بھی سلوک کریں ٹھیک ہوگا۔ ہم اپنے دوست کو کسی ناانصافی کا شکار نہیں ہونے دیں گے۔ تمہارے پاس ایک جواز ہے تو ہمارے پاس دوسرا۔ ہم سب کچھ کر گزریں گے۔"

حوالات میں بند چار افراد ایسے جانور کی طرح لگتے تھے جنہیں ابھی جنگل سے پکڑ کے لایا گیا ہو۔ ان کی نظروں میں خون کی پیاس تھی اور کینہ تھا۔ وہ غرا رہے تھے اور اپنے افسر کے سامنے جس حد تک اپنی برہمی کا اظہار کرسکتے تھے کررہے تھے۔ شاید آدمی اپنی ستر پوشی سے ہی جانور نہیں ہوتا ورنہ اس میں اور کسی بھی حیوان میں کیا فرق رہ جاتا ہے۔

"دیکھو، تم ان پر رحم کرو۔ ہم بات کرسکتے ہیں اور اس غلطی یا غلط فہمی کا ازالہ کرنے کے لئے کچھ سوچتے ہیں جس کی وجہ سے تمہارا ایک دوست... غلط ہاتھوں میں چلا گیا۔"

"ہم بات پہلے کریں گے۔ اگر بات چیت مفید اور نتیجہ خیز رہی تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ انہیں اس حالت میں قید نہیں رہنا پڑے گا۔"

"گویا قید میں رہنا پڑے گا؟"

"میں انہیں آزاد کیسے کرسکتا ہوں۔ جب تک خود اپنے تحفظ کا یقین حاصل نہ ہو" میں نے کہا۔

آفس میں واپس آنے کے بعد وہ کرسی پر گرا تو ایک بالکل مختلف اور بدلا ہوا شخص تھا۔ وہ نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔ کسی اندرونی کرب کا اظہار اس کے چہرے سے ہوتا تھا۔ میں نے اسے اپنی قوتِ فیصلہ کی مدد سے کسی نتیجے پر پہنچنے کی پوری مہلت دی۔

"میں نے آج تک رشوت نہیں لی تھی" اس نے اپنی ... مجھ سے نظر ملائے بغیر خود کلامی کے انداز میں کہا۔ اس کا ... سپاٹ اور جذبات سے عاری تھا۔

اس نے اپنے جرم کا اعتراف کرلیا تھا چنانچہ میں خاموش رہا۔

"مجھے معلوم ہے تم اس پر یقین نہیں کروگے" اس نے ... ایک پینسل سے کاغذ پر بے معنی نقش بناتے ہوئے کہا "لیکن ... مجھے اس سے فرق نہیں پڑتا۔"

"فرق تمہیں آج پہلی بار رشوت لینے سے پڑا ہے" میں نے کہا۔

"ہاں" وہ ایک لمبی سانس لے کر بولا "بہت فرق پڑا ہے۔ آج میں وہ نہیں ہوں جو کل تھا۔ کل تک میں مطمئن تھا اور میرے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ ایک بار کوئی بات نہیں۔ میرا ضمیر بھی روپیٹ کے خاموش ہوجائے گا، اس جواز کو قبول کرلے گا کہ حرام اور حلال کا نظریہ حالات کے تابع ہوتا ہے۔ جب آدمی کے کھانے کو کچھ نہ ہو تو وہ غلاظت تک کھالیتا ہے۔ یہ کوئی قصے کہانی کی بات نہیں۔ انسان نے انسان کو کھایا ہے۔ مجبور ہوکے۔ میں افریقہ کے آدم خور قبائل کی مثال بھی دے سکتا تھا لیکن میں اپنے اور تمہارے جیسے مہذب دنیا کے انسانوں کی بات کررہا ہوں۔"

"مجھے معلوم ہے، ایسے متعدد واقعات ہیں۔ ابھی کچھ دن پہلے کسی کشتی کے مسافروں نے اپنے ایک ساتھی کو کھالیا تھا جو مرگیا تھا۔ انہوں نے سوچا کہ سمندری مخلوق بھی تو اسے کھا جائے گی۔ ان کے کھانے کو سمندر میں اور بہت کچھ ہے لیکن ہمارے پاس کچھ نہیں رہا اور اسے ہم نے سمندر میں پھینک دیا ... کل خود مرجائیں گے۔ چنانچہ انہوں نے اس گوشت کو اپنی زندگی بچانے کے لئے استعمال کرلیا۔"

"یہ بھی دیکھنا پڑتا ہے کہ مجبوری کتنی بڑی تھی اور مجبوری میں آدمی کا استحصال کرنے والی قوتیں کتنی بڑی تھیں" اس نے کہا "جس شخص کو دو یا چار ہزار درکار ہوں تو وہ چوری نہیں کرتا، ادھار مانگتا ہے یا پھر اپنی کوئی چیز بیچنے کی کوشش کرتا ہے اور ... حاصل نہ ہو تو صبر کرلیتا ہے، نقصان بھی برداشت کرلیتا ہے۔ اسے دو چار ہزار کے لئے چوری کرنے یا ڈاکا ڈالنے کا خیال نہیں آتا لیکن اس وقت جب وہ شدید مایوسی کا شکار ہو۔ اس کو ... مل جائے۔ یا موقع ملے پچاس ہزار چوری کرنے کا، ایک ... چھین لینے کا، پکڑے جانے کا ڈر بھی نہ ہو، تو بالآخر وہ واردات کر گزرے گا۔ یہ ہی کتنے مخالف عناصر یکجا ہوگئے۔ ... اور بڑی رقم، تحفظ کا احساس۔"

"تمہارے ساتھ کیا ہوا؟"

"یہی۔ میں نے بہت مقابلہ کیا، تمام ترغیبات کو مسترد ...

... فیصلے پر قائم رہا کہ ایمان کی سلامتی ضروری ہے۔ ... اس کے لئے قربانی دی جاسکتی ہے۔ اگر میں نے رشوت لینی شروع ... تو پھر تمام عمر لیتا رہوں گا۔ ایک برائی سے دوسری برائی کا ... کھلتا ہے۔ آگے ہر برائی کے راستے خود بخود کھلتے جاتے ہیں ... رشوت کو ضمیر قبول کرلے....."

"ضمیر بالآخر راضی برضا ہوجاتا ہے۔"

"ہاں، پھر وہ بھی کہتا ہے کہ میری طرف سے جہنم میں جاؤ۔ ... شراب پیو، جوا کھیلو یا عورتوں کی عصمتوں سے کھیلو، مجھے کیا۔ ... چنانچہ میں نے برائی کا پہلا دروازہ بھی نہیں کھولا۔ میں نوشتۂ تقدیر ... قبول کرلینے اور نقصان پر صبر کرنے کے لئے ذہنی طور پر تیار تھا۔"

"کیا نقصان ہوسکتا تھا تمہیں؟"

"میری ماں کی زندگی کا" اس نے کہا "ماں سب کی ہمیشہ ... نہیں رہتی لیکن ہر بیٹا چاہتا ہے کہ وہ جتنا عرصہ زندہ رہے اچھا ہے۔ ... اسّی سال، یا سو سال، میری ماں تو صرف چوالیس سال کی ... اور وہ مشکل سے پینتیس کی لگتی ہے۔ اس کی قدرتی ... جسمانی ساخت بھی ایسی ہے کہ وہ میری ماں نہیں لگتی۔ لوگ بڑی ... سمجھ لیتے ہیں۔ چوالیس سال میں عورت جوان ہی رہتی ہے۔ ... باہر تو ساٹھ سال میں بھی جوان رہتی ہے اور نہ صرف یہ کہ نظر ... آتی ہے بلکہ خود کو جوان سمجھتی ہے۔ دوسرے بھی اسے بڑھیا ... نہیں کہتے۔ ہر وقت اور اس پر بڑھاپا مسلط نہیں کرتے۔ خیر، میں ... نہیں چاہتا تھا کہ اتنی کم عمر میں میری ماں مرجائے۔ میں چاہتا تھا ... کہ وہ اتنا ہی عرصہ اور زندہ رہے۔ لیکن میرے چاہنے سے اس کا ... عمر تو ختم نہیں ہوسکتا تھا چنانچہ میں نے مان لیا کہ یہ نوشتۂ تقدیر ... ہے۔ میرے پاس اتنا پیسہ نہیں ہے کہ میں اس کا مکمل علاج باہر ... کراسکوں۔ نہ میں اپنے وسائل سے اتنا سرمایہ اکٹھا کرسکتا ہوں۔ ... پہلے بھی اپنی ایمانداری کے چکر میں بہت نقصان اٹھا چکا ہوں ... یہ افسروں کی ناراضگی ہی کا نتیجہ ہے کہ میں یہاں بیٹھا ہوا ... ورنہ میں اپنی ذہانت کا منفی استعمال کرتا تو کوئی سونے کی کان ... اپنے نام کرالیتا۔ سونے کی کان وہ تھانے ہوتے ہیں جہاں کوئی ... لائق افسر بھی مٹی سے سونا بنا سکتا ہے۔ مجھے سمجھانے والوں ... نے سمجھایا، ڈرایا دھمکایا، پولیس ہیڈ کوارٹر میں رکھا اور بالآخر ... یہاں بھیج دیا کہ بھاڑ میں جاؤ۔ میرے دوست احباب، رشتے دار ... میری مزاحمت کی قوت سے عاجز تھے۔ ان سب کی متفقہ ... رائے تھی کہ میں ایماندار نہیں احمق ہوں، ایک ایماندار پولیس ... انسپکٹر اکیلا چنا ہے جو بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا۔ محکمہ جیسا ہے ... ویسا ہی رہے گا۔ تمہارے حصے کا فائدہ کسی اور کو پہنچے گا، جو مال ... تمہاری جیب میں آسکتا تھا وہ کسی اور کی جیب میں جائے گا۔ ... کے کام ضرور ہوں گے۔ میں نے سب سنا اور نظر انداز ... کیا۔ مجھے صرف اپنی ذات سے سروکار تھا۔ میں یہ اطمینان ... رکھتا تھا کہ مجھ پر کیچڑ کا ایک چھینٹا بھی نہیں ہے۔ دوسرے کیچڑ

... مل رہے ہیں یا کرنا چاہتے ہیں تو مجھے کیا۔ نہ میرے پاس اختیار ہے کہ انہیں روک سکوں نہ وسیلہ۔"

وہ خاموش ہوگیا۔ ہم سب منتظر رہے کہ وہ پھر الفاظ اکٹھے کرلے۔

"یہاں آنے کے بعد میں کچھ محفوظ ہوگیا تھا۔" اس نے کہا۔ "کم سے کم لوگوں کی باتوں سے۔ لیکن میرا ذہنی عذاب بڑھتا گیا۔ ماں کی بیماری شدت اختیار کرگئی۔ یہ بات اسے معلوم بھی ہوگئی کہ اس کے مرض کا علاج ممکن ہے مگر یہاں نہیں۔ اس نے مجھ سے کہا کہ تم کیسے بیٹے ہو، ماں نے تمہارے لئے کیا نہیں کیا تھا کہ اب تم ماں کے لئے کچھ نہیں کرسکتے۔ میں نے اس کا مطلب سمجھ لیا۔ وہ زندہ رہنا چاہتی تھی اور اس کے لئے میرا سہارا چاہتی تھی۔ ...اسے یقین تھا کہ میں چاہوں تو اس کا علاج باہر ہوسکتا ہے۔ پھر میں ایسا کیوں نہیں چاہتا؟ میری چھوٹی بہن کو جب سے یہ معلوم ہوا ہے اس کی بری حالت ہے۔ ہمارا اپنا مکان ہوتا تو ہم بیچ دیتے، ...وہ مکان بھی کرائے کا ہے۔ پھر اچانک میری ماں نے بیٹی کی شادی کا فیصلہ کرلیا۔ وہ یہ کام اپنی زندگی میں ہی کرنا چاہتی تھی۔ اس کے لئے بھی پیسہ درکار تھا اور میری تنخواہ میں سے آج تک تو کچھ بچا نہیں تھا۔ بچ بھی نہیں سکتا۔ اب تم غور کرو کہ میرے خلاف کتنی زبردست قوتیں ایک دم سرگرمِ عمل ہوگئی تھیں۔ ماں کی بیماری، اس کا مطالبہ، بہن کی شادی۔ اور ایسے میں حالات نے بہانہ بھی فراہم کردیا۔ ایک وسیلہ آمدنی کا پیدا ہوا جو بہت بڑا تھا۔ تقریباً اتنا ہی بڑا جتنی بڑی میری ماں، اس کی زندگی کے لئے میری خواہش اور اس کا اصرار کہ زندگی کے وسائل فراہم کرنے کے لئے میں جو بھی کرسکتا ہوں کروں۔ بس مجھے شکست ہوگئی۔ میں انکار نہ کرسکا۔ بے شک میں نے سوچا یہی تھا کہ یہ پہلی اور آخری بار ہے لیکن پہلی کے بعد دوسری بار، پھر تیسری بار، سلسلہ چلتا ہے۔ آخری بار نہیں ہوتی۔ خدا نے بہت جلد مجھے سزا دی۔ حالانکہ خدا نے دوسرے عادی گنہگاروں کو ابھی تک معاف کررکھا ہے۔ شاید وہ چاہتا تھا کہ کم سے کم میں گناہ سے بچا رہوں۔ جو صاف ہے وہ تو صاف رہے۔ جو گندا ہوگیا سو ہوگیا۔ دیکھ لو میں پکڑا گیا۔ میں تمہارے سامنے جرم کا اعتراف کررہا ہوں۔ ذلیل ہورہا ہوں، حالانکہ میں نے جھوٹ بول کے ایک جرم کو چھپانے کی کوشش کی تھی۔"

"ان لوگوں نے تمہیں کیا دیا تھا؟"

"ایک لاکھ نقد۔ شروع انہوں نے دس ہزار سے کیا تھا۔ عام طور پر ایک معمولی اے ایس آئی کو جو گاؤں کی کسی پولیس پوسٹ کا نگراں ہو، اس سے زیادہ نہیں ملتا۔ لیکن میں بگڑ گیا اور ان سے کہا کہ میں انہیں رشوت دینے کے جرم میں بند کرادوں گا۔ انہوں نے رقم دُگنی کردی، مجھے ڈرایا دھمکایا، افسرانِ بالا سے بات کرکے میرا بیڑا غرق کردینے کی بات کی، جب انہیں اندازہ

ہوا کہ میرا پہلے ہی بیڑا غرق ہے تو وہ پچاس تک گئے۔ بالآخر ان پر انکشاف ہوا کہ مجھے ایمانداری کا مرض لاحق ہے۔ ظاہر ہے کسی کا ایمان خریدنے کے لئے بھاری قیمت لگانی پڑتی ہے۔ مجھے اتنا اندازہ ضرور ہوگیا تھا کہ یہ آدمی قانون کے لئے اہم ہو نہ ہو ان کے لئے بہت اہم ہے۔ انہوں نے بولی ایک دم دُگنی کردی۔ ہزار سے بات لاکھ تک پہنچ گئی تو میں تذبذب میں پڑگیا اور انہوں نے دیکھ لیا کہ میرے ایمان کی بنیادیں ہل گئی ہیں۔ انہیں میں کیا بتاتا کہ بنیادیں تو پہلے ہی کمزور پڑچکی تھیں۔ بنیادوں میں رخنہ نہ پڑا ہوتا تو لاکھ کیا کروڑ کی ضرب سے بھی دیوار پر خراش تک نہ آتی۔ ... وہ کامیاب بیوپاری تھا۔ بیوپار ان کا کچھ بھی ہو جائز نہیں ہوسکتا۔ ایک نے میرے سامنے لاکھ روپے ڈال دئے۔ دوسرے نے آخری وار کیا اور اپنی جیب خالی کردی۔ اس میں تقریباً تیس ہزار تھے۔ اور بس' میں ان کی گاڑی میں بیٹھ کے یہاں آیا اور ان کا آدمی ان کے حوالے کردیا۔"

"تم نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ وہ آدمی ان کے لئے کیوں اہم تھا؟"

"انہوں نے بتایا تھا کہ وہ ایک ڈاکو ہے۔ میں نے کہا' میری بلا سے اب قاتل بھی ہو تو کیا' مجھے کون پکڑ سکتا ہے' میں نے تفصیل میں جانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔"

"ایک لاکھ تیس ہزار خاصی بڑی تفصیل ہے۔"

"لیں' یہ تفصیل کافی تھی" سائن نے کہا۔

"وہ تمہارے گھر پہنچے تھے؟"

"ہاں۔ میں روز گھر چلا جاتا ہوں' ان حالات میں میرا اکیلے رہنا ناممکن ہے" سائن نے کہا۔

"گھر کہاں ہے تمہارا؟"

"ذاتی گھر ہوتا تو میں اپنا کہتا' اب جہاں میری ڈیوٹی ہو وہیں میں بہن اور ماں کو بھی بلالیتا ہوں۔ کرائے کا چھوٹا سا مکان صرف پچاس روپے میں مل گیا تھا اس گاؤں میں' شہر میں تھے تو پولیس لائنز میں کوارٹر تھا۔ اس سے زیادہ کرائے سے واسطہ نہیں پڑا تھا' ورنہ مشکل ہوجاتی۔"

"وہ لوگ آدھی رات کے وقت پہنچے تھے۔ اتنا نقد روپیہ تھا ان کے پاس۔ تم نے پوچھا نہیں؟"

"میں کیوں پوچھتا' لوگ ٹرنک بھر کے ساتھ لئے پھرتے ہیں۔ وہ تو آئے ہی مجھے خریدنے کے لئے تھے۔"

میں نے کہا "واپسی میں تم ان کے ساتھ گئے تھے۔"

"ہاں" اس نے کچھ دیر بعد کہا۔

"کیوں؟ جب کہ رقم تمہیں پوری مل گئی تھی۔ پھر تم نے یہ رسک کیوں لیا؟" غالب نے کہا

"رسک کیسا؟ میرے پاس ریوالور تھا... سرکاری' اگر وہ ایسی ویسی حرکت کرتے تو میں انہیں شوٹ کردیتا۔"

میں نے مسکرا کے کہا "جیسے تم نے ہمیں شوٹ کیا۔ مائی ڈیئر ینگ بوائے' تم کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ بچ کر آگئے ورنہ تمہیں تو معلوم بھی نہ ہوتا اور تم مرجاتے' تمہاری یہ ساری چالاکی اور مستعدی دھری رہ جاتی۔ پیشہ ور قاتلوں سے تمہارا واسطہ نہیں پڑا کبھی۔"

"ویسے تم گئے کیوں تھے ان کے ساتھ؟" غالب نے کہا۔

"کچھ ادھار باقی تھا" میں نے کہا۔

اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور مسکرانے لگا "تم بہت چالاک آدمی ہو۔"

میں نے کہا "جب آدھے سچ کا اعتراف کرلیا ہے تو پورا بتانے میں تکلف کیسا؟"

اس نے کہا "تمہارا اندازہ بالکل ٹھیک ہے۔ میں نے جب فیصلہ کرلیا کہ اپنا ایمان بیچنا پڑے گا' تو میں نے اس کی زیادہ سے زیادہ قیمت وصول کی۔ میں نے ایک لاکھ تیس ہزار رکھ لئے اور مزید ستر ہزار مانگے۔ میں نے کہا دو لاکھ سے ایک پیسہ کم پر بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ اپنے ایک لاکھ تیس ہزار بھی لے جاؤ... وہ پھنس گئے' اپنی طرف سے وہ لمبا بندوبست کرکے آئے تھے مگر ایک چھوٹا سا پولیس افسر مہنگا پڑا۔ نقد ان کے پاس تھا نہیں' انہوں نے چیک دینے کی بات کی' میں نے کہا کہ اس کاغذ کے پُرزے کو..."

میں نے اسے ٹوک دیا "خواتین انگریزی جانتی ہیں۔"

"مجھے یاد آگیا' اسی لئے میں رک گیا ورنہ ایک بے ہودہ بات کرتا۔ سوری.. میں نے چیک قبول نہیں کیا۔ ان میں سے ایک واپس جاکے نقد لانے پر تیار تھا مگر دوسرے نے کہا کہ ہم انسپکٹر کو ساتھ لے جاسکتے ہیں اور ادائیگی کرسکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ احمق تھا۔"

"کیوں؟"

"اس طرح میں نے ان کا ٹھکانا جو دیکھ لیا' وہ عقل مند ہوتا تو ایسی غلطی نہ کرتا۔"

میں نے کہا "ٹھکانا تو انہوں نے بھی دیکھ لیا ہے تمہارا۔"

"انہیں مجھ سے پھر کیا کام پڑسکتا ہے؟" وہ بولا۔

"کیا تمہیں ان سے پھر کام پڑے گا؟" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "خیر چھوڑو' یہ فیصلہ وقت کرتا ہے کہ احمق کون تھا۔ جیسا کہ انگریزی میں کہتے ہیں... آخری بار کون کس پر ہنستا ہے۔ یہ دیکھنا ہے۔"

غالب نے کہا "تم ستر ہزار وصول کرلائے؟"

"او یس۔"

"اگر وہ نہ دیتے؟ وہاں جاکے انکار کردیتے۔"

"تو میں انہیں مجبور کرتا کہ واپس چلیں' انہیں پولیس اسٹیشن لے جاتا۔ ریوالور میرے ہاتھ میں تھا اور میں نے انہیں مال کی ڈیلیوری روک لی تھی۔ وہ آدمی مال تھا۔ اگر وعدہ خلافی ہوتی تو میں اسے ضائع کردیتا مگر انہیں نہ دیتا۔"

"وہ تمہیں ضائع کردیتے... خیر... انہوں نے تمہیں ستر ہزار دے کر چھوڑ دیا۔ اس کے بعد۔"

"میں نے وہ رقم شہر میں جمع کرادی۔ اپنی بہن کے اکاؤنٹ میں' اس کا بیلنس کئی سال سے ایک سو اکتیس روپے تھا۔ آج ستر ہزار ایک سو اکتیس ہوگیا۔"

"اور جو رقم رات کو لی تھی؟"

"وہ کل جمع کرادوں گا۔ آج تو وقت نہیں رہا۔"

"یعنی وہ رقم ابھی تمہارے ہی گھر میں ہے؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ لیکن میری بہن کو یا ماں کو علم نہیں۔ جس وقت یہ سودا ہوا' میرے ضمیر کا سودا' تو وہ سو رہی تھیں۔"

میں نے کہا "یو ایڈیٹ' کیا تم عقل سے بالکل پیدل ہو! تم کو احساس نہیں ہے کہ تم نے ان دونوں کی زندگی کو کتنے بڑے خطرے سے دوچار کردیا ہے۔"

اس نے حیرانی سے مجھے دیکھا "جب کسی کو معلوم نہیں میرے سوا۔"

"تمہارے سوا وہ جانتے ہیں جن کو تم نے بلیک میل کیا تھا۔ وہ ایسے لوگ نہیں ہیں جن کو بلیک میل کیا جاسکے۔ وہ کبھی برداشت نہیں کرتے کہ کوئی ان کی طاقت کے سامنے دیوار بن جائے۔ جیسے تم بنے تھے اور انہیں کمزور یا مجبور کردے۔ ان کے لئے ایک اے ایس آئی کی زندگی دو لاکھ کی نہیں ہوتی۔ تم ان سے دو لاکھ خیرات میں مانگ سکتے تھے مگر تم نے ان کا گلا دبا کر لئے' یہ غلطی کی تم نے۔ وہ اپنی رقم واپس لے لیں گے۔"

وہ پریشان ہوکے کھڑا ہوگیا "کیا وہ واپس لے جاسکتے ہیں؟"

میں نے کہا "وہ سب کچھ کرسکتے ہیں۔ دو لاکھ کے بدلے وہ تمہاری ماں اور بہن کو لے جائیں گے بے وقوف آدمی' تم نہیں جانتے انہیں' ہم جانتے ہیں۔"

وہ ایک دم باہر کی طرف لپکا "میں ابھی آتا ہوں۔"

میں اور غالب اس کے ساتھ بھاگے۔ یہ اچھی بات تھی کہ ہم دونوں کے جسم پر بھی پولیس کی وردی تھی ورنہ ہم اس کے پیچھے اپنی دھوتیوں سمیت دوڑتے تو بہت عجیب لگتے۔

سائن بہت اچھا دوڑنے والا تھا اور شاید ہر روز دوڑنے کا عادی تھا کہ رکے بغیر بھاگتا گیا۔ میرا اور غالب کا سانس پھول گیا۔

"جب... موقع ملے..... کچھ.... دوڑ لینا چاہئے" غالب نے دوڑتے ہوئے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان کہا۔

"ہاں... پریکٹس فرار... کی بھی... ہونی چاہئے۔"

صرف چار منٹ کے بعد سائن کا گھر آگیا۔ ہم نے اسے خطرے کا احساس دلادیا تھا اور اس کو بھی اپنی غلطی کے سنگین نتائج کا تصور پاگل کر رہا تھا۔ وہ ایک بگولے کی طرح گھر میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ لگاتے ہی دروازہ کھل گیا۔ میں اور غالب کچھ پیچھے رہ گئے تھے لیکن ہم نے اس کے دیوانہ وار چلانے کی آواز سن لی۔

میرا دل بیٹھنے لگا۔ جو بات میرے ذہن میں ایک اندیشہ بن کے آئی تھی اور میرے لبوں سے وارننگ بن کے نکلی تھی وہ سچ ہوگئی تھی۔ مجھے دُکھ کے ایک انوکھے احساس نے گھیر لیا۔ میں نے سوچا کہ کاش میں نے یہ بات نہ کی ہوتی۔ اس سے فرق کچھ نہ پڑتا لیکن بری بات اور بری خبر اپنی زبان سے سنانا کسے اچھا لگتا ہے۔

گاؤں کے بہت سے لوگ پولیس کو سرپٹ بھاگتا ہوا دیکھ کے ہمارے ساتھ دوڑنے لگے تھے۔ انہوں نے گاؤں کے نیک دل تھانے دار کو بھی بھاگتے دیکھا تھا جو تھا تو کرپشن مگر اخلاق و کردار میں مومن کی صفات رکھتا تھا۔ گاؤں کا تھانے دار ایک ظالم و جابر حکمراں ہوتا ہے۔ ایسے تھانے دار گاؤں والوں نے کہاں دیکھے ہوں گے جو رشوت نہ لیتے ہوں اور مکان بھی کرائے کا لے کر رہتے ہوں۔

جتنی دیر میں ہم دروازے تک پہنچے' سائن کے پاگلوں کی طرح چیخنے کی آوازیں شاید سارے گاؤں میں سنی جارہی تھیں۔ ... وہ اپنی ماں کو اور بہن کو پکار رہا تھا۔ میں نے اور غالب نے ساتھ آنے والوں کو باہر ہی روک دیا۔ میں اور غالب دروازے سے گزر کے اندر گئے۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ پوچھتا' ایک فائر ہوا' سائن نے چیخ کر مجھے ایک گالی دی۔ دھماکا میرے کان کے پاس ہوا تھا لیکن میں بچ گیا تھا۔ میں نے دوسری گولی کا نشانہ بننے سے پہلے جست لگا کے سائن کو دبوچ لیا۔ اس نے دیوانگی کی کیفیت میں مجھے اور غالب کو گالیاں دینی شروع کیں۔

"تم... تمہاری وجہ سے.... تمہارے اس دوست کی وجہ سے یہ سب ہوا' میں جان سے ماردوں گا تمہیں۔"

میں نے اسے دونوں بازوؤں میں جکڑ لیا "سائن' ہوش میں آؤ' باہر لوگ کھڑے ہوئے ہیں۔ ان کو کچھ معلوم نہیں اور معلوم ہونا بھی نہیں چاہئے۔"

"نہیں۔ انہیں معلوم ہونا چاہئے" وہ دہاڑیں مار مار کے رونے لگا "کہ یہ میرے جیسے بدبخت بیٹے ہوتے ہیں اور گناہ گار بھائی ہوتے ہیں' جن کے قصور کی سزا ان کی ماؤں اور بہنوں کو ملتی ہے۔ انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ میں نے ہی انہیں مار ڈالا۔ میں قاتل ہوں ان کا۔ لالچی کتا' رشوت خور' ذلیل آدمی' شیطان۔"

میں اسے گھسیٹ کر دوسرے کمرے میں لے گیا کیونکہ اس کمرے کا منظر خود میرے لئے ناقابلِ برداشت ہوتا جارہا تھا جس میں دو خون آلود مسخ شدہ لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ یقیناً ان میں سے ایک سائن کی ماں تھی اور دوسری اس کی بہن۔ ان کے جسم بے لباس تھے اور انسانی درندگی کا نشانہ بنے تھے۔ ان کے

وجود کا ہر زخم انسانیت کے منہ پر رسوائی کا داغ تھا۔

انہیں مارنے والے کون تھے' یہ سوال کسی جواب کا محتاج نہیں تھا۔ وہ ایک لاکھ تیس ہزار وصول کرنے آئے تھے اور اس کے بدلے میں دو مجبور اور کمزور عورتوں سے ان کی آبرو کا اور زندگی کا خراج لے کر چلے گئے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ انہیں اپنی رقم مل جاتی تو وہ کچھ نہ کرتے۔ وہ بدلہ لینے آئے تھے اور سزا دینے آئے تھے۔ پیسہ وصول کرنے کے بعد بھی وہ ایسا ہی کرتے۔ ان کو حکم تھا کہ ایک حقیر اے ایس آئی کو ایسا سبق پڑھا کے آئیں جو وہ کبھی نہ بھولے اور آئندہ اپنی اوقات یاد رکھے۔ انہیں اس کی مجبوری یا ان عورتوں کی بے بسی' شرافت یا رحمدلی سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ انہیں تو اب بھی سخت ملال اور غصہ ہوگا کہ وہ جس مقصد سے آئے تھے وہ ادھورا رہ گیا۔ بے وقوف' ضدی لالچی عورتوں نے نہیں بتایا کہ پیسہ کہاں چھپایا ہے۔ .. عزت گنوائی اور جان گنوائی۔ اتنا بھی خیال نہیں کیا کہ وہ خالی ہاتھ واپس جا کے اپنے آقاؤں کو کیا منہ دکھائیں گے۔

دوسرے کمرے میں غالب نے باہر سے آنے والوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر کے باہر بھیج دیا تھا مگر اس واردات کی خبر پھیل رہی تھی۔ آہستہ آہستہ باہر مجمع اکٹھا ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے سائن کو پانی پلایا اور اسے تسلی دیتا رہا یہاں تک کہ اس کے اندر کا پولیس مین ہوش میں آگیا۔

"میرا خیال ہے کہ اب میں تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکتا" اس نے کہا۔

"لیکن ہم تمہارے لئے کچھ ضرور کر سکتے ہیں" میں نے کہا۔

"اب کوئی کچھ نہیں کر سکتا....."

"کیوں' کیا تم نہیں چاہو گے کہ ان کو پکڑو جو تمہارے ساتھ اس ظلم کے ذمے دار ہیں؟"

"میں انہیں چھوڑوں گا نہیں' اس کے لئے مجھے تمہاری مدد نہیں درکار ہوگی' میرے اتنے اختیارات ہیں....."

"تمہارے اختیارات ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ یہ بات غلط نہیں ہے۔ سمجھنے کی کوشش کرو مسٹر سائن" میں نے کہا۔

اس نے کہا "لیکن مجھے پہلے قانون کے مطابق کارروائی کرنی ہوگی۔"

"ضرور کرو' اس میں بھی ہم تمہاری مدد کریں گے۔ سامنے آئے بغیر" میں نے کہا "آخری رسوم کی ادائیگی تک ہم تمہاری حفاظت کریں گے۔ کیونکہ ہم سمجھتے ہیں خطرے کی زد میں تمہاری ذات بھی ہے۔ فی الحال سب کچھ بھول جاؤ۔ جب تم آخری رسوم سے فارغ ہو جاؤ گے تو ہم خود آجائیں گے اور پھر ہم ایک ساتھ چلیں گے۔"

"کہاں؟" اس نے بے خیالی میں کہا۔

"تم ہمیں بتاتا کہ اس رات وہ تم کو کہاں لے گئے تھے" میں نے کہا "اگر تم کو ان کی گاڑی کا نمبر یاد ہے تو ابھی بتا دو۔"

"مجھے یاد ہے۔ نائن ایٹ ایٹ نائن۔"

"مسٹر سائن' تمہارے پاس کوئی گواہ نہیں' کوئی ثبوت نہیں لیکن تم جانتے ہو کہ مجرم کون تھے۔ انہیں قانون سزا نہیں دے سکتا۔ یہ بات ایک ناقابلِ تردید اور تلخ حقیقت ہے۔ ان کو سزا تم خود دے سکتے ہو۔ کسی شک و شبے کے بغیر' کوئی رعایت دئے بغیر۔"

"رعایت!" وہ چلایا "میں ان کو بدتر' زیادہ پُرعذاب موت دے کر مارنا چاہتا ہوں۔"

"یہ کام تم اکیلے نہیں کر سکو گے۔ تم پھر مار کھا جاؤ گے۔ بہتر ہے کہ تم عقل سے کام لو' کسی کو کچھ مت بتاؤ' کسی سے بات بھی مت کرو کہ کیا ہوا تھا اور کیا نہیں ہوا تھا۔ تم کس سے ملے تھے اور کس سے نہیں ملے تھے۔ نہ ہمارا ذکر کرنا نہ چمن لال کانہ کی اور کا۔ صرف یہ کہنا کہ ڈکیتی کی واردات ہے' ڈاکوؤں کو جب کچھ نہیں ملا تو عورتوں کو مار گئے۔ بس' اس سے زیادہ رپورٹ میں بھی مت لکھنا' آخری رسوم کب تک کرو گے تم؟"

"شاید... کل شام تک۔"

"یہ رسوم کہاں ہوں گی" میں نے کہا۔

"سینٹ اینڈریو چرچ' بمبئی میں۔"

"اوکے' ہم اب جاتے ہیں" میں نے کہا "کل شام تک کے لئے۔"

"تم نے قاتلوں کو سزا دینے کا وعدہ کیا ہے' میرے ساتھ مل کر۔ یہ بات بھولو گے تو نہیں؟" سائن نے کہا۔

"فکر مت کرو۔"

"میں نے انتقام نہ لیا تو میں پاگل ہو جاؤں گا" وہ بولا۔

میں نے کہا "اسے سزا کہو' انتقام مت کہو۔"

"سزا تو خدا نے مجھے دی ہے" وہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا "اور نہ جانے کب تک دے گا۔"

میں نے اسے بڑی مشکل سے چپ کرایا "یہ تمہاری آزمائش بھی ہو سکتی ہے' خدا اپنے نیک بندوں کا امتحان لیتا ہے"

"لیتا ہوگا' مگر میں فیل ہو گیا ہوں اس امتحان میں' میں نے کبھی دعویٰ نہیں کیا تھا کہ میں نیک آدمی ہوں... خدا منصف ہے تو یہ کیسا انصاف ہے..."

میں نے کہا "تم صدمے اور مایوسی کی کیفیت میں جو کچھ کہہ رہے ہو قابلِ معافی ہے۔ آج تم یہ بات نہیں سمجھ سکتے لیکن کبھی نہ کبھی تم اس کے نظامِ انصاف کے ضرور قائل ہو جاؤ گے۔ اب ہم چلتے ہیں۔"

اس نے کہا "جاؤ' فوراً یہاں سے بھاگ جاؤ۔ جو کچھ تم نے تھانے میں کیا' شاید وہ ایک فطری ردِعمل تھا۔ وہ غلطی بھی میری تھی' کیا انہوں نے تمہارے دوست کو بھی مار دیا ہوگا؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ اگر ایسا ہوا تو ہم ان سے خود نمٹ لیں گے۔"

"تھانے جا کے... ان سب کو بھیج دو.. ان کے کپڑے انہیں دے دو۔"

میں نے سر ہلایا اور دوسرے کمرے میں سے غالب کو ساتھ لیتا ہوا باہر نکل گیا۔ مجھ میں ہمت نہ تھی کہ میں ان لاشوں کو پھر دیکھ سکتا۔ اس کے گھر سے کچھ فاصلے پر دیہاتیوں کا ایک غول حلقہ بنائے خوف زدہ کھڑا تھا۔ ابھی تک گاؤں کا کوئی وی آئی پی وہاں نہیں پہنچا تھا۔

پھر ایک شخص آگے بڑھا۔ یہ گرداور کا لڑکا مانک لال تھا۔

"کیا ہوا تھانے دار کے گھر میں' ڈاکا پڑ گیا؟"

میں نے کہا "ہاں' بے چارے کے پاس تھا ہی کیا۔ ڈاکو تو سمجھتے ہیں کہ ہر تھانے دار کے گھر سے مال ملتا ہے۔"

"گھر کی عورتوں کو مار دیا انہوں نے؟" کسی اور نے کہا۔

"ہاں' جب کچھ نہیں ملا تو عورتوں سے پوچھتے رہے کہ مال کہاں چھپایا ہے" غالب نے کہا "وہ کیا بتاتیں۔"

"یہ تھانے دار بھی عجب چیز ہے" مانک لال بولا "ایسا غریب' مسکین تھانے دار کبھی نہیں دیکھا۔"

میں نے مجمع سے نکلنے کے لئے اس سے اتفاق کیا "ہم نے بھی نہیں دیکھا۔"

"مجھے تمہاری صورت کچھ..... دیکھی ہوئی لگتی ہے" گرداور کے لڑکے نے مجھے غور سے دیکھ کر کہا۔

"فلم بادل دیکھی تھی؟"

"وہ جس میں پریم ناتھ ڈاکو بنا تھا؟"

"بادل ڈاکو میرا ماموں تھا' میری شکل اس پر گئی ہے۔ اب ہٹو ہو میرے راستے سے" میں نے دہاڑ کے کہا۔

گرداور کا لڑکا برا سا منہ بنا کے ایک طرف ہو گیا۔ وہ ابھی تک کنفیوژن کا شکار تھا۔ اس نے آج صبح سب سے پہلے میرا ہی چہرہ دیکھا تھا مگر اس حلئے کا پولیس کی وردی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ میری صورت کا بھی پریم ناتھ کی صورت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

واپس جاتے ہوئے میں نے غالب سے کہا "یہ تو دوسرا ہی مسئلہ ہو گیا۔ اب ہم کہاں جائیں گے؟"

"یہاں سے تو جانا ہی پڑے گا۔ آگے کا راستہ تم بتاؤ۔"

"جانا تو واپس بمبئی ہے" میں نے سوچتے ہوئے کہا "کل شام سے ہر امید وابستہ ہے ورنہ مجھے سارے راستے بند لگتے ہیں۔ ہم ایک بند گلی تک پہنچ گئے ہیں۔ آگے کوئی سراغ نہیں۔ نہ شہلا کا اور نہ محسن کا۔"

"کل شام کیا ہوگا؟"

"شاید وہ لوگ یا ان کا کوئی آدمی چرچ پہنچے گا۔ ایک پرانا نظریہ ہے کہ قاتل اپنے مقتول سے بے تعلق ہو کے نہیں بیٹھ جاتا۔ ... وہ واردات کی تفتیش کے نتائج سے باخبر رہنے کی کوشش کرتا ہے لیکن یہاں ان کے آنے کی ایک اور وجہ بھی ہوگی۔"

"وہ کیا؟"

"ہم" میں نے کہا "جیسے ہم پُرامید ہیں کہ ان کا سراغ وہیں ملے گا' ایسے ہی وہ ہماری آمد کی توقع رکھ سکتے ہیں۔ ہم ان کی سوچ کو سمجھتے ہیں' وہ ہمارے ذہن سے واقف ہیں۔"

"یہ ٹھیک ہے' وہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہم محسن کو تلاش ضرور کریں گے۔ ہمیں اس کے اغوا کا علم ہو جائے گا۔ پھر ہم سمجھ جائیں گے کہ اغوا کرنے والے کون تھے اور شاید تھانے دار سے سب معلوم کر لیں گے لیکن وہ ایسا رسک کیوں لیں گے؟ کیا انہیں ڈر نہیں ہوگا کہ خود تھانے دار نے کوئی جال نہ پھیلا رکھا ہو؟"

میں نے کہا "ظاہر ہے اصل مجرم یہ رسک نہیں لیں گے۔ یا تو وہ اصل چہرہ لے کر سامنے نہیں آئیں گے۔ یا اصل لوگ نہیں ہوں گے۔ کوئی اور آئے گا' یہ دیکھنے کے لئے کہ ہمارا ردِعمل کیا ہے اور خود تھانے دار کا کیا حال ہے اس سزا کے بعد۔"

"پر انہیں ہم کیسے پہچانیں گے؟"

"کوشش کریں گے... پہلے یہاں سے تو نکل جائیں" میں نے کہا۔

تھانے میں بدستور سکوت تھا۔ حوالات کے اسیران کی حالت خراب تھی۔ صرف دو گھنٹے میں حوالدار پر نیم بے ہوشی کا عالم تھا اور اس کا بھاری بھرکم وجود زنجیر کے ساتھ تقریباً جھول رہا تھا۔ نگراں حوالات کے لئے بھی جسمانی اذیت کا یہ دوسرا مرحلہ زیادہ سخت تھا۔ انہوں نے ہمارے قدموں کی چاپ سنتے ہی ناک سے آوازیں نکالتے ہوئے منت سماجت کے انداز میں سرہلانا شروع کیا۔

میں نے کہا "غالب' ان کو چھوڑ کے کہیں ہم مشکل میں نہ پڑ جائیں۔"

غالب نے کہا "ان حالات میں ہم انہیں قید بھی نہیں رکھ سکتے۔"

"یہ ہمارے خون کے پیاسے ہوں گے۔ خصوصاً یہ موٹا حوالدار سب کو چھوڑ کے ہمارے پیچھے نہ پڑ جائے۔ اس کو بہت بے عزت کیا ہے ہم نے۔"

"ابھی یہ کچھ نہیں کر سکتا۔ اسے فوراً سائن کی خدمت میں حاضر ہونا ہے" غالب نے کہا۔

"وہاں اس کا کوئی خاص کام نہیں ہے۔"

"کام کیوں نہیں ہے۔ سائن اکیلا ہی سب کچھ کرے گا؟"

میں نے کہا "سائن کو بھی یہاں کیا کرنا ہے۔ سوائے ایک رپورٹ درج کرنے کے۔ باقی سارے کام شہر کے ہیں' ایمبولینس وہیں سے آئے گی' پوسٹ مارٹم وہیں ہوگا اور اس کے بعد کل

آخری رسوم بھی وہیں ادا ہوں گی۔ اگر تفتیش کے لئے کوئی خصوصی ٹیم تشکیل دی گئی تو وہ بھی شہر سے آئے گی۔ لوگوں کو جائے واردات سے دور رکھنے کے لئے ایک کانسٹیبل ڈیوٹی پر کھڑا کردینا کافی ہوگا۔ پھر سائین شہر چلا جائے گا۔ موٹا حوالدار اور نگراں حوالات اپنی حالتِ زار کو بہانہ بنا کے سارے معاملات سے جان چھڑالیں گے۔ وہ سائین سے کچھ نہیں کہیں گے مگر یہ ہوسکتا ہے کہ کسی بڑے افسر کے پاس جاکے فریاد کریں۔ سائین پہلے ہی ناپسندیدہ شخص ہے۔ حوالدار بھی اس کے سخت خلاف ہے۔ وہ اس موقع سے فائدہ اٹھاسکتا ہے۔"

غالب نے کہا "ہم تو پہلے ہی ہر طرف سے محصور ہیں۔ پولیس سارے علاقے کی ناکابندی کئے بیٹھی ہے۔ اعلیٰ افسران خود یہیں موجود ہوں گے۔"

میں نے کہا "اگر حوالدار نے جاکے یہ بتادیا کہ گزشتہ رات اس نے ڈاکوؤں کے ایک ساتھی کو پکڑلیا تھا مگر اسے سائین صاحب نے چھوڑدیا۔ تو سائین بھی مشکل میں پڑجائے گا۔ پھر یہ کہے گا کہ اس ڈاکو کے ساتھی تھانے میں آگئے تھے اور انہوں نے ہمارے ساتھ جو سلوک کیا وہ آپ دیکھ لیں۔ مگر سائین صاحب نے انہیں کچھ بھی نہیں کہا اور آزاد چھوڑدیا۔ وہ اسی علاقے میں دندناتے پھر رہے ہیں۔ تو ایک دم پولیس اپنی ساری نفری کے ساتھ یہاں پہنچ جائے گی۔ ہمارا نکلنا مشکل کیا ناممکن ہو جائے گا۔"

"پھر کیا کریں؟ اسے چھوڑنا بھی ضروری ہے۔ سائین نے کہا تھا۔"

"اس نے تو کہا تھا... لیکن میرا خیال ہے کہ اسے چھوڑنا غلطی ہوگا۔ جب تک ہم اس علاقے سے نکل نہ جائیں اسے بھی کھلی چھٹی نہیں ہونی چاہئے کہ ہمارے اور سائین کے خلاف جو چاہے کرتا پھرے۔ ہم ان دو سپاہیوں کو چھوڑ دیتے ہیں جو ناتجربہ کار لڑکے ہیں اور بہت زیادہ ڈرے ہوئے ہیں۔ انہوں نے بالکل مزاحمت نہیں کی تھی۔"

غالب نے کہا "میری قوتِ فیصلہ تو بالکل مفلوج ہوگئی ہے۔"

"اچھا تو پھر یہ سارے معاملات مجھ پر چھوڑ دے۔ تو خواتین کے ساتھ نکل جا" میں نے کہا۔

غالب نے حیرانی سے کہا "نکل کے کہاں جاؤں؟"

میں نے کہا "کیا یہاں آتے ہوئے تو نے خانہ بدوشوں کے خیمے دیکھے تھے؟"

غالب نے نفی میں سرہلایا "ایک فقیروں کا ڈیرا نظر آیا تھا۔"

میں نے کہا "وہی۔ وہ خانہ بدوش ہیں... چھ سات خیمے ہیں گاؤں سے کچھ فاصلے پر۔ اگر ہم ان میں شامل ہوجائیں تو اس علاقے سے نکل سکتے ہیں، فقیروں اور خانہ بدوشوں کو پولیس کیا کہے گی۔"

"ہم یہ چانس لے سکتے ہیں۔" غالب نے کہا۔

"ان سے صاف صاف بات کرنا کہ پولیس ہمارے تعاقب میں ہے۔ تم کسی طرح ہمیں یہاں سے نکال دو۔ یہ غریب اور لالچی لوگ ہوتے ہیں۔ دو چار ہزار کی خاطر یہ سب کچھ کرنے پر تیار ہوجائیں گے۔"

"پھر دو چار ہزار کیا، دس بیس ہزار دئے جاسکتے ہیں۔"

میں نے کہا "اگر انہیں اندازہ ہوگیا کہ تمہارے پاس لاکھوں ہیں تو وہ خود تمہیں مارڈالیں گے۔ اس لیے محتاط رہنا۔ اپنے اسلحے کی حفاظت کرنا تاکہ ضرورت کے وقت نکالا جاسکے۔ میں کچھ دیر بعد آتا ہوں۔"

"پھر اتنی لمبی وصیت کس لئے؟" غالب نے کہا۔

"میں ان دونوں سپاہیوں کو لاتا ہوں۔ تو یہ وردی بدل کے پھر وہی پرانا برہمنوں والا لباس پہن لے، وردی واپس کرنا ضروری ہے۔"

"ویسے بھی ہم خانہ بدوشوں کے ڈیرے میں پولیس کی وردی پہن کے نہیں جاسکتے۔" غالب نے کہا۔

"میں بھی یہ وردی اتاردوں گا لیکن الماری میں نگراں حوالات کی وردی موجود ہے۔ وہ پہن کے آؤں گا۔"

"وردی میں آنا ضروری ہے؟"

"ہاں یار، مجھے دھوتی کرتے میں پکڑے جانے کا ڈر ہے۔ گرداور کے لڑکے نے مجھے دیکھ لیا تو فوراً پہچان جائے گا۔ تو جا، یہ کپڑے بدل اور خواتین کو تیار کر۔ خانہ بدوشوں سے معاملہ طے ہوجائے تو انہیں سمجھادینا کہ ابھی ہمارا ایک اور ساتھی پولیس کی وردی میں آئے گا۔ اس سے ڈرنے اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

میں لوٹ کر حوالات میں گیا تو حوالدار کی التجا آمیز نگاہیں میرے قدموں میں لوٹ رہی تھیں۔ وہ ہاتھ جوڑنے، پاؤں پکڑنے اور گڑگڑانے سے قاصر تھا لیکن اس کا چہرہ فریاد کناں تھا اور اس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو رحم کی درخواست تھے۔ نگراں حوالات کی مظلومیت اور بے بسی الگ نوحہ خواں تھی مگر میں نے ان کی طرف دیکھے بغیر دونوں سپاہیوں کے ہاتھوں پیروں سے بندھی ہوئی رسّی کھولی اور ان کے منہ میں ٹھونسا ہوا کپڑا نکال دیا۔

"ابھی میں تم دونوں کو چھوڑ رہا ہوں" میں نے کہا "اس لئے کہ مجھے تمہاری جوانی پر ترس آتا ہے۔"

وہ دونوں رونے لگے۔ پہلے ایک نے پھر دوسرے نے میرے پاؤں پکڑلئے۔

میں نے کہا "یہاں سے تمہاری لاشیں نہیں جارہی ہیں تو اس کو ہمارا احسان سمجھو، یہ مت سمجھنا کہ ہم کو ڈر تھا کسی کا۔ ہم بے وجہ قتل نہیں کرتے لیکن قتل بہت کئے ہیں ہم نے، اگر بعد میں تم نے کسی سے کچھ کہا یا ہمارے بارے میں کوئی بات کی تو ہمیں معلوم ہوجائے گا۔ پھر ہم کسی روز بھی تمہارے گھر پہنچ جائیں گے۔"

ان میں سے ایک نے پتا نہیں کس کس کی قسم کھاکے کہا۔ "میں یہ نوکری ہی چھوڑدوں گا، میری زبان سے ایک لفظ بھی نکلے تو میں باپ کا نہیں کتے کا بچہ۔"

دوسرے نے اس کی تقلید کی۔ اس نے بھی قسمیں کھاکے مجھے یقین دلایا کہ وہ مرجائے گا مگر ہمارے بارے میں اپنی زبان سے کچھ نہیں بتائے گا۔

"اگر تم نے یہ سمجھا ہے کہ جھوٹی قسمیں کھاکے اس وقت جان بچالوگے اور بعد میں یہ موٹا حوالدار تمہیں بچالے گا... تو یہ بھی سمجھ لو کہ ایسا ہونا ناممکن ہے، کسی دن تم سوتے رہ جاؤگے اور ہم تمہارے سر اتار کے لے جائیں گے۔ صرف تمہارے ہی نہیں، تمہارے گھر میں جو بھی ہوگا، اس کی چتا سر کے بغیر جلے گی۔"

دہشت سے ان کا برا حال ہوگیا۔ اپنی اپنی وردیاں پہنتے ہوئے ان کے جسم لرز رہے تھے اور ہاتھوں میں رعشہ تھا۔ پولیس کی نوکری میں ان کے لئے یہ پہلا تجربہ تھا جب انہیں اندازہ ہوا تھا کہ وردی سے صرف تھانے داری ہی نہیں ملتی، کبھی ہم جیسے لوگ بھی مل جاتے ہیں جو موت کے نامہ بر ہوتے ہیں۔ مجرم ہونے کے باوجود رشوت نہیں دیتے اور قانون کی گرفت سے بالاتر ہوتے ہیں۔

"اب تم لوگ سیدھے سائین صاحب کے گھر جاؤگے۔"

"جو حکم آپ کا۔"

میں نے کہا "ان کی ماں کو بھی قتل کردیا گیا ہے اور بہن کو بھی۔"

ان کی آنکھوں سے بے یقینی عیاں ہونے لگی۔ وہ چپ کھڑے رہے۔

میں نے کہا "ایسا لگتا ہے کہ ہمارے دوسرے ساتھیوں نے انچارج صاحب کو سزا دی ہے۔"

غالب نے کہا "ہاں، غلطی تو انہی کی تھی۔ انہوں نے ہمارا دل پیچ دیا تھا۔"

"شاید تم کو یقین نہیں آیا۔ اس لئے تم جاکے دیکھ لو" میں نے کہا اور پھر گرج کے کہا "جاؤ۔"

وہ بے تحاشا بھاگے، لڑکھڑاتے اور باربار پیچھے مڑکے دیکھتے ہوئے۔ ان کی حالت اتنی مضحکہ خیز تھی کہ ہم سب اعصابی کشیدگی اور پریشانی کے باوجود مسکرانے لگے۔ میں نے ریوالور ان کے فائر کرنے کے انداز میں ان کی طرف کیا تو وہ دوڑتے دوڑتے گرگئے۔ کچھ دیر بعد پھر اٹھے اور زیادہ تیزی سے بھاگے۔

غالب نے گل کو کندھے پر ڈالا اور بولا "اسے تو تیز بخار ہے۔"

میں نے کہا "دیکھو شاید خانہ بدوش کوئی علاج کرلیں۔ ابھی اسے اسپرین دیتے رہنا۔ یہاں سے نکل گئے تو کسی ڈاکٹر کو بھی دکھائیں گے۔"

رابعہ نے کہا "کیا تم نہیں چل رہے ہو؟"

میں نے کہا "میں کچھ دیر بعد آؤں گا۔ جب تم لوگ پہنچ جاؤگے۔"

رابعہ نے کہا "میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔"

"بے وقوفی کی بات مت کرو۔"

"میں کروں گی" رابعہ نے کہا۔ اور وہیں بیٹھی رہی۔

میں نے ہتھیار ڈالتے ہوئے گل سے کہا "اچھا تم جاؤ، میں نے غالب کو سب سمجھادیا ہے کہ کیا کرنا ہے۔"

"اور میں تمہیں سمجھارہی ہوں کہ بعد میں کچھ نہیں کرنا ہے۔"

گل نے کہا "جب تک یہ وعدہ نہیں کروگے میں بھی نہیں جاؤں گی۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں..."

"کتنی دیر کے بعد آؤگے تم دونوں؟"

"زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے میں۔"

"آخر ساتھ کیوں نہیں چلتے؟"

"بحث میں وقت ضائع مت کرو، ہے کوئی مصلحت" میں نے برہمی سے کہا "یہ پھل اور مٹھائی کا تھیلا اٹھالو اور روانہ ہوجاؤ۔"

میں انہیں باہر جانے کے بعد تھانے کے عقبی حصے کی طرف سے آہستہ آہستہ خانہ بدوشوں کے ڈیرے کی طرف بڑھتا دیکھتا رہا... یہ شاید آدھے میل کا راستہ تھا مگر گاؤں کے باہر سے گزرتا تھا۔ انہیں دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ گاؤں کی ساری آبادی شاید تھانے دار کے گھر پہنچ چکی تھی۔ دُہرے قتل کی اس سنسنی خیز واردات کی خبر نے کھیتوں میں کام کرنے والوں کو بھی کھینچ لیا تھا۔ ہر طرف سناٹا تھا اور ہو کا عالم تھا۔

میں اب حوالات کے نگراں کی وردی میں تھا جو میرے جسم کے لئے زیادہ آرام دہ ثابت ہورہی تھی۔ نوجوان سپاہی کی تنگ وردی میں تو میں بری طرح پھنس گیا تھا۔ رابعہ بینچ پر اکیلی بیٹھی ہوئی خلا میں دیکھ رہی تھی۔

میں نے کہا "ضدی لڑکی!"

اس نے بھیگی ہوئی پلکیں اٹھاکے مجھے دیکھا "میں نے تم سے کہا تھا، میں اکیلی کہیں نہیں جاؤں گی۔"

میں نے ہنس کے کہا "اکیلی! غالب، نازو اور گل کے ساتھ اکیلی!"

"میں تمہارے بغیر ہر جگہ اکیلی ہوں" اس نے آنسو پی کے کہا۔

"دیکھو اب رونا نہیں، میرے ساتھ رہنے کی یہی شرط ہے کہ مسکراتی رہو تاکہ میرے دل کو ٹانک ملتا رہے" میں نے کہا۔ "میں ابھی دو منٹ میں آتا ہوں۔ حوالدار کو ایک خطبہ دے آؤں، تم خاموش بیٹھنا۔"

حوالات کی طرف جاکے میں نے کہا "موٹے، تم نے کچھ سنا"

ہمارے ساتھیوں نے اپنا آدمی چھڑالیا ہے۔ تمہارے انچارج نے اسے اپنے گھر میں چھپا رکھا تھا' ایک لاکھ میں سودا کیا تھا اس نے ہمارے دشمنوں سے اور وہ ایک لاکھ نقد مانگتا تھا۔ وہ سودا کرنے والوں کے ساتھ بھی نہیں گیا تھا۔ اس نے کہا کہ پیسہ لے آؤ اور اپنا آدمی لے جاؤ' وہ گئے تھے پیسہ لینے اور انہوں نے شام تک کا وقت مانگا تھا۔ سائن صاحب ادھر آیا اور ہمارے باقی ساتھی اس کے گھر پہنچ گئے۔ اس کی ماں اور بہن کی لاشیں چھوڑ گئے۔ چمن لال کو لے گئے۔ سائن بچ گیا اس لئے میں یہاں رک کے اس کا انتظار کررہا ہوں ورنہ سب کے ساتھ نکل جاتا۔ یہ سب تمہیں اس لئے بتارہا ہوں میں کہ تمہاری غلط فہمی دور ہوجائے۔ پولیس آج تک ہم پر ہاتھ نہیں ڈال سکی... اور آئندہ بھی نہیں ڈال سکتی۔ تم شکر کرنا کہ زندہ بچ گئے۔ ہم کسی سے رعایت نہیں کرتے لیکن بلاوجہ کسی کو مارتے بھی نہیں۔ تم نے ہمارے ساتھی کو پکڑنے کی جو غلطی کی تھی اس کی اتنی ہی سزا ہوسکتی تھی جتنی تم کو ملی۔ تھانے دار کا جرم ناقابل معافی ہے۔ جیسے ہی وہ ادھر آیا میں چلا جاؤں گا۔ اس کو قتل کئے بغیر میں نہیں جاسکتا۔ تم بھی اپنے دماغ سے سب کچھ بھلادو' ہم سے دوستی سے تمہیں بہت کچھ مل سکتا ہے۔ دشمنی تمہارے بس کی بات نہیں۔ تم بہت چھوٹے آدمی ہو۔ تمہارے اختیارات سے یہ دیہاتی ڈر سکتے ہیں۔ ہمارے متعلق کوئی غلط بات کی تو نقصان اٹھاؤ گے۔ اگلے پھیرے میں ہم تمہیں صاف کرجائیں گے۔ تمہارے خاندان سمیت۔ ورنہ انعام دے جائیں گے۔ سائن کے انجام سے سبق سیکھو۔ وہ بڑا ایمان دار اور فرض شناس بنتا تھا اس لئے اس کا حشر خراب ہوا...."

میں دس منٹ بولتا رہا۔ مقصد حوالدار کو دہشت زدہ کرکے اس کا حوصلہ ختم کرنا تھا۔ تاکہ وہ رہائی پانے کے بعد بھی خاموش رہے اور ہمارے خلاف کسی کارروائی میں فریق تک نہ ہو۔ پھر میں واپس لوٹ آیا۔ میں نے رابعہ کا ہاتھ پکڑا اور دبے پاؤں وہاں سے نکل آیا۔ حوالات میں دونوں قیدی یہی سمجھے ہوں گے کہ میں سائن کی واپسی کے انتظار میں وہیں موجود ہوں۔ معلوم نہیں کب تک انہوں نے انتظار کیا ہوگا کہ سائن کے قتل کئے جانے کی آوازیں سنائی دیں گی... اور معلوم نہیں کب انہیں قید کی اذیت سے نجات ملی ہوگی۔

باہر آتے ہی میں نے دیکھا تو غالب کے ساتھ نازو اور گل بھی دور کہیں کسی خیمے کی پناہ میں پہنچ چکے تھے۔ میری خواہش بھی یہی تھی کہ جتنا جلد ممکن ہو ہم سب اس جگہ سے دور چلے جائیں۔ ...گرد و نواح کے سارے علاقے میں شکاری ہمیں تلاش کررہے تھے۔ گزشتہ رات ہماری کارروائی سے دلاور اور تریونی کو بہت بڑا مالی صدمہ اٹھانا پڑا تھا۔ وہ اب کاروباری شریک اور ہمارے ایک سے دشمن تھے۔ یہاں دلاور کی اصل طاقت تریونی بن گیا تھا جس کی بمبئی میں وہی پوزیشن تھی جو کبھی لاہور میں ... دلاور کی تھی۔ تریونی کے وسائل' اس کے تعلقات اور ... آدمی دلاور کی مدد کررہے تھے۔ جتنے لوگ اس ایک رات ... مارے گئے تھے اس کے بعد پولیس کے پاس نامعلوم دہشت گردوں کے خلاف بڑے پیمانے پر کارروائی کرنے کا پورا جواز ... ابھی تک پولیس درپردہ تریونی کو پورا تعاون فراہم کرتی ... لیکن آج کے بعد پولیس کے ساتھ سراغرسانی کے دیگر ادارے ... حرکت میں آجانا یقینی تھا۔ ان خبروں کی اشاعت کے ساتھ ... پریس اور پبلک کا پولیس کمشنر اور صوبائی وزارت داخلہ پر ... بڑھے گا تو وہ اسلحے کے اس ذخیرے کی تباہی اور اس کشت و خون کے اسباب کی پردہ پوشی نہیں کرسکیں گے۔ انہیں بتانا پڑے گا اسلحہ کس کا تھا' کہاں سے آیا تھا' اس مندر کے ساتھ ... خانے میں کیوں اکٹھا کیا گیا تھا اور اسے تباہ کرنے والے کون ... اسلحہ جمع کرنے والے اسمگلر تھے تو وہ کس کے آلۂ کار تھے ... انہوں نے یہ اسلحہ کس سے حاصل کیا تھا اور ان کے مقاصد ... تھے؟ کیا وہ ملکی سالمیت کے خلاف کسی سازش میں مصروف ... اور اگر اس میں کوئی بیرونی ہاتھ تھا تو اس معاملے سے اب تک وزارتِ داخلہ کیوں بے خبر رہی.... اس کارروائی کو ڈاکوؤں ... کسی گروہ سے منسوب کرکے ختم کرنا مشکل تھا۔

میرا اندازہ تھا کہ شام تک سرکاری سطح پر کوئی بیان جاری ہونے کے بعد بڑی کارروائی ہوگی۔ اس سے پہلے بمبئی سے ا... دوسرے شہروں سے صحافی اور فوٹوگرافر پہنچنے شروع ہوجائیں ... اور اس کے بعد ہمارا یہاں سے نکلنا زیادہ مشکل ہوگا۔ یہ ... ہوسکتا تھا کہ اس خونریزی اور تباہی کے اسباب کا جائزہ لینے ... لئے دفاعی ماہرین آجائیں اور یہ سارا معاملہ پولیس کے ہاتھ ... نکل کے ملٹری کی انٹیلی جنس تک پہنچ جائے یا پھر دونوں کا مشترکہ ... آپریشن شروع ہو۔ ہنگامہ بڑھے تو تحقیقات کے لئے کمیشن ... کردیا جائے جس کے سامنے سارے شواہد آجائیں۔ ... سائن کا بیان بھی لیں گے اور حوالدار کا بھی۔ رامارا ؤ کا بھی ... بالک رام کے گاؤں میں مرنے والے سب لوگوں کے لواحقین ... بھی۔

ہر صورت میں اگر اس سے ہمارے لئے خطرات بڑھے ... تو خود تریونی اور دلاور کے لئے بھی مسائل کھڑے ہوگئے ... انہیں فکر ہوگی کہ کہیں تحقیقات کی لپیٹ میں وہ خود بھی ... آجائیں۔ وہ اپنے کاروبار کی پردہ پوشی پر مجبور ہوں گے۔ کوشش ... کریں گے کہ تحقیقات رکوادیں یا کم سے کم اس کا رخ ... دیں۔ انہیں اپنے کارندوں کو خبردار کرنا ہوگا کہ فی الحال ... سرگرمیاں معطل رکھیں اور اپنے سارے ٹھکانے بدل دیں ... پرانے اڈوں کو خالی کردیں اور اسلحے کی ترسیل کو فوری طور ... روک دیں' جب تک یہ معاملہ دب نہیں جاتا۔ ہر خبر ...

... ... بیانات ... پبلک کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے ... والوں کے دباؤ پر شروع کی جاتی ہیں بالآخر چیخنے والوں کی ... تک محدود ہوجاتی ہیں اور جب لوگ یہ بات بھول جاتے ... نئے سانحے میں الجھ جاتے ہیں تو کمیشن خود سرد خانے ... چلا جاتا ہے۔ زندگی کے سارے کاروبار پھر اسی طرح چلنے ...

... نے رابعہ کے ساتھ ابھی نصف فاصلہ ہی طے کیا ہوگا کہ ... خدشات درست ثابت ہونے لگے۔ میں نے دور سے ... موٹر سائیکل کو دیکھا جو گرد اڑاتی شور مچاتی سیدھی میری ... آرہی تھی۔ جب فاصلہ سو دو سو گز رہ گیا تو میں نے حلئے سے ... نمائندہ نظر آنے والے کو پہچان لیا۔

"... کچھ بھی سوال کرے' تم جواب مت دینا" رابعہ نے کہا۔

"کس کی بات کررہی ہو؟" میں نے انجان بن کے کہا۔

"یہ جو آرہا ہے' دیکھتے نہیں اس کے گلے میں کیمرہ ہے۔ ... پولیس مین سمجھ کے بات ضرور کرے گا" رابعہ نے کہا۔

موٹر سائیکل میرے قریب آکے رک گئی۔ گرد آلود' پریشان ... والے شخص نے دھوپ کا چشمہ اتار کے شیشوں پر پھونک ... اور بولا "تم کچھ بتاسکتے ہو یہ کیا چکر ہے؟"

میں نے حیران ہوکے کہا "مجھے تو کوئی چکر نظر نہیں آرہا ہے!"

"اچھا' مجھے چکر دیتے ہو" وہ مجھے گھور کے بولا "میں ایوننگ ... کا رپورٹر ہوں۔"

"پھر میں کیا کروں' میں اس علاقے کا رہنے والا نہیں ہوں"

"پھر یہاں کیا کررہے ہو؟" وہ بند ہوجانے والی موٹر سائیکل ... کک لگاکے بولا۔

"اپنی بیوی کے میکے جارہا ہوں" میں نے کہا "راستے میں جو ... ایسے ہی سوال کرتا ہے عجیب و غریب۔"

"تو کیا تمہیں واقعی نہیں معلوم؟"

"کیا نہیں معلوم؟"

"یہی کہ کل رات یہاں دہشت گردوں کا ایک گروہ پکڑا گیا ... انہوں نے بہت زبردست تباہی پھیلائی ہے..."

"دہشت گرد' یہاں!"

"ہاں۔ میں دیکھ کے آیا ہوں' بہت بڑا اسلحے کا ذخیرہ تھا۔ ... کہتا ہے خود انہوں نے فرار ہونے سے پہلے تباہ کردیا۔ کوئی ... کہتا ہے کہ دو گروہ تھے جن کے درمیان رات بھر لڑائی ہوئی۔ پتا ... کتنے مارے گئے اور کتنے بچ کر نکل گئے۔ خیر' کچھ اندازہ ہے ... تھانہ کہاں ہے؟"

"تم سے کس نے کہہ دیا کہ یہاں تھانہ ہے۔"

"یہ پتا چلا تھا کہ ایک دہشت گرد پکڑا گیا۔ وہ یہاں لاک ... میں بند ہے۔"

... نے کہا "یہاں لاک اپ کیسے ہوگا جب تھانہ چوکی کچھ بھی نہیں ہے۔"

اس نے مایوسی سے سر ہلایا "افواہیں بھی تو بہت پھیلاتے ہیں لوگ' خواہ مخواہ میرا وقت ضائع ہوا۔"

اس نے موٹر سائیکل موڑنے سے پہلے رابعہ کو گھور کے دیکھا جو منہ پھیرے کھڑی تھی۔ پھر وہ شہدوں کی طرح میری طرف دیکھ کے مسکرایا اور مجھے آنکھ مار کے ہوا ہوگیا۔

"شہدے' لفنگے" میں نے چلا کے کہا۔ جواب میں مجھے اس کا قہقہہ سنائی دیا۔ موٹر سائیکل دھول اڑاتی واپس ہوگئی۔

"اس وقت بال بال بچے" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ "کہیں وہ پولیس چوکی پہنچ جاتا تو سارا بھید کھل جاتا۔ حوالدار اور حوالات کا نگراں رہا ہوتے ہی اسے ہمارے متعلق بتادیتے۔"

"مشکل ہے... تم نے انہیں اتنا ڈرادیا تھا۔"

"پھر بھی کوئی بھروسہ نہیں کیا جاسکتا ان لوگوں پر۔ اخباری نمائندے کو دیکھتے ہی وہ شیر ہوجاتا۔ اور اخباری نمائندہ اسے فوراً بتادیتا کہ ہم دونوں کس طرف جارہے تھے اور اسے کہاں ملے تھے۔"

"جیسے ہی اسے یہ معلوم ہوگا کہ وہ افواہ نہیں تھی بلکہ اسے ایک پولیس والے نے گمراہ کیا تھا' وہ واپس آئے گا۔"

"آنے دو یار۔ وہ کیا اور بھی بہت لوگ آئیں گے' اتنا عظیم کارنامہ سرانجام دیا ہے ہم نے' اس کی شہرت ہوگی تو اخبار والے' پولیس والے کیسے نہیں آئیں گے لیکن فوری طور پر ہمیں تھوڑی سی مہلت مل گئی ہے۔ ہم کوشش کریں گے کہ اس وقت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہاں سے نکل جائیں۔"

"سکندر' یہ اخباری نمائندہ کہہ رہا تھا کہ ایک دہشت گرد پکڑا گیا ہے۔"

"ہاں' میں بھی حیران ہوں کہ یہ خبر اتنی جلدی شہر تک کیسے پھیل گئی۔"

"سوچنے کی بات یہ ہے کہ جب کوئی دہشت گرد پکڑا ہی نہیں گیا تو یہ خبر کس نے ایجاد کی؟" رابعہ نے کہا "کیا وہ کسی اور کی بات کررہا تھا؟"

"پکڑا تو صرف محسن گیا تھا۔"

"اس کا کوئی ثبوت نہیں' کہیں اندراج نہیں۔ ایک پولیس پارٹی نے پکڑا' انچارج نے اسے چھوڑدیا۔ راتوں رات ایک لاکھ میں سودا ہوا اور شکاری اسے لے گئے۔ وہ خود تو خبر دے نہیں سکتے کسی کو۔"

"تم نے اچھی بال کی کھال نکالی ہے عزیزہ۔ یہ نکتہ قابل غور ہے" میں نے کہا۔

"اس سے سائن مشکل میں پڑ سکتا ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"موٹا حوالدار اور دوسرے مظلومین کا بیان' اس کے خلاف

جائے گا' سب ہی اس کے دشمن ہیں۔"

"سائن کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اگر اس نے صاف انکار کردیا تو اسے جھوٹا کون ثابت کرے گا۔ وہ کہہ سکتا ہے کون چمن لال۔ یہاں تو کوئی چمن لال نہیں۔ موٹا حوالدار خود کو سچا ثابت کرنے کے لئے کیا ثبوت پیش کرے گا؟"

"کیا وہ بتائے گا نہیں کہ تھانے دار کی بہن کو اور ماں کو قتل کرنے والے چمن لال کے ساتھی تھے۔ اسے تھانے دار نے ایک لاکھ روپے وصول کرنے کے لئے اپنے گھر میں چھپا رکھا تھا۔ یہ کہانی تم نے ہی سنائی تھی اسے۔"

میں نے ہنس کے کہا "اچھا ہے اگر یہ کہانی وہ دوسروں کو سنائے' اسی سے وہ جھوٹا بنے گا۔ خود پولیس یہ بات تسلیم نہیں کرسکتی کہ سائن نے ایک لاکھ رشوت لے کر ایک دہشت گرد اور قانون کے مجرم کو چھوڑنا منظور کیا تھا۔ اعلیٰ افسران بھی جانتے ہیں کہ سائن کو ایمانداری کا کتنا پرانا اور ناقابلِ علاج مرض لاحق ہے۔ حوالدار ایسی بات کرے گا تو خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارے گا۔ ایک طرف سائن کی ناراضگی مول لے گا تو دوسری طرف ہماری وارننگ کو نظرانداز کرنے کا رسک لے گا۔ ہم اسے بہت اچھی طرح سمجھا چکے تھے کہ اس نے زبان بند نہ رکھی تو نتائج کا بھی خود ذمے دار ہوگا۔"

"مجھے تو محسن کا خیال آتا ہے رہ رہ کے' وہ میری وجہ سے ہی پکڑا گیا تھا۔"

"تمہاری وجہ سے کیوں' تم نے کوئی عقلمندی کی تھی؟"

"نہیں۔ صورتِ حال کچھ ایسی ہوگئی تھی... کہ میں پکڑی جاتی۔ اگر وہ نہ پکڑا جاتا۔"

"یہی تو فائدہ ہے عورت ہونے کا۔ ہر جگہ۔ لیڈیز فرسٹ' مگر مرنا ہو تو جینٹس فرسٹ" میں نے کہا۔

"وہ لوگ اب محسن کو اور شہلا کو نہ جانے کہاں لے جاکے رکھیں گے" رابعہ اپنے خیالوں میں خود اپنے آپ سے باتیں کررہی تھی۔

"فکر کرنے سے کچھ نہیں ہوگا' ملنا قسمت میں ہوگا تو ملوانے کی سبیل وہ خود پیدا کرے گا۔ اللہ بڑا کارساز ہے۔"

ہم اب خانہ بدوشوں کے ڈیرے سے چند قدم دور تھے۔ ڈیرا آٹھ دس بوسیدہ خیموں پر مشتمل تھا۔ یہ خیمے اتنے نیچے تھے کہ کوئی اندر جانے کے بعد سیدھا نہیں کھڑا ہوسکتا تھا۔ یہ باقاعدہ خیمے بھی نہیں تھے۔ آگے پیچھے دس فٹ کے فاصلے سے دو ڈنڈے زمین میں گاڑ کے ایک لکڑی دونوں ڈنڈوں کے اوپر باندھی گئی تھی اور اس کے اوپر سے ترپال گزار کے دونوں جانب گڑی ہوئی کھونٹیوں کے ساتھ کھینچ کر باندھ دی گئی تھی۔ چنانچہ خیمے کا نچلا حصہ تو شاید دس فٹ چوڑا تھا لیکن اوپر اس کی چوڑائی بتدریج کم ہوتی جاتی تھی۔ خیمے دونوں طرف سے بند تھے۔ دیکھنے سے معلوم نہیں ہوسکتا تھا کہ کس خیمے کے اندر کیا ہے۔ خیمے ایک نیم دائرے میں لگائے گئے تھے۔

ہر خیمے کے باہر ایک گدھا یا خچر فارغ کھڑا ہوا چھوٹی سی وقفے سے لطف اندوز ہورہا تھا اور یقیناً ہم سے زیادہ مطمئن اور بے فکر تھا۔ دیگر ذرائع نقل و حمل میں دو بیل گاڑیاں تھیں جن کے اوپر گول چھت تھی۔ کھینچنے والے دونوں بیل نحیف و زار تھے اور وہیں آمنے سامنے بیٹھے جگالی کے مقابلے میں مصروف تھے... ایک بوڑھی عورت' ایک جوان عورت اور دو بچے خیموں کے باہر ساکت و صامت کھڑے مجھے خوفزدہ اور کینہ پرور نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

رابعہ نے کہا "معلوم نہیں وہ کس خیمے میں گھس کر بیٹھ گئے ہیں۔"

"ابھی معلوم ہوجائے گا" میں نے اسے تسلی دی۔

درمیان والے بڑے خیمے سے ایک بوڑھا باہر آیا۔ اس کے سر کے چاروں طرف لمبے لمبے بالوں کی جھالر تھی۔ اس کی سفید مونچھیں لمبی اور کناروں پر ایسے پھیلی ہوئی تھیں کہ لگتا تھا اس نے ہونٹوں پر بو لگا رکھی ہے۔ بالوں کی سفیدی سے اس کی عمر کا اندازہ ساٹھ برس ہوتا تھا مگر اس کی جسمانی صحت بہت سے جوانوں سے بہتر تھی۔ وہ اوپر ایک واسکٹ اور نیچے ایک پاجامہ سا پہنے ہوئے تھا جو چوڑی دار پاجامے کی طرح اس کی ٹانگوں پر فٹ تھا مگر گھٹنوں سے ذرا نیچے ہی ختم ہوجاتا تھا۔

میں نے مسکرا کے رابعہ سے کہا "یہ سردار ہے۔"

یہ بات سن کے وہ خوش ہوا اور دانت نکالتا ہوا آگے آگیا۔ اس نے کسی تکلف کے بغیر رابعہ کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اس سے ہینڈ شیک کرنے کے بعد مجھ سے بغل گیر ہوگیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ جذبات کے اس مظاہرے میں اس کے برعکس نہیں ہوا۔ اس کے جسم سے کڑوے تیل' سڑی ہوئی مچھلی اور گندے انڈوں کی ملی جلی پرفیوم آرہی تھی۔ میں نے اسے مسکراتے ہوئے برداشت کیا۔

"میں آج تک کسی وردی والے سے گلے نہیں ملا تھا" اس نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا۔

"میں بھی کسی جپسی سردار کو گلے لگانے کے اعزاز سے آج تک محروم تھا" میں نے کہا۔

"ہم اور تم دوست ہیں" اس نے میرے سینے پر انگلی رکھ کے کہا۔

میں نے دل ہی دل میں کہا کہ ہاں' پیسہ سب سے بڑا دوستی کا رشتہ قائم کرتا ہے لیکن زبان سے میں نے کہا "ہم لنگوٹیے ہیں" اور اس کے طباق سے سینے پر ہاتھ مار کے بے تکلفی کا جواب دیا اور زور سے ہنسا۔

سردار کے حلق سے "ہخ" جیسی آواز آئی' کھانس کے اس نے لمبی سانس لی اور سر ہلانے لگا۔ وہ اردو بھی پچیس فی صد الفاظ کسی جناتی زبان کے ملا کے بولتا تھا۔ اب اس نے سو فی صد جناتی زبان میں کچھ کہا جو یقیناً کوئی گالی تھی۔

اس نے اقرار میں سر ہلایا اور دو انگلیاں اٹھا کے کہا "دو بیوی والا۔"

"ہمارا دوست آیا ہے یہاں۔"

میں نے وضاحت اور تردید کو غیر ضروری سمجھتے ہوئے کہا۔ "کہاں ہیں وہ سب لوگ' مجھے ان کے پاس لے چلو۔"

اس نے سر ہلایا اور ہمیں پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ پھر اس نے رک کر رابعہ کی طرف دیکھا اور بولا "بیوی ادھر۔"

اس نے بڑے خیمے کی طرف اشارہ کیا تھا۔ میں نے اس میں جھانک کر دیکھا تو مجھے گل اور نازو نظر آئیں۔ گل زمین پر بچھے ہوئے میل سے کالے ہونے والے پیوندوں سے بنے ہوئے گدے پر دراز تھی۔ نازو اس کے پاس چپ چاپ اور اداس بیٹھی تھی۔ خیمہ عجیب و غریب فضول سامان سے بھرا پڑا تھا۔

رابعہ نے اندر جا کے کہا "کیا ہوا نازو؟"

"ابھی تک تو کچھ بھی نہیں ہوا" اس نے گل کی طرف دیکھ کے کہا "ان کے پاس بخار کا کوئی علاج ضرور ہے لیکن ابھی شروع نہیں ہوا۔"

"دیر کس بات کی ہے؟" میں نے کہا۔

"غالب کے اور سردار کے مذاکرات جاری ہیں" نازو نے کہا "خود سردار ہی ڈاکٹر بھی ہے۔"

"سردار!" میں نے اپنے پیچھے کھڑے ہوئے شخص کی طرف دیکھ کے کہا "کیا یہ سردار نہیں ہے؟"

نازو نے کہا "نہیں' وہ تو اسی سال کا بوڑھا ہے۔ ہے کچھ ایسا ہی۔"

"میرا باپ" مجھ سے گلے ملنے والے نے شرمندہ ہوئے بغیر کہا۔

"اچھا' تو آپ ولی عہد بہادر ہیں" میں نے کہا "مستقبل کے سردار۔"

"پرنس آف ویلز" رابعہ نے کہا۔

خود کو سردار بتانے والے نے پھر اسی جناتی زبان میں کچھ کہا اور بولا "آؤ۔"

میں نے اس کی دعوت کو نظرانداز کرتے ہوئے نازو سے کہا "کیا رویہ ہے ان لوگوں کا؟"

"بالکل غیر دوستانہ" نازو نے کہا "دیکھ لو ہم اکیلے بیٹھے ہیں یہاں' ابھی تک کسی نے جھانک کر نہیں دیکھا۔"

"یہ غالباً قبائلی ڈسپلن کا مسئلہ ہے۔ سردار کے ساتھ معاہدہ طے ہونے سے پہلے دوستی کا مظاہرہ سرکشی سمجھا جاتا ہوگا۔"

رابعہ بولی "تم نے تو اعلان کردیا تھا کہ لنگوٹیے ہو۔"

میں نے مسکرا کے کہا "ہماری بات اور ہے۔ ہم دونوں سردار ہیں۔ چلو سردار جی' دیکھ لیتے ہیں تمہارے باپ کو بھی۔"

اصلی تے وڈا سردار صرف لنگوٹی باندھے فرشِ خاک پر آلتی پالتی مارے بیٹھا ہوا تھا اور ایک جلالی شخص تھا۔ اس کی آنکھیں لال ہورہی تھیں۔ وہ چلم میں ڈال کے کچھ پی رہا تھا۔ یہ اسی کا اثر تھا۔ وہ حیرت انگیز طور پر اپنے ولی عہد سے مشابہ تھا۔ ایک سی بالوں کی سفید جھالر اور ایک سی بو ٹائپ مونچھیں' فرق صرف عمر کا تھا... اور مزاج کا۔ سردار نرم مزاج اور خوش اخلاق آدمی تھا۔ اس خیمے میں بھی کاٹھ کباڑ کی کمی نہ تھی۔

غالب اس کے سامنے اسی پوز میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے مجھے بھی وہیں تشریف رکھنے کی دعوت دی۔

"کیا نتیجہ رہا مذاکرات کا؟" میں نے کہا۔

"ابھی مذاکرات شروع ہی نہیں ہوئے" غالب نے دانت نکال کے بتایا۔

"اتنی دیر سے تم ایک دوسرے کو گھور رہے ہو' بس؟"

"ہم تمہارا انتظار کررہے تھے" سردار نے کہا اور چلم میری طرف بڑھائی۔

میں نے معذرت کے بعد کہا "سردار' ہمیں مدد کی ضرورت ہے۔"

"کیا تم جیل سے بھاگے ہو؟ یا کسی کو قتل کرکے آئے ہو؟" سردار نے کہا۔

میں نے کہا "کیا اور کوئی سبب نہیں ہوسکتا۔"

سردار کی گفتگو میں بھی جناتی زبان کے الفاظ آئے تھے لیکن ان کا تناسب دس فی صد بھی نہیں تھا۔ اس نے ولی عہد بہادر کو دفع ہوجانے کا حکم اپنی فادری زبان میں دیا۔

سردار بولا "اگر تم مجرم ہو تو ہم تمہاری نہیں پولیس کی مدد کریں گے۔"

میں نے اس قانون پرست' فرض شناس شہری کی طرف دیکھ کے غالب کی طرف دیکھا۔ بظاہر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہم آسمان سے گرے تو کھجور میں اٹکے تھے اور کھجور سے گرے تو دلدل میں اتر گئے ہیں۔ تاہم ابھی مایوسی کا اظہار قبل از وقت تھا۔

میں نے کہا "ہم مجرم نہیں ہیں۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "تم پولیس والے بھی نہیں ہو۔ پھر کیا چکر ہے؟ اس کی ایک بیوی کو گولی لگی ہے۔ ضرور تم نے کسی پولیس والے کو قتل کیا ہوگا۔ اس کی گولی سے عورت کو زخم آیا۔ پھر تم نے اسے مار کے وردی اتار لی۔"

میں نے کہا "سردار' خواہ مخواہ کی باتیں فرض مت کرو۔ ہم جھوٹ نہیں بولتے۔"

"سب مجرم یہی کہتے ہیں" اس نے چلم کا کش لے کر کہا۔

"لعنت مجرم پر" میں نے برہمی سے کہا "ہم تمہیں نقد رقم

دیں گے۔ تم سے مفت مدد نہیں مانگ رہے ہیں ہم۔"
ایک دم سردار کے چہرے کا تاثر بدل گیا۔ اس کی صورت پر بشاشت نظر آنے لگی "کتنا پیسہ ہے تمہارے پاس؟"
"ہمارے پاس جتنا ہے سب تم کو نہیں دے سکتے۔ تم خود بتا دو کیا چاہئے تمہیں" میں نے کہا۔
سردار نے میری بات پر غور کیا اور بولا "تمہیں کیا چاہئے؟"
میں نے کہا "ایک تو ہمیں پناہ چاہئے۔"
"[illegible] روپے" [illegible]
[illegible]
"[illegible] روپے" [illegible]
"[illegible]" غالب [illegible]
تم [illegible] زیادہ سے زیادہ مطالبات پیش کر [illegible]۔"
مجھے اس چالاک عورت سے منسوب روایت یاد [illegible] کی ایک خواہش پوری ہو سکتی تھی جب کہ وہ سو سال زندہ [illegible] چاہتی تھی۔ اسے دولت کی آرزو تھی اور وہ اولاد کی خواہش مند بھی تھی چنانچہ اس نے دریا کو کوزے میں بند کرتے ہوئے اپنی خواہش ایسے ظاہر کی کہ میں بیٹوں اور پوتوں کو دولت میں کھیلتا دیکھنا چاہتی ہوں۔"
"مجھے مسئلہ پیسے کی کمی کا نہیں تھا مگر سردار کے رویئے نے مجھے مجبور کر دیا تھا کہ میں بھی دریا نہ سہی نالے کو ہی کوزے میں بند کر دوں۔
میں نے کہا "سردار پہلے [illegible] مطالبات واپس۔"
چالاک سردار نے میری امیدوں پر پانی پھیر دیا "وہ سودا تو ہو گیا۔ نہ تم زبان دے کر پھرو گے نہ ہم۔"
"اچھا تو آخری بات یہ ہے کہ جہاں ہم کہیں وہاں ہمیں حفاظت کے ساتھ پہنچا دو" میں نے کہا۔
"دس ہزار روپے" سردار نے کوزہ توڑ کے دریا پھر بہا دیا۔
"ٹھیک ہے، چودہ ہزار میں تم نے ٹھیکا لے لیا ہے" میں نے جھلا کے کہا۔
"ابھی تم سے بات ہوئی ہے، اب اس سے ہو گی" اس نے غالب کی طرف اشارہ کیا۔
سردار بہت عیار اور مکار آدمی تھا۔ اس نے تاڑ لیا تھا کہ ہمارے پاس پیسہ بہت ہے اور ہم مجبور بھی ہیں۔ چنانچہ وہ قدرت کے عطا کردہ اس موقع سے پورا فائدہ اٹھانے پر کمربستہ تھا لیکن مشتعل ہو کے ہمارا بنا بنایا کام بگڑ سکتا تھا "کیا ہر عورت بھی الگ الگ معاہدہ کرے گی؟" میں نے کہا۔
اس نے نفی میں سر ہلایا "بیوی کی بات شوہر کرتا ہے، اس کی دو بیویاں ہیں۔"
"یعنی .... میں اٹھائیس ہزار دوں؟" غالب نے چراغ پا ہو کے کہا۔

"[illegible]" سردار [illegible]
زندگی کا [illegible]
شادی [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
اس نے بڑے افسوس اور حیرت سے [illegible] نظر ڈالی "تمہارا پیسہ بیویاں رکھتی ہیں؟ ان سے [illegible] تم؟"
[illegible] کہا "کیا کریں، ہم دونوں زن مرید [illegible]"
غالب نے کہا "پیسہ بھی بیویوں کا ہے، ہم زر خرید [illegible]"
ولی عہد بہادر کو ہم نے بڑے پر اسرار انداز میں خیمے کے باہر کان لگائے پایا۔ وہ مذاکرات کی ساری کارروائی چھپ کر سن رہا تھا۔ مجھے وہ شخص خطرناک اور کینہ پرور لگا۔ والد صاحب کو بیالیس ہزار کا نقد سودا کرتے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں بھی لالچ کی چمک آ گئی تھی۔ اس کے خیالات کا عکس اس کی صورت پر پڑھا جا سکتا تھا۔ وہ یقیناً فیصلہ کر چکا تھا کہ ہم سے اپنا حصہ الگ وصول کرے گا، وہ ہمیں بلیک میل کر سکتا تھا۔
لیڈیز کیمپ تک ہماری راہنمائی کرتے ہوئے اس نے کوئی بات نہیں کی اور بڑے دوستانہ طریقے پر مسکراتا بھی رہا۔ میں بھی جواب میں مسکرا کے اسے دھوکا دیتا رہا۔ ہم دونوں منافقت کر رہے تھے اور یہ بات جانتے تھے۔ جب وہ ہمارے ساتھ خیمے میں داخل ہونے لگا تو میں نے اسے روک دیا۔ بظاہر اس نے برا نہیں مانا۔
ہمارے پاس جتنی رقم تھی اس میں سے کچھ مرحوم محمد خان کے پاس رہ گئی تھی، کچھ محسن کے پاس تھی، زیادہ حصہ وہ کارٹون نظر آنے والا گلفام لے گیا تھا۔ جو رقم ہمارے پاس تھی اس میں سے راما راؤ نے اپنا حصہ وصول کر لیا تھا۔ اب نو ساڑھے نو لاکھ میں سے ڈیڑھ لاکھ کے قریب بچے تھے۔ نصف رقم میرے پاس تھی اور میری کمر کے گرد کپڑے کی پٹی میں لپٹی ہوئی تھی۔ باقی نازو نے رکھی تھی۔
نازو نے بے چینی سے پوچھا "کیا ہوا؟"
"ہونا کیا تھا، سودا ہو گیا" غالب نے کہا "بیالیس ہزار میں۔"
"بیالیس ہزار!" رابعہ نے حیرانی سے کہا۔
"چودہ ہزار اس کے" غالب نے رونی شکل بنا کے کہا۔

کیونکہ اس کی ایک بیوی ہے۔ اٹھائیس ہزار دو بیویوں والے [illegible]"
نازو کے ساتھ رابعہ بھی ہنس پڑی۔ باہر سے ولی عہد نے [illegible]
[illegible] نے انگریزی میں کہا "مرزا، اس شخص سے ہوشیار رہنا۔"
غالب نے سر ہلایا "یہ ایک کوبرا سانپ ہے۔"
"اس کی آنکھوں میں لالچ اور ہوس کی چمک دیکھی تم نے؟"
"میری ایک بیوی کی طرف آنکھ اٹھا کے بھی دیکھا اس نے [illegible] اسے کانا کر دوں گا۔ دونوں پر بری نظر ڈالی تو اندھا ہو جائے [illegible]
[illegible] اے بیوی پیسے نکال" غالب نے نازو کو ڈانٹا۔
"کیوں ان لوگوں کے سامنے ..." نازو نے بگڑ کے کہا۔
"ارے بے وقوف، ہم نے تو کہا ہے کہ ہم زر خرید ہیں اور [illegible] اور سردار کی رائے ہمارے بارے میں بہت خراب [illegible]
غالب نے کہا "[illegible] بات ہے بیوی کے [illegible] ہاتھ پھیلانا۔"
[illegible] نے کہا "میں ان کے سامنے پیسے نکالنا نہیں چاہتا تھا"
[illegible] تمہارے سامنے کیسے نکالوں؟" نازو نے کہا۔
"[illegible] چلے جاتے ہیں" غالب نے کہا [illegible]
[illegible]
[illegible] سے قتل [illegible]
[illegible] قتل کر دیا [illegible]
[illegible] تو زن مرید۔"
[illegible] فوراً اندر [illegible] رابعہ اور نازو ہنس رہی تھیں۔
"[illegible] زن مرید ہے اور کون زر خرید ہے یہ تو بتا دو" گل نے [illegible] غالب کے حوالے کئے۔
اتفاق سے یہ دونوں صفات میرے مرحوم سسر میں تھیں

جو اب ایک بھوت ہیں" غالب نے جل کے کہا "تمہارے ابا کو کچھ نہیں کہہ رہا ہوں میں، بھتنی" اور فوراً کھسک گیا۔
رابعہ نے کہا "دیکھو جلدی سے بات ختم کرو۔"
ایک بار پھر ہم اصلی تے وڈے سردار کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس نے رقم شمار کی اور پھر ایک دم کھڑا ہو گیا۔ باری باری اس نے مجھے اور غالب کو گلے لگایا اور چوما۔ اس نے بھی وہی پرفیوم لگا رکھی تھی جو ولی عہد نے۔
اس نے مجھے تسلی دی اور کہا کہ اب ہمارے لئے پریشانی کی کوئی بات نہیں رہی کیونکہ وہ ساری ذمے داری قبول کر چکا ہے اور اب ہم پر لازم ہے کہ اپنے سارے معاملات اس پر چھوڑتے ہوئے اس کے احکامات کی اسی طرح تعمیل کریں جیسے اس کے قبیلے کے لوگ کرتے ہیں۔
خیمے سے باہر آ کے اس نے جناتی زبان میں کوئی اعلان نشر کیا اس سے حالات ایک دم بدل گئے۔ خاموش اور خالی نظر آنے والے خیموں میں ہڑبونگ سی مچ گئی۔ پردے ہٹا ہٹا کے ہر خیمے سے حضرات و خواتین برآمد ہونے لگے۔ وہ سب مضحکہ خیز حلیوں والے [illegible] لوگ تھے [illegible] کے معاملے میں وہ ایک ہی [illegible] اصول رکھتے تھے [illegible] حضرات اپنے [illegible]
[illegible]
[illegible] کا فیصلہ نہیں کر سکتا تھا [illegible]
[illegible] خود اپنی مونچھوں کی وجہ سے پہچانے جا سکتے تھے۔
[illegible] مونچھ کی وضع قطع کے معاملے میں بھی انفرادیت پسند تھا [illegible] اپنی وضع خود ساختہ [illegible] کے۔ انہوں نے مونچھیں [illegible] کمانی کمانی تھیں۔ عام طور پر ان کی صحت اچھی نہیں تھی۔ عورتوں کے چہرے پژمردہ اور دکھی لگتے تھے۔ ماحول یا سختی حالات نے سب پر غم عالم کی مہر لگا رکھی تھی۔ جوان عورتیں بوڑھی لگتی تھیں، بوڑھی قریب المرگ ڈھانچے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس قبیلے میں صرف شیر خوار بچے تھے۔ زیادہ سے زیادہ چار پانچ سال کی عمر کے، پانچ سے پندرہ سولہ کی عمر کے لڑکے لڑکیاں مجھے بالکل نظر نہیں آئے۔
جب یہ بھان متی کا کنبہ ہمارے گرد جمع ہو گیا تو سردار نے

ایک اور اعلان کیا۔ ان سب کی نظریں مجھ پر اور غالب پر جم گئیں۔ مجھے ان کی آنکھوں میں ناپسندیدگی کے جذبات کا عکس واضح نظر آیا۔ دونوں گنجے تو باقاعدہ شکل بگاڑ کے خاموش احتجاج میں مصروف تھے۔ وہ دونوں گنجے اس قبیلے کے ٹارزن سمجھے جاسکتے تھے۔ ان کے قد اونٹ جیسے اور جثے ہاتھی کی طرح تھے اور وہ اپنی شہزوری کو مشتہر بھی کرتے تھے۔ سر منڈوانا بھی اس پبلسٹی کا ایک حصہ تھا۔ انہوں نے لمبے نیکر یا چھوٹی پتلونیں پہن رکھی تھیں۔ درحقیقت یہ پاجامے تھے جو گھٹنوں سے ذرا نیچے ختم ہو جاتے تھے۔ ...اوپر وہ صرف واسکٹ پہنے ہوئے تھے مگر اس کے سارے بٹن کھول کے وہ اپنے چٹان جیسے سینوں کی چوڑائی نمایاں کررہے تھے اور دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کے پیر پھیلا کے کھڑے ہوتے وقت اپنے بازوؤں کی مچھلیوں کو بڑے فخر سے دیکھتے تھے۔

اعلان ختم ہوا تو اجتماع منتشر ہوگیا۔ میں نے سردار سے بچوں کی عدم موجودگی کے بارے میں سوال کیا تو اس نے سوچ کے جواب دیا اور کہا کہ وہ دنیا کو دان پُن کا موقع فراہم کرنے کے لئے جاتے ہیں اور لوگوں کو خصوصاً گنہگار اور حاجت مند لوگوں کو انہی کے طفیل نیکی کا ثواب ملتا ہے اور اس کے بدلے میں لوگ وہ چیز دیتے ہیں جو ہاتھ کا میل ہے۔ سیدھے سادے اور سہل الفاظ میں... وہ بھیک مانگنے گئے ہوئے تھے۔

"باقی لوگ کیا کرتے ہیں؟"

"کام کرتے ہیں" سردار نے گول مول جواب دیا۔

"کیا کام کرتے ہیں؟"

"جو بھی مل جائے" اس نے جرح سے اکتا کے کہا "تم اب چلو، میں تمہاری بیوی کو دوا دوں گا۔"

اس نے خیمے میں گل کے پاس بیٹھ کے گل کا معائنہ کسی ماہر ڈاکٹر کی طرح کیا۔ اس کی آنکھیں کھول کر دیکھیں۔ ناخن دیکھے ور پیروں کے تلوے ملاحظہ کئے۔

"یہ ٹھیک ہو جائے گی" اس نے کہا "پانچ سو روپے۔"

میں نے اسے گالی دینے کی خواہش پر بڑی مشکل سے قابو پایا۔ ..اگر میں بمبئی کے سول سرجن کو لے کر آتا تو وہ شاید دو سو روپے بھی نہ مانگتا۔ مجھے اس کے علاج کی کامیابی بھی مشکوک لگتی تھی لیکن یہاں نہ کوئی اسپتال تھا نہ کیمسٹ۔ خود ہمارے پاس کوئی اینٹی بایوٹک دوا ہوتی تو میں ہرگز اسے اپنی ڈاکٹری نہ کرنے دیتا لیکن اب مجبوری کی شکل تھی۔ کچھ نہ کرنے سے بہتر تھا کہ اس قبائلی ڈاکٹر کو اپنی طبابت سے کچھ کرنے کا موقع دیا جائے۔

نازو نے اسے پانچ سو روپے پکڑا دیئے تو وہ باہر چلا گیا۔

میں نے برہمی سے کہا "ہم اس کے رحم و کرم پر ہیں، کہیں ہم نہ مارے جائیں اس لئے غصہ ٹھیک نہیں۔"

"یہ کیسے علاج کرے گا؟ وہی افریقی جادوگروں والے نسخے سے؟ الّو کے کان، لومڑی کی آنکھ اور چمگادڑ کی کلیجی..."

"جب ہم کچھ نہیں کرسکتے تو وہ جو چاہے کرے" رابعہ نے کہا۔

"اور اگر... گل کو کچھ ہوا..."

"تو ہم پورے قبیلے سے نمٹ لیں گے۔ لیکن ان لوگوں کا اپنا ایک تجربہ ہے۔ یہ جڑی بوٹیاں استعمال کرتے آئے ہیں اور باپ دادا کے صدری نسخوں پر قانع ہیں۔ میڈیکل سائنس پہلے بیماری پیدا کرتی ہے پھر اس کی دوا، پھر دوا کے ذیلی اثرات کی بیماریاں ہوتی ہیں اور ان کی دوا الگ اور ہر بیماری کے ساتھ اس کے علاج کا اسپیشلسٹ الگ..."

میں نے بھنا کے کہا "کیوں نہ اس بڈھے کو ڈائریکٹر جنرل ہیلتھ سروسز بنا دیا جائے، سب خرابیاں ٹھیک ہو جائیں گی۔"

نازو نے کہا "یہ مجھے شریف لوگ نہیں لگتے۔"

"ان کو ہم شریف لوگ نہیں لگتے" غالب نے ایک بے حد منطقی اور فلسفیانہ سچائی بیان کی "زمین سے چاند اوپر لگتا ہے، چاند سے زمین، پھر نیچے کون ہے؟"

"ہمیں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ یہ جرائم پیشہ لوگ ہیں، صرف پیسے کے لالچ میں ہماری مدد کررہے ہیں" میں نے کہا۔

"جب تک پیسہ ہے ہم پھینکتے رہیں گے۔ کُتّے کے سامنے ہڈی ڈالتے رہو تاکہ وہ خاموش رہے۔ اگر پھر بھی کاٹنے کی کوشش کرے گا تو گولی مار دیں گے۔"

"یہ لوگ لالچ میں ہماری جان کے دشمن ہو سکتے ہیں، اور نیت خراب ہو جائے تو....."

"کیوں پریشان ہو رہا ہے ابھی سے یار، آخر ہم سب کے ریوالور بھرے ہوئے ہیں۔ ابھی انہیں معلوم نہیں لیکن ہم تو جانتے ہیں۔ ایک ایک کو چُن چُن کر مار دیں گے۔"

غالب کی باتوں نے میری پریشانی کو وقتی طور پر دور کردیا۔ کام میں مصروف عورتیں بار بار ہماری طرف دیکھ کے کوئی بات کرتی تھیں اور پھر ہنسنے لگتی تھیں۔ سردار نہ جانے کہاں غائب ہوگیا تھا۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی اور شاید دوسروں کی حالت بھی مختلف نہ تھی لیکن یہاں کوئی کھانے کو پوچھنے والا نہیں تھا۔

اچانک سردار ایک خیمے سے برآمد ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پیالہ تھا اور ایک بالٹی۔ گل کے پاس بیٹھ کے اس نے زخم کو بالٹی کے گرم پانی سے دھونا شروع کیا، پانی کا عجیب سا رنگ ہورہا تھا اور اس میں سے حقے کے پانی جیسی بو آرہی تھی۔ میں اور غالب اس کارروائی کو خاموشی سے دیکھتے رہے۔

زخم کو خشک کرنے کے بعد اس نے پیالے میں سے کوئی دوا اس پر لگا کے پٹی باندھی۔ پیالے کی آدھی دوا اس لیپ میں استعمال ہوگئی تھی۔ باقی دوا میں اس نے بالٹی والا پانی ملایا اور اسے اتنا پتلا کردیا کہ وہ ایک مکسچر بن گئی۔

"یہ اس کو پلا دو، تھوڑا تھوڑا۔"

"کیا! جو دوا لگائی تھی وہی پلا دیں" میں نے کہا۔

"ہاں، ایک ایک چمچہ پلاتے رہو" اس نے کہا "یہ ٹھیک ہو جائے گی۔"

میں نے کہا "ہمیں کھانے کو کچھ ملے گا؟"

"ملے گا" "ایک آدمی کا سو روپیہ۔"

"سو روپیہ" "ایک وقت کے کھانے کا!" میں نے چلا کے کہا۔ "پانچ ہزار؟"

"اس میں کھانا شامل نہیں ہے۔ وہ تم کو یہاں سے لے جانے کی ذمے داری کا معاوضہ ہے۔"

"یہ بتا دو کہ یہاں اور کس کس چیز کے پیسے الگ ہوں گے" ... نے کہا۔

"بتا دیں گے" اس نے متانت سے کہا اور بالٹی ہلاتا رخصت ہوگیا کیونکہ نازو اسے مزید پانچ سو روپے دے چکی تھی۔ اب وہ گل کو پانچ سو روپے والا مکسچر پلا رہی تھی۔ باہر کی آوازیں سن کے میں نے خیمے سے باہر جھانکا۔

"یہ تو خیمے اکھاڑ رہے ہیں" میں نے کہا "کوچ کی تیاری ہے۔"

"یہ تو اچھی بات ہے، ہمارے یہاں رکنے میں خطرہ زیادہ..." غالب نے کہا۔

ولی عہد پانچ منٹ بعد نمودار ہوا۔ اس کے پیچھے دو عورتیں تھیں۔ ایک نے دھڑ سے ہمارے سامنے چاولوں کی دیگچی رکھی، دوسری نے دال پٹخ دی۔ ولی عہد نے ایک گھڑے کی طرف اشارہ کیا، پھر وہ سب واک آؤٹ کر گئے۔

"یہ... پانچ سو روپے کا لنچ ہے" میں نے سر پکڑ کے کہا۔

"سو روپے پر ہیڈ میں یہاں اور کچھ نہیں مل سکتا" رابعہ ...

"نہ پلیٹ نہ چمچے، کیا ہم براہِ راست دیگچی میں منہ ڈال کے کھائیں گے؟" غالب نے کہا۔

"خدا نے ہاتھ کس لئے دیئے ہیں" نازو نے کہا۔

"یہ تم پوچھ رہی ہو۔ ہاتھوں کا جو استعمال تم کررہی ہو اس ... خود" غالب نے کہا۔

رابعہ نے ایک دیگچی کے ڈھکنے میں چاول نکال کے میرے سامنے رکھے اور اس پر دال انڈیل دی "شوق فرمایئے۔"

"ایک وقت کی کوئی بات نہیں" میں نے سرد آہ بھر کے کہا "... اگر ایسا پھر ہوا تو میں بھوک اور فاقہ کشی سے ہلاکت قبول کر لوں گا۔"

غالب نے میرے ساتھ شامل ہوتے ہوئے کہا "حد ہے ... کی، مہمان کے ساتھ تو چور ڈاکو بھی اچھا سلوک کرتے ہیں۔"

"ہم مہمان نہیں ہیں" نازو نے کہا "ان کے نزدیک ہم مجرم ہیں چنانچہ وہ ہمارے ساتھ مجرموں جیسا سلوک کررہے ہیں۔"

رابعہ اور نازو نے دوسری دیگچی کے ڈھکنے کو استعمال کیا۔ انہوں نے دال چاول کے ملغوبے کو ہاتھ کی انگلیوں سے منہ تک لے جانے کے عمل میں مہارت کا ثبوت دیا۔ میں اور غالب مشکل میں گرفتار رہے۔ ایک بار ہم دونوں پلیٹ پر جھکے تو ہمارے سر ٹکرائے۔ ہماری انگلیاں آخر تک لتھڑ گئیں۔

غالب نے کہا "اگر ہم پلیٹ سے منہ لگا کے کھا لیتے تو اچھا تھا۔"

میں نے کہا "یا پہلے چاول کھا لیتے پھر دال پی لیتے۔"

"ایک اس سے بھی آسان طریقہ تھا۔ پانی جو ہم اب پیئیں گے۔ اسی میں دال چاول گھول کے دو منٹ میں حلق سے اتار لیتے۔"

"عادتیں خراب ہوگئی ہیں تمہاری" رابعہ نے کہا "خدا کا شکر ادا نہیں کرتے کہ یہ بھی مل گیا۔"

"عادتیں نہیں دماغ خراب ہوگیا ہے۔ باپ دادا کیا ڈائننگ ٹیبل پر اور چھری کانٹے سے کھاتے تھے" نازو نے کہا۔

"حدِّ ادب گستاخ لڑکی، ہمارے آباؤ اجداد کو کچھ مت کہنا، ہم غصے میں تھر تھر کانپنے لگتے ہیں" غالب نے کہا۔

"یہ خانہ بدوش سمجھیں گے کہ شاید ڈانس کررہے ہیں" میں نے کہا۔

اچانک گل نے کہا "رابعہ باجی!"

میں اچھل پڑا۔ رابعہ مجھ سے پہلے لپکی پھر نازو اٹھی۔

"کیا ہوا گل؟" رابعہ نے اس پر جھک کے کہا۔

"مجھے پسینہ آرہا ہے، پانی دیں مجھے" گل نے کہا۔

"تمہارا بخار تو اتر گیا ہے" رابعہ نے کہا۔

میں نے حیرانی سے غالب کی طرف دیکھا۔ صرف بیس منٹ میں اس دوا نے اثر دکھایا تھا جس کے اعجازِ مسیحائی پر مجھے ذرا بھی یقین نہ تھا۔ رابعہ نے گل کو پانی پلانے سے پہلے اس جادوئی مکسچر کی ایک اور خوراک دی۔

"خوراک کا کوئی ٹائم بھی ہے؟" غالب نے کہا۔

رابعہ نے کہا "اس نے کہا تھا پلاتے رہو.... اور یہ دوا ہی نہیں خوراک بھی ہے، گل کے لئے۔"

"تمہیں کیا معلوم؟" میں نے کہا۔

"مجھے اس بڈھے نے خود بتایا تھا" رابعہ نے کہا۔

"پھر تو پانچ سو ٹھیک ہی لئے اس نے" میں نے کہا۔

سردار اسی وقت پھر آیا۔ اس نے گل کی حالت میں بہتری پر بے حد خوشی کا اظہار کیا۔

"کیا ہم جارہے ہیں؟" میں نے کہا۔

"ہاں، تم میرے ساتھ آؤ" اس نے مجھے اور غالب کو اشارہ کیا۔

اس نے ایک خیمے میں پہنچانے کے بعد ہمارے سامنے ایک

بہت بڑی گٹھری کھول دی۔ اس میں ہر قسم کے بے جوڑ کپڑے تھے۔

"اپنے لئے لباس منتخب کرلو" اس نے اپنی نوّے فیصد اردو ہندی میں کہا۔ اس کی جناتی بولی کے دس فیصد الفاظ کو سمجھنا ضروری نہیں تھا کیونکہ مطلب اس کے بغیر بھی واضح ہو جاتا تھا۔

میں نے غالب سے کہا "آپ۔"

غالب نے کہا "جی نہیں' آپ کے ہوتے...."

سردار نے کہا "جلدی کرو' باقی کپڑے مجھے ادھر لے جانے ہیں' تمہاری بیویوں کے لئے۔"

میں نے کہا "اچھا تم جاؤ' پانچ دس منٹ تو لگیں گے۔"

"کہیں ایسا نہ ہو کہ پولیس آجائے۔"

میں نے کہا "پولیس.... پولیس کہاں ہے' اور یہاں کیوں آئے گی؟"

"پولیس ہر جگہ ہے' ہر جگہ پہنچ جاتی ہے" بڈھے نے باہر جاتے ہوئے کہا "خطرہ تمہارے لئے ہے۔"

میں نے اور غالب نے کپڑوں کے ڈھیر میں سے دو ایک سے پاپوش ملتے جلتے کپڑے نکالنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ یہ سب مانگے تانگے کے کپڑے تھے۔ جہاں سے جو ملا تھا قبول کرکے وارڈ روب میں شامل کر لیا گیا تھا۔ موسم' فیشن' موقع' سائز وغیرہ کی مناسبت قطعی غیر ضروری تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے مردانہ اور زنانہ ملبوسات کی تخصیص نہیں تھی۔

غالب نے کہا "یہ ضروری ہے کہ ان میں ہم انہی جیسے نظر آئیں۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا "یہ بھی کچھ علاج کرنے کا ایک اچھا طریقہ ہے۔"

[illegible] منٹ بعد سردار وہ گٹھری لپیٹ کے لے گیا۔ اس وقت تک میں اپنے لئے ایک چست چوڑی اور لمبی فوجی نیکر جس پر دھاریاں [illegible] گلے والی ٹی شرٹ اور نارنگی رنگ کا ایک اسکارف منتخب کر چکا تھا جسے میں نے گردن میں لپیٹ لیا۔ بکری کی کھال سے بنی ہوئی لمبے بالوں والی ایک تماشائی ٹوپی سر پر رکھ کے میں نے اعلان کیا کہ میں تیار ہوں۔ غالب مجھے دیکھ کر بہت ہنسا۔ مگر خود اس نے جو کپڑے نکالے تھے وہ زیادہ بے تکے اور مضحکہ خیز تھے۔ اسے لائی سفید دھاریوں والا ریشمی پاجامہ مل گیا تھا۔ اس کے اوپر لمبا سا بغیر گلے کا چغہ تھا اور اس نے ایک لمبا ہرے رنگ کا مفلر اپنے سر پر پگڑی کی طرح باندھ لیا تھا۔

یہ سب کپڑے میلے اور پھٹے پرانے تھے۔ ان میں نہ جانے کس کس کا میل پسینہ شامل تھا چنانچہ اب ہمارے جسموں سے بھی وہی پرفیوم اٹھ رہی تھی جو سردار اور ولی عہد کو گلے لگاتے ہوئے ہمیں سخت ناگوار گزری تھی۔ سردار پھر آیا تو اس نے ہمارے لباس پر اطمینان کا اظہار کیا مگر اس کا خیال تھا کہ یہ تبدیلی کافی نہیں۔ وہ ہمارے صاف ستھرے چہروں کو اور بالوں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے رقم کو اپنی نیکر کے نیچے محفوظ کر لیا تھا اور ریوالور اسی نیکر کی جیب میں تھا۔

باہر اب سامان گدھوں پر لادا جا رہا تھا اور بیشتر خیمے بھی اکھاڑے جا چکے تھے۔ سردار کو انہیں ہدایات دینے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ وہ بستی بساتے اور اجاڑتے رہتے تھے۔ ہر شخص جانتا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہمارے سر کے اوپر سے بھی خیمہ غائب ہو گیا اور ہم کھلے آسمان کے نیچے کھڑے رہ گئے۔ پھر ایک بوڑھی عورت آئی اور اس نے ہمیں بیٹھنے کا حکم دیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بوتل تھی اور دو زنگ خوردہ ڈبے تھے۔ بوتل میں سرسوں کا تیل تھا جو اس نے میرے چہرے' گردن اور ہاتھوں کے علاوہ تقریباً سارے جسم پر چپڑ دیا۔ اس نے رنگ والے ڈبوں میں سے بھی تیل میں کچھ شامل کیا تھا۔ جب یہی عمل غالب کے ساتھ ہوا تو میں نے اس کی جلد کی رنگت کو بدلتے دیکھا۔ ہمارا صاف گندمی رنگ منتقل ہو گیا تھا اور اب ہم اس قبیلے میں شیر و شکر ہو گئے تھے۔

جب آخری خیمہ اکھاڑا گیا تو اس میں سے تین عورتیں برآمد ہوئیں جن کی صورت کے نقوش میں رابعہ اور گل کی مشابہت غور کرنے پر محسوس ہوتی تھی۔ [illegible] اصل رنگ و روپ [illegible] [illegible] قالب میں ڈھل [illegible] میں اور غالب [illegible] نہیں تھے تب یہ حالات [illegible] خود اپنی حالت [illegible] مذاق اڑانے [illegible]

گل کی حالت [illegible]

میں نے کہا "[illegible]

[illegible] شہر [illegible] جائے گی۔"

وہ [illegible] میرا خیال تھا کہ [illegible]

غالب نے کہا "ایسے فضول خیال [illegible] تمہیں [illegible] حماقت بھی [illegible] جائے گا۔"

گل نے کہا "کیا یہ سب لوگ کسی سرکس میں کام کرتے ہیں؟"

"یہ سب لوگ ہی نہیں' ہم سب بھی ایک سرکس میں کام کر سکتے ہیں" غالب نے کہا۔

"ویسے دنیا ایک سرکس ہے جہاں سب اپنے اپنے کرتب دکھا رہے ہیں" میں نے کہا "کیا تم چل سکتی ہو؟"

گل نے اقرار میں سرہلایا "تھوڑی سی کمزوری محسوس ضرور ہوتی ہے۔"

رابعہ نے فوراً پیالہ آگے کیا "لو یہ باقی دوا بھی پی لو۔"

"یعنی ٹانک فوڈ کھالو" غالب نے کہا۔

"یہ واقعی حیرت انگیز چیز ہے' ملٹی پرپز۔ وہی زخم پر لگا دی' اسے پلا کے کھلا دی۔ اسی کو بطور خوراک استعمال کرلیا" میں نے کہا "میں سردار سے اس کا فارمولا پوچھوں گا۔"

"بعد میں ہم اس فارمولے کو پیٹنٹ کرا کے مارکیٹ کریں گے اور دنیا میں تہلکہ مچا دیں گے۔ نام ہوگا غالب کا جادوئی مرہم زخم پر لگائیے اور کھائیے اور لگائیے۔"

"کیا پتا سر میں ملنے سے بال اگ آتے ہوں۔ یہ تجربہ بھی کر کے دیکھیں گے" میں نے کہا۔

"اور اگر یہ ایک بیوٹی لوشن بھی ثابت ہوا تو واہ واہ۔ میرا خیال ہے تم تجربہ کر سکتی ہو" غالب نے تازو سے کہا "داغ دھبے دور کرتا ہے۔"

"پہلے تم کرنا' جب سر کے بال گر جائیں" تازو نے کہا۔

ولی عہد دوڑا دوڑا آیا "اپنے سر میں مٹی ڈال لو۔"

میں نے کہا "کیا...."

اس نے کہا "ہاں' یہ ضروری ہے' جیسے ہمارے بال" اس نے اپنا سر جھکایا پھر خفیف ہو کے دوسرے سروں کی طرف اشارہ کرنے لگا "سردار نے کہا ہے۔"

"اس سے پوچھنا کہ مٹی کے کتنے پیسے ہوں گے" میں نے کہا۔

ولی عہد جاتے جاتے رک گیا "تم نے اسے کتنے پیسے دئے تھے؟"

میں نے سر میں خاک ڈالتے ہوئے کہا "تمہارے باپ نے تمہیں یہ بات نہیں بتائی تو ہم کیوں بتائیں۔"

وہ دکھی نظر آنے لگا "اس نے سب میں برابر تقسیم کیا۔ مجھے بھی اتنا ہی ملا جتنا دوسروں کو' آخر میں اس کا بڑا بیٹا ہوں۔ میرا حصہ زیادہ ہونا چاہئے۔"

میں نے حیران ہو کے کہا "سارا پیسہ بانٹ دیا اس نے؟"

غالب نے کہا "تمہیں مساوات کے اصول سے جو اختلاف ہے' ہمیں اس سے اختلاف ہے۔"

"تمہیں کیا ملا ہے مسٹر ولی عہد.... اور کیا ملنا چاہئے۔"

"اس سے زیادہ تو میں نے کل خود وصول کرایا تھا" وہ بولا۔

"کس سے؟"

"ایک آدمی سے۔ وہ بھی تمہاری طرح مدد مانگتا تھا' تم جیسا ہی تھا۔"

میں نے کہا "ہم جیسا اور کون آگیا یہاں' نام کیا تھا اس کا؟"

"نام" وہ سوچتے ہوئے بولا "کچھ بتایا تھا اس نے' میں بھول گیا۔"

"پھر تم نے کیا مدد کی اس کی؟" غالب نے کہا۔

"میں نے ایسے ہی کپڑے نکال دئے اسے' اور ایک گدھا بھی' وہ راتوں رات بھاگ گیا۔"

"راتوں رات' یہ کب کی بات ہے؟"

"کل رات یا آج صبح' میں نے وقت نہیں دیکھا تھا۔"

اس سے پہلے کہ وہ اور کچھ بتاتا اسے سردار نے طلب کرلیا اور وہ بھاگ گیا۔

"کیا یہ محسن کی بات کر رہا تھا؟" رابعہ نے کہا۔

میں نے نفی میں سرہلایا "محسن کیسے ہو سکتا ہے۔"

"ہو بھی سکتا ہے" گل نے کہا۔

"دل کو تسلی دینے سے بہتر ہے [illegible] فرض کرلو...."

"لیکن یہ ناممکن کیوں ہے؟" رابعہ نے کہا۔

"اس لئے کہ محسن ایک قید سے نکل کے دوسری قید میں تھا۔ پہلے وہ قانون کا قیدی تھا۔ پھر اسے شکاری لے گئے۔ وہ اتنا اناڑی نہیں تھے کہ محسن انہیں دھوکا دے کر فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتا۔"

"ناممکن کچھ نہیں ہوتا" رابعہ نے اصرار کیا۔

"فرض کرلیں وہ محسن ہی ہو.... پھر؟" گل نے کہا۔

"پھر میں کیا بتاؤں' اسی سے پوچھنا" میں نے چڑ کے کہا۔

ان کی صورتوں پر شکستِ آرزو کی مایوسی پھیل گئی۔ مجھے اپنی بے رخی پر افسوس ہونے لگا۔ کیا حرج تھا انہیں چند دیر خواہشوں کے طلسم سے بہلنے کا موقع دینے میں۔ غمین اور سفاک حقائق کا سامنا کرتے کرتے بالآخر آدمی خوش آئند امیدوں کا سہارا مانگتا ہے' جیسے بچہ تھک جائے تو سونا چاہتا ہے۔ نیند نہ آئے تو روتا ہے' ماں اسے لوری دیتی ہے۔ بڑا آدمی سکون آور گولی کھا لیتا ہے۔ اگر ان کے لئے اس خیال میں سکون تھا کہ محسن فرار ہو کے یہاں آیا تھا تو اس خیال کو چھیننے کی کیا ضرورت ہے۔ پھر میں نے سوچا' کیا خیال کبھی حقیقت نہیں بنتا۔

تیاری کا آخری مرحلہ جاری تھا کہ بھگدڑ سی مچ گئی۔ اس وقت تک بیل گاڑیاں بھی تیار ہو گئی تھیں۔

سردار بڑی افراتفری میں نمودار ہوا "چلو' اپنی بیوی کو گاڑی میں ڈالو' جلدی کرو۔"

غالب نے گل کو سہارا دے کر اٹھایا "تم اتنے بوکھلائے ہوئے کیوں ہو؟"

اس نے کہا "پولیس آرہی ہے' چلو تم لوگ بھی۔"

میں نے ادھر اُدھر دیکھا مگر مجھے پولیس کا دور دور تک سراغ نہ ملا۔

"آخر کہاں ہے پولیس؟" میں نے کہا۔

"گاؤں میں۔ وہ ہمارے ڈیرے پر چھاپا مارنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اپنی بیویوں سے کہو ہماری بیویوں کے ساتھ جائیں۔ بولنے کی ضرورت نہیں' کوئی کچھ بھی پوچھے۔ ہماری عورتیں جواب نہیں دیتی ہیں۔ صرف میں بات کرتا ہوں۔ مرد بھی نہیں بولتے"

سردار نے مجھے کم سے کم الفاظ میں قبیلے کے پروٹوکول سے آگاہ کیا۔

یہ صورتِ حال تشویش ناک تھی۔ گاؤں تک پولیس کے پہنچ جانے کا مطلب یہ تھا کہ ہماری تلاش میں ہر جگہ چھاپے مارے جارہے ہیں‘ اس سے بھی زیادہ پریشان کن بات یہ تھی کہ موٹا حوالدار اور اس کے ماتحت اس موقع سے فائدہ اٹھاسکتے تھے۔ ہم صحیح وقت پر گاؤں سے فرار نہ ہوتے تو وہیں دھر لئے جاتے۔ سائن چھاپا مارنے والوں کو کیسے روک سکتا تھا کہ ہمیں گرفتار نہ کریں۔ اگر انہیں معلوم ہوا کہ ڈاکو چمن لال کے ساتھی کچھ دیر پہلے اسی گاؤں میں موجود تھے تو گاؤں کی تلاشی لینے کے بعد وہ خانہ بدوشوں کے ڈیرے میں ہماری موجودگی کے امکان کو نظر انداز نہیں کرسکتے۔

پہلے گل کو ایک بوڑھی عورت کے ساتھ بیل گاڑی میں لٹادیا گیا۔ پھر بوڑھی عورت کو دوسری گاڑی میں شفٹ کردیا گیا۔ گل کی دیکھ بھال رابعہ کے سپرد ہوئی۔ بوڑھی عورت کے پاس نازو کو بٹھایا گیا۔ دونوں بیل گاڑیاں آگے پیچھے روانہ ہوئیں تو اس میں چار عورتیں اور دو بچے بھی ٹھونس دئے گئے۔ باقی عورتیں پیچھے رہیں۔ اگلی بیل گاڑی کو خود سردار نے ڈرائیو کیا‘ دوسری گاڑی کو ولی عہد نے۔ باقی مرد گدھوں کے ساتھ دونوں جانب ایک قطار بنا کے چلنے لگے۔

میرے ہاتھ میں ایک شریف النفس گدھے کی لگام تھی اور میرے ساتھ چلنے والا ایک گنجا تھا۔ ہم گدھوں کے جلوس کی قیادت کررہے تھے اور دو بیل گاڑیوں کے اور خواتین کے بالکل پیچھے تھے۔ غالب بالکل آخر میں تھا اور اس کے ساتھ دوسرا گنجا تھا۔ معلوم نہیں کس مصلحت کے تحت ہم دونوں کا ہم سفر ان ٹارزن ٹائپ گنجوں کو بنایا گیا تھا۔ میں نے گنجے سے دوستانہ گفتگو کرنے کی کوشش سے پہلے کئی بار مسکرا کے اس کی طرف دیکھا لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا اور نہایت حوصلہ شکن انداز میں غراتا رہا۔ مجھے اس کا بے سبب پُرعناد رویّہ ایک چیلنج سا محسوس ہوا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ مجھے برداشت کرنے پر مجبور ہے لیکن موقع ملتے ہی یہ سرد جنگ ایک دم جنگِ عظیم میں ڈھل جائے گی۔ گنجے ٹارزن کے غرور آمیز پُرحقارت رویّے سے یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ اسے اپنی طاقت سے میرا حلیہ بگاڑ دینے کا یقین ہے۔ میں نے اس وقت کا تصور کیا جب اس کے یقین کی مٹی پلید ہوگی۔

اسی وقت پولیس نے دھاوا بول دیا۔ وہ گھوڑوں پر سوار تھے۔ ان میں ایک سب انسپکٹر تھا‘ تین گھوڑوں پر مسلح پولیس والے تھے۔ ان کے کندھوں سے پرانی طرز کی بھاری بھرکم رائفلیں لٹک رہی تھیں۔ آخری دو گھوڑوں پر دو دو افراد تھے۔ وہ اپنے گھوڑے دوڑاتے ہوئے دونوں طرف آئے۔ سب انسپکٹر نے چلّا کے ہمیں رک جانے کا حکم دیا۔ ابھی تک میں نے سر اٹھا کے بھی نہیں دیکھا تھا۔ جب بیل گاڑیاں رک گئیں تو گدھے بھی رک گئے۔ سب انسپکٹر نے گھوڑے پر گارڈ آف آنر کا معائنہ کرنے کے انداز میں سب کی صورتوں پر ایک نظر ڈالی۔

”سب کو ایک لائن میں کھڑا کردو“ سب انسپکٹر نے اترتے ہوئے کہا۔ اس کے ساتھ آنے والے سب لوگ پہلے ہی اتر گئے تھے۔ سردار نے بیل گاڑی کے کاک پٹ سے چھلانگ مار کے اپنی جناتی زبان میں کوئی حکم جاری کیا۔ اس کے ساتھ ہی سارے گدھے رائٹ ٹرن ہوگئے اور ان کے ساتھ چلنے والے ایک قطار میں آگئے۔

”عورتوں کو باہر نکالو“ سب انسپکٹر نے ریوالور نکال کے کہا۔

سردار نے اس حکم کو اپنی زبان میں دہرایا۔ گل اور اس بوڑھی عورت کے سوا سب عورتیں ہمارے پیچھے قطار میں کھڑی ہوگئیں۔ مجھے ایک عجیب سی اعصاب شکن خاموشی کا احساس ہوا۔ میرے پیٹ میں مروڑ سا اٹھنے لگا۔ کیا ہم پہچان لئے جائیں گے؟ یہ سوال پہلے صرف ایک خوف زدہ کرنے والا خیال تھا۔

پھر میں نے پولیس کی ساری نفری کو دیکھا تو خوف ایک حقیقت بن کے میرے دل میں اپنے پُرآزار پنجے گاڑنے لگا۔ ان میں وہ دونوں سپاہی بھی شامل تھے جو حوالدار کے ساتھی تھے۔ باقی سب اجنبی چہرے تھے۔ حوالدار کے ماتحت ہمیں شناخت کرسکتے تھے مگر کیا وہ ایسا کریں گے؟ ہم نے انہیں رعایت دی تھی۔ لیکن یہ رعایت تو ایسی ہی تھی جیسے کسی کو اختیار دے دیا جائے کہ وہ مرنے کے لئے کم تکلیف دہ طریقہ پسند کرے۔ قید میں تو وہ بھی رہے تھے‘ باندھا انہیں بھی گیا تھا۔

امید کا دوسرا پہلو اس احساس میں تھا کہ شاید یہ نوجوان ہمیں شناخت کرلینے کے باوجود صرف ہماری دہشت کی وجہ سے خاموش رہیں۔ ہم نے انہیں بتادیا تھا کہ... لیکن ہمارے گرفتار ہوجانے کی صورت میں ان کے لئے ڈر کی کوئی بات نہ رہتی۔

سب انسپکٹر ایک ایک کی صورت غور سے دیکھتا آرہا تھا۔ گاؤں سے آنے والے دونوں سپاہی اس کی مدد کررہے تھے۔

”کیا نام ہے تیرا؟“ اس نے قطار کے دوسرے شخص سے پوچھا۔

سردار نے جو تھانے دار کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا کہا۔ ”پرشوتم۔“

تھانے دار نے ایک دم پلٹ کے اس کے جھانپڑ مارا ”تو اس کا وکیل ہے‘ کیا یہ خود گونگے ہیں‘ میں جانتا ہوں گونگے کو بولنا سکھانا۔“

سردار پر جھانپڑ کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ اس قسم کے سلوک کا عادی معلوم ہوتا تھا ”میری اجازت کے بغیر کوئی نہیں بولے“

تھانے دار نے اس کے دوسرا تھپڑ مارا ”ان کا تو باپ بھی بولے گا۔“

سردار نے اپنی زبان میں کوئی حکم صادر کیا۔ اس کے تیسرے شخص نے اپنا نام خود بتایا۔ اس نے اپنے باپ کا نام بھی بتایا۔

”کیا کرتا ہے تو؟“

”محنت مزدوری‘ جو کام مل جائے۔“

تھانے دار نے اس کے منہ پر ہاتھ مارا ”ایسے کپڑے پہنتے ہیں محنت مزدوری کرنے والے۔“

”ہم تو جو مل جاتا ہے پہن لیتے ہیں جناب۔“

اس کے بعد غالب تھا۔ میرا دل ایسے دھڑک رہا تھا کہ میں دوسروں کی حالت کا بھی اندازہ کرسکتا تھا۔ یہ مرحلہ بہت کٹھن تھا۔ سب ایک لمحے ایک لفظ اور ایک اشارے پر منحصر تھا۔ اگر شناخت کرنے والے صرف سر ہلا دیتے اور کہتے ”ہاں“ تو دوسرا مرحلہ فیصلہ کن جدوجہد کا ہوتا۔ میرا ہاتھ اپنے ریوالور تک پہنچنے کے لئے تیار تھا۔

میرا خیال ہے کہ صرف میں نے ہی نہیں‘ غالب اور نازو نے بھی ذہنی طور پر اس کی تیاری کرلی ہوگی کہ شناخت کا اشارہ دیکھتے ہی وہ ریوالور نکال لیں گے اور اگر ضروری ہوا تو گرفتار ہونے سے پہلے تینوں ریوالوروں کی آخری گولی بھی کام آئے گی۔ پولیس کی اس نفری کو ہینڈز اپ کرانا آسان نہیں تھا لیکن ان میں سے ایک بھی مارا جاتا تو باقی ہتھیار ڈال دیتے۔ پہلے میرا نشانہ وہ شخص ہوتا جو ہمیں شناخت کرتا۔ اس کے بعد شاید سب انسپکٹر کیونکہ ریوالور صرف اسی کے پاس تھا‘ وہی ہمارے مقابلے پر آنے کی ہمت کرسکتا تھا۔ باقی سب رائفل سنبھالتے رہ جاتے۔ وہ محض خانہ پُری والے لوگ تھے۔

سب انسپکٹر غالب کے سامنے ٹھہر گیا۔ غالب کا چہرہ سپاٹ رہا۔ سب انسپکٹر نے اپنے ساتھ چلنے والے سپاہی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اس شناختی پریڈ میں استغاثہ کے دو ہی گواہ اہم تھے۔ میری نظریں سپاہی پر جمی رہیں۔ وہ بڑے غور سے غالب کو دیکھ رہا تھا۔ ایک سیکنڈ‘ دوسرا سیکنڈ... ہر سیکنڈ لمبا ہوتے لگا۔ میرے اعصاب پر دباؤ بڑھتا گیا۔ سپاہی بے حس و حرکت کھڑا ہوا تھا اور غالب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھ رہا تھا۔ میرے لئے شک کی گنجائش نہ رہی‘ اس نے غالب کو پہچان لیا تھا۔

”کیا ہوگیا! منہ سے کچھ بولو“ سب انسپکٹر نے کہا۔

میرا ہاتھ ریوالور کی طرف بڑھا مگر سپاہی نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“

”جے چند ولد وجے چند“ غالب نے کہا۔

سب انسپکٹر آگے بڑھ گیا۔ میں نے اپنے ماتھے پر سے پسینہ صاف کیا اور اس سپاہی کی طرف دیکھا۔ میری اور اس کی نظریں ملیں اور مجھے اس کے لبوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ محسوس ہوئی۔ شاید یہ میرا وہم تھا... یا حقیقت تھی۔ کسی وجہ سے سپاہی نے شناخت کا اقرار نہیں کیا تھا۔ یہ وجہ ڈاکوؤں کی دہشت بھی ہوسکتی تھی۔ اس نے سوچا ہوگا کہ دو پکڑے بھی گئے تو کیا ہوگا۔ ان کے دوسرے ساتھی آجائیں گے۔ معلوم نہیں کتنا بڑا گروہ ہے۔ انہی کے ساتھی تھے وہ بھی جو سائن صاحب کے گھر والوں کو مار گئے تھے۔

سب انسپکٹر عادت کے مطابق گالی گلوچ اور مار پیٹ کرتا میری طرف بڑھتا آرہا تھا۔ میرے سامنے آکے اس نے پھر شناخت کرنے والے کی طرف دیکھا۔ سپاہی نے مجھے غور سے دیکھا‘ اپنے ہاتھوں سے میری ٹھوڑی اوپر اٹھائی‘ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ میرا پیغام بہت واضح تھا۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ سب انسپکٹر کو میں نے اپنا نام مانک لال ولد گردھاری لال بتادیا۔ ہر شخص نے اپنا صحیح نام بتایا تھا یا نہیں۔ یہ میں نہیں جانتا تھا۔ غالب نے بلا جھجک اور پورے اعتماد کے ساتھ اپنا نام بتایا تھا۔ تذبذب سے شک پیدا ہوتا‘ شاید میری طرح اس نے بھی پہلے سے نام اور ولدیت کا فیصلہ کرلیا تھا۔

سب انسپکٹر مردوں کی شناختی پریڈ کے نتائج سے کچھ مایوس ہوگیا تھا۔ مفرور ملزم اگر مردوں میں نہیں تھے تو عورتوں میں کیسے ہوسکتے تھے۔ ہم نے پچاس فیصد نفسیاتی فتح حاصل کرلی تھی لیکن یہ مکمل فتح نہیں تھی۔

سب انسپکٹر ایک ایک عورت کا بغور جائزہ لیتا رہا۔ اس کے ساتھ چلنے والا سپاہی انکار میں سر ہلاتا گیا۔ رابعہ کے بعد نازو کی باری آئی‘ پھر اس نے بیل گاڑی میں دیکھا۔

”یہ کون عورت ہے‘ اسے نکالو باہر۔“

سردار نے کہا ”اس کو اٹھانے سے خون کی الٹیاں آتی ہیں۔“

”کیوں‘ کیا ہوا اسے؟“

”ٹی بی ہے جناب“ سردار نے بڑی معقولیت سے کہا۔

”اور یہ بڑھیا؟“ اس نے بے دلی سے کہا۔ اب اس کی دلچسپی عملاً ختم ہوگئی تھی۔ اس نے ایک مختصر خطاب کیا۔

”دیکھو بڈھے‘ اس علاقے میں بڑے خطرناک مجرم پھر رہے ہیں۔“

سردار نے کہا ”ہمارا کیا کام...“

بیچ میں بولنے پر اسے ایک اور جھانپڑ کھانا پڑا۔

”اگر تم نے انہیں دیکھا ہے تو بتادو۔ کسی نے بھی دیکھا ہو۔ جو ان کے بارے میں بتائے گا اسے انعام ملے گا‘ وہ اشتہاری مجرم ہیں۔“

”انعام کتنا ہے سرکار؟“ سردار نے کہا۔

”پچاس ہزار روپے“ سب انسپکٹر نے کہا ”ان کی تصویریں دیکھ لو۔“

میں نے سردار کی آنکھوں میں پیدا ہونے والی لالچ کی چمک دیکھی اور آہستہ سے اپنا ہاتھ جیب میں ڈالا۔ عین اس وقت

جب وہ میری طرف دیکھ رہا تھا میں نے اسے اپنی جیب میں سے ریوالور کی ایک جھلک دکھائی۔ ریوالور واپس نیکر کی جیب میں غائب ہوگیا۔ ہماری تصویریں قطار میں کھڑے ہوئے سب لوگوں کے ہاتھوں سے گزر کر میری طرف آرہی تھیں۔ یہ تصویریں کب اخبارات میں شائع ہوئی تھیں اور کیسے حاصل کی گئی تھیں‘ یہ ہم میں سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔

یہ ہندی کا اخبار تھا جس میں اوپر تین تصویریں ایک ساتھ تھیں۔ [illegible] کی تصویریں تھیں۔ میری‘ غالب کی اور محسن کی‘ [illegible] والی تصویریں تھیں اور میں [illegible] تھا کہ یہاں ہماری تصویریں صرف چوہدری [illegible] کی فراہم کی ہوئی ہی۔ اس کے پاس صرف تصویریں ہی نہیں ہماری آوازوں کے ٹیپ تک تھے۔ تصویروں کے اوپر ہندی کی موٹی عبارت کا مفہوم خود سب انسپکٹر نے واضح کردیا تھا۔ میں نے اخبار آگے بڑھا دیا۔ میرے داہنی ہاتھ پر ولی عہد بہادر کھڑے ہوئے تھے۔

دوسرے اخبار میں رابعہ‘ نازو اور گل کی تصویریں تھیں۔ گل کی تصویر نے مجھے حیران کردیا۔ میں شملا کی تصویر دیکھ کے شاید حیران نہ ہوتا کیونکہ گل ہمارے ساتھ بہت دیر سے شامل ہوئی تھی۔

اچانک ولی عہد نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ وہ بڑے غور سے تصویریں دیکھ رہا تھا "میں نے ٹھیک کہا تھا نا۔"

"چل بے اخبار دے..." سب انسپکٹر نے ایک گالی دے کر کہا "پڑھنا آتا ہے جو ایسے دیکھ رہا ہے۔"

ایک سپاہی نے اخبار واپس چھین لیا۔ سب انسپکٹر تفتیش ختم کرنے کے بعد واپس جانے کے موڈ میں تھا۔ میں شناختی پریڈ ختم ہو جانے کے بعد بہت مطمئن ہوگیا تھا اور فوری طور پر میری توجہ ولی عہد کی طرف ہوگئی تھی۔ اس کی بات نے میرے ذہن میں ہلچل مچادی تھی۔ کیا واقعی خیال ایک حقیقت ثابت ہو چکا تھا۔ ولی عہد نے جو کچھ کہا تھا محسن کی تصویر دیکھ کر ہی کہا تھا۔ میں اور غالب تو اس کے سامنے تھے۔

میں اب چاہتا تھا کہ سب انسپکٹر جلد از جلد یہاں سے چلا جائے تاکہ میں اس سے وضاحت کے ساتھ پوچھوں... کہ اس نے کیا ٹھیک کہا تھا۔ لیکن اچانک میری نظر نے دوسرے سپاہی کو دیکھا جو موٹے حوالدار کا ماتحت تھا اور اسی سب انسپکٹر کے ساتھ آیا تھا۔ اس نے براہِ راست شناخت کی کارروائی میں حصہ نہیں لیا تھا لیکن اس میں شک کی کوئی بات نہیں تھی کہ وہ بھی ہمیں پہچانتا تھا۔ وہ مجھے گھور رہا تھا اور اس کی صورت سے عدم اطمینان اور اضطراب کا اظہار ہوتا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے ساتھی سے ناخوش ہے جس نے بزدلی کا مظاہرہ کیا تھا اور جانتے بوجھتے ہمیں نہ پہچان کے اپنے فرض سے روگردانی کی تھی

چند سیکنڈ کے لئے ان کے درمیان کوئی بات ہوئی [illegible] اختلاف کی آئینہ دار تھی۔ دوسرا شخص برہم نظر آتا [illegible] نے ایک نظر مجھے اور غالب کو دیکھا اور پھر شاید اس نے [illegible] کرلیا کہ اسے کیا کرنا چاہئے۔ اس کے ہونٹوں پر ایک [illegible] زہریلی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ جو دھمکی دیتی تھی اور [illegible] لبی کا تمسخرانہ تاثر محسوس ہوتی تھی۔ وہ [illegible] کی طرف بڑھا جو اب گھوڑے پر سوار ہو چکا تھا۔

سب انسپکٹر کے ساتھ ہی اس کے [illegible] بھی گھوڑوں پر سوار ہو چکے تھے اور [illegible] قانونی کارروائی بطریقِ احسن پوری کی۔ [illegible] لہٰذا اسے پھر بچایا۔ رسیدہ ہو جانے [illegible] بدوش یقیناً مطمئن ہوں گے کہ انہیں [illegible] ... دو چار جھاپڑ پڑے تو اس کی کوئی بات نہیں۔ [illegible] دنیا میں اتنا تو ہوتا ہی ہے۔ اگر پولیس ایسا نہ [illegible] مظلوم اپنی اوقات بھول جائیں اور ان پر پولیس کے اختیار واقتدار کی ہیبت قائم نہ رہے۔

اطمینان کی اس فضا کو ایک سپاہی کے عدم اطمینان سے خطرہ لاحق ہوگیا تھا جس کی نظر نے میرے اور غالب کے بہروپ سے دھوکا نہیں کھایا تھا۔ وہ دھوکا کھاتا بھی کیسے؟ ہم نے کئی دن اس کو قید کی اذیت میں رکھا تھا اور اس نے ہمیں بہت قریب سے دیکھا تھا اور ہماری آواز بھی سنی تھی۔

میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں غالب سے سوال کیا کہ اب کیا کرنا چاہئے اور غالب کی نظر نے جواب دیا کہ ابھی کچھ مت کرو‘ صبر کے ساتھ انتظار کرو اور دیکھو۔ سپاہی اب اپنے افسر کو کچھ سمجھا رہا تھا۔

خانہ بدوشوں کا قبیلہ اس قانونی کارروائی کے ختم ہوجانے کے بعد خاموش اور ساکت تھا۔ میں رابعہ سے یا نازو سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ دیگر خواتین کے ساتھ الگ قطار میں کھڑی ہوئی تھیں۔

میں نے داہنی جانب کھڑے ہوئے ولی عہد بہادر سے کہا۔ "اب انتظار کس بات کا ہے؟ چلو۔"

اس نے سرہلا کے کہا "چلو" اور اپنی زبان میں کوئی اعلان کیا جس کے ساتھ ہی الگ الگ قطاروں میں خاموش اور باادب کھڑے ہوئے مرد عورتیں سب حرکت میں آگئے اور آپس میں مل گئے۔ میں نے فوراً موقع سے فائدہ اٹھایا۔ نازو میرے قریب تھی لیکن میری طرف دیکھ نہیں رہی تھی۔ بڑی ہوشیاری کے ساتھ غالب میرے پیچھے پہنچ گیا۔ رابعہ نے شاید یہ سمجھتے ہوئے کہ ہم سب کو یکجا نظر نہیں آنا چاہئے‘ اس بیل گاڑی کی طرف رخ کیا جس میں گل اکیلی لیٹی ہوئی تھی۔

میں نے نازو کی طرف دیکھے بغیر کہا "یہ ہو سکتا ہے کہ ہمیں پولیس اپنے ساتھ لے جائے۔"

نازو نے مجھے مخاطب کئے بغیر جواب دیا "دوسرے سپاہی نے کام خراب کردیا ہے۔ وہ سب انسپکٹر سے شکایت کر رہا ہے۔"

سب انسپکٹر کے سرہلانے اور خوں آشام نظروں سے ہمیں گھورنے کا انداز یہ ظاہر کرتا تھا کہ شناختی پریڈ کا گھپلا اس کی سمجھ میں آگیا ہے۔

"تم لوگ فکر مت کرنا" میں نے نازو کی طرف دیکھا "قافلے کے ساتھ ہی رہنا۔"

غالب نے پیچھے سے کہا "ہاں‘ شور ہنگامہ اور رونا دھونا مت شروع کردینا۔"

سب انسپکٹر گھوڑے سے اتر آیا "کہاں جا رہے ہو تم سب‘ کس نے اجازت دی ہے تمہیں؟" وہ گرج کے بولا۔

خانہ بدوش اپنی اپنی جگہ پر رک کر سب انسپکٹر کی طرف دیکھنے لگے۔

میں نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا "رابعہ اور گل کو بھی بتا دینا یہ بات۔"

غالب نے کہا "رابعہ سے میں نے کہہ دیا ہے۔"

مجھے اس کی بات پر تعجب ہوا کیونکہ میں نے اسے رابعہ سے بات کرتے نہیں دیکھا تھا۔

"سب لائن اپ ہو جاؤ‘ پہلے کی طرح" سب انسپکٹر نے حکم دیا۔

ایک بار پھر خانہ بدوش مرد ایک طرف صف بستہ ہوگئے اور عورتیں دوسری طرف۔ میں اور غالب اب ساتھ ساتھ تھے۔ سب انسپکٹر سیدھا ہماری طرف آیا اور پلک جھپکائے بغیر ہمیں دیکھتا رہا۔ پھر اس نے [illegible] کو قریب آنے کا اشارہ کیا [illegible] پہلی بار [illegible] پہچاننے سے انکار کردیا تھا۔ [illegible] اندازہ ہو چکا تھا کہ اس کے قریب [illegible] چہرہ چاک ہوگیا ہے۔

"نہیں غور سے پھر دیکھو" سب انسپکٹر نے کہا۔

"کیا... جی سر۔"

"سر کے بچے‘ تم انہیں پہچانتے ہو؟"

سپاہی نے مجرمانہ انداز میں سرہلا کے اثبات میں جواب دیا۔

"تم نے جھوٹ بولا تھا۔ دھوکا دینے کی کوشش کی تھی مجھے۔" سب انسپکٹر نے آگ بگولا ہو کے کہا "کیوں؟"

سپاہی کا رنگ فق ہوگیا تھا۔ اس نے کچھ کہنے کی بے سود کوشش کی۔ اعترافِ جرم کے بعد اس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں رہا تھا۔

"تم لوگ کیوں جھوٹ بولا تھا تم نے‘ کیوں کوشش کی تھی ان کو بچانے کی؟" سب انسپکٹر نے دہاڑ کر کہا "کیا تعلق ہے تمہارا ان ڈاکوؤں سے‘ تم ملے ہوئے ہو ان سے؟"

"نہیں سر... یہ بات نہیں۔"

"شٹ اپ‘ جب تفتیش ہوگی تو ساری بات معلوم ہو جائے گی‘ ابھی تم خود کو معطل سمجھو۔"

"سر‘ میرا قصور معاف کردیں‘ مجھے ڈر تھا کہ میں نے انہیں پہچانا تو یہ میرے دشمن ہو جائیں گے‘ انہوں نے دھمکی دی تھی۔" سپاہی نے گڑگڑا کے کہا۔

"اگر ایسی بات تھی تو تم مجھے بتا سکتے تھے‘ پہلے ہی کہہ سکتے تھے‘ خاموشی سے اشارہ کرسکتے تھے" سب انسپکٹر نے چراغ پا ہو کے کہا "اب کچھ نہیں ہو سکتا‘ تمہارا جرم بہت سنگین ہے۔ تمہاری وجہ سے اتنے خطرناک مجرم بچ کے نکل جاتے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ مجرم کی مدد کرنے والا کون ہوتا ہے؟ تم معطل ہی نہیں زیرِ حراست ہو۔"

"سر جی‘ غلطی ہوگئی‘ معافی دے دیں" سپاہی ہاتھ جوڑنے لگا۔

"دفع ہو جاؤ‘ پیچھے ہٹ کے اپنی پیٹی اتار دو" سب انسپکٹر نے حکم دیا۔

خانہ بدوشوں کے قبیلے کا ہر فرد سہما ہوا نظر آتا تھا لیکن سردار کی حالت سب سے زیادہ خراب تھی۔ سب انسپکٹر نے اس کی گردن پر ایک ہاتھ مارا تو وہ زمین پر [illegible]

[illegible]

"معاف ہو گئی مائی باپ۔"

"حرام کی اولاد‘ پیسہ کتنا لیا تھا ان سے" سب انسپکٹر نے اس کے جسم پر بید [illegible] کپڑے پھاڑ [illegible] بھول چکی۔ ان کا حلیہ بدلا یہ بھی بھول [illegible]

سردار ہر ضرب کے ساتھ چلا رہا تھا اور لوٹ پوٹ ہو رہا تھا "[illegible] ... میں مر گیا۔ تھانے دار جی... اس بار معافی دے دو۔ بھگوان کی سوگند... آہ... ہائے... اف... میں مر جاؤں گا۔"

"پیسہ کتنا لیا تھا لالچی کتے؟" سب انسپکٹر کی بید ہوا میں سائیں سائیں کرتی رہی اور بڈھے سردار کے جسم پر لکیریں ڈالتی رہی۔ پورا قبیلہ دم سادھے اپنے سردار پر ہونے والے تشدد کا

نظارہ کرتا رہا' کسی نے اس کی حمایت میں ایک لفظ بولنے کی جرأت نہیں کی۔ کسی نے اس کے لئے رحم کی درخواست نہیں کی۔

"میں' سارا پیسہ... ابھی دیتا ہوں... ابھی لاتا ہوں" سردار نے تڑپتے ہوئے چیخنا چلّانا جاری رکھا۔

"اٹھ' فوراً... ورنہ میں کسی کو نہیں بخشوں گا" سب انسپکٹر نے اسے ٹھوکریں مار کے کہا۔

میں اور غالب اس صورتِ حال میں آگے بڑھ کر کچھ کرتے تو اپنے جرم کی سنگینی میں اضافہ کرتے۔ ہماری گرفتاری اب یقینی تھی۔ ہم ریوالور نکال کے فائر کرتے تو اپنے جرائم کی فہرست میں دو چار قتل بڑھا لیتے لیکن پھر بھی ہم فرار نہیں ہو سکتے تھے۔ صورتِ حالات ایک دم بدل گئی تھی۔ جن پر تکیہ تھا وہی پتّے ہوا دینے لگے۔ خانہ بدوش اب ہماری مدد سے ہاتھ کھینچ چکے تھے۔ انہوں نے پناہ دینے کی جو قیمت وصول کی تھی وہ پولیس کا نذرانہ بن گئی تھی۔ قبیلے کے سب لوگ ہمارے دشمن ہو گئے تھے اور ان کے درمیان ہماری حیثیت زیرِ حراست مجرم جیسی ہو چکی تھی۔

وہ شخص بڑے فاتحانہ انداز میں مسکرا رہا تھا جس نے ہماری گرفتاری کو یقینی بنانے میں مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ اس نے خود کو جرأت مند اور فرض شناس ثابت کر دیا تھا۔ اس کی مسکراہٹ میں فخر کے جذبات تھے اور ہمارے لئے نفرت اور حقارت تھی۔ وہ خوش تھا کہ اس نے اپنی اور دوسرے سب ساتھیوں کی ذلت کا بدلہ لے لیا۔

سب انسپکٹر کی نظر کا اشارہ پا کے وہ بڑی شان سے سینہ تانے آگے بڑھا اور عین میرے مقابل آ گیا۔

"تمہارا کہنا ہے کہ یہ دونوں ڈاکو ہیں۔"

"میری نظر دھوکا نہیں کھا سکتی سر' انہوں نے جو کچھ تھانے میں کیا تھا..."

"وہ سب بعد میں بتانا" سب انسپکٹر نے اس کی بات کاٹ دی "تمہارا بیان بھی ہو گا... اور باقی سب لوگوں کا بھی۔ میں چاہتا ہوں کہ تم انہیں اچھی طرح دیکھ لو۔"

"انہوں نے حلیہ بدلا ہے سر' لیکن ان کا چہرہ وہی ہے۔ اگر یہ غلط ہو تو آپ سو جوتے ماریں مجھے..."

"اچھا ٹھیک ہے' انہیں اپنے ساتھ لے کر چلو" سب انسپکٹر نے ریوالور نکال لیا "خیال رکھنا' یہ فرار نہ ہو جائیں' اگر کوشش کریں تو گولی مار دینا۔"

مجھے اور غالب کو قطار میں سے کھینچ کر نکال لیا گیا۔ اگر میں چاہتا تو ان چاروں کو چاروں شانے چت گرا دیتا جو مجھے اور غالب کو گرفتار کرنے کے لئے آگے بڑھے تھے مگر میں نے مزاحمت سے گریز کیا۔ مجھے امید تھی کہ راستے میں کہیں نہ کہیں مجھے ان کے خلاف اچانک کارروائی شروع کر دینے سے کامیابی کے بہتر مواقع حاصل ہوں گے۔ یہاں خود خانہ بدوش بھی پولیس کا ساتھ دیتے' اتنے لوگوں سے بیک وقت مقابلہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

پولیس پارٹی کے پاس ہتھکڑیاں نہیں تھیں۔ انہوں نے خانہ بدوشوں سے رسیاں لے کر میرے اور غالب کے ہاتھ باندھے اور پھر ہمیں گھوڑوں کے پیچھے ایسے باندھ دیا کہ یا تو گھوڑا ہمیں بھگا کے لے جا سکتا تھا یا ہم گھوڑے کو ساتھ بھگا کر لے جاتے۔ اکیلا کوئی نہیں بھاگ سکتا تھا۔ ہمارے ہاتھوں سے بندھی ہوئی رسیوں کے علاوہ گھوڑے کی لگام بھی سوار کے ہاتھ میں تھی۔ چنانچہ مجموعی صورتِ حال یہ تھی کہ گھوڑا بھاگتا تو ہمیں اس کے پیچھے اتنی ہی رفتار سے دوڑنا پڑتا اور ہم نہ بھاگتے تو سوار نیچے گرتا اور پھر ہم گھوڑے پر سوار ہوتے تو اسے ہمارے ساتھ دوڑ لگانی پڑتی۔ دیکھنے والے سمجھتے کہ ہم اسے گرفتار کر کے لے جا رہے ہیں۔

وہ ناتجربہ کار اور کسی حد تک بے وقوف لوگ تھے۔ انہوں نے ہمارے ہاتھ باندھ دئے تھے اور مطمئن ہو گئے تھے کہ مجرم گرفتار کر لئے۔ وہ سب مسلح تھے اور انہیں اپنی تعداد پر بھی بھروسہ تھا چنانچہ انہوں نے ہماری تلاشی بالکل نہیں لی۔ باقی سب کارروائی تھانے میں ہو گی' یہ فرض کرتے ہوئے انہوں نے گالی گلوچ اور مار پیٹ سے بھی گریز کیا۔ کسی چور یا جیب کترے کے مقابلے میں ڈاکو ایک عام پولیس مین کے لئے وی آئی پی سے کم نہیں ہوتا۔ ڈاکو کا نام ہی دہشت اور ہیبت کی علامت سمجھا جاتا ہے اور اسے ایک بہادر' بے خوف اور جان کی بازی لگانے والے مجرم کی حیثیت سے خوف آمیز احترام حاصل رہتا ہے۔

گرفتاری دینے کے بعد میں نے ایک فلمی ڈاکو کی طرح گرجنا دہاڑنا شروع کیا "میں ایک ایک سے نمٹ لوں گا' مجھے کون جیل میں رکھ سکتا ہے تھانے دار' میرے ساتھی..."

تھانے دار نے میرے منہ پر تھپڑ مارا "تیرے ساتھیوں کو بھی دیکھ لوں گا میں..."

میں نے ایک قہقہہ لگایا "تو دیکھ لے گا! نہیں تھانے دار' تو کیسے دیکھے گا' تیرا تو کریا کرم ہو چکا ہو گا۔ آنکھوں والے دیکھیں گے' تیری بیوہ دیکھے گی' اناتھ بچے دیکھیں گے..."

تھانے دار نے میرے دوسرا تھپڑ مارا "میں نے تجھے خود پھانسی نہ لگایا تو لعنت میری تھانے داری پر' تیری لاش تین دن تک لٹکی رہے گی درخت سے۔ پھر گیدڑ کھا جائیں گے۔"

میں نے غرا کے کہا "زیادہ مت بول تھانے دار' کہیں ایسا نہ ہو کہ سزا تیرے ساتھ بیوی بچوں کو بھی ملے' ابھی تیرے ساتھ میری کوئی دشمنی نہیں۔ تو غلام ہے حکومت کا... اپنا کام کر' ہمارا کام ہم خود کر لیں گے۔"

غالب نے اچانک گالیاں دینا شروع کیا۔ اس کا ہدف وہ پولیس مین تھا جس نے ہمیں شناخت کیا تھا۔ معلوم نہیں اس

سے ایسی کیا بات کہی تھی کہ غالب نے اشتعال کا
ضروری سمجھا۔
تیرے سارے خاندان کو سزا ملے گی اس کی۔ تجھے رونے
نہیں بچے گا۔ ہم نے بتا دیا تھا تجھے۔ اب تیار رہو جا خمیازہ
کے لئے' تیرے خاندان کے بچے بچے کو کاٹ کے نہ پھینک
نہیں منڈوا دیں گے پیشاب سے۔"
اس سپاہی کا رنگ اڑ گیا تھا مگر وہ بے نیازی کے ساتھ
کھڑا رہا۔
بہت بھونک رہے ہیں یہ کتے' انہیں لے کر چلو" تھانے
ایک ایک بید میرے اور غالب کے رسید کیا "ابھی ان کی
کس بھرتے ہیں۔ ذرا تھانے پہنچ جائیں' پھر دیکھیں
میں کتنا دم ہے' چلو تم لوگ۔"
سپاہی گھوڑوں پر ہمارے پیچھے رہے۔ دو ہمیں گھسیٹتے
گھوڑوں پر سوار آگے چلنے لگے۔ ہمیں شناخت کرنے والا
کھڑا ہوا تھا۔
اچانک اس نے کہا "سر' یہ عورت بھی۔"
میں رک گیا لیکن پھر مجھے جھٹکا لگا اور میں آگے قدم بڑھانے
رہ گیا۔ اس سپاہی نے نازو کی طرف اشارہ کیا تھا۔
سب انسپکٹر نے کہا "ہاں' یہ باتیں کر رہی تھی ان دونوں
میں نے دیکھا تھا... اسے بھی پکڑ لو۔"
نازو چلائی "جھوٹ بکتا ہے یہ' میرا کوئی تعلق نہیں ان سے۔"
تھانے دار نے گالیاں بکتے ہوئے نازو کے تھپڑ رسید کیا۔
جا کے بتانا یہ سب' جھوٹ سچ کا پتا چل جائے گا۔"
غالب کے ساتھ ہی میں نے سر گھما کے دیکھا تو پولیس والے
باندھ رہے تھے۔
"عورتوں کو پکڑتے ہو نامردو" میں نے چلّا چلّا کے کہا اور
گھوڑے پر سوار پولیس مین کو نیچے کھینچ لیا۔
وہ گرتے ہی اٹھا اور مجھ پر پل پڑا۔ گھونسے اور لاتیں مارتے
تھانے مجھے ایک سے ایک غلیظ گالی دی لیکن میں نے ضبط
کام لیتے ہوئے مقابلے کی کوشش نہیں کی۔ وہ پھر گھوڑے پر
ہو گیا۔ میرے دونوں ہاتھ بندھے ہوئے تھے لیکن میں ایک
مار کے اسے ہلاک بھی کر سکتا تھا اور اس کی ٹانگیں بھی توڑ
تھا۔ میں اسے بازوؤں کے حلقے میں قید کر کے بے بس بھی
سکتا تھا مگر یہ سارے داؤ میں نے تھانے دار کے لئے محفوظ
اور گھوڑے کے پیچھے چلتا گیا۔ غالب میرے ساتھ تھا۔
پیچھے نازو تھی جسے اسی طرح دست بستہ لایا جا رہا تھا۔
آخر میں خود تھانے دار تھا جو ریوالور ہاتھ میں لئے آ رہا تھا۔
رابعہ اور گل کا گرفتاری سے بچ جانا میرے لئے باعثِ
اطمینان بھی تھا' باعثِ حیرت بھی اور باعثِ تشویش بھی۔
اطمینان کی بات یہ تھی کہ ہم سب گرفتار نہیں ہوئے۔ محسن

اور شہلا پہلے ہی دشمنوں کی قید میں تھے' اب میرے اور غالب کے ساتھ نازو کو بھی پولیس نے پکڑ لیا تھا لیکن رابعہ اور گل بہرحال آزاد تھیں۔ 'مگر کیا ہم ان سے امید رکھ سکتے ہیں کہ وہ ہماری رہائی کے لئے کچھ کریں گی؟' میں نے سوچا 'نہیں۔ یہ خیال دل کو خوش رکھنے کے لئے بھی اچھا نہیں ہو سکتا۔ دو عورتیں ہمیں پولیس کے قبضے سے کیسے چھڑا سکتی ہیں۔ جب کہ ان میں سے ایک بیمار اور زخمی بھی ہو۔ الٹا یہ ہو سکتا ہے کہ اس کوشش کے نتیجے میں وہ خود بھی گرفتار ہو جائیں۔'

رابعہ اور گل کے گرفتاری سے بچ جانے پر مجھے حیرت اس لئے تھی کہ نازو کو شناخت کرنے والا ہی انہیں بھی شناخت کر سکتا تھا۔ شاید نازو کے پکڑے جانے کی وجہ یہ تھی کہ میں نے اور غالب نے اس سے باتیں کرنے کی غلطی کی تھی۔ یہ سب نے ہی دیکھا ہو گا۔ رابعہ سے ہماری کوئی بات نہیں ہوئی تھی چنانچہ وہ کسی کی نظر میں نہیں آئی تھی اور نازو کی گرفتاری سے ذرا دیر پہلے وہ گل کے پاس چلی گئی تھی۔ گل کو کسی نے بھی نہیں دیکھا تھا' ...سوائے انسپکٹر کے مگر وہ اس کو پہچانتا ہی نہیں تھا۔

تشویش کا پہلو اس احساس میں تھا کہ اگر ہم رہائی حاصل کرنے کی کوشش میں ناکام رہے تو رابعہ اور گل کیا کریں گی؟ انہوں نے بڑے حوصلے کا اور صبر و ضبط کا مظاہرہ کیا تھا۔ اگر وہ جذباتی ہو جاتیں تو ہمارے ساتھ ہی گرفتار ہو جاتیں۔ اس سے حاصل کچھ نہ ہوتا۔ اس میں خود غرضی کا کوئی پہلو نہیں تھا۔ دور اندیشی کا تقاضا یہ تھا کہ جو بچ سکتا ہو وہ خود کو ضرور بچائے۔ آزاد رہ کے کوشش تو کی جا سکتی ہے' خواہ اس کا انجام صرف ناکامی ہو' ...اسیری میں تو کوشش ہی ممکن نہیں۔

میں نے پلٹ کے دیکھا تو خانہ بدوشوں کا قبیلہ ابھی تک وہیں موجود تھا۔ میرے دل میں مایوسی کی ایک لہر سی اٹھی۔ کیا اب رابعہ اور گل کو انہی کے ساتھ جانا پڑے گا؟ خانہ بدوش آج یہاں ہیں تو کل وہاں۔ ہم ان کا نیا ٹھکانہ کیسے تلاش کریں گے؟ رابعہ اور گل ان کے ساتھ کب تک رہیں گی اور کیسے رہیں گی؟ نہیں ہماری فکر ہو گی لیکن خانہ بدوشوں میں ... ن ہے جو ان کی مدد کرے اور رابطے کا ذریعہ بن سکے؟

پھر مجھے قبیلے کے بڈھے سردار کا خیال آیا۔ وہ ایک لالچی اور چالاک آدمی تھا۔ اس نے سب انسپکٹر سے کہا ضرور تھا کہ وہ ہم سے وصول ہونے والی سب رقم پولیس کے حوالے کر دے گا لیکن بعد میں اس نے پولیس کو کچھ بھی نہیں دیا تھا۔ سب انسپکٹر کی توجہ ہماری گرفتاری کی طرف ہوئی تو بڈھے نے وہ معاملہ ہی گول کر دیا۔ ...شاید یہ سوچتے ہوئے کہ جب اتنی مار کھا لی تو پھر رقم بچانے کی تھوڑی سی مار اور سہی۔ رقم دینے کا مطلب تو یہ ہوتا کہ چمڑی بھی گئی اور دمڑی بھی۔ وہ اپنی کوشش میں کامیاب رہا' اگر پولیس کو اس کی بات یاد آ جاتی تو وہ کیا کرتا؟

یہ بڑی عجیب بات تھی کہ پولیس اپنا نذرانہ وصول کرنا بھول گئی۔ رقم بھی کم نہ تھی اور پولیس سب کچھ بھول سکتی ہے پیسہ لینا نہیں بھول سکتی۔ قبر میں بھی منکر نکیر کے سوال کا جواب دینے سے پہلے کہیں گے ضرور کہ پہلے کچھ چائے پانی کا خرچہ تو نکالو' پھر دیں گے جواب۔

خیر... میں نے مایوسی کے جذبات کو جھٹک کے سوچا۔ اگر پولیس نے وہ رقم چھوڑ دی ہے تو رابعہ اور گل ان سے وصول کرلیں گی کہ تم وہ معاہدہ پورا کرنے میں ناکام رہے جس کی رو سے سب کو حفاظت اور سلامتی کے ساتھ یہاں سے نکالنا تمہاری ذمے داری تھی۔ خانہ بدوش ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ان دونوں کے پاس ریوالور ہیں۔ ان کے لئے سردار کی کنپٹی پر ریوالور رکھ کے اپنا ہر مطالبہ منوانا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

پولیس پارٹی کا سفر نامعلوم سمت میں جاری تھا۔ مجھے آہستہ آہستہ اپنی غلطی کا احساس پریشان کرنے لگا تھا۔ شاید مقابلہ کرکے نکل جانے کا وقت وہی تھا جب پولیس نے سب کو لائن اپ کر رکھا تھا۔ ہم اچانک ریوالور نکال لیتے تو ان سب کو ہاتھ اٹھانے اور ہتھیار ڈالنے پر مجبور کرسکتے تھے۔ ہم ان کا اسلحہ اور ان کے گھوڑے چھین کر لے جاتے تو وہ بے بس ہو جاتے لیکن گھوڑے پر سواری کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ میرے علاوہ [illegible]

[illegible]

یہ دونوں وہی تھے جو اس پولیس پارٹی کے ساتھ [illegible] [illegible]

[illegible] میں نے [illegible] حوالدار صاحب کو ہم کیا جواب دیں گے؟"

"جواب کس بات کا؟" سب انسپکٹر نے [illegible] کہا۔

"وہ پوچھیں گے کہ مفرور ملزم کہاں ہیں؟"

"مفرور ملزم!" سب انسپکٹر نے طنز سے کہا "کیا تمہارے حوالدار صاحب نے انہیں گرفتار کرلیا تھا اور وہ حوالات سے نکل بھاگے تھے؟"

"یہ... یہ بات تو نہیں ہے سر..."

"واردات ہمارے علاقے میں ہوئی تھی... اس لئے..."

"واردات کہیں بھی ہوئی ہو۔ ملزموں کو میں نے گرفتار کیا ہے اپنے علاقے سے" سب انسپکٹر نے کہا "جا کے بتا دینا اپنے سائن صاحب کو بھی۔ اور اس موٹے ہاتھی کو بھی۔ ان ملزموں کی ذمے داری میری ہے۔ وہ خود کسی قابل ہوتے تو ڈاکو چھین کر کو نہ جانے دیتے۔ اور ان کے ساتھ وہ سب کچھ نہ ہوتا جو تم نے بھی دیکھا تھا۔ ان کی جگہ میں ہوتا نا' تو اتنی بے عزتی کے بعد جوگی بن جاتا۔ پولیس کی وردی پھر کبھی نہ پہنتا' تمہارا سائن صاحب اپنی ماں اور بہن کو بھی بچا نہیں سکا۔ اس کے بس کی بات نہیں ہے ڈاکوؤں سے نمٹنا' جاؤ یہ سب کہہ دو ان سے۔"

ان دونوں کی حالت غیر ہوگئی۔ دوسرے پولیس والے ان کی طرف دیکھ کے مسکرا رہے تھے۔ یہ تمسخر اڑانے والی ہنسی بڑی ذلت آمیز تھی۔ وہ سب جانتے تھے کہ پولیس کے ساتھ ہم نے تھانے میں کیا سلوک کیا تھا۔ سب انسپکٹر نے سب کے سامنے ان کی عزت دو کوڑی کی کردی تھی۔ وہ سر جھکا کے آہستہ آہستہ چل پڑے۔ جب وہ آئے تھے تو ان کی بہت اہمیت تھی کیونکہ وہ ہمیں شناخت کرسکتے تھے چنانچہ انہیں گھوڑوں پر بٹھا کے لایا گیا تھا۔ اب ان کی اہمیت ہی نہیں عزت بھی ختم ہوگئی تھی۔

اب گھوڑوں پر چار سپاہی ہو گئے' پانچویں گھوڑے پر سب انسپکٹر تھا۔

[illegible] ایک سپاہی لوٹ آیا [illegible] سر آپ کی [illegible] ہمیں پہنچانے کے لئے [illegible]

"[illegible] گھوڑے فراہم کردئے جائیں" سب انسپکٹر نے [illegible] کہ [illegible] چھالے پڑتے ہیں [illegible]

[illegible] ایک دم [illegible] کہا۔

[illegible] کرنے والا [illegible] احساس ذلت [illegible] اس کی جذباتی کیفیت [illegible] ان کی حالت [illegible] کے بعد واپس [illegible] شاعر کو بھی منتظمین بہت ترک و احتشام سے [illegible] جاتے ہیں مگر بعد میں کسی بس پر سوار کر [illegible]

سب انسپکٹر نے اپنے دو ماتحتوں سے مخاطب ہو کے [illegible] "دیکھو تم لوگ واپس جاؤ۔ ان خانہ بدوشوں کے پاس [illegible] کہ جب تک اجازت نہ ملے وہ علاقے سے [illegible] جائیں۔"

دونوں سپاہیوں نے کنفیوز ہوکے ایک دوسرے کی [illegible] دیکھا "کیا ہم ان کو یہ بھی بتا دیں کہ علاقے کی [illegible] ہے؟"

سب انسپکٹر نے سوال پر غور کیا اور بولا "تم یہ [illegible] ان سے کہو کہ وہیں رک جائیں' شاید ہمیں پھر ان کے پاس پڑے تفتیش کے لئے۔ یا انہیں بلانا پڑے۔"

دونوں پولیس [illegible] کیا اور واپس ہو [illegible]

[illegible] تدبیر نہیں۔ موقع فراہم کرنے کے لئے حالات کا رخ [illegible] افراد میں سے چار جا چکے تھے۔ اب دو [illegible] اور ایک سب انسپکٹر باقی بچے تھے۔ نازو کے ہاتھوں میں [illegible] وہ سب انسپکٹر نے تھام رکھی تھی۔ جب [illegible] والے دونوں پولیس مین پھر گھوڑوں پر [illegible] نظر سب انسپکٹر کی طرف گئی۔ اس نے [illegible] اور وہ ہماری طرف متوجہ ہی نہیں تھا [illegible] سکتا تھا۔

[illegible] کی طرف دیکھا۔ شاید میرے [illegible] اس نے آہستہ سے سر ہلا کے تائید [illegible] سب انسپکٹر کو ایک جھٹکے سے کھینچ لیا۔ [illegible] انسپکٹر [illegible] کے نیچے گرا تو پھر نہ اٹھ سکا۔ نازو نے [illegible] ہوئے [illegible] کا حلقہ اس کی گردن میں ڈال دیا اور [illegible] اس شکنجے میں جکڑ کے یوں اوپر اٹھایا کہ سب انسپکٹر [illegible] ہاتھ رکھ کے اپنی کمر کو سہارا دینے پر مجبور ہو گیا۔ وہ ایسا نہ کرتا [illegible] ریڑھ کی ہڈی کے مہرے کھسک جاتے یا گردن ٹوٹ جاتی۔ نازو نے اسے پیچھے کی طرف کمان کر دیا تھا۔ انسپکٹر کی حالت [illegible] رحم ہو رہی تھی۔ اس کا سر آسمان کی طرف اٹھا ہوا تھا اور [illegible] زمین پر تڑپ رہا تھا مگر اٹھنے سے قاصر تھا۔ نازو نے پے در پے ٹھوکریں مار کے اس کی دونوں ٹانگوں کو ناکارہ کر دیا تھا۔ وہ ہاتھوں کو استعمال بھی نہیں کرسکتا تھا۔ نازو اب اس کی کمر [illegible] مار رہی تھی اور وہ دونوں ہاتھ زمین پر رکھے ہوئے اذیت [illegible] چلا رہا تھا۔ اپنے ماتحتوں کو پکار رہا تھا اور انہیں گالیاں دے [illegible] تھا۔

سب انسپکٹر نے بھی نازو کو ایک کمزور اور نازک سی لڑکی [illegible] ہوئے اپنی تحویل میں رکھا تھا۔ وہ کیسے تصور کرسکتا تھا کہ [illegible] اس پر قیامت بن کے ٹوٹ پڑے گی تو اس کا اپنے مردانہ [illegible] جسمانی طاقت اور اسلحے کی قوت پر اعتماد خاک میں مل [illegible] گیا۔

[illegible] اس کے ماتحت کچھ دیر بے یقینی اور ذہنی صدمے کی [illegible] میں ہکا بکا کھڑے رہے تھے۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ اپنے [illegible] فریاد پر لپک کر مدد کے لئے پہنچتے' نازو نے سب انسپکٹر پر [illegible] کنٹرول حاصل کرلیا تھا۔

"خبردار! جو کسی نے قدم آگے بڑھایا" نازو نے غرا کے کہا۔ [illegible] اس کی گردن توڑ دوں گی۔"

نازو نے سب انسپکٹر کی پشت پر سوار رہتے ہوئے اپنے [illegible] اور پیروں کے بھرپور استعمال میں حیرت انگیز مہارت کا [illegible] کا مظاہرہ کیا۔ اس کے گھٹنوں نے سب انسپکٹر کی کمر کو [illegible] رکھا تھا۔ اس کے پیروں کے پنجے مشینی انداز میں اوپر نیچے [illegible] کرتے تھے اور ہتھوڑے بن کے سب انسپکٹر کی رانوں پر

[illegible] تھے۔ اس کی ٹانگیں بالکل مفلوج ہو چکی تھیں۔ وقفے وقفے سے نازو تھوڑا سا اوپر اٹھ کے گرتی تھی تو گھٹنوں کی بھرپور ضرب سے سب انسپکٹر کی کمر ٹوٹنے کے قریب ہو جاتی تھی۔ وہ درد کی شدت سے اچھلتا تھا تو نازو اس کی گردن کو کچھ اور اپنی طرف کھینچ لیتی تھی۔

"چھوڑ اسے... سور کی بچی... تیری..." ایک پولیس مین نے چیخ کر کہا اور بندوق سے نشانہ لینے لگا۔

"چلا گولی' اگر ہمت ہے تو" نازو نے للکار کے کہا۔

سب انسپکٹر بولا "[illegible] کی اولاد... یہ کیا کر رہا ہے۔"

میں نے کہا "تمہارا جاں نثار تمہاری جان قربان کر رہا ہے۔"

غالب نے کہا "اس لئے کہ اپنی جان قربان کرکے تمہاری جان بچانے کی کوئی صورت نہیں ہے۔"

"ارے میں مر جاؤں گا..." سب انسپکٹر نے اذیت میں چلاتے ہوئے چیخ کر کہا "جیسا یہ کہے ویسا ہی کرو..."

[illegible] نے پھر اس کی کمر پر دونوں گھٹنے مارے۔ وہ ذبح کئے ہوئے بیل کی طرح ڈکرانے لگا۔ اس کے حلق سے اب خرخر کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔ اس کے دونوں ماتحت انتہائی بے بسی سے دور کھڑے ہوئے صرف تماشا دیکھ رہے تھے۔ ان کے پاس طاقت بھی تھی اور اختیار بھی تھا کہ وہ قانون کے مجرم کو گولی ماردیں۔ گولی چلانے کے لئے بندوق بھی تھی مگر وہ کچھ بھی نہیں کرسکتے تھے۔ وہ کچھ کرتے تو خود اپنے افسر کی موت کے ذمے دار ہوتے۔

ابھی تک میں نے کچھ بھی نہیں کیا تھا لیکن اب میں نے بھی تھوڑا سا تماشا دکھانے کا فیصلہ کیا۔ میں نے بالکل نازو کے اسٹائل میں اس پولیس والے کو گرا لیا جس نے مجھے پکڑ رکھا تھا۔ اس کو یقین آچکا تھا کہ ہم دونوں مرد بس نام کے مرد ہیں اور وہ سب کچھ نہیں کرسکتے جو ایک لڑکی نے کر دکھایا۔ ہم کسی قابل ہوتے تو پہل بھی خود کرتے۔ اس نرم و نازک سی لڑکی کے ایکشن میں آنے تک دست بستہ غلاموں کی طرح نہ چلتے رہتے۔

آدھے منٹ سے کم وقت میں یہ غلط فہمی بھی دور ہوگئی۔ دوسرے پولیس مین کے زمیں بوس ہوتے ہی تیسرے کا حوصلہ جواب دے گیا۔ اس نے غالب کے سامنے ہتھیار ڈال دئے۔

"تم کیا چاہتے ہو؟ مجھے بتاؤ۔"

"ایسے نہیں۔ الہ دین کے چراغ کے جن کی طرح سینے پر ہاتھ رکھ کے اور سر جھکا کے کہو۔ کیا حکم ہے میرے آقا" غالب نے اب اس کو ایک لات رسید کرنے میں کوئی حرج نہ سمجھا۔

وہ غالب کے مقابلے میں زیادہ طاقتور حریف تھا اور اگر لڑائی کا موقع ملتا تو وہ غالب پر بھاری پڑتا لیکن اب اس پر دہشت طاری تھی' اور وہ ذہنی طور پر یہ تسلیم کرچکا تھا کہ غالب کسی طرح بھی کم نہ ہوگا۔

"ڈاکو صاحب، ان کو چھوڑ دو" اس نے مخاطب کے ہاتھوں کی رسیاں رضاکارانہ طور پر کھولتے ہوئے کہا "ہم مجبور لوگ ہیں ...نوکری کے لئے سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ آپ بادشاہ لوگ ہو، ہماری غلطی معاف کر دو۔"

غالب نے رہائی ملتے ہی اپنا ریوالور نکال لیا "خبردار! جو آئندہ بادشاہ کہا ہمیں، بادشاہ اب بہت مجبور اور بے اختیار ہو گئے ہیں۔"

میں نے اور نازو نے اپنے اپنے اسیروں کو آزاد کر دیا۔ غالب کے ہاتھوں میں ریوالور آجانے کے بعد ہمارے لئے زور آزمائی غیر ضروری ہو گئی تھی۔ صورتِ حال اب پوری طرح ہمارے کنٹرول میں تھی۔ غالب نے سب انسپکٹر کا ریوالور لے لیا تھا۔ سب انسپکٹر کو سیدھا کھڑا ہونے میں خاصی دیر لگی۔ اس کی کمر اور گردن اس حد تک پیچھے موڑی گئی تھی کہ ریڑھ کی ہڈی کا ہر مہرہ واپس اصل پوزیشن میں آتے ہوئے درد سے فریاد کرتا تھا۔

غالب نے اس شخص کے دوسری لات ماری جس نے دومنٹ پہلے اسے آزاد کیا تھا "ایسے احمقوں کی طرح مت کھڑے رہو۔ آگے بڑھ کے پہلے ہاتھ جوڑ کر اپنی غلطی کی معافی مانگو، پھر ان کے ہاتھ کھولو۔"

سب انسپکٹر نے اسے آتش فشاں نظروں سے گھورتے ہوئے کہا "ہاں، اب اپنے کئے کی سزا بھگتو۔"

"میری کیا غلطی ہے سر..."

سب انسپکٹر خود کم شرمندہ نہ تھا مگر وہ افسر تھا چنانچہ ماتحت پر غصہ اتار سکتا تھا "ہاں، غلطی تو تمہارے باپ کی تھی جس نے تمہیں پیدا کیا... یا اس کی تھی جس نے تمہیں پولیس میں بھرتی کیا، جھک مارنے کے لئے۔"

سپاہی میرے سامنے آکے ٹھہر گیا۔ وہ منتظر تھا کہ میں اپنے دونوں بندھے ہوئے ہاتھ آگے بڑھا کے اسے پیش کروں تو وہ رسیاں کھولے مگر میں نے دونوں ہاتھ ملا کے اس کے سر پر وار کیا ...وہ نیچے گرا پھر کھڑا ہو گیا۔

"ہم ہر معاملے میں لیڈیز فرسٹ کے اصول پر عمل کرتے ہیں" میں نے کہا۔

غالب نے سر ہلایا "اور اسی لئے ہم نے اپنی جدوجہدِ آزادی کی ابتدا خود نہیں کی تھی۔ یہ موقع پہلے خاتون کو دیا تھا۔"

سب انسپکٹر کے دل سے دھواں اٹھا۔ ایک لڑکی سے پٹ کر اس کی افسرانہ شان کا گراف زیرو سے بھی نیچے جا چکا تھا۔ اب وہ اپنی خودی کو کھسیانی بلی کی طرح کھمبا نوچ کے بلند رکھنے میں مصروف تھا۔

"پہلا اصول ہے کہ ملزم کو گرفتار کرتے ہی اس کی تلاشی لو۔ ...سب ملزمان مسلح تھے اور تم انہیں تھانے لے جارہے تھے۔ یہ تمہارے ساتھ اس سے بھی برا سلوک کرتے جو... اس موٹے ہاتھی کے ساتھ کیا تھا۔ وہ سب تو تھے بے غیرت کہ... اتار کے حوالات میں بند ہو گئے۔"

غالب نے کہا "تم پر زیادہ برا وقت آنے والا ہے... کرو گے؟"

میں نے اپنے ہاتھ ملتے ہوئے کہا "یہ ڈوب مرنے کے... چلو بھر پانی مانگیں تو دے دینا، پانی نہ ہو تو بنا لینا۔"

پانی بنانے کا انگریزی زبان میں کچھ اور مطلب... سب انسپکٹر کا چہرہ احساسِ ذلت سے سرخ پڑ گیا۔

"یہ جو کچھ تم نے کیا ہے نا، یہ اچھا نہیں کیا..." وہ بولا۔ میں نے کہا "ہاں، یہ تو ٹھیک ہے، ہم نے بہت... تمہارے ساتھ۔"

"تم کیا سمجھتے ہو، ایسے بچ کے نکل جاؤ گے۔"

"اور اگر نکل گئے تو؟" غالب نے کہا۔

"خدا کی قسم مونچھیں منڈوا دوں گا۔"

نازو نے قریب جا کے اس کی مونچھوں کو ہلا کے دیکھا "اصلی۔"

سب انسپکٹر کے صبر و ضبط کا پیمانہ چھلک گیا۔ اس... کے کہا "لڑکی!" اور ایک دم نازو کی کلائی پکڑ کے اس... جھٹک دیا۔

نازو کے لئے اتنی اشتعال انگیزی کا بہانہ کافی تھا۔ ا... دومنٹ میں سب انسپکٹر کو چار مرتبہ اوپر نیچے کیا اور گھما... پھینک دیا۔

"بہت مان ہے ان مونچھوں پر" نازو نے ایک ہاتھ رکھ کے کہا "اب کیا خیال ہے، خود مونڈو گے یا میں اکھا... ہاتھ میں دے دوں؟"

سب انسپکٹر ایک سکتے کی حالت میں پڑا ہوا آسمان کی... فریاد کناں نظروں سے دیکھتا رہا۔ یا شاید اسے زمین اور... گھومتے نظر آرہے تھے کہ اس نے اٹھنے میں دیر لگائی۔ میں... کی ذہنی کیفیت کا اندازہ کر سکتا تھا۔ اس وقت کوئی اسے ر... تھما دیتا تو ہمیں شوٹ کرنے کے بجائے وہ خود کو گولی مار لیتا۔

غالب نے ان تینوں کی نگرانی نازو کو سونپی اور خود مجھے... لے گیا "اب کیا ہو گا ان کا؟"

میں نے کہا "ان کو اسی رسی سے باندھ کے لے جا...

"کہاں؟" غالب نے کہا "یہ تو ہمیں تھانے لے... تھے، ہم انہیں لے کر کہاں جائیں گے؟"

"ہم واپس جائیں گے۔ پھر جب تک ہم خانہ بدوشو... ساتھ خطرے کی حدود سے نکل نہیں جاتے انہیں اپ... رکھیں گے۔"

"خانہ بدوشوں کے قافلے میں تین پولیس والے کیسے... گے؟"

"تین کیوں، پانچ" میں نے کہا "وہ دونوں بھی واپس آتے ... ں گے جو قبیلے کی نقل و حرکت پر پابندی کے احکامات لے کر ... ئے تھے۔"

"پانچ افراد کو باندھ کے گاڑی میں نہیں ڈالا جاسکتا۔ جیل ... ڑیاں صرف دو ہیں اور وہ بھی مریضوں کو لے جانے کے لئے ... ور ایمبولینس استعمال ہو رہی ہیں۔"

"مرزا جی، تم نے کبھی گھوڑے پر سواری کی ہے؟"

"ہاں، جب چھوٹا تھا تو ایک بار شہ بالا بن کے دولہا کے پیچھے ... بیٹھا تھا۔ اس کے بعد توبہ کی۔"

"کاش تم نے شہسواری سیکھی ہوتی۔"

"گرتے ہیں شہسوار ہی میدانِ جنگ میں... اور مجھے گرنا ... ہوگا تو میں چارپائی یا میز کرسی پر سے گر کے اپنا شوق پورا کرلوں گا۔"

"ہمارے پاس بہترین ٹرانسپورٹ تھی" میں نے گھوڑوں کی ... طرف اشارہ کر کے کہا "ہم بحرِ ظلمات میں گھوڑے دوڑاتے نکل ... جاتے۔"

"گھوڑے میں بریک اور کلچ نہیں ہوتے۔ ایک ہارس پاور ... کی موٹر سائیکل کو اس لئے بھی گھوڑے پر فوقیت حاصل ہے کہ وہ ... دولتی نہیں مارتی، باقی سب صفات مشترک ہیں؟" غالب نے کہا۔

"سوال یہ ہے دوست کہ اس اصطبل کا کیا ہو گا"

"کیوں نہ ہم گھوڑے بیچ کر سو جائیں، آج اچھا موقع ہے ... اس محاورے پر عمل کرنے کا" غالب نے کہا "خریدار بھی بہت ... ہوں گے یہاں۔"

"تو صورتِ حال پر سنجیدگی سے غور نہیں فرمائے گا تو مجھے ... یہ کیس نازو کے سپرد کرنا پڑے گا۔ وہ اس وقت فارم میں ہے۔"

غالب نے کہا "غور طلب کوئی مسئلہ نہیں، ہم انہی گھوڑوں ... پر سوار ہو کے جائیں گے۔ ڈرائیور آگے بیٹھے گا۔ پیچھے ہم ہوں ... گے۔ گھوڑے کو ڈرائیور کنٹرول کرے گا، ڈرائیور کو ہم کنٹرول ... کریں گے۔"

"وہ خانہ بدوش نہ پولیس والوں کو ساتھ رکھنے پر تیار ہوں ... گے، نہ ان کے گھوڑوں کو۔ میری تجویز یہ ہے کہ ہم انہی کے ... ساتھ جائیں، جہاں بھی جانا ہو۔ ہم پانچ افراد ہیں، گھوڑے بھی ... پانچ ہی ہیں۔"

"یہ ایک اچھی تجویز ہے" غالب نے کہا "ہر گھوڑے پر دو ... افراد جا سکتے ہیں، ایک اصلی شہسوار اور اس کے پیچھے بندوق ... بردار۔"

میں نے کہا "ریوالور ہم سب کے پاس ہے۔ ہم سب کو ... کنٹرول میں رکھ سکتے ہیں۔ راستہ ہمیں معلوم نہیں لیکن غلط ... راستے پر جا کے کون مرنا چاہے گا۔ ہمیں فوراً معلوم ہو جائے گا ... اگر کسی نے گڑبڑ کی۔"

غالب نے کہا "یہ بالکل ٹھیک ہے، اگر ہم آج رات یہاں سے نکل گئے تو کل بمبئی میں ہوں گے پھر کوئی خطرہ نہیں۔"

"فاصلہ تو ایک گھنٹے کا بھی نہیں ہے۔ بس ہم سڑک تک پہنچ جائیں۔ اس کے بعد گھڑ سوار دستے کی ضرورت نہیں رہے گی۔"

"وہاں سے کوئی کار یا ٹیکسی مل جائے گی۔"

"جیسے ہی وہ دونوں پولیس مین آجائیں، ہم نکل جاتے ہیں۔ ... رات ہونے کا انتظار بھی کیوں کریں؟" میں نے کہا "رابعہ اور گل کو ساتھ لے کر اسی وقت چلے جانا بہتر ہے۔"

"سڑک تک تو ہم انہیں زبردستی لے جائیں گے اور یہ لوگ بھی مجبور ہوں گے خاموش رہنے پر، مگر اس کے بعد؟"

"اس کے بعد؟" میں نے سوچ کے کہا۔

"ہاں، جیسے ہی ہم نے انہیں چھوڑا یہ لوگ شور مچا دیں گے اور پوری کوشش کریں گے کہ ہمارے لئے سب راستے بند ہو جائیں۔"

"یہ وقت آنے پر دیکھیں گے اور اس مسئلے کا حل بھی نکل آئے گا۔ ظاہر ہے ہم کوئی رسک لینے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ ہم کوئی ایسا انتظام پہلے کریں گے کہ خود محفوظ رہیں۔"

غالب نے گھڑی دیکھ کے کہا "ان دونوں نے بہت وقت لگا دیا۔"

میں نے کہا "فاصلہ تو زیادہ نہیں تھا۔ آرہے ہوں گے خراماں خراماں۔"

غالب نے کہا "مجھے اخبار میں اپنی تصویریں دیکھ کے بڑی حیرانی ہوئی۔ ہم یہاں بھی اشتہاری مجرم قرار دئے جا چکے ہیں۔"

غالب کی بات پر مجھے کچھ اور یاد آگیا، میں نے کہا "مرزا، اس اخبار میں ہم تینوں کی تصویریں دیکھنے کے بعد گنجے کا ردِعمل عجیب تھا۔"

"کس گنجے کا؟"

"جو میرے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ اس نے میری طرف مسکرا کے دیکھا اور کہنے لگا کہ میں نے ٹھیک کہا تھا۔"

غالب چونکا "پھر تو نے اس سے پوچھا نہیں کہ آخر اس بات کا مطلب کیا تھا؟ کیا ٹھیک کہا تھا اس نے؟"

"یہ پوچھنے کی مہلت ہی کہاں ملی" میں نے کہا "میرا خیال تھا کہ پولیس چلی جائے پھر اس سے بات کروں گا اور پولیس بھی بس واپس جانے ہی والی تھی کہ اس خبیث نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔"

"کیا اس گنجے نے محسن کے بارے میں کچھ کہا تھا؟"

"میرا اندازہ یہی ہے۔ ہماری تصویر دیکھ کے وہ ایسی بات نہیں کہہ سکتا تھا۔"

"کیسی بات یار؟" غالب نے کہا "اگر بات اتنی ہی تھی جتنی تو نے مجھے بتائی ہے تو اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ اس کا تعلق محسن سے ہو گا۔ کیا اس نے محسن کا نام لیا تھا؟ یا تصویر پر انگلی رکھ کے کچھ کہا تھا؟" غالب نے کہا "واضح اشارہ ...یا تھا..."

"نہیں' بالکل واضح طور پر اس نے تصویر کی طرف اشارہ بھی نہیں کیا تھا" میں نے کہا۔

"پھر ممکن ہے اس بات کا تعلق ہم سے ہو۔"

"ہم سے!"

"ہاں۔ اس نے سردار سے یا کسی اور شخص سے کہا ہو گا کہ یہ لوگ مجرم ہیں۔ قاتل ہیں اور ڈاکو ہیں۔ جب پولیس آئی اور انہوں نے اخبار میں شائع ہونے والی تصویریں دکھائیں۔ تو گنجے کی بات درست ثابت ہو گئی۔"

"تو نے مجھے پھر مایوسی میں مبتلا کر دیا ہے۔ بہت پُرامید ہو گیا تھا میں کہ اب محسن مل جائے گا۔"

"پُرامید تو میں بھی ہوں" غالب نے کہا "امید کے بغیر ہم اپنی جدوجہد کو جاری نہیں رکھ سکتے۔ امید پر دنیا قائم ہے۔"

میں نے کہا "خواہ مخواہ فلسفہ مت جھاڑ۔ میری امید محض خیالی نہیں ہے۔ خواہش کا نام نہیں ہے۔ اس بات کا ذکر سردار نے بھی کیا تھا کہ ہمارے جیسا ایک شخص رات کو یا صبح آیا تھا۔"

"یہ بات بھی سردار نے نہیں' اس کے بیٹے ولی عہد بہادر نے ہی کی تھی" غالب کچھ قائل ہو کے بولا "رات یا صبح سے اس کی مراد تھی رات کا آخری پہر' صبح ہونے سے بہت پہلے' جب رات ہی ہوتی ہے۔"

"ہاں۔ اس نے تسلیم کیا تھا کہ اس نے کپڑے دئے تھے اور ایک گدھا دیا تھا جس پر بیٹھ کے وہ شخص بھاگ گیا تھا اور ولی عہد بہادر نے مدد کرنے کا سارا معاوضہ خود رکھ لیا تھا۔ اس وقت وہ نام' حلیہ کچھ نہیں بتا سکا تھا مگر کیا اس وقت ہم سب کا یہ خیال نہیں تھا کہ وہ محسن ہو گا؟"

"ہاں۔ خیال تو تھا۔ مگر..."

"پھر ولی عہد نے اس کی تصویر دیکھ کے جس طرح سر ہلایا تھا اس سے اور کیا ثابت ہوتا ہے؟"

"ثابت کچھ نہیں ہوتا۔ مگر اس خیال کو تقویت حاصل ہوتی ہے کہ وہ محسن تھا۔ خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔ ابھی ہم جائیں گے تو گنجے سے پوچھ لیں گے" غالب نے کہا۔

"اگر وہ محسن تھا تو گدھے پر بیٹھ کے وہ کدھر نکل گیا؟"

"جان بچا کے فرار ہونے والا سمت نہیں دیکھتا۔"

"پھر بھی' اسے ہمارا خیال نہیں آیا؟ اس نے یہ نہیں سوچا کہ ہم اسے کہاں تلاش کریں گے؟" میں نے کہا۔

"ہمیں کیا معلوم' اس نے ہماری تلاش میں کیا پاپڑ بیلے تھے۔" غالب نے ایک سرد آہ بھر کے کہا "جب وہ ملے گا تو معلوم ہو گا کہ ہم سے بچھڑ کے اس پر کیا بیتی۔ وہ بے وقوف تو ہے نہیں' اور نہ بزدل ہے۔ ہمیں چھوڑ کے وہ کہیں نہیں جا سکتا۔ اسی علاقے میں کہیں چھپا ہوا ہو گا اور ہمارا سراغ لگانے کی فکر میں ہو گا۔ جیسے ہم اس کے لئے فکر مند ہیں۔"

دونوں گھڑ سواروں کی واپسی کی خبر گھوڑوں نے ہنہنا کے... میں اور غالب ان کے استقبال کے لئے ریوالور نکال کے چند قدم آگے چلے گئے۔ وہ جیسے ہی پہاڑی کی اوٹ سے نمودار ہوئے ہم نے انہیں سامنے آ کے روک لیا۔

ہمیں آزاد دیکھ کے اور ریوالور کا رخ اپنی طرف پا کے ان کی سٹی گم ہو گئی' وہ ایک لفظ کہے بغیر گھوڑے پر سے اتر آئے۔

"ہم کو مت مارنا جی' ہم غریب لوگ ہیں" ان میں سے ایک نے اپنی رائفل مجھے پیش کرتے ہوئے کہا۔

دوسرے نے بھی ہمت کی "کیا کریں سر' افسر جو حکم دیتے ہیں ماننا پڑتا ہے۔"

میں نے دونوں کی رائفلیں خالی کر کے پھینک دیں "اتنی دیر کیوں ہوئی واپسی میں؟"

"کیا دو میل آنے جانے میں ایک گھنٹا لگتا ہے؟" غالب نے بھی انہیں ڈانٹا "پیدل تو نہیں گئے تھے تم۔"

"وہ... سر... بات دراصل یہ ہے....."

"بات دراصل یہ ہے کہ حرام خوری کی عادت پڑ گئی ہے۔ گھومتے پھرتے سیر کرتے آ رہے تھے" میں نے کہا۔

"نہیں سر' ان کو تلاش کرنے میں دیر ہو گئی۔"

"کیا اتنی دیر میں پورا قبیلہ غائب ہو گیا؟"

"ہاں سر' بالکل غائب ہو گیا۔"

"کیا بکتے ہو!" میں نے کہا۔

"یہ بالکل سچ ہے" دوسرے نے کہا "ان کا کوئی پتا نہیں چلا!" غالب نے اس کی گردن دبوچ لی "تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا ہے؟"

میں نے دوسرے کو جھنجوڑ کے کہا "تم راستے سے بھٹک تو نہیں گئے تھے' پاگل کے بچے۔"

"وہ... سر... پہلے ہم یہی سمجھے تھے" وہ خوف سے کانپنے لگا "مگر راستہ بھولنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"ہم نے ادھر ادھر... سب جگہ دیکھ لیا۔"

"کہاں دیکھ لیا؟" میں نے کہا "اگر وہ تھے مشرق میں تو تم مغرب میں بھٹک کے لوٹ آئے ہو گے۔"

"نہیں جی' ایسی بات نہیں۔ ہم یہاں کے راستوں سے واقف ہیں۔ دن رات پھرتے ہیں" اس نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔

میں اسے گھسیٹ کر سب انسپکٹر کے سامنے لے گیا "سنو' تمہارے یہ قاصد کیا خبر لائے ہیں۔"

"کہاں بھیجا تھا تم نے انہیں' اور یہ کہاں گئے تھے۔ ان سے پوچھو" غالب نے دوسرے کو بھی سب انسپکٹر کی طرف دھکیل دیا۔

انہوں نے پھر وہی دہرایا جو پہلے کہہ چکے تھے۔ سب انسپکٹر کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ ان دونوں کا بیان ایک تھا مگر اس پر یقین نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اس نے ایک کے منہ پر تھپڑ رسید کیا "تو نے بے وقوف سمجھ رکھا ہے مجھے... اور ان سب کو۔"

وہ ہاتھ جوڑ کے گڑگڑانے لگا "آپ میری مانیں سر' میں جھوٹ کیوں بولوں گا آپ سے' قبیلے کا کوئی سراغ نہیں ملا۔"

"ہم نے ہر جگہ تلاش کیا..."

"ابے.... کیا وہ بھوتوں کا قبیلہ تھا" سب انسپکٹر نے چیخ کے کہا "جنات تھے وہ کہ غائب ہو گئے۔ قسم خدا کی جھوٹ بولا مجھ سے تو زندہ گاڑ دوں گا۔"

مجھے پہلے بھی شک ہوا تھا کہ سب انسپکٹر مسلمان ہے۔ اس نے مونچھیں منڈوانے کی بات کرتے ہوئے خدا کی قسم کھائی تھی۔

"سر' آپ خود چل کے دیکھ لیں' اگر آپ کو مجھ پر یقین نہیں" اس کے ماتحت نے کہا "ہم تو خود حیران تھے۔"

"ہم نے دس کوس کا علاقہ چھان مارا" دوسرا بولا۔

... نے سر پر ہاتھ مار کے کہا "خدا کے لئے کوئی عقل کی بات کرو۔ وہ ایک پورا قافلہ تھا۔ اس میں بیل گاڑیاں تھیں۔ کیا انہیں جہاز کی طرح اڑا کر لے گئے وہ لوگ گدھے تھے۔"

"بیل گاڑیاں... وہ تو ہیں سر۔"

میں نے اسے چونک کر دیکھا "کیا؟ بیل گاڑیاں ہیں۔"

"اور گدھے؟ قافلے میں جو اتنے بہت سے لوگ تھے؟" غالب نے کہا۔

وہ نفی میں گردن ہلانے لگا "اور کچھ نہیں' صرف بیل گاڑیاں کھڑی ہوئی ہیں اور بیل بھی ہیں۔"

یہ بہت پریشان کن خبر تھی لیکن اتنی ہی ناقابل یقین بھی لگتی تھی۔ سب انسپکٹر کی بات ٹھیک تھی کہ آخر تھے وہ انسان۔ جنات نہیں تھے کہ پلک جھپکتے میں غائب ہو گئے۔ قافلے میں سب ملا کے کم سے کم بیس مرد اور عورتیں شامل تھے۔ ان کے علاوہ تین چار بچے بھی تھے۔ ان کا ساز و سامان جو بھی تھا نصف درجن گدھوں پر لدا ہوا تھا۔ یہ سب لے کر وہ اتنی سی دیر میں اتنی دور نہیں جا سکتے تھے کہ ان کا سراغ بھی نہ ملے۔

"میرا خیال ہے کہ ہم خود چل کے دیکھتے ہیں" میں نے کہا۔ یہاں ان کے ساتھ سر کھپانے میں وقت ضائع ہو گا۔"

"صحیح بات کا پھر بھی پتا نہیں چلے گا" غالب نے کہا۔

"غالب' کیا وہ رابعہ اور گل کو بھی لے گئے ہوں گے؟" نازو نے جذباتی لہجے میں ایک احمقانہ سوال کیا۔

غالب نے بھی اس کی طرف دیکھا "نہیں' انہیں وہ چھوڑ گئے ہوں گے دہلی میں قطب مینار پر... اور خود چلے گئے ہوں گے ماؤنٹ ایورسٹ پر۔"

میں اسے فوراً کھینچ کر دور لے گیا "یار' ابھی اس نے رونا شروع کر دیا تو چپ کرانا مشکل ہو جائے گا۔ بہت شدید تھکن' نیند کی کمی اور اعصابی دباؤ کا شکار ہے' اس کی حالت دیکھ۔"

"ہم کیا بہت تر و تازہ اور پُرسکون ہیں؟" غالب نے کہا۔

"ہم برداشت کر سکتے ہیں" میں نے کہا۔

"میرا دماغ خراب ہو رہا ہے۔ یہ نئی پریشانی پیدا ہو گئی ہے" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "پریشانی تو ہے لیکن ایک دوسرے کو پریشان کرنے سے کیا یہ پریشانی کم ہو جائے گی۔ ابھی جا کے دیکھ لیتے ہیں ہم خود کہ یہ معاملہ کیا ہے۔"

غالب نے سر کھجا کے کہا "اچھا میں اس سے معافی مانگ لیتا ہوں۔"

نازو سخت خفا بیٹھی تھی۔ اس نے کہا "میری طرف سے آپ بھاڑ میں جائیے۔"

"چلا جاؤں گا' پہلے یہ ناراضگی ختم کرو' دراصل وہ بات ہی اتنی فضول کی تھی تم نے... چلو اب مسکرا کے دکھا دو۔"

بات بنتے بنتے پھر بگڑ گئی "میں مسکرا کے دکھا دوں آپ کو' یہ دیکھئے" نازو نے دونوں ہاتھوں کی ایک ایک انگلی سے منہ پھاڑ کے سارے دانتوں کی نمائش کی۔ ایسے جبڑے چرنے سے اس کے گال تک پھیل گئے تھے۔

"تم ایک بھتنی لگ رہی ہو" غالب نے کہا "میں غلط نہیں کہتا تھا کہ میرا سسرا ایک بھوت ہے۔"

"تم خود کیا ہو' اپنی شکل دیکھو جا کے آئینے میں' بجو" نازو نے ایک پتھر اٹھا کے پھینکا' کوشش کے باوجود غالب بچ نہ سکا۔ پتھر اس کی کمر میں لگا۔ ان کے درمیان بات چیت تک بند ہو گئی۔

میں نے اتنی دیر میں روانگی کی تیاری مکمل کر لی تھی اور پولیس پارٹی کو ہدایات بھی جاری کر دی تھیں۔ میں نے ان کی رائفلیں واپس کرنے سے پہلے میگزین خالی کر دئے تھے۔ سب انسپکٹر کو بھی میں نے خالی ریوالور واپس کرنے میں کوئی حرج نہ سمجھا۔ اس اسلحے کی ہمیں قطعی ضرورت نہ تھی مگر اس کے بغیر ان کی نوکری خطرے میں پڑ جاتی۔

وہی دو سپاہی سب سے آگے رہے جو خانہ بدوشوں کے قبیلے کی تلاش میں ناکام رہے تھے۔ ان کے پیچھے والے سپاہی کے ساتھ غالب ریوالور لے کر بیٹھا تھا۔ پھر ایک سپاہی کے پیچھے نازو تھی جو اس اعزاز پر خاصا خوش نظر آتا تھا' اس نے گھوڑے کو چمکار کے آہستہ آہستہ بڑھایا۔

"آپ کو ڈر تو نہیں لگتا نا جی؟" اس نے پلٹ کے نازو سے کہا۔

"تم سے؟ نہیں' بالکل نہیں" نازو نے کہا۔

"میرا مطلب تھا گھوڑے کی سواری سے۔ میں بڑا اچھا سوار ہوں۔ آپ کو گرنے نہیں دوں گا" اس نے کہا۔

"اور اگر گھوڑا گر گیا تو کیا کرو گے؟" نازو شرارت پر آمادہ تھی۔

"نہیں جی، گھوڑا بہت اچھا ہے..."

"کبھی اس کی نظر ٹیسٹ کروائی ہے تم نے؟ دریا اور پہاڑ نظر تو آجاتے ہوں گے اسے؟"

"آپ میری کمر میں ہاتھ ڈال کے بیٹھ جائیں جی، پھر کوئی خطرہ نہیں..."

"تمہارا موڈ رومانٹک ہوتا جارہا ہے، مجھ پر لٹو ہو گئے ہو؟"

"ہیں جی" سپاہی بوکھلا گیا۔

غالب نے پلٹ کے کہا "ابے لٹو... ٹٹوپہ ٹٹو عرف بجربٹو۔"

"میں تمہیں اچھی لگتی ہوں نا؟" نازو نے کہا۔

سپاہی نے پریشان ہوکے کہا "یہ... آپ کیسی باتیں کرتی ہیں جی۔"

نازو نے کہا "ڈرتے کیوں ہو، ہمت ہے تو بھگا کے لے جاؤ، جیسے راجا پرتھوی راج لے گیا تھا سنجوگتا کو۔"

غالب نے پھر پیچھے سر گھما کے کہا "لے جاؤ... لے جاؤ.. جب بھگتو گے اس مصیبت کو تب پتا چلے گا بیٹا۔"

نازو نے اسے ڈانٹ کر کہا "کیا میں مصیبت ہوں؟"

سپاہی کے اوسان خطا ہوگئے "جی۔ میرا مطلب ہے نہیں جی، بالکل نہیں جی... لیکن آپ کسی اور کے ساتھ بیٹھ جائیں جی، مجھے معاف کردیں..."

"کیوں، کسی اور کے ساتھ کیوں بیٹھوں میں؟ اب مجھے تم اچھے لگتے ہو، انکار کروگے تو میرا دل ٹوٹ جائے گا۔ پھر میں تمہارا دل توڑدوں گی۔ دل بائیں جانب ہوتا ہے نا، پسلیوں کے اندر.. تو پہلے پسلیاں ٹوٹیں گی، پھر دل ٹوٹے گا... ایک ہاتھ مار کے میں سر کو بھی ناریل کی طرح توڑ سکتی ہوں، دل تو بہت نازک ہوتا ہے۔ تم نے دل کسی کو دیا تو نہیں ہے نا؟"

میں آخری گھوڑے پر سب انسپکٹر کے ساتھ تھا چنانچہ نازو کی ساری بکواس سن رہا تھا اور مسکرانے لگا تھا۔

اچانک سب انسپکٹر نے کہا "سکندر بخت، مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔"

میں ایسے اچھلا جیسے کسی نے مجھے راکٹ لانچر میں رکھ کے فائر کردیا ہو "تم.... یہ نام کیسے جانتے ہو!"

"تمہارا نام تو بہت سے لوگ جانتے ہیں۔ اگر میں یہ کہوں کہ تم شیطان کی طرح مشہور ہو تو غلط نہیں ہوگا۔ سرحد کے دونوں طرف تم بہت سے لوگوں کے لئے دردِ سر بنے ہوئے ہو" سب انسپکٹر آصف جاہ نے میری پریشانی سے لطف اندوز ہوکے کہا۔

میں دم بخود بیٹھا رہا "تم نے پہچان لیا تھا مجھے؟"

"نہیں، تمہاری تصویر بہت مختلف ہے" وہ بولا "اگر یہ میک اپ نہ ہوتا تو شاید پہچان لیتا۔"

میں نے کہا "اگر تم میرا نام جانتے ہو تو دوسروں کے نام سے بھی واقف ہوگے؟"

وہ بولا "ہاں، غالب اور محسن کے نام میرے لئے نئے نہیں ہیں۔"

"کب سے سن رہے ہو تم یہ نام؟"

"بہت عرصے سے۔ پہلے میں بی ایس ایف میں تھا۔ بارڈر سیکیوریٹی فورس میں۔ لاہور واہگہ کی سرحد پر میں نے تین مہینے بڑی مشکل سے گزارے۔ پاکستان کا ایک ایس پی تھا، سراج۔"

میں نے کہا "تم سراج کو بھی جانتے ہو؟"

"سراج سے ہمارا براہِ راست رابطہ تھا۔ میرا مطلب ہے، ہمارے اعلیٰ افسروں کا، وہ ایک دوسرے سے تعاون کرتے تھے۔ اسمگلنگ روکنے کے لئے نہیں، وہ اسمگلنگ کرنے والوں کی مدد کرتے تھے۔ ان سے خوب رشوت لیتے تھے اور ان کا راستہ کھلا رکھتے تھے۔ وہاں اکثر تمہارا اور تمہارے کارناموں کا تذکرہ ہوتا تھا۔ ظاہر ہے اچھے الفاظ میں نہیں ہوتا تھا مگر میں سنتا رہتا تھا۔ تین مہینے بعد مجھے یہاں بھیج دیا گیا۔ سراج کی وجہ سے۔"

"سراج کی وجہ سے!"

"ہاں۔ ایک دن اس سے تلخ کلامی ہوگئی تھی۔ میں نے اسے کچھ نہیں کہا تھا۔ میں سب وطن دشمنوں اور غداروں کو گولی مارنے کی بات کررہا تھا، خواہ وہ ہندوستان میں ہوں یا پاکستان میں ہوں یا کہیں اور۔ چور کی داڑھی میں تنکا، وہ مجھ پر گرم ہوگیا کہ ایک معمولی اے ایس آئی کو اتنی ہی بڑی بات کرنی چاہئے جتنی اس کی اوقات ہو۔ اس پر میں نے کہہ دیا کہ بڑے بڑے عہدوں والے بھی اپنے اختیار کے استعمال میں اپنی اوقات بھول جاتے ہیں۔ یہ نہیں سمجھتے کہ ان کے اوپر کتنے بیٹھے ہیں۔ بس اس کے بعد میں ناپسندیدہ ہوگیا۔ جب تک میں وہاں تھا مجھے پاکستانی اخبارات مل جاتے تھے۔ ہم لوگ آپس میں خبروں کا تبادلہ کرتے رہتے تھے۔ دونوں طرف کی سرحدی پولیس آپس میں رابطہ بھی رکھتی تھی۔ میں نے بہت کچھ سنا تھا اور پڑھا تھا۔ پھر مجھے یہاں بھیج دیا گیا تو وہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔ اب اچانک تمہارا ذکر سننے میں آیا۔"

"کس سے سنا تھا ہمارا ذکر؟"

"پھر بتاؤں گا، ابھی وقت کم ہے۔ یہ سمجھ لو کہ میں تمہاری ہر ممکن مدد کروں گا لیکن اس طرح کہ کسی کو شک نہ ہو، شک ہوگیا تو اس کا نقصان مجھے بھی ہوگا اور تمہیں بھی۔ یہی وجہ ہے کہ ابھی تک میں نے تمہارے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی۔ اور تمہاری ہر زیادتی برداشت کرتا رہا۔"

"آئی ایم سوری، مجھے معلوم نہیں تھا۔"

"تمہیں معلوم ہونا بھی نہیں چاہئے۔ دوسروں کے سامنے تم یہی ظاہر کرتے رہو گے کہ نہ تم کچھ جانتے ہو میرے بارے میں نہ میں تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو جانتا ہوں۔ میرا پلان تم نے فیل کردیا۔"

"کیسا پلان؟"

"میں تم کو گرفتار کرکے اپنے ساتھ لے جارہا تھا۔ تمہیں بھگانے کے لئے اور تمہاری مدد کرنے کے لئے میں نے ان دونوں سپاہیوں کو رخصت کردیا تھا جو تمہارے دشمن تھے۔ میں نے انہیں ان سے چھین لیا تھا۔ وہ جاکے شکایت کریں گے اور موٹا نمبردار خاصا ہنگامہ کرے گا اس دخل در معقولات پر کہ میں نے اس کے ملزم ہتھیا لئے۔ وہ تو طے کئے بیٹھا ہوگا کہ کسی طرح تمہیں ایک زیادتی کے بدلے میں دس بار سزا دی جائے۔ وہ سب تم سے انتقام لینے کے لئے پوری تیاری کے ساتھ تمہارے منتظر تھے۔ وہ سخت مایوس اور مشتعل ہوں گے... مگر ان سے میں نمٹ لوں گا بشرطیکہ تم بھی کچھ تعاون کرو مجھ سے۔"

میں نے کنفیوژ ہوکے کہا "میں کیا کرسکتا ہوں؟"

"دیکھو، تم کو میرے ساتھ چلنا ہوگا۔"

"تمہارے ساتھ..."

"ہاں، آج رات میں تم کو اپنے علاقے کے تھانے میں بند رکھوں گا۔"

میں نے کہا "یہ کیسے ہوسکتا ہے؟"

اس نے کہا "کیا تم کو بھروسہ نہیں مجھ پر؟"

میں نے کہا "مگر بھروسے میں کوئی رسک لینا.. مشکل... بلکہ ناممکن ہے۔"

"کیوں؟ تم ڈرتے ہو کہ میں جھوٹ بول کے تمہیں گرفتار کروں گا اور پھر تمہاری گرفتاری پر سند اور انعام حاصل کرنے کی کوشش کروں گا؟"

میں نے کہا "اگر تم مخلص ہو تو گرفتار کئے بغیر اور تھانے کی حوالات میں بند کئے بغیر ہی بہت کچھ کرسکتے ہو ہمارے لئے۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "ایسے میں کیا کرسکتا ہوں، تم نے مجھے بے بس کردیا ہے۔ تم بھاگنا چاہتے ہو۔ موقع ملتے ہی تم مجھے اور سب کو کہیں باندھ کے ڈال دوگے یا ناک آؤٹ کرکے نکل جاؤگے۔ پھر میں تمہیں کہاں تلاش کرتا پھروں گا؟ تم سے دوبارہ رابطے کی کوئی صورت ہی نہیں رہے گی میرے لئے۔ تم آج یہاں ہو، کل نہ جانے کہاں چلے جاؤ گے۔ میں اپنے علاقے سے دور نہیں جاسکتا۔"

"ہم خود رابطہ قائم کرلیں گے تم سے۔"

"پھر کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ تمہارے فرار ہوجانے کے بعد مجھے معطل کردیا جائے گا۔ میرے خلاف انکوائری ہوگی، فرائض سے غفلت برتنے کے الزام میں۔ میرے اختیارات ختم ہوجائیں گے اور میری نقل و حرکت کی نگرانی ہوگی۔ پولیس کی تحویل سے مجرم پہلے بھی بھاگتے رہے ہیں لیکن میرا ایک جرم میرا مسلمان ہونا بن جائے گا۔ خواہ مخواہ یہ شکوک پیدا کئے جائیں گے کہ میں نے تمہیں فرار کے مواقع فراہم کئے۔ اسی لئے میں نے تمہیں اپنی تحویل میں لینے پر اصرار کیا تھا کہ تمہیں بھاگنے میں مدد دوں کیونکہ تم بھی مسلمان ہو۔ یہاں عام بات ہے یہ۔ مسلمان سو فیصد قابلِ اعتماد اور محبِ وطن نہیں سمجھے جاتے ان پر ہمیشہ شک کیا جاتا ہے؟"

"کیا تم اپنے طرزِ عمل سے یہ ثابت نہیں کررہے ہو... کہ شک کرنے والے غلط نہیں کرتے۔"

"نہیں۔ اگر تمہارے عزائم سے میرے وطن کو بالواسطہ طور پر بھی خطرہ لاحق ہوتا تو میں تمہیں دشمن سمجھتا اور کوئی رعایت نہ دیتا لیکن نہ تم بھارت کے خلاف ہو نہ بھارت کو نقصان پہنچانے والوں کے ساتھ ہو۔ تم اپنی جنگ لڑ رہے ہو، اپنے غداروں کے خلاف۔ مشرقی پاکستان کا معاملہ تمہارے گھر کا معاملہ ہے، میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے کسی صوبے میں علیحدگی پسند ایسے سر اٹھائیں تو ہماری حکومت اور ہمارے عوام بھی یہی کریں گے جو تم نے اور تمہاری حکومت نے کیا۔ میں اپنے دیش سے غداری نہیں کررہا ہوں۔ ایک ایسے شخص کی مدد کررہا ہوں جو میرے یقین کے مطابق مظلوم ہے، ظالموں سے لڑرہا ہے، حق پر ہے اور باطل کے خلاف جہاد میں مصروف ہے۔ مجھے رشک ہوتا ہے تمہارے جذبے پر، تمہارے حوصلے پر اور تمہارے یقین پر۔ جس طرح تم چند لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور جو کچھ تم نے کیا، وہ حیرت انگیز اور قابلِ تعریف ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ یہ جذبہ فنا ہو، یہ کام رک جائے، اس مقصد کو شکست ہوجائے۔ یہاں آکے تم میری وجہ سے مجبور ہوجاؤ کہ اپنے مشن کی ناکامی کو قبول کرو، میں یہ الزام لے کر خود اپنی نظر میں مجرم بننا نہیں چاہتا۔"

میں نے کہا "کیا مجرموں کی مدد کرکے تم ایک جرم کا ارتکاب نہیں کروگے؟"

"ہاں۔ یہ الزام آئے گا مجھ پر... کہ میں نے ادائے فرض میں کوتاہی کی۔ میں اس کی سزا بھگتنے کے لئے تیار ہوں۔ جو تمہیں مجرم سمجھتے ہیں میں ان سے اختلاف رکھتا ہوں۔ میرے نزدیک تم مجاہد ہو، جو تم کررہے ہو یہی عین فرض ہے۔ مگر یہ فرق نقطۂ نظر کا ہے۔ میں یہاں کے قانون کو بدل نہیں سکتا، میں سب کو قائل بھی نہیں کرسکتا کہ میری سوچ ٹھیک ہے۔ چنانچہ مجھے اپنی سزا قبول کرنی ہوگی۔ مگر ابھی تم میرے ساتھ چلو۔"

"آخر تم کیوں چاہتے ہو کہ ہم خود کو تمہارے حوالے کردیں اور آج تمہارے ساتھ جاکے حوالات میں بند ہوں؟"

"میں تمہیں آج ہی رات وہاں سے نکال دوں گا۔"

"پھر اس سے کیا فرق پڑے گا؟ ہم ابھی بھاگ جائیں یا رات کو فرار ہوں، ہر صورت میں تم پر یہ الزام ضرور آئے گا۔"

"میں نے کہا نا، الزام سے میں نہیں ڈرتا مگر یہاں میں پوری بات نہیں کرسکتا۔ سب دیکھیں گے اور سننے کی کوشش کریں گے۔

...میں ان دونوں لڑکیوں کا سراغ بھی لگالوں گا جو تمہاری غلطی سے خانہ بدوشوں کے ساتھ چلی گئیں۔"

"وہ میری غلطی نہیں تھی' میرا فیصلہ تھا۔"

اس نے افسوس سے سرہلایا "اچھا ہوتا اگر تم انہیں بھی ساتھ رکھتے۔ مجھے کیا معلوم کہ تمہارے ساتھ اور کون تھا۔ اس نے ایک کو شناخت کیا تھا اور میں نے بھی تمہیں ایک ہی سے بات کرتے دیکھا تھا۔"

"ایک رات میں تم کیسے سراغ لگالو گے ان کا؟"

"میں کوشش کروں گا' اس کے علاوہ بھی میں بہت کچھ کرسکتا ہوں تمہارے لئے۔"

"مثلاً۔"

"مثلاً یہ کہ تمہاری رہنمائی کرسکتا ہوں' تمہیں ضرورت کی ہر چیز فراہم کرسکتا ہوں۔"

"ہمیں کسی چیز کی ضرورت نہیں' ہم اپنے وسائل خود پیدا کرنے کے قائل ہیں... اور رہنمائی کے لئے ہمارے پاس اپنی عقل ہے اور خدا کی مدد پر انحصار کی عادت ہے۔"

اس نے جھنجلا کے کہا "وہ بھی ایسا ہی شکی تھا۔ اس کی مدد کی تھی میں نے... مگر وہ بھاگ گیا' اس نے مجھ پر اعتماد نہیں کیا"

"وہ کون؟"

"تمہارا دوست.. ساتھی.. محسن اور کون۔"

اس سے پہلے کہ میں کسی ردِعمل کا اظہار کرتا' آگے آگے چلنے والوں نے لگام کھینچ کر گھوڑے روک لئے۔

"دیکھ لیں سر' یہی جگہ ہے وہ۔"

اب میں نے بھی چونک کر دیکھا تو مجھے دو بیل گاڑیاں نظر آئیں۔ باتوں میں وقت کا احساس بھی نہیں ہوا تھا اور مسافت کا بھی۔ ورنہ میں اس جگہ کو پہلے ہی دیکھ لیتا' میں سب انسپکٹر آصف جاہ کی طرف متوجہ تھا چنانچہ میں نے بعد میں نازو یا غالب کی گفتگو بھی نہیں سنی تھی۔

میں ریوالور کے ساتھ گھوڑے پر سے اترا۔ نازو کو اتارنے کے لئے غالب نے ہاتھ بڑھایا مگر نازو نے انکار کردیا۔

"میں اس کا ہاتھ تھاموں گی جو مجھے یہاں تک لایا ہے۔ میرا شریکِ سفر کہاں ہے؟" نازو نے کہا۔

بے چارہ سپاہی فوراً ہی گھوڑے سے اتر کے بھاگ گیا تھا۔ اسے واپس آنا پڑا۔ نازو نے اسے بہت پریشان کیا تھا۔

"تمہیں معلوم ہے شریکِ حیات پر شریکِ سفر کو ترجیح دینے سے کیا ہوتا ہے؟" غالب نے چلا کے کہا۔

"کیا ہوتا ہے؟" نازو نے گھوڑے پر سے اتر کے کہا۔

"کچھ نہیں ہوتا" غالب نے متانت سے کہا اور اس جگہ کا معائنہ کرنے لگا جہاں سے خانہ بدوش ایسے غائب ہوگئے تھے جیسے انہیں زمین نگل گئی ہو۔

میں نے ادھر ادھر نظریں دوڑا کے کہا "یہاں تو نہ گھنا جنگل ہے اور نہ پہاڑ۔"

"ہاں جی' ہم دور دور تک دیکھ سکتے ہیں۔"

غالب نے کہا "میں تھانے دار صاحب سے اتفاق کرتا... وہ جن بھوتوں کا قبیلہ تھا' گدھے بھی بھوت تھے' صرف... اصل تھے جو اب تک موجود ہیں کیونکہ یہ غائب ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتے' باقی سب بھوت تھے۔"

نازو نے کہا "تم سکندر کے جذبات سے کھیل رہے ہو..."

"اچھا!" غالب نے خوش ہو کے کہا "وہ کیسے؟"

"رابعہ اور گل بھی تو غائب ہوئی ہیں۔"

"پھر تم ابھی تک کیوں موجود ہو یہاں؟" غالب نے... "ان کے ساتھ تمہیں بھی غائب ہوجانا چاہئے تھا۔"

آصف جاہ نے زمین پر بیٹھ کے کہا "وہ غائب نہیں ہو..."

"کیا مطلب؟" غالب نے ادھر ادھر دیکھا "وہ موجود... مگر نظر نہیں آرہے ہیں؟ کیا میں اندھا ہوگیا ہوں؟"

آصف جاہ مسکرایا "یہ دیکھئے' ٹائروں کے نشانات بہت ہیں مگر یہ ٹرک کے ٹائر ہیں۔ دو بہت زیادہ گھسے ہوئے ہیں لیکن... نسبتاً کم گھسے ہوئے ہیں۔ یہ ان کے نشان ہیں" اس نے زمین... ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہا "آپ غور سے دیکھتے جایئے۔... زمین ہے اس لئے نشان کچھ واضح نہیں ہیں مگر یہ تازہ نشا... ہیں۔"

"میں کچھ زیادہ سراغرساں نہیں ہوں" میں نے... "سمجھاتے جائیں کہ یہ نتیجہ آپ نے کیسے اخذ کیا۔"

"دیکھئے' گھاس دبی ہوئی ہے کہیں کہیں سے۔ آپ ہاتھ ڈالئے۔ یہ گھاس خشک ہے مگر سیدھی ہے۔ اس پر سے ٹرک کے پہیے گزرے ہیں اس لئے دب گئی ہے۔ کچھ دیر بعد یہ سیدھی ہوجائے گی۔"

میں نے کہا "ویری گڈ۔"

غالب نے سرہلا کے کہا "میں نے تو پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔"

"تم نے تو ٹرک کا نمبر بھی نوٹ کرلیا ہوگا" نازو نے کہا۔

میں نے آصف جاہ کی ذہانت کا اعتراف کرنے کے بعد... محسوس کیا کہ رابعہ اور گل سے بچھڑ جانے کا غم جو پہلے مجھ پر... کی طرح محیط تھا اب کچھ سمٹ کر ایک سنگِ گراں ہوگیا ہے۔ ان کے پھر مل جانے کی امید جو مایوسی کے گھپ اندھیرے... ڈوب گئی تھی' روشنی بن کے نظر آنے لگی ہے۔

میں نے کہا "کیا تمہیں یقین ہے کہ... ایسا ہی ہوا ہوگا؟"

"میں انہیں جانتا ہوں" آصف جاہ نے کہا۔

"اس قبیلے کو؟"

"ہاں۔ اس قبیلے کو اور ایسے ہر قبیلے کو۔ یہ ان کا پرانا... واردات ہے۔ یہ لوگ کسی جگہ خیمہ زن رہتے ہیں'... موقع...

...نے رہتے ہیں پھر اچانک اپنا کام دکھا کے غائب ہوجاتے ہیں۔"

"کیا کرتے ہیں یہ لوگ؟"

"چوری اور ڈکیتی۔ ان کی عورتیں گھروں میں جا کے دیکھتی... بچے بھیک مانگتے ہوئے گھر تاکتے پھرتے ہیں۔ ہر طرف سے... ہونے کے بعد یہ لوگ... گھر میں جھاڑو پھیر جاتے ہیں۔ سوئی... نہیں چھوڑتے... اور ایسے غائب ہوتے ہیں کہ کسی کی سمجھ... نہیں آتا۔"

"لیکن ہم نے ان کے پاس کوئی ٹرک نہیں دیکھا تھا۔"

"یہی تو کمال ہے ان کا' وہ ٹرک کو چھپائے رکھتے ہیں۔ سفر... لئے بیل گاڑیاں اور گدھے استعمال کرتے ہیں۔ ٹرک صرف... بار اچانک کہیں سے لے آتے ہیں اور اس میں مالِ غنیمت... ساتھ خود بھی چڑھ جاتے ہیں۔ ٹرک انہیں چالیس پچاس... دور کسی بھی جگہ اتار کے پھر غائب ہوجاتا ہے۔ اس کا مال... آہستہ آہستہ ٹھکانے لگاتے رہتے ہیں۔"

"ٹرک غائب کیسے ہوتا ہے؟" میں نے کہا۔

"کہیں چھپا دیا جاتا ہے' جہاں ان کا ڈیرا ہو اس سے دو چار... کے فاصلے پر' درختوں میں یا کسی کھنڈر میں۔ بعض اوقات یہ... فنکاری کا مظاہرہ کرتے ہیں ... ٹرک کے چاروں ٹائر نکال کے... جاتے ہیں' سیٹ نکال لیتے ہیں' لائٹس کھول لیتے ہیں' ایسا... ہے کہ ٹرک کا صرف ڈھانچہ پڑا ہوا ہے۔ جو دیکھتا ہے یہ... سمجھتا ہے کہ شاید پہلے کوئی حادثہ ہوا ہوگا۔ نکالنے والے ہر کارآمد... چیز نکال کے لے گئے۔ ٹرک عموماً زیادہ پرانا نہیں ہوتا مگر یہ... اس کا رنگ و روغن کھرچ دیتے ہیں یا جلا دیتے ہیں اور... دھوئیں سے کالا کردیتے ہیں۔ اس سے ڈھانچہ واقعی حادثے میں... شدہ نظر آتا ہے مگر جب ان کو ضرورت پڑتی ہے تو یہ چند... منٹوں میں ٹرک کی ہر چیز پھر فٹ کرلیتے ہیں' قابلِ استعمال... بنا لیتے ہیں۔"

غالب نے کہا "وہ انسانوں کے ساتھ گدھوں کو بھی اسی... ٹرک میں لے گئے؟"

"ان میں اور گدھوں میں کیا فرق ہے؟ ایک ہی طرح رہتے... ہیں جناب۔" آصف جاہ نے کہا۔

"یہ بیل گاڑیاں کیوں چھوڑ گئے؟" نازو نے کہا۔

"تمہارے لئے" غالب نے کہا "اس کو ایک حیوانی کار... سمجھو جس میں پیٹرول کا خرچ نہیں ہوتا' توانائی بیل فراہم کرتا... ہے۔"

"اور بیل بھی خرچ نہیں ہوتا" نازو نے اس سے اتفاق کیا۔

"یا تو وہ بیل گاڑی کہیں سے چرا کے لائے ہوں گے یا اپنے... ...چھوڑ گئے ہوں گے کہ موقع ملے تو بعد میں لے آئیں" آصف جاہ بولا۔

آصف جاہ کی پُراعتماد باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ قبیلے کا سراغ بھی لگالے گا۔ اس کی باتوں نے مجھے مخمصے میں ڈال دیا تھا۔.. میرا دل اس پر اعتماد کے حق میں تھا اور دل کی دلیل یہ تھی کہ اس نے اعتماد کے اظہار میں پہل کی تھی اور اپنے بارے میں سب کچھ بتادیا تھا۔ یہ بھی بتادیا تھا کہ وہ ہم سے کس حد تک واقف ہے۔ اگر اسے دھوکا دینا ہوتا تو وہ کوئی جھوٹ بولتا لیکن وہ نہ صرف یہ کہ میرا نام جانتا تھا اور غالب سے واقف تھا بلکہ وہ محسن کی مدد کرچکا تھا۔ اسے محسن کے بارے میں معلوم تھا۔ وہ رابعہ اور گل کو پھر ملوا سکتا تھا اور اس نے ہماری ہر ممکن مدد کا وعدہ کیا تھا لیکن اس کی شرط بہت عجیب تھی۔ عقل یہ کہتی تھی کہ اس گھر میں قدم نہ رکھو جس کا دروازہ صرف ایک ہو۔ جو اندر جانے کے بعد بند ہوجائے تو پھر باہر آنا اپنے اختیار میں نہیں رہتا۔

...خود کو دیدہ دانستہ پولیس کی تحویل میں دینا اور حوالات میں بند ہونے پر رضامند ہونا ایک خطرناک جُوا بھی ہوسکتا تھا جس میں اپنی جیت کے واضح امکانات کسی بھی غیر متوقع صورتحال کے پیدا ہونے سے ہار میں ڈھل سکتے تھے۔

آصف جاہ نے میرے قریب آکے آہستہ سے کہا "پھر کیا سوچا ہے تم نے؟ ابھی فیصلہ کرلو... میرے ساتھ چلو۔"

میں نے اچانک جُوا کھیلنے کا فیصلہ کرلیا "او کے شہزادہ آصف جاہ' میں ایک مسلمان کی حیثیت سے تمہاری نیت پر بھروسہ کرتا ہوں۔ میں ابھی اپنا ریوالور گراتا ہوں۔ تم مجھے دھکا دے کر اٹھالینا اور سب کو ہینڈز اپ کرالینا لیکن ذرا ہوشیاری سے' میرے ساتھی بہت خطرناک ہیں' خصوصاً وہ لڑکی۔"

"تم فکر مت کرو' ڈراما فیل نہیں ہوگا۔"

غالب اور نازو بہت اطمینان سے بیل گاڑی میں ڈرائیونگ کے امکانات کا جائزہ لے رہے تھے اور انہیں کسی سے بھی کوئی اندیشہ نہ تھا۔ سب کا اسلحہ بے مصرف ہوچکا تھا اور ایک شکست خوردہ سپاہ کی طرح وہ ذہنی طور پر بھی مکمل اطاعت قبول کرچکے تھے۔

وہ آصف جاہ کی آواز پر چونک کر پلٹے تو انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ میرا ریوالور آصف جاہ کے ہاتھ میں تھا جو اس نے میری پشت سے لگا رکھا تھا اور میں تصویرِ بے بسی بنا ہوا ہاتھ اوپر اٹھائے کھڑا تھا۔

"بہت ہوگیا کھیل" آصف جاہ نے گرج کے کہا اور اپنے فطری انداز میں چند گالیاں بھی دیں "اب پانسہ پلٹ گیا ہے۔ چلو اپنے ہاتھ اٹھالو' ذرا احتیاط کے ساتھ۔ میں قانونی طور پر گولی چلانے کا اختیار رکھتا ہوں' ایسے کسی مجرم کا کیس فوراً ختم ہوجائے تو مجھے خوشی ہوگی۔"

غالب اور نازو نے میرا اشارہ پا کے ہاتھ اٹھادئے۔

"تم کیا منہ اٹھائے کھڑے ہو۔ الو کے پٹھو' اب کس کا ڈر ہے تمہیں؟" آصف جاہ نے بڑی روانی سے اپنے ماتحتوں کی

شان میں ایک قصیدہ پڑھا جس میں ان کو آدمی کے سوا ہر دنام چوپائے کی نسل قرار دیا گیا تھا۔

انہوں نے ایک دم کندھوں پر سے بندوقیں اتار کے اپنی اپنی جیب میں سے میگزین نکالے اور انہیں لوڈ کرلیا۔ شکست کے یکلخت فتح میں بدل جانے کی خوشی ایسی تھی کہ وہ سب بے مہار ہونے لگے تھے۔

ایک نے غالب کو گالی دے کر کہا "ابھی ٹھنڈا کرتا ہوں تجھے' بہت گرم ہو کے بول رہا تھا تو۔"

دوسرا جذباتی ہونے والا شخص وہ تھا جس نے نازو کو اپنے گھوڑے پر بٹھانے کی غلطی کی تھی اور نازو نے اسے ذلیل کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

"کنجری' اب پتا چلے گا تجھے کہ..." وہ نازو کی طرف لپکا۔

"خبردار!" آصف جاہ نے کڑک کے کہا "سب اپنی جگہ پر... بالکل خاموش... کسی نے کوئی بدمعاشی دکھائی تو کھال کھینچ لوں گا اور زبان سے ایک بھی غلط لفظ نکالا تو زبان کھینچ لوں گا۔ بزدل' نامرد' اب بہادر بن رہے ہو۔"

ان سب کو سانپ سونگھ گیا۔

نازو نے آہستہ سے کہا "میرے لٹو... بجربٹو... بھاڑے کے ٹٹو۔"

اس نے کھا جانے والی نظروں سے نازو کو دیکھا مگر کچھ بولا نہیں۔

آصف جاہ نے حکم دیا "ان سب کی تلاشی لو..."

وہ پھر آگے بڑھے تھے کہ غالب اور نازو نے اشد...

"یہ لو لٹو" نازو نے اپنا ریوالور پھینک کے کہا "... کشتی کرنو۔"

غالب نے اپنا ریوالور بھی لٹو کو تھما دیا "دو مرتبہ لینا' ایک بار میری طرف سے بھی۔"

میرا ریوالور آصف جاہ نے پہلے ہی ضبط کرلیا تھا۔ ہم اب بالکل خالی ہاتھ تھے اور اس کے رحم و کرم پر رہ گئے تھے۔ ابھی تک غالب یا نازو کو بالکل اندازہ نہیں تھا کہ یہ سب کھیل ہے اور ایک جوا ہے جو میں نے ان سے مشورہ کئے بغیر کھیلا ہے' اب مجھے احساس ہونے لگا تھا کہ استحقاق رکھنے کے باوجود میں نے انفرادی فیصلہ کرکے اچھا نہیں کیا۔ مجھے مشورہ کرکے اتنا بڑا قدم اٹھانا چاہئے تھا۔ اگر اس کے نتائج میری توقع کے خلاف نکلے تو میں انہیں کیسے منہ دکھاؤں گا۔

لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ ہم نے جیتی ہوئی بازی ہار دی تھی اور ہم پھر قیدی ہو گئے تھے۔ ہمارے ہاتھ کمر کے پیچھے باندھ کے ہمیں واپس لے جایا جا رہا تھا اور اس مرتبہ محافظ بہت چوکس تھے۔ انہوں نے ہمیں پیدل چلنے پر مجبور کیا اور خود گھوڑوں پر سوار اپنے اپنے اسلحے کا رخ ہماری طرف کئے ہمیں ہر طرف سے محصور رکھتے ہوئے چلتے رہے۔ ان کے عزائم بہت واضح تھے۔ وہ معمولی سی غلطی یا غلط فہمی کو بہانہ بنا کے ہمیں مار دینا چاہتے تھے۔ انہوں نے ہم سب کو ایک ساتھ چلنے کی اجازت بھی نہیں دی تھی۔ جس ترتیب سے اب ہمارا جلوس جا رہا تھا وہ کچھ یوں تھی کہ نازو کو سب سے آگے رکھا گیا تھا۔ اس کے دائیں بائیں دو پولیس مین تھے۔ پھر غالب تھا اور اس کے پیچھے بھی دو پولیس والے تھے۔ آخر میں میرے پیچھے خود آصف جاہ تھا۔

تھکن سے میری حالت خراب تھی۔ مجھے ایک ایک قدم بھاری پڑ رہا تھا۔ تھکن کے ساتھ اب بھوک کا احساس بھی شامل ہو گیا تھا۔ اتنا پیدل چلنے اور اتنی مشقت جھیلنے کے بعد جسم کی محفوظ توانائی کا ذخیرہ بھی خرچ ہو چکا تھا' اب مجھے ان مویشیوں پر بھی رشک آ رہا تھا جو بڑی فراغت سے درختوں کے پتے چر رہے تھے۔ چلتے چلتے میں نے ان سب لوگوں کا تصور کیا جو کہیں فٹ پاتھوں پر' ٹھیلوں پر' چھوٹے بڑے ہوٹلوں میں ... کھا رہے تھے۔ چکن قورمے سے بریانی تک' تڑکا لگی ہوئی ... دال اور ماش کی سفید دال' بیسن کی روٹی اور اچار' مکئی کی روٹی' سرسوں کا ساگ اور مکھن۔ نہاری اور حلیم' بھیل پوری' چاٹ اور فش فوڈ۔ میں نے محسوس کیا کہ ہر نام کے ساتھ میرے تصور میں خوشبو بھی جاگ رہی ہے۔ مجھے اپنی من پسند چیزیں یاد آئیں اور وہ، جو رابعہ شوق سے کھاتی تھی' محسن کو کیا پسند تھا۔ میرے سارے خیالوں کا مجموعہ کھانے پینے کی اچھی اچھی چیزیں ہوگئی تھیں۔ میرا خیال ہے کہ میں کھلی آنکھوں کے ساتھ سو رہا تھا اور نیند میں چلتے ہوئے خواب میں سب دیکھ رہا تھا۔

غالب کی حالت مجھ سے بہتر نہیں ہو سکتی تھی لیکن نہ جانے کیوں اس وقت مجھے کسی کا خیال نہیں آیا۔ میں نے نازو کے بارے میں بھی نہیں سوچا۔ محسن کو یاد نہیں کیا' شہلا کا خیال نہیں آیا اور نہ رابعہ کا یا گل کا۔ میرے ذہن میں ایک خلا تھا اور میں ایک مشینی انداز میں قدم اٹھا رہا تھا۔ میرے پاؤں میرے ارادے کے بغیر حرکت کر رہے تھے۔ میرا دل تو چاہتا تھا کہ وہیں گر جاؤں اور سو جاؤں۔ شاید یہ آصف جاہ کی باتوں کا اثر تھا کہ میں احساس تحفظ کی آسودگی کا شکار ہو گیا تھا یا شاید وہ بے فکری تھی جو سب کچھ ہار دینے کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو۔ فکر اب بے سود تھی' آصف جاہ جو چاہے کرے' دغا کرے یا وفا کرے... میرے کرنے کو کچھ نہیں رہا تھا۔

بالآخر سفر تمام ہوا۔ معلوم نہیں وہ کتنی لمبی مسافت تھی' میں نے دائیں بائیں کچھ نہیں دیکھا۔ ہم کہاں سے گزرے اور کہاں پہنچے' اس میں کتنا وقت صرف ہوا۔ میں نے تو اس وقت خدا کا شکر ادا کیا جب در زنداں کھلا' حوالات کے آہنی سلاخوں والے دروازے کے پیچھے جاتے ہی میں فرش پر گر گیا اور دنیا سے بے خبر ہو گیا۔

جب کسی نے مجھے زور زور سے ہلانا اور جھنجوڑنا شروع کیا تو مجبوراً آنکھیں کھول کے دیکھا۔ اس سے پہلے میں کئی بار ... بدل کے سو گیا تھا لیکن جگانے والے زیادہ ڈھیٹ تھے۔ ... نے میرے چہرے پر ٹھنڈے پانی کا چھڑکاؤ کیا تو میں اٹھ ...

میرے سامنے آصف جاہ کا چہرہ آ گیا "بس اب اٹھ جاؤ۔"

میں نے جماہی لے کر کہا "کیا وقت ہوا ہے؟"

"رات کے آٹھ بج رہے ہیں" آصف جاہ نے کہا۔

"اچھا۔ یہ کون سی جگہ ہے؟"

"یہ تھانے کے ساتھ ہی میرے گھر کا ایک کمرا ہے۔"

میں نے سر جھٹک کے ادھر ادھر دیکھا "یہاں کیسے آ گیا میں' وہاں تو میں حوالات میں تھا' غالب اور نازو کہاں ہیں؟"

آصف جاہ نے کہا "وہ تمہارا انتظار کر رہے ہیں' چلو اٹھ نہا دھو لو۔"

میں نے کہا "میں بھوک سے ہلاک ہونے والا ہوں۔"

"پہلے نہا لو" اس نے مجھے کھینچ کر کھڑا کر دیا۔

"یہ غسل' آخری غسل نہ ہو جائے" میں نے احتجاج کیا مگر اس نے مجھے تولیہ تھما کے ایک غسل خانے میں دھکیل دیا۔

"نہانے کے بعد تم میرے کپڑے پہن سکتے ہو" اس نے کہا۔

میں جب غسل خانے سے برآمد ہوا تو واقعی بدلا ہوا آدمی تھا۔ میری آدھی تھکن سونے سے دور ہو گئی تھی۔ باقی آدھی گرم پانی کے ساتھ بہہ گئی۔ آصف جاہ کے صاف ستھرے کپڑے میرے سائز سے کچھ بڑے ہی تھے لیکن اس وقت ڈھیلے ڈھالے کپڑوں میں مجھے بہت آرام ملا۔

غالب اور نازو دوسرے کمرے میں بید کی کرسیوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ غالب نے بھی آصف جاہ کے کپڑے پہن لئے تھے مگر نازو نے بہت خوب صورت لال جوڑا پہن رکھا تھا۔ سرخ ساٹن کی شلوار' سرخ قمیص جس پر زرد گلاب بنے ہوئے تھے اور لال دوپٹہ۔ نہا دھو کے تازہ دم ہو جانے کے بعد نازو کا رنگ نکھر آیا تھا اور اس لال جوڑے میں اس کے حسن کی آب و تاب پر نگاہ نہیں ٹھہرتی تھی۔ نازو بہت عرصے کے بعد اپنے اصل روپ میں سامنے آئی تھی۔ غالب تو خیر مجسم نیاز بنا ہوا تھا' میں بھی دم بخود رہ گیا۔

"آخر کیا ہو گیا ہے آپ دونوں کو؟" نازو نے شرما کے کہا۔

میں نے کہا "جو نہ ہو جائے کم ہے' بخدا تم کو بیان نہیں کیا جا سکتا' صرف دیکھا جا سکتا ہے۔"

"چنانچہ ہم دیکھ رہے ہیں" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "تم گل لالہ' اور بیر بہوٹی اور شعلہ جوالہ وغیرہ لگ رہی ہو" باقی غالب سے سنو۔"

"ہاں۔ اس کے علاوہ تم... چقندر... ٹماٹر... لال مرچ بھی لگ رہی ہو" غالب نے کہا "تینوں چیزیں مجھے پسند ہیں۔"

نازو ہنس پڑی۔ وہ ہنسنا چاہتی تھی اور ہنستے ہوئے بہت اچھی لگ رہی تھی۔ مجھے رابعہ کی یاد آئی۔ اس کا وہ روپ یاد آیا جو میرے تصور میں ایک نقش دائم تھا۔ اس کی وہ نیلی ساری جس پر زرد بسنتی پھول کھلے ہوئے تھے۔ میں دل مسوس کے رہ گیا۔ کب سے ہم سب بے ساماں' بے گھر اور بے وطن تھے' راحت و آرام کے تصور سے بیگانہ تھے۔ زندگی کی ساری خوشیوں سے بے نیاز تھے۔ اچھے کپڑے' اچھی خوشبو' خوب صورت گیت' خوب صورت کتاب' اچھی سوسائٹی' اچھے ریسٹورنٹ' پیار کے جادو سے سلگتی شامیں' قرب کے لمحوں سے مہکتی چاندنی راتیں' یہ سب کہاں گئیں... آخر کہاں تک یہ سلسلہ چلے گا؟ پریشانی اور سختی حالات کا' دربدری کا اور آزمائشوں کا' فاقہ کشی اور سخت جانی کا' جدائی کے کرب مسلسل کا' آلام و مصائب کا۔ ہم کب واپس گھر جائیں گے' کب اپنا گھر بنائیں گے؟ ویران گھر کے بند دروازے انتظار کرتے ہیں... وزیر خان کا گھر آوازوں کا پیاسا ہے۔

غالب نے کہا "کیا ہو گیا ہے تجھے بھائی؟"

میں نے چونک کر اسے دیکھا "کچھ نہیں' بس ایسے ہی طبیعت اداس ہو گئی تھی' قنوطیت کا دورہ پڑ گیا تھا" میں نے خفت سے مسکرا کے کہا۔

"شرم آتی ہے یہ اعتراف کرتے ہوئے کہ رابعہ یاد آ رہی تھی۔"

میں نے ہنس کے کہا "ہاں وہ بھی... اور بھی سب یاد آ گیا جو تھا اور اب نہیں ہے۔ اچھے دن بھی اچھے خوابوں کی طرح ہو گئے ہیں نے... سارے خوابوں کی البم دیکھ رہا تھا۔"

"کیا فائدہ؟" غالب نے کہا۔

"فائدہ کیوں نہیں" نازو نے کہا "خواب نہ ہوں تو آدمی تعبیر کیسے مانگے۔ یہ خواب ہی تو اپنے مستقبل کا اثاثہ ہیں۔"

میں نے اسے حیرانی سے دیکھا۔ وہ عجیب لڑکی تھی' مایوس ہونا جانتی ہی نہ تھی' الٹا مجھے دلاسہ دے رہی تھی۔

"ہمارا میزبان کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

"باہر کچھ لینے گیا ہے' ہمارے کھانے کے لئے۔"

"تمہارا اس سے تعارف ہوا؟"

"ہاں' ابھی بات ہوئی ہے" غالب نے کہا۔

"کیا تم بھی سو گئے تھے؟"

غالب نے اقرار میں سر ہلایا "یہاں پہنچنے تک میری قوت ارادی کا فیول ٹینک بھی خالی ہو گیا تھا۔ معلوم نہیں میں راستے میں کیوں نہیں گرا تھا لیکن جب تم حوالات میں قدم رنجہ فرماتے ہی پڑ کے سو گئے تو بس اپنا حوصلہ بھی جواب دے گیا۔ سولی کا تو پتا

نہیں لیکن حوالات میں نیند آجاتی ہے' یہ دیکھ لیا۔"

"تمہیں کس نے اٹھایا؟"

"ان محترم خاتون نے" غالب نے نازو کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ واقعی جن کی بچی ہے' اسے نیند نہیں آئی۔"

"نیند کیسے آسکتی تھی' خوف اور پریشانی سے برا حال تھا۔ تم دونوں نے مجھے کچھ بھی نہیں بتایا تھا کہ یہ سب ڈراما ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ' مجھے بھی معلوم نہیں تھا۔"

"تمہیں معلوم تھا... ورنہ تم ایسی بے فکری سے نہ سوتے۔"

"اس میں کوئی شک نہیں کہ تم بہت خوب صورت لگ رہی ہو مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ایک بدصورت جھوٹ مجھ سے منسوب کردو۔ صرف سکندر کو علم تھا اس بات کا" غالب نے برہمی سے کہا۔

میں نے کہا "یہ بالکل ٹھیک ہے۔ میں نے خود ہی آصف جاہ کی بات سن کے یہ فیصلہ کیا تھا کہ اس کا مشورہ مان لینا چاہئے' حالانکہ اس میں بہت بڑا رسک تھا۔ مجھے مشورہ کرلینا چاہئے تھا' یہ احساس... بعد میں ہوا۔"

"کیا واقعی اس نے تم سے ریوالور چھین لیا تھا؟" نازو نے کہا۔

میں نے ہنس کے کہا "کیا تمہیں شک ہے؟"

"ہاں' مجھے شک ہے اس میں۔"

"تمہارا شک بجا ہے' یہ موقع اسے خود میں نے فراہم کیا تھا' پوری طرح مطمئن ہوجانے کے بعد۔"

"جب تم مطمئن تھے تو پھر رسک کیا تھا؟"

"رسک ہمیشہ رہتا ہے' معلوم نہیں کون جھوٹ ہے اور فریب ہے۔ اداکاری سے اور جعلسازی سے دوستی کی نقاب اوڑھ کر آجائے... دشمن جنگ میں ہر چال چل سکتا ہے" میں نے کہا۔

"میں جب حوالات میں اکیلی بیٹھی تھی تو بہت مایوس تھی کہ سب ختم ہوگیا۔ ایم آر ایس کے آخری تین شکاری بھی شکار ہوئے..."

"یہ ایک مایوس ذہن کا تجزیہ تھا" غالب نے کہا "ورنہ حقیقت یہ ہے کہ دشمن کا شکار شہلا کے سوا کوئی نہیں ہوا۔ وہ بھی اکیلی عورت تھی جس کو انہوں نے دھوکے سے پکڑلیا ورنہ بفضل خدا ایم آر ایس زندہ اور فعال ہے۔ گل اور رابعہ دشمن کی قید میں نہیں ہیں۔"

میں نے کہا "ہاں۔ وقتی طور پر ہم منتشر ہوگئے ہیں' محسن بھی قید میں نہیں ہے' ایک حادثے کے نتیجے میں ہم سے جدا ہوگیا تھا لیکن وہ اسی شدت سے ہماری جستجو کررہا ہے جتنی اسے کرنی چاہئے اور ہم بھی کررہے ہیں۔"

نازو نے کہا "ہم نے اسے تلاش کرنے کی بالکل کوشش نہیں کی۔"

میں نے کہا "بی بی' میں نے یہاں آنے کا فیصلہ اس وقت کیا جب مجھے معلوم ہوا کہ آصف جاہ نے اس کی مدد کی تھی اور وہ پھر اس سے ملوانے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔"

"اس نے یقین دلایا ہے کہ وہ رابعہ اور گل کو بھی تلاش کرے گا" نازو نے کہا۔

"تمہاری اس سے بات ہوئی تھی؟"

"ہاں۔ پہلے تو تین گھنٹے تک کسی نے خبر ہی نہیں لی تھی۔ میں زندگی میں پہلے کبھی اتنی پریشان نہیں ہوئی تھی اور نہ اتنی خوف زدہ' وہ لوگ بڑی گندی گالیاں بک رہے تھے۔"

"کیا آصف جاہ کہیں چلا گیا تھا؟"

"وہ کچھ دیر کے لئے گیا تھا۔ اور واضح الفاظ میں حکم دے گیا تھا کہ کوئی ہمارے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہ کرے۔ لیکن اس کے جاتے ہی سب پر شیطان سوار ہوگیا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ حوالات کے قفل کی چابی ان کے پاس نہیں تھی ورنہ وہ اندر آکے دست درازی..."

"کیسی باتیں کرتی ہو' ہم کیا مرگئے تھے!" غالب نے کہا۔

"تم... دونوں مرے پڑے تھے" نازو نے خفگی سے کہا "مجھے بہت غصہ آرہا تھا' تمہیں کچھ بھی معلوم نہیں بعد میں کیا ہوا۔ انہوں نے سامنے آکے مجھ سے کیا کچھ کہا' وہ کیسی کیسی فحش باتیں کرتے رہے' انتہائی بے شرم ہوگئے تھے وہ سب" نازو کا چہرہ لال پڑگیا تھا۔ اس کی زبان وہ سب کچھ تفصیل سے نہیں بتاسکتی تھی جو اس نے دیکھا تھا اور برداشت کیا تھا۔ وہ ایک دم رونے لگی۔

غالب تڑپ کے اٹھا۔ میری موجودگی کی پروا کئے بغیر اس نے نازو کے سر کو سینے سے لگالیا اور اس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں کو سمیٹنے لگا۔

"پاگل' اب رورہی ہو' اس وقت سب اکیلے برداشت کرلیا۔ مجھے بھی نہیں بتایا' تمہارے حوصلے پر مجھے رشک آتا ہے۔"

لیکن وہ بند ٹوٹ گیا تھا جو نازو نے اپنے آنسوؤں کے سیلاب کو روکے رکھنے کے لئے باندھا تھا۔ وہ بہت بہادر اور نڈر تھی' بے خوف اور حوصلہ مند تھی لیکن اندر سے وہ بھی عورت تھی' نازک' کمزور اور بے بس' حباب جیسا شیشے کا دل رکھنے والی' جذبات کی ہلکی سی آنچ سے پگھل جائے اور اشک بن کے بہہ جائے۔

اس کی فطرت اور مزاج کے تضادات کا یہ بھی ایک انداز تھا۔ وہ مشتعل ہوتی تھی تو غالب کو اٹھا کے پٹخ دیتی تھی اور نڈر تھی تو اسی کے بازوؤں کی پناہ میں رورہی تھی۔

چند منٹ میں یہ آنسوؤں کا دریا اترگیا' اب وہ محجوب نظریں جھکائے بیٹھی تھی اور اس کے چہرے پر جذبات کی معصومیت کا گلابی اجالا تھا۔

"سچ بتاؤ" میں نے کہا "کیا واقعی اس وقت تمہیں رونا نہیں آیا تھا؟"

وہ آہستہ سے مسکرائی "جب وہ کمینے مجھے تنگ کررہے تھے تو میں نے سوچا کہ ان کے کیا منہ لگنا' میں اپنے کان تو بند نہیں کرسکتی تھی۔ آنکھیں بند کرکے گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گئی تھی ذرا اس وقت تھوڑا سا رونا آیا تھا' زیادہ نہیں۔"

"ہاں۔ کچھ آنسو بچانے ہوں گے' اس وقت کے لئے جب رلائی چپ کرانے والا بھی ہو" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "یہ فائدہ ہوا سونے کا' وہ کتے بھونکتے رہے ہمیں پتا بھی نہیں چلا۔"

"مجھے بڑی شدت سے احساس ہوا کہ آدمی قید میں کتنا مجبور ہوتا ہے" نازو نے کہا "اسی بے بسی کا نام قید ہے جب آدمی اپنی مرضی سے کچھ نہ کرسکے۔ میرا دل چاہتا تھا کہ باہر نکل کے ان سب کے جبڑے توڑدوں اور ان کے سارے کس بل نکال دوں لیکن سلاخیں اور قفل درمیان میں حائل تھے۔ جب آصف جاہ واپس آیا تو میری جان اس عذاب سے چھوٹی۔"

"کیا وہ حوالات میں آیا تھا؟"

"ہاں۔ اس نے رات ہونے سے پہلے ہی باقی سب کی ڈیوٹی لگادی تھی... کہ ان خانہ بدوشوں کا پتا چلاؤ صبح ہونے سے پہلے۔ دو پارٹیاں بنادی تھیں۔ دونوں کو الگ الگ بھیج دیا۔ وہ بہت پریشان ہوئے تھے لیکن حکم ٹال نہیں سکتے تھے' تھانے میں ایک رہ گیا تھا جس کی ڈیوٹی تھی۔"

غالب نے کہا "اس کے سامنے ہی تھانے دار صاحب حوالات میں آگئے تھے؟"

نازو ہنسی "نہیں بھئی' جو ایک بچا تھا وہ بھی سب کی طرح بہت تھکا ہوا تھا اور تھانے دار صاحب نے اسے گولی دے دی تھی' گولی..."

"ہاں۔ نیند کی گولی' چائے میں گھول کے پلادی۔ وہ بالیٹ گیا تو آصف جاہ سات بجے کے بعد اندر آیا تھا۔ اس وقت حوالات میں گھپ اندھیرا تھا۔ میں بہت ڈری کہ سپاہی تو کسی حد تک بے اختیار تھے اور اندر نہیں آسکتے تھے۔ یہ نہ جانے کیا کرے گا۔ وہ لالٹین لے کر آیا تھا۔ میں نے کہا کہ تھانے دار صاحب' میرے قریب مت آنا' تس نس کردوں گی' وہ ہنسنے لگا کہ 'نہیں' مجھے تو بہت پہلے آنا چاہئے تھا لیکن میں کیا کروں' ان کو رخصت کرکے آیا ہوں' میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی کچھ دیکھ پائے۔ اسی لئے آپ کو اتنی دیر تک یہاں تکلیف اٹھانی پڑی۔ مجھے پہلے تو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا تھا لیکن پھر اس نے وضاحت کردی اور کہنے لگا کہ چلو میرے ساتھ۔"

"تو انہوں نے مجھے جگادیا کہ دیکھو جی۔ یہ مُوا مردوا مجھ سے کہتا ہے کہ میرے ساتھ چلو" غالب نے کہا۔

"مجھے کیوں نہیں جگایا؟" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"آصف جاہ نے کہا کہ پہلے تم لوگ نہا دھولو' پھر اتنی دیر اور سولیں" غالب نے کہا۔

"یہ لال جوڑا کس کا ہے؟" میں نے کہا۔

"اس کی بیوی کا۔ وہ آج کل میکے گئی ہوئی ہے۔"

"مزہ آجائے اگر وہ آج ہی لوٹ آئے اور تمہیں دیکھ لے ان کپڑوں میں" غالب نے کہا۔

"یار' یہ شہزادہ کب واپس آئے گا' جب ہم سب بھوک سے دم توڑ چکے ہوں گے۔ کیا گھر میں کوئی بندوبست نہیں ہوسکتا تھا؟"

"میں نے تو کہا تھا کہ جو کچھ ہے میں پکالیتی ہوں لیکن اس نے کہا کہ ابھی تمہاری حالت ایسی نہیں کہ ہانڈی چولہا کرو ورنہ میں کچن دکھادیتا کسی تکلف کے بغیر" نازو نے کہا۔

آصف جاہ سوا نو بجے آیا تو اس کے پیچھے ایک داڑھی والا اندر آگیا جس نے چادر کو بگل کے انداز میں لپیٹ رکھا تھا۔ وہ دیہاتی وضع کے کرتے اور پاجامے میں تھا اور جوان آدمی تھا جس کی صحت قابل رشک تھی۔ اس کے بال لمبے اور کالے تھے اور تیل سے چمک رہے تھے۔ اس نے اپنی آنکھوں میں بڑی فراخ دلی سے سُرمہ ڈالا تھا۔ اس کے پیچھے سفید لٹھے کے برقعے میں کوئی عورت تھی۔

مولانا نے بڑی قرأت کے ساتھ السلام علیکم کہہ کے چادر اتاری اور اندر سے برآمد ہونے والا ٹفن کیریئر زمین پر رکھ کے مجھ سے بغلگیر ہوگیا۔ میرے بعد اس نے غالب کو گلے لگایا۔ بے حد اپنائیت اور جوش و خروش کے ساتھ اس نے ہم دونوں سے مصافحہ بھی کیا۔

"یہ عنایت اللہ ہے' میرا بہنوئی" آصف جاہ نے کہا "اور یہ میری بڑی بہن ہے زینب۔"

زینب نے اتنی دیر میں اپنا برقع اتار کے رکھ دیا تھا۔ وہ بھی گوری چٹی اور صحت مند عورت تھی جو موٹاپے کی طرف مائل تھی۔ میں نے اس کی عمر کا اندازہ چالیس پینتالیس کے درمیان کیا۔ وہ بھی برقعے کے اندر برتن چھپا کے لائی تھی۔ پیتل کی ایک بالٹی میں دودھ تھا اور کانسی کی چمکتی ہوئی نزوی میں' سفید اُجلا مکھن نظر آرہا تھا۔

اس نے بڑی محبت کے ساتھ نازو کو سینے سے لگا کے کئی بار چوما "خیر ہووے پُتر' مجھے تو آصف نے بتایا کہ اپنے پاکستان سے مہمان آئے ہیں' اور خیر سے سب لہور کے رہنے والے ہیں۔"

جب اس نے لاہور کو لہور کہا تو مجھے کوئی شبہ نہ رہا کہ وہ خود بھی لہور کی رہنے والی ہوگی یا گردونواح کی۔ شک مجھے آصف کے لہجے پر بھی ہوا تھا مگر اس کی اُردو میں پنجاب کا اثر بہت کم رہ گیا تھا۔

نازو نے چہرے پر سے تھوک صاف کرتے ہوئے کہا "آپ بھی لاہور کی ہیں جی؟"

زینب نے ایک سرد آہ بھری "نہیں پتر' لہور کے رب والے ہوتے تو ادھر کیوں لجا، خوار ہوتے۔ اپنا گھر تو امرتسر میں تھا۔ جب پاکستان بنا تو سوچا تھا لہور چلے جائیں گے۔ اپنے بہت لوگ تھے ادھر بھی لیکن سکھوں نے ماں باپ کو شہید کر دیا۔ ہم دو بہن بھائی بچ گئے۔ آصف تو بالکل اتنا تھا" اس نے دو ہاتھوں کے درمیانی فاصلے سے آصف کو تقریباً ایک لوٹے کے برابر ثابت کیا۔

"آپ بھی چھوٹی ہی ہوں گی؟" نازو نے کہا۔

"ہاں۔ مجھے اتنی سمجھ تو نہیں تھی پتر کہ خود آصف کے ساتھ لہور چلی جاتی۔ ایک بندہ تھا' رب اس کا بھلا کرے' اس نے ہمیں بوری میں ڈال کے ریڑھی پر رکھا اور ادھر سے نکال لیا۔ اچھے برے بندے سب جگہ ہوتے ہیں' وہ کون سا رشتے دار تھا ہمارا' بس ماں اس سے سبزی ترکاری لیتی تھی۔ اس نے ایک جاننے والے کے گھر پہنچا دیا۔ وہاں سے بس تقدیر ہمیں آگے ہی آگے لے گئی۔ خیر چھوڑو' یہ تو بڑی لمبی کہانی ہو گئی' تم کھانا کھا لو بیٹھ کے سب۔"

آصف ہنسنے لگا "شکر ہے تجھے خیال تو آیا کہ یہ بھی ... "

"ہائے تو ... میں نے خیریت بھی نہ پوچھی ... "

... کر مسکراتے ہوئے کہا اور بڑی محبت ...

... پلیٹوں میں کھانا ڈال کے رکھنے لگی۔ زینب کی موجودگی میں ہم سب زیادہ بے تکلفی کا مظاہرہ کرنے سے قاصر تھے۔ میں نے خاصی کوشش سے کھانے کو حلق سے اتارنے کی رفتار پر قابو پایا ورنہ میرے پیٹ کا خلا تو مطالبہ کرتا تھا کہ میں سب کچھ ایک ساتھ حلق کے راستے معدے میں ڈال دوں۔

اب زینب نے گفتگو کا دوسرا راؤنڈ شروع کیا جس کا مقصد ہم سے تفصیلی تعارف حاصل کرنا تھا۔ سب سے پہلے اس نے عام عورتوں کی طرح رشتوں کی انکوائری کی۔ آصف نے اپنے بہن بہنوئی کو ہمارے متعلق کچھ بھی نہیں بتایا تھا سوائے اس کے کہ ہم پاکستان سے آئے ہیں مگر یہ بات کسی کو بھی معلوم نہیں ہونی چاہئے ورنہ ہم مشکل میں پڑ جائیں گے کیونکہ ہمارے پاس دہلی' لکھنؤ اور آگرہ جانے کا ویزا تھا' قانوناً ہم بمبئی آنے کے مجاز نہیں تھے۔

"خیر سے تیرا گھر والا کون ہے؟" زینب نے سادگی سے پوچھا۔

شاید اس سوال پر لقمہ نازو کے حلق میں اٹک گیا ہو گا۔ اس نے بڑی مشکل سے سر اٹھا کے غالب کی طرف دیکھا۔

"اچھا اچھا" زینب نے جواب کو سمجھتے ہوئے سر ہلایا۔ غالب بڑی ڈھٹائی سے مسکرا رہا تھا اور نازو کی بے بسی پر بہت خوش نظر آتا تھا۔

"کوئی دھی پتر ہے؟" زینب نے کہا۔

"جی... جی نہیں" نازو نے لال ہو کے جواب دیا اور غالب کی طرف دیکھنے سے گریز کیا۔

"اچھا... کب ہوئی ہے شادی؟" زینب نے کہا۔

"جی۔ ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا" نازو نے کہا۔

"کتنا عرصہ ہوا ہے؟" زینب اپنے زنانہ حساب کتاب کے لئے شادی کے بعد گزرنے والے مہینوں اور دنوں کی صحیح تعداد جاننا چاہتی تھی۔

نازو بری طرح پھنس گئی تھی اور مجھے اندازہ تھا کہ غالب کی ہنسی پر وہ اندر ہی اندر کسی آتش فشاں کی طرح کھول رہی ہو گی۔

اس نے نوالہ نگل کے کہا "جی... چھ سات مہینے۔ آٹھ مہینے ..."

"ہا..." زینب منہ پر ہاتھ رکھ کے بولی "چھ سات یا آٹھ... ابھی کون سے برس گزر چکے ہیں کہ یاد نہیں۔"

غالب نے بڑی مستعدی سے کہا "جی' میں بتاتا ہوں' یہ تو ہے بے وقوف۔ حساب کتاب میں بھی اتنی ہی کمزور ہے جتنی ... آج ہوئے ہیں پورے سات مہینے سات دن۔"

"سات گھنٹے' سات منٹ اور سات سیکنڈ بھی بتا دو" نازو نے اسے پھاڑ کھانے والی نظروں سے گھور کے کہا۔

"نا پتر' غصہ نہیں کرتے' یہی تو دن ہوتے ہیں ہنسی مذاق کے' ویسے بھی شوہر کا بڑا مقام ہے' تیرا مزاجی خدا ہے" اس نے مجازی کو مزاجی بناتے ہوئے نازو کو بزرگانہ تلقین کی۔

"یہ بات کہاں سمجھتی ہیں جی آج کل کی لڑکیاں' ان کو تو بس فیشن کرنا آتا ہے اور باتیں کرنا" غالب نے کہا۔

زینب نے ہنستے ہوئے میری طرف اشارہ کیا "یہ کون ہے؟"

"یہ بھائی ہے میرا؟" غالب نے کہا۔

"شادی ہو گئی ہے" زینب نے کہا۔

ان کے بولنے سے پہلے میں نے نفی میں سر ہلا دیا "نہیں جی۔"

نازو نے فوراً کہا "بات تو پکی ہو گئی ہے۔ ہو جائے گی اب شادی بھی' بہت جلد۔"

"اللہ کرے گا خیر سے" زینب نے کہا "ماں پیو ہیں؟"

نازو نے نفی میں سر ہلایا "سب اللہ کو پیارے ہو گئے۔"

"سب کے سب... تمہارے بھی؟" زینب نے افسوس سے کہا۔

میں نے اقرار میں سر ہلایا "عنایت دو زانو خاموش بیٹھا جھومتا رہا۔ کبھی کبھی وہ آنکھیں بند کر کے لمبی سانس کھینچتا تھا اور منہ اٹھا کے کہتا تھا "فضل... فضل... یا رب فضل۔"

گفتگو کے دوران اس کی آواز پر ہم سب چونک پڑتے تھے لیکن اسے قطعی احساس نہیں ہوتا تھا۔ اس کے استغراق کی کیفیت بڑی عجیب تھی لیکن میں نے اس کے بارے میں کوئی سوال کرنے سے گریز کیا۔ جب زینب ہمارے لئے چائے بنانے ...

... آصف نے کہا۔

"زینب کا گھر والا بہت پہنچا ہوا پیر ہے۔"

میں بھونچکا رہ گیا "پیر!"

"ہاں۔ پیر عنایت کے عقیدت مند بہت ہیں' ہندو بھی اور ... بھی" آصف جاہ نے کہا۔

اب غالب اور نازو بھی عنایت کو ایسے دیکھ رہے تھے جیسے وہ ... نہیں قدرت کا کوئی عجوبہ ہے۔ اس نے آصف جاہ کی ... تھی یا نہیں' اس کا پتا عنایت اللہ کی صورت سے نہیں ... تھا۔

"ہر جمعرات کو سائل حاضری دیتے ہیں۔"

"نذرانے بھی لاتے ہوں گے؟" میں نے کہا۔

آصف نے کہا "نہیں' پیر عنایت صرف عنایت کرتا ہے۔ ... کے مال پر۔ پیر عنایت کی عنایت سے سب کی مرادیں پوری ... ہیں۔"

میں پوچھنا چاہتا تھا کہ کیا خدا سے خود دعا مانگنے والوں کی مراد پوری نہیں ہوتی مگر میں نے آصف جاہ کے جذبات کا ... کرتے ہوئے اس پیر کا تمسخر اڑانے سے گریز کیا۔ ایسے پیر ... ان کے ساتھ ایسی ہی عقیدت رکھنے والے سادہ لوح انسان ... نہیں ہوتے۔ ان کی پیری مریدی کا سارا سلسلہ عموماً ایک ... رانہ کھیل ہوتا ہے جس کا مقصد سیدھے سادے لوگوں کے ... ات کو کیش کرانے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ میں نے سائیں ... والے کا پورا ڈراما دیکھا تھا اور سارے ہندوستان پاکستان کے ... کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا مگر میں کھلم کھلا پیر ... کو فراڈ نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس کے استغراق اور کشف ... کی حقیقت کو سمجھے بغیر ایسا کہنا انتہائی نامناسب بات ... ۔ وہ آصف جاہ کا بہنوئی بھی تھا اور اس کا دہرا جذباتی رشتہ ... احترام اور عقیدت کی بنیادوں پر مضبوطی سے استوار تھا۔

ہم کھانے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ زینب ہمارے لئے ... دودھ والی صحت بخش چائے لے آئی۔

"خیر سے کب واپس جاؤ گے؟"

"کل صبح ہوتے ہی" میں نے کہا۔

"ہائے اتنی جلدی' میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا" وہ بڑے ... ست ہاتھ مل کے بولی۔

میں نے کہا "اتنی محبت کے بعد کرنے کو کیا رہ جاتا ہے۔"

"دو چار دن ٹھہر جاتے نا!" اس نے بڑی حسرت سے کہا۔

میں نے شرمندہ ہو کے کہا "وقت نہیں ہے..."

"ایک بات تو میں نے پوچھی ہی نہیں' تم آصف کو کیسے ... ہو؟" زینب نے کہا۔

"ہم کسی اور سے ملنے آئے تھے لیکن اس کے بجائے ... سے ملاقات ہو گئی" میں نے وضاحت کی "رات ہو گئی تھی اس لئے رک گئے۔"

زینب نے اپنا برقع سنبھالتے ہوئے کہا "اچھا پھر آنا اور اپنی گھر والی کو بھی لانا۔"

میں نے کہا "ضرور لاؤں گا۔"

"اور رات کو سونے سے پہلے دودھ گرم کر کے پی لینا ضرور۔"

اس کی بے لوث محبت کے مظاہرے نے مجھے اداس کر دیا۔ ایسے سادہ دل لوگ بھی ہیں اس دنیا میں جو کسی شک کے بغیر ہر جھوٹ کو تسلیم کر لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ دنیا میں سب سچ بولتے ہیں۔ ہم نے اسے سب کچھ غلط بتایا تھا۔ اگر اسے معلوم ہو جاتا کہ ہم کون ہیں اور کیا کرتے رہے ہیں تو شاید اسے یقین ہی نہ آتا۔ وہ چوہدری دلاور اور تریوینی یا طوترہ جیسے لوگوں کی دنیا کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کیونکہ اس کی اپنی دنیا بالکل مختلف اور محدود تھی۔ اگر ہم اسے اول تا آخر اپنی زندگی کے حقائق سمجھانے کی کوشش کرتے تو کبھی نہ سمجھا پاتے۔ وہ سمجھتی کہ یہ سب جھوٹ ہے' ایسا کیسے ممکن ہے کہ نازو جیسی سیدھی سادی نظر آنے والی لڑکی ایک ساتھ چار مردوں سے بھڑ جائے تو انہیں مار مار کے لٹا سکتی ہے اور ہاتھ مار کے ان کی سانڈ جیسی گردنیں توڑ سکتی ہے۔ اور ہم سب جو اتنے معصوم لگتے ہیں گزشتہ رات ہی قتل و خونریزی کا ایک ایسا معرکہ سر کر چکے ہیں جس میں مشین گن سے دستی بم تک بہت کچھ استعمال ہوا تھا۔

پیر عنایت نے کوئی وظیفہ پڑھ کے ہم پر پھونکا اور کہا "اللہ اپنا فضل کرے گا' کفار سے محفوظ رکھے گا۔"

اتنی دیر میں یہ واحد جملہ تھا جو اس نے بولا تھا۔ ہمارے لئے یہ بھی غیر ضروری تھا کیونکہ ہمارا راسخ عقیدہ یہی تھا لیکن اس کی بات نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ بطور خاص کفار کے خلاف تحفظ کی دعا سے یہ ظاہر ہوتا تھا جیسے خطرہ صرف انہی سے لاحق ہے۔ حالانکہ ہم جس جنگ میں شریک تھے وہ کوئی معرکۂ کفر و اسلام نہیں تھا۔ ہماری جنگ غداروں سے تھی جن میں چوہدری دلاور' پیڈرو اور حاجی عبداللہ کے علاوہ بھی ہمارے بہت سے ہم وطن شامل تھے اور ان کا ساتھ دینے والے تریوینی یا طوترہ جیسے لوگ ہمارے دشمن اس لئے نہیں ہوئے تھے کہ ہم مسلمان تھے۔ یہ مذہب کی نہیں مفادات کی جنگ تھی' ہمارے دشمنوں کے لئے مالی مفادات کی اہمیت ایمان سے' جذبات' حب الوطنی سے' شرافت اور انسانیت کے اصولوں سے زیادہ تھی چنانچہ وہ ایک ہو گئے تھے۔ انہیں متحد کرنے والی قوت صرف دولت تھی جب کہ ہمارے مقاصد کی سمت اس کے برعکس تھی۔

پیر عنایت نے بغل مارنے سے پہلے پھر مجھے اور غالب کو گلے لگایا۔ رات کے سوا دس بجے وہ رخصت ہوئے تو مجھے پھر آصف سے بات کرنے کا موقع ملا۔

"آخر تم نے انہیں کیوں تکلیف دی..."

"تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میں نے ان کو تمہارے بارے میں کیوں بتایا؟" آصف نے میری بات کاٹ دی۔

"چلو ایسے ہی سمجھ لو۔"

"کیا اس سے کوئی فرق پڑتا ہے؟ نہ تم نے انہیں کوئی بات سچ بتائی نہ میں نے" آصف نے کہا۔

"دیکھو نا' ہمیں خواہ مخواہ جھوٹ تو بولنا پڑا" غالب نے کہا۔

"ہم سچ کیسے بول سکتے تھے؟" نازو نے کہا۔

میں نے طنزیہ لہجے میں کہا "خیر پیر صاحب کو پتا چل گیا ہوگا ہمارے جھوٹ کا۔"

آصف کا رنگ کچھ متغیر ہوا "تم ان کا مذاق اڑا رہے ہو اس لئے کہ تم پیروں پر اعتقاد نہیں رکھتے۔"

"ہاں۔ اس سے ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا' ہم خدا سے دعا کرتے ہیں اور وہ ہماری بھی سنتا ہے" غالب نے کہا۔

"اپنا اپنا عقیدہ ہے۔ میں گناہ گار ہوں اور میں ڈرا ہوا تھا۔ میں نے پیر عنایت سے تمہارے لئے اللہ کا فضل مانگا تھا۔ مجھے اس کی دعا کی ضرورت تھی۔ تم نہیں جانتے' پیر عنایت کی دعا کے اثر کو' میں جانتا ہوں۔ اپنی اور تمہاری حفاظت کے لئے مجھے اس کی مدد حاصل ہوگئی' اب میں کچھ مطمئن ہوں" آصف جاہ نے کہا۔

"پھر تم نے اس سے کیوں جھوٹ بولا؟" غالب نے کہا۔

"میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔"

"تم نے جھوٹ سنا اور اس کی تردید نہیں کی اور اس کے بعد پیر صاحب کی دعا پر بھروسہ کرتے ہو۔ اس کی مدد پر انحصار کر کے مطمئن ہو۔ بات تو تب تھی کہ تم اسے سب سچ بتا دیتے اور پھر دیکھتے کہ وہ کیا کرتا ہے۔ خیر' اب چھوڑو اس بات کو۔" میں نے کہا۔

لیکن آصف جاہ نے کہا "جیسے تم اپنے متعلق سچ نہیں بول سکتے تھے' ایسے ہی میں بھی مجبور ہوگیا تھا کہ تمہارے جھوٹ کی پردہ پوشی کروں۔"

"تمہیں کس کا ڈر تھا؟ وہ تمہاری بہن تھی۔"

"ڈر تو ہمیشہ رہے گا' تمہارے جانے کے بعد بھی میں ڈرتا رہوں گا کہ کہیں میرا راز فاش نہ ہو جائے' مجھ پر یہ الزام نہ آجائے کہ میں نے مسلمان دہشت گردوں کی مدد کی۔"

"مگر تم اس الزام سے کیسے بچو گے؟ تم جانتے ہو کہ تمہارے دشمن کون ہوں گے" میں نے کہا "وہ بہت با اثر اور طاقت ور لوگ ہیں۔ یہی فردِ جرم عائد کریں گے وہ تم پر۔"

"ہاں' شاید ایسا ہی ہوگا۔۔۔"

"تم ڈرتے تھے تو تمہیں کوئی ضرورت نہیں تھی ہماری مدد کرنے کی" غالب نے کہا۔

"یہ بھی تو ناممکن تھا کہ میں کچھ نہ کرتا" وہ ایک گہری سانس لے کر بولا "مجھے حکم ہوا تھا۔"

"حکم ہوا تھا' کس کی طرف سے؟" نازو نے کہا۔

"پیر صاحب کا حکم تھا" وہ سر جھکا کے بولا "پیر عنایت نے کہا تھا کہ تین مسافر آئیں گے' ان کے ساتھ ایک عورت ہوگی وہ راستہ بھول گئے ہیں جنگل میں' ان کو راستہ دکھانا' یہ ان کی طرف سے تیری آزمائش ہوگی پھر وہ اپنا فضل کرے گا۔"

میں دم بخود اس پولیس سب انسپکٹر کو دیکھتا رہا جس کے نزدیک اپنے بہنوئی اور پیر کے فرمان کی اہمیت اتنی زیادہ تھی کہ وہ اپنے فرض کو قربان کرنے پر تیار ہوگیا تھا اور اس نے اپنی بہن کو ہی نہیں زندگی کو بھی خطرے میں ڈال دیا تھا۔ اچانک پیر عنایت میرے لئے بھی ایک پُراسرار شخص بن گیا۔ آخر اس نے یہ بات کیسے کہہ دی تھی؟ اسے کیسے معلوم ہوگیا تھا ہمارے بارے میں؟ کیا یہ محض اتفاق تھا؟ اس نے ایک عام سی بات کہی تھی' آصف جاہ کو جنگل میں گھومتے پھرتے کہیں بھی چار مسافر مل سکتے تھے مگر اس نے تین مردوں کا ذکر کیا تھا اور ایک عورت کا۔ ہم میں' غالب اور محسن تھے' عورت نازو تھی۔ محسن الگ ہوگیا تھا' ہم بعد میں لیکن اس نے پیر صاحب کی بات کو ذہن میں رکھا تھا اور وہ ہمارے درمیان رابطے کا ذریعہ بن گیا تھا۔

"ہم تو دو مرد ہیں' ایک عورت" غالب نے کہا۔

"تیسرا کل ملا تھا" آصف جاہ نے میرے خیالات کی تائید کردی "اور اس نے مجھے تمہارے متعلق بتایا تھا۔"

"کیا بتایا تھا؟"

"یہی کہ وہ تم سے بچھڑ گیا ہے اور اسے تمہاری تلاش ہے۔ اسے یقین تھا کہ تم لوگ اسی علاقے میں ہو" آصف جاہ نے کہا۔

"اگر اس نے ہمارے متعلق بتایا ہوگا۔ تو دو مردوں اور دو عورتوں کا ذکر کیا ہوگا" نازو نے کہا۔

"ہاں' دو مرد اور تین عورتیں۔"

"پھر تمہارے پیر صاحب کی بات تو غلط ہوگئی نا کہ تین مرد ہوں گے اور ایک عورت" نازو نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔

"غلط کیسے ہوگئی؟" آصف جاہ بولا "مجھے تو تین مرد ملے ان کے ساتھ تم ایک عورت ہو' انہوں نے بالکل ٹھیک فرمایا تھا۔"

نازو لاجواب ہوگئی' میں نے اسے اشارے سے بحث نہ کرنے کو کہا۔ پیر عنایت پر آصف جاہ کے اعتقاد کو دلائل اور منطق رد و کد سے بدلا نہیں جا سکتا تھا۔ یہ بھی ایک عجیب اتفاق تھا کہ رابعہ اور گل کے جدا ہو جانے کے بعد پیر عنایت کی بات درست ثابت ہو چکی تھی۔

میں نے کہا "محسن تمہیں کہاں ملا تھا اور کیسے ملا تھا؟"

اس نے کہا "میں اس علاقے میں گشت پر تھا۔ مجھے اطلاع ملی ... ہوا تھا کہ کچھ دور بستی میں ڈاکوؤں نے بڑی تباہی مچائی ہے' ان کی تصویر والا اخبار بھیج دیا گیا تھا اور انہیں ہر جگہ تلاش کرنے کا حکم بھی ملا تھا۔ اس علاقے کی ساری پولیس کو الرٹ کیا گیا تھا کہ یہ ڈاکو جہاں ملیں انہیں زندہ گرفتار کرنے کی کوشش کی جائے۔ رات کے وقت میں نے شہر کی طرف سے آنے والی ایک گاڑی کو روکا۔"

"شہر کی طرف سے آنے والی' یا شہر کی طرف جانے والی؟"

"وہ شہر کی طرف سے آئی تھی" آصف جاہ نے کہا "میں نے روکنے کی کوشش کی تو انہوں نے رفتار بڑھادی۔ میں نے اور گاڑی کا ایک ٹائر پھاڑ دیا۔ گاڑی جب رکی تو اس میں تین آدمی نکلے' ان میں ایک تمہارا دوست محسن تھا۔"

"اور باقی دو کون تھے؟" نازو نے اونگھتے اونگھتے چونک کر کہا۔

"وہ محسن کو واپس لائے تھے' تاکہ وہ تمہاری گرفتاری میں مدد دے" آصف جاہ نے کہا۔

"ہماری گرفتاری میں محسن کیسے مدد کر سکتا تھا؟"

"انہوں نے محسن کو بے وقوف بنا کے دھوکا دینے کی کوشش کی تھی۔ ان کو یہ تو معلوم ہی تھا کہ محسن کو پولیس نے پکڑ لیا ہے وہ اس کو چھڑانے گئے۔۔۔۔"

"کیا وہ دشمنوں کے آدمی تھے؟" نازو نے سوال کیا۔

"نہیں" غالب نے اسے گھور کے دیکھا "وہ بھوت تھے اور اس کے دوست تھے۔"

نازو نے خفت اور برہمی کے ساتھ غالب کو دیکھا "فضول نہ بولا کرو۔"

"تم نے ایک فضول سوال کیا تھا" غالب نے کہا "اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تمہارا دماغ کام نہیں کر رہا ہے' تمہیں نیند آرہی ہے۔"

"مجھے نیند نہیں آرہی ہے" نازو نے بضد ہو کے کہا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے کہ تمہیں سو جانا چاہئے" میں نے کہا "ہم دونوں کچھ نیند لے چکے ہیں۔"

"سو جاؤں گی جب مجھے ضرورت محسوس ہوگی" نازو نے کہا۔

"چلو تم آگے سناؤ" میں نے کہا۔

آصف جاہ نے سرہلایا "ان دونوں نے سائمن سے رابطہ کیا تھا اور دو لاکھ نقد میں محسن کا سودا کرلیا۔ محسن انہیں پہچانتا نہیں تھا۔ انہوں نے محسن کو اپنے ساتھ لے جانے کے لئے یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ بھی مسلمان ہیں۔ پھر انہوں نے تم سب کے بارے میں بتایا اور یہ ظاہر کیا کہ یہاں بھارت میں بھی بہت سے حمایتی ہیں جو تم لوگوں کی مدد کریں گے۔ انہوں نے محسن کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا تھا۔ ان کو یقین تھا کہ اس طرح وہ محسن کے ساتھ تم سب تک رسائی حاصل کرلیں گے۔ وہ زبردستی کرتے اور تشدد کے ذریعے محسن سے کچھ پوچھنے کی کوشش کرتے تو کبھی کامیاب نہ ہوتے۔ شاید یہ بات وہ خود بھی جانتے تھے چنانچہ انہوں نے وقت ضائع نہیں کیا اور اسے جھوٹ کے جال میں گرفتار کرلیا۔ محسن نے انہیں بتادیا کہ باقی سب لوگ اسی علاقے میں کہیں روپوش ہیں۔"

"کیا محسن کو معلوم نہیں تھا کہ وہ لوگ اسے سائمن سے دو لاکھ میں خرید کر لے گئے تھے؟"

"نہیں۔ نہ سودا محسن کے سامنے ہوا تھا' نہ اس کے سامنے ادائیگی کی گئی تھی۔ محسن تو صرف یہ جانتا تھا کہ اسے پولیس کی تحویل سے چھڑا کر اپنے ساتھ لے جانے والے دو افراد ہیں۔ محسن نے انہیں کبھی نہیں دیکھا تھا چنانچہ وہ پہلے تو یہی سمجھا تھا کہ اسے دلاور یا تریونی کے آدمی لے جا رہے ہیں۔ بعد میں انہوں نے اپنے دوستانہ رویّے سے محسن کے خدشات دور کردیئے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ سب انسپکٹر کرپشن تھا اس لئے کام بن گیا۔ ہندو ہوتا تو کبھی نہ چھوڑتا۔ اپنا ہمدرد سمجھ کے محسن نے انہیں تم سب کے بارے میں بتادیا۔"

میں نے کہا "کیا بتادیا؟ اسے تو خود بھی معلوم نہیں تھا کہ ہم کہاں ہیں۔"

آصف جاہ نے کہا "اتنا ہی بتادیا ہوگا جتنا اسے معلوم تھا۔ مثلاً یہ کہ تم سب لوگ کہاں ملو گے۔"

میں نے نفی میں سرہلایا "اگر اسے یہ معلوم ہوتا تو وہ خود کیوں بھٹکتا پھرتا... سیدھا ہمارے پاس نہ پہنچ جاتا۔"

"آخر وہ انہیں اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس نے کچھ تو کہا ہوگا ان سے کہ وہ اس کو ساتھ لے کر چل پڑے تھے۔"

میں نے سوچ کے کہا "ہاں' یہ تم نے ٹھیک کہا' اگر وہ محسن پر اعتبار نہ کرتے تو اس کے ساتھ واپس لوٹ کر نہ آتے۔"

غالب ہنسنے لگا "میرا خیال ہے کہ انہوں نے محسن کو بے وقوف بنانے کی کوشش کی مگر وہ کامیاب نہیں ہوئے لیکن محسن انہیں دھوکا دینے میں کامیاب رہا۔"

"کیا مطلب؟" نازو نے کہا۔

"مطلب یہ کہ انہوں نے محسن سے جھوٹ بولا لیکن اس جھوٹ میں کہیں کوئی بات ایسی تھی کہ محسن نے جھوٹ کو تاڑ لیا مگر وہ خاموش رہا اور یہ تاثر دیتا رہا کہ وہ بے وقوف بن گیا ہے اور ان پر پوری طرح اعتبار کرتا ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ محسن سے اسی طرح دوسروں کا پتا ٹھکانا معلوم کیا جا سکتا ہے۔ ایسے ہی محسن بھی یہ سمجھتا ہوگا کہ جان بچانے کے لئے اور وہاں سے نکلنے کے لئے جھوٹ کا سہارا لینا ضروری ہوگا۔ محسن نے انہیں اپنا ہمدرد اور حمایتی تسلیم کرلیا اور اعتماد کے ساتھ انہیں ہمارے بارے میں بتادیا کہ کہاں ملیں گے۔ یہ تو صاف ظاہر تھا کہ ہم اسی علاقے میں ہوں گے مگر خود اسے کہاں علم تھا ہمارے پروگرام کا۔ تاہم اس کے بغیر وہ دوست نظر آنے والے دشمنوں کو یہاں نہ لا پاتا۔ وہ صرف اس قید خانے سے نکلنا چاہتا تھا۔"

"اور یہاں پہنچ جانے کے بعد وہ کیا کرتا؟"

"فرار ہونے کی کوشش کے سوا اور کیا کرتا۔ یہاں پہنچنے کے بعد محسن کے لئے یہ چانس لینا یقیناً بہتر تھا۔ اگر وہ ان سے تعاون نہ کرتا تو معلوم نہیں اس کے ساتھ کیا ہوتا۔ اسے کہاں قید کردیا جاتا۔ شاید وہ اسے آگے کہیں بھیج دیتے۔ پھر اس کے لئے اور ہمارے لئے زیادہ مشکلات پیدا ہوجاتیں۔ اس نے عقل مندی کی کہ خود لوٹ کر اسی علاقے میں آگیا جہاں اس کے اور ہمارے ملنے کے امکانات زیادہ تھے۔"

میں نے غالب کی بات سے اتفاق کیا "بالکل ایسا ہی ہوا ہوگا محسن کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی یہاں آنے کے بعد کسی موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا۔"

غالب نے کہا "موقع یا تو عقل تلاش کرتی ہے یا تقدیر فراہم کرتی ہے۔"

آصف جاہ نے کہا "میں نے تو محسن کو دیکھتے ہی پہچان لیا تھا لیکن اس کے دونوں ساتھیوں کے چہرے اجنبی تھے۔"

"انہوں نے فرار ہونے کی کوشش بالکل نہیں کی تھی؟"

"کی تھی۔ لیکن جہاں وہ پکڑے گئے تھے وہاں سے گاڑی کے ساتھ فرار ہونا ممکن نہیں تھا۔ ہمارے پاس گھوڑے تھے۔ ہم انہیں جنگل میں ہی گھیر لیتے اور شاید یہ بات ان کی عقل میں بھی آگئی تھی۔"

"آخر انہوں نے مقابلہ کیوں نہیں کیا' فائرنگ کیوں نہیں کی؟"

"گاڑی میں محسن کے علاوہ دو ہی آدمی تھے" آصف جاہ بولا۔ "ان میں سے ایک تو ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ وہ فائرنگ نہیں کرسکتا تھا۔ دوسرے کو محسن کی فکر ہوگی کہ موقع سے فائدہ اٹھا کے وہ نہ بھاگ جائے۔ پھر میرے ساتھ چھ سپاہی تھے جو چاروں طرف پھیل گئے تھے۔ گاڑی کا ٹائر برسٹ ہوگیا تو انہوں نے سمجھ لیا کہ مقابلہ بے سود ہوگا۔"

"اسلحہ کیا تھا ان کے پاس؟" غالب نے کہا۔

"ان دونوں کے قبضے سے ریوالور ملے تھے' کار میں ایک مشین گن بھی تھی۔"

"اگر وہ چاہتے تو ایک راؤنڈ میں تم سب کو صاف کردیتے اور نکل جاتے" میں نے کہا۔

آصف جاہ نے اقرار میں سر ہلایا "محسن نے انہیں ایسا نہیں کرنے دیا۔ اس نے دونوں کو سمجھایا کہ بلاوجہ پانچ پولیس والوں کے خون سے ہاتھ رنگنے کی ضرورت نہیں۔ یہ بہت سنگین واردات ہوگی۔ اس کے علاوہ آس پاس کے سارے علاقے میں پولیس موجود ہے۔ وہ فائرنگ کی آواز سن کے آجائیں گے۔"

"محسن نے بڑی دانش مندی سے کام لیا۔ مگر حیرت ہے کہ وہ مان گئے' وہ بڑے خون کے پیاسے لوگ ہیں۔"

"محسن کے اعتماد نے انہیں مروا دیا" آصف جاہ بولا "محسن نے کہا کہ گڑ سے مرنے والے کو زہر دینے کی کیا ضرورت ہم شریف آدمی نظر آتے ہیں۔ باتوں سے پولیس کو قائل کرسکتے ہیں کہ ہم ڈاکو نہیں ہیں' معزز لوگ ہیں اور پولیس اگر قائل نہ ہو تو نوٹوں سے مان جاتی ہے۔ وہ مان گئے اور پھنس گئے۔"

پہلے ان میں سے ایک ہاتھ اٹھا کے باہر آیا "تھانے دار صاحب گولی مت چلانا' ہم شریف لوگ ہیں۔"

میں نے کہا "پھر تم نے بھاگنے کی کوشش کیوں کی تھی؟"

اس نے لجاجت سے کہا "نہیں جناب' آپ کو غلط فہمی ہوگئی' میں نے تو گاڑی موڑتے ہی روک لی تھی۔"

"غلط فہمی کے بچے' بے وقوف سمجھتے ہو مجھے" میں نے کہا "تم اس وقت رکے ہو جب بھاگنے کے قابل نہیں رہے۔ باہر نکالو سب کو۔"

دوسرا شخص بھی بڑی مظلوم صورت بنائے اترا "آپ ایسے ہی ناراض ہو رہے ہیں تھانے دار جی' ہمارے پاس سب کچھ ساہوکاری کا مال ہے۔"

"وہ بھی برآمد ہوجائے گا" میں نے کہا "ابھی ایک بندہ اور ہے گاڑی میں۔ اس نے پاؤں میں مہندی لگائی ہوئی ہے؟"

"وہ جی' ذرا بیمار تھا......" پہلے نے کہا۔

"اوئے باہر لاؤ اسے' ہم بھی دیکھیں کیا بیماری لگ گئی اسے۔ ہمارے پاس ہر بیماری کا علاج ہے پتر" تیرہ نمبر کانسٹیبل نے کہا۔

مجبوراً اس نے محسن کو باہر آنے کے لئے کہا "آجاؤ بھائی تم بھی تاکہ تھانے دار جی کا شک دور ہوجائے۔"

محسن جب باہر آیا تو واقعی بیمار لگتا تھا۔ میں نے اس کے چہرے پر ٹارچ کی روشنی ڈالی تو مجھے اس کی صورت آشنا سی لگی۔ پھر یاد آگیا کہ اس کی تصویر میں نے اخبار میں دیکھی تھی اور اخبار اس وقت بھی میری جیب میں موجود تھا۔ تاہم فوری طور پر میں نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ میں پہلے یہ جاننا چاہتا تھا کہ محسن کے دونوں ساتھی کون ہیں۔

"کون ہو تم لوگ؟" میں نے ٹارچ کی روشنی ان کے چہروں پر ڈال کے کہا۔

"ہم نے کہا نا جناب' ہم شریف آدمی ہیں۔"

میں نے کہا "صورت سے کوئی چور نظر نہیں آتا۔ لیکن شریف آدمی آدھی رات کو جنگل میں گاڑی لے کر نہیں پھرتے۔ گاڑی کس کی ہے؟"

"ہماری... ذاتی گاڑی ہے" دوسرے نے کہا۔

"کاغذات ہیں جن سے یہ ثابت ہوجائے کہ گاڑی تمہاری ہے؟" میں نے کہا۔

انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور نفی میں سر ہلایا "اس وقت ہمارے پاس تو نہیں ہیں کاغذات۔"

"پھر کہاں ہیں؟" میں نے کہا۔

"گھر سے منگوائے جاسکتے ہیں" دوسرے نے اعتماد کے ساتھ کہا۔

"گھر کہاں ہے؟ تم مجھے یہاں کے رہنے والے تو نہیں لگتے۔"

پہلے نے نفی میں سر ہلایا "ہم یہاں کے رہنے والے نہیں ہیں۔"

"شہر میں رہتے ہیں" دوسرے نے کہا "کوٹھی میں' تم ساتھ چل کے کوٹھی دیکھ سکتے ہو۔"

"ابھی تو تم میرے ساتھ چل کے حوالات دیکھو' کوٹھی اور بنگلے کل دیکھیں گے" میں نے کہا اور سپاہیوں کو حکم دیا "پکڑ لو سب کو۔"

"تھانے دار جی' یہ آپ.. بہت زیادتی کر رہے ہیں" پہلے نے فریاد کے انداز میں کہا۔

میں نے کہا "تلاشی لو ان شریف زادوں کی۔"

انہوں نے سخت احتجاج کیا مگر سپاہیوں نے ان کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کے ریوالور نکال لئے۔

"یہ ہے تمہاری شرافت کی سند" میں نے گرج کے کہا۔

"ہمارے پاس ان کے لائسنس ہیں..."

"کہاں؟ گھر پر ہوں گے' کوٹھی میں" میں نے طنز سے کہا۔ "کون ہو تم لوگ آخر؟ گاڑی میں اسلحہ لے کر کیوں پھر رہے تھے اور یہ کون ہے؟"

"یہ... بھائی ہے ہمارا..." پہلے نے محسن کی طرف اشارہ کیا۔

"کیا یہ گونگا ہے؟ خود جواب نہیں دے سکتا" میں نے کہا۔

محسن نے فقط تائید میں سر ہلایا۔ وہ سخت مشکل میں پڑ گیا تھا۔ ایک طرف پولیس کے ہاتھوں گرفتاری کا ڈر تھا تو دوسری طرف دشمن کے ہاتھوں مارے جانے کا۔ دشمن کے ساتھ جانے میں اس کے لئے بچ نکلنے کے امکانات زیادہ تھے چنانچہ اس نے اپنے دشمنوں کے بیان کو جھوٹا نہیں کہا۔

"ہم یہاں کسی کو تلاش کرنے آئے تھے" پہلے نے کہا۔

"اس جنگل میں' آدھی رات کو..."

"ہم جنگل سے گزر کے جا رہے تھے جی' جانا ہمیں آگے تھا' ہمارے بہن بہنوئی صبح ادھر آئے تھے۔ ہم رات تک ان کا انتظار کرتے رہے۔ پھر گاڑی لے کر نکلے۔ ان کی طرف سے فکر لاحق ہوگئی تھی کہ انہوں نے اتنی دیر کیوں کی۔"

میں سمجھ رہا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہے ہیں لیکن میں ان کے جھوٹ کا اعتراف خود انہی کی زبان سے کرانا چاہتا تھا۔ محسن کو پہچاننے کے بعد میں چاہتا تھا کہ اس کی مدد کروں لیکن سب کے سامنے کچھ نہیں کرسکتا تھا اور میں یہ بھی جاننا چاہتا تھا کہ وہ محسن کے ساتھی اور دوست ہیں یا اس کے دشمن۔ محسن کی پریشانی اور خاموشی سے کچھ پتا نہیں چلتا تھا اور یہ سوال اس سے براہِ راست نہیں کیا جاسکتا تھا۔

میں نے کہا "کون ہیں تمہارے بہن اور بہنوئی؟"

"وہ... بزنس ہے ان کا بمبئی میں" پہلے نے کہا۔

"تم دونوں آپس میں بھائی ہو؟"

"ہاں جی۔ میرا نام ہے موہن' یہ مجھ سے چھوٹا ہے سوہن" دوسرے نے کہا۔

"اور یہ..." میں نے محسن کی طرف اشارہ کیا "تم کون ہو سور کے بچے' ادھر آؤ... میرے سامنے۔"

محسن خاموشی سے آگے آگیا "میں ان کے جیجا جی کا بھائی ہوں اور میرا نام شیام کمار ہے" اس نے بڑے سکون اور اعتماد کے ساتھ کہا "آپ بلاوجہ ہمارا وقت ضائع مت کریں۔ اگر کوئی مدد نہیں کرسکتے تو ہمیں جانے دیں۔ آپ نے پہلے ہی ٹائر برسٹ کرکے اچھا نہیں کیا۔"

محسن کے جھوٹ پر میں حیران رہ گیا۔ میں نے عام تھانے داروں کی طرح محسن کی زبان درازی پر مشتعل ہو کے اسے گالیاں دے کے اس کے دو بید رسید کئے۔

"یہ گونگا ایک دم بولنے لگ گیا۔ ہمیں بتا رہا ہے کہ ہم نے اچھا نہیں کیا' ابے جب ہم برا کریں گے تو پتا چلے گا..."

"سب انسپکٹر' ہم کو کیا سمجھا ہے آخر تم نے؟ کیا ہم چور اچکے ہیں؟ ہم عزت دار کاروباری لوگ ہیں" محسن نے برہمی سے کہا "تم جیسے ہمارے پاس ملازم ہیں' تمہیں اندازہ نہیں ہے..."

میں نے اس کو اور گالیاں دیتے ہوئے کئی بید رسید کئے۔ "زبان چلاتا ہے۔ بھونکتا ہے کتے' ابھی تجھے بھی اندازہ نہیں ہے کہ تیرے جیسے کتنے عزت داروں کی کھال ایک رات میں اتار چکا ہوں میں۔"

اب گاڑی میں سے اترنے والا پہلا شخص آگے بڑھا۔ اس نے محسوس کرلیا تھا کہ صورت حال خراب سے خراب تر ہوتی جارہی ہے۔

"تھانے دار جی' آپ ایک منٹ میری بات سن لیں" اس نے بڑی لجاجت کے ساتھ درخواست کی "صرف ایک منٹ.."

"جو کہنا ہے یہاں کہو۔ سب کے سامنے" میں نے غرا کے کہا۔

"آپ بات کو سمجھنے کی کوشش کریں جناب عالی' میری عرض سن لیں پہلے پھر آپ کو اختیار ہے" اس نے میرے پاؤں پکڑتے ہوئے کہا۔

یہ دیکھنے کے لئے کہ علیحدگی میں وہ کیا کہتا ہے میں گھوڑے سے اتر گیا "اگر ان میں سے کوئی اپنی جگہ سے ہلے تو گولی ماردو" میں نے سپاہیوں سے کہا۔

"سر جی' اس بے وقوف کی باتوں میں نہ جائیں" اس نے

مجھے ایک طرف لے جاکے کہا "وہ بیمار ہے اس لئے دماغ خراب ہو رہا ہے اس کا۔"

"دماغ تو ایسے ٹھیک ہو جاتا ہے" میں نے چٹکی بجا کے کہا۔

"چھوڑیں جناب' آپس کی بات ہے۔ آپ ہمیں جانے دیں۔ ہم غلط نہیں کہہ رہے ہیں' ہم آپ کو اس وقت اپنے ساتھ لے جاکے سب کچھ دکھا سکتے ہیں۔ گاڑی کے کاغذات' اپنی کوٹھی' کاروبار کی جگہ' دس آدمی ہمارے ضامن نکل آئیں گے۔ وہ ہمارے کہنے سے آپ کے سامنے ایک ایک لاکھ رکھ دیں۔"

"اچھا!" میں نے دلچسپی سے کہا "یہ بات ہے۔ ایک لاکھ تو بہت ہوتے ہیں۔"

"ایک لاکھ تو واقعی بہت ہوتے ہیں... لیکن آپ ہمارے معاملے میں ٹانگ نہ اڑائیں تو آپ کو مل سکتے ہیں۔"

"کب؟ اسی وقت۔"

"ابھی تو نہیں' لیکن صبح بینک کھلتے ہی۔ اس وقت ہم بہت ضروری کام سے جا رہے ہیں۔ ہمارا وقت بہت قیمتی ہے۔"

اب میں نے ایک دم ترپ کا پتہ اس کے سامنے ڈال دیا۔ "تم میں سے ایک کو میں پہچانتا ہوں۔"

"کس کو پہچانتے ہیں آپ؟" وہ پریشان نظر آنے لگا۔

"اس گونگے بہرے کو جسے تم بیمار کہتے ہو۔ وہ شیام کمار ہرگز نہیں ہے۔ وہ مسلمان ہے۔ محسن نام ہے اس کا۔"

وہ یوں اچھلا جیسے اچانک میں نے اس کے کان پر رکھ کے پستول داغ دیا ہو۔ میں نے اس شدید ردِ عمل کو نوٹ کیا مگر انجان بن گیا۔

"تھانے دار جی' آپ.... یہ کیا کہہ رہے ہیں؟"

میں نے مسکرا کے سرگوشی میں کہا۔ "میرے سامنے ڈراما مت کرو اس لئے کہ میں خود بھی ڈراما کر رہا تھا۔"

"ڈراما... کیسا ڈراما؟"

"میں نے تمہیں دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔ تم سب پاکستانی ہو اور یہاں کی پولیس بھی تمہیں اتنا ہی دہشت گرد سمجھتی ہے جتنا پاکستان کی پولیس۔" میں نے کہا۔

"لیکن... ہم... دہشت گرد نہیں ہیں۔"

میں نے کہا "آہستہ بولو' مجھے سب معلوم ہے کہ تم کو مجرم اور دہشت گرد بنا دیا گیا ہے۔ درحقیقت تم سچے پاکستانی اور سچے انسان ہو۔ تم لوگ وطن کے دشمنوں کے دشمن ہو چنانچہ وہ تمہارے دشمن ہو گئے ہیں۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

میرے لہجے نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ اس نے اقرار میں سر ہلایا مگر ڈرتے ڈرتے۔

"تم بالکل فکر مت کرو' میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا" میں نے کہا "بس مجھے یہ بتا دو کہ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"ہم.... تم پر کیسے اعتبار کر لیں؟" اس نے عیاری سے کہا۔

"میں تم کو... اور اس دوسرے شخص کو پہچان نہیں سکا" میں نے رازدارانہ سرگوشی میں کہا "کیا تم سکندر بخت ہو؟"

اس نے ایک نظر مجھے بے یقینی سے دیکھا اور پھر سر ہلایا "ہاں۔"

"گویا میرا اندازہ درست تھا" میں نے کہا "اگر تم سکندر بخت ہو تو پھر تیسرا آدمی صرف غالب ہو سکتا ہے۔"

اسے یقین آ گیا کہ میں واقعی ان کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کا خیال چھوڑ چکا ہوں۔ اس احمق نے یہ نہیں سوچا کہ جب میں محسن کو پہچانتا ہوں تو پھر سکندر بخت اور غالب کو کیوں نہیں پہچانتا۔ تصویریں تو تینوں کی اخبارات میں ایک ساتھ شائع ہوئی تھیں۔

"بالکل ٹھیک اندازہ کیا تم نے سب انسپکٹر" اس نے گہری سانس لے کر اعتراف اور تعریف کے انداز میں کہا "میں مانتا ہوں کہ میں ہی سکندر بخت ہوں..."

ابھی جملہ پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ میرا ہاتھ گھوم کر اس کے منہ پر پڑا۔ وہ اس حملے کے لئے تیار نہیں تھا چنانچہ لڑکھڑا کے پیچھے گر گیا۔

میں نے اسے ایک سے ایک منتخب گالیاں دیتے ہوئے ٹھوکریں ماریں "سالے جعلساز' دھوکے باز' فریبی' آنکھوں میں دھول جھونکتا ہے ہماری' ہم سب کو پہچانتے ہیں" میں نے کہا۔

کسی کو معلوم نہیں تھا کہ ہمارے درمیان کیا بات ہو رہی تھی اور اب اچانک کس مسئلے پر مذاکرات کی ناکامی سے صورت حال ایک دم پلٹ گئی ہے۔ محسن اور اس شخص کا دوسرا ساتھی حیران پریشان کھڑے ہوئے سب دیکھ رہے تھے مگر کچھ کرنے سے قاصر تھے۔ ایک ریوالور میرے ہاتھ میں تھا اور چار بندوقوں کے دہانے ان کی جانب اٹھے ہوئے تھے۔

"پکڑ لو ان سب حرامزادوں کو' الگ الگ باندھ کے ڈال دو اسی گاڑی میں" میں نے حکم جاری کیا۔

انہوں نے مزاحمت کی واجبی سی کوشش کی مگر میرے ماتحت سپاہی بہت مستعد ثابت ہوئے۔ انہوں نے تینوں کو بندوقوں کے کندے مار مار کے گرا دیا اور رسیوں سے باندھ دیا۔ یہاں ہتھکڑیاں تو ملتی نہیں ہیں۔ ہم مجرموں کو پکڑنے اور باندھنے کے لئے رسی بھی خود ہی فراہم کرتے ہیں۔

"تھانے دار' میں سمجھ لوں گا تجھ سے" پہلے والے شخص نے کسی زخم خوردہ سانپ کی طرح پھنکارتے ہوئے کہا "تجھے معلوم نہیں تو نے کس پر ہاتھ ڈال دیا ہے۔"

دوسرے نے چلا کے کہا "ہم نے تیری پیٹی نہ اتروا دی تو..."

میں نے ان کی بکواس کا جواب زبان چلا کر نہیں دیا۔ وہ چلاتے رہے اور دھمکیاں دیتے رہے۔ مجھے میرے انجام سے ڈراتے رہے اور خطرناک نتائج سے ڈراتے رہے۔ سپاہی

...باندھ کے گاڑی میں ڈال دیا۔ وہ مجرموں کو رسی سے ...کے ماہر ہیں۔ کوئی مجرم کتنا ہی زور کیوں نہ لگا لے' نہ رسی ...ہے اور نہ کھول سکتا ہے۔ وہ اپنے ہاتھ پاؤں کی بغض ...انگلیاں تک نہیں ہلا سکتا۔ زیادہ خطرناک مجرموں کو وہ ...ایسے جکڑتے ہیں کہ اگر کوئی زور لگائے یا ہاتھ پیر ...گردن میں رسی کا حلقہ تنگ ہونے لگتا ہے اور وہ خود ...کو پھانسی دینے لگتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ دم سادھ کر پڑے ...مجبور ہو جاتے ہیں۔ کار کا ٹائر بدل دیا گیا تھا مگر میرے ...ڈرائیونگ نہیں جانتے تھے۔ ڈرائیونگ خود میں نے عرصہ ...تھی چنانچہ میں نے اسی شخص کو ڈرائیونگ پر مجبور کیا جو ...ہی چلا رہا تھا۔ میں اس کے ساتھ ریوالور لے کر بیٹھ گیا۔ ...اپنا گھوڑا ایک سپاہی کے حوالے کر دیا اور ان سے کہا کہ ...دونوں جانب ساتھ ساتھ چلیں۔

...بخوبی اندازہ تھا کہ ان تینوں کی ایک دوسرے کے ...کیا پوزیشن ہے۔ محسن کو اپنے ساتھ لے جانے والے ...زاد کے بارے میں مجھے کوئی شک نہیں رہا تھا کہ وہ محسن ...ت نہیں ہو سکتے۔ اس کے ساتھی کبھی خود کو سکندر بخت ...نہ کہتے۔ محسن کی پریشانی اور خاموشی سے بھی اندازہ ہوتا ...اصل بات کچھ اور ہے۔ اگر وہ محسن کے ساتھی ہوتے تو ...ان کی وکالت کرتا اور مجھے یقین دلانے کی کوشش کرتا ...سکندر بخت اور غالب ہیں مگر اس نے نہ تائید کی تھی نہ ...وہ دونوں محسن کے سامنے اپنی اصلیت ظاہر کرنے سے ...رہے تھے۔ انہوں نے دھمکیاں تو بہت دی تھیں مگر کسی ...بڑے آدمی کا نام نہیں لیا تھا۔ انہوں نے اپنا اصل نام اور ...نہیں بتایا تھا اور صرف یہی کہتے رہے تھے کہ صبح سب ...ہو جائے گا۔ صبح کون آکے توپ چلائے گا' یہ وہ کیسے بتا سکتے ...اگر وہ تردید کرتے کہ وہ محسن کے ساتھی نہیں ہیں تو ان کا ...کھیل بگڑ جاتا۔ انہیں اپنی اصلیت ظاہر کرنے کی صورت ...اپنے مقصد سے دستبردار ہونا پڑتا۔

...جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا۔ محسن تو پہلے ہی جانتا تھا کہ وہ ...نہیں دشمن ہیں اور کسی کے آلہ کار ہیں مگر یہ بات انہیں ...نہیں معلوم تھی اور وہ اس خوش فہمی کا شکار تھے کہ محسن ان کے ...فریب میں گرفتار ہو چکا ہے اور بالآخر انہیں سکندر بخت اور ...غالب کے پاس لے جائے گا۔ خود محسن نے ان کی یہ خوش فہمی ...برقرار رکھی تھی کیونکہ وہ بھی پولیس کے مقابلے میں ان سے نمٹنا ...آسان سمجھتا تھا۔ آسان کچھ بھی نہیں تھا لیکن پولیس کو اپنے ...اور اپنی قوت کے باعث زیادہ خطرناک دشمن سمجھا ...جاتا تھا۔ پولیس کے مقابلے پر دوسری طرف صرف دو افراد ...تھے۔ محسن ان سے نجات حاصل کرنے کے لئے کوئی قدم ...اٹھانا سوچ ہی رہا ہوگا کہ درمیان میں پولیس آ گئی۔

محسن اس لئے خاموش رہا کہ وہ خود پولیس کی قید سے آزادی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے دشمن با اثر اور قوی تھے' ان کا دعویٰ ٹھیک تھا کہ رات کو وہ کچھ نہیں کر سکتے مگر صبح انہیں کوئی قید میں نہیں رکھ سکے گا اور میری پیٹی اتر جائے گی۔ خود محسن نے اپنی آزادی کی سب امیدیں صبح سے وابستہ کر لی تھیں۔ جب اصل لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ایک معمولی سب انسپکٹر نے ان کے کام میں رخنہ ڈالا اور ان کے حکم کے غلاموں کو پکڑ لیا تو وہ صرف ڈوری ہلائیں گے اور اوپر سے کسی بڑے افسر کا حکم صادر ہوگا کہ سب کو چھوڑ دو اور خود وضاحت کرنے کے لئے حاضر ہو جاؤ کہ کیوں نہ تمہیں معطل کر دیا جائے۔ صبح سلسلہ پھر وہیں سے شروع ہوگا جہاں سے ٹوٹا تھا۔ نہ وہ جانتے تھے کہ محسن کے دل میں کیا ہے' نہ محسن کو اندازہ ہو سکتا تھا کہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔ وہ سب اپنے اپنے طور پر جو کچھ سوچ رہے تھے غلط سوچ رہے تھے لیکن یہ بات جانتے نہیں تھے۔

تھانے پہنچ کے میں نے حکم دیا "ان دونوں کو الگ الگ باندھ کے رکھو' اس کو حوالات میں ڈال دو" میں نے محسن کی طرف اشارہ کیا۔

"اور دوسرے کو؟" ایک سپاہی نے کہا۔

"اس کو ساتھ والے کمرے میں رکھو" میں نے کہا "یہ لوگ ایک دوسرے سے بات نہ کرنے پائیں' مسئلہ اس تیسرے کا ہے۔"

"اس کو اپنے گھر میں بند کر دیں جی؟"

"نہیں۔ میں اس کو گرداور صاحب کے حوالے کر دیتا ہوں۔ ...ان کی حویلی کے کسی کونے میں ضرور جگہ ہوگی۔ ورنہ اسے بیلوں کے ساتھ باندھ دیں گے۔"

میں نے کہا "چل بیٹا' گاڑی چلا۔"

"تھانے دار!" گاڑی چلانے والے نے میرے انتظام کے خلاف سخت احتجاج کیا "یہ اچھا نہیں کر رہا ہے تو' میں پھر بتا رہا ہوں۔"

میں نے اس کی گُدی پر ہاتھ مارا "کتنی بار بتائے گا..."

اس نے گاڑی چلاتے ہوئے پلٹ کے گالی دی "تو چیز کیا ہے آخر' دو کوڑی کے تھانے دار۔ تیرے جیسے تو یوینی کے کتے ہیں' اس کے قدموں میں لوٹتے ہیں' اس کا تھوکا ہوا چاٹتے ہیں۔"

"تریوینی کیا چیز ہوتی ہے' کوئی کتے کی نسل ہے یہ بھی؟" میں نے کہا "بھونکنے والا ہے کہ کاٹنے والا؟"

"کیا تیرے بیوی بچے نہیں ہیں' اپنا نہیں تو ان کا خیال کر" اس نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی "تریوینی ایک ہاتھی ہے اور تو اس کے مقابلے میں..."

"چیونٹی.." میں نے اس کی بات کاٹ دی "مگر کیا چیونٹی ہی ہاتھی کی موت کا سبب نہیں بنتی۔"

اب محسن سامنے نہیں تھا تو اس نے تریوینی کا نام لے کر مجھے ڈرانے کی کوشش کی تھی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ میں ڈر گیا تھا۔ تریوینی میری اور میرے بیوی بچوں کی بوٹیاں اپنے کتوں کے سامنے ڈال سکتا تھا۔ وہ میرے ساتھ اس سے بھی برا سلوک کر سکتا تھا۔

لیکن اس وقت میں نے کہا "اب میرے ساتھ جو بھی ہو۔ تیرا یہ تریوینی مجھے سولی چڑھا دے مگر میں کسی کو چھوڑنے والا نہیں ہوں، صبح افسر چھوڑ دیں تو ان کی مرضی۔"

آدھی رات کے وقت گرداور مجھے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"کیا بات ہے تھانے دار جی؟" وہ آنکھیں ملتے ہوئے بولا۔

"ایک بندہ لایا ہوں، اسے آج رات سنبھال کے رکھ لیں" میں نے کہا "صبح میں لے جاؤں گا۔"

"کون ہے یہ؟" گرداور نے حیران ہو کے کار کی طرف اور پھر میرے قیدی کی طرف دیکھا۔

"یہ اسلحہ لے کر جنگل میں پھر رہے تھے، انہوں نے بھاگنے کی اور مجھے دھوکا دینے کی کوشش کی۔ جب پکڑے گئے تو مجھے دھمکیاں دے رہے ہیں کہ صبح میری ایسی کی تیسی کروا دیں گے۔ میرے خیال میں یہ وہی ڈاکوؤں کا گروہ ہے جس نے ادھر بستی میں بہت مصیبت ڈال رکھی تھی۔ انہی کی گرفتاری کے لئے پولیس ہر طرف موجود ہے۔"

"تو ان کو تھانے میں کیوں نہیں رکھا؟" گرداور بولا۔

"تھانے میں دو کو رکھا ہے، الگ الگ۔ یہ ان کا سرغنہ معلوم ہوتا ہے" میں نے کہا۔

"بکواس کرتا ہے یہ تھانے دار... میں نے اسے بہت سمجھایا مگر یہ میری ایک نہیں سنتا" وہ چیخ کر بولا۔

"مجھے ڈر ہے کہ کہیں ان کے ساتھی تھانے پر حملہ کرنے نہ آجائیں اسی لئے سب کو الگ، الگ رکھا ہے، آپ ذرا ہوشیار رہیں..."

"گرداور صاحب، آپ میری بات سن لیں... ہم ڈاکو نہیں ہیں۔"

میں نے کہا "اچھا جی، میں چلتا ہوں.. اس کا خیال رکھیں، فرار نہ ہو جائے۔ بندوق تو ہے آپ کے پاس، بے شک گولی مار دیں۔ میں اس کی گاڑی چھوڑ کے جا رہا ہوں۔"

اس سے پہلے کہ گرداور کچھ کہتا میں واپس ہو گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ بعد میں کیا ہوگا اور میں اس کے لئے بالکل تیار تھا۔ ابھی مجھے تھانے پہنچے ہوئے دس منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ گرداور کا بیٹا مانک لال آگیا۔ اس نے مجھے گرداور کا پیغام دیا۔

"آپ کو فوراً بلایا ہے ابا نے۔"

"لیکن میں ابھی تو آیا ہوں ان سے مل کے" میں نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے۔ مگر انہوں نے کہا تھا کہ بہت ضروری کام ہے، تھانے دار جی کو ساتھ لے کر آنا۔"

میں بادل ناخواستہ اس کے ساتھ گیا۔ گرداور مجھے باہر ہی انتظار میں بے چینی سے ٹہلتا ہوا نظر آیا۔ وہ مجھے اپنی بیٹھک میں لے گیا۔ اس نے دروازہ بند کر کے کہا۔

"تھانے دار جی، یہ تم نے کیا غضب کر دیا، یہ کس کو پکڑ لائے؟"

میں نے کہا "ڈاکو ہیں، میں نے بتایا تھا۔"

گرداور نے سر پر ہاتھ مار کے کہا "یار، عقل کے گھوڑے کو لگام دو، کیوں اپنی تھانے داری کے پیچھے پڑے ہو۔ معلوم ہے یہ کس کے آدمی ہیں؟ تریوینی کے۔"

"یہ نام انہوں نے بھی لیا تھا، کون ہے تریوینی؟"

"تم تریوینی کو نہیں جانتے؟" گرداور نے بے یقینی کے ساتھ کہا۔

اس نے مجھے بڑی تفصیل سے بتایا کہ تریوینی کون ہے اور میرے غلط اقدام سے میری نوکری ہی نہیں زندگی بھی خطرے میں پڑ گئی ہے۔

میں نے ڈر کے کہا "آپ کو یقین ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہے ہیں؟"

"ارے یار، کیا ڈاکو اتنے بے وقوف ہوتے ہیں کہ رات کے وقت کار میں گھومتے پھریں؟" گرداور نے کہا "میری مانو تو ابھی کچھ نہیں بگڑا ہے، معاملے کو سنبھال لو۔"

"کیسے سنبھالوں؟" میں نے کہا۔

"انہیں چھوڑ دو" گرداور بولا۔

"چھوڑ دوں؟ گرداور جی، اگر بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ڈاکو تھے تو کیا ہوگا؟ آپ کا کچھ نہیں جائے گا، میری نوکری جائے گی۔"

گرداور نے کہا "تھانے دار، میری ساری زندگی کا تجربہ کہتا ہے کہ وہ ڈاکو نہیں ہو سکتے۔ چور ڈاکو اتنے اعتماد کے ساتھ بات نہیں کر سکتے۔ اس کا کہنا ہے کہ ابھی میرے ساتھ چلو اور چل کے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لو، ابھی پتا چل جائے گا جھوٹ سچ کا۔"

"وہ جانتا ہے ناکہ اس وقت ہم نہیں جا سکتے۔"

"کیوں نہیں جا سکتے؟ تم اس کی گاڑی میں چلے جاؤ۔ تمہارے لئے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اس نے تو کہا ہے کہ تھانے دار اکیلا ہی چلا جائے اور یہ گاڑی بھی لے جائے، نمبر جا کے تصدیق کرے، ایک گھنٹا جانے کا اور ایک گھنٹا آنے کا۔"

میں نے سوچ کے کہا "میں تو گاڑی نہیں چلا سکتا۔"

"اس کے ساتھ جو دوسرا آدمی پکڑا تھا تم نے، وہ ڈرائیور ہے، اسے لے جاؤ" گرداور بولا "لیکن میرے خیال میں یہ بھی غیر ضروری ہے، وہ جھوٹ نہیں بول رہا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ گاڑی کا نمبر چیک کر لو، معلوم ہو جائے گا کہ گاڑی کس کی ہے۔"

"یہ نمبر... جعلی نہیں ہے؟"

"نہیں، اصلی نمبر ہے" گرداور نے کہا "اس کا کہنا یہ بھی ہے کہ تم فون کر کے پوچھنا چاہو تو وہ ایک نہیں دس نمبر دے سکتا ہے۔"

"یہاں ٹیلی فون کہاں ہے؟"

"یار، نہیں ہے تو کیا ہوا، مین روڈ کتنی دور ہے۔ تم خود فون سے معلوم کر لو۔"

"اگر ایسا ہی ہے تو پھر وہ یہاں کیوں پھر رہے تھے؟ کیا کام تھا اس جنگل میں؟ وہ بھی آدھی رات کے بعد۔ اور ان کے پاس ایک کاغذ کا پرزہ تک نہیں ہے اپنی شناخت کے لئے۔"

"دیکھو تھانے دار، تمہاری نوکری کتنی ہے؟"

"چھ سال... مگر..."

"اگر مگر مت کرو، چھ سال میں تمہیں تجربے نے کچھ نہیں سکھایا۔ تم کو اتنا تو علم ہونا چاہئے کہ پولیس ہر جگہ ٹانگ نہیں اڑا سکتی۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں اور ان کے "معاملات" ایسے ہوتے ہیں جو کسی قانون کے دائرہ اختیار میں نہیں آتے، کوئی نہیں پوچھ سکتا ان سے کہ وہ کیا کر رہے ہیں اور کیوں کر رہے ہیں۔ تمہارے بڑے افسر بھی ان سے ڈرتے ہیں اور غلطی سے بھی ان کے کاروبار کی طرف نظر اٹھا کے نہیں دیکھتے کیونکہ یہ بہت اونچی سطح پر تعلقات رکھنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ پولیس کمشنر بھی ان کا اپنا آدمی ہوتا ہے۔"

"کیا تریوینی واقعی اتنی بڑی چیز ہے؟" میں نے ڈر کے کہا۔

"ہاں یار۔ اب میں کیسے سمجھاؤں تمہیں۔ عقل سے کام لو اور ان کو جانے دو" گرداور نے چڑ کے کہا "مجھے تو تمہارا خیال ہے کہ تم اپنے آدمی ہو اور آج تک کسی کو تم سے شکایت نہیں ہوئی۔ اس لئے میں نے کہا کہ پہلے مجھے بات کرنے دو، صبح تک یہ معاملہ بہت بگڑ جائے گا۔"

میں نے کہا "آپ کی مہربانی گرداور جی، میں آپ کی ضمانت پر ان کو چھوڑ دیتا ہوں۔"

گرداور نے گھبرا کے کہا "میں کون ہوتا ہوں کسی کی ضمانت دینے والا۔ تم مجھے بیچ میں مت لاؤ۔"

"جب آپ کہتے ہیں کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں تو پھر خود کیوں ڈرتے ہیں؟"

"دیکھو یار، یہ قانونی معاملات ہیں، قانونی طور پر مجھے کیا اختیار حاصل ہے کہ میں کسی کا ضامن بنوں۔ نہ میں تمہیں حکم دے سکتا ہوں اور نہ تم کسی سے ضمانت طلب کر سکتے ہو۔ میں نے تمہیں ایک مشورہ دیا ہے جس میں تمہارا فائدہ ہے۔ میرا کوئی نقصان نہیں ہوگا اگر تم میرے مشورے کے خلاف عمل کرو گے۔"

"لیکن میں تو آپ کی بات مان رہا ہوں۔ آپ ذمے دار بنیں نا۔ کل خدانخواستہ کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے تو آپ میری مدد کریں گے، صرف آپ جانتے ہیں...."

گرداور نے پریشان ہو کے کہا "یار، بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ ایسی ویسی کوئی بات اول تو ہوتی نہیں، ہو گی تو تم پر کوئی الزام کیسے آسکتا ہے۔ تم صاف انکار کر سکتے ہو کہ تمہیں کچھ بھی معلوم نہیں، ان لوگوں کو تم نے کبھی دیکھا نہ پکڑا... سمجھ لو کہ آج رات کچھ ہوا ہی نہیں، یہ لوگ خاموشی سے نکل جائیں گے، میں انہیں سمجھا لوں گا کہ تمہاری دخل اندازی کو ایک غلط فہمی سمجھ کے نظر انداز کر دیں، اور وہ مان جائیں گے۔ دو گھنٹے ہی گزرے ہیں ابھی..."

"ابھی تو ڈیڑھ گھنٹا بھی نہیں ہوا" میں نے کہا۔

"چلو یہ اور بھی اچھی بات ہے۔ ڈیڑھ گھنٹے کی تاخیر سے ان کا کوئی کام نہیں بگڑا۔"

"کیسا کام؟ کیا آپ کو معلوم ہے وہ یہاں کیوں آئے تھے؟"

"نہیں یار، مجھے کیسے معلوم ہو سکتا ہے۔ لیکن صاف ظاہر ہے کہ یہاں وہ سیر و تفریح کے لئے نہیں آئے تھے۔ ہو گا ان کا کوئی کام، ہمیں کیا۔"

"لیکن انہوں نے یہاں سے جانے کے بعد کوئی واردات کی، گاؤں میں ڈاکا ڈال دیا یا کسی کو قتل کر دیا تو..."

"نہیں، ایسا نہیں ہو گا، اطمینان رکھو۔"

"ہوا تو میں... آپ کا نام بھی لوں گا کہ آپ نے مجھے کہا تھا۔"

گرداور گھبرا گیا "نہیں، میرا نام لینے کی ضرورت نہیں۔ میرا کوئی تعلق نہیں تمہارے معاملات سے۔ میری طرف سے تم بھاڑ میں جاؤ، مت چھوڑو انہیں، خود بھگت لینا بعد میں، اسے بھی لے جاؤ یہاں سے..."

میں نے کہا "اچھا... آپ خفا مت ہوں... میں ابھی آتا ہوں، ذرا اس کے ساتھی سے بھی پوچھ لوں۔"

"کیا پوچھو گے اس سے؟ اب تفتیش شروع کرو گے؟"

میں نے کہا "تفتیش نہیں، تصدیق کرنا چاہتا ہوں میں۔ آپ مجھے بتائیں، اس نے آپ کے سامنے کس کس کا نام لیا ہے، کس کس کا ٹیلی فون نمبر بتایا ہے۔ اگر یہ سب سچ ہوگا تو اس کے دوسرے ساتھیوں کو بھی یہ نام اور فون نمبر معلوم ہوں گے۔"

گرداور نے کہا "یہ ٹھیک ہے۔ میں اس سے کہتا ہوں کہ وہ نام اور فون نمبر لکھوا دے۔ تم تصدیق کر لو... یا اس کے ساتھیوں سے کہو کہ وہ بھی نام اور فون نمبر بتائیں، پھر دونوں کو آپس میں ملا کے دیکھ لو۔"

چند منٹ بعد مجھے گرداور نے کاغذ کے ایک پرزے پر تین نام لا کے دئے۔ ان کے سامنے چھ سات فون نمبر لکھے ہوئے تھے، ...ان میں ایک نام تریوینی کا بھی تھا۔

میں واپس گیا اور میں نے وہ نام پتے محسن کو دکھائے، زیادہ بات کرنے کے لئے وقت نہیں تھا، میں نے اسے اپنے بارے میں بھی سب کچھ بتا دیا اور تم سب کے متعلق بھی جو کچھ میں جانتا تھا

وہ اسے سنا دیا۔ ظاہر ہے وہ بہت حیران ہوا لیکن بالآخر اسے یقین آگیا کہ میں اس کی مدد کرسکتا ہوں۔ میں نے اسے حوالات سے نکالا اور باہر انتظار کرنے کو کہا۔ میرا ارادہ تھا کہ اسے ایک گھوڑا دوں گا اور پولیس کی وردی۔ تاکہ وہ راتوں رات اس علاقے سے نکل جائے اور اسے کوئی نہ روکے۔ میں اسے ریوالور بھی دینا چاہتا تھا اور کچھ نقد رقم بھی۔ اس کو چھوڑنے کے بعد میں دوسرے شخص کے پاس گیا اور میں نے اس سے واجبی سی تفتیش کی۔ میں نے اس کے سامنے چند نام لئے جو مجھے کاغذی چٹ پر لکھے ہوئے ملے تھے اور اس سے پوچھا کہ کیا وہ ان لوگوں کے ٹیلی فون نمبر بتا سکتا ہے' اس نے سب نمبر بالکل ٹھیک بتائے۔

پانچ منٹ بعد میں باہر گیا۔ میرا خیال تھا کہ محسن میرا انتظار کررہا ہوگا لیکن وہ غائب ہوچکا تھا۔ اس نے مجھ پر اعتماد نہیں کیا۔ ...اچھا ہوتا اگر وہ گھوڑا لے جاتا۔ ریوالور اور پولیس کی وردی لے جاتا۔ میں اس کے تحفظ کے لئے سارا انتظام کررہا تھا مگر پتا نہیں کیوں اس نے میری مدد کی پیشکش سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ وہ باہر نکلتے ہی فرار ہوگیا۔ میں نے دس منٹ کے بعد تھانے میں بند دوسرے قیدی کو آزاد کردیا۔

میں نے کہا "ایک غلط فہمی کی بنا پر میں نے تمہیں ڈاکو سمجھ لیا تھا۔"

وہ بڑے فاتحانہ انداز میں مسکرایا "اچھا ہوا کہ تیری غلط فہمی جلدی ہی رفع ہوگئی۔"

میں نے کہا "ہم آنکھیں بند تو نہیں کرسکتے۔ اس علاقے میں جو کچھ ہورہا ہے تم جانتے ہو۔"

اس نے کہا "لیکن تم کو دیکھنا چاہئے کہ شریف آدمی کون ہے۔ ایسے ہی ہر ایک کو نہیں پکڑ لینا چاہئے۔"

میں نے کہا "میں نے تمہارے ساتھ کوئی برا سلوک تو نہیں کیا۔"

وہ تلخی سے مسکرایا "اور کیا اچھا سلوک کیا تھا تم نے؟ اتنا مارنے اور ذلیل کرنے کے بعد اب کہتے ہو..."

میں نے کہا "چلو یار، غلطی ہوگئی تھی' بھول جاؤ۔"

ایک گھنٹے میں معلوم ہوگیا نا کہ ہم کون ہیں" وہ اکڑ کے بولا۔ "ایک رات گزر جاتی تو تیرا انجام خراب ہوتا تھانے دار۔"

میں نے کہا "تریونی صاحب سے کچھ مت کہنا۔"

"معافی تو مانگنی پڑے گی تجھے ان کے سامنے جاکے۔"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا "اچھا۔ اگر مقدر میں ذلت بھی ہے تو پیشی بھی بھگت لیں گے۔ مگر تم سفارش کردینا کہ جیسے ہی مجھے معلوم ہوا کہ تم کس کے آدمی ہو' میں نے تمہیں چھوڑ دیا تھا۔"

"میرے دوسرے ساتھی کہاں ہیں؟" اس نے بڑی نخوت سے کہا۔

میں نے کہا "ایک کو گرداور صاحب کے گھر میں ٹھہرا رکھا ہے میں نے۔ اس نے گرداور سے بات کی' پھر گرداور نے مجھے سمجھایا۔ جب بات ہوئی تو ساری بات کا پتا چلا۔ میں تو ڈر رہا تھا مگر گرداور نے کہا کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں' ان سب کو چھوڑ دو۔ چنانچہ میں یہاں آگیا' تم اب آزاد ہو۔"

اس نے کہا "میرے ساتھ یہاں کوئی اور بھی تھا۔"

میں نے کہا "ہاں۔ اسے بھی چھوڑ دیا ہے میں نے۔"

وہ ایک دم چونکا "کہاں ہے وہ؟"

میں نے کہا "باہر' تمہارا انتظار کررہا ہے۔"

اس نے مجھے ایک فحش گالی دی اور باہر کی طرف لپکا۔ ظاہر ہے اتنی دیر میں محسن بہت دور جاچکا تھا۔ وہ سخت اشتعال کے عالم میں چیختا چلاتا واپس آیا۔

"باہر کوئی نہیں ہے' وہ بھاگ گیا۔"

"بھاگ گیا!" میں نے حیران ہو کے کہا "تمہیں چھوڑ کے بھاگ گیا۔"

اس نے مجھے ایک درجن غلیظ گالیاں دیں "یہ سب حرامی پن ہے تیرا تھانے دار۔"

"میں نے کیا غلطی کی... اگر اسے چھوڑ دیا" میں نے کہا۔ "میں مانتا ہوں کہ تمہیں پکڑ کے غلطی کی تھی میں نے۔"

"مگر وہ ہے کہاں؟" وہ چیخ کر بولا۔

"کیا وہ باہر نہیں ہے؟" میں نے حیران ہوکے کہا۔

"وہ باہر نہیں ہے" اس نے میرا گریبان پکڑ لیا۔

میں نے ایک ہاتھ مار کے خود کو چھڑا لیا "میں نے اسے حوالات سے نکال دیا تھا اور اس نے کہا تھا کہ میں باہر کھڑا ہوا ہوں۔ جاکے اچھی طرح دیکھو۔"

"اچھی طرح دیکھ لیا ہے میں نے" وہ اسی طرح چیخ کے بولا۔

"اگر وہ بھاگ گیا ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ آخر وہ دوست تھا تمہارا' کوئی قیدی نہیں تھا۔ بھاگ کر واپس ہی جائے گا نا۔"

وہ بکتا جھکتا میرے ساتھ گرداور کے گھر گیا۔ وہاں مزید ہنگامہ ہوا۔ وہ دونوں جو محسن کو پکڑ کے لائے تھے' اپنی ساری کامیابی کے اچانک ناکامی میں بدل جانے سے سخت مشتعل تھے۔ وہ مجھے ساری خرابی کا ذمے دار سمجھتے تھے۔

گرداور نے کہا "یار اب اس میں تھانے دار کی کیا غلطی ہے؟"

"غلطی سب اس کی ہے' اس نے جانتے بوجھتے اسے موقع دیا..." وہ شخص چلانے لگا جو گرداور کے گھر میں ٹھہرا ہوا تھا۔

"کیا عجیب بات کرتے ہو' تم نے کہا تھا کہ سب کو چھوڑ دو۔ اس نے چھوڑ دیا" گرداور بولا۔

میں نے کہا "آپ خود ہی بتائیں جی کہ میں اور کیا کرتا' اگر میں نے انہیں پکڑا تو میری غلطی' چھوڑ دیا تب بھی غلطی۔"

ایک نے کہا "تو جھوٹ بکتا ہے' تو نے اسے چھوڑا ہی نہیں۔ تو نے خود غائب کردیا ہے اسے" دوسرا بولا۔

میں نے کہا "میں ایک کو رکھ کے کیا کروں گا' نہ چھوڑتا تو کو بھی نہ چھوڑتا۔"

گرداور نے کہا "ہاں بھئی' تمہارا ساتھی زیادہ ڈرپوک تھا باہر نکلتے ہی کہیں چھپ گیا... یا واپس چلا گیا اکیلا ہی۔"

...وہ دونوں جانتے تھے کہ اصل بات یہ نہیں ہے لیکن اب وہ گرداور کے سامنے اپنی بات سے مکر نہیں سکتے تھے۔ انہوں نے محسن کو بھی اپنا ساتھی قرار دیا تھا۔ یہ بات انہوں نے میرے سامنے پولیس والوں کے سامنے بھی کہی تھی اور اس کی تائید محسن نے بھی کی تھی۔

صرف میں جانتا تھا کہ وہ محسن ہے اور انہیں بتا چکا تھا کہ انہوں نے محسن کو شناخت کرلیا ہے چنانچہ ان کا مجھ پر شک کرنا بجا تھا۔ میں نے اسے فرار کا موقع فراہم کردیا۔

گرداور کے گھر سے روانہ ہونے کے بعد انہوں نے راستے میں گاڑی روک لی۔

"دیکھو تھانیدار' تم جانتے ہو کہ وہ ہمارا ساتھی نہیں تھا۔"

"تم کس کی بات کررہے ہو؟" میں نے کہا۔

"ہم محسن کی بات کررہے ہیں" وہ چلا کے بولا۔

"محسن تمہارا ساتھی نہیں تھا؟" میں نے سخت حیران ہو کے کہا "مگر یہ تو خود محسن نے اعتراف کیا تھا۔"

"وہ جھوٹ بول رہا تھا" دوسرے نے کہا۔

"تم لوگوں نے میرا دماغ خراب کردیا ہے" میں نے کہا۔ "کچھ پتا نہیں چلتا کہ جھوٹ کیا ہے اور سچ کیا۔ پہلے تم نے کہا تھا کہ تم سب محسن کے ساتھی ہو' تم نے خود کو سکندر بخت کہا تھا اور اس کو غالب حالانکہ یہ جھوٹ تھا اور تم نے مان لیا تھا کہ یہ جھوٹ تھا۔ پھر تم نے گرداور کے سامنے اس سے بھی بڑا جھوٹ بولا۔"

"ہم نے گرداور کے سامنے جو کچھ کہا تھا سچ تھا۔"

"کیا واقعی وہ نام اور ٹیلی فون نمبر درست تھے؟"

"ہاں' وہ سب ٹھیک تھے۔"

"تم واقعی تریونی کے آدمی ہو؟"

"کیا تمہیں شک ہے؟" وہ چیخ کر بولا۔

میں نے اپنا سر پکڑ لیا "یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ میں تو سمجھا تھا کہ تم گرداور کو متاثر کرنے کے لئے خود کو تریونی کا آدمی بتا رہے ہو اور تمہارا مقصد صرف اپنا اعتبار قائم کرکے رہائی حاصل کرنا ہے۔"

اس نے مجھے ایک گالی دی "پاگل کے بچے' وہ سب نام اور ٹیلی فون نمبر ٹھیک تھے' جیسے چاہو تصدیق کرلو۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ تم تریونی کے آدمی ہو تو محسن تمہارا ساتھی کیسے ہوگیا!"

"وہ قیدی تھا' ہم اسے پکڑ کے لائے تھے۔"

میں نے کہا "میں نہیں مان سکتا' وہ قیدی ہوتا تو آزاد نہ ہوتا۔ ...نہ اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ نہ اسے کوئی اور مجبوری لاحق تھی۔ اس نے خود اپنی مرضی سے کسی دباؤ یا خوف کے بغیر کہا تھا کہ تم اس کے ساتھی ہو۔"

ظاہر ہے میرا مقصد صرف وقت ضائع کرنا تھا تاکہ محسن کو زیادہ سے زیادہ دور جانے کا موقع مل سکے۔ اس کے علاوہ میں خود اپنی جان بھی بچانا چاہتا تھا۔ میں انہیں یہ تاثر نہیں دینا چاہتا تھا کہ میں نے محسن کی مدد کی ہے۔ الزام میں نے انہی پر رکھ دیا کہ انہوں نے مختلف اور متضاد باتوں سے مجھے کنفیوژ کیا اور غلطی خود ان کی ہے' کہ انہوں نے مجھے حقیقت نہیں بتائی۔ وہ سخت پریشان ہوئے۔ انہیں اب جواب دہی کی فکر لاحق ہوگئی تھی۔ ان کی اسکیم کامیاب تھی مگر عین وقت پر میری مداخلت نے ان کا سارا کام خراب کردیا تھا۔ وہ اب خوف زدہ تھے۔

"اب ہم باس کو کیا بتائیں گے؟" ایک نے کہا۔

دوسرے نے میری طرف دیکھا "بتادیں گے کہ سب اس کا حرامی پن ہے۔"

میں نے کہا "مجھے گالی مت دو' میں خود تریونی سے بات کرسکتا ہوں۔"

"تم... تم کیا بات کرو گے اس سے؟"

"میں اسے بتادوں گا کہ تم نے سب کے سامنے خود کو محسن کا ساتھی بتایا تھا' تم نے خود کو سکندر بخت اور اس کو غالب کہا تھا۔"

اس کے اوسان خطا ہوگئے "کوئی ضرورت نہیں ایسا کہنے کی۔"

"مجھے کچھ تو بتانا ہی پڑے گا۔ میں وہی بتاؤں گا جو سچ ہے۔ اس کے گواہ بھی ہیں میرے پاس۔ خود گرداور جانتا ہے کہ میں نے کوئی غلطی نہیں کی۔ غلط فہمی رفع ہوتے ہی میں نے تم سب کو چھوڑ دیا۔ نہ تم نے مجھے یہ بات بتائی تھی اور نہ گرداور کو... کہ محسن تمہارا قیدی تھا۔"

اب انہوں نے محسوس کیا کہ میری پوزیشن بہت محفوظ ہے اور تریونی مجھے موردِ الزام قرار نہیں دے سکتا۔ الٹا میرے بیان سے وہ مجرم ثابت ہوتے ہیں اور محسن کے فرار ہونے کی ذمے داری انہی کی غلط بیانی پر عائد ہوتی ہے۔ انہوں نے مجھے سمجھا بجھا کے خاموش رہنے پر رضامند کرلیا۔

"تم اس معاملے سے بالکل الگ رہو۔ سمجھ لو کہ ہم تمہیں ملے ہی نہیں تھے" ایک نے کہا۔

دوسرا بولا "یہ بات گرداور کو بھی سمجھا دینا اور اپنے ماتحتوں کو بھی۔"

"آخر تم کیا کہو گے اپنے باس تریونی سے؟" میں نے کہا۔

"ہم کہہ دیں گے کہ محسن کو اس کے ساتھی چھڑا کے لے گئے۔ انہوں نے اچانک حملہ کر دیا تھا۔"

دوسرا بولا "ٹائر میں گولی کا سوراخ ہمارے بیان کی تائید کرے گا۔"

"کیا تریونی یہ بات مان لے گا اور اس طرح کیا تم پر کوئی الزام نہیں آئے گا؟" میں نے کہا۔

"الزام اتنا زیادہ سنگین نہیں رہے گا' یہ ہماری غلطی نہیں سمجھی جائے گی۔"

"ہم گاڑی میں دو چار سوراخ کرلیں گے ... اور ایک دوسرے کو تھوڑا بہت زخمی بھی' جس سے یہ ظاہر ہو گا کہ ہم نے مقابلہ کیا تھا مگر ہم کچھ نہیں کرسکے۔ وہ ہماری مشین گن اور ریوالور بھی چھین کر لے گئے۔ ہم جان بچا کے فرار نہ ہوتے تو مارے جاتے۔"

باہمی مشورے کے بعد انہوں نے ایسا ہی کیا۔ انہوں نے ایک دوسرے کی ٹانگ پر اور بازو پر گولی چلائی۔ اس طرح کہ ہڈی پر چوٹ نہ آئے۔ زخموں پر کپڑے پھاڑ کر باندھے۔ چند گولیاں کار پر چلائیں جس سے اس کا ونڈ اسکرین پاش پاش ہو گیا اور ایک سائڈ کی کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ گیا۔ اس کے بعد وہ گاڑی لے کر بھاگ گئے۔ مجھے ان کے ڈرامے پر بہت ہنسی آئی۔ وہ کیا مقصد لے کر آئے تھے اور کس طرح ناکام ہو گئے۔ ان کی ساری تدبیریں الٹی ہو گئیں اور وہ جال خود ان کے لئے مصیبت بن گیا جو انہوں نے بڑی عیاری سے دشمنوں کے لئے پھیلایا تھا' محسن کی رہائی کے لئے قدرت نے جو بندوبست کیا تھا اس میں میری حیثیت صرف وسیلے کی تھی۔ یہ خدا کا حسن انتظام تھا کہ میں بھی محفوظ رہا اور مجھے تمہاری مدد کرنے کا موقع بھی ملا۔"

آصف جاہ کی بات ختم ہونے کے بعد کچھ دیر ہم خاموش بیٹھے رہے۔ نازو کی نیند بھی اڑ گئی تھی۔ وہ بھی گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھے آصف جاہ کو دیکھ رہی تھی۔ دیارِ غیر اور دشمنوں کے حصار میں اس کا وجود خدا کی غیبی امداد کا جیتا جاگتا ثبوت تھا۔

میں نے کہا "اس کا مطلب یہ ہے کہ محسن یہاں سے فرار ہونے کے بعد ہی خانہ بدوشوں کے قبیلے میں پہنچا تھا۔"

"یہ بات تو مجھے نہیں معلوم تھی؟" آصف جاہ چونکا۔

میں نے کہا "ہاں۔ وہاں سردار کے بیٹے نے اس کو کپڑے دئے تھے اور سواری کے لئے ایک گدھا بھی دیا تھا۔"

غالب نے کہا "مگر اس نے یہ کام راہ خدا میں نہیں کیا تھا۔ اس نے معاوضہ لیا تھا۔"

میں نے کہا "اس کے پاس پیسے کہاں سے آگئے تھے؟"

آصف جاہ نے کہا "سردار کے بیٹے نے کیا قیمت وصول کی تھی؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا "یہ تو معلوم نہیں' لیکن رقم کم نہیں تھی۔"

غالب نے کہا "ہم اور وہ آگے پیچھے ہیں۔ پہلے وہ خانہ بدوشوں کے قبیلے میں پہنچا تھا۔"

نازو نے کہا "اگر وہ رک جاتا تو ہم مل جاتے۔"

غالب نے کہا "ایسا ہی یہاں بھی ہوا۔ ہم اس کے فرار ہو جانے کے بعد پکڑے گئے اور یہاں بھی اس کے جانے کے بعد پہنچے۔"

"اب معلوم نہیں وہ کہاں ہو گا؟" نازو نے سرد آہ بھر کے کہا۔

"ہو گا اسی علاقے میں' وہ ہمیں تلاش کر رہا ہو گا۔"

میں نے کہا "تھانے دار صاحب' کیا تمہارے آدمی اس قبیلے کو تلاش کرلیں گے؟"

آصف جاہ نے کہا "میں نے تو انہیں فوراً روانہ کر دیا تھا۔ دم لینے کی مہلت بھی نہیں دی تھی۔"

"کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ اپنے اپنے گھروں میں سو نہیں رہے ہوں گے؟"

"واقعی خانہ بدوشوں کی تلاش میں گھوڑے دوڑا رہے ہوں گے؟" میں نے کہا۔

"اور کیا صبح ہونے سے پہلے کوئی اطلاع آجائے گی؟" نازو بولی۔

آصف جاہ نے گھڑی دیکھی "ابھی ساڑھے بارہ بجے ہیں۔ تم لوگ صبح پانچ بجے تک سو سکتے ہو۔ اس وقت تک کچھ نہ کچھ ضرور معلوم ہو جائے گا۔"

میں نے کہا "ہمارا اسلحہ کہاں ہے؟ جو تم نے ضبط کیا تھا۔"

"ابھی اس کی کیا ضرورت ہے۔ صبح جانے سے پہلے تمہیں مل جائے گا۔"

میں نے کہا "ہم ایسے بے فکر ہو کے نہیں سو سکتے۔ میں اور غالب باری باری جاگتے رہیں گے۔"

آصف جاہ نے کہا "میں تھانے میں ہوں' کوئی آئے گا تو وہاں آئے گا۔ یہاں تمہیں کسی کا ڈر نہیں ہونا چاہئے... لیکن آؤ میرے ساتھ' میں تمہیں ریوالور دے دوں۔"

تھانے میں وہ کانسٹیبل ابھی تک بے خبر سو رہا تھا جس کی وہاں نائٹ ڈیوٹی تھی۔ آصف جاہ کی دی ہوئی خواب آور دوا کا اثر پانچ چھ گھنٹے سے پہلے ختم نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے ہم تینوں کے لئے ریوالور فراہم کئے۔ محسن کو قید کر کے یہاں لانے والے بھی اپنا اسلحہ آصف جاہ کے پاس چھوڑ گئے تھے۔ اس میں ان کا مشین گن بھی تھی جس کے بارے میں انہوں نے تریونی سے کہا ہو گا کہ سکندر بخت کے ساتھی چھین کر لے گئے۔

آصف جاہ پولیس چوکی پر ہی رک گیا تھا۔ میں جب واپس آیا تو صرف غالب جاگ رہا تھا۔ پانچ منٹ میں نازو گہری نیند کی آغوش میں پہنچ چکی تھی۔ میں نے غالب سے کہا کہ وہ بھی سو جائے لیکن وہ کوشش کے باوجود نہ سو سکا۔ ہم نے کچن میں جا کے مٹی کے تیل کا چولہا جلایا اور چائے بنانے کے لئے پانی ابالا' چائے کے دیگر لوازمات تلاش کئے اور چائے پیتے ہوئے اس صورت حال کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔

آصف جاہ کی مدد نے امید کے نئے چراغ روشن کر دئے تھے۔ مجھے تشویش اب بھی تھی مگر رابعہ اور گل کے علاوہ محسن سے پھر ملنے کے امکانات میں مایوسی کا پہلو نہیں رہا تھا۔ خانہ بدوشوں کے قبیلے کے ساتھ وہ بہت زیادہ دور نہیں جا سکتی تھیں۔ آصف جاہ نے بتایا تھا کہ یہ قبیلے چالیس پچاس میل کے دائرے میں ہی جگہ بدلتے رہتے ہیں۔ وہ خود اپنی حفاظت کرنے کی اہل تھیں۔ ریوالور ان دونوں کے پاس تھے اور ضرورت پڑنے پر وہ اس سے کام لینا بھی جانتی تھیں۔ قبیلے کے سردار نے وہ رقم واپس نہیں کی تھی جو اس نے ہمیں تحفظ فراہم کرنے کے لئے وصول کی تھی چنانچہ یہ بات بعید از قیاس نہیں تھی کہ وہ قبیلے کے ساتھ ہی رابعہ اور گل کو بھی حفاظت میں رکھے۔ میں نے انہیں تاکید کی تھی کہ وہ قبیلے کا ساتھ نہ چھوڑیں۔ اگر پولیس ان کو تلاش نہ کر سکی تو ہم خود کرلیں گے۔ یہ کام زیادہ مشکل نہیں تھا مگر ہر جگہ کی موجودگی نے مشکل بنا دیا تھا۔

مجھے اصل پریشانی محسن کی طرف سے تھی کہ کہیں وہ پھر نہ پھنس جائے۔ اس نے آصف جاہ پر اعتماد نہ کر کے غلطی کی تھی۔ اگر وہ فرار ہونے میں عجلت سے کام نہ لیتا تو آصف جاہ کی مدد اس کے تمام مسائل حل کر دیتی۔ وہ اپنا پتا چھوڑ جاتا یا اتنا ہی کہہ جاتا کہ بعد میں آصف جاہ سے رابطہ رکھے گا تو ہمارے لئے ایک دوسرے کا سراغ لگانا آسان ہو جاتا۔ ہم یہاں غیر معینہ مدت تک قیام نہیں کر سکتے تھے۔ صبح کا اجالا پھیلنے سے پہلے ہی ہمارا اس علاقے سے نکل جانا بہت ضروری تھا۔

باقی مسائل فی الحال پس منظر میں چلے گئے تھے۔ شہلا اب تک دشمنوں کے قبضے میں تھی اور اس کا سراغ بھی گم ہو گیا تھا۔ ہم نے چوہدری دلاور کو زبردست مالی نقصان پہنچایا تھا اور اس کے اسلحے کا بہت بڑا ذخیرہ تباہ کر دیا تھا مگر ہم شہلا کو واپس حاصل کرنے میں ناکام رہے تھے۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس شکست کا خمیازہ بھی وہی بھگتے گی۔ ایک اور زخم کھانے کے بعد دلاور اور تریونی کی آتش غیظ و غضب بھڑک اٹھی ہو گی۔ ملہوترہ ان کے لئے ایک ٹرمپ کارڈ سے کم نہ تھا۔ باقی سب کارڈ اتنے اہم نہیں تھے' ملہوترہ کو اور اس کے ٹھکانے کو پوشیدہ رکھنے کے لئے انہوں نے بڑی رازداری برتی تھی۔ انہیں ہرگز امید نہ ہو گی کہ ہم ان کی خفیہ تحریر کا مطلب نکال کے یہاں بھی پہنچ جائیں گے۔

رات دو بجے کے بعد غالب بھی سو گیا۔ میں چائے اور سگریٹ پیتا رہا اور ریوالور اپنے قریب رکھے جاگتا رہا۔ میرے خیالات کی رو ہر سمت بھٹکتی رہی اور میرے تصور نے مجھے بہت ہراساں کیا۔ جو میں دیکھنا نہیں چاہتا تھا وہی مناظر بار بار سامنے آئے۔ وقت گزر گیا تھا لیکن ناخوشگوار واقعات اور مناظر کے... نقوش ذہن پر ثبت کر گیا تھا یہ تنہائی اور مایوسی کی کیفیت کا اثر تھا کہ میں زندگی کے خوب صورت لمحوں کی یاد سے دور رہا۔

صبح تین بجے کے قریب آصف جاہ آیا اور اس نے میری مایوسی میں اضافہ کیا۔

"خانہ بدوشوں کے قبیلے کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ میرے آدمی ہر جگہ دیکھ آئے ہیں" اس نے کہا۔

میں نے کہا "چار پانچ گھنٹے میں انہوں نے سارا علاقہ کیسے چھان مارا؟ وہ بھی رات کے وقت۔"

اس نے کہا "میں بھی تم سے یہی کہنے والا تھا کہ مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں۔ خدا نے چاہا تو دن کے اجالے میں ان کا پتا چل جائے گا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اس مرتبہ وہ زیادہ دور چلے گئے ہوں۔"

"میرا خیال ہے کہ تمہارے شہسواروں نے مجبوری میں فرض پورا کیا ہو گا اور ایسے ہی دو چار میل کا چکر لگا کے لوٹ آئے ہوں گے۔"

"ہاں' یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کہیں بیٹھے گپ لگاتے رہے ہوں اور واپس آکے رپورٹ دے دی ہو کہ ہر جگہ دیکھ لیا... کل... میرا مطلب ہے صبح ہونے کے بعد میں خود جاؤں گا۔ آس پاس کے سارے علاقے میں پولیس بہت سرگرم ہے۔ وہ ہر راستے کی نگرانی کر رہے ہیں۔ کسی نے اس قبیلے کو بھی ضرور دیکھا ہو گا۔ ممکن ہے ان کے ٹرک کو روک کر چیک بھی کیا گیا ہو۔"

میں نے کہا "تم نے ہمیں سب کے سامنے گرفتار کیا تھا۔ اب تم اپنے ماتحتوں کو کیا بتاؤ گے ہمارے بارے میں؟"

آصف جاہ نے ہنس کے کہا "میری فکر مت کرو' میں انہیں مطمئن کرنا جانتا ہوں۔"

"پھر بھی' پتا تو چلے کہ تم کیا کہو گے؟"

"میں کہہ دوں گا کہ ڈی ایس پی صاحب نے ہر چوکی سے معلوم کیا تھا کہ کہیں کوئی پکڑا گیا ہو تو ان کے حوالے کر دیا جائے۔ ہمارے پاس جو بندے تھے وہ ہم نے ان کی تحویل میں دے دئے۔ ہمارا کام اور ہماری ذمے داری ختم ہو گئی۔ ڈی ایس پی نے سات میل دور اپنا کیمپ آفس قائم کر لیا ہے۔"

"کیا وہ معلوم نہیں کرسکتے؟"

"وہ بے چارے اتنی ہمت نہیں رکھتے کہ کسی ڈی ایس پی سے بات بھی کرسکیں" آصف جاہ نے کہا "انہیں کیا معلوم کہ ڈی ایس پی صاحب کا کیمپ آفس کہاں ہے اور وہاں کوئی ڈی ایس پی ہے۔ افسر صرف افسر سے بات کرتا ہے اور میں بھی افسر ہوں۔ تمہارے لئے چھوٹا سہی' سپاہیوں کے لئے بہت بڑا ہوں۔ مستند ہے میرا فرمایا ہوا۔"

”تمہاری پوزیشن بہت نازک ہے اور اس کیس میں تمہارے ساتھ ہمارا بھی نام آیا ہے۔ تریونی اور دلاور کو ذرا بھی شک ہوا تو وہ تمہارے لئے مشکلات کے پہاڑ کھڑے کردیں گے۔“

”اللہ مالک ہے“ اس نے اوپر دیکھ کے کہا۔

وہ واپس چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی غالب اٹھ بیٹھا اور اس نے مجھے دو گھنٹے کے لئے سونے پر مجبور کردیا۔ پھر میری آنکھ کھلی تو پونے پانچ بجے تھے۔ نازو مجھ سے پہلے بیدار ہوچکی تھی اور باورچی خانے میں ایسے بیٹھی ہوئی تھی جیسے وہی اس گھر کی مالکن ہے۔ میں نے منہ پر پانی کے چھینٹے مار کے غنودگی کو دور کیا اور تیار ہوگیا۔ رات بھر کے آرام نے ہم سب کو اتنا تازہ دم کردیا تھا کہ اب ہم ایک اور دن کے مسائل سے نمٹ سکتے تھے۔

جب ہم چائے پی رہے تھے اور مکھن کے ساتھ رات کی روٹی کھا رہے تھے تو آصف جاہ آگیا۔ وہ خاصا پریشان نظر آتا تھا۔

”تم لوگ تیار ہو؟“

میں نے کہا ”کوئی بری خبر لائے ہو کیا؟“

وہ زبردستی مسکرایا ”نہیں۔ میں نے ایک تانگہ منگوایا ہے۔“

”کس کا تانگہ ہے؟“ میں نے کہا۔

”ہے ایک لڑکا‘ میرے کام کرتا رہتا ہے۔ میں نے اسے سب سمجھادیا ہے‘ وہ تمہیں نکال کر لے جائے گا‘ بہت ہوشیار لڑکا ہے۔“

میں نے کہا ”بھروسے کے قابل بھی ہے؟“

غالب نے کہا ”تم نے کیا بتایا ہے ہمارے متعلق؟“

آصف جاہ مسکرایا ”ایسی کوئی بات نہیں بتائی جو تمہارے لئے پریشانی کا باعث بنے۔ صرف یہ کہا ہے کہ میرے خاص آدمی ہیں جو برقعے اوڑھ کر تمہارے ساتھ جائیں گے۔“

”برقعے اوڑھ کر!“ میں نے اور غالب نے ایک ساتھ کہا۔

”دیکھو‘ اس کے سوا کوئی صورت نہیں‘ پولیس قدم قدم پر بہت سخت چیکنگ کررہی ہے۔ تم کچھ بھی حلیہ بنالو‘ وہ پہچان جائیں گے۔ میرے پاس میک اپ کرکے تمہاری صورتیں بدلنے کا سامان تو ہے نہیں۔ صرف کپڑے بدل کے تم انہیں دھوکا نہیں دے سکتے۔ برقعے میں کوئی تمہیں چیک نہیں کرسکتا۔ مسلمان عورتوں کے معاملے میں پولیس کو بہت سخت ہدایات ہیں کہ لیڈی پولیس ساتھ لئے بغیر نہ ان کے گھروں میں جائیں اور نہ ہی ان کی تلاشی لیں۔ یہ مذہبی مسئلہ فوراً جذباتی مسئلہ بن جاتا ہے کہ مسلمان عورتوں کی بے پردگی ہوئی۔“

”اگر ان کے ساتھ لیڈی پولیس ہوئی پھر؟“

”مجھے معلوم ہے کہ لیڈی پولیس نہیں ہے۔ شاید کیمپ آفس میں ڈی ایس پی کے ساتھ کوئی لیڈی سرچر ہو لیکن ہر پارٹی کے ساتھ نہیں ہے۔ ہو بھی نہیں سکتی‘ ایک عورت دن رات جنگلوں میں کیسے بھٹک سکتی ہے۔ کہاں کہاں جاسکتی ہے۔ چنانچہ تم بالکل محفوظ رہو گے۔ ناجی خود ہی بات کرے گا۔“

”ناجی کون؟“

”ناجی وہ لڑکا ہے‘ اصل نام تو نذیر ہے مگر لوگ ناجو یا ناجی کہتے ہیں‘ وہ تانگہ چُرا کے لا رہا ہے۔“

میں نے چونک کر کہا ”چُرا کے کیوں؟“

”بات یہ ہے بھائی کہ اور کوئی ذریعہ نہیں ہے نقل و حمل کا... اگر میں گاؤں کے کسی آدمی سے تانگہ منگواتا تو وہ پوچھتا کہ کون جائے گا‘ کہاں جائے گا۔ میں خواہ مخواہ پبلسٹی نہیں چاہتا۔ کسی کو معلوم بھی نہیں ہونا چاہئے کہ میرے گھر سے تین برقع پوش عورتیں منہ اندھیرے کہیں گئی تھیں۔ یہاں کسی کے گھر کے معاملات کسی سے بھی پوشیدہ نہیں۔ سب جانتے ہیں کہ میری بیوی میکے گئی ہوئی ہے۔“

”اگر یہ لڑکا ناجی پکڑا گیا تو کیا ہوگا؟“ نازو نے کہا ”چوری کا تانگہ ہوگا۔“

”صبح ہونے تک کسی کو بھی تانگے کی چوری کا پتا نہیں چلے گا... تم لوگ اس وقت تک بہت دور جاچکے ہوگے۔ ایک گھنٹے میں تانگہ تمہیں آٹھ دس میل دور لے جائے گا۔“

”رات کے وقت بھی؟“

”ہاں۔ میں نے کہا تاکہ وہ لڑکا بہت ہوشیار ہے۔ وہ اپنا حلیہ بدل کے آئے گا تاکہ اسے کوئی پہچان نہ سکے۔“

”وہ کیا بتائے گا کہ سواریاں کس کے گھر کی ہیں؟“ غالب نے کہا۔

”پیر عنایت کے گھر کی“ آصف جاہ نے کہا ”پیر عنایت سے اس علاقے کے لوگ واقف ہیں۔“

”کیا بعد میں معلوم نہیں ہوجائے گا....“

”تم بعد کی فکر چھوڑو۔ پیر عنایت کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا... وہ کہہ دے گا کہ کسی نے میرا نام استعمال کیا تھا۔ میرے گھر سے کوئی عورت کہیں بھی نہیں گئی اور اس کو جھوٹا کوئی نہیں کہہ سکتا۔“

”ناجی واپسی میں پکڑا جائے گا۔“

آصف جاہ نے نفی میں سر ہلایا ”وہ تانگہ واپس نہیں لائے گا۔ وہ دو چار دن بعد بھی آسکتا ہے۔ بس سے یا پیدل اور اس پر کوئی شک نہیں کرسکتا۔ وہ بمبئی جاتا رہتا ہے کسی کو بتائے بغیر‘ اس کو پوچھنے والا کوئی ہے بھی نہیں۔ ماں باپ مرچکے ہیں۔ گاؤں میں کوئی رشتے دار بھی نہیں تھا‘ لوگوں کے گھروں کی روٹیاں توڑ کے اور سب کے کام کرکے پلا بڑھا ہے۔ اس سے کسی کو شکایت نہیں ہے۔“

”وہ تمہارے کام کیوں کرتا ہے؟“

”وہ سب کے کام کرتا ہے۔ اس کام کا میں نے انعام بھی دینے کا وعدہ کیا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ میں تھانے دار ہوں‘ انعام

ملتا ہوں تو سزا بھی دینے کا اختیار رکھتا ہوں۔“

”گویا تمہارا مخبر ہے وہ؟“

”یہی سمجھ لو۔ مخبری کے نظام کے بغیر پولیس کام نہیں کرسکتی اس لڑکے نے کبھی غلط اطلاع نہیں دی۔ میں نے کہا تھا کہ کسی اور کا ہو اور گھوڑا کسی اور کا۔ تاکہ سارا نقصان ایک ہی کا نہ ہو۔“

میں نے کہا ”ہم یہ نقصان پورا کردیں گے۔ تم ہماری طرف سے‘ اپنی طرف سے دونوں کو معاوضہ ادا کردینا۔“

”مجھے کیا ضرورت ہے سخی بننے کی۔ میرا کام ہے رپورٹ اور تفتیش کرنا‘ یہاں ایسی چوریاں ہوتی ہی رہتی ہیں۔ دو دن بعد میں گھوڑا اور تانگہ برآمد کرلوں گا“ آصف جاہ بولا۔

”کہاں سے؟“

”ناجی بتادے گا کہ اس نے تانگہ گھوڑا کہاں چھوڑا ہے۔ تم اپنے سر پر خواہ مخواہ فکر مت سوار کرو۔ جو میرا کام ہے مجھ پر چھوڑ دو“ آصف جاہ نے کہا۔

نازو نے کہا ”ابھی تک یہ معلوم نہیں ہوا کہ برقعے کہاں سے آئیں گے۔“

”برقعے زینب لائے گی۔ ایک تو اس کا اپنا ہے۔ دوسرا اس کی بیٹی کا‘ تیسرا کہیں سے حاصل کرلے گی۔“

”زینب..... گویا اسے معلوم ہوگا... کہ ہم اس طرح فرار ہورہے ہیں؟“

”ہاں۔ اس کی مدد کے بغیر میں کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ میں اس سے برقعے مانگنے جاتا‘ میری بہن پر بھروسہ کرو۔“

میں نے کہا ”مجھے تو شرم آرہی ہے‘ کیا سوچے گی وہ؟“

”وہ کچھ نہیں سوچے گی‘ اسے میں مطمئن کرلوں گا۔ رات جب میں کھانا لینے گیا تھا تو میرے جانے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اسے پہلے سے بتادوں۔ کیا تمہیں اس کے رویّے سے کچھ ایسا لگا تھا کہ وہ تم پر شک کرتی ہے یا تمہیں اچھا نہیں سمجھتی؟“

دروازے کی کنڈی آہستہ سے بجی۔ آصف جاہ نے دروازہ کھولا اور زینب پھر اندر آئی پیر عنایت اس کے پیچھے تھا۔ ان کے سامنے ہم سب شدت سے احساسِ جرم میں مبتلا ہوگئے۔ وہ بہت بھولے لوگ تھے اور صرف اس لئے ہماری مدد کررہے تھے کہ ہم آصف جاہ کے مہمان تھے۔ ہم نے ان سے خوب جھوٹ بولا تھا۔ شاید وہ جانتے تھے کہ ہم جھوٹ بول رہے ہیں مگر انہوں نے پوری کوشش کی تھی کہ ہمیں شرمندگی نہ ہو۔

زینب نے برقع اتار کے اندر سے ایک اور گٹھری برآمد کی۔ اس بار بھی پیر عنایت نے ہمیں گلے لگایا اور ایک بار پھر ہم پر کچھ پڑھ کے پھونکا ”اللہ اپنا فضل کرے گا‘ کفار سے محفوظ رکھے گا“ اس نے کہا۔

”یہ لو پتر‘ اب فٹافٹ نکل جاؤ“ زینت نے نازو کو برقعے پکڑا کے کہا ”اور یہ تو نے جو لال سُوا جوڑا پہن لیا ہے۔ اللہ مبارک کرے مگر ابھی اس کو بدل دے۔ یہ راستے کے لئے ٹھیک نہیں‘ میں تم سب کے لئے پرانے کپڑے لائی ہوں۔ یہاں آصف کی بیوی کے کپڑے کم نہ ہوں ورنہ وہ پوچھے گی۔“

”اب دیر مت کرو“ آصف جاہ نے کہا ”کھڑے شرماتے رہوگے تو وقت نکل جائے گا۔“

باہر گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز سنائی دی تو وہ دروازے کی طرف لپکا ”میرا خیال ہے کہ ناجی آگیا۔“

”ہم اب چلتے ہیں پُتر“ زینب نے نازو کا ماتھا چومنے کے بعد میری اور غالب کی پیشانی چومی۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ اپنے چھوٹے بھائی آصف جاہ کی پیشانی پر بڑی بہن کی مہرِ محبت ثبت کرتی ہوگی ”اللہ خیر سے لے جائے‘ اپنی امان میں رکھے۔“

پھر اس نے ایک اور ایسی حرکت کی جس نے ہم سب کو جذباتی کردیا۔ وہ اپنے ساتھ سبز رنگ کے کپڑے میں سوا روپیا باندھ کے لائی تھی۔ اس نے ہم تینوں کے بازو پر امام ضامن باندھے ”علی مشکل کشا تمہارے ساتھ‘ پاک نبی ﷺ کا سایہ تم پر‘ پنج تن پاک کا صدقہ‘ جاؤ رب راکھا۔“

پیر عنایت نے پھر ہمیں گلے لگایا اور تیسری بار کچھ پڑھ کے ہم پر پھونکتے ہوئے وہی دعا کی ”اللہ محافظ ہو‘ کفار سے بچائے۔“

نہ جانے کیوں ایک دم میرا سارا خوف دور ہوگیا۔ میرے دل کو عجیب سا سکون اور قرار حاصل ہوگیا۔ یہ نفسیاتی ردِ عمل تھا یا کچھ اور‘ حقیقت یہ ہے کہ میری ساری پریشانی اور تشویش ختم ہوگئی اور میں نے اپنے وجود میں اعتماد اور حوصلے کے ساتھ نیا ولولہ بیدار ہوتے محسوس کیا۔ اب مجھے احساس ہوا کہ آصف جاہ غلط نہیں کہتا تھا۔ شاید پیر عنایت پر اس کا اعتقاد بے سبب نہیں تھا۔

وہ دونوں جیسے آئے تھے ویسے ہی خاموشی سے چلے گئے۔ واپس جاتے ہوئے زینب کے سر پر برقع نہیں تھا۔ اس نے اندھیرے کی چادر کو اپنے تحفظ کا ضامن بنالیا تھا اور اس کے شوہر نے بھی بیوی کے یوں بے پردہ ہوجانے پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ حالانکہ وہ کٹر مذہبی خیالات رکھنے والا آدمی تھا۔

زینب بھاری بھرکم‘ دراز قد اور صحت مند عورت تھی‘ اس کے کپڑے میرے اور محسن کے لئے بہت موزوں رہے۔ نازو کے لئے وہ اپنی بیٹی کے کپڑے لائی ہوگی کہ اس کے جسم پر فٹ آگئے۔ یہ دیہاتی وضع کے سلے ہوئے پرانے اور میلے کپڑے تھے جو عام حالات میں ہم دھوئے بغیر استعمال نہ کرتے لیکن اس وقت ان کپڑوں سے خلوص کی وہ خوشبو اٹھتی محسوس ہورہی تھی جو ہمارے تحفظ اور سلامتی کی ضامن تھی۔

مجھے اور غالب کو زنانہ کپڑوں میں دیکھ کر نازو کا ہنستے ہنستے برا حال ہوگیا ”ایمان سے تم وہ لگ رہے ہو“ نازو نے کہا۔

"وہ کون؟"

نازو نے دو ہتھیلیاں ملا کے تالی بجاتے ہوئے زنخوں کی نقل اتاری "اے وہی جو آجاتے ہیں آجاتی ہیں' جہاں موقع دیکھتے ہیں دیکھتی ہیں۔"

میں ہنس پڑا "ایسی باتوں سے ہمارے مورال پر کوئی اثر نہیں پڑسکتا۔"

غالب نے جھینپ کر کہا "ہاں۔ شیر کو نیکر پہناؤ یا غرارہ' یا کچھ مت پہناؤ' وہ شیر ہی رہتا ہے۔"

آصف جاہ نے دروازے کی اوٹ سے کہا "جلدی کرو' صبح ہونے والی ہے۔"

میں نے اور غالب نے برقع سر پر رکھا۔ اس کی لمبائی ہمارے قد کے مطابق نہیں تھی۔ میرا برقع ٹخنوں سے ایک فٹ اوپر رہا۔ غالب کے لئے زینب کسی اور کا برقع مانگ کر لائی تھی۔ یہ بھی اتنا ہی چھوٹا ثابت ہوا تاہم اس کے نیچے ہماری زنانہ شلواریں تھیں۔ میری شلوار گلابی رنگ کے سوتی کپڑے کی تھی اور غالب کی نیلی۔ دونوں پر بھدے پھول تھے۔ یہ پھول کسی ڈیزا ... نے ایجاد کئے تھے۔ میرا خیال ہے کہ قدرت نے ایسے بے ہنگم اور غیر متناسب پھول نہیں بنائے۔

"ذرا اپنی چال میں بھی نسوانیت کی لچک پیدا کرو" نازو نے ایک مفید مش... "... یسے اکڑ کے مت چلو' یا... خان کی طرح"

... شاید کوئی نہ دیکھے' آواز نا ... یا ہوگا؟"

غا... ب ... سلمان پردہ دار عورتیں ... ی غیر مرد سے بات ہی نہیں کرتیں۔"

میں نے مشین گن کو برقعے میں چھپالیا اور ہم سب باہر نکلے۔ دروازے سے کچھ فاصلے پر تانگہ کھڑا ہوا تھا۔ کوچبان بڑے اسٹائل سے پاؤں لٹکائے بیٹھا ہوا سگریٹ پی رہا تھا۔

"تمہارے پاس پیسے ہیں؟" آصف جاہ نے کہا۔

"ہاں' تم کو ضرورت ہے؟"

آصف جاہ ہنسنے لگا "میں مذاق نہیں کر رہا تھا۔ گھر میں اتنی رقم رکھتا ہوں میں۔"

"میں بھی مذاق نہیں کر رہا تھا" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "تم نے بہت رسک لیا ہے ہماری خاطر' خدا تمہیں ہر مصیبت سے بچائے۔"

میں نے کہا "اگر محسن آئے تو اسے کہنا.... کہ ہم سے حاجی صاحب کی معرفت رابطہ قائم کرے۔"

"کون حاجی؟"

"حاجی علی مراد کے مزار پر ان کا ہوس سینٹر ہے' سوات کے رہنے والے پاکستانی ہیں" میں نے کہا۔

"اگر ممکن ہوا تو ہم بھی تم سے معلوم کریں گے۔"

ہم خدا حافظ کہنے کے بعد تانگے میں سوار ہوئے تو صبح کے پونے چھ بجے تھے اور افق پر روشنی کے آثار پیدا ہو چلے تھے۔ میں اگلی سیٹ پر تھا اور تشل کاک برقعے کی جالی میں سے باہر کا منظر دیکھتا جا رہا تھا۔ ناجی سترہ اٹھارہ سال کا لاابالی سا نوجوان تھا۔ اس نے سکھوں کے مخصوص انداز میں پگڑی باندھی تھی چنانچہ وہ ایک نوجوان سکھ ہی نظر آتا تھا جس کی ابھی داڑھی نہ نکلی ہو۔ میں نے یہ بھی اندازہ کیا کہ اسے سگریٹ پینا نہیں آتا۔ وہ دھوئیں کو حلق سے نہیں اتار رہا تھا۔ اس نے زیادہ عمر کا نظر آنے کے لئے سگریٹ جلا کے تھام لی تھی۔

میں نے کہا "ناجی' کیا سکھ سگریٹ پیتے ہیں؟"

وہ ایک دم اچھلا "ہیں جی' کیا غضب کرتے ہو جی' آپ تو مروا دو گے۔"

میں نے کہا "ابھی کون سن رہا ہے؟"

"حد کرتے ہو جی' شہر میں دیواروں کے کان ہوتے ہیں۔ یہاں درختوں کے کان ہوتے ہیں۔ کیا واقعی سکھ سگریٹ نہیں پیتے؟"

"اب پیتے ہوں تو پتا نہیں' اب تو ہندو بھی بہت ماس کھانے لگے ہیں" میں نے کہا۔

اس نے سگریٹ پھینک دی "اچھا کیا آپ نے بتا دیا۔"

"اب تمہارا کیا نام ہے؟"

"بوٹا سنگھ' میرا ایک یار تھا بوٹا ..."

"مر گیا؟"

"ہاں جی' اسے شیر نے کھا لیا۔"

میں حیران رہ گیا "شیر نے! چڑیا گھر یا سرکس کا شیر تو آدم خور نہیں ہوسکتا۔"

"وہ سرکس کا شیر ہی تھا جو اسے کھا گیا تھا۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے؟" میں نے کہا۔

"ایسا ہوا تھا جی' یہاں ایک سرکس آیا تھا۔ بوٹا سنگھ سرکس کے مالک کی بیٹی پر عاشق ہوگیا۔ وہ اس کے ساتھ بھاگ جانا چاہتا تھا مگر عین وقت پر پکڑا گیا۔ سرکس کے مالک نے اس کے ٹکڑے کردئے ... اور بس۔ شیر کھا گیا۔ بعد میں سرکس کے مالک کو پھانسی ہوگئی تھی... بوٹا سنگھ..."

ابھی یہ عجیب اور خوف ناک داستان اختتام کو بھی نہیں پہنچی تھی کہ میں نے سامنے سے صبح کے نیم روشن اندھیرے میں تاریک سایوں کو متحرک دیکھا۔ وہ سیدھے ہماری طرف ہی آرہے تھے۔

میں نے کہا "ناجی' یہ تو پولیس لگتی ہے۔"

"ہاں جی' پولیس ہی ہے' آپ فکر مت کریں" اس نے کہا۔

وہ گھوڑوں پر سوار پولیس کا دستہ تھا جس نے ہمیں ہر طرف سے گھیر لیا۔ اس میں چار کانسٹیبل تھے اور ایک ہیڈ کانسٹیبل ان کی کمان کر رہا تھا۔

"کون ہے تانگے میں؟" ہیڈ کانسٹیبل نے اکھڑ لہجے میں کہا۔

"زنانہ سواریاں ہیں جناب۔"

"کس گاؤں سے آئے ہو تم لوگ اور کس کے گھر سے؟"

"پیر عنایت کے گھر کی عورتیں ہیں جناب" ناجی نے کہا۔

اچانک حوالدار نے اس کے منہ پر تھپڑ مارا "کتے کی نسل' ...ری آنکھوں میں دھول جھونکتا ہے' کیا ہم تجھے جانتے نہیں۔"

"میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں جی" ناجی نے کہا۔

"تو بھونکتا ہے' ہمیں معلوم ہوا ہے کہ ڈاکو برقع اوڑھ کے ...ں علاقے سے نکلنے کی کوشش کریں گے۔"

حوالدار کی بات سن کے میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ کیا ...راز افشا ہوچکا ہے؟ آصف جاہ کی سازش ناکام ہوگئی ہے۔ کسی ...نے جس پر وہ اعتماد کرتا تھا اسے دھوکا دے کر اطلاع آگے پہنچا دی تھی۔

"نیچے اترو..." حوالدار نے دہاڑ کے کہا "مجھے معلوم ہے تم ...ں عورت کوئی نہیں ہے... نقاب ہٹاؤ ذرا چہرے سے۔"

پہلے میں اور میرے بعد نازو اور غالب تانگے سے اتر گئے۔ ...والدار نے اپنے ماتحت کو حکم دیا کہ وہ آگے بڑھے۔

ہمارے ... ھ ایک عورت نازو نہ ہوتی تو نہ جانے ... د تا۔ ...ناید وہ خردماغ حوالدار نتائج کی پروا کئے بغیر مسلمان گھرانے کی ...زت دار خواتین کو مجبور کرتا کہ تم کو پردہ رخ روشن سے ہٹانا ہوگا اور پردہ اٹھتے ہی بقولِ شاعر... مجنوں نظر آتی ہے لیلیٰ نظر آتا ہے... والا سین ہوتا۔

نازو کی ذہانت اور ہمت نے صورتِ حال کو بگڑنے سے پہلے ہی سنبھال لیا۔ اس نے ایک دم بلند آواز میں چلانا شروع کیا۔

"ارے کم بخت... اللہ کی مار تجھ پر' بجلی گرے تجھ پر' جنازہ اٹھے تیرا' تو کون ہوتا ہے ہمارا پردہ ختم کرانے والا۔ ارے اللہ ...م' آج تک نامحرم نے چہرہ نہیں دیکھا' غیر مرد نے آواز نہیں ...نی تھی۔ نامراد' تو کہاں سے آگیا ہماری عاقبت خراب کرنے۔ ارے کیا اس ملک میں اب مسلمان عورتوں کی عزت و آبرو بھی محفوظ نہیں رہی' پولیس برقعے چھینے گی مسلمان بہو بیٹیوں کے... یا اللہ' تو ہی بچا ہمیں ان ملعونوں شیطانوں سے۔" اس نے آسمان کی طرف منہ اٹھا کے فریاد کی۔ وہ کسی بڑھیا کی طرح چیخ رہی تھی اور ایسی روانی سے کوسنے دے رہی تھی کہ سپاہی گھبرا کے پیچھے ہٹ گیا۔

نازو نے اپنا ہنگامہ جاری رکھا "ارے جان دے دوں گی۔ ...کلوہے' کافر' تو قریب تو آ ذرا' چاقو ہے میرے پاس۔"

حوالدار پریشان ہوگیا "کیا بولے چلی جا رہی ہے بڑھیا۔"

"ارے حرامی' تو نے کیا سمجھا ہے آخر ہمیں؟ ہم مسلمان جان دے سکتے ہیں' ایمان نہیں گنوا سکتے۔ اسی چاقو سے گلا کاٹ لوں گی اگر کسی نے ہاتھ بھی لگایا تو۔ تیری ماں بہنیں نہیں ہیں کیا جو تو پرائی بہو بیٹیوں کی عزت اتارتا پھرتا ہے۔ ارے جا کمینے' پہلے اس وردی کو اتار' سرکار نے تجھے اختیار دیا ہے قانون کی حفاظت کا۔"

"اے بھگوان' یہ کیا عورت ہے!" حوالدار نے سر پر ہاتھ مارا۔

"قسم خدا کی' تیری شکایت نہ کی پولیس کمشنر سے تو کہنا' میں خود پیر صاحب کے ساتھ وفد لے کر جاؤں گی۔ چیف منسٹر کے راستے میں برقع اتار کے لیٹ جاؤں گی کہ گاڑی گزار دو مجھ پر سے' ایسے ... بے آبرو ہو کے جینے سے باز آئے ہم مسلمان۔ میں تو جلوس لے کر جاؤں گی گورنر ہاؤس....."

"ارے میری ماں" حوالدار نے ہاتھ جوڑ کے کہا "جا' بھگوان کے لئے معاف کر دے مجھے' بند کر اپنا ٹیپ ریکارڈر۔"

"نہیں۔ تو نے مسلمان عورتوں کو روک کر مسلمانوں کی عزت کو للکارا ہے۔ ارے ہم کفرستان میں رہتے ہیں تو کیا ہوا' بہو بیٹیوں کی آبرو کے لئے خون کی ندیاں بہا سکتے ہیں۔ ہمت ہے تو کہو ان کنجروں سے کہ گولی چلائیں۔ بندوق لے ... چڑھ دوڑے ... عورتوں پر۔ نامرد' بے غیرت کتو..."

حوالدار جس طرح گھوڑے پر سوار ہو کے بھاگا اور جیسے اس کے حکم پر بندوق لے کر ہمیں محصور کرنے والے بھاگے' وہ ایک دلچسپ منظر تھا۔ حوالدار کے لئے نازو سے جان چھڑانا مشکل ہوگیا تھا۔ اس نے بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا تھا۔ نازو کسی بدزبان' بدلحاظ اور بداطوار عورت کی طرح اس کے لئے جان کا عذاب بن گئی تھی۔ وہ اس کی گالیوں' کوسنوں اور بددعاؤں کی یلغار کے سامنے کیسے ٹھہر سکتا تھا۔ نازو کی دھمکیوں سے بھی اس نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ وہ کتنی سنگین اخلاقی' معاشرتی اور قانونی غلطی کا مرتکب ہوچکا ہے۔ اس خیال نے اسے بعد میں بھی پریشان کیا ہوگا کہ سچ مچ مسلمان عورتوں کا کوئی وفد یا جلوس اعلیٰ حکام تک پہنچ گیا تو اس کا کیا بنے گا۔

دوبارہ تانگے میں سوار ہونے تک نازو کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی بلکہ مشین گن کی طرح فائر کر رہی تھی اور پولیس کے شہسوار سخت بدحواسی کے عالم میں روانگی اختیار کر چکے تھے۔ نہ ان کی وردیوں کا رعب کام آیا تھا اور نہ ان کی بندوقوں کی دہشت کا اثر ہوا تھا۔

جب وہ اتنی دور چلے گئے کہ ہماری آواز کے ان تک پہنچنے کا کوئی اندیشہ نہ رہا تو میں نے اور غالب نے ضبط و احتیاط کے تقاضوں کو چھوڑ کے بے اختیار ہنسنا شروع کیا۔ ناجی پھر تانگہ چلانے لگا۔

میں نے ہنستے ہنستے کہا "اس سے زیادہ برداشت نہیں کرسکتا تھا میں۔"

غالب نے کہا "میرے بھی پیٹ میں بل پڑنے لگے تھے۔"

میں نے کہا "عزیزہ کیا زبردست پرفارمنس تھی تمہاری۔"
غالب نے کہا "جی چاہتا ہے کہ تمہارا منہ..."
نازو نے مسکراہٹ کو دبا کے کہا "بدتمیزی مت کرو غالب"
"موتیوں سے بھردوں۔ بات تو سن لیا کرو پہلے' ویسے بدتمیزی بھی تم دل سے نہیں کہہ رہی ہو۔ اندر ہی اندر مسکرا رہی ہونا' شرما بھی رہی ہو۔"
نازو نے اسے ڈانٹا "کومت۔"
"اچھا شرط لگاتا ہوں میں' نقاب اٹھاؤ ذرا" غالب نے کہا۔
میں نے کہا "نقاب اٹھانے کی بات مت کرنا' اس بے چارے حوالدار نے یہی بات کی تھی تو اسے کیا کچھ سننا پڑا تھا' کہیں وہ ٹیپ پھر نہ چلنے لگے۔"
ناجی نے کہا "دل خوش کردیا آپ نے باجی' اس حرامی نے بڑے زور کا تھپڑ مارا تھا' بدلہ لے لیا آپ نے۔"
"ناجی! کیا اس نے تمہیں پہچان لیا تھا؟" میں نے کہا۔
ناجی نے متفکر لہجے میں کہا "اس کی بات سے تو ایسا ہی لگتا تھا۔ خیر جی' اپنا کیا بگاڑے گا۔ پیر عنایت سے ٹکرائے گا تو خاک ہوجائے گا۔"
"تمہارا بہت اعتقاد ہے پیر صاحب پر" میں نے کہا۔
"لو جی' ابھی آپ نے خود بھی دیکھ لیا ہے۔"
"کیا دیکھ لیا ہے؟"
"پیر صاحب کی کرامت کو' آپ صاف بچ گئے" اس نے بڑے یقین کے ساتھ کہا۔
عقیدہ ایسی ہی چیز ہے۔ افریقہ کے وحشی قبائل کا جادوگر جب ملیریا بخار کا علاج اپنے منتروں سے کرتا ہے تو عقیدت مندوں کی عقل بھی اسے موثر تسلیم کرتی ہے لیکن مرض ختم نہ ہو اور مریض ختم ہوجائے تو تب بھی عقیدت کے جذبات بدلتے نہیں ہیں۔ عقل اس ناکامی کو شیطانی قوتوں اور مریض کی بداعمالی سے منسوب کردیتی ہے۔
اگر میں اپنی عقل اور اپنے عقیدے کے حوالے سے بات کرتا تو ناجی کے جذبات مجروح ہوتے' مجھے کچھ حاصل نہ ہوتا۔ پیر عنایت کے لئے اس کے احترام وعقیدت میں کوئی کمی واقع نہ ہوتی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دھوکے فریب کی اس دنیا میں بہت سے جعلی پیروں نے بھی اپنا کاروبار شروع کر رکھا ہے مگر یہ کہنا غلط ہوگا کہ سب پیر جعلی ہوتے ہیں۔ ابھی مجھے پیر عنایت کے بارے میں کچھ معلوم بھی نہیں تھا۔ میری اس سے ملاقات سرسری نوعیت کی تھی۔ اس کا ایک مرید آصف جاہ تھا اور ناجی دوسرا۔ نہ جانے اس علاقے میں اس کی کرامات کے کتنے لوگ قائل تھے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ فرصت ملی تو ناجی سے ان کرامات کا احوال سنوں گا۔

ناجی نے مین روڈ تک پہنچنے کے لئے سڑک کا راستہ اختیار نہیں کیا تھا۔ وہ کھیتوں اور جنگلوں کے درمیان کسی کچے راستے پر تانگہ چلا رہا تھا اور پوری کوشش کررہا تھا کہ اپنا سراغ نہ چھوڑے۔ اس نے اب تانگے کے پائدان سے ایک چادر باندھ دی تھی جو نیچے لٹکتی ہوئی زمین پر گھسٹتی آرہی تھی۔ اس طرح کچی زمین اور مٹی پر بننے والے تانگے کے پہیوں اور گھوڑے کے سموں کے نشانات خود بخود مٹ رہے تھے۔
جب سورج نکلا تو ہم بہت دور پہنچ چکے تھے۔ تانگے کی رفتار کبھی کم ہوجاتی تھی تو ناجی کو نیچے اتر کر اور گھوڑے کی لگام کو تھام کر چلنا پڑتا تھا وہ تانگے کو کھڈوں سے بچا کے یا کھیتوں کی منڈیر پر چڑھا کے نکالتا تھا اور پھر کچے راستے پر لے آتا تھا۔ نہ گھوڑا اناڑی تھا اور نہ تانگہ مگر اسے دونوں پر کنٹرول حاصل تھا۔ ہموار راستے پر وہ گھوڑے کو دوڑاتا تھا تو جھٹکوں اور ہچکولوں سے ہمارا برا حال ہوجاتا تھا۔ کئی مرتبہ نازو اچھل کر گرتے گرتے بچی' غالب نے اسے سنبھال لیا۔
ایک جگہ میں نے اس سے پوچھا "سڑک اب کتنی دور رہ گئی ہے؟"
"شاید آٹھ دس میل" اس نے سوچ کے کہا۔
"اور ہم کتنا فاصلہ طے کرچکے ہیں؟"
اس نے پھر غور کیا اور بولا "شاید آٹھ دس میل۔"
میں نے کہا "تمہارے گاؤں سے سڑک کا کتنا فاصلہ ہے؟"
اس نے تیسری بار کہا "آٹھ دس میل۔"
غالب نے بھنّا کے کہا "تمہارے حساب سے تو ہم مین روڈ بھی آٹھ دس میل پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔"
ناجی نے دانت نکال کے کہا "ہم سیدھے تو نہیں جارہے ہیں جی' گھوم کے جارہے ہیں۔"
"گھومتے پھرتے جارہے ہیں" نازو نے کہا "صبح کی سیر صحت کے لئے مفید ہوتی ہے۔"
"مگر گھوڑے کی صحت پہلے ہی ہم سے بہت اچھی ہے!" غالب نے کہا۔
"آپ ایسے سمجھو" ناجی نے وضاحت کی "یہ میری ناک ہے۔"
"اچھا!" غالب نے اس انکشاف پر حیران ہو کے کہا۔
"اب میں اسے یوں پکڑلوں' سامنے سے' یا ایسے پکڑلوں پیچھے سے ہاتھ گھما کے" اس نے ناک پکڑنے کا عملی مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔
میں نے کہا "اس کے باوجود ہم ناک کی سیدھ میں جارہے ہیں۔"
"اگر ہم ساری عمر ایک دائرے میں گردش کرتے رہیں تب بھی ہمیشہ ناک کی سیدھ میں ہوں گے" نازو نے کہا۔
"لیکن کہیں پہنچ نہیں پائیں گے" غالب نے کہا۔

"جھٹکوں سے میرے جسم کا اندرونی نظام سخت متاثر ہوا ہے۔ بار بار گردوں سے ٹکراتا ہے۔ گردے جگر میں گھس جاتے ہیں۔ جگر شاید گھٹنوں میں پہنچ گیا ہے" غالب نے کہا۔
"کھایا پیا سب ہضم ہوگیا ہے" میں نے اس سے اتفاق کیا۔
"ناشتا نکالوں؟" نازو نے کہا۔
میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا "کیا ہے ناشتے میں؟"
"بس چائے نہیں ہے' باقی سب کچھ ہے" نازو نے کہا۔
غالب نے کہا "میرے لئے' وسلی کس' مکھن' دو انڈے ہاف فرائی۔"
نازو نے ایک دم برقعے میں سے ہاتھ نکالا "یہ لو۔"
میں حیران رہ گیا "یہ پراٹھے اور مکھن۔"
"یہ انڈے" نازو نے مجھے ایک ابلا ہوا انڈا پیش کیا۔
غالب اسے بے یقینی سے دیکھ رہا تھا "تمہارے برقعے کے اندر کچن ہے؟"
نازو ہنسی "جادوگر بھی تو جیب میں سے سب کچھ نکال کے دکھاتے ہیں۔ رومال' کبوتر۔"
"تمہارے جادوگر ہونے میں کسی کو شک نہیں لیکن میں نے نہیں سنا کہ کسی نے جادو سے آج تک ناشتا برآمد کیا ہو۔ اگر ایسا ممکن ہوتا تو ہر ٹرین میں ڈائننگ کار کی جگہ ایک جادوگر کافی ہوتا" غالب نے کہا۔
"تمہیں زینب کا شکر گزار ہونا چاہئے" نازو نے پراٹھے کو بطور پلیٹ استعمال کرتے ہوئے اس پر مکھن رکھ کے غالب کو تھمادیا۔
میں نے کہا "ناجی کے لئے بھی نکالو۔"
نازو نے کہا "تم اسے دے دو' میں اور دیتی ہوں تمہارے لئے۔"
"یہ زادِ سفر اس نے کب پکڑا دیا تھا تمہیں؟" غالب نے کہا۔
"وہ اپنے ساتھ پوٹلی باندھ کے لائی تھی" نازو نے کہا۔
"دوپہر کے لئے بھی کافی ہوگا۔"
میں نے پراٹھا اور مکھن ناجی کی طرف بڑھایا۔ اس نے پہلے تکلف میں انکار کیا پھر لے لیا۔ وہ دیہات کا پلا ہوا جوان آدمی تھا۔ ابھی ہم نے آدھا پراٹھا بھی ختم نہیں کیا تھا کہ وہ فارغ ہوگیا۔ دوسرے پراٹھے کو بھی اس نے شکریے کے ساتھ قبول کیا اور ختم کردیا۔ اس کی خوش خوراکی نے مجھے اور غالب کو رشک میں مبتلا کردیا۔
ناشتا بالکل خشک تھا۔ ابلا ہوا انڈا میرے حلق میں ہی اٹک گیا تھا اور اچانک چائے کی طلب شدید ہوگئی تھی۔ ناجی نے راستے سے کچھ فاصلے پر ایک جھونپڑا دیکھا اور تانگہ روک کے اترگیا۔ وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں پانی سے بھرا ہوا لوٹا تھا۔

ہم سب نے ایک ہی ٹونٹی سے منہ لگا کے پانی پیا۔ کسی نے پانی میں جھانک کر دیکھا تک نہیں۔ حفظانِ صحت کے اور احتیاط کے سارے تقاضے اور سب تکلفاتِ زندگی اس وقت یاد آتے ہیں جب فراغت ہو اور افراط ہو۔
سورج اب کافی بلند ہوچکا تھا۔ دھوپ میں تیزی آنے لگی تھی۔ مجھے برقعے کے اندر پسینہ آرہا تھا اور نقل وحرکت محدود ہوجانے سے سخت الجھن محسوس ہورہی تھی۔
"معلوم نہیں عورتیں اس غلاف میں کیسے رہتی ہیں!" میں نے کہا "کیسے چلتی پھرتی ہیں' دنیا بھر کے کام کرلیتی ہیں۔"
غالب نے کہا "میرا تو دم گھٹ رہا ہے اب۔"
نازو ہنسی "اتنی جلدی گھبرا گئے' یہ سوچو کہ تمہاری جان بچ گئی اس برقعے کی وجہ سے۔"
"اور اسی کی وجہ سے جان جائے گی۔ اگر چند گھنٹے اور گزارنے پڑے اس لٹھے کے زنداں میں" غالب بولا۔
"فرض کرلو کہ یہ برقع نہیں کفن ہے جو تم سر سے باندھ کے نکلے ہو" نازو نے کہا "اس سے تمہارے جذبۂ جہاد کو تقویت حاصل ہوگی۔"
"سڑک پر پہنچتے ہی میں اس مصیبت کو اتار کے پھینک دوں گا۔"
"کیوں کفر بکتے ہو' پردے کو مصیبت قرار دے رہے ہو؟" نازو نے کہا۔
میں نے کہا "جب تک خطرہ باقی ہے ہم پردے میں رہیں گے۔"
"خطرہ تو ہمیشہ رہتا ہے' نہ رہے تو ہم خوش نہیں رہتے' فوراً کوئی بندوبست کرلیتے ہیں خطرے کا" غالب نے کہا۔
"کیا ہم اسی تانگے پر بمبئی تک جائیں گے؟"
"کوئی حرج بھی نہیں" میں نے کہا "دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ہم بس سے جائیں لیکن اس میں زیادہ رسک ہوگا۔"
"ہم کوئی ٹیکسی یا کار بھی لے سکتے ہیں" غالب بولا۔
"اگر پولیس چوکس ہوگی تو کاروں کو چیک کرے گی' تانگے میں بیٹھی ہوئی عورتوں پر کوئی نظر نہیں ڈالے گا۔ ستائیس کلومیٹر کا فاصلہ زیادہ نہیں' دو گھنٹے میں طے ہوجائے گا۔"
"پھر ایک گھنٹا بمبئی کے شہر میں......"
"نہیں' وہاں سیکڑوں ٹیکسیاں ہوں گی۔"
"آخر ہم جائیں گے کہاں؟" نازو نے کہا۔
میں نے کہا "آج سائرن کی بہن اور ماں کی آخری رسوم ادا ہوں گی' اس نے بتادیا تھا کہ چرچ کون سا ہوگا۔"
"وہاں پولیس بہت ہوگی" غالب نے کہا۔
"ہاں۔ اگر ہم وقت پر پہنچے تو ہمارے پہچان لئے جانے کے امکانات زیادہ ہوں گے" میں نے کہا "پولیس کے علاوہ چرچ کے

اندریا راستے میں کہیں شکاری کتے بھی پھر رہے ہوں گے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ وہ قبرستان میں بھی مل جائیں۔"

"ہم بھیس بدل کے جاسکتے ہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ ہم باربار بھیس بدل کے ان کی آنکھوں میں دھول نہیں جھونک سکتے۔ ہم ان سے دور ہی رہیں تو بہتر ہے۔ اس کے لئے ضروری ہوگا کہ ہم پہلے سے چرچ میں موجود ہوں اور چھپ کر دیکھتے رہیں۔"

غالب نے کہا "کیا چرچ اور قبرستان ایک ہی جگہ ہیں؟"

"معلوم نہیں، بائے پتا چلے گا۔"

"اگر قبرستان دور ہوا تو کیا ہم سب بھی جنازے کے جلوس میں شامل ہوکر جائیں گے؟"

"ہم دور رہ کے بھی پیچھے پیچھے چل سکتے ہیں، اور یہ بھی..."

نازو نے میری بات کاٹ کے کہا "کوئی ادھر آرہا ہے۔"

غالب نے کہا "ہاں، لگتا تو ایسا ہی ہے۔"

میں نے سر گھما کے پیچھے دیکھا۔ دور سے گرد کا ایک بگولا سا دکھائی دیتا تھا جو تیزی سے ہماری جانب بڑھ رہا تھا۔

"یہ تو کوئی گاڑی ہے۔ غالباً جیپ" غالب نے کہا۔

"آگے کوئی گھوڑے پر سوار آرہا ہے" نازو نے کہا۔

"کیا یہ لوگ ہمارا پیچھا کررہے ہیں؟" غالب نے فکرمند ہوکے کہا "ان کا رخ ادھر ہی ہے۔"

"اگر وہ ہمارے تعاقب میں ہیں تو ہم کیا کرسکتے ہیں؟ ان کو روک تو نہیں سکتے" میں نے کہا "آنے دو۔"

"یہ شاید پولیس کی جیپ ہوگی" نازو نے کہا۔

میں نے کہا "ناجی، تم بھی خبردار ہوجاؤ۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، ہم سب سے نمٹ لیں گے۔"

ناجی نے کہا "میری سمجھ میں نہیں آتی یہ بات۔"

"کیا بات؟"

"یہ لوگ ہمارے پیچھے کیسے آئے؟" ناجی نے پیچھے مڑکر دیکھتے ہوئے کہا "جو راستہ میں نے پکڑا تھا ان کو کیسے معلوم ہوگیا؟"

"کیا تم نے کسی کو بتایا تھا کہ تم کس طرف سے جاؤ گے؟"

"کیا میں پاگل ہوں جی۔ اگر میں بتاتا تو بالکل غلط بتاتا، کہتا مشرق کی اور جاتا مغرب میں" ناجی نے کہا۔

جیپ بالکل قریب آگئی تو شک کی گنجائش ہی نہ رہی، اس میں پولیس تھی۔ جو شخص آگے آگے گھوڑے پر انہیں راستہ بتاتا آرہا تھا وہ عام قسم کے کپڑوں میں تھا۔ اس نے جسم کے اوپر والے حصے پر چادر لپیٹ رکھی تھی جس میں اس کا چہرہ بھی چھپ گیا تھا۔

ناجی نے جیپ کو راستہ دینے کے لئے تانگے کو کچے راستے سے ہٹا کے کھیتوں میں اتار لیا۔

غالب نے کہا "سکندر، یہ تو عنایت ہے۔"

میں نے بلاارادہ کہا "کون عنایت؟"

"پیر عنایت، حرامزادہ!" غالب نے اسے مشتعل ہوکے گالی دی "یہی لے کر آیا ہے پولیس کو۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ مجھے زینب جیسی عورت کے شوہر سے اور آصف جاہ کے بہنوئی سے ایسی دغا بازی کی امید نہیں تھی لیکن اب شبے کی کوئی بات نہیں رہی تھی کہ عنایت کی پیری فقیری سب ڈھونگ تھی۔ وہ ایک بے ضمیر، دھوکے باز اور منافق آدمی تھا جس کے پُرفریب ظاہر نے خوش اعتقاد لوگوں پر جادو چلا رکھا تھا۔ ناجی کا کہنا ٹھیک تھا۔ ایسے کوئی ہمارے تعاقب میں نہیں آسکتا تھا۔ پیر عنایت گھر کا بھیدی تھا جو سب کچھ جانتا تھا۔ معلوم نہیں اسے کیا لالچ تھا کہ وہ پولیس کو سیدھا ہمارے راستے پر لے آیا۔ یہ صرف لالچ کی بات ہوسکتی تھی۔ اسے کوئی مجبور نہیں کرسکتا تھا کہ ہمارا پتا بتائے۔ شاید اس کی پیری فقیری کا ڈراما چلانے میں پولیس مددگار تھی چنانچہ وہ پولیس کی مدد کرتا تھا۔

عنایت نے تانگے سے آگے نکلتے ہی گھوڑے کی لگام کھینچی اور گھوڑے کے رکتے ہی نیچے اتر گیا۔ پولیس کی جیپ تانگے کے پیچھے ٹھہر گئی تھی۔ اس میں سے ایک ساتھ تین پولیس والے کود کر اترے۔ ان سب کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں۔ چوتھے شخص کے ہاتھ میں ریوالور تھا اور وہ ان کا افسر تھا۔ وہ عہدے کے لحاظ سے اے ایس آئی تھا۔

ناجی جتنا خوفزدہ تھا، اس سے زیادہ حیران تھا اور اس کی نظریں پیر عنایت پر جمی ہوئی تھیں "یہ کیا معاملہ ہے پیرجی؟" اس نے کہا۔

"معاملہ مجھ سے پوچھتا ہے سور کے تخم" پیر عنایت نے غرا کے کہا "کہاں لے کر جارہا تھا اپنی ماں کے یاروں کو؟"

شاید ناجی نے پیر صاحب کی زبان سے کبھی ایسی مغلظات نہیں سنی تھیں۔ اس نے قدرے تیز ہوکر کہا "آپ کیسی باتیں کرتے ہیں جی....."

پیر عنایت نے ناجی کے سر پر مکا مارا "حرامی، کتے، ابھی سب معلوم ہوجائے گا تجھے۔ تھانے دار، پکڑلو ان سب کو، ان برقعوں میں عورتیں نہیں مرد ہیں۔"

ناجی چلایا "پیرجی..."

اس مرتبہ تھانے دار نے ناجی کے جھانپڑ مارا "اب تیری آواز نکلی تو زندہ گاڑ دوں گا اسی جگہ۔"

پیر عنایت نے فاتحانہ انداز میں میری طرف دیکھا "یہ جو آگے بیٹھا ہے، یہ ان کا سرغنہ ہے۔ اس کا دوسرا ساتھی پیچھے بیٹھا ہے۔ میں ان دونوں سے مل چکا ہوں۔ ہاں یہ عورت ہے، کہتی تو یہی ہے کہ..."

"ہم ابھی دیکھ لیتے ہیں" تھانے دار نے اس کی بات کاٹ کر کہا اور اپنے ریوالور کو بڑے جارحانہ انداز میں لہرایا "چلو نیچے اتر آؤ، تمہارا ڈراما ختم ہوگیا۔"

"پیرجی، یہ تم نے اچھا نہیں کیا" ناجی مشتعل ہوکے بولا۔ "اپنے مہمانوں کو دھوکے سے پکڑوا دیا۔"

"بکواس مت کر، میرا کوئی مہمان نہیں، یہ سب ملزم ہیں جو پولیس سے چھپ کر فرار ہورہے تھے" عنایت نے کہا۔

"پیرجی، کچھ خدا کا خوف کرو، آخر آپ بھی مسلمان ہو، اتنی بڑی داڑھی رکھ کے جھوٹ بولتے ہو" ناجی نے آپے سے باہر ہوکے کہا "اپنے ایمان سے کہو، کیا آپ نے اپنی بیوی کے ساتھ کل رات اور آج صبح ان سے ملاقات نہیں کی تھی؟ کیا آپ ان کے لئے کھانا لے کر نہیں آئے تھے؟ یہ کپڑے کیا تمہاری بیوی زینب کے اور تمہاری بیٹی کے نہیں ہیں؟ یہ برقعہ... کیا یہ زینب کا نہیں ہے؟"

"یہ جھوٹ ہے" عنایت نے چیخ کر کہا "جھوٹ بکتا ہے تو۔"

ناجی نے بھی چیخ کر کہا "یہ سچ ہے سور کے بچے، جھوٹا تو ہے۔ دھوکے باز، آج پتا چلا کہ تو پیر نہیں، شیطان ہے، کافر۔"

پیر عنایت نے پھر اس کے مکا مارا "چور کی اولاد، میرے سامنے زبان چلاتا ہے، میرے منہ پر مجھے کافر کہتا ہے۔"

ناجی گرا اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے پیر عنایت کے منہ پر تھوک دیا "لعنت تیری صورت پر۔ اب مجھے تیری اصلیت معلوم ہوگئی ہے۔ میں سب کو بتادوں گا... سارے گاؤں کو، ساری دنیا کو۔"

اے ایس آئی نے ریوالور کا رخ ناجی کی طرف کردیا اور اسے گالی دے کر کہا "تو زندہ بچے گا تو کسی کو کچھ بتائے گا۔"

میں ابھی تک طے نہیں کرپایا تھا کہ ان حالات میں ہمیں پردہ پوشی کا ڈراما جاری رکھنا چاہئے یا ختم کردینا چاہئے۔ ہمارا راز فاش ہوگیا تھا اور جب چھپانے کو کچھ نہیں تھا تو ہمارا چھپنا بے مقصد تھا۔ اچانک میں نے محسوس کیا کہ اے ایس آئی کا مقصد صرف ناجی کو ڈرانا اور دھمکا کے خاموش کرنا نہیں ہے، وہ سچ مچ اسے مارنا چاہتا ہے۔ اس کی آنکھوں کی سفاک خونی چمک میں ایک قاتل جذبہ اتر آیا تھا۔

"ٹھہرو" میں نے چلا کے کہا اور اپنا برقع اتار کے اے ایس آئی پر پھینک دیا۔ برقع اس کے ہاتھ پر جاکر گرا اور سیکنڈ کے ہزارویں حصے کی تاخیر سے فائر ہوا مگر نشانہ چوک گیا۔ برقعے کے وزن سے اے ایس آئی کا ہاتھ کچھ جھک گیا تھا۔ گولی ناجی کے پیروں کے قریب کی زمین میں پیوست ہوگئی۔

برقع اتارتے ہی میں نے تانگے سے جست لگائی اور ناجی کو کھینچ کر اپنے پیچھے لے لیا "یہ تم کیا کررہے ہو؟" میں نے کہا۔

"ہٹ جا... ورنہ تجھے بھی جان سے ماردوں گا" اے ایس آئی نے برقعے کو جھٹک کر پھر ریوالور لہرایا۔

لیکن اب اس کا لہجہ مصنوعی اور کھوکھلا تھا۔ اب وہ صرف دھمکیاں دے رہا تھا۔ وہ لمحہ گزر چکا تھا جب اس کو دستِ اجل نے ناجی کی جان لینے کا اختیار دے دیا تھا۔

میں نے کہا "قانون نے تمہیں مجرم کو گرفتار کرنے کا حق دیا ہے، تم سزائے موت نہیں دے سکتے۔ ایسا کرو گے تو قاتل بن جاؤ گے۔"

"مجھے قانون مت پڑھاؤ" اے ایس آئی دہاڑا۔

"مجھے بتاؤ کہ اس لڑکے کا جرم کیا ہے؟ یہی کہ اس نے پیر عنایت کے منہ پر سچ بول دیا ہے۔"

"تم کس منہ سے سچ کی بات کرتے ہو!" اے ایس آئی نے میرے سراپا کو طنز آمیز تمسخر سے دیکھا "سچے آدمی، ذرا اپنا چہرہ دیکھو اور پھر یہ حلیہ دیکھو، تم کو شرم بھی نہیں آتی..."

"یہ ریاکاری اور منافقت کا لبادہ نہیں ہے" میں نے اس نفسیاتی حملے کو روکتے ہوئے کہا "شرم اسے نہیں آتی جو اپنی بدباطنی پر نیکی اور پارسائی کی نقاب ڈالے پھرتا ہے اور پیری فقیری کی آڑ میں ضمیر فروشی کرتا ہے۔"

اے ایس آئی نے اپنے ماتحتوں کی طرف دیکھا جو بندوقیں اٹھائے تانگے کو گھیرے کھڑے ہوئے تھے۔

اس نے کہا "دیکھتے کیا ہو، اتارلو انہیں گھسیٹ کر نیچے۔"

ایک پولیس مین آگے بڑھا اور اس نے نازو کی طرف ہاتھ بڑھا کے اسے برقعے سمیت کھینچنے کی کوشش کی۔ نازو کا ایک پاؤں حرکت میں آیا۔ ٹھوکر اس پولیس مین کی ٹھوڑی کے نیچے پڑی۔ اس کے حلق سے ایک کراہ نکلی اور وہ بے اختیار گالی دے کر پیچھے ہٹا۔

اے ایس آئی کا چہرہ غصے میں لال ہوگیا۔ اس نے متعدد گالیاں بکنے کے بعد کہا "میں لحاظ کرنے والا آدمی نہیں ہوں۔ سب کے سامنے عزت اتار دوں گا۔ گدھی کی بچی دولتی چلاتی ہے۔ چلو سب مل کے کھینچ لو ان دونوں کو۔ برقع ہی نہیں کپڑے بھی اتار دو کنجری کے۔"

میں نے خاموشی سے ریوالور نکال لیا "ان میں سے کسی نے ہاتھ بھی لگایا اسے تو میں اس کے سر میں سوراخ کردوں گا۔"

اے ایس آئی میرے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر بری طرح چونکا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں حیرانی نظر آئی۔ آہستہ آہستہ اس کی سوالیہ نگاہیں پیر عنایت پر جم گئیں۔

غالب پہلے خود اترا، پھر اس نے نازو کو ہاتھ تھام کے اتارا۔ تینوں پولیس مین ایک قدم پیچھے ہٹ گئے لیکن انہوں نے اپنی رائفلوں کا رخ نہیں بدلا۔

"مقابلے کا کوئی فائدہ نہیں" اے ایس آئی نے کہا "تم سب مارے جاؤ گے۔ بہتر یہی ہے کہ برقعے اتار دو اور خود کو قانون کے حوالے کردو۔"

شاید غالب نے بھی پولیس کی بے بسی کا اندازہ کرلیا تھا۔ وہ بہت کم طاقت کے ساتھ حملہ آور ہونے کی غلطی کرچکے تھے۔ انہیں پیر عنایت نے نامکمل اطلاعات فراہم کرکے غلط فہمی میں مبتلا کردیا تھا۔ اب ان کے لئے نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن والی

بات تھی کہ وہ ہم سے ہتھیار چھین کر ہمیں گرفتار کرنے سے بھی قاصر تھے اور "سوری" کہہ کے واپس جانے کی سبکی برداشت کرنے کا حوصلہ بھی نہیں رکھتے تھے۔

غالب نے کہا "تم نے پولیس کو ہمارے پیچھے لگا کے کتنے نفل کا ثواب حاصل کیا پیر جی؟ اگر ہم گرفتار ہو جاتے تو تمہیں پولیس سے کیا انعام ملتا؟"

"یہ میرا فرض تھا، تم دشمن کے ایجنٹ ہو" پیر عنایت نے ڈھٹائی سے کہا۔

"سؤر کے بچے، تم پولیس کے مخبر ہو، انہی کے دم سے تمہارا کاروبار جاری ہے۔ شاید اس پیری فقیری کے پردے میں تم نے بدمعاشی کے سارے دھندے چلا رکھے ہوں گے" میں نے اسے مشتعل کرنے کے لئے کہا۔

"تم چرس اور گانجا بیچتے ہو گے، عقیدت مند عورتوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کے انہیں بلیک میل کرتے ہو گے" غالب نے کہا۔

"اگر تمہارے عقیدت مندوں پر تمہاری اصلیت کھل جائے تو وہ تمہارا منہ کالا کرکے اور تمہیں ننگا کرکے گدھے پر بٹھائیں....."

"تھانے دار، تم کیا کر رہے ہو آخر؟" پیر عنایت نے چیخ کر کہا۔ "تم انہیں پکڑتے کیوں نہیں؟ تمہارے ہاتھ میں بھی اسلحہ ہے، پھر ڈر کیوں رہے ہو؟"

پیر کی بات کا ردِ عمل وہی ہوا جو میں چاہتا تھا۔ تھانے دار کی غیرت جاگ اٹھی۔ اس نے جوش میں آ کے کہا "ڈرنے والے کی..... میں تو ان... کو مہلت دے رہا تھا۔ خون خرابا نہیں چاہتا تھا۔"

اس جملے میں متعدد بھاری بھر کم گالیاں شامل تھیں۔ غصے میں عقل مند آدمی کی عقل بھی ماری جاتی ہے۔ اے ایس آئی نے پاگل ہو کے ایکشن کا حکم جاری کر دیا۔

"آگے بڑھ کے پکڑ لو سب کو، جو مقابلہ کرے اسے گولی مار دو۔ ان دونوں کے پاس کچھ بھی نہیں ہے جو برقعے میں ہیں۔ اسلحہ ہوتا تو یہ بھی مقابلے پر آ جاتے برقعے سے نکل کے۔ عورت کو چھوڑ دو۔ مرد سے چمٹ جاؤ سارے مل کے۔"

اس کے بعد چند منٹ میں سب کچھ ہو گیا۔ پانچ سات منٹ کی گفتگو کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ہم جوابی کارروائی کے لئے تیار ہو جائیں اور پھر ایک واضح حکمتِ عملی اختیار کریں۔ آپس میں مشورے کی گنجائش نہیں تھی مگر ذہنی ہم آہنگی کے باعث ہم سب کی سوچ میں خاصی مطابقت آ گئی تھی اور عموماً ہم کسی بھی صورتِ حال کا مقابلہ کرتے ہوئے متحد قوت اور مربوط لائحہ عمل کا مظاہرہ کرتے تھے۔ میں نے موقع پا کے نازو کو ایسے اشارے کئے تھے جو دشمن کی نظر میں کوئی مفہوم نہ رکھتے تھے مگر نازو نے میری بات سمجھ لی تھی۔ آہستہ آہستہ وہ تینوں پولیس والوں کے قریب ہو گئی تھی۔ پہلے وہ غالب کے ساتھ کھڑی ہوئی تھی مگر اب ان کے درمیان دو فٹ کی دوری تھی۔

غالب نے برقعے کے اندر سے مجھے بتا دیا تھا کہ ریوالور کا رخ کس سمت میں ہے۔ اس کے ہاتھ کی خفیف سی حرکت کے ساتھ ریوالور کی نال کی پوزیشن واضح ہو گئی تھی۔ اے ایس آئی نے اپنی لاعلمی کا خود اعتراف کر لیا تھا۔ اسے پیر عنایت نے واقعی یہ نہیں بتایا تھا کہ ہم سب مسلح ہیں۔ معلوم نہیں اس نے یہ جھوٹ بولنا کیوں ضروری سمجھا تھا۔ شاید یہ بات معلوم ہو جاتی تو اے ایس آئی اتنی محدود قوت کے ساتھ ہمارے تعاقب میں نہ آتا۔ آخر عنایت کیوں چاہتا تھا کہ پولیس ہر قیمت پر ہمیں پکڑے، مجھے اس کے جذبات میں ذاتی عناد کا انتقامی انداز جھلکتا محسوس ہوتا تھا۔ یہ فرض شناسی اور وطن کی سرزمین پر تخریبی عناصر کے خلاف قانون کی مدد کا جذبہ نہیں لگتا تھا اور بہت جلد مجھے معلوم ہو گیا کہ میرا یہ تاثر بے بنیاد نہیں تھا۔

تینوں پولیس والے ایک ساتھ غالب کی طرف بڑھے۔ اے ایس آئی نے بھی اپنا ریوالور انتہائی جارحانہ انداز میں میری طرف اٹھا لیا، جیسے وہ واقعی مرنے مارنے کے لئے تیار ہے۔ اس نے ہاتھ کی انگلی کو خطرناک انداز میں ٹریگر پر رکھ لیا تھا اور اب میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے وہ مجھے چیلنج کرتا محسوس ہوتا تھا کہ ہمت ہے تو کر لو مقابلہ۔

تینوں پولیس والوں کی ساری توجہ غالب پر مرتکز تھی اور ان کو کسی حد تک یقین تھا کہ عورت خود کو اس جنگ سے الگ ہی رکھے گی مگر نازو اچانک درمیان میں حائل ہو گئی۔ اس نے پلک جھپکتے میں اپنا برقع اتار کے پھینک دیا۔ ایک لمحے کے لئے تینوں پولیس والوں کی نظریں خیرہ ہو گئیں۔ نازو کے حسن کا پہلا جلوہ بے حجاب اسی طرح اثر کرتا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتے اور بندوق اٹھاتے، نازو نے انہیں الٹ پلٹ کے رکھ دیا۔ کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا۔

پہلا شخص اس کی لات لگتے ہی گھوم کر زمین پر بیٹھ گیا تھا۔ دوسرے کو اس نے ایک جھٹکے سے اپنی طرف کھینچا اور تیسرے پر پھینک دیا۔ ان کی رائفلیں ہاتھوں سے نکل کے پرواز کر گئیں۔ میں کچھ بھی نہیں کر رہا تھا اس لئے میں نے نازو کی معرکہ آرائی کا سارا منظر دیکھا۔ تینوں سپاہی اٹھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ نازو نے اپنا ریوالور نکال لیا۔ اس نے غیر ضروری مارپیٹ میں وقت ضائع کرنے سے گریز کیا تھا۔ یہ بات مجھے پسند آئی۔

اے ایس آئی نے بھی یہ سین دیکھا تھا اور اس کا پہلا تاثر بے یقینی کا تھا۔ اس کی فوج کے تین جوانمرد ایک منٹ میں ڈھیر ہو گئے تھے۔ وہ بھی ایک ایسی لڑکی کے ہاتھوں جس کی نزاکت کو دیکھ کر ایسی تباہ کاری کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مزید یہ کہ... اس نے اسلحے کی قوت پر انحصار نہیں کیا تھا اور انہیں پوری طرح احساسِ شکست سے دوچار کرنے کے بعد اطمینان سے ریوالور نکالا تھا۔ مجھے موقع ملا تھا کہ میں اے ایس آئی سے ریوالور چھین کر اسے بھی ماتحتوں کے ساتھ لٹا دوں مگر میں اس پہلوان کی طرح بے فکری سے کھڑا رہا جس کے پٹھے ہی حریف کو چاروں شانے چت گرا دیتے ہوں۔ خود غالب نے بھی نازو پر بھروسا کرتے ہوئے دخل اندازی سے گریز کیا تھا۔ وہ ابھی تک برقعے میں ملفوف تھا حالانکہ کچھ دیر پہلے ہی وہ اس قید سے نجات پانے کے لئے بے چین تھا۔

اس نے برقعے کے اندر سے گولی چلائی اور اے ایس آئی کے ہاتھوں میں سے ریوالور نکل گیا۔ غالب کے نشانے کی مہارت سے ہم سب واقف تھے اور اس کے کمال کا مظاہرہ کئی بار دیکھ چکے تھے۔ اس وقت بھی غالب نے بڑی صفائی سے صرف ریوالور کو نشانہ بنایا۔ اے ایس آئی کے ہاتھ پر خراش تک نہیں آئی مگر وہ ایسے اچھلا جیسے گولی نے اس کی ہتھیلی میں سوراخ کر دیا ہے۔ زور زور سے ہاتھ ہلاتے ہوئے اس نے دور پڑے ہوئے ریوالور کو بے بسی سے دیکھا اور پھر اپنے ہاتھ کو اور انگلیوں کو لیکن خون کہیں ہوتا تو نظر آتا۔ اب غالب نے بھی برقعے کو اتار کے تانگے میں ڈال دیا۔

میں نے اے ایس آئی کا ریوالور اٹھا کے کہا "تمہاری قسمت اچھی ہے کہ ابھی تک اپنے پیروں پر کھڑے ہوئے ہو۔ مقابلہ کرتے تو تمہاری لاشیں کون اٹھاتا؟"

اے ایس آئی خون آشام نظروں سے پیر عنایت کو گھور رہا تھا "سؤر کے تخم، تو نے جھوٹ بولا تھا مجھ سے" اس نے ایک سانس میں پیر عنایت کا سارا شجرۂ نسب خراب کرتے ہوئے کہا۔ "تو نے یہ سب کیوں نہیں بتایا تھا مجھے کہ یہ لوگ مسلح ہیں۔؟"

میں نے کہا "گویا میرا اندازہ درست تھا، تم واقعی غلط فہمی میں رہے۔"

اے ایس آئی نے پھنکار کے کہا "میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا پیر۔"

پیر عنایت اور ناجی ایک طرف کھڑے ہوئے تھے اور پیر آہستہ آہستہ ناجی سے کچھ کہہ رہا تھا۔ اچانک ناجی نے چلانا شروع کیا۔

"اجی آپ کیا نہیں چھوڑیں گے، میں نہیں چھوڑوں گا اس کنجر کی اولاد کو" اس کے ساتھ ہی شائیں شائیں کی آواز سنائی دی۔ میں نے دیکھا کہ ناجی نے گھوڑے کا مزاج درست رکھنے والا چابک اتار لیا ہے اور پیر عنایت پر برسا رہا ہے۔

پیر عنایت کی حالت پہلے ہی خراب تھی۔ اسے خوب اندازہ تھا کہ پولیس اس سے کس طرح اپنی شکست کا بدلہ لے گی۔ ناجی کے قہر و غضب کا طوفان اس پر اچانک نازل ہو گیا۔ پیر عنایت ہٹا کٹا، صحت مند آدمی تھا مگر ناجی بہت پھرتیلا تھا اور چابک کا استعمال جانتا تھا۔ بید کی چھڑی پر مضبوطی سے بندھا ہوا ڈھائی تین فٹ لمبا چمڑے کا تسمہ اس پر بجلی کی طرح لہرا کے گرتا تھا۔ وہ تڑپ کے پلٹتا تھا تو ناجی گھوم کے دوسری طرف سے وار کرتا تھا۔ شائیں کی آواز کے ساتھ ہی چابک پیر عنایت کی کھال پر چپک جاتا تھا اور اس سے پہلے کہ عنایت اسے پکڑے، وہ پھر لہراتا دکھائی دیتا تھا۔

پیر عنایت ایک مضحکہ خیز ڈانس کر رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ آگے پیچھے جاتے تھے۔ کبھی جسم پر انگارے کی لکیر بن کر پڑنے والی ضرب کی اذیت کو کم کرنے کے لئے، کبھی لہراتے چابک کو گرفت میں لینے کے لئے تو کبھی خود کو بچانے کے لئے۔ وہ اچھل رہا تھا اور ہر طرف گھوم رہا تھا مگر اس کے لئے ناجی کی چابک دستی سے کہیں پناہ نہ تھی۔

آہستہ آہستہ پیر عنایت کراہنے لگا۔ پھر چلانے لگا اور فریاد کرنے لگا۔ خدا رسولؐ کے واسطے دینے لگا۔ معافیاں مانگنے لگا مگر ناجی کا ہاتھ نہ رکا۔ یہ اس پیر کی ذلت کی انتہا تھی جس کے قدم چومنے کے لئے نادان اور سادہ لوح عقیدت مند بے تاب رہتے تھے۔ یہاں صرف ناجی ہی نہیں وہ پولیس والے بھی اس کی شامتِ اعمال کا نظارہ کرکے تسکین حاصل کر رہے تھے جو اس کی غلط بیانی کے باعث ذلیل ہوئے تھے۔

میرے لئے اس نظارے میں بڑی عبرت کا سامان تھا۔ خدا کیسے عزت دیتا ہے اور کیسے ذلت! سر جھکانے والے جب سر اٹھاتے ہیں..... جب فریب کا پردہ چاک ہوتا ہے اور آنکھیں روشنی میں اصلیت دیکھتی ہیں، باطل کا طلسم ٹوٹتا ہے اور بے رحم سچ سامنے آتا ہے۔ تو غلام اپنے آقا کا سر قلم کر دیتے ہیں۔ مظلوم کی طاقت ظالم پر خدا کا قہر بن کے ٹوٹتی ہے۔ نخوت و تکبر کے جھوٹے خدا ذلت و رسوائی کے گڑھے میں گر کے انہی کے قدموں تلے روندے جاتے ہیں جو انہیں سجدہ کرتے تھے۔

اگر میں ناجی کو نہ روکتا تو شاید وہ پیر عنایت کی ہڈیوں پر سے گوشت اتار لیتا۔ مجھے اب کوئی شبہ نہیں رہا تھا کہ ناجی کے اس اشتعال کی بنیاد بھی انتقامی جذبات پر تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے پیر عنایت کی عداوت ذاتی تھی۔

میں نے ناجی کا ہاتھ پکڑ کے کہا "بس کرو، اسے قتل کرکے گناہ گار کیوں ہوتے ہو، کہیں یہ مر نہ جائے۔"

"آپ چھوڑ دیں جی مجھے۔ اس مردود کو مارنے کا بہت ثواب ہو گا۔ اگر اسے زندہ چھوڑ دیا گیا تو یہ ایسے ہی دنیا کو دھوکا دیتا رہے گا" ناجی بولا۔

میں نے کہا "ہم پیر جی کو اپنے ساتھ لے جائیں گے، پہلے اسے موقع دیں گے کہ یہ اپنے سارے جرائم کا اعتراف کر لے اور تائب ہو جائے۔"

"یہ توبہ کر لے گا اور پھر مکر جائے گا... میں اس کے سارے کالے کرتوتوں سے واقف ہوں" اے ایس آئی نے کہا "آپ تو اسے میرے حوالے کر دو۔"

میں نے کہا "سب کچھ جانتے ہوئے بھی آج تک تم نے کچھ نہیں کیا تھا۔ میں کیسے مان لوں کہ آئندہ تمہارے اور اس کے درمیان یہ اشتراکِ عمل نہیں ہو گا۔"

"ہم صرف اس کی وجہ سے ذلیل ہوئے" اے ایس آئی بولا۔ "میں نے اس کی کھال کے جوتے بنوا کے مریدوں کو نہ دیئے تو اپنے باپ کا نہیں۔"

غالب نے کہا "اپنے مجرم کو ہم خود سزا دے سکتے ہیں۔"

پیر عنایت نے بڑی لجاجت سے کہا "لیکن میں نے تو کوئی جرم نہیں کیا۔"

میں نے پلٹ کے پوری قوت سے اس کے منہ پر جھانپڑ مارا۔ "کیا ضمیر فروشی سے بڑا کوئی جرم ہے؟ تو نے اپنا ایمان بیچا، خلقِ خدا کے اعتماد کو دھوکا دیتا رہا۔ تو نے دوستی کے پردے میں ہم سے دشمنی کی۔ غدار، تو نے رشتوں کی آبرو کو نیلام کردیا۔ پھر پوچھتا ہے کہ میرا جرم کیا ہے..."

نازو نے کہا "باقی مجرموں کے لئے کیا حکم ہے؟ کیا یہ بھی ساتھ جائیں گے؟"

میں نے نفی میں سرہلایا "ہم جلوس لے کر نہیں جاسکتے۔"

"پھر ان کو یہیں گاڑ دیتے ہیں" نازو نے ایسے ریوالور اٹھایا جیسے وہ تینوں سپاہیوں کو قتل کرنے کا فیصلہ کرچکی ہے۔

ایک سپاہی چلانے لگا "ہماری غلطی معاف کردیں جی، ہم خود نہیں آئے تھے۔ یہ داڑھی والا ہمیں مجبور کرکے لایا تھا۔"

اس نے کہنی مار کے اپنے ساتھ کھڑے ہوئے شخص کو فریاد یا جماعت میں شریک ہونے کا اشارہ دیا۔

دوسرے شخص نے فوراً اقرار میں سرہلایا "ہاں جی، یہ بالکل ٹھیک ہے۔ ہم تو گشت کرکے واپس جارہے تھے کہ پیر عنایت مل گیا۔ اس نے کہا کہ میرے ساتھ چل کے مجرموں کو پکڑلو۔ ہم سے بھول ہوگئی جی۔"

اس نے تیسرے کو کہنی ماری کہ آگے تم بولو۔

تیسرا ہکلاتا تھا۔ اگر اسے مجبور نہ کیا جاتا تو وہ خاموش ہی رہتا۔ "ہمارے بی... بی... بی بیوی بچے ہیں۔ چھ... چھوٹے... چھوٹے... ہم کسی کو... نا... نا... ناہیں بتائیں گے... کچھ بھی..."

میں نے کہا "تھانے دار، کیا یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں کہ تم کو مجبور کرکے لانے والا پیر عنایت تھا؟"

اس نے پیر عنایت کو پُرعناد نظروں سے دیکھا اور اقرار میں سرہلانے لگا "یہ ٹھیک ہے۔"

"تم نے اس سے پوچھا تو ہوگا کہ وہ کون مجرم ہیں؟"

"ہاں، پوچھا تھا۔"

"پھر؟" میں نے اے ایس آئی کو تذبذب میں دیکھ کر کہا۔

"اس نے صرف یہ کہا کہ وہ سب پاکستان سے آئے ہیں اور اس علاقے میں غیر قانونی طور پر موجود ہیں۔ میں نے پوچھا کہ تمہیں کیسے معلوم ہوا ان کے بارے میں؟ اور تمہارا تو سالا بھی پولیس افسر ہے۔ تم نے یہ بات اسے کیوں نہیں بتائی؟ یہ کہنے لگا کہ سالے کو گولی مارو۔ اس نے ایمان بیچ دیا ہے اپنا، اس کو رشوت مل گئی ہے۔ وہ سب بھول گیا ہے کہ اس کا کیا فرض ہے اور کیا ذمے داری ہے۔ اس نے سب کو بے وقوف بنانے کے لئے انہیں پہلے حوالات میں رکھا۔ پھر اپنے گھر لے گیا اور صبح ان کو فرار ہونے کا موقع فراہم کردیا۔ ان کو ایک لونڈا تانگے میں بٹھا کے لے گیا ہے۔ وہ لونڈا لاوارث ہے جس کے نہ ماں باپ ہیں اور نہ آگے پیچھے کوئی اور ہے مگر میرے سالے نے اسے بہت سر چڑھا رکھا ہے۔ وہ چھوٹی موٹی چوریاں کرتا رہتا ہے مگر آج تو وہ گھوڑا بھی چوری کرکے بھاگا ہے اور تانگہ بھی۔ باقی سب مجرم عورتوں کے بھیس میں برقع اوڑھ کے فرار ہوئے ہیں۔ ان کو تم مقابلہ کئے بغیر ہی پکڑلوگے۔"

غالب بولا "لیکن ہوا اس کے برعکس، مقابلہ کئے بغیر تم پکڑے گئے۔"

نازو نے کہا "تھانے دار جی کے دل میں یہ حسرت نہ رہ جائے، اگر یہ مقابلہ کرنا چاہیں تو میرے سامنے آجائیں۔"

اے ایس آئی کا چہرہ شرم سے لال پڑگیا۔ وہ ایک عورت کے چیلنج کو قبول نہ کرنے پر مجبور تھا، اسے معلوم تھا کہ مقابلے کا انجام کیا ہوگا۔

اے ایس آئی کی بات پر غور کرنے کے بعد میں نے کہا "کیا تم ہمیں جانتے ہو؟"

تھانے دار نے نفی میں سرہلایا "میں نے کبھی نہیں دیکھا تمہیں۔"

اس نے بڑے اعتماد کے ساتھ جھوٹ بولا تھا۔ یہ ناممکن تھا کہ اس علاقے میں گشت کرنے والی پولیس پارٹی کو ہمارے متعلق کچھ معلوم نہ ہو۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کی تلاشی لی تو ایک جیب میں سے اخبار کا وہ تراشہ برآمد ہوگیا جس پر میری، محسن کی اور غالب کی تصویر تھی۔

یہ سرکاری اشتہار تھا جس میں ہمیں دہشت گرد قرار دیا گیا تھا اور ہماری گرفتاری پر انعام کا اعلان تھا۔

میں نے اے ایس آئی کو وضاحت کا موقع دیئے بغیر بڑی بے رحمی سے مارا۔ اس کے ماتحت سخت دہشت زدہ کھڑے کانپتے رہے۔ نازو کے ہاتھوں پٹنے کے بعد ان میں آنکھ ملا کے بات کرنے کا حوصلہ بھی نہیں رہا تھا۔ اپنے افسر کی درگت بنتی دیکھ کے وہ زندگی سے مایوس ہوگئے۔ انہیں اندازہ ہوگیا کہ ہم عام قسم کے مجرم نہیں ہیں جن سے ان کا دیہات میں واسطہ پڑتا رہتا تھا۔

اے ایس آئی کے ناک اور منہ سے خون نکل رہا تھا اور وہ زمین پر پڑا ہوا ایسے کراہ رہا تھا جیسے اس کا آخری وقت آگیا ہے... میں نے اس کے انجر پنجر ڈھیلے کردیئے تھے لیکن اس بات کا خیال رکھا تھا کہ اسے کوئی مہلک چوٹ نہ آئے۔

میں نے ریوالور نکال کے کہا "تم پانچ سیکنڈ میں اپنے پیروں پر کھڑے نہ ہوئے تو میں تمہیں شوٹ کردوں گا۔"

اے ایس آئی بڑی پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ہر بزدل آدمی کی طرح اس نے بھی مکروفریب اور جھوٹ کی مدد سے جان

...نے کی کوشش کی تھی اور ناکام رہا تھا۔ اب اس کے پاس کہنے کو کچھ بھی نہیں تھا۔

میں نے غالب سے کہا "ان کا اسلحہ انہیں پیش کردو مگر ناکارہ کرنے کے بعد، اور ان کو جانے دو واپس۔"

غالب نے تینوں رائفلوں کے میگزین نکال لئے اور پتھر مار مار کے گھوڑے ناکارہ کردیئے۔ بولٹ جام ہوجانے کے بعد اب اس بات کا امکان بھی نہ رہا کہ رائفلیں پھر کبھی استعمال کے قابل ہوسکیں گی۔ میں نے ریوالور خالی کیا اور اے ایس آئی کو واپس کرنے سے پہلے اس کا ٹریگر توڑ دیا۔

"ہم بلاوجہ کسی کی جان لینے کے قائل نہیں، اس لئے تم واپس جارہے ہو" میں نے کہا "اپنے ساتھ ہم صرف اس بازو پیر کو لے جائیں گے لیکن اسے بھی قتل کرنے کا ارادہ نہیں ہے۔ جب یہ واپس آجائے تو تم اپنا حساب برابر کرتے رہنا۔ فی الحال صرف ایک بات اچھی طرح سمجھ لو۔ اگر تم سب کو اپنی زندگی اور اپنے خاندانوں کی سلامتی عزیز ہے تو جو کچھ ہوا اس کا ذکر بھی کسی سے مت کرنا، اگر ہمیں کبھی معلوم ہوا کہ تم نے اوپر بات پہنچائی ہے یا پیر عنایت کی بیوی اور اس کے بھائی کے خلاف کارروائی میں فریق بنے ہو تو ہم تمہیں بھی لے جائیں گے۔ ہمیں سب معلوم ہوجائے گا اور ہمارا راستہ روکنا بہت مشکل کام ہے۔ تم نے اخبار میں دیکھ ہی لیا ہوگا کہ ہم آج تک پکڑے نہیں گئے۔"

تھانے دار کا اور اس کے ماتحت سپاہیوں کا چہرہ فق ہورہا تھا۔ میں نے اپنے لہجے کو ڈرامائی حد تک خطرناک بنالیا تھا۔

اے ایس آئی نے سرہلایا اور خاموشی سے اپنی شکست تسلیم کرلی۔

میں نے کہا "تمہاری جیپ ہم لے جارہے ہیں۔"

نازو نے کہا "بھئی، ان سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟ تھانے دار صاحب تو خود یہی کہنے والے تھے۔ یہ پیدل چلے جائیں گے۔"

غالب نے کہا "پیدل چلنے سے صحت ٹھیک رہتی ہے مگر میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔"

میں نے کہا "جو کہنا ہے کہہ ڈالو، اپنے تھانے دار صاحب کسی بات کا برا نہیں مانتے۔"

"میں سوچ رہا تھا کہ کیا ہم ایسے کپڑے پہن کر جیپ میں بیٹھے ہوئے اچھے لگیں گے۔"

میں اس کی بات کا مطلب سمجھ گیا۔ میں نے مسکرا کے کہا۔ "بالکل اچھے نہیں لگیں گے مگر بڑے مہمان نواز لوگ ہیں یہ، اپنے کپڑے بھی دے دیں گے تمہیں۔"

تھانے دار کا منہ احتجاج کے لئے کھلا اور بند ہوگیا "اس طرح تم پھنس جاؤ گے۔ سرکاری جیپ اور سرکاری وردی..."

میں نے کہا "تمہارا خیال تھا کہ یہ لباس ہمارے لئے باعثِ شرم ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس وردی میں تم کو شرم آنی چاہئے۔ ...لباس بدل لیں۔"

تھانے دار کے لئے یہ ذلت ناقابلِ برداشت تھی "وردی تم لے لو مگر ہم یہ عورتوں کے کپڑے نہیں پہن سکتے۔"

نازو نے کہا "جتنی بہادری اور جوانمردی کا مظاہرہ تم نے آج کیا ہے، اس کے بعد تو تمہیں چوڑیاں بھی پہن لینی چاہئیں۔"

غالب نے سرہلایا "چوڑیوں کے پیسے ہم دیں گے.. واپس جاکے ان کپڑوں سے میچ کرتی ہوئی چوڑیاں خرید لینا۔"

ناجی نے پیچھے سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا "ایک بات سن لیں میری جناب۔"

وہ بہت پریشان نظر آرہا تھا۔ میں اس کے ساتھ چند قدم دور جاکے رک گیا "کیا بات ہے ناجی؟"

"دیکھیں جی، میں اس تھانے دار کو بھی جانتا ہوں اور یہ بھی معلوم ہے مجھے کہ اس وقت پیر عنایت آپ کے پیچھے نہیں، میرے پیچھے آیا تھا۔"

"تمہارے پیچھے!" میں نے چونک کر کہا۔

"ہاں جی۔ اس نے تھانے دار سے کہا تھا کہ پہلے ناجی کو گولی ماردینا، کوئی بات کئے بغیر۔ آپ نے بچالیا مجھے ورنہ یہی ہوتا۔ پوری بات میں آپ کو بعد میں بتاؤں گا۔ ابھی صرف یہ کہنا تھا کہ ...بعد میں میرا کیا بنے گا۔ اگر مجھے واپس جانا پڑا تو یہ لوگ مجھے چھوڑیں گے نہیں۔ آپ نے زینب کی جان بچانے کا بندوبست کرلیا اور اس کے بھائی کو بھی بچالیا... رہ گیا میں غریب..."

میں نے کہا "تمہارا کوئی بال بیکا نہیں کرسکتا۔ میں بھول گیا تھا تمہارا ذکر کرنا۔ اب سمجھا دوں گا انہیں۔"

ناجی نفی میں سرہلانے لگا "یہ سمجھنے والے لوگ نہیں ہیں جی۔ ہوسکتا ہے یہ ابھی مجھے لے جانے کی کوشش کریں۔"

"زبردستی کون لے جاسکتا ہے تمہیں؟" میں نے کہا۔

"میں اب واپس نہیں جاسکتا جی، گیا تو یہ لوگ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ مجھے معلوم ہے" ناجی نے کہا۔

"پھر تم کیا کرو گے، کہاں جاؤ گے؟"

"میں... میں آپ کے ساتھ..." اس نے ملتجی نظروں سے دیکھا۔

مجھے امید تھی کہ وہ یہی کہے گا۔ میں نے سختی سے کہا "نہیں ناجی۔ تم ہمارے ساتھ نہیں جاسکتے۔"

اس کی صورت اتر گئی "اچھا جی، پھر میں... کہیں اور چلا جاؤں گا، زبردستی تو میں آپ کے ساتھ بھی نہیں جاسکتا۔"

میں نے کہا "دیکھو ناجی، تمہیں بالکل اندازہ نہیں ہے کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ ہمارا کوئی گھر نہیں ہے جہاں تم رہ سکو۔"

"یہاں میرا کون سا گھر تھا جی" وہ اداس ہوگیا تھا۔

"ہاں۔ لیکن بہت خطرہ ہے ہمارے ساتھ جانے میں... میں تم کو بعد میں سمجھا دوں گا" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے دوستانہ لہجے میں کہا "پہلے ہم انہیں رخصت کردیں۔"

پولیس پارٹی کے ارکان میرے اور ناجی کے خفیہ مذاکرات...

سے غلط امیدیں وابستہ کر بیٹھے تھے اور یہ سمجھنے لگے تھے کہ ناجی ضرور لحاظ یا خوف کے باعث ان کے ساتھ بہتر سلوک کی سفارش کرے گا۔ ہم اجنبی اور بے مروت لوگ تھے مگر ناجی بہرحال اسی علاقے کا رہنے والا تھا اور وہاں کے کمترین طبقے میں شامل تھا جو پیدائشی طور پر محکوم و مظلوم سمجھے جاتے ہیں اور نمبردار سے تھانے دار تک سب کی جوتیاں کھاتے اور اٹھاتے ہیں۔۔

جب میں نے حکم جاری کیا "چلو بھئی... باری باری... اس برگد کے پیچھے جاکے اپنی اپنی وردیاں اتار دو" تو ان سب کی شکلیں رونے والی ہوگئیں۔

"ہمارا وقت ضائع مت کرو" غالب نے انہیں جھاڑا "کیا برگد کا درخت نظر نہیں آرہا ہے؟"

میں نے کہا "جاتے وقت اپنے ساتھ ایک برقع لے جاؤ۔"

تھانے دار نے بے یقینی کے ساتھ مجھے دیکھا "صرف برقع؟"

"ہاں صرف برقع" میں نے کہا "اور کچھ نہیں۔"

"مگر... تم نے اپنے کپڑے دینے کی بات کی تھی..."

"اس وقت تمہاری غیرت جاگ اٹھی تھی۔ تم نے جذباتی ہوکے میری اس پیشکش کو بڑی حقارت سے مسترد کردیا تھا" میں نے کہا "اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ برقعے بھی تین ہیں، جو دیر کرے گا اسے برقع بھی نہیں ملے گا۔"

"تاہم برقع پہننا لازمی کسی کے لئے نہیں ہے۔ جسے زنانہ لباس پہن کے ڈر ہو کہ اس کی جنس بدل جائے گی' وہ ایسے ہی سیٹی بجاتا ہوا مردانہ وار چلا جائے" غالب نے کہا۔

تھانے دار نے اس رسوا کن حکم کی تعمیل میں سبقت لے جانے کی بالکل کوشش نہیں کی۔ صرف برقع پہن کر روانہ ہونے کا اعزاز پہلے اس کے تینوں ماتحتوں نے حاصل کیا۔ آخر میں کوئی برقع نہ رہا تو وہ کچھ پُرامید نظر آنے لگا کہ شاید اس کی وردی اور عزت محفوظ رہ جائے مگر نازو شرارت کے موڈ میں تھی۔ اس نے پیر عنایت سے چادر لے لی اور اس کے وسط میں سر کے سائز کا سوراخ کرکے تھانے دار کے لئے ایک خلعتِ فاخرہ ایجاد کردی۔ جب اس نے چادر کے چاک میں سر ڈالا اور اس بغیر سلی عبا کو دونوں طرف سے پکڑ کے چلنا شروع کیا تو اس کی حالت سب سے زیادہ مضحکہ خیز ہوگئی۔

وہ سب آگے پیچھے جارہے تھے اور ایک دوسرے سے سو قدم کے فاصلے پر چل رہے تھے مگر ابھی تک ان میں سے کسی نے بھی پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔ غالب نے ان کے جوتے بھی اتروا لئے تھے اور برقعے ان کو اتنے چھوٹے تھے کہ گھٹنوں سے نیچے ان کو اپنی مردانہ پنڈلیاں چھپانا مشکل ہورہا تھا۔ شاید برقعے کے اندر بھی انہیں اپنی بے لباسی کا خیال شرم سے ڈوب مرنے پر مجبور کررہا ہوگا۔ ان کی حالتِ زار پر سب سے زیادہ ہنسی نازو کو آرہی تھی۔

غالب نے کہا "آخر کب تک ہنسی کرتی رہو گی۔۔۔ تمہاری ہنسی میں جلترنگ ہے لیکن طبلِ جنگ بج رہا ہے۔۔۔ کوئی نہیں سنتا۔"

نازو نے کہا "مجھے صرف تمہاری پھٹے ڈھول جیسی آواز سنائی دے رہی ہے۔ کیسے طبلِ جنگ ہو تم؟"

میں نے کہا "مرزا' وہ خبیث چابیاں لے گیا جیپ کی۔"

مرزا غالب نے بند مٹھی کھول کے دکھایا، "چابی تو میں نے بہت پہلے نکال لی تھی۔"

"گڈ۔ چلو پھر دیر کیسی؟"

غالب نے کہا "پیر صاحب کی میّت کیسے جائے گی؟"

پیر عنایت نے آسمان کی طرف منہ اٹھاکے فریادی لہجے میں کہا۔ "یا اللہ! تو ہی رحم ڈال ان ظالموں کے دل میں۔"

میں نے کہا "اب کوئی دعا قبول نہیں ہوگی پیر جی۔ خدا کی دی ہوئی مہلت سے تم نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ وہ وقت گزر گیا جب تم دنیا و عقبیٰ کے لئے نیکی کا زادِ سفر جمع کرسکتے تھے۔"

غالب نے کہا۔ "خدا نے ہمیں انسان بنایا تھا جو اشرف المخلوقات ہے اور عقل دی تھی نیکی بدی کے فرق کو سمجھنے کے لئے مگر تم نے شیطان کی اطاعت کی۔ تم پیری مریدی کا جھوٹا ڈرامہ کرتے رہے اور خلقِ خدا کو اپنی شعبدہ بازی اور کرشمہ سازی سے الّو بناتے رہے۔ اس وقت تمہیں خیال نہیں آیا کہ جھوٹ کی کھوکھلی بنیادوں پر استوار کی جانے والی عقیدے کی عمارت کتنی ناپائیدار ہے۔"

"شاعر نے بہت پہلے فرمایا تھا کہ ناؤ کاغذ کی سدا چلتی نہیں..." میں نے کہا "آخر کار خدا نے تمہارے فریب کا پردہ چاک کرنے کا فریضہ ہمیں سونپا۔"

"پھر تمہاری شامتِ اعمال خود تمہیں کھینچ کر ہمارے پاس لے آئی" غالب نے ریوالور کو پیر عنایت کی ناک سے چھو کر کہا۔ "ورنہ ہم تو تمہیں پیچھے چھوڑ آئے تھے۔"

پیر عنایت علی نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "کیا۔ تم دونوں فیصلہ کرچکے ہو مجھے مارنے کا؟"

میں نے کہا "کیا اب بھی تم امید رکھتے ہو کہ تمہارے ساتھ رعایت کی جائے گی؟"

"اس سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا..."

"خلقِ خدا کو فائدہ ضرور ہوگا" میں نے کہا اور اسے جیپ کی طرف دھکیل دیا۔

"دیکھو' میری ایک بات سن لو" پیر عنایت دہشت زدہ ہوکے چلایا۔

وہ جیپ میں بیٹھنے سے ایسے ڈر رہا تھا جیسے یہ آخری سفر پر لے جانے والی میّت گاڑی ہے۔

"جو کہنا ہے راستے میں کہنا" میں نے اس کو جیپ کے پیچھے والے کھلے حصے میں اچھال دیا۔ پچھلے حصے میں آمنے سامنے دو

بیٹھیں تھیں۔ ان میں سے ایک پر میں پیر عنایت کے روبرو بیٹھ گیا اور اس کے ہاتھوں میں گھوڑے کی لگام پکڑا دی۔ جیپ کے ساتھ گھوڑے نے تھوڑی سی مزاحمت کی اور پھر پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ اگلی سیٹ پر غالب نے ڈرائیونگ کی ذمے داری سنبھالی تھی اور اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی نازو محض اسے پریشان کرنے کے لئے ڈانٹ ڈپٹ کے انداز میں ہدایات جاری کررہی تھی۔ "یہ کیا ہے' سیکنڈ گیئر کیوں لگایا ہے' تھرڈ گیئر آخر کس دن کام آئے گا اور پھر گاڑی دائیں بائیں کیوں ہل رہی ہے' ہچکولے کیوں لے رہی ہے' کیا اس کے انجن کو دمے کا مرض لاحق ہے۔ یہ پھر تم نے گڑھے کے دائیں طرف سے گاڑی گزاری ہے۔ گڑھے والا بائیں طرف رہنا چاہئے تم کو۔ یہ ٹھیک ہے کہ بائیں طرف درخت تھا مگر تم ہارن دیتے تو شاید وہ راستے سے ہٹ جاتا۔ تم کو ہارن بجانا بھی نہیں آتا؟ کتنے افسوس کی بات ہے کہ تم ساز نہیں بجاسکتے۔ ایسے میری طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں' ہمیشہ گاڑی چلاتے ہوئے راستے پر نظر رکھو۔ ابھی ابھی تم نے ایک معصوم اور بے ضرر جانور کو کچل کے ماردیا ہے۔ وہ اللہ کی بھینس تھی۔ اللہ میاں کو کیا جواب دوگے حشر کے دن...؟"

مجھے ہنسی بھی آرہی تھی اور تعجب بھی تھا کہ غالب خاموش رہا اور نازو کی فضول باتوں کا اس پر کوئی اثر نہیں ہورہا ہے۔ عام حالات میں تو ان کی لڑائی شروع ہونے میں دیر نہیں لگتی تھی۔ نازو کا غصہ اور حد سے زیادہ بولنا بھی اعصابی دباؤ کو ختم کرنے کی غیر شعوری کوشش تھی۔ وہ ہسٹریا کا شکار ہوکے روتی اور چلاتی نہیں تھی۔ شاید وہ ثابت کرتی تھی کہ وہ عام لڑکی نہیں مگر اس کا بے سبب ہنسنا اور مسلسل باتیں کرنا یا غالب سے لڑنا ہسٹریا کا دورہ ہی ہوتا تھا۔ پھر جیسے جیسے وہ پُرسکون ہوتی جاتی اس کے رویّے میں بھی متانت کا انداز اور معقولیت کا عنصر شامل ہوجاتا تھا۔ گزشتہ چوبیس گھنٹوں میں پُرخطر حالات اور مصائب کا سامنا کرنے والی وہ اکیلی لڑکی تھی جس نے کسی بھی عالم میں صنفِ نازک اور کمزور عورت ہونے کے احساس کو اپنے حوصلے پر حاوی نہیں ہونے دیا تھا۔ رابعہ اور گل ہم سے بچھڑ گئی تھیں۔ اس کا صدمہ مجھے بھی تھا لیکن اس کے ساتھ ہی تقویت دینے والا خیال یہ تھا کہ وہ خانہ بدوشوں کے قبیلے کے ساتھ جہاں بھی ہوں گی محفوظ ہوں گی اور وہ قبیلہ جو ضرورت اور مصلحت کے پیشِ نظر غائب ہوگیا ہے' کبھی نہ کبھی' کہیں نہ کہیں نظر آجائے گا۔ تلاش کرنے سے خدا بھی مل جاتا ہے۔ پھر وہ کیوں نہیں ملے گی؟ اس کا سراغ وہ ہوا دے گی جو رابعہ کے پاس سے چھو کے گزرے گی تو اس کے وجود کی خوشبو سمیٹ لائے گی اور جیسے قطب نما کی سوئی ہر جگہ' سمت اور فاصلوں کے تعین کو رد کرتے ہوئے شمال کی جانب ہوجاتی ہے' ویسے ہی میرا دل بھی از خود اس سمت میں چل نکلے گا' جدھر سے رابعہ کی محبت کی خوشبو آئے گی۔ لیکن ابھی میرے دل کو محسن کی طرف سے پُرتشویش خیالات اور شہلا کی طرف سے یاس آمیز دکھ کی اذیت نے اتنا

مجبور کردیا تھا کہ میں صرف رابعہ کے بارے میں سوچتے ہوئے اپنی خود غرضی کے احساس سے شرمندہ ہوتا تھا۔

مین روڈ اب زیادہ دور نہیں رہی تھی لیکن میں نے راستہ بدل دینا بہتر سمجھا۔ پیر عنایت کی راہنمائی میں ہم تک پہنچ جانے والی پارٹی کو ہم نے ایسی ذلت دے کر رخصت کیا تھا کہ وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے تھے۔ ان سے زیادہ امید یہی تھی کہ وہ اپنی رسوا کن ناکامی کا ذکر کسی سے نہیں کریں گے اور ان کی پوری کوشش ہوگی کہ ان کی ذلت کی تشہیر نہ ہو مگر انہیں راستے میں دوسری پولیس پارٹی مل گئی تو پھر انہیں سب بتانا ہی پڑے گا۔ ظاہر ہے اس کے بعد ہماری تلاش میں زیادہ تندی اور تندہی آجائے گی۔ پولیس اس سارے علاقے میں چپے چپے پر موجود تھی۔ یہ ہوسکتا تھا کہ آگے والوں کو خبردار کردیا جائے کہ ہوشیار' مجرم اسی راستے پر بڑھتے چلے آرہے ہیں۔ اور وہ مین روڈ پر گرفتاری کا تمام ساز و سامان لئے ہمارے استقبال کے لئے ہر طرف موجود ہوں۔

اس علاقے کے راستوں سے صرف ناجی ہی واقف تھا۔ اسے دل گرفتہ دیکھ کر میں نے کہا "استاد ناجی' کوئی ایسا راستہ پکڑو جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ آئے۔"

ناجی کا چہرہ پھر امید کی روشنی سے دمکنے لگا "آپ فکر ہی مت کریں جی۔"

میں نے کہا "خدانخواستہ ہمارے دشمن پیچھا کرنا چاہیں تو ان کے سارے اندازے غلط ہوجائیں۔"

"میں ایسا چکر دوں گا' سالوں کو گھن چکر بنادوں گا" ناجی نے گھوڑے کو جیپ کے ساتھ ساتھ دوڑاتے ہوئے قہقہہ مارا۔ "ان کے باپ کو پتا نہیں چلے گا کہ ہم کدھر سے نکل گئے۔"

گھڑی دیکھ کر میں نے کہا "یہ بھی سمجھ لو کہ ہمارے لئے وقت کی بہت اہمیت ہے۔ دوپہر تک ہم بمبئی پہنچنا چاہتے ہیں۔"

"مین روڈ کی طرف سے؟" وہ سوچ کے بولا۔

"یہ کوئی ضروری نہیں۔ تم ہمارے لیڈر ہو' جس طرف سے چاہو لے جاؤ مگر راستہ محفوظ ہو۔"

ناجی نے یوں سر ہلایا جیسے ساری بات سمجھنے کے بعد اس نے یہ ذمّے داری قبول کرلی ہے "میں گھوڑے پر آگے چلتا ہوں' آپ جیپ لے کر میرے پیچھے آئیں۔"

میں نے کہا "اس طرح تو ہم رفتار کم رکھنے پر مجبور ہوں گے۔"

ناجی ہنسا "سڑک پر جیپ کا مقابلہ گھوڑا نہیں کرسکتا لیکن یہاں گھوڑے کا ساتھ جیپ نہیں دے سکتی۔ آپ بے شک ریس لگاکے دیکھ لیں۔"

ناجی بلاشبہ اچھا شہسوار تھا۔ گھوڑے نے شروع میں تھوڑی بہت سرکشی دکھائی تھی لیکن ناجی نے کسی دشواری کے بغیر اسے اپنا مطیع و فرمانبردار بنالیا تھا۔ جنگل کے ناہموار اور دشوار گزار کچے راستوں پر جیپ واقعی اس کی تیز رفتاری کا ساتھ

دینے میں ناکام رہی۔ ناجی بہت آگے نکل گیا تھا اور غالب اس بات پر بہت خفا تھا۔

رہی سہی کسر نازو نے پوری کردی۔ اس نے کہا "کتنی شرم کی بات ہے کہ چالیس ہارس پاور کی جیپ ہے تمہارے پاس اور تم ایک ہارس پاور کے گھوڑے کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔"

"گھوڑے پر ناجی اکیلا ہے" غالب نے آنکھیں نکال کے کہا۔ "جیپ پر اتنی بڑی گناہوں کی گٹھڑی بھی رکھی ہوئی ہے۔"

غالب کا اشارہ پیر عنایت کی طرف تھا جو خود کو انتہائی مجبور اور بے بس سمجھتے ہوئے خاموش بیٹھا آسمان کی طرف دیکھ دیکھ کر آہیں بھرنے کے سوا کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ اس کے چہرے کی ناامیدی سے اندازہ ہوتا تھا کہ خود اسے بھی اپنی کسی دعا کے قبول ہونے کی امید نہیں۔ اس کے لئے تو دنیا میں ہی روزِ حساب آگیا تھا۔ بالکل اچانک اور غیر متوقع طور پر۔ اور اسے اچھی طرح معلوم [illegible] اس کے اعمال نامے کو دیکھتے ہوئے ہم یہ حساب کیسے بے باق [illegible] یں گے۔

ناجی کچھ دیر پہلے بہت افسردہ تھا۔ میں نے اسے اپنے ساتھ نہ رکھنے کا فیصلہ سنا کے اس کا سب جوش و خروش ختم کردیا تھا۔ اس نے بڑے خلوص کے ساتھ اپنی افادیت ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی مگر میں نے قطعی غیر جذباتی بے رحمی کے ساتھ اس کی درخواست مسترد کردی تھی۔ احساسِ ناقدری کا ردِعمل دل شکستگی اور مایوسی تھا۔ وہ مستقبل کی بے یقینی کے اندیشوں کا شکار ہوگیا تھا۔ جس کے پاس ماضی کی یادوں کے اثاثے میں صرف کھوکھلے اور بے ناموس رشتے ہوں... جو وقت کے ساتھ بدل جاتے ہوں اور جن کی بنیادیں پیار سے زیادہ رحم کے جذبات پر محسوس ہوں۔ جو ہمیشہ یہ سمجھتا آیا ہو کہ اسے التفات بھی خیرات میں ملتا ہے... وہ ایسے ہی سب کے سامنے امیدوں کا خالی کشکول لئے پھرتا ہے کہ شاید کوئی اس پر ترس کھائے بغیر اس میں تھوڑی سی اپنائیت ڈال دے۔ وہ محبت ڈ[illegible] دے، جس میں اعتماد کم نہ ہو۔ لیکن میں بھی مجبور تھا۔ بم[illegible] ہر ٹھکرائے ہوئے بے کس اور مظلوم ناجی کو ساتھ لے کر نہیں چل سکتا تھا اور ہر ناجی کے ترسے ہوئے دل کی پیاس بجھانے کے لئے میرے پاس پیار کا کوئی سمندر نہیں تھا۔

ایک گھنٹے میں ہم نے تقریباً بائیس میل کی مسافت طے کی تھی۔ راستہ ایسا تھا کہ جم کر بیٹھنے کے باوجود ہم سب ہچکولوں اور جھٹکوں سے زلزلے کی کیفیت میں تھے۔ درحقیقت وہ کوئی راستہ تھا ہی نہیں۔ پیدل یا گھوڑے پر سوار ہو کے بھی اس مسافت کو طے کرنا آسان نہ تھا۔ جیپ میں شاید کبھی کسی نے ادھر سے گزرنے کی کوشش ہی نہیں کی ہوگی لیکن ناجی میری ہدایات کو ذہن میں رکھتے ہوئے مشکل ترین راستے کا انتخاب کرتا تھا اور اسے بالکل احساس نہیں تھا کہ اس کے پیچھے پیچھے جیپ چلانا غالب کے لئے کتنی بڑی آزمائش ہے۔ اب نازو بھی خا[illegible]

ہوگئی تھی اور شاید میری طرح اس خیال سے پریشان تھی کہ اس راستے پر ٹائر فلیٹ ہوگئے یا ٹائی راڈ کھل گئے تو ہمیں اس سواری کو اسی جگہ خیرباد کہنا پڑے گا۔ میں ناجی سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اب ہم کہاں ہیں اور بمبئی تک کتنی مسافت باقی ہے لیکن وہ کم سے کم سو گز اور بعض اوقات ایک فرلانگ آگے چل رہا تھا۔ میں چلاتا تب بھی، آواز اس کے کانوں تک نہ پہنچتی۔

آخر کار ناجی کو ایک ریلوے کراسنگ پر رکنا پڑا جہاں پھاٹک بند تھا۔ ہم ایک گاؤں کی آبادی کے [illegible] سے گزر آئے تھے اور دائیں جانب ریلوے لائن سیدھی کسی سیمنٹ فیکٹری تک جارہی تھی۔ غالب کا تھکن سے برا حال تھا اور ہم سب یوں محسوس کررہے تھے جیسے ہم بہت دیر سے کسی کنکریٹ مکسر میں تھے جو اب رک گیا ہے۔

"میں اس الّو کے پٹھے پر سے جیپ گزار دوں گا سکندر۔" غالب نے ہانپتے ہوئے آستین سے پسینہ صاف کیا۔

میں نے کہا "غلطی میری تھی، اسے کچھ مت کہو۔ میں نے ہی اسے کہا تھا کہ جس راستے پر کوئی ہمارے پیچھے نہ آسکے وہ راستہ اختیار کرے۔ واقعی اس طرف کون آسکتا ہے۔"

غالب نے کہا "ہم تو انسان ہیں، خود گھوڑا پریشان ہوگا کہ جن سوار ہوگیا ہے۔"

نازو نے اسے تسلی دی "چلو آگے راستہ صاف نظر آرہا ہے، یہ غالباً شہر کے مضافات ہیں۔"

بائیں طرف سے ایک کالا انجن خالی بوگیوں کو دھکیلتا ہوا لارہا تھا اور الٹا چل رہا تھا چنانچہ اس کی رفتار کم تھی۔ ناجی اپنے گھوڑے سمیت پھاٹک کے دوسری جانب موجود تھا۔ میں ریلوے لائن عبور کرکے اس کے پاس گیا۔

"تم راستہ تو نہیں بھول گئے ہو ناجی؟" میں نے کہا "آخر کتنی دور جانا ہے اب؟"

ناجی کے کپڑے پسینے میں تر تھے اور اسے بات کرنا بھی دشوار ہورہا تھا "بس جی، تھوڑا سا... یہ سڑک آگئی۔"

میں نے کہا "بس تو تم گھوڑے کی جاں بخشی کردو اور ہمارے ساتھ آجاؤ، ریس تم نے جیت لی۔"

نازو نے میرے پیچھے سے کہا "تم گھوڑے کی دل شکنی کررہے ہو، ریس گھوڑے نے جیتی ہے اور وہ غالباً مقابلہ جاری رکھنا چاہتا ہے۔"

غالب بھی ٹانگیں سیدھی کرنے کے لئے جیپ سے اتر آیا تھا۔ اس نے بھنا کے کہا "ہاں، دیکھنا یہ ہے کہ پہلے کون گرتا ہے۔ گھوڑا یا شہسوار۔ مسٹر ناجی! تم اگر گھوڑے ہوتے تو اس وقت تمہاری جذباتی کیفیت کیا ہوتی؟ کیا تم کو گھوڑے کی آنکھوں میں خون اترا ہوا نظر نہیں آتا؟"

ناجی نے بات سمجھے بغیر دانت نکال کے کہا "آپ [illegible] گئے ہو تو ہم تھوڑی دیر یہاں رک کے آرام کرسکتے ہیں" اس نے

انگلی سے ایک پرانے طرز کی عمارت کی جانب اشارہ کیا جو شاید آدھا میل دور تھی۔

"یہ کیا ہے، تمہارا میکا یا سسرال؟" غالب نے کہا۔

"یہ ڈاک بنگلا ہے" ناجی نے مطلع کیا "یہاں جو چوکیدار ہے وہ پیر عنایت کا خاص مرید ہے۔ بہت خدمت کرے گا۔"

نازو نے کہا "وہ پیر کہیں بھاگ نہ جائے اتر کے۔"

ناجی ہنسا "بھاگ کے کہاں جائے گا جی، اس سے تو چلا بھی نہیں جائے گا، اور گھوڑے پر جاکے میں اسے یوں گھیر لوں گا۔" ناجی نے چٹکی بجاکے کہا۔

جب ٹرین گزر گئی تو ناجی نے گھوڑے کو تھپکی دی اور آزاد کردیا لیکن گھوڑا پھر بھی وہیں کھڑا رہا۔ شاید اس کے لئے آزادی کا کوئی مفہوم اور تصور نہیں تھا کہ وہ خوشی کے اظہار میں اچھلتا کودتا اور پھر دوڑتا ہوا جنگل کی طرف نکل جاتا۔ اگر بعد میں کسی نے اسے لاوارث اور بے مہار پھرتا دیکھا ہوگا تو اس کے منہ میں اپنی ملکیت کی لگام ڈال دی ہوگی اور گھوڑے نے اس پر بھی کوئی احتجاج نہیں کیا ہوگا۔ جیپ کے روانہ ہونے تک وہ اسی جگہ موجود تھا اور اس وقت تک نظر آتا رہا جب تک [illegible] جیپ ڈاک بنگلے میں داخل نہیں ہوگئی۔

برآمدے کے سامنے کچے راستے پر ایک خستہ حال گاڑی پہلے سے موجود تھی۔ خاکی رنگ کی پرانی وردی میں ریسٹ ہاؤس کا چوکیدار گزشتہ رات قیام کرنے والوں کو رخصت کررہا تھا۔ اس کے لبوں پر ایک معنی خیز اور سارے راز کھولنے والی مسکراہٹ تھی۔ سلام کے لئے اٹھنے والے ہاتھ میں سو کا نوٹ اس کی فردِ جرم کی طرح تھا جو مہمانوں نے خدمت گزاری کے معاوضے یا انعام سے زیادہ رشوت کے طور پر دیا تھا۔ خود مہمانوں کے چہرے اپنے احساسِ جرم و گناہ پر ندامت کی تصویر نظر آتے تھے۔ ایک کالی سوکھی عورت جس نے اپنی جوانی کو وقت کی مسافت طے کرتے ہوئے مالِ غیر کی طرح لٹایا تھا، جذباتی بے حسی کے ساتھ اپنے ہونٹوں کو لبِ اشک سے رنگنے اور آئینے میں یہ دیکھنے میں مصروف نظر آتی تھی کہ لبوں کی یہ لالی کس حد تک اس کے اجڑے ہوئے چہرے کی رونق اور اس کی بے جان مسکراہٹ کا حسن بحال کرسکے گی۔ شبِ گزشتہ کی مجرم تنہائیوں کا رفیق ایک عمر رسیدہ اور شکست خوردہ چہرے والا شخص تھا جسے دیکھ کر خیال آتا تھا کہ اس نے ساری زندگی خواب دیکھنے اور خواہشوں کے سراب تلاش کرنے گزار دی تھی مگر لندن کے پرستان، ٹوکیو کے نائٹ کلب اور سنگاپور کے رنگین ماحول ہنوز اس کی دسترس سے دور تھے۔ شاید وہ کوئی معمولی سرکاری افسر تھا اور یہ عورت صرف رشوت تھی جو اس کو کسی ٹھیکیدار نے ایک غلط بل پر دستخط کرنے کے لئے پیش کی تھی یا وہ خود کوئی چھوٹا موٹا ٹھیکیدار تھا جس نے تمام عمر جھک مار کے آخر کار ایک سیکنڈ ہینڈ کار اور تھرڈ ریٹ سیکریٹری پر قناعت کرلی تھی۔ پولیس کو دیکھتے ہی وہ بڑی عجلت میں فرار ہوا۔ خود چوکیدار

کی صورت پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں اور اس کی مسکراہٹ کافور ہوچکی تھی۔ اس کا سلام کے لئے اٹھنے والا ہاتھ تیزی سے نیچے آیا اور سو کا نوٹ اس کی جیب میں غائب ہوگیا۔ اس نے بڑی مستعدی سے اپنے چہرے پر ایک خوشامدانہ مسکراہٹ کا خول چڑھایا اور انتہائی عاجزی سے ہاتھ جوڑ کے کھڑا ہوگیا۔ اسے غیر مشروط درخواستِ جاں بخشی بھی سمجھا جاسکتا تھا اور استقبال کا فدویانہ انداز بھی۔ باری باری اس نے مجھے اور غالب کو سلام کیا۔

"پرنام سرکار، پرنام ان داتا۔ پدھاریئے، اندر آیئے مہاراج۔" پھر اس کی نگاہ پیر عنایت پر گئی اور وہ عقیدت کے جذبات سے بے قابو ہو کے اس کی قدم بوسی کے لئے لپکا۔ پیر عنایت کو اپنی ذلت سے زیادہ اپنے انجام کی فکر نے ادھ موا کررکھا تھا مگر ایک مرید کے سامنے اس نے اپنی خودی کو بلند رکھنے کی پوری کوشش کی اور حسبِ عادت اس کے سر پر ہاتھ رکھ کے اسے دعا دی۔

میں نے چوکیدار کو گردن دبوچ کے اٹھالیا "تم مسلمان ہو؟"

"جی... جی سرکار" چوکیدار نے کانپتے ہوئے کہا۔

"مسلمان خدا کے سوا کسی کو سجدہ نہیں کرتا، تم اس شیطان کے پیروں پر سر رکھتے ہو" میں نے اسے جھٹک کے کہا "یہ پیر نہیں ایک مجرم ہے۔"

غالب نے کہا "اگر تم اس کے مرید ہو تو اس کے ساتھ ہی لٹکائے جاؤ گے۔"

چوکیدار کی حالت غیر ہوگئی "مگر حضور... میرا قصور... آہ.. میری گردن ٹوٹ جائے گی سرکار۔"

میں نے اسے ایک اور جھٹکا دے کر چھوڑ دیا "اپنا قصور پوچھتا ہے بدمعاش۔ یہ ڈاک بنگلا کیا تیرے باپ کا ہوٹل ہے؟"

ڈاک بنگلا ریلوے کا تھا چنانچہ اس کی دیکھ بھال پر مامور چوکیدار کو ریلوے سے تنخواہ بھی ملتی ہوگی مگر اس نے سرکاری املاک سے آمدنی کے دیگر ذرائع پیدا کرلئے تھے۔ اب تنخواہ کی کوئی اہمیت نہیں رہی تھی لیکن یہ نوکری بہرحال اہم تھی جو ڈاک بنگلے میں ٹھہرنے والے غیر سرکاری مہمانوں سے سو سو کے نوٹ دلواتی تھی۔ ہم نے اسے جرم کرتے ہوئے پکڑ لیا تھا اور گرفتاری کے ساتھ ہی اسے ملازمت بھی ختم ہوتی نظر آرہی تھی جس پر اس کی ساری خوشحالی کا دارومدار تھا۔ اس نے ایک دم نازو کے پاؤں پکڑ لئے کیونکہ وہی افسر کی وردی میں تھی۔ روتے [illegible] اس نے اپنی ہر خطا معاف کرانے کی کوشش کی۔ نازو پریشان ہوگئی کیونکہ وہ کسی صورت اس کے پاؤں چھوڑنے پر آمادہ نہ تھا۔

"مہاراج غلطی ہوگئی۔ آئندہ کے لئے توبہ، میرے باپ کی توبہ۔ میرے بچوں پر رحم کریں۔"

نازو نے غالب کی طرف امداد طلب نظروں سے دیکھا۔ اگر وہ چاہتی تو ایک لات مار کے اسے دیوار پر پھینک سکتی تھی مگر چوکیدار آنسوؤں سے اس کے پاؤں دھو رہا تھا، [illegible]

واسطے دے رہا تھا اور اس کے پیروں میں ایسے لوٹ رہا تھا کہ نازو کے لئے بے رحمی کا مظاہرہ کرنا بالکل ناممکن ہوگیا تھا۔

غالب نے اسے ڈانٹ کے کہا "ابے چل اٹھ' بہت ڈراما ہوگیا۔ اندر جاکے ہمارے لئے کچھ چائے پانی کا انتظام کر۔"

چوکیدار واقعی ڈراما کررہا تھا۔ غالب کا حکم سنتے ہی وہ بڑی پھرتی سے اٹھا۔ اس کا رونا دھونا سب ایک دم رک گیا اور آنکھوں سے بہنے والے آنسو بھی یوں خشک ہوگئے جیسے اس نے آنسوؤں کا نلکا بند کردیا ہو۔ اس نے ریسٹ ہاؤس کے دونوں کمرے کھول دئے اور خود چائے بنانے کے لئے اندر غائب ہوگیا۔

ناجی نے دانت نکال کے کہا "یہ جھوٹ بول رہا تھا جی۔ نہ اس کی بیوی ہے نہ بچے' سالا ایکٹر ہے۔"

میں نے کہا "آخر مرید کس کا ہے؟ خیر' اب تم یہاں برآمدے میں ٹھہرو' کوئی بھی ادھر آئے تو فوراً بتانا۔"

"آپ فکر مت کرو جی" ناجی نے کہا۔

نازو اندر جاتے ہی ایک آرام کرسی پر نیم دراز ہوگئی تھی۔ اس کا تھکن سے برا حال تھا۔ غالب اس کے سامنے پڑے ہوئے لوہے کے اسپرنگ اور جوٹ کے گدے والے بیڈ پر لیٹ گیا۔ اس کے علاوہ کمرے میں ایک بھدی سی میز بھی موجود تھی اور یہ سارا فرنیچر برطانوی دورِ حکومت کی یادگار نظر آتا تھا۔ دوسرے کمرے میں اضافی چیز بڑی بڑی درازوں والی اونچی ڈریسنگ ٹیبل تھی جس کا بیضوی آئینہ دھندلا چکا تھا۔ بلند چھتوں والے نیم روشن کمرے میں اس کی چمک آسیب زدہ محسوس ہوتی تھی۔ شاید اس احساس کا سبب خانہ ویرانی کی وہ کیفیت تھی جو ریسٹ ہاؤس کے اندر میلی دیواروں اور بوسیدہ کڑیوں والی چھت سے عیاں تھی۔ چھت کے ایک گوشے میں چڑیوں نے گھونسلا بنالیا تھا جس کے تنکے نیچے بکھرے ہوئے تھے اور فرش کے ایک حصے کو بیٹوں نے داغدار کرر کھا تھا۔

بھاری بھرکم آرام کرسی پر نیم دراز ہوکے میں نے پیر عنایت کو دیکھا۔ وہ ابھی تک کھڑا ہوا تھا۔ بیڈ کی ظاہری حالت بھی اتنی خراب تھی کہ وہ اس پر بیٹھنے سے گریزاں تھا۔ اپنے فریب کار پیشے کی ساری بداعمالی اور اپنے کردار کی تمام خرابیوں کے باوجود پیر عنایت نے اپنی ذات کو پاکیزگی اور طہارت کی اعلیٰ صفات سے منسوب کرلیا تھا اور اس کے نزدیک یہ بیڈ ناپاک تھا۔ میز اس کے لئے بہت چھوٹی تھی چنانچہ وہ کھڑے رہنے پر مجبور تھا۔

"آخر تم نے میرے بارے میں کیا سوچا ہے؟" پیر عنایت نے کچھ دیر بعد کہا۔

میں نے کہا "تم جیسے کسی مجرم کے بارے میں مجھے سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی' تمہارا کیس ایم آر ایس کی عدالت میں سماعت کے لئے پیش ہوگا۔ تمہیں وہ سزا دی جائے گی جس کے تم مستحق ہو۔"

"کس نے دیا ہے تمہیں یہ اختیار؟ قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کا" پیر عنایت کی آواز لرز رہی تھی۔

"تم جیسے لوگوں نے جو قانون کا استحصال کرتے ہیں" میں نے کہا "اس کو کمزور سمجھ کے اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اسے خرید لیتے ہیں اور موشگافی کی جنگ میں الجھا کے بے مصرف اور بے وقعت بنادیتے ہیں۔ ہم انصاف کرتے ہیں اور اپنے یقین کی بنیاد پر جو بھی فیصلہ کرتے ہیں وہ ہمارے ضمیر کا فیصلہ ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے ہمارا یہ نظامِ انصاف دنیا سے مختلف ہے کہ ہم سب سے اہم ضمیر کی گواہی کو اور اپنے ایمان کو سمجھتے ہیں۔ تمہارے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہوگی۔"

"اور.... سزا کیا ملے گی مجھے؟"

"تم زبان سے اقرار کرو یا نہ کرو' اپنے جرائم کی نوعیت سے انکار نہیں کرسکتے۔ تم خود غور کرو کہ لوگوں کے اعتماد کو دھوکا دے کر تم نے آج تک کیا نہیں کیا۔ تم نے مال و زر ہی نہیں' مجبور عورتوں کی آبرو بھی لوٹی ہوگی۔ انہیں روحانی عقیدت کے جال میں پھانس کے بلیک میل بھی کیا ہوگا۔ مال دگنا کرنے کے بہانے ان سے سب کچھ ہتھیالیا ہوگا۔ جن اتارنے کے نام پر ان کے سر سے چادر اور تن کا پردہ بھی اتار دیا ہوگا۔ اولادِ نرینہ دینے کے نام پر تم نے انہیں رسوائی دی ہوگی۔ شاید تمہاری وجہ سے گھر اجڑے ہوں گے۔ ناموس کو زیادہ اہم سمجھنے والی عورتوں نے خاموشی سے جان دے دی ہوگی۔ تم جیسے جعلساز پیر یہی سب کچھ کرتے ہیں۔ کیا ان سب جرائم کی سزا موت سے کم بھی ہوسکتی ہے۔"

پیر عنایت کا رنگ لاش کی طرح سفید پڑگیا "تم... قتل کروگے مجھے... تو کیا یہ انصاف ہوگا؟"

میں نے کہا "پیر جی' ہم جانتے ہیں کہ ہم کیا کررہے ہیں۔ تم بھی جانتے تھے کہ تم کیا کررہے ہو مگر تمہیں یہ خوش فہمی تھی کہ تم اپنے سادہ لوح اور احمق مریدوں کے درمیان اور عقیدت مندی کے حصار میں بہت محفوظ ہو۔ آخرت کا خوف تمہیں تھا نہیں اور دنیا کے نظامِ انصاف سے تمہیں کبھی کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوا تھا لیکن اپنی اس وقت کی حالت پر غور کرو کہ تم کتنے بے بس اور مجبور ہو۔ ہم اگر تمہیں مار کے تمہاری لاش اسی ڈاک بنگلے میں چھوڑ جائیں تو ہمارا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے؟ کون کرے گا تمہارے خون کا دعویٰ اور کس کے خلاف؟"

"یہ.... یہ چوکیدار سب کو بتادے گا۔ تم بچ نہیں سکوگے۔" پیر عنایت نے لڑکھڑاتی زبان اور کھوکھلے لہجے میں کہا۔

میں نے حقارت سے ہنس کے کہا "اگر وہ عقل سے کام لے تو ایک زندہ پیر کے مقابلے میں مردہ پیر سے زیادہ فیض حاصل کرسکتا ہے۔ وہ تمہارا شاندار مزار بنوا سکتا ہے اور خود سجادہ نشین ہوکے ہر سال تمہارے عرس کے موقع پر عقیدت مندوں کو اکٹھا کرسکتا ہے۔ وہ آدمی ہوشیار ہے' نوکری میں مفت کی تنخواہ لے رہا ہے اور اس ڈاک بنگلے سے بھی کما رہا ہے۔ گدی کا سلسلہ تو اس کی آئندہ نسلوں کے لئے بھی باعزت اور منافع بخش ذریعہ روزگار ہوگا۔ مگر ہم اسے یہ موقع فراہم نہیں کریں گے۔ اس طرح تو دھوکے فریب کا یہ کاروبار تمہارے مرنے کے بعد بھی جاری رہے گا اور تم مرحوم و مغفور' خلد آشیانی' جنت مکانی' عنایت ربانی' پیر عنایت شاہ رحمتہ اللہ علیہ وغیرہ ہوجاؤ گے۔"

پیر عنایت کا چہرہ پُرامید نظر آنے لگا "کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ تم مجھے مارو گے نہیں؟"

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "ہاں۔ ہماری مجبوری اور تمہاری خوش قسمتی یہ ہے کہ تم زینب کے شوہر ہو اور ہم احسان فراموشی کو کبیرہ گناہوں میں سے ایک سمجھتے ہیں۔ ہم برائی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے قائل ہیں مگر آصف جاہ کی نیکی کا بدلہ ایسے نہیں دے سکتے کہ اس کی بہن کو بیوہ کردیں اور اس کی بھانجی کے سر سے باپ کا سایہ نہ رہنے دیں۔"

پیر عنایت کے چہرے پر اطمینان اور اعتماد کا رنگ نظر آنے لگا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے لبوں سے اوجھل رہنے والی مسکراہٹ میرا مذاق اڑا رہی ہے کہ میاں سکندرِ اعظم' کیسی ایم آر ایس کی عدالت اور کہاں کا تمہارا نظامِ انصاف' اصل بات یہ ہے کہ تم پیر عنایت کے وجود کو ختم نہیں کرسکتے اور اس کے طلسم کو توڑ نہیں سکتے۔ یار زندہ صحبت باقی۔ کل پھر وہی زندگی کے معمولات ہوں گے' وہی پیری مریدی کے چکر' وہی رونقِ محفل' وہی سادہ دل بندوں کے جذبات کی ارزانی اور وہی ہم جیسے سوداگروں کے کاروبار کی سودمند عیاری و عیاشی۔

اس اشتعال انگیز احساس کو دبا کے میں نے کہا "کیا زندگی ہر حال میں اس قابل ہوتی ہے کہ اس کی خواہش کی جائے؟"

پیر عنایت نے میرے سوال کا مقصد سمجھے بغیر کہا "جینا کون نہیں چاہتا؟ کیا تمہیں زندگی عزیز نہیں ہے؟"

میں نے کہا "مگر بہت سے لوگ خود اپنے ہاتھوں اپنی زندگی کا خاتمہ کرلیتے ہیں۔"

"وہ بزدل ہوتے ہیں' خودکشی حرام ہے۔"

میں نے کہا "کچھ ایسے مجبور بھی ہوتے ہیں جو مرنا چاہتے ہیں مگر مر نہیں سکتے۔ وہ موت کو زندگی پر ترجیح دیتے ہیں لیکن پھر بھی انہیں موت نہیں ملتی۔ تم بہت خوش ہو کہ سزائے موت سے بچ گئے لیکن کیا تم کو اندازہ ہے کہ آگے کیسی زندگی ملے گی تمہیں؟ میں بتاتا ہوں تمہیں۔ تم زندہ تو رہو گے مگر تمہاری زندگی دوسروں کے لئے تماشائے عبرت ہوگی اور تمہارے لئے موت سے بدتر سزا۔ اس زندگی کا ہر دن تمہارے گنہگار ماضی کے ہر دن کا کفارہ ہوگا۔ تمہارا یہ پیری فقیری کا ڈراما اب یہاں نہیں چلے گا۔"

"تم مریدوں کے جذبات نہیں بدل سکتے۔"

میں نے کہا "بہت جلد تمہیں معلوم ہوجائے گا کہ تمہارے مرید اپنے جذبات میں کس حد تک مخلص تھے۔ مثلاً یہ چوکیدار۔"

چائے لے کر اندر آنے والے چوکیدار نے میز میرے سامنے رکھتے ہوئے سر اٹھا کے دیکھا "آپ نے مجھ سے کچھ کہا سرکار؟" اس نے چائے کی پیالی اور مٹھائی کی پلیٹ میز پر رکھ دی۔

میں نے کہا "چوکیدار' تمہارے خلاف بہت شکایات ملی ہیں کہ تم یہاں بدمعاشی کا اڈا چلا رہے ہو۔ یہاں بدکردار مرد اور عورتیں آتی ہیں۔ تم خود بھی ایک سپلائر ہو۔"

چوکیدار کی حالت پھر غیر ہوگئی۔ وہ سچا ہوتا تب بھی اس الزام کی تردید کرکے بچ نہیں سکتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ یہاں پولیس کسی سے بھی ہر جرم کا اعتراف حاصل کرلیتی ہے۔ وہ خود تو تھا ہی مجرم۔

میں نے کہا "تم تھانے گئے ہو کبھی؟"

چوکیدار نے ہاتھ جوڑ کے کانپتے ہوئے کہا "خدا نہ کرے سرکار۔"

"تمہیں معلوم تو ہوگا کہ وہاں کھال میں بھس کیسے بھرا جاتا ہے اور کھال کیسے کھینچی جاتی ہے!" میں نے اطمینان سے چائے پیتے ہوئے کہا "جب تم اپنے ہر جرم کا اعتراف کرلوگے تو تمہیں کم سے کم سات سال تک جیل میں قیدِ بامشقت کاٹنا ہوگی۔ اس نوکری کے ساتھ جتنی عیاشی کررہے ہو تم' یہ سب ختم ہوجائے گی' لیکن ایک صورت میں تم بچ سکتے ہو۔"

چوکیدار کا ارادہ اب میرے پاؤں پکڑ کے قسمیں کھانے اور واسطے دینے کا تھا مگر وہ جیسے ہی جھکا' میں نے کک مار کے اسے سیدھا کردیا۔ وہ بلبلایا اور دیوار سے جالگا۔ اس کی آواز پر غالب اور نازو بھی آگئے۔

"ایسے کام نہیں چلے گا" میں نے کہا "یا تو ابھی چلو ہمارے ساتھ یا..."

غالب اور نازو نے دوسرے کمرے میں وہ سب کچھ سنا تھا جو میں نے عنایت سے کہا تھا۔ بیچ میں ایک دروازہ ہی تھا جو پورا کھلا ہوا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ میری آواز ان تک پہنچ رہی ہے۔ پھر بھی ان کے لئے یہ اندازہ کرنا مشکل ہوگیا کہ میرے ذہن میں کیا ہے۔ چوکیدار اور پیر عنایت سانس روکے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

"یا... ایک قینچی لاؤ" میں نے چائے کی خالی پیالی رکھتے ہوئے کہا "اور اس پیر کے چہرے پر سے مکاری کا یہ سائن بورڈ ہٹادو۔ اس دھوکے باز کی داڑھی مونچھیں صاف کردو' شیو کرنے والا استرا ہے تو وہ بھی لے آؤ۔"

پیر عنایت چلّایا "نہیں' تم ایسا نہیں کرسکتے۔"

"میں کچھ نہیں کروں گا' جو کچھ کرے گا تمہارا مریدِ خاص کرے گا" میں نے کہا۔

"بدبخت' اللہ کا قہر نازل ہوگا تجھ پر" پیر عنایت نے چوکیدار سے مخاطب ہوکے کہا۔

لیکن دنیادار مرید نے خلافِ توقع بہت جلد فیصلہ کرلیا تھا۔ کسی تذبذب کے بغیر اس نے پیر عنایت سے کہا "مجھے معاف کردینا پیر صاحب' میں مجبور ہوں" اور فوراً آلاتِ صفائی لینے نکل گیا۔

غالب نے قہقہہ مارا "دیکھا پیر صاحب' ایسے دغا دیتے ہیں یہ مرید۔ یہ تو گردن بھی کاٹ دے تمہاری' داڑھی کیا چیز ہے۔ تمہاری پیری بھی فراڈ تھی اور اس کی عقیدت مندی بھی۔"

پیر عنایت کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے "میں واپس جا کے کسی کو کیا منہ دکھاؤں گا؟"

غالب نے کہا "تم واپس نہ جانا چاہو تو تمہاری مرضی۔ سال چھ مہینے کے لئے بمبئی چلے جاؤ اور فلمی دنیا میں عیش کرو۔ منہ پر کوئی اچھا سا ہیر ٹانک لگاتے رہو۔"

ہنستے ہنستے نازو نے کہا "جب داڑھی پھر کاروبار کے لئے کافی محسوس ہو تو واپس چلے جانا' مریدوں سے کہہ دینا کہ ہمالیہ پہاڑ پر چلہ کاٹنے گیا تھا۔"

غالب نے کہا "نقلی داڑھی سے بھی کام چلا سکتے ہو تم۔"

"مگر یہ مت بھولنا کہ ہم پھر آجائیں گے کسی بھی دن۔ پھر مونڈ جائیں گے تمہیں" میں نے کہا۔

چوکیدار فوراً ہی لوٹ آیا۔ غالباً اسی ریسٹ ہاؤس کے کسی گوشے میں اس کا گھر بھی تھا جہاں سے اس کو قینچی استرا لانے میں دیر نہیں لگی۔ پیر عنایت کی آنکھوں سے دیوانگی کے آثار عیاں تھے اور مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ اسے جسمانی طور پر قابو کئے بغیر یہ کام ممکن نہیں ہوگا۔ وہ چوکیدار کو خون آشام نظروں سے گھور رہا تھا مگر چوکیدار اس سے نظر ہی نہیں ملا رہا تھا۔ اس نے تمام سامان میز پر رکھ دیا اور میری طرف رحم طلب نظروں سے دیکھنے لگا۔ اس کی خاموش التجا کو سمجھنا مشکل نہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ عنایت کو پیر سے آدمی بنانے کا مشکل فریضہ کسی اور کو سونپ دیا جائے۔ وہ دبلا پتلا' سوکھا چرخ سا شخص تھا جس کا بٹے کٹے' حلوے مانڈے پر پلے ہوئے پیر سے مقابلہ ایسا ہی ہوتا جیسے شیر اور بکری کا مقابلہ۔ وہ پیر کی ریش مبارک کی جانب ہاتھ بھی بڑھاتا تو پیر اس کا حلیہ بگاڑ دیتا۔

اچانک میری نظر قینچی پر گئی۔ قینچی پرانی تھی۔ اگر اس پر کبھی پالش اور چمک دمک تھی تو برسوں کے استعمال کے بعد اس کے صرف آثار باقی رہ گئے تھے۔ کہیں کہیں اس پر زنگ کا رنگ بھی غالب آرہا تھا مگر جس چیز نے مجھے متوجہ کیا تھا وہ خون کا رنگ تھا۔ میں نے اسے اٹھا کے غور سے دیکھا۔ یہ کسی ڈاکٹر یا جراح کی قینچی نہیں ہوسکتی تھی۔ وہ تجربہ کار ہوں یا ناتجربہ کار اور گاؤں کے ہوں یا شہر کی فٹ پاتھ پر بیٹھنے والے' اب اتنا شعور ضرور رکھتے ہیں کہ آلات جراحی کو صاف کرلیں۔ دیہات کے مرہم پٹی کرنے والے بھی گندے اور زنگ آلود اوزاروں کے استعمال سے ہونے والے نقصانات کو سمجھتے ہیں۔

"یہ قینچی اور استرا تم کہاں سے لائے ہو؟" میں نے کہا۔

"اپنے... کوارٹر سے سرکار... میرے ذاتی استعمال کے ہیں۔" چوکیدار نے پریشان ہوکے کہا۔

"...اس قینچی پر یہ خون کے داغ کیسے ہیں؟"

چوکیدار کو میرے سوال سے پہلے ہی اپنی غلطی کا اندازہ ہوچکا تھا کہ وہ جلدی میں قینچی کو صاف کئے بغیر اٹھالایا ہے "وہ جی' دراصل... ایک پھوڑا کاٹ دیا تھا میں نے' بہت دن پہلے۔"

وہ بدحواس تھا اور جھوٹ بول رہا تھا' میں نے کہا "اس پھوڑے کا کوئی نشان تمہارے جسم پر ہے؟"

"ہے تو سہی..." اس نے گھبراہٹ میں اِدھر اُدھر دیکھا۔

"مگر تم سب کے سامنے دکھا نہیں سکتے! ہے نا یہی بات؟ خیر چلو میرے ساتھ دوسرے کمرے میں" میں نے کہا اور جب چوکیدار اپنی جگہ سے نہیں ہلا تو میں نے اس کے ایک جھانپڑ مارا۔ وہ دیوار پر گرا اور ہائے ہائے کرنے لگا۔ نازو نے اسے پھر میری جانب دھکیل دیا۔

"پہلی بات تو یہ کہ تمہارے جسم پر کسی پھوڑے کا نشان نہیں ہوسکتا' تم نے جھوٹ بولا تھا۔ تمہارا دوسرا جھوٹ یہ تھا کہ خون پرانا ہے" میں نے اس کے دوسرا جھانپڑ زیادہ قوت سے مارا۔ "یہ تازہ خون لگتا ہے مجھے۔"

اس کی صحت پہلے ہی قابلِ رشک نہ تھی۔ دوبار چکرا کے دیوار سے لگنے کے بعد وہ نیچے گر گیا اور بھوں بھوں کرکے رونے لگا۔ ...میں خون کی پہچان میں مہارت کا کوئی دعویٰ نہیں رکھتا تھا لیکن چوکیدار کے جھوٹ نے مجھے اندھیرے میں تیر چلانے کا موقع فراہم کیا تھا اور یہ تیر نشانے پر جا لگا تھا۔

"پولیس والوں کی آنکھوں میں دھول جھونکتے ہو سؤر کے بچے" میں نے اسے گردن سے دبوچ کے اوپر اٹھالیا اور پھر دیوار پر پھینک دیا "میں تو یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ خون مرد کا ہے یا عورت کا اور مقتول کی عمر کیا تھی۔ سچ بولو کس کو قتل کیا ہے تم نے؟"

"قتل!" چوکیدار کے حلق سے عجیب سی چیخ نکلی "خدا کی قسم سرکار' میں نے کسی کو نہیں مارا' میرے بیوی بچے مرجائیں اگر یہ جھوٹ ہو۔"

میں نے غالب سے کہا "ذرا اس کو دوسرے کمرے میں لے جاکے اس کے کپڑے اتار دو اور پنکھے سے الٹا لٹکا کے اسے سچ بولنا سکھاؤ۔ اس سے کہو کہ اپنے بیوی بچوں کو بھی بلالے۔ جب تک وہ پیش نہ ہوں..."

غالب نے کہا "میرا خیال ہے سر' اس کو جیپ میں ڈال کے تھانے لے چلتے ہیں۔ وہیں آج رات سب معلوم ہوجائے گا۔"

چوکیدار بلاشبہ اچھا ایکٹر تھا۔ وہ فرش پر لمبا پڑا ہوا پیچ و تاب کھا رہا تھا اور پھڑک رہا تھا جیسے اس پر نزع کا عالم طاری ہے مگر غالب کی بات سنتے ہی وہ بڑی پھرتی سے اٹھا اور اس سے پہلے کہ نازو سنبھلتی' وہ پھر اس کے پیروں سے چمٹ گیا "سرجی' مجھے معاف کردیں' میں نے جھوٹ بولا تھا۔ میرے کوئی بیوی بچے نہیں' میں آپ کو سب بتا دیتا ہوں۔ بس آپ مجھے تھانے مت لے جائیں۔ میں مرجاؤں گا سرجی۔ آپ کو اپنے ماں باپ کے سر کی قسم۔"

"یہ کیا مصیبت ہے!" نازو نے جھنجلا کے کہا "چھوڑو مجھے۔ چلو اٹھو' مگر اب جھوٹ مت بولنا۔"

ماں باپ کے سر کی قسم دے کر چوکیدار نے بڑی چالاکی کا ثبوت دیا تھا اور ایک بار پھر نازو کو بے بس کردیا تھا ورنہ دوسری بار پکڑنے پر شاید وہ اسے فٹ بال کی طرح اچھال دیتی۔ چوکیدار کی جذباتی اپیل اپنا اثر دکھا گئی۔

نازو سے تحفظ کی ضمانت حاصل ہوتے ہی وہ سیدھا کھڑا ہوگیا۔ اس کی ٹانگیں اب بھی کانپ رہی تھیں اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے جو بالکل حقیقی تھے اور خوف کا نتیجہ تھے۔

اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا "سرکار' وہ کوئی بہت خطرناک آدمی تھا۔ آج صبح صبح اچانک آگیا تھا' معلوم نہیں کہاں سے۔ وہ چھپتا ہوا یہاں پہنچا تھا اور دیوار پھاند کے اندر گھس آیا تھا۔ اس نے لات مار کے مجھے جگایا۔ میں برآمدے میں سو رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور بھی تھا۔ اس کا دوسرا بازو زخمی تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ پولیس اس کو ہر جگہ تلاش کرتی پھر رہی ہے اور اگر میں نے اس کے بارے میں کسی کو کچھ بتایا تو وہ کسی دن پھر رات کو آجائے گا اور مجھے سوتے میں گولی مار جائے گا۔ وہ ڈاکو تھا لیکن لگتا نہیں تھا..."

چوکیدار کے بیان نے ہم سب کو چونکنے پر مجبور کردیا تھا "یہ کیسے اندازہ کیا تم نے؟"

"اس نے کہا کہ زخم صاف کرکے پٹی باندھو" چوکیدار نے اپنا بیان جاری رکھا "میں اسے اندر اپنے کوارٹر میں لے گیا۔ میں نے اس کی آستین کو قینچی سے کاٹ کے الگ کیا۔ کپڑا خون کے ساتھ چپک گیا تھا۔"

"زخم کس چیز کا تھا' چاقو کا یا گولی کا؟" غالب نے کہا۔

"یہ تو میں نہیں بتا سکتا سرجی۔ زخم سے خون بہہ رہا تھا۔" چوکیدار نے کہا۔

"یہ تو دیکھا ہوگا تم نے کہ زخم معمولی ہے.... یا گہرا۔" نازو نے بے چین لہجے میں کہا۔

"زخم گہرا نہیں تھا سرجی' ہڈی بچ گئی تھی۔"

"زخم کس ہاتھ پر تھا اور کہاں؟" نازو نے کہا۔

"الٹے ہاتھ پر' کہنی سے ذرا اوپر" چوکیدار نے سوچ کے کہا۔ "میرے پاس کچھ نہیں تھا جی۔ میں نے اس کو بتا دیا تھا کہ مجھے مرہم پٹی کرنا بھی نہیں آتی لیکن ڈیٹول تھی میرے پاس۔ اس نے خود ہی اپنا زخم دھولیا۔ پھر اس نے کہا کہ اس پر کوئی بھی صاف کپڑا باندھ دو جس سے خون رک جائے۔ اس نے مجھ سے کپڑے بھی مانگے۔ میرے کپڑے اس کو نہیں آسکتے تھے۔ وہ آپ کے جیسا جوان تھا۔ لیکن... میرے پاس کچھ کپڑے پڑے ہوئے تھے... جو دوسرے لوگ بھول گئے تھے۔ کسی کی قمیص' کسی کا پاجامہ۔ ایک کوٹ سوٹ بھی تھا۔ وہ میں نے اس کو دے دیا۔ اس نے مجھ سے چائے بھی بنوا کے پی۔ درد کی گولیاں بھی تھیں میرے پاس۔ وہ میں نے خود اسے دے دیں۔ وہ بہت خوش ہوا' کہنے لگا چوکیدار' میرے کپڑوں کو جلا دینا یا کہیں گاڑ دینا' کہیں ایسا نہ ہو کہ میری وجہ سے تم پکڑے جاؤ' اس وقت میرے پاس تم کو انعام میں دینے کے لئے کچھ نہیں ہے۔ اور جو ہے وہ تمہارے لئے بے کار ہے۔ اس نے جیب میں سے کچھ نوٹ نکال کے مجھے دکھائے اور بولا' اگر کام کے ہیں تو رکھ لو' بمبئی جائے بدلوا لینا۔ میں نے لے لئے۔ چار نوٹ تھے۔"

میں نے کہا "وہ کیسے نوٹ تھے' کہاں ہیں وہ نوٹ؟"

اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا "پاکستانی نوٹ تھے سرکار۔ یہ دیکھ لیں آپ' سو سو کے نوٹ تھے۔ میں نے سوچا' بمبئی جا کے بدلوا لوں گا' پاکستان جانے والوں کو ضرورت رہتی ہے۔"

میں ان نوٹوں کو ہاتھ میں لئے بیٹھا رہا۔ پھر میں نے وہ کاغذ کے پرزے غالب اور نازو کی طرف بڑھا دئے جو صرف پاکستانی کرنسی نہیں تھے۔ وہ محسن کی خبر دینے والے معتبر حوالے تھے۔ ان کے لمس میں محسن کے قرب کی خوشبو محسوس ہوتی تھی۔ میں نے ایک دم چوکیدار کے دونوں شانے پکڑ لئے اور اسے زور زور سے ہلانے لگا "وہ کہاں گیا' کدھر گیا' اپنے بارے میں اس نے تمہیں اور کیا بتایا؟"

چوکیدار بدحواس ہوگیا "وہ... سرکار' سورج نکلتے ہی وہ چلا گیا تھا... مجھے نہیں معلوم وہ کدھر گیا۔ میرے پاس جو کچھ تھا میں نے دے دیا تھا بھیس بدلنے کے لئے۔ ایک کالا چشمہ تھا' ایک ٹوپی تھی اور چھڑی تھی۔ وہ میری چادر بھی لے گیا تھا اور بوڑھوں کی طرح جھک کر چھڑی کی مدد سے ایسے چل رہا تھا' جیسے وہ دیکھ نہیں سکتا۔ اور ہاں' جاتے جاتے اس نے مجھ سے ایک عجیب سوال کیا... اس نے کہا کہ چوکیدار' تم نے اس علاقے میں کسی اجنبی کو دیکھا ہے۔ میں نے کہا کہ اجنبی تو اس وقت بھی کمرے میں سوئے پڑے ہیں اور آتے جاتے رہتے ہیں۔ اس نے کہا کہ وہ ساتھی ہیں میرے۔ تین عورتیں ہیں' دو مرد ہیں۔"

"پھر... تم نے کیا کہا؟" نازو نے نروس ہوکے چلاتے ہوئے کہا۔

"میں... میں نے کہا کہ نہیں۔ اور کیا کہتا میں سرجی۔" چوکیدار بولا "معلوم نہیں کون تھا وہ؟"

"پھر... وہ چلا گیا۔ اس نے کوئی پیغام نہیں دیا؟ کسی کے لئے بھی" غالب نے مایوسی سے کہا۔

"نہیں سرکار' میں جھوٹ نہیں بولتا۔ اس نے کچھ کہا ہوتا تو میں آپ کو بتا دیتا۔ میرا خیال ہے آپ لوگ اسی کے پیچھے آئے تھے" چوکیدار نے کہا "اگر وہ آپ کو مل جائے.. تو اسے مت بتانا یہ سب' ورنہ وہ مجھے مار ڈالے گا۔"

خاموشی کا ایک مختصر وقفہ آیا جو بیک وقت امید کی روشنی دیتا تھا اور ناامیدی کا اندھیرا۔ امید کہتی تھی کہ وہ اسی علاقے میں ہے اور ہم سے زیادہ دور نہیں ہوسکتا۔ وہ بھی ہماری تلاش میں سرگرداں ہے اور یہ دُہری تلاش رائیگاں نہیں جاسکتی۔ وہ ہمیں ڈھونڈ لے گا یا ہم اسے پالیں گے۔ پھر ناامیدی اس خیال

حاوی آجاتی تھی۔ آخر یہ امید محض دل کے بہلانے کے لئے خوش خیالی کے سوا کیا ہے؟ ان سے ملنا محض حسنِ اتفاق کی بات ہے۔

سب سے پہلے غالب نے کہا "اب یہاں دیر کرنے سے نقصان ہوگا' وہ زیادہ دور چلا جائے گا۔"

میں نے کہا "جب تک وہ مل نہیں جاتا' دور اور نزدیک سب برابر ہے لیکن یہاں رکنے میں فائدے سے زیادہ نقصان کا احتمال ہے۔"

نازو نے کہا "دوپہر ہوچکی ہے' اب چلو۔"

میں نے پیر عنایت کی طرف دیکھا۔ اس کی سزا کا مسئلہ وقتی طور پر فراموش کردیا گیا تھا۔ اچانک مجھے ایک اور خیال آیا۔ میں نے رابعہ اور گل کے ساتھ غائب ہوجانے والے خانہ بدوش قبیلے کی تلاش کا کام پولیس پر چھوڑ دیا تھا۔ آصف جاہ نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ قبیلے کا سراغ لگالے گا لیکن آصف جاہ کے پاس پولیس کی نفری محدود تھی اور اس کی عملداری کا علاقہ بہت وسیع تھا۔ مجھے اس کی نیت پر شک نہیں تھا مگر عملاً یہ ناممکن تھا کہ وہ سب کام چھوڑ کے صرف ایک خانہ بدوش قبیلے کی تلاش شروع کردے۔ اس کے علاقے میں جرائم بھی ہوں گے اور اسے رسمی کارروائی بہرحال کرنا ہوگی۔ پھر آج کل تو اس علاقے میں پولیس ویسے ہی بہت سرگرم عمل ہے اور پولیس کے اعلیٰ افسران کی نگرانی میں دہشت گردی کے حالیہ واقعات کی تفتیش جاری ہے۔ آصف جاہ نے ہماری مدد کرکے بہت بڑا خطرہ مول لیا تھا اور اگر اس نے اپنے عموی فرائض اور خصوصی احکامات کو نظر انداز کرتے ہوئے ہماری خاطر اس خانہ بدوش قبیلے کی جستجو میں غیر ضروری دلچسپی کا مظاہرہ کیا تو وہ اپنی پوزیشن کو زیادہ مشکوک بنالے گا۔ پیر عنایت اس معاملے میں ہماری زیادہ مدد کرسکتا تھا کیونکہ اس کے وسائل کی پوزیشن بہت بہتر تھی۔ اس کا حلقۂ اثر آصف جاہ کے دائرۂ اختیار سے کہیں زیادہ وسیع تھا۔ آصف جاہ صرف اپنے ماتحتوں سے کام لے سکتا تھا۔ سرکاری احکامات کو ٹالنے کے ماہر' حرام خوری میں طاق اور کام چور پولیس کے اہلکار اس وقت تک کوئی کام نہیں کرتے جب تک خود انہیں اس کام سے فائدہ حاصل نہ ہو۔ لیکن پیر عنایت کے مرید' سرکاری اہلکار نہیں تھے۔ وہ عقیدت مند اور اعتقاد رکھنے والے لوگ تھے جو اپنے پیر صاحب کے حکم پر نکل کھڑے ہوتے تو اس علاقے کے چپے چپے کو کھنگال سکتے تھے۔ پھر یہ ناممکن تھا کہ وہ قبیلہ روپوش رہ سکے۔ چوکیدار کو مثال بنا کے یہ فرض کرنا غلط تھا کہ سب مرید ایسے ہی منافق ہوں گے۔ زیادہ ایسے ہوں گے جو فرطِ جذبات میں اپنے پیر کے لئے تن من دھن سب کچھ قربان کرنے پر تیار ہوجائیں گے۔

غالب نے مجھے تذبذب میں دیکھ کے کہا "اب کچھ اور سوچا ہے پیر جی کے معاملے میں؟"

نازو نے کہا "یہی بہتر ہے کہ انہیں انسان کا روپ دے کر

چلتا کرو... نیک کام میں دیر کیسی؟"

میں نے نفی میں سرہلاتے ہوئے پیر عنایت سے کہا "عنایت! فرض کرو تمہیں معاف کردیا جائے۔ تمہارا جرم غداری تھا جو بہت سنگین جرم ہے' تم نے ہم سے دغا کی تھی۔"

غالب نے مجھے حیرانی سے دیکھا "اور وہ سب جرائم جو اس کی فردِ جرم میں پہلے سے موجود تھے۔ جن کا خود تم نے حوالہ دیا تھا؟"

میں نے کہا "اگر میں چشم پوشی سے کام لوں۔ جو کچھ تم نے خلقِ خدا کے ساتھ کیا' اس کی سزا وجزا کو خدا پر چھوڑ دوں تو کیا تم اسے احسان مانوگے؟"

غالب نے برہمی سے کہا "کیا ضرورت ہے ایک ایسے شخص پر احسان کرنے کی جو نہ احسان کو مانتا ہو اور نہ تعلق کو' جس کی فطرت میں فریب ہو اور خمیر میں خباثت۔"

میں نے کہا "یار' میں نے سوچا ہے کہ ہم ان معاملات میں کیوں ملوث ہوں۔ اس جیسے تو ہزاروں نہیں لاکھوں ہیں۔ اخلاقی اور قانونی جرائم میں ملوث افراد کی تعداد شاید کروڑوں تک پہنچ جائے۔ ہم ان سب کے خلاف جنگ کرنے تو نہیں نکلے ہیں۔ عوام کے اعتماد کو دھوکا دے کر انہیں لوٹنے والے چوروں میں تو بدعنوان سیاستداں' تاجر' جرائم پیشہ افراد کے مددگار صحافی' ڈاکٹر' وکیل' جعلی ڈگریاں چھاپنے سے جعلی دوائیں بنانے والے تک سب ہی شامل ہیں۔ ہم کس کس کو سزا دیں گے اور کیا یہ ہمارا کام ہے؟ کیا ہم یہ کام کرسکتے ہیں؟"

غالب اور نازو نے میرے خیالات میں اس تبدیلی پر ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر سرہلایا۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ یہ تبدیلی بے سبب نہیں ہوسکتی اور اب یہ جاننا چاہتے تھے کہ میں کیا کرنا چاہتا ہوں۔

غالب نے میری پالیسی میں تبدیلی کی تائید میں بیان جاری کرنا ضروری سمجھا "خیال تو یہ بھی ٹھیک ہے آپ کا۔ ویسے بھی عفوودرگزر سے کام لینے کا حکم ہے... بڑائی بھی اسی میں ہے۔"

میں نے اس کے لہجے کے طنز کو نظرانداز کردیا "پیر عنایت اپنے گناہ وثواب اور نیکی بدی کا خود ذمے دار ہے۔ حالانکہ ہم جانتے ہیں' عنایت کو چھوڑنا کسی مجرم کو سزا دیئے بغیر چھوڑنے کے مترادف ہے۔ اس سے جرم کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ یہ واپس جاکے پھر پیری مریدی سے لوگوں کو بے وقوف بنانے اور لوٹنے کا دھندا شروع کردے گا مگر ہمیں کیا؟ اسے اپنی قبر میں جانا ہے' ہمیں اپنی قبر میں۔"

پیر عنایت کو اب یقین آنے لگا تھا کہ میری سوچ میں یہ تبدیلی کوئی ڈراما نہیں ہے بلکہ ایک معجزہ ہے جس نے عین وقت پر اس کی زندگی ہی نہیں عزت آبرو اور مستقبل کو بھی تحفظ فراہم کردیا ہے۔

نازو نے جزبز ہوکے کہا "مگر اس نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی ہمیں مروانے میں۔"

میں نے کہا "بس یہی ایک جرم ہے اس کا۔ لیکن میں پیر [illegible] سے ایک سودا کرنا چاہتا ہوں۔ اگر ہم اسے معاف کردیں [illegible] اس احسان کا بدلہ یہ کیسے چکائے گا؟"

پیر عنایت کی قوتِ گویائی پورے اعتماد کے ساتھ لوٹ آئی۔ [illegible] موقع دو اور مجھے آزما کے دیکھ لو' تم جیسے چاہو میں یقین [illegible] ہوں۔ میں اپنی غلطی کو' اپنے جرم کو' اپنے گناہ کو تسلیم [illegible] ہوں اور تم سے معافی مانگتا ہوں۔ مجھے بتاؤ اس کا کفارہ میں [illegible] ادا کروں۔ تمہارا احسان میں کبھی نہیں بھولوں گا اور اس [illegible] بدلے میں سب کچھ کروں گا۔"

میں نے کہا "خدا کو حاضر وناظر جان کے کہہ رہے ہو؟"

نازو نے بگڑ کے کہا "کس شخص کی قسم پر اعتبار کرنے چلے [illegible]"

میں نے کہا "یہ کیسا بھی گنہگار ہو' کافر بہرحال نہیں ہے۔ یہ [illegible] اٹھاکے وعدہ کرے گا۔"

پیر عنایت کا رنگ ذرا سی دیر کے لئے بدلا "کس بات کا؟"

میں نے چوکیدار سے کہا "مسلمان تم بھی ہو' تمہارے گھر [illegible] قرآن مجید ضرور ہوگا' جاکے لے آؤ۔"

غالب نے کہا "یہ ٹھیک ہے' عنایت قرآن کو ہاتھ میں لے [illegible] حلف اٹھائے گا۔ اگر جھوٹا حلف اٹھائے گا تو خدا کے قہر سے [illegible] نہیں سکے گا۔ اس کے انجام سے دنیا عبرت پکڑے گی۔"

پیر عنایت نے حواس باختہ ہوکے کہا "آخر تم کیا چاہتے ہو؟ [illegible] مجھے بتاؤ تو سہی۔"

میں نے کہا "بہت معمولی سا کام ہے جو تم کرسکتے ہو' کوئی [illegible] ممکن بات نہیں ہے۔"

نازو کو میرے موقف سے شدید اختلاف تھا لیکن وہ اس کا [illegible] علانیہ اظہار نہیں کرسکتی تھی۔ اس نے ایک اور نکتہ اٹھایا "پیر [illegible] عنایت نے ناجی کو قتل کرانے کی کوشش کی تھی۔ یہ ناجی کا بھی [illegible] مجرم ہے۔ اس سے بھی پوچھ لو کہ وہ اسے معاف کرنے پر تیار ہے [illegible] یا نہیں۔"

میں نے کہا "یہ معاملہ واقعی قابلِ غور ہے۔ جتنی دیر میں [illegible] چوکیدار آتا ہے میں ناجی سے بات کرتا ہوں۔"

ناجی چائے پینے اور مٹھائی کی پلیٹ صاف کردینے کے بعد [illegible] برآمدے میں پاؤں پسارے بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ اٹھ کھڑا [illegible] ہوا۔

میں نے کہا "ناجی' تمہاری پیر عنایت کے ساتھ دشمنی کا [illegible] سبب کیا ہے؟"

[illegible] اس نے مجھے ٹالنے کی کوشش کی "کوئی خاص سبب تو نہیں [illegible] وہ ایسا ہی آدمی ہے۔"

میں نے کہا "اس نے پولیس سے کہا تھا کہ پہلے تمہارا کام [illegible] تمام کردے۔ تم سے کچھ پوچھے بغیر۔ اور میں نے تمہیں بچا نہ لیا [illegible] ہوتا تو اس وقت تم یہاں نہ بیٹھے ہوتے۔ تمہاری لاش پڑی ہوتی

جنگل میں۔"

ناجی کا چہرہ سرخ پڑگیا۔ اس نے بڑی مشکل سے کہا "پیر عنایت کی ایک لڑکی ہے۔"

میں پہلے حیران ہوا۔ پھر میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ "...تو یہ چکر ہے! صورت سے تو بہت سیدھے سادے لگتے ہو تم۔ پیروں کی لڑکیاں..."

"وہ جی... ایسی کوئی بات نہیں" اس نے جلدی سے کہا۔

"پھر کیا بات ہے؟" میں نے کہا "تم خود بتادو۔"

"وہ جناب' وہ... محبت کرتی ہے مجھ سے۔"

"اچھا! اور تم کیا کرتے ہو؟ تم محبت نہیں کرتے؟" میں نے ہنس کے کہا۔

وہ شرمندہ ہوکے ہنسنے لگا "میں تو شادی کرنا چاہتا تھا اس سے... میں نے پیر عنایت سے کہہ دیا کہ ساری عمر غلامی کروں گا۔ ایسی کون سی غلط بات کی تھی جناب میں نے؟ کیا خرابی ہے آخر مجھ میں؟ ہر کام کرسکتا ہوں میں۔ ان پڑھ بھی نہیں ہوں اتنا۔ بس ایک گھر نہیں ہے۔ گھر والے اگر نہیں رہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ یہ تو اللہ کی مرضی کی بات ہے۔ گھر بنانے کے لئے ہی تو شادی کرنا چاہتا تھا میں۔ رہنے کو جگہ بنالیتا' کما کر اسے کھلا بھی سکتا تھا اور بڑے آرام سے رکھنے کا وعدہ بھی کیا تھا میں نے لیکن اس نے مجھے بہت پٹوایا۔ اس کے حکم پر ٹھے باندھ کے مارا گیا۔ وہ تو بس اللہ نے بچالیا' عین وقت پر آصف جاہ صاحب آگئے۔ وہ میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ انہوں نے ہی میرا علاج کرایا۔ اور یہ سچ ہے کہ وہ نہ ہوتے تو پیر عنایت مجھے زندہ نہ چھوڑتا۔ بعد میں مروادیتا لیکن میری وجہ سے وہ بہت پریشان تھا۔ اس نے پوری کوشش کی تھی کہ بیٹی کی شادی کردے۔ بات بھی کی تھی کسی سے مگر ایک تو بیٹی نے صاف کہہ دیا کہ وہ سب کے سامنے ذلیل کرادے گی۔ صاف انکار کردے گی نکاح کے وقت۔ پھر اس کی ماں اڑگئی۔ عنایت نے بیٹی کا رشتہ جس سے طے کیا تھا وہ بھی ایک جعلی پیر ہے۔ اس کی عمر خود پیر عنایت سے کسی طرح کم نہیں۔ ماں نے کہا کہ باپ کے گھر میں تو مجبوری تھی' وہ جاتی تو کہاں جاتی۔ لیکن شوہر کے ساتھ تمام عمر وہ دھوکے فریب کی کمائی کھائے اور پھر اولاد کو کھلائے... یہ نہیں ہوگا۔"

"یہ سب تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"خود اس نے بتایا تھا مجھے۔"

"تم ملتے رہتے تھے اس سے' اتنی مار کھانے کے باوجود!" میں نے کہا۔

"وہ جی' پیر عنایت کا بس چلتا تو وہ خود مجھے گولی ماردیتا' لیکن ایک تو بات کچھ پھیل گئی تھی اور اس کی بدنامی ہورہی تھی۔ پھر خود زینب میرے حق میں تھی۔"

"اب میں سمجھ گیا۔ اسی لئے وہ چاہتا تھا کہ تمہارا قصہ ہی پاک ہوجائے۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری" میں نے کہا "خیر'

اب خدا نے چاہا تو تمہارا یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔"
"وہ کیسے جی؟" ناجی نے بے یقینی کے ساتھ کہا۔
"میرا خیال ہے کہ پیر عنایت تمہارا رشتہ منظور کرلے گا۔" میں نے کہا۔
"یہ ناممکن ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا جی" وہ بے حد ملول اور دل گرفتہ ہو گیا۔
"محبت کرنے والے تو کبھی مایوس نہیں ہوتے" میں نے کہا اور سوچا کہ اسے ایک شعر سناؤں جو بہت حسب حال تھا کہ۔

جو تجھ سے عہدِ وفا استوار رکھتے ہیں
علاج گردشِ لیل و نہار رکھتے ہیں

مگر ناجی کے لئے شعر کو سمجھنا مشکل ہوتا چنانچہ میں نے اس کا مفہوم واضح کر دیا۔
میں نے کہا "اس راستے پر چلنے والے کبھی راستے کی مشکلات سے نہیں گھبراتے۔ حالات کا مقابلہ کرنا چاہئے' جب تک دم میں دم ہے۔ اگر تم اتنی جلدی ہمت ہار بیٹھے ہو تو پھر میرا خیال ہے کہ یہ محبت نہیں تھی۔ بس تم کو وہ لڑکی اچھی لگی تھی۔ پھر کوئی اور اچھی لگے گی۔ اس عمر میں تو ہر لڑکی ہی اچھی لگتی ہے جو مسکرا کے دیکھ لے۔"
اس کا چہرہ ایسا ہو گیا جیسے کسی بدمعاش سے تھپڑ کھانے والے عزت دار مگر کمزور آدمی کا چہرہ "ایسا مت کہیں جی' اس کی خاطر میں جان بھی دے سکتا ہوں' صرف اس کی خاطر۔"
میں نے کہا "جان لینے کا حوصلہ نہیں رکھتے؟"
"کیا مطلب جی! ابھی پیر عنایت کو مار دوں؟"
میں نے ہنس کے کہا "میں نے ایسا کوئی مشورہ نہیں دیا۔ میں کیسے کہہ سکتا ہوں کہ فلاں کو قتل کر دو۔ اصل بات تو حوصلے کی ہے۔ محبت ہو تو ایسی ہو کہ راستے میں کوئی بھی دیوار آئے اسے گرا دے۔ میں ظالم سماج کی دیوار کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ کوئی بھی مشکل ہو۔ تم اگر سچی لگن رکھتے ہو تو تمہیں یہی سوچنا چاہئے کہ اس پر قابو پانے کے لئے مقابلہ کرو گے' آخری وقت تک۔ جب یہ طے کر لو کہ اسے حاصل کرنا ہے تو پھر سب کی ایسی تیسی۔"
وہ ہکا بکا میری صورت دیکھتا رہا "میری جگہ آپ ہوتے تو جی' تو آپ کیا کرتے؟"
"میں کبھی میدان چھوڑ کے نہ بھاگتا' پیر عنایت کا باپ بھی مانتا میری بات۔"
"اس کے لئے آپ کیا کرتے؟"
"میں بہت کچھ کر سکتا تھا۔ میں بھوت بن کے چمٹ جاتا پیر عنایت کو' اس پر سفلی عمل کرا دیتا۔ اس سے بھی بڑے پیر کے پاس جاتا اور تعویذ لے آتا" میں نے کہا "وہ گانا سنا ہے تم نے۔ جب پیار کیا تو ڈرنا کیا۔ میں تو اپنی اور اس کی جان ایک کر دیتا۔"
ناجی نے پھیکی ہنسی کے ساتھ کہا "آپ ناراض تو نہیں ہوں گے' میں ایک بات پوچھوں؟ آپ نے محبت کی ہے کبھی؟"

میں اس بے وقوف نظر آنے والے دیہاتی لڑکے کی معاملہ فہمی پر حیران رہ گیا "ہاں۔ محبت سب ہی کو ہو جاتی ہے' کسی نہ کسی سے۔ جو کم ہمت ہوں وہ بازی ہار جاتے ہیں۔"
"آپ نے بازی جیت لی ہے جی' اسی طرح" ناجی کے لہجے میں رشک اتر آیا۔
"اسی طرح کیا مطلب؟ میری راہ میں کوئی حائل نہیں ہوا۔"
"ورنہ آپ کیا کرتے؟ سب کی ایسی تیسی کر دیتے" اس نے میرے ہی الفاظ میں اپنا مفہوم واضح کیا۔
"بالکل۔ اگر میرا کوئی رقیب ہوتا۔ رقیب سمجھتے ہو نا؟ جیسے تمہارے سامنے دوسرا پیر آگیا تھا جس سے اس کے رشتے کی بات چلی تھی۔ میں اس کی بھی ایسی تیسی کر دیتا۔"
"اور اگر وہ لڑکی ہی آپ کا ساتھ نہ دیتی... پھر؟"
میں نے سوچ کے کہا "یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ لیکن ایسا ہوتا تو... میرا خیال ہے کہ میں اسے بھی نہ بخشتا۔"
"اس کی بھی ایسی تیسی کر دیتے؟" ناجی دم بخود رہ گیا۔
"اور کیا۔ بھئی محبت ہو تو ایسی ہو کہ تم نہیں تو ہم نہیں اور ہم نہیں تو تم نہیں۔ اور ہم دونوں نہیں تو پھر کچھ نہیں۔ کیا یہ دنیا کیا وہ دنیا۔ کیا جنت' کیا جہنم" میں نے برہمی سے کہا۔
اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں جذباتی ہو رہا ہوں۔ مجھے اپنے فلسفۂ محبت کے حق میں اتنی شدت کے ساتھ دلائل دینے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ رابعہ کے معاملے میں میرے حقیقی جذبات یہی تھے مگر ناجی کے سامنے میرا ردِ عمل قطعی نامناسب تھا... شاید میں جذباتی انتشار کے باعث حد سے زیادہ حساس ہو گیا تھا... کیا یہ رابعہ سے دوری کا نتیجہ تھا یا اُس قربت کا جو دوری سے زیادہ صبر آزما تھی۔ جب نظر کے سامنے کوئی نہ ہو تو خیال کو تصور سے بہلانا زیادہ آسان ہوتا ہے۔ مگر کوئی اتنے قریب رہ کے بھی اتنی دور ہو اور دوری ہی سب سے بڑی مجبوری بن جائے تو اعصاب ہی ساری اذیت جھیلتے ہیں۔
غالب نے اندر سے جھانک کے اور چلّا کے کہا "یہ خاموش مذاکرات کب تک چلتے رہیں گے؟"
میں نے چونک کر کہا "ناجی' تم فکر مت کرو' سب ٹھیک ہو جائے گا۔"
میں اندر گیا تو نازو کی نظر کا سامنا نہ کر سکا جو احتجاجی انداز میں گھڑی دیکھ رہی تھی اور وقت کے بے سبب زیاں پر خفا تھی' تاہم میرے نزدیک یہ سب کچھ ضروری تھا۔
میں نے چوکیدار کے ہاتھ سے قرآن پاک لے کر چوما اور پیر عنایت کو تھما دیا "تمہاری باعزت واپسی کے لئے میری شرائط بہت معمولی ہیں مگر تم کو حلف اٹھا کے بہ آوازِ بلند وعدہ کرنا ہوگا۔"
"کیا وعدہ کرنا ہوگا؟" پیر عنایت نے ہونٹوں پر زبان پھیر کے کہا۔
"ایک تو تم اپنے مریدوں کی مدد سے اس قبیلے کا پتا چلاؤ گے جو رابعہ اور گل کے ساتھ غائب ہو گیا ہے۔ تمہارے سیکڑوں مرید ہوں گے۔ ان کے لئے یہ کوئی مشکل کام نہیں" میں نے کہا۔
"مگر میں رابعہ اور گل کو نہیں جانتا" پیر عنایت نے کہا۔
"یہ سب تفصیلات تم آصف جاہ سے حاصل کر سکتے ہو" میں نے بگڑ کے کہا "بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ تم نے تعاون نہ کیا تو پھر تمہارے ساتھ وہی سلوک ہوگا جس کے تم مستحق ہو۔"
پیر عنایت نے آہستہ سے کہا "میں کب انکار کر رہا ہوں مگر کچھ پتا تو چلے۔"
"جب اس قبیلے کا سراغ مل جائے تو خاموشی سے رابعہ اور گل کو اس ڈاک بنگلے میں پہنچا دو۔ اڑتالیس گھنٹے کے اندر اندر یہ کام آسانی سے ہو سکتا ہے۔ ان کی حفاظت اور سلامتی کی ذمے داری تم پر ہوگی۔ پھر ہم انہیں لے جائیں گے یا تمہیں دوسرا پیغام مل جائے گا۔ ہم کوئی بندوبست کر لیں گے' تمہاری ذمے داری ختم ہو جائے گی۔ کیا تم یہ کام کر سکتے ہو؟"
پیر عنایت نے اقرار میں سر ہلایا۔
میں نے کہا "ایسے نہیں' زبان سے اقرار کرو' جو میں کہتا ہوں وہ بولو۔"
پیر عنایت بری طرح پھنس گیا تھا۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ جھوٹا حلف اٹھائے یا حلف کے الفاظ میں ہیرا پھیری کرتے ہوئے حیلہ سازی کرے۔ میں نے قرآن پاک کو گواہ بناتے ہوئے اس سے جو حلف لیا وہ رابعہ اور گل کی بازیابی اور بہ حفاظت واپسی کو یقینی بنانے کے لئے کافی تھا۔ پیر عنایت کا چہرہ بتاتا تھا کہ اس نے اپنی عزت اور آزادی کی جو قیمت ادا کی ہے... مجبوراً کی ہے مگر اس میں اتنی ہمت نہیں کہ بندوں کی حد سے بڑھ کر نعوذ باللہ خدا کو بھی دھوکا دے سکے۔
غالب اور نازو بہت مطمئن نظر آرہے تھے۔ پہلے انہیں اندازہ نہیں تھا کہ میں کیا کرنے والا ہوں۔ اب وہ کچھ محجوب بھی تھے۔ ان حالات میں یہی بہترین حکمتِ عملی تھی کہ دشمن سے سودا کر لو۔ اسے رعایت دو تو اس سے کچھ فائدہ بھی حاصل کر لو۔ پیر عنایت کو حلف کی زنجیروں میں باندھنے سے ایک بہت بڑا مسئلہ حل ہو جانے کی امید پیدا ہو گئی تھی اور اس ذہنی پریشانی سے وقتی طور پر نجات کے امکانات روشن ہو گئے تھے جو ہم سب کو رابعہ اور گل کی طرف سے لاحق تھی۔
پیر عنایت نے قرآن پاک واپس چوکیدار کے حوالے کر دیا۔ "کیا اب تم مطمئن ہو۔"
میں نے کہا "ایک وعدہ اور کرنا ہے تمہیں۔"
"تم میری مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہو" پیر عنایت نے کہا۔
میں نے مشتعل ہو کے کہا "ہاں۔ وقت وقت کی بات ہے۔ پہلے ہم مجبور تھے تو تم نے اپنی پوزیشن سے پورا فائدہ اٹھایا تھا۔ تم نے ہم سب کو موت کے منہ میں دھکیل دیا تھا۔ کسی لحاظ کے بغیر تم نے ہمیں خون کے پیاسے دشمنوں کے حوالے کرنے کی پوری کوشش کی تھی۔ تم نے ناجی کے قتل کی سازش کی تھی اسی بہانے۔ جو کچھ میں کر رہا ہوں وہ کسی طرح بھی جرم یا گناہ نہیں ہے۔ اس میں ہمارا فائدہ ضرور ہے لیکن تمہارا کوئی مالی یا جانی نقصان نہیں ہے۔ جو کچھ تم کرو گے اس میں کوئی پہلو غیر اخلاقی یا غیر قانونی ہے تو مجھے بتاؤ' الٹا مجھے احساس ہو رہا ہے کہ مجھے تم کو ایسے چھوڑنا نہیں چاہئے' مجبور تو میں ہوں۔"
پیر عنایت نے کہا "اچھا بتاؤ اور کیا کرنا ہوگا مجھے۔"
میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا "تم اپنی بیٹی کے لئے ناجی کا رشتہ منظور کرو گے۔"
پیر عنایت بھڑک اٹھا "ہرگز نہیں' یہ میں کبھی نہیں ہونے دوں گا۔"
میں نے سخت لہجے میں کہا "یعنی تمہیں اپنی سزا منظور ہے' ذلت و رسوائی منظور ہے۔"
"تم اپنی بات کرو' اس کی وکالت مت کرو۔ اس نے میری عزت سے کھیلنے کی کوشش کی تھی۔ میں اس کو معاف نہیں کر سکتا" پیر عنایت چلّانے لگا۔
"وہ باعزت طور پر تمہاری بیٹی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ یہی درخواست کی تھی اس نے جس کے جواب میں تم نے اس کی جان لینے کی کوشش کی تھی۔ مجھے سب معلوم ہے عنایت" میں نے اس کے منہ پر ایک مکا رسید کیا۔
وہ اس مرحلے میں ایسے سلوک کے لئے تیار نہیں تھا۔ اس کا غصہ ایک دم جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ شدید احساسِ ذلت سے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ آج تک ہاتھ اسے سلام کرنے کے لئے اٹھتے رہے تھے اور سوالی بن کے اس کی بارگاہ میں پھیلتے رہے تھے۔ میرا پہلا ہاتھ تھا جو اس پر وار کرنے کے لئے اٹھا تھا... اس احساس کی ذہنی اذیت ہی پیر عنایت کے لئے کم نہ تھی۔
"دیکھو' اس کا میرا کوئی جوڑ نہیں..." پیر عنایت نے بڑی مشکل سے کہا۔
"تم ٹھیک کہتے ہو۔ وہ ایک شریف لڑکا ہے جو تم جیسے رذیل کی بیٹی کو قبول کر رہا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ باپ برا ہے مگر بیٹی بری نہیں ہے۔ یہ اُس کی فراخ دلی ہے کہ وہ تمہاری دھوکے فریب کی زندگی کے ہر پہلو کو سمجھتا ہے مگر اس کے باوجود تمہیں ذلت نہیں عزت دے رہا ہے۔ یہ ایک نیکی ہوگی اگر وہ تمہاری بیٹی کو اپنے گھر لے جائے گا اور اسے عزت کے ساتھ رزقِ حلال کی اور بابرکت زندگی دے گا جس سے وہ محروم ہے۔ تم کو یہ رشتہ منظور کرتے ہوئے خدا کا شکر گزار بھی ہونا چاہئے پیر عنایت۔"
پیر عنایت کے ذہن کو میری منطق نہیں بدل سکتی تھی' وہ خاموش کھڑا رہا۔
میں نے کہا "اگر اب بھی تمہیں انکار ہے تو سمجھو تم

حلف کے پابند نہیں رہے۔ جو تمہارا دل چاہے کرو، ہم بھی وہی کریں گے جو ہمیں کرنا چاہئے۔ میں تمہارا چہرہ اور سر مونڈ کے کالا کروں گا..."

عنایت نے پیچھے ہٹتے ہوئے چیخ کر کہا "خبردار! جو کوئی میرے قریب آیا۔"

پیر عنایت نے مقابلہ کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ جسمانی طور پر وہ مزاحمت کرسکتا ہے اور ہم یہ کام زبردستی نہیں کرسکتے لیکن دو منٹ بعد ہی اس کی ساری اکڑفوں نکل گئی۔ میں نے اسے نیچے گرا کے اس کے دونوں بازو لاک کردئے اور اپنے ایک گھٹنے سے دبالیا۔ دوسرے ہاتھ سے میں نے اس کی گردن دبا کے چہرہ فرش سے لگادیا۔ وہ ٹانگیں چلاتا رہا اور چلا چلا کے مجھے فحش گالیاں دیتا رہا لیکن میری گرفت سے رہائی نہ حاصل کرسکا۔ اگر وہ زور لگاتا تو اس کا بازو شانے پر سے اتر جاتا یا کہنی کے پاس سے ٹوٹ جاتا۔ ریڑھ کی ہڈی پر دباؤ کے باعث وہ شدید اذیت میں تھا۔

"مریدِ خاص، اپنا کام کرو" میں نے چوکیدار سے کہا۔ "پیر صاحب کو انسان بنادو۔"

چوکیدار پر لرزہ طاری تھا۔ وہ اپنی عقل کے مطابق واقعات سے اصل حالات کو سمجھنے کی کوشش کررہا تھا اور خاصا کنفیوز نظر آتا تھا۔ یہ بات اس سے پوشیدہ نہیں رہی تھی کہ ہم پولیس کی وردی میں ضرور ہیں لیکن پولیس والے شاید نہیں ہیں۔ نازو کی زنانہ آواز پر بھی وہ حیران نظر آتا تھا۔ اس کی صورت کے نقوش کی نزاکت اور رعنائی تو پہلی ہی نظر میں دیکھنے والے کو حیران کرتی تھی۔ پولیس والے عموماً اپنے کردار کی بدی کی مناسبت سے بدصورت اور بدہیئت ہو ہی جاتے ہیں۔ مُردوں میں بھی اس قسم کا زنانہ حسن کہاں ہوتا ہے۔ چوکیدار ہمارے اور پیر عنایت کے درمیان اختلاف وعداوت کے اسباب بھی سمجھنے سے قاصر ہوگا اور ممکن ہے بہت سے ناموں کے ساتھ ہمارے رشتے کو سمجھنے کوشش بھی کررہا ہو۔ مجموعی صورتِ حال سے وہ سخت دہشت زدہ تھا۔ جب پیر کو اپنی ساری روحانی قوت اور کرشماتی طاقت کے باوجود ایسی عبرت ناک اور رسوا کن شکست کا سامنا ہو تو مرید کا اپنے انجام سے لرزہ براندام ہونا لازمی تھا۔

میرے حکم پر وہ بری طرح چونکا۔ عدم تعمیل کی ہمت اس میں نہیں تھی مگر ذرا سی دیر کے لئے ایک گناہ کے یا جرم کے احساس نے اسے تذبذب میں مبتلا کردیا۔ اس موقع پر نازو نے ایک بہت فیصلہ کن حربہ آزمایا۔ اس نے بڑی صفائی سے چوکیدار کو اٹھایا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ پاتا، اسے گھما کے میری طرف پھینک دیا۔ چوکیدار کے حلق سے "ہو، ہو" کے سوا کوئی آواز نہ نکلی اور وہ دھم سے میرے قریب آگرا۔ اس نے چیخ ماری "ہائے میں مرگیا" اور ساکت ہوگیا۔

نازو نے اب ریوالور نکال لیا "ابھی مروگے تم، اگر میرے تین تک گنتے سے پہلے نہ اٹھے۔"

اس کے بعد ناممکن تھا کہ چوکیدار لیٹا رہتا۔ پیر اور مرید دونوں پر یہ حقیقت واضح ہوگئی تھی کہ ہم عام لوگ نہیں ہیں۔ جسمانی طور پر ہمارا مقابلہ ناممکن ہے۔ اب معاملہ ختم کرنے کے لئے گولی کی زبان استعمال کرنے کی نوبت آگئی ہے تو ظاہر ہے کہ ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہوچکا ہے اور دیر کی صورت میں ان کا جان سے جانا لازمی ہے۔ اپنی جان بچانے کے لئے مرید تنہا سزا اٹھانے کے لئے لپکا تو پیر کی نظروں میں بھی دنیا تیرہ و تار ہوگئی۔

"مجھے منظور ہے۔ سؤر کے بچو، حرام زادو" اس نے دھاڑیں مار مار کے روتے ہوئے اور گالیاں دیتے ہوئے اعلان کیا۔ تمہارا سب کا بیڑا غرق ہو، شیطان کے چیلو... مجھے چھوڑدو اب تو۔"

میں نے اسے آزاد کردیا۔ اس کی حالت پر نازو کو ہنسی آرہی تھی اور اس کی گالیوں پر غالب مشتعل ہورہا تھا مگر میں نے ان دونوں کو روکا اور باقی کارروائی پوری کی۔ پیر عنایت کو حرف بہ حرف وہی دہرانا پڑا جو میں نے کہا اور یوں ناجی کا رشتہ پیر عنایت کی بیٹی سے طے ہوگیا۔ ناجی بہت پہلے اندر آگیا تھا اور بہت سہما سہما ایک طرف کھڑا ہوا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ پیر عنایت حلف سے رُوگردانی کر ہی نہیں سکتا اور ناجی کے لئے خطرے کی کوئی بات نہیں رہی۔ وہ اب پیر عنایت کا داماد تھا اور اس کی حفاظت کی ساری ذمے داری خود سسر محترم نے قبول کرلی تھی۔ اس کے باوجود ناجی بے اطمینانی کا شکار رہا۔

جب میں نے اسے مبارک باد دی تو اس پر کوئی اثر نہیں ہوا ...نازو اور غالب کے چھیڑنے پر وہ رونے لگا۔

میں نے کہا "اب کیوں روتا ہے یار؟ تیرے سب معاملات ٹھیک ہوگئے۔ تم جاؤ اس کے ساتھ۔"

اس نے نفی میں سرہلایا "یہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا آپ نہیں جانتے اسے۔"

نازو نے کہا "بھئی، یہ خسر ہیں تمہارے اب، انہوں نے اپنی فرزندی میں قبول کرلیا ہے تمہیں۔"

غالب نے بھی کہا "ہم نے پکا کام کیا ہے ناجی، تم حلف کی حفاظت میں ہو۔"

پیر عنایت آگے بڑھا اور اس نے ناجی کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ "میں کتنا بھی کمینہ ہوں، کتنا بھی برا ہوں مگر اب تیرے ساتھ کوئی برائی کیسے کرسکتا ہوں بیٹا۔ اللہ کا قہر نازل نہیں ہوگا مجھ پر، اگر میں حلف اٹھا کے مکر گیا۔ ابھی تو صرف تو نے تماشا دیکھا ہے میری ذلت کا، پھر سارا جہاں دیکھے گا۔ قبر کا اور آخرت کا عذاب تو بعد میں ملے گا، پہلے اس دنیا میں رسوائی کی موت ملے گی مجھے۔ کوئی شک نہیں رہا مجھے اس میں۔"

وہ ایک دم دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کے اور پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔

ناجی نے عادت کے مطابق اس کے پاؤں پکڑ لئے "مجھے ...کردیں جی، پیر صاحب۔"

...عنایت نے اسے اٹھالیا "نہیں، مجھ گنہگار کے پیر مت پکڑ ...جوتے مار میرے مُنہ پر، مجھ رُوسیاہ کے منہ پر تھوک۔"

...معلوم نہیں یہ ایک عارضی جذباتی ردِعمل تھا یا واقعی اس ...سے گزر کے پیر عنایت کی عقل پر پڑا ہوا پردہ ہٹ گیا تھا ...اس کے لئے یہ دل کے منقلب ہونے کے عمل کی شروعات ...زندگی بھر گمراہی کے اندھیرے میں بھٹکنے والے کو بھی ...کہیں، کسی بھی غیر متوقع لمحے میں ہدایت کی روشنی اور ...مستقیم کی طرف رہنمائی حاصل ہوجاتی ہے۔ کوئی نہیں ...یہ لمحہ کس وسیلے اور حوالے سے دستیاب ہوگا، کس بہانے ...ملے گا اور کس روپ میں۔ لیکن توفیق کی ساعتِ نایاب آتی ...رہے۔

ایک دم صورتِ حال سنجیدہ ہوگئی تھی۔ اب ہمیں اپنے ...ایں شرمندگی کا سامنا تھا۔

میں نے بہ عجلت اس جگہ سے چلے جانے میں ہی بہتری ...ی۔ میں نے چوکیدار اور پیر عنایت سے ہاتھ ملا کے کہا "جو ...ہوا، اس کا مجھے افسوس ہے لیکن میں امید رکھتا ہوں کہ اس ...ال سے ہی اچھائی کے اسباب پیدا ہوں گے اور میری خواہش ...کہ ہم پھر کبھی ملیں تو ہمارے درمیان کوئی رنجش آج کے ...لے سے نہ ہو۔ اور کوئی ایسی وجہ نہ ہو کہ ہم پھر دشمن بن کے ...منے آئیں۔"

ایسی ہی کچھ باتیں نازو اور غالب نے کہیں۔ پھر ہم جیپ ...لے کر نکل گئے۔ جیپ کو اب میں چلا رہا تھا۔ مجھے عقب نما ...ئینے میں برآمدے کا پورا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ چوکیدار، پیر ...نایت اور ناجی ایک ساتھ کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان ...تعلق اور رشتوں کی جذباتی نوعیت بدل گئی تھی اور میرے لئے ...اس خیال میں بڑی طمانیت تھی کہ یہ رشتے بے آبرو نہیں ہوئے ...بلکہ پہلے سے زیادہ معتبر ہوگئے۔ پیر عنایت نے اپنا ہاتھ اٹھایا تو ...میں نے پلٹ کے دیکھا۔ غالب اور نازو نے پیچھے سے انہیں ہاتھ ...ہلا کے الوداع کہہ دیا تھا۔ جیپ ڈاک بنگلے کے دروازے سے نکلی ...تو سب اوجھل ہوگئے۔ ڈاک بنگلے میں ہمارا قیام ایک گھنٹا بیس ...منٹ رہا تھا لیکن اس دوران میں بہت کچھ بدل گیا تھا۔ ہمیں ...ان کے بارے میں ایک خبر مل گئی تھی جو کوئی خبر نہ ملنے سے ...بہرحال اچھی خبر تھی۔ ہم نے رابعہ اور گل کے لئے تحفظ کی ایک ...راہ تلاش کرلی تھی۔ ناجی جو پہلے بے گھر اور لاوارث تھا، اب ...محبت کی منزل پاچکا تھا۔ اور شاید پیر عنایت بھی اب پہلے والا ...ثابت نہیں تھا۔

نازو نے پیچھے سے کہا "سر، آپ خفا ہیں مجھ سے؟"

میں نے ہنس کے کہا "تم سے کون خفا ہوسکتا ہے عزیزہ۔"

"نہیں سر، میں نے بہت افسوس ناک احتجاجی مظاہرہ کیا، یہ ...بغیر کہ آپ اپنے اعلیٰ وارفع ذہن کی قائدانہ صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے کیا حکمتِ عملی وضع فرمارہے ہیں۔"

"اتنی مشکل اردو بولنے سے تمہارا گلا بیٹھ جائے گا" غالب نے کہا۔

"واقعی میں سمجھی نہیں تھی..." نازو نے اپنی بات جاری رکھی۔

"اچھا تو میں سرٹیفکیٹ دے دوں تمہیں ناسمجھ، ناقص العقل ہونے کا!" غالب بولا "سکندر کی طرف سے۔"

"مجھے کوئی ضرورت نہیں کسی کے سرٹیفکیٹ کی" نازو نے بگڑ کے کہا "میں جو ہوں سو ہوں۔"

"ہاں، تم تو خود ایک سرٹیفکیٹ ہو، عورت ذات ہونا ہی تمہاری سند ہے۔"

"مجھے معلوم ہے تم کتنے بڑے افلاطون ہو۔ یہ سب مردوں کا کمپلیکس ہے۔ اپنی عقل کا خود ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہیں" نازو نے چڑ کے کہا۔

"آخر تم میرے سچ کا اتنا برا کیوں مانتی ہو؟" غالب نے کہا۔ "اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ تمہاری ناراضگی کے خیال سے میں جھوٹ بولتا رہوں ہر وقت۔"

میں نے کہا "آئینِ جوان مرداں حق گوئی و بیباکی۔"

غالب نے نازو کو سنانے کے لئے کہا "یار سکندر، میں تو شادی کے بعد بھی سچ بولتا رہوں گا۔ حالانکہ اکثر شوہر اس کا حوصلہ نہیں رکھتے۔"

میں نے ہنس کے کہا "بات حوصلے کی نہیں مرزا جی، کچھ ازدواجی سیاست کے تقاضے ہوسکتے ہیں۔ یہ جاننا اچھا شوہر بننے کے لئے ضروری ہے کہ سچ اور جھوٹ میں کیا تناسب رکھا جائے۔ مثلاً جب بیوی محض گوارا لگ رہی ہو تو پچاس ساٹھ فیصد جھوٹ ملا کے کہو کہ تم تو جنت کی حور، کوہ قاف کی پری وغیرہ لگ رہی ہو۔ اور کہیں کوئی ایسی خاتون نظر آجائیں کہ آپ کے ہوش اڑ جائیں تو سو فیصد جھوٹ بولو بیوی سے کہ کیسی بدصورت عورت ہے اور کتنا اِترا رہی ہے۔"

غالب بہت ہنسا "کیا پتے کی بات بتائی ہے استاد۔"

نازو نے کہا "میں بتاؤں گی رابعہ کو، آپ کے اقوالِ زریں۔"

"ارے ہم کیا ڈرتے ہیں کسی سے؟" میں نے کہا "بتادینا، ہم بھی جھوٹ بول دیں گے ڈھٹائی سے کہ ایسی کوئی بات تو بالکل نہیں ہوئی۔"

"اور تم دیکھ لینا، رابعہ تمہاری نہیں مانے گی" غالب نے ہاتھ بڑھا کے کہا "لگالو شرط۔"

"اچھا اب سنبھل جاؤ، بڑی سڑک سامنے آگئی ہے" میں نے کہا۔

ڈاک بنگلے سے شروع ہونے والی پتلی سی نیم پختہ سڑک ایک اور سڑک سے ملنے کے بعد بہت بہتر ہوگئی تھی اور میں نے جیپ کی رفتار کو اسی نوے کلومیٹر تک بڑھالیا تھا۔ اگرچہ ابھی تک کسی نے ہماری راہ میں حائل ہونے کی کوشش نہیں کی تھی لیکن خطرہ

اپنی جگہ موجود تھا اور اس امکان کو یکسر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا کہ جس پولیس پارٹی سے یہ جیپ چھینی گئی تھی اس نے واردات کی اطلاع آگے دے دی ہو۔ اس کے امکانات بہت کم تھے کیونکہ جہاں ہم نے انہیں چھوڑا تھا وہاں سے رابطے کے وسائل بہت دور تھے۔ کسی پولیس جیپ کی تیز رفتاری پر کوئی شک نہیں کرتا اور اسے غلط بھی نہیں سمجھا جاتا۔ یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ کوئی ایمرجنسی درپیش ہوگی۔ مجھے تیز رفتاری سے یہ فائدہ حاصل تھا کہ کسی کو بھی غور سے ہماری صورت یا جیپ کا نمبر دیکھنے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔

مین روڈ پر آنے کے بعد بھی میں نے رفتار کم نہیں کی۔ میں نے سامنے سے آنے والی بہت سی پولیس کی گاڑیاں دیکھیں لیکن جیسے میں کسی کی صورت کی جھلک تک نہ دیکھ سکا ایسے ہی کسی نے ہماری طرف دیکھا ہوگا تو اسے صرف پولیس کی گاڑی نظر آئی ہوگی۔ دو جگہ میں نے اسی سمت میں جانے والی پولیس کی گاڑیوں کو اوورٹیک کیا تو ٹریفک کی موجودگی سے فائدہ اٹھایا۔ میں نے اوورٹیک کرنے والی ایک بس کو سائڈ سے اوورٹیک کیا اور بہت آگے نکل گیا۔ پولیس کے علاوہ کوئی ایسی خطرناک اوور ٹیکنگ کرتا تو اس کا لازمی چالان ہوتا۔

"اب کیا کریں، کہاں چلیں؟" میں نے شہر کی حدود میں کافی اندر داخل ہو جانے کے بعد کہا۔

غالب نے کہا "پہلے تو آپ ایزی ہو جائیں، رفتار کم کر دیں۔ ...یہ معلوم ہو کہ آپ معمول کی پیٹرولنگ ڈیوٹی پر ہیں۔ مجرموں کے تعاقب میں نہیں دوڑ رہے ہیں۔"

میں نے کہا "اوکے۔ اب ہم صرف تیس کلومیٹر کی رفتار سے جا رہے ہیں، یہ طے کئے بغیر کہ ہمیں کس سمت میں جانا ہے۔"

"ہمیں سینٹ اینڈریوز چرچ جانا ہے" نازو نے کہا "اس کے ساتھ والے قبرستان میں ہی سائرن کی ماں اور اس کی بہن کو دفن کیا جائے گا۔"

"سائرن نے کہا تھا کہ چرچ میں آخری رسوم سہ پہر کے بعد ادا کی جائیں گی" میں نے کہا "ابھی تو صرف ایک بجا ہے۔"

"ہم عین وقت پر پہنچنے کا رسک کیسے لے سکتے ہیں؟" غالب نے کہا "ہمیں اسی وقت وہاں جا کے صورتِ حال کا جائزہ لینے کے بعد کوئی فیصلہ کرنا چاہئے۔"

نازو نے کہا "فیصلہ کیا کرنا ہے؟"

"یہی کہ ہم کہاں سے چھپ کر سب پر نظر رکھ سکتے ہیں۔ خود نظر آئے بغیر۔ ایسی کوئی جگہ ہے تو وہاں پہنچنے کا راستہ بھی ہے یا نہیں" غالب نے کہا "ایسا نہ ہو کہ عین وقت پر کوئی مسئلہ پیدا ہو جائے اور ہم قریب بھی نہ جا پائیں یا جائیں تو معلوم ہو کہ سیدھے جال میں چلے گئے جو شکاری پہلے سے پھیلائے بیٹھے ہوئے تھے۔"

میں نے غالب کی دور اندیشی سے اتفاق کیا۔ ہم تو خیر اجنبی تھے راہ چلتے بہت سے لوگ بھی ہمیں صحیح راستہ سمجھانے کی کوشش میں ناکام رہے۔ پھر مجھے ایک بک اسٹال نظر آ گیا اور وہاں سے مجھے بمبئی شہر کی گائیڈ بک بھی مل گئی جس میں سڑکوں کا تفصیلی نقشہ تھا۔ ایسے نقشے ہر بڑے شہر میں بہ آسانی دستیاب ہوتے ہیں لیکن میرے علم میں لاہور یا کراچی کے بارے میں ایسی کوئی رہنمائی کرنے والی کتاب نہیں تھی جو کتابوں کی دکان پر مل جاتی ہو۔

نقشہ ہمارا دیکھا ہوا تھا چنانچہ تھوڑی سی جدوجہد اور جستجو کے بعد ہم اس جگہ کا تعین کرنے میں کامیاب ہو گئے جہاں ہم موجود تھے۔ بمبئی میں سڑکوں کی نشاندہی کرنے والے سائن بورڈ بھی بہت نمایاں اور ہر جگہ موجود ہیں۔ باقی راستہ میں نے غالب کی ہدایات کے مطابق طے کیا جو پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا مجھے صرف نقشہ دیکھ کر یہ بتاتا جا رہا تھا کہ کہاں مجھے دائیں جانب مڑنا چاہئے کہاں بائیں طرف اور کہاں سیدھا چلتے رہنا چاہئے۔ اس چکر میں آدھ گھنٹا ضائع ہو گیا تھا اور غالب بہت محتاط تھا پھر بھی ایک جگہ کنفیوز ہوا۔ یہ اتفاق تھا کہ ہم شہر کے دوسرے کنارے پر نہیں تھے ورنہ باقی وقت بھی تلاش میں ہی صرف ہو جاتا۔ سینٹ اینڈریوز چرچ اینڈ سیمٹری کو ہم نے بیس منٹ میں دریافت کر لیا۔

سُرخ پتھروں کا بنا ہوا چرچ جو طرزِ تعمیر اور خستہ حالی سے کم سے کم سو سال پرانا لگتا تھا' ایک ایکڑ یا کچھ زیادہ رقبے پر محیط قد آدم چاردیواری کے اندر بڑے وقار و تمکنت کے ساتھ سر اٹھائے کھڑا ہوا تھا۔ اس کے ٹاور کی بلندی سرسبز درختوں کے اوپر نیلے آسمان کے پس منظر میں بہت نمایاں تھی اور چاروں طرف پھیلی ہوئی مادی زندگی کی گہما گہمی اور لوٹ کھسوٹ کی دوڑ دھوپ میں انسانوں کو سکون' طمانیت اور قناعت پسندی کا درس دیتی محسوس ہوتی تھی۔ اس کے گرد پھیلے ہوئے ہرے بھرے درخت بھی بہت پُرسکون نظر آتے تھے۔ کھلے ہوئے پھاٹک سے چرچ تک جانے والے راستے پر سرخ بجری اور کنکر بچھے ہوئے تھے اور اس کی حاشیہ بندی کے لئے اینٹوں کو ترچھا کر کے ایسے لگایا گیا تھا کہ دونوں طرف کنارے والی لائن نظر آتی تھی۔ اینٹوں پر اُجلی سفیدی دھوپ میں چمک رہی تھی اور وہ راستہ کسی لال چُنریا کی طرح دکھائی دیتا تھا جس کے کناروں پر کسی نے بڑے اہتمام سے سفید بیل ٹانکی ہو۔ راستے کے دونوں جانب گھنا ہموار سبز گھاس کا فرش قالین کی طرح بچھا ہوا تھا۔

شاید کسی زمانے میں چرچ کے لئے آبادی سے ہٹ کے کسی پُرسکون قطعۂ اراضی کا انتخاب کیا گیا ہوگا مگر جب شہر پھیلا تو چرچ درمیان میں محصور ہو گیا۔ اب اس کی چاردیواری کے ہر طرف بسوں' ٹراموں' کاروں اور دوڑتے بھاگتے انسانوں کا شور تھا جو دن رات کے کسی بھی حصے میں بالکل ختم نہیں ہوتا تھا۔ اس پُرشور دنیا میں یہ سکون اور خاموشی کا جزیرہ ہم جیسے تھکے ہوئے انسانوں کو اندر آنے کی دعوت دیتا محسوس ہوتا تھا۔ ابھی تک کسی نے ایک پولیس جیپ کو چرچ کے دروازے پر دیکھ کے

حیرت کا خاموش اظہار بھی نہیں کیا تھا۔

غالب نے کہا "یہاں ابھی تو کوئی بھی نہیں ہے۔"

میں نے کہا "بہ ظاہر میری نظر بھی یہی دیکھ رہی ہے' کوئی چھپ کے بیٹھا ہو تو الگ بات ہے۔"

نازو نے کہا "مجھے تو قبرستان بھی نظر نہیں آ رہا ہے۔"

میں نے کہا "شاید چرچ کے پیچھے ہو' کیوں نہ ہم اندر جا کے دیکھ لیں۔"

نازو نے کہا "اس طرح... میرا مطلب ہے پولیس کا چرچ میں جانا کچھ معیوب سی بات نہیں ہے؟"

میں نے کہا "کسی بھی عبادت گاہ میں کسی کا غلط مقصد سے جانا معیوب بات ہے۔ ہم چرچ کا بھی اتنا ہی احترام کرتے ہیں جتنا مساجد کا۔"

غالب نے میری تائید کی "ہم تو ان لوگوں کے خلاف کارروائی کرنا چاہتے ہیں جو چرچ کے ہی نہیں ساری انسانیت کے دشمن ہیں۔ جو پیشہ ور قاتلوں کو بے گناہ انسانوں کے قتلِ عام کے لئے اکساتے ہیں اور مسلح کرتے ہیں۔ کبھی سیاست اور کبھی مذہب کے نام پر نفرت کی آگ بھڑکاتے ہیں اور آدمی کے خون کی تجارت کو فروغ دے کر اپنی تجوریاں بھرتے ہیں۔"

"ہم تحفظ کی جنگ لڑ رہے ہیں' اپنے لئے بھی اور ان بے خطا انسانوں کے لئے بھی جو مارے جا رہے ہیں۔ آئندہ بھی مارے جائیں گے' یہ جانے بغیر کہ ان کا جرم کیا ہے کیونکہ وہ کمزور ہیں اور اتنے عیار نہیں ہیں جتنے ان کو اس آگ میں ایندھن بنا کے جھونکنے والے۔ وہ انسان نہیں' صرف کسی گولی کے لئے انسانی ہدف ہیں۔ یہ ہدف دیوار نہیں ہو سکتی اور درخت نہیں ہو سکتے اور کھمبا بھی نہیں ہو سکتا۔ یہ ضروری ہے کہ ہدف کا خون بہے تاکہ پھر اس مظلوم خون کو شہید قرار دے کر نعروں کی سیاست کی جا سکے۔ جلوس' ہنگامے اور ہڑتالیں خون کے بغیر غیر مؤثر ہیں۔"

غالب نے ایک ٹھنڈی سانس لی "ہاں یار۔ بے چارہ ایک وقت پیٹ بھر کر کھانے کے لئے مٹھی بھر چاول مانگنے والا کیسے بات کر سکتا ہے چھ نکات کی یا استحصال کی۔ شاید وہ ان الفاظ کا مطلب تک نہیں سمجھتا مگر اس کا خون بولتا ہے' لیڈروں کی زبان سے۔"

"اگر تمہارے دل کا غبار نکل گیا ہو تو ہم اندر چلیں؟" نازو نے کہا۔

"سامنے سے جانا دور اندیشی کے تقاضوں کے خلاف ہوگا۔" غالب بولا "اگر کوئی شکاری پہلے سے ہمارے لئے چشم براہ ہوا تو تاڑ جائے گا کہ پولیس کی وردی میں پولیس نہیں ہے۔"

میں نے کہا "کیسے تاڑ جائے گا؟ آج یہاں پولیس ہر طرف ہوگی۔ معاملہ ایک پولیس افسر کا ہے اور دہرے قتل کی واردات ہے۔"

"ایسی صورت میں ہمیں پولیس ہی سب سے پہلے پکڑے گی" نازو نے کہا "یہاں منتخب افراد کی ڈیوٹی ہوگی اور ہم غیر منتخب افراد سب سے پہلے نظر آئیں گے۔"

میں نے کہا "ہم قائل ہوئے تمہاری دلیل سے' لیکن اب وقت کہاں ہے کہ ہم لباس اور حلئے بدل سکیں۔ ابھی پولیس نظر بھی نہیں آ رہی ہے۔"

"یہ بات کچھ عجیب ہے' پولیس کو پہلے سے موجود ہونا چاہئے تھا" غالب نے کہا۔

"کہیں پروگرام بدل نہ گیا ہو" نازو نے کہا "دو تو بج گئے ہیں۔"

"کیا مطلب! آخری رسوم کسی اور جگہ نہ ہوں؟" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "رسوم تو اسی چرچ میں ہوں گی۔ ایک تو اس لئے کہ سائرن نے ہم سے یہی کہا تھا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ سائرن کی وابستگی اسی چرچ سے ہوگی۔ عقیدت کی بنیاد پر۔ ہاں یہ بات بعید از امکان نہیں ہے کہ آخری رسوم کی ادائیگی میں کچھ دیر ہو جائے۔ پوسٹ مارٹم اور دوسری قانونی کارروائیوں میں تاخیر ہو ہی جاتی ہے۔ ممکن ہے آخری رسوم ملتوی کر دی گئی ہوں۔"

"یہ پروگرام پہلے سے طے ہوتا ہے' اگر تبدیل ہو تو سب کو مطلع بھی کیا جاتا ہے۔"

"پادری کو یقیناً معلوم ہوگا" نازو نے کہا "آثار ایسے ہی ہیں۔"

غالب نے سر ہلایا "سہ پہر کا مطلب ہے تین یا چار بجے۔ ابھی تک کوئی بھی نہیں پہنچا۔"

"اوکے۔ ہم اندر جاتے ہیں اور پادری سے بات کرتے ہیں" میں نے کہا "چونکہ پولیس موجود نہیں ہے اس لئے ہم موقع سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ تم دونوں ذرا غور سے چاروں طرف دیکھتے رہنا۔"

میں نے تائید یا تردید کا انتظار کئے بغیر جیپ کو بڑھا دیا اور پھاٹک میں سے گزار کے چرچ کی مرکزی عمارت کی سائڈ میں لے گیا۔ جیپ کے انجن نے اپنی آمد کا اعلان خود کر دیا تھا لیکن چرچ کے اندر سکوت کی کیفیت برقرار رہی۔ میں نے انجن بند کر دیا اور چند منٹ ہم نے خاموشی سے انتظار میں گزارے کہ شاید اندر سے کوئی نکل کے ہم سے ہماری آمد کا مقصد پوچھے۔

"کیا تم نے کچھ دیکھا؟" میں نے کہا۔

"ہاں' میں نے نازو کو دیکھا تو یہ مجھے دیکھ رہی تھی" غالب نے شکایت کے انداز میں کہا "اور میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا تو ایک سوال تھا۔ بلکہ ایک حسرت تھی۔"

میں نے مسکرا کے کہا "کیا سوال تھا؟"

"دراصل نازو نے فلموں میں چرچ سے رخصتی کے مناظر بہت دیکھے ہیں نا' اس لئے جذباتی ہو رہی تھی۔"

نازو نے بھنا کے کہا "تم نے سوال غلط پڑھا۔ میں تو سوچ

رہی تھی کہ چرچ خالی ہے۔ تمہاری آخری رسوم ؟ کیوں نہ ہو جائیں ٹھیک وقت پر' سب کو فراغت بھی ہے۔"

اس سے پہلے کہ غالب کچھ کہتا سفید لبادے میں ایک پادری ایسے نمودار ہوا جیسے اس کا غیر مرئی وجود فضا سے نکل کے مجسّم ہو گیا ہے اور اسی طرح پھر ہوا میں تحلیل ہو کے غائب ہو جائے گا۔ میں نے اسے کسی دروازے سے باہر آتے نہیں دیکھا تھا۔ نہ دروازہ کھلنے کی کوئی آواز سنی تھی اور نہ اس کے قدموں کی چاپ۔ جب اس پر میری نظر پڑی تو وہ چند قدم کے فاصلے پر تھا اور بے آواز قدموں سے سیدھا چلتا ہماری طرف آ رہا تھا۔ وہ دبلا پتلا اور دراز قد شخص تھا جس کے سر پر گھنے سفید چاندی جیسے بال مصنوعی وِگ کی طرح نظر آتے تھے۔ اس کے اپنے چہرے کی رنگت بھی بہت صاف تھی مگر وہ انگریز نہیں تھا۔ اُس نے ایک ہاتھ میں کتابِ مقدس کو سینے کے ساتھ تھام رکھا تھا اور اس کے لبوں پر ایک بہت شفیق اور مہربان مسکراہٹ تھی۔

"گاڈ بلیس یُو" اس نے سینے پر صلیب بنا کے نرم لہجے میں کہا۔

"گاڈ بلیس یُو فادر" میں نے اور غالب نے جیپ سے اتر کر احتراماً کہا۔ پھر نازو نے سر جھکا لیا اور پادری نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"کیا ضرورت تمہیں خدا کے گھر میں لے آئی ہے؟ مجھے بتاؤ"

اس نے انگریزی میں کہا "خدا سب کے کام کرتا ہے۔"

میں نے کہا "اس میں کیا شک ہے ہولی فادر۔ ہم تو صرف دنیا کے قانون کی عملداری قائم رکھنے کا فریضہ پورا کرنے کے لئے بھیجے گئے ہیں۔ امید ہے آپ ہماری موجودگی پر معترض نہیں ہوں گے اور اسے چرچ میں دخل اندازی سے تعبیر نہیں کریں گے۔"

"اگر تم ڈیوٹی پر ہو تو شاید میں دخل اندازی کا مرتکب ہو رہا ہوں" پادری نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔

"ایسی کوئی بات نہیں سر" میں نے کہا "آپ کی اجازت ہی کافی ہے ہماری حوصلہ افزائی کے لئے۔ ہمیں یہ بتایا گیا تھا ہولی فادر کہ انسپکٹر سائئن کی والدہ اور بہن کے لئے آج سہ پہر آخری رسوم ادا ہوں گی۔ شاید آپ کے علم میں ہو کہ انہیں درندہ صفت قاتلوں نے بڑی سفاکی سے قتل کر دیا تھا۔"

"اوہ یس!" پادری نے جھرجھری لے کر اپنے سینے پر پھر صلیب بنائی "خدا ان کی روحوں کو سکون میں رکھے۔ انسپکٹر سائئن ایک ایماندار اور فرض شناس افسر ہے۔ یہ اس کی آزمائش ہے خدا کی طرف سے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ خداوند کا پسندیدہ ہے۔"

میں نے کہا "مگر مجھے آخری رسوم کے آثار دکھائی نہیں دیتے۔"

"بتانے والے تمہیں یہ بتانا کیوں بھول گئے کہ رسومات شام تک ملتوی کر دی گئی ہیں۔ سورج غروب ہونے تک۔"

میں نے کہا "محکمہ جاتی کارروائی میں اس قسم کی بھول چوک ہو جاتی ہے فادر۔ ایسی بات ہے تو ہم فی الحال اجازت چاہتے ہیں۔"

پادری کی نظر نازو پر تھی "یہ نوجوان پولیس افسر بہت کم عمر ہے... تمہارا کیا نام ہے آفیسر؟"

پادری نے کھل کر اپنے شک کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اس کی نظر نے تاڑ لیا تھا کہ نازو کوئی لڑکی ہے۔ اگرچہ اس سوال کا نازو نے خاصے اعتماد کے ساتھ جواب دیا تھا مگر اس کی آواز نے پادری کے شک کو تقویت پہنچائی۔ وہ جہاں دیدہ آدمی تھا اور اسے انسانوں کی پہچان تھی۔ تاہم اس نے اخلاقاً یا کسی مصلحت کے پیشِ نظر اپنے شکوک کا اظہار نہیں کیا۔ میں نے فوراً جیپ کے کر روانہ ہو جانے میں ہی عافیت جانی۔ پادری اس وقت تک وہیں کھڑا ہمیں دیکھتا رہا جب تک کہ جیپ چرچ کے گیٹ سے نہیں نکل گئی۔

"اوف! بس بال بال بچ گئے آج ہم" غالب نے باہر نکلتے ہی کہا۔

میں نے کہا "مس نازو' تمہارے لئے یہ رول قطعی ناموزوں ہے۔ کوئی پولیس مین اتنا نازک اور خوب صورت نہیں ہو سکتا۔"

نازو نے خفت سے کہا "یہ رول میں نے کبھی اپنی مرضی سے نہیں لیا۔"

"تم کو یا تو لیڈی پولیس کی وردی میں ہونا چاہئے ورنہ پولیس مین بننے کی کوشش ہی نہیں کرنی چاہئے۔ تمہاری وجہ سے ہم بھی مشکوک ہو جاتے ہیں" میں نے کہا۔

"مردوں پر جب مصیبت آتی ہے کسی عورت کی وجہ سے آتی ہے" غالب نے کہا۔

"مجھے مصیبت کہا تو میں مصیبت ڈال دوں گی۔ ابھی رونے لگوں گی" نازو نے دھمکی دی۔

"تم جذباتی بلیک میلنگ پر اتر آئی ہو لیکن ہم وہ احمق مرد نہیں ہیں جو عورتوں کے آنسو دیکھ کر پگھل جاتے ہیں" غالب نے اعلان کیا "رو کے دکھاؤ ذرا۔"

میں نے کہا "خدا کے واسطے موقع محل دیکھ کے لڑا کرو۔ میں پریشان ہو رہا ہوں کہ شام کو کیا ہو گا' پادری نے ہمیں صاف بتا دیا ہے کہ وہ ہماری حقیقت کو سمجھ گیا ہے۔ وہ ہنگامہ نہیں چاہتا تھا چنانچہ اس نے ایک موقع فراہم کر دیا ہے کہ سمجھدار کو اشارہ کافی ہوتا ہے۔ خیریت چاہتے ہو تو پھر یہاں آ کے یہ ڈراما مت کرنا۔"

"اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ڈراما پھر نہیں کیا جا سکتا۔ اب کچھ اور سوچنا پڑے گا۔ مشکل تو یہ ہے کہ جب پیٹ خالی ہوتا ہے تو دماغ بھی خالی ہونے لگتا ہے" غالب نے کہا۔

"میں فوراً اس جیپ سے اور اس منحوس لباس سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہوں" میں نے کہا۔

"دونوں کام آسان ہیں۔ جیپ چھوڑی جا سکتی ہے کہیں بھی اور یہاں ریڈی میڈ کپڑوں کی بہت دکانیں ہیں" غالب نے کہا۔ "وہا...

مجھے سڑک کے کنارے ایک ورکشاپ کے گیٹ پر

لنچ" کا بورڈ نظر آیا۔ گیٹ بند تھا مگر اس کے سامنے بہت سی گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ میں نے جیپ کو انہی کے ساتھ روک دیا اور چند منٹ بعد ہم ایک ٹیکسی میں تھے۔ ہمارا اندوختہ تقریباً ختم ہو رہا تھا لیکن نازو کے پاس اُس کے اندازے کے مطابق اسی پچاسی ہزار اب بھی موجود تھے جو اس نے اپنی کمر کے گرد لپٹی ہوئی بیلٹ میں چھپا رکھے تھے۔ کسی نہ کسی طرح وہ اس بیلٹ کو بحفاظت اپنے ساتھ رکھنے میں کامیاب رہی تھی۔ ٹیکسی میں بیٹھنے سے پہلے ہی اُس نے یہ بیلٹ میرے حوالے کر دی تھی۔

پرانے طریقِ کار کے مطابق ہم نے ٹیکسی کو کئی بار چھوڑا۔ وہ تیسری ٹیکسی تھی جس نے مجھے ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور پہنچایا۔ وہاں سے سب کے لئے کپڑے خریدنے کے بعد ہم چوتھی ٹیکسی میں سوار ہوئے اور اسے باندرہ چلنے کو کہا لیکن ٹیکسی نے تقریباً دو میل کا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ میں نے اسے رکنے کو کہا اور نازو نے ٹیکسی ڈرائیور کو پیچھے سے ناک آؤٹ کر دیا۔ ٹیکسی ڈرائیور کو اپنی جگہ کھسکا کے میں نے ڈرائیونگ سنبھالی اور پندرہ بیس منٹ کی جستجو کے بعد آخر کار ایک ایسی جگہ تلاش کرنے میں کامیاب رہا جہاں ہم ٹیکسی کو روک کے کپڑے بدل سکتے تھے۔ یہ ایک کھنڈر ہو جانے والے مکان کی باؤنڈری تھی جس کے باہر کسی تجارتی سینٹر کی تعمیر کرنے والی کنسٹرکشن کمپنی نے اپنا بورڈ لگا دیا تھا۔ شاید سال بھر بعد ہم پھر آتے تو اس جگہ کو پہچان نہ پاتے۔ اس کھنڈر کی جگہ جدید وضع کا کوئی شاپنگ پلازا نظر آتا۔ جب یہ کھنڈر ہو جانے والی عمارت تعمیر کی گئی ہو گی تو اسے کتنا جدید' خوب صورت اور قابلِ دید سمجھا جاتا ہو گا۔ میں نے باہر انتظار کرتے ہوئے سوچا۔

عمارت کے کھنڈر میں کوئی بھی نہیں تھا۔ بہت جلد اس کو گرایا جانا تھا چنانچہ اس کی کھڑکیاں دروازے سب نکال لئے گئے تھے اور بجلی کاٹ دی گئی تھی مگر اندر غسل خانوں کے نل موجود تھے اور پانی کا کنکشن باقی تھا چنانچہ میں نے بھی موقع غنیمت جانا اور ہاتھ منہ دھونے گیا تو نہا کے نکلا۔ یہی غالب نے بھی کیا۔ نئے کپڑے پہن کے ایک بار پھر ہم نئی شخصیت اختیار کر چکے تھے۔ زندگی کے روپ اب صبح و شام بدل جاتے تھے اور اس کے ساتھ ہی ہم اپنے انداز و اطوار بدل لیتے تھے۔ یہ سب کچھ اب کھیل ہو گیا تھا۔ ایک ایسا کھیل جس میں کوئی انوکھا پن تھا نہ سنسنی تھی اور نہ مسرت۔ یہ ضرورت کی تکمیل کا معمول ہو گیا تھا۔ ہم جس شکارگاہ میں پھر رہے تھے وہاں خطرے کو اسی طرح کم سے کم کیا جا سکتا تھا کہ ہم اپنی شناخت کو زیادہ عرصہ برقرار نہ رکھیں۔ ہمیں اس ہجوم میں گم ہونے کی آسانی بھی حاصل تھی جو بمبئی جیسے شہر کی سڑکوں کو آباد رکھتا ہے۔ تلاش کرنے والے ہمارے ایک روپ سے آشنا ہوتے تھے تو ہم دوسرا روپ اختیار کر کے پھر محفوظ ہو جاتے تھے۔ اس پُر ہجوم شہر میں ہر چہرے کو غور سے دیکھنا اور لاکھوں چہروں میں سے تین چہرے ڈھونڈ نکالنا ناممکن کام تھا لیکن حلئے مشتہر کر دئیے جائیں تو ناممکن کام صرف مشکل کام رہ جاتا ہے۔ سوٹ پہن کر میں بہت پُر اعتماد ہو گیا کہ اب فوری طور پر کوئی خطرہ نہیں۔ جیپ تو پولیس کو مل ہی جائے گی مگر وہ تین پولیس والے نہیں ملیں گے جن میں سے ایک بہت حسین اور نازک اندام تھا۔

چار بجے تک ہم ایک بہترین ریسٹورنٹ میں پُر تکلف لنچ سے فارغ ہو چکے تھے۔ کافی پینے کے بعد سگریٹ جلاتے ہی مجھ پر قنوطیت کا شدید غلبہ ہوا۔ آسودگی کے ردِعمل نے سب کو یکساں اداس کیا۔ ذہن کو تھوڑی سی فراغت ملی تو گزشتہ چوبیس گھنٹوں کے واقعات کی یاد تازہ ہو گئی۔ رابعہ اور گُل کے خیال نے اور محسن کے بعد شہلا کی یاد نے مجھے شرمسار کیا۔ معلوم نہیں کون کہاں ہے اور کس حال میں ہے' میں نے بڑے دکھ سے سوچا۔ ہم یہاں بہترین لباس پہنے' بہترین لوگوں کے درمیان کتنے آرام سے بیٹھے ہیں۔ اس احساس سے میرا حلق کڑوا ہو گیا۔

میں نے سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسل دیا "جو کچھ ہم سب سوچ رہے ہیں اس سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔"

"میں محسن اور شہلا کے بارے میں سوچ رہی ہوں' کیا وہ پھر ملیں گے؟" نازو نے کہا۔

"ہم سب پھر کب ساتھ ہوں گے' میں سوچ رہا تھا" غالب نے اعتراف کیا۔

"مت سوچو ایسی حوصلہ پست کرنے والی اور مایوسی پیدا کرنے والی باتیں" میں نے برہمی سے کہا "منفی سوچ صرف ناکامی کا احساس دلاتی ہے۔ عمل زندگی کی اساس ہے' ہمیں کچھ کرنا چاہئے"

"ہم دوبارہ اس چرچ میں گئے تو پہچان لئے جائیں گے" غالب نے کہا "اور ہمارا وہاں جانا بھی اتنا ہی ضروری ہے۔ کیا وہ پادری ہم سے تعاون کرے گا؟"

"عام طور پر وہ دنیا کے جھمیلوں میں نہیں پڑتے۔"

"لیکن لوگ ان کے سامنے اپنے گناہ کا اور اپنے جرائم کا اعتراف کرنے جاتے ہیں۔ محض اپنے ضمیر کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے اور بعض اوقات ان سے رہنمائی حاصل کرنے کے لئے۔ وہ ان کی سنتے ہیں اور انہیں مشورہ بھی دیتے ہیں لیکن انہیں مجبور نہیں کرتے۔ ان کے راز کو راز رکھتے ہیں اور پولیس کو بھی کچھ نہیں بتاتے۔ چور' ڈاکو' قاتل سب ہی ان کے سامنے جا کے اکیلے میں انہیں سب بتا کے اپنا دل ہلکا کرتے ہیں۔ یہ ان کی ایک رسم ہے یا روایت ہے جس پر وہ آج بھی سختی سے کاربند ہیں" غالب نے کہا "بے شک وہ دنیاوی معاملات میں نہیں پڑتے لیکن تعاون کرتے ہیں۔"

میں سوچ میں پڑ گیا "تمہارا مطلب ہے ہم اپنے اپنے بارے میں سچ بتا دیں کہ ہم کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟"

"ہاں۔ اگر وہ تعاون پر آمادہ نہیں ہوگا تو ہمارا راز بھی افشا نہیں کرے گا۔ صاف کہہ دے گا کہ میں تم لوگوں کے لئے کچھ نہیں کرسکتا، تم چلے جاؤ۔"

"اور اس نے کہہ دیا سوری تو ہم کیا کریں گے؟ واپس لوٹ آئیں گے" میں نے کہا۔

نازو نے کہا "پھر ہم ٹیڑھی انگلیوں سے گھی نکالیں گے۔"

غالب نے اسے پُرملامت نظروں سے دیکھا "ہم زبردستی کرسکتے ہیں اس بوڑھے کے ساتھ! اور وہ بھی چرچ میں؟ ہم پر دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کا احترام واجب ہے، بلکہ فرض ہے۔"

میں نے کہا "رائٹ۔ ہم زور زبردستی نہیں کرسکتے۔ ہمارے لئے دوسری صورت کیا رہ جائے گی؟"

"مجھے یقین ہے وہ ایک نیک کام میں تعاون سے انکار نہیں کرے گا" غالب نے کہا "اس کو لمبی کتھا سنانے کی ضرورت نہیں، ابتدا سے اب تک جو معاملات دلاور یا استاد پیڈرو سے شروع ہوئے تھے اور تریوینی تک آگئے ہیں ان کا حوالہ غیر ضروری ہوگا۔"

"پھر سنانے کو کیا رہ جائے گا؟" نازو نے کہا۔

غالب نے کہا "ہم مختصرات کرسکتے ہیں کہ ہم دہرے قتل کی اس واردات کے محرکات سے واقف ہیں اور ہمارا خیال ہے کہ ہم دوبارہ دیکھ کر قاتلوں کو شناخت کرسکتے ہیں اور ہمیں ان کے آخری رسوم میں شریک ہونے کا یقین ہے۔ وہ غیر متعلق افراد نہیں ہیں چنانچہ وہ سائمن کے دوست اور ہمدرد بن کے آخری رسوم میں بھی شامل رہیں گے۔ ویسے پولیس کا بھی ایک آزمودہ نظریہ ہے کہ قاتل واردات کے بعد لاتعلق ہوکے چین سے نہیں بیٹھتا۔ وہ تفتیش پر نظر رکھتا ہے اور یہ دیکھتا رہتا ہے کہ معاملات کس نہج پر جارہے ہیں چنانچہ اکثر وہ جائے واردات پر بھی پھر جاتا ہے ورنہ آس پاس ضرور منڈلاتا ہے۔ خوف اور تجسس اسے مجبور کرتے ہیں، یہ جاننے کے لئے وہ اپنے پلان میں کس حد تک کامیاب رہا تھا اور اگر نادانستگی میں اس نے کوئی سراغ چھوڑ دیا تھا تو اسے اب کیسے مٹایا جاسکتا ہے۔ ہم پادری کو قائل کرنے کی کوشش کریں گے کہ وہ ہمیں ان قاتلوں کے چہرے چھپ کر دیکھنے کے مواقع فراہم کرے۔ کسی مجرم کو کیفرِ کردار تک پہنچانا اور قانون کی مدد کرنا یقیناً ایک نیکی ہے۔"

"اس تجویز کی معقولیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا" میں نے اٹھتے ہوئے کہا "ایک تجویز میری بھی ہے جو میں راستے میں بتاؤں گا۔ ابھی چلو یہاں سے۔"

باہر آکے نازو نے کہا "کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم ایک پرائیویٹ کار لے لیں کرائے پر۔"

"اس کے لئے کاغذات درکار ہوتے ہیں" میں نے کہا۔

"اگر ڈرائیور کے ساتھ کار لی جائے تو صرف ڈرائیور کا مطمئن ہونا ہی کافی ہے" نازو نے کہا۔

غالب نے کہا "کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔ یہ تو سامنے اتنی کاریں کھڑی ہوئی ہیں سب کرائے کے لئے ہیں۔"

"ٹیکسی کے مقابلے میں ایک پرائیویٹ کار یقیناً زیادہ بہتر ہوگی" میں نے بھی اس تجویز کو قبول کرلیا۔

ہر پرائیویٹ کار کا ڈرائیور چاہتا تھا کہ ہم اس کو خدمت کا موقع دیں۔ نہ جانے کیوں ان کا خیال تھا کہ ہم شہر میں اجنبی ہیں اور سیر کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے ایک پنجابی سکھ ڈرائیور کا انتخاب کیا جس کے ساتھ ہم بہتر تعلقات استوار کرسکتے تھے۔ بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والوں میں کسی ہم زباں کا مل جانا بقول شاعر بہتر ہے ملاقات مسیحا و خضر سے۔ میری پنجابی پر سکھ ڈرائیور کا چہرہ کِھل اٹھا۔

"او جی بادشاہو، ایدر آؤ، شاہی سواری وِچ۔ چھڈو پراں ایناں لوکاں دے کھٹاریاں نوں۔" اس نے بڑی مستعدی سے اپنی گاڑی کے دروازے کھول کر کہا "اے تواڈی اپنی گڈی جے۔"

ہم نے سردار جی کے جذبات کی قدر کی ورنہ درحقیقت دوسری کاروں کے مقابلے میں انہی کی گاڑی کو کھٹارا سمجھا جاسکتا تھا۔ دوسرے مدراسی، گجراتی اور بنگالی ڈرائیوروں نے برا مانے بغیر پسپائی اختیار کرلی۔ زبان کا رشتہ بہت مضبوط ہوتا ہے۔ اگر کوئی اُن کا ہم وطن مل جاتا تو ان کو ترجیح دیتا۔ اگر میں روانگی کے بعد یہ کہتا کہ ہمیں صرف سینٹ اینڈریو کے چرچ جانا ہے تو ان کا سارا جوش وجذبہ سرد پڑجاتا۔ شاید وہ ایک دم بے مروّت ہوکے کہہ دیتے کہ اتنی دور جانا تھا تو سڑک پر سیکڑوں ٹیکسیاں پھر رہی تھیں، مجھے کیوں خوار کیا۔

"ہاں جی، ہن دسو..... کتھے چلئے" سکھ نے بڑی خوش دلی سے کہا "خیر نال کتھوں آئے او، لگدے اپنے جلندھر دے او۔"

میں نے تردید نہیں کی اور کہا "ابھی پہلے تو چلیں سینٹ اینڈریوز چرچ، اس کے بعد رات بارہ بجے تک بہت وقت ہے، سارا شہر گھومیں گے۔"

نازو نے میری پنجابی کو آگے بڑھایا "سردار جی، سانوں لُٹ نہ لینا پردیس وِچ۔"

سردار جی اچھلے "او کڑیئے، کیسی گلاں کرنی ایں، تینوں لُٹ کے اسی کنّے امیر ہوجاواں گے۔"

نازو نے کہا "پھر بھی بتادیں، کتنے پیسے ہوں گے؟"

سردار جی نے مجروح لہجے میں کہا "او یار، اے کیدی وولی اے؟ کیسا سوہنا روپ دِتا اے رب نے، تے گلاں کیسی کردی اے۔ او بابا، جو تیرا دل کرے.... جو تیری خوشی ہووے، دے دیں، وے کڑیئے۔"

میں نے کہا "سردار جی، ہم پانچ سو دیں گے، کم ہیں تو ہمیں ا[illegible]"

سردار جی کا چہرہ کھل اٹھا۔ پانچ سو ان کی توقعات سے کہیں

لیکن انہوں نے قبول کرتے ہوئے یہی ظاہر کیا جیسے [illegible] تو بالکل نہ ہونے کے برابر ہے مگر وہ زبان کے رشتے سے [illegible] ہیں اور ازراہِ التفات یہ بھی قبول کرلیں گے۔

ہم پھر سینٹ اینڈریوز چرچ پہنچے تو شام کے پانچ بجے تھے لیکن وہاں خانہ ویرانی کا ماحول بدلا نہیں تھا۔ ابھی تک نہ کہیں پولیس نظر آرہی تھی اور نہ آخری رسوم کے شرکا کی صورت۔

"یہاں تو وہی کیفیت ہے" غالب نے کہا "نہ آدم نہ آدم زاد۔"

"کہیں تدفین کل پر ملتوی نہ ہوگئی ہو" نازو نے کہا۔

میں نے کہا "سب کچھ ہوسکتا ہے۔ قانونی معاملات خود اپنی چال چلتے ہیں۔ کسی کے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ خود سائمن [illegible] تاخیر چاہتا ہوگا۔ وہ خود بھی پولیس افسر ہے اور خواہ اس کی ایمانداری سے افسرانِ بالا کتنے ہی ناخوش کیوں نہ ہوں، اس وقت اسے سب کی ہمدردی حاصل ہوگی۔ پھر بھی دیر ہورہی ہے تو وہ مجبور ہے۔"

میں نے سردار جی سے کہا کہ وہ گاڑی باہر لے جائیں اور انتظار کریں۔ ان کی صورت پر کچھ ناخوشی اور عدم اطمینانی کے آثار جھلکنے لگے۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ چرچ کے احاطے میں پارکنگ کی اجازت نہیں ہے اور مزید اطمینان کی خاطر انہیں پورے پانچ سو پیش کردئے۔

"آپ فکر مت کریں، ہم پچھلی دیوار سے کود کر فرار نہیں ہوں گے۔"

ایک خفت آمیز ہنسی کے ساتھ انہوں نے کہا "او نئیں یارا۔ کیسی غلط گل کیتی اے توں" مگر پانچ سو فوراً جیب میں رکھ لئے۔ پھر وہ گاڑی کو ریورس گیئر میں واپس لے گئے۔

نازو نے برا مان کے کہا "ایسی بات کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اگر اسے اعتماد نہیں تھا ہم پر تو سودے کر چھٹی کردیتے۔"

غالب نے بھی کہا "اگر وہ عقل مند ہوگا تو انتظار کیوں کرے گا، جاکے دوسری سواری اٹھائے گا۔"

میں نے کہا "اگر وہ نہ گیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس پر بھروسا کیا جاسکتا ہے۔ پانچ سو میں ایک بااعتماد کار ڈرائیور کی خدمات حاصل ہوجائیں، اور کیا چاہئے۔"

پُراسرار پادری پھر ایسے آیا کہ ہم سب چونک پڑے۔ ہم سب چرچ کے صدر دروازے کی طرف سے اس کے نمودار ہونے کی آس لگائے کھڑے تھے۔ وہ پیچھے سے نکل آیا۔

"ہیلو ایوری بوڈی" اس نے عادتاً سینے پر صلیب بنائی "گاڈ بلیس یو، تم پھر آگئے؟"

میں نے پُرمتانت انداز میں اس سے ہاتھ ملایا "مجھے یقین تھا کہ آپ کی نگاہیں دھوکا نہیں کھائیں گی۔ آپ نے ہمیں پہچان لیا۔"

"اب کیوں آئے ہو؟" اس نے مسکرا کے اپنی ہوشیاری اور دانائی پر پیش کئے جانے والے اس خراجِ عقیدت کو قبول کیا "کیا مسئلہ ہے کہ تم یوں بھیس بدل بدل کے آرہے ہو؟"

میں نے کہا "ہم اعتراف کے لئے آئے ہیں۔"

"اعتراف! کیا تم کرسچین ہو؟" اس نے ہمیں غور سے دیکھا۔

"نہیں۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ کیا آپ کے سامنے کسی اور کا اعتراف کرنا ممنوع ہے؟ آخر ہم بھی اہلِ کتاب اور ایک خدا پر یقین رکھنے والے لوگ ہیں، سب پیغمبروں کو برحق مانتے ہیں۔"

"تم ہندو نہیں ہو؟"

میں نے کہا "ہندو اہلِ کتاب تو نہیں ہوتے، ہم مسلمان ہیں۔"

اس نے کچھ دیر سوچا اور پھر کہا "اوکے، اندر آجاؤ... میں خدا کے گھر کا دروازہ کسی پر بند نہیں کرسکتا۔"

اس نے بلند وبالا مرکزی دروازہ کھولا۔ اس کے دونوں پٹ پرانی شیشم کی لکڑی کے بنے ہوئے تھے اور ان پر ماہر ہاتھوں نے جو نقش ابھارے تھے وہ ایک صدی گزر جانے کے بعد بھی احساسِ حسن کو اجاگر کرتے تھے۔ پالش سے چمکتا ہوا بھاری دروازہ کسی آواز کے بغیر کھلا اور ہمارے پیچھے ایک دھماکے سے بند ہوگیا۔ اس کی گونج عبادت گاہ کے ہال کی دیواروں کا نتیجہ تھی جو بلند اور سپاٹ تھیں۔ اندر کی چھت بیضوی اور درمیان سے اوپر اٹھی ہوئی تھی۔ مرکز میں چھت کی بلندی تیس پینتیس فٹ سے کم نہ تھی۔ چاروں طرف دیوار کے اوپر والے حصے میں لمبوترے رنگین شیشوں والے روشندان ایک قطار میں بنے ہوئے تھے جن کی لمبی لمبی ڈوریاں انہیں کھولنے اور بند کرنے کے کام آتی تھیں۔ سارے روشندان بند تھے۔ دونوں جانب دیواروں پر نصب پیتل کی منقش لائٹس میں دودھیا بلب روشن تھے۔ ہال میں زیادہ سے زیادہ ڈھائی تین سو افراد کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ درمیان سے گزرنے والے راستے کے دونوں طرف صاف ستھری، مضبوط بینچوں پر گرد کا ایک ذرہ نہ تھا۔ راستہ تھوڑا سا مائل بہ نشیب تھا اور اس پر سرخ رنگ کا دبیز قالین ڈال دیا گیا تھا چنانچہ ہم میں سے کسی کے قدموں کی چاپ بھی سنائی نہ دیتی تھی۔ اندر کے ماحول میں ایک ایسی پُرہیبت اور پُرتقدس خاموشی تھی جس کا بوجھل پن اعصاب پر محسوس کیا جاسکتا تھا۔

پادری ہمیں منبر کے پیچھے ایک کمرے میں لے گیا جہاں ایک میز کے گرد چند کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ میز پر تازہ پھولوں کا گلدستہ تھا۔ پادری نے ہم سب کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی بیٹھ گیا۔

"ویل، اب کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟" پادری نے کہا۔

میں نے اتنی دیر میں تمہید کے لئے مناسب الفاظ کا انتخاب کرلیا تھا تاکہ اپنا مافی الضمیر بیان کرتے ہوئے مجھے عدم اعتماد کی جھجک کا احساس نہ ہو۔

"ہولی فادر! یہ بات یقیناً آپ کے دل میں نزاع پیدا کرنے کے لئے کافی ہے کہ ہم پہلے پولیس کی وردی میں یہاں آئے تھے۔ جب کہ درحقیقت ہم پولیس کے اہلکار نہیں ہیں۔ اس خیال نے ہمیں اتنا شرمندہ کیا کہ اب ہم پھر آپ کے سامنے اصل روپ میں حاضر ہیں۔ دراصل ہم مجبور تھے' ہمارے لئے بھیس بدلے بغیر خود کو چھپانا مشکل تھا۔"

"تم کس سے چھپنا چاہتے تھے؟"

میں نے کہا "انہی دشمنوں سے جو دو محترم خواتین کے قاتل ہیں۔ میری مراد انسپکٹر سائمن کی والدہ اور بہن سے ہے۔"

"کیا تم ان کو پہچانتے ہو۔۔۔ اور جانتے ہو؟"

"یس ہولی فادر۔ ہمارا خیال ہے کہ ان کے سوا کوئی ایسی وحشیانہ درندگی کا ثبوت نہیں دے سکتا اور ہمارے آخری رسوم میں شریک ہونے کا مقصد بھی یہی ہے کہ ہم ان کو شناخت کریں۔"

"گویا تمہیں یقین نہیں ہے کہ قاتل وہی ہیں؟"

"اس میں شک کی گنجائش ضرور ہے لیکن بہت کم" میں نے کہا۔

پادری نے کہا "اگر بالفرض ایسا ہی ہے تو تم کیسے امید رکھتے ہو کہ وہ آخری رسوم میں شریک ہوں گے؟"

"خود کو بے گناہ اور معصوم ثابت کرنے کے لئے وہ غمگساروں میں شامل ہوں گے اور ہمدردی کا بھرپور مظاہرہ کریں گے" میں نے کہا۔

"پھر تم ان کو کیسے قاتل ثابت کرو گے؟"

میں نے کہا "پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم ان کو یہاں دیکھ لیں۔۔۔ مگر اس طرح کہ وہ ہمیں نہ دیکھ پائیں۔"

"یہ کیسے ممکن ہے؟"

"اس لئے ہم پولیس کی وردی میں آئے تھے' لیکن پھر ہمیں خطرہ محسوس ہوا کہ پولیس ہمیں پہچان جائے گی جیسے آپ نے پہچان لیا تھا" میں نے کہا۔

"تم مرنے والوں کے ہمدرد اور دوست ہو' انسپکٹر سائمن بھی تمہیں جانتا ہو گا؟"

"اچھی طرح فادر" میں نے یقین کے ساتھ کہا "آپ اس سے تصدیق کرا سکتے ہیں کہ یہ سب سچ ہے اور اس کو ہمارے سامنے لا کے ہمارے بارے میں کچھ بھی معلوم کر سکتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ وہ پہلے آئے گا تو میں اس کو یہاں بلا لوں گا۔ اب تم یہ بتاؤ کہ ان دونوں عورتوں کو کیوں قتل کیا گیا تھا؟ اور تمہارا اس قتل میں دلچسپی لینا کیا معنی رکھتا ہے' تم پولیس کا کام خود کرنے کے لئے بے چین کیوں ہو؟" پادری نے کہا۔

"بات یہ ہے ہولی فادر کہ ہمارے وہ دشمن، درحقیقت شرافت اور انسانیت کے دشمن ہیں۔ وہ ہر بھیانک جرم کرنے کی لامحدود صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو بدمعاش اور دادا کہلا کے فخر کرتے ہیں۔ جوئے خانے اور قحبہ خانے چلاتے ہیں۔

اسمگلر ہیں اور مجرموں کے سرپرست ہیں۔ آج کل وہ اسلحہ کی ناجائز تجارت سے دولت کما رہے ہیں۔ یہ اسلحہ وہ باہر سے منگواتے ہیں اور مشرقی پاکستان بھیجتے ہیں جہاں تخریب کاروں اور علیحدگی پسندوں کی شورش کے باعث خانہ جنگی کی کیفیت ہے۔ آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ کتنا مذموم شیطانی کاروبار ہے۔ جو اسلحہ وہاں کی منڈی میں دگنے چوگنے داموں پر بیچا جاتا ہے وہ پیشہ ور قاتلوں اور لوٹ مار کرنے والے غنڈہ عناصر کے ہاتھوں میں دے دیا جاتا ہے۔ اس سے وہاں خونریزی کا بازار گرم ہے۔ سیکڑوں ہزاروں بے گناہ' نہتے انسان روز موت کے گھاٹ اتارے جا رہے ہیں۔ عورتیں بیوہ ہو رہی ہیں اور بچے یتیم۔ لیکن اس گروہ کو صرف اپنے منافع سے سروکار ہے۔"

"خدا ہم سب کو اپنی امان میں رکھے" پادری نے کہا "اگر یہ سب سچ ہے۔۔۔۔"

"اس میں ایک لفظ بھی جھوٹ نہیں ہے" میں نے کہا "ہم خدا کے گھر میں سچ بولنے کے لئے آئے ہیں۔"

"او کے۔ تم مجھے ان کے نام بھی بتا سکتے ہو۔"

"ان کے ناموں کی کوئی اہمیت نہیں ہے' یہ لوگ گرگٹ کے رنگ بدلنے سے پہلے اپنا نام بدل سکتے ہیں۔ پھر بھی میں آپ کو چند نام بتاتا ہوں۔ چوہدری دلاور' استاد پیڈرو' حاجی عبداللہ تریویدی۔"

"میں نے کوئی نام پہلے نہیں سنا!" وہ حیرت سے بولا۔

"آپ جس دنیا میں رہتے ہیں ہولی فادر' وہاں یہ نام کون لیتا ہے؟ آپ شرافت' نیکی اور راستی کی دنیا کے مکین ہیں" میں نے کہا۔

"پھر کیا تم انہی کی دنیا کے مکین ہو؟" پادری نے کہا۔ "تمہارے اور ان کے درمیان بھی کوئی واسطہ نہیں ہونا چاہئے اگر تم شریف آدمی ہو۔"

"ہم شریف آدمی ضرور ہیں۔۔۔ لیکن ہماری بدقسمتی کہہ لیں یا بے وقوفی۔۔۔ کہ ہم نے خود ان سے دشمنی مول لی۔ ہم ان کے کاروبار کو تباہ کرنے پر تل گئے اور انہیں ہم سے کافی نقصان ہوا۔ کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ حسب توفیق سب کو برائی کے خلاف جنگ لڑنی چاہئے۔ اور بدی کو جڑ سے اکھاڑ کے پھینکا جا سکتا ہے' اگر انفرادی طور پر سب طے کر لیں کہ وہ عملاً برائی کا قلع قمع کرنے والوں کا ساتھ دیں گے۔ لوگ ذاتی نقصان سے ڈر جاتے ہیں اور خود غرضانہ سوچ رکھتے ہیں ورنہ معاشرے کی اجتماعی طاقت کے سامنے کون ٹھہر سکتا ہے۔ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ پولیس جیسے ادارے بھی انہی کے زرخرید ہو گئے ہیں۔۔۔"

پادری بے حد متاثر نظر آنے لگا تھا اور آہستہ آہستہ میری بات میں روانی آتی جا رہی تھی۔ میں نے دس پندرہ منٹ تک فصاحت و بلاغت کے جوہر دکھائے اور پادری کی حمایت حاصل

کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

"تمہارے خیالات بہت امید افزا ہیں مائی سَن' خدا ابھی اپنے بندوں سے مایوس نہیں ہوا ورنہ تم جیسے بہادر نوجوان پیدا نہ ہوتے" پادری نے کہا "میری دعا ہے کہ خدا تم کو اپنی امان میں رکھے اور اس جدّوجہد میں کامیابی عطا کرے۔ بتاؤ میں تمہارے لئے کیا کر سکتا ہوں؟"

میں نے کہا "مجھے پورا یقین تھا کہ آپ سچائی کا ساتھ دیں گے۔ اب جیسا کہ میں نے کہا' ہم نہیں چاہتے کہ دشمن ہمیں شناخت کرے لیکن ہم ان کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ ممکن ہے ان کے یہاں آنے کا ایک مقصد ہمیں تلاش کرنا بھی ہو۔ اگر ہم بھیس بدل کر آخری رسوم میں شریک ہوں تو ان پر نظر رکھ سکتے ہیں اور ان کی حرکات و سکنات سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ کس حد تک بے قتل کی اس واردات میں شریک تھے۔"

"یہ بات میں ابھی تک نہیں سمجھ سکا کہ ان دو عورتوں کو قتل کرنے کا کیا مقصد تھا! کیا وہ بھی ان کی دشمن تھیں؟"

میں نے کہا "وہ غلط فہمی میں ماری گئی ہیں' قتل وہ ہمیں کرنا چاہتے تھے۔"

"یہ بہت عجیب بات ہے۔ خیر' مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا اگر تم چھپ کے انہیں دیکھتے رہو۔ یہ نہ ہو کہ خدا کے گھر میں بھی کشت و خون کی نوبت آ جائے۔ تم باہر تدفین کے وقت آ سکتے ہو" پادری نے کہا۔

"مسئلہ وہی ہے فادر' پھر وہ ہمیں دیکھ لیں گے اور پہچان لیں گے۔ ہاں اگر ہم ایسا بھیس بدل لیں کہ انہیں گمان تک نہ ہو۔۔۔ مثلاً۔۔۔ مثلاً ہم بھی چرچ کے نمائندے کی حیثیت سے موجود ہوں۔"

"آخر کیا مطلب ہے اس بات کا؟" پادری نے نرمی سے کہا۔

"اگر ایسا ہی راہبانہ لباس مل جائے۔ مجھے اور میرے ساتھی کو۔ اور اس لڑکی کے لئے نن کا لبادہ ہو تو ہمارا کام بہت آسان ہو جائے گا' ہم آپ کے بہت شکر گزار ہوں گے۔"

پادری نے پہلے تو اس تجویز کو صاف رد کر دیا لیکن میں نے اپنی کوشش جاری رکھی اور اسے دلائل دیتا رہا کہ اس طرح بد کا مقابلہ نیکی ہے اور اس میں کوئی بات خلافِ قانون نہیں ہو گی۔ آخر کار وہ مان گیا مگر اس نے شرط عائد کی کہ ہماری مدد کرنے سے پہلے وہ انسپکٹر سائمن سے تصدیق حاصل کرے گا۔ میں نے یہ شرط منظور کر لی۔

چھ بجے کے قریب باہر کوئی گاڑی آ کے رکی۔ یہ لمبی سیاہ کار تھی جس میں سے یکے بعد دیگرے لکڑی کے بنے ہوئے دو تابوت اتارے گئے۔ اسی گاڑی سے افسردہ اور تھکن سے بے حال نظر آنے والا سائمن اترا۔ جنازہ گاڑی کے پیچھے بھی چند کاریں تھیں۔ ان میں سائمن کے عزیز و اقارب اور دوست رشتے دار تھے۔ دونوں تابوت اٹھا کے ایک خاموش جلوس کی صورت میں یہ سب

لوگ چرچ کے اندر داخل ہو گئے۔ دونوں تابوت میز کے پاس رکھ دیئے گئے۔ اگلی صف کی ایک بینچ پر سائمن بیٹھ گیا۔ کچھ لوگوں نے اس سے رسمی تعزیت کے الفاظ کہے اور پھر پیچھے والی بینچوں پر جا بیٹھے۔ سادہ کپڑوں میں چند پولیس والے آخر میں آئے۔ وہ بھی رسما سائمن کے پاس گئے اور پھر مختلف مقامات پر جا بیٹھے جہاں سے وہ سب پر نظر رکھ سکتے تھے۔ ان کی وضع قطع بتاتی تھی کہ وہ پولیس کے لوگ ہیں۔ پھر جس طرح وہ اپنی عقابی نظریں ہر طرف ڈال رہے تھے اس سے بھی صاف ظاہر ہو جاتا تھا کہ وہ آخری رسوم میں شرکت کے لئے نہیں قانونی کارروائی پوری کرنے کے لئے آئے ہیں۔

پادری نے سائمن کو اندر بلوایا۔ ہم سب ابھی تک اسی کمرے میں موجود تھے۔

"تم۔۔۔!" سائمن نے مجھے اور غالب کو دیکھ کر حیرانی سے کہا۔ "تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

میں نے اس سے ہاتھ ملانے کے بعد کہا "ہم اپنے مشن پر ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ ہمارے وہ دشمن یہاں آئیں گے جن کو ہم تمہارے ساتھ ہونے والے ظلم کا ذمے دار سمجھتے ہیں۔"

"تم پاگل ہو اگر ایسا سمجھتے ہو" سائمن نے کہا "وہ یہاں کیسے آ سکتے ہیں؟"

میں نے کہا "چوہدری دلاور یا تریویدی اگر خود نہیں آئیں گے تو اپنے شکاری کتوں کو ضرور بھیج دیں گے' ان کو بھی ہم پہچانتے ہیں۔"

"وہ بھی تمہیں پہچانتے ہیں' یہ مت بھولو" سائمن نے کہا۔

"ہم اپنی حفاظت کے خیال سے غافل نہیں ہیں" میں نے کہا "اور ہولی فادر کو ہم نے سب کچھ بتا دیا ہے۔ ان کی مدد اور ان کی دعا ہمارے ساتھ ہے۔ تم انہیں صرف یہ یقین دلا دو کہ نہ ہم غلط قسم کے لوگ ہیں اور نہ کوئی غیر قانونی یا غیر اخلاقی کام کر رہے ہیں۔"

"اس بات کی میں ضمانت دے سکتا ہوں کہ یہ لوگ بہادر' نیک اور دوستی کے قابل ہیں' ان کی مدد کرنا انسانیت کی فلاح کے لئے ضروری ہے" سائمن نے غیر متوقع طور پر ہمارے حق میں دوٹوک گواہی دے دی اور وہ بھی بہت پرستائش الفاظ میں۔ اس کے بعد پادری کے لئے شک کی گنجائش ہی نہ رہی۔

میں نے سائمن کا شکریہ ادا کیا۔ وہ واپس جانے کے لئے مڑا اور رک گیا۔

"سکندر' مجھے امید ہے کہ اس موقع پر تم یہاں کسی کارروائی سے اجتناب کرو گے۔"

میں نے کہا "تم مجھ پر اعتماد رکھو' میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں کہ حالات کی نزاکت کو نہ سمجھوں یا موقع محل دیکھے بغیر کوئی ایسی ویسی حرکت کروں جس سے تمہیں ہی نہیں مجھے بھی شرمندگی ہو۔"

اس کے جانے کے بعد پادری نے کہا "میرے ساتھ آؤ'

میں تم کو سمجھاتا ہوں کہ تمہیں کیا کرنا ہوگا۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ پادری کی مدد کے بغیر ہم نہ وہ لباس صحیح طور پر پہن سکتے تھے اور نہ اپنا کردار صحیح ادا کرسکتے تھے۔ چرچ کی ایک خادمہ نے پادری کی ہدایات کی روشنی میں ہمارے لئے ضرورت کا سب سامان فراہم کیا اور ہمیں تیار ہونے میں بھی مدد دی۔ اس اثنا میں چرچ کے اندر آخری رسوم شروع ہوگئی تھیں۔ پادری میز پر کتابِ مقدس سے اقتباس پڑھ رہا تھا اور اس کی گونجتی ہوئی پاٹ دار آواز ہمارے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ ...آخر کار عبادت ختم ہوئی اور تابوت پر پھول رکھے گئے۔ کسی نے آرگن پر ماتمی دھن بجانی شروع کی اور تابوت اٹھانے والے آگے بڑھے۔ انہوں نے کنڈے پکڑ کے تابوت اٹھائے اور آہستہ آہستہ دروازے کی طرف چلنے لگے۔ سوگواروں کا یہ جلوس چرچ کے گرد گھوم کر پیچھے پہنچا جہاں ایک چھوٹا سا قبرستان تھا۔ شام کے سائے گہرے ہوچکے تھے اور قبرستان میں ایک بجھتا ہوا اداس اجالا بھی دم توڑ رہا تھا۔ جنازے کے پیچھے چلنے والوں کا ہجوم دیکھنے سے مجھے اندازہ ہوا کہ بعد میں بھی بہت لوگ آئے تھے اور وہ سب کرسچین نہیں تھے۔ ان میں سائن کے کئی افسران بھی تھے' اس کے پڑوسی بھی اور جاننے والے بھی۔ بالکل آخری وقت میں پیچھے والا دروازہ کھول کے میں' غالب اور نازو بھی جلوس میں شامل ہوگئے۔ ہمارے لبادے سیاہ تھے اور ہمارے سروں پر سیاہ ٹوپیاں تھیں۔ نازو بھی سرتاپا سیاہ لباس میں تھی اور اس کا چہرہ نظر آرہا تھا۔ سیاہی کے پس منظر میں اس کا رنگ زیادہ روشن نظر آنے سے گڑبڑ ہوسکتی تھی چنانچہ اس نے سامنے کے حصے پر اور کھلے ہاتھوں پر سیاہی مل لی تھی۔ ہمارے ہاتھوں میں عام کتابیں تھیں لیکن ہم ایسے چل رہے تھے جیسے مناجات پڑھتے جارہے ہوں۔ سوگواروں کی بھیڑ نے خود ہمارے لئے راستہ چھوڑ دیا۔ ہم سر جھکائے آگے بڑھتے گئے۔ سب سے آگے نازو تھی۔ اس حلئے میں کوئی اسے قریب سے دیکھ کے بھی شناخت نہیں کرسکتا تھا چنانچہ اس کے پیچھے ہم بھی خود کو محفوظ سمجھ رہے تھے۔ ہمیں یقین تھا کہ اگر کسی نے سرسری نگاہ ڈالی تو نازو کو دیکھنے کے بعد ہمیں غور سے دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرے گا۔

قطار میں بنی ہوئی قبروں کے درمیان ایک جگہ دونوں تابوت رکھ دیئے گئے۔ سوگوار حلقہ بنا کے دور کھڑے ہوگئے۔ پادری نے کتابِ مقدس سے مناجات کا درس جاری رکھا۔ ہم تینوں اس سے چند قدم پیچھے سرنگوں کھڑے رہے اور کن انکھیوں سے ان سب کی صورتوں کو دیکھتے رہے جو ہمارے آس پاس موجود تھے۔ اچانک احاطے کے بیرونی دروازے کی طرف سے ایک شخص نمودار ہوا۔ اس نے بہت پرانا' میلا اور بوسیدہ سوٹ پہن رکھا تھا اور میلی کچیلی مسلی ہوئی ٹائی لگا رکھی تھی۔ اس کا پیٹ بھی مضحکہ خیز تھا مگر یہاں اس کا تمسخر اڑانے کی جرأت کوئی نہیں کرسکتا تھا۔ وہ شخص' آہستہ آہستہ آگے آیا تو میں نے اس کے ہاتھ میں ایک سفید چھڑی دیکھی۔ وہ نابینا تھا اور بڑی مشکل سے قبروں کے درمیان راستہ تلاش کرتا آرہا تھا۔ میرا دل پہلے تو دھڑکنا بھول گیا۔ پھر میں نے آہستہ سے سر گھما کے غالب کی طرف دیکھا اور کہا۔ "محسن۔"

غالب نے سر کی خفیف سی حرکت کے ساتھ میرے خیال کی تائید کی اور یہی بات نازو کو بتائی۔

نازو نے بھی اقرار میں سرہلایا اور مزید کچھ کہا۔ اس کی بات غالب کے ذریعے مجھ تک سرگوشی میں پہنچی۔ اس نے کہا تھا۔ "برے پھنسے" جب میں نے اپنے دائیں جانب اور پھر بائیں جانب دیکھا تو شک کی گنجائش بھی نہ رہی۔

اگرچہ اس ہجوم میں ابھی تک مجھے کسی آشنا صورت کی جھلک تک دکھائی نہیں دی تھی لیکن اس سے میرے یقین میں کمی نہیں آئی تھی۔ محسن کا وہاں پہنچ جانا ہی میرے اندازوں کی درستگی کا ثبوت تھا اور ان حالات میں یہ ایک منطقی نتیجہ تھا جو میرے ذہن نے دلائل کی روشنی میں اخذ کیا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے میدان جنگ میں ایک ہی فوج کے ایک ساتھ لڑنے والے فوجی دستے بچھڑ جائیں اور ان کے درمیان ہر قسم کا رابطہ بھی ختم ہوجائے تو وہ اپنی ذہنی تربیت' تجربے اور مشاہدے کو قیاس کی بنیاد بناتے ہوئے اپنی قوت کو ایک جگہ مرتکز کرنے کی حکمتِ عملی وضع کرتے ہیں۔ ظاہر ہے انہیں سوچنا پڑتا ہے کہ اس قسم کے حالات میں ہر دستے کا کمانڈر کیا کرے گا؟ دشمن اس صورت حال کو اپنے حق میں رکھنے کے لئے کیا اقدام کرے گا اور ان سب کو مل کر دشمن کو ناکام بنانے' اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے کس طرح ایک مربوط کارروائی کی پیش بندی کرنا ہوگی؟ اگر ان کے درمیان مکمل ذہنی ہم آہنگی' ایک سی پلاننگ کا ڈسپلن اور درست اندازے قائم کرنے کی صلاحیت چھٹی حس کی طرح موجود ہو تو وہ پھر متحد ہوجاتے ہیں اور دشمن کی "اسٹرے ٹیجی" انہیں منتشر نہیں رکھ سکتی۔

میں سمجھتا تھا کہ حادثاتی طور پر ہم سے جدا ہوجانے والے محسن کا ذہن کن خطوط پر سوچے گا۔ میرے خیال کو کسی حد تک حالات کی کسوٹی نے حقیقت ثابت کیا تھا۔ محسن بھی انہی راستوں پر محوِ سفر رہا تھا جن پر ہم چل رہے تھے۔ فرق صرف وقت کی عدم مطابقت سے پڑا تھا۔ کہیں وہ ہم سے پہلے پہنچ گیا تھا تو کہیں ہم اس سے پہلے جا پہنچے تھے۔ اس تلاش رائیگاں کی بہرحال ایک حد تھی۔ میرے اندازے کے مطابق یہی وہ جگہ تھی جہاں سب شکاری اکٹھے ہوسکتے تھے۔ جیسے ہم پُریقین تھے کہ دلاور اینڈ کمپنی کے زرخرید قاتلوں کا ٹولہ اور ان کے اشاروں کے غلام' خون آشام شکاری کتوں کا گروہ اس اجتماع کو نظر انداز نہیں کرسکتا' ایسے ہی انہیں بھی امید ہوگی کہ ہم ایک دوسرے کی تلاش میں چھپ کر یہاں پہنچنے کی کوشش ضرور کریں گے۔

مجھے دلاور اور ترپاٹھی کے انتقامی جذبات کی شدت اور مسلسل ذلت کی اذیت کا بھی اندازہ تھا۔ وہ پے در پے ناکامیوں سے زخم خوردہ تھے۔ متعدد بار ہزیمت کی رسوائی جھیل چکے تھے اور مسلسل نقصانات کا صدمہ ان کو آتشِ زیرپا کرنے کے لئے کافی تھا۔ انہوں نے اپنے شیطانی کاروبار کو ہم سے خفیہ رکھنے کے لئے اس بار غیر معمولی حفاظتی انتظامات کا سہارا لیا تھا۔ ان کی توقعات کو پہلی شکست اس وقت ہوئی تھی جب بمبئی پہنچتے ہی ہم نے ان کا سراغ لگا لیا تھا۔ ان کے ٹھکانے معلوم کرلئے تھے اور ان کے نئے حواریوں کا پتا چلا لیا تھا۔ انہیں دوسری مایوسی کا سامنا اس وقت ہوا تھا جب ہم ان کے پھیلائے ہوئے ہر دام جال کو توڑ کے نکل گئے اور ان کی داداگیری کی ساکھ کو خاک میں ملا دیا۔ ہماری تیسری بڑی کامیابی یہ تھی کہ ہم نے ان کا بے حد خفیہ کوڈ حاصل کرلیا اور اسے سمجھ کے ایک ایسے ٹھکانے تک جا پہنچے جس کو وہ انتہائی محفوظ اور ہمارے وہم وگمان کی دسترس سے دور سمجھتے تھے۔ اگرچہ پہلے بھی ہم نے متعدد بار ان کے اسلحہ خانوں کو نیست ونابود کیا تھا مگر بالک رام کے انتہائی پوشیدہ اسلحے کے گوداموں کی تباہی کو ہماری اب تک کی سب سے بڑی کامیابی سمجھا جاسکتا تھا۔ اسے بچانے کے لئے دلاور اور ترپاٹھی نے اپنی ساری قوت میدان جنگ میں جھونک دی تھی لیکن اتنے کشت وخون کے بعد بھی وہ اپنی کروڑوں کی سرمایہ کاری کو دھوئیں کا غبار بن کر اڑنے اور راکھ کا ڈھیر ہونے سے نہ بچا سکے تھے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دشمنوں نے شہلا کی اور اس کے بیٹے کی زندگی کو داؤ پر لگا کے یہ سمجھا تھا کہ اس جذباتی بلیک میلنگ سے وہ ہماری مزاحمت کا جذبہ اور مدافعت کا حوصلہ خرید لیں گے۔ ...یہ ٹرمپ کارڈ ابھی تک انہی کے ہاتھوں میں تھا لیکن اس سے انہیں ہاری ہوئی بازی جیتنے کا کوئی موقع نہیں ملا تھا۔ ہر تازہ شکست انہیں احساس دلاتی تھی کہ اپنی ساری شہ زوری' بدمعاشی کی طاقت اور مالِ حرام کی قوتِ خرید کے باوجود وہ ابھی تک روزِ اول کی طرح بے بس ولاچار ہیں۔ اپنی رسوائی کے ہر زخم کی اذیت جب ان کے فرعونی غرور کو پامال کرتی تھی تو وہ جنون اشتعال میں پاگل ہوجاتے تھے۔ وہ ہار ماننے والے نہیں تھے۔ انہیں اب بھی یقین تھا کہ وہ گنتی کے چند سرپھروں کو ٹھکانے لگا کے انسانیت کے لہو کی سیاست کا کاروبار جاری رکھ سکتے ہیں اور تمام سابقہ نقصانات کی تلافی ممکن ہے۔ آخر یہ ایم آر ایس ہے کیا؟ بدی اور بدی کا شوربہ۔ قسمت ساتھ دے رہی ہے تو خود کو طاقت سمجھنے لگے ہیں۔ ان کی مجروح انا انہیں مجبور کرتی تھی کہ وہ شکست سے بددل نہ ہوں بلکہ پہلے سے زیادہ تباہ کن قوت کے ساتھ ایم آر ایس کے جیالوں کو فنا کرنے پر تل جائیں اور انہیں سمجھا دیں کہ خوش قسمتی بھی آخر کار ساتھ چھوڑ جاتی ہے۔ چنانچہ یہ جنگ ابھی جاری تھی۔ ہم جان کی بازی ہارنے سے پہلے حوصلہ ہارنے کے قائل نہ تھے اور ہماری اصل طاقت یہ یقین تھا کہ ہم حق پر ہیں۔ اور یہ ایمان تھا کہ خدا بہت منصف مزاج ہے اور آدمی کی فلاح کے لئے حق کو باطل پر غالب رکھتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ دنیا بہت پہلے بدی کی قوتوں کے تابع ہوجاتی اور یہاں سے نیکی کا وجود مٹ چکا ہوتا۔ نمرود کی خدائی باقی رہتی اور حسین کا نام لیوا باقی نہ رہتا۔

پادری نے کتابِ مقدس کی تلاوت ختم کردی تھی اور اب تابوت تدفین کے لئے لحد میں اتارے جارہے تھے۔ ہر طرف اندھیرا پھیل چکا تھا۔ چرچ کے احاطے میں ساری مرکری لائٹس روشن ہوگئی تھیں۔ ایک کھمبا عین میرے سامنے تھا جس کا روشنی پھیلانے والا بازو آگے نکلا ہوا تھا چنانچہ میں کسی حد تک اندھیرے میں تھا۔ محسن لوگوں کی بھیڑ میں شامل ہوچکا تھا لیکن اس نے آگے آنے سے گریز کیا تھا اور ایک درخت کی جھکی ہوئی شاخوں کے سائے میں خود کو روشنی سے دور رکھنے کی کوشش کررہا تھا۔ اس نے کالا چشمہ پہن رکھا تھا جو رات کو عموماً نابینا ہی لگاتے ہیں مگر میں نے دیکھ لیا تھا کہ اس کی نظریں ہماری جستجو میں سرگرداں ہیں۔ کالے چشمے کے پیچھے اس کی آنکھوں کو حرکت کرتے نہیں دیکھا جاسکتا تھا لیکن وہ سر کو بھی دائیں بائیں گھما رہا تھا اور اس نے ابھی تک اشارے سے بھی شناسائی کا اظہار نہیں کیا تھا۔

کیا محسن نے ہمیں پہچانا نہیں؟ میں نے حیرانی سے سوچا۔ یا وہ بھی میری طرح محتاط ہے؟ میں نے پہلے سوچا تھا کہ اسے دو انگلیوں سے وی فار وکٹری کا نشان بنا کے دکھاؤں۔ پھر میں نے اس جذباتی حرکت سے اجتناب کیا تھا۔ یہ ہوسکتا تھا کہ صرف محسن ہی ہمیں تلاش نہ کررہا ہو' سارے شکاری ہر طرف سے نگاہوں کا حصار قائم کئے اس انتظار میں ہوں کہ پہچان کا کوئی اشارہ ملے تو وہ سب کو ہوشیار کردیں اور ہمارے لئے سب راستے بند ہوجائیں۔ ان جیسے لوگ چرچ کے تقدس کو پامال کرتے ہوئے تذبذب کا شکار نہیں ہوتے۔

جب نازو نے زیرِ لب کہا تھا "برے پھنسے" تو میں نے ان الفاظ کے مفہوم پر غور کرتے ہوئے اپنے چاروں طرف غور سے دیکھا تھا لیکن مجھے کسی گڑبڑ کا احساس نہیں ہوا تھا۔ سب لوگ سر جھکائے پادری کا خطبہ سن رہے تھے۔ ماحول ایک سوگوار سکوت میں ڈوبا ہوا تھا اور اگر کسی کے دل میں معاندانہ جذبات تھے تو اس کا اظہار صورت سے نہیں ہورہا تھا۔ اگر اس ہجوم میں دوستوں کے درمیان دشمن بھی شامل تھے تو ان کے چہروں سے نقاب ہٹا کے دیکھنا محال تھا۔ شاید میں نے غلط سنا یا غلط سمجھا تھا۔ ممکن ہے نازو کے اصل الفاظ کچھ اور ہوں۔ یا ان الفاظ کا مطلب وہ نہ ہو جو میں نے سمجھا۔

نگاہ سامنے رکھتے ہوئے اور سر اٹھائے بغیر میں نے کہا "مرزا! نازو نے کچھ دیکھا ہے۔"

میری آواز ایک سرگوشی تھی جسے صرف غالب کے کان ہی سن سکتے تھے۔

غالب نے کہا "دال میں کالا ہے" اور اسی طرح ساکت کھڑا رہا۔

میں نے اس کی طرف دیکھنے سے گریز کیا اور زیرِ لب دعا کے انداز میں کہا "کالا کیا مجھے تو دال بھی نظر نہیں آرہی ہے۔"

غالب نے سر جھکاتے ہوئے کہا "دائیں اور بائیں جانب... اور سامنے ایک سی مونچھوں والے۔"

میں نے کن انکھیوں سے مونچھوں کا جائزہ لیا۔ کم سے کم پچاس افراد بامونچھ تھے۔ مکھی مارکہ مونچھ سے لے کر تلوار مارکہ اور جھاڑ جھنکاڑ مونچھ تک ہر ڈیزائن موجود تھا۔ ان میں سے ایک جیسی مونچھوں والے تین افراد کا انتخاب مشکل کام تھا۔ ...معلوم نہیں نازو کی نظر نے پلک جھپکتے میں کیسے پہچان لیا کہ دشمن کون ہیں اور ان کی شناخت کی نشانی بھی دیکھ لی؟ میں مونچھ شناسی کے امتحان میں فیل ہونے کا اعتراف کرنے ہی والا تھا کہ دشمن نے خود اپنا راز افشا کردیا۔

میں نے ایک شخص کو ایک قدم دائیں جانب آتے دیکھا۔ وہ ایسے دبے پاؤں اپنی جگہ سے کھسکا تھا کہ اس کے ساتھ خاموش اور باادب کھڑے ہوئے کسی بھی شخص کو یہ حرکت ناگوار نہ گزرے۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹا اور پھر دائیں طرف سے آگے آگیا۔ اس کے اور میرے درمیان مشکل سے پندرہ فٹ کا فاصلہ تھا جو نامعلوم طریقے سے کم ہوتا جارہا تھا۔ اگر وہ بھیڑ کو چیرتا ہوا آگے آتا تو سب اس کی طرف متوجہ ہوجاتے اور اس معیوب حرکت پر احتجاج بھی کرتے۔ احتجاج کی اسے کوئی پروا شاید نہ ہوتی۔ اس کا اصل مقصد اس طرح حرکت کرنا تھا کہ ہمیں معلوم نہ ہو۔ وہ بالکل اسی طرح آگے بڑھ رہا تھا جیسے دیوار پر رینگنے والی چھپکلی ساکت وصامت بھی نظر آتی رہتی ہے لیکن مکھی کو لقمہ بنانے کے لئے پیش قدمی بھی جاری رکھتی ہے۔ معلوم نہیں وہ شخص کتنی دیر سے دائیں بائیں آگے پیچھے ہوتا' کسی کو چھوئے بغیر اور کسی سے معذرت کئے بغیر اپنا راستہ بناتا ہماری طرف آرہا تھا۔

اس کی پُراسرار پیش قدمی کا احساس ہوتے ہی میری خطرے کا اعلان کرنے والی حسّ بھی جاگ اٹھی۔ میں نے اس شخص کی مونچھوں کو دیکھا اور پھر اپنے بائیں جانب نگاہ کی۔ اب مجھے ویسی ہی مونچھوں کا جوڑا فوراً نظر آگیا۔ یہ مونچھیں کیا تھیں' بالائی لب پر دو بریکٹ تھے۔ آدھا ناک کے ایک طرف اور باقی آدھا دوسری طرف۔ درمیان سے لب کا جو حصہ عین ناک کے نیچے تھا' ...بالکل صاف تھا۔ میں نے بائیں طرف والے پر نظر رکھی تو یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ ایسے ہی پُراسرار طریقے پر وہ بھی آہستہ آہستہ کھسکتا چلا آرہا ہے۔ تیسرے شخص کی تلاش اب آسان ہوگئی تھی۔ ایسی ہی مونچھیں بالکل میرے سامنے موجود تھیں۔

اس ٹریڈ مارک کے ساتھ میں نے مزید تین افراد دریافت کئے جو ماتم گساروں میں گھل مل گئے تھے مگر درحقیقت وہ برابر فاصلے پر ایک حلقے کی صورت میں مورچہ بندی کئے کھڑے تھے۔

میں نے زمین پر نگاہ رکھتے ہوئے کہا "ڈبل مونچھ گروپ کے سات ارکان ہیں۔"

غالب نے کہا "نو شمار کئے ہیں میں نے' گیارہ نازو نے۔"

"پھر اب کیا کرنا چاہئے؟"

"انتظار" غالب نے مختصراً کہا۔

"یعنی جب تک وہ قریب آکے بغل گیر نہ ہوجائیں..." میں نے کہا۔

میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی میری کمر میں کوئی سخت چیز گڑ گئی جس کے بارے میں مجھے کوئی سوال کرنے کی قطعی ضرورت نہیں تھی۔ میں ریوالور کی فولادی نال کے سرد سفاک لمس سے آشنا تھا۔

کسی نے کہا "ول یو پلیز کیپ کوائٹ" (ازراہ عنایت خاموش ہوجایئے)

پادری نے پیچھے پلٹ کے دیکھا۔ اسے یقین تھا کہ میں خاموش ہی ہوں لیکن مجھ سے خاموش رہنے کی درخواست خاصے درشت لہجے میں کی گئی تھی۔ شاید اسے میرے پیچھے کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آئی ہوگی کہ وہ پھر سامنے متوجہ ہوگیا۔ ریوالور کی نال میری ریڑھ کی ہڈی میں چبھنے لگی تھی اور میں پُرسکون رہنے کی کوشش میں ناکام تھا۔ مجھے یقین تھا کہ کوئی ڈبل بریکٹ مونچھ والا بڑی شرافت سے سر جھکائے مجھ سے تقریباً چپکا ہوا ہے تاکہ وہ ریوالور کو چھپا کے رکھ سکے۔ وہاں سب ہی ایک دوسرے سے لگے ہوئے کھڑے تھے چنانچہ اس کی یہ قربت کسی طرح بھی شکوک پیدا نہیں کرسکتی تھی۔

میں دعا کے ختم ہونے سے پہلے کسی نتیجے پر پہنچنا چاہتا تھا۔ میرے سامنے بہت سے امکانات تھے جو ایک جیسے تاریک تھے۔ میں جہاں کھڑا تھا' وہیں بیٹھ جاتا اور اسے اٹھا کے آگے قبر میں پھینک دیتا لیکن اس طرح جنگ کا آغاز ہونے کے بعد مونچھ بٹالین کے سارے کمانڈوز کھل کر سامنے آجاتے اور آخری رسوم کا آخری منظر قتل وخونریزی اور مار دھاڑ سے بھرپور کلائمکس میں ڈھل جاتا۔ گیارہ مونچھ والے اپنے آتشیں اسلحے کا فراخدلانہ استعمال کرنے پر کمربستہ تھے۔ ہمارا ان کے حصار کو توڑ نکلنا عملاً ناممکن تھا۔ ایسی احمقانہ کوشش کا انجام کچھ غم گساروں کے لئے مرگِ ناگہاں ہوتا۔ اگلے دن ان سب کی آخری رسوم شاید مسلح پولیس کی حفاظت میں ادا کی جاتیں اور ان میں وہی شریک ہوتے جن کے لئے شریک نہ ہونے کا بہانہ کوئی نہ ہوتا اور وہ بلٹ پروف ماتمی لباس پہن کر آتے۔

مجھے یہ بھی علم نہیں تھا کہ غالب اور نازو کے پیچھے بھی مونچھوں والا کوئی موت کا فرشتہ موجود ہے یا نہیں۔ ہمت کرکے

میں نے سر کو تھوڑا سا دائیں جانب اور پھر بائیں جانب گھمایا تو نیقت کھل کر سامنے آگئی۔ مونچھوں والے نو دس یا گیارہ نہیں نھے' شاید ان کی اصل تعداد کہیں زیادہ تھی کیونکہ غالب اور نازو کے پیچھے بھی وہ پوری مستعدی کے ساتھ موجود تھے اور حیرت نگیز بات یہ تھی کہ ان سب کی ایک جیسی مونچھیں تھیں۔ نہوں نے اپنے آپ کو سب سے جدا رکھنے لیکن آپس میں ناخت کا ذریعہ بنانے کے لئے یہ مونچھیں بنائی تھیں۔ یہ اصلی ونچھیں نہیں تھیں بلکہ آئی برو پینسل سے بنائی گئی تھیں۔ جیسے ورتیں اصلی بھویں صاف کراکے (بزعم خود) خوب صورت ھویں بناتی ہیں۔ دیکھنے والوں کو وہ بھی اصل ہی نظر آتی ہیں۔ ائی برو پینسل کی ان مونچھوں کو بھی ایک نظر دیکھنے والا دھوکا کھا باتا تھا کہ وہ بہت نفاست سے تراشی ہوئی باریک خط والی مونچھیں ہیں۔ ان سب کا لباس مختلف تھا اور چہروں کی ساخت مختلف تھی بنانچہ اس واحد قدرِ مشترک کو صرف انہی کی نظر دیکھ رہی تھی۔ ہ احتیاط انہوں نے دوست اور دشمن میں امتیاز رکھنے اور ایک دسرے کی پوزیشن سے باخبر رہنے کے لئے کی تھی مگر اس سے یک بات واضح ہوگئی تھی۔ وہ سب ایک دوسرے کو صورت سے ہیں پہچانتے تھے۔ اس کا ایک مطلب تو یہ نکلتا تھا کہ وہ بھان تی کا کنبہ ہیں۔ کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا۔ تریویدی نے ادھر دھر سے منتخب افراد کو اس مشن پر یکجا کردیا ہے جو ایک دوسرے سے ناواقف ہیں اور اگر بدقسمتی کے باعث ان کا پلان فیل ہوجاتا ا کسی غیر متوقع گڑبڑ کی وجہ سے کوئی مونچھ والا غلط ہاتھوں میں پڑجاتا تو وہ دوسروں کے بارے میں کچھ نہ بتا پاتا کہ وہ کون تھے اور انہیں کس نے بھیجا تھا۔ پولیس انہیں مار مار کے دنبہ بنادیتی یا ہم کوٹ کوٹ کر پاپڑ کردیتے۔ جو بات کسی کو معلوم ہی نہ ہوتی وہ بتاتا کیسے۔ ایسی منصوبہ بندی چوہدری دلاور کا عیار ذہن ہی کرسکتا تھا۔ وہ سنسنی خیز اور چونکا دینے والے ڈرامائی منظر پیش کرنے میں یدطولیٰ رکھتا تھا اور نقلی مونچھوں والی قاتل فوج کا آئیڈیا بھی ایک ایسا خونی ڈراما تھا جس میں کردار یہ نہیں جانتے تھے کہ ہدایت کار کون ہے۔ ان کٹھ پتلیوں کی طرح جن کو علم نہ ہو کہ انہیں حرکت دینے والا ہاتھ کس کا ہے۔ چوہدری دلاور نے یا تریویدی نے سامنے آئے بغیر انہیں احکامات دیئے ہوں گے اور معاوضے ادا کئے ہوں گے۔ مختلف رابطوں اور وسیلوں کے ذریعے انہیں اس مشن کے بارے میں تفصیلات فراہم کی گئی ہوں گی۔ پھر انہیں اتنا پُرکشش معاوضہ پیش کیا ہوگا کہ وہ انکار کر ہی نہیں سکتے تھے۔ وہ اپنے انجان آقاؤں کے احکامات کے مطابق انجان لوگوں کے ساتھ مل کر ایک خفیہ مشن پر انجان لوگوں کو قتل کرنے آگئے۔ شاید انہیں بتادیا گیا ہوگا کہ ناکامی کے نتائج کے وہ خود ذمے دار ہوں گے۔ بالکل اسی طرح جیسے کامیابی کی صورت میں انعام بھی انہی کو ملے گا۔ یہ سب جواری تھے جو ایک بہت بڑے انعام کے لالچ میں نتائج سے بے نیاز ہوکے جان لینے یا دینے کے لئے یہاں آپہنچے تھے۔

ایک اور امکان یہ تھا کہ مونچھوں کی شناخت کا مضحکہ خیز اسٹائل اپنانا اس لئے ضروری سمجھا گیا تھا کہ وہ سب اپنے اصل چہرے بدل کے آئے تھے اور میک اپ میں ایک دوسرے کو پہچان نہیں سکتے تھے چنانچہ انہوں نے صورتوں پر وہ نشان بنائے جو انہیں آسانی سے نظر آجائیں لیکن کسی اور کو شک میں مبتلا نہ کریں۔

میرا ذہن دونوں امکانات کو قبول کرتا تھا۔ سمجھ میں نہ آنے والی بات یہ تھی کہ نقلی مونچھوں والی اس ڈیتھ فورس نے ہمیں کیسے پہچان لیا؟ ان کے لئے ہم اتنے ہی اجنبی چہروں والے لوگ تھے' جتنے مونچھ فورس والے ہمارے لئے۔ شاید انہیں ہم سب کی درجنوں تصویریں دکھادی گئی ہوں گی۔ لیکن ہمارا اس وقت کا حلیہ ایسا تھا کہ محسن بھی دھوکا کھا گیا تھا۔ مگر محسن نے دھوکا نہیں کھایا تھا اور وہ جانتے بوجھتے انجان بن گیا تھا تو پھر یہ ممکن تھا کہ اس مجمع میں ہمارا دشمن' کوئی پرانا شکاری بھی انجان بنا کھڑا ہو جو ہمیں اسی طرح پہچانتا ہو جیسے محسن۔ ایسا شخص چوہدری دلاور ہوسکتا تھا۔ استاد پیڈرو یا حاجی عبداللہ۔ حاجی اپنی بھاری بھرکم' ریچھ جیسی جسامت اور حلیے کے باعث چھپا نہیں رہ سکتا تھا۔ استاد پیڈرو اپنے کالے رنگ کو گورا نہیں کرسکتا تھا اور اپنے کانوں میں پڑی ہوئی پیتل کی مندریوں کو چھپا نہیں سکتا تھا۔ ہاں چوہدری دلاور بھیس بدل کے ہماری نشاندہی کے لئے بنفسِ نفیس یہاں موجود تھا تو اس کو اتنی آسانی سے پہچاننا مشکل کام تھا' اس کی نظر دھوکا نہیں کھاسکتی تھی۔

تدفین کے مراحل ختم ہونے والے تھے اور ابھی تک میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچا تھا۔ میں سائن کی والدہ اور بہن کی آخری رسوم میں خونریزی شامل کرنا نہیں چاہتا تھا اور میں پادری کے ساتھ کئے ہوئے وعدے سے بھی انحراف نہیں کرسکتا تھا۔ مجھے اس بارے میں بھی کوئی خوش فہمی نہیں تھی کہ میری کمر سے لگے ہوئے ریوالور کی گولی کا راستہ کوئی مصلحت روک سکتی ہے۔ ان پیشہ ور قاتلوں کے نزدیک آخری رسوم کے احترام کی کوئی اہمیت نہیں ہوسکتی تھی اور نہ عبادت گاہ کے تقدس کے خیال کی۔ وہ ایسی جذباتی مصلحتوں کے احساس سے ناآشنا لوگ تھے چنانچہ انہوں نے ہمارے باہر نکلنے کا انتظار نہیں کیا تھا۔ وہ زیرِ دام آئے ہوئے شکار کو مہلت دے کر ناکامی مول لینے کا رسک لیتے تو جان سے بھی جاتے اور انعام سے بھی۔ شاید یہ بات ان کو اچھی طرح ذہن نشین کرادی گئی ہوگی کہ دشمن انتہائی عیار اور خطرناک ہے اور پل بھر میں نقشہ پلٹ دیتا ہے۔

میں نے آہستہ آہستہ سر کو پیچھے کی طرف گھمایا مگر میں اس شخص کی صورت نہ دیکھ سکا جو اپنے ریوالور کی نال کو خنجر کی طرح میری کمر میں گھونپ دینے پر آمادہ تھا لیکن میں نے ان دونوں کو دیکھ لیا جو غالب اور نازو کے دائیں بائیں کھڑے ہوئے تھے۔

یقیناً ان میں سے ایک نے ریوالور کو غالب کی پسلیوں سے لگا رکھا تھا اور دوسرے نے نازو کی کمر سے۔ وہ دونوں جسمانی طور پر صحت مند اور گٹھے ہوئے جسم کے مالک تھے۔ ایک نے ڈینم کی، پتلون اور واسکٹ پہن رکھی تھی۔ دوسرا گرے پینٹ اور براؤن چیک والے کوٹ میں تھا۔ وہ دونوں ہاتھ سینوں پر باندھے کھڑے تھے اور دونوں کے دائیں ہاتھ میں ریوالور تھا مگر یہ ہاتھ بائیں بازو کے نیچے تھا۔

"اپنی نظر سامنے رکھو" میرے پیچھے کھڑے ہوئے مونچھ والے قاتل نے انگریزی میں غرا کے کہا۔

میں نے کہا "آگے کیا دیکھوں، میری نظر میں دنیا تیرہ و تار ہوگئی ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے موت کا اندھیرا چھا گیا ہے۔ میں موت کے فرشتے کو دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"خاموش ہوجاؤ ورنہ..."

"ورنہ کیا؟ تم مجھے دو مرتبہ قتل کروگے، ایک بار ابھی اور پھر مقررہ وقت پر۔"

"تمہارے ساتھ دوسرے لوگ بھی مارے جائیں گے، ہمارا راستہ کوئی نہیں روک سکتا۔"

میں نے کہا "میرے مرنے کے بعد اگر ساری دنیا مرجائے تو مجھے کیا۔"

"یعنی تم چاہتے ہو کہ تمہیں آخری رسوم ختم ہونے سے پہلے ہی نکال کرلے جائیں۔ ٹھیک ہے، میں سب کو اکٹھا کرلیتا ہوں۔"

"آئی ایم سوری۔ میں چاہتا ہوں جہاں تم نے اتنا صبر کیا ہے تھوڑی دیر اور ٹھہر جاؤ تاکہ یہ تدفین مکمل ہوجائے" میں نے کہا۔

پادری نے پلٹ کر مجھے گھورا "ول یو پلیز۔ آل آف یو کم فارورڈ" (مہربانی کریں اور آپ سب لوگ آگے تشریف لے آئیں) یہ بات اس نے بالکل واضح اور بلند آواز میں کہی تھی اور سب نے سنی تھی۔

میں نے سر جھکا کے کہا "یس فادر" اور آگے بڑھ کے پادری کے ساتھ جا کھڑا ہوا۔ غالب اور نازو نے بھی پادری کے حکم کو تائید غیبی سمجھتے ہوئے تعمیل کی۔ یہ سب اتنا اچانک ہوا تھا کہ مونچھ فورس کے مستعد ارکان کی قوتِ فیصلہ مفلوج ہوگئی اور وہ وہیں کھڑے رہ گئے۔ معلوم نہیں انہوں نے کس طرح اپنے ریولوار چھپائے ہوں گے۔ اگر ہم اپنی مرضی سے ایک قدم بھی آگے بڑھاتے تو وہ بھی ایسے آگے بڑھ جاتے جیسے ہم یک جان دو قالب ہیں یا آپس میں گوند سے چپکے ہوئے ہیں۔ وہ پادری کے حکم پر عمل درآمد نہیں روک سکتے تھے کیونکہ غالباً انہیں آخری رسوم کے دوران خونریزی سے اجتناب کرنے کا سختی سے حکم دیا گیا تھا تاوقتیکہ ہم مزاحمت کرتے ہوئے خود انہیں مقابلے پر مجبور نہ کردیں۔ انہیں یہ حکم بھی تھا کہ ہمیں قتل نہیں گرفتار کرنا ہے اور اسی لئے نقلی مونچھ والوں کی پوری بٹالین بھیجی گئی تھی۔ قتل کرانے کے لئے یہ ضروری نہیں تھا کہ ہمیں چرچ کے اندر محصور

کیا جاتا۔ اس کے لئے تدفین سے پہلے یا بعد کی شرط بھی غیر ضروری تھی۔ کوئی ایک پیشہ ور قاتل جس کا نشانہ درست ہوتا، ہمیں صرف ایک ریوالور سے تین گولیاں چلا کے کسی بھی جگہ، کسی بھی وقت ٹھکانے لگا سکتا تھا۔ یہ پندرہ بیس افراد تھے یا اس سے بھی زیادہ۔ اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا مگر میں یہ بات سمجھ سکتا تھا کہ ان کا مقصد ہمیں زندہ سلامت گرفتار کرکے لے جانا ہے۔ ولاور اور تریونی اچھی طرح جانتے تھے کہ ایک کے مقابلے میں ایک کی کوئی حیثیت نہیں اور دو چار تو ہمارے ہاتھوں کسی بھی معرکہ آرائی کی افتتاحی تقریب میں ہی مارے جاتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اتنے لوگ بھیج دئے تھے جو ایک ساتھ ہم سے چمٹ جائیں تو ہمیں بے دست و پا کردیں۔ وہ اس حقیقت کو بھی سمجھتے تھے کہ اس موقع پر چرچ میں کتنی پولیس فورس ہوگی۔ پولیس کے ساتھ چرچ میں براہ راست تصادم کے نتائج بہت سنگین ہوسکتے تھے۔ اخبارات میں واویلا مچ جاتا اور ہر طبقۂ فکر کے لوگ احتجاجی مظاہرے شروع کردیتے تو حکومت کی مشینری نیچے سے اوپر تک حرکت میں آجاتی۔ یہی وجہ تھی کہ سب مونچھوں والے خاموشی سے لیکن بڑے منظم انداز میں ہمارے گرد حلقہ تنگ کرتے جارہے تھے اور انہوں نے بروقت ہمارے پیچھے ریوالور کی موجودگی کا احساس دلا کے ہمیں خاموشی سے اطاعت پر مجبور بھی کردیا تھا اور انہیں اپنے آپریشن کے مکمل اور کامیاب ہونے کا یقین ہو چلا تھا کہ پادری کی مداخلت نے ان کا بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا۔

پادری نے مجھ سے اور غالب سے کہا "آپ دونوں ادھر میرے سامنے آجائیں۔"

اس نے قبر میں اتارے جانے والے تابوت کے پیروں کی جانب اشارہ کیا تھا۔ میں نے اور غالب نے پھر تعمیل کی اور گھوم کر ان خبیثوں کے مقابل آگئے جو ہماری کمر سے ریوالور لگائے کھڑے ہوئے تھے۔

"تم میرے ساتھ رہو سسٹر" پادری نے نازو سے کہا اور اسے اپنے برابر کھڑا کرلیا۔

ہمارے گرد جمع ہوکے حصار کو تنگ سے تنگ تر کرنے والوں کی منصوبہ بندی دھری رہ گئی تھی اور ان کی ساری محنت پر پانی پھر گیا تھا۔ وہ بڑی تیزی سے منتشر ہورہے تھے اور ایک دوسرے کو واضح اشاروں سے ہمیں پھر گھیرنے کے لئے دوسری طرف سے آنے کا منصوبہ بنا رہے تھے مگر یہ اشارے صرف ہم ہی سمجھ سکتے تھے۔ باقی لوگوں کے لئے ان کی نقل و حرکت میں کوئی غیر معمولی یا شک و شبے والی بات نہیں تھی۔

ہم سب کے ہاتھوں میں جو کتابیں تھیں انہیں ہم احتیاط سے دونوں ہاتھوں میں تھام کر سینے سے لگائے رکھنے پر مجبور تھے حالانکہ وہ بائبل نہیں تھیں لیکن اس طرح ہم ضرورت پڑنے پر وہ ریوالور بھی نہیں نکال سکتے تھے جو ہمارے پُرشکوہ لبادوں کے نیچے پوشیدہ تھے۔ میرا خیال تھا کہ ان کے استعمال کی نوبت نہیں

آئی مگر اب مجھے اپنا خیال غلط ثابت ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔

میں نے غالب سے کہا "وہ موت کے فرشتے پھر آرہے ہیں، انہیں قریب مت آنے دینا۔"

غالب نے کہا "اگر وہ مجھ سے چمٹنے لگیں تو کیا کروں؟ پلٹ کے ڈانٹوں کہ یہ کیا بدتمیزی ہے۔ یا منہ کے بل قبر میں گر جاؤں؟"

میں نے کہا "حرکت میں برکت ہے۔ ادھر ادھر ہوتے رہو، جیسے تمہاری عبا میں بھڑ داخل ہوگئی ہے یا تمہاری ٹانگوں پر چیونٹیاں چڑھ گئی ہیں۔"

"اس سے انہیں کتنی دیر ٹالا جاسکتا ہے؟" غالب نے کہا "آہ! چیونٹیاں۔"

غالب نے یہ آخری الفاظ خاصی اونچی آواز میں کہے تھے۔ پیر کو زور زور سے زمین پر مارتے ہوئے اس نے جگہ بدلی۔ اس کی یہ کارروائی بہت موثر رہی۔ اس کے پیچھے پہنچ جانے والا مونچھ فورس کا تیسرا رکن جو ہجوم کو چیر کر آگے آگیا تھا، پیچھے ہٹنے پر مجبور ہوگیا۔ غالب کی ایک لات اس کے گھٹنے کی ہڈی پر بھی لگی تھی لیکن اس نے چوٹ کی اذیت کو برداشت کرلیا اور پھر غالب کی پشت پر اپنا دستِ شفقت رکھنے کے لئے بڑھا۔ غالب کے ہاتھ سے کتاب گر گئی۔

"اوہ مائی گاڈ!" اس نے اونچی آواز میں کہا اور ایک دم جھک گیا۔ اس نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کے کتاب کو اٹھایا اور جھاڑ کے چوما۔ وہ شخص ریوالور نکال چکا تھا۔ اس نے بڑی پھرتی سے ریوالور کو اپنی بغل میں چھپالیا اور ہاتھ باندھ کے دوسری طرف دیکھنے لگا۔

میں نے اپنی طرف بڑھنے والے کو قریب آنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ ابھی وہ مجھ سے دو قدم دور تھا کہ میں نے بھی زمین پر پاؤں مارا، جیسے مجھے بھی کسی چیونٹی نے یا چیونٹے نے کاٹ لیا ہو۔ میں اتنی تیزی سے پیچھے ہٹا اور میری کہنی یوں حرکت میں آئی کہ وہ شخص سنبھل ہی نہ سکا۔ کہنی اس کے سینے پر لگی تھی۔ اس کا سانس رک گیا اور اس کے حلق سے "اوق" کی آواز کے سوا کچھ نہ نکلا۔ اس کا ہاتھ بھی ریوالور نکال چکا تھا مگر اس کو ریوالور چھپانے کی مہلت نہ ملی۔

"یہ کیا ہے؟" ایک شخص بڑی تیزی سے جھپٹا اور اس نے ریوالور پر ہاتھ ڈال دیا وہ یقیناً سادہ کپڑوں میں کوئی پولیس مین تھا جس کی نظر اس وقت مجھ پر تھی۔

عین اسی وقت نازو نے پلٹ کر کسی شخص کے منہ پر طمانچہ مارا "بدتمیز، بیہودہ، گنہگار آدمی... اتنی دیر سے تم مجھے پریشان کررہے ہو۔ کیا چاہتے ہو تم آخر؟ کیا تمہیں بالکل احساس نہیں کہ یہ خدا کا گھر ہے اور تم قبرستان میں کھڑے ہوئے ہو، نقلی مونچھیں بنا کے۔"

وہ شخص گال پر ہاتھ رکھے کھڑا ہی تھا کہ محسن نے اپنی

نابیناؤں والی سفید چھڑی ہلائی اور آگے بڑھنے کی کوشش میں اسے دھکا دے کر گرادیا "اوہ! سوری، کون تھا بھائی؟"

لیکن اب یہ ڈراما یوں نہیں چل سکتا تھا۔ ایک اور پولیس مین نے غالب کے پیچھے آجانے والے کو دبوچ لیا تھا کیونکہ وہ اس کی بغل میں دبے ہوئے ریوالور کو دیکھ چکا تھا۔

"ٹھہر جاؤ۔ آخر یہ سب کیا ہورہا ہے؟" پادری نے چلا کے کہا۔

"آپ ان کے ساتھ اندر جائیں ہولی فادر" سائن نے پادری کے سامنے آکے کہا "یہاں کچھ غلط قسم کے لوگ مسلح ہوکے آگئے ہیں۔"

"مسلح ہوکے۔ او مائی ہولی گاڈ!" پادری نے سینے پر صلیب بنائی "کون ہیں یہ جہنم کے سزاوار لوگ جو عبادت گاہوں میں خون بہانا چاہتے ہیں۔ ان سے کہو مجھ پر گولی چلائیں۔"

"آپ جائیں پلیز" سائن نے چلا کے کہا اور ریوالور نکال لیا "یہ لوگ آپ کا سرمن سننے والے نہیں ہیں۔ تم لوگ ادھر ٹھہرو، ہنگامہ ختم ہونے تک" اس نے ہم سے مخاطب ہوکے کہا۔

تدفین ختم ہوچکی تھی۔ ہنگامہ آرائی پر سہم کر منتشر ہوجانے والے اب اپنی اپنی گاڑیوں کی طرف بھاگ رہے تھے۔ پولیس کے جو سپاہی سادہ کپڑوں میں تھے انہوں نے چرچ کی چاردیواری پر چڑھ کے مورچے بنالئے تھے اور ان کے ریوالوروں کا رخ اندر کی طرف تھا۔ ہم آخری دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہوگئے۔

"یہ چرچ کے لوگ نہیں ہیں" ایک شخص نے ہماری طرف انگلی اٹھا کے کہا۔

"شٹ اپ" سائن دہاڑا "تم کیا جانتے ہو؟"

"میں جانتا ہوں" اس شخص نے کہا۔ وہ اس مونچھ فورس کا کمانڈر معلوم ہوتا تھا جو بڑی تیزی سے پسپا ہورہا تھا۔ ان کے متعدد ارکان عام لوگوں کی بھیڑ میں شامل ہوکے گیٹ سے نکلنے کی کوشش کررہے تھے جہاں پولیس ایک ایک شخص کو چیک کررہی تھی۔

ایک ساتھ تین افراد آگے بڑھ آئے "یس، یہ تینوں چرچ کے ممبر نہیں ہیں۔"

وہ سب مونچھوں کی شناختی علامت نہیں رکھتے تھے جو میرے لئے ایک حیران کن بات تھی۔ پھر اتفاقاً میری نگاہ اس شخص پر گئی جس کو نازو نے تھپڑ مارا تھا۔ وہ بڑی بدحواسی کے عالم میں پیچھے ہٹ گیا تھا اور اب زمین پر سے کوئی چیز اٹھا رہا تھا۔ نابیناؤں کی طرح راستہ بناتا ہوا گیٹ کی طرف جانے والا محسن اس کے قریب سے گزر رہا تھا۔ میں نے ایک دم کہا "اسے دیکھو... وہ ریوالور اٹھا رہا ہے۔ وہ شخص۔"

مگر وہ شخص ریوالور نہیں اٹھا رہا تھا۔ اس نے گھبرا کے میری طرف دیکھا اور رومال سے ناک صاف کرتے کرتے ایک دم

گیٹ کی طرف روانہ ہوگیا۔ مگر اس نے اتنی دیر میں آئی برو سے بنی ہوئی مونچھوں کو مٹادیا تھا۔ اب میں نے سائمن سے الجھنے والوں کو غور سے دیکھا۔ وہ بھی اپنی مونچھیں صاف کرچکے تھے۔ شناخت کی اس علامت کو انہوں نے خطرے کا احساس ہوتے ہی سب سے پہلے مٹایا تھا۔

"تم ان کی تلاشی لو۔ ان کے پاس اسلحہ ہے" سائمن کے گرد جمع ہوجانے والے چاروں افراد اتنی آسانی سے قائل ہونے والے نہیں تھے "آخر تم کیوں ان کی حمایت کررہے ہو اور ہماری بات کو کیوں اہمیت نہیں دے رہے ہو؟"

"تم کون ہوتے ہو مجھ سے یہ سوال کرنے والے؟" سائمن نے دہاڑ کے کہا۔

ایک شخص نے فوراً اپنا کارڈ نکال لیا "پریس رپورٹر فرام ٹائمز آف انڈیا۔"

دوسرے شخص نے کہا "میرا تعلق اے پی آئی سے ہے انسپکٹر سائمن۔"

تیسرے نے خود کو روزنامہ دیش سماچار کا کرائم رپورٹر کہا "ہم اس اسٹوری کی کوریج کے لئے آئے ہیں۔"

میں نے اور غالب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ میرا یہ خیال غلط ثابت ہوا تھا کہ وہ اپنی مونچھیں صاف کرچکے ہیں اور اسی مونچھ فورس کے ارکان ہیں جو ہماری گرفتاری پر مامور تھی۔ ان کی مونچھیں تھی ہی نہیں اور وہ جائز طور پر دہرے قتل کی اس واردات میں دلچسپی لے رہے تھے۔ حیرانی کی بات یہ تھی کہ انہیں ہمارے پاس اسلحے کی موجودگی کا علم کیسے ہوا تھا؟ صرف ہماری صورت دیکھ کر اخباری نمائندے اتنا بڑا الزام کیسے لگا سکتے تھے اور اتنے یقین کے ساتھ کیسے کہہ سکتے تھے کہ ہم چرچ سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھتے۔ صاف ظاہر تھا کہ یہ معلومات انہیں عین وقت پر دی گئی تھیں اور اس کا مقصد ایک مکمل شکست کا سدباب تھا۔ اگر مونچھ فورس ہمیں گرفتار کرنے میں ناکام رہے تو پھر پولیس گرفتار کرلے۔ اور بعد میں زیور پہنا کے مسٹر تریوینی کی خدمت میں پیش کردے کہ سر آپ کے مجرم حاضر ہیں۔ آپ کی نالائق بھگوڑا فورس تو مونچھیں منڈوا کے بھاگ گئی تھی۔ انعام اب ہمیں ملنا چاہئے۔ اور تریوینی کہے گا 'کیوں نہیں 'کیوں نہیں۔ ... ہم تمہاری وفاداری سے خوش ہوئے...

سائمن اخباری نمائندوں کے اختیارات کو چیلنج نہیں کرسکتا تھا اور ان کی معلومات کو ثبوت کے بغیر غلط بھی قرار نہیں دے سکتا تھا۔

"دیکھئے آپ لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے" سائمن نے کہا۔ "کس نے کہی ہے آپ سے یہ بے سروپا بات؟"

دیش سماچار کے کرائم رپورٹر نے چوتھے شخص کی طرف دیکھا لیکن اس کا حوالہ دینے سے گریز کیا۔ شاید اس نے ہی ہمارا راز فاش کیا تھا مگر اخبار والوں سے درخواست کی تھی کہ اس کا نام نہ لیا جائے۔ اخبار والے ایسے ذرائع سے پورا فائدہ اٹھاتے ہیں اور قانوناً انہیں یہ حق حاصل رہتا ہے کہ اپنی معلومات کے ذریعے کو ظاہر نہ کریں۔ چوتھا شخص بڑی متانت کے ساتھ کھڑا ہوا تھا اور میرے لئے شک کی قطعی گنجائش نہ رہی تھی کہ وہی اس مونچھ فورس کا سپہ سالار تھا۔ پھر میرے شک کو اس نے غیر ارادی طور پر یقین میں بدل دیا۔ اس نے جیب سے رومال نکالا اور بلا ضرورت منہ صاف کیا۔ مجھے ہوا میں اسپرٹ جیسی بو کا جھونکا محسوس ہوا۔ اس نے اپنی مونچھوں کے نشانات مٹادیئے تھے لیکن وہ اپنا چہرہ آئینے میں نہیں دیکھ سکتا تھا چنانچہ مزید اطمینان کے لئے اس نے پھر رومال سے اس جگہ کو رگڑ دیا تھا جہاں آئی برو پینسل سے مونچھوں کا ڈیزائن بنایا گیا تھا۔

"کیا آپ کو اصرار ہے کہ یہ چرچ کے نمائندے ہیں" ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا کے نمائندے نے کہا۔

ٹائمز آف انڈیا کے نمائندے نے زیادہ دوراندیشی کا ثبوت دیا۔ وہ پادری کی طرف لپکا جو تیز تیز قدم اٹھاتا چرچ کی طرف جانے والے راستے پر گامزن تھا۔ معلوم نہیں اس نے پادری کا راستہ روک کے کیا کہا مگر پادری اس کے ساتھ آنے پر مجبور ہوگیا۔ مجھے اس شریف آدمی کی پوزیشن خراب ہونے پر افسوس ہوا۔ اس نے ہماری مدد کی تھی اور اب پریشانی میں گرفتار تھا۔ اس نے جان بچا کے نکل جانا چاہا تھا مگر اخباری رپورٹر نے اس کوشش کو بھی ناکام بنادیا تھا۔ خود سائمن کے لئے صورت حال اچانک قابو سے باہر ہوگئی تھی اور اگرچہ ابھی تک اس نے ہم سے کچھ نہیں کہا تھا مگر صاف ظاہر تھا کہ ساری خرابی کا ذمے دار وہ ہمیں سمجھتا ہے۔ ہم آٹھ دس فٹ دور تھے چنانچہ ابھی تک براہ راست سوالات کی زد میں نہیں آئے تھے۔

"فادر۔ میں آپ کو زحمت دینے پر معذرت خواہ ہوں" ٹائمز آف انڈیا کے نمائندے نے کہا "لیکن اس گتھی کو آپ ہی سلجھا سکتے ہیں۔"

پادری نے خفگی سے کہا "آخر تمہیں کس نے اندر آنے کی اجازت دی؟"

"ہم کسی کی اجازت کے محتاج نہیں ہوتے فادر۔ جہاں بھی کچھ ہو ہم خود پہنچ جاتے ہیں اور یہی ہمارے پیشہ ورانہ فرائض کا تقاضا ہے" دیش سماچار کا نمائندہ بولا۔

"میرا مقصد ہرگز دھمکی دینا نہیں تھا۔ یہ اسٹوری بہرحال ایک نیوز ویلیو رکھتی ہے۔ اس میں کوئی زرد صحافت والی بات نہیں ہے" ٹائمز آف انڈیا کے نمائندے نے کہا "اس معاملے میں پولیس بھی کوئی مدد کرنے سے قاصر تھی۔"

"آپ صرف تصدیق یا تردید کردیں کہ یہ تینوں چرچ سے متعلق ہیں یا نہیں ہیں؟" اے پی آئی کے نمائندے نے کہا۔

پادری کے لئے اب براہ راست جواب دینے سے گریز کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ اس کی نظریں ہمیں مطعون کرتی محسوس ہوتی تھیں کہ تم نے باتوں میں الجھا کے مجھے ایک ایسے کام پر مجبور کردیا جس کا نتیجہ پریشانی اور پشیمانی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ تاہم اب وہ کسی صورت اپنی پوزیشن خراب کرتے ہوئے ہمیں تحفظ فراہم کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔

اس نے قطعی اور دوٹوک لہجے میں کہا "آئی ایم سوری جنٹلمین... لیکن ان تینوں کا چرچ سے کوئی تعلق نہیں۔"

ظاہر ہے اس بیان کے ساتھ ہی صحافیوں کے لئے ایک تہلکہ خیز سرخی بن گئی۔ انہوں نے فاتحانہ نظروں سے سائمن کی اور ہماری طرف دیکھا۔ پھر انہوں نے سوالات کی بوچھاڑ کردی۔

"پھر یہ کون ہیں؟"

"انہوں نے چرچ کا لبادہ کیوں پہن رکھا ہے؟"

"یہ آپ کی موجودگی میں کیسے چرچ کی نمائندگی کررہے تھے؟" "اگر آپ کو معلوم تھا کہ یہ جھوٹے اور جعلی لوگ ہیں تو آپ نے احتجاج کیوں نہیں کیا تھا؟"

"آپ نے پولیس کو کیوں نہیں بتایا تھا؟"

پادری پُرسکون رہا اور اس نے کسی کو جواب دینے کی کوشش ہی نہیں کی۔ آخر کار صحافیوں کو خاموش ہونا پڑا۔

"آپ کی خاموشی کا کیا مطلب لیا جائے ہولی فادر؟" دیش سماچار کا کرائم رپورٹر بولا۔

"مطلب نکالنا آپ لوگ جانتے ہیں۔ میں تو منتظر تھا کہ آپ کے سوالات ختم ہوں تو میں بھی کچھ کہوں" پادری نے مسکرا کے کہا "اور کہنا مجھے صرف اتنا ہے کہ آپ کے سب سوالات کا جواب میری طرف سے بھی نوجوان انسپکٹر سائمن ہی دیں گے جن کی والدہ اور ہمشیرہ کی المناک وفات اس اجتماع کا سبب بنی۔ انہوں نے ہی مجھ سے ان تینوں کی مدد کے لئے کہا تھا اور ان کے ضامن بھی یہ ہوئے تھے۔ میں نے ہمیشہ قانون کا احترام کیا ہے اور قانون کی مدد کی ہے اس لئے میں آپ لوگوں سے بھی درخواست کروں گا کہ اس خبر میں میری ذات یا چرچ کے ارفع مقام کو بے سبب نہ گھسیٹا جائے۔ یہ ایک ناخوشگوار واقعہ تھا جس کا چرچ سے کوئی تعلق نہیں۔ مجھے اور کچھ نہیں کہنا ہے" خاموشی کا ایک مختصر وقفہ آیا۔

پھر اے پی آئی کا نمائندہ بولا "لیکن ہولی فادر! اگر اس واقعے کی تحقیقات کے لئے آپ کو گواہی دینی پڑے..."

"تو میں دوں گا۔ میں نے کہا نا کہ قانون کی مدد کرنا میرا فرض ہے" پادری نے اس کی بات کاٹ دی "وہاں بھی یہی کہوں گا جو میں اس وقت کہہ رہا ہوں۔ آپ لوگ مجھ سے غلط بیانی کی توقع نہیں رکھ سکتے۔ اگر مجھے دس بار بھی بتانا پڑے گا تو میں ایک ہی سچ بتاؤں گا۔ سچ ایک ہوتا ہے اور اس کے دو پہلو بھی نہیں ہوسکتے۔ تھینک یو جنٹلمین۔ گاڈ بلیس آل آف یو" پادری نے سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور واپس چل پڑا۔

"آپ مطمئن رہیں سر۔ آپ کی اور چرچ کی نیک نامی پر کوئی حرف نہیں آسکتا" دیش سماچار کے نمائندے نے کہا "یہ وعدہ میں سب کی طرف سے کرسکتا ہوں۔"

"تھینک یو... تھینک یو مائی سن" پادری نے پلٹ کر مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلایا۔

"ظاہر ہے اب توپوں کا رخ میری طرف ہوگا" سائمن نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"انسپکٹر سائمن 'ہمیں آپ سے پوری ہمدردی ہے۔ یہ بہت بڑا المیہ تھا لیکن اس واردات کے بہت سے پہلو ابھی تک بے نقاب نہیں ہوئے" دیش سماچار کا نمائندہ بولا۔

"اتنی جلدی... بھی نہیں سکتے۔ ابھی تو تفتیش کا آغاز ہی نہیں ہوا۔ ابتدائی کارروائی جاری ہے" سائمن نے کہا "اور قبل از وقت میں اس معاملے میں کوئی رائے نہیں دے سکتا۔"

"مجھے افسوس اس بات کا بھی ہے کہ آپ کا رویہ ابتدا میں عدم تعاون کا اور کسی حد تک غلط اور جارحانہ تھا" ٹائمز آف انڈیا کے نمائندے نے کہا۔

"آئی ایم سوری۔ میں ذہنی و جسمانی طور پر بہت اپ سیٹ ہوں۔ میں چوبیس گھنٹے سے سویا نہیں ہوں۔ جو کچھ میں نے پہلے کہا 'میری درخواست ہے کہ آپ اسے حذف کردیں۔ میں آپ کے سب سوالات کا جواب دینے کے لئے تیار ہوں۔"

"او کے انسپکٹر۔ ان حالات میں ہم وہ سب آف دی ریکارڈ رکھتے ہیں۔"

"اس میں سے کچھ شائع نہیں ہوگا" اے پی آئی کے نمائندے نے کہا۔

"اب آپ بتائیں کہ کیا یہ صحیح ہے جو کچھ پادری نے کہا؟ کہ اس بھیس میں خود آپ انہیں چرچ میں لائے تھے" ٹائمز آف انڈیا کا نمائندہ بولا۔

"ہاں۔ یہ بالکل صحیح ہے۔ انہیں میں لایا تھا۔"

"کیا یہ بھی درست ہے کہ ان لوگوں کے پاس اسلحہ ہے" دیش سماچار کا نمائندہ بولا۔

"ہاں۔ ہم سب مسلح ہیں" سائمن نے پورے اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔

"یہ کون لوگ ہیں؟ پولیس کے آدمی۔ ہم ان سے بات کرسکتے ہیں؟"

"ظاہر ہے پولیس کے آدمی ہیں" سائمن مسکرایا "کیا آپ لوگ انہیں ہر طرف نہیں دیکھ رہے ہیں سادہ لباس میں؟ لیکن

آپ ان سے کوئی سوال نہیں کرسکتے۔"

"اس مخصوص لباس میں ایک عورت کو اور دو مردوں کو یہاں بھیجنے کی ضرورت اور مصلحت ابھی تک واضح نہیں ہوئی" اے پی آئی کا نمائندہ بولا "یہ یہاں کیا کر رہے تھے؟"

"ان کا تعلق پولیس کے محکمے کے کس شعبے سے ہے؟" ولیش سماچار کا کرائم رپورٹر بولا۔

"ان کے نام اور عہدے کیا ہیں؟"

"دیکھیں۔ میں ایک بات کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔ میں ایک چھوٹا سا پولیس افسر ہوں جس کی ڈیوٹی ایک دور افتادہ گاؤں میں تھی۔ سرکاری طور پر میں کوئی بیان دینے یا پریس کانفرنس کرنے کا مجاز نہیں۔ یہاں میں آپ سے اپنی ذاتی حیثیت میں بات کر رہا ہوں۔ یہ تینوں میرے معاون اور مددگار کی حیثیت سے آئے تھے۔ ان کا پولیس کے محکمے کی ملازمت سے کوئی تعلق نہیں۔ درحقیقت انہیں ایک خاص مقصد کے تحت یہاں لایا گیا تھا۔ یہ قاتلوں کو شناخت کرسکتے تھے۔"

"کیا پولیس کا خیال تھا کہ قاتل بھی یہاں موجود ہوں گے؟"

"اس کا امکان تھا" سائن نے کہا "پولیس مفروضات قائم کرکے آگے بڑھتی ہے۔"

"کیا وہ پہچان لئے گئے؟" ولیش سماچار کا نمائندہ بولا۔

"نہیں۔ یہ مفروضہ غلط ثابت ہوا" سائن نے کہا۔

"پھر وہ دونوں کون ہیں جن کو ریوالور نکالتے ہوئے گرفتار کیا گیا تھا۔"

"یہ ابھی نہیں بتایا جاسکتا۔ میں خود بھی نہیں جانتا" سائن بولا۔

ٹائمز آف انڈیا کا نمائندہ بولا "کیا یہ چشم دید گواہ ہیں، آخر ہم ان سے بات کیوں نہیں کرسکتے؟"

"اس لئے کہ فی الحال ان کی شناخت کو ظاہر نہیں کیا جاسکتا۔ ... اس سے تفتیش متاثر ہوگی اور قاتل ہوشیار ہوجائیں گے۔ ممکن ہے وہ فرار ہونے کی کوشش کریں۔ یا ان کی زندگی کے دشمن ہوجائیں اسی لئے ان کو چھپا کے یہاں لایا گیا تھا۔ لیکن یہاں سیکیورٹی کے انتظامات کا ذمے دار میں نہیں تھا۔ دیکھا جائے تو میرا اس وقت پولیس کے معاملات سے کوئی تعلق ہی نہیں کیونکہ میں ایک فریق ہوں۔ قتل کی ایف آئی آر میں مدعی میں ہوں۔ میں آخری رسوم میں ایک بیٹے کی یا بھائی کی حیثیت سے شریک تھا اور بس۔ آپ لوگوں کو یہ سب سوالات متعلقہ پولیس افسران سے کرنے چاہئیں۔ مگر پولیس تو اب جاچکی ہے۔"

"کیا۔ کون تھا متعلقہ افسر؟" ٹائمز آف انڈیا کے نمائندے نے برہمی سے کہا۔

"آپ لوگ معلوم کرسکتے ہیں۔ تفتیش کا نگراں کون ہے اور حفاظتی انتظامات کی ذمے داری کس کو سونپی گئی تھی۔ میں تو آپ لوگوں سے بھی زیادہ اجنبی ہوں ان معاملات میں... میری ڈیوٹی نہیں ہے یہاں۔"

"دا ٹ نان سنس۔ تم نے پہلے کیوں نہیں کہا؟"

"کیا نہیں کہا" سائن نے کہا "تم خود میرے پاس آئے تھے۔ ... میں نے تمہیں نہیں بلایا تھا اور نہ کسی پریس کانفرنس کا دعوت نامہ بھیجا تھا۔"

"تم ہمارا وقت ضائع کرتے رہے۔ تم نے ہمیں روکے رکھا، ... فضول باتوں میں الجھایا۔"

"تم نے خود اپنا وقت ضائع کیا، میں نے صرف سوالات کے جواب دیئے۔ ناؤ یو کین گو ٹو ہیل آل آف یو" سائن نے کہا۔

"کیا؟ انسپکٹر سائن... یہ مت بھولو..."

"شٹ اپ اینڈ گیٹ لاسٹ۔ جاؤ جو لکھنا ہے لکھو میرے خلاف یا چرچ کے خلاف۔ میں نہ تمہاری پروا کرتا ہوں اور نہ اس نوکری کی، جس میں اپنی ماں اور بہن کو نہیں بچاسکا۔ میں لعنت بھیجتا ہوں اس وردی پر اور ان قانون کی کتابوں کی رو سے ملنے والے اختیارات پر جو پولیس کا محکمہ صرف اپنی دہشت قائم کرنے کے لئے استعمال کرتا ہے۔ اس سے کسی شہری کی حفاظت نہیں ہوتی۔ انصاف کا بول بالا نہیں ہوتا۔ ڈرتے وہ ہیں جو رشوت سے کوٹھیاں، کاریں اور بینک بیلنس بناتے ہیں اور اس ملازمت کو سونے کی کان سمجھتے ہیں۔ بس میں نے تم سب کو بے وقوف بنایا اور روکے رکھا تاکہ تم متعلقہ پولیس افسران سے بات نہ کرسکو۔ وہ بھی مجھ سے خوش نہیں ہیں کیوں کہ ان کے سامنے بھی میں ایسے ہی سچ بکتا رہتا ہوں۔ وہ بادل ناخواستہ ادائے فرض کے لئے آئے تھے اور دیکھ لو کتنی جلدی چلے گئے۔ انہوں نے مجھ سے بھی کوئی بات نہیں کی اور تم سے بھی۔ اب تم جاؤ ان کے دفتر اور جو میں نے کہا یا کیا، سب انہیں بتادو اور جو پوچھنا ہے ان سے پوچھو۔ آئی ڈیم کیئر فار واٹ دے سے اینڈ ڈو۔ اس سے پہلے کہ وہ میرے خلاف محکمہ جاتی کارروائی کا آغاز کریں میں استعفیٰ دے رہا ہوں۔ ایسی کی تیسی ان کی تفتیش کی۔ مجھے معلوم ہے کہ اس کا نتیجہ کچھ بھی نہیں نکلے گا۔ کوئی قاتل گرفتار نہیں ہوگا۔ یہ جو آج پکڑے گئے تھے یہ بھی چھوٹ جائیں گے۔ میری ماں اور بہن کسی کی دشمن نہیں تھیں اور انہوں نے زندگی میں کسی کا برا تک نہیں چاہا تھا۔ جس نے بھی انہیں قتل کیا یا کرایا، ان سب پر خدا کا عذاب نازل ہو۔ وہ تمام عمر رسوا ہوں۔ خدا کے گھر میں کسی کو بھی بددعا دینا گناہ ہے مگر میں اور کیا کرسکتا ہوں۔ میرا دل کتنا دکھی ہے اس کا کوئی ذکر ہوگا تمہاری اس رپورٹ میں، جس کی نیوز ویلیو کا تم نے ذکر کیا تھا۔ جاؤ... دفع ہوجاؤ... ورنہ میں تم سب کو مار دوں گا یا خود کو شوٹ کرلوں گا" اس نے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپالیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

اس کا نروس بریک ڈاؤن ہوگیا تھا۔ اخباری نمائندوں کی ...گم ہوگئی تھی۔ وہ اپنے سارے پیشہ ورانہ فرائض بھول گئے ...اور دم بخود کھڑے تھے۔ ان کے سامنے جو شخص تھا وہ کوئی ...لیس انسپکٹر نہیں تھا۔ وہ ایک ایسا شخص تھا جو اندر سے او... ...ے ٹوٹ پھوٹ چکا تھا۔ بکھر چکا تھا۔ اس کے وجود کی عمارت ...ت اور یقین، احساس اور ایمان کے جن جذباتی سہاروں پر قائم ...ی وہ گر گئے تھے۔ وہ اپنی فطرت کے تقاضوں سے باغی ہوگیا تھا، ...ی اصول پرستی اور راستی کے آدرشوں کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ برائی ...کے خلاف جنگ میں اپنی ساری اچھائی کے ساتھ لڑتے لڑتے ہار ...گیا تھا۔ وہ انسانیت، اخلاق اور معاشرے کی کھوکھلی قدروں کا ...عتبار کھو چکا تھا۔

پادری اس کی آواز پر باہر آیا۔ چرچ کی جانب سے اس کا ...یاہ ہیولا پُرسکون اور پُرمتانت انداز میں اس گوشے کی طرف بڑھا جہاں سایہ دیوار میں ہم سب خاموش کھڑے سائن کو روتا دیکھ رہے تھے۔ وہ اپنے دکھ پر نہیں اس سارے نظام کی بے حسی اور بے بسی پر رو رہا تھا جس نے اس کو شکست دے دی تھی۔ اس ...ے سب کچھ چھین لیا تھا۔ آدمی رشتوں کے بغیر کیسے جی سکتا ہے؟ ...سارے رشتے جذبات کے رشتے ہیں۔ وہ انسانوں کے رشتے ہوں یا حوالوں کے۔ عقیدوں کے، اصولوں کے اور نظریوں کے رشتے یا ماضی وحال اور مستقبل کے رشتے۔ امیدوں کے اور خواہشوں کے رشتے، وقت کے اور زمین کے رشتے۔ ان رشتوں کے بغیر زندگی کا تصور ہی ممکن نہیں۔ آدمی ایک صحرا میں دفن کیڑا یا بے مصرف پڑا ہوا پتھر نہیں ہے اور خلا میں سرگرداں مردہ سیارہ نہیں ہے۔

پادری نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا "تم کو خداوند کی رحمت سے مایوس ہونا زیب نہیں دیتا۔ تم نے اس کی خوشنودی کے لئے غلط راستوں اور کج رو انسانوں سے سمجھوتا نہیں کیا۔ تم وہ خوش قسمت ہو جس کو اس نے فلاح کے لئے چنا، ورنہ تم انہی جیسے بھی ہوسکتے تھے جو تمہارے وجود کی نیکی سے شرمسار ہیں اور تمہاری استقامت سے خوفزدہ ہیں۔ آؤ، خدا کے گھر کی پناہ میں۔ تم کو سکون اور آرام کی، صبر اور حوصلے کی ضرورت ہے۔"

سائن نے پادری کے کندھے پر سر رکھ دیا تھا۔ کسی بچے کی طرح وہ اس کے ساتھ چل پڑا۔ اخباری نمائندے تذبذب اور پشیمانی کی کیفیت میں کھڑے ہوئے تھے۔ قبرستان ویران ہوچکا تھا لیکن اس کی چار دیواری کے باہر کی دنیا میں رات اپنی ساری جلوہ نمائی، رنگ و نور کی فراوانی اور پُرکیف خلوتوں کی خوشبو کے ساتھ خوش باش، خوش پوش اور خوش شکل مردوں اور عورتوں میں مسرتوں کے خوش رنگ پھول اور شوخ مسکراہٹوں کے شگوفے تقسیم کر رہی تھی۔

ہم سب ایک ہی جگہ کھڑے کھڑے تھک گئے تھے۔ پُر ملامت خیالوں کی کسک میرے لئے ناقابل برداشت ہوتی جارہی تھی۔ سائن نے میری مشکل آسان کردی۔ اس نے اپنے ضمیر کا بوجھ اتار پھینکنے میں پہل کی تھی۔ اب ہماری باری تھی یا وہاں موجود اخباری نمائندوں کی جو اپنی خبر کی قبر پر کھڑے ہوئے تھے اور اس کی لوح کو کسی سنسنی خیز سرخی میں ڈھالنے کا حوصلہ نہ رکھتے تھے۔ ان کی مشکل غالب نے آسان کی۔ اس سے پہلے کہ میں بولتا، وہ آگے بڑھا۔

غالب نے کہا "آپ لوگ اب کیا سوچ رہے ہیں؟ جا کے اس خبر کے لئے سہ کالمی سرخی کیوں نہیں بناتے؟ دیر ہوگئی تو آخری کاپی پریس میں چلی جائے گی اور کل اس کی نیوز ویلیو آدھی رہ جائے گی۔ آپ لوگ صحافی ہیں۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ صحافت کسے کہتے ہیں۔ کیا یہ ریاست کا چوتھا ستون ہے؟ کیا یہ ایک مقدس فریضہ ہے؟ یا یہ صرف اخبار بیچنے کا ذریعہ ہے؟ آپ لوگ ہم سے ہمارے بارے میں جاننا چاہتے تھے۔ ہم سے بات کرنے کے لئے بے چین تھے۔ اندر آیئے، میں آپ لوگوں کو ایک پریس کانفرنس میں مدعو کرتا ہوں۔ ایک اور "ایکس کلوسو" اسٹوری کے لئے۔ یہ اتنی ہی بڑی خبر بن سکتی ہے جتنی بڑی ہیروشیما پر ایٹم بم کے دھماکے کی خبر تھی۔ اس میں سب کچھ ہے۔ فکشن، ایکشن، سسپنس، سنسنی خیز انکشافات کا سلسلہ، دھماکا کرنے والا مواد، انتظامی مشینری کو تہ و بالا کردینے اور حکومت کے ایوانوں میں زلزلہ لانے والے واقعات۔ بڑے بڑے ناموں کے دیومالائی امیج کو بھک سے اڑا دینے والا مسالہ... میں آپ لوگوں کو سب سچ بتا سکتا ہوں۔ اس شرط کے ساتھ کہ آپ اس سچ کو مسخ کئے بغیر اور سنسر کئے بغیر، اپنے کیریئر، کاروبار اور زندگی کو لاحق خطرات کی پروا کئے بغیر شائع کردیں گے۔"

خاموشی کا ایک طویل وقفہ رات کے تاریک خلا میں ایسے معلق رہا جیسے پھانسی کے اندھے کنویں میں کسی لاوارث لاش ... انصاف کے نام پر قتل کردیا گیا ہو۔

آخر کار ٹائمز آف انڈیا کے نمائندے نے کہا "یہ ناممکن ہے۔ ایسا اب کہیں بھی ممکن نہیں پورا سچ نہ کوئی بول سکتا ہے اور نہ لکھ سکتا ہے۔"

"کوئی سنتا جو نہیں" اے پی آئی کے نمائندے نے مایوسی سے کہا۔

"اور نہ برداشت کرتا ہے۔ ہم صحافی میں خبریں بنانے والے ملازم ہیں۔ صرف وہی خبریں بناسکتے جو کاروباری لحاظ سے مالک کے لئے سودمند ہوں" ولیش سماچار کے نمائندے نے کہا۔

غالب نے کہا "میں بھی ایک صحافی تھا۔ اب میں ایک مجرم ہوں جسے یہ بھی معلوم نہیں کہ اب اس کے خلاف جرائم کی فہرست کتنی طویل ہے۔ میں تم سے حمایت یا جذباتی ہمدردی نہیں مانگ رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ تم مجبور لوگ ہو اور کسی کے لئے کچھ بھی نہیں کرسکتے۔ لیکن کیا تم سچ سنو گے؟"

انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور سوچ میں پڑ گئے۔

آخر کار دیش سماچار کا نمائندہ بولا "سن لینے میں کیا ہے؟ کوئی فائدہ نہیں تو نقصان بھی نہیں۔"

"نقصان کیوں نہیں۔ صرف حق دل میں کھٹکتا ہے' کانٹے کی طرح" اے پی آئی کا نمائندہ بولا۔

"ہم اس کا اظہار بھی نہیں کرسکتے کہ خلش مٹ جائے" ٹائمز آف انڈیا کا نمائندہ بولا "لیکن ہم تم سے سچ سننے پر تیار ہیں۔ آخر تم اس کا بوجھ کب تک اٹھائے پھرو گے؟ تم ہمارے قبیلے سے ہو۔ اپنا دل ہلکا کرنا چاہو تو کھل کے بات کرو۔"

"یہ بھی ہو سکتا ہے کہ... ہم سے تمہیں فائدہ نہ ہو تو نقصان بھی نہ ہو۔"

"تمہارا وہ چوتھا ساتھی کہاں ہے؟" غالب نے کہا۔

"وہ ہمارا ساتھی نہیں تھا۔"

"اس نے تو بس ہمیں لائن دی تھی۔"

"شوشہ چھوڑ کے خود کیسے غائب ہو گیا؟ کسی کو پتا ہی نہیں چلا۔"

غالب نے کہا "وہ کسی اور کو ہیڈ لائن دینے کے لئے چلا گیا۔ اسے کہیں اور جا کے کسی کے لئے خبر بنانی ہو گی۔ اس کے لئے حالات اور واقعات کا رخ بدلنا ہو گا۔ اپنے مفادات کے حق میں... خیر اچھا ہی ہوا کہ وہ چلا گیا' ورنہ میرا سچ کل جھوٹ بن کے شائع ہو جاتا۔"

چرچ کے اس کمرے میں جہاں ہم نے پادری کے سامنے اعتراف کیا تھا' میں نے' غالب نے اور نازو نے اخباری نمائندوں کے سامنے وہ حالات رکھے جو سائن کی ماں اور بہن کی افسوسناک موت کا سبب بنے تھے۔ میں نے اختصار سے کام لیا اور غیر ضروری تفصیلات کو حذف کر دیا مگر بنیادی حقائق ان سب کے سامنے رکھ دیئے۔ وہ سب ذہین' حساس اور باضمیر لوگ تھے۔ چوہدری دلاور کے ساتھ ذاتی عداوت سے شروع ہونے والے واقعات کا سلسلہ تریوینی تک اور بالک رام تک پہنچا۔ وہ حیران و پریشان سنتے رہے۔ کسی نے اسے افسانہ طرازی نہیں کہا اور ہم پر مبالغہ آرائی کا الزام نہیں لگایا۔ وہ جانتے تھے کہ یہ ملکی' برصغیر کی اور بین الاقوامی سیاست کا منظر نامہ ہے جس کو ان کا قلم بدل نہیں سکتا۔ وہ پس منظر کے حقائق سے بھی باخبر تھے چنانچہ انہیں ہماری بات سمجھنا مشکل نہ ہوئی۔ انہیں مشرقی پاکستان کی خانہ جنگی یا انتشار کی کیفیت کے محرکات کا علم تھا اور وہ جانتے تھے کہ اس شورش میں کتنا ہاتھ اپنوں کا ہے اور کتنا غیروں کا۔ وہ اسلحے کی عالمی منڈی کے ٹھیکے داروں کو پہچانتے تھے اور تسلط کی سیاست کے سارے داؤ پیچ سمجھتے تھے۔ لیکن انہوں نے اعتراف کیا کہ آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے' کان جو کچھ سنتے ہیں اور عقل جو کچھ سمجھاتی ہے' وہ لکھا نہیں جا سکتا۔ لکھا جائے تو شائع نہیں ہوتا اور شائع ہو جائے تو جھوٹ قرار دے دیا جاتا ہے اور "جھوٹے" کا منہ کالا ہوتا ہے۔ انہوں نے یہ بھی تسلیم کیا کہ وہ ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ سوائے اس کے کہ وہ سچ کو چھپالیں۔ اس کے خطرات اور مضمرات سے خود بھی بچ جائیں اور ہمیں بھی محفوظ رکھیں۔ جھوٹ مت بولو' سچ بھی مت بولو' اگر اس سے نقصان ہو کیونکہ ہم سب کمزور' خود غرض اور بے بس انسان ستراط نہیں ہیں۔

جب وہ چلے گئے تو میں نے غالب سے کہا "کیا اب ہم بھی جا سکتے ہیں؟"

غالب نے گھڑی دیکھی "دس بجے ہیں' کیا وہ سکھ ٹیکسی ڈرائیور ابھی تک ہمارے انتظار میں باہر کھڑا ہو گا۔ اور محسن؟"

نازو نے کہا "اور ہمارے وہ دشمن بھی جو یہاں کچھ نہیں کر سکے تھے؟"

میں نے کہا "میں پادری کو دیکھتا ہوں۔ مجھے اس سے معافی مانگنی ہے۔"

غالب نے کہا "چھوڑو' اسے ہم سے کوئی گلہ نہیں' ورنہ وہ کہتا..."

لیکن میں نے غالب سے اتفاق نہیں کیا۔ میں اسے تلاش کرتا ہوا اس کے رہائشی کوارٹر کی طرف گیا۔ اندر کی لائٹس آف تھیں۔ برآمدے میں ایک راہبہ دوزانو بیٹھی دعا مانگ رہی تھی۔ اسی نے مجھے بتایا کہ فادر سو چکے ہیں اور انہوں نے تاکید کی تھی کہ انہیں جگایا نہ جائے۔

"ان کے ساتھ ایک نوجوان تھا..."

"وہ بھی سو گیا ہے" راہبہ نے سرگوشی میں کہا "آہستہ بولو' فادر نے کہا تھا کہ اگر تم آؤ تو میں تمہیں بتادوں کہ ان کا دل تمہاری طرف سے صاف ہے اور انہوں نے خدا سے دعا کی ہے کہ وہ تمہارے راستوں میں آسانی پیدا کرے۔ تمہارے پیروں کو راستے کے کانٹوں سے محفوظ رکھے اور تمہیں بھٹکنے سے بچائے!"

میں نے راہبہ کے سامنے سر جھکا کے کہا "صبح ان کو بتانا کہ ہم بہت مقروض تھے۔ نیکی کے احسان کا یہ قرض باقی رہے گا۔ خدا نے توفیق دی تو شاید ادا ہو جائے ورنہ ان سے کہنا کہ اسے بھی معاف کر دیں۔"

میں واپس آیا تو غالب اور نازو نے لباس بدل لئے تھے۔ ہم دروازہ کھول کے باہر آئے اور رات کی وہ مسافت طے کرنے لگے جو چرچ کے احاطے میں بہت خاموش اور پرسکون تھی۔ ہمارے قدموں کے نیچے وہی سرخ بجری بچھا راستہ تھا۔ وہی سبزہ تھا اور وہی درخت تھے مگر اس وقت ہر چیز نے سیاہ ماتمی لباس پہن لیا تھا... ہمارا یہاں آنا بے مقصد نہیں رہا تھا۔ حسب توقع یہاں محسن بھی ملا تھا اور ہمارے لئے جال لے کر آنے والے شکاری بھیس

بدلنے کے باوجود پہچانے گئے تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے ہم پہچانے گئے تھے۔

ایک بار پھر ہمارے سامنے وہی دنیا تھی جس میں زندگی نے بساط اجل بچھا رکھی تھی اور خطرات کا کھیل جاری تھا۔ پرانے حریف نظر سے اوجھل تھے لیکن ان کی موجودگی کا احساس پوری توانائی اور شدت کے ساتھ اندھیرے کی آہٹ میں موجود تھا۔ ان کی آنکھیں ہر سمت سے دیکھتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔

میں نے گیٹ سے باہر آتے ہوئے ریوالور نکال لیا "سردار جی کی گاڑی تو ہے مگر ذرا غور سے دیکھو' کہیں اس مونچھ فورس کے ارکان تو گھات میں نہیں ہیں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ صرف دو افراد کی گرفتاری کے بعد توبہ کر کے بھاگ گئے ہوں۔" غالب نے کہا "وہ سامنے نہیں آئیں گے لیکن پیچھا بھی نہیں چھوڑیں گے۔"

نازو نے کہا "محسن کہاں گیا؟ اس نے ہم سے ملنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟"

"ممکن ہے وہ محسن نہ ہو... ہماری آنکھوں نے ایسا دیکھا ہو۔"

"یہ کیا فضول بات ہے!" میں نے برہمی سے کہا "میں آنکھوں کے بغیر بھی اس کو دیکھ سکتا ہوں اور کوئی مجھے محسن بن کے دھوکا نہیں دے سکتا۔"

"شاید وہ انہیں بھی دھوکا نہیں دے سکا" غالب نے کہا۔ "وہاں آنکھوں والے اور بھی تھے۔"

نازو نے کہا "تمہارا مطلب ہے... وہ پھر پکڑا گیا؟"

سردار جی سیٹ پر سر رکھے خراٹے لے رہے تھے۔ میں نے انہیں جگایا تو وہ ہڑبڑا کے اٹھے "اوئے آگئے ہو تسی لوگ؟" انہوں نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا "ان دونوں کا خیال تھا کہ تم نہیں ملو گے۔"

"لوجی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے... ہاں بارہ بجے کے بعد آتے تو میں نہ ملتا" سردار جی نے کہا "ایک بات تو بتاؤ۔ آخر یہ کیا گول مال ہے' میرا مطلب ہے اتنی پولیس کیوں آئی تھی؟ بڑا رولا پے گیا تھا۔"

میں نے کہا "بمبئی میں گول مال چلتا رہتا ہے۔ بس ہم بچ کے نکل آئے' یہی کافی ہے۔"

غالب نے کہا "تم تو محفوظ رہے نا' کسی نے تم سے تو کچھ نہیں کہا؟"

"میں تو واہ گورو کی کرپا سے دوڑ گیا تھا۔ جب پولیس دفع ہو گئی تو پھر آیا تھا" سردار جی نے گاڑی میں بیٹھ کے اسے اسٹارٹ کیا "سڑک کے پار سے سب دیکھتا رہا تھا۔ ہن دسو کتھے چلیے۔"

میں نے کہا "چلو کسی ایسی جگہ... جہاں کچھ دیر آرام ملے۔ خطرہ کوئی نہ ہو اور کھانا اچھا ہو۔"

"میری مانو تو سی فوڈ کھاؤ۔ واہ واہ مچھلی ملتی ہے ایک جگہ۔ ذرا دور ہے مگر آپ کے مطلب کی جگہ ہے۔"

نازو نے کہا "تم نے کسی نابینا کو دیکھا' اندھے کو۔ جس کے ہاتھ میں سفید چھڑی تھی؟"

"ہاں جی۔ ایک بڈھی مائی آگئی تھی ہاتھ پھیلائے۔ چنگی طرح جانتا ہوں میں اسے۔ وہ اندھی نہیں ہے" سردار جی نے کہا "شوقین گاڑی والوں کے پاس جا کے پوچھتی ہے مال چاہئے؟"

"بھئی' میں ایک بڈھے کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ وہ چرچ سے نکلا تھا" نازو نے کہا۔

"وہ... ہاں... لیکن وہ اسی اندھی کے ساتھ چل پڑا تھا۔ دونوں ہنسی مخول کر رہے تھے" سردار جی نے ہماری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ بار بار پوچھنے کے باوجود وہ بڑے یقین کے ساتھ ایک ہی بات دہراتے رہے۔ غلط فہمی کا سوال ہی نہیں۔ وہ دونوں ساتھ ہی گئے تھے۔ وہ بڈھا اکثر اس کے ساتھ نظر آتا ہے۔ دونوں پرانے ساتھی ہیں' معلوم نہیں ان کے درمیان میاں بیوی کا رشتہ ہے یا صرف گناہ کے کاروبار کا۔

جب میں نے کہا "یہ کیسے ہو سکتا ہے" تو یہ میرے مایوس ذہن کا ردعمل تھا۔ ایک خواہش تھی کہ کاش ایسا نہ ہو۔ اپنے یقین کو شکست سے بچانے کی کوشش تھی اور جھنجلاہٹ تھی۔

سردار جی نے گاڑی چلاتے ہوئے چہک کے کہا "لوجی۔ اپن بمبئی میں دس سال سے ٹوگڈی چلا رہے ہیں۔ اس سے پہلے بھی بڑے پاپڑ بیلے تھے۔ ہم تو سڑک سڑک کی مخلوق کو پہچانتے ہیں۔ ...اس اندھی نے پتا نہیں کتنی بار لال بتی پر میری سواریوں سے یہی پوچھا ہے اور سب بندے بھی فرشتے تو نہیں ہوتے۔ دوبار کسی نے کہا کہ کدھر ہے مال۔ تو اندھا بیٹھنے لگا ٹیکسی میں کہ میں لے چلتا ہوں۔ میں نے بے عزت کر کے اتار دیا کہ چل اتر... دے دے پتر۔ کوئی اور ٹیکسی پکڑ" اس نے پھر ہچکی لے کر کہا۔ "معاف کرنا۔"

اب میرے پاس سردار جی کو جھٹلانے کے لئے کوئی دلیل نہ تھی۔ میرا دل اب بھی کہتا تھا کہ میں نے محسن کو پہچاننے میں غلطی نہیں کی تھی لیکن اندیشہ غالب کا درست ثابت ہو رہا تھا اور میرے لئے خود اپنا دعویٰ باعث شرمندگی ہونے لگا تھا۔ سردار جی خاصی رفتار سے ساحل سمندر کے کسی سی فوڈ ریسٹورنٹ کی طرف رواں تھے۔ غالب نے کہا "سردار جی' ذرا سوچ کے ایک بات بتاؤ' آج جو لوگ یہاں آئے تھے' ان میں سے کوئی ایسا تھا جسے تم نے پہلے بھی دیکھا ہو۔"

نازو نے کہا "ہاں۔ تم دور سے دیکھتے رہے تھے۔ کیا تمہیں سب کے چہرے دکھائی دے رہے تھے؟ کوئی ایسا چہرہ یاد کرو جو بعد میں بھی نظر آیا ہو۔ جب سارے لوگ چلے گئے تھے۔"

سردار جی نے کہا "ہاں۔ ایک بندہ تھا ایسا۔ پر کوئی چنگا بندہ نہیں ہے وہ۔ پہلے باہر سے اندر دیکھتا رہا اس کے بعد غائب ہو گیا۔ ...وہ بات کرتے کرتے ہچکی لیتا تھا اور پھر کہتا تھا "ماف کرنا" غالباً وہ پیتا رہا تھا۔

"کیسے غائب ہو گیا؟ اندر چلا گیا یا کہیں اور چلا گیا؟"

"یہ تو میں نے نہیں دیکھا لیکن وہ بعد میں پھر نظر آیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ ادھر کیا ہو رہا ہے اور میں نے اسے ٹالنے کے لئے کہہ دیا کہ مجھے نہیں معلوم۔ سور دا پتر۔ خود اچھی طرح جانتا تھا سب کچھ اور پوچھ رہا تھا مجھ سے۔ بعد میں اس نے کہا کہ وہ جو تمہاری گاڑی میں آئے تھے وہ اندر ہی ہیں۔ تو میں نے کہا کہ جا میاں، اپنا کام کر۔ تو وہ ہنسنے لگا اور میرے کندھے پر ہاتھ مار کے بولا۔ تمہاری شکل پر کیوں بارہ بج گئے ہیں۔ کھوتا نہ ہو تو۔ ماف کرنا" اس نے چوتھی بار کہا اور میں نے شراب کی ہلکی سی بو محسوس کی۔

"کون تھا وہ شخص؟" میں نے کہا۔

"ہے ایک موالی۔ پیسہ لے کر بدمعاشی کرتا ہے۔ آپ نے کسی کے دانت تڑوانے ہوں۔ کسی کی عورت کو اٹھوانا ہو۔ کسی کے گھر میں آگ لگوانی ہو تو اس کو پیسہ دیں۔ وہ اپنے باپ کے دانت توڑ دے۔ اس کی گھر والی کو اٹھالائے۔ حرامی نمبر ون۔ یار کسی کا نہیں اور نہ وفادار۔ آج ایک سے مال لے کر جائے گا اس کے دشمن کا خانہ خراب کرنے۔ دوسرے دن دشمن سے مل جائے گا۔ اس سے پیسہ لے کر پہلے والے کا بیڑا غرق کرنے پر تیار ہو جائے گا۔ وہ دونوں برباد۔ اس کے دونوں طرف سے وارے نیارے مگر دیکھ لینا، کسی دن ایسا حشر خراب ہو گا...."

میں نے کہا "سردار جی، کوئی نام پتا بھی ہے اس کا؟ یا صرف قصے کہانیاں ہیں۔"

"نام ہے جی بیلی رام لیکن بیل کہتے ہیں سب۔ ہر ایک کو ٹکریں جو مارتا پھرتا ہے، پاگل بیل کی طرح۔ ٹھکانا نہیں معلوم لیکن کوئی ایسی ویسی بات ہے تو بتاؤ، پتا چل جائے گا۔" سردار جی نے کہا۔

"کہاں سے۔ اور کس سے؟"

"ہیں جی اپنے بھی بندے۔ جس کا کہو اس کا اگلا پچھلا سارا ریکارڈ نکال لائیں... لیکن آپ کا اس سے کیا تعلق ہے جی؟ وہ کیوں پوچھ رہا تھا آپ کو... ماف کرنا۔"

"یہی تو ہم اس سے پوچھنا چاہتے ہیں۔ مگر یہ تم کہاں لے جا رہے ہو ہمیں؟" میں نے کہا "یہ کون سی جگہ ہے؟"

گاڑی ایک پیٹرول پمپ میں داخل ہوئی تھی لیکن پیٹرول ڈلوانے کے لئے کسی پمپ کے سامنے ٹھہرنے کے بجائے عمارت کے گرد گھوم کر پیچھے پہنچ گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ مجھے کسی گڑبڑ کا احساس ہوتا گاڑی رک گئی۔ ایک ساتھ اندھیرے سے چھ افراد نکل آئے جن کے ہاتھوں میں خطرناک قسم کے خود کار آتشیں ہتھیار تھے۔ انہوں نے گاڑی کے چاروں دروازوں کو روک لیا۔

سردار جی نے ہم سے دغا کی تھی۔ انہوں نے ہمارا اعتماد حاصل کرنے کے بعد ہمیں دشمنوں کے ہاتھ بیچ دیا تھا۔ ہم اجنبی شہر کے راستوں سے ناواقف تھے۔ انہوں نے ہمیں باتوں میں الجھالیا اور ہمیں احساس بھی نہ ہوا کہ مال تجارت کی طرح ہمارا سودا ہو چکا ہے اور اب ہمیں خریداروں کے حوالے کرنے کے لئے لے جایا جا رہا ہے۔ سردار جی نے ہماری ڈلیوری دے دی تھی اور گاڑی روکتے ہی باہر نکل گئے تھے اور بڑی بے غیرتی کے ساتھ ہمارے دشمنوں کے پیچھے کھڑے دانت نکال رہے تھے۔

اچانک گاڑی کو ایک جھٹکا لگا، پھر دوسرا۔ اس کے دونوں اگلے ٹائروں سے ہوا بڑی آواز کے ساتھ خارج ہوئی۔ چند سیکنڈ کے وقفے سے پیچھے والے ٹائر فلیٹ ہوئے اور گاڑی بیٹھ گئی۔

"کیا تمہیں باہر آنے کے لئے کہنا پڑے گا؟" ایک شخص نے غرا کے کہا۔

"اگر دماغ میں کوئی احمقانہ خیال ہے کہ تم کچھ کر سکتے ہو تو اسے نکال دو" دوسرے شخص نے نسبتاً شائستہ لہجے میں کہا اور انگریزی میں بات کی "آہستہ آہستہ باری باری باہر آجاؤ۔"

تیسرے نے کہا "اگر چالاکی دکھائی نا..."

دوسرے شخص نے اسے ٹوک دیا "جب میں بات کر رہا ہوں تو تم کو بھونکنے کی ضرورت نہیں۔"

تیسرا شخص گالی دیتے دیتے رک گیا تھا۔ دوسرا شخص ان سب کے درمیان باس کی حیثیت رکھتا تھا لیکن وہ خود بھی کسی باس کے حکم پر ہمیں لینے آیا تھا، یہ بات سمجھنا مشکل نہیں تھا۔ معلوم نہیں کیوں مجھے اس کی صورت دیکھی ہوئی لگی۔

"تمہاری کسی حرکت سے یہ شبہ نہیں ہونا چاہئے کہ تم مقابلے کا ارادہ رکھتے ہو" دوسرے آدمی نے کہا "اپنے ہاتھوں کو کنٹرول میں رکھو اور جیب سے دور رکھو۔ ورنہ تمہارے یہ ہاتھ ہمیشہ کے لئے ناکارہ ہو جائیں گے۔ شاید تمہارے جسم کا حصہ ہی نہ رہیں۔"

ہم اپنی کوتاہ اندیشی کے باعث اتنی آسانی سے گرفتار ہو گئے تھے۔ ہم دشمنوں کے حصار کو توڑ کر نکل آئے تھے مگر بھروسہ کرنے کی غلطی کر بیٹھے تھے حالانکہ میدان جنگ اگر دشمن کا علاقہ ہو تو کسی پر بھی اعتبار کا رسک نہیں لینا چاہئے۔

سب سے پہلے میں باہر نکلا اور میں نے سردار جی سے کہا۔ "میرا خیال تھا، سکھ بہادر قوم ہیں۔ پیٹھ میں خنجر نہیں گھونپتے۔ یاری کا نام بدنام نہیں کرتے۔"

"او چھڈو جی۔ سب سے بڑا یار ہے پیسہ" سردار نے کہا۔

...یا گانا ہے۔ باپ بڑا نہ بھیا۔ بھیا سب سے بڑا روپیا۔ ہاں جی، ...سے بڑا روپیا" وہ بے سری آواز میں گانے لگا۔

...نازو اور غالب بھی پیچھے کے دونوں دروازوں سے نکل آئے۔ ...ن کی خوں آشام نظریں بھی سردار جی پر مرتکز تھیں "کسی دن ...یں معلوم ہو جائے گا کہ سب سے بڑا کون ہے۔"

سردار جی نے قہقہہ مارا اور جیب سے ایک چپٹی سی بوتل ...ل کے منہ سے لگالی۔

"اس سکھ کو اندر لے جاؤ اور اس کا حساب صاف کر دو"

"وہ جی۔ آپ نے میرے کو پانچ دئے تھے" سردار نے ...یں انگلیاں پھیلا کے کہا "ان کو بتا دیں اپنے کرنل صاحب۔ ...اتنے ہی اور دینے ہیں۔ کوئی لفڑا نہ کریں یہ میرے ساتھ۔ ...ر گڈی کے ٹائر..."

"تم جاؤ۔ انہیں سب معلوم ہے" اس شخص نے کہا جسے ...ل کے نام سے مخاطب کیا گیا تھا "تمہارا کام ختم ہو گیا۔"

دو افراد نے سکھ کو اباؤٹ ٹرن کر دیا اور اسے پیٹرول پمپ ...عمارت کے عقبی دروازے سے اندر لے گئے۔ ان کے تیور ...بھی دوستانہ نہیں تھے۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ حساب نہیں ...ردار جی کا قصہ پاک کر دیں گے۔ اس خیال کی تصدیق بھی فوراً ...ہو گئی۔ اندر سے سردار جی کے چلانے کی آواز آئی۔

"اوئے۔ اوئے بدبختو۔ اوئے یہ کیا۔ اوئے تم کو رب دی ...۔ اچھا چھڈ دو۔ میں نئیں مانگتا کچھ بھی۔ مجھے جانے دو" ان ...آواز میں وحشت تھی جو ایک دم موت کی دہشت میں بدل گئی۔ ...انہوں نے ایک چیخ ماری۔ پھر ایک فائر ہوا جو کسی سائلنسر لگے ...پسٹل سے کیا گیا تھا۔ سردار جی کی آخری چیخ دبا دی گئی۔ انہیں ...اپنے ساتھ لے جانے والے دونوں افراد واپس آگئے۔ کسی نے ...بات کوئی سوال نہیں کیا، جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ جو ہوا وہ پہلے ...سے طے تھا۔

ان میں سے ایک نے نوٹوں کی ایک گڈی آگے بڑھائی جو ...میرے اندازے کے مطابق پانچ ہزار ہی تھے۔ کرنل نے بے دلی ...سے وہ گڈی جیب میں ڈال لی۔ باپ بڑا نہ بھیا۔ سردار جی، سب ...سے بڑا روپیا، جس نے تم سے بھی دغا کی۔ میں نے دکھ کی تلخی کے ...ساتھ سوچا۔

وہ پیٹرول پمپ اور اس سے ملحق سروس اسٹیشن دونوں بند ...تھے۔ جب سردار جی نے گاڑی اندر موڑی تھی تو مجھے اندھیرا اور ...ویرانی دیکھ کر عجیب سا لگا تھا کیونکہ عام طور پر پیٹرول پمپ بہت ...روشن اور آباد رہتے ہیں لیکن پھر میں نے دیکھ لیا کہ اس کے اندر ...جانے اور جانے کے راستے تارکول کے ڈرم رکھ کے بلاک کر دئے ...گئے تھے اور عمارت پر کپڑے کا بینر لگا دیا گیا تھا۔ اس پر ہندی میں ...کچھ لکھا ہوا تھا جو میں پڑھ نہیں سکا تھا لیکن اب مجھے اندازہ ...ہو گیا تھا کہ پیٹرول پمپ تعمیر نو کے مراحل میں تھا۔ اس کے عقبی حصے میں دوسرا بینر نظر آرہا تھا جس پر انگریزی میں کرم فرماؤں کو مطلع کیا گیا تھا کہ ہم معذرت خواہ ہیں۔ نئی انتظامیہ بہت جلد بہترین سروس کا آغاز کرے گی۔ یہ بینر یا تو ہٹالیا گیا تھا یا ابھی لگایا ہی نہیں گیا تھا۔

کرنل نے کہا "انہیں باری باری اندر لے جاؤ۔"

سردار جی کے قاتل انہی دو افراد نے مجھے اباؤٹ ٹرن کرنے کی کوشش کی۔ میں نے انہیں دور پھینک دیا "تم اتنی آسانی سے ہمیں نہیں مار سکتے جتنی آسانی سے تم نے اس سکھ ڈرائیور کو مار دیا" میں نے کہا اور اپنا ریوالور نکال لیا۔ وہ سب اسی طرح کھڑے رہے۔

"کوئی ہمارے قریب آیا تو مارا جائے گا" نازو نے کہا۔ مجھے اس کے ہاتھ میں ریوالور نظر آیا۔

ریوالور غالب نے بھی نکال لیا تھا۔ سردار جی کے انجام کے بعد کسی خوش فہمی کی گنجائش تھی تو وہ کرنل کے احکامات سن کے ختم ہو گئی تھی۔ پہلے ہم صورت حال کا مشاہدہ کر رہے تھے اور قبل از وقت کسی نے بھی رسک لینے کی کوشش نہیں کی تھی مگر جب سردار جی کی طرح مجھے قتل گاہ لے جانے کا فرمان صادر ہوا تو مقابلہ کئے بغیر باری باری مرنے کے خیال کو کسی کا ذہن قبول نہ کر سکا۔ یہ اتنا ہی ناممکن تھا جتنا اپنے مقصد سے منحرف ہو کے شکست قبول کرنا، یا ایم آر ایس کے مشن سے تائب ہونا۔ اگر پہلے کبھی ایسی صورت حال سامنے آئی تھی تو اپنی فطرت اور مزاج کے تقاضوں کے مطابق ہمارا رد عمل ایک تھا اور ایک جیسا تھا کہ مرنا ہی پڑا تو دشمن کو مرتے مرتے بھی مار جائیں گے۔

خلاف توقع کرنل نے یا اس کے کسی ماتحت نے مشتعل ہو کے گولی نہیں چلائی اور کوئی مشترکہ کارروائی نہیں کی۔ وہ اپنے خطرناک ہتھیاروں کا رخ ہماری طرف کئے کھڑے رہے۔

پھر کرنل نے کہا "بے وقوفی کی بات مت کرو، ہم تمہیں قتل نہیں کر سکتے۔"

"کیوں قتل نہیں کر سکتے؟"

"اس لئے کہ ابھی یہ فیصلہ نہیں کیا گیا۔ ورنہ کیا یہاں تمہیں گولی نہیں ماری جا سکتی۔ ہم تمہارے گاڑی سے اترنے کا انتظار بھی نہ کرتے اور تمہیں اندر ہی چھلنی کر دیتے" کرنل نے کہا۔

"پھر تم ہمیں کیوں اندر لے جانا چاہتے ہو؟" نازو نے کہا۔

"اندر تمہارے لئے بیٹھنے کی جگہ ہے۔ آخر کب تک کھڑے رہو گے تم لوگ یہاں؟" کرنل نے کہا "تمہارے ساتھ ہمیں بھی کھڑا رہنا پڑے گا رات کے بارہ بجے تک۔"

"اور رات کے بارہ بجے کیا ہو گا؟" غالب نے کہا۔

"مجھے نہیں معلوم" کرنل نے سپاٹ لہجے میں کہا "مجھے صرف یہ حکم ہے کہ تمہیں کوئی تکلیف نہ ہونے دوں۔ میں نے

اپنے طور پر چائے کا انتظام کیا ہے۔"

"تمہیں حکم دینے والا کون ہے؟" میں نے کہا۔

"میں ایسے سوالوں کا جواب نہیں دوں گا۔ آپ لوگ اندر چلیں پلیز۔ اور یہ ریوالور استعمال کرنے کی مت سوچیں۔ آپ لوگ خواہ مخواہ تین آدمی ماردوگے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ باقی بچ جانے والے تمہیں ماردیں گے" کرنل نے انتہائی سرد اور غیر جذباتی لہجے میں کہا۔

"مارے جانے والوں میں تم بھی ہوسکتے ہو کرنل" میں نے کہا۔

"ہاں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ تم ایسی بے وقوفی نہیں کروگے کہ خود اپنی موت کا سبب بنو۔ میں نے تمہیں بتادیا ہے کہ تمہیں بحفاظت اپنی تحویل میں رکھنے کے سوا میری کوئی ذمے داری نہیں اور یہ ذمے داری بھی بارہ بجے ختم ہوجائے گی۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد" اس نے کلائی کی گھڑی دیکھ کر کہا۔

کرنل کی عمر چالیس سال سے زائد تھی مگر وہ تیس سال کا نظر آتا تھا۔ عمر کی چغلی وہ تھوڑے سے سفید بال کھاتے تھے جو کنپٹی کے پاس سفید ہوچکے تھے۔ سر کے باقی بال سیاہ اور گھنے تھے۔ وہ چھ فٹ قد کا وجیہہ اور اسمارٹ آدمی تھا جس کا چہرہ سپاٹ رہتا تھا۔ اس کے اندازِ گفتگو اور اطوار میں ایک دھیما پن تھا جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کوئی کام عجلت میں کرنے کا عادی نہیں۔ اس کی آنکھیں بھی سوچ میں ڈوبی ہوئی لگتی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ وہ پلکیں نہیں جھپکاتا مگر غور سے دیکھنے پر اندازہ ہوا کہ میرے یا عام آدمی کے مقابلے میں وہ بہت کم اور بہت دیر سے پلک جھپکاتا تھا۔ وہ بھی اتنی تیز کہ پتا نہیں چلتا تھا۔ اس کی آواز بھاری تھی اور وہ ہر لفظ کی ادائیگی میں تلفظ کا خیال رکھتا تھا۔ یقیناً یہ اس کی عادت تھی مگر محسوس یہ ہوتا تھا کہ اس کا یہ اندازِ تکلم فطری نہیں ہے اور یہ لہجہ مصنوعی ہے۔ ممکن ہے اس نے یہ مخصوص اور پُر تاثر اندازِ گفتگو خاصی مشق کے بعد حاصل کیا ہو۔ اس کی انگریزی میں کانونٹ کا رنگ غالب تھا۔ اگر وہ کبھی فوج میں کرنل رہا تھا تو اس کا تعلق ریگولر فورس سے نہیں ہوسکتا تھا ورنہ وہ اتنی کم عمری میں ریٹائر نہ ہوتا۔ اس میں بظاہر کوئی جسمانی نقص بھی نہیں تھا کہ اس کو میڈیکل گراؤنڈ پر پنشن دے دی گئی ہو۔ وہ شارٹ سروس کمیشن لینے والا میڈیکل کور یا ایجوکیشن کور کا کرنل ہوسکتا تھا۔ یا پھر آخری صورت یہ تھی کہ اسے فوج سے ڈسمس کردیا گیا ہو۔

"میری وضاحت کے بعد سوچ بچار میں پڑنے کا مطلب ہے کہ تم مجھے قابلِ اعتبار نہیں سمجھتے" کرنل نے کہا۔

"کیا دشمن کبھی قابلِ اعتبار بھی ہوسکتا ہے کرنل؟" میں نے کہا۔ "ہم تو اس غلطی پر پچھتارہے ہیں کہ ہم نے اس سکھ ڈرائیور پر بھروسہ کیا۔"

"ہم تمہاری میزبانی پر لعنت بھیجتے ہیں" نازو نے کہا۔

کرنل نے افسوس سے سرہلایا "تم یہ بھی نہیں سمجھتے کہ تم انکار کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہو۔"

وہ پلٹ کے خاموشی سے اندر چلا گیا۔ اس کے چلنے کا انداز بھی ایسا تھا جیسے اس کے قدموں کے نیچے سرخ قالین بچھا ہوا ہے اور وہ کسی سربراہِ مملکت کی طرح دونوں جانب استادہ گارڈ آف آنر کا معائنہ کرتا جارہا ہے۔ وہ ایک ایسا شخص تھا جو اپنی بھرپور شخصیت کی طاقت سے کسی پر بھی نفسیاتی غلبہ حاصل کرسکتا تھا اور اس سے پورا فائدہ اٹھانے کا عادی تھا۔ وہ احساسِ برتری کا شکار تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ وہ حکم دینے کے لئے پیدا ہوا ہے چنانچہ حکم کی تعمیل کے لئے پیدا ہونے والی اکثریت کو اس کا یہ پیدائشی حق تسلیم کرلینا چاہئے۔ اس کی صورت میرے ذہن میں ایک ناقابلِ فہم خلش پیدا کررہی تھی۔

ہم چھ مسلح محافظوں کے نرغے میں تھے اور خود بھی ان پر ریوالور تانے کھڑے ہوئے تھے لیکن یہ ایک عددی حقیقت تھی کہ ہم صرف تین کو مارسکتے تھے جو ہمارے سامنے تھے۔ ہمارے پیچھے موجود تینوں افراد اس کے ساتھ ہی ہمارا سرپاش پاش کرسکتے تھے۔ وہ طے شدہ طور پر مرنے کے لئے تیار تھے کیونکہ یہ جاں نثاری ان کے عہد نامے کی ایک شرط تھی۔ انہیں جتنے مادی فوائد حاصل ہوتے رہے تھے، وہ بے سبب نہیں تھے۔ انہیں بتادیا گیا تھا کہ وہ زندگی پر اپنے اختیار کو گروی رکھ چکے ہیں۔ ہم انہیں ماردیتے اور پھر وہ ہمیں ماردیتے، اس سے واقعی کچھ حاصل نہیں ہوسکتا تھا۔ زندگی کی مہلت کا ہر لمحہ غنیمت تھا جس سے امید وابستہ رکھی جاسکتی تھی کہ شاید قدرت کوئی موقع فراہم کردے۔

ابھی میں نے ریوالور جیب میں رکھنے اور غالب اور نازو کو کرنل سے تعاون کے لئے آمادہ کرنے کا سوچا ہی تھا کہ جیسے آسمان ٹوٹ پڑا۔ میں دائیں بائیں یا آگے پیچھے چاروں سمت میں ضرور دیکھ رہا تھا لیکن یہ بھول گیا تھا کہ اوپر نیچے کی دو سمتوں سے بھی آفات نازل ہوسکتی ہیں۔ کسی نے پیٹرول پمپ کی عمارت کے اوپر سے جال پھینکا۔ میرا فوری ردعمل پلٹ کر دیکھنے اور ہاتھ پاؤں چلا کے جال کے پھندوں سے نجات حاصل کرنے کا تھا مگر چھت پر اندھیرے میں مجھے کچھ نظر نہ آیا۔ میں نے ریوالور کا رخ اوپر کرکے جو فائر کیا اس سے آسمان میں سوراخ نہیں ہوا۔ جال پھینکنے والے نے رسی کھینچی اور مجھے گٹھری بنادیا۔ میں نے آس پاس کھڑے ہوئے مسلح افراد میں سے کسی کو ہنستے سنا۔ غالباً یہ وہی تھا جس کو کرنل نے بھونکنے سے منع کردیا تھا۔

تین چار منٹ میں تین گٹھریاں اندر پہنچادی گئیں۔ ان میں میرے علاوہ غالب اور نازو بندھے ہوئے تھے۔ اندر ایک درمیانے سائز کا کمرا تھا جس میں اسٹیل کی میز کرسی رکھی ہوئی،

...یہ شاید پیٹرول پمپ کے کیشیئر کی ٹیبل تھی جو اس پر بیٹھتا ...آؤٹ گوئنگ کا حساب لکھتا ہوگا۔ میز کی سطح کا اصل رنگ تیل اور ...گریس کے دھبوں سے نظر ہی نہیں آرہا تھا۔ فرش بھی چکنا اور ...میلا تھا اور دیواروں پر بھی تیل کے داغ اور گریس بھری انگلیوں ...کے نشانات سے نقش ونگار بنے ہوئے تھے۔ کمرے کی فضا میں ...ڈیزل، پیٹرول اور انجن آئل کی ملی جلی بو بس گئی تھی۔ مسلح ...گارڈز نے ہمارے اور اس کے پیچھے پوزیشن سنبھال لی۔

کرنل میز کے پیچھے والی ٹین کی کرسی پر ایسے بیٹھا تھا جیسے اپنی ...کے آفس میں بیٹھا ہو۔ اس کے سامنے ایک لکڑی کی بینچ ...اور ٹین کی دو کرسیاں، دائیں بائیں ہاتھ پر بھی رکھی ہوئی ...تھیں۔ کمرے کو روشن کرنے والی واحد ٹیوب لائٹ اس کے پیچھے ...دیوار پر نصب تھی۔ دوسری ٹیوب مسلسل جل بجھ رہی تھی۔ ...چائے کا سامان بڑے سلیقے سے رکھا گیا تھا۔ کپ چار تھے ...اور نشست کی ترتیب دیکھ کر رکھے گئے تھے۔ ہمیں اندر لانے ...کے بعد کسی دشواری کے بغیر ہمارے ہاتھوں سے ریوالور لے لئے گئے ...اور پھر ہمیں کھول دیا گیا۔ کرنل نے کوئی حکم جاری نہیں کیا اور ...ایسے دیکھتا رہا جیسے اس کی تربیت یافتہ فورس کے ماتحت جو اں وہی ...کررہے ہیں جو انہیں کرنا چاہئے۔ اس نے ہماری تشریف آوری ...کے اس انداز پر کسی قسم کا طنزیہ یا مزاحیہ تبصرہ بھی نہیں کیا لیکن ...اشارے سے ہمیں بیٹھنے کے لئے ضرور کہا اور سگریٹ پیتا رہا۔

میں نے بہتر سمجھا کہ اس شکست کو قبول کرنے میں عالی ظرفی ...کا اظہار نہ کرنے سے ہمیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ چیخنے چلانے ...ہنگامہ کرنے سے ہم خود اپنی نظر میں تماشا بنیں گے۔ کرنل کسی ...تماشے سے محظوظ ہونے والا آدمی نہیں تھا۔ میں نے غالب کی ...طرف دیکھ کے سرہلایا، جو اشارہ تھا مزاحمت کا سلسلہ موقوف ...کرنے کا۔

"اگر ہم مختلف حالات میں ملے ہوتے تو میں تم سے مل کے ...خوش ہوتا۔ کرنل" میں نے آخری لفظ طنزاً کہا۔ میری نگاہ اپنی ہوئی ...کے درمیان میں رکھی ہوئی غیر ملکی برانڈ کی بہترین سگریٹوں ...پر تھی۔

"حالات آدمی نہیں بناتا" کرنل نے کسی فلسفی کی طرح کہا ...اپنی پسند کے مطابق چائے بناؤ۔ اس میں زہر نہیں ہے، ...ٹیسٹ لو۔"

"کیسے سے۔ تھوڑا سا بھی نہیں مل سکتا؟" میں نے مایوسی ...سے کہا اور ایک سگریٹ لے لی۔

"کیا کروگے؟" کرنل نے کہا اور لائٹر میری طرف بڑھادیا۔

"تمہاری چائے میں ڈالوں گا" میں نے کہا لیکن کرنل ...اس مذاق پر مسکرایا تک نہیں۔

"خاتون! آپ یقیناً ان کی پسند سے واقف ہوں گی۔ میرے لئے ایک چمچہ چینی۔ نو ملک، تھینک یو" کرنل نے نازو سے مخاطب ہوکے کہا مگر اس کی طرف دیکھا نہیں۔

نازو کا چہرہ لال ہوا تھا مگر میں نے اسے پھر اشارے سے سمجھایا کہ فی الحال جذبات پر قابو رکھے۔ نازو نے باری باری سب کے لئے چائے بنائی اور ایک بااخلاق خاتونِ خانہ کی طرح سب کو پیش کی۔ ہم نے کھانے پینے کی چیزیں اٹھانے میں تکلف نہیں کیا۔ میں کرنل کو خاموشی سے چائے پیتے دیکھ رہا تھا کہ ایک دم وہ خلش دور ہوگئی جو اس کی صورت نے پیدا کی تھی۔ وہ چوتھا شخص تھا۔ چرچ میں اسی نے ہماری طرف انگلی اٹھاکے کہا تھا کہ یہ چرچ کے لوگ نہیں ہیں اور اسی نے تین اخباری نمائندوں کو اکٹھا کیا تھا لیکن بعد میں خود پُراسرار طور پر غائب ہوگیا تھا لیکن اس وقت وہ ایک قطعی بدلی ہوئی شخصیت تھا۔

میں نے کہا "تم اس مونچھ فورس کو کمانڈ کررہے تھے۔ کرنل، میں نے تمہیں پہچان لیا۔"

"اگر تم باقی لوگوں کو بھی پہچان لیتے ہو تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟" کرنل نے کہا۔

"تمہارا وہ چہرہ، وہ اندازِ گفتگو، چال ڈھال کا وہ طریقہ اصلی تھا؟ یا یہ جواب ہمارے سامنے ہے؟" غالب نے کہا۔

نازو نے تلخی سے کہا "شاید دونوں اصلی نہیں۔"

کرنل نے صرف انگلی اٹھاکے کہا "خاتون کی سوچ زیادہ حقیقت پسندانہ ہے۔"

"لوگ تمہیں کرنل کیوں کہتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"اگر لوگ مجھے میرے اصلی نام سے پکارتے تب بھی تم یہ سوال کرتے۔ پھر تم یہ بھی پوچھ سکتے تھے کہ میرے والدین نے میرا نام کچھ اور کیوں نہیں رکھا۔ یہ احمقانہ بات ہوگی۔ اگر یہ میز ہے تو میں پوچھوں کہ اس کا نام بینچ کیوں نہیں ہے۔"

وہ جھکی آدمی تھا اور ہر لمحہ اس کوشش میں نظر آتا تھا کہ اپنے سامنے والے پر چھا جائے۔ اسے ذہنی ونفسیاتی طور پر کمتری کے احساس میں مبتلا کردے۔ اس کا یہ رویہ جھنجلاہٹ پیدا کررہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ دلاور یا تریونی کی طرح غرائے۔ اکڑفوں دکھائے، مذاق اڑائے میری بے بسی کا۔ مجھے ڈرائے دھمکائے اور خوف میں مبتلا کرے۔ مجھے ذلیل وخوار کرے اور مجھ سے پوچھے کہ اب کیا ارادہ ہے تاکہ میں جواب میں یہی سب کچھ اس کے ساتھ کروں۔ لیکن وہ ان سب باتوں سے بے نیاز، عجیب لاتعلقی کے ساتھ بالکل مطمئن بیٹھا تھا جب کہ میں سکون اور اطمینان سے محروم تھا۔ مجھے دلاور اور تریونی، پیڈرو یا عبداللہ کے مقابلے میں کرنل ایک بہت زیادہ خطرناک اور سفاک دشمن لگا۔ اس کی خاموشی اور بے نیازی کا اثر غالب اور نازو کے اعصاب پر بھی پڑرہا تھا۔ ان کی نظر بار بار گھڑی پر جارہی تھی۔

ابھی صرف بیس منٹ گزرے تھے۔ ایک گھنٹا دس منٹ کا انتظار باقی تھا جس میں ہمیں ایسے ہی بیٹھے رہنا تھا۔ کرنل سے کوئی بات کرنا' اس سے کچھ پوچھنے کی کوشش کرنا' اسے گالیاں دینا یا اس کا مذاق اڑانا سب بے کار تھا۔ حالات پوری طرح اس کے کنٹرول میں تھے اور اسے وقت کی سست رفتاری کا بھی احساس نہیں تھا۔

کرنل کے پیچھے اور میرے سامنے والی دیوار وہی تھی جس کے دروازے سے گزر کے ہم اندر آئے تھے۔ سڑک کہیں میرے پیچھے تھی۔ دائیں جانب کی دیوار میں الماری جیسے کھلے شیلف مختلف ناموں کے انجن آئل اور بریک آئل کے ڈبوں' کار پالش اور ایسی ہی چیزوں سے بھرے ہوئے تھے جو عام طور پر پیٹرول پمپ سے ملتی ہیں۔ بائیں جانب کی دیوار کے وسط میں چھ فٹ چوڑا اور تین فٹ اونچا خلا تھا جس کو شیشے سے بند کیا گیا تھا۔ ریڈیو اسٹیشن میں ایسی پارٹیشن اسٹوڈیو اور پروڈیوسر کے کمروں کے بیچ میں ہوتی ہے جہاں سے پروڈیوسر اشارہ دیتا ہے۔ اس شیشے کی پارٹیشن کا مقصد بھی کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا تھا۔ اس کے دوسری طرف سروس اسٹیشن تھا جہاں گاڑیاں دھوئی جاتی تھیں اور ان کا آئل وغیرہ بدلا جاتا تھا۔ شاید منیجر اس کمرے میں بیٹھ کے کاریگروں پر نظر رکھتا تھا۔

اس شیشے کی دیوار کی موجودگی کا احساس مجھے اس وقت ہوا جب دوسری طرف کا تاریک منظر یکلخت روشن ہوگیا اور وہ شیشے کی مستطیل کسی بہت بڑے ٹی وی اسکرین کی طرح نظر آنے لگی۔ مجھے اس کمرے کی مجموعی حالت کے پیش نظر یہ غیر معمولی طور پر صاف شفاف شیشہ اتنا ہی بے جوڑ لگا جیسے ٹاٹ میں مخمل کا پیوند لگتا ہے۔ اس پر کوئی داغ دھبہ نہیں تھا جو بڑی عجیب بات تھی کیونکہ دوسری طرف بھی جو کام ہوتا تھا وہ صاف ستھرا نہیں تھا۔ گاڑی اوپر اٹھا کے اس پر بڑے پریشر کے ساتھ تیل ملا پانی ڈالا جاتا تھا اور گاڑی کی باڈی کے نیچے کا سارا میل کچیڑ دھونے سے ہر طرف چھینٹے اڑتے تھے۔ ہر سروس اسٹیشن کی دیوار تیل سے سیاہ اور چکنی رہتی ہے مگر اس شیشے پر ایک دھندلا سا نشان تک نہیں تھا۔ یہ بالکل نیا شیشہ تھا جسے کسی خاص ضرورت کے لئے خشک اور نرم کپڑے سے یوں صاف کیا گیا تھا کہ اس پر لائن بھی نہ پڑے۔

یہ ضرورت فوراً واضح بھی ہوگئی۔ سکھ ڈرائیور کی لاش اس پلیٹ فارم پر نمودار ہوئی جو گاڑیوں کو چیسس کے ساتھ اٹھالیتا ہے۔ اس کے نیچے گول ستون نما ہائیڈرالک پریس تھا۔ لاش کے کپڑے اتار لئے گئے تھے۔ پھر سروس اسٹیشن کی یونیفارم میں دو افراد پائپ لئے نمودار ہوئے اور انہوں نے لاش کی سروس شروع کی۔ شیشے کی وجہ سے پورے پریشر کے ساتھ نکلنے والے پانی کی شوں شوں بالکل سنائی نہیں دے رہی تھی اور یہ کسی خاموش فلم کا منظر دکھائی دیتا تھا۔ ہم ایک ہی بینچ پر بیٹھے ہوئے تھے چنانچہ سب کی نظر اس منظر کو بلا ارادہ دیکھ رہی تھی۔ سکھ ڈرائیور اچھا آدمی نہیں تھا اور جو کچھ اس نے ہمارے ساتھ کیا وہ بہت برا تھا مگر پھر بھی ہمیں اس کی لاش کے ساتھ یہ غیر انسانی سلوک دیکھ کر خوشی نہیں ہو رہی تھی۔ آدمی کی نیکی بدی اس کی ذات کے ساتھ ہے۔ ہم اسے سزا دے سکتے تو ضرور دیتے' وہ مرگیا تو اس کا اور ہمارا حساب اوپر چلا گیا۔ روح کے بدن سے جدا ہوتے ہی وہ جزا وسزا کی اذیت و مسرت کے احساس سے ہی بیگانہ ہوگیا تھا۔ اب اس کی لاش کو جلا دو' پیس دو' کتوں کے آگے ڈال دو یا عبرت کے لئے شہر کے چوک میں الٹا لٹکائے رکھو۔ یہ صرف لاش کی بے حرمتی ہے اور کچھ نہیں۔

نازو نے کہا "بہادر کرنل! کیا تمہارا غسل میت بھی ایسا ہی مشینی اور سائنٹفک ہوگا؟"

غالب نے کہا "کیسی باتیں کرتی ہو۔ کرنل کے لئے موت نہیں ہے۔"

میں نے کہا "یہ سب تو ہمیں دہشت زدہ کرنے کے لئے ہے۔"

کرنل نے ایک سگریٹ جلائی اور پیکٹ مجھے پیش کیا "میں زیادہ پروا نہیں کرتا کہ میری لاش کا کیا بنے گا۔ یہ میرے وارثوں کا دردِ سر ہے کہ وہ ان طریقوں میں سے' جو رائج ہیں' کوئی بھی طریقہ اختیار کرلیں۔ تم نے سنا ہوگا ایک فرقے کے بارے میں۔ جو لاش کو مرنے کے بعد جانوروں کی ضیافت کے لئے رکھ دیتے ہیں۔ یہ سب سوچنے کی بات ہے ورنہ ان کے جذبات بالکل مجروح نہیں ہوتے۔"

"تم یہ ظاہر کرتے ہو کہ تمہارا انداز فکر کتنا غیر جذباتی ہے لیکن اس کی جگہ تمہاری ماں کی لاش ہوتی..." نازو نے کہا مگر اس کی بات ادھوری رہ گئی۔

میں نے تو پہلے ہی دیکھ لیا تھا کہ لاش کے ساتھ کیا ہو رہا ہے... نازو کی نظر اب لاش پر گئی تو وہیں جم کے رہ گئی۔ پانی کے ساتھ آہستہ آہستہ لاش کے جسم پر سے گوشت اترنے لگا تھا۔ ریشہ ریشہ ہوکے اس کی بوٹیاں ایسے بہنے لگی تھیں جیسے واقعی وہ خاک کا پتلا تھا۔ محاورے کے مطابق نہیں بلکہ سچ مچ گیلی ہوئے ہڈیوں کے پنجر سے جدا ہو جانے والی مٹی پانی کے دھاروں میں کھل رہی ... سے ہڈیوں کی سفیدی نمودار ہوگئی تھی۔ چشم تصور ... یہ سکتا تھا کہ اس پلیٹ فارم پر صرف ہڈیوں کا کھلا ڈھانچہ پڑا ہوا ہے۔ ایسے جیسے اسے کئی سال بعد کھود کے قبر سے نکالا جائے۔

"یہ... یہ کیا ہے؟ یہ پانی تو نہیں" نازو نے بمشکل تمام کہا۔

"نہیں۔ یہ ایک کیمیائی محلول ہے جس میں بہت سے تیزاب شامل ہیں" کرنل نے ایک اور سگریٹ نکال کے جلاتے

... نے کہا۔ "ہر تیزاب گوشت کو جلا دیتا ہے مگر یہ مرکب زود اثر ... میں ایک ریسرچ کیمسٹ ہوں لیکن یہ میری ایجاد نہیں ہے۔ ... میں ہڈیاں بھی حل ہوجاتی ہیں مگر اس میں وقت لگتا ہے۔ ... چوبیس گھنٹے۔ لیکن انہیں کرش کرلیا جائے تو دو گھنٹے میں ... کو اس محلول میں حل کرکے بیس لیٹر کے ٹن میں ڈالا جاسکتا ...

"یو باسٹرڈ۔ سن آف اے بچ" میں نے چیخ کر کہا اور کوشش ... اس پر میزائل دوں لیکن مجھے احساس ہوا کہ میرے جسم کی ... حرکات میں فرق آگیا ہے۔ میرا ہاتھ مجھے بہت بھاری لگا ... اسے تیزی سے نہ اٹھا سکا۔ یہ عجیب سی کیفیت تھی۔ اس ... یا غنودگی کا نام نہیں دیا جاسکتا تھا۔ میرے حواس پوری ... کام کر رہے تھے اور میری ذہنی مستعدی میں بھی فرق نہیں ... لیکن ایسا لگتا تھا جیسے مجھے جسمانی طاقت فراہم کرنے والی ... بہت ڈاؤن ہوگئی ہے۔ میری حالت آہستہ آہستہ چلنے ... پنکھے کی طرح تھی جسے بہت کم وولٹیج مل رہے ہو۔ جب میں ... بات کی تھی تو میری آواز بھی ایک خاص حد سے زیادہ بلند ... ہوئی تھی حالانکہ میں چیخنا چاہتا تھا اور میرے حلق سے ... کے نکلنے کی رفتار میں بھی کمی آگئی تھی۔ میں مجموعی طور پر ... موشن میں دکھائی جانے والی فلم کے کردار کی طرح مضحکہ خیز ... گیا تھا۔

میں نے بہت ٹھہر ٹھہر کے اور رک رک کے کہا "تم نے کچھ ... دیا ہے ہمیں" میں نے اسے ایک گالی بھی دی۔

غالب نے آہستہ آہستہ اٹھتے ہوئے میز پر سے چائے دانی ... کے کرنل پر مارنے کی کوشش کی مگر ایک محافظ جھپٹا اور اس ... غالب کو دھکا دے کر بینچ پر بٹھا دیا۔

عجیب مضحکہ خیز لہجے میں غالب نے اسے چند ناقابل اشاعت ... دیں۔ اس کی آواز ایسی ہوگئی تھی جیسے گراموفون ریکارڈ ... ختم ہونے سے رفیع کی آواز سہگل جیسی لیکن بے سری ... بھدی ہو جائے۔ نازو نے ہماری حالت دیکھتے ہوئے کچھ کہنے ... سے گریز کیا۔

"یہ ایک بے ضرر سانک فوڈ ہے۔" کرنل نے کہا "یہ جسم ... RESPONSE کو بہت کم کر دیتا ہے۔ ابتدا میں اس کا اثر ... ہوتا ہے جیسے سکون آور گولیوں کی مقررہ مقدار سے چار یا ... خوراک کھالی جائے لیکن باقاعدگی سے استعمال کے بعد یہ ... سسٹم میں جذب ہوجاتا ہے۔ اور جسم کے تمام افعال کو ... کنٹرول کے مطابق چلانے کی صلاحیت پیدا کر دیتا ہے۔ جیسے ... کا ریگولیٹر ہوتا ہے۔ جو پنکھے کی رفتار کو کم یا زیادہ کرتا ہے۔ ... ایک ریگولیٹر ہے۔ یو سی... میرا جسم اس کے مثبت اثرات ... قبول کرچکا ہے۔ اب میں تمہارے سامنے اپنے رویئے کو اپنی ... کے مطابق بدل سکتا ہوں۔ سلو... میڈیم یا فاسٹ کرسکتا ہوں۔ قبرستان میں تم نے ایک میڈیم کنٹرول دیکھا تھا۔ یہ سب ذہن پر منحصر ہے۔ ذہن پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا..... آدمی حلیہ تو بدل لیتا ہے میک اپ سے لیکن رویہ نہیں بدلا جاتا چنانچہ پکڑا جاتا ہے۔ یہ میری ریسرچ کا حاصل ہے۔ ابھی تک میں نے اسے پیٹنٹ نہیں کرایا ہے۔ یہاں تو کچھ ملے گا نہیں۔ فوراً میرا فارمولا چرالیا جائے گا۔ اور ممکن ہے اس پر پابندی لگ جائے۔ امریکا میں مجھے لاکھوں ڈالر کی رائلٹی مل سکتی ہے۔ میڈیکل ریسرچ میں اس کی بہت اہمیت ہوگی۔"

"شاید تمہیں دو نوبل پرائز ایک ساتھ مل جائیں" میں نے آہستہ آہستہ بولتے ہوئے ایسی آواز میں کہا جو میرے کانوں کو ہرگز اپنی آواز نہیں لگتی تھی "ایک سائنس اور میڈیسن کا۔ دوسرا اپنی ذہانت اور صلاحیت کو شیطانی کاموں کے لئے وقف کرنے کا۔"

حسب توقع اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ میں نے سر گھما کے دیکھا تو سردار جی کی جگہ اب ایک ڈھانچہ رکھا ہوا تھا۔ کاسۂ سر سے استخوانی پنجے تک مکمل۔ سفید چمکتی ہڈیوں کا پنجر۔ باپ بڑا نہ بھیا۔ بھیا سب سے بڑا روپیا۔ ڈھانچہ اٹھ کے گانے لگا۔ پھر پلیٹ فارم اوپر اٹھا۔ اوپر سے گیراج کی چھت نیچے آئی۔ ان سب کے لئے جو یہاں اپنی گاڑیاں دھلوانے آتے ہوں گے یہ ایک عام سروس اسٹیشن تھا۔ انہوں نے کبھی غور نہیں کیا ہوگا کہ گیراج کی چھت کے نیچے دوسرا پلیٹ فارم کیوں نصب ہے۔ ایسا منظر تو انہوں نے کسی ڈراؤنی' دہشت ناک فلم میں بھی نہیں دیکھا ہوگا جو ہم دیکھ رہے تھے۔ آج سے پہلے ہم بھی یہ تصور نہیں کرسکتے تھے۔ شاید لاشوں کو غائب کرنے کا یہ پلانٹ حال ہی میں لگایا گیا تھا اور اسی لئے عارضی طور پر بند کردیا گیا تھا کہ اس میں کرم فرماؤں کی بہترین "خدمت" کے لئے بہتر سہولتوں کا اضافہ کیا جا رہا تھا۔

اوپر نیچے کے پلیٹ فارم بڑی مشینی یکسانیت سے حرکت کرتے ہوئے قریب آئے اور آپس میں مل گئے۔ ان کے درمیان چند ملی میٹر کی جگہ بھی نہ رہی۔ اگرچہ درمیان میں شیشہ تھا اور دوسری طرف سے کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی' اس کے باوجود میرے دماغ کے اندر دھماکے ہو رہے تھے۔ لاش کی ہڈیاں چیخ رہی تھیں' ٹوٹ رہی تھیں اور ریزہ ریزہ ہو رہی تھیں۔ کاسۂ سر جو مرکز تھا نیکی بدی کے خیالوں کا' محبت اور نفرت کے جذبات کا' زندگی پر غرور رکھتا تھا اور جسم کی ساری حرکت اور توانائی کنٹرول کرتا تھا۔ وہ دماغ جو احساس اور حواس کا سرچشمہ تھا۔ ہاتھ جو تمام عمر مصروف رہے تھے۔ کچھ دیر پہلے گاڑی کے اسٹیئرنگ وھیل پر تھے۔ پھر نوٹ گن رہے تھے اور شراب کی بوتل کو حلق میں انڈیل رہے تھے۔ اور پاؤں جو حرکت کی علامت تھے' سب سرمہ ہوگئے۔ ایک ریسرچ کیمسٹ کی ایجاد میں تحلیل

ہونے کے لئے۔ وقت کم ہے۔ ہڈیوں کو دو گھنٹے سے کم میں حل ہوجانا چاہئے اس لئے ایک منٹ میں کرش کردو۔ بیس لیٹر کا کوئی ڈرم ہے؟ اس میں ڈالو سردارجی کو اور گٹر میں بہادو۔ اس محلول کے تیزابی اثرات گٹر کو بھی صاف کردیں گے۔ پلیٹ فارم نیچے چلا گیا۔ سردارجی غائب ہوگئے۔ جیسے جادوگر کسی بھی چیز کو غائب کردیتا ہے۔

"یہ سب کچھ تم ہمیں اس لئے دکھارہے ہو کہ ہم اپنے انجام کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ یہ سمجھ لیں کہ جو اس سکھ کے ساتھ ہوا وہ ہمارے ساتھ بھی ہوسکتا ہے۔ تمہاری بے پناہ تباہ کن طاقت کا اعتراف کرتے ہوئے مقابلے کا خیال چھوڑدیں" میں نے آہستہ آہستہ کہا۔ میری قوتِ گویائی میرے خیالات کی تیز رفتاری کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ ذہن بہت تیز اور آگے دوڑ رہا تھا۔ جذبات کے طوفان کی آتش فشانی اپنی انتہا پر تھی۔ غم وغصے کے ساتھ نفرت کے شعلے پھیلتے جارہے تھے اور میرے وجود میں اشتعال کا سمندر چڑھ رہا تھا مگر باہر سے میں ٹھنڈا اور پُرسکون تھا۔ میں چیخنا چلّانا چاہتا تھا لیکن میری آواز دبی ہوئی تھی۔ یہ سب اس منحوس دوا کا اثر تھا جو میں نے چائے میں پی لی تھی۔ کرنل اس کا عادی تھا۔ میں اس کے پہلے تجربے کو بھگت رہا تھا۔

"یہ لوگ اپنا کام کررہے ہیں" کرنل نے ایسی بے نیازی سے کہا جیسے یہ کوئی خاص بات نہیں اور سروس اسٹیشن پر جو کچھ ہورہا ہے وہ معمول کی کارروائی ہے۔

تقریباً پانچ منٹ کے بعد میں نے سکھ ڈرائیور کی گاڑی کو اوپر اٹھتا دیکھا۔ اس کے چاروں ٹائر اب بھی فلیٹ تھے۔ پھر رنچ، اسپینر اور اسکریو ڈرائیور اٹھائے چار افراد کی ایک ٹیم نمودار ہوئی اور انہوں نے بڑی فنی پیشہ ورانہ مہارت کے ساتھ دو منٹ میں چاروں وہیل کھول کے الگ کردئے۔ پھر انہوں نے وہ حصے کھول ڈالے جن پر وہیل ٹائٹ کئے جاتے ہیں۔ اس کے بعد لائٹس کی باری آئی۔ پھر سیٹوں کی۔ وہ روبوٹس کی طرح کام کررہے تھے اور ان میں ڈسپلن تھا۔ کوئی کسی سے نہیں پوچھتا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے اور کوئی کسی کو ہدایات نہیں دیتا تھا۔ ایک کام ختم ہوتے ہی ہر شخص دوسرا کام ایسے شروع کردیتا تھا جیسے اپنے حصے میں آنے والے ہر کام کا پہلے سے علم ہے۔

آدھے گھنٹے بعد صرف کار کا ڈھانچہ رہ گیا۔ اس کے چاروں دروازے اور آگے پیچھے کے بونٹ تک ہٹائے جاچکے تھے۔ الگ کئے جانے والے سب پارٹس نہ جانے کہاں لے جائے جارہے تھے۔ گھڑی میں اب گیارہ بج کر بیس منٹ ہوئے تھے۔ میرا ذہن پوری طرح بیدار اور اس صورت حال سے پوری طرح آشنا تھا مگر جسم نیم خوابیدہ تھا۔ شاید کچھ ایسی ہی کیفیت غالب اور نازو کی بھی تھی۔ وہ بالکل چپ بیٹھے کار کو ٹکڑے ٹکڑے ہوتا دیکھ رہے تھے۔ آخر میں انہوں نے انجن کو فاؤنڈیشن پر سے اتارا۔ ایک زنجیر سے منسلک ہک نے جو چھت سے لٹک رہی تھی انجن کو اٹھالیا اور کچھ آگے لے جاکے چھوڑ دیا۔ انجن ایک دھماکے سے فرش پر گرا جس نے دیواروں کو ہلا دیا۔ باقی ماندہ کار کو ہائیڈرالک پریس نے دبا کے ایسے چپٹا کردیا کہ وہ ایک ٹوٹی پھوٹی فولادی چادر نظر آنے لگی۔ ایک بار پھر میرے ذہن میں ویسے ہی دھماکے ہوئے جیسے سکھ ٹیکسی ڈرائیور کی ہڈیوں کے چٹخنے ٹوٹنے کی آواز کے تصور سے ہوئے تھے۔ نہ جانے کیوں چلتی ہوئی کار بالکل زندہ نظر آتی ہے اور خراب ہو تو بیمار لگتی ہے۔ اس وقت مجھے یوں لگا جیسے یہ کار کی لاش تھی جس کے اعضا تھے اور ہڈیاں تھیں اور پورا جسم تھا جو ہائیڈرالک پریس میں پس گیا۔ سکھ سردار اور اس کی گاڑی لوح جہاں سے حرف مکرر کی طرح مٹ چکے تھے۔ ان کا سراغ بھی باقی نہیں رہا تھا۔ اسکاٹ لینڈ یارڈ کے سراغ رساں اور ایف بی آئی کے جاسوس، شرلاک ہومز اور کرنل فریدی۔ تمام حقیقی اور افسانوی کردار جو اپنی عقل اور ذہانت سے بڑے بڑے مجرموں کو پکڑ لاتے تھے، خواہ وہ آکاش پر ہوں یا پاتال میں۔ مل کر بھی دہرے قتل کی اس واردات کے بارے میں تفتیش کرتے تو سر کھجاتے رہ جاتے۔ یہی جانا کہ کچھ نہ جانا میر۔ سو بھی اک عمر میں ہوا معلوم۔

ٹھیک بارہ بجے باہر دو گاڑیاں آکے رک گئیں۔ اس وقت تک ہم خاموش بیٹھے کرنل کو گھورتے رہے تھے اور بہت سوچنے کے بعد کچھ کرنے کی خواہش سے دستبردار ہوچکے تھے۔ ہمارے جسم کے تمام افعال میں سستی، بے عملی اور ناطاقتی پوری طرح شامل ہوچکی تھی اور یہ ایک خوف زدہ کرنے والا احساس تھا کہ ہم جزوی طور پر مفلوج ہوگئے ہیں۔ کرنل نے بھی ہم سے کوئی بات کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا لیکن وہ ایک لمحے کے لئے بھی غافل یا غیر مستعد نہیں ہوا تھا۔

دو اجنبی افراد اندر آئے جو شوفر نظر آتے تھے اور انہوں نے عین فوجی انداز میں کرنل کو سیلوٹ کیا۔ پھر ان میں سے ایک شخص آگے بڑھا اور اس نے براؤن پیپر کا ایک پیکٹ کرنل کے سامنے رکھ دیا۔ غالباً اس کے اندر نوٹ تھے اور یہ ہمیں گرفتار کرکے بحفاظت آگے پہنچانے کا معاوضہ تھا۔

کرنل نے نوٹوں کے بنڈل کو کھول کر نہیں دیکھا اور صرف سرہلایا "تم انہیں لے جاسکتے ہو۔"

"مسٹر تریوینی نے پیغام دیا ہے کہ اگر آپ مصروف نہ ہوں تو ساتھ ہی چلیں" دوسرے نے کہا۔

"یہ درخواست وہ ٹیلی فون پر مجھ سے براہ راست بھی کرسکتا تھا" کرنل نے کہا۔

میں نے نوٹ کیا کہ کرنل نے "پیغام" کے لفظ کو "درخواست" میں بدل دیا ہے حالانکہ پیغام کے متن میں بھی درخواست کا ہی انداز تھا۔ کوئی حکم نہیں تھا۔

پیغام لانے والے چند سیکنڈ خاموش کھڑے رہے۔

"تم جاسکتے ہو" کرنل نے مختصراً کہا اور اپنی جگہ بیٹھا رہا۔

"چلو" پہلے شخص نے میری طرف دیکھ کے خاصے جارحانہ انداز میں کہا۔

"کہاں؟" میں نے کہا۔

جواب دینے کے بجائے دو افراد نے مجھے جھٹکا دے کر پیروں پر کھڑا کردیا اور دروازے کی طرف دھکیلا۔ اگر مجھے اپنے جسم کی حرکات پر پورا اختیار ہوتا تو انہیں تمیز سکھانے کے لئے میں پوری بہت ورزش کراتا۔ شاید نازو بھی ایک دو کو الٹ پلٹ سکتی مگر ہم کچھ بھی نہ کرسکے۔ میری جسمانی حالت کی بہترین مثال اس شخص سے دی جاسکتی ہے جو پانی میں ہاتھ پیر چلانے کی کوشش کرے۔ کسی کو مکا مارنا چاہے یا کسی پر جست لگانا چاہے تو پانی کی مزاحمت آڑے آتی ہے۔۔۔ اتنی تیزی سے حرکت نہیں کرسکتا جتنی تیزی سے خشکی پر یا ہوا میں کرسکتا ہے۔ اگر مجھے بھاری بھرکم فولادی زرہ بکتر پہنادئے جاتے تب بھی ایسا ہی ہوتا۔ ذہنی برق رفتاری، چستی اور سیکنڈ کے سویں یا ہزارویں حصے کی صحیح ٹائمنگ کی ضرورت جسمانی مقابلے میں مہارت کے مظاہرے کے لئے پڑتی ہے، وہ یکسر مفقود تھی۔

ایک گاڑی مجھے اور غالب کو لے کر روانہ ہوگئی۔ اس کے شیشے سیاہ تھے اور دروازے اندر سے نہیں کھولے جاسکتے تھے۔ ہمارے ڈرائیور اور ہمارے درمیان شیشے کی پارٹیشن تھی چنانچہ ہم اسے دیکھ تو سکتے تھے لیکن پیچھے سے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے۔ ہم اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے مسلح شخص کی باتیں بھی نہیں سن سکتے تھے۔

غالب نے کہا "یہ لوگ ہمیں کہاں لے جارہے ہیں؟"

میں نے کہا "جام شہادت پیش کرنے۔ ہم اپنے سفر آخرت پر رواں ہیں۔"

"مجھے ایسا ہی لگتا ہے۔ کہ دی اینڈ۔ تمت بالخیر" غالب نے اداسی سے کہا۔

"ایک نہ ایک دن تو یہ ہونا تھا۔ پھر رونا کیسا؟"

"میرا خیال ہے۔۔۔"

میں نے اسے انگلی ہونٹوں پر رکھ کے خاموش کردیا "کوئی خطرناک بات مت کرنا۔"

"ان کی آواز تو ہم نہیں سن سکتے" غالب بولا۔

"مگر وہ سن لیں گے۔ ادھر مائک ہوسکتے ہیں۔"

"اس حرامزادے ڈرائیور کی مونچھیں بھی نقلی ہیں" غالب نے کچھ دیر بعد کہا۔

ڈرائیور کے ردعمل نے ثابت کردیا کہ میرا خیال درست تھا۔ اس نے چونک کر خاصی برہمی سے پیچھے دیکھا جیسے وہ بتاتا ہو کہ دیکھ لو، میری مونچھیں اصلی ہیں۔"

غالب نے ہنس کے کہا "تھینک یو۔ تم نے میری غلط فہمی دور کردی۔"

ڈرائیور کو اپنی غلطی کا احساس ہوچکا تھا۔ اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص کے رویے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ڈرائیور کی غیر ارادی حماقت کے مظاہرے سے خوش نہیں ہے۔

یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ ہماری منزل کا راستہ کیا ہے۔ ابھی تک شہر کی سب سڑکیں ایک جیسی لگتی تھیں۔ وہی بلند وبالا عمارات جن میں نیچے سے اوپر تک چھوٹے چھوٹے کابک نما فلیٹ تھے۔ وہی بھانت بھانت کی مخلوق۔ دوڑتی ہوئی گاڑیاں، پیدل چلنے والوں کا ہمہ وقت رواں ہجوم۔ ایک سی دکانیں۔ اسٹریٹ لائٹس اور نیون سائن۔ مشکل بندی ناموں والی سڑکیں... یہ سب یاد رکھنا بہت مشکل تھا۔ برسوں یہاں رہنے کے بعد شاید ایسا ممکن ہوتا مگر ابھی تو ہم بے بسی سے باہر کی آزاد مخلوق کو دیکھتے جارہے تھے جو ہماری حالت سے قطعی بے خبر ہمیں دیکھ تک نہیں سکتی تھی۔

اچانک کار نے زبردست بریک لگائے۔ پھر ایک خوف ناک دھماکا ہوا اور میں اچھل کے اپنے سامنے والی شیشے کی پارٹیشن سے ٹکرایا۔ جھٹکا لگتے ہی غیر ارادی طور پر میرا ہاتھ سامنے آگیا تھا چنانچہ میں نے تصادم سے بچنے کی فضول سی کوشش بھی کی تھی۔ ...اس سے صرف اتنا فائدہ ہوا کہ صدمے کی شدت کو کسی حد تک ہاتھوں نے اور میرے جسم نے بھی جھیل لیا ورنہ صرف سر لگتا تو میں شیشے کی دیوار سے منہ نکال کے ڈرائیور کی بغل میں گھس جاتا۔

شیشہ ٹوٹنے کی آواز بہت شدید تھی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ڈرائیور کے چلانے کی آواز سنی۔ اس نے کسی کو بہت بڑی گالی دی تھی۔ اس کے ساتھ ہی جو شور اٹھا وہ بھی میں نے سنا۔ غالباً کار کی ہیڈلائٹس اور اس کا ونڈ اسکرین سب ٹوٹ گئے تھے۔ میں نے کار کے سامنے کوئی پہاڑ سا کھڑا ہوا دیکھا۔ یہ کوئی ٹرک تھا جو پانی یا تیل سپلائی کرنے میں استعمال ہوتا ہوگا۔ وہ کار کے راستے میں اس طرح حائل ہوا تھا کہ کار دونوں ٹائروں کے درمیانی حصے میں پھنس گئی تھی۔ ٹینکر کا چیسس لوہے کے گرڈروں کا بنا ہوا تھا جو اتنے موٹے تھے کہ ریلوے لائن جیسے لگتے تھے۔ ظاہر ہے ایک کار ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔ باہر ایک ہجوم جمع ہونے لگا تھا اور ٹریفک رک گئی تھی۔

خود سنبھلتے ہی میں نے غالب کو دیکھا۔ "حادثہ ہوگیا ہے۔ تجھے چوٹ تو نہیں آئی؟"

"ایسے ہی خراشیں آئی ہیں۔" غالب نے رومال سے پیشانی صاف کی تو رومال کا رنگ لال ہوگیا۔

غالب نے کہا۔ "تیرا چہرہ بھی لال ہو رہا ہے۔ کیا زیادہ چوٹ آئی ہے؟"

میں نے چہرے کو ہاتھ سے چھو کر دیکھا۔ خون کی نمی کے ساتھ میری انگلیاں سرخ ہو گئیں۔ میں نے جیب سے رومال نکال کر پیشانی صاف کی۔ "شاید شیشہ ٹوٹنے سے خراشیں آئی ہیں۔" غالب نے پیچھے ہٹ کے دیکھا۔ "دوسری گاڑی تو نکل گئی ہو گی۔"

"ہاں۔ وہ کیوں رکے گا۔" میں نے کہا۔

"گویا نازو بھی گئی؟" غالب نے کہا۔

"ہم بھی پہنچ جائیں گے۔ ڈرائیور زیادہ زخمی نہیں ہوا ہے۔"... میں نے کہا۔ "جو اس کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا وہ بھی بچ گیا۔"

"ہم موقع سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔" آگے سے نکل سکتے ہیں یا کسی کو آواز دے کر کہہ سکتے ہیں کہ باہر سے دروازہ کھول دے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "بے کار ہے۔ اس طرح ہم نازو سے بھی بچھڑ جائیں گے۔ بہتر ہے ہم تریونی سے مل لیں۔"

ابھی میری بات ختم نہیں ہوئی تھی کہ کسی نے باہر سے دروازہ کھول دیا۔

"باہر نکلو۔ جلدی۔" کسی نے میرا ہاتھ پکڑ کے کھینچا۔

میرا دل ایسے دھڑکا جیسے سینے کی دیوار کو توڑ دے گا۔ "محسن تو!"

"پیچھے سے اس آئل ٹینکر پر چڑھ جاؤ۔" محسن نے کہا۔ "اندر اتر جاؤ۔"

غالب نے کہا۔ "مگر نازو؟ اسے وہ لے گئے ہیں۔"

سامنے ہجوم نے کار کے ڈرائیور اور اس کے ساتھی کو گھیر رکھا تھا۔ وہ دیوانہ وار چلا رہے تھے۔ مگر کچھ لوگ ان سے اس طرح چمٹ گئے تھے کہ ان کے لئے خود کو چھڑانا ناممکن ہو رہا تھا۔

"نازو کی فکر مت کرو۔" محسن نے برہمی سے کہا۔ "باہر نکلو۔ اتنی مشکل سے روکا ہے انہیں ہم نے۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ "تم نے۔ یہ ٹینکر..."

محسن نے سر ہلایا اور مجھے گھسیٹ کر ٹینکر کے دوسری طرف لے گیا۔ وہاں ٹینکر کی باڈی کے ساتھ لوہے کی ایک سیڑھی سی نصب تھی۔ میں اس پر چڑھ گیا۔ اوپر اس کا دو فٹ قطر کا ڈھکنا کھلا ہوا تھا۔ میں نے اندر جھانک کر دیکھا۔ ٹینکر آدھا خالی تھا۔ جب میں اندر اتر گیا تو مجھے احساس ہوا کہ میں کمر تک آنے والے پانی میں کھڑا ہوا ہوں۔ میرے پیچھے پیچھے غالب آ گیا۔ باہر اتنا شور تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ کار کا ڈرائیور سب سے زیادہ بلند آواز میں چیخ رہا تھا اور گالیاں دے رہا تھا۔

"چھوڑو۔ مجھے کیوں پکڑ رکھا ہے تم نے... تمہاری... سور کے بچو، کتو، تم سب ملے ہوئے ہو۔ جان بوجھ کے... مجھے مارتے ہو الٹا۔"

کسی نے چیخ کر کہا "حرامی۔ غلط سائڈ سے آ رہا تھا۔ پیچھے ایک بچے کو مار کے بھاگا تھا۔"

"جھوٹ ہے۔ یہ جھوٹ ہے" ڈرائیور نے چیخ کر کہا۔

بیک وقت کئی آوازیں آئیں "یہ ٹھیک ہے، ہم نے بھی دیکھا تھا حادثہ۔ ہم وہیں سے اس کے پیچھے لگ گئے تھے۔ اسے تھانے لے چلو" مجھے ان میں سے چند آوازوں پر بنگالی لب و لہجے کا گمان ہوا۔

ڈرائیور کے ساتھی نے چلّا کے کہا "کون ہو تم لوگ؟ تم نے جان بوجھ کے راستہ روکا ہے ہمارا۔ تم سب کی..... تم سب نے سازش کی ہے۔"

"گالی دیتا ہے سب کو شالا، مارو شالے کو... مارو... مارو۔"

میں نے خود کو کہنیوں کے بل تھوڑا سا اوپر اٹھایا اور باہر جھانک کے دیکھا۔ بہت سے لوگ ڈرائیور کو اور اس کے ساتھی کو مل کے مار رہے تھے۔ وہ سب کار اور ٹرک کو تھانے لے جانے کا مطالبہ کر رہے تھے۔

غالب نے نیچے سے کہا "یار! یہ کیا معاملہ ہے؟ راستے میں تو کوئی حادثہ نہیں ہوا تھا۔"

"جب اتنے لوگ کہہ رہے ہیں تو پھر یہی سچ ہے" میں نے پھر نیچے اتر کے کہا۔

غالب اپنا چہرہ پانی سے دھو رہا تھا "مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ محسن کی کارروائی ہو سکتی ہے۔ ایسا زبردست پلان۔"

"اس کے ساتھ یہ دوسرے حمایتی کہاں سے آ گئے؟" میں نے بھی منہ دھو کے خراشوں کی جلن کو کم کیا۔

"انہوں نے جانتے بوجھتے کار ڈرائیور کو اور اس کے ساتھی کو پکڑا تاکہ وہ کار کی طرف نہ آئیں۔ انہیں کھینچ کر دور لے گئے۔"

"اب وہی شور مچا رہے ہیں کہ ڈرائیور کسی بچے کو مار کے بھاگا تھا۔ اور وہ اپنی اپنی گاڑی میں تعاقب کر رہے تھے۔ میرا تو خیال ہے کہ یہ سب غلط ہے" میں نے کہا۔

"کیا غلط ہے؟"

"نہ حادثہ ہوا ہے۔ نہ کسی نے گاڑی میں پیچھا کیا۔ یہ لوگ ٹینکر پر تھے اور انہوں نے جانتے بوجھتے خود ٹینکر کو کار سے بھڑایا اور پھر نیچے اترتے ہی بھڑوں کی طرح ان دونوں سے چمٹ گئے۔"

غالب بولا "یعنی انہیں معلوم تھا کہ یہی دونوں ہمیں اغوا کر کے لے جا رہے ہیں؟"

"ظاہر ہے یہ محسن کا پلان تھا تو اس نے ہی سب کچھ بتایا ہو گا اور اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ قبرستان سے غائب ہونے کے بعد محسن بے خبر نہیں تھا۔ وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور جتنی دیر ہم پیٹرول پمپ پر رہے اس نے سارا بندوبست کر لیا۔"

غالب نے کہا "مگر کیسے؟ کہاں سے لایا وہ اتنے طرف دار۔ ...یہ لوگ آخر؟"

میں نے کہا "یہ تو محسن ہی بتائے گا۔ بہرحال، کرنل صاحب کی ایسی تیسی کر دی محسن نے۔ تریونی کی اور دلاور کی......" جو بات میں نے کہی وہ ایسی کی تیسی کرنے سے کہیں زیادہ سخت تھی۔ ہم دونوں نے ہنس کے ہاتھ ملائے۔

اسی وقت ٹرک کا انجن غرایا۔ پولیس آ گئی تھی اور انہوں نے ٹریفک کو رواں رکھنے کی ذمے داری سنبھال لی تھی۔ وہ سیٹیاں بجا رہے تھے اور کاروں کو اور دوسری گاڑیوں کو چلنے کی ہدایت دے رہے تھے۔ کسی نے یہ بھی کہا کہ ٹرک کو ایک طرف لے جاؤ۔ ٹریفک رک رہی ہے۔"

"سب قصور اس کار والے کا ہے... یہ پیچھے حادثہ کر کے بھاگا تھا۔"

"یہ جھوٹ ہے جناب" ڈرائیور نے چیخ کر کہا۔

ایک بار پھر کئی آوازوں نے اس کی تردید کی "ہم نے خود دیکھا تھا۔ ہم اسے پکڑ لیتے لیکن اس سے پہلے ہی یہ ٹرک میں گھس گیا۔"

"پکڑے رکھو ان دونوں کو" یہ حکم غالباً کسی پولیس افسر نے دیا تھا۔

پھر وہ شور دور ہونے لگا اور صرف ٹریفک کا شور رہ گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ ٹرک جائے حادثہ سے فرار ہو رہا ہے۔ کار اس قابل بھی نہ تھی کہ ٹرک کے ساتھ آتی۔

"کیا ٹرک خود محسن چلا رہا ہے؟"

"محسن ٹرک چلا سکتا ہے۔ زمین پر دوڑنے والی ہر چیز چلا سکتا ہے" میں نے خوش دلی سے کہا "اور وہ جو اس کے حمایتی تھے، سب پیچھے رہ گئے" غالب کی عقل بھی حیران تھی۔

"میں دیکھتا ہوں باہر نکل کے" میں نے کہا اور پھر اس ٹینکر کی چھت کے سوراخ سے طلوع ہوا۔ ٹینکر کی اوپر والی چھت دونوں طرف سے ڈھلوان تھی اور اس پر توازن قائم رکھنا اس لئے بھی آسان نہ تھا کہ ٹرک بہت رفتار سے جا رہا تھا۔ میں نے سوراخ کے کنارے پر گرفت قائم رکھی اور ایک پاؤں لمبا کر کے سیڑھی پر جما دیا۔ ڈنڈے کو مضبوطی سے پکڑ کے میں کچھ نیچے آیا تو ٹرک ڈرائیور کا چہرہ مجھے اس شیشے میں دکھائی دیا جو دائیں جانب باہر کی طرف لگا ہوا تھا۔ یہ محسن کا چہرہ تھا۔ وہ اوورٹیک کرنے کے لئے ٹریفک کو دیکھ رہا تھا کہ اسے میری صورت نظر آئی۔ اس نے سر نکال کے مجھے دیکھا۔

"الو کے پٹھے۔ یہ کیا سرکس دکھا رہا ہے" محسن نے ایک دم رفتار کم کی "ساری پسلیاں ٹوٹ جائیں گی۔"

میں نے چلّا کے کہا "کوئی بات نہیں۔ بس دل نہ ٹوٹے جو پسلیوں کے اندر ہے۔"

پاس سے گزرنے والی بہت سی کاروں کے ڈرائیور بھی مجھے دیکھ رہے تھے۔ محسن نے رفتار پھر بڑھا دی۔ میں نے دور سے کسی ٹریفک سارجنٹ کا سائرن سنا اور پھر اوپر چڑھ کے پانی میں ڈوب گیا۔

"ٹرک کی لگام محسن ہی کے ہاتھ میں ہے" میں نے بہت خوش ہو کے غالب کو اطلاع دی۔

"میں ڈوب مرنا چاہتا ہوں۔ چلّو بھر سے زیادہ ہے یہ پانی۔ نازو کے بغیر میں کیسے جی سکتا ہوں۔"

"جیسے میں رابعہ کے بغیر جی رہا ہوں۔ اور شہلا کے بغیر محسن جی رہا ہے۔ امید کے سہارے پر کہ ہم پھر ملیں گے" میں نے کہا۔

"کتنے شرم کی بات ہے۔ ایم آر ایس کی سب خواتین قید میں ہیں۔ مرد آزاد پھر رہے ہیں۔ ہم فرار ہو گئے اپنی جان بچا کے۔ ...نازو کے لئے کسی نے کچھ نہیں کیا۔ آخر یہ محسن اتنا احمق کیوں ہے؟ لیڈیز فرسٹ کا اصول کیوں یاد نہیں رہا اسے؟" غالب نے بڑبڑانا جاری رکھا۔

میں نے کہا "ابھی سب سے اہم سوال یہ ہے کہ اس واٹر ٹینکر میں ہم کہاں جا رہے ہیں اور کیوں؟"

آخر کار ٹرک رک گیا۔ میں نے سطح زمین کے نیچے رہنے والے کسی جانور کی طرح سر نکال کے باہر دیکھا تو ٹرک ایک ہائیڈرنٹ سے پانی لینے والے ٹرکوں کی قطار میں کھڑا ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ کوئی اور ٹرک ہمارے پیچھے لگتا، میں اور غالب باہر نکل آئے۔ ہر ٹرک کا ڈرائیور اندر ہی بیٹھا ہوا تھا کیونکہ جیسے ہی ایک ٹینکر کو پانی مل جاتا تھا وہ قطار سے نکل جاتا تھا اور پیچھے والے سب ٹرک آگے بڑھ جاتے تھے وہاں کم سے کم دو تین سو ٹرک تھے جو مختلف مقامات پر قطاروں میں کھڑے ہوئے تھے اور زمین سے دس فٹ اونچے پانی کے بڑے نلکوں سے پانی حاصل کر رہے تھے۔ میں حیران تھا کہ رات کو اتنے ٹرک پانی لے کر کہاں جا رہے ہوں گے۔ شاید ہوٹلوں اور بڑی بڑی کوٹھیوں کے انڈر گراؤنڈ ٹینک بھرنے کے لئے، تاکہ اگلے دن پھولوں کو اور گھاس کے لان کو اور باغات کو سیراب کیا جا سکے، گاڑیاں دھوئی جائیں، باتھ رومز کے شاور چلیں اور کتوں کو بھی نہلایا جا سکے۔ غربت نصیب، خاک نشیں، بدبخت انسانوں کی لاوارث بستیوں میں بچے بوڑھے عورتیں اور مرد سوکھے نلکوں پر ٹین کے ڈبے لئے پانی کی پتلی سی دھار تک پہنچنے کے لئے لڑ رہے ہوں گے....

غالب نے میرا ہاتھ پکڑ کے کھینچا "حضرت! بس نکل چلئے ورنہ اس ٹرک کو بھرنا پڑ جائے گا۔"

آگے والا ٹرک تھوڑا سا آگے کھسک گیا تھا اور ایک ٹرک احاطے میں داخل ہو رہا تھا۔ قطار کے آخر میں وہ ٹرک اپنی جگہ سے نہیں ہلا تھا جسے ہم نے سواری کے لئے استعمال کیا تھا۔ میں غالب اور محسن کے ساتھ پیچھے نکل گیا جہاں اندھیرے اور پھسلن والی زمین تھی اور دیوار کا ایک حصہ ٹوٹا ہوا نظر آ رہا تھا۔ میری

پتلون پانی میں تر تھی اور پانی میرے جوتوں میں ہر قدم پر بول رہا تھا۔ باہر آتے ہی میں نے جوتوں کے گیلے تسمے کھول کے پانی باہر انڈیلا اور جرابوں کو نچوڑ کے پھر جوتے چڑھا لئے۔ اس وقت غالب اور محسن گلے مل کے نہایت نامناسب الفاظ میں دوستی کے جذبات کا اظہار کر رہے تھے۔

میری باری آئی تو میں نے بھی محسن کی کم تواضع نہیں کی اور جواب میں اس سے بھی اتنی ہی شاندار گالیاں وصول کیں۔ شکوہ شکایت کا ایک غبار تھا جو ایکدم اٹھا لیکن اتنا وقت نہیں تھا کہ ہم اس غبار کو صاف کرتے۔ ہم سڑک کے ایک کنارے پر چلنے لگے۔

محسن نے کہا "میں کہاں رہا اور تم کہاں رہے؟ میں نے کیا توپ چلائی اور تم نے کیا جھک ماری۔ یہ سب باتیں کریں گے فرصت ملنے پر۔ ابھی تو بس خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ مل گئے۔"

"یہ کیا ملنا ہوا؟ جمع ایک منفی ایک ’حاصل صفر‘" غالب نے کہا۔

"تو نازو کو رو رہا ہے نا۔ مت رو‘ وہ بھی مل جائے گی۔"

"کہاں؟ میدان حشر میں" غالب نے کہا "وہاں تو اور بھی بہت ہوں گی۔ ایک سے بڑھ کر ایک‘ مگر وہ حوران خلد ہمارے کس کام کی۔ ہم جہنمی لوگ..."

میں نے کہا "یار! یہ تو پاگل ہو گیا ہے۔ تو بتا‘ قبرستان سے کہاں غائب ہو گیا تھا؟"

"غائب نہ ہوتا تو یہ سب کیسے کرتا۔ میں نے تو اس مونچھ برانڈ فورس کے سب ارکان کو تاڑ لیا تھا اور اندازہ کر لیا تھا کہ اس مرتبہ بچ کے نکلنا آسان نہیں ہوگا" محسن نے کہا۔

میں نے کہا "مگر تو کسی اندھی کے ساتھ چلا گیا تھا۔ وہ خاتون کوئی نیک نام نہیں ہیں۔"

"ہاں یار‘ وہ عجیب اتفاق ہوا۔ اس کا ایک مجنوں ہے۔ عاشق جاں نثار۔"

"وہ اس کا بزنس پارٹنر ہے" میں نے اپنی معلومات کا اظہار کیا "دونوں مل کے مال فراہم کرتے ہیں۔ مال یعنی جسم فروش عورتیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔ وہ بزنس پارٹنر تو ابھی بنا ہے۔ دو چار سال پہلے۔ عاشق بہت پرانا ہے۔ مجھے تو اتفاق سے نظر آ گیا۔ میں خود نابینا بن کے فرار ہوا تھا۔"

"ہاں۔ ریسٹ ہاؤس کے چوکیدار نے بتا دیا تھا۔"

"اس کی صورت تو نہیں مگر حلیہ سو فی صد میرا تھا۔ بس اسے دیکھ کے مجھے ایک خیال آیا۔ میں نے کہا کہ آج شام کے لئے لیلیٰ کرائے پر دے دو۔ وہ پہلے تو بہت بگڑا۔ پھر میں نے بیان حلفی داخل کیا کہ میں اس عفت مآب حسینہ پر بری نگاہ تک نہیں ڈالوں گا بلکہ میرا مدعا کیا ہے؟ اور میں نے معقول نذرانہ پیش کیا تو وہ مان گیا۔ میں مجنوں کی جگہ اس اندھی کے ساتھ ہو لیا۔ وہ نا ڑی پی کے اپنی جھگی میں سو رہا ہوگا۔ وہ جانے پہچانے کردار ہیں اس لئے مجھ پر کسی کو شک نہیں ہوا" محسن نے کہا۔

"کیا یہ ٹھیک ہے کہ لیلیٰ کو سب نظر آتا ہے؟" میں نے ہنس کے کہا۔

"ہاں۔ اس مجنوں کی بصارت بھی بہترین ہے لیکن اندھا بہرا یتیم وغیرہ بننا تو ایک پیشہ ورانہ ضرورت ہے۔ اصلیت کو جاننے والے کتنے ہوں گے؟ زیادہ سے زیادہ دس فیصد۔ باقی نوے فیصد تو ترس کھا کے ہر روز کچھ دیتے ہی رہتے ہیں۔ بہت پیسہ ہے ان کے پاس لیکن اب بھیک مانگنا عادت یا مجبوری بن گیا ہے۔ میں نے ایک ہزار میں ڈبل رول کرنے کے اجازت لی تھی اور میرے لئے یہ سودا مہنگا نہیں رہا۔ میں کسی بھی بھیس میں جاتا تو پکڑا جاتا۔"

"کیا تو نے پہچان لیا تھا ہمیں؟"

"جب دوسروں نے پہچان لیا تھا تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں نہ پہچانتا؟" محسن بولا "اور میں نے یہ بھی تاڑ لیا تھا کہ تم دشمنوں کو دھوکا دینے میں ناکام رہے ہو چنانچہ میں نے باہر آ کے ان پر نظر رکھی۔ میں نے یہ اندازہ بھی کر لیا تھا کہ تم اس سکھ کی گاڑی میں وہاں پہنچے تھے۔ اور اس کی تصدیق بھی کر لی تھی۔ آخری رسوم کے ختم ہونے سے پہلے میں نے ایک اور گاڑی حاصل کی اور جب تم لوگ روانہ ہوئے تو میں پیچھے تھا۔ اندھی اس عرصے میں وہیں موجود رہی تھی۔ وہ کافی چالاک عورت ہے۔ اس نے مجھے رپورٹ دی کہ سکھ کی گاڑی میں بیٹھ کے دو افراد اس سے باتیں کرتے رہے تھے۔"

"اس سکھ نے بہت کم میں اپنی زندگی بیچ دی تھی" میں نے افسوس سے کہا۔

"لالچ ایسی ہی چیز ہے۔ اسے کہاں معلوم ہوگا کہ وہ اپنے قاتلوں سے بیعانہ جاں لے رہا ہے" غالب نے کہا۔

"پیٹرول پمپ بند تھا چنانچہ میں سمجھ گیا کہ معاملہ گڑبڑ ہو گیا ہے۔ میں نے چھپ کر ان کی باتیں سنیں تو مجھے اندازہ ہوا کہ قدرت نے مجھے کچھ کرنے کے لئے گھنٹا ڈیڑھ گھنٹا دیا ہے۔"

میں نے کہا "تو نے بہت بڑا خطرہ مول لیا تھا۔ وہاں ان کے آدمی ہر جگہ موجود تھے۔"

"ہاں۔ خطرہ مول نہ لیتا تو کچھ کرتا کیسے۔" محسن نے کہا۔ "اس واٹر ٹینکر کا ڈرائیور سڑک کے کنارے دیوار کی طرف منہ کئے پانی بنا رہا تھا۔ چابیاں اس نے لگی چھوڑ دی تھیں اور انجن تک بند نہیں کیا تھا۔ دو چار منٹ میں وہ پھر روانہ ہو جاتا مگر افسوس کہ اسے دست قضا نے وہاں روکا تھا۔"

"تو نے مار دیا اسے؟"

"میرا ارادہ اسے مارنے کا نہیں تھا۔ میں نے اسے ناک

...ر کے اٹھا لیا تھا مگر راستے میں دوسری طرف کا دروازہ نہ ...نے کیسے کھل گیا۔ شاید اس کے ہاتھ کا دباؤ پڑنے سے۔ وہ باہر ...گیا۔ رفتار اتنی زیادہ تیز تھی کہ اس کے بچنے کا کوئی سوال ہی ...تا۔ میں رک بھی نہیں سکتا تھا۔ ورنہ اس وقت یہاں نہیں ...ات میں نظر آ رہا ہوتا۔ میں نے دروازہ بند کرنے کے بعد ...ی کو ادھر ادھر دوڑایا۔ جب واپس پیٹرول پمپ کی طرف آ رہا ...تو ایک اور حادثہ پیش آ گیا۔ کچھ شہدے قسم کے لونڈے ایک ...میں کسی کو گھیر کر مار رہے تھے۔ ایک طرح کی گینگ وار تھی۔ ...ی مخالف گروہ کا کوئی آدمی ان کے علاقے میں آ کے اینڈ رہا تھا۔ ...ان کا لفڑا شروع ہو گیا۔ وہ آٹھ دس تھے۔ ان کا مقابلہ پہلے ...کر رہا تھا۔ پھر دوسرا آ گیا۔ ڈنڈے اور ہاکیاں ایسے چل رہے ...نے جیسے شمشیر و سناں۔ ان دونوں کا سر پھٹ گیا۔ میں اترا تھا ...لوموں کی حمایت کرنے کے لئے۔ وہ سب ٹرک پر چڑھ گئے اور ...روہ کے سرغنہ نے بڑی بدمعاشی کے ساتھ مجھے حکم دیا کہ چلو۔ ...س وقت اچانک میرے خیالات بدل گئے جس پر مجھے یقیناً شرم ...نی چاہئے کہ میں نے مظلوموں کا ساتھ چھوڑ دیا اور ظالموں کے ...ساتھ ہو گیا۔ میں نے یہ ظاہر کیا جیسے میں واقعی ان کی داداگیری ...کے ڈر سے حکم کی تعمیل کر رہا ہوں۔ انہیں پولیس کا ڈر تھا مگر میں ...انہیں خطرے کی حدود سے نکال کے دور لے گیا۔ پھر میں نے ان ...ے کام کی بات کی۔ بدمعاشی کے کام وہ بڑے شوق سے اور فخر ...کے ساتھ کرتے ہیں۔ میں نے انہیں سارا پلان سمجھانے کے بعد ...سو روپے دئے۔ ہم اچھے خاصے دوست بن گئے تھے۔ جب ہم ...ول پمپ سے کچھ دور انتظار کر رہے تھے تو میں نے انہیں کولڈ ...ڈرنک بھی پلائی اور انہوں نے کہا کہ آئندہ بھی ان کی خدمات کی ...ضرورت ہو تو وہ حاضر ہیں۔ غلطی مجھ سے اندازے کی ہوئی۔ میرا ...خیال تھا کہ تم سب کو ایک ہی گاڑی میں لے جایا جائے گا۔ وہاں ...گاڑیاں آ گئیں تو میں نے پہلے روانہ ہونے والی گاڑی کے پیچھے ...ٹرک دوڑانا شروع کیا۔ وہ سب ٹرک کی باڈی پر چڑھے ہوئے اس ...ایڈونچر کو بہت انجوائے کر رہے تھے۔ موقع پاتے ہی میں نے کار ...کا راستہ روک دیا اس سے مجھے یا ٹرک کو کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔ ...میرے حمایتی ہدایات کے مطابق چھلانگ مار کے اترے اور کار ...میں آگے بیٹھے ہوئے دونوں افراد سے چمٹ گئے۔ تم نے ان کا ...ہنگامہ سنا ہی ہوگا۔ میں نے کہا تھا کہ بس انہیں پکڑے رہنا‘ ...جب تک ٹرک دور نہ چلا جائے۔"

"بعد میں وہ خود نہ پکڑے گئے ہوں۔"

"میں نے انہیں دو سو اضافی دئے تھے کہ دونوں کو دو ٹیکسیوں ...میں تھانے لے جانا اور راستے میں ہی کہیں گرا دینا۔ یا جیسا ...آپ سمجھو۔ انہوں نے وہ دو سو بھی رکھ لئے ہوں گے اور ...نکل گئے ہوں گے۔ وہ بدمعاشی کے کام کے ماہر ہوں نہ ہوں‘ ...دنگے کے ماہر ہیں۔ یہ میں دیکھ چکا تھا اور پکڑے بھی گئے ہوں تو میری بلا سے" محسن بولا۔

"نازو کو لے جانے والی گاڑی کا ڈرائیور اب تک تریوینی کو پوری رپورٹ دے چکا ہوگا۔"

"ذرا تریوینی کو دوسری رپورٹ بھی مل جائے" محسن نے کلائی کی گھڑی دیکھ کے کہا "پھر اس پلان کے دوسرے حصے کو عملی پاجامہ پہناتے ہیں۔"

"آپ اس ناچیز کو اس پاجامے کے بارے میں کچھ بتائیں گے" میں نے کہا۔

"ابھی سب تمہارے سامنے ہی ہوگا۔ مجھے یہ بتاؤ کہ مسماۃ رابعہ اور مس ناگ منی کو تم لوگ کہاں چھوڑ آئے ہو؟"

"وہ بہت محفوظ ہاتھوں میں ہیں" میں نے کہا "اس خانہ بدوش قبیلے کے ساتھ جہاں سے تو گدھے پر فرار ہوا تھا۔ قبیلہ بعد میں غائب ہو گیا اور انہیں ساتھ لے گیا۔ ابھی تک قبیلے کا سراغ نہیں ملا۔"

"پھر وہ محفوظ کیسے ہوئیں؟"

"ہم نے اس کا بندوبست کر دیا تھا" میں نے کہا "خدا نے چاہا تو اگلے اڑتالیس گھنٹوں میں وہ مل جائیں گی۔"

سمندر کی طرف سے آنے والی ہوا میں رطوبت زیادہ ہوتی تھی مگر آج ہوا کا رخ بدلا ہوا تھا اور راجستھان کی طرف سے آنے والی خشک اور گرم ہوا سے میرے اور غالب کے کپڑے کی نمی بہت کم ہو گئی تھی۔ ہم واٹر ہائیڈرنٹ سے کافی دور آ چکے تھے مگر مجھے بالکل اندازہ نہ تھا کہ ہم کس سمت میں جا رہے ہیں۔

اچانک محسن نے کہا "مجھے تم دونوں کی چال ڈھال بدلی ہوئی لگتی ہے۔ تم پہلے جیسے پھرتیلے اور چست نہیں رہے۔ کیا یہ نیند کی کمی کے سبب سے ہے؟"

میں نے کہا "نہیں شیروانی صاحب۔ زندگی میں پہلی بار پی ہے نا۔"

محسن چلتے چلتے رک گیا "کیا! تم نے شراب پی رکھی ہے؟"

"لاحول ولا قوۃ۔ اس حرام شے کا ہم نے نام تک نہیں لیا" غالب بولا۔

"واقعی تم سوئے سوئے‘ تھکے ہوئے اور پژمردہ سے لگتے ہو۔ تمہاری آواز بتاتی ہے کہ تم پر نشے کا اثر ہے" محسن نے کہا۔

میں نے اسے مختصراً کرنل کی ایجاد کے بارے میں بتایا "اس کا کہنا ہے کہ اس دوا کے باقاعدہ استعمال سے رویہ بدل جاتا ہے اور کنٹرول بھی کیا جا سکتا ہے۔ میں اب پہلے سے بہتر محسوس کر رہا ہوں۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہے کہ ایک بار کے استعمال سے کچھ نہیں ہوتا۔ یہ اثر عارضی ہوگا" محسن نے مطمئن ہو کے کہا "پھر کوئی بات نہیں" اس نے پھر گھڑی دیکھی۔

میں نے کہا "اور کتنی دیر انتظار کریں گے ہم؟"

غالب نے کہا "وہ حرامزادے اپنی اس ناکامی کا بدلہ نازو سے لیں گے۔"

محسن نے کہا "مجھے افسوس ہے لیکن میں بیک وقت دو گاڑیوں کو نہیں روک سکتا تھا۔ تمہاری گاڑی پہلے روانہ ہوئی تھی، اس کا تعاقب کرنا زیادہ ضروری تھا۔ میرا خیال تھا کہ دوسری گاڑی پیچھے پیچھے آئے گی لیکن وہ شاید کسی دوسرے راستے سے نکل گئے۔"

"وہ نازو کو کہیں اور نہ لے گئے ہوں" غالب نے کہا "ہمیں کیسے معلوم ہوگا..."

"ابھی معلوم ہوجائے گا" محسن نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے تسلی دی "پریشان ہونے سے کچھ حاصل ہوتا ہے تو میری طرف سے اجازت ہے، آہیں بھرنے کی اور نالہ و فریاد کرنے کی!"

میں نے کہا "اس غولِ بیابانی میں، جسے تو گھیر لایا تھا مجھے ایک بنگالی کی آواز بھی سنائی دی تھی۔"

"ہاں۔ اس کا ذکر کرنا تو میں بھول ہی گیا۔ وہ منو میاں تھے۔"

"منو میاں، کوئی بچہ ہے؟" غالب بولا۔

"بچہ ہی سمجھو۔ چوالیس سال کا" محسن بولا "اصل نام تو منیر الدین احمد تھا لیکن بنگال میں بھی لمبے ناموں کو مختصر کرنے کا ایک فارمولا ہے۔ شبیہہ الدین ہو تو شبو میاں۔ محمد مجاہد علی ہیں موجو میاں۔ یہاں تک کہ اردو کے ایک شاعر ہیں قدرت الاسلام قدوائی۔ ان کا شارٹ کٹ کردیا کدو میاں۔ یہ منو میاں کے ساتھیوں میں سے ہیں۔"

"اور منو میاں خود کیا چیز ہیں؟"

"یہ ایک بنگالی محب وطن ہے۔ پرانا مسلم لیگی" محسن نے کہا۔ "تقسیم ہند سے پہلے مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا اتنا فعال رکن تھا کہ تین دفعہ جیل جاچکا تھا۔ مولوی تمیزالدین جو غلام محمد کی غیر آئینی سیاست کے نتیجے میں توڑی جانے والی اسمبلی کے اسپیکر تھے، اس پر بہت اعتماد کرتے تھے اور جس زمانے میں وہ سیاست سے کنارہ کش ہونے کے بعد ڈھاکا میں پریکٹس کررہے تھے تو یہ ان کا نائب تھا۔ ان سے انتہائی عقیدت رکھتا ہے۔"

"ان جیسے صاحبِ کردار کم لوگ تھے" میں نے افسوس کے ساتھ کہا۔

"ہاں۔ خودداری کا یہ عالم تھا کہ پیدل کورٹ جاتے تھے اور ایک پرانا سوٹ پہنتے تھے۔ خاصی تنگی میں زندگی بسر کی لیکن اصول پر ڈٹے رہے اور غیر آئینی حکومت سے سمجھوتا نہیں کیا۔ اس کا نتیجہ تھا کہ جب دس سال بعد پھر اسمبلی بنی تو ان کے ایمان اور ایقان کا نقش لوگوں کے دل پر باقی تھا۔ وہ پھر بلا مقابلہ اسپیکر چن لئے گئے تھے۔ خواجہ ناظم الدین نے منو میاں کو بطور ایلچی استعمال کیا۔ وہ دوبارہ خصوصی پیغامات لے کر قائداعظم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ کبھی منو میاں سے سنو یہ واقعات۔ آج بھی وہ فرطِ جذبات سے آبدیدہ ہوجاتا ہے۔"

"تجھے کیسے مل گئے یہ منو میاں؟"

"منو میاں مشرقی پاکستان کی ایک محب وطن تنظیم کے خصوصی نامہ بر کی حیثیت سے ہماری جستجو میں تھے۔ انہوں نے ایم آر ایس کی جدوجہد کا ذکر سنا تھا۔ اخبارات میں ہمارے کارناموں کی تفصیل پڑھ کے وہ بے حد متاثر ہوئے تھے۔ ان کی تنظیم پاکستان کی وحدانیت اور مسلمانوں کی یک جہتی پر یقین رکھتی ہے اور تخریب کاروں کے خلاف گوریلا جنگ میں مصروف ہے۔ علیحدگی پسندوں کا سراغ لگانا اور ان کے منصوبوں کو ملیامیٹ کرنا ان کے مقاصد میں شامل ہے۔ وہ مشرقی پاکستان میں پی ایل او کی طرز پر خود کو منظم کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ اب تک کئی مرکز قائم کرچکے ہیں لیکن ان کی رکنیت محدود ہے کیونکہ وہ بہت سخت شرائط پر اور بہت آزمانے کے بعد کسی کو تنظیم کا رکن بناتے ہیں۔ یہ سب انہی سے سنا۔ وہ ایم آر ایس سے رابطہ قائم کرنا چاہتے تھے تاکہ دونوں کے درمیان اشتراکِ عمل سے پاکستان اور اسلام کے دشمنوں کے خلاف کارروائی کو تیز تر اور زیادہ مؤثر بنایا جاسکے۔ اس کے علاوہ وہ چاہتے تھے کہ ہم جو اسلحہ تباہ کرتے پھر رہے ہیں۔ وہ تباہ نہ کریں بلکہ ان کے حوالے کردیں۔"

"ایسا ہر جگہ ممکن نہیں ہوتا" میں نے کہا۔

"میں نے بھی یہی کہا تھا لیکن منو میاں نے کہا کہ ہم مل کے اسے ممکن بناسکتے ہیں" محسن بولا۔

"تو نے ابھی تک بتایا نہیں کہ تیری اس سے ملاقات کہاں ہوگئی۔"

"منو میاں پاکستان پہنچے۔ بڑی مشکل سے پتا چلایا کہ ہم بمبئی جاچکے ہیں۔ یہاں آنے کے بعد چوری چھپے ہمارا سراغ لگانے کی کوشش کرتے رہے۔ کسی کے سامنے ہمارا نام لے کر تو پوچھ نہیں سکتے کہ سکندر بخت، محسن یا غالب کہاں ہیں۔ خود بھی دھر لئے جاتے۔ اخبارات میں ہمارے کارناموں کی تفصیلات دیکھ کے بمبئی میں ہی رک گئے۔ اس امید میں کہ کبھی قسمت ضرور یاوری کرے گی۔ پولیس کے اشتہار بھی دیکھے تھے اخباروں میں۔ لیکن یہ خود اشتہاری مجرم ہیں۔ ایک دن حاجی علی کی درگاہ گئے۔ وہاں کسی سے سنا کہ پاکستان کے کوئی حاجی صاحب ہیں۔ سوات کے رہنے والے۔ ان کا جوس سینٹر بہت مشہور ہے۔ یہ وہاں گئے مگر ان سے کچھ پوچھنے کی ہمت نہ پڑی تاہم قدرت ملوانے کا فیصلہ کرچکی تھی۔ حاجی صاحب کی دکان پر وہی اخبار پڑا ہوا تھا۔ انہوں نے تمہید کے طور پر کہا کہ "بھئی بڑے جیالے لوگ ہیں یہ..." اس پر حاجی صاحب نے انہیں غور سے دیکھا اور پھر سرہلا کے آہستہ سے کہا "مجاہدین ہیں۔ اللہ کی خاص نظرِ عنایت ہے ان پر۔" اور... منو میاں نے کہا "مگر پولیس تو انہیں مجرم سمجھتی ہے۔" حاجی صاحب نے غصے میں یا جذبات سے مغلوب ہوکے کہہ دیا۔ "پولیس تو مجھے بھی مجرم بنادے۔ اگر یہ معلوم ہوجائے کہ میں نے ان کو مجاہد کہا ہے۔ میں جانتا ہوں یہ مجرم لوگ نہیں ہیں" اس پر منو میاں کا حوصلہ بڑھا۔ انہوں نے کہا "حاجی صاحب۔ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ کوئی ترکیب بتایئے" اس پر حاجی صاحب ... اندر لے گئے اور بہت دیر تک پوچھ گچھ کرتے رہے کہ وہ پولیس کا مخبر یا ایجنٹ تو نہیں ہے۔ جب انہیں اطمینان ہوگیا کہ منو میاں خود بھی مجاہد ہیں تو انہوں نے بڑے فخر کے ساتھ بتایا کہ کس طرح ہم ان سے ملے تھے اور بعد میں بھی وہ رابطے کا ذریعہ بنے رہے مگر اب مدت سے کسی کی کوئی خبر نہیں" منو میاں نے کہا کہ "اچھا پھر ان میں سے کوئی آئے تو اسے میرا پتا ... دیں۔ میرا ان سے ملنا اشد ضروری ہے" حاجی صاحب نے ... لے کر رکھ لیا۔ منو میاں بعد میں دوبارہ گئے اور مایوس لوٹے۔ اب اللہ کی قدرت دیکھو۔ بمبئی پہنچ کے میں پہنچا سیدھا حاجی صاحب کے پاس۔ اس امید میں کہ شاید تم نے ان کے پاس کوئی پیغام چھوڑا ہو۔ چرچ جانے کا خیال مجھے بعد میں آیا۔ حاجی صاحب کا جوش اور ولولہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ وہ بضد تھے کہ میں ان کے پاس رک کر خدمت کا موقع دوں مگر میں نے وقت کی کمی کا عذر پیش کیا۔ انہوں نے مجھے منو میاں کے بارے میں بتایا کہ اس سے ضرور ملو۔ حاجی صاحب نے تین افراد کے نام بھی ... جو ہمارے مددگار ثابت ہوسکتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ سب بہت صاحبِ ایمان لوگ ہیں اور ہماری ہر طرح سے مدد کریں گے۔ خود حاجی صاحب ایک دستخط شدہ چیک دے رہے تھے ایک لاکھ ... مگر میں نے قبول نہیں کیا۔ اس پر تاریخ کوئی نہیں تھی۔ میں نے منو میاں کو تلاش کیا۔ وہ واقعی مجاہد ہے حالانکہ اب اس کی عمر پینتالیس سال کے لگ بھگ ہے۔ کہتا ہے ہندوستان کے ... کے ہاتھوں مارے جاتے تو دکھ نہ ہوتا۔ خود مسلمانوں نے ... اکیس بائیس سال بعد ماردیا۔ وہ بچے جو پیدائشی طور پر پاکستانی تھے صرف پاکستانی کہلانے کے جرم میں شہید کردیئے گئے۔ بیوی جو گھربار چھوڑ آئی تھی، اس کے سارے خاندان کے ... ہندوستان میں ہی رہ گئے تھے۔ وہ ان علیحدگی پسندوں کی ... کا نشانہ بنی۔ ردعمل کے طور پر منو میاں پھر انقلابی ہوگئے۔ پہلے حاکم انگریزوں سے اور غاصبانہ عزائم رکھنے والے ہندوؤں سے جنگ تھی۔ اب غداروں کے خلاف کمربستہ ہیں۔"

"یہ منو میاں بھی انہی میں شامل ہوگئے تھے؟ اس غول بیابانی ... جو ٹرک پر سوار تھا؟"

"ہاں۔ اس کارِ خیر میں وہ بھی شریک تھے لیکن اس کے بعد منصوبے کے دوسرے حصے پر عمل درآمد کے لئے نکل گئے ہوں گے۔ ٹرک لے کر تمہارے ساتھ مجھے فرار ہونا تھا۔ منو میاں نے نازو کو لے جانے والی گاڑی کو دیکھ لیا تھا۔"

"گاڑی کو دیکھنے سے کیا ہوتا ہے؟"

"اس نے گھر بھی دیکھ رکھا تھا۔ منو میاں کے ساتھ ڈھاکا سے دو گوریلے بھی آئے ہوئے تھے۔ ان کی حفاظت کے لئے۔" محسن بولا "سین شین۔"

میں نے ہنس کے کہا۔ "سین شین۔ یہ نام ہیں ان کے؟"

"نام تو ہیں عمادالدین اور غفورالدین۔ دونوں جڑواں بھائی ہیں اور ان میں فرق بس اتنا ہی ہے جتنا سین شین میں۔ یہ ایک نقطہ بھی نظر نہ آئے اگر ایک جیسے کپڑے پہن کر سامنے آجائیں۔ سین شین کا نام تو میں نے دیا ہے انہیں۔ وہ بالکل برا نہیں مانتے۔ ایک نمونہ ہیں دونوں خدا کی قدرت کا۔ مشکل سے پانچ فٹ قد ہے۔ دبلے پتلے اور دیکھنے میں بڑے مسکین لیکن انتہائی تباہ کن۔ بندر کی طرح پھرتیلے۔ کھمبے درخت اور دیواروں پر ایسے چڑھتے ہیں کہ آدمی دیکھتا رہ جاتا ہے۔ ادھر سے چھلانگ ماری۔ ادھر کودے۔ دیوار پھاندی اور چھت پر۔ وہاں سے منڈیر پر لٹکے، کھمبے سے پھسل کر اترے اور غائب۔ دونوں ایک دوسرے کی ایسے مدد کرتے ہیں جیسے سرکس میں ایک ساتھ کام کرتے ہوں۔ آتشیں اسلحہ ہر قسم کا استعمال کرلیتے ہیں۔ ریوالور سے مشین گن تک اور دستی بم سے ڈائنا مائیٹ تک، دیسی طریقے پر پائپ میں بارود بھر کے بم بنالیتے ہیں۔ معلوم نہیں کس حد تک درست ہے یہ بات مگر ان کا دعویٰ ہے کہ ٹیلی فون یا بجلی کے کھمبے سے توپ بنا کے چلالیں۔ منو میاں نے ان دونوں کی پرورش کی تھی۔ وہ الگ اسٹوری ہے۔ یہ دونوں بچے ماں باپ سے بچھڑ گئے تھے اور منو میاں کو مل گئے۔ منو میاں نے بہت کوشش کی لیکن ماں باپ کا پتا نہ چلا۔ وہ انہی کے بچوں کے ساتھ پلے بڑھے۔ پڑھنے لکھنے میں ہمیشہ پیچھے رہے مگر چکر باز ایک نمبر کے تھے۔ سوائے منو میاں کے جن کو وہ حقیقی باپ سے زیادہ عزت دیتے ہیں، کسی سے نہیں ڈرتے تھے۔ جب منو میاں کے اپنے بچے مارے گئے تو یہ اس لئے بچ گئے کہ گھر سے باہر تھے۔ انہوں نے بعد میں پتا چلا لیا کہ مجرم کون تھے اور ایک ایک کو بڑے پُراسرار انداز میں ٹھکانے لگا آئے۔ خود منو میاں کو کبھی شک نہیں ہوا کہ وہ کچھ کررہے ہیں لیکن یہ بات چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ ایک دن منو میاں نے سختی سے پوچھا تو دونوں نے مان لیا کہ سب کو انہوں نے ہی مارا ہے اور یہ اعلان بھی کیا کہ وہ باقی کو بھی وہ نہیں چھوڑیں گے۔ منو میاں کی مار پیٹ اور دھمکی کا بھی ان پر کوئی اثر نہیں ہوا کہ وہ خود انہیں پولیس کے حوالے کردیں گے۔ الٹا انہوں نے منو میاں کو قائل کرلیا کہ جو کچھ وہ کررہے ہیں یہی انصاف حاصل کرنے کا صحیح طریقہ ہے ورنہ دنیا میں انصاف بھی انہیں ہی ملتا ہے جو اس کی قیمت چکاسکتے ہوں یا قانون کو اپنی مٹھی میں رکھتے ہوں۔ وہی ایم آر ایس والا نظریہ۔ یوں سمجھ لو کہ سین شین نے مشرقی پاکستان میں لاقانونیت کے خلاف جنگ لڑنے کے لئے مائٹ از رائٹ سوسائٹی کے اصول اپنائے اور اب جو کچھ مت

میاں گوریلا جنگ کے نام پر کر رہے ہیں وہ تقریباً وہی ہے جو یہاں ہم کر رہے ہیں۔ وقت ہو گیا ہے اس لئے میں بات کو مختصر کرتا ہوں۔ سین تھین کو منو بھائی نے تریونی کے گھر بھیج دیا تھا۔ نازو کی بحفاظت واپسی انہی کی ذمے داری ہے لیکن تھوڑا سا ڈراما ہمیں بھی کرنا ہے۔ چلو۔"

"چل تو رہے ہیں اتنی دیر سے۔" غالب نے کہا۔

"میرا مطلب تھا کہ ادھر ایک نائٹ پوسٹ آفس نظر آ رہا ہے۔ وہاں سے فون کریں گے۔"

"کس کو؟"

"اپنے چوہدری صاحب کو۔ یا ان کے نئے باپ تریونی کو۔"

...محسن بولا۔ "نمبر میرے پاس ہے۔"

پوسٹ آفس میں رات کے ساڑھے بارہ بجے ویرانی تھی۔ ایک اونگھتے ہوئے کلرک نے فون ہماری طرف کھسکا دیا۔ "پیسے پہلے دے دو۔ کتنی دیر بات کرو گے؟"

میں نے اسے دس کا نوٹ تھما دیا۔ "لمبی بات ہو گی۔"

اس نے نوٹ جیب میں ڈال کے کہا۔ "چلو اطمینان سے بات کرو۔ میں ابھی آتا ہوں باتھ روم ہو کے۔"

میں نے کہا "فکر مت کرو۔ تمہارے واپس آنے تک ہم پوسٹ آفس کو کہیں نہیں جانے دیں گے۔"

وہ دروازے سے نکلا اور سڑک پار کر کے ایک ایرانی ریسٹورنٹ میں داخل ہو گیا۔ اس نے دوبار پلٹ کے ہماری طرف دیکھا اور غالباً مطمئن ہو گیا کہ وہ آرام سے بیٹھ کے چائے پی سکتا ہے۔ چائے کے پیسے تو شاید وہ روز اسی طرح بنا لیتا ہو گا۔ یہ کون چیک کر سکتا ہے کہ سرکاری ٹیلی فون کا رات بھر میں کتنا استعمال ہوا۔

محسن نے اتنی دیر میں نمبر ملا لیا تھا۔ "ہیلو۔ تریونی ہے؟ اُلّو کا پٹھا۔ اس شہر میں کتنے تریونی ہیں۔ سیٹھ تریونی۔ میں اس کا باپ بول رہا ہوں سکندر بخت۔ جا کے بتا دے' سے۔ وہ نہیں آیا تو پھر میں خود آتا ہوں۔" محسن نے انتہائی جارحانہ انداز میں بات کی تھی۔

"ڈر گیا سالا۔" محسن نے ریسیور پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ "اطلاع دینے گیا ہے۔"

تقریباً آدھے منٹ کے بعد تریونی لائن پر آ گیا۔ محسن نے کہا۔ "تریونی! بات مجھ سے پوچھتا ہے..." محسن نے اسے ایک خوف ناک گالی دی۔ "تجھے معلوم ہے کہ کیا بات ہے۔ ابھی تک وہ دونوں کتے پہنچے نہیں جو گئے تھے' بکتر بند گاڑی میں مجھے اور غالب کو اٹھانے کے لئے۔ میں نے اس لئے ان کو نہیں اٹھایا کہ تجھے معلوم ہو جائے۔ میں ان کی لاشیں بھی بھجوا سکتا تھا مگر پھر تجھے رپورٹ دیر میں ملتی۔"

میں دوسری طرف سے کی جانے والی گفتگو سننے کے لئے بے چین تھا۔ اس فون کی ایکس ٹینشن کاؤنٹر کے پیچھے ایک میز پر نظر آ رہی تھی۔ کلرک بادشاہ کی خفگی کی پروا کئے بغیر میں کاؤنٹر پر سے اندر کود گیا۔ ریسیور اٹھاتے ہی میں نے تریونی کی آواز سنی۔ وہ غصے میں چلا رہا تھا۔ گالیاں بک رہا تھا اور دھمکیاں دے رہا تھا۔

"تم اچھی طرح جانتے ہو کہ وہ لڑکی ہمارے قبضے میں ہے۔"

"لیکن تم نہیں جانتے کہ تم ہمارے قبضے میں ہو۔" محسن نے اس کی بات کاٹ دی۔

جواب میں تریونی نے پُر حقارت انداز میں ایک قہقہہ لگایا۔

"تم اسے مذاق سمجھ رہے ہو نا۔ ذرا اپنی کوٹھی کے مشرقی حصے کی بالکونی سے باہر دیکھو۔ جاؤ دیکھو' میں ہولڈ کرتا ہوں۔" محسن نے کہا۔ "تار لمبا ہے تو فون اٹھا کے بھی لے جا سکتے ہو۔"

"کیا ہے وہاں؟" تریونی نے شک آمیز لہجے میں کہا۔ "میں دیکھ لیتا ہوں۔"

محسن نے ریسیور پر ہاتھ رکھ کے مجھے آنکھ ماری اور مسکرایا۔ ..."ابھی سب چوکڑی بھول جائے گا سالا۔"

"بکواس کرتے ہو تم۔" تریونی بولا۔

"کیا تم بالکونی میں ہو؟" "مشرق کی طرف دیکھ رہے ہو؟"

"ہاں۔ مجھے بلف کرتے ہو۔" "اندھیرے سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہو۔"

"پھر دیکھو تریونی۔ بارہ بج کر چالیس منٹ پر تمہیں ثبوت مل جائے گا کہ تم محصور ہو۔ چاروں طرف سے۔" محسن نے کہا "باقی تین طرف تم نہیں دیکھ سکتے لیکن مشرق کی طرف تمہاری نظر پورا منظر دیکھ سکتی ہے۔ ابھی تم ایک لائٹ دیکھو گے جو پہلے سبز ہو گی' پھر زرد اور اس کے بعد سرخ ہو جائے گی۔ ٹریفک سگنل کی طرح۔ پھر دس قدم کے فاصلے پر دوسری لائٹ اسی طرح نظر آئے گی۔ پھر مزید دس قدم کے بعد۔ کیا تمہیں کچھ نظر آیا؟"

"یہ... کیا ہے یہ آخر۔ کون لوگ ہیں یہ؟" تریونی نے کہا۔

محسن نے قہقہہ مارا۔ "یہ سب موت کے فرشتے ہیں۔ یہ نقلی' مصنوعی مونچھیں بنا کے نہیں آئے ہیں۔ ان کے پاس بہت خطرناک اسلحہ ہے۔ یہ ایک فائر کریں گے تو بالکونی کے شیشے توڑتا ہوا ایک چھوٹا سا آگ لگانے والا راکٹ تمہارے بیڈ روم میں جا گرے گا اور اس کے پھٹتے ہی ہر چیز آگ پکڑ لے گی۔"

"جھوٹ بولتے ہو تم۔ مجھے ڈرانا چاہتے ہو..." تریونی نے چیخ کر فحش گالیاں بکتے ہوئے کہا۔

"سنو۔ تمہارے پاس وقت بہت کم ہے۔ اگر پولیس سے رابطہ قائم کرنے میں وقت ضائع کیا تو میری بات ادھوری رہ جائے گی لیکن تمہارا کام تمام ہو جائے گا۔" محسن نے دہاڑ کر کہا۔

اچانک فون پر چوہدری دلاور آ گیا۔ شاید وہ بھی دوسرے فون پر ساری گفتگو سن رہا تھا اور اب اس کی قوت برداشت جواب دے گئی تھی۔ "واہ جی واہ۔ خیر سے آپ جوکر تو پہلے بھی تھے۔ اب بھانڈ بھی ہو گئے۔ اپنے سکندر صاحب کو کیا لقوہ مار گیا

کہ تم اس کی آواز میں بول رہے ہو۔"

ایک دم میں نے ریسیور اٹھا لیا اور محسن نے رکھ دیا۔ "خیر اپنے چوہدری صاحب بھی کفن پھاڑ کر بولے۔ بڑی پہچان ہے آپ کو ماشاءاللہ سے۔ تم مروا دو گے تریونی کو دلاور۔ تمہارے بچے تو لاہور میں محفوظ ہیں۔ تریونی کی بیٹی پہلے ماری جا چکی صرف تمہاری وجہ سے۔"

تریونی نے برہمی سے کہا۔ "دلاور! مجھے بات کرنے دو۔"

دلاور کی آواز آئی۔ "تم نہیں جانتے ان... کو۔" اس نے سب کے لئے ایک ہی گالی ارسال کی۔

اب پھر محسن نے کہا۔ "تریونی! اپنی موت کو آواز مت دو۔ تم نے دیکھ لیا ہے نا کہ ایم آر ایس کی ڈیتھ فورس کس طرح تمہیں محصور کر چکی ہے۔ تمہارے باقی سب فون ڈیڈ پڑے ہیں۔ یہ بات ختم ہو گی تو یہ لائن بھی کٹ جائے گی اور باہر کی دنیا سے تمہارا رابطہ ختم ہو جائے گا۔"

"دلاور! دیکھو کیا یہ سچ ہے۔ وہ فون اٹھاؤ۔" تریونی نے کہا۔ دلاور اب نروس تھا۔

دور سے دلاور کی آواز آئی۔ "میں بتا رہا ہوں تمہیں کہ یہ سب ڈراما ہے۔"

تریونی نے کہا۔ "پولیس سے رابطہ کرو۔ ایمرجنسی پولیس ہے... کیا... لائن نہیں ہے۔ اچھا اندر جاؤ۔ میرے آفس کے فون سے۔" وہ دلاور سے بات کر رہا تھا مگر اس طرح کہ ہم بھی سن رہے تھے۔

"سب بے کار ہے تریونی۔" محسن نے اس کی بات میں مداخلت اندازی کی۔ "بس یہی ایک لائن رہ گئی ہے۔ اس پر تم بات جاری رکھو گے تو کچھ نہیں ہو گا۔ ریسیور رکھا تو لائن کٹ جائے گی۔ اور ثبوت چاہیے؟ اب تمہاری لائٹ بند ہونے والی ہے۔ ٹھیک بارہ بج کر پینتالیس منٹ پر... تمہارے گھر میں تھری فیز کنکشن ہے نا؟ تینوں فیز بند ہو جائیں گے۔ تم اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتے رہ جاؤ گے۔"

تریونی ایک دم چلانے لگا۔ وہ اپنے نوکروں کو آوازیں دے رہا تھا اور وحشت کی کیفیت میں ان کو گالیاں بک رہا تھا۔ "کہاں مر گئے سارے۔ سب سو جاتے ہیں اتنی جلدی اور سوتے ہیں تو مردوں کے طرح سوتے ہیں' جنریٹر چلاؤ۔"

رات کے پونے ایک بجے یہ کہنا کہ سب سو جاتے ہیں تریونی کی بدحواسی کی دلیل تھا۔ پھر دن بھر کے تھکے ہارے ملازم اس کی آوازیں کیسے اٹھ کے آ سکتے تھے۔ ان کے سرونٹ کوارٹرز اتنے دور تھے کہ وہاں تک تریونی کی آواز نہیں پہنچ سکتی تھی۔ صرف وہی نوکر آ سکتا تھا جو رات کے وقت کوٹھی کے اندر رہتا ہو یا چوکیدار جو باہر کے گیٹ پر موجود رہتا تھا۔

محسن نے آواز کو خوف ناک بنا کے ایک قہقہہ مارا۔ "تم بہت بزدل ہو تریونی۔ ابھی سے تمہارے اوسان خطا ہو گئے۔ خوف اور وحشت سے تمہارے اعصاب جواب دے گئے ہیں اور تمہاری عقل خبط ہو گئی ہے لیکن ابھی آخری موقع ہے۔ دلاور کی بات مانو گے تو یہ موقع بھی ہاتھ سے گنوا دو گے۔"

"کیا... کیا چاہتے ہو تم آخر؟" تریونی نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

دلاور چیخ کر بولا۔ "تریونی! ان کی باتوں میں مت آؤ۔ ان کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔"

اب میں نے کہا۔ "دلاور! ایک شعر سنو۔ گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں۔ یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں۔ کیا اس کا ثبوت تمہارے گوریلوں کی ناکامی نہیں ہے جو مجھے غالب کو اغوا کر کے لا رہے تھے۔ کیا انہوں نے تمہیں نہیں بتایا کہ ان کا راستہ روکنے والوں کی تعداد کیا تھی؟ یہ تمہاری ادھر ادھر سے جمع کی ہوئی کرائے کی فوج نہیں ہے جو نقلی مونچھیں صاف کر کے بھاگ گئی تھی۔ یہ ایم آر ایس کے کمانڈوز ہیں۔ کم از کم چالیس افراد تریونی کی کوٹھی پر ہر سمت سے یلغار کرنے کے لئے تیار ہیں جو آہستہ آہستہ قریب آتے جا رہے ہیں۔ صرف پانچ منٹ میں وہ سب کچھ تہس نہس کر کے بھاگ جائیں گے۔ کل پولیس کو کھنڈر میں سے تمہاری لاشیں ملیں گی۔"

"ٹھہرو۔ میری بات سنو۔" تریونی چلایا۔ "مجھ سے بات کرو۔"

دلاور نے چیخ کر کہا۔ "تریونی! ان کو کچھ بتایا تو ان کے پہنچنے سے پہلے میں تجھے گولی مار دوں گا۔ یہ دونوں جھوٹ بول رہے ہیں۔ ... یہ ان کی چالاکی ہے۔ صرف ایک ڈراما ہے۔ آخر وہ نازو کو کیوں نہیں بچا سکے تھے؟"

"دلاور! میں نے خود لائٹ سگنل دیکھے تھے۔ وہ ہر طرف موجود ہیں۔"

محسن نے کہا۔ "تریونی! نازو کو چھوڑ دو۔ تمہاری جان بچ جائے گی۔ یہ ٹھیک ہے کہ نازو کو لے جانے والی گاڑی ہم سے مس ہو گئی تھی لیکن اس کے لئے ہم پہلے سے تیار تھے کہ خدانخواستہ وہ کسی گاڑی کو نہ روک سکے تو ہمارے کمانڈوز کیا کریں گے۔ انہوں نے تمہاری کوٹھی کے گرد مورچہ بندی کر لی تھی اور ان کا پلان مکمل تھا۔ ناقابل شکست۔ وہ ایک ایک منٹ کے حساب سے بالکل ٹھیک جا رہے ہیں۔ ہماری ساری گفتگو بھی سن رہے ہیں۔ ادھر تم نے ریسیور رکھا ادھر لائن کٹ جائے گی اور ایکشن شروع ہو جائے گا۔ کوئی تمہاری مدد کے لئے نہیں آ سکے گا باہر سے اور جس نے ان کا راستہ روکا وہ مارا جائے گا۔ ہمارا مطالبہ اور کچھ نہیں ہے۔ نازو کو بحفاظت واپس پہنچا دو۔ اسی گاڑی میں جو اسے لے کر گئی تھی۔ ہم گاڑی کو پہچانتے ہیں اور ڈرائیور کو بھی۔"

"لیکن... اس کو کہاں پہنچانا ہو گا؟" تریونی شکست خوردہ لہجے میں بولا۔

"گاڑی اسی راستے پر واپس جائے گی جس راستے سے ہماری گاڑی آئی تھی۔ ہم کہیں بھی گاڑی کو روک کے نازو کو وصول کرلیں گے۔ تمہاری گاڑی واپس کردی جائے گی۔ یہ خیال رکھنا کہ نازو کے ساتھ کوئی بدتمیزی نہ کرے۔ اسے خراش بھی آئی تو اس کا کفارہ تم کو کبھی نہ کبھی ادا کرنا پڑے گا۔"

"او کے۔ او کے۔ میں اسے واپس بھجوا رہا ہوں۔" تریونی نے گھبراہٹ میں کہا۔

"جب وہ پہنچ جائے گی تو محاصرہ ختم ہوجائے گا۔ اس کے بعد تم پولیس کو، بجلی والوں کو یا ٹیلی فون ڈیپارٹمنٹ کو۔ جسے چاہو فون کرو۔ تمہاری یہ لائن چالو چھوڑ دی جائے گی۔" محسن بولا۔

"ٹھیک ہے۔ مجھے تھوڑی سی مہلت چاہیے۔" تریونی بولا۔

"مہلت کس لئے؟"

"انہیں روانہ کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔ ڈرائیور کو اٹھانا پڑے گا جو سوچکا ہے۔ وہ گاڑی نکالے گا گیراج سے۔ وہ دونوں گاڑیاں موجود نہیں ہیں اور اس وقت میں انہی ڈرائیوروں کو نہیں بلا سکتا۔ میری اپنی گاڑی آئے گی۔ میرا شوفر لے کر آئے گا۔ تم پہچانتے ہو نا؟"

"ہم پہچانتے ہیں۔" میں نے کہا۔

یہ مذاکرات بخیروخوبی ختم ہونے والے تھے کہ دلاور نے بازی کو ہاتھ سے نکلتے دیکھ کر ایک دھماکا کردیا۔ اس نے محسن کو ایک گندی گالی دے کر کہا۔ "اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ تیری بیوی اور تیرا بیٹا میرے پاس ہیں۔ تریونی کے پاس نہیں۔ انہیں کیسے بچاؤ گے تم؟"

میرا دل حرکت کرتے کرتے ایک دم ٹھہر گیا۔ اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ جو بات اب تک ہم نے محسن سے چھپائے رکھی تھی وہ ایک غیر متوقع لمحے نے بڑی بے رحمی سے بتادی تھی۔

محسن کا پہلا تاثر حیرت اور بے یقینی کا تھا۔ "کون... شہلا؟"

دلاور نے نفرت سے پھنکارتے ہوئے کہا۔ "کیا اور بھی کوئی بیوی ہے تمہاری؟ کسی اور شہلا نے بھی جنم دیئے ہیں تمہارے بچے؟ وہ بارود کے ڈھیر پر بیٹھے ہیں، اپنے شیروانی صاحب۔ ایک چنگاری کافی ہے ان کا نام ونشان مٹانے کے لئے۔ اب دیکھتے ہیں کتنی ہمت ہے تم میں آگ لگانے کی۔"

"یہ کیا بکواس ہے؟" محسن نے کہا۔ "میں تمہاری چالاکی اور جھوٹ کو سمجھتا ہوں۔"

"میں چاہتا تھا کہ تم خود ہی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے۔ لیکن تم بھاگ گئے۔ خیر تمہاری نازو انہیں دیکھ چکی ہے۔ وہ بتادے گی تمہیں۔ میرا جتنا نقصان تم کرسکتے تھے تم نے کرلیا۔ اب تم میرا راستہ نہیں روکو گے۔ اس بار تمہیں یہ بھی معلوم نہیں ہوگا کہ وہ کس ٹرک میں ہیں۔ تم راستہ معلوم کرلو۔"

"تمہارا.... مطلب ہے شہلا.... اور میرا بیٹا۔ تم انہیں اغوا کرلائے ہو۔" محسن نے چیخ کر کہا۔ "تم بکواس کرتے ہو۔ بھونکتے ہو ذلیل کتے۔ وہ لاہور میں ہیں۔"

دلاور نے قہقہہ مارا۔ "میں سمجھ گیا۔ تمہیں یقین اس لئے نہیں آرہا ہے کہ کسی نے تمہیں بتایا ہی نہیں۔ تمہارے دوست چاہتے تھے کہ تمہارے ہی ہاتھوں انہیں مروادیں۔ بھولے بادشاہ! اس مرتبہ وہ اتفاق سے بچ گئے مگر اب اتفاق پر بھروسا مت کرنا۔ شہلا ایک ٹرک میں ہوگی اور تمہارا بیٹا دوسرے ٹرک میں ہوگا۔ ان کے زندہ جسم تابوتوں میں بند ہوں گے اور مال کے درمیان کہیں رکھ دیئے جائیں گے۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تم نے دخل اندازی نہ کی تو وہ تمہیں پندرہ دن بعد زندہ سلامت مل جائیں گے۔ کلکتہ کے ہوٹل گرانڈ کے منیجر کو پیغام مل جائے گا۔"

ریسیور محسن کے ہاتھ سے گر گیا تھا۔ وہ بت بنا کھڑا ہوا تھا اور اس کی نظریں خلا میں دیکھ رہی تھیں۔ کاؤنٹر پر بیٹھنے والا بابو چائے پی کر لوٹ آیا تھا اور بہت دیر سے ہماری گفتگو سن رہا تھا مگر اس نے کسی تجسس کا مظاہرہ کیا تھا نہ حیرانی کا۔ اس نے ریسیور اٹھا کے کریڈل پر رکھ دیا۔

میں اور غالب مجرم بنے ایک دوسرے سے بھی نظریں چرا رہے تھے۔

اچانک محسن ہنسا اور اس نے ہماری طرف دیکھا۔ "حرام زادہ۔ کیسا جھوٹ بول رہا تھا۔"

میں نے کاؤنٹر کلرک کے سامنے دس کا ایک اور نوٹ رکھا اور محسن کا ہاتھ تھام کے کہا۔ "چل یار۔ دیر ہورہی ہے۔"

باہر آکے محسن نے اپنا بازو چھڑالیا۔ "دلاور جھوٹ بول رہا تھا نا؟"

غالب نے کہا۔ "تو نے تو کمال کردیا یار۔ تریونی کی ایسی تیسی کردی۔ کیا واقعی...."

محسن نے چیخ کر کہا۔ "میرے سوال کا جواب دو۔ کیا دلاور نے جو کچھ بتایا ہے وہ جھوٹ نہیں ہے؟ کہتے کیوں نہیں کہ وہ بکواس کرتا ہے۔"

میں نے ہنس کے کہا۔ "کیا تو اسے سچا آدمی سمجھتا ہے یار!"

محسن کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر ہنسنے لگا۔ "میرا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ شہلا اور میرا بیٹا تو لاہور میں ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس نے جھوٹ کے جواب میں جھوٹ بولنے کی کوشش کی مگر کتنا بھونڈا جھوٹ بکا اس نے۔ میرے جھوٹ کو تریونی نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ معلوم ہے یہ سب کیسے ہوا۔ سین شین کی مدد سے۔ ان کے پاس رنگ بدلنے والی ٹارچ ہے۔ اس کے سامنے کا شیشہ گھوم جاتا ہے۔ جیسے کیمرے کا لینس گھومتا ہے۔ پہلے سبز، پھر زرد، پھر لال سامنے آتا ہے۔ وہ اپنے ساتھ ہی لائے تھے یہ ٹارچیں۔ وہاں پیغام رسانی کے لئے استعمال کرتے تھے۔ یہ اسکیم انہی کی تھی۔ ٹیلی فون کی لائن کاٹنا تو ان کے لئے کوئی مشکل نہیں تھا۔ تریونی کو ایک ہی پول پر سے سارے دیئے گئے ہوں گے۔ انہوں نے بس ایک لائن چھوڑ دی ہوگی۔ ٹیلی فون کا کھمبا کیا چیز ہے ان بندروں کے لئے۔ اس کے بعد دوسری طرف چلے گئے ہوں گے۔ تریونی کی کوٹھی کے مشرقی حصے کی طرف شیشے کی بالکونی سے پہلے سین نے ٹارچ جلا کے سگنل دیا۔ پھر وہ دوڑ کر آگے چلا گیا اور مسٹر شین نے جو دس قدم کے فاصلے پر موجود تھے اپنی ٹارچ روشن کردی۔ اس کے بعد وہ جگہ بدلنے بھاگا مگر سین صاحب اتنی دیر روشنی چمکاتے رہے۔ تریونی کو وہ اندھیرے میں بھاگ بھاگ کر آگے جاتے ہوئے کیسے نظر آسکتے تھے۔ اس نے تو یہی دیکھا کہ ایک کے بعد ایک لائٹ سگنل مل رہا ہے اور واقعی ہر دس قدم کے فاصلے پر کوئی موجود ہے۔"

محسن نے ایک قہقہہ مارا۔ اس کی ہنسی میں واضح طور پر ذہنی انتشار کی کیفیت تھی اور وحشت تھی۔ لاشعور میں جاگنے والے خوف کا ہسٹریا اسے اپنی گرفت میں لے رہا تھا جس کو اس نے وقتی طور پر دبا دیا تھا۔ جیسے تہ خانے کی آگ کا دھواں نیچے ہی نیچے بڑھ جائے اور پھیلتا جائے مگر اوپر سے نظر نہ آتا ہو۔

ہم محسن سے زیادہ ڈرے ہوئے تھے۔ اس کا قہقہہ سن کے مجھے یوں لگا جیسے زلزلہ آنے والا ہے اور زمین پہلے سے کانپ رہی ہے۔ میں اس کے ساتھ نہ ہنس سکا۔ کوشش کے باوجود۔

محسن تیز تیز قدموں سے چلتا گیا اور بولتا گیا۔ "سین شین بہت بدمعاش ہیں۔ سب پہلے سے طے تھا کیونکہ وہ گوریلا جنگ لڑتے رہے ہیں۔ ٹائم ٹیبل سے چلتے ہیں۔ انہوں نے منو میاں کے مشورے سے پانچ منٹ میں پورا منصوبہ بنالیا تھا۔ تریونی کا گھر اور آس پاس کا علاقہ وہ پہلے ہی دیکھ چکے تھے۔ انہیں جیسے ہی معلوم ہوا کہ گاڑی بارہ بجے ہمیں لے جائے گی، وہ تریونی کی کوٹھی کے باہر پہنچ گئے۔ انہوں نے دیکھ لیا ہوگا کہ ایک گاڑی آئی ہے دوسری نہیں آئی۔ بس انہوں نے اپنا کام شروع کردیا۔ میں بھی وقت کا ہی انتظار کررہا تھا۔ لائٹ سگنل دینے کے بعد ان میں سے کوئی چڑھا ہوگا بجلی کے پول پر۔ وہاں سے تریونی کی کوٹھی تک تھری فیز کے چار تار گئے ہوں گے۔ تین فیز اور ایک نیوٹرل۔ انہوں نے نیوٹرل کو کاٹ دیا ہوگا، کسی خطرے کے بغیر۔ وہ تار کٹ کے نیچے گر گیا ہوگا۔ اسے پھر جوڑنے میں وقت لگے گا اور یہ کام بجلی کمپنی والے ہی کرسکتے ہیں لیکن نیوٹرل کے بغیر تینوں فیز بے کار ہیں۔ تریونی کی کوٹھی میں اندھیرا ہوا تو وہ دہشت زدہ ہوگیا۔ فوراً شکست مان لی اس نے۔ خبیث کتنی جلدی راضی ہوگیا نازو کو واپس کرنے کے لئے۔ بس اسی جگہ ٹھہر جاؤ۔ اس کی کار اسی طرف سے آئے گی۔ سین شین نے کار کو باہر نکلتے ہی روک لیا ہوگا۔ وہ بھی ساتھ بیٹھے ہوں گے۔ دلاور نے عجیب بات کی تھی کہ نازو سب دیکھ کر آرہی ہے۔ کیا دیکھا ہوگا نازو نے آخر؟ شہلا اور میرا بیٹا تو لاہور میں ہیں اور تم لوگ مجھ سے کیسے جھوٹ بول سکتے ہو۔" وہ پھر دیوانوں کی طرح ہنسا۔ "سور کا بچہ کہتا تھا کہ تمہارے دوست تمہارے ہی ہاتھوں انہیں مروانا چاہتے تھے۔ انہوں نے تمہیں بتایا نہیں۔ وہ جھوٹ بول رہا تھا نا! ...ایسی کوئی بات تم مجھ سے کیسے چھپا سکتے ہو۔"

پھر اچانک وہ چلتے چلتے رک گیا اور اس نے ایک پتھر اٹھالیا۔ "...سکندر! بول حرام زادے۔ بولتا کیوں نہیں؟ تیری زبان کیوں چپ ہے؟ بتا مجھے کہ یہ جھوٹ تھا۔ رابعہ کی عزت کی قسم کھا کے کہہ کہ دلاور جھوٹ بول رہا تھا۔ ورنہ میں سر پھاڑ دوں گا تیرا۔"

اب سچ کے انکشاف کو روکا نہیں جاسکتا تھا۔ سفاک حقیقت کا سورج سوا نیزے پر تھا۔ اس کے وجود کو جھٹلانا ناممکن تھا۔

میں نے محسن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھا۔ ان آنکھوں کی کیفیت دیکھ کر مجھے خوف آیا۔ وہ پاگل ہوچکا تھا۔ دیوانگی اس کے انداز سے ہی نہیں آنکھوں سے بھی عیاں تھی۔

"یہ جھوٹ نہیں تھا محسن" میں نے ایک لمبی گہری سانس لے کر کہا۔

محسن کا ہاتھ اوپر اٹھا رہا۔ خاموشی کا ایک بھیانک لمحہ آیا جو عذاب کی وہ ساری شدت رکھتا تھا جسے پھانسی کے اندھے کنویں میں لٹکا ہوا آدمی اکیلا جھیلتا ہے۔ پھر محسن نے ایک اور قہقہہ مارا۔

"یار تو بڑا حرامی ہے۔ مذاق کرتا ہے موقع محل دیکھے بغیر۔ کیا میں تیرا سر پھاڑ دوں؟"

میں نے کہا "ہاں۔ یہ پتھر میرے ہی سر کے لئے تھا۔ جو یہاں پڑا ہوا منتظر تھا اس لمحے کا، جب میں تیرا مجرم اور گنہگار ہوکے یہاں سے گزروں اور یہ تیرے ہاتھوں میں پہنچ جائے۔ تجھے اب کس کا انتظار ہے؟ میں اعتراف کرچکا ہوں اپنے جرم کا۔"

غالب نے کہا "اگر دلاور کہتا ہے تو ٹھیک کہتا ہے۔ ہم تیرے دوست نہیں دشمن تھے۔ ہم نے یہی چاہا تھا کہ شہلا اور اس کے بیٹے کا قاتل تو کہلاتا۔ ہمارے دامن پر کوئی داغ نہ آتا۔ پہلا پتھر مجھے مار۔"

"دشمن ہو" آہستہ آہستہ محسن کا ہاتھ نیچے آگیا "تم بھی۔"

صدیوں پہلے جب سیزر کے دوست بروٹس نے اس کو خنجر گھونپا تھا تو سیزر بھی حیران رہ گیا تھا۔ وہ صرف اتنا کہہ سکا تھا "تم بھی۔ بروٹس...." اس سے زیادہ کچھ کہنے کی گنجائش نہ تھی لیکن اس سے زیادہ کہنا بھی غیر ضروری تھا۔ کہ صفِ دشمناں میں تم بھی شامل ہو۔ نہیں، یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ باقی سب تو میرے سینے میں خنجر اتار سکتے تھے کیونکہ وہ دشمن تھے اور خون کے پیاسے تھے مگر تم... تم تو دوست تھے بروٹس۔ تم بھی!"

"تم بھی دشمن ہو؟" محسن نے پھر دہرایا "نہیں۔ دلاور جھوٹ بولتا ہے۔ بھونکتا ہے وہ کتے کا بچہ۔ میں قتل کردوں گا اسے اگر اس نے تمہیں گالی دی۔ یہ گالی نہیں سنوں گا میں۔ جو کہے کہ سکندر میرا دوست نہیں دشمن ہے۔ لیکن ایسی! ت ...

کہہ سکتا ہے جو پاگل ہو۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ ہم پہلے دن سے دوست ہیں۔ اس دنیا میں اپنی زندگی کے آغازِ سفر سے۔ یہ بات تو دشمن بھی جانتے ہیں۔ جیسے ہر شخص سورج کو جانتا ہے۔ جو اسے چاند کہے گا۔۔ ظاہر ہے وہ پاگل ہوگا۔ پاگل کی بات کا کیا برا ماننا۔"

...اس نے ایک قہقہہ مارا اور بہت دیر تک ہنستا رہا۔

اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ دلاور کی بات سن کے محسن کا دماغ الٹ گیا ہے۔ وہ یقین کر چکا ہے کہ یہ بات غلط نہیں لیکن اس کے لاشعور میں دبا ہوا خوف اسے یقین سے روکتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس خبر کو جھوٹ سمجھے۔ اس کی خواہش ہے کہ یہ سچ نہ ہو۔ شعور اور لاشعور کی خانہ جنگی میں رزم گاہ اس کا وجود ہے۔ صدمے کا یہ اثر عارضی بھی ہو سکتا تھا۔ اگر شہلا مل جاتی۔ اگر اسے یقین دلایا جا سکتا کہ دلاور جھوٹ بول رہا تھا۔ مگر یہ مشکل تھا۔ شاید ناممکن تھا۔

میں نے محسن کو جھنجوڑا "یہ کیا ہو گیا ہے تجھے؟"

محسن کی ہنسی رک گئی "واقعی یار۔ یہ کیا ہو گیا تھا مجھے؟ غالب، یار مجھے کیا ہو گیا ہے؟"

غالب نے کہا "ابھی تک تو کچھ بھی نہیں ہوا۔"

وہ بولا "یہ تو ہو سکتا ہے کہ میں پاگل ہو جاؤں تو خود انہیں مار دوں۔ لیکن پاگل ہو کے بھی میں کیسے اتنا بڑا جھوٹ تسلیم کر سکتا ہوں کہ تم میرے ہاتھوں ان کو مروانا چاہتے تھے۔ کیا میں اتنا کمینہ ہوں کہ کوئی تم پر یہ الزام لگائے اور میں مان لوں۔ معاف کرنا یار، میں واقعی پاگل ہو گیا تھا۔ مرزا غالب، تمہارا ہی شعر ہے نا وہ کہ۔ میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد۔ سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا" اس نے قہقہہ لگایا اور وہ پتھر پھر اٹھا لیا جو وہ نیچے گرا چکا تھا "لو۔ یہ پتھر میرے سر پر مارو... مارو۔"

فرطِ غم سے میرا دل پھٹنے والا تھا۔ اس کی حالت دیوانوں جیسی ہو رہی تھی اور میرے ضمیر کو ایک غیبی آواز مسلسل کچوکے لگا رہی تھی۔ اس کے ذمے دار تم ہو۔ تم نے جھوٹ بولا۔ اس وقت تم سچ بول سکتے تو آج محسن تمہارے ساتھ ہوتا۔ وہ حقیقت کا سامنا کرتا لیکن تم نے ڈر کے جھوٹ کی آڑ میں پناہ لی۔ وہ جھوٹ ایک کینسر کی طرح پھیلتا رہا۔ اس کا علاج اب کون سے سچ کے تریاق سے کرو گے؟ غالب کی آنکھوں میں آنسو تھے جو محسن کے درد کا درماں نہیں ہو سکتے تھے۔

وقفے وقفے سے سڑک پر دونوں جانب سے گاڑیاں آ رہی تھیں۔ آدھی رات کے بعد ٹریفک بہت کم ہو چکی تھی لیکن بالکل ختم نہیں ہوئی تھی۔ مجھے ایک اندیشہ یہ لاحق تھا کہ کہیں ہمیں مشتبہ انداز میں کھڑا دیکھ کر پولیس کی کوئی گشت کرنے والی پارٹی نہ آ جائے۔ محسن کا رویہ دیکھ کر وہ سمجھتے کہ ہم سب نشے میں ہیں۔ مجھے اس گاڑی کی فکر بھی تھی جس میں نازو کو واپس آنا تھا۔ دور سے آنے والی ہر گاڑی صرف چندھیا دینے والی روشنی ہوتی تھی۔ ...رات کے وقت گاڑی کا رنگ، ماڈل کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ نہ یہ پتا چلتا تھا کہ گاڑی کون چلا رہا ہے اور ونڈ اسکرین کے پیچھے کون ہے۔ سین شین مجھے اور غالب کو نہیں جانتے تھے۔ اگر نازو آگے بیٹھے گی تو اس کی نظر ہمیں دیکھ لے گی۔ لیکن وہ پیچھے بیٹھی تو اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ سین شین میں سے کوئی ایک ہوگا۔ اگر انہوں نے محسن کو مس کر دیا...

ایک گاڑی بہت تیزی سے آئی۔ قریب آ کے اس کی رفتار کم ہوئی۔ پھر ڈرائیور نے زبردست بریک لگائے اور گاڑی ہم سے چند قدم کے فاصلے پر رک گئی۔ یہ تریوینی کی گاڑی نہیں تھی۔ ...جو شخص آگے سے اترا اسے بھی میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اور اس کے انداز انتہائی جارحانہ تھے۔ تقریباً اس کے پیچھے پیچھے پولیس کی گاڑی آئی اور پہلی گاڑی کے سامنے آ کے ٹھہر گئی۔ ...میں نے محسن کی طرف دیکھا۔ وہ دیوانوں کی طرح ہنس رہا تھا۔

گاڑی سے اترنے والے تین پولیس والوں میں سے ایک ان کا افسر تھا۔ باقی دو نے کسی حکم اور کسی وجہ کو ضروری سمجھے بغیر اپنی رائفلوں کو ایسے اٹھا لیا جیسے ان کو سخت مزاحمت درپیش ہے۔ کار میں سے پہلے اترنے والا شخص ہمارے لئے اجنبی تھا مگر اس نے ہمیں شناخت کر لیا تھا۔ پولیس کی گاڑی اس کے پیچھے تھی اور شاید اس کے اشارے پر رکی تھی۔ اپنے انداز و اطوار سے وہ سادہ کپڑوں میں پولیس کا کوئی بڑا افسر یا فوجی لگتا تھا۔

جب کار کا دوسرا دروازہ کھول کے کرنل سامنے آیا تو مجھے جیتی ہوئی بازی ہارنے پر مایوسی اور تقدیر کے ہاتھوں تدبیر کی شکست کا شدت سے احساس ہوا۔

"یہی ہیں نا وہ لوگ کرنل؟" کار سے پہلے اترنے والے نے انگریزی میں سوال کیا۔ کرنل نے اقرار میں سر کو خفیف سی جنبش دی "مجھے معلوم ہے کہ تمہاری نظر عقاب سے زیادہ تیز ہے۔ تم شناخت میں غلطی نہیں کر سکتے تھے ایس پی۔"

جسے ایس پی کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا وہ اس تعریف پر مسکرایا۔ "میں ان سب کی تصویریں جو دیکھ چکا تھا۔"

کرنل نے کہا۔ "آج تم نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ پولیس والے کتنے ہی کاہل کیوں نہ ہوں، اگر وہ چاہیں تو مستعدی کے ساتھ وقت پر کہیں بھی پہنچ سکتے ہیں۔ تھینک یو مائی فرینڈ۔"

کرنل کا دوست ایس پی اگرچہ سیاہ فام اور کسی حد تک بدرد تھا مگر وہ حیرت انگیز طور پر فٹ اور اسمارٹ تھا۔ اس کی عمر چالیس سال کے قریب تھی مگر وہ پچیس سے زیادہ کا نظر نہ آتا تھا۔ ...آدھی آستین کی سفید اسپورٹس شرٹ اور کالی پتلون سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی کمر پتلی اور سینہ چوڑا ہے۔ اپنے جسم کو اتنا متوازن اور متناسب رکھنے کے لئے وہ یقیناً ورزش یا باڈی بلڈنگ کرتا ہوگا۔

محسن جو پہلے دیوانہ وار ہنس رہا تھا، اب سنجیدہ ہو چکا تھا۔ شاید یہ خطرے کا احساس تھا جس نے اس کے حواس کو جھنجوڑ کر ایک جذباتی ہسٹریا کو ختم کر دیا تھا اور اسے صورتِ حال کی سنگینی کو سمجھنے پر مجبور کر دیا تھا۔

ہم بہت غلط وقت پر پکڑے گئے تھے۔ قصور ہمارا اپنا تھا۔ ہم نے تریوینی اور دلاور کے عیار ذہن کو بڑی غیر متوقع شکست دی تھی۔ پہلے محسن نے ایک کامیاب چھاپا مار کے ہماری اسیری کو آزادی سے ہمکنار کیا تھا اور اس سے پہلے کہ شکاری کچھ سمجھتے اور سنبھلتے، وہ ہمیں نکال کر لے جانے میں کامیاب رہے تھے۔ دوسری کامیابی ہم نے صرف چشم تصور سے دیکھی تھی مگر اس میں بھی شبے کی گنجائش نہیں تھی۔ تریوینی مجبور ہو گیا تھا کہ نازو کو باعزت طور پر واپس کر دے۔

غلطی ہم سے یہ ہوئی تھی کہ ہم کرنل کو بھول گئے تھے۔ کچھ محسن سے ملنے کی خوشی تھی، کچھ اس کی سرگزشت میں دلچسپی اور انہماک کا نتیجہ تھا اور کچھ کامیابی کے غرور کا فطری ردِ عمل کہ ہم نے احتیاط کے تقاضوں کو نظر انداز کر دیا اور سرِ راہ گزر سب کی نظروں کے سامنے کھڑے نازو کو لانے والی گاڑی کا راستہ دیکھتے رہے۔

میدان جنگ میں ہر بھول چوک کا فائدہ حادثاتی طور پر بھی دشمن کو پہنچتا ہے۔ اگر ہم نے صرف اتنا کیا ہوتا کہ کسی درخت کے سائے میں یا کسی گوشۂ دیوار کے پیچھے رہتے تو شاید کسی کی نظر ہم پر نہ پڑتی مگر ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی میں ایس پی نے ہمیں دیکھ لیا تو یہ کمال اس کی عقابی نظر کا نہیں تھا، ہماری بے احتیاطی کی سزا تھی۔ انہوں نے ہمیں پیچھے دھکیل کر ایک دیوار کے ساتھ لگا دیا۔

کرنل نے حقارت کے انداز میں کہا "یہ مسٹر سکندر بخت ہیں۔ یہ ان کے دوست مسٹر محسن اور یہ مرزا غالب" اس نے اپنی اطوار کی شائستگی میں فرق نہیں آنے دیا تھا۔

"میں ان سب سے بہت اچھی طرح واقف ہوں" ایس پی نے کہا "یوں سمجھ لو کہ مل چکا ہوں۔ یہ حیرت انگیز لوگ ہیں۔"

میں نے بلا ارادہ اپنا ہاتھ مصافحے کے لئے بڑھا دیا۔ میں نے انگریزی میں کہا "کچھ دشمن بھی اس قابل ہوتے ہیں کہ ان کے ساتھ عداوت میں بھی وضع داری کو ملحوظ رکھا جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ حالات نے ہمیں آمنے سامنے اور منافرت کی لکیر کے دونوں طرف کھڑا کر دیا ہے۔ اگر ہم ایک ہی طرف ہوتے تو۔"

ایس پی نے مصافحے کے لئے ہاتھ نہیں بڑھایا۔ بظاہر وہ میری بات بھی غور سے سن رہا تھا۔ مگر پھر اس کا ہاتھ بڑی تیزی سے حرکت میں آیا اور میرے بائیں گال پر ایسے پڑا کہ میرا گال دہکنے لگا۔

"مجھے معلوم ہے کہ تم ایک دہشت گرد ہو۔ غدار ہو۔ قاتل ہو اور مفرور مجرم ہو۔ اس کے باوجود تم کہتے ہو کہ ہم ایک ہی صف میں ہوتے۔ میں ایک ذمے دار پولیس افسر اور ایک امن پسند شہری ہوں۔"

"سوری" میں نے کہا۔ "مجھ سے اندازے میں غلطی ہو گئی۔ ...تم اور یہ کرنل۔ دونوں صرف مالک کے اشاروں پر دُم ہلانے والے وفادار کتے ہو۔ لیکن تمہارے مالک بد خصلت، بے ضمیر شیطان ہیں۔"

ایس پی مشتعل ہو گیا تھا مگر کرنل نے اسے روک لیا "یہ ان کی چالاکی ہے۔ تمہیں سمجھنا چاہئے۔ یہ تمہیں مار پیٹ پر اکسانا چاہتے ہیں تاکہ اس صورت حال کو اپنے حق میں استعمال کرنے کے لئے کوئی موقع پیدا کریں۔ اور باتوں میں وقت ضائع کرنا جانتے ہیں۔ انگلش ہی نہیں فرنچ بھی بول لیتے ہیں اور اکثر اپنے انداز و اطوار سے امپریس کر کے فائدہ اٹھاتے رہے ہیں۔"

"میرے ساتھ ایسی کوشش کا انجام صرف یہ ہوگا کہ ان کے سر میں ایک ایک سوراخ ہو جائے گا۔" ایس پی نے فرعونیت سے کہا اور اپنا ریوالور نکال لیا۔

"نہیں۔ خوش اسلوبی سے ہو جانے والے کام کو بدمزاجی سے خراب مت کرو۔ انہیں ساتھ لو اور چلو" کرنل نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔

"ان کے کچھ اور ساتھی بھی تو آنے والے ہیں" ایس پی نے کہا۔

"جب وہ آئیں گے تو ان سے بھی نمٹ لیں گے" کرنل نے کہا "انہیں تو گاڑی میں ڈالو۔"

ایس پی کے مقابلے میں کرنل بہت زیادہ ٹھنڈے دماغ کا آدمی تھا۔ اس نے میری نیت کو سمجھ لیا تھا۔ میں واقعی بازی پلٹ دینے کے لئے کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھا۔ سوچنے اور منصوبہ بندی کرنے کے لئے تھوڑی سی مہلت چاہتا تھا اور اپنے سب حریفوں کی طاقت کا اندازہ کر رہا تھا۔ مجھے اس وقت نازو کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔ محسن اور غالب کسی میدان میں پیچھے ہٹنے والے نہیں تھے لیکن اسلحے کے بغیر ان میں نہ اپنے دفاع کی صلاحیت تھی اور نہ مدِمقابل پر غالب آ جانے کے لئے مؤثر جسمانی قوت۔ کرنل کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ جوڈو کراٹے سے بھی واقف ہوگا۔ اس کو میں ایک کوبرا سانپ سے زیادہ ہلاکت آفریں۔ بھیڑئیے سے زیادہ سفاک۔ چیتے سے زیادہ پھرتیلا اور آدم خور شیر سے زیادہ خوں آشام سمجھنے پر مجبور تھا۔ حالاں کہ وہ اپنے اطوار سے انتہائی بے ضرر، معقول اور پُرسکون نظر آتا تھا مگر اس کی شخصیت پر ایک نہیں کئی پردے تھے اور ہر پردے کے پیچھے اس کی منفی ذہانت سے مسخ شدہ صورت ایک بھیانک حیوانی روپ رکھتی تھی۔ اس میں دلاور کی عیاری۔ پیڈرو کی بے رحمی۔ حاجی عبداللہ کی منافقت اور تریوینی کی بدمعاشی کی صفات بھی اکٹھی ہو گئی تھیں اور وہ اپنی شیطانی ذہانت میں بھی ان سب سے بہت آگے تھا۔ وہ خوش اطوار، خوش لباس اور خوش شکل تھا اور بلا شبہ اپنی پُرکشش طلسماتی شخصیت سے دشمن کو ذہنی طور پر مفلوج کر سکتا تھا یا اسے ہپناٹائز کر کے اس حد تک اپنا مطیع کر سکتا تھا کہ اسے حکم دے تو وہ خود اپنے ہاتھوں اپنا

گلا کاٹ لے۔ بہت کم وقت میں اس نے ظاہر کردیا تھا کہ وہ اب تک ہمارے مقابل آنے والے سب دشمنوں سے کہیں زیادہ خطرناک ثابت ہوگا۔

ایس پی کچھ اپنے سرکاری اختیارات اور پھر اپنی جسمانی طاقت پر نازاں تھا۔ باقی تین پولیس مین صرف اسلحہ بردار حکم کے غلام تھے۔ نازو ساتھ ہوتی تو میں سب سے پہلے کرنل پر قابو پانے کی کوشش کرتا اور نازو کو ایس پی سے نمٹنے کا موقع دیتا۔ وہ ساڑھے چھ فٹ قد کا کالا دیو اپنی طاقت پر غرور کے باعث اس نازک اندام لڑکی کے ہاتھوں اسی طرح مارا جاتا جیسے روایت اور ضرب المثل کے مطابق چیونٹی سے مقابلہ کرکے ہاتھی مارا جاتا ہے۔ محسن اور غالب کچھ دیر تینوں پولیس والوں کے ساتھ... بہرحال مقابلہ کرسکتے تھے۔ پھر میں یا نازو ان کی مدد کے لئے پہنچ جاتے اور دو منٹ میں یہ مقابلہ ختم بھی ہو سکتا تھا مگر اب میں بیک وقت کرنل اور ایس پی سے بھڑ جاتا تو نتائج مختلف ہوتے۔

ریوالور نکالنے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ شاید ہمارے ہاتھوں کی حرکت کا اندازہ کرتے ہی کرنل ریوالور نکال لیتا۔ وہ ایس پی کی طرح اشتعال اور عجلت میں کسی کے سر کا نشانہ کبھی نہ لیتا۔ وہ میرے یا محسن اور غالب کے ہاتھوں پر فائر کرتا اور نہ جانے کیوں مجھے یہ بھی یقین تھا کہ وہ فلمی کاؤبوائے اسٹائل میں تین فائر کرتا تو ہم تینوں کے ہاتھ سے ریوالور اڑ جاتے لیکن ہمارے ہاتھوں میں خراش بھی نہ آتی۔ آخر یہ کیا ہے؟ میں نے سوچا۔ کیا میں اس شخص کے ذہن کی مقناطیسی قوت سے مغلوب ہورہا ہوں؟ میں کیوں ہر معاملے میں اس کی برتری اور فوقیت کو تسلیم کررہا ہوں؟ جب کہ اس نے ابھی تک اپنی ہر غیر معمولی صلاحیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود کو سپرمین ثابت نہیں کیا ہے۔

"اپنے چہرے دیوار کی طرف کرلو" ایس پی نے کہا "ایک دوسرے سے دور ہو اور اس خوش فہمی سے بھی کہ میں نے تمہارے سر میں سوراخ نہ کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے تو تم محفوظ ہو۔ میں تمہارے ٹخنوں کو یا گھٹنوں کو ناکارہ کردوں گا۔ اگر تمہارے پنجے کاٹ دیئے گئے یا گھٹنوں سے نیچے ٹانگیں نہ رہیں تو تمہاری زندگی فٹ پاتھوں پر دوسروں کے لئے بھیک مانگتے گزرے گی۔ میں تمہیں ایسے ٹھیکیداروں کے حوالے کردوں گا جو معذور فقیروں کی آمدنی سے اتنے دولت مند ہوچکے ہیں کہ انتخابات لڑ سکتے ہیں۔ اور وہ بہت بڑے بدمعاش بھی ہیں۔"

"تم سے بھی بڑے؟" محسن نے دیوار کی طرف رخ کرکے کہا۔

"نہیں۔ میرے سامنے وہ ہاتھ باندھ کر آتے ہیں" ایس پی نے غرا کے کہا۔

غالب نے کہا "تمہارا حصہ پہنچانے؟ تمہاری اجازت کے بغیر بدمعاشی کے دھندے کیسے چل سکتے ہیں۔"

"ہاں۔ مگر یہ میری اجازت کی بات نہیں۔ اجازت اوپر سے بھی آتی ہے" ایس پی بولا۔

جہاں ہم اپنے ہاتھ دیوار پر رکھے کھڑے تھے وہ جگہ سڑک سے دور اور کچھ تاریکی میں تھی۔ سڑک پر دن کے وقت یہ کارروائی ہوتی تو شاید کوئی رکنے کی ہمت کرتا مگر رات کے وقت کسی گاڑی والے کو پولیس کے کام میں دخل اندازی کرکے خود کو مصیبت میں ڈالنے کا خیال نہیں آسکتا تھا۔ اگر کسی نے اس پورے منظر کو غور سے دیکھا ہوگا تو یہی نتیجہ اخذ کیا ہوگا کہ پولیس نے تین مشتبہ افراد کو پکڑا ہے جو چور ڈاکو یا آوارہ گرد کچھ بھی ہوسکتے تھے۔ آدھی رات کے بعد کسی اخباری رپورٹر کے آجانے کی امید بھی نہیں تھی۔ ایک پولیس مین میری جامہ تلاشی کے بعد میرا ریوالور اپنے افسر کی خدمت میں پیش کرچکا تھا۔ محسن اور غالب سے بھی اسلحہ برآمد ہوچکا تھا اور قانون کے لئے ہمارے خلاف کارروائی کو سند دینے کے لئے یہ ثبوت کافی تھے مگر یہ قانونی کارروائی نہیں تھی۔ قانون کے عملدار ہمیں غیر قانونی طور پر پکڑ کے تریوینی کے سامنے دست دبابستہ پیش کرنا چاہتے تھے... قانون نچلی سطح کے لوگوں کے لئے ایک جال تھا۔ بہت اوپر کی سطح پر تریوینی جیسے لوگ وہ شکاری تھے جو اس جال سے کام لیتے تھے۔ یہ کمزور کے لئے اس کی کمزوری کی سزا تھا اور طاقتور کے لئے اختیار کا سرچشمہ۔

کرنل اور ایس پی ابتدائی کارروائی سے فارغ ہوجانے کے بعد خاصے مطمئن تھے کہ یہ مرحلہ کسی قسم کی مزاحمت اور کشت و خون کے بغیر طے ہوگیا۔ تینوں پولیس مین پیچھے ہٹ گئے تھے لیکن ابھی تک انہوں نے اپنی بندوقوں کا رخ ہماری سمت کررکھا تھا۔ انہوں نے مجھے، غالب اور محسن کو ایک دوسرے سے اتنا دور کردیا تھا کہ ہم رازداری کے ساتھ سرگوشی میں کوئی بات نہیں کرسکتے تھے۔ ان حالات میں وہ کیا سوچ رہے ہوں گے، اس کا اندازہ کیا جاسکتا تھا۔ تھکن اور نیند کی کمی سے سب کی جسمانی حالت تباہ تھی۔ گرفتاری نے ذہنی طور پر بھی سب کو مایوسی کی بے بسی اور احساسِ شکست کی کم ہمتی میں مبتلا کردیا تھا۔

خود میرا ذہن قوتِ فیصلہ سے محروم تھا اور خیالات کے انتشار نے میری سوچ کو بے سمت کردیا تھا۔ کبھی مجھے خیال آتا تھا کہ ہمیں نتائج کی پروا کئے بغیر دشمنوں پر ٹوٹ پڑنا چاہئے۔ وہ پانچ ہیں اور ہم تین۔ پھر اتنا ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس خیال کو دوسرا خیال مسترد کردیتا تھا کہ سوچے سمجھے بغیر مقابلے پر اتر آنا خودکشی کے مترادف ہوگا کیوں کہ وہ مسلح ہیں اور ہم خالی ہاتھ۔ اگر میں اچانک کرنل پر جا پڑوں یا ایس پی کو بے بس کرکے یرغمال بنالوں؟ انہیں خبردار کروں کہ کسی نے ہمارا راستہ روکا تو میں ایس پی کی گردن توڑ دوں گا۔ کیا وہ ہمیں نکل جانے دیں گے؟ ... یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ اِدھر میں ایس پی کو مغلوب کروں اُدھر کرنل جوابی کارروائی کرتے ہوئے محسن یا غالب میں سے کسی کو پکڑ لے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میں کرنل یا ایس پی پر قابو پانے میں ناکام رہوں اور میری ناکامی کے نتیجے میں وہ دونوں مارے جائیں۔ پھر میں اکیلا رہ کے کیا کروں گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ میرے ہاتھوں کرنل یا ایس پی میں سے ایک ہلاک ہوجائے لیکن پولیس والے بھی خاموش تماشائی بنے تو نہیں کھڑے رہیں گے۔ اپنے افسر کو بچانے کے لئے انہوں نے فائرنگ کی تو گولی کسی کو بھی لگ سکتی ہے۔ ایسے دس کرنل اور سو ایس پی مرتے ہیں تو دنیا کو فرق نہیں پڑتا لیکن ایک غالب یا محسن کے مرنے سے میری دنیا میں امید، یقین اور اعتماد کا سورج نہیں رہے گا تو یہ دنیا کیسی ادھوری اور اندھیری ہوجائے گی؟ نہیں۔ مجھے انتظار کرنا چاہئے۔ ... سوچنا چاہئے اور دیکھنا چاہئے کہ وقت کب موقع فراہم کرتا ہے اور اس موقع سے کب فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے کہ اپنا کم سے کم نقصان ہو۔ ابھی نازو آجائے گی۔ اس کے ساتھ منو بھائی بھی ہوں گے اور سین شین بھی۔ پھر ہم زیادہ قوت کے ساتھ ان سے نمٹ سکیں گے۔ مگر سوال یہ ہے کہ وہ ابھی تک آئے کیوں نہیں؟ ... اور اس سے بھی زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ آخر کرنل کو ہمارے بارے میں کس نے بتایا؟ کیسے اتنے کم وقت میں وہ پولیس کے ساتھ ہمارا تعاقب کرتا ہوا سیدھا یہاں آپہنچا؟ اور اسے کیسے معلوم ہوا کہ اب اسی راستے سے نازو اور ہمارے دوسرے ساتھی آنے والے ہیں؟

خیالات کی منتشر افواج کو پھر منظم کرنے کے لئے مجھے سخت جدوجہد کرنی پڑی لیکن آخر کار میں ایک حکمتِ عملی وضع کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

میں نے اپنے ہاتھ دیوار پر سے اٹھائے اور آہستہ آہستہ پلٹ کے سیدھا کھڑا ہوگیا۔

"یہ کیا ہے؟" ایس پی نے غرا کے کہا "کس کی اجازت سے اپنی پوزیشن بدلی ہے تم نے؟"

میں نے اطمینان سے کہا "خود اپنی اجازت سے۔"

"شٹ اپ۔ پلٹ کے اسی طرح کھڑے ہو جاؤ ورنہ..."

"ورنہ کیا؟ تم گولی ماردو گے" میں نے کہا "کیا تم سینے پر گولی مارتے ہوئے ڈرتے ہو؟ اس لئے کہ ہمیشہ پشت پر وار کرتے رہے ہو۔"

"مجھے مجبور مت کرو" ایس پی نے دہاڑ کر کہا۔

"تم پہلے ہی بہت مجبور ہو۔ تم سے زیادہ مجبور کون ہو سکتا ہے کہ ریوالور تمہارے ہاتھ میں ہے لیکن تم کو گولی چلانے کی اجازت نہیں ہے ایس پی صاحب۔ عقل اور ہوش سے کام لو۔ ایک گولی چلا کے تم کیا کچھ گنوادو گے؟ یہ بھی سوچ لو۔ تمہاری خدمات ہماری لاشیں لانے کے لئے حاصل نہیں کی گئی ہیں۔ تم کو جواب دہی مشکل ہوجائے گی اپنے آقاؤں کے سامنے" میں نے فلمی ولن کے انداز میں ایک قہقہہ مارا "تم ایک زرخرید غلام کی طرح مجبور ہو۔ یو سن آف اے بچ۔ تم صرف بھونک سکتے ہو۔ کاٹنے کی کوشش کروگے تو تمہارے گلے میں پٹہ ڈالنے والے ہاتھ تمہاری گردن دبوچ لیں گے۔"

ایس پی اتنا مشتعل ہوچکا تھا کہ درمیان میں کرنل حائل نہ ہوتا تو یا وہ مجھ پر گولی چلا دیتا یا خود مجھ پر حملہ کردیتا۔ میں اس گولی کے ساتھ زندگی اور موت کا خطرناک کھیل کھیلنے کے لئے تیار تھا۔ ... نشانہ خطا جانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن گولی کو ڈاج کرکے خود کو بچانے کی کوشش میں میری کامیابی کے امکانات ففٹی ففٹی تھے۔ میں دائیں یا بائیں غوطہ لگا کر خود کو بچاتے ہوئے ایک ہی جست میں ایس پی پر جاگرتا اور اسے دوسرا فائر کرنے کی مہلت نہ دیتا۔

کرنل نے کہا "میں نے تمہیں بتایا تھا کہ یہ لوگ تمہیں مشتعل کریں گے۔ اور تم اشتعال میں کوئی غلطی کروگے تو اس سے پورا فائدہ اٹھائیں گے۔"

ایس پی نے شکایت اور احتجاج کے انداز میں کہا "لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں بے عزتی کو برداشت کروں۔ اپنے ماتحتوں کے سامنے۔"

"اس کا صرف ایک مطلب ہے کہ یہ جو کچھ کہیں اسے مت سنو اور نظرانداز کرتے رہو" کرنل نے کہا "تم کو کچھ دیر انتظار کرنا پڑے گا۔ صبر کے ساتھ....."

اب محسن اور غالب بھی اطمینان سے سیدھے کھڑے ہوگئے تھے۔ غالب نے کہا "ہم بھی بہت صبر کے ساتھ یہ سب کچھ برداشت کررہے ہیں لیکن برداشت کی ایک حد ہوتی ہے۔"

محسن نے تائید میں سر ہلایا "ہمیں اتنا مجبور نہ کرو کہ ہم مرنے مارنے پر تل جائیں۔ ہم صلح پسندی کو ترجیح دے رہے ہیں۔ ... اسے ہماری بزدلی یا کمزوری مت سمجھو۔"

میں نے کہا "اگر ہم نے مصلحت کے تقاضوں کو نظرانداز کردیا تو فیصلہ چند منٹ میں ہوجائے گا۔ اسلحے کا فرق اتنا اہم نہیں ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ میں یا میرے ساتھیوں میں سے کوئی تمہارا اسلحہ چھیننے میں کامیاب ہوجائے اور خود مرنے سے پہلے تمہیں بھی ٹھکانے لگادے۔ تین اور پانچ کی عددی قوت میں زیادہ فرق نہیں ہے مسٹر ایس پی۔"

کرنل نے کہا "او کے مسٹر سکندر بخت۔ تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی اس کے لئے میں معذرت خواہ ہوں۔ بہتر ہوتا، اگر تم فرار کا راستہ اختیار نہ کرتے۔ تم کو صرف مذاکرات کے لئے لے جایا جارہا تھا۔ مجھے تریوینی نے بتایا کہ تم نے اسے ہراساں کیا اور اس لڑکی کو بھی واپس بلالیا۔"

"تریوینی سے مذاکرات کرنے والے پر لعنت۔ مذاکرات وہاں ہوتے ہیں جہاں افہام و تفہیم کی گنجائش ہو۔ ہمارے مقاصد میں زمین آسمان کا فرق ہے اور مشرق و مغرب کی دوری ہے۔ میں جانتا ہوں وہ کیا کہے گا۔ تم اسے میرا جواب پہنچا دو کرنل۔ نہ ہم اس کی شرائط تسلیم کرسکتے ہیں۔ نہ اس کی کوئی پیشکش قبول کرسکتے ہیں، خواہ وہ کتنی ہی فراخدلانہ کیوں نہ ہو۔ ہم

اس کی کسی دھمکی سے ڈرنے والے نہیں ہیں۔ جو وہ کرسکتا ہے کرے۔ جو ہم کرتے رہے ہیں وہ آئندہ بھی کریں گے" میں نے کہا۔

"میں ان مذاکرات میں فریق نہیں ہوں۔ اور نہ تمہارے معاملات میں۔ میں نے صرف ایک ذمے داری قبول کی تھی" کرنل بولا "تمہیں تریوینی سے ملوانے کی' چنانچہ میں تمہیں اس کے سامنے ضرور لے جاؤں گا۔ میرا خیال ہے کہ اب ہمیں چلنا چاہئے۔"

ایس پی نے کہا "لیکن باقی لوگ؟"

"مجھے اندیشہ ہے کہ انہیں خطرے کے احساس نے روک لیا ہے" کرنل بولا "ورنہ انہیں اتنی دیر نہ لگتی۔ شاید انہیں اپنے ساتھیوں کی گرفتاری کا علم ہوگیا اور وہ راستہ بدل کے فرار ہوگئے۔"

"نگران کو کیسے معلوم ہو سکتا ہے؟"

"پہلی بات تو یہ کہ وہ بے وقوف نہیں ہیں۔ آنکھیں اور کان کھلے رکھتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ ہر شخص ایک چھٹی حس رکھتا ہے۔ خصوصاً وہ جو خطرات میں گھری ہوئی زندگی گزارے۔ ان سے کچھ بعید نہیں کہ وہ اپنے ساتھیوں کو چھڑانے کے لئے اچانک حملہ کردیں یا کوئی نئی چال سوچ کر آجائیں۔"

ایس پی نے کہا "ٹھیک ہے۔ ان سے کہو کہ گاڑی میں بیٹھ جائیں۔"

میں نے ہنس کے کہا "تم کیا روٹھ گئے ہو ہم سے؟ کہ خود نہیں کہہ سکتے۔"

کرنل نے جیب میں سے ایک پین ٹارچ قسم کی چیز نکالی۔ "مسٹر سکندر بجنت! اس سے پہلے کہ تم فرار ہونے کی سوچو' میں تم کو یاد دلادوں کہ میں ایک ریسرچ کیمسٹ ہوں اور میرے لئے کسی کا نام نشان تک مٹا دینا ایک کھیل ہے۔ میں آدمی کو بخارات بنا کے اڑادوں یا محلول کی طرح ڈرم میں بھردوں۔ اس کو مفلوج کردوں یا بے ہوش کردوں۔ عارضی طور پر یا ہمیشہ کے لئے۔ یہ بہت معمولی کام ہے مگر میں روایتی طریقے اختیار نہیں کرتا۔ اور نہ کشت خونریزی کے لئے اسلحہ استعمال کرتا ہوں۔"

میں نے کہا "تمہیں یہ جان کر افسوس ہوگا کہ میں دہشت زدہ نہیں ہوا۔"

"گاڑی میں بیٹھنے کے بعد تم نے پھر فرار ہونے کی احمقانہ کوشش کی تو میں تمہیں اعصابی طور پر ناکارہ کردوں گا" کرنل نے اپنی بات جاری رکھی "جو چیز تم میرے ہاتھ میں دیکھ رہے ہو یہ ایک ریموٹ کنٹرول ہے۔ اس کے بہت سے فنکشن ہیں۔ ایک بٹن دبانے سے اندر "مسٹرڈ گیس" بھر جائے گی۔ اسے نرو گیس یا اعصابی گیس بھی کہتے ہیں۔ یہ ویسے تو ہلاکت خیز ہوتی ہے مگر میں نے اس کی مقدار کو کم کر رکھا ہے اور اسے کچھ بے ضرر بھی بنادیا ہے۔ تم تین چار دن بعد اس قابل ہو سکو گے کہ اپنی مرضی سے کچھ کرسکو۔ اپنے جسم کے تمام اعضا پر تمہارا کوئی کنٹرول نہیں رہے گا اور تم بالکل کسی نوزائیدہ بچے کی طرح پڑے رہو گے۔ ایک ہفتے بعد تمہاری ذہنی صلاحیت نارمل بھی ہو سکتی ہے مگر یہ بھی ممکن ہے کہ تمہاری یادداشت جزوی طور پر بحال ہو۔ یا دماغ کے کسی حصے پر اثرات ہمیشہ باقی رہیں۔ تم یقیناً نہیں چاہو گے کہ میں اس بٹن کو دبادوں۔"

"اگر میں پھر یہ کہتا کہ میں دہشت زدہ نہیں ہوا تو یہ جھوٹ ہوتا۔ ہم سب کرنل کے سرد' سفاک لہجے کو اور اس کی دھمکی کو نظرانداز نہیں کرسکتے تھے..." اس نے ہمارے تصور میں ایک لرزہ خیز منظر بھردیا تھا کہ ہم اپنے ہی جسم کی غلاظت میں فرش پر لوٹ رہے ہیں اور جانوروں کی طرح حلق سے بے معنی آوازیں نکال رہے ہیں۔ ہم بھوکے پیاسے پڑے ہیں مگر نہ ہاتھوں پر ہمارا اختیار ہے کہ کچھ کھا پی سکیں اور نہ ہم اس قابل ہیں کہ منہ میں ڈالی جانے والی چیز کو حلق سے اتار سکیں۔ ہم اپنی مرضی سے ایک انگلی نہیں ہلا سکتے۔ ایک لفظ ادا کرنے کے لئے زبان کو استعمال نہیں کرسکتے۔ جسم کے نظام اخراج پر ہمارا کوئی کنٹرول نہیں۔ اعصابی نظام تباہ ہوجانے کے بعد آدمی نالی میں کلبلانے والے کیڑے سے بھی زیادہ بے بس۔ مضحکہ خیز اور قابل رحم ہو جاتا ہے۔ دلاور اور تریوینی جیسے دشمنوں کے سامنے یوں تماشا بننے کی ذلت کا تصور کرکے ہی مجھے پسینہ آگیا تھا۔

کرنل اپنی بات کا اثر دیکھ کر بہت خوش تھا۔ اس نے کہا۔ "اس ریموٹ میں ایک اور بٹن بھی ہے۔ اس سے گاڑی میں نصب بم کا دھماکا ہو سکتا ہے۔"

میں نے کہا "اتنا کافی ہے کرنل صاحب۔ ہم نیک چلنی کی ضمانت دیتے ہیں۔"

ایس پی کے لبوں پر ایک پُر حقیر مسکراہٹ نمودار ہوئی "میں نے سنا تھا کہ تم بڑے حاضر جواب ہو۔ بہت دلچسپ اور پُر مزاح باتیں کرتے ہو۔ بلکہ کہنے والے نے تو جوکر کہا تھا تمہیں۔ اب کہاں گئی تمہاری وہ بذلہ سنجی اور حس مزاح۔"

میں نے ایک آہ بھر کے کہا "یہ قصہ ہے تب کا کہ آتش جواں تھا"

ایس پی نے جہالت سے کہا "یہ آتش کون تھا؟ تمہارا کوئی ایسا ہی دوست۔ جوانی میں مرنے کے کام تو تم سب ہی کر رہے ہو"

ابھی اس کی احمقانہ بکواس جاری تھی کہ ایک طرف سے کوئی دھوتی پوش چیختا چلاتا نمودار ہوا۔ "ارے بچاؤ کوئی ہم کا ...! ایہہ جالم ہم کا مارئی ہے...."

وہ بالکل سوکھا سڑا' فاقوں کا مارا ہوا لگتا تھا۔ اس نے دھوتی کے اوپر کچھ نہیں پہن رکھا تھا چنانچہ اس کے سیاہ بدن پر پسینہ چمکتا ہوا نظر آرہا تھا۔ دوڑنے سے اس کی سانس پھول گئی تھی اور اس کا سینہ دھونکنی کی طرح اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ وہ ننگے پاؤں بھاگا چلا آرہا تھا اور کسی کے کچھ سمجھنے سے پہلے وہ ایس پی کی

ٹانگوں سے لپٹ گیا "ہم کا بچاؤ سرکار..."

ایس پی نے اسے ایک ٹھوکر ماری "ابے سیدھا کھڑا ہو کے بات کر۔"

اس کے تعاقب میں آنے والا بھی تارزن نہیں تھا مگر نسبتاً خوشحال نظر آتا تھا۔ اس نے سفید ٹوپی اور پجامے پر سفید قمیص پہن رکھی تھی لیکن پاؤں سے وہ بھی ننگا تھا۔ وہ گالیاں بکتا اور ایک ہاتھ میں گز بھر کے ڈنڈے کو لاٹھی کی طرح گھماتا آرہا تھا۔ خبیث الدہر ہم چودہ طبق روشن کردیں تیرے۔ سرمہ کردیں گے تیری ہڈیوں کا بدبخت۔ نمک حرام۔ ہماری شرافت کا خوب صلہ دیا تونے۔"

مظلوم نے پھر واویلا مچایا "ارے یہ مارڈالے گا ہم کا مائی باپ۔ دہائی ہے سرکار کی۔" وہ پھر ایس پی کے پیروں سے لپٹ گیا اور اس کے پیچھے چلا گیا "یہ راکھش ہے...."

ایس پی نے ڈنڈا لے کر دوڑنے والے کو پکڑ لیا "ابے دادا گیر کی اولاد! کیا بات ہے؟ کیا بدمعاشی ہے یہ؟"

"بندہ نواز آپ ہمیں خود ہی نمٹ لینے دیں۔" اس نے اپنی مخنی آواز میں کہا "ہم اس کو ایسی سزا دیں گے" اس نے ڈنڈا گھما کے ایس پی کی آڑ میں پناہ لینے والے کو مارنے کی کوشش کی۔ ...اس نے ایک دل دہلا دینے والی چیخ ماری' جیسے ڈنڈا لگنے سے اس کا سر پھٹ گیا ہو حالاں کہ ڈنڈا ایس پی کی ٹانگ پر لگا تھا۔

ڈنڈا چھین کر ایس پی نے اس کے ایک جھانپڑ دیا "اُلّو کا پٹھا۔ ...سیدھی طرح منہ سے بات کر۔ تو بھی سامنے آ...." اس نے پیچھے چھپ کر کانپنے والے کو گالی دی "خبردار جو کسی نے شور کیا۔"

کرنل نے پولیس والوں سے کہا۔ "تم ادھر ادھر مت دیکھو۔ ...اپنا کام کرو" پولیس والوں کی نظر گھومی تھی تو ان کی بندوقوں کا رخ بھی تھوڑا سا غلط ہوگیا۔ اب انہوں نے پھر نشانہ درست کیا اور بے حد مستعد نظر آنے لگے۔

فریادی کانپتا ہوا اور لرزتی آواز میں دہائی دیتا ہاتھ باندھے سامنے آگیا "سرکار! ہم کا مار دے گا ایہہ جالم.... ایہہ ہم پر جھوٹا الجام لگاوت ہے۔ ہم چوری ناہیں کئے...."

"دروغ گوئی اس کا شعار ہے حضورِ والا۔" مدعی نے مضحکہ خیز لہجے میں کہا۔ وہ ناک میں بولتا تھا اور اس کی آواز بھی زنانہ تھی۔ "ہم نے اسے کہا کہ سچ بتادے ہماری اہلیہ کے طلائی زیورات کہاں ہیں۔ ہم کچھ نہیں کہیں گے تجھے۔ پہلی غلطی پر درگزر شیوہ اسلاف رہا ہے۔ مگر یہ مانتا ہی نہیں سیاہ بخت' سیاہ رو۔"

"ہم گہنے ناہیں چرائے حجور۔ ہم سوگند کھائی کے بولت ہیں۔ مائی باپ۔" ایس پی نے سمجھ لیا کہ یہ چوری کا مقدمہ ہے۔ فریادی پر الزام تھا کہ اس نے مدعی کی بیوی کے زیور چوری کر لئے ہیں۔ ملزم قسم کھا کے کہتا تھا کہ اس نے ایسا نہیں کیا۔ فیصلہ تھانے والے آسانی سے کرسکتے تھے مگر ایس پی نے "حضور۔ سرکار۔ مائی باپ" جیسے خطابات وصول کرنے کے بعد خود ہی منصف کے اختیارات استعمال کرکے وہیں فیصلہ سنا دینا مناسب سمجھا۔

"کتنا گھنا تھا بے تیرا۔ جھوٹ بولا تو کھال ادھیڑ دوں گا...." اس نے مدعی کا ڈنڈا اسی کے رسید کرتے ہوئے کہا۔

وہ چلایا "یہ آپ کیا کرتے ہیں جنابِ عالی۔ ہمارا نقصان ہوا' ہمیں ہی زدوکوب فرماتے ہیں۔ خدارا انصاف فرمائیے۔ ہمارا دس ہزار کا زیور اس نمک حرام نے غصب کرلیا۔ اس پر غضب آپ کی یہ جانبداری...."

ایک لمحے کے لئے تو ان کے مقدمے کی کارروائی نے مجھے بھی مسکرانے پر مجبور کردیا تھا۔ ان میں ایک ان پڑھ اجڈ اور تمیز تہذیب سے ناآشنا بھکاری ٹائپ شخص تھا تو دوسرا لکھنوی تہذیب کا مرقع زبان کے شین قاف سے تعلیم یافتہ اور لباس سے خوشحال نظر آنے والا۔ اچانک میری نگاہ محسن کی طرف گئی اور مجھے یوں لگا جیسے اس نے مجھے آنکھ ماری ہے۔ ابھی میں اس سگنل کا مطلب سمجھنے کی کوشش ہی کررہا تھا کہ ایک دم سین بدل گیا۔

مظلوم اور فریادی بن کر آنے والے نے بڑی صفائی سے ہاتھ گھمایا اور میں نے ایس پی کو منہ پر ہاتھ رکھے چلاتے سنا۔ اسی وقت ظالم اور مدعی بن کر چوری کا مقدمہ پیش کرنے والا بھی حرکت میں آگیا اور اس نے بھی بڑی پھرتی سے ہاتھ لہرایا۔ کرنل کے منہ سے ایک گالی نکلی اور اس نے بھی چہرہ چھپا کے شور مچانا شروع کیا تو میرے سامنے ساری صورتِ حال اظہر من الشمس ہوگئی۔ ظالم اور مظلوم کا کردار کرنے والے سین شین تھے اور انہوں نے موقع پاتے ہی ایس پی کی اور کرنل کی آنکھوں میں پسی

ہوئی لال مرچیں جھونک دی تھیں۔

پہلے ریموٹ کرنل کے ہاتھ میں تھا مگر اب سین یا شین میں سے کسی کے ہاتھ میں نظر آرہا تھا۔ ان میں سے ایک نے اپنا ہی ڈنڈا چھین کر ایس پی کے سر پر مار دیا تھا اور دوسری ضرب کرنل کے سر پر لگانے کے لئے جست لگا کے پیچھے جا چکا تھا۔ میں نے ان کا صرف اتنا ہی ایکشن دیکھا جو مشکل سے دس بیس سیکنڈ کا کھیل تھا۔

پولیس والے رائفلوں کا رخ ہماری طرف کئے کھڑے تھے۔ پہلے تو وہ سمجھ ہی نہیں پائے تھے کہ آخر یہ معاملہ کیا ہے۔ پھر ان کے لئے مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ اپنی بندوقوں کا رخ ہماری طرف رکھیں یا دوسری طرف کریں جہاں ان کے افسران اعلیٰ پاگلوں کی طرح چلا رہے تھے اور چیخ چیخ کر گالیاں دیتے ہوئے یہ حکم بھی دے رہے تھے کہ انہیں گولی مار دو۔ ان کے لئے فیصلہ کرنا بہت مشکل ہو رہا تھا کہ اگر ان دونوں بدمعاشوں کو گولی مارنے کے لئے انہوں نے پوزیشن بدلی تو کہیں ہم ان پر حملہ نہ کر دیں۔

میں نے ان کے تذبذب سے فائدہ اٹھانے میں دیر نہیں کی۔

... میں نے سب سے قریب کھڑے ہوئے پولیس مین پر جست لگائی اور اس کو ایک ایسی فلائنگ کک ماری کہ وہ دوسرے پر گرا۔ دوسرے لمحے اس کی رائفل میرے ہاتھ میں آچکی تھی۔ میں نے اس کو نالی کی طرف سے پکڑ کر گھمایا۔ ابھی وہ اٹھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ رائفل کا بٹ اس کے سر پر لگا اور وہ چیخ مار کے وہیں گر گیا۔ اس کا سر پھٹ گیا تھا اور میں اس کا بہتا ہوا خون دیوار پر بھی دیکھ سکتا تھا جس پر لہو کی سرخی سے بننے والی لکیریں نیچے کی طرف پھیلتی جا رہی تھیں۔

دوسرے سپاہی کو میری کک اتنی قوت سے لگی کہ وہ ہاتھ اٹھا کے تقریباً اڑتا ہوا گیا اور دیوار سے ٹکرا کے اپنے دم توڑتے ہوئے ساتھی پر گرا۔ خون سے اس کے ہاتھ لتھڑ گئے اور اس کا چہرہ رنگین ہو گیا۔ خوف اور دہشت سے وہ پاگلوں کی طرح چلایا اور ایک دم اٹھ کر دوڑا۔ ایسا لگتا تھا کہ اپنے ساتھی کے خون کی تازہ مہک نے ذہنی طور پر اس کا دماغی توازن بگاڑ دیا تھا۔ وہ چیختا ہوا بھاگا جا رہا تھا "یہ خون نہیں ہے۔ یہ خون نہیں ہے۔" اور زور زور سے اپنے ہاتھوں کو جھٹک رہا تھا اور چہرے کو رگڑ رہا تھا۔

تیسرے پولیس مین نے ایک فائر کیا تھا۔ پھر اس کی نظر نے اپنے ایک ساتھی کو دیکھا اور اس کے پاش پاش ہو جانے والے سر سے اچھلنے والے خون کے فواروں کو دیوار پر پڑتے دیکھا تو وہ خوف سے منجمد ہو گیا اور سین یا شین میں سے ایک اس کے پیچھے جا پہنچا اور دوسرے نے اتنی پھرتی سے اس کو ٹکر ماری کہ میں حیران رہ گیا۔ تیسرا پولیس مین لڑکھڑا کے پیچھے ہٹا تو ایک دم الٹ گیا اور اس کے پیچھے بیٹھے ہوئے شخص نے ایک دم اٹھ کے اس کی رائفل چھین لی۔

غالب اور محسن بھی خاموش تماشائی بنے نہیں کھڑے رہے تھے۔ محسن نے مجھ سے پہلے سین شین کو پہچان لیا تھا۔ چنانچہ وہ بالکل تیار کھڑا تھا۔ جیسے ہی انہوں نے کرنل کی اور ایس پی کی آنکھوں میں مرچیں جھونکیں، محسن نے کرنل پر حملہ کر دیا تھا۔ یہ اس نے مجھے بعد میں بتایا کہ کرنل تقریباً اندھا ہو چکا تھا مگر وہ زبردست قوتِ برداشت رکھتا تھا۔ وہ اس وقتی معذوری کو اپنی شکست کا سبب نہ بننے دیتا۔ آنکھوں سے بہنے والے پانی کے ساتھ مرچوں کا اثر کچھ کم ہوتا تو وہ آنکھیں کھول دیتا اور پھر اکیلا ہم سب پر حاوی ہو جاتا۔ چنانچہ محسن نے اس کی معذوری کو دیرپا کرنے کے لئے اس کی آنکھوں کو نشانہ بنایا اور پوری قوت کے ساتھ اپنی دو انگلیاں کرنل کی آنکھوں میں گھونپ دیں۔ اتنی دیر میں سین شین میں سے ایک کی لاٹھی کرنل کے سر پر پڑ چکی تھی اور یہ ضرب اتنی شدید تھی کہ کرنل کے قدم لڑکھڑا گئے۔

غالب نے دوسرے کے ساتھ مل کر ایس پی کو گھیر لیا تھا۔ محسن کی تقلید کرتے ہوئے اس نے بھی ایس پی کی آنکھوں میں دو انگلیاں گھونپ کے اپنا کام آسان کیا۔ پھر کرنل کی طرح ڈنڈا پڑتے ہی ایس پی چکرایا تو محسن نے لات مار کے اسے گرا دیا۔ یہ سب کچھ میں نے نہیں دیکھا کیونکہ میں خود مصروف تھا اور اتنی دیر میں تینوں پولیس والوں سے اسلحہ چھین چکا تھا۔

اچانک ایک کار زوم سے ہمارے پاس آ کے رکی اور میں ~~نے اس میں سے نازو کو چھلانگ مار کے باہر آتے دیکھا۔~~ سین اور شین نے کرنل کو اور ایس پی کو مقابلے کے قابل نہیں چھوڑا تھا لیکن وہ ابھی تک اپنے پیروں پر کھڑے ہوئے تھے اور یہ جانے بغیر کہ مسلح پولیس فورس تو پہلے ہی کام آ چکی ہے، ان پر خفا ہو رہے تھے اور انہیں گالیاں بکتے ہوئے ہمیں کتے کی موت مار ڈالنے کے احکامات دینے میں مصروف تھے۔ پہلے میں نے کرنل سے نمٹنے کا فیصلہ کیا۔ بہت ناپ تول کے میں نے اس کی کنپٹی پر کھڑی ہتھیلی کا وار کیا۔ وہ کٹے ہوئے تنے کی طرح زمین پر گرا اور ساکت ہو گیا۔ اب صرف ایس پی بچا تھا۔ نازو نے ایک ہاتھ مار کے اسے لٹا دیا اور شہیدوں میں شامل ہو گئی۔

"مجھے کچھ دیر ہو گئی" اس نے ہاتھ مل کے کہا۔

"میک اپ کرنے میں وقت لگ ہی جاتا ہے" غالب نے طنز سے کہا۔

میں کرنل کی جیب میں ہاتھ ڈال چکا تھا کہ پیچھے سے کسی نے میرے کندھے پر تھپکی دی۔ میں نے مڑ کے دیکھا۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات تیرہواں حصے میں ملاحظہ فرمائیں

جاسوسی ڈائجسٹ کا منفرد و مقبول سلسلہ
شکاری
تیرہواں حصہ

زندہ کرداروں پر مشتمل ایک روایت شکن سلسلہ

نئی سوچ نیا رنگ نیا لہجہ نیا آہنگ

احمد اقبال کے شرربار و شبنم فشاں قلم سے

اُجلے اور دلکش چہروں کا مہیب نظارہ، ناکردہ گناہوں کا سنگین کفارہ
ناآسودہ جذبوں کا پیچ و تاب، لمحوں کی خوشیاں، صدیوں کا عذاب
دامنِ تہذیب پر رُسوائیوں کے داغوں کا قصہ۔ اندھیرے تقسیم کرنے والے روشن چراغوں کا قصہ۔
معاشرے کے اُن ناسوروں کی رُوداد جو گوشت پوست سے گزر کر ہڈیوں میں اُتر رہے تھے۔
ایک کفن بردوش نوجوان کی کہانی جس کے شب و روز موت کی بستی میں گزر رہے تھے۔
جلتے دن، سُلگتی راتیں، آس و یاس، خوف و ہراس، تلخ حقائق، شیریں خواب۔

• •

"ہم نے نکال لیا ہے۔" فریادی بن کے نمودار ہونے والے نے اپنے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے مجھے ایک ریوالور دکھایا جس پر سائلنسر بھی لگا ہوا تھا۔

"تم سین ہو یا شین؟" میں نے اٹھ کے اس سے ہاتھ ملایا۔

"ہم شفیع الدین ہیں۔" اس نے کہا "اب فوراً نکل چلیں۔ فائرنگ کی آواز سن کے لوگ بھاگ گئے ہیں مگر ایسا نہ ہو کہ پولیس آجائے۔"

"تم نے واقعی کمال کردیا۔" میں نے کہا اور دوسرے شخص سے ہاتھ ملایا جو ایس پی کا ریوالور لئے کھڑا ہوا تھا۔

"ہم سمیع الدین ہیں۔" وہ بولا "ہم آپ کو اچھی طرح جانتے ہیں۔"

"یہ باتیں کرنے اور تعارف کرانے کی جگہ نہیں ہے۔" نازو نے کہا "چلو یہاں سے فوراً بھاگنے کی فکر کرو۔"

غالب نے کہا "میں تو خود کب سے کہہ رہا ہوں کہ میرے ساتھ بھاگ چلو۔"

"غالب! ابھی کوئی آجائے گا۔" نازو نے برہمی سے کہا۔

غالب پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس نے کہا "ایسے نہیں یوں کہو ہائے اللہ کوئی آنہ جائے۔"

"کہیں شامت نہ آجائے تمہاری۔" میں نے کہا "میں نہیں بچاؤں گا اس وقت۔"

سین اور شین بڑی پھرتی دکھا رہے تھے۔ انہوں نے پولیس والوں کی رائفلیں اس گاڑی کی ڈکی میں منتقل کردی تھیں جس میں سے نازو اتری تھی۔ پھر انہوں نے کرنل کی کار کا بونٹ کھولا۔ سین نے اندر سے تار کھینچی اور شین نے بونٹ اٹھایا۔ سین نے چابی جیب میں ڈالی اور شین نے کار کے انجن میں سے تار کھینچ لئے۔ ایک جھٹکے میں اس نے ڈسٹری بیوٹر کیپ سے پلگ اور اگنیشن کوائل تک جانے والے پانچوں تار الگ کئے اور بونٹ چھوڑ دیا۔ پھر وہ دونوں پولیس کی گاڑی کی طرف لپکے۔

میں نے غالب اور محسن سے کہا "تم اسے ڈکی میں ڈالو کرنل کو۔"

"اسے ہم کہاں لے جائیں گے؟" غالب نے کہا۔

"جہاں خود جائیں گے۔ ایس پی کو چھوڑا جا سکتا ہے لیکن کرنل جیسے خطرناک دشمن کو نہیں۔" میں نے کہا "گاڑی میں اور کون ہے؟"

نازو نے کہا "متو میاں ہیں، وہی گاڑی چلا کر لائے تھے۔"

"اچھا۔ بڑی خاموشی سے بیٹھے ہیں۔ گاڑی بھی بند نہیں کی۔" میں نے کہا اور گاڑی کی طرف بڑھا۔

متو میاں ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھے بیڑی پی رہے تھے۔ میں نے ان کے ساتھ بیٹھ کر کہا۔ "السلام علیکم! میرا نام سکندر بخت ہے۔"

"ہمیں معلوم ہے میاں، ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہم آپ کو روبرو دیکھ رہے ہیں آج۔" منّو میاں نے بیڑی پھینک کر بڑی گرمجوشی کے ساتھ مصافحہ کیا۔

"میں آپ کا کس طرح شکریہ ادا کروں؟"

"میاں! شکریہ تو ہم کو ادا کرنا مشکل ہے۔ جو کچھ آپ ہمارے لئے کر چکے ہیں اور کر رہے ہیں۔" وہ جذباتی ہو کے میرے ہاتھ چومتے ہوئے بولا۔ "وہ کتنا بڑا احسان ہے۔"

"منّو میاں! ایسی باتیں مت کریں۔ ہم سب ایک ساتھ ہیں، ایک ہی مقصد کے لئے لڑ رہے ہیں۔ کوئی کسی پر احسان نہیں کر رہا ہے۔ ہر شخص اپنا فرض ادا کر رہا ہے۔ کسی کو شکریئے کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "آئندہ ایسی فضول رسمی باتوں سے گریز کریں۔ ان سے غیریت کی بو آتی ہو۔"

ڈگی بند ہو چکی تھی۔ غالب.... اور محسن نے پیچھے کے دروازے کھول کر بیٹھتے ہوئے کہا "جناب منّو میاں! السلام علیکم" اور منّو میاں نے پلٹ کر ان سے بھی انتہائی عقیدت مندانہ جذبات کے ساتھ مصافحہ کیا۔ پھر نازو نے انہیں چابی پکڑا دی اور غالب کے ساتھ ہی پیچھے کی سیٹ پر فٹ ہو گئی۔

"اب چلیں، باقی باتیں بعد میں" نازو نے کہا۔

"مگر وہ دونوں سین اور شین نظر نہیں آ رہے ہیں مجھے۔ انہیں بھی تو آنے دو۔"

"گاڑی میں جگہ نہیں ہے۔ وہ آ جائیں گے۔" منّو میاں نے بے نیازی سے کہا اور کار اسٹارٹ کر دی۔

میں نے حیرانی سے پیچھے مڑ کر دیکھا تو سین اور شین کا کہیں پتہ نہ تھا۔ وہ اپنا کام ختم کرتے ہی چھلاوے کی طرح غائب ہو گئے تھے۔ ان دونوں کے درمیان اشتراکِ عمل اور ٹیم ورک کا ایسا مربوط سلسلہ تھا کہ معلوم ہوتا تھا وہ ایک ہی سوچ کے کنٹرول ہونے والے دو مشینی پُرزے ہیں۔ کس کو کب کیا کرنا ہے، یہ سب ایک میکانکی عمل تھا جس میں ایک کو دوسرے سے کچھ بھی کہنے یا پوچھنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی تھی۔ زبانِ خاموشی میں وہ مصروفِ گفتگو رہتے تھے تو اس ٹیلی پیتھی کی زبان کو تیسرا نہ سن سکتا تھا اور نہ سمجھ سکتا تھا۔ جس پھرتی اور مستعدی کے ساتھ انہوں نے ہر کام کیا تھا اس میں مکمل ہم آہنگی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ظالم اور مظلوم کے ڈرامے کی طرح انہوں نے باقی کام بھی ریہرسل اور مشق کے بعد سرانجام دئے تھے جبکہ درحقیقت ایسا نہیں تھا۔

جہاں صرف آدھا گھنٹہ پہلے ہم دیوار کی طرف منہ کئے اور ہاتھ اٹھائے کھڑے تھے، وہاں اب دو پولیس والے مردہ یا نیم مردہ پڑے ہوئے تھے۔ ان کے قریب ہی ایس پی لیٹا ہوا تھا۔ صرف ایک پولیس والے کے بارے میں میرا خیال تھا کہ وہ مر چکا ہو گا۔ ایک دماغ الٹ جانے کے بعد فرار ہو گیا تھا۔ کرنل ہماری گاڑی کی ڈگی میں بند تھا۔ اس خطرناک کوبرا سانپ کو بے بس کر کے پکڑنے والے شکاری سین اور شین تھے۔ انہوں نے پھر ثابت کر دیا تھا کہ عقل ہمیشہ بھینس سے بڑی رہے گی۔

جائے واردات پر ہنگامے کا آغاز ہوتے ہی کاروں میں گزرنے والے اپنی اپنی جان بچا کے بھاگنے لگے تھے مگر بعد میں وہاں لوگوں کا جمع ہونا اور پولیس کا آ جانا یقینی تھا تاہم ہمارے لئے اب خطرے کی کوئی بات نہیں رہی تھی۔ کار نامعلوم راستوں پر موڑ کاٹتی اس مقام سے دور ہوتی جا رہی تھی جہاں ایک معمولی سی غلطی نے ہمارے لئے بدترین ناکامی کے اسباب پیدا کر دئے تھے۔ کار ہندوستان کی بنی ہوئی "ایمبیسڈر" تھی اور تقریباً نئی تھی۔

میں نے کہا "یہ گاڑی کس کی ہے؟"

منّو میاں ہنسنے لگے۔ "اپنے پاس ہے تو پھر اپنی ہے۔ دہلی سے لی تھی میاں۔"

میں نے کہا "بمبئی میں کوئی پوچھتا نہیں؟"

"کیوں نہیں پوچھتا۔ سو بار پوچھے۔ ہم ایسے ہی تو نہیں لئے پھر رہے ہیں گاڑی کو۔ ہم مالک ہیں اس کے۔ کاغذات پر ہمارا نام لکھا ہوا ہے اور کاغذات اصلی ہیں۔ ملاؤ ہاتھ اسی بات پر۔"

ہاتھ ملا کے میں نے کہا "مجھے بھی بتا دیں کاغذات میں کیا نام ہے۔"

"میاں وہی جو اپنا نام ہے۔ منیر الدین۔ بس نام ہی صحیح ہے۔ نام سے زیادہ کوئی کچھ پوچھتا بھی نہیں۔ پتا بدلتا رہتا ہے۔" منّو میاں بولے "اور یہ گاڑی بھی خوب ہے۔ گرگٹ کی طرح رنگ بدلتی ہے۔" وہ چوالیس سال کا عمر رسیدہ آدمی ہونے کے باوجود شوخ طبیعت تھا۔ بات کرتے ہوئے ہنستا بھی بہت تھا اور اچانک ہاتھ بڑھا دیتا تھا کہ "ملاؤ ہاتھ اسی بات پر" چنانچہ مخاطب اس کے ہاتھ پر رسماً ہاتھ مارنے یا اسے اپنا ہاتھ پیش کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔

"میاں! چھ مہینے سے بس یوں سمجھ لو... کہ سب کی جورو ہے۔ سب کے کام آ رہی ہے اور ہے بھی سب کی۔ نہیں سمجھے؟ ملاؤ ہاتھ اسی بات پر"

میں نے اپنا ہاتھ آگے کیا تو انہوں نے اس پر اپنا بایاں ہاتھ پٹاخ سے مارا "یہ دو مہینے شفیع کی رہی۔"

"شفیع کون؟" میں نے کہا۔

"اپنا شین۔ نام تو اس کا شفیع الدین ہی ہے نا۔ اس وقت یہ کالی تھی اور بریلی کی رہنے والی تھی۔ پھر میاں، اس نے شفیع کو چھوڑ دیا اور سمیع کی ہو گئی۔" انہوں نے ایک مصنوعی سرد آہ بھری۔ "اور رنگ بھی اس کا ہو گیا ایک دم سفید اور بن گئی دلی والی۔ اور اب دیکھو کیسی لال ہو رہی ہے۔ نئی نویلی دلہن بنی ہوئی ہے میری دو مہینے سے۔ خاص بمبئی نگری کی ہو گئی ہے۔"

ان کی بات نے ہم سب کو ہنسنے پر مجبور کر دیا۔ وہ گاڑی کا ذکر ایسے کر رہے تھے جیسے وہ کوئی داشتہ ہے جو ہر دو مہینے بعد یار بدل لیتی ہے۔ ہمیں ہنستا دیکھ کر وہ خود بھی بہت ہنسے۔

غالب نے کہا "نئی نویلی دلہن نخرے تو بہت کرتی ہو گی۔"

"میاں، بوڑھے مرد کی نوجوان جورو ہو تو بیچارا کیا کرے، اگر نخرے نہ اٹھائے۔" منّو میاں نے کہا اور پھر ایک ایسی بات کی کہ میں بھی جھینپ گیا۔ پیچھے نازو کو شاید پسینہ آ گیا ہو گا مگر منّو میاں بے تکلفی میں بڑھتے جا رہے تھے اور پھکڑپنا ان کی عادت معلوم ہوتی تھی۔ ایسی عادت بعض اوقات دوسروں کے لئے شرمندگی کا باعث بن جاتی ہے کیونکہ بات کرنے والے کو تو احساس ہی نہیں ہوتا کہ اس نے بچوں یا عورتوں کی موجودگی میں یا بزرگوں کے سامنے کیا بک دیا ہے۔ اس وقت بھی یہی ہوا۔ منّو میاں نے قہقہہ مار کے کہا۔ "ملاؤ ہاتھ اسی بات پر" اور مجھے مروت میں ان کی ایک بیہودہ بات پر بھی ہاتھ ملانا پڑا۔ انہیں بعد میں احساس دلایا جا سکتا تھا کہ وہ گفتگو کرتے ہوئے خواتین کی موجودگی کا خیال رکھیں۔ بے تکلف دوستوں کی محفل میں سب چلتا ہے لیکن گھر میں چھوٹے بڑے کے سامنے سنسر کی پابندی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

فوری طور پر موضوع بدلنے کے لئے میں نے کہا۔ "آپ گاڑی کا رنگ اور نمبر بدلواتے رہے ہیں؟"

"بدلواتے کیا رہے ہیں۔ خود بدلتے رہے ہیں میاں۔ ہم نے بہت پاپڑ بیلے ہیں۔ محاورے کی بات نہیں۔ نرائن گنج میں منو پاپڑ والے کا نام آج بھی پوچھ لو۔ حالانکہ یہ بات کئی سال پرانی ہے۔ دس سال پہلے کی۔ پھر ہم ایک رنگساز کے پاس ملازم ہو گئے۔ وہ گاڑی پر رنگ کرتا تھا۔ پانچ سال بعد اپنا ورکشاپ کھول لیا۔"

"لیکن نمبر اور کاغذات کیسے بدل لیتے ہیں آپ؟"

"میاں! لوگ یہاں گھر کے سامان سے دھرم ایمان تک بدل لیتے ہیں۔ پارٹیاں بدلتے ہیں، ملک بدل لیتے ہیں۔ عورت بدل لیتے ہیں۔ محبوبہ، گرل فرینڈ، سیکریٹری، بیوی، داشتہ۔" وہ پھر پٹڑی سے اترنے لگے تھے "اور خریدنے والے ہر چیز خرید لیتے ہیں میاں۔"

میں نے کہا "میں سمجھ گیا۔ پیسے سے ہر کام ہو جاتا ہے۔"

گاڑی اسی وقت ایک پھاٹک کے سامنے رکی جس پر "ارجن داس الومنیم" لکھا ہوا تھا۔ گیٹ کے دونوں جانب شیڈ جیسی عمارت کی بے رنگ اور خستہ حال دیواریں تھیں جن پر فلموں کے رنگین پوسٹر نہ جانے کب سے چپکائے جا رہے تھے۔ لکڑی کے گیٹ پر ہندی میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ شاید "داخلہ منع ہے" یا "کوئی جگہ خالی نہیں ہے" ایسے بورڈ اکثر کارخانوں کے باہر لٹکے ہوئے نظر آتے تھے۔

یہ کوئی صنعتی علاقہ نہیں تھا مگر آبادی کے درمیان ایسے بہت سے چھوٹے چھوٹے کارخانے خلاف قانون چل رہے تھے۔ رہائشی علاقوں میں کارخانوں کا سلسلہ پاکستان میں بھی قانونی پابندیوں کے باوجود چلتا تھا۔ بدمعاشی کے زور پر یا پیسے کے زور پر۔ محلے والے غریب لوگ ہوتے تھے۔ اعتراض کرتے تھے تو مالکان خود ان کی زبان بند کر دیتے تھے ورنہ پولیس یہ نیک کام کرتی تھی۔ عموماً ان کے لائسنس گھریلو صنعت کے نام پر لئے جاتے تھے۔ بعد میں کچھ بھی ہوتا رہے، کوئی نہیں پوچھتا تھا کیونکہ پوچھنے والے خود شریک جرم ہوتے تھے اور ماہانہ بھتے وصول کرتے تھے۔ غیر قانونی کام نہ ہوں تو رشوت اور بھتے بند ہو جائیں چنانچہ قانون پر عملدرآمد کرانے کے ذمے دار خود قانون شکنی کی حوصلہ افزائی میں پیش پیش تھے۔

یہ بھی ایک غریب طبقے کی بستی تھی۔ گاڑی جب گیٹ سے اندر چلی گئی تو اسے خود منو میاں نے بند کیا۔ فیکٹری کا احاطہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ یہاں الومنیم کی کھڑکیاں اور دروازے بنتے تھے۔ سیدھے ہاتھ پر ایک کمرا دفتر کا تھا۔ اس کے بعد ایک گودام تھا جس میں تیار مال رکھا ہوا تھا اور خام مال بھی بھرا ہوا تھا۔ بائیں جانب ورکشاپ کے مختلف حصے تھے جن میں مشینیں نصب تھیں۔ کمرا صرف آفس کو کہا جا سکتا تھا۔ باقی سب کھلے شیڈ تھے جن پر سیمنٹ کی چادریں ڈال دی گئی تھیں اور درمیان میں عارضی دیواریں کھڑی کر کے مختلف سیکشن بنا دئے گئے تھے۔

گاڑی سے باہر آ کے میں نے اوپر کھلا آسمان دیکھا اور ایک بار پھر تحفظ کے خیال کی مسرت نے مجھے زندگی کی خوبصورتی کا احساس دلایا اور میرا دل شکر گزاری اور احسان مندی کے جذبات سے بھر گیا۔ خدا میرا محافظ اور مددگار اور مجھے سلامتی کا راستہ دکھانے والا اور مجھے ہمت دینے والا تھا۔ اس نے کبھی مجھے مایوس نہیں کیا تھا۔ بے شک وہ ہمارا صبر آزماتا تھا مگر ہماری استطاعت کے مطابق اس نے ہمیں جدا کیا اور پھر ملا دیا۔ مصائب سے نبرد آزما ہونا سکھایا لیکن مصائب کو ہماری قوت برداشت میں رکھا۔ یا پھر وقت ضرورت ہمیں اضافی قوت برداشت دی کہ ہم دل برداشتہ نہ ہوں۔ اس نے ہمیں کامیابیوں کے غرور سے بچانے کے لئے ناکامیوں سے روشناس کیا۔ وقت اور حوادث کی بھٹی میں پکنے اور تجربات و موارث کی آگ میں جلنے کے بعد ہی ہم نے خام لوہے سے فولاد میں ڈھلنا سیکھا تھا۔

ایک پُرسکون، خاموش رات کے سائے میں ہم سب خاموش ہو گئے تھے اور شاید ہم سب کے خیالات بھی ایک تھے۔ ان حالات میں یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ کسی کو دوسرا کوئی خیال آئے۔ ہم سب اکٹھے ہو گئے تھے اور دوستوں کے درمیان تھے۔ دشمنوں کی دسترس سے دور تھے اور ایک مستقبل کا تصور کر سکتے تھے جس میں دوری ناکام ہو اور ناکامی دور ہو۔

ایسے وقت میں رابعہ کا خیال مجھ سے کیسے دور رہ سکتا تھا۔ میں نے اس کا متبسم اور پرامید چہرہ اپنے تصور میں روشن کرنا چاہا مگر وہ اداس تھی اور خفا لگتی تھی۔ اس نے کوئی شکوہ نہیں کیا اور کوئی

شکایت نہیں کی۔ بس ایک نظر مجھے دیکھا اور وہ سب کہہ دیا جو زبان سے تمام رات میں نہیں بتا سکتی تھی۔

جب منو میاں نے کہا "بھئی' یہ کیا۔ کوئی آسمان کی طرف منہ کئے کھڑا ہے' کوئی زمین کو گھور رہا ہے۔ میاں سکندر! یہ اختر شماری ہے یا اپنے مقدر کے ستارے کی تلاش۔"

میں نے چونک کر کہا "ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا۔"

"بھئی واہ! یہ تو شعر علامہ صاحب کا ہے۔" منو میاں پھڑک کر بولے "پہلا مصرعہ سناؤ۔"

میں نے کہا "دوسرا مصرعہ ہے۔ وہ خود فراخی افلاک میں ہے خوار و زبوں۔"

"اچھا ہے۔ خوب ہے۔ ملاؤ اسی بات پر ہاتھ۔" انہوں نے میری ہتھیلی پر ہاتھ مارا "اور میاں! تم کیا دیکھ رہے ہو؟ مٹی سے سونا بنانے کی سوچ رہے ہو یا دشمنوں کے عزائم کو خاک میں ملانے کی؟" وہ ایک دم محسن سے مخاطب ہو گیا۔

محسن گم صم اور تنہا تنہا سا کھڑا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر جذبات کا کوئی سایہ تک نہ تھا۔ نہ رنج و غم کا' نہ راحت' مسرت کا' نہ اطمینان و سکون کا۔ اس نے زمین پر جھک کے ایک مٹھی خاک اٹھائی اور اسے آہستہ آہستہ چھوڑ دیا۔ "یہ میرا وقت ہے۔ اور میں ہوں۔ اور میرے خواب ہیں۔ صرف ایک مشت خاک کی تگ و دو" اس نے اچانک قہقہہ مارا۔ میں سمجھ گیا کہ شہلا کے خیال نے پھر اس کے خیالوں پر شبخون مارا ہے اور خطرہ ٹلتے ہی وہ پھر خوف کے پر آسیب صحرا میں شہلا کو کسی سراب کی طرح تلاش کرنے نکل گیا ہے۔ منو میاں اس بات پر ہنسنا اور ہاتھ ملانا سب بھول گئے تھے۔

غالب نے نازو کو اشارہ کیا اور اس نے محسن کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "ایسی مایوسی کی باتیں تم پہلے تو نہیں کرتے تھے۔ آؤ میرے ساتھ۔"

محسن کسی فرمانبردار بچے کی طرح اس کے ساتھ ہو لیا۔ "تمہیں معلوم ہے وہ خبیث تریوینی کیا کہہ رہا تھا مجھ سے ٹیلی فون پر؟"

نازو نے کہا "میں اس وقت وہیں تھی۔ اس کو دلاور نے یہ پٹی پڑھائی تھی کہ رابعہ یا شہلا کے بارے میں ایسا جھوٹ بولو کہ ان مجاہدوں کے چھکے چھوٹ جائیں۔ رابعہ ہمارے ساتھ ہی ہے چنانچہ اس نے شہلا کی بات کی تم سے۔"

ان کے پیچھے چلتے ہوئے میں نے نازو کی ذہانت کی دل ہی دل میں داد بھی دی اور اس کے جھوٹ پر دکھ بھی محسوس کیا۔ آخر ہم کب تک سچ کو دھتکارتے رہیں گے۔ دھکے دیتے رہیں گے کہ وہ ہمارے سامنے نہ آئے۔ کب تک ہم جھوٹ کی ڈھال کے پیچھے منہ چھپائیں گے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ اس حقیقت کو غیر معینہ عرصے تک محسن سے چھپانا ممکن نہیں ہوگا۔ بہتر یہی ہے کہ اسے سچ بتا دیا جائے۔ مگر ابھی نہیں۔ آج رات وہ سکون سے سو جائے۔ کل وہ ذہنی و جسمانی طور پر اس قابل ہوگا کہ اس صدمے کی شدت کو برداشت کر سکے۔

احاطے کے سامنے والے حصے کو ایک رہائشی کوارٹر بنا لیا گیا تھا۔ اس میں ساتھ ساتھ تین کمرے تھے جو اندر سے ملے ہوئے تھے۔ تینوں کمروں کا ایک ایک دروازہ برآمدے میں بھی کھلتا تھا۔ اس برآمدے میں ایک طرف کچن تھا اور دوسری طرف باتھ روم۔ کسی بھی کوارٹر کا اس سے آسان نقشہ کیا ہو سکتا ہے۔ ایک کمرے میں منو میاں اپنے دونوں شاگردوں یا فرزندوں سین شین کے ساتھ مقیم تھے۔ دو کمروں کو انہوں نے پہلے سے ہمارے لئے مختص کر رکھا تھا یا اس حصے کو عام استعمال کا مہمان خانہ بنا دیا تھا۔ کمروں میں کوئی فرنیچر نہیں تھا۔ تینوں کمروں میں وال ٹو وال کارپٹ لگے ہوئے تھے اور گاؤ تکیے رکھے ہوئے تھے۔ سبز رنگ کا قالین نیا نہیں تھا مگر اس کے نیچے ربر فوم کا انڈر لے بچھانے سے اس کی دبازت انتہائی آرام دہ ہو گئی تھی۔

میرے ذہن میں بہت سے سوالات تھے۔ مجھے نازو سے بہت کچھ پوچھنا تھا اور محسن سے بھی۔ میں منو میاں سے اس جگہ کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا تھا لیکن قالین پر گرتے ہی تھکن سے چور جسم اور پریشان ذہن کو ایسا سکون ملا کہ مجھے اپنا ہوش نہیں رہا۔ سونے سے پہلے میں نے سوچا تھا کہ موقع ملا تو میں نہالوں گا اور اطمینان سے کچھ کھانے یا چائے پینے کے بعد سو جاؤں گا لیکن نیند نے بھوک کو شکست دے دی۔ وہ نیند بھی بے ہوشی سے کم نہ تھی۔

دس گھنٹے بعد مجھے منو میاں نے جھنجوڑنا شروع کیا۔ "میاں کیا سوتے ہی رہو گے۔ غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی۔ کہ دو بج گئے۔ ناشتا تو خیر گیا مگر کیا خواب میں پلاؤ قورمے کھا کے لنچ کرو گے؟ ہم تو فاقے سے نہیں مر سکتے تمہارے ساتھ۔ ویسے جان حاضر ہے۔"

میں نے اٹھ کر جماہی لی۔ پھر ایک انگڑائی لی۔ آنکھیں ملیں اور ادھر ادھر دیکھا۔ منو میاں ریکارڈر کی طرح بجے چلے جا رہے تھے۔ مجھ سے کچھ دور نازو الٹی پڑی تھی۔ اس کے ساتھ غالب نے یوں زاویہ قائمہ بنا رکھا تھا کہ نازو کے سر کو اس کے پیر چھو رہے تھے۔ محسن دیوار میں گھس گیا تھا اور ان سب کی نیند اتنی گہری تھی کہ منو میاں کے شور سے کسی کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی تھی۔

میں نے کہا "یہ سب بھی ایسے ہی سو گئے تھے۔ کچھ کھائے پیئے بغیر؟"

"میاں! جو سردار کا حال وہ قبیلے کا۔ ملاؤ اسی بات پر ہاتھ" منو میاں نے زبردستی میرا ہاتھ پکڑ کے کہا۔ "ادھر تم اتنا غفیل ہوئے ادھر تمہاری قوم۔ ہم تو پوچھتے ہی رہ گئے کہ بھئی کچھ کھا لو۔ چائے پی لو لیکن جواب ندارد۔"

میں نے کہا "منو میاں! وہ کرنل۔ اسے تم نے نکالا یا نہیں؟"

"وہ تو رات کو ہی نکال لیا تھا۔ ایک پنجرے میں بند ہے۔" منو میاں بولے "بھاگ بھی نہیں سکتا اور مر بھی نہیں سکتا۔"

اور سین شین کہاں ہیں؟ کسی کام سے گئے ہیں۔" میں نے کہا۔

"کھانا بنا رہے ہیں بڑے شوق سے۔" منو میاں نے کہا "پورا دعوت کا انتظام کر لیا ہے۔"

میں نے کہا "کمال کے لوگ ہیں۔ ہر کام کر لیتے ہیں۔ مجھے محسن نے آپ سب کے بارے میں تفصیل سے بتا دیا تھا۔ یہاں آپ لوگوں کا ملنا ہمارے لئے تائید ایزدی ہے۔"

"تم نے پھر شروع کر دیں نا غیروں والی باتیں۔ اب ہم بھی کہیں گے کہ تائید ایزدی تو ہمارے حق میں تم ہو۔" منو میاں بولے "خدا نے ہماری تلاش کو کامیاب کیا ورنہ ہم بہت مایوس ہو چلے تھے۔"

میں نے کہا "یہ جگہ کس کی ہے؟"

منو میاں نے کہا "ہم یہاں ہیں تو ہماری ہے ہمارے بعد کوئی بھی آئے۔ اپنی بلا سے بُوم بسے یا ہُمارہے یا دونوں ایک ساتھ رہیں۔ آخر وہ چوہا بھی تو رہتا تھا ایک ہتھنی کے ساتھ...."

میں نے انہیں ٹوک دیا۔ "آپ بھٹک جاتے ہیں۔ آخر یہ کیا مسئلہ ہے؟"

"کوئی مسئلہ نہیں میاں"

میں نے کہا "اکیلے میں تو کوئی بات نہیں۔ لیکن ہم بہت کم اکیلے ہوتے ہیں۔ ابھی صرف نازو ہے۔ شام تک رابعہ اور گل بھی آ سکتی ہیں۔ ان کی موجودگی میں...."

"لاحول ولا قوۃ! ہم کیا سمجھتے نہیں یہ بات!" منو میاں نے آزردہ ہو کے کہا۔

میں سمجھ گیا کہ انہیں سمجھانا فضول ہے۔ وہ بالکل غیر ارادی طور پر کوئی بات کر جاتے ہیں جس کا انہیں احساس بھی نہیں ہوتا۔ آئندہ انہیں غلط وقت پر غلط بات کرتے ہوئے ٹوکنا پڑے گا۔

"باہر کسی المونیم فیکٹری کا بورڈ لگا ہوا ہے۔" میں نے موضوع بدل کے کہا۔

"تو کیا یہ المونیم فیکٹری نہیں ہے؟ تم نے دیکھا نہیں...."

"میرا مطلب یہ تھا کہ اس پر جو نام لکھا ہے' ارجن داس۔ کیا وہ مالک ہے؟"

"ہاں" مالک ارجن داس ہی ہے۔" منو میاں بولے "لیکن ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔"

"یہ ایک ہندو کی جگہ ہے جس پر آپ نے خود بھی قبضہ کر رکھا ہے اور ہمیں بھی یہاں لے آئے ہیں۔" میں نے کہا۔

منو میاں ہنسے "میاں! ہم کچی گولیاں نہیں کھیلتے۔ کارخانے کے نام سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ مالک ہندو ہوگا۔ نام وہی چل رہا ہے مگر مالک بدل گیا ہے۔ اس کا یہ کارخانہ وراثت کے مقدمے بازی کی نذر ہو گیا تھا اور بند پڑا تھا۔ انکم ٹیکس اور قرض خواہوں کے واجبات کی وصولی کے لئے اس کو نیلام کیا گیا۔ اتفاق سے ہم یہیں موجود تھے۔ ہم نے بھی بولی لگا دی ایک دوست کے نام سے اور ادائیگی کر کے قبضہ بھی لے لیا۔ ملاؤ اسی بات پر ہاتھ۔"

"کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ دن بھر میں جتنی بار ہاتھ ملانے کی ضرورت پیش آئے' اس کا حساب رات کو فرصت ملتے ہی بے باق کر لیا جائے؟ دس بیس یا سو پچاس مرتبہ ہاتھ ملایا اور سو گئے۔" میں نے کہا۔

منو میاں نے قہقہہ مار کے کہا "یہ بھی اچھی رہی میاں۔ ملاؤ اسی بات پر ہاتھ۔" اور میں نے بلا ارادہ ہاتھ آگے کر دیا۔ یہ منو میاں کے فیضانِ صحبت کا اثر تھا۔

"آپ کا یہ دوست کون ہے؟ میرا مطلب ہے بھروسے کا آدمی ہے نا؟"

"لو۔ جس پر بھروسا نہ ہو وہ دوست کیسے ہوا؟ اگر یہ کہتے کہ ایک جاننے والے کا ہے یا میرے ماموں سسر کے سمدھی کے نواسے کا ہے تو تم یہ سوال کر سکتے تھے۔ بس یوں سمجھ لو کہ یہ ہمارا ہے۔ ہمارا وہ دوست سامنے آنا بھی نہیں چاہتا۔ ذرا ڈرتا ہے کیونکہ اسے بہرحال یہیں رہنا ہے اور کاروبار بھی کرنا ہے مگر وہ ہمارا' سب مسلمانوں کا اور تمہارا ہمدرد اور دوست ہے۔ اس نے کہہ دیا ہے کہ جب تک چاہو یہاں رہو۔ کارخانہ پہلے بھی بند پڑا ہوا تھا' اب بھی بند ہے' کسی کو ہمارے آنے جانے پر شک نہیں ہو سکتا۔ یہاں ویسے بھی شک کرنے کی فرصت کسے ہے۔"

"اور اگر ہماری وجہ سے تمہارے اس دوست پر کوئی مصیبت آئی؟"

"اچھا سوال ہے میاں' یہ میں نے بھی سوچا تھا۔ سوچا کیا تھا' اس سے پوچھا بھی تھا اور اس نے صاف کہہ دیا تھا کہ منو میاں' اپنی ذمے داری پر کچھ بھی کرو' میں کچھ نہیں کہوں گا لیکن تم پکڑے گئے تو میں تمہیں پہچاننے سے بھی انکار کر دوں گا۔ مجھے کہنا پڑے گا کہ کارخانہ تو دو سال سے بند اور لاوارث پڑا ہوا تھا۔ کوئی گھس کر بیٹھ گیا تھا تو میرا کیا قصور ہے۔ مجھے تو قبضہ لئے جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے۔ اس وقت قبضہ دلانے والے سرکاری اہلکار بھی ساتھ تھے اور انہوں نے کسی کو دیکھا ہوتا تو نکال باہر کرتے۔"

"یہ بھلا کیا دوستی ہوئی؟"

"کسی کی مجبوری کو بھی سمجھا کرو میاں' اس نے پہلے بھی بہت مدد کی تھی۔ پھر نقد رقم خرچ کر کے یہ جگہ خریدی اور ہمارے حوالے کر دی ورنہ ہم کہاں چھپتے پھرتے۔ یہاں ہم بہت محفوظ ہیں۔ ہمارے ساتھ وہ کیوں پکڑا جائے؟ یہ تو نیکی کرنے والے کو دریا میں ڈالنے والی بات ہوئی۔ وہ باہر رہے گا تو ہمارے لئے بہت کچھ کر سکے گا۔ اندر ہو گیا تو اس کا خاندان اور کاروبار سب تباہ ہو جائے گا

کیونکہ وہ مسلمان ہے اور کسی مسلمان پر اس سے زیادہ سنگین الزام کوئی نہیں آسکتا کہ وہ مشرقی پاکستان کے محب وطن مسلمانوں کا ہمدرد ہو یا مغربی پاکستان کے دہشت گردوں کا مددگار ہو۔ چلو میاں، اب باقی باتیں ہوں گی بعد میں۔ تم فٹافٹ نہادھولو۔ میں اتنی دیر میں سب کو اٹھاتا ہوں۔ تمہارے سائز کے کپڑے غسل خانے میں رکھ دئے ہیں۔ میرا خیال ہے ٹھیک ہی ہوں گے۔ ہم نے اندازے سے لئے تھے۔

میں منّو میاں کے حسن انتظام کا قائل ہوگیا۔ انہوں نے محسن سے مشورہ کرتے ہوئے ہم سب کی ضرورت کے مطابق کپڑے خرید لئے تھے۔ ہمارے اپنے کپڑے نہ صرف یہ کہ بہت غلیظ اور میلے ہوچکے تھے بلکہ ہماری پہچان کا ایک حصہ بھی بنے ہوئے تھے۔ اب ہم بمبئی میں اپنے اصلی چہروں کے ساتھ بے خوفی سے نہیں گھوم سکتے تھے۔ گزشتہ شب کی واردات سے پہلے ہی ہماری تصاویر مشتہر ہوچکی تھیں اور اب یہ بات یقینی تھی کہ بمبئی کی پولیس کو بھی ہم اتنے ہی مطلوب ہوں گے جتنے کبھی لاہور کی پولیس کو عزیز تھے۔

سین اور شین نے اپنے ماہر باورچی ہونے کا ثبوت دیا تھا۔ وہ مغلئی کھانے نہیں پکا سکتے تھے مگر انہوں نے تین طرح کی مچھلی فرائی کی تھی۔ جھینگوں والے چاول پکائے تھے جو چائنیز اسٹائل کے "فرائیڈ رائس و دیران" سمجھے جاسکتے تھے۔ یہ مشرقی پاکستان میں رہنے کا اثر تھا کہ وہ مچھلی اور چاول اسپیشلسٹ ہی بن سکے تھے۔ نیند پوری کرکے اٹھنے کے بعد میری طرح سب کا بھوک سے برا حال تھا۔ محسن کھانے کے دوران بھی خاموش رہا۔ اس کا رویّہ عجیب بجھا بجھا سا ہوگیا تھا۔ اس کی طبیعت کی فطری شوخی اور مزاج کا چلبلا پن۔ اس کی حاضر جوابی۔ غالب سے چھیڑ چھاڑ کی عادت اور زندہ دلی سب پر ایک بے نام سی اداسی کا پردہ پڑگیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کچھ سوچ رہا ہے مگر میرے پوچھنے پر وہ ٹال گیا۔ اس نے کہا کہ یہ صرف تھکن کا اثر ہے مگر میں جانتا تھا کہ یہ تھکن نہیں، اس کے دل کا آزار بن جانے والی خلش ہے جس سے وہ پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔ اگر وہ کہتا کہ میرا دل نہیں مانتا کہ تریونی جھوٹ بول رہا تھا تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ ہم جھوٹ بول رہے ہیں۔ اس کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ ہم پر اتنے بڑے جھوٹ کے شبے کا اظہار بھی کرتا تو یہ دوستی کے خلوص کو گالی دینے کے مترادف ہوتا۔ نازو کی یقین دہانی نے اسے قائل کرلیا تھا مگر مطمئن نہیں کیا تھا۔ کھانے کے بعد وہ منّو میاں کے ساتھ برآمدے میں کرسی ڈال کے بیٹھ گیا۔ منّو میاں بولتے رہے اور وہ سنتا رہا۔ میں اس کی دلی کیفیت اور اس کے جذبات کا اندازہ کرسکتا تھا۔ اس کے دکھ کو غالب بھی سمجھتا تھا اور نازو بھی جانتی تھی۔ ہم سب نے مل کے ایک جرم کیا تھا اور آج تک اس کو چھپانے میں کامیاب تھے مگر اب افشائے راز کو روکا نہیں جاسکتا تھا چنانچہ ہم سب ڈرے ہوئے تھے۔

نازو نے سب سے پہلے کہا "سکندر زرات کو میں نے اس لئے جھوٹ بولا تھا..."

"آہستہ بولو۔ مجھے معلوم ہے تم نے کیوں جھوٹ بولا تھا لیکن مجھے نہیں معلوم کہ میں نے یہ حماقت کیوں کی تھی۔ کیوں چھپایا تھا حقیقت کو" میں نے کہا اور محسن کی طرف دیکھا مگر وہ اتنی دور تھا کہ ہماری گفتگو نہیں سن سکتا تھا۔

"تم نے اس وقت گل کو بچایا تھا۔ تمہارا اور ہم سب کا خیال تھا کہ ایسا نہ کیا گیا تو وہ ناگ منی ہی رہے گی۔ ایک ڈاکو کی بہن۔ وہ کبھی گل بانو نہ بن سکے گی۔ اور یہ غلط نہیں تھا۔ یہ محسن کی چاہت ہی تھی جس نے ناگ منی کو زندگی کے نئے راستوں پر ہمارے ساتھ چلنے پر مجبور کردیا تھا۔" غالب بولا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "مرزا غالب! اس وقت ایک زندگی کو بچانے کے لئے ہم نے ایک جھوٹ بولا تھا۔ پھر ہم اس جھوٹ کے جال میں پھنس گئے اور اس جھوٹ کو نبھانے کے لئے مسلسل جھوٹ بولتے رہے۔ ہم گل سے یہ بات چھپاتے رہے کہ محسن کسی اور کا ہے اور کبھی اس کا نہیں ہوسکتا۔ اب اسے بھی یقین آچکا ہے کہ شہلا نام کی کوئی لڑکی محسن کی شریکِ حیات نہیں، اس کے بچے کی ماں نہیں اور اس یقین کے ساتھ وہ محسن کے دل میں اپنی جگہ بنانے کے لئے سرتوڑ کوشش کررہی ہے۔ سوچو، جب اسے ہمارے جھوٹ کا علم ہوگا تو اس پر کیا بیتے گی۔ اب یہ ایک کی زندگی کا نہیں دو کی زندگی کا سوال بن گیا ہے۔"

نازو نے متفکر لہجے میں کہا۔ "مجھے وہ سب بتانا پڑے گا جو تریونی نے کہا تھا۔" وہ غسل کے بعد کپڑے بدل چکی تھی اور گھٹنے پر ٹھوڑی رکھے اپنے پیروں کے ناخن ایک بلیڈ سے کاٹ رہی تھی۔

"اگر ہم نے اسے کچھ نہ بتایا تو وہ خود معلوم کرلے گا لاہور فون کرکے۔ اور وہ زیادہ بری بات ہوگی۔" غالب نے کہا "ہم اسے سچ بتاسکتے ہیں کہ ہم نے ایسا کیوں کیا تھا۔ یہ ہماری مجبوری تھی۔ ہماری جگہ وہ ہوتا تو وہ کیا کرتا؟"

"وہ بھی مجبور ہوتا۔" میں نے اس سے اتفاق کیا اور ایک گاؤ تکیہ سر کے نیچے رکھ کے لیٹ گیا۔

"تریونی سے تمہاری ملاقات کیسی رہی۔" غالب نے کہا اور دوسرا گاؤ تکیہ لے کر لیٹ گیا۔

نازو بیٹھی رہی۔ "بہت مختصر۔ مجھے اس کے سامنے حاضر کرنے والوں میں سے ایک نے میرا بازو پکڑنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے اس کا بازو توڑ دیا۔ انہوں نے گالیاں بہت دیں مجھے مگر اب میں بھی عادی ہوگئی ہوں کہ کتے بھونکتے رہیں اور میں سنی ان سنی کرتی رہوں۔"

"تریونی کے ساتھ دلاور بھی تھا۔"

"نہیں۔ دلاور وہاں نہیں تھا۔" نازو نے کہا۔ "حسبِ توقع تریونی نے بھی بہت بکواس کی کہ یہ اچھا ہوا۔ یک نہ شد دو شد۔ وہ شہلا کے ساتھ مجھے بھی بارود کے ڈھیر پر بٹھانے کی دھمکی دے رہا تھا۔ مگر اسی وقت تمہارا فون آگیا۔ پھر لائٹ چلی گئی۔ وہ پاگل ہورہا تھا، یہ تو خود میں نے بھی دیکھا۔ شیشے کی دیوار سے لائٹس جلتی بجھتی نظر آرہی تھیں۔ ایک کے بعد دوسری لائٹ جلتی تھی اور بالکل ایسا لگتا تھا جیسے ہر دس قدم کے فاصلے پر اندھیرے میں کوئی کھڑا ہے"

میں نے کہا "وہ صرف دو افراد کا کھیل تھا۔ سین اور شین کا۔ ایک لائٹ جلا کے بجھاتا تھا تو دوسرا جلاتا تھا۔ اتنی دیر میں پہلا دوڑ کر اس سے دس قدم آگے نکل جاتا تھا اور پھر لائٹ کا سگنل دیتا تھا تو لگتا ہوگا کہ یہ تیسرا شخص ہے۔ پھر دوسرا بھاگ کر چوتھے شخص کی جگہ پہنچ جاتا تھا۔"

"مجھے معلوم ہے۔ یہ زبردست خوفزدہ کردینے والا حربہ تھا۔ تریونی بدحواس ہوگیا تھا۔ لائٹ جاتے ہی اس کا سارا دم خم جواب دے گیا۔ وہ بدمعاش ضرور بنا ہوا ہے لیکن اپنی دولت کے بل پر کسی حد تک ہر سرمایہ دار اپنی طاقت کے غرور کو جائز سمجھتا ہے۔ تریونی وہ بدمعاش نہیں ہے جو صرف بدمعاش ہوتے ہیں، وارداتیں کرتے ہیں، گروہ بناتے ہیں اور جیل جاجا کے دادا کے منصبِ اعلیٰ پر فائز ہوتے ہیں۔ بنیادی طور پر وہ کاروباری آدمی ہے جو سہاروں کے بغیر ہوا نکلا ہوا غبارہ رہ جاتا ہے۔ ٹیلی فون [illegible] بہت کامیاب ڈراما تھا۔ صرف ایک لائن تھی۔ اگر وہ اس لائن پر پولیس سے یا دلاور سے رابطہ قائم کرتا تو یہ لائن بھی کٹ جاتی۔" سین ہمارے لئے چائے لے کر آیا تو وہ خاموش ہوگئی۔ منّو میاں نے اپنے لئے اور محسن کے لئے چائے باہر ہی لے لی تھی چنانچہ سین کے جاتے ہی نازو نے اپنی بات پھر شروع کی۔

"بس اس نے افراتفری میں نوکروں کو بلایا۔ ڈرائیور کو جگایا اور گاڑی نکالنے کو کہا کہ مجھے واپس لے جائے۔ میں وہ گالیاں نہیں دہرا سکتی جو اس نے آپ سب کو دی تھیں۔"

"تم نے اس سے کچھ نہیں کہا؟"

"میں نے؟" نازو ہنسی "سنو گے تو جل جاؤ گے۔ میں نے اس سے کہا کہ مجھے کیوں واپس بھیج رہے ہو اس کنگال ٹولے میں۔ مجھے اس محل میں اپنی داسی بنا کے رکھ لو۔ اس نے مجھے گالیاں دیتے ہوئے کہا کہ وہ جو تیرے ساتھ ہے اس سے کہہ کہ تجھے ایسا ہی محل بنادے۔ بنواسکتا ہے وہ، اگر شرافت سے ہماری بات مان لے۔ میں بنوا کے دوں گا۔ میں نے کہا کہ گولی مارو اس افریقی بندر جیسے منہ والے کو۔ میں تو تم پر مرمٹی ہوں۔ تمہارا اس کا کیا مقابلہ۔ تم ایک ہینڈسم ہیرو ہو۔ یہی محل میرے نام کردو۔"

غالب نے کہا "کیا مجھے یہ خطاب دئے بغیر کام نہیں چل سکتا تھا؟"

"میں نے کہا تھا نا، جل جاؤ گے۔ بھئی میں تو اسے جلا رہی تھی۔"

"یعنی حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ ہینڈسم ہیرو میں ہوں اور..."

"مطلب آپ نکالتے رہیں۔" نازو نے جھینپ کر اس کی بات کاٹ دی۔ "اس نے چلتے وقت مجھ سے کہا کہ میں لعنت بھیجتا ہوں اس دن پر جب میں نے تمہاری منحوس شکل دیکھی اور دلاور سے بات کی۔ میری بیٹی جیسی بھی تھی میرے پاس تھی۔ اب میرے پاس صرف راکھ ہے اس کی۔ میرے کروڑوں خاک میں مل گئے۔ میں برباد ہوگیا۔ دیوالیہ ہوگیا۔ خیر یہ آخری بازی ہے۔ اگر اس میں میرا مال جائے گا تو شہلا کی اور اس کے بیٹے کی جان جائے گی۔ جاؤ پھر کوشش کرو انہیں بچانے کی۔ میں نے بھی اپنا سب کچھ داؤ پر لگادیا ہے۔ میں خود آگ لگادوں گا بارود میں۔ سب کو مار ڈالوں گا۔ دلاور کو بھی اور اس کی ساری چنڈال چوکڑی کو بھی۔ پھر میں خود بھی مرجاؤں گا۔ اس کے بعد میں جی کے کیا کروں گا۔ سیٹھ تریونی سڑکوں پر بھیک مانگے گا۔ میرا بال بال قرضے میں بندھا ہوا ہے۔ جائیداد کی اینٹ اینٹ رہن رکھی جاچکی ہے۔ میرے پاس اپنا کچھ نہیں رہا۔ سب اس حرامزادے کے چکر میں پڑنے کی سزا ہے۔ وہ دلاور کا دشمن ہورہا تھا پاگل پن میں۔"

میں نے کہا "ویری گڈ۔ یہ تو بہت اچھی خبر سنائی تم نے۔ ہم پوری کوشش کریں گے کہ شہلا کو بچالیں اور تریونی [illegible] خود کشی کا اور اس سے پہلے دلاور اینڈ کمپنی کو ختم کرنے کا۔ اب تو ایک طرح سے وہ بھی ہمارے ساتھ ہے۔"

غالب نے کہا "کیا یہ عجیب بات نہیں ہے کہ دلاور نے اسے تباہ کردیا مگر وہ خود ابھی تک تباہ نہیں ہوا؟"

"وہ بندوق تریونی کے کندھے پر رکھ کے چلا رہا تھا" میں نے کہا "تریونی کے کاروبار کی نوعیت مختلف تھی مگر وہ لالچ میں آگیا۔ باتوں سے دلاور نے اسے بے وقوف بنالیا ہوگا کہ ایک کروڑ لگاؤ اور ہفتہ دس دن بعد دو کروڑ لے لو۔ نقصان دلاور نے بھی اٹھایا تھا مگر اتنا بڑا نہیں۔ اور اس نقصان میں دوسرے بھی شریک تھے جن کو تریونی چنڈال چوکڑی کہہ رہا ہے۔ خیر یہ بتاؤ کہ اور کیا کہا اس نے؟"

"اور کیا کہتا۔ زیادہ وقت تو اس نے گالیاں بکنے اور شراب پی پی کر تمہیں کوسنے میں صرف کیا" نازو ہنسی "وہ اپنے آپ کو، دلاور کو اور تمہیں۔ اور ان سب کو گالیاں دیتا رہا جو اس کی تباہی کے ذمے دار تھے، اس کے نالائق ساتھی۔ بالک رام جیسے احمق۔"

"اس نے ایسی کوئی بات نہیں کی جس سے کچھ پتا چلے کہ اب مال کس راستے سے اور کب جائے گا؟" میں نے کہا۔

"خیر، اب وہ بالکل پاگل بھی نہیں ہوا تھا۔ ایسی بات اس کے منہ سے نکل جاتی تو پھر باقی کیا رہتا۔ وہ مجھے بھی گولی ماردیتا اور خود بھی وہیں مرجاتا۔ بعد میں تو مجھے اس کی وحشت اور دیوانگی سے خوف آنے لگا تھا لیکن میں بھی بالکل تیار تھی کہ ایسی ویسی کوئی بات

ہوئی تو میں تریوینی کا وہیں کام تمام کردوں گی۔ اس کے بعد کچھ بھی ہو، تریوینی کے کتے میرے بوٹیاں کھا جائیں۔"

"یہ بہت احمقانہ خیال تھا" غالب نے برہمی سے کہا "تم کیا سمجھتی ہو، وہ تمہیں مار ڈالتے۔ وہ تمہاری بوٹیاں کھاتے رہتے لیکن تم کو مرنے نہ دیتے۔"

"فضول مت بولا کرو۔ میں اکیلی تھی اور مجھے یہ بھی یقین نہیں تھا کہ بچ کے واپس آسکوں گی یا نہیں۔ اور کیا کرتی میں اگر اسے مارنے کا نہ سوچتی؟" نازو نے احتجاجاً کہا اور پھر ایک دم اس کا حوصلہ جواب دے گیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ دہشت کے ایک صبر آزما مرحلے کا مقابلہ کرتے ہوئے اس نے اپنا تمام حوصلہ پہلے ہی ہار دیا تھا۔ وہ ذہنی و جسمانی طور پر نارمل نظر آرہی تھی مگر اس کے لاشعور میں خوف کا آسیب تھا جو کسی کمزور لمحے میں اس کو دبوچ لینا چاہتا تھا۔ اور غالب کی بات جذبات کی اس چٹان کو لڑھکانے کا بہانہ بن گئی جس نے اشکوں کے سیلاب کو روک رکھا تھا۔ اسے ایک ٹھیس بہت تھی۔

ظاہر ہے اس کے بعد غالب نے اسے منایا اور میں نے بھی اسے سمجھایا کہ غالب کا مقصد ہرگز اس کی دلآزاری نہیں تھا۔ سارا قصور اعصابی کشیدگی کا اور جذباتی دباؤ کا تھا کہ ہم سب اپنے رویئے و معتدل اور متوازن رکھنے میں ناکام تھے۔

"دیکھو میں شاعری تو کر نہیں سکتا کہ روتے ہوئے تمہاری کالی آنکھیں ساون کی گھٹا لگتی ہیں۔ اور آنسو تمہارے رخساروں پر ایسے لگتے ہیں جیسے صبح دم برگ گل پر قطرہ شبنم۔ یہ اتنا خوب صورت منظر ہوتا تو میں کہتا کہ روتی رہو شام تک۔ یا میں اشکوں کے یہ گوہر آبدار پلکوں سے چن سکتا تو شام کو ان موتیوں کے ہار تمہارے گلے میں ڈال دیتا۔"

میں نے کہا "مرزا! یہ جدید شاعری ہے۔"

غالب نے کہا "اچھا یار، غلطی سے شاعری ہوگئی۔ میں تو اسے صرف یہ سمجھانا چاہتا ہوں کہ روتے ہوئے یہ ذرا بھی اچھی نہیں لگتی۔"

"اچھی نہیں لگتی تو مت دیکھو میری طرف" نازو نے خفگی سے کہا۔

"مگر تم روتی ہو تو میرے دل کو کچھ ہونے لگتا ہے" غالب نے کہا۔

"کیا ہونے لگتا ہے؟" نے کہا "اپنڈی سائٹس۔ برون کائٹس۔"

غالب نے سوچ کے کہا "بچپن میں ایک قربانی کے بکرے کو میں نے دادا جان کی کوئی معجون کھلادی تھی۔ آدھا پاؤ کے قریب۔ اور پھر تین دن پرانا حقے کا پانی پلا دیا تھا۔ اس کی جو حالت ہوئی تھی بس ویسی ہی حالت..."

نازو روتے روتے ایک دم ہنس پڑی "شرم نہیں آتی۔"

"شرم تمہیں آنی چاہئے۔ روتے روتے ہنسنے کا مطلب یہ ہے کہ سب ایکٹنگ تھی۔ ویسے ہی کہہ دیتا تھا کہ میرا دل چاہ ہے تم مجھے مناؤ۔ میرے سامنے ہاتھ جوڑو۔ ناک سے لکیریں نکالو۔ ہم سب کچھ کرسکتے ہیں تمہیں خوش دیکھنے کے لئے۔"

میں نے اس کی تائید کی "ہاں۔ اگر عورتیں اس ڈرامے سے خوش ہوتی ہیں تو کوئی حرج نہیں انہیں یوں وقوف بنا کے اپنا کام نکالنے میں۔"

"یار، اس جذباتی مخلوق کو عقل کی لاٹھی سے جدھر چاہو ہانک دو۔ آخر یہ بھی تو ہمارا استحصال کرتی ہیں۔ عشوہ و غمزہ و ادا سے۔ کیا ہم بے وقوف بنتے ہیں؟"

"قطعی نہیں۔ ہم تو صرف یہ ظاہر کرتے ہیں کہ مر گئے۔ قتل ہوگئے۔"

نازو نے کہا "اچھا سکندر! میں بتاؤں گی رابعہ کو۔"

میں ایک دم اٹھ کھڑا ہوا "رابعہ۔ زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آگیا۔ میں جا رہا ہوں۔ وہ مجھے بلا رہی ہے۔"

غالب نے کہا "میں بھی ساتھ چلوں گا۔ ایک اکیلا دو گیارہ۔"

"اور تین ایک سو گیارہ" نازو نے کہا۔

میں نے اسے روک دیا "جو کام گیارہ آدمی کرسکتے ہوں اسے ایک سو گیارہ صرف سرکاری دفاتر میں کرتے ہیں۔ تم ایک زیادہ مشکل کام کرسکتی ہو یہاں۔"

نازو سمجھ گئی "جی نہیں۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ میں محسن کے سامنے تم سب کے جھوٹ کا اعتراف کروں۔"

"کیا تم نے جھوٹ نہیں بولا تھا؟ سچی کی بچی۔"

میں نے کہا "ہمارے جھوٹ کا نہ سہی، تم اپنے جھوٹ کا اعتراف کرلو۔ دیکھو نازو! یہ ذرا نازک کام ہے۔ دلجوئی اور غمگساری۔ ہمدردی مسیحائی۔ یہ عورت بہتر طور پر کرسکتی ہے۔"

"چلو چلو۔ باتوں سے بے وقوف مت بناؤ" نازو نے بگڑ کے کہا "ایسا ہی ہے تو اپنی ان سے کہنا۔ وہ وکیل بھی ہیں۔ دلائل سے بھی قائل کرلیں گی اور تمہیں جھوٹ کے الزام سے بری کرالیں گی۔ بلکہ سچا ثابت کردیں گی۔"

میں نے کہا "مجھے معلوم ہے تم انکار نہیں کر رہی ہو دل سے۔"

غالب نے کہا "ویسے بھی عورت کی نا اس کی ہاں ہوتی ہے۔"

منو میاں برآمدے میں بیٹھے اپنی سوانح حیات کا کوئی قصہ ہوشربا بڑے ذوق و شوق سے سنا رہے تھے اور انہیں محسن کی شکل میں ایک بہت اچھا سامع میسر آگیا تھا جو نہ صرف یہ کہ اس داستان عشق کو سنسر کے بغیر سن رہا تھا بلکہ ان کی ہر بات پر ہاتھ ملانے پر بھی تیار تھا۔ یہ صرف میں اندازہ کرسکتا تھا کہ محسن کے کان منو میاں کی آواز ضرور سن رہے ہیں لیکن اس کا دماغ کہیں اور ہے۔ اس کے تصور میں منو میاں کی اسٹوری والی ہیروئن نہیں ہے، شہلا ہے۔ اس کا انہماک مصنوعی ہے اور وہ محض مروت میں بندھا بیٹھا ہے۔

"آپ کدھر چل دیئے میاں۔ آپ سے تو بڑے اہم امور پر تبادلہ خیال کرنا تھا" منو میاں ہمیں دیکھتے ہی چہکے۔

میں نے کہا "ہم ایک بہت ضروری کام سے جا رہے ہیں۔ امید ہے دو تین گھنٹے میں واپس آجائیں گے۔"

منو میاں کا چہرہ متفکر ہوگیا "کیسے جاؤ گے؟"

میں نے کہا "آپ کی وہ لال پری کہاں ہے؟"

"مر کیا تمہیں راستہ معلوم ہے" "تم پکڑے نہ جاؤ۔ بہت سخت چیکنگ ہورہی ہے۔"

"آپ کو کیسے معلوم ہوا؟" غالب نے کہا۔

"سین شین گئے تھے بازار۔ وہی رپورٹ لائے ہیں" منوں میاں بولے۔

"لیکن ہمارا جانا بے حد ضروری ہے۔ ہم نے وعدہ کیا تھا اور اگر ہم نہ پہنچے تو بڑی خرابی ہوجائے گی۔ وہ نہ جانے کیا سمجھیں گی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ خود ہمیں ڈھونڈنے کے لئے نکل کھڑی ہوں۔"

"اچھا۔ تو پھر یوں کرو کوئی ٹیکسی لے لو۔ لینے کا مطلب سمجھتے ہونا؟" وہ ہنسے۔

میں نے کہا "بہت اچھی طرح۔"

"تو پھر ملاؤ اسی بات پر ہاتھ۔ باہر نکلتے ہی جو پہلی ٹیکسی ملے وہ پکڑلو۔ جسے ڈرائیور کی وردی فٹ آجائے وہ گاڑی چلائے۔ دوسرا نظر ہی نہ آئے۔ پولیس سمجھے گی کہ خالی ٹیکسی ہے۔ ویسے بھی ان کی نظر آج لال گاڑیوں پر ہے۔ ہم سوچ رہے ہیں کہ اپنی لال پری کو پھر سیاہ کردیں۔ آج رات" انہوں نے منہ کالا کرنے کے بارے میں ایک اور لغویات کی اور خود ہی بہت ہنسے مگر میں ان سے ہاتھ ملانے کے بجائے کچھ اور پیچھے ہوگیا۔

میں نے کہا "کرنل کہاں ہے ایک نظر اسے بھی دیکھ لیں۔"

"پنجرے میں بند ہے۔" منو میاں نے فخریہ انداز میں بتایا۔

کرنل واقعی ایک پنجرے میں تھا۔ یہ المونیم کا پنجرہ کس نے بنوایا تھا اور کس مقصد کے لئے بنوایا تھا، یہ پوچھنا غیر ضروری تھا۔ المونیم میں زنگ نہیں لگتا۔ شاید کسی شوقین نے اپنے گھر میں کسی خطرناک پالتو جانور کو رکھنے کے لئے اس کا آرڈر دیا ہوگا۔ تین سوت سے زیادہ موٹے المونیم کے تاروں کے بنے ہوئے آدھے انچ کی جالی والے پنجرے میں کرنل واقعی کسی خونخوار بھیڑیے کی طرح غرا رہا تھا جسے شکاری جنگل سے پکڑ کر لائے ہوں۔

"آخر یہ کیا ہے۔ میں نے تمہارے ساتھ کوئی غیر انسانی سلوک نہیں کیا تھا" اس نے مجھ سے مخاطب ہو کے کہا۔

غالب نے کہا "تم نے بالکل ٹھیک کیا تھا۔ انسانوں کے ساتھ انسانوں جیسا ہی سلوک کرنا چاہئے۔"

"ہم بھی تمہارے ساتھ وہی سلوک کر رہے ہیں جس کے تم مستحق ہو۔ تم انسان نہیں ہو، ایک ایسے درندے ہو جو اب تک نہ جانے کتنے انسانوں کا خون پی چکا ہے اور ان کی ہڈیاں چبا چکا ہے۔ تم نے ہمارے سامنے ہی ایک ٹیکسی ڈرائیور کو اس کی گاڑی سمیت نگل لیا تھا۔ پانچ ہزار روپے بچانے کے لئے نہیں، صرف اس لئے کہ وہ ایک گواہ تھا جو ہمیں پہچان سکتا تھا۔ اس وقت نہیں پہچانا تھا مگر بعد میں کبھی وہ اخبار دیکھتا اور اسے ہماری تصویر نظر آجاتی تو وہ دو جمع دو کو چار کر کے بہت سے درست نتائج اخذ کرلیتا جو شاید تمہارے حق میں غلط ہوتے۔ وہ پولیس کو بتا دیتا کہ چرچ میں گڑبڑ کے بعد کیا ہوا تھا۔ اس سے پہلے تم نے کتنے انسانوں کو تیزاب میں حل کیا اور ہڈیوں سمیت ڈرم میں پیک کیا۔ یہ ہم نہیں جانتے اور جاننا بھی نہیں چاہتے۔ لیکن سردار جی تمہارا پہلا شکار نہیں تھے۔ تمہاری ریسرچ کیمسٹری انسانیت کی فلاح کے لئے اور بہتر زندگی کے لئے نہیں تھی۔ دنیا میں سیکڑوں ہزاروں ریسرچ کیمسٹ دن رات اس دنیا کو ایک زیادہ خوبصورت دنیا بنانے اور انسان کو اشرف المخلوقات کی زیادہ قابلِ فخر، زیادہ پرمسرت اور طویل تر زندگی دینے کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ تم نے اس علم کو ایک آدم خور عفریت بنا دیا ہے۔ کیا کبھی تمہیں خیال آیا کہ کسی دن یہ عفریت تمہیں ہی نہ نگل جائے؟"

"تم مجھے مار ڈالو گے؟" وہ بے یقینی سے بولا۔

میں نے کہا "تم کو زندہ چھوڑ کے ہم خود اپنی نظر میں مجرم ہوجائیں گے۔ ہم ایسا نہیں کرسکتے۔"

"میں تمہارے لئے بہت کارآمد ثابت ہوسکتا ہوں۔ میری مدد سے تم..."

میں نے اس کی بات کاٹ دی "ہم شیطان سے مدد مانگ کے خدا کے قہر کو دعوت دیں؟ ہم اپنی مدد آپ کرتے ہیں چنانچہ خدا ہماری مدد کرتا ہے۔ تم دیکھو اس نے کس طرح تمہیں ہماری تحویل میں دیا۔ اب کہو شیطان سے، تمہیں بچائے" وہ مایوس ہو کے خاموش ہوگیا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس نے اپنی سزائے موت کے فیصلے کو قبول کرلیا ہے اور یہ بھی سمجھ لیا ہے کہ اس کی کوئی اپیل منظور نہیں ہوگی۔

میں اور غالب باہر نکلے تو سہ پہر کے ساڑھے تین بجے تھے۔ بستی میں کوئی بہت عمر رسیدہ ہندو مر گیا تھا۔ اس کی ارتھی کسی بارات کی طرح دھوم دھام سے جا رہی تھی۔ مرنے والے کے ورجنوں بیٹے، پوتے، نواسے نئے کپڑے پہنے خوش خوش ساتھ چل رہے تھے۔ بہت لمبی عمر پا کے زیادہ سے زیادہ لواحقین چھوڑنے والے کی موت پر روتا کوئی نہیں۔ اس کی خوش [illegible] پر باقاعدہ خوشی کا اظہار کیا جاتا ہے۔ ہم بھی اس جلوس میں شامل ہوگئے جس کے آگے آگے سنکھ اور گھنٹیاں بجانے والے بڑی سُر اور لے میں "رام نام ست ہے" گا رہے تھے۔ سامنے سے آنے والی گاڑیاں احتراماً ایک سائڈ پر رک جاتی تھیں اور جلوس کے گزرنے

تک کھڑی رہتی تھیں۔

میں نے غالب کے کان میں کہا "ہم شمشان گھاٹ جانے کے ارادے سے تو نہیں نکلے تھے۔"

غالب نے کہا "یہ تو ایک اچھا چانس ملا ہے اپنے آپ کو کیمو فلاج کرنے کا۔ ہمیں کوئی بھی شک کی نظر سے نہیں دیکھ سکتا۔ ویسے بھی کوئی ٹیکسی ابھی تک نہیں آئی ہے۔"

غالب کی بات ختم ہونے سے پہلے ٹیکسی آگئی۔ ڈرائیور نے ٹیکسی کو ہمارے دائیں ہاتھ پر دیوار سے لگا دیا اور جلوس کے گزرنے کا انتظار کرنے لگا۔ اگر یہ کسی مسلمان کا جنازہ ہوتا اور ٹیکسی ڈرائیور مسلمان ہوتا تو اتر کے چند قدم کندھا بھی دیتا۔

میرے سوال نے ٹیکسی ڈرائیور کو بوکھلا دیا "کدھر جائیں گا۔"

"جدھر اپنا مرجی ہوئیں گا۔ تم کو بھاڑا دیں گا" میں نے بمبئی کی زبان اور لہجے میں کہا۔

"تم سالا نرک میں جانے کا واسطے بولیں گا تو ادھر ٹیکسی نئیں جاتا۔ اپنا تو سالا اکھا سسرالی بھی ہے ادھر" ڈرائیور نے ایک چپٹی سی بوتل سے گھونٹ لے کر کہا "ویسے سیر سپاٹا شوقینی کی بات ہے تو اپن ایک گھنٹا کا بھاڑا لیں گا بیس روپیہ۔ بولو ہاں یا نئیں۔"

میں نے کہا "ہاں۔ ایک دم ہاں" اور دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔

غالب نے کہا "ابھی تم بھی یہ چسکی لگانا چھوڑ دو ورنہ تم سالا ٹیکسی گزاریں گا کسی دیوار کے بیچ میں سے یا بس کے نیچے سے یا کسی کھمبے پر چڑھائے گا۔"

ڈرائیور قہقہہ مار کے ہنسا "لو تم بھی پیو پھوکٹ میں۔ اپن کو بھی پھوکٹ میں ملا ہے۔ ابھی ایک ہیرو ہیروئن بیٹھا تھا۔ اس کو چھوکری کا ایسا نشہ ہوا کہ سالا بوتل بھول گیا۔"

میں نے کہا "اپن یہ نئیں پیتا۔"

ڈرائیور نے مجھے حیرانی سے دیکھا "یہ اصلی جانی واکر ہے۔"

غالب نے کہا "گولی مارو جانی واکر کو۔ اپن جب بولا کہ یہ نئیں پیتا تو لفڑا کاہے کو کرتا۔ ابھی چالو کرو اپنا کھٹارا۔"

"خالی پیلی سیر ماریں گا بھیل پوری والی کہ پکا شوقینی کریں گا؟ اپنا پاس بھی ایک دم فسٹ کلاس مال ہے۔ کرسچین۔ پارسی، پنجابی، سکھ، بنگالی۔ سولہ سال کا سولہ روپیہ، ساٹھ سال کا ساٹھ پیسہ" وہ ٹیکسی چلاتے ہوئے قہقہہ مار کے ہنسا "مال کتنا ہے پاکٹ میں؟"

میں نے کہا "تمہاری کوئی بہن ہے؟ جوان۔ کنواری ہو تو کیا بات ہے۔ پکا سولہ روپیہ۔"

"اپن کا واسطے ساٹھ پیسہ والا مال۔ تمہاری ماں زندہ ہے؟" غالب نے کہا۔

اس نے یوں سر گھما کے دیکھا جیسے پہلے وار کے بعد سانپ پلٹ کر دیکھتا ہے۔ ایک گالی دے کر اس نے ٹیکسی روکی اور چیخ کر بولا۔ "اترو نیچے...." وہ کچھ نشے میں تھا چنانچہ اس کو اپنے ہوش و حواس پر تو قابو تھا مگر اپنے جذبات پر اختیار نہ تھا "اپنا ماں کو گالی دیتا ہے کنجر...."

میں نے جواب میں اس کے خون کے رشتوں کو ایک ایسی گالی سے رسوا کیا کہ اس کا خون کھول اٹھا اور وہ دروازہ کھول کر نیچے اترا اور پھر پیچھے کا دروازہ کھول کر مجھ پر حملہ آور ہوا۔ غالب میرے اشارے پر دوسرے دروازے سے باہر نکلا اور میں نے ڈرائیور کو اندر کھینچ لیا۔ ڈرائیور کے سر کو سیٹ پر دبا کے میں نے اس پر اپنا وزن ڈال دیا اور اس کی آواز کو دبانے کے لئے ایک ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔ وہ تڑپا مگر میری گرفت سے چھٹکارا حاصل نہ کر سکا۔ پیچھے کا دروازہ بند ہوتے ہی غالب نے ٹیکسی آگے بڑھا دی۔ میں نے اسے سمیٹ کر سیٹ کے برابر کر دیا اور خود اس پر سوار ہو گیا۔

جس سڑک پر یہ کارروائی ہوئی تھی وہ غیر آباد نہیں تھی مگر اس میں ایک منٹ بھی صرف نہیں ہوا تھا۔ [illegible] گا تو صرف یہ کہ ٹیکسی ڈرائیور اتر کے پیچھے گیا اور پیچھے سے ایک شخص آگے آ کے اس کی جگہ بیٹھ گیا۔ جو کچھ ٹیکسی کے اندر ہوا وہ کسی کو نظر آ ہی نہیں سکتا تھا۔

ڈرائیور کمزور نہیں تھا مگر میں نے اسے خالص پیشہ ورانہ انداز میں قابو کر رکھا تھا۔ نہ وہ اپنا ہاتھ ہلا سکتا تھا اور نہ پاؤں۔ اس کے لئے سانس لینا بھی دشوار ہو رہا تھا کیوں کہ میرے گھٹنے سے اس کا سر سیٹ پر دبا ہوا تھا۔ دس منٹ کے بعد غالب نے ٹیکسی کو ایک شکستہ دیوار سے گزار کے روک دیا۔ وہ ایک ویران احاطہ تھا۔

میں نے کہا "ابھی بول کیا بولتا ہے" اور ہاتھ اس کے منہ پر سے ہٹا لیا۔

اس نے ہانپتے ہوئے رک رک کر بڑی مشکل سے کہا "ابھی سالا.... اگر.... تیرا معاملہ فٹ ہے اس کا ساتھ۔ تو سولہ روپیہ کا بات کاہے کو کرتا ہے۔ رکمنی کا اپن بیس لیتا ہے۔"

"رکمنی! کون رکمنی؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔

"اپنا بہن سالا اور کون۔ اس کا عاشق ہو ٹیلا ہے تو۔ یا گاہک ہے؟ بول۔"

غصے سے ایک لمحے کے لئے میرا دماغ ماؤف ہو گیا۔ میں نے اس کی گردن مروڑ دینے کا سوچا۔ پھر غالب کی آواز نے مجھے اس انتہائی اقدام سے روک لیا۔

"اپنی سگی بہن کا بھی دلال ہے تو۔ کمینے...... بے غیرت!"

میں نے کہا "چھوڑ غالب۔ یہ غیرت اور حمیت کا مطلب ہی نہیں سمجھتا۔ اس کی دنیا میں رشتے اہمیت نہیں رکھتے۔ یہ کسی اور کی بہن کے سولہ وصول کرتا ہے تو اپنی بہن کے بیس۔ شاید اس لئے کہ وہ زیادہ خوبصورت ہو گی۔"

"اس سے پوچھ کہ ماں کی عزت کیا واقعی یہ ساٹھ پیسے میں بیچ دیتا؟"

میں نے بالوں سے پکڑ کے اس کا سر سیٹ پر مارا "ماں کچھ نہیں کہتی؟ تجھے اور اسے۔"

سیٹ پر منہ لگنے سے اس کو چوٹ نہیں آئی تھی مگر وہ چلانے لگا "رام قسم، ہم کو اسی رنڈی نے اس لائن پر ڈالا۔ میرے کو بھی اور رکمنی کو بھی۔ ابھی میرے کو نہیں مالوم وہ کدھر گیا۔"

"ایک تو سن ہے تمہاری اور اس سے بھی تم دھندا کراتے ہو؟" میں نے بڑے دکھ سے کہا۔

"ہم نہیں کراتا.... وہ سالا ہم کو مجبور کیا۔ اس کا دھندا کوئی اور کرتا تھا۔ اکھا پیسہ وہ مار جاتا تھا۔ رکمنی کو پانچ دیتا تھا۔ دس خود رکھتا تھا۔ وہ بولا کہ تیری وجہ سے میرا نقصان ہوتا ہے۔ تو کیسا بھائی ہے۔ ہم کو بہت شرم آیا۔ ابھی ہم اس کا بیس لیتا اور سب اس کو دیتا ہے۔ میرے کو کیوں مارتا ہے بابا۔"

میں نے زندگی میں کبھی نیکی اور شرافت کے رشتوں کی ایسی رسوائی کا تصور نہیں کیا تھا۔ ایک عورت نے بھائی سے صرف اس لئے گلہ کیا تھا کہ وہ اس کے جسم کی پوری قیمت خود کیوں نہیں لیتا۔ اور بھائی کو یہ سن کر غیرت نہیں آئی تھی کہ وہ جسم فروش بہن کا گلا گھونٹ دے۔ اسے واقعی "شرم" آئی تھی کہ وہ بہن کا اتنا سا کام نہیں کر سکتا۔ اس نے جس ماحول میں آنکھ کھولی تھی وہاں واقعی عورت کی عفت و عصمت کے الفاظ بے معنی تھے اور رشتوں کی حرمت... اور تقدس کا کوئی وجود نہ تھا۔ خود اس کی ماں ایک طوائف تھی جس کے بارے میں وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ زندہ ہے یا مر چکی ہے۔ اسی کے جنم دئے ہوئے اسی کے نقش قدم پر چل رہے تھے تو انہیں کوئی احساسِ گناہ یا پشیمانی نہیں تھی۔ میں نے اسے چھوڑ دیا۔

وہ کانپتا ہوا اٹھا "کیا بات ہے؟ اپن غلطی کیا۔ چل میرے کو معافی دے میرے باپ۔ پر دیکھ تو پہلے گالی دیا میرا ماں کو۔"

"کیا کسی عورت کے لئے طوائف سے بڑھ کر کوئی گالی ہو سکتی ہے؟"

"ابھی تو کیا بولتا ہے یار۔ طوائف اپنا واسطے تو نئیں تھا۔ اپنا ماں اپن کو پیٹ میں رکھا۔ پیدا کیا اور پالا..... اپن کا واسطے وہ ماں ہے۔ اس کو گالی مت دو۔"

اس کی منطق ہماری سمجھ میں نہیں آ سکتی تھی۔ اس کے الفاظ کا مطلب ہمارے لئے کچھ اور تھا، خود اس کے لئے کچھ اور۔ ہم دو مختلف دنیاؤں کے رہنے والے تھے جو مکمل اجنبی تھے اور اگر ہمارے درمیان کوئی تعلق قائم ہو سکتا تھا تو صرف سکہ رائج الوقت سے۔ ہم اس کی ٹیکسی کا بھاڑا دیں یا اس کی بہن کا۔ پیسہ واحد اہم چیز تھا۔ اخلاقی اقدار کے اعتبار سے ہمارے درمیان زمین آسمان کی دوری تھی۔ شاید اس جہان میں ایسے کئی جہان آباد تھے جن میں رہنے والے ہم جیسے ہی انسان نظر آتے تھے مگر وہ ایک دوسرے کو صرف دیکھتے تھے، پہچانتے نہیں تھے اور جانتے نہیں تھے اور ایک دوسرے کی زبان سے نا آشنا تھے۔

میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا "تمہاری ایک بہن ہے۔ بھائی ہے کوئی؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "اپن صرف رکمنی کو جانتا ہے۔ اس نے اپنا ساتھ نہیں چھوڑا۔ باقی لوگ کو پتا نئیں ماں کدر چھوڑا۔ ابھی تو کدر لے جاتا ہے یار میرے کو....؟"

"تم کو ڈرنے کی ضرورت نہیں" میں نے کہا "تم کو پیسہ چاہئے نا۔ جتنا مانگو گے مل جائے گا" میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کے نوٹ نکالے اور اس کے سامنے ڈال دئے۔

"صاف بول یار۔ کیا مانگتا ہے تو؟ کون ہے تو؟" وہ نوٹوں کو ہاتھ لگائے بغیر بولا۔

میں نے کہا "ہم جیل سے بھاگے ہوئے ہیں۔ ہمیں یہ ٹیکسی چاہئے اور یہ وردی۔"

وہ ہاتھ جوڑنے لگا "اے میرے باپ، تو جدھر بولے گا میں تیرے کو لے کر جائے گا۔ رام قسم کسی سے کچھ نئیں بولے گا۔ پر تو اپنا ٹیکسی مت لے۔"

میں نے سوچ کے کہا "ٹھیک ہے۔ تم گاڑی چلاؤ۔ ہم میں سے ایک ڈکی میں چھپ کر بیٹھے گا۔ دوسرا بالکل تمہارے پیچھے ہو گا۔ اور اس کے ہاتھ میں ہو گا یہ ریوالور۔ یہ ایک دم اصلی ریوالور ہے اور اس کی گولی چلنے کی آواز سنائی نہیں دیتی۔"

اس نے ہکلا کے کہا۔ "ابھی..... اس کو اُدھر کر لے بابا..... پھوکٹ میں مر جائیں گا ہم، اگر گولی چل گیا۔ میں تیرے کو بولا تا کہ جدھر بولے گا جائے گا۔"

میں نے کہا "پونا جانے والی سڑک پر بائیں جانب ایک سیمنٹ فیکٹری ہے۔ ادھر ایک ریلوے لائن بھی جاتی ہے اندر تک۔"

اس نے ایسے سر ہلایا جیسے کہہ رہا ہو میں سمجھ گیا۔

"سیمنٹ فیکٹری کے قریب ریلوے کا ایک ریسٹ ہاؤس ہے۔ ڈاک بنگلا۔"

اس کی آنکھوں میں الجھن کے آثار نظر آنے لگے "تم دیکھا ہے تو ٹھیک ہے۔ مگر دیکھ یار، تیرے کو ماں کا قسم۔ اپن کو اُدھر لے جا کر مرڈر مت کرنا۔ ہاں" وہ ہاتھ جوڑ کر گھگیانے لگا۔

میں نے کہا "مرڈر کرنا ہوتا تو یہاں نہ کر دیتے۔"

"بس تم چالاک یا بہادر بننے کی کوشش مت کرنا ورنہ مارے جاؤ گے۔ راستے میں کوئی بھی روکے تو رکنا نہیں ہے" غالب نے کہا۔ "پولیس روکے تب بھی نہیں۔"

ہر لالچی، بے غیرت آدمی بزدل بھی ہوتا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ہماری ہدایات کی خلاف ورزی نہیں کرے گا۔ چند منٹ بعد ہم

وہاں سے روانہ ہوئے تو میں ڈکی میں تھا۔ غالب آگے اور پیچھے کی سیٹوں کے درمیان کی خالی جگہ پر لیٹا ہوا تھا۔ ہم دونوں کے لئے ایک سی جسمانی اذیت کی قوتِ برداشت کا امتحان تھا۔ میں ڈکی میں ٹائر اور جیک' فالتو پرزوں اور آئل کے ڈبے جیسی چیزوں کے درمیان سمٹا پڑا تھا اور پیٹرول ٹینک کے عین اوپر ہر جھٹکے کے ساتھ اچھل رہا تھا۔ پیٹرول کے بخارات کی بو سے میرا دماغ خراب ہو رہا تھا اور میں تازہ ہوا کے لئے ایک سوراخ سے ناک لگانے پر مجبور تھا جہاں سے ٹیکسی کی پچھلی سیٹ نظر آتی تھی۔

غالب کی حالت کا میں تصور کر سکتا تھا۔ آگے پیچھے کی سیٹوں کے درمیان ہر کار کی چوڑائی کے رخ پر صرف پیر رکھنے کی جگہ ہوتی ہے۔ اس جگہ میں پھنس کر لیٹنا' وہ بھی ہاتھ میں ریوالور پکڑ کے۔ یہ بہت مشکل کام تھا۔ اسے ٹیکسی ڈرائیور پر نظر بھی رکھنی تھی کہ وہ گڑبڑ نہ کرے اور اسے یہ احساس بھی دلاتے رہنا تھا کہ وہ غافل نہیں ہے۔

کافی دیر تک ٹیکسی چلتی رہی اور میں ٹریفک کی آوازوں کے ملے جلے شور سے اندازہ کرتا رہا کہ ہم ابھی تک آبادی میں ہیں۔ پھر یہ شور کم ہو گیا' یہاں تک کہ کبھی کبھار گزرنے والی کسی گاڑی کی آواز سنائی دینی بھی بند ہو گئی۔ ٹیکسی رک گئی اور غالب نے دروازہ کھول کر مجھے ڈکی کی قید سے آزاد کیا۔ اب خطرے کی کوئی بات نہیں رہی تھی۔ میں غالب کے ساتھ ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور اپنے ہاتھ پاؤں سیدھے کرنے لگا۔ میری کمر بھی ٹیڑھی ہو گئی تھی اور میرا سارا جسم ایسے درد کر رہا تھا جیسے کسی نے مجھے مگدروں سے کوٹا ہو۔

دن کے اجالے میں اس راستے کو پہچاننا دشوار نہ تھا جس پر ہم نے گزشتہ روز ایک پولیس جیپ میں سفر کیا تھا۔ ڈرائیور کا رخ سیمنٹ فیکٹری کی طرف تھا مگر ڈاک بنگلا اس سے پہلے ہی پڑتا تھا۔ میں نے اس کی عمارت کو دور سے ہی دیکھ کر پہچان لیا اور ٹیکسی ڈرائیور سے کہا کہ گاڑی کو گیٹ سے اندر لے جائے۔

گاڑی کے رکنے کی آواز پر چوکیدار باہر آیا۔ ہماری صورت دیکھتے ہی اس کا ہاتھ سلام کے لئے اٹھ گیا "آپ آگئے جی۔ بہت اچھا ہوا۔"

میں نے کہا "پیر عنایت آیا تھا؟"

"پیر صاحب بھی تشریف لائے تھے کل رات کو۔ اور..."

اس کی بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ اندر سے گل نمودار ہوئی۔ اس نے ہماری آواز سن لی تھی۔ اس نے ایک چیخ ماری۔ "بھائی جان" اور دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ کچھ کہے بغیر اس نے زار و قطار رونا شروع کر دیا۔

میں نے کہا "گل' اے گل! یہ کیا دیوانگی ہے۔ کیا ہوا ہے تجھے؟"

غالب کی نظر ٹیکسی ڈرائیور پر تھی جو احمقوں کی طرح منہ کھولے بیٹھا ہوا تھا۔ میں گل کو کھینچ کر اندر لے گیا۔ روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی تھی اور میری پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔

میں نے گل کو سختی سے جھنجوڑ کے کہا "گل! منہ سے بتاؤ کیا بات ہے۔"

"وہ... وہ... رابعہ باجی..." اس نے بڑی مشکل سے کہا اور پھر رونے لگی۔

"کیا ہوا ہے رابعہ کو؟" میں نے پھر اسے جھنجوڑا۔

چوکیدار نے میرے پیچھے سے کہا "سر جی' وہ رات کو۔ پیر صاحب دونوں کو یہاں چھوڑ گئے تھے۔ وہ دو بجے تشریف لائے تھے اور فوراً ہی واپس چلے گئے تھے۔ میں نے انہیں ایک ہی کمرے میں سلا دیا تھا۔ چائے وغیرہ بھی بنا کے دی تھی۔ میں نے کہا تھا کہ آپ بے فکر ہو کے سو جائیں۔ میں جاگ رہا ہوں۔ لیکن ان کے سونے کے بعد میری بھی آنکھ لگ گئی۔ پھر جناب! صبح دس بجے تک میں اندر نہیں گیا۔ میں نے سوچا انہیں سونے دوں۔ دس بجے میں نے دیکھا تو یہ اکیلی سو رہی تھیں" اس نے گل کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے گل کی طرف دیکھا "گل..."

گل نے آنسوؤں سے بھیگی آنکھیں اٹھا کے مجھے دیکھا اور اقرار میں سر ہلایا "یہ مجھے اپنے سرہانے ملا تھا" اس نے تکیے کے نیچے سے ایک لفافہ نکالا۔

لفافے پر میرا نام تھا مگر یہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے اس میں رکھا ہوا کاغذ نکال لیا۔

"یہ... میں نے کھول لیا تھا... میں بہت پریشان ہو گئی تھی..." گل نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔

رابعہ نے اپنے خط میں لکھا تھا۔

میری جگہ میرے خط کو پا کے تم کو یقیناً مایوسی ہو گی' صدمہ ہو گا اور شاید غصہ بھی بہت آئے گا۔ اگر میں تمہیں کچھ بتائے بغیر چلی جاتی تو تم۔ اور تم سب بہت پریشان ہوتے لیکن پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ حالات کی مجبوری کچھ ایسی ہے کہ فی الحال میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی۔ میں کوئی بہانہ نہیں کر رہی ہوں' جھوٹ نہیں بول رہی ہوں اور نہ کسی کے جبر یا دباؤ کے باعث ایسا کہہ رہی ہوں۔ میں تمہاری اور اس محبت کی جو مجھے تم سے ہے' قسم کھا کے تمہیں یقین دلانا چاہتی ہوں کہ فکر یا تشویش کی کوئی بات نہیں۔ یہ ہو سکتا تھا سکندر کہ کوئی دشمن میری کنپٹی پر ریوالور رکھ کے مجھ سے یہ سب لکھوا لیتا لیکن ایک بار نہیں دس بار گولی مار کے بھی وہ مجھ سے جھوٹی قسم نہیں لے سکتا تھا۔

تم یقیناً جاننا چاہو گے کہ میں نے اچانک ایسا فیصلہ تمہیں کچھ بتائے بغیر کیوں کیا۔ اور اگر تم سے جدا ہونے کے بعد کوئی ایسی بات ہو گئی تھی تو اب بتانے میں کیا قباحت ہے۔ اچانک کچھ نہیں ہوا سکندر۔ ایک ضرورت کا احساس مجھے بہت پہلے سے تھا۔ میں تذبذب کا شکار تھی۔ پہلے مجھے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ تمہیں اور تم سب

کو اپنے فیصلے میں شریک کروں یا نہ کروں۔ بہت سوچنے کے بعد میں نے استخارہ کیا اور مجھے اشارہ ملا کہ ابھی کسی کو کچھ بتانا مناسب نہیں اور مجھے یہ قدم بلا تاخیر اٹھانا چاہئے اور اسی میں بہتری ہے۔ میری یا تمہاری یا ہم سب کی۔ ابھی تو میں واپس جا رہی ہوں۔ شاید کوئی میری بات نہ سمجھ سکے۔ ممکن ہے تم بھی اسے دماغ کی خرابی کہو۔ لیکن مجھے یہ غیب کا اشارہ لگتا ہے۔ اسے میں چھٹی حس اس لئے نہیں کہوں گی کہ یہ اس سے زیادہ طاقتور آواز تھی جس کے خلاف میری عقل کے دلائل اور جذبات کی مزاحمت سب بے کار ثابت ہوئے۔ ایسا ایک بار نہیں متعدد بار ہوا۔ میں نے رات کو خواب میں یہ آواز سنی۔ معلوم نہیں کون تھا جو کہتا تھا۔ جا' واپس لوٹ جا۔ ظاہر ہے یہ خواب تھا۔ مگر سکندر! کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک ہی خواب بار بار دکھائی دے۔ وقفے وقفے سے میں نے چار مرتبہ یہ خواب دیکھا کہ میں کسی پہاڑ کی چوٹی پر تنہا کھڑی ہوں اور میرے چاروں طرف ایسے ہی پہاڑوں کی چوٹیوں کا سلسلہ ہے۔ تاحدِ نظر۔ اور پہاڑوں پر برف ہی برف ہے۔ کہیں کوئی درخت' کوئی پرندہ' کوئی آواز۔ کچھ بھی نہیں۔ وہ سب برف کے بنے ہوئے پہاڑ ہیں۔ بالکل سفید اور اوپر نیلا آسمان ہے۔ ایک پہاڑ کے پیچھے سورج غروب ہو رہا ہے یا شاید طلوع ہو رہا ہے۔ اور پس منظر کی اس روشنی میں مجھے ایک ہیولا سا نظر آتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ تم ہو۔ بہت دور ایک پہاڑ کی چوٹی پر ہاتھ پھیلائے کھڑے ہو اور غالباً یہ تمہاری ہی آواز ہے۔ پھر اچانک گھپ اندھیرا پھیل جاتا ہے اور تم غائب ہو جاتے ہو۔ ہر مرتبہ خواب اسی طرح ختم ہوا اور میں نے خوف سے کانپتے ہوئے باقی رات گزاری۔ میں نے خواب کو صرف واہمہ اور خیالوں کا سراب سمجھ کے ٹالنا چاہا۔ سوچا' تم سے کہوں مگر کہہ نہ سکی۔ تم بھی کہتے کہ خواب کا کیا ہے۔ خواب تو صرف خواب ہوتے ہیں۔ فرائیڈ کہتا ہے کہ ناآسودہ خواہشوں کی تصویر۔ اور ڈاکٹر کہتے ہیں کہ... یہ سب میں بھی جانتی ہوں لیکن کیا مجھے کوئی بتا سکتا ہے کہ ایک خواب کسی نے دوسری بار' تیسری بار اور چوتھی بار ایسے دیکھا ہو جیسے ایک ہی فلم کا کوئی حصہ ہو کہ ہر شو میں ہر روز سب کچھ وہی رہے۔ کچھ بدل بھی کیسے سکتا ہے۔ اسی بات نے مجھے خوف میں مبتلا کر دیا تھا۔ تم جانتے ہو میں توہم پرست' شکی مزاج یا خبطی بہرحال نہیں ہوں اور تقدیر کے لکھے کو خدا کی رضا سمجھ کر قبول کرنا میرے ایمان کا اتنا ہی حصہ ہے جتنا تمہارا۔ چنانچہ جو ہونا ہے وہ ہو گا۔ لیکن اس کے باوجود میں وہم میں مبتلا ہو گئی۔ شک میں پڑ گئی یا سمجھو کہ میرا یقین متزلزل ہونے لگا۔ میں نے سوچا کہ یہ خواب آخر کس کا اشارہ ہے اور اشارہ ہے تو اس کو سمجھنے کے لئے مجھے کیا کرنا ہو گا۔ ابھی میں کچھ طے نہیں کر پائی تھی کہ پرسوں رات جب میں خانہ بدوشوں کے خیمے میں سو رہی تھی یا یوں سمجھو کہ آنکھیں کھولے لیٹی تھی اور سوچ رہی تھی (یہ میں نہیں بتاؤں گی کہ کس کے بارے میں کیا سوچ رہی تھی) اچانک میرے کانوں نے ایک آواز سنی۔ جاؤ واپس لوٹ جا۔ میں گھبرا کے اٹھ بیٹھی اور میں نے گل کو بھی جگا دیا۔ وہ بھی جاگ ہی رہی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا اس نے کچھ سنا۔ گل نے کچھ نہیں سنا تھا۔ ابھی ہم باہر کی خاموشی پر کان لگائے بیٹھے تھے کہ وہ آواز پھر آئی۔ میں اچھل پڑی لیکن مجھے بڑی حیرت ہوئی جب گل اسی طرح بیٹھی رہی۔ اس نے پھر کچھ بھی نہیں سنا تھا۔ میں نے کہا کہ گل' ابھی کوئی کہہ رہا تھا۔ جاؤ واپس لوٹ جا۔ بالکل سکندر کی آواز میں۔ گل پریشان ہو گئی۔ اس نے کہا کہ باجی آپ سو جائیں۔ آیت الکرسی پڑھ کے۔ اس نے جو سوچا ٹھیک ہی سوچا۔ وہ سمجھی کہ یہ دوری کی مجبوری کا صدمہ ہے جس نے میرے اعصاب پر برا اثر ڈالا ہے۔ میں اس سے کیا کہتی۔ رات کے شاید دو بجے میری آنکھ لگی ہی تھی کہ پھر وہ خواب شروع ہو گیا۔ پانچویں بار۔ لیکن خواب کے آغاز میں ہی کسی نے مجھے جھنجوڑ کر کہا۔ جا' واپس لوٹ جا۔ اور میں چیخ مار کے اٹھ بیٹھی۔ گل بھی اٹھ گئی۔ میں نے اسے کہا کہ ابھی یہاں کوئی تھا۔ میرا خیال ہے سکندر آیا تھا۔ گل بے چاری تقریباً رونے پر آگئی۔ اس نے کہا کہ باجی' پریشان کیوں ہوتی ہیں۔ شاید آپ کو ڈر ہے کہ سکندر بھائی نہیں آئیں گے۔ مگر اب چند گھنٹوں کی بات ہے' پھر وہ آجائیں گے۔ یہ ناممکن ہے کہ وہ نہ آئیں۔ دیکھیں' کتنے کم وقت میں پیر عنایت نے ہمیں تلاش کر لیا اور وعدے کے مطابق یہاں پہنچا گیا۔ مگر اس کی باتوں سے میری تسلی نہیں ہوئی۔ اور اس وقت میں نے گل کے سونے کے بعد استخارہ کیا اور فیصلہ کر لیا۔ اس وقت صبح کے چھ بجے ہیں۔ اجالا ڈاک بنگلے کی کھڑکیوں کے دھندلے شیشوں پر اتر آیا ہے۔ گل سو رہی ہے اور میں یہ خط چھوڑ کے جا رہی ہوں۔ اگر یہ میری غلطی ہے تو مجھے معاف کر دینا۔ ناراض مت ہونا اور دل برا مت کرنا۔ بدلا کچھ نہیں ہے۔ نہ میں نہ تم' نہ وقت جو ہمارے عہد محبت کا امین ہے۔ کل کا وقت' آج کا وقت اور آنے والا وقت۔ سب وہی ہے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تم میرے ساتھ ہو۔ تصور میں اور یادوں میں میں تم سے جدا نہیں ہو رہی ہوں۔ بس ایک کام پڑ گیا ہے۔ مجھے بھی نہیں معلوم کہ وہ کیا کام ہے۔ وہ کام ختم ہوتے ہی میں لوٹ آؤں گی۔ پہلے بھی ایسا ہوا ہے۔ تم ایک طرف نکل گئے۔ میں دوسری طرف چلی گئی۔ نازو سے غالب اور شہلا سے محسن جدا ہوا۔ کام تو کام ہے۔ اس سے محبت کو کیا۔ فاصلے تو قرب کی آرزو کو زندہ رکھتے ہیں۔ میں پہلی فرصت میں تم سے رابطہ قائم کر لوں گی۔ خود تمہیں تلاش کر لوں گی' تم دنیا سے چھپ سکتے ہو مجھ سے تو نہیں چھپ سکتے۔ تم اپنا سفر جاری رکھو۔ اسی حوصلے اور لگن کے ساتھ ورنہ میں سمجھوں گی کہ تم سکندر اعظم نہیں تھے۔ ایک عام مرد تھے جس نے ایک عام عورت کی خاطر اپنے مقصد' اپنے مشن' اپنے مستقبل اور اپنی کامیابی سب کو قربان کر دیا۔ تم دنیا فتح کر سکتے تھے مگر

اپنے خوابوں کے جال سے نہ نکل سکے۔ مجھے یقین ہے کہ تم میرے پیچھے نہیں آؤگے، آگے جاؤگے۔ میں تمہیں آگے ملوں گی پیچھے نہیں۔ میں تمہارے استقبال کے لئے اس منزل پر پہلے سے موجود ہوں گی جو میری، تمہاری اور ہم سب کی منزل ہے۔ میرے یقین کی لاج رکھوگے نا؟ میں تمہیں باتوں سے نہیں بہلا رہی ہوں۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ بہت جلد میں تم سے آملوں گی۔ اسی دنیا میں، اسی زندگی میں۔ تب تک کے لئے تم کو اللہ کی امان میں دیا۔ معلوم نہیں میں اپنی بات تمہیں سمجھا سکی یا نہیں لیکن تم سمجھ لو تو پھر سب کو سمجھا دینا۔ تمہاری پاگل۔ پاگل۔ پاگل۔ رابعہ۔

میں نے اس خط کو ایک بار پڑھا، پھر پڑھا۔ اس کے ہر لفظ کو باربار پڑھا۔ یہاں تک کہ سب کچھ میرے دل پر نقش ہوگیا۔ میرا دل ایک پتھر کی سل بن گیا تھا جس پر رابعہ نے بڑی سفاکی سے وہ سب کچھ لکھ دیا جو میرے لئے ناقابلِ فہم تھا۔ خط مجھ سے گل نے لیا۔ پھر غالب کو دے دیا اور غالب نے پھر مجھے پکڑا دیا۔ میں ایک تاریک خلا میں سرگرداں رہا جس میں ہر سمت پاگل کر دینے والی آوازوں کا شور تھا۔ وہ آخر کیوں چلی گئی۔ کیسے چلی گئی۔ کہاں چلی گئی۔ واپس کا کیا مطلب ہے۔ کیا وہ لاہور چلی گئی، اکیلی۔ لاہور میں کیا تھا۔ کون تھا اسے لاہور بلانے والا۔ کیا واقعی وہ پاگل ہوچکی تھی۔ اس کا نروس بریک ڈاؤن اس انتہا کو پہنچ چکا تھا... آوازیں سننے لگی تھی جو لاشعور میں دبی ہوئی تھیں۔ وہ گھبرا گئی تھی اس سفرِ مسلسل سے اور مصائب و آلام کے دائم و قائم سلسلے سے۔ مگر وہ اس کا اعتراف کرتے ہوئے ڈرتی تھی۔ وہ جھوٹ نہیں بول رہی تھی کہ اسے کوئی آواز بلاتی ہے۔ مگر یہ بات نہیں سمجھ سکتی تھی کہ یہ اس کے اندر کی آواز ہے۔ وہ اس کا اعتراف بھی نہیں کر سکتی تھی کہ اسے خود اپنے اندر کی آواز مجبور کرتی ہے۔ چناں چہ لاشعور کی بھول بھلیوں میں بھٹکتے ہوئے اس نے میری آواز سن لی۔ اور کسی کی آواز اتنی معتبر کیسے ہو سکتی تھی۔ اس کا خواب ایک تکرار تھا۔ اسی آواز کی بے وجود تصویر تھا۔ کبھی تصویر سامنے آتی تھی، کبھی آواز۔ پھر خیال آتا تھا کہ رابعہ نے اصل بات مجھ سے چھپالی۔ لیکن دل نہیں مانتا تھا کہ وہ مجھ سے جھوٹ بولے گی۔ حالات، مجبوری، آوازِ غیب، اشارہ، استخارہ۔ کیا سچ ہے کیا غلط ہے؟ کیا قابلِ اعتبار ہے اور کس کے لئے کس زاویے سے کیا سچ ہے۔ میرے لئے آج یہ سچ ہے کہ دو گھنٹے بعد سورج غروب ہوجائے گا۔ مگر آج، ابھی کسی قطب شمالی پر رہنے والے کے لئے یہ سچ ہے کہ سورج تین مہینے یا چار پانچ مہینے بعد غروب ہوگا۔ چناں چہ رابعہ نے جو کچھ مجھے سمجھایا اور میری سمجھ میں نہ آسکا۔ وہ خود اسی کی سمجھ میں آنے والی بات تھی جو اس نے قطعیت کے ساتھ قبول کی۔

رابعہ کی آواز باربار میرے کانوں سے ٹکراتی تھی۔ ناراض مت ہونا اور دل برا مت کرنا۔ بدلا کچھ نہیں ہے۔ نہ میں، نہ تم نہ وقت۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تم میرے ساتھ ہو۔ تم اپنا سفر جاری رکھو۔ میں تمہیں آگے ملوں گی، پیچھے نہیں۔ یہ آوازوں کا بھنور تھا جس میں میرا خیال اور میرا تصور گھوم رہا تھا۔ باربار وہی آوازیں آتی تھیں اور ان آوازوں کا وجود اتنا حقیقی ہوتا جارہا تھا جیسے رابعہ میرے سامنے کھڑی ہوئی مجھ سے یہ سب کہہ رہی ہے۔ شاید ایسے ہی اس نے میری آواز سنی ہوگی۔ میں نے سوچا۔ میرے یقین کی لاج رکھوگے نا؟ بولو سکندر، وعدہ کرو تم اپنا سفر جاری رکھو گے۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ میں تم سے آملوں گی۔ اسی دنیا میں۔ اسی زندگی میں۔ تم بھی وعدہ کرو کہ مجھے پاگل نہیں سمجھوگے۔ حالاں کہ میں پاگل ہوں۔ تمہاری پاگل پاگل پاگل رابعہ۔

"پاگل"! میں نے زور سے کہا اور ہنس پڑا۔ "میں بھی پاگل ہوں۔"

گل نے ایک چیخ ماری۔ "سکندر بھائی"! اور پھر مجھ سے چمٹ کے رونے لگی۔

میں نے کہا "تجھے کیا ہوا ہے؟ کیا تو بھی پاگل ہوگئی ہے؟"

غالب نے کہا "میرا خیال ہے کہ ...... یہاں رکنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ وہ واقعی چلی گئی ہے"

میں نے کب کہا ہے۔" میں نے کہا "کہ میں اس کی تلاش میں مجنوں کی طرح صحرا اور جنگل کی خاک چھاننے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ مجھے اس کے یقین پر یقین ہے۔ وہ جھوٹ بول سکتی ہے مجھ سے؟ یا تم سے؟"

غالب نے اطمینان کا گہرا سانس لیا اور اس کا رنگ جو شاید میری حالت دیکھ کر اڑ گیا تھا، بحال ہونے لگا۔ اس نے کہا "گل! کیا یہ سب ٹھیک ہے؟ جو رابعہ نے بتایا ہے۔"

گل نے آنسو پونچھ کے کہا "کیا؟"

"یہی جو رابعہ نے لکھا ہے کہ اس نے تمہیں جگایا تھا..."

"ہاں۔ انہوں نے پوچھا تھا کہ سکندر کی آواز نہیں سنی تم نے۔ باہر بالکل سناٹا تھا۔ کوئی آہٹ بھی ہوتی تو میں سن لیتی۔ مگر باجی کا اصرار تھا کہ کسی نے بہت بلند آواز میں یہی کہا ہے۔ جا! واپس لوٹ جا۔ میرے انکار پر وہ خفا ہونے لگی تھیں۔ نیند کی گولیاں ہوتیں تو میں انہیں زبردستی کھلا دیتی۔ وہ سب نیند کی کمی اور تھکن کا اثر تھا۔ وہ بہت پریشان تھیں۔ سارا دن یہی سوچتی رہتی تھیں کہ اب کیا ہوگا؟ میں بہت تسلی دیتی تھی انہیں کہ خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہوجائے گا۔ لیکن اندر سے میں بھی ڈری ہوئی تھی۔ انہوں نے ذکر تک نہیں کیا مجھ سے کہ وہ اتنا بڑا فیصلہ کر چکی ہیں" وہ پھر رونے لگی۔

"گل! اس نے جو کیا۔ شاید اسی میں بہتری تھی۔ اس نے لکھا ہے...."

"سارا قصور میرا ہے۔ مجھے نیند بہت آتی ہے۔ باجی کہتی تھیں گل بڑی خوش قسمت ہو تم کہ جب چاہتی ہو سو جاتی ہو۔ جتنا وقت نیند میں گزر جاتا ہے اس اذیت سے تو نجات مل جاتی ہے جو ہم ان خانہ بدوشوں کی قید میں برداشت کر رہے ہیں۔ رات بھی کچھ دیر میں جاگتی رہی اور آیت الکرسی پڑھ پڑھ کے ان پر پھونکتی رہی۔ پھر پتا نہیں کب سو گئی۔ مجھے نہیں معلوم انہوں نے خط کیسے لکھا۔ کاغذ اور قلم کہاں سے لیا۔ لفافہ کہاں سے آیا۔ مجھے تو چوکیدار نے جگا کے پوچھا ان کے بارے میں تو مجھے یقین نہیں آیا۔ پھر میں نے خط دیکھ لیا......"

"اچھا اب چلو" غالب نے کہا "معلوم ہوجائے گا کہ وہ واپس لاہور ہی گئی ہے۔ اور وہ کہاں جا سکتی ہے۔ واپسی کا کوئی دوسرا مطلب نہیں ہو سکتا۔ ہم فون کر کے منظر سے پوچھ لیں گے۔"

غالب نے میرا ہاتھ پکڑا اور میں خاموشی سے اس کے ساتھ چل پڑا۔ میرے ذہن میں ابھی تک ایک خلا تھا جس میں کبھی یکلخت رابعہ کا چہرہ روشن ہو جاتا تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ اندھیرے میں غائب ہو جاتی تھی اور آوازوں کی بازگشت رہ جاتی تھی۔ پاگل۔ پاگل۔ پاگل۔ معلوم نہیں پاگل کون ہے۔ یہ دنیا جو مجھے پاگل سمجھتی ہے یا دنیا جسے میں پاگل سمجھتا ہوں۔ رابعہ، میں، محسن۔ سب پاگل ہی تو ہیں۔

میں واپسی کے سفر میں سارا راستہ سوچتا آیا۔ سوچنے کے سوا میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ رابعہ نے بڑی سادگی و پُرکاری سے مجھے وعدوں کی اور یقین دہانیوں کی، محبت پر اعتماد کی اور اعتبار کی زنجیروں میں جکڑ دیا تھا۔ میں اسے جھوٹا نہیں کہہ سکتا تھا۔ حوصلہ نہیں ہار سکتا تھا۔ اس کے پیچھے نہیں جا سکتا تھا۔ مجھے ایسا لگتا تھا کہ اگر میں نے صبر و ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوڑا۔ چیخا چلّایا اور اس پر خفا ہوا تو وہ مجھ سے خفا ہو جائے گی۔ اس کا دل ٹوٹ جائے گا کہ اتنی التجاؤں کے باوجود سکندر نے میرے یقین کی لاج نہیں رکھی۔

مجھے معلوم نہیں واپسی کے سفر میں کیا ہوا۔ ایک جگہ رک کر غالب نے ٹیکسی ڈرائیور کو ادائیگی کی۔ اس نے بہت سے نوٹ اسے دئے تھے اور شاید یہ بھی کہا تھا کہ آج کے بعد وہ اس ملاقات کو بھول جائے ورنہ ہم نے ٹیکسی کا نمبر دیکھ لیا ہے۔ ہم گھر بھی دیکھ لیں گے۔ پھر اس نے دوسری ٹیکسی پکڑی تھی۔ آخری بات مجھے یہ یاد ہے کہ سورج غروب ہو رہا تھا جب ہم نے پیدل چلنا شروع کیا اور "ارجن داس الموینم" کے گیٹ سے اندر داخل ہوگئے۔

نازو نے باری باری ہم سب کی صورت دیکھنے کے بعد کہا۔ "رابعہ کہاں ہے؟" کسی نے اس کو جواب نہیں دیا۔ گل روتی ہوئی اندر بھاگ گئی۔ کتنا اچھا ہوتا اگر میں بھی رو سکتا۔ میں نے سوچا۔ وہ بوجھ جو میرے سینے پر چٹان کی طرح رکھا ہوا تھا۔ آنسوؤں سے پگھل کے بہہ جاتا۔ اس سے بھی اچھا ہوتا اگر میں پاگل ہو جاتا۔ احساس سے بیگانہ ہو جاتا، مر جاتا۔

نازو نے چلا کے کہا "غالب! بتاتے کیوں نہیں۔"

غالب نے رابعہ کا خط اس کو پکڑا دیا "اندر جا کے پڑھو۔ اور چیخنے چلّانے کی ضرورت نہیں۔ گل کو بھی سمجھا دو کہ عقل سے کام لے۔"

میں نے کہا "وہ رابعہ کو رو رہی ہے۔"

"رابعہ کوئی مر نہیں گئی ہے۔ وہ کچھ دن کے لئے واپس چلی گئی ہے اور بس" غالب نے برہمی سے کہا۔ ہم سب اندر جا کے کمرے میں ایسے بیٹھ گئے جیسے میت والے گھر میں سوگوار بیٹھتے ہیں۔

محسن نے سامنے آ کے کہا "رابعہ کہاں چلی گئی؟ لاہور؟"

غالب نے کہا "واپس کا مطلب اور کیا ہو سکتا ہے؟"

"مگر کیوں؟ کیا وہ شہلا کو لائے گی اپنے ساتھ؟ اور میرے بیٹے کو" محسن نے خوش ہو کے کہا "چلو، یہ اچھا ہوا۔ آج سارا دن میں کوشش کرتا رہا مگر لاہور کی لائن نہیں ملی۔"

"تم فون کرتے رہے۔ کہاں سے؟" غالب نے کہا۔

"آفس میں فون ہے" محسن بولا "منو میاں نے تالا کھول دیا تھا۔"

میں نے کہا "شہلا کا کون سا فون نمبر ہے....؟"

"میں اپنے یار عبدالودود منظر ایڈوکیٹ کو فون کرتا رہا۔ لائن مل جاتی تو وہ بتا دیتا" محسن نے کہا "تم لوگ خواہ مخواہ ناراض ہو رہے ہو۔ مجھے اعتبار ہے تم پر کہ تم نے غلط نہیں کہا تھا۔ وہ حرام زادہ تریویدی جھوٹ بول رہا تھا۔ نازو نے بھی یہی بتایا تھا۔ اسی لئے تو میں فون کر رہا تھا۔ میں شہلا سے بات کرنا چاہتا تھا۔ مگر میں اسے یہ نمبر دے دیتا تو وہ منظر کے گھر سے بات کر لیتی۔"

"محسن! یہ کیا بے وقوفی ہے" میں نے کہا "کیا تمہیں اندازہ نہیں کہ ٹیلی فون پر بات دوسرے بھی سنتے ہیں۔ اور انڈیا، پاکستان کے درمیان گفتگو سنسر بھی ہوتی ہوگی۔ آج کل حالات ایسے ہی ہیں۔ سب کو مروانا چاہتے ہو تم۔"

غالب نے کہا "پولیس سیدھی یہاں پہنچ جائے گی اور ہمیں معلوم بھی نہیں ہوگا۔ تم نے کال بک کروائی ہوگی؟"

محسن نے مجرمانہ انداز میں سر ہلایا "ہاں۔ انٹرنیشنل ٹرنک کال تو بک کرائے بغیر نہیں ہو سکتی۔ مگر میں بے وقوف نہیں ہوں۔ میں نے اپنا نام نہیں بتایا۔ میں نے کہا کہ "ارجن داس الموینم" کا نمبر ہے۔ خود ارجن داس بات کریں گے۔ آپریٹر کو کیا معلوم۔"

"چلو، یہ بھی اچھا ہوا کہ کال ملی نہیں۔ ورنہ تم بات کرتے شہلا سے تو سب کا بیڑا غرق ہو جاتا" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "فوراً کینسل کراؤ کال۔"

"کال کینسل کرا دوں؟" محسن سوچ میں پڑ گیا "خیر تم کہتے ہو تو میں منو میاں سے کہتا ہوں۔ وہ نماز پڑھ رہے ہیں۔"

"سین شین کہاں ہیں؟" میں نے کہا۔

"ان کو منو میاں نے کہیں بھیجا تھا۔ ابھی تک لوٹ کر نہیں آئے" محسن نے کہا۔

اس کے جانے کے بعد میں اور غالب کمرے میں گئے تو گل رو دھو کے چپ ہو گئی تھی اور نازو کے سامنے بیٹھی دیوار کو گھور رہی تھی۔ نازو خط ہاتھ میں لئے کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی اپنے سامنے والی دیوار پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔

"میں یہ نہیں مان سکتی" اس نے جذبات سے عاری سپاٹ لہجے میں کہا "اس میں ضرور دشمنوں کی کوئی چال ہے۔"

میں دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھ گیا "چال کیا ہو سکتی ہے؟ میں رابعہ کی تحریر پہچانتا ہوں"

"تحریر کی بات نہیں۔ یہ سوچو کہ ایسا وہ کیوں کرے گی؟ اس نے مجبور ہو کے یہ قدم اٹھایا ہوگا۔ تحریر تو میں بھی پہچانتی ہوں۔ اس میں کوئی جعلسازی نہیں ہے۔"

"مجبوری کا تو رابعہ نے اعتراف کیا ہے۔ اپنی مجبوری بتا دی ہے۔"

نازو نے نفی میں سر ہلایا "اصل مجبوری کچھ اور تھی جس پر رابعہ نے ایک خواب کا پردہ ڈال دیا۔"

"تم یہ کہہ رہی ہو کہ رابعہ نے جھوٹ بولا ہے جانتے بوجھتے" غالب بولا۔

"یہ خواب والا واقعہ اور سکندر کی آواز سنائی دینے والا معاملہ غلط ہے۔ یہ صرف ہمیں مطمئن کرنے کے لئے ہے۔"

"یہ رابعہ کا نفسیاتی مسئلہ بھی تو ہو سکتا ہے" غالب نے کہا۔ نروس بریک ڈاؤن۔

"نہیں، یا تو تحریر جبر کے تحت حاصل کی گئی ہے..."

میں نے کہا "فضول باتیں مت کرو۔ اس نے قسم کھائی ہے اور وہ جھوٹی قسم نہیں کھا سکتی۔ اس نے لکھا ہے کہ کوئی اسے دس بار گولی مار کے بھی جھوٹی قسم نہیں دے سکتا تھا۔"

"سکندر! جبر کا مطلب صرف جسمانی تشدد ہی تو نہیں ہوتا۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ اسے بلیک میل کیا گیا ہو۔ اس کی کسی کمزوری سے فائدہ اٹھا کے۔ ہر شخص کسی نہ کسی پہلو سے کمزور پڑتا ہے۔"

"رابعہ کو ایسی کسی کمزوری کا سامنا نہیں ہو سکتا" میں نے کہا۔

"کیوں؟ کیا تم تمہاری زندگی، تمہارے تحفظ کی ضمانت۔ یہ رابعہ کی کمزوری نہیں بن سکتے؟" نازو نے کہا "فرض کرو اس سے خفیہ طور پر رابطہ قائم کیا گیا ہو۔ اسے بتایا گیا ہو کہ دشمن تمہارے خلاف قاتلانہ عزائم رکھتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ایم آر ایس کی طاقت تم ہو۔"

"وہ غلط سمجھتے ہیں" میں نے بگڑ کے کہا۔ نازو کے دلائل مجھے پریشان کر رہے تھے۔

"ایسا تم سمجھتے ہو" نازو نے چلّا کے کہا "دشمن کے نزدیک لیڈر ہی سب سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔ ان کا خیال ہو گا کہ سکندر کو ختم کر دو۔ ایم آر ایس بکھر جائے گی۔ ختم نہیں ہو گی تب بھی کمزور پڑ جائے گی۔ پھر اس کو ختم کرنا مشکل نہیں رہے گا۔ فرض کرو..."

"کیا فرض کرو فرض کرو لگا رکھی ہے" غالب نے جھلا کے کہا۔

"آخر تم لوگ میری بات سنتے ہوئے ڈرتے کیوں ہو؟" نازو نے برہمی سے کہا "اگر غلط ہو میری بات تو مسترد کر دینا مگر سننے میں کیا حرج ہے۔ کیا تمہیں اندیشہ ہے کہ میری دلیل کا مقابلہ تمہارے جذبات نہیں کر سکتے؟ مفروضات غلط بھی ہوتے ہیں لیکن صحیح بھی ثابت ہو جاتے ہیں۔"

میں نے کہا "نازو کو اپنی بات کہنے دو۔"

نازو نے کہا "سکندر! فرض کرو انہوں نے تنظیم کو توڑنے کے لئے نفسیاتی حربے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا ہو۔ وہ طاقت سے ہمیں شکست نہیں دے سکے۔ اب انہوں نے سوچا ہو کہ ایک ایک کر کے ان سب کی قوتِ مدافعت ختم کر دو۔ اکٹھے رہیں گے تو ان کی طاقت اتنی ہی ہو گی جتنی لکڑیوں کے گٹھے کی ہوتی ہے۔ ہر لکڑی کو الگ توڑا جا سکتا ہے۔ بوڑھے لکڑہارے کی کہانی یاد ہے نا؟ اتفاق میں برکت والی۔ پہلے انہوں نے شہلا کو اٹھا لیا تھا۔ محسن کو توڑنے کے لئے۔ ان کا خیال تھا کہ محسن کی جذباتی شکست اس کی ایم آر ایس سے علیحدگی کا سبب بن جائے گی..."

"مگر ایسا نہیں ہوا" غالب نے اس کی بات کاٹ دی۔

"ایسا اس لئے نہیں ہوا کہ ہم نے یہ بات محسن کو پتا ہی نہیں چلنے دی۔" نازو نے کہا "یہ بات اسے معلوم ہو جاتی تو شاید......"

"ہرگز نہیں۔ محسن کو میں جانتا ہوں" میں نے کہا۔

"اور تمہیں میں جانتی ہوں" نازو نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا "تمہیں محسن بھی جانتا ہے۔ لیکن تم اپنے آپ کو نہیں جانتے۔ محسن بھی اپنے آپ کو نہیں جانتا۔ یہ سب قیاس آرائیاں غلط بھی ہو سکتی ہیں کہ محسن کے لئے شہلا کے مقابلے میں اس مشن کی زیادہ اہمیت ہے اور وہ محبت کو فرض پر قربان کر سکتا ہے۔ ایسا موقع ابھی آیا ہی نہیں۔ آج اسے بتا کے دیکھو۔ صاف واضح الفاظ میں بتا دو کہ تمہاری بیوی اور تمہارا بچہ کب سے دشمنوں کے قبضے میں ہیں۔ وہ ان کو بارود اور اسلحے کے ڈپو پر لٹا کے کس طرح اپنے مالِ تجارت کے تحفظ کی ضمانت کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔ اور گزشتہ بار تو وہ اتفاق سے بچ گئے تھے۔ شاید قدرت کا مقرر کردہ وقت ابھی نہیں آیا تھا۔ لیکن اگلی بار یا اس سے اگلی بار یہ ہو سکتا ہے کہ ہماری کوئی کامیابی ان کے وجود کو دھوئیں میں تحلیل کر دے۔ محسن کو بتا کیوں نہیں دیتے اگر تمہیں اتنا ہی اعتماد ہے کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا؟"

میں نے پہلے تو غور ہی نہیں کیا تھا مگر جب میں نے غالب کو اشارے کرتے دیکھا تو ایک دم مجھے بھی نازو کی غلطی کا احساس ہو گیا۔ جو بات آج تک کسی نے گل کے سامنے نہیں کی تھی وہ

شدید جذباتی دباؤ میں نازو نے صاف کہہ دی تھی۔ میں اور غالب خاموش بیٹھے گل سے نظریں چراتے رہے مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ گل کو معلوم ہو چکا تھا کہ شہلا کون تھی۔ کسی بھی لڑکی کے لئے اس سے بڑا جذباتی سانحہ کیا ہو سکتا ہے کہ وہ جس پر محبت کے حق ملکیت کا دعوے رکھتی ہو وہ اچانک کسی اور کی ملکیت ثابت ہو جائے۔ ہم سب نے مل کے اسے بھی دھوکا دیا تھا۔ محسن کبھی اس کا نہ تھا۔ یہ ایک سنگدلانہ مذاق تھا، ایک بہت بے رحم کھیل تھا جو ہم سب کے ساتھ محسن نے بھی اس کے جذبات کے ساتھ کھیلا تھا۔

لیکن مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ گل نے نازو کی پوری بات سکون سے سنی تھی اور اب بھی پُرسکون تھی۔ اس نے درمیان میں ایک بار بھی نازو کو ٹوک کر نہیں پوچھا تھا کہ یہ تم محسن کی کس بیوی کا اور کون سے بچے کا ذکر کر رہی ہو؟ کیا میں نے جس شہلا کا ذکر سنا تھا یہ وہی محسن کی بیوی شہلا ہے؟ کیا واقعی محسن شادی شدہ اور ایک بچے کا باپ ہے؟ کیا تم سب یہ بات جانتے تھے؟ تم یہ بھی جانتے تھے کہ میں محسن کو اپنا سمجھتی ہوں۔ اس کی چاہت پر ناز کرتی ہوں۔ پھر تم نے مجھے دھوکے میں اور اندھیرے میں کیوں رکھا؟ بولو۔ نازو، غالب، سکندر......

لیکن اس کی آنکھوں میں کوئی شکوہ نہیں تھا۔ کوئی گلہ نہ تھا۔ اس نے نازو سے سب کچھ ایسے سنا تھا جیسے یہ کوئی انوکھی اور نئی بات نہیں۔ کوئی انکشاف نہیں۔ خیالِ خاطرِ احباب چاہئے ہر دم۔ جیسے ہم سب مل کے اس کی دلداری کا بھرم رکھتے تھے ایسے ہی وہ ہم سب کی دوستداری کا پاس کرتی تھی ورنہ سچ بھی کہیں چھپانے سے چھپتا ہے۔ اسے سب معلوم تھا۔

ایک مجرم خاموشی کے آزار سے بچنے کے لئے غالب نے کہا۔ "یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ انہوں نے رابعہ کو بھی ایسے ہی اٹھا لیا ہو جیسے شہلا کو اٹھایا تھا۔"

میں نے کہا "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اگر وہ رابعہ کو لے جاتے تو گل کو بھی لے جاتے۔"

اچانک گل نے کہا "گل کو لے جاتے تو کیا فرق پڑتا۔ نہ گل کسی کی زندگی ہے اور نہ گل کی زندگی کسی کی ہے۔"

یہ ایک زہر میں بجھا ہوا خنجر تھا جو گل نے بڑی بے رحمی سے میرے دل میں اتار دیا تھا۔ یہ ایک ایسا تیر تھا جس کو اس نے کھینچ رکھا تھا اور اپنے خیالوں کی کمان سے نکلنے نہیں دیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا ہدف ہم ہوں گے مگر آج خود ہم نے کسی احساسِ شرمندگی اور اظہارِ ندامت کے بغیر اس کے سامنے اپنے جھوٹ کا پردہ چاک کر دیا تھا تو یہ تیر خود ہی نکل گیا تھا۔ ذہن میں آنے والا خیال الفاظ کے روپ میں ڈھل کر اس کی زبان پر آ گیا تھا۔ اس نے بھی ایک سچ بول دیا تھا کہ میرا مقابلہ شہلا سے یا رابعہ سے کیوں کرتے ہو۔ ان کو وہ محبت میسر ہے جس کی آبرو کے لئے زندگی کی بازی لگائی جا سکتی ہے اگر جیت گئے تو کیا کہنا ہارے بھی تو بازی مات نہیں۔ شہلا کے لئے محسن جان دے سکتا ہے۔ رابعہ کے لئے سکندر جان دے سکتا ہے اور نازو کے لئے غالب۔ گل کے لئے کون ہے جان دینے والا۔ پھر اس کی جان کی قدر ہی کیا۔

خاموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد میں نے کہا "گل! تمہاری زندگی بھی اتنی ہی اہم ہے ہم سب کے لئے..... یہ تم نے کیوں سمجھ لیا ہے کہ....."

گل نے کہا "مجھے معاف کر دیں سکندر بھائی، میں نے بہت گھٹیا بات کی ہے۔ آپ سب لوگوں کی محبت کو گالی دی ہے میں نے۔ مجھے ایسا نہیں کہنا چاہئے تھا۔"

غالب نے کہا "مجھے معلوم تھا کہ یہ بات چھپائی نہیں جا سکتی۔ ایک نہ ایک دن تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ ہم جھوٹ بول رہے تھے۔ لیکن ہم سب کا خیال تھا کہ یہ جھوٹ ضروری ہے۔ تمہاری بہتری کا ایک پہلو تھا اس میں۔ لیکن وہ بعد میں ایک ایسی غلطی بن گیا جس کی تلافی کی کوئی صورت نہیں رہی۔ ہم سب ڈرتے رہے کہ اب تمہیں سچ کیسے بتائیں۔"

"یہ غلط نہیں ہے گل کہ رشتے اہم ہوتے ہیں، ان کی نوعیت نہیں۔ مجھے میری ماں زیادہ چاہتی تھی یا رابعہ زیادہ چاہتی ہے۔ مجھ سے میرے باپ کو زیادہ محبت تھی یا محسن کو ہے۔ یہ میں ناپ تول کے کیسے بتا سکتا ہوں۔ تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ ان سب سے میرے جذبات کا رشتہ ٹوٹ جائے تو میری زندگی میں خلا پیدا ہو جائے گا جو شاید کبھی پُر نہ ہو۔ تم مانو یا نہ مانو، مگر تم نے ہم سب کے دل میں جگہ بنا لی ہے۔ تم ہمارے گھر اور ہمارے خاندان میں ہو۔ تمہاری جگہ خالی ہو گی تو اس کا احساس ہم سب کو اتنی ہی شدت کے ساتھ ہو گا جتنا رابعہ، شہلا یا نازو کے نہ ہونے کا یا میرے، غالب کے اور محسن کے نہ ہونے سے۔ کوئی اور اس جگہ کو پُر نہیں کر سکتا۔ خدا کے لئے ایسا مت سوچو کہ تمہاری زندگی کسی کے لئے اہم نہیں ہے۔"

ان سب دلائل کے باوجود جن کا گل کے پاس کوئی جواب نہیں تھا اور اب جو غلط بھی نہ تھے۔ میں یہ تسلیم کرنے پر مجبور تھا کہ میں حقیقت سے آنکھیں چرا رہا ہوں اور گل کی بات کا رخ بدل رہا ہوں۔ اس کے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ دشمن مجھے اس لئے نہیں لے جا سکتے کہ میں کسی کی کمزوری نہیں ہوں۔ جیسے شہلا کو انہوں نے محسن کی کمزوری سمجھ کے اٹھایا تھا۔ ایسے ہی وہ رابعہ کو بھی لے جا سکتے ہیں کیوں کہ وہ میری کمزوری ہے۔ اور نازو کو لے جا سکتے ہیں جو غالب کی کمزوری ہے مگر گل کسی کی کمزوری نہیں ہے۔ اس کو اغوا کر کے وہ کس کو جذباتی طور پر کمزور کرنے کا سوچیں گے؟

نازو بالکل خاموش تھی اور اس کی یہ خاموشی اس کے اعترافِ جرم سے کم نہ تھی۔ اس نے بھی گل سے جھوٹ بولا تھا اور اس جھوٹ کو نبھانے میں ہمارے ساتھ مسلسل جھوٹ بولتی

رہی تھی۔ عذرِ گناہ بدتر اَز گناہ۔ اب اس کے سوا ہم کیا کہہ سکتے تھے کہ ہمارے سچ سے محسن کو بھی نقصان ہوتا اور گل کو بھی۔ لیکن سچ کسی پھوڑے کی طرح پکتا گیا تھا جو آخر کار پھوٹ گیا تھا۔ اب اس سے خارج ہونے والے مواد کی کراہیت کو چھپانا ممکن ہی نہ تھا۔ اب یہی بہتر تھا کہ اسے نشتر لگا کے چیر دیا جائے اور سارے مواد کو خارج کر دیا جائے۔

نازو نے اچانک کہا "گل! تم کو..... یہ کیسے معلوم ہوا..... میرا مطلب ہے کب....."

گل تلخی سے مسکرائی "کیا عشق چھپائے چھپتا ہے؟ تمہیں کیسے معلوم ہوا اور کب معلوم ہوا کہ میں محسن کو چاہنے لگی ہوں؟ میں نے تو بہت کوشش کی تھی چھپانے کی، پھر بھی تم سب کو پتا چل گیا۔ کیسے، کیوں اور کب۔ یہ سب غیر اہم ہے۔ میں نے بھی جان لیا تھا کہ محسن کی بے نیازی اور تغافل کے انداز میں کسی اور کی محبت کا دخل ہے۔ تم نے شہلا کا نام آتے ہی انجان بننے اور محسن سے اس کے تعلق کی پردہ پوشی کی۔ میں نے اسی سے سمجھ لیا تھا کہ شہلا کے سوا میری محبت کا راستہ روکنے والی کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ پھر میں نے محسن کی زبان سے سن لیا۔ سوتے میں' جاگتے میں۔ بالکل غیر ارادی طور پر اس نے اپنا راز افشا کر دیا۔ لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا مجھے۔ میں نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا کہ میں محسن کے دل سے شہلا کی محبت کو نہیں نکال سکتی۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ خود یا تم میرے دل سے اس کی محبت کا نقش نہیں مٹا سکتے۔ جو ہے سو ہے۔ کیوں کا کیا سوال۔ یہ بھی فضول بات ہے کہ ایسا ہونا چاہیے اور ویسا نہیں ہونا چاہیے۔ میں چاہوں کہ شہلا کو محسن سے یا محسن کو شہلا سے پیار نہیں کرنا چاہئے اور ان کے رشتے کو دیکھتے ہوئے مجھے محسن کی محبت کے پاگل پن میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے۔ تو میرے چاہنے یا نہ چاہنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ تم جو چاہو سمجھو' جو چاہو کہو۔ میں مجبور ہوں۔ اتنی ہی جتنے تم سب ہو۔ اتنی ہی بے بس ہوں جتنے محبت کرنے والے ہوتے ہیں۔ فرق اگر ہے تو صرف اتنا کہ تم محبت میں سب کچھ پا لو گے۔ میں سب کچھ گنوا دوں گی' خوشی خوشی۔"

میں نے کہا "دیکھو گل! یہ سب اگر محسن نے سنا تو کیا ہوگا؟ کیا سمجھے گا وہ؟"

گل نے روتے روتے کہا "بھائی سکندر! میں بھی تمہاری طرح شہلا کی زندگی اور اس کی سلامتی چاہتی ہوں۔ میں تم سے زیادہ فکر مند اور خوفزدہ ہوں کہ خدانخواستہ اسے کچھ ہو گیا تو کہیں الزام میری چاہت پر نہ آ جائے کہ میں نے ایسا چاہا تھا۔ خدا کی قسم' میں اتنی ذلیل نہیں ہوں۔ میں بھی نہیں چاہتی کہ محسن کو کچھ معلوم ہو۔ آپ سب بھی مجھ پر رحم کریں۔" وہ ہاتھ جوڑ کے بولی "پھر کبھی یہ بات نہ کریں، نہ مجھ سے اکیلے میں، نہ کسی کے سامنے۔ مجھے معلوم ہے محسن کتنا دکھی ہے۔ میں اس کے دکھ میں اضافہ کرنا نہیں چاہتی۔ میں نے تو چاہا تھا کہ اس کے سب دکھ لے لوں۔ شہلا کی جگہ میں چلی جاؤں مگر...... وہ نہیں مانے۔"

اس بات نے ہم سب کو چونکا دیا "کون نہیں مانا" غالب نے کہا۔

"وہی۔ جنہوں نے شہلا کو قید کر رکھا ہے اور کون...."

"تم... تم نے ان سے بات کی تھی؟" میں نے کہا۔

گل نے اقرار میں سر ہلایا "تم اسے غلطی کہو' نافرمانی یا بے وقوفی۔ مگر میں سمجھتی ہوں کہ میں نے جو کیا تھا ٹھیک تھا۔ میں نے تریویدی سے بات کی تھی۔"

میں بھونچکا رہ گیا "تم نے اسے فون کیا تھا؟"

"ہاں۔ فون بھی کیا تھا اور پیغام بھی بھجوایا تھا' ڈاک سے کہ وہ شہلا کو چھوڑ دے.... اس کی جگہ میں آنے کے لئے تیار ہوں۔"

"تمہارا کیا خیال تھا۔ وہ مان جائے گا؟" میں نے برہمی سے کہا "جتنا تمہیں محسن کا خیال ہے اتنا ہی انہیں بھی ہوگا کہ...."

"میں نے... محسن کے حوالے سے بات نہیں کی تھی۔ میں نے تو کہا تھا کہ شہلا ایک ماں ہے۔ اس کے ساتھ ایک معصوم بچہ ہے جو کچھ نہیں جانتا اور کچھ نہیں سمجھتا۔ اس پر رحم کرو۔"

"بے وقوف لڑکی! وہ رحم کے لفظ کو بھی نہیں سمجھتے۔ کسی رشتے کی حرمت کو تسلیم نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک شہلا ایک عورت ہے جس پر زیادہ درندگی کے ساتھ جسمانی تشدد کیا جا سکتا ہے۔ وہ ایک ماں بھی ہے جس کے سامنے اس کے بیٹے کو انگاروں پر لٹایا جائے یا کند چھری سے ذبح کیا جائے تو وہ برداشت نہیں کر سکتی۔ اس کی قوتِ مزاحمت جواب دے جائے گی۔ وہ دشمنوں کی آلۂ کار بننے پر مجبور ہو جائے گی۔ اور گل! وہ ایک بیوی بھی ہے۔ اگر اس کے شوہر کے سامنے....."

نازو نے کہا "رابعہ بھی تو ایک عورت ہے۔ ایک محبت کرنے والی عورت۔"

"تم جانتی ہو کہ اس نے کیسی کیسی ذلت آمیز اذیت برداشت کی تھی اور خود میں نے وہ سب کچھ دیکھا تھا اپنی آنکھوں سے۔ غالب سے پوچھو کہ اس پر کیا بیتی تھی" میں نے غصے سے کہا۔

"غالب سے مت پوچھو۔ مجھ سے پوچھو۔" نازو نے کہا۔

"ابھی تک میں نے تمہیں اپنا سرکاری ترجمان مقرر نہیں کیا۔" غالب نے احتجاج کیا۔

"تمہارے انکار سے کچھ نہیں ہوتا" نازو نے تڑخ کے کہا۔

غالب نے میز پر مکا مارا "انکار کا حق مجھے اس وقت بھی حاصل رہے گا جب قاضی پوچھے گا کہ قبول کیا؟ حالانکہ میرا سسر ایک بھوت ہے مگر میں اس سے بھی نہیں ڈرتا۔"

"کرو نا انکار۔ پروا کرتی ہے میری جوتی۔"

"بابا' میں نے کب کہا ہے کہ تمہیں قبول کرنے سے انکار

کر دوں گا۔ تم ابھی پوچھ کے دیکھو۔" غالب نے کہا "ویسے ہے یہ بے شرمی کی بات کیوں کہ پیغام لڑکے والے دیتے ہیں یا لڑکا پوچھتا ہے۔"

نازو آگ بگولا ہو کے اٹھی ہی تھی کہ میں نے اسے ہاتھ پکڑ کے بٹھا دیا "لڑائی سے لڑائی نکالنا تم دونوں کو آتا ہے۔ پتا نہیں تم دونوں کا گزارا کیسے ہوگا۔"

"ایسے ہی ہوگا جیسے جیلر کا قیدی کے ساتھ ہوتا ہے" غالب نے کہا "کیوں نازو؟"

"مجھ سے کیوں پوچھتے ہو' جا کے پوچھو اس سے جو یہ قید قبول کرنا چاہے۔" نازو بگڑ گئی۔

"پھر وہی الٹی بات۔ قیدی میں نے اپنے آپ کو کہا تھا۔ جیلر تو بن سکتی ہو تم۔ بلکہ جلاد تک بن سکتی ہو" غالب بولا "دل توڑنے سے زیادہ گردن توڑنا آتا ہے تمہیں۔"

نازو ہنس پڑی۔ "سکندر کا دل رونے کو چاہتا ہے اور تم مذاق کر رہے ہو۔"

میں نے چونک کے کہا۔ "لاحول ولا قوۃ! اپنی لڑائی میں مجھے مت گھسیٹو۔"

نازو نے کہا "میرا خیال ہے سکندر کہ رابعہ حوصلہ ہار گئی۔ کسی نے اسے دہشت زدہ کیا۔ تمہارا نام لے کر دھمکی دی کہ تمہیں قتل کر دیا جائے گا۔ لیکن وہ واپس چلی جائے تو تمہیں زندہ سلامت اس کے پاس پہنچا دیا جائے گا۔ اسے کسی نہ کسی طرح یقین دلایا گیا ہوگا کہ یہ محض دھمکی نہیں ہے۔ اور وہ ڈر گئی۔ اس نے بہتر یہی سمجھا کہ واپس لوٹ جائے۔"

"یہ ناممکن ہے" میں نے کہا۔

"ناممکن کوئی لفظ نہیں۔ جو آج ناممکن ہے وہ کل ممکن بھی ہو سکتا ہے" نازو نے قطعی بے رحمی سے کہا "رابعہ بہر حال عورت تھی' کوئی پتھر کی چٹان نہیں تھی۔"

"خود تم کیا ہو؟ مجھے بتاؤ۔ اگر ایسا تمہارے ساتھ ہوتا" میں نے غصے سے کہا۔

"میں کیا کہہ سکتی ہوں کہ کب تک میرے اعصاب میرا ساتھ دیں گے۔ میں بھی بشر ہوں۔ ہار سکتی ہوں" نازو نے صاف کہا۔ "میں کوئی دعویٰ نہیں رکھتی ناقابلِ شکست ہونے کا۔ آج زبان سے دعوے کرنا آسان ہے۔ کل جب عملاً کچھ کرنا پڑا تو میں کیا کروں گی۔ یہ میں نہیں جانتی۔"

"لیکن میں جانتا ہوں۔ تم غالب کو خود گولی مار سکتی ہو" میں نے کہا۔

"جیسے تم رابعہ کو مار سکتے ہو" نازو نے طنز سے کہا "ہے نا یہی بات؟ باتیں کرنا تو واقعی بہت آسان ہے۔"

غالب کسی سوچ میں غرق تھا۔ اس نے اچانک کہا "اگر ایسا ہے تو معلوم ہو جائے گا۔ رابعہ ہمت ہار گئی ہے تو وہ سکندر کو بھی ہم سے چھین کر لے جانے کی کوشش کرے گی۔ اس کے ارادوں کی راہ میں جذباتی خندقیں حائل کرنا پڑیں گی۔ ایک طرح سے وہ دشمن کی آلۂ کار بن جائے گی۔"

نازو نے کہا "یہ قطعی ضروری نہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ رابعہ خود کو سکندر کے راستے سے ہٹا لے۔ اس کی زندگی سے نکل جائے تاکہ اس کے لئے کوئی مشکل نہ رہے۔ وہ اپنی محبت کو اور اپنے ارمانوں کو قربان کر سکتی ہے۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ اس میں سکندر کی بہتری ہے۔ اگر وہ سکندر کا ساتھ نہیں دے سکتی تو اس کا راستہ کیوں روکے۔ سکندر کو صدمہ ایک ہی بار ہوگا۔ آخر کار وہ رابعہ کو بھول جائے گا۔"

میں نے کہا "نازو! خدا کے لئے اتنی بے رحم مت بنو۔ میں اسے کیسے بھول سکتا ہوں۔"

نازو نے کہا "وقت ہر زخم کو بھر دیتا ہے۔ مگر دیکھو' مجھے غلط مت سمجھو۔ میں بھی عورت ہوں اور اپنی کمزوری کا اعتراف کرنے کے باوجود میں یہ بھی جانتی ہوں کہ مجھ میں کتنی طاقت ہے۔ رابعہ تمہاری طاقت بھی بن سکتی ہے تو تم سے اپنی طاقت منوا بھی سکتی ہے۔ ابھی تو بات صرف اتنی ہے کہ وہ چلی گئی ہے' اپنی مرضی سے یا کسی اور کی مرضی سے۔ حقیقت کیا ہے۔ اصل اسباب کیا ہیں؟ رابعہ کس حد تک مجبور تھی۔ کیا کسی نے اسے بلیک میل کیا یا کوئی تمہیں بلیک میل کرنا چاہتا ہے؟ اس نے خود کو کمزور پڑتا دیکھ کر یک طرفہ طور پر فیصلہ کر لیا کہ اس کا الگ ہو جانا ہی سب کے مفاد میں ہے۔ یا کوئی اور بات ہے' اس کا پتا چل جائے گا۔ اچھی بات یہ ہے کہ تم کمزور نہیں پڑے۔"

نازو کی بات اب میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ شاید اصل بات رابعہ نے مجھ سے اور ہم سب سے چھپالی۔ دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز۔ یعنی وہ جھوٹ بہتر ہے جس میں بہتری ہو بہ نسبت اس سچ کے جس میں خرابی ہو۔ اس نے اپنی مجبوری کے لئے ایک ایسا جذباتی عذر تلاش کر لیا جسے ہم عقل کی دلدل سے مسترد نہ کر سکیں۔ وہ واپس جانا چاہتی تھی کیوں کہ وہ ہمارا ساتھ نہیں دے سکتی تھی اور یہ سمجھتی تھی کہ اس کی موجودگی ہمارے لئے مسائل پیدا کر رہی ہے مگر رابعہ اس حقیقت کا اعتراف ہم سب کے سامنے کیسے کر سکتی تھی بزدل' بے وقوف لڑکی' اتنی جلدی ہمت ہار گئی۔ اب وہ کیا کرے گی؟ لاہور میں بیٹھ کے میری راہ دیکھے گی؟ میری سلامتی کے ساتھ واپسی کے لئے دعائیں مانگے گی۔ رات رات بھر جاگ کے کاٹے گی اور اپنی تنہائی سے باتیں کرے گی۔

رنج اور صدمے کے ساتھ میرا غصہ بڑھ رہا تھا۔ آخر اس نے مجھ پر بھروسا کیوں نہیں کیا۔ میں اسے زبردستی ساتھ نہ رکھتا۔ وہ صاف کہہ سکتی تھی کہ سکندر میں تھک گئی ہوں۔ مجھ میں اور ہمت نہیں ہے آگے جانے کی۔ مجھے واپس جانے دو۔ ایسی بزدل اور کم حوصلہ لڑکی سے کیا بعید۔ وہ انتظار بھی نہ کر سکے۔ مایوس ہو کے ان

سب خوابوں سے دستبردار ہو جائے جو اس نے میرے ساتھ دیکھے تھے۔ صرف اسے یہ حق حاصل نہیں تھا کہ ان خوابوں سے تعبیر چھین لے۔ ان پر میرا بھی حق تھا۔

پھر رابعہ کی آواز نے میرے خیالات کی رو پلٹ دی۔ اس نے کہا سکندر! تم کیا سوچ رہے ہو؟ ایسا کیوں سوچ رہے ہو؟ تم مجھے جھوٹا سمجھ رہے ہو' حوصلہ ہار رہے ہو ابھی سے۔ تم کو میرے وعدوں پر اعتبار نہیں رہا۔ میں نے کہا تا کہ میں پھر ملوں گی۔ اسی دنیا میں، اسی زندگی میں۔ تم اپنا سفر جاری رکھو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔

میں شرمندہ ہو گیا۔ عدم اعتماد کا مظاہرہ رابعہ نے نہیں کیا تھا' میں کر رہا تھا۔ اس نے مجھ سے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ اس کے ساتھ وہی ہوا ہوگا جو اس نے لکھا ہے مگر یہ بات میری عقل میں نہیں آسکتی، کسی کی عقل میں نہیں آسکتی۔ اس لئے کہ یہ عقل کی نہیں جذبات کی بات ہے۔ ای ایس پی۔ چھٹی حس۔ ٹیلی پیتھی۔ بہت سی باتیں انسانی تجربے کا حصہ ہیں مگر نا قابلِ فہم۔

غالب نے کہا "سوچنے کی بات یہ ہے کہ رابعہ نے واپس جانے کے لئے راستے کی مشکلات کو کیسے نظر انداز کیا۔ اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ پاسپورٹ نہ نقد رقم۔ وہ اکیلی کیسے جائے گی۔"

نازو نے کہا "وہ آئی بھی تو اکیلی تھی۔ راستہ نکالنا اور وسائل پیدا کرنا اسے آتا ہے۔ وہ جس راستے پر جیسے آئی تھی اسی راستے پر اسی طرح واپس کیوں نہیں جا سکتی۔"

محسن منہ لٹکائے اندر آیا اور میرے قریب بیٹھ گیا "گل کیوں اداس ہے؟"

نازو نے آہ بھر کے کہا "بلبل نے آشیانہ چمن سے اٹھالیا۔"

"کیا واپس میکے چلی گئی؟" محسن بولا "اداس تو بلبلے کو ہونا چاہئے۔"

غالب نے میری طرف اشارہ کر کے کہا "بلبلے کی حالتِ زار کہتی ہے۔ تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے۔"

محسن نے میرے کندھے پر ہاتھ مار کے شگفتگی سے کہا "یار' ہم بلبل کے وارنٹ نکلوادیں گے یا تصویر لگوادیں گے اخبار میں کہ بلبل کسی بھی آشیاں میں ہو فوراً لوٹ آئے۔ اسے کچھ نہیں کہا جائے گا۔ اس کے بغیر بلبلے کی حالت خراب ہے۔"

نازو نے کہا "اور ہم بہار کو بھی واپس لے آئیں گے۔ سدا بہار پھول اور پودے ہوں گے تو بہار جائے گی کیسے۔"

محسن نے سب کو ہنستے دیکھ کر کہا "تم بھی مسکراؤ گلِ نو بہار۔ ورنہ میں کرتا ہوں گدگدی۔"

میں نے اسے حیرانی سے دیکھا۔ یکلخت وہ پرانا محسن بن گیا تھا۔ شگفتہ مزاجی' شوخی اور زندہ دلی کا پیکر۔ میرا خیال تھا کہ وہ کال کینسل کرا کے آئے گا تو اس کا موڈ زیادہ خراب ہوگا۔

گل مسکرانے لگی "بھائی سکندر کو ہنساؤ تو مانیں۔"

"میں ہنسا دوں گا' پھر مانو گی؟ بولو" محسن نے بڑے یقین کے ساتھ کہا۔

گل نے گڑبڑا کے کہا "کیا؟"

"جو بھی میں کہوں" محسن نے شرارت سے کہا۔

گل کا رنگ گلِ لالہ جیسا ہو گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے ہم سب کی خاطر محسن نے اپنے غم پر بے حسی کا پردہ ڈال دیا ہے اور دکھ کو اپنے دل کی دیواروں میں قید کر دیا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے گل نے محسن کی چاہت کو اپنی دل کی دیواروں میں قید کر دیا تھا کیوں کہ وہ اپنے غم کے بارے میں سب کو اذیت میں مبتلا کرنا نہیں چاہتے تھے۔ پھر کیا میں ہی اتنا بے بس دلاچار ہوں کہ اپنے دل کا درد نہیں چھپا سکتا اور ان سب کی خاطر ہنس نہیں سکتا جو مجھے افسردہ دیکھ کے افسردہ ہو جاتے ہیں۔ رابعہ کے خیال نے کہا۔ یاد کرو اس وقت میں نے تمہیں کیا کہا تھا جب تم زنداں کی دیوار کے دوسری طرف تنہا' مایوس اور دل گرفتہ بیٹھے تھے۔ جدا ہیں آج اگر ہم تو کل بہم ہوں گے۔ یہ چند روزہ جدائی تو کوئی بات نہیں۔ اور تم خوش ہو گئے تھے پھر آج کیوں منہ لٹکائے بیٹھے ہو۔

میں ہنسنے لگا۔ محسن ہنسنے لگا' پھر گل ہنسنے لگی۔ ہنسی علاجِ غم ہے۔ فرار پسند' بادیں لوگ سارے غم نشۂ شراب کی خود فراموشی میں ڈبوتے ہیں اور خود بھی ڈوب جاتے ہیں۔ پینے والوں کو سب کچھ سہنا پڑتا ہے۔ کبھی اپنے لئے' کبھی اپنوں کے لئے سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ دل کا لہو آنکھ سے آنسو بن کر ٹپکنا چاہے تو اس کا راستہ روکنے کے لئے ہونٹوں پر مسکراہٹ کو مسلط کرنا پڑتا ہے اور اسی طرح ہنسنا پڑتا ہے جیسے محفل میں سب خندہ زن ہوں۔ یہ کوئی نہ سمجھے کہ اس ہنسی کے پیچھے کیا ہے۔ کتنا جبر ہے اور کتنا صبر۔ کتنا اختیار ہے اور کتنا خلفشار۔ کتنا سچ ہے اور کتنا جھوٹ۔

منّو میاں نے اچانک قدم رنجہ فرما کے رنگِ محفل بدل دیا۔

"بھئی آج تو خوب رونق ہے۔ سبحان اللہ! یہ خاتون کون ہیں جن کی آنکھوں میں ساری مستی نشیش کی سی ہے۔"

گل کی آنکھیں رونے سے لال ہو رہی تھیں چناں چہ منّو میاں نے میر کے شعر کو حسبِ حال کرتے ہوئے شراب کی جگہ چرس ڈال دی اور پھر اپنی بات پر خوب ہنسے۔

غالب نے کہا "یہ گل ہے"

"صرف گل۔ چہ خوب۔ رنگت میں گلِ لالہ۔ صورت میں گلِ نرگس۔"

غالب نے کہا "یہ گل بانو ہے۔"

"اچھا اچھا۔ اور بھئی وہ کہاں ہیں" منّو میاں بولے "سکندر اعظم کو فاتح اور مفتوح بنانے والی۔ محبت کی عدالت میں مدعی اور مدعا علیہ۔ ملاؤ اسی بات پر ہاتھ۔"

غالب نے ان کے آگے بڑھے ہوئے ہاتھ پر چٹاخ سے ہاتھ

مارا۔ اتنی قوت سے کہ منّو میاں کا ہاتھ لال ہو گیا ہوگا "وہ میکے چلی گئی ہے کچھ دن کے لئے۔"

منّو میاں نے پھیکی ہنسی کے ساتھ کہا "بھئی' کیوں ہم بوڑھوں پر طاقت آزماتے ہو۔ اللہ کرے زورِ شباب اور زیادہ مگر اس کے لئے جو۔۔۔۔"

ان کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی میں نے کہا "وہ منکر نکیر کہاں ہیں؟"

"وہ ایک اہم کام سے گئے ہیں۔ کچھ معلومات ایسی ملی تھیں کہ تصدیق ضروری تھی" منّو میاں ایک دم سنجیدہ ہو گئے۔

"معلومات کہاں سے حاصل ہوتی ہیں آپ کو؟" میں نے کہا۔

غالب نے بھی سرہلایا "اور یہ کس قسم کی معلومات ہیں؟"

"ایک طرح سے ہمارا اور تمہارا کام بالکل ایک ہے۔ فرق صرف یہ تھا کہ ہم مشرقی حصے میں سرگرمِ عمل تھے۔ تم مغربی حصے میں۔ دشمن بھی ہمارے وہی تھے جو تمہارے۔ تمہیں یہ تو معلوم ہوگا کہ مشرقی پاکستان میں علیحدگی پسندوں کے خلاف مزاحمت کرنے والے منظم ہو گئے ہیں۔ مکتی باہنی جیسی تنظیموں کے خلاف البدر اور الشمس جیسی قوتیں ہیں۔ فرق صرف وسائل کی کمی کا ہے۔ دہشت گردوں اور تخریب کاروں کو باہر سے وافر امداد مل رہی ہے۔ پیسے کی صورت میں بھی اور اسلحے کی شکل میں بھی۔ ہم کس سے مانگنے جائیں؟ بس خدا سے ہمت مانگتے ہیں۔ وہی مُسبّب الاسباب ہے۔ وسائل بھی پیدا کر دیتا ہے۔ ہمارے مقابل کرائے کے لوگ ہیں۔ لالچی اور بے ضمیر۔ صرف پیسے کے لئے لڑنے والے۔ وہ بہادر کیسے ہو سکتے ہیں۔ انہیں جان پیاری ہے۔ پیسہ انہوں نے جینے کے لئے لیا ہے، مرنے کے لئے نہیں۔ ایک بار نہیں سیکڑوں بار ایسا ہوا کہ ہمارے سامنے اگر سیکڑوں تھے تو ہمارا شمار درجنوں میں کیا جا سکتا تھا مگر وہ بلا مقابلہ بھاگ کھڑے ہوئے اور جو پکڑے گئے انہوں نے بڑی ڈھٹائی سے کہا کہ ہمیں معلوم ہے تم پکڑ لوگے تو قتل نہیں کرو گے پھر ہمیں کیا ضرورت ہے تمہاری گولی کا نشانہ بننے کی۔"

"یعنی وہ دونوں طرف کے غدار ہیں؟" میں نے کہا۔

"کیا یہ بات انہیں معلوم نہیں جو معاوضے پر ان کی خدمات حاصل کرتے ہیں اور انہیں اسلحہ فراہم کرتے ہیں؟" غالب نے کہا۔

"کیوں نہیں معلوم۔ لیکن وہ ہر محاذ پر موجود نہیں رہ سکتے۔ قید ہو جانے والے بھی یہی کہتے ہیں اور بلا مقابلہ بھاگ جانے والے بھی کہ دشمن کی طاقت بہت زیادہ تھی۔ ہم نے تو ڈٹ کے مقابلہ کیا مگر اسلحہ ختم ہو جانے کے بعد ہم کیا کرتے۔"

"اور وہ یقین کر لیتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"نہ یقین کریں تو کیا کریں؟ انہیں خود گولی ماردیں؟ میدانِ جنگ سے فرار ہونے والے سپاہی کی طرح ان کا کورٹ مارشل تو ہو نہیں سکتا" منّو میاں بولے۔

"وہ اسلحہ استعمال ہی نہیں کرتے تو پھر کیا کرتے ہیں؟"

"کچھ ہمارے ہاتھ لگ جاتا ہے۔ باقی وہ دوسروں کو بیچ دیتے ہیں۔ کبھی ہمارے ایجنٹ خرید لیتے ہیں تو کبھی پھر دشمن کے ایجنٹ لے جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ ہر جگہ ایسا ہو رہا ہے۔ لوگ مار بھی رہے ہیں اور مارے بھی جا رہے ہیں۔ ہماری قوت بھی منتشر ہے۔ وہ نہتی بستیوں پر حملے کر دیتے ہیں۔ راہ چلتے لوگوں کو مار جاتے ہیں۔ کشتیوں پر فائرنگ کرتے ہیں اور چھپ کر پُلوں پر سے گزرنے والی لاریوں کے مسافروں کو بھون ڈالتے ہیں۔ ہم بھی تاک میں رہتے ہیں اور غداروں کو چن چن کے مارتے ہیں۔ لیکن کبھی وہ اکٹھے ہو کے آتے ہیں اور غیر متوقع طور پر محصور ہو جانے کی نوبت آجائے تو پھر ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ بعض اوقات ہمیں اطلاع مل جاتی ہے۔ بعض اوقات ان کے اندازے غلط ہو جاتے ہیں یا ہم انہیں غلط اطلاعات کے جال میں پھنسا کے گھیر لاتے ہیں۔"

"اچھا شکاری کون ثابت ہو رہا ہے؟"

"اچھا شکاری وہ ہے جس کی تقدیر اس کے ساتھ ہو" منّو میاں نے کہا "ورنہ ہر تدبیر دھری رہ جاتی ہے۔"

"آپ لوگ کس تنظیم سے منسلک ہیں؟"

"منسلک ہم کسی سے نہیں اور سب سے ہیں" منّو میاں بولے "مقصد کو دیکھا جائے تو ہم سب کے ساتھ ہیں۔ طریقۂ کار ہمارا اپنا ہے۔ ہم دوسروں کی مدد بھی کرتے ہیں اور خود بھی مدد مانگ لیتے ہیں ضرورت پڑنے پر۔ اس قسم کے تعاون کے بغیر کام نہیں چلتا۔ بس ہم سیاست میں الجھن نہیں چاہتے اور مصلحت دیکھ کر کام کرنے والوں کا ساتھ نہیں دیتے۔"

"پھر بھی کتنے لوگ ہیں جو آپ کا حکم مانتے ہیں؟ آپ کی منصوبہ بندی کے مطابق کام کرتے ہیں۔"

"بہت ہیں، ہر جگہ ہیں۔ سب ایک دوسرے کو نام سے نہیں جان سکتے اس لئے نمبر سے پہچانتے ہیں۔ نمبر بدلتے رہتے ہیں اور بہت خفیہ رکھے جاتے ہیں ورنہ دشمن ہماری صفوں میں شامل ہو جائے۔ غلط قسم کے لوگ نکال بھی دئے جاتے ہیں۔ ہم تین یہاں آئے ہوئے ہیں لیکن باقی سب سے ہمارا رابطہ قائم ہے۔ مقررہ وقت پر میں ایک شخص سے رابطہ قائم کرتا ہوں۔ وہ مجھے اہم معاملات کی مختصر رپورٹ دیتا ہے اور مجھ سے ہدایات لیتا ہے۔"

"وائرلیس؟"

"ظاہر ہے۔ ہمارے پاس شارٹ ویو ٹرانسمیٹر ہیں اور ریڈیو ریسیور۔ ان کی رینج ایک ہزار سے پندرہ سو میل کے درمیان تک ہے۔ ہم مخصوص فریکوئنسی پر بات کرتے ہیں۔"

"لیکن یہ گفتگو تو کسی بھی ریڈیو پر کوئی بھی سن سکتا ہے" میں

نے کہا۔
"ایک تو ہم فریکوئنسی بدلتے رہتے ہیں" منّو میاں نے کہا۔ "دوسرے یہ گفتگو خفیہ زبان میں ہوتی ہے۔ ہر بار ہم یہ کوڈ بھی تبدیل کردیتے ہیں۔"
غالب نے کہا "آپ کو کیسے معلوم ہوتا ہے کہ جو معلومات آپ کو فراہم کی جاتی ہیں وہ درست ہیں اور اپنے ہی ساتھی کی فراہم کردہ ہیں۔ آج کل کسی بھی کوڈ کو سمجھنا کوئی مسئلہ نہیں۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ دشمن آپ کو گمراہ کرنے کے لئے آپ کی خفیہ زبان میں غلط معلومات فراہم کردے۔"
"ایسے امکانات کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا' خواہ وہ ایک فیصد ہوں یا دس فیصد۔ کوئی بھی سسٹم سو فیصد قابلِ اعتماد نہیں ہوتا لیکن ابھی تک ایسا ہوا نہیں۔ یہ کام ناممکن نہیں مگر بہت مشکل ہے۔ ہم خود اپنی عقل سے بھی تو پیغام کو سمجھتے ہیں اور مندرجات کا تجزیہ کرتے ہیں۔ مثلاً کل ہی ہمارے ایک ساتھی نے اطلاع دی کہ یہاں سے اسلحے کی ایک کھیپ مال گاڑی کے ذریعے روانہ کی جارہی ہے۔ تاریخ اور جگہ کے بارے میں معلومات حاصل کی جارہی ہیں۔ اس سے پہلے پیغام ملا تھا کہ اسلحے کی خالی پیٹیاں دھوکا دینے کے لئے پورے حفاظتی انتظامات کے ساتھ ٹرکوں پر لوڈ کر کے بھیجی جائیں گی۔ اس ڈرامے کی پوری ریہرسل ہوچکی ہے۔"
میں نے حیران ہوکے کہا "ہمیں بے وقوف بنانا چاہتے ہیں۔"
غالب نے سرہلایا "ہم تو واقعی گمراہ ہوجاتے۔ ٹرکوں کے پیچھے چل پڑتے۔ بعد میں معلوم ہوتا کہ ان میں کچھ بھی نہیں ہے۔"
"یہ بات یہاں کس نے معلوم کی اور کیسے؟" میں نے کہا۔
منّو میاں مسکرائے "ساری معلومات وہیں حاصل ہوجاتی ہیں جہاں مال وصول کرنے والے بیٹھے ہیں۔ ان کے پیچھے ہم نے اپنے جاسوس چھوڑ رکھے ہیں۔ غدار شامل ہوگئے ہیں۔ وہ درحقیقت ہمارے ساتھ ہیں مگر ان کا اعتماد حاصل کرچکے ہیں۔ ان کے درمیان کچھ کالی بھیڑیں بھی ہیں۔ ان کو ففتھ کالم سمجھ لو کہ وہ دل سے ان کے ساتھ نہیں ہیں بلکہ ان کے مخالف ہیں مگر کسی مجبوری کی وجہ سے کھل کر ہمارا ساتھ نہیں دے سکتے۔ ان لوگوں سے حاصل ہونے والی معلومات پر ہم آنکھ بند کرکے اعتبار نہیں کرتے۔ پہلے تصدیق کرلیتے ہیں لیکن بعض اوقات خود ہماری چھٹی حس یا ہمارا وجدان رہنمائی کرتے ہیں۔"
میں نے کہا "میں سمجھ گیا آپ کے طریقِ کار کو۔ لیکن اب مجھے یہ بتایئے کہ کیا خود آپ کے درمیان کالی بھیڑیں اور ان کے چھوڑے ہوئے جاسوس نہیں ہیں؟"
"کیوں نہیں ہیں۔ میں نے کہا نا کہ ہم انہیں پکڑلیتے ہیں تو ان کی چھٹی کردیتے ہیں۔"
"کیسی چھٹی؟ صرف خارج کردیتے ہیں انہیں؟" غالب نے کہا۔
"کبھی دکھائیں گے تمہیں یہ تماشا بھی" منّو میاں بولے۔
"منّو میاں! آپ ہم پر اعتماد نہیں کرتے؟"
منّو میاں چونکے "توبہ توبہ! آپ کیسی بات کرتے ہیں۔ ہم تو آپ کے پرستار ہیں۔ بہت ادنیٰ خادم ہیں۔"
"پھر آپ یہ کیوں نہیں بتاتے کہ آپ اپنے ساتھیوں کو نمبر کیسے دیتے ہیں۔ ان کی شناخت کیسے کرتے ہیں اور آپ کے درمیان پیغام رسانی کی خفیہ زبان کیا ہے۔"
"ہم آپ کا امتحان لیتے ہیں۔ ابھی جو پیغام ہم نے آپ کو بتایا یہ ہمارے دوست ڈی ایف نے بھیجا تھا۔"
"ڈی ایف" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔
نازو نے کہا "نمبر چھیالیس۔"
منّو میاں نے اسے تعریفی نظروں سے دیکھا مگر کہا "لائن ٹھیک ہے مگر جواب غلط"
غالب نے کہا "چونسٹھ؟"
منّو میاں ہنسے "ایک ہی لائن پر جارہے ہو دونوں۔"
غالب نے آہ بھر کے کہا "کاش ایسا ہوتا۔ ہم تو ریل کی پٹڑیوں کی طرح چل رہے ہیں ساتھ ساتھ مگر ہمیشہ ہی دور۔"
نازو نے کہا "کانٹا بدل لو۔ کوئی نہ کوئی لائن مل جائے گی۔"
میں نے کہا "چھوڑیئے ان کی باتوں کو۔ آپ بتایئے منّو میاں کہ اصل نمبر کیا تھا۔"
"اصل نمبر تھا بانوے۔ مگر تم کس طرح اندازے لگا رہے تھے؟"
"ہم بھی یہ خفیہ زبان استعمال کرچکے ہیں۔ انگریزی زبان کے چھبیس حروف ہیں جو چھبیس اعداد کے طور پر استعمال کئے جاسکتے ہیں۔ نمبر چار ہے ڈی۔ نمبر چھ ہوگیا ایف۔ نازو نے چھیالیس بتایا تھا۔ میں نے سوچا شاید نمبر الٹا چلتا ہو۔"
"ابھی نمبر سیدھا چل رہا ہے۔ پچھلے مہینے الٹا تھا۔ مگر اس کے ساتھ ہی پچھلے مہینے نمبر کو تین سے ضرب دے کر اصل نمبر حاصل ہوتا تھا۔ اس ماہ دو سے ضرب دینا ہے۔ اب تم یوں سمجھ لو کہ ہم نے سب کو مستقل نمبر دے دیئے ہیں۔ ہر ماہ ہر دوست کو صرف اتنا بتادیا جاتا ہے کہ ضرب دو یا ضرب تین یا جمع دس یا نفی بارہ۔" سب کو ایک ہی کوڈ پر عمل کرنا ہوگا۔ نمبر چھیالیس نے جب پیغام بھیجا تو نمبر دیا ڈی ایف۔ ہم نے اصل نمبر معلوم کرلیا۔ بانوے۔ گزشتہ ماہ کوئی ڈی ایف بتاتا تو اس کا مطلب ہوتا نمبر ایک سو اڑتیس۔ ہم فوراً چیک کرلیتے ہیں کہ وہ کون ہے اور اس نے کہاں سے پیغام دیا ہے۔ اس طرح ہر ماہ نمبر بدل جاتا ہے لیکن اصل نمبر وہی رہتا ہے۔ اگر آئندہ ماہ "نفی دس" ہوجائے تو ڈی ایف کا مطلب ہوگا نمبر چھتیس۔"
"ویری گڈ" غالب نے کہا "نمبروں کی شناخت تو ہوگئی۔ کیا

پیغام رسانی بھی ایسے ہی ہوتی ہے؟ اے بی سی کی جگہ ایک دو تین کے اعداد کی مدد سے۔"
"نہیں۔ اس کے لئے ہماری اپنی ڈکشنری ہے۔ کس لفظ کا مطلب کیا ہے۔ یہ گنے چنے لوگ سمجھتے ہیں۔ دوست صرف اطلاع دے سکتے ہیں۔ اسے کہیں پہنچانے کے لئے ریڈیو ٹرانسمیٹر پر جو زبان استعمال کی جاتی ہے اسے یا تو پیغام بھیجنے والا جانتا ہے یا پیغام وصول کرنے والا۔ مثلاً کرسی کا مطلب اگر میز ہے اور میز کا مطلب چارپائی ہے تو یہ ڈکشنری میں دیا ہوا ہے۔"
"پیغام ملنے کے بعد آپ ڈکشنری نکال کے مطلب دیکھتے ہیں؟"
"ڈکشنری یہاں ہے" منّو میاں نے سر کو انگلی سے بجا کے کہا۔ "ایسے بہت زیادہ الفاظ نہیں ہیں۔ بس ایک ہزار الفاظ سے کام چلتا ہے۔ پستے' بادام' چھوارے مختلف سائز کی گولیاں ہیں۔ سیب کا مطلب ہے دستی بم۔ انڈا ہے پستول تو مرغی مشین گن۔"
غالب ہنس پڑا "توپ کیا ہے؟ ہاتھی۔"
"ہاتھی کا مطلب ہے ٹرک۔ مگرمچھ ہے لانچ۔ ٹرین کے لئے سانپ۔ ہوائی جہاز کے لئے کبوتر اور کار کے لئے گھوڑا۔"
منّو میاں کی بات ابھی جاری تھی اور ہم سب ہنس رہے تھے کہ سین اور شین نمودار ہوئے۔ انہوں نے ایک آواز میں سب کو سلام کیا۔
"ہم کھانا بازار سے لے آئے ہیں" سین بولا۔
"اور ایک اہم خبر بھی" شین نے کہا۔
"ہمارے پیچھے کوئی لگ گیا تھا" سین نے کہا۔
منّو میاں کھڑے ہوگئے "تم سے کس نے کہا تھا کہ بازار میں گھومتے پھرو؟"
سین نے شین کی طرف اشارہ کیا "اس نے بولا تھا بمبئی بریانی لے چلو۔"
شین نے اسے گھور کے دیکھا "تُو نے نہیں کہا تھا۔"
منّو میاں نے کہا "بکو مت۔ یہ بتاؤ پیچھا کرنے والے کہاں ہیں؟ تم کو کیسے احساس ہوا کہ وہ تمہارا تعاقب کررہے ہیں؟ پولیس کے لوگ تھے یا کوئی اور؟"
اسی وقت گیٹ کے اوپر ایک انسانی ہیولا نمودار ہوا۔ گیٹ کھلوا کر اندر آنے کے بجائے وہ اوپر چڑھ کے خاموشی سے اندر کودنا چاہتا تھا۔
یہ میں نے نہیں دیکھا کہ گیٹ کے اوپر چڑھ کر اندر کودنے کی تیاری کرنے والے نے محسن کو اور کیا اشارہ کیا تھا۔ لگتا ایسا تھا کہ اس کے پیچھے بھی کچھ لوگ ہیں جن کو وہ حملہ کرنے کا حکم دے رہا ہو۔
میں نے چلّا کے محسن اور غالب کو ہوشیار کیا مگر وہ پہلے ہی مستعد ہوچکے تھے۔ ان میں غالب کو ریوالور سے نشانہ لینے میں خصوصی مہارت حاصل تھی۔ غالباً اس نے کمرے کی دیوار کے پیچھے بنی ہوئی کھڑکی کی نچلی منڈیر کے اوپر سے فائر کیا۔
گیٹ پر چڑھے ہوئے شخص نے چھلانگ لگادی تھی اور کوئی چیز احاطے کے اندر پھینکی تھی۔ اگر وہ گولی کا نشانہ نہ بنتا تو وہ چیز شاید میرے سامنے آکے گرتی۔ جیسا کہ مجھے بعد میں پتا چلا کہ گولی اس کے شانے میں لگی تھی چناں چہ اس کا ہاتھ گھوم گیا اور آتش گیر دستی بم بائیں طرف ورکشاپ کے اس حصے میں جاگرا جہاں مشینیں نصب تھیں۔
اندازہ میں نے بھی کرلیا تھا کہ اس نے محبت سے پھول نہیں پھینکے ہوں گے۔ میں جہاں کھڑا ہوا تھا وہیں لیٹ گیا اور دھماکا ہوا تو میں بم کے ٹکڑوں سے اور اُڑتی ہوئی کرچیوں سے محفوظ رہا۔
ورکشاپ میں شعلہ سا بھڑکا تھا اور بیک وقت کئی جگہ چراغ سے جل اٹھے تھے۔ آگ لگانے والے اس بم میں کوئی ایسا کیمیائی محلول تھا کہ اس کے چھینٹے جس چیز پر پڑے اس نے آگ پکڑلی۔ فاسفورس بھی ایک ایسا ہی عنصر ہے جو خشک ہو تو ہوا میں آگ پکڑ لیتا ہے چناں چہ اسے پانی میں ڈال کر رکھنا پڑتا ہے لیکن اس کے علاوہ بہت سے مرکبات ہیں جو زیادہ مؤثر ثابت ہوتے ہیں۔
اندر گرنے والا پھر اٹھ کے دروازے کی طرف لپکا تھا اس نے شانے میں گولی کے پیوست ہوجانے کے باوجود ہمت نہیں ہاری تھی۔ اس نے جان ہتھیلی پر رکھ کے گیٹ کو اندر سے کھولنے کی ذمے داری قبول کی تھی۔ اس کی ناکامی کا اثر دوسرے ساتھ آنے والوں پر یہ پڑتا کہ وہ پسپائی قبول کرلیتے۔ پہلا مرحلہ گیٹ کو کھولنے کا تھا۔ اندر داخل ہوکے کچھ کرنے کا مرحلہ اس کے بعد آتا تھا۔
میں لڑھک کر ایک ستون کی اوٹ میں چلا گیا تھا۔ وہاں سے جوابی کارروائی کرنا زیادہ آسان تھا۔ میں نے اطمینان سے ریوالور نکال کے اس شخص کا نشانہ لیا جو گیٹ کھولنے کی دیوانہ وار کوشش میں مصروف تھا' اس کی کھوپڑی اڑادی۔ تاہم اسی اطمینان کی وجہ سے اسے ایک سیکنڈ مل گیا۔ ممکن ہے اسے آدھا سیکنڈ ملا ہو یا چوتھائی لیکن بعض اوقات سیکنڈ کے سویں یا ہزارویں حصے میں بہت کچھ ہوجاتا ہے۔ کوئی کسی کی ایک نگاہ کا ایک برقِ تبسم کا شکار ہوجاتا ہے تو کوئی قضا کے ہاتھوں سے نکلے ہوئے اجل کے تیر کا۔ کوئی ایک غلط قدم اٹھا کے اور کوئی صحیح فیصلے میں تاخیر کرکے خود اپنے حق میں تباہی کو مقدر کرلیتا ہے۔
گرتے گرتے بھی اندر آنے والے نے کنڈی کو کھینچ لیا تھا اس نے اپنے ساتھیوں کے لئے کامیابی کا دروازہ کھول دیا تھا اور جان دے کر فرض ادا کرنے کی ایک قابلِ تقلید مثال قائم کردی تھی۔
میں نے غالب سے کہا "یہ تو پورا لشکر معلوم ہوتا ہے۔"
غالب نے پیچھے سے کہا "اپنی جگہ سے مت ہلنا۔ تمہاری یہی پوزیشن سب سے بہتر ہے۔"
"محسن کہاں ہے؟"

"میں دائیں جانب ہوں۔ گل میرے ساتھ ہے" محسن نے کہا۔

پہلے کسی جیپ کا انجن غرّایا پھر گیٹ ایک دھماکے سے ٹوٹا۔ جیپ یوں سامنے آئی جیسے گھنے جنگل میں جھاڑ جھنکار کی باڑھ سے اچانک گھات میں بیٹھا ہوا چیتا دہاڑ کے جست لگاتا ہے۔ اس سے پہلے میں نے کسی جیپ کے انجن کی آواز نہیں سنی تھی۔ یہ غالباً ان کی تیاری تھی کہ جیپ کو خاموشی سے دھکیل کے گیٹ تک لے آئے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ہمارے کان کوئی آواز سنیں۔ حملہ اچانک اور اتنا شدید ہو کہ ہمیں سنبھلنے کا بھی موقع نہ ملے۔ اگر میری نظر گیٹ پر چڑھنے والے کو نہ دیکھتی تو ایسا ہی ہوتا۔ اس نے رسک لیا تھا جس میں اس کے لئے کامیابی اور ناکامی کے امکانات برابر تھے۔ یہ ہو سکتا تھا کہ ہم اپنی باتوں میں اتنے محو ہوتے کہ وہ کسی کی نگاہ میں نہ آتا اور پیچھے سے دروازہ کھول دیتا مگر اس پر کسی کی نظر پڑ جانا بھی عین ممکن تھا۔

جیپ کا سامنے والا حصہ بلڈوزر کی طرح تھا۔ اس کے بمپر کی جگہ دو انچ کے قریب موٹے فولادی پائپ تھے جو ایک جنگلے کی شکل میں انجن کے اور دونوں ہیڈ لائٹس کے سامنے پھیلے ہوئے تھے اور دونوں سائڈ سے اس طرح ویلڈ کر دیئے گئے تھے کہ جیپ کسی دیوار سے بھی ٹکرا جاتی تو انجن محفوظ رہتا۔ اس قسم کی بکتر بند گاڑی جیسی جیپوں میں پھرنے والے اپنی بدمعاشی کو مشتہر کرتے ہیں اور سڑک پر ہر گاڑی والے کو چیلنج دیتے پھرتے ہیں کہ ہے کوئی ہم سے ٹکرانے والا۔ ہر کار والا ہی نہیں، بس والا بھی ان سے بچتا ہے اور خود کو ان سے بچاتا ہے۔

ہم نے ایک ساتھ جیپ پر فائر کئے۔ دوسروں کا مجھے علم نہیں لیکن میں نے ٹائروں کو نشانہ بنایا تھا۔ مینول ٹینک پیچھے تھا چناں چہ محفوظ تھا۔ اگر میرا نشانہ خطا نہ جاتا تو جیپ آگے نہ بڑھ پاتی۔ جیپ میں بیٹھے ہوئے افراد نے دونوں طرف سے فائر کھول دئے تھے۔

جیپ احاطے کے درمیان میں پہنچی تھی کہ دو دھماکے ہوئے۔ اس کے دونوں اگلے ٹائر برسٹ ہو گئے تھے۔ میں زیادہ سے زیادہ ایک کو نشانہ بنانے کا دعوے کر سکتا تھا۔ دوسرا کسی اور کی گولی نے برسٹ کیا تھا۔ انہوں نے ساری لائٹس پہلے ہی راؤنڈ میں گل کر دی تھیں۔

گولیاں میرے دائیں بائیں اور اوپر نیچے سے گزر رہی تھیں اور ستون سے ٹکرا رہی تھیں لیکن میں اس کے پیچھے رہنے کی وجہ سے محفوظ رہا تھا۔ مجھے منّو میاں اور ان کے دونوں ساتھیوں سین اور شین کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہیں۔ محسن اور غالب برابر فائرنگ کا جواب دے رہے تھے، غالباً گل اور نازو ان کا اسلحہ دوبارہ لوڈ کرنے میں مدد کر رہی تھیں۔

جیپ کا ونڈ اسکرین ابھی تک سلامت تھا جو ایک تعجب خیز بات تھی۔ میں نے نشانہ لے کر اس پر گولی چلائی تب بھی کچھ نہیں ہوا۔ یہ ناممکن تھا کہ گولی پانچ نت چوڑے "شیشے" پر نہ لگی ہو۔ غور کرنے پر ایک ساتھ مجھے متعدد انکشافات کی شرمندگی کا سامنا ہوا۔

جیپ میں ونڈ اسکرین تھا ہی نہیں۔ اندھیرے میں مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ شفاف شیشے کے پیچھے بھی اندھیرا ہے۔ اس کو فریبِ نظر بھی سمجھا جا سکتا تھا اور دامِ خیال بھی۔ ہم عموماً چیزوں کو مکمل صورت میں دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں چناں چہ ونڈ اسکرین کے بغیر کسی جیپ کا تصور بھی محال تھا۔ خصوصاً ایک ایسی جیپ کا جس پر ہر سمت سے فائرنگ ہو رہی ہو۔

مجھ پر دوسرا انکشاف یہ ہوا کہ ہماری طرف آنے والی گولیاں اس جیپ میں بیٹھا ہوا کوئی بھی شخص نہیں چلا رہا ہے۔ ہم ذرا سے سمت کے فرق کو محسوس نہ کر سکے۔ گولیاں چلانے والے جیپ کے پیچھے تھے۔ وہ شاید گیٹ کے باہر سے فائرنگ کر رہے تھے مگر احاطے کے اندر دونوں جانب سے چلائی جانے والی گولیوں کی آوازیں اس طرح گونج رہی تھیں کہ یہ اندازہ کرنا مشکل تھا۔ اگر جیپ میں کوئی ہوتا تو یہ کیسے ممکن تھا کہ تین طرف سے آنے والی گولیوں میں سے ایک بھی اسے نہ لگتی۔

دراصل جیپ ایک ڈمی تھی۔ اس کا صرف ڈھانچہ تھا جو گیٹ توڑنے کے لئے استعمال کیا گیا تھا اور اسے شاید پیچھے سے کسی دوسری گاڑی نے ٹکر ماری تھی کہ وہ گیٹ توڑتی ہوئی اندر آئی اور احاطے کے وسط میں پہنچ کے خود ہی رک گئی۔ اس کے ٹائر برسٹ ہونے سے صرف اتنا فرق پڑا کہ جیپ نے مزید چند گز کا فاصلہ طے نہیں کیا۔

ورکشاپ کے حصے میں آگ پوری طرح پھیل چکی تھی۔ اس کی روشنی نے سارے احاطے میں اجالا کر دیا تھا۔ میں باہر آبادی میں خوف و ہراس اور ہلچل کے آثار دیکھ سکتا تھا اور بدحواسی میں جان بچا کے بھاگنے والوں کی چیخ پکار سن سکتا تھا۔

اچانک گیٹ پر ایک زبردست دھماکا ہوا۔ کوئی بڑی اذیت سے چلّایا۔ اس کے ساتھ ہی فائرنگ بند ہو گئی۔ میں نے آفس کی طرف سے ایک سایہ سا گیٹ کی جانب لپکتے دیکھا۔

"یہ منّو میاں ہیں" محسن نے چلّا کے کہا "گولی مت چلانا۔"

میں نے کہا "منّو میاں کیا خودکشی کرنا چاہتے ہیں؟"

غالب نے کہا "میرا خیال ہے کہ وہ بھاگ گئے۔"

غالب کا خیال ٹھیک تھا۔ میں نے ایک گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی۔ یہ فاکس ویگن کی مخصوص گھن گرج تھی۔ ہولناک خاموشی میں ایک پُرکرب چیخ مار کے کسی نے کہا "ارے ٹھہرو۔ رکو......" مگر اس کا جواب ایک گولی نے دیا۔ گیٹ کے باہر ایک اور بم کا دھماکا ہوا۔

میں نے ستون کی اوٹ سے نکل کے جیپ تک دوڑ لگائی۔ لیکن جیپ میں کوئی بھی نہیں تھا۔ اس کے پچھلے حصے میں سیٹیں تک نہیں تھیں لیکن ڈرائیور کی جگہ ایک پتلا بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا

صرف آدھا دھڑ سیٹ پر رکھا ہوا تھا۔ کمر سے نیچے کا حصہ بنانا غیر ضروری سمجھا گیا تھا۔ باقی جسم بھی بناوٹ کے اعتبار سے انسانی جسم کا چربہ تھا۔ اس میں تناسب یا توازن کا حسن پیدا کرنے کی کوشش ہی نہیں کی گئی تھی کیوں کہ اس کے وجود کا مقصد صرف فریبِ نظر کا تاثر دینا تھا جس میں وہ کامیاب رہے تھے۔ ایک بہت بڑے تکئے جیسے دھڑ کے ساتھ دو لمبے پتلے گاؤ تکئے لگا دئے گئے تھے۔ ان سب میں روئی بھری ہوئی تھی۔ اوپر جو سر رکھا گیا تھا وہ بے حد حقیقی تھا۔ اس کے نقوش میں زندگی تھی اور دستِ قدرت کی صناعی کا سارا کمال تھا۔ یہ کمال اس کے بند ہونٹوں، کھلی آنکھوں، ناک اور کانوں کی ساخت میں اور بالوں میں نظر آتا تھا اور اس کی خاموشی زبانِ حال سے پکارتی تھی کہ۔ دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو۔ میں بھی کبھی کسی کا سرِ پُرغرور تھا۔

میرے پیچھے سے گل نے چیخ ماری "یہ...... یہ تو"

میں نے پلٹ کے اسے ڈانٹا "ہوش میں رہو گل۔ یہ صرف کسی انسان کا سر ہے۔ یہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔"

محسن اور غالب گیٹ تک پہنچ چکے تھے۔ صرف نازو ابھی تک کمرے سے نہیں نکلی تھی۔ شاید وہ اسے ہدایت کر گئے تھے کہ باقی سب کو کور کرے۔ گل کی چیخ پر وہ بھی آ گئی۔

"کیا ہوا؟"

میں نے پتلے کو اٹھانے کی کوشش کی تو اس کا سر جو تکئے پر رکھ کے چپکا دیا گیا تھا لڑھک کر نازو کے پیروں میں چلا گیا۔ دوسری چیخ نازو نے ماری اور چھلانگ مار کے دور جا کھڑی ہوئی۔

محسن نے واپس آ کے کہا "کیا تماشا ہو رہا ہے یہاں؟"

میں نے کہا "تماشا تو ختم ہو گیا۔ اب خواتین بے ہوش ہونا چاہتی ہیں۔"

"خبردار! جو اس وقت کسی نے ایسی حرکت کی۔ باہر ایک قیامت مچی ہوئی ہے۔ پولیس بھی آنے والی ہو گی۔ فائر بریگیڈ کو بھی اطلاع مل چکی ہو گی۔"

میں نے کہا "یہ غالب وہاں کیا کر رہا ہے؟"

"وہ منّو میاں کو واپس لانے گیا ہے۔ ان کا جذبۂ جہاد اور شوقِ شہادت بالکل آؤٹ آف کنٹرول ہو گیا تھا" محسن نے کہا "وہ بم انہوں نے ہی پھینکا تھا جس نے دشمنوں کو فرار ہونے پر مجبور کیا۔ دوسرا بم مارنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی، وہ گیٹ پر چلے گئے تھے۔ بھاگتے بھاگتے دشمن انہیں مار جاتے تو کیا ہوتا؟"

"بہت بڑی کامیابی ہوتی ان کی" میں نے کہا۔

"اب تیسرا بم جیپ پر پھینکنے کے لئے پیچھے بھاگے تھے کہ سب کو فنا کر دوں گا کہ غالب نے روک لیا" محسن بولا۔

غالب اور منّو میاں ایک دوسرے سے سخت خفگی کا اظہار کرتے ہوئے واپس آ رہے تھے۔

"ہم ان کو چھوڑنے والے نہیں تھے۔ مگر آپ نے ہمیں نہیں چھوڑا۔ بہت افسوس کی بات ہے۔"

"دماغ خراب ہے آپ کا۔ یہ ہے افسوس کی بات" غالب نے کہا۔

"وہ ایک لاش چھوڑ گئے ہیں" محسن نے کہا۔

"اور ایک لاش کا صرف سر" میں نے زمین پر پڑے ہوئے سر کی طرف اشارہ کیا۔

"اب دیر مت کرو۔ تم لوگ نکل جاؤ" منّو میاں بولے۔

"نکل کے کہاں جائیں؟"

"سین شین کے ساتھ جاؤ۔"

"اور تم؟"

"میں کیسے جا سکتا ہوں۔ میری فیکٹری پر غنڈوں نے حملہ کیا۔ مجھے قتل کرنے کی کوشش کی۔ مجھے پولیس کو رپورٹ لکھوانی ہے" منّو میاں نے کہا۔

دور سے فائر بریگیڈ کی گاڑیوں کی گھنٹی سنائی دینے لگی۔

"سین شین ہیں کہاں؟" میں نے کہا۔

"ارے چلو باہر" منّو میاں نے آفس بلاک کی طرف منہ کر کے ہانک لگائی۔

وہ دونوں ایک کھڑکی کھول کے ایک ساتھ کودے اور دوڑتے ہوئے آئے۔ ان کے ہاتھ میں لوہے کے پائپ کے ایک فٹ لمبے ٹکڑے تھے۔ یہ عام استعمال میں آنے والے آدھے یا پونے انچ قطر کے پائپ تھے۔

"یہ کیا ہے؟" غالب نے کہا۔

"یہ بم ہے" سین نے پائپ اسے پیش کیا۔

"ابھی ایسا ہی بم مارا تھا استاد نے" شین بولا۔

استاد نے انہیں ڈانٹا "بک بک میں وقت ضائع مت کرو، ان سب کو لے کر جاؤ۔ ہم بعد میں آئیں گے۔"

"کہاں جائیں استاد؟" سین نے کہا۔

"چاچا کے گھر یا ماما جی کے اڈے پر" شین بولا۔

"ماما جی کے پاس لے جاؤ" منّو میاں نے سوچ کے کہا۔

اب دروازے کے سامنے ایک ہجوم اکٹھا ہو چکا تھا۔ وہ زمین پر پڑی ہوئی لاش کو دہشت زدہ نظروں سے گھور رہے تھے اور اس خون کو دیکھ رہے تھے جو بہہ کر زمین میں جذب ہو گیا تھا۔ فائر بریگیڈ کی آوازیں بالکل قریب آ چکی تھیں۔ کسی نے چلّا کے کہا "ہٹو۔ ہٹو۔ راستہ دو۔"

"یہی وقت ہے نکلنے کا" میں نے غالب سے کہا۔ غالب نے نازو کا ہاتھ پکڑا اور دروازے کی طرف لپکا۔ محسن نے گل کے ساتھ اس کا تعاقب کیا۔ گیٹ کے سامنے کھڑے ہوئے کچھ لوگ خوف زدہ ہو کے ایک طرف ہو گئے۔ ابھی تک کسی نے گیٹ کراس کر کے فیکٹری میں داخل ہونے کی ہمت نہیں کی تھی۔ وہ غریب اور لاوارث لوگ تھے جو بمبئی شہر میں اس قسم کا تماشا دیکھتے تھے تو یہ

سمجھتے تھے کہ فلم شوٹنگ ہو رہی ہے یا بد معاشوں کے دو گروہ آپس میں ٹکرا گئے ہیں۔ ہر صورت میں وہ دخل اندازی سے گریز کرتے تھے۔

منو میاں نے اچانک زمین پر پڑا ہو سر اٹھایا اور اس کو سین یا شین میں سے کسی کے بنائے ہوئے "پائپ بم" کے ساتھ باندھ کر آگ میں اُچھال دیا۔ ایک دھماکے سے ورکشاپ کی چھت گر گئی۔ یہ اندازہ کرنا میرے لئے مشکل نہ تھا کہ بم نے س بے نام شخص کے سر کے پرخچے اڑادئے ہوں گے اور آگ نے اسے جلا کے خاک کر دیا ہوگا۔ منو میاں نے جیب میں رکھے ہوئے روئی کے دھڑ کو بھی اسی طرح نذرِ آتش کیا اور میری طرف دیکھ کر مسکرائے۔

ورکشاپ کی آگ جس حد تک پھیل سکتی تھی پھیل چکی تھی۔ اس آگ نے مشینری کو اور ورکشاپ کے شیڈ کو مکمل طور پر تباہ کر دیا تھا لیکن اب اس کے شعلے پہلے کی طرح نہیں بھڑک رہے تھے۔ آس پاس کی آبادی کو لاحق خطرہ ٹل گیا تھا۔

جب فائر بریگیڈ والے آئے تو مجمع نے خود ہی راستہ چھوڑ دیا مگر عین درمیان میں پڑی ہوئی لاش اپنی جگہ موجود رہی۔ فائر مین یا ڈرائیور نہ لاش کے اوپر سے گاڑی گزار سکتے تھے اور نہ حکم کے بغیر لاش کو ہٹا کے ایک طرف کر سکتے تھے۔ پیچھے کی کسی گاڑی سے اتر کر آنے والے افسر نے صورتِ حال کا معائنہ کیا اور ماتحتوں کو حکم دیا کہ وہ گاڑیاں لاش کے اوپر سے لے جائیں' ایسے کہ نہ کوئی پہیہ لاش کو چھوئے اور نہ خون لو۔ وہ بڑے بڑے ٹرک تھے جن کے پہیوں کے درمیان کافی فاصلہ تھا۔

جب پہلی گاڑی آگے بڑھی تو دم بخود کھڑے ہوئے مجمع کی نظر پہیوں پر اور اس جگہ پر رہی جہاں پر لاش پڑی تھی۔ سین اور شین نے موقعے سے فائدہ اٹھایا اور غالب اور محسن کو ہاتھ سے اشارہ کرکے وہ دروازے کی طرف چلنے لگے۔ غالب اپنے ساتھ نازو کو کھینچ کر لے گیا تھا اور اس کے برعکس محسن کو گل نے کھینچا تھا ورنہ وہ میرے ساتھ مطمئن کھڑا ہوا تھا۔

"تم کیا میرا منہ دیکھ رہے ہو؟" منو میاں بولے "تم بھی نکل جاؤ ورنہ تفتیش کی زد میں آجاؤ گے۔"

آگ بجھانے والے عملے نے اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ وہ منو میاں سے پوچھ رہے تھے کہ پانی کا ٹینک کہاں ہے۔ کچھ پائپ کھول رہے تھے اور کچھ فائر ہائیڈرنٹ تلاش کر رہے تھے۔ میں باہر جانے کے لئے آگے بڑھا ہی تھا کہ فائر بریگیڈ انچارج نے مجھے روک لیا۔

"جب پانی ہی نہیں ہے تو ہم آگ کیسے بجھائیں؟"

میں نے اسے مشورہ دیا "پھونک مار کے بجھادو۔"

"آگ کسی وقت بھی لگ سکتی ہے۔ فیکٹری کے قریب کہیں پانی ہونا چاہئے" وہ خفا ہو کے بولا۔

میں نے کہا "سمندر زیادہ دور نہیں ہے ویسے تو...."

"اے مسٹر! تم مذاق کر رہے ہو' بجائے مدد کرنے کے۔ تم جیسے مالک پہلے حفاظتی انتظامات کو نظر انداز کرتے ہیں۔"

میں نے دانت نکال کے کہا "میں مالک نہیں ہوں۔"

"مالک نہیں ہو تو پھر یہاں کیا کر رہے ہو؟" وہ بگڑ کے بولا۔

"جو تم کر رہے ہو یعنی ہم دونوں کچھ نہیں کر رہے ہیں محض وقت ضائع کر رہے ہیں" میں نے کہا "میں تو اب چلتا ہوں۔ تم بھی جانا چاہو تو جاؤ۔ آگ بجھانے کی کوشش کا اب کیا فائدہ۔ اب بچا ہی کیا ہے بجھانے کے لئے۔"

کسی فائر مین نے نعرہ لگایا "مل گیا ہائیڈرنٹ۔"

انچارج فوراً اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔ میں نے گیٹ سے گزرتے ہوئے اس لاش کو دیکھا جو الٹی پڑی رہ گئی تھی۔ یہ سب سے پہلے کود کر اندر آنے والے کی لاش تھی۔ ایک اور لاش کچھ آگے سڑک کے کنارے پڑی ہوئی تھی۔ یہ اس بد بخت کی لاش تھی جسے انہوں نے مار دیا تھا کیوں کہ وہ ان کا ساتھ دینے کے قابل نہیں رہا تھا اور پیچھے رہ گیا تھا چناں چہ اسے زندہ نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات۔ کمزور کو زندہ رہنے کا حق نہیں ہے۔

ایک موٹر سائیکل سوار نے مجھ سے کہا "آخر یہ سب کیسے ہوا؟"

میں نے کہا "اچھا سوال کیا ہے تم نے۔ میں یہی معلوم کرنے جا رہا ہوں۔ واپس آکے جواب دوں گا۔"

اس نے غرا کے کہا "ادھر آؤ' کون ہو تم؟ میرے ساتھ زبان چلاتے ہو۔ معلوم ہے میں کون ہوں؟"

میں نے اطمینان سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا "کیا تم جانتے ہو کہ میں کون ہوں؟"

اس کے اعتماد اور فرعونیت کے انداز میں فرق آگیا "میں اسپیشل پولیس میں ہوں۔ اس وقت ڈیوٹی پر نہیں ہوں ورنہ بتاتا تمہیں۔"

"میں بتاتا ہوں تمہیں۔ میں ڈیوٹی پر ہوں۔ بک بک کرو گے تو میں لحاظ بھی نہیں کروں گا کہ ہم ایک ہی محکمے میں ہیں۔ جاؤ' میرے کام میں مداخلت مت کرو" میں نے آنکھیں نکال کے کہا۔

اس نے برا سا منہ بنایا مگر فوراً روانہ ہوگیا۔ زبانی دعوے ہم دونوں نے کئے تھے مگر اس کے پاس یقیناً کوئی ثبوت بھی ہوگا۔ اگر معاملہ شناختی کارڈ طلب کرنے تک پہنچ جاتا تو نقصان مجھے نہ ہوتا۔ وہ مارا جاتا۔ مخالف سمت سے سائرن کی آواز سن کر میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ غالب یا محسن میں سے کسی کا دور دور پتا نہیں تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ اس مجمع سے نکلنے کے بعد میرا انتظار کریں گے۔ منو میاں نے انہیں ماما جی کے گھر بھیجنا تھا۔ بمبئی میں کسی دادا کا پتا تو پوچھا جا سکتا ہے لیکن کوئی اپنے ماما جی کا گھر پوچھتا پھرے تو لوگ اسے پاگل خانے پہنچادیں گے۔

اچانک سین یا شین میں سے کسی نے پیچھے آکے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

میں نے چونک کے کہا "تم کہاں سے ٹپک پڑے؟"

اس نے کہا "ہم اوپر تھے" اور ٹیلی فون کے ایک کھمبے کی طرف اشارہ کیا۔

"تم سین ہو یا شین؟" میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

"جو بھی آپ سمجھ لیں" وہ عیاری سے بولا۔

"باقی سب لوگ کہاں ہیں؟"

"وہ تو پہنچ بھی گئے ہوں گے اپنی گاڑی میں۔"

"اپنی گاڑی کہاں تھی؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔

"باہر ہی تھی۔ کیا آپ کی جیب میں دس روپے ہیں؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا "مجھے موقع ہی نہیں ملا۔"

"پھر ہم بس میں چلتے ہیں" اس نے کہا "رک جائیں' بس آرہی ہے۔"

"بس کا کرایہ ہے" میں نے کہا "اور یہ تو بتادو کہ جانا کہاں ہے؟ کہیں ایسا نہ ہو...."

"آپ مجھ پر نظر رکھیں" اس نے سامنے آکے رکنے والی بس کی طرف لپکتے ہوئے کہا۔ جو لوگ قطار میں کھڑے ہوئے تھے انہوں نے شور مچایا۔ ان سے زیادہ احتجاج اترنے والوں نے کیا۔

"ارے چھوکرا کیا کرتا ہے' پہلے اترنے دے" کنڈکٹر نے اسے روکنے کی ناکام کوشش کی لیکن وہ بندر کی طرح اُچکتا' لوگوں کی ٹانگوں میں سے گزرتا اور سب کو دھکیلتا اندر پہنچ چکا تھا۔ میں قطار میں بہت پیچھے تھا اور مجھے یقین تھا کہ میری باری آنے سے پہلے ہی بس روانہ ہو جائے گی اور میں اس اجنبی شہر کی سڑکوں پر لاپتا رہ جاؤں گا۔

بس میں سوار ہونے کے لئے میں نے بھی قطار سے نکل کر آگے جانے کی کوشش کی مگر ایک خوفناک مونچھوں والے نے مجھے کالر سے پکڑ کر اپنے پیچھے کر دیا۔ اگر میں چاہتا تو اس کی مونچھیں پکڑ کے اسی طرح اسے اپنے پیچھے کر دیتا مگر نظم و ضبط کی پابندی کرنے والے سب لوگوں سے لڑنا مشکل تھا اور غلط تھا۔

میں دوڑ کر کھڑکی کے پاس پہنچا اور سین یا شین کو تلاش کیا۔ وہ ایک مرہٹہ لڑکی کے پہلو میں بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ اس نے اشارہ کیا کہ میں اندر آجاؤں تو وہ سیٹ میرے لئے خالی کر دے گا لیکن اندر پہنچنا ہی سب سے مشکل کام تھا۔

میں نے کہا "یار' مجھے پتا تو بتادو۔"

"بس تھوڑا سا کھسکی۔ اس نے کھڑکی سے منہ نکال کر کہا "میں اگلے اسٹاپ پر اتر جاؤں گا۔"

میں بس کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگا "ابے بندر کی اولاد' سیدھی طرح پتا کیوں نہیں بتاتا۔"

اس نے کسی جیب میں سے ایک کاغذ نکال کر پھینکا اور بولا "یہاں معلوم ہو جائے گا۔"

کاغذ کا وہ پرزہ اڑتا ہوا سڑک پر آیا۔ بس کی اور میری ریس ختم ہوگئی۔ اب میں منتظر تھا کہ ٹریفک میں وقفہ آئے تو وہ کاغذ کا پرزہ اٹھاؤں' مگر ہر گزرنے والی گاڑی اس کو روندتی جا رہی تھی اور ہوا کا ہر جھونکا اسے مجھ سے دور کر رہا تھا۔ سر دھڑ کی بازی لگا کے اور کسی گاڑی کے نیچے گھس کر اس پرزے کے حصول کی کوشش خودکشی کے مترادف ہوتی۔ میں صبر اور ضبط سے کام لیتے ہوئے مناسب موقعے کا منتظر رہا اور آخر کار وہ پرزہ کسی تتلی کی طرح میرے ہاتھوں میں آگیا۔

میں نے پرزے پر غور کرنے کے بجائے اسے جیب میں رکھا اور اگلے بس اسٹاپ کی طرف روانہ ہوگیا۔ ایک بس اسٹاپ سے دوسرے اسٹاپ کا فاصلہ کتنا ہوگا؟ میں نے چلتے ہوئے سوچا۔ زیادہ سے زیادہ دو فرلانگ۔ میں سڑک کے کنارے پر اور ٹریفک سے بہت دور فٹ پاتھ پر چل رہا تھا۔ چنانچہ میرا کسی گاڑی کے نیچے آجانا اتنا ہی بعید از قیاس تھا جتنا کسی بحری جہاز سے ٹکرا جانا۔ اس کے باوجود ایک کار نے مجھے پیچھے سے ٹکر مار کے سڑک پر پھینک دیا۔

وہاں فٹ پاتھ نہیں تھی۔ اس کا کچھ حصہ ٹوٹ گیا تھا یا توڑ دیا گیا تھا۔ یہ بائیں جانب سے آنے والی ٹریفک کے لئے مین روڈ کا شارٹ کٹ تھا ورنہ شاید انہیں بہت آگے جانا پڑتا۔ ایسے راستے لوگ ہر جگہ بنا لیتے ہیں اور مرمت کرنے والے بھی تنگ آکر ہار مان لیتے ہیں۔

مجھے حادثے سے قبل کسی نے چلا کر خبردار کیا تھا۔ معلوم نہیں وہ کون تھا جس کی نظر نے غیر متوقع خطرے کو مجھ سے پہلے دیکھ لیا تھا۔ جب میں نے پلٹ کر دیکھا تو سڑک کی جانب سے کار کسی پاگل کتے کی طرح میری جانب بڑھ رہی تھی۔ کار کو بائیں جانب مڑنا ہی تھا تو ڈرائیور پر لازم تھا کہ ہارن دیتا اور انڈی کیٹر جلاتا لیکن اس نے یہ فیصلہ اچانک کیا تھا۔ نتیجہ یہ کہ پیچھے آنے والی کئی گاڑیوں نے زبردست بریک لگا کر تصادم سے بچنے کی کوشش کی۔ ایک زیادہ تیز رفتار گاڑی کے ڈرائیور نے اسٹیرنگ پورا بائیں طرف گھما دیا اور خود کو بچا کر نکلنا چاہا مگر اس کی گاڑی فٹ پاتھ پر چڑھ گئی۔ فٹ پاتھ ٹوٹی ہوئی نہ ہوتی تو کار کا ایکسل ٹوٹ جاتا یا ٹائی راڈ کھل جاتے۔ اس گاڑی نے مجھے سائڈ سے ٹکر ماری۔

میں تھوڑا سا اوپر اُچھلا اور پھر فٹ پاتھ سے نیچے گرا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ بائیں طرف سے آنے والی کسی گاڑی نے مجھے نہیں کچلا۔ ٹکر مارنے والی گاڑی پھر ٹریفک میں شامل ہو کے سب کی نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ چوٹ میری دائیں ٹانگ اور دائیں کہنی پر آئی تھی لیکن چوٹ سے زیادہ مجھ پر حادثے کے نفسیاتی شاک کا اثر تھا۔ مجھے یہ احساس تھا کہ ابھی ابھی موت مجھ سے چھو کر گزری ہے۔ وہ گاڑی ایک انچ آگے ہوتی تو اس کے پہیے مجھے کچل دیتے۔ نیچے گرنے کے بعد مجھے دن میں تارے ہی نظر آسکتے تھے مگر میں نے بہت سے چہرے دیکھے جو مجھ پر جھکے ہوئے تھے

اور میں ان سب کے ہونٹ ہلتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ کچھ تشویش کا اظہار کررہے تھے، کچھ مجھے خوش قسمت قرار دے رہے تھے کہ مجھے خراش تک نہیں آئی، کچھ ٹکر مار کے غائب ہو جانے والی کار کے ڈرائیور پر خفا تھے اور کچھ مجھے مفید قانونی اور طبی مشورے دے رہے تھے۔ پھر ایک شخص نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور مجھے پیروں پر کھڑا ہونے میں مدد دی۔

اس نے انگریزی میں کہا "تم کو فوراً کسی ڈاکٹر سے رجوع کرنا چاہئے"

میں نے کپڑے جھاڑ کے کہا "اس کی کوئی ضرورت نہیں.....!"

"ضرورت ہے" وہ زور دے کر بولا "چوٹ کا پتا بعد میں چلتا ہے۔"

میں نے کہا "میں درد کا احساس ختم کرنے والی گولیاں کھالوں گا۔"

"لیکن اس سے زیادہ اے ٹی ایس کا انجکشن ضروری ہے۔ سڑک پر گرد اور لید میں ٹیٹنس کے جراثیم ہوتے ہیں" میرے مشفق و مہربان نے مجھے سمجھایا "چلو، میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے چلتا ہوں، اپنی گاڑی میں۔"

اس نے میری ایک نہیں سنی اور نہ میری کلائی چھوڑی۔ میں اس کو سختی سے جھڑکتا تو اس کے پُر خلوص جذبات مجروح ہوتے۔ رائے عامہ اسے فرشتہ قرار دے چکی تھی اور بہت سے لوگ مجھ پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ میں اس کی بات مان لوں۔ آخر اس میں حرج ہی کیا ہے۔

وہ غالباً بنگالی تھا۔ پستہ قد، سانولے رنگ اور مختصر وجود کے ساتھ اس کی شخصیت دبی ہوئی محسوس ہوتی تھی مگر اس نے بہترین تراش کا سفاری سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کے جوتے پالش سے چمک رہے تھے، اس کے ہاتھ پر سنہری رولیکس گھڑی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ کار والا تھا، چناں چہ مجمعِ عوام میں اس کا ہمدردانہ رویّہ اور انسانی شرافت کا اظہار ایک خاص اہمیت اختیار کر گیا تھا۔

اس کی کار بالکل نئی بھی نہ تھی اور پرانی بھی نہیں تھی۔ یہ عام کار تھی جو خواص بھی کسی کمپلکس کے بغیر استعمال کرتے تھے۔ پھر مجھے ایک مفید خیال آیا۔

میں نے کہا "آپ بلاوجہ زحمت کررہے ہیں....!"

اس نے وہی مخصوص جملہ بولا جو اس قسم کی صورتِ حال میں بولا جاتا ہے "زحمت کیسی۔ یہ تو میرا اخلاقی فرض ہے۔"

"دراصل مجھے ایک جگہ جانا تھا۔" میں نے کہا "اور جس شخص کے ساتھ جانا تھا وہ اگلے بس اسٹاپ پر میرا انتظار کررہا ہوگا۔ وہ مایوس ہو کے چلا گیا تو میرے لئے پتا تلاش کرنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ میں یہاں اجنبی ہوں۔"

حسبِ توقع اس نے کہا "آپ فکر نہ کریں۔ آپ کو جہاں جانا ہے میں پہنچادوں گا۔"

"پھر بھی اگلے اسٹاپ پر دیکھ لینا ضروری ہے۔ ورنہ وہ شریف آدمی انتظار میں سوکھتا رہے گا۔"

"اوکے۔ ہم بس اسٹاپ کی طرف چلتے ہیں" وہ میرے ساتھ بیٹھ کے بولا۔ اس کی کار ایئر کنڈیشنڈ تھی۔

کار ابھی منتشر ہونے والے مجمع کو پیچھے چھوڑ کے چند قدم ہی گئی ہوگی کہ مجھے دال میں کالا نظر آنے لگا۔ ڈرائیور بار بار اوپر لگے ہوئے ریو مرر میں دیکھ رہا تھا۔ میں نے سر گھما کر پیچھے دیکھا۔ سیاہ رنگ کی ایک کیڈلک بڑی بردباری سے ہماری کار کے پیچھے چل رہی تھی۔ اتنی بڑی اور طاقتور گاڑی چند سیکنڈ میں آگے نکل سکتی تھی۔ یہ عوامی کار اس کی گرد کو بھی نہ پہنچ پاتی۔ سڑک پر اوور ٹیک کرنے کے لئے جگہ بھی بہت تھی۔

کار اچانک رک گئی "دیکھو، کیا تمہارا دوست یہاں ہے؟"

بے اختیار میری نگاہ بس اسٹاپ کی طرف چلی گئی۔ سین یا شین میں سے وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ یہ صرف ایک لمحے کی بات تھی۔ ابھی میں نے کار سے اترنے کا سوچا ہی تھا کہ بیک وقت اس کے تینوں دروازے کھلے اور بند ہوگئے۔ کار کا ڈرائیور بدل گیا۔ پیچھے والی سیٹ پر دو افراد آ بیٹھے۔ دروازے پھر بند ہوئے اور پانچ سیکنڈ بعد کار پھر روانہ ہوگئی۔

میں نے مشتعل ہو کے کہا "آخر یہ سب کیا ہے؟"

"تمہاری بے وقوفی" ڈرائیور نے خوشدلی کے ساتھ کہا "اب آرام سے بیٹھے رہو۔"

پیچھے بیٹھنے والے ایک شخص نے میری کھوپڑی کو ریوالور کی نال سے بجا کے کہا "گڑبڑ کرے گا تو ہم تیرے کو ناک آؤٹ کردے گا۔ مسٹر الیگزنڈر۔ تمہارا سری توڑ دیں گا۔"

دوسرے نے بھی یہی حرکت کی "پھر الیگزنڈر دی گریٹ اکھا دنیا کو کیسے فتح کریں گا۔"

میں نے ایک گہری سانس لے کر دس سے الٹی گنتی شمار کی۔ جذبات کی تند آندھی اور اشتعال کی لہر کا زور توڑنے کے لئے یہ پرانا نسخہ کارگر ثابت ہوا۔ میں نے ان تینوں کی صورتیں دیکھنے سے پہلے گاڑی کو دیکھا۔ اس کے دروازے صرف باہر سے کھولے جا سکتے تھے اور شیشے اتارے ہی نہیں جا سکتے تھے کیونکہ اسے ایئر کنڈیشنڈ کر دیا گیا تھا۔ نہ میں سڑک پر چھلانگ لگا سکتا تھا اور نہ شور مچا کے کسی کو اپنی طرف متوجّہ کر سکتا تھا۔

نیا ڈرائیور زیادہ پُر اعتماد اور پُر سکون تھا کیوں کہ اس کی حفاظت کرنے والے پیچھے موجود تھے۔ ڈرائیور نے میرے سوال کا بہت معقول جواب دیا تھا۔ میں صرف اپنی بے وقوفی کی وجہ سے پکڑا گیا تھا۔ وہ پوری تیاری کے ساتھ اور سب انتظامات کر کے آئے تھے۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ آخر انہیں کیسے معلوم ہوا کہ اس وقت میں ان کو اس سڑک پر پیدل چلتا ہوا ملے گا۔ اگر میں بس میں بیٹھ جاتا تو وہ کیا کرتے؟ شاید مجھے بس سے اترتے ہی گرفتار کرلیتے۔ انجام ہر صورت میں یہی ہونا تھا۔

جس نے بھی یہ منصوبہ بندی کی تھی اس کی ذہانت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا تھا کہ اس کے سب اندازے سو فیصد درست ثابت ہوئے۔ جیسا اس نے سوچا تھا بالکل ویسا ہی ہوا۔ منّو میاں کے کارخانے پر ایک بھرپور حملہ کرنے کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ ہم اس محفوظ ٹھکانے سے نکل کر فرار ہوں۔ یہ وہی طریقہ تھا جو شکاری اپنے شکار کو کسی غار یا بل میں سے نکالنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ وہ غار کے دہانے پر لکڑیاں اور جھاڑ جھنکار جلا کے اندر دھواں چھوڑتے ہیں تو شکار بدحواس ہو کے باہر نکلنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور اتنی ہی آسانی سے پکڑا جاتا ہے جیسے میں پکڑا گیا تھا۔ حملہ آور ہمیں مارنا چاہتے تو رات کی خاموشی میں آتے اور اپنا کام کر جاتے مگر انہوں نے طے شدہ جنگی حکمتِ عملی کے تحت ہمیں مقابلے پر اکسایا۔ ایک ڈی کو جیپ میں بٹھا کے آگے کرنا تاکہ ہم اس پر اپنا اسلحہ ضائع کریں، اس پلان کا سب سے کامیاب حصہ تھا اور مجھے یوں لگتا تھا جیسے اس ڈرامے کا ہدایت کار چوہدری دلاور کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔

مقابلے میں مارے جانے والے تریونی کے آدمی تھے۔ وہ بد بخت جن کی حیثیت سیاست کی بساط پر پیادوں سے زیادہ نہیں ہوتی۔ جو اسی لئے آگے رکھے جاتے ہیں کہ مارے جائیں۔ ان کی جان کی اگر کوئی قیمت ہوتی ہے تو انہیں موت کے مشن پر بھیجنے سے پہلے ہی ادا کردی جاتی ہے اور وہ مجبوریوں کے مارے ہوئے لوگ اس حقیر سی رقم کے لئے بھی جان کی بازی لگا دیتے ہیں کیوں کہ وہ مجبور ہوتے ہیں۔ ان کے پیچھے ان سے زیادہ مجبور لوگوں کی قطار ہوتی ہے جو چاہتے ہیں کہ ان سے یہ موقع چھین لیں۔ موقع کوئی نہیں گنواتا۔ جان گنوانے میں جاتا بھی کیا ہے۔ یہ زندگی جو ویسے بھی جینے کے قابل نہیں تھی۔ موت آنے کی صورت میں دس ہزار نقد سکہ رائج الوقت سے کتنے خواب، کتنی خوشیاں اور کتنی امیدیں خریدی جا سکتی ہیں۔ جینے کے کتنے بہانے پیدا ہو جاتے ہیں۔ کتنے سہارے مل جاتے ہیں۔ اور جو زندہ رہے یقیناً خوش قسمتی پر نازاں ہوں گے۔

اچانک ایک گاڑی نے اوور ٹیک کیا اور آگے آگے چلنے لگی۔ میرے خاموش خیالات کا سلسلہ درہم برہم ہوگیا تو میں نے ایک جھلک غالب اور نازو کی دیکھی۔ وہ اس کی پچھلی سیٹ پر بے سدھ پڑے ہوئے تھے۔

میں پھر اس ذہن کی تعریف کرنے پر مجبور ہوگیا جس نے بڑی خوبصورتی سے معمولی جزئیات کو بھی نظر انداز نہیں کیا تھا اور پورا منصوبہ بڑی دوراندیشی کے ساتھ مرتب کیا تھا۔ ایک ایک سیکنڈ کے حساب سے۔ کب، کہاں، کیا ہوگا اور کیسے ہوگا کہ شبہ پیدا نہ کرے اور حقیقت کا جزو بھی خود اپنی جگہ حقیقت نظر آئے۔ ایسی باریک بین اور دوررس نگاہ صرف ایک شخص کی ہو سکتی تھی جس نے پہلے بھی بہت سے کامیاب ڈرامے کئے تھے۔ اس ڈرامے کے ہر سین میں مجھے چوہدری دلاور کی ہدایت کاری کا کمال نظر آرہا تھا۔ اس نے کہا ہوگا کہ پہلے تو انہیں وہاں سے نکالو۔ پھر ایک ایک کو الگ الگ اٹھالو۔ یہ دیکھو کہ وہ کس راستے سے فرار ہوتے ہیں۔ ہر راستے پر ان کا انتظار کرو۔ وہ اکٹھے فرار نہیں ہوں گے۔ جو سامنے آتا جائے، پکڑتے جاؤ۔ اس نے تریونی سے کہا ہوگا کہ مجھے چند ہوشیار آدمی دے دو جو یہ کام کرسکیں اور چند بے وقوف جن کی زندگی اس منصوبے کی کامیابی پر قربان کی جا سکے، باقی سب مجھ پر چھوڑ دو۔

جس سوال کا میرے ذہن میں کوئی جواب نہ آتا تھا یہ تھا کہ دلاور یا تریونی نے منّو میاں کے ٹھکانے کا سراغ کیسے لگا لیا؟ کیا وہ منّو میاں کی خفیہ سرگرمیوں سے بھی واقف تھے اور سین، شین کو پہچانتے تھے؟ اگر ایسا تھا تو پھر وہ ماما جی کو بھی جانتے ہوں گے۔ ایک سے دوسرے کا سراغ لگانا مشکل نہیں ہوتا۔ سین اور شین نے اس شبے کا اظہار کیا تھا کہ شاید کوئی ان کے پیچھے لگ گیا تھا۔ شکاری نہ جانے کب سے تاک میں ہوں گے اور خاموشی سے پل پل کی خبر آگے پہنچا رہے ہوں گے۔ پنہاں تھا دامِ سخت قریب آشیانے کے۔ لیکن ہماری نظر نے نہ دیکھا۔ خیر اپنے چوہدری صاحب، بازی ابھی ختم نہیں ہوئی۔

گاڑی نامعلوم راستوں پر چلتی جا رہی تھی۔ شہر کے بازار اور پُر رونق علاقوں سے گزرنے کے بعد اب ہم کسی پُر سکون اور پوش رہائشی علاقے میں پہنچ چکے تھے۔ اپنے دائیں جانب سے میں سمندر کے پھنکارنے کی آواز سن رہا تھا اور ہوا میں بس جانے والی مچھلیوں کی بو کو محسوس کر سکتا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ یہ سفر کسی بھی وقت ختم ہونے والا ہے۔

آگے اب بھی وہی گاڑی تھی جس میں غالب اور نازو پڑے ہوئے تھے۔ شاید نازو نے مزاحمت کی تھی یا غالب نے مقابلہ کیا تھا کہ ان دونوں کو ناک آؤٹ کرنا ضروری ہوگیا تھا۔ میں نے افسوس سے سوچا۔ کیا گل اور محسن نے بھی یہی جذباتی غلطی کی ہوگی؟ سوچے سمجھے بغیر طاقت کا مقابلہ طاقت سے نہیں کرنا چاہئے۔ جب طاقت کا توازن اس حد تک اپنے خلاف ہو تو پھر عقل کی سپاہ پر انحصار کرنا چاہئے۔ حالات پر نظر رکھتے ہوئے اس موقعے کا انتظار کرنا چاہئے جو تقدیر کی یاوری سے اچانک بھی مل جاتا ہے مگر کبھی اس کے لئے بہت صبر کرنا پڑتا ہے۔

گل اور محسن شاید تیسری کار میں تھے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو سیاہ کیڈلک غائب ہو چکی تھی۔

"پیچھے مُنڈی گھما کر اپنا تھوبڑا دیکھتا ہے کیا؟" ایک شخص نے ریوالور کی نال سے دبا کے میرا چہرہ گھما دیا۔

دراصل تمہاری صورت دیکھ کر مجھے کوئی یاد آگیا" میں نے آہ بھر کے کہا۔

"کون؟"

"ایک کتا تھا میرے نوکر کے پاس۔ لومڑی کی شکل کا۔"

"کتا بولتا ہے میرے کو....." وہ بگڑ کے بولا۔

"نہیں۔ تم ابھی پاگل کہاں ہوئے ہو۔ وہ تو پاگل ہو کے مر گیا تھا۔ بالکل اس طرح غراتا تھا جیسے تم....."

شاید وہ میرے سر پر ریوالور کا دستہ مارنا چاہتا تھا مگر اس کے ساتھی نے روک لیا "ارے چریا' تیرے کو کیا بولا تھا اپنا سیٹھ نے۔ اپنا مغز ٹھنڈا رکھنا۔"

میں نے کہا "سیٹھ تریوینی کی کیڈلک کہاں گئی۔ پہلے تو پیچھے ہی تھی؟"

"سیٹھ تریوینی کی کیڈلک!" ان دونوں نے ایک ساتھ چونک کر اور مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

میں نے ہنس کے کہا "تمہارا کیا خیال ہے' میں تریوینی کو نہیں جانتا؟ مجھے معلوم ہے اس کی کتنی کوٹھیاں ہیں اور کہاں کہاں ہیں۔ اس کے پاس کتنی گاڑیاں ہیں۔ کس میک اور رنگ کی اور ان کے نمبر کیا ہیں۔ میں تو اس کے کتوں تک کو جانتا ہوں۔ ان میں سے کتنے پالتو ہیں اور کتنے فالتو۔ جو مارے گئے وہ فالتو تھے اور تم پالتو ہو۔"

"تو اپنا بھونکنا بند کرے گا یا نہیں۔ ابھی میرے کو غصہ آگیا تو تیرے مغز میں گولی ڈال دوں گا۔"

"ناممکن" میں نے اپنی بات جاری رکھی "تم اس کے اشارے پر چلتے ہو۔ اپنی مرضی سے کچھ نہیں کرسکتے اس لئے کہ تم پالتو کتے ہو۔ فالتو کتوں کو وہ مرواتا رہتا ہے۔"

"دیکھ تو بڑا السیگزنڈر ہے مگر......"

میں نے کہا "تمہیں تو میرا نام بھی نہیں معلوم لیکن میں تمہارے سیٹھ تریوینی کے بارے میں تم سے زیادہ جانتا ہوں۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ اس کے کتنے باپ ہیں؟ ان میں سے کتنے اصلی ہیں کتنے نقلی اور کتنے جدی پشتی کمینے ہیں؟"

آگے والی گاڑی اچانک ایک گیٹ کے سامنے ٹھہر گئی۔ اس میں سے ایک شخص اتر کے آگے گیا اور بیل دبا کے اس نے انٹرکام میں کچھ کہا۔ شاید داخلے کی اجازت سے پہلے اپنی شناخت کرانا حفاظتی انتظامات کا ایک حصہ تھا۔ اس علاقے میں رہنے والے سب ہی اپنی زندگی کو لاحق حقیقی اور تصوراتی خطرات کے خلاف اپنا دفاع مضبوط رکھتے ہیں۔ مسلسل جدوجہد' شب و روز کی تگ و دو' جوڑ توڑ اور ہیرا پھیری سے چوری اور سینہ زوری تک کامیابی کے لئے سب کچھ کرنے کے بعد جو لاکھوں اور کروڑوں کے مالک تھے۔ لشکارے مارتی لمبی لمبی کاروں میں گھومتے تھے اور محلوں میں رہتے تھے وہ اپنی بہت قیمتی زندگی کی حفاظت ضروری سمجھتے تھے اور ایک بے وقعت مشتِ خاک ہو جانے کے تصور سے اتنا ڈرتے تھے کہ اپنی ذات کو بدخواہوں اور حاسدوں کی دسترس سے دور حفاظتی حصاروں میں مقید رکھتے تھے اگر ان کے اختیار میں ہوتا تو وہ دولت سے حیاتِ جاودانی کا نسخۂ کیمیا خرید لیتے اور لازوال شباب کی ضمانت حاصل کر لیتے اور اس تکلیف دہ خیال کو شکست دے سکتے کہ ہر گزرنے والے دن کے ساتھ بڑھاپے کی پیش قدمی جاری ہے اور آخر کار انہیں مرنا پڑے گا۔

گیٹ کا الیکٹرانک قفل کھل گیا تو اس کے فولادی پٹ وا ہوگئے۔ پہلی گاڑی اندر چلی گئی۔ گیٹ پھر بند ہوگیا۔ ہماری گاڑی جو پیچھے رکی ہوئی تھی گیٹ پر پہنچی تو ڈرائیور اتر کے آگے گیا۔ جاتے وقت وہ چابی نکال کر لے گیا اور اس نے کار کے دروازے کو بھی باہر سے لاک کر دیا۔ اپنی سیٹ سے ڈرائیور کی سیٹ پر پہنچنا اور دروازے کو باہر ہاتھ نکال کر کھولنے کے بعد تین مسلح افراد کی فائرنگ سے بچتے ہوئے فرار ہونے کی کوشش کرنا اتنا ہی ناممکن تھا جتنا مکا مار کے گاڑی کی چھت پھاڑنا اور شگاف سے کسی پرندے کی طرح پرواز کر جانا چناں چہ میں آرام سے بیٹھا رہا۔

ڈرائیور نے گیٹ پر لگے ہوئے انٹرکام کا بٹن دبا کے اپنی آمد کا اعلان کیا۔ شاید کسی نامعلوم جگہ پر موجود کسی کیمرے کی خفیہ آنکھ نے تاریکی میں ہم سب کی صورتوں کا عکس اتارا اور اندر کسی مانیٹر اسکرین پر پیش کیا۔ ڈرائیور اور انٹرکام کے درمیان ہونے والی گفتگو میں نہ سن سکا۔ میں نے اتنی دیر میں آس پاس کے دوسرے گھروں کا جائزہ لیا جو ایک جیسے عالی شان' سنسان اور تنہا تھے اور درختوں کے حصار میں دکھائی نہیں دیتے تھے۔ میرے سامنے والے گیٹ پر کوئی نمبر نہیں تھا اور کسی کے نام کی تختی نظر نہیں آرہی تھی۔ یہاں رہنے والے خواص کے حلقے میں خود اپنی شناخت رکھتے تھے اور عوام کے لئے نام و پتے کو مشتہر کرنے سے گریز کرتے تھے۔

گیٹ دوسری بار کھلا تو ڈرائیور نے گاڑی کو بڑی احتیاط سے گزارا۔ میں نے دیکھا کہ فولادی پٹ صرف اتنا ہی وا ہوئے تھے جتنی گاڑی کی چوڑائی تھی۔ دونوں جانب ایک ایک انچ سے زیادہ جگہ نہ تھی۔ اس گیٹ سے کسی کا تیزی سے گزرنا ممکن ہی نہیں تھا۔

محض اپنے تجسس کو رفع کرنے کے لئے میں نے پوچھا "اگر گاڑی کسی طرف سے گیٹ کو چھو لیتی تو کیا ہوتا؟"

ڈرائیور مسکرایا "وہیں پھنس جاتی۔ گیٹ دونوں طرف سے آگے بڑھ کے گاڑی کو پکڑ لیتے اور جام ہو جاتے۔ یہ راستہ شرافت سے اور آرام سے گزرنے والوں کے لئے ہے۔ تیز رفتاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کوئی فرار ہونا چاہے یا ایک دم اندر پہنچنے کی کوشش کرے تو اس کی گاڑی پھنس جائے گی۔ اس طرح گاڑی کی اسکیننگ بھی ہوگئی۔"

"کیا ہوگیا؟" میں نے انجان بن کے پوچھا۔

"یہ دیکھ لیا گیا کہ گاڑی میں کون ہے اور کیا ہے۔ جب گاڑی واپس جائے گی تو گیٹ پھر اتنا ہی کھلے گا۔ نہ زیادہ نہ کم"

گاڑی اب ایک جنگل سے گزر رہی تھی جو درحقیقت باغ تھا۔ ایک فرلانگ سے زیادہ فاصلہ طے کر چکی تھی مگر ابھی تک مجھے کسی عمارت کے آثار نظر نہیں آئے تھے۔ سڑک اچانک گہرائی میں اترنے لگی اور ایک سرنگ میں داخل ہوگئی جو زمین کی سطح سے زیادہ نیچے نہیں تھی۔

ایک موڑ کاٹنے کے بعد چڑھائی شروع ہوئی اور کار سرنگ سے نکل کے ایک کوٹھی کے پورچ میں ٹھہر گئی۔ میرا یہ اندازہ غلط نہیں ہو سکتا تھا کہ ہم جس گیٹ سے داخل ہوئے تھے یہ اس کے سامنے سڑک کے دوسری جانب کی کوئی کوٹھی ہے۔ تاہم میں نے اپنے خیال کا اظہار نہیں کیا۔ مجھے یہ بھی یقین تھا کہ یہاں میری ملاقات تریوینی سے اور دلاور سے ہوگی۔ گزشتہ بار ہم نے "مذاکرات" کی کوشش کو ناکام بنا دیا تھا۔ کرنل نے ہمیں خصوصی انتظامات کے ساتھ روانہ کیا تھا مگر پہلے محسن نے ہمیں چھڑا لیا تھا۔ دوسری کوشش کو سین اور شین کی مداخلت نے ناکام بنا دیا تھا۔ انہوں نے کرنل کی اور ایس پی کی آنکھوں میں دھول کے بجائے لال مرچیں جھونک دی تھیں۔ چناں چہ مذاکرات نہ ہو سکے تھے۔ غالباً اس کے بعد ہمیں بلوانے کی ذمے داری دلاور نے قبول کرلی تھی اور اس سے یہ اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ مذاکرات کے لئے کتنے بے چین ہیں۔ یہی سب سوچ کے میں بھی خاموش ہوگیا تھا اور میں نے راستے میں کسی جگہ مرنے مارنے اور جان بچا کے فرار ہونے کے امکانات پر سنجیدگی سے غور ہی نہیں کیا تھا۔ اگر مذاکرات کے پسِ پردہ ان کے عزائم کچھ اور نہیں ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ ایک اور امتحان ہی سہی۔

ڈرائیور میرے لئے دروازہ کھولے ہوئے تھا۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھنے والے دونوں خونخوار گوریلے بھی اپنی توپوں کا رخ میری جانب کئے کھڑے تھے مگر خاموش تھے اور ان کے رویے میں ایک نمایاں تبدیلی یہ آگئی تھی کہ وہ باادب باملاحظہ ہوشیار نظر آنے لگے تھے۔

میں کار سے یوں اترا جیسے ایوان صدر کے عشائیے میں شرکت کے لئے آنے والا کوئی سربراہِ مملکت پرچم والی گاڑی سے اترتا ہے۔ میں نے خود پر متانت اور وقار کی شائستہ مسکراہٹ طاری کی اور شوفر سے کہا "تھینک یو۔ میرے دوسرے ساتھی کہاں ہیں؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ ادھر تشریف لائیے آپ" شوفر نے طنز کے ساتھ مگر مہذب لہجے میں کہا۔

برآمدے کی چند سیڑھیوں کے بعد دروازہ تھا جو میرے قریب پہنچنے پر کھل گیا اور میرے اندر داخل ہوتے ہی بند ہوگیا۔ میں نے خود کو ایک مختصر راہداری میں پایا۔ میرے قدموں کے نیچے سرخ قالین تھا اور سر کے اوپر ایک فانوس روشن تھا۔ اس کے بعد ایک ہال یا لاؤنج تھا جہاں میری رہنمائی کے لئے کالے سوٹ اور سفید قمیص پر کالی بو لگائے ہیڈ بٹلر ٹائپ ایک شخص پہلے سے موجود تھا۔ اس نے مجھے خاصے افسوس سے دیکھا۔ وہ کسی وی آئی پی کے استقبال پر مامور کیا گیا تھا لیکن میں اپنے حلئے سے وی ایف پی لگتا تھا۔ ویری فنی پرسن۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا میں نے اسے گلے لگا لیا "ارے کلن خان' تم۔ یار' کتنے بدل گئے ہو تم لیکن دیکھ لو ہم نے پھر بھی پہچان لیا تمہیں۔"

اس شخص کی صدمے اور حیرت سے حالت غیر ہوگئی "جی' وہ۔ میں......"

"ہاں ہاں۔ تم اپنے چچا خلیل خان فاختہ کے منجھلے بیٹے ہو نا۔ جن کا دماغ چل گیا تھا۔ کیوں کہ تم کسی کرستان چھوکری کے ساتھ بمبئی بھاگ گئے تھے..... فلموں میں کام کرنے کے لئے....."

"جی سر...... میں وہ نہیں ہوں۔ میرا نام جوزف ہے۔"

"اچھا' تو مذہب بھی بدل لیا تم نے اس کرستان کے لئے' اسی نے رکھا ہوگا یہ نام بھی مگر خیر بھئی' بڑی خوش ہوئی۔" میں نے اس سے پُرجوش مصافحہ جاری رکھا۔

جوزف نے بڑی مشکل سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور گھبرا کے بولا "آپ ادھر آیئے" اس نے آگے بڑھ کے ایک دروازہ کھول دیا۔

اچانک میں نے خود کو ایک ہال جیسے کمرے میں پایا جس کی زیبائش و آرائش واقعی ایوانِ صدر کے ڈرائنگ روم سے کم نہ تھی۔ اس کے آخری گوشے میں جہاں دو دیواریں ملتی تھیں' شفاف شیشے سے سمندر کا پورا منظر دکھائی دیتا تھا اور پرائیویٹ بیچ پر پھیلا ہوا سرسبز باغ اس منظر کو زیادہ دلفریب بناتا تھا۔

ایک نیم دائرے میں لگے ہوئے بید کے صوفوں پر وہ چاروں بیٹھے ہوئے تھے۔ تریوینی' چوہدری دلاور' حاجی عبداللہ اور کرنل۔ ان سب کی صورتوں کے تاثرات مختلف تھے۔ تریوینی کے اعصاب سب سے زیادہ کشیدہ تھے وہ تقریباً نروس بریک ڈاؤن کا شکار تھا۔ اس کے لئے ناممکن تھا کہ وہ اپنے دل میں میرے خلاف اٹھنے والے نفرت اور عداوت کے جذبات کو چہرے پر ظاہر نہ ہونے دے۔ اس کے ہونٹ سختی سے بند تھے۔ آنکھیں سکڑ گئی تھیں اور وہ دونوں ہاتھوں سے صوفے کے بازوؤں کو پکڑ کے منجمد بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے تیور صاف بتاتے تھے کہ اس کا اٹھ کر مجھ سے مصافحہ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں اور اگر میں نے ہاتھ بڑھایا تو شاید ایک بے ساختہ ردِعمل کے طور پر وہ مجھے گالی دے گا اور کہے گا کہ لعنت تم سے ہاتھ ملانے والے پر۔ اسے میرے نکتۂ نظر سے باقی سب پر ترجیح دی جا سکتی تھی کیوں کہ وہ منافق نہیں تھا۔ اس کا ظاہر اور باطن ایک تھا' وہ اگر دشمن تھا تو دوست نہیں نظر آتا تھا۔

چوہدری دلاور کا چہرہ ہمیشہ کی طرح سپاٹ تھا۔ کوئی اندازہ نہیں

کر سکتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے اور کیا کرے گا۔ وہ اٹھ کر ہاتھ ملائے گا یا میں ہاتھ بڑھاؤں گا تو وہ میرے منہ پر طمانچہ مار دے گا۔ وہ کدورت اور کینے۔ نفرت وعناد اور بغض بھرے دل میں بھڑکنے والے شعلوں کا کوئی عکس اپنی صورت کے آئینے پر عیاں نہیں ہونے دیتا تھا۔

حاجی عبداللہ سب سے بڑا منافق تھا چناں چہ اس کا قراقلی ٹوپی سے ڈھکا ہوا خشخشی بالوں والا سر‘ ماتھے پر سجدہ ریزی کی سند بن کے نظر آنے والا نشان‘ گھنی داڑھی اور بھاری بھرکم جسم کے ساتھ شرعی لباس اسے بندۂ مومن ثابت کرتے تھے مگر اس کا باطن تمام شیطانی صفات سے مزیّن تھا۔ اس کی زبان الحمداللہ اور ماشاءاللہ کہتے نہیں تھکتی تھی مگر اس کا ہر فعل اللہ کے عذاب کو دعوت دیتا تھا۔ اس کی انگلیاں تسبیح کے دانے گھماتی رہتی تھیں مگر اس کے ہاتھ دنیاوی جرم وگناہ کی ہر آلائش میں بھرے ہوئے تھے۔ وہ بڑا متقی اور پرہیزگار نظر آتا تھا مگر وہ قانون اور انسانیت کا دشمن اور ایک خطرناک مجرم تھا۔ اس کے عجز وانکساری کا پردہ اس کی سفاکی اور شقی القلبی کو چھپا لیتا تھا۔ اس وقت وہی ایک شخص تھا جو اپنے لبوں پر دوستانہ خوش آمدید کہنے والی مسکراہٹ سجائے بیٹھا تھا حالاں کہ موقع ملتا تو وہی سب سے پہلے میرے دل میں خنجر اتارتا۔

چوتھا شخص ایک نیا دشمن تھا جس سے میرا تعارف ہی انتہائی لرزہ خیز اور خوف ودہشت سے لہو کو رگوں میں منجمد کر دینے والے حالات میں ہوا تھا اور اس نے اپنے پُرسکون غیر جذباتی انداز سے مجھ پر ایک نفسیاتی غلبہ بھی حاصل کرلیا تھا۔ اس وقت بھی وہ پُرسکون ہی تھا۔ اس کوبرا سانپ کی طرح جو کنڈلی مارے بیٹھا ہو اور اندھیرے میں نظر بھی نہ آتا ہو۔ اس کے انداز میں ایک لاتعلقی اور بے نیازی شامل تھی۔ جیسے وہ غیر جانبدار ہو‘ نہ کسی کا دوست نہ دشمن۔

مجھے قریب پا کر صرف حاجی عبداللہ اٹھا "السلامُ علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاۃ" اس نے بڑی قرات کے ساتھ کہا اور پھر اپنا ہاتھ آگے بڑھایا "بھئی میاں سکندر‘ سبحان اللہ! بڑی لمبی عمر پائی ہے۔ ابھی ہم سب یاد ہی کر رہے تھے تمہیں۔"

میں نے سپاٹ لہجے میں کہا "نہ میں تمہارے سلام کا جواب دوں گا کیوں کہ تم ایک منافق ہو اور نہ تم سے ہاتھ ملاؤں گا۔ کیوں کہ تم میرے نہیں میرے وطن کے بھی دشمن ہو۔"

حاجی عبداللہ کی مسکراہٹ میں خفت شامل ہوگئی۔ اس کا ہاتھ آہستہ آہستہ نیچے ہوا۔ پھر وہ خود بھی بیٹھ گیا "چلو میاں‘ جیسے تم خوش۔ ہم تو چھوٹوں کے ساتھ عفو ودرگزر کے قائل ہیں" اس نے ڈھٹائی سے کہا "حدیث نبوی ہے....."

میں نے کہا "دیکھو حاجی۔ میں یہاں تم سے درس قرآن لینے اور احادیث سننے کے لئے نہیں آیا ہوں۔ میرے سامنے اتنی بے غیرتی کے ساتھ اپنے پاجی پن کو مت اچھالو۔"

اب دلاور نے کہا "چھوڑ یار حاجی‘ تو بے موقع کرتا ہے ہر بات۔ چلو اب اپنے سکندر صاحب‘ آپ بھی خیر سے ذرا ٹھنڈے ہو جاؤ اور بیٹھو ادھر۔"

"بیٹھنے سے پہلے میں جاننا چاہتا ہوں کہ مجھے یہاں کس حیثیت میں لایا گیا ہے‘ اگر مجھے اس بین الاقوامی مجرموں کی عدالت میں مجرم بنا کر پیش کیا گیا ہے تو..."

دلاور طنز سے مسکرایا "او یار۔ کس .... نے کہا ہے کہ تم مجرم ہو۔ بس تمہارا بھی مسئلہ یہی ہے کہ ایک دم ڈائیلاگ بولنے لگتے ہو بڑے بڑے۔ دوست کہنے پر تم خفا‘ ہیں جی۔ مہمان تم بنو گے نہیں۔ شاید پانی کا ایک گھونٹ بھی نہیں پیو گے اپنے دشمن کے گھر میں۔ نہ پیو جی‘ پر بیٹھو تو سہی۔ کوئی گل بات ایسے تو نہیں ہو سکتی نا۔"

میں دو میں سے ایک خالی صوفے پر بیٹھ گیا "کوئی بھی بات کرنے سے پہلے مجھے یہ بتا دیا جائے کہ میرے دوسرے ساتھی کہاں ہیں۔"

تریونی پھٹ پڑا "بکواس بند کرو۔ کیا سمجھتے ہو تم آخر خود کو۔ کیا تم اس پوزیشن میں ہو کہ شرائط منوا سکو۔"

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا "کیا اب بھی تمہیں شک ہے تریونی؟ ابھی ہوش نہیں آیا ہے تمہیں؟ اتنا نقصان اٹھانے کے باوجود تمہارا غرور باقی ہے؟ کوئی بات نہیں وقت آئے گا جب تمہاری ساری بدمعاشی کی طاقت کا یہ کھیل ختم ہو جائے گا۔ آج تم کتے کی طرح بھونک رہے ہو‘ کل دُم ہلاتے آؤ گے قدموں کی خاک چاٹنے کے لئے۔"

"دلاور! روک لو اس......کو۔ یہ حد سے زیادہ بڑھ رہا ہے" تریونی نے غضب ناک ہو کے کہا "میں یہ بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا۔"

"تم کو کہنا چاہئے کہ میں عزت برداشت نہیں کر سکتا۔ ہر عزت دار کے سامنے تمہارے اندر کا بے عزت انسان ننگا ہو جاتا ہے۔ جو ایک تھرڈ ریٹ بدمعاش سے بمبئی کی داداگیری تک پہنچ کر خود فریبی کے خیال میں پناہ ڈھونڈتا ہے کہ اس کی بھی عزت ہے" میں نے کہا۔

"پلیز‘ جنٹلمین!" کرنل نے ہاتھ اٹھا کے کہا "ایسے لڑ کر اور ایک دوسرے کو ذلیل کر کے کوئی مفید مقصد حاصل نہیں ہوگا۔"

"مفید مقصد؟" میں نے تلخی سے کہا۔

"ہاں۔ مذاکرات میں معقولیت کا رویّہ اختیار کرنا سب کے لئے ضروری ہے" کرنل نے کہا۔

میں نے دلاور کی طرف دیکھ کے کہا "کیا مجھے یہاں کسی مذاکرے میں شرکت کے لئے لایا گیا ہے؟ مذاکرے کا موضوع کیا ہے؟"

دلاور نے پہلو بدل کے کہا "خیر سے اپنے سکندر صاحب‘ ہم تو کہتے ہیں گل بات‘ ہیں جی۔ آپس میں بیٹھ کے معاملات طے کرلیں۔ اب اس کو تم بے شک مذاکرات کا نام دے دو۔"

حاجی نے سر ہلایا "جزاک اللہ! کیا جامع بات کی ہے چوہدری صاحب نے۔ افہام وتفہیم سے باہمی مفادات......."

میں نے اس کی بات کاٹ دی "ہمارے مفادات میں کوئی بات مشترک نہ تھی‘ نہ ہوگی۔ آگ اور پانی میں کیسی افہام وتفہیم۔"

"ہم اختلافات کی نوعیت کو سمجھ لیں تو سب نہ سہی بہت سے مسائل حل کرسکتے ہیں۔ کوشش کرسکتے ہیں ایک دوسرے کی پوزیشن کو سمجھنے کی۔ سارے ترپ کے پتے تمہارے ہاتھ میں نہیں ہیں مسٹر سکندر بخت‘ تم نہیں کہہ سکتے کہ نقصان صرف ہمارا ہوگا‘ اگر جنگ میں دونوں فریق برابر ہوں تو نہ کسی کی جیت ہوتی ہے نہ کسی کی ہار۔" کرنل نے اپنے پُرسکون انداز میں کہا۔

مجھے اندازہ تو سب کے رویّے سے ہی ہوگیا تھا کہ وہ سب مل کے مجھ سے بات چیت کے لئے کتنے بے چین ہیں مگر کرنل کی زبان سے یہ سن کر میرا حوصلہ بڑھ گیا۔ وقت نے انہیں ایک سبق تو سکھا دیا تھا کہ نہتے اور کمزور دشمن کو بھی تنہا اور کمزور مت سمجھو۔ کل تک وہ دھمکیوں کی زبان میں بات کرتے تھے کہ تباہ کردیں گے‘ مٹا دیں گے‘ فنا کردیں گے اور ہمارے انجام کو درسِ عبرت بنا دیں گے۔ اس سے بھی پہلے وہ وقت تھا جب اپنی قوتِ خرید پر ناز کرتے ہوئے انہوں نے ہمارے ضمیر کا سودا کرنے کی کوشش کی تھی۔ ہماری حبّ الوطنی‘ قانون کی بالادستی پر ہمارے یقین اور انسانیت کی اعلیٰ اقدار پر ہمارے ایمان کی بولی لگائی تھی۔ وہ پہلی شکست تھی جو انہیں دولت کو سب سے بڑی طاقت سمجھنے کی غلطی کرکے اٹھانا پڑی تھی۔ پھر انہوں نے اپنی بدمعاشی اور اسلحے کی طاقت آزمائی تھی۔ قتل وخونریزی‘ ظلم اور تشدد کے سارے انسانیت سوز حربے آزمانے کے بعد آج انہوں نے مجھے برابر کا فریق تسلیم کرکے اور مذاکرات کے لئے بلوا کے اپنی دوسری شکست کا بھی اعتراف کرلیا تھا کہ وہ طاقت کے استعمال سے بھی اپنی جیت کو یقینی نہیں بنا سکے تھے۔

میں نے اطمینان سے صوفے پر بیٹھ کے کہا "اوّل تو میں ان مذاکرات کی حیثیت کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔ مذاکرات باہمی رضامندی سے ہوتے ہیں جب کہ یہاں آنے میں میری رضامندی کا کوئی دخل نہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم تمہیں زبردستی لانے پر مجبور تھے مگر سوچو" چوہدری دلاور نے کہا "اپنے سکندرِ اعظم صاحب‘ اس کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔ ہیں جی‘ اگر تمہارا کوئی ٹھکانا ہوتا۔ وہ کیا ہے تمہاری ایم آر ایس۔ اس کا کوئی ہیڈ کوارٹر ہوتا تو ہم آجاتے۔"

"ایم آر ایس" تریونی نے نفرت اور حقارت سے کہا "یہ سب نتیجہ ہے شروع میں نرمی برتنے کا کہ آج تم اکڑ فوں دکھاتے ہو اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بات کرتے ہو۔ سرحد کے اس پار سے تمہاری دہشت گردی کا دائرہ یہاں تک پھیل گیا ہے اور تمہارے جنونی حمایتی ہر جگہ پیدا ہوگئے ہیں۔"

میں نے جانتے بوجھتے ہوئے اپنے لہجے میں فرعونیت کا غرور پیدا کرتے ہوئے کہا "ہاں تریونی‘ اب پچھتانے سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ اب تو ڈرو وقت سے جو کہ آنے والا ہے۔ ایم آر ایس اب کوئی معمولی قوت نہیں رہی۔ ہم تمہارے مضبوط سے مضبوط قلعے کی اینٹ سے اینٹ بجا سکتے ہیں۔ اس وقت بھی تمہیں کیا معلوم کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ تم جو اتنے حفاظتی حصاروں میں بیٹھے ہو کتنے غیر محفوظ ہو..."

"دیکھو۔ بہت زیادہ امپریس کرنے کی کوشش مت کرو‘ ہم ایک دوسرے کی حقیقت سے واقف ہیں۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ سب مذاکرات......"

"کیا مذاکرات اور کیسے مذاکرات" میں نے کرنل کی بات کاٹ دی "کیوں کروں میں تم سے مذاکرات۔ میں تو تمہارے بارے میں یہ بھی نہیں جانتا کہ تم اصلی کرنل ہو یا جعلی۔ میں نے صرف ایک بار دیکھا ہے تمہیں اور وہ بھی ایک بھیانک خونی واردات کرتے ہوئے۔ تم سب نے مل کے مجھے محصور کرلیا ہے‘ ایک آدمی کے مقابلے پر تم چار ہو۔ تم مجھے دہشت زدہ کرکے دبانا چاہتے ہو۔ تم نے میرے ساتھیوں کو نہ جانے کہاں لے جا کر رکھا ہے۔ ان کی عدم موجودگی میں مذاکرات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

کرنل کی صورت اتر گئی۔ کوشش کے باوجود وہ خفت کی جھنجھلاہٹ کو نہ چھپا سکا۔ حاجی عبداللہ اور تریونی کی عزت میں پہلے ہی دو کوڑی کی کر چکا تھا۔ میرے اس جارحانہ انداز نے ان کے مزور آمیز اعتماد کو بہت کم کردیا تھا اس سے مجھے ایک نفسیاتی غلبہ حاصل ہونے لگا تھا۔

"یار‘ اپنے سکندر اعظم۔ بڑے جلال میں ہو بھئی۔ لگتا ہے تم نے تو ہندوستان بھی فتح کرلیا ہے" چوہدری دلاور نے کہا "وہ کیا کہتے ہیں سیانے‘ چھوٹا منہ بڑی بات۔ مذاکرات کا سن کے تم بانس پر چڑھ گئے ہو‘ ہیں جی۔ چلو‘ دفع کرو مذاکرات کو۔ سیدھی طرح بتاؤ کہ اب کیا چاہتے ہو۔"

میں نے سوچ کر کہا "واہ چوہدری صاحب‘ اتنی دیر بعد پوچھ رہے ہیں۔ میں واپس جانا چاہتا ہوں اور کیا۔"

"اکیلے جاؤ گے؟" دلاور مسکرایا۔

"نہیں۔ غالب اور نازو میرے ساتھ آئے تھے بلکہ آگے آگے آئے تھے۔ محسن اور گل بھی ہوں گے۔ میں سب کی غیر مشروط رہائی چاہتا ہوں۔ ورنہ۔"

"ورنہ کی بات مت کرو۔ تم کچھ نہیں کرسکتے" تریونی نے بگڑ کر کہا۔

دلاور نے اسے روک دیا "سکندر‘ ایک نام اور شامل کرلو ان

میں۔ تم شہلا کو بھی واپسی میں ساتھ لے جا سکتے ہو۔"

میں سنبھل کر بیٹھ گیا "غیر مشروط طور پر۔"

دلاور نے دوغلے لہجے میں کہا "ایسا بھی ہو سکتا ہے" بظاہر یہ ایک مثبت جواب تھا مگر یوں لگتا تھا جیسے اس نے جواب کو بھی ایک سوال بنا دیا تھا یا وہ میری نادانی پر طنز کر رہا ہے کہ اپنے سکندر صاحب۔ ہوش کے ناخون لو۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے تم خود سوچو۔

میں نے کہا "نہیں چوہدری صاحب، آپ کی ذات سے ایسی نیکی اور روا داری کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ یہ آپ کی فطرت اور آپ کے مزاج کے خلاف ہوگا اگر آپ دشمن کو رعایت دیں اور اس کے خلاف استعمال ہونے والا ٹرمپ کارڈ اسے لوٹا دیں یا اپنی غیر اخلاقی حرکت پر پشیمانی کے احساس نے آپ کی سوچ بدل دی ہو۔ کھل کے بات کرو دلاور کہ تم نے کیا سوچا ہے۔ شرائط پر سمجھوتا نہ پہلے ہوا ہے اور نہ کبھی آئندہ ہوگا۔ میں شہلا کی واپسی کے لئے تمہاری پیشکش کو مسترد کرتا ہوں۔ خدا نے توفیق دی تو ہم اسے خود چھڑا کے لے جائیں گے۔"

مشکل یہ ہے کہ تم دماغ سے نہیں دل سے سوچتے ہو" دلاور نے برہمی سے کہا "کیا تمہاری جگہ محسن ہوتا تو انکار کرتا۔"

میں نے میز پر مکا مار کے کہا "ہاں۔ وہ بھی تمہاری اس مہربانی کے جواب میں تم پر لعنت بھیجتا۔ شکریہ ادا کرنے کے بجائے وہ تم پر تھوک دیتا۔ میں شرط لگانے کو تیار ہوں۔ اسے بلالو۔"

افسوس کہ وہ دونوں ہمارے ہاتھ سے نکل گئے" تریونی نے کہا۔

میں نے کہا "افسوس سے زیادہ یہ تمہارے لئے پریشانی والی بات ہونی چاہئے۔ وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھے نہیں بیٹھے ہوں گے۔"

تریونی کا رنگ اڑ گیا جس سے مجھے یقین آگیا کہ محسن اور گل واقعی محفوظ ہیں اور یہ اندازہ بھی ہوا کہ تریونی پر کس حد تک ہمارے نام کی دہشت سوار ہے۔ وہ واقعی ڈر گیا تھا کہ کہیں ایم آر ایس اس کے ناقابلِ تسخیر سمجھے جانے والے قلعے کی اینٹ سے اینٹ نہ بجادے۔

میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ وہاں موجود ہونے کے باوجود باقی سب نے مذاکرات میں ترجمانی کے اور فیصلے کے اختیارات چوہدری دلاور ہی کو دے رکھے ہیں۔ وہ اگر کچھ کہتے تھے تو محض اس لئے کہ انہیں ڈمی نہ سمجھ لیا جائے۔ ایک طرح سے دلاور قائدِ ایوان تھا تو میں قائدِ حزبِ اختلاف۔ میں نے کہا "جتنا غیر محفوظ میں ہوں۔ اتنے ہی تم بھی ہو تریونی!"

"دیکھو جی، اپنے سکندر صاحب!" چوہدری دلاور نے اپنی انگلیاں چٹخاتے ہوئے کہا "میں جانتا ہوں تم سب کتنے ضدی اور سر پھرے ہو۔ دوسروں کا نقصان تو خیر کیا ہی ہے تم نے۔ خود اپنے آپ کو بھی تباہ کر لیا ہے، ہیں جی۔ صرف اس چکر میں۔ وہ کیا کہتے ہیں اسے خیر سے۔ ضمیر، اصول پرستی وغیرہ...... لیکن ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے......"

"سودائے سر میں حد کیا اور سرحد کیا...."

"پہلے میری بات سن لو۔ اپنی فارسی بعد میں بولنا۔ خیر سے ہم سب چٹے اَن پڑھ ہیں۔ آپ کے مقابلے میں ایک، شعر نہیں پڑھ سکتے" اس نے باقی تینوں کی طرف دیکھ کر کہا "مگر اپنی بات سمجھا سکتے ہیں۔ یہ معاملہ اب بہت لمبا ہو گیا ہے۔ صلح صفائی کے لئے میں نے پہلے ہی ہر طرح سے کوشش کی مگر تم نے تو دشمنی پر کمر باندھ لی ہے۔ سب سے بڑھ کر تمہیں شکوہ تھا اس زیادتی کا...... جو تمہارے والد مرحوم وزیر خان کے ساتھ ہوئی۔"

میں نے مشتعل ہو کے کہا "وہ صرف زیادتی تھی؟......"

"او جی، پہلے عرض میری سن لو۔ تھوڑا حوصلہ رکھو۔ میں نے کوئی ساری رات تقریر نہیں کرنی ہے اپنے سکندر اعظم صاحب" چوہدری دلاور نے میری بات کاٹ دی "دیکھو یار، کتنی پرانی ہو گئی وہ بات۔ ہم نے تو معافی شافی بھی مانگ لی تم سے۔ اب تمہارے گوڈے پکڑنا یا ہتھ جوڑ کے ناک سے لکیریں نکالنا ہی رہ گیا ہے تو وہ مشکل ہے۔ ہاں تلافی کے لئے ہم حاضر ہیں، ہیں جی۔ آپ بولو۔ جو میرے اختیار میں ہے وہ ضرور ہوگا۔"

میں نے کہا "خود کو قانون کے حوالے کردو اور اپنے ہر جرم کا اعتراف کرلو جس میں وزیر خان کا قتل بھی شامل ہو۔"

وہ ہنسنے لگا "اوئے بھولے بادشاہو۔ اگر میں نے اسے قتل کیا ہوتا تو میں کہتا بسم اللہ۔ ہیں جی۔ آخر اپنا بھی یار تھا وہ۔ غصے مت ہونا۔ تم تو بچے ہو۔ سامنے کھڑے ہو کے بات کرنا بھی آگیا ہے تمہیں۔ قد بھی مجھ سے اونچا نکل گیا ہے تمہارا اور خیر سے تم کمزور دشمن بھی نہیں ہو۔ مگر اس سے تم بڑے تو نہیں ہو جاتے...."

میں نے کہا "بڑائی کیا صرف عمر سے ہوتی ہے۔ اور ہوتی ہے تو تم نے کتنا لحاظ رکھا بڑے چھوٹے کے خون کا۔ شاید اب تم چچا کی حیثیت سے بھی اپنے رشتے کا حق مانگو گے۔ تم بہت بے غیرت ہو دلاور!"

دلاور کا چہرہ سرخ پڑ گیا "تم بھی یہ سمجھتے ہو کہ مجھے پھانسی چڑھا لوگے تو یہ بھول ہے تمہاری۔ زیادہ سے زیادہ میں یہ کر سکتا ہوں کہ تمہارے باپ کے قاتل کو تمہارے حوالے کردوں۔"

"اس کے قاتل تم ہو۔" میں نے اسے گالی دے کر کہا "یہ نیا چکر مت چلاؤ میرے جذبات کا رخ موڑنے کے لئے۔ تم دنیا کو دھوکا دے سکتے ہو مگر مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔"

"خدا کی قسم سکندر! میں نے اسے قتل نہیں کیا تھا۔"

"بکواس بند کرو۔ تم اس جرم میں برابر کے شریک تھے۔ خنجر اٹھانے والا ہاتھ کسی کا بھی ہو جو اس ہاتھ میں خنجر دیتا ہے جو حالات پیدا کرتا ہے، سازش کرتا ہے اور فرمان صادر کرتا ہے۔ اصل قاتل تو وہی ہوتا ہے۔ حکم کی تعمیل کرنے والا مجبوری کا عذر پیش کر سکتا ہے مگر تم اس دلیل کی آڑ بھی نہیں لے سکتے کہ خدا نے تو سب کو عقل دی ہے۔ جس نے بھی جرم کیا وہ مجبور نہیں مختار تھا۔ اس نے نتائج کو سمجھتے ہوئے اپنی مرضی سے سودا کیا تھا......"

دلاور نے ہاتھ اٹھا کے کہا "ابھی میری بات ختم نہیں ہوئی تھی۔ تم کو منظور نہیں تو نہ سہی۔ میں تو سمجھا تھا کہ تم اپنے باپ کے قاتل کو خود سزا دینا چاہتے ہو۔ دنیا کی کسی عدالت میں تم اسے مجرم ثابت نہیں کر سکتے لیکن تم بھی جانتے ہو اور میں بھی تسلیم کرتا ہوں کہ وزیر خان کو پندرو نے قتل کیا تھا۔ وہ خود بھی تمہارے سامنے اعتراف کرے گا اپنے جرم کا۔ اور خود کو تمہارے حوالے کردے گا۔"

اس کی عیاری اور مکاری کا احمقانہ کھیل مسلسل میرے اشتعال میں اضافہ کر رہا تھا "آخر بات کیا ہے؟ کیا غلطی کی ہے پندرو نے کہ تم اسے میرے ہاتھوں سزائے موت دلوانے پر تل گئے ہو۔ اتنی فرمانبرداری سے تمہارے لئے جان دینے والا تو پندرو بھی نہیں ہے۔ کس مجبوری کے شکنجے میں کسا ہے تم نے اسے کہ وہ میرے سامنے گردن جھکا کے اعترافِ جرم کرنے کے لئے تیار ہو گیا؟..." میں نے تلخی سے کہا "کوئی اور بات کرو دلاور، یہ ڈراما نہیں چلے گا۔"

دلاور نے ایک گہری سانس لے کر افسوس سے سر ہلایا جیسے واقعی اس کو اپنی فراخدلانہ پیشکش کے یوں مسترد کئے جانے کا دکھ اور میری نادانی کا رنج ہے۔

"اچھا چھوڑو۔ دوسرا مسئلہ تھا تمہاری جائداد کا۔ ہیں جی" دلاور نے کہا "تم کو بڑی شکایت تھی کہ میں نے ...... وہ کیا کہتے ہیں اسے۔ بڑا مشکل سا لفظ ہے۔..... ہاں۔ حقِ وراثت۔ اس سے محروم کردیا تھا۔ اب تو وہ بات ہی ختم ہو گئی۔ ساری جگہ مل گئی تم کو جہاں وہ فیکٹری تھی اور اس پر ہسپتال بھی کھڑا ہو گیا تمہارے والد کے نام پر۔ وزیر خان چیری ٹیبل ڈسپنسری اینڈ ہاسپٹل۔"

اچانک مجھے یوں لگا جیسے دلاور نے مجھے گالی دے دی ہے۔ ایسی گالی جس نے وزیر خان کی روح کو بھی تڑپا دیا ہوگا۔ میری آنکھوں میں وہ منظر گھوم گیا جب میں لندن میں عیش کر رہا تھا اور میرے پیچھے دلاور نے وزیر خان کو کوڑی کوڑی کا محتاج کر دیا تھا۔ وزیر خان کاغذات میں کوٹھی اور کارخانے کا مالک تھا لیکن عملاً وہ فقیر تھا۔ وہ اپنے ایک پرانے نوکر کے گھر میں نوکر بن کے رہتا تھا اور اپنی لاعلاج بیماری کے لئے خیراتی شفا خانے جا کر لائن میں کھڑا رہتا تھا۔ وہ بے اثر لال پیلے پانی سے بھری ہوئی شیشیاں اور اسپرین کی گولیاں کھا کر کھاتے مر گیا۔ آج اسی کے نام پر خیراتی شفا خانہ چل رہا ہے۔ یہ فخر کی بات ہے یا شرم کی۔

میرے دماغ میں بجلی سی چمکی اور عقل کا فیوز اُڑ گیا، میں نے دلاور کو ایک ایسی گالی دی جو میں نے پہلے کبھی نہیں دی تھی۔ دلاور نے میرے جذبات کے سوئے ہوئے آتش فشاں میں ڈائنامائیٹ لگا کے نادانستگی میں ایک چنگاری پھینک دی تھی۔ جب یہ آتش فشاں پھٹا تو اس نے سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

میں نے چیخ کر کہا "تو نے اسے بے کسی کی موت مار دیا...... آج بات کرتا ہے خیراتی شفا خانے کے نام کی۔ وہ نام تو کتبہ ہے اس کی قبر کا۔ تیری ذلالت کا اشتہار ہے۔ میں تجھے کتے کی موت ماروں گا دلاور، اور تجھے کتے ہی کھائیں گے۔"

کرنل نے چلّا کے کہا "شٹ اَپ، یو باسٹرڈ!" کرنل کی گالی نے جلتی پر تیل چھڑک دیا۔ میں ایک دم اٹھا۔ کرنل میرے ساتھ ہی اٹھ کھڑا ہوا تھا مگر اسے دفاع کی مہلت بھی نہ ملی۔ میں نے اس کے پیٹ پر لات ماری اور وہ صوفے سمیت پیچھے جا گرا۔ پھر میں نے درمیان کی میز تریونی پر الٹ دی اور خود دلاور پر جا پڑا۔

مجھے اس وقت ہوش آیا جب کرنل نے فائر کیا۔ شاید اس سے پہلے کرنل نے چلّا کے کچھ کہا تھا جو میرے کانوں نے ضرور سنا تھا۔ عین وقت پر میں نے دلاور کو چھوڑ دیا ورنہ میں اس کا گلا دبائے رکھتا تو کرنل کی گولی مجھے آلیتی۔ میں نے الٹی قلابازی کھائی اور پھر اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔

پُرامن مذاکرات کی ایسی کی تیسی ہو گئی تھی۔ تریونی کے چلّاتے ہی ایک ساتھ چار محافظ دوڑتے ہوئے آگئے تھے۔ ان سب کے ہاتھوں میں خود کار رائفلیں تھیں۔ وہ چمکتے سیاہ فولادی جسموں والے حکم کے غلام تھے جو اپنے آقا کے ایک اشارے پر مرنا بھی جانتے تھے اور مار دینا بھی۔ تریونی نے کرنل کے ریوالور والے ہاتھ کو پکڑ لیا تھا۔ خود چوہدری دلاور کھڑا ہو جانے کے بعد اپنی سانس درست کرتے ہوئے اسے ہاتھ سے اشارہ کر رہا تھا کہ وہ رک جائے۔

میں نے پیچھے ہٹتے ہوئے ایک چھوٹی سی لکڑی کی میز اٹھالی لیکن یہ ایک بہت کمزور ڈھال تھی۔ اس سے میں ان چاروں کے حملے کو نہیں روک سکتا تھا جو قاتلانہ عزائم کے ساتھ آگے بڑھتے آرہے تھے اور مجھے ایک کونے میں محصور کر چکے تھے۔

اچانک ایک زبردست چھناکا سنائی دیا اور سمندر کے رخ کا پورا منظر پیش کرنے والی شیشے کی دیوار کا ایک حصہ گر گیا۔ کوئی چیز راکٹ کی طرح اندر آئی اور حاجی کے پیروں کے قریب گر گئی۔ وہ پہلے ہی اس دھماکا خیز صورتِ حال سے لرزہ براندام تھا۔

اس نے کہا "یا اللہ" اور منہ کے بل گر گیا۔ کرنل کے ساتھ تریونی بھی بے اختیار پیچھے ہٹا۔ پھر کرنل نے بھی صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ کرتے ہوئے سب کو چلّا کے منہ کے بل فرش پر لیٹ جانے کے لئے کہا۔ میری نظریں اس چیز پر جم کے رہ گئی تھیں جو مجھ سے صرف چند فٹ دور پڑی ہوئی تھی اور میں ہر گزرے ہوئے لمحے کی صدائے مرگ سن رہا تھا لیکن کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر تھا۔

حاجی عبداللہ نے بڑی قرأت کے ساتھ پہلے کلمہ پڑھا اور پھر کہا "اِناللّٰہ واِنااِلیہ راجعون۔"

ایک لمحے کے لئے وہ بھی بدحواس ہوگئے جو چاروں طرف سے مجھے گھیر چکے تھے۔ انہوں نے دہشت زدہ نظروں سے پہلے درمیان میں گرنے والی چیز کو دیکھا اور پھر ان سب کو جو زمیں بوس ہو چکے تھے۔ انہوں نے کرنل کا حکم سُنا پھر حاجی کی آواز سُنی جو آخری وقت میں خدا کو یاد کر رہا تھا۔ ایک لاشعوری خوف نے انہیں بھی یقین دلا دیا کہ کسی نے دستی بم اندر پھینک دیا ہے۔

صورتِ حال کی مضحکہ خیزی مجھ پر واضح ہو چکی تھی۔ وہ نہ دستی بم تھا اور نہ دھماکے سے پھٹنے والی کوئی چیز۔ وہ غالباً ایک پتھر تھا، جس پر کاغذ لپٹا ہوا تھا اور یہ پتھر کسی نے باہر سے اندر پھینکا تھا اتنی قوت اور مہارت کے ساتھ کہ اس نے شیشے کی دیوار کو چکنا چور کرتے ہوئے اندر تک راستہ بنا لیا تھا۔

اس وقت میرے پاس یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا کہ ایسا کس نے کیا اور کیسے کیا۔ قدرت نے مجھے مہلت کے چند لمحے عطا کئے تھے اور اس مہلت سے فائدہ اٹھانا میری قوتِ فیصلہ اور فوری عمل کرنے کی صلاحیت پر منحصر تھا۔ میرے گرد کھڑے ہوئے محافظ ذرا سی دیر کے لئے غافل ہوگئے تھے لیکن اس سے پہلے کہ میں کسی محافظ سے اسلحہ چھین کر پانسہ پلٹ دینے یا چھلانگ مار کے شیشے کی دیوار کے خلا سے فرار ہونے کا فیصلہ کرتا، ولاور نے آگے بڑھ کے وہ پتھر اٹھا لیا۔

"یہ بم نہیں ہے اپنے کرنل صاحب" اس نے تمسخر اڑانے والے طنزیہ لہجے میں کہا "اٹھ جاؤ خیر سے، خطرے کی کوئی بات نہیں۔"

کرنل کی ساری اداکاری کا پول کھل گیا تھا۔ وہ اپنے غیر معمولی، پُرسکون رویے سے اور اطمینان آمیز انداز گفتگو سے خود کو انتہائی مضبوط اعصاب کا مالک ظاہر کرتا تھا۔ وہ ایک فوجی بھی رہا تھا جو میدان جنگ میں اس سے زیادہ پُرخطر حالات کا مقابلہ کرتے ہیں اور ان سے توقع کی جاتی ہے کہ عام شہری کے مقابلے میں وہ گولہ بارود اور بم جیسی چیزوں کی بہتر شناخت کرتے ہوئے ان کی ہلاکت خیزی کی قوت سے نمٹنا بھی جانتے ہیں۔

کرنل اٹھا تو اس کی صورت پر خفت کے ذرا بھی آثار نہ تھے۔ چند سیکنڈ میں وہ پھر ایک ایکٹر بن چکا تھا "میں نے تو دیکھ لیا تھا مگر احتیاط کی عادت اب فطرت بن چکی ہے" اس نے متانت سے کہا۔

ولاور معنی خیز انداز میں ہنسا "کرنل، تم غالباً ایجوکیشن کور میں تھے۔"

کرنل نے اسی متانت سے کہا "ہاں۔"

"جتنا عرصہ تم نے فوج کی ملازمت میں گزارا شاید اس دوران میں کوئی جنگ بھی نہیں ہوئی تھی؟"

کرنل نے اس سے نظر ملائے بغیر کہا "میں اُنیس سو چونسٹھ میں ریٹائرمنٹ لے چکا تھا۔ ورنہ......"

"ورنہ کیا؟ تم کلاس روم سے میدان جنگ میں پہنچ جاتے اور کُشتوں کے پُشتے لگا دیتے۔ توپوں کے گولے اور دستی بم تو چٹکی میں دبا کے اِدھر اُدھر پھینک دیتے......"

کرنل نے ایک سگریٹ سلگا کے سر کو پُرحقارت انداز میں جھٹکا، جیسے اس طرح مذاق اڑانے سے خود ولاور کا ذہنی دیوالیہ پن ظاہر ہوتا ہے۔ اس کی حیثیت متاثر نہیں ہوتی۔

اب تریوینی بھی پھر صوفے پر بیٹھ چکا تھا اور حاجی عبداللہ بھی کندھے پر پڑے ہوئے رومال سے منہ صاف کرتے ہوئے شرمندگی کی گرد صاف کرتا نظر آرہا تھا۔

"ماشاء اللہ سے اپنے حاجی صاحب!" چوہدری ولاور نے پھر بیٹھتے ہوئے کہا "آج تو کلمہ بھی پڑھ لیا تھا آپ نے مگر بچ گئے۔ کبھی وقت سچ مچ آگیا تو......"

"بس میاں! بہت ہو چکا مذاق" حاجی نے ڈھٹائی سے ہنستے ہوئے کہا "تم بھی نام کے ولاور ہو۔ ہم جانتے ہیں۔"

تریوینی نے جھنجلا کر کہا "فضول باتیں کرنے کے بجائے دیکھو یہ کیا ہے۔ کس کا پیغام ہے؟"

"پیغام ہونا ضروری ہے؟" ولاور نے پتھر کے اوپر سے کاغذ اتارتے ہوئے کہا "کچھ اور نہیں ہو سکتا؟"

"اور کیا اس طرح کسی نے مٹھائی بھیجی ہوگی؟" تریوینی بولا۔

"افسوس! کسی نے باہر دیکھنے کی زحمت نہیں کی" حاجی نے کہا۔

"اس کا کوئی فائدہ نہیں" کرنل نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"پتا تو چلے یہ حرکت کس کی تھی...."

"جس نے یہ حرکت کی وہ سامنے پوز بنا کر نہیں کھڑا رہے گا کہ اطمینان سے دیکھ لو۔ تصویر اتار لو یا گولی مار دو" کرنل بولا۔

میں ایک کونے میں کھڑا ہوا تھا اور چاروں حکم کے غلام مجھ سے پانچ چھ فٹ دور ایک نیم دائرے میں مجھ پر ٹوٹ پڑنے کے لئے تیار تھے۔ اشتعال کی وہ لہر گزر چکی تھی جس نے مجھے پاگل کر دیا تھا اور ایک بار پھر میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت لوٹ آئی تھی۔ وہ وقت بھی گزر چکا تھا جب میں صورتِ حالات کو اپنے حق میں کر سکتا تھا۔ اب میں واقعی کسی عدالت میں پیش کئے جانے والے مجرم کی طرح تھا لیکن مجھے سزا دینے کا اختیار رکھنے والے میری موجودگی کو نظر انداز کئے بیٹھے تھے۔

ولاور نے پتھر پر لپٹے ہوئے کاغذ کو غور سے دیکھا۔ غیر ارادی طور پر اس کا ایک ہاتھ کاغذ کی شکنوں کو دور کرنے میں مصروف رہا۔ پھر اس نے وہ کاغذ تریوینی کی طرف بڑھا دیا۔ میں نے صورت کے تاثرات کا مشاہدہ کرتے ہوئے پیغام کی نوعیت کو سمجھنے کی کوشش کی مگر ولاور کا چہرہ ہمیشہ کی طرح جذبات سے عاری رہا۔

تریوینی کا رنگ بدلتا دیکھ کے میرا حوصلہ بڑھا۔ میرے اس خیال نے یقین کی صورت اختیار کرلی کہ یہ پہلا پتھر ایم آر ایس کی طرف سے ایک الٹی میٹم ہوگا۔ کہ ہمارے دوستوں کو چھوڑ دو ورنہ بد سے بدتر کے لئے تیار رہو۔ تریوینی نے کہا تھا کہ گل اور محسن ان کے ہاتھ نہیں آئے۔ اگر یہ بات سچ نہ ہو تب بھی منو میاں اینڈ کمپنی سے توقعات وابستہ کی جا سکتی تھیں۔ سین اور شین فتنہ ساماں ہیں۔ بظاہر تو امید نہیں کہ کسی کو ہمارے اغوا کر کے یہاں لائے جانے کی خبر بھی ہو مگر اللہ کارساز ہے۔ کیا پتا سین شین یا گل اور محسن میں سے کسی نے دور سے کچھ دیکھ لیا ہو۔

وہ کاغذ حاجی کے ہاتھوں سے گزر کے اب کرنل کے پاس پہنچ چکا تھا اور ولاور کے سوا سب ہی تشویش میں مبتلا نظر آتے تھے۔ ولاور ایک ہاتھ میں پتھر کو تولتے ہوئے کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اچانک اس کا ہاتھ گھوما اور اس نے بڑی تیزی سے پلٹ کے وہ پتھر مجھ پر کھینچ مارا۔

مجھے اس کی پھرتی اور نشانے کی مہارت پر حیران ہونے کا موقع بھی نہ ملا۔ اس کی یہ حرکت اتنی غیر متوقع تھی کہ میں خود کو بچانے کے لئے کچھ بھی نہ کر سکا۔ پتھر گولی کی طرح آیا اور میرے ماتھے پر لگا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرے میں جگنو سے اُڑے۔ بے اختیار میرا ہاتھ پیشانی کی طرف گیا اور میں نے کسی گرم سیال کے لمس کو انگلیوں پر اور پھر اپنے ہونٹوں پر محسوس کیا۔ پتھر پھینکتے ہوئے ولاور نے مجھے وہی گالی لوٹائی جو میں نے کچھ دیر پہلے اسے دی تھی۔

میں جہاں کھڑا ہوا تھا وہیں گر گیا تھا کیوں کہ کچھ دیر بعد جب مجھے ہوش آیا تو میں انہی محافظوں کے قدموں میں پڑا ہوا تھا۔ بے ہوشی کا یہ وقفہ مختصر ہی ہوگا۔ یہ میرا اندازہ تھا۔ وہ سب اسی طرح بیٹھے ہوئے تھے اور ہر چیز اپنی جگہ پر تھی۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو مجھے چکر آنے لگے۔

"اسے یہاں لاؤ" ولاور نے کہا۔

مجھے دونوں طرف سے بازو پکڑ کے اٹھا لیا گیا۔ میں نے خود کو چھڑا کے اپنے پیروں پر چلنے کی کوشش کی مگر انہوں نے مجھے گھسیٹ کر صوفے پر ڈال دیا۔ میرا سر کسی پھوڑے کی طرح دُکھ رہا تھا اور میری بائیں آنکھ سے اوپر پیشانی کی کھال کھنچ رہی تھی۔ شاید زخم پر خون جم گیا تھا۔ خون کی سرخی میرے الٹے ہاتھ کی آستین پر بھی نظر آرہی تھی۔ اس سے میں نے چہرہ صاف کیا تھا۔

"تم نے بہت غلط حرکت کی تھی۔ ایسی بے وقوفی کی میں تم سے توقع نہیں کر سکتا تھا۔" ولاور نے ناگواری سے کہا۔

"تمہاری توقعات پر ہم پہلے کب پورے اترے ہیں؟" میں نے سر کو دبا کے کہا "تمہارے نزدیک تو وہ سب بے وقوفی ہے جو ہم کر رہے ہیں۔"

"میں اس پتھر کے بجائے تم کو گولی بھی مار سکتا تھا....."

"پھر کیا ہمت نہیں پڑی؟" میں نے کہا "اگر حسرت ہے دل میں اور ہمت ہے تو اپنا شوق اب پورا کرلو۔ یہاں کون ہے تمہیں روکنے والا؟"

"میاں، کہو شکر الحمدللہ" حاجی نے داڑھی پر ہاتھ پھیر کے کہا۔ "سمجھو، دوسری زندگی ملی ہے تمہیں۔"

میں نے کہا "ابے گھامڑ، ابوجہل، خدا ایک ہی زندگی دیتا ہے اور جب تک وہ نہ چاہے نہ مجھے گولی مار سکتی ہے اور نہ گولا۔ ایک کے بعد دوسری زندگی کا تصور ہندو رکھتے ہیں رام داس۔"

"رام داس؟" حاجی کا ہاتھ تسبیح پر رک گیا۔

"ہاں۔ عبداللہ کو ہندو اور کیا کہیں گے؟ تم نے خود کو ان کے ہاتھ بیچ دیا ہے۔ اپنا دین ایمان ان کے پاس گروی رکھ دیا ہے۔ تم ان کے زر خرید ہو پنڈت رام داس" میں نے کہا۔

"حاجی! پلیز شٹ اپ" ولاور نے کہا "تم وقت ضائع کر رہے ہو۔"

حاجی غصے میں سرخ چہرہ لئے اپنے ہونٹ کاٹتا رہا۔

تریوینی نے کلائی کی گھڑی میں وقت دیکھ کے کہا "ہاں۔ وقت کم ہے"

پہلے کرنل نے اسے گھور کے دیکھا پھر ولاور نے۔

میں نے ہنس کے کہا "کتنی مہلت دی ہے تمہیں میرے دوستوں نے؟"

"یہ غلط فہمی ہے ان کی اور تمہاری' اپنے سکندر اعظم صاحب۔ ...چوروں کی طرح پتھر پھینکنا اور بات ہے" دلاور نے برہمی سے کہا۔ "ان میں ہمت ہے تو کچھ کرکے دکھائیں۔ سامنے آکے....."

"سامنے بھی آجائیں گے وہ' اگر تم نے ان کے پیغام کو محض کھوکھلی دھمکی سمجھ کر نظرانداز کیا" میں نے اپنے اندازے سے جو تیر چلایا تھا وہ نشانے پر لگا تھا۔

تریوینی نے نروس ہو کے کہا "دلاور! اس کے ساتھ وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں پولیس کو فون کرتا ہوں۔"

"کیا کہو گے پولیس سے؟" دلاور نے کہا۔

"یہ..... یہ کھلی دھمکی ہے" اس نے کاغذ لہرا کے کہا "ہم اپنے لئے تحفظ مانگنے کا حق رکھتے ہیں۔"

دلاور نے حقارت سے اسے دیکھا "یہ صرف کاغذ کا ایک پُرزہ ہے۔ تم اس سے ڈر گئے ہو؟"

"مگر جو کچھ اس میں کہا گیا ہے....."

"تم کیا بتاؤ گے پولیس کو؟ کہ یہ کس کی تحریر ہے۔ اور کیا وہ یقین کرلیں گے تمہاری بات کا؟" دلاور نے کہا۔

کرنل نے تائید میں سرہلایا "اور یقین کر بھی لیا تو کیا وہ اپنا توپ خانہ بھیج دیں گے تمہاری حفاظت کے لئے؟ مجھے تو حیرت ہے کہ تم جیسا آدمی پولیس کو بلانے کی سوچنے لگا ہے جس کے نام کی دہشت سے دہشت گرد ڈرتے ہیں۔ کیا ہوگیا ہے تمہیں آخر؟"

"کچھ بھی ہوا ہے... تم جانتے ہو" تریوینی نے مشتعل ہو کے کہا "اور یہ بھی جانتے ہو کہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔"

"اچھا تو پھر ہمیں ہی نمٹنے دو تمام مسائل سے۔ تم آرام سے بیٹھو" دلاور نے کہا۔

میں نے کہا "ہاں مسٹر تریوینی! تم بلاوجہ اپ سیٹ ہو۔ تمہارے دوست اپنے ساتھ تمہیں بھی مروانے کی پوری کوشش کررہے ہیں' پھر تمہیں فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ابھی تو کچھ نہیں ہوا۔ بس تمہارا ایک جہاز غرق ہوا ہے۔ کاروبار کا بیڑا غرق ہوا ہے۔ بیٹی ہاتھ سے گئی۔ تمہاری داداگیری گئی۔ اب کسی دن جان بھی جائے گی....."

"یہ تمہاری خام خیالی ہے...." دلاور نے تلخی سے کہا۔

"اچھی اردو بولنے لگے ہو خیر سے اپنے چوہدری صاحب" میں نے کہا۔

"میں جانتا ہوں تمہارے حربے سکندر! تم مجھے مشتعل نہیں کرسکتے" دلاور مسکرایا "یہ ہر وقت ہمارے اختیار میں تھا اور آج بھی ہے کہ تمہیں بدترین عذاب کے ساتھ ماردیں۔ خود تمہارے سورماؤں کے سامنے۔ اور پھر انہیں بھی ختم کردیں....."

"لیکن تم جانتے ہو کہ ہم میں سے کوئی موت سے ڈرنے والا نہیں ہے" میں نے اس کی بات کاٹ دی "تم کو اپنے انجام کا خیال روک لیتا ہے۔ تم سکندر بخت کو مار کے ایم آر ایس کو نہیں ختم کرسکتے۔"

"ایم آر ایس کی کیا حیثیت ہے؟" دلاور نے کھوکھلے لہجے میں کہا۔

"میں بتاؤں تمہیں؟" میں نے کہا "یہ پہلے صرف میرا نام تھا۔ پھر اس نام کو محسن نے اختیار کرلیا۔ اس کے بعد یہ رابعہ کا نام بن گیا۔ پھر غالب' نازو اور گل۔ استاد ٹیڈی سے ڈاکو محمد خان تک یہ نام سب کے لئے ایک عہد کی زنجیر بن گیا۔ حلقہ در حلقہ زنجیر پھیلتی رہی اور مضبوط سے مضبوط تر ہوتی گئی' یہاں تک کہ اس زنجیر کا سلسلہ ایک طرف مغربی پاکستان کی سرحدوں تک پھیلا ہوا ہے تو دوسری طرف مشرقی پاکستان تک اتنا طویل ہوگیا ہے۔ اب یہ ایک نام نہیں' ایک طاقت ہے۔ جو پہلے ایک لہر تھی وہ اب ایک طوفان ہے۔ گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں۔ یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں۔ سیکڑوں' ہزاروں......"

"میاں' ماشاء اللہ سے بڑی فصاحت ہے کلام میں" حاجی نے میرا مذاق اڑاتے ہوئے کہا "لیکن مبالغہ آرائی میں سیکڑوں ہزاروں کی تعداد پر قناعت کیوں کرلی! لاکھوں کہہ دیتے۔"

دلاور نے سرہلایا "خیر سے اپنے سکندر صاحب کو عادت ہے مذاق کرنے کی۔ ڈائیلاگ بھی خوب بولتے ہیں اور ایسا شعر [illegible] کرتے ہیں کہ واہ واہ۔ ابھی علامہ غالب صاحب کا کیسا سوہنا شعر نکال لیا انہوں نے۔ بس حساب میں ذرا گڑبڑ ہوگئی۔ ایک اکیلا دو گیارہ ہوتے ہیں' یہ تو ہم مانتے ہیں۔ چلو ان کی خاطر ایک سو گیارہ مان سکتے ہیں۔ مگر یار' تم تو ثابت کرنا چاہتے ہو کہ ایم آر ایس ایک سو گیارہ ڈویژن فوج ہے اور اس کے ایک سو گیارہ جرنیل جن کے پاس ایک سو گیارہ توپیں ہیں جو ایک منٹ میں ایک سو [illegible] گولے چلاتی ہیں۔ تو اس مذاق پر کسی کو ہنسی بھی نہیں آئے گی۔"

میں نے اپنی متانت برقرار رکھتے ہوئے دلاور کے تمسخر [illegible] والے لہجے اور پُرتحقیر اندازِ گفتگو پر صرف مسکرانا ہی کافی [illegible] "اگر یہ مذاق تھا چوہدری صاحب تو پھر حقیقت تم بتادو۔ تمہارے ذرائع اطلاعات بہت وسیع ہیں۔ تمہیں پل پل کی خبر ملتی رہتی [illegible] میری مبالغہ آرائی کے جواب میں تم اپنے دوستوں کو صحیح تعداد [illegible] ...وہ کتنے افراد تھے جنہوں نے سرِراہ ہمیں اغوا کرکے لانے والوں کا راستہ روک لیا تھا اور کرنل صاحب کے خصوصی انتظامات [illegible] ایسی تیسی کردی تھی؟ یہ بھی سوچو کہ انہیں اطلاع کیسے ملی اور انہوں نے فوراً جوابی کارروائی کے لئے پلاننگ کرلی؟ یہ ایک [illegible] کا کام تو نہیں تھا۔ اس کے بعد کرنل اور ایس پی کی آنکھوں [illegible] مرچیں جھونک کر اور ان کی مسلح سپاہ کو شکست دے کر ہمیں لے جانے والے کتنے تھے؟ تریوینی! تم کو بھی اندازہ ہوا ہو [illegible] تمہارے محل کا محاصرہ کرنے والے افراد کی کیا تعداد تھی؟ [illegible]

نے تمہاری بجلی کی اور ٹیلی فون کی ہر لائن کاٹ دی تھی اور تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ وہ ہر طرف موجود تھے۔ ابھی کچھ دیر پہلے تم نے کتنے غنڈوں کی فوج بھیجی تھی؟ اس کا کیا حشر ہوا؟ کیا ان کا مقابلہ کرنے والے دو چار ہی تھے؟ نہیں دلاور! آزمانا چاہو تو آزما کے دیکھ لو۔ ہر قدم پر میرے ساتھی موجود ہیں اور وہ ہر جگہ پہنچ بھی سکتے ہیں۔ صرف بمبئی کی بات نہیں' ہم اپنے پیچھے مغربی پاکستان کے محاذ کو بھی خالی چھوڑ کر نہیں آئے ہیں اور اب ہمارا رابطہ مشرقی پاکستان کے مجاہدوں سے بھی ہے۔ ان کا پیغام تم تک پہنچ چکا ہے۔ میں تم کو چیلنج کرتا ہوں۔ ہمت ہے تو اس پیغام کو مجھ سے چھپانے کے بجائے مجھے پڑھ کر سناؤ اور پھاڑ کے پھینک دو۔"

حاجی عبداللہ اور تریوینی پر یقیناً میرے پُراعتماد انداز نے خوف طاری کردیا تھا۔ کرنل اور دلاور نے خوف کو ظاہر نہیں ہونے دیا تھا مگر جس خاموشی اور سنجیدگی کے ساتھ انہوں نے میری پوری بات سنی تھی وہ از خود ان کی سوچ کے منفی پہلو کی آئینہ دار تھی۔ میں نے ثابت کردیا تھا کہ ایم آر ایس اب واقعی ایک ناقابلِ تسخیر منظم فوج ہے۔ حالات اور واقعات کی شہادت میرے ہر دعوے کے سچ کا ثبوت تھی۔ اس حقیقت کو تسلیم نہ کرنا خود دلاور کے لئے ممکن نہ تھا کہ ان کے پاس پیسے کی قوت تھی اور ہمارے پاس ایک جذبہ تھا۔ کرائے سے خریدی ہوئی وفاداری کا ایمان کی طاقت سے کیا مقابلہ۔ ایم آر ایس میں سب سودائی تھے جو سربکف اور کفن بردوش پھرتے تھے۔ نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا۔ نہ دنیا میں سرخروئی کی خواہش نہ مال و متاعِ جہاں کی آرزو۔ نہ موت کا ڈر نہ زندگی باعثِ شرمندگی۔

دلاور نے آخرکار میرا دیا ہوا چیلنج قبول کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ سب کے سامنے یہ اس کے وقار کا اور انا کا مسئلہ بن گیا تھا۔ وہ مجھ سے مرعوب ہوجاتا تو دوسروں کو نفسیاتی طور پر احساسِ شکست ہوتا۔ ...شاید وہ ہمت ہار بیٹھتے۔ دلاور کا ساتھ چھوڑ کے الگ الگ اپنے مفادات کے تحفظ کو ترجیح دینے کا خیال انہیں مغلوب کرلیتا۔ ان سب کے درمیان خلوص اور دوستی یا مقصد کی وہ اجتماعی سوچ نہیں تھی جس نے ہم سب کو اکٹھا کیا تھا۔ ہمارے درمیان انتشار یا نااتفاقی کے امکانات سرے سے معدوم تھے کیوں کہ ہم اپنے اپنے مادی مقاصد کے حصول کی جنگ نہیں لڑ رہے تھے۔ ہمارے حریف صرف کاروباری اشتراک کے منفعت بخش مقاصد کو پیشِ نظر رکھتے تھے۔ مل کر کاروبار کرنے میں فائدے کی جگہ نقصان کا احتمال اور جان کا خطرہ ہو تو پھر اشتراک جائے بھاڑ میں۔ اس مرحلے پر دلاور نہیں چاہتا تھا کہ وہ مایوس اور بددل ہو کے الگ ہوجائیں اور وہ اکیلا رہ جائے۔

اس نے وہ کاغذ تریوینی کے ہاتھ سے چھین کر میری طرف بڑھادیا "یہ لو اپنے سکندرِ اعظم۔ دیکھ لو کیا فرماتے ہیں تمہارے جرنیل۔ ہیں جی۔ ان سب کی....."

گالی کو نظرانداز کرتے ہوئے میں نے کاغذ پر پنسل سے لکھی ہوئی تحریر کو دیکھا۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ کسی بچے کا خط ہے جو ابھی لکھنا سیکھ رہا ہو۔ غالباً یہ دائیں ہاتھ سے لکھنے کے عادی کسی شخص نے بائیں ہاتھ میں پنسل پکڑ کے لکھا تھا۔

"ہم سب جانتے ہیں اور سب دیکھ رہے ہیں۔ اپنی سلامتی چاہتے ہو تو ایک گھنٹے کے اندر اندر ہمارے دوستوں کو سلامتی کے ساتھ ان کی خواہش اور ہدایت کے مطابق رخصت کردو۔"

عبارت کے آخر میں ایک لفظ تھا جو بظاہر بے معنی نظر آتا تھا۔ دلاور نے اور اس کے سب ساتھیوں نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ پیغام بھیجنے والا اپنے اصل نام کی جگہ خود کو کالا دیو یا لال چقندر بھی لکھ سکتا تھا۔ اگر اس نے اوٹ پٹانگ نام لکھ دیا تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ مگر یہ لفظ اوٹ پٹانگ اور بے معنی نہیں تھا۔ یہ فرانسیسی زبان کا لفظ تھا جو اردو میں لکھا گیا تھا۔ اس کا مطلب تقریباً وہی تھا جو محسن کا۔ احسان کرنے والا۔ یہ محسن کا پیغام تھا' خواہ بھیجنے والا سین یاشین میں سے کوئی ہو۔ اس کی چالاکی نے میرا دل خوش کیا اور میرے اعتماد کو دوچند کردیا۔

میں نے کاغذ کو بڑی احتیاط سے موڑ کے گول کیا اور کچھ دیر اسے اپنے دونوں ہاتھوں کے درمیان گھماتا رہا۔ اس طرح ایک لمبی سی پتلی ڈنڈی بن گئی۔ جیسے کولڈ ڈرنک پینے کا اسٹرا۔

میں نے یہ بتی دلاور کو پیش کرتے ہوئے کہا "یہ لیجئے اپنے چوہدری صاحب۔ ابھی آدھا گھنٹا ہے۔"

دلاور بھڑک اٹھا۔ یہاں اس کے جواب کا اقتباس بھی پیش نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے حکم پر چاروں محافظ ایک ساتھ مجھ پر پل پڑے۔ انہوں نے مجھے رائفلوں کے کندوں سے مارا اور پھر اپنے ساتھ گھسیٹ کرلے گئے۔ چوٹوں کی تکلیف بہت زیادہ تھی لیکن میں بے ہوش نہیں ہوا تھا۔ میرے حق میں بہتر بھی یہی تھا کہ مقابلہ نہ کروں اور جان بچاؤں چناں چہ میں نے پہلے ہی راؤنڈ میں ناک آؤٹ ہوجانے کو ترجیح دی۔ بے ہوش آدمی پر جسمانی تشدد کوئی نہیں کرتا۔

میں نے بیک وقت دلاور اور تریوینی کو چلّاتے سنا۔

دلاور نے کہا "اسے تہ خانے میں ڈال کے واپس آؤ۔"

تریوینی نے کہا "زنجیر ڈال دینا۔"

"تم فوراً سب کو اکٹھا کرو۔ ان سے کہو باہر جا کے چاروں طرف دیکھیں۔ درختوں میں اور جھاڑیوں میں۔ چھت پر۔ کہیں کوئی بھی نظر آئے اسے گولی ماردیں۔ پوچھے بغیر۔"

"پولیس کو بھی بلالینا چاہئے" تریوینی نے کہا۔

"بلالو۔ اگر تم ان پر بھروسہ کرسکتے ہو...." دلاور نے کہا۔

"میں ایس پی سے بات کرتا ہوں" یہ آواز کرنل کی تھی۔

"تم باقی انتظامات کا جائزہ لیتے تو اچھا تھا۔"

"میں وہ بھی کرلوں گا۔ گھبرانے اور پریشان ہونے کی کوئی بات

نہیں" کرنل نے کہا "سب ہو جائے گا۔"

یہ آوازیں دور ہوتی جا رہی تھیں۔ چار میں سے دو محافظوں نے مجھے بازو پکڑ کے یوں اٹھا رکھا تھا کہ میرا دھڑ زمین سے اوپر تھا مگر پیر فرش پر رگڑتے جا رہے تھے۔ میں نے ایک آنکھ تو تھوڑا سا کھول کر دیکھا تو باقی دو مجھے اپنے پیچھے نظر آئے۔ وہ بڑے قاتلانہ انداز میں مجھ پر خود کار رائفلیں تانے ہوئے تھے۔ وہ قریب ہوتے تو میں ٹانگ اڑا کے انہیں منہ کے بل گرا دیتا مگر وہ مجھ سے چند قدم دور تھے۔ میں نے ایکشن کو تہ خانے میں پہنچنے تک مؤخر کر دیا۔ تہ خانے سے نیچے جانے والا زینہ ان سے نمٹنے کے لئے موزوں ترین جگہ ہو سکتی تھی یا پھر تہ خانہ۔ میں طے کر چکا تھا کہ انہیں زنجیریں پہنانے کا موقع فراہم نہیں کروں گا۔ مجھے یہ بھی دیکھنا تھا کہ کیا اس تہ خانے میں غالب اور نازو کو بھی قید کیا گیا ہے۔

وہ مجھے گھسیٹتے ہوئے دو کمروں سے گزرے اور ایک لمبے، اونچی چھت والے کاریڈور میں طلوع ہوئے۔ اس کے آخری حصے میں زینہ اوپر بھی جا رہا تھا اور نیچے بھی۔ وہ مجھے اسی طرح کھینچتے گئے۔ زینے سے نیچے جاتے ہوئے میرا سر نیچے ہو گیا۔ میری ٹانگیں اوپر کی تین سیڑھیوں پر رہیں اور مجھے لے جانے والے مجھ سے بھی ایک سیڑھی نیچے رہے۔ ہر سیڑھی پر میرے پاؤں دھڑ سے لگتے تھے اور انہیں بھی سنبھل کے اگلا قدم اٹھانا پڑتا تھا۔ آخر میں آنے والے محافظ ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ زینے کی چوڑائی میں ان کے لئے دائیں بائیں حرکت کرنے کی گنجائش باقی نہ رہی تھی۔

مجھے یہ موقع غنیمت لگا۔ میں نے پوری قوت کے ساتھ دونوں ٹانگوں کو اوپر اٹھایا اور پیچھے پلٹ گیا۔ یہ ہوا میں الٹی قلابازی تھی جو اس لئے آسان ہو گئی تھی کہ مجھے کندھوں کے پاس سے اٹھانے والوں نے سہارا فراہم کر دیا تھا۔ میرے دونوں پاؤں پلٹ کر ان کے شانوں پر لگے تو وہ میرا ہاتھ چھوڑنے پر مجبور ہو گئے اور ایک دم آگے جھکے۔ پھر میرا وزن ان پر آ گیا اور وہ منہ کے بل گئے تو آخری سیڑھی پر عین سر کے بل گرے اور الٹ کر تہ خانے کے فرش پر چت ہو گئے۔ ان کے اوپر سے گزر کے میں نے بھی تہ خانے میں لینڈ کیا اور یہ سب کچھ مشکل سے دو تین سیکنڈ میں ہو گیا۔ میرا کوئی فعل غیر ارادی نہیں تھا۔ میں پہلے سے طے کر چکا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہوگا چناں چہ میں گرتے ہی پلٹ کے ایک طرف ہو گیا۔

میرے پیچھے آنے والے مسلح محافظ ایک لمحے تک تو سمجھ ہی نہ سکے کہ یہ اچانک کیا ہو گیا۔ جب ان پر صورتِ حال واضح ہوئی تو وہ فوراً یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ کیا اب انہیں بلا تامل فائر جھونک دینا چاہئے۔ تامل کی وجہ یہ تھی کہ میں اور ان کے دونوں ساتھی گڈمڈ ہو چکے تھے اور وہ فائرنگ کرتے تو حساب کے قاعدے کی رو سے دو تہائی امکانات یہ تھے کہ اپنے ہی ساتھیوں کو ہلاک کر دیں گے۔ ایک تہائی خطرہ میرے لئے تھا۔

اسی تذبذب نے انہیں فائر کرنے سے روکا اور وہ خود مجھ پر حملہ آور ہونے کے لئے ایک ساتھ دوڑے۔ انہیں یقین ہوگا کہ نیچے تہ خانے کے ہموار میدان جنگ میں وہ چاروں بندوقوں کے کندے مار مار کے دوسری بار مجھے سچ مچ ناک آؤٹ کر لیں گے۔ لیکن ان کے یقین میں پہلی گڑبڑ تو یہ ہوئی کہ ان کے زمیں بوس ہونے والے ساتھی فوراً نہ اٹھ سکے۔ ان کا سر اتنی قوت کے ساتھ سنگین فرش پر لگا تھا کہ وہ وہیں لیٹے رہے اور شاید اندھیرے میں گول چکر والے جھولے پر بیٹھے تارے دیکھتے رہے۔ دوسری گڑبڑ کے ذمے دار وہ خود تھے۔ ان کو تنگ راستے پر آگے پیچھے لپکنا چاہئے تھا۔ ایک ساتھ دوڑنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ آپس میں ٹکرائے۔ ایک نے شاید دوسرے کے پاؤں پر پاؤں رکھ دیا تھا۔ وہ چلّایا "ابے میرا پاؤں۔"

جس کا پاؤں دب گیا تھا اس نے ضرور پیر کو جھٹکا ہوگا تاکہ اس تکلیف سے چھٹکارا پائے۔ پاؤں دبانے والا اپنے ساتھی کے اسی ایک پیر پر کھڑا ہوا تھا۔ اس کا دوسرا پاؤں آگے بڑھ چکا تھا چناں چہ وہ ہوا میں معلق رہ گیا اور زمین کی کشش نے اسے کھینچ لیا۔ اس کے ساتھی نے پاؤں تو چھڑا لیا مگر جھٹکے سے اور تصادم سے وہ بھی حرکت کا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔

میں نے یہ سب زینے کی دیوار کے گوشے سے سر نکال کر دیکھا تھا۔ چند سیکنڈ بعد جب باقی دونوں محافظ بھی نیچے پہنچے تو میں ان کے استقبال کے لئے تیار تھا اور ہنگامی صورتِ حال نے میرے بدن میں فاضل بجلی بھر دی تھی۔ میں نے ایک کے سر پر بوٹ کی بھرپور ٹھوکر ماری اور دوسرے کی گردن پر ہاتھ مارا۔ پہلا تو دیوار سے سر ٹکرا کے گرا اور ساکت ہو گیا۔ دوسرے کی گردن میری توقع سے زیادہ نازک ثابت ہوئی۔ مجھ سے بھی آگے گرنے والے جھومتے جھامتے اٹھنے کی تیاری کر رہے تھے کہ میں نے انہی کی رائفلوں کے بٹ مار کے انہیں پھر لٹا دیا۔

اسی وقت پیچھے سے کسی نے کہا "بیوٹی فل۔"

میں نے نازو کی آواز پہچان لی اور پلٹ کے دیکھا "تھینک یو لیڈی۔ آپ بھی کم خوبصورت نہیں ہیں۔"

نازو نے کہا "میں آپ کے ایکشن کی تعریف کر رہی تھی"

اس کے ساتھ بندھے ہوئے غالب نے کہا "مجھے تم بھی خوبصورت لگ رہے ہو۔"

دس فٹ لمبے چوڑے اس تہ خانے کی تعمیر کا مقصد ہرگز کسی کو اسیر رکھنا نہیں تھا۔ یہ ایک انڈر گراؤنڈ قسم کا خفیہ بیڈ روم سمجھا جا سکتا تھا مگر اس کی تزئین و آرائش کا انداز بے حد پُراسرار اور خطرناک لگتا تھا۔ یہ ایک ایسا عشرت کدہ تھا جس میں گناہ کی پرچھائیوں کے پیچھے گھناؤنے کاروبار کا عکس نظر آتا تھا اور اس کی مجرم خاموشی میں مجبور عصمتوں کی نوحہ خواں سسکیاں سنائی دیتی تھیں۔ اس کی دیواریں آئینوں سے سب کچھ دیکھتی تھیں اور چھت کے مختلف زاویوں پر آویزاں روشنی ہر منظر کو فروزاں کرتی

تھی۔ تو کہیں پوشیدہ کیمروں کی نگاہ اسے محفوظ کرتی جاتی تھی۔ میں نے یہ سب ایک نظر میں دیکھا اور سمجھا، کسی دشواری کے بغیر۔ میری جگہ کوئی بھی ہوتا، سب جان لیتا۔

غالب اور نازو پہلے سے وہاں موجود تھے چناں چہ وہ بھی اس زیرِ زمین عقوبت خانے کے رُسوا کن اسرار و رموز کو سمجھ چکے تھے اور اس وقت کے تصور سے خوفزدہ تھے جو کسی بھی لمحے انسانی درندوں کی شکل میں شرافت اور انسانیت کی لاش کو تار تار کرنے کے لئے آ سکتا تھا۔

"اب کیا سوچ رہے ہو سکندر! جلدی کرو۔" نازو نے جھنجلا کے کہا۔

غالب نے کہا "ٹارزن کی جیت کے بعد فلسفی غالب آ گیا ہے"

میں نے چونک کے اور خفت سے سر کھجا کے انہیں دیکھا، وہ زنجیروں سے بندھے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھ بڑے عجیب طریقے سے جکڑے ہوئے تھے۔ غالب کے دونوں ہاتھ نازو کی کمر کے گرد تھے اور نازو کے ہاتھ غالب کی کمر کا احاطہ کئے ہوئے تھے۔ پھر انہیں الگ الگ زنجیر میں ڈال کے تالے لگا دئے گئے تھے۔ عام زندگی میں وہ کبھی اس انداز میں اتنی دیر تک یک جان دو قالب نہ رہے ہوں گے۔ ایک زنجیر نے ان کے پیروں کو باندھ رکھا تھا اور وہ چھت کے وسط میں نصب آئینے کے عین نیچے بیڈ پر ایسے پڑے ہوئے تھے کہ نازو کا شرم سے برا حال تھا اور غالب کا خفت سے۔ انہیں یہاں آئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی ورنہ ذہنی اذیت کے ساتھ جسمانی اذیت بھی برداشت کی حد سے گزر جاتی۔ وہ کروٹ تک نہیں لے سکتے تھے۔ کروٹ لینے کے لئے انہیں ایک دوسرے کے اوپر سے گزرنا پڑتا۔ انہیں باندھ کر یہاں ڈالنے والوں کے ذہن میں نہ جانے کیا غلیظ منصوبہ تھا جو پورا نہ ہوا۔ ڈرا نہیں کسی کا نہ تھا۔ نازو اور غالب کتنا بھی چیختے چلّاتے ان کی آواز کوئی نہ سنتا۔

"معاف کرنا یار" میں نے تالوں کو دیکھ کر کہا "ان کی چابیاں میرے پاس نہیں ہیں۔"

غالب نے مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ "چابیاں ان کی جیب میں ہیں"

نازو نے گردن کے اشارے سے کہا "وہ جو دیوار کے ساتھ پڑا ہے۔ بھوری داڑھی والا۔ قفل اسی نے لگائے تھے۔"

میں نے سر ہلا کے کہا "تم لوگ.... واقعی چاہتے ہو کہ تمہیں ...... الگ کر دیا جائے؟"

نازو نے بگڑ کے کہا "شرم آنی چاہئے تمہیں...."

میں نے حیران ہو کے کہا "مجھے؟ کمال ہے۔ یعنی میں نے کیا کیا ہے" اور بھوری داڑھی والے کی جیب سے چابی نکال لی۔

غالب نے کہا "اُلو کے پٹھے، تجھے مذاق کی سوجھ رہی ہے۔ ابھی وہ آ جائیں گے اوپر سے۔"

میں نے ایک تالا کھول کر ان دونوں کے پاؤں آزاد کر دئے۔

"قید تو ہم بھی کئی بار ہوئے" میں نے آہ بھر کے کہا "لیکن کوئی ایسا دل والا دشمن کبھی نہ ملا۔ کہ ایسے اسیر کرتا۔"

نازو کے ہاتھ جیسے ہی آزاد ہوئے اس نے اپنی شرمندگی مٹانے کے لئے مجھے نشانہ بنا لیا۔ میں اس کے حملے کے لئے تیار نہ تھا۔ پلک جھپکتے ہی اس نے مجھے اٹھا کے نیچے پھینک دیا اور ہاتھ جھاڑ کے بیڈ سے اتر آئی۔

میرے چوٹوں سے بدحال جسم کے لئے یہ صدمہ بھی کم نہ تھا مگر مجھے بے اختیار ہنسی آئی۔

"زبان کا مقابلہ ہاتھ سے کرنا تو بڑی بے اصولی کی بات ہے عزیزہ" میں نے اٹھتے ہوئے کہا "چلئے مرزا غالب۔ اٹھئے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی۔ ہتھیار اٹھانے کا وقت آ گیا۔"

ہتھیار انہوں نے پہلے ہی اٹھا لئے تھے۔ ایک محافظ کی خود کار رائفل نازو کے ہاتھ میں تھی اور دوسرے کی غالب کے ہاتھ میں۔ وہ ابھی تک ایک دوسرے سے ہی نہیں آئینوں سے بھی نظریں چرا رہے تھے۔

"تمہیں ہے کچھ اندازہ۔ کہ یہاں کتنے لوگ ہیں؟"

میں نے کہا "سارے شکاری اوپر بقلم خود موجود ہیں۔"

"باہر جانے کا راستہ ہے کوئی؟" نازو نے کہا۔

"راستہ بنانا پڑے گا۔ ویسے فکر کی اب کوئی بات نہیں۔ میں نے انہیں لڑنے پر مجبور کر دیا ہے ورنہ وہ تو مذاکرات پر اڑے ہوئے تھے۔ ہماری سپاہ نے باہر کہیں مورچے سنبھال لئے ہیں۔" میں نے کہا۔

غالب نے اوپر سے آنے والے راستے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "باہر کہاں؟"

"اور انہیں کیسے معلوم ہوا؟" نازو بولی۔

"کیا معلوم ہوا؟"

"یہی کہ ہم یہاں ہیں؟" نازو نے جھلّا کے کہا۔

"یہ تو مجھے نہیں معلوم۔" میں نے سادگی سے کہا۔

"پھر تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ باہر موجود ہیں؟" نازو کے بجائے غالب نے کہا۔

"وہ کون؟"

"ہماری سپاہ اور کون" غالب چلّا کے بولا۔

"وہ۔ اچھا۔ میں سمجھ گیا۔ دراصل ان کا ایک پیغام آ گیا تھا" میں نے کہا۔

"آخر تم یہاں وقت کیوں ضائع کرنے پر تُلے ہوئے ہو؟" غالب نے کہا "سیدھی طرح بات کیوں نہیں بتاتے۔"

میں نے کہا "کون سی ٹیڑھی بات کی ہے؟ وقت میں اس لئے ضائع کر رہا ہوں کہ وقت ہے۔ ابھی پانچ منٹ اور ضائع کر سکتا ہوں میں۔"

"اور پانچ منٹ کے بعد کیا ہوگا؟"

"یہ بھی مجھے معلوم نہیں" میں نے بے وقوفوں کی طرح کہا۔

نازو نے مجھے غور سے دیکھا "غالب! مجھے یہ کسی چوٹ کا اثر لگتا ہے۔ ایسی بہکی بہکی باتیں....."

میں نے کہا "نشے میں بھی تو بہک جاتا ہے آدمی۔"

"اچھا نہیں بتانا چاہتے تو مت بتاؤ" غالب نے کہا "بھاڑ میں جاؤ۔"

"اچھا۔ میں بھاڑ میں جاتا ہوں۔ اتنی دیر میں تم ایسا کرو کہ ان محافظوں کے کپڑے خود پہن لو" میں نے کہا "دو منٹ اور چالیس سیکنڈ باقی ہیں۔"

ان کی سمجھ میں تو کچھ نہ آیا مگر پہلے غالب ایک محافظ کو کھینچ کر لے گیا۔ وہ بیڈ روم سے ملحق باتھ روم میں غائب ہو گیا تو میں دوسرے کو گھسیٹ کر اوپر زینے میں لے گیا۔ جب میں نیچے آیا تو نازو نے تیسرے کی وردی چڑھالی تھی۔

غالب نے باتھ روم کا دروازہ بجا کے کہا "میں آجاؤں؟"

میں نے کہا "آجاؤ یار۔ تم سے کوئی پردہ ہے۔"

"پردے کے بچے۔ باہر سے کنڈی کھول....."

کنڈی نازو نے لگائی تھی۔ اس نے ہاتھ آگے بڑھایا ہی تھا کہ اوپر کہیں ایک دھماکا ہوا۔

غالب نے باہر آتے ہی کہا "یہ کیا تھا؟"

میں نے کہا "دھماکا" اور اوپر دوڑا۔

اوپر سے چیخ پکار کے ساتھ گالیوں کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ دلاور نے کسی سے کہا "وہ چاروں..... کیا نیچے ہی فوت ہو گئے!"

اوپر آتے ہی میں نے دھوئیں اور بارود کی بو محسوس کی۔ ایک شخص بڑی خطرناک قسم کی مشین گن لئے دلاور کے ساتھ نمودار ہوا۔ اس نے مجھے پہچاننے میں غلطی کی لیکن دلاور ایک کھلے دروازے میں غوطہ مار گیا۔ اس نے میری وردی کے باوجود میرا چہرہ دیکھ لیا تھا۔ میں نے خودکار را ئفل کا راؤنڈ چلا کے مشین گن کے ساتھ آنے والے کو چھلنی کر دیا۔

غالب اور نازو ابھی تک میرے پیچھے تھے۔ میں نے غالب سے کہا "تم زینے سے اوپر جاؤ۔ دیکھو اوپر کون ہے؟"

غالب دوڑتا ہوا اوپر چلا گیا۔

"میں بھی اوپر جاؤں؟" نازو نے کہا۔

"خبردار! پھر کوئی باندھ کے ڈال دے گا" میں نے کہا "تم پیچھے سے جاؤ۔ اس دروازے کو کھولو۔"

"کیسے کھولوں؟ میرے پاس چابی نہیں ہے" نازو نے مجھے چڑانے کے لئے کہا "تمہارے پاس ہے؟"

"چابی نہیں ہے۔ عقل بھی نہیں ہے کیا! گولی مار دو" میں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"کسے گولی ماردوں؟" نازو میری بات سمجھ لینے کے باوجود وہیں کھڑی رہی۔

"غالب کو" میں نے بھنا کے کہا اور نیچے پڑے ہوئے شخص کی مشین گن اٹھالی "سمجھ لو کہ یہ دروازہ نہیں غالب ہے۔"

نازو ہنس پڑی۔ اوپر سے غالب نے نہ جانے کس پر ایک راؤنڈ چلایا۔ نازو نے اس کے ساتھ ہی دروازے کا قفل اڑا دیا اور باہر نکل گئی۔ میں مشین گن اٹھا کے اس کمرے میں گھس گیا جس میں دلاور غائب ہوا تھا لیکن وہاں اب کوئی نہیں تھا۔ غالباً وہ فرار ہو رہے تھے۔ اوپر سے پھر فائرنگ کی آواز آئی۔ ایک اور کار کا انجن غرایا۔ کوئی بری طرح چیخنے لگا۔ ریوالور کے ایک فائر کے ساتھ ہی اس کی آواز بند ہو گئی۔

مشین گن لے کر میں ایک سے دوسرے کمرے میں گیا مگر اب کہیں کوئی نہ تھا۔ جہاں مذاکرات ہو رہے تھے وہاں ملبے کے ایک ڈھیر سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے پتھر پھینکنے والوں نے مہلت تمام ہوتے ہی اسی راستے سے دستی بم اندر پھینک دیا تھا۔

اوپر سے غالب نے چلا کے کہا "وہ بھاگ گئے۔"

میں نے سر اٹھا کے پیچھے دیکھا تو غالب ایک بالکونی میں کھڑا ہوا تھا "سب بھاگ گئے؟"

"ہاں۔ دو کاروں میں" غالب نے اوپر سے ہی جواب دیا۔

"اور آپ نے کچھ نہیں کیا؟"

"میں نے فائر کئے تھے۔ اگر آواز تمہارے کانوں نے نہیں سنی تو ابھی وقت ہے۔ بڑے کان لگوالو۔ مثلاً گدھے کے" غالب نے کہا۔

"اگر تمہارا نشانہ خطا ہو گیا تو تم بھی یہ آنکھیں بدلوالو۔ چمگادڑ کی آنکھیں لگوالو" میں نے جوابی مشورہ دیا۔

"کاریں بلٹ پروف تھیں" غالب نے مجھے مطلع کیا۔

"بہت خوب۔ اب آپ نیچے تشریف لائیں گے یا میں نازو کو بھیجوں۔ کہ آپ کو منالائے" میں نے کہا۔

نازو نے اس کے پیچھے آکے کہا "چلو نیچے کودو۔ اسی جگہ سے" اور اسے دھکا دیا۔

"ارے..... کیا کرتی ہو۔ خواہ مخواہ خودکشی کرانا چاہتی ہو میری" غالب نے برہمی سے کہا "تاکہ بعد میں کہتی پھرو کہ غالب نے میری خاطر جان دے دی۔ میرے اشارے پر۔"

سامنے والے گیٹ کے اوپر سین یا شین میں سے کوئی نمودار ہوا۔ اس کے پورے بتیس دانت نظر آرہے تھے۔

میں نے خوشی سے چلا کے کہا "شاباش۔ تم نے تو کمال کر دیا سین۔"

"میں شین ہوں" وہ اندر کود کے بولا۔

"اچھا..... تو پھر سین کہاں ہے؟"

دھم سے کوئی میرے سامنے گرا "میں سین ہوں۔"

میں نے اوپر دیکھا "کیا تم اس پیڑ سے لٹکے ہوئے تھے؟"

"ہاں۔ ہم نے ہی تو وہ پتھر پھینکا تھا۔ ہم سب دیکھ رہے تھے"

سین نے گلے میں پڑی ہوئی دوربین دکھائی۔

"کمال ہے۔ لیکن پتھر وہاں تک پہنچا کیسے؟" میں نے کہا۔

اس نے دوربین کے ان فیتوں کو کھینچا جو اسے گلے یا شانے پر لٹکانے کے کام آتے ہیں۔ فیتے ربر کے تھے اور سین نے ان فیتوں سے غلیل کا کام لیا تھا۔ اس نے زمین پر سے ایک اور پتھر اٹھا کے غلیل کی عملی کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔

"مگر سارے بھاگ گئے خفیہ راستے سے" سین نے افسوس کے ساتھ سر ہلایا "ایک آدمی زخمی ہوا تھا، اسے مار کے لاش چھوڑ گئے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ یہ زمین دوز راستہ ہے۔ وہ دوسری طرف جا نکلے ہوں گے مگر تم نے کیسے پتا چلا لیا ہمارا؟"

"ہم کو محسن بھائی نے تریونی کی گاڑی دکھادی تھی۔ کالے رنگ کی لمبی سی گاڑی تھی۔ ہم نے اس کا پیچھا کیا تھا۔ یہاں آکے وہ غائب ہو گئی تھی۔ دوبارہ یہاں نظر آئی" سین نے کہا "ہم نے آس پاس مورچے سنبھال لئے تھے۔"

"محسن اور گل اب کہاں ہیں؟" نازو نے پوچھا۔

شین نے کہا "باہر گاڑی میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

میں نے کہا "چلو تم سب لوگ جاؤ۔ میں اور سین بعد میں آئیں گے۔"

"بعد میں کیوں؟" نازو نے کہا۔

غالب نے بھی اعتراض کیا "تم کو اکیلا چھوڑ کے ہم کیسے جا سکتے ہیں۔"

"مجھے کام ہے؟" میں نے کہا۔

"ایسا کیا خفیہ کام ہے؟ ہمیں بھی تو پتا چلے۔" نازو نے کہا۔

میں نے کہا "ہر بات بتانے کی نہیں ہوتی۔"

نازو احتجاجاً وہیں دھرنا مار کے بیٹھ گئی "یہ بات ہے تو پھر میں بھی تمہاری ہر بات ماننے کی پابند نہیں۔ کرلو جو کر سکتے ہو۔"

میں نے کہا "بغاوت؟"

"ہاں بغاوت" وہ چلا کے بولی "جب اعتماد ہی نہیں تم کو تو پھر ہم کیوں مانیں تمہیں اپنا لیڈر۔"

میں نے کہا "دیکھو دیر مت کرو۔ فائرنگ کی آوازیں سب نے سنی ہوں گی۔ ایسا نہ ہو کہ پولیس آجائے۔"

نازو اسی بے نیازی سے بیٹھی رہی اور گھاس کا تنکا توڑ کے چباتی رہی "تم بھی بیٹھو۔ تازہ گھاس کھاؤ" اس نے غالب سے کہا اور ہاتھ پکڑ کے اسے زبردستی بٹھا دیا۔

"جس کا ٹیکسی ہے اس نے بولا تھا دیر مت کرنا" شین پریشان ہو کے بولا۔

"کس کی ٹیکسی لے کر آئے ہو تم؟"

"ایک یار ہے" شین نے مطلع کیا "گاڑی میں بیٹھا ہے۔"

میں نے غالب اور نازو کو قائل کرنے کے لئے ایک اور دلیل پیش کی "گاڑی میں تین افراد پہلے سے موجود ہیں۔ مزید پانچ کیسے بیٹھ سکتے ہیں؟ بہتر ہے کہ تم تینوں جاؤ۔"

نازو اور غالب بہرے بنے بیٹھے رہے۔ باہر سے کار نے ہارن دیا۔

میں نے بھنا کے کہا "یار، یہ کیا بچوں والی حرکت ہے! میں سین کے ساتھ اس زمین دوز راستے سے جاؤں گا اور دوسری کوٹھی کے راستے باہر آجاؤں گا۔ بس اتنا سا کام ہے۔"

"اور اگر آپ درمیان میں ہی کہیں اٹک گئے؟ سرنگ سے ہی نہ نکل سکے۔ یا سرنگ سے نکلنے کے بعد دھر لئے گئے پھر؟ وہ سب اسی راستے سے گئے ہیں۔ سرنگ کے دوسرے کنارے پر ان کی ساری نفری موجود ہو گی۔" غالب نے کہا۔

"اگر میں کوئی خطرہ دیکھوں گا تو واپس آجاؤں گا۔" میں نے وعدہ کیا۔

"آخر ضرورت کیا ہے یہ پنگا لینے کی؟"

"میں ذرا نقشہ سمجھنا چاہتا ہوں۔ یہ اندازہ کرنا چاہتا ہوں کہ کیا شہلا دوسری کوٹھی میں ہو سکتی ہے۔ جہاں سے ہم داخل ہو کے زمین دوز راستے میں اترے تھے اور یہاں آنکلے تھے۔"

"یہ پتا چلانا آسان نہیں ہو گا سکندر" غالب نے نفی میں سر ہلایا۔

"میں دور سے اندازہ کروں گا۔"

"کیا دیواروں کا ایکسرے کرو گے؟" نازو نے کہا "یا کسی چھٹی حس سے کام لو گے؟"

"خدا کے لئے بحث مت کرو۔ میں نے وعدہ کیا ہے تاکہ کوئی خطرہ مول نہیں لوں گا۔ تم لوگ جاؤ۔ پلیز نازو! وہ لوگ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ سین میرے ساتھ ہے۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں" میں نے برہمی سے کہا "اب تم کیا چاہتی ہو، میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑوں۔"

نازو اٹھ کھڑی ہوئی "ہاتھ جوڑو یا پیر، میں کسی ڈرامے بازی سے متاثر نہیں ہوتی۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔"

"کیا..... میرے ساتھ؟"

"ہاں۔ یہ چار آدمی ایک گاڑی میں جائیں۔ ہم چار بعد میں دوسری گاڑی پکڑ لیں گے" نازو نے کہا۔

"دیکھو، جب ضرورت ہوتی ہے تو میں خود تمہیں ساتھ رکھنے کو ترجیح دیتا ہوں لیکن ابھی کوئی ضرورت نہیں ہے تمہاری۔ میں صرف راستہ دیکھنے جا رہا ہوں۔ راستہ صاف نہ ملا تو واپس۔ میرا ارادہ کسی سے لڑنے بھڑنے کا یا مقابلہ کرتے ہوئے اپنا راستہ بنانے کا ہرگز نہیں ہے۔ ایسی ویسی کوئی بات ہو گی تو میں الٹے قدم واپس....."

"بشرطیکہ اتنی دیر میں واپسی کے راستے بھی بند نہ ہوئے۔"

نازو نے غصے سے کہا۔
باہر سے کار کا ہارن مسلسل کئی بار سنائی دیا۔ پھر محسن کا چہرہ گیٹ پر نمودار ہوا۔
"غالب کے بچے! یہ کیا ہو رہا ہے؟"
غالب نے کہا "دیکھو گھاس کتنی عمدہ ہے۔ پھول کتنے اچھے ہیں۔ آؤ تم بھی گھاس کھاؤ۔"
محسن نے کہا "ہارن کا گلا بیٹھ گیا چلاتے چلاتے"
میں نے کہا۔ "غالباً کچھ سننے کو تیار نہیں۔"
"کون کچھ سننے کو تیار نہیں؟"
"غالب کی غالباً" میں نے کہا "غالب کیا کرے؟"
غالب نے کہا "میرے نام پر مت جاؤ۔ در حقیقت میں مغلوب ہوں۔"
"تف ہے تجھ پر۔ تو نے مردوں کا نام بدنام کر دیا ہے۔ میں ہوتا تو ایک ہاتھ مارتا ایسا کہ سیدھی ہو جاتی" محسن نے کہا۔
میں نے کہا "غلط۔ ایک چیز کبھی سیدھی نہیں ہوتی، خواہ اسے بارہ برس نلکی میں ڈال کے رکھو۔"
نازو غصے میں اٹھی اور دروازے کی طرف چل پڑی "تم خود کتے کی دم۔ نہیں سنتے میری تو بھاڑ میں جاؤ" وہ بولی۔ غالب اس کے پیچھے دوڑا۔
میں نے ہنستے ہوئے اطمینان کا سانس لیا اور سین کے ساتھ زمین دوز راستے کی طرف بڑھ گیا۔ جہاں سے یہ راستہ شروع ہوتا تھا وہیں ایک شخص الٹا پڑا ہوا تھا۔ یہ شخص غالب کی فائرنگ سے مجروح ہوا تھا۔ جاتے جاتے وہی اس کو مار گئے تھے جن کا وہ نمک خوار تھا۔ اس کی اکڑی ہوئی لاش کو پلٹ کر میں نے جیبوں کی تلاشی لی لیکن مجھے کچھ بھی نہ ملا۔
زیر زمین راستے کا نشیب آہستہ آہستہ بڑھتا تھا۔ یہ سیمنٹ کا بنا ہوا پختہ راستہ سطح زمین سے تقریباً چھ فٹ نیچے تھا اور اس کی چوڑائی اتنی ہی تھی کہ اس میں سے ایک کار گزر جائے۔ دن کا اُجالا اس کے تھوڑے سے حصے کو روشن کرتا تھا۔ آگے گھپ اندھیرا تھا۔ ایک لمحے کے لئے مجھے خوف کا شکار ہو گیا۔ کہیں سرنگ درمیان میں سے بند نہ ہو۔ کسی مشینی نظام سے آہنی دروازے کو بجلی کے تار یا بارودی سرنگیں لگا کے اسے دامِ اجل نہ بنا دیا گیا ہو۔ یہ نہ ہو کہ اندھیرے میں ہم کسی گڑھے کو نہ دیکھ پائیں یا کوئی ہم پر اچانک حملہ کر دے۔ میں نے سوچا کہ شاید نازو ٹھیک ہی کہتی تھی۔ مجھے واپس لوٹ جانا چاہئے لیکن واپسی کا مطلب سین کے سامنے اپنے خوف کا اعتراف کرنا تھا۔ مجھے شکست تسلیم کرتے ہوئے شرم آئی اور میں خدا کا نام لے کر آگے بڑھنے لگا۔
میں نے اندھیرے میں راستہ تلاش کرنے اور محفوظ رہنے کے لئے پیش قدمی کا وہی طریقہ اختیار کیا جو نابینا کرتے ہیں۔ میں اپنے ہاتھ آگے پھیلا کے اور مشین گن سے فرش کو محسوس کرتے ہوئے چلا گیا۔ اس احتیاط نے مجھے بھی بچا لیا اور سین کو بھی۔ فرش میں تین جگہ گہرے خلا تھے۔ جیسے کھلے ہوئے گٹر۔ معلوم نہیں میں کسی مین ہول میں گر جاتا تو میرا کیا حشر ہوتا اور میں کتنی گہرائی میں جا کے گرتا۔ کار کی ہیڈ لائٹس میں یہ کھلے ہوئے مین ہول صاف نظر آ جاتے ہوں گے تو کار کے پہیے ان کے دونوں جانب سے گزر جاتے ہوں گے۔
یہ راستہ تقریباً سو فٹ لمبا تھا جو ہم نے دس پندرہ منٹ میں طے کیا۔ پھر ایک موڑ آیا، روشنی اس کے دوسرے کنارے سے آ رہی تھی مگر مجھے یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ باہر نکلنے کا راستہ مضبوط فولادی سلاخوں والے دروازے نے بند کر دیا ہے۔ آہنی سلاخوں میں کرنٹ بھی ہو سکتا تھا۔ میں نے سین کا مشورہ قبول کرتے ہوئے واپسی اختیار کی۔ پندرہ منٹ بعد ہم باہر نکلے اور گیٹ سے گزر کے سڑک پر آ گئے۔ سین نے گزرتی ہوئی ایک ٹیکسی کو روک لیا "ابھی چل یار" اس نے کہا اور اپنے ساتھ مجھے بھی اندر گھسیٹ لیا۔
ٹیکسی ڈرائیور نے غصے سے پلٹ کر دیکھا "دیکھتا نہیں میٹر ڈاؤن ہے۔ اپنا ٹیکسی بند کرنے کا ٹائم ہے۔"
اچانک اس نے مجھے دیکھا اور اس کی نظر میرے چہرے پر جم گئی "میں نے تم کو دیکھا ہے۔ پر کدھر؟"
میں سمجھ گیا کہ اس نے مجھے نہیں میری تصویر کو دیکھا ہو گا مگر ٹالنے کے لئے میں نے کہا "کسی فلم میں دیکھا ہو گا۔"
"فلم میں؟" وہ کنفیوز ہونے لگا۔
"ہاں۔ میں نے بہت سی فلموں میں سائیڈ رول کئے ہیں۔"
"ایک دم بنڈل" اس نے چٹکی بجا کے کہا "تیرا فوٹو تھا اخبار میں۔ اکھا بمبئی کے انگریزی گجراتی اخبار میں۔"
میں نے ریوالور نکال کر کہا "بالکل ٹھیک۔ میری گرفتاری کا انعام بھی ہے لیکن آج تک کوئی لے نہیں سکا۔ تم بھی کوشش مت کرنا ورنہ بچے اناتھ اور پتنی ودھوا ہو جائے گی۔"
حیرت انگیز ہمت اور پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے میرے ریوالور پر ہاتھ ڈال دیا اور میری کلائی کو جھٹکا دے کر سیٹ پر مارا "سالا ودھوا کی اولاد......"
ریوالور میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور ٹیکسی ڈرائیور کے پیروں کے قریب گرا۔ خلافِ توقع وہ ایک قوی دشمن ثابت ہوا تھا۔ اگر ریوالور اس کے ہاتھ میں آ جاتا تو شاید وہ بلا جھجک مجھے گولی مار دیتا۔
میں نے جوڈو میں اپنی پیشہ ورانہ مہارت کو بروئے کار لاتے ہوئے اس کی گردن کو بازو کے شکنجے میں کس لیا اور اسے اپنی طرف کھینچا۔ اس نے مزاحمت کرتے ہوئے دونوں ہاتھ گھمائے۔ ایک ہاتھ سین کے منہ پر لگا۔ وہ پاگل کی طرح چلایا۔ ڈرائیور کی لات دروازے پر لگی۔ دروازہ کھل گیا۔ پیچھے سے آنے والا ایک تیز رفتار سائیکل والا کھلے دروازے سے ٹکرا کے سڑک پر لیٹ گیا۔

سائیکل اس کے اوپر گری۔
میرے اور ڈرائیور کے درمیان سیٹ حائل تھی۔ آگے والی دونوں سیٹوں کی بیک اونچی تھی اور درمیانی جگہ سے ڈرائیور کو کھینچ کر پیچھے لانے کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ دونوں اگلی سیٹوں کے درمیان بری طرح پھنس گیا تھا۔ اس کے سر کو میں نے گردن دبوچ کے قابو میں کر لیا تھا لیکن اس کی اوپر اٹھی ہوئی ٹانگیں دھم دھم چھت پر لگ رہی تھیں۔
سائیکل سوار کے گرتے ہی باہر کچھ اور لوگ بھی آ گئے تھے اور ٹیکسی کے اندر ہونے والی جنگ کو بند کرانے کے لئے کوشاں تھے۔ کچھ محض شور مچا رہے تھے۔ "ارے۔ ارے چھوڑو۔ کیوں دشمن ہو رہے ہو ایک دوسرے کی جان کے۔ اے بھائی صاحب! آپ ہی مان جائیں۔ ڈرائیور! ارے بھائی بند کرو مار پیٹ۔ آخر ہوا کیا ہے؟"
کچھ ڈرائیور کو کھینچ کر الگ کرنا چاہتے تھے اور اس کوشش میں ڈرائیور کی لات ایک کے منہ پر لگ چکی تھی اور دوسرے کے پیٹ میں۔ صورتِ حال میرے لئے خطرناک ہو گئی تھی۔ میں ڈرائیور کو چھوڑتا تو وہ چلا چلا کے سب کو بتا دیتا کہ میں کون ہوں اور میں اسے مار ڈالتا تو لوگ مجھے جانے نہ دیتے۔ اس کے علاوہ مجمع بڑھتا جا رہا تھا اور پولیس کسی بھی وقت نمودار ہو سکتی تھی۔
اس وقت سین نے بڑی حاضر دماغی کا ثبوت دیا۔ وہ ٹیکسی کا پیچھے والا دروازہ کھول کر اترا اور آگے جا کے اس نے بڑی ہوشیاری سے ریوالور کے اوپر ایک کپڑا ڈال دیا۔ پھر اس نے دونوں ٹانگیں پکڑ کے ڈرائیور کو سیٹ کے اوپر سے گزار دیا اور پوری طرح میری تحویل میں دے دیا۔
"اس بدمعاش نے ہمیں لوٹنے کی کوشش کی تھی۔ یہ دیکھیں" سین نے کہا "اس ریوالور سے۔"
اس نے کپڑا ہٹا کے ان سب کو ریوالور کا دیدار کرایا جو ٹیکسی کے اندر اپنا سر ڈال چکے تھے۔
"چھونا مت۔ اس پر انگلیوں کے نشانات ہوں گے۔ ہم اس کو تھانے لے جاتے ہیں۔"
میں نے اتنی دیر میں ایک ہاتھ مار کر ڈرائیور کو بے سدھ کر دیا تھا۔ وہ بڑا سخت جان حریف ثابت ہوا تھا اور اسے پوری طرح زیر کرنے کی جدوجہد میں میرا سانس پھول گیا تھا۔ سین نے فوراً ٹیکسی اسٹارٹ کر دی۔
"کوئی گواہ ساتھ چلے گا؟" اس نے کہا۔
ایک دم سارے خدائی فوجدار اور صلح صفائی کرانے والے رضاکار پیچھے ہو گئے۔ سرِراہ کسی بھی معاملے میں دخل در معقولات کی عادت عام بات ہے لیکن تھانے جا کے عملاً قانون کی مدد کرنے اور گواہی میں ملوث ہونے سے وہ بھی گریز کرتے ہیں جو قانونی ذمے داریوں کے موضوع پر کالم لکھتے ہیں اور جنتا کو بھاشن دیتے پھرتے ہیں کہ معاشرے سے جرائم کی بیخ کنی کے لئے قانون سے تعاون کرنا کتنا ضروری ہے۔ دراصل کالم لکھنے یا تقریر کرنے کے پیسے ملتے ہیں اور مفت میں گواہی دینے کا انجام خواری کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا۔
سین نے ٹیکسی چلا دی تھی کہ موٹر سائیکل پر ایک پولیس کا سب انسپکٹر نمودار ہو گیا۔ ٹیکسی کے مجمع سے نکلتے ہی اس نے بھی موٹر سائیکل قریب لا کے سین سے کہا "گاڑی روکو ایک سائیڈ میں۔"
سین نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی "بات کیا ہے تھانے دار جی......"
"بات کے بچے۔ بھاگنے کی کوشش کی تو گولی مار دوں گا" سب انسپکٹر نے مشتعل ہو کے کہا "ٹیکسی لے کر فرار ہو رہا ہے......"
سین نے پھر رفتار کم کی "ٹیکسی میری ہے۔"
"بکواس مت کر۔ وردی اور بیج کیوں نہیں ہیں؟ کاغذات ہیں تیرے پاس؟" سب انسپکٹر نے کہا "مجھے معلوم ہے ڈرائیور پیچھے پڑا ہے۔"
"ہم اسے تھانے ہی لے جا رہے ہیں....." میں نے کہا "اس نے ہمیں لوٹنے کی کوشش کی تھی۔"
"بکو مت۔ تھانہ تو گزر گیا۔ آگے تمہارے باپ کا تھانہ ہے کوئی....." اس نے مجھے گالی دے کر کہا۔
سین نے اسے جوابی گالی سے نواز کر کہا "اچھا تو پھر تو بھی آ جا ہمارے ساتھ" اور ٹیکسی کا ایکسیلریٹر دبا دیا۔ ٹیکسی کا انجن غرایا اور رفتار کی سوئی ساٹھ سے ستر اور پھر اسی نوے تک پہنچ گئی مگر موٹر سائیکل نے چند منٹ میں ہمیں آ لیا۔
میں نے سین سے کہا "ہم اس کی موٹر سائیکل سے ریس نہیں جیت سکیں گے۔ بہتر ہے کہ اس سے نمٹ لیا جائے۔"
"آپ دیکھتے جائیں سر" سین نے کہا۔
سب انسپکٹر نے کہا "میں آخری وارننگ دے رہا ہوں۔"
ادھر اس کا ہاتھ ریوالور نکالنے کے لئے جیب کی طرف بڑھا ادھر سین نے اسٹیرنگ گھما دیا۔ ٹیکسی لہرا کے دائیں طرف گئی اور اس کی سائیڈ موٹر سائیکل سے ٹکرائی۔ دو پہیوں والی کسی بھی سواری کا توازن بگڑتے دیر نہیں لگتی۔ موٹر سائیکل اس تصادم کی تاب نہ لا سکی اور سڑک پر گر گئی۔
میں نے موٹر سائیکل کے ساتھ سب انسپکٹر کو بھی کچھ دور سڑک پر پھسلتا دیکھا۔ سین نے اسے ایک ساتھ ولدیت کو غلط کرنے والی دو گالیاں دیں اور ٹیکسی کو یوٹرن دے کر واپس جانے والی سڑک پر موڑ لیا۔ یہ ایک غیر قانونی اور خطرناک حرکت تھی۔ دوسری طرف سے ٹریفک بہت تیز آ رہی تھی اور سڑک کو تقسیم کرنے والی گرین بیلٹ میں یہ کٹ اچانک ہی آ گیا تھا۔ سین کو سوچنے سمجھنے کی مہلت ہی نہ ملی۔ یہ کٹ نکل جاتا تو شاید اسے ایک

میل آگے چوک تک جانا پڑتا۔ ٹیکسی الٹتے الٹتے بچی اور کئی گاڑیاں بریک لگا کے یا لہرا کے ٹیکسی سے ٹکراتے ٹکراتے رہ گئیں۔ ان کے ڈرائیوروں نے سین کو ردیف قافیے سے آزاد گالیاں سنائیں مگر سین گالیاں کھا کے بے مزہ تک نہیں ہوا۔ اس نے اپنی باکمال اور بے ا[illegible] ئیونگ جاری رکھی اور سارے قواعد و ضوابط کی ایسی تیسی کرتا گیا۔ ایک جگہ اس نے ون وے ٹریفک کے خلاف ایک فرلانگ کا فاصلہ طے کیا پھر شارٹ کٹ لینے کے لئے راؤنڈ اباؤٹ کا چکر کاٹے بغیر دائیں جانب مڑ گیا اور ایک چوک سے لال بتی کی پروا کئے بغیر گزر گیا۔ اسے اس کی خوش قسمتی ہی کہا جا سکتا ہے کہ کہیں بھی ٹریفک پولیس نے اس کا راستہ نہیں روکا۔

پندرہ منٹ کے بعد اس نے اعلان کیا "اب کوئی خطرے کی بات نہیں رہی۔"

میں نے اطمینان اور سکون کا سانس لے کر کہا "تم نے تو بہت کوشش کی خودکشی کرنے کی۔ اور اپنے ساتھ مجھے مروانے کی۔ لیکن میری کوئی نیکی کام آگئی۔"

"ابھی میرا تمہارا ٹائم پورا نہیں ہوا تھا دنیا میں۔ ٹائم پورا ہو جائے تو کوئی بھاگ کے کہاں جا سکتا ہے" مسٹر سین نے کسی فلسفی کی طرح کہا "جہاں جائے گا موت پہلے سے وہاں موجود ہوگی۔"

"یہ بتاؤ کہ اب ہم ماماجی کے گھر سے کتنا دور ہیں؟"

"پہلے سے زیادہ سر" وہ بولا۔

میں نے کہا "پھر اس ٹیکسی کو چھوڑ دو کہیں۔"

اس نے ایک دم بریک لگا کے ٹیکسی کو سائیڈ میں روک لیا۔

"میں بھی یہی سوچ رہا تھا سر۔ یہ دیکھیں۔" اس نے نوٹوں کی ایک گڈی لہرائی۔

میں بھونچکا رہ گیا "یہ اتنے سارے نوٹ...."

سین نے کہا۔ "یہ پورے دس ہزار ہیں۔ اور ایسی چار گڈیاں ابھی اندر پڑی ہیں۔" اس نے گلوز کمپارٹمنٹ کھول کر دکھایا۔

"پچاس ہزار!" میں نے حیرانی سے کہا "ایک ٹیکسی ڈرائیور کے پاس اتنی دولت کہاں سے آگئی۔"

"اور سر! یہ بھی دیکھئے کہ اس نے کتنی بے پروائی سے اس کو کہاں ڈال رکھا تھا" سین بولا "اس کی جگہ میں ہوتا تو سیٹ کے نیچے چھپاتا یا ڈکی میں دبا کے رکھتا۔"

میں نے کہا "ہو سکتا ہے یہ رقم کسی کی امانت ہو۔ یہ کسی کو پہنچانے جا رہا ہو۔ کیا پتا اس نے اپنا گھر یا بیوی کا زیور بیچا ہو۔ بیٹی کی شادی کرنے کے لئے۔"

سین نے نفی میں سر ہلایا "سر، آپ جذباتی ہو رہے ہیں۔ یہ ایسا شریف آدمی نہیں تھا۔ بدمعاش تھا۔"

"اس لئے کہ اپنا دفاع کرنے کے لئے اس نے ہمارا مقابلہ کیا تھا" میں نے کہا۔

"نہیں سر۔ یہ بھی دیکھئے" اس نے سیٹ کے نیچے سے ایک ریوالور نکال لیا۔

میں نے کہا "کمال ہے! اتنی جلدی تم نے تلاشی بھی لے ڈالی۔"

"مجھے رقم دیکھ کر شک ہوا تھا سر" وہ بولا "تلاشی ابھی کہاں ہے۔ یہ تو ایسے ہی سیٹ کے نیچے ہاتھ مارنے سے مل گیا۔ کیا معلوم ڈکی میں سے کیا نکلے گا۔"

میں نے ڈرائیور کی جیبوں کی تلاشی لی۔ ڈرائیونگ لائسنس میں اس کا نام دھرمیندر ولد کاشی ناتھ لکھا ہوا تھا لیکن اس کے ایڈریس پتے کی جگہ۔ "معرفت جیون پرشاد ایم ایل اے لکھا ہوا تھا جو کہ میرین ڈرائیو پر رہتا تھا۔ یہ پتا از خود خبردار کر دیتا تھا کہ اسے کوئی عام ٹیکسی ڈرائیور نہ سمجھے۔ وہ ایک ایم ایل اے کا آدمی ہے۔ اس کی ایک جیب میں سے جو نوٹ بک برآمد ہوئی اس میں بھی چند نام صوبائی اور مرکزی اسمبلی کے ارکان کے تھے۔ باقی نام میرے لئے اجنبی تھے مگر میں اندازہ کر سکتا تھا کہ وہ سب صاحبانِ اختیار و اقتدار کے حوالے تھے۔

انہی بااثر لوگوں کی فہرست میں تریونی کا نام دیکھ کر میں چونکا۔ اس کا پتا اور فون نمبر سب ٹھیک تھے۔ میں نے اس نوٹ بک کو اپنی جیب میں رکھ لیا۔ اندر کی جیب سے نکلنے والے پرس میں دو ڈھائی سو روپے تھے اور ایک لفافہ تھا جسے تہہ کر کے بڑی احتیاط سے رکھا گیا تھا۔ میں نے لفافہ نکال کے روشنی کے رخ پر دیکھا تو مجھے بائیں جانب، نیچے والے کونے میں جیون پرشاد کا نام نظر آیا جو بار یک سرخ رنگ کے ابھرے ہوئے حروف میں بہت نمایاں تھا۔

لفافے کے اندر سے جو خط نکلا وہ بھی جیون پرشاد ایم ایل اے کے لیٹر ہیڈ پر لکھا گیا تھا۔ اس پر نام اور پتا دائیں جانب تھے بائیں کونے پر مرکزی اسمبلی کا مونوگرام تھا۔ لیٹر ہیڈ کا اور لفافے کا ایک ہی کاغذ تھا جو بہت قیمتی تھا۔

خط انگریزی میں تحریر کیا گیا تھا اور اس پر کوئی تاریخ نہیں تھی مگر خط اور لفافے کی حالت سے ظاہر ہوتا تھا کہ معاملہ زیادہ پرانا نہیں۔ لفافہ اور خط اگر چند دن اسی طرح جیب میں رہتے تو گرد آلود ہو جاتے اور میلے نظر آتے۔

خط میں لکھا تھا۔

ڈیئر مسٹر تریونی۔

تمہارا کام ہو گیا ہے۔ اس کے لئے مجھے ریلوے کے منسٹر صاحب کے پی اے سے فون کروانا پڑا۔ آپ تو جانتے ہیں کہ ریلوے پر کتنا بوجھ ہے اور اتنے کم وقت میں کوئی کام کرانے کے لئے صرف سفارش ہی کافی نہیں ہوتی۔ اوپر والے تو ہاں کر دیتے ہیں مگر نیچے والے ٹالنے کے ماہر ہیں اور جب تک ان کتوں کو ہڈی نہ ڈالی جائے یہ راستہ نہیں دیتے۔ راستہ بنانے کے لئے جتنا خرچ کرنا پڑا اتنا ہی میں آپ سے لوں گا۔ آپ کی طرف سے تو ایک لاکھ تک خرچ کرنے کا اختیار حاصل تھا مگر میں مالِ مفت دلِ بے رحم کا قائل نہیں ہوں۔ آپ کے پچاس ہزار بچ گئے۔ ریلوے کمرشل کارگو آفیسر نے "فوجی ضرورت" کے حوالے سے خواجہ سیمنٹ والوں سے دو بوگیاں لے لی ہیں۔ یہ تو دیکھنا پڑتا ہے کہ پارٹی کیسی ہے اور مال کیا ہے ورنہ عین وقت پر کسی کی بکنگ منسوخ کرنے میں خطرہ رہتا ہے کہ وہ اپیل نہ کر دے۔ اخبار میں اشتہار یا خبر لگوا دے یا رٹ دائر کر دے۔ خیر اب آپ فکر نہ کریں۔ میں نے سارے کام خوش اسلوبی سے طے کروائے ہیں۔

یہ خط لانے والا دھرمیندر میرا خاص آدمی ہے۔ اس کو پچاس ہزار نقد دے دیں۔ چیک نہیں چلے گا۔ ہم تو ہمیشہ خدمت کے لئے تیار ہیں۔

میں نے خط کو دوبارہ پڑھا اور سوچ میں پڑ گیا۔ تریونی نے کسی ایم ایل اے کی معرفت ریلوے پر دباؤ ڈال کے فوری ضرورت کے لئے مال گاڑی کی دو بوگیاں حاصل کر لی تھیں اور یہ پچاس ہزار اسی "خدمت" کا معاوضہ تھا۔ دھرمیندر یہ رقم تریونی سے لے کر آ رہا تھا اور جیون پرشاد ایم ایل اے کو پہنچانے جا رہا تھا کہ ہم نے اس کا راستہ کاٹ دیا۔ اس کا برہم ہونا برحق تھا۔

خط سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ بوگیاں کس تاریخ کے لئے حاصل کی گئی ہیں لیکن اس میں "اتنے کم وقت" کا حوالہ یہ ظاہر کرتا تھا کہ تریونی نے دو تین دن کے اندر کسی گڈز ٹرین پر جگہ مانگی ہوگی۔ عام طور پر ریلوے کی بکنگ پندرہ دن ایڈوانس میں چلتی ہے اور پھر بھی جگہ اسے ہی ملتی ہے جو زیادہ ضرورت مند ہو اور اپنی ضرورت کے مطابق زیادہ نذرانہ پیش کر دے۔ انڈے، پھل اور مچھلی جیسے ضائع ہونے والے مال کی ترسیل میں چوبیس گھنٹے کی تاخیر بھی کاروباری آدمی کو تباہ کر دیتی ہے۔ تاہم سیمنٹ ایسی چیز نہیں تھی جسے روکنے سے زیادہ نقصان کا احتمال ہو۔ معلوم نہیں خواجہ سیمنٹ والوں پر یہ نزلہ کیوں گرا مگر جیسا کہ مشہور ہے۔ نزلہ برعضو ضعیف۔ شاید وہی سب سے کمزور تھے یا متعصب ہندو انتظامیہ کے نزدیک کسی مسلمان کے کاروبار کو نقصان پہنچانا کارِ ثواب تھا اور حُب الوطنی تھی۔ خواجہ سیمنٹ کے نام سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ اس کے مالک مسلمان ہوں گے۔

اس خط نے میرے رگ و پے میں جوش و خروش کی سنسنی پھیلا دی تھی۔ اب یہ معلوم کیا جا سکتا تھا کہ تریونی نے کس دن کے لئے بکنگ حاصل کی ہے۔ بوگی نمبر وغیرہ سب کا خواجہ سیمنٹ کی بوگیاں منسوخ کرنے والوں سے یا خود خواجہ سیمنٹ والوں سے پتا چل سکتا تھا۔

میں نے پہلے سوچا کہ اس خط کو غائب کر دوں۔ رقم بھی مار لوں تاکہ بالواسطہ طور پر ہم جیون پرشاد کو بھی اپنے شکنجے میں کس لیں۔ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ ٹیکسی ڈرائیور کو جان سے مار دوں اور اس خط کی فوٹو اسٹیٹ کاپی پولیس کے اعلیٰ حکام سے اخبارات تک سب کو بھیج دوں۔ جیون پرشاد تو سیاست داں تھا۔ آئندہ انتخابات تک اس کی پوزیشن محفوظ تھی اور خراب ہو جاتی تب بھی عوام کو بے وقوف بنانے کے لئے اس کے پاس بہت وقت تھا اور اس کے شاطر ذہن میں ان گنت چالیں تھیں لیکن تریونی نہیں بچ سکتا تھا۔ دھرمیندر کے قتل کا اس پر براہِ راست الزام آجاتا۔ پولیس اسے قتلِ عمد کے جرم میں گرفتار کرتی تو چالان میں یہ لکھا جاتا کہ اس نے پہلے جیون پرشاد کے ذریعے بوگیاں حاصل کر لیں اور ایک لاکھ دینے کا وعدہ بھی کیا مگر کام ہو جانے کے بعد اس نے پچاس ہزار بھی بچانے کی کوشش کی۔ اس نے دھرمیندر کو راستے میں مروا دیا اور رقم اس کے آدمی واپس لے گئے۔ جیون پرشاد کو اس نے اطلاع دے دی ہوگی کہ میں نے تمہارے آدمی کو رقم دے دی ہے اور وہ رقم لے کر روانہ ہو چکا ہے۔

اس کیس میں تریونی کو سزا ہوتی یا نہ ہوتی، اس کا فیصلہ برسوں بعد عدالتِ عالیہ میں ہونا تھا۔ اپنی دولت کے بل پر وہ بہترین وکیل کر سکتا تھا اور ہر قسم کے عینی شاہد لا سکتا تھا جو اسے بے قصور ثابت کر دیں چناں چہ خط اور رقم لے جانے کا کوئی فوری فائدہ نہیں تھا۔

"آپ کس سوچ میں پڑ گئے سر؟" سین نے کہا۔

میں نے کہا "مسٹر سین۔ جو چیز جہاں تھی وہیں رکھ دو۔ بالکل اسی حالت میں۔ اس طرح کہ ہوش آنے پر اسے شک بھی نہ ہو کہ ہم نے کسی چیز کو دیکھا ہے یا چھیڑا ہے۔"

سین نے مایوسی سے کہا "یہ پچاس ہزار...."

میں نے کہا "ان کو بھی واپس گلوز کمپارٹمنٹ میں رکھ دو۔ ریوالور کو اچھی طرح کپڑے سے صاف کرو تاکہ اس پر تمہاری انگلیوں کے نشانات باقی نہ رہیں۔ جس چیز کو بھی تم نے چھوا ہے اسے صاف کر دو۔ میرا ریوالور مجھے دے دو۔ جلدی کرو۔ ڈرائیور ہوش میں آنے والا ہے۔"

میں نے نوٹ بک اپنی جیب سے نکال کے واپس ڈرائیور کی جیب میں رکھی۔ خط کو اسی طرح پرس میں ڈالا اور پرس کو اندر کی جیب میں رکھ دیا۔ ہر طرح سے مطمئن ہو جانے کے بعد میں نے چند منٹ انتظار کیا کہ دھرمیندر ہوش میں آجائے۔ میں یہ رسک نہیں لینا چاہتا تھا کہ خالی ٹیکسی میں اسے بے ہوش پڑا دیکھ کر کوئی راہ گیر یا پولیس والا مال پر ہاتھ صاف کر جائے اور ہمارا بنا بنایا کام خراب کر دے۔ تریونی کو فوراً معلوم ہو جائے گا کہ اس کا راز اب راز نہیں رہا۔ اگر ہم پچاس ہزار لے جاتے تو وہ سمجھتا کہ ہم نے خط بھی ضرور دیکھا ہوگا۔ لیکن ہم کسی بھی چیز کو چھوئے بغیر نکل گئے تو اس کے دل کو تھوڑا سا اطمینان حاصل رہے گا کہ ہم افراتفری میں فرار ہو گئے تھے کیوں کہ پولیس ہمارے پیچھے لگ گئی تھی۔ ہم ایک سب انسپکٹر کو ناک آؤٹ کرنے کے بعد اپنی جان بچانے کی فکر میں تھے

چناں چہ ٹیکسی کو سڑک کے کنارے چھوڑ کر بھاگ جانے کے سوا ہمارے ذہن میں کوئی خیال ہی نہیں آیا۔ بعد میں جب ٹیکسی ڈرائیور بتائے گا کہ ہر چیز اپنی جگہ موجود تھی تو اس کو ریلوے کی بکنگ کینسل کرانے کا خیال نہیں آئے گا۔ محض شک کی بنا پر وہ اتنا بڑا قدم نہیں اٹھائے گا۔ اتنی مشکل سے بوگیاں حاصل کرنے کے بعد اپنا پیسہ اور جیون پرشاد کی کوشش کے رائیگاں جانے کا احساس اسے روک لے گا۔ وہ یہ سوچنے پر بھی مجبور ہوگا کہ کینسل کرانے کے بعد دوبارہ بوگیاں نہ جانے کب ملیں گی اور کس کی وساطت سے۔ اگر وہ مطمئن رہا تو ایسا قدم ہرگز نہیں اٹھائے گا۔

ڈرائیور نے ہوش میں آنے کے بعد آنکھیں کھول کے مجھے دیکھا۔ سر پر ہاتھ رکھ کر کچھ یاد کرنے کی کوشش کی مگر اس سے پہلے کہ وہ اٹھ کر بیٹھتا یا شور مچاتا' میں نے سین کو اشارہ کیا اور ہم ٹیکسی سے نکل بھاگے۔

ہمارے بھاگنے کا انداز بالکل چوروں جیسا تھا۔ میں دھرمیندر کو یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ ہر مجرم کی طرح ہم بھی خوف زدہ ہیں۔ وہ تقریباً پون گھنٹا بے ہوش رہا تھا اور میں نے اس کی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کو آدھا گھنٹا پیچھے کردیا تھا۔ اگر اس کے ذہن میں وقت کا حساب آیا تو وہ سمجھے گا کہ ہوش اور بے ہوشی کے درمیان صرف پندرہ منٹ حائل رہے۔ وہ اندازہ کرے گا کہ جہاں اس کی ہم سے ملاقات ہوئی تھی اس جگہ سے یہ جگہ کتنے فاصلے پر ہے جہاں اب ٹیکسی موجود ہے۔ تو یہی سمجھے گا کہ ہم ٹیکسی کو مسلسل دوڑاتے رہے اور جیسے ہی ہمیں احساس ہوا کہ ڈرائیور کو ہوش آنے والا ہے ہم ٹیکسی چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

مجھے دھرمیندر سے یہ اندیشہ بہرحال نہیں تھا کہ ہوش میں آتے ہی وہ ٹیکسی لے کر ہمارے تعاقب میں دوڑے گا۔ کسی بھی شخص کو بے ہوشی سے ہوش میں آنے کے بعد پوری طرح مستعد ہونے میں کچھ وقت لگتا ہے۔ اس میں بھی کوئی شک کی بات نہیں تھی کہ پھر اس کا فطری ردِّعمل کیا ہوگا۔ وہ سب سے پہلے یہ دیکھے گا کہ اس کی دولت محفوظ ہے یا نہیں۔ وہ اپنے ریوالور کو چیک کرے گا اور آخر میں جیبوں کو۔ سب کچھ اپنی جگہ موجود پا کے وہ خدا کا شکر ادا کرے گا کہ جان بچی اور مال بھی نہیں گیا ورنہ ہمارا کیا تھا' اسے قتل کر کے کہیں بھی چھوڑ جاتے اور مالِ غنیمت پر قبضہ کر لیتے۔ وہ سمجھے گا کہ ہم صرف اس کے انکار پر مشتعل ہوئے تھے۔ ہمارا مقصد اسے مارنا یا لوٹنا ہرگز نہیں تھا۔ چناں چہ اس بات کا بھی قوی امکان تھا کہ وہ اس حادثے یا ہم سے ملاقات کا کسی سے ذکر ہی نہ کرے۔

ایک فرلانگ کی ریس سین نے جیت لی۔ اس کے دوڑنے کا انداز ضرور مضحکہ خیز تھا لیکن اس کے پیر مشین کی طرح حرکت کرتے تھے اور یہ مشین بہت تیز چلتی تھی۔ کچھ لوگوں نے اس منظر کو خاصی دلچسپی سے دیکھا کہ ساڑھے چار فٹ کے بونے کے پیچھے ایک چھ فٹ کا آدمی بھاگتا جا رہا ہے مگر اسے پکڑ نہیں پا رہا ہے۔

کسی نے بھی ہم سے نہیں پوچھا کہ معاملہ کیا ہے۔ کوئی گڑبڑ ہوتی تو میں اس کے پیچھے خاموشی سے کیوں بھاگتا۔ میں پکڑو پکڑو کا شور مچاتا تاکہ آگے والے سین کو پکڑلیں لیکن ایک شخص ضرورت سے زیادہ مستعد ثابت ہوا۔ وہ سین سے لپٹ گیا۔

"سالا پاکٹ مار۔ بھاگ کے کدھر جائیں گا۔"

میرا دل بیٹھ گیا۔ میں یہ سمجھا کہ پکڑنے والا کبھی سین کی فنکارانہ صلاحیت کا شکار ہوا ہوگا اور واردات کے بعد سین کو پکڑنے میں ناکام رہا ہوگا لیکن آج اس نے پھر سین کو پہچان لیا ہے۔

میں نے کہا "اے بھائی صاحب! کیا بات ہے؟"

اس نے سین کو قابو میں رکھنے کے لئے کشتی لڑتے ہوئے کہا۔

"اجی آپ ہم سے پوچھتے ہو کہ کیا بات ہے...."

"اور کس سے پوچھوں؟ تم نے ہی تو پکڑ رکھا ہے اسے...." میں نے خفگی سے کہا۔

اس نے سین کو چھوڑ دیا "کیا یہ تمہارا پاکٹ مار کے نہیں بھاگا تھا؟" وہ ہانپتے ہوئے بولا۔

سین نے اس کی اور اس کے والد صاحب کی شان میں ایک مُرصع قصیدہ پڑھا "ابے تو خود شکل سے پاکٹ مار لگتا ہے سالے چور کی اولاد....."

میں نے کہا "جاؤ یار۔ ایسے ہی ٹانگ مت اڑایا کرو بلاوجہ ہر معاملے میں۔ کسی روز ٹانگ ٹوٹ جائے گی۔"

وہ سٹپٹا کے احمقوں کی طرح ان لوگوں سے مخاطب ہوگیا جو اس پر ہنس رہے تھے "یار' کیسا لفڑا ہے سالا۔ ابھی اپن کیا غلطی کیا۔ آئندہ میرا باپ کا توبہ۔ اپن کا سامنے کوئی مرڈر کر کے جاتا ہے تو جائے" وہ بڑبڑاتا ہوا روانہ ہوگیا۔ تماشائی بھی چل پڑے تو میں نے گھڑی دیکھی۔ رات کے نو بج رہے تھے "بہت وقت ضائع ہوگیا استاد" چند قدم چلنے کے بعد میں نے کہا "ہم سے پہلے منو میاں پہنچ گئے ہوں گے ماما جی کے گھر۔ باقی لوگ بھی پریشان ہوں گے ہمارے لئے۔"

سین نے پرس کھول کر دیکھا "پھر ٹیکسی کے پیسے نہیں ہیں۔ پتا نہیں کس کنگلے پر غلطی سے ہاتھ پڑ گیا تھا۔ سات روپے لے کر پھر رہا تھا"

"بس میں سات ہزار لے کر کون پھرے گا؟" میں نے کہا۔

"بڑا دھوکا ہے دنیا میں سر" اس نے افسوس سے کہا "نمائش ہی نمائش رہ گئی ہے۔ ذرا پرس کو دیکھیں' کتنا پھولا ہوا ہے۔ میں بھی دھوکا کھا گیا۔ صرف تصویریں تھیں...."

"تم پہلے چیک کرتے ہو مال کو؟" میں نے ہنس کے کہا "اب ایسا کرتے ہیں کہ ٹیکسی ادھار پکڑ لیتے ہیں۔"

"ادھار کون کرے گا سر؟"

"بھئی ہم اسے بتائیں گے نہیں کہ جیب خالی ہے۔ ماما جی کے گھر پہنچ کے دے دیں گے۔"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "ٹھیک ہے سر۔ اسے یہ بھی نہ بتائیں کہ ہم پچاس ہزار نقد پر لات مار آئے ہیں۔ وہ سمجھے گا' ہم نے دا بولی رکھی ہے۔"

رات کے پونے دس بجے ٹیکسی کسی ریلوے اسٹیشن کے عقبی حصے میں بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے کوارٹروں کے پاس رک گئی۔

سین نے کہا "میں ابھی دو منٹ میں آیا۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے اسے روکنے کی بے سود کوشش کی "بابا ہم انتظار نہیں کر سکتا۔"

سین غائب ہو چکا تھا۔ میں نے کہا "پیسے لینے کے لئے تم کو انتظار کرنا ہی پڑے گا۔ بغیر پیسے لئے جانا چاہو تو میں اتر جاتا ہوں"

"کیا مطلب؟"

میں نے کہا "وہ گھر سے پیسے لانے کے لئے گیا ہے۔"

"تمہاری جیب میں پیسے نہیں تھے۔ ٹیکسی پکڑلی! واہ بھوکے نواب اور کڑکے شہزادے" ڈرائیور نے کہا "ٹیکسی راستے میں خراب ہو جاتی تو تم کیا کرتے؟"

"یہ ہم نے طے نہیں کیا تھا مگر کچھ نہ کچھ ضرور کرتے۔ تم سے کہتے اللہ کے نام پر کرایہ معاف کردو۔ یا صبح تک انتظار کرتے کہ تمہاری ٹیکسی ٹھیک ہو تو گھر جائیں۔"

ڈرائیور ہنس پڑا۔ اسی وقت سین نے اس کی خدمت میں بھاڑا پیش کیا۔ اس نے جاتے جاتے پھر کہا "خوش رہو کڑکے نواب اور بھوکے شہزادے۔ تم کو خوش رہنا آتا ہے۔"

سین کے ساتھ دورویہ کوارٹروں کی قطار کے درمیان تنگ گلی میں چلتے ہوئے میں نے کہا "یہ ماما جی کس کے ماما ہیں؟"

"وہ جگت ماما ہیں۔ ان کا اصلی نام مجھے بھی نہیں معلوم سر" سین نے کہا "سب ماما جی کہتے ہیں۔"

تنگ گلی کے درمیان مشکل سے دس فٹ جگہ تھی مگر اس میں بھی کسی نے مرغی کا ڈربہ باہر رکھ دیا تھا تو کسی نے بکری باندھ رکھی تھی۔ دونوں طرف چارپائیوں کی قطاریں کسی ہسپتال کے اوپن ائیر وارڈ کا منظر پیش کررہی تھیں۔ دس فٹ کی چوڑائی میں دو چارپائیاں لمبائی کے رخ نہیں لگائی جا سکتی تھیں چناں چہ ایک چارپائی کے بعد دوسری چارپائی مخالف سمت کے کوارٹر کی تھی۔ ان کے درمیان چھ آٹھ انچ کی جگہ خالی تھی جس میں سے میں بار بار گھوم کر زگ زیگ طریقے پر گزر رہا تھا۔

دو کمروں والے آخری کوارٹر کے بعد بھی جھونپڑیوں کا اتنا ہی طویل سلسلہ تھا جتنا کوارٹروں سے پہلے۔ یہ جھونپڑیاں عین ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ پھیلی ہوئی تھیں۔ باہر سے کوارٹروں کی حالتِ زار سے مکینوں کی مفلسی ٹپکتی تھی اور سرکار کی عدم دلچسپی ظاہر ہوتی تھی جسے ان کوارٹروں کو صاف ستھرا رکھنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ صفائی ان لوگوں کے لئے ایسی عیاشی تھی جس کے یہ متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ ان کے پاس باتھ روم تھے تو پانی نہیں تھا۔ باری سے ملنے والا پانی بمشکل تمام منہ چپڑنے یا کھانے پینے کی ضرورت پوری کرتا تھا۔ فالتو پانی خریدنے کی ان کے بجٹ میں گنجائش نہیں ہوتی تھی کہ یہ ہر روز نہا بھی سکیں۔

ماما جی کا کوارٹر اندر سے نسبتاً صاف ستھرا تھا اور سامان نہ ہونے کی وجہ سے کشادہ بھی لگتا تھا۔ اس کے دونوں کمروں میں دریاں بچھی ہوئی تھیں اور فرنیچر نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ ماما جی کے چند کپڑے دیوار پر کھونٹیوں سے لٹکے ہوئے تھے۔ باورچی خانے میں چند برتن ان کا کل اثاثہ تھے۔

غالب اور محسن سر کے نیچے تکئے رکھے جوتوں سمیت دری پر لیٹے ہوئے چھت کو گھور رہے تھے۔ نازو اور گل دوسرے کمرے میں سر جوڑے گپ لگا رہی تھیں۔

"تم کہاں رہ گئے تھے؟" غالب نے بےزاری سے کہا۔

"ہم انتظار میں دہل رہے تھے" محسن بولا۔

"یہ کیوں تسلیم نہیں کرتے کہ تم مجھے چھوڑ کے بھاگ آئے تھے" میں نے جوتوں سمیت دری پر بیٹھ کے کہا "منو میاں ابھی نہیں پہنچے؟"

غالب نے نفی میں سر ہلایا "کہیں وہ کسی مشکل میں نہ پڑ جائیں۔ پولیس دو لاشوں کی اور دھماکوں کی تحقیقات تو کرے گی"

"ان کے پاس سے خانہ تلاشی میں بہت کچھ برآمد ہو جائے گا" محسن بولا "شیین نے بتایا ہے کہ وائرلیس ٹرانسیٹر اور بم بنانے کا سامان' دوربین اور کیمرے وغیرہ سب وہیں ہیں۔"

"پولیس ایک فیکٹری کے مالک پر ہاتھ نہیں ڈالے گی۔" میں نے کہا "اس کے علاوہ منو میاں تجربہ کار آدمی ہیں۔"

"تریونی ان سے بڑا گھاگ ہے۔ وہ اس کے ہی آدمی تھے جو وہاں حملہ آور ہوئے تھے" غالب نے کہا۔

"تمہیں کس نے بتایا؟"

"اور کون ہو سکتا ہے۔ بے شک وہ اپنی اس کوشش میں ناکام رہے لیکن تریونی کے لئے اپنی شکست کو فتح میں بدلنا کیا مشکل ہے۔ وہ منو میاں کو گرفتار کروا سکتا ہے۔ اس نے پولیس کو بتادیا ہوگا کہ وہاں کون لوگ گھسے ہوئے ہیں۔"

"اگر ایسا ہوتا تو پولیس خاموشی سے چھاپا مار سکتی تھی" میں نے کہا "ہم سب گرفتار ہو جاتے۔"

"پہلے اس نے خود ہی کوشش کی۔ کہ ہمارا نام و نشان مٹادے۔ یہ بڑا بھرپور حملہ تھا لیکن ہم بچ کر نکل آئے۔ پھر انہوں نے تمہیں' غالب اور نازو کو راستے سے اٹھالیا۔ اور اس بار پھر ہم نے تائیدِ ایزدی سے ان کے ناپاک ارادوں کو خاک میں ملا دیا۔ یہ تریونی اینڈ کمپنی کے لئے ایک اور شکست کا صدمہ ہے۔ وہ انتقام کی آرزو میں پاگل ہو رہا ہوگا۔ احساسِ ذلت نے اسے ہمارے خون کا پیاسا بنادیا ہے۔ اب وہ پولیس سے کام لے سکتا ہے" غالب نے کہا "پولیس اس کے پیسے کی غلام ہے اور اس کا اثر رسوخ بھی کم نہیں۔ کسی قانونی جواز کے بغیر بھی وہ منو میاں کو گرفتار کرسکتے ہیں۔ تلاشی لینے پر جو اسباب برآمد ہوگا وہ ان کے

خلاف ہر سنگین الزام عائد کرنے کے لئے کافی ہے۔"

غالب اور محسن کے دلائل کو بے بنیاد سمجھ کر نہیں ٹالا جا سکتا تھا۔میں نے افسوس سے سرہلایا "اچھا ہوتا اگر وہ بھی ہمارے ساتھ ہی نکل آتے۔ خیر پریشان ہونے سے کیا ہوگا۔یہ بتاؤ کہ وہ ماماجی کہاں ہیں جن کا ذکر ہم گھنٹے بھر سے سن رہے ہیں؟ ہمارے میزبان اور صاحبِ خانہ۔"

غالب نے کہا "وہ ڈیوٹی پر ہیں۔ابھی ہماری ملاقات بھی نہیں ہوئی۔"

میں نے کہا "کوئی غائبانہ تعارف بھی نہیں؟"

"سنا ہے جوانی میں بڑے انقلابی تھے۔منو میاں کے والد کے ساتھ بنگال کی مارکسی تحریک میں شریک رہے اور برسوں جیل میں گزارے۔ہمیشہ ایک ہی جیل میں رہے اور اکثر ایک ہی کوٹھری میں۔"

"اب کیا کرتے ہیں؟"

"قلیوں کے ٹھیکے دار ہیں۔ان کی مرضی اور منشا کے بغیر کوئی قلی بھرتی نہیں ہو سکتا۔اسے بیج بھی نہیں ملتا۔"

"کوئی بھتہ وصول کرتے ہیں ان سے؟"

غالب نے افسوس کے ساتھ کہا "ایسا آدمی بھتہ وصول کرے گا؟ انہوں نے بھتے بند کروائے۔ جو پہلے ٹھیکیداروں کی معرفت افسروں سے ماتحتوں تک سب کو ملتے تھے۔قلی روز کی آمدنی کا دس فیصد دینے پر مجبور تھے۔اب ماماجی کو تم ان کی یونین کا غیر منتخب یا غیر سرکاری صدر سمجھ لو۔ان کے ہوتے کوئی دوسرا تو آ نہیں سکتا چناں چہ وہ ہیں تاحیات صدر۔انتظامیہ اور قلیوں کے درمیان ایک مضبوط پل۔نہ انتظامیہ ان سے مشورہ کئے بغیر قلیوں کے خلاف کوئی کارروائی کر سکتی ہے اور نہ وہ قلیوں کے حقوق پر سودے بازی کے قائل ہیں۔وہ قلیوں میں نظم و ضبط قائم رکھتے ہیں۔ان سے وہ ڈسپلن اور قواعد و ضوابط کے مطابق کام کراتے ہیں اور کسی کو کسی پر زیادتی نہیں کرنے دیتے۔نہ باری کے معاملے میں نہ اجرت کے مسئلے پر۔انتظامیہ ان سے ڈرتی بھی ہے اور ان کا احترام بھی کرتی ہے۔ قلیوں کے تو وہ ماماجی ہیں۔سب بھانجوں پر ایک سی سختی اور ایک سی شفقت۔سب کے مسائل کا حل تلاش کرنے میں ہر وقت سرگرداں۔خود تو شادی کی نہیں۔ساری عمر تجرد کی زندگی گزار دی۔اب ہر کنبہ ان کا کنبہ ہے۔ وہ چھوٹے بڑے سب کے ماماجی ہیں۔"

"یہ تو بڑا تفصیلی تعارف ہوگیا" میں نے کہا۔

"شین ہمارے ساتھ تھا۔اسی نے بتائی ہیں ساری باتیں" غالب نے کہا۔

"اب کہاں ہے وہ؟" میں نے ادھر اُدھر دیکھا۔

"روٹی سالن لینے گیا ہے۔ریلوے اسٹیشن تک۔ آتا ہی ہوگا" غالب نے کہا۔

"سین اور شین بڑے فنکار ہیں" میں نے کہا "میرے دیکھتے دیکھتے اس نے اتنی صفائی سے بس کے کسی مسافر کی جیب کاٹی..."

"ملا کیا سر؟ سات روپے اور یہ تصویریں" اس نے بلیک اینڈ وائٹ تصویریں درمیان میں ڈال دیں۔

"تم ایسی تصویریں ساتھ لئے پھر رہے ہو؟" غالب نے ان تصویروں کو دیکھ دیکھ کر محسن کو پاس کرتے ہوئے کہا۔

"تصویریں اس شخص کے صاحبِ دل ہونے کی دلیل ہیں۔ صاحبِ ثروت نہیں تھا تو کیا" محسن نے کہا۔

سب تصویریں پورنوگرافک تھیں۔میں نے سین سے کہا "انہیں سنبھال کے رکھو۔ایسے ہر جگہ مت نمائش لگاؤ۔ہمارے ساتھ خواتین بھی ہیں۔"

"تم لوگ بس سے آئے تھے؟" غالب نے کہا۔

"سین تو مجھ سے ٹیکسی کا کرایہ مانگ کے لے گیا تھا" محسن بولا۔

"وہ دوسری ٹیکسی تھی۔ پہلی ہم نے چھوڑ دی تھی۔ آتے وقت ہم دونوں کی جیب خالی تھی۔ مگر یہ بات دونوں نہیں جانتے تھے۔"

سین نے آہ بھر کے کہا "اس ٹیکسی کو چھوڑتے وقت ہم خالی جیب نہ رہتے۔ہماری ہر جیب میں دس دس ہزار ہوتے لیکن سر نے کہا کہ بیٹا پیسہ ہاتھ کا میل ہے۔پچاس ہزار ایسے ہی چھوڑ آئے۔"

غالب اور محسن نے ایک ساتھ چونک کر مجھے دیکھا "یہ پچاس ہزار کا کیا معاملہ ہے؟"

میں نے انہیں سارا معاملہ بتادیا۔ایک دم ان کی ساری بیزاری دور ہوگئی۔وہ اٹھ کر بیٹھ گئے اور ان کے اشتیاق کی کیفیت دیکھ کر نازو اور گل نے محسوس کیا کہ کوئی غیر معمولی مسئلہ زیرِ بحث ہے چناں چہ وہ بھی شریکِ گفتگو ہوگئیں۔ لیکن اس سے پہلے کہ ہم کوئی متفقہ لائحہ عمل مرتب کرتے شین ڈنر لے کر آگیا۔ابھی نازو اور گل نے اس عوامی ڈنر کو دوسرے کمرے میں دسترخوان پر لگایا ہی تھا کہ ماماجی بھی آگئے اور ہم سب شریکِ طعام ہوگئے۔

ماماجی کا ہم سے غائبانہ تعارف ہو چکا تھا لیکن ماماجی صرف منو میاں کو یا ان کے دونوں فرشتوں کو جانتے تھے۔ہم نے اپنا اپنا تعارف خود کرایا لیکن تفصیل سے گریز کرتے ہوئے صرف یہ بتایا کہ ہم بھی منو میاں کے ساتھی ہیں۔

ماماجی کی عمر ساٹھ سال سے زیادہ ہی ہوگی۔ان کے جسم کو دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ جیسے جوانی میں وہ پہلوانی کرتے ہوں گے۔اب ان کا جسم گوشت کا بے ہنگم پہاڑ بن گیا تھا لیکن وہ بہت زندہ دل آدمی تھے۔کھرج میں بات کرتے تھے۔ اپنے دبنگ لہجے سے کسی کو بھی خاموش کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے اور بڑے جلالی بزرگ نظر آتے تھے لیکن اتنے ہی خوش مزاج اور زندہ دل تھے۔وہ سفید کرتا پاجامہ پہنتے تھے۔ان کا سر بھی سفید تھا۔فرنچ کٹ داڑھی بھی سفید تھی یہاں تک کہ گھنی بھویں بھی سفید تھیں۔اس عمر میں بھی وہ چشمہ نہیں لگاتے تھے اور سیدھا چلتے تھے۔سر پہ ڈھکنے جیسی سفید جالی دار ٹوپی صرف سوتے وقت اتارتے تھے اور تہجد گزار تھے۔سجدہ ریزی کی نورانی علامت ان کی پیشانی پر نمایاں تھی۔

کھانے میں بھی انہوں نے ہم جوانوں کو مات کردیا۔ہم سب ہی بھوک سے بے حال تھے لیکن ان کی خوش خوراکی کا ساتھ نہ دے سکے۔بچا کھچا اپنے پیٹ میں ڈال کے انہوں نے گرج دار ڈکار لی اور تین گلاس پانی حلق میں انڈیل کر بولے۔

"ابے وہ اپنا منو نہیں آیا؟"

سوال شین سے کیا گیا تھا چناں چہ اس نے کہا "ماماجی! وہ کچھ ایسی بات ہوگئی تھی....."

"کیا بات ہوگئی تھی؟ کھل کے بتا بیٹا۔اور لڑکی! کیا نام بتایا تو نے اپنا.....پھول؟"

"جی گل....."

"اچھا گل ہی سہی۔ تو گل بٹیا! چائے بنانا آتی ہے نا؟ جا شاباش۔سب کے لئے اچھی سی چائے بنا خوب گرم گرم۔اور تو بھی سن" انہوں نے نازو کو روک لیا "ادھر حقہ رکھا ہے ہمارا' اس کو تازہ کرکے چلم بھر لا۔ کبھی کیا ہے یہ کام؟ کوئلے وہیں انگیٹھی میں دہکا لینا۔ تمباکو کا ڈبا بھی وہیں ہے۔میرے جیسے بڈھے بابا کی تصویر والا۔"

نازو اور گل کھی کھی کرکے ہنسنے لگیں۔

گل نے کہا "مجھے چائے بنانا نہیں آتی مگر میں حقہ تازہ کر سکتی ہوں۔"

نازو نے کہا "مجھے چلم بھرنا نہیں آتا۔چائے بنا لیتی ہوں۔"

"ہو ہو ہو....." ماماجی ہنسے تو گوشت کے پہاڑ میں جیسے زلزلہ آگیا "خیر آپس میں مل کے کام کرلو" پھر وہ گاؤ تکئے کے سہارے فرش پر دراز ہوگئے "ہاں بھئی۔اب کہو کیا بات ہوگئی۔"

میں نے کہا "اجازت ہو تو میں عرض کروں ماماجی؟"

انہوں نے خلال کرتے ہوئے کہا "بھانجے! کیا لکھنؤ سے آیا ہے تو۔ابے ہم سے ہماری زبان میں بات کر۔ ہاں۔اور یہ کیا حرکت کر رہا ہے تو" وہ گرج کر بولے۔

میں نے حیران ہوکے کہا "جی؟"

"جی کے بچے۔ماں باپ نے چھوٹے بڑے کا ادب لحاظ تمیز کچھ نہیں سکھائی۔ ہمارے سامنے دھواں چھوڑ رہا ہے ناک منہ سے۔کیا باپ کے سامنے بھی سگریٹ پیتا تھا؟"

گھبراہٹ اور شرمندگی سے میرا برا حال ہوگیا۔"جی.....میں معافی چاہتا ہوں" میں نے سگریٹ کو زمین پر مسل دیا۔

غالب اور نازو نے میری حالت پر سب سے زیادہ دانت نکالے۔ انہوں نے کسی سے مجھے ایسی ڈانٹ پڑتے نہ دیکھی تھی۔اپنے مرحوم والد وزیر خاں کے سامنے واقعی میری مجال نہ تھی کہ میں سگریٹ پیوں۔ادب احترام کے یہ پرانے اصول پرانی وضع داریوں کے ساتھ ختم ہو رہے تھے۔پھر بھی بیشتر مشرقی گھرانوں میں لڑکے ابھی بزرگوں کے ساتھ اتنے بے تکلف نہیں ہوئے تھے۔ سگریٹ محسن نے بھی نکالی تھی مگر وہ ڈانٹ سے بال بال بچ گیا۔نازو نے نظر بچا کے مجھے زبان چڑائی اور انگوٹھا دکھایا۔اور اسی پر بس نہیں کی۔اس نے شرارت کی نیت سے کہا "ماماجی! یہ بری عادت چھڑادیں ان سے...."

"چل لڑکی۔اپنا کام کر" ماماجی نے اسے بھی ڈانٹ لگائی۔ "ارے ہم تو خود اس بری لت میں پڑے ہوئے ہیں۔ہم کس منہ سے کہیں کہ سگریٹ مت پیو۔اس نے پلٹ کر کہہ دیا کہ تم بھی حقہ چھوڑ دو۔تو کیا عزت رہ جائے گی ہماری"

اب میری اور محسن کی باری تھی۔ہم نے بڑی دلی مسرت کا اظہار کیا مگر نازو ہماری طرف دیکھے بغیر ہی غائب ہوگئی تھی۔میں نے ماماجی کو منو میاں کے ٹھکانے پر حملے کی تفصیلی رپورٹ دی۔ درمیان میں گل نے حقہ لا کے ان کے سامنے رکھا۔ انہوں نے ایک گڑگڑاتا کش لینے کے بعد کہا "جیتی رہو" اور پھر میری طرف متوجہ ہوگئے۔

ساری بات سن کے انہوں نے کہا "ہوں" اور پھر سوچ میں غرق حقے کو گڑگڑاتے رہے۔

"اس منو کا باپ بھی ایسا ہی ٹیڑھا تھا۔ہم بھی اب سیدھے ہوئے ہیں جب جوانی کے کس بل نکل گئے۔اتنا سمجھایا اسے کہ بیٹا وہ اور زمانہ تھا۔سیاست میں شرافت تھی اور اصول تھے۔انگریز کتنا ہی متعصب کیوں نہ ہو' انصاف کے معاملے میں کمینہ نہیں تھا۔کینہ نہیں رکھتا تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ مخالفت کو برداشت کرنے کا ظرف رکھتا تھا۔سیاسی حریفوں کو دبانے کے لئے کالے قوانین کا سہارا نہیں لیتا تھا۔ان پر ملک کے عام قوانین کے تحت کھلی عدالتوں میں مقدمات چلتے تھے۔اپیل کی اجازت پریوی کونسل تک تھی۔ خصوصی اختیارات والی خصوصی عدالت یا ٹریبونل کہاں ہوتے تھے۔اخباروں کے لئے بھی عام عدالتوں میں عام قانون کے تحت کارروائی ہوتی تھی۔اب تو سیاست میں دہشت گردی ہے۔ مخالفت کو ختم نہیں کر سکتے تو مخالف کو ختم کردو......"

بہت سے معاملات میں اصولی اختلافات رکھنے کے باوجود میں خاموش رہا۔میں اس وقت کسی بحث میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔بحث سے ان کی سوچ کو اور ان کے نظریات و عقائد کو بدلا نہیں جا سکتا تھا جو چالیس پچاس سال کے تجربات کا حاصل تھے۔انہوں نے اپنے وقت کی بہت سی اچھی روایات کا ذکر کیا جو اب افسانۂ فردا ہوگئی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ سیاست میں مروت' بردباری اور اصول پرستی نہ ہو تو پھر کسی شریف آدمی کو اس چکر میں پڑنا ہی نہیں چاہئے۔

"پہلے سیاست تھی خدمت کے لئے۔اب یہ ہے نفع بخش پیشہ" ماماجی نے گویا دریا کو کوزے میں بند کیا۔نازو چائے لے آئی تھی۔پیالی سے شڑپ کرکے ایک چسکی لینے کے بعد انہوں نے عادتاً دعا دی "جیتی رہو۔"

"گیارہ بج گئے۔منو میاں نہیں لوٹے" میں نے تشویش سے

کہا۔

"۔۔۔ابھی معلوم کرتے ہیں؟" ماماجی نے کہا "تم تو اب یوں کرو۔۔۔جاؤ۔ہم جاتے ہیں۔"

"آپ اس وقت۔اکیلے جائیں گے؟"میں نے کہا۔

"آدمی اکیلا کب ہوتا ہے بیٹا۔اس کا خدا ہر وقت اس کے ساتھ رہتا ہے" ماماجی نے کہا "یہ بندہ ہی ہے جو اسے بھول جاتا ہے۔پھر مجھے کس کا ڈر ہے۔جب حالات مخالف تھے تب تو مارا نہیں کسی نے۔اب وقت آجائے تو اور بات ہے۔بیٹھے بیٹھے بھی دل ساتھ چھوڑ جاتے......."

"میں آپ کے ساتھ چلوں؟" غالب نے کہا۔

"میں بھی....." محسن نے کہا۔

"کوئی ضرورت نہیں۔میں باہر سے کسی کو ساتھ لے جاؤں گا" انہوں نے ڈانٹ کر کہا "تم دونوں برآمدے میں لیٹ جاؤ" انہوں نے سین شین سے کہا "ایک کمرے میں تم۔دوسرے میں لڑکیاں۔"

یہ فرمان جاری کرنے کے بعد ماماجی اپنے بھاری بھرکم وجود کو سمیٹ کر اٹھے اور چپل پہن کر روانہ ہوگئے۔ان کا قد بھی شاید چھ فٹ سے زیادہ ہی تھا چناں چہ وہ دروازے سے گزرتے تھے تو اس میں پورے سما جاتے تھے۔

ہم سب ان کی شاندار شخصیت سے بے حد متاثر ہوئے تھے۔ وہ ایک ایسے دور کے نمائندہ بزرگ تھے جن کی نسل کو بدلتے وقت نے شکست دے دی تھی۔ان کی عمر کے بڈھے' نوجوان پوتوں اور نواسوں کی نظر میں مضحکہ خیز "اولڈ مین" تھے جن کے درمیان ڈبل جنریشن گیپ تھا۔ تقسیم کے بعد ہندوستان کے قصبوں اور دیہاتوں سے ہجرت کرکے آنے والے ادھر دہلی' بمبئی اور کلکتہ جیسے شہروں میں پہنچے تھے تو ادھر لاہور اور کراچی میں۔اس سے اگلی نسل نے کانونٹ میں تعلیم پائی تھی اور ناجائز ذرائع سے آجانے والی دولت کی آسائشوں سے مستفید ہونے کے لئے انہوں نے مشرقی روایات اور وضع داریوں کو رجعت پسندی کا الزام دے کر اپنی تہذیب سے خارج کردیا تھا۔

مجھے یقین تھا کہ ماماجی نے شادی کی ہوتی تو اپنے خاندان میں بیٹوں اور بہوؤں' پوتوں اور نواسوں کے درمیان ان کی حیثیت وہی ہوتی جو سمندر میں روشنی کے مینار کی ہوتی ہے۔بیٹے خود جوان بیٹوں کے باپ ہوجاتے مگر اپنے باپ کے سامنے سگریٹ نہ پیتے۔ بہوئیں ان کے سامنے سر پر آنچل رکھ کے آتیں۔پوتے اور پوتیاں ان سے پرانے وقتوں کے قصے شوق سے سنتے اور ان کے پاؤں دباتے ہوئے ہنستے کھیلتے اور شرارتیں کرتے مگر بدتمیزی کرتے تو ان کے ہاتھ سے پٹتے۔ہر فیصلے پر عمل درآمد سے پہلے ان کی توثیق ہوتی اور اس فیصلے سے انحراف کی جرأت کوئی نہ کرتا۔

یہ بڑے دکھ کی بات تھی کہ ایسا شخص جو کسی خاندان کا مثالی سربراہ ہو سکتا تھا' خاندان جیسی نعمت سے بھی محروم تھا۔نہ جانے کیوں مجھے اپنے مرحوم والد وزیر خاں بہت یاد آئے۔اگر وہ زندہ ہوتے اور اسی گھر میں ہوتے۔میرے اور رابعہ کے اور ہمارے بچوں کے ساتھ۔تو ایسے ہی ہوتے۔رابعہ کا خیال آیا تو میرے دل میں ایک ٹیس اٹھی۔کیا وہ واقعی اسی گھر میں واپس پہنچ گئی ہے جو وزیر خان کا گھر تھا؟ پھر ان سے چھین لیا گیا اور ایک عرصے بعد رابعہ.... نے میرے ماضی کی امانت دار اس گھر کو اپنے مستقبل کا خواب بنا کے پھر حاصل کرلیا۔اس امید میں کہ ایک نہ ایک دن وہ گھر پھر آباد ہوگا۔اب وہ وہاں کیا کرے گی؟ ہر شام یادوں کے چراغ جلا کے بیٹھے گی اور ہر رات پلکوں پر آنسوؤں کے دیئے جلا کے انتظار کرے گی۔دعائیں مانگے گی اور خواب دیکھے گی۔کب تک؟ آخر کب تک؟ کوئی حد ہے تو کہاں ہے اس ہجر کے صحرا کی۔

محسن نے کہا "سکندر! اس خط کا مضمون پھر بتا" میں چونکا۔

"کام کی بات اس میں ایک ہی تھی۔ہمیں معلوم کرنا ہوگا کہ خواجہ سیمنٹ کی ترسیل کے لئے کون سی بوگیاں بک ہوئی تھیں۔کس تاریخ کے لئے اور کہاں کے لئے۔"

غالب نے کہا "یہ معلومات ماماجی زیادہ آسانی سے حاصل کرسکتے ہیں۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا "ہاں۔ قلیوں کا براہِ راست ریلوے بکنگ کلرکس سے رابطہ رہتا ہے۔"

"یہ معلومات حاصل کرلینے کے بعد ہمارا اگلا قدم کیا ہوگا؟"

"ہم دیکھیں گے کہ اس پر کیا مال جارہا ہے۔"

محسن بولا "لوڈنگ کے وقت ہمیں کون قریب پھٹکنے دے گا۔"

میں نے کہا "ماماجی کے اتنے سارے بھانجے کس مرض کی دوا ہیں۔آخر انہی میں سے کوئی لوڈنگ کرے گا۔"

"وہ کوئی شریف بھانجا نہیں ہوگا۔اس کا انتخاب بہت دیکھ بھال کے کیا جائے گا۔اسے معاوضہ بھی بہت دیا جائے گا اپنا منہ بند رکھنے کا۔اور جان سے ماردینے کی دھمکی الگ ہوگی۔"

نازو نے کہا "خود ماماجی کو وہاں جانے سے کون روک سکتا ہے۔"

"ان سے کچھ بعید نہیں۔بیڈرو جیسے لوگ کسی ماماجی کی اتھارٹی تسلیم نہیں کرتے۔"

"یہ کوئی بحث کی بات ہے؟"میں نے کہا "کسی طرح بھی ہم معلوم کرلیں گے کہ اب کیا مال لادا گیا ہے۔پھر؟"

غالب نے کہا "پھر ہم وہی کریں گے جو پہلے کرتے آئے ہیں۔"

"مال گاڑی پر ڈرائیور اور کنڈکٹر گارڈ وغیرہ کے علاوہ کوئی عام آدمی نہیں چڑھ سکتا" محسن نے کہا۔

میں نے کہا "اس کا کیا مطلب ہے؟ مال گاڑی میں جانے والے مال کے ساتھ کوئی محافظ نہیں جائے گا۔"

نازو نے کہا "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔وہ چوبیس گھنٹے نگرانی کریں گے۔"

"سوال یہ ہے کہ کیسے؟"

میں نے کہا "یا تو ان کے محافظ مال کے ساتھ ہی بند ہوجائیں گے۔چھپ کر یا رشوت دے کر سوار ہوں گے اور اندر بیٹھ کر پورا سفر طے کریں گے۔"

"یہ بہت لمبا سفر ہے" نازو نے کہا۔

"ہاں۔لیکن اسلحہ لے جانے والی بوگی کو وہ چھت تک تو پیک نہیں کریں گے۔اس میں ایک دو افراد کے لئے ضرور جگہ بنائیں گے جو محدود جگہ میں اٹھ بیٹھ سکیں اور آرام کرلیں۔ان کے لئے وافر مقدار میں کھانے پینے کا سامان بھی رکھا جاسکتا ہے۔"

غالب نے کہا "ہاں۔اور بھیا سارا کھیل تو پیسے کا ہے۔گارڈ راستے میں انہیں باہر نکل کے تازہ دم ہونے یا حوائجِ ضروریہ سے فارغ ہونے کے مواقع بھی فراہم کرسکتا ہے۔"

"اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا بھی غلط نہ ہوگا کہ اس ٹرین میں گارڈ بھی انہی کا آدمی ہوگا۔زورِ بازو کی مدد سے وہ اس کو قابو میں رکھیں گے۔ایسی صورت میں ہم تو گاڑی پر نہیں سوار ہوسکتے۔"

"گاڑی پر سوار ہونا قطعی ضروری نہیں" محسن نے کہا۔

"میں نے کہا "گاڑی کو راستے میں کہیں بھی روکا جاسکتا ہے۔"

"اتنے لمبے سفر میں درجنوں چھوٹے بڑے اسٹیشن آئیں گے۔سیکڑوں سگنل اور پٹڑی بدلنے والے کانٹے۔ہم کسی جگہ موقع محل دیکھ کر کوئی پلان بنائیں گے۔"

"اور موقع محل دیکھنے کے لئے آگے آگے چلیں گے؟"

"گاڑی کے آگے؟ کون دوڑے گا؟" نازو بولی۔

"تم میرا ساتھ دو تو میں دوڑ سکتا ہوں" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "ہم گدھا گاڑی کی بات نہیں کررہے ہیں۔"

گل اور محسن ہنسنے لگے۔میں نے کراچی میں جس گدھا گاڑی کو دیکھا اس میں دو گدھے نظر آئے۔گاڑی ایک کھینچتا تھا' دوسرا فقط ساتھ دیتا تھا۔کسی نے مجھے بتایا کہ گدھا اس وقت تک نہیں چلتا جب تک گدھی ساتھ نہ ہو۔معلوم نہیں یہ کس حد تک درست تھا مگر یہ بات غالب اور نازو پر چپک کے رہ گئی۔

"تم سب جلتے ہو" نازو نے جھینپ کر کہا۔

غالب نے اس کا ساتھ دیا "ہاں۔اپنا ساتھ دینے والا تو کوئی ہے نہیں" وہ دونوں ہم سب کے مقابلے میں متحد ہوگئے تھے جو سب سے زیادہ آپس ہی میں لڑتے تھے۔بات مذاق کی تھی مگر مجھے شدت سے احساس ہوا کہ واقعی ہم وہ گدھے ہیں جو اپنی اپنی گاڑی اکیلے ہی کھینچنے پر مجبور ہیں۔میں بھی اور محسن بھی۔اسی وقت میری نظر گل پر گئی۔اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور وہ اپنے پیر کے انگوٹھے کو مسل رہی تھی۔اس نے ہونٹوں سے کچھ نہیں کہا مگر میں نے اس کے دل کی آواز کو صاف سنا۔وہ کہنا چاہتی تھی کہ تم تو اکیلے نہیں ہو محسن۔میں ساتھ ہوں تمہارے۔لیکن اس نے الفاظ کا گلا گھونٹ دیا۔ایک سنگین اور سفاک حقیقت کا سامنا ہم میں سے کوئی بھی نہیں کرسکتا تھا۔

محسن کا چہرہ ایک دم سپاٹ ہوگیا تھا۔جذبات سے عاری اور بے حسی کا مظہر۔ایک پتھر چہرہ۔اس کو دیکھ کر میں ڈر گیا۔مجھے اپنا ہی یقین ڈرانے لگا۔محسن جانتا ہے۔اس کو حالات نے' مشاہدے نے' ہماری مجرمانہ دروغ گوئی نے' اس کی چھٹی حس نے اور اس کے دل نے سب بتادیا ہے۔وہ محض اس لئے انجان بن رہا ہے کہ ہم اپنی نظر میں خود شرمسار نہ ہوں۔اس نے دل کو پتھر کرلیا ہے اور آنکھوں سے ٹپکنے والے دل کے لہو کے سامنے بے حسی کی دیوار چُن دی ہے۔پہلا صدمہ یقیناً بہت شدید تھا جس نے اس کو پاگل کردیا تھا مگر پھر اس نے ہماری صورتوں پر ندامتوں اور ملامتوں کا دکھ دیکھا تو وہ سنبھل گیا اور اس نے نوشتۂ تقدیر کو قبول کرلیا۔زندگی میں پھر شہلا سے ملنا لکھا ہوگا تو وہ ہزاروں میل کا سفر طے کرکے اور کئی سرحدیں عبور کرکے بھی مل جائیں گے اور مقدر میں جدائی کے سوا کچھ نہیں تو پھر ہم انتظار کریں گے تیرا قیامت تک۔

پتا نہیں غالب کے خیالات کی رو کس سمت میں بہہ رہی تھی لیکن اچانک ایک ہی وقت میں ہم دونوں کا خاموش ہوجانا بھی اعترافِ جرم کے مترادف ہونے لگا تھا۔

میں نے کہا "یار' میں سوچ رہا تھا کہ ٹرین پر رہنے کے بجائے وہ اس کے ساتھ ساتھ رہنے کو ترجیح دیں گے۔"

ظاہر ہے میں نے جھوٹ بولا تھا۔میں کچھ اور سوچ رہا تھا مگر میرا یہ فی البدیہہ جھوٹ کام کرگیا۔

"تمہارا مطلب ہے سڑک پر رہتے ہوئے؟" نازو بولی۔

"ہاں۔عموماً ہر ریلوے لائن کے ساتھ سڑک چلتی ہے۔راستے میں درمیانی فاصلہ کم زیادہ ہوجاتا ہے مگر جو سامان مال گاڑی سے اتارا جاتا ہے اسے اندرونی علاقے تک روڈ ٹرانسپورٹ کے بغیر نہیں پہنچایا جاسکتا۔سڑک اسی لئے ہوتی ہے" میں نے کہا۔

"یہ بات زیادہ قرینِ قیاس ہے" محسن نے کہا "کسی ٹرک میں ان کا محافظ دستہ ٹرین کے ساتھ چلے تو دور رہ کے بھی وہ نگرانی کرسکتے ہیں۔"

"یہ سب مفروضات ہیں۔وہ کیا کرتے ہیں' یہ دیکھنے کے بعد ہی ہم اپنی منصوبہ بندی کرسکتے ہیں۔ماماجی کے ذریعے یہ معلوم کرانے میں تو کوئی حرج نہیں کہ بوگیاں کون سی ہیں اور کس ٹرین کے ساتھ جائیں گی۔لیکن باقی تمام معاملات ایسے ہیں کہ خود ہمیں ان پر نظر رکھنی ہوگی تاکہ یہ پتا چلے کہ سامان کس طرح پیک ہوا ہے۔کس نے لوڈ کرایا ہے اور اس کے ساتھ کون جارہا ہے۔"

"یہ ہم خود کیسے دیکھیں گے؟"

"نکالیں گے کوئی صورت" میں نے کہا "قریب جانے کی"

"قریب جانے کی" نازو نے کہا "اب آپ حد سے زیادہ خود اعتمادی کے فریب میں مبتلا نہ ہوں۔اتنے بھیس بدل چکے ہیں ہم کہ اب جس بھیس میں جائیں گے پہچانے جائیں گے۔ان کی نظر میں ہمارے سب بہروپ ہیں۔کب تک دھوکا کھائیں گے وہ۔"

"تمہاری دور اندیشی پر مبنی خیالات سے تمہاری ذہانت ثابت ہوتی ہے" غالب نے کہا۔

"میں بہت پہلے خود کو ذہین ثابت کر چکی ہوں۔"

"لیکن اس کا کبھی انعام نہیں ملا تمہیں جو آج میں دینا چاہتا ہوں۔"

"لا ؤ دو۔" نازو نے سوچے سمجھے بغیر کہا۔

"یہاں سب کے سامنے ؟" غالب نے ادھر اُدھر دیکھ کے کہا۔

ظاہر ہے ایسے جواب پر نازو کا ردِ عمل کیا ہو سکتا تھا۔ پہلے تو اس کا رنگ شرم سے گلابی ہوا۔ پھر ہم ہنسنے لگے تو غصے سے لال ہو گیا۔ اس نے ایک دم اٹھ کے غالب پر جست لگانے کی کوشش کی مگر غالب کو امید تھی کہ ایسا ہی ہو گا۔ وہ بالکل تیار تھا۔ میرے کندھے پر سے دوسری طرف کود گیا مگر نازو نے پلٹ کر اس کی ٹانگ پکڑلی اور واپس کھینچا تو میں اور وہ ایک ساتھ لڑھک گئے۔

" لاحول ولا قوۃ۔ تم تو بالکل پاگل ہو چکی ہو نازلی بیگم۔ خطرناک قسم کی پاگل" غالب نے اٹھنے کے بعد کہنی سہلاتے ہوئے کہا "آدمی کو خواہ مخواہ کاٹنے کو دوڑتی ہو۔"

"خواہ مخواہ!" نازو نے برہمی سے کہا۔

" اور کیا۔ ہر بات کا الٹا سیدھا مطلب خود نکالتی ہو۔ پھر دست درازی مجھ پر کرتی ہو۔"

"مت کیا کرو ایسی باتیں۔ جن کا الٹا مطلب نکلے۔"

"کیا الٹی کھوپڑی ہے۔ مطلب تم نکالتی ہو یا میں پیدا کرتا ہوں؟" غالب نے چلّا کے کہا "انعام کا کیا مطلب ہوتا ہے آخر۔ میں ایک روپیہ انعام میں دینا چاہتا تھا۔ ایک ہی روپیہ تھا میرے پاس۔"

"تو سب کے سامنے کیا تھا؟"

"مجھے شرم آتی تھی تمہیں چار چونیاں دیتے ہوئے۔ ان میں سے بھی دو کھوٹی تھیں" غالب نے کہا۔

ان کے لڑنے پر ہمیشہ سب کو ہنسی آتی تھی۔ اس وقت بھی ہنستے ہنستے سب کی آنکھوں سے نیند اڑ گئی۔ پھر مجھے اچانک سین اور شین کی عدم موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے کہا "وہ دونوں کیسے خاموشی سے غائب ہو گئے"

محسن نے کہا "ہاں یار۔ ہم باتوں میں لگے رہے۔ پتا ہی نہیں چلا وہ کب کھسک گئے۔"

"کہیں باہر نہ سو رہے ہوں" غالب بولا۔

" ماماجی نے حکم دیا تھا' صحن میں سونے کا۔ ان کے حکم کی خلاف ورزی کون کر سکتا ہے" میں نے کہا "پھر بھی دیکھ لو' شاید باہر چارپائیوں پر لیٹ گئے ہوں۔"

باہر کی چارپائیاں خالی تھیں۔ شاید یہ دونوں بستر ماماجی نے اپنے لئے اور منو بھائی کے لئے رکھے تھے مگر اب وہ دونوں ہی نہیں' سین' شین بھی غائب تھے اور ہم ان کا انتظار کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ انتظار ایک مشکل کام تھا کیوں کہ سب پر تھکن غالب تھی۔

نازو اور گل پہلے اپنے دوپٹے کی مچھر دانی میں سمٹ سمٹا کے اور گٹھڑی بن کے پڑ گئیں۔ اندر گرمی اور حبس کے ساتھ مچھر تھے۔ کچھ دیر ہم بھی ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے اور پھر لیٹ کر کان پر بھن بھن کرنے والے مچھروں کو بھگانے کے لئے ہاتھ چلاتے رہے۔

میں نے کہا "یار' کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ منو میاں کو پکڑلیں اور ماماجی جائیں انہیں چھڑانے تو وہ بھی گرفتار ہو جائیں۔"

"ماماجی کی عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں۔ وہ نکسل باڑی تحریک کے زمانے سے زیرِ زمین رہنے کا تجربہ رکھتے ہیں۔ اتنی آسانی سے ہاتھ نہیں آئیں گے۔" میں نے کہا "شیر کبھی بڈھا نہیں ہوتا۔"

" مجھے تو شک ہے کہ سین شین بھی ادھر ہی پہنچے ہوں گے اپنے استاد کی خبر لینے۔"

"پولیس' منو میاں سے ہمارا پتا معلوم کر سکتی ہے۔"

"ناممکن۔ وہ ایسے آدمی نہیں ہیں" میں نے کہا۔

"پولیس زبان کھلوانے کے طریقے جانتی ہے۔"

"یار' ہر شخص پر وہ طریقے کارگر نہیں ہوتے" میں نے چڑ کے کہا "بہت ہوتے ہیں ایسے لوگ جن کی قوتِ ارادی ناقابلِ شکست ہی رہتی ہے۔ مرتے دم تک۔ خواہ ان کو قیمہ کرنے والی مشین میں ڈال دیا جائے یا روڈ رولر کے سامنے۔ جسم کی شکست ارادے کی شکست نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ۔ میرا خیال ہے کہ منو میاں اس میدان کے پرانے کھلاڑی ہیں جو ناکامی کی موت اور اس سے پہلے دشمن کی قید میں اذیت کے خیال کو نظرانداز نہیں کرتے۔ چنانچہ اس وقت کے لئے آخری علاج اپنے پاس رکھتے ہیں۔ جب امید کی آخری کرن بھی بجھ جائے۔ دانتوں کے کسی خلا میں کوئی قاتل زہر ان کو قیدِ حیات سے ہی نجات دلا دیتا ہے....."

مجھے احساس ہوا کہ میں اکیلا ہی بول رہا ہوں۔ محسن اور غالب سو چکے تھے۔ تنہائی ہوئی تو دل کے دروازے پر رابعہ کے خیال نے دستک دی اور اس کا تصور ذہن کے دریچے سے روشنی بن کر اتر آیا۔ کھلی کھڑکی سے تاریک کمرے میں اترنے والی چاندنی کی طرح۔ اس نے وہی نیلی ساری باندھ لی تھی جس پر شوخ زرد پھول ستاروں کی طرح جگمگاتے تھے۔ اس نے آرائشِ لب و رخسار میں بھی اہتمام سے کام لیا تھا۔ وہ اپنی آنکھوں میں کاجل بھر کے اور کالے ریشم کی گھٹا جیسے بالوں کو شانوں پر پھیلا کے آئی تھی' میں سمجھ گیا کہ یہ سب اس نے کیوں کیا ہے۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کا یہ اندازِ دلبری دیکھ کے میں اپنے ہوش کھو بیٹھوں اور اپنی خفگی بھول جاؤں مگر میں اتنی آسانی سے اسے معاف کرنے والا نہیں تھا۔ میں کیسے بھول سکتا تھا کہ اس نے اچانک مجھے بتائے بغیر ایک ایسا فیصلہ کر لیا تھا جس کا سارا عذاب صرف میرے دل پر ٹوٹا۔ آج تک میں ان سوالوں کے گرداب سے نہیں نکل سکا کہ رابعہ نے ایسا کیوں کیا؟ کیا سوچ کے کیا؟ اپنی مرضی سے کیا یا مجبوری میں؟ بے ہوشی میں کیا یا دیوانگی میں؟

رابعہ نے کہا "بہت ناراض ہو مجھ سے۔ میری طرف دیکھو گے بھی نہیں۔"

میں اپنا منہ دوسری طرف کئے کھڑا رہا۔ حالاں کہ میرے ضبط کا یہ امتحان بہت سخت تھا اور میری قوتِ مدافعت ایسے ختم ہوتی جا رہی تھی جیسے آگ میں برف پگھلتی ہے۔ برف میرا دل تھا اور اس کے قرب کی آگ سے پگھل رہا تھا۔

جب اس نے پیچھے سے میرے گلے میں اپنے بازو حمائل کئے تو میں ہار گیا۔ میں نے تڑپ کر پیچھے دیکھا اور اس کو اپنے بازوؤں کے حلقے میں سمیٹنا چاہا مگر وہ ہوا کے دوش پر بہت دور چلی گئی۔

"آؤ۔ میرے ساتھ چلو" وہ ہاتھ پھیلا کے بولی۔

میں بے تابانہ آگے بڑھا "کہاں؟"

"اپنے گھر۔ جو ہماری منزل ہے۔ جہاں میں ہوں" اس کے ہونٹوں پر بڑی اُجلی مسکراہٹ تھی۔ اس کے حسن کے ہوشربا انداز نے مجھے ہپناٹائز کر دیا تھا۔ اس کے وجود سے پھوٹنے والی خوشبو میرے حواس پر چھا گئی تھی۔ میں اور آگے بڑھا۔ وہ اور پیچھے ہٹ گئی۔ پیچھے کچھ بھی نہیں تھا۔ بس خلا تھا۔ تاریک خلا جس میں میرا اور اس کا جسم تیرتا جا رہا تھا۔ اوپر آسمان تھا یا اس نے اپنا آنچل پھیلا دیا تھا۔ یہ الف لیلیٰ کی کسی کہانی کا طلسم تھا کہ ہم ساتھ ساتھ اڑتے جا رہے تھے۔ اب اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا تھا اور میں اس کے ریشمی لمس کی نرمی اور دل گداز حرارت کو محسوس کر سکتا تھا۔ ایسا ایک بار پہلے بھی ہوا تھا۔ میں نے سوچا۔ کب اسی طرح میں نے رابعہ کے ساتھ پرواز کی تھی؟

رابعہ نے کہا "پیچھے دیکھو۔ کیا ہے۔"

میں نے بچوں کی طرح خوش ہو کے کہا "یہ تو راوی ہے۔ اور ادھر۔ وہ مقبرۂ جہانگیر کے مینار ہیں نا؟ اور ادھر' یہ اتنا بڑا میدان۔ یہ اقبال پارک ہے۔ وہ مینارِ پاکستان۔"

اس نے کہا "اپنا گھر کہاں ہے؟"

میں نے کہا "یہی تو ہے اپنا گھر۔ اپنا شہر۔ اپنا وطن۔ سب ایک ہی ہیں۔ ایک کے بغیر دوسرے کا تصور ناممکن ہے۔"

اندھیرے کے باوجود میں سب دیکھ رہا تھا۔ لاہور کی سڑکیں' بازار اور گلیاں۔ میکلوڈ' بیڈن روڈ۔ مال' ٹمپل روڈ' مزنگ اور ماڈل ٹاؤن سب ایسے نظر آ رہے تھے جیسے اندھیرے سینما ہال کے پردے پر فلم چل رہی ہو۔ پھر اچانک وہ گھر آ گیا۔ لان میں وزیر خان ہاتھ باندھے ٹہل رہے تھے۔ بالکل وہی شان اور اعتماد۔ وقار اور تمکنت۔ محبت آمیز شفقت کی نرم روی۔ وہ ابھی ابھی نماز سے فارغ ہوئے تھے۔ صبح کی نماز وہ شبنم سے بھیگی ہوئی گھاس پر پڑھتے تھے۔ اس کے بعد سورج نکلنے تک ہاتھ میں تسبیح لئے ٹہلتے رہتے تھے' یہاں تک کہ میں اٹھ کر باہر آ جاتا تھا۔

اپنے اسی پرانے مخصوص لہجے میں انہوں نے کہا "بھئی یہ کیا طریقہ ہے سکندر میاں۔ بہت بے پروا ہو گئے ہو تم۔ کہاں چلے جاتے ہو ہماری بچی کو اکیلا چھوڑ کے۔"

میں نے ندامت سے سر جھکا کے کہا "جی۔ میں...."

"دیکھو اس نے کیسے خوبصورت پھول کھلائے ہیں" انہوں نے میری طرف دیکھے بغیر کہا "تم نے بتایا ہو گا اسے کہ مجھے یہ ننھے منے رنگ برنگے پٹونام کے پھول اچھے لگتے ہیں۔ وہ ہے کہاں؟ اندر چلی گئی ناشتا بنانے۔ بھئی سکندر میاں۔ اتنے اچھے نصیب ہیں ہمارے کہ ہم سوچتے ہیں' خدا سے کیا کہیں۔ الفاظ تو بڑے کم ظرف ہوتے ہیں' شکر گزاری کے جذبات کا اظہار بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔ اور ہم تو بھئی' سخت شرمندہ ہیں اپنے خدا سے۔ ہم نے بڑا گلہ شکوہ کیا تھا۔ ذرا سی آزمائش کی بات تھی۔ خیر۔ اس نے بھی معاف کر ہی دیا۔ اور پھر اتنا دیا۔ اور یہ بہو ہماری۔" انہوں نے ایک گہری' دکھ بھری سانس لی "کاش ہم اس کے لئے کچھ کر سکتے۔ دعا ہی دے سکتے اسے۔ دیکھو وہ کتنی اداس اکیلی بیٹھی ہے۔"

اور میں نے پلٹ کے دیکھا تو رابعہ گھر کے بند دروازے کے باہر برآمدے کی دو سیڑھیوں پر بیٹھی تھی۔ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں چہرے پر انتظار سجائے۔ آنکھوں میں ادھورے خواب لئے۔

میں نے کہا "رابعہ' یہاں کیوں بیٹھی ہو اندھیرے میں؟"

اس نے کہا "روشنی کہاں سے لاؤں؟"

میں نے کہا "اندر چلو....."

"اندر بھی اندھیرا ہے" وہ مایوسی سے بولی "مجھے ڈر لگتا ہے اکیلے جاتے ہوئے۔ مجھ سے یہ دروازہ بھی نہیں کھلتا۔ اس کی ایک چابی تمہارے پاس بھی ہے نا۔ جب تک دونوں چابیاں نہ لگائی جائیں اس کا قفل نہیں کھلے گا۔"

میں نے اپنی ہر جیب میں دیکھا۔ چابی کہاں گئی؟ اکیلی رابعہ اس گھر کا دروازہ کیسے کھول سکتی ہے؟ پھر کیا وہ دروازے پر ہی بیٹھی رہے گی؟ انتظار تو آدمی کو پتھر کر دیتا ہے۔ چابی کہاں گئی؟ میری چابی کہاں گئی؟ میں سخت بدحواس اور پریشان تھا۔

جب محسن نے مجھے جھنجوڑا تب بھی میں یہی کہہ رہا تھا۔ چابی کہاں گئی؟ میری چابی کہاں ہے۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر غالب سو رہا تھا۔ محسن پھر لیٹ گیا۔ شاید اس نے مجھ سے کچھ پوچھا تھا مگر میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ سمجھ گیا ہو گا کہ میں خواب دیکھ رہا تھا۔ کیسا عجیب خواب تھا۔ دل دُکھانے والا۔ کتنی پرانی یادوں کے تاروں سے بُنا ہوا۔ ہر یاد کے ساتھ ایک زخم کا رشتہ تھا۔ وزیر خان کی ہڈیاں بھی اپنے بے نشان مدفن میں میرا انتظار کر رہی ہیں۔ اس کے قاتل بے خوف پھر رہے ہیں۔ اس کے گھر کی دیواریں سوگوار ہیں۔ کیسے سب ناآسودہ خواہشوں نے ایک ہی خواب میں جگہ بنالی۔ میں نے وزیر خان کو لان میں ٹہلتا دیکھ لیا۔ ان کے ساتھ رابعہ کو دیکھ لیا۔ ان کے منہ سے رابعہ کی تعریف سن لی۔ یہ احساس

مجھے ہمیشہ رہا تھا کہ وہ رابعہ جیسی بہو پا کے کتنے خوش ہوتے۔

اس وقت صبح کے پونے پانچ بج رہے تھے۔ نہ جانے کہاں سے میرے کانوں میں فجر کی اذان کی آواز آئی۔ دل کی عجب سی کیفیت تھی۔ اپنے والد کو خواب میں دیکھنا حقیقی زندگی کا ایک واقعہ لگتا تھا۔ اور میرے کان ابھی تک ان کی آواز سن رہے تھے۔ آج یہ کتنی پرانی بات ہوگئی تھی۔ مجھے ان کی موت کا صدمہ ناقابلِ برداشت محسوس ہوتا تھا لیکن وقت نے سب کچھ بھلا دیا تھا۔ میں نے عہد کیا تھا کہ ان کے قاتلوں کو بے نقاب کروں گا اور قانون نے انہیں سزا نہ دی تو میں خود دوں گا مگر میں یہ عہد بھی بھول گیا تھا۔ پھر میں نے عہد کیا تھا کہ اس مدفنِ بے نشاں کا سراغ ضرور لگاؤں گا جہاں ان کی لاش کو قبر سے چوری کرکے لے جانے والوں نے دفن کیا تھا۔ مگر یہ عہد بھی گردشِ حالات کی نذر ہوگیا تھا۔ ان حالات کی جو تقاضا کرتے تھے کہ میں ذاتی انتقام کے جذبات کو ملک و قوم کے وسیع تر مفاد پر قربان کردوں۔ پہلے ان دشمنوں کو کیفرِ کردار تک پہنچاؤں جو میرے وطن کی سالمیت کے خلاف دشمنوں کی سازش میں شریک ہوگئے ہیں اور یوں وزیر خان کے بے گناہ لہو کی پکار فرض کی پکار میں دب کے رہ گئی۔

وطن کی مٹی مجھ پر فرض سے کوتاہی کا الزام عائد نہیں کرسکتی تھی مگر وزیر خان کی مٹی فریاد کناں تھی کہ میں نے اس کا قرض نہیں چکایا۔ وزیر خان کی ہڈیاں کسی گمنام جنگل کے کسی ویران اور بے نام و نشاں مدفن سے فریاد کرتی تھیں کہ ہمیں اپنی قبر میں لوٹا دو جو ہماری ابدی آرام گاہ تھی۔ ابھی تک میں یہ بھی معلوم نہ کرسکا تھا کہ ان کی لاش کو قبر سے نکالنے والے کون تھے اور اسے کہاں لے گئے تھے۔

یہ میری روح کی خلش تھی اور دلِ مضطر کی کسک تھی جو اس وقت میرا آزار بن گئی۔ میں نے اٹھ کے وضو کیا اور اندازے سے قبلے کی سمت کا تعین کرکے خدا کے سامنے حاضر ہوگیا۔ ایسا بہت کم ہوتا تھا مگر پہلے متعدد بار ہوا تھا کہ حضوری کی کیفیت ایک وارفتگی کا نتیجہ بن گئی تھی۔ از خود میں ایک الہامی یا وجدانی انداز میں سجدہ ریز ہوا تھا۔

میں نے خدا سے اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کیا اور اس کی رحمت مانگی۔ وزیر خان کے لئے دعائے مغفرت کی اور التجا کی کہ وہ مجھے حوصلہ اور استطاعت دے کہ میں وزیر خان کا وارث بنوں۔ اس کے نام و نسبت کا سلسلہ آگے بڑھاؤں اور اس کے خوابوں کے ساتھ اپنے ارادوں کی تکمیل کرسکوں۔

ہمیشہ کی طرح میں پُرسکون ہوگیا اور وہ بے کلی جو آنکھ کھلنے کے بعد خواب کے اثرات سے طاری تھی دور ہوگئی۔ میں نے کچن میں جاکے چائے بنانے کا اسباب تلاش کیا اور ابھی چولھا جلا ہی رہا تھا کہ نازو آگئی۔

"کیا نیند نہیں آئی؟" اس نے جماہی لے کر کہا۔ اس کی نیم باز آنکھوں میں ابھی تک نیند بسی ہوئی تھی۔

میں نے جھوٹ بولا "ابھی آنکھ کھلی ہے۔ تم کیوں اٹھ گئیں؟"

"آوازیں سن کر۔ میں سمجھی وہ لوگ آگئے۔"

میں نے کہا "ان میں سے تو کوئی بھی واپس نہیں آیا"

نازو نے کہا "چلو ہٹو، میں بناتی ہوں چائے۔"

میں نے کہا "نہیں تم بیٹھو۔ آج میں بھی دیکھ لوں کہ کہیں چائے بنانا بھول تو نہیں گیا۔"

اس نے اپنی انگلیوں سے بالوں میں کنگھی کی اور ایک سرکنڈوں کے بنے ہوئے موڑھے یا اسٹول پر بیٹھ گئی "مجھے آثار اچھے نہیں دکھائی دیتے۔ پہلے ماماجی گئے۔ پھر سین شین۔ چھ سات گھنٹے ہوگئے۔ ابھی تک کسی کی کوئی خبر نہیں۔"

"میرا خیال ہے....."

"مجھے معلوم ہے تمہارا خیال" نازو نے میری بات کاٹ دی۔ "تم خود جاکے دیکھنا چاہتے ہو۔ لیکن میں اس کی اجازت نہیں دوں گی۔"

میں نے کہا "لڑکی! کیا میں تم سے اجازت لینے کا پابند ہوں؟ تم یہ بھول رہی ہو کہ میں ایم آر ایس کا سربراہ ہوں۔"

"مگر میں سکندر سے بات کررہی ہوں" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا "صرف اپنی طرف سے نہیں، رابعہ کی طرف سے بھی۔ اور ان سب کی طرف سے بھی" اس نے کمرے میں سونے والوں کی طرف اشارہ کیا۔

"آخر ہم کب تک ہاتھ پر ہاتھ رکھے انتظار کریں گے؟"

"ابھی صرف چھ گھنٹے گزرے ہیں۔ ایک دن بھی نہیں ہوا ہے۔ ہوسکتا ہے وہ صبح آجائیں۔"

"صبح اور کب ہوگی۔ سورج نکلنے والا ہے" میں نے سلور کی کیتلی میں چائے کی پتی ڈالتے ہوئے کہا۔

"ہوسکتا ہے رات کو وہ کہیں چھپ گئے ہوں۔"

میں نے ہنس کے کہا "اس بات سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ وہ سب پکڑے گئے ہوں گے۔ پھر کسی طرح فرار ہونے میں کامیاب ہوئے ہوں گے۔ اس کے بعد دشمنوں کی نظر سے بچنے کے لئے کہیں پناہ لینے پر مجبور ہوئے ہوں گے اور جب تک دشمنوں کی طرف سے خطرہ ٹل نہیں جاتا وہ چھپے رہیں گے۔"

"ایسا بھی ہوسکتا ہے۔" نازو نے سوچ کے کہا۔

میں نے پیالی میں چائے ڈال کے نازو کے سامنے رکھ دی۔ "اس میں چینی خود ڈالو۔ دودھ نہیں ہے۔ میں تو ایسے ہی پیوں گا۔"

"مجھ پر چائے پینا کوئی فرض نہیں ہے۔"

"میں نے بنائی ہے تو پھر پینی پڑے گی" میں نے کہا۔

"اچھا کوشش کرتی ہوں" نازو نے کہا "ایک بات تو بتاؤ۔"

"کوئی راز کی بات ہے؟ غالب کے بارے میں معلوم کرنا ہے کہ کیسا لڑکا ہے؟"

نازو نے مذاق کو نظر انداز کردیا اور بولی "کیا وہ بات محسن کو

معلوم ہوئی ہے؛ جو ہم سب نے چھپالی تھی۔"

میں نے کہا "تمہارا کیا خیال ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ وہ سب جانتا ہے۔" نازو نے کہا۔

"ہم سب کا یہی خیال ہے" میں نے کہا۔

"پھر وہ...... کچھ کہتا کیوں نہیں؟"

میں نے کہا "وہ کہے گا بھی نہیں۔ اس نے نوشتۂ تقدیر یا رضائے الٰہی، اپنی تیرہ بختی یا بے رحمیٔ حالات، کچھ بھی کہو۔ اسے قبول کرلیا ہے۔ معلوم نہیں اس میں صبر و ضبط کی اتنی طاقت کہاں سے آگئی۔ اس کی جگہ میں ہوتا تو پاگل ہوجاتا۔"

"کیا یہ صبر و ضبط پاگل پن کی بات نہیں ہے؛ کیوں کررہا ہے وہ اپنے آپ پر یہ جبر؟ وہ روتا کیوں نہیں، چلاتا کیوں نہیں؟ ہم پر خفا کیوں نہیں ہوتا؟ اس کے دل سے اٹھنے والا دھواں اندر بھرتا جارہا ہے۔ یہ غبار آنسوؤں میں ڈھل کے نکل جائے تو آدمی محفوظ رہتا ہے ورنہ بکھر جاتا ہے۔ ٹوٹ پھوٹ کے ریزہ ریزہ ہوجاتا ہے۔ باہر سے پتھر کا آدمی نظر آنے والا اندر سے تو پتھر نہیں ہوسکتا۔"

"اندر سے وہ بھی شیشے کا آدمی ہے" میں نے اتفاق کیا۔

"کیا میں یہ بات چھیڑوں؟"

میں نے چائے کی پیالی نیچے رکھ دی "خدا کے لئے ایسا مت کرنا۔ ابھی میں کسی قیامت کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ اس آتش فشاں کو خاموش ہی رہنے دو۔"

"مجھے گل پر ترس آتا ہے لیکن میں اس کے لئے کچھ نہیں کرسکتی۔"

"وہ کب چاہتی ہے کہ اس کے لئے کوئی کچھ کرے۔ اسے بھی اپنے حال پر چھوڑ دو۔"

"میں بہت مایوس ہوں۔ ہر طرف سے مایوسی کی دیواریں مجھے اوپر اٹھتی محسوس ہوتی ہیں" نازو نے کہا "اب تو ایسا لگتا ہے....."

میں نے کہا "بولو، رک کیوں گئی ہو۔ کیا کیسا لگتا ہے؟"

"کہ کسی دن میں بھی ہار مان لوں گی۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ ہار جانے میں ہی سکون ہے اور عافیت ہے۔"

میں نے کہا "رابعہ نے ہار نہیں مانی تھی۔"

"پھر وہ کیوں واپس چلی گئی؟"

"ابھی میرے پاس اس سوال کا جواب نہیں ہے" میں نے برہمی سے کہا۔

"اب بھی مجھے کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ یہ سب بے کار ہے، کچھ حاصل نہیں ہوگا اس سے۔ ہم شہلا کو نہیں بچا سکیں گے۔ وہ ہمارے پاگل پن پر قربان ہوجائے گی۔ وہ بھی اور اس کا بیٹا بھی۔ آخر کار ایک دن یہ خیال میرا یقین بن جائے گا۔ جس دن ایسا ہوگا اس دن میں بھی پیچھے ہٹ جاؤں گی۔ میں اپنے دامن پر ان کے خون کا رنگ نہیں دیکھوں گی۔"

"فضول باتیں مت کرو۔ تم میرا مورال بھی ڈاؤن کررہی ہو۔ دیکھنا ہی ہے تو محسن کی طرف دیکھو۔ اس کا حوصلہ دیکھو۔ یہ تو بڑی خود غرضی ہوگی، اگر ہم سب اپنی ذات کی شکست سے ڈرنے لگے اور مستقبل پر یقین سے محروم ہونے لگے۔ ایک منٹ کے لئے فرض کرلو کہ رابعہ کم حوصلہ تھی اور اس نے مشکل جیت کے مقابلے میں آسان ہار کو منتخب کرلیا ہے تو کیا مجھے یہ سمجھنا چاہئے کہ رابعہ نے ٹھیک کیا؟ نہیں۔ اس نے ٹھیک کیا ہوتا تو میں اس کا ساتھ دیتا۔ افسوس مجھے صرف اس بات کا ہے کہ وہ میرے لئے کوئی جواب نہیں چھوڑ کے گئی جو میں دوسروں کو دے سکوں۔ لیکن تم ایسا کروگی تو تمہیں بھی مایوسی ہوگی۔ غالب تمہارا ساتھ نہیں دے گا۔ وہ ہمارے ساتھ آگے بڑھ جائے گا۔ ہم آگے چلتے جائیں گے۔ امید کے سورج کے ساتھ ساتھ۔ اور چونکہ دنیا گول ہے اس لئے آگے جانے کے باوجود ہم ایک دن پھر پیچھے پہنچ جائیں گے۔ وہیں جہاں سے چلے تھے....."

صحن کا دروازہ آہستہ سے کھلا اور ماماجی اندر آگئے۔ میں اور نازو ہڑبڑا کے اٹھے۔ ماماجی کی صورت پر ہمارے سوال کا جواب تحریر تھا لیکن میں چاہتا تھا کہ وہ میرے اندازوں کی نفی کردیں۔

میں نے کہا "ماماجی! خیریت ہے نا؟"

نازو نے کہا "کیا ہوا ماماجی؟"

ماماجی صحن میں پڑی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گئے۔ خالی خالی نظروں سے ہماری طرف دیکھتے ہوئے انہوں نے کہا "مجھے چائے لادے بٹیا۔ بہت تھک گیا ہوں میں۔"

ان کی آواز نے غالب اور محسن کو بھی بیدار کردیا تھا۔ وہ آنکھیں ملتے ہوئے باہر آئے اور سوالیہ نشان بن کے کھڑے ہوگئے۔

"بھئی...... وہ اپنا منو تو خیر سے بچ گیا" ماماجی نے کسی کو مخاطب کئے بغیر کہا۔

"کیا وہ گرفتار ہوگیا تھا؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ پولیس نے دھرلیا تھا، تخریب کاری اور دہشت گردی کے الزام میں" ماماجی بولے "بڑی تیاری کے ساتھ پہنچے تھے وہ۔ وارنٹ وغیرہ لے کر۔ اور ان کو سب معلوم تھا۔"

"کسی نے مخبری کی ہوگی" محسن بولا۔

غالب بولا "کسی نے کیا، وہی حرام زادے ہیں۔ دلاور اور تریویدی۔"

"پولیس نے سب برآمد کرلیا۔ جتنا سامان تھا وہاں۔ میرے پہنچنے سے پہلے ہی وہ منو کو لے جاچکے تھے۔"

"پھر آپ نے کیسے بچایا ان کو؟"

"میں نے کہاں بچایا۔ میں دخل دیتا تو وہ مجھے بھی لے جاتے۔ باہر کے معاملات سنبھالنے والا کوئی نہ رہتا" ماماجی نے کہا "وہ تو اس کے دونوں بیٹے بڑے جیالے تھے۔"

"سین اور شین؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ کیسے چھوٹے چھوٹے بونے سے تھے۔ کارٹون۔ مگر کیا حوصلہ تھا ان کا۔ مجھے شرم آئی اپنے اتنے بڑے ڈیل ڈول پر۔ وہ

جان پر کھیل گئے۔ جیسے ہی انہیں پتا چلا کہ منو کو پولیس اپنے ساتھ لے گئی ہے انہوں نے آپس ہی میں سب طے کر لیا۔ مجھ سے انہوں نے صرف اتنا کہا کہ ماماجی' آپ قریب مت آئیں۔ گاڑی کے ساتھ پولیس اسٹیشن سے دور انتظار کریں۔ منو کے خلاف جو بھی کارروائی ہوتی صبح ہوتی۔ وہ اعلیٰ افسران کو مطلع کرتے کہ دہشت گردی اور تخریب کاری میں ملوث ایک پرانا پاپی پکڑا گیا ہے جو مشرقی بنگال میں گوریلا جنگ لڑنے والوں کے لئے اسلحہ وغیرہ لینے آیا تھا۔"

"کیا وہ منو میاں کو پہچان گئے تھے؟"

"یہ واقعی عجیب بات ہے۔ انہوں نے ابھی تفتیش شروع بھی نہیں کی۔ سب پہلے سے معلوم تھا ان کو۔ کسی نے بتایا ہو گا۔ پولیس نے انہیں لاک اپ میں بند کر دیا تھا اور وہ ضبط شدہ اسباب کی فہرست بنا رہے تھے کہ سین شین نے حملہ کر دیا۔"

میں بھونچکا رہ گیا "سین شین نے تھانے پر حملہ کر دیا؟"

"ہاں بھئی۔ وہ تو قیامت بن کر ٹوٹ پڑے۔ انہوں نے ایک کے بعد ایک دستی بم پھینکے۔ باہر والوں کو پہلے صاف کر دیا۔ پھر اندر جا کے فائر کھول دیا۔ نہ جانے کہاں سے وہ ایک مشین گن لے آئے تھے۔ میں نے تو صرف دھماکے سنے اور فائرنگ کی آواز سنی۔ انہوں نے کسی کو سنبھلنے کا موقع نہیں دیا اور چار منٹ میں لاک اپ کا گیٹ توڑ کے منو کو باہر نکال لیا۔ میں گاڑی لئے دور کھڑا ہوا تھا کہ منو دوڑتا ہوا آیا۔ اس نے ایک بوری اٹھا رکھی تھی جو اس نے گاڑی میں ڈال دی اور مجھ سے کہنے لگا کہ ماماجی تم جاؤ۔ میں پہنچ جاؤں گا وہیں۔"

"یہ کب کی بات ہے؟" میں نے کہا۔

محسن نے کہا "گیارہ ساڑھے گیارہ تک تو سین اور شین یہاں تھے۔"

"رات بارہ بجے کے قریب پولیس نے وہاں اپنی کارروائی مکمل کی تھی" ماماجی نے کہا "میں باہر ہی تھا کیوں کہ گیٹ پر بھی پولیس کا پہرہ تھا۔ انہوں نے گیٹ کے سامنے جمع ہونے والوں کو بھگا دیا تھا۔ پھر بھی کچھ لوگ دور کھڑے کانا پھوسی کر رہے تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ پاکستانی جاسوس پکڑے گئے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہاں وہ کیا لینے آئے تھے؟ ایک شخص نے کہا کہ یہاں بم بنانے کا کارخانہ تھا۔ دوسرے نے کہا کہ نہیں۔ یہ ان کا خفیہ ہیڈ کوارٹر تھا۔ ان کا تعلق بنگال سے ہے۔ تیسرے کا کہنا یہ تھا کہ وہ مغربی پاکستان سے آئے ہوئے تخریب کاروں کا گروہ تھا۔ جتنے منہ تھے اتنی باتیں۔ حقیقت کا کسی کو بھی علم نہیں تھا۔ پھر بھی میرے لئے شک کی گنجائش نہ رہی کہ منو مصیبت میں پھنس گیا ہے۔ اسے چھڑانے کے دو ہی طریقے تھے۔ یا تو پولیس کو بھاری رشوت دی جائے اور وہ منو کو نکل جانے دیں۔ اپنی کارگزاری کی رپورٹ میں لکھیں کہ تخریب کار فرار ہو گئے لیکن تخریب کاری میں کام آنے والا سامان پکڑا گیا۔ اگر لاکھ دو لاکھ ہوتے تو شاید میں یہ طریقہ

آزماتا۔ کامیابی پھر بھی مشکوک تھی۔ پولیس کی نفری کم [illegible] تھی۔ لالچی سب ہوتے ہیں مگر غدار سب نہیں ہوتے۔ یہ م[illegible] بہت سنگین تھا۔ ان میں سے ایک بھی ڈر جاتا یا اڑ جاتا تو دو[illegible] مجبور ہو جاتے۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہوا تھا وہ آس پاس کے رہنے والوں نے دیکھا تھا۔ دوسرا طریقہ منو کو زبردستی چھڑانے [illegible] جو میرے بس کی بات نہ تھی۔ میں باہر ہی کھڑا پریشان ہو رہا تھا [illegible] دونوں پہنچ گئے۔ انہوں نے کہا کہ آپ صرف اتنا معلوم کر[illegible] پولیس' منو میاں کو کہاں لے کر جاتی ہے۔ باقی ہم کر لیں گے۔ ا[illegible] نے کہا کہ ہم ایک ڈیڑھ گھنٹے میں آتے ہیں۔ آپ اسی جگہ ملنا[illegible] پولیس کے پیچھے پیچھے گیا اور پھر واپس آیا۔ سین اور شین [illegible] گاڑی میں آئے تھے۔ گاڑی انہوں نے میرے حوالے کی اور [illegible] خواہ کچھ بھی ہو جائے قریب آنے کی ضرورت نہیں۔ منو میاں [illegible] ہی میرے پاس پہنچ جائیں گے۔ اور اس کے بعد جو ہوا' وہ م[illegible] بتا دیا ہے۔"

"مگر وہ دونوں کہاں گئے؟ سین اور شین۔"

"میرا خیال ہے کہ وہ...... شہید ہو گئے" ماماجی نے کہا۔

"شہید ہو گئے؟" ایک ساتھ ہم سب نے کہا۔

"ہاں۔ منو نے کچھ ایسی ہی بات کی تھی۔ میں نے بھی ا[illegible] یہی سوال کیا تھا تو وہ آسمان کی طرف منہ اٹھا کے اور دعا کے ہاتھ اٹھا کے بولا۔ ماماجی' اللہ سے دعا کریں۔ میں نے کہا' [illegible] مارے گئے؟ تو وہ بگڑ گیا کہ ماماجی' کیسی باتیں کرتے ہو۔ مرتے ہیں [illegible] لوگ عام طریقے سے۔ وہ تو زندہ ہیں۔"

میں نے کہا "میں سمجھ گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ شہید کو [illegible] مت کہو۔ وہ تو زندہ ہیں۔"

ماماجی نے اقرار میں سر ہلایا "یہی مطلب تھا اس کا۔"

سین اور شین کی صورت میری نظروں میں پھر رہی تھی [illegible] سے میری شناسائی کا دور بہت مختصر تھا لیکن اتنے کم وقت میں ان[illegible] نے ہم سب کو اپنا گرویدہ کر لیا تھا۔ دونوں بڑے شوخ' زندہ[illegible] سب کے خدمت گزار' مجسم انکسار۔ انتہائی تیز طرار اور [illegible] نثاری میں پیش پیش رہنے والے تھے۔ انہوں نے اپنی افادی[illegible] پہلے ہی ثابت کر دی تھی۔ موت کے سامنے سینہ سپر ہو کے [illegible] مثل بہادری کا ایک ایسا کارنامہ سرانجام دے گئے تھے جس [illegible] سامنے ہمارے سب دعوے ہیچ تھے۔ ثبت است بر جریدۂ عالم [illegible]

میں نے کہا "کچھ لوگ اپنی زندگی کی حرارت میں [illegible] ہوتے ہیں۔ وہ شعلہ تھے۔ جل کے خاک ہوئے اور خاک[illegible] گئے۔"

"ٹیپو سلطان نے کہا تھا۔ گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے [illegible] ایک دن کی زندگی بہتر ہے" محسن بولا۔

غالب نے کہا "انہوں نے اس قول کو سچ کر دکھایا۔ ہم [illegible] اتنی بے خوفی سے مرنے نہ جاتے۔ یہی سوچتے رہتے کہ یہ بہا[illegible] ہے یا اقدام خودکشی۔"

یعنی سب سوگوار ہو گئے تھے اور یہ ضروری تھا کہ اس ماتمی فضا کو ختم کرنے کے لئے موضوع بدلا جائے۔

میں نے کہا "آپ کو منو میاں نے کچھ نہیں بتایا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں؟"

"نہیں۔ مگر میرا خیال ہے کہ اس بوری میں وہ سب سامان ہو گا جو پولیس نے ضبط کر لیا تھا۔ وہ اس کو کسی محفوظ جگہ پر پہنچانے گیا ہو گا۔"

"کیا یہ جگہ محفوظ نہیں ہے؟" نازو نے کہا۔

ماماجی نے کہا "ارے بٹیا! ہر جگہ محفوظ ہے' اگر خدا حفاظت کرنے والا ہے۔ اور وہ ہاتھ کھینچ لے تو پھر کوئی بھی جگہ محفوظ نہیں۔ مگر تم فکر مت کرو' پولیس یہاں نہیں آ سکتی۔"

نازو نے خفت سے کہا "میرا یہ مطلب نہیں تھا۔"

"اچھا چھوڑو یہ بات۔ تم سب کیا منہ لٹکائے کھڑے ہو۔ ارے جاؤ ہاتھ منہ دھو کے کچھ ناشتا وغیرہ کرو" ماماجی نے ایک ساتھ سب کو ڈانٹا "بھئی ہم جوان تھے تو اور بات تھی مگر اب بھی صبح اٹھ کے سب سے پہلے خدا یاد آتا ہے پھر پیٹ۔"

گل نے کہا "دل نہیں چاہ رہا ہے۔"

اس کی شامت آ گئی "لو۔ اس بالشت بھر کی لڑکی کو دیکھو۔ دل کی بات کرتی ہے ہم سے۔ ارے پاگل! اس دل کے چکر میں مت پڑنا۔ بڑا خوار کرتا ہے یہ آدمی کو۔ بھلا پیٹ کا دل سے کیا تعلق ہے! دو دن کھانے کو نہ ملے تجھے تو پتا چلے کہ معاملہ دل کا نہیں۔ ابھی تو تیرے پیٹ میں رات کا کھانا پڑا ہو گا...... کل تک کچھ مت کھا پھر تیرا یہی دل سو پیاز اور سو جوتے بھی کھانے کو تیار رہو گا۔"

گل کی شکل رونے والی ہو گئی۔ محسن نے اس کے کان میں کہا۔ "روئے گی تو ماماجی ماریں گے۔"

میں قریب تھا اس لئے میں نے یہ بات بھی سن لی۔ گل مسکرانے لگی۔ ماماجی دروازے تک گئے اور انہوں نے کسی کو آواز دے کر بلایا۔ جیب سے دس کا نوٹ نکال کے دیا اور کہا "جا ذرا گرم گرم حلوہ پوری لے کر آ۔ دوڑتا جا اور دوڑتا ہوا آ۔"

وہ غالباً کوئی لڑکا تھا۔ اس نے کہا "لو ماماجی۔ میں یوں گیا طوفان میل کی طرح اور یوں آیا۔" پھر اس نے انجن کی طرح سیٹی ماری اور بھاگ گیا۔

میں نے ماماجی کو اندر لے جا کے ان سے فوری توجہ طلب معاملات پر بات کرنے کے لئے اس مہلت سے فائدہ اٹھایا۔ اس کے لئے یہ ضروری تھا کہ ہم اپنے مشن کے بارے میں انہیں بریف کریں۔ میں نے کچھ ضروری تفصیل نکال دی اور کہا۔

"منو میاں کا اور ہمارا مشن ایک ہی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ مشرقی پاکستان کے علیٰحدگی پسندوں سے لڑ رہے ہیں اور ہم اپنے وطن کے غداروں سے۔ پاکستان کے کچھ جرائم پیشہ افراد اور اسمگلر بیرونی طاقتوں کی مدد سے اسلحہ برآمد کرتے ہیں اور مشرقی پاکستان اسمگل کر دیتے ہیں۔ ہوائی جہاز کے ذریعے یہ کام ہو نہیں سکتا چناں چہ وہ بحری اور زمینی راستے استعمال کرتے ہیں۔ ہم نے ایک گروہ کے بہت سے ذخائر راستے میں ہی تباہ کر دئے لیکن ان کا یہ دھندا ختم نہیں ہوا۔ وہ ہماری جان کے دشمن ہو گئے لیکن خدا نے ابھی تک ہمیں محفوظ رکھا ہے۔ انہوں نے سرحد کے ادھر اور اُدھر کی پولیس کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا ہے چناں چہ ہم چھپ کر رہنے پر مجبور ہیں۔ اب تازہ ترین مسئلہ یہ ہے کہ وہ اسلحے کی ایک کھیپ مال گاڑی کے ذریعے روانہ کر رہے ہیں جو غالباً کلکتہ جائے گی۔ اس کے لئے ایک ایم ایل اے جیون پرشاد نے بمبئی کے ایک کروڑ پتی بدمعاش تریوینی کو دو بوگیاں دلوائی ہیں۔ یہ بوگیاں خواجہ سیمنٹ والوں کے نام پر بک ہوئی تھیں لیکن اچانک "دفاعی ضروریات" کا بہانہ کر کے ان کی بکنگ منسوخ کر دی گئی ہے۔ ظاہر ہے وہ احتجاج بھی نہیں کر سکتے۔"

ماماجی حیرت سے یہ سب کچھ سن رہے تھے "کمال ہے! تم کو یہ سب کیسے معلوم ہوا؟"

"بس ماماجی' معلوم ہو ہی گیا۔ سمجھ لیں تائیدِ غیبی سے" میں نے کہا اور انہیں مختصراً گزشتہ رات کے واقعات بھی سنا دئے۔

ماماجی نے سر ہلایا "اچھا تو پھر اب کیا چاہتے ہو؟"

"سب سے پہلے تو یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ خواجہ سیمنٹ والوں کی بوگیاں کس تاریخ میں منسوخ ہوئی ہیں اور کس ٹرین کے ساتھ کہاں جا رہی تھیں۔"

ماماجی نے کہا "یہ تو میں تم کو ابھی دو گھنٹے بعد بتا دوں گا۔ ذرا بابو آ جائیں۔"

"کون بابو؟" غالب نے کہا۔

"کلرک بابو جو بکنگ کرتے ہیں۔ کیوں ماماجی؟" میں نے کہا۔

ماماجی نے میری معاملہ فہمی کو سر ہلا کے تعریف کی سند دی۔

"اس کے علاوہ" میں نے کہا "یہ بھی معلوم کرنا ہے کہ اس مال گاڑی کے ساتھ گارڈ کون ہو گا اور انجن ڈرائیور کے علاوہ ٹرین کے ساتھ سفر کرنے والے عملے میں کون شامل ہو گا۔"

ماماجی نے کہا "یہ بھی شیڈول دیکھ کے پتا چل جائے گا۔"

"شیڈول دیکھتے وقت ایک بات کا خیال رکھیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ عملے میں تبدیلی کی گئی ہو۔ پہلے کوئی اور جا رہا ہو۔ پھر اچانک سب کو بدل دیا گیا ہو" میں نے کہا۔

"سب کو؟" ماماجی نے کہا۔

"جی سب کو۔ وہ کوشش کریں گے کہ ٹرین پر ان کا زر خرید عملہ جائے جو اُن کو راستے میں وہ مراعات دے جو عام طور پر گارڈ نہیں دیتے۔ مثلاً یہ کہ ایک آدمی کو انجن ڈرائیور کے ساتھ رہنے کی اجازت مل جائے' دوسرے کو گارڈ کے ساتھ مسلح بیٹھنے کی۔ وہ پوری کوشش کریں گے کہ ان کے مسلح محافظ ٹرین کے ساتھ جائیں۔ آپ سب کے نام لکھ لائیں۔ جو پہلے جا رہے تھے ان کے اور جو اَب جا رہے ہیں ان کے بھی۔"

ماماجی نے کہا "یہ بھی ہو جائے گا۔ اور کچھ؟"

میں نے کہا "ہمارے مطالبات کی فہرست تو بہت لمبی ہے۔ یہ بتایئے کہ ہم کس طرح ٹرین پر جاسکتے ہیں؟"

"اگر ان کے آدمی ہوں گے ٹرین پر۔ تو تمہیں کوئی قریب بھی نہیں پھٹکنے دے گا" ماماجی بولے۔

"کیا انہیں کوئی چیک نہیں کرے گا؟ میرا مطلب ہے مال گاڑی میں عملے کے علاوہ کوئی سفر کر رہا ہو تو کیا راستے میں پوچھ گچھ نہیں ہوتی کہ یہ غیر متعلقہ افراد کون ہیں؟"

ماماجی ہنسنے لگے "پوچھ گچھ کرنے والے تو خود اپنے آدمی بٹھا دیتے ہیں کہ اسے فلاں گاؤں یا قصبے کے اسٹیشن پر اتار دینا۔ تقریباً سب ہی انجن ڈرائیور اور گارڈ اپنے ساتھ دو چار سواریاں لے جاتے ہیں اور ان سے کرایہ وصول کر لیتے ہیں۔ مال گاڑی میں مسافروں کا سفر کرنا جرم ہے مگر یہاں سب چلتا ہے۔ اگر خطرے کی بات ہو تو اسٹیشن آتے ہی ان سواروں کو پلیٹ فارم کے دوسری طرف اتار دیتے ہیں جہاں وہ ٹرین کی روانگی تک ٹہلتے رہتے ہیں اور ٹرین روانہ ہوتی ہے تو لپک کے چڑھ جاتے ہیں۔"

میں نے کہا "اچھا اگر ہم ٹرین پر نہیں جاسکتے تو پھر کوئی ایسی ترکیب نکالئے کہ ہم ان دو بوگیوں کی لوڈنگ دیکھ لیں۔"

"ہاں یہ ہو سکتا ہے۔ میں تم کو لے چلوں گا۔"

"ماماجی، اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے سب جانی دشمن وہاں پوری طرح چوکس ہوں گے۔ وہ ہر طرف سے نگرانی کریں گے اور ہم نظر آئے تو پکڑے جائیں گے۔ آس پاس پولیس بھی بہت ہوگی"

میں نے کہا "وہ خاص طور پر ان بوگیوں کے آس پاس سادہ کپڑوں میں پولیس کو رکھیں گے۔"

"پھر تم ہی بتاؤ" ماماجی نے کہا۔

"قلی تو سب آپ کے بھانجے ہیں۔ سب بھانجے ایک جیسے تو نہیں ہو سکتے۔ کچھ حرامی بھی ہوں گے۔"

ماماجی ہنسنے لگے "ہاں۔ ایک سے ایک بڑھ کر حرامی موجود ہے مگر میرے ساتھ کسی کا حرامی پن نہیں چلتا۔"

"آپ یہ معلوم کریں کہ مال کون لوڈ کرے گا۔ مال آئے گا ٹرکوں پر اور اس کے لئے وہ خود قلیوں کا انتخاب کریں گے۔ یا ہو سکتا ہے کہ اپنے مزدور لائیں۔"

"باہر کا کوئی مزدور اندر کسی قلی کی جگہ لوڈنگ کرنے کا کام نہیں کر سکتا۔"

محسن نے کہا "ماماجی! زیادہ امکان اسی بات کا ہے کہ مزدور انہی کے ہوں گے۔"

ماماجی نے نفی میں سر ہلایا "اندر کون جانے دے گا انہیں؟ بمبئی کا گورنر بھی حکم دے تو قلی نہیں مانیں گے۔ سارے قلی دیوار بن کے راستہ روک لیں گے۔"

"بس تو آپ اس کے لئے تیار رہیں۔ جب ان کے مزدور سامان اتارنے لگیں تو آپ اپنے سارے بھانجوں کو کہیں کہ وہ ان کے سامنے دیوار بن جائیں" غالب نے کہا "ظاہر ہے وہ مجبور ہو جائیں گے آپ کی بات ماننے پر۔ پھر آپ خود قلی دیں ان کو۔"

میں نے کہا "وہ قلی ہوں گے ہم۔"

"تم! وہ کیسے؟"

میں نے کہا "قلی تو آپ ہی بھرتی کرتے ہیں نا۔ ایک وردی اور بیج دلوا دیں ہمیں بھی۔"

"میں بھرتی نہیں کرتا، سفارش کرتا ہوں۔ بھرتی کرنے والا افسر میری مانتا ہے مگر ایسے نہیں ہو سکتا کہ میں خود بلّے دینا شروع کر دوں" ماماجی نے کہا۔

"اچھا۔ اگر ایسا نہیں ہو سکتا، تو پھر اپنے کسی قابلِ اعتماد بھانجے سے وردی اور بیج لا دیں۔ جس کی باری ہو۔ معاوضہ اسے مل جائے گا لیکن اس کا سارا کام ہم کریں گے۔ وہ یہاں بیٹھ کے انتظار کریں۔"

"دو بوگیوں کو لوڈ کرنے کے لئے کم سے کم دس قلی درکار ہوں گے" ماماجی نے کہا۔

"ان میں تین ہم شامل ہو گئے تو کسی کو کیا پتا چلے گا؟"

"دوسرے قلی تو سمجھ جائیں گے۔ وہ سب ایک دوسرے کو نمبر سے جانتے ہیں۔"

"آپ ان کو سمجھا نہیں سکتے؟" میں نے کہا۔

ماماجی کچھ دیر سوچتے رہے پھر انہوں نے سر ہلایا "اچھا میں کر لوں گا کچھ نہ کچھ۔ مگر یہ سوچو کہ تمہارے دشمنوں نے پہچان لیا تمہیں پھر؟"

"تب بھی آپ کچھ تو کر ہی لیں گے" میں نے کہا۔

ماماجی ہنسنے لگے "تم لوگ جو کام کر رہے ہو، اپنی جوانی میں ہم نے بھی بہت کئے۔ لڑکیاں ہمارے ساتھ بھی ہوتی تھیں اور ہر کام کرتی تھیں۔ ٹرین کی پٹڑی پر بم باندھنے سے دستی بم پھینکنے تک۔ لیکن ہم ان کو ہر جگہ ساتھ نہیں لئے پھرتے تھے۔ پھر آج کل زمانہ بھی وہ نہیں۔ انسان اور درندے میں کوئی فرق نہیں رہا۔"

میں نے کہا "ہم بھی سمجھتے ہیں اس فرق کو، لیکن ہم کیا کریں، مجبوری ہے۔ انہیں ہم چھوڑ نہیں سکتے۔"

"اور ہم چھوڑنا بھی چاہیں تو وہ کب ہمیں چھوڑتی ہیں" غالب نے کہا۔

ایک ساتھ منو میاں اور طوفان میل اندر آ گئے۔ طوفان میل تو وہی لڑکا تھا جو حلوا پوری لینے گیا تھا۔ وہ سچ مچ دوڑتا ہوا آیا تھا اور ہانپ رہا تھا۔ اس نے ہمیں غور سے دیکھ کر کہا "دیکھا ماماجی! کتنی جلدی آیا ہوں میں۔"

ماماجی نے اسے ایک روپیہ دیا "جا عیش کر" اور وہ سیٹی بجاتا ہوا بھاگ گیا۔

ہم سب منو میاں کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ وہ بہت تھکے ہوئے اور شکست خوردہ سے نظر آ رہے تھے۔

"معاف کرنا، ہمیں کچھ دیر ہو گئی" انہوں نے کمرے میں دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھنے کے بعد یوں کہا جیسے یہ معمولی تاخیر تھی۔

میں نے کہا "ماماجی نے ہمیں بتا دیا ہے۔"

"ہم سب کو بڑا دکھ ہوا۔ وہ بڑے اچھے لڑکے تھے" غالب نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

"کوئی اور بات کرو" منو میاں نے چڑچڑے پن سے کہا۔ شاید یہ ذکر بھی ان کو دکھ دیتا تھا۔

میں نے فوراً بات بدل دی "آپ کہاں چلے گئے تھے؟"

"مجھے وہ سب سامان چھپانا تھا۔ اللہ کا شکر ہے ان کے ہاتھ کچھ بھی نہیں لگا۔ میں سب سمیٹ لایا بوری میں" منو میاں بولے۔

"کہاں چھوڑا ہے وہ سب سامان؟"

"ہے ایک جگہ۔ ہم اپنا سب سامان ایک ہی جگہ نہیں رکھتے تھے کہ کبھی جان بچا کے بھاگنے کا وقت آ جائے تو ہم خالی ہاتھ نہ رہ جائیں" منو میاں نے کہا۔

میں یہ پوچھتے پوچھتے رہ گیا کہ کیا رات کو سین شین اسی دوسرے ٹھکانے سے مشین گن اور دستی بم بغیرہ لے کر تھانے پر حملہ آور ہوئے تھے۔

منو میاں نے اچانک ریوالور نکال لیا۔ ان کی آنکھوں میں وحشت ناچ رہی تھی۔ جیسے پُر آسیب مرگھٹ میں بدروحیں۔ وہ زندگی سے برگشتہ تھے۔ جو کچھ اس دنیا نے انہیں دیا تھا۔ تجربات و حوادث کی شکل میں، اسے وہ اپنے لہو کا تاوان دے کر لوٹانا چاہتے تھے۔ وہ مایوسی کی اس انتہا کو پہنچ چکے تھے جہاں تسخیرِ کائنات کا عزم رکھنے والا، پہاڑوں سے بلند حوصلہ رکھنے والا اور امید کو ناقابلِ شکست یقین سے وابستہ رکھنے والا بھی ہمت ہار جاتا ہے۔

منو میاں کے ارادے کو ہم سب نے ہی سمجھ لیا تھا مگر ان کے ہاتھ سے ریوالور چھین لینے کی کوشش میں نازو کامیاب رہی۔ وہ اسی وقت گل کے ساتھ اندر آئی تھی۔ گل نے چائے کی ٹرے اٹھا رکھی تھی اور نازو کے ایک ہاتھ میں وہ سلور کی کیتلی تھی جس میں چائے ابالی گئی تھی۔

اس نے حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے منو میاں کے ہاتھ پر کک ماری۔ ریوالور منو میاں کے ہاتھ سے نکل کے اڑتا ہوا چھت کی طرف گیا اور پھر نیچے آیا تو غالب نے کیچ کر لیا۔ منو میاں کے ہاتھ کی کلائی ٹوٹنے سے رہ گئی تھی مگر انہیں سخت چوٹ آئی تھی۔ تکلیف سے زیادہ یہ اپنی بزدلانہ کوشش میں ناکامی کا ردِ عمل تھا کہ ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

میں اور محسن بھی ان سے ریوالور لینے کے لئے ہی جھپٹے تھے۔ نازو نے قریب ہونے کا فائدہ اٹھایا مگر اس سے زیادہ یہ نازو کی حاضر دماغی تھی کہ ریوالور پر نظر پڑتے ہی اس نے منو میاں کے ارادے کو سمجھ لیا تھا۔

میں نے منو میاں کو جھنجھوڑ کے کہا "کیا آپ کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ یہ کیا حرکت کرنے والے تھے آپ؟"

منو میاں نے مظلوم صورت بنا کے ہم سب کی طرف دیکھا مگر زبان سے کچھ نہیں کہا۔

"مجاہد کو ایسی حرام موت زیب نہیں دیتی" محسن نے کہا۔ "ساری عمر لڑتے رہے اور اب خود اپنی جیت کو ہار میں بدلنا چاہتے تھے۔"

ماماجی کا چہرہ سب سے زیادہ دُکھی تھا۔ وہ آہستہ آہستہ آگے آئے اور منو میاں کے پاس بیٹھ گئے۔

"منو! مجھے معلوم ہے تو کتنا دُکھی ہے" انہوں نے نرمی سے کہا۔ "لیکن دکھ کا یہی علاج کرنا تھا تو پہلے کرتا۔ جب تو اکیلا رہ گیا تھا۔ جب تیرے بیوی بچوں کو انہی لوگوں نے شہید کیا تھا جن پر تو اعتبار کرتا تھا۔ تجھے یاد ہے تیری کیا حالت تھی؟"

منو میاں نے ندامت سے سر کو اقرار میں ہلایا۔

"آج تو ہم سب کو اکیلا کرنا چاہتا تھا" ماماجی نے کہا "وہی دُکھ ہمیں دینا چاہتا تھا جو تو نے جھیلا تھا؟ ہم کیا دشمن ہیں تیرے کہ تو بدلہ ہم سے لے گا؟ پورے خاندان سے بدلہ لے گا؟"

"خاندان..... میرا ہے کوئی خاندان؟" منو میاں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"کیوں۔ میں کون ہوں؟ تیرا کچھ نہیں لگتا میں؟ کیا تیرے باپ کی جگہ نہیں ہوں میں؟ انکار کر دے اگر ہمت ہے تو۔ اور دیکھ، کیسے رشتے ملاتا ہے خدا۔ ان بھائیوں کو دیکھ۔ کیسے جیالے بھائی مل گئے ہیں تجھے۔ ان کو دیکھ۔ کیسی قابلِ فخر بہنیں ہیں تیری" ماماجی نے ہم سب کی طرف باری باری دیکھا۔

منو میاں سر جھکائے سنتے رہے۔ آخر کار انہوں نے سر اٹھایا۔

"مجھے معاف کر دینا۔ ماماجی۔ تم سب..... میں پاگل ہو گیا تھا۔"

ماماجی نے مسکرا کے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ "چل اب جا کے ہاتھ منہ دھو۔ ناشتا کر۔ پیٹ خالی ہو تو دماغ بھی خالی ہو جاتا ہے۔"

موضوع بدلنے کے لئے میں نے کہا "آج بہت سے کام نمٹانے ہیں۔"

محسن نے بھی میرا مدعا سمجھ لیا "بھاڑ میں گئے کام۔ پہلے پیٹ پوجا۔"

"تم لوگ آج باہر مت نکلنا" منو میاں نے کہا "پولیس بہت زیادہ دباؤ میں ہے۔ کئی افسر معطل ہو چکے ہیں اور صوبائی ہوم سیکریٹری کو وضاحت کے لئے دہلی طلب کیا گیا ہے۔ کہ آخر یہ کیا تخریبی سرگرمیاں اچانک شروع ہو گئی ہیں اور تخریب کار ابھی تک پکڑے کیوں نہیں گئے۔"

ناشتے کے بعد ماماجی نے کہا "میں چلتا ہوں۔ دو گھنٹے میں واپس آؤں گا۔ تم خود کچھ مت کرنا۔"

میں نے کہا "ہم آپ کی واپسی کا انتظار کریں گے۔"

منو میاں رات بھر کے جاگے ہوئے تھے۔ ان کو پولیس نے مارا بھی بہت تھا اور اس کے بعد تھانے کے اندر کی معرکہ آرائی میں بھی ان کو زخم آئے تھے۔ سین اور شین کی موت کے صدمے نے ان کو توڑ کے رکھ دیا تھا۔ میں نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ نہا

دھو کے زخموں پر دوا لگالیں مگر وہ راضی نہیں ہوئے۔

"یہ تو کچھ بھی نہیں سکندر میاں۔ ایسے تو بہت مرتبہ ہوا کہ ہم جنگلوں میں چھپتے پھرے۔ کئی کئی دن درختوں کے پتے تک کھائے۔ مٹی کیچڑ میں پڑے رہے۔ جنگ میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ یہ بھی جنگ ہی ہے۔ میں کیا کپڑے بدلوں اور کیسے ان معمولی خراشوں کی فکر کروں جب کہ میرے دو شیر خون میں لت پت پڑے ہیں۔ لاوارث اور بے گور و کفن۔ ان کے جسم جھلس گئے ہیں اور گولیوں سے چھلنی ہوگئے ہیں۔ میں زندہ ہوں۔ اتنا بوڑھا ہوگیا ہوں صدمات جھیلتے جھیلتے۔ سب مرتے جاتے ہیں۔ میں ہر بار بچ جاتا ہوں۔ آخر موت کو مجھ سے کیا دشمنی ہے! یہ کس گناہ کی سزا دے رہا ہے خدا مجھے کہ میں اپنی آنکھوں سے ان سب کو مرتا دیکھوں جو مجھ سے محبت کرتے ہوں۔ جن سے مجھے محبت ہو۔ نحوست ہے میرے وجود میں۔ جو میرے ساتھ تعلق رکھتا ہے کوئی رشتہ قائم کرتا ہے۔ وہ مرجاتا ہے!"

منو میاں نے ہم سے کہا تھا کہ سین یا شین کا ذکر نہ کریں جس سے انہیں دکھ ہوتا ہے مگر دکھ کے اس آتش فشاں سے بہتے لاوے کو دبانا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ انہوں نے خود دل سینہ صد چاک، ہمارے سامنے رکھ دیا اور اس کے ہر زخم پر خون کے آنسوؤں میں بھیگے ہوئے چاہت کے پھول نچھاور کرنے لگے۔ ان کا درد ایک رکا ہوا سیلاب تھا۔ جب بند ٹوٹ گیا تو صبر و ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔

ہم سب سنتے رہے اور انہیں پھوٹ پھوٹ کر روتا دیکھتے رہے۔ وہ سب کچھ پھر دہرا رہے تھے۔ سین کیا تھا اور شین کیا تھا۔ بچپن سے اب تک انہوں نے کیسے آداب فرزندی نبھائے۔ ان کا کتنا خیال رکھا۔ ان کے لئے کیا کچھ نہیں کیا۔ صرف جان نچھاور کرنا باقی تھا سو انہوں نے یہ بھی کر دکھایا۔

ماماجی دو گھنٹے سے بھی پہلے لوٹ آئے۔ اس وقت تک منو میاں اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرکے سو چکے تھے۔ وہ نیند میں بھی بے چین تھے مگر جسم کے لئے آرام کا یہ وقفہ غنیمت تھا۔

"منو سو گیا؟" ماماجی نے گہری سرد آہ بھر کے کہا "بے چارہ بد نصیب۔ پھر اکیلا ہو گیا۔"

میں نے سرگوشی میں کہا "آہستہ بولیں۔ ابھی بہت رو کے سوئے ہیں۔"

ماماجی نے کہا "تمہارا اندازہ ٹھیک تھا۔ گڈز ٹرین کے گارڈ اور ڈرائیور کو بدل دیا گیا ہے۔"

"آپ تو سب کو جانتے ہوں گے۔ جو گارڈ اور ڈرائیور اب جارہے ہیں وہ کیسے آدمی ہیں؟"

ماماجی نے سر ہلایا "انہی کے جیسے۔ ایک نمبر حرامی ہیں دونوں۔ کئی بار معطل بھی ہو چکے ہیں مگر ان کے پیچھے کوئی طاقتور ہاتھ ہے۔"

میں نے سوچ کے کہا "اگر بوگیاں جیون پرشاد ایم ایل اے کی کوشش سے منسوخ ہونے کے بعد انہیں ملی ہیں تو عملہ بھی اسی نے اپنی مرضی سے رکھوایا ہوگا۔"

"جیون پرشاد کا بھی اس کاروبار میں حصہ ہوگا؟"

"حصہ نہ سہی کمیشن ضرور ہوگا" محسن بولا۔

"یہ بھی معلوم کیا جا سکتا ہے" ماماجی نے کہا۔

"آپ نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ پہلے کون جارہا تھا اس ٹرین کے ساتھ؟"

"ہاں۔ ان کے نام روسٹر میں لکھے ہوئے ہیں۔ بابو نے بتایا کہ وہ آج ہی واپس آئے تھے۔ ان کو بتا دیا گیا کہ ڈیوٹی بدل گئی ہے چنانچہ پرسوں وہ دوسری ٹرین پر جائیں گے۔ کل کا دن ان کے لئے آف ہے۔"

"انہوں نے احتجاج نہیں کیا؟"

"احتجاج کی کیا بات ہے اس میں۔ ڈیوٹی لگانے والے اپنی مرضی سے اسٹاف کو ادھر ادھر کرتے رہتے ہیں۔"

"یہ گاڑی پرسوں کس وقت روانہ ہوگی؟"

"صبح ساڑھے پانچ بجے" ماماجی نے کہا "خواجہ سیمنٹ والوں کی بوگیاں پہلے درمیان میں تھیں۔ اب ایک انجن کے پیچھے لگائی جائے گی۔ دوسری گارڈ کے ڈبے سے پہلے۔"

میں نے کہا "ایک شروع میں اور ایک آخر میں۔ مجھے یہی ڈر تھا۔ انجن ڈرائیور اور گارڈ کے ساتھ وہ اپنے آدمی بٹھائیں گے۔"

محسن نے اچانک کہا "ماماجی! آگے پیچھے کوئی ایسی بوگی ہے جس میں مویشی جا رہے ہوں۔"

"ہوگی۔ ایک بوگی تو ضرور ہوگی۔ گائے بھینسوں کے لئے۔ سنا ہے کسی نے ایک اسپیشل بوگی اپنے ریس کے گھوڑوں کے لئے بھی بک کرائی ہے۔"

میں نے محسن کی بات کا مقصد سمجھ لیا تھا۔ مویشیوں والے ڈبے میں انسانوں کا چھپ کے سفر کرنا نسبتاً آسان تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ خطرہ بھی تھا کہ دشمن اس ڈبے پر خاص نظر رکھیں گے۔ اس امکان کو وہ بھی نظر انداز نہیں کریں گے کہ ہم اس ڈبے سے تخریبی کارروائی کا آغاز کرسکتے ہیں۔

"ریس کے گھوڑے لے جانے والی بوگی کون سی ہوگی کیا یہ پہلے معلوم ہو سکتا ہے؟"

ماماجی نے کہا "یہ تو کل دن میں ہی پتا چل جائے گا۔ گھوڑے رات کو سوار ہوں گے۔ رات کے وقت ہی باقی سامان بھی لوڈ ہوگا۔"

"انہوں نے صحیح ٹرین کا انتخاب کیا ہے۔ رات کے وقت لوڈنگ کا کام زیادہ رازداری کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔"

"تم لوگوں کے لئے میں نے وردی اور بیج کا بندوبست کرلیا ہے۔ مگر مجھے لگتا ہے کہ تم پکڑے جاؤ گے۔ تمہارے چہرے قلیوں والے چہرے نہیں ہیں" ماماجی بولے۔

میں نے کہا "ماماجی! اب آپ نے ایک نئی بات بتائی ہے۔ ریس کے گھوڑوں کے ساتھ بھی دو چار خدمت گار سائیس یا نیز وغیرہ جائیں گے۔ ممکن ہے کوئی ڈاکٹر بھی جائے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ یہ ذمے داری ہم کیوں نہ قبول کرلیں۔"

"کون سی ذمے داری؟"

"گھوڑوں کی ماما۔ گھوڑے بچارے راستے میں کیا مانگیں گے۔ وہی اپنا چارا۔ چارا ہم ڈال دیں گے۔"

"ابھی کل کا دن بھی باقی ہے ماماجی" غالب نے جوش سے کہا۔ "آپ اپنے تعلقات استعمال کریں اور پتا چلائیں کہ ان گھوڑوں کا خیال رکھنے والے کتنے لوگ جائیں گے۔ وہ کون لوگ ہیں۔ ان کے نام پتے اگر مل جائیں....."

"تمہاری فرمائشوں کا معاملہ مشکل ہوتا جارہا ہے۔ خیر کوشش کرتے ہیں" ماماجی نے کہا "لیکن ان کی جگہ تم لوگ کیسے لوگے؟ یہ بھی سوچا ہے۔"

"ہم بھی کوشش کریں گے ماماجی" میں نے کہا "یہ کام کوئی اتنا مشکل نہیں ہونا چاہئے۔ میں غالب اور نازو گھوڑوں کے ساتھ سفر کرسکتے ہیں۔ میں محافظ۔ غالب سائیس اور نازو ویٹرنری سرجن۔"

"کیوں نازو؟"

"میں گدھوں کے ساتھ سفر کرتی رہی ہوں۔ گھوڑے بھی ان کے کزن ہی ہوتے ہیں" نازو نے کہا۔

"تم نے اپنا اپنا کام اپنی مرضی سے چن لیا۔ میں اور گل کیا گھوڑوں میں شامل ہوں گے؟" محسن نے کہا۔

"ہو تو سکتے تھے مگر وہ اعلیٰ نسل کے گھوڑے برا مانیں گے" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "میاں محسن حسن خان شیروانی! آپ کو مرنے کا کوئی تجربہ ہے؟"

"بھائی سکندرِ اعظم! آپ کیا بھول گئے کہ ہم ایک ساتھ مرتے تھے اور اکثر مرتے تھے۔ ایک باقاعدہ پروگرام کے تحت کبھی اس پر کبھی اس پر" محسن بولا "اور آج بھی مرتے ہیں۔"

کسی ارادے کے بغیر اس نے یہ بات کہتے ہوئے گل کی طرف دیکھا اور گل کا رنگ ایک دم بدلا۔ مایوسی اور پژمردگی کے باوجود اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ مجھے یوں لگا جیسے سب کچھ جانتے ہوئے بھی وہ خود فریبی کے طلسم سے دل کو بہلائے رکھنا چاہتی ہے کہ نہ سہی وصل تو حسرت ہی سہی۔ مذاق میں یا جھوٹ میں، محسن کہے تو سہی کہ میں تم پر مرتا ہوں۔

میں نے کہا "میں فوت ہونے کی بات کررہا تھا۔ فرض کریں آپ فوت ہوجائیں۔"

گل نے خوفزدہ لہجے میں کہا "سکندر بھائی! ایسا مذاق مجھے اچھا نہیں لگتا۔"

محسن نے کہا "سکندر مذاق کب کررہا ہے۔"

میں نے بھی کہا "مذاق کی کون سی بات ہے اس میں۔ فرض کریں یہاں کلکتے کا رہنے والا کوئی کرسچن فوت ہوجاتا ہے۔ اس کا نام پیٹر یا یوسف مسیح کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اب اس کی میت کو تابوت میں رکھ کے کلکتہ لے جانا ہو اسی مال گاڑی سے۔ پھر؟"

"پھر کیا؟ تابوت ہوائی جہاز میں جا سکتے ہیں تو مال گاڑی میں کیوں نہیں جا سکتے؟" محسن بولا۔

ماماجی نے نفی میں سر ہلایا "بہت مشکل طریق کار ہے اس کے لئے۔ خصوصی اجازت نامہ چاہئے اور میڈیکل رپورٹ کہ لاش کو محفوظ کر دیا گیا ہے۔"

میں نے کہا "ہمارے ملک میں۔ میری مراد انڈیا اور پاکستان دونوں سے ہے۔ ہر قاعدہ اور ضابطہ اس لئے بنایا جاتا ہے کہ کوئی اس کی خلاف ورزی کرنا چاہے تو شوق سے کرے۔ بس متعلقہ حکام کو راضی کرے۔ راضی کرنے کے لئے کوئی پاپڑ نہیں بیلنے پڑتے اور لوہے کے چنے نہیں چبانے پڑتے۔ صرف نوٹ خرچ کرنے پڑتے ہیں۔ جیسا کام ویسے دام۔ یہ ایک عام اصول ہے۔ ایک تابوت لے جانے میں گارڈ کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہ اجازت نامہ نہیں ہے۔ اجازت وہ خود دے سکتا ہے۔ میڈیکل سرٹیفکیٹ کے معاملات کو نظر انداز کرنا بھی اس کے دائرہ اختیار میں ہے۔ پیسہ دینے کے علاوہ اس کی منت سماجت بھی کی جا سکتی ہے۔"

محسن نے کہا "کیا سورگباشی کی ودھوا بھی ساتھ جائے گی؟"

"یہ کیسی باتیں شروع کر دی ہیں تم لوگوں نے؟" گل نے برہمی سے کہا۔

"تم چپ کرو" محسن نے اسے ڈانٹا "تمہیں کیا معلوم کام کیسے ہوتے ہیں۔ یہ بچوں کا کھیل نہیں ہے۔"

ماماجی نے کہا "یار، کچھ مجھے بھی تو سمجھاؤ۔"

میں نے کہا "ماماجی! یہاں کرسچن کافی ہیں۔ ایسی دکانیں بھی ہوں گی جہاں سے "کفن باکس" یا تابوت ملتے ہوں گے۔ آپ ایک تابوت کا بندوبست کریں۔ زیادہ قیمتی نہ ہو لیکن جتنا بڑا مل سکے بہتر ہے۔ مشکل یہ ہے کہ ہم باہر نہیں نکل سکتے اور اس مرحلے پر کوئی رسک لینا مناسب بھی نہیں۔ کوئی ایسی جگہ ہے جہاں سے کل یہ تابوت اٹھا کے ریلوے اسٹیشن پہنچایا جا سکے عین گاڑی کی روانگی کے وقت؟"

ماماجی نے کہا "تابوت میں کون ہوگا؟"

محسن نے کہا "میں۔"

میں نے کہا "تابوت میں سوراخ ہوں گے نیچے کی طرف۔"

"جب تابوت فرش پر رکھا جائے گا تو سوراخ بند ہوجائیں گے" غالب نے اعتراض کیا۔

"تابوت کے چاروں کونوں پر ایک ایک انچ کے پائے لگوائے جا سکتے ہیں۔ یہ کام ہم خود کرلیں گے آج رات۔ سوراخ بھی کرلیں گے اور پائے بھی لگالیں گے۔ بس آپ تابوت کسی ایسی جگہ

پہنچادیں جہاں ہم اپنا کام کسی قسم کی مداخلت کے ڈر سے بے نیاز ہو کے کر سکیں" میں نے کہا۔

ماماجی کچھ دیر سوچتے رہے۔ پھر انہوں نے کہا "ٹھیک ہے۔ لیکن یہ کام تم اپنی ذمے داری پر کروگے۔"

"اب آپ کے ذمے تین کام ہیں" میں نے انگلیوں پر گنتے ہوئے کہا "نمبرون۔ یہ معلوم کریں کہ گھوڑے کس کے ہیں اور ان کے ساتھ کتنے لوگ جارہے ہیں' وہ کون ہیں اور کہاں رہتے ہیں۔ نمبردو۔ ایک کنگ سائز تابوت خاموشی سے کہیں پہنچانا ہے اور رات کو ہمیں یہاں سے نکال کرلے جانا ہے۔ تابوت والا کام آج ہی ہوجانا چاہئے۔ دیگر معلومات بھی اگر آج ہی حاصل ہوجائیں تواچھا ہے۔"

"تیسرا کام کیا ہے؟"

"تیسرا کام ہے ایک اچھے سے میک اپ مین کا بندوبست۔ جو آج رات بھر اپنا کام کرے اور صبح معاوضہ لے کر رخصت ہوجائے۔ تم لوگوں کے پاس اب کتنی رقم ہے؟"

سوال نازو اور گل سے کیا گیا تھا۔ انہوں نے دوسرے کمرے میں جا کے مشورہ کیا اور واپس آکے بتایا "ایک لاکھ چالیس ہزار۔"

"میک اپ مین کو دس ہزار تک دئے جا سکتے ہیں۔

ماماجی نے حیرانی سے کہا "پاگل ہوئے ہو کیا۔ ایک ہزار بھی بہت ہیں۔"

میں نے کہا "آپ پیسے کو مت دیکھیں۔ کام ایسا ہو کہ ہم بھی ایک دوسرے کو نہ پہچان پائیں۔ باقی معاوضہ رازداری کا ہے"

غالب نے کہا "آپ کے بھانجے بھی آپ کی مدد کر سکتے ہیں۔"

ماماجی نے نفی میں سرہلایا "یہ ایسے کام نہیں ہیں جو میں کسی بھانجے کے سپرد کردوں۔ سب مجھے خود ہی کرنا پڑے گا۔ کام بہت سے بتادئے ہیں تم نے۔ میرا خیال ہے کہ مجھے فوراً روانہ ہوجانا چاہئے۔"

"شام تک آپ کی واپسی کی امید ہے؟"

"انشااللہ۔ لیکن دیکھو' تم خود کچھ مت کرنا۔ میں پھر بتارہا ہوں کہ باہر تمہارے لئے خطرہ ہی خطرہ ہے۔ جو لڑکا صبح ناشتا لایا تھا' وہ کھانا بھی لادے گا۔ یہاں سے تیسرے کوارٹر میں رہتا ہے۔ کسی بھی چیز کی ضرورت ہو اسے بلالینا۔"

ماماجی کو میں نے چند دواؤں کی مختصر سی فہرست کے ساتھ بڑے اصرار سے پچیس ہزار روپے دئے مگر انہوں نے صرف پانچ ہزار رکھے اور رخصت ہوگئے۔

سارا پلان میرے ذہن میں تھا۔ اس کی تفصیلات پر ہم نے دن بھر غور کیا۔ گل اور نازو کو اس پلان سے بالکل اتفاق نہیں تھا مگر اس کی وجہ عقلی نہیں جذباتی تھی۔ کھانا پھر اسٹیشن سے منگوایا گیا۔ دن کا باقی حصہ ہم نے سوکے اور منو میاں نے روکے گزارا۔ شام ہوتے ہی انہیں کچھ قرار آگیا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ چند دستی بم' بم بنانے کا سامان' ایک مشین گن اور دو وائرلیس ٹرانسمیٹر ریسیور تھانے سے واپس نکال لائے تھے۔ ضرورت پڑنے پر یہ چیزیں پھر جائیں گی۔

ماماجی رات کو آئے تو اپنی دن بھر کی کارگزاری پر بہت خوش تھے۔ وہ ریلوے کے اپر کلاس کے ویٹنگ روم میں نہادھوکے آئے تھے۔ چائے پینے اور حقے کے دم لگانے کے بعد انہوں نے دن بھر کی روداد کا خلاصہ پیش کیا۔

"میاں! ایک تو ایسی خبر ہے کہ تم سن کے اچھل پڑوگے۔ معلوم ہے وہ ریس کے گھوڑے کس کے ہیں؟ ای ایم ایل اے جیون پرشاد کے۔"

"سب ایک ہی سلسلہ ہے۔ ایک پنتھ دو کاج۔ تریونی کے اور جیون پرشاد کے مال کی نوعیت میں فرق ہے مگر دونوں کے لئے لاکھوں کا مال ہے۔ دونوں کے محافظ ایک ساتھ ہوں گے تو ان کی طاقت دگنی ہوجائے گی۔"

"گھوڑوں کے ساتھ ایک محافظ اور ایک ڈاکٹر جارہا ہے۔ محافظ ایک گورکھا ہے۔ وہ گھوڑوں کے ساتھ کل صبح ہی روانہ ہو کے دوپہر تک وہاں پہنچ جائے گا جہاں سے گھوڑوں کو مال گاڑی میں سوار کیا جائے گا۔ گھوڑے چالیس فٹ لمبے' ہر طرف سے بند ڈبے میں ہوں گے جسے اسی طرح کرین سے اٹھا کے اوپن پلیٹ فارم ٹائپ بوگی پر رکھ دیا جائے گا۔ دراصل ریس کے گھوڑے پہلے بھی بمبئی اور کلکتہ کے درمیان آتے جاتے رہے ہیں' اس لئے یہ معلومات حاصل کرنے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ گھوڑوں کی تعداد پانچ ہوگی اور وہ ایک زرد رنگ کے کنٹینر میں ہوں گے جو جیون پرشاد کی ملکیت ہے اور گھوڑوں کے لئے ہی بنایا گیا ہے۔ ہر گھوڑے کے لئے اس میں الگ خانہ ہے۔ درمیان میں چار فٹ کی دیوار ہے۔ ایسے کنٹینر عام طور پر بھاری مشینری وغیرہ کے لئے استعمال ہوتے ہیں اور بحری جہازوں پر بھیجا جانے والا سامان انہی میں بند کرکے رکھا جاتا ہے تاکہ خراب یا چوری نہ ہو۔ اس کنٹینر کو ایک ٹرک کھینچ کرلائے گا۔ تم نے دیکھا ہوگا' سامان شہروں کے درمیان لانے لے جانے کے لئے ٹریلر استعمال ہوتے ہیں۔"

"میں سمجھ گیا" میں نے کہا۔

"اس چالیس فٹ لمبے کنٹینر کے آخری حصے میں گھوڑوں کے ساتھ جانے والے عملے کے لئے آٹھ فٹ چوڑا کیبن ہے جس میں چار افراد کے سونے کے لئے اوپر نیچے بینچ ٹائپ سیٹیں ہیں۔ ایک کونے میں باتھ روم ہے۔ اس کیبن کا راستہ اندر سے گھوڑوں والے حصے میں کھلتا ہے مگر گھوڑوں کو چڑھانے اور اتارنے کے لئے پیچھے والا دروازہ استعمال ہوتا ہے۔ اب سنو ساتھ جانے والوں کی بات۔ ڈاکٹر بھی پرانا ملازم ہے۔ مویشی ڈاکٹر ہے۔ لیکن ایک عورت بھی ان کے ساتھ جائے گی جو اوپر کے سارے کام کرتی ہے۔"

میں نے کہا "پھر تو کام بن گیا۔ میں لے سکتا ہوں محافظ کی جگہ۔ غالب بن جائے ڈاکٹر اور نازو اس کی مددگار۔ مگر ابھی یہ ایک خیال ہے۔ اس پر عمل در آمد یقیناً آسان نہیں ہوگا۔"

"میری تو سمجھ میں آتا نہیں کہ تم یہ کام کیسے کروگے؟" ماماجی نے پریشانی سے کہا۔

"ایک بات اور بتائیں۔ کیا اس ٹرین کے گارڈ اور ڈرائیور انہیں جانتے ہیں؟ جیون پرشاد ایم ایل اے کے گھوڑوں کو اور ان کے خدمت گاروں کو۔"

"یہ میں کیسے بتا سکتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ جانتے ہوں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ نہ جانتے ہوں" ماماجی نے کہا۔

"تابوت کا کیا بنا؟"

"تابوت رکھا ہوا ہے ایک خالی مکان میں۔ میک اپ مین بھی رات نو بجے آجائے گا۔ چل کے دیکھ لو۔ اور میک اپ مین سے بھی بات کرلو" ماماجی نے کہا "اسے جو سمجھانا ہے خود ہی سمجھادو۔"

منو میاں نے جو بہت دیر سے خاموش تھے' مایوسی سے کہا۔ "میرے لئے کوئی کام نہیں رہا؟"

میں نے کہا "منو میاں! سب سے اہم ذمے داری آپ کو سونپی جائے گی۔ ہمارے جانے کے بعد۔ میرا مطلب ہے' اگر ہم ٹرین پر سوار ہو کے نکلنے میں کامیاب رہے تو پھر آپ کا کام شروع ہوگا۔ اور وہ ایسا کام ہے جو کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔"

منو میاں کا چہرہ امید کی روشنی سے منور ہوگیا "ایسا کون سا کام ہے؟"

میں نے کہا "اطمینان رکھیں' میں آپ کو سب بتادوں گا۔"

ہم رات کے کھانے کے بعد نکلے۔ اندھیرا اس وقت ہمیں تحفظ فراہم کر رہا تھا اور ماماجی ہمیں کسی محفوظ راستے سے لے جارہے تھے۔ ہم ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ پھر دوسری طرف ہوگئے اور نیچے اتر کے ایک سڑک پر آگئے۔ یہ دو تین میل کا فاصلہ ضرور ہوگا جو ہم نے ایک گھنٹے میں طے کیا۔ پھر ماماجی نے ایک ویران نظر آنے والے گھر کا قفل دروازہ کھولا اور ہم باری باری اندر داخل ہوگئے۔ ماماجی نے دروازہ بند کرکے لائٹ جلادی۔

مکان میں ایک ہی کمرا تھا جس کے وسط میں تابوت بند رکھا ہوا تھا۔ اس کے اوپر والے حصے میں ایک فٹ چوڑا اور ایک فٹ لمبا شیشہ بڑی صفائی سے فٹ کیا گیا تھا جس میں سے لاش کا چہرہ دیکھا جا سکتا تھا۔ گل کے ساتھ اب نازو بھی دہشت زدہ نظر آنے لگی تھی۔

میں نے محسن سے کہا "ذرا لیٹ کے دکھا اپنے تابوت میں۔"

گل نے ہسٹیا زدہ لہجے میں کہا "ایسا مت کرو۔"

میں نے پلٹ کے اسے دیکھا اور درشتی سے کہا "دیکھو گل! اگر اتنا کمزور دل ہے تمہارا تو تمہیں آنا ہی نہیں چاہئے تھا ہمارے ساتھ ہم اس قسم کی جذباتی حماقت کا روگ نہیں پال سکتے۔ زندہ آدمی اگر قبر میں بھی لیٹ جائے تو مردہ نہیں کہلاتا۔ میں تم پر بھروسہ کروں یا نہ کروں: ابھی بتادو۔ یہ کام تو تمہیں محسن کے ساتھ مل کے کرنا تھا۔ اور یہ بہت اہم ذمے داری ہے۔ اس پر ہمارے پلان کی کامیابی کا انحصار ہے۔"

گل شرمندہ نظر آنے لگی "مجھے معاف کردیں سکندر بھائی۔ میں سب کچھ کر سکتی ہوں۔"

محسن نے ہنس کے کہا "ارے پاگل! یہ تو کھیل ہے' ایک دلچسپ کھیل۔ میں ابھی لیٹتا ہوں۔ یہ دیکھو" وہ ایک دم تابوت کا ڈھکنا اٹھا کے لیٹ گیا۔

غالب نے کہا "کیا میں اور سکندر منکر نکیر کی طرف سے چند سوالات کر سکتے ہیں؟"

محسن باہر نکل آیا "یار' اس میں بستر لگادیں ورنہ میری تو کمر تختہ ہوجائے گی۔"

"تمہیں زیادہ نہیں' دو تین گھنٹے ہی اندر گزارنے ہیں" میں نے کہا "کل رات ہم جب تم کو اس میں بند کریں گے تو تمہارے لئے پانی کی ایک بوتل اور بسکٹوں کا ایک پیکٹ رکھ دیا جائے گا۔ تمہارا چہرہ کافی بدلا ہوا ہوگا۔ گل تمہاری بیوہ کی حیثیت سے ساتھ جائے گی۔ المیہ اداکاری اس کا کام ہے۔ بظاہر تابوت کئی پیچوں سے بند ہوگا لیکن در حقیقت سب چھوٹے پیچ ہوں گے جو اوپر والے ڈھکنے کی لکڑی میں ہی رہ جائیں گے۔ مجھے امید ہے کہ تابوت کو گارڈ والے ڈبے میں ہی رکھا جائے گا۔ جب ٹرین شہر کی حدود سے باہر نکل جائے گی تو موقع پاتے ہی گل تمہیں سگنل دے گی اور تم ڈھکنا کھول کے باہر آجاؤ گے۔ ریوالور کے ساتھ۔ پھر گارڈ کو قابو کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہونا چاہئے۔"

"تابوت کو اٹھا کے کون لے جائے گا؟"

میں نے ماماجی کی طرف دیکھ کے کہا "اس کا انتظام بھی کرلیں گے کچھ نہ کچھ۔ دوسری طرف بھی غالب اور نازو شری جیون پرشاد کے گھوڑوں کی رکھوالی سنبھال لیں گے۔"

"ان تینوں کا کیا کروگے؟"

"اگر انہوں نے مزاحمت کی تو ہم انہیں ناک آؤٹ کردیں گے۔ اگر انہیں مارنا پڑجائے تو یہ بھی جائز ہے" میں نے کہا۔

"راستے میں کہیں بھانڈا نہ پھوٹ جائے۔"

میں نے نفی میں سرہلایا "ان کے لئے یہ کوئی نیا کام نہیں۔ وہ

گھوڑوں کے ساتھ آتے جاتے رہے ہیں۔ راستے میں کسی کو چیک کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ گھوڑے بمبئی سے سوار ہوں گے تو کلکتے میں اتار لئے جائیں گے۔ ہمیشہ کی طرح۔ اگر پلان کے مطابق تم نے گارڈ پر قابو پالیا اور ہم بھی اپنے مقصد میں کامیاب رہے تو پھر مسئلہ رہ جائے گا صرف انجن ڈرائیور کا۔"

"گارڈ اور انجن ڈرائیور کے ساتھ بھی تو تریونی کے محافظ ہوں گے۔"

"میرا خیال ہے کہ انہیں تو فوراً مار دیا جائے۔ جنگل میں فائر کی آواز کوئی نہیں سُنے گا۔ اس سے فائدہ یہ ہوگا کہ گارڈ اور ڈرائیور کی قوتِ مزاحمت دم توڑ دے گی۔ پھر وہ ویسا ہی کریں گے جیسا ہم کہیں گے۔"

"ہمارے جانے کے بعد منو میاں کا کیا کام رہ جائے گا؟ ان کے لئے کون سی سب سے اہم ذمے داری ہے؟" محسن نے کہا۔

میں نے کہا "وہ تریونی سے اور جیون پرشاد سے رابطہ قائم کریں گے اور....."

میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی دروازے پر دستک ہوئی۔ ایک ساتھ چونک کر سب نے دروازے کی طرف اور [illegible] ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"میں دیکھتا ہوں" ماماجی نے کہا اور آگے بڑھ کے دروازہ کھولا۔ ایک پادری اندر آگیا۔

اس نے سینے پر صلیب بنا کے کہا "مجھے معلوم ہوا تھا کہ یہاں خدا نے کسی جسم کی روح کو اپنے پاس طلب کرلیا ہے" وہ تابوت کی طرف بڑھا۔

تابوت ہم سب کے درمیان کھلا ہوا اور خالی پڑا تھا۔

اس سے پہلے کہ پادری آگے بڑھ کر تابوت میں جھانکتا' ماماجی نے اس کا راستہ روک لیا۔

"اے بھائی پادری صاحب! آخر کس نے بلایا ہے تمہیں یہاں؟" ماماجی نے کہا۔

پادری حیران ہو کے بولا "کیا یہاں کوئی بھی اللہ کو پیارا نہیں ہوا؟" اس نے ہم سب کو غور سے دیکھا۔

"ہم میں سے کون ہے جو تم کو ایک لاش نظر آتا ہے؟" میں نے کہا۔

"اور کیا تابوت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہاں کوئی فوت ہوچکا ہے؟" محسن بولا۔

"پھر تم ایسے کیوں کھڑے ہو؟ لواحقین کی طرح رونی شکل بنا کے" پادری نے کہا۔

غالب نے کہا "تابوت کے پاس کھڑا رہ کے کون خوشی سے قہقہے لگا سکتا ہے فادر؟"

"آئی ایم سوری۔ کسی نے مجھے گمراہ کیا" پادری نے افسوس سے سرہلایا اور واپس جانے کے لئے پلٹا۔

"شاید کسی نے آپ کے ساتھ مذاق کیا۔"

"مگر ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا" وہ جاتے جاتے رک گیا۔

"ہولی فادر! دنیا میں بہت کچھ ہو رہا ہے۔ جو پہلے نہیں ہوا" میں نے کہا "اگر آپ اخبار پڑھتے ہیں تو آپ کو سب معلوم ہوگا۔"

اس نے اقرار میں سرہلایا "ویسے یہ تابوت کس کے لئے ہے؟"

محسن نے کہا "یہ کیسا عجیب سوال ہے۔ کیا قبرستان کی زمین دیکھ کر کوئی بتا سکتا ہے کہ وہاں کس کس کی قبر بنے گی؟"

غالب نے سرہلایا "اور کھدی ہوئی قبر دیکھ کر کوئی بتا سکتا ہے کہ اس میں کون دفن ہوگا؟"

"میں سمجھ گیا" پادری نے ملول ہو کے سرہلایا "شاید تمہارا کوئی عزیز یا دوست فوت ہونے والا ہے۔"

میں پادری کی فضول باتوں سے تنگ آگیا تھا "ممکن ہے ہم میں سے ہی کوئی فوت ہوجائے۔"

نازو اور گل نے برا مانتے ہوئے مجھے گھورا مگر غالب نے دلیل دی "آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں۔"

"یہ بہت غلط ہوگا" پادری نے نصیحت کے انداز میں کہا "تم میں سے کوئی خود کشی کرنا چاہتا ہے .... زندگی خدا کی امانت ہے۔"

"امانت کے بچے۔ جاتے ہو یا ....." ماماجی بگڑ گئے۔

پادری کا چہرہ افسردہ ہوگیا "ورنہ کیا تم مجھے مار کے تابوت میں ڈال دوگے؟"

میں نے نرمی سے کہا "آپ بلاوجہ دخل اندازی کر رہے ہیں اور ہمارا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ بہتر ہے' آپ تشریف لے جائیں ورنہ ہم آپ کو اٹھا کے باہر پھینک دیں گے۔ معذرت کے ساتھ۔"

"اچھا تو پھینک دو" پادری وہیں دھرنا مار کے بیٹھ گیا "خود بلاتے ہو خود اور پھر گھر آئے مہمانوں کو باہر پھینکنے کی دھمکی دیتے ہو۔"

ہم سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پادری کا ذہنی توازن خراب معلوم ہوتا تھا۔ پہلے وہ تسلیم کرچکا تھا کہ کسی نے اس کے ساتھ مذاق کیا ہوگا۔ اب کہہ رہا تھا کہ اسے ہم نے بلایا ہے۔ وہ کوئی مشکوک آدمی تھا لیکن اس کو جسمانی طور پر اٹھا کے باہر پھینکنے کا نتیجہ ہنگامہ آرائی کی صورت میں نکلتا اور جو کام ہم خاموشی اور رازداری کے ساتھ ہو رہا تھا اس کا بھانڈا پھوٹ جاتا۔

"اے میاں لاٹ پادری!" ماماجی نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے "خدا کے لئے تم [illegible] نے تمہیں نہیں بلایا۔

مسلمان ہیں۔ مریں گے تو ہماری نماز جنازہ کوئی مولوی پڑھائے گا۔ اس وقت بھی تمہاری ضرورت نہیں ہوگی......"

وہ اچانک ہنس پڑا "واہ ماماجی۔ آپ کی نظر بھی دھوکا کھا گئی۔ آپ [illegible] چشمہ لگوالیں۔"

"ابے تو! چشمے کی اولاد" ماماجی نے حیرانی کے ساتھ ہنستے ہوئے کہا "[illegible] ڈرامے باز۔"

پادری اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے اپنا چغہ اتار دیا۔ چغے کے نیچے وہ قمیص پتلون پہنے ہوئے تھا۔ اس کی داڑھی بھی مصنوعی تھی اور سر کے بالوں کی وگ کے نیچے اس کا سر درمیان سے بالکل صاف تھا۔ ہم سب ہکا بکا کھڑے اس کی ظاہری حالت میں رونما ہونے والے انقلاب کو دیکھتے رہے۔

ماماجی نے مسکرا کے کہا "میاں! یہ وہی میک اپ مین ہے جسے میں نے بلایا تھا۔ بڑے کمال کا آدمی ہے۔"

محسن نے کہا "کمال کے اس مظاہرے کے بعد تو کسی تعریف کی ضرورت باقی نہیں رہی۔"

میں نے اس سے ہاتھ ملا کے کہا "بھئی مان گئے تمہیں استاد' تم نے تو ماماجی کو بھی چکر میں ڈال دیا۔"

وہ خوش ہو کے ہنسا "ہم نے سوچا' تھوڑی دل لگی ہی سہی۔"

"مگر یہ بہت خطرناک مذاق تھا" محسن نے کہا "جس کے نتائج کا تمہیں اندازہ نہیں۔"

غالب نے محسن کی تائید کی "اچھا ہوا کہ بات زبانی جمع خرچ تک محدود رہی۔"

اس نے نفی میں سرہلایا "ایک پادری پر کوئی ہاتھ نہیں اٹھاتا۔ میں نے بھی یہ بھیس اس لئے بدلا تھا کہ میرا راستہ کوئی نہ روکے۔ ریلوے کالونی کے گیٹ پر مشکوک افراد کو روک لیتے ہیں۔"

میں نے کہا "تم تو مشکوک نظر نہیں آتے۔"

اس نے کہا "مجھے یہ ڈر بھی تھا کہ کوئی جان پہچان والا نہ مل جائے۔ بیس سال سے فلم انڈسٹری میں جھک مار رہا ہوں۔ کامیابی کی لاٹری ابھی تک نہیں نکلی۔ سب قسمت کے کھیل ہیں" اس نے ایک سرد آہ بھری۔

"قسمت کو الزام کیوں دیتا ہے" ماماجی نے کہا "تو نے دل لگا کے کبھی [illegible] کام کیا ہے تھالی کے بینگن۔ ادھر سے ادھر لڑھکتا پھرتا ہے۔ اوپر سے تیری عادتیں۔"

"یہ تو آپ نے ٹھیک کہا" وہ اداس ہوتے بولا "عادتیں خراب ہیں [illegible] مستقل مزاجی نہیں۔ یہ بھی تو تقدیر کی خرابی ہے۔"

"ابے چل رہنے دے۔ باتیں مت بنا" ماماجی نے کہا اور پھر ہم سے مخاطب ہوگئے "اس کا نام ہے یوسف خان اور اتفاق سے یہ بھی پشاور کا رہنے والا ہے۔ کتنے یوسف خان ہوں گے آج بھی پشاور میں؟ شاید سیکڑوں۔ کیا وہ سب دلیپ کمار بن سکتے ہیں؟"

"اسی لئے تو کہتا ہوں ماماجی کہ سب کھیل تقدیر کے ہیں" یوسف خان نے کہا "دلیپ کمار کے کیا سرخاب کا پر لگا ہوا ہے۔"

"سرخاب کا پر اس نے خود اپنی محنت اور صلاحیت سے لگایا ہے" ماماجی نے کہا۔

میں نے مسکرا کے کہا "کیا تم بھی گھر سے دلیپ کمار بننے کے لئے نکلے تھے؟"

"ہاں۔ آیا تھا ایکٹر بننے۔ مگر کون سا کام ہے جو اس [illegible] [illegible] کی ایسی بات نہیں۔ سب ہی نیچے سے اوپر جاتے ہیں۔ اتنا بڑا [illegible] ساز اور اسٹوڈیو کا مالک محبوب بھی پہلے لائٹ مین تھا۔ مگر آدمی کے سامنے ایک ارادہ ہوتا ہے اور ایک منزل ہوتی ہے۔ سب بڑے گُن تھے اس میں۔ یہ ہمت نہ ہارتا تو کچھ بھی بن سکتا تھا مگر ہوا یہ کہ دو سال بھی جم کر اس نے کوئی ایک کام نہیں کیا۔ جب چھوٹے موٹے رول ملنے شروع ہوئے تو یہ ایک فوٹوگرافر کے ساتھ ہوگیا۔ کیمرہ مین بننا بھی کیسا آسان کام ہے۔ ڈیڑھ سال بعد اس نے پٹڑی بدل لی۔ موسیقار نوشاد کے پاس چلا گیا۔ بانسری بجالیتا تھا انہوں نے رکھ لیا مگر سال بھر کے بعد کسی ساؤنڈ ریکارڈسٹ کی بیوی پر مر مٹا اور اس کا شاگرد ہوگیا۔ دراصل اس پاگل کو کسی نے یہ الٹی پٹی پڑھادی تھی کہ بمبئی میں کامیابی کے لئے حسین سہارے کی ضرورت پڑتی ہے اور یہ حسین سہارے ہی تلاش کرتا پھرا۔ ایسے عارضی سہارے اس کی بربادی کا سبب بن گئے۔ اتنے دوست نہیں بنائے انڈسٹری میں جتنے دشمن بنا لئے۔ اب دو سال سے میک اپ مین بنا ہوا ہے۔"

"کس کی وجہ سے؟" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"بتا بھئی' کس کی وجہ سے؟" ماماجی نے اس کے کندھے پر بے تکلفی سے ہاتھ مارا۔

"مار دیا ماماجی۔ کندھا ہی توڑ دیا۔ وجہ بس اپنا شوق ہے اور کیا" وہ کندھا سہلاتے ہوئے بولا۔

"ابھی ایک اور ماروں گا" ماماجی نے کہا "صاف کیوں نہیں بتاتا کہ ایک میک اپ آرٹسٹ کی بہن کے چکر میں پڑ گیا تھا اور ابھی تک میک اپ سے بھیس بدل بدل کر ملنے جاتا ہے اس سے ورنہ اس کا شوہر تیرا جھٹکا کردے۔"

غالب نے کہا "شادی ہوچکی ہے اس کی؟"

"ہاں۔ بڑا خونخوار قسم کا سکھ ہے اس کا شوہر۔ بھائی نے شادی کردی تھی کہ یہ چکر ختم ہوجائے گا۔ وہ سکھ یہ مسلمان....."

"ماماجی! عشق کا کیا مذہب اور کیا ذات۔ عشق تو بس عشق ہے" یوسف خان نے آہ بھری "دیکھ لو' شادی سے کوئی فرق نہیں

پڑا۔"

میں نے متاثر ہو کے کہا "یوسف خان! اگر یہ واقعی عشق تھا تو پھر تم نے اس سے شادی کیوں نہیں کر لی؟"

محسن نے بھی کہا "ہاں۔ تم اسے مسلمان کر سکتے تھے"

"میں اس کے لئے خود سکھ بن جاتا" غالب نے کہا۔

یوسف خان نے افسوس سے نفی میں سرہلایا "یہ بات آپ لوگ نہیں سمجھو گے۔ جب شادی ہو جائے تو پھر عشق کہاں رہتا ہے۔ عشق تو نام ہے جدائی کا۔ صرف آرزو کا۔ ایک تڑپ کا۔ اسے دیکھنے کی تڑپ۔ اس سے ملنے کی تڑپ۔ اس کی خاطر جان کی بازی لگانے کی تڑپ۔ شادی تو بہت آسان کام تھا۔ یہ عشق بہت مشکل ہے۔ لیکن یہ عشق ہے۔"

ہم سب دم بخود کھڑے یوسف خان کے عشق کی گہرائی کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ عام لوگوں کی طرح ہم نے بھی اس کے عشق کو سطحی نظر سے دیکھا تھا مگر یوسف خان جس عشق کی بات کر رہا تھا اس کا حاصل جسموں کا ملاپ نہیں تھا۔ یہ عشق کا مادی روپ نہیں تھا۔ یہ ایک ماورائی جذبہ تھا۔ عشقِ حقیقی کی طرح۔ یہ تصوف کا فلسفہ تھا جس کو بیان کرنے ولا کوئی صوفی نہیں تھا بلکہ ایک عام آدمی تھا۔ دنیا کی نظر میں ناکام مگر خود اس ناکامی کو اپنی کامیابی سمجھ کے شاد کام۔ دنیا بھی کیا عجائب خانہ ہے۔ کیا تماشاگاہ ہے۔ ہر قدم پر سامان حیرت بھی ہے' نیرنگیٔ قدرت بھی اور اہلِ بصارت کے لئے اسباب بصیرت بھی۔

ماماجی بھی کچھ متاثر نظر آرہے تھے۔ انہوں نے کہا "اچھا بھئی یوسف خان! تیری بات اپنے پلے تو پڑی نہیں لیکن تو ہماری بات دھیان سے سن لے تاکہ بعد میں گڑبڑ نہ ہو۔ ہاں میاں سکندر! تم بتادو اسے سارا کام۔"

میں نے کچھ تذبذب کے ساتھ کہا "ماماجی! ہم یوسف خان پر بھروسہ کر سکتے ہیں نا؟"

ماماجی نے خفگی سے کہا "تمہیں مجھ پر بھروسہ ہے یا نہیں؟"

"آپ کیسی باتیں کرتے ہیں ماماجی....." میں نے کہا۔

"گولی مارو ماماجی کو۔ یہ بتاؤ' مجھے پہلے کبھی دیکھا تھا تم نے" ماماجی کا غصہ کم نہیں ہوا "میں کون سا سگا ماما ہوں تم سب کا۔ پھر آنکھ بند کر کے کیوں چلے آئے تھے میرے گھر میں؟"

"وہ..... منومیاں آپ کو جانتے تھے....؟"

"تم منومیاں کو جانتے تھے؟" ماماجی نے کہا۔

"وہ میرا ہرگز یہ مطلب نہ تھا کہ....."

"چھوڑو مطلب کی بات" ماماجی نے میری بات کاٹ دی۔ "سکندر میاں! یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کئے میں نے۔ ساری زندگی ایسے ہی گزاری ہے جیسے تم اب گزار رہے ہو۔ دوست دشمن میں تمیز کرنا آتا ہے مجھے۔ کھوٹے کھرے کی پہچان رکھتا ہوں۔ کوئی دھوکا نہیں دے سکتا مجھے۔ اور تم ڈرتے ہو کہ میں تمہیں دھوکے میں نہ رکھوں۔ میرے منہ پر شک کی کالک ملتے ہو۔"

معاملہ بڑی مشکل سے رفع دفع ہوا۔ میں نے ہی نہیں میرے ساتھ غالب اور نازو' گل اور محسن نے بھی ان سے معافی مانگی تب کہیں جا کے ان کا غصہ ٹھنڈا ہوا۔

میں نے یوسف کو اپنے پورے پلان سے آگاہ کر دینا بہتر سمجھا۔ "میک اپ ہم سب کا ہوگا۔ کیسے ہوگا' یہ فیصلہ تم خود کرو۔ ہم ایک مال گاڑی کے ساتھ جائیں گے۔ مال گاڑی میں ایک تو ڈرائیور ہوتا ہے سب سے آگے۔ اور ایک ہوتا ہے گارڈ سب سے پیچھے۔"

"تو آپ لوگ ڈرائیور اور گارڈ بننا چاہتے ہیں؟"

میں نے کہا "نہیں۔ ذرا صبر سے کام لو۔ ہم انجن ڈرائیور کیسے بن سکتے ہیں؟ گارڈ بھی نہیں بن سکتے۔ اس لئے کہ یہ کام ہم نے کبھی نہیں کیا۔ ہمارا مقصد اس مال گاڑی پر قبضہ کرنا ہے۔"

"مال گاڑی پر...... قبضہ؟" یوسف بھونچکا رہ گیا۔

"ہاں۔ ہم اسے ہائی جیک کریں گے" غالب نے کہا۔

"جیسے ہوائی جہاز ہائی جیک ہوتے ہیں" محسن بولا۔

"مگر..... تم اسے لے کر کہاں جاؤ گے؛ اور کیسے لے جاؤ گے آخر؟ جہاز تو کسی بھی جگہ اتارا جا سکتا ہے لیکن پٹڑی کے بغیر ٹرین تو نہیں چل سکتی...."

"یار' یہ تمہارا وردِ سر نہیں ہے۔ کہ ہم ٹرین کو سڑک پر دوڑاتے ہیں یا اڑا کے لے جاتے ہیں۔ تم پوری بات سن لو گے تو سمجھ جاؤ گے" میں نے کہا "ٹرین کی سب سے آگے اور سب سے پیچھے والی بوگی میں۔ یعنی انجن کے پیچھے والی اور گارڈ کے ڈبے سے اگلی۔ اس میں شاید کچھ لوگ ہوں گے جن سے ہمیں نمٹنا پڑے گا۔ چناں چہ گارڈ کے ڈبے میں یہ تابوت جائے گا۔ تابوت میں یہ مُردہ ہوگا۔ اور یہ اس مُردے کی بیوہ۔ ہم گارڈ کو رشوت دے کر یا کسی اور طرح راضی کر لیں گے کہ وہ تابوت کو لے جانے کی اجازت دے۔"

"کہاں تک؟"

"ہم راستے میں کسی جگہ کا نام بتا سکتے ہیں جو زیادہ دور نہ ہو" میں نے کہا "ٹرین کے روانہ ہوتے ہی مُردہ خود تابوت میں سے نکل آئے گا۔ اس کی بیوہ موقع پاتے ہی گارڈ بابو کو ناک آؤٹ کر دے گی اور پھر مُردے سے کہے گی کہ اٹھ مُردے۔"

یوسف دانت نکالنے لگا "یہ تو بہت مشکل اور خطرناک کام ہے۔ فرض کرو مُردے نے انکار کر دیا۔ کہ ابھی تو قیامت نہیں آئی۔ صورِ اسرافیل کی آواز نہیں سنی میں نے....."

میں اس کا مطلب سمجھ گیا "خطرے کی اس میں کوئی بات نہیں ہے۔ ہم نے پکا بندوبست کیا ہے کہ مُردہ حکم پاتے ہی اٹھ کھڑا ہو۔ تم تو بس مُردے کا ایسا میک اپ کرو کہ وہ ذرا بھی زندہ نظر نہ آئے۔ اور اس کی بیوی واقعی بیوہ لگے۔"

"میں سمجھ گیا۔ یہ کام کب ہونا ہے؟"

"کل۔ شام کے بعد۔" میں نے سوچ کے کہا "ٹرین علی الصبح ساڑھے پانچ بجے روانہ ہوگی۔ ہم رات بارہ بجے کے بعد تابوت ٹرین پر چڑھانا چاہتے ہیں۔ تمہیں کتنا ٹائم لگے گا اس کام میں؟"

"اندازاً دو گھنٹے۔ میں آٹھ نو بجے یہ کام شروع کر سکتا ہوں" یوسف نے محسن اور گل کے چہروں کا بغور جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"اہم بات یہ ہے کہ شیردانی صاحب جو خالص پٹھان نظر آتے ہیں' بالکل اینگلو انڈین دکھائی دیں۔ محسن خاں نہیں بلکہ رابرٹ۔ اور یہ خاتون۔ گل بانو۔ کوئن میری یا وکٹوریہ۔ تم بمبئی کی اس رنگ دار انگریز کی نقال اقلیت سے بخوبی واقف ہو۔ جیسا ان کا چہرہ' لباس اور حلیہ ہوتا ہے' ایسا ہی اس کا بنادو۔"

"مس گل بانو کو اینگلو انڈین اردو آتی ہے؟"

میں نے گل کی طرف دیکھا "آجائے گی کل تک۔ زبان کو بگاڑ کے بولنا کیا مشکل ہے۔ سُدھارنا مشکل ہوتا ہے۔"

"اب آپ فرمائیں اپنے بارے میں۔"

"صبح ہم قلی بن کے پھرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے پاس اپنی وردی ہوگی بیج ہوگا۔ بس ہماری شکلیں قلیوں جیسی نہیں ہیں۔ وہ تم بنادو" میں نے کہا "ہم بنگالی نظر آئیں یا مدراسی۔ بس وہ نظر نہ آئیں جو ہم ہیں۔ ہمارے دشمن بہت تیز نظر رکھتے ہیں اور بہت چوکس ہیں۔ وہ ہمیں نہ پہچان پائیں۔"

"ہمارا کیا خاک کمال ہوگا' اگر کسی نے آپ کو پہچان لیا۔"

"تم صرف اپنے کمال کی بات کر رہے ہو۔ یہ ہمارے لئے زندگی اور موت کا سوال ہے۔ ہم پہچانے گئے تو سمجھو پکڑے گئے اور پکڑے گئے تو مارے گئے" میں نے کہا۔

"اگر ہم مارے گئے تو تم بھی مارے گے" غالب نے کہا۔

"چناں چہ تمہارے لئے بھی یہ کمال کا نہیں زندگی اور موت کا سوال ہی ہے" محسن نے کہا۔

"کیوں خواہ مخواہ دھمکیاں دیتے ہو۔ کیا میں سمجھتا نہیں کہ تم کیا کر رہے ہو..... اور تمہاری مدد کر کے میں کیا کر رہا ہوں؟ یہ کھیل تماشا نہیں' کوئی ڈراما نہیں ہو رہا ہے جس کے لئے آپ سب میک اپ کرا رہے ہو۔" یوسف خفا ہونے لگا۔

میں نے کہا "اگر تم سمجھتے ہو تو بہت اچھی بات ہے۔"

"تم اسے دھمکی نہیں' حقیقت کا اظہار یا اعتراف سمجھو۔" غالب نے کہا۔

"میں صبح کس وقت آؤں؟" یوسف نے سرہلایا۔

"صبح سات آٹھ بجے" میں نے کہا "کیوں ماماجی؟"

ماماجی چونکے "ہاں۔ یہ وقت ٹھیک ہے۔ دس بجے سے پہلے تو ہم جا نہیں سکتے۔"

محسن نے کہا "اگر یہ کام ابھی ختم ہو جائے تو کیا یہ بہتر نہ ہوگا۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے۔ صبح دوبارہ آنا نہیں پڑے گا" یوسف نے کہا۔

"تم سامان لائے ہو میک اپ کا؟"

"ہاں۔ وہ سب چھپا کر لانے کے لئے ہی تو میں نے بھیس بدلا تھا" یوسف نے کہا۔

"ایک بات اور سمجھ لو" میں نے کہا "اسی ٹرین پر ایک ڈبے میں کچھ گھوڑے جائیں گے۔"

"ریس کے گھوڑے" محسن نے وضاحت کی۔

"گھوڑوں کے ساتھ تین افراد ہوں گے۔ ایک ٹرینر۔ دوسرا ان کا ڈاکٹر اور ایک خادم یا اسسٹنٹ۔ ان تینوں کی جگہ ہم لینے کا ارادہ رکھتے ہیں" میں نے اپنی' غالب اور نازو کی طرف اشارہ کیا۔ "کیا ہمارے قلیوں والے چہرے چل جائیں گے؟"

"یہ میں کیسے بتا سکتا ہوں" یوسف نے کہا "میں نے تو ان کے چہرے نہیں دیکھے۔"

"ان کے چہرے تو ابھی ہم نے بھی نہیں دیکھے" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

"پھر کیا ہوگا..."

"کل دیکھیں گے" میں نے کہا "اگر قلیوں کی وردی اتار کے لباس بدلنے سے کام چل گیا' تو چلا لیں گے۔"

غالب نے کہا "یہ بہت بڑا رسک ہے۔"

محسن نے بھی کہا "ہاں۔ ضروری نہیں کہ ٹرین پر جانے والے گارڈ اور انجن ڈرائیور۔ یا دوسرے محافظ ان سے ناواقف ہوں۔"

میں نے کہا "خیال تو ٹھیک ہے تمہارا۔ نہ دلاور اتنا احمق ہے اور نہ تریونی۔ وہ ٹرین پر سب اپنے آدمی بھیج رہے ہیں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ انہیں ایک دوسرے سے نہ ملوا دیں۔ وہ سب صورت آشنا ہوں گے۔ ایک دوسرے کو اچھی طرح پہچانتے ہوں گے۔ ان کے درمیان کوئی اجنبی ہوگا تو سب کو نظر آجائے گا۔"

"جناب یوسف خان صاحب!" محسن نے کہا "آپ ایسا کریں' کل کا دن ہمارے ساتھ ہی گزاریں تاکہ جب اور جہاں آپ کی ضرورت پڑے آپ دستیاب ہوں۔"

"بالکل ٹھیک ہے" غالب نے کہا "چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی۔"

"کیا..... کیا بولا آپ نے؟"

ماماجی نے سر کھجایا "میاں' فارسی ہم نے بھی نہیں پڑھی"

"مطلب یہ ہوا اس کا کہ ایسا کام عقل مند آدمی نہیں کرتا جس پر بعد میں پچھتانا پڑے" غالب نے بڑی متانت سے کہا۔

"یہ بات کہنے کے لئے فارسی بولنا ضروری تھا؟" محسن نے کہا۔

"ہم پر کوئی رعب نہیں پڑا" نازو نے کہا جو بہت دیر سے چپ تھی "معلوم ہے تم کتنے عالم فاضل ہو۔"

"یہ جہالت کا کمپلیکس ہے" غالب نے کہا "جس میں تم سب مبتلا ہو گئے ہو۔"

میں نے کہا "یوسف! تم مجھ سے بات کرو۔"

"آپ حکم کریں۔"

"تمہیں کل کوئی مصروفیت تو نہیں ہے؟"

"ہو گی تو میں ٹال دوں گا" وہ بولا۔

"اس کا مطلب ہے کہ کوئی مصروفیت نہیں ورنہ تم یقین کے ساتھ کہتے" غالب نے کہا۔

"ایسا ہی سمجھ لیں" یوسف نے جھینپ کر کہا۔

"بس تو تم صبح آجاؤ" میں نے کہا۔

"کہاں آجاؤں؟"

"ماماجی کا گھر تو ضرور دیکھا ہو گا تم نے۔"

وہ ہنسنے لگا "اپنا ایک ہی تو گھر ہے یہاں۔ اپنے ماماجی کا گھر۔ میں پہنچ جاؤں گا۔"

"ابے پہنچ جاؤں گا نہیں، ابھی چل۔ تیرے کون سے بیوی بچے واپسی کا انتظار کریں گے" ماماجی نے اس کے شانے پر عادت کے مطابق اپنا بھاری ہاتھ مارا۔

"ہائے ماماجی۔ دوسرا کندھا بھی توڑ دیا" وہ شور مچانے لگا۔

"اب ٹھیک ہو گئے ہیں دونوں کندھے۔ برابر ہیں دونوں طرف سے" ماماجی نے کہا۔

نازو نے کہا "کتنا اچھا ہوتا اگر آپ حضرات کی عقل شریف میں یہ بات پہلے آجاتی۔"

"اس سے کیا ہوتا؟" غالب نے کہا۔

"یہ ہوتا کہ ہم آرام سے گھر بیٹھ کے سب معاملات طے کر لیتے۔ یہاں ایک ٹانگ پر کھڑے نہ رہتے" نازو نے کہا۔

"اگر تمہاری عقل شریف میں یہ بات آجاتی کہ دو ٹانگوں پر کھڑے رہنے میں کوئی قباحت نہیں تو کتنا اچھا ہوتا" غالب بولا۔

"ہم نے ایسی کوئی پابندی نہیں لگائی تھی" محسن نے غالب کا ساتھ دیا "تم اپنی مرضی سے ایک ٹانگ پر کھڑی رہیں۔"

"تم تابوت پر بیٹھ بھی سکتی تھیں۔"

"شرعاً اور اخلاقاً اس میں کوئی معیوب بات نہیں۔"

غالب نے محسن پر ہاتھ رکھ کے کہا "آپ کے اس پسندیدہ مُردے کے بغیر یہ تابوت صرف لکڑی کا ایک صندوق ہے۔"

گل کی صورت پر ناگواری کے آثار نمودار ہوئے "جو منہ میں آتا ہے بکتے چلے جاتے ہو۔"

نازو نے اسے کھینچ لیا "چھوڑو۔ ان کے منہ مت لگو۔"

"اگر آپ لگنا چاہیں تو ہمیں خوشی ہو گی۔" محسن نے کہا۔

غالب نے قہقہہ مار کے کہا "محاورے کے مطابق نہیں، عملاً منہ لگنا عین ہماری خواہش کے مطابق ہو گا۔"

یوسف اس چھیڑ چھاڑ سے لطف اندوز ہو رہا تھا جس میں غصہ تھا پیار کے انداز کے ساتھ۔ برہمی تھی ادائے ناز کے ساتھ۔ لیکن ماماجی پرانی وضع کے بزرگ تھے۔ وہ ہماری بے تکلفی پر ناخوش تھے۔

"میاں! یہ پھکڑپن زیب نہیں دیتا تمہیں" انہوں نے واپسی میں کہا "کچھ ادب لحاظ اور آپس میں بے تکلفی کی حد بھی ہوتی ہے........"

میں نے ان کے ساتھ چلتے ہوئے کہا "بالکل صحیح فرمایا آپ نے۔ میں بھی ان دونوں کو یہی سمجھاتا ہوں۔"

محسن اور غالب ڈھیٹ بنے پیچھے چلتے رہے۔ گل اور نازو ان سے بھی چند قدم پیچھے تھیں۔

"میں بھی ان دونوں کو یہی سمجھاتا ہوں" غالب نے کہا۔

"اور میں بھی" محسن بولا "مگر آج کل کی لڑکیاں۔ توبہ! نہ شرم نہ حیا۔ دیکھ لینا، قیامت انہی کی وجہ سے آئے گی۔"

"کب آئے گی، یہ بھی بتا دو" نازو نے کہا۔

"ہر بات بتانے کی نہیں ہوتی" غالب نے اسے ڈانٹا۔

"خواتین بتاتی ہیں اپنی عمر۔ کبھی عورت نے آج تک انٹرویو میں اپنی تاریخ پیدائش بتائی ہے؟" محسن نے کہا۔

"تم لوگ کچھ نہیں چھپاتے؟" گل نے کہا۔

"چھپاتے ہیں" غالب نے اعتراف کیا "بیوی سے اصل آمدنی۔ رات کو دیر سے لوٹنے کے اسباب...."

"اور وہ سامان جو مرنے کے بعد نکلتا ہے۔ چند تصویرِ بتاں چند حسینوں کے خطوط" محسن نے کہا۔

"بس بس۔ تم اپنی بات کرو" نازو نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔ "تمہارے پاس سے نکلیں گی اپنی ہی تصویریں جو اخباروں میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ مطلوب ہے۔ گرفتاری پر انعام۔ اشتہاری مجرم جیسے عنوانات کے ساتھ۔"

"اور عدالتوں کے سمن۔ وارنٹ" گل نے کہا۔

ماماجی نے دوبارہ کچھ نہیں کہا۔ غالباً انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ یہ "ناقابلِ اصلاح" لوگ ہیں چناں چہ ان پر نصیحت کا وہی اثر ہو گا جو چکنے گھڑے پر پانی کا ہوتا ہے۔ وہ سب سے آگے تیز تیز قدموں سے چلتے گئے۔ میں رفتار بڑھا کر ان کے ساتھ ہو گیا۔ ہمارے اور ان کے درمیان فاصلہ بڑھتا گیا۔ دل لگی کے لئے یا اعصابی کشیدگی کم کرنے کے لئے غالب اور محسن کی گل اور نازو سے لڑائی جاری تھی۔

نہ جانے کتنی دیر بعد مجھے احساس ہوا کہ ان کی آوازیں خاموش ہو گئی ہیں۔ خاموشی ان کے مزاج کے خلاف تھی اور وہ اتنے پیچھے بھی نہیں رہ سکتے تھے کہ ان کی آواز میرے کانوں تک نہ پہنچتی۔ جب میں نے پلٹ کر دیکھا تو میرے پیچھے کوئی بھی نہیں تھا۔

"معلوم نہیں یہ سب لوگ کہاں رہ گئے" میں نے تشویش کے ساتھ کہا۔

ماماجی نے کہا "پریشان کیوں ہوتے ہو۔ آجائیں گے۔ کوئی بچے تو ہیں نہیں کہ راستہ بھول جائیں۔"

میں نے کہا "میں دیکھ کے آتا ہوں۔ آپ چلیں۔"

"اچھا.... میں چلتا ہوں۔"

میں چند قدم ہی واپس گیا تھا کہ مجھے یوسف مل گیا۔ وہ اکیلا تھا۔

"باقی سب کہاں رہ گئے؟" میں نے کہا۔

"اُدھر ریلوے لائن کے پار بنگالن کا پان کھانے کے لئے گئے ہیں۔ ایک نمبر چیز ہے" وہ بولا۔

میں نے کہا "کون، بنگالن یا اس کا پان؟"

وہ ہنسنے لگا "دونوں۔ سالی نشہ ڈالتی ہے اس میں۔ جو ایک بار کھا لیتا ہے روز پہنچ جاتا ہے۔ اس بہانے اپنا اصل دھندا خوب چلاتی ہے۔"

"اصل دھندا کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"بمبئی میں اصل دھندا کیا ہے، تم نہیں جانتے؟ یہ جو سیکڑوں ہزاروں لڑکیاں ہر سال یہاں فلموں کی ہیروئن بننے پہنچتی ہیں اور ایکسٹرا بھی نہیں بن پاتیں، وہ کیا کرتی ہیں؟ خیر چھوڑو۔ تمہیں کیا ضرورت ہے جاننے کی۔ تم ہماری لائن کے آدمی ہی نہیں ہو۔ چلو ہم چلتے ہیں۔ تمہارے ساتھی آگئے" یوسف نے کہا۔

میں نے یوسف سے کہا "مجھے تمہاری زندگی پر رشک آتا ہے"

"وہ کیوں؟"

"ہر فکر سے آزاد ہو تم۔ نہ گھر نہ بیوی بچے۔ نہ گزرے ہوئے دن کا غم نہ آنے والے دن کا مسئلہ۔ جہاں چاہا چلے گئے۔ جو ملا کھا لیا۔ جو ہاتھ آیا پہن لیا۔ جس پر دل آیا اس کے لئے زندگی کا راستہ بدل لیا۔ جہاں تک ساتھ رہا چلتے رہے۔ پھر کہیں، کسی بھی موڑ پر قدم کسی اور منزل کی طرف اٹھ گئے تو پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھا۔"

"یار مجھ میں اور گلی کے کتے میں کوئی فرق نہیں۔" اس نے تلخی سے کہا۔

"یہ کیوں سمجھتے ہو تم؟"

"بے مقصد زندگی کو میں اور کیا سمجھوں؟ آدمی جئے تو کسی مقصد کے لئے۔ مرے تو کسی مقصد کے لئے۔ کوئی سمت ہو زندگی کی۔ اپنا اختیار ہو زندگی پر۔ ورنہ ایسے کوئی نہیں جی سکتا۔ دسویں جماعت کی کتاب میں ایک شعر پڑھا تھا میں نے۔ نہ اپنی خوشی سے آئے نہ اپنی خوشی سے گئے۔ لائی حیات آگئے موت لے چلی چلے گئے۔ شاید غالب کا شعر ہے۔"

اگرچہ اس نے ذوق کے شعر کا ستیاناس کر دیا تھا مگر وہ اپنا مفہوم بیان کرنے میں کامیاب رہا تھا۔ میری بات کا مقصد اسے ڈیپریشن میں مبتلا کرنا نہیں تھا مگر وہ مایوس اور افسردہ نظر آنے لگا تھا۔

"تم سب کی زندگی میں مقصد کی اہمیت ہے" وہ بولا "اور یہ مقصد ہے کامیابی۔ میں ناکامیوں کے راستے پر چل رہا ہوں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں تمہارے ساتھ قدم ملا کے چلوں؟"

میں نے کہا۔ "نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔"

"کیوں نہیں ہو سکتا؟"

"تم جس ٹرین کو پکڑنے کی کوشش کرنا چاہتے ہو وہ نکل چکی ہے" میں نے اسے دو ٹوک اور صاف الفاظ میں حقیقت سے آگاہ کر دینا بہتر سمجھا "صرف خواہش کی کمند ڈال کے آدمی اس وقت کو اسیر نہیں کر سکتا جو گزر چکا ہو۔ ہر کام کے لئے ایک وقت اور ہر وقت کے لئے ایک کام ہے۔ تم جو کام کر رہے ہو۔ وہی ٹھیک ہے تمہارے لئے۔ یہ کام ہم نہیں کر سکتے۔"

ماماجی کے گھر میں منو میاں انتظار کرتے کرتے سو گئے تھے۔ تھکن مجھ پر بھی غالب تھی۔ میں اور ماماجی ایک طرف بیٹھ کے باتیں کرنے لگے۔ یوسف میرے رویئے سے دل شکستہ ہو کے غالب اور محسن کی پارٹی میں شامل ہو گیا تھا اور وہ دونوں کرید کرید کر اس پرانے مجنوں کی داستانِ عشق سن رہے تھے جس کا ہر باب کسی نئی لیلیٰ کے نام سے شروع ہوتا تھا۔ نازو اور گل کا ہنس ہنس کے برا حال تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ہم عام لوگوں کی طرح ایک خاندان کے افراد ہیں جن کے سامنے روز مرہ زندگی کے مسائل کے سوا کوئی پریشانی نہیں۔ فرمودۂ غالب کی صداقت نے مجھے قائل کر لیا۔ رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج۔ ہم سب مصائب و آلام، حادثات و آفات اور پُرخطر حالات کے اتنے عادی ہو چکے تھے کہ بھولتے کچھ نہیں تھے مگر انہیں ہر وقت یاد کر کے خوف زدہ رہنے، مایوس ہونے، رونے دھونے اور اندیشوں میں مبتلا ہو کے پریشان ہونے کو لاحاصل سمجھنے لگے تھے۔ آج ہی سین اور شین شہید ہو کے ہمارا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ ہم ایک معرکہ آرائی کے بعد دامِ اجل سے نکلے تھے۔ اسی شہر میں کہیں شہلا اپنے بیٹے کے ساتھ ہم سب کی راہ تک رہی تھی۔ یا شاید موت کی آرزو کر رہی تھی۔ اور بے بس تھی۔ آنے والا دن زیادہ دور نہیں تھا جس کے دامن میں نئے خطرات کا چیلنج تھا اور عشق کے نئے امتحاں تھے۔ مگر یہاں ہم سب کتنی بے فکری سے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ شاید عزم و حوصلے کو شکست و ریخت سے بچانے کے لئے ایک متوازن رویہ ضروری تھا۔ زندگی کے ایک پلڑے میں رنج و غم ہوں تو دوسرے میں مسکراہٹیں اور ہنسی ڈال دو۔ فرصتِ کشاکشِ غمِ دوراں سے جب ملے۔ جب بھی کوئی فرصت کی ساعتِ نایاب حاصل ہو تو قہقہے لگاؤ۔ گاؤ۔ رنگ، خوشبو اور گیت سمیٹو اور محبت کرو۔

معلوم نہیں کب مجھے نیند آگئی۔ صبح باتوں کی آواز سن کے میں جاگا تو دن نکلنے والا تھا۔ ماماجی اور منو میاں گلی کی چارپائیاں صحن میں ڈالے بیٹھے تھے۔ محسن اور غالب کے علاوہ یوسف مجھ سے کچھ

فاصلے پر بے ترتیب پڑے ہوئے تھے۔ ساتھ کے دوسرے کمرے میں گل اور نازو بھی سو رہی تھیں۔

میں باہر نکلا تو منو میاں نے کہا "آؤ بھئی سکندر' ہم تو ہیں بوڑھے لوگ۔"

"ہاں۔ سوئے جتنا سونا تھا جوانی میں" ماماجی بولے۔

میں نے شرمندگی سے کہا "اول تو آپ بوڑھے نہیں ہوئے ابھی۔ آدمی حوصلے سے جوان رہتا ہے۔"

"مدہوشی کی نیند جسم کو آتی ہے" منو میاں بولے "اور جسم کو وقت ضرور شکست دیتا ہے۔"

میں نے کہا "صرف بدبختی ہے ہماری۔ بُری عادتوں نے آداب سحرخیزی سے دور رکھا ورنہ آپ کی طرح ہم بھی اپنے دن کا آغاز خدا کے سامنے سر جھکا کے کرتے۔"

"میں سوچ رہا ہوں کہ اب میرا یہاں کوئی کام نہیں رہا۔ مجھے واپس لوٹ جانا چاہئے" منو میاں بولے۔

"آپ ہمیں چھوڑ جائیں گے؟"

"چھوڑ کے تو میں اپنے ساتھیوں کو آیا تھا۔ اور...... چھوڑ کے جاؤں گا اپنے دو شہید بیٹوں کو" وہ آبدیدہ ہو گئے۔

"ابھی آپ کا کام ختم تو نہیں ہوا......" میں نے بات آگے بڑھادی۔

"نہیں میاں سکندر۔ میں یہاں آیا تھا تم سے رابطہ قائم کرنے۔ تم سے رابطہ ہو گیا۔ اب میں واپس جاؤں گا۔ تم سے وہاں ملاقات ہو گی جہاں میرے لاکھوں ساتھی' غداروں اور وطن فروشوں کے خلاف ہر محاذ پر لڑ رہے ہیں۔ مجھے بمبئی میں نہیں' ان کے درمیان ہونا چاہئے۔"

"آج ہمارا بھی آخری دن ہے بمبئی میں۔ کل ہم بھی روانہ ہو جائیں گے۔" میں نے کہا "ہماری منزل تو ایک ہی ہے۔"

"ہاں۔ مگر راستے جدا ہیں" منو میاں نے کہا "تم میرا ساتھ نہیں دے سکتے اور میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا۔"

ان کی دلیل معقول اور قائل کرنے والی تھی "اگر آپ نے فیصلہ کر ہی لیا ہے تو مجھے آپ کی راہ میں حائل ہونے کا حق نہیں؟"

"اچھا تو پھر اللہ حافظ" وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

میں بھونچکا رہ گیا "ابھی...... اسی وقت......"

وہ ہنسے "اور کیا جانے سے پہلے میرے اعزاز میں الوداعی دعوتیں اور تقریبات ہوں گی...... ہار پھول اور بینڈ باجے کے ساتھ رخصت کرو گے مجھے!"

میں نے کہا "میرا مطلب ہے کہ اچانک۔ کسی تیاری کے بغیر"

"تیاری کیسی۔ ہم سے پہلے جو گئے انہوں نے کیا تیاری کی تھی؟ اپنا رخت سفر تو بس اپنا یہی جنون ہے جس نے تمام عمر سرگرداں رکھا۔ کہیں ٹک کر بیٹھنے کی نوبت آئی تو تقدیر نے اسباب سفر پیدا کر دیئے۔ چناں چہ ہم چلتے ہیں۔ زندگی رہی تو پھر ضرور کہیں ملیں گے۔"

میرا دل رنج سے بوجھل ہو گیا "آپ...... ان سب سے نہیں ملیں گے؟"

انہوں نے نفی میں سر ہلایا "میں تو نکل جاتا چند منٹ میں۔ تم سے بھی نہ ملتا۔ کسی سے رخصت لینا اور کسی کو رخصت کرنا ایک مشکل کام ہے۔ ڈر لگتا ہے کہ کہیں یہ آخری ملاقات نہ ہو" منو میاں نے کہا۔

"آپ کو ناامید نہیں ہونا چاہیے" میں نے کہا۔

وہ کچھ دیر سوچتے رہے' جیسے میری بات کا جواب دینا بھی چاہتے ہوں اور نہیں بھی۔ پھر انہوں نے ہاتھ ملائے بغیر دروازے کی طرف قدم بڑھائے اور جاتے ہوئے پٹ بھیڑ گئے۔ میرے لئے یہ یقین کرنا محال تھا کہ وہ ایک لمبے سفر کے لئے نکلے ہیں۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ چند منٹ کے لئے کسی کام سے گئے ہیں اور ابھی آجائیں گے۔ انہیں ہزار میل سے زیادہ کی مسافت درپیش تھی۔ ہر قدم پر خطرات کا سامنا تھا۔ دشمنوں کی سرزمین بھی ان کی دشمن تھی اور اس سرحد کے پار ہوائے وطن میں بھی خانہ جنگی کے بادل تھے' بارود کا دھواں تھا اور خون کی بُو تھی۔ نفرت اور تعصب کی زہر آلودہ فضا تھی۔ اجنبی چہرے تھے اور اپنوں کی بدلی ہوئی نگاہیں تھیں۔ وہ پھر بھی واپس جا رہے تھے۔ خالی ہاتھ۔ اکیلے محض اپنے یقین اور ارادے کے ساتھ۔

میں نے کہا "ماماجی! یہ پہنچ جائیں گے مشرقی پاکستان"

ماماجی زبردستی مسکرائے "میاں! آدمی تو چاند پر پہنچ گیا ہے۔"

"ان کے پاس ٹکٹ کے پیسے بھی تھے؟"

"ہوں گے۔ یا نہیں ہوں گے۔ میں نے تو پوچھا نہیں" ماماجی بولے "پوچھنا بے کار ہی ہوتا۔ اصل چیز تو ہے نیت۔ باقی اللہ مسبب الاسباب ہے۔"

نازو آنکھیں ملتی باہر آئی "کیا بات ہے؟ صبح صبح منہ لٹکائے کیوں بیٹھے ہو؟"

میں نے کہا "منو میاں چلے گئے۔"

"کہاں چلے گئے؟" گل نے پیچھے سے آکے کہا۔

"واپس۔ مشرقی پاکستان۔"

نازو ہنس پڑی "کون سی فلائٹ ملی؟"

میں نے کہا "یہ ہماری اور تمہاری مجبوریاں ہیں فلائٹ یا ٹرین۔ بس یا کوئی بھی سواری' تیاری اور بندوبست۔ آزاد لوگ تو بس چل پڑتے ہیں۔ سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے۔ یہ بات آج دیکھی۔ اس کی عملی تفسیر۔"

رفتہ رفتہ محسن اور غالب بھی اٹھے اور انہیں بھی بڑی مشکل سے میری بات پر اعتبار آیا۔ پہلے سب یہی سمجھتے رہے کہ میں مذاق کر رہا ہوں۔ سب کے چہروں پر جذبات کا ایک ہی رنگ تھا۔ بے یقینی کا رنگ۔ کیا یوں بھی کوئی جاتا ہے! ایسے بھی کوئی جاتا ہے!

سب کے دل بجھ سے گئے تھے۔ کوئی ناشتا کرنے کے موڈ میں نہیں تھا لیکن ماماجی نے سب کو ڈانٹ لگائی۔

"ارے یہ کیا نحوست پھیلا رہے ہو تم سب مل کے۔ منو گیا ہے کام سے۔ کوئی دنیا سے تو نہیں چلا گیا۔ ایسی شکلیں تو کسی کو دفن کرکے واپس آنے والوں کی بھی نہیں ہوتیں۔ اس کی ہمت دیکھو اور اپنی کم ہمتی دیکھو۔ کھانا پینا چھوڑ دیا' ہنسنا بولنا چھوڑ دیا۔ ارے اچھا سوچو اس کے لئے۔ امید رکھو کہ پھر اس سے ملاقات ہو گی۔ منو تو ناامید نہیں تھا جس کے پاس امید رکھنے کے لئے کچھ نہ تھا" وہ کسی آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑے تھے اور ہم شرم سے سر جھکا کے سب سننے پر مجبور تھے۔

ماماجی کے ڈر سے سب نے ناشتا کیا اور خواہش نہ ہونے کے باوجود پیٹ بھر کے کھایا۔ آہستہ آہستہ ہماری مصنوعی بشاشت اور جھوٹی ہنسی میں حقیقت کا رنگ گہرا ہونے لگا۔ دکھ کے احساس کو ہم نے ایسے مٹا دیا تھا جیسے پنسل سے لکھی ہوئی عبارت کو ربڑ سے گھس کر مٹاتے ہیں۔ اس کا نقش ہلکا پڑ جاتا ہے اور دوسری عبارت کے نیچے دب جاتا ہے مگر ختم تو نہیں ہوتا۔ جب یوسف نے ہمارا میک اپ شروع کیا تو منو میاں کی عدم موجودگی کا خیال بھی ذہن سے ایسے ہی اوجھل ہو گیا۔

ساڑھے آٹھ بجے کسی نے دستک دی اور ماماجی نے دروازے پر جا کے ایک بنڈل وصول کیا۔

"لو بھئی' تمہاری وردیاں" انہوں نے بنڈل ہماری طرف اچھال دیا "دیکھ لو' سائز ٹھیک ہیں یا نہیں۔"

میں نے بنڈل کھول کر قلیوں کی تین پرانی اور میلی وردیاں نکالیں اور اندازے سے اپنے لئے ایک منتخب کی۔

"کیا آپ نے آرڈر پر بنوائی ہیں؟" میں نے کہا۔

"تمہارے سائز کے اعتبار سے منگوائی تھیں۔ تھوڑا بہت فرق تو ہو گا۔" ماماجی نے کہا۔

"یہ وردیاں کس کی ہیں؟" غالب نے کہا۔

"کسی کی ہوں۔ تمہیں کیا؟" ماماجی نے کہا۔

"یہ نہ ہو کہ ہم شکل قلیوں کے تین جوڑے کہیں اکٹھے ہو جائیں" محسن نے کہا۔

"یہ تینوں گاؤں گئے ہوئے ہیں" ماماجی نے کہا۔

"پھر وردیاں کیسے ملیں؟"

"بس کسی طرح مل ہی گئیں" ماماجی نے کہا۔

"انہیں پہچانتے تو ہوں گے دوسرے قلی؟"

"ہاں۔ لیکن تم ذرا احتیاط کرنا۔ ایک تو پلیٹ فارم پر مت جانا۔ کسی بھی پلیٹ فارم پر۔ زیادہ قلی وہیں ہوتے ہیں جہاں مسافر گاڑیاں آتی ہیں۔ وہاں پر کچھ فارغ بھی بیٹھے ہوتے ہیں۔ وہ آتے جاتے لوگوں کو دیکھتے رہتے ہیں۔ ایسے ہی کینٹین کی طرف مت جانا جہاں سب کھانا کھانے اور چائے پینے کے لئے آتے ہیں۔" ماماجی نے ہدایت دیتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا "مال گودام کی طرف تو جانا پڑے گا۔"

"ادھر جاؤ۔ لیکن بلا ضرورت کہیں مت بیٹھو۔ وہاں قلی سامان لادنے اور اتارنے میں مصروف رہتے ہیں اس لئے کوئی بھی کسی کی طرف نہیں دیکھتا۔ وردی سب کی ایک ہے اور قلی ہیں ہزاروں۔ صورت سے سب ایک دوسرے کو نہیں پہچانتے۔ اصل چیز ہے نمبر والا بیج۔ اس پر کسی کی نظر پڑنے کا امکان بہت ہی کم ہے۔ قلی کبھی دوسرے قلی کا نمبر نوٹ نہیں کرتا۔ اس بات کا امکان اور بھی کم ہے کہ کوئی نمبر دیکھے تو اسے یاد آجائے کہ یہ نمبر کس کا تھا۔ اس لئے تم نوے فیصد محفوظ ہو۔"

"یعنی دس فیصد خطرہ ہے پکڑے جانے کا؟"

"وہ تو میں نے کم بتایا۔ خطرہ ایک فیصد ہو یا پچاس فیصد' خطرہ ہی ہوتا ہے۔ تم اجنبی ہو' کبھی قلی نہیں رہے۔ ان کے طور طریقے اور قاعدے ضابطے کچھ نہیں جانتے۔ اس لئے جو کام کرنا ہے کم سے کم وقت میں دور رہ کے نمٹاؤ۔ اپنا چہرہ چھپانے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ کوئی ٹوکرا یا کریٹ اٹھالو۔ ریلوے کے ہر افسر سے بچو۔ خاص طور پر ریلوے پولیس سے۔"

"آپ بالکل پریشان نہ ہوں" میں نے کہا "اب صرف یہ بتادیں کہ وہ مال گاڑی کس جگہ سے روانہ ہو گی؟"

"ستائیس نمبر پلیٹ فارم سے" ماماجی نے کہا۔

"اور ان کا مال وہیں اتارا جائے گا؟"

"ہاں۔ پلیٹ فارم کے باہر گودام ہیں۔ لوڈ ہونے والا سب مال وہاں پہنچ چکا ہو گا" ماماجی نے کہا۔

گل اور نازو خاصی فکرمند نظر آرہی تھیں۔ میں نے انہیں تسلی دی "ہم دوپہر تک واپس آجائیں گے۔ گھبرانا مت۔"

"بقول فلمی شاعر۔ مری یاد میں تم نہ آنسو بہانا" غالب نے کہا۔

نازو نے کہا "تم اگر دوپہر تک نہ آئے تو......؟"

"بھئی کیوں نہیں آئیں گے" میں نے کہا۔

"اور دوپہر تک نہ آئے تو شام تک آجائیں گے" غالب نے کہا "اپنی مرضی کے مالک ہیں۔"

"شام تک بھی نہ آئے تو؟" گل نے کہا۔

محسن نے جھلا کے کہا "تو ڈھول لے کر باہر نکل جانا دونوں۔ گلی گلی چلانا۔ ہائے محسن۔ ہائے غالب۔ عجیب الٹی کھوپڑی ہے تمہاری۔ بابا' ہم کیسے وعدہ کر جائیں کہ بارہ بج کر ستائیس منٹ پر ضرور آجائیں گے۔"

"اتنی پابندی وقت کے ساتھ تو ہم ڈولی لے کر بھی حاضر نہیں ہوں گے" غالب نے کہا "دو چار گھنٹے انتظار کرنا پڑے گا۔"

"مگر حد ہوتی ہے انتظار کی بھی" نازو نے چلا کے کہا۔

"اچھا میں نہ آؤں تو قاضی سے کہنا' کسی سے بھی نکاح پڑھوا دے۔" غالب نے بھی چلا کے کہا اور فوراً میرے پیچھے آگیا۔ "قاضی کو ہی قبول کر لینا......"

نازو آگے بڑھی مگر میں نے ماماجی کی طرف اشارہ کرکے اسے روک دیا۔ ماماجی ناخوش ہونے کے باوجود منہ پھیر کر مسکرا رہے تھے۔ میں نے کہا "ہم کوشش کریں گے کہ جلد از جلد واپس

آجائیں۔ نہ آئیں تو جو تمہارا جی چاہے کرنا۔ ہم زیادہ دور نہیں جارہے ہیں۔ ہونگے اسی علاقے میں۔"

"اگر پکڑے نہ گئے" غالب نے کہا "اور لے جانے والے کہیں اور نہ لے گئے۔"

"ہم تلاش کرلیں گے" گل نے کہا۔

"تلاش خاک کروگی۔ دونوں پکڑی جاؤ گی اور جب ہم آئیں گے تو پتا چلے گا کہ آپ غائب ہیں۔ گھر میں بیٹھو آرام سے" محسن نے کہا۔

"ہم اکیلے کب تک انتظار کریں گے؟" گل نے کہا۔

"اور انتظار کرنے میں کیا ہمارے لئے کوئی پریشانی نہیں؟" نازو نے کہا۔

میں نے کہا "دیکھو ماماجی تمہارے پاس ہیں۔ اگر ہمارا سراغ لگانا ہوگا تو یہ کام بھی ماماجی تم دونوں سے بہتر طریقے پر کرسکتے ہیں۔ تمہیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں..."

"ہاں۔ عورت کا صحیح مقام گھر ہے۔ خبردار جو قدم باہر رکھا۔ ٹانگیں توڑدوں گا۔ بہت ہوا لگ گئی ہے باہر کی۔" غالب نے کہا اور فوراً باہر نکل گیا۔

میں اور محسن ہنستے ہوئے اس کے پیچھے گئے۔ باہر نکلتے ہوئے میں نے نازو کے چلانے کی آواز سنی "واپس تو آؤ گے نا۔ نہیں آئے تو دیکھنا..."

غالب دبے پاؤں واپس آگیا اور دروازے سے سر نکال کے بولا "یہ تو وہی بات ہے کہ جو بچے اسکول سے غیر حاضر ہیں وہ بینچ پر کھڑے ہوجائیں۔"

وہ قہقہہ مار کے دوڑا۔ نازو نے واقعی احمقانہ بات کی تھی لیکن اس حماقت کا تعلق اس کے جذبات سے تھا۔ غالب کی ہنسی نے اس کی خفت کو غصے میں بدل دیا۔ معلوم نہیں اس نے کیا چیز پھینک کرماری تھی۔ کوئی لوٹا تھا یا مگ جو شن سے دروازے پر لگا تھا۔ اس وقت تک غالب ہم سے بھی آگے نکل چکا تھا۔ اس کے ساتھ ہم بھی ہنس رہے تھے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو دروازے کے باہر کھڑے ماماجی مسکراتے ہوئے نازو کو اندر جانے کا کہہ رہے تھے۔

ریلوے لائنوں کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ہم مال گوداموں کی طرف بڑھتے گئے۔ میک اپ کے بعد ہمارے چہرے حیرت انگیز طور پر بدل گئے تھے۔ رہی سہی کسر قلی کی وردی نے پوری کردی تھی۔ اب مجھے پورا یقین تھا کہ ہمارے دشمن ہمیں بالکل شناخت نہیں کرسکتے۔

ریلوے گودام تقریباً ایک میل دور تھے اور وہاں سے آنے جانے والی ہر سڑک پر سیکڑوں ٹرک رواں تھے۔ یہ ٹرک بمبئی کی بندرگاہ پر اتارے جانے والے مال کو اندرون ملک لے جانے والی مال گاڑیوں تک لاتے تھے اور برآمد کے لئے مال گاڑیوں سے آنے والے مال کو بندرگاہ پہنچاتے تھے۔

پلیٹ فارم بہت دور دور تک، پھیلے ہوئے تھے اور ان کے درمیان لمبی لمبی مال گاڑیوں کے ہزاروں ڈبے کھڑے ہوئے تھے۔ قلیوں کا ایک جم غفیر تھا جو ان ٹرینوں کے درمیان پلیٹ فارموں پر، ہر گودام میں اور ریلوے لائنوں کے ساتھ نظر آرہا تھا۔ بوریاں اور کریٹ ڈھونے والے یہ مزدور کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ بوجھ اٹھا کے اپنی اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کرنے میں مصروف تھے۔ شاید کوئی خوش ہو کے انعام میں ایک روپیہ ہی زیادہ بخش دے یا انہیں نوکری کے لئے منتخب کرلے تو روزگار مستقل ہوجائے۔ مزدوری کا کیا ہے۔ کبھی ملی کبھی نہ ملی۔ اس کوشش میں وہ اپنا خون پسینہ ایک کررہے تھے۔ انہیں قطعی احساس نہیں تھا کہ وہ اپنے ساتھ کتنا ظلم کررہے ہیں۔ انسان تو پھر انسان ہے، مشین کو بھی احتیاط کے ساتھ استعمال نہ کیا جائے تو وہ جواب دے جاتی ہے... دو مشینوں کا کام ایک مشین نہیں کرسکتی مگر وہ دو مزدوروں کے برابر بوجھ اٹھا رہے تھے۔ صرف اس انعام کی امید میں جو خیرات کی طرح ملے گا۔ حق کے طور پر دگنی اجرت طلب کرنے کا ان میں حوصلہ نہ تھا۔

ہم ایک دوسرے سے فاصلہ رکھ کے چل رہے تھے لیکن ایک دوسرے کی نظر سے اوجھل نہیں تھے۔ اس افراتفری میں کسے فرصت تھی کہ ہماری طرف نظر اٹھا کے بھی دیکھتا۔ اچانک محسن نے ایک خالی کریٹ اٹھالیا جو کسی نے بے کار سمجھ کے پھینک دیا تھا یا بعد میں لے جانے کے لئے بینچ کے نیچے رکھ دیا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے بھی روپوشی کا خیال آیا۔ ایک پھول والے کی دکان پر بہت سے خالی ٹوکرے رکھے ہوئے تھے۔

"میں ایک ٹوکرا لے لوں؟" میں نے کہا۔

"پھوکٹ میں لے لوں" دکاندار میری طرف جھپٹا اور مجھ سے ٹوکرا چھین لیا "چار آنے نکال۔"

میں نے اسے جیب سے ایک روپیہ نکال کے دیا اور بارہ آنے واپس لے کر چل پڑا۔ یہ پچھتر پیسے تھے۔ عادت کے مطابق اب تک لوگ چار آنے اور آٹھ آنے ہی کہتے تھے۔ پچاس پیسے یا پچیس پیسے نہیں کہتے تھے۔

ٹوکرا میرے کندھے پر تھا اور اس سے مجھے کئی فائدے حاصل ہوئے تھے۔ میں زیادہ قلی نظر آنے لگا تھا۔ میرا چہرا ایک طرف سے چھپ گیا تھا اور مجھ پر دھوپ بھی نہیں پڑ رہی تھی۔ پھر چار آنے میں یہ تین فائدے غالب نے بھی حاصل کیے۔

ہم ایک گھنٹے تک ستائیس نمبر پلیٹ فارم تلاش کرتے رہے۔ اگر ہم کسی سے پوچھتے تو یہ بڑی غلط بات ہوتی۔ قلی سے زیادہ پلیٹ فارم کے بارے میں کون جانتا ہے۔ مشکل یہ تھی کہ پلیٹ فارم ترتیب میں نہیں تھے۔ دو نمبر کے بعد سات آگیا۔ پھر گیارہ اور اس کے بعد تین۔ پھر اچانک میں نے ستائیس نمبر دیکھا۔ وہاں ایک بہت لمبی مال گاڑی کھڑی ہوئی تھی اور پلیٹ فارم کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہر قسم کے سامان کا ڈھیر پڑا ہوا تھا۔

چند بوگیوں میں سامان رکھا جاچکا تھا اور انہیں ریلوے والے سیل کررہے تھے۔ کیا یہی وہ ٹرین ہوگی؟ میں نے سوچا۔ ابھی اٹھارہ انیس گھنٹے باقی تھے۔ ریلوے کا کوئی بابو ہی یہ بات بتا سکتا تھا کہ یہ کل صبح ساڑھے پانچ بجے جانے والی مال گاڑی ہے یا اس ٹرین کی روانگی کے بعد دوسری مال گاڑی آئے گی؟ آئے گی تو کب آئے گی؟ مگر میں یہ بات کسی سے پوچھ کے شک پیدا کرنا نہیں چاہتا تھا۔

میں نے خاموشی سے پلیٹ فارم پر اپنا سفر جاری رکھا اور ٹوکرے کی جالی میں سے ٹرین کی طرف دیکھتا رہا۔ سب سے پیچھے والی بوگی کا دروازہ بند تھا مگر مقفل نہیں تھا۔ مجھے وہاں کوئی ایسا چہرہ بھی دکھائی نہ دیا جس کا دلاور اور ترویدی کے ساتھ تعلق ثابت ہوتا۔ یہ محض ایک امکان تھا کہ شاید ٹرین کے ساتھ جانے والا کوئی ایسا شخص ہو جسے میں نے پہلے بھی ان کے ساتھ کبھی دیکھا ہو۔ اب آہستہ آہستہ میں پہلے ڈبے کی طرف جارہا تھا۔

آخری بوگی پلیٹ فارم سے باہر تھی۔ اس کے آگے ابھی کوئی انجن نہیں تھا۔ میں تھک چکا تھا اور مجھے پیاس بھی لگ رہی تھی۔ ایک واٹر کولر کا اسٹاپر دبا کے میں نے اوک سے پانی پیا اور پھر وہیں ستانے بیٹھ گیا۔ دراصل میں غالب اور محسن سے مشورہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ بھی گھوم پھر کے میری طرف ہی آرہے تھے۔

میرے آس پاس چند قلی ہاتھ سرہانے رکھے سو رہے تھے۔ میں ان سے کچھ فاصلے پر واٹر کولر کے پیچھے والی جالی سے ٹیک لگا کے بیٹھا مگر وہاں کولر سے خارج ہونے والی گرم ہوا آرہی تھی۔ میں سائیڈ پر آگیا۔ چند منٹ بعد غالب نے بھی پانی پیا اور بظاہر لاتعلقی کے ساتھ میرے قریب آبیٹھا۔

محسن کے آنے کے بعد میں نے کہا "یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔"

"مجھے بھی کوئی نظر نہیں آیا" غالب نے کہا۔

"لے یار، بیڑی پی" محسن نے کان پر لگی ہوئی بیڑی مجھے پیش کی۔ ایک قلی نے کروٹ بدلتے ہوئے ہمیں دیکھا اور پھر سو گیا۔

"اگر اس ٹرین پر سامان ہوتا تو آس پاس محافظ موجود ہوتے" غالب نے کہا۔

"میں نے سب سے پیچھے والی بوگی کو دیکھا تھا۔ اس میں تالا ہی نہیں تھا" میں نے کہا "وہ اسلحہ لوڈ کرانے کے بعد بوگی کو کھلا نہیں چھوڑ سکتے۔"

غالب نے مجھ سے اتفاق کیا "بوگیاں سیل کردی جائیں گی۔"

اسی وقت ہاتھ گاڑی پر نو کریٹ لادے ایک قلی عین ہمارے سامنے آکے رک گیا۔ اس نے بوگی کی بھاری کنڈی کھسکا کے کھولی تو اوپر اٹھ کے بند ہونے والا آہنی دروازہ تیز آواز کے ساتھ نیچے گرا۔ بوگی کے وسطی درمیانی حصے میں آٹھ فٹ لمبا اور چار فٹ چوڑا خلا نمودار ہوگیا۔ اس میں سے بوگی کے اندر کا نیم روشن حصہ نظر آتا تھا۔ قلی نے باری باری سب کریٹ اس راستے سے اندر کھسکائے اور پھر خود بھی اوپر چڑھ گیا۔ وہ کریٹ آگے لے جاکر ترتیب سے جمانے میں مصروف تھا۔

"یہ کریٹ زیادہ بھاری نہیں تھے۔" میں نے کہا۔

"میں بھی یہی دیکھ رہا تھا۔" محسن بولا "ان میں اسلحہ ہوتا تو یہ قلی انہیں اتنی آسانی سے اوپر نہیں چڑھا سکتا تھا۔"

"مجھے پہلے ہی شک تھا کہ یہ مال گاڑی پہلے جائے گی۔"

غالب نے کہا "شک کی کیا بات ہے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ ٹرین روانہ ہونے والی ہے۔"

"تم نے معلوم کیا تھا کسی سے؟"

"نہیں۔"

"پھر کیا ٹائم ٹیبل دیکھا تھا؟"

"نہیں۔"

"تو کیا الہام ہوا ہے؟" محسن نے جھلا کے پوچھا۔

"میں دیکھ رہا ہوں کہ ایک انجن اسی پٹری پر آرہا ہے۔ انجن لگنے کے بعد گاڑی کل صبح تک کھڑی نہیں رہ سکتی" غالب نے کہا۔

انجن نے پٹری بدلی اور ساتھ والی لائن پر ہوگیا۔

محسن نے غالب کو آڑے ہاتھوں لیا "شاید انجن پاگل ہوگیا ہے۔"

"غالباً انجن ڈرائیور کی نظر کمزور ہے۔ اسے سامنے کھڑی ہوئی مال گاڑی نظر نہیں آئی۔ نشانہ خطا ہوگیا" میں نے کہا۔

"وہ پھر کوشش کرے گا۔ ابھی واپس جائے گا اور دوسری دفعہ صراطِ مستقیم پر آئے گا۔"

غالب نے ایک ڈوری اٹھا کے کہا "اس کا اگلا حصہ کون سا ہے اور پچھلا کون سا؟"

"عموماً یہ سوال جلیبی کے بارے میں کیا جاتا ہے کہ وہ کہاں سے شروع ہوتی ہے اور کہاں ختم ہوتی ہے" محسن نے کہا۔

غالب نے ڈوری کے دونوں سرے تھما کے پکڑ لئے۔ "میری چھٹی حس کہتی ہے کہ تم سیدھے کو الٹا اور اول کو آخر سمجھ رہے ہو۔"

چند منٹ بعد مجھے اور محسن کو شرمندہ ہونا پڑا جب خاصے شور کے ساتھ مال گاڑی کے ڈبے آپس میں ٹکرا کے تھوڑا سا پیچھے ہوگئے۔ انجن اس کے دوسرے کنارے پر لگ گیا تھا۔ جسے ہم نے آخری بوگی فرض کیا تھا وہ پہلی ہوگئی تھی اور پہلی بوگی اب آخری تھی۔

جس قلی کی نیند خراب ہوئی تھی وہ اٹھ بیٹھا "کیا شور مچا رکھا ہے! سونے بھی نہیں دیتے" اس نے آنکھیں نکال کے کہا۔

"یہ بیڈ روم ہے تیرا" غالب نے بھی اکھڑ لہجے میں جواب دیا۔ "اور شور کم ہورہا ہے۔"

"تم کیوں بیٹھے ہو یہاں؟ مزدوری دیکھو کہیں جاکے"

"کیوں؟ یہاں مزدوری نہیں مل سکتی؟" غالب نے کہا۔
"یہ ٹرین تو جا رہی ہے" قلی بولا۔
"اس کے بعد دوسری جائے گی" غالب نے کہا۔
"وہ جائے گی کل صبح۔ پانچ بجے لگے گی" قلی نے کہا "تم کو باتیں کرنی ہیں تو کہیں اور جا کے کرو۔"
"تو کہیں اور جا کے سو جا" غالب اس سے ہار ماننے پر تیار نہیں تھا۔
"او میرے بھائی!" قلی ہاتھ جوڑ کے بولا "کل بھی میں نے رات بھر مزدوری کی۔ اس سے پہلے بھی ایک رات اور آج رات بھر ہم سب کی مصیبت ہے" اس نے باقی سونے والوں کی طرف اشارہ کرکے کہا۔
میں نے ہمدردی سے کہا "ارے یار' معاف کرنا۔ ہمیں معلوم نہیں تھا۔"
وہ میری ہمدردی سے متاثر ہوا "اسے تو بخار بھی ہو گیا ہے اور خود میری سب ہڈیاں درد کر رہی ہیں مگر مجبوری ہے۔"
"ہاں بھیا" میں نے کہا "مزدوری کا نام ہی مجبوری ہے۔ نہ کریں تو کیا کریں۔ کیا دن کو کام نہیں ملتا تمہیں؟"
محسن نے اسے بھی ایک بیڑی پیش کی "کیا رات کو بہت پیسہ ملتا ہے؟"
اس نے بیڑی لے کر کہا "مزدوری تو زیادہ دے رہے ہیں مگر ہمت بھی تو ہو آدمی میں۔ میں تو کل رات بھی سوچ رہا تھا کہ انکار کر دوں۔"
"تو کرو' زبردستی کون مزدوری کرا سکتا ہے؟"
اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "زبردست سب کچھ کرا سکتا ہے بھائی۔ اس نے کل رات بھی بڑا ظلم کیا اپنے ساتھ۔ رات بھی اس کی حالت خراب تھی۔ میں نے تو صبح بھی کہا تھا کہ آج تو مت جا مگر اس نے بات نہیں مانی میری۔ رات بھر کے سو روپے چھوڑنا بھی تو مشکل ہے۔"
"ایک رات کے سو روپے؟" میں نے سخت حیرانی کا اظہار کیا۔
"آج تو دو سو کی امید ہے" وہ بولا "سو روپے انعام کے بھی ملیں گے۔ لیکن یہ کیسے جائے گا بچارا؟ میں تو خیر مر کے بھی کچھ کر لوں گا۔"
اس نے اپنے سوئے ہوئے ساتھی کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کے دیکھا اور افسردہ ہو گیا "بہت تیز بخار ہے۔"
"تو اسے اسپتال کیوں نہیں لے جاتا۔"
"کون سے اسپتال؟" وہ بولا "سرکاری اسپتال؟ [illegible] ملے گا وہاں سے؟ لال پانی۔"
"تو کسی ڈاکٹر کے پاس لے جا۔ دو دن میں اس نے دو سو کمائے ہیں" میں نے کہا۔

قلی دکھ سے سہلانے لگا "ڈاکٹر پیسے لے گا۔ دس روپے کم ہو جائیں گے۔ یہ چار سو پورے کرنا چاہتا ہے۔"
میں نے کہا "کیا کسی کا قرض ادا کرنا ہے؟"
"ہاں۔ بیٹی کی شادی کے لئے سود خور مہاجن سے پانچ سو لئے تھے۔ ہر مہینے پچاس روپے بیاج کے دیتا ہے۔ اصل رقم اتنی کی اتنی ہے۔ بیٹی تو سکھی ہے اپنے گھر میں مگر باپ کو دیکھو۔ بڑی مشکل ہے بچارے کے لئے۔ بیاج نہ دے تو مہاجن گردن پکڑ لیتا ہے۔ یہ موقع دیا ہے بھگوان نے تو چار سو اکٹھے مل گئے ہیں۔ ہم نے کہا کہ چل یار' سو ہم سے لے لینا۔ تیری جان چھٹ جائے گی اس قرض کے عذاب سے۔"
جو پہلے میری دلچسپی تھی وہ اب ہمدردی میں بدل گئی تھی۔ میں نے کہا "تم لوگ اچھے یار ہو۔ مل کے سارا قرض ادا نہیں کر سکتے؟ ایسے تو یہ مر جائے گا......"
"یہ نہیں مر سکتا بھائی" قلی نے میری بات کاٹ دی "جس پر قرضہ ہو اسے کون مرنے دیتا ہے۔ پھر بھی مر گیا تو قرضہ وصول کرنے والے بیٹی کے گھر پہنچ جائیں گے۔ جنوائی کو پکڑ لیں گے۔ ہم اس سے زیادہ نہیں کر سکتے۔ آخر ہمارے بھی بچے ہیں۔"
"آج رات کوئی اور اس کی جگہ مزدوری کرنے چلا جائے' یہ نہ ہو سکتا ہے؟" میں نے کہا۔
"نہ۔ وہ نہ مانیں گے۔"
"کون نہیں مانے گا؟" میں نے کہا۔
"جن کا کام ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ سارا کام اب تم کرو گے۔ کسی اور کو مت لانا۔"
"ایسا کیا کام ہے؟" محسن نے کہا۔
"کام تو مزدوری کا ہے۔ پرسوں رات ایک گودام سے مال ٹرک پر لادا تھا۔ کل رات یہاں اتارا۔ آج رات مال گاڑی پر لادنا ہے" قلی نے کہا۔
میں نے کہا "یار' چائے پیو گے؟" اور اس کے سرہلانے سے پہلے ایک چھوکرے کو آواز لگائی "اے باہر والا!"
چھوکرا آواز پر لپکا اور تار کے ایک ہینگر میں لٹکے ہوئے چائے کے گلاسوں میں سے چار ہمارے سامنے رکھ گیا۔ مجھے اب سو روپے رات کی اس مزدوری کے پیچھے گڑبڑ محسوس ہو رہی تھی اور میں قلی کے دل میں شک پیدا کئے بغیر اس معاملے کی تہ تک پہنچنا چاہتا تھا۔ چائے کی پیشکش دوستانہ رشتوں کی تمہید تھی۔
"تم نئے آئے ہو کیا؟" قلی نے دوستانہ تعلقات استوار ہو جانے کے بعد کہا۔
"ہاں۔ نیا ہی سمجھو یہاں" میں نے گول مول بات کی۔
"پہلے کہاں تھے؟" وہ سڑپ سڑپ کرکے چائے پینے لگا۔
"پونا میں۔ اُدھر پھڈا ہو گیا تھا۔ اپن کو ماماجی نے ادھر بلا لیا" غالب بولا۔

ماماجی کے حوالے کے بعد کسی شک وشبہے کی گنجائش نہ رہی تھی "رہنے والے کہاں کے ہو۔ دلی کے؟"
میں نے کہا "تم نے کیسے جانا؟"
"زبان سے۔ میں غازی آباد کا ہوں" وہ بولا۔
میں نے محسن اور غالب کا تعارف کرایا "یہ بھی میرے ساتھ ہی آئے تھے۔ یہ مراد نگر کا ہے۔ یہ میرٹھ کا۔"
"ایک ساتھ آئے تھے۔ کس چکر میں؟" وہ ہنسا۔
"چکر مت پوچھو" محسن نے کہا۔
"فلموں میں کام کرنے آئے ہو گے۔ دلی سے بمبئی اور کس لئے آتا ہے آدمی۔"
"مطلب یہ کہ تم بھی آئے تھے ہیرو بننے مگر بن گئے قلی" میں نے کہا "ہماری طرح۔"
"اسی کو کہتے ہیں تقدیر" غالب نے آہ بھری۔
میں نے کہا "کیا تم انہیں جانتے ہو؟"
"کس کو؟"
"جہاں تم مزدوری کر رہے ہو؟"
اس نے نفی میں سر ہلایا "نام تو نہیں معلوم۔"
"پھر تم کو کیسے موقع مل گیا؟"
"ایک آدمی آیا تھا ادھر۔ اس نے کہا' رات کو کام کرنے کا ہے۔ سو روپیہ روز ملے گا۔ ہم نے کہا کہ پہلے کام بتاؤ۔ بمبئی میں بہت لفڑا ہے۔ سو روپیہ دے کر کوئی بولے کہ رات بھر......"
جو بات اس نے کہی وہ یہاں بیان نہیں کی جا سکتی۔
میں نے ہنس کے کہا "پھر؟"
"اس نے کہا کہ بابا لوڈنگ کا کام ہے۔ وہ ہم تینوں کو لے گیا گودام۔"
"گودام کہاں تھا؟"
"پتا نہیں کہاں تھا۔ ہم تو موٹر میں بیٹھ کے گئے تھے اس کی" قلی نے کہا "وہ راستے میں سمجھاتا رہا کہ اس کام کے بارے میں ہم کسی کو کچھ نہ بتائیں۔"
"مگر تم تو بتا رہے ہو" میں نے کہا۔
وہ ہنسنے لگا "تم اچھے آدمی ہو۔ دل میں درد ہے تمہارے ورنہ کون کسی کی جگہ بیگار قبول کرتا ہے۔"
باہر والا چائے کے خالی گلاس اٹھانے کے لئے آیا تو میں نے کہا "چار چائے اور لا۔ اور بسکٹ بھی۔"
غالب نے کہا "ہم تو رہنے والے بھی ایک ہی جگہ کے ہیں۔"
"ہاں۔ دلی۔ پھر غازی آباد۔ مراد نگر اور میرٹھ" وہ بولا۔
میں نے کہا "پھر تم نے رات بھر لوڈنگ کی؟"
"ہاں۔ بڑے بھاری بکس تھے۔ لگتا تھا سب میں لوہا بھرا ہوا ہے۔ مگر وہ بار بار کہتے تھے آہستہ اٹھاؤ۔ جیسے اندر شیشہ ہے کہ ٹوٹ جائے گا۔ لکڑی کے بکس تھے مگر وہ ایسے رکھواتے تھے جیسے مٹی کے ہوں۔ دھیرے دھیرے۔ نزاکت سے۔ بار بار بولتے تھے کہ خبردار کوئی پیٹی نہ گرے۔ سنبھل کر چلو۔ احتیاط سے اٹھاؤ۔ پتا نہیں کیا تھا ان میں۔ پوری رات لگ گئی اپنی تو۔ صبح وہ موٹر گاڑی میں یہاں چھوڑ گیا اور سو سو روپے دے گیا۔ ساتھ ہی کہہ گیا کہ رات کو اسی جگہ ملنا۔"
"واہ بھئی۔ عیش ہو گئی تیری تو" میں نے بے تکلفی سے کہا۔ "موٹر میں گئے تھے مزدوری کرنے۔ کیسی موٹر تھی؟"
"بڑی شاندار" وہ خوش ہو کے بولا "کالے رنگ کی یہ لمبی سی۔ اندر سے بالکل ٹھنڈی۔ لگتا تھا سڑک پر نہیں چل رہی' [illegible] تیر رہی ہے۔ گانے لگے ہوئے تھے۔"
"دوسری رات بھی وہی موٹر آئی تھی؟" غالب نے یوں پوچھا جیسے وہ رشک میں مبتلا ہو گیا ہے۔
"ہاں۔ وہی موٹر تھی۔ وہی ڈرائیور۔ بڑا اچھا آدمی تھا۔ سگریٹ بھی پلائی اس نے راستے میں۔ کل رات مال اتارنا تھا اس لئے دیر نہیں لگی۔"
میں نے بے وقوفوں کی طرح سر کھجا کے کہا "یار' یہ بات اپنی سمجھ میں نہیں آئی۔"
"کون سی بات؟"
"ایک رات میں مال چڑھایا۔ دوسری رات میں اتار لیا۔"
وہ ہنسنے لگا "اے چڑھایا تھا کسی کوٹھی میں۔ اتارا یہاں اپنے گودام میں" اس نے باہر کی طرف اشارہ کیا۔
میں کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر میں نے کہا "یار! اس رات جب کوٹھی میں ٹرک لوڈ ہو گئے تھے تو وہ گودام کے لئے روانہ کیوں نہیں ہوئے؟ اگلی رات پہنچے گودام۔"
"یار' اب یہ ہمارا کام تو نہیں ہے نا۔ خواہ مخواہ کی باتیں پوچھنے سے فائدہ؟ اپنا کام کیا' پیسے لئے' موٹر میں بیٹھے اور واپس۔ لیکن آج تو بھیا یہی بات ہے کہ سو روپے بڑے مشکل لگ رہے ہیں۔"
"بہت نہیں ہے؟" میں نے کہا۔
"ہاں یار۔ اور آج کام بھی زیادہ ہے۔ گودام سے مال گاڑی تک لانا اور چڑھانا۔ ڈبل [illegible] ہو گیا۔"
"ڈبل اُجرت [illegible] تو ملے گی۔"
اس نے پھر اپنے ساتھی کی طرف دیکھا "اجرت تو وہی ہے۔ ہاں انعام کی امید ہے۔ لیکن انعام کا کیا بھروسہ۔ ان کی نیت بدل جائے' مزدوری دے کر کہیں بھاگ جاؤ۔"
میں نے کہا "یار' ایک بات کہوں؟ تم ہو اپنے شہر کے۔ غلط مت سمجھنا۔"
باہر والا چائے اور بسکٹ رکھ کے غائب ہو چکا تھا۔ اس نے بسکٹ کھاتے ہوئے کہا "کہہ یار۔"
میں نے کہا "آج کی اجرت تم ابھی لے لو ہم سے۔ تمہاری جگہ ہم چلے جاتے ہیں۔"

اس نے مجھے غور سے دیکھا "یہ کوئی چکّر والی بات ہے؟"

میں نے جلدی سے کہا "کوئی چکّر والی بات نہیں۔"

"اگر وہ رات کو نہ آیا۔ پھر؟ تمہارے پیسے کیا فالتو کے ہیں!"

"وہ نہ آیا...... تو تم واپس نہیں کرو گے؟"

وہ مجھے انتہائی سادہ دل یا بے وقوف سمجھنے پر مجبور تھا "آپ آج ہم ملے ہیں۔ کل کی کسے خبر۔ کہاں ڈھونڈو گے تم ہمیں اور ہم نے پہچاننے سے انکار کر دیا تمہیں۔ پھر؟ یا ہم نے خرچ کر دئے پھر؟"

"تم ایسا نہیں کر سکتے۔"

وہ ہنسنے لگا "نئے ہو نا بمبئی میں' اس لئے بھروسہ کر رہے ہو۔ پیارے' بمبئی میں سب کچھ ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے۔ ایسے ایسے چکّر باز پڑے ہیں یہاں۔ ابھی واسطہ نہیں پڑا تمہارا۔"

میں نے کہا "چلو ہمارا تمہارا حساب برابر۔ مل گئے تو ہماری قسمت۔ نہ ملے تو تم پر کوئی قرض نہیں۔ جب ہوں تب دے دینا۔ چھ سو ہم تینوں سے لے لو اور آج ہمیں جانے دو۔"

وہ شک میں مبتلا ہو گیا تھا جو ایک قدرتی بات تھی۔ اس نے ہمیں پہلی دفعہ دیکھا تھا اور ہمارے بارے میں وہ کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ ایک قلی دوسرے قلی کو اپنے بارے میں کوئی بات غلط نہیں بتاتا۔ بتاتا ہے تو وہ غلط آدمی ہوتا ہے یا اس کے مقاصد غلط ہوتے ہیں۔ آہستہ آہستہ اس کی سمجھ میں یہ آ رہا تھا کہ ہم نے بھی اس سے دوستی کا رشتہ استوار کیا تھا تو اس کے پیچھے کوئی غرض مندی کا جذبہ تھا۔ یہ ملاقات اتفاقیہ نہیں تھی اور نہ ہمارا حسنِ سلوک بے سبب تھا۔ قلی کی زندگی کیا ہوتی ہے اور مالی طور پر وہ کتنا آسودہ ہوتا ہے' یہ وہ بھی جانتا تھا اور اس نے ہمیں بھی بتا دیا تھا۔ ہمدرد دل وہ بھی رکھتا تھا مگر دوستی کے رشتے کا بھرم رکھنے کے لئے وہ پچاس روپے سے زیادہ قربان نہیں کر سکتا تھا۔ ہم جیسے حاتم طائی کی قبر پر لات مارنے والے اس نے کہاں دیکھے ہوں گے جو چھ سو روپے پھینک دیں اور کہیں کہ جاؤ اپنے مسائل حل کرو۔ جیسے ہمارے لئے اپنے کوئی مسائل نہیں۔ پھر نہ ضمانت نہ واپسی کی شرط۔ ایسے سخی کیا قلی ہوتے ہیں!

میں نے اس کے تذبذب کو سمجھ لیا تھا "کیا بات ہے؟" میں نے کہا "کس سوچ میں پڑ گئے؟"

وہ چونکا "کچھ نہیں۔"

"پھر میری بات کا جواب کیوں نہیں دیا؟"

"وہ..... شاید یہ نہیں ہو سکتا۔ جو تم چاہتے ہو۔"

"تم چاہتے ہو یا نہیں؟" محسن نے کہا۔

"میرے چاہنے کی بات نہیں۔ وہ.... انہوں نے کہا تھا کہ کسی سے ذکر مت کرنا..... وہ تمہیں..... ہو سکتا ہے وہ تم پر اعتبار نہ کریں۔"

"تم کہہ سکتے ہو کہ ہم بھروسے کے آدمی ہیں۔ اپنا بھائی بتا سکتے ہو" غالب بولا۔

"بھائی..... میں..... کچھ نہیں کہہ سکتا۔ وہ کہیں گے کہ تم خود کیوں نہیں چلتے" وہ گھبرا کے بولا۔

"اچھا تم کچھ مت کہنا۔ تم غائب ہو جاؤ۔ صرف اسے چھوڑ جاؤ جو بخار میں مبتلا ہے۔ یہ بتا دے گا کہ تم سب بیمار پڑ گئے ہو۔ کیوں کہ تم نے دو راتیں جاگ کر گزاری تھیں اور دن میں بھی مزدوری کرتے رہے تھے۔ آرام نہیں کیا تھا۔ ہر شخص بیمار ہو سکتا ہے' اگر وہ دو دن اور دو راتیں اتنی سخت محنت کا کام کرے۔ اس میں نہ ماننے والی کوئی بات نہیں......"

"ایک بات کہوں؟" اس نے میری بات کاٹ دی۔

"ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟ کہو۔"

"میرا خیال ہے تم قلی نہیں ہو" وہ بولا۔

میں نے غالب اور محسن کی طرف دیکھا "تو پھر ہم کون ہیں؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ لیکن تمہارا مقصد کسی کی مدد کرنا معلوم نہیں ہوتا۔ تم کچھ اور چاہتے ہو" اس نے بات ختم کرنے کے انداز میں کہا اور اٹھنے لگا "مجھے معاف کرو۔"

اب میرے لئے زبردستی کے سوا چارہ نہ رہا۔ میں نے اسے ہاتھ پکڑ کے بٹھا لیا "تم سمجھ دار آدمی ہو' اس لئے اب جو کچھ میں بتانے والا ہوں۔ وہ غور سے سنو۔ تمہارا اندازہ بالکل درست تھا۔ ہم واقعی قلی نہیں ہیں۔"

"وہ سب جھوٹ تھا جو تم نے کہا؟" اس نے پریشانی سے ہم سب کی طرف دیکھا "نہ تم میرٹھ کے ہو' نہ تم غازی آباد کے اور نہ مراد نگر کے....."

میں نے اعتراف کے طور پر سر ہلایا "ہم پولیس کے آدمی ہیں"

اس کا رنگ اڑ گیا "پولیس....." اس نے بڑی مشکل سے کہا۔

"گھبراؤ نہیں۔ تم نے کوئی جرم نہیں کیا" میں نے اسے تسلی دی "ہم چند مجرموں کی نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ وہ سونے کی اسمگلنگ کرتے ہیں...."

"سونے کی اسمگلنگ......" اس کے حلق سے مری مری آواز نکلی۔

"ہاں۔ ان صندوقوں میں سونا تھا' اس لئے وہ اتنے بھاری تھے" میں نے کہا "وہ سیاہ کیڈلک کار تھی جس میں تم کو لے جایا گیا تھا۔ اس کا مالک بمبئی کا ایک مشہور سیٹھ ہے جو پہلے دادا گیری کرتا تھا۔ تریونی کا نام سنا ہے کبھی؟"

وہ تقریباً اچھل پڑا "سیٹھ تریونی۔ نہیں جناب۔"

میں نے سنجیدہ ہو کے کہا "نہیں کا کیا مطلب ہے؟ ہم تو اس کار کا نمبر بھی بتا سکتے ہیں۔"

حقیقت یہ ہے کہ مجھے کار کا نمبر یاد نہیں تھا مگر محسن نے اس وقت خوب مدد کی۔ اس نے کار کا نمبر بتا دیا۔

"یہی نمبر تھا نا؟ تم نے دیکھا بھی تھا" محسن بولا۔

اس کے لئے اقرار میں سر ہلانے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا

"آپ دیکھ رہے تھے...."

میں نے فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا "ہم تو بہت دن سے دیکھ رہے تھے۔ سو دن چور کے پورے ہو گئے۔ ایک دن کوتوال کا آج آگیا ہے۔ اب تم نے قانون کی مدد نہ کی تو خود بھی مجرم بن جاؤ گے۔"

"ہم قلی ہیں مائی باپ۔ مزدوری کے سوا کیا کر سکتے ہیں۔ جو پیسہ دیتا ہے اس کی صورت پر تو نہیں لکھا ہوتا کہ وہ کون ہے" اس کا لہجہ ایک دم وہی ہو گیا جو کسی بھی غریب کا تھانے دار کے سامنے خود بخود ہو جاتا ہے۔ مجھے اس پر ترس آیا۔ وہ میرے ملک کے ان لاکھوں محکوم و مجبور اور مظلوم انسانوں میں شامل تھا جو جبر و استبداد کی چکّی میں دن رات پستے چلے آئے ہیں۔ آباواجداد کے زمانے سے غلامی اور غریبی پر قانع ہیں اور اتنی ہمت نہیں رکھتے کہ کسی زبردست کے سامنے سر اٹھا کے بات کریں۔ بدمعاش سے تو بہت ہی ڈرتے ہیں۔ وہ پولیس والے سے یہ بھی نہیں پوچھ سکتے کہ تم قانون کے نمائندے ہو تو اپنی شناخت کا ثبوت پیش کرو۔ کیوں کہ پولیس بھی ایسے توہین آمیز سوال پر مشتعل ہو جائے تو ان کے لئے جینا مشکل کر دے۔

میں نے اس کے کندھے پر دوستانہ انداز میں ہاتھ رکھا "فکر مت کرو۔ نہ تمہارا نام کہیں آئے گا نہ کوئی تم سے کچھ پوچھے گا۔ ان سے ہم نمٹ لیں گے" میں نے بہتر سمجھا کہ اسے ریوالور کی ایک جھلک دکھا دوں تاکہ اسے میرے پولیس آفیسر ہونے کا یقین آجائے۔ کسی قلی کے پاس ریوالور کا ہونا اتنا ہی ناممکن تھا جتنا غریب کی جھونپڑی میں ہاتھی کا ہونا۔

"جناب عالی......وہ...... کہیں بعد میں ہماری شامت نہ آجائے" وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔

میں نے کہا "دیکھو ایک بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ ایسے لوگ جرم کے گواہ کو نہیں چھوڑتے۔ تم نے تو کچھ بھی نہیں دیکھا۔ تم سے انہیں کوئی خطرہ نہیں۔ وہ پہلے بھی مال لاتے لے جاتے رہے ہیں اور اسی طرح قلی پکڑتے رہے ہیں۔ تم میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ تم نہ ملتے تو وہ کسی اور کو موٹر میں بٹھا کر لے جاتے۔ ہاں پیسہ دے کر وہ اتنا اطمینان ضرور حاصل کر لیتے ہیں کہ قلی کسی سے بھی کوئی بات نہ کہے۔ قلی اس لئے خاموش رہنا پسند کرتے ہیں کہ اس مزدوری میں سے بھتّہ نہ دینا پڑ جائے۔ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ تم نے تین دن میں چار سو روپے کمائے ہیں تو کیا تمہیں بھتّہ نہیں دینا پڑے گا؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ اس کی حالت میں ایک افسوس ناک انقلاب آچکا تھا۔ اس کا دوستانہ رویہ اور پُراعتماد انداز رخصت ہو چکے تھے۔ وہ ناکردہ جرم میں پکڑے جانے والے کی طرح بدحواس تھا۔

میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کے نوٹ نکالے "ہم نہیں چاہتے کہ تمہارا کوئی نقصان ہو۔ اس لئے یہ رکھو۔"

"نہیں حضور" وہ ہاتھ پیچھے ہٹانے لگا۔

"بے وقوف مت بنو۔ یہ پولیس کی مدد کرنے کا معاوضہ ہے۔" میں نے کہا "کیا تمہیں پیسے کی ضرورت نہیں؟ تمہارے اس دوست کو علاج کے علاوہ اپنا قرض ادا کرنا ہے۔ چلو رکھو یہ اپنے پاس۔"

اس نے نوٹ یوں لئے جیسے کسی کو یقین ہو کہ بجلی کے تار میں کرنٹ ہے مگر وہ اسے چھو کر دیکھنے پر مجبور ہو۔

"یہ...... یہ تو پندرہ سو روپے ہیں" وہ بوکھلا گیا۔

"ہاں۔ تینوں کے پانچ پانچ سو" میں نے کہا "اب انہیں فوراً جیب میں ڈال لو ورنہ کوئی دیکھ لے گا۔"

"بھگوان خیر کریں۔ آج تک سنا نہیں' پولیس نے کسی کو اپنے کام کے لئے کچھ دیا ہو۔"

"ہم وہ پولیس والے نہیں ہیں۔ نارکوٹکس کنٹرول بورڈ کے لوگ ہیں" میں نے کہا۔

وہ حیرت سے میرا منہ تکنے لگا۔

اسے سمجھانے کے لئے میں نے کہا "سیٹھ تریونی ایسے ہی سیٹھ بنا ہے۔ یہاں سے ہیروئن بھیجتا ہے' باہر سے سونا منگواتا ہے۔ اب سمجھ میں آئی بات؟ میں اپنی جیب سے کچھ نہیں دے رہا ہوں۔ انہی جیسے لوگوں کا مال ہے۔ اب تم اپنے ساتھی کے لئے کسی ڈاکٹر کا انتظام کرو۔ پچاس روپے میں ڈاکٹر اسے یہاں آکے بھی دیکھ سکتا ہے۔ اسے سب سمجھا دینا۔ ہم رات کو پھر آئیں گے"

اس نے ہمت کر کے کہا "سرکار! اس کو جانے دیں' گھر میں خود آجاؤں گا رات کو۔"

غالب نے کہا "ابھی تم کہہ رہے تھے کہ وہ نہیں مانیں گے"

"اس کی جگہ میں لیٹ جاؤں گا جناب بیمار بن کے۔ اس سے تو بات بھی نہیں ہو گی۔"

"اور تمہارا تیسرا ساتھی؟" میں نے رضامندی ظاہر کرنے کے لئے سر ہلایا۔

"وہ پیدائشی گونگا ہے۔ مگر میں اسے سمجھا دوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ جیسے چاہو کرو۔ بس ایک بات مت بھولنا۔ کہ اتنے بڑے مجرم پولیس کو دھوکا نہیں دے سکے تو تم کیا ہو۔"

وہ کانوں کو ہاتھ لگا کے بولا "توبہ میرے باپ کی جو میں کسی کو کچھ بتاؤں۔ لیکن مجھے تھوڑا سا جھوٹ بولنا پڑے گا۔"

"جھوٹ؟ کس سے؟" محسن نے کہا۔

"اپنے دوستوں سے۔ میں ان کو پانچ سو نہیں دے سکتا۔ یہ شک میں پڑ جائیں گے۔"

"پھر کیا کرو گے؟" غالب بولا۔

"میں ان کو دو دو سو روپے دوں گا اور کہوں گا کہ وہ موٹر والا

آیا تھا۔ انعام دے گیا ہے اور بتا گیا ہے کہ آج رات کوئی کام نہیں اس لئے وہ نہیں آئے گا۔ ہم انتظار نہ کریں۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "یہ پالیسی بالکل ٹھیک ہے۔"

"گویا تم گیارہ سو رکھو گے۔ خیر رکھو۔ ہمیں کیا۔ مگر دیکھو' اس کا قرضہ ضرور ادا ہونا چاہئے" میں نے کہا۔

اس نے اطمینان کا سانس لیا "اسے میں اوپر سے سو دے دوں گا۔ آپ کہیں گے تو ...دو سو دے دوں گا۔"

وہ اب لالچ کے جال میں پھنس گیا تھا۔ دوستی کے جذبات پر دولت کی مقناطیسی قوت غالب آگئی تھی۔ اس کے لئے ہزار یا نو سو بھی ایک خزانے سے کم نہیں تھے چناں چہ اس کا خوف بھی دور ہوگیا تھا اور وہ تعاون کے لئے پوری طرح تیار تھا۔

"ہم رات کے آٹھ بجے آئیں گے" میں نے کہا۔

"وہ کس وقت آیا تھا کل؟" غالب نے کہا۔

"نو بجے کے بعد" وہ بولا "آپ نے تو دیکھا ہوگا؟"

"ہاں۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ تم جھوٹ تو نہیں بولتے ہو۔" غالب نے فوراً اپنی غلطی محسوس کرلی۔

"ممکن ہے ہم پہلے ہی آجائیں۔ تمہارا نمبر ہے سات سو بیس۔ ان کے نمبر بتاؤ؟" میں نے کہا۔

"یہ آٹھ سو بائیس ہے" اس نے بیمار کے بیج کو سامنے نمایاں کرکے کہا۔

بیمار نے آنکھیں کھول کے دیکھا اور بولا "کیا ہے؟؟"

اس کے تیسرے ساتھی کا بیج ویسے ہی نظر آرہا تھا۔ اس کا نمبر گیارہ سو چوبیس تھا۔

"پانی ....پانی لادے مجھے" بیمار قلی نے کراہتے ہوئے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری "میرا آخری سمے آگیا...."

"میں ابھی تجھے ڈاکٹر کے پاس لے کر چلتا ہوں" نمبر سات سو بیس نے کہا۔

وہ کراہا۔ "میں مرنے والا ہوں۔ پانی دے دے تھوڑا سا۔"

"ارے تو جئے گا سو سال تک" سات سو بیس نے کہا۔

ہم نے اپنے اپنے ٹوکرے اٹھائے اور کہا "اچھا یار' ہم چلیں۔ اب کچھ مزدوری کرلیں۔ رام رام۔"

اس نے ہاتھ جوڑ کے پرنام کیا۔ واپس جانے کے بجائے ہم نے وہیں سے ریلوے لائن کے ساتھ چلنا شروع کیا۔ ہمارے سیدھے ہاتھ پر ایک جنگلا تھا جو باہر کی سڑک کو ریلوے بارڈر سے الگ کرتا تھا۔ اس کا ایک حصہ توڑ کے باہر نکلنے کا راستہ بنالیا گیا تھا۔

ہم بھی جنگلے کے درمیان سے گزر گئے اور کسی گیٹ سے داخل ہونے کے بجائے اس چور دروازے سے براہِ راست مال گوداموں کے علاقے میں پہنچ گئے۔ یہاں شور سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ہر گودام آر سی سی کی بہت بڑی بیرک تھا جو کسی ہوائی اڈے پر بنے ہوئے جہازوں کے ہینگر کی طرح نظر آتی تھی۔ ان کے دیو پیکر فولادی گیٹ کھلے ہوئے تھے اور گیٹ کے سامنے والے پلیٹ فارم پر ٹرک یوں کھڑے ہوئے تھے کہ ان کا رخ مخالف سمت میں تھا اور پیچھے کا کھلا حصہ پلیٹ فارم کے برابر آیا تھا۔ ہر گودام کے سامنے یہ ٹرک آپس میں تقریباً ملے ہوئے کھڑے تھے اور گودام سے ٹرک تک سامان لانے یا ٹرک سے سامان اتار کے گودام میں پہنچانے والے مزدور کمر پر بوجھ اٹھائے وزن سے دہرے ہوئے تیز تیز قدموں سے مسلسل پھیرے لگا رہے تھے۔ سامان بک کرانے والے اور سامان چھڑانے والے مختلف کھڑکیوں کے سامنے جمع تھے اور ان کی مشکل کو آسان کرنے والے ایجنٹ بہت مستعد تھے۔

گودام کی دیوار کے سائے میں اس وقت بھی بہت سے لوگ سوئے ہوئے تھے۔ بمبئی میں سونے کی جگہ بھی اتنی مشکل سے ملتی ہے جتنی مشکل سے سونے کے لئے وقت ملتا ہے' چناں چہ لوگ شفٹوں میں کام کرتے ہیں اور شفٹوں میں سوتے ہیں۔ یہ رات کی شفٹ میں کام کرنے والے تھے جو اس وقت زمانے بھر کے شور و غل سے بے نیاز گہری نیند میں کھوئے ہوئے تھے۔ جب دن کی شفٹ والے کام سے فراغت پا کے لوٹیں گے تو یہ ان کے لئے جگہ خالی کردیں گے اور خود فکر روزگار کے لئے نکل کھڑے ہوں گے۔

ہم ایک بینچ کے پیچھے جمع ہوئے۔ بینچ پر بھی کوئی سو رہا تھا اور اس کے نیچے کی سایہ دار جگہ پر بھی۔ ہمارے سامنے مختصرے باغیچے میں درجن بھر افراد چادریں تانے ایک قطار میں لیٹے ہوئے تھے۔

دوپہر کے ساڑھے بارہ بج چکے تھے اور ہم اپنے حق میں ایک اہم کامیابی کے لئے راستہ ہموار کرچکے تھے۔ قلی نمبر سات سو بیس کا ملنا ایک ایسا اتفاق تھا جسے ہم تائید ایزدی سے منسوب کرسکتے تھے۔

"میرا دل چائے پینے کو چاہتا ہے۔" محسن نے کہا۔

"دوبار چائے پینے کے بعد بھی؟" غالب نے کہا۔

"وہ کوئی چائے تھی؟"

"یہاں ایسی ہی چائے ملے گی۔ اسپیشل انٹرنیشنل ریلوے اسٹیشن برانڈ" میں نے کہا۔

"ماماجی نے کیا کہا تھا۔ کسی کینٹین میں مت جانا" غالب نے یاد دلایا "یہ کمسچر پینا ہے تو باہر والا چھوکرا حاضر ہے۔"

میں نے کہا "اس کمسچر کی سپر کوالٹی دودھ پتی کہلاتی ہے۔ چائے تو وہ بھی نہیں ہوتی مگر لذت میں وہ گرم مشروب بہتر ہوتا ہے"

غالب نے چلّا کے کہا "اوئے باہر والا! تین دودھ پتی اسپیشل۔ ایک دم کڑک۔ جلدی۔"

باہر والا' بمبئی میں ہر جگہ پائی جانے والی مخلوق ہے۔ جہاں لوگ جمع ہوں گے وہاں باہر والا چھوکرا ضرور نظر آئے گا۔ ایک ساتھ دونوں ہاتھوں میں چار چار اسٹینڈ اٹھائے ہوئے وہ ہوٹل کے آس پاس دوڑتے رہتے ہیں۔ ہر اسٹینڈ میں چار یا چھ گلاس ہوتے ہیں۔ پانی پینے والے عام گلاس نصف اور وہ بھی نصف خالی۔ مگر آواز کے ساتھ ہی چائے حاضر کرنے اور گلاس خالی ہوتے ہی پیسے وصول کرنے کے لئے نازل ہونے میں ان کا جواب نہیں۔ ان کی پھرتی اور مستعدی پر حیرت ہوتی ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ کوئی چائے طلب کرے اور پیسے دئے بغیر یا گلاس سمیت غائب ہوجائے۔ ساتھ ساتھ بنے ہوئے ایرانی ہوٹلوں کے باہر والوں کے درمیان ہمہ وقت ایک مقابلہ جاری رہتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ چائے کے آرڈر لینے کا۔ ٹپ انہیں کوئی بھی نہیں دیتا۔ غالباً وہ سیل پروموشن کی بنیاد پر رکھے جاتے ہیں۔ برائے نام تنخواہ اور کمیشن۔ مجھے ان کی جسمانی صحت کی خستہ حالی اور اخلاقی زبوں حالی دیکھ کر افسوس ہوتا تھا۔ اتنی کم عمر میں یہ بچے کمانے کی مشین بنادئے گئے تھے اور اس بچپن سے محروم تھے جو معصومیت کے قہقہے بکھیرنے اور خوشیوں کے سنگریزے چننے اور پُرامید مستقبل کے آسمان پر خوابوں کی رنگین پتنگ کو اونچا اڑانے اور خود اس کے ساتھ اڑنے کا زمانہ ہوتا ہے۔

محسن نے اچانک کہا۔

"خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھئے احوال
کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے"

غالب نے کہا "کبھی ناممکن بات بھی ممکن ہوجاتی ہے۔ بد ذوق آدمی برمحل شعر پڑھ دیتا ہے اور ٹھیک پڑھ دیتا ہے۔"

محسن نے مشتعل ہو کے کہا "ایسا حادثہ تمہارے ساتھ کبھی پیش نہیں آیا؟"

"میں نے دیوانِ غالب لکھ دیا ہے۔ تم نے کیا لکھا ہے؟" غالب نے متانت سے کہا۔

"میں مرثیہ لکھوں گا تمہارا۔ اور نازو کو پیش کروں گا۔"

"یار' ہمت ہے تو یہ کام آج ہی کرکے دیکھو۔ انعام بھی آج ہی مل جائے گا" غالب نے کہا۔

"سب کو اپنے جیسا مت سمجھو۔ مرد کی تو ایک نظر ہی کافی ہوتی ہے عورت کو قدموں میں گرانے کے لئے۔"

"مجھے معلوم ہے" غالب نے کہا "تم اپنی بات کرو۔"

باہر والا چائے لے کر نہ آتا تو یہ جنگ چلتی رہتی۔ وقفہ پاتے ہی میں نے کہا "اب گودام میں جا کے کچھ دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ رات کو دیکھ لیں گے۔"

غالب نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا "ہاں۔ ہم ان کو دیکھیں گے اور وہ ہمیں۔ اگر پہچانے گئے تو مل کے بہت خوش ہوں گے"

"دن کے مقابلے میں رات کو اس کا امکان کم ہوگا۔"

محسن نے کہا "قلی نمبر سات سو بیس ڈبل ایجنٹ بن گیا تو دوسری طرف سے بھی انعام وصول کرسکتا ہے۔"

"میں اس کی جگہ ہوتا تو یہی کرتا" غالب بولا۔

"مگر وہ ایک معمولی قلی ہے" میں نے کہا "دریا میں رہ کے مگرمچھ سے بیر نہیں رکھے گا۔ ہم پولیس والے ہیں۔"

"کیا اس نے واقعی یہ مان لیا ہے؟"

میں نے کہا "میں نے اسے ریوالور دکھا دیا تھا۔"

"ہر ریوالور رکھنے والا شخص پولیس مین نہیں ہوتا۔" غالب نے کہا۔

"رائٹ۔ مگر وہ موت کا نامہ بر ضرور ہوتا ہے۔ فریق اول کے بارے میں اسے کوئی شبہ نہیں ہوگا کہ وہ مجرم ہیں۔ ان کا طریقۂ واردات بھی ایسا تھا۔ خلافِ معمول اور پُراسرار۔ عام' شریف لوگ رات کے اندھیرے میں قلیوں کو کار میں بٹھا کے نہیں لے جاتے' نہ اتنا معاوضہ دیتے ہیں اور نہ رازداری کی تاکید کرتے ہیں۔ ہم نے براہ راست نہیں بتایا مگر آخر کار تسلیم کرلیا کہ ہم کون ہیں۔ اس نے پولیس کا آدمی نہ سمجھا تو پھر یہ سمجھے گا کہ ہم بھی ان کی ٹکر کے مجرم ہیں اور ہماری دھمکی کو نظرانداز نہیں کرسکے گا۔"

باہر والا چائے کے پیسے لینے آیا تو اس نے کہا "تم کو اِدھر بلاتا پڑا ہے" اس نے ہوٹل کی طرف اشارہ کیا۔

"مجھے ......کون بلاتا پڑا ہے؟" میں نے حیران اور پریشان ہو کے کہا۔

"اپن کو نہیں مالوم۔ جا کے دیکھو۔" باہر والا مختصر بات کرکے دوڑ گیا۔

"یہ کون ہوسکتا ہے؟" محسن بولا۔

"کہیں کسی کو غلط فہمی نہ ہوئی ہو" غالب نے کہا۔

"کسی نے ....پہچان تو نہیں لیا؟" میں نے وہ بات کہہ دی جو سب کے دل میں تھی مگر کہنا کوئی نہیں چاہتا تھا "خیر' میں جا کے دیکھتا ہوں.... تم باہر سے نظر رکھو۔"

لمبے سرنگ جیسے نیم روشن ہال میں پرانے' گھسے ہوئے ریکارڈ اونچی آواز میں بجائے جارہے تھے۔ پرچ پیالیوں اور برتنوں کے شور میں چیخ چیخ کر باتیں کرنے والوں کی آوازیں بھی شامل تھیں۔ میں نے اس کونے سے اس کونے تک دیکھا۔ پھر مجھے ایک ہاتھ اُوپر اٹھا ہوا نظر آیا جو مجھے بلا رہا تھا۔

میں نے تیزی سے قریب جا کے کہا "یوسف!"

"ہاں یار۔ اتفاق سے نظر پڑ گئی تم پر۔"

"تم کیا کررہے ہو یہاں؟ اور یہ بڑی غلط حرکت کی ہے تم نے" میں نے برہمی سے کہا "تم نے تو تقریباً راز فاش کردیا ہے میرے اس بہروپ کا۔"

"مجھ پر کیوں خفا ہوتے ہو یار۔ میں کوئی اپنی مرضی سے آیا ہوں" یوسف نے کہا "گھنٹا بھر ہوگیا تم کو ڈھونڈتے ہوئے۔ ابھی

تھک گیا تھا تو چائے پینے بیٹھ گیا۔"

"ایسی کیا آفت آگئی تھی؟"

"آفت تو یار وہ لڑکی ہے۔ توبہ توبہ۔ اس نے تو میرا ملبہ کر دیا تھا" یوسف نے ہاتھ جوڑ کے منہ اوپر اٹھایا "زندگی تھی کہ اللہ نے بچالیا۔"

میں اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ "تم نازو کی بات کررہے ہو۔ کیا کیا ہے اس نے؟"

"اس نے ۔۔۔۔ میرے کو ایسے اٹھایا جیسے مداری لوگ ڈگڈگی کو اٹھاتا ہے۔ اور ایسے ہلایا جیسے میں ڈگڈگی ہوں اور چارپائی پر پھینک دیا۔ اللہ کا شکر ہے فرش پر نہیں پھینکا ورنہ اپنا جنازہ اسی چارپائی پر اٹھتا۔ ایسی ظالم حسینہ" یوسف نے پھر دونوں کانوں کو ہاتھ لگایا۔

مجھے ہنسی بھی آرہی تھی اور غصہ بھی تھا "آخر ہوا کیا تھا؟ تم نے کوئی ایسی ویسی حرکت تو نہیں کی تھی۔"

"یہ کیا بولتے ہو اپنے سکندر بھائی۔ میرا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ ہے۔ مگر قسم خدا کی ایسا بھی نہیں کہ کسی کی عزت کا خیال نہ ہو۔ وہ تو اس نے کہا کہ میرا میک اپ کرو ابھی اور میرے کو کرسچین چھوکری بنادو' مجھے جانا ہے فوراً۔"

"کہاں جانے کا ارادہ تھا اس کا؟"

"میں نے پوچھا تو بولی کہ سسرال جانا ہے۔ تم کو کیا۔ لڑکی ہے کہ گولی۔ میں نے کہا کہ تم کو تمہارا گھر والا کیا بول کے گیا تھا۔ کہ گھر میں بیٹھو۔ باہر جاؤ گی تو ٹانگیں توڑ دوں گا۔ کیا میں نے غلط بولا تھا۔"

"نہیں" میں نے ہنستے ہوئے کہا "مگر تم کو یہ کہنا نہیں چاہئے تھا۔"

اس نے اپنے سر پر ہاتھ مارا "مجھے کیا معلوم تھا یار کہ وہ کیا بلا ہے۔ وہ تو جب میں چارپائی پر لیٹا چھت کو گھومتا ہوا دیکھ رہا تھا تب میری سمجھ میں آیا۔ اللہ میری توبہ۔"

میں نے ہنسی پر بڑی مشکل سے قابو پایا اور کہا "کیا ماما جی موجود نہیں تھے؟"

اس نے نفی میں سرہلایا "اسی لئے تو یہ لفڑا ہوا۔"

"ماما جی کہاں گئے؟"

"اسی نے کہیں بھیجا تھا۔ ایسی چکرباز چھوکری ہے' میرے کو ابھی تک چکر آرہے ہیں" وہ بولا۔

"آگے بتاؤ۔"

"آگے کیا بتاؤں۔ میں نے میک اپ کردیا۔ اس نے پتا نہیں کس کے کپڑے پہنے اور چلی گئی۔ وہ جو دوسری لڑکی ہے گل' اس نے بھی روکا تھا۔ بہت منع کیا تھا۔ وہ بہت شریف اور معصوم لڑکی ہے۔ خیر معصوم تو یہ بھی نظر آتی ہے مگر۔۔۔۔" اس نے پھر کانوں کو ہاتھ لگایا۔

"وہ کچھ بتا کے نہیں گئی۔ کہ کہاں جارہی ہے؟" مجھے اب نازو پر غصہ آنے لگا تھا۔

"وہی تو بتانے نکلا تھا میں۔ اس نے بولا تھا کہ جاؤ انہیں تلاش کرو۔ ان سے کہنا کہ میں گھوڑے اور گدھے دیکھنے جارہی ہوں۔ کیا مطلب ہوا اس بات کا؟ میری تو ہمت نہیں پڑی کہ اس سے پوچھتا۔ میرے کو پھر ڈگڈگی بنادیتی۔"

"بے وقوف لڑکی" میں نے بے اختیار کہا۔ مجھے اس پر سخت طیش آرہا تھا۔ اس احمقانہ خود سری کے نتیجے میں اپنے ساتھ وہ ہمارے لئے بھی پریشانی کے اسباب پیدا کرسکتی تھی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ تریونی کے ریس کے گھوڑوں کا پتا چلانے نکلی ہے مگر کسی سے مشورہ کئے بغیر اس کا اکیلے نکل جانا بہت غلط حرکت تھی۔

میں نے یوسف سے کہا "تم جاؤ واپس۔ گل سے کہنا' پریشان نہ ہو۔ ہم کو پیغام مل گیا ہے اور اب ہم صورتِ حال کو سنبھال لیں گے۔ گل اکیلی ہوگی۔"

یوسف کھڑا ہوگیا۔ میں اس سے پہلے ہی نکل آیا۔ کسی نے ہماری گفتگو نہیں سنی تھی۔ وہاں جتنے لوگ موجود تھے سب اپنی اپنی باتوں میں مصروف تھے۔ غالب اور محسن کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے کے بعد میں نے انہیں تلاش کرلیا۔

"کون تھا؟ تم بہت غصے میں ہو" غالب نے کہا۔

"یوسف تھا" میں نے کہا "پیغام لے کر آیا تھا۔"

"کس کا؟"

"اس کا جس کے تم گھر والے ہو" اس وقت تک میرا غصہ کافی حد تک کم ہوچکا تھا۔ "وہ نکل گئی گھر سے۔"

"کون۔ نازو۔"

"اور کون" میں نے کہا "بڑی دھمکی دے کر آئے تھے کہ قدم گھر سے نکالا تو ٹانگیں توڑ دوں گا۔ ہمارے روانہ ہوتے ہی وہ بھی چلی گئی۔"

"مگر کہاں؟" غالب نے پریشان ہو کے پوچھا۔

میں نے جواب میں وہ سب بتادیا جو مجھے یوسف کی زبانی معلوم ہوا تھا۔ وہ یوسف کی حالتِ زار تھی اور اس کا اندازِ بیاں تھا جس پر مجھے ہنسی آئی تھی۔ میری بات سن کے کوئی بھی نہیں ہنسا۔

"یہ تو بہت غلط حرکت کی اس نے" غالب نے کہا۔

"صرف غلط حرکت کہتے ہو تم اسے۔ یہ ایک احمقانہ غلطی ہے اور میرے نزدیک جرم ہے" میں نے بگڑ کے کہا۔

محسن نے میری تائید کی "ڈسپلن کی خلاف ورزی کو جرم ہی سمجھا جائے گا۔ یہ لڑکی پتا نہیں اپنے آپ کو کیا سمجھنے لگی ہے معلوم ہوتا ہے اکیلی ہی ساری دنیا کو فتح کرلے گی۔"

"ایسی خوش فہمی کے سنگین نتائج کا خمیازہ کسی دن سب کو بھگتنا پڑے گا۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے" غالب نے رنجیدہ ہو کے کہا "تم کو اختیار ہے کہ اسے جو چاہے سزا دو۔ اس نے سرکشی اور بغاوت کا مظاہرہ کیا ہے۔ ایم آر ایس کی عدالت میں اس پر بھی مقدمہ چلاؤ اور اسے گولی ماردو۔"

محسن نے حیرانی سے غالب کو دیکھا "تم نے برا مانا ہے ہماری بات کا۔ خود سوچو کہ ایسے سب اپنی اپنی کرنے لگے تو تنظیم کی ایسی تیسی ہوجائے گی۔ ساتھ رہ کے اگر صلاح مشورہ بھی نہیں کرنا تو پھر سب جائیں اپنے اپنے راستے۔ جس کا جو دل چاہے کرے۔"

"نہیں بس یہ غم ہے کہ ڈسپلن خراب ہوگیا۔ نازو کی کوئی فکر نہیں۔۔۔۔" غالب نے جذباتی ہو کے کہا۔

"خواہ مخواہ ہمیں امپریس کرنے کی کوشش مت کرو کہ صرف تم ہی نازو سے محبت کرتے ہو" محسن نے برہم ہو کے کہا "ہم کیا جذبات سے عاری اور بے مروّت لوگ ہیں۔ دوستی کے رشتے کا نام بدنام کرتے ہیں۔"

میں نے انہیں سمجھانے کے لئے کہا "مرزا جی! کیا دوستی میں کوئی ڈسپلن نہیں ہوتا۔ لحاظ اور مروّت' ایثار اور قربانی' وفاداری اور جاں نثاری کے لئے کیا خود کو جذباتی ڈسپلن کا پابند نہیں کرنا پڑتا۔ کیا رشتوں میں ڈسپلن نہ ہو تو وہ قائم رہ سکتے ہیں۔ بڑوں کے ساتھ عزت کا سلوک اور چھوٹوں سے شفقت کا اظہار۔ میاں بیوی کے حقوق و فرائض کا تعین۔ سماجی تعلقات کی وضعداری اور رکھ رکھاؤ۔ یہ سب ڈسپلن ہے۔ دنیا کے اور آخرت کے تمام معاملات ڈسپلن کے متقاضی ہیں۔"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا" غالب نے شرمندہ ہو کے کہا۔

"چلو چھوڑو یہ بات" میں نے کہا "قصور نازو کا بھی نہیں۔ اس کی جذباتی سرکشی میں بھی نیک نیتی اور خلوص کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ بس یہ اس کی فطرت ہے۔"

محسن نے کہا "تمہاری بات سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس غلطی پر بھی تم اس سے باز پرس نہیں کرو گے؟"

میں نے کہا "یار' وہ بہت زود رنج اور حسّاس ہے۔ آخر ہے تو ایک لڑکی۔ ہم اس سے لڑ سکتے ہیں' اس کا کورٹ مارشل نہیں کرسکتے۔ لڑلینا اچھا ہوتا ہے۔ جس کے دل میں جو ہے منہ پر صاف کہہ دے' پھر بات ختم۔ چلو پہلے تو اسے تلاش کریں۔"

"کہاں جا کے تلاش کریں؟" محسن نے کہا "اور کیسے تلاش کریں؟ اس نے تو حلیہ ہی بدل رکھا ہے۔"

"وہ خود ہمیں دیکھ لے گی" میں نے کہا۔

لیکن ایک گھنٹے سے زیادہ اس علاقے میں الگ الگ پھرنے کے بعد ہم دوبارہ ملے تو پہلے سے زیادہ مایوس تھے۔ نازو کا کوئی پتا نہ تھا۔ صبح کی مال گاڑی سے جانے والے ریس کے گھوڑے ابھی تک ریلوے یارڈ میں پہنچے ہی نہیں تھے۔

"مجھے ایک کنٹینر نظر آیا لیکن اس کے اندر ناگپور جانے والی ٹیکسٹائل مل مشینری تھی" غالب نے رپورٹ دی "کسی نے مجھے اندر جھانک کر دیکھنے سے روکا بھی نہیں۔"

"میں نے بھی مویشیوں کا ایک وفد دیکھا جو اسی ٹرین سے رائے پور جارہا ہے۔ اس میں گائے بھینسوں کے ساتھ بکریاں تھیں مگر گھوڑے جیسا کوئی جانور نہیں تھا" محسن بولا۔

"وہ ریس کے گھوڑے عام جانوروں کے ساتھ جائیں گے بھی نہیں۔ الگ بوگی میں ہوں گے" میں نے کہا۔

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ابھی وہ گھوڑے پہنچے ہی نہیں" غالب نے کہا "ورنہ چالیس فٹ لمبا کنٹینر ایسی چیز نہیں کہ نظر نہ آتا۔"

"نازو بھی جھک مار کے واپس چلی گئی ہوگی" محسن نے کہا۔

"پس ہم بھی واپس چلیں۔ ابھی کوئی کام نہیں یہاں" غالب بولا۔

اچانک مجھے اپنے چاروں طرف ایک عجیب سی ہلچل اور بے چینی کا احساس ہوا۔ بہت سے قلی کام چھوڑ کے کھڑے ہوگئے تھے اور ایک دوسرے سے چلاّ چلاّ کے کچھ پوچھ رہے تھے۔ ہمارے قریب ہی ایک بہت لمبے تڑنگے قلی نے دوسرے قلی کو دھکا دیا۔

"تو بکتا ہے۔"

دوسرا قلی سکھ تھا۔ اس کی پگڑی کھل گئی۔ "او یار' سچے واہگورو کی سونہہ" اس نے پگڑی اٹھا کے پھر اپنے سر کے بالوں پر رکھ لی "ہم ایسی گل کریں گے لفڑے والی۔"

وہ اپنی مادری پنجابی کے الفاظ کو بمبئی کی بولی میں بلا ارادہ شامل کررہا تھا۔ لمبے تڑنگے قلی نے کہا "پھر چل کے دیکھتے ہیں۔"

"اسی بھی چلتے ہیں ناں" سکھ نے کہا "ایک منٹ۔۔۔۔"

مگر دوسرے قلی نے اسے ایک منٹ کی مہلت بھی نہ دی اور وہ دونوں پگڑی باندھتے ہوئے دوڑے۔ ایک اور قلی نے جو صرف نیکر پہنے ہوئے تھا ان سے کچھ پوچھا۔ اس کا سیاہ بدن دھوپ اور پسینے میں چمک رہا تھا۔ میں نے چند اور قلیوں کو بھی بھاگتے دیکھا۔

"کیا ہنگامہ ہے آخر؟" محسن نے کہا۔

"قلیوں کا معاملہ ہے کوئی" غالب نے کہا "ہوا ہوگا کوئی فساد۔ یا کوئی ٹرین سے کٹ کے مرگیا ہوگا۔"

ہم ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ ماماجی کے کوارٹر کی طرف جارہے تھے۔ مختلف اور دور دور تک پھیلی ہوئی پٹریوں کو عبور کرتے بہت سے قلی بھی اُدھر ہی آرہے تھے۔ کچھ قلی ہمارے پاس سے دوڑتے ہوئے گزر گئے۔

میں نے ایک کو روکنے کی کوشش کی اور پوچھا "کیا بات ہے۔"

اس نے جنوبی ہند کی کسی زبان میں جو کچھ کہا' اس کا ایک ہی لفظ میری سمجھ میں آیا اور یہ لفظ تھا "ماماجی۔"

"اس نے ماماجی ہی کہا تھا نا؟" محسن بولا۔

"کسی اور اردو سمجھنے والے سے پوچھتے ہیں" میں نے کہا۔

دوسرا قلی جسے غالب نے روکا' بنگالی تھا۔ اس نے احتجاجی نعرے کے انداز میں کہا "گونڈا لوگ حاملہ کار کے سوردیا۔ فس تول چولائے کے سور کا اندر گولی مورا" اس نے دو انگلیاں اٹھا کے اور آنکھیں دہشت سے پھیلا کے کہا۔

ہم اپنی جگہ سن ہوگئے۔ مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ جو میں نے سنا وہ صحیح ہے۔ اس نے اپنے لب و لہجے میں کہا تھا کہ غنڈوں نے حملہ کرکے انہیں مار دیا۔ پستول سے دو گولیاں ان کے سر میں ماردیں۔ غالب اور محسن نے بھی بنگالی کی بات سمجھ لی تھی۔

"کیا ماماجی کو گولی ماردی۔ کس نے؟"

"غنڈوں نے۔ بنگالی یہی کہہ رہا تھا" محسن بولا۔

"غنڈوں نے....یہ کیسے ہو سکتا ہے....ان کا غنڈوں سے کیا تعلق۔"

میں نے کہا "ان کا تعلق ہم سے تو تھا۔"

"اور انہیں سزا ملی ہے اس تعلق کی....؟"

"ایسا ہی لگتا ہے مجھے" میں نے کہا "شکاری مسلسل ہمارے تعاقب میں تھے۔ ایک جگہ سے ہم فرار ہوگئے تھے مگر منو میاں پکڑ لئے گئے تھے۔ ان کو سین شین نے دہشت گردوں سے رہا کرالیا تھا اور خود مارے گئے تھے۔ ہم سب کو ماماجی نے ہی تو پناہ دی تھی۔ کیا یہ کم سنگین جرم تھا؟"

"او میرے خدا!" محسن نے اپنا سر پکڑ لیا "کیا انہیں منو میاں اور ماماجی کے تعلق کا علم تھا؟"

"دشمن کو کبھی بے خبر نہیں سمجھنا چاہئے۔ ہم نے تو کوئی احتیاط بھی نہیں کی تھی۔ نہ جانے کتنے لوگوں نے ہمیں دیکھا ہوگا۔"

"سکندر! وہاں گل بھی تھی۔ شاید یوسف بھی ہوگا" محسن نے پُر وحشت لہجے میں کہا۔

"ممکن ہے نازو بھی واپس پہنچ گئی ہو" غالب نے کہا۔

یہ سب ایک جیسے پریشان کُن خیالات تھے۔ ہم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس وقت ہمارا حلیہ دوسروں سے مختلف نہیں اور قلیوں کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگے۔ درمیانی فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ چند منٹ میں ہم نے وہ ہجوم دیکھ لیا جو ماماجی کے دروازے پر جمع ہوچکا تھا۔ شبہے کی اب کوئی گنجائش نہ رہی تھی کہ بنگالی نے مصدقہ اطلاع فراہم کی تھی۔

جیسے جیسے یہ خبر پھیل رہی تھی' قلی کام چھوڑ کے اسی طرف کا رخ کررہے تھے۔ ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی دروازے کے سامنے دو ڈھائی سو قلی اکٹھے ہوگئے تھے۔ آگے جانے کا راستہ نہ تھا مگر میں خوفزدہ۔ صدمے سے بے حال اور مشتعل لوگوں کے ہجوم کو چیر کے آگے بڑھتا گیا۔

اس طرح بہ زورِ بازو سب کو دھکیل کر راستہ بنانے میں مجھے بہت سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ دوسرے قلی بھی اتنے ہی مضطرب نظر آتے تھے لیکن وہ میرے دلی اضطراب کو نہیں سمجھ سکے تھے۔ زور زبردستی پر احتجاج کرنے والے سب ہی تھے۔ چند ایک نے مجھے جسمانی طور پر روکنے کی بے سود کوشش بھی کی۔ میرے کپڑے پھٹ گئے اور میرا راستہ روکنے والے مجھے گالیاں دیتے رہ گئے۔

محسن اور غالب کو بھی اندازہ تھا کہ اس ہجوم کو چیر کر آگے پہنچنے کے لئے طاقت ہی کام آئے گی۔ شرافت سے کوئی راستہ نہیں دے گا۔ وہ میرے پیچھے رہے اور کسی کی گالی گلوچ کی پروا کئے بغیر سب کو دھکے دے کر ایک طرف کرتے ہوئے آگے پہنچنے میں کامیاب رہے۔

تاہم ہماری یہ طاقت آزمائی رائیگاں ہی گئی۔ پولیس ہم سے پہلے وہاں پہنچ گئی تھی اور انہوں نے قلیوں کو دروازے سے باہر گزدور ہی روک دیا تھا۔ شروع میں پہنچنے والوں کو انہوں نے مار بھگانے کی کوشش ضرور کی تھی مگر ہجوم بڑھنے لگا تو انہوں نے محسوس کیا کہ تشدد سے صورتِ حال بے قابو ہوجائے گی۔ ان کے ساتھ ایک جونیئر افسر آیا تھا جو پرانے' ان پڑھ' ڈنڈے مار اور خرانٹ افسروں کے مقابلے میں کچھ ذہین اور معاملہ فہم تھا۔ اسے بہت جلد اندازہ ہوگیا تھا کہ مقتول ماماجی سب قلیوں کے ماماجی تھے اور اس کے سیکڑوں بھانجوں کے دل ہمدردی سے جیتے جا سکتے ہیں۔ فرعونیت کے مظاہرے سے اشتعال کے پھیل جانے کا امکان تھا۔ قلی ہڑتال بھی کرسکتے تھے۔ مگر توڑ پھوڑ پر اتر آتے تو ریلوے کا بہت نقصان ہوتا۔ لاٹھی چارج' آنسو گیس کے استعمال یا فائرنگ کی نوبت آجاتی تو معاملہ بہت سنگین ہوجاتا۔ وہ خود کچھ بھی کرنے کا مجاز نہیں تھا۔ وہ غلطی سے لاٹھی چارج کا حکم دے دیتا تو بعد میں تحقیقاتی کمیشن اسی پر ساری ذمے داری عائد کردیتا۔

جب میں آگے پہنچا تو وہ ہاتھ جوڑ کے قلیوں کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کررہا تھا "بھائیو! کچھ میری نوکری کا خیال کرو۔ میں خود مجبور ہوں۔ میں کسی کو اس وقت تک آگے جانے کی اجازت نہیں دے سکتا جب تک تفتیش مکمل نہ ہوجائے۔"

"ماماجی کو مروایا گیا ہے" کسی نے چیخ کر کہا۔

"مروانے والے قلیوں کے دشمن ہیں۔"

پولیس کے سب انسپکٹر نے کہا "دیکھو' جب تفتیش ہوگی تو سب سامنے آجائے گا۔"

"کچھ سامنے نہیں آئے گا۔ سب چھپا لیا جائے گا" کسی اور نے چیخ کر کہا۔

"ماماجی کی لاش ہمارے حوالے کردو۔"

بیک وقت کئی آوازیں آئیں "لاش ہمارے حوالے کرو۔"

"ہم ارتھی لے کر پولیس کمشنر کے پاس جائیں گے" کوئی اور چلایا۔ بہت سے لوگوں نے اس کی تائید کی۔

"ریلوے منتری کے پاس جائیں گے" ایک اور مشتعل شخص نے کہا اور اس کی تجویز کی حمایت میں بھی بہت سی آوازیں اٹھیں۔

سب انسپکٹر نے پھر صورت حال کو کنٹرول میں کیا "بھائیو! ایسا مت کرو۔ تم سارے سراغ مٹا دو گے تو ہتیارے کیسے پکڑے جائیں گے۔ مجھے تم سب کے دکھ کا احساس ہے۔ میں بھی غریب آدمی کا بیٹا ہوں۔ میرے سورگباشی پتاجی کی موت کے بھی ایسے ہی کارن تھے۔ وہ مزدور یونین کے صدر تھے اور مالکوں نے انہیں بھٹی میں ڈلوادیا تھا اور پولیس سے کہا تھا کہ یہ ایک درگھٹنا تھی۔ مزدور تمہاری طرح کرودھ میں آگئے تھے۔ انہوں نے مل کو تباہ کرنے اور آگ لگانے کی کوشش کی تھی۔ اس سے کچھ بھی پراپت نہیں ہوا۔ سوائے نقصان کے۔ پولیس کی فائرنگ سے اور لوگ مارے گئے۔ مالکوں نے ان سب کو ختم کروادیا جو بعد میں میرے پتا کی جگہ لے سکتے تھے۔ ان سب کو اپرادھی بنادیا گیا جو نردوش تھے۔ پولیس نے انہیں چُن چُن کے نشانہ بنایا۔ ایک میری ماں ہی ودھوا نہیں ہوئی۔ میں ہی اناتھ نہیں ہوا۔ بہت سے پریوار اجڑ گئے تھے۔ یونین میں مالکوں کی مرضی کے لوگ آگئے تھے۔ حالاں کہ وہی ہتیارے تھے۔ کیا تم بھی یہی چاہتے ہو؟ قانون کو اپنے ہاتھ میں لوگے تو اپنے ساتھ انیائے کروگے۔"

مشتعل مزدور ایک دم خاموش ہوگئے۔ اچانک ان کے جذبات کے تند و تیز دھارے نے اپنا رخ بدل لیا۔ وہ پولیس کے دشمن ضرور تھے مگر ان کے سامنے کھڑا ہوا سب انسپکٹر انہیں اپنے جیسا معلوم لگا۔ وہ ایک مزدور کا بیٹا تھا اور ان کو ہمدردی میں صحیح مشورہ دے رہا تھا۔

معلوم نہیں پولیس سب انسپکٹر کی کہانی میں حقیقت کتنے فیصد تھی اور سیاست کتنے فیصد۔ اگر یہ افسانہ طرازی تھی تو بلاشبہ وہ سیاست دانوں سے زیادہ ذہین آدمی تھا اور غلط محکمے میں آگیا تھا۔ وہ الفاظ سے وہ کام لے سکتا تھا جو پولیس ڈنڈوں اور گولیوں سے نہیں لے سکتی تھی۔ وہ بپھرے ہوئے ہجوم کو قابو میں کرنے کے لئے ان کے جذبات کی آتش فشانی کو سرد کرنے کا ہنر جانتا تھا۔

"ابھی تفتیش کرنے والے آئیں گے۔ ہتیا کا کارن پتا کرنے کے لئے وہ لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے لے جائیں گے۔ اس کے بعد لاش آپ لوگوں کے حوالے کردی جائے گی۔ میری پرارتھنا یہ ہے کہ آپ ان کے کام میں خلل نہ ڈالیں۔ ماماجی کا کریا کرم آپ اپنی مرضی سے کریں۔ جیسے چاہیں کریں۔ آپ نے میری بات سنی' اس کے لئے آپ کا بہت دھنیہ واد۔ اب آپ میں سے تین آدمی آگے آجائیں۔"

اس کی بات ختم ہونے سے پہلے جو تین آدمی آگے بڑھ گئے تھے ان میں ایک میں بھی تھا۔

سب انسپکٹر نے ہم پر ایک سرسری نگاہ ڈالی اور بولا "تم ان لوگوں کو آگے نہیں آنے دو گے۔ یہ سب تمہارے متر ہیں۔ میری بات مان سکتے ہیں تو تمہاری بھی مانیں گے۔ میں اندر جاتا ہوں۔"

میرے ساتھ آگے جانے والوں میں سے ایک تو محض جوشیلا تھا مگر دوسرا لیڈر بننے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اس نے ہجوم کو مخاطب کرکے ایک جذباتی تقریر شروع کردی۔ اس نے ماماجی کی تعریف کی کہ وہ کتنے عظیم آدمی تھے' کتنے بے غرض لیڈر تھے اور قلیوں کے حقوق کے لئے کس طرح جدوجہد کرتے رہے۔ پھر اس نے کہا کہ ماماجی مرے نہیں' زندہ ہیں کیوں کہ ان کا مشن زندہ ہے اور ہم ان کے کام کو جاری رکھیں گے وغیرہ وغیرہ۔ وہ ماماجی کی جگہ یونین کی قیادت سنبھالنے کے پروگرام پر عمل درآمد شروع کرچکا تھا اور جذبات کی رو میں بہہ جانے والے مزدور اس کی بات توجہ سے سن رہے تھے۔ بہت سے اب رو رہے تھے اور نعرے لگا رہے تھے۔

موقع پاتے ہی میں پلٹا اور گھر کے اندر گھس گیا۔ پولیس سب انسپکٹر کے ساتھ ابھی علاقے کے تھانے سے جو نفری آئی تھی اس میں ایک ہیڈ کانسٹیبل اور دو کانسٹیبل شامل تھے جو فی الحال کچھ بھی نہیں کررہے تھے۔ انہیں قتل کی تحقیقات کرنے والی خصوصی ٹیم کا انتظار تھا۔

دالان میں سب سے پہلے میری نظر یوسف کی لاش پر پڑی وہ الٹا پڑا ہوا تھا اور اس کے سر سے بہنے والا خون فرش پر ایک بدنما داغ کی صورت میں جم گیا تھا۔ ماماجی کی لاش کمرے اور برآمدے میں ایسے پڑی ہوئی تھی کہ ان کا آدھا دھڑ دروازے سے باہر تھا۔ شاید انہوں نے جان بچا کے بھاگنے کی کوشش کی تھی لیکن قاتلوں نے پیچھے سے ان کے سر میں دو گولیاں اتاردی تھیں۔ اس بات کا واضح امکان نظر آتا تھا کہ یوسف کے سر میں وہ گولی لگ گئی جو ماماجی کے سر کا نشانہ لے کر چلائی گئی تھی۔ ماماجی پر مسلسل فائر کئے گئے تھے۔ دو گولیاں سامنے والی دیوار میں بھی پیوست نظر آرہی تھیں۔ یوسف کے جسم پر ایک نظر دیکھنے سے مجھے تشدد کی کوئی علامات نظر نہیں آئی تھیں لیکن ماماجی واضح طور پر تشدد کا نشانہ بنے تھے۔ ان

کا ایک ہاتھ ٹوٹا ہوا تھا ورنہ کہنی سے اوپر کا حصہ یوں مڑا ہوا نہ ہوتا۔ ان کے چہرے پر ضربات کے نیل تھے اور ایسے زخم تھے جیسے ان کے منہ پر کانٹے دار دستانے پہن کر مُکے مارے گئے ہوں۔

سب انسپکٹر مجھے دیکھتے ہی بگڑ گیا "کیا ہے؟ کس کی اجازت سے اندر آیا ہے تُو؟"

"شما کرنا مہاراج" میں نے ہاتھ جوڑ کے کہا "آپ سے صرف ایک بات پوچھنا تھی۔"

"باہر نکالو اس حرام زادے کو" سب انسپکٹر اب ایک روایتی قسم کا خر دماغ پولیس مین بن چکا تھا۔

دو پولیس والے آگے بڑھے اور انہوں نے مجھے اپنی لاٹھیوں سے باہر ہانکنے کی کوشش کی۔

میں نے کہا "سرکار....."

"سرکار کا بچّہ" ایک پولیس والے نے مجھے دھکا دیا۔ اس کے ساتھی نے لاٹھی اٹھائی مگر ماری نہیں۔ اس نے صرف گالیاں دینے پر اکتفا کی۔

"دیکھو، میں جانتا ہوں تمہیں تھانے دار" میں نے اونچی آواز میں کہا "تم نے ابھی جھوٹ بولا ہے سب۔ میری بات سن لو، نہیں تو میں تمہارا پول کھول دوں گا۔"

عام حالات میں کوئی قلی کسی تھانے دار کے سامنے سچ بولنے کی کوشش کرے یا اس کو جھوٹا کہے تو اس کا انجام عبرتناک ہوتا ہے مگر اس وقت میری دھمکی کام کر گئی۔ میرا یہ اندازہ درست ثابت ہوا تھا کہ سب انسپکٹر نے عیّاری سے کام لیتے ہوئے قلیوں کے غیظ و غضب کی آگ کو جھوٹی ہمدردی سے دبا دیا تھا۔

"ٹھہو۔ اِدھر لاؤ اس..." سب انسپکٹر نے ایک گالی دے کر کہا۔

پولیس والوں نے راستہ چھوڑ دیا۔ سب انسپکٹر بڑی نخوت سے ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور اس کی آنکھوں میں کینہ اتر آیا تھا۔

"تُو مجھے جھوٹا کہے گا" اس نے شائیں سے میرے ایک بید رسید کی "بعد میں کیا ہوگا، یہ سوچا ہے....."

"آپ یہ سوچو کہ ابھی کیا ہوگا" میں نے بے خوفی سے کہا۔ "اور بعد میں تم کیا بگاڑ لوگے میرا؟ ماماجی مر گئے تو کیا ہوا۔ میں تو زندہ ہوں۔ ان کی جگہ لینے والا۔ تم ہاتھ ڈال کے دیکھو مجھ پر۔ ساری گاڑیاں نہ رک جائیں تو رستم نہیں، کتا کہنا۔ یہ سب جو ماماجی کے ساتھ تھے، میرے ساتھ ہوں گے۔"

سب انسپکٹر نے میری بات پر غور کیا اور میرے اعتماد سے قائل ہوگیا کہ میری دھمکی کو فی الحال نظر انداز کردے۔ مصلحت کا تقاضا بھی یہی تھا۔ تاہم اس نے اپنی خودی کو بلند رکھا اور اپنے ماتحتوں کے سامنے شان سکندری میں فرق نہیں آنے دیا۔

"فضول باتیں چھوڑ۔ کیا کہتا تھا تجھے؟"

"رات ماماجی کے گھر میں کچھ مہمان تھے۔"

"تجھے کیسے معلوم ہوا؟" انسپکٹر نے کہا۔

"میں رات کو ان سے ملنے آیا تھا" میں نے کہا "ان میں ا... تو یہی تھا۔"

"تو جانتا ہے اسے؟"

"یوسف نام ہے اس کا" میں نے کہا "فلموں میں ایکسٹرا... کرتا تھا۔ دو لڑکیاں تھیں اس کے ساتھ۔ کل ہی آئی تھیں۔"

"لڑکیاں! کیا وہ بھی ایکسٹرا تھیں؟"

"پتا نہیں۔ ماماجی نے اس سے کہا تھا کہ تم فکر مت کرو... ایک ہفتہ نہیں ایک مہینہ رہ سکتی ہیں میرے پاس۔"

"لیکن یہاں تو اور کوئی نہیں تھا" انسپکٹر سوچ میں پڑ گیا... پہچان لوگے انہیں۔"

"ہاں جی۔ پھر دیکھا تو پہچان لوں گا" میں نے کہا "آپ کو با... معلوم نہیں کہ وہ کہاں گئیں؟"

"ابے اُلّو کے پٹھے، مجھے معلوم ہو تو اب تک انہیں پکڑ... ہوتا میں نے۔"

"شاید وہ بھاگ گئیں" میں نے کہا۔

"یہ تو لمبا ہی چکّر ہے" انسپکٹر بولا "مجھے یہ کام کسی عورت... نہیں لگتا۔ مگر عورت بیچ میں ہو تو بہت کچھ ہو جاتا ہے۔ قتل ا... وجہ سے ہوا ہوگا۔ صورت سے کیسی لگتی تھیں وہ؟"

"صورت سے تو جی سیدھی سادی لگتی تھیں۔ اور ماماجی کا... دشمن تو تھا نہیں۔ نہ مال دولت کی خاطر کوئی ان کو قتل کر سکتا ت... انہوں نے تو شادی بھی نہیں کی تھی۔ بڑی سادہ زندگی گزار... تھے۔"

"سب سامنے آجائے گا جب تفتیش ہوگی۔ سیدھے سا... نظر آنے والے ہی تو ہوتے ہیں بدمعاش۔ تم باہر ٹھہرو۔ یہ ب... قتل کی تفتیش کرنے والے تھانے دار کو بتانا۔ تمہارا بیان ا... گواہی بہت اہم ہے۔"

"آپ فکر مت کریں جی۔ میں تو خود اس لئے آگیا تھا"... نے باہر کا رخ کرتے ہوئے کہا۔

"تم جاؤ گے بھی کہاں تمہارا نمبر دیکھ لیا ہے میں نے۔" س... انسپکٹر نے مجھے یاد دلایا کہ اس واردات کی تفتیش کے بعد... میرے اور اس کے تعلقات ختم نہیں ہوں گے۔

"وہ جناب..... ایک بات اور..... آپ کو اطلاع کس نے... تھی واردات کی؟"

"کوئی عورت تھی۔ اس نے اپنا نام نہیں بتایا تھا۔"

"آپ لوگ گم نام کال پر آگئے۔ کمال ہے! اگر یہ شرار... ہوتی پھر....."

"زیادہ افلاطون بننے کی ضرورت نہیں رستم کی اولاد۔ ہ... کام کرنا جانتے ہیں اور جھوٹ سچ کی پہچان رکھتے ہیں۔ وہ لڑکی... رہی تھی اور ہسٹریا میں مبتلا تھی" سب انسپکٹر نے کہا۔

"یہ وہی لڑکی نہ ہو" میں نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔

سب انسپکٹر نے بُرا سا منہ بنایا۔ شاید اس کا نظریہ بھی یہی تھا مگر ایک معمولی قلی کے ساتھ اس کا ہم خیال ہونا اس کی شانِ افسری کے خلاف تھا "یہاں تو کوئی ایسی عورت نہیں ملی۔ خیر تم اس کا حلیہ لکھوا دینا۔"

صورتِ حال کسی حد تک مجھ پر واضح ہو چکی تھی۔ دل کو اب اطمینان حاصل تھا کہ قتل ہونے والوں میں نازو یا گل شامل نہیں ہیں۔ تاہم یہ اطمینان اس وقت تک ادھورا تھا جب تک ان دونوں کے بحفاظت اور خیریت کے ساتھ ہونے کا ثبوت نہ ملتا۔ اس امکان کو یکسر مسترد کرنا مشکل تھا کہ ماماجی اور یوسف کے قاتل جاتے ہوئے، انہیں ساتھ نہ لے گئے ہوں۔

باہر مجمع اب پہلے سے کہیں زیادہ ہوگیا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہاں چار پانچ سو قلی جمع تھے۔ یہ سب جذباتی، جوشیلے اور ماماجی سے زیادہ عقیدت رکھنے والے لوگ تھے۔ ان سے دس گُنا تعداد میں قلی اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ یا تو انہیں خبر ہی نہیں تھی کہ ماماجی کا خون کردیا گیا ہے یا وہ غیر جذباتی، خود غرض اور اپنے کام سے کام رکھنے والے لوگ تھے۔ موت سے کس کو رستگاری ہے۔ ارے کیا ماماجی نہیں ہوں گے تو دنیا کے کاروبار رُک جائیں گے۔ کوئی اور آجائے گا ان کی جگہ لیڈری کرنے۔ ماماجا بن کے۔ قلی تو قلی رہے گا۔ ایسی بہت سی باتوں کے پیچھے آدمی اپنی بے حسی کا جواز رکھتا ہے۔

پہلا مقرر اس مجمع کے سامنے اپنی فصاحت وبلاغت کے دریا بہا کے الگ ہوگیا تھا۔ اس کی جگہ ایک اور شعلہ نوا پیشہ ور قسم کا مزدور لیڈر آگیا تھا جو ماماجی کے خون سے مزدوروں کی تاریخ لکھنے کا عزم کر رہا تھا اور اس واردات کے ڈانڈے تاریخ کے ان ادوار سے ملا رہا تھا جب زبردست نے آوازِ حق کو دبانے کے لئے اسی طرح انسانیت کا خون بہایا تھا۔ مزدور کچھ سمجھ رہے تھے یا نہیں سمجھ رہے تھے مگر خاموش کھڑے رہنے پر مجبور تھے۔

مجھے دیکھتے ہی ہجوم میں ایک ہلچل سی پیدا ہوئی۔ میں اندر جا کے تازہ ترین اور چشم دید صورتِ حال کی خبر لانے والا واحد شخص تھا۔ میں نے گڑبڑ پھیلانے کے لئے اس آتش نوا مقرر کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا جو اپنی لیڈری چمکانے کے لئے موقعے سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔

میں نے اس کے قریب جا کے کہا "بڑے بھائی! ان سے کہہ دو کہ جان بچا کے بھاگ جائیں۔ سب انسپکٹر نے سب کو بے وقوف بنایا تھا۔ اس نے امن وامان کی تشویشناک صورتِ حال ظاہر کی ہے۔ پولیس کمشنر نے مسلح پولیس کے دستے روانہ کردئے ہیں۔"

شعلہ نوا مقرر کے لئے یہ بہت دھماکا خیز مواد تھا۔ وہ گلا پھاڑ کے کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ میں نے اسے روک لیا۔

"بہت لوگ مارے جائیں گے بڑے بھائی۔ معلوم نہیں کتنی لاشیں گریں گی اور کتنے زخمی ہوں گے۔ باقی کو پولیس نقضِ امن کے الزام میں گرفتار کرنا چاہتی ہے۔ خود مجسٹریٹ ساتھ آرہا ہے۔"

"ہم بزدل نہیں ہیں" مقرر نے چیخ کر کہا۔

"یہ بہت ظالم افسر مشہور ہے۔ اس نے وارانا سی میں بھوک ہڑتال کرنے والے مزدوروں کے کیمپ پر گولی چلوادی تھی" میں نے اتنے اعتماد کے ساتھ سفید جھوٹ بولا جیسے مجھ سے زیادہ محرمِ راز کوئی ہے ہی نہیں "اس نے دھنی رام کو مار ڈالا تھا۔"

"کون دھنی رام؟" مقرر کچھ کنفیوز ہوا۔

"وہ کیلاش کپور انڈسٹری والا یونین کا صدر۔ جس کی موت کو خودکشی بنا دیا گیا تھا۔"

اپنی کم علمی کا اعتراف کرنا مقرر کے لئے مشکل تھا۔ اس نے فوراً کہا "اچھا! یہ وہی ہے؟"

میں نے گرم لوہے پر ضرب لگائی "اور سب سے بڑا جھوٹ اس نے یہ بولا ہے کہ اس کا باپ مزدور تھا۔ اس کا باپ ہریانہ میں ڈی ایس پی ہے اور اس کا چچا جو اس کا سسر بھی ہے ایک ایم پی اے ہے۔ اترپردیش سبھا کا۔ مجھے یہ سب معلوم تھا اور میں اسے یہی بتانے کے لئے اندر گیا تھا۔"

مقرر کے لئے اتنا آتش گیر مواد کافی تھا۔ میں نیچے اتر کے عوام میں شامل ہوگیا۔ نسبتاً اونچی جگہ پر کھڑے رہ کر میں نے غالب اور محسن کو تلاش کرلیا تھا۔ وہ آگے ہی موجود تھے لیکن پہلی صف میں نہیں تھے۔ میں نے بھس میں چنگاری ڈالی تھی۔ مقرر اب چیخ چیخ کر قلیوں کو بتا رہا تھا کہ ان کے خلاف کیسی سازش کی گئی ہے مگر وہ ثابت کردیں کہ مزدور غریب ضرور ہوتا ہے، دغاباز اور مکّار نہیں ہوتا۔ بزدل نہیں ہوتا۔ وہ سینے پر گولی کھا سکتا ہے۔ جہاں اس کا خون پسینہ گرتا ہے اس مٹی سے حق اور صداقت کی فتح کا نیا سورج طلوع ہوتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

یہ سب الفاظ تھے۔ کھوکھلے بے معنی الفاظ سے۔ وہ خوب صورت، نظر فریب جال جو پیشہ ور شکاری لیڈر آج بھی ہر جگہ سادہ دل عوام کا جذباتی استحصال کرنے، انہیں سنہرے خواب اور سبز باغ دکھا کے پھانسنے کے لئے استعمال کر رہے ہیں اور خود ان کی لاشوں پر قدم رکھتے کامیابی کی منزل کی طرف بڑھتے جا رہے ہیں۔

کچھ قلی مسلح پولیس کے آنے کی اطلاع ملتے ہی کھسکنے لگے تھے مگر زیادہ تعداد ان کی تھی جو مقرر کے آتشیں الفاظ سے آتش فشاں بن گئے تھے۔ میں نے انتشار اور افراتفری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے غالب اور محسن کو بھی اپنے ساتھ پیچھے کھینچ لیا۔ مشتعل ہجوم اب پولیس کے خلاف نعرے لگاتا آگے بڑھ رہا تھا اور سیاست کے داؤ پیچ سے کام لے کر مجمع کو پُرسکون رکھنے والا سب انسپکٹر اچانک اپنی کامیابی کو ناکامی میں بدلتا دیکھ کے پریشان تھا۔

اس دھکم پیل میں باہر نکلنے کے لئے راستہ بنانا دشوار کام تھا مگر

ہم آخر کار ان "بزدل" لوگوں میں شامل ہوگئے جو ایک بے بنیاد اطلاع پر جائے واردات سے بخیر و عافیت رخصت ہوجانے کو عقلمندی سمجھتے تھے۔ بھیڑ میں مجھے کسی قلی کا ایک ٹوکن بھی ملا میں نے فوراً اپنا ٹوکن اتار کے پھینک دیا اور دوسرا نمبر لگالیا۔ سب انسپکٹر کو بعد میں ضرور معلوم ہوگیا ہوگا کہ آگ لگانے والا وہی رستم تھا جو خود کو ماماجی کا جانشین کہتا تھا۔ ممکن ہے اس نے مجھے ہجوم میں تلاش بھی کیا ہو مگر اس وقت تک ہم بہت دور جاچکے تھے۔

"گل کا کچھ پتا چلا؟" محسن نے موقع پاتے ہی میرے قریب آکے کہا۔

میں نے کہا "نہیں۔"

غالب جو مجھ سے بھی آگے تھا' رُک گیا اور اس نے یہی سوال پھر کیا۔

میں نے کہا "اتنا میں ضرور کہہ سکتا ہوں کہ جب پولیس آئی تھی تو گھر میں نہ گل تھی اور نہ تازو۔ اندر صرف ماماجی کی اور یوسف کی لاشیں پڑی ہیں۔"

"یوسف! وہ بھی مارا گیا؟" غالب اور محسن نے ایک ساتھ کہا۔

"ہاں۔ گیہوں کے ساتھ گھن پس جاتے ہیں۔"

"ہمارے دامن پر بے گناہوں کے خون کا قرض بڑھتا جارہا ہے۔" محسن نے بڑے دکھ سے کہا۔

غالب نے اس کی تائید کی "دونوں کی موت کے ذمے دار ہم ہیں۔"

میں نے کہا "کیا ہم چاہتے تھے کہ وہ ...... اس طرح مارے جائیں......"

پھر بھی۔ ہم یہاں نہ آتے تو......"

"کیسے نہ آتے ہم یہاں۔ کیا ہم نوشتۂ تقدیر کو بدل سکتے تھے؟ غیب کا علم تھا ہمارے پاس؟ تم چوہدری دلاور کو ذمے دار کیوں نہیں سمجھتے جس نے ہمیں اس جنگ میں اترنے پر مجبور کیا۔ اور دلاور ہی کیوں؟ تم انہیں ذمے دار کیوں نہیں سمجھتے جو مشرقی پاکستان میں خانہ جنگی اور انتشار کے بیج بو چکے تھے۔ ملکی اور عالمی سیاست کے شیطان شاطروں کو ذمے دار کیوں نہیں سمجھتے؟"

"یہ دلائل درست ہیں دوست۔ لیکن میں اپنے احساس کو کیا کروں' وہ کسی دلیل سے مطمئن نہیں ہوتا۔" غالب نے کہا۔

"جس نے بھی ہماری مدد کی گویا موت کو دعوت دی" محسن بولا۔

"بحث تم نے ہی شروع کی تھی" میں نے برہمی سے کہا۔

"اچھا یار' جس نے بھی شروع کی تھی۔ ختم کرو یہ بات۔ تم اندر کیا لینے گئے تھے؟" غالب نے کہا۔

"ظاہر ہے گل اور تازو کی خبر لینے گیا تھا۔"

"تازو تو شاید قسمت سے بچ گئی ہو" محسن بولا "اچھا ہی ہوا کہ وہ گھر سے نکل گئی تھی۔"

"ابھی کیا پتا۔ امید تو گل کے بارے میں بھی ہے کہ وہ نکل گئی؟" میں نے کہا

"وہ کیسے؟" محسن نے پُرامید لہجے میں کہا۔

"پولیس سب انسپکٹر کا کہنا ہے کہ واردات کی اطلاع کسی لڑکی نے دی تھی جو بہت خوفزدہ اور نروس تھی۔"

"وہ گل تھی؟"

"اس نے اپنا نام نہیں بتایا تھا۔ یہ صرف میرا خیال ہے' میں نے کہا "میرا خیال غلط بھی ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے شکاری اسے پکڑ لے گئے ہوں۔"

"کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ جب شکاری اندر آئے ہوں تو وہ کہیں چھپ گئی ہو اور ان کے جانے کے بعد وہاں سے فرار ہوکے اس نے پولیس کو فون کیا ہو؟" محسن بولا۔

"یہ بھی ہو سکتا ہے" میں نے کہا "مگر گل کو آخر کیا ضرورت تھی پولیس کو اطلاع دینے کی؟ فون کہاں سے کیا ہوگا اس نے؟"

"شاید کسی پبلک کال آفس سے۔"

"تو کیا وہاں کسی نے اس کو نہیں دیکھا ہوگا؟ اس کی بات نہیں سنی ہوگی؟" میں نے کہا۔

"تم نے کیا بتایا پولیس کو؟"

میں نے جو کچھ کہا تھا وہ انہیں بتادیا۔

"اگر گل کو فرار ہونے کا موقع مل گیا تھا تو وہ کہاں گئی ہوگی؟" غالب نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

"اگر میں یہ بتا سکتا تو تمہیں سیدھا اس کے پاس نہ لے جاتا" محسن بولا۔

"کسی کی چھٹی حس کچھ نہیں بتاتی؟" غالب مایوس ہوکے بولا۔

"ہم صرف قیاس کرسکتے ہیں۔ ممکن ہے وہ اسی علاقے میں چھپی بیٹھی ہو۔ ممکن ہے وہ ہمیں تلاش کرنے نکل کھڑی ہوئی ہو۔ ممکن ہے وہ بھی گھوڑے گدھے دیکھنے چلی گئی ہو۔ اس امید میں کہ وہاں تازو مل جائے گی تو وہاں سے واپس جانے سے روک لے گی۔ امکانات لامحدود ہیں۔ ایک امکان یہ بھی ہے کہ وہ عقل سے کام لے۔"

"عام آدمی بھی پریشان ہو تو عقل سے کام نہیں لے سکتا۔ کہاں ایک عورت۔"

میں نے کہا "یار' وہ عورت نہیں ہے۔ وہ ناگ منی تھی۔ ایک ڈاکو کی بہن۔ ڈکیتی کی وارداتوں میں اپنے بھائی شیش ناگ کے ساتھ رہتی تھی۔ وہ ہراساں ہونے والی لڑکی نہیں ہے۔ تازو اور گل دونوں ہی غیر معمولی حالات میں غیر معمولی ہمت اور جرأت کا مظاہرہ کرنے کی اہل ہیں۔ یہ ہم بارہا آزما چکے ہیں۔ گل اگر سوجھ بوجھ سے کام لے تو سیدھی وہاں پہنچ سکتی ہے جہاں ہم کل رات گئے تھے۔ اور آج رات پھر جائیں گے۔ وہ ایک ایسی جگہ ہے جہاں ہم یقینی طور پر مل سکتے ہیں۔ اس کے لئے رات تک انتظار ضرور کرنا پڑے گا۔"

غالب نے چٹکی بجا کے کہا "اب میری چھٹی حس بھی کہتی ہے۔"

"لیکی کی تیسی تمہاری چھٹی حس کی" محسن نے کہا "جو تم سے زیادہ مردار اور کاہل ہے۔"

"مگر گل وہاں گئی تو وہاں تالا پڑا ہوا ہوگا۔" غالب نے کہا۔

محسن نے پھر اس پر طنز کیا "پھر کیا ہوا؟ وہ دروازے پر بیٹھ کے رونا شروع کردے گی۔ یہاں تک کہ فرشتۂ غیب بن کے کوئی خدا کا نیک بندہ اس کی مشکل کشائی کے لئے چابی لے کر نمودار ہوجائے گا۔"

میں نے کہا "مرزا جی! وہ ناگ منی تھی۔ تالے کھولنا شاید نہ جانتی ہو مگر توڑنا ضرور جانتی ہوگی۔ دروازے اس کی راہ میں حائل نہیں ہوسکتے۔ وہ دروازہ توڑدے..."

غالب نے کہا "خدا کرے ایسا ہی ہو۔ کیوں نہ ہم ابھی جا کے دیکھ لیں۔"

"تازو کو واپس جانے سے کیسے روکا جائے؟ یہ بھی سوچو۔"

"اس میں ذرا بھی عقل ہوگی تو اُدھر کا رخ نہیں کرے گی۔ اسے دور سے ہی گڑبڑ نظر آجانی چاہئے۔" میں نے کہا۔

"اور نظر نہ آئی تو؟ خاتون کو حد سے زیادہ خود اعتمادی کا مرض بھی تو لاحق ہے" محسن نے کہا۔

"ہم کہیں روک سکتے اسے...." غالب نے کہا۔

"کہاں' کب اور کیسے؟" محسن بولا "کچھ پتا ہے وہ کدھر سے تشریف لائیں گی اور کب تک۔"

میں نے کہا "یار' وہ بھی اُدھر ہی آئے گی۔ کیوں نہ ہم ایک بار پھر دیکھ لیں۔ ہم خطرے سے بہت دور آگئے ہیں۔"

"چلو۔ لیکن اب میں خود کو کہیں محفوظ نہیں سمجھتا۔ ہمارا بھیس بدل کے پھرنا اور کہیں بھی جا چھپنا ان کی نظر سے پوشیدہ نہیں رہتا" محسن بولا "کچھ پتا نہیں اس وقت بھی کون ہمارے پیچھے لگا ہوا ہے اور سب کچھ دیکھ رہا ہے۔"

"ماماجی کے وحشیانہ قتل سے تو یہی ثابت ہوتا ہے" غالب نے کہا "منو میاں کو اور خود ماماجی کو شاید یقین تھا کہ ان کے ٹھکانے تک ہمارے دشمنوں کی رسائی نہیں ہوسکتی مگر یہ یقین غلط تھا۔"

"میں نہیں مان سکتا کہ وہ ہر جگہ اور ہر وقت ہم پر نظر رکھتے ہیں؟" میں نے کہا "یہ کیسے ممکن ہے یار! بمبئی کا اتنا بڑا شہر ہے' لاکھوں کی آبادی ہے۔ اس کے ایک سرے سے دوسرے سرے کی خبر نہیں ملتی۔ کتنی بڑی انٹیلی جنس فورس ہے آخر ان کی؟ اور اگر تمہاری بات درست ہے تو وہ کیوں خاموشی سے ہمارا پیچھا کرتے ہیں۔ اس وقت بھی ہمارے تعاقب میں ہیں تو انہیں انتظار کس کا ہے؟ ہمیں پکڑ کیوں نہیں لیتے۔ گولی کیوں نہیں مار دیتے۔ ہمارے آگے پیچھے کتنے لوگ چل رہے ہیں۔ کس پر شک کیا جائے؟"

"پھر یہ کیسے ہوا آخر۔ ہم بال بال بچ گئے۔ گھر میں ہوتے تو مارے جاتے" محسن نے کہا۔

"مجھے ایسا لگتا ہے کہ کوئی مخبری کرتا رہا۔ کسی نے ہمارے بارے میں دلاور اینڈ کمپنی کو اطلاع دے دی۔ مثلاً پولیس نے۔"

اچانک محسن خود بھی رُک گیا اور ہاتھ بڑھا کے ہمیں بھی روک لیا۔ میں نے اس کی نظر کا تعاقب کیا تو مجھے زرد اور سرخ دھاریوں والا ایک کنٹینر نظر آیا جو چالیس فٹ لمبا اور بیس فٹ چوڑا تھا۔ ایک مستطیل فولادی باکس جو دیو ہیکل ٹریلر کے اوپر لدا ہوا تھا۔ بین الاقوامی جہاز راں کمپنیاں بھی مال لانے لے جانے کے لئے ایسے ہی کنٹینرز استعمال کرتی ہیں۔ چھوٹے بیس فٹ لمبے ہوتے ہیں لیکن یہ بڑا کنٹینر تھا اور کچھ دیر پہلے وہاں موجود نہیں تھا جہاں اب نظر آرہا تھا۔

غالب نے کہا "کیا یہ وہی ڈبا ہے جس میں گھوڑے جائیں گے؟"

"ذرا اس سوال کا جواب بھی عنایت فرمائیے" محسن بولا۔

"قریب جاکے دیکھ لیتے ہیں۔ قریب سے بھی یہ ویسا ہی نظر آئے گا جیسا دور سے نظر آرہا ہے۔"

غالب نے کہا "ہم کسی سے پوچھ سکتے ہیں۔"

"مثلاً جیون پرشاد ایم ایل اے سے۔ فون کرکے۔ یار مرزا' میں محسوس کررہا ہوں کہ آج کل ہر احمقانہ بات کرنے کا ٹھیکا تم نے لے رکھا ہے۔"

"جیسے ہم سخن ہوں ویسی ہی بات کرتا ہوں میں۔ عقل کی بات کہاں سمجھو گے تم" غالب نے کہا۔

"سنو' لڑنے سے کچھ نہیں ہوگا" میں نے کہا "صورت حال اس وقت یہ ہے کہ ہمارے پاس کوئی عارضی ٹھکانہ بھی نہیں رہا۔ نہ کوئی ساتھ دینے والا ہے اور نہ کوئی گھر۔ ابھی بجے ہیں سہ پہر کے تین۔ اگر خوش قسمتی سے ہمیں قلی نمبر سات سو بیس کی سفارش پر لوڈنگ کا کام مل گیا......"

"موجودہ حالات میں اسے خوش قسمتی نہیں شامتِ اعمال کہو"... محسن بولا۔

"میں امید پرستی نہیں چھوڑ سکتا" میں نے کہا "حادثات تو ہماری زندگی کے معاملات میں شامل ہیں۔ شام تک ہمیں کہیں نہ کہیں وقت گزارنا ہوگا۔ ہم یوں کرتے ہیں کہ پہلے تو کھانا کھالیں حالاں کہ مجھے بھوک نہیں ہے۔"

بھوک غالب اور محسن کو بھی نہیں تھی۔ آج کا دن ہمارے لئے مسلسل صدمات اور توقعات کی شکست کے اسباب لے کر طلوع ہوا تھا۔ سب سے پہلے صبح ہوتے ہی اچانک منو میاں رخصت ہوئے اور ایسے گئے کہ اپنا پتا ٹھکانہ بھی بتا کر نہیں گئے۔ پھر تازو تن

تھا اور کسی سے مشورہ کئے بغیر ایک ایسے مشن پر روانہ ہو گئی جس میں اس کی کامیابی کے امکانات کو محض خوش فہمی سمجھا جا سکتا تھا۔ ماماجی اور یوسف کے بہیمانہ قتل کے بعد نازو کی گمشدگی آخری سانحہ تھی جس نے ہم سب کا سکون چھین لیا تھا۔ ایسے میں کھانے کا خیال ہی وحشت انگیز تھا لیکن میں نے غالب اور محسن کو کھانے پر مجبور کیا۔ کھانا جسم کی ضرورت تھا اور جسم کو توانائی کی ضرورت تھی۔

"آگے کا کچھ بھروسہ نہیں' کچھ ملے نہ ملے" میں نے کہا۔ "ابھی فرصت تو ہے۔"

"میرے ذہن میں ایک خلا ہے' میں مایوسی کا شکار ہو رہا ہوں" ۔ غالب نے کہا۔

"ذہن اور جسم کے اعصاب کو انتشار سے بچاؤ' یہ وقتی اثر ہے۔ ابھی نازو مل جائے یا گل نظر آ جائے تو سب پھر ٹھیک ہو جائے گا" میں نے کہا "یہاں بیٹھ کے کچھ کھاتے ہیں' کچھ سوچتے ہیں۔"

ہم ٹریلر سے سو گز دور ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ قریب کھڑے ہوئے ایک موبائل ریسٹورنٹ کے گرد اس وقت بھی کھانے والوں کا ہجوم تھا حالانکہ دوپہر کے کھانے کا وقت گزر چکا تھا۔ یہ ایک پرانا ٹرک تھا جس کے پچھلے حصے کو کسی نے چلتا پھرتا ریسٹورنٹ بنا دیا تھا۔ ایک شخص بہت سی پتیلیوں کے درمیان بیٹھا بڑی پھرتی سے دال چاول نکال رہا تھا۔ سالن روٹی کے مقابلے میں دال چاول کی مقبولیت کا سبب صرف اس کی کم قیمت تھی ورنہ اس کے پاس قیمہ اور قورمہ بھی تھا۔ اس ٹرک کے ایک کونے میں ریسٹورنٹ کے مالک کا لڑکا مسلسل چائے تقسیم کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ بڑی مشّاقی سے ایک ٹونٹی کھولتے تھے اور کپ میں چائے کی مقررہ مقدار پوری کرتے ہی ٹونٹی بند کر دیتے تھے۔ لڑکا کپ آگے بڑھا کے اسی ہاتھ سے پیسے وصول کرتا تھا اور ایک صندوقچی میں ڈال دیتا تھا۔

کھانے کے بعد چائے پینے اور سگریٹ ختم کرنے تک ہم سب اپنے اپنے خیالات میں غلطاں رہے۔ ہم سب ایک دوسرے سے اپنی پریشانی چھپانے کی کوشش کر رہے تھے اور مایوس کُن خیالات کے خلاف اپنے اپنے طور پر ایک دفاعی جنگ لڑ رہے تھے۔ ہم سب کی نظر بار بار اس ٹریلر کی طرف اٹھ جاتی تھی جو بظاہر بالکل لاوارث کھڑا ہوا تھا۔ ٹریلر میں ڈرائیور کی جگہ بھی خالی تھی اور اگر ان کنٹینرز میں گھوڑے تھے تو وہ بھی اکیلے تھے۔ ان کے ساتھ کوئی ہوتا تو اتنی دیر میں نظر ضرور آتا۔

"مجھے آہستہ آہستہ یہ احساس ہو رہا ہے کہ ہم اس مرغی سے انڈے کی آس لگائے بیٹھے ہیں جو کڑک ہے" غالب نے کہا۔

"یا شاید مرغی ہی نہیں ہے' مرغا ہے" محسن بولا۔

"تمہارا مطلب ہے کہ یہ کسی اور کا ٹریلر ہے...... اور اس میں وہ گھوڑے ہی نہیں ہیں جن کا سراغ لگانے کے لئے نازو گئی تھی" میں نے کہا۔

"یہی تو فلسفیانہ بات مگر تم سمجھ گئے" غالب بولا۔

"آخر کچھ تو فائدہ ہوا ہماری صحبت کا" محسن نے کہا۔

میں خود تذبذب کا شکار تھا اور یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ ہم نے واقعی اپنا وقت ضائع کیا ہے۔ بس میری چھٹی حس تھی جو کہتی تھی کہ ہم نے اندازوں میں کوئی غلطی نہیں کی' کیونکہ ابھی تک اس پورے علاقے میں دوسرا کوئی کنٹینرز نہیں پہنچا تھا۔ عام طور پر گھوڑے ریلوے کی عام بوگیوں میں اسی طرح بھیجے جاتے تھے جیسے دوسرے مویشی۔ لیکن یہ خاص گھوڑے تھے چنانچہ ان کے لئے خاص انتظامات کئے گئے تھے۔ ماماجی کی فراہم کردہ اطلاعات درست تھیں تو یہی وہ کنٹینرز ہو سکتا تھا جس میں جیون پرشاد ایم ایل اے کو اپنے ریس کے گھوڑے روانہ کرنے تھے۔ ایک ویٹرنری ڈاکٹر' ایک ٹرینر اور ایک نرس یا خادمہ کے ساتھ۔ ابھی ان تینوں میں سے کسی نے اپنی شکل نہیں دکھائی تھی' یہاں تک کہ کنٹینرز میں گھوڑوں کی موجودگی کا بھی کوئی ثبوت نہیں ملا تھا۔

اچانک مجھے ایک ایسا خیال آیا جو بہت پہلے آنا چاہئے تھا۔ میں نے کہا "شیروانی صاحب! آپ گدھے ہیں مان لیجئے۔"

محسن نے سر کھجا کے کہا "دیکھئے' ظاہری صفات تو اس کے برعکس ہیں مگر میں آپ کی درخواست کو رد بھی نہیں کر سکتا۔"

"اور مرزا غالب' آپ بھی عقل سے پیدل ہیں" میں نے کہا۔

"اگرچہ یہ انکشاف ہے میرے لئے۔ پھر بھی آپ کا دل رکھنے کے لئے میں مان لیتا ہوں۔ خیالِ خاطرِ احباب چاہئے ہردم" غالب نے کہا۔

محسن بولا "اخلاقاً تم بھی بتا دو کہ تم ہمیں گالیاں کیوں دے رہے ہو۔"

میں نے کہا "یار! خود ہی سوچو' کیا اتنا بڑا ٹریلر اور کنٹینرز جیون پرشاد کے گھر جائے گا' گھوڑے لانے کے لئے۔ شہر کی اکثر سڑکوں پر دن کے وقت بھاری گاڑیوں کا گزرنا منع ہے۔"

غالب اور محسن نے بات سمجھ لی تھی۔ انہوں نے ایک دوسرے کو خفت سے دیکھا مگر ڈھٹائی سے ہنسنے لگے "مجھے تو خیر بہت پہلے ہی اندازہ ہو گیا تھا...." محسن بولا۔

"اور مجھے اس سے بھی پہلے یہ بات سمجھ میں آ گئی تھی" غالب نے کہا۔

میں اٹھ کھڑا ہوا "مرزاجی' اب تم اکیلے ڈیوٹی دو گے یہاں۔ رات سے پہلے پہلے گھوڑے بھی پہنچ جائیں گے اور ان کے خدمت گار بھی۔"

"میں بس دیکھتا رہوں' تم لوگ کہاں جا رہے ہو آخر؟"

"میری چھٹی حس غراتی ہے کہ نازو انہی کے ساتھ آئے گی" میں نے کہا۔

محسن نے بڑی عقیدت سے کہا "پیرومرشد' میری ساتویں حس بھی یہی عرض کرتی ہے۔"

بہت عرصے بعد اس نے مذاق میں یہ بات کہی تھی۔ وہ جب بھی اپنی ساتویں حس سے میری چھٹی حس کی تائید کرتا تھا تو گویا اپنے اور میرے وجدان' ذہنی ہم آہنگی اور سوچ میں مطابقت کا اعلان کرتا تھا۔ کہنے کو یوں بھی کہا جا سکتا تھا کہ یہ ٹیلی پیتھی تھی کہ جو بات میرے دماغ میں آتی تھی وہ زبان کے اظہار سے پہلے اس کے شعور اور ادراک تک پہنچ جاتی تھی۔

"محسن جائے گا ماماجی کے کوارٹر کی طرف...."

محسن نے گھبرا کے کہا "میں اپنی ساتویں حس کی حمایت واپس لیتا ہوں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں...."

"یار' بات تو سن لے پہلے" میں نے کہا "میں اُدھر اس لئے نہیں جا سکتا کہ وہاں وہ خبیث سب انسپکٹر ہو گا جو مجھے دیکھ چکا ہے۔ وہ میرا ویسے ہی دشمن ہو رہا تھا مگر مجبور تھا۔ میرے غائب ہو جانے کے بعد تو اس نے مجھے صفِ مجرماں میں شامل کر دیا ہو گا اور میری باقاعدہ تلاش کی جا رہی ہو گی۔"

"وہ بے چارہ مفت میں پکڑا جائے گا جس کا بیج تھا۔"

"نہیں۔ میں نے اپنا نام رستم بتایا تھا۔ اگر کوئی رستم ملا تو اس کا بیج نمبر مختلف ہو گا" میں نے کہا "تم کو پہچاننے والا کوئی نہیں۔ وہاں اس وقت بھی قلی موجود ہوں گے۔ ضابطے کی کارروائی کے بعد لاشیں تو پولیس لے جا چکی ہو گی۔"

"تم جو شوشہ چھوڑ آئے تھے' اس کے بعد معلوم نہیں وہاں کتنا ہنگامہ ہوا ہو گا۔"

"وہ بھی ختم ہو چکا ہو گا اب تک۔ کوارٹر کو پولیس نے سیل کر دیا ہو گا مگر ماماجی کے بھانجے تو آتے رہیں گے۔ جس کو بھی خبر ملے گی وہ اُدھر کا رخ کرے گا۔ اور ظاہر ہے آس پاس رہنے والوں سے ہی سارے حالات کا پتا چلے گا۔ زیادہ دلچسپی کا مظاہرہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ ممکن ہے وہاں شکاری بھی تاک میں ہوں کہ ہم میں سے کوئی نظر آئے۔"

غالب نے کہا "مشکل ہے۔ وہ مایوس ہو کر لوٹ گئے ہوں گے کہ ہم پھر بچ کر نکل گئے۔ ہنگامے کے بعد ہماری واپسی کی توقع کیسے رکھ سکتے ہیں وہ۔"

"اچھا میں جاتا ہوں" محسن نے کہا "کہا سنا معاف کرنا۔"

غالب نے نفی میں سر ہلایا "نا بھائی' ابھی سے تمہارا کہا سنا کیسے معاف کر دوں' تم تو آئندہ بھی بہت کچھ کہو گے مجھے۔"

میں نے کہا "تم کو یہاں اس لئے چھوڑا جا رہا ہے مرزا غالب کہ نازو کی نظر تمہیں ہر حال میں سب سے پہلے دیکھ سکتی ہے۔ تم اسے اندھیرے میں بھی نظر آ جاؤ گے۔ ویسے میرا مشورہ ہے کہ اندھیرا ہونے لگے تو روشنی میں جا بیٹھنا۔"

"تم کیا ہمیشہ کے لئے رخصت ہو رہے ہو کہ اپنا وصیت نامہ سنا رہے ہو" غالب نے کہا "واپس تو آؤ گے نا؟"

"میں جا کے گل کو دیکھتا ہوں۔ ہو سکتا ہے وہ فرار ہو کے وہیں پہنچی ہو۔ واپس ہم دونوں یہیں آئیں گے۔"

"دل کے بہلانے کے لئے تو یہ خیال اچھا ہے۔ مگر اس کا کوئی امکان نظر نہیں آتا کہ اس خونی بھیڑیوں کے گروہ نے ایک کمزور لڑکی کو بخش دیا ہو" غالب نے کہا "وہ اسے ساتھ لے گئے ہوں گے۔"

"بس ایک موہوم سی امید اس خیال نے دی ہے کہ پولیس کو اطلاع دینے والی کوئی عورت تھی جو ہسٹریا کا شکار تھی۔"

"وہ کوئی پڑوس کی عورت بھی ہو سکتی ہے۔ جو عورت بھی خونریزی کا ایسا منظر دیکھے گی وہ ہسٹریا میں مبتلا ہو جائے گی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ گل کے ساتھ شکاری وہاں تمہارے استقبال کے لئے موجود ہوں" غالب نے کہا۔

محسن نے بھی اس کی تائید کی "یہ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے ماماجی یا یوسف سے سب کچھ اگلوا لیا ہو۔"

میں نے کہا "یوسف کا میں نہیں کہہ سکتا مگر ماماجی ایسے نہیں تھے کہ اتنی آسانی سے اپنی جان کے بدلے ہماری زندگی کا سودا کر لیتے۔ بے شک تشدد کے طریقے مؤثر ثابت ہوتے ہیں اور مضبوط سے مضبوط قوتِ ارادی رکھنے والا شکست کھا جاتا ہے مگر انہیں اتنا وقت نہیں ملا۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ صرف ماماجی کو قتل کرنے آئے تھے۔ یوسف خواہ مخواہ ہی مارا گیا۔ محض وہاں موجود ہونا اس کا جرم بن گیا۔"

"موجود تو گل بھی تھی۔"

"شاید وہ چھپ گئی ہو' اس لئے بچ گئی ہو۔ خیر تم فکر مت کرو' میں احتیاط سے کام لوں گا" میں نے کہا۔

شام کے ساڑھے چار بجے سائے لمبے ہونے لگے تھے۔ میں نے کوشش کی کہ اپنے آپ کو آنے جانے والے سب قلیوں کی نگاہوں سے محفوظ رکھوں۔ جس خالی کوارٹر میں خالی تابوت رکھا ہوا تھا وہاں تک پہنچنے کے لئے میں نے لمبا راستہ اختیار کیا حالانکہ وہ جگہ مشکل سے دس منٹ کی مسافت پر تھی۔ جب بھی میرے سامنے کوئی قلی آ جاتا تھا' میں جھک کر زمین پر کوئی چیز تلاش کرنے لگتا تھا۔ اس طرح میں اپنا چہرہ ہی نہیں بیج بھی چھپا لیتا تھا۔ لیکن میں اپنے کان ان کی گفتگو پر رکھتا تھا کہ شاید کسی سے کوئی کام کی بات معلوم ہو جائے۔

اس کوارٹر کے بالکل سامنے تقریباً سو قدم کے فاصلے پر ایک ملنگ ٹائپ فقیر نے ڈیرا ڈال رکھا تھا۔ میلی گدڑیوں اور ہر قسم کے کاٹھ کباڑ کے ساتھ وہ نہ جانے کب سے وہاں مقیم تھا۔ اس کے الجھے ہوئے لمبے لمبے بال' جھاڑ جھنکاڑ داڑھی' بدبودار جسم کی غلاظت' چرس کے نشے میں لال آنکھیں اور جنونی چہرہ اس کو دیوانہ ثابت کرتے تھے اور وہ شخص اس قابل تھا کہ اسے فوراً پاگل خانے

خفل کردیا جائے مگر محرومیوں کے مارے ہوئے' مجبوریوں کے شکست خوردہ' مایوس اور بے بس انسانوں نے اس کے وجود سے عقیدت کے جذبات وابستہ کرکے اسے ایک مجذوب کی حیثیت عطا کردی تھی۔

میں اس کے پاس جا بیٹھا۔ وہ مٹھی بند کرکے سگریٹ کے کش لگا رہا تھا اور اس کی آنکھیں بند تھیں۔ میں ہوا کے رخ پر بیٹھا ہوا تھا چنانچہ سارا دھواں منتشر ہونے سے پہلے میری طرف آتا تھا۔ چرس کی ناگوار بو نے مجھے مجبور کردیا کہ میں اس کے پیچھے جا بیٹھوں۔ ملنگ کی آنکھیں بند تھیں اور اس کا خیال تھا کہ وہ اکیلا ہے۔ اس کا کل اثاثہ ایک بدصورت' زنگ خوردہ پرانا ٹین کا صندوق تھا اور ایک لوٹا۔

میری نگاہ سامنے کوارٹر کے دروازے پر تھی۔ میری موجودگی میں ملنگ کے پاس دو حاجت مند آئے۔ ان میں سے ایک ریس کے گھوڑے کا نمبر معلوم کرنا چاہتا تھا۔

"ابے چھوڑدے یہ دھندے' گھوڑے کی اولاد" نشے میں دھت ملنگ نے گرج کے کہا۔

اس نے ملنگ کے پیر دباتے ہوئے کہا "چھوڑدیں گا بابا صاحب' ایک دم چھوڑدیں گا۔"

ملنگ نے اس کے لات رسید کی "کب چھوڑے گا' جب دنیا چھوڑدے گا گدھے کے بچے۔"

"نہیں بابا صاحب' ابھی ایک بار اپنا لک اور آزمائے گا صرف ایک بار۔" وہ پھر اٹھ کے ملنگ کے پاؤں پڑ گیا "اپن بولا یہ آخری بار ہے بابا صاحب"

"یہ تو پہلے بھی کہا تھا تو نے..... سُور کے بچے" ملنگ بولا۔

"ابھی اپنا باپ کا قسم بابا صاحب' اپنا سب کچھ لگادیا ہے اس بار..... تھوڑا مہربانی کرو۔"

"کیا لایا ہے اب' تیرے پاس بچا ہی کیا ہے کُتے کے بچے" ملنگ نے اسے چوتھے والد سے منسوب کرتے ہوئے کہا۔

ملنگ کی باتوں نے مجھے تھوڑا سا حیران کیا۔ ایک تو عام طور پر ایسے فریب کار ملنگ کسی کو نیکی کا مشورہ نہیں دیتے۔ وہ کسی علت میں پڑا ہو تو اسے برائی چھوڑ کے راہ راست پر چلنے کی ترغیب دینا ان کے اپنے کاروباری مفادات کے خلاف ہوتا ہے۔ مگر وہ اس عقیدت مند کو ریس کی لت چھوڑنے کی کہہ رہا تھا۔ دوسری عجیب بات یہ تھی کہ بابا صاحب کے ساتھ عقیدت مند کے پرانے کاروباری تعلقات تھے۔ ظاہر ہے وہ پہلے بھی نذرانہ لاتا رہا تھا اور اس شوق میں تباہ ہوچکا تھا مگر ایک بار بھی بابا صاحب اپنی روحانی قوت سے اس گھوڑے کا نمبر نہیں بتاپائے تھے جس کو ریس جیتنی تھی۔ عقیدت مند اندھے ہوتے ہیں ورنہ ایک ہی جگہ بار بار لٹنے نہ جائیں۔ شاید کبھی ایسا اتفاق ہوا ہوگا کہ بابا جی نے نشے میں کچھ بک دیا ہوگا اور کسی نے اپنے طور پر کوئی نمبر نکال کے داؤ لگایا ہوگا

تو وہ گھوڑا جیت گیا ہوگا۔ اس سے باباجی کا کاروبار چمک اٹھا ہوگا۔

میرے سامنے عقیدت مند نے ایک تھیلی نکال کے ملنگ کے قدموں میں ڈال دی۔

"چوری کا مال لایا ہے حرامی کے بچے" ملنگ نے دہاڑ کے اس کو دوسری لات رسید کی اور تھیلی پھینک دی۔

حاجت مند لڑھک گیا اور پھر اٹھ بیٹھا "قسم اللہ کا' اپ گھر والی کا اکھا گہنا ہے۔ اس کا مرضی سے لایا ہوں۔ میں بولا سالی دل چھوٹا مت کر' اپن تیرے کو پیلا کردے گا سونے سے۔"

ملنگ نے تھیلی میں ہاتھ ڈالا اور زیور نکال کے دیکھا۔ اس میں سے تقریباً آدھا اس نے واپس تھیلی میں ڈال دیا "پھر اپنی شکل مت دکھانا مجھے' تیری گھر والی پر رحم آگیا ہے ہمیں۔ تیرے نصیب میں کچھ نہیں تھا۔ اس کے مقدر سے ملے گا تجھے۔ نام بتا اس کا۔"

"کلثوم بائی بابا صاحب" عقیدت مند فرطِ مسرت سے کانپنے لگا۔

"کل کو بھول جا' بائی کو چھوڑدے" ملنگ نے آنکھیں بند کرکے کہا "باقی حرف اس کے ہیں... جا..." اس نے تیسری بار عقیدت مند کے لات ماری۔

"تین" وہ خوشی سے چلّایا "بابا صاحب' تین بار لات مارا اپن کو' آج تین تاریخ..." وہ اب اپنے آپ سے باتیں کررہا تھا "نمبر سو پر تین لاکھ۔"

جب وہ اپنی بیوی کا آدھا زیور ریس میں ہارنے چلا گیا تو بابا صاحب نے باقی آدھا زیور اپنے پیچھے والے ٹرنک میں ڈال لیا۔ یہ ٹرنک بڑی ہوشیاری سے زمین میں اس طرح دفن تھا کہ صرف اس کا ڈھکن زمین کی سطح سے چند انچ اوپر رہ گیا تھا۔ ملنگ اس پر گدا بچھا کے سوتا تھا اور اسے تکیے کی جگہ استعمال کرتا تھا۔ مجھے اس شخص کے حال پر بہت دکھ ہوا جو سب کچھ گنوانے کے بعد بیوی کا زیور تک چھین لایا تھا۔ اس نے یقیناً جھوٹ بولا ہوگا کہ وہ بیوی سے پوچھ کے لایا ہے۔ بیویاں کتنی ہی عجیب اور بے وقوف کیوں نہ ہوں' دو چیزیں کبھی اپنے شوہر کے جوئے کی لت' شراب کی عادت یا طوائف کے کوٹھے پر قربان نہیں کرتیں۔ ایک اپنا گھر اور دوسرا اپنا زیور۔ اس شخص کا اور اس جیسے لاکھوں انسانوں کا مقدر صرف تباہی تھا۔ اپنے لئے بھی اور اپنے خاندان کے لئے بھی۔ جو محنت کئے بغیر دولت کی دیوی کے پیچھے جھولی پھیلائے پھرتے ہوں کہ انہیں کسی مدفون خزانے کا پتا بتادے۔ ان کے نام کوئی لاٹری نکل دے یا چھپر پھاڑ کے ان کے خراب خانے کو دولت سے بھردے۔ پیر فقیر' سادھو جوگی جو دولت کی دیوی لکشمی کے ایجنٹ رہتے ہیں' انہی جیسے احمقوں کو لوٹتے رہتے ہیں اور خود دولت مند ہوتے جاتے ہیں۔ بیوی کا زیور ہارنے کے بعد جب اس کے پاس ہارنے کو زندگی کے سوا کچھ نہیں رہے گا تب بھی اسے شکوہ خود سے ہی ہوگا بابا صاحب سے نہیں۔ اتنا ہمت والا کوئی نہیں ہوتا کہ

اپنا نقصان بابا صاحب سے پورا کرنے آجائے۔ جو محنت کی ہمت نہیں رکھتے' وہ بابا صاحب کی روحانی قوت سے برگشتہ ہونے کی ہمت کہاں رکھتے ہیں۔

دوسرا کاٹھ کا الوّ ٹے کا نمبر پوچھنے آیا تھا۔ بابا صاحب نے اسے بھی مختلف نجس جانوروں کی ولدیت قرار دینے کے علاوہ کئی لاتیں رسید کرنے کے بعد کہا تھا "دفع ہوجا ورنہ تیرے جتنے دانت بچے ہیں وہ بھی توڑ دوں گا" اور اس نے بہت خوش ہوکے خود ہی حساب لگالیا تھا کہ بتیس میں سے اس کے کتنے دانت ٹوٹ چکے ہیں' کتنے وہ نکلوا چکا ہے اور کتنے باقی ہیں۔ اس کے نزدیک یہی تعداد خوش نصیبی کے نمبر کی ضمانت تھی۔

مجھے اس مکار بابا صاحب کی لوٹ کھسوٹ پر سخت طیش آرہا تھا اور ممکن ہوتا تو میں صندوق کی جگہ اسے گاڑ کے اس کا سارا مال انہی کو لوٹا دیتا جو بابا صاحب کو گالیوں اور لاتوں کے بدلے نذرانے دے گئے تھے۔ مگر ایسے ہزاروں لاکھوں دھوکے باز اس برصغیر یا ایشیا میں ہی نہیں یورپ اور امریکا میں بھی خوابوں کے سوداگر بنے ہوئے تھے اور خوش فہمیوں کے جال پھیلا کے تعبیر بیچ رہے تھے۔

مجھے وہاں بیٹھے آدھے گھنٹے سے زیادہ ہوگیا تھا۔ میں گھٹنوں میں سر دئے ایک کھمبے سے ٹیک لگائے لاتعلق بیٹھا تھا مگر بابا صاحب نے تاڑ لیا کہ وہاں میری موجودگی بے سبب نہیں ہے۔

"تو کیا چاہتا ہے؟ ڈر مت... قریب آ" بابا صاحب نے جھوم کے کہا۔

میں نے کہا "میں جائزہ لے رہا تھا... کہ میں بھی یہی دھندا شروع کردوں تو میری کامیابی کے کیا امکانات ہیں۔"

بابا صاحب کے لئے یہ ایک جھٹکا تھا "کیا بکتا ہے؟"

"بمبئی میں بزنس کے لئے بہت سرمایہ چاہئے یا تھوڑی سی عقل" میں نے کہا "جس سے بے عقل لوگوں کی جیب کا مال اپنی جیب میں آجائے۔ تمہاری جگہ اچھی ہے دھندے کے لئے۔ مجھے بیچوگے؟"

بابا صاحب کی آنکھیں کُھل گئیں "تُو خریدے گا یہ جگہ! فقیر کی اولاد" اس نے حقارت سے کہا۔

"پھر مجھے گالی مت دینا' میں کوئی مرید نہیں ہوں تمہارا۔ بزنس کی بات کرنے آیا ہوں' منہ مانگی قیمت دوں گا۔"

بابا صاحب کی صورت پر اب پریشانی اور خوف کی علامات واضح تھیں "ابے تو کیا جانے قیمت کیا ہوتی ہے۔ نیچے سے اوپر تک سب کو دیتا ہوں۔ ریلوے والوں سے پولیس والوں تک اور پورے بیس ہزار دئے تھے جگہ کے پانچ سال پہلے۔"

"روز کی آمدنی کتنی ہوجاتی ہے؟" میں نے خالص کاروباری لہجے میں سوال کیا۔

اس نے گھبرا کے مجھے مشکوک نظروں سے دیکھا۔

میں نے کہا "میں انکم ٹیکس والا نہیں ہوں۔ جب سودا ہو رہا ہے تو پھر..."

"کون سالا کر رہا ہے سودا تم سے" وہ بگڑ کے بولا "جاؤ یار' کام کرو اپنا۔"

میں نے کہا "میرے حلئے پر مت جاؤ۔ پیری فقیری کے علاوہ شعبدے بازی اور جادو کے کمالات میں سات سال کا تجربہ ہے میرا۔"

"مجھے بیس سال ہوگئے ہیں" اس نے حقارت سے یوں کہا جیسے میں ایک طفلِ مکتب ہوں۔

"پھر تمہارا کیا ہے' کہیں بھی اڈا جماسکتے ہو۔ بولو اب کتنے مانگتے ہو..."

اس سے پہلے کہ وہ مجھے جواب یا کوئی گالی دیتا' میری نظر سامنے والے کوارٹر کی طرف اٹھی۔ غافل میں ایک لمحے کے لئے بھی نہیں ہوا تھا اور ملنگ کے ساتھ باتیں کرنا تو محض وقت ضائع کرنے کا ایک بہانہ تھا۔ اس کا وقت بھی اور اپنا بھی۔ دراصل کوارٹر کا غیر مقفل دروازہ دیکھ کر مجھے آس بندھ گئی تھی کہ گل اندر ہی چھپی بیٹھی ہے لیکن گل کا چہرہ مجھے ایک لمحے کے لئے ساتھ والے کوارٹر میں نظر آیا تو میں ہکا بکا رہ گیا۔ گل نے دروازہ کھول کے اِدھر اُدھر دیکھا تھا اور پھر بند کرلیا تھا۔

"میں کل آؤں گا۔ قیمت سوچ کے رکھنا" میں نے جاتے جاتے کہا "دیسے فراڈ کی ایک سے ایک شاندار اور کامیاب اسکیم ہے میرے پاس' کبھی پکڑے نہیں جاؤ گے۔"

وہ میری باتوں سے بدحواس ہوگیا تھا۔ اسے شک تھا کہ میں خفیہ پولیس کا آدمی ہوں یا ایسے ہی کسی ادارے کا جو اس کے کاروبار اور آمدنی پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ اس کی نظر سے بچنے کے لئے میں گھوم کر اس کوارٹر تک گیا جہاں میری نظروں نے گل کے چہرے کی جھلک دیکھی تھی۔ میں سیدھا جاتا تو ملنگ اس کوارٹر کو میری رہائش گاہ سمجھ لیتا۔

دروازے پر دستک دینے سے پہلے میں تذبذب کا شکار ہوگیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ میری نظر کا دھوکا ہو۔ میں نے کسی اور کو گل سمجھ لیا ہو۔ اتنی دور سے صورت کی معمولی سی مشابہت بھی نظر کا فریب ہوسکتی تھی۔ میں دستک دے کر یہ بھی نہیں پوچھ سکتا تھا کہ کیا مساۃ گل بانو عرف گل یہاں تشریف رکھتی ہیں۔ پھر مجھے ایک طریقہ سوجھ گیا۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور کسی کو قریب نہ پاکے اونچی آواز میں کہا "ناگ منی... اے ناگ منی" اور دوڑ کے دور جا کھڑا ہوا۔

کوئی بھی میری آواز سن کے کیسے اندازہ کرسکتا تھا کہ میں دراصل گل بانو کو پکار رہا ہوں۔ سوائے گل بانو کے۔ میں بالکل لاتعلقی کے انداز میں دوسری طرف دیکھ رہا تھا کہ میرے کانوں نے دروازہ کھلنے کی آواز سنی۔ میں نے آہستہ آہستہ سر گھما کے

دیکھا۔ گل بڑی بے چینی سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ اس نے یقیناً میری آواز پہچان لی تھی۔ میری صورت دیکھتے ہی اس کا چہرا امید کی روشنی سے منور ہوگیا۔

اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے قریب بلایا۔

"اندر آجائیں بھائی سکندر، مجھے یقین تھا کہ آپ ہی آئیں گے" اس کے لہجے میں اعتماد کے ساتھ مسرت تھی۔

اندر جاکے میں نے کہا "یہ گھر کس کا ہے؟"

"اندر ایک بوڑھا لیٹا ہے، بیمار ہے اور بے چارے کو نظر بھی کچھ نہیں آتا" اس نے دروازہ بند کردیا اور سرگوشی میں بولی۔

"تم کیسے آگئیں یہاں؟"

"اور کیا کرتی... کہاں جاتی؟" گل نے کہا۔

"یہ ساتھ والا کوارٹر بھی تو تھا۔ میں تو سمجھا تھا کہ تم یہاں چھپی بیٹھی ہو۔"

"دروازے میں تالا پڑا ہوا ہے۔"

"کہاں، مجھے تو کوئی تالا نظر نہیں آیا۔"

"پیچھے کی طرف ہے" گل نے کہا۔

"تم نے مجھے مایوس کیا گل۔"

"کیوں؟" اس کی شکل اتر گئی۔

"میں نے بڑے دعوے سے کہا تھا کہ تالا کیا چیز ہے، تم دروازہ توڑ سکتی ہو" میں نے کہا "ایسے منہ اٹھا کے کسی بھی گھر میں گھستے ہوئے ڈر نہیں لگا تمہیں؟"

"وہ... دراصل...... میں یہاں آئی تھی۔ سوچ رہی تھی کہ دیوار پھاند کے اندر کود جاؤں۔ اتنی دیر میں ایک بچّہ بھاگا بھاگا آیا اور بولا "دیدی، جلدی سے چل کے کاکا کو دیکھ لو، ان کی طبیعت بہت خراب ہے۔ منورما دیدی کہیں گئی ہے۔ اس سے پہلے کہ میں فیصلہ کرتی، وہ میرا ہاتھ پکڑ کے کھینچنے لگا اور میں مجبور ہوگئی۔ یہاں آکے پتا چلا کہ بچّہ محلے کا تھا، کھانا لے کر آیا تھا۔"

"یہ منورما دیدی کون ہے؟"

"بڈھے نے مجھے بتایا کہ لاوارث لڑکی ہے۔ اس کے ساتھ رہتی ہے اور اس کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ کبھی جب اسے کام مل جاتا ہے تو وہ اکیلا رہ جاتا ہے۔ آج رات بھی وہ نہیں آئے گی..."

میرے ذہن میں سوال یہ آیا تھا کہ آخر منورما دیدی کیا کام کرتی ہے جو ہر روز نہیں ملتا مگر ملتا ہے تو اس کی رات باہر گزرتی ہے۔ گل سے یہ سوال پوچھنا اس لئے مشکل تھا کہ اسے جواب دینا زیادہ مشکل ہوجاتا۔

"میں نے بڈھے کو کھانا کھلادیا۔ یہ کہا کہ میں منورما کی ایک سہیلی ہوں۔ وہ دیکھ تو سکتا نہیں۔"

"کیا سن بھی نہیں سکتا؟"

"اونچا سنتا ہے۔ اکیلا پڑا مرنے کی دعائیں کرتا رہتا ہے۔ پہلے اس نے بیوی کو چھوڑ دیا تھا۔ بعد میں بچّے اس کو چھوڑ گئے۔ کہتا ہے مجھے اپنے اعمال کی سزا مل رہی ہے۔"

"یہ بتاؤ، تم کو معلوم ہے ماماجی کے گھر میں ہمارے جانے کے بعد کیا ہوا تھا؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ پہلے تو نازو چلی گئی۔ میں نے بہت روکا مگر وہ نہیں کہنے لگی تم فکر مت کرو، مجھے کچھ نہیں ہوگا، یہ کام میرے سوا اور نہیں کرسکتا۔"

"کہاں گئی تھی وہ؟ تمہیں تو بتایا ہوگا۔"

"اس نے کہا تھا کہ میں جیون پرشاد سے ملنے جارہی ہوں"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "مجھے یہی ڈر تھا۔ میں غالب اور محسن سے بات تو نہیں کی تھی مگر میرا اندازہ یہی تھا"

"میں نے پوری کوشش کی تھی نازو کو سمجھانے کی مگر آپ جانتے ہیں بھائی سکندر..."

"ہاں، وہ کسی کی نہیں سنتی۔ اگر اسے جیون پرشاد سے ... سوجھ ہی گئی تھی تو اسے ذکر تو کرنا چاہئے تھا ہم سے..."

"وہ... اس کا کہنا تھا... کہ آپ لوگ مخالفت کریں... گل نے کہا۔

"حمایت ہم کیسے کرسکتے تھے۔"

"اس کا خیال تھا کہ آپ لوگوں کے منصوبے میں رسک زیادہ ہے۔ کامیابی کے امکانات کم ہیں۔"

"بے وقوف لڑکی، جہاں رسک لینا ضروری ہو وہاں لینا ہی ہے۔ اب کیا ضمانت ہے کہ خود اس کے لئے کوئی رسک نہیں... وہ کیوں نہیں سمجھتی کہ وہ ایک جوان اور خوب صورت عورت ہے" میں نے مشتعل ہوکے کہہ دیا۔

گل کا رنگ لال ہوگیا "اس نے کہا تھا... کہ میں اپنی حفاظت کرسکتی ہوں، تم فکر مت کرو۔"

"یہ کہنا بہت آسان ہے" میں نے بگڑ کے کہا۔

"پلیز بھائی سکندر، آہستہ بولیں، بڈھا نہ جاگ اٹھے۔"

"تم نے کہا تھا کہ وہ بیمار ہے اور دیکھ نہیں سکتا۔"

"ہاں۔ مگر معذور تو نہیں ہے۔"

میں نے ایک گہری، لمبی سانس لے کر نازو کے خلاف ... کے بخارات کو خارج کیا اور پھر ایک سے دس تک الٹی گنتی کی۔ قدرے پُرسکون ہوجانے کے بعد بھی مجھے سوچنا پڑا کہ بات کیسے شروع کروں جو گل کو جذباتی بحران میں مبتلا کردے... بظاہر وہ پُرسکون تھی اور خوف یا دہشت کے احساس سے ... نظر نہیں آتی تھی۔

میں نے کہا "گل... وہ..."

اس نے مجھے غور سے دیکھ کر کہا "کیا بات ہے بھائی، آپ کچھ کہتے کہتے رُک گئے... سب خیریت ہے نا، غالب، محسن...."

میں نے کہا "ان کو کچھ نہیں ہوا۔"

"مگر وہ ہیں کہاں؟"

ایک تو نازو کے انتظار میں دھونی رما ... بیٹھا ہے...

اس سمت میں اشارہ کیا جہاں غالب تھا "دوسرا گھر کی طرف گیا ہے حالات کا اندازہ کرنے کے لئے۔"

گل کے ہونٹ کانپنے لگے۔ اس نے پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کریدتے ہوئے نظر جھکا کے کہا "بھائی سکندر..... وہ..... مجھے اس کو مارنا پڑا۔"

میں بھونچکا رہ گیا "کس کو....؟"

"اس خبیث شیطان، یوسف کو اور کسے۔"

میں نے محسوس کیا کہ خون میری کنپٹی میں جمع ہوگیا ہے اور میرا چہرہ گرم ہورہا ہے "یوسف.... کیا اس نے...."

گل نے میری بات کا مطلب سمجھ لیا اور جلدی سے بولی۔ "نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ دراصل آپ چلے گئے تو وہ مجھ سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا جن کا کوئی سر پیر نہیں تھا۔ مثلاً اس نے کہا، یہ کس چکر میں پڑ گئی ہو تم۔ بمبئی کی فلمی دنیا میں دھماکا کرسکتی ہو تم دونوں۔ اگر چاہو تو۔ خیر، میں نے اسے سمجھا دیا کہ میں نے اسے معاف کیا کیونکہ یہ اس کی پہلی گستاخی تھی جو اس نے اندازوں کی غلطی کے باعث کی۔ مگر نازو کے سامنے وہ ایسی بات نہ کرے، ورنہ ایک بار تو اس نے ڈگڈگی کی طرح بجاکے چھوڑ دیا تھا، دوسری بار وہ ہیلی کاپٹر کی طرح اڑادے گی اور تم بغیر پیراشوٹ کے لینڈ کروگے تو جسم کی ایک ہڈی بھی سلامت نہیں رہے گی۔ اس کے بعد وہ دوسری باتیں پوچھنے لگا۔ ہمارا ارادہ کیا ہے۔ کب تک روانہ ہوں گے۔ ولاور اور تریونی سے ہماری کیا دشمنی ہے اور کہاں... شک تو مجھے ہوا تھا کہ اس نے یہ سب معلوم کرنے کے لئے میرا ہی انتخاب کیوں کیا اور وہ بھی ایسے وقت میں جب اور کوئی موجود نہ تھا۔ میں بتانا بھول گئی کہ ماماجی کسی کام سے تھوڑی دیر کے لئے کہیں چلے گئے تھے اور کہہ گئے تھے کہ میں ایک گھنٹے تک لوٹ آؤں گا۔ میں نے اسے بہت سی باتیں بتائیں جو سب غلط تھیں۔ میں بے وقوف بن کے اسے بے وقوف بناتی رہی۔ وہ سمجھا کہ میں کچھ نہیں سمجھی۔ اس نے کرید کرید کر پوچھا اور میں نے بھی شک نہیں ہونے دیا کہ جو معلومات میں اسے فراہم کررہی ہوں وہ سب جھوٹ پر مبنی ہیں۔ پندرہ بیس منٹ بعد اس نے مجھ سے کاغذ قلم مانگا۔ میں نے پوچھا کہ کیا کروگے۔ تو کہنے لگا، ایسے فارغ بیٹھنا تو مشکل ہے۔ ایک خط کیوں نہ لکھ لوں، میرا ایک دوست ہے لندن میں۔ بہت دن ہوئے اس کا خط ملا تھا۔ اس نے شکایت کی تھی کہ میں خط کا جواب نہیں دیتا۔ اس بات کو بھی ایک مہینہ ہوگیا" میں نے اسے ایک کاپی اور پنسل فراہم کردی اور خود لاتعلق بیٹھی رہی۔ پھر چائے بناکے لائی۔ اسے بھی دی اور خود بھی لی۔ اس نے دو صفحے لکھے اور کہنے لگا کہ میں ذرا ڈاک خانے تک ہوکے آتا ہوں، میں نے کہا۔ ماماجی کو آنے دو پھر چلے جانا، اس نے کہا۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ ڈاک نکل جائے۔ اس بات نے مجھے اور شک میں ڈال دیا۔ جس خط کا جواب کسی نے ایک مہینے تک نہ لکھا ہو اس کو پوسٹ کرنے میں اگر ایک گھنٹے کی تاخیر ہوجائے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ پھر یہ کہ اسے یہاں کے ڈاک خانے کے بارے میں کیسے معلوم ہوا کہ ڈاک نکلنے والی ہے۔ اس کا رنگ بھی کچھ احساس جرم سے اڑا ہوا تھا۔ میں نے کہا "یوسف، کیا واقعی یہ خط تم نے اپنے لندن والے دوست کو لکھا ہے؟" وہ گھبرا گیا اور بولا "ہاں، تمہیں شک کیوں ہے؟" میں نے کہا "میں یہ خط پڑھنا چاہتی ہوں۔" اس نے کہا "مگر یہ تو ہندی ہے۔" میں نے کہا "تمہارا کیا خیال ہے کہ ہم ہندی نہیں جانتے۔ ہم سب ہندی کے علاوہ بنگالی بھی جانتے ہیں۔ لکھ بھی سکتے ہیں، پڑھ بھی سکتے ہیں اور بول بھی سکتے ہیں۔ لاؤ یہ خط دو" اب اس کی حالت خراب ہوگئی۔ اس نے کہا "بی بی، یہ مردوں کے خط ہیں۔ ان میں ایسی باتیں بھی ہوتی ہیں جو عورتوں کے پڑھنے کی نہیں ہوتیں۔" بس اس کے بعد میں نے ایک دم ریوالور نکال لیا اور کہا "اگر تم نے خط میرے حوالے نہ کیا تو میں تم کو گولی ماردوں گی" اس نے سمجھ لیا کہ میں مذاق نہیں کررہی ہوں اور اب اس کا بچنا مشکل ہے۔ پہلے اس نے حملہ کرکے مجھ سے ریوالور چھیننے کی کوشش کی مگر عمر کے علاوہ شراب نے اور دوسری بری عادتوں نے اسے ڈھیلا کردیا تھا۔ میں نے بڑی آسانی سے خود کو بچالیا اور غصے میں اس کو ایک لات بھی ماردی۔ وہ دیوار سے ٹکرا گیا۔"

میں نے کہا "شاباش! تم نے تو ثابت کردیا ہے کہ تم کسی طرح بھی نازو سے کم نہیں ہو" اور اس کے کندھے پر تھپکی دی۔

وہ مسکرائی "افسوس تو یہ ہے بھائی سکندر کہ اس سے کچھ حاصل نہیں ہوا۔"

"کیا اس نے خط نہیں دیا تمہیں؟"

گل نے نفی میں سرہلایا "جب اس نے محسوس کیا کہ اب اس کی غداری اور ضمیر فروشی کا راز فاش ہونے والا ہے تو اس نے دو صفحات کے خط کو گولی بناکے منہ میں رکھ لیا اور چباکے نگل گیا۔ یہ بہت مشکل کام تھا۔ کاغذ اس کے حلق میں پھنس گیا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس کا سانس رکنے لگا تھا مگر وہ مسکرا رہا تھا۔ اس کی مسکراہٹ نے مجھے مشتعل کردیا۔ وہ میری ناکامی کا مذاق اڑا رہا تھا۔ جب میں نے ریوالور اٹھایا تو وہ اٹھ کر باہر بھاگا مگر میں نے اسے گولی ماردی۔ سر میں۔ اور میں کیا کرتی بھائی سکندر؟"

"تم نے بہت اچھا کیا۔ تمہاری ذہانت اور ہمت پر مجھے بھی فخر ہے گل بانو۔ اور میرا خیال ہے تمہارے بھائی کی روح بھی بہت مطمئن ہوگی۔ کہ تم نے اس کے ساتھ خون کے رشتے کی لاج رکھ لی اور اسے اپنے آخری فیصلے پر شرمندہ نہیں ہونا پڑا جو اس نے تم کو ہمارے حوالے کرکے کیا تھا...."

گل رونے لگی "بھائی سکندر!" اس نے بڑی مشکل سے کہا اور پھر میرے سینے سے لگ گئی "کیا ہوتا، اگر آپ لوگ نہ ہوتے۔ میں کہاں جاتی... آج کیا ہوتی، بھائی کے ساتھ میں خود کو محفوظ سمجھتی تھی۔ اکیلی عورت تو اکیلی ہی ہوتی ہے، خواہ وہ ناگ منی ہو۔"

میں نے اسے دلاسا دیتے ہوئے اس کے آنسو پونچھے اور کہا۔ "گل، تم اب پہلے سے زیادہ طاقتور ہو۔ زیادہ حوصلہ مند ہو۔ اگر میری کوئی بہن زندہ ہوتی تو تم جیسی ہوتی۔ بیک وقت اتنی ہی بہادر اور اتنی ہی ڈرپوک، اتنی ہی ذہین اور اتنی ہی بے وقوف۔ اتنی ہی محبت کرنے والی۔ معصوم اور پیاری سی۔۔۔۔۔ پہلے ایک غدار کو گولی ماردی، اب آنسو بہا رہی ہے پاگل۔"

جب وہ پھر مسکرانے لگی تو میں نے کہا "یہ تو بتا بعد میں کیا ہوا؟"

"معلوم نہیں۔ میں تو اتنا گھبرا گئی تھی کہ مجھے بھاگنے کے سوا کچھ نہ سوجھا" وہ بولی "میں وہاں ٹھہرتی تو پکڑی جاتی۔ گولی چلنے کی آواز اور یوسف کی چیخ سب نے ہی سنی ہوگی۔ بس میں نے ایک تھیلا اٹھایا۔۔۔۔۔۔"

"کون سا تھیلا ۔۔۔۔"

"وہ منو میاں لائے تھے مگر جاتے وقت ساتھ نہیں لے گئے تھے" گل نے کہا "نازو نے کہا تھا کہ اسے سنبھال کے رکھنا۔ وہ جاتے وقت سب رقم بھی اس میں ڈال گئی تھی۔ خاصا بھاری تھا وہ، مگر میں نے دیوار کے اوپر سے باہر پھینک دیا۔ پھر صحن کی دیوار پر سے میں بھی باہر کود گئی ۔۔۔ وہ کونے کا کوارٹر تھا اس لئے گلی میں نہیں اتری۔"

"کسی نے دیکھا نہیں؟"

"میں نے کچھ نہیں دیکھا کہ مجھے کوئی دیکھ رہا ہے یا نہیں۔ میں تو باہر آتے ہی بیگ اٹھا کے چل پڑی۔ میرا خیال ہے کہ کسی نے نہیں دیکھا۔ دیکھا ہوتا تو اور کچھ نہ سہی، یہ سمجھ کے شور مچاتا یا میرے پیچھے دوڑتا کہ میں چور ہوں اور کسی کوارٹر سے بیگ میں مال بھر کے فرار ہو رہی ہوں۔ اور اگر خدانخواستہ کوئی مجھے پکڑ لیتا تو پھر۔۔۔۔ اس نے دہشت سے جھرجھری لی "اتنا مال تھا بیگ میں۔۔۔"

"وہ بیگ اب کہاں ہے؟"

"اندر رکھا ہوا ہے۔ اس میں ریڈیو ہے اور شاید واکی ٹاکی ہے۔ ایک ٹرانسسٹر جیسی چیز ہے۔"

"تم نے کمال کر دیا گل" میں نے اس کے ماتھے پر بوسہ دے کر کہا "خدا تمہیں نظرِ بد سے بچائے۔"

وہ شرمانے لگی "خدا کا شکر ہے بھائی سکندر! مجھ سے کوئی بے وقوفی سرزد نہیں ہوئی۔ کیا آپ گئے تھے اُدھر؟ مجھے پتا تھا، آپ بہت پریشان ہوں گے مجھے غائب پا کے اور یوسف کی لاش دیکھ کر۔ اس وقت یہی ایک جگہ میرے ذہن میں آئی جہاں میں آپ سے پھر مل سکتی تھی۔۔۔۔"

"تم بہت خوش قسمت بھی ہو گل" میں نے کہا "یوسف شاید وہ خط پوسٹ کرنے نہیں، کسی کو دینے جا رہا تھا۔ یوسف نہیں پہنچا تو وہ خود آ پہنچے۔ ماماجی ان کی موجودگی میں پہنچے۔ جب وہ گھر کو الٹ پلٹ کر رہے تھے اور سخت مشتعل تھے۔ ہم سب کو خدا نے کیسے بچایا۔ ہم صبح نکل گئے نازو کسی پروگرام کے بغیر چلی گئی۔ ہم سب کو بہت غصہ تھا اس پر کہ اس نے ڈسپلن کی خلاف ورزی کی۔ یہ قدرت کا بندوبست تھا۔ ایک بات البتہ میری سمجھ میں آئی۔ یوسف تو ہمیں تلاش کرتا ہوا آیا تھا۔ اسے نازو سے تھا۔"

"ہاں۔ نازو نے میرے سامنے ہی کہا تھا کہ جاکے تلاش کرو اور یہ بتادو۔۔۔۔"

"کیا اس وقت تک یوسف کے ذہن میں ہم سے غداری کا کوئی خیال نہیں آیا تھا؟"

"معلوم نہیں، اسے کیا ہو گیا اچانک۔ آخر ماماجی بھی تو بھروسہ کرتے تھے" گل نے کہا۔

"ہاں۔ بلکہ میں نے ذرا سا شبہے کا اظہار کیا تھا ایک بار تو خفا ہو گئے تھے" میں نے کہا "یہ اسے کیا سوجھی؟ مجھے بھی اس کے غدار ہونے پر حیرت ہے۔ ہو سکتا ہے وہ لالچ میں آگیا ہو۔ کسی نے اس کو اچھی آفر دی ہو یا خود اس نے سوچا ہو کہ کیوں نہ ان سے بات کر کے پوچھا جائے کہ وہ کیا قیمت دے سکتا ہے۔ وہ ناکام آدمی تھا۔ اس نے ساری عمر گنوا کے حاصل کچھ بھی نہ کیا تھا۔ کامیابی اسے کسی فیلڈ میں نہیں ملی۔ ایکٹر، کیمرہ مین، موسیقار، کہانی نویس، وہ کچھ نہ بن سکا۔ وہ شہرت کے پیچھے بھاگتا رہا۔ شہرت کے پیچھے دوڑنے والے کی منزلِ مقصود تو دولت ہی ہے۔ کیا پتا، اب اچانک اسے خیال آیا ہو کہ شہرت نہ سہی دولت ہی مل جائے۔ اتنی ۔۔۔ کہ زندگی کی سب حسرتیں پوری ہو جائیں۔ اگر اس نے ترویجی سے بات کی ہوگی تو یقیناً ترویجی دلاور نے اسے بہت بڑی آفر دی ہوگی۔ اتنی بڑی کہ وہ مزاحمت نہیں کر سکتا تھا۔ غالباً ہم سے مل کر آنے کے بعد واپسی میں اسے خیال آیا۔"

"کیا اس نے کچھ بتایا نہیں ہوگا؟"

"اگر معاملہ سودے بازی کا ہوگا تو یوسف نے کہا ہوگا کہ میں تمہارے دشمنوں کے بارے میں تم کو بہت کچھ بتا سکتا ہوں لیکن مجھے کیا ملے گا؟ اور جو معلومات اس نے تم سے حاصل کرنے کی ناکام کوشش کی تھی، ان کے بارے میں یوسف کو ہدایات کسی نے دی ہوں گی۔ خریداروں نے کہا ہوگا کہ یہ معلوم کرو اور معلوم کرو۔ تمہاری حاضر دماغی نے ہمارے پلان کو ناکام ہونے سے بچا لیا۔ اگر خدانخواستہ یوسف ان معلومات آگے پہنچانے میں کامیاب ہو جاتا تو اس سے دشمن صرف گمراہ ہوتے۔ انہیں بعد میں پتا چلتا کہ یوسف کی اطلاعات غلط تھیں اور وہ ان سے لاکھوں ٹھگ کے لے گیا۔ وہ تمہارے ہاتھوں نہ مارا جاتا تو ان کے ہاتھوں مارا جاتا۔ افسوس اور دکھ کی بات بس یہ ہے گل کہ اس کام میں ایک بہت بڑا نقصان ہو گیا، ناقابلِ تلافی ۔۔۔"

گل نے پلکیں اٹھا کے کہا "کیسا نقصان؟"

میں نے کہا "گل، انہوں نے ماماجی کو مار دیا۔"

گل نے منہ سے نکلنے والی چیخ کو منہ پر ہاتھ رکھ کے دبا دیا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔

"ماماجی۔۔۔۔۔ ماماجی مر گئے ۔۔۔"

"ہاں گل۔ وہ شاید عین اس وقت پہنچے جب یوسف سے مفید معلومات لینے والے بھی رقم کے تھیلے لے کر پہنچ چکے تھے اور یوسف کی موت سے سخت مشتعل تھے۔ ہم سب کو موجود نہ پا کے وہ سمجھے ہوں گے کہ ہمیں بروقت یوسف کی غداری کا علم ہو گیا چنانچہ ہم اسے مار کے نکل گئے۔ خود میں یہی سمجھا تھا کہ یوسف اور ماماجی کو مارنے والے ایک ہی تھے جو درحقیقت ہمیں مارنے آئے تھے۔ اصل بات تو تم نے بتائی جو بالکل مختلف تھی۔ بے چارے ماماجی خواہ مخواہ مارے گئے۔ انہوں نے ماماجی پر بہت تشدد کیا۔ وہ سب جاننے کے لئے جو انہیں یوسف بتانے والا تھا۔۔۔"

"یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"میں نے ماماجی کی لاش دیکھی تھی۔ اس پر تشدد کی بہت بھیانک علامات تھیں۔ بعد میں انہوں نے گھر کو آگ لگائی اور چلے گئے۔ اللہ ماماجی کی ساری عمر کے جہاد کو قبول کرے۔ انہوں نے ہمیں بچانے کے لئے خود جان دے دی ہوگی مگر منہ سے ایک لفظ نہیں کہا ہوگا کہ ہم کہاں ہیں اور کیا عزائم رکھتے ہیں۔ اور اس قربانی کے بدلے ہم صرف مغفرت کی دعا کر سکتے ہیں ان کے لئے اور کچھ نہیں کر سکتے۔۔۔۔"

اندر سے بڈھے نے چلانا شروع کیا "ارے منوہا کہاں چلی گئی۔۔" پھر اسے کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔

"آئی ہوں بابا" گل نے کہا "بڈھا بھول گیا ہے کہ میں منوہا نہیں اس کی سہیلی ہوں۔"

"اب میں جاتا ہوں، تم رات تک یہیں رہنا۔"

"تم لوگ کب تک آؤ گے؟"

"وقت نہیں بتا سکتا۔ اگر نازو مل گئی تو آٹھ نو بجے تک۔ اس وقت چھ بجے ہیں۔"

میرے باہر آتے ہی گل نے دروازہ بند کر لیا۔ میرے سینے پر سے ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا تھا۔ گل محفوظ تھی اور اس نے حیرت انگیز طور پر ہم سب کو تحفظ فراہم کرنے کا ایسا زبردست کارنامہ سرانجام دیا تھا کہ ہم اس پر فخر کر سکتے تھے۔ ماماجی کی شہادت بھی عظیم تھی۔ ان کی بے لوث زندگی کے عظیم انسانی مقاصد کی طرح۔ یوسف کی موت افسوس ناک تھی۔ انسان واقعی بہت کمزور ہے اور شیطان قوی۔ کسی ایک کمزور لمحے میں وہ تمام عمر کی بامقصد جدوجہد کو بے مقصد شکست کی شرمساری میں بدل دیتا ہے۔ دنیا میں کچھ نہ پانے والا آخرت بھی ہار جاتا ہے۔

ملنگ بابا صاحب بہت دور چند عقیدت مندوں کے حلقے میں گھرے بیٹھے تھے۔ آج تیری بھی ایسی تیسی نہ کی تو سکندر نام نہیں، میں نے اپنے ہی دل میں عہد کیا۔ بے شک یہ ہمارا مشن نہیں تھا مگر کوئی برائی ہمارے راستے میں آجائے اور ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں تو اس کو نظر انداز نہ کرنا بھی تو برائی ہی شمار ہوگا۔ برائی کے تناور درخت کو گرانا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی کیونکہ اس کی جڑیں بہت گہری ہوتی ہیں اور معاشرے میں اندر تک پھیلی ہوئی۔ لیکن برائی کا ایک بیج تو تلف کیا جا سکتا ہے۔ ورنہ ایک بیج سے برائی کا ایک درخت اگتا ہے اور وہ بھی اتنا ہی پھیل جاتا ہے کہ پھر اسے گرانا ناممکن سمجھ لیا جاتا ہے۔

محسن میری جستجو میں بھٹک رہا تھا۔ وہ کوارٹر کے آس پاس کئی چکر لگا کے جا چکا تھا مگر میں دوسرے کوارٹر میں گل سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ بہت خفا ہوا۔

"یار کبیر خاں! میں کسی دن گناہِ کبیرہ کا مرتکب ہو جاؤں گا تمہارے ساتھ۔ تمہیں احساس ہونا چاہئے کہ میں پون گھنٹے سے جھک مار رہا تھا۔"

"کس نے کہا تھا آپ سے جھک مارنے کو" میں نے ہنستے ہوئے کہا "اور شیروانی صاحب! آپ کی تو زندگی ہی جھک مارتے گزری ہے پون گھنٹے کا کیا رونا۔ یہ بتاؤ نازو کا کچھ سراغ ملا۔"

"میں نہیں بتاتا، بھاڑ میں جائیں سب۔"

میں نے کہا "اس کا مطلب یہ ہوا کہ سب ٹھیک ہے۔"

"یہ تمہیں غالب بتائے گا، سخت مشتعل ہے وہ اور اس کا خیال ہے کہ نازو نے اخلاق سے گری ہوئی حرکت کی۔ جسے معیوب ہی نہیں قابلِ شرم کہا جا سکتا ہے۔"

"ایسا کیا جرم سرزد ہو گیا اس سے؟"

"نازو نے جیون پرشاد کو گھن چکر بنا دیا۔ اس نے اپنے عورت ہونے کا پورا فائدہ اٹھایا اور اپنے ناز و انداز کا بھی۔ سیدھی اس کے گھر جا پہنچی درخواست لے کر کہ مجھے ملازمت کی ضرورت ہے۔ ٹائپ اور شارٹ ہینڈ کے علاوہ بھی بہت کچھ جانتی ہوں۔ جیون پرشاد ریشہ خطمی ہو گئے اور اسے فوراً سیکریٹری رکھ لیا۔"

میں نے اپنا سر پکڑ لیا "لاحول ولا قوۃ۔ کہاں جا کے پھنس گئی وہ۔ سیکریٹری بن کے رہے گی جیون پرشاد کے ساتھ۔"

محسن ہنسا "فی الحال تو نہیں رہے گی۔ اس نے ایک دردناک اسٹوری سنائی تھی کہ کس طرح وہ رائے پور سے بمبئی پہنچی تھی۔ ایک عیار شخص کے جال میں پھنس کر جس نے اسے فلموں میں چانس دلوانے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر اسے یہاں بڑے تلخ تجربات سے گزرنا پڑا۔ یہ بمبئی میں سب سے عام اور قابلِ یقین کہانی ہوتی ہے۔ جیون پرشاد نے سمجھ لیا ہوگا کہ لڑکی شریف نہیں ہے۔ ورنہ گھر سے ہی کیوں نکلتی فلموں کے چکر میں۔ پھر زخم خوردہ بھی ہے۔ اس کو ہمدردی کے مرہم کی ضرورت ہے۔ تاکہ ایک اور زخم وہ خود بھی لگائیں۔ نازو نے کہا کہ مجھے تو بس ایک مضبوط سہارا چاہئے تاکہ جو غنڈے میرے پیچھے لگ گئے ہیں وہ میرا کچھ نہ بگاڑ سکیں۔ میں نے سنا تھا، آپ بڑے خدا ترس، بندہ پرور اور نیک انسان ہیں اس لئے بغیر اجازت کے چلی آئی۔ ظاہر ہے، جیون پرشاد اس خوشامد سے بانس پر چڑھ گیا۔ اس نے کہا سندری، چنتا نہ کرو۔ جس نے تمہارا اپمان کیا ہے ہم اس کا سمان کریں گے۔ یہ گھر

تمہارا ہے۔ ل بھی تیرا ہم بھی تیرے۔ شانتی سے یہاں رہو اور ہماری سیوا کرو۔ میوا ضرور ملے گا۔ نازو نے شکریہ ادا کرنے کی جذباتی اداکاری کے بعد عرض کی کہ مجھے ایک بار صرف ایک دن کے لئے رائے پور جانا ہوگا۔ جیون پرشاد نے اپنے شوفر کو حکم دیا تھا کہ وہ ائر کنڈیشنڈ کار نکالے مگر نازو نے انکار کردیا۔ انہوں نے اپر کلاس ایئر کنڈیشنڈ سے بھیجنے کی پیش کش کی۔"

"کیا وہاں ہوائی جہاز نہیں جاتا؟"

"نہیں۔ نازو کو ضرور یہ سب معلوم ہوگا؟ اس نے ڈر کے کہا کہ وہ اکیلی ٹرین پر بھی نہیں جاسکتی۔ لالہ جیون پرشاد تو ریجھ گئے اس کی ادائے معصومیت پر۔ انہوں نے کہا کہ اچھا آج رات ہم تمہیں بھجوادیں گے۔ اس نے کسی عورت کو بلوایا۔ وہ بھی بقول نازو بری نہیں تھی۔ وہ گھوڑوں کے ڈاکٹر اور ٹرینر کے ساتھ جارہی تھی۔ ان کی خدمت کے لئے۔"

"گھوڑوں کی خدمت کے لئے؟"

"احمقانہ سوالات سے گریز فرمایئے" محسن بولا "وہ نازو کو اپنے ساتھ لے گئی۔ نازو ایک شاندار کار میں وہاں پہنچی جہاں اس کا مجنوں خاک بسر سراپا انتظار بیٹھا تھا۔ کار میں سے دو حضرات اور دو خواتین بر آمد ہوئیں۔ ان میں نازو کو شامل دیکھ کے وہ بیہوش ہوتے ہوتے بچا۔"

"گھوڑے بر آمد نہیں ہوئے؟"

"کار میں سے ..... نہیں۔ وہ پہلے ہی آچکے تھے' چار ملازمین کے ساتھ۔ ہر گھوڑے کا ایک نوکر الگ ہے۔"

میں نے کہا "ان کے تو کتوں کے بھی نوکر ہوتے ہوں گے۔"

"اب صورت احوال یہ ہے کہ نازو اس سیلون کے اندر ہے اور غالب باہر۔"

"کون سا سیلون؟"

"وہی کنٹینر یار..... اس کا ایک حصہ خواب گاہ بھی تو ہے اور وہ سارا ایئر کنڈیشنڈ ہے" محسن بولا۔

"یہ سب تجھے کیسے معلوم ہوگیا؟"

"خود نازو نے بتایا۔"

"وہ کہاں مل گئی تجھے؟" میں نے کہا۔

"اس نے وہاں پہنچتے ہی دیکھ لیا تھا کہ اس کا دیوانہ وہیں ستم کش انتظار ہے۔ جب کار چلی گئی تو اس نے کہا کہ میں ابھی ایک گھنٹے میں آتی ہوں۔ مجھے کچھ ضروری کام یاد آگیا ہے اور جیون پرشاد جی سے ایک بات بھی کہنی ہے جو میں بھول گئی تھی۔ ٹرینر تو احمق ہے۔ یہ نازو کی رائے ہے۔ ڈاکٹر کچھ عیاش طبع ہے مگر اس کے ساتھ ہے پاسبان عقل۔ وہ لڑکی آج کل اس کی محبوبہ کے عہدے پر فائز ہے۔ ڈاکٹر کے بس میں ہوتا تو وہ فوراً اسے برطرف کرکے نازو کی اس عہدے پر تقرری کردیتا مگر شیر کے منہ سے نوالہ چھیننا مشکل کام ہے۔ اسے معلوم ہے کہ کانتا۔ یہ نازو کا نام ہے۔ جیون پرشاد کی سیکریٹری ہے۔ چنانچہ نازو محفوظ ہے مگر غالب غیرت اور غصے سے برا حال ہے۔ ان کی ایک لڑائی بھی ہوچکی ہے۔"

"اس کا نتیجہ کیا نکلا؟"

"غالب کچھ دیر بہکی بہکی باتیں کرتا رہا۔ چلتے ہوئے کمر میں درد کی شکایت کرتا ہے اور ایک پاؤں سے لنگڑاتا ہے" محسن نے کہا "عیادت کرنا ہی بھی۔"

"جی نہیں' ہم اب ریلوے اسٹیشن جارہے ہیں۔ قلی نمبر سات سو بیس کے پاس۔ ایسا نہ ہو کہ موقع ہاتھ سے نکل جائے" محسن بولا "غالب وہیں آجائے گا۔"

قلی نمبر سات سو بیس اسی جگہ کمبل اوڑھے اکیلا لیٹا ہوا تھا جہاں دن میں اس کا ساتھی بخار میں جلتا پڑا ہوا تھا۔

"اچھا ہوا آپ آگئے۔ میں ڈر رہا تھا کہ کہیں وہ جلدی آجائے" اس کی پریشانی میں ذاتی مالی نقصان کی فکر کو زیادہ دخل نظر آتا تھا۔

میں نے کہا "تمہارے دوست کا کیا حال ہے؟"

اس نے کہا "میرا حال خراب ہے۔ دیکھ لو کتنا تیز بخار ہے" میں نے ہاتھ لگا کے دیکھا تو واقعی اس کا پنڈا تپ رہا تھا۔ "یہ بخار کیسے چڑھالیا تم نے؟"

"اس کے بھی گرہیں جی" وہ بولا۔

میں نے پھر پوچھا "تمہارے دوست کا بخار اترا یا نہیں؟"

"سرکار!" اس نے درد ناک شکل بنا کے کہا "اسے میں اسپتال لے گیا تھا۔ داخلہ نہیں ملا۔"

"کون سے اسپتال؟" میں نے کہا۔

"سرکاری اسپتال..... اور ہم غریب کہاں جاسکتے ہیں۔"

"غریب کے بچے! تم اسے کسی پرائیویٹ ڈاکٹر کے پاس لے جاتے۔ میں نے تو کہا تھا کہ ڈاکٹر کو یہاں لے آتا۔ اسے ایسی کون سی بیماری تھی کہ اسپتال میں داخل کرانا ضروری تھا۔ تم اسپرین کی گولی دے دیتے تو ٹھیک ہوجاتا۔ کیا تم اسے سرکاری اسپتال کی سیڑھیوں پر ڈال آئے؟ کیا دوا ملے گی اسے وہاں اور کون پوچھے گا اسے۔ مرجائے گا وہ۔ یہی ہے تمہاری دوستی' اسی کا نام ہے یاری تم اس کا حصہ مارنے کے لئے....."

محسن نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا "آپ جذباتی ہوں' کام کی بات کریں۔"

میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا "اچھا' تمہارا کام تم جانو۔ یہ لو اپنا معاوضہ۔ ہمارے ساتھ کوئی گڑبڑ مت کرنا ورنہ....."

"آپ بالکل فکر نہ کریں سرکار" وہ سخت ڈرا ہوا تھا "میری کیا مجال......"

میرے ذہن میں یوسف کی بے وفائی کی یاد کا زخم ابھی تازہ تھا۔ کون کس کے چہرے پر اعتبار کرے۔ کون کس کے عہدے کو مانے کس کے خلوص پر شک کرے اور کس کے ایمان میں کھوٹ دیکھے۔ یہ پیسے کی دنیا ہے۔ غریب آدمی کی قوت مزاحمت بھی کم ہوتی ہے۔ جو زیادہ قیمت لگادے اس کے ہاتھ دنیا اور آخرت سب بیچ سکتا ہے۔

میں اور محسن اس کے قریب ہی بیٹھ گئے۔ میں نے اسے طے شدہ معاوضے سے بھی زیادہ ادا کردیا تھا اور اس مرتبہ میرے علاوہ محسن نے بھی اسے ریوالور کا دیدار کرادیا تھا تاکہ اس کے دماغ سے فوری پیدا کرنے والے خیالات رفع ہوجائیں۔ غالب کچھ دیر بعد آیا تو واقعی بہت خفا تھا۔

میں نے کہا "اس قسم کی صورت حالات میں روایت یہ ہے کہ عاشقانِ صادق خود کشی کرلیتے ہیں۔"

محسن نے میری تائید کی "فرہاد نے سر میں تیشہ مار لیا تھا"

میں نے آہ بھر کے کہا "آہ ... عورت کی ذات بڑی ناقابل اعتبار ہے۔ آج کا مذاق کل کی حقیقت بن سکتا ہے۔"

"ہاں یار۔ جیون پرشاد کے پاس بہت دولت ہے اور ایک شہنشاہ نے دولت کے سہارا لے کر۔ شیریں کو خرید لیا تھا' نورجہاں کا دل جیت لیا تھا۔ تاج محل بنوادیا تھا۔"

غالب نے مسکرا کے کہا "میں نے مشتعل نہ ہونے کا فیصلہ کرلیا ہے لیکن آپ دونوں کا نام اس فہرست میں لکھ لیا ہے۔"

"کون سی فہرست میں؟"

"مقتولین میں آپ کا نمبر دوسرا ہوگا۔ سکندر اعظم کا تیسرا۔"

"پہلا پھر کانتا یعنی سابق نازو کا ہوگا۔"

"پہلا جیون پرشاد کا ہے۔ نازو سے تو میرا عقد اسی دن ہوگا جس دن تم دونوں کا سوئم...."

اچانک قلی نمبر سات سو بیس نے کہا "وہ آرہا ہے۔"

ہم مسکین اور مظلوم صورتیں بنا کے بیٹھ گئے۔ پتا نہیں اس نے کس کی طرف اشارہ کیا تھا مگر جب وہ قریب آکے ہمارے سر پر کھڑا ہوگیا تو میں نے اسے پہچان لیا۔

اس وقت میں نے خود کو اس بے وقوف چوہے کی طرح محسوس کیا جو اپنے ساتھ دوستوں کو بھی چوہے دان میں پھنسانے کے لئے لے آیا ہو۔ میرے سامنے جیون پرشاد کا خط لے جانے والا وہی ٹیکسی ڈرائیور موجود تھا جس کو میں ناک آؤٹ کرکے بھاگ گیا تھا۔ اس کے لبوں کی معنی خیز مسکراہٹ کہتی تھی کہ پہلی بار تو بے خبری میں تم نے موقع سے فائدہ اٹھالیا تھا۔ آج کیا کروگے؟

پہلے تو اس خیال سے میری روح فنا ہوگئی تھی کہ اس نے مجھے پہچان لیا ہے۔ ایسا ہو جاتا تو ہمارے سارے پروگرام کا ملبہ ہوجاتا۔ سو اپنے آپ کو ٹارزن سے کم نہیں سمجھتا تھا اور میں بھی کسی رستم کو خاطر میں لانے والا نہیں تھا۔ وہاں مار دھاڑ سے بھرپور فلمی سین پیش کیا جاتا جس کے بعد ہم فرار پر مجبور ہوتے اور اس زمین پر قدم نہ رکھ پاتے۔

جب اس نے قلی نمبر سات سو بیس کی جانب روئے سخن کیا تو میں نے بھی خدا کا شکر ادا کیا۔

"ابے کیا لمبا لیٹا ہوا ہے؟ چل اٹھ۔ کہاں ہیں تیرے دونوں ساتھی؟" اس نے تھانے داروں کے لہجے میں کہا۔

قلی نمبر سات سو بیس نے نقاہت سے کپکپاتی آواز میں کہا۔ "مائی باپ آج کل مسکل ہے......"

"کیا مشکل ہے؟" وہ غرایا۔

"آج مجوری مسکل ہے۔ بڑے جور کا تپ چڑھا ہے۔"

"ابھی ایک منٹ میں سارا تپ نکل جائے گا......" ڈرائیور اسے ایک گالی دے کر بولا۔

"آپ دیکھ لو جور..... جاڑا بکھار ہے..... ہم آپ سے جھوٹ بولیں گے.... اتنی مجوری کون چھوڑتا ہے جی......"

ڈرائیور نے تصدیق کے لئے اس کا ہاتھ تھام کے دیکھا اور اس کے ماتھے پر ناگواری کے آثار شکنوں کی صورت میں نمودار ہوئے۔

"اور ان دونوں کو کیا ہوا؟ ہیضہ یا کینسر۔"

"توبہ توبہ...... ان کو بھی جاڑا بکھار ہوا......"

"ایک ساتھ......" ڈرائیور نے بگڑ کے کہا۔

"وہ جی..... ساتھ جو رہتے ہیں ہر وکھت..... ایک ہی جگہ۔ کھاتے پیتے بھی ساتھ ہیں..... مچھر بہت ہیں۔"

"سالے مرنا تھا تو میرا کام ختم کرکے مرتے۔" وہ فکر مند ہوگیا۔

"سرکار.... مجھے بھی بڑی جرورت تھی پیسے کی۔ میں ان کو لایا ہوں۔" اس نے ہماری طرف اشارہ کیا۔

"یہ کون ہیں؟" اس نے پلٹ کر غور سے ہماری صورتوں کا جائزہ لیا۔

"بھروسے کے آدمی ہیں جی۔ آپ بالکل پھکر نہ کریں۔ میں نے ان سے کہا ہے کہ یہ آدمی مجوری مجھے دیں گے۔"

ڈرائیور پھر اس کی طرف پلٹا "یہ کیا حرامی پن ہے!"

"بس جی...... کچھ ان کو مل جائے گا۔ کچھ مجھے۔ آپ کا تو کوئی نکسان نہیں ہے۔" سات سو بیس نے منت کرتے ہوئے کہا۔

"مگر میں ان پر بھروسہ کیسے کرلوں......"

"جیسے آپ نے مجھ پر کیا تھا جور......" "دس سال سے جانتا ہوں میں ان کو...." قلی نمبر سات سو بیس نے کہا "ہمارے گاؤں پاس پاس ہیں۔ یہ دونوں تو بھائی ہیں سگے۔ مگر بیچارے گونگے بہرے ہیں۔"

اس نے مجھے اور محسن کو بھائی بنا دیا تھا اور نوٹس دیئے بغیر گونگا بہرا بھی۔ اس کی اداکاری بھی اچھی تھی اور حکمتِ عملی بھی۔

اور یہ تیسرا؟" ڈرائیور نے کہا۔

"یہ ان کے ساتھ رہتا ہے۔ راجکمار ہے نام اس کا۔"

وہ ہنس پڑا "راجکمار ...... واہ ..... کون سی ریاست کے راجہ کا نطفہ ہے تو؟"

غالب نے عاجزی کے ساتھ دانت نکالتے ہوئے خود کو پرلے درجے کا احمق بھی ثابت کیا۔

"اور تیرا کیا نام ہے؟"

قلی نمبر سات سو بیس نے کہا "بول نہیں سکتا جور ...... میں نے بتایا نا کہ دونوں گونگے بہرے ہیں۔"

"پیدائشی طور پر؟"

غالب نے نفی میں سرہلایا "یہ چھوٹے تھے تو ان کو گلڑ ہو گئے تھے۔"

"گلڑ؟"

"ہاں جی ...... "غالب نے گلے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "یہاں سے گلے پھول گئے تھے۔"

اس نے یوں سرہلایا جیسے سب کچھ سمجھ گیا ہو۔ "یہ تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔ کون چلائے گا ان کو اپنی بات سمجھانے کے لئے؟"

"میں سمجھا دوں گا جی۔" غالب نے کہا "یہ تو بھگوان نے گریبی کی سزا دی ہے۔ سرکاری اسپتال میں آپریشن ہوا۔ مرنے سے بچ گئے مگر آواز بند ہو گئی۔ اشارے سے بات کا جواب دے سکتے ہیں۔"

وہ کچھ نرم پڑا "کتنی عمر تھی ان کی جب آپریشن ہوا تھا؟"

"یہ سات سال کا تھا۔ یہ نو سال کا ......"

"یہ کیا۔ نام نہیں ہیں ان کے؟" ڈرائیور نے کہا "اس کے لہجے میں اب پہلے والی سختی اور رعونت نہیں رہی تھی۔ غالباً ہمارے ساتھ پیش آنے والے حادثے کا اس کے دل پر اثر ہوا تھا۔

"یہ سورج مل ہے۔ یہ چندر کمار ......"

"ذرا شکلیں تو دیکھو سورج مل اور چندر کمار کی ...... بڑے سیانے پنڈت سے جنم پتری بنوا کے اماں ابا نے نام نکلوائے ہوں گے۔ اور اس نے زائچہ دیکھ کے کہا ہو گا کہ دنیا میں چاند سورج کی طرح ہو گا ان کا جیون۔ چلو اٹھو۔"

ہم سب بڑی پھرتی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس نے ہمارے نمبروں کو غور سے دیکھا "تمہیں اس نے بتا دیا ہے نا کہ کیا کام ہے؟"

میں نے اور محسن نے اقرار میں سرہلایا اور غالب نے کہا۔

"سب سمجھا دیا ہے اس نے۔ مائی باپ۔"

ڈرائیور نے سو سو کے دو نوٹ نکال کر قلی نمبر سات سو بیس کی طرف پھینک دیئے "یہ لے تیرا حصہ۔ اب خبردار جو ان سے کچھ لیا۔"

"بھگوان کھس رکھیں ...... سکھی رکھیں ......" قلی نمبر سات سو بیس نے نوٹ جھپٹ لئے۔

اس نے غالب سے کہا "یہ بیچ میں آنے والے کسی کا حق ضرور مارتے ہیں۔ اب محنت تم کرو گے تو تمہیں یہ کیوں دے بھئی۔ مفت کی تھانے داری۔ تم کو پوری اُجرت ملے گی۔ کام ذرا سخت ہے آج مگر مزدوری بھی اچھی ملے گی "دو دو سو۔"

غالب نے کہا "آپ کی کرپا ہے جی ...... کام کی آپ بالکل پھکر مت کریں۔"

وہ آگے چلتا جا رہا تھا۔ "فکر ایک بات کی ہے مجھے۔ ان کو تو زبان ہی نہیں ملی' یہ کیا بولیں گے۔ تم راز کو راز رکھ سکتے ہو؟ لوگوں کے بیچ میں بیٹھ کے زیادہ بڑ مارنے کی عادت تو نہیں ہے تمہاری؟"

غالب نے کانوں کو ہاتھ لگایا "گریب آدمی کیا بڑا بول بولے گا جی"

"آج تم جو کچھ دیکھو گے' سنو گے یا کرو گے۔ اس کا ذکر کسی سے نہیں کرنا ہے۔ ڈرو نہیں۔ تم کسی کو قتل ہوتا نہیں دیکھو گے اور لاش اٹھانے کا کام بھی نہیں کرو گے" ڈرائیور ہنسا "تم کو صرف مزدوری کرنی ہے۔ سامان کو گودام سے اٹھا کے مال گاڑی تک لے جانا ہے۔ ہمت سے کام لو گے تو تین چار گھنٹے کی محنت ہے۔ کسی سے بھی ذکر مت کرنا کہ تمہیں کتنی مزدوری ملی ہے۔ کوئی ہمارے بارے میں پوچھے تو بس انجان بن جانا ہی بہتر ہو گا۔ سمجھ لو تم نے ہمیں دیکھا ہی نہیں۔"

"میں سمجھ گیا جور۔"

"اب ان دونوں گونگے بہروں کی جوڑی کو بھی سمجھا دے۔ یہ تیری بھاشا تو سمجھتے ہوں گے؟"

غالب نے انگلیوں سے بے معنی اشارے کئے اور ہم احمقوں کی طرح سرہلاتے رہے۔ ڈرائیور نے غالب کے اشاروں کو گونگے بہروں کی زبان سمجھتے ہوئے اہمیت نہیں دی۔ اگر وہ پوچھ بیٹھتا کہ یہ زبان تم نے کس سے سیکھی اور کب سیکھی تو غالب کے لئے جواب دینا مشکل ہو جاتا۔ ظاہر ہے یہ ایک بین الاقوامی اشاروں کی زبان ہے۔ مورس کوڈ کی طرح۔ اسے سیکھنا پڑتا ہے اور وہ بھی ماہرین سے۔ مگر ڈرائیور کو یہ خیال ہی نہیں آیا۔ وہ تیز مزاج تو تھا لیکن زیادہ شکی مزاج نہیں۔ ورنہ شاید اتنی آسانی سے ہمیں قبول بھی نہ کرتا۔

گودام تک کا باقی فاصلہ ہم نے خاموشی سے طے کیا۔ صرف ایک بار غالب نے محسن کو بڑے غلط قسم کے اشارے کئے اور محسن نے گونگوں کی طرح بے معنی آوازیں نکال کے گالیوں سے جواب دیا۔ دونوں نے اپنا اپنا مطلب خود اخذ کیا۔

"کیا بات ہے؟" ڈرائیور نے کہا۔

"یہ کہتا ہے بھوک لگی ہے۔ ابھی کام کیا نہیں' کھانے کو پہلے مانگتا ہے۔"

ڈرائیور نے سوچ کے کہا "کہتا تو یہ ٹھیک ہی ہے۔ بعد میں کہاں فرصت ہو گی۔ خیر ابھی کھانے کا بھی کر ...... تو ...... کچھ۔"

گودام کا بھاری فولادی پھاٹک بند تھا اور باہر لمبی گھنی مونچھوں والا ایک سکھ خاکی وردی میں ملبوس توند نکالے خود کار گن لئے کرسی پر بیٹھا تھا۔

اس نے ہم تینوں کو غور سے دیکھا اور بولا "اوئے یہ کیا نئے نمونے لے آئے ہو جی اج"

ڈرائیور نے کہا "مجبوری تھی۔ وہ کمبخت بیمار پڑ گئے ہیں ایک ہی رات میں۔"

"اوجی شہزادے ہیں شہزادے۔ کام کیا کرتے ہیں بڑ حرام۔ کسی کا بکسا اٹھا لیا کسی کا بسترا۔ کی ناں اے بتا اوئے ٹینڈے؟"

غالب نے کہا "ہم کو ٹینڈا کہا تو ہم تمہیں کدو کہیں گے سردار جی؟"

"تو کہہ کے تو دیکھ۔ تیرا سر پھاڑ دوں سُور دے پُتر" سردار جی آگ بگولا ہو کے اٹھے۔

"ہم بھی پیٹ پھاڑ دیں گے۔" غالب نے کہا۔

ڈرائیور نے بیچ میں آ کے کہا "یہ کیا ہے۔ کام کرنے آئے ہو یا لڑنے؟ سردار جی! چلو اٹھو دروازہ کھولو"

"ابھی دروازہ نہیں کھل سکتا۔" سردار جی نے رکھائی سے کہا۔

"کیوں؟"

"حکم ہے سیٹھ صاحب کا' ان کے آنے سے پہلے کوئی اندر نہیں جا سکتا۔" سردار نے کہا۔

مشتعل ہونے کے باوجود ڈرائیور بے بس تھا۔ اس نے ہم سے مخاطب ہو کے کہا "چلو جاؤ تم لوگ اتنی دیر میں کھا پی کے فارغ ہو جاؤ۔ پیسے ہیں؟"

غالب نے نفی میں سرہلایا اور جھینپ کر مسکرانے لگا۔ اس نے دس کا ایک ایک نوٹ ہم سب کو تھما دیا۔

"جاؤ۔ مگر دیر مت کرنا۔ سیٹھ لوگ آنے ہی والے ہوں گے۔"

"پھکر نہ کریں سرکار۔ ہم روٹی لا کے اِدھر بیٹھ جاتے ہیں۔"

غالب نے کہا "بلکہ یہ ہوں گے اِدھر۔ میں کھانا لے آتا ہوں۔"

"یہ ٹھیک ہے۔" ڈرائیور نے مطمئن ہو کے کہا اور سگریٹ سلگا کے ادھر ہی ٹہلنے لگا۔ وہاں اس کے بیٹھنے کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔

میں اور محسن اندازے سے اتنی دور جا کے گودام کی دیوار کے ساتھ پیٹھ لگا کے بیٹھ گئے جہاں سے ہماری آواز کسی کے کانوں تک نہ پہنچے۔ بظاہر ہم دونوں اپنے سامنے خلا میں دیکھ رہے تھے اور خاموش تھے لیکن آپس میں مشورے کی یہ جگہ بہت غنیمت تھی۔ احتیاطاً ہم نے فرنچ میں بات کی اور سرگوشیاں کرتے رہے۔

"یہ کون سیٹھ لوگ آنے والے ہیں؟"

"وہی ہوں گے۔ ان میں سے کوئی ایک یا دو" محسن بولا۔

"اس سے معاملہ گڑبڑ ہو سکتا ہے۔ ڈرائیور نے تو اس لئے نہیں پہچانا کہ اس کی اور ہماری ایک صرف ایک ملاقات ہوئی ہے اب تک۔ اس نے زیادہ غور بھی نہیں کیا۔ دلاور آیا تو فوراً پہچان لے گا۔"

"اللہ اس کی آنکھوں پر سُور کی چربی چڑھائے۔ کالا موتیا اتارے۔" محسن بولا "اس کی عقل پر پتھر پڑ جائیں۔"

"ایسے کوسنے دینے سے کام چلتا تو ہماری زنانہ فورس ہی کافی ہوتی۔ یہ بتا کہ اس خبیث نے پہچان لیا تو کیا ہو گا؟"

"یار' میں کیا بتاؤں کیا ہو گا۔ کوئی علمِ غیب ہے میرے پاس۔ ظاہر ہے کچھ نہ کچھ تو ہو گا۔ یہ تو ہونے سے رہا کہ ہم کہیں سوری ہم غلطی سے آ گئے تھے۔ اور وہ کہے کہ اچھا جاؤ پھر ایسا مت کرنا۔"

"ہماری جیب میں ریوالور بھی ہیں۔"

"کیا کریں۔ مشین گن تو جیب میں رکھ نہیں سکتے۔ نہ توپ۔"

"تجھے مسخری سوجھ رہی ہے۔ میں سردار جی کے رویئے سے کھٹک گیا ہوں۔ ریلوے کے گودام پر خود ریلوے والوں کا پہرا ہوتا ہے' وہ کسی سیٹھ کے غلام نہیں ہوتے۔"

"بالکل ٹھیک۔ وہ سیٹھ کے پیسے کے غلام ہوتے ہیں۔"

"سردار جی نے اس ڈرائیور جیسے قابلِ اعتماد شخص کی بات نہیں مانی۔ اس کا کیا مطلب ہے؟"

"اس کا مطلب ہے کہ یا تو سردار جی احمق ہیں یا ڈرائیور صاحب گدھے ہیں۔"

میں نے نفی میں سرہلایا "یہ سخت حفاظتی انتظامات کا مسئلہ ہے۔ اور اگر یہاں محاورے کے مطابق پرندہ پر نہیں مار سکتا تو ہم کیا مار سکتے ہیں۔ ہماری تلاشی لی جائے گی۔"

"سرچ وارنٹ کے بغیر یہ کام غیر قانونی ہو گا۔"

"قانون کے بچے! میں ایک ہاتھ مار دوں گا ابھی ......"

"یہ بھی غیر قانونی ہو گا۔ زیرِ دفعہ تین سو تیئس ......"

"گیٹ پر میٹل ڈی ٹیکٹر ہو سکتے ہیں" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "کوئی بھی ہاتھ میں یہ آلہ لے کے کھڑا ہو گیا تو جامہ تلاشی کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی۔"

"جس آلے کا آپ حوالہ دے رہے ہیں وہ صرف اتنا بتاتا ہے کہ سامنے سے گزرنے والے کی جیب میں دھات کی کوئی چیز ہے۔ یہ چیز ایک پچاس پیسے کا سکہ بھی ہو سکتی ہے۔ ناخن تراش یا چاقو بھی' اس سے پہلے کہ وہ ہم پر دست درازی کریں ہم خود سب سکے اور جیب میں موجود ہر چیز انہیں پیش کر کے انہیں مطمئن کر دیں گے۔"

"ہر چیز میں اسلحہ بھی شامل ہو گا؟"

"نہیں کیسے خیال آ سکتا ہے کہ قلیوں کے پاس کھانے کے لئے روٹی کے پیسے تو تھے نہیں ......"

"بھیا! خیال بڑی بادلی چیز ہے۔ بقول شاعر کے

نہیں آتی جو ان کی یاد تو برسوں نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

"یہ فرنچ میں اردو شعر کا تڑکا کیوں لگا رہا ہے۔ نن لے گا کوئی تو کہے گا کہ قلی ہو یا علی قلی خاں۔" محسن بولا "مگر خیال کے بارے میں آپ کے خیال سے میرا خیال اچانک مطابقت اختیار کر گیا ہے۔ میں ہتھیار ڈالنے کا سوچ رہا ہوں۔"

"کہاں ڈالنے کا؟"

"جیب سے نکال کے ہم ہتھیار جرابوں میں رکھ سکتے تھے لیکن جوتے ہی نہیں ہیں تو جرابیں کہاں۔ پھر بھی ایک ترکیب ہے۔ ہم انہیں پنڈلی سے باندھ لیتے ہیں۔ ٹخنوں سے ذرا اوپر۔"

"باندھنے کے لئے بھی تو کوئی چیز ہو۔ اور یہ کام ان کے سامنے ہوگا کیسے؟"

"غالب روٹی لے کر آرہا ہے۔ ہم مل کر بیٹھیں گے تو ان کی طرف پیٹھ ہوگی۔" محسن نے کہا "کیا آس پاس کوئی رسی کا یا ستلی کا ٹکڑا نہیں ہے؟"

"ہم قمیص کے دامن سے پٹی پھاڑ سکتے ہیں۔"

محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "ان کو شک ہوجائے گا کہ اچانک تینوں کے دامن کیسے چاک ہوگئے۔ ازار بند بہتر رہے گا۔"

"کیا مطلب...... بچا ہاتھ سے پکڑ لیں؟"

محسن نے مجھے افسوس سے دیکھا "ذرا اپنے گریبان میں جھانک کے دیکھئے کہ کتنا ازار بند فالتو ہے۔ کم سے کم پر گزارا کرتے ہوئے فاضل ٹکڑا نکالنے کی کتنی گنجائش ہے۔"

"گنجائش ہر ازار بند میں ہوتی ہے۔ ہم ہلکے پیٹ کے لوگ ہیں "میں نے اپنے گریبان میں جھانک کے کہا "یہ اچھی تجویز ہے۔"

"فاضل پیس کاٹنے سے پہلے مضبوط گرہ لگا لیں "غالب نے روٹیاں درمیان میں رکھنے کے بعد کہا "ورنہ"

"ورنہ کیا۔ گرتے ہیں شہ سوار ہی میدان جنگ میں "محسن بولا۔

کھانا کھاتے ہوئے ہم نے اپنی اسکیم کو مزید قابل عمل بنایا۔ باری باری ہم سب اٹھ کر چند قدم دور گئے اور دیوار کی طرف ایسے منہ کر کے بیٹھ گئے جیسے سب بیٹھتے ہیں۔ جلتی ہوئی سگریٹ سے ہم نے ازار بند کے فاضل ٹکڑے الگ کئے جو چند سیکنڈ کا کام تھا۔ پھر واپس آکے ایک دوسرے کو تحفظ فراہم کرتے ہوئے ریوالور اپنی اپنی پنڈلی سے باندھ لئے۔ اس کے لئے ہم نے ازار بند کے ٹکڑے کو ٹریگر کے ہک سے گزارا تاکہ اس کے کھل کر گرنے کا کوئی خطرہ باقی نہ رہے۔ پنڈلی کے سب سے پتلے حصے پر ایک بل دینے کے لئے ہر ایک کے پاس جو ایک ڈیڑھ فٹ کا ازار بند تھا وہ کافی ثابت ہوا۔ رسک اب بہت کم رہ گیا تھا۔ اگر وہ جسمانی طور پر ہماری تلاشی لیتے تو اوپر سے نیچے ہاتھ مار کر دیکھنے سے انہیں کچھ نہ ملتا۔ تلاشی لینے والے اتنا جھک کر قدم بوسی کے انداز میں کچھ نہیں دیکھتے۔

ہم کھانے سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ تریونی اور کرنل نمودار ہوئے۔ وہ ایک ہی گاڑی میں وہاں پہنچے تھے۔ غالباً ڈرائیور نے انہیں ہمارے بارے میں بتایا تھا کہ ان کی نظروں میں مشکوک انداز میں ہماری طرف اٹھیں۔ یہ شاید وہ ڈرائیور کی یقین دہانی سے مطمئن ہوگئے اور انہوں نے سامنے بلانے میں ملاحظہ فرمانا ضروری نہیں سمجھا۔ ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی رکھنے والا ہر شخص ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کو نظر انداز کرنے کی غلطی کر جاتا ہے۔ شکل سے آدمی دلاور تھا۔ وہ ڈرائیور کی بات سنتا تھا۔ ... دال میں کچھ کالا نظر آنے لگتا اور وہ سوچتا کہ آخر خود دیکھ لینے میں حرج ہی کیا ہے۔

"چلو اب دیر مت کرو۔" کرنل نے کلائی کی گھڑی دیکھ کر کہا۔

"اب تک تو آدھا کام ہوجاتا کرنل صاحب۔" ڈرائیور بولا۔

"پھر ہوا کیوں نہیں؟" کرنل بولا

"کیسے ہوتا؟ دروازے جو بند تھے۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے ہیں سب ایک گھنٹے سے؟" ڈرائیور نے شکایت کو تھوڑی سی مبالغہ آرائی سے زیادہ موثر بنا دیا۔

"بھئی کیوں بیٹھے تھے۔ دروازہ کھلوا کے کام شروع کرا دیتے تم۔"

"جی نہیں کرنل صاحب۔ اس کے لئے آپ کی اجازت درکار تھی۔ سردار جی نے کہا کہ آپ کا یہی حکم ہے" ڈرائیور بولا

"میں نے ایسا کوئی احمقانہ حکم نہیں دیا۔"

"میں نے سب تمہارے سپرد کردیا تھا" تریونی بولا۔

"وہ موتیاں والیو! اپنے بہادر صاحب نے کہا تھا" سردار جی بولے۔ اُسے آخر کار صفائی پیش کرنے کا موقع ملا۔

"کون بہادر صاحب؟"

"غالباً اس کی مراد دلاور سے ہے" تریونی بولا اور سردار جی کو ڈانٹنے لگا "کتنی بار بتانا پڑے گی تمہیں یہ بات کہ ان کا نام چوہدری دلاور ہے، بہادر نہیں"

"بس جی بندہ بشر غلطی کر جاتا ہے...... اب یاد رکھوں گا۔" سردار جی نے کہا

"گزشتہ بار بھی یہی کہا تھا تم نے۔ چلو دروازہ کھولو۔"

ڈرائیور نے اب مالکوں کے نمائندے کی حیثیت سے اس کو ڈانٹتے ہوئے حکم دیا اور پھر ہماری طرف پلٹا "کیا تم نے سنا نہیں؟ سنا کیا خاک ہوگا ان بہروں نے!" وہ خود ہی جھنجلا کے بولا۔

غالب کے اشارے پر ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ سردار جی نے پچیس تیس فٹ اونچا لوہے کا پھاٹک کھولنے کے لئے ایک فولادی کیبنٹ کو کھولا اور کوئی لیور اونچا کردیا۔ اتنے بھاری دروازوں کو دھکیل کر کھولنا ناممکن تو نہیں مگر مشکل ضرور ہوتا ہے۔ ایک مشین نے یہ کام بڑی خوبی سے سرانجام دیا۔ دونوں پٹ ایسے الگ ہوگئے۔ جیسے کسی نے ڈوری سے پردے کھینچ دیئے ہوں۔

میرے اندیشے اس وقت درست ثابت ہوئے جب کرنل گیٹ میں واکی ٹاکی جیسا کوئی آلہ لے کر کھڑا ہوگیا۔ موبائل فون تریونی کے ہاتھ میں تھا اور اس کا رابطہ کار میں لگے ہوئے سنٹرل ٹرانسیٹر سے تھا جس کا انٹینا پورا باہر نکلا ہوا تھا۔ کرنل کے ہاتھ میں اسلحے کا سراغ لگانے میں استعمال ہونے والا "میٹل ڈی ٹیکٹر" تھا جو ائرپورٹ اور حساس نوعیت کی تنصیبات سے گزرنے والوں کو چیک کرنے کے لئے دیواروں یا دروازوں میں ہی نصب ہوتا ہے۔ اگر ریوالور ہماری جیب میں ہوتے تو یقیناً وہ ہماری تلاشی لیتے۔ میں نے سب سے کہہ دیا تھا کہ وہ اپنی جیب میں کوئی سکہ تک نہ رکھیں تاکہ ہم صاف گزر جائیں۔ کرنل کے ہاتھ میں اس آلے کی بلندی ہمارے گھٹنوں سے اوپر تک ہی محدود رہی۔ وہ آلے کو ہاتھ میں اوپر اٹھاتا تھا تو اس سے خارج ہونے والی مگر نظر نہ آنے والی شعاعیں ہمارے نچلے دھڑ سے ٹکراتی تھیں اور وہ ہاتھ سیدھا کرلیتا تھا تب بھی ٹخنوں سے اوپر بندھے ہوئے ریوالور محفوظ تھے۔ چنانچہ میرے مطمئن ذہن کو اس وقت شدید جھٹکا لگا جب آلے نے چیڑ کرنا شروع کردیا۔ چیڑ کے لئے اردو میں کوئی متبادل لفظ موجود نہیں جو اس کا بالکل صحیح مفہوم بتا سکے۔ یہ آواز ایسے تھی جیسے بہت گرم گھی یا تیل والے توے پر پانی کے چھینٹے پڑنے سے پیدا ہوتی ہے۔

"اے کیا ہے تیرے پاس؟" کرنل نے محسن سے کہا مگر وہ سیدھا گزرتا چلا گیا۔

ڈرائیور جو ہمیں لایا تھا، مسکرا دیا۔ "بہرے ہیں کرنل صاحب۔ ابھی بتایا تھا آپ کو میں نے۔"

کرنل نے محسن کی بشرٹ کی جیبوں کو ٹٹولا اور محسن کو آگے دھکیل دیا۔ "پیتل کے بٹن ہیں۔ میں سمجھا کوئی سکہ ہوگا۔"

"پھر دیکھ لیں، کہیں بم نہ ہو۔"

"شٹ اپ! تم اپنی اوقات میں رہو۔ سمجھے" کرنل آپے سے باہر ہوگیا۔

اس کے اور ڈرائیور کے درمیان تعلقات کی سرد جنگ شاید پہلے سے جاری تھی۔ "میں نے کون سی غلط بات کی ہے کرنل صاحب؟"

وہ معصوم صورت بنا کے بولا۔ وہ ایک ایم ایل اے کا ڈرائیور تھا اور محض ڈرائیور ہی نہیں تھا، محرم راز درون خانہ بھی تھا۔ ایسا نہ ہوتا تو جیون پرشاد ایم ایل اے اور تریونی کے درمیان رابطے کا ذریعہ نہ بنتا۔ جیون پرشاد اس پر پورا اعتماد کرتا تھا اور جیسے شہ کا منہ لگا مصاحب بگڑ جاتا ہے ایسے ہی وہ کرنل کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ کرنل اس کے ساتھ وہی سلوک روا رکھتا ہوگا جو ملازموں کے ساتھ رکھا جاتا ہے اور اس سے بھی غلامانہ تابعداری کی توقع کرتا ہوگا مگر ڈرائیور رعب میں آنے والا نہیں تھا۔ تریونی نے بروقت مداخلت کی۔ "اسٹاپ اٹ کرنل! مجھے جانا بھی ہے۔"

"تم جاؤ۔" کرنل نے ناخوشگوار لہجے میں کہا "میں موجود رہوں گا یہاں۔ کام ہوجائے گا۔"

تریونی نے کہا "کام خراب نہ ہوجائے۔ تم دونوں تو ساس بہو کی طرح ہوجاتے ہو ایک دوسرے کی موجودگی میں۔ میرا خیال ہے تم بھی جاؤ۔"

وہ ہوائی جہاز کے ہینگر بتنا بڑا گودام تھا۔ اس کی چھت شاید چالیس فٹ اونچی ہوگی۔ لمبائی دو سو فٹ اور چوڑائی سو فٹ۔ بیس ہزار اسکوائر فٹ جگہ میں اگر بیس بلب بھی ہوتے تو ناکافی تھے کیونکہ چھت بہت بلندی پر تھی۔ وہاں چاروں کونوں میں سو سو واٹ کے چار بلب آویزاں تھے اور ہوا میں جھول رہے تھے۔ اس سے گودام میں برائے نام اجالا تھا۔ اور سائے متحرک نظر آتے تھے، تو لگتا تھا پوری عمارت ہل رہی ہے۔ تریونی کا مشورہ قبول کرتے ہوئے کرنل بھی رخصت ہوگیا تھا۔ گودام کے دوسرے کنارے پر بھی دروازہ تھا اور اس کے درمیانی حصے میں اسباب سے لدے ہوئے ٹرک کھڑے ہوئے تھے جو روانہ ہونے کے لئے تیار تھے یا صبح ان لوڈ ہونے کے لئے۔ اس ایک گودام میں اتنا سامان سما سکتا تھا جو دس مال گاڑیوں پر لوڈ ہوتا لیکن گودام کا بیشتر حصہ خالی تھا۔ اسباب اس کی چاروں دیواروں کے ساتھ ساتھ الگ الگ ڈھیر کی شکل میں پڑا ہوا تھا۔

ڈرائیور نے غالب سے کہا "یار، تم ان گونگے بہروں سے کہو کہ یوں منہ اٹھا کے نہ چلتے جائیں، اشارہ دیکھیں۔"

غالب نے میرے اور محسن کے کندھے پر ہاتھ مار کے متوجہ کیا

اور ڈرائیور کے حکم کی تعمیل میں بائیں طرف چلنے کو کہا۔ کونے کے بلب کے نیچے لکڑی کے چھ فٹ لمبے بالکل تابوت کی شکل کے ایک جیسے باکس رکھے ہوئے تھے۔ میں پریشان ہوگیا۔ ان کی تعداد کسی طرح بھی سو سے کم نہیں تھی اور اگر ان میں اسلحہ تھا تو ایک باکس کو ایک آدمی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ اگر ایک وقت میں دو آدمی مل کے ایک باکس لے جاتے تو تیسرا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ یہ بات سب کے ذہن میں تھی۔

ڈرائیور نے غالب کے تذبذب کو تاڑ لیا "کیا سوچنے لگے؟"

"صاحب جی' یہ کتنے بکسے ہیں؟ سو تو ہوں گے۔"

"چوراسی ہیں" ڈرائیور بولا۔

میں نے کہا "چوراسی پھیرے پڑ جائیں گے؟ ایک وکھت میں دو بکسے نہیں جا سکتے۔ چار آدمی ہوتے تو......"

اس نے کہا "ابے راجکمار قلی! کیا میں تجھے آدمی نہیں لگتا؟ ایک یہ چاند سورج کی جوڑی ہے۔ دوسری راجہ اور راجکمار کی۔"

وہ اپنے مذاق پر قہقہہ مار کے ہنسا۔

کرنل نے دور سے کہا "لطیفے مت سناؤ ایک دوسرے کو' کام کرو۔"

"کیا ہنسنا بھی منع ہے کرنل صاحب؟ ڈرائیور نے پلٹ کے جواب دیا اور زیرِ لب اسے ایک گالی دی "سالے کی سب کرنلی نکال دوں گا کسی دن ...... کے راستے سے۔ چلو بے تم دونوں" اس نے مجھے اور محسن کو ہاتھ سے اشارہ کیا۔

غالب میرے نزدیک تھا۔ اس نے میرے ساتھ مل کے ایک باکس اٹھا لیا۔ اس کے دونوں کناروں پر لمبائی کے رُخ موٹی رسی کے ہک تھے جن پر چمڑے جیسی ریگزین تھی۔ لوہے کے ہک ہوتے تو باکس کو اٹھانا زیادہ مشکل ہوتا۔ اس کے کنارے انگلیوں میں گڑ جاتے۔

باکس کا وزن ایک من تو ضرور ہوگا جو میری توقع سے کم ہی تھا۔ باکس عام چیڑ کی لکڑی کے بنے ہوئے تھے جو ہلکی بھی ہوتی ہے اور سستی بھی۔ کسی باکس کے سیدھے الٹے کا پتا نہیں چلتا تھا کیونکہ ڈھکن الگ نہیں تھا اور نہ اسے کنڈوں میں قفل ڈال کے بند کیا گیا تھا۔ باکس عین درمیان سے سے کھلتا تھا۔ اور اسے بڑی مہارت سے بند کیا گیا تھا۔ ڈھکن کا نچلا حصہ بھی ڈھکن کے برابر ہی تھا۔ غالباً نیچے والے حصے پر بغیر سروالی نوکیلی کیلیں گاڑی گئی تھیں اور پھر اوپر والا حصہ ان کیلوں پر رکھ کے دبا دیا گیا تھا۔ کیلیں اوپر والے حصے کے تختوں میں پیوست ہوگئی تھیں۔ اب باکس کو پیچ کس جیسے کسی اوزار سے درمیانی جھری کو چوڑا کر کے اٹھایا جا سکتا تھا اور اوپر کھینچ کر پھر اوپر نیچے کے حصوں کو الگ کیا جا سکتا تھا۔

دونوں حصوں کی درمیانی جھری کے چاروں طرف یعنی باکس کی لمبائی اور چوڑائی کے رخ پر دو انچ چوڑا سخت چپکنے والا ٹیپ تھا جس نے جوڑ کو بھی چھپا لیا تھا اور ایک طرح سے باکس کو سیل بھی کر دیا تھا۔ جہاں ٹیپ کے دونوں کنارے ملتے تھے وہاں ایک گول کاغذ کی سیل تھی جس پر کسی نے دستخط کئے تھے مگر اس سے نام نہیں پڑھا جاتا تھا۔ اگر راستے میں کوئی باکس کھولنے کی کوشش کرتا تو اس کے لئے ٹیپ ہٹانا ضروری ہوتا۔ دستخط شدہ کاغذ کی سیل کو پھاڑے بغیر ٹیپ کا کنارا نظر تک نہیں آ سکتا تھا۔ اگر کوئی مہارت سے اس کاغذ کی سیل کو ہٹانے کی کوشش کرتا تو شاید ناکام رہتا۔

صرف اوپر کے حصے پر کالے رنگ میں لکھے ہوئے انگریزی کے حروف سے باکس کے سیدھے الٹے کا پتا چلتا تھا۔ یہ تین لفظ بھی ہاتھ سے نہیں لکھے گئے تھے بلکہ کٹے ہوئے اسٹینسل پر رنگ پھیر کر چھاپ دیئے گئے تھے۔ عین درمیان میں "FOR DEFENCE USE" کی عبارت خبردار کرتی تھی کہ کوئی باکس کو ہاتھ بھی نہ لگائے۔ یہ سب جھوٹ تھا۔ وہ حقیقی باکس دفاعی مقاصد کے استعمال کے لئے تھے اور نہ ان میں بھرا ہوا سامان۔ مگر کس میں ہمت تھی کہ اسے چیلنج کرتا؟ خود فوجی بھی ان کو دیکھتے تو کوئی اہمیت نہ دیتے۔ فوج ایک بہت بڑی اور ملک گیر تنظیم ہے۔ دفاعی ضرورت کا سامان ہزار قسم کا ہو سکتا ہے اور اِدھر سے اُدھر آتا جاتا رہتا ہے۔ باکس کے اوپر والے حصے پر دائیں جانب جو اسٹیکر لگا ہوا تھا اس پر شیشے کا جام بنا ہوا تھا۔ یہ ایک عالمی نشان ہے جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس باکس یا کارٹن کا اسباب ٹوٹ بھی سکتا ہے۔ چنانچہ اسے احتیاط سے اٹھایا اور رکھا جائے۔ دوسری طرف ایک تیر بنا ہوا تھا جس کا رخ اوپر کی جانب تھا اور اس کا مطلب تھا کہ باکس کو اس رخ پر سیدھا رکھا جائے۔

پہلا پھیرا ہم نے دس منٹ میں مکمل کر لیا۔ مال گاڑی کا وہ ڈبا عام قسم کا تھا جو سب سے آگے تھا اور پلیٹ فارم سے بہت دور تھا۔ وہاں تک پہنچنے کے لئے ایک ریلوے لائن کو بھی عبور کرنا پڑتا تھا چنانچہ دس منٹ کے اس پھیرے نے مجھے اور غالب کو تھکا دیا۔

"سر! کیا یہ سب تابوت یہاں تک لانے ہوں گے؟" غالب نے فریادی لہجے میں کہا۔

میں نے افسوس سے جواب دیا "فرض کرو لانے ہیں۔ پھر؟"

"تو آخری تابوت میں مجھے بھی رکھ لانا......"

"تم مایوسی میں روشن پہلو کو نظرانداز کر رہے ہو۔"

"اتنی محنت سے ہلاک ہونے میں روشن پہلو کہاں ہے؟"

"ہے۔ تم یہ سوچو کہ ہم آدھے باکس لائیں گے۔ باقی آدھے محسن اور وہ ڈرائیور اٹھائیں گے۔ یعنی یہاں تک صرف بیالیس باکس لانے ہوں گے۔ باقی آدھے آخری بوگی میں رکھے جائیں گے جو بالکل گودام کے سامنے ہے۔ یعنی صرف اٹھارہ اُنیس باکس یہاں تک لائیں گے ہم......"

لیکن ریاضی کے قاعدے پر مبنی یہ خوش فہمی کا سبق اس وقت اچانک ختم ہو گیا جب میں نے ڈرائیور اور محسن کو آخری بوگی تک جا کے لوٹتے دیکھا۔

انہوں نے اپنے لئے قریب کی بوگی کا انتخاب کر لیا تھا۔ ڈرائیور صاحب کو اپنے لئے آسان کام منتخب کرنے کا حق حاصل تھا۔

غالب نے مجھے خون آشام نظروں سے دیکھا "کیا اب بھی کوئی روشن پہلو نظر آتا ہے آپ کو؟"

میں نے متانت سے کہا "سرنگ کے آخری حصے میں بہرحال روشنی ہے۔ کام ختم ہو جانے کے بعد آرام کرنے میں کتنا لطف آئے گا۔"

غالب نے غرا کے کہا "اتنا ہی جتنا تھانے میں مرغا بننے والے کو ٹانگوں میں سے دنیا کو الٹا دیکھ کر آتا ہے۔"

ڈرائیور اور محسن دوسرا باکس اٹھا کے لے جا چکے تھے اور ہم اب دوسرا باکس اٹھانے پہنچے تھے۔

"مرزا جی! ایک خیال مجھے پریشان کر رہا ہے۔"

"کہ کہیں کسی تابوت میں شہلا نہ ہو" غالب نے کہا۔

"بالکل ٹھیک سمجھا تم نے۔"

"وہ ایسے تابوت میں کیسے زندہ رہ سکتی ہے۔ جو ائرٹائٹ ہو"

"لیکن فرض کرو اس میں کوئی ایسا باکس ہو جس میں نیچے کی طرف چند سوراخ ہوں ہوا کے لئے۔ اور اندر شہلا کے ساتھ اس کا بیٹا خواب آور انجکشن کے اثر سے بے ہوش پڑے ہوں تو ہمیں کیسے معلوم ہوگا" میں نے کہا۔

"ظاہر ہے ہمیں معلوم نہیں ہو سکتا" غالب نے کہا۔

"یعنی ہم خود ہی انہیں اٹھا کے لے جائیں گے اور اس تمام گولہ بارود کے ذخیرے میں رکھ دیں گے۔ اپنے ہاتھوں سے یا خود محسن اپنی بیوی اور بچے کا تابوت اٹھا کے اسلحے کے ڈھیر پر رکھ آئے گا۔"

غالب نے کہا "کیا آپ روشن پہلو پر نظر نہیں رکھ سکتے؟"

"پھر وہی بات یار۔ اس احساس کی اذیت میں روشن پہلو کہاں ہے؟"

"ہے۔ اول تو مجھے اس کا امکان بہت کم نظر آتا ہے کہ وہ شہلا اور اس کے بیٹے کو ایسے باکس میں لے جائیں۔ تم نے تو دیکھا تھا انہیں شیشے کے تابوت میں۔ اب وہ ایسے ہی باکس میں لے جانا چاہیں گے تو وہ باکس ائرٹائٹ نہیں ہوگا۔ اس میں تازہ ہوا کے لئے سوراخ ہوں گے۔ اس کے نچلے حصے میں۔"

"ہم نیچے کی سطح کو ہاتھ سے ٹٹول کر دیکھ سکتے ہیں۔"

"اگر بدقسمتی سے وہ باکس محسن نے ڈرائیور کے ساتھ مل کر اٹھایا تو کیسے پتا چلے گا؟"

"اس سے اتنا تو معلوم ہو جائے گا نا کہ باکس پہلے ڈبے میں نہیں ہے۔ آخری ڈبے میں ہے۔"

غالب نے نفی میں سر ہلایا "اتنی دیر تک کسی خواب آور دوا کا اثر باقی نہیں رہتا۔ ٹرین کے جانے میں آٹھ نو گھنٹے باقی ہیں اور یہ باکس تو یہاں گزشتہ رات سے موجود ہیں۔ میرا خیال ہے کہ شہلا کو وہ بعد میں لائیں گے۔ بالکل آخری وقت میں' جب ٹرین کی روانگی کا وقت ہو جائے گا" غالب نے کہا۔

شاید وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ اس کی دلیل نے میرے دل کو اس خوف سے بھی نجات دلا دی کہ کہیں شہلا کے تابوت کو اٹھانے والا خود محسن نہ ہو۔

جب ہمارا تیسرا پھیرا تھا تو محسن اس ڈرائیور کے ساتھ پانچ پھیرے کر چکا تھا۔

"حرام خوری مت کرو" ڈرائیور نے مجھے پھیرے کے لئے جاتے وقت کہا۔

"حرام کھوری کون کرتا ہے جی" غالب نے کہا۔

"اور پھر یہ کیا ہے؟ تم نے تین باکس پہنچائے ہیں اتنی دیر میں ہم چھٹا لے جا رہے ہیں۔"

"اچھا جی آپ اس کو ادھر لے جاؤ آکھری بوگی میں اور پھر دیکھو......"

"بکواس مت کرو ذرا تیز چلو گے تو مر نہیں جاؤ گے۔ میں صرف اس لئے مدد کر رہا ہوں کہ وقت کم لگے۔ مجھے تمہاری مزدوری میں سے حصہ تو نہیں ملے گا" ڈرائیور نے مشتعل ہو کے کہا۔

"اچھا جناب' آپ بیٹھ جائیں آرام سے۔ ہم نمٹا دیں گے سارا کام" غالب نے میرے اشارے پر ہاتھ جوڑ کے کہا۔

"غلطی مجھ سے ہوئی۔ ایک اور کو لے آتا تو خود ہاتھ میں ہنٹر لے کے کھڑا رہتا۔ کام آدھا آدھا بانٹ دیتا اور پھر جو حرام خوری کرتا اس کی کھال ادھیڑ دیتا۔" ڈرائیور نے کہا لیکن اس کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ "چل بے اٹھا" اس نے محسن کو گالی دے کر کہا۔

گالی وہ عادتاً دیتا تھا اور تیز مزاج بھی تھا مگر وہ دل کا اتنا برا نہیں تھا۔

میں نے غالب سے کہا "اس سے بگاڑ مول لینے کا کوئی فائدہ نہیں"

"یار' بات ہی الٹی کی تھی اس نے۔ کیا فاصلہ نظر نہیں آتا اسے؟" غالب نے کہا۔

"جو حاکم ہو یا مالک ہو اس کی الٹی بات کو بھی اس کے منہ پر الٹا کہنے سے صرف اس کی ناراضگی حاصل ہوتی ہے۔ کام نکالنے کے لئے......"

"ہمارا کون سا کام رک جائے گا اگر یہ ناراض ہو گیا۔ میں تو چاہتا ہوں کہ جان چھٹے۔ اب کیا فائدہ اس مزدوری کا۔ جو معلوم ہونا تھا ہو گیا" غالب نے کہا۔

میں نے غور کیا تو مجھے اس کی بات پھر ٹھیک لگی۔ اس گودام میں داخل ہونے کا مقصد پورا ہو جانے کے بعد ہمارے لئے جسمانی مشقت لاحاصل تھی۔ دو سو روپے کی خاطر خود کو تھکانا کوئی عقلمندی

نہ تھی۔

غالب نے کہا "یہ پتا چل گیا کہ شہلا اس وقت یہاں موجود نہیں ہے۔ صندوقوں میں کیا ہے یہ ہم دیکھ نہیں سکتے۔ یہ مال کونسی بوگیوں میں رکھا گیا ہے یہ بھی معلوم ہو چکا ہے۔ ہمیں اب چلنا چاہئے ورنہ دوسری طرف کام خراب ہو جائے گا۔"

میں نے کہا "درست فرمایا آپ نے۔ سارے باکس ڈھونے میں ڈھائی تین گھنٹے لگ جائیں گے کم سے کم۔ اور بج جائیں گے رات کے بارہ۔ گاڑی تو روانہ ہوگی صبح ساڑھے پانچ بجے مگر ہمیں دو ڈھائی بجے رات سے پہلے دو کام نمٹانے ہیں۔ پہلے محسن کے تابوت کو گارڈ کے پاس رکھوانے کے لئے جانا ہے۔ وہاں ہم اس لباس فاخرہ میں نہیں جا سکتے۔ گارڈ تب ہی قائل ہوگا جب ہم صورت اور حلئے سے بھی سچ مچ کے لواحقین نظر آئیں۔ اور اس کام سے فارغ ہو کر ہمیں نازو کے پاس پہنچنا ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ پہلے ہم نازو کی مدد کریں۔" غالب نے کہا اور ہم نے چوتھے باکس کو بوگی میں دھکیل دیا۔

"نازو کو مدد کی ضرورت نہیں" میں نے کہا "اپنی حفاظت کی وہ خود اہل ہے۔ ہم پہلے دوسرے کام ختم کریں گے اور پھر ایک ہی بار نازو کے پاس جائیں گے تو وہیں قیام کریں گے۔"

"اور اتنی دیر میں گھوڑے بھی مال گاڑی پر پہنچا دئے گئے پھر؟"

"پھر کیا۔ ہم مال گاڑی پر پہنچ جائیں گے" میں نے کہا۔

"اس میں گڑبڑ نہ ہو جائے۔ ہم پہلے تابوت اٹھا کر لے جائیں گے۔ اس وقت گارڈ ہمیں دیکھ لے گا۔ پھر ہم ہی گھوڑوں کے ساتھ نظر آئیں گے تو اسے فوراً شک ہو جائے کہ دال میں کالا ہے۔ آخر وہ ہے تو انہی کا آدمی' دلاور اور تریویدی کا جسے خاص طور پر کسی اور کی ڈیوٹی بدل کے لایا گیا ہے۔"

میں نے کہا "لیکن ہم ابھی سے گھوڑوں کے ڈاکٹر اور ٹرینر بن گئے تو....."

"تو کیا۔ اصل ڈاکٹر اور ٹرینر کو باندھ کر اندر ڈال دیتے ہیں۔ اور پھر چلتے ہیں تابوت لے کر اپنے محسن شیروانی مرحوم اور ان کی بیوہ کے ساتھ" غالب نے کہا۔

"یہ تو وہی بات ہوئی۔ کان کو ادھر سے پکڑو یا ادھر سے۔ کیا پھر گارڈ نہیں دیکھے گا۔ ابھی صرف نو بجے ہیں' کہیں ایسا نہ ہو کہ جیون پرشاد یا اس کا کوئی آدمی کسی کام سے آجائے۔ مثلاً گھوڑوں کی خیریت معلوم کرنے۔ بارہ بجے کے بعد یہ خطرہ نہیں رہے گا۔ ابھی جو آتا ہے آئے۔ نازو کو خود جیون پرشاد نے ساتھ کیا ہے۔ اچھا ہے وہ دیکھ جائیں گے کہ سب ٹھیک ہے" میں نے کہا اور غالب نے مجھ سے اتفاق کیا۔

ہم واپس گودام میں پہنچ چکے تھے لیکن اگلا باکس اٹھانے کے بجائے ہم دونوں ایک باکس پر بیٹھ گئے۔

"ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ دو بوگیوں کا سامان تو نہیں تھا" میں نے کہا۔

غالب نے سرہلایا "ہاں۔ ایک بوگی کے کونے میں سما جاتا"

"پھر انہوں نے دو بوگیاں حاصل کرنے کا تکلف کیوں کیا؟"

"ممکن ہے خالی جگہ میں محافظ سونے کے لئے آئیں" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "کتنے محافظ آئیں گے ایک بوگی میں۔ جتنی خالی جگہ بچی ہے اس میں تو دس آدمی لمبے لیٹ سکتے ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ ان بوگیوں میں دوسرا اسباب بھی بھرا جائے گا۔"

"وہ کیوں؟"

"اصل مال کو چھپانے کے لئے۔ کیموفلاج کرنے کے لئے وہ بھوسہ بھی بھر سکتے ہیں" میں نے کہا اور سگریٹ جلالی۔

غالب نے کہا "رائٹ۔ ان کی جگہ میں ہوتا تو یہی کرتا۔"

"اور میں ہوتا تو معلوم ہے کیا کرتا؟" میں نے سگریٹ کا ایک کش لے کر کہا "میں خواجہ سیمنٹ والوں کی خدمت میں حاضر ہوتا اور کہتا کہ جناب میں وزارت دفاع کی طرف سے ایک پیغام لایا ہوں۔ اشد ضرورت کے تحت ہم نے آپ کی ریزرویشن منسوخ کرا کے دو بوگیاں حاصل کرلی تھیں جن پر آپ کو سیمنٹ بھیجنا تھا مگر اب صورت حال کچھ ایسی ہے کہ ہمارا شیڈول بدل گیا ہے اور بہت تھوڑا سامان جا رہا ہے۔ آپ اگر چاہیں تو اپنا سیمنٹ بھی لوڈ کرلیں تاکہ آپ کا نقصان نہ ہو۔ تاہم اس کے لئے آپ کو کسی قسم کا معاوضہ وزارت دفاع کو ادا نہیں کرنا ہوگا۔ یہ محض خیر سگالی کے جذبات کا اظہار کرنے کے لئے ہے' اس کوفت پر جو آپ کو ہوئی" محسن کو آتا دیکھ کر میں خاموش ہو گیا۔

اچانک ڈرائیور نے چیخ کر مجھے ایک گالی دی اور دیوانہ وار میری طرف دوڑا۔ میرے ہاتھ سے سگریٹ چھین کر زمین پر جوتوں سے مسلتے ہوئے اس نے میرے ایک ہاتھ بھی رسید کر دیا۔ میں نے گونگوں کی طرح احتجاج کیا اور چلانے لگا۔

غالب کو جس بہانے کی ضرورت تھی وہ ڈرائیور نے فراہم کر دیا تھا "کیا بات ہے جی۔ کیا لگتی ہے اس گریب کی؟"

"گریب کے بچے....." ڈرائیور نے مزید گالیاں دیتے ہوئے کہا "سگریٹ پیتے ہو یہاں۔"

"کیا ہوا اگر ذرا دم لینے کو سگریٹ پی لی۔"

"سگریٹ پینا منع ہے یہاں" ڈرائیور نے چلا کے کہا۔

"تو پہلے بتانا تھا۔ گالیاں دینے کی کیا ضرورت ہے؟" غالب گرم ہو کے بولا۔

"تمہیں معلوم نہیں یہ بات؟" ڈرائیور نے اس کے بھی ایک ہاتھ مار دیا "کس گودام میں سگریٹ پینے کی اجازت ہے؟ آگ لگ گئی تو نقصان تمہارا باپ....."

"بس صاحب! بہت ہو گئی۔ اب تم باپ تک پہنچ گئے ہو"

غالب نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا "مجوری پر لعنت۔"

"تجھے پتا ہے اپنے باپ کا حرامی" ڈرائیور نے ہاتھ چھڑا کے غالب کو دھکا دیا۔ اس کے لئے غالب کی سرکشی ناقابل برداشت تھی۔

"تو حرامی۔ تیرا باپ حرامی" غالب نے چلا کے جواب دیا۔ وہ غصے میں پاگل ہو گیا مگر اس سے پہلے کہ وہ مار مار کے غالب کا بھرکس نکال دیتا' میں اور محسن اس کے سامنے آگئے۔

"کیا سمجھتا ہے تو۔ ہم گریبوں کی اجت نہیں ہے۔ تو نے کھرید لیا ہے ہمیں۔ اپنے پاس رکھ اپنی مجوری۔ اور یہ لے جو تو نے پیسے دئے تھے" غالب نے سو کا نوٹ اس کی طرف پھینک دیا "ہم مار کھائیں گے۔ گالیاں کھائیں گے تیری۔"

وہ ایک دم سنبھل گیا اور اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا مگر اس کے لئے یہ بھی بہت مشکل تھا کہ وہ اپنی ناک نیچی کر کے ایک قلی سے کہے کہ سوری۔ مجھ سے غلطی ہو گئی۔

"ہم جا رہے ہیں" غالب نے کہا اور ہمیں چلنے کا اشارہ کیا۔

اس نے ہمارا راستہ روک لیا "ٹھہرو۔ تم ایسے نہیں جا سکتے۔ کام ختم کئے بغیر۔"

"کسی اور سے کرالے کام" غالب نے کہا "اور ہم ابھی جا کے سب کو بتاتے ہیں کہ تو نے کیسی گندی گالیاں دی ہیں ہمیں اور مارا ہے ہمیں۔ پھر ہم دیکھتے ہیں تیرا کام کرنے کون آتا ہے۔ کل سے ساری قلی ہڑتال پر نہ چلے جائیں تو کہنا۔"

ڈرائیور کی حالت غیر ہو گئی "میں گولی مار دوں گا تمہیں۔"

"ارے جا۔ تو کیا گولی مارے گا" غالب نے حقارت سے کہا اور باہر جانے کے لئے آگے بڑھا۔

"چوکیدار! روک لو اس.....کو" ڈرائیور نے ایک گالی دے کر کہا اور ایک دم ریوالور نکال لیا "گولی مار دو اگر ان میں سے کوئی بھی باہر قدم رکھے۔"

میں نے ایک دم ڈرائیور کے ریوالور والے ہاتھ پر ہاتھ مار دیا۔ اس وار کے لئے وہ بالکل تیار نہ تھا۔ اس کا ریوالور ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ کلائی پکڑ کے درد سے چلانے لگا۔ وہ کمزور حریف نہیں تھا مگر صورت حال ایک دم اس کے قابو سے باہر ہو گئی تھی۔ غالب کی دھمکی نے اس کے اوسان خطا کر دئے تھے۔ اسے یہ کام وقت پر ختم کرانا تھا۔ اگر واقعی قلی اس کے غلط رویئے کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے تو اس ہنگامے کا ذمے دار وہی سمجھا جاتا۔

وہ یہاں فائرنگ نہیں کر سکتا تھا۔ کوئی گولی نشانہ چوک جانے سے آتشیں اسلحے کے باکس میں لگ جاتی تو پورا گودام ایک دھماکے سے اڑ جاتا اور خود اس کے پرخچے اڑ جاتے۔ وہ مار پیٹ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ شور سے لوگوں کو متوجہ کرتا اور مجمع لگ جاتا تو اس کا کام رک جاتا۔

سردار جی بھی اس صورت حال میں گھبرا گئے تھے۔ کسی قلی کو گولی مارنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ان کے لئے ہم سب کو زبردستی روکنا بھی مشکل تھا۔

"اوئے یارو کیا ہوا؟ موتیاں والیو" سردار جی نے مصالحت کرانے کے لئے کہا "اوئے چھڈو غصہ۔"

"ہٹ ہمارے راستے سے سکھ کی اولاد" غالب نے اسے دھکیل کر ایک طرف کیا اور باہر نکل گیا۔

سردار جی نے غصے میں رائفل اٹھائی مگر اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا "سور دے پتر۔ چلے گئے۔"

"تم الو کے پٹھے ہو۔ تم نے انہیں روکا کیوں نہیں؟"

"کیسے روکاں جی۔ آپ تو بولتے ہو گولی مار دو۔ پھانسی آپ چڑھو گے میری جگہ؟" سردار جی نے آگ بگولا ہو کے کہا۔

ڈرائیور نے اب اپنی خودی کو بالائے طاق رکھا اور ہمارے پیچھے دوڑا "بات سنو۔ چلو مجھ سے غلطی ہو گئی۔ مجھے معاف کرو۔ تم سب میرے باپ اور میں حرامی" وہ ہاتھ جوڑ کے بولا۔

غالب نے نفی میں سرہلایا "اب جا کسی اور کو لے آ۔"

"لے آؤں گا۔ مگر تم ایک مہربانی کرو۔ یہ لو اپنی مزدوری۔ تم جاؤ' میں زبردستی کام کیسے لے سکتا ہوں تم سے" ڈرائیور نے کانپتے ہاتھوں سے سو سو کے نوٹ نکالے۔

"پھر مجوری کیوں دے رہا ہے؟" غالب بولا۔

"تم کسی سے ذکر مت کرنا' بس جو ہو گیا اسے بھول جاؤ۔" ڈرائیور نے کہا۔

"رسوت دے رہا ہے۔ وہ بھی اتنی تھوڑی۔ گالیاں اور مار کھانے کی بس اتنی ہی قیمت۔"

"اچھا پانچ پانچ سو لے لو۔ مگر بس اپنی زبان بند رکھو۔ کسی اور سے یہ سب مت کہو۔ ایسا نہ ہو ہنگامہ کھڑا ہو جائے۔"

"وہ تو ہو گا۔ تو نے کیا سمجھا تھا۔ تیرے باپ کے نوکر ہیں ہم۔ پولیس بھی ہاتھ لگائے تو ہم ہڑتال کر دیں۔ تو کون ہوتا ہے پھر؟"

ڈرائیور سخت پریشانی میں مبتلا ہو گیا تھا۔ غالب اسے پوری طرح بلیک میل کر رہا تھا اور ہم اس صورت حال میں غالب کی اداکاری سے پورا لطف لے رہے تھے۔ اس نے پانچ پانچ ہزار فی کس پر "عزت" کا سودا کیا۔

"خبردار جو آئندہ کسی قلی کو گالی دی" غالب نے پندرہ ہزار سمیٹ کر جیب میں رکھے۔ پھر نکالے اور ہمیں پانچ پانچ ہزار روپے دے کر اشاروں کی زبان میں سمجھایا کہ ہم اس بے عزتی، مار پیٹ اور گالم گلوچ کا کسی سے ذکر نہیں کریں گے۔ پندرہ ہزار کا نقصان ڈرائیور کو محض اپنی بدمزاجی کے باعث برداشت کرنا پڑا تھا مگر اس نے ہم سے جان چھڑا کے خدا کا شکر ادا کیا ہو گا کہ بات زیادہ نہیں بگڑی ورنہ دلاور اور تریونی اس کی کھال میں بھس بھر دیتے۔

گودام سے بہت دور آ جانے کے بعد ہم پر ہنسی کا دورہ پڑا۔

"کیا یاد رکھے گا سالا۔ لینے کے دینے پڑ گئے" غالب بولا۔

"ساری اکڑفوں دھری رہ گئی" میں نے کہا۔

"قلیوں نے سارا غرور خاک میں ملا دیا اور بلیک میل کر کے لوٹ بھی لیا" محسن بولا۔

"سب وقت کی بات ہے۔ وہ مجبور تھا اس وقت ورنہ وہ خود کیا کم سرپھرا بدمعاش تھا۔ اور اسے تریونی جیسے بدمعاشوں سے جیون پرشاد جیسے بااثر لوگوں تک کی حمایت حاصل ہے۔"

"اب اس کی طرف پینتیس ہزار رہ گئے؟" میں نے کہا۔

"وہ کس حساب میں بھیا؟"

"ایک بار میں نے اسے ٹیکسی میں ناک آؤٹ کیا تھا تو اس کی جیب میں سے وہ خط نکلا تھا جس میں سارا پلان تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی پچاس ہزار بھی تھے جو میں اس لئے چھوڑ آیا تھا کہ اسے شک نہ ہو۔ اس میں سے پندرہ ہزار وصول ہوئے۔ باقی پینتیس ہی بچے۔"

"یار زندہ صحبت باقی۔ پھر کبھی ضرورت کے وقت لے لیں گے۔"

"آج رات تو میرا ارادہ ایک اور بدمعاش کو سبق سکھانے کا ہے" میں نے کہا۔

"سبق سکھانے کے لئے وقت ہو گا؟"

"اور ہم سارے زمانے کو سبق سکھانے کے لئے نہیں نکلے ہیں"

میں نے کہا "مگر یار، کوئی راستے میں آ جائے تو اس کو کیسے چھوڑ دیں؟ نظر چرا لیں اور بچ کے نکل جائیں یہ تو ہو نہیں سکتا۔"

"کون ہے آخر وہ؟" محسن بولا۔

"رات کو بتاؤں گا۔ ابھی سسپنس چلنے دو" میں نے کہا۔

"ابھی رات کے سوا نو بجے ہیں۔ دس بجے تک بازار کھلے ہیں" غالب نے کہا۔

"کیا لانا ہے بازار سے؟" محسن بولا۔

"یہ کپڑے نہیں بدلنے ہیں کیا؟ جو کچھ ہمارے پاس تھا سب ماما جی کے گھر میں جل گیا۔"

"خدا بھلا کرے گل کا۔ وہ کام کی چیزیں نکال لائی مگر کپڑے تو واقعی نہیں ہیں ہمارے پاس اور ہمیں کم سے کم بھی دو دو جوڑوں کی ضرورت ہو گی" میں نے کہا "ایک وہ جو ہم تابوت لے جاتے وقت سوگواروں کی حیثیت سے زیب تن کریں گے اور دوسرے وہ جو اس کے فوراً بعد گھوڑوں کے ڈاکٹر اور ٹرینر بن کے پہنیں گے۔"

"دونوں بالکل مختلف ہونے چاہئیں۔"

"نو پرابلم" میں نے کہا "سوگواروں کے لباس سیاہ ہوں گے۔ ڈاکٹر اور ٹرینر کے شوخ اور جدید وضع کے۔"

"سوگوار بیوہ کے لئے بھی ایک کالا لباس لینا مت بھولنا۔"

ایک ٹیکسی نے ہمیں ایک جدید شاپنگ سینٹر میں پہنچا دیا۔ ٹیکسی میں بیٹھنے سے پہلے ہم نے قلیوں والی وردی اتار کے پھینک دی تھی جو صبح ہم نے اپنے کپڑے اتارے بغیر پہن لی تھی۔

"ہمیں ایک جنازے میں شریک ہونے کے لئے ماتمی سیاہ سوٹ چاہئیں دوست" میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔

ٹیکسی والا حیران ہو کر بولا "اس وقت۔ رات کو۔"

میں نے کہا "تابوت ہوائی جہاز کے ذریعے روانہ کیا جا رہا ہے۔ مجبوری ہے۔ ہمیں ابھی کچھ دیر پہلے معلوم ہوا ہے۔"

"اس وقت تو مشکل ہے۔ یہ سب ہوٹل، ریسٹورنٹ، بار اور کیمسٹ وغیرہ کھلے ہیں۔ ڈیپارٹمنٹل اور سپر اسٹور بند ہو چکے ہیں۔"

میں نے کہا "پھر کیا ہم اسی لباس میں جائیں؟"

"یہ تو بڑی غلط حرکت ہو گی" محسن بولا۔

"مجبوری میں سب چلتا ہے سر" ٹیکسی والا بولا۔

میں نے افسوس کے ساتھ نفی میں سر ہلایا "چل سکتا تو ہم بھی چلا لیتے۔ تم تو بمبئی کے چپے چپے سے واقف ہو۔"

"یس سر۔ بیس سال ہو گئے ادھر ٹیکسی چلاتے ہوئے" وہ فخر سے بولا۔

"ہم تو اجنبی ہیں" میں نے کہا "تمہیں ضرور کوئی ایسی جگہ معلوم ہو گی۔"

"بات یہ ہے سر کہ عام استعمال کی چیزیں تو آپکو کسی ہوٹل کے اندر شاپنگ آرکیڈ سے بھی مل جائیں گی۔ یہ مجھے نہیں معلوم کہ کپڑے بھی ملتے ہیں یا نہیں۔ لیکن۔۔۔"

"لیکن کیا" میں نے کہا۔

محسن نے کہا "کوشش کرنے میں کیا حرج ہے چل کے دیکھ لیتے ہیں۔"

ڈرائیور نے پلٹ کر ہماری صورتوں کو غور سے دیکھا اور بولا۔ "میرا ایک دوست ویٹر ہے۔"

میں نے کہا "یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔"

"تم کچھ اور کہنا چاہتے تھے" محسن بولا۔

"وہ سر، ہے تو بری بات۔ مگر یہ سب ہی ہوٹلوں کے بیرے کرتے ہیں" وہ بولا۔

"کیا کرتے ہیں؟"

"چھوٹی موٹی چوریاں۔ بعض اوقات موقع مل جاتا ہے کسی چیز پر ہاتھ صاف کرنے کا۔ کبھی مسافر سامان بھول بھی جاتے ہیں اور کچھ ایسے بھی آتے ہیں جو نشے میں یا حد سے زیادہ خوش ہو کے انعام میں دے جاتے ہیں۔"

"کیا دے جاتے ہیں؟"

"ہر چیز۔ شراب کی بوتل۔ پرفیوم۔ ڈالر۔"

"ہمیں ایسی کسی چیز کی ضرورت نہیں" میں نے کہا۔

"اس کے علاوہ۔ اچھے خاصے سوٹ" ڈرائیور نے کہا "باتھ روم میں بھول جاتے ہیں یا لانڈری والے کے پاس کبھی ڈرائی کلین ہونے کے لئے بھیجتے ہیں اور اچانک جانا پڑ جاتا ہے۔ بعض اوقات یاد نہیں رہتا انہیں۔۔۔ یہ سوٹ ان کے کسی کام کے نہیں ہوتے۔ بیروں کے اور لانڈری میں کام کرنے والوں کے۔ وہ بیچ دیتے ہیں"

میں نے کہا "دوست! پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہیں رہا۔"

"لیکن آپ کو چاہئیں کالے سوٹ۔"

"ہم دوسرے بھی لے سکتے ہیں۔ قیمت دے کر۔ تم اپنے دوست کے پاس چلو فوراً" میں نے کہا۔

"وہ ڈرتا ہے سر۔"

"ہم سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔"

"پتا نہیں ہوتا نا سر۔ کوئی مسافر پھر آ جائے، جس کا سوٹ ہوٹل میں گم ہوا ہو" وہ بولا۔

"ایسا ہونا تو بہت مشکل ہے۔ نہ ہونے کے برابر ہیں امکانات" میں نے اسے تسلی دی۔

"جب آدمی کے برے دن آتے ہیں تو سب ہونے لگتا ہے جو ناممکن نظر آتا ہے۔"

"خیر ہمارا نہ آج تک کوئی سوٹ گم ہوا ہے۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ ہم ایسے کسی ہوٹل میں کبھی ٹھہرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے" غالب نے کہا۔

اس بات نے ڈرائیور کا اعتماد بحال کر دیا۔ وہ سیدھا ہمیں ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں لے گیا اور ٹیکسی باہر روک دی۔

"آپ ادھر بیٹھیں۔ میں اسے لے کر آتا ہوں۔"

"دیر مت کرنا۔ ہمارے پاس وقت کم ہے۔"

"ایک کام تو ہوا۔" غالب نے کہا۔

"دوسرے کی سبیل بھی اللہ پیدا کرے گا" محسن نے کہا "اگر یہ ڈرائیور نہ ملتا تو ہم مارے جاتے۔"

"ہم کیوں مارے جاتے۔ تین بے قصور مارے جاتے جن کے ہم کپڑے اتروا تے۔" غالب بولا۔

میں ہنس پڑا "ہاں۔ کچھ تو کرنا ہی پڑتا ہمیں۔"

ٹیکسی ڈرائیور ایک بیرے کے ساتھ نمودار ہوا "میں نے ساری بات کر لی ہے سر۔ ایک ہزار روپے کا ایک سوٹ ہو گا۔"

میں نے کہا "ایک ہزار! پرانے سوٹ کے۔"

"دو نئے سوٹ مل سکتے ہیں اس قیمت میں" محسن بولا۔

"آپ کی مرضی جناب۔ آپ نئے سلوا لیں" ٹیکسی ڈرائیور کے بجائے ویٹر نے کہا۔ وہ بہت عیار شخص تھا۔

"اچھا یار، روٹھے کیوں جا رہے ہو۔ کہاں ہیں سوٹ؟" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "لنڈا بازار والے تم کو سو روپے بھی نہ دیتے۔"

"ضرورت مند کے لئے انتظار کرنا پڑتا ہے سر" ویٹر نے کہا۔

"دن میں کوئی ضرورت مند تمہیں دو سو دیتا۔"

"ابھی تو رات ہے سر" ویٹر نے سمجھ لیا تھا کہ فوری ضرورت نہ ہوتی تو ہم اس کے پاس کیوں آتے۔

"اچھا جاؤ۔ لے کر تو آؤ۔ ہم دیکھ لیں سوٹ کیسے ہیں" میں نے کہا "وقت ضائع مت کرو۔"

"آپ پیچھے آ جائیں اس کے ساتھ سر" اس نے ایک انتہائی منافع بخش سودا بڑی ہوشیاری سے طے کر لیا تھا چناں چہ اس کے لبوں پر کامیابی کے تفخر کی مسکراہٹ پھیل گئی۔

ٹیکسی ڈرائیور نے کوئی ڈیڑھ میل کا چکر کاٹا اور ہوٹل کے احاطے کو طے کرتا ہوا عقبی حصے میں پہنچا۔ ویٹر نے اندر ہی اندر سے شارٹ کٹ لے کر یہ فاصلہ طے کیا تھا۔ ہمارے پہنچنے کے چند منٹ بعد وہ بھی آ پہنچا۔

"میرا مال ہوتا تو میں آپ کے ساتھ رعایت کر دیتا سر، مگر مال ہے کسی اور کا۔ ایک لانڈری والا ہے" ویٹر نے کہا۔

"چھوڑو یہ فضول باتیں" میں نے کہا "سوٹ دکھاؤ۔"

میرا خیال ہے کہ اس نے نظروں سے ہماری پیمائش کر لی تھی کیوں کہ تینوں سوٹ عین ہمارے سائز کے مطابق تھے۔ شاید پہن کر انیس بیس کا فرق رہ جاتا۔ کسی اور کے سوٹ ہمارے جسم پر اس طرح فٹ نہیں آ سکتے تھے جیسے ہمارے اپنے آرڈر پر سلوائے ہوئے کپڑے مگر میرا اندازہ یہ تھا کہ سوٹ نہ کسی کو بہت تنگ ہوں گے نہ بہت ڈھیلے۔

”دے دو اسے تین ہزار“ میں نے کسی ارب پتی کی طرح کہا جو اپنے سیکریٹری کیشیئر کو ساتھ رکھتا ہو۔

محسن نے اسے تین ہزار پکڑا دیئے ”ڈسکاؤنٹ بھی نہیں دو گے یار۔ کتنی دور سے چل کے آئے ہیں۔“

”چل کے کہاں سر۔ ٹیکسی میں آئے ہیں آپ“ اس نے مکاری سے مسکرا کے کہا اور نوٹ جیب میں رکھ کے غائب ہو گیا۔

”میں شرمندہ ہوں سر۔ میں نے آپ کو لوٹ لیا۔“

”لوٹا اس نے ہے تو شرمندہ تم کیوں ہو؟“ میں نے کہا۔

”دوستی کا بھی لحاظ نہیں کیا اس نے۔“

”دوست وہ تمہارا ہے‘ ہمارا نہیں۔ ہم تو صرف گاہک تھے اس کے لئے“ محسن بولا۔

”جن کو تم پھانس کر لائے تھے“ غالب نے کہا۔

غالب کی بات غلط نہ تھی۔ ڈرائیور نے اس سے پہلے ہی کمیشن وصول کر لیا ہو گا اور وہ طے کر کے آئے ہوں گے کہ ایک سوٹ کے ایک ہزار لیں گے۔ اس میں سے ڈرائیور نے آدھے ضرور وصول کئے ہوں گے ورنہ دھمکی دی ہو گی کہ میں گاہکوں کو کہیں اور لے جاتا ہوں۔

ڈرائیور نے مجروح جذبات کے بھرپور تاثر کے ساتھ پیچھے پلٹ کے دیکھا ”ایسی غلط بات مت کریں سر۔ میں آپ کو پھانس کر نہیں لایا تھا۔ ٹیکسی آپ نے خود روکی تھی۔ میں نے آپ کو روک کر ٹیکسی میں نہیں بٹھایا تھا۔ آپ نے کہا تھا کہ سوٹ چاہئیں۔ میں نے نہیں پوچھا تھا کہ کیا آپ کو سوٹ خریدنے ہیں۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو دوست“ میں نے اس کے کندھے پر تھپکی دی ”ہمارا یہ دوست غصے میں ایک ناجائز بات کہہ گیا۔“

”تمہارا واقعی اس سودے میں کوئی کمیشن نہیں“ محسن نے کہا۔

”تم نے تو مدد کی ہماری۔ احسان کیا ہم پر“ غالب طنز سے بولا۔

”میں نے تو سوچا تھا آپ کا دوسرا مسئلہ بھی حل کر دوں مگر آپ لوگ ایسی باتیں کرتے ہیں تو مجھے کیا ضرورت ہے۔“

میں نے غالب اور محسن کو غصے سے دیکھا اور ان کو آنکھ مار کے برہمی سے کہا ”تم دونوں کا دماغ خراب کیوں ہو رہا ہے آخر۔ لعنت بھیجو پیسے پر۔ پیسہ ہاتھ کا میل ہے۔ یہ نہیں دیکھتے کہ ایک شریف آدمی ہماری خاطر کتنی پریشانی اٹھا رہا ہے۔ اگر یہ مدد نہ کرتا تو ہم کہاں جاتے۔ کیا کرتے۔ کون جانتا ہے بمبئی میں ہمیں‘ جس کے سامنے اپنی ضرورت بیان کرتے۔“

باری باری غالب اور محسن نے ٹیکسی ڈرائیور سے معذرت کی اور اس ”شریف آدمی“ نے فوراً انہیں معاف کر کے اپنے فراخدل ہونے کا ثبوت دیا۔

میں نے کہا ”دوست! اب یہ بتاؤ کہ دوسرا مسئلہ کیسے حل کیا ہے تم نے؟“

اس نے کہا ”اس ویٹر نے مجھے ایک نیا پتا بتایا ہے جہاں سے ہر قسم کے کپڑے کرائے پر مل جاتے ہیں۔ عروسی جوڑے۔“

”اتنی رات گئے ہم میں سے کوئی شادی کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا“ محسن نے کہا۔

”کیونکہ ابھی تک تو کسی نے دلہن ہی منتخب نہیں کی ہے۔“

”اس کے پاس ماتمی تقریب کے لئے بھی لباس ہو گا۔ مردانہ بھی اور زنانہ بھی“ ڈرائیور نے کہا۔

”کیا اس کی دکان کھلی ہو گی؟“

”نہیں۔ اس کے گھر جانا پڑے گا“ ٹیکسی ڈرائیور نے کہا۔

”وہ گھر پر بھی رکھتا ہے۔ آمدنی کے ذرائع؟“

”یہ تو گھر جا کے پتا معلوم ہو گا۔ ہو سکتا ہے اسے اٹھا کے لانا پڑے۔ اس کی دکان قریب ہی ہے“ ٹیکسی ڈرائیور نے کہا ”مگر ایک بات میں پہلے سے بتا دوں سر۔ اس وقت وہ عام ریٹ پر کپڑے نہیں دے گا۔ ارجنٹ ریٹ لگائے گا۔ یہ تو دھندا ہے سر۔ ارجنٹ سروس لانڈری کی ہو یا فوٹوگرافر کی‘ ڈبل چارج کرتے ہیں سب۔“

میں نے کہا ”میں تم سے اتفاق کرتا ہوں۔“

”اس کے علاوہ وہ ضمانت بھی رکھے گا۔ نقد رقم۔“

”کتنی رقم؟“

”مجھے نہیں معلوم سر“ ٹیکسی ڈرائیور نے کہا ”نہ میں نے کبھی شادی کے لئے کرائے پر جوڑا لیا نہ آخری رسوم کے لئے۔“

”شادی بھی آخری رسوم ہوتی ہیں۔ انسان کی آزادی کی“ غالب نے فلسفیانہ نکتہ بیان کیا۔

”اور جن کو ہم آخری رسوم کہتے ہیں‘ وہ دنیا کے جنجال سے نجات کی افتتاحی تقریبات ہوتی ہیں“ محسن نے کہا۔

ڈرائیور اس فلسفے کو سمجھا یا نہیں سمجھا مگر وہ دوستانہ طریقے پر ہنسا ”آپ لوگ کرسچین ہیں۔ بڑا آسان ہے آپکے لئے شادی کرنا بھی اور مرنا بھی۔ کرائے کے کپڑے پہنے‘ گرجا میں پادری نے شادی کی اور چلتا کر دیا۔ دس پندرہ یا چالیس پچاس مہمان آ گئے اور گھنٹا بھر میں تقریب ختم۔ نہ دعوت‘ نہ جہیز‘ نہ جوڑے اور زیور۔ بعد میں مرضی ہوئی تو یار دوستوں کی دعوت کر دی ورنہ دولہا دلہن نکل گئے ہنی مون پر۔ ہمیں تو رسمیں مار دیتی ہیں۔ شادی کا کھانا۔ ولیمہ۔ بری۔ جہیز۔ منہ دکھائی۔ اور تو اور اس کے بعد بھی دس رسموں کا خرچہ۔ پیچھے رہ جانے والے کچھ نہ کریں تو بدنام......“

اس معاشرتی برائیوں کے خلاف اس کی حقیقت پسند مشاہدات و تاثرات پر مبنی تقریر اس وقت تک جاری رہی جب تک کہ ٹیکسی ایک محلے میں جا کے نہیں رکی۔ وہ محلہ بھی عجیب تھا اور ایک نظر میں بہت غلط تاثر دیتا تھا۔ لڑکے لڑکیاں دیوار سے لگے کھڑے تھے۔ یوں کہ لڑکے نے لڑکی کو ڈھانپ رکھا تھا۔ کھمبوں کے سہارے کھڑے تھے۔ فٹ پاتھوں پر سب کے بیچ میں بیٹھے تھے اور بڑے دھڑلے سے عشق کر رہے تھے۔ بعض شدت جذبات میں

حد سے بھی بڑھ جاتے تھے تو کسی دوسرے کو تکلیف نہیں ہوتی تھی۔ یہ کرسچین علاقہ تھا جہاں کے رہنے والے ذہنی طور پر اپنے آپ کو یورپی ہم مذہبوں کے برابر روشن خیال ثابت کرنے پر تلے ہوئے تھے حالانکہ ان کے سفید فام ہم مذہب ان کے خلاف صرف نفرت اور تعصب رکھتے تھے کیونکہ وہ کالے تھے اور غیر مہذب قوم کے فرد تھے۔

ٹیکسی ڈرائیور ایک مکروہ شکل کے بڈھے کو گھر سے نکال لایا۔ بڈھا حبشی نظر آتا تھا‘ اس کے کالے سر کی چندیا کے گرد سفید بالوں کی جھالر تھی اور وہ غالباً سوتے سے اٹھ کر آیا تھا۔ اس لئے آنکھیں لال تھیں یا وہ شراب کے نشے میں تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے اسے ہماری ضروریات سے آگاہ کر دیا تھا۔

”سب ملیں گا۔ ڈبل ریٹ پر۔ سو روپیہ ایک ڈریس کا ہوئیں گا صبح نو بجے تک۔ شام کو لائیں گا تو دو سو۔ اپن تم کو نہیں جانتا۔ ہزار ہزار ایک ڈریس کا ضمانت رکھے گا۔ ضمانت سمجھتا ہے؟ سیکورٹی ڈپازٹ۔ تم بھاگ جائیں گا تو اپن کیا کریں گا۔“

”ہم بھاگ جائیں تو تم نئے ڈریس بنوا لینا۔ تین کی جگہ دس کے پیسے ہوں گے تمہارے پاس“ غالب نے کہا۔

میں نے فوراً تین ہزار نکال لئے کہ کہیں غالب کی آشفتہ بیانی سے بڈھا بھی نہ بگڑ جائے ”یہ تین ہزار ضمانت۔“

”اور بھاڑا۔ تین سو“ اس نے نوٹ جیب میں ڈال کے ہاتھ پھیلا دیا ”تین سو اور نکالو۔ اور آگے ہو جاؤ۔ ہمارا واسطے جگہ بناؤ‘ ہم تمہارا ساتھ چلے گا۔“

”کہاں؟ قبرستان“ غالب نے کہا ”اتنا پیسہ لے کر۔ کہیں مُردے یا بدروحیں نہ لوٹ لیں تم کو۔“

”ہم دکان پر جائے گا بابا۔ کیسا مافک بات بولتا تم“ وہ غالب کے ساتھ فٹ ہو کے بولا۔

رات کے دس بجے یہ مرحلہ سر ہوا تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ جیسے بھی ہوا کام ہو گیا اور ہمارا کیا گیا۔ مال حرام بود بجائے حرام رفت۔ تاہم مجھے شدت سے احساس ہوا کہ پیسہ کس طرح آدمی کے احساس مروت اور ان تمام نیک جذبات پر حاوی آجاتا ہے جن میں رحم دلی‘ ہمدردی‘ شرافت‘ وضع داری‘ احسان اور انسانیت کے تمام اوصاف شامل ہیں‘ وہ دوسرے انسان کی مجبوری‘ بے بسی اور ضرورت کو اپنے مفادات کے فروغ کے لئے استعمال کرتے ہوئے ان تمام صفات کو یکسر فراموش کر دیتا ہے اور جذبات کے احساسات سے عاری ہو کے صرف اس پیسے کو یاد رکھتا ہے جو وہ کسی بھی صورت حال کو اپنے حق میں استعمال کرتے ہوئے حاصل کر سکتا ہے۔ وہ مرتے ہوئے آدمی کی ماں یا بیوی یا بیٹی سے اس دوا کے دُگنے‘ چار گُنا دام بھی طلب کر سکتا ہے اور دس گنا بھی‘ جس سے اس کی زندگی بچائی جا سکتی ہے۔ اہم صرف دو عناصر رہ جاتے ہیں۔ خریدار کی قوت خرید اور ان کے درمیان طلب کی شدت۔ جو زیادہ ضرورت مند ہو یا زیادہ دولت مند ہو وہ زندگی خرید لے۔ ورنہ مُردے کو بے کفن گاڑ دے۔ قبر کی زمین مہنگی لگے تو سمندر میں پھینک دے۔ اس کی بلا سے جو گورو کفن کا دھندا کرتا ہے۔ دھندا تو دھندا ہے بابا۔

ٹیکسی والا اپنے دیٹر یار سے کمیشن کما چکا تھا چناں چہ اب اس کی مستعدی ٹپ کی خاطر نہیں تھی۔ میں نے اسے ٹپ دیا بھی نہیں اور جہاں اسے چھوڑا وہاں سے دوسری ٹیکسی پکڑ لی۔ تیسری ٹیکسی چھوڑ کے ہم پیدل اس گھر تک پہنچے جس میں اکیلی گل خوف سے قریب مرگ تھی۔

میری آواز پر اس نے پڑوس کے گھر میں سے جھانکا ”اُف بھائی سکندر۔ آج تو آپ نے دیر ہی کر دی۔“

میں نے کہا ”بی بی! ہم آئندہ کبھی کریں گے۔ تم بس دیکھتی جاؤ۔ آگے آگے ہوتا ہے کیا۔“

”پورا شعر یوں ہے کہ... ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا“ غالب نے کہا۔

گل مسکرانے لگی ”بڈھا تو سو گیا گولی کھا کے۔“

”تم نے کچھ کھایا؟“

”ہاں۔ جو کھانا اس کے لئے آیا تھا محلے کے کسی گھر سے وہی کھا لیا تھا۔“

”وہ کافی ہوا تمہیں؟“ میں نے کہا۔

”اس سے زیادہ اہم یہ سوال ہے کہ وہ کھانا لانے والا کون تھا؟ کافر یا مسلمان۔“ محسن بولا۔

میں نے کہا ”میں فتویٰ تو نہیں دے سکتا لیکن جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے‘ ہندو کے گھر کا کھانا بھی کھایا جا سکتا ہے۔ بہ شرطیکہ وہ پاک ہو اور اس میں حرام چیز شامل نہ ہو۔“

”دال چاول تھے۔ ان میں کیا حرام حلال۔“

”دال ایک غیر اسلامی خوراک ہے۔ خیر اللہ تمہیں معاف کرے۔ اس نے ضرورت میں حرام حلال کا پابند نہیں کیا اپنے بندے کو۔“

میں نے کہا ”گل! دوسرے کوارٹر میں ہم کیسے جائیں گے۔ دیوار پھاند کے؟ چابی تو اب ہے نہیں ہمارے پاس۔“

”ظاہر ہے‘ دروازے سے تو شریف آدمی آتے ہیں۔“ غالب نے کہا۔

میں نے کہا ”تو پھر تم آگے چلو۔ سب سے کم شریف تم ہو۔ ہم خود کچھ نہیں کریں گے۔ تمہاری تقلید کریں گے۔“

باری باری ہم درمیانی دیوار سے ساتھ والے گھر میں اتر گئے۔ آخری شخص میں تھا جس نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنسا کے گل کو قدم رنجہ فرمانے کے لئے کہا۔ اس نے جوتے اتار کے دیوار پر سے دوسری طرف پھینک دیئے۔

میں نے غالب کے ہنسنے کی آواز سنی ”بھئی واہ۔ کیا نشانہ پایا

ہے خاتون نے۔ اندھیرے میں تیر چلایا تھا۔"

"یہ تیر نہیں، جوتی ہے اندھے" محسن بھنا کے بولا "جو ہر روز کھاتا ہے تو اس سے۔"

"قسم خدا کی۔ وہ تو ہے میرے پاؤں کی جوتی۔ نیت بھی کرے ایسی تو اس کا سر توڑ دوں۔ دست درازی اور چیز ہے، محبت میں ہوتی رہتی ہے مگر عورت سر پر جوتی کھینچ مارے۔ ایسی ذلت۔ توبہ توبہ۔ خودکشی کرلوں اسی دن....."

اب میں بھی دوسری طرف اتر گیا تھا۔ محسن کی خفت غالب کی بکواس سے غصے میں بدل گئی تھی۔ گل کی جوتی اچانک ہوا میں اڑتی ہوئی آئی تھی اور اس کے سر پر تو نہیں لگی تھی مگر سر سے چھو کر نیچے گر گئی تھی۔ گل اب محسن کے سامنے ہاتھ جوڑ رہی تھی۔

"مجھے معاف کردو۔ مجھے کیا معلوم تھا۔"

"تمہارا کیا قصور ہے گل۔ اگر مقدر میں جوتے کھانے لکھے ہوں تو آسمان سے جوتے برستے ہیں" غالب نے کہا جس کا ہنسی سے برا حال تھا۔

محسن نے کہا "گل، اس کو بکنے دو۔ میں نے تمہیں کچھ کہا ہے؟"

"نہیں۔ غلطی تھی یہ میری۔ مجھے پہلے دیکھنا چاہئے تھا۔ تمہیں بتا دیتی میں" گل رونے کے قریب ہوگئی۔

"چلو اگلی بار دیکھ کے اور نشانہ لے کر مارنا اس کے سر پر" محسن نے اس کے کندھے پر محبت سے ہاتھ رکھ کر کہا "اب ایسی رونی شکل مت بناؤ۔"

"یہ سب اداکاری ہے شیروانی صاحب۔ پہلے تو....."

میں نے غالب کو ڈانٹا "یار مرزا، وہ سچ مچ رو پڑے گی تو تم مناؤ گے اسے۔ چلو اندر۔ ختم کرو یہ بیہودگی۔"

خالی تابوت وہاں اسی طرح رکھا ہوا تھا جیسے ہم نے چھوڑا تھا۔ یکلخت سب کو چپ لگ گئی۔ سب تابوت کو خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگے۔ مذاق میں یا اداکاری کے لئے بھی موت کا سوانگ رچانے میں خوف اور دہشت کا ایک آسیب پوشیدہ رہتا ہے جو اس وقت اچانک سب کے سامنے آگیا تھا۔ ماحول کی اعصاب شکن کشیدگی کو ختم کرنے کے لئے ایک بار پھر میں نے تابوت کا معائنہ کیا۔

"سب ٹھیک ہے۔ میں چیک کرتا ہوں۔"

محسن سے پہلے میں تابوت میں لیٹ گیا اور محسن سے کہا کہ وہ ڈھکن بند کردے۔ میرے چہرے کے عین اوپر شیشہ تھا جس میں سے مجھے ان سب کے ہونق چہرے نظر آرہے تھے۔ وہ سب ایسے کھڑے تھے جیسے سچ مچ کسی میت کو دیکھ رہے ہوں۔ پھر شاید محسن کو اس احمقانہ صورت حال کا احساس ہوا۔

اس نے مجھ پر جھک کے کچھ کہا جس پر غالب قہقہہ مار کے ہنسا اور گل بھی مسکرانے لگی۔

"چل بھئی اصل مردے۔ تیری جگہ پر غاصبانہ قبضہ ہوگیا تھا"

غالب نے کہا "جگہ خالی ہوگئی۔"

"حکومت کی کرسی پر غاصبانہ قبضہ ہوتے تو سنا تھا۔ مُردوں نے بھی یہ کام شروع کردیا" محسن بولا۔

باہر نکل کے میں نے کہا "وہ بیچارا میک اپ مین تو مارا گیا۔"

"بیچارا مت کہو اسے" گل نے خفگی سے کہا۔

"اب مُردے کا میک اپ بھی کون کرے گا۔ ایسے ہی کام چلانا پڑے گا" میں نے کہا "تم تیار ہو گل؟"

"جی....." گل نے کچھ تذبذب کے ساتھ کہا۔

"دیکھو یہ سب ایسا ڈراما ہے جس میں کسی کی اداکاری ذرا بھی خراب ہوئی تو سب کا کام خراب ہوجائے گا۔"

"کام تمام ہوجائے گا" غالب نے لقمہ دیا۔

"تم کو ایک وفادار بیوہ کا پورا کردار کیسے کرنا چاہئے، یہ ہم تم پر چھوڑتے ہیں۔ بہت بڑا امتحان ہے یہ مگر اس پر ہمارے مشن کی کامیابی یا ناکامی کا انحصار ہے" میں نے کہا۔

"آپ بالکل پریشان نہ ہوں بھائی سکندر" گل نے نئے عزم کے ساتھ کہا اور لباس بدلنے کے لئے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

محسن نے تیسرے کمرے کی عدم موجودگی میں غسل خانے کا رخ کیا۔ جب گل تیار ہو کے آئی تو بلاشبہ ایک لمحے کے لئے میری نظریں بھی خیرہ ہوگئیں۔ کالے لباس میں اس کا میدہ شہاب رنگ ایک دم نمایاں ہوگیا تھا اور اس کی گردن واقعی مرمریں نظر آرہی تھی۔ اس کے چہرے کی دلفریبی میں سیاہی کے اس غم انگیز تاثر نے رعنائی کا بالکل انوکھا انداز پیدا کردیا تھا جو میں نے بھی اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"ایسے.....کیا دیکھ رہے ہیں آپ دونوں؟" وہ شرما کے لال ہوگئی کیوں کہ وہ جانتی تھی، ہم کیا دیکھ رہے ہیں۔

"یہ کالا لباس تم کو نظرِ بد سے بچائے گا" غالب نے کہا "ورنہ ایسی حسین بیوہ تو صوفیہ لارین بھی نہیں بنی تھی۔"

"فلم 'ٹو ویمن' میں نے بھی دیکھی تھی" میں نے غالب سے اتفاق کیا "گل نے اسے پیچھے چھوڑ دیا۔"

"چلیں اب اتنا بھی مت بنائیں مجھے" گل نے کہا۔ مگر یہ وہ بات ہے جو ہر حسین عورت اپنے حسن کی تعریف سن کے "شکریہ" کے طور پر کہتی ہے کہ آپ نے ٹھیک کہا۔

محسن کالا سوٹ پہن کے اور کالی ٹائی لگا کے آیا تو وہ بھی دم بخود رہ گیا "گل! تم تو قیامت ڈھا رہی ہو۔ کیا بنے گا اس بیچارے گارڈ کا۔"

"مجھے تو اندیشہ لاحق ہوگیا ہے کہ کہیں اس کا اُلٹا اثر نہ ہوجائے۔"

"میں اس کی آنکھیں نہ نکال دوں، اگر وہ گل کو بری نظر سے دیکھنے کی جرأت بھی کرے" محسن نے کہا۔

گل، سب سے زیادہ محسن کی زبان سے تعریف کے الفاظ سن کے خوش ہوئی تھی جو ایک قدرتی بات تھی۔ محسن کا اس کے حسن کو خراج تحسین پیش کرنا گل کے لئے مختلف جذباتی معنی رکھتا تھا۔ اس کی دوسری بات نے گل کو اتنا بے قرار کیا کہ ہم نہ ہوتے تو شاید وہ محسن کے سینے سے لگ جاتی۔

اب اس نے محسن کا بازو تھام کے اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا "یہ کیسی باتیں کرنے لگے تم؟"

میں نے غالب کی طرف اور غالب نے میری طرف دیکھا کیوں کہ ہم گل کی طرف نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ محسن نے آہستہ سے اپنا بازو چھڑالیا "ایک مردے کے اتنا قریب مت آؤ کنواری بیوہ۔"

کنواری بیوہ کچھ عرصہ پہلے ریلیز ہونے والی شمیم آرا کی فلم تھی۔ گل جھینپ کر پیچھے ہٹی اور مسکرانے لگی۔

"اچھا دوستو....."

"کوئی الوداعی ڈائیلاگ بولا یا دردناک شعر پڑا تو جھانپڑ ماردوں گا آپ کے" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "چل لیٹ ورنہ میں لٹاتا ہوں اڑنگی مار کے۔"

○.......☆.......○

ہم نے محسن کو چند ہدایات دیں۔ پھر وہ تابوت میں لیٹ گیا۔ تابوت کے ڈھکنے میں چاروں کونوں پر باریک کیلوں کو پہلے ہی ٹھوک دیا گیا تھا۔ ڈھکنے کو دبا کے ہم نے ان کیلوں کے نوکیلے سرے نچلے حصے میں دبا دئے۔ تابوت بند ہوگیا۔

"اس میں.......نیچے سوراخ ہیں نا ہوا کے لئے؟" گل نے اپنی اضطرابی کیفیت چھپانے کے لئے کہا۔

"کیا تم نے دیکھے نہیں تھے؟" میں نے اسے ڈانٹ کے کہا۔

تابوت کے شیشے میں سے محسن کا مسکراتا ہوا چہرہ نظر آرہا تھا۔ میں نے اس سین کو مختصر کرنے کے لئے غالب سے کہا "چلو مرزا جی! تابوت اٹھاؤ۔"

"یار! ہم دو آدمی اتنا وزن اٹھا کے جائیں گے؟"

"کیا کریں۔ مجبوری ہے۔"

غالب نے کہا "اور کوئی طریقہ نہیں اس مردے کو ڈھونے کا؟"

"اس وقت کیا ہوسکتا ہے دوسرا طریقہ؟" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

"یار، وہ جگہ کافی دور ہے۔"

"جگہ تو واقعی دور ہے" میں نے کہا "پہلے خیال نہیں آیا۔"

"کیوں نہ کہیں سے کوئی گاڑی لے آئیں۔ ابھی زیادہ رات تو نہیں ہوئی۔"

"ہاں۔ آدھی رات باقی ہے" میں نے کہا۔

"شاید کوئی گدھا گاڑی یا ریڑھی مل جائے۔"

گل نے اچانک کہا "ایک ریڑھی ہے تو سہی۔ مگر....."

"مگر کیا؟"

"وہ دے یا نہ دے۔ چرا سکتے ہو تو چرا لاؤ۔ ساتھ والے کوارٹر کے پیچھے دیوار کے ساتھ کھڑی ہوگی۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟" غالب نے کہا۔

"ایک مونگ پھلی بیچنے والا ہے۔ روز دوائیں لاتا ہے بڈھے کے لئے۔ اس نے بتایا۔ وہ خود بھی وہیں سو رہا ہوگا۔"

میں نے اور غالب نے ایک دوسرے سے نظروں ہی نظروں میں مشورہ کیا اور محسن کو باہر نکل آنے کا اشارہ کیا۔ میں اور غالب ریڑھی لینے چلے گئے۔

"کیا کرنا ہے۔ ریڑھی مانگنی ہے، خریدنی ہے یا چرانی ہے؟"

"گھی اگر سیدھی انگلیوں سے نکل آئے تو اچھا ہے۔ وہ ڈر جائے گا کہ یہ کالے سوٹوں والے ریڑھی کیوں مانگ رہے ہیں۔ کسی کی لاش لے جانا چاہتے ہیں۔ کیا کسی کو قتل کرکے آئے ہیں۔ کسی مشکل میں پڑ جانے کا احساس غالب آگیا تو وہ ریڑھی بیچے گا بھی نہیں۔"

میں نے کہا "بس پھر ریڑھی اٹھا لاتے ہیں۔"

"اور اگر وہ خود اٹھ گیا؟"

"تو اسے پھر لٹا دیں گے۔ مجبوری ہے یہ بھی۔ ایک ریڑھی کتنے میں ملتی ہے؟"

"میرا باپ ڈاکٹر تھا۔ میں نے بھی سب کام کئے ہیں لیکن ریڑھی لگانے کی سعادت حاصل نہیں کی۔"

"چل یار، ہزار روپے رکھ دیں گے اس کی جیب میں۔ دو ہزار رکھ دیں گے۔ کون سے ہماری جیب سے جارہے ہیں۔ پندرہ ہزار میں سے آٹھ ہزار سات سو بچے ہیں۔"

ریڑھی وہیں موجود تھی جہاں گل نے بتایا تھا مگر اس کو چرانا ناممکن تھا۔ ریڑھی والے نے اس کے فریم سے زنجیریوں گزاری تھی کہ ہر پہیہ لپیٹ میں آگیا تھا۔ زنجیر کو اس نے ایک ٹیلی فون کے کھمبے کے ساتھ قفل سے جوڑ دیا تھا۔ بمبئی میں ریڑھی بھی بہت قیمتی چیز ہے۔ ایک چلتی پھرتی دکان کا مالک خوش نصیبوں میں شمار ہوتا ہے۔ لے جانے والے اس کے پہیئے بھی نہ چھوڑتے کیوں کہ یہ سائیکل کے پہیئے تھے۔ ٹائر ٹیوب کے ساتھ۔

میں نے اور غالب نے ریڑھی کو ہاتھ لگایا ہی تھا کہ زنجیر نے صدا دی اور ریڑھی کا مالک ایک دم اٹھ بیٹھا۔ مجھے ایک دم اندازہ ہوگیا کہ اس نے شور مچانے کے لئے منہ کھولا ہے۔ پلک جھپکتے ہی میرے ہاتھوں نے اس کو دبوچ لیا اور اس کی چیخ تو کیا آواز تک نہ نکل سکی۔

"دیکھو ہم یہ ریڑھی لے جارہے ہیں۔ اس لئے کہ ہمیں ضرورت ہے۔ ہم اپنی ضرورت نہیں بتائیں گے۔ بس یہ سمجھ لو کہ ہم تمہیں اس کی قیمت دے کر جائیں گے۔ جاتے وقت تم کو ناک آؤٹ کرجائیں گے۔ ناک آؤٹ سمجھتے ہو؟ بے ہوش کرجائیں

گے، ماریں گے نہیں۔ ہم بلاوجہ کچھ نہیں مارتے۔ کسی کا حق بھی نہیں۔ اب یہ بتادو کہ ریڑھی کی کیا قیمت لوگے؟ ایک ہزار۔"

اس نے نفی میں سرہلایا۔

"دو ہزار کافی ہوں گے؟" میں نے کہا "ہمیں نہیں معلوم کہ ریڑھی کتنے میں بنتی ہے یا بنی بنائی کتنے میں ملتی ہے۔"

اس نے میرے بیان کو اپنے حق میں استعمال کرتے ہوئے پھر نفی میں سرہلایا۔

"اوکے۔ تین ہزار۔ اب تم نے نفی میں سرہلایا تو میں خود تمہارے سر کو ایک سو اسّی درجے گھما کے پیچھے کی طرف کردوں گا۔ خواہ اس کوشش میں تمہارا منکا ٹوٹ جائے۔ تم بھی بلیک میل کررہے ہو ہمیں خبیث" میں نے کہا اور اس کی کنپٹی پر ایک ہاتھ مار کے اسے بے حس و حرکت کردیا۔

تین ہزار روپے اس کی جیب میں رکھتے ہوئے میں نے جیب میں سے وہ چابی نکال لی جو ریڑھی کو آزاد کرسکتی تھی۔ اسے سونے کے انداز میں لٹا کے میں اور غالب ریڑھی لے گئے۔ آدھی رات کے وقت ہماری اس کارروائی کو کسی نے بھی نہیں دیکھا۔

معلوم نہیں ہماری عدم موجودگی میں محسن اور گل کے درمیان کیا بات ہوئی تھی۔ گل کی صورت دیکھ کے صاف اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے اپنے آنسو پونچھ لئے ہیں۔ آنسوؤں کی نمی اس کی آنکھوں میں رہ گئی تھی۔ محسن کچھ جھینپا ہوا سا لگا تھا۔ میں نے عمداً کچھ پوچھنا مناسب نہیں سمجھا اور غالب بھی انجان بن گیا۔

جب ہم تابوت کو ریڑھی پر رکھ کے روانہ ہوئے تو گل نے ریڑھی کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کیا۔ ریڑھی کو میں پیچھے سے دھکیل رہا تھا اور غالب آگے سے کھینچ رہا تھا۔ آہستہ آہستہ اور پورے احترام کے ساتھ۔ کچھ دور جانے کے بعد ہمیں بہت سے لوگوں نے دیکھا۔ ان میں قلی بھی تھے اور عام افراد بھی مگر کسی نے ہم سے کچھ نہیں پوچھا۔ وہ سب احتراماً راستہ دیتے گئے۔ صرف دو افراد نے سینے پر صلیب بنائی جو یقیناً کرسچین تھے۔

گل باقاعدہ رو رہی تھی اور یہ اداکاری نہیں تھی۔ کچھ اس کے جذبات پہلے ہی سے طلبگار رفغاں تھے۔ وہ رونا چاہتی تھی اور ضرورت نے اسے جواز فراہم کردیا تھا۔

میں نے مذاق میں کہا "آنسو خوب بہالیتی ہو تم۔ یہ کام میں نہیں کرسکتا۔"

غالب نے کہا "گلیسرین کے بغیر شاید نیّر سلطانہ بھی نہیں کرسکتی۔ حالاں کہ المیہ اداکاری اس پر ختم ہے۔"

گل نے پھس پھس کرتے ہوئے رومال سے آنکھیں صاف کیں اور بولی "رومال میں گلیسرین ہے۔"

"گلیسرین کہاں سے آئی؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"بڈھے کے گھر میں تھی۔ سردی میں ہاتھ پاؤں پھٹ جائیں تو لگاتے ہیں" گل نے کہا "اس کا بھی کوئی ہوگا لگانے والا۔"

"چلو تمہارا کام تو بن گیا" میں نے کہا۔

"گل اس کے بغیر بھی رو سکتی تھی۔ نازو کے سوا ہر لڑکی رو سکتی ہے۔"

"نازو بھی رو سکتی ہے" میں نے کہا "شرط لگالو۔"

شرط لگانے سے پہلے ہم پلیٹ فارم کے آخری حصے کے بعد شروع ہونے والے فولادی جنگلے تک پہنچ گئے تھے۔ یہاں آمد و رفت درمیان کے اس راستے سے جاری تھی جو دو سلاخیں نکال کے عوام نے خود اپنی سہولت کے لئے بنالیا تھا۔ ایسا ہر جگہ ہوتا ہے۔ لوگ لمبا چکر کاٹ کے سیدھے راستے سے جانے کے بجائے کہیں بھی ایک شارٹ کٹ پیدا کرلیتے ہیں۔ دیوار ہو تو اینٹوں کو نکال کے اور جنگلا ہو تو سلاخیں نکال کے۔ انتظامیہ جتنی بار چاہے اس راستے کو بند کرے، راستہ بند نہیں ہوتا۔

لیکن یہ راستہ صرف اتنا تھا کہ اس میں سے ایک وقت میں ایک ہی آدمی گزر سکتا تھا۔ ریڑھی اس راستے سے نہیں گزاری جاسکتی تھی اور اس مقصد کے لئے ہم صحیح راستہ اختیار کرتے تو چیکنگ کرنے والوں کے سوالات کا سامنا کرنا پڑتا کہ لاش کس کی ہے۔ ڈیتھ سرٹیفکیٹ۔ این او سی۔ کلیئرنس۔ ریلوے کا اجازت نامہ۔ بکنگ کی رسید اور نہ جانے کیا کچھ پیش کرنا ضروری ہوتا۔

میں نے اور غالب نے تابوت کو یہاں سے مال گاڑی تک خود اٹھا کے لے جانے کا فیصلہ کیا۔ گارڈ کا ڈبا مال گاڑی کے آخری حصے میں لگایا جاچکا تھا اور درمیانی فاصلہ مشکل سے سو گز تھا۔

اندر کے رش میں صورت حال مختلف ہوگئی۔ ہم سے متعدد افراد نے "مرحوم" کے بارے میں پوچھا۔ چند ایک خدا ترس قسم کے لوگوں نے اتنے ہی خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ تابوت اٹھوانے میں ہماری مدد کی جیسے راہ چلتے لوگ جنازے کو کندھا دینا کارِ ثواب سمجھتے ہیں۔

گارڈ اپنے ڈبے میں نہیں تھا۔ ایک کیبن میں اس کا بیڈ بنا ہوا تھا جس پر وہ آرام کرسکتا تھا۔ اس سے ملحق کچن اور باتھ روم تھے جو ڈبے کی چوڑائی کو دو حصوں میں تقسیم کرکے بنادئے گئے تھے۔ بیڈ کے سامنے کا حصہ خالی تھا۔ ہم نے تابوت وہاں رکھا اور "بیوہ" کو روتا چھوڑ کے باہر کے برآمدہ نما کھلے حصے میں آگئے۔

اسی وقت گارڈ نمودار ہوا۔ کالے سوٹوں میں ملبوس دو افراد کو اپنی سفری قیام گاہ میں بلا اجازت موجود پا کے وہ حیران بھی ہوا اور مشتعل بھی۔ وہ چھ فٹ قد کا بھاری جسم والا مدراسی تھا "کون ہو تم لوگ؟" اس نے اوپر آکے کہا۔

میں نے بڑی سوگوار آواز میں شائستگی سے کہا "میرا نام رابرٹ ہے۔ مرحوم کا بھائی ہوں میں" اور ہاتھ آگے بڑھادیا۔

اس نے مجبوراً مصافحہ کیا "کون مرحوم؟"

"میرا نام البرٹ ہے۔ میں مرحوم کی بیوہ کا بھائی ہوں۔" غالب نے بھی لہجے میں رقت پیدا کرنے کی کوشش کی اور ہاتھ آگے

بڑھایا۔ لیکن اتنی دیر میں گارڈ نے مرحوم کو بھی دیکھ لیا تھا اور اس کی بیوہ کو بھی۔

"واٹ از دس۔ کس کی اجازت سے یہ تابوت یہاں رکھا گیا ہے؟" اس نے پہلے درشت لہجہ اختیار کیا تھا مگر پھر اسے فوراً اپنی بدخلقی کے احساس نے روک لیا "سوری۔ یہ ممکن نہیں ہے۔ آئی ایم سوری۔"

"سر، آپ کے لئے کچھ بھی ناممکن نہیں ہے" میں نے لجاجت سے کہا۔

"آپ کو خدا نے دردمند دل دیا ہے اور یہ انسانیت کے رشتے سے ایک اخلاقی فریضہ ہے جس کی ادائیگی میں آپ جیسا نیک آدمی کوتاہی برتنے کا سوچ بھی نہیں سکتا" غالب نے کہا۔

خوشامد اور تعریف سے پتھر بھی موم ہوجاتے ہیں۔ وہ کیسے متاثر نہ ہوتا۔ اس کے اور ہمارے درمیان گفتگو انگریزی میں ہورہی تھی۔ چناں چہ سب تہذیب کے دائرے میں تھے۔

"جنٹلمین پلیز! میری مجبوری کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں آپ کی مدد کرسکتا تو ضرور کرتا۔ یہ بداخلاقی کی بات نہیں ہے۔ ریلوے کے قوانین مجھے اس کی اجازت نہیں دیتے۔ اگر آپ لوگ کچھ دیر پہلے آجاتے تو میں تابوت کو مال گاڑی سے لے جانے کے لئے آپکو خصوصی اجازت نامہ بھی دلوادیتا۔"

"سر! ہم مجبور نہ ہوتے تو ایسا غلط کام نہ کرتے جس سے آپ کی پوزیشن پر حرف آئے" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "یہ کوئی معاشی مجبوری نہیں ہے۔"

میں نے کہا "ہم ٹرک میں رکھ کے بھی تابوت کو لے جاسکتے تھے۔"

"پھر کیا بات ہے؟"

"بات صرف اتنی سی ہے کہ اس وقت کوئی ٹرک وہاں جانے کے لئے تیار نہیں۔ وہ صبح کی بات کرتے ہیں اور ہم صبح تک انتظار نہیں کرسکتے۔" میں نے کہا۔

"ٹرک والوں میں انسانیت اور ہمدردی کا جذبہ نہیں ہے۔ ہم نے تو پچاس کلومیٹر کے پانچ ہزار تک پیش کئے تھے" غالب نے افسوس ناک انداز میں سرہلایا۔

"پانچ ہزار!" گارڈ حیرت سے سکتے میں آگیا۔

میں نے سمجھ لیا کہ جو پانسہ ہم نے پھینکا تھا وہی ہمارے حق میں پلٹ گیا ہے۔ "ہاں۔ وہ جگہ مشکل سے چالیس پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔"

"پھر کون احمق تھا جس نے انکار کیا؟"

"ہم احمق نہیں کہہ سکتے انہیں۔ ان کے پیٹ بھرے ہوئے ہیں اور دل شرافت سے خالی ہیں" میں نے کہا "جس کو پیسے کی ضرورت ہوگی وہ کیوں انکار کرے گا۔"

"پیسے کی ضرورت کس کو نہیں ہے۔ آخر ٹرک کیوں چلاتے ہیں یہ لوگ؟"

میں نے کہا "کچھ وہمی بھی ہیں۔ صاف تو کسی نے نہیں کہا مگر رویے نے یہ بتادیا کہ وہ مردے ڈھونا نہیں چاہتے۔ یہ نحوست کا کام ہے اور ان کے ٹرک میت گاڑی نہیں ہیں۔"

"وہ لوگ بھولے ہوئے ہیں کہ ایک دن سب کو مرنا ہے۔" غالب نے کہا۔

"خیر ہم زبردستی تو کسی کو نہیں لے جاسکتے تھے۔ ایک شخص نے ذاتی نیکی کی کہ آپ کی طرف بھیج دیا۔"

"میری طرف۔ کون تھا وہ؟"

"میرا مطلب تھا اس مال گاڑی کی طرف۔ باقی سب ڈبے تو بند تھے اور سیل ہوچکے تھے۔ ہم نے تابوت یہاں رکھ دیا۔ آپ سے اجازت بھی نہیں لی۔"

اس سے پہلے کہ وہ اپنے محدود اختیارات کی بات کرتا، میں نے کہا "یہ ٹھیک ہے کہ ریلوے کے قواعد و ضوابط اس کی اجازت نہیں دیتے۔ مگر رات کے وقت آپ کو بھلا کون چیک کرنے آئے گا؟ آپ کے ذاتی کمپارٹمنٹ میں۔ اور آجائے تو کیا وہ ایک نیکی کرنے کے جرم میں رپورٹ کرے گا آپ کی؟ آپ اسے قائل بھی کرسکتے ہیں۔ اور خاموش بھی۔"

غالب نے پانچ ہزار روپے نکالے "مجھے معلوم ہے کہ آپ معاوضہ نہیں لیں گے۔ مگر ہوسکتا ہے کہ راستے میں آپ کو کسی کا منہ بند کرنا پڑے۔ کمینے لوگوں کا منہ صرف پیسہ بند کرتا ہے۔"

میں نے کہا "پلیز! یہ آپ رکھ لیں۔"

پانچ ہزار کے نوٹ دیکھتے ہی گارڈ کی آنکھوں میں مدھم سی چمک پیدا ہوئی تھی مگر وہ ایک دم اپنی بات پلٹ کے یہ ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا کہ پیسہ دیکھ کر وہ ریلوے کے قواعد و ضوابط کو بھول گیا ہے۔

اس نے کہا "میں ایک غریب آدمی ہوں۔ میری نوکری داؤ پر لگ جائے گی لیکن دوسری طرف میں انکار کرکے خود اپنی نظر میں گر جاؤں گا۔ میرا ضمیر مجھے ملامت کرے گا کہ میں نے سفرِ آخرت پر ایک انسان کی راہ میں روڑا اٹکایا۔ میں یہ رسک لوں گا۔ مجھے یہ بتادیں کہ تابوت کو کہاں اتارنا ہوگا؟"

"بیوہ خاتون آپ کو بتادیں گی۔"

اس نے نوٹوں کی گڈی ہاتھوں میں پکڑ کے یہ ظاہر کیا کہ وہ کتنا شرمسار اور مجبور ہے "میں اتنا ذلیل نہیں ہوں کہ اس نیک کام کا معاوضہ لوں۔ لیکن یہاں سے روانہ ہونے میں بھی چار گھنٹے باقی ہیں ابھی۔ راستے کا مسئلہ تو بعد میں پیدا ہوگا، یہاں بہت سے لوگ آئیں گے چیک کرنے۔ لالچی افسر اور ان کے چمچے۔ جو مفت میں سفر کرتے ہیں ہر گاڑی میں گارڈ کے ساتھ۔ آپ کا اندازہ بالکل ٹھیک ہے۔ ان کا منہ ایسے ہی بند کیا جاسکتا ہے۔"

میں نے کہا "میں کس طرح آپ کا شکریہ ادا کروں؟"

"کوئی بات نہیں مسٹر البرٹ۔"

"میں رابرٹ ہوں" میں نے کہا۔

"آپ کا یہ احسان....."

"پلیز ڈونٹ مینشن اٹ مسٹر رابرٹ۔"

"البرٹ میرا نام ہے" غالب نے کہا۔

"سوری۔ میں تھوڑا سا کنفیوز ہوا۔ اب آپ لوگ مطمئن رہیں" اس نے نوٹ جیب میں ڈال لئے "کسی کو آنے ہی نہیں دوں گا میں۔"

غلطی سے اس نے دل کی بات کہہ دی تھی اور اعتراف کرلیا تھا کہ وہ رقم اپنے پاس رکھے گا۔ جب کوئی آئے گا ہی نہیں تو اعتراض کون کرے گا۔

غالب نے کہا "اچھا سسٹر اس فرشتہ صفت شخص کی مدد سے ہمارا مسئلہ حل ہوگیا۔ خداوند یسوع مسیح اس کی شفاعت کے ضامن ہوں" اس نے سینے پر صلیب بنائی۔

گل نے ایک چیخ ماری اور غالب کے سینے سے لگ کے رونے لگی "کاش میں بھی مرجاتی ڈیوڈ کے ساتھ۔"

"اوہ نو! تم کو بچوں کے لئے زندہ رہنا ہے۔ ڈیوڈ کی نشانیوں کو سنبھالنا ہے" میں نے کہا۔

گل میرے سینے سے لگ کے بھی روئی اور گارڈ اس دردناک' جذباتی منظر کو ایک پُراحترام' غمناک خاموشی سے دیکھتا رہا۔ گارڈ کے ڈبے کے پاس چند افراد رک گئے تھے مگر انہیں گارڈ نے اشارے سے چلتا کردیا۔

"کیا تماشا ہورہا ہے یہاں۔ چلو' چلتے پھرتے نظر آؤ۔"

میں اور غالب آنسو پونچھ کے گارڈ سے مصافحہ کرکے اور ایک بار پھر ممنونیت کے ساتھ اس کا شکریہ ادا کرنے کے بعد نیچے اترے اور سر جھکا کے روانہ ہوگئے۔ ہمارے لئے رونا مشکل کام تھا مگر یہ مشکل گل کے گلیسرین میں بھیگے ہوئے رومال نے آسان کی۔ گارڈ نے ہماری آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کو حقیقی غم والم کا غماز سمجھا تو غلط نہیں سمجھا۔ ہمارا پورا ڈراما بہت کامیابی سے پیش کیا گیا تھا۔ واپسی پر ہم پھر اس جنگلے کے درمیان سے گزرے تو ریڑھی وہیں موجود تھی۔

غالب نے کہا "کیا اسے واپس لے جائیں؟"

"کیوں' اب کیا ضرورت ہے پھر اُدھر جانے کی؟"

"اچھا ہے' اسے ریڑھی بھی واپس مل جائے۔ رقم بھی مل جائے۔"

"رقم پر مجھے یاد آیا کہ مجھے ایک اور بندۂ خبیث الزماں سے خلق کا قرض وصول کرنا ہے" میں نے کہا۔

"کیا قرض تم اکیلے وصول کرلوگے؟"

"ہاں۔ اس میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ تم جاؤ نازو کی طرف۔ امید ہے' تمہارے پہنچتے ہی وہ ڈاکٹرز اور ٹریزر کا بنڈل بنادے گی۔ تم تیار ہوجانا۔ میں اگر وہاں نہ پہنچا تو براہِ راست ٹرین پر آجاؤں گا۔"

"انہی کپڑوں میں؟ جو گارڈ دیکھ چکا ہے۔"

"میں پچھلی طرف سے آؤں گا" میں نے کہا۔

"یہ ریڑھی تو واپس لے جاؤ۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ تم کو ریڑھی کی اتنی فکر کیوں ہے؟ جب اسے قیمت دے چکے۔ وہ بھی منہ مانگی۔ تو ریڑھی ہماری ہوگئی۔ ہم اسے یہاں چھوڑ دیں یا بمبئی کے چیف منسٹر کو تحفے میں بھیج دیں' ہماری مرضی۔ ویسے صبح مل ہی جائے گی اسے" میں نے کہا اور بائیں جانب مڑ گیا۔

غالب کو دائیں طرف جانا تھا۔ بڑا مرحلہ کسی دشواری کے بغیر سر ہوگیا تھا۔ مال گاڑی کے گارڈ پر قابو پانا اب محسن اور گل کا کام تھا اور یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ گارڈ ہی مال گاڑی کو چلانے کی اجازت دیتا ہے اور روکتا ہے۔ اس کا تعاون حاصل ہوجانے کے بعد مال گاڑی راستے کے ہر چھوٹے موٹے اسٹیشن سے گزر جائے گی اور کسی کو شک بھی نہیں ہوگا کہ پوری ٹرین ہائی جیک ہوگئی ہے۔ گارڈ کے تعاون کے بغیر یہ کام اس لئے مشکل ہوتا کہ ہم گارڈ کے فرائض کی نوعیت سے ناواقف تھے اور ہمیں یہ معلوم نہیں تھا کہ کس اسٹیشن سے گزرنے کا مقررہ طریقۂ کار کیا ہے۔

اگلے چار گھنٹے خطرے سے یکسر خالی نہیں تھے۔ تریویدی اور کرنل قدرے بے پروا واقع ہوئے تھے اور انہوں نے اپنے حفاظتی انتظامات کو کافی سمجھ کے باقی معاملات ان پر چھوڑ دئے تھے جن کو وہ قابلِ اعتماد سمجھتے تھے یا خرید چکے تھے۔ مگر دلاور ایک ناقابلِ اعتبار دشمن تھا۔ ایک ایسا عیار آدمی جس کے بارے میں حتمی پیش گوئی کرنا اتنا ہی ناممکن تھا جتنا نوشتۂ تقدیر کو پڑھنے کے بعد زندگی کے معمولات کو مُرتب کرنا۔ وہ کچھ بھی کرسکتا تھا۔ ٹرین کی روانگی کے وقت وہ اچانک آسکتا تھا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ سب ٹھیک ہے۔ دراصل ہمیں جتنا دلاور سمجھتا تھا اتنا تریویدی یا کرنل نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے ساتھ ہمارے دورِ عداوت کا تجربہ اتنا طویل نہیں تھا جتنا دلاور کے ساتھ۔ اس کے علاوہ دلاور کے مقابلے میں وہ احمق بھی تھے۔ احمق اگر نہ کہا جائے تو نسبتاً کم عیار و مکار ضرور تھے۔

میں ریلوے لائنوں کے درمیان چل رہا تھا۔ کئی بار سامنے سے مجھ پر ریلوے انجن کی پیشانی پر ایک آنکھ کی طرح نصب چُندھیا دینے والی روشنی پڑی۔ میں پٹڑی بدلتا گیا اور آخر کار بابا صاحب کے ٹھکانے پر جا پہنچا۔ اس نے اوس سے بچنے کے لئے اپنے اوپر چادر کا خیمہ سا بنا لیا تھا۔ بابا صاحب اپنے لوٹ کے خزانے پر سانپ بن کے سوئے پڑے تھے۔ میں نے قریب بیٹھ کے اسے جگایا۔

"اے بابا صاحب' ہم آگیا۔"

وہ ہڑبڑا کے اٹھا۔ کالی رات میں ایک کالے سوٹ والے کو دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہوگئے۔ "کک..... کو..... کون آگیا؟"

"ہم بولا نا کہ ہم آگیا۔ الیگز نڈر۔"

"کون..... کون الیگزنڈر؟ کہاں سے آیا ہے؟"

"جدھر تم بھیجا تھا ہم کو۔ گاڈ کا پاس سے" میں نے اوپر انگلی اٹھا کے کہا "ابھی گاڈ تیرے کو بلانے کا واسطے میرے کو بھیجا" میں نے ریوالور نکال لیا۔

"کیا..... کیا بکتا ہے!" وہ ہکلانے لگا۔

"ہم کو گاڈ بولا' ادھر ایک دم گھپلا ہے۔ ایک داڑھی والا فراڈ کرتا پڑا ہے۔ پبلک اس کو سینٹ سمجھتا مگر وہ ڈیول کا سن ہے۔ اس کو لانا مانگتا۔"

"ہے بھگوان۔ یہ آدھی رات کو کیا بلا چمٹ گئی" وہ تھرتھر کانپنے لگا "جا بھائی جا۔ فقیروں کو مت چھیڑ۔ ہم نے کیا بگاڑا ہے تیرا۔"

"تم ہمارا وائف بگاڑا۔ ہمارا لائف بگاڑا۔ ہمارا وائف ایک دم ایڈیٹ۔ ہم اس سے بڑا ایڈیٹ۔ تیرا بات میں آگیا اور اکھا مال تیرے کو دے دیا۔"

"پیسہ وصول کرنے آئے ہو تو یار جان لینے کی بات کیوں کرتے ہو؟ میں سمجھ گیا۔ تم نے اور تمہاری بیوی نے کچھ نذرانہ دیا ہوگا۔ کتنا مال تھا؟ زبان سے بات کرو۔ میں سب واپس کردیتا ہوں۔"

"لائف کیسے واپس کرے گا اپنا وائف کا۔ اس نے خودکشی کیا۔ آتم ہتھیا۔ سوئی سائیڈ۔ اور ابھی ہم تیرا سوئی سائیڈ کرنے کو مانگتا۔"

اس نے چلانے کے لئے منہ پھاڑا ہی تھا کہ میں نے ریوالور کی نالی اس کے حلق تک اتار دی۔ وہ ایسے ساکت ہوگیا کہ اپنا سانس تک روک لیا۔

"مُنڈی ہلائیں گا یا زبان ہلائیں گا تو یہ سوئی سائیڈ ہوئیں گا۔ خودکشی۔ اپنا انگلی ٹریگر پر ہے مگر اپن اس کو دبا کے مرڈر نہیں کریں گا۔ سامنے سے گولی جائیں گا تو پیچھے سے نکلیں گا۔ تیرا باڈی پنکچر ہوجائیں گا تو تیرا آتما کا پھونک بھی نکل جائیں گا۔ تو ایک دم فلیٹ ہوجائیں گا ٹائر کا مافک۔ ابھی میں تیرے سے پوچھے گا کہ کیا مانگتا ہے؟ جان کہ مال۔ سالا زندہ رہے گا تو مال بوہت۔ سارا دنیا کا ایڈیٹ لوگ آئے گا تو مال بھی آئے گا۔ لیکن ہوا نکل گیا تو تیرا ارتھی میں جتنا لوگ آئے گا سالا کچھ دے کر نہیں جائے گا۔"

اسے بولنے کا موقع دینے کے لئے میں نے ریوالور کو واپس کھینچ لیا "ابھی اپن بہرا نہیں ہے اور آپس کا بات ہے اس لئے اونچا بولنے کا نہیں ہے۔ ایسا مافک بات کریں گا جیسے تیرا باپ ہے سامنے۔ کیا سمجھا..... ورنہ....."

اس کی زبان ہرے رام کرشنا کا وِرد کررہی تھی اور اس کا پورا جسم لرز رہا تھا۔ موت کو اتنا قریب پا کے اس کے دل میں مال و زر کی وقعت ختم ہوگئی تھی اور اگر کسی چیز کی اہمیت تھی تو صرف زندگی کی۔

اس نے کہا "دیکھ۔ میرے کو مت مار۔ یہ سب لے جا۔ جتنا تیرا دل چاہے لے جا۔"

"ابھی رو کڑا بول کتنا ہے۔ تیرے کو پیسہ پیسہ معلوم ہوگا۔ تو روز گن کر دیکھتا ہوگا۔ ایک دم ٹھیک بول۔"

"سات..... سات لاکھ اٹھاون ہزار نو سو پچپن روپے..... نقد" اس نے تھرتھراتی زبان میں بالکل صحیح ٹوٹل بتایا "گن کر دوں گا۔"

"زیور کا بول۔"

"زیور کیا کرے گا تو..... نقد لے جا' کام آئے گا" وہ خوشامد پر اتر آیا "زیور بیچے گا تو پکڑا جائے گا۔ ہے بھی تھوڑا۔"

میں نے سرد' سفاک لہجے میں کہا "بکس کھول حرامی کا بچہ۔ نئیں تو ابھی پھونک نکالتا ہے تیرا۔"

اس نے بڑی پھرتی سے ایک اینٹ ہٹائی اور نیچے سے چابی نکال کے زمین میں تین چوتھائی دفن فولادی سیف جیسے صندوق کا تالا کھول دیا۔

"یہ لے..... سب نقد....." اس نے سو سو کے علاوہ چھوٹے نوٹوں کی گڈیاں برآمد کرتے ہوئے کہا۔ آدھی تجوری خالی ہوگئی اور میرے سامنے نوٹوں کا ڈھیر لگ گیا۔ اتنے بڑے ڈھیر کو لے جانے کا مسئلہ غور طلب تھا۔

"کوئی تھیلا دے میرے کو" میں نے کہا۔

"تھیلا کہاں سے لاؤں۔ یہ چادر لے جا۔ اس میں باندھ لے۔ ہے بھگوان۔ کیا کلجگ ہے۔ ڈاکو لوٹنے لگے ہیں فقیروں کو۔"

میں نے اس کے منہ پر ریوالور مارا "اپن کو ڈاکو بولتا ہے سالا۔ تو خود کیا ہے۔ چل یہ سو والا نوٹ ڈال اس چادر پر۔ چھوٹا والا چھوڑ۔ دس والا بھی ڈال۔"

آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے اور خون اس کے ہونٹ کے کٹے ہوئے کنارے سے ٹپک رہا تھا لیکن وہ میرے حکم کی تعمیل کرنے پر مجبور تھا۔ اس کی ٹارچ سے میں نے تجوری میں روشنی ڈالی تو اس کی گہرائی دیکھ کے حیران رہ گیا۔ اس کے نچلے حصے میں شاید ایک فٹ تک سونے کے کنگن' جھمکے' بالیاں اور ہار بھرے پڑے تھے۔ یہ شاید بیس سیر سے زائد سونا تھا۔ سب مجبور' ضرورت مند اور مایوس عورتوں کا اثاثہ۔ جو کوشش کرکے ہار گئی تھیں۔ دعاؤں کے اثر پر یقین سے محروم ہوگئی تھیں۔ کسی دیوی دیوتا کی کرپا مانگتے مانگتے تھک گئی تھیں اور نہ جانے کیسے اس بابا صاحب کے پاس لٹنے کے لئے آگئی تھیں۔ بدقسمتی نہیں' عقل سے محرومی اور عقیدے کی کمزوری ہوتی ہے جو انسان کی شامتِ اعمال بن جاتی ہے۔ پورے ہندوستان پاکستان میں ایسے سیکڑوں ہزاروں فراڈ بابا صاحب' لوگوں کی آرزوؤں کے سودے کررہے تھے۔ ارمانوں کو پورا کرنے کی ضمانتوں کے بدلے ان سے عزت آبرو کے نذرانے

تک وصول کر رہے تھے۔

کاش میرے پاس وقت ہوتا اور میرے لئے یہ ممکن ہوتا کہ یہ سب زیور ان بے وقوف اور مجبور عورتوں کو واپس کر سکوں۔ میں نے دکھی دل سے سوچا۔ ان میں سے کچھ مایوسی کی انتہا کو پہنچ کے مر بھی چکی ہوں گی۔ سردست یہ تمام زیور میرے کسی کام کا نہیں تھا۔ میں اس بوجھ کو کہاں اٹھا کے پھر سکتا تھا۔ پھر بھی میں نے خزانے میں سے اتنا زیور اٹھالیا جو نازو، گل، رابعہ یا شہلا پہن سکتی تھیں۔ آرائش حسن کے لئے نہیں، ایسی ضرورت میں کیش کرانے کے لئے جب مالی وسائل کی کمی سے دیگر مسائل پیدا ہو رہے ہوں۔ عورت کا زیور اس کے جسم پر ہو تو ہر وقت ساتھ رہنے والے بینک سے کم نہیں ہوتا۔

باباصاحب نے اس وقت مجھے غافل سمجھنے کی غلطی کی۔ وہ ایکدم اٹھ کے مجھ پر حملہ آور ہوا۔ شاید وہ مجھ سے ریوالور چھین لینا چاہتا تھا۔ میں نے پلٹ کے اس پر ریوالور کے دستے کا بھرپور وار کیا۔ اس نے ایک دردناک آواز نکالی اور منہ کے بل گرا تو اس کا سر سیدھا کھلی تجوری میں چلا گیا۔ وہ عجیب منظر تھا۔ گردن سے نیچے تک وہ تجوری کے منہ میں پھنسا ہوا تھا اور اس کے دونوں بازو بھی سینے تک اندر چلے گئے تھے۔ باقی دھڑ باہر رہ گیا تھا۔ وہ ٹانگیں چلا رہا تھا مگر خود کو کھینچ کے باہر نکالنے سے قاصر تھا۔

اس کی گھٹی گھٹی آواز میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ وہ مجھے واسطے دے رہا تھا اور میری منت سماجت کر رہا تھا کہ میں اسے کھینچ کر نکالوں لیکن اچانک میرا دل پتھر ہو گیا تھا۔ میں نے اسے ایک عبرت ناک موت مرنے کے لئے چھوڑ دیا۔ سونے چاندی کے زیورات میں چہرہ چھپ جانے سے یقیناً اس کا دم گھٹ رہا ہوگا۔ وہ ایک فولادی شکنجے میں ایسا پھنسا تھا کہ اس کے لئے سانس لینا بھی دشوار ہو گیا تھا۔

ابھی میں چادر کی پوٹلی اٹھاکے روانہ بھی نہیں ہوا تھا کہ اس کی ٹانگیں ساکت ہو گئیں اور عجیب بے ڈھنگے انداز میں پیچھے کی طرف مڑ کے لٹکنے لگیں۔ اس کی کمر بھی پیچھے کی طرف کمان کی طرح مڑ گئی۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا یا مر چکا تھا۔ اگر وہ زندہ تھا تب بھی اس حالت میں زیادہ دیر نہیں جی سکتا تھا۔

باباصاحب کا ڈیرہ ایک تاریک مقام تھا اور آدھی رات کے وقت وہاں سے کوئی بھی گزرنے والا نہیں تھا۔ چادر کے سائبان کے نیچے وہ نظر بھی نہیں آتا تھا اور صبح ہونے سے پہلے اس کی عبرت ناک موت کا کسی کو علم نہیں ہو سکتا تھا۔ جاتے وقت مجھے وقت کی تنگی کا شدت سے احساس رہا۔ صرف دو گھنٹے اور ہوتے تو میں غالب اور محسن کے ساتھ واپس آتا اور ہم سارا زیور سمیٹ کے لے جاتے۔ اصل حقداروں تک تو یہ مال کسی صورت نہیں پہنچ سکتا تھا مگر یہ ہو سکتا تھا کہ ہم فاقہ کش، غربت کے مارے ہوئے الم نصیبوں کی کسی بستی میں جاکے اس خزانے کو یوں تقسیم کردیں کہ سیکڑوں گھرانوں میں خدا کی طرف سے چھپر پھاڑ کے ملنے والی دولت ان کی تقدیر بدل دے۔ ان کے مقدر کی نسل بعد نسل ملنے والی تیرہ بختی کو ختم کردے۔ شاید کم سے کم سو گھروں میں ہم وہ زیور ایسے ڈال سکتے تھے کہ کسی کو خبر نہ ہو مگر صبح وہ اٹھ کر دیکھیں تو انہیں یقین نہ آئے کہ آخر کار خدا نے اور بھگوان نے ان کی سن لی ہے۔ اب وہ جدوجہد کر سکتے ہیں کوئی کام دھندا کر سکتے ہیں۔ سر کے اوپر چھت ڈال سکتے ہیں۔ موت کو دھتکار سکتے ہیں جو علاج سے محرومی کو بہانہ بنا کے آگے بڑھتی آرہی تھی۔ کاش ایسا ہو سکتا! میں نے ایک گہری سانس لے کر سوچا۔

رات کے ایک بجے میں اس جگہ پہنچا جہاں جیون پرشاد ایم ایل اے کے ریس میں دوڑنے والے خاص گھوڑوں کو لے جانے والا ٹریلر کھڑا ہوا تھا۔ ٹریلر کے آس پاس خاصی گہما گہمی تھی۔ ایک بہت لمبی فولادی بازو والی دیوہیکل کرین سے اس فولادی کنٹینر کو اٹھایا جارہا تھا جس میں گھوڑے بند تھے۔ کنٹینر کے چاروں طرف فولادی رسے ڈال دئے گئے تھے اور کرین آپریٹر بہت بلندی پر اپنے کیبن سے سر نکال کے ہدایات دینے میں مصروف تھا۔

بہت سے لوگ صرف تماشا دیکھ رہے تھے۔ ان میں مجھے نہ غالب نظر آیا اور نہ کہیں نازو کی شکل دکھائی دی۔ وہ کنٹینر کے اندر تھے تو اپنے کیبن میں بند ہو چکے تھے اور جب تک کنٹینر کو اٹھا کر ریل کی کھلی بوگی میں نہ رکھ دیا جاتا میری ان سے ملاقات ممکن نہیں تھی۔ اس سے مجھے تھوڑی سی مایوسی ہوئی۔ میں بھی تماشائیوں کے ساتھ کھڑا رہ کے تماشا دیکھنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ سب قلی اور مزدور ٹائپ لوگ تھے۔ جن میں رات کے وقت آوارہ گرد اور فقیر ٹائپ لوگ بھی شامل ہو گئے تھے۔ شریف اور معزز لوگ اس وقت اپنے اپنے گھروں میں سو رہے تھے یا ہوٹلوں، کلبوں اور ساحلی نشاط گاہوں پر رات کا لطف اٹھا رہے تھے۔ میں کالے سوٹ اور ٹائی سے شریف اور معزز لگتا تھا چناں چہ وہاں مس فٹ تھا۔

میں نے مناسب سمجھا کہ وہاں سے کھسک جاؤں۔ صبح ہوتے ہی اس حلئے کی تشہیر ہر جگہ ہو جائے گی۔ ایک ریڑھی والا دو افراد کا ذکر کرے گا جو کالے سوٹوں میں تھے مگر اس سے ریڑھی چھین کرلے گئے تھے (مگر تین ہزار روپے وصول کرنے کی بات گول کر جائے گا) پھر جب باباصاحب اپنی تجوری میں سر کے بل کھڑے، دولت کے ڈھیر میں مدفون ملیں گے تب بھی کوئی نہ کوئی ضرور کہے گا کہ اس نے آدھی رات کے بعد ایک کالے سوٹ والے بابو کو ادھر ہی جاتا دیکھا تھا۔ ایسے گواہ تو بہت ہوں گے جو بتا سکیں گے کہ دو کالے سوٹوں والے ایک تابوت کو ریڑھی پر رکھ کے کہیں لے جارہے تھے اور ان کے ساتھ کالے کپڑوں میں ملبوس ایک بہت خوبصورت عورت روتی جارہی تھی۔ مزید تفتیش کی گئی تو تابوت کا مال گاڑی تک پہنچنا بھی ثابت ہو جائے گا۔

میں اس مجمع کو گواہ بنانے کی غلطی کر چکا تھا اور وہاں سے کھسکنے ہی والا تھا کہ کسی نے مجھے کہنی ماری۔

میں نے سر گھما کے دیکھا تو وہ پچیس تیس سال کی اور دلفریب خدوخال رکھنے والی سانولے رنگ کی کوئی کریکیٹر عورت تھی جس نے اسکرٹ پہن رکھا تھا۔ اسکرٹ کے بلاؤز کا گلا اتنا کھلا ہوا تھا کہ میری نظر کا بہک جانا قدرتی بات تھی۔ اس کا جسم گداز تھا اور نگاہوں میں خمار تھا۔ وہ سگریٹ پی رہی تھی اور مسکرا رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ اس مسکراہٹ کا مطلب کیا ہے۔

"تم یہاں کیوں وقت ضائع کر رہے ہو؟" وہ انگریزی میں بولی۔

"اور مجھے کہاں وقت ضائع کرنا چاہئے؟" میں نے کہا۔

وہ زیادہ شوخی سے مسکرائی "وقت تب ضائع ہوتا ہے جب آدمی کے پاس کرنے کو کچھ نہ ہو۔ وہ اکیلا ہو اور اس کا گھر ہو تو وہ گھر نہ جانا چاہتا ہو۔"

"تم نے بالکل صحیح تجزیہ کیا....."

"تو پھر آؤ میرے ساتھ۔ تمہارا وقت ضائع نہیں ہوگا۔" اس نے بے تکلفی سے میری بانہوں میں بانہیں ڈال کے مجھے کھینچا۔

میں نے مزاحمت نہیں کی "غالباً پیسہ ضائع ہوگا۔"

وہ کھلکھلا کے ہنسی "میں یقین دلاتی ہوں کہ تمہیں پیسہ ضائع ہونے کا احساس بھی نہیں ہوگا۔ کیا ہم کسی بار میں چلیں؟"

میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا "میں غم کو شراب میں ڈبونے کا قائل نہیں۔"

"میں تمہارا غم غلط کر سکتی ہوں۔ کیا غم ہے تمہیں؟"

"مجھے یہ غم ہے" میں نے سوچ کے کہا "کہ میں غریب کیوں ہوں اور میری جیب میں پھوٹی کوڑی تک کیوں نہیں ہے۔ جب کہ اس شہر میں میرے جیسے دو ہاتھوں اور دو ٹانگوں والے لاکھوں روپے جوئے میں ہار رہے ہیں۔ کیوں کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اتنی دولت کہاں اور کیسے صرف کریں۔"

وہ ایک دم رک کے مجھے گھورنے لگی "کیا تم مذاق کر رہے ہو؟"

"اگر میں مذاق کر سکتا تو اتنا غمزدہ کیوں نظر آتا!"

"تمہارے پاس واقعی صرف یہ خالی پاکٹ والا سوٹ ہے اور کچھ نہیں ہے؟"

میں نے کہا "تم کو یقین نہیں آتا تو تم میری تلاشی لے کر دیکھ لو۔"

"یو ڈیم فول! تم نے میرا وقت ضائع کیا" وہ بگڑ کے بولی۔

"ضائع کرنے کے لئے تمہارے پاس اب وقت کے سوا بچا ہی کیا ہے۔ یہ جسم بھی وقت کا ایک حصہ ہے جو ساتھ ساتھ ضائع ہوا۔ بہت جلد تم کسی میرے جیسے خالی جیب والے سے بھی سہارا مانگو گی تو وہ ہاتھ کھینچ لے گا۔"

"شٹ اپ۔ اپنا سرمن مت سناؤ مجھے۔ میں تو سمجھی تھی تم معزز نظر آتے ہو....."

"میں معزز ہوں" میں نے اصرار کیا "یہ لباس تم دیکھ سکتی ہو مگر میری عزت نفس....."

میری بات ختم ہونے سے پہلے ہی وہ میرا ہاتھ جھٹک کر جا چکی تھی۔ میں نے ایک قہقہہ مارا اور اس نے پلٹ کر مجھے ایک ایسی گالی دی جو کوئی شریف عورت نہیں دے سکتی تھی۔ مگر وہ شریف عورت ہی کب تھی۔ میں نے تو محض اس لئے اس کا ساتھ قبول کیا تھا کہ وہاں موجود سب لوگ مجھے دیکھ رہے تھے اور وہ سب بعد میں کہہ سکتے تھے کہ میں ایک بدقماش عورت کے ساتھ کہیں رات بسر کرنے چلا گیا تھا۔

اس عورت سے جان چھڑا کے میں چند قدم ہی واپس گیا تھا کہ میں نے پیچھے سے اس کی آواز سنی۔

"اب کیا ہے؟" میں نے رک کے کہا۔

"کیا واقعی تم اتنے قلاش ہو۔ کہ ایک جام تک نہیں پی سکتے؟" اس نے قریب آکے افسردگی سے کہا۔

"میری جیب میں ایک لاکھ نقد ہوتے تب بھی میں جام کا نہ سوچتا" میں نے کہا۔

"کیوں ہتم مسلمان تو نہیں ہو۔"

میں نے کہا "بیشتر غیر مسلم بھی شراب کو ہاتھ نہیں لگاتے۔"

"تم نے میری آخری امید بھی ختم کردی" وہ اداسی سے بولی۔ "اب میں کیسے گھر جاؤں؟"

میں نے کہا "اگر وہ تمہارا گھر ہے۔ تو تمہیں وہاں جانے سے کون روک رہا ہے؟"

"یہ خیال کہ...... آج مجھے ماں کے لئے انجکشن لے کر جانا تھا۔ بہت مہنگا انجکشن ہے۔ معلوم نہیں ڈاکٹر بھی سوچے سمجھے بغیر ایسی دوائیں کیوں لکھتے ہیں جو کوئی خرید نہیں سکتا۔ اور معلوم نہیں ماں، یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی کیوں جئے جارہی ہے۔ اگر اسے میرا ذرا بھی خیال ہوتا تو کب کی مر گئی ہوتی۔ اب دیکھونا، خود میرے لئے کتنا مشکل کام ہے زندہ رہنا۔ پھر اپنے ساتھ میں اسے بھی زندہ رکھوں۔ صرف اس لئے کہ اس نے مجھے پیدا کیا تھا۔ یہ احسان تھا تو مجھے اس کی سزا کیوں....."

وہ نشے میں تھی لیکن سچ بول رہی تھی۔ میرے دل میں دکھ کا ایک کانٹا چبھ گیا۔

"کیا بیماری ہے تمہاری ماں کو؟"

"ہڈیوں کی ٹی بی ہے اسے" وہ بولی "اور اس کے پھیپھڑوں میں بھی پانی اتر آتا ہے۔ معدے میں السر ہے۔ اتنی بیماریوں کے ساتھ، اتنے دکھ اٹھا کے جینے میں کیا ہے۔ کہ وہ زندگی سے چمٹی ہوئی ہے۔ سکھ تو ساری زندگی میں کبھی دیکھا نہیں مگر یہ دکھ جھیلنے سے کیا مرجانا اس کے لئے باعث سکون نہیں ہوگا؟"

میرے پاس تقریباً سات لاکھ روپے تھے اور میرے ساتھ

ایک ایسی عورت چل رہی تھی جس کو معاشی مجبوریوں نے یا استحصال کرنے والی خواہشوں نے ویشیا بنادیا تھا۔ میرے جیسے شریف آدمی کا اس کے ساتھ چلنا بھی کچھ لوگوں کے نزدیک گناہ ہوگا۔ مجھ پر لازم تھا کہ میں اسے دھتکار دوں۔ اس سے کوئی ہمدردی نہ رکھوں کیوں کہ وہ گناہگار تھی اور میں.... کیا میں فرشتہ تھا؟ میں نے زندگی میں کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔ نیتوں کا بھید تو صرف خدا جانتا ہے کہ کس نے کب کوئی ایسا کام کیا جو گناہ تھا مگر گناہ شمار نہ ہوا۔ اور کس نے کیا نیکی کی جو اس کے نامۂ اعمال میں بدی لکھی گئی۔

ایک لمحے کے لئے مجھے خیال آیا کہ میں وہ سب اسے دے دوں جو میرے پاس تھا مگر پھر میں نے اس انتہائی جذباتی اقدام سے اجتناب کیا۔ میں نے سوچا کہ شاید کچھ دیر پہلے جو کچھ میں سوچ رہا تھا' خدا نے اس کے لئے مجھے ایک موقع فراہم کردیا ہے۔ پھر میرے احساس میں احتیاط اور اعتدال' عقل و ہوش اور حقیقت شناسی کا خیال شامل ہوگیا۔ کیا معلوم یہ عورت کس حد تک سچ کہہ رہی ہے۔ ایک مرد کو ترغیب کے جال میں پھنسانے کی کوشش میں ناکامی کے بعد وہ ایک انسان کی شرافت کے جذبات سے کھیلنے کی کوشش تو نہیں کررہی ہے۔ کہ اگر وہ برائی پر خرچ نہیں کرتا' عورت اور شراب دونوں سے دور رہتا ہے تو کارِ ثواب سمجھ کے جیب خالی کردے۔ جسم کی طلب کو نظرانداز کرسکتا ہے تو ضمیر کے اطمینان کے لئے ہی مال نکالے۔ وہ اپنی باتوں سے پڑھی لکھی اور چالاک عورت نظر آتی تھی اور اس کا انکار کے باوجود دوبارہ میرے پیچھے آنا بے مقصد نہیں ہوسکتا تھا۔

"یہ وقت تم کسی اور گاہک کو پھانسنے میں استعمال کرو تو شاید تمہیں خالی ہاتھ گھر نہ لوٹنا پڑے۔"

اس نے نفی میں سرہلایا "بہت دیر ہوگئی ہے۔ اب کوئی نہیں ملے گا۔ بزنس کا وقت ختم ہوچکا ہے۔"

"مجھ سے باتیں کرکے کیا ملے گا؟"

"کچھ نہیں۔ بس ایسے ہی دل اداس تھا۔ تم اچھے آدمی ہو یا سمجھ لو' مجھے اچھے لگے۔ سوچا کچھ باتیں ہی کرلوں۔ بہت دیر تک خاموش بھی نہیں رہ سکتی میں۔ آج تو جس سے بات کی وہ پھاڑ کھانے کو دوڑا۔ ویسے تم اگر یہ محسوس کرتے ہو کہ میرے ساتھ چلنا تمہارے لئے بدنامی کا سبب بن سکتا ہے یا تم کو جلدی ہے تو جاؤ۔"

میں نے کہا "میں اب گھر واپس جارہا تھا۔"

اس نے مجھے غور سے دیکھا اور ہنس پڑی "تم کو جھوٹ بولنا نہیں آتا۔"

میں نے کہا "یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو! میں نے بہت جھوٹ بولے ہیں زندگی میں۔"

"گھر ہوتا تمہارا تو تم سڑک پر لاوارث نہ پھرتے۔ اور پھرتے تو پھر میری طرح پھرتے۔ کسی شکار کی تلاش میں۔ نشے میں مدہوش' آوارہ گردوں کی طرح۔ مگر تم ہوش مند آدمی ہو اور حلیئے سے ہی نہیں صورت سے بھی معزز لگتے ہو۔ میں انسانوں کو خریدتی ہوں ہر روز۔ اپنا جسم بیچ کر۔ مجھے انسانوں کی کافی شناخت ہوگئی ہے۔" وہ مسکرائی۔

کچھ دیر پہلے میں سوچ رہا تھا کہ اگر بابا صاحب کی دولت تقسیم کی جاسکتی تو کم سے کم سو گھر خوشحال ہوجاتے۔ سات لاکھ اگر میں ستر ضرورت مندوں میں تقسیم کرتا تو ہر ایک کو دس ہزار ملتے۔ بمبئی میں محنت کرنے والے کو دس ہزار مل جائیں تو اس کے لئے کامیابی کے دس دروازے کھل جاتے ہیں۔ یہ سب رقم اس ایک ضرورت مند عورت کو دینے کا کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ اس کی ماں کی بیماری کے لئے سو روپے ہر روز درکار تھے۔ ماں کا گھر اور یہ رشتہ اس کی ضرورت تھے۔ اگر اسے دولت مل گئی تو وہ مجبوریوں کی زنجیر توڑ کے اپنے خوابوں کی تعبیر خریدنے نکل جائے گی اور شاید کبھی لوٹ کر نہیں آئے گی۔

میرا ذہن یہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھا کہ میں اسے کتنا پیسہ دوں اور اس سے یہ ضمانت کیسے حاصل کروں کہ وہ اس پیسے کو بے جا نہیں لٹائے گی۔ شراب اور عیش کے اسباب پر خرچ نہیں کرے گی۔ میرے پاس وقت ہوتا تو میں ایک لاکھ کسی بینک میں ڈال دیتا اور بینک کو ہدایت کردیتا کہ ہر ماہ اسے لگی بندھی رقم دے دیا کرے۔

اچانک مجھے ایک ایسا شخص یاد آیا جو یہ ذمّے داری قبول کرنے کا اہل تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی تو رات کے دو بجنے والے تھے۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"ویشیا" وہ بولی "اور بھی نام ہیں۔"

"شٹ اپ۔ مجھے یہ بتاؤ کہ کیا تم عزت سے رہنا چاہتی ہو۔"

وہ ہنس پڑی "تم شادی کروگے مجھ سے؟ ایسے کئی الّو کے پٹھے ملے ہیں مجھے جو نشے میں اتنے جذباتی ہوجاتے تھے کہ ایسی ہی باتیں کرنے لگتے تھے۔"

"میں نشے میں نہیں ہوں۔ جلدی بولو۔ تم ویشیا کی طرح رہنا چاہتی ہو تو جاؤ۔ میرے اور تمہارے راستے الگ ہیں۔ مگر تم عورت بننا چاہتی ہو تو میرے پاس تھوڑا سا وقت ہے تمہیں ایک موقع فراہم کرنے کے لئے۔ آگے خدا کی مرضی۔ میں کبھی معلوم کرنے بھی نہیں آسکوں گا کہ بعد میں تم نے زندگی کو کیسے رکھا۔ مقدس کتاب کی طرح۔ یا پورنوگرافی کے البم کی طرح۔"

"کیا کروگے آخر؟"

میں نے کہا "اسی جگہ موجود رہنا۔ میں ابھی دس منٹ میں آتا ہوں۔"

آہنی جنگلے سے گزر کے میں سیدھا مال گاڑی تک گیا اور درمیانی بوگی کے نیچے سے گزر کے دوسری طرف چلنے لگا۔ مال گاڑی کی لمبائی کے ساتھ تاریکی میں کسی نے مجھ پر غور نہیں کیا۔ گھوڑوں کو لے جانے والا کنٹینر کھلی بوگی پر رکھا جاچکا تھا۔ پلیٹ فارم کی طرف بہت سے لوگ اس تماشے کو محض وقت گزاری کے لئے دیکھ رہے تھے۔

اچانک غالب نے مجھے پکڑلیا "کہاں رہ گئے تھے آپ اور اب اس طرح منہ اٹھائے کہاں جارہے ہیں؟"

میں نے گھبرا کے غالب کو دیکھا اور پھر اطمینان کا سانس لیا۔ "تم نے مجھے ڈرا دیا تھا یار۔ سب ٹھیک ہے نا؟"

"سب ٹھیک ہے۔ میں تمہارا انتظار کررہا تھا یہاں۔"

میں نے اسے پوٹلی پکڑانے سے پہلے اس میں سے نوٹوں کی دس گڈیاں نکال لیں "یہ لو' اسے سنبھال کے رکھو۔"

"یہ۔ کہاں سے آگیا یہ مال؟"

"میں ابھی آتا ہوں۔ آکے بتاؤں گا۔"

غالب نے مجھے پکڑلیا "جب تک بتاؤگے نہیں کہ اب کہاں جارہے ہو' میں جانے نہیں دوں گا۔ کوئی تک ہے اس وقت آپ کے اکیلے جانے کی۔ وقت اتنا کم رہ گیا ہے۔"

"ابھی تین گھنٹے ہیں۔ میں اس سے بہت پہلے لوٹ آؤں گا" میں نے کہا۔

"تمہاری یہ خوش فہمی ہم سب کو نہ مروادے۔ جانا تو ہوتا ہے اپنی مرضی سے۔ آدمی چاہے تو جہنم میں جائے۔ مگر واپس آنا اپنے اختیار کی بات نہیں رہتی۔"

"میں کسی خطرناک جگہ پر ٹانگ اڑانے نہیں جارہا ہوں۔ بھروسہ رکھو مجھ پر" میں نے کہا۔

"اچھا یہ کالا سوٹ تو بدلو۔ وہاں بھی ۔ میں نمایاں تھے۔ جب کنٹینر کو کرین سے اٹھایا جارہا تھا تو تم تماشائیوں میں کھڑے تھے" اس نے ایک بنڈل مجھے تھمادیا۔

"تم نے دیکھا تھا؟ نازو نے بھی دیکھا ہوگا۔"

"اسی سے تو اطمینان ہوگیا تھا۔ مگر اب پتا نہیں آخری وقت میں کیا سوجھ گئی ہے تمہیں۔ خیریت راس نہیں آتی ہمیں۔ کوئی پنگا ضرور لے بیٹھتا ہے....."

میں نے کہا "یار' تمہارے سرِعزیز کی قسم میں پنگا نہیں لے رہا ہوں۔ کپڑے کہاں بدلوں؟ خیر اب تم سے کیا شرم۔ تم ایسے لنگوٹیے ہو۔ تم پر یہ سوٹ بہت جچ رہا ہے۔ تم کیا ہو آخر' ڈاکٹر یا ٹرینر۔"

"میں ڈاکٹر ہوں۔ مجھے نرس کے ساتھ رہنا ہے۔ گھوڑوں سے تم نمٹ سکتے ہو' اس لئے ٹرینر کا عہدہ تمہیں مبارک ہو" وہ بولا۔

"یہ کالا سوٹ....."

"اسے لے جاؤ اپنے ساتھ۔ کہیں پھینک دینا۔"

"اوکے۔ تم جاؤ نازو کے پاس۔ اسے بھی بتادینا کہ میں ساڑھے تین چار بجے تک ضرور آجاؤں گا۔ خواہ میری راہ میں پہاڑ حائل ہوں یا سمندر" میں نے ٹرین کے نیچے گھستے ہوئے کہا۔ میرا سر فولادی چھت کے کسی کونے سے لگا۔ بوگی کے نیچے پہیّوں کے علاوہ کیا کچھ ہوتا ہے' یہ آج میں نے پہلی بار تفصیل سے دیکھا تھا۔

وہ وہیں کھڑی ہوئی تھی۔ گھورنے والوں کی نظروں سے بے نیاز۔ گھورنے والے سب قلی مزدور ٹائپ لوگ تھے۔

"تم صرف کپڑے بدلنے گئے تھے؟" وہ حیران ہوکے بولی۔

"تمہیں یقین تھا کہ میں واپس آؤں گا؟" میں نے اس کے سوال کا جواب گول کردیا "میں نہ آتا تو تم کیا کرتیں؟"

"پتا نہیں۔ میں نے نہیں سوچا تھا" وہ میرے ساتھ چلنے لگی۔ "سوچنا چاہئے تھا مجھے۔"

بمبئی میں رات کو ٹیکسی کا ملنا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا اور وہ پیسے ضرور زیادہ مانگتے ہیں مگر کہیں جانے سے انکار نہیں کرتے۔

"سینٹ اینڈریوز چرچ" میں نے کہا "مجھے واپسی میں ٹرین پکڑنی ہے۔ جتنی تیز چل سکتے ہو چلو۔"

"ڈرے گا تو نہیں۔ اپن جیٹ کا مالک جائیں گا اور گولی کا مالک آئیں گا" ڈرائیور بولا۔

"ڈرنے کی کیا بات ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا نہ کہ حادثے میں مرجائیں گے" میں نے کہا۔

وہ ہنسا اور ٹیکسی کو چند منٹ میں خالی سڑک پر لے آیا۔ اس کے بعد ٹیکسی نے رفتار پکڑی تو حوصلہ رکھنے کے باوجود کئی بار میں وحشت زدہ ہوا۔ کسی موڑ پر ٹائر چیختے تھے تو لگتا تھا کہ ٹیکسی الٹ جائے گی لیکن میں اب اس کے سامنے اپنی بزدلی کا اعتراف کرنا نہیں چاہتا تھا۔ رات کے وقت سڑکیں نسبتاً خالی تھیں چنانچہ اسے اپنی مہارت اور بے خوفی کے مظاہرے کا پورا موقع مل رہا تھا اور وہ بہت خوش تھا۔ بار بار قہقہہ مارتا تھا اور تعریف طلب نظروں سے میری طرف دیکھتا تھا۔ خصوصاً اس وقت جب وہ ٹیکسی کو الٹنے سے بچالیتا تھا۔ کئی بار میں اپنے ساتھ بیٹھی ہوئی عورت پر گرا اور وہ مجھ پر گری۔

"یہ..... یہ نشے میں ہے۔ اسے روکو" وہ سخت خوف زدہ ہو کے بولی۔

"ایسی کوئی بات نہیں" میں نے کہا "اگر پیرس یا روم کے ڈرائیوروں سے تمہارا واسطہ پڑے تو پھر تمہیں اندازہ ہوگا کہ خطرناک ڈرائیونگ کیا ہوتی ہے۔"

"تم پیرس اور روم جاچکے ہو؟"

"لندن سے آدمی کہیں بھی جاسکتا ہے۔"

"اس وقت چرچ کیا لینے جارہے ہو؟"

"روشنی۔ ہدایت۔ تائید۔" میں نے کہا۔

"کس کے لئے؟"

"جسے بھی ضرورت ہو" میں نے گول مول جواب دیا "تم اب تو نام بتادو اپنا۔"

"مونا" وہ باہر دیکھتے ہوئے بولی "کہا تمہارے بھی بہت سے نام

ہیں؟"

"یہ شک تمہیں کیوں ہوا؟"

"تمہارے پُراسرار رویے سے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ تم شاید بین الاقوامی سطح کے مجرم ہو۔ تمہارا تعلق مافیا سے ہے یا کسی ایسی ہی تنظیم سے۔ تم ضرورت مندوں اور مجبوروں کو تلاش کرتے رہتے ہو۔ خصوصاً میری جیسی عورتوں کو۔ جو عزت و غیرت کے ڈھکوسلوں پر یقین نہ رکھتی ہوں اور خریدی جا سکتی ہوں۔ بیچی جا سکتی ہوں' کیا وہ چرچ بھی تمہارا کوئی خفیہ ٹھکانہ ہے؟"

اس کی باتوں پر مجھے سخت ہنسی آرہی تھی مگر میں نے ضبط سے کام لیا "ہو سکتا ہے۔"

"مجھے معقول معاوضہ ملے تو میں ہر کام کر سکتی ہوں۔ جان کی بازی لگا سکتی ہوں۔ ہارنے کا مجھے کوئی افسوس نہیں ہوگا مگر جیت یقیناً میری زندگی کا رخ بدل دے گی۔"

"اور اگر زندگی کا رخ دوسری طرف بدلنا پڑے؟ ایک باعزت' پُرسکون زندگی کی طرف جس میں ضمیر پر نہ احساسِ گناہ کا بار ہو نہ دل میں شرمندگی کا کانٹا۔"

وہ تلخی سے ہنسی "ایسا خواب میں پہلے دیکھتی تھی۔ اب حالات سے سمجھوتا کر چکی ہوں۔"

ٹیکسی چرچ کے احاطے میں داخل ہوئی اور ایک دم رک گئی۔ میں الٹ کر سامنے گیا اور میرا سر سیٹ سے ٹکرایا۔ ڈرائیور قہقہہ مار کے ہنسا۔

"تم کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔" میں نے اترتے ہوئے کہا۔

"اپن ادھر آرام سے لیٹا ہے" وہ ٹیکسی سے اتر کے گھاس کے تختے کی طرف بڑھا "تم موج کرو۔ جب جی چاہے آؤ" اس نے مجھے آنکھ ماری اور بے شرمی سے ہنسا۔

خون کی گرمی میرے سر تک چڑھ گئی تھی مگر میں نے مونا کو بھی اپنے ساتھ کھینچ لیا "اس کی پروا مت کرو۔"

"پروا کرے گی میری جیسی عورت.....!"

"ایسی ویسی کچھ نہیں' تم صرف عورت ہو۔ کم سے کم یہاں اپنے آپ کو ذلیل مت کرو۔ آخر یہ خدا کا گھر ہے" میں نے برہمی سے کہا۔

عقبی حصے میں پادری کو گھر کے برآمدے سے اترتا دیکھ کر میں بھونچکا رہ گیا۔ وہ پہلے بھی اسی طرح کسی پُراسرار روح کی مانند نمودار ہو چکا تھا۔

"گاڈ بلیس یو۔ خدا کا یہ عاجز بندہ اس کے مہمانوں کو خوش آمدید کہتا ہے" اس نے شفقت سے مسکرا کے مجھ سے ہاتھ ملایا اور پھر مونا سے۔

"ہولی فادر! میں مدد چاہتا ہوں۔ اس عورت کے لئے۔"

"کیا تم نہیں جانتے کہ خدا ان کی مدد کرتا ہے جو خود اپنی مدد کرتے ہیں" پادری نے کہا۔

"کچھ لوگ بھٹک جاتے ہیں۔ گر جاتے ہیں۔ ان کو سہارے کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ مونا ہے۔ شرافت کے راستے پر لوٹنا چاہتی ہے۔ میرے پاس وقت ہوتا تو میں اس کے ساتھ چلتا۔ دو گھنٹے بعد چلے جانا ہے۔ کبھی واپس نہ آنے کے لئے۔ میرا ایسا دوست نہیں تھا جس پر میں اعتبار کر سکتا اور مونا کو اس کے ... جاتا۔ یہ آپ رکھ لیں" میں نے ایک لاکھ کے نوٹ اسے تھمائے جو ایک رومال میں بندھے ہوئے تھے۔

"تم غلط جگہ آگئے غالباً۔ یہ نیکی کی دکان نہیں ہے۔"

"آپ مجھ سے ایسی توقع نہ رکھیں۔ کہ میں خدا کے گھر سے کچھ لینے کے لئے نوٹوں پر انحصار کرنے کا گناہ کروں گا۔ یہ امانت ہے مگر اس میں سے مونا کو حسب ضرورت دینے کی ذمہ داری آپ قبول کر لیں تو میں بہت مطمئن واپس جاؤں گا۔ اگر سب میں مونا کے حوالے کر دیتا تو مجھے اندیشہ تھا کہ یہ احتیاط کے تقاضوں کو نظر انداز کر دے گی اور یہ پیسہ اسے گناہ کی دلدل سے نکالنے کے بجائے ڈبونے کا سبب بن جائے گا۔ اس کی ماں بیمار ... اور یہ خود بھی بیمار رہی ہے۔ اس کی روح کے آزار کا درماں اگر ہے تو یہاں۔ اسی لئے میں آپ کے پاس آگیا۔ اپنے بارے میں خود آپ کو تفصیل سے بتائے گی۔ مجھے اجازت دیں۔"

پادری نے مجھ سے ہاتھ ملایا "خدا مجھے توفیق اور استقامت دے کہ میں اس ذمے داری سے عہدہ برآ ہو سکوں۔"

مونا نے کہا "تم جا رہے ہو؟"

"میں نے بتایا تو تھا تمہیں کہ مجھے جانا ہے۔ ڈرو نہیں میں ... چرچ کی تحویل میں دے کر نہیں جا رہا ہوں۔ دنیاوی زندگی ترک کرکے نن بنانے کے لئے نہیں لایا ہوں یہاں۔"

"تم بالکل آزاد ہو میری بچی۔ آنے کے لئے بھی اور جانے کے لئے بھی۔"

"فادر کو اپنے بارے میں وہ سب کچھ بتا دو جو سچ ہے۔ جو تم نے مجھے بتایا تھا۔" میں نے کہا اور پھر پادری سے مخاطب ہوا "اگر بدقسمتی سے کبھی آپ کو یہ معلوم ہو کہ اس نے جھوٹ بولا تھا۔ ہدایت پانا اس کے اختیار میں نہیں اور یہ پیسہ بھی ضائع جا رہا ہے۔ تو پھر باقی سب رقم میری طرف سے چرچ کو عطیہ سمجھ لیں۔ میری خواہش ہے کہ خدا ایسا وقت نہ لائے۔"

"سنو!" مونا میرے پیچھے دوڑی "یہ تم کیا کر رہے ہو۔ ... کیوں؟" اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

میں نے کہا "مونا' واپس جاؤ۔"

وہ رک گئی "اتنا تو بتا جاؤ کہ پھر کب آؤ گے؟"

میں نے پلٹ کے کہا "کبھی نہیں۔ ویسے میں غیب کا حال نہیں جانتا۔ کیا پتا حسنِ اتفاق سے پھر کہیں ہمارے راستے مل جائیں۔"

جب میں ٹیکسی میں بیٹھا تو میرے دل میں متضاد جذبات کا

تلاطم تھا۔ ایک طرف سکون تھا تو اس کے ساتھ ہی خلش تھی۔ خوشی کے ساتھ اداسی تھی اور میں خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرتے ہوئے روح کے بوجھل پن کا شکار تھا۔ جب ٹیکسی گیٹ سے نکلی تو میں نے مونا کو دیکھا۔ غالباً وہ پادری کے بازو پر سر رکھے وہ سب آنسو بہا رہی تھی جو اس نے برسوں بے حسی کی چٹان کے پیچھے روک رکھے تھے۔

ڈرائیور بھی اب خاموش تھا "ابھی اپن کو ماف کرنا صاب۔ اپن غلط بات بولا تھا۔"

میں نے کہا "میں نے بھی جھوٹ بولا تھا کہ میں ڈرتا نہیں۔ میں زندہ سلامت واپس پہنچنا چاہتا ہوں۔ ٹیکسی کو جمبو جیٹ کی طرح مت چلاؤ۔"

میں پھر ریلوے اسٹیشن کے علاقے میں پہنچا تو رات کا آخری پہر تھا لیکن وہاں وقت کے صرف دو ہی روپ تھے۔ ایک اجالے کا تو دوسرا اندھیرے کا۔ گھڑی پر نظر ڈالے بغیر یہ اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ رات کے آٹھ بجے ہوں گے یا ساڑھے تین۔ وہاں کی رونق اور گہما گہمی ایک ہی سطح پر رہتی تھی۔

میں اطمینان سے چلتا ہوا پلیٹ فارم تک گیا۔ وہیں ایک دکان سے میں نے سگریٹ خریدی تو دکان والے نے رازداری سے کہا۔

"فارن کا سگریٹ سر۔ کارٹن۔ ٹرپل فائیو۔"

میں نے رئیسانہ شان سے کہا "دے دو" اور قیمت ادا کرنے کے بعد یہ بھی نہیں دیکھا کہ دکان دار نے کیا واپس کیا ہے۔ میں جنگلے کے ٹوٹے ہوئے حصے سے گزرا اور مال گاڑی سے کچھ فاصلے پر چلنے لگا۔ گارڈ جس نے پانچ ہزار بہت خوش ہو کے جیب میں رکھے تھے' اب سیل کئے جانے والے ڈبوں کو چیک کر رہا تھا۔

اچانک میں نے نازو کو دیکھا۔ وہ ایک پستہ قد گنجے سر والے شخص کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی اور بڑی ادا سے اٹھلاتی ہوئی آرہی تھی۔ میں ایک ستون کی اوٹ میں ہو گیا۔ وہ دونوں میرے سامنے سے گزرے۔ ہندوستانی لیڈروں جیسے لباس کو دیکھ کر میں نے اندازہ تو کر ہی لیا تھا کہ وہ جیون پرشاد ایم ایل اے ہوگا۔ حالاں کہ کوئی اسے سلام نہیں کر رہا تھا مگر وہ دیش کی جنتا کو خود ہاتھ جوڑ جوڑ کے پرنام کرتا جا رہا تھا۔

"بس جی۔ آپ کشٹ نہ کریں دیوی جی۔"

"کشٹ کی کون سی بات ہے اس میں" نازو نے کہا۔

"میں دیکھنے آیا تھا کہ جنتا کا کوئی کارن تو نہیں ہے" جیون پرشاد نے چند قدم کے فاصلے پر رک کے کہا "سنا تھا پاکستان سے جو ٹیررسٹ آئے ہوئے ہیں' ان کی منڈلی میں سندر کنیائیں بھی شامل ہیں۔"

نازو ہنسی "آپ دیکھنے آئے تھے کہ کہیں میں بھی ان میں سے تو نہیں ہوں۔"

"رام رام۔ ایسی باتیں مت کریں۔ میں تو منش کی صورت سے پہچان لیتا ہوں" وہ بولا "آپ تو اس دیش کی وہ ناری ہیں....."

"پھر شروع کرنے والے ہیں آپ بھاشن۔"

"اف۔ کیا کروں دیوی جی۔ راج نیتی کے دھندے میں الجھ کے میں تو ہولی ٹائم نیتا ہو گیا۔ عادت بگڑ گئی ہے میری۔ خیر اس عادت کا سدھار بھی آپ ہی کریں گی۔ کرپا کرکے واپس آنے میں دیر مت کرنا۔"

"کرپا تو آپ کی ہے جی کہ مجھ ابھاگن کو اپنے چرنوں میں جگہ دی ورنہ اپرادھی اور ہوس کے پجاری تو کتوں کی طرح میرے پیچھے لگ گئے تھے" نازو نے کہا اور میں دل ہی دل میں اس کی ذہانت سے بھرپور اداکاری کو سراہنے پر مجبور ہو گیا۔ اس نے واقعی جیون پرشاد پر الو کی لکڑی پھیر دی تھی۔

"جب ڈاکٹر آئے اور وہ حرام کا جنا..... شما کرنا دیوی' میں اپنی اصلی بھاشا بولتا ہوں تو تھوڑا سا بے لگام ہو جاتا ہوں۔ ٹریزر کی بات کر رہا تھا میں۔ انہیں بتا دینا کہ میں نے آدھا گھنٹا انتظار کیا۔"

"کوئی خاص بات کہنی ہو تو مجھے بتا دیں۔"

"نہیں۔ بس یہی سمجھانا تھا کہ ہوشیار رہیں۔ سدھ بدھ نہ کھوئیں اپنی۔ کہیں پینے پلانے میں لگ جائیں اور گھوڑوں کو بھول جائیں۔ چائے پینے کیا اپنے گھر چلے گئے؟" اس نے گھڑی دیکھی "میں اب چلتا ہوں۔ اور ضرورت ہو کسی چیز کی تو بتا دو۔"

"بہت دھنیہ واد آپ کا سر۔"

"پھر وہی سر۔ بھئی جیون کہو ہمیں جیون" جیون پرشاد نے کہا۔

"اچھا جیون" نازو نے پرنام کے لئے ہاتھ جوڑے اور ریشہ خطمی ہو جانے والا جیون پرشاد بادل ناخواستہ باہر گیا مگر جاتے ہوئے بھی مڑ مڑ کے دیکھتا رہا۔ نازو پلٹ کے جانے لگی تو میں اس کے ساتھ ہو لیا۔

"یہ منظر غالب دیکھ لیتا تو کم سے کم ایک خون ضرور ہو جاتا" میں نے کہا۔

"غالب اس سے زیادہ خون جلانے والے سین دیکھ چکا ہے" نازو نے مسکرا کے کہا "جیون پرشاد بہت ہی خبیث چیز ہے۔ بڑھاپے میں بالکل سٹھیا گیا ہے۔"

"سٹھیا نہیں گیا ہے' تم نے اسے دیوانہ کر دیا ہے۔ اس بیچارے کا کیا قصور" میں نے کہا "ایسے کسی سے التفات کا اظہار کرو گی تو یہی ہو گا۔ اتنی رات کو یہ کیسے آپہنچا؟"

"تخریب کاروں کا تو بہانہ تھا۔"

"پھر کیا گھوڑوں کو دیکھنے آیا تھا؟" میں نے انجان بن کے کہا۔

"وہ مجھے دیکھنے آیا تھا۔" نازو جھلا کے بولی "اس کے دل کو قرار نہیں مل رہا تھا۔ نیند نہیں آرہی تھی اسے۔ بدمعاش۔ لچا۔ اب لیڈر بنا پھرتا ہے۔"

"تم نے خود اس کے لئے جال پھیلایا وہ پھنس گیا ہے تو اسے

گالیاں دے رہی ہو" میں نے کہا۔

"خدا کا شکر ہے کہ بروقت میں نے اسے دیکھ لیا۔ غالب دوسری طرف سے اتر گیا اور میں نے اسے بڑی مشکل سے جھوٹ بول کے ٹالا کہ ڈاکٹر اور ٹرینر کہیں چائے پینے گئے ہیں۔ چائے کا انتظام تو کیبن میں بھی ہے۔ مگر اس وقت وہ زیادہ خفا یوں نہیں ہوا کہ اسے مجھ سے اکیلے میں باتیں کرنے کا موقع مل گیا۔ جی چاہتا تھا ایک ہاتھ مار کے اسے بھی لٹا دوں سب کے ساتھ۔ لیکن اسے بہت لوگوں نے آتے دیکھا تھا۔ ان میں گارڈ اور ڈرائیور بھی شامل ہیں جو اس کے زر خرید غلام ہیں۔ واپس جاتا بھی دیکھا ہوگا سب نے۔ میں اسی لئے ساتھ گئی تھی کہ گارڈ اور ڈرائیور دیکھ لیں۔ بعد میں شک کی گنجائش ہی نہ رہے" نازو نے کہا اور اوپن پلیٹ فارم ٹائپ بوگی پر چڑھ گئی۔

زرد رنگ کا کنٹینر اس کے درمیان میں رکھا ہوا تھا۔ نازو ایک چھوٹے سے دروازے کا قفل کھول کے اندر داخل ہوئی' اس کے ساتھ ہی دوسری جانب سے غالب اوپر چڑھ آیا۔

"رخصت کر آئیں اپنے اس پرستار جاں نثار چڑیمار کی شکل والے کو" غالب نے کہا۔

"حسد میں تم کچھ بھی کہو مگر وہ ایک ایم ایل اے ہے جو کسی دن وزیر بھی بن سکتا ہے۔"

"ہونے کو وہ مسلمان بھی ہو سکتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ تم سے عقد کی درخواست کرے" غالب نے جل بھن کے کہا۔

"اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں اس درخواست کو قبول کرلوں" نازو نے کہا۔

غالب نے چلاّ کے کہا "مگر اس سے پہلے وہ قتل ہو سکتا ہے"

میں نے کہا "مجھے معلوم ہے کیا ہو سکتا ہے اور کیا نہیں ہو سکتا۔ بس اس وقت جھگڑا نہیں ہو سکتا۔ یہ بتاؤ کہ جن کو تم نے چائے پینے بھیج دیا تھا وہ کہاں ہیں؟"

نازو نے ہنس کے کہا "سو رہے ہیں۔"

غالب نے کہا "انگریزی کے محاورے کا اردو ترجمہ پیش ہے۔ سوئے ہوئے کتوں کو سوتا رہنے دو۔"

"مگر وہ کہاں سو رہے ہیں؟" میں نے کہا۔

"اصطبل میں" نازو نے کہا "بعد میں دیکھ لینا۔"

"تمہیں یقین ہے کہ وہ سو رہے ہیں۔ یہ ابدی نیند تو نہیں؟" میں نے کہا۔

"میں نے انہیں ایک ایک سکون آور انجکشن لگایا تھا۔ جو ویسے تو گھوڑوں کے لگایا جاتا ہے......"

میں اچھل پڑا "گھوڑوں والا انجکشن انہیں لگا دیا؟"

غالب نے کہا "وہ ہنہناتے ہوئے اٹھیں گے۔"

میں نے کہا "یہ مذاق کی بات نہیں۔ گھوڑے اور آدمی میں تو بڑا فرق ہوتا ہے۔"

"مگر وہ انجکشن ایک ہی تھے۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟" میں نے کہا۔

"مجھے خود ڈاکٹر نے بتایا تھا۔"

"کمال ہے! گھوڑوں کو بھی سکون بخش انجکشن لگا... ہیں" میں نے کہا۔

"کیا گھوڑوں کا بھی نروس بریک ڈاؤن ہو جاتا ہے؟ ... ذہنی اور اعصابی امراض لاحق ہوتے ہیں۔ مثلاً عشق...."

"جب گدھوں کو ہو سکتا ہے تو گھوڑے تو بہر حال ان... ہیں" نازو نے غالب کی طرف دیکھ کے کہا "دراصل انگ... حریف گھوڑوں کے لئے۔ جیون پرشاد نے ایک سازش... بنایا تھا کہ ریس شروع ہونے سے پہلے ان گھوڑوں کو کمزور... دیا جائے جن سے خطرہ تھا کہ وہ جیت سکتے ہیں۔ ان کو وہ... کا انجکشن لگانے سے مطلوبہ نتائج حاصل ہو سکتے تھے۔"

"کیا ویلیم ٹین سے گھوڑے پر اثر ہوتا؟"

"جیون پرشاد کا خیال تھا کہ ہوگا۔ ڈاکٹر تعریفی انداز... کے شیطانی ذہن کو خراج تحسین پیش کر رہا تھا کہ سور کے... دماغ میں کیا زبردست خیال آیا ہے۔ ڈاکٹر نے تسلیم کیا کہ... ہوگا مگر ہوگا۔ جیون پرشاد بھی بس اتنا ہی اثر چاہتا تھا کہ... تھوڑا سا مست ہو جائے تو کافی ہے۔"

"لیکن ریس کے گھوڑوں کی حفاظت کی جاتی ہے۔ یہ خ... جگہ رہتا ہے کہ کوئی انہیں نقصان نہ پہنچا دے۔"

"ڈاکٹر اور ٹرینر کا خیال تھا کہ جیون پرشاد نے کسی طر... ٹرینر کا تعاون حاصل کر لیا ہے۔ زورِ بازو کی مدد...."

"زورِ بازو یا زن کی مدد سے" غالب نے اس کی بات... دی "یہ ترمیم ضروری ہے۔"

میں نے کہا "تم نے وہی انجکشن انہیں لگا کے ثابت... چاہ کن را چاہ درپیش۔"

غالب نے کہا "اس میں یہ ترمیم کی جائے کہ گھور کر... درپیش۔"

"تم باہر جا کے ٹہلو اور آنکھیں کھلی رکھو۔ آخری وق... کوئی آ نہ جائے" میں نے کہا۔

"آخری وقت میں صرف فرشتۂ اجل آتا ہے اور ا... نہیں ٹال سکتا۔" غالب نے کہا "میں اس وقت ٹہلنے کے... بھی نہیں ہوں۔ دو گھنٹے سے ٹہل ہی رہا تھا تمہارے انتظار..."

نازو نے کہا "تم آ کے پھر کہاں چلے گئے تھے کچھ بتائے..."

میں نے کہا "بعد میں بتاؤں گا۔ غالب سے بھی کہ... نے۔"

غالب لیٹ رہا تھا مگر میں اسے کھینچ کر باہر لے گیا۔ ... کھلے حصے سے ایک طرف بمبئی شہر کی روشنیاں نظر... تھیں۔ دوسری طرف وہ پلیٹ فارم تھا جو تقریباً سونا پڑا تھا۔

...ٹی کے انتظامات تقریباً مکمل ہو چکے تھے۔ جن کا سامان تھا وہ ...ا چکے تھے اور سامان چڑھانے والے قلی بھی۔ ضابطے کی ...روائی بھی شاید مکمل ہو چکی تھی۔

پلیٹ فارم کے آخری کنارے پر لمبائی کے رخ سیکڑوں قلی ...اپنی چادریں تانے ایک دوسرے کے متوازی یوں سو رہے تھے ...گتا تھا' یہ زندہ انسان نہیں کسی حادثے میں مرنے والوں کی ...یں ہیں۔ ٹرین کو خفیف سا جھٹکا لگا۔ اس کو کھینچ کر لے جانے ...لا انجن ٹرین سے لگا دیا گیا تھا۔ جس کھلی بوگی پر ہم کھڑے ہوئے ...ہ وہ تقریباً درمیان میں تھی' پھر بھی پلیٹ فارم سے آگے تھی۔ سال ...ڑی اتنی لمبی تھی کہ ایک سرے سے دوسرے سرے کا کچھ پتا ...یں چلتا تھا۔

میں نے کہا "مرزا جی! کیا سوچ رہے ہو؟"

"سوچ رہا ہوں محسن کے بارے میں۔ بہت سخت اور خطرناک ...م ہے اس کا۔ ابھی اسے مزید ایک گھنٹا مُردے کی طرح ساکت ...ے گزارنا ہے۔"

"گارڈ کو شک تو نہیں ہوا تھا؟"

"نہیں۔ شک کیوں ہوگا۔ اس کی آنکھوں پر پانچ ہزار کی پٹی جو ...ہ دی تھی ہم نے۔ بعد میں اس نے تابوت کے اوپر چادر ڈال ...ا تھی۔"

"کیا تم پھر گئے تھے؟"

"ہاں۔ ایسے ہی ٹہلتا ہوا نکل گیا تھا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ گل ...کیا حال ہے۔"

"اور اگر گارڈ تمہیں دیکھ لیتا پھر؟"

"میں پلیٹ فارم پر نہیں تھا۔ دوسری طرف تھا۔ میرے ...پڑے بھی وہ نہیں تھے۔"

"صورت تو وہی تھی۔"

"صورت پر کون دھیان دیتا ہے۔ میں تھا بھی اندھیرے میں ...ور اتفاق سے اس وقت گارڈ بھی موجود نہیں تھا۔ وہ اپنے کام میں ...مصروف تھا چناں چہ مس گل بھی مزے سے عرشے پر موجود تھیں۔ ...میرا مطلب ہے گارڈ کے ڈبے کے سامنے کھلے حصے پر۔ اس نے بھی ...نہیں پہچانا تھا مجھے۔ میں نے قریب جا کے کہا "حسین بیوہ۔" وہ ...اچھل پڑی۔ میں اوپر چڑھ گیا۔ تابوت پر کپڑا پڑا ہوا تھا۔ گل نے ...بتایا کہ سرکاری افسروں کے چمچے اور مفت سفر کرنے کے خواہش مند ...گارڈ سے معاملہ طے کر کے بیٹھ جاتے ہیں۔ آج بھی آئے تھے مگر ...گارڈ نے سب کو رخصت کر دیا کہ جیون پرشاد ایم ایل اے کا ...سامان رکھا ہوا ہے۔"

"محسن سے بات نہیں ہوئی؟"

"بات کیسے ہوتی۔ چادر ہٹا کے میں نے اشاروں کی زبان میں ...اسے حوصلہ دیا تھا اور کہا تھا کہ بس تھوڑی دیر کی آزمائش اور ...ہے۔ وہ خاصی تکلیف میں ہوگا۔ مگر مجھے دیکھ کے مسکرایا۔ کروٹ بھی تو نہیں لے سکتا وہ۔ کپڑا ڈالنے سے اتنا فائدہ ہوا کہ وہ آنکھیں کھول سکتا تھا۔ گل نے نگاہ پلیٹ فارم پر رکھی اور گارڈ ادھر آنے لگا تو میں پھر دوسری طرف اتر گیا۔"

"اصل بات کا ہمیں ابھی تک علم نہیں۔"

"تمہاری مراد شہلا سے ہے؟"

"ہاں۔ وہ کہاں ہے' اگر وہ اس ٹرین پر ہوتی تو نظر نہ آتی؟" میں نے کہا۔

"ہم نے ٹرین کی ہر بوگی میں دیکھا بھی نہیں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "یہ پوری مال گاڑی ان کی نہیں ہے۔ دو بوگیوں میں کافی جگہ تھی۔"

غالب نے چونک کر کہا "میں تو یہ بتانا بھول ہی گیا کہ تمہارا اندازہ ٹھیک تھا۔"

"کیسا اندازہ....؟"

"ان بوگیوں میں خواجہ سیمنٹ والوں نے اپنا مال بھر دیا ہے۔ ان کے ٹرک عین وقت پر پہنچ گئے۔ گل نے ایک شخص کو گارڈ سے باتیں کرتا سنا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ بوگیوں کی منسوخی سے ان کا بہت بڑا نقصان ہو جاتا۔ وہ کسی پروجیکٹ کے لئے سپلائی کا ٹھیکا لے چکے تھے۔ شاید ٹھیکا ہی منسوخ ہو جاتا۔ وہ ریلوے نقصانات کی تلافی کا کیس کرنے کا سوچ ہی رہے تھے کہ سب ٹھیک ہو گیا۔ کسی نے فون کر کے کہا کہ آپ چاہیں تو وہی بوگیاں مل سکتی ہیں۔"

"مرزا غالب! مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہ ڈراما تھا۔"

"ڈراما تو چل بھی رہا ہے۔ تم کس سین کا حوالہ دے رہے ہو؟"

میں نے کہا "یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ ولاور اینڈ کمپنی نے دو بوگیاں کیوں بک کرائی تھیں۔ اگر سامان اتنا ہی تھا کہ ایک بوگی کے آدھے حصے میں آجاتا۔ تو ایک بوگی بھی کافی ہوتی۔"

غالب سوچ میں پڑ گیا "کیا مقصد ہو سکتا ہے اس کا؟"

"مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے انہیں یہ خوف لاحق تھا کہ ہم یا ہمارے ایجنٹ ان کے مال کا سراغ لگا لیں گے۔ خواجہ سیمنٹ والوں کی بوگیاں منسوخ کرانے سے لے کر چوراسی تابوت نما باکس لوڈ کرانے تک سب ایک ڈراما تھا۔ تاکہ ہماری توجہ اس طرف مبذول کرا دی جائے۔"

"تمہارا مطلب ہے ان میں اسلحہ نہیں تھا؟"

"ممکن ہے تھوڑا بہت آتش گیر اور دھماکہ خیز مادہ ہو جس سے بوگیاں تباہ ہو جائیں۔ نقصان ہو ریلوے کا یا خواجہ سیمنٹ والوں کا۔ سیمنٹ ویسے بھی دھماکے کی شدت کم کر دے گا۔ اصلی مال کسی دوسری بوگی میں ہوگا۔"

غالب نے میرا ہاتھ پکڑ کے کہا "پیرو مرشد! آپ کا یہ خیال کسی الہامی کیفیت کا نتیجہ ہے۔ آپ سچ فرماتے ہیں۔ بالکل ایسا ہی

ہوا ہے۔ انہوں نے رسک نہیں لیا۔ دھوکا دینے کے لئے قلیوں نے مال لوڈ کرایا اور گودام تک لائے۔ گودام سے یہ مال سب کے سامنے اٹھایا گیا۔ اور سب کچھ ہمیں ان کی توقعات کے مطابق ہوا۔"

میں نے کہا "ہاں۔ ہم نے قلیوں سے معلومات حاصل کرلیں اور گودام تک جا پہنچے۔"

"کیا انہوں نے ہمیں پہچان لیا ہوگا؟"

"نہیں۔ پہچانا کسی نے بھی نہیں۔ لیکن تم نے ان کے رویئے پر غور کیا؟ نہ وہاں تریوینی رکا اور نہ کرنل۔ اتنی اہم ذمے داری وہ ڈرائیور کو سونپ کر چلے گئے۔ اور اس ڈرائیور نے بھی کتنی آسانی سے دوسرے قلیوں کو قبول کرلیا تھا۔ شاید اس وقت جب ہم وہ باکس لوڈ کر رہے تھے۔ دلاور اور تریوینی اپنے گھر میں مطمئن بیٹھے ایک ایک منٹ کی رپورٹ حاصل کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنا مال دن میں ہی لوڈ کروادیا ہوگا۔ اس وقت جب ٹرین واشنگ لائن پر تھی۔ وہ بوگیاں وہیں سے بھرکے اور سیل ہوکے آئی ہوں گی۔ سخت حفاظتی انتظامات کے ساتھ یہ کام دلاور نے اپنی نگرانی میں کرایا ہوگا۔ ہم بے وقوف بنے۔ اب اتنی لمبی ٹرین میں ان دو بوگیوں کا پتا چلانا تو ناممکن ہے۔"

"گارڈ کو معلوم ہوگا۔"

"مشکل ہے۔ دلاور جیسا شخص کسی کو رازدار بنانے کا خطرہ مول نہیں لے گا" میں نے کہا "رازداری کا سب سے بہتر طریقہ خاموشی ہے۔ اس مرتبہ دلاور نے یہی کیا۔ اس نے خاموشی سے سب کچھ کرلیا۔ حفاظتی انتظامات کے ہنگامے کے بغیر اور احتیاطی تدابیر کے بغیر۔ عین ممکن ہے کہ دو بوگیاں کسی گمنام سے اسٹیشن پر لوڈ کی گئی ہوں اور واشنگ لائن سے بننے والی ٹرین میں ایسے لگادی گئی ہوں کہ کسی کو پتا بھی نہ چلا ہو۔ سوائے ان کے جن کا تعاون بہرحال ضروری تھا۔ دلاور کی یہ چال کامیاب رہی۔ ہم قلی بنے اور بھیس بدل کے اس کے مال کا سراغ لگاتے رہے مگر صرف گمراہ ہوئے۔ یہی وہ چاہتا تھا۔"

غالب نے سر پر ہاتھ مارا "کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہ خیال آپ کو اتنی دیر سے کیوں آیا؟"

"اس لئے کہ دیر آید درست آید" میں نے کہا۔

"پھر اب کیا ہوگا؟ فرض کرو وہ مال اس ٹرین پر نہ ہو۔ آپ کی دو بوگیوں کو خاموشی سے لوڈ کرانے والا نظریہ بھی غلط ہو۔ یہ ایک مفروضہ ثابت ہوا۔"

"اگر ٹرین کی روانگی تک شملا کو نہ لایا گیا تو پھر واقعی ہمیں کچھ اور سوچنا پڑے گا۔"

"اتنی خواری کے بعد؟"

"یار، یہ تو جنگ ہے۔ شطرنج کا کھیل۔ ایک چال چلنے سے پہلے حریف کی چال کا اندازہ کرنا پڑتا ہے۔ اندازہ غلط ہو جائے تو چال بھی غلط ہو جاتی ہے مگر اس کے بعد اگلی چال اور وہ بھی... تو اس سے اگلی چال کے لئے سوچنا ہی کھیل کو اس وقت تک جاری رکھنے کے لئے ضروری ہوتا ہے جب تک کہ بازی ختم نہ ہو جائے۔ اور بازی ابھی ختم نہیں ہوئی۔ دلاور یہ سمجھ... اب ہم سامنے آئے بغیر سب معلوم کرسکتے ہیں۔ پہلے... تعداد میں برابر تھے۔ پھر بمبئی میں ایسے واقعات پیش آئے... ہماری قوت کے لامحدود ہونے کا یقین آگیا۔ ہمارے... گنے چنے افراد ہیں جن کو ہم پہچانتے ہیں چناں چہ اس نے... ہمارے سامنے نہیں آنے دیا۔ سوائے ان تین افراد کے... ہمیں غلط راہ پر ڈالنے آئے تھے۔ تریوینی، کرنل... ڈرائیور۔ لیکن ان سب پر فریب اقدامات کے باوجود... کے تحفظ کی ضمانت سے دست بردار نہیں ہوگا۔ وہ شملا... کے بیٹے کی زندگی کو ضرور داؤ پر لگائے گا۔ تاکہ اس کی تمام... اور رازداری کے باوجود ہم کسی طرح اس کے مال کا پتا... کامیاب ہو جائیں تو ہماری راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ حائل رہے۔"

غالب نے سرہلا کے کہا "یہ ایک منطقی نتیجہ ہے جس... اختلاف نہیں کرسکتا۔ اگر شملا اور اس کے بیٹے کو... ہم سوری کر کے... جائیں گے؟ اور ہم تو... گے۔ اس مرحلے کا کیا ہوگا؟"

"اس میں پریشانی کی کون سی بات ہے۔ ہم ٹرین کی... بعد کہیں بھی اتر سکتے ہیں۔ بریک تو گارڈ بھی لگوا سکتا ہے۔"

"ابھی آدھا گھنٹا ہے اور مجھے ایسا لگتا ہے کہ ہماری... رائیگاں گئی۔ محسن بلاوجہ تابوت میں لیٹا اور گل... مرحوم کے لئے آنسو بہائے۔"

"کیوں نہ ہم ایک راؤنڈ لگا کے دیکھ لیں۔ میں ٹرین... کی طرف جاتا ہوں۔ تم گارڈ کے ڈبے کی طرف جاؤ۔"

"اس وقت کہاں جانے کی باتیں ہو رہی ہیں؟" ناز... سے آ کے کہا "ٹرین روانہ ہونے والی ہے۔"

"پھر کیا ہوا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ ٹرین... نی۔ ہم آجائیں گے اگلی گاڑی سے۔"

ناز نے بگڑ کے کہا "اگلی گاڑی سے آنے کی بھی کیا... ہے؟"

"ہاں اب جیون پرشاد مل گیا ہے تمہیں۔ اور وہ... کے گھوڑے ہیں۔ مجنوں کو سگ لیلیٰ بھی عزیز تھا۔"

میں نے کہا "ہم دیکھ رہے ہیں کہ شملا کیوں نہیں... ٹرین کیسے مس ہوسکتی ہے مس ناز۔ کیا ہم ایک مال گاڑی... سے بھی نہیں دوڑ سکتے؟"

"اسے تو ہم روانگی کے ایک گھنٹے بعد بھی پکڑ لیں... سیدھے پٹری پر دوڑتے ہوئے آجائیں گے" غالب نے... ہوئے کہا۔

"... لگ جائے پیچھے تو ضرور بھاگو گے۔ مثلاً پاگل کتا۔"

"... میرا سسر جو ایک بھوت ہے" غالب نے کہا۔

"واپس تو آؤ گے نا؟" ناز نے چلا کے کہا۔

"تم ہر بار اپنے مرحوم ابا کی طرف کیوں لے جاتی ہو میری بات۔ میرے چار سسر بھی ہوسکتے ہیں۔ تمہیں کیا معلوم ان میں سے کون بھوت ہے؟" غالب نے جاتے جاتے کہا۔

... اس وقت تک مخالف سمت میں روانہ ہو چکا تھا اور میری نظر ویران پلیٹ فارم پر کسی غیر معمولی نقل و حرکت کی تلاش میں تھی۔ بہت دور انجن کی ہیڈلائٹ سے اندھیرے میں ایک روشن لکیر بنی تھی۔ اس کے آگے سگنل تھا جس کی لائٹ ابھی سرخ ہی رہی تھی۔

میرا انداز کسی کو شک میں مبتلا نہیں کرسکتا تھا۔ انجن کے گارڈ اور ڈرائیور کو معلوم تھا کہ ہم کون ہیں اور ان کے علاوہ وہاں صرف قلی تھے جو سوئے پڑے تھے۔ اس پلیٹ فارم پر نہ ٹی اسٹال تھے اور نہ وینڈر جو ہر قسم کی چیزیں ریڑھی پر لئے پھرتے ہیں۔ مسافر بردار گاڑیاں یہاں سے روانہ ہی نہیں ہوتی تھیں۔

میں غور سے ہر بوگی کو دیکھتا جا رہا تھا مگر وہ سب ایک جیسی بوگیاں تھیں۔ سیاہ رنگ کے فولادی ڈبے جو ہر طرف سے بند تھے۔ ایک کھلے پلیٹ فارم جیسی بوگی پر چند پرائیوٹ کاریں کھڑی ہوئی تھیں۔ چار بوگیاں کسی آئل کمپنی کی تھیں۔ سلور کلر کی گول بوگیوں پر ریلوے کا نمبر بھی تھا اور کمپنی کا نام بھی۔ میں ان کے قریب سے گزر چکا تھا کہ اپنے پیچھے مجھے معمولی سی گڑبڑ کا احساس ہوا۔

میں نے آہستہ سے سر گھما کر دیکھا تو تیل لے جانے والی ایک بوگی کے اوپر والے گول ڈھکنے کو ہٹا کے کوئی شخص باہر آرہا تھا۔ اس نے بہت احتیاط کے ساتھ ڈھکنا دوبارہ بند کیا اور پھر سائیڈ میں لگی ہوئی سیڑھی پر قدم جماتا اترنے لگا۔

شک تو مجھے اس کا سایہ دیکھ کر ہی ہوگیا تھا۔ آج تک میں نے آئل کیریر میں سے آدمی کو برآمد ہوتا نہ دیکھا تھا۔ اگر اس میں آئل ہوتا تو وہ شخص صاف ستھرا نہ نکلتا۔ مٹی کے تیل' پیٹرول یا لبریکینٹ (چکناہٹ والے تیل) سے اس کے کپڑے تر ہوتے۔ مگر تیل سے بھرے ہوئے ٹینک میں کوئی اترے گا ہی کیوں؟

غلطی مجھ سے یہ ہوئی کہ میں چلتے چلتے رک گیا۔ اگر میں اسے دیکھنے کے بعد نظرانداز کردیتا اور بے نیازی سے انجن کی طرف چلتا رہتا تو وہ شخص شک میں مبتلا نہ ہوتا۔ جب وہ میری طرف بڑھا تو میں نے اپنی غلطی کو محسوس کرتے ہوئے آگے جانے کی کوشش کی اور اطمینان سے سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے یہ ظاہر کیا کہ مجھے اس کے پیچھے آنے کی کوئی پروا نہیں ہے مگر وہ تیزی سے آیا اور پھر میرے ساتھ چلنے لگا۔

"کون ہو تم؟ یہاں کیا کر رہے ہو؟" اس نے غرا کے کہا۔

میں نے رک کر اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا "تم کون ہو مجھ سے اس لہجے میں یہ سوال کرنے والے؟" میں نے مشتعل ہوئے بغیر متانت سے کہا۔

"میں تمہارا باپ ہوں۔"

میں نے اطمینان سے سگریٹ کا آخری کش لیا اور اسے جوتوں سے مسل کے ایک دم اس کی گردن دبوچ لی "میں بدتمیزی کرنے والوں کو سزا دیتا ہوں۔ میرے اس سوٹ نے تم کو غلط فہمی میں مبتلا کردیا ہے شاید کہ میں بدمعاشی نہیں کرسکتا۔"

اس نے خود کو چھڑانے کی اور حلق سے آواز نکالنے کی کوشش کی مگر میں نے اسے دھکیل کر ایک بوگی سے لگا دیا۔

"تمہارا سر میں ناریل کی طرح توڑ سکتا ہوں۔ اس بوگی پر مار کے۔ اگر تمہاری لاش کو نیچے پٹری پر ڈال دیا جائے تو سارے پہیے تمہارے ٹکڑوں کا قیمہ بناتے ہوئے گزریں گے۔"

"میں.....میں نے صرف یہ پوچھا تھا" اس کی حالت غیر ہوگئی۔

"میں تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے" میں نے کہا۔

لیکن دفع ہونے کے بجائے اس نے ایک دم ریوالور نکال لیا۔ اس نے چیخ کر مجھے گالی دی اور بولا "جلدی بول..... ورنہ تیری لاش پھڑکتی نظر آئے گی۔"

میں انجن کے قریب تھا۔ دو بوگیوں کا فاصلہ اتنا نہیں تھا کہ ڈرائیور کے کانوں تک یہ آواز نہ پہنچتی۔ اس نے جھانک کر دیکھا اور وہیں سے چلایا "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

ڈرائیور کی آواز پر وہ ہوش میں آگیا ورنہ مجھے یقین تھا کہ وہ گولی چلادے گا۔ غصے نے اسے پاگل کردیا تھا۔

میں نے بھی اب چیخ کر جواب دیا "میں جیون پرشاد ایم ایل اے کا آدمی ہوں۔ اس کے گھوڑوں کا ٹرینر....."

انجن ڈرائیور چھلانگ مار کے دوڑا "کیا بات ہے؟"

میں نے غصے میں ڈرائیور سے کہا "کون ہے یہ پاگل کا بچہ؟ کیا اسے معلوم نہیں کہ اس ٹرین پر جیون پرشاد ایم ایل اے کے تین خاص آدمی جا رہے ہیں۔ ایک ڈاکٹر' ایک ٹرینر اور ایک نرس۔"

اس نے ریوالور جیب میں رکھ لیا۔ اچانک اسے اپنی حماقت کا شدت سے احساس ہونے لگا تھا اور وہ پریشان تھا "تم یہ بات شرافت سے پہلے ہی بتا دیتے۔"

"کیوں بتا دیتا؟" میں نے چلا کے کہا "یہ تو اب تم بتاؤ گے کہ تم نے میرے ساتھ یہ بدمعاشی کی جرات کیسے کی!"

"چلیں سر' جانے دیں اس کو۔" انجن ڈرائیور نے مصالحانہ کردار ادا کرتے ہوئے کہا "ٹرین روانہ ہونے والی ہے' آپ

آجائیں۔"
"جب تک یہ معافی نہیں مانگے گا میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔ ٹرین کھڑی رہے۔"
"ابے کیوں مرنا چاہتا ہے ...." انجن ڈرائیور نے اسے گالی دی۔
اس نے برہ لہجے میں کہا" سر..... غلطی ہوگئی۔ معاف کردیں مجھے۔"
"اس شریف آدمی کی وجہ سے معاف کرتا ہوں تمہیں۔ جاؤ دفع ہوجاؤ اب" میں نے کہا اور اس کی طرف دیکھے بغیر واپس ہوگیا۔
سگنل کی لائٹ سبز ہوگئی تھی۔ میں اس کھلی بوگی تک پہنچا ہی تھا جس پر نازو پریشان کھڑی تھی کہ میں نے مخالف سمت سے غالب کو دوڑ لگا کے آتا دیکھا۔ ٹرین آہستہ آہستہ کھسکنے لگی۔ میں نے ہاتھ بڑھایا اور غالب کو اوپر کھینچ لیا۔
"یار غضب ہوگیا" غالب نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان کہا۔ اس کی صورت پر وحشت برس رہی تھی۔
میں نے اور نازو نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔
"آخر منہ سے کچھ بولو۔ کیا غضب ہوگیا؟" نازو نے جھلا کے کہا۔
"یار، وہ کرنل..... وہ پھر آیا تھا۔" غالب نے کہا۔
میں نے کہا "کیا.... ہم ساتھ جائے گا؟"
"یہ تو پتا نہیں..... اکیلا نہیں تھا" غالب کے چہرے پر ملال اور افسردگی سے زیادہ مایوسی غالب تھی۔
"کیا دلاور اینڈ کمپنی میں سے کوئی....."
اس نے نفی میں سر ہلا دیا "وہ..... غالباً شہلا کو لایا ہے۔"
میں نے کہا "غالباً کیا۔ جو تم نے دیکھا ہے وہ بتاؤ۔"
"میں نے تو ایک تابوت کے سوا کچھ نہیں دیکھا۔ اسے دو قلی اٹھا کے لائے تھے" غالب نے کہا "کرنل آگے آگے تھا۔ اس نے تابوت کو وہیں رکھوا دیا۔ گارڈ کے ڈبے میں۔"
"او مائی گاڈ" میرے لبوں سے بے اختیار نکلا۔
نازو کا رنگ اڑ گیا "تمہارا مطلب ہے کہ وہاں ایک ساتھ، ایک ہی جگہ۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟"
"یہ کیوں نہیں ہوسکتا آخر؟" غالب نے بے خیالی میں کہا۔
ہم سب خاموش ہوگئے۔ یہ دکھ اور اذیت کے احساس کا انوکھا تجربہ تھا اور قدرت کی ستم ظریفی کا نرالا نمونہ کہ میاں بیوی پہلو بہ پہلو لیٹے ہوئے تھے مگر ایک کو دوسرے کی خبر نہ تھی۔ ہزاروں میل کی مسافت ختم ہوجانے کے باوجود احساس کے فاصلوں میں برقرار تھی۔ شہلا بھی زندہ تھی اور محسن بھی اور ان کا بیٹا بھی ان کے ساتھ تھا۔ مگر طویل جدائی کی عقوبت کا صلہ یہ قربت تھا جس میں کسی کے لئے راحت کا کوئی پہلو نہ تھا۔ اگر ان میں سے ایک کو شک بھی ہوجاتا کہ دوسرا اس کے اتنا نزدیک ہے تو مجھے یقین ہے وہ سب کچھ بھول جاتے۔ یہ کہ مصلحت کے کیا تقاضے ہیں کس صبر و ضبط کے مظاہرے کا طلب گار ہے اور صورت حال کی نزاکت ان سے کیا قربانی مانگتی ہے۔ وہ ایم آر ایس کو، اس مشن کو، ہم سب کو بھول کر اور ساری زنجیریں توڑ کے مل جاتے۔ بیوی اپنے شوہر کی آغوش محبت میں گم ہوجاتی۔ باپ اپنے بیٹے کو سینے سے لگا لیتا اور وہ کبھی جدا نہ ہوتے۔ خواہ چند لمحوں میں ہجر کے درد کی آگ کے بجھنے سے پہلے ہی انہیں موت آلیتی۔ وہ ایسی موت کو یقیناً ترجیح دیتے۔ لیکن اب انتہائی اذیت کے احساس کی ڈور اس خیال سے بندھی ہوئی تھی کہ شہلا اور محسن اپنے اپنے تابوت میں الگ الگ۔ قید حیات کے ایک صبر آزما لمحے کا سارا عذاب اکیلے جھیل رہے ہیں۔ ممکن ہے شہلا بے ہوش ہو یا سو رہی ہو اور اس کا بیٹا بھی اپنی ماں کے ساتھ وہ سزا کاٹ رہا ہو جو اس کے مقدر میں پیدائش کے روز اول سے لکھی گئی تھی۔ اس کی عمر کی معصومیت نہ سیاست کے اسرار و رموز کو سمجھتی ہے اور نہ تجارت کے معاملات سود و زیاں کو۔ یہ عمر صرف پیار مانگتی ہے۔ شفقت اور محبت مانگتی ہے۔ رنگین غبارے اور کھلونے اور ٹافیاں مانگتی ہے۔ لیکن اس کے برعکس محسن اور شہلا کے بیٹے کو کیا ملا تھا؟ وہ دکھ جو اس کی ماں نے جھیلا۔ وہ صدمات جو اس کی ماں نے ایک عورت کی حیثیت سے برداشت کئے۔ وہ ظلم جو اس عورت پر محسن کی بیوی کہلانے کے جرم میں روا رکھے گئے۔ ان سب میں وہ بچہ شریک رہا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ قدرت کی طرف سے اسے زندگی کی کتنی مہلت عطا ہوئی ہے۔ اور وہ بھی دوسرے بہت سے خوش نصیب بچوں کی طرح عمر کے مرحلے طے کرتا ہوا صحافی یا دانشور، پروفیسر یا سائنس داں۔ ڈاکٹر یا انجینئر بنے گا۔ یا آغاز سفر میں زندگی کا کوئی حادثہ اسے وجود سے پھر عدم کی جانب بھیج دے گا۔
جب ٹرین نے جھٹکا لیا تو میرے خیالات کی رو بھی ایک جھٹکے سے ٹوٹی۔ میں نے نازو کو خاموشی سے روتے دیکھا۔ آنسو بے آواز اس کی آنکھوں سے گر کے گالوں پر پھسلتے جا رہے تھے اور غالب اسے یوں دیکھ رہا تھا جیسے دیکھ ہی نہیں رہا ہے۔
"نازو! رو رہی ہو" میں نے کہا "اچھا ہے رو لو، ہم تو رو بھی نہیں سکتے۔"
"اونہہ۔ رونے سے کیا ہوگا؟" غالب نے تلخی سے کہا۔
"کاش! میں محسن کو بتا سکتی کہ اٹھو۔ دیکھو تمہاری بیوی تمہارے پاس ہے۔ تمہارا بیٹا....." وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔
"وہ اب بھی اتنے ہی دور ہیں جتنا مرنے والا زندگی سے دور ہوتا ہے" غالب نے کہا "ایسا کیوں ہوگیا سکندر! یہ تو بڑا ظلم ہے۔ کم سے کم ایک بار تو انہیں پھر ملنا چاہئے۔ دیکھ تو لینا چاہئے۔"
"کچھ نہیں ہوسکتا دوست۔ کوئی ان کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ ابھی وہ کچھ نہیں جانتے چنانچہ آگہی کا سارا عذاب صرف ہم جھیل رہے ہیں۔ محسن کو بھی یقین ہوگا کہ وہ اکیلا ہے۔ اور اس کے ذہن پر بوجھ ہے تو تحمل ہے۔ انہیں خیال ہوگا صرف اپنی ذمے داری کا اور اپنا کام خوش اسلوبی سے کرنے کا۔ شاید اس وقت محسن کے دماغ میں شہلا کا خیال تک نہیں ہوگا۔ اور اسی طرح شہلا کو اگر سلا دیا گیا ہوگا تو وہ خواب میں بھی محسن کو ہی دیکھ رہی ہوگی کیوں کہ یہ نیند نہیں بے ہوشی ہے" میں نے کہا۔
غالب اور نازو کے چہرے کچھ پرسکون ہونے لگے۔
میں نے اپنی بات جاری رکھی "ابھی وہ سب بے خبری کے باعث سکون میں ہیں۔ سوچو، ان پر کیا گزرتی اگر وہ ایک دوسرے کے قریب ہوتے۔ ایک دوسرے کو دیکھ سکتے۔ یا ایک دوسرے کی آواز سن سکتے مگر مل نہ سکتے۔ شاید وہ پاگل ہوجاتے۔ میری اور رابعہ کی بات بھی بہت مختلف ہے۔ اور تمہاری بھی۔ محسن اور شہلا کیسے ملے اور پھر ایسے بچھڑے کہ آج تک محض آس کے سہارے جیتے رہے۔ اگر وہ ایک ہی زنداں میں ہوتے۔ آمنے سامنے۔ یا درمیان دیوار ہوتی۔ تو وہ سر پھوڑ کے مرجاتے مگر دیوار نہ گرا پاتے۔ خدا کا شکر ہے کہ محسن کچھ دیکھ نہیں سکتا اور کچھ سن بھی نہیں سکتا۔"
"اگر گل کی جگہ میں ہوتی تو کیا ہوتا؟" نازو نے جھرجھری سی لے کر کہا۔
"یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ شہلا کو گل نہیں پہچانتی" غالب نے کہا۔
میں نے کہا "پہچانتی نہیں، مگر جانتی تو ہے۔ اس کو سب معلوم ہے۔"
غالب ایک دم متفکر ہوگیا "کہیں وہ بے وقوفی میں کوئی جذباتی غلطی نہ کر بیٹھے۔"
"حالت تو اس کی وہی ہوگی جو میری ہوتی۔ اس نے پہلی بار شہلا کو دیکھا ہوگا۔ اور محسن کے بیٹے کو۔ ہم سب مارے جائیں گے، اگر اس نے محسن کو کچھ بتایا۔ یا انہیں ملوانے کی کوشش کی" نازو بھی تشویش میں مبتلا ہوگئی۔
"مجھے اس پر بھروسہ ہے کہ وہ ایسی حماقت نہیں کرے گی" غالب نے کہا "وہ تمہاری طرح جذبات کی رو میں بہہ جانے والی لڑکی نہیں ہے۔"
"دوسرے لفظوں میں تم مجھ پر الزام لگا رہے ہو کہ میں جذبات سے اتنی مغلوب ہوجاتی ہوں کہ عقل سے کام نہیں لے سکتی!" نازو نے غالب کو گھور کے دیکھا۔
"خاتون!" غالب نے متانت سے کہا "ہر شخص وہی چیز استعمال کر سکتا ہے نا، جو اس کے پاس ہو۔"
نازو بگڑ گئی "کیا عقل نہیں ہے میرے پاس؟"
"میں نے ایک عام اصول بیان کیا ہے" غالب نے کہا "چور کو داڑھی میں تنکا محسوس ہو تو میں کیا کروں۔ مطلب تم اسے غلط نکال رہی ہو۔"
"بلاوجہ غلط بات کیوں کرتے ہو؟"
"تم الٹا مطلب کیوں نکالتی ہو؟" غالب نے کہا "میں اپنے سسر کو بھوت کہتا ہوں تو تم برا مان جاتی ہو کہ میرے والد کو کہا ہے۔ خواہ مخواہ۔"
"بس شروع ہوگئی چخ چخ" میں نے کہا "معلوم نہیں تم دونوں کی زندگی ایک ساتھ کیسے گزرے گی۔"
نازو نے ایک دم پینترا بدل لیا "آپ فکر میں دبلے مت ہوں، جیسی بھی گزرے گی آپ سے اچھی ہی گزرے گی۔"
غالب کا چہرہ کھل اٹھا "اور کیا۔ بھلا وہ بھی کوئی زندگی ہوتی ہے کہ ایک مشرق کی دیوار کو گھور رہا ہے اور دوسرا چھت کو دیکھ رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے گونگے بہرے بیٹھے ہیں۔"
نازو نے کہا "جہاں دو برتن ہوں گے آواز تو ہوگی۔"
"بس جو برتن خالی ہوگا وہ زیادہ بولے گا" غالب نے پھر نازو کو چھیڑ دیا۔
"خدا کے لئے" میں نے ہاتھ جوڑ کے کہا "ابھی تم رو رہی تھیں محترمہ۔ اور محترم، آپ بھی تشویش میں مرے جا رہے تھے۔ ایک دم سب کچھ بھول گئے۔ مجھے تو تم دونوں ہی خالی برتن لگتے ہو۔"
غالب نے کچھ شرمندہ ہو کے سر کھڑکی سے نکالا اور بولا "ابھی تو بمبئی ہی چل رہا ہے۔"
نازو نے کہا "بمبئی نہیں چل رہا ہے۔ گاڑی چل رہی ہے۔"
میں نے اسے گھور کے دیکھا "اس سے زیادہ تمہاری زبان چل رہی ہے۔ چلو اندر چل کے مجھے ان دونوں سے ملواؤ جو اب "ہم" ہیں۔"
"یعنی ہمیں ہم سے ملوا دو" غالب نے کہا۔
چالیس فٹ لمبا فولادی کنٹینر اندر سے دس فٹ چوڑا اور دس فٹ اونچا تھا۔ جس حصے کو الگ کر کے گھوڑوں کی دیکھ بھال کرنے والوں کے قیام کی جگہ بنادی گئی تھی وہ لمبائی اور چوڑائی میں دس فٹ تھا۔ باقی تیس فٹ کی جگہ گھوڑوں کے لئے تھی۔ لمبائی کے رخ تین فٹ چوڑی راہداری تھی جس کے ایک جانب تو فولادی دیوار تھی۔ دوسری طرف چھ کیبن بنادئے گئے تھے۔ ہر کیبن کو دوسرے سے بالکل الگ کرنے کے لئے درمیان میں فولادی چادریں ویلڈنگ سے جوڑی گئی تھیں۔ غالباً ایک گھوڑے کو دوسرے سے بالکل الگ رکھنے کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ کبھی ایک بیمار ہوجائے تو دوسرے محفوظ رہیں۔ ہر گھوڑے کے لئے پانچ فٹ چوڑا اور آٹھ فٹ لمبا کیبن تھا جس میں ان کی ضروریات کے مطابق ہر چیز فراہم کی گئی تھی۔
نازو نے بیچ کا دروازہ کھولا اور پتلے سے کاریڈور میں چلنے لگی۔ یہ گھوڑے بہت قیمتی تھے چناں چہ کنٹینر باہر سے بھی مقفل تھا اور اندر ہر گھوڑے کے کیبن کا دروازہ بھی۔ ریس کے گھوڑے

مجھے کسی طرح بھی تانگے کے گھوڑے سے مختلف نہیں لگتے تھے کیوں کہ نہ مجھے ریس کا شوق تھا اور نہ شہسواری کا کہ میں ان کی نسلی صفات اور "خوبصورتی" کو سمجھ سکتا۔ ایک گھوڑے پر ہی کیا منحصر۔ عام آدمی تو کبوتر یا باز کی بھی اعلیٰ و ادنیٰ اقسام میں فرق کو دیکھ ہی نہیں سکتا۔

یہی وجہ تھی کہ میں نے گھوڑے دیکھنے میں کسی اشتیاق کا مظاہرہ نہیں کیا۔

نازو نے کہا "ان میں سے ہر گھوڑا لاکھوں کا ہے۔"

"گھوڑا لاکھوں کا ہو سکتا ہے۔ مگر میرے جیسے ہمہ صفت' خوبرو اور جینئس نوجوان کی کوئی قدر نہیں۔ افسوس!" غالب نے کہا۔

"یار' اپنا موازنہ گھوڑے سے مت کرو" میں نے کہا۔

"گھوڑے برا مانیں گے" نازو ہنسی اور چابی سے آخری کیبن کا قفل کھولنے لگی۔ ہوا کے لئے کوئی گزرگاہ نہیں تھی چناں چہ دروازہ کھلا تو مجھے شدید حبس اور بو کا احساس ہوا۔ کیبن بہت صاف رکھے جاتے ہوں گے مگر پھر بھی ایک گھوڑے کے جسم سے خارج ہونے والے سارے مواد کی بو اس فضا میں رچ بس گئی تھی۔ کیبن ائر ٹائٹ نہیں تھے اس لئے گھوڑے دم گھٹنے سے ہلاک نہیں ہوتے تھے لیکن میرے خیال میں انہیں زیادہ تازہ ہوا کی ضرورت تھی۔ روشنی کے لئے آگے والی بوگی سے تار کا کنکشن لیا گیا تھا اور اس سے چوبیس وولٹ کے وہ سارے بلب جل رہے تھے جو عام مسافر گاڑیوں کے ڈبوں کو روشن رکھتے ہیں۔

مجھے یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ اس کیبن میں کوئی گھوڑا نہیں تھا۔ فرش پر دو افراد انتہائی مضحکہ خیز انداز میں مگر سخت مشتعل بیٹھے تھے۔ ان کے جسم پر ایک انڈرویئر کے سوا کچھ بھی نہیں تھا مگر اس سے بھی زیادہ ہنسی ان کے چہرے دیکھ کر آتی تھی جو سیاہی سے کالے کردیئے گئے تھے۔

"یہ تمہاری حرکت تھی؟" میں نے کہا۔

نازو نے سرہلایا "ہاں۔ میں نے انہیں اس قابل نہیں چھوڑا تھا کہ یہ کسی کو منہ دکھا سکیں۔ ویسے بھی یہ باہر نہیں نکل سکتے تھے۔"

"لیکن یہ شور مچا سکتے تھے۔ اندر سے کیبن کی دیوار بجانا شروع کردیتے پھر؟" میں نے کہا۔

"انہیں باندھ کے ڈالنا تھا" غالب نے مجھ سے اتفاق کیا۔

"باندھا تو تھا" نازو نے کہا "یہ رسیاں نظر نہیں آرہی ہیں کیا؟"

"ایک ڈائیلاگ بولوں۔ اگر اجازت ہو؟"

"بولو بولو" میں نے کہا۔

"ایسے باندھنا تھا جیسے مجھے پیار کی زنجیر سے باندھ کے بے بس کردیا ہے۔ آزاد کیسے ہوگئے؟"

نازو نے کہا "انہی سے پوچھ لو۔ میں نے دونوں کے ہاتھ پیچھے کر کے باندھ رکھے تھے۔ اور پاؤں بھی۔"

میں نے کہا "یہ بہت فرماں بردار قسم کے لوگ لگتے ہیں یہ طرح بزدل بھی ہیں" غالب نے کہا۔

نازو مسکرائی "میں نے انہیں سمجھا دیا تھا کہ حلق سے نکالی یا دیواروں پر مکے مارے تو سب سے پہلے تمہاری آواز میرے کانوں تک پہنچے گی اور میں فوراً آکر تمہیں پھر سلا دوں گی۔ صاحب کو معلوم ہے کہ میں کیسے لڑاتی ہوں۔ انہوں نے ٹرینر کو ہوئے دیکھا تھا۔"

میں نے کہا "ان میں سے ڈاکٹر کون ہے اور ٹرینر کون ہے؟"

"تمہارا کیا اندازہ ہے؟" نازو بولی۔

"ایک جیسے لباسِ فاخرہ میں ان کی مظلوم صورتوں کے تاثرات بھی ایک جیسے ہوگئے تھے مگر ان میں سے ایک قدرے سنجیدہ' بردبار اور مہذب لگتا تھا۔ دوسرا چیچک کے داغ والا اور باکسر ٹائپ شخص تھا۔

میں نے پہلے شخص کو ڈاکٹر قرار دیا اور دوسرے کو گھوڑوں کا ٹرینر۔

"غلط" نازو ہنسی "الٹا بتایا ہے تم نے۔"

میں نے کہا "چہرے دیکھ کے دھوکا ہوجاتا ہے۔"

"اور اس کی سب سے زیادہ تباہ کن مثال تمہارا چھوٹا تمہارا نام بھی ہے" غالب نے کہا۔

میں نے ڈاکٹر سے کہا "تم کچھ نہیں بولو گے؟"

اس نے انگریزی میں جواب دیا "میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ تم لوگ وہی کرو گے جو تمہارا دل چاہے گا۔ ہماری مرضی سے یا اختیار میں کچھ ہوتا تو ہم یہاں اس طرح نہ ہوتے۔"

میں نے کہا "اگر تم تعاون کرو گے۔۔۔۔"

"تعاون۔ مائی فٹ۔ زبردستی تم سب کچھ کرا سکتے ہو" ڈاکٹر نے میری بات کاٹ دی "لیکن وہ تعاون نہیں ہوگا۔ میں نمک حرام نہیں ہوں۔ مجھے کوئی شکایت بھی نہیں ہے اس شخص سے جو میرا باس ہے۔"

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ وہ کس قماش کا آدمی ہے؟"

"آئی ڈیم کیئر' وہ کیا کرتا ہے اور کیا نہیں کرتا۔ میرا اس کے سیاسی' کاروباری یا اخلاقی معاملات سے کوئی تعلق نہیں۔ جس کام کا وہ مجھے معاوضہ دیتا ہے اور جو کام میں کرتا ہوں وہ غلط نہیں ہے۔ میں اس معاوضے سے بہت خوش ہوں اور بہت مطمئن بھی۔ تم جیسے لوگوں کو تعاون کی بات کرتے ہوئے شرم آنی چاہئے۔ میں تم سے تعاون کروں تو لعنت مجھ پر" ڈاکٹر ایک دم بھڑک پڑا۔

میں نے کہا "اصولی طور پر میں تم سے اتفاق کرتا ہوں لیکن ہماری بھی کچھ مجبوریاں ہیں۔ ان کی وضاحت ضروری نہیں۔ بس خاموش بیٹھے رہو تو ہمارا وعدہ ہے کہ تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔"

"میں خاموش ہی بیٹھا تھا۔ تم نے مجھے بولنے پر مجبور کیا" ڈاکٹر نے کہا اور گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گیا۔

"تم سالا گھوڑے چوری کرے گا؟" ٹرینر نے زیادہ جارحانہ انداز میں بات کی۔

"نہیں۔"

"پھر کیا ان کو مارے گا؟"

میں نے پھر نفی میں سرہلایا "گھوڑوں نے ہمارا کیا بگاڑا ہے کہ ہم انہیں ماریں گے۔"

ٹرینر حیران نظر آنے لگا "بابا پھر یہ سب کیا ہے۔ کس کا آدمی ہے تم؟ فیروز بھائی کا۔"

"کون فیروز بھائی؟"

"جس کا بلیک گولڈ اور کارپر ہیڈ جیتا تھا لاسٹ ٹائم۔ اس لئے کہ اپنا اسٹار کوئن اور چیف نہیں تھا۔ ابھی اس کا کوئی چانس نہیں۔"

میں نے کہا "نہ ہم کسی فیروز بھائی کو جانتے ہیں اور نہ کسی ریس کے گھوڑے کو۔"

وہ کنفیوز نظر آنے لگا "ابھی یہ لفڑا ہے۔"

میں نے کہا "کوئی لفڑا نہیں۔ آرام سے یہاں بیٹھو۔ چاہو تو سو جاؤ۔ تمہارے کپڑے بھی واپس مل جائیں گے۔ بھوک پیاس لگی ہے تو بتا دو۔"

"مجھے چائے اور سگریٹ چاہئے" ڈاکٹر نے سر اٹھا کے کہا "مل سکتی ہے؟"

"کیوں نہیں۔ میں تم دونوں کو یقین دلاتا ہوں کہ ہماری تم سے یا تمہارے گھوڑوں سے کوئی دشمنی نہیں۔ نہ ہم اس فیلڈ کے آدمی ہیں۔ بس تم اپنی اور ہماری مجبوری کو سمجھتے ہوئے یہاں خاموش بیٹھے رہو۔ چالاک یا بہادر بننے کی کوشش کرو گے تو مارے جاؤ گے۔ یہ لڑکی ہی کافی ہے ایک ہاتھ مار کے تمہارا کام تمام کرنے کے لئے۔ تمہاری گردن ٹوٹ جائے گی۔"

ٹرینر کا ہاتھ بے اختیار اپنی گردن پر گیا۔

"دیکھنے میں خاصی مضبوط گردن لگتی ہے تمہاری۔ دیکھنے میں یہ لڑکی بھی بہت معصوم صورت اور بے ضرر نظر آتی ہے۔ اس لئے حقیقت پسندی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنی جان بچاؤ۔"

"ہم گولی ضائع کرنے کے عادی نہیں ہیں" غالب نے ریوالور نکال کے دیکھا اور چوم کے پھر جیب میں رکھ لیا۔ یہ بہت عمدہ اور بر وقت پیش کیا جانے والا ڈرامائی تاثر تھا۔

نازو نے پھر دروازہ مقفل کیا اور ہم واپس چلنے لگے "یہ تو بہت عاجز نکلے" غالب نے مایوسی سے کہا۔

"بدمعاش نہیں ہیں نا۔ اس لئے ڈر گئے" نازو بولی۔

"پھر بھی محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ دشمن کو کمزور سمجھنے والا مارا جاتا ہے۔ کیا پتا وہ حد سے زیادہ مکار اور عیار ہوں۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر نے بھی صاف بات کی۔ ٹرینر بھی اب کچھ مطمئن ہے۔ تم ان کے کپڑے واپس کردو۔ اور چائے تو خیر سب کے لئے بناؤ۔"

میں اور غالب واپس اپنے کیبن میں پہنچ کے ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔ اس کیبن میں سونے کے لئے اوپر نیچے تین فٹ چوڑے تختے لگے ہوئے تھے۔ دو ایک طرف۔ دو دوسری طرف۔ تیسری طرف کا نصف حصہ کچن سمجھا جاسکتا تھا جو چار فٹ لمبا اور تین فٹ چوڑا تھا۔ اتنا ہی بڑا دوسرا حصہ باتھ روم تھا۔ کچن کے ایک کونے میں مٹی کے تیل کا چولہا رکھا ہوا تھا اور اوپر بنے ہوئے شیلف میں برتن تھے۔ چائے کافی بنانے کا سامان تھا اور کھانے پینے کی مختلف چیزوں کے علاوہ سگریٹ اور شراب تک موجود تھی۔ جیون پرشاد ایم ایل اے کے ملازم بھی عیش کررہے تھے اور کیوں نہ کرتے۔ سرکاری عہدے کے اختیارات تھے۔ اسمگلنگ کی آمدنی تھی۔ ریس میں گھوڑے دوڑتے تھے تو صرف جیتنے کے لئے۔ ناجائز آمدنی کے سارے در کھلے ہوئے تھے اور مال حرام میں سے سب کو ان کی توقع سے بڑھ کر مل رہا تھا۔

ٹرین اب کافی تیز رفتاری سے چل رہی تھی لیکن ہنوز بمبئی کے مضافات کا سلسلہ جاری تھا۔ یہ گڈز ایکسپریس معلوم ہوتی تھی کیوں کہ تھانہ اور کلیان کے اسٹیشنوں سے رکے بغیر گزر گئی تھی۔ غالب نے جیب سے ایک نقشہ نکالا۔

"یہ کہاں سے آیا؟"

"یہیں سے ملا ہے" غالب نے کہا "ابھی کلوبانی۔ شاہ پور اور دیولالی تک بمبئی ہی ہے۔ اس کے بعد ناسک۔"

"دیولالی اور ناسک کے درمیان ہم اپنا کام کرسکتے ہیں" میں نے نقشے پر غور کرکے کہا۔

"کیا محسن کو ہمارا ایکشن پلان معلوم ہے؟"

"نہیں۔ اسے تو بس گارڈ کو کنٹرول کرنا تھا۔"

"کہاں پہنچ کے۔ کتنی دیر بعد؟" غالب نے کہا۔

"میں نے گل کو سمجھا دیا تھا کہ جلدی نہ کرے۔ پچاس کلومیٹر کے بعد۔۔۔۔"

"اسے کیسے اندازہ ہوگا کہ ٹرین پچاس کلومیٹر دور آچکی ہے۔"

"یار' اب وہ اتنی بے وقوف بھی نہیں ہے" میں نے کہا "دو اسٹیشن گزرے ہیں۔ اس نے دیکھ لیا ہوگا کہ ہم کتنی دور ہیں اس مقام سے جہاں سے چلے تھے۔"

"پچاس کلومیٹر کا فاصلہ طے ہوگا دو گھنٹے میں۔" غالب نے گھڑی دیکھی "اس وقت تک سورج نکل آئے گا۔"

"ہاں۔ تقریباً ساڑھے سات بجے ہوں گے۔"

"پہل کون کرے گا؟"

"ظاہر ہے گل ہی پہل کرے گی۔وہ موقع محل دیکھ کے ریوالور نکال لے گی اور محسن کو سگنل دے گی کہ تابوت سے نکل آؤ" میں نے کہا"گولی کے سامنے کوئی نہیں ٹھہرتا۔ گارڈ نے بہادر بننے کی کوشش کی تو گل اسے مار دے گی۔رعایت یا تکلف کی گنجائش ہی نہیں۔اس کی لاش ویسے ہی نیچے گر جائے گی ورنہ وہ اٹھا کے پھینک دیں گے۔پھر گاڑی روک لیں گے بریک لگا کے۔"

"اس وقت تک ہم کچھ نہیں کریں گے؟"

"گاڑی رک جائے گی تو ڈرائیور خود اتر کے آئے گا۔اور بھی جتنے لوگ ساتھ ہیں سب ہی اتر کے دیکھیں گے کہ بلاوجہ ٹرین جنگل میں کیوں کھڑی ہوگئی ہے۔پھر ہم ان سے نمٹ لیں گے۔"

میں نے کہا"چلو باہر نکل کے تازہ ہوا میں بیٹھتے ہیں۔"

غالب نے سرہلایا اور اٹھ کھڑا ہوا"ہمارے اور محسن کے درمیان کوئی رابطہ نہیں۔یہ غلط ہے۔"

"رابطہ ہو بھی کیسے سکتا تھا۔ ہمارے پاس دو عدد وائرلیس سیٹ ہیں مگر گل انہیں چھپا کے ساتھ نہیں رکھ سکتی۔"

"ایک وائرلیس تابوت کے اندر رکھا جا سکتا تھا۔ محسن باہر نکلتے ہی ہم سے بات کرلیتا۔ہمیں بتا دیتا کہ اس نے گارڈ پر قابو پا لیا ہے" غالب نے کہا"ہم اسے ہدایات دے سکتے تھے۔"

"ہاں۔یہ پلاننگ کی غلطی ہے" میں نے تسلیم کیا۔

"ابھی تو مجھے ایک اور خیال پریشان کر رہا ہے۔"

"وہ کیا؟"میں نے کھلی بوگی کے فرش پر بیٹھ کے کہا۔

"کہیں ایسا نہ ہو کہ محسن پروگرام کے مطابق تابوت سے نکلے تو شہلا کو دیکھ کر سب بھول جائے اور ہوش کھو بیٹھے۔"

میں نے کہا"اگر اس دوسرے تابوت میں واقعی شہلا ہوگی تو ظاہر ہے اس امکان کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔اچھی بات یہ ہے کہ محسن اکیلا نہیں ہے۔پاسبان عقل کی طرح گل اس کے ساتھ ہے۔"

نازو نے چائے لا کر دی تو ہم خاموشی سے پینے لگے۔رات کے آخری پہر میں دور دور تک اندھیرے کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ بمبئی شہر کی روشنیاں بھی افق کے پیچھے رہ گئی تھیں۔ٹرین کی رفتار کا اندازہ میں نے تیس چالیس کلو میٹر فی گھنٹہ کیا۔کھلی بوگی بہت لمبی تھی چناں چہ چالیس فٹ کا کنٹینر رکھنے کے باوجود اس پر کافی جگہ بچ گئی تھی جو کسی پختہ آنگن کی طرح تھی۔صبح کی نم آلود خنک ہوا میں چائے پیتے ہوئے میں نے خود کو بہت پرسکون محسوس کیا'اگرچہ اس سکون کے پیچھے ایک پر آزار تصور تھا جس کا نقش مٹائے نہ مٹتا تھا۔ میں نے کچھ بھی نہیں دیکھا تھا پھر بھی میں دیکھ سکتا تھا کہ محسن اور شہلا کس طرح دو تابوتوں میں ساتھ ساتھ لیٹے ہوئے ہیں۔ زندہ ہونے کے باوجود مردوں کی طرح۔شہلا نہیں جانتی کہ اس نے محسن کو پالیا ہے جو بہت پہلے ہمارے ساتھ نکلا تھا تو لوٹ کے گھر جاتا ہی

بھول گیا تھا۔ صرف اس کا خیال تھا اور امید تھی جس نے شہلا زندہ رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ محسن کو نہیں معلوم کہ اس کی شہلا زندگی دشمنوں کے پاس کب سے گروی رکھی ہے اور وہ ذلت مصائب کے ہر استحصال سے گزر کے آخر کار اس تک آپہنچی ہے۔ حقیقت بھی بعض اوقات کتنی افسانوی اور ناقابل یقین ہو جاتی ہے۔

"مرزا جی!" میں نے کہا"مجھے ایسا لگتا ہے جیسے ہم یہ وقت ضائع کر رہے ہیں یہاں بیٹھ کے۔"

غالب نے کہا"پھر ایسا کرتے ہیں کہ کھڑے ہو جاتے ہیں۔"

"یار'کہیں معاملہ گڑبڑ نہ ہو جائے۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا"چل ہم دیکھتے ہیں کہ صورت حالات کیا ہے۔اگر گارڈ کے ڈبے میں کرنل بھی ہوا۔تو وہ بہت خطرناک دشمن ہے۔شاید سب سے زیادہ خطرناک۔"

"کیا اس پر گولی اثر نہیں کرتی؟"

"اگر اس نے گل کو یا محسن کو پہچان لیا۔تو ان کے کچھ کرنے سے پہلے ہی وہ کچھ کر بیٹھے گا۔ شہلا اور اس کا بیٹا یرغمالی ہیں۔ابھی تک محسن نے انہیں اس حالت میں نہیں دیکھا۔ کرنل عیار آدمی ہے۔وہ محسن کو بیوی اور بچے کی جھلک دکھا کے پاگل کر سکتا ہے اور پاگل پن میں اس سے سب کچھ کروا سکتا ہے۔اس کے ہاتھوں گل کو مروا سکتا ہے۔ہمیں مروا سکتا ہے۔"

"ناممکن۔ محسن ایسا نہیں کر سکتا۔"

"وہ محسن نہیں ہوگا" ایک دیوانہ ہوگا جو کہ کرنل کے ہر حکم کی تعمیل کرے گا۔ صرف بیوی بچے کی جان بچانے کے لئے وہ اس کی ہر شرط مان سکتا ہے" میں نے کہا"اس کے علاوہ یہ بھی ہو سکتا ہے مرزا جی۔کہ تابوت میں شہلا اور اس کے بیٹے کو کرنل نے کسی خاص انتظام کے ساتھ سلایا ہو۔کہ کوئی اور انہیں اٹھانا چاہے تو خود دنیا سے اٹھ جائے یا ان کی جان اپنے ہاتھوں سے لے۔ محسن باہر نکلتے ہی شہلا کو دیکھے گا۔"

غالب ایک دم کھڑا ہو گیا۔ "یہ بات تمہیں بہت پہلے سوچ لینی چاہئے تھی۔اور سوچ لی تھی تو بتا دینی چاہئے تھی۔"

" ابھی وقت ہے۔ہم اندھیرے سے فائدہ اٹھا کے ٹرین کے اوپر چلتے ہوئے آخر تک جا سکتے ہیں اور آخری بوگی کے اوپر سے جھانک کر گارڈ کے ڈبے میں ہونے والی سب کارروائی دیکھ سکتے ہیں۔"

نازو نے چلا کے کہا" پاگل ہو گئے ہو تم دونوں۔"

"سکندر کا تو مجھے علم نہیں' لیکن میں ضرور پاگل ہو گیا ہوں ایک لڑکی کے پیچھے" غالب نے کہا۔

"کون ہے وہ لڑکی؟"میں نے نازو کو چھیڑنے کے لئے کہا۔

"ہے ایک بھوت کی بچی" غالب نے کہا۔

لیکن نازو لڑنے کے موڈ میں نہیں تھی۔وہ غم زدہ اور پریشان

تھی"فضول باتیں مت کرو۔تم چلتی گاڑی کی چھت پر چڑھ کے مرنے کی سوچ رہے ہو۔خود کشی کا کوئی آسان طریقہ کیوں اختیار نہیں کرتے۔"

غالب نے کہا"آسان طریقوں سے کئی بار مر چکے ہیں ہم سب"

میں نے اس کی تائید کی"ہاں۔کبھی اس پر کبھی اس پر۔اب اور کسی پر نہیں مر سکتے۔چلو یار۔"

نازو نے ایک بار پھر ہمیں سمجھانے کی کوشش کی"غالب! تمہیں میری قسم۔"

"چلو جاؤ۔ان قیدیوں کو چائے دو۔میں ایسی فضول قسموں کو نہیں مانتا جو آدمی ہوش میں نہ اٹھائے" غالب نے برہمی سے کہا"تمہیں بھی میری قسم ہے جو آگے ایک لفظ کہا۔"

نازو خاموش ہو گئی۔اس کی صورت کے تاثرات میں اس کے جذبات کا سارا تلاطم۔دل کا سارا درد اور احساس کی تمام اذیت کے ساتھ بے بسی کا تمام عذاب شامل ہو گیا تھا۔شاید اس کی جگہ رابعہ ہوتی تو وہ بھی مجھے روکنے کے لئے ایسے ہی آنسوؤں سے اور قسموں سے کام لیتی۔

اس سے پہلے کہ وہ رو پڑتی'میں نے نازو کے سر کے بالوں کو چھیڑ کے کہا"اس میں خطرے کی کوئی بات نہیں ہے پاگل۔ٹرین کی رفتار بہت کم ہے اور چھت پر چلنے کے لئے بہت جگہ ہوتی ہے۔آدمی گر جائے تب بھی چھت پر ہی رہتا ہے۔پھر اٹھ کے کھڑا ہو سکتا ہے۔"

"یہ کوئی پل صراط نہیں ہے۔بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز" غالب نے کہا۔

جذبات کا سرکش ریلا ضبط کا بند توڑے بغیر گزر گیا تھا۔ نازو نے ایک گہری سانس لی اور غالب کی طرف دیکھا"تم ہو بہت کمینے۔قسم کو مانتے بھی نہیں اور ساتھ ہی قسم دیتے ہو۔"

"قسم کو تم تو مانتی ہونا" غالب نے کہا"کتنی اچھی بات ہے کہ تم کمینی نہیں ہو۔کتنا غلط ہوتا اگر دو کمینے اکٹھے ہو جاتے زندگی بھر کے لئے۔"

میں نے کہا"ہاں۔وہ جو شعر ہے نا کہ۔خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔وہ تو بس شاعر کا فریب خیال ہے۔دو دیوانے اکٹھے ہوں گے تو ایک دوسرے کے کپڑے پھاڑیں گے۔پھر سر پھاڑ دیں گے۔خوب خاک گزرے گی۔ایک دیوانہ ہو تو دوسرے کو ہوشیار ہونا چاہئے۔"

"جیسے رابعہ ہوشیار ہے اور تم دیوانے ہو۔ادھر میں ہوشیار ہوں اور۔۔۔"

"اب چلے جاؤ خیریت سے ورنہ......" نازو نے اس کا مطلب سمجھ کے جملہ پورا ہونے سے پہلے کہا۔

"ورنہ کیا۔میری جگہ تم چلی جاؤ گی؟جاؤ اگر ہمت ہے تو۔"

"ہمت تم سے کم ہے کیا؟"نازو فوراً تیار ہو گئی۔

میں نے اسے بڑی مشکل سے اندر بھیجا۔پھر میں اور غالب بوگی کے آخری حصے تک گئے۔اس سے اگلی بوگی تک پہنچے بغیر ہم چھت پر نہیں چڑھ سکتے تھے۔غالب نے میرا ہاتھ پکڑا تو میں نے توازن برقرار رکھتے ہوئے دونوں بوگیوں کو ملانے والے بمپرز پر قدم رکھا اور دوسرا ہاتھ بڑھا کے اگلی بوگی کے ایک ہک کو تھام لیا۔پھر میں نے ایک ہاتھ بڑھایا اور غالب کو کھینچ لیا۔باری باری ہم نے ایک سے دوسرے ہک پر قدم رکھا اور ہلتی ہوئی بوگی کی چھت پر چڑھ گئے۔مال گاڑی ایک ہی رفتار سے چلتی جا رہی تھی۔اگر اس وقت ڈرائیور بریک لگا دیتا تو شاید جھٹکے سے ہم دونوں بوگیوں کے بیچ میں گرتے اور پھر جو کچھ ہوتا اس کا تصور بھی رونگٹے کھڑے کر دینے کے لئے کافی تھا۔

مال گاڑی میں میرے اندازے کے مطابق تیس چالیس بوگیاں تھیں اور ہم نے اپنا سفر درمیان سے شروع کیا تھا چناں چہ ہمیں پندرہ بیس بوگیوں کی چھت پر سفر کرتے ہوئے آخر میں لگے ہوئے گارڈ کے ڈبے تک پہنچنا تھا۔ڈبے دائیں بائیں جھول رہے تھے اور ان پر سیدھا چلنا مشکل کام تھا۔ ہر بوگی اوپر سے بالکل سیدھی نہیں تھی۔اس کا درمیانی حصہ کچھ اوپر اٹھا ہوا تھا اور چھت دونوں جانب قوس کی شکل میں کھلی ہوئی تھی۔

ہم نے ایک بوگی کا فاصلہ طے کر کے دوسری بوگی تک پہنچنے کے لئے چھلانگ ماری اور بڑی مہارت کے ساتھ اپنا توازن برقرار رکھنے میں کامیاب رہے۔ آٹھ بوگیوں کے بعد اچانک آئل ٹینکر آگیا۔یہ ایک گول بوگی تھی اور اس کی چھت پر تیل ہی تیل تھا جو گرد شامل ہونے سے گریز کی طرح ہو گیا تھا۔غالب نے پہلے چھلانگ لگائی۔میں نے اسے قدم جمانے کے بجائے پھسلتا دیکھا......

غالب نے بڑی پھرتی سے سائڈ میں لگے ہوئے فولادی زینے پر ہاتھ ڈال دیا۔ سیکنڈ کے ہزارویں حصے کی تاخیر بھی ہو جاتی تو شاید میں اپنی آنکھوں سے اس کی موت کا وہ بھیانک منظر دیکھتا جسے میں زندگی کی آخری سانس تک تصور سے کھرچ کے بھلا نہ پاتا۔وہ چلتی ٹرین سے گرتا تو سر کے بل سلیپروں یا ان کے دونوں جانب بچھے ہوئے پتھروں سے ٹکراتا اور اس کا جیتا جاگتا وجود ایک شکستہ ہڈیوں کا مجموعہ اور پھٹے ہوئے لہو آلود جسم کا انبار بن جاتا جسے میں ہر پل اپنی نظروں سے دور ہوتا دیکھتا رہتا اور کچھ بھی نہ کر پاتا۔اس کی لاش وہیں اپنی بے کسی پر نوحہ خواں اور بے مہری یاران وطن پر شکوہ کناں پڑی رہتی۔ نہ جانے کون اس کی لاوارث لاش اٹھاتا اور کہاں'کس عقیدے اور دستور کے مطابق سپرد خاک کرتا یا جلا کے راکھ کرتا۔ہمیں کبھی معلوم نہ ہوتا۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک پل میں پر وحشت خیالوں کا جو ریلا میرے ذہن سے گزرا اس نے زندگی پر میرے یقین کی بنیادوں کو تہ و بالا کر دیا۔ میں نے جو کچھ سوچا اور محسوس کیا وہ ایسا ہی تھا جیسے

عملاً میں نے اپنی آنکھوں سے ہوتا دیکھا ہے۔ مجھے زندگی کی بے ثباتی کے بارے میں بہت سے لوگوں کا کہا ہوا یاد آیا۔ یک نفس بیش نہیں فرصت ہستی غالب۔ آدمی بلبلا ہے پانی کا۔ اک مشت خاک ہے کہ تماشا کہیں جسے۔

غالب نے تالی بجا کے کہا "اے بھائی! کیا ہو گیا ہے تجھے۔ جام کیوں ہو گیا؟"

میں چونکا "وہ.... کچھ نہیں۔ کچھ ایسے ہی سوچ رہا تھا" میں نے کہا "تو ڈر گیا ہے کیا؟"

میں نے ایک جست لگائی اور غالب کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ "ہاں یار، میں واقعی ڈر گیا تھا۔ ایک لمحے کے لئے خوف نے مجھے منجمد کر دیا تھا۔ جب تو پھسل گیا تھا..... میں بتا نہیں سکتا کہ میرے ذہن میں کیسے کیسے عذابناک خیالات اس ایک لمحے میں آ کے گزر گئے۔"

غالب نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا "اس ایک لمحے کے لئے تو ہم سب کو تیار رہنا چاہئے۔ ہر جگہ۔ ہر وقت۔ ہم میں سے کون دست قدرت کی تحریر میں زندگی کی ضمانت کے ساتھ گھر سے نکلا تھا ..... چل آ جا۔ وہ لمحہ ٹل گیا۔ اب آگے نظر رکھ۔ آنے والا ہر لمحہ اس سے زیادہ صبر آزما ہو سکتا ہے۔"

ہم نے سنبھل سنبھل کے گول آئل ٹینکر کے عین وسط میں رہتے ہوئے اگلی بوگی تک سفر کیا۔ ٹرین کی رفتار سے ہمیں بہت مدد ملی جو نہ کم ہو رہی تھی اور نہ زیادہ۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے ہوائی جہاز میں کیپٹن "آٹو پائلٹ" سیٹ کر کے اطمینان سے بیٹھ جاتا ہے۔ ایسے ہی مال گاڑی کے انجن کا ڈرائیور بھی رفتار وغیرہ کو متعین کر کے سکون سے بیٹھا ہوا ہے۔

ایک بوگی پر سے گزرتے ہوئے ہمیں تین چار منٹ لگ جاتے تھے چنانچہ جب ہم آخری بوگی تک پہنچے تو افق پر صبح صادق کا اجالا بڑھ گیا تھا۔ یوں بھی ساحلی افق نسبتاً کم تاریک ہوتا ہے۔ ٹرین کے دونوں جانب غیر آباد علاقے میں بھی کہیں کھیت کھلیان اور کہیں اکا دکا مکان نظر آ جاتے تھے۔ سحر خیز دیہاتی منہ اٹھا کے گزرتی ہوئی ٹرین کو اور پھر اس کی چھت پر ہمیں مخالف سمت میں رواں دیکھ کر حیران ضرور ہوتے ہوں گے کیوں کہ ایسا تماشا روز کہاں نظر آتا ہے۔

گارڈ کی بوگی پر چھلانگ مارنے سے پہلے میں نے کہا۔ "مرزا جی! تمہارے کان کچھ سن سکتے ہیں؟"

"ہاں۔ چند آوازوں کے سوا۔ مثلاً چیونٹی کی آواز۔ میرے کان سب سن سکتے ہیں۔"

"یار، اتنی خاموشی کیوں ہے؟"

"خاموشی" مرزا غالب نے بڑے دکھ سے کہا "دوست تو بہرا ہو گیا ہے، اگر اتنا شور بھی نہیں سن سکتا۔"

"مجھے محسن اور گل کی آواز سنائی نہیں دے رہی ہے" میں نے بہتر سمجھا کہ اس کی بات کو نظر انداز کر دوں۔

"مجھے تو تازو اور رابعہ کی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی ہے" غالب نے اسی غیر سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"یار، اب تک محسن نکل آتا اپنے تابوت سے۔ تو کیا وہ سب خاموش بیٹھے ہیں؟"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ ابھی تک وہ مدفون ہے اور اس کی بیوہ کو موقع نہیں ملا ہے۔"

"نہیں۔ اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ گارڈ ابھی تک خیر عافیت ہے" میں نے کہا "زندہ ہے" ہوش میں ہے اور جاگ رہا ہے۔"

"جاگ رہا ہے" کہنا کافی تھا۔"

"ہم چھت پر کودیں گے تو کیا وہ چونکے گا نہیں؟ کہ یہ کیا دھماکا تھا۔"

"اس کو چونکنا چاہئے۔ اور باہر نکل کے دیکھنا چاہئے کہ چھت پر اترنے والی بھینس اتری ہے یا خدائی مخلوق۔ اور جب وہ باہر آئے تو مس گل بانو کی ناقص عقل میں بھی یہ بات آ جانی چاہئے کہ اس سے بہتر موقع نہیں مل سکتا۔ لیکن دوست! ہوتا وہی ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔ ہمارے چاہنے سے کچھ نہیں ہوگا اور ایسے سوچتے رہے تو آ جائے گا کوئی اسٹیشن۔"

"او کے۔ اب جو ہو سو ہو" میں نے کہا اور گارڈ کے ڈبے پر کود گیا۔ تقریباً ایک ساتھ ہم نے ریوالور نکالے اور چھت پر لیٹ کر چھپکلی کی طرح رینگتے ہوئے آگے بڑھے۔ میں نے کنارے سے سر نکال کر دیکھنے سے پہلے چند سیکنڈ انتظار کیا کہ شاید کوئی پکارے کہ "کون ہے اوپر؟" مگر کسی کی آواز سنائی نہ دی تو میں نے گردن لٹکا کر کے نیچے دیکھا۔

گارڈ کے ڈبے کا کھلا پلیٹ فارم خالی پڑا ہوا تھا۔

میں نے غالب کے کان میں آہستہ سے کہا "یار، یہ کیا معاملہ ہے؟"

غالب نے میرے کان میں جواب دیا "عجیب بات ہے واقعی کہ کوئی متوجہ ہی نہیں ہوا۔"

"کیا یہ ہو سکتا ہے کہ گارڈ بابو سو گئے ہوں اور گل کی آنکھ بھی لگ گئی ہو؟"

غالب نے نفی میں سر ہلایا "یہ ناممکن ہے۔ نہ ٹرین کا گارڈ سو سکتا ہے۔ اور نہ گل کو ایسے دہشتناک ماحول میں نیند آ سکتی ہے جب کہ وہ دو تابوتوں کے ساتھ بیٹھی ہے۔"

"ہاں۔ اس کے لئے تو یک نہ شد دو شد والی بات ہو گئی ہے" میں نے کہا "ایک محسن کو تابوت میں دیکھنا ہی کم اذیت ناک نہ تھا کہ دوسرے تابوت میں شملا آ گئی۔"

غالب نے آخر کار وہ بات کہہ دی جو میرے دل میں تھی مگر میں کہتے ہوئے ڈرتا تھا "مجھے معاملہ گڑبڑ نظر آنے لگا ہے۔"

میں نے صرف تائید کے طور پر سر ہلایا۔

"تم مشورہ لو گے یا حکم دو گے۔ تمہارا ڈبل رول ہے۔ ایک دوست کا الگ اور مشن کمانڈر کا الگ۔"

"آتش نمرود میں کودنے کے لئے نہ کسی کے مشورے کی ضرورت پڑتی ہے اور نہ حکم کی" میں نے کہا اور چھت پر سے بوگی کے فرش پر چھلانگ ماردی۔

میرے قدموں نے فرش کو چھوا ہی تھا کہ میں اسپرنگ کی طرح اچھل کر گھوما اور ریوالور کا رخ اس حصے کی طرف کر کے کھڑا ہو گیا جہاں میرے یقین کے مطابق گارڈ کو، گل اور محسن کو، شملا اور اس کے بیٹے کو ہونا چاہئے تھا لیکن ایک گارڈ کے سوا وہاں کوئی نہ تھا۔ گارڈ بھی فرش پر الٹا پڑا تھا اور بظاہر مر چکا تھا۔ وہ تابوت جس میں ہم نے محسن کو لٹایا تھا اب کھلا پڑا تھا۔ اس کے ساتھ ہی دوسری طرف بھی ایک تابوت تھا جسے میں نے دیکھتے ہی پہچان لیا۔

دوسرا شیشے کا وہی تابوت تھا جس کے اندر میں نے کچھ عرصہ پہلے شملا کو اور اس کے بیٹے کو خواب آور دواؤں کے زیر اثر ساکت وصامت دیکھا تھا۔ یوں جیسے وہ سو نہیں رہے تھے بلکہ مر چکے تھے۔ یہ بہت پرانی بات ہو گئی تھی مگر مجھے آج بھی اس دن کا تصور لرزا دیتا تھا جب اس کے اور میرے درمیان فولادی سلاخیں حائل تھیں۔ اس طرح کہ میں شملا اور اس کے بیٹے کو بے بسی سے دیکھتا رہنے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ نہ انہیں چھونا ممکن تھا نہ آواز دے کر بیدار کرنا۔ وہ تابوت میں قید تھی اور میں اسے قید کرنے والوں کی قید میں تھا۔

لیکن آج وہی شیشے کا تابوت میرے سامنے خالی پڑا ہوا تھا اور اس کا صرف نصف حصہ سلامت تھا جس سے میں نے اسے پہچانا۔ باقی حصہ ٹوٹے ہوئے شیشے کی صورت میں بکھر گیا تھا۔ گارڈ ان شیشے کی کرچیوں کے اوپر اور دونوں تابوتوں کے درمیان تھا۔

میں نے اسے پلٹ کر غور سے دیکھا۔ وہ صرف بے ہوش تھا۔

غالب نے کہا "یہ زندہ ہے۔ میں نبض دیکھ چکا ہوں۔"

میں نے کہا "مرزا! یہ کیا ہو گیا؟ یہ سب کیا ہے۔"

"میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا" غالب نے کہا جو مجھ سے زیادہ پریشانی میں مبتلا تھا "آخر سب لوگ کہاں گئے؟"

"اس تابوت میں شملا تھی" میں نے کہا "یہ وہی تابوت ہے غالب۔ اس کا بیٹا بھی تھا۔ اسی تابوت میں....."

"اگر محسن بھی تابوت سے نکل گیا تھا۔ تو پھر۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ کہاں گیا وہ۔ کیا انہیں اغوا کر لیا گیا ہے؟"

میرے پاس اس کے ہر سوال کا جواب دوسرا سوال تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے میرے ہر سوال کا جواب اس کا وہی سوال تھا، شک کی کوئی بنا نہیں تھی۔ ہم ادھر بے فکری سے بیٹھے چائے پیتے رہے تھے اور بالکل مطمئن تھے کہ سب ہمارے پلان کے مطابق ہو رہا ہے لیکن دوسری طرف کیا ہو گیا تھا، اس کی ہمیں کوئی خبر نہ تھی۔ اب مجھے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ مجھ سے کیسی خوفناک غلطی سرزد ہو گئی تھی۔ میں نے اپنے اور محسن کے درمیان کوئی رابطہ نہیں رکھا تھا۔ حالاں کہ یہ ہو سکتا تھا۔ غالب نے ٹھیک کہا تھا کہ ہم ایک واکی ٹاکی محسن کے تابوت میں رکھ سکتے تھے۔ پھر شاید کوئی ہمیں ضرور بتا دیتا کہ صورت حال قابو سے کیسے باہر ہو گئی ہے۔ کیا شملا کو اور اپنے بیٹے کو دیکھ کر محسن کا دماغ الٹ گیا تھا اور اس نے عالم وحشت میں تابوت توڑ کے شملا کو نکال لیا تھا؟ اگر ایسا ہوا تھا تو پھر اس کے بعد کیا ہوا؟ شملا تو اسے محو خواب ملی ہوگی اور اس کا بیٹا بھی۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ وہ ان کو بغل میں دبا کے ٹرین سے کود کر بھاگ گیا ہو۔ اگر شملا ہوش میں ہوتی تب بھی یہ ناممکن تھا۔ گارڈ کو کس نے ناک آؤٹ کیا تھا؟ اگر یہ کام گل نے کیا تھا تو وہ خود کہاں غائب ہو گئی؟ کیا محسن کی شملا کے لئے دیوانگی دیکھ کر وہ اتنی مایوس ہو گئی کہ اس نے اپنی تمام محرومیوں کا علاج زندگی سے محروم ہونا سمجھ لیا اور...... نہیں۔ یہ سب مفروضات اور اندیشے غلط تھے بے بنیاد تھے اور غیر منطقی تھے۔ ہم محسن کو جانتے تھے۔ شملا کو اور گل کو جانتے تھے۔ ان میں سے ایک پاگل ہو جاتا اور عقل و ہوش سے بیگانگی کا مظاہرہ کرتا تو باقی دو اسے سنبھال لیتے۔

غالب بھی خاموش تھا اور میں اس کی صورت پر اس کے خیالات کا ہر تاریک سایہ یوں دیکھ سکتا تھا جیسے اندھیری رات میں انسان کی نظر بادلوں کے سرمئی اور کالے رنگ کا ہر شیڈ دیکھ لیتی ہے۔

"اس کو ہوش میں لانا ضروری ہے سکندر۔ یہی بتا سکتا ہے ساری بات" غالب نے کہا

"ہاں۔ بات جو بھی ہے۔ اچھی تو ہو نہیں سکتی" میں نے بے خیالی میں سر ہلایا "پھر بھی....."

"ٹرین تو کہیں رکی بھی نہیں۔"

"وہ چلتی گاڑی سے نہیں کودے ہوں گے۔ مجھے معلوم ہے"

"گڑبڑ ہیں ہو گئی۔ روانگی سے پہلے۔"

میں نے کہا "دیکھ یار، پانی لا۔ چھینٹے مار اس کے منہ پر۔"

غالب نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر ایک واٹر کولر سے گلاس بھر لایا۔ اسی وقت ٹرین کی رفتار میں کمی آئی۔

"ٹرین رکے گی یہاں؟"

"ایسا ہی لگتا ہے" میں نے کہا اور کنارے سے سر نکال کے آگے دیکھنے کی کوشش کی مگر مجھے کچھ نظر نہ آیا۔

"کیا کوئی سگنل ہے؟" غالب نے چلو بھر کے گارڈ کے چہرے پر چھڑکاؤ کرتے ہوئے کہا۔

"نظر تو نہیں آیا ابھی تک۔"

"ابھی دیولالی تو نہیں آسکتا" غالب نے کہا۔

"مجھے کیا معلوم" میں نے کہا "ہم نے نہ شاہ پور گزرتا دیکھا

اور نہ کلسوبانی کا اسٹیشن۔"

گارڈ تھوڑا سا کراہنے لگا "اسے ہوش آرہا ہے۔"

میں نے کہا "مجھے ایک سگنل کی لال روشنی دکھائی دے رہی ہے۔ یہ آؤٹر سگنل ہوگا۔"

گاڑی کی رفتار بتدریج کم ہو رہی تھی۔ فولادی پہیوں پر بریک لگنے سے پیدا ہونے والی چرچر کی آوازیں بڑھ گئی تھیں۔

"غالب! یہ ہوش میں آبھی گیا تو اس کے حواس اتنی جلدی بحال نہیں ہوں گے۔"

"پھر کیا کرنا چاہئے؟" غالب نے کہا۔

"ہمیں یہ شیشہ صاف کردینا چاہئے۔ اور اس تابوت کو بھی پھینک دینا چاہئے" میں نے کہا "کوئی اسٹیشن آنے سے پہلے۔"

"اسٹیشن آنے سے پہلے؟"

"ہاں۔ ورنہ معاملہ مشکوک نظر آئے گا" میں نے کہا اور تابوت کا نصف حصہ اٹھا کے دوسری پٹڑی پر پھینک دیا جو ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ ایک چھناکا ہوا اور اندھیرے میں ڈوب گیا۔ اتنی دیر میں غالب نے وہ تابوت کھینچ لیا جس میں ہم نے محسن کو بند کیا تھا۔ اس نے تابوت کو بھی پٹڑی پر پھینک دیا۔ میں ہاتھ پر ایک کپڑا لپیٹ کر شیشہ سمیٹنے لگا۔

"کوئی ٹرین آرہی ہے سامنے سے" غالب نے کہا

"تابوت کو دوسری طرف ڈالنا تھا۔ عقل مند آدمی۔"

"بس خیال نہیں رہا۔ تم نے جو کیا وہی میں بھی کر بیٹھا" غالب نے پریشانی سے کہا "اب کیا ہوگا؟ ٹرین الٹ تو نہیں جائے گی۔"

"لکڑی کے ایک باکس سے؟ نہیں" میں نے کہا "کتنی دور ہے ابھی ٹرین؟"

"پتا نہیں۔ بس روشنی نظر آرہی ہے۔"

"ہو سکتا ہے، اسٹیشن پر رکی ہوئی ہو" میں نے شیشے کی کرچیوں کے ڈھیر کو باہر کی جانب کردیا۔

"دیکھ یار، کہیں ہاتھ نہ کٹ جائے۔ جھاڑو یا برش جیسی کوئی چیز نہیں ہے کیا؟"

"نظر تو نہیں آئی۔ تلاش کرنے میں وقت ضائع ہوتا میں نے گارڈ کے کپڑے ہاتھ پر لپیٹ رکھے ہیں" میں نے کہا اور احتیاط کے ساتھ بڑے ٹکڑے اٹھا کر پھینکنے کے بعد چھوٹی کرچیوں کو پیر سے کھسکا کے نیچے گرادیا۔ صرف باریک باریک ذرات اور دور تک کونوں میں پھیلے ہوئے چھوٹے ٹکڑے باقی رہ گئے تو میں نے ہاتھ پر لپٹے ہوئے کپڑوں کو کھول دیا۔ یہ گارڈ کے ذاتی استعمال کے کپڑے تھے۔ لٹھے کا پجامہ اور قمیص۔ شیشوں کی دھار سے کٹ جانے کے بعد یہ استعمال کے ناقابل ہوگئے تھے۔ میں نے انہیں جھاڑن کی طرح فرش پر مار مار کے باقی صفائی بھی کردی۔ اب گارڈ کے ڈبے

میں شک پیدا کرنے والی کوئی چیز نہیں رہی تھی۔ اسی وقت ما[illegible] گاڑی جھٹکا لے کر رک گئی۔

"یہ گاڑی کیوں کھڑی ہوگئی ہے آخر؟"

"میرا خیال ہے کہ پہلے وہ گاڑی گزرے گی جو اسٹیشن پر کھڑ[illegible] ہوئی ہے" غالب۔ [illegible] کہا "وہ کوئی مسافر گاڑی ہوگی۔"

"اس کا مطلب ہے کہ بڑا اسٹیشن ہوگا ورنہ مسافر گاڑی [illegible] دیر نہ رکی رہتی" میں نے غور سے اس تیز روشنی کو دیکھا جو [illegible] ایک میل دور تھی اور ساکت محسوس ہوتی تھی۔ یہ انجن کی [illegible] لائٹ تھی۔ اس کے سوا کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔

"اگر یہ مسافر ٹرین ہوگی تو ریلوے لائن پر تابوت دیکھ کر [illegible] جائے گی۔"

میں نے کہا "مال گاڑی ہوگی تب بھی رک جائے گی۔"

"بشرطیکہ ڈرائیور کی نظر نے پٹڑی پر کوئی چیز دیکھ لی اور وہ بر[illegible] لگانے میں کامیاب رہا۔ ورنہ.........."

"ورنہ کیا! پرخچے اڑ جائیں گے تابوت کے۔ انجن کے [illegible] جو ایک جالی سی ہوتی ہے نا، وہ گائے بھینس کو بھی پہیوں کے [illegible] نہیں آنے دیتی۔ گھسیٹتی ہوئی آگے لے جاتی ہے" میں نے [illegible] "تابوت کسی بھینس سے زیادہ بڑا اور وزنی تو نہیں۔ ویسے بھی [illegible] سے ٹوٹ گیا ہوگا۔"

"پھر بھی ڈرائیور اتر کے دیکھے گا تو سہی کہ کیا چیز ہے جو پٹڑی [illegible] رکھی گئی تھی" غالب نے کہا۔

"اب دیکھتا ہے تو دیکھے۔ اس کو اندازہ ہو ہی جائے گا کہ [illegible] لکڑی کا خالی باکس تھا یا تابوت تھا۔ کوئی کٹی ہوئی لاش بھی [illegible] معاملہ سنگین ہوتا۔ اس فضول سی چیز کے لئے تفتیش نہیں [illegible] کیوں کہ نقصان کوئی نہیں ہوا۔"

تابوت کوئی دو فرلانگ پیچھے رہ گیا تھا۔ میں نے مال گاڑی [illegible] انجن کو دیکھنے کی کوشش کی مگر مجھے صرف روشنی دکھائی دی [illegible] اندھیرے جنگل کے دونوں جانب پھیلی ہوئی تھی۔

"مرزا جی! اگر یہ ٹرین بھی اسٹیشن پر رکی تو کیا ہوگا؟" [illegible] کہا۔

"کیا ہوگا؟"

"میں کبھی ریلوے گارڈ نہیں رہا۔ میں کیا بتاؤں۔"

"اتفاق سے ناچیز کے ساتھ بھی یہی ہوا کہ ماں باپ دون[illegible] ڈاکٹر تھے اور میں ایم آر ایس کے چکر میں پڑنے سے پہلے صحافی [illegible]" غالب بولا "مجھے بھی نہیں معلوم کہ گارڈ کے فرائض کیا ہوتے [illegible] اور اسے کیا کچھ کرنا پڑتا ہے۔"

میں نے گارڈ کی طرف دیکھا، وہ ہوش کی طرف بڑی [illegible] رفتار سے گامزن تھا۔

"فرض کرو، اسٹیشن پر مال لوڈ کیا گیا یا اتارا گیا۔ تو وصولیا[illegible] کاغذی کارروائی ہوگی۔"

"یہ خبیث اتنی دیر کیوں لگا رہا ہے آخر ہوش میں آتے ہوئے؟" غالب نے جھک کر اس کے منہ پر آہستہ آہستہ تھپڑ مارے اور بولا "اب اٹھ۔ بہت ہوگیا ڈراما۔"

میں نے چٹکی بجا کے کہا "مرزا! تم چیک تو کرو کہ اس کی بے ہوشی اصلی ہے یا محض اداکاری۔"

غالب نے تلاش کر کے شیشے کا ایک چھوٹا سا نوکیلا اور ٹکڑا اٹھالیا۔ اس کی نوک سے غالب نے گارڈ کی ناک کو چھوا مگر اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

میں نے کہا "ٹرین آرہی ہے۔ اس کے گزرتے ہی یہ ٹرین چل پڑے گی۔"

غالب نے مایوسی سے سر ہلایا "چوٹ سر پر ہے اور [illegible] شدید ہے۔"

اسی وقت مجھے خیال آیا کہ کہیں گارڈ نے وہ بات تو نہیں سن لی تھی جو میں نے غالب سے کہی تھی۔ وہ ٹیسٹ کے لئے تیار تھا اس لئے ہلا بھی نہیں، نوکیلے شیشے کی چبھن کو برداشت کرگیا۔ میں نے اس کے پھٹے ہوئے کپڑوں کا ایک دھاگا کھینچ کر بل دیا اور دبے پاؤں گارڈ کے قریب جا کے بتی اس کی ناک میں ڈال دی۔

اس کا RESPONSE بالکل نارمل تھا۔ ایک عام آدمی کی طرح جو نیند میں ہو۔ اس نے سر کو دائیں بائیں جھٹکا لیکن آنکھیں نہیں کھولیں۔ غالب نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

ساتھ والے ٹریک پر تیز روشنی پڑ رہی تھی اور میں بھی قریب آتی ہوئی ٹرین کے شور میں ہونے والے مسلسل اضافے کو محسوس کر رہا تھا۔ ایک منٹ سے بھی کم وقت میں ٹرین ہمارے قریب سے گزرنے والی تھی۔

میں اٹھ کھڑا ہوا "ایسے تو پتا نہیں چلتا یار۔ اب تو صرف ایک ہی صورت باقی رہ گئی ہے۔"

"وہ کیا؟"

"میں اس کے کپڑے پہن لیتا ہوں" میں نے گارڈ کو سنانے کے لئے صاف اونچی آواز میں کہا اور نگاہ اس کے چہرے پر مرکوز کردی۔

غالب میری بات کا مدعا سمجھ گیا "اور اس کا کیا ڈسپوزل ہوگا؟"

"فالتو چیزوں کا ڈسپوزل کیا ہوتا ہے؟ اسے ہم پھینک دیں گے ٹرین کے سامنے۔"

"ڈرائیور دیکھ لے گا۔"

"یار، میں آنے والی ٹرین کی بات نہیں کر رہا تھا۔ تم بھی احمق ہو" میں نے کہا۔

اسی وقت مسافر ٹرین دندناتی ہوئی ہمارے قریب سے گزری، [illegible] شور میں میری آواز دب گئی۔ مسافر گاڑی کے باہر کی [illegible] لائٹ روشن تھی مگر کھڑکیوں کے پیچھے اندھیرا تھا جس کا مطلب

تھا کہ سب مسافر لائٹ بجھا کے سو رہے ہیں۔ جو نہیں سو سکتے ہوں گے وہ بھی خاموش لیٹنے پر مجبور ہو گئے ہوں گے۔

مال گاڑی نے ایک جھٹکا لیا تو میں نے پیچھے ہٹ کے دیکھا۔ آؤٹر سگنل کی روشنی سبز ہو گئی تھی۔

غالب کی نظر دم بہ دم دور ہونے والی مسافر گاڑی پر تھی۔ پھر اس نے بڑی مسرت کے ساتھ اعلان کیا "ٹرین نہیں رکی۔"

"گڈ۔ تابوت تو پرزہ پرزہ ہو گیا ہو گا" میں نے کہا اور گارڈ کے کپڑے اتارنے لگا "ٹرین ذرا اسپیڈ پکڑ لے تو اس کو پیچھے گرا دیں گے۔ بعد میں آنے والی کوئی گاڑی اس کا قیمہ بنا دے گی"

میری بات کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ گارڈ ایک دم اٹھ بیٹھا۔

"بڑی جلدی ہوش آیا" غالب نے ایک لات مار کے اسے ایک غلیظ گالی دی۔

گارڈ کراہنے لگا "مجھے مت مارو۔"

"اور پھر کسے ماریں!" غالب نے اس کی پسلیوں میں دوسری ٹھوکر ماری "سؤر کے بچے! مکر کر رہا تھا۔ سیدھا کھڑا ہو جا۔"

وہ اٹھتے ہوئے لڑکھڑایا مگر سنبھل کے کھڑا ہو گیا اور پتلون کے بٹن بند کرنے لگا "دیکھو۔ تم جیسا کہو گے میں ویسا ہی کروں گا' جب گاڑی اسٹیشن پر رکے گی۔ مجھے ٹوکن دینا بھی ہو گا اور لینا بھی۔ ہر اسٹیشن پر۔ یہ کام تم نہیں کر سکو گے۔"

"اگر کام اتنا ہی ہے تو ہم کر لیں گے" میں۔

"تمہیں کوئی نہیں جانتا" وہ ہانپتے ہوئے بولا "اگر تم نے ایک اسٹیشن گزار دیا تو اگلے اسٹیشن پر ٹرین کے پہنچنے سے پہلے تمہارے سواگت کی پوری تیاری ہو گی۔ تمہارے دو ریوالور تمہیں نہیں بچا سکیں گے۔"

میں نے غالب کی طرف دیکھا اور غالب نے میری طرف۔ شاید گارڈ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ جان کے خوف نے اسے رضاکارانہ طور پر اپنی خدمات پیش کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"اچھا تو پھر تیار رہو جاؤ" میں نے کہا "اسٹیشن پر کسی کو تمہاری صورت سے یا حالت سے کچھ معلوم نہیں ہونا چاہئے۔"

غالب نے اسے دھکیل کر باہر کھڑا کر دیا "ہم اندر سے تم پر نظر رکھیں گے۔ کوئی آئے تو اس سے ہندی یا انگریزی میں بات کرنا۔"

"میری گولی کا نشانہ تمہارا سر ہو گا" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "میں دل کو نشانہ بناؤں گا۔"

"اگر تمہاری زبان سے ایک بھی غلط لفظ نکلا۔ یا تمہاری کسی حرکت پر ہمیں شک ہوا تو......"

"میں وعدہ کر چکا ہوں۔ اس لئے کہ نوکری کی تھوڑی سی تنخواہ کے لئے میں مرنا نہیں چاہتا۔ بتیس سال گزر گئے' اب تو پنشن ہونے والی ہے" وہ گڑگڑانے لگا۔

میں نے اس کے منہ پر الٹے ہاتھ کا طمانچہ مارا "ایسے مظلوم بن کے الو مت بناؤ ہمیں۔ تم ریلوے کے ملازم نہیں تریونی کے زر خرید غلام ہو۔ جتنی پنشن تمہیں ریلوے دے گی اس سے کہیں زیادہ تم کو مل چکا ہو گا۔ اور ہر ماہ ملتا ہو گا۔ سب معلوم ہے ہمیں۔"

ٹرین ایک اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر پہنچ چکی تھی اور رکنے ہی والی تھی۔ میں اور غالب دروازے کے دونوں طرف چھپ کر کھڑے ہو گئے۔

"تازو پریشان ہو گی" غالب نے آہستہ سے کہا۔

"جاؤ اسے تسلی دے آؤ گلے لگا کے" میں چڑ گیا "میرے پاس تو اس کی پریشانی کا کوئی علاج ہے نہیں۔ اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ ہم کوئی آئس کریم لانے نہیں گئے تھے۔ کتنی دیر لگتی ہے اس کام میں۔ یہ بتا کے نہیں آئے تھے۔"

غالب شرمندہ نظر آنے لگا تو مجھے افسوس ہوا کہ میں نے اس سے اتنے سخت لہجہ میں بات کی۔

"آئی ایم سوری یار" میں نے ایک گہری سانس لی "یہ نروس ٹینشن ہے۔"

غالب سر ہلا کے مسکرایا "میں نے برا تو نہیں مانا۔"

"اسٹیشن سے نکل جائے گاڑی۔ پھر اس سے پوچھتے ہیں روانگی سے پہلے یا بعد میں کیا ہوا تھا۔"

"آسانی سے کچھ بتانے والا نہیں لگتا یہ شخص" غالب نے کہا۔

"مشکل طریقے بھی ہیں ہمارے پاس۔ ہمارا کیا جاتا ہے اپنی ہڈی پسلی ایک کروائے گا یا جان سے جائے گا۔"

"سکندر! اسے مارنا نہیں ہے ابھی۔ جب تک ہم زندہ ہیں۔ اس کے بغیر گاڑی نہیں چل سکتی......"

میں نے اسے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے خاموش کر دیا۔ کوئی ہمارے قریب آ رہا تھا اور پتا نہیں کون سی بھاشا میں شور کر رہا تھا۔

"چلاتا کیوں ہے؟ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ بخار ہے مجھے' اس لئے خود اتر کے نہیں آیا" گارڈ نے کہا۔

آنے والا لائن مین جیسی وردی میں تھا اور ٹوکن دے رہا تھا۔ "ابھی اپن کو نہیں مالوم تھا۔ تم کیسے آگیا پھر؟"

"میری مرضی۔ بھیجنے والوں کی مرضی" گارڈ نے برہمی سے کہا۔

"ابھی گرم کاہے کو کریلا ہے۔ اپن تم کو کل دیکھا' واپس پڑا تھا۔ ایسا ما فک پوچھا" اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ پھر ٹوکن لے کر چلا گیا۔

میں نے قدرے بلند آواز میں پوچھا "ٹرین یہاں کتنی دیر رکی رہے گی؟"

گارڈ نے پلٹ کے دیکھا "دس منٹ۔"

میں نے غالب سے کہا "تم جا کے تازو کو بتا دو۔ بلکہ بہتر ہو اسی کے پاس ٹھہرو۔"

"میں جا کے واپس بھی آ سکتا ہوں...... دس منٹ بہت ہیں"

"اسے ابھی مت بتانا۔ جو ہم نے یہاں دیکھا ہے۔"

"کیا فائدہ؟ کتنی دیر چھپا سکتے ہیں آخر ہم یہ بات" غالب نے کہا اور پلیٹ فارم پر اتر گیا۔

گارڈ نے کہا "کیا میں اندر آ جاؤں؟"

"نہیں۔ جب تک ہم اسٹیشن کی حدود سے نہیں نکلتے' تم باہر رہو۔ معلوم نہیں کون کس وقت آ جائے۔"

"کوئی نہیں آئے گا۔ مجھے چکر آ رہے ہیں۔ میں اتنی دیر کھڑا نہیں رہ سکتا" وہ چلا کے بولا "گر جاؤں گا یہاں بے ہوش ہو کے"

"او کے۔ اندر آ جاؤ لیکن تم نے چکر دینے کی کوشش کی تو۔"

"بار بار مت دھمکی دو۔ مجھے معلوم ہے کہ میری زندگی کی تمہارے لئے کوئی اہمیت نہیں" وہ اندر آ کے بینچ پر گر گیا۔

"تمہارے آقاؤں کے نزدیک کیا اہمیت ہے انسانی زندگی کی؟" میں نے کہا "وہ دن رات تھوک کے بھاؤ زندگی کے بدلے موت کا سودا کرتے ہیں۔ اور جتنے بے آسرا' بے قصور اور بے زبان لوگ ان کی ہوس کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں' ان کے ہر قطرہ خون کی قیمت سے ان کی تجوریاں بھرتی جا رہی ہیں۔"

وہ مجھے حیرانی سے دیکھتا رہا "تم کیوں سر کھپاتے ہو ایسی فضول باتوں میں۔ کوئی کیا کرتا ہے اور کیا نہیں کرتا' اس کے متعلق سوچنے سے کیا ملتا ہے۔ تم پڑھے لکھے اور ذہین' باہمت اور نوجوان آدمی کس چکر میں پڑ گئے ہو۔"

"یہ بات تم جیسے لوگ نہیں سمجھ سکتے۔"

"میں تمہارے مقابلے میں جاہل اور بے وقوف آدمی ہوں۔ بزدل بھی ہوں۔ تم بے ضمیر بھی کہہ سکتے ہو۔ لیکن ایسی بھی کچھ باتیں ہیں جو تم نہیں سمجھتے۔ بہت بعد میں سمجھو گے' جب بہت نقصان اٹھا لو گے۔ اچانک تم کو احساس ہو گا کہ تم نے اپنا وقت اور اپنی انرجی ضائع کی۔ اس دنیا کو تم سیدھے راستے کی طرف ایک سوت دھکیلنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ کتے کی دم سیدھی کرنے کی کوشش اگر کامیاب ہو جائے۔ جو ناممکن ہے۔ تو اس سے حاصل کیا ہو گا؟ تمہیں یا دنیا کو یا خود کتے کو۔ اگر دم ٹیڑھی ہے تو کیا فرق پڑ رہا ہے۔"

"شٹ اپ" میں نے چلا کے کہا "میں اپنے اصول اور نظریات اور اپنا فلسفہ حیات سمجھانے نہیں آیا ہوں۔ سمجھ لو' ہم پاگل ہیں۔ مگر انسانی تہذیب کا وجود ایسے ہی پاگلوں کے دم سے ہے جو دنیا کو انسانوں کی منڈی نہیں سمجھتے۔ ارتقاء کو سمجھتے ہو؟ حیوان سے انسان بننے کا عمل جو کروڑوں برس سے جاری ہے اور ابھی ختم نہیں ہوا۔ انہی کا مرہون منت ہے جو سوچتے ہیں جسم کی حد سے آگے۔ جسم کی طلب محدود ہے۔ عیش و عشرت کی زندگی۔ شان و شوکت' ہوس اور غرور۔ دماغ کی سرحدیں لامحدود ہیں۔ ماضی سے مستقبل تک' زمین سے کائنات کی انتہا تک۔ یہ ٹرین جس پر تم سفر کر رہے ہو' کسی شراب و شباب کے رسیا شہزادے نے نہیں بنائی تھی۔ وہ بھی پاگل تھا۔ تم سوئچ دبا کے لائٹ جلا لیتے ہو۔ بلب کا موجد بھی پاگل کہلاتا تھا۔ گراہم بیل بھی پاگل سمجھا جاتا تھا' جس نے ٹیلیفون بنا کے چھوڑا۔"

میں نے ایک گہری سانس لی اور خاموش ہو گیا کیوں کہ ٹرین چلنے کا وقت ہو گیا تھا۔ میں تھک گیا تھا۔ میرے اعصاب پر شکست کے آثار ظاہر ہونے لگے تھے۔ پرسکون رہنا میرے اختیار کی بات نہیں رہی تھی۔ مجھے کوئی ضرورت نہیں تھی اتنا بولنے کی اور چلانے کی اور ایک گارڈ کو وہ بات سمجھانے کی جو کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ گارڈ کی طرح عام آدمی کی سوچ اپنی ذات کے تعلق تک محدود رہتی ہے۔ وہ خود' بیوی بچے' خاندان اور اس کا گھر۔ نہ وہ معاشرے کی ٹھیکیداری چاہتا ہے نہ مذہب کی اور نہ سیاست کی۔ وہ محنت کرتا ہے۔ کماتا ہے۔ جائز ناجائز کے چکر میں نہیں پڑتا۔ خود غرضی کے ساتھ اپنے مفادات کا تحفظ کرتا ہے اور بقاء کی جدوجہد میں کولہو کے بیل کی طرح ایک محدود دائرے میں گردش کرنے کو ہی زندگی سمجھتا ہے۔

غالب ابھی تک واپس نہیں آیا تھا مگر یہ میرے لئے تشویش کی بات نہیں تھی۔ میں اکیلا ہی گارڈ سے نمٹ سکتا تھا اور وہ سب کچھ معلوم کر سکتا تھا جو اس کے سوا کوئی بتانے والا نہیں تھا۔ بظاہر

گارڈ نے خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا اور فیصلہ کر لیا تھا کہ مزاحمت نہیں کرے گا۔ دلاور اور تریوینی سے خدمات کا معاوضہ وہ پہلے ہی وصول کر چکا ہو گا۔ ان خدمات میں دشمنوں سے مقابلہ کرتے ہوئے جان دینا شامل نہیں ہو سکتا تھا چناں چہ اس کی پوزیشن بالکل محفوظ تھی۔ وہ بعد میں کہہ سکتا تھا کہ میں اکیلا ان سب کے سامنے کیا کرتا۔ انہوں نے جبر اور تشدد سے کام لیا اور مجھے مجبور کر دیا۔

ٹرین کی رفتار بڑھنے لگی تھی کہ غالب نے چھلانگ مار کے ڈنڈے کو پکڑا اور اوپر آ گیا۔

"یہ آخری ڈبا تھا۔ اگر یہ ہاتھ سے نکل جاتا تو کیا ہوتا؟" میں نے کہا۔

"اس سوال کا جواب تو پرائمری کے بچے بھی دے سکتے ہیں" غالب نے افسوس سے سر ہلایا "میں وہاں ریلوے لائن پر پڑا ہوتا۔ یا گاڑی کے پیچھے دوڑ رہا ہوتا۔"

میں گارڈ کی طرف متوجہ ہو گیا کیوں کہ پلیٹ فارم کی حدود ختم ہو گئی تھی۔ غالب شاید دوڑ لگا کے آ رہا تھا۔ وہ میرے سامنے گارڈ کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

"ہمارے پاس وقت کم ہے" میں نے کہا "اس لئے جو بات آسانی سے بتا سکتے ہو اس کے لئے مشکل میں مت پڑنا"

"جو معلوم کرنا ہو وہ ہم لاش سے بھی معلوم کر لیتے ہیں" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "سب سے پہلے یہ بتاؤ کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا؟"

گارڈ نے سر پر ہاتھ لگا کے چوٹ کی جگہ کو محسوس کیا اور بولا۔ "میرے ساتھ دھوکا ہوا تھا۔ جس کو میں نے مُردہ سمجھا تھا وہ اچانک تابوت سے نکل آیا۔ میرا تو ہارٹ فیل ہو جاتا مگر اس کے اٹھنے سے پہلے ہی لڑکی نے ریوالور نکال لیا تھا اس لئے میں سمجھ گیا کہ نہ وہ بیوہ ہوئی تھی اور نہ کوئی مرا تھا۔ غصہ آنے کی تو بات تھی۔ میری جگہ تم ہوتے تو مسکرا کے اس زندہ ہو جانے والے مُردے سے مصافحہ نہ کرتے۔ میرا بلڈ پریشر ویسے بھی زیادہ رہتا ہے۔ میرے منہ سے گالی نکل گئی اور میں نے زنجیر کھینچ کر ٹرین رکوانے کی کوشش کی۔ عادت کے مطابق۔ لیکن اس لڑکی نے میرے سر پر ریوالور مار دیا۔ اس سے تو زیادہ چوٹ نہیں آئی تھی مگر میں چکرا کے گرا تو بینچ کا یہ کونا بھی اس جگہ لگا جہاں ریوالور کا دستہ پڑا تھا۔ بس میں بے ہوش ہو گیا اور ہوش میں آیا تو تم دونوں سامنے تھے۔"

میں نے اور غالب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ یہ بہت سیدھی سادی اور مختصر بات تھی مگر اس میں ہمارے کسی بھی سوال کا جواب نہیں تھا۔ ایسا تو ہونا تھا۔ ہمارا پلان یہی تھا مگر پلان کے خلاف جو کچھ ہوا تھا اس کے بارے میں گارڈ نے کوئی بات اشارتاً بھی نہیں کی تھی۔

میں نے سوالات کو ذہن میں ترتیب دیتے ہوئے کہا "وہ دونوں کہاں گئے؟"

"یہ میں کیسے بتا سکتا ہوں۔ میں تو۔۔۔"

"جھوٹ بک رہے ہو تم" میں نے ایک دم اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کا گلا دبوچ لیا۔

اس کی آنکھیں حلقوں سے ابلنے لگیں "نہیں۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میں بے ہوش ہو گیا تھا۔"

میں نے اس کی گردن پر گرفت سخت کر دی "وہ چلتی گاڑی سے نہیں کود سکتے تھے۔"

اس کا سانس رکنے لگا تو میں نے اسے چھوڑ دیا۔

غالب نے کہا "جب انہوں نے تمہیں ناک آؤٹ کیا تھا تو ٹرین بمبئی سے کتنے فاصلے پر تھی؟ یہ خوشگوار واقعہ کتنی دیر بعد پیش آیا؟"

"تقریباً آدھے گھنٹے بعد" وہ ہانپتے ہوئے بولا۔

"آدھے گھنٹے کا مطلب ہے صبح کے چھ بجے؟"

"نہیں۔ ساڑھے پانچ بجے۔ ٹرین پانچ بجے روانہ ہوئی تھی" گارڈ نے کہا۔

"تمہیں بتیس سال ہو گئے ریلوے کی نوکری کرتے۔ اتنے تجربے کے ساتھ تم ٹرین کی رفتار کا اندازہ آسانی سے کر سکتے ہو۔ ٹرین کتنی دور آ گئی تھی؟"

"میرا خیال ہے پچیس کلو میٹر۔ اس وقت رفتار کم تھی۔ اتنی ہی ہو گی شاید۔"

"اس شخص نے تابوت سے نکلنے کے بعد تم سے کوئی بات نہیں کی تھی؟"

گارڈ نے نفی میں سر ہلایا "بات کرتا تو میں کب سنتا۔"

میں نے کہا "اس نے دوسرے تابوت کو دیکھ کر بھی کچھ نہیں کہا تھا؟"

"دوسرا تابوت!"

میں نے اس کے منہ پر مکا مارا "انجان مت بنو۔ دوسرا تابوت بمبئی میں ہی رکھوا دیا گیا تھا۔"

گارڈ کا ہونٹ کٹ گیا تھا اور دانتوں سے خون رس رہا تھا "شیشے کا باکس تھا۔ تابوت نہیں تھا" اس نے کراہتے ہوئے کہا۔

"اس میں کون تھا؟"

"کوئی بھی نہیں۔ خالی باکس تھا۔"

میں نے دوسری مرتبہ پھر وہیں مُکا مارا۔ اس کے سامنے والے دو دانت نکلنے لگے اور وہ درد کی شدت سے چلانے لگا۔ دونوں ہاتھ منہ پر رکھ کے اس نے خون کے بہاؤ کو روکنے کی بے کار کوشش کی۔

سب سے بڑا مسئلہ وقت کی کمی کا تھا۔ کچھ دیر میں سورج نکل آتا تو ہم کچھ بھی نہ کر پاتے۔ ابھی اندھیرا ہمارے لئے پردہ فراہم کر رہا تھا اور اگلے اسٹیشن پر پہنچنے سے پہلے ہمیں اپنا کام ختم کرنا تھا۔ زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے میں۔

گارڈ مزید کچھ بتانے پر آمادہ نظر نہ آتا تھا یا شاید اتنا ہی جانتا تھا جتنا بتا چکا تھا۔ اگر وہ کچھ چھپا رہا تھا تو اُس سے سچ اگلوانے کے مؤثر طریقے آزمائے جا سکتے تھے مگر عملاً کچھ کرنے کا وقت تفتیش میں گزار کے ہم خود اپنے لئے وہ مسائل پیدا کر سکتے تھے جو آخر کار ہمارے منصوبے کی ناکامی کا سبب بن جاتے۔

میں نے غالب کو دیکھا تو وہ بھی گارڈ پر نظر رکھے کسی سوچ میں مبتلا تھا "تم کیوں اپنی زندگی کے دشمن ہو رہے ہو۔"

اس نے تلخی سے کہا "کیا تم خود اپنی زندگی کے دشمن نہیں ہو! جو کچھ تم کر رہے ہو یہ جینے کے ڈھنگ تو نہیں ہیں۔ جا کے دیکھو تمہاری عمر کے لوگ اس وقت کیا کر رہے ہیں۔ ہوٹلوں اور نائٹ کلبوں سے لے کر اپنی خواب گاہوں تک۔۔۔۔ کہاں کہاں وہ کس کس کی آغوش میں سمائے ہوئے ہیں۔ راحت اور آسودگی کے احساس کی دولت کے ساتھ۔۔۔۔"

میں نے اس کے سر پر مُکا مارا۔

وہ چکرا کے گرا اور پھر کھڑا ہو گیا "میں۔۔۔۔ صرف یہ کہنا چاہتا تھا۔۔۔ کہ ہر شخص کے جینے کا انداز الگ ہے اور اپنا ہے۔ چنانچہ ایسے ہی ہم سب اپنی اپنی موت مریں گے' اپنے وقت پر' اپنے انداز میں۔ نہ تم میری موت کے وقت کا تعین کر سکتے ہو اور نہ یہ بتا سکتے ہو کہ مجھے موت کیسے آئے گی۔ اس طرح میں۔۔۔۔ کیا کہہ سکتا ہوں کہ۔۔۔"

"فلسفی کی اولاد" میں نے پھر اس کے مُکا مارا اور اس کا سر لکڑی کی دیوار سے ٹکرایا "زندگی اور موت کے اسرار و رموز مت سمجھاؤ ہمیں۔ یہ بتاؤ کہ شیشے کا خالی تابوت، کس نے رکھوایا تھا' اور کیوں؟"

"میں نے اُن سے بھی پانچ ہزار لئے تھے۔ انہوں نے کہا تھا کہ تم کوئی سوال نہیں کرو گے" وہ بولا "صرف خاموش رہنے کے پانچ ہزار دئے تھے انہوں نے۔ پھر مجھے کیا ضرورت تھی ان سے نام پتا پوچھنے کی اور شیشے کے باکس بنوا کے میرے پاس رکھوانے کا مقصد معلوم کرنے کی۔ جب میں ایک لاش والا تابوت لے جانے پر تیار ہو گیا تھا تو اس خالی تابوت پر مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا جس میں کچھ بھی نہیں تھا۔"

میں نے غالب کی طرف دیکھا تو وہ بھی الجھن میں مبتلا نظر آیا۔ گارڈ یا تو سچ بول رہا تھا یا جھوٹ بولنے کا ماہر فن تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ دلاور اینڈ کمپنی نے تابوت خالی ہی رکھوا دیا ہو۔ غالب نے بھی صرف تابوت دیکھا تھا۔ اس نے تابوت لانے والوں کی صورت بھی نہیں دیکھی تھی اور دور سے تابوت کے اندر کچھ نظر آنا محال تھا۔

میں نے غالب کی طرف دیکھا "کیا پتا یہ ٹھیک ہی کہہ رہا ہو۔"

غالب نے سر ہلایا "ابھی اس کی بات مان لینے کے سوا چارہ نہیں۔"

"یاد کرو تم نے کیا دیکھا تھا۔"

غالب کا چہرہ سپاٹ رہا "صرف تابوت' میں قریب جانے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔ اور دور سے اندھیرے میں کیا نظر آ سکتا تھا۔"

"او کے۔ فی الحال ہم مان لیتے ہیں کہ تابوت خالی تھا اور یہ بھی چال ہو گی دشمنوں کی۔ وہ چاہتے ہوں گے کہ جب تابوت لایا جائے تو ہم دیکھ لیں۔ لیکن اس کے حصول کی کوشش کریں تو یہ ہوا کو مٹھی میں بند کرنے کی کوشش ثابت ہو۔"

"وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہے۔"

"اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے مرزا جی" کہ انہوں نے شہلا کو اور محسن کے بیٹے کو کہاں رکھا ہو گا۔"

"وہ اسی ٹرین کی کسی بھی بوگی میں ہو سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "کسی بھی بوگی میں۔ مال گاڑی تو بہت لمبی ہے۔ پچاس بوگیاں تو ہوں گی اس میں۔"

"اس میں باون بوگیاں ہیں" گارڈ بولا۔

میں نے اس اطلاع کو نظر انداز کر دیا "اُن کے پاس تو بس دو ہی بوگیاں ہیں۔"

"دو بوگیاں تو انہوں نے اپنا مال بھیجنے کے لئے حاصل کی تھیں" غالب نے کہا "خواجہ سیمنٹ والوں کی بکنگ منسوخ کرا کے۔ لیکن اس ڈرامے کا مقصد ہمیں گمراہ کرنا بھی تو ہو سکتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ ہم ان کے پیچھے لگے ہوئے ہیں اور ان کی تمام نقل و حرکت پر نظر رکھتے ہیں۔ ان کے ہر کام اور ہر منصوبے کی تفصیل جان لیتے ہیں اور کسی نہ کسی ذریعے سے ہمیں سب معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔"

"شک تو مجھے بھی ہے کہ سب سے آگے اور پیچھے والی بوگیوں میں کچھ نہیں ہو گا۔ یہ محض دھوکا دینے کی کارروائی ہے" میں نے اس سے اتفاق کیا "اصل مال کسی اور بوگی میں ہو گا' غالباً اسی آئل ٹینکر میں۔۔۔۔"

"جس کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے۔"

"لیکن گارڈ صاحب تو جانتے ہوں گے۔"

"میں صرف یہ بتا سکتا ہوں کہ کون سی بوگی کس کی ہے اور اس میں کس قسم کا سامان ہے لیکن یہ ضمانت نہیں دے سکتا کہ سامان وہی ہو گا جو ظاہر کیا گیا ہے۔ میں کسی باکس یا پیٹی' بوری یا بلٹی کو کھول کے نہیں دیکھتا۔ دیکھ بھی نہیں سکتا" گارڈ نے کہا۔

"وہ فہرست کہاں ہے۔ جس میں بوگیاں بک کرانے والوں کے نام ہیں۔"

گارڈ نے کاغذات کا ایک پلندہ مجھے تھما دیا جو ایک شیلف پر رکھا ہوا تھا "تم کیا پڑھو گے اس تحریر کو' کاربن کاپی ہے اور وہ بھی

ریلوے والوں کے ہاتھ کی۔ عدالت کے منشی اور تھانے کے محرر یا ڈاکٹر کے نسخے کی طرح یہ بھی ایسی زبان ہے....."

غالب نے کہا "اچھا بک بک مت کرو۔ تم پڑھ کے بتاؤ۔"

"جب تمہیں ہندی نہیں آتی" گارڈ نے کہا "تو پھر تمہیں کیسے معلوم ہوگا کہ میں نے وہی پڑھا ہے جو لکھا ہوا ہے؟"

میں مشتعل ہوکے اسے جان سے مار دیتا مگر غالب نے مجھے روک لیا۔ گارڈ پہلے ہی زخمی تھا اور معمولی مار بھی برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ اس کے باوجود وہ فضول بولنے سے باز نہیں آرہا تھا۔ دو منٹ میں اس کی ساری ہڈیاں توڑ کے اسے چلتی گاڑی سے نیچے پھینکا جاسکتا تھا مگر ابھی ہمیں اس کی ضرورت تھی۔

"ہم ہر بوگی کو چیک کریں گے" غالب نے کہا "ہم تم پر بھروسا نہیں کرسکتے۔ اس لئے بہتر ہے..."

"کہ تم سے تعاون کروں؟" گارڈ نے غالب کی بات کاٹ دی۔ "ٹھیک ہے سرکار۔ میں تعاون کروں گا' اپنی جان بچانے کے لئے۔ مجھے بہت کم امید ہے کہ تم میری جاں بخشی کرو لیکن کوشش مجھے ضرور کرنی چاہئے زندہ رہنے کی۔"

میں نے کہا "تم فہرست کو چھوڑو' ٹرین روکو۔"

"ٹرین روکوں؟ یہاں....." وہ بوکھلا گیا۔

"ہاں۔ اسی جگہ۔ بریک لگاؤ" میں نے اسے گالی دے کر کہا۔

"ہم تلاشی لیں گے۔"

"پوری ٹرین کی؟" غالب نے کہا۔

"لیکن کیسے ... سب بوگیاں مقفل ہیں۔ سیل لگی ہوئی ہے سب پر" گارڈ پریشان ہوکے بولا۔

"سیل اور قفل توڑنا آتا ہے ہمیں۔"

"اسٹیشن بہت قریب ہے" گارڈ نے کہا۔

میں نے کہا "کون سا اسٹیشن؟ کیا وہاں گاڑی رکے گی؟"

"نہیں۔ بہت چھوٹا سا قصباتی اسٹیشن ہے۔"

"بس تو پھر گاڑی کو اسٹیشن پر روک لو" میں نے ایک نیا خیال آتے ہی کہا "اسٹیشن کا عملہ کتنے افراد پر مشتمل ہے؟"

"تین چار افراد ہوں گے۔ اسٹیشن ماسٹر جو بکنگ کلرک بھی ہے۔ دو لائن مین۔ ان میں سے ایک کانٹا بدلتا ہے۔ شاید کوئی بھنگی چپراسی بھی ہوگا صفائی کا کام کرنے کے لئے۔ چار سے زیادہ نہیں ہوسکتے۔"

"ان کا رابطہ اگلے اسٹیشن سے ہوگا۔ وہ انہیں سگنل دیتے ہوں گے کہ مخالف سمت سے آنے والی ٹرین کے لئے کون سی لائن خالی ہے۔"

"ویسے تو اگلے اسٹیشن والوں کو معلوم ہوتا ہے۔ پھر بھی کلیرنس ضروری ہوتی ہے کہ غلطی سے بھی حادثہ نہ ہو" گارڈ نے کہا۔

"ٹھیک ہے" میں نے کہا "اب کلیرنس ہماری مرضی سے دی جائے گی' تمہارا کام ختم۔"

گارڈ کا چہرہ لمحے بھر کے لئے فق ہوا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ [...] منصوبہ کیا ہے۔

"ایسا مت کرو' بہت سے بے گناہ مارے جائیں گے [...] ٹرینوں کی آپس میں ٹکر ہوگئی" وہ چلایا۔

میں نے کہا "ہزار دو ہزار بے گناہ دنیا میں ہر روز مارے جاتے ہیں۔ جنگ میں لڑنے والے کم مرتے ہیں بے گناہ شہری زیادہ [...] ہوتے ہیں۔ زلزلہ آئے یا سیلاب' بارش نہ ہونے سے قحط [...] ایٹم بم گرے... ہر صورت میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ بوڑھے [...] عورتیں' سب بے گناہ ہی مرتے ہیں لیکن یہ تو ازل سے ہو رہا [...] اور ابد تک ہوتا رہے گا۔ خواہ تم اسے نوشتہ تقدیر کہو یا قدرت [...] ستم ظریفی۔ مگر تم ہونی کو انہونی نہیں کرسکتے۔"

[...] نے کہا "آؤٹر سگنل گزرا ہے ابھی ابھی۔ بریک لگا [...] چیخ کر کہا "نہیں' میں یہ نہیں کروں گا۔ تم مجھے [...] مگر میں اس [...] کے منصوبے میں تمہاری مدد نہیں کرسکتا [...] اس ٹرین [...] مسافر گاڑی سے لڑانا چاہتے ہو۔"

"یہ ضروری تو نہیں کہ سامنے سے مسافر گاڑی ہی آرہی ہو [...]" غالب نے میرے پلان کو سمجھنے کے بعد کہا "اگلے ایک گھنٹے [...] سامنے سے کتنی گاڑیاں آئیں گی؟"

"جس حساب سے گاڑیاں کراس کرتی رہی ہیں اس سے [...] اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کم سے کم دس" میں نے کہا۔

"ان میں سے چھ سات مسافر گاڑیاں ہوں گی۔ ایک [...] گاڑی اور ایک آئل ایکسپریس" گارڈ نے کہا' جواب کچھ مطمئن [...] نظر آنے لگا تھا۔

"آئل ایکسپریس' تیل لے جانے والی تیز رفتار گاڑی [...]"

میں نے کہا "اس کا کیا ٹائم ہے؟"

"اگر لیٹ نہ ہو..... تو سوا آٹھ..... ساڑھے آٹھ کے درمیان وہ یہاں سے گزرے گی۔"

"اس سے اچھی کیا بات ہوسکتی ہے" میں نے کہا "تم [...] بریک لگاؤ گے یا میں تمہارا کام تمام کرکے یہ کام کروں۔"

گارڈ نے ایمرجنسی بریک لگائے۔ گاڑی کی رفتار ایک دم [...] ہوگئی۔ ویکیوم کی آواز کے ساتھ ہی لوہے کے پہیوں پر [...] رگڑنے کی کرخت آواز سنائی دینے لگی۔ پہیئے جام ہوکے لائن پر [...] پھسلتے جارہے تھے اور لوہے کی رگڑ سے ریلوے لائن پر چنگاریاں اڑنے لگی تھیں۔

غالب نے جھانک کر باہر دیکھا "صرف ایک پلیٹ فارم [...] ایک یا دو کمروں کی چھوٹی سی عمارت ہے۔ صرف ایک شخص [...] فارم پر کھڑا ہوا ہے۔ اب دوسرا بھی نکل آیا ہے۔"

میں غالب کی رننگ کمنٹری سن رہا تھا مگر گارڈ کی طرف [...] غافل نہیں تھا۔ اس نے موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی [...] میرے ریوالور پر جھپٹا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کرپاتا' میرا وہی ہاتھ گھوما جس میں ریوالور تھا۔ ضرب اس کے چہرے کے بجائے کچھ نیچے پڑی۔ اس کے پاؤں اکھڑ گئے۔ ایک جھٹکے سے وہ پیچھے گیا اور توازن کھو بیٹھا۔ میرا خیال ہے کہ نیچے گرنے سے پہلے ہی اس کی گردن ٹوٹ چکی تھی۔ چند سیکنڈ بعد میں نے اسے ریلوے لائن سے لڑھک کر نیچے کی جانب ایک گڑھے میں گرتے دیکھا جہاں وہ ساکت پڑا رہا۔ اس کا سر اتنا پیچھے کی طرف مڑا ہوا تھا کہ مضحکہ خیز لگتا اور یہ ثبوت تھا اس بات کا کہ اس کی گردن ٹوٹی ہوئی ہے۔

میں نے کہا "غالب صاحب' ایکشن کے لئے تیار ہو جاؤ۔"

"یہ ایک دم پروگرام کیسے بدل گیا؟"

"کوئی پروگرام نہیں بدلا" میں نے کہا۔

"اسٹیشن پر گاڑی رکوانا ہمارے پلان میں شامل نہیں تھا" غالب نے کہا۔

"گاڑی جنگل میں کھڑی ہو یا اس ویران اسٹیشن پر' کیا فرق پڑتا ہے۔"

"نازو کو بھی بتانا ضروری تھا۔"

"اسے خود معلوم ہو جائے گا۔ جلدی کیا ہے" میں نے کہا۔ "نیچے اتر کے اطمینان سے چلتے جاؤ۔ اسٹیشن کے عملے کو میں قابو کرلیتا ہوں۔ تم نازو کے ساتھ مل کے ٹرین کے ڈرائیور کو ساتھ لے آؤ۔"

"ٹرین ڈرائیور پیچھے دیکھ رہا ہے" غالب بولا "کہیں اسے شک نہ ہو جائے۔"

"شک ہونے دو۔ وہ ٹرین لے کر فرار نہیں ہوگا اور نہ ٹرین چھوڑ کر" میں نے پلیٹ فارم پر کودتے ہوئے کہا۔

آگے میں نے نازو کو پلیٹ فارم پر اترتے دیکھا۔ شاید اس نے اندازہ کرلیا تھا کہ عمل کی گھڑی آگئی۔

پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے دونوں افراد میں سے کون اسٹیشن ماسٹر تھا اور کون لائن مین۔ یہ ان کی صورت دیکھ کر نہیں بتایا جاسکتا تھا۔

"تم سیدھے نکل جاؤ" میں نے غالب سے کہا "وہ دیکھو ڈرائیور اتر کے آرہا ہے۔ آگے کہیں کانٹا بدلنے والا ملے گا' تم اسے پکڑ لاؤ۔ نازو کو اپنے ساتھ لے جاؤ اگر چاہو۔"

"میں ایسا ضرور چاہوں گا" غالب نے کہا۔

میں اطمینان سے چلتا ہوا اس دھوتی والے کی طرف بڑھا جو ٹرین کے رکنے پر اور گارڈ کے نظر نہ آنے پر حیران پریشان نظر آتا تھا۔ وہ چالیس پینتالیس سال کا چرخ شخص تھا۔

"تم اسٹیشن ماسٹر ہو؟" میں نے کہا۔

اس کے ساتھی' نسبتاً صحت مند اور جوان لڑکے نے تیز لہجے میں کہا "اور نہیں تو کیا تم ہو۔"

میں نے جملہ پورا ہوتے ہی اس کے منہ پر ایسا چانٹا مارا کہ وہ بھونچکا رہ گیا۔ اسے قطعی امید نہ تھی کہ میرا ردِ عمل اتنا شدید بھی ہوسکتا ہے۔ اس کا گال طمانچے سے لال پڑ گیا تھا۔

"تم سے کس نے بھونکنے کو کہا ہے؟" میں نے کہا۔

وہ ابھی تک گال پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا' جہاں میری چار انگلیوں کے واضح نشان نظر آرہے تھے "مجھے کتا کہا تم نے؟"

میں نے اس کو آگے بڑھتا دیکھا اور اس کے دوسرے گال پر دوسرے ہاتھ سے زیادہ بھرپور طمانچہ مارا "تم بلاوجہ بھونکنے والے کتے ہو" میں نے صاف لہجے میں کہا۔

"اجی' یہ سب کیا ہے' کاہے کی مارا ماری ہے" دھوتی والا اسٹیشن ماسٹر بدحواس ہوکے بولا "کون ہو تم آخر اور گارڈ بابو کہاں ہیں۔"

"وہ پرلوک گئے ہیں" میں نے یوں کہا جیسے وہ کسی کام سے گئے ہیں اور لوٹ آئیں گے "بڑی مشکل سے بھیجا انہیں ہم نے۔"

دو جھانپڑ کھا کے حوصلہ ہار جانے والا لڑکا اب مجھے کینہ پرور نظروں سے گھور رہا تھا اور یہ اندازہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ حلئے سے اور اندازِ گفتگو سے تو میں بدمعاش نہیں لگتا۔ مگر میرے جیسے ڈیل ڈول والے شخص سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کی خاطر لڑنا کس حد تک گھاٹے کا سودا ہوسکتا ہے۔ میری قوت کا اندازہ اس نے تھپڑوں سے ضرور کرلیا ہوگا۔ میرے جارحانہ عزائم تعارف کے انداز سے ہی واضح ہوگئے تھے۔ اس نے آخرکار بے عزتی کو پی جانے کا غیر جذباتی فیصلہ کیا۔ سوائے ایک شخص کے کسی نے یہ بے عزتی نہیں دیکھی تھی لیکن اس کی جوابی کارروائی کا انجام کیا ہوگا۔ یہ سمجھنا اس کے لئے مشکل نہ تھا۔

"میں پوچھتا ہوں جی کہ یہ گاڑی یہاں کیوں رکی ہوئی ہے؟" اسٹیشن ماسٹر نے کہا "اور اسے کیوں مار رہے ہو تم؟"

میں نے کہا "اسے بات کرنے کی تمیز سکھانا ضروری تھا۔ گاڑی یہاں میں نے نہیں روکی' گارڈ بابو نے رکوائی ہے۔"

"پر کیوں جی؟" وہ بولا "یہاں تو اسٹاپ نہیں ہے اس کا' سگنل بھی کھلا ہوا ہے۔ گارڈ بابو خود کہاں ہیں آخر؟"

اب میں نے ایک چانٹا اسٹیشن ماسٹر کے بھی رسید کیا "ابھی بتایا تھا کہ وہ پرلوک گئے ہیں۔ کیا تم بھی جانا چاہتے ہو۔"

اس نے ایک چیخ ماری "اجی مار دیا' منہ پر اتنے زور کا چانٹا مار دیا جی۔ اب تو کیا کھڑا منہ دیکھ رہا ہے میرا۔"

"وہ اپنا منہ دیکھ رہا ہے" میں نے کہا "اس کے دونوں جبڑے ہل گئے ہیں نا۔ لو وہ اپنے ڈرائیور صاحب بھی آگئے۔ ان سے پوچھو گاڑی کیوں روک دی انہوں نے۔ کہیں ان کا ارادہ بھی پرلوک جانے کا نہ ہو۔"

"سب کو پرلوک بھیج کے خود کیا نرک میں جاؤ گے" لڑکا غصے سے بولا "میرے ابا کو کیوں مارتے ہو۔"

میں نے کہا "یہ حرامی تمہارا بیٹا ہے۔"

"حرامی بولا جی" اسٹیشن ماسٹر اچھلا "ابھی تو سن رہا ہے سب چپ چاپ۔ یہ تیری ماں پر الزام لگاتے جی' تیرے باپ کو مارتے جی۔ تو اصلی حرامی ہے۔ ابھی میرے کو معلوم ہوگیا جی۔"

میں نے اسے گھما کے کہا "اندر چلو' سور کے بچے۔"

لڑکا ایک دم پلٹ کے مجھ پر حملہ آور ہوا۔ میں نے اس کے پیٹ میں مُکا مارا۔ وہ بلبلا کے دہرا ہوگیا اور زمین پر لوٹنے لگا۔ میں نے اسے کھینچ کر پیروں پر کھڑا کردیا۔ اسٹیشن ماسٹر کی حالت غیر ہوگئی۔ وہ تھر تھر کانپ رہا تھا اور اپنے بیٹے کو بھی سنبھال رہا تھا۔

دور سے میں نے نازو کو اور غالب کو دیکھا۔ وہ ڈرائیور کو ہانک کر لا رہے تھے۔ ڈرائیور نے اسٹیشن ماسٹر اور اس کے بیٹے کی پٹائی کا پورا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ وہ گھنی سیاہ داڑھی والا بھاری بھرکم شخص تھا جو بڑے اطمینان سے مسکراتا ہوا آ رہا تھا۔ نازو اور غالب اس کے پیچھے کسی بات پر آپس میں الجھے ہوئے تھے۔ ریوالور غالب کے ہاتھ میں ضرور تھا لیکن خانہ پُری کے انداز میں۔ اگر ڈرائیور اچانک پلٹ کے کوشش کرتا تو شاید ریوالور اس سے چھین سکتا تھا۔ پھر نازو کو ہی ڈرائیور سے نمٹنا پڑتا۔

ایک مختصر سے کمرے میں ایک میز کے ساتھ دو کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ دیوار پر ایک الماری نصب تھی۔ شاید اس میں ٹکٹ ہوں گے یا کاغذات۔ باپ بیٹا دونوں مل کے یہاں سارے فرائض انجام دیتے ہوں گے۔ پسنجر ٹرین پر سوار ہونے کے لئے آس پاس کے علاقے سے دیہاتی آجائیں تو انہیں ٹکٹ دینا اور کوئی یہاں اترے تو اس سے ٹکٹ لینا' مال مویشی بک کرنا' حساب کتاب رکھنا اور ریلوے کے قواعد و ضوابط کے مطابق ریلوے اسٹیشن کے جملہ امور نمٹانا اسٹیشن ماسٹر کا کام تھا' مگر اس نے اپنی سہولت کی خاطر لڑکے کا نام بھی عملے میں شامل کرلیا تھا اور اسے لائن مین کی حیثیت سے تھوڑی بہت تنخواہ بھی مل جاتی تھی۔ وہ افسوس ناک حد تک بزدل اور کمزور لڑکا تھا۔ اس نے طیش میں آکے حملہ تو کردیا تھا مگر ایک مکے میں اس کا برا حال ہوگیا تھا۔ وہ ابھی تک ہائے ہائے کر رہا تھا اور باقاعدہ رو رہا تھا۔ اس کا باپ اب اسے تسلی دے رہا تھا۔ "اجی چپ کر جاؤ جی' اتنا کاہے کو روتے ہو جی۔ یہ ظالم لوگ پتا نہیں کہاں سے آگئے ہماری جان کے دشمن۔ ان سے لڑنا بے کار ہے جی۔ یہ مار ڈالیں گے....."

میں نے کہا "بند کرو اپنی بک بک' سیدھے کھڑے ہو جاؤ۔"

وہ ایک دم خاموش ہوگیا۔ اس کا بیٹا بھی سیدھا کھڑا ہوگیا۔ باہر سے غالب اور نازو کے لڑنے کی آواز اب صاف سنائی دے رہی تھی۔ نازو خفا تھی کہ اسے بتائے بغیر ہم نے منصوبہ بدل دیا اور اتنی دیر تک اس کی خبر بھی نہیں لی۔

"کیا ہوتا اگر پہلے تمہیں بتا دیتے....." غالب نے ڈرائیور کے پیچھے اندر آتے ہوئے کہا "ہر بات عورتوں کو بتانے کی نہیں ہوتی۔"

"ابھی سب کے سامنے بتاؤں تمہیں....." نازو بگڑ کے بولی۔

"بس" میں نے ہاتھ اٹھا کے کہا "باقی لڑائی فرصت کے وقت کرنا۔"

ڈرائیور جو اسٹیشن ماسٹر کے قریب پہنچ کے رک گیا تھا ابھی تک مسکرا رہا تھا۔

میں نے کہا "آپ بہت خوش نظر آتے ہیں۔"

"خوشی کا مقام ہے" اس نے داڑھی پر ہاتھ پھیر کے کہا۔ "مدت سے آرزو تھی' اللہ نے آج پوری کی۔"

"رحمت علی ہم سے غائبانہ متعارف ہیں" غالب نے کہا "اور ہمارے عقیدت مندوں میں شامل ہیں۔"

"بہت کچھ سنا اور پڑھا تھا آپ کے بارے میں سکندر صاحب" ڈرائیور نے کہا اور مصافحے کے لئے آگے بڑھا مگر ہاتھ ملانے کے بعد اس نے عید ملنے کے انداز میں مجھے تین بار سینے سے لگالیا۔ یہ سب کچھ اسٹیشن ماسٹر نے بڑے دکھ کے ساتھ دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں رحمت علی کے لئے وہی نفرت تھی جو ایک متعصب ہندو کے جذبات کی ترجمانی کرتی تھی۔ اس کی نظر میں رحمت علی غدار تھا۔ شاید ہر مسلمان ناقابلِ اعتبار تھا۔ تاہم وہ ہمارے تعلقات کی نوعیت کو سمجھنے سے قاصر تھا اور شاید یہ سوچ رہا تھا کہ رحمت علی کو میرا نام پہلے سے معلوم تھا تو یہ چکر کیا ہے۔

میں نے کہا "رحمت علی' کیا انجن خراب ہوگیا ہے؟"

وہ چونکا "انجن" پھر اس نے میرا مطلب سمجھ لیا "ہاں جناب' انجن بالکل خراب ہوگیا ہے۔"

غالب نے کہا "زمانہ ہی بڑا خراب ہے۔ انجن کا کیا قصور۔"

میں نے کہا "ہاں' اولاد تک خراب ہوگئی ہے۔ اس میں بھی اولاد کا کیا قصور۔"

"میں آپ کے ساتھ ان کو نہیں دیکھ رہا ہوں' جن کا نام آپ کے ساتھ ہی آتا ہے۔ جیسے منکر نکیر کا" رحمت علی بولا۔

"محسن..... پیچھے رہ گیا ہے" میں نے کہا "کچھ کام تھا" اور اسٹیشن ماسٹر کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"تمہارے علاوہ کتنے آدمی اور کام کرتے ہیں یہاں؟"

"آدمی تو میں اکیلا ہوں جی" وہ بولا "باقی ایک نمونہ تو یہ رکھا ہے جی آپ کے سامنے۔ شرم آتی ہے اس کو بیٹا کہتے۔ چار جماعتوں کے بعد بڑا عالم فاضل ہوگیا تھا جی' اس لئے نام لکھوا دیا اس کا صفائی کرنے والوں میں۔ تھا بھی یہ بھنگی بننے کے لائق جی۔"

"تم رہتے کہاں ہو؟" میں نے اِدھر اُدھر دیکھا مگر مجھے کوئی فیملی کوارٹر نظر نہ آیا۔ اسٹیشن کے آگے پیچھے سب ویرانہ تھا۔

"اُدھر اپنا گھر ہے جی" اس نے اشارے سے بتایا "ہوگا یہاں سے آدھا پونا میل دور۔"

"عملے میں اس کے علاوہ کون ہے؟"

"چندو ہے جی۔ بیٹھا ہوگا پریشان کہ گاڑی کیوں رک گئی' سگنل تو ڈاؤن ہے۔"

غالب اور نازو کی طرف دیکھا "جاؤ بھئی' چندو کو بھی آؤ۔ پریشانی دور کرو اس کی۔"

غالب اور نازو کے جاتے ہی میں نے رحمت علی سے کہا "کتنا عرصہ ہوگیا ہے تمہیں اس لائن پر چلتے؟"

"آٹھ سال جناب!" وہ بولا۔

"پھر تو تمہیں سب گاڑیوں کے بارے میں معلوم ہوگا کہ کون گاڑی کب گزرتی ہے یہاں سے۔"

"بالکل معلوم ہے جناب۔ ابھی بس دو منٹ میں فاسٹ ایکسپریس گزرے گی....." اس نے جیسے ریلوے ٹائم ٹیبل پڑھنا شروع کردیا جس میں متعدد اپ ڈاؤن ٹرینوں کے نمبر آتے تھے۔

میں نے کہا "بس بھئی' سارے دن کا نہیں پوچھا ہے میں نے۔"

اسی وقت زمین میں گڑگڑاہٹ پیدا ہوئی اور چند منٹ میں فاسٹ ایکسپریس دندناتی گزر گئی۔ جب پھر خاموشی ہوئی تو میں نے اسٹیشن ماسٹر کی طرف دیکھا۔

"تم بے کار کیوں کھڑے ہو جی؟ ٹرین کا انجن خراب ہوگیا ہے۔"

"پھر میں کیا کروں جی۔ آپ کی مرضی کے بغیر ہلوں گا بھی تو آپ مار دوگے۔ بڑا بھاری ہاتھ ہے جی آپ کا۔ اس جیسے تو بہت دیے ہیں بھگوان نے۔ لیکن میں تو ایک ہی باپ ہوں سب کا۔ چتنی کا بھی اکلوتا پتی ہوں جی۔"

"ان حالات میں جو تم کو کرنا چاہئے وہ کرو" میں نے کہا۔ "اطلاع بھیجو آگے یا پیچھے کہ مال گاڑی یہاں کیوں رکی ہوئی ہے۔"

اس نے دیوار پر لگے ہوئے قدیم وضع کے فون کا ریسیور اٹھا کے ایک ہینڈل گھمانا شروع کیا۔ یہ مواصلاتی رابطے کا ذریعہ میں نے ریلوے کے علاوہ فوج میں بھی استعمال ہوتے دیکھا تھا لیکن یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اس نظام کو مطلوبہ نمبر ڈائل کرنے کے لئے کیسے استعمال کیا جاتا ہے۔

کئی بار ہینڈل گھمانے کے بعد آخر کار کسی نے اس کے ایس اوایس کا جواب دیا۔ اتنی دیر میں غالب اور نازو بھی لوٹ آئے تھے۔ شاید مسمی چندو انہیں باہر نکلتے ہی مل گیا تھا۔ وہ لائن مین سے زیادہ ایک فلمی ہیرو تھا جس نے دلیپ کمار اسٹائل میں بال بناتے برقرار رکھے تھے۔ پرانی جینز کی پتلون اور آدھی آستین کی رنگین شرٹ میں وہ بڑی شان سے سینے پر ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ اس کا رنگ توے جیسا کالا نہ ہوتا تو شاید وہ فلمی دنیا میں داخلے کی کوشش بھی کرتا' مگر اس کے رنگ کی انڈسٹری کو بالکل ضرورت نہیں تھی۔ فلمیں اب رنگین بن رہی تھیں اور کوئی ایکسٹرا تک کالا نہیں تھا۔

"اجی میں اور کیا بک رہا ہوں" اسٹیشن ماسٹر نے فون میں چلاتے ہوئے کہا "آپ سنو بھی تو میری بات۔ انجن خراب ہوگیا ہے انجن... کیا جی.... اجی مجھے کیا معلوم..... میں نے معائنہ نہیں کیا ہے انجن کا.... اجی میں کیا بتاؤں..... بس کھڑا ہوگیا ہے... نہیں جی..... بالکل نہیں چلتا..... ہل بھی نہیں سکتا جی اپنی جگہ سے..... ٹرین؟ اجی ٹرین کیا بغیر انجن کے بھیج دوں... وہ بھی کھڑی ہے اسٹیشن پر... ہے رام.... آخر میں کیا کروں۔ کیسے سمجھاؤں جی تمہیں... لو بات کرلو رحمت سے' رحمت ڈرائیور سے۔"

ریسیور رحمت علی کو تھما کے وہ ہانپنے لگا۔ غالب نے کہا "تم بغیر فون کے بھی بات کرسکتے تھے۔ آواز تو پہنچ ہی جاتی۔"

اسٹیشن ماسٹر نے ماتھے پر ہاتھ مارا "ایک دم بہرا ہے جی۔ علاج بھی نہیں کراتا۔ ایک بات کو دس بار کہنے سے سمجھتا ہے پھر بھی غلط سمجھتا ہے۔ ٹیلی فون کرتا ہوں جی تو دمہ ہو جاتا ہے مجھے۔"

"اس نے کیا کہا ہے؟"

"کچھ نہیں جی' وہ بھی کیا کرے گا۔ آگے بتا دے گا۔ یہاں فالتو انجن کس کے پاس ہے۔ دو تین گھنٹے تو لگ جائیں گے دوسرا انجن آتے آتے۔"

اب رحمت علی چیخ چیخ کے انجن کی خرابی کے بارے میں تفصیلات بتا رہا تھا اور اعلان کر رہا تھا کہ گاڑی اس وقت تک کھڑی رہے گی جب تک دوسرا انجن نہیں آجاتا۔ آج آئے یا کل۔ اس نے دھڑ سے ریسیور دیوار پر دے مارا۔

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے" میں نے کہا "کہ ہمارے پاس دو تین گھنٹے ہیں۔"

"کس لئے جی؟" اسٹیشن ماسٹر بولا "کیا کرنا چاہتے ہو تم؟"

"پہلے ہمیں بتائیے کہ یہ کیا اسٹوری ہے" چندو نے کسی ہیرو کی طرح [illegible] بولا "تم ٹرین کے گارڈ تو نہیں ہو۔ اور یہ لڑکی..... اس کو ہم نے کہاں دیکھا ہے؟"

میں نے کہا "نازو۔ اس کو بتاؤ۔"

نازو نے بڑی ادا سے کہا "میرے چندا۔ تم نے مجھے خوابوں اور خیالوں میں دیکھا ہوگا۔ ہے نا یہی بات؟"

"ضرور تم فلموں میں کام کرتی ہو۔ ہم سمجھ گئے۔ یہ کسی نئی فلم کا یونٹ ہے۔ کوئی شاٹ لینے آئے ہو تم لوگ لیکن اور سب کہاں ہیں۔ کیمرا مین..... تم کون ہو۔ ہدایت کار..... اور تم کیا ہو۔ خیر' معلوم ہو جائے گا" اس نے نازو کی طرف ہاتھ بڑھایا "ہم بمبئی جانے ہی والے تھے۔ بمبئی خود چل کے ہمارے پاس آگئی۔ ہم چندو کمار ہیں سندری۔"

نازو نے مسکرا کے ہاتھ آگے بڑھایا۔ اس کے بعد وہی ہوا جس کے لئے میں اور غالب تیار تھے۔ نازو نے ایک جھٹکے سے ہیرو کو اوپر اٹھایا۔ ہوا میں ایک چکر دیا اور اچھال کے چھوڑ دیا۔ وہ میرے قدموں میں آگرا اور چند لمحے سیدھا بے حس و حرکت پڑا چھت کو گھورتا رہا۔ خود اسٹیشن ماسٹر اور اس کے لائق فائق سپوت کے مُنہ حیرت سے کھلے رہ گئے تھے۔ اتنا عجیب اور ناقابلِ یقین منظر انہوں نے عملی زندگی میں کہاں دیکھا ہوگا۔ فلموں میں شاید دیکھا ہو مگر وہ سب کیمرے کا کمال ہوتا ہے۔

میں نے چٹکی بجا کے کہا "چلو ہیرو' کھڑے ہو جاؤ فوراً دوسرے

شاٹ کے لئے۔ امید ہے پوری اسٹوری تمہاری سمجھ میں آگئی ہوگی۔"

وہ بڑی مشکل سے کراہتا ہوا اٹھا "ہائے، ہم تو مر گئے۔ کچھ نہیں بچا۔ ساری ہڈیاں ٹوٹ گئیں۔"

"دل ٹوٹ گیا، خواب ٹوٹ گئے" نازو نے کہا "اب کچھ یاد آیا کہ مجھے پہلے کہاں دیکھا تھا۔"

چندو دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھ گیا۔ اس کی نظر نازو پر جم کے رہ گئی تھی۔ اس کے حسن کی آب و تاب ہی کم خیرہ کُن نہ تھی۔ پھر اچھے خاصے فلمی ہیرو کو چٹکیوں میں اڑا کے وہ رہی سہی کسر پوری کردیتی تھی اور آدمی کی عقل خبط ہو جاتی تھی۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ یہ حقیقت ہے۔

"نازو۔ تم ہیرو کو لے جاؤ۔ اسے سگنل دینے کے لئے موجود رہنا چاہئے۔ ورنہ دونوں طرف سے آنے والی گاڑیاں باہر ہی رک جائیں گی۔ معمول کے مطابق ہر ٹرین کو سگنل ڈاؤن ملنا چاہئے۔ میں اور غالب اسٹیشن ماسٹر کے ساتھ ہیں" میں نے کہا۔

"آؤ میرے کالے چاند" نازو نے ہاتھ بڑھا کے کہا "ہم ان سب سے دور چلے جاتے ہیں جہاں ہم دونوں کے سوا کوئی نہ ہو۔ اور میں اچھی طرح سمجھا دوں کہ تم ہیرو ہو یا زیرو۔"

چندو ہاتھ جوڑنے لگا "ہمیں معاف کردو، ہم زیرو بھی نہیں۔ ہماری بہن ہو تم، ہماری اماں ہو۔"

لیکن نازو نے اسے کھینچ کے اٹھالیا اور گھسیٹ کر باہر پھینک دیا۔ وہ گرتے ہی اٹھا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کے نزدیک اب جان بچانے کی یہی ایک صورت تھی۔ مگر وہ مشکل سے چند قدم دوڑا تھا کہ نازو نے نشانہ لے کر فائر کیا۔ وہ ایک چیخ مار کے پلیٹ فارم پر گر گیا۔

اسٹیشن ماسٹر نے اچھل کے چلّانا شروع کیا "مرڈر ہو گیا جی۔ ہائے ہائے۔ گولی ایک دم ماردی جی۔ کیسا ظلم ہے جی۔"

میں نے اسے ڈانٹ کر اپنے ریوالور کا رخ اس کی طرف کردیا۔ "مرڈر اب ہوگا جی، اگر تم نے حلق سے کوئی بھی آواز نکالی۔"

اس نے ایک ہاتھ منہ پر رکھ لیا۔ مجھے یقین تھا کہ نازو نے چندو کو ڈرانے کے لئے فائر کیا ہوگا۔ وہ اسے گولی مارنے کی غلطی نہیں کرسکتی تھی۔ چند سیکنڈ بعد جب نازو نے اسے لات مار کے اٹھنے کو کہا تو اسے یقین آیا کہ گولی اس کے کان کو چھو کے گزر گئی تھی۔ اس کا آدھا کان اڑ گیا تھا اور زخم سے خون بہہ رہا تھا۔ چندو کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور آواز کانپ رہی تھی۔ اور اسے زندہ بچ جانے کی اتنی خوشی نہیں تھی جتنا ایک کان سے محروی کا دُکھ تھا۔ رنگ تو بھگوان نے جیسا دیا تھا بدلا نہیں جاسکتا تھا، اب ایک کان بھی کم ہوگیا تھا چنانچہ اس کے فلمی مستقبل کے خواب بھی تاریکی میں ڈوب گئے تھے۔ وہ کان پر رومال رکھ کے رو رہا تھا۔ نازو نے اسے حکم دیا کہ اسے دوسرا کان عزیز ہے تو رونا دھونا بند کرے اور آگے چلے۔ اس نے فوراً تعمیل کی۔

"یہ خاتون نے کوئی عقل مندی نہیں کی تھی" میں نے کہا "نشانہ خطا ہو جاتا تو۔"

"یہ ایک حاسدانہ بیان ہے" غالب نے کہا "ورنہ تم کو اس کے نشانے کی تعریف کرنی چاہئے۔ کتنی صفائی سے کان اڑایا تھا اس نے۔"

"نہ اس کا نشانہ کبھی اتنا اچھا تھا اور نہ میرا۔ یہ محض اتفاق ہے۔ چند سوت کا فرق بھی پڑ جاتا تو گولی سر میں گھس جاتی" میں نے کہا "تمہاری بات اور ہے۔"

باہر اب صبح کا اجالا پھیل چکا تھا۔ میں نے اسٹیشن کے دوسرے کمرے میں جھانک کر دیکھا تو مجھے ایک چارپائی اور کچھ برتن نظر آئے۔ یہ ایک امید افزا بات تھی۔

"تمہارا یہ عالم فاضل بیٹا اور کیا کرسکتا ہے؟ کچھ چائے وغیرہ کا انتظام....."

"کیوں نہیں جی۔ آپ حکم کرو" اسٹیشن ماسٹر بولا "ایسی چائے تو سورگ میں بھی نہیں ملے گی۔"

لڑکا بڑی پھرتی سے اٹھا اور دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

میں نے کہا "چائے پلا کے ہمیں سورگ پہنچانے کی کوشش مت کرنا۔ ہم زہر سے مرنے والے نہیں ہیں۔"

"گڑ سے مرجاتے ہیں البتہ" غالب نے سرہلا دیا۔

"آپ کیسی باتیں کرتے ہو جی، رام رام۔"

میں نے کہا "چائے پہلے تم خود پیو گے، پھر ہم پئیں گے۔"

یہ محض ایک دھمکی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ایسی کوشش کرہی نہیں سکتے۔ انہیں زہر کہاں دستیاب ہوگا پھر ان کی حالت ایسی تھی کہ زہر ہوتا تب بھی وہ زہر دینے کی ہمت کہاں سے لاتے۔

میں نے اسٹیشن ماسٹر سے ریلوے ٹرینوں کے بارے میں ضروری معلومات لیں، تصدیق رحمت علی کرتا گیا۔ کون سی ٹرین کب آئے گی۔ کس وقت کہاں ہوگی۔ کون سی جگہ مال گاڑی کو سامنے سے آنے والی ٹرین سے ٹکرانے کے لئے موزوں ترین ہے۔ اسٹیشن کے آگے کہاں موڑ ہے، کہاں چڑھائی یا اترائی ہے۔ کہاں ندی نالے کا پل ہے۔

تیل لانے والی گاڑی ہر اعتبار سے ہمارے مقاصد کے لئے بہترین تھی۔ اس میں جانی نقصان کم سے کم تھا۔ بلکہ نہ ہونے کے برابر تھا لیکن تباہی مکمل تھی۔ رحمت علی نے اس پلان پر عمل در آمد کے سلسلے میں بڑی مفید رہنمائی کی۔ اس نے کاغذ پر ایک نقشہ بنا کے واضح کیا کہ اگلے اسٹیشن سے ساڑھے آٹھ بجے نکلنے والی آئل ایکسپریس آٹھ بج کر پچاس منٹ پر ایک برساتی دریا کا پل عبور کرے گی۔

"اگر یہاں سے مال گاڑی آٹھ چالیس پر نکلے تو دس منٹ بعد اسے بھی پل پر پہنچ جانا چاہئے" اس نے کہا۔

"جگہ تو خیر یہ اچھی ہے" میں نے کہا "پہنچ جانا چاہئے والا مسئلہ ذرا ٹیڑھا ہے۔"

غالب بولا "بہت کچھ ہونا چاہئے دنیا میں... مگر ہوتا نہیں۔ کوشش کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا" اس نے یوں کہا جیسے مشاعرے میں نظم پڑھ رہا ہے۔ "مثلاً میں کوشش کروں تو اس ٹرین کو اُڑا کے لے جا سکتا ہوں اور بحرالکاہل میں غرق کرسکتا ہوں" غالب نے کہا۔

رحمت علی ہنسنے لگا "آپ مذاق کیوں سمجھ رہے ہیں میری بات کو۔ جو میں نے کہا ہے وہ کر کے بھی دکھا سکتا ہوں جناب!"

"یہ کیسے ممکن ہے رحمت علی کہ ایک چھوٹے سے پل پر دونوں طرف سے دو گاڑیاں ایک ساتھ داخل ہوں۔ چند سیکنڈ کا فرق بھی نہ ہو ورنہ کوئی ایک ٹرین پل کو عبور کر جائے گی۔" غالب نے کہا "ہر ٹرین کی رفتار کیا ہوگی؟ پل کی لمبائی کتنی ہے۔"

"آئل ایکسپریس کی رفتار ہوگی پچیس تیس کلو میٹر" رحمت علی بولا "اور پل ہے تقریباً ایک فرلانگ۔"

"پھر تو سوال بہت آسان ہوگیا" غالب نے کہا "اب اپنی ٹرین کی رفتار لو، پھر دونوں ٹرینوں کی مجموعی لمبائی معلوم کرو، پھر یہ دیکھو کہ آٹھ بج کر پچاس منٹ پانچ سیکنڈ پر تمہاری ٹرین پل کا کتنا حصہ طے کرچکی ہوگی اور عین اسی وقت مخالف سمت سے آنے والی آئل ایکسپریس پل پر کہاں ہوگی۔ تصادم کس جگہ کتنے سیکنڈ کے بعد ہوگا۔"

میں نے سر کھجا کے کہا "یار مرزا جی! کیوں معاملے کو زلفِ یار کی طرح طول دے کر الجھاتے ہو۔ اس سوال کا جواب تو کمپیوٹر بھی نہیں دے سکتا۔ تم یہ بتاؤ رحمت علی کہ پل پر سے گزرنے میں ایک ٹرین کو کتنا وقت لگتا ہے۔"

"پوری ٹرین گزر جائے گی..... چار منٹ میں" اس نے سوچ کے جواب دیا۔

"چار منٹ تو بہت کم ہوتے ہیں۔ اگر ادھر سے آنے والی ٹرین کی رفتار میں کمی بیشی آگئی....."

"میرا خیال ہے کہ ہم پل پر گاڑیاں لڑانے کے امکانات کو بھول جائیں اور آسان کام کریں" غالب نے کہا۔

"آسان کام کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"بس کہیں بھی ہو جائے دھماکا۔ جگہ کا تعین نہ کیا جائے۔" غالب نے کہا "دونوں گاڑیاں ریموٹ کنٹرول ہوتیں اور کنٹرول ہوتا ہمارے ہاتھ میں، پھر بھی یہ مشکل تھا....."

رحمت علی جوش میں آگیا "آپ کمال بات کرتے ہیں جناب! میں نے پندرہ سال ڈرائیوری کی ہے۔ یہ مشینی گھوڑا میرا غلام ہے، میرے اشاروں پر چلتا ہے۔"

"بالکل چلتا ہوگا بھائی رحمت علی۔ لیکن دوسرے گھوڑے کی باگ تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے۔"

"اس کے علاوہ" میں نے کہا "تصادم کے وقت تمہارا جائے واردات....."

"جائے حادثہ" غالب نے میری تصحیح کی۔

"تم کو جائے حادثہ سے دور رہنا چاہئے۔ انجن کے اندر نہیں" میں نے کہا "ورنہ تمہارا نام و نشان بھی نہیں ملے گا۔"

"شہادت کی موت کا اعزاز چھیننا چاہتے ہیں آپ مجھ سے" وہ دُکھی لہجے میں بولا۔

"میرے نزدیک یہ خودکشی ہوگی" میں نے کہا "جو حرام ہے۔"

"ناگزیر خطرے کا مقابلہ کرتے ہوئے جان دینا بہادری ہے جانتے بوجھتے، آنکھیں بند کرکے اور عقل سے کام لئے بغیر موت کو گلے لگانا بے وقوفی" میں نے بھی کہا "یہاں تمہارا جان دینا قطعی بے مقصد اور غیر ضروری ہے رحمت علی۔"

وہ مایوس نظر آنے لگا "زندہ رہ کے میں کیا کروں گا جناب عالی۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تم مرنا چاہتے ہو کسی بہانے" میں نے کہا "آخر کیوں... مسلمان کی زندگی خدا کی امانت ہے اور یہ امانت خدا نے اسے بے مقصد گنوانے کے لئے نہیں دی ہے۔ جہاں تک ممکن ہو تم پر فرض بنتا ہے کہ اپنی زندگی کی حفاظت کرو۔ اسے ناکارہ اور فضول چیز سمجھ کے ضائع مت کرو۔ کیا معلوم آگے کب قدرت کی طرف سے تمہیں کوئی عظیم ذمے داری سونپ دی جائے۔ ایک زندگی کو بے وجہ اور بے مقصد گنوادوگے تو کسی عظیم تر مقصد کی خاطر شہادت پانے کے لئے دوسری زندگی کہاں سے لاؤ گے میرے بھائی!"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "شاید آپ نے ٹھیک ہی کہا ہے۔ مجھے موت کی آرزو کرنا چھوڑ دینا چاہئے اور جینے کی کوشش کرنی چاہئے مگر کوشش کے لئے خواہش کی شرط ہے اور جینا بہت مشکل ہوگیا ہے میرے لئے۔ موت کے تصور میں مجھے اپنی نجات محسوس ہوتی ہے۔ بڑا سکون ہے اس خیال میں۔"

"وقت کم ہے رحمت علی، اس لئے میں تم سے ابھی یہ نہیں پوچھوں گا کہ تم ایسا کیوں سوچتے ہو۔ فی الحال خودکشی کا خیال چھوڑ دو اور جو میں کہنا چاہتا ہوں وہ غور سے سنو۔"

اس نے بے دلی سے کہا "میں سن رہا ہوں جناب!"

"سامنے سے آنے والی آئل ایکسپریس تمہارے اندازے کے مطابق ٹھیک آٹھ بج کر پچاس منٹ پر یہاں ہوگی" میں نے پنسل سے نقشے پر نشان لگا کے کہا "جہاں سے پل شروع ہوتا ہے۔"

"ٹھیک کی جگہ جملے میں تقریباً کا لفظ شامل کیجئے" غالب نے کہا۔ "دو چار منٹ آگے پیچھے ہوسکتے ہیں کیونکہ گھڑیوں میں اور عورت ذات کی رائے میں ہمیشہ اختلاف پایا جاتا ہے۔"

"ٹرین جب اگلے اسٹیشن سے روانہ ہوگی تو ہمیں معلوم ہو جائے گا" رحمت علی بولا "یہاں گھنٹی بجے گی۔ اس کے ٹھیک دس منٹ بعد ٹرین پل پر ہوگی۔"

"گڈ! اب ہوئی نا صحیح بات" میں نے کہا "میں یہ چاہتا ہوں کہ تم پونے سات سے پہلے ہی اس مال گاڑی کو پل پر لیجاؤ اور بالکل بیچ میں روک لو۔"

غالب نے کہا "جب یہ ٹرین یہاں سے روانہ ہوگی تو کیا اگلے اسٹیشن پر گھنٹی نہیں بجے گی؟"

"بجے گی' مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ آؤٹر سگنل سے نکل کر ٹرین پٹری بدل لے گی" رحمت علی بولا "اور اسی ٹریک پر رک جائے گی جس پر آئل ایکسپریس کو آنا ہے۔ وہ لائن تو خالی ہوتی ہے اس لئے سامنے سے آنے والی ٹرین پوری رفتار سے گزر جاتی ہے۔"

"اگر ڈرائیور نے ٹرین کو دیکھ لیا..... تو کیا وہ بریک لگا کے گاڑی روک نہیں لے گا؟"

رحمت علی نے نفی میں سر ہلایا "مشکل ہے بلکہ ناممکن ہے۔ دور سے تو اندازہ ہوتا نہیں کہ ٹرین کس پٹری پر ہے اور یہ بھی پتا نہیں چلتا کہ ٹرین کھڑی ہوئی ہے یا چل رہی ہے۔ بہت قریب آ کے جب یہ انکشاف ہوتا ہے تو ایمرجنسی بریک لگانے سے بھی کچھ نہیں ہوتا۔"

میں نے کہا "صرف رفتار کی بات نہیں۔ آئل ایکسپریس کا MOMENTUM بہت ہوگا یعنی وزن اور رفتار۔ فٹ بال کو آپ روک سکتے ہیں مگر اتنی ہی رفتار سے ٹھوس لوہے کی گیند آئے تو اسے دیوار بھی نہیں روک سکتی۔ وہ دیوار گرا دے گی۔"

"اللہ بھلا کرے آپ کا ... آپ سمجھ گئے" رحمت علی بولا۔

"اب ایک نظر نقشے پر ڈالئے۔ یہ دیکھئے' یہاں ایک چھوٹی سی پہاڑی ہے' مشکل سے سو فٹ اونچی مگر اس کی وجہ سے ریلوے لائن گھوم کر آتی ہے اور پہاڑی عین برساتی ندی کے کنارے پر ہے۔ پہاڑی کے موڑ سے پُل کا فاصلہ سو گز بھی نہیں۔ موڑ کاٹتے وقت ٹرین کی رفتار کم نہیں ہوتی کیونکہ موڑ معمولی ہے۔ ڈرائیور کو ٹرین اس وقت نظر آئے گی جب انجن موڑ کاٹ کے سامنے آئے گا اور اس وقت وہ کچھ بھی نہیں کر پائے گا۔"

میں نے کہا "اگر ٹرینوں کا تصادم پُل پر ہو گیا تو پھر ہماری کامیابی بھرپور ہوگی۔ پل بکھر جائے گا اور سارے ڈبے ایک ساتھ نیچے جائیں گے۔"

"پل کی بلندی کیا ہے؟" غالب نے کہا۔

"ایک سو بارہ فٹ" ڈرائیور رحمت علی نے کہا۔

"ابھی تقریباً ایک گھنٹا چالیس منٹ ہیں ہمارے پاس" میں نے اپنی گھڑی میں وقت دیکھا "اسٹیشن ماسٹر صاحب' آپ بتائیں ریلوے کی سرکاری گھڑی کا وقت کیا ہے؟"

اسٹیشن ماسٹر چپ چاپ بیٹھا ہماری ساری گفتگو بڑی بے بسی کے ساتھ سن رہا تھا۔

میری بات پر وہ چونکا "اپنی گھڑی میں پانچ منٹ اوپر ہوئے ہیں جی۔"

"سات بج کر پانچ منٹ" میں نے کہا "ٹھیک ہے۔ اپنی اپنی گھڑیاں ملا لو۔ چائے پیو اور چلو۔"

اسٹیشن ماسٹر کے لڑکے نے چائے کی کیتلی ہمارے درمیان رکھ دی تھی۔ کپ نہایت بدوضع اور غلیظ تھے۔ ان کے کنارے ٹوٹے تھے اور ایک دو کے کنڈے بھی نہیں تھے مگر یہ موقع نخرے کا نہیں تھا۔ لڑکے نے ہر کپ میں چائے انڈیلی اور پھر خود بھی ایک طرف بیٹھ کے چسکی لگانے لگا۔ اس نے چائے کے تمام اجزا پانی میں ڈال کے خوب ابالے تھے چنانچہ یہ وہی لذیذ' خوش رنگ گاڑھا مشروب تھا جسے دیہات میں چائے سمجھ کے پیا جاتا ہے۔ باپ بیٹا سخت پریشان تھے کہ عین ان کے سامنے بیٹھ کے دہشت گرد ایک تخریب کاری کی واردات کا پروگرام بنا رہے ہیں اور ان کا ساتھ ایک غدار بھی دے رہا ہے مگر وہ کچھ نہیں کر سکتے۔ انہیں جان کی فکر پڑی ہوئی تھی کہ کہیں جاتے جاتے ہم انہیں مار نہ جائیں۔

باہر وقفے وقفے سے ٹرینوں کے گزرنے کا شور ہوتا تھا اور چند منٹ بعد پھر خاموشی چھا جاتی تھی۔ چائے ختم کرتے ہی مجھے سگریٹ کی طلب محسوس ہوئی۔ رحمت علی نے مجھے سگریٹ کی ڈبیا پیش کی۔

"یہ آپ کے لائق تو نہیں ہیں۔"

میں نے کہا "ضرورت میں سب چلتا ہے" اور ایک سگریٹ جلا کے ڈبیا اسے واپس کر دی "اب تم انہیں سنبھالو۔ ہم ذرا ٹرین کی تلاشی لیں گے۔"

"ان کی آپ فکر نہ کریں" رحمت علی بولا۔

"ریوالور کی ضرورت ہوگی تمہیں؟"

"بالکل نہیں' مکا مار کے میں ناریل توڑ دیتا ہوں' یہ تو کھوپڑیاں ہیں" وہ بولا۔

باہر نکل کے غالب نے کہا "رحمت علی کا مسئلہ کچھ نفسیاتی ہے۔ وہ ہمارا ساتھ اس لئے دے رہا ہے کہ اس طرح وہ اپنے جذبہ انتقام کی تسکین کر سکتا ہے۔"

"کچھ ایسی ہی بات نظر آتی ہے" میں نے کہا "فرصت ملی تو سنیں گے اس کی کہانی۔"

"یعنی اسے بھی ساتھ رکھیں گے ہم۔"

میں آخری بوگی کی طرف چلتا رہا "ہاں ... ابھی تو ساتھ رہے گا وہ بھی اور کہاں جائے گا۔"

"جہاں چاہے جائے۔ ہم اس کی ذمے داری قبول نہیں کر سکتے" غالب نے کہا۔ "ہمارا ساتھ دے کر اس نے اپنا مستقبل داؤ پر لگا دیا ہے۔ وہ ایک مجرم اور غدار سمجھا جائے گا اور سزائے موت سے نہیں بچ سکے گا۔"

میں نے ہنس کے کہا "ہاں' اگر وہ کسی کے ہاتھ آیا۔ ورنہ مرحوم سمجھا جائے گا اور پنشن کا حقدار ہو گا کیونکہ فرض ادا کرتے ہوئے مارا گیا۔"

"اسٹیشن ماسٹر اور اس کا بیٹا چشم دید گواہ ہیں۔ انہوں نے سب دیکھا ہے اور سنا ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ انہیں بھی ختم کر دینا

چاہئے ورنہ وہ رحمت علی کے خلاف بیان دیں گے تو ہمارا ذکر بھی کریں گے۔"

"کیا انہیں معلوم ہو گیا کہ ہم کون ہیں؟"

"ابھی معلوم نہیں تو بعد میں ہو جائے گا۔ جب حادثے کی انکوائری ہوگی" غالب نے کہا "چندو تیسرا گواہ ہوگا۔ ان تینوں کو مار دینے سے فائدہ یہ ہوگا کہ حادثے کو تخریب کاری کوئی نہیں کہے گا۔ یہی سمجھا جائے گا کہ غلطی کانٹا بدلنے والے کی تھی۔"

"کچھ لوگ اور بھی ہیں جو حادثے کے اسباب کو سمجھتے ہوئے حقیقت بیان کر دیں گے" میں نے کہا۔

غالب نے نفی میں سر ہلایا "سمجھنے کی حد تک ٹھیک ہے۔ ولاور اینڈ کمپنی کو معلوم ہو جائے گا۔ تریونی اور جیون پرشاد کو بھی معلوم ہو جائے گا مگر وہ ہمارے خلاف بیان دیں گے تو گویا خود اپنے خلاف بیان دیں گے۔ اسلحہ قانونی طور پر نہیں جا رہا ہے۔ تفتیش کرنے والوں کے لئے اس نتیجے پر پہنچنا مشکل نہیں ہوگا کہ ساری تباہی گولہ بارود کی وجہ سے ہے۔ اس کی کون ذمے داری قبول کرے گا۔ وزارتِ دفاع کا نام استعمال کرنے والے کیسے سامنے آ سکتے ہیں۔"

غالب نے سر ہلایا اور گارڈ کے ڈبے میں چڑھ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید گارڈ کے پاس بوگیوں کے قفل کھولنے والی چابیاں ہوں گی مگر وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ اگر چابیاں تھیں تو وہ گارڈ کی لاش کے ساتھ ہی گر گئی ہوں گی۔

اب تالے توڑے بنا چارہ نہ تھا۔ غالب نے پہلی بوگی کا قفل توڑنے کے لئے فائر کیا تو اس بات کا خیال رکھا کہ گولی پلٹ کر نہ آئے اور بوگی میں سوراخ کر کے بھی داخل نہ ہو۔ اگرچہ مجھے یقین تھا کہ اسلحہ اسی آئل ٹینکر میں ہوگا جس میں سے میں نے ایک آدمی کو برآمد ہوتے دیکھا تھا لیکن کسی دوسری بوگی میں اسلحے کی موجودگی کے امکانات کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔

"اس میں تو بوریاں ہیں" غالب نے پہلی بوگی کا گیٹ کھول کے جھانکا "غالباً پیاز ہے ..... اور آلو۔"

"ٹھیک ہے' آگے چلو۔"

غالب نے کہا "یار سکندر۔ وہ شیشے کا تابوت کیوں خالی تھا؟"

"میں کیا بتا سکتا ہوں؟"

"کہیں انہوں نے ..... شہلا کو تابوت سے نکال کے کسی دوسری بوگی میں نہ قید کر دیا ہو۔"

"اگر ایسا ہو گا تو معلوم ہو جائے گا۔"

غالب نے ڈبے میں سر ڈال کے آواز دی "شہلا!"

میں نے کہا "مرزا جی۔ عقل کی بات کرو۔ کیا وہ ہوش میں ہوگی اور آزاد ہوگی کہ تمہاری پکار سن کے جواب دے۔"

"مفروضات سے امید وابستہ کرنے میں کیا نقصان ہے یار۔ کیا ہوا اگر جواب میں شہلا کہے میں یہاں ہوں غالب۔ ناممکن تو کچھ نہیں ہوتا۔"

میں نے دوسری بوگی کا تالا توڑا۔ اس میں اور اگلی دس بوگیوں میں مختلف نوعیت کا سامان بھرا ہوا تھا۔ پھر کھلی بوگیاں آ گئیں جن پر گاڑیاں اور بلڈوزر لدے ہوئے تھے۔ سفید اور سبز رنگ کے پتھروں کی چٹانیں تھیں جن کو تراشنے کے لئے کارخانوں میں بھیجا جا رہا تھا۔

ہر بوگی کھولتے وقت ہم پُرامید اور پُراشتیاق نظروں سے اندر دیکھتے تھے' غالب چلا کے شہلا کو آواز دیتا تھا لیکن ابھی تک یہ تلاش بے سود ثابت ہوئی تھی۔ میں کچھ مایوسی کا شکار تھا۔

"ہم دو آدمی اتنی بڑی ٹرین کی تلاشی نہیں لے سکتے مرزا جی؟" میں نے کہا "کیا پتا کس بوگی کے کس کونے میں اسلحہ رکھا ہو۔ اسلحہ کیا آلو پیاز کی بوریوں کے درمیان نہیں ہو سکتا اور کیا شہلا ان کے پیچھے نہیں ہو سکتی۔"

غالب نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ جانتا تھا کہ میری بات کی تردید نہیں کی جا سکتی۔ ہر بوگی میں اندھیرا تھا اور ہماری نظر آخری کونے تک نہیں دیکھ سکتی تھی۔ یہ بھی ناممکن تھا کہ ہم ہر بوری کو کھول کر دیکھیں۔ اگر ایکس رے مشین بھی ہوتی تب بھی اس تمام اسباب کو اندر سے نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ وقت کی کمی کا احساس الگ ہمارے اعصاب پر اثرانداز ہو رہا تھا۔ ہم دوڑ دوڑ کے تالے توڑ رہے تھے اور سرسری نگاہ ڈال کے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔

جیون پرشاد کے گھوڑے زندہ تھے مگر ان کے ساتھ جانے والے ڈاکٹرز اور ٹرینرز مرے پڑے تھے۔ وہ غالباً نازو کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ مجھے نازو سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا کہ میں ان کے بارے میں پوچھ سکتا۔

غالب تیل سے چکنے ٹینکر کی سیڑھی پر چڑھ چکا تھا۔ ایک مسافر بردار ٹرین ساتھ والی ریلوے لائن پر سے گزر گئی۔ سورج اب کافی اوپر اٹھ چکا تھا اور ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ اِکا دُکا سائیکل سوار' پیدل چلنے والے اور گدھوں گھوڑوں پر سوار لوگ نظر آنے لگے تھے۔ ان کے لئے مال گاڑی میں دلچسپی کی کوئی بات نہ تھی اور اس کا وہاں کھڑے رہنا بھی کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔

میں اگلی بوگی میں جھانک رہا تھا کہ غالب اتر آیا "اسی میں ہے سارا مال" وہ بڑے جوش سے بولا۔

"کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"سب کچھ' رائفلیں اور مشین گنیں۔ دستی بم۔ میں نے آخر تک دیکھ لیا۔"

"آخر تک کیسے دیکھ لیا؟" میں نے کہا "اوپر دو فٹ قطر کے ایک ڈھکنے سے کیا نظر آیا ہو گا۔"

"سورج کی روشنی کافی تھی۔ میں اندر اتر گیا تھا" غالب نے کہا "آخر تک واقعی نہیں گیا مگر جہاں تک میں دیکھ سکتا تھا اسلحہ بھرا ہوا ہے۔ یہ تیل کی بوگی ایک بم سے کم نہیں ہے۔"

"اندازہ تو رات کو ہی ہو گیا تھا" میں نے کہا۔
"اب باقی بوگیوں کو دیکھنا ضروری ہے کیا؟"
میں نے کہا "کیا ہم صرف اسلحے کے ذخائر تلاش کر رہے تھے، شہلا کو نہیں؟"
غالب شرمندہ نظر آنے لگا "شہلا۔ ہاں، اسے بھی تلاش کرنا ہے۔ میں بھولا تو نہیں تھا۔"
"غالب۔ اگر وہ نہ ملی....."

"تو یہ تلاش جاری رہے گی۔ ہم امید سے کیسے دستبردار ہو سکتے ہیں۔" غالب نے کہا۔
"یہ بات نہیں۔ میں کچھ اور کہنا چاہتا تھا۔ اگر وہ ٹرین پر موجود ہونے کے باوجود موجود نہ ملی۔ ہم اسے دیکھ نہ سکے۔ وہ خود مجبوری اور معذوری کے باعث کسی طرح اپنی موجودگی کا احساس دلانے میں ناکام رہی.... تو؟"
طویل خاموشی کے بعد غالب نے کہا "تو کیا؟"
"کیا خود ہم ذمے دار نہیں ہوں گے اس کی موت کے اور اس کے معصوم بیٹے کی ہلاکت کے۔ یہ احساس جرم تو تمام عمر کا آسیب بن جائے گا کہ ہم کوتاہی کے مرتکب ہوئے تھے۔ ہم نے اچھی طرح دیکھا ہوتا تو انہیں تلاش کر سکتے تھے۔"
"اس کے لئے تو ایک پورا دن بھی ناکافی تھا۔"
"کم سے کم تارچ ہوتی ہمارے پاس تو ہر بوگی کے تاریک گوشوں میں بھی جھانک لیتے۔ میری قوت فیصلہ کمزور پڑتی ہے یہ سوچ کر کہ کہیں ہماری نظر نے انہیں مس نہ کر دیا ہو۔" میں نے کہا۔
غالب نے چٹکی بجائی۔ "تارچ تو ہے گارڈ کے ڈبے میں، ابھی لے کر آتا ہوں۔"
"غالب! وقت بہت کم رہ گیا ہے۔ کیا تم پھر پہلی بوگی سے شروع کرو گے؟" میں نے پریشان ہو کر کہا۔
"تم آگے چلو، میں تارچ کی روشنی میں جھانک کر دیکھنے میں زیادہ وقت نہیں لگاؤں گا۔" وہ واپس گارڈ کے ڈبے کی طرف سر پٹ بھاگا۔ خالی پلیٹ فارم کی خاموشی میں اس کے قدموں کی آواز بھی مجھے بھیانک لگی۔
یہ بڑی اداس صبح تھی۔ غم والم کے احساس کا سارا بوجھل پن ماحول میں بس گیا تھا۔ رات کے اندھیرے میں اچانک ہم سب بچھڑ گئے تھے۔ ایک ساتھ محسن اور گل غائب ہو گئے تھے، کچھ بتائے بغیر۔ ان کے بارے میں آخری اطلاع دینے والا وہی گارڈ تھا جس کی لاش پیچھے ایک کھائی میں پڑی رہ گئی تھی۔ اس نے جو کچھ بتایا تھا اس کے مطابق گل اور محسن کو اپنے پلان پر عمل در آمد تک کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ انہوں نے گارڈ کو ناک آؤٹ کر دیا تھا۔ اس کے بعد کیا ہوا۔ اس سوال کے جواب میں ان گنت ڈرانے والے مفروضات قائم کئے جا سکتے تھے لیکن یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ شہلا اور اس کے بیٹے کا نہ ملنا ایک اور معما تھا۔ گارڈ نے مرتے دم تک اعتراف نہیں کیا تھا کہ وہ شیشے کے تابوت میں تھے۔ بظاہر وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ جھوٹ بول کر اسے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا تھا۔
ایک ایک کر کے میں تالے توڑتا گیا۔ دھماکوں سے فضا ... رہی۔ سہمے ہوئے پرندے فضا میں گردش کرتے رہے اور ... شور مچاتے رہے۔ غالب دوبارہ ہر بوگی کو تارچ کی روشنی میں ... ہوا آ رہا تھا۔ ہمارے پاس اب پینتیس منٹ تھے، زیادہ سے زیادہ چالیس منٹ۔ ایک گھنٹا گزر چکا تھا۔ دھوپ تیز ہو گئی تھی جس سے فضا کی خنکی ختم ہو چکی تھی اور فولادی بوگیاں سورج کی تپش منعکس کرنے لگی تھیں۔
میں نے اچانک اسٹیشن ماسٹر کے کمرے سے رحمت علی کو برآمد ہوتے دیکھا۔ وہ دوڑتا ہوا میری طرف آ رہا تھا۔
"سکندر صاحب۔ انجن آ رہا ہے۔ آنے ہی والا ہے۔" اس نے قریب پہنچنے سے پہلے ہی چلا کے کہا۔
"کون سا انجن؟" میں نے بے خیالی میں کہا۔
"کمال کرتے ہیں آپ۔ آپ نے ہی تو اطلاع بھجوائی تھی کہ اس مال گاڑی کا انجن خراب ہو گیا ہے۔" وہ ہانپتے ہوئے بولا۔ "پچھلے اسٹیشن سے کوئی انجن روانہ کیا گیا ہے۔ کسی مال گاڑی کو روک لیا گیا ہے لائن کلیئر کرانے کے لئے۔"
"میں سمجھا نہیں۔ یہ لائن کلیئر کرانے کے لئے پچھلے اسٹیشن پر جو مال گاڑی روکی گئی ہے۔"
"ایسا ہی ہوتا ہے جناب۔ پیچھے والے اسٹیشن پر اس مال گاڑی کو سائیڈ لائن پر لگا دیا گیا ہو گا..... تاکہ مین لائن پر سے ہماری مال گاڑی ہٹ جائے۔ جلدی کریں ورنہ ہمارے جھوٹ کا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔"
"تمہارا مطلب ہے، ہم ابھی سے گاڑی لے کر نکل جائیں۔"
میں نے کلائی کی گھڑی دیکھی اور پھر ان بوگیوں کو دیکھا جو ابھی بند پڑی تھیں۔

"کیا فائدہ دیر کرنے سے۔ میں انجن کی طرف جاتا ہوں۔" رحمت علی نے کہا۔
"رحمت علی۔ ابھی آئل ایکسپریس کے آنے میں آدھا گھنٹا ہے۔"
"دس پندرہ منٹ کا تو راستہ بھی ہے۔" وہ بولا۔
"درمیان میں کوئی مسافر گاڑی تو نہیں آجائے گی؟"
اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس کے بعد وہی تیل لے جانے والی گاڑی آئے گی سامنے سے۔"
"اور پیچھے سے؟"
"پیچھے سے جو گاڑی آئے گی وہ یہاں رکی رہے گی۔ سگنل ڈاؤن نہیں ملے گا اسے۔"
میں اس کے ساتھ چلتا گیا "ہم ان دونوں کو ایسے ہی چھوڑ آئے۔ وہ فون کر دیں گے۔"
"میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں جناب!"

"کیا فون توڑ دیا ہے تم نے۔"
"جی نہیں، ان کے سر توڑ دیئے ہیں۔ میں نے دونوں کو جہنم رسید کر دیا ہے۔ میں انہیں زندہ نہیں چھوڑ سکتا تھا جناب!"
رحمت علی بولا اور انجن پر چڑھ گیا۔
"اچھا تم گاڑی چلاؤ۔ مگر دیکھو، آؤٹر سگنل پر وہ لڑکی ہو گی چندو کے ساتھ۔ ان کو لینا ہے۔" میں نے کہا۔
واپس دوڑا کے میں نے غالب کو اس صورت حال سے آگاہ کیا "وقت نہیں رہا مرزا جی، سب بوگیوں کو دیکھنے کا۔"
"پیچھے تو سب دیکھ آیا ہوں میں۔"
"بس۔ چڑھ جاؤ گاڑی پر۔ ورنہ گڑبڑ ہو جائے گی" میں نے کہا۔
آگے انجن نے وسل دی۔ میں اور غالب پھر بھاگے اور اسی کھلے ہوئے پلیٹ فارم جیسی بوگی پر کود گئے جس پر جیون پرشاد کے گھوڑوں کے لے جانے والا کنٹینر رکھا ہوا تھا۔ ٹرین آہستہ سے کھسکی۔
"یہ تو برا ہوا یار" غالب نے کہا "کتنی بوگیاں رہ گئیں۔"
"پانچ" میں نے کہا "اب بوگیوں کی تعداد سے کیا فرق پڑتا ہے، اگر ایک بھی رہ جاتی تو احساس کی شدت کم نہ ہوتی۔ یہ خیال ہمیشہ رہتا کہ کہیں شہلا اسی میں تو نہیں تھی۔"
"خدا کرے کہ وہ دشمنوں کی قید میں ہو۔"
"کیسی عجیب ہے یہ دعا۔ جو عام حالات میں بددعا تھی لیکن اب سوال ہے ان کی زندگی کا تو ہم چاہتے ہیں کہ وہ قید میں ہی زندہ رہیں" میں نے کہا۔
"قید سے کبھی رہائی بھی ہو سکتی ہے لیکن خدانخواستہ...." اس نے دوبار خدانخواستہ کہا مگر بات پوری نہیں کی۔ شاید میری صورت دیکھ کر وہ ڈر گیا۔
آؤٹر سگنل کے قریب گاڑی آہستہ ہوئی اور رک گئی۔ میں نے نازو کو اشارہ کیا اور اپنی طرف بلایا لیکن وہ چندو کو ہدایات دینے میں مصروف تھی۔ سگنل ڈاؤن کے بغیر ریلوے لائن لاک رہتی تھی اور پٹڑی بدلی نہیں جا سکتی تھی اور جب تک پوری ٹرین گزر نہ جائے سگنل پھر اپ نہیں ہو سکتا تھا۔ گاڑی پھر آگے بڑھی اور اس کے پہیے شور مچاتے ہوئے دوسری لائن پر اترنے لگے۔ آخری بوگی کے گزرنے تک نازو کافی پیچھے رہ گئی تھی اور میں اسے ہاتھ ہلاتا دیکھ رہا تھا۔ سگنل اب بھی ڈاؤن تھا۔ چندو نے لیور کھینچا اور سگنل کا بازو اوپر اٹھا۔ اس کے ساتھ ہی نازو کا ہاتھ بھی اٹھا اور چندو جہاں کھڑا تھا وہیں گر گیا۔ نازو نے ہاتھ لہرایا اور گارڈ کے آخری ڈبے پر چڑھ گئی۔ ٹرین کی رفتار بہت کم تھی مگر اس کے باوجود نازو کا چلتی گاڑی پر دوڑ کے سوار ہونا ایک خطرناک حرکت تھی۔ ریلوے ٹریک پر دوڑنا یوں بھی آسان نہیں ہوتا۔ اس کا پاؤں کسی پتھر پر پڑ سکتا تھا یا ان فولادی تاروں میں الجھ سکتا تھا جو ٹریک کے ساتھ ساتھ زمین پر چند انچ اوپر چل رہے تھے۔

غالب نے بے حد مشتعل ہو کے اسے گالی دی "الو کی پٹھی۔ ضرورت سے زیادہ اعتماد میں ہی ماری جائے گی کسی دن۔ جب ڈرائیور گاڑی روک رہا تھا تو جلدی کس بات کی۔"
اسے دوڑ کر چڑھتا دیکھ کر میرا سانس بھی رکنے لگا تھا مگر میں نے غالب کو تسلی دی "چلو مرزا جی۔ کچھ نہیں ہوا۔ ٹیک اٹ ایزی۔"
"مزید حماقت ملاحظہ ہو" وہ برہمی سے بولا۔
میں نے پیچھے دیکھا تو نازو ایک ہاتھ سے ڈنڈے کو پکڑ کے باہر جھول رہی تھی اور دوسرا ہاتھ لہرا رہی تھی۔ میں نے اسے اشارہ کیا کہ اندر ہو جائے مگر اس کا الٹا اثر ہوا۔ وہ ایک ٹانگ بھی باہر جھلانے لگی۔ وہ غالب کو پریشان کرنے کے لئے ایسا کر رہی تھی مگر خون میرا بھی خشک ہو رہا تھا۔
"اس کا جواب تو یہ ہے کہ میں بھی سر کے بل لٹک کر کوئی کرتب دکھاؤں" غالب نے کہا۔
"بہتر ہے کہ تم ادھر مت دیکھو" میں نے کہا "یہ ظاہر کرو کہ تمہیں خاک بھی پروا نہیں۔"
"اچھا۔ مگر یار، میرا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔"
"کیا خیال ہے، ان گھوڑوں کو چھوڑ نہ دیں" میں نے غالب کی توجہ ہٹانے کے لئے کہا "ان بے زبان جانوروں نے تو کوئی گناہ نہیں کیا۔"
"اندر کا دروازہ کیسے کھولو گے۔ چابی تو خاتون کے پاس ہے۔ اف، یار یہ مرے گی" وہ سر پیٹ کر بولا۔
"وہ تو نہیں مرے گی مگر لگتا ہے تم چھلانگ مار دو گے اور مر جاؤ گے بلاوجہ" میں نے کہا۔
ٹرین اب اچھی خاصی رفتار سے جا رہی تھی۔ وہ ریلوے اسٹیشن بہت پیچھے رہ گیا تھا جہاں ہم نے دو گھنٹے گزارے تھے۔ زندگی کے سفر میں ایسے کتنے گمنام اسٹیشن آتے ہیں جہاں سے آدمی پھر کبھی نہیں گزرتا۔ کچھ عرصہ وہ یاد کا نقش بن کے خیال میں رہتے ہیں پھر خیال پر بھی وقت کی گرد جم جاتی ہے۔ اسٹیشن ماسٹر، اس کا بیٹا اور چندو آج صبح سورج نکلنے سے پہلے زندگی کے آنے والے بہت سے دنوں، ہفتوں، مہینوں اور سالوں کے بارے میں کسی شک و شبے کا شکار نہ تھے کہ یہ ان کے مستقبل کا حصہ ہوں گے، مگر مستقبل کی مسافت اچانک یوں ختم ہو گئی تھی جیسے ریلوے اسٹیشن پر کوئی لائن بند ہو جاتی ہے۔ آگے راستہ روکنے والے بمپر آ جاتے ہیں۔ ان کی لاشیں دریافت کے وقت کا انتظار کر رہی تھیں۔ ٹرین میں بھی دو لاشیں پڑی تھیں۔ اُن کی چتا ایک پُل پر جلائی جائے گی۔
"پل آ گیا" غالب نے کہا۔
میں نے چونک کر دیکھا تو مجھے پل کے شہتیروں کا فولادی ڈھانچہ نظر آیا۔ گاڑی کے بریک لگنے سے رفتار کم ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے انجن کو پل کے اندر داخل ہوتے دیکھا۔ پل کے دونوں جانب ندی خشک پڑی تھی۔ کچھ دیر بعد اس کی تہ میں دو

ٹرینوں کا ملبہ بھی پڑا ہوگا۔ پل کے شہتیر تنکوں کی طرح بکھر چکے ہوں گے۔ آگ اور دھوئیں کے بادل ہماری ایک اور فتح کا عنوان بنیں گے یا شہلا کے لئے تحفۂ مرگ؟ وہ ایک نام تھا۔ ایک چہرہ تھا۔ ایک یاد تھی اور ایک پورے عہدِ حیات کا ٹکڑا تھا جس کی خلش میرے دل میں نوکِ خار کی طرح رہی۔ پھر انگارہ بن گئی اور میں احساس کے ناقابلِ بیان کرب کا شکار ہوگیا۔ کہیں اس کامیابی کے رنگ میں شہلا اور اس کے بیٹے کے لہو کی سرخی نہ شامل ہو جائے۔ میرے دامن پر وہ داغ نہ آجائے جو نہ میرے آنسو دھو سکیں اور نہ پچھتاوے۔ میں ان کا قاتل کہلانا نہیں چاہتا تھا۔ میرے خدا، مجھے اس الزام سے بچانا۔

ٹرین اب پل پر رکی ہوئی تھی۔ اس کا آدھے سے زیادہ حصہ پل سے پیچھے تھا لیکن انجن درمیان تک پہنچ گیا تھا۔ آگے ریل کی پٹڑی دھوپ میں دو چمکتی لکیروں کی طرح دکھائی دیتی تھی جو پہاڑی کے موڑ پر غائب ہو جاتی تھی۔ نیالے زرد رنگ کی پتھریلی پہاڑی نے پیچھے کے منظر کو چھپا رکھا تھا۔ آس پاس کا سارا علاقہ ایسا ہی نیم صحرائی بنجر زمین پر محیط تھا جس میں کہیں کہیں کانٹے دار جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ اس کے درمیان میں برساتی ندی کا گول کنکروں والا فرش موزیک کا دلکش نمونہ لگتا تھا۔

میں نے گھڑی دیکھی۔ آٹھ بج کر بیس منٹ ہوئے تھے۔ اگلے پندرہ بیس منٹ میں ہمارا اس جگہ سے دور بھاگ جانا ضروری تھا۔ میں نے نازو کو پٹڑی کے سلیپروں پر لمبے لمبے قدم رکھتے دیکھا۔ وہ کسی بچی کی طرح کودتی آرہی تھی جو ٹھیکری سے لنگڑی پالا کھیل رہی ہو۔ زمین پر کوئلے یا چاک سے خانے بنا کے کھیلا جانے والا لڑکیوں کا کھیل جس میں کبھی ایک ٹانگ پر خانہ عبور کرنا پڑتا ہے تو کبھی آنکھوں پر پٹی باندھ کے۔ وہ قطعی متفکر یا پریشان نظر نہ آتی تھی۔ اس کے برعکس غالب ابھی تک برہم تھا اور مجھے یقین تھا کہ اب ان کی لڑائی ضرور ہوگی لیکن میں نے کسی کو بھی نہیں روکا۔ میں پلٹ کے انجن ڈرائیور کی طرف چلنے لگا جو خود بھی نیچے اتر کے میری طرف آرہا تھا۔

"ہم اس پہاڑی پر سے تماشا دیکھیں گے" اس نے بڑی مسرت سے کہا۔

"یہ تماشا تو نہیں ہے رحمت علی" میں نے کہا۔

"کچھ بھی ہے جناب۔ میرے لئے تو اس میں دہری خوشی ہے۔ خدا نے مجھے آپ کے کسی کام آنے کی سعادت بخشی۔ اور اپنا بدلہ لینے کا موقع بھی فراہم کیا" وہ میرے ساتھ چلتے ہوئے بولا "بس ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے۔ اچانک وقت آگیا۔ آپ سے ملاقات ہوگئی۔ اس سے پہلے ایسا کوئی خیال بھی نہیں تھا میرے دل میں۔"

"تم کیسے جانتے تھے ہمیں؟"

"لوگوں سے سنا تھا۔ اخباروں میں پڑھا تھا۔ آج کل یہاں کے مسلمان بڑے عذاب میں مبتلا ہیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کس کا ساتھ دیں۔ کس کو الزام دیں۔ ہم بھارت میں رہتے ہیں اور بھارتی شہری ہیں۔ ہمیں اس ملک سے وفادار رہنا چاہئے۔ یہاں کیا سلوک ہوتا ہے ہمارے ساتھ۔ نام نہاد سیکولر اسٹیٹ میں ہم دوسرے درجے سے بھی کم تر شہری سمجھے جاتے ہیں۔ عام ہندو کا رویہ تو ہمیشہ سے متعصبانہ رہا ہے مگر سرکاری سطح پر تو ہمارے حق غصب نہیں ہونے چاہئیں اور ہمارے ساتھ ظلم ہو تو انصاف بھی ملنا چاہئے۔"

میں نے حیران ہو کے کہا "تم اچھے خاصے تعلیم یافتہ ہو۔"

"ڈگری تو کوئی نہیں لی میں نے آپ کی دعا سے۔ مگر دنیا کو آنکھوں سے دیکھا ہے اور سمجھا ہے۔"

"ڈگری تو محض کاغذ کا ایک ٹکڑا ہوتی ہے۔ جو سب کو مل جاتا ہے جیسے بھی ملے" میں نے کہا "ضروری نہیں کہ اس کے ساتھ عقل بھی آجائے۔"

"ادھر ہم دیکھتے ہیں کہ مشرقی پاکستان میں خود مسلمان ہی مسلمانوں کو مار رہے ہیں۔ انہیں بے وطن کر رہے ہیں اور غیر قوم کا فرد قرار دے کر دھتکار رہے ہیں۔ صرف اس لئے کہ وہ بنگالی نہیں ہیں یا بنگالی زبان نہیں بول سکتے۔ وہ اس زمین کے بیٹے نہیں ہیں جو سونار بنگلہ دیش ہے۔ کتنے دکھ اور افسوس کی بات ہے یہ۔ کیا زبان کی اہمیت مذہب سے زیادہ ہے۔ اسلام کا رشتہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اور یہ لوگ جو اسلام کے نام پر گھربار چھوڑ کے مشرقی پاکستان پہنچے تھے۔ آج بائیس تیئیس سال بعد ان کی قربانی ان کا جرم بنا دی گئی ہے۔ ان حالات میں بھارت کے مسلمان کے الزام دیں۔ باہر سے دخل اندازی کرنے والوں کو یا خود گھر والوں کو۔ پہلے ہی یہاں ہماری وفاداریوں پر شک کیا جاتا ہے۔ ہم کھل کے نہیں کہہ سکتے کہ بھارت کو پاکستان کے تخریب کار اور علیحدگی پسند عناصر کی مدد نہیں کرنی چاہئے۔ اور جارحیت سے گریز کرنا چاہئے۔ یہ بھی ناممکن ہے کہ ہم ہندوؤں کی طرح پاکستان کی خانہ جنگی پر خوشی کا اظہار کریں کیونکہ پاکستان دشمن ہے بھارت کا۔"

"پاکستان کسی کا دشمن نہیں۔"

"میں تو سرکاری پروپیگنڈے کی بات کر رہا تھا۔ اس میں یہی کہا جاتا ہے۔ مسلمان نہ اِدھر کے نہ اُدھر کے۔ ہمدردی بھی رکھیں تو کس کے ساتھ۔"

غالب اور نازو کی لڑائی ختم ہو چکی تھی۔ اس کا پتا دونوں کی صورت پر پھیلی ہوئی مصنوعی خفگی سے چلتا تھا۔

"رحمت علی کا خیال ہے کہ ہمیں پہاڑی کے اوپر سے یہ تماشا دیکھنا چاہئے" میں نے کہا "مگر میں یہ خطرہ مول لینے کے خلاف ہوں۔"

"منظر کی کیا بات ہوگی اتنے فاصلے پر؟"

میں نے کہا "رحمت علی! کیا تمہیں معلوم ہے کہ اس مال گاڑی میں کتنا اسلحہ اور گولہ بارود لدا ہوا تھا؟"

"اسلحہ اور گولہ بارود۔ آپ مذاق کرتے ہیں۔"

"مذاق میں ضرور کرتا ہوں۔ اکثر کرتا ہوں لیکن موقع محل دیکھ کے۔ یہ مذاق کی بات نہیں ہے" میں نے کہا "تصادم صرف ٹرینوں کا نہیں ہوگا۔ اس کے بعد جو دھماکے ہوں گے وہ بہت خوفناک ہوں گے۔ سو گز کے فاصلے پر وہ جگہ قطعی غیر محفوظ ہے۔"

غالب نے میری تائید کی "ہمیں واپس جانا چاہئے۔ ادھر۔"

"پھر میں ادھر جاؤں گی" نازو نے کہا۔

"جاؤ۔ مرو، انجن پر جا کے بیٹھ جاؤ" غالب نے کہا۔

"مریں میرے دشمن" نازو جلے بھنے لہجے میں بولی۔

"نازو۔ ہم آگے نہیں جاسکتے کیونکہ وہ سب کہیں پیچھے ہی ہم سے جدا ہوئے تھے" میں نے کہا "وہ خود اترے تھے یا انہیں اتارا گیا تھا۔ ہمیں یہ بھی معلوم کرنا ہے۔"

"اچھا میں وہ بیگ تو اتار لاؤں" نازو نے کہا۔

میں نے پریشان ہو کے گھڑی دیکھی "دس پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں ہیں ہمارے پاس۔"

"ہم دوڑ کے کتنا فاصلہ طے کر سکتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ دو فرلانگ" غالب مایوسی سے بولا۔

"وہ بھی مشکل ہے۔ کوئی اتنا نہیں دوڑ پائے گا۔ ویسے تو چار سو گز کچھ نہیں ہوتے۔ مگر کسی کو عادت نہیں ہے اور یہ راستہ بھی بہت خراب ہے۔"

"سکندر۔ گھوڑے آخر کس لئے ہیں۔ ریس کورس کے گھوڑے یہاں بھی تو دوڑ سکتے ہیں" نازو نے کہا۔

"رائٹ" میں نے چٹکی بجا کے کہا "چلو فٹافٹ دروازہ کھولو۔ دو گھوڑے کافی ہوں گے۔ جلدی کرو۔"

نازو بڑی پھرتی سے اوپر چڑھی اور اندر چلی گئی۔ میں اس کے پیچھے گیا کیونکہ غالب اس سے قطعی تعاون کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ اس نے نازو کی بہترین تجویز کو بھی بادلِ ناخواستہ قبول کیا تھا۔ غالب کو گھڑسواری نہیں آتی تھی۔ مگر ضرورت ایک مجبوری بن گئی تھی اور میرے فیصلے سے اختلاف بھی ممکن نہ تھا۔

ہم دو گھوڑوں کے ساتھ باہر آئے تو گھوڑوں کو نیچے اتارنا ایک مشکل مرحلہ ثابت ہوا۔ خطرہ یہ تھا کہ اوپر سے جست لگانے والے گھوڑے اگر ٹریک کے پتھروں پر توازن قائم نہ رکھ سکے تو ان کی ٹانگ ٹوٹ جائے گی۔ ایک گھوڑے کے ساتھ یہی ہوا۔ اس کی جگہ مجھے تیسرا گھوڑا لانا پڑا۔

"رحمت علی، تم بیٹھے ہو کبھی گھوڑے پر؟" میں نے کہا۔

"بیٹھا تھا جناب، سرا باندھ کے۔ بہت پرانی بات ہے" وہ بولا۔

"اچھا تم میرے ساتھ پیچھے بیٹھو" میں نے کہا۔

"اس لنگڑے گھوڑے کا کیا ہوگا جناب۔"

"ویسے تو انہیں گولی ماردی جاتی ہے۔ مگر ہم اسے چھوڑ جاتے ہیں۔ اس کی زندگی ہوتی تو یہ ہمارے ساتھ جاتا۔"

"ساڑھے آٹھ تو بج گئے ہیں" رحمت علی میری مدد سے گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہوگیا۔

میں نے اتنی دیر میں گھوڑے کو لگام ڈال دی تھی "مرزا جی، کھڑے کیوں ہو؟" میں نے چلّا کے کہا۔

رحمت علی نے چونک کر کچھ سننے کی کوشش کی "یہ.... یہ آواز سن رہے ہیں آپ۔"

میرے کان ابھی تک کوئی آواز نہیں سن پائے تھے مگر میں سمجھ گیا کہ رحمت علی نے آنے والی ٹرین کی سرسراہٹ کو فضا میں محسوس کر لیا ہوگا۔ ہوا کے ارتعاش میں پہچان لیا ہوگا۔ پندرہ سال تک ایسی ہی آوازیں سننے والے کانوں کا تجربہ اس کی چھٹی حس بن گیا تھا۔

نازو گھوڑے کی باگ تھامے مسکرا رہی تھی اور اس مسکراہٹ کا مقصد غالب کا تمسخر اڑانا، اسے چڑانا اور اس کی مجبوری سے لطف لینا تھا۔ وہ نازو کے پیچھے بیٹھنے پر مجبور تھا۔

"چلو اب نخرے مت دکھاؤ۔ بعض اوقات مردانگی کام نہیں آتی۔ ناک نیچی کرنی پڑتی ہے" نازو بولی۔

"سکندر۔ میں تمہارے ساتھ بیٹھوں گا۔"

"مگر میں تو کسی اور کے ساتھ نہیں بیٹھوں گی" نازو نے یوں کہا کہ غالب کی جگہ پتھر بھی ہوتا تو پگھل جاتا۔ پلک جھپکتے میں اس کا غصہ کافور ہوگیا اور اس نے نازو کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ نازو نے ہلکا سا جھٹکا دے کر اسے اٹھایا اور اپنے پیچھے بٹھا لیا۔

"ڈرنا نہیں" نازو نے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔

"تمہارے ساتھ تو میں مرنے سے بھی نہیں ڈرتا۔ کیسا ہے ڈائیلاگ" غالب نے کہا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ سب عشق بھول گیا۔ نازو نے گھوڑے کو دوڑانا شروع کیا تو غالب چلّانے لگا۔

"ارے نازو، اے نازو کی بچی۔ آہستہ۔ ارے میں کہیں ٹپک جاؤں گا بھوت کی بچی۔ یہ بحرِ ظلمات نہیں ہے۔"

جواب میں نازو کا ایک کھنکتا ہوا قہقہہ سنائی دیا۔ اس نے گھوڑے کی رفتار اور بڑھا دی۔

غالب شور مچانے لگا "ارے کوئی بچاؤ.... یا اللہ، یہ کیسی بلا چمٹ گئی ہے مجھ سے...."

رحمت علی ہنسنے لگا "تمہارا دوست الٹی بات کر رہا ہے، چمٹا ہوا تو خود ہے۔"

میں نے کہا "دونوں بالکل بچے ہیں۔"

رحمت علی نے کہا "جب آدمی محبت کرتا ہے تو ایسے ہی بچہ بن جاتا ہے۔ خواہ اس کی عمر کچھ بھی ہو۔"

میں نے پلٹ کر اسے دیکھا "تمہیں کس نے بتائی ہے یہ بات۔"

"عمر کے تجربے نے" وہ بولا "زندگی کے اس راستے سے میں گزر چکا ہوں، جس پر آپ لوگ چل رہے ہو۔ تمہارا ساتھ کسی نے نہیں دیا اس راستے پر؟"

میں نے دکھ کی ٹیس کو دل کے اندر محسوس کیا۔ میں اسے کیا بتاتا، کیسے بتاتا اور کیوں بتاتا کہ میرا ساتھ چھوڑ کے بھی کوئی ہر لمحہ میرے ساتھ ہے۔ خیالوں میں اور نگاہوں، خلوت میں اور جلوت میں۔ روزِ روشن میں اس کے تصور سے قربت ہے۔ شبِ ماہتاب میں اس کے احساس کی راحت ہے۔

"میں نے سنا تو تھا۔ کوئی وکیل تھی ۔۔۔ نام مجھے یاد نہیں آرہا ہے۔ کیا وہ مرگئی؟"

میں نے تڑپ کے اور چلاّ کے کہا "ایسی بات مت کہو۔ اگر وہ مرجاتی تب بھی میرے لئے زندہ رہتی۔ ابھی تو وہ زندہ ہے۔"

"معاف کرنا جناب۔ میرا مقصد آپ کا دل دکھانا نہیں تھا" رحمت علی شرمندہ ہوگیا۔

میں نے ایک گہری سانس لی "خود میں بھی تو اسی لئے زندہ ہوں کہ مجھے واپس جانا ہے۔ رابعہ کے پاس۔ وہ میرے گھر میں میرا انتظار کررہی ہے۔ صبح سے شام تک اور شام سے اگلی صبح تک اس نے ہر لمحے کو میری یاد کے چراغوں سے روشن کررکھا ہے۔"

اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں اپنے آپ سے اور رابعہ کے تصور سے باتیں کررہا ہوں۔ یہ محبت کی دیوانگی تھی جس نے ذرا سی دیر کے لئے مجھے دنیا ومافیہا سے بے خبر کردیا تھا۔ میں نے رابعہ کے خیال کو بھلادیا اور نازو کی طرف دیکھا۔ وہ بہت آگے نکل گئی تھی اور اب رک کر ہمارا انتظار کررہی تھی۔

دس منٹ میں ہم پل سے بہت دور آچکے تھے اور خطرے کی کوئی بات نہیں رہی تھی۔

میں نے گھڑی میں وقت دیکھا "پونے نو۔۔۔ ابھی تک۔۔"

میرے الفاظ لبوں پر ہی تھے کہ فضا لرز اٹھی۔ پہلے ایک دھماکا سنائی دیا۔ اس کے ساتھ ہی دوسرے قیامت خیز دھماکے نے تصدیق کردی کہ گولہ بارود کا ذخیرہ اڑ گیا ہے۔ پھر مسلسل کئی چھوٹے دھماکے ہوئے جو شاید پل کے ٹوٹنے اور بوگیوں کے نیچے گرنے سے پیدا ہوئے تھے۔ پھر دوسرا زبردست دھماکا ہوا جس سے ہمارے قدموں کے نیچے کی زمین بھی کانپ گئی۔ گھوڑے بدک کر بھاگے اور ہم کچھ نہ کرسکے۔ وہ ایک ساتھ اور پوری رفتار سے دوڑتے ہوئے جارہے تھے اور انہیں پکڑنے کی کوشش کرنا بھی بے کار تھا۔

جہاں پل تھا وہاں اب دھوئیں کا ایک بادل سا نظر آنے لگا تھا۔ گہرے سیاہ مرغولے مسلسل بلند ہورہے تھے اور یہ بادل پھیلتا جارہا تھا۔ ہم سب اس بادل پر نظریں جمائے کھڑے تھے اور ہم تصور سے ایک ہی منظر دیکھ رہے تھے۔ برساتی ندی کا پل غائب ہوگیا تھا۔ اس کے فولادی شہتیروں کو سنبھالنے والے ستون ملبے کا ڈھیر بن گئے تھے۔ شہتیر اور شکستہ بوگیاں ایک دوسرے پر گرکے چورچور ہوگئے تھے۔ لکڑی کے تختے دھڑدھڑ جل رہے تھے۔ جیون پرشاد ایل اے کے چار بہترین گھوڑے، ان کے ساتھ جانے والا ڈرائیور اور ٹریزسب پرزہ پرزہ ہوکے بکھر گئے تھے۔

غالب نے خود کلامی کے انداز میں کہا "گولہ بارود سے بھری ہوئی دو بوگیاں تھیں۔"

میں چونکا "ہم نے تو ایک ہی دریافت کی تھی۔"

"مگر دوسری بھی تھی۔ آگے یا پیچھے" غالب نے اصرار کیا۔

"ہاں۔ دوسری کو ہم دیکھ نہ سکے۔ وقت کم پڑگیا تھا۔"

"وقت کون کم کرتا ہے" غالب نے کہا۔

میں سمجھ گیا کہ اس کے خیالات کی رَو کس سمت میں بہہ رہی ہے۔ اس کو احساسِ جرم نے شکار کرلیا تھا۔ اور میں اس کے ساتھ اختلاف کیسے کرسکتا تھا۔ ہم نے وقت کی کمی کے باعث آگے کی چند بوگیوں کو نہیں دیکھا تھا۔ انہی میں سے ایک میں اسلحہ اور گولہ بارود تھا۔ شاید اسی میں شہلا تھی اور محسن کا بیٹا تھا۔ ولادورانیڈ کمپنی نے ان کو اپنے مال کے ساتھ بطور ضمانت رکھا تھا۔ انہوں نے واضح الفاظ میں یہ بات بتادی تھی۔ اسے محض دھمکی قرار دے کر ہم احساس کی اذیت سے چھٹکارا نہیں پاسکتے تھے۔ یہ عین ممکن تھا کہ انہوں نے ایسا ہی کیا ہو۔ وقت جاری وساری تھا۔ وقت ہمارے ساتھ تھا اور ہم وقت کے ساتھ تھے۔ شاید شہلا کے لئے وقت ختم ہوگیا تھا۔ اور اس کے بیٹے کے لئے وقت اتنا ہی تھا۔ وقت احساس کا نام ہے۔ وقت زندگی کا نام ہے۔ وہ زندگی سے محروم ہوئے تو احساس سے بھی بیگانہ ہوگئے تھے مگر ہم زندہ تھے۔

نازو نے کہا "ایسا نہیں ہوسکتا۔"

غالب نے سپاٹ لہجے میں کہا "ایسا ہو بھی سکتا ہے۔"

"میرا دل نہیں مانتا۔"

رحمت علی نے کہا "کیا ہوا۔ آپ سب اچانک رنجیدہ کیوں ہوگئے۔ کس کی بات کررہے ہیں آپ۔۔۔"

میں نے کہا "دیکھو مرزا جی۔ اس جذباتی مایوسی سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ کیا کوئی تقدیر سے لڑسکتا ہے، ہم نیت اور ارادے سے نہ مجرم ثابت ہوتے ہیں نہ گنہگار۔ ہم ان کی زندگی کے لئے ہی لڑرہے تھے اور جب تک امید باقی رہے گی ہم دعا بھی کریں گے اور دعوے بھی کہ ایک نہ ایک دن انہیں موت کے منہ سے بھی نکال لائیں گے۔ ابھی ایک اندیشے کو یقین کی بنیاد مت بناؤ۔ بہت کم امکان ہے اس بات کا کہ وہ اسی بوگی میں ہوں گے۔"

میں نے اس کے کندھے پر تھپکی دی "قنوطی مت بنو۔ چلو۔" امکان ہے تو سہی۔"

رحمت علی کبھی میری صورت دیکھتا تھا تو کبھی غالب کی۔ اس کے سوال کا کسی نے بھی جواب نہیں دیا تھا چنانچہ وہ کچھ سمجھنے سے قاصر تھا کہ ہم کس کا ذکر کرکے اداس ہیں۔

میں نے مختصراً کہا "رحمت علی۔ تم میرے دوست محسن کے نام سے تو واقف ہوگا؟"

"جی۔ بہت اچھی طرح جناب!"

"اس کے بیوی بچوں کو دشمنوں نے پکڑلیا تھا۔ اور یرغمال بنالیا تھا۔"

"وہ بیوی بچوں کو ساتھ لے کر کیوں نکلے تھے" رحمت علی نے افسوس سے سرہلایا۔

"بیوی بچے لاہور میں تھے۔ دشمنوں نے انہیں اغوا کیا اور یہاں لے آئے۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح وہ ہمیں بلیک میل کریں گے۔ انہوں نے بتایا تھا کہ اس مال گاڑی میں گولہ بارود کے ساتھ وہ بھی ہوں گے۔ محسن کے بیوی بچے۔ انہوں نے ہمیں چیلنج کیا تھا کہ اب ہمت ہے تو کچھ کرکے دکھاؤ۔"

رحمت علی کا چہرہ سرخ پڑگیا "اللہ کا عذاب نازل ہو ان پر۔ جو انسانیت کے مرتبے سے اتنا گرگئے ہیں۔"

"وہ انسان نہیں شیطان ہیں۔ اس مرتبے تک وہ کبھی پہنچے ہی نہیں تھے تو گرنا کیسا" میں نے کہا۔

وہ آہ بھر کے بولا "اگر اللہ کو یہی منظور تھا جناب تو۔۔۔"

"نہیں۔ ابھی ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی" میں نے جلدی سے کہا "وہ بڑے عیار اور جھوٹے لوگ ہیں۔ ایک امکان کی وجہ سے ہم کچھ دل گرفتہ تھے۔ زیادہ امکانات یہ ہیں کہ دشمنوں نے انہیں اپنی قید میں رکھنا بہتر سمجھا ہوگا۔ بعد میں ہر جگہ وہ ہماری کمزوری سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے" نازو نے آنسو پونچھ کے اور مسکرا کے کہا۔ وہ جھوٹ بول رہی تھی ورنہ یہ مسکرانے کا موقع ہی نہیں تھا مگر میں نے اس کے جھوٹ کو سچ کی طرح قبول کرلیا۔

"رحمت علی، تم اس علاقے سے کس حد تک واقف ہو" میں نے کہا۔

"زیادہ نہیں۔ میں خود تو ناگپور میں رہتا ہوں۔ بمبئی آتا جاتا رہتا ہوں مگر ٹرین سے" وہ بولا۔

"گویا تم ہماری رہنمائی نہیں کرسکتے" میں نے کہا "خیر چلو، تم بھی ہمارے ساتھ۔ یہاں کب تک کھڑے رہیں گے۔"

"آپ لوگ اب کہاں جائیں گے" وہ میرے ساتھ چل پڑا۔

"ابھی کچھ طے نہیں کیا" میں نے کہا "فوری طور پر ہمیں کوئی ایسی جگہ چاہئے جہاں ہم ایک دو دن کے لئے رُوپوش ہوجائیں۔"

"پھر آپ میرے ساتھ ناگپور چلیں جناب۔ ادھر کچھ دور چل کے سڑک آجائے گی" رحمت علی بولا۔

"فی الحال ہم اس پیشکش کو قبول نہیں کریں گے۔ ہمیں اس علاقے میں اپنے ساتھیوں کو تلاش کرنا ہے۔"

"اس علاقے میں کہاں؟"

"وہ بمبئی سے روانہ تو ہمارے ساتھ ہی ہوئے تھے۔ راستے میں کہیں اتر گئے یا گرگئے۔ کوئی حادثہ پیش آگیا یا کوئی اور بات ہوگئی۔ بس وہ غائب ہوگئے مگر ہم معلوم کرلیں گے" میں کچے راستے پر چلتا گیا۔

نازو اور غالب ہم سے چند قدم پیچھے تھے اور آہستہ آہستہ نہ جانے کیا باتیں کرتے آرہے تھے۔ وہ بیگ غالب کے ہاتھ میں تھا جس میں ہمارا سب سرمایہ تھا۔ نقد رقم کے علاوہ زیورات تھے اور منو میاں کے چھوڑے ہوئے انٹرکام سیٹ تھے۔ تقریباً ایک میل چلنے کے بعد غالب نے بیگ مجھے دے دیا۔ ابھی تک سڑک کے آثار دکھائی نہیں دیتے تھے۔ دھوپ میں تیزی آگئی تھی اور کچے راستے پر سفر مشکل ہوتا جارہا تھا۔ ہم سب بھوکے بھی تھے اور پوری رات جاگنے کے بعد آرام کی ضرورت محسوس کررہے تھے۔

رحمت علی نے کہا "ایسے تو بہت مشکل ہوجائے گی جناب آپ کے لئے۔"

میں نے کہا "ہم مشکلات کے عادی ہیں۔ جو کچھ تم نے کیا وہ بہت کافی ہے۔ ہمیں سڑک پر چھوڑ کے تم بس سے ناگپور چلے جاؤ یا جہاں بھی تمہیں جانا ہو۔"

"مجھے اب کہیں نہیں جانا" وہ بولا "میں تو حادثے میں مرچکا۔ رحمت علی ڈرائیور کا دنیا میں کون تھا جو اسے روئے۔ میں اب آپ کے ساتھ ہوں۔"

میں نے کہا "ہم تمہیں ساتھ نہیں رکھ سکتے۔"

"اچھا تو آپ میرے ساتھ رہیں" وہ بولا "اگر میں بار ہوں آپ پر تو پھر یوں سمجھ لیں، آپ مجھ پر بار نہیں ہوں گے۔"

"تم عجیب آدمی ہو، کیا زبردستی ہمیں ساتھ لے جاؤگے؟ یا زبردستی ساتھ رہوگے" میں نے برہمی سے کہا۔

"خفا نہ ہوں جناب۔ ابھی تو کسی کو معلوم نہیں۔ ناگپور جا کے بینک سے ایک ایک پائی نکلوالیتا ہوں آج ہی۔ چالیس ہزار سے اوپر ہی ہوں گے۔ آپ کے کام آئیں گے۔۔۔"

میں نے کہا "اس بیگ کو کھول کے دیکھو۔"

رحمت علی نے بیگ کھول کے دیکھا تو اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں "اتنی دولت اٹھائے پھر رہے ہیں آپ اپنے ساتھ۔"

میں نے ہنس کے کہا "یہ ہاتھ کا میل ہے ہمارے لئے۔ اگر تم چاہو تو یہ سب لے جاؤ۔ تمہارے کام آئے گا۔"

اس نے بیگ مجھے تھمادیا "وہ دیکھیں جناب۔ سڑک آگئی، یہاں سے ہم کسی بس میں بھی سوار ہوسکتے ہیں۔"

"ہم بس میں سفر نہیں کرتے" غالب نے ساتھ آکے کہا "کیا

یہاں کوئی بس اسٹاپ ہے؟"

"بس اسٹاپ تو نہیں ہے۔ مگر جگہ ہو تو ہاتھ کا اشارہ دیکھ کے ڈرائیور گاڑی روک لیتے ہیں" رحمت علی نے کہا۔

"ہاتھ کے اشارے سے تو کار کو بھی روکا جاسکتا ہے" غالب نے کہا "کیوں نہ کار میں چلیں۔"

"اس حالت میں کون ہمارے لئے کار روکے گا" وہ بولا۔

غالب نے نازو کی طرف دیکھا "کار کیا چیز ہے۔ نازو کا اشارہ ہو تو یہ کائنات رک جائے۔ گردشِ شام و سحر رک جائے۔"

نازو مسکرائی۔ اس نے غالب کی بات کا مطلب سمجھ لیا تھا۔ سڑک سے کچھ فاصلے پر میں' غالب اور رحمت علی ایک درخت کی اوٹ میں ٹھہر گئے۔ نازو سڑک پر جا کھڑی ہوئی۔ چند منٹ بعد ایک بس نمودار ہوئی۔ نازو کے قریب آکے آہستہ ہوگئی۔ جنگل بیابان میں نازو جیسی لڑکی کو اکیلا کھڑا دیکھ کے ڈرائیور کا حیران ہونا جائز تھا مگر نازو نے اسے ہاتھ کے اشارے سے رخصت کردیا۔

وقفے وقفے سے دو بسیں گزریں۔ پھر تین ٹرک گزرے۔ چار کاروں میں جگہ نہیں تھی اس کے باوجود ایک شریف آدمی نے اپنی فیملی کے ساتھ نازو کو بیٹھنے کے لئے کہا۔

رحمت علی نے کہا "ایسے کب تک کھڑے رہیں گے جناب!"

غالب نے بھی سر ہلایا "آج نازو کا جادو نہیں چلا۔"

اسی وقت ایک ٹرک نے جو بڑی تیز رفتاری سے آرہا تھا' بریک لگائے اور اس کے ٹائر جام ہوگئے۔ سڑک پر دو کالی لکیریں بناتے ہوئے ٹرک یوں نازو کے سامنے رکا کہ وہ چھلانگ مار کے ایک طرف نہ ہوتی تو اس کے نیچے کچلی جاتی۔ نازو کی بدحواسی پر ڈرائیور نے قہقہہ مارا۔

"ارے جنگل کی ہرنی۔ ہم سے کاہے کو ڈرتی ہے۔ ہم کوئی شکاری ہیں" وہ نیچے اتر کے بولا "ہم تو شوقین ہیں شوقین۔ کیا سمجھی۔"

وہ مکروہ شکل کا ہٹا کٹا بدمعاش نظر آنے والا شخص تھا۔ اس کی لال آنکھیں اور بڑی بڑی مونچھیں' بھاری بھرکم جسم اور چہرے پر کرخت نقوش کسی کو بھی خوفزدہ کرسکتے تھے مگر نازو کو نہیں۔ وقتی صدمے کے بعد اس نے خود کو سنبھال لیا تھا اور اندازہ بھی کرلیا تھا کہ ٹرک ڈرائیور کے عزائم کیا ہیں۔

"دور رہو مجھ سے" نازو نے پیچھے ہٹتے ہوئے خوف کی اچھی اداکاری کی "اکیلی لڑکی کو دیکھ کے غنڈا گردی کرنا چاہتے ہو۔ شرم آنی چاہئے تمہیں۔"

وہ گلا پھاڑ کے ہنسا۔ یہ جان کے اس کا حوصلہ دوچند ہوگیا تھا کہ لڑکی حسین ہی نہیں تنہا بھی ہے۔

"ارے جس نے کی شرم اُس کے پھوٹے کرم۔ آخر کس کا انتظار تھا تمہیں۔ ہمارے سوا کون آئے گا تمہاری مدد کرنے۔ آؤ' ہمارے ساتھ چلو۔ جنگل کی ہرنی۔ تم بھاگ کیوں رہی ہو۔ بھاگ کے کہاں جاؤ گی۔ ہم سے بچ کے جاسکتی ہو تم۔ ہم شیر ہیں' جنگل کے بادشاہ۔ تم جنگل کی ہرنی۔۔۔۔" وہ نشے میں بول رہا تھا چنانچہ بار بار ہچکی بھی لیتا تھا۔

میں اور غالب بڑی دلچسپی سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ نازو ایک ایک قدم پیچھے ہٹتی جارہی تھی۔ وہ بیک وقت اس کی آتشِ شوق کو بھی ہوا دے رہی تھی اور اس کو مشتعل بھی کررہی تھی۔ کبھی مسکرا کے اسے آگے بلاتی تھی اور خود پیچھے ہٹ جاتی تھی۔

رحمت علی نے کہا "کمال کرتے ہو آپ بھی جناب!"

میں نے کہا "خاموش رہ کے دیکھو۔۔۔۔"

"کیا دیکھوں جی۔ میرا تو خون کھول رہا ہے۔۔۔۔"

غالب نے ہنس کے کہا "کبھی شکاری کو شکار ہوتے دیکھا ہے۔ ہرنی کے ہاتھوں جنگل کے بادشاہ کی درگت بنتے دیکھی ہے؟"

نازو اسے سڑک سے کافی دور لے گئی۔ وہ بار بار جھپٹتا تو نازو اسے قریب آنے کا موقع دے کر اس کی گرفت سے تڑپ کر نکل جاتی تھی۔ اس کی جھنجلاہٹ اس نارسائی سے غیظ و غضب میں ڈھل گئی تھی۔ وہ دیوانہ وار حملے کررہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ نازو آخر کار اس کے ہاتھوں میں یوں آجائے گی جیسے باز کے پنجوں میں ننھی سی چڑیا۔

پھر اچانک کھیل ختم ہوگیا۔ نازو نے پینترا بدلا تو میں سمجھ گیا وہ فلائنگ کِک مارے گی۔ دوسرے لمحے ڈرائیور زمین پر چت نظر آیا۔ اس کا نشہ ہرن ہوگیا ہوگا مگر وہ پھر بھی سمجھ رہا ہوگا کہ نشے میں اس نے جنگل کی ہرنی کو شیرنی کی طرح جھپٹتے دیکھا تھا۔ وہ زمین پر پڑا آسمان کو گھورتا رہا اور پھر اٹھا ہی تھا کہ نازو نے دوسری فلائنگ کِک ماری۔

"اٹھو جنگل کے بادشاہ!" نازو نے کہا۔

وہ بری طرح کراہ رہا تھا "تم۔۔۔۔ تم کیا ہو۔۔۔ بلا۔۔۔۔"

"میں جنگل کی ہرنی ہوں" نازو نے کہا اور اسے بالوں سے پکڑ کے جھٹکا دیا۔ وہ اٹھا تو نازو کے ہاتھ بجلی کی طرح چلنے لگے۔ ڈرائیور کی چیخوں سے جنگل گونجنے لگا۔ نازو نے اس کے دونوں بازو توڑ دیئے تھے جو اس نے اپنے آپ کو بچانے کے لئے اوپر اٹھائے تھے لیکن یہی وہ ہاتھ تھے جو اسے ہوس کا شکار بنانے کے لئے آگے بڑھے تھے۔

رحمت علی دم بخود کھڑا تھا۔ نازو کی نزاکت کا معمولی سا نمونہ وہ پہلے ہی دیکھ چکا تھا مگر یہ انتہا تھی۔ وہ گینڈے جیسے مضبوط جسم کا مالک اور خود کو بدمعاش سمجھنے والا گرانڈیل مرد ایک دھان پان سی لڑکی کے ہاتھوں مٹی کے کھلونے کی طرح ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ ڈرائیور کی صورت ہی اتنی بھیانک تھی کہ عام آدمی اس کا مقابلہ کرتے ہوئے دہشت میں مبتلا ہوجاتا۔ اب وہ زمین پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔ ہم سے پچاس قدم کے فاصلے پر۔

نازو تیزی سے ہماری طرف آئی "اس کا کیا کرنا ہے؟"

میں نے کہا "تمہارا شکار ہے' جو تم چاہو کرو۔"

رحمت علی نے ڈرتے ڈرتے کہا "کیا وہ مرگیا ہے؟"

"مرا تو نہیں' مرجائے گا" نازو بے نیازی سے بولی۔

غالب نے کہا "پھر کیا انتظار کریں اس کے مرنے کا۔ اسے ٹرک کے جائیں۔"

میں نے کہا "ٹرک میں ڈال لیتے ہیں۔ کہیں بھی چھوڑ دیں گے۔ یہاں چھوڑ کے گئے تو کسی اور کو لے کے جانا پڑے گا۔"

"بھئی اب اسے ڈھونا پڑے گا۔ اچھی مصیبت ہے۔ کرے کوئی بھرے کوئی" غالب نے کہا "آخر اتنی دور لے جانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"اور کیا سڑک پر دکھاتی یہ تماشا۔ آتے جاتے سب لوگ رک جاتے" نازو نے کہا "میں نے تو نہیں روکا تھا اسے۔ اس کی موت اسے گھسیٹ لائی تھی یہاں۔"

میں نے غالب کو سمجھایا "ہم اسے یہاں چھوڑ کے بھی تو نہیں جاسکتے۔ ہوش میں آتے ہی وہ پولیس پولیس چلانے لگے گا۔"

میں نے ٹرک ڈرائیور کی ٹانگیں پکڑیں۔ غالب اور رحمت علی نے اسے ہاتھ پکڑ کے اٹھایا اور اسے ٹرک تک لے آئے۔ سڑک سنسان دیکھ کے نازو نے اشارہ کیا اور ہم نے اسے اٹھا کے پیچھے ڈال دیا۔ اس کا وزن ڈھائی سو پونڈ سے کسی طرح کم نہ تھا۔

ابھی تک میرے ذہن میں اس جگہ سے دور چلے جانے کے سوا کوئی پروگرام نہ تھا۔ ڈرائیونگ میں نے سنبھالی۔ غالب نے نازو کے ساتھ پیچھے سوار ہونے کو ترجیح دی چنانچہ رحمت علی میرے ساتھ رہا۔

ٹرک بالکل نیا بھی نہیں تھا مگر بہت اچھی حالت میں تھا اور اس کے فیول میٹر کی سوئی ٹینک کو فل بتارہی تھی۔ ڈیزل کے ٹینک میں جھاگ پیدا ہونے سے میٹر کچھ غلط ہوجاتا ہے۔ ایک چوتھائی ٹینک خالی ہو تب بھی کانٹا نیچے نہیں آتا اور پھر ایک دم آدھے پر آجاتا ہے۔ تاہم چالیس پچاس لیٹر بھی بہت تھے اور تین چار سو کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے لئے کافی تھے۔

ٹرک اسٹارٹ کرنے کے بعد میں نے رحمت سے کہا کہ وہ سگریٹ جلا کے مجھے دے۔ اس نے دو سگریٹ جلائے اور ایک مجھے پیش کردیا۔

"رحمت علی!" میں نے کچھ پُرسکون ہونے کے بعد کہا "تم نے دو اسباب بیان کئے تھے' جن کی بِنا پر تم نے ہمارا ساتھ دیا۔"

"دوسرا سبب میں نے نہیں بتایا تھا" وہ بولا۔

"کوئی ایسی بات ہے جو۔۔۔۔"

"نہیں جناب۔ آپ سے کیوں چھپاؤں گا میں۔ میں انتقام لینا چاہتا تھا" رحمت علی نے کہا۔

"کس سے؟"

"ریلوے سے" وہ بولا "میرے والد نے اڑتیس سال سروس کی بڑی ایمانداری کے ساتھ۔ پہلے لوگ عام طور پر ایماندار ہی ہوتے تھے۔ ریٹائرمنٹ سے دو سال قبل ان کے اور ریلوے کے درمیان اصول پرستی کا تنازعہ بن گیا۔ نئے افسروں کی نظر میں ان کی ایمانداری پہلے ہی کھٹکتی تھی۔ وہ کسی کی سفارش پر اپنے ساتھ کسی مفت خورے کو سفر کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ ان افسروں کے دوست' بھانجے بھتیجے اور جاننے والے یا تو بغیر ٹکٹ سفر کرنے کے خواہش مند ہوتے تھے یا لوئر کلاس کے ٹکٹ پر اپر کلاس میں بیٹھنا چاہتے تھے۔ راستے میں ڈائننگ کار سے مفت کھانا مانگتے تھے اور والد صاحب کسی کے ساتھ رعایت نہیں کرتے تھے۔ انتہا یہ تھی کہ میں ٹکٹ لے کر اس گاڑی میں بیٹھتا تھا جس میں گارڈ وہ خود ہوتے تھے۔ صرف ایک بار میں نے ڈنڈی مارنے کی کوشش کی۔ یہ سوچا کہ کچھ پیسے بچ جائیں گے تو ایک قمیص بنوالوں گا۔ میرے پاس کالج جانے کے لئے ایک ہی قمیص تھی۔ راستے میں چیکر آیا تو میں نے والد صاحب کا نام بتادیا اور وہ سر ہلا کے گزر گیا مگر جیسا کہ میں نے کہا' پرانے وقتوں کے سب لوگ ہی ایماندار تھے' چیکر کو شک گزرا کہ میرے بلا ٹکٹ سفر کرنے کا علم میرے والد کو نہیں ہے۔ وہ ہندو تھا مگر عناد کی کوئی بات نہیں تھی۔ اس نے والد صاحب سے ذکر کیا اور کہا کہ قانونی معاملہ تو بعد میں آتا ہے' میری اخلاقی ذمے داری ہے کہ آپ کو اولاد کی غلطی سے آگاہ کردوں۔ کیونکہ میرے بھی بچے ہیں اور آج ایک بچے کو چھوڑ دیا گیا تو کل وہ دوسرے کے ساتھ یہ بات بڑے فخر سے کرے گا کہ ریلوے تو میرے باپ کی ہے اور پھر سب یہی کرنے لگے تو ریلوے کہاں رہے گی۔ والد صاحب نے لالہ جی کا شکریہ ادا کیا اور مجھے بغیر ٹکٹ سفر کرنے کے جرم میں پولیس کے ہاتھوں پکڑوادیا۔ ریلوے مجسٹریٹ نے قاعدے ضابطے کے مطابق مجھ پر سو روپے جرمانہ کیا جو اس زمانے میں بہت بڑی رقم تھی۔ یہ جرمانہ میری والدہ نے ادا کیا۔ والد تو چاہتے تھے کہ میں پندرہ دن جیل میں گزاروں تاکہ مجھے قانون کا احترام کرنا آجائے مگر ماں کو فکر تھی بدنامی کی۔ سارے زمانے کو معلوم ہوجائے گا کہ گارڈ صاحب کا بیٹا سزا یافتہ ہے۔ ابھی سے جیل کاٹ رہا ہے۔ کل کون جانے چور بنے گا یا ڈاکو۔ اور بدنامی ہوگی تو پھر لڑکیوں کے رشتے نہیں ہوں گے۔ بڑی دور کی سوچتے تھے پہلے کے لوگ۔ آج کوئی قتل کرے یا ڈاکا ڈالے اور جیل کاٹ آئے تب بھی معزز ہی رہتا ہے' اگر اس کے پاس کار اور کوٹھی ہو۔ پروفیسر اگر جوتیاں چٹخاتا پھرے تو معزز نہیں۔ خیر جناب' سو روپے تو ماں نے نکال کردے دیئے مگر ہم نے وہ مہینہ فاقہ کشی میں کاٹا۔ والد قرض لینے کے قائل ہی نہ تھے۔ ادھار سودا تک نہیں لیتے تھے۔ اب ایسے لوگ احمق کہلاتے ہیں۔ بینک سے' حکومت سے یا کسی ادارے سے قرض لے کر ہضم کرجانا یا معاف کرالینا عقلمندی کی دلیل ہے۔ اس پورے مہینے ہم نے ایک وقت کھایا۔ اور ظاہر ہے جتنی ذہنی اذیت میں نے برداشت کی وہ بہت سخت سزا تھی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ایک ٹکٹ نہ لے کر میں نے پورے خاندان کو شرمندگی ہی نہیں دی' ان سے مُنہ کا نوالہ بھی چھین لیا ہے۔ چھوٹے بھائی بہنوں کو ایک آنہ روز جیب خرچ ملتا تھا۔ وہ بند کردیا گیا۔ دودھ بند کردیا گیا۔ چائے بند کردی گئی۔ صرف میری وجہ سے ایسا ہوا۔ یہ احساس پندرہ دن جیل

میں رہنے کی سزا سے کہیں زیادہ تکلیف دہ تھا۔ میرا شرمندہ ہونا یا کسی سے معافی مانگنا بے کار تھا۔ اس سے وہ سو روپے واپس نہیں آنے تھے جو ان کی چھوٹی چھوٹی راحتوں اور خوشیوں کے ضامن تھے۔ معاف کرنا جناب، میں بات لمبی کربیٹھا۔ بتانا صرف یہ تھا کہ میرے والد کتنے ایماندار تھے۔ پرانے سینئر افسر بھی انہی جیسے تھے چنانچہ ان کا احترام کرتے تھے اور نئے کم ظرف، چھوٹے افسروں کی شکایات والد صاحب کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھیں لیکن پھر بدقسمتی سے ایک انتہائی متعصب ہندو ڈویژنل افسر بن کے آگیا جو بہت گھٹیا خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔"

"تم خاندانی نجابت کے فلسفے پر یقین رکھتے ہو کہ عالی نسب لوگ ہی شریف اور ایماندار ہوتے ہیں" میں نے کہا۔

"بالکل نہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا جناب!" رحمت علی بولا "دراصل غربت، جہالت اور حالات کی سختی نے اس کو ایک نفسیاتی مریض بنادیا تھا۔ اس کی ماں کا کردار بہت عجیب تھا۔ وہ کئی بار بچوں کو چھوڑ کے کسی کے ساتھ بھاگ گئی اور پھر کچھ دن بعد لوٹ آئی۔ کبھی ایک ہفتے بعد۔ کبھی ایک مہینے بعد۔ ایک بار تو سنا ہے کہ وہ ایک بچہ ساتھ لے کر آئی تھی۔"

"کمال ہے! اس کا شوہر اتنا بے غیرت تھا۔"

"بس جی۔ میں تو سنی سنائی بتارہا ہوں۔ حقیقت کا علم تو خدا ہی کو ہے" رحمت علی نے کہا "وہ شوہر بس نام کا تھا۔ کام بھی کوئی نہیں کرتا تھا اور گانجا بھی پیتا تھا۔ بیوی سب خرچہ اٹھاتی تھی، معلوم نہیں کیسے۔ شوہر کو بھی کچھ نہیں کہتی تھی۔ لوگ کچھ کہتے تھے تو وہ سینہ تان کے سامنے آجاتا تھا کہ میری بیوی پر کسی نے انگلی اٹھائی تو چھرا گھونپ دوں گا۔ یہ سب میرے بچے ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ پھر نہ جانے کس نے عورت کو قتل کردیا۔ پولیس نے شوہر کو بھی قربانی کا بکرا بنا کے پھانسی چڑھوادیا۔ بچے لاوارث ہوگئے اور اِدھر اُدھر بھٹکتے ہوئے نہ جانے کہاں کہاں گئے۔ پھر ایک کو دوسرے کی خبر نہیں ملی۔ رشتے دار تھے مگر کسی نے انہیں اپنا سمجھ کے قبول نہ کیا تھا۔ یہ ڈویژنل افسر زمانے کی ذلت اٹھاکے اور ٹھوکریں کھاکے بھی نہ جانے کیسے آگے نکل گیا۔ تاہم بچپن کی ساری تلخی اس کی ذات میں شامل تھی اور اس نے دنیا سے انتقامی رویہ اختیار کرلیا تھا۔ اذیت پسندی اس کی فطرت میں شامل تھی اور وہ کسی کی نیک نامی سے خاص طور پر الرجک تھا۔ والد صاحب کی نیک نامی کا چرچا کچھ زیادہ تھا۔ وہ ان کا دشمن ہوگیا اور اس کے بعد اپنی انتقامی کارروائی شروع کردی۔ انجام یہ ہوا کہ برطرفی کے خوف سے والد صاحب نے ایک سال کی چھٹی لے لی جو ریٹائرمنٹ سے قبل مل جاتی ہے۔ اس کے باوجود وہ پنشن نہ وصول کرسکے۔ ان کے خلاف شکایات کے پرانے دفتر کھولے گئے۔ ان شکایات میں بے بنیاد الزامات شامل کرلئے گئے۔ میری دو بہنوں کے رشتے ٹوٹ گئے۔ کچھ بدنامی کے باعث، کچھ اس لئے کہ شادی کے اخراجات کے لئے پیسہ نہ تھا۔ فاقہ کشی کا ایک طویل دور خودکشی پر ختم ہوا۔ آپ یقین کریں گے کہ اس دن گھر میں کفن کے پیسے بھی نہیں تھے۔ محلے والوں نے یہ خرچہ اٹھایا۔ کالج نے چھوڑ ہی دیا تھا۔ نوکری کہیں ملتی نہ تھی۔ پھر فسادات ہوگئے۔ اماں تو عدت کا زمانہ پورا ہونے سے پہلے ہی دنیا سے رخصت ہوئیں۔"

وہ خاموش ہوگیا تو میں نے کہا "یہ تو بہت پرانی بات ہوگئی۔ اکیس بائیس سال بعد بدلہ لینے کا خیال کیوں آیا تمہیں؟"

"بدلہ تو میں دس سال سے لے رہا تھا" وہ بولا "سب سے پہلے تو میں نے اس ہندو افسر کو تلاش کیا۔ وہ بھی ریٹائر ہوکے اب شہر میں ٹھاٹھ سے رہنے لگا تھا۔ اسے اتنی پرانی بات یاد بھی نہ تھی۔ میں نے ایک رات اس کے گھر کو باہر سے تالے لگا کے سارے دروازے بند کردئے۔ کھڑکیوں میں لوہے کی گرل تھی۔ وہ بچ کے نکل ہی نہیں سکتا تھا۔ پھر میں نے اطمینان سے اپنی گاڑی میں سے پیٹرول کھینچ کر نکالا اور گھر کو چاروں طرف سے آگ لگادی۔ بھاگتے ہوئے میں نے کار کو بھی نہیں چھوڑا۔ جب شور ہوا اور لوگوں نے فائر بریگیڈ کو بلایا تو میں وہیں موجود تھا۔ اور میں مجمع میں شامل رہا۔ میرے سامنے اس کی جلی ہوئی لاش نکالی گئی۔ اس کے بیوی بچوں کی لاشیں لائی گئیں۔"

"تم اتنے سفاک نظر تو نہیں آتے" میں نے کہا "تم نے عورتوں اور بچوں کو بھی معاف نہیں کیا۔ وہ تو بے قصور تھے۔"

"بے قصور تو ہم سب تھے۔ میری بہنیں بھی" وہ بولا "میرے بھائی تھے۔ پانچ بہنوں کے علاوہ۔ اب مجھے بھی معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہے۔ جیسے اس ہندو افسر کو علم نہیں تھا کہ اس کے بھائی کہاں گئے۔ مگر ان کی بات اور تھی۔ ان کا دعویدار کوئی نہ تھا۔ کا کسی سے خون کا رشتہ نہیں تھا۔ یا تھا تو وہ لوگ اسے تسلیم نہ کرتے تھے۔ وہ ایک خاندان کے افراد نہیں تھے۔ بھان متی کا کنبہ تھا۔ کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا۔ لیکن ہم سب ایک ماں باپ کی حقیقی اولاد تھے۔ ہمیں صرف ان کی ایمانداری اور شرافت کی سزا میں دربدری ملی۔ بھائی کو میں تلاش کررہا ہوں اور کرتا رہوں گا۔ ایک بہن مجھے ریل میں بھیک مانگتی نظر آئی تھی۔ لوگ اسے دھتکار رہے تھے کیونکہ وہ کوڑھ میں مبتلا تھی۔ وہ سب سے چھوٹی تھی اس لئے میں نے پہچان لیا اسے۔ اور بعد میں چلتی ٹرین سے گرادیا۔ دوسری کو بھی میں نے ٹرین پر ہی دیکھا تھا۔ بالکل انداز میں۔ اس میں بڑی بہن کی جھلک تھی۔ وہ ایک کوپے میں تھی اور اس کے انداز بتاتے تھے کہ وہ بیسوا ہے۔ جو شخص اس کے ساتھ تھا وہ بھی شراب پی رہا تھا اور میری بہن کو بھی پلا رہا تھا۔ میں نے دونوں کو وہیں ماردیا۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ ان بہنوں کی صورت آج بھی میری نظروں میں گھومتی ہے۔

روزمی بھکارن دوسری طوائف۔ تیسری، چوتھی اور پانچویں کے بارے میں سوچتا ہوں تو اس کے سوا خیال ہی نہیں آتا کہ وہ بھی عزت آبرو کے ساتھ اپنے گھر میں آباد نہیں ہوں گی۔ یہ سب صرف اس لئے ہوا کہ وقت پر میرے والد انہیں رخصت نہ کرسکے۔ اس سے پہلے وہ خود حرام موت مرگئے۔ اس سب کا ذمے دار ایک شخص تھا۔ اس نے میرے پورے خاندان کو تباہ کیا۔ میں نے اس کے خاندان کو عبرت ناک انجام سے دوچار کیا۔ ریلوے کا پورا محکمہ اس سازش میں شریک تھا۔ ایک افسر کی دشمنی سے اتنا نقصان نہیں ہوسکتا تھا۔ مگر نیچے والے اور اوپر والے سب بزدل تھے یا کمینے تھے کہ کسی نے اُن کی اڑتیس سال کی خدمت گزاری کا لحاظ نہیں رکھا۔ کیا ملا میرے والد کو ریلوے کے ساتھ ایمانداری کا صلہ۔ سو روپے کا جرمانہ ریلوے کے خزانے میں گیا۔ وہ بِلا ٹکٹ مسافروں کو پکڑ کے فائدہ ریلوے کو پہنچاتے رہے۔ میں نے ریلوے میں ملازمت ہی اس لئے کی تھی۔ جب سے میں بھرتی ہوا۔ پہلے میں قلی تھا جناب، اس وقت سے آج تک میں مسلسل نقصان پہنچا رہا ہوں اس محکمے کو۔ اپنے والد کا سارا حساب برابر کرنے کے لئے۔"

میں نے کہا "رحمت علی۔ میں اسے انتقام نہیں سمجھتا۔ میرا خیال ہے کہ تم ایک نفسیاتی مریض ہو۔ تخریبی رجحانات رکھنے والے۔"

اس نے حیرانی سے مجھے دیکھا "یہ غلط ہے جناب!"

"یہ بالکل ٹھیک ہے" میں نے کہا "تم کہہ سکتے ہو کہ وہ ہندو افسر قصوروار تھا مگر کیا تم اس کا جرم کسی عدالت میں ثابت کرسکتے تھے؟"

"نہیں۔ مگر میرا ضمیر مطمئن تھا۔۔"

"تمہارا ضمیر اس معاملے کو خدا کے انصاف کی عدالت میں پیش کرکے مطمئن نہیں ہوسکتا تھا" میں نے اس کی بات کاٹ دی "کیا تمہیں یوم مکافات عمل پر یقین نہیں۔ تمہارے والدین اور بھائی بہنوں کے ساتھ ظلم کرنے والے اس جرم میں اجتماعی طور پر شریک تھے اور انہوں نے بالواسطہ طور پر جرم کیا۔ تم براہِ راست جرم کے مرتکب ہوئے۔ ہر قتل کا تم اعتراف کرچکے ہو۔"

"اگر دنیا کے نظامِ انصاف کو دیکھا جائے تو۔۔۔۔"

"آخرت کے حساب پر تو تمہارا اعتقاد ہی نہیں تھا ورنہ تم یہ سب کچھ کیوں کرتے" میں نے برہمی سے کہا۔

"مجھے اپنے جذبات پر اختیار نہیں تھا۔"

"یعنی تم عقل سے کام نہیں لے سکتے تھے۔ یہ پاگل پن ہی تو کہلائے گا" میں نے کہا "تم خود سوچو کہ ذاتی انتقام کا کوئی اخلاقی جواز بنتا ہے۔ تم کہہ سکتے ہو کہ تمہاری جدوجہد کسی نیک مقصد کے لئے ہے۔ زیادتی، ظلم یا ناانصافی اکیس بائیس سال پہلے ہوئی تھی اور بدلہ تم آج ٹرینوں سے لے رہے ہو۔ تمہارا باپ ٹیلی فون کے محکمے میں ہوتا تو تم کھمبے اکھاڑتے پھرتے۔ تار کاٹتے یا ٹیلی فون ایکس چینج تباہ کرتے۔۔۔"

وہ مشتعل ہوکے بولا "آخر آپ بھی تو۔۔۔۔"

"بکومت۔" میں نے دہاڑ کے کہا "ہم اپنی ذات کے لئے نہیں لڑرہے ہیں۔ یہ جہاد ہے۔ اس کا ایک مقصد ہے۔ میں اپنے ملک اور اپنی قوم کے دشمنوں کے خلاف جنگ میں شریک ہوں۔ محاذِ جنگ پر لڑنے والے فوجی بھی میرے ساتھ ہیں۔ میں نے اپنے باپ کے قاتل سے بدلہ نہیں لیا۔ موقع ملنے کے باوجود اسے خود نہیں مارا۔ میں اسے ایک نہ ایک دن اسی نظامِ انصاف کے ہاتھوں تختۂ دار پر پہنچاؤں گا جس کو اس نے بے بس سمجھ رکھا ہے۔"

"آپ نے غلط سمجھا ہے مجھے۔"

"مجھے افسوس ہے کہ یہ سب مجھے دیر سے معلوم ہوا۔ تم کو واقعی غلط سمجھا تھا میں نے ورنہ میں تمہاری مدد کی پیش کش ہی قبول نہ کرتا۔ ہمیں ضرورت بھی نہیں تھی تمہاری مدد کی۔ تم اس ملک کے شہری ہو تو تمہیں اس ملک سے وفادار رہنا چاہئے۔ اس ملک کے قانون کی بالادستی کو تسلیم کرنا چاہئے۔ میں جانتا ہوں کہ دلاور میرے باپ کا قاتل ہے مگر اس کی وجہ سے میں اپنے ملک کو نقصان پہنچانے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ کوئی ایسا کام نہیں کرسکتا جو میرے قومی مفاد کے منافی ہو۔ مگر تم یہی کررہے ہو۔ جس ملک کے خزانے سے تنخواہ لے رہے ہو۔ جس محکمے کی کارکردگی کے ذمے دار ہو اسی کے خلاف ہر کام کررہے ہو۔ تمہارے جذباتی دلائل نے مجھے وقتی طور پر متاثر کرلیا تھا لیکن اب میری نظر میں تمہاری حیثیت ایک ایسے مجرم کی ہے جس کو فوراً قانون کے حوالے کردینا چاہئے۔"

احساسِ ذلت سے اس کا چہرہ مسخ ہوگیا "یہ سب تمہارے ساتھ ہوتا پھر میں پوچھتا تم سے جرم اور گناہ کا فلسفہ۔"

میں نے ٹرک روک دیا "ابھی وقت ہے رحمت علی۔ میں تمہیں ایک موقع دیتا ہوں۔ جاؤ خود کو قانون کے حوالے کردو۔ اگر تم میرے ملک میں ہوتے تو اس اعتراف کے بعد میں خود تمہیں سزا بھی دے سکتا تھا۔ مگر ایک تو تم نے خواہ مخواہ احسان کا بار ڈال دیا ہے مجھ پر۔۔۔۔"

"میں بھی پکڑوا سکتا ہوں تم سب کو۔۔۔۔" وہ نیچے اترتے ہوئے چیخ کر بولا۔

"جاؤ تم بھی شامل ہوجاؤ ان سب میں جو ہمارے دشمن ہیں۔ اس سے پہلے کہ میں تمہیں دشمن سمجھتے ہوئے گولی ماردوں۔" میں نے کہا اور ٹرک کو آگے بڑھادیا۔

پیچھے غالب اور نازو کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ میرے اور رحمت علی کے درمیان کیا گفتگو ہوئی چنانچہ ٹرک رکا تو انہوں نے حیرانی سے رحمت علی کے اتارے جانے کا منظر دیکھا۔

"یہ کیا ہوا؟" غالب نے کہا۔

"ٹھیک ہوا جو بھی ہوا" میں نے غصے میں کہا اور ٹرک کو آگے

بڑھادیا۔ ایک میل کے بعد سڑک دو شاخوں میں تقسیم ہوگئی۔ میں نے ٹرک کو بائیں جانب موڑ لیا اور دو میل بعد ایک کنارے پر روک دیا۔

"آخر بات کیا ہوئی" غالب نے نیچے اترتے ہی پوچھا۔

"ابھی بتاتا ہوں" میں نے کہا "پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ اس وقت ہم کہاں ہیں؟"

"بھارت کی سرزمین پر۔ ایک نامعلوم سڑک پر۔ ضلع اور تحصیل معلوم کرکے بتا سکتا ہوں۔"

میں نے کہا "تمہارا اندازہ کیا کہتا ہے۔ ہم اس مقام سے کتنی دور ہیں جہاں گل اور محسن اترے ہوں گے یا اتارے گئے ہوں گے؟"

غالب نے سر کھجایا "میری چھٹی حس جغرافیے میں بہت کمزور ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ دس میل اِدھر یا اُدھر۔"

"سبحان اللہ! آپ تو عین اسی جگہ لے آئے۔ اب ایسا کرتے ہیں کہ میں چلتا ہوں دس میل شمال کی جانب اور آپ جائیں جنوب کی سمت" غالب نے کہا "نازو کو مشرق کا علاقہ سونپ دیں پھر بھی مغرب کا کیا ہوگا؟"

نازو نے انگلیوں پر حساب لگا کے کہا "یہ کوئی چار سو مربع میل کا علاقہ ہوا۔"

میں نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑا کے کہا "ہو سکتا ہے کہ میرا اندازہ غلط ہو۔ لیکن جتنا سفر ہم نے ٹرین میں کیا تھا اتنا ہی واپسی کا سفر بھی تھا۔ اور یہاں سے ریلوے لائن بھی دور نہیں ہو سکتی۔ خیر پہلے تو یہاں سے چلو۔"

"کہاں چلیں۔ مجھ سے اب نہیں چلا جاتا" نازو بولی۔

میں نے کہا "تھوڑی سی ہمت اور کرو۔ اس ٹرک کے قریب رکے رہنے میں خطرہ ہے۔ کسی آبادی کے قریب پہنچ جائیں تو پھر کسی کے مہمان ہو جائیں گے۔"

غالب نے کہا "یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے۔"

میں نے کہا "دھواں وہیں سے اٹھتا ہے جہاں آگ ہو۔ اور آگ چولھے کی ہو یا بھٹی کی، کسی آبادی کا پتا دیتی ہے۔"

ہم نے کھیتوں کے بیچ سے شارٹ کٹ اختیار کیا اور درختوں کے ایک جھنڈ سے گزرے تو ہمارے سامنے ایک اینٹوں کا بھٹہ آگیا۔ دھواں اس کی چمنی اُگل رہی تھی۔ بھٹے میں کام کرنے والے مزدور عورتوں اور مردوں نے ہمیں حیرانی سے دیکھا۔ ان کا نگراں ایک خوں خوار قسم کا موالی ٹائپ آدمی تھا۔ بھٹے کے عقب میں ایک کار بھی موجود تھی۔

میں نے نمستے کے انداز میں ہاتھ باندھ کے کہا "تم مالک ہو؟"

"مالکوں سے کیا کام ہے تمہیں؟" وہ نازو کو گھور کے بولا۔

"یہ ہم مالکوں کے سوا کسی کو نہیں بتا سکتے۔"

اس نے نظر جما کے مجھے دیکھا "تم کون ہو؟ اخبار والے"

میں نے کہا "اسسٹنٹ کمشنر ہوں ناسک کا۔ میری کار خراب ہوگئی تھی۔ دھواں دیکھ کر ادھر چلا آیا۔"

اس کا رویہ ایک دم بدل گیا "آئیے۔ مالک اور ہیں۔ اتفاق سے آج آگئے" اس نے بڑی شرافت سے کہا اور آگے چلنے لگا "میں یہاں منیجر ہوں۔"

بھٹے کے پیچھے کمرا بنا ہوا تھا۔ یہ مالک کا آفس تھا۔ اس پیچھے مجھے دوسرا کمرا نظر آیا مگر اس کا دروازہ بند تھا۔ ہم بیٹھ گئے۔ باہر کے مقابلے میں یہ جگہ ائیرکنڈیشنڈ محسوس ہوتی تھی۔ منیجر نے بڑی نرمی سے دروازے پر انگلی ماری۔

"کیا بات ہے؟" اندر سے کسی نے چنگھاڑ کے کہا۔

"سر! وہ... مہمان آئے ہیں۔"

"ان سے کہو دفع ہو جائیں۔ میرا کوئی مہمان یہاں نہ آسکتا" اسی شخص نے دہاڑ کے کہا۔

میں نے دروازے کے قریب جا کے کہا "اگر تم باہر نہ آئے تو مجھے اندر آنا پڑے گا۔"

مجھے پہلے ہی شک تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ میری بات کے جواب میں چوڑیاں کھنکنے کی آواز آئی اور کوئی عورت گرار میں کچھ بولنے لگی۔ مرد نے اسے "شٹ اپ" کہا اور دروازہ کھول کے باہر آگیا۔ وہ ایک جوان آدمی تھا۔ اس نے صرف پتلون رکھی تھی "ہو وا ییل آر یو......" "خیر اسے دیکھئے" فرار ہو...

میں نے انگریزی میں کہا "اگر تم انسانیت کا جامہ پہن آؤ تو میں بتاؤں۔"

وہ ایک دم واپس ہوگیا اور چند منٹ بعد پھر برآمد ہوا تو لباس میں تھا۔ وہ بھاری بدن کا پستہ قد آدمی تھا جس کی آنکھوں عیش پرستی کی بے حیائی جھلکتی تھی۔ لیکن اپنے سامنے نائب اسسٹنٹ کمشنر کو دیکھ کر وہ ساری عیاشی بھول گیا تھا۔ اب اس صورت پر خفت کے ساتھ پریشانی جھلک رہی تھی۔ پھر اندر ایک عورت ساڑی ٹھیک کرتی اور ہاتھوں سے بالوں کو سنوارتی نکلی۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ ایک مشہور ایکٹریس تھی جس کی شہرت کا آفتاب گہنا چکا تھا۔ اسے بڑی مایوسی ہوئی جب ہم کے شاندار ماضی سے کسی جذباتی وابستگی کا اظہار نہیں کیا اور پہچانا تک نہیں۔

"میرا نام مہتا ہے۔ جی پی مہتا" بھٹے کے مالک نے کہا "اور ان کو تو آپ نے پہچان ہی لیا ہوگا۔ اگر آپ فلمیں دیکھتے ہیں"

"سوری۔ میں یہ لچر اور گھسی پٹی فارمولا فلمیں دیکھنے میں وقت ضائع نہیں کرتا" میں نے انگریزی میں کہا "ویسے بھی فلموں کے لئے وقت کہاں ہوتا ہے ہمارے پاس۔ یہ میرے دوست

اسسٹنٹ پولیس کمشنر بمبئی۔ اور یہ ان کی دھرم پتنی ہیں"

انہوں نے باری باری ہاتھ جوڑے اور صوفوں پر بیٹھ گئے۔ مہتا نے منیجر کو آواز دے کر بلایا اور اسے چائے کا بندوبست کرنے کے لئے کہا۔

پھر اسے اپنی بدتہذیبی کا احساس ہوا "سوری! مجھے پوچھ لینا چاہئے تھا کہ آپ کیا پئیں گے۔ چائے یا کافی؟"

"مل جائے تو کافی ورنہ چائے۔" میں نے کہا۔

"کافی میں کچھ وقت لگے گا" وہ معذرت آمیز انداز میں بولا۔

"پھر چائے ہی ٹھیک ہے" میں نے کہا۔

"مسٹر مہتا!" میں نے منیجر کے جاتے ہی کہا "غالباً میں نے اپنے بارے میں نہیں بتایا۔ میں نیا اسسٹنٹ کمشنر ہوں۔ گپتا۔ ابھی ایک ہفتہ پہلے چارج لیا ہے میں نے۔ اس سے پہلے میں شملہ میں تھا۔"

"ہم آپ کے خادم ہیں جناب......"

میں نے کہا "ایک معمولی سی انکوائری بھی تھی۔ ہم نے سوچا کہ ادھر آئے ہیں تو اسے بھی نمٹا دیں۔ ویسے ہم ادھر شکار کھیلنے آئے تھے۔ بدقسمتی سے گاڑی خراب ہوگئی۔ دوسری جیپ کو ہم نے ایک کام سے شہر بھیج دیا تھا۔"

انکوائری کے نام پر مہتا کا رنگ فق ہوگیا تھا۔ ہر کاروباری شخص کہیں نہ کہیں ہیرا پھیری یا قوانین کی خلاف ورزی ضرور کرتا ہے۔ خواہ وہ ٹیکس بچانے کا معاملہ ہو، کم اجرت دے کر زیادہ کام لینے کا، جبری مشقت کا یا غنڈہ گردی کا۔

"کس قسم کی انکوائری ہے سر؟ میں تو بہت قانون کے دائرے میں رہ کے کام کرتا ہوں" مہتا نے کہا۔

"مجھے کچھ سمجھانے کی ضرورت نہیں۔ سات سال میں میری پوسٹنگ مختلف مقامات پر رہی ہے۔ مجھے سب کے دائروں کی وسعت کا اندازہ ہے۔" میں نے کہا "جس کے ہاتھ جتنے لمبے ہوتے ہیں اتنا ہی اس کی غیر قانونی سرگرمیوں کا دائرہ وسیع ہوتا ہے مسٹر مہتا۔ اور یہ تو آپ کے رویے پر منحصر ہے کہ آپ کس حد تک قانون کی اہمیت کو سمجھتے ہیں۔ بعض اوقات ہاتھی اسمگل کر دیا جاتا ہے اور چیونٹی خریدنے پر قانون رسید طلب کرلے تو کیس بن جاتا ہے۔"

مہتا نے اطمینان کا سانس لیا کہ "ہم تعاون" مانگنے والے گزشتہ... قانون پرست اور فرض شناس نہیں ہیں۔

اس نے رازدارانہ لہجے میں کہا "یونین نے وہی معاملہ اٹھایا ہوگا... کا۔"

میں نے بے نیازی سے کہا "وہ ایک معاملہ ہے۔"

"یہ بڑے احسان فراموش لوگ ہیں۔ میں تو نمک حرام کہوں گا۔ جس تھالی میں کھاتے ہیں اسی میں چھید کرتے ہیں" مہتا کا حوصلہ بڑھ گیا تھا "اب پچاس فیصد مہنگائی الاؤنس کا مطالبہ محض مجھے بلیک میل کرنے کے لئے تھا۔ میں بیس سے پچیس فیصد پر آگیا تو انہوں نے بچوں سے مشقت لینے کا معاملہ کھڑا کر دیا حالاں کہ ان کے حرامی بچوں کو میں نے کام کرنے کے لئے نہیں بلایا تھا۔ یہ خود لائے ہیں انہیں اور آدھی اُجرت......"

میں نے کہا "ان سب معاملات پر بات ہو جائے گی۔ پہلے ایک اور بات۔ یہ بھٹہ کب سے چلا رہے ہیں آپ؟"

"ساٹھ سال ہوگئے۔"

"میں نے ہنس کے کہا "اتنی عمر ہے آپ کی...."

"میرے دادا نے یہ کام شروع کیا تھا۔ پھر والد صاحب نے سنبھالا۔ اب وہ بوڑھے ہوگئے ہیں۔"

"یہ سب کچھ اپنے وقت میں انہوں نے بھی کیا ہوگا جو اُب آپ کررہے ہیں جوانی میں" میں نے کہا اور اس اداکارہ کی جانب دیکھا جس کے پندار کو احساسِ ناقدری سے پہلے ہی ٹھیس پہنچ چکی تھی۔

غالب نے کہا "آپ شکار کے بھی شوقین ہیں؟"

مہتا نے سنبھل کے کہا "جی۔ سیزن کی بات ہے۔"

"سیزن یا موڈ اور موقع؟" غالب نے کہا۔

فلمی اداکارہ نے اپنی سخت تذلیل محسوس کی مگر صورتِ حال کی نزاکت کے پیشِ نظر وہ مسکراتی رہی "موقعے اور موڈ سے آپ فائدہ نہیں اٹھاتے؟ میرا خیال ہے کہ شکاری اچھا ہو تو اس کا نشانہ بھی وقت کے مطابق صحیح جگہ پر لگتا ہے۔ اس وقت آپ خوب آئے" ایکٹریس نے کہا۔

مہتا نے اسے آنکھوں کے اشارے سے روکا مگر وہ نشے میں تھی۔

"مہتا ڈارلنگ۔ اتنے معزز اور بااختیار مہمانوں کو تم نے کہاں بٹھا رکھا ہے۔ انہیں اندر لے جاؤ۔ اپنے گھر مدعو کرو۔ یہ انکوائری وغیرہ سب ختم کر سکتے ہیں" وہ ہنسی "کیا خیال ہے مسٹر گپتا! کیا آپ کو بھی لچر، گھسی پٹی فارمولا فلمیں پسند نہیں؟ میری فلمیں۔"

مہتا نے سخت لہجے میں کہا "تم اندر جاؤ" اور پھر اسے بازو سے پکڑ کے اندر لے گیا، اس کے احتجاج کو نظر انداز کرتے ہوئے۔ اندر سے میں نے اس کی آواز سنی "تم کیوں برباد کرنا چاہتی ہو مجھے۔"

"اس لئے کہ تم نے مجھے برباد کیا ہے۔"

"بکواس بند کرو ورنہ......"

"ورنہ کیا۔ میں سب کچھ جانتی ہوں۔ انکوائری......"

اس کے بعد عورت خاموش ہوگئی۔ اس کا جملہ "انکوائری"

کے لفظ پر ختم ہو گیا۔ میں نے کان لگا کے کوئی آہٹ سننے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ غالب اور نازو نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ان کا سوال میرے ذہن میں بھی تھا کہ کیا مجھے دروازہ کھول کر اندر جھانکنا چاہئے اور اپنا یہ شک رفع کر لینا چاہئے کہ مہتا نے اس زبان دراز عورت کو ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا ہے جو اچانک موقعے سے فائدہ اٹھا کے عملاً اس کا مستقبل تباہ کرنے پر تل گئی تھی۔

ٹھنڈے دماغ سے کام لیتے ہوئے میں نے فوری طور پر کچھ نہ کرنے کا فیصلہ کیا کیوں کہ جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ میری دخل اندازی سے اس عورت کو پھر زندگی نہیں مل سکتی تھی اور اگر کچھ بھی نہیں ہوا تھا تو دخل اندازی بے مقصد تھی۔

مہتا واپس آیا تو اس کی صورت پر اس کے جرم کی تحریر بہت واضح پڑھی جاتی تھی مگر وہ اس پر ایک پُر فریب مسکراہٹ کا پردہ ڈالنے کی ناکام جدوجہد میں مصروف تھا۔

"شی واز ڈرنک" اس نے معذرت آمیز لہجے میں کہا اور تھوڑی سی پھول جانے والی سانس پر قابو پانے کے لئے پانی پینے لگا۔

"تم نے نشہ اتار دیا اس کا؟" میں نے کہا۔

وہ پھر نروس ہوا "وہ۔ہاں۔ شی از کوائیٹ ناؤ۔ آپ بتائیں میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں؟"

"مسٹر مہتا! اس بھٹے سے اینٹوں کی سپلائی کہاں تک ہوتی ہے؟"

"بہت دور دور تک۔ ہماری ایک گڈول ہے پرانے تعلقات ہیں' اور بس۔ بمبئی تک اس علاقے میں یہ ایک ہی بھٹہ تھا۔ اب تو درجنوں ہیں مگر اولڈ از گولڈ۔ لوگ یہ بات سمجھتے ہیں" وہ ہنسا۔

"آس پاس کے علاقے میں تمہارے نام کو جاننے والے لوگ کتنے ہیں؟ میرا مطلب ہے واقفیت کا دائرہ کتنے فاصلے تک ہو گا۔ دس میل ادھر یا ادھر؟"

"زیادہ ہی ہو گا" وہ سوچ کے بولا "مہتا کا نام ہر اینٹ پر نقش ہے' جو دس میل کے دائرے میں آج سے پچاس سال قبل بھی لگی ہو گی۔"

"اس بھٹے پر کام کرنے والے افراد کی تعداد کیا ہے' ان میں مرد کتنے ہیں' عورتیں کتنی ہیں اور بچے کتنے؟"

وہ گھبرا گیا "یہ سب مجھے زبانی تو یاد نہیں۔ مینجر بتائے گا۔ رسونتی والا معاملہ تو......"

میں نے کہا "میں نے ابھی انکوائری شروع نہیں کی مسٹر مہتا۔ اور اس کی اتنی جلدی بھی نہیں ہے مجھے۔"

مہتا کے چہرے پر سکون نظر آنے لگا "وہ چائے لاتا ہی ہو گا سر۔ اس کے علاوہ کسی چیز سے آپ شوق کرنا چاہیں تو بلا تکلف کہیں سر۔"

میں نے کہا "یہ مزدور بھی آس پاس کے دیہات سے آتے ہوں گے؟"

"جی سر! مستقل کام نہیں کرتے یہ لوگ۔ آتے جاتے رہتے ہیں۔"

"بہت دور دور سے آتے ہوں گے؟"

وہ کنفیوز نظر آنے لگا "روزگار کا مسئلہ ایسا ہی ہے۔"

میں نے کہا "میں ایک بات معلوم کروانا چاہتا ہوں ان لوگوں کے ذریعے۔"

مہتا کا رنگ اڑ گیا "میں بتا سکتا ہوں آپ کو سر ورنہ یہ کہیں..."

"نہیں۔ یہ کام ایسا ہی ہے" میں نے کہا "اس کی بہت اہمیت ہے اور فوری ضرورت بھی۔ ان لوگوں سے کہو کہ یہ اپنے اپنے گاؤں یا قصبے جا کے ایک مرد اور ایک عورت کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔ لوگوں سے پوچھیں کہ کسی نے کچھ سنا ہو تو بتائیں۔ کل صبح تک جہاں سے بھی یہ انفارمیشن ملے' حاصل کریں اور ہمیں خاموشی سے بتا دیں۔ کسی اور کے سامنے کوئی بات نہ کریں۔"

"کس عورت اور مرد کے بارے میں معلوم کرنا ہے سر؟ یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ آپ حکم کریں۔" مہتا نے کہا "نام اور پتا بتائیں' یا کوئی تصویر ہے تو دیں۔ میں سب کو دکھا دیتا ہوں۔"

"ایسے نہیں۔ تم باری باری سب کو بلاؤ" میں نے کہا "ہم خود ان سے بات کریں گے۔"

"اس کی کیا ضرورت ہے سر۔ یہ جنگلی اور غیر مہذب لوگ اس قابل نہیں ہیں....."

میں نے سخت لہجے میں کہا "کیا میں اسے تمہارا انکار سمجھوں؟"

"بالکل نہیں۔ ہرگز نہیں سر۔ آپ چائے پی لیں پھر....."

"چائے پیتے ہوئے بھی بات کی جا سکتی ہے" میں نے کہا۔

مہتا بادلِ ناخواستہ اٹھا اور باہر گیا۔

غالب نے کہا "اس نے ابھی ابھی ایک خون کیا ہے۔"

نازو نے سر ہلایا "ہاں۔ اس عورت کا گلا گھونٹ کر۔"

میں نے اقرار میں سر ہلا کے انہیں خاموش ہونے کا اشارہ کیا کیوں کہ مہتا واپس آ رہا تھا۔ اس نے مزدوروں کے کسی نگران کو طلب کر لیا تھا۔ وہ دروازے کے باہر ہی رک گیا اور فوجی ڈرل ماسٹر کی طرح بلند آواز میں ہر مزدور کا نام لے کر بلانے لگا۔

پہلا مزدور ایک بوڑھا تھا۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے اپنے آپ سے شرم محسوس ہوئی۔ ہم کتنے آرام سے صوفے پر بیٹھے حکم چلا رہے تھے' رعب جھاڑ رہے تھے اور دھڑلے سے جھوٹ بول رہے تھے۔ ہمارے پاس ایک بیگ

لاکھوں تھے جو ہم نے خون پسینہ بہا کے نہیں کمائے تھے۔ ہم جوان اور صحت مند تھے۔ وہ بوڑھا بھٹے میں ساری زندگی جھونک چکا تھا اور ابھی تک اس کا مقدر غلامی کی ذلت' مجبوری کی مشقت اور وہی غربت تھی جو اس نے ورثے میں پائی تھی۔

میں نے کہا "بابا جی! کتنا عرصہ ہو گیا مزدوری کرتے؟"

سوال سمجھنے میں اسے کچھ دیر لگی۔ پھر وہ آہستہ سے بولا "کچھ یاد نہیں جی۔"

"ساری عمر مزدوری ہی کی ہے اس نے" مہتا نے وضاحت کی۔

"رہتے کہاں ہو؟"

"اپنے کنبے کے ساتھ۔ اپنے گھر میں جی" اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"گھر کہاں ہے بڈھے۔ گاؤں کا نام بتا" مہتا نے اسے ڈانٹ کر کہا۔

بڈھے نے کانپتے ہوئے کہا "بھل ڈیری جناب!"

"سات آٹھ میل دور ہے" مہتا نے کہا۔

میں نے کہا "بابا جی۔ آج تمہاری چھٹی۔ گھر جاؤ۔ کل تک اپنے گاؤں میں سب سے معلوم کرو کہ آس پاس کسی مرد یا عورت کی لاش تو نہیں ملی ہے۔"

"لاش......" بڈھے کی حالت غیر ہو گئی۔

"اگر لاش نہیں ملی تو کیا کوئی گرفتار ہوا ہے۔ جوان خوب صورت عورت ہے۔ ان کے جیسی" میں نے نازو کی طرف اشارہ کیا۔ "اور مرد بھی اچھا جوان ہے۔ کسی نے ان کو دیکھا ہو۔ اجنبی چہرے تو گاؤں میں فوراً پہچان لئے جاتے ہیں۔"

بڈھا کچھ خوف میں مبتلا تھا اور کچھ ذہنی طور پر نارمل نہیں تھا۔ وہ ہر بات کو بہت دیر سے سمجھتا تھا لیکن "جی حضور" اور "جی جناب" پہلے کہہ دیتا تھا۔ قصور اس کا نہیں تھا۔ اس نے تمام عمر یہی کیا تھا۔ اس نے اپنے ذہن کو عضو معطل بنا دیا تھا کیوں کہ روز مرہ کے کام میں دماغ کہیں استعمال نہیں ہوتا تھا۔ زندہ رہنے کے لئے ہاتھ پیر سلامت ہوں اور جسم سختی جھیل سکتا ہو تو سارے کام چلتے تھے۔ عقل اور ذہانت کے استعمال کی نہ ضرورت تھی اور نہ اجازت۔ ان حالات میں ذہن کی صلاحیت کو زنگ لگ جانا ایک فطری عمل تھا۔

ایک بار گل اور محسن کے بارے میں تفصیل سے سب بتانے کے بعد میں نے یہ تکلیف وہ کام اس شخص کے سپرد کر دیا تھا جو مزدوروں کو حاضر کر رہا تھا۔ میرے سامنے اس نے اپنے انداز میں وہی بات ان تو تلا دماغ والوں نے آسانی سے سمجھ لی اور تعمیل کا عہد کر کے خوشی خوشی رخصت ہو گئے۔ انہیں آج کے دن کی چھٹی پوری تنخواہ کے ساتھ مل گئی تھی اور میں نے مفید معلومات فراہم کرنے والے کے لئے سو روپے کے خصوصی انعام کا اعلان بھی کر دیا تھا۔ سو روپے ہمارے لئے کچھ نہیں تھے مگر ان کے لئے قارون کا خزانہ تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ان میں سے ہر شخص یہ سو روپے حاصل کرنے کے لئے کتنی کوشش کرے گا۔

مہتا نے میرے چھٹی کے اعلان پر کسی ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ حاکم مجاز کے سامنے وہ بھی "جی حضوری" پر مجبور تھا۔ وہ ہر طرح سے "تعاون" کر کے اپنی جان اس انکوائری سے چھڑانا چاہتا تھا جس کا راز خود اس کی زبان نے فاش کر دیا تھا۔ ہمیں تو کسی رسونتی کے نام سے منسوب کسی اسکینڈل کی خبر نہ تھی مگر اب میں قیاس کی بنیاد پر حقائق کا پورا ڈھانچہ استوار کر سکتا تھا۔ رسونتی۔ رسیلی بائی۔ شیریں جان۔ ایسے بہت سے نام اس عورت کے تھے' جس نے جبر کی قربان گاہ پر اپنا جسم ہر جگہ اور ہر دور میں بھینٹ چڑھایا۔ طاقت رکھنے والے کی ہوس کی نذر کیا یا دولت مند کے سامنے کوڑیوں کے مول بیچا۔ دامنِ عصمت کو تار تار دیکھا مگر اسے بھی نوشتۂ تقدیر سمجھ کے قبول کیا۔ اور اس کے خلاف آواز اٹھائی تو پھر اپنے جسم کی آبرو کا غرور بھی خاک کیا۔ جسم ایک مشت خاک ہی تو تھا۔ یہی رسونتی کی کہانی ہو گی۔ یہی اس عورت کا انجام تھا جو مہتا کو تباہ کرنے کی دھمکی دے رہی تھی۔

چائے کے ساتھ معاملہ فہم مینجر نے وافر لوازمات فراہم کئے تھے۔ یہاں کیک پیسٹری تو مل نہیں سکتی تھی۔ اس نے حیرت انگیز طور پر کم وقت میں مرغیاں روسٹ کرا لی تھیں۔ پراٹھے بنوائے تھے۔ ابلے ہوئے انڈے اور مکھن کے ساتھ چائے محض ایک ضمیمہ لگتی تھی۔ ہم نے ہر چیز کے ساتھ انصاف کیا مگر شائستگی اور قرینے سے۔ ہم جیسے حاکم لوگ ندیدوں کی طرح ٹوٹ پڑتے تو ہمارا رعب اور دبدبہ کم ہو جاتا۔

سب مزدور چھٹی کر کے چلے گئے تو بھٹے کے آس پاس مکمل خاموشی کا راج ہو گیا۔ مہتا کو کیسے شک ہو سکتا تھا کہ وہ خود اپنی بدبختی کے پھیلائے ہوئے جال میں گرفتار ہو چکا ہے۔ اسے یقین آ چکا تھا کہ اب وہ ہم سے تمام معاملات طے کرا لے گا۔ ہم ویسے ہی افسر تھے جیسے عام طور پر ہوتے ہیں۔ ہماری خدمت کر کے اور ہم سے تعاون کر کے وہ مستقبل کے لئے بھی یہ ضمانت حاصل کر سکتا تھا کہ جس رسونتی کو چاہے اپنی خواب گاہ میں طلب کرے۔ جب چاہے اس کی آواز کو دبا دے اور جہاں چاہے اسے دبا دے۔

دوسری سگریٹ جلا کے میں نے گھڑی دیکھی تو دوپہر کے ساڑھے گیارہ بجنے والے تھے۔ پیٹ بھر جانے کے بعد آسودگی کے ساتھ ہی غنودگی نے یلغار کی تھی۔ غالب تو باقاعدہ اونگھنے لگا تھا۔ پھر نازو اس کو انگلی چبھو کے بیدار کرتی تھی اور گھورتی تھی تو مہتا صرف مسکراتا تھا۔ اچھا ہے' دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل۔ دھرم پتنی اپنے پتی دیوتا کا خیال نہیں رکھے گی تو اور کون

رکھے گا۔

اچانک میں نے کہا "مسٹر مہتا' یہاں باتھ روم تو ہوگا" اور اٹھ کے دروازے کی طرف بڑھا۔

اس سے پہلے کہ مہتا مجھے روکتا' میں دروازہ کھول کے اندر داخل ہوچکا تھا۔ مہتا میرے پیچھے لپکا۔ اس کی بدحواسی اور پریشانی کا یہ حال تھا کہ دروازے سے گزرنے کی کوشش میں وہ چوکھٹ سے ٹکرا گیا۔

"وہ...... باتھ روم" اس نے آخری دیوار میں نظر آنے والے دروازے کی جانب اشارہ کیا "چلے جائیں۔"

اس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی میں نے جائے واردات کا پورا نقشہ دیکھ لیا تھا۔ ایک تخت جیسے بیڈ پر وہ عورت پڑی ہوئی تھی جس کی شہرت کا گہنایا ہوا سورج ہمیشہ سے غروب ہوگیا تھا۔ وہ جو لاکھوں کروڑوں دلوں کی دھڑکن تھی' اب اپنے دل کی دھڑکن سے بھی محروم ہوچکی تھی۔ پھر بھی یوں لگتا تھا کہ وہ سو رہی ہے۔ مہتا نے اسے ایک منٹ میں زندگی کی ہر اذیت' ہر احساسِ ذلت' یادِ ماضی کے عذاب اور بے مہریٔ ایام کے دکھ سے نجات دلادی تھی۔

میں نے مسکرا کے کہا "یہ سوگئی۔ اب تو فرصت ملی تھی اس سے بات کرنے کی۔"

مہتا نے کہا "جی...... وہ باتھ روم...... ہاں۔ عجیب عورت ہے یہ بھی...... بدتمیز۔ پہلے نشے میں بولتی رہی فضول" وہ بلاوجہ ہنسنے لگا۔ "اب۔ پڑ کے سوگئی۔ بہت مشکل ہے اس کا جاگنا۔"

"کیا ناممکن ہے اس کا پھر اٹھنا؟" میں نے کہا۔

مہتا کا رنگ زرد پڑ گیا "نہیں۔ ناممکن کیوں؟ مگر میں عادت جانتا ہوں اس کی۔ آپ لاکھ اٹھائیں' ہوش ہی نہیں آئے گا اسے چار چھ گھنٹے تک۔ نشے کا اثر رہے گا۔"

میں باتھ روم میں گیا اور دروازہ بند کرنے کے بعد ایک جھری سے جھانکتا رہا۔ مہتا نے بڑی پھرتی سے لاش کو دوسرے پہلو پر لٹا دیا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ اور ایک پاؤں کمبل سے باہر کردیا تھا۔ یوں جیسے سوتے میں اس نے کروٹ لی ہے۔ میرے بعد غالب اور پھر نازو نے باتھ روم جا کے آتے ہوئے اس منظر کا "ایکشن ری پلے" دیکھا۔ وہ دونوں بھی جب باتھ روم میں گئے تو انہیں وہ اداکارہ ایک کروٹ پر لیٹی نظر آئی تھی مگر واپسی پر اس کا پوز بدل گیا تھا۔ ان دونوں نے بھی جھری سے جھانک کر مہتا کی یہ کارروائی دیکھی تھی۔

جب مہتا مطمئن ہو کے میرے سامنے بیٹھ گیا کہ اس نے بڑی چالاکی سے قتل کے جرم پر نیند کا پردہ ڈال دیا ہے تو میں نے اسے نظر جما کے دیکھا۔ وہ نروس ہو کے ماتھے پر آیا ہوا پسینہ خشک کرتے ہوئے مسکرایا۔

"مسٹر مہتا! شی از ڈیڈ" میں نے کہا۔

وہ یوں اچھلا جیسے میں نے پن نکال کر دستی بم اس کی گود میں ڈال دیا ہو "جی......"

میں نے کہا "جی۔ تم نے اسے گلا گھونٹ کے مار ڈالا ہے۔"

غالب نے کہا "ورنہ وہ تمہیں تباہ کردیتی۔"

نازو نے کہا "مگر تباہ تو کردیا ہے اس نے تمہیں۔ مر کے بھی۔"

مہتا کا چہرہ احساسِ شکست کی تصویر بن گیا۔ اس کی زبان گنگ ہوگئی اور وہ یوں لمبے لمبے سانس لینے لگا جیسے اس پر دل کا دورہ پڑنے والا ہے۔

میں نے کہا "میں نے دیکھا تھا تمہیں لاش کی پوزیشن بدلتے۔"

غالب اور نازو نے بھی یہ بات دہرائی۔

"کوئی عورت جو نشے میں شور مچا رہی ہو' اچانک خاموش نہیں ہوتی۔ لیکن اسے خاموش کیا جاسکتا ہے۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ ماضی کی نامور اداکارہ تھی یا صرف رسونتی۔"

میں اس اداکارہ کا نام نہیں لوں گا کیوں کہ بعد میں اس کی موت کے اسباب بدل دیئے گئے تھے۔ اخبارات میں شائع ہونے والی خبر کے مطابق اپنی زندگی کے آخری لمحات میں وہ معمول کے مطابق اپنے گھر کے اندر بنے ہوئے مندر میں پوجا کررہی تھیں کہ ان پر دل کا دورہ پڑا اور کار میں ہسپتال جاتے ہوئے......

اس کے نام کی جگہ میڈم استعمال کیا جاسکتا ہے۔

میں نے کہا "میڈم کا قتل ہمارے سامنے ہوا ہے۔ ہم اس جرم کے چشم دید گواہ ہیں۔ اور ہماری گواہی تمہیں تختۂ دار تک پہنچا سکتی ہے۔"

مہتا کا حوصلہ جواب دے گیا "بھگوان کے لئے مجھے بچالیں سر۔ آپ کے سوا یہ بات کوئی نہیں جانتا۔ میں اس کا تاوان ادا کرنے کے لئے تیار ہوں۔ جو سزا دینا چاہیں آپ خود بتادیں۔ میں ساری عمر غلام رہوں گا آپ کا۔"

میں نے نازو سے کہا "اندر سے ٹیپ ریکارڈر اٹھالاؤ۔"

نازو نے غالب کی طرف خوف زدہ نظروں سے دیکھا مگر یہ صرف اداکاری تھی۔ "تم اٹھو ناجی" وہ ٹھوکا دے کر بولی۔

غالب بہادر شوہر کی طرح مسکرایا "مجھ سے تو ڈرتی نہیں ہو۔ بے جان لاش سے ڈر لگتا ہے۔ ابھی وہ بھوت تو نہیں بنی میرے سُسر کی طرح۔"

نازو نے اسے غصے سے دیکھا مگر خاموش رہی۔

"آپ... میرا بیان ریکارڈ کریں گے؟" مہتا نے خشک حلق کو تھوک نگل کے تر کیا۔

"ہاں۔ تم نے تمام عمر غلام رہنے کا وعدہ کیا ہے نا۔ یہ بیان غلامی کی زنجیر ہوگا جسے تم کبھی نہ توڑ سکو گے۔"

مہتا نے بے بسی سے کہا "سر! ایسا ظلم مت کریں۔"

میں نے اس کے منہ پر چانٹا مارا "مجھے ظالم کہتے ہو۔ رسونتی کو کس نے مارا تھا' میڈم کا قاتل کون ہے؟"

مہتا تھر تھر کانپنے لگا "شما کریں سر۔ غلطی ہوگئی مجھ سے۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ آپ جو چاہیں مانگ لیں۔ پانچ لاکھ۔"

میں نے اس کے دوسرے گال پر تھپڑ رسید کیا۔ وہ صوفے سے نیچے گر گیا "اتنی ہی قیمت ہے تمہاری جان کی؟"

"دس...... دس لاکھ......" وہ ہکلانے لگا "اس سے زیادہ نہیں ہے میرے پاس۔"

غالب نے ٹیپ ریکارڈر میرے سامنے رکھ دیا۔ اس میں لگا ہوا ٹیپ آدھا چل چکا تھا۔ میں نے اسے واپس چلایا اور پھر کسی وجہ کے بغیر آن کردیا۔ میڈم کی آواز نے ایک دھماکا کیا۔ میرا خیال تھا کہ یہ فلمی گانوں کا کیسٹ ہوگا۔ غالب اور نازو میں سے کوئی بھی اس دھماکے کے لئے تیار نہ تھا۔ خود مہتا دیوانہ وار اچھلا اور اس نے ٹیپ ریکارڈر پر حملہ کیا۔

میرے ایک مکے نے اسے واپس صوفے پر پہنچا دیا۔ پھر میں نے ریوالور نکال لیا "سنو مسٹر مہتا۔ یہ موت کی آواز ہے۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ مہتا کے لئے یومِ حساب پہلے ہی آچکا تھا۔ آخر کار ایک عورت نے اسے تمام عمر کے گناہوں کی سزا دینے کے لئے وہ جال پھیلا دیا تھا جسے خود مہتا کی نظر نہ دیکھ سکی۔ حالاں کہ وہ بڑا عیار شکاری تھا مگر میڈم نے اسے بھی شکار کرلیا۔ اسے یقین تھا کہ مہتا اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ ان کے درمیان عدم اعتماد کی فضا پہلے سے موجود تھی اور کوئی ایسی بات ہوچکی تھی کہ وہ اپنی جان خطرے میں محسوس کرتی تھی۔ یہاں آتے وقت بھی اس کے ذہن کے کسی گوشے میں یہ خیال موجود تھا کہ شاید مہتا اپنی کمیں گاہ میں بیٹھ کے اسے شکار کرنے کی کوشش کرے گا۔ یہ اس کی سلطنت تھی جہاں صرف اس کے حکم کے غلام تھے اور باہر سے کسی دوسرے کی دخل اندازی کا کوئی امکان نہ تھا۔ خطرے کو محسوس کرتے ہوئے بھی اس نے یہاں آنا قبول کیا مگر اپنی حفاظت کے خیال سے غافل نہیں ہوئی۔ ممکن ہے وہ آنے سے پہلے کسی کو بتا آئی ہو کہ وہ کس کی ساتھ کہاں جارہی ہے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اسے عین وقت پر خود حفاظتی کے انتظامات کی طرف سے غفلت کا احساس ہوا اور موت یقینی نظر آنے لگی تو اس نے ایک آخری کوشش کے طور پر وہ حرکت کی جس سے خود مہتا بھی بے خبر رہا۔ ان کی بہت سی گفتگو اس میں ریکارڈ ہوچکی تھی۔ اگر مہتا کو موقع ملتا تو وہ اس ٹیپ کو بھی ضائع کردیتا لیکن ہم اس کی شامتِ اعمال بن کے ٹپک پڑے اور میڈم نے مرنے مارنے کا جو عہد کیا تھا وہ پورا ہوا۔

ٹیپ میں تقریباً بیس منٹ کی گفتگو تھی جو ہمارے آنے سے پہلے کسی وقت ہوئی تھی۔ میڈم کے آخری لمحات کی صوتی تصویر اس میں شامل نہیں تھی۔ اس وقت جب مہتا اس کا گلا گھونٹ رہا تھا' اس کے لئے ٹیپ ریکارڈر کو چلانا ممکن ہی نہ تھا۔ یہ کام اس نے بڑی صفائی سے ایسے وقت میں کیا تھا جب مہتا کو بالکل پتا نہیں چلا اور وہ چلتے ہوئے ٹیپ کی سرسراہٹ بھی نہ سن سکا۔ جانتے بوجھتے میڈم نے ایسے سوال جواب کئے تھے جو مہتا کے اعترافِ جرم کے بیانِ حلفی سے کم نہ تھے۔

بات بہت معمولی تھی اور آغاز سے انجام تک اس کہانی میں کوئی نیا پن نہیں تھا۔ شوقین مزاج مہتا نے آخر کار فلمی دنیا کی ایک نامور اداکارہ کے عشق میں "کامیابی" حاصل کی تھی۔ اس وقت جب وہ مہتا جیسے خریداروں کی دسترس میں آگئی تھی۔ وہ وقت گزر چکا تھا جب میڈم فلمی دنیا کے افق کا روشن ستارہ تھی اور اسے چھونے کی آرزو رکھنے والے دیوانے کہلاتے تھے۔ وقت کی گردش نے اس کو پستی میں دھکیلا تو مہتا نے اسے تسخیر کیا۔ اس کامیابی کے پیچھے مہتا کی دولت بھی تھی' اس کی عیاری بھی اور میڈم کی ناکامی کے دور کی کمزوری بھی۔ اس نے میڈم کو سبز باغ دکھائے تھے کہ وہ فلم بنائے گا جس میں اس کے مقابل دلیپ کمار ہوگا یا شمی کپور۔ اور یہ فلم باکس آفس پر ہٹ ہوگی تو میڈم پر تقدیر پھر مہربان ہوجائے گی۔ جب یہ وعدہ جھوٹا ثابت ہونے لگا تو جہاں دیدہ اور مردم گزیدہ میڈم نے اپنے ترکش کا آخری تیر نکالا۔ اس نے مہتا کو بلیک میل کرنے کے لئے کہا کہ وہ اس کے بچے کی ماں بننے والی ہے چناں چہ وہ اپنا وعدہ پورا کرے ورنہ نتائج بھگتنے کے لئے تیار ہوجائے۔ اس کی ازدواجی اور کاروباری زندگی تباہ ہوجائے گی۔ مہتا نے حرجانہ ادا کرکے جان چھڑانے کی کوشش کی مگر میڈم کا مطالبہ بہت بڑا تھا۔ وہ مہتا کو رعایت دینے پر بھی آمادہ نہ تھی چناں چہ اس کا یہی انجام ہونا تھا۔

ٹیپ میں نے اپنے قبضے میں کرنے کے بعد کہا "اب کہو جو تمہیں کہنا ہے۔"

"وہ مجھے بلیک میل کررہی تھی۔ اور اب......"

"اب ہم کررہے ہیں "؟" میں نے کہا "او کے۔ تم تیار رہو جاؤ۔ کفارہ ادا کرنے کے لئے۔ گپتا صاحب' یہ آپ کا مجرم ہے۔"

غالب اٹھا "میں فون کرکے پولیس کی نفری طلب کرتا ہوں۔ اور اخباری نمائندوں کو بلاتا ہوں۔"

"دیکھوجی۔ میرے بھیا کے سوا یہ خبر کوئی نہیں دے گا۔ یہ ان کی ایکس کلیوسیو اسٹوری ہوگی۔ ان کے کیریئر کا سب سے بڑا دھماکا۔"

"پلیز سر۔ ایک منٹ۔ میری بات سن لیں۔"

"تمہارے سامنے دو ہی راستے ہیں۔" میں نے کہا "تم اپنا اعترافِ جرم ریکارڈ کرادو۔ جو کچھ پہلے ہوا وہ۔ اور وہ سب جو آج ہمارے سامنے ہوا۔ یہ ہمارا وعدہ ہے کہ ہم اس ٹیپ کو استعمال نہیں کریں گے۔ میرا مطلب ہے پولیس کی حد تک۔"

"لیکن تم میرا خون چوستے رہو گے۔ تمام عمر میں تمہارے مطالبات پورے کرتا رہوں گا۔ جتنا کماؤں گا تم لے جاؤ گے۔ پھانسی چڑھانے کی دھمکی الگ دیتے رہو گے۔ نو سر! میں یہ گھاٹے کا سودا نہیں کروں گا۔ تم مجھے گرفتار کرلو۔ صرف رسوائی اور پریشانی کے خیال سے دس لاکھ دے رہا تھا۔ اس رقم سے میں فیصلہ اپنے حق میں حاصل کرلوں گا۔ اچھے سے اچھا وکیل سب کچھ کرلیتا ہے۔ میں گواہ لا سکتا ہوں اپنی دہلی میں موجودگی کے۔ ثبوت

شہادت سب غلط کر سکتا ہوں۔"

میں نے کہا "مسٹر مہتا جائے واردات پر رنگے ہاتھوں پکڑا جانے والا قاتل کچھ نہیں کر سکتا۔ فنگر پرنٹس ہماری موجودگی میں لئے جائیں گے۔ اور پولیس تمہیں یہاں سے اسسٹنٹ کمشنر پولیس کی موجودگی میں لے جائے گی۔ تو تم آج خود کو دہلی میں کیسے ثابت کرو گے؟ دراصل تم نے غلط سمجھا ہے۔ ہمیں نہ پانچ لاکھ کی ضرورت ہے نہ دس لاکھ کی۔"

"پھر...... کیا چاہتے ہو تم؟"

حالات کے پلٹا کھاتے ہی مہتا نے پروٹوکول کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ اس کے اندازِ تخاطب میں نیاز مندی کے عجز کی جگہ برہمی اور سرکشی نے لے لی تھی۔ "وہ سر" کے بجائے ایک دم "تم" پر آگیا تھا۔

میں نے کہا "تم اور بھی بہت کچھ کر سکتے ہو ہمارے لئے۔ صرف ایک بار نہیں۔ جب بھی ضرورت پڑے۔ ساری عمر غلام کیا کرتا ہے۔ خدمت کے سوا۔ چناں چہ تمہیں خدمت کے مواقع ملتے رہیں گے۔ اور تم ہمارے بہت سے کام کرو گے۔"

وہ کچھ نہیں سمجھا "کیسے کام؟"

"عام زندگی کے کام۔ جو کوئی بھی کر سکتا ہے۔ کوئی کام ناممکن یا مشکل نہیں ہوگا" میں نے گول مول جواب دیا "کسی کام میں نہ تمہاری زندگی کو خطرہ لاحق ہوگا نہ عزت آبرو کو۔ شاید پیسہ بھی خرچ نہ ہو۔"

معلوم نہیں اس نے میری بات سے کیا نتیجہ اخذ کیا مگر اچانک وہ مطمئن نظر آنے لگا "ٹھیک ہے۔ مگر میں کوئی اقبالی بیان ریکارڈ نہیں کراؤں گا۔"

میں نے کہا "ویسے تو میڈم کی تم سے گفتگو کا یہ ٹیپ کافی ہے۔ بیس منٹ میں تمہارے کرتوت اور ارادے واضح ہو گئے تھے۔"

"عدالت میں ٹیپ کی ہوئی گفتگو کو مستند ثبوت تسلیم نہیں کیا جاتا......"

"لیکن عدالت اسے مسترد بھی نہیں کرتی۔ سائنسی طریقے موجود ہیں جن سے معلوم ہو جاتا ہے کہ آواز ملزم کی ہے یا کسی اور کی۔ اور یہ کہ ٹیپ میں رد و بدل کیا گیا ہے یا نہیں۔ اس کے بعد یہ مستند ثبوت ہو جاتا ہے" میں نے کہا۔

پھر مجھے ایک اور خیال آیا۔ میں نے غالب سے کہا کہ وہ مہتا کا خیال رکھے اور خود اندر چلا گیا جہاں میڈم کی لاش سرد پڑتی جا رہی تھی۔ بیڈ روم میں عیش و عشرت کے سب لوازمات موجود تھے۔ میں نے ایک بیڈ سائڈ ٹیبل کی درازوں کو کھول کر دیکھا۔ اس میں میڈم کی جیولری رکھی ہوئی تھی۔ دوسری دراز میں مجھے کیمرا مل گیا۔ حسبِ توقع اس میں استعمال شدہ فلم موجود تھی۔ مہتا یقیناً خود کو بلیک میل ہونے سے بچانے کے لئے حفظِ ماتقدم کے طور پر یہاں آنے والی نیک نام، نیک دل اور نیک چلن عورتوں کی ایسی

تصویریں ضرور اتار لیتا ہوگا جو بعد میں ڈھال کی طرح استعمال ہو۔ اور کوئی اس کے لئے گڑھا کھودے تو وہ بتا دے کہ خاتون آپ خود گڑھے کے کنارے کھڑی ہیں اور یہ رسوائی کا وہ گڑھا ہے جو آپ نے خود کھودا تھا۔ یا ممکن ہے وہ اس طرح خود بلیک میلنگ کرتا ہو اور مجبور عورت سے وہ سب مع سود وصول کر لیتا ہو جو اس نے سنہرا جال پھیلانے اور سبز باغ لگانے میں صرف کیا تھا۔

تاہم یہ صرف میری خیال آرائی تھی۔ اصل ضرورت کیمرے نے پوری کر دی تھی۔ اس میں چار تصویریں باقی تھیں۔ کیمرہ اپنے پیچھے چھپا کے میں واپس آگیا۔

"مسٹر مہتا! آپ ایک منٹ کے لئے اندر تشریف لائیں گے؟" میں نے کہا "ذرا اس لاش کو دیکھئے۔"

مہتا سخت پریشان تھا کہ آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے مگر وہ انکار کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

"کیا ہوا ہے لاش کو؟" وہ لاش پر جھک کر بولا۔

"اسے پلٹ کر دیکھو" میں نے کہا "پھر اندازہ ہوگا تمہیں۔"

اس نے کندھے پکڑ کے لاش کا رخ بدلا۔ اسی وقت میں نے پہلی فوٹو لی لیکن فلیش استعمال نہیں کیا۔ اندر کم روشنی تھی مگر ایک دھندلی تصویر اتاری جا سکتی تھی۔ شٹر کی آواز کو دبانے کے لئے میں نے دروازے کو ٹھوکر ماری تھی اور کیمرا فوراً پیچھے کر لیا تھا۔

مہتا نے چونک کر مجھے دیکھا مگر میں سیدھا کھڑا مسکرا رہا تھا۔ مہتا کا دماغ پہلے ہی ماؤف تھا اور اس کی عقل عین اس وقت ساتھ چھوڑ گئی تھی جب مہتا کو اس کی رہنمائی کی زیادہ ضرورت تھی لیکن ایسا اکثر ہوتا ہے۔ سخت پریشانی میں دماغ کام نہیں کرتا۔

"مجھے تو کچھ نظر نہیں آیا" وہ بولا۔

میں نے کہا "اچھا اس لاش کو اٹھا کے باہر لے آؤ۔"

وہ مجھے گھورنے لگا "کیوں؟"

"کیا اسے یہیں چھوڑ جاؤ گے؟ واپس اس کے گھر نہیں پہنچاؤ گے۔" میں نے کہا۔

"یہ کام [illegible]"

"بعد میں [illegible]"

"تمہارے جانے کے بعد۔" وہ بولا "میرا منیجر کر لے گا۔"

"اپنے خلاف ایک اور گواہ پیدا کرو گے؟ جو تمہارا ملازم ہے" میں نے کہا "ابھی وہ ہے بھی نہیں اور ہم جا رہے ہیں۔ تمہیں اپنے ساتھ لے کر۔"

"مجھے ساتھ لے کر...... کہاں؟"

"تمہارے گھر" میں نے کہا۔

"میرا گھر تو۔ نماڑ سے آگے ہے۔ نندہ گاؤں میں۔ مگر میں تمہیں وہاں کیسے لے جا سکتا ہوں۔ وہاں میرے بیوی بچے اور ماں باپ ہیں۔"

"وہ ہم سے مل کے خوش ہوں گے۔ ان کی عزت افزائی ہوگی کہ حکام نے ان کے غریب خانے میں قدم رنجہ فرمایا۔ مہمانوں کے لئے ایک کمرا بھی ضرور ہوگا اس گھر میں۔"

"بلکہ پورا مہمان خانہ ہوگا" غالب نے کہا۔

"مگر کیوں جانا چاہتے ہو تم ان سے؟"

"ہم تمہارا ٹھکانا دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہمارا تعلق تو اب دائم رہے گا۔ آنا جانا بھی ہوگا۔ اس لئے فضول باتوں میں وقت مت ضائع کرو۔ ہم نے کہہ دیا ہے کہ تمہارے ساتھ جانا ہے تو جانا پڑے گا تمہیں۔ میڈم کے زیورات بھی نکال لاؤ۔"

اس نے مجبوراً لاش کو دونوں ہاتھوں میں اٹھایا۔ اسی وقت میں نے فلیش کے ساتھ تصویر لی۔ اس نے چلا کے مجھے گالی دی اور لاش پھینک دی۔ میں نے لاش کی اس پوزیشن کی تیسری تصویر بنائی جس کے پس منظر میں مہتا کا پریشان حال وحشت زدہ چہرہ جرم کی ساری ہولناکی کے ساتھ نظر آ رہا تھا۔ پھٹی آنکھیں۔ کھلا ہوا منہ۔ پھیلے ہوئے ہاتھ جن میں میڈم کا زیور بھی تھا۔

اس نے عالمِ دیوانگی میں لاش کے اوپر سے چھلانگ مار کے مجھ پر حملہ کیا۔ میں نے اسے یوں لات ماری جیسے گول کیپر دور سے آنے والی فٹ بال کو کک مار کے واپس کرتا ہے۔ وہ پلٹ کے لاش پر گرا اور مجھے چوتھی بہترین تصویر اتارنے کا موقع مل گیا۔ وہ اب غصے میں پاگل ہو کے گالیاں بک رہا تھا۔ اقبالی بیان سے زیادہ خطرناک یہ تصویریں تھیں۔ ایک تصویر وہ سب بتا دیتی ہے جو ایک ہزار الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ بیس منٹ کا ٹیپ اور چار تصویریں مہتا کو موت کے اندھے کنویں میں لٹکانے کے لئے گردن میں پڑے ہوئے پھندے سے کم نہ تھیں۔

میں کیمرے کو بچانے کے لئے پیچھے ہٹ گیا اور نازو کو آگے آنے کا اشارہ کر دیا۔ روایتی بزدل دھرم پتنی کا کردار کامیابی سے ادا کرنے والی نازو آگے بڑھی اور اس نے دو منٹ میں مہتا کے سارے کس بل نکال دئے۔

اب وہ دیوار کے ساتھ لگا بیٹھا تھا اور اس کی حالت پاگلوں سے بدتر تھی "تم۔ تم جھوٹے ہو۔ تم میں سے کوئی سرکاری افسر نہیں...... کون ہو تم آخر؟"

میں نے کہا "کیا میں مسز گپتا سے کہوں کہ وہ تمہیں یہ بات اچھی طرح سمجھائیں جو ابھی تک تمہاری سمجھ میں نہیں آئی ہے۔ تمہاری عقل ٹھکانے آ جائے گی تو تم فضول سوالوں سے گریز کرو گے اور صرف ہمارا حکم مانو گے۔ اس لئے کہ تم غلام بن چکے ہو ہمارے تمام عمر کے لئے۔ اور غلام صرف تعمیل کرتے ہیں۔"

وہ بڑی مشکل سے اٹھا اور پھر لاش اٹھانے لگا تو میں نے اسے روک دیا "اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔ شوٹنگ ختم ہو گئی۔ تمہیں اجازت ہے کہ اپنے منیجر کو طلب کر کے یہ لاش اس کے حوالے کرو۔ سراغ مٹانا چاہو تو مٹا دو۔ تمہارا منیجر لگتا تو بے وقوف سا ہے۔ وہ کرے گا یہ کام۔ لاش کو خوش اسلوبی سے ٹھکانے لگانے کا؟"

"یہ کام میں خود کروں گا۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "ہم کہیں نہیں جا رہے ہیں۔ کل تک تم بھی ہمارے ساتھ یہیں رہو گے۔"

اس نے سر پر ہاتھ مارا "ہے بھگوان۔ یہ کس جنجال میں پھنسا دیا مجھے۔"

میں نے کہا "اس سے پہلے بھگوان کب یاد آئے تھے تمہیں؟"

غالب نے کہا "یہ الزام لگا کے تم بھگوان کو اور زیادہ خفا کر رہے ہو۔"

"منیجر اپنے کوارٹر میں ہوگا" وہ بولا۔

غالب نے کہا "میں اسے بلا کے لاتا ہوں۔ اچھی طرح سمجھا بھی دوں گا کہ اسے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے۔"

"اب ہم باہر بیٹھ کے دوستانہ ماحول میں گپ شپ کریں گے تاکہ منیجر کو شک نہ ہو۔ کہ خدانخواستہ ہمارے درمیان کوئی کشیدگی یا تلخی ہے" میں نے کہا۔

"خدانخواستہ؟ کیا تم مسلمان ہو؟"

"اگر میں گاڈ فاربڈ کہتا [illegible]"

"تم وہ نہیں ہو۔ جو نظر آتے ہو" مہتا نے پھر کہا "تمہارے نام اور کام سب پراسرار ہیں۔"

"بالکل تمہاری طرح" میں نے کہا "ظاہر اور باطن کا فرق ہی تو ایک بڑے آدمی کو بڑا آدمی بناتا ہے۔ خواہ وہ سیاست داں ہو یا صنعت کار، سماجی کارکن یا دانشور۔ اگر اصل روپ سامنے آ جائے تو ان میں سے بیشتر فرشتے نظر آنے والے شیطان ثابت ہوں۔"

غالب لوٹ کے آیا تو منیجر اس کے ساتھ تھا۔ اس نے ہم پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی اور اندر چلا گیا۔ شک اس کے چہرے پر لکھا ہوا تھا اور پریشانی اس کے انداز سے عیاں تھی مگر مالک کے حکم کو بلا چون و چرا بجا لانا اس کی فطرت بن چکی تھی۔

"میڈم کو ان کے گھر پہنچانا ہے۔ اس طرح کہ کسی کو کچھ پتا نہ چلے" مہتا نے کہا "انہی کی گاڑی میں جاؤ اور گاڑی کو دروازے پر چھوڑ کے لوٹ آؤ۔ آج کل تو دروازے پر گورکھا بھی نہیں ہوتا۔ ہو سکے تو گاڑی اندر لے جانا۔"

میں نے کہا "یہ جو باہر کھڑی ہے میڈم کی گاڑی ہے؟"

منیجر نے نفی میں سر ہلایا "نہیں سر۔ میڈم کی گاڑی بھٹے کے پیچھے کھڑی ہے۔ نظر نہیں آتی۔"

"شام تک تم واپس آ جاؤ گے" مہتا نے کہا۔

"مشکل ہے سر۔ یہ کام رات کو ہی ہوگا۔ دس بجے کے بعد۔" منیجر بولا "دیر بھی ہو سکتی ہے۔"

"چلو تم صبح آ جانا" میں نے کہا "جلدی مت کرنا ورنہ تم بھی پھنس جاؤ گے اور مہتا صاحب بھی مشکل میں پڑ جائیں گے۔"

مہتا نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا مگر میری نظر کا اشارہ سمجھ کے خاموش ہو گیا "جانے سے پہلے سب صاف کر جاؤ۔ کوئی ثبوت نہ رہے میڈم کی یہاں موجودگی کا۔"

"آپ فکر نہ کریں سر" منیجر بولا۔

"مجھے امید ہے تم ایسا کوئی کام نہیں کرو گے جس سے مسٹر مہتا کی عزت یا زندگی خطرے میں پڑے۔ کسی کو بھی کچھ معلوم نہیں ہونا چاہئے۔ یہ بھی نہیں کہ جو کچھ ہوا ہمارے سامنے ہوا۔ ہم سرکاری افسر بھی مجبور ہوتے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ ہمیں مہتا صاحب کے خلاف گواہی دینی پڑے۔ تم تو بس یہ سمجھ لو کہ ہم یہاں آئے ہی نہیں تھے۔"

"لیکن سر! آپ کو اتنے مزدوروں نے دیکھا تھا۔ آپ نے بات کی ہے ان سے" منیجر بولا۔

"مزدوروں کی کون سنتا ہے۔ نہ کوئی پوچھے گا ان سے" میں نے کہا "تم خود یہاں نہیں تھے آج۔ چھٹی ہوتے ہی چلے گئے تھے۔ مہتا صاحب اپنی جان بچانے کا انتظام خود کرلیں گے۔"

"جان بچانے کا انتظام؟" وہ بولا۔

"ہاں۔ گواہ، ثبوت جس سے ثابت ہو گا کہ یہ تو دہلی میں تھے یا یہاں سے سیکڑوں میل دور۔ اب تم جاؤ" میں نے کہا۔

منیجر نے ہر کام بڑے سلیقے سے کیا اور میڈم کی لاش اٹھا کے لے گیا۔ اب یہاں مہتا کے علاوہ صرف ہم تھے اور ہمارے لئے اگلے دن تک پناہ کی ضمانت تھی۔ فوری طور پر ہمیں کسی چیز کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ سوائے آرام کے۔ جتنا ہم نے کھایا تھا اس سے زیادہ بچایا تھا چناں چہ رات کو پھر کھایا جا سکتا تھا۔

مہتا سخت سہا ہوا تھا اور غالباً اس اندیشے میں مبتلا تھا کہ کہیں ہم اسے قتل نہ کردیں۔ ہم کسی رسونتی یا میڈم کے وارث نہ ہوں جو اس کے بے گناہ لہو کا انتقام لینے آئے ہوں۔ خود اسے تو ہر میڈم یا رسونتی کا نام بھی یاد نہ ہو گا جو اس کی زندگی میں ایک دروازے سے داخل ہو کے دوسرے دروازے سے نکل گئی تھیں۔ گمنامی اور رسوائی کی جانب یا وجود سے عدم کی طرف۔

"اب ہم بھی آرام کریں گے مہتا جی اور تم بھی آرام کرو" میں نے اٹھتے ہوئے کہا اور ایک دم اس کے سر پر ریوالور مار دیا۔ وہ کراہ کر صوفے پر لڑھک گیا۔

بھٹے کے مالک کی حیثیت سے مہتا کا دفتر بہت اچھی جگہ پر تھا۔ یہ جگہ آبادی سے دور تھی اور بڑی سڑک سے اتنے فاصلے پر تھی کہ بلا ضرورت ادھر کسی کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس گوشۂ عافیت کو مہتا نے اور اس سے پہلے شاید اس کے باپ نے اور دادا نے ایک پرائیوٹ عشرت کدہ بنا رکھا تھا۔ باہر کا کمرا آفس تھا اور اندر کا خواب گاہ۔ ٹیوب ویل کو چلانے کے لئے بجلی بھی پول لگا کے حاصل کی گئی تھی۔ اسی سے پنکھے اور ایئرکنڈیشنر چلتے تھے۔ اندر ایک دیوار کے ساتھ چھوٹا سا فریج بھی تھا۔ باتھ روم کے لئے پانی اوور ہیڈ ٹینک سے فراہم ہوتا تھا۔ اس کی موٹر کا کنکشن بھی ٹیوب ویل سے تھا۔

دروازہ بند کرنے کے بعد ہم نے باری باری غسل کیا۔ خواب گاہ میں مہمانوں کے لئے ضرورت کے ملبوسات فراہم کئے گئے تھے۔ ان کے فٹ نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ ناز... ایک سوتی ساری باندھی اور وہیں پڑ کے سو گئی جہاں کچھ دیر... میڈم محوِ خواب تھیں۔

غالب نے اور میں نے بھی نہانے کے بعد طے کیا کہ... کے لائحۂ عمل پر بحث کو التوا میں رکھا جائے۔

میں نے کہا "پہلے تم سو جاؤ۔ میں شام تک جاگ سکتا ہوں۔"

"اس نے کہا "اجی حضرت، پہلے آپ" اور فوراً لمبا... گیا "میرا مطلب تھا پہلے آپ جاگ لیں۔"

اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے غالب کی طرف...

"کیا کریں اب؟"

"بجنے دو گھنٹی۔ فون کرنے والا خود ہی جھک مار کے ریسیور... دے گا۔" میں نے کہا۔

"لیکن یہ کاروباری اوقات ہیں۔"

"اچھا تو پھر آرڈر نوٹ کرلو" غالب نے کہا۔

میں نے ریسیور اٹھا کے کہا "کہیں مہتا کے ابا یا اس کی... ہو۔"

"مہتا سنز؟" کسی نے کہا۔

"ہاں۔" میں نے ریسیور پر رومال رکھ کے کہا۔

"یہ آواز کو کیا ہوا ہے تمہاری مہتا؟"

"زکام" میں نے جملے کے بجائے لفظ سے کام چلایا۔

"اچھا۔ میں وہ ایک لاکھ کا آرڈر کنفرم کررہا ہوں۔ ایک... کا ٹائم ہے۔"

"اچھا۔" میں نے کہا۔

"تم تو سخت بیمار لگتے ہو۔" بات کرنے والا ہنسا "آواز... ہے اور الفاظ بھی کم نکل رہے ہیں حلق سے۔ کیا بخار ہے؟"

"ہاں۔" میں نے کہا۔

"اچھا یار۔ ضروری بات تھی اس لئے ڈسٹرب کیا۔ آرام... تم۔"

میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور ریسیور کریڈل پر رکھنے کے... نیچے اٹھا کے رکھ دیا "نہ ہو گا بانس نہ بجے گی بانسری۔"

"محاورے کو جدید حالات کے مطابق بنا دینا چاہئے کہ نہ... فون نہ بجے گی گھنٹی" غالب بولا۔

"اگر تمہیں نیند نہیں آرہی ہے تو باری مجھے دے دو"... جماہی لے کر کہا۔

"یار ہم ایسا کیوں نہ کریں .... مہتا جی کو بند کر دیا جائے... روم میں۔ اور تم بھی سو جاؤ۔"

میں نے کہا "خیال تو اچھا ہے۔ مگر پہلے میں دیکھ لوں کہ کہیں... پیچھے سے تو نہیں نکل جائے گا۔"

باتھ روم میں صرف ایک روشن دان تھا جس میں لو... گرل لگی ہوئی تھی۔ خالی ہاتھوں سے اس گرل کو توڑنا یا ا... ناممکن تھا۔ پھر میں نے خودکشی کے امکانات پر غور کیا اور باتھ... ... بلیڈ تک ہٹا دیئے۔ کپڑے نکال لئے کہ کہیں وہ خود کو ازار بند سے پھانسی پر نہ لٹکا لے۔ حالاں کہ اب اس کے امکانات معدوم تھے۔

آخری کام میں نے یہ کیا کہ مہتا کے کپڑے بھی اتار لئے اور اسے باتھ روم میں بند کرکے دروازے کو باہر سے کنڈی لگا دی۔ اب دروازہ توڑے بغیر وہ باہر نہیں آسکتا تھا۔ اگر وہ ایسی کوشش کرتا تو کنڈی توڑنے سے پہلے ہم اس کا سر توڑ دیتے۔ میں ان انتظامات سے فارغ ہوا تو میں نے غالب کو گہری نیند میں دیکھا۔ روسٹ مرغی کھانے سے مجھے پیاس لگ رہی تھی۔ میں فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکال ہی رہا تھا کہ کسی نے دروازہ بجایا۔ میں نے دروازے کے قریب جا کے کہا "کون ہے؟"

"میں ہوں مہتا جی" کسی نے باہر سے کہا "گھر سے کھانا لایا ہوں۔"

اب دروازہ کھولے بنا چارہ نہ تھا۔ میں حیران بھی تھا کہ گھر کے کسی فرد یا ملازم نے میری آواز کو مہتا کی آواز کیوں سمجھ لیا۔

"ابھی ٹھہر جاؤ دو منٹ" میں نے کہا۔

"اچھا مالک۔" اس نے یہ بھی بتا دیا کہ وہ نوکر ہے اور میرے اس خیال کی تصدیق بھی کر دی کہ میری آواز مہتا کی آواز سے ملتی ہے لیکن میں سامنے جاتا تو بھانڈا پھوٹ جاتا اور نوکر واپس جا کے الٹا سیدھا بیان داغ دیتا کہ پتا نہیں کون تھا جو مہتا جی کی آواز میں بات کر رہا تھا۔

میں نے نازو کو جگایا۔ وہ اتنی گہری نیند میں تھی کہ اسے ہوش میں لانے کے لئے مجھے اس پر پانی ڈالنا پڑا۔

"اف! کیا ہو گیا اب؟" وہ بولی۔

"کچھ نہیں ہوا۔ باہر ایک شخص کھڑا ہے۔"

"کھڑا رہنے دو" وہ جھومتے ہوئے بولی۔

میں نے اسے جھنجوڑا "وہ کھانا لایا ہے گھر سے۔"

"کھالو تم۔ مجھے بھوک نہیں ہے۔"

"نازو!" میں نے اسے دروازے کی طرف گھسیٹا "دروازہ کھول کے کھانا لے لو۔"

اس سے پہلے کہ وہ سمجھتی میں نے کنڈی کھول کے اسے سامنے کردیا اور خود دروازے کے پیچھے چھپ گیا۔

ملازم شاید مالک کے دفتر میں خوبصورت اجنبی چہرے دیکھنے کا عادی تھا۔ اس نے کچھ بھی نہیں کہا اور ایک ٹفن کیریئر آگے بڑھا دیا۔ جو نازو نے ایسے وصول کرلیا جیسے اسی نے کھانے کا آرڈر دیا تھا۔ میں نے دروازہ بند کیا اور اسے پیچھے کھینچ کر ... کنڈی لگا دی۔

"اتنا سا کام تم خود نہیں کر سکتے تھے" وہ جماہی لے کر بولی۔ "مجھے جگانا ضروری تھا۔"

میں نے کہا "سوری۔ مجھے واقعی خیال نہیں آیا کہ یہ بہت معمولی سا کام تھا۔ خیر۔ تم پھر سو جاؤ۔"

نازو نے مجھے بے وقوفوں کی طرح دیکھا اور پھر جا کے بیڈ پر گر گئی۔ میرا خیال ہے کہ کھانا لیتے وقت بھی وہ پوری طرح جاگ نہیں رہی تھی۔ اس کے ذہن کا صرف ایک حصہ جاگ رہا تھا۔ نیند میں چلنے والے کی طرح اس نے کھلی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا تھا اور میرا کہا بھی مانا تھا مگر اس کا جسم نیند میں تھا۔

میں نے کھانے کو سنبھال کے رکھ دیا اور صوفے پر لیٹ کر سوچنے لگا کہ کیا میری تلاش کامیاب ہوگی؟ صبح تک گل اور محسن کے بارے میں کوئی خبر ملے گی؟ اچھی یا بری۔ جب تک ہم مہتا کے ساتھ تھے اور مہتا ہمارا غلام تھا ہم خطرات سے کسی حد تک محفوظ تھے مگر اس کے بعد؟ کل اگر کسی نے بھی ان کا پتا نہ دیا تو کیا ہو گا؟ سفر ختم ہو جائے گا۔ جدوجہد بے معنی رہ جائے گی۔ ہم ناکامی اور پشیمانی کے احساس کا زخم لے کر لوٹ جائیں گے؟

نیند نے مجھے حوصلہ شکن اور مایوس کن خیالوں سے پناہ دی۔ میں نے کوئی خواب بھی نہیں دیکھا جس کی تعبیر کوئی امید کی کرن دیتی۔ ابھی میں سویا ہی تھا کہ دھماکوں سے میری آنکھ کھل گئی۔

میں بڑبڑا کے اٹھا۔ غالب مجھ سے پہلے بیدار ہو گیا تھا اور اس شور پر سخت برہم تھا جو مہتا نے باتھ روم میں برپا کر رکھا تھا۔ وہ دروازے پر مکّے مار رہا تھا اور ہمیں آوازیں دے کر قید سے رہائی مانگ رہا تھا۔

غالب نے کہا "یہ کیا ہنگامہ ہے؟"

جواب میں مہتا نے اسے ایک گالی دی "کُتّا...... مجھے اندر کیوں بند کیا ہے؟"

غالب نے کہا "اگر تم خاموش نہ ہوئے تو تمہیں نیند کی ایک اور خوراک دینی پڑے گی۔ بند کرو یہ شور۔"

"میں باہر آکے خاموش بیٹھ جاؤں گا..... مجھے یہاں سے نکالو" مہتا نے چلّا کے کہا۔

اب مجھے اٹھ کے جانا پڑا۔ میں نے کنڈی کھولی اور اس سے پہلے کہ مہتا پنجرے میں بند ہو جانے والے چوہے کی طرح باہر نکلنے کی کوشش کرتا میں نے اسے پیچھے دھکیل دیا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے کہا۔

"تم ایسا سلوک کیوں کررہے ہو میرے ساتھ؟ بلاوجہ تم نے میرے سر پر مارا....."

"کیا تم چاہتے ہو کہ میں پھر وہی کروں؟"

"نہیں" وہ چلّایا "میں مر جاؤں گا۔ میرے سر میں بہت سخت درد ہے۔"

ریوالور نکال کے میں نے کہا "ہم سونا چاہتے ہیں خبیث! تمہارے حق میں یہی بہتر ہے کہ آرام سے بیٹھے رہو ورنہ میں تمہیں باندھ کے ڈال دوں گا اور تمہارے منہ میں کپڑا ٹھونس دوں گا۔ یا پھر ناک آؤٹ کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔ پہلی بار ہاتھ ذرا ہلکا تھا۔ یہ نہ ہو کہ غصے میں....."

وہ ہاتھ جوڑنے لگا "میں بھگوان کی سوگند کھاتا ہوں۔ اب نہیں بولوں گا۔ بس مجھے اسپرین لادو۔ دراز میں ہوگی۔ اور بیٹھنے کے لئے کرسی دے دو۔"

غالب نے اسے دونوں چیزیں فراہم کردیں اور وہ کسی قیدی کی طرح سینے پر صبر کی سل رکھ کے بیٹھ گیا جس نے سزا کو ناگزیر سمجھ کے قبول کرلیا ہو اور دیوارِ زنداں سے سر پھوڑنے کو بے سود سمجھ کے اپنی اسیری کے احساس سے مفاہمت کرلی ہو۔

پھر میں جاگا تو رات ہو چکی تھی۔ غالب اور نازو سر جوڑے آہستہ آہستہ باتیں کرنے میں مصروف تھے۔ مہتا اب باہر کرسی ڈالے بیٹھا تھا۔ نازو بہت تر و تازہ اور چاق و چوبند نظر آرہی تھی۔ وہ دونوں منہ دھو چکے تھے اور مہتا کی آزادی کا سبب یہی ضرورت بنی تھی۔

میں نے کلائی کی گھڑی دیکھی تو اس میں آٹھ بج رہے تھے۔ آٹھ نو گھنٹے کی نیند نے میری تمام تھکن دور کردی تھی۔

مہتا نے کہا "اگر میں نو بجے تک گھر نہ پہنچا تو میرے گھر والے آجائیں گے یہاں۔"

میں نے انگڑائی لے کر کہا "آنے دو۔ ان سے بھی مل لیں گے۔"

غالب نے کہا "فون تمہارے گھر میں بھی ہوگا۔"

اس نے اقرار میں سر ہلایا "فون تو کیا ہوگا انہوں نے بھی۔ اور بھی بہت سے لوگوں نے ..."

غالب ہنسا "آج فون خراب تھا تمہارا۔ لیکن اب ٹھیک ہوگیا ہے۔ اپنے گھر والوں کو اطلاع کردو کہ آج رات تم گھر نہیں آؤ گے۔ تمہیں ایک ضروری کام سے بمبئی جانا پڑگیا تھا۔ اور یہ کال بھی تم بمبئی سے کررہے ہو۔"

وہ غالب کو اور پھر مجھے گھورتا رہا "آخر کیا مقصد ہے تمہارا؟ کون ہو تم لوگ۔ مجھے تم پاگل بھی نہیں لگتے۔ جیل سے بھاگے ہوئے مجرم بھی نہیں ہو تم۔ پھر تم ایسا کیوں کررہے ہو؟ وہ مرد عورت کون ہیں جن کی تمہیں تلاش ہے؟"

"یہ تمہیں بعد میں معلوم ہوگا" غالب نے کہا اور پھر مجھ سے مخاطب ہوگیا "میری دھرم پتنی ان کے ساتھ گھومنے پھرنے کے لئے باہر جانا چاہتی ہے۔ کھلی ہوا میں۔"

میں سمجھ گیا کہ غالب کا مقصد مہتا کو باہر بھیجنا ہے "جاؤ بھئی مہتا۔ انہیں بھٹہ دکھاؤ۔ یہ بتاؤ کہ اینٹیں کیسے بنتی ہیں۔ لیکن خبردار! کوئی شرارت مت کرنا۔ غلط خیال بھی مت لانا دل میں ورنہ یہ تمہارا بھٹہ بٹھادیں گی اور بھٹے کی اینٹ سے اینٹ بجادیں گی۔"

نازو مسکرا کے کھڑی ہوگئی "آؤ۔ تم بھی بہت دیر بند رہے ہو۔ تازہ ہوا کھالو۔"

مہتا وہیں بیٹھا خون کے گھونٹ پیتا رہا "مجھے معاف کردو۔"

نازو نے لات مار کے اس کی کرسی الٹ دی۔ پھر مہتا کو بال پکڑ کے اٹھایا اور اس کے چیخنے چلانے کی پروا کئے بغیر دوسرے کمرے میں دھکیل دیا۔ وہ دہلیز سے ٹھوکر کھا کے پھر گرا۔

"جلدی سے فون کرو" نازو نے کہا "نمبر غلط نہ ہو۔"

مہتا بڑی مشکل سے اٹھا اور ریسیور اٹھا کے اپنے گھر کا نمبر ملانے لگا۔ نازو موت بن کے اس کے سر پر سوار رہی۔

"بالکل ایسے بات کرنا جیسے روزانہ کرتے ہو" نازو نے کہا۔

مہتا نے ہیلو کہا تو نازو نے ریوالور بھی نکال لیا۔ ظاہر ہے اس کے بعد مہتا نے لفظ بہ لفظ اس کے حکم کی تعمیل کی اور اپنے گھر والوں کو مطمئن کرکے ریسیور رکھ دیا۔ نازو نے ریوالور جیب میں رکھا اور اسے باہر چلنے کا اشارہ کیا۔

"معلوم نہیں یہ کس قسم کا کھیل ہے۔ مگر مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں کسی شیطانی چکر میں پھنس گیا ہوں" مہتا نے کہا۔

"یہ انکشاف بہت دیر سے ہوا تم پر۔ اس چکر میں تو جوانی اور دولت ہاتھ میں آتے ہی پڑ چکے تھے" غالب نے کہا۔

"خود کو قانون کے حوالے نہ کرکے میں نے بہت بڑی حماقت کی ہے۔ پھانسی چڑھ جانا بہتر ہوتا شاید۔"

نازو نے اسے باہر کی طرف دھکیلا "تمہاری یہ خواہش بھی پوری کی جائے گی۔ بس تم ایک رسی فراہم کردو گے۔ باقی کام ہمارا۔"

"اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے" غالب نے کہا "ورنہ مقدمہ چلنے تک جیل میں سڑو گے۔ ایک عدالت سے سزا' دوسری میں اپیل۔ پھر تیسری میں اپیل۔ رحم کی درخواست اور سزائے موت پانے والوں کے ساتھ کال کوٹھڑی میں دن رات موت سے پہلے ہزار بار مرنا۔ اس سب سے بچ جاؤ گے۔"

مہتا نے چیخ کر اسے گالی دی "تم دھوکے باز اور جعلساز ہو۔ کوئی دہشت گرد ہو۔ خطرناک قسم کے۔"

"تم ہوا کھا کے آؤ۔ اس کے بعد پھانسی کی تقریب ہوگی تمہاری" غالب نے کہا اور نازو نے اسے باہر پھینک دیا۔

میں نے کہا "کیا منصوبہ بندی کی ہے لیلیٰ مجنوں نے؟"

"خاندانی منصوبہ بندی" غالب بولا۔

"وہ قبل از وقت ہے" میں نے کہا "مہتا کو ہوا خوری کے لئے کیوں ایکسپورٹ کیا ہے؟"

"یہ آلۂ بے تار برقی برائے پیغام رسانی و وصولی" غالب نے فون کی طرف اشارہ کیا "اس کے سامنے استعمال نہیں کیا جاسکتا تھا۔"

"واقعی۔ یہ خیال تو مجھے بہت پہلے آنا چاہئے تھا۔ شاید آیا بھی تھا لیکن میں اس وقت سو رہا تھا" میں نے کہا۔

"چناں چہ خیال نے میرے دماغ سے رجوع کیا۔ خیر اب دیر مت کرو۔ نمبر ملاؤ۔ ہم یہاں پوری رات رہنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔" غالب نے کہا۔

"رات کو کیا خطرہ ہو سکتا ہے؟"

"کیا پتا وہ بدمعاش مینجر آجائے۔ اسے شک نہ ہوگیا ہو تو" غالب نے کہا "آنے کو کوئی میڈم بھی آسکتی ہے اور خود مہتا کی گھر والی آسکتی ہے سُن گُن لینے۔ اسے پتی مہاراج کے لچھن معلوم ہوں گے۔"

"ارے یار یہ بیویاں۔ اللہ میاں کی گائے سے زیادہ معصوم انہیں کہاں پتا چلتا ہے مردوں کے چکر کا۔"

"چل رہنے دے بھائی۔ تریا چلتر ایسے ہی مشہور نہیں ہوا۔ یہ جتنی بھولی بنتی ہیں اتنی ہی مکار ہوتی ہیں۔ وہ بیوی ہی کیا جسے شوہر کی رگ رگ کا پتا نہ ہو" غالب نے کہا۔

"پہلے تریویدی سے بات کی جائے۔"

"کرلو۔ مگر اس کا نمبر آبزرویشن پر ہوگا۔ فوراً معلوم کرلے گا کہ فون کہاں سے کیا گیا تھا اور صبح ہونے سے پہلے اس پورے علاقے کا محاصرہ کرلیا جائے گا۔"

"یہ تو ہے" میں نے کہا۔

"تم لاہور فون کرو" غالب نے کہا "یہ لو ڈائریکٹری' آپریٹر کو اپنے یار منظر کا نمبر دو۔"

میرا دل لاہور کے نام پر دھڑکا "رابعہ سے بات کرنے میں کیا حرج ہے؟"

"حرج ہے۔ انڈیا' پاکستان کے درمیان بات چیت ٹیپ کی جاتی ہوگی۔ خصوصاً آج کل کے حالات میں۔ منظر کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ رابعہ کسی مشکل میں نہ پڑ جائے۔"

"منظر مشکل میں نہیں پڑ سکتا تو رابعہ کیوں پڑے گی؟" میں نے کہا "دونوں وکیل ہیں آخر۔"

"مگر رابعہ اتنا عرصہ روپوش رہی ہے۔ اس کا نام تمہارے نام کے ساتھ منسوب تھا۔ ہر معاملے میں۔ ممکن ہے وہ ابھی گمنامی کی زندگی گزار رہی ہو۔ کسی کو پتا ہی نہ ہو کہ وہ واپس لاہور آگئی ہے۔ اس کے خلاف پرانے دفتر نہ کھل جائیں۔ اگر بے قراری پر اختیار نہیں تو پہلے منظر سے بات کرو۔ اس کا مشورہ ہو تو رابعہ سے بھی فریاد و فغاں آہ و زاری کرلینا" غالب نے کہا۔

اس کی بات معقول تھی۔ میں نے ریسیور اٹھا کے انٹرنیشنل ٹرنک ڈائلنگ کا نمبر ملایا اور اسے عبدالودود منظر' بار ایٹ لاء کے گھر کا نمبر دیا۔ پھر ہم انتظار کرنے لگے۔

"اس کال کا بھی پتا چل جائے گا" میں نے کہا۔

"ہاں۔ مگر کارروائی فوراً نہیں ہوگی۔ ممکن ہے بعد میں مہتا سے پوچھا جائے۔ اس کا جو دل چاہے کہے۔ تم منظر سے گپ شپ مت کرنا زیادہ۔ مختصر بات کرنا....."

"اب آپ مجھے ٹیلی فون پر گفتگو کے آداب مت سکھائیں۔" میں نے کہا۔

"اس سے کہنا کہ تریویدی کو فون کرے" غالب نے اپنی بات جاری رکھی "تریویدی سے پوچھے۔ کیا حال ہے۔"

"حال تو ہمیں معلوم ہے پتلا ہوگا۔"

"پھر یہ پوچھے کہ اب وہ شہلا کو اور اس کے بیٹے کو کہاں ضمانت رکھے گا۔ یہاں تو اسے ہمت نہیں پڑی۔"

"ہمت نہیں پڑی؟"

"ہاں۔ ایسے ہی کہنا پڑے گا۔ براہِ راست اس سے ... کرنا تو حماقت ہوگا کہ اس ٹرین پر وہ تھے یا نہیں۔ اس سے ... بے خبری اور بے عملی ظاہر ہوجائے گی۔ ہم تو دعویٰ کریں گے کہ وہ ٹرین پر ہوتے تو ہم انہیں ایسے نکال لے جاتے جیسے محبوب کی ایک ادائے ناز دل لے جاتی ہے' یا پولیس سو مجرموں کے درمیان سے ایک بے گناہ کو لے جاتی ہے۔"

گھنٹی بجی تو میں نے ریسیور اٹھایا "آپ کی کال ہے لاہور کے لئے؟ پی پی کال فار مسٹر منظر ایڈوکیٹ۔"

"بار ایٹ لاء" میں نے تصحیح کی۔

"کون بات کرے گا؟" آپریٹر بولی۔

"مسٹر مہتا آف مہتا سنز" میں نے کہا۔

"ریسیور رکھ دیں" آپریٹر نے کہا "کال آرہی ہے۔"

"میں سخت جذباتی ہورہا ہوں" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "میں بھی نروس ہوں۔ یاز سب پوچھ لینا اس سے کہ کس حال میں ہیں یارانِ وطن۔ اپنا ڈبل ایس آئی تیجیہ....."

گھنٹی پھر بجی اور میں نے غالباً پاکستان کے آپریٹر کی آواز سنی۔ "لاہور بات کریں۔"

پھر منظر نے کہا "ہیلو!"

میں نے کہا "میں مہتا بول رہا ہوں۔"

"بھائی کون مہتا؟" وہ حیران اور پریشان تھا۔

"ابے تیرا باپ۔ الو کے پٹھے" میں نے چلا کے کہا۔

"ابے۔ تو....." وہ چلایا اور فرطِ جذبات میں اس نے جواب میں مجھے نصف درجن گالیاں دیں مگر میرا نام نہیں لیا۔

غالب نے ریسیور مجھ سے چھین لیا "اور میں تیرا دوسرا باپ ہوں" غالب چیخ کر بولا اور پھر قہقہہ مار کے ہنسا۔ شاید اسے بھی منظر نے اتنی ہی گالیاں دی ہوں گی۔

ریسیور پھر میں نے چھین لیا۔ "یار' پہلے مجھے تو بات ختم کرنے دے" منظر کی آواز نے جلاوطنی کے احساس کو یکلخت عذاب ناک بنا دیا تھا اور وطن کی یاد نے دل میں آگ لگادی تھی۔ مجھے صرف غالب کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو نظر آرہے تھے۔ خود اپنے آنسوؤں سے میں بے خبر تھا جو شدتِ جذبات میں بہہ نکلے تھے۔

"ابے تو رو رہا ہے بھوتنی کے" میں نے منظر کی آواز سنی۔ وہ خود بھی گلوگیر لہجے میں بات کررہا تھا "تیرا کہاں ہے۔ میرا تیرا باپ محسن۔"

میں نے خود پر قابو پا کر کہا "وہ اس وقت ہمارے ساتھ نہیں ہے۔"

"اور کون ہے؟"

"نازو ہے" میں نے کہا "باہر ہے ابھی۔"

"اور شہلا۔ اس کا بیٹا؟"

"وہ بھی ہمارے ساتھ نہیں ہیں۔"

"اچھا وہ محسن کے ساتھ ہوں گے۔ ابے یار' کتنا عجب لگ رہا ہے آج تمہاری آواز سن کے۔ میں تو بھول چکا تھا تمہیں کہ مرگئے مردود نہ فاتحہ نہ درود۔ بڑے ذلیل کمینے لوگ ہو تم سب....." اس نے کچھ اور نفیس گالیاں دیں۔

میں نے کہا "منظر یار' ہم واپس آئیں گے۔ بہت جلد۔"

"میری بلا سے مت آؤ۔ مگر یار' خبر تو دیتے رہا کرو۔ کچھ پتا تو چلے کہاں ہو۔ زندہ ہو کہ نہیں۔ عدم آباد سے بھی چٹھی آجاتی ہے۔ روح بن کے آسکتے ہو تم۔ تم نے تو حد کردی۔ میرے خواب میں بھی نہیں آتے۔"

"ابے بند کر اپنی بکواس۔ لائن نہ کٹ جائے کہیں۔ یہ بتا رابعہ کا کیا حال ہے؟"

"اس کے حال مستقبل کو گولی مار۔ میرا تو خیال ہے کہ میں اسے سمجھاؤں مجھ سے شادی کرلے۔ چھوڑے تمہاری واپسی کا انتظار۔"

"میں ابھی قتل کردوں گا فون پر۔"

"یار تو جہاد کر۔ تیرا کام ہم کرتے ہیں۔ آخر دوست کس کام آتے ہیں۔ سب بچوں کے نام تیرے نام پر رکھوں گا۔ وعدہ۔ ورنہ یار' وہ تیرے ویران گھر میں بھٹکتی ہوئی روح ہے۔ تیری یاد میں دیواروں سے سر ٹکرا کے مرجائے گی کسی دن۔"

"وہ اکیلی ہے وہاں؟" میرا دل کٹ گیا۔

"سالی پاگل ہوگئی ہے۔ میں نے کتنا سمجھایا کہ میرے گھر آجائے مگر اس کی وہی ایک بات۔ میں اس گھر میں ان کی واپسی کا انتظار کرتی رہوں گی۔ ایسی کی تیسی ان کی۔ انہیں کہاں فرصت۔"

"میں ابھی بات کرتا ہوں اس سے۔"

"کوئی ضرورت نہیں۔ وہ زخم سی رہی ہے۔ تو اُدھیڑنا چاہتا ہے" منظر نے برہمی سے کہا "ایک بار بات کرکے تجھے کیا ملے گا؟ وہ سو راتیں تڑپتی رہے گی۔ آپ مہربانی کریں اس کے حال پر۔ آتش فشاں کو مت چھیڑیں ورنہ لاوا ابلنے لگا تو جل کے مرجائے گی وہ۔ میں نے تو یہ بھی کہا تھا کہ وزیر خان ٹرسٹ کو سنبھال لو۔ اپنی پریکٹس میں دل لگاؤ۔ مگر وہ تارک الدنیا ہوگئی ہے" منظر نے کہا۔

"کیا کرتی رہتی ہے اکیلے میں؟"

"مشہور فلمی گانے گاتی ہے۔ مثلاً۔ تو کون سی بدلی میں مرے چاند ہے آجا بھوتنی کے۔ تیری تصویر سامنے رکھے تیرے نام کی مالا جپتی رہتی ہے۔"

غالب نے پھر ریسیور مجھ سے چھین لیا "یار' تم فضول باتوں میں لگ گئے۔ مجھے یہی ڈر تھا۔ اسے سمجھایا بھی تھا کہ پہلے کام کی بات کرنا۔ پھر کوئی اور بات۔ تجھے کچھ معلوم ہے نازو کے بھائی کے بارے میں۔ سیّد اکرام شیخ۔ سابق سب انسپکٹر۔ ہاں وہ کراچی میں ٹیکسی چلا رہا تھا۔ وہیں چھوڑ آئے تھے ہم اسے۔ نہیں۔ پھر اس سے کوئی رابطہ نہیں ہوا۔ محسن۔ ہاں۔ ان کا پتا چلانا ہے اور یہ کام تجھے کرنا ہے۔ پہلے بات سن۔ ایک نمبر لکھ۔ بمبئی کے ایک سیٹھ کا نمبر ہے۔ ترویدی۔ دلاور اسی کے ساتھ ہے۔"

غالب نے اسے کیا کہا اور کیا نہیں کہا' میں نے کچھ نہیں سنا کیونکہ میں رابعہ کے خیال میں گم تھا۔ میری آنکھیں اسے اپنے آبائی گھر میں دیکھ رہی تھیں۔ اداس اور تنہا مگر پُرعزم اور پُرامید۔ منظر کے الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے "وہ تیرے ویران گھر میں بھٹکتی روح ہے۔ تیری یاد میں دیواروں سے سر ٹکرا کے مرجائے گی کسی دن۔ میں اسی گھر میں ان کی واپسی کا انتظار کرتی رہوں گی۔"

غالب نے ریسیور رکھ کے ایک لمبی گہری سانس لی "میں نے منظر سے کہا ہے کہ ایک گھنٹے بعد ہم پھر کال کریں گے۔"

میں نے ریسیور اٹھالیا "اس وقت تک میں رابعہ سے بات کرلوں۔"

غالب نے فون اٹھا کے پیچھے کرلیا "ہرگز نہیں۔ مجھے منظر نے کہا ہے کہ تجھے رابعہ سے بات نہ کرنے دوں۔"

"وہ کون ہوتا ہے....." میں نے مشتعل ہوکے کہا۔

"وہ ٹھیک کہتا ہے۔ رابعہ تنہا ہے مگر پُرسکون ہے۔ اس نے جدائی کے احساس سے مفاہمت کرلی ہے۔ صبر کرنا اور امید رکھنا سیکھ لیا ہے۔ کوئی ضرورت نہیں اس کے جذبات میں آگ لگانے کی۔ ظلم کرنے کے بجائے ظلم سہنا سیکھو۔ ورنہ یہ محبت نہیں خودغرضی ہوگی۔ ابھی تک تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ رابعہ ہے کہاں۔ کیا یہ کم اطمینان کی بات ہے کہ وہ اپنے گھر میں ہے۔ تمہارے گھر میں۔ اور انتظار کررہی ہے۔ تم بھی انتظار کرو دوست' اچھے وقت کا۔"

میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا "میں اس خود فریبی کے احساس سے دل کو نہیں بہلا سکتا۔"

"یہ خود فریبی ہے؟ رابعہ کی محبت کو رُسوا مت کرو۔ وہ جس امید اور یقین کے سہارے پر زندہ ہے' اسے تم خود فریبی کہتے ہو؟"

مجھے غالب کی بات نے شرمندہ کردیا تھا۔ کچھ دیر ہم خاموش بیٹھے رہے۔ پھر وہ اٹھا اور باہر چلا گیا۔ اب ٹیلی فون میرے سامنے اور میری دسترس میں تھا۔ ڈائل کے اعداد کو چھونے کی خواہش میری انگلیوں میں سنسنی پیدا کررہی تھی۔ وہ رابعہ کا نہیں میرا فون نمبر تھا۔ جو پہلے وزیر خان مرحوم کا فون نمبر تھا۔ ایک بار وہ گھر جو میرے بچپن سے جوانی تک کی یادوں کا امین تھا فروخت ہوگیا تھا۔ کئی سال اس کے در و دیوار میری واپسی کے انتظار میں رہے۔ بالکل اسی طرح جیسے آج رابعہ میری منتظر ہے۔ پھر رابعہ نے وہ گھر میرے لئے خرید لیا۔ میرا ماضی پھر میرے مستقبل سے مل گیا۔ میری زندگی اس کے بغیر نامکمل رہتی.....

نازو کی آواز پر میں چونکا "مہتاجی کو آرام سے بٹھاؤ۔ یہ تھک گئے ہیں۔"

میں نے مہتاجی کو سخت اشتعال کے عالم میں اندر آتے دیکھا۔

"پدھاریے مہاراج۔ بھوک لگی ہو تو بھوجن پروسوں؟ آپ کے گھر سے تیار رکھا ہے۔"

وہ میرے سامنے بیٹھ گیا "وہ کیسٹ اور فلم کا رول مجھے دے دو۔ تم لوگ زبردستی سب کچھ کرواسکتے ہو' سارے کام۔ مارپیٹ کرکے اور گولی مارنے کی دھمکی دے کے۔ تو اس کیسٹ اور فلم کو رکھ کے کیا کروگے؟"

میں نے کہا "مہتاجی! آج تو خیر ہم زبردستی کرنے کی پوزیشن میں ہیں۔ کل جب ہم چلے جائیں گے تو تم زبردست ہوجاؤ گے۔ اپنی دولت' طاقت اور اثر و رسوخ کو استعمال کرکے تم ہمیں پکڑوانے کی کوشش کروگے۔ اس وقت یہی دو چیزیں تو بچائیں گی ہمیں اور ہمارے درمیان پیار و محبت کا رشتہ بھی انہی کے دم سے برقرار رہے گا۔"

"کم سے کم اتنا تو بتادو کہ میری جان کب چھوٹے گی اس عذاب سے؟ کوئی حد بھی ہے اس کی؟ آخر میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا کہ تم نے مجھے قربانی کا بکرا بنالیا۔"

"کسی نہ کسی کو ہمارے کام آنا تھا۔ بدبختی نے تمہارے پاس بھیج دیا۔ تمہاری بدبختی نے۔ ورنہ ہم تو کبھی اس راستے سے نہ پہلے گزرے نہ آئندہ گزریں گے۔ ہم تمہارا نام تک نہیں جانتے تھے۔ جیسے تم ہمارا نام نہیں جانتے۔"

"پھر یہ کس قصور کی سزا ہے؟"

"کیسی سزا؟ ہم نے تو تمہیں سزا سے بچالیا۔ تمہارے ہر جرم کی پردہ پوشی میں تمہاری مدد کی۔ رسونتی کا معاملہ تو پہلے کا تھا لیکن تم نے میڈم کو ہمارے سامنے قتل کیا اور ہم نے اس جرم کا سراغ مٹانے میں تمہاری مدد کی۔ تمہارے دوست بھی ایسا نہ کرتے۔ اس طرح ہم تو خود شریکِ جرم ہوگئے۔ دراصل میڈم سے ہمیں کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ وہ کوئی شریف اور بے گناہ عورت نہیں تھی۔ ایسی عورتوں کا انجام ایسا ہی ہوتا ہے اس لئے ہم نے قانون کی نہیں تمہاری مدد کی۔ تمہارا گلہ ناجائز ہے مسٹر مہتا۔"

وہ لاجواب نظر آنے لگا "پھر بھی' میں مصیبت میں پڑگیا ہوں جس سے نجات کی صورت نظر نہیں آتی۔ اب تو مجھے یقین آنے لگا ہے کہ تم جاتے وقت مجھے قتل کرجاؤ گے۔"

"تمہیں قتل ہی کرنا ہوتا تو آج کا دن بھی تمہاری زندگی میں شامل نہ ہوتا" میں نے کہا "اس وقت تمہیں پرلوک سدھارے دس بارہ گھنٹے ہوجاتے مگر ایک تو ہم بے مقصد کوئی کام نہیں کرتے۔ دوسرے ہمیں تمہاری مدد کی آئندہ بھی ضرورت پڑسکتی ہے اس لئے تمہیں موت کے خوف کو دل سے نکال دینا چاہئے۔ گناہ بے لذت کرنے والے احمق ہوتے ہیں یا نفسیاتی مریض۔ اگر تم سے ذرا بھی خطرہ محسوس کرتے ہم تو پہلی فرصت میں تمہارا کام تمام کردیتے لیکن ایسی کوئی بات نہیں۔ جب تک میڈم کا ٹیپ اور چند تصویریں ہمارے پاس ہیں تم وہی کروگے جو ہم کہیں گے۔"

"ورنہ کیا تم یہ ثبوت لے کر عدالت میں حاضر ہوجاؤ گے؟" وہ

طنز سے بولا۔

"تمہارے دشمن بھی تو ہوں گے مہتا" میں نے کہا "اسی طرح میڈم کے چاہنے والے ہوں گے۔ وکیل اور تفتیش کار بھی ایسے کیس تلاش کرتے پھرتے ہیں جن سے ان کی شہرت سارے ہندوستان میں ہو جائے اور یہ ایسا ہی کیس ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ تم فضول باتوں کو دماغ سے نکال دو۔ اور تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ تم بعد کے واقعات کو بھول جاؤ۔ یہ ہو سکتا ہے کہ چند دن بعد یا کل ہی پولیس' ملٹری انٹیلی جنس یا سی بی آئی والے پوچھ گچھ کے لئے آئیں۔ ظاہر ہے تم ان سے سفید جھوٹ نہیں بول سکتے۔ تم ان کو وہ سب بتا دو جو ہم نے کہا تھا۔ ہمارے نام حلیے جو کچھ ہم نے کیا۔ مزدوروں سے کیا کہا اور کس طرح انہیں چھٹی دی۔ بس' اس کے بعد ہم کھانا کھا کے رخصت ہو گئے تھے اور تم اپنے کام سے دہلی یا بمبئی چلے گئے تھے۔"

"دہلی جانے میں وقت لگتا ہے۔"

"تو ناگپور چلے جاؤ۔ بمبئی چلے جاؤ" میں نے کہا "کل صبح تمہارا منیجر رپورٹ لکھوا دے یا تم خود یہ کام کرو مگر تمہاری بہتری اسی میں ہے۔ پولیس کو سوچا سمجھا کے بھی رپورٹ ضرور لکھوا دو کہ رات کو تمہارے دفتر میں کوئی آیا تھا۔ چیزیں الٹ پلٹ کر دیکھنے سے تم نے اندازہ کیا۔ انہوں نے تمہارے گھر سے آنے والا کھانا بھی کھایا تھا مگر اور کچھ لے کر نہیں گئے۔ روپیہ پیسہ آفس میں ہوتا ہی نہیں۔ ظاہر ہے نقصان کوئی نہ ہو تو پولیس رپورٹ نہیں لکھتی مگر رپورٹ ہی تمہیں پریشانی سے بچائے گی۔"

وہ حیرانی سے مجھے دیکھتا رہا "آخر تم ہو کیا چیز؟"

"پولیس بہت تفصیل سے بتائے گی تمہیں" میں نے کہا۔

"مگر پولیس مجھے کیوں پریشان کرے گی؟"

"وہ پوچھیں گے کہ انہوں نے فون پر کیا باتیں کی تھیں اور کس سے۔ تم لاکھ انکار کرو' وہ مانیں گے نہیں۔"

"آخر کیوں...؟"

"وہ سمجھیں گے کہ تم ہمارے خوف سے کچھ نہیں بتا رہے ہو" میں نے کہا "لیکن تمہاری رپورٹ ثبوت ہو گی کہ تمہیں واقعی کچھ معلوم نہیں۔ تم بمبئی میں تھے اور ہم رات کو چوروں کی طرح یہاں صرف اس لئے آئے تھے کہ فون استعمال کریں۔ ہم چور نہیں تھے اس لئے لے کر کچھ بھی نہیں گئے..."

غالب اور نازو لڑتے ہوئے اندر آئے۔

"ہر بات میں عورت کو ناقص العقل کہنے سے کیا ملتا ہے تمہیں؟ مردوں کے احساس کمتری کو تسکین ملتی ہے شاید۔"

"سچ ہمیشہ کڑوا لگتا ہے" غالب نے کہا "ورنہ تم کیوں چراغ پا ہوتی ہو۔ تم سے کچھ کہا تھا میں نے؟"

"اور کون تھا وہاں...؟"

"ایک بھوت تھا۔ تمہیں نظر نہیں آیا۔ مگر وہ سُر تھے میرے" غالب نے کہا۔

"اگر مجھ سے بات نہیں کر رہے تھے تو میری طرف کیوں دیکھ رہے تھے؟" نازو نے کہا۔

"تم بھینگا کہہ رہی ہو مجھے۔ اور دیکھنے سے کیا نظر لگتی ہے تمہیں' ایسی کون سی حور پری ہو تم۔"

نازو نے جل کے کہا "پھر کیوں دیکھتے ہو میری صورت؟"

"نہیں دیکھوں گا۔ پھر یہ مت کہنا پرائی عورتوں کو تاکتے پھرتے ہو" غالب نے کہا "بابا' مرنا ہو گا تو وحیدہ رحمان پر مریں گے۔"

"جاؤ مرو" نازو نے بھنا کے کہا "میں بھی جا رہی ہوں مہتا کے ساتھ۔"

میں تو خیر عادی تھا ان کی خانہ جنگی کا جو محبت کے چونچلوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھی مگر ان کی باتوں نے مہتا کو بھی مسکرانے پر مجبور کر دیا تھا۔ نازو کی زبان پر اس کا نام آیا تو وہ چونکا۔

"سنا نہیں تم نے۔ چلو میرے ساتھ" نازو چلا کے بولی۔

مہتا فوراً کھڑا ہو گیا "میں کب انکار کر رہا ہوں دیوی جی۔"

"اتنا ہی برا ہوں میں تو۔ واپس مت آنا" غالب نے کہا۔

"نہیں آؤں گی" نازو نے چلا کے کہا۔

"اچھا۔ یہ تو بتاتی جاؤ" غالب نے روتی آواز میں کہا "کہ اسے مسلمان کرو گی شادی کے لئے یا خود ہندو ہو جاؤ گی؟"

نازو کے لئے مسکراہٹ کو روکنا مشکل ہو گیا "بڑے ڈھیٹ ہو تم بھی۔ شرم نہیں آتی..."

"پہلے آتی تھی اب نہیں آتی" غالب نے ہنس کے کہا۔

میں نے کہا "جیسے کتا بلی گھاس کھاتے ہیں ہاضمہ درست رکھنے کے لئے۔ ایسے ہی تم دونوں کی لڑائی ہے۔"

"آخر تم کتا کسے کہہ رہے ہو اور بلی کسے؟ ان کا تو بیر مشہور ہے" غالب نے میز پر مکا مار کے کہا "جب کہ ہماری سچی محبت مشہور ہے۔ اور نہیں ہے تو ہو گی۔"

"اب کیا خیال ہے لاہور چلیں؟"

غالب نے ریسیور اٹھا کے نمبر ملایا اور آپریٹر کو پھر منظر کے گھر کا نمبر دیا "ارجنٹ کال پلیز" اس نے ریسیور رکھ دیا۔

"اگر محسن یا گل کا پتا مل گیا تو ہمارا پروگرام کیا ہو گا اور نہیں ملا تو کیا ہو گا؟" غالب بولا۔

میں نے کہا "ہر صورت میں ہم مہتا جی کے ساتھ جائیں گے ان کی گاڑی میں۔"

"کہاں جائیں گے؟ یہ بھی ارشاد ہو۔"

"پہلی صورت میں گل یا محسن کا پتا چلانے اور ان سے رابطہ قائم کرنے کے لئے" میں نے کہا "وہ پولیس کی تحویل میں ہوں گے یا اسپتال میں۔ دونوں جگہ مہتا جی کا اثر و رسوخ ہمارے کام آئے گا۔ وہ اس علاقے کے معززین میں شامل ہیں۔ پولیس کو قائل کر سکتے ہیں کہ جن کو غلط فہمی کی بنا پر پکڑ لیا گیا ہے وہ ان کے مہمان ہیں۔ پرانے دوست ہیں۔ قائل کرنے کے لئے پیسہ خرچ کرنا پڑے یا کسی اوپر والے سے کہلوانا پڑے۔ مہتا کے لئے کچھ مشکل نہیں ہونا چاہئے۔ خدا نخواستہ وہ اسپتال میں ہوئے۔ زندہ یا مردہ۔ تب بھی مہتا ہی مدد کرے گا۔"

"اور اگر کچھ پتا نہ چلا...؟"

"پھر ہم مہتا کی گاڑی میں ناگپور چلے جائیں گے۔"

"ناگپور ہی جانا تھا تو رحمت علی کے ساتھ جاتے۔ اس کو خواہ مخواہ ذلیل کر کے اتار دیا۔"

"خواہ مخواہ نہیں یار۔ وہ گھٹیا انسان تھا۔ پاگل نظر نہیں آتا تھا مگر تھا ذہنی مریض" میں نے کہا "بے ضمیر اور..."

"لاحول ولا قوۃ!" غالب نے کہا "بھائی' آپ اپنے کام سے کام رکھیں۔ وہ برا تھا تو اپنے لئے' ہمارے ساتھ تو کوئی برائی نہیں کی تھی اس نے۔"

"برے آدمی کی مدد بھی بری۔"

"یہ عجیب فلسفہ ہے۔ اگر کوئی آدمی مدد کی پیشکش کرے تو کیا اس سے پہلے کریکٹر سرٹیفکیٹ طلب کریں؟ یہ پوچھیں کہ تم باضمیر' باکردار ہو اور نفسیاتی مریض تو نہیں ہو۔ وہ ایسا آدمی تھا جو اپنی جان پر بھی کھیل جاتا ہمارے لئے" غالب نے کہا۔

"بس یار۔ مجھے اچھا نہیں لگا۔ آدمی کو غدار اور وطن دشمن نہیں ہونا چاہئے۔ ویسے تو چوہدری دلاور اور حاجی عبداللہ جیسے لوگ خالص پاکستانی ہیں۔ عزت دار بھی سمجھے جاتے ہیں مگر ان کو ہم کیا سمجھتے ہیں؟"

"ان کا رحمت علی سے موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔"

"کیوں نہیں کیا جا سکتا؟ ایک ہی کام کر رہے ہیں سب۔ جس ملک کے شہری ہیں اسی کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ رحمت علی جیسے لوگوں کی وجہ سے سب مسلمانوں کی وفاداری پر حرف آتا ہے۔ سب بدنام ہوتے ہیں۔"

غالب نے کچھ نہیں کہا۔ پھر فون کی گھنٹی بجنے لگی اور میں نے دوبارہ منظر کی آواز سنی۔

"سالے وہ نمبر کیا تھا۔ معاف کرنا یار۔ غلطی سے سالا کہہ دیا تجھے۔ اس طرح تو رابعہ بہن ہو گئی میری... خیر۔"

"بہنوئی صاحب' نمبر ٹھیک تھا۔ کیا ہوا؟"

"خاک ہوا۔ ایک شخص نے خواہ مخواہ مجھے گالیاں دیں۔ وہ تو بمبئی کے کسی تھانے کا نمبر تھا۔ یار' تم تو خیر دنیا میں آئے ہی ذلیل و خوار ہونے کے لئے تھے۔ پہلے عشق میں خوار ہوئے۔ اب کافروں کے ملک میں ذلیل ہو رہے ہو۔ مجھے یہاں کا کوئی تھانے دار کُتے کا بچّہ کہتا تو میں صبح اسے کاٹ لیتا پاگل ہو کے...."

میں نے ہنس کے کہا "نمبر غلط ملا دیا ہو گا آپریٹر نے۔"

"نہیں۔ وہ کیا نام ہے اس بھوتنی والے کا۔ تریویدی.... ہاں' اس کا نمبر بدل گیا ہے۔ وہ کوئی بڑی توپ چیز ہے کیا؟" منظر بولا۔

"ہاں۔ اپنے چوہدری دلاور کا بھارتی ایڈیشن ہے۔"

"اسی لئے۔ آپریٹر نے بیچ میں کہا کہ آپ کو سیٹھ تریویدی سے بات کرنی ہے۔ میں ملا دیتا ہوں دوسرا نمبر۔"

"آپریٹر! وہ سن رہا تھا ساری گفتگو؟"

"ہاں یار۔ کچھ ہوتے ہیں نسلی حرامزادے...."

"تم خود حرامزادے" بیچ میں آواز آئی۔

مجھے بے اختیار ہنسی بھی آئی اور یہ احساس بھی ہوا کہ ٹیلی فون پر گفتگو کرنا کس حد تک غلط اور خطرناک کام تھا۔ اب آپریٹر اور منظر کے درمیان ناقابل اشاعت مکالمے شروع ہو گئے تھے اور بات انڈیا' پاکستان کی جنگ بن گئی تھی۔

جب آپریٹر نے کہا "میں لائن کاٹ دوں گا۔"

اور منظر نے کہا "بھوتنی کے میں تمہاری پردھان منتری کی ناک کاٹ دوں گا دہلی جا کے۔ جو خوف ناک ہے۔"

تو میں نے کہا "خدا کے واسطے بھائی آپریٹر صاحب! جتنی گالیاں دینی ہوں مجھے دے لو۔ یار منظر. کام کی بات کر' تیری بات ہوئی تریویدی سے؟"

"میں بتاتا ہوں جی' تریویدی صاحب سو رہے تھے" آپریٹر نے کہا۔ "کسی نے کہا کہ صبح بات کرنا۔"

میں نے کہا "منظر..... ہیلو منظر..."

"اجی' اس کی تو لائن کاٹ دی میں نے۔ آپ کو بات کرنی ہے تریویدی صاحب سے تو بتاؤ۔ میں صبح آٹھ بجے تک ڈیوٹی پر ہوں" آپریٹر بولا۔

میں نے اسے پنجابی میں ایک درجن مُرصّع اور ناقابل فہم گالیاں دے کر کہا کہ جو کام منظر کو کرنا تھا اب وہ میں کروں گا اور دھڑ سے ریسیور رکھ دیا۔ پھر مجھے بے اختیار ہنسی آئی۔

"یہ کیا بات ہوئی؟" غالب حیران ہو کے بولا۔

میں نے اسے ساری بات بتائی تو پہلے وہ بھی ہنسا اور پھر فکر مند ہو گیا "اس کا مطلب ہے سانپ تو مرا نہیں۔ لاٹھی ٹوٹ گئی بلاوجہ۔"

میں نے کہا "ہاں۔ معلوم کچھ نہیں ہوا۔ بات مشہور ہو گئی۔"

"یہ آپریٹر تو اب کبھی بات نہیں کرائے گا منظر سے۔ بلکہ مجھے امید ہے کہ اکثر رات کے وقت فارغ ہو گا تو جنگ چھیڑ دے گا۔

کسی دن کوئی پاکستان کا آپریٹر بھی اس میں شریک ہو جائے گا۔"

"صبح آٹھ بجے کے بعد پھر کوشش کی جاسکتی ہے۔ ترویدی دس گیارہ بجے سے پہلے کہاں اٹھتا ہوگا" میں نے کہا "اور ہم اتنی دیر یہاں انتظار نہیں کرسکتے۔"

"کیا ہم نہار منہ نکل جائیں گے۔ ابھی کیا وقت ہوا ہے؟"

میں نے کہا "دس بجے ہیں۔ صبح تک آرام کرتے ہیں۔ آٹھ بجے تک جھٹے پر مزدور آجائیں گے اور کوئی کام کی بات ہوگی تو معلوم ہوجائے گی۔ ورنہ یہاں ٹھہرنے کا فائدہ؟"

"ناگپور جا کے کیا کریں گے ہم؟"

"کچھ نہیں۔ وہاں سے آگے جائیں گے۔ مشرقی پاکستان کی طرف" میں نے کہا "مہتا ہمیں اس خطرے والے علاقے سے نکال سکتا ہے۔ ناگپور سے ہم ٹرین پکڑلیں گے کلکتہ کے لئے اور کلکتہ سے ڈھاکا....."

"بس ہم تین.....؟" غالب نے مایوسی سے کہا۔

"مجھے امید ہے کہ گل اور محسن یہاں نہ ملے تو وہاں شاید مل جائیں گے" میں نے کہا "محسن کی جگہ میں ہوتا تو یہی کرتا۔ ڈھاکا پہنچنے کے بعد منومیاں کو تلاش کرتا' ان کے ذریعے پھر رابطہ قائم ہوسکتا ہے۔"

غالب نے سرہلایا "کاش' محسن کی عقل بھی انہی خطوط پر کام کرے۔"

"ایسا تو اکثر ہوتا ہے۔ میرے اور اس کے سوچنے کا انداز ایک ہوگیا ہے۔ اتنی طویل رفاقت ہے ہماری کہ ہمارے ذہن میں ایک ہی بات آتی ہے اور ایک ہی وقت میں۔"

"یعنی اس وقت محسن جہاں بھی ہوگا یہی سوچ رہا ہوگا" غالب نے کہا "میں تاریخ اور وقت نوٹ کرلیتا ہوں۔ محسن ملے گا تو اس سے پوچھوں گا۔"

"کیا تمہارے اور نازو کے درمیان ذہنی ہم آہنگی نہیں ہے؟"

غالب نے سوچ کے کہا "ہمارے درمیان وہی ہم آہنگی ہے جو کرکٹ کی گیند اور بیٹ میں ہوتی ہے۔ ایک کے بغیر دوسرا بے کار ہے مگر بیٹ چوکے چھکے مارنا چاہتا ہے۔ بال وکٹ لینا چاہتی ہے۔"

"واہ۔ کیسا اندازِ بیاں ہے۔ بیسویں صدی کے عشق میں آپ دونوں نے بالکل نیا اسٹائل اختیار کیا ہے۔ باکس آفس کی کامیاب فلم والا۔ حسن و عشق' ہنسی مذاق اور مار دھاڑ سے بھرپور سنسنی خیز فلم۔ بیٹ اور بال۔" میں نے ہنس کے کہا۔

"تمہیں بھوک نہیں لگی؟"

"بھوک سے زیادہ چائے کی طلب ہے" میں نے کہا "کتنے افسوس کی بات ہے کہ مہتا کے پاس سب کچھ ہے مگر چائے نہیں۔"

"یہاں نہ سہی۔ آس پاس کہیں چائے ضرور ملتی ہوگی" غالب نے کہا "اسے معلوم ہوگا۔"

"رائٹ۔ آخر ہم مہمان ہیں اور وہ میزبان ہے۔ اس کا اخلاقی فرض بنتا ہے کہ ہماری ہر خواہش پوری کرے۔ بلاؤ اسے۔"

غالب اٹھا ہی تھا کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ وہ پھر بیٹھ گیا۔ اس کا بھی خیال تھا کہ یہ نازو ہوگی۔ جب دستک دوسری بار سنائی دی تو غالب نے کہا۔

"اب کیا لینے آئی ہو؟ وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے۔"

میں نے کہا "بھئی آجاؤ۔ دکان کھلی ہوئی ہے۔"

باہر سے کسی نے بیٹھی ہوئی آواز میں کہا "بابو صاحب جی۔"

میں اور غالب چونک کر اٹھے۔ یہ مردانہ آواز تھی۔ یوں لگتا تھا کہ کوئی آواز کو دبا کے بول رہا ہے۔ ہم نے ایک ساتھ ریوالور نکال لئے۔ پھر میں آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔

اسی وقت باہر سے نازو نے کہا "کون ہو تم۔ ہاتھ اوپر اٹھالو ورنہ گولی ماردوں گی۔"

"بیگم صاب جی..... میں ... میں ہوں" کوئی دہشت زدہ آواز میں چلانے لگا۔

میں اور غالب باہر نکلے تو اپنے سامنے ہمیں وہی بڈھا نظر آیا جسے آج دن میں سب سے پہلے طلب کیا گیا تھا اور اسے بڑی مشکل سے محسن اور گل کا حلیہ بتا کے سمجھایا گیا تھا کہ وہ ان کے بارے میں جہاں سے بھی ممکن ہو معلومات بہم پہنچائے۔

"تم..... باباجی۔" میں نے کہا۔

اس نے اقرار میں سرہلایا "میں جی..... کچھ بتانے آیا تھا" اس نے کانپتے ہوئے کہا۔

میں نے ریوالور جیب میں ڈال لیا اور حوصلہ افزا لہجے میں کہا "کیا بتانے آئے ہو بابا؟ جلدی بولو۔"

اس نے باری باری غالب کو اور مجھے دیکھا "مجھے..... سو روپیہ ملے گا صاب جی۔ آپ نے کہا تھا۔"

"بالکل ملے گا۔ اندر آؤ" غالب نے کہا "بتاؤ کیا خبر لائے ہو؟"

وہ تذبذب میں مبتلا وہیں کھڑا رہا "سو روپیہ....."

میں نے جیب سے سو کا نوٹ نکال کے اس کے ہاتھ پر رکھ دیا اور کہا "لو۔ پہلے انعام لے لو مگر بات فضول ہوئی تو ہم واپس بھی لے لیں گے۔ کیا معلوم کیا ہے تم نے؟"

بڈھے کے کچھ بولنے سے پہلے غالب نے کہا "یار' یہ نازو خود کہاں ہے؟ اس کی آواز تو سنی تھی ہم نے۔"

"وہ۔ ہوگی کہیں آس پاس ہی" میں نے کہا اور اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔

نازو کو بالآخر غالب کی نگاہ نے تلاش کیا۔ وہ برگد کے ایک بہت قدیم اور پھیلے ہوئے درخت کے نیچے موجود تھی برگد کی داڑھی چاروں طرف شاخوں سے لٹک کے زمین کے سینے میں اتر گئی تھی اور یوں اصل تنے کے گرد متعدد چھوٹے تنوں کی افزائش نے ایک بارہ دری سی کھڑی کردی تھی جس کے اوپر برگد کے پتوں کی گنبد نما چھت تھی۔ یہ دستِ قدرت کا فطری اندازِ حسن تھا۔ ترتیب اور تناسب کی قیود سے بالا تر۔ تجریدی مصوّری کے کسی فن پارے کی طرح۔ نازو اس کے اندھیرے میں ایک سایہ بن کے ساکت کھڑی ہوئی تھی۔ مہتا اس کے سامنے تنے سے ٹیک لگائے پتھر کا بت نظر آتا تھا۔

میری نظر نے دوسری طرف ایک سائے کو متحرک دیکھا۔ وہ ایک درخت سے دوسرے درخت تک بے آواز قدموں سے چلتا تھا اور پھر کچھ دیر اندھیرے کی پناہ میں درخت کے پیچھے بے حس و حرکت کھڑا رہتا تھا۔ غالباً اسے نازو نے بھی دیکھ لیا تھا اور گولی مارنے کی دھمکی بڈھے کو نہیں اس پراسرار انداز میں پیش قدمی کرنے والے کو دی گئی تھی۔

"کوئی ہے ادھر۔" میں نے بھی ریوالور نکال لیا اور آگے بڑھا "سامنے آجاؤ ورنہ گولی سے بچ نہیں سکو گے۔"

بڈھے نے شور مچایا۔ "صاحب جی ایسا ظلم مت کرو۔ وہ بیٹا ہے میرا۔"

میں نے حیران ہو کے کہا "تمہارا بیٹا...؟"

"ہاں جی میرے ساتھ آیا ہے۔"

"تمہارے ساتھ آیا تھا تو ایسے چھپ کے کیوں کھڑا ہوا ہے؟" غالب نے کہا۔

"وہ دراصل جی..." بڈھے کی صورت پر دکھ اور شرمندگی کے آثار نظر آنے لگے۔ "اس کو شک تھا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ انعام زیادہ ہے مگر میں کم بتا رہا ہوں۔"

میں نے کہا "انعام کم ہو یا زیادہ۔ اسے کیا....."

"وہ جی..... اس نے بھی بڑی محنت کی ہے... میں تو بڈھا آدمی ہوں۔ سب کام میرے بیٹے نے کیا ہے..."

میں نے کہا "بابا تم جھوٹ بول رہے ہو۔ سب کام اس نے کیا ہے تو وہ ڈرتا کیوں ہے۔ خود انعام لینے کے لئے آگے کیوں نہیں آتا۔"

غالب نے کہا "چلو اندر بیٹھو پھر بتاؤ معاملہ کیا ہے۔"

میں نے کہا "مرزا جی تم ذرا بڑے میاں کے ہونہار سپوت پر نظر رکھو ایسے کہ اسے پتا نہ چلے اور وہ کوئی ایسی ویسی حرکت کرے تو۔"

"تم فکر مت کرو۔" غالب نے کہا اور نازو کی طرف چلا گیا۔

بڈھے نے میرے اصرار کے باوجود کرسی یا صوفے پر بیٹھنا قبول نہیں کیا۔ "ہم مالکوں کے برابر بیٹھ جائیں' ہماری ایسی حیثیت نہیں جناب۔"

مجھے اس کی سوچ پر افسوس ہوا۔ یہ صدیوں اور نسلوں کی غلامی کا عطا کردہ احساسِ کمتری تھا جس نے انسانی مساوات اور عزتِ نفس کے خیال کو ان کے لئے ناقابلِ قبول بنا دیا تھا۔ انہوں نے اس حقیقت کو بھی عقیدے اور ایمان کا حصہ بنا لیا تھا کہ انسان دو قسم کے ہوتے ہیں اور شاید خدا نے ہی انہیں ایسا بنایا ہے۔ ایک مالک جو عزت رکھتے ہیں۔ اچھا کھاتے پیتے ہیں اور بااختیار ہوتے ہیں۔ دوسرے وہ جو ذلت اٹھاتے ہیں ظلم سہتے ہیں فاقہ کشی اور بے آبروئی برداشت کرتے ہیں۔ اس فرق کو بھلا کون مٹا سکتا ہے۔ اب ان کے لئے عزت کو قبول کرنا اتنا ہی مشکل ہوگیا تھا جتنا کسی دوسرے مذہب کے عقیدے کو تسلیم کرنا۔ یا یہ سوچنا کہ کتا اگر خواہش کرے اور کوشش کرے تو انسان بن سکتا ہے۔

میں نے کہا "باباجی کیا معلوم ہوا ہے آپ کو۔ آرام سے بتائیں۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ کام کی بات ہوگی تو انعام پانچ سو بھی ہوسکتا ہے۔"

"پانچ سو..." اس نے بڑی مشکل سے کہا اور پلٹ کے دروازے کی طرف یوں دیکھا جیسے وہ ڈرتا ہو کہ یہ بات کوئی سن لے گا۔ پھر ایک دم وہ میرے پیروں میں گر گیا۔

میں نے گھبرا کر کہا "کیا ہوا باباجی۔ اٹھو۔"

مگر وہ زار و قطار رو رہا تھا۔ "مائی باپ ان داتا پانچ سو نہیں۔ بس تین سو دے دو مجھے لیکن..... اس کو نہ معلوم ہو..."

"کس کو..... تمہارے بیٹے کو؟"

اس نے اقرار میں سرہلایا۔ "میں کل لے لوں گا۔ بعد میں لے جاؤں گا۔ ابھی کچھ مت دو مجھے۔ گالیاں دے کر اور دھکے دے کر نکال دو مجھے۔ بڑی مہربانی ہوگی آپ کی۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ "وہ کیوں..."

"وہ... وہ حرامی سب چھین لے گا مجھ سے۔ وہ اسی لئے تو آیا ہے میرے ساتھ۔" بڈھے کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔ "میری بیٹی بچ جائے گی سرکار۔ اس کی عزت بچ جائے گی۔ وہ اپنے گھر کی ہوجائے گی۔"

تھوڑا سا کریدنے پر ساری بات معلوم ہوئی بڈھے کی بیٹی سولہ سال کی ہوچکی تھی اور اس کا بیاہ بھی ہوسکتا تھا مگر بڈھے کو شادی کے اخراجات پورے کرنے کے لئے پانچ سو روپے کی خطیر رقم کی فراہمی کا مسئلہ درپیش تھا۔ وہ بڑی مشکل سے چرا کے اور چھپا کے دو سو روپے جمع کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔ اس کا بڑا بیٹا نشہ کرتا تھا اور اپنے ساتھ باپ کی کمائی کو بھی ٹھکانے لگا دیتا تھا۔ اس کی بیوی دن میں بھٹے پر کام کرتی تھی اور شام کو منیجر کے گھر چلی جاتی تھی۔ ایسا کئی سال سے ہو رہا تھا۔ وہ ہفتے میں ایک آدھ بار گھر آتی تھی تو سب کو گزر اوقات کے لئے کچھ دے جاتی تھی۔ کبھی اناج کبھی پرانے کپڑے جوتے۔ اس نے دو لڑکیاں بھی جنی تھیں جن کو اس کے غیرت مند شوہر نے گلا گھونٹ کے مار دیا تھا اور زمین میں دفن کردیا تھا۔ اب بڈھے کو اندیشہ تھا کہ یہی سب کچھ اس کی بیٹی

کے ساتھ بھی ہوگا۔ کیونکہ وہ زیادہ خوبصورت تھی۔ اس کی شادی نہ ہوئی تو وہ کب تک گھر میں محفوظ رہے گی۔ خود اس کا بھائی اسے بیچ ڈالے گا۔ بڈھے کی بات سمجھنا آسان نہ تھا مگر میں مطلب نکالتا رہا اس دکھ بھری کہانی نے میرے دل کو خون کے آنسو رلا دیئے مگر ایسی لاکھوں کروڑوں کہانیاں تھیں جو ہر قدم پر پرانی قبروں کے کتبوں کی طرح خاموش تھیں مگر پکارتی تھیں کہ ہماری بھی سنو۔ مگر اتنی فرصت کسے اور فرصت ہو تو ضرورت کسے کہ ہر آنسو ہر سسکی ہر فریاد کی لے اور ہر درد کی کراہ سے اس کا دکھ پوچھے۔

میں نے بڈھے کو اٹھایا اور کہا "تم جیسا چاہتے ہو بابا ویسا ہی ہوگا۔ میں تم کو پورے پانچ سو دوں گا اور تمہارے بیٹے کے سامنے..."

"نہیں جناب۔" وہ ہاتھ جوڑنے لگا۔

میں نے اسے تسلی دی۔ "میری بات سن لو پہلے۔ کتنے دن میں بندوبست کرلو گے تم شادی کا..."

"بس دو دن۔ دو دن بعد میں اس کو شوہر کے حوالے کر دوں گا۔ میری ذمے داری ختم۔"

"تم نے انتخاب کرلیا ہے۔ میرا مطلب ہے کس سے کرو گے اس کی شادی۔ اور کیا وہ شادی کے بعد حفاظت کرسکے گا اپنی بیوی کی عزت کی۔ شادی تو تمہارے بیٹے نے بھی کی تھی۔"

"وہ ایسا نہیں ہے سرکار..."

"بس تو ٹھیک ہے۔ تمہارا بیٹا چار دن بعد گھر آئے گا۔ بہن کی رخصتی کے بعد۔" میں نے کہا "تم کسی خوف کے بغیر اس کی شادی کرو۔"

اس کو کچھ اطمینان حاصل ہوا۔ "بھگوان سکھی رکھے آپ کو۔ مگر چار دن آپ کیسے روکو گے اسے۔"

"یہ ہمارا کام ہے۔ کہو تو تھانے میں بند کرادیں۔"

"ضرور کرادیں جناب۔ بڑی مہربانی ہوگی۔ چار دن کے لئے کیا مہینہ بھر کے لئے بند کرادیں تاکہ اس کی نشے کی لت بھی چھوٹ جائے۔" بڈھا منت کرنے لگا۔

"وہ سب ہو جائے گا۔ اب تم بتاؤ کیا خبر لائے ہو۔" میں نے کہا۔

"یہاں چار کوس دور گیا تھا کل۔" بڈھے نے کہا "اور بھی سب پوچھتے پھر رہے تھے لیکن ابھی تک کسی کو کچھ نہیں معلوم۔ جس لڑکے کو میں بیٹی دینا چاہتا ہوں اس کے باپ نے بلایا تھا مجھے۔ وہ لڑکا ریلوے میں قلی ہے۔ اچھا کما لیتا ہے۔ اس کا باپ بھلا مانس ہے کہتا تھا کہ وہ بات توڑنا نہیں چاہتا مگر زیادہ انتظار بھی نہیں...... کرسکتا۔ اس نے مجھے مہلت دی۔ یہ آخری بار ہے۔ اگر ایک مہینے میں کچھ نہ کیا میں نے تو پھر وہ لڑکے کا بیاہ دوسری جگہ کر دے گا۔ رشتوں کی کوئی کمی نہیں اور نہ داج دینے والوں کی۔ پتا نہیں کس کی بات کر رہا تھا کہ وہ لڑکے کو بالکل نئی سائیکل بھی دیں گے۔ شریف آدمی ہے جی ورنہ یہاں کون پروا کرتا ہے کسی کی۔ روز زبان دے کر پھر جاتے ہیں لوگ۔ میں نے پھر وعدہ کرلیا تھا کہ مہینہ بھر میں کچھ نہ کچھ ضرور ہو جائے گا۔ بھگوان نے میری سن لی آپ کو بھیج دیا۔"

"اگر ہم نہ آتے تو تم کیا کرتے۔"

"پتا نہیں جی۔" وہ سوچ کے بولا "لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ آپ نہ آتے۔ جب بھگوان کی یہی مرضی تھی۔"

"خیر آگے بتاؤ۔" میں نے کہا۔

"اس سے باتوں باتوں میں پتا چلا کہ ریلوے لائن کے پاس ایک تو کسی کی لاش ملی تھی۔ ریلوے کا گارڈ تھا کوئی۔ پتا نہیں کس نے مار کے پھینک دیا تھا۔ کہتے ہیں اسی گاڑی کا ڈرائیور تھا جس کی ٹکر ہوئی تھی۔"

"گاڑیاں ٹکرائی ہیں کہیں؟" میں نے انجان بن کے پوچھا۔

"ہاں سرکار۔ مال گاڑی تھی ایک۔ دوسری تیل لانے والی گاڑی۔ پل پر دونوں ٹکرائیں۔ پل بھی ختم ہوگیا۔" بڈھے نے گویا مجھے اطلاع دی۔ "وہاں پولیس بھی بہت آئی تھی۔ لائن کے پاس جو نظر آیا اسے پکڑلیا۔ اس کی' میرے جوائی کی قسمت اچھی تھی کہ اس دن ڈیوٹی پر نہیں گیا تھا۔ جاڑا بخار میں پڑا رہا تھا اور ریلوے کے اسپتال کی پرچی تھی اس کے پاس۔ پولیس نے اس علاقے سے ایک عورت کو بھی پکڑا ہے۔"

میں چونکا۔ "عورت۔"

"ہاں جی۔ ہے تو شاید ویسی ہی جیسی آپ نے بتایا تھا۔ میں نے دیکھا نہیں مگر سنا ہے بہت سندر ہے۔ مشہور یہ ہوگیا ہے کہ کسی ڈاکو کی بہن ہے۔ خود بھی ڈاکو ہے۔"

میرے تجسس اور اضطراب نے ہیجان اور پریشانی کی صورت اختیار کرلی۔ "ڈاکو کی بہن؟"

بڈھے کا چہرہ مایوسی سے زرد پڑنے لگا۔ "ہاں جی بس سنا ہے۔ دیکھا کچھ نہیں۔ مجھے پتا تھا اس کا آپ سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ مجھے کوئی انعام نہیں دو گے آپ۔"

میں نے کہا "انعام ضرور ملے گا.... جو تم مانگو گے ملے گا۔ اپنے جوائی کو تم بھی سائیکل دینا۔ موٹر سائیکل کار' ہوائی جہاز جو مانگے دینا۔"

وہ ڈر گیا۔ "مجھ سے غلطی ہوگئی۔ سرکار۔" وہ ہاتھ جوڑنے لگا۔

میں نے گہری سانس لے کر کہا "باباجی اور کیا سنا ہے تم نے سب بتاؤ۔"

بڈھا سوچ کے بولا "اور بس جی۔ اس عورت کو پولیس ساتھ لے گئی تھی۔"

میں نے کہا "کچھ معلوم ہے وہ کیسے ملی تھی پولیس کو گھومتے پھرتے..... یا بے ہوش پڑی ہوئی۔ کہیں چھپی ہوئی....."

"وہ چھپی ہوئی تھی۔ ایک کیبن میں سرکار۔ پٹڑی کے ساتھ ایک پرانا کیبن ہے جہاں کوئی نہیں رہتا۔ اس کے اندر وہ سوری تھی۔ پولیس نے پکڑلیا۔"

میرا سانس رکنے لگا تھا۔ "اس کا... نام وغیرہ معلوم ہوا۔"

بڈھا نفی میں سرہلانے لگا۔

میں نے کہا "وہ ناگ منی تو نہیں تھی؟"

"ناگ منی..."

"ہاں ڈاکو شیش ناگ کی بہن" میں نے کہا۔

"آپ جانتے ہو اسے حضور..."

"ہاں اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ اگر وہ تھی تو وہ... جانتے میں تھی وہ..." میں نے کہا۔

"مجھے نہیں معلوم جناب۔ نہ میں شیش ناگ کو جانتا ہوں اور نہ اس کی بہن ناگ منی کو..." وہ بولا۔

میرا ذہن تیزی سے کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ یقیناً وہ گل تھی۔ بھارتی پولیس کے لئے وہ آج بھی ناگ منی تھی۔ ایک زمانہ تھا کہ شیش ناگ ڈاکو اور اس کی بہن نے مل کر سرحد کے دونوں جانب اپنی دہشت پھیلا رکھی تھی۔ یہ ہمارے لئے پرانی بات ہوگئی تھی۔ پولیس کو کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ ناگ منی اب گل بانو ہے اور اتنی ہی شریف لڑکی ہے جتنی اس معاشرے میں کسی بھی غیرت دار گھر کی بیٹی ہو سکتی ہے۔ انہیں تو شاید یہ بھی علم نہیں تھا کہ شیش ناگ مارا جاچکا ہے۔ پولیس کے ریکارڈ میں ان بھائی بہن کے سارے کارنامے زندہ تھے اور وہ آج بھی پولیس کو مطلوب تھے۔ برسوں پرانی بات ہوتی تو شاید کسی کے ذہن میں ناگ منی کا چہرہ نہ رہتا لیکن سرحد پار پاکستان میں شیش ناگ کے مارے جانے کی خبر ابھی غیر مصدقہ تھی یا پھر یہاں پہنچی نہیں تھی۔ ناگ منی کی تصویر دیکھنے والوں نے اسے فوراً شناخت کرلیا ہوگا۔

میں ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ جیب سے ہزار روپے نکال کے میں نے کہا "باباجی۔ یہ لو۔ اس کو اپنا انعام سمجھو۔ اپنی بیٹی کا جہیز یا ہمارا تحفہ۔ اس سے بیٹی کی شادی کرو۔ اپنے داماد کو نئی سائیکل خرید کے دو۔ خدا کرے اس کا نصیب اچھا ہو۔"

بڈھا رونے لگا۔ اس کے حلق میں الفاظ پھنس گئے۔ میں نے کہا "یہ لو۔ چھپا کے رکھو۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی ایک ہزار کی خاطر تمہاری جان لے لے۔"

"جان لے گا تو اپنا ہی بیٹا لے گا۔"

"وہ ہمارے ساتھ ہوگا یا جیل میں۔ تم اس کی طرف سے بالکل بے فکر ہو جاؤ۔" میں نے نوٹ اس کی طرف بڑھائے۔

اس نے والہانہ انداز میں میرے ہاتھ چومے۔ اس کے آنسو میرے ہاتھوں کو گیلا کرنے لگے۔ پھر وہ میرے پاؤں چومنے لگا اور اپنی زبان میں وہ سب دعائیں دینے لگا جو اس کے دل سے نکلی تھیں۔ میں نے اس کی اور اپنی گفتگو عام فہم زبان میں بیان کی ہے ورنہ اس کے اور میرے درمیان استعمال ہونے والے الفاظ مختلف تھے۔ کمیونی کیشن گیپ تھا۔ تاہم اس نے میرا اور میں نے اس کا مطلب آسانی سے سمجھ لیا تھا۔ جب لوگ ایک کی بات سمجھنا چاہیں تو الفاظ کے بغیر بھی سمجھ لیتے ہیں اور نہ سمجھنا چاہیں تو الفاظ کے مفہوم کو بھی الگ کرلیتے ہیں۔

میں نے بڈھے کو اٹھا کے مشکل سے چپ کرایا اور پھر غالب کو آواز دی۔ غالب اور نازو بالکل فارغ تھے چنانچہ لڑ رہے تھے جو ان کے پیار کا انداز تھا۔ میری آواز پر ان کی چخ چخ بند ہوگئی۔

مہتا ان کے ساتھ ہی آگیا تھا۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ مجھے گل کے گرفتار ہو جانے کا خدشہ ہے تو ان کی صورت پر بھی ہوائیں اڑنے لگیں۔

"اب کیا ہوگا۔ اگر پولیس نے اسے ڈاکو سمجھ لیا ہے تو پھر وہ کڑے پہرے میں ہوگی" غالب نے کہا۔

"اور اتنی بڑی کامیابی کی خبر نیچے سے اوپر تک پہنچادی گئی ہوگی۔ اعلیٰ افسران نے اخبار والوں کو بھی بتادیا ہوگا کہ وہ ناگ منی کو پکڑ چکے ہیں...." نازو بولی۔

میں نے کہا "ممکن ہے ابھی یہ سب نہ ہوا ہو۔ وہ تصدیق کئے بغیر اعلان نہیں کرسکتے" میں نے کہا "اور اگر اسے پولیس کے قبضے سے چھڑانا ہے تو اس کے لئے آج کی رات ہی کچھ کرنا پڑے گا۔ صبح معاملہ ہمارے بس سے باہر ہو جائے گا۔"

"یہ معاملہ تو شاید اس وقت بھی ہمارے بس سے باہر ہی ہے۔" میں نے کہا۔

"ہم چانس لے سکتے ہیں۔ کوشش کئے بغیر مایوسی غلط ہے" میں نے کہا۔

"تم۔ ڈاکو ہو" مہتا اچانک بولا۔

میں نے اس کی طرف دیکھا اور سرہلادیا "اور کیا سمجھ رہے تھے تم۔ ہم یاتری ہیں۔ کاشی جا رہے تھے۔"

"سالی ناگ منی کا نام تو سنا تھا میں نے" وہ بولا۔

غالب نے اس کے منہ پر مکا مارا "دیکھو گے تو ہوش اڑ جائیں گے تمہارے۔ عزت سے نام لو اس کا۔"

مہتا نے کہا "کیا وہ سردار ہے تمہاری؟"

میں نے کہا "سردار اس کا بھائی ہے۔ شیش ناگ اور اس علاقے میں تم جیسے الو کے پٹھے میں نے نہیں دیکھے جن کا یہ نام سن کے پیشاب خطا نہ ہوتا ہو۔"

مہتا اب واقعی دہشت زدہ نظر آنے لگا تھا "دیکھو میں مدد کر سکتا ہوں تمہاری۔ لیکن۔"

"لیکن کیا....؟"

"مجھ سے بس اتنا وعدہ کرو کہ آئندہ مجھے تم سے کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔"

میں نے کہا "اگر تم نے واقعی مدد کی ہماری تو آئندہ تمہیں کسی سے بھی خطرہ لاحق نہیں رہے گا۔ کسی کی مجال ہے جو ڈاکو شیش ناگ کے دوست کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے۔"

"بس تو پھر چلو۔ ہم معلوم کرتے ہیں کہ ناگ منی کو کس نے پکڑا ہے اور کہاں رکھا ہے۔ ہو سکتا ہے ہم اسے چھڑالیں۔" مہتا نے کہا۔

"کیسے؟ اگر تمہارا خیال ہے کہ پیسہ چل جائے گا تو پھر یہ خیال غلط ہے" میں نے کہا "ناگ منی جیسی عورت کو چھوڑنے کا خطرہ

کوئی مول نہیں لے گا۔ اس کی گرفتاری پر انعام کی رقم بھی کم نہیں ہوگی۔ اگر یہ بات معلوم ہوگئی کہ پولیس نے اسے پکڑا اور رشوت لے کر چھوڑ دیا تو نیچے سے اوپر تک سب گرفتار ہوجائیں گے۔"

مہتا پریشان نظر آنے لگا "میرے اچھے خاصے تعلقات ہیں۔"

میں نے کہا "انہی تعلقات سے فائدہ ہو سکتا ہے۔ اگر تم پولیس کو یقین دلا سکتے ہو کہ وہ عورت ناگ منی ہے ہی نہیں بلکہ تمہاری رشتے دار ہے؟"

وہ چونک کے بولا "میری رشتے دار۔ یہ میں کیسے کہہ سکتا ہوں۔ میرے سب رشتے دار ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔"

"لیکن پولیس تمہارے سب رشتے داروں کو بلا کے اس کی صورت نہیں دکھائے گی اور یہ تصدیق حاصل نہیں کرے گی کہ وہ عورت واقعی تمہارے خاندان میں شامل ہے یا نہیں۔"

"رشتے دار نہ سہی۔ تم اپنی دوست بتا سکتے ہو۔ تم کو جھوٹا کون کہے گا۔ تم اس علاقے کے معتبر آدمی ہو اور اگر چاہو تو اپنے سے بھی زیادہ کسی معتبر آدمی کو ساتھ لے جا سکتے ہو۔ پولیس کو دھمکی دے سکتے ہو کہ انہوں نے فوراً اسے نہ چھوڑا تو ان سب کی ایسی تیسی کردی جائے گی۔ کسی معزز گھر کی عورت کو ناگ منی سمجھ کے پکڑ لینے کی غلطی معمولی نہیں سمجھی جا سکتی۔ ان کی حالت خراب ہوجائے گی انجام کا سوچ کر۔"

مہتا نے سرہلایا "تم نے ٹھیک سوچا ہے۔ کچھ ایسا ہی کرنا پڑے گا لیکن میں کیا کہوں گا۔ وہ عورت کیا کررہی تھی اس جگہ۔ جہاں سے اسے گرفتار کیا گیا تھا؟"

"جو چاہو کہہ دینا۔ مثلاً یہ کہ وہ ذہنی مریض ہے اس پر دورے پڑتے ہیں یا کوئی جن عاشق ہے اس پر جو اسے اکثر لے جاتا ہے اٹھا کے۔ وہ ایسے ہی کبھی مرگھٹ میں ملتی ہے کبھی ویرانے میں۔ تمہاری بات کو جھٹلانے والا کون ہوگا اس علاقے میں" میں نے کہا۔

"ہمیں فوراً روانہ ہوجانا چاہئے" نازو نے بے چینی سے کہا۔

"جانے سے پہلے یہ سمجھ لو......"

مہتا نے کہا "مجھے اچھی طرح معلوم ہوگیا ہے کہ تم کتنے خطرناک لوگ ہو۔ زیادہ ڈرانے دھمکانے کی ضرورت نہیں۔ میں کوئی ایسی غلطی نہیں کروں گا جو میری جان کے زیاں کا سبب بن جائے مجھے خودکشی کا کوئی شوق نہیں۔ تم قتل کرنا چاہو تو بعد میں بھی کرسکتے ہو۔"

میں نے کہا "ہم سیاست داں نہیں ڈاکو ہیں۔ وعدہ کرلیں تو جان دے کے نبھانا جانتے ہیں تم ووٹ دو یا نہ دو۔"

بڑی عجلت میں مہتا کے آفس کو مقفل کیا گیا نازو اور غالب نے وہاں سے ہماری موجودگی کے سب آثار مٹائے اور لائٹس آف کر دیں۔ میں نے مہتا کو بے ضرر سمجھتے ہوئے آفس کے اندر اس کو نقل و حرکت کی آزادی دے دی تھی۔ وہ بھاگ کے جا بھی کہاں سکتا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی غلط حرکت کرتا مارا جاتا۔ اس کی وضاحت نے مجھے قائل کرلیا تھا کہ وہ خودکشی نہیں کرے گا۔ اپنی جان بچانے کے لئے اس نے جو رضاکارانہ پیش کش کی تھی اس پر بھی شک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ مفاد باہمی کا سودا تھا۔

روانگی سے پہلے چند منٹ میں نے بڈھے کے نانجار بیٹے کا انٹرویو لینے اور اس کا دماغ درست کرنے میں صرف کئے۔ نشے کے عادی کسی بھی شخص کا دماغ کتے کی دُم جیسا ہوتا ہے اور آسانی سے ٹھیک نہیں ہوتا مگر میں نے مناسب سمجھا کہ آخری علاج کے طور پر اسے ایک خوراک ایسی ضرور دی جائے کہ وہ ہوش میں آجائے۔ اس نے بہت عاجزی سے اور بے غیرتی کے ساتھ اپنے باپ کے عائد کردہ الزامات کی صحت سے انکار کیا۔ پھر مار کھا کے تڑپنے کی اور یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ فوت ہوجائے گا۔ جب میں نے اسے پیروں پر کھڑا کردیا تو وہ معافی اور منت سماجت پر اتر آیا۔ بھگوان کے ہرنام کی سوگند کھانے لگا کہ آئندہ وہ نشہ کرے تو کتے کا بچہ۔

اس کے باپ کی دلی خواہش تھی کہ بیٹے کی کھال میں بھس بھروا دیا جائے۔ یہ جو تا کاری تو کچھ بھی نہیں اس سولی والے کے لئے لیکن وقت کی کمی کے باعث میں اس کی خواہش پوری نہ کرسکا۔

مہتا نے لباس بدل لیا تھا اور اب پہلے کی نسبت بہت زیادہ اعتماد نظر آرہا تھا۔ اس کی گاڑی میں فرنٹ سیٹ پر وہ خود بیٹھا۔ اس کے ساتھ غالب اور پھر کھڑکی سے لگ کے نازو بیٹھی۔ پیچھے بڈھا رہا۔ درمیان میں نشے باز بیٹے کو رکھا گیا کہ کہیں راستے میں دروازہ کھول کر کودنے اور فرار ہونے کی کوشش نہ کرے۔ آخر وہ بڈھا رہا جس پر اچانک لکشمی مہربان ہوگئی تھی۔ کسی دست غیب نے اس کے سارے مسئلے چٹکی بجا کے حل کردئیے تھے۔ یہ غریب لوگ تھے جو بہت چھوٹے لوگ سمجھے جاتے تھے۔ چناں چہ ان کی خواہشات بھی چھوٹی تھیں۔ یہ کوٹھی تو کیا مکان بھی نہیں مانگتے تھے۔ ان کے خوابوں کی انتہا ایک جھگی تھی۔ یہ کاروں کو ایسے ہی دیکھتے تھے جیسے کاروں والے ستاروں کو دیکھتے ہیں مگر ان کی تمنا نہیں کرتے۔ ان کے لئے ایک سائیکل بھی رولز رائس سے کم نہ ہوتی۔ بڈھے کا دماغ شاید ساتویں آسمان پر تھا کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی دھوم دھام سے کرے گا۔ صرف ایک ہزار میں دھوم دھام کا تصوّر بھی مضحکہ خیز تھا۔ مگر ہم میں اور اس میں طبقاتی سوچ کا فرق تھا۔ مڈل کلاس کی دھوم دھام ایک لاکھ کی تھی تو اس سے اوپر ایک کروڑ کی۔ بڈھا اپنے داماد کو نئی سائیکل دیتے وقت اتنا ہی خوش ہوتا جتنا متوسط طبقے میں کوئی داماد کو کار دے کر ہو سکتا ہے۔ یا کوئی دولت مند اپنے داماد کو سوئٹزرلینڈ کی کوٹھی کی چابی دے کر۔ شاید بڈھے کی خوشی زیادہ انمول اور بے داغ تھی۔

"تمہارے اس ہونے والے سمدھی کا گھر کہاں ہے؟" نازو نے روانگی کے وقت پوچھا۔

بڈھے نے کہا "وہاں گاڑی نہیں جا سکتی۔"

"جہاں تک گاڑی جا سکتی ہے وہاں تک راستہ بتاؤ۔ آگے ہم پیدل چلے جائیں گے۔"

"میرے خیال میں اس کی ضرورت نہیں" مہتا بولا "جو بھی معلوم کرنا ہے میں خود کرلوں گا۔ تم نے ان دونوں کو خواہ مخواہ ساتھ بٹھالیا ہے۔"

بڈھا تھوڑا سا مایوس نظر آنے لگا۔ اچانک اس کی اہمیت باقی نہیں رہی تھی۔

غالب نے بھی کہا "انہیں جانے دو اپنے گھر۔"

میں نے بڈھے کی طرف دیکھا "یہاں سے پیدل جا سکتے ہو اکیلے۔"

مہتا نے کہا "روز یہ کون سا ٹیکسی میں آتا ہے۔"

"میں چلا جاؤں گا سرکار" بڈھے نے عاجزی سے کہا۔

مہتا نے گاڑی روک دی "دیکھو۔ آج جو کچھ ہوا وہ کسی کو معلوم نہیں ہونا چاہئے۔ نہ تم نے کچھ دیکھا نہ سنا۔ ایک لفظ بھی نکلا تمہاری زبان سے تو بھٹے میں ڈلوادوں گا۔"

بڈھا ہاتھ جوڑنے لگا "آپ کا نمک کھایا ہے مالک جیسا آپ کا حکم۔"

بڈھے کا بیٹا اترنے لگا تو میں نے اسے روک لیا "تم کہاں چل دیے نور چشم۔"

مہتا نے کہا "یہ کیا کرے گا؟"

"یہ ہمارے ساتھ رہے گا تو کچھ نہیں کرے گا۔ ورنہ یہ باپ کو بیٹی کے ہاتھ پیلے نہیں کرنے دے گا۔ اس کی جمع پونجی چھین لے گا اور نشے میں اڑا دے گا۔"

"نہیں" مہتا نے نفی میں سرہلایا "یہ کچھ نہیں کرے گا۔ کیا تو نہیں جانتا میں اس کی ٹانگیں چیردوں گا اور اس کے ٹکڑے گارے میں ملا کے اینٹوں کے ساتھ پکوادوں گا۔"

وہ تھرتھر کانپنے لگا اور رونے لگا "میں وعدہ کرتا ہوں۔"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "میں تمہارے کسی وعدے کا اعتبار نہیں کر سکتا۔ جب نشہ ٹوٹے گا تو تم سب بھول جاؤ گے اپنے وعدے اپنی قسمیں۔ باپ کی مجبوری کو اور بہن کی عزت کو۔ تم چلو مہتا۔ میں کوئی رسک نہیں لینا چاہتا۔"

مہتا نے بادل ناخواستہ کار آگے بڑھائی "اس کی ہماری ساتھ موجودگی ٹھیک نہیں۔ یہ آدمی بھروسے کے قابل نہیں ہے۔"

"ابھی تم خود اس پر اپنے بھروسے کا اظہار کررہے تھے۔" غالب نے کہا۔

"وہ اور بات تھی" مہتا بولا "میں ان لوگوں کی فطرت اور مزاج کو سمجھتا ہوں۔ نشے میں یہ باپ کی مجبوری اور بہن کی عزت کو بھول سکتا ہے مگر میرے حکم کو نہیں۔ اسے معلوم ہے اچھی طرح کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔"

"تم واقعی اس کو بھٹے میں ڈلوادو گے؟" نازو نے حیرت خوف اور نفرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ کہا۔

مہتا خاموش رہا اس کی یہ خاموشی بھی اعتراف جرم سے کم نہیں تھی۔ مگر اس کے نزدیک یہ کوئی جرم تھا ہی نہیں۔ ایسا پہلے بھی ہوتا آیا تھا اور آئندہ بھی ہوگا۔ حکم عدولی اور سرکشی کرنے والوں کی یہ سزا دوسروں کو درس عبرت دینے کے لئے ضروری تھی۔ اس سے مہتا جیسے مالکوں کی حاکمیت کا دبدبہ اور ان کے فرمان کی نادر شاہی ہیبت برقرار تھی۔ نظم و ضبط قائم تھا اور ڈسپلن تھا۔ انسانی مساوات کا درس دینے والی قانونی اور الہامی کتابوں کے سب اصول یہاں غلط تھے اور ناقابل عمل سمجھے جاتے تھے۔ یہاں حاکم و محکوم میں وہی دوری تھی اور وہی فرق تھا جو خدا اور بندے میں ہے۔ مالکوں کا خوف ان کی سرشت میں شامل ہوگیا تھا اور اطاعت ان کے لئے ایمان کا درجہ رکھتی تھی۔

نازو نے کہا "مہتا۔ یہ سب جو تمہارے حکم کے غلام ہیں۔ تم سے کتنی نفرت کرتے ہیں۔ کبھی یہ سوچا تم نے۔"

"یہ سوچنے کی کیا ضرورت ہے مجھے بی بی" وہ تمسخر آمیز لہجے میں بولا "مجھے نہ ان کی محبت سے غرض ہے نہ نفرت سے۔ میں صرف کام لینا چاہتا ہوں اور اس کا طریقہ مجھے آتا ہے۔"

"تم محبت سے بھی کام لے سکتے ہو۔ شرافت......"

"تم محبت سے اور شرافت سے کام لیتی ہو؟ شرافت کا ثبوت دے کر ڈاکا ڈال سکتی ہو۔ بغیر اپنی دہشت قائم کئے تمہارا کام نہیں چل سکتا خاتون" مہتا بولا "تم نے اور تمہارے گروہ نے کئی خون کئے ہیں بے گناہوں پر گولیاں برسائی ہیں اور جس نے بھی تمہاری راہ میں حائل ہونے کی کوشش کی اسے بے دریغ قتل کیا ہے۔ تب کہیں تمہارے نام سے ڈرنا شروع کیا ہے لوگوں نے۔ میں بھی ڈرنے والوں میں شامل ہوں۔ مقابلہ کرکے موت کے سوا کیا ملے گا مجھے؟ کیا میرے سمجھانے سے تم لوگ قائل ہوجاؤ گے اور ڈاکے ڈالنا چھوڑ دو گے؟ یہ شرافت اور اخلاق اور انسانیت کا سبق پہلے خود پڑھ لو تو مجھے پڑھانا۔"

اس کی ہر بات کا جواب دیا جا سکتا تھا لیکن اپنے آپ کو ڈاکو خود ہم نے کہا تھا۔ ہم نے اس کے ساتھ جو سلوک کیا تھا اس کے بعد مہتا کی باتوں کو جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا۔ میں نے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا اور شاید نازو کو بھی احساس ہوگیا کہ یہ بحث بے سود ہے۔

"میں اس علاقے کی پولیس چوکی سے معلوم کرتا ہوں" مہتا نے کہا اور گاڑی ایک ویران عمارت کے سامنے روک دی جو اندر باہر سے تاریک تھی۔

"یہاں کون ملے گا؟"

"ایک ہیڈ کانسٹیبل انچارج ہے۔ دو ماتحت کانسٹیبل ہیں" مہتا بولا۔

"تمہیں جانتے ہیں؟"

مہتا ہنسا "علاقے کا ایس پی بھی میرا دوست ہے۔ ان کے لئے

میں بھی ایس پی سے کم نہیں۔"

"ایس پی صاحب" میں نے طنز سے کہا "اس کو تم یہاں رکھوا دو ہفتے بھر کے لئے۔ ایک ہفتے سے پہلے یہ نکلنے نہ پائے اگر ضروری ہو اور اس نے نشے کا علاج ہو جائے تو مہینہ بھر داخل رکھیں اپنے کلینک میں۔"

مہتا نے سرہلایا "اس کا تو ایسا علاج ہوگا کہ اس کی آنے والی نسلیں یاد رکھیں گی" اور کار سے اتر گیا۔ نازو اور غالب اس کے ساتھ اتر گئے۔

وہ میرے پاؤں پڑ کے رونے لگا۔ "جناب عالی۔ مجھے یہاں مت چھوڑیں۔ یہ بہت ماریں گے مجھے۔"

میں نے بے رخی سے کہا "اچھا ہے تمہاری سب دھول جھڑ جائے گی۔ کسی اور کی مانتے کہاں تھے تم۔ باپ کی زندگی عذاب کررکھی تھی تمہارے نشے نے۔"

"یہ مجھے مار ڈالیں گے....." وہ دہشت سے کانپنے لگا۔

"زندگی کیا ہے تمہاری۔ تمہارے لئے محض شرمندگی اور مجبوری۔ دوسروں کے لئے عذاب اور مصیبت" میں نے کہا۔ "مر گئے تو فائدے میں رہو گے تم بھی۔ سب کی جان چھوٹ جائے گی۔"

اس نے ایک دم دروازے کی طرف پلٹ کے ہاتھ بڑھایا اور بھاگنے کی کوشش کی مگر میری گرفت سے نہ نکل سکا نشے نے اسے کھوکھلا کر دیا تھا ورنہ وہ مجھ سے کم عمر جوان آدمی تھا اور دیکھنے میں بھی تندرست لگتا تھا۔ اس نے میری کلائی پر کاٹنے کی کوشش کی اور پھر دوسرے ہاتھ سے میرا منہ نوچنے لگا۔ میں نے بالوں سے پکڑ کر اس کا سر دروازے پر دے مارا۔ وہ چلایا "ہائے رام" اور ساکت ہو کے مجھ پر گر گیا۔

اسی وقت اندر سے ایک بدحواس شخص برآمد ہوا جو سوتے سے اٹھ کے آیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مہتا نکلا اور پھر غالب اور نازو۔ اندر اب روشنی بھی نظر آرہی تھی۔

مہتا نے کہا "اس حرام زادے کو بند رکھو اور جب تک میں نہ کہوں اسے چھوڑنا نہیں ہے۔"

"آپ کا جیسا حکم مہتا جی" چوکی سے آنے والا مجھے سلام کر کے بولا۔

"یہ بھاگ گیا تو سمجھو تمہاری خیر نہیں۔"

میں نے کہا "اس کی نشے کی عادت چھوٹ جائے تو اسے بھی چھوڑ دینا۔ یہ نہ ہو کہ تم خود اسے نشہ دیتے رہو۔"

"یہ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے سر" اس نے بے سدھ پڑے ہوئے جوان آدمی کو گھسیٹ کے اتار لیا "جن اتار دیتے ہیں ہم۔ نشہ کیا چیز ہے۔"

مہتا نے پھر گاڑی اسٹارٹ کی اور بولا "چلو کچھ تو فائدہ ہوا یہاں آنے کا۔"

میں نے کہا "کیا معلوم ہوا؟"

"وہ عورت شام کو پکڑی گئی تھی۔ کیا نام ہے اس کا۔ ہاں ناگ منی" مہتا بولا "ابھی جل گاؤں کے تھانے میں پہنچا دیا گیا ہے اسے۔"

"یہ جل گاؤں کہاں ہے؟"

"وہیں جا رہے ہیں ہم" مہتا بولا "انسپکٹر سورج پانڈے انچارج ہے وہاں۔ ایک نمبر حرامی آدمی ہے۔"

نازو نے گھبرا کے کہا "کیا مطلب......"

مہتا نے حیرانی سے کہا "تمہیں تو ہم سے زیادہ معلوم ہونا چاہئے کہ وہ حرامی پولیس انسپکٹر کیسے ہوتے ہیں اور کیا کرتے ہیں۔ تفتیش کے نام پر۔"

"اگر اس نے کوئی زیادتی کی ہوگی تو آج اسے معلوم ہو جائے گا کہ شریفوں کے مقابلے میں ڈاکو کیا ہوتے ہیں" غالب نے بڑی نرمی سے کہا۔

"کیا وہ ایمان دار اور فرض شناس ہے؟" میں نے فکرمند ہو کے پوچھا۔

مہتا ہنسنے لگا "میں نے یہ تو نہیں کہا تھا۔"

"پھر کوئی فکر کی بات نہیں" میں نے نازو کو تسلی دی "مگر ہے وہ منتظر ہو ناگ منی کے بھائی کا۔ یا اس کے ساتھیوں کا۔ سمجھدار اور تجربہ کار پولیس والے ڈاکوؤں کو وی آئی پی سمجھتے ہیں اور ان کے آرام و آسائش کا پورا خیال رکھتے ہیں۔ حکومت کیا دے گی اسے۔ تھوڑی سی رقم اور تعریفی سند۔ ہم سے سودا کر کے وہ اتنا فائدے میں رہے گا کہ چاہے تو نوکری چھوڑ دے۔"

"تم خود چھڑاؤ گے اسے؟ ڈاکو کی حیثیت سے اپنا تعارف کرا کے۔ کیا یہ کام مجھے کرنا ہے؟" مہتا بولا "ہو سکتا ہے کہ معاملہ انسپکٹر سورج پانڈے کے ہاتھ میں نہ رہا ہو۔"

میں نے کہا "اگر کوئی خرابی نہ ہو تو تمہیں اختیار ہے کہ جیسے چاہو اس مسئلے سے نمٹ سکتے ہو مگر خرابی کی صورت میں ہم معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیں گے۔"

"اس سے کیا ہوگا۔ مزید نقصان......"

"ایک مرحلہ ایسا بھی آجاتا ہے" میں نے کہا "خواہ معاملہ کچھ بھی ہو جب عقل کے تقاضوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے صرف جذبات کی پکار سننی پڑتی ہے اور اس وقت نفع نقصان کا خیال بھی نہیں آتا۔"

"مجھے امید ہے کہ وہ نوبت نہیں آئے گی۔ میں تمہیں اور ناگ منی کو خطرات کی حدود سے نکال لوں گا اور جہاں تم کہو گے پہنچا دوں گا۔ اس کے بعد تو میری ذمے داری ختم ہو جائے گی نا؟" مہتا نے کہا۔

میں نے غالب کی طرف دیکھا اور سرہلایا "مسٹر مہتا اگر تم نے یہ سب کر لیا تو پھر تمہارے لئے بھی کوئی خطرہ باقی نہیں رہے گا۔ ہم وہ ٹیپ اور تصاویر تمہارے حوالے کر دیں گے جن کی موجودگی میں تم پھانسی کا پھندا اپنی گردن میں محسوس کرتے ہو۔"

"ابھی تک ہم نے کوئی کاپی تو بنائی نہیں ہے کہ تمہارے دل میں شک باقی رہے؟" غالب نے کہا "یہ مردوں والا وعدہ ہے؟" مہتا بولا۔

"وعدہ میں کروں گی" نازو نے میرے یا غالب کے کچھ بولنے سے پہلے ہی کہا "ہر معاملے میں تم مردوں نے اپنے آپ کو معتبر بنایا ہے۔ کیا عورتوں کا وعدہ قابل اعتبار نہیں ہوتا۔"

مہتا مسکرانے لگا "شریمتی جی۔ آپ ان عورتوں میں شامل نہیں ہیں۔ میں آپ کے وعدے کی ضمانت قبول کرتا ہوں۔"

ہمارے اور مہتا کے درمیان اس معاہدے نے کشیدگی کو تقریباً ختم کر دیا تھا۔ ہم ایک دوسرے کی مدد پر انحصار کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اس کی ایمبیسڈر کار میں ریڈیو بھی تھا۔ میں نے خبریں سننے کی خواہش ظاہر کی تو غالب نے اسے آن کر دیا۔ آکاش وانی سے رات گیارہ بجے کا بلیٹن چند منٹ بعد شروع ہوا۔ مال گاڑی اور آکل ٹرین کے تصادم کی مختصر خبر میں تخریبی کارروائی کا امکان ظاہر کیا گیا تھا اور یہ کہ اعلیٰ حکام تفتیش کر رہے ہیں مگر کسی گرفتاری کا تذکرہ نہیں تھا۔ مال گاڑی کے گارڈ اور قریبی اسٹیشن کے عملے کی لاشوں کے ملنے کا بھی کوئی ذکر نہیں تھا۔

خبروں کے بعد کلاسیکی موسیقی نشر ہونے لگی اور میں اپنے خیالات کے گرداب میں کھو گیا۔ میرے کان ابھی تک اس نوجوان کی درد بھری فریاد سن رہے تھے جس کو ہم نے نشہ چھڑانے کے لئے پولیس کے حوالے کر دیا تھا۔ نازو پر اس کی فریاد و فغاں کا زیادہ اثر ہوا تھا مگر اس کا باپ بالکل متاثر نظر نہ آتا تھا۔ پیسہ کس طرح انسانی رشتوں کو بے آبرو کرتا ہے اور کیسے قربتوں کو فاصلوں میں بدل دیتا ہے۔ یہ خاندان اس سفاک حقیقت کی جیتی جاگتی تصویر تھا۔ باپ کو فکر نہیں تھی کہ بیٹے کو پولیس تشدد سے مار ہی نہ ڈالے کیوں کہ اس کے دل میں بیٹے کی محبت پہلے ہی مر چکی تھی۔ بیٹے کے لئے بس کی جوانی ایک بہت بڑی رقم کا چیک تھی جسے کیش کرانے کی تاریخ قریب آگئی تھی۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ کیسی عصمت اور کیسی عزت۔ اصل مسئلہ پیسہ تھا۔ جو کسی طرح ہاتھ نہیں آتا تھا۔ اس کے حصول کے لئے دو ہی ذرائع تھے۔ غیر قانونی یا غیر اخلاقی۔ غیر قانونی کام کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ چناں چہ اس نے دوسرا طریقہ اختیار کیا تھا جس میں کوئی پکڑ نہ تھی اس نے اپنی بیوی کے جسم کو رہن رکھوا دیا تھا اور اس کی فراہم کردہ ضروریات زندگی کے بارے میں بے غیرتی کے احساس سے سمجھوتا کر لیا تھا اب ان سب کے وجود جرم و گناہ کی ایک دلدل میں ڈوبے ہوئے تھے مگر انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ ان کے لئے یہی زندگی تھی۔

کار اچانک رک گئی "ایک ایک کپ چائے پی کے آگے چلتے ہیں" مہتا نے کہا۔

کسی نے بھی اس سے اختلاف نہیں کیا۔ وہ سڑک کے کنارے بنا ہوا عام سا چائے خانہ تھا جہاں رات کے ساڑھے گیارہ بجے بھی ٹرک اور مسافر بسوں کی موجودگی سی رونق تھی۔ آمنے سامنے چائے کھانے کے ایک درجن سے زیادہ ریسٹورنٹ اور تنور تھے جن کے باہر لکڑی کی بوسیدہ کرسیوں اور بان کی چارپائیوں پر مسافر اور ٹرک ڈرائیور کھانے پینے میں مصروف تھے۔ وہیں پان سگریٹ کے کیبن بھی نظر آرہے تھے۔ بہت سے لوگوں نے کار کو دلچسپی سے دیکھا۔ دلچسپی کا اصل سبب نازو تھی جو اگلی سیٹ پر رونق افروز تھی۔ جب میں سگریٹ لینے گیا تو وہ پیچھے آ بیٹھی۔ ... بیٹا اور بد شکل مدراسی لونڈے نے دوڑ کے آرڈر لیا اور اپنے حریف "باہر والوں" کو شکست دے کر فخر سے اکڑتا ہوا چلا گیا وہاں جتنے ریسٹورنٹ تھے اس سے کہیں زیادہ باہر والے تھے چناں چہ مقابلہ سخت تھا اور کامیاب وہی تھا جو زیادہ مستعد تھا۔

چائے پیتے ہوئے میں نے مہتا سے پوچھا "اب اور کتنی دور جانا ہے؟"

اس نے گھڑی دیکھی "میرا خیال ہے آدھے گھنٹے میں جل گاؤں پہنچ جائیں گے ہم۔"

"تم اس علاقے سے واقف ہو نا؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے" مہتا نے کہا۔

"میں اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ ہم راستوں سے ناواقف ہیں۔ تم راستہ بھولنے کی غلطی مت کرنا۔"

"مجھے مرنا ہوتا تو میں تمہارے ساتھ اتنی دور کیوں مرنے آتا" مہتا نے کہا "مگر تم کیسے ڈاکو ہو کہ تمہیں راستوں کا بھی پتا نہیں۔ عام راستے عام لوگ جانتے ہیں۔ ڈاکو تو ان راستوں سے بھی واقف ہوتے ہیں........."

میں نے اس کی بات کاٹ دی "یہ ہمارا علاقہ نہیں ہے اور اسی لئے ناگ منی پولیس کے ہتھے چڑھ گئی۔"

"تمہارا علاقہ کون سا ہے؟"

میں نے کہا "راجستھان کی سرحد اور تھرپارکر کے دونوں جانب۔"

"معلوم نہیں کیوں میرا دل یہ بات نہیں مانتا کہ تم لوگ ڈاکو ہو" مہتا نے کہا۔

"دل کی بات مت مانو۔ ہماری بات مان لو گے تو فائدے میں رہو گے" غالب نے اسے مشورہ دیا۔

اسی وقت مدراسی چھوکرا آگیا "صاحب جی۔ ابھی اپن ایک بات پوچھیں گا۔ ناراج مت ہونا۔"

"میں نے کہا "پوچھو۔"

"اپن تم کو بھی دیکھا ہے اور بائی جی کو بھی پر سالا یاد نہیں پڑتا کون سا فلم تھا" وہ سر کھجا کے بولا "بائی جی کا نام...... ہے نا؟"

اس نے ایک مشہور فلم اسٹار کا نام لیا تھا "بالکل پہچانا تم نے" غالب بولا۔

چھوکرے کا چہرہ کھل اٹھا "ابھی اپن شرط جیت گیا صاحب۔ پیسہ رہنے دو ابے سالا ابھی نکال دس کا پتا نئیں تو" اس نے غالباً شرط ہارنے والے کو مطلع کیا کہ بدعہدی کی صورت میں وہ کیا کر سکتا ہے۔

مہتا مسکرانے لگا "چائے کے دو روپے چھوڑ دیئے پھر بھی فائدے میں رہا۔"

"دونوں کی نظریں کمزور تھیں اور دماغ خراب تھا" غالب نے کہا۔

مہتا نے گاڑی پھر سڑک پر دوڑاتے ہوئے کہا "یہ بات نہیں دھوکا بہت سے لوگوں کو ہوا ہوگا۔ صورت ہی ایسی ہے ان کی۔"

"اس میں میرا کوئی قصور ہے؟" نازو چڑ کے بولی۔

"نہیں۔ مگر اس سے میری بات کو تائید حاصل ہوتی ہے کہ تم لوگ ڈاکو نہیں ہو" مہتا بولا۔

"ڈاکو کی پہچان ہے تمہیں' سینگ ہوتے ہیں ان کے سر پر یا ان کی تین آنکھیں اور چار کان ہوتے ہیں؟" غالب نے کہا۔

"ان کی پہچان ہوتی ہے خود ان کی صورت۔ جرائم پیشہ لوگ ایسے فر فر انگریزی نہیں بولتے جیسے تم مجھ سے بات کر رہے ہو" مہتا نے کہا "ان کے اطوار میں یہ شائستگی نہیں ہوتی جو تمہارے اچھے فیملی بیک گراؤنڈ کا پتا دیتی ہے۔ حالاں کہ تم خاصے بے رحم اور سفاک ہو۔ مرنے مارنے سے نہیں ڈرتے اور واقعی کشتوں کے پشتے لگا سکتے ہو۔ مگر پھر بھی میں کہوں گا کہ تم چور ڈاکو ہرگز نہیں ہو بلکہ تم میں سے کسی نے کبھی جیل دیکھی تک نہیں۔"

"پھر ہم کون ہیں تمہارے خیال میں؟"

مہتا نے جانتے بوجھتے ہوئے سچ نہیں بولا "میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا' میں خود کنفیوژن کا شکار ہوں۔"

پہلے مدراسی چھوکرے کی بات نے اور پھر مہتا نے مجھے فکر مند کر دیا تھا۔ یہ مہتا کی مردم شناسی کا کمال نہیں تھا۔ کوئی بھی ہماری صورت دیکھ کر اور چند گھنٹے ہمارے ساتھ رہ کے اس نتیجے پر پہنچتا کہ ہم ڈاکو نہیں ہو سکتے۔ مدراسی چھوکرے کا کنفیوژن سمجھ میں آتا تھا۔ اس نے ضرور ہماری تصویریں.... اخبارات میں دیکھی ہوں گی۔ فلم کی بات ہوتی تو اسے نام فوراً یاد آجاتا مگر صورتیں دیکھ کے وہ چکرا گیا تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ بعد میں شرط ہارنے والا اسے کوئی پرانا اخبار دکھا کے اس سے دس روپے واپس وصول کرے اور یہ ثابت ہو جائے کہ ہم وہی دہشت گرد تھے جن کی پولیس کو تلاش تھی تو کوئی ہمارے راستے کی نشاندہی کر دے۔

ہم مسلسل مین روڈ پر سفر کر رہے تھے۔ کم ہونے کے باوجود اس پر ٹریفک کا سلسلہ ٹوٹنے میں نہیں آتا تھا۔ آمنے سامنے سے ٹرک اور بسوں کے علاوہ دوسری گاڑیوں کی آمد و رفت جاری تھی لیکن ابھی تک کہیں بھی پولیس کی ناکا بندی یا چیکنگ نظر نہیں آئی تھی۔

مہتا نے اچانک اعلان کیا کہ ہم جل گاؤں پہنچ گئے ہیں اور گاڑی کو دائیں جانب نسبتاً چھوٹی سڑک پر موڑ لیا۔ وہاں پولیس کی ایک موبائل وین موجود تھی۔ ایک کانسٹیبل نے ہمیں ہاتھ کے اشارے سے روکا اور ٹارچ کی روشنی میں کار کا نمبر دیکھا۔

مہتا نے شیشہ نیچے کیا اور کہا "کیا بات ہے؟"

ایک سب انسپکٹر آگے بڑھا "کاغذات دکھائیے۔"

مہتا نے گلوز کمپارٹمنٹ میں سے کاغذات نکال کے اسے پیش کر دیئے "میں خود مالک ہوں اس کار کا۔ مہتا سنز اور مہتا انڈسٹریز......"

"آپ کے ساتھ کون ہے؟" سب انسپکٹر نے کاغذات پر سرسری نگاہ ڈالتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی۔

"میری فیملی ہے" مہتا نے کہا۔

سب انسپکٹر نے کاغذات واپس کر دیئے "اس وقت کہاں سے آرہے ہیں آپ؟"

"بمبئی سے۔"

"اور ادھر کہاں جا رہے ہیں؟"

"میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ان فضول اور بے سروپا سوالات کا مقصد کیا ہے۔ کیا کوئی بھارتی شہری رات کو اپنی فیملی کے ساتھ اپنی مرضی سے کہیں آجا بھی نہیں سکتا؟"

"براہ مہربانی میرے سوال کا جواب دیجئے مسٹر مہتا ورنہ میں....."

"ورنہ کیا۔ تم گرفتار کرلو گے مجھے؟"

"میں آپ کو روکنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔ افسران اعلیٰ کے آنے تک۔"

"او کے۔ میں وقت ضائع نہیں کر سکتا ورنہ دیکھ لیتا تمہارے افسران بالا کو بھی۔ میں اپنے دوست ہری چند کے گھر جا رہا ہوں" مہتا بولا۔

"کون ہری چند۔ ایم پی اے؟"

"یس تم جانتے ہو نا۔ نہیں جانتے تو میں پتا بتا دیتا ہوں اور فون نمبر۔ تم انہیں بلا لو۔ وہ فوراً آکے ہمیں اپنے ساتھ لے جائیں گے" مہتا نے کہا۔

"آپ جا سکتے ہیں" سب انسپکٹر نے کہا "آپ کو ناراض نہیں ہونا چاہئے۔ ہم اپنی ڈیوٹی کر رہے ہیں۔"

"آتے جاتے لوگوں کو پریشان کرنا ڈیوٹی ہے؟ پہلے بھی آتا رہا ہوں میں..... اکثر آتا ہوں۔"

"ہم بھی ہر روز ایسا نہیں کرتے۔ آج کچھ ایسی ہی بات ہے" سب انسپکٹر بولا اور راستے سے ہٹ گیا۔

"کیا بات ہے؟"

"آپ کو معلوم ہو جائے گا ہری چند سے۔ اگر آپ واقعی ان کے گھر جا رہے ہیں" سب انسپکٹر نے کہا۔

مہتا بگڑ گیا "واقعی کا کیا مطلب ہے۔ کیا جھوٹ بولا ہے میں نے۔ تم ساتھ چل سکتے ہو میرے......"

"سوری۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا" سب انسپکٹر بولا۔

میں نے کہا "چھوڑو یار۔ چلو۔ ان کو تو عادت ہوتی ہے ایسے ہی بک بک کرنے کی۔"

مہتا نے گاڑی بڑھاتے ہوئے کہا "سب عادتیں پبلک بگاڑتی ہے۔ مگر میں پبلک نہیں ہوں۔"

"معاملہ گڑبڑ نظر آتا ہے مجھے" غالب نے کہا۔

"ہاں۔ پولیس کیا دیکھ رہی ہے آخر؟" نازو بولی "وہ تو اچھا ہوا کہ ہم مہتا جی کی گاڑی میں تھے اور خود مہتا جی ساتھ تھے۔ رات کے وقت کسی نے غور سے دیکھا بھی نہیں۔"

"میری فیملی کی طرف کون نظر اٹھا کے دیکھ سکتا ہے۔ میں کوئی عام آدمی نہیں ہوں" مہتا نے کہا۔

"ہاں۔ عام آدمی تو بہت مجبور اور بے بس ہوتا ہے اور شریف ہوتا ہے" نازو نے کہا "اس لئے قانون کی گرفت میں آجاتا ہے کہ پھندا اس کی گردن میں فٹ کیا جا سکتا ہے۔"

میں نے کہا "تم نے ہری چند کے نام کو استعمال کیا تھا یا واقعی وہ دوست ہے تمہارا؟"

"ایم پی اے بننے کے بعد وہ میرا دوست نہیں رہا۔ مگر ایسا بھی نہیں کہ پہچاننے سے انکار کر دے۔ بڑا کام ہوتا تو شاید ٹال دیتا۔ یہ ایسا کام ہے کہ وہ مجھ پر احسان کرنے کا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دے گا اور احسان کا بدلہ بعد میں طلب کرے گا" مہتا نے کہا۔

پولیس اسٹیشن کے باہر بھی سخت پہرہ تھا۔ اندر داخل ہونے سے پہلے ہماری گاڑی کو روک لیا گیا۔ گیٹ کے سامنے ایک پولیس جیپ پہلے سے موجود تھی جس کی چھت پر نیلی گھومنے والی لائٹ اس وقت بجھی ہوئی تھی۔

"کیا پبلک کے لئے تھانہ بھی ممنوعہ علاقہ ہو گیا ہے؟" مہتا نے راستہ روکنے والے اے ایس آئی سے کہا۔

"اندر ڈی ایس پی صاحب موجود ہیں اور ان کا حکم ہے کہ کسی کو اندر نہ آنے دیا جائے" وہ بولا۔

"خواہ کوئی چوری ڈاکے یا قتل کی رپورٹ لکھوانا چاہتا ہو۔"

اے ایس آئی نے تذبذب سے کہا "کہاں پڑا ہے ڈاکا۔ کس کا قتل ہوا ہے۔"

"کچھ ہوا ہے یا نہیں۔ مجھے تھانے میں داخل ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا" مہتا نے چیخ کر کہا "میں نہیں جانتا کہ ڈی ایس پی۔ پولیس کمشنر بھی ایسا غیر قانونی حکم جاری نہیں کر سکتا۔"

اے ایس آئی گھبرا گیا "دیکھئے۔ آہستہ اور تحمل سے بات کریں۔"

مہتا نے نیچے اتر کے دھڑ سے کار کا دروازہ بند کیا "شٹ اپ مجھ سے کہتے ہو کہ تحمل سے بات کرو۔ جو کچھ تم نے کیا ہے اس کے بعد کوئی گنجائش رہ جاتی ہے رعایت کی۔ میں ایسی کی تیسی کروں گا ان سب کی جو اس زیادتی کے ذمے دار ہیں۔ یہ میری عزت کا معاملہ ہے میں کیس کر دوں گا اور میں کوئی معمولی آدمی نہیں ہوں۔"

"پلیز سر۔ گاڑی دروازے میں سے ہٹا لیں اور پھر بتائیں مجھے" سب انسپکٹر کی حالت غیر ہونے لگی۔

"گاڑی اسی جگہ رہے گی۔ میں اندر نہیں جاؤں گا تو کوئی بھی باہر نہیں آئے گا۔ بلاؤ اپنے اس ڈی ایس پی کو" مہتا نے انگریزی میں گرجنا جاری رکھا۔

اس شور کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا۔ اندر سے پہلے ایک انسپکٹر نکلا "کیا ہنگامہ ہے یہ؟"

"ہنگامے کے بچے۔ اس نے مجھے اندر آنے سے روکا ہے" مہتا نے کہا "یہ کون ہوتا ہے۔"

"بھونکنا بند کرو کتے" انسپکٹر کا پارا چڑھ گیا۔

"مجھے کتا کہتے ہو؟ میرا نام مہتا ہے۔ میں یوں وردی اتروا سکتا ہوں تمہاری" مہتا نے چٹکی بجائی "شرافت سے تم لوگ کب کس کی بات سنتے ہو۔ سب چھٹے ہوئے بدمعاش اکٹھے ہو گئے ہیں۔ کسی کی عزت محفوظ نہیں رہی۔ پبلک کے ساتھ جو ہوتا ہے وہ تو معلوم تھا مجھے۔ آج میرے گھر کی عزت پر ہاتھ ڈال دیا تم نے......"

اب ڈی ایس پی خود باہر آچکا تھا اور اس نے مہتا کی پوری بات سکون سے سنی تھی۔ مہتا نے کہا "میرے خاندان کی ایک عورت اٹھالی گئی ہے۔"

"اندر آکے اطمینان سے بات کریں مسٹر مہتا۔ باقی سب لوگ گاڑی میں رہیں" ڈی ایس پی نے کہا اور اندر چلا گیا۔

مہتا نے گاڑی کو فاتحانہ انداز میں آگے بڑھایا اور پولیس اسٹیشن کے احاطے میں روک دیا۔

"میں تمہارے ساتھ چلوں گا" میں نے کہا۔

نازو نے کہا "کوئی ضرورت نہیں۔"

"ضرورت کا فیصلہ کرنا میرا کام ہے" میں نے کہا۔

"کیوں خود کو بلاوجہ آزمائش میں ڈالتے ہو۔ کسی نے تمہیں بھی پہچان لیا پھر؟" غالب نے کہا۔

نازو نے کہا "فوراً تصدیق ہو جائے گی کہ وہ گل نہیں ناگ منی ہے۔ سب پکڑے جائیں گے۔"

مہتا نے بھی سر ہلایا "میری بات کون سنے گا پھر؟"

میں نے کہا "کچھ بھی ہو۔ میں یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا کہ مہتا اکیلا اندر جائے اور ڈی ایس پی کو وہ سب بتا دے جو صبح سے اب تک ہوا ہے۔ پھر وہ اطمینان سے ہم سب کو چوہے دان میں داخل ہونے والے چوہوں کی طرح پکڑ لیں۔"

غالب نے کہا "یہ تو ٹھیک کہا تم نے۔"

میں نے کہا "میں فرشتہ اجل نہیں کہ مہتا کے ساتھ رہوں گا تو اس کی زبان نہیں بہکے گی اور اس کی زندگی ضمانت ہوگی ہم سب کی سلامتی کی۔"

"مگر تمہارے پہچانے جانے کا جو رسک ہے" مہتا نے مجھے سمجھانے کے لئے کہا۔

میں نے کہا "میں یہ رسک لوں گا۔ اس میں کچھ چانس ضرور ہے۔ لیکن میں نے تمہیں اکیلا جانے دیا تو پھر کوئی چانس نہیں ہوگا ہمارے لئے۔ خدانخواستہ مجھے شناخت کر لیا گیا تب بھی میں آسانی سے ان کے ہاتھ نہیں آؤں گا۔ میں ڈی ایس پی کو یرغمال بنالوں گا۔ دو چار کو مارے بغیر تو میں مروں گا بھی نہیں۔ اور اندر کوئی گڑبڑ ہو گئی تو تمہیں باہر اس کی خبر مل جائے گی۔ پھر تم بھی کچھ نہ کچھ

ضرور کرو گے۔ ایسے ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے نہیں پکڑے جاؤ گے۔"

ایک کانسٹیبل نے قریب آکے کہا "مہتا جی کو بلاتے ہیں ڈی ایس پی صاحب۔"

مہتا نے کہا "تم چلو۔ ہم مشورہ کر کے آتے ہیں۔"

پولیس اس لئے محتاط تھی کہ کہیں ڈاکو تھانے پر حملہ نہ کردیں مگر مہتا نے گاڑی اندر کی طرف لے جاکے روک دی تو ان کے لئے شک و شبہے کی کوئی بات نہ رہی کہ ہم فرار ہونے والے نہیں ہیں ورنہ باہر ہی رک جاتے۔

کانسٹبل کے پیچھے پیچھے ہی مہتا اترا۔ پھر میں باہر نکلا اور ہم ایک ساتھ پولیس اسٹیشن کی عمارت میں داخل ہوئے۔ مہتا نے اپنے معزز اور بااثر ہونے کا اعلان بھی کردیا تھا اور پولیس پر کیس کی دھمکی دے کر تھوڑی سی ہلچل بھی مچا دی تھی چناں چہ اندر جاتے وقت کسی نے میری تلاشی نہیں لی ورنہ ریوالور برآمد ہوجاتا تو لینے کے دینے پڑجاتے۔

اندر داخل ہوتے وقت میرا دل دھڑکنا بھی بھول گیا تھا وہ صرف ایک لمحہ تھا جس میں صورت حال ایک دم پلٹ سکتی تھی۔ اگر ڈی ایس پی مجھے پہچان لیتا تو اس کا رد عمل فوری ہوتا اور پھر میرے لئے اس کو قابو کرنا ضروری ہوجاتا۔

ڈی ایس پی جوان آدمی تھا اور صورت سے ہی احمق آدمی لگتا تھا۔ جو قابلیت سے زیادہ سفارش کی بنیاد پر بھرتی ہوا ہو۔ اس کے چہرے پر تھکن بیزاری اور کوفت کے آثار تھے جیسے وہ کئی راتوں کا جاگا ہوا ہو۔ اس نے مجھ پر اچٹتی سی نگاہ ڈالی اور ہاتھ کے اشارے سے ہمیں بیٹھنے کے لئے کہا۔ اس کمرے میں تھانوں کی مخصوص فضا تھی۔ سہمی ہوئی۔ پُر آسیب اور دہشت ناک۔ پرانی میز کے گرد چھ بھدی کرسیاں جمع کردی گئی تھیں۔ میلے میز پوش پر چائے کے خالی کپ رکھے ہوئے تھے اور ایک ٹیلی فون پڑا تھا۔ میں اس کرسی پر بیٹھ گیا جو ٹیلی فون کے قریب تھی۔ اس کا تار میرے پیروں سے چھوتا ہوا گزر رہا تھا۔ انسپکٹر میرے بائیں ہاتھ پر رہا۔ مہتا سامنے اور ڈی ایس پی دائیں طرف۔

"اگر آپ اغوا کی رپورٹ لکھوانا چاہتے ہیں مسٹر مہتا تو اس کے لئے اتنے چراغ پا ہونے کی کیا ضرورت ہے؟"

"اگر تمہارے خاندان کی کسی عورت کو پولیس یوں پکڑ لیتی تو میں دیکھتا کہ تم کتنے خوش ہو" مہتا نے پلٹ کر کہا۔

"پولیس نے؟" ڈی ایس پی چونکا۔

"ہاں پولیس نے۔ اور یہ بات معلوم ہوتے ہی میں چل پڑا۔ میں صبح ہونے کا انتظار نہیں کرسکتا" مہتا نے میز پر مُکا مارا "میں ابھی اسی وقت ہری چند سے بات کروں گا۔ وہ الو کا پٹھا ایم پی اے ہوگا تمہارے لئے۔ میرا بچپن کا دوست ہے" اس نے ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھایا "ساری بات اس کے سامنے ہوگی۔"

"ایک منٹ۔ ایک منٹ" ڈی ایس پی نے فون پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "بات میرے سامنے بھی ہوسکتی ہے پہلے مجھے تو کچھ معلوم ہو کہ یہ قصہ کیا ہے۔ آخر میں ایک ذمے دار افسر ہوں جائز شکایت ہو تو میں بھی ایکشن لینے کا اختیار رکھتا ہوں۔ ہری چند کو بعد میں بلانا۔"

"تم سب ایک ہی تھالی کے چٹے بٹے ہو۔ جیسے تم ویسے تمہارے ماتحت۔ تم کچھ نہیں کرو گے" مہتا نے کہا۔

"دیکھو تم حد سے بڑھ رہے ہو....."

"میں۔ میں حد سے بڑھ رہا ہوں؟" مہتا نے چیخ کے کہا "تم میرے خاندان کی عورت کو اٹھا لائے ہو۔ میری خالہ زاد بہن۔"

"یہ کیا بکواس ہے" ڈی ایس پی دھاڑا "تمہارے سامنے کھڑے ہیں سب لوگ۔ جو باہر ہیں انہیں بھی بلا لو۔ پھر مجھے بتاؤ کس پر شک ہے تمہیں۔"

"شک کی بات نہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ تم نے اسے یہاں رکھا ہے" مہتا بولا۔

انسپکٹر نے اپنے افسر کے کان میں کچھ کہا۔

"تم۔ اس عورت کی بات تو نہیں کررہے ہو۔ ناگ منی کی؟" ڈی ایس پی بولا۔

"میں کسی ناگ منی کو نہیں جانتا۔"

"ڈاکوؤں کے گروہ کی ایک عورت کو ہم نے آج شام ضرور گرفتار کیا ہے اور وہ اس وقت بھی تھانے میں موجود ہے۔ مگر اس کا آپ جیسے معزز شخص کے خاندان سے تعلق نہیں ہوسکتا" ڈی ایس پی نے کہا۔

"کہاں سے پکڑا ہے تمہارے جیالے سپاہیوں نے اسے؟" مہتا نے کہا۔

"وہ چھپی ہوئی تھی۔ ایک کھنڈر میں" انسپکٹر نے کہا۔

"ایک پرانے متروک ریلوے کیبن میں؟ یہی مجھے بھی معلوم ہوا ہے" مہتا نے کہا "آخر تم نے کیسے فرض کرلیا کہ وہ ڈاکو ہے۔ کیا اس کو ڈاکا ڈالتے دیکھا تھا کسی نے؟ وہ رنگے ہاتھوں پکڑی گئی تھی؟"

"مہتا صاحب۔ کیسی باتیں کررہے ہیں آپ۔ اسے کون نہیں جانتا" ڈی ایس پی بولا "اس کا بھائی شیش ناگ تھا۔ وہ ابھی مفرور ہے۔ ناگ منی نے بھائی کے ساتھ مل کر ڈکیتی کی ان گنت وارداتیں کی ہیں۔ پتا نہیں کتنے انسانوں کا خون کیا ہے۔ جب پولیس کا گھیرا یہاں ان کے گرد تنگ ہونے لگتا تھا تو وہ پاکستان بھاگ جاتے تھے اور کچھ عرصے بعد یہی صورت حال وہاں ہوتی تھی تو لوٹ کر اس علاقے میں وارداتیں شروع کردیتے تھے۔"

"ڈی ایس پی صاحب۔ کیا اس عورت نے مان لیا ہے کہ وہ ناگ منی ہے؟ اپنے جرائم کا اعتراف کرلیا ہے؟"

"ہاں۔ اور یہ بھی مان لیا ہے کہ شیش ناگ اس کا بھائی ہے" ڈی ایس پی نے کہا۔

تم تشدد کرکے کیا نہیں منوا سکتے۔"

"نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں" ڈی ایس پی بولا "مجھے تصدیق کے لئے ہی بھیجا گیا تھا مگر میرے آنے سے پہلے ہی وہ سب مان چکی تھی۔ کسی نے اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا اس وقت تک اور وہ ذرا بھی خوف زدہ نہیں تھی۔ شیرنی کی طرح دھاڑ رہی تھی اور ان پولیس والوں کو دھمکی دے رہی تھی کہ اب وہ اپنی بہن اور اس کا بھائی آتا ہی ہوگا۔ وہ کسی کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ ہم نے اس لئے ناگ منی کو بہت دور اس تھانے میں شفٹ کر دیا تھا۔"

مہتا نے سر پر ہاتھ مارا "ہے بھگوان۔ آخر میں کیا کروں اس پاگل لڑکی کا۔"

انسپکٹر نے ڈی ایس پی کی طرف دیکھا "وہ پاگل نہیں ہے سر۔ پورے ہوش و حواس میں ہے۔ اس نے خود کو ناگ منی تسلیم کیا ہے سب کے سامنے۔"

"یہی تو پاگل پن ہے اس کا۔ تم پوچھتے کہ کیا جھانسی کی رانی ہو تم تو وہ کہتی ہاں۔ میں انگریزوں کی اینٹ سے اینٹ بجادوں گی۔ تم کہتے کہ ملکہ نور جہاں ہو تو وہ کہتی کہ ہاں۔ اب جہانگیر آتا ہی ہوگا۔ تم سب کو ہاتھی کے پاؤں کے نیچے ڈلوا دے گا وہ۔ وہ پڑھی لکھی اور ذہین لڑکی ہے مگر اس پر دورے پڑتے ہیں تو وہ گھر سے نکل جاتی ہے۔ اسے تہہ خانے میں بند رکھا جاتا ہے اور ہر وقت نگرانی بھی ہوتی ہے۔ خطرناک پاگل نہیں ہے اس لئے زنجیروں سے یا رسّی سے باندھ کے نہیں رکھا جاتا۔ چناں چہ کبھی موقع ملے تو سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کے نکل جاتی ہے۔ سب کو معلوم ہے یہ بات۔ لوگ پہلے بھی اسے کئی بار جنگلوں اور مرگھٹوں سے پکڑ کر لائے ہیں۔"

ڈی ایس پی کی نظر میں اب بھی شک تھا "مہتا صاحب یہ کیا کہانی سنا رہے ہیں آپ۔"

"آپ کا مطلب ہے جھوٹ بول رہا ہوں میں" مہتا بھڑک اٹھا "ناگ منی کو اپنے خاندان میں شامل کرنے کا اعزاز حاصل کرنا چاہتا ہوں تاکہ وہ میرا بھی نام روشن کرے اور میرے باپ کا بھی۔ آپ کا دماغ خراب ہے کیا۔ چور ڈاکو سے لوگ رشتہ توڑتے ہیں یا جوڑتے ہیں۔"

انسپکٹر زیادہ خرانٹ تھا "پھر اس نے اقبالی بیان کیوں دیا؟ آپ تو جانتے نہیں کسی ناگ منی کا نام۔ اس نے کہاں سے سن لیا تھا۔"

"اس نے تم سے سنا ہوگا یا ممکن ہے پہلے سے معلوم ہو اسے۔ اس اقبالی بیان کی کوئی حیثیت نہیں۔ وہ ایک ذہنی مریضہ ہے۔ سارا گاؤں جانتا ہے۔ ہری چند کو بلالیں۔ وہ جانتا ہے یہ بات۔"

"کیا وہ ناگ منی کو...... میرا مطلب ہے آپ کی بہن کو پہچانتے بھی ہیں" ڈی ایس پی نے کہا۔

"ہاں۔ بہت اچھی طرح۔ بچپن کے دوست ہیں ہم تیسری جماعت سے اکٹھے پڑھتے رہے کالج تک۔ ایک ہی محلہ بھی تھا۔ اب وہ مصروف ضرور ہوگیا ہے پھر بھی ملتا رہتا ہے۔ پرمیلا میں دلچسپی بھی تھی اسے۔"

"کون پرمیلا؟"

"میری یہی پاگل خالہ زاد بہن۔ بچپن میں حد سے زیادہ ذہین تھی۔ کچھ لوگ ذہنی طور پر پسماندہ ہوتے ہیں۔ پرمیلا اپنی عمر سے بہت آگے تھی۔ اس کی باتیں لوگوں کو سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ بے حد حساس اور زود رنج تھی۔ بعد میں سنکی اور خبطی ہوگئی تھی۔ تصوّر میں جو کچھ دیکھتی تھی اسے حقیقت سمجھ کے قبول کرلیتی تھی اور دوسروں کے سامنے ایسے بتاتی تھی جیسے آپ بیتی ہو۔ مشہور ہوگیا تھا کہ اس پر سایہ ہے۔ آسیب ہے۔ یہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔ کوئی نفسیاتی علاج کے بارے میں نہیں سوچتا۔ ہم نے بھی صرف سنا ہے کہ سائیکاٹرک کلینک ہوتے ہیں بڑے شہروں میں......"

ڈی ایس پی نے پریشان ہوکے کہا "مہتا صاحب' میں پوری کیس ہسٹری نہیں سن سکتا اور اس عورت کو آپ کے حوالے بھی نہیں کرسکتا کیوں کہ مجھے بھی یقین ہے کہ وہ ناگ منی ہے۔ ہم اس سے شیش ناگ کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔"

"یعنی تفتیش شروع کردی ہے تم نے۔ اپنے انہی روایتی طریقوں سے" مہتا کا چہرہ لال ہوگیا "کیا بتایا ہے اس نے تمہیں؟"

"ابھی تک تو کچھ نہیں بتایا۔ مگر بتائے گی" انسپکٹر نے یقین کے ساتھ کہا۔

"ڈی ایس پی صاحب۔ کچھ عقل سے کام لیں۔ اگر وہ شیش ناگ جیسے ڈاکو کی بہن ہوتی تو وہاں اس کھنڈر میں کیا کام تھا اس کا؟ اس کا پورا گروہ ہے تو وہ اکیلی کیسے رہ گئی تھی؟"

"یہ سب معلوم ہوجائے گا۔"

"کوئی اسلحہ وغیرہ ملا اس کے پاس سے؟" مہتا نے کہا۔

"نہیں۔ اسلحہ تو نہیں ملا لیکن آپ پہلے اس کی تصویر دیکھ لیں" ڈی ایس پی نے کہا۔

پولیس انسپکٹر نے ایک فائل آگے بڑھادی۔ اس میں ناگ منی کے علاوہ اس کے بھائی شیش ناگ کی بہت سی تصاویر تھیں۔ وہ تمام اخبارات کے تراشے تھے جن میں وارداتوں کی تفصیل تھی اور مختلف عدالتوں کے جاری کردہ وارنٹ تھے۔ یہ سب ہندی میں تھے چناں چہ میں کچھ نہ پڑھ سکا تاہم اس فائل کو دیکھنے کے بعد مہتا کے لئے شک کی کوئی بات نہ رہی کہ ہم نے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا تھا وہ غلط تھا۔ ہمارے بارے میں اس کا یقین باطل ہوگیا تھا۔

"کمال ہے۔ بہت مشابہت ہے' اس میں اور پرمیلا میں مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں ڈی ایس پی صاحب کہ جسے آپ نے گرفتار کیا ہے وہ ناگ منی نہیں میری خالہ زاد بہن پرمیلا ہے۔"

ڈی ایس پی نے نفی میں سر ہلایا "صرف آپ کے کہنے سے میں اسے چھوڑ نہیں سکتا۔ ابھی تو خود آپ نے بھی نہیں دیکھا اس کو۔ کیا پتا وہ آپ کی خالہ زاد بہن نہ ہو۔ سچ مچ ڈاکو ناگ منی ہو۔"

"آپ اس کو بلائیں......یا مجھے لے چلیں اس کے پاس" مہتا

نے فائل رکھ دی۔
ڈی ایس پی نے سرہلایا "ذرا یہاں لاؤ اسے"
انسپکٹر تذبذب کی کیفیت میں کھڑا رہا "یہاں؟ سر..... ہم نے اسے ایسے باندھ رکھا ہے......."
"او کے۔ مہتا صاحب کو لے جاؤ اندر۔"
مہتا کے ساتھ میں بھی اٹھا تھا مگر پھر ڈی ایس پی نے مجھے اشارا کیا کہ بیٹھ جاؤں "تم کیا ہو اس کے۔"
"بھائی" میں نے بے اختیار کہا "چھوٹی بہن ہے پرمیلا سر۔"
اس تمام عرصے میں جب ڈی ایس پی اور مہتا گفتگو کر رہے تھے میرے دل کی عجیب حالت تھی۔ کبھی اچانک امید حاوی آنے لگتی تھی، پھر مایوسی کے اندھیرے میں امید کی آخری کرن بھی ڈوب جاتی تھی میں گل کا تصور کرتا تھا تو مجھے محسن اور شہلا کا خیال آتا تھا۔ صرف گل ہی بتا سکتی تھی کہ ان پر بعد میں کیا گزری مگر گل زنجیروں میں جکڑی پڑی تھی اور یہی نہیں۔ وہ اعتراف جرم بھی کر چکی تھی۔ ایک عورت پر تھانے کی دہشت ہی اتنی ہوتی ہے کہ وہ تشدد سے بچنے کے لیے سب کچھ کر سکتی ہے۔ گل نے زیادہ بہادری کا ثبوت دیا تھا مگر اس کے مقابل تفتیش کرنے والے سفاک درندوں کا غول تھا۔ معلوم نہیں انہوں نے اس پر کیا مظالم توڑے تھے۔
مہتا کے چلانے کی آواز پر میں چونکا "پرمیلا۔ پاگل۔ یہ کیا حال کر دیا ہے ان ظالموں نے تیرا۔"
میں تڑپ کر اٹھا مگر ڈی ایس پی نے گرج کے کہا "بیٹھ جاؤ۔ کیا نام ہے تمہارا۔"
میں نے اسے وہی نام بتا دیا جو مہتا کو بتایا تھا۔ ڈی ایس پی نے ایک فاش غلطی کی تھی۔ اگر وہ پہلے گل سے پوچھ لیتا کہ مہتا کون ہے اور کہاں رہتا ہے۔ پرمیلا کس کا نام ہے اور اس کا بھائی کون ہے تو سارا جھوٹ کھل جاتا۔ اب مہتا نے اسے سب کچھ خود ہی بتا دیا تھا۔
"میرا نام بھی مہتا نہیں اگر ایک ایک کو جیل میں نہ ڈلوا دیا میں نے پرمیلا" وہ چلا رہا تھا اور میں رات کے سناٹے میں اس کی آواز صاف سن رہا تھا "تو فکر مت کر۔ تیری اور میری ماں سگی بہنیں تھیں۔ تیرا بھائی بھی آیا ہے میرے ساتھ۔"
میں نے پہلی بار گل کی آواز سنی "میں یہاں کیسے آ گئی بھیا" وہ رو رہی تھی اور سخت دہشت زدہ معلوم ہوتی تھی۔
"رو مت۔ جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب میں سب ٹھیک کر لوں گا۔"
مہتا نے کہا "میں ابھی ہری چند کو بلاتا ہوں فون کرکے آخر وہ کس دن کام آئے گا۔ ایم پی کی اولاد۔ دیکھنا وہ کیا کرے گا تجھے اس حال میں دیکھ کر......."
جب وہ پھر میرے سامنے آیا تو مہتا کی حالت واقعی ایسی تھی کہ میں نے اس کی اعلیٰ اداکارانہ صلاحیت کا اعتراف کیا۔ وہ غصے میں آگ بگولا ہو رہا تھا اور بری طرح ہانپ رہا تھا۔
"فون ملاؤ۔ ابھی اسی وقت" اس نے پولیس کو اور پولیس کے محکمے کو بے نقط سناتے ہوئے کہا "ہری چند ابھی بات کرے گا ہوم سکریٹری سے۔"
اب انسپکٹر اور ڈی ایس پی بھی پریشان نظر آنے لگے تھے انہیں احساس ہو رہا تھا کہ غلط فہمی کے باعث وہ کسی اور کو ناگ منی سمجھ کے پکڑ لائے تھے۔
"بات یہ ہے مہتا جی کہ ہم تو اس وقت ہری چند صاحب کو فون نہیں کر سکتے" ڈی ایس پی نے کہا "آپ بات کر لیں لیکن ان کو مت بتائیں کہ آپ تھانے سے بات کر رہے ہیں۔ ہم اس کی اجازت نہیں دے سکتے۔"
"بکواس بند کرو۔ اس وقت میں اور کہاں جا کے فون کروں اور جب بات تھانے کی ہے۔ میں یہاں موجود ہوں تو پھر تم کیوں ڈر رہے ہو" مہتا نے فون چھین لیا۔
مگر اس وقت تک میں اپنی کارگزاری دکھا چکا تھا اور فون کا ایک تار جوتے سے رگڑ کے یوں توڑ چکا تھا کہ وہ دیکھنے میں ٹوٹا ہوا نہیں لگتا تھا۔ پلاسٹک کے اندر سے تار عام طور پر ٹوٹ جاتا ہے مگر بیرونی انسولیشن لچک کے باعث برقرار رہتی ہے۔ میرے ذہن کے ایک گوشے میں یہ خوف موجود تھا کہ ہماری حقیقت کشیدگی کا باعث نہ بن جائے لیکن اس سے زیادہ میری کارروائی کا مقصد تھانے کا باہر کی دنیا سے رابطہ منقطع کرنا تھا۔ ناگزیر حالات میں اگر مجھے گل کو بزور بازو نکال کے لے جانا پڑتا تو اس سے پہلے بہت مار دھاڑ ہوتی۔ ٹیلیفون کی عدم موجودگی میں تھانے کے اندر پیش آنے والے واقعات کا علم دنیا کو صبح اس وقت ہوتا جب ہم بہت دور جا چکے ہوتے۔
"آپ خود جا کے ہری چند صاحب کو بلا لائیں" ڈی ایس پی نے کہا "میں پولیس کمشنر کو ساری صورت حال بتا کے ہدایات حاصل کرتا ہوں۔"
مہتا اٹھ کھڑا ہوا "او کے۔ تم یہی چاہتے ہو تو یہی سہی۔ ہری چند یہاں بھی آ جائے گا۔"
"تم نمبر ملاؤ پولیس کمشنر کا" ڈی ایس پی نے فون اپنے ماتحت انسپکٹر کے سامنے رکھ دیا۔
"فون ...... فون تو ڈیڈ ہے سر۔" انسپکٹر نے یوں کہا جیسے فون کے ڈیڈ ہونے کا ذمے دار وہ خود ہے۔
"چیک کرو کہیں سے لائن تو ڈس کنکٹ نہیں ہوئی ہے" ڈی ایس پی نے برہمی سے کہا "کسی نے لائن کاٹ نہ دی ہو۔ سب کو الرٹ کر دو۔"
تھانے دار باہر دوڑا حالاں کہ پہلے اسے اندر ہی لائن دیکھنی چاہیے تھی مگر اسے خیال ہی نہیں آیا کہ کوئی اتنے لوگوں کی موجودگی میں فون کو یوں ڈیڈ کر سکتا ہے کہ کسی کو خبر تک نہ ہو۔ اس کا دھیان باہر گیا اور اس نے چیخ کر حکم دیا کہ پول سے تھانے تک اور آگے کی لائن چیک کی جائے اور کوئی مشکوک حالت میں نظر آئے تو اسے شوٹ کر دیا جائے۔ مشکوک حالت کیا ہوتی ہے یہ پولیس والوں کی لغت میں وہ اصطلاح ہے جس کا مطلب اپنی ضرورت کے مطابق نکالا جا سکتا ہے۔ اس وقت کوئی کتا ٹیلی فون کے کھمبے کا استعمال کرتا نظر آ جاتا تو وہ مشکوک قرار پاتا۔
"لائن تو ٹھیک ہے سر" انسپکٹر نے باہر سے آتے ہوئے کہا۔ ہم اس وقت برآمدے میں کھڑے ہوئے تھے۔
"میری گاڑی میں وائرلیس سیٹ ہے۔ اس کے ذریعے پولیس کمشنر سے رابطہ کرو" ڈی ایس پی بولا۔
"یہ تو معاملہ خراب ہوتا جا رہا ہے۔" مہتا نے کچھ پریشان ہو کے کہا۔
"کیوں۔ ہری چند......."
"وہ ایک ایم پی ہے۔ یہاں اس کا بہت اثر رسوخ ہے مگر بات کمشنر تک پہنچ گئی تو پھر وہ بھی بے بس ہو جائے گا۔ پولیس کمشنر براہ راست ہوم سکریٹری یا وزیر داخلہ سے بات کرکے ہری چند کی بات ماننے سے انکار کر سکتا ہے۔ یہ کسی عام مجرم کا معاملہ نہیں ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ اس نے پہلے ہی اعتراف بھی کر لیا ہے کہ وہ ناگ منی ہے۔"
"پھر جلدی بولو کیا کرنا ہے۔"
"میں کیا بتاؤں۔ کہو تو ہری چند کو جگاتے ہیں" مہتا نے تذبذب اور تامل کے ساتھ کہا۔
"تمہیں یقین ہے کہ وہ تمہیں مایوس نہیں کرے گا اور فوراً اٹھ کر چل پڑے گا تمہارے ساتھ۔"
"پتا نہیں۔ اب وہ پہلے والا ہری چند تو ہے نہیں۔ ووٹ آدمی کو بدل دیتا ہے مگر کوشش کرنے میں کیا جاتا ہے ہمارا" مہتا نے کہا۔
"نہیں۔ ایسی کوشش سے کچھ حاصل نہیں جس کی کامیابی پہلے سے غیر یقینی ہو" میں نے کہا۔
"پھر۔ اور تو کوئی صورت نہیں....."
"ہے۔ بہت ہی آزمودہ طریقہ ہے" میں نے کہا "جب سیدھی انگلیوں سے گھی نہیں نکلتا تو ٹیڑھی انگلیوں سے نکلتا ہے۔"
"کیا مطلب ....." وہ گھبرا کے بولا۔
"مطلب تم خود سمجھ لو گے۔ بس خاموشی سے دیکھتے رہو کہ ہم کیا کرتے ہیں" میں نے کہا۔
کچھ دور تھانے کی دیوار کے ساتھ کھڑی ہوئی کار میں سے نازو اور غالب کی نظر ہم پر تھی اور میں ان کے دلی اضطراب کا بخوبی اندازہ کر سکتا تھا کہ شاید ہمیں برآمدے میں بے مقصد کھڑا ہوا دیکھ کے نازو نے ہمارے مشن کی ناکامی کا اندازہ کیا۔ وہ اتر کے نہیں آ سکتی تھی اور اتنے فاصلے سے بات بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ کار کی کھڑکی سے نکالا اور دو انگلیوں سے انگریزی حرف وی کا نشان بنایا۔ نازو کا ہاتھ اندر غائب ہو گیا۔
یہ ایک سوال تھا کہ کیا تم مقصد میں کامیاب رہے؟ میں نے سوال سمجھ لیا اور جواب میں ایک انگوٹھا دکھایا جس کا یہ مطلب نکالا جا سکتا تھا کہ ٹھینگا کامیابی ہوئی۔
انسپکٹر پھر باہر آیا "ڈی ایس پی صاحب پوچھ رہے ہیں کہ آپ لوگ کیوں وقت ضائع کر رہے ہیں۔"
میں نے کہا "ہم مشورہ کر رہے ہیں۔"
"ڈی ایس پی صاحب نے بھی مشورہ کر لیا ہے" انسپکٹر نے طنز آمیز پُر تمسخر انداز میں کہا "پولیس کمشنر صاحب سے۔"
"اور انہوں نے کیا فرمایا ہے؟" میں نے بھی انسپکٹر ہی کے لہجے میں کہا۔
"انہوں نے کہا ہے کہ گورنر بھی آ جائے تو پوری تصدیق اور تفتیش کئے بغیر ناگ منی کو نہ چھوڑا جائے اور اگر ہمیں یقین ہے کہ وہ کوئی اور نہیں تو صبح اسے بمبئی بھیج دیا جائے۔ اس کے لئے علاقے کی ساری نفری کارڈ لی جائے۔"
میں نے کہا "اچھا جناب۔ پھر ہم بھی صبح تک انتظار کرتے ہیں۔"
مہتا نے کہا "صبح ہری چند بھی ساتھ چلے گا۔ تم لوگ معاملے کو آگے بڑھانا چاہتے ہو تو ٹھیک ہے۔ بہتر تھا کہ یہ بات یہیں ختم ہو جاتی۔ بعد میں مت کہنا کہ تمہیں صاحب نے مروا دیا۔"
ہم پھر اندر گئے اور اسی اعتماد کے ساتھ بیٹھ گئے۔ ہم نے اپنی صورت یا رویے سے شکست خوردگی یا مایوسی کی علامت تک ظاہر نہیں ہونے دیں۔
ڈی ایس پی مسکرا رہا تھا "کیا بات ہے۔"
"بات کچھ نہیں" مہتا نے کہا "تم نے بہت جلدی کی اپنے افسر اعلیٰ سے احکامات حاصل کرنے میں۔ ظاہر ہے اس وقت ہری چند بھی تمہیں قائل نہیں کر سکتا۔ اب تو جو ہو گا صبح ہو گا اور بمبئی جا کے ہو گا۔"
مہتا کی بات جاری ہی تھی کہ میں نے ریوالور نکال لیا۔
"بمبئی بہت دور ہے اور صبح بھی دور ہے" میں نے کہا "جلدی اگر ڈی ایس پی صاحب کر سکتے ہیں تو ہم ان سے زیادہ جلد باز ہیں۔"
ایک لمحے کے لئے انسپکٹر اور ڈی ایس پی کو بے یقینی نے دم بخود کر دیا۔ میری یہ حرکت ان کے لئے اتنی غیر متوقع تھی کہ وہ پلک جھپکانا بھی بھول گئے تھے۔
"یہ۔ یہ کیا ہے" آخرکار ڈی ایس پی نے کہا۔
"یہ ریوالور ہے" میں نے اسے مطلع کیا "بالکل ویسا ہی جیسا تمہاری جیب میں ہو گا یا تمہارے انسپکٹر نے اپنی کمر سے باندھ رکھا ہے۔ اس کے اندر گولیاں بھی ویسی ہی ہیں اور اگر یہ کسی کے دل جگر میں اتر جائیں تو وہ ڈائریکٹ پرلوک کی فلائٹ پکڑ لیتا ہے۔"
"مہتا صاحب۔ واٹ از دس۔ آپ جانتے ہیں اس کا انجام" ڈی ایس پی نے برہمی سے کہا۔
مہتا کی صورت پر بھی ہوائیں اڑنے لگی تھیں۔ اسے مجھ سے یہ امید ہرگز نہ تھی کہ میں ڈی ایس پی پر ریوالور تان لوں گا۔ اس نے مجبوری میں ہمارا ساتھ دیا تھا اور پھر ہمارے درمیان ایک سودا

ہوگیا تھا جو بقائے باہمی کے لئے ضروری تھا۔ اس نے ہمارا ساتھ دے کر خود کو قانون کے خلاف محاذ آرائی میں شریک کرلیا تھا۔ اگر گل آسانی سے نکل آتی تو کچھ بھی نہ ہوگا مگر اب وہ دونوں طرف سے مشکلات کے شکنجے میں پھنس گیا تھا۔ اس کے جرائم کا ثبوت ہماری تحویل میں تھا اور خود اس نے غلط بیانی سے کام لے کر قانون کی تحویل سے ایک خطرناک مجرم کو چھڑانے کی کوشش کی تھی۔ اس نے جو بیان دیا تھا اس کا گواہ انسپکٹر، ڈی ایس پی کے علاوہ اس تھانے کا پورا عملہ تھا۔ یہ جھوٹ ظاہر ہوجانے کے بعد ہری چند اس کو پہچاننے سے بھی انکار کرسکتا تھا۔ مہتا کو اس علاقے میں رہنا تھا اور بد بختی یا شامت اعمال نے اس کے پورے خاندان کی عزت کو خاک میں ملانے کا اہتمام کردیا تھا۔ اس کے اپنے بیان کی رو سے ناگ منی اس کی خالہ زاد بہن ثابت ہوتی تھی تو میں خالہ زاد بھائی۔

"یہ۔ بے وقوفی مت کرو" مہتا نے بھی ہکلا کر کہا "تم پاگل ہوگئے ہو کیا۔"

میں نے کہا "شٹ اپ۔ اپنی جان بچانی ہے تو سچ بتادو ڈی ایس پی کو کہ ہم تمہیں زبردستی یہاں لائے تھے اور تم جھوٹ بولنے پر اس لئے مجبور ہوئے تھے کہ ہم نے تمہیں تمہارے خاندان سمیت ملیامیٹ کرنے کی دھمکی دی تھی۔"

"یہ۔ یہ ٹھیک ہے ڈی ایس پی صاحب" مہتا کا ایک دم نروس بریک ڈاؤن ہوگیا "اس نے صبح سے پکڑ رکھا ہے مجھے....."

"ٹیک اٹ ایزی مسٹر مہتا" ڈی ایس پی بولا "مجھے پہلے ہی شک تھا۔ میں سب سمجھ گیا ہوں۔"

"یہ اچھا ہے کہ تم نے سمجھنے میں دیر نہیں لگائی۔ اب اپنے ہاتھ اوپر اٹھالو اور دیوار کی طرف منہ کرکے کھڑے ہوجاؤ۔ حلق سے آواز نکالی تو یاد رکھنا کہ میرا یہ ہتھیار ایسی آوازوں سے بہت الرجک ہے۔ خود گولی چل جائے گی۔ نہ تمہارا کوئی ماتحت اس گولی کو تمہارے دل میں اترنے سے پہلے روک سکتا ہے اور نہ تمہارے پولیس کمشنر کا حکم۔"

وہ چند سیکنڈ بعد آہستہ آہستہ اٹھے اور دیوار سے لگ کے کھڑے ہوگئے۔ میں نے مہتا کو حکم دیا کہ ان کے ریوالور نکالے اور میری طرف میز پر ڈال دے۔

"ریوالور ہاتھ میں آجائے تو یہ مت سمجھنا کہ تم اسے استعمال بھی کرسکو گے۔" میں نے مہتا سے کہا "شیش ناگ گولیوں کی بوچھاڑ سے گزرا ہے مگر اس کے جسم پر آج تک خراش نہیں آئی۔"

"تم شیش ناگ ہو۔" انسپکٹر نے دہشت زدہ ہو کے کہا۔

"جب میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میں اس کا بھائی ہوں۔ تمہیں اس وقت سمجھ لینا چاہئے تھا کہ ناگ منی کا بھائی شیش ناگ کے سوا کوئی نہیں ہوسکتا" میں نے حقارت سے کہا۔

"میں نے آپ سے کہا تھا سر" انسپکٹر نے ڈی ایس پی کی طرف دیکھ کے فریاد کی۔

"تم نے یہ نہیں کہا تھا ایڈیٹ" ڈی ایس پی بگڑ کے بولا۔

"آپ نے غور سے دیکھا ہوتا سر تو آپ خود بھی فرق محسوس کرتے۔ اس کی داڑھی بڑھی ہوئی ہے اور......"

"مہتا نے کہا تھا کہ کار میں میری فیملی ہے" ڈی ایس پی نے غلطی کا اعتراف کرنے کے انداز میں کہا "اس کے اعتماد سے دھوکا کھا گیا تھا میں۔"

میں نے ان دونوں کے ریوالور اٹھا کے جیب میں ڈالے۔ پھر آگے بڑھ کے میں نے ڈی ایس پی کو اپنی طرف کھینچ کے ریوالور کی نالی اس کی گدی پر رکھ دی۔

"اپنے اس ماتحت کو حکم دو کہ میری بہن کو فوراً یہاں لے آئے" میں نے کہا

احمق نظر آنے والے ڈی ایس پی نے بڑی پھرتی سے میرے سینے پر کہنی ماری اور پھر ایک ٹانگ پیچھے اٹھا کے بوٹ کی ایڑی سے میری ٹانگوں کے درمیان ضرب لگائی۔ سینے پر لگنے والی ضرب سے ہی میرا سانس رکنے لگا تھا۔ دوسری چوٹ نے میرے وجود میں آتش فشاں جگا دیا مگر میں نے ہمت سے کام لیا۔ اگر اس وقت ہمت ہار دیتا تو شاید زندگی کی بازی ہار دیتا۔ میں نے ڈی ایس پی کے سر پر ریوالور کا دستہ مارا اور وہ منہ کے بل گر گیا۔

اپنے افسر کو حرکت میں دیکھ کر انسپکٹر کی غیرت نے بھی جوش مارا۔ اس نے چلا کے کسی کو آواز دی اور مجھ پر ٹیلی فون کھینچ مارا۔ میں نے سر تو بچالیا مگر فون میرے کندھے پر لگا اور پھر کھڑکی کے شیشے پر۔ شیشہ ٹوٹتے ہی رات کا سکوت منتشر ہوگیا۔ انسپکٹر کو میں نے ایک لات مار کے الٹ دیا اور وہ میز کے اوپر سے دوسری طرف جا گرا۔ ابھی وہ اٹھا بھی نہ تھا کہ میں نے دوسری لات مار کر میز الٹ دی اور میز کا کنارا اس کے سر پر لگا۔ پھر وہ میز کے ساتھ ہی ڈھیر ہوگیا۔

باہر سے نازو کی آواز کے ساتھ دو فائر ہوئے اور کوئی موت کے کرب میں چیخنے لگا۔ سب انسپکٹر دوڑتا ہوا اندر آیا اور اندر کا نقشہ دیکھ کر دروازے میں ہی منجمد ہوگیا۔

میں نے اسے ریوالور سے اشارا کیا "اندر آجاؤ۔ ہاتھ اوپر رکھنا۔ مہتا۔ اس سے ہتھیار لے لو۔"

لرزہ بر اندام مہتا نے حکم کی تعمیل کی۔

"میری بہن کو لاؤ" میں نے سب انسپکٹر کو حکم دیا "ناگ منی کو۔ چابیاں کس کے پاس ہیں۔"

سب انسپکٹر نے ہونٹوں پر زبان پھیر کے انسپکٹر کی طرف اشارہ کیا۔ اس کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں اور میں اس کی آنکھوں میں وہی دہشت دیکھ رہا تھا جو شیش ناگ کے نام سے منسوب تھی۔ اسے ہلاک ہوئے زمانہ گزر چکا تھا مگر نام کی دہشت زندہ تھی اور میں اس سے پورا فائدہ اٹھا رہا تھا۔

باہر کی صورت حال کے بارے میں مجھے کوئی تشویش نہیں تھی۔ غالب اور نازو بہ آسانی سب سے نمٹ سکتے تھے اور غالباً وہ اپنا کام کر چکے تھے کیوں کہ باہر بالکل سکون تھا۔ سب انسپکٹر نے چابیاں نکالنے کے لئے اپنے افسر کو میز کے نیچے سے نکالا اور اس کی جامہ تلاشی لی۔ چابیوں کا ایک گچھا اس کی پتلون کی بیلٹ کے ساتھ منسلک تھا۔ پھر وہ میرے آگے آگے چلنے لگا۔

تھانے کی عمارت تین کمروں اور ایک برآمدے پر مشتمل تھی۔ برآمدہ پچھلے حصے میں تھا جس کو سلاخیں لگا کے حوالات میں تبدیل کردیا گیا تھا۔ دو کمروں میں دفتر قائم تھے۔ بہت سی چارپائیاں پڑی ہوئی تھیں اور وہاں دن میں ڈیوٹی دینے والے عملے کے دو افراد سوئے پڑے تھے۔

حوالات میں اندھیرا تھا اور بدبو تھی۔ گل اس کے فرش پر بڑی قابل رحم حالت میں پڑی ہوئی تھی۔ سب انسپکٹر نے بلب جلایا تو اس نے آنکھیں کھول کے مجھے دیکھا اور ایک چیخ مار کے اٹھ بیٹھی۔ اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پیروں میں بیڑیاں تھیں اس کا چہرہ سوجا ہوا تھا اور آنکھوں کے نیچے گہرے نیل پڑے ہوئے تھے۔ تفتیش کرنے والوں نے اپنی فطرت کی درندگی اور بے حیائی کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہوئے اس کے لباس کو بھی تار تار کردیا تھا۔ میں آج تک یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ پولیس کے محکمے میں جانے والوں میں یہ تبدیلی آخر کیوں آجاتی ہے اور کیسے۔ اس لئے کہ پہلے وہ ہمارے اور آپ جیسے عام لوگ ہوتے ہیں جو کسی پر ظلم ہوتا ہی نہیں دیکھ سکتے۔ جن کی نظریں پرائی بہو بیٹیوں کے لئے احترام ہوتا ہے اور قانون کا خوف۔ پھر آہستہ آہستہ ان کے قلب بدلتے ہیں۔ وہ بے حسی کے ساتھ انسان پر تشدد کے انسانیت سوز حربے آزماتے ہوئے کچھ محسوس نہیں کرتے۔ شاید اس سے لطف اندوز ہونے لگتے ہیں۔ ہر عورت ان کے سامنے فقط وہ مخلوق رہ جاتی ہے جس پر ظلم میں لذت کا عنصر بھی شامل کیا جاسکتا ہے اور وہ جو قانون کی محافظت کا حلف اٹھاتے ہیں وہی سب سے بڑے قانون شکن ہوجاتے ہیں۔

یکلخت میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ میں نے اے ایس آئی سے چابی چھین لی اور اسے کئی بار اٹھا اٹھا کے لوہے کی سلاخوں پر مارا۔ میری زبان نے اسے جو گالیاں دیں وہ میری آتش غضب کی صرف چنگاریاں تھیں۔ اصل آگ تو شاید گل پر یہ تشدد روا رکھنے والوں کا خون بھی نہیں بجھا سکتی تھی۔

"تمہارا وہ افسر۔ ذلیل کتا۔ بے ضمیر شیطان۔ اس نے کہا تھا کہ ناگ منی نے خود ہی سب کچھ مان لیا ہے۔ کسی نے اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ وہ پولیس کو دھمکیاں دے رہی تھی۔"

انسپکٹر کی چیخوں سے تھانہ گونجنے لگا "میں نے ——— میں نے کچھ نہیں کیا۔ آپ پوچھ لیں" وہ چلانے لگا مگر میں پاگل ہوگیا تھا۔ میں نے اس کی ایک نہیں سنی۔ اس کا سر پھٹ گیا اور چہرہ سلاخوں پر لگنے سے مسخ ہوگیا۔ آخر کار وہ گرا تو پھر نہ اٹھا۔

مہتا نے کانپتے ہوئے کہا "چلو۔ دیر مت کرو۔ یہ مر گیا تو خواہ مخواہ قتل کا الزام آجائے گا۔"

میں نے پھنکارتے ہوئے کہا "میں ایسے دس کتوں کو مار کے بھی سمجھوں گا کہ اپنی بہن کے جسم پر لگے ہوئے ایک زخم کا حساب بھی برابر نہیں ہوا ہے۔"

حوالات کا تالا کھول کے میں اندر گیا تو گل مجھ سے زنجیروں سمیت لپٹ گئی۔ اس عقوبت خانے میں فولاد کی بے رحم کھنک کے ساتھ اس کی دیوانگی آمیز ہسٹریائی چیخوں نے مجھے بھی رلا دیا۔

"بس میری جان۔ میری بہن۔ بس۔ میری 'بہادر بہن' مت رو۔ مجھے کچھ دیر ہوگئی" میں نے اس کے ماتھے کو بالوں اور آنسو بھری آنکھوں کو پیار سے چومتے ہوئے کہا۔ اچانک اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ اسس کے ہاتھوں کی مٹھیاں بند ہوگئیں اور دانت آپس میں جڑ گئے میں نے چابیوں کے گچھے میں سے ہتھکڑی کی چابی تلاش کی۔ اس کے بعد بیڑیوں کو کھولا اور پھر بے ہوش گل کو اٹھا کے باہر لے گیا۔

شور سن کے سونے والے اٹھ گئے مگر جب انہوں نے میری دیوانگی دیکھی اور اپنے افسر کی حالت دیکھی تو وہ پھر دم سادھ کے لیٹ گئے۔ میں نے لات مار کے ایک کو جگایا اور اس کی چادر چھین لی۔ اس چادر میں گل کو لپیٹ کر میں اس کمرے تک آیا جہاں انسپکٹر اور ڈی ایس پی ابھی تک بے سدھ پڑے ہوئے تھے۔

میں ایک صراحی سے پانی انڈیل رہا تھا کہ مہتا چلایا مگر پلٹ کر دیکھنے اور سنبھلنے سے پہلے ہی ایک ڈنڈے کی ضرب میرے سر پر پڑی۔ میں نے اندھیرے میں ہاتھ پھیلائے اور سہارا لینے کی کوشش کی۔ یہ ڈی ایس پی تھا جو موقع کے انتظار میں سانس روکے پڑا ہوا تھا اور اس نے میرے سر پر لکڑی کا سیاہ رولر مارا تھا گلاس میرے ہاتھ سے چھٹ گیا اور میں آگے جھکا۔ بے اختیار میں نے چیخ کر غالب کو آواز دی۔ پھر دوسرا ڈنڈا میری گردن کے نیچے پڑا اور میں صراحی پر الٹ گیا۔ آخری آواز جو میں نے سنی وہ ڈی ایس پی کی گالیاں تھیں۔

میں ہوش میں آیا تو سب کچھ وہی تھا۔ میں وہیں لیٹا ہوا تھا جہاں گرا تھا اور نازو میرے منہ پر پانی کے چھینٹے مار رہی تھی۔ میرے لاشعور میں ہنگامی صورت حال کے خطرات کا خوف تھا جس نے مجھے اتنے کم وقت میں پھر ہوش کی دنیا میں کھینچ لیا تھا۔ آنکھیں کھولتے ہی میں اٹھ بیٹھا اور اپنے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کے کھڑا ہوگیا۔ زمین میرے قدموں کے نیچے متحرک لگتی تھی اور میری ٹانگیں میرے جسم کے بوجھ سے لڑکھڑا رہی تھیں۔ نازو نے مجھے سہارا دیا اور کرسی پر بٹھا دیا۔

پانی کے دو گھونٹ پی کر میں نے کہا "اس حرامزادے نے

اچانک پیچھے سے حملہ کردیا... غلطی میری تھی۔"

"چلو تم نے اتنا تو کیا کہ غالب کو پکار لیا۔ ہم نے تمہاری آواز سن لی تھی۔"

"غالب کہاں ہے؟" میں نے ادھر ادھر دیکھا۔

"وہ مورچہ سنبھالے بیٹھا ہے۔" نازو نے کہا۔

گل بدستور بے ہوش پڑی تھی۔ میری نظر اور آگے گئی تو مجھے ڈی ایس پی نظر آیا اس کا سر ایک دیوار پر ٹکا ہوا تھا اور اس کے خون کے چھینٹے اوپر تک نظر آرہے تھے۔ نازو نے گولی مار کر اس کا خاتمہ کردیا تھا۔ انسپکٹر کی پوزیشن نہیں بدلی تھی لیکن اس کی بے ہوشی میں مکر شامل نہیں تھا۔ اس کا دوبارہ ہوش میں آنا ممکن ہی نہ تھا۔ میز گرنے سے اس کی گردن ٹوٹ گئی تھی۔ ان کی لاشیں دیکھ کر میرے لبوں پر ایک مسکراہٹ آگئی۔ میرے دل میں لگی ہوئی آگ کچھ سرد پڑ گئی۔

مہتا کی حالت سب سے زیادہ خراب تھی۔ اسے معلوم تھا کہ ہم تو فرار ہوجائیں گے بعد میں اس تمام کشت و خون کا خمیازہ وہ بھگتے گا کیونکہ اس نے شیش ناگ کو اندر پہنچایا تھا ورنہ پولیس کا پہرا توڑ کے کوئی جن بھی ناگ منی کو نہیں لے جاسکتا تھا۔ وہ اتنا دہشت زدہ تھا کہ ہم سے کچھ کہتے ہوئے بھی ڈرتا تھا کہ کہیں ہم اس وحشت کے عالم میں اسے بھی ٹھکانے نہ لگادیں۔

"اب کیا کرنا ہے؟" نازو نے کہا۔

"کیا کرسکتے ہیں ہم سوائے فرار ہونے کے۔ ہمارے پاس صبح تک کا وقت ہے۔" میں نے میز کی درازوں کو کھینچ کر کھولتے ہوئے اور اسباب باہر پھینکتے ہوئے کہا۔ آخر کار مجھے اسپرین مل گئی۔ میں نے پانی کے ساتھ چار گولیاں نگل لیں اور باقی جیب میں ڈال لیں۔

باہر جاکے میں نے غالب سے چارج لیا۔ وہ تھانے کی باقی نفری کو دیوار کے ساتھ ایک قطار میں لٹا کے ان کے سر پر ریوالور لئے کھڑا ہوا تھا۔

"تم جاکے گل کو اٹھا لاؤ۔" میں نے کہا "یہ ریوالور مجھے دے دو۔"

"کیسے نکلیں گے ہم؟" غالب نے کہا "اس حلئے میں اور مہتا کی گاڑی میں....."

میں نے کہا "سوائے پولیس کی وردی پہن کر نکلنے کے ہمارے پاس اور کوئی طریقہ نہیں۔ ابھی یہی کرو۔ آگے چل کے دیکھیں گے۔ گاڑیاں دونوں لے لو۔ مہتا کی اور ڈی ایس پی کی۔ عملے کو حوالات میں بند کرکے آفس کو باہر سے تالا لگادو۔"

آدھے گھنٹے میں یہ سب کام ختم ہوگیا۔ حوالات میں چار پولیس مین بے بسی سے بیٹھے رہ گئے۔ ہم نے ان کو ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنا کے چابیاں جیب میں ڈال لی تھیں۔ اس حوالات میں لاشوں کو بھی منتقل کردیا گیا تھا اور جاتے جاتے غالب نے ٹیلی فون کو تار سے الگ کرکے زمین پر دے مارا تھا۔

ڈی ایس پی کی وردی استعمال کے قابل نہیں رہی تھی میں نے وردی انسپکٹر کی پہنی اور کندھوں پر نشانات ڈی ایس پی کے لگائے۔ غالب اور نازو نے سپاہیوں کی وردی پہنی مگر مہتا کو ہم نے عمداً لباس بدلنے پر مجبور نہیں کیا۔ اسے بعد میں اپنے بیان میں رہنا تھا کہ شیش ناگ ڈاکو نے جبراً اور دھمکی سے اس کو مجبور کیا تھا کہ وہ ان کی مدد کرے۔ مہتا اس علاقے کا منفرد آدمی تھا۔ مجھے یقین تھا کہ یہی عذر آخر کار اس کی جان بچائے گا۔

مہتا نے اپنی کار کی ڈرائیونگ سنبھالی اور اس کے ساتھ سیٹ پر نازو نے گل کو گود میں لٹائے رکھا۔ آگے غالب نے کی جیپ کا سائرن آن کیا اور اس کی چھت پر نصب نیلی روشنی گھومنے لگی۔ رات کے دو بجے ہم نے واپسی کا سفر اختیار کیا سمت پھیلی ہوئی ویرانی اور خاموشی ہمارے ساتھ نوحہ خواں رہی خطرات کے عفریت ہمارے تعاقب میں دوڑتے رہے اور آنے والے لمحے کا خوف ہماری راہ میں حائل رہا۔ غالب نے جیپ کی رفتار کو اسّی میل پر رکھا اور مہتا نے اسی رفتار سے جیپ کا تعاقب کیا۔

ایک بار پھر ہم اس چیک پوسٹ سے گزرے جہاں آتے وقت ہمارے کاغذات دیکھے گئے تھے۔ اب وہاں موجود پولیس پارٹی نے دور سے سائرن کی آواز سن لی تھی اور اندھیرے میں گھومتی نیلی روشنی دیکھ لی تھی چنانچہ وہ بے حد مستعد کھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے ایک ساتھ سلیوٹ کیا اور جیپ گولی کی طرح گزر گئی۔ اتنی تیز رفتاری میں وہ ڈی ایس پی کی صورت کیسے دیکھ سکتے تھے۔ رات بھی ہماری معاون تھی ورنہ دن کے اجالے میں شاید کسی اجنبی چہرے کی ایک جھلک بھی شکوک پیدا کردیتی۔ وردی اور ٹوپی کے ساتھ ڈی ایس پی کی جیپ میں ڈی ایس پی کے سوا کون ہو سکتا تھا۔

مین روڈ پر آجانے کے بعد میں نے کہا "مرزا جی۔ اب جلد از جلد اس جیپ اور ان وردیوں سے نجات پانا ضروری ہے۔"

غالب نے ایک دم بریک لگائے اور جیپ روک دی "اور کوئی حکم" وہ نیچے اتر کے بولا۔

مہتا نے بھی گاڑی روک لی تھی۔ میں اور غالب اس کی طرف لپکے تو اس نے دروازہ کھول دیا۔ میں پہلے ہی طے کرچکا تھا کہ مہتا کی گلو خلاصی کے لئے ہمیں کیا کرنا ہوگا۔ اسے نہ کچھ پوچھنے کا موقع ملا اور نہ کچھ کہنے کا۔ میں نے اچانک ریوالور مار کے اس کو ناک آؤٹ کیا اور جیپ میں ڈال دیا۔

اب غالب نے مہتا کی کار کو دوڑانا شروع کردیا اور آدھے گھنٹے میں ہم تیس چالیس میل دور نکل گئے۔

"اس میں فیول ختم ہونے والا ہے" غالب نے کہا "ہونے دو۔ یہ بڑی نیچرل سی بات ہوگی کہ ڈاکو مہتا کو مار کے اسی کی گاڑی لے گئے۔ جہاں فیول ختم ہوا وہاں وہ گاڑی بھی چھوڑ دی۔ اس طرح مہتا کی مجبوری اور بے گناہی شبے سے بالاتر ہوجائے گی۔"

نازو نے کہا "یہ تو ہوش میں آنے کا نام ہی نہیں لے رہی"

"فکر مت کرو۔ پہلے ہم خطرے کی حدود سے نکل جائیں۔ پھر اس کا علاج بھی کرلیں گے۔"

گاڑی نے ایک جھٹکا لیا تو میں سمجھ گیا کہ پٹرول ختم ہوچکا ہے۔ چند قدم کے بعد دوسرا جھٹکا لے کر انجن کھانسنا شروع ہوگیا۔ غالب نے گاڑی کو سڑک سے اتار کے کھڑا کرلیا۔

"تم بیٹھو۔ ہم دوسری گاڑی کا بندوبست کرتے ہیں۔" میں نے اور غالب نے سڑک پر اتر کے کہا۔

ہم نے دو کاروں کو روکا مگر ان میں عورتیں اور بچے بھی تھے چنانچہ ہم نے رسمی طور پر کاغذات چیک کئے اور انہیں جانے دیا۔ تیسرا شامت کا مارا تنہا تھا۔ ہم نے گاڑی روک کے اس سے کاغذات طلب کئے تو وہ اکڑ گیا۔

"میں ڈاکٹر ہوں۔"

"اس وقت تم ایک ڈرائیور ہو" میں نے کہا "ڈرائیونگ کے لئے بھی لائسنس ہونا چاہیے۔ جیسے میڈیکل پریکٹس کے لئے۔"

اس نے گاڑی کے کاغذات پہلے ہی پیش کردیئے تھے جو بالکل ٹھیک تھے مگر ڈرائیونگ لائسنس کے معاملے میں وہ مار کھا گیا۔

"دیکھو۔ دراصل میں جلدی میں گھر سے نکلا تھا۔ ایک مریض کو دیکھنے گیا تھا اس لئے لائسنس ساتھ لینا بھول گیا تھا۔"

"اب مریض کو دیکھ کر واپس گھر جارہے ہو؟"

"ہاں" ڈاکٹر نے کہا۔

"پھر ہم ساتھ چلتے ہیں۔ گھر پر تو ہوگا نا لائسنس" میں نے دروازہ کھول کے ساتھ بیٹھتے ہوئے کہا۔

"واٹ نان سنس" وہ چراغ پا ہو کے بولا "تم چالان کرسکتے ہو میرا۔ گیٹ آؤٹ۔"

مگر گیٹ آؤٹ ہونے کی بجائے غالب بھی پیچھے بیٹھ گیا "گاڑی چلاؤ" میں نے غرا کے کہا "اور چلو تھانے۔"

وہ ایک دم گھبرا گیا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور بولا "بلاوجہ معمولی سی بات کو بڑھانے کا فائدہ۔ یہ لو" اس نے جیب سے پرس نکالا۔

میں نے پولیس والوں کی طرح بے شرمی سے خوشی کا اظہار کیا "ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ معاملہ آپس میں طے ہوجائے لیکن یہاں نہیں۔ سڑک پر لوگ دیکھ رہے ہیں۔"

وہ حیران ہوا کیوں کہ اکا دکا گزرنے والی گاڑیوں کے سوا دیکھنے والا کوئی نہیں تھا "جیسی مرضی تمہاری" اس نے اترتے ہوئے کہا اور میرے ساتھ سڑک سے کچھ دور چلا گیا۔

"لاؤ۔ چابیاں مجھے دو" میں نے ایک جگہ رک کے ہاتھ پھیلایا۔

"کیا مطلب....."

مطلب سمجھانے کے لئے میں نے اس کے سر پر ریوالور مارا اور وہ وہیں گر گیا۔ چابی لینے کے بعد مجھے اس کے کپڑوں کا خیال آیا مجھے احمد کی پگڑی محمود کے سر والا محاورہ بھی یاد آیا اور میں نے دس منٹ میں اس کو ڈی ایس پی بنا کے خود اس کے کپڑے بھی پہن لئے۔

غالب نے اتنی دیر میں گل اور نازو کو ڈاکٹر کی کار میں شفٹ کر دیا تھا۔ میں نے ڈی ایس پی کی وردی والے ڈاکٹر کو مہتا کی کار میں ڈالا اور ڈاکٹر کی کار کو واپس موڑ لیا۔

"یہ ہم نے کچھ ٹھیک نہیں کیا۔ آئندہ یہ ڈاکٹر کبھی رات کے وقت کسی مریض کو دیکھنے کے لئے نہیں جائے گا" میں نے کہا۔

"وہ ڈاکٹر نہیں تھا" غالب نے سوچ کے کہا۔

"یہ کیسے معلوم ہوا تمہیں؟"

"ڈاکٹر جب ایمرجنسی میں کسی مریض کو دیکھنے جاتے ہیں تو خالی ہاتھ نہیں جاتے۔ اسٹیتھوسکوپ کے علاوہ ان کے پاس ایک میڈیکل بیگ ہوتا ہے۔"

"میڈیکل بیگ ہوگا گاڑی میں۔"

"نہیں۔ آگے پیچھے کہیں بھی نہیں ہے۔ ڈکی میں تو ہونے سے رہا" غالب نے کہا۔

میرا احساس شرمندگی کچھ کم ہوا "پھر خواہ مخواہ رعب جھاڑ رہا تھا۔"

"عموماً ڈاکٹروں اور اخبار والوں سے پولیس رعایت کرتی ہے۔ ڈاکٹر ہمیں کبھی رشوت پیش نہ کرتا" غالب بولا اور اس کا گلوز کمپارٹمنٹ کھول کے دیکھنے لگا۔

اندر سے بہت کچھ نکلا۔ غالب نے سامنے والی لائٹ جلائی اور کاغذات کو غور سے دیکھنے لگا۔ وہ ایک البم اور ایک نوٹ بک کے صفحات پلٹتا جارہا تھا اور سر ہلا رہا تھا۔ نوٹ بک میں چند وزیٹنگ کارڈز بھی تھے۔

"یہ تو کمال کا آدمی تھا بھئی" غالب بولا "تم بھی دیکھو۔"

"میں گاڑی چلاتے وقت صرف سڑک پر دیکھتا ہوں۔ تم ویسے ہی بتادو۔"

"مجھے دکھاؤ کیا ہے" نازو نے پیچھے سے کہا۔

"ہر چیز عورتوں کے دیکھنے کی نہیں ہوتی۔ آرام سے بیٹھو" غالب نے اسے ڈانٹا اور پھر مجھ سے مخاطب ہوگیا "اس ریسرچ کے نتیجے میں جو میں نے ابھی ابھی کی ہے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ ایک بلیک میلر تھا۔"

"اتنے کم وقت میں ریسرچ مکمل ہوگئی" میں نے کہا۔

"اگر تمہیں ایک نوٹ دیا جائے تو تم کتنی دیر میں ریسرچ کرکے بتاؤ گے کہ وہ سو کا نوٹ ہے یا پچاس کا؟ کس ملک کی کرنسی ہے اور اصلی ہے کہ نقلی" غالب نے کہا "البم میں کچھ تصاویر ہیں۔ نام اور تاریخ کے ساتھ۔ نوٹ بک میں کچھ پتے ہیں۔ ان میں مجھے

وہی نام نظر آئے اور کچھ رقوم کی تفصیلات اور دیگر حوالے۔"

میں نے گاڑی کو ناگپور سے پہلے ایک بغلی سڑک پر موڑ لیا۔ سنگ میل سے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ ناگ پور بیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہے اس وقت صبح کے چار بجے تھے اور ابھی ہمارے اطراف میں رات پوری طرح محیط تھی۔ آخر شب کا چاند نکل آیا تھا چناں چہ میں ہیڈ لائٹس بجھا کے گاڑی چلاتا رہا۔ سڑک پر تقریباً پانچ میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد میں نے ایک بورڈ دیکھا یہ کوئی ڈیری فارم تھا۔

میں نے کار کو کچے راستے پر اتار دیا اور ڈیری فارم کے پیچھے لے گیا۔ پھر میں اور غالب اتر کے واپس گئے اور سامنے سے ڈیری فارم میں داخل ہوئے۔ تین طرف بھینسوں کے لئے نیچی چھت والے شیڈ بنے ہوئے تھے۔ چوتھی طرف ایک مکان کے عقبی حصے کی کھڑکیاں تھیں۔ یہ غالباً ڈیری فارم کے مالک یا مینیجر کا گھر تھا۔ دائیں جانب سے ایک گلی سی سامنے والے حصے کی طرف جاتی تھی۔ اندر خاموشی تھی اور تاریکی۔ میں اور غالب چوروں کی طرح گلی سے گزرے جو شاید پانچ فٹ چوڑی تھی۔ اس میں لمبائی کے رخ ایک ڈوری بندھی ہوئی تھی جس پر کپڑے دھو کو سوکھنے کے لئے ڈالے گئے تھے۔

میں نے غالب کو روک لیا "پہلے کپڑے بدل لیں یہاں پھر کسی اور گھر میں جا کے پناہ لیں۔"

غالب نے مجھ سے اتفاق کیا "ایسے پولیس کے کپڑوں میں کوئی بھی ہمیں خوش آمدید نہیں کہے گا۔"

میں نے اطمینان سے نازو اور گل کے لئے کپڑوں کا انتخاب کیا۔ ساری بلاؤز اور پیٹی کوٹ۔ اس علاقے کا عام پہناوا یہی تھا غریب عورتیں چولی گھاگھرا استعمال کرتی تھیں۔ شلوار قمیص کا استعمال نہ ہونے کے برابر تھا۔

"میرے لئے تو بس یہ نائٹ سوٹ ملا ہے۔"

میں نے کہا "رات کے وقت نائٹ سوٹ ہی پہنا جاتا ہے سوٹ کہاں ملے گا۔"

ہم جس طرح دبے پاؤں گئے تھے اسی طرح واپس نکل آئے۔ بھینسوں کے ڈکرانے کے سوا وہاں کوئی آواز نہ تھی۔ اگر کوئی چوکیدار تھا تو رات کے آخری پہر میں کہیں لمبی تان کے سو گیا تھا۔ غالب نے تو نائٹ سوٹ وہیں بدل لیا تھا اور پولیس کی وردی بغل میں دبا کے لے آیا تھا۔ میں نے اسے مشورہ دیا کہ وردیوں کو اس علاقے میں پھینکنا مناسب نہیں۔ دو چار کپڑوں کی چوری سے تو کوئی فرق نہیں پڑے گا مگر اسی جگہ پولیس کی وردیاں بھی پڑی ہوئی ملیں گی تو ہمارے راستے کی نشان دہی ہو جائے گی۔ جس گاؤں کے ایک تھانے میں ڈی ایس پی سمیت تین افسروں کا قتل اور شیش ناگ کا اپنی بہن ناگ منی کو چھڑا لے جانا ایسے واقعات نہیں تھے کہ پولیس رسمی کارروائی پر اکتفا کرتی۔ ناگ منی کے پکڑے جانے کی

اطلاع بمبئی کے پولیس کمشنر تک پہنچ چکی تھی۔

نازو نے کار کے پیچھے رہ کے ساری باندھی اور ہم اپنا رخ دوسری طرف کئے پُرسکون رات کے افق کو دیکھتے رہے اور لمبے لمبے سانس لے کر اپنے اعصاب کے لئے فضا سے سکون کشید کرتے رہے۔ میں نے ایک سگریٹ جلائی مگر وہ مجھے اتنی بدذائقہ لگی کہ میں نے ایک کش لے کر پھینک دی۔

گل کی بے ہوشی ختم ہونے میں نہیں آرہی تھی۔ غالب کا خیال تھا کہ اتنا تشدد برداشت کرنے کے بعد یہ بے ہوشی کا وقفہ جسمانی توانائی کی بحالی کے لئے ضروری تھا اور جیسے ہی ہم کہیں رکنے کے قابل ہوئے گل کو ہوش میں لانے کے لئے کسی دوا کی نہیں صرف گرم چائے یا دودھ ہی کافی ہو گا۔

"گرم چائے کا نام مت لے بھائی" میں نے کہا اور اپنے ہاتھ پھیلا کے دائیں بائیں گھما کے جسم پر طاری ہونے والی تھکن اور سستی کو دور کرنے کی کوشش کی۔ میں نے بہت تیز گاڑی چلائی تھی اور دو گھنٹے میں ڈیڑھ سو میل کا فاصلہ ضرور طے کیا تھا۔ اب یہ ذمے داری میں نے غالب کو سونپی۔

"دو چار میل کے بعد یہ گاڑی بھی چھوڑ دیں گے ہم" میں نے کہا۔

"اور اس کے بعد؟"

"ہم ناگپور کی مضافات میں ہوں گے" میں نے کہا "ہمارے حق میں یہی بہتر ہے کہ شہر میں داخل ہونے سے گریز کریں۔ کیا پتا بعد میں جل گاؤں کے تھانے میں کیا ہو۔ ممکن ہے کوئی ضرورت کے تحت یا گشت کرتا ہوا پہنچا ہو تو اس نے سب کو آزاد کر دیا ہو۔ یہ پولیس کے لئے انتہائی رقت آمیز شکست ہی نہیں ادائے فرض میں کوتاہی کی ایسی مثال ہے جس پر پولیس کمشنر سب کو برطرف کر دے گا۔ وہ پوری کوشش کریں گے کہ ہمیں پھر پکڑ لیں۔"

"اب یہ ناممکن ہے۔"

"ناممکن کچھ نہیں ہوتا مرزا جی اگر تقدیر ساتھ چھوڑ دے۔" میں نے کہا "ہم جگہ جگہ اپنی نشانیاں چھوڑ کے آرہے ہیں۔ مثلاً جیپ میں مہتا پڑا ہوا ہے۔ اس کے بعد جس سے ہم نے کار چھینی تھی وہ بھی کہیں تو فریاد لے کر جائے گا۔ یہ کار دریافت ہو گئی تو ثابت ہو جائے گا کہ ہم ناگپور میں ہیں۔"

"پھر کیوں نہ اس کار کو غائب کر دیں۔"

"کیسے غائب کر دیں۔ جادو سے؟" نازو نے کہا۔

"جادو آتا مجھے تو اب تک تمہیں غائب کر چکا ہوتا" غالب نے کہا "یا خود غائب ہو جاتا اور پھر ایسے آتا کہ تمہارے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوتی۔"

"یہ گاڑی کو آگ لگا کے تباہ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں اگر چھپانے کے لئے کوئی جگہ مل جائے۔"

"مل جائے گی" غالب نے کسی بروکر کی طرح کہا "کرایہ ایک

بازار سے ہو گا۔"

گاڑی ایک کچے راستے پر اتر گئی۔ ایک فرلانگ دور کسی کسان کا کچا مکان نظر آرہا تھا۔ اس کا کچا احاطہ خاصا وسیع تھا اور گارے سے بنی یہ چار پانچ فٹ اونچی بدوضع دیوار حفاظت کے لئے نہیں حد بندی کے لئے بنائی گئی تھی۔ اس میں آٹھ دس فٹ جگہ کو ایک گزرگاہ کے لئے چھوڑ دیا گیا تھا۔

غالب نے گاڑی روک دی "خواتین یہاں اتر جائیں"

"میں اکیلی گل کو نہیں اٹھا سکتی" نازو نے کہا۔

"نکمی لڑکی۔ زبان چلانے کے سوا بھی کچھ کر سکتی ہو تم" غالب نے نیچے اتر کے کہا۔

"یہ موقع نہیں ہے ورنہ میں بتاتی تمہیں" نازو نے کہا "کہ اور بہت کچھ کر سکتی ہوں میں۔"

میں نے گل کو کچھ فاصلے پر ایک درخت کے نیچے لٹا دیا "ہم ابھی آتے ہیں دو منٹ میں" میں نے کہا۔

اسی وقت گل نے کراہ کے کہا "بھائی سکندر۔ مجھے چھوڑ کے مت جاؤ۔"

نازو نے خوش ہو کے کہا "گل۔ دیکھو میں نازو ہوں۔" میں نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا "میں کہیں نہیں جا رہا ہوں۔ گل ہم سب تمہارے پاس ہیں۔ بس تھوڑی دیر کی بات ہے۔ پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

میں اٹھنے لگا تو گل نے میرا ہاتھ پکڑ لیا "تم جا رہے ہو"

میں نے کہا "نہیں۔ میں تمہارے پاس ہوں۔"

"وہ پھر پکڑ لیں گے مجھے؟" گل کانپنے لگی۔

"یہاں کوئی نہیں آسکتا۔ خدا کے لئے کچھ ہمت سے کام لو۔ میں ابھی آتا ہوں۔ نازو تمہارے پاس ہے"

"مگر تم کہاں جا رہے ہو" گل چلائی۔

میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا "گل۔ میں چائے لینے جا رہا ہوں تمہارے لئے۔ وہ دیکھو سامنے ہوٹل ہے۔ گرم گرم چائے پیو گی تو طبیعت ٹھیک ہو جائے گی تمہاری۔"

نہ جانے اس نے اندھیرے میں کیا دیکھا اور کیا سمجھا لیکن میرا جھوٹ کام کر گیا۔ وہ خاموش ہو گئی۔ غالب اتنی دیر میں کسان کو بیدار کر چکا تھا۔ صبح کے ساڑھے چار بجے تھے اور وہ سحر خیز دیہاتی ویسے بھی اٹھنے ہی والا تھا۔

گل کی آواز پر وہ سیدھا ہماری طرف آیا۔ اس نے ٹھیٹھ دیہاتی لب و لہجے میں مقامی بولی میں کہا "یہ کون عورتیں ہیں بابو صاحب؟"

غالب نے کہا "یہ ہمارے ساتھ ہیں۔ ایک بیوی ہے میری اور دوسری بہن۔"

"یہ تو بیمار لگتی ہے۔"

"ہاں۔ اس کو ناگپور لے جا رہے تھے کہ گاڑی خراب ہو گئی" غالب نے کہا۔

"گاڑی تو خیر ہم رکھ لیں گے" وہ بولا "حفاظت بھی کریں گے۔ مگر آپ شہر کیسے جاؤ گے؟"

میں نے کہا "صبح دیکھیں گے کوئی سواری مل جائے" اس نے افسوس سے سر ہلایا "اور صبح تک کیا اس کو یہاں لٹائے رکھو گے زمین پر۔ کھلے آسمان کے نیچے۔"

غالب نے کہا "اور کہاں لے جائیں۔ یہاں کوئی ہوٹل تو ہے نہیں۔"

"ارے بابو۔ ہم اس خراب گاڑی کو رکھ سکتے ہیں تو کیا بیمار عورت کو نہیں رکھ سکتے" دیہاتی نے کہا "ہمارا گھر چھوٹا ہے مگر دل اتنا چھوٹا نہیں ہے۔ آپ کی شان خراب نہ ہو تو اندر آجاؤ۔ غریب کے گھر میں۔ صبح ہم خود چھوڑ آئیں گے تمہیں جہاں بولو گے۔"

شرمندہ ہو کے میں نے گل کو اٹھایا اور ہم چاروں اس دیہاتی کے پیچھے پیچھے گھر کے کچے آنگن سے گزرے۔ اس کا کچی دیواروں والا مکان دو کمروں پر مشتمل تھا۔ ہمارے داخلی انداز سے اس کا سارا خاندان اٹھ گیا تھا۔ چار ہکا بکا بچے اور ایک بدحواس عورت صبح سے پہلے نمودار ہونے والے مہمانوں کو دیکھ رہے تھے۔ میلے کچیلے بچے نیم برہنہ تھے۔ عورت جوانی میں بوڑھی ہو گئی تھی اور بکھرے بالوں کے ساتھ بھتنی نظر آتی تھی۔ افلاس اور سختیٔ حالات کے ساتھ صرف بدصورتی جنم لیتی ہے خواہ وہ احساس کی ہو۔ اظہار کی یا وجود کی۔

سب بچے جو ایک کمرے میں خشک گھاس کے فرش پر محو خواب تھے اب دوسرے کمرے میں اکٹھے ہو گئے تھے اور یہ کمرا معزز مہمانوں کے لئے وقف کر دیا گیا تھا جس کی کل کائنات مٹی کا ایک گھڑا اور طاق میں رکھے ہوئے چند برتن تھے۔ گل کو گھاس پر لٹانے کے بعد میں نے اور غالب نے باہر کا رخ کیا اور گاڑی کو دھکا لگاتے ہوئے صحن میں لے آئے۔ کسان کے سب بچوں نے اس دلچسپ اور سنسنی خیز کام میں بڑے جوش و خروش سے حصہ لیا۔ ان کے گھر میں ایک کار کا آنا ایسا ہی تھا جیسا کسی فقیر کی جھونپڑی میں راجہ کا معہ تخت کے اتر آنا۔

ہم نے گاڑی کو آخری گوشے میں بھوسے کے ڈھیر کے پاس کھڑا کیا تو سب بری طرح ہانپ رہے تھے۔

غالب نے کہا "ہم شہر سے مستری لے آئیں گے کل پرسوں تک۔ پہلے ہمیں اس کو ہسپتال لے جا کے داخل کرانا ہے۔ اس وقت تک تم گاڑی کا خیال رکھو گے۔"

"آپ بالکل فکر مت کرو جی۔"

"گاڑی بہت نازک اور قیمتی چیز ہوتی ہے" غالب نے کہا "کسی نے اس کو بلاوجہ چھیڑا تو......"

"مجال ہے کسی کی جو قریب بھی آئے۔"

"تمہارے بچے...... کسی کو کچھ نہ بتائیں تو اچھا ہے۔ ورنہ ہر

شخص اسے دیکھنے آئے گا تو تمہارے لئے اس کی حفاظت کرنا مشکل ہو جائے گا۔ کس کس کو منع کرو گے تم۔ بہتر یہ ہو گا کہ تم اس کے اوپر کچھ ڈال دو۔ تاکہ یہ باہر سے نظر ہی نہ آئے۔"

"ترپال ہے میرے پاس" وہ بولا۔

میں نے ایک ہزار روپے نکال کے آگے بڑھا دیئے "یہ بہت بڑی ذمے داری ہے۔ گاڑی کو چھونے بھی نہ پائے کوئی۔"

اس نے ایک بار پھر ہمیں یقین دلایا کہ اگر بچوں نے کسی سے کچھ کہا تو وہ ان کی زبان جلا دے گا اور جھپٹ کر ایک ہزار مٹھی میں دبا لئے۔ پھر اس نے بہ آواز بلند اپنی اولاد کے سامنے اعلان کیا کہ کسی نے بھی باہر کوئی بات کی تو وہ کیا کرے گا۔ دھمکی میں زبان جلانے سے کہیں زیادہ سنگین سانحے کا ذکر تھا مگر ناقابل اشاعت زبان میں۔

ترپال ہمارے سامنے ہی گاڑی پر پھیلا دیا گیا تھا۔ یہ غالباً کھلیان کو بارش سے بچانے کے کام آتا تھا۔ کار بھی اب بھوسے کا ایک ڈھیر ہی لگتی تھی۔ اس کچے گوبر اور گھاس کی بو والے تاریک کمرے میں پہنچ کے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں تعاقب کرنے والے شکاری کتوں سے بچ کے اپنے گھر کے محفوظ حصار میں داخل ہو گیا ہوں جہاں وہ میری بُو تک نہیں پا سکتے۔ سکون اور طمانیت کے ناقابل بیان احساس نے سب کو مغلوب کر لیا تھا۔ میں نے اور غالب نے اپنے جوتے موزے اتارے اور دیوار سے ٹیک لگا کے پاؤں پھیلا ئے۔

ہماری خواہش پر کسان کی بیوی نے چائے بنائی۔ یہ دیسی شکر اور خالص تازہ دودھ کی چائے تھی جس کا ہر گھونٹ مفرح تھا۔ میں نے جیب سے اسپرین نکال کے گل کو دی اور پھر گرم پانی منگوایا۔ نازو نے گرم پانی میں کپڑا بھگو کے گل کے چہرے اور جسم کو صاف کیا۔ وہ کراہتی رہی اور روتی رہی۔ دیہاتی اور اس کی بیوی حیران پریشان ہونے کے باوجود خاموش رہے۔ یہ ایک ہزار روپے ان کو کتنے مہنگے پڑ سکتے ہیں اس کا ابھی انہیں کوئی اندازہ نہ تھا۔

ہم نے صبح کا اجالا پھیلنے تک آرام کیا پھر کسان کی بیوی نے تھوپ کے بھاری بھرکم پراٹھے بنائے اور گھر کے خالص مکھن کا پیالہ بھر کے ہمارے سامنے رکھ دیا۔ وہ ہمیں لسی پلانے کے موڈ میں تھی مگر ہم نے اسی صحت بخش توانائی سے بھرپور چائے کو ترجیح دی جس کے پہلے دور نے ہماری تھکن بھی زائل کی تھی اور کچھ پیٹ بھی بھر دیا تھا۔

نازو نے جذباتی ہو کے کہا "کیسے مہمان نواز لوگ ہیں کہ بچھے جا رہے ہیں۔"

غالب نے کہا "یہ سب ایک ہزار سکہ رائج الوقت کا کمال ہے۔"

"یہ ان کے خلوص پر تہمت ہے" نازو نے کہا "تم جیسے شہری ان سادہ دل لوگوں کو زر خرید سمجھ لیتے ہیں۔"

"دیہاتی اب آدھے شہری ضرور ہیں۔ خصوصاً وہ جو شہر کے قریب رہتے ہیں" میں نے کہا۔

"اتنا ہی مہمان نواز ہوتا تو ایک ہزار پر یوں نہ جھپٹتا جیسے گوشت پر جھپٹتی ہے" غالب نے کہا "یا تم جیسی فضول لڑکی میرے جیسے ہمہ صفت ہیرو پر جھپٹتی ہیں۔"

نازو نے بھی جل بھن کے کہا "جھپٹتی ہے میری جوتی۔"

"بابا میں نے تم سے تو کچھ نہیں کہا۔ تم جیسی لڑکیوں کی مثال دی تھی۔"

"فضول لڑکی تو کہا ہے مجھے۔"

"سچ بولنا میری عادت ہے" غالب نے کہا "اور سچ کڑوا ہوتا ہے۔"

"تم سے زیادہ فضول آدمی ہے کوئی۔"

"ہاں۔ میرا سسر تھا" غالب نے کہا "آج کل بھوت بن کے میرے پیچھے پھرتا ہے۔"

میں نے ہنس کے کہا "کیوں پیچھے پیچھے پھرتا ہے؟"

"کہتا ہے خدا کے لئے میری بھتنی بیٹی سے شادی کر لو۔ بتاؤ کہاں چڑیل ہے وہ۔"

نازو نے چراغ پا ہو کے کہا "بتاؤں تمہیں کیا ہوں میں۔"

"بھئی تم تو نازو ہو۔ نازک اندام۔ ناز آفریں نازلی بیگم۔ میں تمہاری بات تو نہیں کر رہا تھا" غالب نے دانت نکال کے کہا۔

"باہر چلو پھر بتاؤں گی تمہیں" نازو نے دانت پیس کے کہا۔

کسان فیملی ہماری گفتگو بہت غور سے سن رہی تھی۔ چنانچہ میں نے بھی کام کی کوئی بات نہیں کی تھی۔ باہر سورج طلوع ہو چکا تھا مگر کمرے میں ابھی تک لالٹین جل رہی تھی۔ میں نے پہلے سوچا تھا کہ پناہ کے لئے یہ جگہ بری نہیں مگر ہماری روپوشی کسان کے دل میں شک پیدا کر سکتی تھی۔ ویسے بھی یہ بہت مشکل نظر آتا تھا کہ اس کے بیوی بچے صبح دم کار میں آنے والے مہمانوں کا کسی سے بھی ذکر نہ کریں۔ کار وہاں دو چار دن بالکل محفوظ تھی خواہ گرد و نواح کے سب لوگ اس کا دیدار کر جاتے۔ پولیس کا ہمارا سراغ لگاتے ہوئے یہاں تک پہنچنا بھی تقریباً ناممکن تھا۔ شاید ہفتے بھر انتظار کرنے کے بعد کسان پریشان ہو گا اور کسی سیانے کے مشورے پر پولیس کو ہمارے بارے میں کچھ بتانے پر مجبور ہو گا مگر اس وقت نہ جانے ہم کہاں ہوں گے۔

میں نے روانگی کا ارادہ ظاہر کیا تو کسان نے کہا کہ ویسے تو اس کی اپنی بیل گاڑی بھی ہے مگر ہم تانگے میں جانے کو ترجیح دیں تو وہ تانگہ بھی حاضر کر سکتا ہے۔ آدھے گھنٹے بعد وہ کہیں سے تانگہ لایا۔

"چار سو روپے میں مانا ہے" وہ عیاری سے بولا۔

"کتنی دور ہے شہر یہاں سے؟" میں نے کہا۔

"پانچ چھ کوس تو ہو گا۔"

"چار سو تو بہت زیادہ ہیں۔" میں نے کہا "مگر خیر۔۔۔۔"

"پچاس روپے اور دے دیں۔"

"وہ کس بات کے۔"

"چائے کھانے کے" کسان نے کہا۔

میں نے نازو کی طرف دیکھا "ہم نے پانی بھی پیا تھا۔ اس کے پیسے نہیں لگائے تم نے اور کمرے کا کرایہ۔"

وہ ڈھٹائی سے بولا "آپ کی مرضی ہے سو دے جائیں بڑے مہربان اور دیاوان ہیں۔"

"دیکھی ان کی سادہ دلی۔ نیک نیتی اور مہمان نوازی" غالب نے نازو سے کہا جو سخت خفا نظر آتی تھی۔

تانگے میں روانہ ہونے کے بعد نازو نے کہا "اچھا ہے بعد میں پولیس اس کو ایک ہزار جوتے لگائے اور ایک ہزار پیاز کھلائے۔"

تانگے والے نے کہا "بڑا بدمعاش ہے جی یہ۔ اب دیکھو تانگہ میرا گھوڑا میرا۔ مجھ سے بھی آدھے پر سودا کیا اس نے۔ دو سو مفت میں لے لئے۔ ورنہ کہتا تھا کہ دوسرے تانگے والے سے بات کروں گا۔"

میں نے کہا "کاروبار میں یہی ہوتا ہے۔"

"دوست بھی بنتا ہے" وہ گالی دے کر بولا۔

میں نے کہا "دوستی اور بیوپار ایک ساتھ نہیں چلتے۔ یہ بتاؤ ناگ پور کتنی دور ہے یہاں سے۔"

"ویسے تو ناگ پور میں ہی ہو آپ لیکن کوئی خاص جگہ بتاؤ۔"

میں نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کے کہا "وہ جو کچہری کے پیچھے کا علاقہ ہے نا۔ میں نام بھول رہا ہوں۔"

اندھیرے میں چلایا ہوا تیر نشانے پر بیٹھا۔ کچہری کس شہر قصبے میں نہیں ہوتی۔ تانگے والے نے سر ہلایا "میں سمجھ گیا۔ اب جو صاف راستہ ہے جی۔ وہ ذرا لمبا ہے۔ اس پر موٹریں گاڑیاں چلتی ہیں۔ دوسرا پرانا راستہ۔ اس پر تانگے آخر تک جا سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "پھر تم پرانے راستے پر ہی چلو۔"

"کون سے ہسپتال جاؤ گے؟"

میں نے کہا "ابھی تو کسی کے گھر جانا ہے۔"

"پتا ہے آپ کے پاس۔"

"ہے بھائی۔ تم کیوں پریشان ہو" میں نے کہا۔

اس کے بعد وہ نہیں بولا۔ تانگہ بہت ٹوٹی پھوٹی سڑک پر چلتا رہا۔ اس پر موٹر سائیکلیں اور رکشا بھی آ جا رہے تھے۔ میں گل کو سنبھال کے پیچھے بیٹھا تھا تاکہ سامنے کہیں پولیس ہو تو سب سے پہلے میرا چہرہ نظر نہ آئے۔ غالب اور نازو کو جل گاؤں کے تھانے میں کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ غالب اپنے نائٹ سوٹ میں خود کو مضحکہ خیز محسوس کر رہا تھا مگر اور کسی کو اس کی پروا نہیں تھی۔ وہاں اس سے کہیں زیادہ عجیب و غریب کپڑے پہننے والے ہر طرف پھر رہے تھے اور کسی کو کسی کی طرف دیکھنے کی نہ فرصت تھی اور نہ ضرورت۔

ایک بازار سے گزر کے میں نے تانگہ چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ وہ چار سو لے کر رخصت ہو گیا تو میں نے گل کو سہارا دے کر کچھ اور پیدل چلنے پر مجبور کیا۔ ہم کسی سے کچھ پوچھے بغیر ایک گلی میں گھس گئے۔ میری نظر پرانے مکانوں کا جائزہ لے رہی تھی۔ یہ متوسط طبقے کی ملی جلی آبادی تھی اور ہندو ناموں کے ساتھ کہیں کہیں مجھے مسلمانوں کے نام بھی دروازوں کی تختی پر نظر آئے۔

گلی ایک اور سڑک کا شارٹ کٹ ثابت ہوئی میں نے وہاں سے دوسرا تانگہ پکڑا اور اسے ریلوے اسٹیشن چلنے کو کہا مگر تانگہ ابھی دو فرلانگ ہی چلا ہو گا کہ میں نے اسے روک لیا اور دس روپے دے کر رخصت کر دیا۔ مجھے ایک مسجد کے ساتھ بنے ہوئے مکان پر "حافظ قاری عادل شاہ نکاح خواں" کا بورڈ نظر آگیا تھا۔

غالب نے کہا "میں ابھی تک بے مقصد بھٹکنے کا مقصد نہیں سمجھا۔"

"سمجھو گے کیسے۔ اس کے لئے عقل چاہئے" نازو نے کہا۔

"ایک محاورہ ہے کہ چھاج بولے سو بولے۔ چھلنی کیا بولے جس میں نو سو چھید" غالب نے کہا۔

میں نے مدرسے میں چند طالب علموں کو دیکھا جو قرأت کے ساتھ تلاوت کر رہے تھے اور اللہ کا نام لے کر دروازے پر دستک دے دی۔

اندر سے برآمد ہونے والے ساٹھ سال کے گھنی سفید داڑھی والے شخص نے مجھے غور سے دیکھا اور میرے سلام کا جواب دیا۔

"میں نے پہچانا نہیں آپ کو۔"

"آپ نے مجھے کبھی دیکھا ہی نہیں حافظ صاحب" میں نے کہا "ہم مسافر ہیں۔ مشرقی پاکستان سے جان بچا کے آئے ہیں۔"

"یہاں۔ ناگ پور میں کس کے پاس آئے تھے" وہ حیران ہو کے بولا۔

"جن کے پاس آئے تھے وہ ملے نہیں۔ خواتین ساتھ ہیں ورنہ آپ کو زحمت نہ دیتے۔ مسجد میں ٹھہر جاتے یہ بتا دیں کہ شرفا کے لئے یہاں کوئی سستا اور اچھا ہوٹل ہے۔"

"سستا اور اچھا ..... یہ تو متضاد باتیں ہیں۔ اگر سستا ہو گا تو اس قابل نہیں ہو گا کہ وہاں شریف عورتوں کے ساتھ کوئی ٹھہر سکے" حافظ جی نے کہا۔

میں نے کہا "میری بہن بیمار ہو گئی ہے سفر میں۔ اس کے ٹھیک ہونے تک ہم آگے نہیں جا سکتے۔"

"آگے کہاں؟"

"جانا تو پاکستان ہی ہے قاری صاحب بڑے دھکے کھاتے یہاں تک پہنچے تھے۔ پیسہ بھی ہے ہمارے پاس مگر ہم اجنبی ہیں اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں ٹھہریں۔"

"دیکھو میاں۔ تمہارا مسئلہ تو میری سمجھ میں آگیا" انہوں نے عادتاً داڑھی پر ہاتھ پھیر کے کہا "لیکن ..... میرا یہ گھر تو بہت چھوٹا

ہے ورنہ میں تمہیں سر آنکھوں پر۔ ہاں۔ ایک صورت ہے۔"
میں نے کہا "وہ کیا؟"
"یہاں ایک گھر خالی ہوا ہے۔ اس کا مالک مکان بھی ویسے تو مسلمان ہی ہے مگر پیسے اور لین دین کے معاملے میں ذرا سخت ہے۔ تم ویسے بھی اجنبی ہو مگر میں کہوں گا تو شاید وہ تمہیں اس گھر میں ٹھہرنے کی اجازت دے دیں۔"
میں نے کہا "آپ کی بڑی عنایت ہوگی قاری صاحب۔ ہم بس دو چار دن قیام کریں گے اور انہیں شکایت کا کوئی موقع نہیں فراہم کریں گے۔"
"وہ تو ٹھیک ہے مگر۔ وہ کرایہ لے گا پورے مہینے کا چار سو روپے۔"
میں نے کہا "ہم دے دیں گے۔ ہوٹل سے تو بہتر ہے کہ شرفا کے محلے میں رہیں۔"
"بس تو پھر آؤ میرے ساتھ۔ اللہ کارساز ہے۔ مجھے تم شریف آدمی لگتے ہو اور مصیبت زدہ ہو مگر دنیا کا چلن بہت بگڑ گیا ہے میاں۔ جس پر کوئی اعتبار کرے وہی دھوکا دے جاتا ہے۔ کون سچا ہے کون جھوٹا۔ کچھ پتا نہیں چلتا۔ ہر روز آجاتے ہیں نئے لوگ اپنی دکھ بھری کہانی لے کر۔ سیلاب میں گھر بہہ گیا۔ کسی نے جیب کاٹ لی۔"
میں رک گیا "دیکھئے۔ اگر بالواسطہ طور پر آپ یہ کہنے کی کوشش کررہے ہیں کہ ہم بھی بھیک مانگنے والے ہیں اور......"
انہوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا "میاں میں اپنی بات بتاؤں۔ میں نے ستر سال گزار دیئے دنیا میں انسانوں کو پرکھتے۔ جو بچے مجھ سے پڑھتے رہے اب ان کے بیٹے پوتے یہاں دین کا علم حاصل کرنے آتے ہیں۔ میں صورت پر جھوٹ سچ شرافت اور مفادات کو پڑھ لیتا ہوں۔ تم پر شک ہوتا تو تمہاری ذمے داری قبول کرکے ساتھ نہ چل پڑتا۔ وہیں تم سے معذرت کرلیتا۔ چلو۔"
میں نے شرمندہ ہوکے پھر ان کے ساتھ چلنا شروع کیا۔ گل اگرچہ سب کا ساتھ دے رہی تھی مگر میں دیکھ رہا تھا کہ اس کی حالت بگڑتی جارہی ہے۔ رات سے اب تک نہ اسے آرام ملا تھا اور نہ علاج۔ اس نے ایک گاڑی سے دوسری گاڑی میں جھٹکے کھاتے سینکڑوں میل طے کئے تھے۔ پھر تانگے میں اور اب پیدل چلنے سے اس کی رہی سہی جسمانی قوتِ مدافعت بھی جواب دے چکی تھی۔
جب حافظ صاحب ایک مکان کے سامنے رکے تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ مالک مکان نے اوپر سے جھانک کے دیکھا اور پیش امام کو دیکھ کر فوراً نیچے آگیا۔ مکان دینے کی بات پر وہ سوچ میں پڑ گیا۔
"کسی اجنبی کو مکان دے دوں؟ حافظ جی۔ کسی مصیبت میں نہ ڈال دینا۔ بعد میں پولیس آجائے کہ یہاں پاکستانی جاسوس چھپے ہوئے ہیں۔"
"خدا کا خوف کرو۔ ان کی حالت دیکھو ذرا۔ بے چارے لٹ پٹ کے یہاں پہنچے ہیں" حافظ جی نے کہا "تن کے کپڑوں کے سوا کچھ نہیں لا سکے۔ ہم اور تم بھی غیروں جیسا سلوک کریں ان کے ساتھ تو یہ کہاں جائیں گے۔"
"آپ کہتے ہو تو۔ آپ کی ذمے داری پر میں گھر کھول دیتا ہوں لیکن کرایہ پھر کہاں سے دیں گے یہ لوگ اگر خالی ہاتھ جان بچا کر آئے ہیں؟"
"کرایہ دیں گے ہم" میں نے کہا "کچھ زیور ہے"
غالب نے کہا "میری بیوی کا زیور ہے۔"
"اور میری بہن کا" میں نے کہا۔
"نا بھائی۔ نقد کی بات ہے۔ چوری کے الزم میں نہ پکڑا جاؤں میں۔ نیکی گلے پڑجائے۔"
میں نے نقد رقم اس کے ہاتھ پر رکھ دی "بڑے افسوس کی بات ہے۔ کیا ہم صورت سے چور نظر آتے ہیں۔ ہم نقد رقم اس لئے بچا رہے تھے کہ ضرورت کی چیزیں خرید لیں۔ تم کو سب جانتے ہوں گے۔ ہم زیور بیچنے گئے تو۔"
حافظ جی نے میری کندھے پر ہاتھ رکھا "میاں اللہ پر بھروسہ رکھو۔ مہاجنوں کا تو کام ہی یہ ہے۔ زیور رکھ کے ادھار دینا۔ بے آرام سے بیٹھ جاؤ پھر یا لی فکروں میں پڑنا۔"
دو کمروں کے اس گھر میں جو سرائے محمد علی کے پچھواڑے میں واقع تھا مجھے یوں لگا جیسے میں اپنے ماضی کے آسیب سے نکل کے تحفظ مستقبل کی جانب پہلا قدم بڑھا رہا ہوں۔ میدان جنگ میں موت و زیست کی کشمکش۔ خطرات کے خلاف معرکہ آرائی۔ زندگی کی رزم گاہ میں ثابت قدمی کی جدوجہد۔ سب سے دور یہ وہ پڑاؤ کی جگہ ہے جہاں عافیت ہے اور سکون کی منزل ہے۔ یہ بڑا عجیب احساس تھا۔ کیا یہ علامت تھی اس بات کی کہ میں ذہنی طور پر تھک گیا ہوں۔ مایوسی مجھ پر غالب آنے لگی ہے اور میں شکست خیال سے مفاہمت کرنا چاہتا ہوں۔ جنگ تو ابھی جاری تھی۔ ابھی تمام نہیں ہوا تھا۔ یہ میری منزل بھی نہ تھی۔ پھر یہ احساس کیوں۔ کم ہمتی اور شکست خوردگی کے جذبات کی یلغار کیوں۔ اداسی کا بوجھ کیوں۔ کیا اس لئے کہ آغاز سفر میں جو ساتھ تھے ایک ایک کرکے بچھڑ گئے تھے۔ آخری آدمی وہ تھا جو میرا دایاں ہاتھ تھا۔ محسن لاپتا تھا۔ گل بیمار تھی۔ شہلا فقط ایک الزام تھی جس کا سامنا کرنے کی مجھ میں ہمت نہ تھی۔ رابعہ میرا ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ نہ جانے مجھے کیا ہوا کہ میں دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھا تو ان سب کو یاد کرکے میرا دل بھر آیا جو میری دیوانگی کے سفر میں شریک تھے مگر منزل تک نہ پہنچ پائے۔ استاد ٹیڈی سے ایس ایس پی رضوی صاحب تک اور سین شین تک کتنے لوگ تھے جو محض یاد کی پرچھائیں بن گئے تھے۔
ضبط کا بند ٹوٹا تو سیل اشک مجھے بہا کر لے گیا اور مجھے ڈیپریشن کے دورے نے میرے وجود کو ناامیدی کے گرداب میں دھکیل دیا۔

غالب اور نازو پریشان ہوگئے تھے کہ آخر مجھے کیا ہوگیا ہے۔ خود گل مجھے تسلی دے رہی تھی مگر میں اپنے آنسوؤں کو روکنے میں ناکام تھا۔
"یار سکندر۔ یہ اچانک کیا ہوگیا تجھے۔"
"مجھے نہیں معلوم۔ میں خود بھی نہیں جانتا کہ اس مایوسی اور خوف کا کیا سبب ہے" میں نے آخر کار خود کو سنبھالا "پتا نہیں کیوں مجھے ایسا ... ہم ہار گئے۔ مجھے جدوجہد بے مقصد لگتی ہے مستقبل سراب کی طرح محسوس ہوتا ہے۔ جس کے پیچھے ہم دیوانوں کی طرح دوڑ رہے تھے۔"
"یہ سب اعصابی دباؤ کا نتیجہ ہے" غالب نے فیصلہ دیا "ایک دن رات آرام کرنے کے بعد سب ٹھیک ہوجائے گا۔"
میں نے سر ہلایا "خدا کرے ایسا ہی ہو اب تو میرا دل چاہتا ہے کہ سب کچھ چھوڑ دوں۔ یہیں سے واپس چلا جاؤں۔ ہم چوہدری ولاور۔ پیڈرو اور تریوینی جیسے لوگوں سے کبھی نہیں جیت سکیں گے۔ ان کا کتنا بھی نقصان ہوجائے۔ وہ برداشت کرتے رہیں گے۔ ان کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔"
غالب کا چہرہ پھیکا پڑ گیا تھا۔ نازو کی صورت پر ناامیدی کی پرچھائیاں نظر آنے لگی تھیں اور گل خلا میں نہ جانے کیا دیکھ رہی تھی۔ مجھے اپنے آپ سے شرم آئی۔ اپنی باتوں سے میں نے ان کو مایوس کیا تھا۔ وہ میرے پیچھے چلتے تھے۔ رہنمائی کے لئے میری طرف دیکھتے تھے۔ میں راستے کا پتا بتاتا تھا اور منزل کا نشان دیتا تھا۔ میرے بغیر وہ صحرا کی بے سمت ویرانی میں بھٹکنے والے مسافر کی طرح تھے۔
میں نے کہا "دوستو۔ مجھے معاف کردو۔ جو کچھ میں نے کیا بھول جاؤ کیوں کہ وہ غلط تھا۔ پاگل پن کا دورہ تھا۔ بوجھ برداشت کی حد سے بڑھ جائے تو آدمی لڑکھڑا کے گر جاتا ہے۔ میں بہرحال انسان ہوں۔ فولادی اعصاب نہیں رکھتا۔"
"ایسا ہی کسی دن میرے ساتھ ہوگا۔ جو سب کے ساتھ ہوا۔ نروس بریک ڈاؤن" غالب نے کہا۔
"میں تمہیں ناقابل شکست سمجھتی تھی سکندر" نازو بولی۔
"کوئی آدمی ناقابل شکست نہیں ہوتا۔ بڑے سے بڑے پہاڑ میں بھی زلزلے سے دراڑیں پڑ جاتی ہیں" میں نے کہا "پھر بھی۔ میں آج اپنی اس کیفیت کو خود نہیں سمجھ سکا۔ یاد ماضی نے اس طرح کبھی میرے احساس کو شکست نہیں دی تھی۔"
غالب نے کہا "اب ہم اس وقت تک یہاں رہیں گے جب تک نارمل نہیں ہوجاتے۔"
"کیا اس وقت ہم نارمل نہیں ہیں؟" نازو نے کہا۔
"نہیں۔ ہم پاگل پن کے قریب ہیں" غالب نے کہا "ہم پہلے محسن کو تلاش کریں گے۔ شہلا کا پتا چلائیں گے۔"
"کیسے؟ ابھی تو محسن کا بھی پتا نہیں" نازو نے کہا۔
"مجھے معلوم ہے" گل نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے بے حس و حرکت بیٹھی مقابل کی دیوار کو گھور رہی تھی۔
"کیا معلوم ہے؟" نازو نے کہا۔
گل نے کوئی جواب نہیں دیا اور اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔
"گل۔ ادھر دیکھو۔ مجھے بتاؤ کیا معلوم ہے تمہیں؟" میں نے کہا "محسن کہاں ہے۔"
وہ چونکی "میں۔ مجھے نہیں معلوم۔"
"مگر ابھی تو تم کہہ رہی تھیں کہ تمہیں معلوم ہے۔"
وہ آہستہ آہستہ نفی میں سر ہلانے لگی "نہیں۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا۔"
اس کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ ذہنی صدمے کی شدت ہی کم نہ تھی کہ اسے فرار میں ہمارے ساتھ سفر کی صعوبت برداشت کرنی پڑی۔ ہم سب عجب بے سروسامانی کی کیفیت میں خالی فرش پر خالی ہاتھ اور خالی ذہن لئے بیٹھے تھے اور یوں لگتا تھا جیسے دشوار گزار پہاڑوں کی بلندی کا جان لیوا سفر اچانک ختم ہوگیا ہے۔ آگے کچھ نہیں۔ محض خلا ہے جس کی گہرائی اور وسعت کو عبور کئے بغیر آگے بڑھنا ممکن ہی نہیں رہا۔
ہم کہاں سے چل کر کہاں آگئے؟ کیا تھے اور کیا ہوگئے۔ اس ویران گھر کے سرد سفاک سناٹے میں ہمت کیوں ساتھ چھوڑ رہی ہے۔ میں نے سوچا۔ کیا اتنا ہی حوصلہ تھا میرا زادِ راہ۔ امید کی اتنی ہی روشنی تھی۔ نہیں۔ اس پڑاؤ کو منزل نہیں سمجھا جا سکتا۔ ہم سب کو آگے جانا چاہئے۔ پھر ایک مرکز پر اکٹھا ہونا ہے اور ایک مقصد حاصل ہونے تک جدوجہد کو جاری رکھنا ہے۔
میں نے کہا "مس نازو۔ تمہارے پاس کیا ہے۔"
اس نے مجھے حیران ہوکے دیکھا "کیا ہے؟"
"ہاں۔ دنیاوی مال و متاع کا کیا حساب ہے۔ کتنا ہاتھ کا میل ہے اور کتنا سیم و زر۔"
اس نے کہا "پیر صاحب کی عنایت سے ہم لکھ پتی ضرور ہیں۔ جو کچھ ہے اس بیگ میں ہے۔"
میں نے بیگ کھول کے دیکھا۔ اس میں نوٹ بھرے ہوئے تھے اور وہ سب زیور جو میں نے ایک جعلی پیر کو سزا دینے کے لئے چھینے تھے۔ یہ دولت بہت بڑا سہارا تھی۔ ہم صورت سے لٹے پٹے بیمار اور غریب الوطن نظر آتے تھے مگر ہمارے پاس اسلحہ بھی تھا اور ہم اپنا دفاع کرنا جانتے تھے۔ ہم حالات کا مشکل ترین دور گزار چکے تھے اور کوئی وجہ نہ تھی کہ ہم نئے عزم کے ساتھ پھر اپنی منزل کی جانب گامزن نہ ہوں۔ میری وقتی مایوسی نے سب کو دل گرفتہ کردیا تھا۔ اب میں ہی انہیں پھر نیا حوصلہ دے سکتا تھا۔
"ابھی گیارہ بجے ہیں" میں نے کلائی کی گھڑی دیکھی "تم یہاں ٹھہرو۔ میں اور غالب بازار جا کے ضرورت کا کچھ سامان لاتے ہیں۔ کھانا تو خیر پکا پکایا بھی آجائے گا مگر سونے کے لئے بستر اور پہننے کے لئے کچھ کپڑے۔"

اوپر سے مالک مکان نے نیچے آکے دروازہ بجایا۔ زینے کا دروازہ اندر ہی کھلتا تھا۔

"معاف کرنا اس وقت حافظ جی کے سامنے کوئی بات نہیں ہو سکی" وہ بولا "کرائے کی رسید کس کے نام سے بناؤں۔"

میں نے کہا "میرے نام سے بنادیں۔ شرافت علی خاں"

"ولد؟" وہ بولا اور رسید بک میں کچھ لکھنے لگا۔

میں نے کہا "لطافت علی خاں۔"

اس نے رسید پھاڑ کے میری طرف بڑھادی "یہ رسمی سی کارروائی تو کرنی ہی پڑتی ہے" وہ بولا "یہاں بھی دستخط کردیں۔"

"یہ کیا ہے؟"

"کرایہ نامہ۔ گیارہ مہینے کا" وہ بولا "خالی کرنے سے پہلے ایک مہینے کا نوٹس دینا ہوگا۔"

میں نے دستخط کرنے کے بعد کہا "سمجھ لیں کہ میں نے نوٹس دے دیا۔ ہم مہینہ بھر کیا ایک ہفتہ بھی نہ رہیں شاید۔"

"وہ کیوں۔ مکان پسند نہیں آیا یا کرایہ زیادہ ہے؟"

میں نے کہا "دیکھئے۔ ہم تو ایک عزیز کے پاس قیام کرتے مگر وہ گئے ہوئے ہیں عمرہ کرنے۔ ہمیں معلوم نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے ہم پاکستان چلے جائیں ان کی واپسی سے پہلے ہی۔"

"اچھا اچھا..... میرا نام اصغر علی ہے۔ میرا بھی آدھا خاندان کراچی میں ہے" وہ بولا "ابھی تم لوگوں کے پاس کچھ بھی نہیں۔ خیر میں بستر بھجوا رہا ہوں۔"

میں نے کہا "اس کی ضرورت نہیں۔ ہم خرید لیں گے سب"

"کیا کروگے چند دن کے لئے گھر گرہستی کا سامان لے کر۔ بس ناشتا آتا ہی ہوگا۔ بعد میں اطمینان سے باتیں ہوں گی۔ میری بیوی ذرا مزاج کی تیز ہے مگر دل کی اچھی ہے۔ چاہو تو عورتوں کو اوپر بھیج دو نہانے دھونے کے لئے۔ اور ہاں۔ برا مت ماننا۔ مجبوری کی بات اور ہے۔ حافظ جی بھی شاید اسی لئے کچھ نہیں بولے کہ تمہارے حالات ہی ایسے تھے۔ ظاہر ہے جان بچا کے بھاگے ہو۔ اللہ سب کو برے وقت سے بچائے۔ مگر یہ جو خواتین کا لباس ہے نا۔ یہ مسلمان گھروں میں......"

میں نے کہا "میں سمجھ گیا۔ دراصل وہاں سب یہی پہنتے ہیں اس کے علاوہ ہم مجبور تھے اپنی شناخت چھپانے پر..... ان کو برقعے پہنا کے نہیں لا سکتے تھے۔"

وہ انتہائی باتونی شخص لین دین کے معاملے میں جیسا بھی تھا برا آدمی نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد اس کے ایک جیسے ڈیزائن اور سانچے کے بچوں نے گرد کی پروا کئے بغیر زمین پر بستروں کے ڈھیر لگادیئے۔ پھر اس کی بیوی ناشتے کے ساتھ نازل ہوئی اور اس نے کسی نہ کسی بات پر سب کو ڈانٹا۔ جوتے اتارو۔ ہاتھ دھو کے آؤ۔ ڈھنگ سے ناشتا کرو۔ جوان ہو کے اتنا کم کھاتے ہو۔ اس لڑکی کو کیا ہوا ہے۔ کچھ نہیں۔ صرف تھکن ہے تو پھر ہائے ہائے کیوں کررہی ہے۔ ابھی لے کر جاتی ہوں میں اسے ڈاکٹر کے پاس۔ دور نہیں جانا۔ یہ گلی کے موڑ پر دکان ہے۔ اللہ نے ہاتھ میں شفادی ہے۔ چلو تم لیٹ جاؤ۔ میں ڈاکٹر کو یہیں بلالیتی ہوں اور تم نے ابھی تک مجھے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ یہ کون ہے۔ تمہاری بیوی......

ذرا سی دیر میں اس نے ہمارے تمام معاملات اپنے ہاتھ میں لے لئے تھے۔ وہ ایسی عورت تھی جو گھر میں بہنوں اور بہوؤں کی فوج کو بھی کمان کر سکتی تھی اور کسی چھوٹے بڑے کی مجال نہ تھی کہ اس کی بات ٹالے۔ ہم سب نے اس کا غصہ اور اس کی تیز مزاجی بھی اس لئے برداشت کی کہ وہ بہر حال جو کچھ کہہ رہی تھی اور کررہی تھی ہمارے دکھ درد کو سمجھتے ہوئے نیک دلی سے ہماری بھلائی کے لئے کررہی تھی۔ یہ اس کی عادت یا فطرت تھی کہ وہ بڑی بہن یا ماں کی طرح اپنے پرائے سب کی دیکھ بھال کی ذمے داریاں خود سنبھال لیتی تھی اور سب کی فکریں مول لے کر نہ جانے اس کو کیا خوشی ملتی تھی۔

صرف ایک گھنٹے بعد ہم سب سو چکے تھے۔ ڈاکٹر نے گل کا معائنہ کرکے اسے دوا دے دی تھی۔ گل نے خود کو ایک کمبل کے نیچے چھپائے رکھا تھا تاکہ وہ اس کے جسم پر تشدد وغیرہ کی علامات نہ دیکھ سکے۔ چہرے کی خراشوں اور ہاتھ پیروں کی سوجن کو اس نے طویل سفر کا نتیجہ سمجھ کے قبول کرلیا تھا۔ گل کو ٹمپریچر بھی تھا۔ خاتون خانہ نے بہت ڈانٹ ڈپٹ کے بعد ڈاکٹر کو انجکشن لگانے پر مجبور کرنے کی کوشش بھی کی تھی مگر وہ مسکرا کے ٹال گیا کہ یہ ایسے ہی بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گی۔

رات کو خاتون خانہ پھر طوفان کی طرح نازل ہوئیں اور انہوں نے چلّانا شروع کیا "ارے غضب خدا کا سارا دن گزر گیا۔ رات ہوگئی۔ کیا اٹھو گے نہیں حشر تک۔ اندھیرا کئے پڑے ہو سب۔ کیسی نحوست پھیلا رکھی ہے۔ دن میں بھی نہ منہ دھویا نہ کسی نے نہانے دھونے کی تکلیف کی۔ ذرا حالت دیکھو اپنی۔ سب بھوت بنے ہوئے ہو۔ اٹھو نہا دھو کے کپڑے بدلو۔ میں نے سب کے لئے کپڑے نکال لئے ہیں اور اس لڑکی کو دوائی دوسری خوراک دینی تھی شام پانچ بجے۔ جو بج گئے ہیں۔ کھانا نہیں کھاؤ گے۔ میں انتظار کررہی ہوں اوپر۔"

میں نے سر پکڑ کے غالب سے کہا "یار یہ کیا مصیبت ہے۔ اعصاب پر سوار ہوگئی ہے۔"

نازو نے کہا "شرم نہیں آتی۔ وہ بے چاری اتنا خیال کررہی ہے۔"

غالب نے کہا "میری ساس لگتی ہے بالکل۔ مسز بھوت۔"

نازو اس وقت گل کی طرف متوجہ تھی "کیا حال ہے تمہارا؟"

گل مسکرائی "بہت ٹھیک ہے پہلے سے۔ بالکل یوں لگتا ہے جیسے اپنے گھر میں پہنچ گئی ہوں۔"

نازو نے اداس ہو کے کہا "میری ماں بھی ایسے ہی کرتی تھی۔ ذرا سی بات پر اتنی پریشان ہو جاتی تھی۔ میرا بھائی تو بہت چڑتا تھا کہ ہم اتنے بڑے ہوگئے لیکن تم بچہ سمجھتی ہو۔"

"ماں تو بچہ ہی سمجھتی ہے... اور ٹھیک ہی سمجھتی ہے۔" گل نے کہا "ایک بھائی میرا بھی تھا۔"

میں نے کہا "لیڈیز۔ خدا کے واسطے پرانے قصے مت چھیڑو۔ جذباتی ہونے کے لئے یہ کوئی وقت نہیں اور بہت سے مسائل ہیں ہمارے سامنے۔"

رات کے کھانے کے بعد گل اور نازو کو مالک مکان کی بیوی کی طلب کی ہوئی زنانہ پریس کانفرنس سے خطاب کرنا پڑا۔ یہ سب ان کے لئے قطعی غیر متوقع تھا مگر محلے میں مشرقی پاکستان سے جان بچاکے آنے والوں کی خبر پھیل چکی تھی اور خواتین جہاں بے حد ہمدردی اور غم گساری کے اظہار کے لئے بے تاب تھیں وہیں مشرقی پاکستان کے حالات جاننے کے لئے بھی اتنی ہی بے چین تھیں۔ گل اور نازو کو انہوں نے چشم دید گواہ سمجھتے ہوئے ان سے کیا کچھ پوچھا۔ یہ ہمیں فوری طور پر معلوم نہ ہوسکا کیونکہ ہم خود بھی ایسی ہی صورت حال سے دوچار ہوگئے تھے۔ اگر یہ معلوم ہوتا کہ ہمیں یوں مہاجر بنا کے انصار کے سامنے پیش کیا جائے گا تو ہم پہلے سے تیاری کرلیتے اور اپنے حالات ایک سے بیان کرتے۔ گل نے تو یوں جان بچائی کہ وہ بیماری کے باعث بول نہیں سکتی مگر نازو کو ایک جھوٹ چھپانے کے لئے، دس اور دس کو چھپانے کے لئے سو جھوٹ بولنے پڑے تاہم اس نے سنی سنائی اور اخباروں کی اطلاعات کو بنیاد بنا کے عورتوں کو خاصا مطمئن کردیا۔

ایک کمرے میں جسے مردانہ حصے کی بیٹھک کہا جاسکتا تھا کھانے کے بعد مالک مکان نے مجھے دو افراد سے متعارف کرایا۔ دونوں مسلمان تھے اور مشرقی پاکستان کی صورت حالات پر اتنی ہی تشویش میں مبتلا تھے جتنے مغربی پاکستان کے مسلمان۔ فرق صرف اتنا تھا کہ مغربی پاکستان کے ذرائع ابلاغ سرکاری پالیسی کے مطابق تصویر کا ایک رخ پیش کررہے تھے اور حالات کو مٹھی بھر شرپسندوں، تخریب کاروں اور علیحدگی پسند عناصر کی کارروائی قرار دیتے تھے جو بھارت اور دیگر صیہونی طاقتوں کی پشت پناہی سے محب وطن پاکستانیوں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑ رہے تھے۔ جب کہ بھارت میں اسے بنگالیوں کی جدوجہد آزادی سے تعبیر کیا جارہا تھا اور اسے مشرقی پاکستان کی اکثریت پر مغربی پاکستان کی اقلیت کے تسلط کا نتیجہ قرار دیا جارہا تھا۔ وہاں عموماً مجیب الرحمٰن کے نقطہ نظر کی تشہیر ہورہی تھی اور یہ بھی مشہور تھا کہ مغربی پاکستان کی فوج نہتے عوام کے خون سے ہولی کھیل رہی ہے۔ مکتی باہنی جیسی تنظیموں کو پی ایل او کی طرز پر جبر واستبداد کے خلاف اور بنگالیوں کے غصب شدہ حقوق کی خاطر جدوجہد کا علمبردار سمجھا جارہا تھا۔

میں نے اور غالب نے اپنے اپنے طور پر اس منفی اور یک طرفہ پروپیگنڈے کے اثرات کو زائل کرنے کی پوری کوشش کی مگر مجھے اندازہ ہوا کہ سرکاری مشینری نے ذرائع ابلاغ سے زہریلا مواد پھیلا کے ذہنوں کو اس حد تک مسموم کردیا ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت بھی مغربی پاکستان کے حکمرانوں کی غلط پالیسی اور آمرانہ طرز عمل کو اس سیاسی انتشار کا ذمے دار سمجھتی ہے اور ان کا خیال ہے کہ یہ مشرقی پاکستان کے سیاسی ومعاشی استحصال کا نتیجہ ہے۔

بحث نہ جانے کب تک چلتی۔ حاضرین کی تعداد دو سے بڑھ کر دس ہوگئی تھی۔ گیارہواں شخص اچانک ہمارے لئے پریشانی کا سبب بن کے [illegible] میں آیا تھا۔ وہ مشرقی پاکستان کا ہی رہنے والا تھا اور جب اس نے ہم سے ذاتی نوعیت کے سوالات شروع کئے تو ہمارے لئے بات نبھانا مشکل ہوگیا۔ اس نے ہم سے پوچھا کہ ہم ڈھاکا میں کہاں تھے، کب پہنچے تھے، کہاں سے آئے تھے، تعلیم کہاں سے حاصل کی، کون سے کالج میں پڑھا۔ کاروبار کیا تھا اور ہم فلاں فلاں کو ضرور جانتے ہوں گے۔

میں نے تھکن اور نیند کا بہانہ کرکے بڑی مشکل سے جان چھڑائی مگر وہ شخص شک میں مبتلا ہوگیا تھا اور اس نے دوسروں کو بھی شک میں ڈال دیا تھا۔ خود مالک مکان فکرمند نظر آنے لگا تھا کیونکہ اس کی نظر میں ہمارا سچ پہلے جتنا معتبر نہیں رہا تھا۔ ابھی محفل برخاست ہورہی تھی کہ حافظ صاحب آگئے اور "السلام علیکم" کہہ کے بیٹھ گئے۔ پریشانی کے آثار ان کی صورت پر بھی ہویدا تھے۔

کچھ دیر بعد انہوں نے خود ہی کہا "میاں۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہے تو ہمیں بتادو۔"

میں نے کہا "جی۔ میں سمجھا نہیں۔"

"سمجھا تو میں بھی نہیں" وہ بولے "ایک طرف تم مجھے کوئی دھوکے باز نہیں لگتے۔ تمہاری گفتگو اور شائستگی تمہارے عالی نسب اور تعلیم یافتہ ہونے کی دلیل ہے۔ تمہارے ساتھ شریف خواتین ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ میں تم پر یقین نہ کروں۔"

مالک مکان کی نظر اب مجھ پر جم گئی تھی اور اس کی نظر میں جو سوال تھا اس کا جواب اعتراف جرم کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا تھا کہ ہم اپنے جھوٹ کو اول تا آخر تسلیم کرلیں اور اسے ضرورت کا جواز فراہم کرتے ہوئے اصل حقیقت بیان کردیں اور پھر خود کو ان کے رحم وکرم پر چھوڑ دیں۔

میں نے کہا "آخر بات کیا ہے حافظ جی؟"

"بات بڑی خطرناک ہے میاں" وہ بولے "دوپہر کے بعد ایک شخص میرے پاس آیا تھا۔ اس نے تمہیں میرے دروازے پر دیکھا تھا۔ وہ کوئی اچھا آدمی نہیں ہے۔ سب جانتے ہیں کہ وہ پولیس کا مخبر ہے۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ حافظ جی۔ وہ کون لوگ تھے جن سے آپ بات کررہے تھے۔ دو مرد تھے اور دو عورتیں۔ میں نے کہا "میاں تم سے مطلب؟" وہ کہنے لگا "حافظ جی، اور کوئی ہوتا تو میں پولیس کو پہلے بتاتا مگر آپ پیش امام ہیں۔ عمل چاہے نہ کیا ہو مگر قرآن آپ ہی سے پڑھا تھا میں نے۔ جمعے کے جمعے اور عید تو عید آپ کے پیچھے نماز بھی پڑھ لیتا ہوں اس لئے پوچھ رہا ہوں کیونکہ میرا خیال ہے ان کی وجہ سے آپ مصیبت میں پڑ جائیں گے" میں نے کہا "میاں خدا خدا کرو۔ وہ بے چارے لٹ پٹ کر آنے والے

لوگ ہیں۔ مشرقی پاکستان سے بس تن کے دو کپڑے لے کر بھاگنے پر مجبور ہو گئے تھے" وہ کہنے لگا "یہی تو غلط ہے حافظ جی' جھوٹ بولا تھا انہوں نے آپ سے۔"

حافظ جی اپنی بات کا ردعمل دیکھنے کے لئے خاموش ہوئے تو ہمارے مالک مکان نے دانتوں میں خلال کرتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا "وہ ٹھیک کہہ رہا تھا حافظ جی۔ انہوں نے جھوٹ بولا تھا آپ سے بھی اور مجھ سے بھی۔"

حافظ جی کی صورت پر دکھ کے جذبات دیکھ کر مجھے ندامت اور پریشانی ہونے لگی۔ زبان سے کچھ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی میرے اور غالب کی صورت پر ہمارا جرم صاف پڑھا جاسکتا تھا۔

میں نے کہا "اور کیا بتایا تھا اس نے۔"

حافظ جی نے ایک گہری سانس لی "اب یہ کیوں پوچھتے ہو میاں؟ کیا خود تمہیں اندازہ نہیں کہ اس نے کیا کہا ہوگا؟ افسوس کہ تم نے ہم پر بھروسہ نہ کیا۔ ہم سے بھی غلط بیانی کی۔ حالانکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ہم تمہیں پناہ دینے سے انکار نہ کرتے لیکن خود مشکل میں نہ پڑتے۔ اب بتاؤ ہم کیا کریں۔ تم مہمان ہو۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ مسلمان ہو اور مجاہد ہو۔ اگر تم کو پولیس کے حوالے کرتے ہیں تو خود کو کیا منہ دکھائیں گے اور خدا کو کیا منہ دکھائیں گے کہ ہم نے حق کے مقابلے میں باطل کا ساتھ دیا اور زبان سے بھی جہاد نہ کیا۔ دوسری طرف ہماری عزت کے خاک میں ملنے کا ڈر ہے۔"

مالک مکان کی حالت غیر ہونے لگی تھی "تو کیا یہ واقعی پاکستانی جاسوس ہیں حافظ جی۔"

"جاسوس' نہیں میاں۔ یہ بڑے دلیر لوگ ہیں۔ حق کے راستے پر چلنے والے محب وطن جنہوں نے اپنا عیش آرام' مال و دولت' رشتے ناتے سب ایک عظیم مقصد پر قربان کردیئے۔ یہ دیکھو۔"

انہوں نے بغل میں سے چند اخبارات نکالے اور سامنے پھیلا دیئے۔ ان میں سے بیشتر ہندی کے اخبار تھے۔ انگریزی کے دو اور اردو کا ایک اخبار تھا۔ سب میں ہم تینوں کی تصویر تھی۔ میرے ساتھ محسن اور غالب پولیس کو مطلوب تھے۔ ہمیں پاکستانی دہشت گرد اور جاسوس قرار دیا گیا تھا اور ہمارے بارے میں اطلاع فراہم کرنے والے کے لئے دس ہزار روپے کے انعام کا اعلان تھا۔ مجھے مالک مکان کی آنکھوں میں خوف کے ساتھ دلچسپی کی جھلک محسوس ہوئی۔ اچھے برے لوگ کہاں نہیں ہوتے اور پیسہ تو چیز ہی ایسی ہے کہ محبت اور ایمان میں خلل ڈال دیتا ہے۔ ہمارے لئے ابھی راستے بند نہیں ہوئے تھے۔ ایک امید کا دروازہ حافظ جی کی ذات تھی جو ہمارے بارے میں اچھی رائے رکھتے تھے۔ دوسرا راستہ ہم بزور بازو بنا سکتے تھے لیکن ہر صورت میں ہمیں پناہ دینے والوں کے لئے کوئی پناہ نہ تھی اگر حافظ جی مشکل میں نہ پڑتے تو مالک مکان پڑ جاتا جس نے ہمارے ساتھ نیکی ہی کی تھی۔

خاموشی کے ایک طویل اعصاب شکن وقفے کے بعد میں نے ہمت کر کے کہا "آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے حافظ جی۔"

"پولیس اسٹیشن جانے کا" حافظ جی نے سر جھکا لیا۔ مالک مکان نے اطمینان کا سانس لیا "بالکل ٹھیک۔ انہیں پولیس کے حوالے کر کے ہی بچ سکتے ہیں ہم۔"

حافظ جی نے سر اٹھایا "تم غلط سمجھے میاں۔ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ یہ فیصلہ تو میں نے اسی وقت کرلیا تھا جب وہ شخص میرے پاس آیا تھا۔ یہ اخبارات وہی لایا تھا اور ظاہر ہے کہ اس کے بعد میرے لئے انکار کرنے کی گنجائش نہ رہی تھی کہ میں نے انہیں نہیں دیکھا مگر میں نے اسے جھوٹ سے ٹال دیا۔ میں نے کہا کہ "ہاں۔ یہی تھے جو مجھ سے مسجد میں قیام کی اجازت مانگ رہے تھے مگر میں نے کہا کہ عورتوں کے ساتھ یہ ناممکن ہے۔ پھر وہ چلے گئے۔"

"آپ نے میرے گھر کا پتا نہیں بتایا" مالک مکان بولا۔

"نہیں" حافظ جی نے کہا۔

"مگر لوگوں نے تو دیکھا تھا اور ابھی یہاں سارا محلہ جمع تھا" مالک مکان نے کہا۔

"اللہ مالک ہے میاں....."

"حافظ جی میرے بیوی' بچے ہیں" مالک مکان رونے پر آگیا۔

"وہ تو میرے بھی ہیں۔ اس خبیث نے یقین کیا تھا یا نہیں۔ اس وقت تو پتا نہیں چلا۔ وہ کہہ گیا تھا کہ حافظ جی بعد میں مجھے کچھ مت کہنا۔ میں نے تمہیں خبردار کردیا ہے۔ آگے تم جانو تمہارا کام" میں نے اسے ڈانٹا بھی تھا کہ کیا ہمیں جھوٹا سمجھتا ہے کہ ایسی بات کرتا ہے" اور اس نے معافی مانگ لی تھی۔ ہم نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ یہ سب جانتے ہیں۔"

"لیکن آج تو جھوٹ بول دیا آپ نے۔"

"نہیں۔ یہ جھوٹ اس سچ سے زیادہ پسندیدہ ہے خدا کے نزدیک جس سے مسلمانوں کو نقصان ہو اور وہ بھی کافروں کے ہاتھوں۔ ان کے مقصد کا زیاں ہو اور راہ حق پر چلنے والوں کی قربانیاں رائگاں جائیں۔ اگر اللہ نیتوں کو سمجھتا ہے اور اگر کا کیا سوال۔ وہ دلوں کے بھید جانتا ہے تو وہ میرے جھوٹ کو بھی معاف کرے گا۔ میں ایسا نہیں کرسکتا تھا کہ انہیں پولیس کے حوالے کردوں۔ میں نے اس شیطان کو گمراہ کردیا اور کہا کہ وہ لوگ مجھ سے مایوس ہو کے کہیں اور چلے گئے تھے۔"

"حافظ جی...." مالک مکان نے کچھ کہنا چاہا۔

"مجھے اب پولیس اسٹیشن طلب کیا گیا ہے" حافظ جی نے اس کی بات کاٹ دی "جو تھانے دار کا آدمی پیغام لے کر آیا تھا وہ بھی مسلمان تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ حافظ جی۔ ان کو گھر سے نکال دو جن کو آپ نے چھپا رکھا ہے کچھ نہیں تو آپ کے خلاف

ہوگا۔ میں نے کہا کہ میں نے گھر میں کسی کو بھی نہیں چھپا رکھا ہے"

"آپ اس وقت جائیں گے۔"

"ہاں۔ جانا تو پڑے گا" حافظ جی نے کہا "یہی بہت غنیمت ہے مجھے ہتھکڑی ڈال کے نہیں لے گئے اور خانہ تلاشی کے لئے گھر میں نہیں گھسے۔ اللہ عزت رکھنے والا ہے۔"

"وہ معلوم کرلیں گے حافظ جی" مالک مکان نے کہا "اور مجھ میں ہمت نہیں ہے اتنی۔ میں تو صاف بتادوں گا کہ انہیں آپ نے بھیجا تھا۔ سارا محلہ ان کے جھوٹ کا گواہ ہے۔"

میں نے اتنی دیر میں فیصلہ کرلیا تھا کہ ہمیں کیا کرنا ہوگا۔ میں نے بھی مردہ لہجے میں کہا "آپ بھی بتادیں پولیس کو حافظ جی کہ ہم یہاں ہیں۔ ہمارے لئے خود کو مشکل میں نہ ڈالیں۔"

غالب نے سر جھکا کے کہا "یہ بات چھپ نہیں سکتی۔ ابھی نہیں تو صبح معلوم ہو جائے گا پولیس کو۔ پھر آپ زیادہ مجرم ہو جائیں گے۔"

میں نے آہ بھر کے کہا "ہمیں آپ سے کوئی شکایت نہیں اور نہ ان سے۔ آپ لوگوں نے تو نیکی ہی کی تھی ہمارے ساتھ۔ آگے جو اللہ کو منظور ہے وہ ہوگا۔"

میں نے اور غالب نے دلائل سے حافظ جی کو قائل کرلیا کہ وہ پولیس کو سچ بتادیں۔ کوئی بات نہ چھپائیں تاکہ ان کی عزت محفوظ رہے۔ یہی اطمینان ہم نے مالک مکان کو دلایا کہ جب ہم خود کو پولیس کے حوالے کردیں گے تو وہ بھی محفوظ ہو جائے گا۔ اس نے حافظ جی کی بات مان کے اور ہمارے جھوٹ کو سچ سمجھ کے کوئی جرم نہیں کیا تھا۔

"میرا تو خیال ہے کہ حافظ جی پہلے نہ جائیں" غالب نے تجویز پیش کی "یہ پہلے جا کے پولیس کو بتادیں کہ وہ پاکستانی دہشت گرد ان کے گھر میں موجود ہیں۔ اس طرح انہیں دس ہزار کا انعام بھی مل سکتا ہے۔"

"بعد میں حافظ جی صرف یہ کہنے چلے جائیں کہ انہیں کچھ معلوم نہیں وہ کون تھے۔ انہوں نے تو ایک گھر کا پتا بتایا تھا جو کرائے کے لئے خالی تھا تاہم وہ انہیں شناخت کرسکتے ہیں۔ حافظ جی کی گواہی سے دس ہزار کا انعام پکا ہو جائے گا۔"

"ہاں۔ اور تو ہم کچھ کر نہیں سکتے۔ جو کچھ انہوں نے کیا اس کے بدلے میں مگر سرکار سے دس ہزار تو دلوا سکتے ہیں۔"

حافظ جی نیک آدمی تھے اور اگر ہم انہیں مجبور اور قائل نہ کرتے تو وہ ہمیں بچانے کے لئے خود بخود مصیبت میں پڑنا منظور کر لیتے مگر مالک مکان کی نیت کے بارے میں غالب کو اور مجھے کوئی شبہ نہ رہا تھا کہ وہ دس ہزار کے چکر میں پڑ گیا ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جن کو پیسہ اپنے ایمان سے زیادہ عزیز ہوتا ہے۔ بہ لحاظ فطرت اس کی بیوی یقیناً مختلف تھی۔ لالچ کی بات نہ ہو تو وہ خود بھی بے ضرر تھا۔ جیسا کہ حافظ جی نے کہا تھا' وہ پیسے کے معاملے میں

یہودی تھا۔ چناں چہ ہم نے اسے لالچ کے جال سے ہی شکار کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

حافظ جی کے رخصت ہوتے ہی میں نے محسوس کیا کہ اندر سے عورتوں کی باتیں کرنے کی آوازیں بھی سنائی نہیں دے رہی ہیں۔ غالباً وہ بھی ہماری باتیں سن چکی تھیں اور جذبات کی نوعیت یکسر بدل چکی تھی۔ نہ وہ مالک مکان رہے تھے نہ ہم کرائے دار۔ نہ وہ میزبان تھے اور نہ ہم مہمان۔ ہمدردی کے جذبات برہمی میں بدل گئے تھے کہ ہم نے غلط بیانی سے انہیں بھی مصائب کی دلدل میں دھکیل دیا۔

مالکہ مکان پہلے مذ آئی اور آتے ہی ہم پر گرجنے برسنے لگی اس کے پیچھے نازو اور گل مجرم صورت بنائے داخل ہوئیں اور چپ چاپ کھڑی ہوگئیں۔ خاتون خانہ کو حق حاصل تھا کہ جتنا چاہیں بولیں مگر ہمارے پاس وقت کی کمی تھی۔

میں نے گھڑی دیکھ کر کہا "آپ کی تقریر کا وقت ختم ہوگیا خاتون۔ محترم آپ کو کچھ کہنا ہے؟"

خاتون نے مجھے چند زنانہ گالیوں سے نوازا اور پھر روئے سخن اپنے مجازی خدا کی طرف کرلیا جو اس مصیبت کے ذمے دار تھے۔

انہوں نے کہا "بھئی بیگم۔ یہ خود کو پولیس کے حوالے کرنے پر تیار ہیں۔ ہم جارہے ہیں تھانے۔ انعام کے دس ہزار ملیں گے۔"

میں نے ریوالور نکال لیا "دس کیا بیس ہزار ملیں گے مگر وہ انعام ہم دیں گے۔"

مالک مکان "ہائیں ہائیں" کرتے پیچھے ہٹے "یہ کیا......؟"

ان کی بیوی نے ایک چیخ ماری مگر نازو نے ان کا منہ پیچھے سے ہاتھ بڑھا کے بند کردیا۔

میں نے کہا "ان کو فٹافٹ باندھ کے ڈالو کچن میں باتھ روم میں۔"

مالک مکان نے کانپتے لرزتے کہا "یہ۔ یہ کیا کررہے ہو تم۔ اچھا صلہ دے رہے ہو۔"

میں نے انہیں غسل خانے کی طرف دھکیلا "ویسے ہی خاموش رہنا پسند کریں گے آپ یا......"

وہ سمجھے میں گولی مارنے کی دھمکی دے رہا ہوں "میں جاتا ہوں۔ خدا کے لئے میرے بچوں کو یتیم مت کرو۔"

غالب نے کہا "بیوی کے بیوہ ہونے کی فکر نہیں ہے۔"

"شوہر تو مل جاتا ہے۔ باپ کہاں ملتا ہے دوسرا۔" صاحب خانہ بدحواسی میں کہہ گئے مگر یہ بات ان کی اہلیہ کے کانوں تک نہیں پہنچی۔ نازو انہیں کچن میں ڈال آئی تھی۔ دہشت سے وہ خود ہی بے ہوش ہوگئی تھیں۔ بچے سب سوئے پڑے تھے۔ میں نے بیس ہزار روپے میزبان کی جیب میں ڈالے اور معذرت کے ساتھ اسے ناک آؤٹ کردیا۔ چلتے چلتے میں نے نازو سے کہا کہ ان کی بیوی کو بھی خدمت گزاری کا کچھ صلہ دے آئے اور اس نے زیورات کے بوجھ میں سے دو بھاری کنگن نکال کے خاتون کے ہاتھوں میں دے دیئے۔ غالباً اس تحفے کو وصول کرنے کے بعد انہوں نے ہماری سب خطائیں معاف کردی ہوں گی۔

ان کے بچے سوئے پڑے تھے۔ رات کے ایک بجے ہم ... ہوئے حالانکہ صبح ہمارا خیال کچھ اور تھا۔ ہم یہاں چند دن ... قیام کرنا چاہتے تھے۔ گل اور نازو نے ساریاں اتار کے شلوار قمیص پہن لئے تھے اور ہم نے بھی صاحب خانہ کے کپڑے چڑھا لئے تھے۔

"معلوم نہیں تھانہ یہاں سے کتنی دور ہوگا" غالب نے ... کے دروازے کو مقفل کرتے ہوئے ویران گلی میں ادھر ادھر دیکھا۔

"پولیس زیادہ دیر نہیں لگائے گی" میں نے کہا۔

"پہلے تو مالک مکان کو جانا تھا" غالب نے کہا۔

"ہاں مگر حافظ جی کب تک انتظار کریں گے۔ چلو اب نکل ..." میں نے کہا۔

گل اور نازو برقعے میں تھیں۔ دونوں مالکہ مکان کے برقع تھے۔ ایک کچھ پرانا تھا اور اس کا نسواری رنگ بھی کالا نظر آرہا تھا دوسرا نئے بھجتے ہوئے کریپ کا تھا۔ گلی کافی لمبی تھی۔ ہم بار بار پلٹ کر دیکھتے رہے اور تیزی سے آگے بڑھتے گئے۔ اس وقت ہم دوڑ لگاتے تو کوئی ضرور شور مچا دیتا یا ہمارے پیچھے لگ جاتا چناں چہ ہم جب تک تیز قدم اٹھا سکتے تھے اٹھا رہے تھے۔

ایک جگہ گل نے ہانپتے ہوئے کہا "بھائی سکندر۔ ذرا آہستہ چلو۔ میں کیسے دوڑوں تمہارے ساتھ۔"

نازو نے بھی کہا "میں الجھ کے گروں گی منہ کے بل۔"

"ضرور گرو۔ پھر خود ہی اٹھنا" غالب نے کہا "ہم نہیں اٹھانے والے۔ اللہ ہی اٹھائے گا۔"

"اب جانا کدھر ہے۔ یوں منہ اٹھا کے چلتے جارہے ہیں سب۔" گل نے کہا "کیا ہو کا عالم ہے۔ تانگہ ٹیکسی کچھ نہیں۔"

میں نے پیچھے دیکھ کر کہا "پولیس آرہی ہے جیپ لے کر۔ چاہو تو انتظار کرلو۔"

گل نے پلٹ کے دیکھا "آپ نے تو ڈرا ہی دیا تھا مجھے"

آخر کار گلی ختم ہوئی اور اچانک ہم نے خود کو ایک سینما ہاؤس کے سامنے پایا۔ آخری شو ختم ہوچکا تھا اور بیشتر تماشہ بین جا چکے تھے لیکن سواریوں کے انتظار میں دو تانگے اس وقت بھی موجود تھے۔ ایک میں دو سواریاں بیٹھی تھیں اور وہ "درگاہ۔ درگاہ" کی صدا لگا کے مزید دو سواریوں کو متوجہ کررہا تھا۔ دوسرا تانگہ بالکل خالی تھا۔

پوچھے بغیر میں نے اس سے کہا "درگاہ چلو۔" سواریاں پوری تھیں چناں چہ وہ پہلے روانہ ہوگیا۔ مجھے بالکل معلوم نہیں تھا کہ وہ کس درگاہ کی بات کررہا ہے مگر میں اس کے سامنے خود کو اجنبی انجان ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ بعد میں معلوم ہوا وہ حضرت بابا ... الدین رحمتہ اللہ علیہ کے مزار والے علاقے کی طرف جارہا تھا ... تاج آباد کہلاتا تھا۔

... تانگہ دو تین میل دور نکل آیا تو میری جان میں جان آئی ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ ہم اپنے جھوٹ کی وجہ سے پکڑے گئے تھے اگر ... وقت پردہ شخص نہ آتا جو ڈھاکہ میں عمر گزار چکا تھا تو ہمارا راز فاش ... ہوتا مگر قدرت کو یہ منظور نہ تھا۔ یہ بھی بعد میں پتا چلا کہ اندر خواتین کے سامنے نازو نے بالکل مختلف واقعات بیان کئے تھے۔

اب سوال یہ تھا کہ کیا ہم درگاہ پر رات بسر کرسکیں گے۔ تانگے والے نے پوچھا کہ کہاں جانا ہے تو اسے کیا بتائیں ... اس مشکل سے بچنے کے لئے میں نے تانگے کو عین درگاہ کے سامنے روک لیا۔ وہاں بہت رونق تھی اور اندر سے قوالی کی آواز آرہی تھی۔ مجھے بالکل یاد نہ تھا کہ آج دن کیا ہے اور تاریخ کیا مگر درگاہ کی رونق دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ جمعرات ہے اور ہم بہ آسانی عقیدت مندوں میں شامل ہوسکتے ہیں۔ یہاں پولیس کے ہماری تلاش میں آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اندر مردوں کے بیٹھنے کا انتظام بالکل الگ تھا چناں چہ میں نے گل اور نازو سے کہا کہ وہ خواتین میں شامل ہوجائیں مگر ایک طرف رہیں جہاں سے وہ ہمیں دیکھ لیں۔ ہم خود درمیانی حد کے قریب ہوں گے۔

قوالی صبح پانچ بجے تک جاری رہی۔ میں اور غالب کھسکتے آگے چلے گئے تھے تاکہ پیچھے سے کوئی نگاہ ڈال کے ہمیں دیکھنا چاہے تو ہم نظر نہ آئیں۔ ہمیں ننگے سر دیکھ کر ایک لڑکا ہماری طرف لپکا۔ اس نے گلے میں ٹرے سی لٹکا رکھی تھی جس میں تبرکات کے علاوہ ٹوپیاں بھی تھیں۔ میں نے اور غالب نے فوراً ایک جیسی ٹوپیاں سر پر رکھ لیں اور لڑکا پیسے لے کر چلا گیا۔ وہاں ہم جیسے سینکڑوں سر تھے جن پر ایک جیسی سفید ٹوپیاں تھیں۔

غالب نے سر جھکائے ہوئے سرگوشی میں کہا "آج برے پھنسے۔ اب یہاں سے نکل کے کہاں جائیں گے۔"

میں نے کہا "جہاں تقدیر لے جائے۔"

غالب نے کہا "صبح تک شہر کی ہر طرف سے ناکا بندی ہوجائے گی۔ ہم تو محصور ہوگئے ہیں ناگ پور میں۔"

اس وقت ایک شخص نے نعرہ لگایا اور قوالوں کے سامنے حال کھیلنے لگا۔ میں اور غالب دونوں ادھر متوجہ تھے کہ ایک شخص نے بالکل قریب آکے مجھے کہنی ماری۔

میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ بڑے معنی خیز انداز میں آنکھ مار کے مسکرایا۔ میری سٹی گم ہوگئی۔ اپنی مونچھوں اور چہرے کے سخت نقوش سے وہ کوئی شریف آدمی نہیں لگتا تھا۔ میں نے غالب کو اس کی طرف متوجہ کیا تو وہ پھر مسکرایا۔

"میں نے پہچان لیا ہے تمہیں" وہ میری طرف جھک کے بولا۔

"کیا...... کیا مطلب۔ کون ہو تم۔"

"ہم تو نہیں جانتے تمہیں" غالب نے کہا۔

"غور سے دیکھو۔ پہچان جاؤ گے" وہ کچھ اور میرے قریب آگیا۔

میں نے کہا "میں ان سب کو نہیں پہچان سکتا۔ جو مجھے جانتے ہیں۔"

"تم سکندر بخت ہو نا؟" وہ سرگوشی میں بولا۔

انکار کرنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ میں نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

"اور یہ جو تمہارے ساتھ بیٹھا ہے۔ محسن ہے؟"

اب میرا ماتھا ٹھنکا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ صرف مجھے پہچانتا ہے۔ وہ غالب کو محسن سمجھ رہا تھا۔ اس سے یہی اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ ان دونوں کو اس نے نہیں دیکھا۔ اگر اس نے مجھے اخباروں میں شائع ہونے والی تصاویر سے پہچانا ہوتا تب بھی وہ ایسی غلطی نہ کرتا۔ محسن اور غالب کی صورتوں میں تو بہت فرق تھا اور ہم تینوں کی تصویریں ایک ساتھ شائع ہوتی رہی تھیں۔

غالب نے کہا "اگر میں محسن ہوں۔ پھر؟"

"پھر یہ کہ تمہارا یہاں آنا خالی از علت نہیں ہوسکتا۔ تم ضرور چھپنے کے لئے اس محفل میں شامل ہوئے ہو" وہ بولا۔

"اس سے یہ نتیجہ اخذ مت کرنا کہ ہم محصور ہوگئے ہیں اور ہم نے یہاں آکے غلطی کی ہے" میں نے کہا۔

"توبہ توبہ۔ یہاں آنے والا محفوظ ہوجاتا ہے۔ محصور نہیں" وہ بولا "اسے غلطی کہنا بھی غلطی ہے۔"

میں نے کہا "ہم مسلح ہیں۔"

اس نے کہا "کیسی باتیں کرتے ہو۔ یہاں اسلحے کا کیا کام نہ تم پر گولی چلا سکتا ہے کوئی اور نہ تم کسی پر۔"

میں خاموش رہا۔ میرا خیال تھا کہ یہ اس کا عقیدہ ہے تو مجھے اس کی تردید کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ چلانے والوں نے تو مسجدوں اور معبدوں میں گولیاں برسا کے عبادت گزاروں کو شہید کیا ہے اور خانہ کعبہ کی حرمت تک کا خیال نہیں کیا۔

"آخر تم کیا چاہتے ہو؟" غالب نے کہا۔

"کچھ نہیں۔ میں تو یہاں قوالی سننے آتا ہوں۔ ہر جمعرات کو۔ آج تم کو دیکھا تو یقین نہیں آیا۔ کہاں کراچی کہاں ناگ پور" اس نے کہا۔

قوالی اب پورے عروج پر تھی اور قوال حضرت امیر خسرو رحمتہ اللہ علیہ کا عارفانہ کلام گا رہے تھے۔ سننے والوں پر وجد طاری تھا۔

میں نے کہا "تم۔ کراچی میں تھے۔ کس کے ساتھ تھے۔"

"ہمارے دشمنوں کے ساتھ" غالب نے کہا۔

وہ ہنسنے لگا "میں وہاں ٹیکسی چلاتا تھا۔ تمہارا بھی ایک یار تھا اکرام شیخ۔ وہ بھی ٹیکسی ڈرائیور تھا۔"

"تم۔ اکرام شیخ کے ساتھی ہو" میں نے مضطرب ہو کے کہا "یہاں کیا کر رہے ہو۔ کب آئے وہاں سے؟"

اس نے کہا "یہاں میرا بڑا بھائی پولیس میں ہے۔"

میرا خون خشک ہونے لگا۔ "پولیس میں ہے؟"

"ڈرو نہیں۔ میں تمہیں اس کے حوالے نہیں کروں گا۔ میں آیا تھا ماں کی بیماری کا سن کے۔ وہ بے چاری تو عرصہ ہوا اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ میں واپس نہ جا سکا۔ بھائی نے روک لیا۔"

"اکرام شیخ سے کب ملے تھے؟"

"یہاں آنے سے پہلے ملاقات ہوئی تھی آخری بار۔ بہت حالت خراب تھی اس کی۔"

میرا دل بیٹھنے لگا "کیوں۔ کیا ہوا اسے۔"

"بیمار تھا وہ" غالب نے کہا۔

"نہیں۔ ایک تو بہن کو یاد کرکے روتا تھا۔ کہتا تھا ایک ہی بہن تھی جس کا میں اکلوتا بھائی تھا۔ مجھے یہاں چھوڑ کے چلی گئی واپس آنے کا کہہ گئی تھی۔ اب میں کہاں جاؤں۔ کیسے جاؤں۔ پتا نہیں وہ زندہ ہے کہ نہیں۔"

میرا دل بھر آیا "وہ زندہ ہے۔ بالکل ٹھیک ہے۔ تمہارے پاس کوئی پتا ہے اکرام شیخ کا؟"

"ہاں۔ چنیل پاڑے کی ایک دکان کا پتا ہے۔ اس کو ایک خط ڈال دو۔ وہ تم سب کو بھی بہت یاد کرتا ہے۔ کہتا ہے میری عقل پر پتھر پڑ گئے تھے کہ یہاں رک گیا۔ سب سے بچھڑ گیا۔ ایک لڑکی اس کے پیچھے پاگل ہے مگر وہ تم سب کے لئے پاگل ہے۔ کہتا ہے جب تک سب کا پتا نہیں چلے گا اور سب واپس نہیں آئیں گے میں اپنا گھر بسا کے نہیں بیٹھ سکتا۔"

میں نے کہا "کون ہے وہ لڑکی؟"

"ایک لیڈی ڈاکٹر ہے۔ شہناز۔ تم نہیں جانتے؟" وہ حیران ہو کے بولا۔

"ہمارا تو پھر اس سے رابطہ ہی نہیں ہوا۔ ہمیں کیسے معلوم ہو سکتا تھا" غالب نے کہا۔

"خیر ہے ایک لیڈی ڈاکٹر۔ پیدائشی طور پر کچھ معذور تھی اس کے دونوں پیروں کے پنجے مڑے ہوئے ہیں اور گھٹنے تک ٹانگوں میں بھی خم ہے۔ ماں باپ غریب تھے ورنہ بچپن میں علاج ہو جاتا تو آپریشن سے یہ نقص دور ہو سکتا تھا۔ اکرام اسے ایک بار کہیں لے کر گیا تھا رات کے وقت۔ راستے میں کچھ فلمی صورت حال ہو گئی۔ کورنگی سے پہلے چار افراد نے ٹیکسی روک لی اور انہیں لوٹنے کی کوشش کی اکرام نے خاموشی سے سب کچھ دے دیا اور اس لیڈی ڈاکٹر نے بھی اپنی گھڑی اتار دی۔ سونے کی دو چوڑیاں اور بندے بھی دے دیئے مگر اس کے بعد انہوں نے میڈیکل بیگ لے جانے کی کوشش کی۔ ان جاہلوں کا خیال تھا کہ اس میں اصل مال ہے۔ شہناز نے انکار کیا اور اکرام بھی اڑ گیا تو وہ بدمعاشی پر اتر آئے اور بس اس کے بعد جو ہوا وہ بھی فلموں میں ہوتا ہے۔ انہیں کہاں معلوم تھا کہ اکرام شیخ پہلے پولیس افسر تھا اور کسی کا بھائی ہے۔ اس نے مار مار کے چاروں کا بھرکس نکال دیا۔ خود بھی زخمی ہوا۔ مگر پھر ٹریفک آ گئی اور پولیس کی ایک گشتی گاڑی آ گئی۔ وہ سب پکڑے گئے۔ اب جیل کاٹ رہے ہیں۔ ڈاکٹر شہناز نے..... اسپتال میں اکرام شیخ کا خود علاج کیا اور دن رات ایک کر دیئے۔ جب اسے اکرام شیخ کے اصل حالات کا علم ہوا تو اس نے اکرام شیخ کو بہت سمجھایا کہ وہ ٹیکسی چلانا چھوڑ دے وہ اس کے لئے اچھے سے اچھی نوکری کا بندوبست کر سکتی ہے اور رہائش کے لئے اپنا فلیٹ دے سکتی ہے۔۔۔ جو خالی پڑا ہے مگر وہ کہاں ماننے والا تھا۔ اس کو کیسے بتا سکتا تھا کہ وہ کیوں ٹیکسی چلاتا ہے لیکن بعد میں اس نے بتا دیا۔ اب روز اسے گھر سے کلینک لاتا ہے اور رات کو گھر چھوڑتا ہے۔ اور بس۔"

"اس ڈاکٹر شہناز کا آگے پیچھے کوئی نہیں ہے؟"

"ہے کیوں نہیں۔ ماں بھی ہے اور باپ بھی۔ اس کی بہت عزت کرتے ہیں اور بالکل بیٹا سمجھتے ہیں اپنا مگر وہ ان کے پاس بالکل رکنے کو تیار نہیں اور نہ کوئی احسان لینے پر۔ وہ تو صبح سے شام تک وہیں کھڑا رہتا ہے۔ بندر گاہ پر۔"

"اس نے تمہیں سب بتا دیا تھا۔"

"ہاں۔ ہم ایک ساتھ رہتے تھے۔ بھروسے کے قابل نہ ہوتا میں تو مجھے کیوں بتاتا۔ جب میں آ رہا تھا تو رو رہا تھا۔ کہتا تھا کہ کہیں میری بہن ملے یا سکندر اور محسن ملیں تو ان سے کہنا کہ اپنی خیر دیں۔ میں بالکل اکیلا ہوں یہاں۔ حالاں کہ خود اسے معلوم تھا کہ ہمارا ملنا ناممکن ہوگا۔ مگر دیکھو۔ اللہ کیسے اسباب پیدا کرتا ہے۔ یہ سب بابا تاج الدین کی کرامت ہے۔ کہ تم یہاں آ گئے اور میرے پاس آ بیٹھے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ اسے کرامت کہو یا معجزہ۔ یا خدا کی مرضی کہ اس نے ادھر ادھر کے سب در بند کئے مگر وہ در کھلا رکھا جس سے گزر کے ہمیں یہاں پہنچنا تھا۔ آلام و مصائب بھی ایک وجہ تھے۔ ہمارا فرار ہونا بچ نکلنا اور وہ سب جو ہوا اسی ایک لمحے تک رسائی کا سبب بنا۔ اس کے رموز کو بندہ کیا جانے۔" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "تم نے اپنا نام تو بتایا نہیں اب تک۔"

"غلام نبی" وہ بولا "محمد علی سرائے کے پاس رہتا ہوں۔ قوالی ختم ہو جائے تو میرے ساتھ چلو۔"

"محمد علی سرائے۔ وہاں تو ہم نہیں جا سکتے۔"

"میرے گھر میں کوئی خطرہ نہیں۔"

"سب سے بڑا خطرہ خود تمہارا بھائی ہے۔ وہ ضرور پہچان جائے گا ہمیں" میں نے کہا "آج بھی ہم پولیس کے ہاتھوں گرفتار ہوتے ہوتے بال بال بچے ہیں۔ پولیس ہمیں تلاش کر رہی ہوگی۔ ہونے والی ہے۔"

"اچھا جو میں کہتا ہوں وہ کرو۔ قوالی ختم ہوگی تو لنگر بٹے گا۔ چل رہا ہے نا" وہ بولا "تم سیدھے نکل جانا۔ ادھر بہت رش ہوگا۔"

میں نے کہا "غلام نبی۔ ہمارے ساتھ وہ بھی ہیں نازو اور گل بانو"

"گل بانو کون ہے۔"

"ہے ایک لڑکی۔ تم نہیں جانتے۔ وہ ادھر عورتوں میں بیٹھی ہیں۔ برقعے پہنے۔"

"مجھے بتاؤ کیسے برقعے ہیں۔"

"تم کیا عورتوں میں گھس کے تلاش کرو گے۔"

"اچھا تم انہیں بلاؤ۔ کیسے بلاؤ گے۔ ان سے کہو کہ باہر انہیں۔ میرا رکشا کھڑا ہے باہر۔ اس میں بیٹھ جائیں اور برقعے اتار کے مجھے دے دیں۔ میں تمہیں لا دوں گا جو رکشا میرے رکشا کے پیچھے کھڑا ہوگا اس میں سوار ہو جانا۔"

میں نے غالب کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"شاید وہ اس طرح تمہارے رکشا میں بیٹھنے پر تیار نہ ہوں۔"

میں نے کہا "میرا مطلب ہے اکیلی۔"

"ساری بات اعتماد کی ہے" غالب نے کہا "ہم نے تو پہچانا بھی نہیں تھا تمہیں۔ کیسے مان لیں کہ جو تم کہہ رہے ہو....."

"میں آپ کو مجبور نہیں کر سکتا لیکن آپ خود سوچو کہ میں نے جو باتیں بتائی ہیں کیا کوئی اجنبی بتا سکتا تھا۔ جو آپ کو جانتا بھی نہ ہو۔ اکرام شیخ کے بارے میں بھی کیا میں نے جھوٹ بولا ہے؟ جب وہ ملے گا تو تصدیق ہو جائے گی مگر میں نے جو پتا دیا ہے تمہیں کیا وہ بھی غلط ہے اور میں تمہارا دشمن ہوتا تو اتنی باتیں کیوں کرتا تم سے؟ یہ تو بڑا اچھا موقع تھا۔ تم یہاں سے نکل بھی نہیں سکتے۔ دو منٹ میں تم کو پکڑ کے یہی لوگ پولیس کے حوالے کر دیں گے۔"

اس کی بات میں وزن تھا۔ میں نے اور غالب نے طے کیا کہ اس میں رسک ہے تو نہ ہونے کے برابر اور اتنا رسک ہمیں بہرحال لینا پڑے گا۔ رسک تو ہمارے یہاں بیٹھے رہنے اور یہاں سے نکلنے میں بھی تھا۔ یہ موقع اگر تقدیر نے فراہم کیا تھا تو اس کو گنوانا کوئی عقلمندی کی بات نہ تھی۔ خطرہ محسوس ہوا بعد میں تو اس سے نمٹا جا سکتا ہے۔

یہ فیصلہ کرنے کے بعد میں نے خواتین کے حصے کی طرف دیکھا مگر وہاں ایک اژدھام تھا اور سینکڑوں عورتوں کے درمیان گل اور نازو کے کالے نسواری برقعوں کو تلاش کرنا آسان نہ تھا۔ اس امید پر کہ وہ ہمیں دیکھ لیں گی میں نے ایک ہاتھ اوپر اٹھا کے ایسا اشارا کیا جیسے کوئی اپنے گھر کی خواتین کو دیکھ کر انہیں اٹھنے کی کہہ رہا ہو۔ جب وہ آگے پیچھے اٹھیں اور دروازے کی طرف بڑھیں تو میں نے غلام نبی کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اشاروں کی مدد سے اپنا مطلب واضح کرنے کی کوشش کی کہ وہ اس اجنبی پر بھروسہ کریں اور جیسا وہ کہے ویسا ہی کریں۔

دس منٹ بعد غلام نبی پھر نمودار ہوا تو اس کی بغل میں دو برقعے تھے۔ اس نے ہمیں اپنی طرف بلایا اور ایک گلی کی طرف بھیج دیا جس میں اندھیرا تھا اور مختلف کاٹھ کباڑ بھرا ہوا تھا۔ ہم وہاں سے برقع پہن کے غلام نبی کے سگنل پر باہر آئے۔ اس نے راستہ صاف دیکھ کے کہا تھا کہ نکل آؤ۔ میں نے اور غالب نے اپنے مردانہ جوتے اتار کے بغل میں دبائے تھے۔ ہمارے ننگے پاؤں کی طرف تو شاید کسی کا دھیان نہ جاتا مگر برقعے کے ساتھ مردانہ جوتے سب کی نظر میں آتے۔

باہر گل اور نازو ایک ہر طرف سے بند رکشا میں چھپی بیٹھی تھیں۔ ایسے باپردہ رکشا مسلمان گھرانوں کی عورتوں کو درگاہ تک لانے لے جانے کے لئے چادر باندھنے کا خصوصی اہتمام کرتے تھے۔ ہم پیچھے والے رکشا میں بیٹھے ہی تھے کہ قوالی اچانک ختم ہو گئی اور مؤذن کی صدا بلند ہوئی۔ میں اور غالب آپس میں بات بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اس طرح ہمارے مرد ہونے کا راز فاش ہو جاتا۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے تقدیر نے ہمیں تماشائے عبرت کیوں بنا لیا ہے اور ہمارے سفر کو بے سمت کیوں کر دیا ہے۔ وہ مقصد جس کی خاطر ہم نے ہر قربانی دی۔ ہر الزام برداشت کیا اور ہر صعوبت جھیلی۔ اس میں یہ غیر متوقع رکاوٹیں کیوں پیدا ہو رہی ہیں۔ ہمارا جذبۂ جہاد۔ جوش و خروش اور ولولہ۔ ہمارا نظم و ضبط اور ہماری کامیابی کے عناصر میں اعتدال کیوں نہیں رہا۔ وہ متحرک منظم قوت جو ایم آر ایس تھی یکلخت بے سر و سامان کیوں ہو گئی ہے۔ راستے بند کیوں نظر آنے لگے ہیں اور ہم ذہنی انتشار کا شکار کیوں ہیں۔ یہ قافلہ پھر کب جادہ پیما ہوگا۔

رکشا اچانک رک گیا۔ غلام نبی نے ایک بند دروازے پر دستک دی۔ معلوم نہیں وہ کون سا محلّہ تھا اور کون سی گلی تھی اور وہ کس کا گھر تھا۔ ہم تو یہ بھی یقین سے نہیں کہہ سکتے تھے کہ ہم جہاں سے چلے تھے تقدیر ہمیں پھر وہیں تو نہیں لے آئی ہے۔

اپنے طور پر میں ہر طرح کی صورت حال سے نمٹنے کے لئے تیار تھا۔ شاید ہم سب تیار تھے۔ دروازہ کسی عورت نے کھولا اور غلام نبی اس سے آہستہ آہستہ باتیں کرتا رہا۔ پھر اس نے ہمیں بلا لیا۔ ہمارے اندر داخل ہو جانے کے بعد گل اور نازو آئیں۔ ہم کچھ دیر ڈیوڑھی کی تاریکی میں کھڑے رہے۔ جب ہماری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو ہمیں اپنے سامنے پرانی سیڑھیاں نظر آئیں۔ غرارے میں ملبوس ایک عورت کے پیچھے چلتے ہوئے ہم اوپر کی منزل پر پہنچے۔ یہ بہت پرانا بنا ہوا خستہ حال مکان تھا۔ کمرے میں پہنچ کر میں نے اس عورت کو دیکھا جو شاید غلام نبی کی بیوی تھی۔ اس کے ہاتھوں کی مہندی اور اس کے لب و عارض کی حیا آلود شادابی اور اس کی آنکھوں کی پھول کھلاتی مسکراہٹ بتاتی تھی کہ وہ نئی نویلی دلہن ہے۔

"یہ بیوی ہے میری۔ شاداں۔ اور یہ" اس نے میری طرف دیکھا "سکندر بادشاہ ہیں۔ یہ اپنے یار اکرام کی بہن ہے۔ اس سے چھوٹی ہے۔ اکرام میرے ساتھ کراچی میں ٹیکسی چلاتا تھا۔ میں نے بتایا تھا نا۔ اور یہ......" وہ کچھ کنفیوز ہوگیا اور سر کھجا کے ہنسنے لگا۔

میں نے کہا "یہ میری بہن ہے گل بانو اور یہ غالب ہے۔ اسے تم میرا بھائی سمجھ لو۔"

"میں جب ماں کو دیکھنے آیا تھا تو وہ اتنی زیادہ بیمار نہیں تھی۔ مگر پتا نہیں کیوں بہت مایوس تھی۔ اب سوچتا ہوں کہ ماں کو کیسے معلوم ہوگیا تھا۔ ڈاکٹر تو بہت پُر امید تھے مگر اسے معلوم ہوگیا تھا کہ اس کے دن پورے ہوگئے ہیں۔ اس نے پہلے سے بندوبست کر رکھا تھا۔ میرے تو خواب و خیال میں بھی نہیں تھا۔ اس نے مولوی کو بلا کے نکاح پڑھوا دیا۔ میں انکار کیسے کرتا۔"

"کر دیتے" شاداں بولی۔

"تجھے دیکھنے کے بعد تو بالکل گنجائش نہیں رہی تھی" وہ بولا "اچھا اب جو بات میں نے سمجھائی تھی وہ تیری عقل میں آگئی ہے یا نہیں۔"

"میں اتنی بے وقوف بھی نہیں ہوں" شاداں بولی۔

"چل پھر انہیں آرام کرنے دے کچھ دیر۔ اندر والے کمرے میں۔" وہ بولا۔

شاداں مشکل سے سولہ سترہ برس کی لڑکی تھی جو صورت کے بھولے پن سے بچی ہی لگتی تھی۔ وہ بہت حسین تو نہیں تھی مگر قبول صورت تھی اور اس کی صورت پر فخر و مسرت۔ اندازِ محبوبی و ولداری اور انگ انگ سے پھوٹنے والی وہ سرمستی کے جذبات تھے جو ایک دلہن کے حسن کو خیرہ کن بنا دیتے ہیں۔ وہ اٹھلاتی ہوئی آگے بڑھی اور ہم نے اس کی تقلید کی۔ غلام نبی بڑی عجیب سی نظروں سے دیکھتا رہا اور مسکراتا رہا۔

اندر والا کمرا ان کی خواب گاہ تھا بلکہ حجلہ عروسی تھا جس کی چمک دمک ابھی باقی تھی۔ اس کی چھت رنگ رنگ کے کاغذوں کے پھولوں، چمکیلی بیلوں اور سنہرے اور روپہلے ستاروں سے سجی ہوئی تھی اور دیواروں پر بھی کاغذی پھولوں کی رنگین لڑیاں لہرا رہی تھیں۔ کمرے میں دلہن کا نیا جہیز سجا ہوا تھا۔ خوب صورت ڈبل بیڈ۔ الماری۔ سنگھار میز اور دوسرا سامان جسے نفاست سے آرائش کے انداز میں رکھ دیا گیا تھا۔

گل اور نازو جھجکتی ہوئی بیڈ پر بیٹھ گئیں۔ میں اور غالب ایک نئے صوفے پر بیٹھ کے بوٹ کھولنے لگے۔

"یہ کون ہے؟" نازو نے کہا۔

میں نے کہا "اس کا بھائی پولیس میں ہے۔"

"تو یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی۔ سیدھے تھانے چلے جاتے" نازو بولی۔

غالب نے کہا "تم مذاق سمجھ رہی ہو۔ غلام نبی نے خود ہی کہا تھا۔"

"یہ غلام نبی آخر کہاں سے آٹپکا۔ پہلے نہ دیکھا نہ سنا اور تم اس کے ساتھ چلے آئے۔"

"خدا کو یہی منظور تھا" میں نے ایک آہ بھر کے کہا "لیکن تم اسے بابا تاج الدین کی کرامت بھی کہہ سکتے ہیں۔ انہوں نے ہمیں وہاں بلوایا اور ملا دیا۔ کسی نہ کسی کو ہماری نجات کا وسیلہ بننا تھا۔"

غالب نے کہا "کیا اس کا پولیس مین بھائی بھی اسی گھر میں رہتا ہے۔"

میں نے سر کھجا کے کہا "یہ تو نہیں پوچھا ہم نے۔ میرا خیال ہے وہ الگ رہتا ہوگا۔ اس گھر کی حالت سے تو ظاہر نہیں ہوتا کہ یہاں ہذا من فضل ربی کو دخل ہے۔"

"کیا پتا وہ نیچے رہتا ہو یا ایماندار آدمی ہو۔ رشوت نہ لیتا ہو" غالب نے کہا "میری مانو تو غلام نبی سے کہو ہمیں ناگ پور سے نکال دے۔ ہم یہاں چھپ کر کب تک بیٹھے رہیں گے۔ آج کل میں جب بھی موقع ملے۔"

"یہاں سے نکل کے جائیں گے کہاں۔ واپس؟"

"واپس کیوں۔ ہم ڈھاکا جائیں گے" میں نے کہا "وہاں محسن کے ملنے کی امید ہے۔"

گل نے سر ہلایا "یہ کہا تھا اس نے کہ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوجائے کہ ہم جدا ہوجائیں تو گھبرانا نہیں۔ ڈھاکا پہنچ جانا۔ میں ہوٹل شاہ باغ کے سامنے ہر روز صبح آٹھ سے نو بجے تک دیکھوں گا یا اس کے مین گیٹ کے بالکل سامنے سڑک کے دوسرے کنارے پر دیکھنا۔ کسی کھمبے پر کوئی کاغذ کا ٹکڑا چپکا ہوا ملے گا۔ اس پر میں رابطے کی جگہ اور وقت لکھ دوں گا اور ملاقات نہ ہوسکی تو پیغام بدل دوں گا۔ نئی جگہ اور نیا وقت بتا دوں گا یا جیسا بھی ہوا۔ میرا پیغام فرنچ میں ہوگا۔ سکندر سمجھ لے گا۔ اگر تم پہلے پہنچ جاؤ تو یہی کرنا۔ میں کھمبا تلاش کر لوں گا۔"

میں غالب اور نازو اسے حیرانی سے دیکھتے رہے۔

"کب کہی تھی محسن نے تم سے یہ بات۔"

"اسی رات۔ جب وہ میرے ساتھ تھا۔ مال گاڑی کے آخری ڈبے میں" گل نے کہا۔

"تابوت سے نکلے بغیر وہ بات کیسے کر سکتا تھا۔"

میں نے کہا "گل۔ ابھی تک تم نے کچھ نہیں بتایا تھا اور ہم نے بھی تم سے اس لئے کچھ نہیں پوچھا تھا کہ تمہاری ذہنی و جسمانی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ لیکن اب وقت ہے۔ بتاؤ اس رات کیا ہوا تھا۔ شروع سے بتاؤ۔"

"شروع سے" وہ سوچ کر بولی۔

"ہاں۔ ہم نے تو تمہیں پولیس کے قبضے سے چھڑایا تھا۔ انہوں نے تمہیں گل بانو نہیں ڈاکو ناگ منی سمجھ کے گرفتار کیا تھا۔ تم کیبن میں سوتی ہوئی ملی تھیں۔ وہاں کیسے پہنچ گئی تھیں تم۔"

گل نے کہا "مجھ سے محسن کہہ گیا تھا کہ یہیں میری واپسی کا انتظار کرنا۔"

"وہ خود کہاں گیا تھا؟"

"ایسے نہیں۔ یہ بتاؤ کہ جب ہم چلے گئے تھے اس کے بعد کیا ہوا تھا" میں نے کہا "کوئی ایک شیشے کا تابوت لایا تھا۔"

گل نے اقرار میں سر ہلایا "وہ تابوت لانے والے۔ ایک تو کرنل تھا۔ اس کے ساتھ چوہدری دلاور تھا۔"

"دلاور۔ تمہیں یقین ہے۔ میرا مطلب ہے اچھی طرح دیکھا تھا تم نے۔ پہچان لیا تھا اسے؟"

"اس میں شک و شبے کی کون سی بات ہے۔ کیا میں نے اسے دیکھا نہیں تھا پہلے؟" گل نے کہا۔

"وہ دونوں خود اٹھا کے لائے تھے تابوت؟"

"نہیں۔ وہ ساتھ آئے تھے" گل نے کہا۔

"اچھا تابوت میں کیا تھا۔ کون تھا؟"

گل نے نفی میں سر ہلایا "کوئی نہیں۔ تابوت خالی تھا۔"

میں نے غالب کی طرف دیکھا "یہ کیسے ہوسکتا ہے۔"

"میں نے تو دیکھا تھا۔ اور میں بھی حیران ہوئی تھی کہ اس میں وہ کیوں نہیں ہیں۔ شہلا اور اس کا بیٹا۔ محسن نے بھی دیکھا تھا بعد میں۔ اور۔ مجھ سے پوچھا تھا۔"

"کیا پوچھا تھا؟"

"یہی۔ جو تم نے پوچھا" گل بولی "وہ بہت دیر تک خالی تابوت کو دیکھتا رہا تھا۔ بڑی عجیب نظروں سے۔ میں تمہیں بتا نہیں سکتی اس وقت محسن کی کیا حالت تھی۔ مجھے خوف آنے لگا تھا اس کی صورت دیکھ کر۔ وہ...... عجیب ہوگیا تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب میں نے گارڈ کو ناک آؤٹ کر دیا تھا اور محسن تابوت میں سے نکالا تھا۔"

"کرنل اور چوہدری دلاور کی باتیں سن کے تم نے کوئی اندازہ نہیں کیا تھا؟" میں نے کہا "آخر شہلا کو اور اس کے بیٹے کو اس تابوت سے نکال کے وہ کہاں لے گئے تھے اور خالی تابوت وہاں چھوڑنے کا مقصد کیا تھا۔"

"مجھے نہیں معلوم۔ انہوں نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔ انہوں نے گارڈ سے کہا تھا کہ اس کا خیال رکھے۔ شیشے کو کچھ نہ لگے جب ضرورت پڑے گی اس کی تو لے جائیں گے۔ ان کی صرف ایک بات سے اندازہ ہوتا تھا کہ شاید انہیں آگے کسی جگہ رکھا گیا تھا۔ کرنل نے پوچھا تھا کہ وہ آگئے ہیں نا اور چوہدری نے سر ہلا کے کہا تھا کہ ان کی فکر مت کرو۔ پھر وہ چلے گئے تھے۔"

"ان کی مراد یقیناً شہلا سے ہوگی" نازو نے کہا "بعد میں وہ پھر انہیں اس تابوت میں ڈالنا چاہتے ہوں گے۔"

میں نے اور غالب نے اس خیال کی تردید نہیں کی۔ گل کا اندازہ غلط بھی ہوسکتا تھا اور ٹھیک بھی۔ اگر انہیں واقعی آگے رکھا گیا تھا تو شک کی گنجائش بہت کم رہ جاتی ہے۔ ہم نے انہیں خود مار ڈالا۔ ٹرین کے ٹکراتے ہی ان کا وجود آگ اور دھوئیں میں تحلیل ہوگیا ہوگا۔ چوہدری دلاور نے تو صاف کہا تھا کہ انہیں ضمانت کے طور پر ساتھ رکھا جائے گا۔ اسلحے کے ڈھیر پر محسن کی شہلا ہوگی اور ان کی محبت کی نشانی وہ بچہ ہوگا جو اپنے باپ کی صورت سے اتنا ہی ناآشنا تھا جتنا باپ اس کی صورت سے۔ جس نے ان سے رشتوں کے نام تو سنے ہوں گے مگر اس کے چچا اور ماموں اور پھوپی کون ہیں اور کہاں ہیں۔ یہ جاننے کے لئے اس کے پاس فرصتِ عمر بہت کم تھی۔

کیا واقعی ہم نے شہلا کو اپنی کامیابی کی بھینٹ چڑھا دیا ہوگا۔ یہ تصور بھی احساس کے لئے سزا تھا۔

میں نے کہا "گل۔ سوچو۔ یاد کرو۔ کوئی ایسا وقفہ تو نہیں آیا تھا جب تم پر نیند غالب آگئی ہو۔ یا۔"

"کیسی باتیں کرتے ہیں آپ بھائی سکندر۔ وہاں نیند آسکتی تھی مجھے۔" گل نے کہا "موت آسکتی تھی مگر نیند نہیں۔ میرا کیا حال تھا اکیلے رہ جانے کے بعد۔ آپ کو کیا معلوم۔ خوف اور دہشت سوار تھی مجھ پر۔ پھر جب وہ خالی تابوت رکھ گئے۔ تو بھی۔ میں نہ جانے کیسے بے ہوش نہیں ہوئی۔ ایک خیال تھا کہ مجھے محسن کو بچانا ہے۔ اسے نکالنا ہے۔"

"اچھا! اس نے باہر آنے کے بعد کیا پوچھا۔ کیا کہا تم سے یاد کر کے بتاؤ؟ کیا اس نے شہلا کا نام لیا تھا؟"

"نہیں۔ نام تو نہیں لیا۔ مگر وہ بار بار کہتا رہا کہ گل۔ اس میں تو کوئی نہیں۔ یہ خالی کیوں ہے گل....."

"اس کا مطلب ہے۔ اسے سب معلوم تھا" میں نے دکھی دل سے کہا "وہ سب جو ہم اس سے چھپاتے رہے تھے۔"

گل نے اقرار میں سر ہلایا "جب میں کچھ نہیں بولی تو اس نے مجھے دیوانوں کی طرح جھنجوڑا اور چلانے لگا کہ گل تم کو ضرور معلوم ہوگا۔ تم چھپا رہی ہو مجھ سے۔ اور میں نے اس کی قسم کھا کے کہا کہ میں سچ کہہ رہی ہوں۔ تو اس نے یقین بھی کر لیا میری بات کا۔ وہ اپنے آپ سے باتیں کرتا رہا۔ پھر کہنے لگا کہ میں آگے جا کے دیکھتا ہوں۔ سکندر اور غالب سے پوچھتا ہوں۔ میں نے کہا کہ چلتی ٹرین میں کیسے جاؤ گے ان کے پاس تو وہ کہنے لگا میں چھت کے اوپر چلتا ہوا جاؤں گا۔ مگر میں نے اسے روک لیا۔ پھر ایک جگہ ٹرین رکنے لگی تو اس نے دوسری طرف اشارا کیا۔ ایک طرف تو پلیٹ فارم تھا۔ دوسری طرف جنگل تھا۔ اس نے کہا "وہ دیکھو گل" اور میں نے دیکھا تو مجھے کوئی نظر نہ آیا۔ میں نے کہا "کیا ہے؟" محسن نے کہا "ایک عورت تھی۔ اس کی گود میں ایک بچہ تھا۔ اور دو آدمی اسے

پکڑے لے جا رہے تھے۔ زبردستی۔"

میں نے کہا "اور تمہیں یقین ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔"

گل نے کہا "بھائی سکندر۔ کچھ ہوتا تو مجھے نظر نہ آتا اس نے نام تو نہیں لیا شہلا کا۔ مگر اس کے حواس پر اور اعصاب پر شہلا سوار تھی۔ اور اپنا بیٹا۔ وہ ہوش میں نہیں تھا۔ اس کی آنکھیں اسے جھوٹے خواب دکھا رہی تھیں۔ وہ صرف اس کا تصور تھا اور دھوکا تھا اس کے خیالوں کا۔ مگر وہ ایک دم اتر کے بھاگا۔ پھر میں کیا کرتی۔ میں اس کے پیچھے بھاگی ایک جگہ میں نے اسے جا لیا۔ وہ جنگل میں کھڑا ادھر ادھر دیکھ رہا تھا اور اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا "ابھی تو یہاں تھے وہ۔ کہاں چلے گئے" میں نے کہا کہ محسن۔ پاگل مت بنو۔ واپس چلو۔ گاڑی نکل جائے گی۔ اس نے کہا کہ گاڑی نکل کے کہاں جائے گی۔ اور ہنسنے لگا۔ تم جاؤ اگر تمہیں گاڑی کے نکلنے کا ڈر ہے۔ مگر میں اس کے ساتھ رہی۔ میں نے ٹرین کی وسل سنی اور ٹرین کو روانہ ہوتے ہوئے سنا۔ اس وقت اچانک محسن کو ہوش آگیا۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کے واپس دوڑا مگر اتنی دیر میں ٹرین دور نکل گئی تھی۔ ہم پٹڑی پر اس کے پیچھے پیچھے نہیں بھاگ سکتے تھے۔ ہم پٹڑی کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ میں بہت تھک گئی تھی۔ اچانک ایک پرانا کیبن آگیا۔ پٹڑی سے کافی دور ایک کمرا تھا جو پہلے کبھی استعمال ہوتا ہوگا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ تم یہاں ٹھہر جاؤ۔ میں آگے جاتا ہوں۔ ٹرین زیادہ دور نہیں جا سکتی۔ سکندر اور غالب کو معلوم ہوگا کہ ہم ٹرین پر نہیں ہیں تو وہ ٹرین کو روک لیں گے۔ ویسے بھی پروگرام کے مطابق ٹرین کو تباہ کرنے کے لئے یہی جگہ ہے۔ چند میل آگے یا پیچھے۔ اس نے زبردستی مجھے وہاں بٹھا دیا اور کہہ گیا کہ میں اس جگہ سے نہ ہلوں۔ وہ واپس آکے مجھے لے جائے گا۔" گل بات کرتے کرتے رونے لگی تھی۔

میں نے کہا "رونے سے کچھ نہیں ہوگا۔ چلو اچھا ہوا اتنا تو معلوم ہوگیا کہ وہ ہمارے پیچھے ہی نکلا تھا۔ ہو سکتا ہے پیچھے پیچھے آجائے اور نہ آیا تب بھی اس نے خود ہی صورت بتا دی تھی پھر ملنے کی۔"

غالب نے سر ہلایا "میرا خیال ہے کہ اب یہاں سے نکلیں تو سیدھے ڈھاکا چلیں۔"

"محسن اکیلا رہے گا تو پاگل ہو جائے گا۔"

"اب بھی کیا کم ہے اس کی دیوانگی" گل نے کہا "تم لوگ ایسے ہی اس کے سامنے انجان بنتے رہے۔ تمہارا دل رکھنے کو وہ بھی چپ رہا۔ ورنہ اسے سب معلوم تھا۔ اس نے انتہائی صبر اور ضبط کا مظاہرہ کیا۔"

"اب تو یہ خیال بھی آرہا ہے مجھے کہ کہیں محسن نے لاہور فون کر کے سب معلوم نہ کیا ہو" تازو بولی۔

"مجھے تمام عمر شرمندہ رہنا پڑے گا کہ میں نے اسے اندھیرے میں رکھا۔ اگر شہلا مل جاتی تو کچھ نہ ہوتا۔ لیکن اب احساس کی اذیت کم نہیں ہے کہ ہم نے محسن کو شہلا سے اور ہم نے ہی انہیں ملنے نہ دیا۔ خود اپنے ہاتھوں اس کی دی۔"

"ابھی تصدیق کہاں ہوئی ہے کہ شہلا اسی ٹرین پر تھی" نے کہا "محسن نے اسے ٹرین سے اتر کے جاتے دیکھا تھا۔"

"اول تو گل کے کہنے کے مطابق یہ فریب خیال تھا۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ جو محسن نے دیکھا تھا وہ گل نہیں آیا" غالب بولا "اس سے پہلے کہ گل کچھ دیکھتی وہ غائب ہوگئی۔ کیوں گل؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا؟"

گل نے سوچ کے آہستہ سے کہا "چند سیکنڈ میں اس کا ہو جانا مشکل تھا۔"

"مگر ناممکن نہیں" غالب نے کہا۔

"ہاں۔ ناممکن نہیں کہہ سکتے۔ آگے جنگل تھا۔ یہ کہ محسن نے اس کی ایک جھلک دیکھی۔ اور پھر مجھے کوشش کی۔ اس وقفے میں وہ سب نگاہ سے اوجھل ہوگئے۔ وہ کتنی دیر تک دیکھتا رہا تھا۔ اور کتنی دیر غور کرنے کے بعد مجھے متوجہ کیا تھا۔"

غالب نے کہا "پھر یہ بھی تو ضروری نہیں کہ وہ عورت ہو۔ اور اس کی گود میں جو بچہ تھا وہ محسن کا بیٹا ہو۔ ایسے تو میں بہت سے لوگ نظر آجاتے ہیں آتے جاتے۔ محسن کو لگی ہو مگر شہلا نہ ہو۔"

"کیا اس نے۔ ان دونوں مردوں کے بارے میں تھا۔ جو اس عورت کے ساتھ تھے؟" میں نے پوچھا۔

گل نے کہا "نہیں۔ ان کے بارے میں تو کچھ بھی نہیں تھا۔"

"اگر وہ دلاور اینڈ کمپنی کے لوگ ہوتے تو محسن کسی نہ کسی نام لیتا" غالب نے کہا۔

"ایسے کام خود دلاور یا تریویدی جیسے لوگ نہیں کرتے کے سب کارکنوں کو ہم نہیں جانتے" میں نے کہا۔

"پھر بھی۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ راستے میں اتار کے وہ کہاں لے جا سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "یہ ان کی چالاکی ہو سکتی ہے۔ انہوں نے اسی شیشے کے تابوت میں اسٹیشن پہنچایا۔ مقصد یہ ہوگا کہ ہم لیں۔ پھر وہاں خالی تابوت چھوڑ دیا اور اسے کسی بوگی میں ہمیں دھوکا دینے کے لئے۔ ان کو ڈر ہوگا کہ ہم آس پاس تو کہیں ایسا نہ ہو کہ حملہ کر کے شہلا کو بھی نکال لے جائیں۔ ایسا کرتے تو ہمیں مایوسی ہوتی۔ ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہوتے کہ انہوں نے اپنی دھمکی پر عمل کرتے ہوئے اسلحہ خانے میں ہے۔ ایک چیلنج بنا کے۔ کہ اب ہمت ہے تو کچھ کر کے دکھاؤ۔"

"پھر اسے اتار کیوں لیا انہوں نے۔"

"یہی تو چالاکی ہوگی ان کی۔ انہوں نے پلیٹ فارم کی طرف نہیں بلکہ دوسری طرف سے اسے غائب کر دیا۔"

"مگر کیوں۔"

"پھر کسی موقع پر استعمال کرنے کے لئے۔ اس ٹرین کو محفوظ رکھنے کے لئے جو کچھ وہ کر سکتے تھے کر چکے تھے۔ وہ ہمیں یقین دلا چکے تھے کہ شہلا کی زندگی داؤ پر ہے۔ اس کے بعد شہلا کو قربان کرنا ضروری نہیں رہا تھا۔ اس ٹرمپ کارڈ کو پھر کسی جگہ کھیلا جا سکتا تھا۔ دلاور جیسے عیار آدمی کے ذہن کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔"

غالب نے کہا "کیوں نہ ہم تریویدی سے پوچھ لیں۔"

"تمہارا کیا خیال ہے وہ بتا دے گا؟" میں نے کہا "وہ کم تو نہیں ہے دلاور سے۔ پھر بھی اس کے رد عمل سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔"

"کیا فون ہے یہاں؟"

"ہوا بھی تو تریویدی سے بات کیسے ہوگی۔ ہمیں تو اس کا پرانا نمبر معلوم ہے۔"

"آپریٹر خود نیا نمبر ملا دے گا۔ میں غلام نبی کو بلاتا ہوں۔" غالب نے کہا اور دروازے کے قریب جا کے اسے آواز دی۔

غلام نبی نیچے سے دوڑتا ہوا آیا "یہ آپ کیا غضب کرتے ہیں جناب۔ میں نے تو آپ کو چھپا کے رکھا ہے۔"

میں نے کہا "کیا تمہارا بھائی بھی اسی گھر میں رہتا ہے؟"

"ہاں جی۔ خدا کا شکر ہے کہ اس وقت وہ موجود نہیں تھا اور بھابی ابھی سو رہی ہے" وہ بولا۔

"تم نے اپنی بیوی کو بھی سمجھا دیا ہے۔"

"سمجھا دیا ہے جناب بہت اچھی طرح۔ لیکن آپ لوگ اس کمرے سے باہر نہ نکلیں۔ آواز بھی نہ آئے آپ کی۔ نیچے ورنہ گڑبڑ ہو جائے گی۔"

"اور کوئی اوپر آگیا۔ پھر؟"

"اوپر کوئی نہیں آتا۔ ہمارے کمرے کے ساتھ ہی غسل خانہ بھی ہے۔ شاداں ناشتا لا رہی ہے سب کے لئے۔"

میں نے کہا "غلام نبی۔ تم نے اکرام شیخ کی دوستی کا حق ادا کر دیا ہے۔"

"آپ مجھے اپنا دوست نہیں سمجھتے؟" وہ بولا۔

"دوست نہ سمجھتے تو تمہارے ساتھ کیوں آتے۔ اور تو سب دشمن ہیں" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "غلام نبی۔ یہاں کہیں فون ہے۔"

"فون۔ نیچے ہے۔ لائن اوپر بھی ہے۔ کس سے بات کرنا چاہتے ہیں آپ؟"

"بمبئی میں سیٹھ تریویدی سے" میں نے کہا۔

وہ سوچ میں پڑ گیا "ٹیلی فون بیڈ سائیڈ ٹیبل کے اندر ہے میں جوڑ دیتا ہوں۔ دراصل بھائی کے فون آتے ہیں تو ہماری نیند خراب ہوتی ہے۔ سو فون ان کے ہوں تو ایک ہمارا ہوتا ہے۔"

"چناں چہ تم فون الگ کر کے رکھ دیتے ہو۔"

"اور کیا کروں۔ اس کی گھنٹی تو بند ہوتی نہیں۔ اب آپ نمبر ملائیں گے تو گھنٹی نیچے بھابی کے کمرے میں بھی ٹن ٹن کرے گی۔ خیر میں تار الگ کرتا ہوں نیچے جا کے۔ بھابی کے کمرے کا سوئچ آف کرتا ہوں۔ ورنہ وہ سب سن لے گی۔"

"ایسا ہی سوئچ تم بھی لگوا لو نا" تازو نے کہا۔

غلام نبی مسکرایا اور نیچے چلا گیا۔ چند منٹ بعد وہ پھر نمودار ہوا اور اس نے بیڈ سائڈ کی ایک دراز میں سے فون نکال کے نیچے سے آنے والے تار سے جوڑ دیا۔

"جلدی سے بات کر لیں۔ بھابی کا کوئی بھروسہ نہیں ابھی اٹھے گی تو شور مچا دے گی کہ فون ڈیڈ ہے۔ اسے خبط ہے فون گھمانے کا۔ صبح سب سے پہلے تو میکے میں ایک ایک کی خیریت پوچھتی ہے۔ لیٹے لیٹے۔ میری بیوی بہت جلتی ہے۔"

"اس کا بھی دل چاہتا ہوگا۔"

"ہاں۔ مگر فون کہاں ہے ان کے گھر میں" غلام نبی بولا۔

"بمبئی کا کوڈ یاد ہے" میں نے کہا۔

غلام نبی کوڈ بتا کے پھر نیچے بھاگ گیا۔ وہ بے حد مصروف نظر آتا تھا۔ اس گھر میں پہلے ان کی ماں بھی ہوگی مگر اب اوپر کی منزل چھوٹے بھائی کے تصرف میں تھی اور نیچے کی منزل بڑا بھائی استعمال کر رہا تھا۔ وہ خود بھی پولیس افسر تھا اور ایسا لگتا تھا کہ اس کی بیوی سب کی افسر ہے۔ غلام نبی بھی اس سے ڈرتا تھا۔

بمبئی کا نمبر ملتے ہی میں نے آپریٹر کو نمبر دیا کہ سیٹھ تریویدی کا نمبر ہے۔ ارجنٹ کال ملا دو۔

چند منٹ بعد گھنٹی بجنے لگی۔ صبح صبح لائنوں پر رش نہیں تھا۔

آپریٹر نے کہا "ان کا یہ نمبر نہیں ہے۔"

میں نے کہا "اگر نمبر بدل گیا ہے تو مہربانی کر کے نیا نمبر ملا دو۔"

شاید یہ انکسار آپریٹر کو پسند آیا۔ اس نے "اچھا" کہا اور میں پھر ریسیور رکھ کے انتظار کرنے لگا۔ گھنٹی دوسری بار بجی۔

"سیٹھ تریویدی سے بات کریں۔"

مجھے بہت کم امید تھی کہ اتنی صبح تریویدی سے بات ہو سکے گی۔ دوسری طرف سے اس نے پھاڑ کھانے والے انداز میں "ہیلو" کہا۔

"مسٹر تریویدی" میں نے کہا "میں تمہیں اور دلاور کو مبارک باد دینا چاہتا ہوں۔"

وہ جیسے چونک کر بولا "کون۔ محسن۔ تم نے کل بھی فون کیا تھا۔ دیکھو میں پھر بتا دینا چاہتا ہوں تمہیں کہ مجھے اس حرام زادے کا کچھ پتا نہیں۔ وہ مجھے مل جائے تو تم سے پہلے میں خود اسے کتے کی موت مار دوں۔"

میں نے اس انکشاف کی حیرت پر قابو پالیا کہ محسن پہلے بھی تریوینی سے بات کر چکا تھا "آخر کیوں تریوینی۔ تم بڑے اچھے دوست تھے آپس میں....."

"دوست۔ اس لفظ کے کوئی معنی نہیں ہیں میری لغت میں۔ نہ کبھی کوئی میرا دوست ہوا ہے نہ میں کسی کا دوست ہوں۔"

"صرف دشمن بنائے ہیں تم نے؟"

"مطلب کی بات کرو۔ میں ایک کال کا انتظار کر رہا تھا اس لئے جاگ رہا تھا" تریوینی بولا "تم سے تو میں بعد میں نمٹوں گا پہلے مجھے دلاور مل جائے۔ اس نے مجھے تباہ کر دیا۔ میں اچھا بھلا بزنس مین تھا۔ اس نے مجھے دہشت گردوں کے کاروبار میں ڈال دیا۔"

"فیصلہ تمہارا اپنا ہوگا تریوینی۔ تم بچے نہیں ہو کہ اس نے تمہیں مجبور کر دیا تھا۔"

"ہاں۔ لالچ نے اندھا کر دیا تھا مجھے کہ اس کاروبار میں ایک کے سو بنانے کی بات میری سمجھ میں آگئی۔ نقصانات کا مجھے کوئی اندازہ نہ تھا۔"

"تریوینی۔ میری پوزیشن بھی تم سے مختلف نہیں ہے۔ مجھے بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس میں میرا مستقبل تباہ ہو جائے گا" میں نے بڑے دکھی لہجے میں کہا۔

وہ قہقہہ مار کے ہنسا "اب کیوں روتے ہو۔ میں نے تمہیں بتا دیا تھا کہ تمہاری بیوی بچے ضمانت ہوں گے ہمارے تحفظ کی۔ مگر تمہارے ان دوست کہلانے والے دشمنوں نے تم کو بے خبر رکھا۔ میرا بہت بڑا مالی نقصان ہوا مگر اس سے میں غریب نہیں ہوا۔ میں سب کسر نکال لوں گا سال بھر میں۔ تم اپنے بیوی بچے.... کہاں سے لاؤ گے۔ مجھ سے نہیں اس سکندر اعظم کی اولاد سے پوچھو کہ اس نے کون سی دنیا فتح کر لی۔ اپنی اس...... کو تو چپکے سے واپس بھیج دیا۔"

"رابعہ اپنی مرضی سے گئی تھی" میں نے اس کے نام کے ساتھ دی جانے والی اشتعال انگیز گالی کو نظر انداز کر دیا۔

"ایسا ہی کہتا ہوگا وہ تمہیں۔ مگر یہ سازش تھی۔ اس نے بے وقوف بنا دیا تم سب کو۔ وہ سب کو مروا دے گا اور خود بڑی شان سے واپس لوٹ جائے گا۔ تم کو کہیں بھی چھوڑ دے گا راستے میں۔ تم سب پاگل ہو کہ اس کی باتیں سن لیتے ہو۔ وہ ہٹلر ہے۔ اسی کی طرح سفاک اور بے رحم۔ اس نے بھی جرمن قوم کو دیوانہ کر رکھا تھا۔ مگر حاصل کیا ہوا اسے.....؟"

"تم مجھے بدگمان کرنا چاہتے ہو اس سے؟"

"معلوم ہوتا ہے اب بھی تمہاری آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی ہے۔ تم یہ بات اس سے پوچھ کے دیکھو کہ اس ٹرین پر تمہارے بیوی بچوں کی موجودگی کا اسے علم تھا یا نہیں۔ وہ یہی کہے گا کہ نہیں حالاں کہ اسے سب معلوم تھا۔ پھر اس نے ان کے اور تمہارے بارے میں سوچا کیوں نہیں ٹرینوں کو لڑانے سے پہلے۔ اس لئے کہ خود اس کے لئے اپنی کامیابی زیادہ اہم تھی۔ تم سب ہوتے اس ٹرین میں تب بھی وہ پروانہ کرتا۔ سب کو اسی طرح موت کے گھاٹ اتار دیتا اور اپنی فتح کا میڈل سینے پر سجا لیتا۔ میری مانو تو اب بھی وقت ہے۔ واپس چلے جاؤ اپنے گھر۔ اس احمقانہ جدوجہد سے کچھ حاصل نہیں۔ تم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ رائی سے پہاڑ نہیں ہل سکتا۔ جہاں بین الاقوامی سیاست کے گھوڑے دوڑ رہے ہوں کیا وہاں چیونٹی راہ میں حائل ہو سکتی ہے۔"

میں خاموشی سے سب سن رہا تھا اور یہ نہیں چاہتا تھا کہ میری اور تریوینی کی گفتگو کے بارے میں دوسروں کو کچھ معلوم ہو۔ اپنی طرف سے تریوینی نے محسن کو مجھ سے بدظن کیا تھا۔ خوشی کی بات یہ تھی کہ محسن زندہ تھا اور محفوظ تھا۔ اس نے کہیں سے تریوینی کو فون کیا تھا اور اس سے دلاور کے بارے میں پوچھا تھا۔ دکھ کی بات یہ تھی کہ اب وہ ذاتی انتقام کے چکر میں پڑ گیا تھا۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ ہماری کامیابی کا عنوان شہلا اور اس کے بیٹے کا بے گناہ لہو بنا ہے۔ جو سب جانتے ہوئے بھی انجان بنا رہا تھا۔ اس امید میں کہ آخر کار ہماری کوششوں سے ان کی جان بچالی جائے گی مگر یہ امیدیں خاک میں مل گئی تھیں۔ اب شاید وہ میرا دوست بھی نہیں رہا تھا۔ جب وہ دوبارہ فون کرے گا تو تریوینی اسے بتائے گا کہ وہ سکندر اعظم تھا جس نے محسن بن کے فون کیا تھا۔ پھر وہ محسن کو مزید بدظن کرے گا۔

لائن کٹ گئی تھی مگر میں ریسیور کان سے لگائے کھڑا ہوا اپنے ہی خیالوں کی بازگشت سن رہا تھا۔

گل نے مجھ سے کہا "بھائی سکندر کیا ہوا؟" میں نے ریسیور رکھ دیا اور بیڈ پر بیٹھ گیا۔ میرے پاس اس کو بتانے کے لئے کچھ بھی نہیں تھا۔ میں اسے جواب دیتے ہوئے ڈرتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ سچ بولنا ممکن نہیں اور ان سب سے جو میرے دوست تھے اور مجھ پر اعتماد رکھتے تھے جھوٹ بولنا اس سے زیادہ ناممکن تھا۔

اچانک نیچے کوئی عورت چلانے لگی۔ پھر کسی اجنبی مرد کی آواز نے اسے خاموش کر دیا۔ میں نے دروازے سے کان لگا کے سنا۔

"شور مت کرو۔ میں دیکھتا ہوں" مرد بولا۔

"غلام نبی۔ بولتا کیوں نہیں......" عورت چلائی۔

"آپ کو وہم ہو گیا ہے بھابی......" غلام نبی نے کہا "اوپر کوئی نہیں ہے۔"

"تو جھوٹ بکتا ہے" عورت نے کہا۔

میں نے گھبرا کے دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر دروازہ باہر سے بند تھا۔ شاید مقفل تھا۔ کوئی اوپر آ رہا تھا۔

غالب اور نازو کا رنگ فق ہو گیا تھا۔ انہوں نے کمرے کے پردے ہٹا کے کوئی کھڑکی، دروازہ یا روشن دان تلاش کرنے کی کوشش کی مگر فرار کے سب راستے مسدود تھے۔ کھڑکی میں آہنی سلاخیں تھیں اور غسل خانے کا روشن دان چھوٹا ہونے کے علاوہ دوسری منزل کی انتہائی بلندی پر تھا۔

غلام نبی چلانے لگا "رک جاؤ بھیا۔ اوپر دوست ہیں میرے۔ فیملی ہے۔"

"کیا؟" یہ غالباً غلام نبی کے بھائی کی آواز تھی "ابھی تُو کہہ رہا تھا کہ اوپر کوئی نہیں ہے۔"

"وہ...... دراصل پردہ دار لوگ ہیں۔"

"کون لوگ ہیں؟ انہیں اس طرح چھپا کے کیوں رکھا ہوا ہے تم نے؟" غلام نبی کے بھائی نے شکی لہجے میں کہا۔

"میرا دوست ہے۔ اور اس کی بیوی۔"

"بیوی یا کوئی لڑکی، جسے وہ بھگا کے لایا ہوگا اور تُو نے اسے میرے ہی گھر میں چھپنے کی اجازت دے دی" غلام نبی کے بھائی نے غصے سے کہا "مجرم برآمد ہوں تو ایک پولیس افسر کے گھر میں سے۔"

"ارے یہ بے وقوف بنا رہا ہے تمہیں۔ نہ کوئی دوست نہ کسی کی بیوی" غلام نبی کی بھابی نے چلاتے ہوئے کہا "وہ تو پتا نہیں کون لوگ ہیں۔ دو مردوں کی آواز خود سنی ہے میں نے۔ فون پر بات کر رہا تھا ایک تو۔ اس کا نام محسن ہے۔"

"ٹیلی فون بھی کیا تھا؟"

"صبح صبح ٹرنک کال کی تھی آپ کے مہمانوں نے" غلام نبی کی بھابی نے طنز سے کہا "بمبئی کے کسی سیٹھ تریوینی کو۔ وہ پتا نہیں کس دلاور کو گالیاں بک رہا تھا کہ اس نے مجھے دہشت گردی کے کاروبار میں ڈال دیا۔ بہت نقصان ہو گیا میرا۔ میں اسے مار ڈالوں گا۔ اور کسی سکندر اعظم کا نام بھی لیا تھا اس نے، جس نے ٹرینوں کو لڑا دیا۔"

"یہ کیا بکواس ہے" غلام نبی کے بھائی نے کہا۔

"ارے، میں نے خود سنا ہے اپنے کانوں سے۔ وہ تو جب میرے کمرے میں گھنٹی ٹرن ٹرن کرنے لگی تو میری آنکھ کھل گئی تھی۔ ...میں نے کہا یہ اتنی صبح کون بیٹھ گیا فون ملا کے۔ پہلے ہی بل کم نہیں آتا، دینا تو ہمیں پڑتا ہے۔ ایک ایک لفظ سنا تھا میں نے۔"

میں اور غالب دروازے کے پیچھے دم سادھے سب کچھ سن رہے تھے۔ اس میں کوئی شک کی گنجائش نہ تھی کہ ہمارے ستارے گردش میں تھے اور ہم مر مر کے ایک آفت سے بچتے تھے تو دوسری گلے پڑ جاتی تھی۔ ٹیلی فون کو استعمال کرنا ایک فاش غلطی ثابت ہوا۔ اس کی ایکس ٹینشن پر غلام نبی کے انسپکٹر بھائی کی بدمزاج، بدخو بیوی نے میری اور تریوینی کی ساری باتیں سن لی تھیں اور جتنی یاد رہی تھیں وہ اپنے شوہر کے کانوں میں ڈال دی تھیں۔ اب غلام نبی کے پاس نہ جھوٹ کا سہارا تھا نہ کوئی اور بہانہ۔

"میں کہتا ہوں ہٹ جا میرے راستے سے۔ میں سب سمجھ گیا ہوں غلام نبی۔"

"آپ میری بات تو سنیں۔"

"کیا سنوں میں تیری بات۔ تو ان دہشت گردوں کو کہاں سے لایا ہے؟" کتنے پیسے لئے ہیں ان کی مدد کرنے کے؟"

"خدا کی قسم بھیا......"

غلام نبی کے بھائی نے اسے چند گالیوں سے نوازا "قسم کھانے سے کچھ نہیں ہوگا...... یہ تو سوچ کہ ہم بہت بڑی مصیبت میں پڑ سکتے ہیں۔ دہشت گرد کسی کے یار نہیں ہوتے۔ وہ اس گھر کو تباہ کر سکتے ہیں۔ مجھے اور تجھے مار کے بھی نکل جائیں گے وہ۔ اور میری پوزیشن کا خیال ہے تجھے؟ میں ایک پولیس افسر ہوں۔ جان نہ گئی میری تو نوکری چلی جائے گی۔ جیل ہو جائے گی مجھے۔ میری وجہ سے کتنے مسلمان پولیس افسروں کی وفاداری مشکوک ہو جائے گی۔ سب کہیں گے کہ یہ مسلمان بھروسے کے قابل ہیں ہی نہیں۔ یہ سب پاکستان کے ایجنٹ ہیں دل سے" غلام نبی کا بھائی اب اسے قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ راستے سے ہٹ جائے۔

میں نے دروازے کی جھری سے جھانک کر دیکھا۔ غلام نبی واقعی اپنے بھائی کے سامنے دیوار بنا ہوا تھا اور ہاتھ پھیلائے سینہ تانے کھڑا ہوا تھا۔

"بھیا، آپ پہلے مجھے گولی مار دیں۔ تاکہ مجھے شرمندگی نہ ہو یا میں جن کو بابا تاج الدین رحمت اللہ علیہ کی درگاہ سے اپنے گھر لایا تھا، ان کے ساتھ بدعہدی کا الزام آئے مجھ پر" غلام نبی اب رونے لگا تھا۔

"آپ اس کے ٹسوے بہانے پر مت جائیں جی" غلام نبی کی بھابی نے کہا "یہ تو خود پاکستانی ایجنٹ ہے۔ میں تو اسی لئے کہتی تھی کہ اسے مت روکو۔ واپس بھیج دو پاکستان۔ ماں کی بیماری ہم نے بھگتی۔ یہ آگیا مٹی ڈال کے دودھ بخشوانے۔ ہم تو پہلے ہی پھنس گئے ہیں اس کی شادی کر کے۔ کسی کو پتا چل گیا......"

اس وقت ایک غیر متوقع بات ہوئی۔ غلام نبی کے بھائی نے اپنی بیوی کی زبان بند کرنے کے لئے خالص مردوں والا فارمولا استعمال کیا۔ اس نے بیوی کے ایک جھانپڑ رسید کیا "بھونکنا بند کر۔ بہت دیر سے بولے چلے جا رہی ہے الو کی پٹھی۔ یہ چھوٹا بھائی ہے میرا۔ اس کے باپ کی جگہ ہوں میں۔ ماں نے مرتے وقت اسے میرے حوالے کیا تھا۔ مگر تو پہلے دن سے دشمن ہو رہی ہے اس کی۔ سمجھتی ہے یہ مکان کا حصہ بٹانے کہاں سے آگیا۔ تیرے بھائی کے نام کر دوں مکان؟"

اس کی بیوی نے روتے دھوتے کہا "مجھے کیا جی۔ میں کون ہوتی ہوں صحیح مشورہ دینے والی۔ جو تمہارے جی میں آئے کرو۔"

"چل نیچے جا۔ اور خبردار جو اَب تیری آواز بھی سنی میں نے۔" غلام نبی کے بھائی نے گرج کے کہا "ہمارے گھر کی بات ہے ہم نمٹ

لیں گے۔"

غلام نبی اس کایا کلپ سے بہت مطمئن اور مسرور نظر آتا تھا۔

"بھیا! مجھے تو حکم ہوا تھا بابا تاج الدین کا۔ انہوں نے خواب میں آکے کہا تھا کہ غلام نبی' تیرے دو مہمان ہمارے پاس بیٹھے ہیں۔ انہیں اپنے گھر کیوں نہیں لے جاتا۔"

"اچھا! یہ...... یہ پہلے کیوں نہیں بتایا تھا تو نے۔ کہ بابا تاج الدین کا حکم ہے" سب انسپکٹر کو ان سے انتہائی عقیدت معلوم ہوتی تھی۔

"یہ ٹھیک ہے کہ وہ پاکستان سے آئے ہیں۔ مگر بھیا وہ دہشت گرد نہیں ہیں۔"

"اچھا۔ پہلے میں ان سے مل لوں' پھر فیصلہ ہوگا" غلام نبی کے بھائی نے ریوالور جیب میں ڈال لیا۔

جھکے جھکے میری کمر اکڑ گئی تھی۔ میں نے اطمینان کا گہرا سانس لیا اور ان کے دستک دینے سے پہلے ہی دروازہ کھول دیا اور وہ سیدھے چلتے ہوئے اندر آگئے۔

غلام نبی کا بڑا بھائی اس سے بالکل مختلف تھا۔ صورت شکل میں بھی اور ڈیل ڈول میں بھی۔ اس کی خاص پولیس اسٹائل کی توند تھی' مونچھیں تھیں اور کینہ توز آنکھیں تھیں۔ وہ کچھ دیر ہم سب کو گھورتا رہا اور ہم سب مجرم بنے کھڑے اس کے فیصلے کا انتظار کرتے رہے۔ یہ فیصلہ ہمارے خلاف ہوتا تو اس کے آثار پہلے نظر آجاتے اور فیصلے کے اعلان سے پہلے ہم عدالت کو بے بس کردیتے۔ اس نے بات تو عقل مندی کی کہی تھی کہ دہشت گرد کسی کے یار نہیں ہوتے اور اس گھر کو بھی تباہ کرسکتے ہیں مگر حماقت کا ثبوت یہ دیا تھا کہ ہم سے مذاکرات کرنے آگیا تھا۔ ہم جیسے لوگ مذاکرات نہیں فیصلے کرتے ہیں اور فیصلے بھی وہ جو یک طرفہ طور پر ہمارے مفادات کے حق میں ہوں۔

"میں سمجھ گیا" آخر کار اس نے کہا "تم دونوں کو اچھی طرح پہچان گیا۔"

میں نے کہا "گویا تعارف کی ضرورت نہیں" اور مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔

غالب نے بھی کہا "آپ کا اسم شریف؟" اور آگے بڑھا۔

"ٹھہرو۔ تم نے کیسے فرض کرلیا کہ میں بھی الو کا پٹھا ہوں غلام نبی کی طرح" وہ پیچھے ہٹ کے بولا۔

"فرض کرنے کی کون سی بات تھی اس میں! آخر تم اس کے بڑے بھائی ہو" میں نے کہا۔

"مگر میں بے وقوف نہیں ہوں۔"

"ہاں۔ صورت سے بھی نہیں لگتے" میں نے اتفاق کیا اور ایک دم اس کے پیچھے جا کے دروازہ بند کردیا۔

وہ تیزی سے گھوما "یہ...... یہ کیا حرکت ہے۔"

میں نے کہا "اب ہم اطمینان سے بیٹھ کے بات کرسکتے ہیں۔"

"مجھے تم سے کوئی بات نہیں کرنی" اس نے مشتعل ہو کے ریوالور نکال لیا۔

میں اطمینان سے دروازے کے سامنے کھڑا رہا "اوکے۔ ہم بات کریں گے۔ تم سنو گے اور صرف اتفاق کروگے۔ اختلاف کی اجازت نہیں ہوگی۔"

"تم کون ہوتے ہو......" اس نے دھاڑ کے کہا اور مجھے ایک گالی دی۔

میں نے متاثر ہوئے بغیر اسی پُرسکون انداز کو برقرار رکھا۔ "پہلے ہم مہمان تھے اس گھر میں۔ گھر تمہارا اور غلام نبی کا ہے۔"

نازو نے رونی شکل بنا کے اور قریب آکے کہا "تھانیدار جی! چلو غلطی ہوگئی۔ اب جانے دو ہمیں۔"

اس نے حقارت اور طنز سے کہا "غلطی ہوگئی۔ کس سے؟"

"تم سے" میں نے کہا "آنے سے پہلے تم نے بھی نہیں سوچا تھا کہ جانا دوسرے کی مرضی کے بغیر ممکن نہیں ہوگا۔"

وہ میری طرف متوجہ تھا جب نازو نے اس کی کلائی پر اپنی کھڑی ہتھیلی ماری۔ اس نے بلبلا کے نازو کو ایک گالی دی لیکن اس کے ہاتھ سے ریوالور چھوٹ گیا۔ وہ اب دوسرے ہاتھ سے مضروب کلائی کو پکڑے کھڑا تھا۔ نازو اس کے ریوالور کو گرنے سے پہلے جھپٹ کے دور جا کھڑی ہوئی تھی اور یہ سب پانچ سیکنڈ سے بھی کم وقت میں ہوگیا تھا۔

"اب آپ ہمارے مہمان ہیں" میں نے کہا "اس گھر میں ہم آپ کے مہمان۔ اس کمرے میں آپ ہمارے مہمان۔"

"گویا ہم دونوں بیک وقت میزبان بھی اور مہمان بھی۔"

غالب نے ایک کرسی آگے بڑھائی "پدھاریئے۔"

وہ چالاک آدمی تھا۔ اس نے جیسے ہی محسوس کیا کہ بازی الٹ گئی ہے اور اب وہ کچھ بھی نہیں کرسکتا تو اس نے گرگٹ کی طرح رنگ بدل لیا۔ اس کے چہرے کی خشونت میں نرمی جھلکنے لگی۔ وہ مسکرانے لگا اور پھر بے تکلفی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ غلام نبی کے چہرے پر اطمینان کے آثار نظر آنے لگے۔

"آپ لوگ بھی اب بیٹھ جائیں۔ غلام نبی! تم نے کچھ خاطر تواضع کی اپنے دوستوں کی۔"

"خاطر تواضع تو آپ کرتے" غالب نے کہا "اگر یہ لڑکی آپ کو موقع دیتی۔"

وہ ہنسا "بھئی بڑا کرارا ہاتھ مارا تھا۔ میں تو سمجھا' ہڈی ہی ٹوٹ گئی ہوگی۔ غالب اور سکندر کو تو پہچان لیا میں نے۔ تمہارا کیا نام ہے؟"

"غالباً" میں نے کہا۔

"غالباً کیا؟" وہ بولا۔

"یہ اس لڑکی کا نام ہے" میں نے کہا "پورا نام مع ولدیت و خاندانی القاب و آداب کے ساتھ ایک میٹر لمبا ہے اس لئے یاد نہیں رہتا۔"

وہ خفت کے باوجود ہنسا "اچھا۔ نہیں بتاتا تو مت بتاؤ مگر اب طرف سے دل صاف کرلو۔ تم غلام نبی کے دوست ہو اور بابا تاج الدین کے مہمان تو میرے لئے باعثِ رحمت۔"

میں نے کہا "تمہاری بیوی کا خیال مختلف ہے۔"

"وہ...... وہ کچھ نہیں کرے گی۔ میری مرضی کے بغیر۔ تم نے بے وقوفی کی یہاں سے فون پر بات کی۔ اس نے سب سن لیا۔ فکر مت کرو۔ یہ بتاؤ کچھ کھایا پیا ہے یا نہیں۔"

"شاداں لا رہی ہے ناشتا" غلام نبی نے کہا۔

"گڈ۔ ویری گڈ۔ اس گھر کو اپنا ہی گھر سمجھو۔ یہ ٹھیک ہے کہ مجھے پہلے معلوم ہو جاتا تو میں غلام نبی کو کبھی اجازت نہ دیتا کہ تمہیں یہاں لائے۔ تمہاری وجہ سے ہم بڑی مصیبت میں پڑ سکتے ہیں۔ بہتر یہ ہوگا کہ تم جلد از جلد رخصت ہو جاؤ۔ کسی چیز کی ضرورت ہے تو بلا تکلف بتا دو۔" وہ اٹھنے لگا۔

غالب نے کہا "ضرورت صرف آپ کی ہے۔ اور آپ جا رہے ہیں۔ یہ تو بڑی غلط بات ہے۔"

"مجھے ڈیوٹی پر جانا ہے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "تھانیدار جی۔"

"میرا نام انعام نبی ہے۔"

"جب تک ہم یہاں ہیں آپ بھی کہیں نہیں جائیں گے۔ بہتر ہوگا' اگر آپ اپنی زبان دراز بیوی کو بھی یہ بات اچھی طرح سمجھا دیں کہ اس کی ذرا سی بے وقوفی خود اسے بیوہ کرسکتی ہے" میں نے کہا۔

انعام کا چہرہ تاریک ہوگیا۔ اس کو اندازہ ہوگیا کہ ہم اتنی آسانی سے فریب دوستی کھانے والے لوگ نہیں ہیں۔

"اپنی بیوی کو بھی یہاں بلالو" غالب نے کہا "ورنہ ہم اسے خود اٹھالائیں گے۔"

"اس سے کچھ بھی نہیں ہوگا۔ تم بچ کے نہیں نکل سکتے۔" انعام نے کہا "آخر کب تک قید میں رکھو گے تم ہمیں۔"

"تمہاری مراد قیدِ حیات سے تو نہیں ہے؟" غالب نے کہا۔

"تمہیں قیدِ حیات سے بھی آزاد کرسکتے ہیں ہم۔ ابھی تک ہم نے اس گھر کا نمک نہیں کھایا ہے اس لئے نمک حرامی کا الزام بے جا ہوگا۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ہم کس قسم کے لوگ ہیں۔ ہمارا راستہ روکنے کی کوشش کا کیا انجام ہو سکتا ہے!"

"کیا کروگے آخر تم۔ مجھے مار دوگے؟"

"اگر یہ ناگزیر ہوا۔ یہ بقا کی جنگ ہے انعام اور اس میں تم ہمارے ساتھ نہیں ہو۔ ہمارے مقابل آگئے ہو۔ خود اپنی مرضی سے۔"

"میری کوئی مرضی نہیں۔ حالات نے پہلے ہی مجھے اور تمہیں ایک دوسرے کی دشمنی ورثے میں دے دی تھی" وہ بولا۔

"ورثے میں؟" غالب نے کہا۔

"ہاں ورثے میں" وہ بولا "تم میرے ہی ہم عمر ہو۔ جب ہم پیدا ہوئے تھے تو ہمارے درمیان ایک اٹوٹ رشتہ تھا۔ صدیوں پرانا تہذیبی رشتہ اور مذہبی رشتہ۔ تمہارے اور میرے آباو اجداد اسی زمین کا حصہ ہیں۔ ہم ہندوستانی تھے اور مسلمان تھے۔ مگر اس کے بعد تم ایک نئی سرحد عبور کرگئے۔ یہ فیصلہ تمہارے والد نے کیا تھا۔ میرے والد کا فیصلہ اس کے برعکس ہوا۔ میں اور تم ان کے فیصلوں میں نہ فریق تھے اور نہ شریک' چناں چہ آج مسلمان ہونے کے باوجود تم پاکستانی ہو اور میں بھارتی۔ اس حقیقت کو نہ میں نظر انداز کرسکتا ہوں نہ تم۔"

"تم نے مان لیا کہ ہم دشمن ہیں۔ تمہاری صاف گوئی مجھے پسند آئی" میں نے کہا۔

"میں مجبور ہوں۔"

"ہم بھی مجبور ہیں" غالب نے کہا "ہم دشمن کو رعایت دینا خودکشی کے مترادف سمجھتے ہیں۔"

"لیکن تم تھوڑی سی رعایت حاصل کرسکتے ہو۔ ایک اس لئے کہ تم غلام نبی کے بھائی ہو۔ دوسرے ہم بلاوجہ کسی کی جان لینے کے قائل نہیں۔ تم اپنی زندگی کا سودا بھی کرسکتے ہو۔" میں نے کہا۔

"سودا؟" وہ تلخی سے مسکرایا "زندگی کا سودا؟"

"ہاں۔ ہم اپنی زندگی کی تھوڑی بہت قیمت ادا کرسکتے ہیں۔" میں نے کہا "ہم تو نکل ہی جائیں گے' خواہ تم کو سودا منظور ہو یا نہ ہو۔ مگر تم اس پیشکش سے فائدہ اٹھا سکتے ہو۔ تمہاری زندگی بچ جائے گی۔ تمہاری بیوی کا سہاگ اجڑنے سے بچ جائے گا۔ تمہارے بچے اگر ہیں تو وہ یتیم نہیں کہلائیں گے۔ اور اس کے علاوہ تمہیں اتنا مل جائے گا جو تم ساری عمر کی کمائی جمع کرکے بھی نہیں حاصل کرسکتے۔"

غالب نے کہا "تم ایمان دار ہو غالباً۔ اور فرض شناس بھی؟"

"حرام نہیں کھاتے" نازو بولی۔

"اسی لئے تمہارا گھر بہت چھوٹا سا ہے۔ وہ بھی خود تم نے نہیں بنایا۔ تمہارے والد کی نشانی ہے۔ اس میں بھی آدھے کے مالک ہو تم۔ تمہارے پاس نہ شان و شوکت کے اسباب ہیں نہ کوٹھی نہ کار۔ تم نے دیکھا تو ہوگا کہ دوسرے تمہارے جیسے تھانیدار کتنے ٹھاٹ باٹ کے ساتھ رہتے ہیں۔"

"سب معلوم ہے مجھے۔ مگر میں وہ سب نہیں کرسکتا جو دوسرے تھانیدار کرتے ہیں۔ میرے والد حافظ تھے۔ ایک مسجد میں بچوں کو درس دیتے تھے۔ جو درس انہوں نے مجھے دیا وہ میری گھٹی میں پڑا ہوا ہے۔ میں اپنی فطرت کو بدل نہیں سکتا۔ جب بھی میرے دل میں ایسا کوئی خیال آتا ہے۔ دو تین ایسے موقعے آئے تھے جب میری نیت ڈانوں ڈول ہوگئی تھی۔ تو وہ رات کو خواب میں آگئے اور انہوں نے مجھے بہت شرمندہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ تو میری قبر میں انگارے بھرنا چاہتا ہے بد بخت۔ مجھے سکون سے پڑا رہنے

دے۔ اور میں نے اپنی ماں سے کچھ بھی نہیں کہا تھا مگر نہ جانے کیسے انہیں بھی معلوم ہو گیا۔ انہوں نے کہا کہ "انعام، رات تیرے ابا کو خواب میں دیکھا تھا میں نے۔ وہ بہت دکھی تھے۔ کہتے تھے کہ اپنے بیٹے کو سمجھاؤ" بس اس کے بعد میری ہمت نہیں پڑی۔ وہ بڑے سنہری مواقع تھے۔ میں لکھ پتی ہو جاتا۔ وہ سب میرے پاس ہوتا جو دوسروں کے پاس ہے۔ تم کیا سودا کرو گے مجھ سے۔"

غلام نبی نے پہلی بار لب کھولے "بھیا! ان کو جانے دیں۔ یہ کوئی مجرم نہیں ہیں۔ نہ دہشت گرد۔"

"مجھے سب معلوم ہے لیکن....."

شاداں کے آنے سے اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ شاداں نے باہر سے دستک دی "دروازہ کھولیں جی۔"

میں نے کہا "کیا بات ہے؟"

"میں شاداں ہوں۔ ناشتا لائی ہوں۔"

میں نے دروازہ کھول کے کہا "معاف کرنا۔ میں آواز پہچان نہیں سکا تھا۔ تمہاری بھابی کیا کر رہی ہے؟"

"رو رہی ہے" شاداں نے ڈرتے ڈرتے ناشتے کی ٹرے درمیان میں رکھ دی۔ کمرے کے اندر کا نقشہ دیکھتے ہی وہ سمجھ گئی تھی کہ صورتِ حال غلام نبی کے قابو سے باہر ہو چکی ہے۔ میں نے ریوالور تو جیب میں رکھ لیا تھا مگر میرے ساتھ غالب اور نازو بڑے جارحانہ انداز میں چوکس کھڑے ہوئے تھے۔ صرف گل تھی جو بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی مگر وہ بھی خوف زدہ تھی۔ کرسی پر بیٹھا ہوا انعام اپنے چہرے سے جھنجلاہٹ، بے چارگی اور احساسِ شکست کے جذبات کو چھپانے سے قاصر تھا۔

غلام نبی نے کہا "شاداں! نیچے کا خیال رکھنا۔"

شاداں نے واپس جاتے جاتے پلٹ کر حیران نظریں اٹھائیں۔ "کیا خیال رکھوں جی؟"

میں نے کہا "کچھ نہیں۔ تم اپنی بھابی کو اوپر بھیج دو۔"

انعام نے احتجاجی انداز میں سر اٹھایا مگر پھر کچھ سوچ کے خاموش ہو گیا۔

"نیچے کسی کا بھی فون آئے، کوئی بھی گھنٹی بجا کے کسی کو بلائے، دروازہ مت کھولنا" میں نے کہا "فون کا ریسیور اٹھا کے نیچے رکھ دو۔ جو آئے اس سے کہہ دو کہ گھر پر کوئی نہیں ہے۔"

اس نے غلام نبی کی طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھا اور غلام نبی نے سر ہلایا "پریشانی کی کوئی بات نہیں شاداں۔"

ناشتے میں پوریاں تھیں اور حلوا تھا۔ گل نے سب کے لئے چائے بنائی۔ ایک اعصاب شکن، بوجھل خاموشی کی دیوار ہمارے اور ان دونوں بھائیوں کے درمیان حائل رہی۔ غلام نبی کی راز داری سے ہماری مدد کرنے کی اسکیم بری طرح فیل ہو گئی تھی۔ اب ایک طرف وہ بھائی تھا جو اس کے لئے باپ کی جگہ تھا۔ وہ بھائی کو مجبور نہیں کر سکتا تھا کہ اپنا فرض نہ ادا کرے اور ایمان بیچ دے۔ دوسری طرف دوستی کے تقاضے تھے اور مہمان کی خاطر کے اخلاقی تقاضے تھے۔ وہ بڑی مشکل میں پھنس گیا تھا۔ یہی حالت انعام کی تھی۔ وہ خوب جانتا تھا کہ ہماری راہ میں حائل ہونے کی کوشش کرنا خود کشی کے مترادف ہے۔ ہم واقعی اسے مار کے اپنا راستہ بنا لیں گے۔ اس کی بیوی، اس کے بھائی اور بھائی کی نئی نویلی دلہن۔ سب ہمارے لئے اپنی جان بچانے کے مقصد سے زیادہ اہم نہیں ہو سکتے اور وہ خود کو شدید دباؤ میں محسوس کر رہا تھا۔ ایمان داری اور فرض شناسی کو اس نے ہمیشہ مقدم رکھا تھا اور بڑے سے بڑے لالچ کے جال میں گرفتار نہیں ہوا تھا۔ مگر یہاں مسئلہ لالچ کا نہیں تھا۔ اپنی زندگی کا تھا اور ان جذباتی رشتوں کی بقا کا تھا جو اُسے جان سے زیادہ عزیز تھے۔ جن کے بغیر وہ زندہ رہتا تو اس کی زندگی محض احساسِ جرم و پشیمانی کے بارِ گراں کا عذاب اٹھائے گزرتی۔ وہ اپنی ذمے داریوں اور مجبوریوں کو عقل کی ترازو کے دو پلڑوں میں تولنے کی کوشش کر رہا تھا مگر ان کے درمیان توازن برقرار رکھنے میں ناکام تھا۔ آہستہ آہستہ جذبات کا پلڑا نیچے جھک رہا تھا۔

ہم نے خاموشی سے حلوا پوری کھائے اور چائے پی۔ شاداں نے بڑے سلیقے اور محنت سے ناشتا بنایا تھا۔ پہلے ہم سب بھوکے بھی تھے مگر اب اچانک بھوک مر گئی تھی اور ناشتا صرف ایک جسمانی ضرورت کی تسکین کے لئے کیا گیا تھا۔

انعام کی بیوی ایک بار پھر اوپر آئی تو اس کے تیور بدلے ہوئے تھے۔ زبان سے اس نے کچھ نہیں کہا مگر اس کے ماتھے پر نظر آنے والے بل اس کی برہمی کا پتا دیتے تھے۔ اس کی آنکھیں رونے سے لال ہو رہی تھیں۔ سب کے سامنے شوہر نے اس کی تذلیل کی تھی اور بے عزتی کا یہ احساس بھی اس کے وجود میں دبے ہوئے غصے کی خبر دیتا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اپنے شوہر کی اصول پرستی اور ایمان داری کے ساتھ وہ بادلِ ناخواستہ اور خود پر جبر کر کے نباہ کر رہی تھی۔ شوہر سے محبت کرنا، اس کا حکم ماننا اور اس سے وفادار رہنا تو ایک ذمے داری تھی جو معاشرے، مذہب اور قانون نے اس پر تھوپ دی تھی اور اس نے نوشتۂ تقدیر جان کے قبول کر لی تھی مگر اس کی زندگی میں وہ خوشی مفقود تھی جو ارمانوں کے پورا ہونے اور خواہشات کی تکمیل سے ملتی ہے۔ اس نے ضرور یہ خواب دیکھے ہوں گے کہ ایک تھانیدار کی بیوی بن کے وہ عیش کرے گی۔ دولت کی دیوی اس کے گھر کی باندی ہو گی۔ وہ شوہر کے اختیارات کو بھی اپنی مرضی سے کیش کرا سکے گی اور استعمال کرے گی مگر اس کے یہ خواب پورے نہیں ہوئے تھے۔ اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو۔ حسرتوں نے دکھوں کو روگ بنا دیا تھا اور وہ چڑچڑی، بد مزاج اور بد خو ہو گئی تھی۔ یہ احساسِ محرومی کا ردِ عمل تھا جس نے اسے سب سے بیزار کر دیا تھا۔ اس حد تک کہ اسے خوش رہنے سے نفرت ہو گئی تھی۔

اپنے اندازے کو آزمانے کے لئے میں نے اس عورت کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا جو انعام کی بیوی کے وجود میں اپنے حالات کی اسیر تھی۔ جو مجبوریوں کے حصار میں سسکنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتی تھی اور اپنی خواہشات کا گلا گھونٹتے رہنے کے باوجود زندہ تھی۔ ایک عام عورت جو زندگی سے پیار و محبت، محبت کرنے والا شوہر اور بچے تو مانگتی ہی ہے مگر اس کے علاوہ بھی بہت کچھ چاہتی ہے۔ زیورات۔ اچھے اچھے کپڑے۔ شوق کے سامان۔ وہ خود کو وسائل کی حد کا پابند نہیں کر سکتی اور وسائل ہوں تو پھر اس کا شوق بے لگام ہو جاتا ہے۔

میں نے کہا "بھابی، مجھے بہت افسوس ہے، انہوں نے آپ کے ساتھ زیادتی کی۔"

میرے طرزِ تخاطب نے غلام نبی اور انعام کو حیران کیا مگر انعام کی بیوی کا ردِ عمل بہت شدید ہوا۔

"تمہیں کیوں افسوس ہے؟" وہ بھڑک کے بولی "جب انہیں افسوس نہیں۔ اور یہ سب ہوا کس کی وجہ سے؟"

انعام نے کہا "چلو چھوڑو....."

وہ فرطِ جذبات سے گلو گیر ہو گئی "کیا کیا چھوڑوں۔ سب کچھ تو چھوڑ دیا تمہارے لئے۔ اب یہ نوبت آگئی ہے..... کہ بس اپنا چھوڑ دوں" وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی "کوئی خوشی تو ملی نہیں۔ عزت بھی نہیں رہی اب تو۔ آج غیروں کے سامنے ہاتھ اٹھایا ہے۔ کل اپنوں کے سامنے جوتے مارو گے۔"

"خواہ مخواہ رائی کا پہاڑ مت بناؤ" انعام نے بگڑ کے کہا "ہزار بار کہا ہے کہ زبان مت چلایا کرو سب کے سامنے۔ میں شوہر ہوں تمہارا یا غلام؟"

میں نے غلام نبی کو آنکھ سے اشارہ کیا اور اس نے میرا مطلب سمجھ لیا۔ اس نے آگے بڑھ کے کہا "بھابی! سارا قصور میرا ہے۔ آپ مجھے ایک کے بدلے دو تھپڑ مار لیں۔ اپنے دوستوں کو گھر میں لانے سے پہلے میں آپ کو بتا دیتا تو کچھ نہ ہوتا۔"

"تو آتا ہی نہ ہمارے گھر میں تو بڑا اچھا ہوتا۔ ساری عمر تو ماں کی خبر نہ لی۔ اب بھی نہ آتا تو کیا اس کا جنازہ نہ اٹھتا۔ پہلے ہی کیا تھا تیرے پاس ..... پھر بھی شادی کر دی تیری۔ آدھا گھر دے دیا تجھے۔ اس کے باوجود تو دشمن ہو رہا ہے ہمارا ..... یہ تیرے دوست نہیں ہیں۔ مجھے معلوم ہے۔ سارا فساد انہی کا ہے۔"

"نہیں بھابی۔ یہ دوست ہیں۔ بڑے اچھے دوست ہیں میرے۔ بے شک یہ پاکستان سے آئے ہیں" غلام نبی نے کہا۔

"مگر ہم خالی ہاتھ نہیں آئے ہیں" میں نے کہا "ہم آپ کے گھر میں فساد کیوں ڈالیں گے۔"

غالب نے نازو کی طرف دیکھا "ایسے کیا منہ دیکھ رہی ہو بڑا سلاؤ بھابی کو ان کی چیز دے دو۔"

نازو سے پہلے گل نے بیگ میں سے زیورات نکال لئے تھے۔ یہ ایک جعلی پیر نے سادہ لوح عورتوں کو خواہشوں کے فریب دے کر ٹھگ لئے تھے۔ سونے کا یہ ڈھیر اس کے کام کا نہیں تھا مگر اس کی ہوس ایک اندھا کنواں تھی جس نے آخر کار خود اس پیر کو نگل لیا تھا۔ یہ زیورات ابھی تک ہمارے لئے بھی ایک بوجھ بنے ہوئے تھے۔ ان کا اس سے بہتر کوئی مصرف نہیں ہو سکتا تھا۔

زیورات کی چمک دیکھتے ہی انعام کی بیوی کی صورت کا رنگ بدل گیا۔ اس کی تمام افسردگی ایک پُر تجسس اشتیاق میں ڈھل گئی۔

انعام نے کہا "خبردار! جو کوئی چیز لی۔ یہ رشوت دینا چاہتے تھے مجھے۔"

میں نے کہا "آپ نے انکار کر دیا، آپ کی مرضی۔ مگر یہ بھابی کے تحائف ہیں۔"

غالب نے کہا "ہم بڑی دور سے لے کر آئے ہیں۔"

میں نے کہا "تحفے اور رشوت میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ رشوت میں ہم لاکھوں دے سکتے تھے۔ نقد" میں نے بیگ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

گل نے بیگ مجھے تھما دیا "یہ دیکھو۔ اس میں کتنی رقم ہے۔ یہ سب ٹھکرا کے تم نے واقعی ثابت کر دیا ہے کہ تم ایمان دار ہو۔"

غالب نے کہا "لیکن بھابی کے لئے اور شاداں کے لئے ہمارے گھر والوں نے جو کچھ بھیجا ہے، یہ ان کا حق ہے۔"

"تمہارے گھر والے!" انعام نے کہا۔

"ہاں۔ ہم غلام نبی کی شادی میں تو شریک نہیں ہو سکے مگر......" میں نے گل کے نکالے ہوئے نیکلس، بُندے اور چوڑیاں انعام کی بیوی کے سامنے دونوں ہاتھوں پر رکھ کے پیش کئے۔

اس کی نگاہیں ان بھاری اور بیش قیمت زیورات پر جم کے رہ گئی تھیں اور وہ اپنے شوہر کی طرف دیکھ بھی نہیں رہی تھی جو دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ہم جھوٹ بول رہے ہیں اور اس کی بیوی ہماری باتوں کے جال میں پھنس گئی ہے۔ مگر وہ ہماری تردید کیسے کرتا۔ کیسے ثابت کرتا کہ نہ ہمارا گھر ہے اور نہ گھر والے۔ یہ بات تو شاید خود اسے بھی معلوم نہ ہو گی۔ ہم غلام نبی کے دوست تھے، اگر وہ ہمارے بیان کو غلط قرار دیتا تو جائز ہوتا۔

"یہ...... یہ تو بہت بھاری ہیں" انعام کی بیوی نے ہاتھوں سے زیورات کو تول کے سحر زدہ لہجے میں کہا "بہت قیمتی ہیں۔"

میں نے عاجزی سے کہا "جی۔ بس جیسے بھی ہیں، اگر آپ کو پسند ہیں تو......"

انعام کی بیوی کا چہرہ مسرت سے دمکنے لگا تھا "پسند...... یہ بہت اچھے ہیں" اس نے فوراً نیکلس کو پہن لیا۔

انعام نے چلا کے کہا "الو کی پٹھی۔ واپس کر دے یہ سب۔"

"کیوں؟" انعام کی بیوی پوری طرح سونے کے جال میں گرفتار ہو چکی تھی "تحفہ واپس کر دوں؟"

"تحفہ نہیں ہے یہ۔ رشوت ہے۔"

"تم کہتے رہو اسے رشوت۔ واہ، کسی نے اتنی دور سے میرے لئے کوئی چیز بھیجی ہے" اس نے بندے پہنتے ہوئے کہا "تمہارے تو کسی دوست کو چاندی کا چھلا تک دینے کی توفیق نہ ہوئی کبھی۔ خود کاروں میں اُڑے پھرتے ہیں۔ سب اپنے گھر والوں کے لئے کرتے ہیں۔ ایک تم ہو۔"

میں نے فوراً کہا "بھابی۔ اگر یہ ایمان دار ہیں تو آپ کو فخر کرنا چاہئے اِن پر۔"

"خالی فخر کو کیا کروں۔ اپنے دل پر تو صبر کا پتھر رکھے بیٹھی ہوں۔ دنیا کو کیا منہ دکھاؤں۔ سب کہتے ہیں میاں تھانیدار ہے۔" اس نے خود کو آئینے میں دیکھا۔

"کہہ دو سب سے کہ وہ رشوت لینے والا تھانیدار نہیں ہے۔" انعام چراغ پا ہو کے بولا۔

"میرے کہنے سے مانتا ہے کوئی۔ میں تو کہتی رہتی ہوں مگر سب پیٹھ پیچھے کیا باتیں کرتے ہیں، مجھے معلوم ہے۔ سب کہتے ہیں کہ انعام بہت کنجوس ہے۔ بہت چالاک ہے۔ نقد جمع کرتا جا رہا ہے یا فرضی ناموں سے جائدادیں خرید رہا ہے۔ نیک نامی الگ کما رہا ہے۔ دولت الگ۔"

غالب نے اس موقع پر نازو کو پھر اشارہ کیا اور اس نے دوسرا تحفہ شاداں کے لئے نکال لیا۔ یہ زیورات بھی کم قیمتی نہ تھے۔ شاداں جھجکی مگر غلام نبی کی نظر کا اشارہ پا کے آگے بڑھی اور اس نے خالص مشرقی انداز کی نئی دلہن کی طرح سلام کر کے تحفہ قبول کر لیا۔

انعام کی بیوی اب اپنا سب غصہ اور بے عزتی بھول چکی تھی اور یہ بھی فراموش کر بیٹھی تھی کہ اس کے گھر میں ہماری حیثیت کیا ہے۔

"تمہارے گھر والے تو بہت امیر لوگ ہوں گے۔ کیا کرتے ہیں وہ؟" اس نے حسد سے شاداں کے زیورات کو دیکھا۔

"یہی۔ سونے کا کام" میں نے کہا۔

"اچھا۔ سنار ہو تم لوگ۔ پھر تو سونا بھی خالص ہو گا؟"

"یہ جھوٹے ہیں" انعام چلّایا "پاگل کی بچی۔ تو خود بھی مصیبت میں پھنسے گی، مجھے بھی مروائے گی۔ میں کہتا ہوں اب بھی واپس کر دے یہ سب کچھ۔"

"نہیں۔ میں کچھ واپس نہیں کروں گی۔"

"دیکھ۔ پھر سوچ لے۔ یہ میری مرضی کے خلاف کر رہی ہے تُو۔" انعام نے ایک مرد کے اختیار کا ٹرمپ کارڈ نکال لیا "تیری زندگی گزر جائے گی ان زیورات کے ساتھ۔"

انعام کی بیوی کو سانپ سونگھ گیا۔

"ٹھیک ہے۔ رکھ لے یہ زیور اور چلی جا ان کے ساتھ۔"

"ان کے ساتھ کیوں؟ میرا اپنا گھر نہیں ہے کیا" وہ ایک دم پھٹ پڑی "تم یہی چاہتے ہو تو یہی سہی۔ بہت بار سن لی میں نے تمہاری یہ بات۔ اور نہیں سن سکتی یہ دھمکی۔ تم پیچھا چھڑانے کے بہانے تلاش کر رہے ہو کب سے۔"

"بھابی گئی تو ہم بھی جائیں گے" غلام نبی نے کہا "ہم اس گھر میں نہیں رہیں گے۔ تم اکیلے خوش رہو۔"

یہ صورتِ حال بڑی غیر متوقع تھی۔ انعام نے رشوت لینے سے انکار کر دیا تھا اور ہماری دوسری چال کی کامیابی ایک بسے بسائے گھر کو اجاڑ رہی تھی۔ رشتوں کی بنیادیں مسمار کر رہی تھی۔ اس سے تو کہیں بہتر تھا کہ ہم انعام نبی کو باندھ کر ڈال جاتے یا اسے یرغمال بنا کے ساتھ لے جاتے۔ اس سے پہلے کہ میں چال واپس لیتا یا نئی حکمتِ عملی اختیار کرتا، اچانک انعام نے ہتھیار ڈال دیے۔

"نہیں۔ خدا کے لئے ایسا مت کرو" انعام نے کہا "مجھے اکیلا مت چھوڑ کے جاؤ۔"

انعام کی بیوی نے پسپائی اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا ہو گا۔ میکے جا کے بیٹھ جانے کی دھمکی تو محض دھمکی ہوتی ہے۔ کوئی بیوی زیورات کی خاطر شوہر کو کہاں چھوڑتی ہے۔ یہ غلام نبی تھا جس نے انعام کی استقامت کو ناکامی میں بدل دیا تھا۔ شاید اسے چھوٹے بھائی سے اتنی ہی محبت تھی کہ وہ اکیلا رہ جانے کے خیال سے ڈر گیا۔ اس کے ساتھ ہی انعام کی بیوی نے پھر جارحانہ رویہ اختیار کر لیا اور آخر کار انعام نے اپنی شکست تسلیم کر لی۔

"تم لوگ یہ چاہتے ہو تو پھر یوں ہی سہی۔ انعام کا ایمان دار ہونا اس کی خطا تھا تو پھر آج سے وہ بھی اپنا ایمان بیچے گا۔ اس کا گناہ تمہارے سر" انعام نے چیختے چلّاتے ہوئے کہا "تم کو عیش و عشرت کی زندگی، کار کوٹھی سب ملیں گے۔ میں آخرت کے بدلے دنیا کا سودا کرتا ہوں۔ خود اپنے باپ کی قبر میں انگارے بھرتا ہوں۔ لاؤ، کتنی رشوت دے رہے ہو تم مجھے۔"

میں نے کہا "یہ رشوت نہیں ہے۔"

"نہیں۔ مجھے رشوت چاہئے" پاگلوں کی طرح اس نے میرے ہاتھ سے بیگ چھین لیا "کتنی رقم ہے اس میں؟"

"مجھے۔ مجھے نہیں معلوم۔"

انعام نے بیگ اپنی بیوی کی طرف پھینک دیا "یہ بھی رکھ سنبھال کے۔"

انعام کی بیوی کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ اس نے کانپتے لبوں سے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر الفاظ اس کے حلق میں اٹک گئے۔ غلام نبی کو بھی احساسِ جرم و ندامت نے گھیر لیا تھا اور وہ سر جھکائے کھڑا تھا۔

"تم بتاؤ۔ کیا چاہتے ہو تم؟"

میں نے دل کڑا کر کے کہا "ہم بحفاظت ناگپور سے نکلنا چاہتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ ناگپور سے کہاں جاؤ گے؟"

"یہ ہم نہیں بتا سکتے؟" میں نے کہا۔

"مت بتاؤ۔ بھاڑ میں جاؤ" اس نے کہا اور فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"کسے فون کر رہے ہو؟" میں نے کہا۔

"گاڑی منگوا رہا ہوں تمہارے لئے" انعام نے کہا "ڈرو نہیں۔ تم کو دھوکا دینے کی غلطی نہیں کر سکتا میں۔ میں مرنا نہیں چاہتا"

"تم ہمارے ساتھ چلو گے" میں نے کہا اور ریوالور نکال لیا۔

"ظاہر ہے" وہ فون گھماتے ہوئے بولا "شاداں نیچے جا کے ریسیور ٹھیک سے رکھ۔"

"کس کی گاڑی میں جائیں گے ہم؟" میں نے کہا۔

"ایمبولینس میں" انعام نے کہا "اور کوئی صورت نہیں تمہارے شہر سے نکلنے کی۔ سارے راستوں پر سخت چیکنگ ہو رہی ہے۔ تم کسی بھی بھیس میں جاؤ پکڑے جاؤ گے۔"

انعام نے نمبر ملا کے ریسور اپنی بیوی کو تھما دیا "ان سے کہو کہ میرے شوہر پر دل کا دورہ پڑا ہے۔"

انعام کی بیوی نے کانپتے ہاتھوں سے ریسیور لے لیا۔ "ہیلو۔ دیکھیں جی۔ میں سب انسپکٹر انعام نبی کی بیوی بول رہی ہوں۔ ان کو دل کا دورہ پڑا ہے۔ فوراً ایمبولینس چاہئے۔ ہاں جی پتا لکھ لیں۔"

"اب سنو غور سے کہ تمہیں کیا کرنا ہے" انعام نے ریسیور بیوی کے ہاتھ سے لے کر پٹخ دیا۔

"وہ مجھے معلوم ہے" میں نے کہا "ڈرائیور کے ساتھ یہ لڑکی بیٹھے گی" میں نے نازو کی طرف اشارہ کیا "پیچھے ہم سب ہوں گے۔ تم بیمار بن کے سیدھے لیٹے رہو گے۔"

"اور تم تیماردار بن کے ریوالور لئے بیٹھے رہو گے۔"

"ہاں۔ بعد میں جو تمہارا دل چاہے کہنا۔" میں نے کہا۔

"اس کے سوا ہم کیا کہہ سکتے ہیں کہ دہشت گرد ہمارے گھر میں گھس آئے تھے۔ ہم نے جو کچھ کیا اپنی جان بچانے کے لئے کیا۔ تم میری فکر مت کرو۔"

"یہ بات اپنی بیوی کو بھی سمجھا دو۔"

"وہ اتنی بے وقوف نہیں ہے کہ اسے کچھ سمجھانا ضروری ہو۔ سب دیکھ رہی ہے اور سن رہی ہے" انعام نے تلخی سے کہا۔

"غلام نبی! مجھے افسوس ہے۔"

"تم سے زیادہ مجھے افسوس ہے" اس نے کہا "کہ میں تمہیں اپنے ساتھ لایا۔ ہمارا گھر اب کبھی وہ گھر نہیں ہو گا جو تمہارے آنے سے پہلے تھا۔"

"کیا ہم تمہیں بند کر جائیں؟ تمہاری بھابی اور بیوی کے ساتھ۔"

"کوئی ضرورت نہیں اس کی۔ ہم بھیّا کے واپس آنے تک خاموش رہیں گے۔ وعدہ کرو کہ تم بھیّا کو......"

میں نے کہا "اگر تم اعتبار کر سکتے ہو تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارا بھائی تمہیں واپس مل جائے گا۔ بالکل صحیح سالم اور خیر و عافیت کے ساتھ۔"

انعام کی بیوی سب سے زیادہ پریشان تھی۔ اسے احساس تھا کہ یہ صورتِ حال اس کے رویّے نے پیدا کی ہے۔ اسے اپنے لالچ پر افسوس ہو رہا تھا۔ روتے روتے اس نے کہا "دیکھو...... تم یہ سب لے جاؤ۔ انہیں چھوڑ جاؤ۔ میں غصے میں تھی۔ پاگل ہو گئی تھی لالچ میں۔"

میں نے کہا "نہیں۔ یہ سب اپنے پاس رکھو۔"

"نہیں۔ میں کچھ نہیں رکھوں گی" اس کے جذبات کا دھارا اچانک الٹا بہنے لگا تھا "اس نے نیکلس اتار کے میری طرف پھینکا۔ پھر بُندے اتارے "یہ لو۔ سب لے جاؤ۔ بس انعام کو چھوڑ جاؤ۔" اس نے بیگ بھی اٹھا کے غالب کو تھما دیا۔

"ہم دی ہوئی چیز واپس نہیں لیتے" میں نے کہا۔

وہ زار و قطار رونے لگی "انعام! مجھے معاف کر دو۔ میں نے تمہارا کہا نہیں مانا۔"

انعام نے کہا "اچھا۔ چلو رونا دھونا بند کرو۔ خدا کا شکر ہے کہ تمہیں عقل آ گئی۔ غلام نبی! خیال رکھنا اپنی بھابی کا۔ یہ کوئی اور بے وقوفی نہ کر بیٹھے۔"

"آپ فکر نہ کریں بھیّا۔"

"میں آ جاؤں گا تھوڑی دیر میں" اس نے ہماری طرف دیکھ کر کہا "کہیں سے فون کر دوں گا۔"

"میں تمہیں اکیلا نہیں جانے دوں گی۔ ساتھ چلوں گی تمہارے۔" انعام کی بیوی نے کہا۔ اور انعام سے لپٹ گئی۔

انعام نے اسے بڑی مشکل سے الگ کیا "نہیں۔ تم گھر میں رہو۔"

"نہیں۔ میں ساتھ جاؤں گی۔"

"بابا، عورتوں کا ہر جگہ ساتھ جانا ممکن نہیں ہوتا۔ تمہاری وجہ سے میرے لئے زیادہ مسائل پیدا ہوں گے" انعام نے اسے سمجھانا چاہا مگر وہ کچھ سننے پر تیار نہ تھی۔ یکلخت اس عورت کا دوسرا روپ سامنے آ گیا تھا جس کی نظر میں ساری دنیا کے زر و جواہر کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اگر اہمیت تھی تو صرف اپنے شوہر کی زندگی کی۔

"ایمبولینس میں اتنی جگہ نہیں ہو گی" انعام نے کہا۔

"میں کچھ نہیں جانتی۔"

اسی وقت باہر سے ایمبولینس کا سائرن سنائی دیا اور ہم سب مستعد ہو گئے۔

"چلو۔ تم آگے چلو" میں نے ریوالور جیب میں رکھا مگر اپنا ایک ہاتھ بھی اسی جیب میں رکھا۔ انعام کی بیوی نے اسے ایک طرف سے پکڑ لیا۔ نازو نے دوسری طرف سے۔

میں نے غلام نبی سے کہا "مجھے تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہئے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "یہ سب اچھا نہیں ہوا۔ ایک دوست کی حیثیت سے میں کچھ نہیں کر سکا۔ تمہارے کسی کام نہ آسکا۔"

میں نے کہا "تم نے کوشش ضرور کی۔"

اس نے کہا "اپنے یہ تحفے واپس لے جاؤ۔ اور یہ ساری دولت بھی۔ اس کی نحوست سے خدا ہمیں محفوظ رکھے۔"

میں نے افسوس سے کہا "اگر تم ایسا سمجھتے ہو....."

"کیا تم نے دیکھا نہیں۔ ہمارا گھر برباد ہو جاتا' اگر ہم یہ قبول کر لیتے۔ میرے بھائی کا ایمان سب سے بڑی چیز ہے۔ وہ بک جاتا تو ہماری عاقبت بھی خراب ہوتی اور دنیا میں بھی کیا رہتا ہمارے پاس اگر یہ رشتے نہ رہتے۔"

میں نے وہ بیگ اٹھالیا "اچھا۔ خدا تمہیں خوش اور آباد رکھے۔ تمہاری محبتوں میں اضافہ کرے۔ لاؤ مجھے کوئی تالا دے دو۔"

"تالے کا کیا کرو گے؟"

"ہم باہر سے تالا لگا کے جائیں گے۔ انعام خود آ کے تالا کھولے گا۔ اس وقت تک تم انتظار کرو گے۔"

اس کی بیوی نے مجھے ایک تالا پکڑا دیا "باہر سے ٹیلی فون کا تار بھی کاٹ جانا۔"

اس معصوم لڑکی کے طنز نے مجھے شرمندہ کر دیا۔ میں گل کے ساتھ تیزی سے باہر کی طرف لپکا۔ دروازے کو مقفل کر کے میں نے چابی جیب میں ڈال لی۔ اس وقت تک انعام ایمبولینس کے پچھلے حصے میں اسٹریچر جیسے بیڈ پر لیٹ چکا تھا۔ نازو نے آگے ڈرائیور کے ساتھ جگہ سنبھال لی تھی۔ میں اور گل پیچھے چڑھ گئے اور دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ اسٹریچر کے دونوں جانب بھی بینچیں تھیں جن پر ضرورت کے وقت دو مریض اور لٹائے جا سکتے تھے۔ یہ فاکس ویگن کی مائیکرو بس تھی جس میں جگہ کی کمی نہیں ہوتی۔

انعام کے ایک طرف گل اور انعام کی بیوی تھیں۔ میں غالب کے ساتھ دوسری طرف بیٹھ گیا۔ انعام کی بیوی کی نظریں اب مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ احساسِ پشیمانی کا دورہ ختم ہوا تھا تو اس پر خوف اور دہشت کے جذبات غالب آنے لگے تھے۔

"تم لوگ کہاں لے جاؤ گے ہمیں؟" وہ بولی۔

"ایسے ہی کچھ دور" میں نے کہا۔

"اور اس کے بعد؟"

"ہم اپنے راستے چلے جائیں گے۔ تم اور انعام واپس اپنے گھر" میں نے کہا۔

ایمبولینس سائرن بجاتی ناگپور کے بازاروں اور سڑکوں پر سے گزر رہی تھی اور اپنا راستہ بناتی جا رہی تھی لیکن میں باہر کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ایمبولینس کی کھڑکیوں کے شیشوں پر سفید پردے پڑے ہوئے تھے۔

انعام نے کہا "کیا اب میں اٹھ کے بیٹھ سکتا ہوں؟"

غالب نے کہا "تمہیں پوری آزادی ہے۔ بیٹھو' لیٹو یا کھڑے ہو جاؤ۔"

"جو لڑکی آگے بیٹھی ہے' کیا اسے معلوم ہے کہ ایمبولینس کو کس راستے سے کہاں لے جانا ہے؟"

میں نے سر ہلایا "اس کی مرضی کی بات ہے۔"

"اگر ڈرائیور نے اس کی بات نہ مانی تو معاملہ بگڑ جائے گا۔" انعام نے تشویش سے کہا۔

"وہ منوا لے گی۔ تم جانتے نہیں کہ وہ کیا چیز ہے۔ ایک معمولی سا تجربہ ہوا تھا تمہیں مگر اس سے کچھ اندازہ نہیں ہو سکتا۔ وہ اتنی ہی آسانی سے صرف ایک ہاتھ مار کے ڈرائیور کی گردن بھی توڑ سکتی ہے۔ وہ چاہتی نہیں تھی ورنہ تمہاری کلائی بھی سلامت نہ رہتی۔" میں نے کہا۔

انعام کی بیوی نے کہا "ڈرائیور کو مار دے گی تو گاڑی کیا اس کے فرشتے چلائیں گے؟"

میں نے کہا "یہ گاڑی کیا چیز ہے۔ وہ تو ٹینک اور ہوائی جہاز تک سب کچھ چلا سکتی ہے۔ اس کا نشانہ غضب کا ہے۔ ریوالور ہو یا مشین گن۔"

"اور مشین گن نہ ہو تو اس کی زبان......"

گاڑی ایک دم رک گئی۔ غالب کی بات ادھوری رہ گئی۔ ایک ساتھ ہم دونوں نے ریوالور نکال لئے۔ پھر میں نے درمیان کا پردہ ہٹا کے دیکھا۔ ڈرائیور اور نازو کے درمیان نہ جانے کیا بات ہو رہی تھی۔ ڈرائیور جوان تھا۔ شاید اس نے نازو کے حکم کی تعمیل کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

پھر وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ نازو نے ریوالور نکالا اور ڈرائیور نے بہادری کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی۔ اس نے ریوالور چھیننے کے لئے نازو کو پکڑنا چاہا اور نازو نے بڑی پھرتی سے اس کے سر پا ہاتھ مارا۔

میں چھلانگ مار کے نیچے اترا۔ سڑک نسبتاً ویران تھی۔ میں نے ڈرائیور کی سائیڈ کا دروازہ کھولا اور ڈرائیور کو کھینچ کے کندھے پر اٹھا لیا۔ اسے میں نے پیچھے شفٹ کیا اور اسٹریچر پر ڈال دیا۔ میرے سوار ہوتے ہی ایمبولینس پھر روانہ ہو گئی۔

انعام کی بیوی کی آنکھیں خوف سے پھٹی جا رہی تھیں۔ وہ ڈرائیور کے سر سے بہنے والے خون کو دیکھ رہی تھی اور اپنے شوہر کے بازو سے چمٹی ہوئی تھی۔

"کیا...... یہ مر گیا ہے؟"

میں نے کہا "نہیں۔ مارا گیا تمہارا شوہر۔ واپسی میں اسے بھی اٹھا کے لے جانا پڑے گا۔ اگر یہ اس وقت تک زندہ رہا۔"

"مر گیا تو اس کی لاش پھینک جائیں گے ہم۔ بے وقوف"

غالب نے کہا "غلط فہمی میں مارا گیا۔"

اب انعام بھی کچھ متفکر نظر آنے لگا تھا۔ ہم نے ثابت کر کہ ہم کس حد تک خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس کے گھر ہم شرافت اور انکساری سے کام لے رہے تھے۔ بے رحمی کا مظاہرہ نازو نے کیا تھا جو ایک دھان پان سی لڑکی تھی۔ صرف پہلے میں نے اس کے بارے میں جو کہا تھا وہ سچ ثابت ہو گیا

"تم چاہو تو اس کے سر پر پٹی باندھ دو" میں نے کہا "تاکہ خون رک جائے۔ ویسے زخم گہرا نہیں ہے۔"

انعام کی بیوی نے کوئی حرکت نہیں کی۔ یہ کام گل نے کیا۔ ایمبولینس کے اندر مرہم پٹی کا پورا سامان موجود تھا۔

پردہ ہٹا کے میں نے باہر جھانکا تو ایمبولینس پوری رفتار سے تھی اور شہر کے مضافات بھی ختم ہو رہے تھے۔ میں نے اپنے اور ڈرائیونگ کیبن کے درمیان والے شیشے پر دستک دی اور نازو نے پلٹ کے دیکھا تو میں نے اسے رکنے کا اشارہ کیا "اب تم ڈرائیونگ کرو گے۔ میں تمہارے ساتھ بیٹھوں گا" میں نے کہا۔

انعام نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ نازو پیچھے چلی گئی تو اس نے کہا "میری تو کوئی بات نہیں۔ کسی کو شاید معلوم بھی نہیں ہو گا کہ میں گھر سے غائب ہوں۔"

"ہم اسی لئے تالا لگا آئے تھے تاکہ تمہارے خیر خواہ آئیں تو دستک دیئے بغیر لوٹ جائیں۔"

"لیکن اس ایمبولینس کی گمشدگی تمہارے لئے مسائل پیدا کر سکتی ہے" انعام نے کہا "عام طور پر ایمبولینس گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں واپس پہنچ جاتی ہے۔"

"ایمبولینس کا ٹائر پنکچر ہو جائے یا بریک ڈاؤن ہو جائے تو واپسی میں دیر بھی ہو سکتی ہے" میں نے کہا "اور کیا یہ ممکن نہیں کہ ایمبولینس ڈرائیور جب واپس جا رہا ہو تو راستے ہی میں کوئی اور ضرورت مند اسے روک لے۔ یا اس کی ضرورت کسی جائے حادثہ پر محسوس ہو۔"

"ہاں۔ یہ سب کچھ ہو سکتا ہے۔ مگر پھر بھی ایک حد ہے۔" انعام نے کہا "پھر ایمبولینس سینٹر سے معلوم تو کیا جائے گا تاکہ آخر وہ ایمبولینس کہاں گئی جو انسپکٹر انعام کو گھر سے ہسپتال لے جانے کے لئے بلائی گئی تھی۔ اور جب یہ معلوم ہو گا کہ میں دل کے امراض کے ہسپتال میں نہیں ہوں بلکہ کسی بھی ہسپتال میں نہیں ہوں اور میرے گھر سے فون پر بھی رابطہ نہیں ہو گا تو ایمبولینس کی تلاش بھی شروع ہو گی اور میری بھی۔"

میں نے بے نیازی سے کہا "چار پانچ گھنٹے ہیں ابھی۔"

"جو بات میں بتانا چاہتا تھا وہ کچھ اور تھی۔ کیا تم نے دیکھا نہیں کہ راستے میں چیکنگ کتنی سخت ہو رہی تھی۔ ایمبولینس اس لئے گزر گئی کہ اس کا سائرن چلا رہا تھا اور اس کے اوپر لائٹ گھوم رہی تھی۔ اس کا سراغ فوراً مل جائے گا۔"

"جس سڑک پر ہم جا رہے ہیں یہ کہاں جاتی ہے؟"

"سڑک کہیں نہیں جاتی۔ اس پر سفر کرنے والے کہیں بھی جا سکتے ہیں۔ ہر سڑک دوسری سڑک سے ملی ہوئی ہے۔ اور یہ تم پر منحصر ہے کہ تم دائیں بائیں مڑتے جاؤ تو ہندوستان سے پاکستان تک جہاں چاہو پہنچ جاؤ۔"

میں نے سورج کو دیکھ کر کہا "ہم بمبئی سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ کیا تمہارے پاس کوئی نقشہ ہے؟"

"میرے پاس؟ کیا یہ میری کار ہے؟"

میں نے سر کھجا کے کہا "تمہارے ذہن میں تو ہو گا۔"

"ہاں۔ میں تھوڑی بہت رہنمائی کر سکتا ہوں اور ایک نقشہ بنا کے دے سکتا ہوں جس کی مدد سے تم سمت کا تعین کر سکو گے اور کسی سے راستہ پوچھے بغیر کسی منزل تک پہنچ جاؤ گے۔"

میں نے کہا "برطانیہ بلکہ پورے یورپ کو میں نے سڑک کے راستے کئی بار دیکھا تھا۔ نہ کبھی مجھے کسی سے راستہ پوچھنے کی ضرورت محسوس ہوئی' نہ ہم راستہ بھولے۔ نقشے عام ملتے ہیں اور نہ ملیں تب بھی مسافروں کی رہنمائی کے لئے ہر سڑک پر سائن نظر آتے رہتے ہیں۔"

اس نے کچھ حیرانی سے مجھے دیکھا "یہاں صرف فاصلہ بتانے والے پتھر ہوتے ہیں۔ سنگ میل۔ ان پر عموماً تین چار اہم قصبوں یا شہروں کا فاصلہ ہو گا۔ کہیں سڑک کسی اور سڑک سے ملے گی تو تیر کا نشان بھی ہو گا۔ جیسا یہ نظر آ رہا ہے۔"

"ہم اس سڑک پر چلتے جائیں تو شام تک اندور پہنچ سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "اوکے۔ تھینک یو ویری مچ۔ گاڑی یہاں روک دو۔ امید ہے یہاں سے تمہارے لئے واپس جانا مشکل نہیں ہو گا۔ کیا تمہاری بیوی گاڑی چلا سکتی ہے؟"

سوال اتنا غیر متوقع تھا کہ اسے سوچ کے جواب دینے کی مہلت نہ ملی اور اس نے سر ہلا کے کہہ دیا "ہاں۔"

"پھر یہ گاڑی تمہاری بیوی لے آئے گی۔ تم جاؤ۔"

"یہ کیا بدمعاشی ہے؟" وہ بگڑ کے بولا۔

"یہ ہماری شرافت ہے کہ تمہیں وعدے کے مطابق واپس بھیج رہے ہیں۔ زندہ سلامت اور بخیر و عافیت۔"

"مگر تم میری بیوی کو لے جاؤ گے۔"

"تم مرد ہو۔ پیدل بھی چل سکتے ہو کچھ دور۔ کہیں نہ کہیں تم کو سواری مل جائے گی یا کوئی لفٹ دینے کے لئے رک جائے گا۔ اس عورت کو اپنے ساتھ کیوں گھسیٹتے ہو۔ وہ آرام سے گاڑی میں پہنچ جائے گی" میں نے کہا۔

"تم ڈرتے ہو کہ میں نیچے اترتے ہی اپنا وعدہ بھول جاؤں گا اور تمہارا تعاقب شروع ہو جائے گا۔"

"تم سمجھتے ہو تو پھر پوچھتے کیوں ہو؟ ہم ایک فیصد کا رسک بھی

نہیں لے سکتے" میں نے کہا "کوئی غلط قدم اٹھانے سے پہلے اپنی بیوی کو مت بھولنا۔ ہم اتنے شریف ہیں کہ اسے سگی بہن کی عزت دیں تو اتنے بے رحم بھی ہیں کہ دشمن کا ایک مہرہ سمجھ کے مار دیں۔ چلو اب اترو اور روانہ ہو جاؤ" میں نے کہا اور گاڑی کو موڑ لیا۔

شاید انعام کا ارادہ اپنی بیوی سے کچھ کہنے سننے کا ہوگا مگر میں نے اسے مہلت ہی نہ دی۔ اس کے اترتے ہی میں نے گاڑی کو آگے بڑھادیا۔ اس نے ضرور مجھے گالیاں دی ہوں گی اور چیخ چیخ کر دی ہوں گی۔ میں نے اسے بیک ویو مرر میں پیچھے دوڑ کے پتھر اٹھاتے اور ایمبولینس پر مارتے دیکھا۔ ایمبولینس کے پچھلے حصے میں انعام کی بیوی نے بھی کہرام مچایا ہوگا مگر میں پلٹ کر دیکھ نہیں سکتا تھا۔ درمیان میں شیشہ تھا اور پردے دوسری طرف پڑے ہوئے تھے۔ پچھلے حصے کی کوئی آواز بھی شیشے کی دیوار سے گزر کے مجھ تک نہیں پہنچی تھی۔

جہاں میں نے انعام کو اتارا تھا وہ ایک ویران علاقہ تھا اور اس سڑک پر آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ غالباً یہ متروک راستہ تھا، کسی نئی سڑک کی تعمیر کے بعد لوگوں نے خود ہی ادھر سے گزرنا چھوڑ دیا تھا۔ وجوہات بہت سی ہو سکتی تھیں۔ عام طور پر نئے راستے فاصلے کم کرنے کے لئے نکالے جاتے ہیں مگر اس سڑک کے دونوں طرف کی زمین کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ علاقہ سیلاب کی زد میں آتا تھا یا نشیب میں ہونے کی وجہ سے بارشوں کا ریلا ادھر ہی سے گزرتا تھا۔ شاید برسات میں راستہ بند ہو جاتا ہوگا۔ بعد میں متبادل راستہ بنایا گیا ہوگا۔

تقریباً دو میل چلنے کے بعد میں نے گاڑی کو یو ٹرن دے کر واپس موڑا اور آہستہ آہستہ اسی سڑک پر آگیا جہاں میں نے انعام کو اتارا تھا۔ دائیں طرف کی سڑک خالی پڑی تھی اور وہ کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ میں نے سڑک کو عبور کیا اور مخالف سمت میں روانہ ہوگیا۔ یہ ایک چوراہا سا تھا جہاں سے سڑکیں دونوں طرف نکلتی تھیں۔

مجھے بالکل اندازہ نہ تھا کہ میں جس سڑک پر گاڑی دوڑا رہا ہوں وہ ہمیں کہاں پہنچائے گی۔ فاکس ویگن کا طاقتور انجن گرج رہا تھا اور اس کے عام کار سے بڑے پہیے رفتار کو مسلسل بڑھانے میں پوری طرح معاون تھے۔ یہ پتلی سی سڑک بھی خستہ حالی کا شکار تھی۔ اس پر نوکیلے پتھر، گڑھے اور کیچڑ سب کچھ تھا مگر ایمبولینس کے ٹائر بھی نئے تھے چناں چہ میں جھٹکوں کی پروا کئے بغیر چلتا گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ پیچھے بیٹھنے والوں کا کیا حال ہوا ہوگا مگر میں رفتار کم نہیں کر سکتا تھا۔

کسی حد تک میں انعام کو یہ تاثر دینے میں کامیاب رہا تھا کہ میں انتہائی احمق بھی ہوں۔ کسی اجنبی ملک میں کوئی بھی شخص عقل سے کام لے تو راستے سے بھٹک کے گم نہیں ہو سکتا۔ ریگستان کی بات اور ہے۔ جہاں سڑکیں ہر طرف رگوں کے جال کی طرح بچھی ہوئی ہوں وہاں سمت کا تعین کر کے چلنے والا غلطی نہیں کر سکتا۔ انعام کے ذہن میں یہی ہوگا کہ ہم اس کی بیوی کو اغوا کر کے اندور کی طرف لے گئے ہیں جب کہ ہم صرف دو میل کے فاصلے سے لوٹ آئے تھے اور اب مخالف سمت میں رواں تھے۔

مجھے اس وقت بڑی طمانیت حاصل ہوئی جب اچانک وہ بے ہودہ سڑک ختم ہوئی اور ایک صاف ستھری، ہموار سڑک آگئی جس پر دونوں جانب سے ٹریفک آجا رہی تھی۔ سمت کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے گاڑی کو دائیں جانب موڑ لیا۔ میرے اندازے کے مطابق بمبئی اسی سمت میں تھا۔

میری نظر اسپیڈومیٹر پر تھی۔ گاڑی ساٹھ میل فی گھنٹا کی رفتار سے جا رہی تھی۔ اس کے فیول ٹینک کی سوئی یہ ظاہر کر رہی تھی کہ ٹینک تین چوتھائی سے زیادہ خالی ہو چکا ہے۔ ایک چوتھائی بھرے ہوئے فیول ٹینک کے ساتھ ہم زیادہ سے زیادہ چالیس پچاس میل کا سفر کر سکتے تھے۔

ایک برساتی ندی کے پُل پر میں نے گاڑی روک دی۔ اس ندی میں پانی کا وجود ایک نالے کے برابر رہ گیا تھا اور میری نظر نے نیچے ایک ٹرک دیکھ لیا تھا۔ ٹرک کا ڈرائیور یا کلینر اسے دھو رہا تھا اور اس کے قریب ہی کوئی اپنی جیپ بھی چھوڑ گیا تھا۔ عام طور پر ایسی جگہ گاڑیاں دھونے والے محنت کر کے کچھ کما لیتے ہیں۔

نیچے اتر کے میں نے انعام کی بیوی سے کہا "بھابی......"

جواب میں اس نے مجھے ایک درجن گالیاں دیں اور وہ سب کہا جو مجھ سے پہلے غالب، نازو اور گل سن چکے تھے۔

میں نے کہا "آپ کی خفگی بجا ہے۔ میں آپ سے معافی مانگ سکتا ہوں ہاتھ جوڑ کے۔ لیکن ہماری مجبوری......"

"بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہاری مجبوری۔ یہاں کیوں لائے ہو آخر مجھے؟" وہ چراغ پا ہو کے بولی۔

میں نے چابیاں اس کی طرف بڑھادیں "انعام نے کہا تھا کہ آپ ڈرائیونگ کر سکتی ہیں۔ یہ کار تو نہیں ہے مگر مجھے امید ہے کہ آپ چلالیں گی۔ چالیس پچاس میل کے اندر جو پیٹرول پمپ آئے وہاں سے ٹنکی ضرور فل کرالیں۔ اس کے لئے ہم پیسے چھوڑ جائیں گے۔ یہ راستہ بمبئی کی طرف ہی جاتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کسی سے پوچھے بغیر بھی آپ شام تک بمبئی پہنچ جائیں گی۔"

"بمبئی جا کے کیا کروں گی میں؟"

"وہاں سے آپ اپنے گھر فون کردیں۔ یا خود ناگپور پہنچ جائیں کل۔ مجھے نہیں معلوم لیکن ہو سکتا ہے آگے کہیں سے آپ کو براہ راست ناگپور جانے والی سڑک مل جائے۔ ہم یہاں سے جبل پور کی طرف جا رہے ہیں۔"

"تمہارا بیڑا غرق ہو۔ اتنی لمبی ڈرائیونگ کروں گی میں۔ میں نے تو دو سال سے ہاتھ بھی نہیں لگایا گاڑی کو" وہ شور مچانے لگی۔

"پھر آپ ایسا کریں کہ راستے میں کہیں پولیس سے مدد لیں۔ ان کو بتادیں کہ آپ انسپکٹر انعام کی بیوی ہیں۔ وہ خود آپ کو گھر پہنچادیں گے۔ اس تکلیف کے لئے جو آپ کو ہوگی ہم بہت شرمندہ ہیں۔ ہمیں جبل پور نہ جانا ہوتا تو......"

"تم خاک شرمندہ ہو۔ شرم ہوتی تو ڈوب مرتے بہت پہلے۔ آوارہ گرد زمانے بھر کے۔ ایسے دنیا کو پریشان نہ کرتے پھرتے۔ گھروں میں گھس کے مار پیٹ نہ کرتے۔ اور تو اور۔ لڑکیاں تک بے مہار پھر رہی ہیں۔ جب دیکھو ہاتھ میں پستول۔ مار دھاڑ میں مردوں سے آگے۔"

"اب یہ تقریر چھوڑیں۔ ہم کیا کر رہے ہیں یہ ہم جانتے ہیں۔" میں نے کہا "فوراً روانہ ہو جائیں۔ یہ نہ ہو کہ ہمارے جانے کے بعد کوئی گاڑی سمیت لے جائے۔"

اس نے خوف زدہ ہو کے ڈرائیور کی جگہ سنبھال لی اور ڈرتے ڈرتے کہا "یہ... بہت بڑی گاڑی ہے۔"

میں نے کہا "حوصلہ رکھیں۔ اعتماد سے کام لیں۔ اس کا چلانا بھی اتنا ہی آسان ہوگا جتنا کسی کار کا۔"

اس سے پہلے کہ وہ روانہ ہوتی، غالب نے کہا "ایک بات کہوں، اگر برا نہ مانیں تو۔"

اس نے نفرت سے ہم سب کی صورتوں کو دیکھا "برائی کے سوا تم نے کچھ کیا ہے۔ برا ماننے کی بات کرتے ہو۔"

غالب نے کہا "آپ وہ تحفے قبول کرلیں۔"

"لعنت تم پر اور تمہارے تحفوں پر۔ میری تو مت ماری گئی تھی۔ تم نہ جانے کس کا گلا کاٹ کے لائے ہوگے وہ سب۔ میرا گھر اُجڑ جاتا۔ تم اپنی گھر والیوں کو پہناتا۔ گھر میں ماں بہنیں ہوں تو انہیں دینا۔" اس نے غصے سے کہا اور ایک دم گیئر ڈال دیا۔ گاڑی جھٹکا لے کر بند ہو گئی مگر اب وہ حالات کا مقابلہ کرنے پر تُل گئی تھی۔ اس نے گاڑی کو پھر اسٹارٹ کیا۔ گاڑی کچھ دور شرابی کی طرح ڈولتی لہراتی گئی مگر ہر ایمبولینس کی طرح اس گاڑی کی حالت بہترین تھی اور اس کو کنٹرول کرنا بہت آسان تھا۔ جب گاڑی سیدھی دوڑنے لگی تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

"اب آگے جانا ہے یا پیچھے؟" غالب نے کہا۔

میں نے انگلی سے اشارہ کیا "نیچے۔ تم ذرا اس کو باتوں میں لگاؤ۔"

ہم ڈھلوان سے سنبھل کر نیچے اترے۔ ٹرک دھونے والے نے دلچسپی اور حیرت کے ساتھ ہمیں دیکھا مگر اپنے کام میں مصروف رہا۔ ٹرک سے فارغ ہو کے وہ جیپ کے ٹائر دھو رہا تھا۔

"یہ ٹرک کس کا ہے؟" غالب نے ٹرک کو لات مار کے کہا۔

وہ جز بز ہو کے بولا "میرا ہے۔ ابھی بولو۔ لات مارنے سے کیا ٹرا ہو جائے گا؟"

"ہمیں کرائے پر چاہئے" غالب نے اس کے سامنے جا کے کہا۔

"تین دن کے لئے۔"

"تین دن...... کہاں جانے کو ہے؟"

"تین دن میں ہماری مرضی ہم جہاں چاہیں جائیں۔ یا کہیں نہ جائیں۔"

"ٹرک میں بیٹھ کے قوالی گاتے رہیں" نازو نے کہا۔

میں نے نظر بچا کے ٹرک کی چابیاں نکال لیں۔ پھر میں جیپ کی طرف گیا "یہ جیپ کس کا ہے؟" میں نے جیپ کو لات ماری۔

"یہ میرے باپ کا ہے۔" وہ بگڑ گیا "ابھی جیپ والا آئیں گا تو۔ لو، وہ آگیا۔"

جیپ والا مکرانی ٹائپ شخص تھا مگر وہ مدراسی ثابت ہوا۔ اس نے لڑکے کا بیان سنا اور پھر کچھ اڑم دم گڑم والی زبان میں کہا۔ اس کی نظر گل اور نازو پر جمی ہوئی تھی اور وہ غالباً ہمیں ٹورسٹ سمجھ رہا تھا۔ ٹرک دھونے والا لڑکا نہ جانے کہاں روانہ ہو گیا تھا۔

"ابھی بولو جی۔ ہم آگئی۔ جیپ کو لات مارتے، بے زبان کو؟" اس نے غصے میں کہا "اپن کو مارو جی تو بولے۔"

میں نے کہا "جیپ تمہاری ہے؟"

"اجی آپ کو میں بولتی۔ یہ اپنا۔ آپ کیا جیپ سے پوچھتی۔ بے زبان ہے۔"

میں نے کہا "ہمیں جیپ چاہئے۔ کرائے پر دو گے یا بیچو گے اس بے زبان کو؟"

اس کا منہ حیرت سے کھُل گیا "اپن ڈرائیور ہوتی۔ بھاڑا لیتی۔ آپ بولو جی کدھر جانے کو مانگتی۔"

میں نے پُل کے نیچے سے دریا کو دیکھا جس کے دونوں کناروں پر گول کنکریوں کا بستر سا بچھا ہوا تھا "ندی کا سیر کرتی ہم" میں نے اشارے سے واضح کیا کہ ہم پانی کے ساتھ ساتھ ندی کے بیڈ پر سفر کرنا چاہتے ہیں۔

"ادھر۔ آگے جنگل۔ پہاڑ ہوتی جی۔ دو میل بعد۔ شکاری لوگ آتی۔ اپن سب کو لے جاتی۔ ادھر سڑک ریسٹ ہاؤس۔" اس نے واضح کیا کہ وہ ہمیں سیدھے راستے سے بھی لے جا سکتا ہے۔

میں نے نفی میں سر ہلایا "ادھر سے جاتی۔"

وہ سوچ میں پڑ گیا "ایک ہزار" اس نے قدرے تذبذب کے ساتھ کہا۔ اور اس وقت بہت حیران ہوا جب ہم نے سودا پانچ سو سے شروع نہیں کیا۔ اس کی باچھیں کِھل گئیں۔

ہم جیپ میں بیٹھ گئے۔ جیپ نے برساتی ندی کے بیڈ پر دوڑنا شروع کیا۔ اس کی رفتار زیادہ نہیں تھی، اس کے باوجود جھٹکوں سے سب کا برا حال تھا۔ اس کے پہیوں کے نیچے گول کنکریاں پھسل رہی تھیں، دب کے اِدھر اُدھر ہو رہی تھیں۔ اڑ کے جیپ کی باڈی سے ٹکرا رہی تھیں اور خاموشی میں یہ شور بہت زیادہ محسوس ہو رہا تھا۔

آہستہ آہستہ ہم اس جگہ سے دور ہوتے گئے۔ ندی کے

کنارے جو پہلے ایک فرلانگ دور تھے' کچھ سمٹ گئے۔ درمیان میں سرکنڈے نمودار ہو گئے۔ پانی کے متعدد دھارے نالیوں کی صورت میں دونوں طرف سے ندی میں شامل ہوتے گئے اور جہاں پانی کی پتلی سی دھار تھی وہاں تقریباً پچاس گز چوڑی ندی کا بہاؤ بن گیا۔ فاصلے کے ساتھ ساتھ کنارے بلند ہونے لگے۔ آبی گھاس اور سرکنڈے گھنے ہو گئے اور ندی کا پاٹ سو گز سے بھی بڑھ گیا۔ ندی نے کئی موڑ کاٹے تھے چناں چہ وہ جگہ نظر سے اوجھل ہو چکی تھی جہاں سے ہم نے سفر کا آغاز کیا تھا۔

دو میل سے زیادہ دور آنے کے بعد ڈرائیور کچھ پریشان ہونے لگا۔ اس نے واضح کیا کہ آگے راستہ غیر محفوظ ہے۔ پانی بہت زیادہ ہو جائے گا اور گھاس کے جھنڈ راہ میں حائل ہو جائیں گے۔ میں نے اس کی سنی ان سنی کر دی۔

"ابھی چلتے جاؤ" میں نے کہا۔

ایک فرلانگ کے بعد اس نے جیپ روک دی۔ اب میں پانی کے بہاؤ کی آواز سن سکتا تھا۔ آگے کہیں پانی نشیب میں گر رہا تھا۔ پانی کے راستے میں چٹانیں نمودار ہو گئی تھیں اور ان سے ٹکرا کے جھاگ اڑانے والا پانی ہماری احمقانہ ہمت پر مشتعل نظر آتا تھا۔

"آگے جاتی تو رام نام ست ہے" ڈرائیور نے کہا "تم آتم ہتیا کیوں کرتی؟"

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور کہا "اوپر جانے کا راستہ تو ہوگا۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "یہ جیپ ہوتی۔ ہیلی کوپٹر نہیں ہوتی۔"

میں نے کہا "ادھر دیکھو۔ یہ زیادہ چڑھائی تو نہیں ہے اور تمہاری جیپ فور وھیل ڈرائیو ہے۔"

اس نے فریادی لہجے میں کہا "اپن آپ کو بولتی تو سیدھا جاتی۔ ادھر سے جیپ گرتی تو بے زبان کا ہڈی سب ٹوٹ جاتی۔ اپن کا سرمہ بن جاتی۔"

میں نے کہا "دو ہزار لے کر چلو گے؟"

"دو ہزار؟" وہ چکر میں پڑ گیا "تم ابھی دے گی۔ اپن ڈرتی۔ تم ادھر جا کے گولی مارتی۔"

میں نے ہنس کے کہا "یار' رقم ابھی لے لو۔ یہ لو پورے دو ہزار۔ ہم شریف آدمی ہیں۔ خواتین ہیں ہمارے ساتھ۔"

"کون......" وہ گھبرا گیا۔

"یہ عورتیں۔ فیملی" میں نے وضاحت کی۔

اس نے دو ہزار جیب میں ڈالے اور پھر ایک نعرہ لگایا۔ "یا علی مدد" اس کے ساتھ ہی جیپ چڑھائی کی جانب لپکی۔ اس نے جیپ کو اسپیشل گیئر میں ڈالا۔ جیپ تیس چالیس درجے کی بلندی پر چڑھنے لگی۔ ٹائروں کے نیچے گھاس پھوس اور جھاڑیاں کچلے جا رہے تھے لیکن بہت جلد مجھے جیپ چلانے والے کی چالاکی کا اندازہ ہو گیا۔ اسے معلوم تھا کہ ادھر سے اوپر جانے کا راستہ ہے۔ شاید ہم سے پہلے بھی ایڈونچر کے شوقین شکاری ادھر سے گئے ہوں گے۔ وہ بڑی مہارت سے پگڈنڈی جیسے راستے تلاش کرتا جا رہا تھا اور جیپ کو درختوں کے بیچ میں سے نکالتا ہوا کسی پریشانی کے بغیر آگے بڑھ رہا تھا۔

ابھی ہم نے نصف بلندی طے کی تھی کہ میں نے اسے جیپ روک دینے کا حکم دیا۔ اس نے جیپ روک دی۔ اس کا خیال تھا کہ شاید ہم گردوپیش کے نظارے سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں مگر میرے ذہن میں کچھ اور تھا۔

"کیوں نہ یہاں ایک دن گزار لیں ہم" میں نے کہا۔

غالب نے میرے خیال کی تائید کی "بہت محفوظ جگہ ہے۔"

سڑک پر سے گزرنے والوں کی نظر یہاں پہنچ ہی نہیں سکتی تھی۔ ہم اپنے پیچھے عقل کو چکرا دینے والے سراغ چھوڑ کر آئے تھے۔ سب سے پہلے تو ناگپور کی پولیس نے حافظ جی کے بیان پر ہماری تلاش شروع کی ہوگی۔ ممکن ہے وہ بابا تاج الدین کی درگاہ تک ہمارا سراغ لگا لیں مگر وہاں سے ہم کہاں گئے' یہ کوئی معلوم نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے بعد انعام نبی کے گھر سے ہمارا پھر سراغ ملے گا اور پولیس اس ایمبولینس کو تلاش کرے گی جس کا سائرن بجاتے اور لائٹ چمکاتے ہم اتنے کڑے پہرے اور اتنی سخت چیکنگ کے باوجود سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر نکل گئے تھے۔ انعام کے بیان کی روشنی میں ہمارا تعاقب کرنے والے اندور کی طرف جائیں گے اور اس کے لئے پرانا راستہ استعمال کریں گے مگر سو پچاس میل کے بعد ان کو احساس ہوگا کہ ادھر سے کوئی ایمبولینس نہیں گزری۔ شاید اندرو پہنچ کے انہیں پتا چلے کہ ہم وہاں نہیں پہنچے۔ ہم نے واپسی پر جہاں انعام کی بیوی کو چھوڑا تھا وہیں سے ایک سڑک جبل پور کی طرف جاتی تھی اور ہم نے انعام کی بیوی کو بار بار کہا تھا کہ اب ہم جبل پور جا رہے ہیں تاکہ یہ بات اس کے ذہن میں بیٹھ جائے۔ تلاش کا اگلا مرحلہ پولیس کو جبل پور کی طرف لے جائے گا اور یہ مرحلہ زیادہ دشوار ہوگا۔ انہیں یہ نہیں معلوم ہوگا کہ ایمبولینس چھوڑنے کے بعد ہم نے کیا ٹرانسپورٹ استعمال کی۔ کسی سے کار چھینی' بس میں سفر کیا' بیل گاڑی میں یا پیدل۔ اس بات کا ایک فیصد امکان تھا کہ کوئی تفتیش کرتا ہوا پل کے نیچے پہنچ جائے اور ٹرک دھونے والے لڑکے سے معلوم کرے۔ وہ زیادہ سے زیادہ اتنا بتا سکے گا کہ ہم کسی جیپ والے سے بات کر رہے تھے۔ اس نے ہمیں جیپ میں دریا کے ساتھ ساتھ جاتے نہیں دیکھا تھا۔ بفرض محال کوئی ادھر چل پڑتا تو میل دو میل کے بعد مایوس ہو کے لوٹ جاتا۔ اس راستے پر سیدھا کوئی نہیں جا سکتا تھا۔ آگے دریا کا راستہ موت کا راستہ تھا۔

چناں چہ اوپر جنگل کے حصار میں ہم خود کو اتنا ہی محفوظ سمجھ سکتے تھے جتنا کسی زیر زمین پناہ خانے میں' جو اوپر سے نظر بھی نہ آتا ہو۔

جب میں نے وہاں ڈیرا ڈالنے کا خیال ظاہر کیا تو جیپ چلانے والے نے مجھے یوں دیکھا جیسے میرا دماغ چل گیا ہو۔ پھر اسے یقین آیا کہ میں سیریس ہوں تو وہ چلانے لگا۔

"ادھر لا کے بولتی ایسی بات۔ ابھی اپن واپس جاتی۔ تم اپن کو نہیں روکتی۔"

میں نے ریوالور نکال لیا "مگر بے زبان چیز تم کو روکتی۔"

اس کی آواز ایک دم بند ہو گئی۔ وہ تھرتھر کانپنے لگا اور ہاتھ جوڑنے لگا "اپن مرتی۔ ماں مر جاتی۔ ایک دم سب خلاص ہو جاتی۔ بھائی بہن۔ اپن کماتی اور سب کھاتی۔"

میں نے ریوالور جیب میں رکھ کے اسے تسلی دینے کے لئے دوستانہ انداز میں کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا "تمہارا نام کیا ہے؟"

"رامن۔ آپ کیوں پوچھتی جی؟"

میں نے کہا "رامن۔ ہم ڈاکو ہیں۔"

اس کا رنگ لاش کی طرح سفید ہو گیا "ڈاکو......"

"ہاں۔ خطرناک ڈاکو۔ بہت لوگوں کو مارا ہم نے۔ روز دس بارہ ڈاکے ڈالتے ہیں۔ پانچ چھ آدمی اوسطاً ہلاک کر دیتے ہیں" میں نے کہا۔

غالب نے بھی ریوالور نکال کے ہوا میں اچھالا اور کاؤ بوائے اسٹائل میں کیچ کرنے کی کوشش کی مگر ریوالور نیچے گر گیا۔ پھر یہی کرتب نازو نے کامیابی سے دکھایا۔ رامن کی وہ حالت ہو گئی جو نہتے آدمی کی خود کو آدم خور شیروں میں گھرا ہوا پا کے ہو سکتی ہے۔ وہ رونے لگا۔ عجیب مضحکہ خیز انداز میں۔

میں نے کہا "رامن! تم کیوں ڈرتے ہو؟"

"مرنے سے سب ڈرتی جی۔"

میں نے کہا "ہمارا کوئی ارادہ نہیں تم کو مارنے کا۔ ہم تمہیں بہت پیسہ دیں گے۔ اگر تم ہماری مدد کرو۔ مدد نہیں کرو گے تو ایک ایک گولی سب ماریں گے' یہاں' یہاں اور یہاں" میں نے سر' گردن اور دل کو نالی سے چھو کے بتایا۔

"ہم مدد کرتی جی" وہ لرزتی آواز میں بولا "اور کسی کو کچھ نہیں بولتی۔"

میں نے کہا "دیکھو۔ ہم یہاں پولیس سے چھپنے کے لئے آئے ہیں۔ پولیس ہر جگہ ہمیں تلاش کر رہی ہے مگر وہ اس جگہ نہیں آ سکتی۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

وہ چونکا "اِدھر نہیں آتی جی۔ ہم پکا بات بولتی۔"

میں نے کہا "یہ دیکھو۔ اس بیگ میں کیا ہے۔"

اس نے بیگ میں جھانکا تو حیرت سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں اور اسے ہمارے ڈاکو ہونے کے بارے میں کوئی شک نہ رہا۔ اتنا نقد اور اتنے ڈھیروں سونے کے زیورات اس نے پہلے کسی کے پاس نہ دیکھے ہوں گے۔ حیرت اسے ہوگی تو شاید ہمارے حلئے اور ہمارے شریفانہ انداز و اطوار پر۔ ہم خود بھی مہذب اور معزز لگتے تھے اور ہمارے ساتھ جو "فیملی" تھی وہ بھی ڈاکو سے زیادہ فلمی ہیروئن لگتی تھی۔

میں نے کہا "تم اس میں سے جتنا چاہو لے سکتے ہو لیکن شرط یہ ہے کہ کل تک تم ہماری مدد کرو گے۔ ہمارے سب کام کرو گے۔ چھوٹے چھوٹے کام جو ہم خود نہیں کر سکتے۔"

وہ سوچ میں پڑ گیا تھا مگر رضامندی کے آثار پہلے ہی اس کی صورت پر عیاں تھے۔ اس جیسے بہت سے غریب لڑکے ساری زندگی ایسے ہی خواب دیکھتے گزار دیتے تھے کہ غیب سے کوئی انہونی بات ہو۔ کہیں دفینہ مل جائے۔ کوئی لاٹری نکل آئے۔ کوئی لکھ پتی حسینہ عین فلمی انداز میں مہربان ہو جائے یا کوئی کروڑ پتی لاوارث انہیں بیٹا بنا لے۔ محنت کرتے کرتے ان کے جسم شل ہو جاتے تھے اور حوصلے ختم ہو جاتے تھے مگر حاصل ان خوابوں کی خیرات کے برابر بھی نہیں ہوتا تھا۔ رامن کے لئے اچانک وہ معجزہ ظہور میں آ گیا تھا جو اس کی تقدیر بدل سکتا تھا۔ بے شک اس میں خطرہ بھی تھا مگر اتنا نہیں جتنا تقدیر بدلنے کے لئے بینک میں ڈاکا ڈالنے والوں یا کسی سیٹھ کی تجوری خالی کرانے والوں کے لئے ہوتا ہے۔

اس نے کہا "اپن بہت ڈرتی جی۔"

میں نے کہا "ڈرنے کی کوئی بات نہیں تمہارے لئے۔ اگر تم خدمت کرو گے تو انعام ملے گا۔ ہمارے بارے میں کسی کو کچھ بتایا تو مارے جاؤ گے۔ صرف ایک دن کی بات ہے۔ ایک دن میں تم کو دس ہزار مل سکتے ہیں۔"

"کتنا بولتی آپ۔ دس.... ہزار بولتی آپ؟"

"ہاں۔ دس ہزار کم ہیں کیا؟"

"آپ پھر بولتی جی۔ دس ہزار" اس نے ناقابلِ یقین لہجے میں دُہرایا اور بیگ میں دیکھنے لگا "یہ سب دس ہزار ہوتی؟"

"یہ تو بہت زیادہ ہیں" میں نے ہنس کے کہا "مگر تم اچھا کام کر کے زیادہ انعام بھی لے سکتے ہو۔"

"ہم کرتی۔ سب کرتی جی۔ آپ بولتی۔ ہم ایک دم کرتی۔ آپ حکم کرتی۔ یا آپ حکم کرتی۔ یا آپ" وہ باری باری ہم سب کی طرف گھومتا گیا۔

میں نے کہا "شاباش۔ اب دیکھو' ہم یہاں بیٹھے ہیں۔ تم یہ بتاؤ کہ کہیں سے کھانے پینے کا سامان مل سکتا ہے۔"

"آپ کیا کھاتی جی۔ ہم لاتی۔ ادھر دس میل پیچھے سب ملتی۔ ہم جیپ میں جاتی۔"

میں نے کہا "نہیں۔ یہ جیپ یہیں رہے گی۔ تم جیسے چاہو جاؤ۔ بے شک ٹیکسی میں جاؤ۔ پیسے ہم دیں گے۔ کھانا لاؤ سب کے لئے۔ ہم چائے بنا لیں گے ادھر۔ کافی ملے تو کافی لاؤ۔ برتن چولھا سب خریدو۔ ہم رات کو ادھر سوئیں گے۔ ہم سب کے لئے کمبل بستر لاؤ۔ سگریٹ لاؤ۔"

وہ حیران ہونے لگا "اتنا سامان لاتی۔ بہت پیسہ خرچ ہوتی۔"

"تم پیسے کی فکر مت کرو" میں نے کہا۔

اچانک اسے کچھ اور خیال آیا "اگر آپ جیپ لے کر بھاگ جاتی تو سیٹھ ہم کو اندر کراتی۔ پولیس بہت مارتی۔ ہم مرجاتی جی۔"

میں نے کہا "تم جیپ کی چابیاں لے جاؤ۔ اس کے تار نکال کے لے جاؤ۔ اس کے بغیر تو جیپ نہیں چل سکتی نا۔ ایک بات اور سمجھ لو۔ ہماری گرفتاری پر انعام ہے۔ بہت سے لوگ اس انعام کے چکر میں پڑ گئے تھے۔ ان کی لاشیں گدھ اور کتے کھا گئے۔ جتنا تم کو پولیس دے گی اس سے زیادہ ہم دے سکتے ہیں مگر کسی کو ہمارے بارے میں بتا کے تم بچ نہیں سکتے۔ تمہارا سارا خاندان......"

وہ ہاتھ جوڑنے لگا "ہم ایسا نہیں کرتی جی۔"

میں نے کہا "اچھا تو پھر جاؤ۔ اور دیکھو' ایسا نہ ہو کہ تم سامان اٹھا کے لاؤ تو تمہارے پیچھے پولیس لگ جائے۔"

"اپن بہت چالا کی کرتی جی۔ پولیس کو بالکل معلوم نہیں ہوتی جی" اس نے ہمیں یقین دلایا۔

"جب تم واپس آؤ تو پہلے سیٹی بجانا دوبار۔ دور سے۔ ہم چھپ کر دیکھیں گے" میں نے کہا "اگر گڑ بڑ ہوگی تو ہم گولی ماردیں گے سب کو۔"

رامن نے واپسی کے بجائے اوپر جانے کا کوئی راستہ تلاش کیا اور دیکھتے دیکھتے گھنے درختوں کے جھنڈ میں غائب ہوگیا۔ گل اور نازو جیپ میں بیٹھی ہوئی تھیں اور غالب گھوم پھر کے آس پاس کا علاقہ دیکھ رہا تھا۔

"رامن دھوکا نہیں دے گا" غالب نے کہا۔

"ہاں۔ مجھے بھی بھروسہ ہے اس پر۔ ورنہ میں اسے اکیلا نہ جانے دیتا" میں نے کہا۔

"پھر کیا خود ساتھ جاتے؟"

"نہیں۔ نازو کو بھیجتا۔ پولیس والے ہم تینوں ہی کو پہچانتے ہیں جن کی تصویریں شائع ہوتی رہی ہیں۔ انہیں معلوم تو ہے کہ ہمارے ساتھ عورتیں بھی ہیں مگران عورتوں کی ابھی تک کوئی بھی تصویر شائع نہیں ہوئی ہے اس لئے وہ نسبتاً محفوظ ہیں۔"

"پھر تو نازو کو ساتھ بھیج دینا چاہئے تھا۔ خیر میں اب کہہ دیتا ہوں اس سے۔ وہ پیچھے لگ جائے۔" غالب نے کہا "ابھی رامن زیادہ دور نہیں گیا ہوگا۔"

وہ پلٹ کے جیپ تک گیا جو کچھ فاصلے پر سرسبز پتوں والے درختوں اور گھنی جھاڑیوں کے درمیان کھڑی ہوئی تھی۔ پھر میں نے سوچا کہ اب اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ رامن نہ جانے کس طرف سے نکل گیا ہوگا۔ اسے جنگل کے پُرپیچ راستوں کا علم تھا۔ یہ نہ ہو کہ نازو بلاوجہ اس کے پیچھے بھٹکتی پھرے۔

جیپ کے قریب پہنچ کے میں نے دیکھا کہ اس میں صرف گل ہے جو پیچھے والی سیٹ پر لیٹی ہوئی تھی۔

نازو کہاں گئی؟" میں نے کہا۔

غالب مسکرایا "رامن کے ساتھ۔ اس نے ہمیں بھی نہیں بتایا۔ غالباً وہ چھپ کے ہماری باتیں سن رہی تھی۔"

میں اور غالب جیپ کی اگلی سیٹوں پر بیٹھ گئے "ان حالات میں اور کچھ نہیں کر سکتے تھے ہم" میں نے کہا "بڑی بری طرح محصور ہو گئے تھے۔"

"ہاں۔ اب تو ڈر لگتا ہے یہاں بھی۔"

گل نے پیچھے سے کہا "جب تک خطرہ ٹل نہیں جاتا۔ کم سے کم چوبیس گھنٹے تو پولیس بہت مستعد رہے گی۔ وہ آس پاس کے علاقے کو چھان ماریں گے۔ دیکھا نہیں' راستے میں ہر گاڑی کو کس طرح چیک کیا جارہا تھا۔"

"میں نے نہیں دیکھا۔"

"میں نے ناکا بندی کا ذکر تو اکثر سنا ہے لیکن دیکھا پہلی بار کہ پولیس نے واقعی راستے بلاک کردئے تھے۔ عام طور پر بڑی بڑی کاروں والے نکل جاتے ہیں۔ مگر ایسا لگتا تھا کہ پورے صوبے کی پولیس لگادی گئی ہے۔ ایک ایک کار کو' ہر بس کو' ہر مسافر کو وہ بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔"

"یہ تو ہمیں ایمبولینس کا فائدہ ہوگیا۔ اور کوئی بھی گاڑی ہوتی روک لی جاتی۔ ایمبولینس دیکھ کے بس یہی خیال آتا ہے کہ نہ جانے کس کی زندگی اور موت کا سوال ہے۔ فوراً راستہ مل جاتا ہے کہ ایک منٹ کی تاخیر بھی نہ ہو۔"

"بھائی سکندر..." گل نے کہا اور خاموش ہوگئی۔

"کیا بات ہے گل؟"

"وہ...... محسن کا کچھ پتا نہیں چلا؟"

"صرف یہ معلوم ہوا ہے کہ اس نے تریویدی کو فون کیا تھا۔ دلاور کا پتا پوچھنے کے لئے" میں نے کہا۔

"کیا اسے معلوم ہوگیا ہے کہ......"

"ہاں۔ اسے یقین آچکا ہے کہ آخر کار اس کی بیوی شہلا اور اس کا بیٹا' دلاور کے شیطانی منصوبے پر قربان ہوگئے ہیں۔ وہ اسی ٹرین پر تھے" میں نے افسردگی سے کہا۔

"مگر محسن نے کسی عورت کو دیکھا تھا۔"

"پتا نہیں کون تھی وہ۔ اب تو مجھے بھی شک نہیں رہا کہ ہم انہیں بچانے کی کوشش میں ہار گئے" میں نے کہا "یہاں دلاور جیت گیا۔ اس نے جو کہا تھا وہ کر دکھایا۔ اس نے ہمارے ہاتھوں کو شہلا کی مظلوم محبت کے لہو سے رنگ دیا۔ وہ معصوم بچہ جس نے باپ کی شفقت اور محبت کا مطلب کبھی سمجھا ہی نہیں تھا' باپ کو سرخرو کر گیا اور ہمیں شرمندہ۔"

"سکندر بھائی! ایسا کیوں ہوا؟" گل رونے لگی۔

غالب نے کہا "کون جانتا تھا کہ ایسا ہوگا۔ حالاں کہ اس کا خطرہ ہر وقت موجود تھا۔ پھر بھی دل کو خیال تھا کہ... نہیں ہو

لگتا۔ اب بھی دل کہاں مانتا ہے کہ شہلا نہیں رہی۔"

پھر رنج میں ڈوبی ہوئی خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا جس میں گل صرف روتی رہی مگر میں اور غالب' شہلا کے تصور اور اس کی یاد کے ہر عکس کو اپنے ماضی کے دھندلائے ہوئے آئینے میں دیکھتے رہے۔ مجھے وہ وقت یاد آیا جب وہ پہلی بار ملی تھی۔ کس طرح ہم نے اسے برائی اور بدبختی کی دلدل سے نکالا تھا اور کیسے دیکھتے ہی دیکھتے اس کے وجود کی پاکیزگی یوں عیاں ہوگئی تھی جیسے پانی سے دھلتے ہی کیچڑ میں لت پت ہیرے کی آب و تاب نگاہوں کو حیران کر دیتی ہے۔ وہ دور کتنا مختصر مگر یادوں سے کتنا معمور تھا جب اس نے ہمیں اور ہم نے اسے اپنالیا تھا اور اس نے محسن کو جیت لیا تھا۔ رابعہ سے پہلے اور نازو سے پہلے اس نے محسن کو اپنی تقدیر کا مالک بنادیا تھا اور اپنے جسم و جاں سونپ دئے تھے۔ پتا نہیں اسے جلدی کیوں تھی۔ شاید وہ اپنی تقدیر سے ڈرتی تھی جس کے تاریک سائے اسے اپنے تعاقب میں محسوس ہوتے تھے۔ اور شاید اس کا خوف بے جا بھی نہیں تھا۔ ان تاریک سایوں نے خود اسے نگل لیا تھا۔ محسن کو اس سے نہیں چھینا تھا تو اسے محسن سے چھین لیا تھا۔ اتنے طویل صبر آزما انتظار اور ہجر کے عذاب بے حساب کے بعد۔ اتنی دعاؤں کے نامراد لوٹ آنے کے بعد اور محسن کے پیچھے اتنا عرصہ نذرانۂ جاں لے کر پھرنے کے بعد۔ وہ کبھی مایوس نہیں ہوئی تھی۔ کبھی اس کی زبان پر حرفِ شکایت نہ آیا تھا۔ اس نے محسن سے ایک بار بھی نہیں پوچھا تھا کہ تم لوٹ کر آؤ گے یا نہیں آؤ گے۔ ہم سے شکوہ نہیں کیا تھا کہ تم مجھے میرا محسن لوٹا کیوں نہیں دیتے۔

سسکتا ہوا وقت ہمارے دل کے ہر زخم پر نمک پاشی کرتا گزرتا گیا۔ اس درد کی تڑپ ہم نے استاد ٹیڈی کی موت پر بھی محسوس کی تھی لیکن اس دکھ میں خود اپنے جرم پر ندامت کی کسک شامل نہ تھی۔ ٹیڈی کو ہم سے جدا کرنے والے ہمارے دشمن تھے اور اگر اسے قضا کے تیر نے نشانہ بنالیا تھا تو ہم کسی طرح خود کو موردِ الزام نہیں سمجھتے تھے۔ مگر شہلا کو ہم نے جانتے بوجھتے اور سمجھتے ہوئے بھی اپنے مقصد کی کامیابی پر قربان کیا تھا۔ بے شک ہم شکست کی شرائط پر کوئی سمجھوتا نہیں کر سکتے تھے اور شہلا کی جگہ رابعہ ہوتی تب بھی آگے بڑھنے والے قدم پسپائی قبول نہ کرتے مگر ایک احساس تھا کہ شاید ہم سے کہیں کوتاہی ہوئی۔ ہماری کوشش کی ناکامی میں کسی خامی کو دخل تھا۔ بہت کچھ جو ہم کر سکتے تھے نہ کر سکے۔ الجھن یہ تھی کہ ہم خود اپنے ذہن میں پیدا ہونے والے کسی سوال کا کوئی جواب نہ رکھتے تھے۔ کون سی کوتاہی' کیسی ناکامی؟ اور کوشش میں کیا کمی تھی جو ہمارا قصور سمجھی جائے؟

جب خاموشی میں ایک سیٹی گونجی تو میں اور میرے ساتھ غالب چونکا۔ پچھلی سیٹ پر روتے روتے سوجانے والی گل اٹھ بیٹھی۔ ہم ریوالور ہاتھ میں لے کر نیچے اترے اور مختلف سمتوں میں درختوں کی اوٹ سے دیکھنے لگے۔ دوسری سیٹی کے بعد پتوں

کی اور شاخوں کی حرکت نظر آئی اور ایک پیڑ کے پیچھے سے رامن نمودار ہوا۔

اس کے سر پر ایک گٹھڑی تھی۔ ایسی گٹھڑی جسے دیکھ کر کوئی شک میں مبتلا نہیں ہو سکتا۔ اس کے وزن کو اٹھا کے گھنے جنگل میں ناہموار' اونچے نیچے راستے پر قدم جما کے چلنا مشکل کام تھا مگر رامن اِدھر اُدھر کی شاخوں کو تھام کے آہستہ آہستہ ہماری طرف بڑھتا آرہا تھا۔ ٹین کا ایک ڈبا اس کے شانے پر رسی سے بندھا جھول رہا تھا اور اس کے ایک ہاتھ میں کینوس کا پرانا تھیلا تھا۔

وہ قریب آیا تو میں نے سامان اتروانے میں اس کی مدد کی اور اس کی پیٹھ ٹھونکی "شاباش۔ تم نے تو کمال کردیا۔"

اس نے ہانپتے ہوئے کہا "اپن مرگئی۔ اتنا وزن اٹھاتی۔ اپنا کمر ٹوٹ جاتی۔"

وہ ہائے ہائے کرتا ہوا دھپ سے بیٹھ گیا اور ہمیں گٹھڑی کھولتا دیکھتا رہا۔ اس نے بڑی ہوشیاری سے سامان کا انتخاب کیا تھا۔ مٹی کے تیل کا چولہا گٹھڑی کے اندر چادروں میں لپٹا ہوا تھا اور بالکل نیا تھا۔ تیل اس نے الگ لیا تھا اور ٹین کے ڈبے کو رسی کے ساتھ کندھے پر لٹکا کے لایا تھا۔ چادروں میں سے ڈبل روٹیاں' مکھن' چینی اور خشک دودھ کے علاوہ چائے کی پتی کا ڈبا اور کافی سب موجود تھے۔

"کسی نے تمہیں خریداری کرتے دیکھ کر کچھ پوچھا تو نہیں؟"

"اپن گھر کے لئے سب لیتی جی۔" رامن نے کہا۔

"اور یہ سب تم اتنی دور سے کیسے لائے؟" غالب نے کہا۔

"سب اپنا یار ہوتی جی۔ اِدھر سے ٹرک میں جاتی۔ اُدھر سے جیپ میں آتی۔ اپنا یار بھی جیپ چلاتی۔ کار چلاتی ایک سیٹھ کا۔"

"تم بہت ہوشیار آدمی ہو۔" میں نے کہا "تمہارے دوست نے پوچھا نہیں کہ گھر کا سامان ادھر کہاں لے جارہے ہو؟"

"اپنا گھر ادھر ہوتی جی۔ اوپر ریسٹ ہاؤس کا باجو میں۔ ایک کھولی" اس نے اوپر کی طرف اشارہ کیا "وہ گھر کا دروازہ تک سامان لاتی۔ ادھر سے ہم اٹھاتی۔ ابھی اپن سارا حساب لکھتی۔" اس نے جیب سے ایک کاغذ برآمد کیا۔

"یہ کیسا حساب ہے؟"

"خرچہ ہوتی جی۔ چار سو۔ چالیس اور چار۔ اپن سب لکھتی۔ پانچ سو میں کتنا بچتی؟ پچاس کا نوٹ۔ اور چھ......" اس نے جیب سے چھپن روپے نکالے۔

میں نے ہنستے ہوئے کہا "یہ رکھو اپنے پاس۔ اور یہ لو پانچ سو جو تم نے خرچ کئے۔ تمہارے دو ہزار پورے۔"

اس نے سر ہلایا اور اٹھ کھڑا ہوا "ابھی اپن چائے بناتی۔"

میں نے کہا "تم چائے بنالو گے؟"

"اپن سب کرتی جی" اس نے نئے چولہے میں تیل ڈال کر اس کی بتیاں برابر کرتے ہوئے کہا اور پھر بڑی احتیاط سے انہیں

روشن کیا۔ پھر اس نے ایک نئی سلور کی کیتلی اٹھائی اور پانی لینے چلا گیا۔ دریا کا قدرتی پانی بہت صاف تھا۔ آدھے گھنٹے بعد ہم سب چائے پی کے تازہ دم ہو چکے تھے اور ہم سب پر غنودگی طاری ہو رہی تھی۔ رامن نے خود کو بھروسے کے قابل ثابت کر دیا تھا مگر میں نے جاگتے رہنے کا فیصلہ کیا۔ ایک خطرہ نادیدہ دشمنوں کا تھا۔ میں اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتا تھا کہ رامن وہ بیگ لے کر بھاگ جائے جس میں دس ہزار سے کہیں زیادہ کا مال تھا۔ غریب' فاقہ کش اور سخت حالات جھیلنے والے رامن جیسے کسی بھی لڑکے کا ایمان کسی عابد و زاہد کی طرح نہیں ہوتا کہ شیطان اسے ورغلانا بھی چاہے تو نہ ورغلا سکے۔ انعام کی صورت میں اسے صرف دس ہزار کی امید تھی۔ لاکھوں لے کر وہ بھاگ جاتا پھر ہمیں گرفتار کرا دیتا اور اپنے گھر والوں سمیت غائب ہو جاتا تو ہم کہاں اس کا سراغ لگاتے۔

آہستہ آہستہ دن ڈھلنے لگا۔ رامن کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ اس کی اردو انتہائی ناقص تھی چناں چہ اسے باتیں کرتے ہوئے بہت دشواری پیش آتی تھی۔ میں بہرحال اس کی مونث اردو گرامر سے مفہوم اخذ کر لیتا تھا۔ کچھ دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ وہ باتیں کرنا چاہتا ہے۔ میں نے کہا۔ "رامن! تم یہاں کب سے ہو؟ میرا مطلب ہے کیا ساری زندگی اسی جگہ گزاری ہے۔ یہی کام کرتے رہے ہو؟"

اس نے نفی میں سرہلایا اور بولا "اپنا باپ چور ہوتی جی۔"

میں بھونچکا رہ گیا "چور تھا تمہارا باپ؟"

"پھر ڈاکو بن جاتی۔ آپ کا مافک" وہ بولا "پکڑا جاتی تو جیل جاتی۔"

میں نے سخت شرمندگی محسوس کی مگر اب اس کے سامنے صفائی پیش کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

"اپن کا ماں بہت کام کرتی۔ اپن پڑھتی۔ پھر ماں بیمار ہو جاتی۔" اس نے اداسی سے کہا "اپن کام کرتی۔"

"کیا بیماری تھی تمہاری ماں کو؟"

"ٹی بی ہوتی جی" وہ بولا "ابھی ڈاکٹر بھی نہیں آتی۔ وہ بولتی رامن۔ تیرا پیسہ پھوکٹ میں جاتی۔ اس کو مرنے دے۔"

"تمہارا مطلب ہے وہ اتنی بیمار تھی کہ اس کے علاج پر خرچ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ پیسہ ضائع ہو جاتا تمہارا؟" میں نے ہمدردی اور دکھ کے ساتھ کہا۔

اس نے اقرار میں سرہلایا "سب بولتی رامن' تیرا ماں اس مہینے مرجاتی۔ پھر دوسرا مہینہ ایسا مافک بولتی۔ ابھی چھ مہینہ ہوتی جی۔ وہ نہیں مرتی سالی۔"

میں نے کہا "ماں کو گالی دے رہے ہو رامن۔ جس نے تمہیں محنت کر کے پالا۔ چور ڈاکو نہیں بننے دیا۔ تمہاری خاطر کام کرتے کرتے خود بیمار پڑ گئی۔ تم چاہتے ہو وہ مر جائے؟"

اس نے اقرار میں سرہلایا "وہ بھی بولتی' مرنے کو مانگتی۔ اپنا کو بہت دکھ ہوتی۔ کیا کرتی جی۔ روتی اور بس۔ اس کو زہر نہیں دے سکتی۔ اس کو سکھ ہوتی۔ اپن کو بھی" وہ بات کرتے کرتے رونے لگا۔

میں اس کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ وہ ماں کو دیکھ دیکھ کر دکھی ہوتا تھا مگر سوائے رونے کے اس کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ چھ مہینے سے اس کی ماں زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھی۔ خود بھی موت کی دعائیں مانگتی تھی مگر اس کا عذاب ختم ہونے میں نہیں آتا تھا۔ رامن کے لئے یہ بھی ناممکن تھا کہ وہ زہر دے کر ماں کو سکون کی نیند سلادے چناں چہ اس نے ...ت کو سب کے سکون کا ضامن اور سب کی نجات دہندہ کی حیثیت سے قبول کر لیا تھا۔ اس غیر جذباتی سوچ یا بے حسی کا سبب اپنی مجبوریاں تھیں جن کا علاج اس کے پاس نہیں تھا۔ حیرت کی بات تھی کہ ایک چور ڈاکو کا بیٹا پھر بھی اپنے باپ کی طرح اس معاشی جبر کے خلاف بغاوت کے طور پر ڈاکو نہیں بنا۔ اس نے مایوسی کی انتہا کو پہنچ کے یہ نہیں کیا کہ دنیا سے اپنی ماں کے لئے جینے کا حق چھین لیتا۔ اس کی صحت خریدنے کے لئے پیسہ اہم تھا تو پیسے والوں کی گردن دبوچ لیتا۔ عموماً مجرم ایسے ہی عذر رکھتے ہیں مگر یہ تصویر کا دوسرا رخ تھا۔ اسے باپ کے رویے نے مایوس کیا تھا۔ وہ باپ کے راستے پر چلنے سے نفرت کرتا تھا۔ شاید یہ نفرت ماں کی تربیت کی عطا کردہ تھی اور اس کا منفی ردِعمل اس مایوسی کی صورت میں سامنے آیا تھا جو عام طور پر غریب اللہ کی مرضی منصب کا لکھا اور اپنے ناکردہ گناہوں کی سزا سمجھ کے قبول کر لیتا ہے۔

میں رامن کو روتا دیکھتا رہا۔ مجھے اس سے ہمدردی بھی تھی اور اس پر غصہ بھی آ رہا تھا کہ آخر اتنی بزدلی کے ساتھ اس نے ماں کی ممتا سے محرومی کیوں قبول کر لی تھی۔ اس نے موت کے خلاف جدوجہد اتنی آسانی سے کیوں ختم کر دی۔ مگر میں اس کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اگر میں اسے ایک لاکھ دیتا تب بھی بے کار تھا۔ اس مرحلے پر دولت کی طاقت بھی کسی ٹی بی کے مریض کو موت کی سرحد سے کھینچ کر واپس نہیں لا سکتی تھی۔ شاید کسی بہت بڑے وی آئی پی ہسپتال میں جہاں ماہرین کی توجہ اور ہر علاج کی سہولت ملتی ہے یا بیرونِ ملک ایسا ہو سکتا تھا مگر کسی رامن کی ماں وی آئی پی نہیں ہوتی اور بیرونِ ملک اگر علاج کے لئے جاتے ہیں تو صرف سیاست داں۔

بہت دیر بعد رامن نے کہا "آپ کے لئے چائے بناتی جی؟"

میں نے چونک کر جنگل میں اترتی شام کو دیکھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے اجالا تھا۔ اچانک اندھیرے نے ہر سمت سے یلغار کی تھی۔ لوٹ کر آشیانوں میں آنے والے پرندوں کے شور سے جنگل گونج رہا تھا۔ اس شور میں دریا کے بہنے کی آواز دب گئی تھی۔

"بناؤ اور تم بھی میرے ساتھ پیو" میں نے مچھروں کو بھگانے

...نے کہا "آخر یہ اتنے مچھر کہاں سے آ گئے؟"

وہ ہنسنے لگا "ابھی تو اور آتی جی۔ زمین سے سانپ بچھو نکلتی رات کو۔"

سانپ بچھو؟ میں نے کہا۔

"بہت سانپ ہوتی ادھر جی" وہ چولہا جلا کے بیٹھ گیا "جوگی لوگ ادھر سے پکڑتی۔ اتنا لمبا ہوتی۔ اور اتنا" اس نے پہلے دونوں ہاتھوں کی مجموعی لمبائی بتائی اور پھر ایک انگلی دکھائی۔

"زہریلے سانپ ہوتے ہیں۔ کاٹ لے تو آدمی مرجاتا ہے۔"

وہ پھر ہنسنے لگا "ہم کو بہت کاٹی جی۔ اپن نہیں مرتی۔ کالا کوبرا کاٹی تو آدمی مرتی۔ وہ ہم نہیں دیکھی۔"

ایسے جنگل کی ویرانی میں رات گزارنے کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ اڑنے والے کیڑے مکوڑے تو دن میں بھی تھے مگر کم تھے۔ اب تو بڑے خوف ناک قسم کے مچھروں نے یلغار کر دی تھی۔ سانپ اور بچھو کے ذکر نے بھی مجھے پریشان کر دیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ دیگر حشرات الارض بھی اب چہل قدمی کے لئے نکلیں گے۔ سانا کہ سب خطرناک نہیں ہوتے مگر ہمیں کیا معلوم کہ کون سا سانپ بے زہر ہے چناں چہ اسے کاٹنے کا موقع ملے تو ہم زہر کے اثر کا خیال بھی دل میں نہ لائیں۔

میں نے گل' غالب اور نازو پر چادریں ڈال دیں تاکہ وہ ان مچھروں اور دوسرے اڑنے والے کیڑوں سے محفوظ ہو جائیں۔ یہاں کسی کو ملیریا بھی ہو جاتا تو ہم کیا علاج کرتے۔

"تم نے بتایا نہیں کہ اور کیا کام کرتے رہے ہو؟"

اس نے مجھے چائے پیش کی "اپن ہر کام کرتی۔ بمبئی کے گیراج میں مستری اپن کو دو روپیہ دیتی۔ استاد کا پاس بہت فلمسٹار آتی۔ نمی اور نرگس۔ مدھوبالا۔ اپن کو حسرت جے پوری لے جاتی۔ ادھر سب آتی۔ پھر وہ اپن کو دادا برمن کا پاس جانے کا بولتی۔ راحول کا واسطے۔"

"کس کے واسطے؟"

"راحول۔ دادا برمن کا بیٹا۔ وہ اپن کو پڑھاتی......"

وہ بمبئی کے واقعات سناتا رہا۔ موسیقار ایس ڈی برمن کے گھر میں نوکر کی حیثیت سے اس کا جو وقت گزرا تھا وہ اسے بہت یاد آتا تھا اور وہ اس پورے گھرانے کو فرشتہ قرار دیتا تھا۔ مجھ پر یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ رامن کو ہیرو بننے کا بالکل شوق نہیں تھا۔ وہ گانا چاہتا تھا۔ اس کی آواز اچھی تھی اور اسے یقین تھا کہ دادا برمن کے زیر سایہ اس کی تربیت ہو گی تو وہ گانے لگے گا۔ اس نے بڑے فخر سے بتایا کہ کئی بار وہ کورس بوائے کی حیثیت سے ریکارڈنگ میں شریک ہو چکا تھا۔

"پھر تم نے یہ شوق ترک کیوں کر دیا؟" میں نے کہا۔

"شوق ختم نہیں ہوتی جی۔ اپنا باپ ختم ہوتی۔ جیل سے نکلتی اور پھر وہی کام کرتی۔"

"تمہارا باپ اگر ڈاکو تھا تو لوٹ کا مال بھی گھر لاتا ہو گا۔ تمہاری ماں کو دیتا ہو گا۔"

"اپنا ماں نہیں لیتی جی۔ اس سے جھگڑا کرتی۔ وہ سب شراب جوئے میں اڑاتی۔ چھوکری لوگ پر خرچ کرتی اور ماں کو بہت مارتی۔ ایک روز ماں اس کو خلاص کرتی۔"

"کیا؟ تمہاری ماں نے مار دیا اسے؟ قتل کر دیا؟"

"اور کیا کرتی جی۔ اپن تو بولا بہت اچھا کرتی۔ ماں سات سال جیل کاٹتی۔ اپن اس سے ملنے جاتی۔ کام کرتی۔ چھوٹا بہن کا خیال کرتی۔ چھوٹا بھائی کو پڑھاتی۔"

"اتنی سی عمر میں یہ سب ذمے داریاں سنبھال لی تھیں تم نے؟" میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

"ادھر سے ماں آتی تو ٹی بی ہوتی۔ چھوٹا بھائی ایک دم باپ کا مافک ہوتی۔ سالا چور بن جاتی۔ ماں اس کو نکال دیتی۔ بہن کا سودا کرتی وہ۔"

میں نے کہا "کون۔ کس نے یہ سودا کیا؟ تمہاری ماں نے؟"

وہ نفی میں سرہلانے لگا "وہ سالا اپنا بھائی۔ وہ کسی موالی کو لاتی۔ دو ہزار میں بات کرتی۔ اپن سب سن لیتی۔ رات کو......"

"رات کو کیا؟"

"کچھ نہیں جی" وہ خاموش ہو گیا۔

میں نے اسے غور سے دیکھا "تم نے انہیں مار دیا۔"

وہ چونکا "اپن..... اور کیا کرتی۔ ماں اور بہن کا ساتھ ادھر سے بھاگ آتی۔ ابھی چار سال ہوتی۔"

"یہ چار سال پرانی بات ہے۔ اس وقت کیا عمر ہے تمہاری؟"

"بیس سال" وہ بولا "اپن کو ادھر کوئی نہیں جانتی۔"

"کوئی یہ نہیں جانتا کہ تم پہلے کیا تھے۔ تم نے ضرور اپنا نام بھی بدل لیا ہو گا۔ مگر رامن! تم بہت بے وقوف ہو۔ کیا تم ہر ایک کو یہ بات بتا دیتے ہو؟ کیوں بتاتے ہو۔ کیا ضرورت ہے کسی سے کہنے کی کہ تمہارا باپ چور ڈاکو تھا۔ اور تمہاری ماں قتل کے جرم میں سات سال جیل کاٹ چکی ہے۔ اور تم خود دو قتل کر چکے ہو۔"

"دو نہیں جی' ایک۔ اپن اس موالی کو مارتی۔"

"اور کسی دن تمہارا بھائی پھر آ گیا۔ اس نے تمہیں تلاش کر لیا تو کیا ہو گا؟ تم پکڑے جاؤ گے۔"

"اپن اس حرامی کو بھی خلاص کرتی۔"

میں نے کہا "رامن! سوچو تم جیل چلے گئے تو تمہاری بہن کا کیا ہو گا؟ ماں تو مرجائے گی۔ اس طرح ہر ایک سے کہتے پھرو گے یہ باتیں تو......"

"سب کو نہیں بولتی جی۔ آپ کو بولتی۔"

"مجھے بھی کیوں بتایا یہ سب۔ کیا میں دوست ہوں تمہارا یا ہمدرد؟" میں نے کہا "میں ڈاکو ہوں۔"

"نہیں جی۔ آپ ڈاکو نہیں ہوتی۔ ہم جانتی۔"

"میں ڈاکو نہیں ہوں۔ تمہیں کس طرح معلوم ہو سکتی ہے یہ بات؟" میں نے کہا۔

"اپن جانتی ڈاکو کیسا ہوتی۔ چور کیا ہوتی۔ اپنا تو سالا باپ بھی چور ڈاکو ہوتی" اس نے کہا۔

"تم خطرناک حد تک سمجھدار ہو" میں نے کہا "بیس سال کی عمر میں تم نے زندگی کے جو تجربات حاصل کر لئے ہیں وہ لوگ ساری عمر گنوا کے بھی حاصل نہیں کرتے۔ کیا تمہاری بہن کی شادی ہو گئی ہے؟"

"وہ ابھی انکار کرتی۔"

"پھر سوچو رامن، تم ہی تو ان کا سہارا ہو۔ تم کو ان کی خاطر جینا ہے۔ جیل نہیں جانا ہے" میں نے کہا "تم نے اپنے باپ کے اور بھائی کے راستے پر چلنا قبول نہیں کیا۔ تم نے ان سے ہر تعلق کو ختم کر دیا۔ ایسے ہی اپنے ماضی سے رشتہ توڑ لو۔ کبھی مت بتاؤ کسی کو اپنے بارے میں کوئی سچائی۔"

"پھر کیا بتاتی جی؟"

"یہ کہو کہ تم ایک عزت دار باپ کے بیٹے ہو۔ تمہارا باپ کلرک تھا یا ٹیچر تھا۔ مزدور تھا۔ تمہاری ماں اس وقت بیوہ ہو گئی تھی جب تم چھوٹے تھے۔ اس نے محنت کر کے تمہیں پالا۔ اپنے لئے عزت حاصل کرو بے وقوف، خواہ وہ جھوٹ بول کے ملے۔ اس سچ سے کیا فائدہ جو تمہارے لئے ذلت و رسوائی کا سبب بنے اور تمہارا مستقبل بھی اتنا ہی داغ دار ہو جتنا تمہارا ماضی۔ یہاں سب ایسا ہی کرتے ہیں۔ جھوٹی عزت حاصل کر لیتے ہیں اور ساری عمر جھوٹ کے سہاروں پر آگے بڑھتے ہیں۔ پھر تم سچ کیوں بتاتے پھرتے ہو دنیا کو۔"

"اپن کسی کو نہیں بتاتی جی۔"

"پھر وہی بات۔ مجھے بھی کیوں بتایا؟ میری بات کو پلّے باندھ لو رامن۔ اپنے ماضی کو بھول جاؤ۔ جیسے تم باپ کو اور بھائی کو بھول گئے ہو۔ ان سے تعلق ختم کر لیا ہے تم نے۔ صرف آگے دیکھو۔ مستقبل پر نظر رکھو۔ تمہاری ماں بھی مر جائے گی۔ بہن اپنے گھر چلی جائے گی۔ پھر تم اکیلے رہ جاؤ گے دنیا میں۔ رشتوں کے بغیر۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ میرا اور تمہارا صرف ایک رات کا ساتھ ہے ورنہ شاید میں تمہاری مدد کرتا۔ مجھے بتاؤ کہ عزت سے، محنت سے زندہ رہنے کے لئے تمہیں کس چیز کی ضرورت ہے۔ پیسے کی؟ کتنا پیسہ چاہئے تم کو؟ بولو۔"

وہ ہنسنے لگا "اپن کا ایک ٹیکسی ہوتا تو اپن دو بناتا۔ دو سے چار....."

میں نے کہا "شیخ چلی کی طرح خواب مت دیکھو۔"

"کس کا خواب۔ یہ کون شیخ ہوتی؟"

میں نے کہا "چھوڑو اسے۔ یہ بتاؤ ٹیکسی کتنے میں مل جاتی ہے؟"

"جیسا گاڑی ویسا دام۔ نئی تیس ہزار میں ملتی۔ بیس میں اچھا گاڑی ملتی۔ دس میں چالو کھٹارا۔"

میں نے کہا "سنو۔ میں تم کو تیس ہزار دے کر جاؤں گا۔ پورے تیس ہزار۔ یہ بتاؤ تم جھوٹ بول کے مجھے الو تو نہیں بنا رہے ہو۔"

وہ ایک دم دکھی نظر آنے لگا۔ "کیسا مافک بات بولتی جی۔"

میں نے کہا "یہ نہ ہو بعد میں تم کہتے پھرو کہ میں نے اسٹوری سنا کے تیس ہزار وصول کر لئے۔"

"یہ اسٹوری نہیں ہوتی جی۔ آپ میرے ساتھ چلتی۔ ادھر سے دو میل پر اپنا کھولی میں ماں ہوتی۔ اپنا بہن ہوتی۔"

میں نے کہا "مجھے یقین آ گیا ہے۔ تم اتنی بڑی رقم کی حفاظت کر سکو گے؟ ضائع تو نہیں کر دو گے یہ رقم۔ ایسا نہ ہو کہ تم ٹیکسی خریدنے کے بجائے کسی اور چکر میں پڑ جاؤ۔ یا کوئی تم سے رقم ہتھیا لے، ٹیکسی چھین لے۔ اور ٹیکسی تم کہاں چلاؤ گے؟ بمبئی میں۔ وہاں پکڑے نہ جاؤ تم۔"

"اپن مدراس جاتی۔ اپنا گھر۔ ماں بولتی۔"

"اچھا اچھا۔ تمہاری ماں کی خواہش ہے کہ وہ لوٹ کر اپنی جنم بھومی جائے۔ تم اسے ضرور لے جاؤ۔ اور کچھ تو کر نہیں سکتے تم اس کے لئے۔ یہ نیکی ضرور کما لو۔"

"ہم ٹھیک بولتی جی۔ آپ ڈاکو نہیں ہوتی" وہ پھر رونے لگا۔ "پھر آپ کون ہوتی جی؟ اتنا پیسہ کدھر سے لاتی؟ اپن کو کیوں دیتی جی؟"

میں نے کہا "میں تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔ مگر یہ سمجھ لو کہ تمہارے لئے اپنی زندگی یا قسمت کو بدلنے کا ایک موقع ہے جو قدرت نے فراہم کیا ہے۔ اس کو ضائع مت کرنا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ تم اپنے باپ کی طرح چور ڈاکو نہیں، عزت دار آدمی بنو گے۔ تم سے پھر کبھی ملاقات نہیں ہو گی مگر دس بیس سال بعد یہ دنیا تم کو سلام کرے گی جس نے تم سے سب کچھ چھین لیا تھا۔ اب جو میں نے کہا ہے وہ یاد رکھنا۔ کبھی کسی کو اپنے بارے میں کچھ نہیں بتانا۔ بس ماں اور بہن کو ساتھ لو اور کسی کو کچھ بتائے بغیر مدراس چلے جاؤ۔ یہاں رہو گے تب بھی لوگ پوچھیں گے کہ یہ نئی ٹیکسی کیسے لی۔ جو باتیں میرے اور تمہارے درمیان ہوئیں یہ بھی کسی کو مت بتانا۔ یہ بھی مت کہنا کہ ٹیکسی تم نے کیسے خریدی۔ وہ کون تھا جو تم کو اتنی رقم دے گیا تھا۔ ورنہ تم بھی مصیبت میں پڑ جاؤ گے اور ہم بھی۔"

"اپن وعدہ کرتی جی۔"

"یہ رونا بند کرو۔ میرے ساتھیوں کو بھی کچھ مت بتانا۔ میں خود بتاؤں گا بعد میں" میں نے کہا۔

یہ اپنے دوستوں پر عدم اعتماد کا اظہار نہیں تھا جس پر میں شرمندگی محسوس کرتا۔ میں رامن کو آزمانا چاہتا تھا۔ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ میری نصیحت پر کس حد تک عمل پیرا ہوتا ہے۔

اندھیرا اب اتنا گہرا ہو گیا تھا کہ ہم ایک دوسرے کی صورت کے نقوش بھی واضح طور پر نہیں دیکھ سکتے تھے حالاں کہ وہ مجھ سے دس بارہ فٹ کے فاصلے پر بیٹھا ہوا تھا۔ جیپ دور تک پھیلی ہوئی تاریکی کا حصہ بن چکی تھی۔ درختوں کے مکین بھی شب بسری کے لئے آشیانوں میں پناہ لے چکے تھے اور اس کے ساتھ ہی ویران رات کا سناٹا جنگل میں گونجنے لگا تھا۔ اس میں دریا کی روانی کا شور زیادہ بلند محسوس ہوتا تھا اور جھینگروں کا کورس ایک عجیب تاثر پیدا کرتا تھا، جیسے غمناک تنہائی کا نوحہ۔

میں نے کہا "اندھیرا ہو گیا۔ یہاں تو کچھ نظر نہیں آتا۔"

وہ سمجھا کہ میں شکایت کر رہا ہوں۔ وہ سب کچھ لے آیا تھا مگر موم بتی یا لالٹین لانا بھول گیا تھا "اپن کا مغز خراب ہوتی جی۔ لائٹ کا واسطے کچھ نہیں لاتی۔"

میں نے کہا "روشنی کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ خواہ مخواہ کوئی دیکھے گا تو ادھر آ جائے گا۔"

"روشنی میں جانور نہیں آتی۔ ابھی ہم لکڑی جلاتی۔"

میں نے کہا "رہنے دو۔ ایسے کون سے خطرناک جانور ہیں یہاں۔"

گیدڑ ہوتی۔ بھیڑیا ہوتی۔ آدمی اکیلا سوتی تو کھاتی۔" اس نے متفکر ہو کے کہا۔

میں نے کہا "اول تو ہم اکیلے نہیں ہیں۔ اور ہم میں سے کوئی نہ کوئی جاگتا رہے گا۔ پھر بھی گیدڑ یا بھیڑیئے نے ادھر کا رخ کیا تو مارا جائے گا۔"

میں نے بار بار گھڑی دیکھی۔ وقت جیسے منجمد ہو گیا تھا۔ بیٹھے بیٹھے میں تھک گیا تھا اور نیند کا غلبہ شدید سے شدید تر ہوتا جا رہا تھا۔ نو بجے میں نے محسوس کیا کہ اب غالب کو جگا دینے میں کوئی حرج نہیں۔ وہ سات آٹھ گھنٹے کی نیند پوری کر چکا تھا اور باقی رات جاگ کر گزار سکتا تھا۔

میں نے غالب کو بیدار کیا تو نازو بھی اٹھ گئی "مجھے تو مچھر کھا گئے" اس نے ہاتھوں اور پیروں کو ملتے ہوئے کہا۔

"ایسی چیز ہر روز کہاں ملتی ہو گی انہیں" غالب نے کہا "مجھے تو کسی نے نہیں کاٹا۔"

میں نے کہا "چلو اب جگہ دو مجھے۔ میں سونا چاہتا ہوں۔"

"وقت کیا ہوا ہے؟"

"نو بجے ہیں۔ چائے پیو بنا کے اور ایک دوسرے کا سر کھاؤ۔" میں نے کہا اور خود کو سر سے پیر تک چادر میں لپیٹ کر پڑ گیا۔

میری آنکھ اس وقت کھلی جب رات کے اندھیرے میں صبح کے اجالے کی ہلکی سی رمق شامل ہونے لگی تھی۔ پرندوں کے شور سے جنگل گونج رہا تھا۔ جیپ میں میرے سوا کوئی نہیں تھا۔ میں نے غور سے کلائی کی گھڑی دیکھی تو پانچ بج کر دس منٹ ہوئے تھے۔

جہاں میں رامن کے ساتھ بیٹھا رہا تھا وہاں اب گل، غالب اور نازو گھیرا بنائے بیٹھے تھے۔ انہوں نے خشک لکڑیوں کا الاؤ سا روشن کر رکھا تھا اور کیمپ فائر کے مزے لے رہے تھے۔

میں نے کہا "یہ آگ کیا لوگوں کو متوجہ کرنے کے لئے جلا رکھی ہے؟"

غالب نے کہا "لوگوں سے زیادہ جنگل کے دوسرے جانور بے تکلفی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ آپ تو خواب خرگوش میں تھے یا گھوڑے بیچ کے سو رہے تھے مگر یہاں بھیڑیئے اور گیدڑ آ گئے تھے۔"

نازو نے کہا "اف! کیسے اندھیرے میں چمکتی تھیں ان کی آنکھیں۔ میرا تو خون خشک ہو جاتا تھا۔"

گل نے اس کی تائید کی "اتنا ڈر مجھے پہلے کبھی نہیں لگا۔"

غالب نے کہا "ایک تو خودکشی پر آمادہ تھا۔ میں ضبط سے کام نہ لیتا تو مارا جاتا۔"

میں ان کے ساتھ بیٹھ گیا "رامن کہاں ہے؟"

غالب نے کہا "وہ گھر چلا گیا تھا۔ صبح آئے گا۔"

"اس نے اپنے بارے میں کچھ بتایا؟"

"نہیں۔ ہم نے بہت پوچھا۔ کہنے لگا۔ جی غریب کی کیا لائف ہوتی۔ گزر جاتی، جیسے کتے کی گزرتی۔ بتا رہا تھا کہ باپ کہیں کلرک تھا۔ وہ مر گیا تو ماں نے محنت کر کے پالا۔ دو بھائی ہیں اور ایک بڑی بہن ہے۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ میں نے یہی کہا تھا اس سے۔ خدا کا شکر ہے کہ میری بات اس نے سمجھ لی اور مان لی۔

"تم نے کیا کہا تھا؟" نازو حیران ہو کے بولی۔

"چائے پلاؤ تو بتاؤں" میں نے انگارے سے سگریٹ جلاتے ہوئے کہا۔

نازو نے کہا "کافی پی لو۔ ہم نے ابھی پی ہے۔"

کافی پیتے ہوئے میں نے انہیں رامن کے بارے میں بتایا۔ نازو اور گل پر حسبِ توقع شدید جذباتی دورہ پڑا۔ نازو نے تجویز پیش کر دی کہ ہم رامن کو ساتھ لے چلیں۔

میں نے کہا "اس کی ماں کے ساتھ۔ جو بستر مرگ پر ہے؟"

"ایک بہن بھی ہے اس کی" غالب نے کہا۔

"انہیں بھی گھسیٹتے پھریں ساتھ۔ خود تو خوار ہیں، انہیں بھی خوار کریں؟" میں نے کہا۔

نازو نے کہا "انہیں مدراس چھوڑتے ہوئے نکل جائیں۔"

"کچھ پتا ہے مدراس کا؟ شمال میں ہے کہ جنوب میں" غالب نے کہا "بس یہ ٹھیک ہے جو سکندر نے کیا۔"

"پیسہ یہاں ان کے کسی کام نہیں آئے گا۔"

"پیسہ ہر جگہ کام آتا ہے۔ انسانوں سے زیادہ" غالب نے کہا۔

"یہ تو ٹھیک ہے۔ آج ہم خالی ہاتھ ہوتے تو خود کو کتنا بے سہارا محسوس کرتے۔ اب امید تو ہے کہ ہم سہارے خرید سکتے ہیں" میں نے کہا "وسائل پیدا کر سکتے ہیں۔"

"اس جنگل میں کب تک قیام رہے گا؟"

"میں سمجھتا ہوں کہ اِدھر سے اُدھر بھاگے پھرنے کی فوری ضرورت کوئی نہیں ہے۔ہم اچانک ہر طرف سے گھر گئے تھے۔ خوش قسمت ہیں کہ یہاں اکٹھے بیٹھے ہیں اور محفوظ ہیں۔کم سے کم دو دن......"

"دو دن! یہاں؟" گل نے کہا۔

"جہاں کرنے کو بھی کچھ نہیں ہے" نازو نے کہا۔

"کرنے کو بہت کچھ ہے۔اگر تم چاہو" غالب نے کہا۔

"مثلاً کوّے اڑاؤں۔چڑیاں ماروں۔یا درخت کاٹوں۔" نازو نے کہا۔

"بھئی آرام کرو۔باتیں کرو مجھ سے۔فرض کرلو کہ ہم ایک فلم یونٹ ہیں جو یہاں لوکیشن شوٹنگ پر آیا ہے۔میں اور تم مرکزی کردار ہیں۔باقی یہ کہ دریا کا کنارا ہے۔ڈائیلاگ مجھے بھی یاد ہیں بہت۔اور دو گانا بھی پکچرائز ہو سکتا ہے۔"

"تم ایڈونچر کی شوٹنگ کیوں نہیں کراتے۔دریا میں... بہاؤ کے ساتھ تیرتے جاؤ اور سر کے بل آبشار کے ساتھ گرو کسی چٹان پر۔ایسے کہ چٹان پاش پاش ہو جائے" نازو نے کہا۔

"ایسی باتوں سے تم ہمیشہ میرا دل پاش پاش کرتی ہو مس نازو۔" غالب نے کہا۔

"اور تم ایسے ڈھیٹ ہو کہ پھر جوڑ لیتے ہو اس کے ٹکڑے اٹھا کے" نازو نے مسکرا کے کہا۔

صبح کا اجالا پھیلنے تک ہم باتیں کرتے رہے اور اصولی طور پر اتفاق رائے ہو گیا کہ جب تک اس علاقے میں پولیس کی دوڑ دھوپ ختم نہیں ہو جاتی ہمارا غائب رہنا ہی تحفظ کا ضامن ہو گا۔دو دن میں ہمارا کہیں سراغ نہ ملا تو پولیس یہ سمجھنے پر مجبور ہو گی کہ ہم پھر انہیں چکمہ دے کر نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔پھر یہ دردِ سر ہو جائے گا دوسرے علاقے کی پولیس کا اور یہاں ہمارے لئے کچھ آسانی پیدا ہو جائے گی۔پھر ہم بھیس بدل کے نکلیں گے تو سیدھے ڈھاکا جائیں گے۔سب سے زیادہ اہم کام محسن کو تلاش کرنا ہے۔ اس کے بعد یہ طے کیا جا سکتا ہے کہ مشرقی پاکستان میں ہمارے کرنے کے لئے کیا ہے۔

اس جنگل میں قیدِ تنہائی کاٹنے کا خیال میرے لئے بھی کم پریشان کن نہ تھا مگر باہر کے خطرات کا تصور کرتا تھا تو مجھے اسی مجبوری کو قبول کرنے میں عافیت محسوس ہوتی تھی۔ہم نے ایک پورا دن سوتے' باتیں کرتے گزار دیا تھا مگر دوسرا دن اور پھر آنے والی رات ایسے ہی کاٹنا ضروری تھا۔

رامن کا لایا ہوا ڈبل روٹی' مکھن کا اسٹاک صبح کے ناشتے میں ختم ہو گیا۔میں نے اسے دوبارہ بازار بھیجنے کا فیصلہ کیا۔نازو اور گل کا خیال تھا کہ وہ رامن کے گھر جا کے اس کی ماں کو دیکھ آئیں مگر میں نے انہیں روک دیا۔ہمارا اس جگہ سے زیادہ دور جانا احتیاط کے تقاضوں کے خلاف تھا۔ریسٹ ہاؤس میں کسی کی ان پر نظر پڑ جاتی اور کوئی خواہ مخواہ کے تجسس میں مبتلا ہو جاتا تو خود پیچھے لگ جاتا یا رامن سے پوچھنا شروع کر دیتا کہ یہ کون تھیں۔کہاں سے آئی تھیں۔

رامن جب بازار جا رہا تھا تو نازو نے اسے خاصی لمبی فہرست بنا دی تھی کہ یہ بھی لیتے آنا اور وہ بھی۔

میں نے کہا "چاٹ اور پکوڑے۔ دوپہر کے لئے قورمہ بریانی۔کیا ہو گیا ہے تمہاری عقل کو؟"

"جب وہ بازار جا ہی رہا ہے......تو کیا حرج ہے۔"

میں نے کہا "کیا ہم پکنک پر آئے ہیں؟"

"آئے تو نہیں مگر اسے پکنک بنا لیں تو قید اور مجبوری کا احساس کچھ کم ہو جائے گا" نازو نے کہا۔

"میں بھی اپنی پسند کا مینو بتاؤں" غالب نے کہا "چکن کارن سوپ۔فرائیڈ پران...... آئس کریم۔"

رامن کبھی ایک کی صورت دیکھتا تھا کبھی دوسرے کی۔آخر کار اس نے کہا "ادھر وال ملتی۔آلو کی ترکاری ملتی اور بس۔"

میں نے ہنس کے کہا "تو بس یہی لے آؤ۔ایک اور چیز زیادہ ضروری ہے۔کہیں سے اخبار مل جائے تو ضرور لے آنا۔"

غالب نے کہا "یار' کوئی ریڈیو پیدا کرو کہیں سے۔"

رامن نے کہا "ریڈیو تو جیپ میں ہوتی جی۔اخبار میں لاتی۔"

اس کے جانے کے بعد میں نے کہا "کمال ہے۔تم نے یہ بھی نہیں دیکھا مرزا جی کہ ریڈیو فٹ تھا جیپ میں۔"

"حیراں ہوں کہ ان آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں" غالب نے نازو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ویسے بھی ریڈیو دیکھنے کی نہیں سننے کی چیز ہوتی ہے۔"

میں نے ریڈیو کو آن کیا۔عام کار کے ریڈیو کی طرح یہ بھی اے ایم ایف ایم ریڈیو تھا یعنی طویل فاصلے کی نشریات وصول نہیں کر سکتا تھا جو شارٹ ویو پر موصول ہوتی ہیں۔اس سے مجھے قدرے مایوسی ہوئی۔شارٹ ویو بینڈ ہوتا تو میں پاکستان کی نشریات سن سکتا تھا۔لاہور' کراچی یا اسلام آباد کی آواز صاف سنی جا سکتی تھی۔ بیرونی ممالک کے لئے ریڈیو پاکستان کے پروگرام الگ تھے۔ان سے ملکی اور بین الاقوامی صورت حالات کا پتا چل سکتا تھا۔

میڈیم ویو پر بی بی سی واحد اسٹیشن تھا جو ہمیں پاکستان کی خبریں بھی فراہم کر سکتا تھا اور دنیا کی بھی..... لیکن اس کا اردو پروگرام رات کو ہوتا تھا۔اس وقت نہ جانے کس زبان میں پروگرام جاری تھا۔ ریڈیو پر پانچ اسٹیشن پہلے سے سیٹ تھے' جیسے کہ عام طور پر ہوتے ہیں۔میں نے ایک ایک بٹن کو دبایا۔تین اسٹیشن خاموش تھے یا موصول نہیں ہو رہے تھے۔چوتھے پر آواز کم تھی مگر پانچویں کی نشریات بالکل صاف سُنی جا سکتی تھیں۔اس وقت ہندی میں سما چار چل رہے تھے۔

غالب بھی میرے ساتھ آ بیٹھا تھا اور ہم نے ہندی بلیٹن سے جو کچھ سمجھا وہ ہمارے لئے خاصا مایوس کن تھا۔مشرقی پاکستان کی صورت حال کا اثر مغربی پاکستان کی سرحدوں پر بھی پڑنے لگا تھا اور بظاہر دونوں ممالک کے درمیان جنگ شروع ہونے ؟!! تھے۔ادھر

آل انڈیا ریڈیو نے مشرقی پاکستان کے حالات کی جو تصویر کھینچی تھی وہ ایسی تھی کہ معلوم ہوتا تھا وہاں پاکستانی افواج اور مشرقی پاکستان کے رہنے والوں کی براہِ راست گوریلا جنگ چل رہی ہے جس میں پاکستانی فوج کو بہت نقصان اٹھانا پڑ رہا ہے۔ایک خبر کے حوالے سے یہ بھی کہا گیا تھا کہ پاکستان کی فوج نے آزادی مانگنے والے بنگالیوں کا قتلِ عام بند نہ کیا اور ان پر اپنے مظالم جاری رکھے تو بھارت فوجی مداخلت پر مجبور ہو جائے گا کیوں کہ وہ انسانی ہمدردی کی بنیاد پر بنگالیوں کے حقوق کی پامالی اور نہتے عوام کے خلاف فوج کی کارروائی کے خلاف ہے۔

میں اور غالب یہ بکواس سن کر حیران رہ گئے۔

"یہ ہمارا داخلی معاملہ ہے" غالب نے برہمی سے کہا "اگر ہم اپنے ملک میں تخریب کاروں سے نمٹنے کے لئے فوج کی مدد لیتے ہیں تو بھارت کو کیا پریشانی ہے۔اس کے اپنے ملک میں یہ صورت حال ہوتی تو کیا وہ خاموش تماشائی بنے رہتے؟ آسام اور کیرالہ میں کیا ہوتا ہے؟"

میں نے کہا "مرزا جی! یہ سب بہانے ہیں۔سیاست کے میدان میں شکاری تو سپر پاورز ہیں۔ہم جیسے ممالک اور ان کے عوام کی کیا حیثیت ہے؛ صرف شکار کی۔افریقہ اور ایشیا کے غریب ممالک ان کی شکار گاہیں ہیں۔"

"مشرقی پاکستان کی صورت حال اتنی خراب کیسے ہو سکتی ہے؟"

میں نے کہا "دشمن کبھی حوصلہ افزا خبر نہیں دے گا۔" یہ تو پروپیگنڈا ہے۔اسے خبر مت سمجھو۔"

ہندی کے بعد انگریزی بلیٹن شروع ہوا تو خبروں کا انداز بدل گیا۔نقطۂ نظر اب بھی وہی تھا کہ بنگالی اپنی آزادی کے لئے جنگ لڑ رہے ہیں اور دنیا بھر کی جمہوریت پسند قوتوں کا اور اقوام متحدہ کا یہ فرض ہے کہ پاکستانی فوج کے ہاتھوں ہونے والے قتلِ عام کو رکوا دے۔انگریزی کی خبروں میں جذباتی عنصر کچھ کم تھا۔مبالغہ آرائی میں بھی توازن تھا مگر اس سے مشرقی پاکستان کے حالات کی ابتری کا تاثر زیادہ منطقی انداز میں سامنے آتا تھا۔بالکل اسی طرح جیسے ایک جاہل آدمی کسی واقعے کو بیان کرتے ہوئے سخت جذباتی ہوتا ہے۔غصے میں گالیاں بکتا ہے۔قسمیں کھاتا ہے کہ یہ سچ ہے۔ اور دلائل کی جگہ چلّا کے بات منوانے کی کوشش کرتا ہے تو اس جیسے قائل بھی ہو جاتے ہیں اور مان بھی لیتے ہیں۔مگر ایک پڑھا لکھا آدمی دلیل کے ساتھ' منطقی انداز میں اور قطعیت کے ساتھ غلط بات بھی کرتا ہے تو زیادہ مستند سمجھ لی جاتی ہے۔

ہندی کا بلیٹن عام آدمی کے لئے تھا۔اس کے جذبات کا رخ حکومت کی پالیسی کے مطابق موڑنے اور اسے یکطرفہ سوچ کا مواد فراہم کرنے کے لئے۔انگریزی جاننے والا پڑھا لکھا آدمی تھوڑا بہت تجزیہ کرتا ہے اور انگریزی کے بلیٹن کو غیر ملکی نمائندے اور مشن کے ارکان بھی سنتے ہیں چناں چہ انگریزی میں وہی نقطۂ نظر ایسے پیش کیا گیا تھا کہ غلط بیانی نہ لگے۔

سماچار ختم ہوئے تو کسی متعصب سیاسی مبصر نے مشرقی پاکستان کے حالات کا تجزیہ شروع کیا جو خبروں سے زیادہ گمراہ کن اور اشتعال انگیز تھا۔غالب نے غصے میں ریڈیو آف کر دیا تھا مگر میں نے پھر کھول دیا۔

"اگر تم یقین کرتے ہو تو یہ پروپیگنڈے کی کامیابی ہے اور یقین نہیں کرتے تو مشتعل ہونے کا کوئی جواز نہیں" میں نے کہا۔

"سننے میں کیا حرج ہے۔"

"میں کیوں سنوں فضول بکواس!"

"اس لئے کہ اور کچھ ہے نہیں سننے کو" میں نے کہا "ورنہ میں بھی گانے سننا پسند کرتا۔"

"اس سے ڈپریشن ہو جائے گا ہمیں۔بلڈ پریشر ہائی ہو جائے گا اور مورال ڈاؤن" غالب نے کہا۔

"اس کا مطلب تو یہی ہے کہ تم متاثر ہو رہے ہو اور اسے بکواس سمجھ کے نظرانداز کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو۔"

"مجھے خبر چاہئے۔خالص خبر۔جو غیر جانب داری سے دی جائے" غالب نے کہا "وہ کہاں سے ملے گی؟"

"میرا خیال ہے کہیں سے بھی نہیں۔ریڈیو پاکستان بھی... بہرحال سرکاری ادارہ ہے۔سرکاری پالیسی کا ترجمان ہے۔اور جو کام یہاں آکاش وانی کرتا ہے' اس کے برعکس ہمارے ذرائع ابلاغ کرتے ہیں۔اور انہیں کرنا چاہئے۔یہ جنگ کا نفسیاتی محاذ ہے جس میں عوام شریک ہونے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔رائے عامّہ ہی حکومت کی اصل طاقت ہوتی ہے۔اسے بہرحال حکومت اپنے حق میں رکھتی ہے۔"

اچانک تبصرہ ختم ہو گیا اور مقامی خبروں کا بلیٹن نشر ہونے لگا۔ ہم بے دلی سے سُن رہے تھے کہ ایک خبر نے بم کا دھماکا کیا۔خبر پڑھنے والی نے شدھ ہندی میں جو کچھ کہا اس کا اردو مفہوم کچھ یہ تھا۔جیسا کہ پہلے خبر دی جا چکی ہے' مغربی پاکستان کی سرحد عبور کر کے بھارت میں داخل ہو جانے والے دہشت گردوں کے ایک اور گروہ کا سراغ لگا لیا گیا ہے۔اس کے سرغنہ سکندر بخت عرف کبیر خاں کو گزشتہ روز ایک سادھو کے بھیس میں سفر کرتے ہوئے پکڑا گیا تھا۔اس کی نشان دہی پر دوسرے دو تخریب کاروں کو رات گئے ایک خفیہ ٹھکانے پر چھاپا مار کے گرفتار کر لیا گیا۔ان میں سے ایک محسن شیروانی حکومت پاکستان کے ایک سابق ڈپٹی سیکریٹری کا بیٹا ہے۔دوسرا مرزا غالب ایک مشہور صحافی تھا۔یہ مغربی پاکستان سے اسلحہ اسمگل کر کے بھارت کے راستے مشرقی بنگال پہنچاتے تھے۔ان کے ساتھیوں میں کچھ خوب صورت' جوان لڑکیاں بھی شامل ہیں جن کے بارے میں معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ وہ تربیت یافتہ کمانڈو ہیں اور ان میں سے ایک بدنام ڈاکو شیش ناگ کی بہن ناگ منی ہے۔اپنا نام اور حلیہ بدل کے یہ گروہ مختلف وارداتوں میں ملوث رہا ہے اور گزشتہ روز انہوں نے ایک

ایمبولینس پر قبضہ کرکے پولیس کی ناکا بندی کو ناکام بنادیا تھا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ان کی ساتھی عورتیں ابھی ناگپور کے آس پاس ہی چھپی ہوئی ہیں۔ تینوں گرفتار ہونے والے اشتہاری مجرم ہیں اور ان کی تصویریں اخباروں میں بھی شائع ہوچکی ہیں۔ عوام کو خبردار کیا جاتا ہے کہ وہ کسی بھی اجنبی عورت کو تصدیق کئے بغیر گھر میں جگہ نہ دیں ورنہ وہ شریکِ جرم تصور کئے جائیں گے۔ اگر کسی عورت کی نقل و حرکت مشکوک ہو تو اس کی اطلاع فوراً قریبی تھانے میں دیں...

اس کے فوراً بعد مقامی انتظامیہ کی جانب سے جاری ہونے والا پریس نوٹ سنایا گیا اور وہی اعلان جو خبروں میں شامل تھا۔

میں اور غالب دم بخود' سکتے کی کیفیت میں بیٹھے تھے۔ ہم نے خبر' اعلان اور پریس نوٹ کا ایک ایک لفظ یوں سنا تھا کہ تقریباً ازبر ہوگیا تھا۔ شک و شبے اور ابہام کی قطعی گنجائش نہ تھی۔ ہم دونوں نے جو سنا تھا' ناقابلِ یقین اور بے بنیاد ضرور تھا مگر غلط نہیں سنا تھا۔

اگرچہ اس کے بعد ریڈیو سے سنگیت سبھا شروع ہوگئی تھی مگر خود میں نے ریڈیو بند کردیا۔

غالب نے کہا "یہ... یہ کیا ہے سکندر؟ ہم پکڑے جا چکے ہیں۔"

میں نے کہا "ہاں۔ اور ہمیں معلوم ہی نہیں۔ ہے نا کمال کی بات۔"

"یار' یہ پاگل ہوگئے ہیں یا میں پاگل ہوں۔ کہیں میرے کانوں نے غلط تو نہیں سنا تھا۔ ریڈیو سے ایسا احمقانہ' بے بنیاد جھوٹ ایک سرکاری پریس نوٹ کی صورت میں کیسے نشر ہوسکتا ہے!"

میں نے کہا "جیسے ابھی ہوا۔ اور ہوسکتا ہے یہ ہر ایک گھنٹے بعد یا دن میں کئی بار نشر ہو۔ آپ بلاوجہ خفا ہورہے ہیں۔ جو بات بے بنیاد ہے وہ جھوٹ ہے اور جھوٹ ہے تو احمقانہ ہے۔ عاقلانہ جھوٹ یا بے بنیاد سچ تو کوئی چیز ہوتی نہیں۔"

"یار' یہ چکر کیا ہے آخر؟"

"چکر کچھ نہیں۔ اس کو کہتے ہیں EYEWASH۔ اُردو میں مفہوم ہوسکتا ہے آنکھوں میں دُھول جھونکنا۔"

"کس کی آنکھوں میں؟ خود اپنی آنکھوں میں دُھول جھونک رہی ہے بھارت سرکار۔"

"یار بھارت سرکار کیا چیز ہے۔ یہ مقامی انتظامیہ کا چلایا ہوا چکر ہے' جو اس نے پولیس اور تفتیشی اداروں کی طے شدہ پالیسی کے مطابق چلایا ہے۔ اس ایک جھوٹ سے کتنے فوائد حاصل ہوں گے۔ ایک تو رائے عامہ پر بڑا اچھا اثر پڑے گا کہ تفتیشی ادارے کتنے مستعد ہیں۔ اطمینان حاصل ہوگا کہ تخریب کار اور دہشت گرد پکڑ لئے گئے۔"

"کیسے پکڑ لئے گئے؟ کہاں پکڑ لئے گئے؟"

"یہ کون پوچھے گا؟"

"اخبار والے۔ غیر ملکی نمائندے۔" غالب نے کہا۔

"ابھی انہیں کسی پریس کانفرنس کی دعوت نہیں دی گئی۔ اور کبھی نہیں دی جائے گی۔ تفتیش ملٹری انٹیلی جنس یا سی بی آئی والے اپنے ہاتھ میں لے لیں گے۔ وہ نتائج کو خفیہ رکھ سکتے ہیں۔"

"مگر مجرم کو عدالت میں پیش کرنا پڑتا ہے۔ تفتیش کے لئے بھی ریمانڈ تو لینا پڑتا ہے۔"

"یار مرزا! تم صحافی ہونے کے باوجود احمقانہ باتیں کررہے ہو۔ کس ملک میں خصوصی قوانین نہیں ہوتے؟ ملکی دفاع اور سلامتی کے نام پر انتہائی نوعیت کے کالے قانون آخر کب کام آتے ہیں؟ ایسے ہی ہنگامی حالات میں۔ ایسے ہی مجرموں کے معاملات سے نمٹنے کے لئے۔ بغیر مقدمہ چلائے نظر بند رکھنا یا جرم بتائے بغیر کسی کو حراست میں لے کر غائب کردینا کیا مشکل ہوتا ہے۔"

"وہ تو ٹھیک کہا آپ نے۔ مگر اس اعلان کا مقصد ہمیں دھوکا دینا بھی ہوسکتا ہے۔"

"ہم کیسے دھوکا کھا سکتے ہیں؟ ہمیں معلوم ہے کہ محسن ڈھاکا میں ہے اور ہم بیٹھے ہیں آمنے سامنے۔"

"اس کا مقصد ہمیں یہ تاثر دینا ہوسکتا ہے کہ اب پولیس اور دیگر تفتیشی اداروں نے ہماری تلاش ختم کردی ہے۔ ہم ایزی ہوکر پھریں۔ کہیں روپوش ہوں تو نکل آئیں۔ کہ اب ڈر کیسا" غالب نے کہا۔

"ہاں' یہ مقصد ہوسکتا ہے۔ وہ چانس لے سکتے ہیں کہ ہم خود کو باخبر رکھنے کے لئے ریڈیو سنتے ہوں گے تو یہ اعلان بھی سن لیں گے۔"

غالب نے کہا "حالاں کہ ہمیں نہ فرصت تھی نہ ضرورت۔"

"ضرورت تو تھی مگر وسائل کہاں تھے۔ کبھی کہیں سے اخبار مل جاتا تھا تو دیکھ لیتے تھے۔ ویسے ہمیں ریڈیو رکھنا چاہئے تھا اپنے ساتھ۔ کوئی بھی چھوٹا سا پورٹیبل ریڈیو ہوتا۔ اچھا اور طاقت ور۔ تو شارٹ ویو پر پاکستان کی آواز سنتے رہتے۔"

"اب پہلا کام یہی کرنا ہے۔ تصویر کا دوسرا رخ کیا ہے' یہ بھی تو معلوم ہو" غالب نے کہا "دونوں جانب کی سن کے کسی حد تک اوسط کے فارمولے سے صحیح خبر اخذ کی جاسکتی ہے۔"

"بی بی سی خاصا قابلِ اعتماد ہے۔"

"سمجھا جاتا ہے مگر میں نہیں مانتا" غالب نے کہا۔

"انہیں کیا ضرورت ہے جانب داری کی؟ ان کی ساکھ اچھی ہے تو خراب کیوں ہو۔"

"ساکھ بھی ایک سیاسی اصطلاح ہے۔ اور ایک متنازعہ لفظ ہے" غالب نے کہا۔

ہماری اس بحث کو رامن نے ختم کیا۔ وہ بڑے پُراسرار طریقے پر نمودار ہوا اور اس نے اسباب کا ڈھیر نازو اور گل کے حوالے کردیا جو دریا کے کنارے ایک پتھر پر بیٹھی تھیں پاؤں پانی

[...] نہ جانے کیا باتیں کررہی تھیں۔

میں اور غالب جیپ سے اتر کے گئے۔ ہم نے رامن کی بغل [...] دبا ہوا اخبار دیکھ لیا تھا مگر ہم دونوں کو یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ وہ [...]ہندی میں چھپا ہوا تھا۔

"تم ہندی اخبار اٹھالائے۔ انگریزی نہیں ملا۔"

رامن نے نفی میں سرہلایا "آپ نہیں بولتی۔"

اس کا مطلب تھا کہ آپ نے کہا نہیں تھا۔ میں نے کہا "اب [...] سکتے ہو؟"

اس نے پھر نفی میں گردن ہلائی "ادھر انگریزی کوئی نہیں [...]باتی" پھر جیسے اس کو اچانک کوئی بات یاد آگئی "گیسٹ ہاؤس میں [...]انگریزی اخبار آتی۔ دوپہر کے بعد۔"

"دوپہر کے بعد۔ اتنی دیر سے؟" میں نے کہا۔

"بہت دور سے آتی" رامن نے کہا۔

میں بہت گھٹیا کاغذ پر انتہائی ناقص طریقے پر شائع ہونے [...]والے آٹھ صفحے کے اس اخبار کی سرخیوں پر نظر ڈال رہا تھا مگر میرا [...]اصل مقصد خبر پڑھنا نہیں بلکہ تصویریں دیکھنا تھا۔ آخری صفحے [...]پر ایک ہی خبر کے ساتھ تین تصویریں دیکھ کر میں چونکا۔ میرے [...]ساتھ غالب بھی چونکا اور ایک ساتھ ہم نے رامن کو دیکھا۔ وہ [...]ہمیں دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

"رامن! تم ہندی پڑھ سکتے ہو؟"

اس نے اقرار میں سرہلایا "اپن آٹھ جماعت پڑھتی۔"

"تم نے یہ خبر بھی دیکھی ہوگی؟" غالب نے کہا۔

"ابھی آپ دیکھتی تو اپن دیکھتی" وہ بولا۔

میں نے کہا "کیا مطلب! اخبار لینے کے بعد تم نے پڑھا نہیں [...]تھا؟"

"اپن کو جلدی ہوتی۔ اخبار لے کر بغل میں دباتی۔ سودا لیتی [...]اور واپس آتی" اس نے کہا۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا ہے۔ اس نے [...]واقعی اخبار پڑھنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ اس کے نزدیک نہ اخبار [...]کی کوئی اہمیت تھی اور نہ دنیا بھر کی ان خبروں کی جن کا اس کی زندگی [...]کے معمولات پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ دنیا کے کس حصے میں کیا [...]ہورہا ہے اور کیوں ہورہا ہے' اس کی فکر وہ کیوں کرے گا جس کو [...]مزدوری کرنی ہے یا ہل چلانا ہے یا بس ٹرین چلانی ہے۔ لوہا کوٹنا ہے یا [...]سونے کے زیور بنانے ہیں۔ رامن کی زندگی پر ایک معمولی واقعہ [...]زیادہ اثر انداز ہوسکتا تھا جس کی دنیا کی نظر میں کوئی اہمیت نہ [...]ہو۔ اس کی ٹانگ ٹوٹ جائے یا کوئی مفت میں دریا کے پانی سے [...]کپڑے دھونے دے۔ اس کی ماں مرجائے یا بمن بھاگ جائے۔

میں نے کہا "رامن! تم نے یہ سرخی تو پڑھ لی ہوگی اب؟"

"اپن پڑھتی جی۔"

[...] "اچھا۔ یہ پوری خبر ہمیں پڑھ کے سناؤ۔"

رامن نے مجھ سے اخبار لے لیا۔ اخبار دیکھ کر نازو اور گل بھی قریب آگئی تھیں اور جھک کر میری' غالب اور محسن کی تصویروں کو دیکھ رہی تھیں۔

"یہ کیا معاملہ ہے؟" نازو نے کہا۔

"مبارک ہو۔ ہم پکڑے گئے" غالب نے خوش دلی سے کہا۔

نازو نے کہا "اچھا۔ آپ نے ہندی پڑھ لی؟ پھر تو واقعی مبارک ہو۔"

میں نے کہا "یہ مذاق نہیں ہے۔ ابھی ریڈیو پر بھی سنا ہے ہم نے۔"

گل نے پریشانی سے کہا "کیا سنا ہے؟"

غالب نے کہا "جو تم اب سنوگی۔ بیٹا رامن! پڑھ۔"

رامن نے پڑھنا شروع کیا۔ وہ رک رک کے پڑھ رہا تھا لیکن اخبار کی ہندی زبان وہ بھیانک بھاشا نہیں تھی جو آکاش وانی بولتا تھا۔ یہ اُردو ہی تھی جس کو رسم الخط بدل کے انہوں نے ہندی کا نام دے دیا تھا۔ ہم پوری خبر پہلے ہی سن چکے تھے چناں چہ رامن غلط پڑھتا تو ہم اس کے جھانپڑ رسید کرتے اور اس کا دماغ اس حد تک درست کردیتے کہ وہ پھر ایسی غلطی نہ کرتا۔ لیکن رامن کو میں نے گزشتہ رات تیس ہزار کے جال میں قید کرلیا تھا اور یہ اتنا مضبوط جال تھا جسے وہ تو کیا کوئی اور بھی آسانی سے نہیں توڑ سکتا تھا۔ وہ حُب الوطنی اور فرض شناسی یا قانون سے تعاون کے چکر میں پڑتا تو اسے اپنی زندگی میں پہلی بار ملنے والی سب سے بڑے خواب کی تعبیر سے محروم ہونا پڑتا۔ پولیس کا وعدہ ناقابلِ اعتبار تھا۔ وہ اسے انعام نہ دینے کے لئے ہمارا ساتھی بھی قرار دے سکتے تھے۔

خبر پڑھنے کے بعد وہ خود بھی حیران پریشان کھڑا رہا "ایسا جھوٹ ہوتی اخبار میں جی۔ پھر آپ اخبار کیوں پڑھتی؟" اس نے ایک منطقی سوال کیا۔

میں نے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ یہ جواب بھی اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ جسے وہ جھوٹ سمجھتا ہے وہ باقی دنیا کے لئے جھوٹ نہیں ہے اور حکومت کے اعلان کو جھوٹا کہنے والا شرپسند کا نام پاتا ہے۔ جوتے کھاتا ہے اور جیل میں سڑتا ہے۔

گل اور نازو نے بھی اس بے بنیاد اعلان کے بارے میں بہت سے غیر ضروری سوالات کئے۔ رامن ہم سب کی صورتیں دیکھتا رہا۔ ڈاکو کے نام سے وہ آشنا تھا مگر تخریب کار کیا ہوتا ہے اور دہشت گردی کیا ہوتی ہے' یہ اس کی عقل میں آنے والی باتیں نہیں تھیں۔ وہ مجھے بتا چکا تھا کہ ہم ڈاکو نہیں ہوسکتے۔ اس خبر سے یہ واضح ہوگیا تھا کہ ہم کون ہیں مگر یہ نہیں کہ ہم کیا کرتے ہیں اور کیوں کرتے ہیں۔ وہ انجان بن رہا تھا تو یہ اس کی اداکاری نہیں تھی۔

اخبار کے ایک کونے میں سرکاری اعلان بھی شائع ہوا تھا جس میں عوام کو دہشت گردوں کی ساتھی عورتوں کے بارے میں

خبردار کیا گیا تھا۔ اس میں ان عورتوں کا جو حلیہ بیان کیا گیا تھا وہ کسی بھی عورت کا ہو سکتا تھا۔ انہیں جوان' خوبرو اور پُرکشش کہا گیا تھا مگر زیادہ زور ان کے خطرناک اور تربیت یافتہ کمانڈو ہونے پر دیا گیا تھا۔

"یہ بھی کیا لطیفہ ہے" غالب نے تلخی سے کہا "کہ ہمارے نامۂ اعمال میں چوہدری دلاور کا جرم لکھ دیا گیا ہے۔"

"اور ہماری نیکی اس نے اپنے کھاتے میں لکھوالی ہوگی۔" میں نے کہا "اسلحہ وہ اسمگل کر رہا تھا۔ الزام ہم پر۔ دہشت گردوں کی اور تخریب کاروں کی مدد وہ کر رہا تھا۔ مجرم ہم۔ پولیس اس کی مدد کرتی رہی۔ اب بھی کر رہی ہوگی۔ وہ نیک نام تھا۔ واپس جا کے بھی نیک نام ہی ہوگا۔"

"مجھے ایسا لگتا ہے کہ وہ پاکستان لوٹ گیا ورنہ یوں کہاں غائب ہو سکتا تھا۔" غالب نے کہا۔

"کیا ثبوت ہے کہ تریونی سچ بول رہا تھا؟"

"اس کو کیا فائدہ ہو سکتا تھا ایسے جھوٹ سے؟ واقعی دلاور کی وجہ سے اس کا بہت نقصان ہوا تھا۔"

"گولی مارو ان دونوں کو۔ اپنی فکر کرو۔ یہ سوچو کہ اب یہاں سے کیسے نکلیں گے؟" نازو نے کہا "اس جنگل میں ڈیرا ڈال کے بیٹھے ہیں کل سے۔"

میں نے کہا "یہ بھی ضروری تھا۔ ہم پکڑے جاتے تو جیل میں اتنے آرام سے نہ بیٹھے ہوتے۔ پولیس تو کچھ لے کر چھوڑ بھی دیتی ہے اور ان سے مقابلے میں تھوڑا بہت چانس ضرور ہوتا ہے کامیابی کا مگر اب ہم عام مجرم نہیں رہے۔ ہمیں حوالے کر دیا جائے گا ملٹری انٹیلیجنس کے۔ اور ان کی تفتیش کے طریقے......"

غالب نے کہا "چھوڑو یہ بات۔ بس خدا کا شکر ہے کہ ہم آزاد ہیں اور کچھ کر سکتے ہیں۔"

"لیکن ہم کچھ نہیں کر رہے ہیں" نازو بولی۔

"آج رات ہم نکل جائیں گے۔" میں نے کہا "اب یہ مت پوچھنا کہ کیسے اور کب۔ کوئی صورت ضرور نکل آئے گی۔"

رامن ہمارے اور باہر کی شکاری دنیا کے درمیان رابطے کا واحد ذریعہ تھا۔ اس نے دوپہر سے کچھ پہلے ہمیں انگریزی کا اخبار لا کے دیا اور یہ خبر بھی سنائی کہ ریسٹ ہاؤس میں کچھ ولایتی فقیر آ کے ٹھہرے ہیں۔ ان میں دو عورتیں بھی ہیں۔

"ولایتی فقیر؟" میں نے کہا "تمہارا مطلب ہے ہپّی؟"

"اپن خود دیکھتی جی۔ ایک دم فقیر کا مافک" رامن نے کہا۔ "مرد لمبا بال رکھتی۔ عورت اپنا مافک۔ عورت نیکر پہنتی اور بنیان۔ مرد عورت جیسا لگتی۔ عورت مرد جیسا۔ وا رو پیتی ولایت والا اور ڈانس کرتی۔ ان کا اتنا بڑا گاڑی' جس میں سب کچھ ہوتی۔ سونے کا جگہ۔ کھانے کا جگہ۔"

میری دلچسپی بڑھ گئی "یہ ہپّی تو نہیں ہو سکتے مرزا جی۔ وہ گاڑی لے کر کہاں پھرتے ہیں۔ ایسے ہی نکل کھڑے ہوتے ہیں خالی ہاتھ۔ اور یہ غالباً کاروان کی بات کر رہا ہے۔"

"لیکن ان کے فقیرانہ حلیے۔"

"یار! سے وہ فقیر لگتے ہوں گے۔ ممکن ہے وہ ٹورسٹ ہوں۔ وہ لوگ ایسے ہی پھرتے ہیں۔ نہ لباس کی پروا۔ نہ حلیے کی۔ دیکھنا چاہئے ریسٹ ہاؤس جا کے۔ بات کرنی چاہئے....."

غالب نے کہا "ان سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ ہمیں اپنے ساتھ نہیں لے جائیں گے۔"

"پہلے یہ تو پتا چلے کہ وہ کدھر جا رہے ہیں' کون ہیں اور کیا کرتے ہیں" میں نے کہا "انگریز ہیں' امریکن یا کوئی اور......"

"مگر اس سے فائدہ؟" غالب نے پھر کہا۔

"اس میں نقصان بھی کیا ہے؟" میں نے کہا "میں اکیلا جاؤں گا۔"

"اکیلا کیوں؟" گل نے کہا۔

"اس لئے کہ اور کوئی فرنچ نہیں جانتا۔ محسن جانتا تھا اور ہماری فرنچ وہ کام کر جاتی تھی جو انگلش نہیں کر سکتی تھی" میں نے کہا۔

ہم نے رامن سے مزید تفصیلات پوچھیں تو اس نے سوچ کے بتایا کہ وہ غالباً انگریزی نہیں بولتے۔ آٹھویں تک اس نے بھی انگلش پڑھی تھی اور ان کی گفتگو میں اس نے انگریزی کا ایک لفظ نہیں سنا تھا۔ اس نے بڑے وثوق سے بتایا کہ وہ انگریزی سے قطعی نابلد نہیں ہے۔

"واٹ یور نیم سر۔ مائی نیم رامن" اس نے اپنی زباندانی کا مظاہرہ کیا "واشنگ کار سر۔ ٹین روپیہ اونلی۔ ادھر سے بہت ٹورسٹ گزرتی۔ ہم سب سے بات کرتی۔ سب کا خدمت کرتی۔ انعام لیتی۔ گڈ مارننگ۔ بریک فاسٹ۔ لنچ۔ ڈنر۔ چکن۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا "بس رامن۔ ہم نے مان لیا کہ تمہیں اچھی خاصی انگریزی آتی ہے۔ کیا تم نے ان سے بات کی تھی؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "اپن آپ کا سروس کرتی۔"

میں نے کہا "اچھا۔ تم جا کے ان سے پوچھو۔ کار واشنگ سر؟ دیکھو وہ کیا جواب دیتے ہیں۔ جتنی انگریزی بول سکتے ہو بولو۔ اور پھر ہمیں آ کے بتاؤ۔"

غالب نے کہا "ان سے پوچھنا۔ ویئر یو گو سر۔"

"ویئر یو گو۔ آپ کدھر جاتی؟" رامن نے سر ہلایا۔

"ٹھیک۔ پھر پوچھنا۔ واٹ یو ڈو سر۔ ٹورسٹ سر۔"

وہ جانے لگا تو میں نے کہا "رامن! ایک بات بتاؤ۔" وہ رک گیا اور سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

"یہ خبر پڑھنے کے بعد تمہارے خیالات تو نہیں بدلے؟ میرا مطلب ہے تم کو ڈر نہیں لگتا ہم سے۔"

"آپ گڈ مین ہوتی سر" وہ بولا "آپ کو ہم یاد رکھتی۔ آپ رامن کا لائف بناتی۔ بہت دیالو ہوتی۔ ہم آپ سے نہیں زبانی۔ آپ کا واسطے بھگوان کا دیا مانگتی۔ بھگوان آپ کو بھائی۔ خوش رکھتی۔"

"تم کو احساس ہے کہ ہماری مدد کر کے تم نے رسک لیا ہے؟ بہت خطرے میں ڈالا ہے خود کو۔"

"اپن ادھر سے بھاگ جاتی۔ آپ ہم کو ٹیکسی خریدنے کا واسطے پیسہ دیتی۔"

"کیوں نہیں۔ وہ ہمارا وعدہ ہے" میں نے کہا "اس سے زیادہ کے مستحق ہو تم۔ ان حالات میں جو کچھ تم نے کیا ہے اس کے بعد تم زیادہ بھی مانگ سکتے ہو۔"

"اپن کچھ نہیں مانگتی صاب۔ آپ بوت دیتی۔ اپن کیا رہتی۔ اپنا جان دیتی۔ ضرور دیتی۔"

"زندگی بہت قیمتی ہوتی ہے رامن۔"

"ایسا مافک لائف ایک دم کنڈم ہوتی۔ آپ نیا لائف دیتی اپن کو۔ آپ بہت گریٹ ہوتی۔"

اس کے جانے کے بعد میں نے کہا "آدمی کتنی کم قیمت چیز ہے۔ صرف تیس ہزار میں رامن نے خود کو بیچ دیا ہے۔ وہ جان بھی دینے کو تیار ہے ہمارے لئے۔"

"یہ تیس ہزار کی بات نہیں' احسان کی بات ہے۔ اس کے لئے نیکی کا قرض سب سے بڑا ہے جس نے اس کو ایک گھناؤنے ماضی سے نجات دلا کے ایک خوش حال' باعزت مستقبل کی امید عطا کی ہے۔ شاید اس کے بعد آنے والی نسلوں کو ورثے میں ملنے والی بدنصیبی کے بدلے خوش نصیبی دی ہے۔"

رامن آدھے گھنٹے میں لوٹ آیا۔ میں نے اتنی دیر میں سوچ لیا تھا کہ ان حالات سے کس طرح فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔ چناں چہ رامن نے اطلاع دی کہ وہ انگریز نہیں ہیں تو میں نے قسمت آزمانے کا فیصلہ کر لیا۔

"وہ انکار کرتی۔ نو کار واشنگ۔"

"جب وہ انگریز نہیں ہیں تو انہوں نے تمہاری بات کیسے سمجھی اور جواب کیسے دیا؟"

"ہم گاڑی کی طرف اشارہ کرتی۔ کہ ایسے دھوتی۔ دس انگلی دکھاتی۔ وہ گردن ہلاتی۔ ایک میم روتی۔ ایک ہنستی۔ یہ سب پاگل ہوتی سر۔ ہم کو مارتی۔"

میں نے کہا "اچھا تم مجھے ان کے پاس لے چلو۔"

اس نے مجھے حیرانی سے دیکھا "وہ بہت خراب لوگ ہوتی۔ بدمعاش لوگ ہوتی۔ چرس پیتی اور ڈانس کرتی۔ کپڑا کے بغیر۔"

میں نے حیرانی سے کہا "ننگے ناچ رہے تھے نشے میں؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا "ریسٹ ہاؤس میں ننگا کرتی۔"

میں نے کہا "اچھا میں دیکھ لوں گا۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ مجھے بدمعاشوں سے نمٹنا آتا ہے۔"

بادلِ ناخواستہ رامن آگے آگے چلنے لگا۔ بھرا ہوا ریوالور میرے پاس تھا اور اس کے بغیر بھی میرے لئے خوف کی کوئی بات نہ تھی۔ میں حیران تھا کہ یہ کس قسم کے لوگ ہیں۔ ہپّی ہوتے تو اتنے ساز و سامان کے ساتھ نہ پھرتے۔ ٹورسٹ ہوتے تو ہپّی جیسی حرکات نہ کرتے۔ دوسرے ممالک سے ریسرچ اسکالر اور سرکاری وفود بھی آتے رہتے تھے مگر وہ بہت پڑھے لکھے اور مہذب اطوار کے مالک ہوتے تھے۔

ریسٹ ہاؤس کا راستہ ایک پگڈنڈی کی صورت میں اوپر جا رہا تھا۔ رامن کی مدد کے بغیر بھی میں وہاں پہنچ سکتا تھا کیوں کہ ریسٹ ہاؤس اس پہاڑی جیسے بلند حصے کی انتہائی بلندی پر تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ سرکاری نقشے کے مطابق بنی ہوئی تین یا چار کمروں کی عمارت تھی جس پر زرد رنگ تھا۔ اس کے چاروں طرف لکڑی کی ڈھلوان چھت اور برآمدہ تھا۔ اردگرد کے علاقے کو صاف کر کے گھاس لگا دی گئی تھی۔ برآمدے کے گملوں میں پھول بھی نظر آ رہے تھے۔

ہم ریسٹ ہاؤس کے پچھلے حصے میں تھے۔ سامنے والے حصے تک آنے والی سڑک نشیب کی جانب ایک فرلانگ کے بعد مین روڈ سے مل جاتی تھی۔ ریسٹ ہاؤس کے سامنے ایک سفید رنگ کی اسٹیشن ویگن کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے پیچھے درمیانے سائز کا کاروان تھا۔ یعنی وہ ڈبا جو چار پہیوں پر چلتا تھا اور اسٹیشن ویگن سے جوڑ دیا گیا تھا۔ اس کو چھوٹا سا سفری گھر بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ عام طور پر اس میں چار چھ افراد کے لئے اوپر تلے سونے کی برتھ ہوتی ہیں۔ مختصر سا کچن ہوتا ہے اور باتھ روم۔

رامن مجھے باہر سے ہی راستہ دکھا کے واپس بھاگ گیا۔ معلوم نہیں اس کے ساتھ ان غیرملکیوں نے کیا بدتمیزی کی تھی کہ وہ پھر سامنے جاتے ہوئے ڈرتا تھا۔ اندر سے مجھے ریکارڈ پلیئر پر تیز موسیقی کی اور ہذیانی ہنسی کی آواز سنائی دی۔

میں نے دروازے پر انگلی مار کے کہا "ہیلو۔"

موسیقی کے ساتھ ہی شور تھم گیا اور ایک سفید فام "گوریلا ٹائپ" شخص ہاتھ میں بیئر کا ٹن لئے نمودار ہوا۔ وہ چالیس سال کا فربہ بدن شخص تھا اور اس نے صرف انڈرویئر پہن رکھا تھا۔

اس نے غصے میں اشارے سے کہا "گو۔ گو" جس کا مطلب تھا کہ میں دفع ہو جاؤں "بلیک مین۔"

اس کی آواز پر ایک عورت نمودار ہوئی جس کا لباس دیکھ کر میری نظریں جھک گئیں۔ وہ بھی شاید تیس سال کی تھی۔ اس کے چہرے پر اس زندگی کی چھاپ صاف نظر آتی تھی جو اخلاقی قیود سے آزاد تھی مگر اس کا بدن اب بھی دلکش تھا۔

میں نے فرانسیسی آزمانے کا فیصلہ کیا "میں دخل اندازی پر معذرت خواہ ہوں۔"

عورت کے لبوں پر ایک خوش گوار حیرت کے آثار نمودار

ہوئی "یہ تو فرنچ جانتا ہے۔"

"فرنچ جانتا ہے تو کیا اسے باپ بنا لوں اپنا" مرد نے بدتمیزی سے کہا۔

"کیا چاہتے ہو تم؟" عورت نے کہا۔ اس کی نظریں بتاتی تھیں کہ وہ مجھ میں دلچسپی لینے پر مجبور ہے "اچھا اندر آجاؤ۔ اس کی بات کا برا مت مانو۔ یہ ایسے ہی بات کرتا ہے مگر دل کا بہت اچھا ہے۔"

"شکریہ میڈم۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ یہاں کچھ مہمان ٹھہرے ہوئے ہیں۔" میں نے سر جھکا کے کہا اور مرد کی طرف دیکھے بغیر اندر چلا گیا۔ اندر دوسرا مرد اور دوسری عورت جس انداز سے ڈانس کر رہے تھے وہ مضحکہ خیز تھا۔ یہ اعضا کی شاعری سے زیادہ جسم کے حیوانی جذبوں کا اظہار تھا۔

مرد نے اطالوی میں کچھ کہا۔ اس کے ساتھ چمٹی ہوئی عورت ناگواری سے الگ ہو گئی اور اس نے جرمن میں بات کی۔ میں نے قیامِ انگلستان کے دوران سب یورپی ممالک دیکھے تھے اور فرنچ تو باقاعدہ سیکھی تھی مگر اطالوی اور جرمن کے علاوہ سوئس اور آسٹرین زبانوں کو فرق سے شناخت کرنا مجھے خود ہی آگیا تھا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے اُردو جاننے والا فارسی اور عربی سمجھے یا نہ سمجھے' اندازہ کر سکتا ہے کہ بولنے والا کس زبان میں بات کر رہا ہے۔ یا پاکستان کا رہنے والا چاروں زبانوں کو سُن کے بتا سکتا ہے کہ وہ کس صوبے کی زبان ہے۔ شاید بنگالی اور مدراسی کو بھی پہچان سکتا ہے۔

"یہ جین کو پسند آگیا ہے" پہلے مرد نے کہا "حالاں کہ اس کی جیب میں کچھ نہیں ہوگا جین کو دینے کے لئے۔ الٹا یہ جین سے ہی کچھ مانگے گا۔"

جین نے خفگی سے کہا "میری مرضی میں کسی سے کچھ نہ لوں اور....."

دوسرے مرد نے کہا "ہاں کیوں نہیں۔ مگر ہمارا گزارا کیسے ہوگا؟"

میں بھونچکا رہ گیا۔ تاہم میں نے اپنے جذبات کا اظہار نہیں ہونے دیا اور نرمی سے کہا "میں پھکڑ نہیں ہوں۔ بہت پیسہ ہے میرے پاس۔"

اچانک ان سب کا رویّہ بدل گیا۔ دوسری عورت نے زیادہ شوخی اور بے حیائی سے کہا "پھر جین میں کیا ہے۔ مجھے دیکھو۔"

دوسرے مرد نے کہا "مگر یہ زیادہ پیسے لیتی ہے۔"

"جین بھی بری نہیں" پہلے مرد نے کہا "تم اس کتے کی باتیں مت سنو۔ جتنے پیسے ہیں تمہاری جیب میں اس کے مطابق سودا کرو۔ تم دونوں کو بھی خرید سکتے ہو۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔"

"ہمیں کیوں اعتراض ہوگا" دوسرے مرد نے کہا۔

میں نے کہا "حضرات اور خواتین! جہاں تک پیسے کا تعلق ہے تو پیسہ میرے پاس واقعی اتنا ہے کہ میں تم سب کو خرید لوں۔ مگر پہلے میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم کون لوگ ہو۔"

"ہم ٹورسٹ ہیں۔ دنیا گھومنے نکلے ہیں۔" پہلے مرد نے کہا "چھ مہینے پہلے روم میں ملے تھے۔ مشترکہ سرمائے سے ہم نے یہ گاڑیاں خرید لیں اور اس کے بعد ساری دنیا کا سفر کرنے کا پروگرام بنا لیا۔ ہم آدھی دنیا گھوم چکے ہیں۔"

"باقی آدھی دنیا دیکھنے کے بعد روم میں اپنا سفر ختم کریں گے اور اپنے اپنے راستے پر چلے جائیں گے۔"

"اور اس سفر کے اخراجات ایسے ہی پورے کرتے ہو؟" میں نے کہا "خود کو بیچ کے؟"

"اور کیا ہے ہمارے پاس" پہلے مرد نے کندھے ہلا کے کہا "ہم کوئی کام کرنے کے قائل نہیں۔ اس لئے آپس میں طے کر لیا تھا کہ مرد لوگوں سے بھیک مانگیں گے۔ عورتیں......"

"اور اس میں شرم کی کوئی بات نہیں تمہارے لئے؟" میں نے کہا "کوئی غیر اخلاقی بات نہیں؟"

پہلا مرد ہنسنے لگا "اگر تمہاری جیب میں دس روپے فالتو پڑے ہیں تو مجھے ایک روپیہ دینے سے تم غریب نہیں ہو جاؤ گے اور نہ تمہاری صحت پر کوئی اثر پڑے گا۔ لیکن ایک روپیہ میری ضرورت ہے۔ اس کے لئے میں تم سے کہوں تو اس میں شرم کی کون سی بات ہے۔ آدمی ہی آدمی کے کام آتا ہے اور مدد کے لئے بھی آدمی سے ہی درخواست کر سکتا ہے۔"

"دوسرا طریقہ یہ ہے کہ تم دس روپے میں خوشی خرید لو۔ جین سے یا ماریا سے" دوسرے مرد نے کہا "دس روپے ان کی ضرورت ہیں"

"ہم سب کی" جین نے مداخلت کی۔

"او کے۔ ہم سب کی۔ اس میں اخلاقیات کہاں آتی ہے۔ یہ معاشیات کا مسئلہ ہے۔"

اگرچہ میں ان کے فلسفۂ حیات کو انسانیت سوز سمجھتا تھا مگر ایک تو میں بحث اور دلیل سے ان کی سوچ نہیں بدل سکتا تھا' دوسرے میں یہاں تبلیغ اور اصلاح کے لئے نہیں آیا تھا۔ مجھے اپنا کام نکالنا تھا اور اسی شیطانی قبیلے کے ساتھ اپنے نکلنے کی تدبیر نکالنی تھی۔ اب یہ کام مجھے بہت آسان نظر آتا تھا۔

میں نے مسکرا کے کہا "میں سمجھ گیا۔ اور میں تیار ہوں۔"

"کس کے لئے تیار ہو؟" جین نے پُرامید نظروں سے مجھے دیکھا۔

میں نے کہا "ایک میں ہوں' ایک میرا دوست ہے۔ ہم دونوں کی بات کرو۔ مجھے جین پسند ہے۔ ظاہر ہے میرے دوست کو ماریا کو پسند کرنا ہوگا۔ ایک پوری رات کی قیمت کیا ہوگی۔"

مردوں نے حیرت سے گول گول نظریں گھما کے عورتوں کی طرف دیکھا "پوری رات! کیا تم بہت امیر ہو؟"

میں نے مسکرا کے کہا "فضول سوالات مت کرو۔ قیمت بتاؤ اگر تم ان کے ایجنٹ ہو۔ ورنہ انہیں بات کرنے دو۔"

جین نے مسکرا کے کہا "میں تیار ہوں۔ تم کچھ بھی دو۔"

"شٹ اپ۔ تم جذباتی ہو رہی ہو کیوں کہ یہ خوب صورت جوان مرد ہے اور تمہارا ہم زبان" مرد نے کہا۔

"شٹ اپ ٹام۔ تم نہ میرے شوہر ہو' نہ باس اور نہ باپ" جین نے کہا "میں اپنے معاملات طے کرنے کے لئے آزاد ہوں۔"

"لیکن میں دو ہزار لوں گی تمہارے دوست سے" ماریا نے کہا۔ "جین تمہیں کم میں پڑتی۔"

میں نے ان کے درمیان کاروباری یا جذباتی رقابت اور جھگڑے کو ختم کرنے کے لئے کہا "ٹھیک ہے۔ میں جین کو ایک ہفتے کے لئے لیتا ہوں۔ اور ماریا کو اپنے دوست کے لئے۔"

ایک دم وہ سب خاموش ہو کے مجھے گھورنے لگے۔ مردوں کو اچانک ایک کالے آدمی کے سامنے کمتری کی شرمندگی تھی۔ جین خوش نظر آتی تھی مگر حیران بھی۔ ماریا کا ردِّ عمل کچھ نہیں تھا۔

ٹام نے کہا "تمہارا دوست کہاں ہے؟ پیسہ کہاں ہے؟"

ماریا نے طنز سے کہا "کیا تم کسی ریاست کے پرنس ہو؟" پھر وہ اپنے ساتھی سے مخاطب ہوئی "برٹ! یہ مجھے کوئی دھوکے باز لگتا ہے۔"

برٹ نے انتہائی جارحانہ لہجے میں اعلان کیا کہ دھوکے باز کے ساتھ وہ کیا کر سکتا ہے۔ یہ ایک ناقابلِ اشاعت بات تھی۔

میں نے کہا "میں ابھی واپس آتا ہوں۔ پیسہ لے کر اور اپنے دوست کے ساتھ۔"

ٹام نے مجھے گالی دی "سنو کالے کتے! یہ عورتیں سفید فام ہیں۔ ان پر عاشق ہونے یا ان پر قبضہ جمانے کی کوشش مت کرنا ورنہ میں تمہیں جان سے مار دوں گا۔ ہم یہاں ایک ہفتہ نہیں رک سکتے۔"

برٹ نے اس کی تائید میں سرہلایا "اس لئے صرف آج رات کی بات کرو۔ اس کے علاوہ دوبارہ سوچنے پر میں محسوس کرتا ہوں کہ معاوضے پر نظرِ ثانی کی ضرورت ہے۔ یہ قیمت بہت کم ہے۔"

"بہت کم ہے" ٹام نے کہا "اس کو ڈبل کردو۔"

"صرف ڈبل!" میں نے طنز سے اور حقارت سے کہا "تین گنا کردو۔ ایسا نہ ہو کہ میں ڈبل پر راضی ہو جاؤں تو تم پھر سوچنے لگو۔"

جین نے کہا "تم میرے معاملے میں....."

"شٹ اپ۔ یہ سب کا معاملہ ہے اور یہ طے ہو گیا تھا کہ ہم سب کا مفاد مشترک ہوگا۔ کوئی کسی کو دھوکا نہیں دے گا۔ اور اگر اختلاف ہوا تو فیصلہ میں کروں گا" ٹام نے کہا۔

جین نے بے بسی سے میری طرف دیکھا اور خاموش ہو گئی۔

"میرا فیصلہ یہ ہے کہ تم اور تمہارا دوست....."

میں نے کہا "ایک منٹ۔ تم نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ تم کہاں جا رہے ہو۔"

"ہم یہاں سے کلکتہ جائیں گے گھومتے پھرتے" جین نے کہا۔

"ایسی صورت میں ہم تمہارے ساتھ رہ سکتے ہیں۔ ایک ہفتہ یا اس سے زیادہ' اگر دل چاہے۔"

ماریہ نے کہا "بالکل رہ سکتے ہو۔"

برٹ نے بھی سرہلایا "جگہ ہے ہمارے پاس۔"

ٹام نے اپنے ساتھیوں کی طرف غصے سے دیکھا "تم انہیں دن رات اپنے ساتھ رکھو گے؟"

"کیا حرج ہے' اگر یہ اس کی قیمت دیں۔"

میں نے کہا "اس کے علاوہ۔ میں تمہاری بہت مدد کر سکتا ہوں۔ مجھے انگریزی بھی آتی ہے اور ہندوستانی بھی۔ تمہیں کہیں کوئی مسئلہ پیش آیا تو میں نمٹ لوں گا۔"

ماریا نے کہا "یہ کام کا آدمی ہے برٹ۔ یہ ہمارے کاروبار میں بھی مددگار ثابت ہوگا۔ تم تو خیر اپنا کام بلا روک ٹوک آسانی سے کر لیتے ہو مگر ہمیں مشکل پیش آتی ہے۔ یہ مقامی لوگوں میں جا کے ہمارے لئے آمدنی کے ذرائع تلاش کر سکتا ہے۔"

ماریا کی بات پر میرا خون کھولنے لگا۔ وہ مجھے اپنا دلال بنانے کی بات کر رہی تھی کہ میں اس کے لئے گاہک پھانس کے لا سکتا ہوں۔ مگر اس وقت میں ضبط سے کام لینے پر مجبور تھا۔

"یہ سب تو ٹھیک ہے۔ مگر وہ جو اپنی اور اپنی دوست کی بات کی تھی تم نے" ٹام بولا "کیا تم ایک ہفتے کے پچاس ہزار دو گے؟"

جین چلائی "ٹام! تم پاگل ہو گئے ہو کیا؟"

ماریا نے بھی کہا "ٹام! یہ زیادتی ہے۔"

مگر میں نے ہاتھ اٹھا کے کہا "مجھے منظور ہے۔ آخری بار۔ اب تم اپنی زبان سے پھرے تو میں تمہیں جان سے مار دوں گا۔"

ٹام بے شرمی سے ہنسنے لگا۔ "مار دینا۔ کالا سانپ کاٹ لے یا کالا کُتا۔ میری موت اگر ایسی ہی ذلّت آمیز ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ تم کب تک آؤ گے؟"

"رات ہونے سے پہلے" میں نے کہا۔

ان سے سودا کرنا ایک انتہائی اذیت دہ فعل تھا۔ مجھے اپنے آپ سے شرم آرہی تھی مگر یہ موقع ٹھنڈے دماغ سے کام لینے کا تھا۔ اس جگہ سے نکلنے اور سیدھے کلکتہ پہنچنے کے لئے ہمیں اس شیطانی قبیلے کے ساتھ سفر کرنے میں جہاں بہت سے اخلاقی معاملات میں خود پر جبر کرنا تھا وہیں صبر سے کام لے کر یہ بھی دیکھنا تھا کہ ان حالات میں یہ موقع گنوانا عقلمندی نہیں سمجھا جا سکتا۔

میرا باقی وقت پہلے غالب کو قائل کرنے میں صرف ہوا اور اس کے بعد گل اور نازو کو سمجھانے میں کہ وہ غلط نہ سمجھیں۔ وہ سب نہیں ہوگا جو میں نے کہا ہے۔ ہمیں ایک بار ان کے ساتھ سفر کا موقع مل جائے' اس کے بعد ہم معاملات کو اپنے ہاتھ میں لے لیں گے۔ وہ غیر ملکی ہیں اور انہیں سفارتی قوانین کے تحت وہ تحفظ حاصل ہے جو ہر غیر ملکی کو ہوتا ہے۔ پولیس انہیں نہیں پکڑ سکتی اور

ان کے ساتھ ہمارے نکل جانے کے امکانات بہت روشن ہیں۔
"لیکن وہ سب کچھ ہمیں دیکھنا تو پڑے گا' جو وہ کرتے ہیں"
نازو نے احتجاج کرتے ہوئے کہا "ان میں تو شرم حیا ہے نہیں۔"
میں نے کہا "تم اپنی آنکھیں بند رکھ سکتی ہو۔ چادر تان کے سو سکتی ہو۔ باہر دیکھ سکتی ہو۔"
"مگر وہ شراب پی کر خرمستی کریں گے۔"
میں نے کہا "نہیں۔ وہ کچھ نہیں کریں گے۔ اور جو کچھ کریں گے آگے' اسٹیشن ویگن میں کریں گے۔ کاروان پیچھے ہوگا اور اس میں صرف ہم ہوں گے۔ میں آگے رہوں گا۔ ہو سکتا ہے جین اور ماریا پیچھے تمہارے ساتھ ہوں۔"
غالب نے سرہلایا "نقشہ کچھ میری سمجھ میں آرہا ہے۔"
میں نے کہا "یہ صرف پیسہ چاہتے ہیں۔ پیسہ ہم ان کے سامنے پھینک دیں گے۔ اور انہیں کچھ کئے بغیر پیسہ ملے گا تو یہ ہماری بات مانیں گے۔"
"ہر بات؟"
"جو بات نہیں مانیں گے وہ ہم منوالیں گے" میں نے کہا۔
طے شدہ پروگرام کے مطابق میں غالب کے ساتھ واپس گیا تو وہ ہمیں دیکھ کر ایسے خوش ہوئے' جیسے ہم خلافِ توقع آگئے تھے۔ وہ شاید دیر کی وجہ سے مایوسی کا شکار ہو رہے تھے۔
میں نے رئیسانہ شانِ استغنا کے ساتھ دس ہزار روپے ٹام کی طرف پھینک دئے "یہ رکھ لو ابھی۔ دس ہزار ہیں۔"
اس نے نوٹوں کی طرف لالچ کے ساتھ ہاتھ بڑھایا اور پھر واپس کھینچ لیا "ابھی کا کیا مطلب؟ باقی چالیس ہزار......"
میں نے کہا "جب ہم آئیں گے تو دیں گے۔"
برٹ ہنسنے لگا "تم آگئے ہو اور کہتے ہو آئیں گے۔ آنا اور کیسے ہوگا؟"
میں نے کہا "کچھ مصروفیات ایسی ہیں کہ آج رات ہم شاید نہ آئیں۔ کل تمہارے ساتھ ہی روانہ ہو جائیں۔"
"جیسی تمہاری مرضی" ٹام نے رقم اٹھالی۔
"تم کس وقت روانہ ہونے کا ارادہ رکھتے ہو؟" میں نے کہا۔
"صبح کسی وقت" ٹام نے کہا۔
جین نے میرا ہاتھ پکڑ لیا "اچھا بیٹھو تو سہی۔ بولو کیا پیو گے؟"
میں نے ہاتھ چھڑا کے کہا "آج کچھ نہیں" اور معنی خیز انداز میں مسکرایا۔
ماریا نے زیادہ بے تکلفی کا مظاہرہ کیا اور غالب کے بارے میں ایک ایسا سوال کیا جس کا مطلب غالب سمجھ لیتا تو اس کی حالت غیر ہو جاتی۔
میں نے کہا "میرا دوست صرف انگلش سمجھتا ہے۔"
"ہم انگلش نہیں جانتے" برٹ نے کہا۔
"پھر کام کیسے چلاتے ہو؟"
"ایک کتاب ہے۔ اس میں انگریزی کے جملے لکھے ہوئے ہیں۔ عام استعمال کے۔ ہندوستانی زبان کی ایک کتاب ملی تھی مگر وہ بے کار ہے۔ ہر جملے کا مطلب انگریزی میں لکھا ہوا ہے" برٹ نے کہا۔
"کتاب کی مدد سے تم میرے دوست سے اظہارِ محبت تو کر سکتی ہو۔" میں نے ماریا سے کہا۔
ماریا نے فوراً وہ کتابچہ اٹھایا جو عام طور پر ہر ملک میں زبان نہ جاننے والے سیاحوں کی سہولت کے لئے شائع ہوتے ہیں۔ اس میں فرانسیسی کے متبادل انگریزی کے جملے لکھے ہوئے تھے۔ مگر ظاہر ہے روزمرہ زندگی میں زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم والا مسئلہ درپیش نہیں ہوتا۔ اس میں ہوٹل' بازار' بس اسٹاپ' ٹرین' ٹیکسی سروس اور ذاتی تعارف کے بارے میں جملے درج تھے۔ دیارِ غیر کی کسی حسینہ سے اظہارِ عشق کے لئے مکالمات شامل نہیں کئے گئے تھے۔ ماریا کو خاصی مایوسی ہوئی۔
ٹام نے کہا "تم نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ تم کیا کرتے ہو؟"
"میں عیش کرنے کے لئے پیدا ہوا تھا۔ عیش کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔
"عیش کے لئے کیش کہاں سے لاتے ہو؟"
"وہ خود آتا ہے۔ باپ دادا کی زمینداری سے۔ کاروبار سے" میں نے گول مول جواب دیا۔
"گویا تم کچھ نہیں کرتے؟" ٹام نے حسد سے کہا۔
"بتایا نا کہ عیش کرتا ہوں۔ یہ کوئی آسان کام ہے؟"
جین ہنسنے لگی "بہت خوش قسمت ہو تم۔"
میں نے کہا "پتا نہیں۔ میرے خیال میں تم خوش قسمت ہو۔ ہر قسم کی فکر سے آزاد ہو۔"
"اس آزادی کی بہت بڑی قیمت ادا کرتے ہیں ہم۔ سارے رشتے توڑ کر۔ خود کو قتل کر کے" جین نے کہا اور کچھ افسردہ ہو گئی۔
"تم ایسی جذباتی لڑکی ہو کہ مجھے ڈر لگتا ہے۔ تم کسی دن ہمارا ساتھ چھوڑ جاؤ گی۔"
"ایک نہ ایک دن ہم سب الگ ہو جائیں گے۔ یہ ساتھ عارضی ہے۔ زندگی بھر کا ساتھ نہیں ہے" جین نے کہا "روم سے شروع ہونے والا سفر روم پر ختم ہو جائے گا۔"
"قنوطی مت بنو۔ اس کے بعد زندگی ختم نہیں ہو جائے گی یا دنیا ختم نہیں ہو جائے گی" ٹام نے کہا۔
میں نے کہا "ایک بات بتاؤ۔ تم پیسہ کہاں خرچ کرتے ہو؟"
"ضروریات پر" برٹ نے کہا "گاڑی بغیر پٹرول کے نہیں چلتی۔ اس کی دیکھ بھال الگ ہے۔ پھر کھانا پینا۔ ہوٹل بہت مہنگے ہیں۔ شراب ملتی ہی نہیں۔ اور بلیک سے خریدنی پڑتی ہے۔ ہر روز اتنی آمدنی ہی نہیں ہوتی۔"

ہوٹل گندے ہندوستانی فقیروں کو خیرات دیتے ہیں۔ ہم کہیں اپنا ہیٹ زمین پر رکھ کے گھنٹوں کھڑے رہیں تب بھی لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ ہم ہیٹ میں سے خرگوش نکالنے والے مداری نہیں ہیں۔ بھیک مانگ رہے ہیں۔ وہ ہمیں دیکھتے رہتے ہیں یا ہیٹ کو۔ اور جب انہیں بتایا جائے کہ اس میں روپے ڈالو تو وہ ہنس کے چل پڑتے ہیں۔ ہم سے کام نہیں کراتے" ٹام نے شکوہ کیا۔
برٹ نے کہا "پھر بھی سو پچاس روپے بن جاتے ہیں۔ مگر اصل میں تو جین اور ماریا کی کمائی سے کام چل رہا ہے۔"
ماریا نے حقارت سے کہا "خاک کام چل رہا ہے۔ بڑے شہروں میں بہت پیسہ ہے۔ جس ہوٹل میں ہم ٹھہرتے رہے وہاں بہت کمایا۔ چھوٹے شہروں میں کچھ نہیں۔ یہاں خوش قسمتی سے تم مل گئے ہو تو بہت سے مسئلے حل ہو جائیں گے۔ کلکتہ پہنچ کے پھر پیسہ ملے گا مگر ہمیں تو وہاں پہنچنا مشکل ہو رہا تھا۔ اسی لئے پڑے ہیں یہاں فقیروں کی طرح اس تھرڈ کلاس ریسٹ ہاؤس میں۔"
"جہاں سب کچھ ہے مگر ریسٹ نہیں ہے" ٹام بولا۔
میں نے کہا "اچھا۔ ہم صبح صبح آجائیں گے۔"
ماریا نے غالب کو گرسنہ نظروں سے دیکھا "اس کے ساتھ میرا کیسے گزارا ہوگا؟ اس کے منہ میں تو زبان ہی نہیں ہے۔"
"کرلینا کسی طرح" برٹ ہنسنے لگا۔
واپس آتے ہوئے میں نے غالب کو اس گفتگو کا خلاصہ سنایا جس میں وہ ایک خاموش فریق تھا۔ اس کی غصے اور شرم سے بری حالت ہو گئی۔
"یار سکندر! یہ تو بہت ہی بے شرم ہیں۔ اتنی بے حیا تو ہماری طوائفیں بھی نہیں ہوتیں" غالب نے کہا۔
"ایک تو ان کا معاشرہ ہی بے راہروی کا شکار ہے۔ یہ اس معاشرے سے بھی باغی ہیں۔"
"مگر ہمارے ساتھ نازو اور گل ہیں۔ مجھے تو پسینہ آتا ہے یہ سوچ کر۔ کہ ان کے سامنے ایسی ویسی کوئی بات ہو گئی تو کیا ہوگا؟"
میں نے کہا "صبح صاف بات ہو جائے گی۔ کہ ہمارا اصل مقصد کیا ہے۔ ہم کاروان میں ہوں گے اور پچاس ہزار کو اس کا کرایہ سمجھا جائے۔ جین اور ماریا کا نہیں۔"
"ممکن ہے یہ بات وہ نہ مانیں۔"
"انہیں پیسے کی جتنی ضرورت ہے اس کو دیکھتے ہوئے یہ ناممکن ہے کہ وہ انکار کریں" میں نے کہا "اس کے علاوہ۔ ہم یہ بات روانہ ہونے سے پہلے نہیں بتائیں گے۔ راستے میں بتائیں گے۔"
رامن کو ہم نے رات کے کھانے کے بعد چالیس ہزار روپے دئے تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور میرے ہاتھ چومنے لگا اور پاؤں پکڑنے لگا۔ اسے یقین نہیں تھا کہ ہم واقعی اسے اتنی بڑی رقم دے دیں گے۔ بس ایک امید تھی جس کی خاطر اس نے ہمارا ہر کام کیا اور ہمارا وفادار رہا۔ اس نے اعتراف کیا کہ اس کے دل میں ہمیں پولیس کے حوالے کرنے کا خیال بھی آیا تھا مگر وہ ڈر کی وجہ سے ایسا نہ کر سکا۔ وہ حد درجہ جذباتی ہو رہا تھا اور اپنی ٹوٹی پھوٹی اردو میں ہمیں فرشتۂ رحمت بھگوان کا اوتار اور پتا نہیں کیا کچھ کہہ رہا تھا۔ اس نے ہم سے وعدہ کیا کہ وہ ہمارے جانے کے بعد اپنی ماں اور بہن کے ساتھ مدراس روانہ ہونے میں دیر نہیں کرے گا۔
"تم نے دیر کی تو خطرے میں پڑ جاؤ گے" میں نے کہا "یا پولیس آجائے گی ہمیں تلاش کرتی ہوئی۔ تم کو کیا معلوم کہ تمہیں کسی نے آتے جاتے دیکھا تھا یا نہیں۔"
"اپن کو کوئی نہیں دیکھتی جی۔"
میں نے کہا "پھر تمہارے پاس اتنی بڑی رقم ہے۔ اگر کسی کو معلوم ہو گیا تو وہ تمہیں قتل بھی کر سکتا ہے۔ ورنہ یہ وضاحت کیسے کرو گے کہ اتنی دولت تم نے کہاں سے حاصل کی؟ تم پر شک کیا جائے گا کہ تم نے کہیں چوری ڈاکے کی واردات کی ہے یا کسی کو قتل کر کے اس سے چھینی ہے یہ رقم۔ اس لئے خاموشی سے نکل جاؤ۔"
اس نے رقم گنے بغیر رکھ لی تھی۔ اگر میں اسے بتاتا کہ یہ تیس ہزار نہیں چالیس ہزار ہیں تو شاید وہ پھر زائد رقم کی واپسی پر اصرار کرتا۔ گل اور نازو بھی اس کے لئے جذباتی ہو رہی تھیں۔
"بڑا اچھا لڑکا تھا۔ ہمارے ساتھ رہتا تو......"
میں نے کہا "بی بی نازو! اپنی زندگی پر اس کا اختیار باقی رہنے دو۔ یہ زیادہ خوش رہے گا۔"
گل نے زیورات میں سے وہی نیکلس نکالا اور چوڑیاں جو ہم نے انعام نبی کی بیوی کو رشوت میں دینے کی ناکام کوشش کی تھی۔
"یہ لو۔ یہ ہماری طرف سے اپنی بہن کو دے دینا۔"
وہ سہم کر پیچھے ہٹ گیا "یہ...... ہم نہیں لیتی۔"
"جب تمہاری بہن کی شادی ہو تو ہماری طرف سے اس کو تحفہ دے دینا" نازو نے کہا۔
"نہیں جی۔ اپن غریب آدمی ہوتی۔ اتنا اپن کا پاس ہوتی تو پولیس پکڑ لیتی۔ چور سمجھتی۔"
گل نے کہا "بے وقوف۔ اسے چھپا کے رکھنا۔ آخر تیس ہزار بھی تو چھپا کے رکھو گے تم۔"
میں نے کہا "ہاں۔ مدراس پہنچ جانے کے بعد تمہارے لئے کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ تم اپنی ٹیکسی چلاؤ گے تو غریب آدمی نہیں رہو گے۔ پھر تم کہہ سکو گے کہ یہ تم نے بنوائے ہیں۔"
ہمارے بہت مجبور کرنے پر وہ مان گیا۔ بہت رونے دھونے کے بعد وہ بڑی مشکل سے رخصت ہوا۔ گل اور نازو نے اس کے جانے کے بعد تھوڑے سے آنسو بہائے۔ خود میں اور غالب بھی اداس تھے۔ رامن کا سارا ماضی ہمارے سامنے تھا مگر اس کا مستقبل کیا ہوگا' یہ ہم نہیں جانتے تھے۔ کیا ہماری کوشش سے اس کی زندگی کا راستہ بدل جائے گا؟ وہ اپنی ماں کو اس کی آخری خواہش کے مطابق مدراس میں اس کے آبائی وطن تک پہنچانے میں کامیاب

ہوگا؟ وہ ٹیکسی خرید لے گا۔ اور جیسا کہ اس نے کہا تھا' ایک سے دو' دو سے چار بنا لے گا۔ کسی دن وہ امیر آدمی ہوگا؟ اپنی بہن کو عزت سے رخصت کر سکے گا؟ ہمارے دیئے ہوئے تحائف کے ساتھ۔ یہ ایسے سوال تھے جن کا جواب وقت دے سکتا تھا مگر اس کے اور ہمارے وقت میں وہ فاصلے حائل تھے جو کبھی ختم نہیں ہو سکتے تھے۔ ہم کبھی نہ جان سکیں گے کہ جو ہم نے چاہا تھا وہی ہوا یا نوشتۂ تقدیر وہی رہا جس سے رامن لڑنا چاہتا تھا۔

ہمارا دن کھاتے اور سوتے گزرا تھا۔ رات گئے تک ہم آگ جلا کے بیٹھے رہے۔ چائے اور کافی پیتے رہے اور فرصت کے ان لمحات کو اپنی شیرازہ بندی کے مسائل پر غور کرنے اور اپنے آنے والے کل کے حالات کا اندازہ کرنے میں گزارتے رہے۔ وہ رات بہت غنیمت تھی۔ ہم نے اتنی باتیں کرلیں کہ دل کا سارا غبار نکل گیا۔ ہم نے گزر جانے والے وقت کو اور بچھڑ جانے والوں کو یاد کیا اور اپنے سود و زیاں کا موازنہ اپنی کامیابی اور ناکامیوں سے کرتے رہے۔ ایک نئے عزم اور نئے لائحہ عمل کے ساتھ ہم صبح پھر سفر کی اگلی منزل کا ارادہ لے کر نکلے۔

ہم نے رامن کو تاکید کردی تھی کہ وہ ان ولایتی فقیروں پر نظر رکھے اور وہ رات کو کسی وقت ہمارے دس ہزار لے کر فرار ہونے کی کوشش کریں تو ہمیں فوراً مطلع کردے۔ وہ ہمیں صبح ریسٹ ہاؤس کے دروازے پر ملا۔ رات بھر جاگتے رہنے اور رونے سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ رخصتی کا الوداعی منظر پھر دُہرایا جائے چناں چہ میں نے ہاتھ ہلا کے اسے جانے کو کہا۔

گل اور نازو ہماری ہدایات کے مطابق کاروان میں گھس کر بیٹھ گئیں۔ اس کا سائز اندر سے کسی درمیانی کمرے کے برابر تھا۔ دائیں اور بائیں طرف لمبائی کے رخ اوپر نیچے دو فٹ چوڑے تین تین بیڈ لگے ہوئے تھے۔ نیچے والے بیڈ فولڈ ہو جاتے تھے۔ آگے والے حصے میں کچن اور باتھ روم کے خانے نظر آرہے تھے۔ ٹرین کے ڈبوں کی طرح پانی کا ذخیرہ چھت پر بنے ہوئے ٹینک میں تھا۔

میں اور غالب ریسٹ ہاؤس میں داخل ہوئے تو اچانک ایک چوکیدار قسم کا شخص سامنے آگیا۔

"اے بھیا! کہاں گھسے جات ہو۔"

میں نے فرنچ میں کہا "اس اُلو کے پٹھے کو سمجھاؤ کہ ہم ان کے ساتھی ہیں۔"

غالب نے کہا "مجھ سے بات کرو۔ یہ ہندوستانی نہیں جانتا۔ ہم مسٹر برٹ اور مسٹر ٹام کے ساتھ ہیں۔ ان کے ساتھ ہی جانا ہے ہمیں۔"

"ہم تو کل ناہیں دیکھت ہیں تم کو۔ بدیسی لوگاں کے سنگ" اس نے مشکوک لہجے میں کہا۔

"تم نے تو بہت کچھ نہیں دیکھا۔ صرف پیسہ دیکھا اور اس ریسٹ ہاؤس کو اپنے باپ کا گھر سمجھتے ہوئے ان سفید چمڑی والے بدمعاشوں کو یہاں رنگ رلیاں منانے کی اجازت دے دی" غالب نے اسے ڈانٹنا شروع کیا۔ "وہ کچھ بھی کریں۔ شراب پئیں اور نشے میں دھما چوکڑی مچائیں۔"

چوکیدار کا رنگ اڑ گیا "ہمار..... اے مطلب ناہیں....."

"مطلب کے بچے۔ تم نے کتنا پیسہ وصول کیا ہے ان سے؟ یہ بات تمہارے محکمے کو معلوم ہو جائے۔ یا کوئی پولیس کو بتادے کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔ پھر کیا بنے گا تمہارا؟"

چوکیدار گڑگڑانے لگا "غلطی ہوئی گوا صاب جی۔ مائی دئی ریوہم کا۔"

غالب کی فراخ دلی کے مظاہرے سے پہلے ٹام اندر سے نمودار ہوا۔ اس نے صرف انڈرویئر پہن رکھا تھا اور اس کی آنکھیں لال ہو رہی تھیں۔ یہ غالباً رات کو بہت زیادہ پینے اور جاگنے کا نتیجہ تھا۔ اس نے ہاتھ ہلا کے ہیلو کہا۔

میں نے کہا "یہ چوکیدار ہمیں روک رہا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ہم تمہارے ساتھی نہیں ہیں۔"

"اس انڈین کالے کتے کو صحیح جگہ ٹھوکر مارو۔ یہی علاج ہے ایسے لوگوں کا جو اپنی اوقات بھول جائیں" ٹام نے غرا کے کہا۔ مگر مجھ سے پہلے یہ کام خود اس نے کیا۔

"دفع ہو جاؤ لالچی کتے۔ تم کو پانچ سو ہم نے بھونکنے کے لئے نہیں دیئے تھے" اس نے چوکیدار کو دھکا دے کر اور چیخ کر کہا۔ پانچ سو کا اشارہ اس نے پانچ انگلیاں دکھا کے کیا تھا چناں چہ چوکیدار نے فرنچ بھی سمجھ لی۔ دھکے سے وہ گرتے گرتے بچا مگر اس کے بعد بڑی بدحواسی میں باہر نکل گیا۔

برٹ بھی جاگ اٹھا تھا اور اب دونوں لڑکیوں کو جگانے کے لئے ان پر جگ سے ٹھنڈا پانی ڈال رہا تھا۔ وہ جاگ رہی تھیں اور اس کھیل سے لطف اندوز ہونے کے باوجود ہنس ہنس کے برٹ کو فحش گالیاں بک رہی تھیں۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

انہیں نہا دھو کے کپڑے بدلنے اور انسانوں کی جون میں آتے آتے نو بج گئے۔ اب وہ خاصے مختلف نظر آرہے تھے اور جلئے سے ولایتی فقیر بھی نہیں لگتے تھے۔ ماریا اور جین کا لباس ہمارے نقطۂ نظر سے اب بھی قابل اعتراض تھا اور بہت کم تھا مگر نہ ہونے سے بہرحال بہتر تھا۔ ان کا اسباب سفر بہت مختصر تھا۔ خیمے اور سلیپنگ بیگ انہوں نے نکالے ہی نہیں تھے۔ ریسٹ ہاؤس کے بیڈ روم میں انہیں زیادہ آرام ملا تھا۔

نو بجے ہم نے کہا "تم لوگ بہت وقت ضائع کر رہے ہو۔"

"ہمارے پاس ضائع کرنے کے لئے بہت وقت ہے" ماریا نے سادگی سے کہا "ساری عمر ضائع کی ہے ہم نے۔"

"تم نے دیکھا کہ ہم گھڑی نہیں رکھتے۔ اس لئے کہ گھڑی آدمی کو وقت کا غلام بنا دیتی ہے" جین بولی۔

میں نے کہا "لیکن ہم نے اپنی زندگی کے معمولات کو گھڑی کی سوئیوں کے تابع کر رکھا ہے۔ ہم وقت پر ہر کام کرنے کے عادی ہیں۔ وقت پر کھاتے ہیں' وقت پر سوتے ہیں اور جاگتے ہیں۔"

"تت تت۔ صرف اپنی مرضی سے وقت پر پیدا نہیں ہو سکتے اور گھڑی دیکھ کر مر نہیں سکتے" ٹام نے افسوس سے کہا۔

"اگر تم آدھے گھنٹے میں روانہ ہو جاتے ہو تو ٹھیک ہے ورنہ یہ معاہدہ منسوخ" میں نے گھڑی دیکھ کر کہا "اتنی رقم میں ہم اپنی گاڑی خرید سکتے تھے۔ تمہیں نقصان ہوگا۔ بلکہ جین کو اور ماریا کو۔"

برٹ نے کہا "او کے۔ ہم آدھے گھنٹے میں چلتے ہیں لیکن تمہارا نظام الاوقات دورانِ سفر ہم پر لاگو نہیں ہوگا۔"

میں نے کچھ سوچ کے کہا "ٹھیک ہے۔ تم آزاد ہو مگر ہم وقت کے پابند رہیں گے۔"

چوکیدار ڈرتے ڈرتے ناشتے کی ٹرے لایا۔ اس میں ڈبل روٹی' مکھن' انڈے اور چائے کا خصوصی اہتمام دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ آدمی دیس میں ہو یا بردیس میں' اگر قوتِ خرید رکھتا ہے تو گھر جیسا آرام بھی حاصل کر سکتا ہے۔ ناشتے کے بعد ٹام نے نقشہ نکالا اور وہ سڑکوں کے جال میں سرخ پینسل کے نشان لگے ہوئے راستے پر انگلی رکھتے سفر کے اگلے مرحلے کی تفصیلات طے کرنے لگے۔

جین نے صوفے پر مجھ سے چپک کے کہا "تم بھی ڈرائیو کر سکتے ہو؟"

میں نے کچھ دور ہٹ کے کہا "میں نے کبھی گاڑی نہیں چلائی۔ اس کام کے لئے میرے پاس شوفر ہے۔"

وہ پھر کھسک کے میرے نزدیک ہوگئی "تم بہت پُراسرار آدمی ہو۔ مگر تم اتنا ڈرتے کیوں ہو مجھ سے؟ میں پسند کرتی ہوں تمہیں۔"

میں نے کہا "پسند تو میں بھی کر سکتا ہوں تمہیں' اگر تم تھوڑا سا شرافت کا ثبوت دیتے ہوئے دن دھاڑے مجھ پر دست درازی نہ کرو۔"

وہ ہنس پڑی "دوستی یا تعلق میں دن رات کیا....."

میں نے خدا کا شکر ادا کیا جب ٹام اور برٹ نے نقشہ سمیٹ کر کوچ کا اعلان کیا۔

"میں اور برٹ باری باری گاڑی چلائیں گے" ٹام نے کہا۔ "ایک ایک گھنٹا۔ دو گھنٹے بعد ہم کہیں بریک کریں گے۔ ڈرنکس کے بعد پھر دو گھنٹے سفر ہوگا۔ اس کے بعد لنچ۔"

"لنچ۔ ڈرنکس" ماریا نے حقارت سے کہا "ڈرنکس کا مطلب ہے وہی گھٹیا' گندے چائے خانوں کا قہوہ۔ لنچ کا مطلب ہے دال چاول۔ یا بکرے کا واہیات گوشت۔ میں ترس گئی ہوں پورک' ٹراؤٹ اور......"

"شٹ اپ" ٹام نے کہا "آج ہم چھ سات گھنٹے سفر کریں گے۔ اور پھر رات کو کہیں اسٹاپ ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ تمہارا ہندوستانی بولنے والا دوست ہماری بہت مدد کر سکتا ہے۔"

"کس معاملے میں؟" میں نے کہا۔

"کسی جگہ قیام کی اجازت دلوانا۔ یہ ایک مسئلہ ہے۔ مقامی لوگوں کے ذریعے ضروریات حاصل کرنا۔ میں نے سنا ہے کہ اس علاقے میں جنگلی سُور بہت ہیں۔"

میں نے کہا "میرا دوست کسی بھی معاملے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کرے گا۔ اپنا سفر پہلے کی طرح جاری رکھو' جب ہم تمہارے ساتھ نہیں تھے۔ ہم تمہارے مسائل حل کرنے کے لئے نہیں آئے ہیں۔ عیش کرنے آئے ہیں۔"

"اچھا۔ پھر تم عیش کرو" برٹ نے تلخی سے کہا "تم دونوں جین اور ماریا کے ساتھ پیچھے کاروان میں رہو۔"

میں نے کہا "ابھی ہم سب ساتھ رہنے کو ترجیح دیں گے۔ گپ شپ کے لئے۔"

"گپ شپ" ماریا ہنس پڑی "تمہارا گونگا دوست کیا اشاروں کی زبان میں بات کرے گا۔"

پھر اس نے جو اشاروں کی زبان استعمال کی اس کا مفہوم انتہائی لغو تھا مگر غالب نے ہمت سے کام لیا اور شرمانے کے بجائے ماریا کو دلچسپی سے دیکھتا رہا اور مسکراتا رہا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ روانگی سے قبل ہی ان پر کاروان میں گل اور نازو کی موجودگی کا راز افشا ہو۔ ریسٹ ہاؤس سے باہر آتے وقت ان کے ہاتھوں میں صرف دو بیگ تھے۔ جین اور ماریا انہیں کاروان میں رکھنا چاہتی تھیں۔

میں نے جین سے بیگ لے لیا "لاؤ یہ مجھے دے دو۔" اس نے میرے لہجے کی نیاز مندی کو میرے عاشقانہ جذبات کی ترجمانی سمجھا اور مسکراتے ہوئے مجھے اس خدمت کی سعادت بخشی۔ پھر غالب نے ماریا پر واضح کیا کہ وہ اس کے نازک ہاتھوں کو بیگ اٹھانے کی مشقت اٹھاتے نہیں دیکھ سکتا اور یوں ہم نے بیگ جلدی سے کاروان میں رکھے اور پھر اسٹیشن ویگن میں آبیٹھے۔

ٹام نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور برٹ اس کے ساتھ بیٹھا تو مجھے اور غالب کو پیچھے والی سیٹ پر جین اور ماریا کے ساتھ سمٹ کے بیٹھنا پڑا۔ جین مجھ میں گھسی جا رہی تھی اور ماریا نے غالب کی جان عذاب میں ڈال رکھی تھی۔ آبادی سے باہر آنے تک ہمارا طوعاً و کرہاً سب کچھ برداشت کرتے رہنا ضروری تھا۔

اب ہم واپس جا رہے تھے۔ اسی راستے پر جس پر ہم نے ایمبولینس ڈرائیو کی تھی اور پھر انعام کی بیوی کو روانہ کر دیا تھا۔ تقریباً دس میل کے بعد وہ قصبہ بھی گزر گیا جہاں سے رامن ہمارے لئے کھانے پینے کا سامان لاتا رہا تھا۔ سڑک اسی بازار سے نکلی جس کے دونوں طرف دُکانیں تھیں۔ کچھ دیہاتی وضع کے لوگوں نے گوری میموں کو اور اسٹیشن ویگن کے پیچھے بندھے ہوئے کاروان کو بڑی دلچسپی سے دیکھا۔

بازار کے ختم ہوتے ہی میں نے پولیس کو سڑک کے درمیان

دیکھا۔ ٹام نے انہیں ایک گالی دی۔
"کیا یہاں بھی پاسپورٹ چیک ہوگا؟"
برٹ نے کہا "آخر کیا سمجھتے ہیں یہ ہمیں؟ ہم ٹورسٹ ہیں۔ صورت سے چور ڈاکو بھی نہیں لگتے۔"
میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ ریوالور نکالوں اور ٹام سے کہوں کہ وہ سب اپنے پاسپورٹ دکھائیں مگر ہمارے بارے میں صرف اتنا کہیں کہ دوست ہیں اور دہلی سے ہمارے ساتھ ہیں۔ ریوالور نکالنا بھی آسان کام نہ تھا کیوں کہ مجھے ایک طرف سے دروازے نے اور دوسری طرف سے جین نے دبا رکھا تھا۔
اچانک پولیس والے ہٹ گئے اور ایک سب انسپکٹر قسم کے افسر نے ہاتھ کے اشارے سے گاڑی کو گزر جانے کی اجازت دی۔ غالباً اس نے فرنٹ سیٹ پر دو گوروں کو دیکھ لیا تھا۔ ان میں سے ایک گاڑی چلا رہا تھا۔ ممکن ہے اس نے پچھلی سیٹ پر دو میموں کو بھی دیکھا ہو اور مطمئن ہوگیا ہو کہ ان غیر ملکیوں کے ساتھ کوئی مجرم نہیں ہو سکتا۔ ہمیں ایک نفسیاتی تحفظ یوں حاصل ہوا کہ کسی کی نظر نے ہمیں غور سے نہیں دیکھا۔
میں نے خود کو جین کے پیچھے اس طرح چھپالیا تھا کہ معلوم ہوتا تھا' میں سیٹ کے پیچھے والے حصے میں سے کوئی چیز اٹھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ یوں میرا چہرہ ذرا سی دیر کے لئے دوسری طرف ہوگیا تھا۔ جین تھوڑا سا آگے ہوئی تو اس کے بال میرے چہرے پر آگئے۔ یہی طریقہ مرزا غالب نے بھی اختیار کیا تھا۔ اچانک ماریا کے التفات کے جواب میں غالب نے خود کو اس کی آغوش کے سپرد کر دیا تھا اور کچھ دیر غالب کا چہرہ بھی ماریا کے چہرے اور اس کی زلف کے سائے میں روپوش ہوگیا تھا۔
جب خطرے کی سرحد گزر گئی تو میں نے غالب سے کہا "کیا خیال ہے۔ اب خواتین کو زنان خانے میں بھیج دیں؟"
"واقعی آپ کا دل چاہتا ہے......" غالب نے کہا۔
"اگر نازو یہاں ہوتی تو آپ کو یک جان دو قالب ہو کے پناہ لینا بھی بہت مہنگا پڑتا" میں نے کہا "اسے زیادہ بے تکلف مت ہونے دو۔ وہ تم سے پہلے اسے مار ڈالے گی۔"
غالب نے کہا "کوئی بات نہیں۔ تمہاری جین تو بچ جائے گی۔"
جین اپنا نام سن کے مسکرائی۔ وہ ہماری گفتگو سے کوئی مطلب اخذ کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔
ٹام نے کہا "یہ بدتہذیبی ہے؟"
"کیا بدتہذیبی ہے۔"
"اس طرح اپنی زبان میں باتیں کرنا۔"
"کیا تم اپنی مادری زبان میں باتیں کرنے کو ایک غیر مہذب حرکت سمجھتے ہو؟" میں نے کہا۔
"جب دوسرے کوئی زبان نہ سمجھتے ہوں اور درمیان میں مشترک زبان کا رشتہ موجود ہو......"
"اپنا یہ فلسفہ بند کرو۔ ہم ایک غیر مہذب قوم ہیں تمہاری نظر میں مگر تم کتنے مہذب ہو' یہ میں جانتا ہوں۔ سارا یورپ دیکھا ہے میں نے۔ کیا تم کسی انگریز کو انگلش جاننے کے باوجود انگلش میں جواب دیتے ہو؟ نہیں۔ تم ہر غیر ملکی سے صرف فرنچ میں بات کرتے ہو' خواہ وہ سر پٹخ کے مر جائے۔"
برٹ نے حیرانی سے مجھے دیکھا "تم یورپ کیا کرنے گئے تھے؟"
میں نے کہا "عیش کرنے۔ میں بتا چکا ہوں کہ عیش کرنے کے سوا میں کچھ نہیں کرتا۔ اب ذرا گاڑی کو ایک طرف روک لو مائی ڈیئر مسٹر ٹام۔ چند منٹ کے لئے۔"
ٹام نے کہا "کیوں؟ کیا ہوا؟"
میں نے کہا "گاڑی روکو گے تو کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا۔"
"میں سمجھ گیا۔ تم پانی بنانا چاہتے ہو" برٹ نے کہا "دیکھو یہ انگریزی محاورہ استعمال کیا ہے میں نے۔"
ٹام نے گاڑی ایک طرف روکی تو میں دروازہ کھول کے نیچے اتر گیا۔ سکون اور آزادی کی گہری لمبی سانس لے کر میں نے کہا۔ "لیڈیز! آپ دونوں پیچھے چلی جائیں۔"
جین اور ماریا نے قدرے حیرانی اور ناگواری سے مجھے دیکھا۔ انہیں یقین تھا کہ وہ ہمیں بہترین کمپنی فراہم کر رہی ہیں اور ہم یقیناً ان کی قربت سے بہت لطف اندوز ہو رہے ہوں گے۔
"جین! پلیز۔ کیا تم نے سنا نہیں؟" میں نے کہا۔
"آخر کیوں۔ یہاں......"
میں نے اس کی بات کاٹ دی "جگہ تنگ ہے۔ ہم اس طرح لمبا سفر نہیں کر سکتے۔"
ٹام اور برٹ مسکرائے "تم انہیں گود میں بٹھا سکتے تھے۔"
میں نے کہا "تمہارا مشورہ نہیں مانگا ہے میں نے۔"
ماریا نے برہمی سے کہا "تم خود چلے جاؤ پیچھے۔ عجیب مرد ہو تم بھی۔"
برٹ نے انتہائی تحقیر کے ساتھ کہا "یہ ہندوستانی کالے کتے..."
میں نے اس کے بال پکڑ کے اس کا سر ڈیش بورڈ پر مارا۔ "دوبارہ کسی ایشیائی کے لئے اپنے باپ کا نام استعمال مت کرنا" میں نے کہا "سفید سور۔"
ٹام مجھے ایک گالی دے کر اترا اور میرے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر منجمد ہوگیا۔ ایک لمحے کے لئے برٹ بھی سر پکڑے سکتے کی حالت میں بیٹھا رہا۔ جین اور ماریا ایک دوسرے سے لپٹ گئیں۔ غالب دوسری طرف پوزیشن سنبھال چکا تھا اور دوسرا ریوالور اس کے ہاتھ میں تھا۔
"یہ......یہ کیا ہے؟" آخر کار ٹام نے ہمت کی۔
"یہ۔ اسے انگریزی میں ریوالور کہتے ہیں۔"

"خدا کے لئے۔ یہ کیسا مذاق ہے۔ اگر تم نے برا مانا ہے کسی بات کا تو میں معافی مانگ لیتا ہوں" ٹام نے کہا۔
برٹ نے کہا "ایسا نہ ہو گولی چل جائے۔"
برٹ چالاک آدمی ثابت ہوا۔ اس نے ایک دم میرے ریوالور پر ہاتھ ڈال دیا۔ مجھے قطعی امید نہ تھی کہ وہ جوڈو کراٹے کے داؤ بھی جانتا ہوگا۔ اس کی ضرب میری کلائی پر یوں پڑی کہ ریوالور خود بخود میرے ہاتھوں سے نکل گیا۔ میں نے بہت تاخیر سے اپنا دفاع کیا تھا چناں چہ ضرب سے تو نہ بچ سکا مگر پھر بھی میری کلائی نہیں ٹوٹی۔
ایک درجن فحش گالیوں کے ساتھ برٹ نے مجھ پر حملہ کیا۔ ٹام اسی وقت میرا ریوالور اٹھانے کے لئے لپکا تھا۔
غالب نے کہا "خبردار!"
مگر اس سے پہلے ہی میری لات نے ٹام کو الٹ دیا۔ پھر میں برٹ کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کے دوسرے وار کو میں نے جھکائی دے کر بچایا ورنہ اس کی کھڑی ہتھیلی میری گردن پر لگتی۔ اس وار کو میں نے شانے پر جھیلا اور پھر جھک کر برٹ کے پیٹ پر لات مارنے کے لئے دائیں پیر کی ایڑی پر گھوم گیا۔
اب اس کو حیران ہونے کا موقع نہیں ملا۔ لات پیٹ پر پڑتے ہی وہ دُہرا ہوا تو میں نے گھٹنا اٹھا کے اس کی ٹھوڑی پر مارا اور پھر دونوں ہاتھوں کی مدد سے اس کو الٹ کے زمین پر دے مارا۔
"اتنا کافی ہے مسٹر برٹ" میں نے کہا "اندازہ تو کر لیا ہوگا تم نے کہ ریوالور ہاتھ میں نہ ہونے سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پھر کسی جگہ ہم فیصلہ کن مقابلہ کریں گے۔"
برٹ کپڑے جھاڑ کے کھڑا ہوگیا۔ اب میں ان سب کی نگاہوں کا مرکز بن گیا تھا۔ غالب نے مجھے میرا ریوالور پھر پکڑا دیا۔ گاڑی کے رکتے ہی گل اور نازو نے بھی سمجھ لیا ہوگا کہ اب کیا ہوگا لیکن میری ہدایات کے مطابق انہوں نے دخل در معقولات سے گریز کیا اور اپنی موجودگی کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔
"چلیں آپ دونوں پیچھے" میں نے یوں کہا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو "جین! تم اچھی لڑکی ہو۔"
"مجھ میں کیا برائی ہے؟" ماریا نے نیچے اتر کے تلخی سے کہا اور پیر پٹختی ہوئی پیچھے گئی۔ جین بھی خوف زدہ تھی مگر میرے لہجے نے اسے کچھ تقویت عطا کی۔ وہ زبردستی مسکرائی اور سر ہلا کے ماریا کے ساتھ ہو گئی۔
کاروان میں داخل ہونے کے چند سیکنڈ بعد میں نے ان کی چیخ سنی "کون...... کون ہو تم؟" ماریا نے کہا۔
پھر جین کے چلانے کی آواز آئی "یا میرے خدا۔"
ٹام نے کہا "کاروان میں کون ہے؟"
برٹ نے کہا "لڑکیوں کے ساتھ کوئی زیادتی ہوئی تو......"
"تو تم کیا کرو گے؟" میں نے کہا "خود کشی کر لو گے غیرت میں؟ مسٹر برٹ! کاروان میں ویسی ہی دو لڑکیاں ہیں۔"
"لڑکیاں......" انہوں نے ایک ساتھ کہا۔
"ہاں۔ ہمارے ساتھ تھیں۔" میں نے کہا۔
"تم نے ہم سے پوچھے بغیر' ہمیں بتائے بغیر......"
میں نے کہا "شٹ اپ۔ گاڑی چلاؤ۔ جیسی پہلے چلا رہے تھے۔ اور برٹ تم! ابھی آگے بیٹھ جاؤ۔ جیسے کوئی بات نہیں ہوئی۔"
اس نے مجھے خون آشام نظروں سے گھورا۔ پھر اسٹیشن ویگن کی اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ آہستہ آہستہ ٹام بھی ڈرائیور کی جگہ سنبھالنے کے لئے بڑھا۔
چند منٹ بعد ہم پھر اپنا سفر شروع کر چکے تھے۔
میں نے کہا "ٹام! اب میں تم کو بتاؤں گا کہ یہ سب کیوں ضروری تھا' جو ہم نے کیا۔ لیکن اس سے پہلے ایک بات بہت اچھی طرح سمجھ لو۔ میں تمہارے بالکل پیچھے ہوں' موت کے فرشتے کی طرح۔ غلطی میں نہیں کروں گا۔ مگر تمہاری غلطی کو معاف بھی نہیں کروں گا اور اس سے پہلے کہ تمہیں پتا چلے' تم مر چکے ہوگے۔ برٹ! یہ تم بھی سن رہے ہو نا؟ ریوالور کے فائر کی آواز کوئی نہیں سنے گا۔ لیکن گردن کی ہڈی کے ٹوٹنے کی آواز بالکل صاف سنائی دے گی۔ اسے جو زندہ رہے گا۔"
ٹام اور برٹ کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ وہ نظریں سڑک پر جمائے میری زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ غور سے سن رہے تھے۔
"تم سب غیر ملکی ہو۔ فرنچ میں بھی جانتا ہوں لیکن ہمارے پاس پاسپورٹ صرف یہ ہے" میں نے ریوالور لہرایا "یا پھر پیسہ ہے۔ ہم کلکتہ تک تمہارے ساتھ جائیں گے۔ شاید آگے بھی۔ اور یہ سفر مسلسل ہوگا۔"
"خدا کے لئے مجھے ایک بات سمجھاؤ" ٹام نے کہا "جب تم غیر ملکی نہیں ہو۔ تم انڈین ہو۔ تو تمہیں پاسپورٹ کی کیا ضرورت ہے؟"
برٹ نے بھی سر ہلایا "تم کو کیا مجبوری ہے کہ ہمارے ساتھ ایسے سفر کرو؟ تم بس یا ٹرین سے یا ہوائی جہاز سے بھی سفر کر سکتے ہو۔"
میں نے کہا "اگر مجبور نہ ہوتے بے وقوف آدمی' تو کیا ہم تمہیں پچاس ہزار دیتے؟ ہم واقعی ہوائی جہاز سے جاتے۔ ان عورتوں سے ہمیں کوئی دلچسپی نہیں جن کو ہم عورت کیا' طوائف بھی کہیں تو طوائف کے نام پر گالی ہے۔ ہمارے یہاں طوائف کتنی بھی آبرو باختہ کیوں نہ ہو' ایسی اخلاق سوز......"
"اب تم اپنا یہ فلسفۂ حیات رہنے دو" ٹام چڑ کے بولا۔
"ہاں۔ کام کی بات کرو" برٹ نے کہا "کیوں زبردستی ہمارے ساتھ جانا چاہتے ہو تم؟"
میں نے کہا "اس لئے کہ تم غیر ملکی ہو اور تمہیں یہاں کے قوانین سے تحفظ حاصل ہے یعنی DIPLOMATIC

IMMUNITY تم پر پولیس ہاتھ نہیں ڈال سکتی جب تک کہ تم سنگین نوعیت کے جرم میں براہ راست ملوث نہ ہو جاؤ اور اس کے لئے بھی تمہارے سفارت خانے کو مطلع کرنا ضروری ہو گا۔"

"یہ سب معلوم ہے ہمیں۔"

"تو ہم بھی تمہارے اس تحفظ کی ضمانت سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ کیوں کہ ہم پولیس کو مطلوب ہیں۔ بھارتی حکومت کو مطلوب ہیں۔"

حیرت سے تام اور برٹ کا منہ کھلا رہ گیا "کیا..... ایسا کیا جرم کیا ہے تم نے؟"

میں نے کہا "ہم اس کی تفصیل میں نہیں جائیں گے۔ خطرہ یہ تھا کہ ہم بھیس بدل کر بھی جاتے تو کہیں نہ کہیں پکڑے جاتے۔"

"تو..... یہ پولیس....."

"ہاں۔ وہ ہمارے ہی استقبال کے لئے مستعد تھے۔ تمہیں دیکھ کر انہوں نے گاڑی کو روکا نہیں اور تلاشی نہیں لی۔ آگے بھی ایسا ہی ہو گا۔"

"کلکتہ تک؟"

"شاید۔ اس سے بھی آگے" میں نے کہا۔

"مگر ہم آگے نہیں جا رہے ہیں۔" تام بولا۔

"تم آگے جا رہے ہو۔ ڈھاکا تک۔ ہمارے ساتھ" میں نے اسے یقین دلایا۔

"ہر جگہ ایسا نہیں ہو گا۔ کہ پولیس خود راستے سے ہٹ جائے" تام بولا۔

"اس لئے میں تم کو سمجھانا چاہتا ہوں کہ تمہیں چیکنگ اور تلاشی کی صورت میں کیا کرنا ہو گا" میں نے کہا "بات میں کروں گا کیوں کہ میں فرنچ اور انگلش جانتا ہوں۔ ان کی جرح کا جواب دے سکتا ہوں۔"

"تمہارا ساتھی' وہ ہندوستانی ہے؟"

"وہ خاموش رہے گا۔ یا سامنے ہی نہیں آئے گا۔ میں یہ بتاؤں گا کہ تم ٹورسٹ ہو۔ کہاں کہاں سے گھومتے پھرتے آ رہے ہو۔ میں تمہارا دوست اور گائیڈ ہوں۔ بلکہ ہندوستان میں تمہاری میزبانی کر رہا ہوں۔ کیوں کہ میں تمہاری ترجمانی کر سکتا ہوں۔ اور میں بہت مشہور' بہت دولت مند آدمی ہوں۔ تم سب اپنے اپنے پاسپورٹ دکھا سکتے ہو کہ ہم دو مرد ہیں اور ہمارے ساتھ دو ہم سفر عورتیں....."

"مگر عورتیں چار ہیں!"

"کوئی ایسی ویسی صورت حال سامنے آئی تو دیکھنے والوں کو دو ہی نظر آئیں گی" میں نے مسکرا کے کہا "چار پاسپورٹ ان کو قائل کرنے کے لئے کافی ہوں گے۔"

"میں سمجھا نہیں! چار کی جگہ دو....."

"دو چھپ جائیں گی۔ سامان کے نیچے یا برتنوں کے نیچے۔ اس کاروان میں بہت جگہ ہے۔ پولیس اندر جھانک سکتی ہے' اندر داخل ہو کے تلاشی نہیں لے سکتی۔ ممکن ہے میرا یہ دوست بھی ڈکی میں غائب ہو جائے" میں نے غالب کی طرف اشارہ کیا۔

"مجھے معلوم نہیں میں اتنا جھوٹ بول سکتا ہوں یا نہیں۔ اس میں بہت خطرہ ہے" تام بڑبڑایا۔

"جھوٹ میں بولوں گا' تم صرف تائید کرو گے۔ اور معاملہ صرف میری شناخت کا رہ جائے گا تو چار غیر ملکی سیاحوں کی گواہی کافی ہو گی۔"

"مگر میں یہ سب کچھ کیوں کروں؟"

"اس لئے کہ تم نے پچاس ہزار روپے لئے ہیں" میں نے کہا۔

"وہ اس کام کے نہیں تھے۔"

"پھر تم سوچ لو۔ تم کو صرف سر ہلانے اور میرے بیان کی تائید کے عوض اتنی بڑی رقم مل رہی ہے۔ کیا تم اس سے محروم ہونا پسند کرو گے؟ میرے لئے وہ سب واپس لینا مشکل نہیں۔"

"مجھے سوچنا پڑے گا" تام نے کہا۔

"میرے لئے تو یہ بھی مشکل نہیں" میں نے اپنی بات جاری رکھی "کہ تم سے سب کچھ چھین لوں۔ تمہیں شوٹ کر کے تمہاری لاشیں کہیں بھی دبائی جا سکتی ہیں۔ اور تمہارے پاسپورٹ ہم استعمال کر سکتے ہیں۔ اس رقم سے ہم جعلسازوں کی خدمات حاصل کر لیں گے جو کسی بھی پاسپورٹ پر کسی بھی شخص کی تصویر لگانے کے ماہر ہوتے ہیں۔ فوٹو چینجنگ یونٹ ہوتے ہیں ان کے پاس۔"

برٹ نے دہشت زدہ ہو کے تام کی طرف دیکھا "یہ ایسا کر سکتے ہیں تام۔ ان کے پاس مہلک ہتھیار ہیں۔"

میں نے کہا "اور ہم قتل نہ کریں' تمہیں ایسے ہی ناک آؤٹ کر کے سامان میں ڈال دیں تب بھی کام چل جائے گا۔ کسی غیر ملکی سیاح کا قتل بہت سنگین مسئلہ بن جاتا ہے۔ چار افراد کا قتل ہوا تو قیامت آ جائے گی۔ مگر قیامت تم سب کی لاشیں دریافت ہونے سے پہلے نہیں آئے گی۔ اور لاشوں کے دریافت ہونے کا امکان بہت کم ہے۔ نہ ہونے کے برابر۔ ہم لاشوں کو ٹھکانے لگاتے رہے ہیں بڑی کامیابی سے۔"

"آخر..... تم کون لوگ ہو؟ تم مجھے صورت سے چور ڈاکو یا سزا یافتہ مجرم نہیں لگتے۔ تم پڑھے لکھے ہو۔ فرنچ اور انگلش روانی سے بولتے ہو۔ یورپ تک دیکھ چکے ہو اور تمہارے پاس پیسہ بھی بہت ہے" تام بولا۔

میں نے کہا "اندازے مت لگاؤ۔ ہم بین الاقوامی قسم کے دہشت گرد ہیں۔ کسی بھی گوریلا تنظیم یا حکومت کے لئے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ معاوضہ منہ مانگا ملے۔ اور ہماری کامیابی کا راز یہی ہے کہ ہم ایسے نظر نہیں آتے۔ کہیں نمایاں نہیں ہوتے بلکہ عام آدمی دکھائی دیتے ہیں۔"

"آل رائٹ۔ تم نے ہمارے لئے انکار یا انتخاب کی گنجائش تو بھی نہیں ہے۔ ہم ہاں کرنے پر مجبور ہیں۔" برٹ نے کہا "مگر تم بہت بڑا رسک لے رہے ہو۔"

"ہم رسک کے بغیر ایک منٹ نہیں رہ سکتے۔"

"فرض کرو ہم جھوٹا وعدہ کر لیں اور عین وقت پر پولیس کی پناہ میں چلے جائیں" تام نے کہا۔

"پولیس تمہیں نہیں بچا سکتی۔ وہ جہاں بھی ملیں گے تعداد میں کتنے ہوں گے؟ چار' چھ یا آٹھ دس۔"

"اور وہ بھی مسلح ہوں گے۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ انہیں مہلت ہی کہاں ملے گی اپنا اسلحہ استعمال کرنے کی" میں نے کہا "وہ صرف ہمیں محصور کریں گے تو پیچھے سے مشین گن کا ایک برسٹ سب کو لٹا دے گا' یا ایک دستی بم....."

"مشین گن..... دستی بم....." برٹ بوکھلا گیا۔

"اور کیا۔ دہشت گرد صرف کھلونے لے کر پھرتے ہیں؟"

میں نے اپنا ریوالور دکھا کے کہا "اصل دھوکا تو وہ عورتیں دیتی ہیں جو بہت بے ضرر اور معصوم نظر آتی ہیں مگر وہ انتہائی خطرناک اور پیشہ ور قسم کی کمانڈوز ہیں۔ تم دیکھو گے انہیں تو حیران رہ جاؤ گے۔ سب سامان انہی کے پاس ہے۔ ہم اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتے تھے اس لئے ہم نے رات کے وقت تمہارے کاروان میں چھپا دیا تھا۔ اگر تم نے پولیس یا ملٹری سے بھی مدد مانگی تو پھر ہم جان پر کھیل جائیں گے۔ ہم زندہ کسی کے ہاتھ آنا قبول نہیں کرتے۔ تم سب سے پہلے مارے جاؤ گے۔ باقی تمہارے بعد ہلاک ہوں گے۔ اگر ہم میں سے بھی کوئی ہلاک ہوا تو اس کی قسمت۔ اس کی پروا ہم نہیں کرتے۔ گزشتہ پانچ۔ نہیں ساڑھے چھ سالوں میں ہمارے گروپ کے صرف دو افراد ہلاک ہوئے ہیں۔ کم سے کم دو درجن مقابلوں میں۔ اور ہمارے مقابلے میں جو مارے گئے وہ کسی طرح بھی سو سے کم نہیں ہوں گے" میں نے غالب سے مخاطب ہو کے کہا "ان کی تو ہوا خراب ہو رہی ہے۔ ذرا تم انگلیاں اٹھا کے ہنڈرڈ کا لفظ استعمال کرو۔ میں نے کہا ہے کہ ہم سو افراد کو ہلاک کر چکے ہیں۔ تمہارا اصرار ہے کہ تعداد دو سو سے کم نہیں۔"

برٹ نے اشارہ دیکھ لیا تھا اور دم بخود بیٹھا تھا۔

"میرے دوست کا خیال ہے کہ میں نے تعداد کم بتائی تھی اور ہمارے مقابلے میں دو سو کے قریب دشمن ہلاک ہوئے" میں نے کہا۔

"کیا واقعی وہ تمہارے دشمن تھے؟" تام نے طنز سے کہا "تم تو کرائے کے قاتل ہو۔"

"دشمنی کا تعلق جذبات سے رہتا ہے" میں نے فلسفیانہ استدلال اختیار کر لیا "یہ ممکن ہے کہ تم اپنے باپ کے قاتل کو بھی معاف کر .. اور تمہارے جذبات بدل جائیں۔ لیکن اس کے برعکس تم لوگ میرے لئے اجنبی ہو۔ تم نے میرا کہنا نہ مانا تو میرے دل میں تمہارے خلاف جو جذبات پیدا ہوں گے وہ دشمنی کے خیال پر مبنی ہوں گے۔ ظاہر ہے آپ کسی کو دوست سمجھتے ہوئے ہلاک نہیں کر سکتے۔"

"کیا یہ سارا فلسفہ اور مسئلہ عورتوں کو بھی سمجھانا ضروری نہیں ہو گا؟" تام نے کہا۔

برٹ نے کہا "جین اور ماریا سمجھ دار ہیں۔"

تام نے برا سا منہ بنایا "سمجھدار! ہر عورت ہسٹریا میں مبتلا ہو کے مصیبت پیدا کر دیتی ہے۔ عقل ہونے کے باوجود وہ عقل کے استعمال پر اختیار سے محروم ہو جاتی ہے۔"

میں نے کہا "آپ لوگ پریشان نہ ہوں۔ ان کو یہ سب سمجھا دیا گیا ہو گا۔ سمجھانے والی بھی عورتیں ہیں اور سمجھنے والی بھی چناں چہ اب تک تمام معاملات پر اتفاق رائے ہو گیا ہو گا۔"

"اگر تم مطمئن ہو تو مجھے کیا" تام نے کہا۔

"تم کو مزید کوئی سوال کرنا ہے تو کر سکتے ہو" میں نے کہا۔

"کیا ہم کھانے پینے اور سونے کے معاملے میں اپنی مرضی کے مالک ہوں گے یا اس کے لئے بھی تم این او سی جاری کرو گے؟" تام بولا۔

میں نے غور کرتے ہوئے کہا "سوال کے تین حصے ہیں۔ کھانا ہم اور تم ایک ساتھ کھائیں گے۔ جو ہم کھائیں گے وہ تم کھاؤ گے۔ پینے کا معاملہ مختلف ہے۔ ہم چائے کافی سے آگے نہیں

جا سکتے۔"

"کیا تم مسلمان ہو؟" برٹ بولا "وہ شراب نہیں پیتے۔"

"دنیا کے بیشتر لوگ شراب نہیں پیتے۔ انڈیا میں بھی شراب کی مخالفت ہے۔ پھر بھی میں یہ بتاتے ہوئے فخر محسوس کرتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں" میں نے کہا "ہمارے مذہب میں شراب کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ یہ مت پوچھنا کہ کیوں۔ کوئی میرے مذہبی عقیدے پر منفی جرح کرے تو میں اس کے دانت توڑ کر ہتھیلی پر رکھ دیتا ہوں۔ بہرحال تم کو اعتدال میں رہتے ہوئے پینے کی اجازت ہوگی۔"

"اعتدال کی حد کیا ہوتی ہے؟"

"جب تک شراب پی کر تم انسان رہتے ہو' حیوان نہیں بنتے اور عقل و ہوش سے محروم نہیں ہوتے۔ یہ خود تمہیں بھی اندازہ ہوگا کہ کون کتنی قوتِ برداشت رکھتا ہے" میں نے کہا "اب تمہارے سوال کا تیسرا حصہ۔ سونے پر کوئی پابندی نہیں۔ تم جب چاہو سو سکتے ہو۔ اکیلے' الگ الگ اور اسی لباس میں۔"

"اس لباس میں! یہ سفری لباس ہے۔ اس میں تو مجھے نیند ہی نہیں آئے گی" ٹام نے احتجاج کیا۔

"تو مت سونا" میں نے مختصراً کہا "ویسے میرا خیال ہے کہ نیند تختۂ دار پر بھی آجاتی ہے۔ دیگر مسائل نفسیاتی ہیں۔ جسم آخر کار خود سو جاتا ہے۔"

برٹ بولا "تم کمانڈو یا دہشت گرد سے زیادہ فلاسفر ہو۔"

"ہم بظاہر عام لوگ ہیں مگر عام لوگوں سے بہت مختلف ہیں" میں نے کہا "اوسط ذہانت اور ہمت رکھنے والا ہمارے برابر نہیں آسکتا۔ تم اگر چاہو تو اس سفر کو پہلے کی طرح تفریحی سمجھ سکتے ہو اور انجوائے کر سکتے ہو۔ اگر تم یہ فرض کر لو کہ ہم صرف تمہارے نئے رفیق ہیں۔ مگر اس کے برعکس تم ذہنی کشیدگی' اعصابی اور جسمانی دباؤ میں رہے تو تمہاری لئے واقعی سفر تکلیف دہ ہوگا۔ اس لئے میرا مشورہ ہے کہ۔ ٹیک اٹ ایزی۔ ہم بلاوجہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ معاوضہ ہم پہلے ہی ادا کر چکے ہیں' شکر گزار بعد میں ہوں گے۔"

برٹ مسکرایا اور اس نے ہاتھ پیچھے بڑھا کے مجھ سے مصافحہ کیا۔ "اب ہم دوست ہیں۔ جو ہوگی بھگت لیں گے ایک ساتھ" پھر اس نے غالب سے بھی ہاتھ ملایا۔ کشیدگی کو مزید کم کرنے کے لئے میں نے بھی ریوالور جیب میں رکھ لیا اور غالب نے بھی۔ اس کے بعد برٹ نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔

ٹام نے کہا "مجھے ایک ڈرنک کی ضرورت ہے تاکہ میں بھی کچھ پُرسکون ہو جاؤں اور تم سے ہاتھ ملا سکوں۔"

میں نے کہا "اگر ڈرنک تمہارے پاس ہے تو شوق پورا کرو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

"بوتلیں وغیرہ پیچھے کاروان میں ہیں" ٹام نے کہا۔

"پھر تھوڑا سا انتظار کر لو۔ ہم کو پروگرام کے مطابق دو گھنٹے بعد رکنا ہوگا" میں نے کہا۔

سفر کا پہلا مرحلہ بخیر و عافیت طے ہوا۔ دو گھنٹے بعد ہم نے سڑک کے کنارے ایک مختصر قطعۂ زمین پر پڑاؤ کیا۔ ایک گھنٹے کے اس وقفے میں غالب نے گل اور نازو کو وہ سب بتایا جو ہمارے درمیان طے پایا تھا۔ انہوں نے کاروان کے مختصر کچن میں گیس کا چولہا جلا کے کافی بنائی اور غالب کو جین اور ماریا کے بارے میں اپنے تاثرات سے آگاہ کیا۔ ظاہر ہے یہ تاثر خوشگوار نہیں ہو سکتا تھا۔ ان کے درمیان بات چیت بھی اشاروں کی زبان تک محدود رہی تھی۔ تاہم جین اور ماریا نے عدم تعاون کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ وہ گل اور نازو کے ہاتھوں میں ریوالور دیکھ کر جتنی دہشت زدہ ہوئی تھیں' اس سے زیادہ حیران۔ یہ سب مجھے غالب نے بعد میں بتایا۔

میں ان چاروں کے ساتھ رہا۔ ان سب نے ایک ہی بوتل سے منہ لگا کے پی اور مجھے بھی پیش کی مگر میں نے انکار میں سر ہلا کے سگریٹ جلالی۔

جین کا رویّہ بھی اب مہربان نہیں رہا تھا۔ اس نے جھنجلاہٹ سے کہا "کیا تم اسی طرح ہمارے سر پر سوار رہو گے؟"

میں نے کہا "خاتون! آپ کا سر بہت خوب صورت ہے مگر سواری کے لئے نہیں ہے۔"

برٹ ہنس پڑا "اس کا مطلب تھا......"

"مطلب میں سمجھ گیا ہوں مسٹر برٹ" میں نے اس کی بات کاٹ دی "میں اتنا بے وقوف بھی نہیں ہوں۔"

"پھر تم کچھ دیر کے لئے ہمیں تنہا کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟" ٹام بگڑ کے بولا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا "میں پھر کہتا ہوں کہ میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں۔ میں یہ رسک نہیں لے سکتا کہ تم لوگ بلاوجہ ہمارے خلاف جذباتی ہو کے کوئی سازش کرو۔"

"ہم صرف تھوڑی دیر کھلی فضا میں ٹہلنا چاہتے ہیں۔" برٹ نے کہا "ہم فرار نہیں ہو سکتے۔"

"ہاں۔ تم فرار نہیں ہو سکتے۔" میں نے اس سے اتفاق کیا۔ "مگر ٹہلتے ہوئے میں تمہارے ساتھ رہوں تو کیا حرج ہے؟ میں تمہاری گفتگو سنوں گا مگر دخل اندازی نہیں کروں گا۔ ہاں تم نے جنگل کی خلوت میں رومانی ہونے کی کوشش کی تو میں ضرور ٹانگ اڑاؤں گا۔"

وہ چھدرے جنگل میں ادھر سے اُدھر گھومتے رہے اور ایک دوسرے کو پریشانی کا ذمّے دار قرار دیتے رہے۔ مردوں نے عورتوں کو بتا دیا تھا کہ انہیں کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے۔ گل اور نازو نے انہیں کچھ نہیں سمجھایا تھا۔ مسئلہ وہی تھا کہ دونوں فریق الگ الگ زبان بولتے تھے۔

بیس منٹ بعد غالب دو کافی کے مگ لئے نمودار ہوا۔ اس نے ایک مگ مجھے تھما دیا۔ اس کے پیچھے گل اور نازو کاروان سے اتریں تو ٹام اور برٹ کے قدم رک گئے۔ ان کے نزدیک آنے تک وہ حیرت میں ڈوبے رہے۔

"یہ...... تمہارے ساتھی ہیں؟" ٹام نے کہا "یہ تو بہت خوب صورت ہیں۔"

میں نے کہا "میں اسے کیا سمجھوں؟ طنزیا اعترافِ حقیقت۔ کیا خوب صورت لڑکی خطرناک نہیں ہوتی؟"

"ہوتی ہے مگر دوسری طرح" ٹام بولا۔

"تمہارا مطلب ہے دہشت گرد نہیں ہو سکتی؟"

"فلموں میں ہو سکتی ہے" ٹام بولا۔

میں نے کہا "تمہاری زندگی کا یہ تجربہ کسی ایڈونچر فلم سے کم تو نہیں۔ خیر اب تمہارے پہریدار بدل رہے ہیں۔ میں اپنے دوست سے کچھ مشورہ کروں گا۔ یہ لڑکیاں تمہارے ساتھ رہیں گی۔"

برٹ نے کہا "کیا ہم ان کے ساتھ جنگل میں آگے تک جا سکتے ہیں؟"

میں اس کا مطلب سمجھ گیا تھا مگر عمداً انجان بن گیا "ضرور جاؤ مگر دیر مت کرنا" میں نے گھڑی دیکھ کر کہا۔

جب وہ کچھ دور نکل گئے تو غالب نے کہا "وہ سُور کا بچّہ ٹام اپنے ساتھی کو آنکھ مار رہا تھا۔"

"میں نے دیکھ لیا تھا۔ لیکن اچھا ہے' گل اور نازو کے بارے میں ان کی غلط فہمی رفع ہو جائے۔ میں بتاتا تو وہ مزہ نہ آتا جو تجربے کے بعد آئے گا" میں نے کہا۔

میں اور غالب اطمینان سے ٹہلتے رہے۔ سڑک پر سے گزرنے والی بسوں اور دوسری گاڑیوں کے مسافر ہماری گاڑی اور اس کے پیچھے بندھے ہوئے کاروان کو تو دیکھ سکتے تھے مگر ہم ان کی نظر سے اوجھل تھے۔ اس علاقے میں ملے جُلے درخت تھے۔ کچھ بلند قامت کچھ پستہ قد۔ درمیان میں جھاڑیاں بھی اُگی ہوئی تھیں اور خودرو پودوں کی بہتات اس علاقے میں بارش کی فراوانی کو ظاہر کرتی تھی۔ اس وقت بھی بادل چھائے ہوئے تھے اور آثار بارش کے تھے۔ آگے گہرے سیاہ بادلوں میں بجلی چمک رہی تھی اور دوپہر کے وقت بھی جنگل میں غروبِ آفتاب کے بعد کا سماں تھا۔

میں اور غالب پورے پلان پر نظر ثانی کر چکے تھے' تمام امکانات کا جائزہ لے چکے تھے اور اس صورت حالات سے پوری طرح مطمئن تھے۔ "شام تک سفر بلا روک ٹوک جاری رہا تو ہم خطرات سے خاصے محفوظ ہو جائیں گے" میں نے کہا۔

غالب کی نظر جنگل کی طرف تھی۔ "یہ لوگ کتنی دور چلے گئے ہیں؟ کسی کی آواز بھی سنائی نہیں دیتی۔"

"سنائی دے گی۔" میں نے غالب کو تسلی دی "ٹام نسبتاً زیادہ خباثت پسند ہے۔ امید ہے اسی کی فریاد پہنچے گی ہمارے کانوں تک۔"

"بھائی صاحب! اگر ان کے پاس ریوالور ہوئے پھر؟ ہم نے کون سی تلاشی لی تھی۔"

میں نے کہا "تلاشی لینے کی ضرورت محسوس نہیں کی ورنہ ضرور لیتا۔ تم نے ان کی صورت دیکھی تھی اس وقت جب میں نے ریوالور نکالا تھا؟ جس کے پاس ریوالور ہو اس کی حالت اتنی غیر نہیں......"

میری بات ختم ہونے سے پہلے ہی ٹام کے چلّانے کی آواز آئی۔ وہ فرنچ میں شور مچا رہا تھا "ہائے۔ میری ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔ اُف۔ میری پسلیاں۔ برٹ! سُور کے بچے۔ اس شیطان کو منع کرو کسی طرح......" اس نے ایک چیخ ماری "یہ میری بات ہی نہیں سمجھتی۔ اسے سمجھاؤ۔ میں معافی مانگتا ہوں۔"

غالب نے ہنس کے کہا "اُلو کا پٹھا۔"

میں نے کہا "تھیوری اور پریکٹیکل میں یہی فرق ہوتا ہے۔ اب ان میں سے کوئی گل کے ساتھ بھی غیر محتاط رویّہ اختیار نہیں کرے گا۔" چند منٹ کے بعد ٹام لنگڑاتا ہوا نمودار ہوا۔ اس کے ساتھ برٹ تھا جو اسے سہارا دے کر لا رہا تھا۔ ٹام گالیاں بک رہا تھا مگر مجھے دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ نازو اور گل ان کے پیچھے بڑے سکون سے چلتی آرہی تھیں اور آپس میں یوں باتیں کر رہی تھیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

میں نے بھی بہتر سمجھا کہ کسی سے کوئی سوال نہ کیا جائے۔ اندازہ مجھے پہلے ہی ہو گیا تھا کہ ٹام کا یہ حشر اس کی غلط فہمی کے باعث ہوا تھا۔ اس نے نازو کو ایک نازک لڑکی سمجھ کے خود کو قوی مرد ثابت کرنے کی کوشش کی ہوگی۔

"چلو بھئی' واپس اپنی اپنی جگہ" میں نے کہا "ہمیں بارش شروع ہونے سے پہلے روانہ ہو جانا چاہئے۔"

برٹ نے کہا "وہ...... آئی ایم سوری۔ ٹام نے......"

میں نے کہا "کچھ زیادہ پی لی ہوگی۔ کوئی بات نہیں۔ اس کا نشہ اتر گیا ہے۔ میں دیکھ سکتا ہوں۔ اب تمہاری باری تو نہیں مگر ڈرائیونگ تمہیں کرنی پڑے گی۔"

ہم گاڑی کے قریب پہنچے ہی تھے کہ میری نظر پیچھے سے آنے والی جیپ پر گئی۔ گل اور نازو اس وقت تک کاروان میں غائب ہو گئی تھیں۔ میں نے غالب کو خبردار کیا "تم فوراً چھپ جاؤ مرزا۔ یہ پولیس ہے" میں نے کہا "ٹام! ہوشیار رہو اور برٹ! تمہیں یاد ہے میں نے کیا سمجھایا تھا؟ ہم اب فرار بھی نہیں ہو سکتے۔"

جیپ ہمارے قریب آ کے رک گئی۔ اس میں سے چھ مسلح پولیس والے کود کر اترے اور انہوں نے ہمارے چاروں طرف پوزیشن سنبھال لی۔ پھر ایک گٹھری سی باہر گرا دی۔ گٹھری پر خون کے سرخ دھبّے تھے۔ میں نے اسے غور سے دیکھا۔ یہ رامن تھا۔

ایک پولیس مین نے ٹھوکر مار کے رامن کو پیروں پر کھڑا کر دیا۔ لیکن وہ کھڑا رہنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ وہ پھر گر گیا۔

برٹ نے ہراساں ہو کے میری طرف دیکھا اور پوچھا "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

ٹام کی نظروں میں تشویش تھی "اس لڑکے کو کیوں مار ڈالا ہے انہوں نے؟ اور ہمیں کیوں گھیر لیا ہے.....؟"

میں نے کہا "مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟ تمہاری طرح میں بھی کچھ نہیں جانتا۔"

پولیس والے نے پھر رامن کو ٹھوکر ماری "اٹھ ..... کنجر کی اولاد۔ نہیں تو....." اس نے گالیوں کی گردان کرتے ہوئے کہا مگر اس کا رامن پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ تھوڑا سا تڑپا اور ساکت ہو گیا۔

پولیس والوں کی ٹیم کا کپتان ایک پھول والا اے ایس آئی تھا۔ اس کی صورت پر پولیس کی طویل نوکری کے سارے نحس اثرات عیاں تھے۔ شاید وہ کانسٹیبل بھرتی ہوا ہو گا تو اٹھارہ بیس سال کا آٹھ جماعت پاس لڑکا ہو گا۔ اب اس کی عمر پچاس سے اوپر تھی۔ تیس سال یا اس سے زیادہ دورِ ملازمت میں وہ ترقی کی صرف اتنی ہی منزلیں طے کر پایا تھا کہ ریٹائر ہو تو خود کو سابق افسر کہہ کر تسکین حاصل کرتا رہے۔ وہ بھدے، بے ڈول جسم کا مالک تھا۔ جاہل، کاہل اور غبی نظر آتا تھا اور روایتی طور پر بدنام پولیس والوں کی طرح موٹے پیٹ والا تھا۔

اس نے اشارے سے اپنے ماتحت کو روک دیا "ابھی اس کو تھوڑی دیر مکر کرنے دو۔ ضرورت پڑے گی تو اس کی لاش کو بھی سلامی کے لئے کھڑا کر دیں گے۔"

میں نے فرنچ میں کہا "آخر یہ کیا کر رہے ہو تم لوگ۔ اور کس اختیار کے تحت؟ کس کی اجازت سے؟ کیوں محصور کیا ہے تم نے ہمیں، اس طرح مسلح ہو کے؟ جیسے ہم ٹورسٹ نہیں جیل سے بھاگے ہوئے مجرم ہیں۔ تم کو....."

انسپکٹر نے میرے منہ پر تھپڑ مارنے کی کوشش کی "بھونک مت کتے۔ اپنی بھاشا بول۔"

میں نے اس کی کلائی پکڑ لی "میں قانون کا احترام کرتا ہوں مگر اس کا یہ مطلب نہیں۔"

وہ میری سخت گرفت میں چلّانے لگا "چھوڑ مجھے نہیں تو....."

میں نے اسے ایک سخت جھٹکا دے کر چھوڑ دیا۔ ٹام اور برٹ بھی اب میرے ساتھ احتجاج میں شامل ہو گئے تھے اور ہم تینوں کی فرنچ اس کے سر پر سے گزرتی جا رہی تھی۔

میں نے چیخ کر کہا "کہو اپنے کتوں سے کہ گولیاں چلائیں اگر ہمت ہے۔ ہم غیر ملکی ہیں اور اگر ہمارے ساتھ کسی قسم کی زیادتی ہوئی تو ہم سفارت خانے کے ذریعے اپنی حکومت کو مطلع کریں گے۔"

"تم ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے ہمیں" ٹام نے بھی چیخ کر کہا۔

برٹ نے اے ایس آئی کے بالکل سامنے جا کے اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا "ہمیں سفارتی تحفظ حاصل ہے سمجھے؟"

تھانے دار سمجھا تو خاک نہیں مگر بے اختیار ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ برٹ کے چھ فٹ سے نکلتے قد کے مقابل ساڑھے پانچ فٹ کے تھانے دار کو سر اٹھا کے دیکھنا پڑ رہا تھا۔ وہ کچھ کنفیوز نظر آنے لگا تھا۔

اس نے انگریزی میں کہا "تم انگریزی نہیں سمجھتے مگر تمہارے ساتھ کچھ مفرور مجرم ہیں...."

"کیا کہتا ہے؟" ٹام نے کہا۔

میں نے لاعلمی کے اظہار میں منہ بنا کے کندھے ہلائے اور غالب کی طرف متوجہ ہوا "تم بات کرو اس سے راجہ صاحب۔"

برٹ نے اتنی دیر میں اپنا پاسپورٹ نکال لیا تھا اور اسے تھانے دار کی آنکھوں کے سامنے لہرا رہا تھا "یہ دیکھ سکتے ہو تم۔"

ٹام نے اس کی تقلید کی اور اپنا پاسپورٹ برٹ کو تھما دیا "یہ بھی دیکھو۔ اور دیکھو گے؟"

وہ پیچھے کاروان تک گیا اور اپنے ساتھ دونوں خواتین کو لے آیا۔ انہوں نے بھی پاسپورٹ ہلا کے غصے میں چیخنا چلّانا شروع کیا تو تھانیدار کچھ پریشان سا ہو گیا۔

"کیا مصیبت ہے یہ؟" اس نے اپنے ساتھی اور نائب حوالدار سے کہا "یہ تو کچھ سمجھتے ہی نہیں۔ سارے ہی انگریز ہیں۔"

حوالدار نے کہا "وہ جو پیچھے ہے، وہ مشکوک لگتا ہے۔"

تھانے دار نے غالب کو اشارہ کیا "تم آگے آؤ۔"

غالب نے آگے بڑھ کے کہا "ہم سے ادب کے ساتھ بات کرو۔ سمجھے۔ شرافت سے۔ ہم راجہ جے سنگھ ہیں۔ پنجاب کے شکھشا منتری کے پریوار سے سمبندھ ہے ہمارا۔"

"کیا سمبندھ ہے؟" تھانے دار ایک دم چوکنا ہو گیا۔

"وہ سمدھی ہیں ہمارے پتا کے۔ آگے جا رہے ہیں وہ بھی" غالب نے راجے مہاراجوں کی طرح رعب اور دبدبے سے کہا۔

"خود۔ شکھشا منتری؟"

"ہاں خود شکھشا منتری۔ ہردے ناتھ۔ اور یہ انہی کے مہمان ہیں سارے" غالب نے اسی شان سے کہا۔

تھانے دار متاثر ہو گیا تھا مگر اس کا نائب بہت کائیاں تھا۔ اس نے کہا "راجہ صاحب! پھر اتنی دیر سے آپ خاموش کیوں تھے؟ آپ کو معلوم تھا کہ یہ ہندوستانی نہیں سمجھتے اور ہم ان کی زبان نہیں سمجھتے اس کے باوجود آپ چپ کھڑے سنتے رہے۔"

غالب نے بے نیازی سے کہا "جب تک کوئی ہم سے بات نہ کرے، ہم بھی دخل نہیں دیتے۔"

غالب کے جواب نے اسے مطمئن نہیں کیا "اپنے مہمانوں کی مدد کرنا تو آپ کا ہی کام ہے۔ یہ کسی مشکل میں پڑ جائیں زبان نہ سمجھنے کی وجہ سے تب بھی آپ نہیں بولیں گے؟ ابھی اتنا جھگڑا ہو گیا۔ بات بڑھ بھی سکتی تھی۔ ہم گرفتار کر لیتے انہیں...."

غالب نے تھانے دار سے کہا "تمہارا یہ سپاہی بہت زیادہ بے وقوف ہے یا ضرورت سے زیادہ سیانا؟ اسے بتاؤ۔ کیا تم ہمیں گرفتار کرنے کی غلطی کرو گے؟ اس کا اختیار ہے تمہارے پاس۔ آخر ہم شکھشا منتری کے....."

"راجہ صاحب! آپ خود تو شکھشا منتری نہیں ہیں" حوالدار نے اس کی بات کاٹ دی "اور ہمیں تو پنجاب کے چیف منسٹر کا نام بھی نہیں معلوم۔"

اب تھانے دار کی ہمت بڑھی "یہ بالکل ٹھیک کہتا ہے راجہ صاحب! ہم تو بس اپنے صوبے کی بات جانتے ہیں۔ شکھشا منتری کا تو نہیں پتا مگر اپنے چیف منسٹر اور وزیر کو پہچانتے ہیں۔ جب وہ آتے ہیں تو ہمیں پہلے سے معلوم ہوتا ہے۔ اور کوئی ایسے کچھ بھی کہہ دے۔"

"کیا مطلب؟" غالب نے گرج کے کہا "تم کو نظر نہیں آتے یہ غیر ملکی۔ ان کے پاسپورٹ دیکھو۔ چیک کرو۔ یہ عورتیں مفرور مجرم ہیں؟ یا یہ خود..... کیا ہم مجرم لگتے ہیں تمہیں؟"

"آپ..... تو نہیں" تھانے دار نے بڑی مشکل سے کہا "مگر دیکھیں، ہمیں یہی معلوم ہوا تھا..."

"کیا معلوم ہوا تھا؟"

"یہی۔ کہ ان غیر ملکیوں کے ساتھ کچھ مجرم نکل بھاگے ہیں۔ چار دہشت گرد ہیں۔ دو مرد اور ان کے ساتھ دو عورتیں۔"

"چار مجرم۔ ہم چھ آدمی تمہارے سامنے کھڑے ہیں۔ ان میں پانچ غیر ملکی ہیں۔ چار مجرم ملا کے نو آدمی تو ہوتے ہیں یا نہیں تھانے دار" غالب نے کہا۔

تھانے دار نے امداد طلب نگاہوں سے اپنے ماتحت کی طرف دیکھا۔ اس کے لئے حساب کا یہ سادا سوال بھی مشکل بن گیا تھا۔

حوالدار نے کہا "یہ تو ٹھیک ہے راجہ صاحب۔ مگر وہ اندر بھی تو ہو سکتے ہیں۔ کیا ہم دیکھ لیں؟"

"کیا؟ تلاشی لو گے؟" غالب نے غصے میں لال پیلا ہو کے کہا "وارنٹ لائے ہو؟ میرے مہمانوں کو بے عزت کرو گے میرے سامنے۔ مجھے بے عزت کرو گے ان کے سامنے؟"

"یہ بے عزتی کی بات نہیں راجہ صاحب" حوالدار میری توقع سے زیادہ سمجھدار اور خطرناک ثابت ہو رہا تھا "آپ جیسے ہی لوگوں کو قانون کی مدد کرنی چاہئے۔ ہماری کیا مجال کہ بلاوجہ آپ جیسے معزز لوگوں کا راستہ روکیں مگر ہمیں معلوم ہوا تھا....."

"کیا معلوم ہوا تھا۔ یہ کہ ہم مجرموں کی مدد کر رہے ہیں؟ خود مجرم ہیں" غالب چراغ پا ہو کے بولا "میرا خیال ہے کہ مجھے تم جیسے شخص کو معاف نہیں کرنا چاہئے۔ میں آج ہی رپورٹ کروں گا صوبے کے ہوم سیکریٹری کو۔ ہوم منسٹر کو۔ ان کو اچھی طرح معلوم ہے میرا نام۔ جو بھی ٹائمز آف انڈیا پڑھتا ہے وہ راجہ جے سنگھ کا نام جانتا ہے۔"

تھانے دار کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں "وہ سر.... میں آپ سے معافی مانگتا ہوں ... دراصل ہمیں جو اطلاع ملی تھی......"

"کیسے ملی تھی، کس سے ملی تھی، کس نے نام لیا تھا ہمارا؟"

"نام نہیں لیا تھا سر!" حوالدار بولا۔

"تم چپ کرو" تھانیدار نے اسے ڈانٹ کر کہا "جب افسر بات کر رہے ہوں تو ماتحت کو بولنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ بات یہ ہے سر! اس لڑکے نے بتایا تھا کہ چاروں اشتہاری مجرم ریسٹ ہاؤس سے غیر ملکیوں کے ساتھ نکل گئے ہیں۔"

"اس نے... اس لاش نے؟" غالب نے حقارت اور نفرت سے کہا "تم نے اس کا جو حشر کیا ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔ ایسے تو کسی سے کچھ بھی کہلوایا اور منوایا جا سکتا ہے۔ اگر کبھی آزمانا ہے تو ہمارے علاقے میں آ کے دیکھو۔ ہم بھی بہت کچھ معلوم کر لیں گے۔ ان تمام چوریوں کا اعتراف کرا لیں گے تم سے جو گزشتہ ایک سال میں ہو چکی ہیں۔ خواہ تمہارے پاس صفائی کے ہزار گواہ ہوں یہ ثابت کرنے کے لئے کہ تم وہاں سے ہزار میل دور تھے۔ یہ سب تو بعد میں ہو گا۔ جب معاملہ عدالت میں جائے گا۔"

حوالدار نے پھر ہمت کی "راجہ صاحب! اگر یہ ابھی آپ کے سامنے کھڑا ہو جائے اور کہے......"

"بابا، ہمارے سامنے بھی تمہارا طوطا وہی سبق پڑھے گا جو تم نے رٹایا ہے" غالب نے کہا "ہم تو چلے جائیں گے۔ بعد میں پھر اس کی کھال ہو گی اور تمہارا بھس بھرنے کا آلہ۔"

"راجہ صاحب۔ اسے یا ہمیں کسی غیر ملکی یا کسی عزت دار، بے گناہ پر الزام لگانے سے کیا ملے گا؟"

غالب نے ایک طنزیہ قہقہہ لگایا "یہ ہم سے پوچھتے ہو کہ کیا ملے گا۔ ہم اس دیش کے باسی ہیں جس دیش میں گنگا بہتی ہے۔ اور ہمیں معلوم ہے کہ کس تھانے میں کون سی گنگا بہہ رہی ہے اور بہتی گنگا میں کون کون ہاتھ دھو رہا ہے۔ کون ڈبکی لگا رہا ہے اور کون غرق ہو رہا ہے۔ خیرت چاہتے ہو تو چلے جاؤ۔"

غالب نے یہ آخری جملہ اچانک بلند آواز میں یوں بولا کہ تھانے دار چونک پڑا۔ وہ سخت تذبذب کا شکار تھا اور اس کی قوتِ فیصلہ مفلوج ہو رہی تھی۔ وہ باعزت طور پر اس دلدل سے نکلنے کا کوئی راستہ تلاش کرنے میں ناکام تھا۔ اگر وہ اپنی غلطی پر معافی مانگ کے واپس چلا جاتا تو یہ بھی اپنے ماتحتوں کے سامنے اچھا نہیں لگتا تھا اور اس سے زیادہ پریشانی کی بات یہ تھی کہ کہیں اس کے غلط فیصلے سے فائدہ اٹھا کے مجرم نہ نکل جائیں۔ دوسری طرف وہ ہم پر ہاتھ ڈالتے ہوئے ڈر رہا تھا کہ کہیں راجہ صاحب اور غیر ملکی سیاحوں کو حبسِ بے جا میں رکھنے کا جرم اس کی برطرفی کا سبب نہ بن جائے اور اسے تھانے دار کی وردی کے بجائے جیل کے قیدی کا

لباس زیب تن نہ کرنا پڑے۔ وہ راجہ صاحب کے رعب و دبدبے سے بھی اتنا ہی متاثر نظر آتا تھا جتنا اپنے ذہین اور باہمت ماتحت کے دلائل سے۔

بلاشبہ حوالدار اپنے افسر کے مقابلے میں ہوشیار تھا مگر میرے معاملے میں وہ بھی دھوکا کھا گیا۔ یا تو اس نے میری تصویر نہیں دیکھی تھی۔ یا پھر تصویر اتنی پرانی ہو چکی تھی کہ اس کا میرے موجودہ حلئے سے مماثل ہونا اتفاق لگتا تھا۔ ایک ایسا اتفاق جس پر کوئی بھی سنجیدگی سے غور نہ کرتا ہو۔ میرا لباس بھی عجیب تھا اور میرے چہرے پر بے ہنگم داڑھی تھی جو دوسرے ہم سفروں کے جھاڑ جھنکاڑ حلئے سے زیادہ میل کھاتی تھی۔ پھر میری رواں فرنچ میں شور مچانے اور دوسروں کے میرے ساتھ چلّانے سے بھی اداکاری میں حقیقت کا رنگ شامل ہو گیا تھا۔ اٹالین، جرمن، فرنچ اور سوئس سیاحوں کے اس گروپ کو زبان کی بنیاد پر کسی قومیت سے منسوب کرنا مشکل تھا۔ وہ ایک سے لگتے تھے اور پولیس والوں کے لئے انگریز تھے۔ میرا اور اطالوی کا رنگ بہت صاف گندمی تھا اور میں بھی نہ انگریزی جانتا تھا نہ ہندوستانی۔ دو میموں کی موجودگی الگ جذباتی مسئلہ بن گئی تھی۔ ان کے ملبوس کی بے حجابی نگاہوں کو دعوتِ دید دیتی تھی اور ان کے مرمرے تراشے ہوئے بدن دیسی سپاہیوں کی نظروں کو خیرہ کرتے تھے۔

تھانے دار کی قوت مزاحمت یکلخت ختم ہو گئی "چلو واپس سب" اس نے پورے اختیارات کے ساتھ حکم دیا۔

حوالدار نے احتجاج کے لئے منہ کھولا "لیکن سر....."

"تم کون سی زبان سمجھتے ہو سر کے بچے!" تھانیدار نے گرج کے کہا "سنا نہیں میرا حکم۔"

"ہاں، جی سر!" حوالدار نے تلخی سے کہا "سن لیا حکم۔"

تھانے دار نے راجہ صاحب سے کہا "سوری سر۔ وہ دوسرے لوگ ہوں گے جن کے ساتھ مجرم کسی اور طرف نکل گئے۔ ہم تلاش کرلیں گے۔"

غالب نے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا "بھئی ہم تو سب تمہارے سامنے ہیں۔ تم چاہو تو دیکھ لو اندر بھی۔"

غالب نے جُوا کھیلا تھا مگر بازی جیتنے کے بعد۔ تھانے دار نے کہا "نہیں راجہ صاحب۔ ایسی غلطی نہیں کر سکتا میں۔ کل کو آپ بھی لکھ ماریں گے میرے خلاف کہ میں نے وارنٹ کے بغیر تلاشی لی۔ میں تو مارا جاؤں گا۔ آپ کی سُنی جائے گی۔ میری کون سُنے گا۔"

غالب نے ہاتھ آگے بڑھایا "نہیں بھئی۔ جب ہم نے خود ہی اجازت دے دی تھی تو پھر یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ مگر خیر تمہاری مرضی۔ ہمیں کوئی شکایت نہیں تم سے۔ تم نے اپنا فرض ادا کیا۔ لیکن اپنے دائرہ اختیار کے اندر رہ کے۔"

چار پولیس والے واپس گاڑی میں سوار ہو چکے تھے مگر دو منتظر تھے کہ تھانے دار صاحب کی بات ختم ہو تو وہ اپنی بات کہیں۔ وہ رامن کو اٹھاتے اٹھاتے رک گئے تھے۔

"کیا ہوا۔ کھڑے کیوں ہو؟" تھانے دار نے کہا جس نے راجہ صاحب سے مصافحہ کرنے کے بعد مجھ سے اور آخر میں میموں کے گورے گورے ہاتھوں کو تھامنے کا اعزاز حاصل کر لیا تھا اور خاصا مطمئن تھا۔

"یہ۔ مر گیا ہے جی۔"

"مر گیا؟" تھانے دار نے خفگی سے کہا "کیوں مر گیا؟"

رامن کی موت کا سُن کے میرے دل میں بھی دکھ کا ایک کانٹا سا ٹوٹ گیا تھا۔

غالب نے کہا "ہم بتائیں یہ کیوں مر گیا۔ تم نے رات بھر اس کو الٹا لٹکایا ہوگا، ننگا کر کے۔ اسے آگ پر بھونا ہوگا اور برف میں دبایا ہوگا۔ اس میں مرچیں بھری ہوں گی تم نے اور اسے غلاظت کھلائی ہوگی۔ پانی میں غوطے دیئے ہوں گے اور اس پر کودتے رہے ہوگے تم سب۔ یہ ایک لڑکا تھا۔ غریب اور کمزور۔ تختہ ہوتا تو وہ بھی ٹوٹ جاتا۔ پتھر ہوتا تو بکھر جاتا۔ تم نے وحشیانہ تشدد کیا اس پر اور اسے مار ڈالا۔ اب تم ہی پوچھتے ہو کہ یہ کیوں مر گیا۔ یہ سب تمہارے ساتھ ہوتا تو کیا تم مرنے سے پہلے بھی اجازت مانگتے اپنے قاتلوں سے ..... ہم اس کے بارے میں ضرور لکھیں گے۔ ٹائمز آف انڈیا میں پوری رپورٹ دیں گے۔ تصویر کے ساتھ۔ کیمرا" اس نے ٹام کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

ٹام نے گلے میں لٹکا ہوا کیمرا غالب کو پکڑا دیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ تصویر بناتا، رامن کے فریب کا پردہ چاک ہو گیا۔

"یہ زندہ ہے جناب۔ مکر کر رہا تھا حرامی۔ سانس روک لیا تھا اس نے" تھانیدار نے رامن کو ٹھوکر مار کے کہا۔

عین اسی وقت فلیش چمکی۔ وہ منظر کیمرے نے محفوظ کر لیا جس میں دو پولیس والے رکوع کی حالت میں جھکے ہوئے رامن کو بڑی تشویش سے دیکھ رہے تھے اور تھانے دار اسے بڑی سفاک مسکراہٹ کے ساتھ ٹھوکر مار رہا تھا۔ رامن کا زخموں سے چُور کمزور و ناتواں بدن، کمر سے لپٹے ہوئے چیتھڑے کے ساتھ فرشِ خاک پر پولیس کی بربریت کا ثبوت بنا پڑا ہوا تھا اور خود اپنی فریاد تھا۔ خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری۔

تھانے دار نے پریشان ہو کے کہا "راجہ صاحب!"

غالب نے دوسری تصویر بنائی جس میں جیپ کا نمبر بھی صاف نظر آیا ہوگا۔ اب پولیس والوں کی اور تھانے دار کی صورت کے تاثرات بالکل مختلف تھے۔ پہلے فلیش کی چمک نے جیپ میں بیٹھے ہوئے حوالدار کو بھی سر نکال کے جھانکنے پر مجبور کر دیا تھا چناں چہ دوسری تصویر میں اس کی شکل بھی آئی ہوگی۔

"اب تم لے جاؤ اسے۔ راستے میں مار کے گاڑ دو یا اس کو ہر روز مارتے رہو اور زندہ کرتے رہو۔"

تھانے دار نے کہا "راجہ صاحب! ایسا مت کریں۔ ہم سب

ہارے جائیں گے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس کو چھوڑ دوں گا۔"

"تمہارے وعدے پر اعتبار کر کے ہم بھی وعدہ کرلیں کہ نہ کچھ لکھیں گے نہ یہ تصویر تمہارے خلاف استعمال کریں گے۔ اتنے بھی نظر آتے ہیں ہم شکل سے۔ ہمیں معلوم ہے کہ تم اس کو ہی نہیں اس کے پورے خاندان کو نہیں بخشو گے۔ تم اس کی ماں اور بہن کو اٹھا ہی چکے ہو گے۔"

"نہ اس کی ماں ہے راجہ صاحب، نہ بہن۔ یہ تو ایک عادی مجرم ہے۔ جیب کترا تھا پہلے پھر چور بن گیا۔"

"تمہاری مہربانیوں سے۔ تمہارے ساتھ رہے گا تو ایک دن ڈاکو بنے گا اور قاتل بھی" غالب نے تلخ لہجے میں کہا "ہم رگ رگ سے واقف ہیں تم لوگوں کی۔ خود ہمارے علاقے میں کتنا ظلم کرتی ہے پولیس اور فریاد بھی ہم تک نہیں پہنچنے دیتی۔ یہ ہم جانتے ہیں، اگر کسی کی وجہ سے پولیس پر حرف آجائے تو بعد میں اس سے کیسے بدلہ لیا جاتا ہے۔"

اچانک اس نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کے کہا "ہاں ایک صورت میں ہم وعدہ کر سکتے ہیں۔ کہ تمہارے خلاف کچھ نہیں ہوگا۔ اور ہمارا وعدہ کسی سیاست داں کا وعدہ نہیں۔ تمہارا وعدہ نہیں۔ ایک راجپوت کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ اس کی آن ہوتا ہے۔ یہ آن ٹوٹ نہیں سکتی۔"

تھانے دار نے پُرامید لہجے میں کہا "میں سمجھا نہیں آپ کی بات جناب!"

"اسے ہم لے جائیں گے۔ اس کا خود علاج کرائیں گے اور اگر واقعی اس کا گھربار نہیں ہے تو پھر یہ ہمارے خادموں میں شامل ہو کے ہمارے محل میں رہے گا۔ اصطبل میں یا گیراج میں، باغ میں۔ جہاں اتنے لوگ کام کرتے ہیں وہاں یہ بھی کچھ تو کر ہی لے گا۔"

تھانیدار نے سر ہلایا "جیسی آپ کی مرضی سر۔ آپ لے جائیں۔ لیکن یہ بڑا جھوٹا لڑکا ہے، کہیں آپ کو ہمارے خلاف نہ کرے۔"

"اب ہم نے جو کہہ دیا سو کہہ دیا۔ یہ لڑکا ہمیں مجبور نہیں کر سکتا کہ جو قول تمہیں دیا ہے اس سے پھر جائیں۔ یہ جھوٹ بولے یا سچ، تم کو کچھ نہیں ہوگا۔"

جیپ سے سر نکال کے حوالدار نے کہا "سر جی، ذرا ایک منٹ میری بات بھی لیں۔"

تھانے دار نے پلٹ کے دیکھا اور بادلِ ناخواستہ جیپ تک گیا۔ حوالدار نے اس سے آہستہ آہستہ کچھ کہا۔ تھانے دار نے گھوم کے رامن کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ دیر بحث کرتے رہے۔ رامن کو دیکھنے کے بہانے میں اس پر جھک گیا اور اس کی نبض ٹٹولنے لگا۔ انہیں کیسے شک ہو سکتا تھا کہ میں ہندوستانی سمجھ لیتا ہوں۔ میں نے اپنے کان ان کی سرگوشی پر لگا رکھے تھے۔

"میری مانیں..... یہ حرامی ضرور بتائے گا اپنی بہن کے بارے میں۔ ماں تو خیر مر گئی۔"

"مگر میں نے پہلے ہی راجہ صاحب کے کان میں یہ بات ڈال دی ہے کہ یہ جھوٹ بولتا ہے۔"

"راجہ بہت کائیاں ہے۔ وہ سچ معلوم کرا لے گا۔"

"او یار، راجپوت کی آن....."

"سر، یہ نہ ہو کہ اس آن پر آپ اور ہم سب قربان ہو جائیں۔" حوالدار بولا۔

"مگر کیسے؟"

"راجہ صاحب کے پاس تصویریں ہیں۔ یہ گواہ ہیں۔ رامن کے بیان کی مصیبت الگ ہو جائے گی۔"

"پھر کیا کروں میں" تھانیدار جھنجلا کے بولا۔

"آپ راجہ صاحب سے معافی مانگ لیں۔ کہ ایک مجرم کو ان کے حوالے نہیں کیا جا سکتا۔ ہم کیا جواب دیں گے واپس جا کے۔"

"ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ فرار ہو گیا۔ یا مر گیا۔"

"اور بعد میں کیس بن گیا اس کی بہن کا۔ اور ماں کی موت کا۔ خود اس کا۔ تو ہم کیسے بچائیں گے خود کو؟ راجہ صاحب کو جھوٹا کون کہے گا۔ اور ہم سچ کو کیسے جھوٹ ثابت کریں گے۔ تصویر کی کوئی بات نہیں۔ ہم انکار کر سکتے ہیں۔ کہہ سکتے ہیں کہ وہ زندہ تھا۔ اور اسے زندہ بھی رکھ سکتے ہیں۔ اس کی زبان تو نہیں کھلے گی نا ہمارے خلاف۔ راجہ صاحب کے پاس جا کے وہ شیر ہو جائے گا۔ دُہری مصیبت گلے میں پڑ جائے گی۔"

"یار! میں اب کیسے کہوں۔ جاؤ تم بات کرو۔"

"کیوں۔ اب افسر نہیں رہے آپ؟ اس وقت تو حکم چلا رہے تھے۔ جب میں نے بولنے کی کوشش کی تھی تو مجھے چپ کرا دیا تھا۔"

"پھر اب بھی تم چپ رہو۔ جو میں کر رہا ہوں ٹھیک ہے۔"

تھانے دار مشتعل ہو گیا۔ ماتحت کے طنز سے اس کی خفت اور شرمندگی ایک دم غصے میں ڈھل گئی۔

"چلو اوئے۔ اٹھاؤ اسے آرام سے اور پیچھے لٹاؤ۔" تھانیدار نے حکم دیا۔

میں نے حوالدار کو زیرِ لب گالی دیتے سُنا "ایسے کم عقل اور کم ہمت افسر ہی مرواتے ہیں۔"

دونوں سپاہیوں نے رامن کو یوں اٹھایا جیسے کارپوریشن والے گلی سے آوارہ کتے کی لاش اٹھاتے ہیں۔

میں نے فرنچ میں جین سے کہا "تم جا کے دروازہ کھولو اور دیکھو کہ وہ دونوں سامنے نظر تو نہیں آ رہی ہیں۔"

"وہ سامان میں چھپی ہوئی ہیں" جین نے کہا "لیکن ان کے ہاتھوں میں ریوالور ہیں۔"

میں نے تشویش سے غالب کی طرف دیکھا اور اس نے آہستہ سے سر ہلایا۔ دونوں سپاہیوں سے پہلے ہی وہ کاروان کا دروازہ

کھولنے کے لئے آگے بڑھ گیا۔

"ہاں بھئی۔ ادھر لے آؤ آرام سے" اس نے کہا "یہاں پر لٹادو۔ تشویش کی کوئی بات نہیں۔ سب ٹھیک ہے۔"

یہ آخری بات بیک وقت سپاہیوں کو مخاطب کرکے بھی کہی گئی تھی اور گل اور نازو سے بھی ورنہ عین ممکن تھا کہ وہ اسباب کے ڈھیر سے چھپ کر دیکھتی رہیں اور پولیس کی شکل نظر آئے تو بلاوجہ انہیں ہینڈز اپ کرانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوں۔

آخر کار پولیس والوں کی اسٹیشن ویگن ٹائپ جیپ لوٹ گئی اور ہمیں سکون کا سانس لینے کی مہلت ملی۔ یہ سب تھانے دار کی کم ہمتی اور کم عقلی تھی جیسا کہ اس کے ماتحت حوالدار نے کہا تھا ورنہ ہم اتنی آسانی سے گلو خلاصی نہ کرپاتے۔

غالب نے کہا "خیر سے بدھو گھر کو لوٹے۔"

میں نے کہا "مگر یار۔ میرا دل مطمئن نہیں ہے۔ وہ حوالدار مجھے خطرناک لگتا ہے۔ بعد میں موقع ملا تو وہ اپنے شکوک کا صاف اظہار کرے گا اور ممکن ہے اعلیٰ افسران کے سامنے بولنا شروع کردے کہ تھانے دار صاحب ڈر گئے ورنہ ان سب کو ساتھ لا کے تصدیق کی جاسکتی تھی کہ وہ جھوٹ بول رہے ہیں یا سچ۔ فرض کی ادائیگی میں بعض اوقات ناخوشگوار حالات بھی پیدا ہوجاتے ہیں۔ وہ سچے ہوتے تو ان سے معافی مانگی جاسکتی تھی۔"

"وہ اپنے افسر کی شکایت کرے گا؟"

"یار، کتنا فرق ہے ایک حوالدار میں اور ایک پھول والے اے ایس آئی میں۔ حوالدار بھی کوئی نیا ناتجربہ کار اور احمق نوجوان نہیں تھا۔ بہت جلد وہ بھی اسی عہدے پر ہوگا۔ اس کی بات کو افسر بھی اہمیت دیتے ہوں گے۔ خصوصاً وہ افسر جو تھانے دار کی نااہلی کے ریکارڈ سے واقف ہوں گے۔"

"اس کا مطلب ہے ہمیں راستہ بدل لینا چاہئے؟"

میں نے کہا "اتنے بڑے کاروان کے ساتھ ہم گمنام راستوں پر بھی چھپ نہیں سکتے۔ پولیس چاہے تو ہیلی کاپٹر سے بھی دیکھ سکتی ہے۔ سفید اسٹیشن ویگن اور سفید کاروان جنگل میں صاف نظر آئیں گے۔ نیچے ہر طرف سے گاڑیاں ہمارے راستے روک لیں گی۔ ہمیں پتا بھی نہیں چلے گا۔"

"پھر اب کیا کریں؟"

میں نے کہا "ابھی تو نازو اور گل کو آل کلیئر کا سگنل دو تاکہ وہ رامن کو سنبھال لیں۔ میرا خیال ہے کاروان میں فرسٹ ایڈ کا سارا سامان ہوگا اور سب دوائیں ہوں گی۔ ایسے دنیا کی سیاحت کرنے والے ہر چیز ساتھ رکھتے ہیں۔"

"وہ چاروں آپس میں سر جوڑے کیا کانفرنس کررہے ہیں۔ ہمارے خلاف کوئی سازش؟" غالب نے کاروان میں داخل ہوکے کہا۔

میں نے کہا "میں ان کی سازش سے نمٹ لوں گا۔"

مجھے قریب آتا دیکھ کر وہ خاموش ہوگئے۔ ٹام مجھے ان میں سب سے زیادہ کینہ اور کینہ پرور ہی نہیں، بے وقوف بھی لگتا تھا۔ اور نادان دشمن ہی زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ جو سوچے سمجھے بغیر کوئی قدم اٹھاتا ہے تو اپنا نقصان نہیں دیکھتا، سب کو مروا دیتا ہے۔ برٹ نسبتاً ٹھنڈے دماغ کا آدمی تھا مگر اس کی عادت کسی پر حکم چلانے کی نہیں تھی چنانچہ ٹام اگر غلط رائے بھی دیتا تھا تو منوالیتا تھا۔ جین اور ماریا صرف کٹھ پتلی تھیں یا خوب صورت گڑیاں جن کے جسم ہی ان کا سارا اثاثہ تھے۔ وہ اپنی عقل کو کہیں استعمال کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتی تھیں اور شاید اس کی اہل بھی نہیں تھیں۔

"چلو دوستو۔ بلا ٹلی" میں نے خوش دلی سے کہا۔

"یہ بلا نازل ہی کیوں ہوئی تھی؟" ٹام نے کہا۔

"کوئی بلا کسی پر پوچھ کے نازل نہیں ہوتی۔ اگر تم سوچنے بیٹھ جاؤ کہ زلزلہ کیوں آیا تو ملبے میں دب جاؤ گے اور سیلاب کی وجہ دریافت کرتے رہ گئے تو بہہ جاؤ گے۔ اچھی بات یہ ہے کہ ہم عقل سے کام لے کر بچ گئے ورنہ ان کی غلط فہمی....."

"مجھے یقین ہے وہ غلط فہمی کی بنا پر نہیں آئے تھے" ٹام نے میری بات کاٹ دی۔

"جہنم میں جائے تمہارا یقین اور تم" میں نے کہا "میں تمہاری بات کو اہمیت نہیں دیتا۔ تمہیں کیا معلوم کہ ہمارے درمیان کیا بات ہورہی تھی۔ پھر تم نے یہ نتیجہ کیسے اخذ کیا؟"

"پھر تم نے اس مُردہ کتے کی لاش کیوں رکھی؟"

میں نے ٹام کے منہ پر باکسنگ کا پنچ مارا۔ وہ لڑکھڑا کے پیچھے گرا اور منہ پر ہاتھ رکھ کے سہلانے لگا۔ اس کا ہونٹ پھٹ گیا تھا اور منہ سے خون جاری تھا۔ اس کے جبڑے ٹوٹے نہیں تھے مگر دانت ضرور ہل گئے تھے۔ اس نے مجھے خون آشام نظروں سے گھورتے ہوئے اپنے ساتھیوں کو گالی دی "خاموش کھڑے دیکھ رہے ہو تم!"

میں نے کہا "یہ سمجھ دار لوگ ہیں۔ اسی لئے ابھی تک محفوظ ہیں۔ تم کو میں آخری بار تنبیہہ کرتا ہوں کہ کسی بھی پاکستانی، ہندوستانی یا ایشیائی کے بارے میں بات کرتے ہوئے کوئی غلط لفظ منہ سے نہ نکالو ورنہ اگلی مرتبہ میں تمہارا منہ نہیں گردن توڑدوں گا۔ اب اس سے پہلے کہ میں تمہیں لات مار کے اٹھاؤں، تم خود اٹھو اور گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔"

برٹ نے اپنے ساتھی کی مدد کی اور اسے ڈرائیونگ سیٹ پر اپنے ساتھ بٹھالیا۔ ان کے لئے سب سے بڑی مشکل یہ بن گئی تھی کہ میں ان کی زبان سمجھتا تھا چناں چہ نہ وہ میرے سامنے کوئی ایسی ویسی بات کرسکتے تھے اور نہ کھل کر اپنے جذبات کا اظہار کرسکتے تھے۔ لیکن اس کے برعکس ہم اُردو یا انگریزی میں کچھ کہتے تھے تو وہ بے بسی سے منہ تکنے کے سوا کچھ نہیں کرسکتے تھے۔

جین اور ماریا واپس کاروان میں چلی گئیں اور برٹ نے گاڑی

آگے بڑھادی۔ پچھلی نشست پر اب میں اکیلا تھا۔ میں نے ٹانگیں پھیلا کے سگریٹ جلالی۔

"کوئی حماقت کرنے سے پہلے دیکھ لینا کہ میں واقعی سو رہا ہوں یا مکر کررہا ہوں" میں نے کہا "یا مرگیا ہوں۔"

"تم اتنی آسانی سے اکیلے مرنے والے نہیں ہو" ٹام پھر بولا۔

میں نے ہنس کے کہا "تم دعا کرو۔ مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ باقی تین رہ جائیں گے اور ان میں سے ایک لڑکی بچ گئی تو وہ بھی تم چاروں سے نمٹ لے گی۔"

برٹ نے کہا "کیا تم بتاؤ گے کہ پولیس کیوں آئی تھی؟ ان سے کیا بحث ہوئی؟"

میں نے کہا "سوری۔ میں اس موضوع پر بات کرنا پسند نہیں کروں گا۔"

"یہ پوچھنے میں کوئی حرج ہے کہ اس لڑکے کو پولیس تمہارے سپرد کیوں کرگئی؟ جو انتہائی زخمی حالت میں تھا۔"

"حرج تو ہے" میں نے کہا "تم غور کرو تو تمہیں ٹام کا جبڑا سوجا ہوا نظر آجائے گا مگر شرافت سے بات کی ہے تم نے، اس لئے ایک جواب حاضر ہے۔ وہ میرا کزن ہے۔ پولیس نے بڑی مشکل سے ہمیں تلاش کیا اور اسے ہم تک پہنچایا۔ بڑی فرض شناس اور خدمتِ خلق کرنے والی پولیس ہے ہماری۔ خدا ترس اور ایمان دار۔"

"اس میں کیا شک ہے" برٹ نے طنز سے کہا۔

"اب تمہارے تجسس کو رفع کرنے کے لئے میں یہ بھی بتادیتا ہوں کہ میرا یہ کزن کیسے زخمی ہوا۔"

"وہ مجھے معلوم ہے۔"

"تمہیں غلط معلوم ہوا ہے" میں نے اسے ڈانٹ کر کہا۔ "اصل بات یہ ہے کہ وہ جنگل سے گزر رہا تھا۔ اچانک اس پر ایک آدم خور شیر نے حملہ کردیا۔ چوں کہ وہ میرا کزن ہے اس لئے شیر کو بھی گدھا سمجھتا ہے۔ اس نے مقابلہ کیا اور لاتیں مار مار کے شیر کی ہڈیاں توڑ دیں۔ اس میں خود بھی معمولی سا زخمی ہوا۔"

برٹ سامنے دیکھتا رہا۔ ٹام ایک رومال منہ پر رکھے بار بار کھڑکی سے تھوکتا رہا۔ انہوں نے میری فضول بکواس پر کسی قسم کے تبصرے سے گریز کیا۔

"ٹام! کیا تم یہ سمجھ رہے ہو کہ میں نے جھوٹ بولا ہے؟"

ٹام نے مجھے گھور کے دیکھا "میرا دماغ خراب نہیں ہے۔"

"پہلے ثابت کرو کہ دماغ ہے تمہارے پاس" میں نے کہا۔

"اوکے۔ دماغ بھی نہیں ہے میرے پاس۔ تم میرا دوسرا جبڑا توڑنے کا فیصلہ کرچکے ہو تو بہانے تلاش مت کرو" وہ بگڑ کے بولا۔

"تم مجھے بہانے باز کہہ رہے ہو۔ خیر۔ اس وقت میں آرام کررہا ہوں اور پشیمانی کے ردِ عمل کا شکار۔ میں سوچ رہا ہوں کہ اپنے رویّے کی تلافی کیسے کروں۔ میرے دل میں رحم دلی اور دوستی کے جذبات اُبل رہے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے جوابی پنچ مارو اور میرا جبڑا ہلادو۔ اس طرح ہم پھر پرانی دوستی کی سطح پر آجائیں گے۔" میں نے کہا۔

ٹام خون کے گھونٹ پی کے میری باتوں کو نظر انداز کرتا رہا۔ برٹ اسے ضبط سے کام لینے کی تلقین کے طور پر دوستانہ انداز میں ہاتھ سے تھپکی دے چکا تھا۔

ایک گھنٹے بعد جب ہم پچاس کلومیٹر سے زیادہ فاصلہ طے کرچکے تھے، ہمارا گزر ایک قصبے سے ہوا۔ وہاں سے سڑک دائیں اور بائیں جانب دو حصوں میں تقسیم ہوجاتی تھی۔ برٹ نے نقشہ دیکھتے ہوئے دائیں طرف والی سڑک کا انتخاب کیا تھا مگر میں نے اسے بائیں طرف چلنے کا مشورہ دیا۔

اس نے حیرانی سے کہا "مگر یہ سڑک......"

میں نے کہا "یہ نقشہ مجھے دے دو۔ تمہیں اس کے مطابق نہیں، میری ہدایات کے مطابق چلنا ہوگا۔"

"تمہیں معلوم ہے یہ راستہ کہاں لے جائے گا؟"

"ہر راستہ کسی منزل کی طرف ضرور جاتا ہے" میں نے کسی فلسفی کی طرح کہا "اور منزل ہم بدلتے رہتے ہیں۔ سیاحت کا صحیح لطف ہی تب آتا ہے جب آدمی لکیر کا فقیر نہ ہو۔ بلکہ بے مہار اونٹ ہو۔ جدھر جی چاہا نکل گئے۔ راستہ گم کرنے میں بڑا ایڈونچر ہے۔"

"تمہارے لئے ہوگا۔ ہم ایک پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق چل رہے تھے" ٹام نے کہا "کہ ہمیں کس وقت کہاں ہونا چاہئے۔ اور کب واپس پہنچنا چاہئے۔"

"وہ سب بھول جاؤ" میں نے مشورہ دیا "سفر میں ایسے غیر متوقع حادثات پیش آجاتے ہیں تو پروگرام بدل جاتا ہے۔"

"کیا تم سمجھتے ہو کہ اس طرح ہماری مرضی کے خلاف ہمیں کہیں زبردستی لے جانا اغوا کہلائے گا۔ اغوا بہت سنگین جرم ہے۔"

"ہم اس سے کہیں زیادہ سنگین جرائم کا ارتکاب کرچکے ہیں اور اس ملک کے قانون کو تم سے بہتر سمجھتے ہیں۔"

"کیا ہے اس ملک کا قانون؟" ٹام نے کہا۔

"وہی جو ساری دنیا میں رائج ہے۔ اس وقت بھی رائج تھا جب تمہارے دادا، پردادا جانوروں کی طرح غاروں میں رہتے تھے۔ اور آج بھی ہے جب اکیسویں صدی کی جانب گامزن مہذب انسان نے خلا کو تسخیر کرلیا ہے۔ یہ ہے لاٹھی اور بھینس کا قانون۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ انگریزی میں کہتے ہیں مائٹ از رائٹ۔ چنانچہ... یہ جو اقوام متحدہ ہے نا اس کی سلامتی کونسل میں سب لاٹھی والے شامل ہیں۔ بڑے اور طاقت ور ممالک۔ سپرپاورز۔ جو وہ کہتے ہیں وہی درست قرار پاتا ہے۔ جو وہ چاہتے ہیں وہی ہوتا ہے۔ وہ نہ چاہیں تو انصاف بھی نہیں ہوتا اور کشمیر یا فلسطین کے رہنے

والوں کے حق کی بات پر ویٹو کی تلوار چل جاتی ہے۔ تم سفید فاموں نے ایک مائٹ از رائٹ سوسائٹی بنالی ہے چناں چہ مستند ہے تمہارا فرمایا ہوا۔ یہاں ہم نے ایک مائٹ از رائٹ سوسائٹی بنالی ہے جس کے ہم سب معزز اراکین ہیں اور جو ہم کہتے ہیں وہ صحیح ہوتا ہے۔ وہی قانون ہوتا ہے اور انصاف کا پیمانہ بھی۔ اس لئے مائی ڈیئر ٹام ڈک اینڈ ہیری۔ حکم مانو' حق اور انصاف کی بات مت کرو۔ سمجھ لو کہ ہم سپرپاورز ہیں اور تم افریقہ ایشیا کی تیسری دنیا کے ممالک ہو۔"

ٹام اور برٹ اس سچ کے زہر کو خاموشی سے پینے پر مجبور تھے۔ گاڑی اب کسی بے نام سڑک پر رواں تھی اور اس راستے پر آہستہ آہستہ درختوں کی تعداد بڑھ رہی تھی۔ سڑک تنگ' ٹوٹی پھوٹی اور ویران تھی۔ اس پر اتنی بڑی لینڈروور اور کاروان کو چلانا بہت مشکل کام تھا۔ آدھے گھنٹے میں ہم نے اس سڑک پر کوئی تانگہ' ریڑھا یا بیل گاڑی گزرتے نہیں دیکھا تھا۔ اور میں سوچنے لگا تھا کہ کہیں اس راستے پر آکے ہم نے کوئی غلطی تو نہیں کی۔ ایسا نہ ہو' اچانک ہم کسی خطرناک یا ممنوعہ علاقے میں داخل ہوجائیں۔

سڑک اچانک ختم ہوگئی۔ گھنا جنگل جو ہمارے دائیں بائیں ساتھ تھا' سامنے بھی آگیا۔ ایک بہت بڑے درخت کے گرنے سے راستہ مسدود ہوگیا تھا۔ درخت شاید کئی مہینے پہلے گرا ہوگا۔ یہ اس کے تنے کا ایک حصہ تھا۔ دوسرا حصہ ابھی تک تنے کے ساتھ پیوستہ تھا مگر تنے کے ساتھ ہی جھک گیا تھا۔ درخت کے آس پاس جھاڑیوں اور خودرو گھاس کے اُگنے سے سڑک غائب ہوگئی تھی اور اگر آگے کہیں پھر شروع ہوتی تھی تو وہ بھی نظر سے اوجھل تھی۔ سیدھے یا الٹے ہاتھ کی طرف سے راستہ کاٹ کے نکلنا بھی مشکل تھا۔ اسٹیشن ویگن اور کاروان کو گزارنے کے لئے جتنی جگہ درکار تھی' وہ درختوں کے درمیان کہیں نہ تھی۔ درخت بہت قریب ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے اور ان کے بیچ کا خلا بھی جھاڑ جھنکاڑ سے بھرا ہوا تھا۔ اس گھنے جنگل سے آدمی پیدل گزر سکتا تھا یا پھر جیپ میں گھوم پھر کے راستے کی تلاش جاری رکھ سکتا تھا۔

"اب کیا حکم ہے مسٹر مائٹ؟" ٹام نے تلخی سے کہا۔

"تم مسٹر مائٹ اور تمہارا ساتھی مسٹر رائٹ" برٹ نے ٹام کے لہجے کی ناگوار تلخی کو مذاق کا رنگ دے دیا۔

میں نے نیچے اتر کے گرد و پیش کا جائزہ لیا اور سگریٹ کا دُھواں چھوڑتے ہوئے کہا "یہ جگہ ہمیں پسند آئی۔"

کاروان سے غالب باہر نکلا "کیا ہم راستہ بھول گئے ہیں؟"

میں نے کسی فلسفی کی طرح کہا "ہم سب صراطِ مستقیم سے بھٹک چکے ہیں۔ آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا۔ میری نظر قربِ قیامت کی نشانیاں دیکھ رہی ہے مرزا غالب۔ رامن کا کیا حال ہے؟"

"ممکن ہے وہ بچ جائے۔ ممکن ہے وہ مرجائے۔"

"گویا تیسری صورت کوئی نہیں" میں نے غور کرتے ہوئے کہا۔

ٹام اور برٹ گاڑی سے اتر آئے تھے اور سخت بے بسی کے ساتھ اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ آغازِ سفر سے پہلے انہوں نے سوچا بھی نہ ہوگا کہ وہ کہیں اتنے بے اختیار بھی ہوجائیں گے۔ وہ دنیا کی سیر کے لئے نکلے تھے اور ہنستے کھیلتے بے فکری سے اپنے پروگرام کے مطابق بڑھتے جارہے تھے کہ بدبختی نے انہیں ہماری طرف دھکیل دیا اور وہ لالچ کے جال میں پھنس گئے۔ اب عملاً وہ ہماری قید میں تھے اور انہیں یہ بھی یقین کرنا مشکل ہوگا کہ کبھی پھر وہ آزادی سے اپنے سفر پر روانہ ہوسکیں گے۔ ان حالات میں یہ خدشات غلط نہ تھے کہ ہم انہیں اس ویرانے میں مار کے دفن بھی کرجائیں گے تو کسی کو کبھی کچھ معلوم نہیں ہوگا۔

جین اور ماریا باہر آئیں تو خوف سے ان کی حالت غیر تھی۔ وہ ہم سے بچ کر ٹام اور برٹ کے ساتھ جا کھڑی ہوئیں۔

"یہ کیا ہے آخر۔ ہم کہاں ہیں؟" جین نے کہا۔

"جہنم میں۔ شاید اس سے بھی بدتر جگہ ہے" ٹام نے کہا۔

"یہ لوگ یہاں کیوں لائے ہیں ہمیں؟" ماریا نے کہا۔

"بے وقوف عورت!" ٹام نے بِھنا کے کہا "دیکھتی نہیں یہ کتنی اچھی جگہ ہے۔ سرسبز و شاداب' پرسکون اور الگ۔ دفن ہونے کے لئے ایسی جگہ کسے میسّر آتی ہے۔"

"شٹ اپ ٹام!" برٹ نے کہا۔

"ایسا نہیں ہوسکتا۔ تم غلط سمجھ رہے ہو" جین بولی۔

"نہیں۔ میں بالکل ٹھیک سمجھا ہوں۔ اب ان کے لئے ضروری ہوگیا ہے کہ ہمیں قتل کردیں" ٹام نے کہا "کیوں کہ ہم سب کچھ جان گئے ہیں۔ ان کے لئے خطرہ بن گئے ہیں۔ یہ سڑک پر ہمیں قتل کرکے ہماری لاشیں....."

"خدا کے لئے ٹام....." ماریا چلّائی۔

"لاشیں کہاں پھینکتے؟ یہاں ہمیں لانے کا مقصد ہی یہ ہے کہ قتل کرکے گاڑ دیا جائے" ٹام نے اپنی بات جاری رکھی۔

غالب نے کہا "کیا فرمایا ہے انہوں نے؟"

میں نے مسکرا کے کہا "فرماتے ہیں کہ ہم انہیں یہاں قتل کرکے دفن کرنے کے لئے لائے ہیں۔"

اب گل کے ساتھ نازو بھی کاروان سے باہر آگئی تھی "کیوں بلاوجہ انہیں دہشت زدہ کرتے ہو۔ بتادو کہ ہمارا ایسا کوئی ارادہ نہیں" غالب نے کہا۔

"ابھی سے کیسے بتادوں" میں نے کہا "کیا پتا انہیں سچ مچ مارنا پڑجائے۔"

"یار' جب آدمی کو موت سامنے نظر آنے لگتی ہے تو وہ مرنے سے بھی نہیں ڈرتا۔ مرنے سے پہلے مارنے کی سوچتا ہے۔ اور خطرناک ہوجاتا ہے" غالب نے کہا۔

"ہم انہیں یقین نہیں دلا سکتے کہ ہمارے ارادے بہت نیک ہیں" میں نے کہا۔

"کوشش تو کرسکتے ہیں۔"

میں نے کہا "اچھا۔ کوشش کرتا ہوں میں" اور پھر ان سے مخاطب ہوگیا۔

"حضرات اور خواتین!" میں نے کہا "میرے ساتھی یہ چاہتے ہیں کہ میں تم سب کو اپنی نیک نیتی کا یقین دلاؤں۔ یہ بتاؤں کہ ہم یہاں صرف اس لئے آئے ہیں کہ تعاقب کرنے والوں کی نظر سے اوجھل ہوجائیں۔ ہم سڑک پر چلتے رہتے تو آگے ہر قدم پر نئی مشکل کا سامنا ہوتا۔ کہیں نہ کہیں ہم گرفتار ہوجاتے۔ ابھی ایک پولیس پارٹی ناکام لوٹ گئی۔ دوسری زیادہ قوت اور وسائل کے ساتھ آسکتی تھی۔ وہ ہیلی کاپٹر کی مدد سے ہمیں تلاش کرلیتے یا آگے کہیں پورے بکتربند ڈویژن کے ساتھ گھیرے میں لے لیتے۔ یہ جگہ ایسی ہے کہ یہاں کوئی ہم تک آسانی سے براہ راست نہیں پہنچ سکتا۔"

"تم نے ایسا کیا جرم کیا ہے کہ پولیس تمہیں گرفتار کرنا چاہتی ہے؟" ٹام نے کہا۔

"غالباً میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ اس موضوع پر کسی بھی سوال کا جواب نہیں دیا جاسکتا۔ تم جو چاہو فرض کرسکتے ہو۔ کسی وجہ کے بغیر پولیس کسی کا یوں پیچھا نہیں کرتی" میں نے کہا "تم اپنے دماغ سے فضول خیالات کو دور رکھو اور صرف تعاون کرو تو میں وعدہ کرسکتا ہوں کہ بہت جلد تم بخیروعافیت اپنا سفر پھر شروع کرسکوگے۔"

"تم اور تمہارا وعدہ!" ٹام نے تلخ لہجے میں کہا۔

میں نے اسے کالر سے پکڑ کر کھینچ لیا اور اوپر اٹھا کے زمین پر دے مارا "مجھے جھوٹا کہہ رہے ہو تم؟ کیا میں ڈرتا ہوں تم سے کہ جھوٹ بولوں گا؟ کیا تمہیں شوٹ کردینا میرے لئے مشکل ہے؟ کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے میرا اگر میں تم سب کو یہاں گاڑ جاؤں؟ مگر میں وہی کرتا ہوں جو کہتا ہوں۔ جب میں بتارہا ہوں کہ بہت جلد تمہیں آزاد کردیا جائے گا تو تمہیں یقین کرنا چاہئے۔"

برٹ نے ٹام کو سہارا دے کر اٹھایا "تم کو اس کی بات پر اتنا مشتعل نہیں ہونا چاہئے۔ یہ تیز مزاج ہے۔ احمق ہے۔ میں یقین کرتا ہوں تمہاری بات کا اور تمہیں یہ بھی یقین دلا سکتا ہوں کہ نہ ہماری طرف سے عدم تعاون کا مظاہرہ ہوگا اور نہ دشمنی کے جذبات کا۔ اپنی جان بچانے کے لئے ہم تمہاری ہر ممکن مدد کریں گے۔ آگے تمہاری مرضی۔"

"برٹ' تم سمجھ دار آدمی ہو۔ اگر تمہارے وہی حالات ہوتے جو ہمارے ہیں تو شاید تم اتنے ٹھنڈے دماغ سے کام نہ لیتے۔ تم ہمیں مار کے اپنی جان چھڑاتے۔ اپنے دماغ پر کوئی بوجھ نہ رکھتے۔ مگر یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ ہم وہ بے ضمیر پیشہ ور مجرم نہیں ہیں جو کسی کو قتل کرتے ہوئے اتنا بھی نہیں سوچتے جتنا کسی درخت کی ٹہنی سے ایک پتہ توڑتے ہوئے۔ تم سب کو قابو میں رکھو۔ میں پھر تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ حالات ایسے نہیں رہیں گے۔ آخرکار ہم اپنے راستے پر چلے جائیں گے اور تم اپنی مرضی سے کہیں بھی جا سکوگے۔"

"تھینک یو۔ ایک وعدہ میں بھی کرتا ہوں۔ ہم کبھی کسی کے سامنے تم سے ملاقات کا اعتراف نہیں کریں گے۔ اور نہ خود کسی سے تمہارے بارے میں کچھ کہیں گے۔ جب تک ہم واپس وطن نہیں پہنچ جاتے" برٹ نے کہا۔

"آل رائٹ۔ اب اس سے پہلے کہ بارش شروع ہو' درختوں سے شاخیں توڑ کے اسٹیشن ویگن کی اور کاروان کی چھت پر پھیلادو۔ سائیڈ میں لگادو۔"

"تم اسے کیموفلاج کرنا چاہتے ہو۔ میں سمجھ گیا۔"

"ہاں۔ مجھے یقین ہے کہ ہماری تلاش کے لئے ہیلی کاپٹر ضرور استعمال ہوں گے۔ اس وقت بادل ہیں' اوپر زیادہ بلندی سے نیچے کا منظر دُھند اور غبار میں صاف نظر نہیں آسکتا۔ وہ کم بلندی پر رہ کے دوربین سے دیکھنے کی کوشش کریں گے۔ انہیں جنگل میں کوئی سفید دھبّہ بھی نظر نہیں آنا چاہئے۔ گھنے درختوں کے درمیان یہ کوئی مشکل یا ناممکن کام نہیں۔"

ہم نے یہ کام ان کے ساتھ مل کے کم سے کم وقت میں پورا کیا۔ اس سے مجھے یہ اطمینان حاصل ہوگیا کہ فوری طور پر ہماری تلاش میں کامیابی ممکن نہیں رہی۔ ابھی تک ہم نے جس راستے پر سفر کیا تھا اس پر ہم بہت سے سراغ چھوڑ آئے تھے۔ انہی کی مدد سے پولیس نے رامن کو پکڑ لیا تھا اور پھر اس سے تشدد کے ذریعے معلومات حاصل کرلی تھیں۔ ہمیں بہت سے لوگوں نے چار غیر ملکیوں کے ساتھ دیکھا ہوگا۔ وہ سب ہماری نشان دہی کرسکتے تھے اور ایک نااہل تھانے دار کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے بعد اس بات کے امکانات بڑھ گئے تھے کہ اب اعلیٰ سطح پر تحقیقاتی ادارے ہماری تلاش کے لئے نئی حکمتِ عملی وضع کریں گے۔ ان کے لئے ہمارے راستے کا تعین کرنا آسان ہوگا اور جب اس راستے پر ہمارا سراغ نہیں ملے گا تو وہ آس پاس کا سارا علاقہ چھان ماریں گے۔ اس یقین کے ساتھ کہ ایک اسٹیشن ویگن اور اتنے ہی بڑے کاروان سمیت روپوش ہونا عملاً ناممکن کام ہے۔

ہم اپنے کام سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ گہرے کالے بادل چھلک پڑے اور موسلا دھار بارش نے ہمیں کاروان کے اندر پناہ لینے پر مجبور کردیا۔ کاروان کسی پختہ کمرے کی طرح تھا۔ اندر ہم بالکل محفوظ رہے۔ گل نے مختصر سے کچن میں گیس کا چولھا جلا کے کافی بنائی اور لنچ میں ہم نے پھر ناشتے کا بچا ہوا سامان استعمال کیا۔ اندر کم جگہ ہونے کے باوجود ہم دو گروہوں میں بٹ کر بیٹھ گئے تھے۔ جین اور ماریا بوتل سے منہ لگا کے پی رہی تھیں اور نشے کی خود فراموشی میں سارے غموں کو بھلانے کی کوشش کررہی تھیں۔

آہستہ آہستہ وہ فکرِ فردا اور غمِ دوش سے بیگانہ ہوگئیں اور زور زور سے ہنسنے لگیں اور باتیں کرنے لگیں۔ اچھی بات یہ تھی کہ میرے سوا کوئی ان باتوں کا مطلب نہیں سمجھ رہا تھا ورنہ صورت حال خراب ہوجاتی۔ نشے نے ان کی زبانوں کو آزاد کردیا تھا اور ان کی تمام گفتگو محض فحاشی کے زُمرے میں آتی تھی۔ ٹام بھی پی رہا تھا مگر نشے نے اسے اتنا سنجیدہ کردیا تھا کہ وہ مغموم نظر آتا تھا۔ اس نے دونوں لڑکیوں کو چپ کرانے کی کوشش کی۔

"کیوں ہنسی آرہی ہے تمہیں؟ بہت انجوائے کررہی ہو اس صورت حال کو؟"

برٹ نے اسے روک دیا "انہیں مت ٹوکو' اس طرح یہ ایزی ہوجائیں گی۔ انہیں ریلیکس کرنے دو۔"

ٹام کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے "معلوم نہیں کوئی کیسے ریلیکس کرسکتا ہے' جب موت سامنے ہو اور قاتل آزاد ہوں۔ معلوم نہیں میں گھر سے نکلا ہی کیوں تھا۔"

"معلوم نہیں تم پیدا ہی کیوں ہوئے تھے" جین اس کا مذاق اُڑانے لگی "کون سا گھر تھا تمہارا ٹام؟"

ٹام نے کہا۔ "ہم شادی کرلیتے تو ہمارا گھر ہوتا۔ ہم کبھی گھر سے نہ نکلتے۔ تم دونوں نے انکار نہ کیا ہوتا تو آج میں یہاں بیٹھا قسمت کو نہ روتا۔"

"پھر میں اپنی قسمت کو روتی" جین نے ہنس کے کہا۔

رامن دونوں طرف کی بینچوں کے درمیان ساکت لیٹا ہوا تھا اور اس کی حالت بتدریج بگڑتی جارہی تھی۔ ہم اس کے لئے جو کچھ کرسکتے تھے' کرچکے تھے۔ اگر فوری طور پر اسے انتہائی نگہداشت کے کسی وارڈ میں رکھا جاتا تو شاید وہ بچ سکتا تھا مگر یہاں وہ کاروان کے فرش پر لیٹا ہچکولے کھارہا تھا اور پولیس کے تشدد کا عذاب جھیلنے کے بعد سفر کی صعوبت برداشت کرنے پر مجبور تھا۔

میں نے کئی بار اس سے پوچھنا چاہا کہ وہ ہمیں اپنے ساتھ ہونے والے وحشیانہ مظالم کے بارے میں کچھ بتائے۔ یہ بتائے کہ پولیس نے اسے کیسے پکڑا تھا۔ اس کی بہن کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔ اور وہ اب کہاں ہے۔ اس کی ماں کیسے مرگئی تھی۔ مگر اس کی آنکھیں بند رہیں اور لب خاموش رہے۔

رات کو کسی وقت وہ خاموشی سے مرگیا۔ ہمیں بالکل پتا نہ چلا کہ اس تنِ داغ داغ کے زنداں سے روح نے کب آزادی حاصل کی اور رامن کے لئے دنیاوی عذاب کب ختم ہوا۔ ایک بار اچانک میں نے محسوس کیا کہ سانس کی آمدورفت کی علامات مفقود ہیں اور نبض دیکھنے سے مجھے اس کی موت کا یقین آیا۔ اس کا بدن ابھی تک گرم تھا۔ شاید ایک منٹ پہلے یا چند سیکنڈ پہلے وہ زندہ تھا۔

اس کی موت نے گل اور نازو کے اعصاب کو جھنجوڑ ڈالا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگیں۔ صدمہ مجھے اور غالب کو بھی تھا مگر ہم نے گل اور نازو کو تسلی دینے کے لئے خود رونے سے اجتناب کیا۔ ٹام اور برٹ کے ساتھ دونوں لڑکیاں بھی ہمیں تعجب سے دیکھتی رہیں۔ ان کے لئے رامن جیسے کسی بے مایہ اور لاوارث شخص کے لئے آنسو بہانا بھی آنسوؤں کا زیاں تھا۔

میں نے ٹام اور برٹ کو اشارہ کیا "چلو اٹھو۔ ہمیں اس کی تدفین کرنی ہوگی۔"

ٹام نے غصے سے کہا "اس وقت۔ بارش میں۔"

میں نے کہا "تم مٹی کے پتلے نہیں ہو کہ پانی میں گھل جاؤ گے"

"کیا ضرورت ہے آخر اس کی....."

"جب تم مروگے تو تمہیں دفن کرنا نہ کرنا تمہارے ان لواحقین کی مرضی ہوگی۔ ابھی یہ میری مرضی کی بات ہے۔ اگر تم شرافت سے نہ اٹھے تو میں تم کو بھی اس کے ساتھ دفن کردوں گا۔" میں نے دہاڑ کے کہا۔

وہ بادل ناخواستہ اٹھے۔ شدید بارش میں ہم نے ایک جگہ تلاش کی جو درختوں کے نیچے تھی۔ وہاں ایک گڑھا پہلے سے موجود تھا۔ ہم نے رامن کو اس میں لٹایا اور اس کے اوپر مٹی' خس و خاشاک اور پتھر پھیلادیئے۔ یہ آخری رسوم نہ ہمارے عقیدے کے مطابق تھیں اور نہ رامن کے مذہب کے مطابق مگر ہم نے اس کی لاش کو جنگلی جانوروں کی دستبرد سے محفوظ کردیا تھا۔

ہم بھیگے ہوئے سخت بوجھل دل کے ساتھ واپس آئے اور پھر خاموش بیٹھ گئے۔ گل اور نازو آنسو بہا کے چپ ہوگئی تھیں مگر ہماری طرح ڈیپریشن کا شکار تھیں۔ رامن کی موت کے جذباتی صدمے نے ان سے قوت برداشت چھین لی تھی اور ماحول کی مُہیب وحشت ان کے حوصلے پست کررہی تھی۔ باہر بارش کا شور تھا مگر اندر سکوت تھا۔ اور ہم سب اپنی اپنی سوچ کے آزار میں مبتلا تھے۔ آخرکار گل نے اس سکوت کو ایک آہ بھر کے ختم کیا۔

"بھائی سکندر! کیا ہم کبھی......"

"کبھی کیا؟" میں نے کہا "جو کہنا ہے کہہ دو۔"

"نہیں۔ کچھ نہیں" وہ سر جھکا کے ایک پاؤں کے ناخن صاف کرنے لگی۔

"میں سمجھ گیا گل۔ تم پوچھنا چاہتی ہو کہ ہم یہاں سے کب نکلیں گے اور کیسے۔ نکل کے کہاں جائیں گے۔ آگے یا واپس اسی راستے پر' جس پر چل کے ہم یہاں تک پہنچے ہیں۔"

"واپس کیسے جاسکتے ہیں ہم؟" غالب نے کہا۔

"جیسے رابعہ چلی گئی" نازو نے کہا۔

میں نے اسے حیرانی سے دیکھا "یہ تم کہہ رہی ہو نازو۔ کیا میں نے روک رکھا ہے تمہیں؟ تم جب چاہو جاسکتی ہو۔ اکیلی یا غالب کے ساتھ۔ مگر مجھے آگے جانا ہے۔ میں اکیلا بھی جاؤں گا۔ محسن میرا انتظار کررہا ہوگا۔ میں اس کے بیوی بچوں کو نہ بچا سکا یہی دکھ کیا کم ہے۔ محسن کو کیسے چھوڑ جاؤں میں....."

"میں آپ کے ساتھ ہوں بھائی سکندر" گل نے کہا۔

"تو کیا میں نازو کے ساتھ واپس جارہا ہوں؟" غالب نے برہمی سے کہا "یہ جاتی ہے تو جائے۔ جہنم میں جائے۔"

نازو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ ہسٹریا سے مغلوب ہوگئی تھی "دیکھو ذرا ہم اس وقت کہاں ہیں' کیا ہیں۔ کہاں گیا وہ مقصد جو بہت عظیم تھا؟ کہاں ہے ہمارا عزم اور حوصلہ؟ ہم اپنی جان بچاتے پھر رہے ہیں۔ ہر طرف سے شکاری آگے بڑھتے چلے آرہے ہیں اور ہم بھاگتے رہنے کے سوا کچھ بھی نہیں کرسکتے۔ اس سے تو بہتر ہے کہ ہم مقابلہ کریں اور مارے جائیں۔ آخر کب تک اس بزدلی کے ساتھ جئیں گے ہم۔ فرار کے راستے بھی تو بند ہوتے جارہے ہیں۔"

میں نے محسوس کیا کہ اس وقت نازو کو تسلی اور دلاسے کی ضرورت ہے۔ یہ شدید مایوسی کا ردِعمل تھا کہ وہ اپنی فطرت کے خلاف باتیں کررہی تھی۔

"یہ لڑکی کیوں رورہی ہے؟" جین نے کہا۔

میں نے اسے سختی سے جھڑک دیا "تم اسے سنبھالو جو تمہارے سامنے بیٹھا آنسو بہارہا ہے۔ ہماری فکر مت کرو۔"

"یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا۔ اپنے ساتھ ہمیں بھی مروا دیا تم نے" ماریا نے چیخ کر کہا اور شراب کی خالی بوتل میرے سر پر مارنے کے لئے لپکی "تم منحوس شیطان...."

میں نے ایک جھانپڑ مار کے اسے واپس کردیا۔ وہ ٹام پر گری اور ٹام نے اسے سنبھال لیا "کم آن بے بی۔ ان لوگوں سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ مجھ سے بات کرو۔ بولو تم کروگی مجھ سے شادی جب ہم واپس جائیں گے۔"

"ہم کبھی واپس نہیں جائیں گے۔ مجھے معلوم ہے" ماریا نے زاروقطار روتے ہوئے کہا۔

غالب نے اب نازو کو خاموش کرانے کی کوشش کا آغاز کردیا تھا۔ اس نے نازو کے آنسو پونچھے اور اسے تسلی دینے لگا۔

"نازو' میری جان۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ بہت جلد۔ یہ تو ہوتا ہے زندگی میں۔ ناکامی کے بغیر کامیابی کا تصور ہی ممکن نہیں۔ آزمائش کا یہ دور کچھ طویل ضرور ہوگیا ہے مگر اس سے بددِل ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں تو اپنے حوصلے کا سرمایہ ایسے ہی آڑے وقت میں استعمال کرنا چاہئے۔"

میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا "بہت جلد ہم سب پھر اکٹھے ہوجائیں گے۔ سوچو' ہم نے مل کے کتنے معرکے سر کئے تھے۔ کہاں کہاں وطن کے دشمنوں کو شکست دی تھی۔ ان کی بے پناہ طاقت کے غرور کو خاک میں ملایا تھا۔ اپنی ہر کامیابی کا شمار کرو اور سوچو کہ کیا ہم خسارے میں رہے؟ کچھ لوگ ہم سے ضرور بچھڑے۔ بڑے اچھے لوگ تھے سب۔ استاد ٹیڈی سے لے کر شہلا تک۔ شیش ناگ جیسے ڈاکو سے لے کر اس معصوم بچے تک جو شہلا اور محسن کی محبت کا ثمر تھا۔ مگر ان کی موت بھی کتنی اچھی تھی۔ ایک مقصد کی خاطر جان دی سب نے۔ اور یہ مقصد ان کے جذبے سے عظیم تھا۔ وہ سب شہید ہوئے' ان کو مُردہ مت سمجھو۔ وہ ہمارے درمیان نہ سہی ہمارے ساتھ ضرور ہیں.... اور ہمیشہ رہیں گے۔"

پھر غالب نے کہا "دیکھو' یہ گل کتنی پُرسکون ہے اور پُرامید ہے۔ حالاں کہ یہ پہلے ناگ منی تھی۔ گل بانو بن کے اس نے کیا پایا' یہ اس سے پوچھو۔ ہم سب نے کچھ کھو کے بہت کچھ پایا ہے۔ اور جو پایا ہے اسے سفر کے اس مرحلے پر گنوا نہیں سکتے۔"

"یوں سمجھو کہ سفر کی پہلی منزل ہم نے بہت پہلے پالی تھی' جب ہم نے اپنے وطن کی سرحد عبور کرکے دشمن ملک کی زمین پر قدم رکھا تھا۔ دوسرا مرحلہ ہم طے کرچکے ہیں۔ ہم نے دلاور اور تریوینی کے اتحاد کو انتشار میں بدل دیا ہے۔ ان کی ہر مذموم کوشش کو ناکام بنا کے۔ اتنے وسائل اور اتنی قوت رکھنے والے' اسلحے کی ایک بھی کھیپ مشرقی پاکستان نہیں پہنچا سکے۔ انہوں نے کروڑوں کا نقصان اٹھایا اور ہمیں اپنے راستے سے ہٹانے کے لئے کیا کچھ نہیں کیا۔ مگر آج کامراں کون ہے؟ تریوینی روتا ہے کہ دلاور نے اسے تباہ کردیا۔ دلاور کا سب سے بڑا دشمن وہ خود ہے۔ اور دلاور رلا پتا ہے۔"

میں نے محسوس کیا کہ ان حقائق کا اعادہ ناامیدی کی دھند صاف کررہا ہے اور مایوسی کے ردِعمل کا بوجھل پن ختم کررہا ہے۔ آہستہ آہستہ نازو کا اور اس کے ساتھ گل کا چہرہ مستقبل پر یقین کی روشنی سے منور ہونے لگا۔ جذباتی کمزوری کی جس لہر نے نازو کو احساسِ شکست سے دوچار کیا تھا وہ گزر چکی ہے۔ نازو کی کیفیت ڈراؤنا خواب دیکھنے والے جیسی تھی جو آنکھ کھلنے کے بعد خدا کا شکر بجالاتا ہے کہ وہ محض خواب تھا اور زندگی تو وہی ہے۔ جینے کے قابل پُرکشش اور ایک مقصد۔ مقصد کے لئے جدوجہد اور جدوجہد کے انعام کا سلسلہ۔

میں نے اپنی بات جاری رکھی "یہاں سے ہمارے سفر کا تیسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ اب ہم مشرقی پاکستان پہنچ کے اس جہاد میں شریک ہوں گے جو ہمارے ہم وطن غداروں کے خلاف کررہے ہیں۔ بیرونی مداخلت کار۔ تخریب پسند اور علیٰحدگی کے جذبات کی آگ بھڑکانے والوں کے خلاف۔ ان کے خلاف جنہوں نے روزِ اوّل سے پاکستان کے وجود کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ آج بھی مسلم قومیت کے اجتماعی شعور سے خائف رہتے ہیں۔ ڈرتے ہیں کہ کہیں اسلام کا رشتہ اتنا مضبوط نہ ہوجائے کہ مسلم ممالک کا بلاک سب سے بڑی سُپر پاور بن جائے۔ اس رشتے کو سبوتاژ کرنے کے لئے وہ ساری دنیا میں سرگرمِ عمل ہیں۔ وہ اسرائیل کے ہاتھوں عربوں میں انتشار پیدا کرتے ہیں۔ مغربی اور مشرقی پاکستان کو الگ کرنا چاہتے ہیں۔ ایران عراق کے درمیان شط العرب کا جھگڑا ہو یا کشمیر کا مسئلہ۔ سب کی زد میں مسلمان ہی آتے ہیں۔"

غالب نے کہا "بس چند دن میں ہم مشرقی پاکستان میں ہوں گے اور پھر منظم ہو کے سرگرم عمل ہو جائیں گے۔ وہاں محسن بھی ہوگا اور پیارے میاں ہوں گے۔ ہمارے ساتھ ہزاروں نہیں لاکھوں کروڑوں ہوں گے۔ جیسے ہم یہاں اکیلے اور بے سہارا تھے ' ایسے وہاں بے بس نہیں ہوں گے۔ جیسے یہاں چھپتے پھرتے ہیں اور مسلسل فرار کے عذاب میں مبتلا ہیں۔ ایسا وہاں نہیں ہوگا"

میں نے کہا "اور یہ فرار بھی جنگ کا حصہ ہے۔ ہر فوج کو کسی نہ کسی محاذ پر پسپا بھی ہونا پڑتا ہے۔ پسپائی کا مقصد اگر موت کا خوف ہو یا جنگ سے منہ موڑنا ہو تو وہ بزدلی ہے مگر اس کا مقصد پھر منظم ہو کے نئی حکمتِ عملی کے ساتھ دشمن پر حملہ کرنا ہو تو یہ عقل مندی ہے۔ جانتے بوجھتے موت کے منہ میں جانا بھی خود کشی کے مترادف ہے اور خود کشی حرام ہے۔ ہم خود کشی نہیں کر سکتے۔ اپنا دفاع کرتے ہوئے خود کو محصور نہ ہونے دینا اس وقت ہمارا واحد مقصد ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم ان کے نرغے کو توڑ کے نکل جائیں گے اور پھر سب اسی مرکز پر اکٹھے ہو جائیں گے جہاں سے ہماری جدوجہد کا آخری مرحلہ شروع ہوگا۔"

"نہیں۔ آخری مرحلہ اس کے بعد آئے گا۔ مکمل فتح کے بعد۔ جب ہم سُرخرو لوٹیں گے۔ واپس وطن جائیں گے اپنے گھر" غالب نے کہا۔

نازو نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا "مجھے بہت شرم آ رہی ہے۔"

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ لڑکیوں کو بے شرم نہیں ہونا چاہئے" غالب نے کہا۔

"معلوم نہیں کیا ہو گیا تھا مجھے۔ پاگل ہو گئی تھی میں کہ میں نے ایسی بات کہہ دی" نازو نے کہا۔

"پاگل ہو کے کبھی ہم سے بھی کوئی پاگل پن کی بات کہہ دو" غالب نے آہ بھر کے کہا "دل ہمارا بھی بہت اداس ہے۔"

وہ نازو کو ہنسانے کے لئے ایک دم غیر سنجیدہ ہو گیا تھا اور اس ماحول کی کیفیت کو بدلنے کی یہ کوشش بہت بروقت تھی۔

گل نے کہا "مجھ پر بھی پاگل پن کا دورہ پڑنے ہی والا تھا۔"

غالب نے کہا "چلو اب تم شروع ہو جاؤ۔ تمہاری باری ہے"

میں نے ہنس کے کہا "ہاں۔ تم بھی شوق پورا کر لو۔"

گل مسکرائی "آپ پھر لیکچر دیں گے۔"

"وہ تو ضروری تھا۔ جیسا مرض ویسی دوا" میں نے کہا۔

"اچھا ہوا لیکچر کے مکسچر سے ہی خاتون کو شفا ہوئی ورنہ انجکشن دینا پڑتا" غالب نے اپنے ہاتھ کو تھپڑ کے انداز میں اٹھا کے کہا "ہسٹریا کے علاج کا یہ مجرب نسخہ کبھی ناکام نہیں ہوا۔ کچھ ہوتے ہیں لاتوں کے بھوت۔"

نازو نے اسے لال لال آنکھوں سے دیکھا "مثلاً تم۔"

غالب نے کہا "میں ایک بھوت کا داماد ضرور ہوں۔ خود بھوت نہیں ہوں۔ اور میرے محترم سسر بھوت..."

"یہ کیا ہر وقت بھوت کہتے رہتے ہو میرے والد کو" نازو بگڑ گئی۔

"لاحول ولا قوۃ۔ تم کیوں زبردستی گلے پڑ رہی ہو میرے۔ مان نہ مان میں تیرا مہمان کی طرح۔ مان نہ مان میں ہوں سسر کی بیٹی۔ بابا! تمہارے والد کا کب نام لیا ہے میں نے" غالب نے کہا۔

"بے وقوف مت بناؤ مجھے۔"

"تمہیں جیسا بنایا ہے' خدا نے بنایا ہے۔ اور ابھی تم خود کو پاگل تسلیم کر چکی ہو۔" غالب نے کہا "تم پاگل ہی نہیں ایک خطرناک پاگل ہو۔"

"میں باہر پھینک دوں گی بارش میں۔"

اسی وقت بجلی چمکی اور زبردست کڑکا ہوا۔

غالب نے کہا "اس وقت میری نیکی کام آ گئی ورنہ بجلی تم پر گرتی۔ گستاخ لڑکی۔"

جین اور ماریا بے سدھ ہو کے سو گئی تھیں اور نہایت بے ہنگم طریقے پر ٹام اور برٹ کے اوپر پڑی ہوئی تھیں۔ ٹام پلک جھپکائے بغیر ہمیں دیکھ رہا تھا۔ برٹ نے اس سے بوتل چھین لی تھی چناں چہ وہ آؤٹ نہیں ہوا تھا مگر پوری طرح ہوش میں بھی نہیں تھا۔ صرف برٹ کا رویہ متوازن تھا۔ وہ ظاہری لاتعلقی سے سگریٹ پی رہا تھا مگر کبھی کبھی اچانک ہماری طرف متوجہ ہو جاتا تھا۔ جیسے ہماری گفتگو سن کے کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ نازو کو روتے دیکھ کر' پھر غالب سے لڑتے دیکھ کر اور ہمارے بدلتے موڈ کو دیکھ کر وہ کچھ حیران تھا اور کچھ پریشان۔ پریشان اس لئے کہ وہ ہمارے عزائم سے اپنے مستقبل کا اندازہ کرنے میں ناکام تھا۔ ہم یہ ضرور جانتے تھے کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ وہ صرف خوف اور بے یقینی کے عذاب میں مبتلا تھے۔ ہم انہیں کب تک اپنے ساتھ رکھیں گے۔ ان سے کیا کام لیں گے۔ انہیں کہاں کہاں لے جائیں گے اور آخر کار ماردیں گے یا چھوڑ دیں گے۔ ان میں سے کسی کے پاس اندازے کی بنیاد پر بھی ان سوالات کے جواب حاصل کرنا مشکل تھا۔

جنگل میں سیلاب آ گیا تھا۔ طوفانی بارش کا ریلا' درختوں کی شاخوں اور پتوں کے سائبان سے اترنے والا پانی زمین پر جھاڑیوں' پودوں' خس و خاشاک اور سوکھے پتوں کو بہا کر لے جا رہا تھا۔ بجلی کی خیرہ کن چمک بار بار کھڑکیوں کے پیچھے اجالا کرتی تھی اور اس کے بعد گرج کے شور سے شیشے بج اٹھتے تھے۔ میرا خیال ہے کئی بار کہیں بجلی گری۔ میں اور غالب ایک دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ نازو اور گل ہم سے چمٹی بیٹھی تھیں۔ گرج چمک کے اس طوفان سے وہ بہت سہمی ہوئی تھیں اور ان کے ڈیپریشن کی یہ بھی ایک وجہ تھی۔

میں نے کئی بار پردے ہٹا کے دیکھا تو تاریکی' بارش کی دھند اور شیشوں کی بیرونی سطح پر بہتے پانی کے دھاروں سے مجھے کچھ نظر نہ آیا۔ ایک بار میں نے غالب سے کہا کہ چلو جنگل کی بارش میں سیر کا تجربہ کرتے ہیں اور نہا کے آتے ہیں۔ تو نازو اور گل نے ہمیں پکڑ لیا۔ بیٹھے بیٹھے وقت گزارنا مشکل ہو گیا تھا۔ میں نے ایک بار نازو سے پھر کافی لانے کو کہا تو اس نے انکار کر دیا۔

"سلنڈر کی گیس ختم ہو جائے گی تو کیا کریں گے اور کافی بھی بس اتنی ہے کہ دو بار کافی ہو گی۔"

"چائے تو ہو گی" غالب نے کہا۔

"چینی اور دودھ کے بغیر پیو گے۔ آرام سے بیٹھے رہو۔ ابھی رات کاٹنی ہے۔ کھانے کے لئے بھی کچھ کرنا ہوگا۔ یہ بارش تو نہ جانے کب تک چلے گی" نازو نے کہا۔

"خدا کرے یہ کبھی ختم نہ ہو" غالب نے کہا۔

"تاکہ ایم آر ایس کو سیلاب بہا کے لے جائے" نازو نے کہا۔

میں نے کہا "یہ بارش بھی تائیدِ ایزدی ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"بھئی ایسے موسم میں کون تلاش کرے گا ہمیں؟" میں نے کہا' "موسم صاف رہتا تو شاید ہمیں چھپنے اور خود کو کیموفلاج کرنے کی مہلت بھی نہ ملتی۔ کچھ دیر میں رات ہو جائے گی۔ اندھیرے میں وہ ہیلی کاپٹر سے سرچ لائٹ ڈال کر بھی دیکھیں گے تو انہیں کچھ نظر نہیں آئے گا۔"

"صبح کیا ہو گا؟"

"یہ صبح دیکھا جائے گا۔" میں نے کہا۔

رات کے کھانے کے لئے ہمیں کاروان کے ذخیرۂ خوراک میں سے ڈبے نکالنے پڑے۔ روشنی کے لئے ہم گاڑی کا انجن اسٹارٹ کر سکتے تھے مگر ڈر یہ تھا کہ کھڑے کھڑے ہی پیٹرول نہ ختم ہو جائے۔ کاروان کے اندر ایک لائٹ تھی جو بیٹری سے جلتی تھی' چارج نہ ملنے کے سبب آہستہ آہستہ اس کی روشنی بھی مدھم پڑتی جا رہی تھی۔

میں نے اور غالب نے ہر ڈبے پر لکھی ہوئی عبارت کو غور سے پڑھا کہ کہیں غلطی سے حرام چیز نہ کھا جائیں۔ ان کے ذخیرے میں پورک کے ڈبے بھی تھے۔ ہم نے نمکین مچھلی کے ڈبے کھولے۔ ان میں سارڈین اور شرمپ مچھلیوں کے قتلے تھے۔ ہنٹر بیٹ اور پنیر کے ڈبے نازو نے کھولے۔ جین اور ماریا بے بسی سے اس زادِ راہ کو ہم جیسے قزاقوں کے ہاتھوں لٹتا دیکھتی رہیں جو انہوں نے بچا بچا کے رکھا تھا۔ ٹام کے شور کو ہم نے اہمیت ہی نہیں دی۔ پورک کے ڈبے ہم نے ان کی طرف پھینک دئے۔

کھانے کے بعد نازو کی مہربانی سے کافی مل گئی۔ بارش اب بھی جاری تھی مگر گرج چمک کے بغیر۔

میں نے کہا "رات کو کیا ہو گا؟"

"جو ہر رات ہوتا ہے۔ بقول فلمی شاعر۔ جا اپنی حسرتوں پر آنسو بہا کے سو جا" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "میرا مطلب تھا کیا ہم انہی کے ساتھ سوئیں گے؟"

"جین اور ماریا سے پوچھ لو۔ برٹ اور ٹام کو تو اعتراض نہیں ہوگا" غالب نے کہا "میرا خیال ہے گل اور نازو کو بھی اعتراض نہیں ہوگا۔"

گل نے جھینپ کر کہا "کیسی باتیں کرتے ہیں آپ لوگ۔"

"لوگ کیا مطلب۔ میں ایسی کوئی بات نہیں کر رہا ہوں مس گل بانو۔ میں تو صرف یہ پوچھ رہا تھا کہ کیوں نہ مردانہ اور زنانہ خواب گاہیں الگ الگ رکھی جائیں۔"

"ہر خواب گاہ میں ایک کو جاگتے رہنا پڑے گا۔ سب ایک جگہ ہوں گے تو صرف ایک جاگے گا۔ پھر دوسرا۔"

"زنانہ ڈبے میں اندیشۂ نقصِ امن کا مجھے کوئی امکان نظر نہیں آتا" میں نے کہا "یہ لڑکیاں اتنی بہادر نہیں ہیں کہ رات کے وقت اس موسم میں نکل جائیں۔ فرار ہونے کے لئے۔"

"ہم پر حملہ تو کر سکتی ہیں" گل نے کہا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا "اتنی ہمت بھی نہیں ہے ان میں۔ اور انہیں ویسے بھی ہوش کہاں ہو گا۔ ابھی پیتے پیتے خود ہی غافل ہو کے پڑ جائیں گی۔"

"مجھے تو نیند نہیں آئے گی" گل نے کہا۔

"اچھا پھر یوں کرتے ہیں کہ ان چاروں کو باندھ کے ڈال دیتے ہیں۔ ایک ہی جگہ۔ مگر الگ الگ" غالب نے کہا "پھر ہم بھی چین سے سو جائیں گے۔"

"یار' پہلی بات تو یہ ہے کہ کس چیز سے باندھیں گے؟ دور دور کیسے رکھیں گے؟ اور اگر رات کو ایک آزاد ہو گیا تو سب کو کھول دے گا" میں نے کہا "ہم چاروں نہیں سو سکتے۔"

"یہ اپنا سب کچھ چھوڑ کر کیسے فرار ہو سکتے ہیں؟"

"جب موت کا ڈر ہو تو فرار ہونے والا صرف موقع تلاش کرتا ہے" میں نے کہا۔

"ان سے گاڑی کی چابیاں لے لو۔ سب نقد رقم لے لو بلکہ پاسپورٹ بھی لے لو" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "یہ تجویز اچھی ہے۔ مگر اس پر عمل کرنے کے بعد بھی ہم سب کا بے فکری سے سو جانا خلافِ احتیاط ہے۔ ایک کو ضرور جاگنا پڑے گا۔"

نازو نے کہا "باری باری سب جاگ لیں گے۔ دو دو گھنٹے۔"

میں نے کہا "باری باری سے میری مراد تھی میں اور غالب۔ خواتین کا اس انتظام سے کوئی تعلق نہیں۔"

"تم اس کا اہل نہیں سمجھتے ہمیں؟"

"اہلیت کی بات نہیں۔ آپ جاگ سکتی ہیں اور جس پر نظرِ کرم ہو اسے جگا کے رکھ سکتی ہیں۔ اس کی آنکھوں سے نیند اڑا سکتی ہیں۔ نیند اس کی ہے' دماغ اس کا ہے' راتیں اس کی

ہیں.....'' غالب نے کہا ''نیند کیوں رات بھر نہیں آتی۔''

''تم کو بھی نشہ ہوگیا ہے'' نازو ہنسنے لگی۔

''ہاں۔ کم سے کم دس اشعار پڑھ سکتا ہوں میں کہ مجھے نشہ کیوں ہوگیا ہے۔'' غالب نے کہا ''مگر کیا فائدہ' تمہیں کیا معلوم شعر کیا ہوتا ہے۔''

''شیر جنگل کا بادشاہ ہوتا ہے۔ چڑیا گھر میں رہتا ہے'' نازو بولی۔

میں انہیں چھوڑ کے ٹام اور برٹ کی طرف متوجہ ہوگیا ''تم لوگ کہاں سونا پسند کروگے؟''

''تمہارے ساتھ قبر میں'' جین نے تلخی سے کہا۔

ٹام ہنسنے لگا ''یہ جگہ قبر سے کم ہے کیا۔ مگر جس کو تم مرد سمجھ رہی ہو وہ مُردہ ہے۔''

''شٹ اپ!'' میں نے کہا ''اپنی جیب میں سے ہر چیز نکال کے میرے حوالے کردو۔ گاڑی کی چابیاں۔ نقدی۔ پاسپورٹ۔''

برٹ نے احتجاج کیا ''یہ سب کیا ہے؟''

''حفاظتی انتظام'' میں نے کہا۔

''ہم بھاگنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔''

میں نے کہا ''میں تمہارے دل کا حال نہیں جانتا۔ میرے لئے اپنا اطمینان ضروری ہے۔''

''اطمینان؟'' ٹام نے طنز سے کہا ''اگر ہم فرار ہو سکتے تو خالی ہاتھ بھی فرار ہو جاتے۔''

''میں ایسی نوبت نہیں آنے دوں گا۔ کسی نے یہ احمقانہ کوشش کی تو اس کی لاش جنگل میں پڑی رہ جائے گی۔ چلو دیر مت کرو۔'' میں نے ہاتھ پھیلا کے کہا۔

''تم ایک مکار' دھوکے باز ڈاکو ہو'' ٹام نے وہ رقم میری طرف پھینک دی جو ہم نے اسے صبح دی تھی۔

''یہ تمہاری امانت ہے۔ تمہیں واپس مل جائے گی۔''

برٹ نے چابیاں میری طرف اچھال دیں ''گاڑی ان کے بغیر بھی اسٹارٹ ہو جاتی ہے۔''

''مجھے معلوم ہے۔ میں پلگ کے تار بھی نکال کے اپنے پاس رکھوں گا'' میں نے کہا ''پاسپورٹ۔''

''ہم پاسپورٹ نہیں دے سکتے'' ٹام نے چیخ کر کہا۔

''مگر میں پاسپورٹ لے سکتا ہوں'' میں نے سکون سے جواب دیا ''خواہ اس کوشش میں مجھے تمہاری جان ہی کیوں نہ لینی پڑے۔''

ٹام کا رنگ فق ہوگیا ''تم بہانے ڈھونڈھ رہے ہو۔ اور کچھ نہیں۔ کسی نہ کسی بات پر تم مشتعل ہو کے ہمیں مار ڈالوگے اور الزام بھی ہمیں دوگے کہ مشتعل کرنے کے ذمے دار ہم تھے۔ تم جواز پیدا کروگے تاکہ خود اپنے ضمیر کو مطمئن رکھ سکو۔''

میں نے کہا ''اگر تم یہ سب سمجھتے ہو تو پھر دیر کیوں کر رہے ہو مسٹر ٹام؟ ایک بات اور۔ جنگ میں ضمیر کچھ نہیں کہتا۔ زندگی یا موت کا مسئلہ ہو تو دشمن کو قتل کر دینا جرم بھی نہیں کہلاتا۔''

برٹ نے اپنا پاسپورٹ نکال کے کہا ''بحث سے کیا فائدہ ٹام۔ تعاون کرو تاکہ انہیں موقع نہ ملے۔''

ٹام نے پاسپورٹ میری طرف پھینک دیا ''تعاون سے کچھ نہیں ہوگا۔ تم دیکھ لینا' یہ موقع پیدا کرلیں گے اور موقع نہ ملا تب بھی چھوڑیں گے نہیں۔''

جین اور ماریا سے پاسپورٹ لے کر میں نے غالب کو تھما دیے ''اب تم دونوں اسٹیشن ویگن میں چلو۔''

''یہاں کیا ہے؟'' ٹام نے کہا۔

برٹ نے بھی کہا ''اوپر نیچے چھ افراد کے سونے کی جگہ ہے۔''

میں نے غالب کی طرف دیکھا تو اس نے رضامندی کے اظہار میں سر ہلایا ''اگر یہ شرافت سے سوتے رہیں تو ٹھیک ہے۔ ہم میں سے ایک جاگتا رہے گا۔ دوسرا اسٹیشن ویگن کی پچھلی سیٹ پر جا کے سو جائے۔''

دائیں طرف کی تین برتھوں پر میں نے ٹام کو سب سے اوپر رکھا۔ پھر برٹ کو۔ سب سے نیچے والی برتھ پر گل رہی۔ دوسری جانب اوپر کی جگہ ماریا کو دی گئی۔ درمیان میں جین رہی اور سب سے نیچے نازو۔ ٹام اور ماریا اس گروپ میں زیادہ جارحانہ رویہ رکھتے تھے اور ان کی آپس میں بھی نہیں بنتی تھی۔ گل اور نازو کو ہم نے زبردستی کرتے ہوئے سونے پر مجبور کر دیا۔ اسبابِ سفر کے میڈیکل باکس میں سے سکون آور گولیاں بھی مل گئیں۔ چند دیر بعد صرف میں اور غالب جاگتے رہ گئے۔ ہمارے لئے سونے والوں کے درمیان فرش پر اتنی ہی جگہ بچی تھی کہ ہم دیوار سے ٹیک لگا کے اور پاؤں پھیلا کے بیٹھ جائیں۔

میں نے غالب سے کہا ''تم بھی سو جاؤ اسٹیشن ویگن میں۔''

غالب نے نفی میں سر ہلایا ''ابھی نیند نہیں آرہی ہے۔ تم چلے جاؤ۔''

میں وہیں فرش پر لیٹ گیا۔ باہر بارش پھر تیز ہوگئی تھی۔ اندر بیٹری سے جلنے والی لائٹ اتنی کم ہوگئی تھی کہ اس کا اجالا موم بتی کی روشنی کے برابر بھی نہیں رہا تھا۔ میرا ذہن بھی خیالات کے انتشار میں مبتلا تھا اور سکون آور گولیاں بھی مؤثر ثابت نہیں ہو رہی تھیں۔ آدھے گھنٹے تک میں آنکھیں بند کئے سوچ کے راستوں کی ناکا بندی کرتا رہا اور ہر سمت سے یلغار کرنے والے فتنہ انگیز اندیشوں کو دور بھگاتا رہا۔ آخر کار نیند غالب آگئی اور پانچ گھنٹے بعد غالب نے مجھے اٹھایا تو میں بڑی مشکل سے جاگا۔ میں نے بارش کے ٹھنڈے پانی سے منہ پر چھینٹے مارے اور سگریٹ جلا کے بیٹھ گیا۔ غالب پڑتے ہی سو گیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ یوں خاموش اکیلے بیٹھ کے رات کا ایک ایک پل شمار کرنا اور صبح کے انتظار میں وقت کاٹنا کتنا مشکل کام ہے۔

اس جنگل میں بارش کے پتوں پر گرنے سے اور پانی کے بہنے سے جو شور پیدا ہو رہا تھا وہ بھی ویرانی کے سکوت اور جمود کو ختم کرنے میں ناکام رہا تھا۔ میری تنہائی کے حصار میں ہر سمت سے خیالوں کے غنیم شب خون مارتے رہے۔ میں رابعہ کے تصور کو ذہن سے نکالتا تھا تو محسن کا مظلوم چہرہ سامنے آجاتا تھا۔ شہلا کی فریاد عدم آباد کی بیکراں دوری سے سنائی دینے لگتی تھی۔ پھر دلاور کی شیطانی ہنسی کی فاتحانہ بازگشت سب پر غالب آجاتی تھی۔ میرے ماضی کے دکھ اور مستقبل کے اندیشے کسی امید کے چراغ کو روشن دیکھنا نہیں چاہتے تھے اور میں مایوسی کے گھپ اندھیرے میں بے بسی سے بھٹکنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

رات کے آخری پہر میں بارش تھم گئی تو جنگل کا سناٹا زیادہ بھیانک ہوگیا۔ میں نے کاروان کے دروازے کا ایک پٹ آہستہ سے کھولا اور باہر آگیا۔ کھلے دروازے سے میں اندر بھی نظر رکھ سکتا تھا۔ میرے قدموں کے نیچے خشک پتھریلی زمین تھی مگر اوپر سے درختوں کی چھت مسلسل برس رہی تھی۔ خنک ہوا نے مجھے بڑی فرحت دی اور میں نے بھیگے ہوئے جنگل کی خوشبو کو محسوس کیا۔ اس میں مٹی' خودرو گھاس اور پتوں کی مہک شامل تھی۔

اچانک میں نے ٹام کو سر اٹھاتے دیکھا۔ وہ کاروان کے اندر سونے والوں کی صورتوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ وہ کیا کرتا ہے میں تھوڑا سا ایک طرف ہوگیا اور دروازے کے قبضے کی جھری سے اندر جھانکتا رہا۔ ٹام کو یقین آگیا تھا کہ اس کے سوا سب خوابِ خرگوش کے مزے لے رہے ہیں۔ اس نے کاروان کا کھلا دروازہ دیکھ کر یہ بھی سمجھ لیا ہوگا کہ میں کسی ضرورت سے باہر گیا ہوں یا شاید اسٹیشن ویگن میں جا کے سو گیا ہوں۔ اس نے موقعے سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کرلیا۔

وہ خاموشی سے نیچے اترا اور دبے پاؤں کاروان کے آخری حصے میں بنے ہوئے کچن کی طرف گیا۔ فرش پر بیٹھ کے وہ نہ جانے کیا کرتا رہا۔ جب وہ اٹھا تو برائے نام روشنی میں مجھے اس کی صورت پر ایک سفاک مسکراہٹ نظر آئی۔ وہ پلٹا تو میں نے اس کے ہاتھ میں ریوالور دیکھا۔ یہ ریوالور اس نے کسی خفیہ خانے سے برآمد کیا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ میں گھوم کے کاروان کی سائیڈ میں ہوگیا۔

ٹام نے اسٹیشن ویگن کا رخ کیا تو میں کاروان کی آڑ میں آگے بڑھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ سب سے پہلے میرا کام تمام کرنا چاہتا ہے۔ میں اسٹیشن ویگن میں سو رہا ہوتا تو وہ ریوالور کا دستہ مار کے پہلے مجھے ناک آؤٹ کر دیتا اور پھر میرا گلا گھونٹ کے سب سے خطرناک دشمن سے نجات پا لیتا۔ اس کے بعد وہ واپس کاروان کی طرف جاتا اور غالب کو سوتے میں ہی گولی مار دیتا۔ فائر کی آواز سے نازو اور گل کے جاگ اٹھنے میں پھر کوئی خطرہ نہ ہوتا۔

غالباً اسٹیشن ویگن میں جھانکنے سے اسے مایوسی ہوئی۔ وہ باہر آیا اور لوٹ کر کاروان کی طرف گیا۔ دوبارہ غور سے دیکھنے پر بھی اسے سونے والوں میں میری صورت نظر نہیں آئی تو وہ چوکنا ہو کے ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ میں اس کی ایک ایک حرکت کا مشاہدہ بڑی دلچسپی سے کر رہا تھا اور منتظر تھا کہ وہ اپنی عقل و ہمت کے گھوڑے کو کسی سمت میں دوڑائے تو میں ٹانگ اڑا کے اسے منہ کے بل گرا دوں۔

شاید اس کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ وہ میری عدم موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے باقی سب لوگوں کو لائن اپ کرلے یا اسے ڈر ہوگا کہ میں زیادہ دور نہیں جاؤں گا اور عین وقت پر نمودار ہو کے اس کو دور سے ہی شوٹ کردوں گا۔ رات کے اندھیرے میں اور جنگل میں اس کی نظر ہر طرف مجھے تلاش کرنے سے قاصر تھی۔ ممکن ہے اسے یہ خیال بھی ہو کہ نقد رقم اور پاسپورٹ کے بغیر اس کے فرار ہونے کا کوئی فائدہ نہیں اور یہ چیزیں میرے ہی پاس ہوں گی۔

وہ کچھ دیر سوچتا رہا اور پھر واپس اسٹیشن ویگن کی طرف گیا۔ میں کوئی آہٹ کئے بغیر دوسری طرف سے آگے بڑھا۔ بڑی ہوشیاری اور خاموشی سے ٹام نے کاروان کو اسٹیشن ویگن سے الگ کیا۔ دونوں کو منسلک رکھنے والے فولادی کُنڈے کی آواز نے کسی کو بیدار نہیں کیا۔

اب میں سمجھ چکا تھا کہ ٹام گاڑی لے کر فرار ہو جانا چاہتا ہے۔ شاید اس کے پاس ڈپلی کیٹ چابیاں تھیں اور اس نے یہ جُوا کھیلنے کا فیصلہ کرلیا تھا جس میں اس کی کامیابی کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے مگر وہ امید کے سراب میں مبتلا تھا۔ جنگل کے راستوں پر اندھیرے اور بارش سے پیدا ہونے والی کیچڑ میں وہ گاڑی کو کہاں دوڑاتا اور کیسے دوڑاتا۔ گاڑی کسی پانی سے بھرے ہوئے گڑھے میں پھنس جاتی یا اچانک بند ہو جانے والے راستے پر کسی درخت سے ٹکرا جاتی۔ یہ کوئی صاف سڑک نہیں تھی جس پر وہ چلتا جاتا اور اسے کوئی پکڑ نہ پاتا۔

میں نے اسے گاڑی میں بیٹھ جانے کا موقع فراہم کیا۔ اس نے آخری بار ادھر اُدھر خوف زدہ نظروں سے دیکھا اور پھر ایک دم اوپر چڑھ گیا۔ میں نے لپک کے دوسری طرف سے دروازے کا رخ کیا اور ابھی وہ سوئچ میں چابی لگا ہی رہا تھا کہ میں بھی دوسرے دروازے سے اوپر پہنچ گیا۔

ٹام کو اچانک اپنی ناکامی کے احساس سے دوچار ہونا پڑا۔ وہ تو سمجھ رہا تھا کہ چند منٹ میں وہ آزادی حاصل کرلے گا۔ اور کسی سڑک تک پہنچ جانے کے بعد امداد لے کر واپس لوٹے گا۔ اس وقت تک مجرم یعنی ہم تو خیر فرار ہو چکے ہوں گے مگر اس کے ساتھی شاید مل جائیں گے۔ زندہ یا مردہ۔ اور ہم بھی گاڑی کے بغیر فرار ہو کے کہاں جائیں گے۔ صبح تک گرفتار ہوں گے یا مارے جائیں گے۔

اس کا ردِ عمل بہت شدید تھا۔ دیوانگی آمیز اور اس مایوسی کا

آئینہ دار جب آدمی مرنے کا فیصلہ کرلیتا ہے۔ ٹکر مارنے کے بعد اس نے ایک دم ریوالور نکال کر مجھ پر فائر جھونکنے کی کوشش کی۔ پھر اسے احساس ہوا کہ وقت کم ہے اور درمیانی فاصلہ بھی کم ہے۔ دوسرے لمحے وہ چابیاں لگی چھوڑ کے نیچے کود گیا اور ایک دم بھاگا۔ اسے یقین تھا کہ میں تعاقب میں آؤں گا۔ چند قدم کے فاصلے سے اس نے گولی چلائی تو نشانہ ونڈ اسکرین کا نہیں لیا جس کے پیچھے میں موجود تھا۔ اس نے دوسرے دروازے کی جانب فائر کیا تھا جہاں اس کے اندازے کے مطابق مجھے موجود ہونا چاہئے تھا۔

میں گولی سے بچنے کے لئے جہاں بیٹھا تھا وہیں غوطہ مار گیا تھا۔ پہلے فائر کے بعد میں نے سر اٹھا کے دیکھا تو ٹام اندھیرے میں غائب ہو رہا تھا۔ میں نے اس کا متحرک سایہ پندرہ بیس قدم دور دیکھا اور کھڑکی سے ہاتھ نکال کے اس کا نشانہ لیا۔ میں باہر نکل کے اس کا تعاقب کرتا اور اسے دوڑ کر شوٹ کرنے کی کوشش کرتا تو میں بھی کھلے میدان میں اس کا نشانہ بن سکتا تھا۔

میرے فائر کی آواز کے ساتھ ہی ٹام کی دلخراش چیخ سے جنگل کا سکوت درہم برہم ہوگیا۔ میں نے اسے اچھل کر گرتے دیکھا مگر اس کے باوجود اتر کے اس کی طرف نہیں لپکا۔ وہ زخمی یقیناً ہوا تھا مگر کس حد تک ؟ یہ اندازہ اس کی چیخ سے نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ گولی اس کی ٹانگ میں یا سینے میں لگی ہو۔ سینے پر لگنے والی گولی بعض اوقات صرف پسلیوں کو توڑتی ہے دل کو نقصان نہیں پہنچاتی۔ شدید زخمی حالت میں بھی انسان فوراً نہیں مرتا۔ گولی سر یا گردن میں لگے یا دل میں پیوست ہو جائے تو موت فوری اور یقینی ہوتی ہے۔ بصورتِ دیگر موت کی طرف پیش قدمی کرنے والا زخمی سانپ سے زیادہ خطرناک ہو جاتا ہے۔

گولیاں چلنے کی آواز سن کر کاروان میں سونے والے ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھے تھے۔ ٹام کی چیخ نے انہیں بہت کچھ بتا دیا ہوگا مگر میں اپنے ساتھیوں کو خطرے سے دور رکھنا چاہتا تھا۔

"کوئی باہر نہ آئے۔" میں نے چیخ کر کہا۔

غالب نے چلا کے کہا "تم ٹھیک ہو ؟"

"میں نے ٹام کو کتے کی موت مار دیا ہے۔"

"مگر تم ....."

"میں ٹھیک ہوں۔" میں نے کہا۔

"تم نے مار دیا اسے ....." ماریا نے ہسٹریا میں چلا کے مجھے گالی دی۔ پھر شاید نازو نے اسے خاموش کر دیا۔

"ٹام کہاں ہے؟" غالب نے کہا۔

"سامنے کہیں پڑا ہے" میں نے کہا "تم باہر مت آنا ورنہ ممکن ہے وہ فائر کردے۔ میں دیکھ لیتا ہوں۔"

"یہ کیا پاگل پن ہے ؟" نازو نے چلا کے کہا "کیا وہ تم پر فائر نہیں کرے گا ؟ تم سامنے جاؤ گے ....."

میں نے کہا "میں سامنے نہیں جاؤں گا" "تم باقی سب کی لگام اپنے ہاتھ میں رکھو۔"

پھر میں نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ انجن ایک مرتبہ غرا کے خاموش ہو گیا۔ دوسری بار میں نے لمبا سیلف دیا اور انجن عین اس وقت چل پڑا جب مجھے بیٹری کے بیٹھ جانے کا اندیشہ لاحق ہو رہا تھا۔ انجن کو ریس دے کر میں نے ہیڈلائٹس آن کردیں اور فل بیم کی روشنی میں اپنے سامنے دیکھا۔ ٹام کہیں بھی نہیں تھا۔

گاڑی کے دروازے بند کر کے میں نے اسے آگے بڑھایا اور اسی سمت میں موڑا جدھر ٹام فرار ہوا تھا۔ اس کی لاش بھی کہیں نہ تھی اور وہ خود بھی غائب تھا۔ شاید وہ زخمی حالت میں خود کو گھسیٹ کر کسی جھاڑی کے پیچھے لے گیا تھا اور اب گھات لگائے بیٹھا تھا۔

میں نے وائپر چلا کے شیشہ صاف کیا اور پھر کھڑکی سے سر نکال کے زمین پر خون تلاش کرنے کی کوشش کی۔ گاڑی آہستہ آہستہ آگے سرک رہی تھی۔ اس کے پہیوں کے نیچے کیچڑ اور پانی تھا۔ بارش کا پانی پگڈنڈی جیسی نالیوں میں جمع ہو کے نشیب کی جانب اپنا راستہ بناتا بہہ رہا تھا۔ اس میں لہو کی سرخی کا محسوس ہونا بہت مشکل تھا۔

ٹام کو میں نے اس وقت دیکھا جب اگلے پہیوں نے پانی کو کاٹا اور گاڑی اس کے اوپر سے گزری۔ جھٹکے سے ٹام کا ایک ہاتھ اٹھا اور پانی سے باہر گر گیا۔ میں نے بریک لگا کے گاڑی روک لی ورنہ پیچھے والے پہیے بھی اس کی لاش کو دبا کے گزرتے۔

وہ ایک نالے میں گرا تھا۔ پانی اس کی لاش کو ٹھنڈا کرتا ہوا گزر رہا تھا۔ یہ پانی کی گزرگاہ تھی جو برسوں میں تھوڑا سا پھیل کے چھوٹے سے نالے کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ ٹام کی لاش اس میں سیدھی پڑی تھی اور اس پر سے گاڑی کا ایک ہی پہیہ گزرا تھا۔ دوسرے پہیے کو پانی سے گزرتے ہوئے شدید جھٹکا لگا تھا۔

میں نے ہیڈلائٹ آف نہیں کی اور انجن بھی بند نہیں کیا۔ دور کاروان سے سر نکال کے جھانکنے والے غالب نے مجھے اترتا دیکھ لیا تھا۔ اس نے چلا کے کہا "سکندر ! کیا ہے؟"

میں نے ہاتھ ہلا کے کہا "ٹام کی لاش۔"

میں ہیڈلائٹس کے اجالے میں تھا۔ غالب نے میرے ہاتھ کی حرکت کو صاف دیکھا ہوگا۔ وہ دوڑتا ہوا آیا۔ اس کے پیچھے گل آنے کا ارادہ رکھتی تھی مگر غالب نے اسے ڈانٹ کر روک دیا۔

میں نے بہتے پانی کے قریب پنجوں کے بل بیٹھ کے ٹام کی لاش کو دیکھا۔ اس کا ہاتھ پانی سے باہر تھا اور وہ خود ایک فٹ گہرے نالے میں تھا۔ شفاف پانی میں اس کا بے حس و حرکت جسم الٹا لیٹا ہوا تھا۔ گولی اس کے سر میں لگی تھی۔ زخم سے نکلنے والا تازہ خون بھی پانی کے ساتھ بہتا جا رہا تھا۔

"کیا اس نے فرار ہونے کی کوشش کی تھی؟" غالب نے میرے قریب بیٹھ کے کہا۔

"اس نے مجھے قتل کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ یہ اسی کا

ریوالور ہے" میں نے کہا۔

"ریوالور اس کے پاس!"

"اس نے کسی خفیہ خانے سے نکالا تھا" میں نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ انجن کو چلتا چھوڑ کے میں نے ہیڈلائٹ بند کی اور گاڑی کو ریورس گیئر میں واپس لے گیا۔ غالب نے یہ فاصلہ پیدل طے کیا۔

میں پھر کاروان میں پہنچا تو مجھے اپنے سامنے برٹ کے علاوہ جین اور ماریا کے دکھی چہرے نظر آئے۔ برٹ اپنے جذبات پر قابو رکھنا جانتا تھا مگر دونوں لڑکیاں ہچکیوں کے ساتھ رو رہی تھیں۔ انہوں نے مجھے یوں دیکھا جیسے میں جلاد ہوں۔ جو پھانسی کے تختے کا لیور کھینچتا ہے یا فائرنگ اسکواڈ کو اشارہ دیتا ہے یا تلوار اور گلوٹین کو جسم سے روح کا رشتہ منقطع کرنے کا حکم جاری کرتا ہے۔ کامل بے حسی کے ساتھ۔

میں نے چابیاں اوپر اٹھا کے کہا "یہ دیکھو۔ ڈپلی کیٹ چابیاں۔ ان کی مدد سے وہ فرار ہونا چاہتا تھا۔"

میں نے چابیاں ان کی طرف اچھال دیں "جاؤ۔ تم بھی کوشش کرو۔ اور کہیں کوئی ریوالور چھپا رکھا ہے ایسا ہی تو نکال لو" میں نے ریوالور انہیں دکھا کے کہا۔

جین اور ماریا سہم کر برٹ سے چمٹ گئیں۔

"کس کا ہے یہ ریوالور؟" میں نے دہاڑ کے کہا۔

"ٹام ..... ٹام نے لیا تھا۔ ایک ہندوستانی سے۔ اس کا مقصد صرف اپنی حفاظت کرنا تھا" برٹ نے کہا۔

میں نے آگے بڑھ کے اسے کھینچ لیا "اور یہ بات تم جانتے تھے مگر تم نے مجھے نہیں بتائی۔ کیوں؟"

میرے ایک بھرپور مکے نے اسے کاروان کی دیوار پر دے مارا۔ اس کے منہ سے خون بہنے لگا۔

جین چلائی "خدا کے لئے اسے مت مارو۔ اس کو چھوڑ دو۔"

ماریا نے لپک کے برٹ کو اٹھایا "اسے بتا دو ..... کہ تمہیں کچھ معلوم نہیں تھا۔"

برٹ مشکل سے اپنے پیروں پر کھڑا ہوا۔ "مجھے ..... صرف اتنا ہی معلوم تھا۔ یہ نہیں معلوم تھا کہ ٹام نے ریوالور کہاں چھپا کے رکھا تھا۔"

میں نے اس کے دوسرا مکا مارا "یہ میں پوچھ سکتا تھا اس سے ....."

"اس نے ..... منع کر دیا تھا مجھے" برٹ نے کہا "اس نے کہا تھا ..... یہ امید کا آخری سہارا ہوگا۔ جو موقع ملتے ہی کام آئے گا۔"

"ہاں۔ دیکھو کیسا زبردست موقع ملا اسے آخر کار۔ اس کی لاش کو دیکھو۔ وہ کیچڑ میں دھنسا ہوا ہے۔ اس کا سر پاش پاش ہو گیا ہے۔ اسی ریوالور کی گولی سے جس کو وہ امید کا آخری سہارا سمجھتا تھا۔ اس کا جسم چکنا چور ہو گیا ہے۔ اسی گاڑی کے نیچے آ کے جس میں وہ فرار ہونا چاہتا تھا۔ میں نے خبردار کیا تھا تمہیں کہ چالاک اور بہادر بننے کی کوشش نہ کرنا۔ اس کا انجام برا ہوگا۔"

"ٹام بد قسمت تھا" برٹ نے کہا۔

"وہ بے وقوف تھا۔ احمق اور پاگل تھا۔"

"ہاں۔ مگر بد قسمتی نے اسے مروا دیا۔ ورنہ احمق اور پاگل ہونے سے فرق نہ پڑتا" برٹ نے کہا۔

"آپ آرام سے بیٹھ جاؤ۔ اپنے دماغ سے فضول، جذباتی اور گمراہ کرنے والے خیالات کو خارج کردو۔ صرف اسی صورت میں زندگی کی امید رکھ سکتے ہو تم کہ میرے وعدے پر اعتبار کرو۔ ٹام نے اعتبار نہیں کیا تھا۔ اس کا خمیازہ بھگت لیا۔ ہمیں دھوکا دے کر فرار ہونے یا ہم سے دغا کرنے کی کوشش کرو گے تو تمہارے لئے کوئی چانس نہیں ہوگا۔ ایک فیصد بھی نہیں۔ بصورتِ دیگر تمہارا انجام یہ نہیں ہوگا۔ میرا خیال ہے تمہارے سامنے ایک سبق ہے۔ تم کو زندگی کے لئے چانس لینے کی کوشش ضرور کرنی چاہئے۔ موت کے لئے نہیں۔"

"کیا۔ ہم ایک ڈرنک ....."

"پیو۔ جو چاہو کرو۔ بس خودکشی مت کرو۔ یہ میرا دوستانہ مشورہ ہے۔ جو میں دشمن ہونے کے باوجود دے رہا ہوں" میں نے کہا۔

غالب نے گل اور نازو کو بھی بٹھا دیا تھا۔ تختے جو رات کو سونے کے لئے کھول دئے گئے تھے۔ پھر اٹھا کے اوپر کر دئے گئے تھے ہم آمنے سامنے دو بینچوں پر ایک دوسرے کے مقابل اور بہت قریب تھے مگر ٹام کی لاش جیسے ہمارے درمیان آگئی تھی۔ عدم اعتماد کی فضا میں عداوت کا زہر گھل گیا تھا۔

میں نے کلائی کی گھڑی دیکھی۔ صبح کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ اب کسی کے سونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ نازو خود ہی کافی بنانے کے لئے اٹھ گئی۔

غالب نے کہا "فائرنگ کی آواز بہت دور تک سنی گئی ہوگی۔"

میں نے کہا "ہاں۔ رات کی گرج چمک کے بعد یہ سکوت بھی زیادہ گہرا ہے۔ میرا خیال ہے اجالا پھیلنے سے پہلے ہم نکل جائیں۔"

"نکل کے کہاں جائیں؟ کھلی جگہ میں اپنے آپ کو دشمن کی نظر میں عیاں کردیں؟" غالب بولا۔

میں نے کہا "یہ نہ ہو وہ آواز کی سمت میں بڑھتے ہوئے یہاں آجائیں۔ پھر نکلنے کے راستے بھی نہ رہیں۔"

"کیوں نہ ہم اس گاڑی کو اور کاروان کو یہاں ایسے ہی چھوڑ جائیں؟" نازو نے کہا۔

"یہ تجویز اچھی ہے" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "پھر ان کا کیا ہوگا۔ یہ ساتھ چلیں گے

ہمارے؟"

گل نے کہا "اور ہم کیا پیدل جائیں گے؟"

"نہیں۔ ٹیکسی منگوا لیتے ہیں" نازو نے زور سے کہا۔

گل جھینپ کر مسکرانے لگی۔

میں نے کہا "ایک صورت تو یہ ہے کہ ہم انہیں بھی ساتھ رکھیں۔ مگر یوں قافلے کی صورت میں سفر کرنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ ہم اپنے آپ کو بچا سکتے ہیں کسی بھی طرح۔ ان کے ساتھ مسائل دُگنے ہو جائیں گے۔ انہیں بھی خاموش رکھنا اور تعاون پر مجبور کرنا آسان نہیں ہو گا۔ کہیں نہ کہیں انہیں موقع مل جائے گا۔"

"پھر کیا انہیں بھی؟ ٹام کے ساتھ....."

میں نے کہا "نہیں یار۔ ایسے قتل نہیں کر سکتے ہم۔"

"انہیں ایسے ہی چھوڑ دیا تو یہ خطرہ بھی بن سکتے ہیں ہمارے لئے۔"

میں نے کہا "یار اتنا تو میں بھی سمجھتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ انہیں ناک آؤٹ کر کے یا باندھ کے ڈال جائیں۔"

"اگر کوئی ادھر نہ آیا تو یہ بھوکے پیاسے مر جائیں گے۔" گل نے کہا۔

"اور اگر ہوش میں آنے کے بعد گاڑی لے کر ہمارے پیچھے چل پڑے....." نازو نے کہا۔

"تم کافی بناؤ خاموشی سے" غالب نے اسے ڈانٹا "مردوں کی بات میں دخل دینے سے ہزار بار منع کیا ہے۔"

"لیکن یہاں تو تم لوگ باتیں کر رہے ہو" نازو نے پلٹ کے کہا۔ گل ہنسنے لگی۔

اس سے پہلے کہ غالب اس بے عزتی کا بدلہ لیتا میں نے اسے روک دیا "بھائی صاحب، ادھر۔ میری طرف رکھیں اپنا روئے سخن۔ جذبات پر قابو رکھیں۔"

"خاتون بھی زبان پر قابو رکھیں" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "ہم گاڑی کو ناکارہ کر جائیں گے۔ تار نکال لیں گے۔ پیٹرول بہا دیں گے اور ٹائر فلیٹ کر دیں گے" میں نے کہا "ان کا سب کیش اور پاسپورٹ ہمارے قبضے میں ہوں گے۔ ہم انہیں سمجھا کے جا سکتے ہیں کہ اسی جگہ انتظار کریں۔ کوئی ان کی مدد کرنے والا ضرور آئے گا۔ ہم کسی کو بھیج دیں گے۔ وہ پاسپورٹ بھی دے جائے گا اور نقد رقم بھی۔ اگر یہ لوگ یہاں سے ہلے تو نقصان انہی کا ہو گا۔"

"گریٹ آئیڈیا" غالب نے نازو سے کافی لیتے ہوئے کہا "اس پر عمل درآمد میں تاخیر نہیں ہونی چاہئے۔"

میں نے کہا "تاخیر کیوں ہو گی۔ بس کافی پی کے چلتے ہیں۔"

"کہاں اور کس طرف، یہ بھی سوچنا چاہئے" نازو نے کہا۔

"ہم چلتے ہیں۔ تم بیٹھ کے سوچو۔ جب سوچ لو تو روانہ ہو جانا" غالب نے کہا "کوئی جلدی نہیں۔ خوب غور کرو۔"

نازو نے برا سا منہ بنا کے کہا "کوئی غلط بات کہی ہے میں نے؟"

"کون نا فر کہہ سکتا ہے تمہیں غلط۔ کم سے کم میں یہ گستاخی نہیں کر سکتا کہ تمہارے سامنے سچ بولوں" غالب نے کہا۔

"یعنی سب جھوٹ بولتے رہے ہو آج تک؟"

"بالکل۔ مگر اسے بھی سچ مت سمجھنا" غالب نے کہا۔

نازو میری طرف متوجہ ہو گئی "اگر انہوں نے تمہاری بات نہ مانی۔ اور یہاں سے چل پڑے ہمارے پیچھے۔"

میں نے ہاتھ پھیلا کے کہا "ان کی مرضی۔ ہمارے ہاتھ لگ گئے تو ہم نہیں چھوڑیں گے۔ لوگوں کے ہاتھ لگے تو وہ نہیں چھوڑیں گے۔ رائے عامہ ان آوارہ گردوں کے بہت خلاف ہے۔ انہیں جاسوس، منشیات فروش اور خارش زدہ کتے سے زیادہ قابل نفرت سمجھا جاتا ہے۔ پولیس نے پکڑ لیا بغیر پاسپورٹ کے تو جیل جائیں گے۔ یہ سب میں انہیں اچھی طرح سمجھا دوں گا۔"

جین، ماریا اور برٹ پٹنے کے بعد زیادہ افسردہ ہو گئے تھے اور آہیں بھر کے ٹام کو یاد کر رہے تھے۔ وہ جیسا بھی تھا ان کا ایک شریکِ سفر تھا جو اچانک دیارِ غیر میں ان کا ساتھ چھوڑ گیا تھا۔ ان کی نظریں بار بار کھڑکی سے اس طرف دیکھتی تھیں جہاں اندھیرے میں ٹام کی لاش پر سے بارش کا پانی گزر رہا تھا۔ وہ اس کے لئے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ دعائے مغفرت کے وہ قائل نہ تھے۔ تدفین اور آخری رسوم کی ادائیگی ممکن نہ تھی۔ انہیں اس کی لاش کو اسی جگہ اسی حالت میں چھوڑ کے جانا تھا۔ تمام عمر یاد رکھنے کے لئے ایک دل سوز خیال کا نقش ان کے ذہنوں میں محفوظ ہو چکا تھا۔

جب میں نے انہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کیا تو وہ سراسیمہ ہو گئے۔

"ایسا مت کرو۔ ہم تمہارے ساتھ چل سکتے ہیں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "تمہارے دوست کی بے وقوفی کے بعد یہ ممکن نہیں رہا۔ ہم صرف اپنے تحفظ کی ذمے داری اٹھا سکتے ہیں، تمہاری نہیں۔ تمہارے ساتھ ہونے سے صرف خطرات کے بوجھ میں اضافہ ہو گا۔"

برٹ نے کچھ دیر بعد کہا "آخر ہم کب تک اس نامعلوم شخص کا انتظار کریں گے جو ہمارے پاسپورٹ اور نقد رقم لائے گا۔"

میں نے کہا "آج شام تک۔ یا کل صبح تک۔ یا کل شام تک۔ اس سے زیادہ نہیں۔ جیسے ہی کوئی بھروسے کا آدمی ملا ہم اسے بتا دیں گے کہ تم کہاں ہو۔"

"بھروسے کا آدمی کیسے تلاش کرو گے تم؟ کسی کی صورت پر لکھا ہوا نہیں ہوتا کہ وہ بھروسے کے قابل ہے یا نہیں..... اور تم جسے اتنی نقد رقم دو گے وہ بدل گیا تو؟ تمہارا بھی نقصان اور ہمارا بھی۔"

میں نے اس کی بات پر غور کرتے ہوئے کہا "یہ سب کچھ سوچ لیا ہے ہم نے۔ سوچے سمجھے بغیر ہم کوئی قدم نہیں اٹھاتے۔ تم صرف اپنی حد تک سوچو۔ تم کو اسی جگہ رک کر انتظار کرنا ہو گا۔"

برٹ نے کندھے ہلا کے مجبوری اور بے بسی کا اظہار کیا "کیا کر سکتے ہیں اس کے سوا ہم۔ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ تم پر اعتبار کرنا بھی مشکل ہے۔"

میں نے برٹ کی بات غالب کو بتائی تو وہ بھی سوچ میں پڑ گیا "یہ تو اس نے ٹھیک کہا ہے۔ آدمی کتنا بھی بھروسے کے قابل کیوں نہ ہو، پچاس ہزار اس کے حوالے کریں گے تو وہ سیدھا اپنے گھر جائے گا۔ ادھر کیوں آئے گا وہ۔"

نازو نے کہا "اور وہ ہو گا کون؟ ہم تو کسی کو بھی نہیں جانتے۔"

میں نے کہا "ایک طریقہ ہے۔ فرض کرو ہم اپنے اس نامہ بر کو کچھ نہ بتائیں۔ بس ایک بنڈل اس کے حوالے کر دیں اور کہہ دیں کہ فلاں جگہ لے جاؤ، جہاں کچھ غیر ملکی بیٹھے ہیں۔ وہ انعام دیں گے ایک ہزار روپے۔ کسی غریب فاقہ کش یا دیہاتی کے لئے ایک ہزار رقم بہت بڑا انعام ہے۔"

"اور اگر اس نے پیکٹ کھول کے دیکھ لیا۔ تجسس آدمی کو ورغلاتا ہے۔ اور شیطان بہکاتا ہے" غالب نے کہا۔

"یار، تم لوگ ادھر اُدھر کی بہت سوچتے ہو۔ کچھ اپنے دماغ کو بھی تکلیف دے لیا کرو۔ ہر سوال کا جوب مل جائے گا۔ ہم پیکٹ دیتے وقت سمجھا سکتے ہیں کہ اس میں زہریلے سانپ یا بچھو ہیں اور یہ غیر ملکی جنگل میں ریسرچ کر رہے ہیں ایسے ہی جانوروں پر۔ کون ہمت کرے گا پھر اسے کھولنے کی" میں نے کہا۔

"او کے باس۔ اور کوئی سوال نہیں۔ کیا ہم رختِ سفر باندھ لیں؟" غالب نے کہا۔

"بالکل باندھ لو۔ جو چیز کام کی ہو ضرور لے لو لیکن یہ یاد رکھو کہ ہمیں پیدل چلنا ہے۔ نہ جانے کب تک اور کہاں تک۔ ہم بوجھ نہیں ڈھو سکتے۔"

اسبابِ سفر کا انتخاب گل اور نازو نے کیا۔ میں نے اور غالب نے تخریبی کارروائی کی۔ سب سے پہلے میں نے اسٹیشن ویگن کا بونٹ کھول کے ڈسٹری بیوٹر کیپ اتار لی۔ اس کے ساتھ ہی پلگ تک جانے والے تمام تار آ گئے۔ احتیاط در احتیاط کی خاطر میں نے اس کا روٹر بھی نکال لیا۔ غالب نے چاروں پہیوں کی ہوا نکالی۔ صرف دو پہیوں کی ہوا نکال دینا بھی کافی تھا مگر میری طرح وہ بھی احتیاط در احتیاط کے اصول پر عمل کر رہا تھا۔ ٹائروں سے نکلنے والی ہوا کی تیز آواز سے میرے کان خراب ہونے لگے تھے۔

غالب نے کہا "بچپن میں بڑا مزہ آتا تھا اگر کبھی موقع مل جاتا تھا کسی ٹائر کی ہوا نکالنے کا۔ ہمارے گھر ایک بہت موٹا شخص آتا تھا۔ اس سے زیادہ موٹا آدمی میں نے پھر کہیں نہیں دیکھا..... پتا نہیں وہ کون تھا۔ وہ ہمیشہ رات کو بہت دیر سے آتا تھا۔ اور پھر بہت دیر تک بیٹھتا تھا۔ میری ماں اس سے بہت تنگ تھی۔ اسے رات کو چائے بھی بار بار بنانی پڑتی تھی۔ ابا پتا نہیں کیوں اسے برداشت کرتے تھے۔ ماں کی مدد ہم نے کی اور ایک بار اس کے ٹائر کی ہوا نکال دی۔ اگلے دونوں ٹائروں کی۔ ایک ٹائر بدلنا بھی اس کے لئے کم عذاب نہ تھا۔ وہ بھینسے کی طرح ہانپنے لگا اور اس کے لئے جھکنا، جھک کر جیک لگانا، جیک کو گھمانا اور وھیل کھولنا سب..... مشکل کام تھے۔ اس رات وہ پیدل واپس گیا۔ ان کو گالیاں دیتا ہوا جو اس کمینگی کے ذمے دار تھے۔ اندر ہم معصوم بنے سوتے رہے اور اس کی جھک جھک سُن کے منہ دبا کے ہنستے رہے۔"

"تم جمع کا صیغہ استعمال کر رہے ہو" میں نے کاربوریٹر کے آگے سے پیٹرول لائن کو الگ کرتے ہوئے کہا اور پیٹرول کو زمین پر پتلی سی دھار کی صورت میں بہتا ہوا دیکھتا رہا "اور کون تھا تمہارے ساتھ؟"

"میرا ایک بھائی تھا۔ بعد میں مر گیا تھا۔ ہم نے ایسا کئی بار کیا تو وہ سمجھ گیا۔"

"آواز نہیں پہنچتی تھی اس کے کانوں تک؟"

"تم نے ہمارا وہ کھنڈر گھر تو دیکھا تھا۔ بہت بڑا بنگلا تھا۔ اور وہ گاڑی سڑک پر کھڑی کرتا تھا۔ اس کی گاڑی بہت بڑی تھی اور غالباً موٹاپے کے باعث وہ اسے تیزی سے موڑ کے گیٹ سے گزار نہیں سکتا تھا چناں چہ دو بار گیٹ توڑ چکا تھا۔ باہر سے گھر میں اندر ڈرائنگ روم کے بند دروازے کے پیچھے ہوا نکلنے کی آواز کیسے پہنچ سکتی تھی۔ ماں کو بھی معلوم نہیں تھا ورنہ مہمانوں کے ساتھ ایسی بدسلوکی پر ہمیں سخت سزا ملتی۔ ابا نانا ابا تاڑ گئے تھے مگر وہ انجان بنے رہے۔ ہاں کبھی ہم رنگے ہاتھوں پکڑے جاتے تو وہ ہماری کھال میں بھُس بھر دیتے۔"

جب ہوا ختم ہو گئی اور پیٹرول بھی ختم ہو گیا تو میں نے برٹ سے کہا "ہم ہوا بھرنے والا پمپ بھی لے جا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ" میں نے ڈسٹری بیوٹر کیپ کی نمائش کی "یہ سب تمہیں کل تک واپس مل جائے گا۔ جو شخص بھی یہ پیکٹ لائے اسے ایک ہزار بطور انعام بخشش دینا۔ اگر زیادہ دینا چاہو تو تمہاری مرضی۔ ایک ہزار ہم چھوڑ جائیں گے تمہارے پاس۔"

"کوئی پاگل ہو گا جو پیکٹ لائے گا" برٹ بولا۔

"ہم اسے بتائیں گے کہ اس پیکٹ میں خطرناک زہریلے سانپ ہیں اور تم لوگ ان پر ریسرچ کے لئے یہاں بیٹھے ہو۔ اس طرح وہ پیکٹ کھولے گا نہیں۔ سارا وزن تمہارے پمپ کا ہو گا یا پچاس ہزار کے نوٹوں کا۔ گاڑی کے تار اور پاسپورٹ تو ایسے ہی ہیں۔ تاہم اپنے نجات دہندہ کو تم اس کی محنت کا صلہ ضرور دینا۔ کیا پتا وہ کہاں سے آئے گا۔ اور اب ہمیں اجازت دو۔ صبح ہونے والی ہے۔ امید ہے اور خدا سے دعا ہے کہ ہماری ملاقات پھر نہ ہو۔"

"آمین" برٹ نے تلخی سے کہا "میری دعا یہ بھی ہے کہ خدا تم کو اس ظلم کی سزا دے جو تم نے ہم پر روا رکھا۔"

"خدا بددُعا شاید نہ سُنے۔ وہ خود بہت انصاف پرور ہے اور

والوں کے بھید جانتا ہے" میں نے کہا۔

ہم روانہ ہوئے تو وہ عجیب منظر تھا۔ آسمان پر بادل چھٹ رہے تھے اور مشرق کی طرف سے نکلنے والے سورج کی کرنوں نے ان میں سنہرا رنگ بھر دیا تھا۔ آشیانوں میں رات بھر سہمے رہنے والے طیور دن کے اجالے کو خوش آمدید کہتے ہوئے فضا میں پرواز کر رہے تھے اور اپنے بھیگے پروں کی طاقتِ پرواز بحال کر رہے تھے۔ نیچے درختوں سے اب بھی بارش کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ کہیں کہیں گڑھوں میں بھرا ہوا پانی باقی تھا۔ اس نالی یا نالے میں بھی پانی کی روانی نہ رہی تھی جس میں ٹام گرا تھا۔ اس کی لاش ابھر کر سامنے آگئی تھی اور اکڑ چکی تھی۔

ہم نے اسٹیشن ویگن اور جیپ پر جو شاخیں پھیلائی تھیں وہ طوفانی ہوا سے اڑ گئی تھیں مگر اس سے زیادہ ٹوٹے ہوئے پتے ایک سبز چادر کی طرح چھت کی گیلی سطح پر چپکے رہ گئے تھے۔ گل نے ایک تھیلے میں سامانِ خورونوش بھرا تھا اور کچھ دوائیں ڈال لی تھیں۔ دوسرے تھیلے میں نازو نے نقد رقم، اسلحہ اور روا کی ٹاکی اٹھا رکھا تھا۔

میں نے کہا "ایک بار پھر سمجھ لو۔ اگر تم نے ہمارا تعاقب کیا تو ہم تمہیں شوٹ کر دیں گے۔ تمہیں ہمارے بارے میں کسی کو کچھ بتا کے صرف نقصان ہوگا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ہم پھر تمہیں تلاش کر لیں۔ ورنہ کچھ نہیں ہوگا۔ کل تم پھر اپنی مرضی سے جہاں چاہو گے جا سکو گے۔"

"اگر ٹام نہ مرتا تو ہم تمہیں معاف کر دیتے اور سب کچھ بھلا کے دوستوں کی طرح خدا حافظ کہتے" ماریا نے تلخ لہجے میں کہا "لیکن اب میں چاہتی ہوں کہ تم اپنی منحوس صورت کے ساتھ جتنی جلدی دفع ہو جاؤ اتنا ہی اچھا ہے۔ تاکہ میں سکون سے سانس لوں۔"

میں نے کہا "ٹام نے اپنی بے عقلی سے خودکشی کی۔ اس کی لاش کو درسِ عبرت سمجھنا اور زندہ رہنے کی کوشش کرنا۔"

نازو کا بیگ میں نے اٹھا لیا اور گل کا بیگ غالب نے۔ پانی اور کیچڑ سے بچتے ہم درختوں کے درمیان سے راستہ بناتے بڑھتے گئے۔ مجھے پورا یقین تھا کہ اب برٹ ہمارے پیچھے نہیں آئے گا۔ اب وہ اکیلا مرد تھا۔ جین اور ماریا اسے مرنے نہیں دیں گی۔ وہ خود بھی ٹام کی طرح شعلہ مزاج نہیں تھا۔

ہمارے حلئے کسی طرح بھی ان بدیسی آوارہ گردوں سے کم خراب نہ تھے۔ میری اور غالب کی داڑھی کے اور سر کے بال الجھے ہوئے تھے۔ ہم نے ایک مدت سے حجامت نہیں کرائی تھی اور شیو نہیں کی تھی۔ میں نے اور غالب نے برٹ اور ٹام کے فل بوٹ پہن لئے تھے جو بہت بھاری تھے مگر اس وقت ہمارے پیروں کو کیچڑ اور پانی سے بچا رہے تھے۔ ہماری پتلونیں میلی تھیں اور قمیصوں کو جسم سے جدا ہوئے زمانہ ہو گیا تھا۔ نازو اور گل کا حسن بھی سختیِ حالات اور درماندگی کا شکار تھا۔ ان کے چہرے خشک اور کملائے ہوئے تھے۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نمودار ہو گئے تھے۔ میں نے انہیں بھی پتلون پہننے کا مشورہ دیا تھا مگر انہوں نے انکار کر دیا تھا اور دیہاتی عورتوں کی طرح بستر کی ایک چادر کو دھوتی کی طرح پہننے کو ترجیح دی تھی۔ دھوتی پر جین یا ماریا کا اسکرٹ نہیں پہنا جا سکتا تھا چنانچہ انہوں نے بھی مردانہ قمیص پہن کر دوسری چادر ایسے لپیٹ لی تھی کہ اس وضع قطع میں کسی کو بھی اجنبیت محسوس نہیں ہو سکتی تھی۔

تقریباً ایک فرلانگ دور آ جانے کے بعد غالب نے کہا "یار کیا خیال ہے، میں واپس جا کے انہیں دیکھ آؤں؟"

"کیسے جاؤ گے واپس؟" گل نے کہا۔

"چھپ چھپا کے۔ پتا تو چلے وہ کیا کر رہے ہیں۔"

"اور واپسی کا راستہ بھول گئے پھر؟" نازو نے کہا۔

"تمہارے تصور کو ذہن میں رکھ کے چلتا رہوں گا۔ میرا دل ایک قطب نما ہے اور تمہارا خیال وہ سوئی جو ہمیشہ ایک ہی سمت میں رہتی ہے۔ جدھر تم ہوتی ہو" غالب نے کہا۔

نازو کا چہرہ اندرونی مسرت سے روشن ہوا۔ پھر گل ہنسی تو اس روشنی میں گلابی رنگ شامل ہو گیا "چلو جاؤ۔ فضول باتوں میں جواب نہیں تمہارا بھی" اس نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

غالب گیا اور بیس منٹ میں لوٹ آیا "سب سو رہے ہیں۔ میں نے اندر جھانک کر دیکھ لیا ہے۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا "اس کا مطلب ہے خطرے کی کوئی بات نہیں۔"

اسی وقت آسمان سے ایک جانی پہچانی آواز سنائی دینے لگی۔ میں نے نازو کا ہاتھ پکڑا اور غالب نے گل کو کھینچا۔ ہم سمٹ کر ایک گھنے درخت کے تنے سے چمٹ گئے۔ میں نے ایک شاخ کو ہاتھ بڑھا کر نیچے جھکا لیا۔ پھر غالب نے دوسری شاخ کو کھینچ لیا اور ہمارے سامنے بھی ہریالی آگئی۔ ہیلی کاپٹر کی پھٹ پھٹ واضح ہو گئی تھی۔ اوپر نیلے آسمان کو دھوپ نے روشن کر دیا تھا۔ ہیلی کاپٹر کسی دیو ہیکل سفید پرندے کی طرح پر پھڑپھڑاتا ہمارے اوپر سے گزرا۔

"یہ ہمیں تلاش کر رہے ہوں گے" گل نے کہا۔

"کیا پتا۔ ہیلی کاپٹر ویسے بھی پھرتے رہتے ہیں" غالب نے اسے تسلی دینے کے لئے کہا۔

"مگر صبح صبح۔" نازو نے کہا۔

"ہم تو شاید نظر نہ آئیں.... مگر اسٹیشن ویگن اور وہ کاروان نظر آ جائیں گے" میں نے کہا۔

"ابھی ہم زیادہ دور بھی نہیں ہیں" گل نے کہا۔

"مگر ہیلی کاپٹر دوسری طرف گیا ہے" غالب نے کہا۔

"اگر یہ ہمیں تلاش کر رہے ہوں گے تو پتا چل جائے گا۔ ہیلی کاپٹر پھر آئے گا۔" میں نے کہا۔

ہم آدھا گھنٹا وہیں کھڑے رہے۔ میں نے اور غالب نے شاخوں کو چھوڑ دیا تھا اور خود کو چھپانے کے لئے قریب ہی دوسری

جگہ تلاش کی تھی۔ یہ دو درختوں کے ملنے سے بن جانے والی قدرتی چھت تھی۔ ہم ہیلی کاپٹر کی آواز پر کان لگائے منتظر رہے اور آدھے گھنٹے بعد پھر روانہ ہو گئے۔

چلتے چلتے دو گھنٹے گزر گئے تو سب پر تھکن طاری ہونے لگی۔ دھوپ نے جنگل میں شدید حبس پیدا کر دیا تھا۔ اور گیلی زمین سے اٹھنے والے بخارات بھی ہمارے جسموں پر پسینہ بن کے بہنے لگے تھے۔

آخر کار نازو نے کہا "آخر ہم جا کدھر رہے ہیں؟"

میں نے کہا "مشرق کی طرف۔"

"جدھر مشرقی پاکستان ہے" غالب نے کہا۔

"غلط۔ وہ ہمارے مغرب میں ہے۔"

"کہیں بھی ہو۔ کیا پیدل جائیں گے وہاں تک" نازو بھنّا کے بولی اور وہیں بیٹھ گئی۔ مجبوراً گل بھی رک گئی۔

"اچھا بھئی۔ تمہارا اور ہمارا ساتھ یہیں تک تھا" غالب نے اس سے مصافحہ کر کے کہا "ہم ناک کی سیدھ میں چلتے رہے تو دنیا کا چکر لگا کے اُدھر سے آئیں گے۔ دوسری طرف دیکھتی رہنا۔"

نازو نے مصافحے کے بعد اس کا ہاتھ نہیں چھوڑا اور اسے ایک جھٹکا دے کر زمین پر لٹا دیا "اب ناک کی سیدھ کیا ہے؟"

"عالمِ ارواح" غالب نے آسمان کو تکتے ہوئے کہا "چلو یہاں نہ سہی، وہاں ملیں گے۔"

میں نے ایک صاف جگہ دیکھ کر بیگ رکھ دیا "گل، ہم اس طرف سے آئے تھے۔ اب مخالف سمت میں جانا ضروری ہے۔"

نازو نے کہا "اس طرح کہاں پہنچیں گے۔ یہ سوچنا ضروری نہیں؟"

"اب سوچتے ہیں عزیزہ۔ تم کوئی ٹانک یا مفرّح مشروب پلوا سکتی ہو مسافروں کو؟" میں نے سگریٹ سلگا کے کہا۔

"بریک فاسٹ کا ٹائم ہے۔ ناشتا لگا دو میز پر دو منٹ کے اندر اندر" غالب نے ڈانٹ کر کہا۔

"کیا کھائیں گے سرکار ناشتے میں؟" نازو نے جارحانہ انداز میں پوچھا۔

"یہی جو دستیاب ہے۔ گھاس پھونس۔ آب و ہوا۔ دھوکے دھکے وغیرہ وغیرہ۔ جو نصیب میں ہیں۔"

"میں تھرماس بھرلائی تھی" گل نے سادگی سے کہا "بیگ میں ہے۔"

"اچھا۔ یہ تو کمال کر دیا تم نے مس گل بانو" غالب نے بیگ کھول کے تھرماس نکالتے ہوئے کہا "تم ہو ایک بے حد سلیقہ شعار اور دوسروں کا خیال رکھنے والی لڑکی۔ ان کی طرح نہیں جو ہر وقت یا تو پھاڑ کھانے کو دوڑتی ہیں یا مار پیٹ سے بدمعاشی کے جوہر دکھاتی ہیں۔ اللہ تمہیں جنت میں جگہ دے۔"

"میرے مرنے کی دعا کر رہے ہیں۔"

"کبھی مرنا تو سب کو ہے۔ پہلے سے بکنگ کرا رہا تھا تمہاری۔ دنیاوی دعا اب دوں گا۔ کہ تمہیں مثالی شوہر ملے۔ مثال تو خیر میں ہوں مگر مجھ سے بھی اچھا ہو۔" غالب نے ایک پیکٹ کھولتے ہوئے کہا "واہ واہ۔ اس وقت دل سے دعا نکلی ہے تمہارے لئے۔"

"پیٹ سے نکلی ہو گی" نازو نے کہا "کھانے کی چیز ملی ہے نا۔"

میں نے دوسرے تھیلے میں سے ریوالور نکالے اور سب میں تقسیم کر دیئے "سب کو اپنی حفاظت کے لئے ہر وقت تیار رہنا چاہئے۔"

غالب نے مجھے گرما گرم کافی کا مگ دیا اور بسکٹوں کا پیکٹ کھول کر سامنے رکھ دیا۔ میں اس وقت بیگ میں سے نکلنے والے پاسپورٹ دیکھ رہا تھا۔ میرے سامنے ٹام کا پاسپورٹ تھا اور اس کی تصویر۔ پہلے کبھی مجھے کسی کے پاسپورٹ کو چیک کرنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا اور میں نے اس کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی۔ اچانک میری نظر پاسپورٹ کے اندراجات پر رک گئی۔

"مرزا جی! یہ کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"اگر آپ کی نظر ٹام کی روح کو دیکھ رہی ہے تو میں کیا بتاؤں۔ مجھے تو کچھ نظر نہیں آ رہا ہے سوائے پاسپورٹ کے۔"

"پاسپورٹ میں ٹام کا نام کچھ اور ہے۔"

"ٹام، ڈک یا ہیری۔ اُردو میں کہتے ہیں ایرا غیرا یا نتھو خیرا۔" غالب نے کہا "نام میں کیا رکھا ہے۔"

میں نے پاسپورٹ اس کی طرف پھینک دیا "خود ملاحظہ کرو" میں نے کہا اور دوسرا پاسپورٹ کھول لیا۔

غالب نے کہا "یہ تو واقعی گڑبڑ ہے۔ ٹام انگریز تھا نہیں۔ اس کا باپ انگریز نہیں ہو سکتا۔"

"باپ کیوں نہیں ہو سکتا؟" نازو نے کہا۔

"اگر ہوتا تو ٹام تھوڑی بہت انگریزی ضرور سمجھتا۔ اس نے تو خود کو جرمن یا اٹالین بتایا تھا۔ اور یہ پتا لندن کا ہے۔"

میں نے کہا "تاریخ پیدائش دیکھو۔ اور یہ دوسرا پاسپورٹ برٹ کا ہے۔ یہ بھی جعلی ہے۔"

"جعلی ہے! تم نے کیسے شناخت کر لیا؟" نازو بولی۔

میں نے کہا "یہ دونوں پاسپورٹ دو بھائیوں کے ہیں۔ البرٹ ہارورڈ اور ٹریور ہارورڈ۔ ولدیت ایک ہے۔ تاریخ پیدائش میں چار سال کا فرق ہے لیکن رہائش کا پتا ایک ہے۔ دیکھو۔"

غالب نے دوسرا پاسپورٹ بھی لے لیا "زبردست جعلسازی ہے یہ تو۔ مسٹر شرلاک ہومز۔ آخر اصل افراد کہاں ہیں؟"

"یہ آپ معلوم کریں ڈاکٹر واٹسن۔" میں نے کہا "میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ پاسپورٹ چرا کے تصویریں بدلی گئی ہیں۔"

دونوں پاسپورٹ اب نازو اور گل کے زیرِ مطالعہ تھے اور وہ خالص زنانہ انداز میں ہائے اور اوئی کے ساتھ اُس پر حیرت سے بھرپور اظہارِ خیال کر رہی تھیں۔ میں نے باقی دو پاسپورٹ نکالے۔

"یہ انتہائی پیچیدہ، پُراسرار اور سنسنی خیز کیس تھا جو میں نے حل کرلیا ہے۔ ڈاکٹر واٹسن" میں نے شرلاک ہومز کی طرح تبصرہ کیا۔ "میرے مشاہدے کی تفصیل یہ ہے کہ سب پاسپورٹ ایک وقت میں ایک ہی جگہ سے حاصل کئے گئے۔ کیوں کہ یہ ایک ہی فیملی کی ملکیت ہیں۔ اس میں دو خواتین کی تصویریں بھی بدلی گئی ہیں جو اُن بھائیوں کی بیویاں ہیں یا تھیں۔"

"تھیں کیا مطلب؟ پاسپورٹ نہ رہے تو بیوی بہرحال بیوی رہتی ہے" غالب نے کہا۔

"پیٹریشیا البرٹ اور سوسن ٹریور۔ واقعی" غالب نے کہا "کاش یہ بات پہلے معلوم ہوجاتی۔"

"پھر کیا ہوتا؟" نازو نے کہا۔

"پھر یہ بھی معلوم ہوجاتا کہ ٹام اور برٹ کی اصلیت کیا ہے اور وہ لڑکیاں کون ہیں۔"

"ان کی اصلیت تو دیکھ چکے ہیں ہم" میں نے کہا۔

"ان سے پوچھا جاسکتا تھا کہ پاسپورٹ انہوں نے کیسے حاصل کئے۔ لندن میں اس فیملی سے چھینے تھے یا یہاں کسی سے خریدے تھے۔ کیا وہ فیملی بھی کہیں دورانِ سفر ملی تھی......"

"چھوڑو ان باتوں کو۔ کہاں تک مفروضات قائم کریں گے ہم۔ اس کی تو نہ حد ہے نہ حساب۔ صرف کمالِ فن کو دیکھو۔ کسی نے کتنی مہارت سے تصاویر بدلی ہیں۔"

"یہ کسی پروفیشنل کا ہی کام ہوگا۔ جعل سازی کے دھندے کرنے والے ہر جگہ ہوتے ہیں" غالب نے کہا۔

"یہاں بھی ہوں گے۔ بھارت دیش میں بھی" میں نے کہا۔

غالب نے ایک نعرہ لگایا "سمجھ گیا میں استاد۔ تصویریں پھر بدلی جاسکتی ہیں۔"

"ہاں۔ ان کی جگہ ہم لے سکتے ہیں۔"

"مگر وہ انگریز تھے۔ میرا مطلب ہے سفید فام" نازو نے کہا۔

"ہم کون سے کالے ہیں۔ اور رنگ بدلنا تو گرگٹ کو بھی آتا ہے۔ ہمارے لئے ولایتی بننا کیا مشکل ہے؟" میں نے کہا۔

"دیسی مال کو ولایتی بنانے میں ہمارا جواب نہیں" غالب بولا۔

"وہ انتظار کریں گے۔ اور کرتے رہیں گے۔"

غالب نے ایک قہقہہ مارا "یقین بھی بعض اوقات کتنا غلط ہوتا ہے۔ وہ مطمئن تھے کہ پاسپورٹ واپس مل جائیں گے۔ ہماری نظر فرق کو نہیں دیکھے گی۔ حالاں کہ یہ نظر کا نہیں عقل کا مسئلہ تھا۔"

اس انکشاف کے ساتھ ہی کہ پاسپورٹ کسی اور کے ہیں جن پر اپنی تصویریں لگا کے ٹام اور اس کے ہم سفر دنیا گھوم رہے تھے، میرے ذہن میں بہت سی کہانیاں گردش کرنے لگی تھیں۔ شاید ان کا جرم اتنا ہی تھا کہ انہوں نے پاسپورٹ بدلوائے تھے مگر سوال یہ تھا کہ کیوں؟ یورپی ممالک میں پاسپورٹ کا حصول کوئی مشکل کام نہیں جیسا کہ ہمارے ملک میں ہے۔ تصدیق و تفتیش کے مراحل میں الجھا کے سرکاری اہلکار ضابطے کی کارروائی اس وقت تک پوری نہیں ہونے دیتے جب تک کہ درخواست دینے والا چکرا چکرا کر پریشان نہ ہوجائے اور انہیں نذرانہ پیش کرکے جان نہ چھڑالے۔ ٹام اور برٹ کو اپنی شناخت چھپانے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر ان کے اصل پاسپورٹ کھوجاتے تو ان کے سفارت خانے بڑی مستعدی کے ساتھ انہیں فوراً ڈپلی کیٹ جاری کردیتے۔ کیا وہ بھی مجرم تھے؟ مجرم تھے تو ان کا جرم کیا تھا؟ یہ بات ناقابلِ فہم تھی کہ محض پاسپورٹ حاصل کرنے کے لئے انہوں نے چار افراد کے ایک کنبے کا صفایا کردیا ہو۔ ابھی تک وہ کہیں بھی پکڑے نہیں گئے تھے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ہندوستان میں تھے جہاں سب چلتا ہے۔ اگر گم ہوجانے یا چوری ہونے والے پاسپورٹ کے بارے میں کوئی رپورٹ برطانیہ کے وزارتِ داخلہ کے پاس تھی تو اس کا ریکارڈ دنیا کے ہر ملک میں نہیں تھا۔

"اب کس سوچ میں پڑگئے؟" غالب نے کہا "کیا ان سے کئے ہوئے وعدے کا خیال ستارہا ہے۔"

میں نے کہا "نہیں۔ ایسے لوگوں سے کیا ایفائے عہد۔ میں تو سوچ رہا تھا کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟"

"وہ بھی ہماری طرح ہی تھے۔ بس یہ بات ذرا دیر سے معلوم ہوئی۔"

"انہوں نے مدد بہرحال کی تھی ہماری۔"

"صرف پیسے کے لالچ میں۔ یا مجبور ہوکے؟"

"پاسپورٹ نہ سہی، یہ رقم انہیں پہنچادیتے ہم تو اچھا تھا" میں نے کہا "اور مجھے اپنے وعدے کا خیال تھا۔"

"ان کی فکر چھوڑو۔ وہ خود نمٹ لیں گے اپنے مسائل سے۔" غالب نے کہا "یہ پیسہ کب تک ساتھ دیتا ان کا؟ شراب پی کر چند دن میں اڑادیتے۔ ان کی زندگی نہ سنورتی نہ سُدھرتی۔ وہ جس راستے پر چل رہے ہیں وہ انہیں کسی خوابوں کی جنت میں نہیں پہنچائے گا۔ وہ اپنے اعمال کے جہنم میں ہی جئیں گے اور مریں گے۔"

"مگر یہ گاڑی کا سامان؟ یہ تو انہیں واپس ملنا چاہئے جو ہم زبردستی لے آئے ہیں۔ اس کے بغیر گاڑی ناکارہ ہوجائے گی ان کی۔ پیٹرول تک بہادیا تھا ہم نے۔ اب ہم محفوظ ہیں تو انہیں مصیبت میں گرفتار رکھنے کا فائدہ" میں نے کہا۔

"اچھا پھر جیسی تمہاری مرضی؟" غالب نے کہا۔

نازو نے میری حمایت کی "ہاں یہ تو بہت ظلم ہوگا ان پر۔ وہ مجرم ہیں یا کچھ اور ہمیں کیا۔"

گل نے کہا "میں تو کہتی ہوں سب لوٹادو انہیں۔ کیا کریں گے ہم جعلی پاسپورٹ رکھ کر۔ پاسپورٹ ویسے ہی بن جاتے ہیں۔ تھوڑا سا پیسہ خرچ ہوتا ہے۔"

"بی بی، یہ برطانوی پاسپورٹ ہیں۔ انڈین نہیں۔ ان کی عزت اور وقعت کو تم کیا جانو۔ بھارتی پاسپورٹ کے مقابلے میں ان کی وہی حیثیت ہے جو روپے کے مقابلے میں ڈالر کی۔" غالب نے کہا۔

"مگر اس پر نام بھی ولایتی ہے" نازو نے کہا "ہم اپنی صورت بدل سکتے ہیں مگر لہجہ نہیں۔"

"میں تو ایسے فرفر انگریزی بھی نہیں بول سکتی جیسے آپ سب لوگ بول لیتے ہیں" گل نے جھینپ کر کہا۔

"چلو سب کی یہی رائے ہے تو پاسپورٹ بھی واپس کردیں گے" میں نے کہا "ابھی تو چلو۔"

ایک بار پھر ہم نے سامان سمیٹ لیا۔ جنگل اب چھدرا ہوگیا تھا اور اس میں انسانی قدموں نے برسوں میں جو راستے بنادئے تھے وہ نمایاں ہونے لگے تھے۔ آدھے گھنٹے بعد ہم ایک کچی سڑک پر پہنچے۔ اس کی گیلی زمین پر تانگوں اور بیل گاڑیوں کے گزرنے سے نالیاں سی بن گئی تھیں۔ یہ تازہ نظر آنے والے نقش تھے۔ گزشتہ رات کی موسلادھار بارش نے پرانے نقش مٹادئے ہوں گے۔

ہم نے وہیں رک کے انتظار کیا۔ کچھ دیر بعد ایک بیل گاڑی نمودار ہوئی جس پر گول محرابی چھت تھی۔ یہ چھت ہٹائی بھی جاسکتی تھی اور ضرورت کے مطابق اسے مال لے جانے یا مسافر لے جانے کے لئے استعمال کیا جاسکتا تھا۔

قریب آکے بیل گاڑی خود ہی رک گئی۔ اس میں بریک کا خود کار نظام نہیں تھا۔ یہ ڈرائیور اور بیل کے درمیان مکمل ذہنی ہم آہنگی کا نتیجہ تھا کہ بیل اپنے مالک کے دل کی بات سمجھ لیتا تھا۔

اس نے عجیب و غریب اُردو ہندی ملا کے سوال کیا تھا جس کا مطلب میں نے یہ نکالا "کہاں جاؤ گے جناب؟"

میں نے کہا "تم کہاں جارہے ہو؟"

اس نے دانت نکال کے عام فہم زبان میں کہا "ہم تو ہری پور لوٹ کر جارہے ہیں۔"

میں نے کہا "پہلے اتنی مشکل زبان کیوں بولی تھی؟"

اس نے کہا "وہ یہاں کی بولی ہے۔"

میں نے کہا "ہم راستہ بھول گئے ہیں۔ ناگپور سے چلے تھے۔ راستے میں بارش نے آلیا۔"

"ناگپور سے؟" وہ حیران ہو کے بولا "وہ تو ادھر سے بہت دور ہے۔"

"ضرور ہوگا۔ اس میں حیرانی کی کون سی بات ہے؟"

"ہم ناگپور نہیں لے جاسکتے آپ لوگاں کو" اس نے بیل کی طرف دیکھا اور بیل اسٹارٹ ہوگیا۔

"ارے بھائی، رکو" میں نے کہا "آخر تم کہاں پہنچا سکتے ہو ہمیں؟ کسی سڑک یا ریلوے اسٹیشن تک لے جاسکتے ہو ہمیں؟ پیسے دیں گے ہم۔"

بیل پھر رک گیا "سڑک جس پر لاریاں چلتی ہیں وہ تو ہے ادھر ہے دو میل۔ اور گاڑی پر چڑھنا ہے تو پانچ میل ادھر ہری پور کا اسٹیشن ہے۔ رات کو ملے گی گاڑی اندور جانے کے لئے۔"

"رات تک کوئی ٹرین نہیں؟" میں نے اپنا بیگ اندر رکھا اور گل کو بیل گاڑی میں سوار ہونے کا اشارہ کیا۔

"گاڑیاں تو بہت آتی ہیں۔ لیکن سب گزر جاتی ہیں بغیر رکے" بیل گاڑی والے نے کہا "صبح گیارہ بجے بھی ایک گاڑی اندور سے آتی ہے مگر وہ تو نکل جائے گی۔"

"ہاں۔ گیارہ بجنے والے ہیں" غالب نے بیٹھنے کے بعد کہا۔

"پھر کیا خیال ہے؟ ہری پور جاؤ گے تو سو روپے۔ ورنہ ندی تک پہنچانے کے پچاس روپے" وہ بولا۔

"کوئی ندی بھی ہے یہاں؟"

"ہاں۔ دو میل کے بعد ندی ہے۔ اس کے پار سڑک ہے۔" بیل گاڑی والے نے کہا۔

"اس پر پُل بھی ہوگا۔"

"پُل بہت دور ہے۔ یہاں کشتی سے ندی پار کرلو" اس نے ہمیں انجان سمجھتے ہوئے مشورہ دیا۔

"تمہارا کون سا گاؤں ہے؟" میں نے کہا۔

"ادھر ہری پور، ابھی بتایا تھا آپ کو۔ گاڑی وہیں سے ملتی ہے" وہ بولا۔

میں نے سوچ کے کہا "بہتر تو یہی ہوتا کہ ہم گاڑی سے جاتے۔ مگر دن کہاں گزاریں گے؟"

غالب نے کہا "سارا دن ریلوے پلیٹ فارم پر تو نہیں بیٹھ سکتے۔"

"وہاں بیٹھ کے کیا کروگے۔ کھانے پینے کو بھی کچھ نہیں ملے گا" وہ بولا "کوئی بھی نہیں ہوگا اس وقت تو۔"

"گاؤں میں ہے ایسی کوئی جگہ؟"

"میرے گھر چلو۔ رات کو گاڑی کا ٹائم ہوگا، اس سے پہلے ہی اسٹیشن پہنچانا میرا کام" وہ بولا۔

ایک گھنٹے بعد ہم اس گاؤں میں پہنچے جو ہری پور کہلاتا تھا۔ معلوم نہیں ہندوستان میں اور کتنے ہری پور ہوں گے۔ ایک ہری پور ضلع ہزارہ میں بھی تھا اور وہاں پاکستان ٹیلی فون فیکٹری تھی۔ یہ گاؤں اس کے مقابلے میں بہت چھوٹا تھا۔ دو ڈھائی سو گھروں کی آبادی میں ہماری آمد نے خاصی ہلچل پیدا کی مگر بیل گاڑی والا سادہ دیہاتی تھا اور ہم جیسے مہمانوں کی آمد اس کے لئے باعثِ عزت تھی۔ اس کی بیوی اور ماں نے سارا دن ہماری خدمت کی۔ ہم نے دن آرام کرتے گزارا۔ شام کو غسل کے بعد ہم کپڑے حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ اس کے لئے ہمیں جھوٹ پر جھوٹ بولنا پڑا کہ ہمارے کپڑے گاڑی میں تھے اور گاڑی جو ناگپور سے آئی تھی واپس چلی گئی۔ ہماری کہانی میں بہت سقم تھے مگر انہوں نے کوئی

جرح نہیں کی اور ہر بات کا صدقِ دل سے یقین کرتے رہے۔

وہ ایک عام سا گاؤں تھا جہاں کسی بھی مہمان یا اجنبی کی آمد وقتی طور پر تھوڑی سی ہلچل پیدا کرتی ہے۔ چند بچوں نے بیل گاڑی کا تعاقب کیا۔ انہیں بیل گاڑی والے نے بھگا دیا۔ تاہم ان کی زبانی یہ خبر آس پڑوس کے گھروں تک پہنچ گئی۔

بیل گاڑی ایک پکے اینٹوں کے بنے ہوئے مکان کے احاطے میں داخل ہو کے رک گئی۔ احاطے کی دیوار کچی تھی اور مکان کا نصف حصہ زیرِ تعمیر نظر آتا تھا۔ شاید اس کو پختہ کرانے کا تعمیراتی کام مالی وسائل کی کمی کے باعث رک گیا تھا۔

بیل گاڑی سے اُتر کے میں نے کہا "یار تم نے مہمان تو بنا لیا مگر میزبانوں کا نام ہمیں ابھی تک نہیں معلوم۔"

"اجیت سنگھ ہے جی میرا نام ---" وہ بولا۔

"یعنی تم سکھ ہو؟" میں نے اس کے حلئے کو حیرانی سے دیکھا۔

"میں پکا سکھ ہوں۔ مگر ماں کہتی ہے کہ میرا ایمان خراب ہو گیا ہے کیوں کہ میں نے کیس کٹوائے ہیں۔ کرپان اور کنگھی بھی نہیں رکھتا۔ کڑا نہیں پہنتا۔ صرف کاچھے کا سکھ رہ گیا ہوں۔ کاچھا تو سب ہی پہنتے ہیں۔ باپ نے مجھے گھر سے نکال دیا تھا۔ میں گردوارے بھی نہیں جاتا۔ کیوں کہ جا نہیں سکتا" وہ بولتا رہا اور بیلوں کو کھولتا رہا۔

گل' نازو اور غالب میرے ساتھ ہی اتر آئے تھے۔ اندر سے نمودار ہونے والی ایک بوڑھی اور دوسری جوان عورت حیرت اور تجسس کے ساتھ دور کھڑی ہمیں دیکھ رہی تھیں۔

میں نے کہا "اجیت سنگھ! ہم نہیں چاہتے کہ ہمیں عجوبہ سمجھ کے سارا گاؤں دیکھنے آئے۔ ہم انہی جیسے انسان ہیں۔"

"لوگ یہاں مہمان کو عجوبہ سمجھ کے دیکھنے نہیں آتے' ان سے ملنے آتے ہیں" اجیت سنگھ نے کہا "تم نہیں ملنا چاہتے تو مرضی تمہاری۔ میں منع کر دوں گا۔"

میں نے وضاحت کی "ہم بہت تھکے ہوئے ہیں۔ ساری رات جنگل میں چلتے رہے ہیں۔ ہمیں آرام کی ضرورت ہے اور کوئی بات نہیں۔"

اس نے سرہلایا اور بولا "آؤ تمہیں بی بی اور بے بے سے ملاؤں۔"

بی بی بڑی خوب صورت سکھنی تھی اور گاؤں میں رہنے والی کا رکھ رکھاؤ شہری عورت سے کم نہ تھا۔ اس نے بڑی خوش دلی کے ساتھ گل' اور نازو کو سینے سے لگایا جیسے وہ پرانی سہیلیاں ہوں۔ مگر بے بے نے انہیں بادل نخواستہ سر پر ہاتھ رکھ کے دعا دی اور اندر چلی گئی۔

اجیت سنگھ بھی بہت تندرست اور جوان آدمی تھا اور کسی طرح بھی دیہاتی نہیں لگتا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے شک ہوا کہ اس کا حسنِ سلوک ظاہر کا پردہ ہے' اندر کی بات کو چھپانے کے لئے۔

یہ اندر کی بات کیا تھی' اس کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔

اس نے اپنی بیوی سے کہا "یہ مسافر ہیں۔ رات تک ٹھہریں گے۔ رات کی گاڑی سے اندور چلے جائیں گے۔"

بے بے نے یہ سب دروازے کے پیچھے سے سُنا اور اچانک سر نکال کے کہا "پر یہ ہیں کون؟"

"تجھے کیا نظر آتے ہیں بے بے؟ انسان یا جن؟"

بے بے نے بگڑ کے کہا "ارے کس دھرم کے ہیں؟ کہیں پھر مُسلوں کو تو نہیں لے آیا ہے گھر میں۔"

"مُسلے ہوں یا کرسٹان۔ دو وقت کی روٹی کھائیں گے۔ تیرا دھرم خراب نہیں کریں گے۔ زیادہ مت بول" بیٹے نے ماں کو جھاڑ کے کہا۔

"میں روٹی کا انتظام کرتی ہوں" اجیت سنگھ کی بیوی نے کہا۔ ان کے درمیان ساری گفتگو پنجابی میں ہوئی تھی جو ہم سب نے سمجھ لی تھی۔

اجیت سنگھ پھر ہم سے مخاطب ہو گیا "تم بھی اب بوٹ شوٹ اتارو۔ نہانا دھونا ہے تو ادھر پیچھے جگہ ہے۔ ہاتھ کا نلکا چلاؤ اور نہاؤ۔ کپڑے شپڑے بدلو۔"

کمرے میں دو چارپائیاں تھیں۔ ایک پر گل اور نازو لیٹی تھیں۔ دوسری پر میں اور غالب۔ اجیت سنگھ دروازے کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ اچانک میں نے اس کے بالوں کو دیکھا۔ کان سے اوپر سیدھے ہیئرکٹ نے مجھے چوکنا کر دیا۔ یہ ہیئرکٹ فوج یا پولیس سے تعلق کو ظاہر کرتا تھا۔ اجیت سنگھ کا رویّہ اب مجھے پہلے سے زیادہ پُراسرار نظر آنے لگا۔

وہ بات کرتے وقت دیکھتا ہماری طرف تھا مگر لگتا یوں تھا جیسے اس کا ذہن کچھ اور سوچ رہا ہے۔ اس کی بات چیت کا انداز بھی عین شہری تھا۔ اس نے پہلے مقامی بولی میں کچھ کہا تھا اور پھر اپنا لہجہ بھی بدل دیا تھا۔ دوسری حیران کن بات یہ تھی کہ اس نے ہم سے کچھ پوچھا ہی نہیں تھا۔ نہ ہمارا نام اور پتا' نہ آپس کا تعلق۔ ہم کام کیا کرتے ہیں اور ایسا حلیہ کیوں بنائے ہوئے ہیں۔ سب سے اہم سوال بھی اس نے نظر انداز کر دیا تھا کہ ہم شکاری ہیں تو ہمارے ہاتھ میں بندوق کیوں نہیں اور ہم ناگپور سے چل کے راستہ بھول گئے تھے تو واپس ناگپور کیوں نہیں جاتے؟ اندور کیوں جانا چاہتے ہیں؟

جب گل اور نازو غسل کرنے گئی ہوئی تھیں تو میں نے چارپائی پر لیٹے لیٹے کہا "اجیت سنگھ! تم کیا کرتے ہو؟"

"وہی جو باپ دادا کرتے آئے ہیں؟" اس نے گول مول جواب دیا۔

"کھیتی باڑی تو نہیں کرتے تم" غالب نے کہا۔

وہ چونکا "یہ آپ کو کیسے پتا چلا؟"

"تمہارے لہجے سے' تمہاری باتوں سے اور تمہارے

ہے۔" میں نے کہا "کیا تم فوج میں ہو؟"

اس نے چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد اقرار میں سرہلا دیا۔

"ٹھیک پہچانا تم نے۔ میں فوجی ہوں۔ آج کل چھٹی پر ہوں۔"

"چھٹیوں میں بیل گاڑی چلاتے ہو؟" میں نے مذاق میں کہا۔

"اپنی ضرورت کے لئے نہیں چلاتا۔ دوسروں کو ضرورت پڑے تو انکار نہیں کر سکتا" وہ بولا۔

"جب تمہاری چھٹی ختم ہو جائے گی تو بیل گاڑی کون چلائے گا' بیل کیا کریں گے؟"

"بیل آرام کریں گے یا ہل چلائیں گے۔ گاڑی کھڑی رہے گی۔ بی بی یا بے بے کو کہیں آنا جانا ہو گا تو کام آئے گی۔" وہ بولا۔

"کون لے جائے گا انہیں؟"

"بہت لوگ ہیں۔ چاچے مامے' ان کے پُتّر۔ وہی ہماری زمین پر بھی ہل چلاتے ہیں۔ ماں بیوہ ہے۔ اس کو ساری فصل مل جاتی ہے۔ مزارع ہوں تو حصہ مانگیں" وہ بولا۔

"تم نے ابھی تک ہمارے بارے میں کچھ نہیں پوچھا؟ نہ نام نہ مذہب۔ کیا ہمارا صرف انسان ہونا کافی ہے؟"

"مذہب سے مجھے فرق نہیں پڑتا۔ تم غلط بھی بتا دیتے اگر ماں پوچھتی" وہ بولا "وہ غیر سکھ کو گھر میں برداشت نہیں کرتی۔"

میں نے اچانک پنجابی میں کہا "سکھ تو نہیں ہیں ہم اور کرسٹان بھی نہیں ہیں۔"

وہ پھر چونکا "تم نے ساری بات سن کے سمجھ لی تھی؟"

"ہاں۔ تم شاید جالندھر امرتسر کے ہو" میں نے کہا۔

"اور تم لاہور کے؟" وہ بولا۔

میرے اور اس کے اندازے کی بنیاد وہ فرق تھا جو لاہور اور جالندھر و امرتسر کے پنجابی الفاظ اور لب و لہجے میں ہے۔ درمیانی فاصلہ صرف تیس پینتیس میل ہونے کے باوجود مقامی لوگ اس فرق کو نوٹ کر لیتے ہیں۔

گل اور نازو نہا کے آئیں تو میں اور غالب انہیں دیکھ کر دم بخود رہ گئے۔ وہ پھول دار ریشمی قمیص اور پنچ کرتی ہوئی شلواریں پہن کے پھر اپنے اصل اندازِ حسن میں نمودار ہوئی تھیں۔ دُھل کے ان کے رنگ و روپ میں پرانی تابندگی آ گئی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ انہوں نے یہ کپڑے اجیت سنگھ کی بیوی سے لئے تھے لیکن مجھے یہ بات پوچھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔

اجیت سنگھ ہمارے سر پر سوار تھا "چلو اب خیر سے تم بھی نہا دھو کے آجاؤ تو روٹی شوٹی کھائیں۔"

میں نے اور غالب نے فل بوٹ پہلے ہی اتار دئے تھے اور مسلسل سفر میں جکڑے رہنے والے پاؤں آزاد ہو کے بڑی راحت محسوس کر رہے تھے۔ سردی کے موسم میں ٹھنڈے پانی سے نہا کے گل' اور نازو کانپ رہی تھیں مگر نہانا ضروری تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ ہینڈ پمپ کا پانی خوشگوار حد تک گرم ہو گا۔

اجیت سنگھ نے گل سے کہا "لحاف کھول کے آرام سے بیٹھو' سردی دور ہو جاوے گی۔"

تھوڑی سی جھجک کے ساتھ گل اور نازو نے ایک ہی لحاف میں پناہ لے لی اور گیلے بالوں کو تولئے سے رگڑ کے خشک کرنے لگیں۔ میں نے دل میں ایک انجانی سی بے چینی محسوس کی۔ گاؤں کے اس گھر میں ہمارے ساتھ برتے جانے والے تکلفات اس درجہ شہری تھے کہ مصنوعی لگتے تھے۔ اس سے پہلے بھی ہم نے دیہات کے گھروں میں قیام کیا تھا مگر وہاں کسی نے ہمارے لئے ہماری ضرورت کے مطابق انتظام نہیں کیا تھا بلکہ جو کچھ تھا' وہ حاضر کر دیا تھا۔ اصل چیز ان کا جذبہ تھا جو میزبان بنے تھے۔ جو سادگی اور خلوص کا مظہر تھا۔ یہاں سادگی مفقود تھی تو کہیں خلوص بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

میں نے اور غالب نے غسل کرتے ہوئے امدادِ باہمی کے فارمولے پر عمل کیا۔ پہلے میں ہینڈ پمپ چلاتا رہا اور وہ اس کے سامنے گرنے والی موٹی دھار کے نیچے بیٹھا جسم کو لال صابن سے دھو دھو کے سارے میل کو بہاتا رہا۔ پھر میری باری آئی۔

میں نے موقع پاتے ہی اپنے خدشات کا اظہار کر دیا "مرزا! یہ آدمی کچھ پُراسرار ہے۔"

"پُراسرار اور خطرناک" غالب نے سردی سے بتّیسی بجاتے ہوئے کہا "باہر سے کچھ اور نظر آتا ہے جبکہ اندر کا آدمی گھات میں ہے۔"

"تم نے میرے دل کی بات کہہ دی۔ کوزے کو دریا میں بند کر دیا۔" میں نے نہاتے ہوئے کہا "ذرا توجہ سے ہینڈل چلائیے۔ بندہ نہا رہا ہے' آپ کا بھوت سسر نہیں۔"

اس نے کہا "جسم کو گرم کرنے کے لئے اچھی ورزش ہے۔" اور زیادہ قوتِ ایمانی کے ساتھ پمپ چلانے لگا۔

"میری اس پر نظر ہے اپنے مرزا صاحب" میں نے کہا۔

"کس پر؟ مانا کہ کرپان نہیں ہے اس کے پاس مگر سکھنی پر نظر ہے تمہاری تو....."

"لاحول ولا قوۃ۔ میں اجیت سنگھ کی بات کر رہا تھا۔"

"میں بھی غافل نہیں ہوں۔ حیرت کی بات ہے اس نے تمہارے کہنے پر بھی نام نہیں پوچھے۔ بات گول مول کر گیا" غالب نے کہا "وہ اتنا بڑا فلسفی تو ہو نہیں سکتا کہ کہے' نام میں کیا رکھا ہے۔ اس کے رویّے سے ایک منطقی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔"

"وہ کیا؟ تھینک یو۔ میں نہا چکا۔ آپ بلاوجہ پانی بہا رہے ہیں" میں نے کہا۔

"وہ ہمارے نام پہلے سے جانتا ہے" غالب نے کہا۔

میرے جسم پر کپکپی طاری ہو گئی "واقعی' یہ ہو سکتا ہے مرزا۔ بڑا وزن ہے تمہاری بات میں۔ پھر اب کیا کریں؟"

"کھانے کے ڈکار لیں اور لمبی تان کے سو جائیں۔" غالب نے کہا "دیسی ترنج۔ مکھن اور دیسی گھی۔ گڑ لسی اس کا لازمی جزو ہوں

گے۔"

"سو کے اٹھیں تو تھانے چلے جائیں" میں نے کہا "خوب!"

"سردی میں آپ کی عقل منجمد ہو رہی ہے۔ میرا مطلب تھا کہ ہم اپنے شکوک کو ظاہر نہ ہونے دیں۔ خود کو بدستور احمق اور خوش فہمی کا شکار ثابت کرتے رہیں۔ یہ پتا نہ چلے کہ ہم محتاط ہو گئے ہیں اور اپنے دفاع کی طرف سے فکر مند ہیں۔ سوتے وقت ایک آنکھ کھلی رکھیں۔"

"مشکل کام ہے" میں نے کہا "ایک آنکھ سے سونے اور دوسری سے جاگنے کا تجربہ کبھی نہیں کیا۔ رنجیت سنگھ کر سکتا تھا۔"

"اجیت سنگھ کے ہاتھوں جھٹکا ہو جائے گا سب کا۔" غالب نے کہا۔

اسی وقت اجیت سنگھ نمودار ہوا۔ اس کے پاس مردانہ شلوار قمیص کے دو جوڑے تھے۔ صاف دُھلے ہوئے اور استری کئے ہوئے۔

"یہ پہن لو بھاجی" اس نے قدرے اپنائیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا "پرانے کپڑے ادھر ہی چھوڑ دو۔ بی بی دھو کے ڈال دے گی۔"

میں نے کہا "تم نے تو حد کر دی یار۔ اب بیوی کو کیوں تکلیف دیتے ہو۔ ہمارے کپڑے وہ بھی دھو کے ڈال سکتی ہیں۔"

"ہماری گھر والیاں" غالب نے کہا "ان کپڑوں کی ضرورت بھی نہیں تھی مگر خیر۔"

خلافِ توقع کھانے کا مینو وہ نہیں دیا جو غالب نے بتا دیا تھا۔ ہمارے سامنے گندم کی روٹی' آلو کی بھجیا اور دہی رکھا گیا اور بعد میں چائے سرو کی گئی۔ کسی حیرت کا اظہار کئے بغیر ہم نے ڈٹ کے کھایا اور اس کی مہمان نوازی کے ممنون ہوتے رہے۔ اس کی بیوی کچھ بجھی بجھی نظر آئی۔ وہ خاصی ہنسوڑ اور بے باک عورت تھی۔ غالباً اسے اجیت سنگھ نے شٹ اپ کر دیا تھا۔

میزبان کی خواہش پر ہم نے فوراً سونے پر بھی رضامندی ظاہر کی۔ ایک چارپائی پر گل اور نازو تو فوراً سو گئیں۔

میں نے اور غالب نے دروازے کے بند ہو جانے کے بعد اندھیرے میں کانا پھوسی جاری رکھی۔

"ہم لیٹے لیٹے کچھ نہیں کر سکتے" غالب نے کہا۔

"پھر کیا کریں' اٹھیں اور ڈز ڈز گولیاں چلاتے ہوئے نکل جائیں۔ جب تک اجیت سنگھ کچھ نہ کرے....."

"اسے کچھ نہیں کرنا ہو گا۔ سوائے پولیس کو بلانے کے۔" غالب نے کہا "اور میرا خیال ہے' وہ جا چکا ہے۔"

اس کا خیال فوراً غلط ثابت ہو گیا۔ دروازہ آہستہ سے ہلا۔ میں نے روشنی کی لکیر کو چوڑا ہوتے محسوس کیا۔ کمرے میں اجالا بڑھ گیا۔ میں نے ایک آنکھ کو تھوڑا سا کھول کے دیکھا۔ اجیت سنگھ اندر آ چکا تھا اور اس نے دروازہ پھر بند کر دیا تھا۔ دروازے نے چوں تک نہیں کی تھی۔ وہ غور سے یہ دیکھ رہا تھا کہ ہم سو چکے ہیں یا نہیں۔ ہم نے حلق سے ایسی آوازیں نکالیں جو بعض لوگ سوتے میں نکالتے ہیں۔

اجیت سنگھ آگے بڑھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لمبا خم دار چمکیلا چھرا تھا۔ کرپان۔ مجھے خیال آیا۔ جو شاید اس کے باپ کی ہو گی لیکن آج بھی ہماری گردنوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ سکتی تھی۔

وہ دبے پاؤں بیگ کی طرف بڑھا۔ دونوں بیگ چارپائی کے نیچے کھسکا دئے گئے تھے جس پر میں اور غالب دراز تھے۔ وہ مجھ سے چند انچ کے فاصلے پر گھٹنوں کے بل بیٹھا اور بیگ کھینچنے لگا۔ میں نے انتظار کیا اور اس نے جیسے ہی بیگ اٹھانے کا ارادہ کیا' میں نے اسے یوں دبوچا کہ وہ حلق سے آواز تک نہ نکال سکا۔

غالب میرے ساتھ ہی چھلانگ مار کے اٹھا۔ اس نے اجیت سنگھ کی کرپان چھین لی اور اسے ہوا میں لہرایا۔

میں نے کہا "دیکھ کے وار کرنا' میرا ہاتھ نہ کٹ جائے گردن کے ساتھ ہی۔"

غالب نے کہا "فکر مت کرو۔ میرا ہاتھ بہت صاف ہے اور کرپان بھی واہ واہ ہے۔"

اجیت کی آنکھوں میں وحشت پھیل گئی تھی۔ غالب نے کرپان اٹھائی اور وار کیا مگر عین اس وقت جب کرپان اس کی گردن کو چھونے والی تھی' غالب نے اپنا ہاتھ روک لیا۔

"یار خون بہے گا۔ کپڑے الگ خراب ہوں گے۔"

میں نے سر ہلایا "ٹھیک ہے۔ ایسے ہی ٹھنڈا کر دیتا ہوں میں' گردن توڑ کے۔"

"میزبان کچھ کہنا چاہتا ہے۔ شاید اس کی کوئی آخری خواہش ہو" غالب نے کہا۔

اجیت نے نفی میں سر ہلانے کی کوشش کی۔ اسے بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ میری گرفت کسی عام آدمی کی گرفت نہیں ہے۔ وہ خود اچھا خاصا تندرست جوان تھا مگر میں نے اسے یوں دبا لیا تھا کہ وہ سانس لینے کے سوا کوئی حرکت کرنے سے قاصر تھا۔

"ہمیں اندازہ ہو چکا ہے تمہارے ارادے کا۔ اور یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ تم بہت چالاک ہو۔ تم پہچان چکے تھے ہمیں اور اب تک انجان بنے رہنے کی اداکاری کر رہے تھے۔ تم یا تو فائدہ اٹھانا چاہتے ہو یا اپنا فرض ادا کرنے کی سوچ رہے ہو۔ دونوں صورتوں میں نقصان تمہارا ہو گا۔ ہم کسی کے ہاتھ آنے والے لوگ نہیں ہیں۔ تمہارے گھر کا نمک نہ کھایا ہوتا تو تمہیں اتنی رعایت بھی نہ ملتی۔ جب تک لوگوں کو معلوم ہوتا کہ تم' تمہاری بے بے اور بی بی سب دنیا سے کوچ کر چکے ہو' ہم اتنی دور نکل جاتے کہ تمہارے رونے والے چاچے مامے کا خیال بھی وہاں تک نہ پہنچتا....."

"اجیت سنگھ کو موقع دو ایک....."

میں نے آہستہ آہستہ اس کے منہ پر سے ہاتھ ہٹایا۔ پھر اسے آزاد کر دیا۔ وہ اٹھا اور ایک ہاتھ سے گردن ملنے لگا۔

"تم پولیس کو اطلاع دو گے تو انعام کب ملے گا؟ ملے گا یا نہیں ملے گا' تم کچھ نہیں جانتے۔ ہم سے سودا کر لو۔ ہم اپنی آزادی کی قیمت دُگنی ادا کریں گے۔ نقد اور اسی وقت" میں نے کہا۔

"دُگنی..... چالیس ہزار....." وہ بولا۔

"چالیس ہزار" میں نے کہا "مگر اس کے بعد تمہاری زندگی بھی اسی طرح ہمارے قبضے میں ہو گی جیسے ہماری رقم تمہاری جیب میں۔ ہمیں ذرا بھی شبہ ہوا تو ہم رقم واپس لے لیں گے تمہیں مار کے۔ لالچ ہی آدمی کو مرواتا ہے۔ اگر تم نے یہ سوچا کہ پہلے ہم سے چالیس ہزار لے کر پھر پولیس سے بھی بیس ہزار وصول کرنے کی گنجائش ہے تو تمہیں یہ خیال بھی مہنگا پڑے گا۔ ادھر تمہارے دماغ میں یہ خیال آیا' ادھر آتما تمہارے شریر سے نکلی۔ ایک ہاتھ مار کے گردن کیسے توڑی جاتی ہے۔ کہو تو تم پر تجربہ کر کے دکھاؤں؟ مگر تم دیکھو گے کیسے؟ اور کسی کی گردن فالتو ہے نہیں۔"

"میں..... دیکھو..... میں....." اس نے بڑی مشکل سے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا "بہت کمینہ آدمی ہوں میں۔ تم کو مہمان بنا کے لایا..... میں تمہاری..... زندگی کا سودا کرنا چاہتا تھا..... صرف بیس ہزار میں..... مگر میں کیا کروں۔ میں بہت مجبور ہوں۔ دو ہی راستے تھے میرے سامنے۔ یا تو میں کہیں ڈاکا ڈالوں یا کسی کی جان لے لوں۔ اپنی یا راج کی۔"

"یہ راج کون ہے؟" میں نے کہا۔

وہ بے حد غمگین' شرمندہ اور خوف زدہ سر جھکائے بیٹھا ہوا فرش کو گھور رہا تھا "راج؟ میری رجنی۔ میری بیوی۔"

"اسے مارنا کیوں ضروری تھا۔ اس کو مار کے تمہارا مسئلہ کیسے حل ہو گا؟"

"اس لئے..... کہ مسئلہ وہ خود ہے" اس نے سر اٹھا کے ایک آہ بھری "ابھی کتنے دن ہوئے ہیں ہماری شادی کو۔ رجنی برہمن ہے ذات کی۔"

"برہمن! اور تم سکھ۔"

"ہاں۔ ہاں ٹھیک ہی تو کہتی ہے ناستک ہوں میں۔ میں نے ایک لڑکی کے لئے باپ دادا کا دھرم چھوڑ دیا۔ شادی سے پہلے میں ایسا نہیں تھا۔ میں پورا سکھ تھا۔ یہ کرپان میری ہے۔ انبالہ میں ڈیوٹی تھی' جب رجنی ملی تھی مجھے۔ اور بس۔ پھر جو ہونا تھا وہی ہوا۔ نہ دھرم اسے روک سکا نہ مجھے۔ اس کے باپ نے ضرور خودکشی کر لی ہو گی۔ خالص برہمن باپ تھا۔"

"کر لی ہو گی کیا مطلب؟ تمہیں معلوم نہیں ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "رجنی مجھے بنارس میں ملی تھی۔ وہ کمبھ کے میلے میں آئی تھی۔ میں ایسے ہی گیا تھا۔ کاشی اور متھرا دیکھنے کا شوق تھا۔ آگرہ اور فتح پور سیکری بھی گیا تھا۔ ایک مہینے کی چھٹی جو ہر سال ملتی ہے' میں ایسے ہی گزارتا تھا۔ میں اور رجنی کاشی سے بھاگے۔ باپ اس کی شادی ساٹھ سال کے کسی کائستھ برہمن سے کرنا چاہتا تھا۔ وہ طے کئے بیٹھی تھی کہ گنگا میں ڈوب کے مر جائے گی۔ بس بھگوان نے یا واہگورو نے مجھے بھیج دیا۔ میں انبالہ چھاؤنی سے آیا تھا' لوٹ کر وہاں بھی نہیں گیا۔ اب میں بھگوڑا ہوں۔"

"تم DESERTER ہو؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ مجھے ڈر تھا کہ پکڑا جاؤں گا۔ رجنی کا باپ تلاش کر لے گا مجھے' حالاں کہ یہ ناممکن تھا۔ اس نے مجھے دیکھا ضرور تھا' میرا نام بھی معلوم تھا اسے مگر اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ صرف نام سے کسی کو سارے بھارت میں کون تلاش کر سکتا ہے۔ مگر رجنی مجھ سے زیادہ ڈری ہوئی تھی' پھر میں کیا کرتا۔ میں اسے ادھر اُدھر لے کر پھرا۔ ملٹری پولیس مجھے تلاش کرتی ہوئی یہاں بھی آئی۔ یہاں کسی کو معلوم ہی نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں۔ وہ واپس چلے گئے۔ ایک مہینے بعد میں آیا' رجنی کے ساتھ۔ ماں سے جھوٹ بولا کہ چھٹی لے کر آیا ہوں۔ اس نے کہا کہ جھوٹ مت بول۔ تجھے تو ملٹری والے پوچھتے پھر رہے ہیں۔ میں نے کہہ دیا کہ وہ تو پرانی بات ہے۔ میں پہنچ گیا تھا ڈیوٹی پر۔ اب دو مہینے کی چھٹی ملی ہے۔ چاچے بہت ہوشیار ہیں۔ وہ تاڑ گئے تھے کہ یہ سب جھوٹ ہے۔ میں نے انہیں سچ بتا دیا تھا۔ ماما ایک ہے مگر وہ بے وقوف ہے۔ رجنی کے کہنے پر میں نے ماں سے دوسرا جھوٹ یہ بولا تھا کہ وہ سکھ ہے' سردار چرن سنگھ کی بیٹی۔ مگر یہ جھوٹ بھی کچھ دن میں کھل گیا۔ رجنی کو ہمارے دھرم رواج کا کچھ پتا ہی نہیں تھا۔ ماں نے بہت شور کیا۔ ظاہر ہے اس کی نظر میں مجرم اس کا بیٹا نہیں یہ عورت تھی جس نے اسے باپ دادا کے دھرم سے دور کر دیا۔ ماں کی مجبوری یہ ہے کہ اس کا میں ایک ہی بیٹا ہوں۔ باپ نے جب نکال دیا تھا تو اس نے ہی مجھے واپس بلا لیا تھا۔ میرے واپس آنے کے چند دن بعد باپ مر گیا۔ اچھا ہوا۔ ورنہ بعد میں وہ بھی وہی کرتا جو رجنی کے پتا نے کیا ہو گا۔ اب دیکھو کہ تقدیر کیا چیز ہے۔ مجھے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ رجنی کو کمبھ کے میلے سے ایک سکھ کے گھر میں لے آئی اور جب یہ سارا تماشا ہو گیا' میں اور رجنی اپنی خوش قسمتی پر ناز کرنے لگے' مستقبل کی باتیں کرنے لگے' آنے والے بچے کا استقبال کرنے اور اس کی زندگی کے خواب دیکھنے لگے' میں نے کچا مکان گرا کے پکا مکان بنوانے میں اپنی ساری جمع پونجی لگا دی تو اچانک ایک دن رجنی کی طبیعت خراب ہو گئی۔ گاؤں کے وید حکیم کچھ نہ بتا سکے۔ میں اسے اِندور لے گیا اور وہاں میری دنیا برباد ہو گئی۔ تقدیر نے مجھے سب کچھ دے کر میرا سب کچھ چھین لیا..... مجھے پتا چلا کہ رجنی زیادہ سے زیادہ چھ مہینے جئے گی۔ چار مہینے بعد تو اسے ماں بننا تھا۔ وہ مجھے اپنی نشانی دے کر چلی جائے گی۔ کیا پتا اس سے پہلے ہی" وہ

پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ جوان آدمی یوں روتا ہے تو یقین آتا ہے کہ ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی۔ سارا کھیل تقدیر رچاتی ہے۔ انسان تو بس کھلونا ہے۔

میں نے کہا "کیا یہ سب......."

اس نے نفی میں سر ہلایا "ابھی نہیں۔ وہ خوش ہے کہ یہ سب تخلیق کے عمل میں شامل ہے۔ اس کا دکھ اور عذاب بھی ماں بننے کی جدوجہد کا حصہ ہے۔ مگر کب تک۔؟ آخر کار اسے پتا چل جائے گا۔ اس نے عورتوں کو ماں بنتے دیکھا ہوگا۔ مرتے بھی دیکھا ہوگا۔"

غالب نے کہا "اس کا علاج کوئی نہیں ہے؟"

"سُنا ہے' باہر ہوتا ہے۔ ایک لاکھ ہوں تو اس کی جان بچ جائے گی" وہ بولا "چالیس پچاس میں یہ سب بیچ سکتا ہوں میں۔ اپنی زمین' یہ مکان اور بیل۔ لیکن ماں ایسا کہاں ہونے دے گی۔ وہ خود اپنے بھائی کے گھر میں بھی رہ سکتی ہے مگر اس عورت کی خاطر دھرم کے بعد باپ دادا کی ہر نشانی بک جائے' بیٹا اپنی زندگی تباہ کرلے' یہ ناممکن ہے۔ وہ تو چاہے گی کہ رجنی کل کی مرتی آج مرجائے۔ چالیس پچاس میں کچھ ہوتا تو میں ماں کی پروانہ کرتا۔ رجنی کو بچالیتا مگر ایک لاکھ کرنا مشکل تھا۔ ناممکن تھا میرے لئے۔ چاچا یا ماما بھی اس معاملے میں میری مدد نہ کرتے۔"

"اسی لئے تم ہماری زندگی بیچ رہے تھے؟"

"ہاں۔ پہلے میں پہچانا نہیں تھا تمہیں' پھر تم نے ناگپور کا ذکر کیا۔ تمہاری بات مجھے جھوٹ لگی۔ تم شکاری نہیں تھے۔ شکاری ایسے خالی ہاتھ دو عورتوں کے ساتھ بھٹکتے نہیں پھرتے اور اس حلئے میں نہیں ہوتے۔ ناگپور سے چل کے کوئی یہاں تک بھٹکتا ہوا کیسے آسکتا ہے۔ اور آجائے تو وہ آگے اندور جانے کی بات کیوں کرے گا۔ پھر مجھے یاد آگیا۔ میں نے تمہاری تصویریں دیکھی تھیں۔ اخبار میں بھی پڑھا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میری لاٹری نکل آئی ہے۔ بے رحم قسمت مجھ پر دوبارہ مہربان ہوگئی ہے۔ بیس ہزار اور ہوجاتے تو میں ایک لاکھ کے قریب پہنچ جاتا۔ باقی کے لئے میں نے چوری کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا' اپنے ہی گھر میں۔ میں چاچے اور مامے کے گھر سے ان کی بیویوں کے زیور اور اپنی ماں کا سب زیور اکٹھا کرلیتا اور بھاگ جاتا۔ بعد میں جو ہوتا میری بلا سے۔ میں لوٹ کر واپس ہی نہ آتا' اگر میں اپنی رجنی کو بچالیتا۔"

"بیگ میں کیا تھا تمہارے خیال میں؟"

"میرا خیال تھا' کچھ رقم ہوگی۔ وہ میں قبضے میں کرلوں گا۔ کچھ اسلحہ ہوگا' اسے بھی بعد میں بیچ دوں گا۔"

خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا۔ گل اور نازو گہری نیند میں تھیں چناں چہ انہوں نے کچھ بھی نہیں سنا تھا۔

میں نے کہا "اجیت سنگھ! تم ہمیں خاموشی سے نکال دو۔ اب ہم نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔ ہم ٹرین سے نہیں جائیں گے۔ آج رات دریا پار کرنے کی کوئی صورت ہے؟"

"رات کو پوری موٹر بوٹ لینی پڑے گی اور کرایہ بھی دُگنا ہوگا" وہ بولا۔

"کتنا کرایہ ہوگا؟"

"پانچ سو۔ شاید کوئی چار سو میں مان جائے۔"

"ٹھیک ہے' تم ہمارے ساتھ دریا تک جاؤ گے۔ موٹر بوٹ میں روانہ ہونے سے پہلے ہم تمہیں چالیس ہزار دیں گے۔"

"وہاں جا کے تم مکر گئے تو..... تمہارا کیا بھروسہ۔ تم مجھے مار ڈالو" اجیت نے کہا۔

"بھروسہ تو کرنا پڑے گا تمہیں۔ رجنی کے لئے۔"

"رجنی کے لئے" اس نے دُہرایا "اچھا' میں چلوں گا۔"

"تم اب گھر سے باہر نہیں جاؤ گے۔ نہ اپنی بیوی کو اور ماں کو جانے دو گے۔ تم سب کو ہماری نظروں کے سامنے رہنا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"اگر تم نے ہمیں پہچان لیا ہے" غالب نے کہا "تو تمہیں یہ بھی جان لینا چاہئے کہ ہمارے ساتھ دغابازی کا انجام عبرت ناک ہوتا ہے۔ اور کوئی ہماری راہ میں حائل ہوکے ہمارا راستہ نہیں روک سکتا۔ ہمیں دشمنوں کی لاشوں پر سے گزر جانے کی عادت ہوگئی ہے۔ دشمن ایک ہو یا دس ہوں' اس سے ہمیں فرق نہیں پڑتا۔"

میں نے تائید میں سر ہلایا "ہم ابھی تک اسی لئے آزاد ہیں کہ ہمیں گرفتار کرنے والوں نے ہماری شرافت کا غلط مطلب سمجھا اور ہماری طاقت کا غلط اندازہ کیا۔"

"میں یہ غلطی نہیں کروں گا" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا' "کس وقت جانا چاہتے ہو تم؟"

میں نے کہا "ٹرین کس وقت جاتی ہے؟"

اجیت سنگھ نے کہا "ساڑھے آٹھ بجے۔"

"پھر یہی وقت ٹھیک رہے گا۔"

"مگر تم نے ابھی کہا تھا کہ تم ٹرین سے جانا نہیں چاہتے۔" اجیت بولا۔

میں نے کہا "ہم فیصلہ بدل سکتے ہیں' جتنی بار چاہیں۔ اس کے علاوہ کیا ساڑھے آٹھ بجے کشتی سے دریا پار کرنے میں کوئی حرج ہے؟"

"نہیں۔ حرج کیسا..... جیسی تمہاری مرضی" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

"جاتے ہوئے دروازہ مت بند کرنا۔"

"اچھا..... مگر وہ جو تم نے کہا ہے نا..... کہ باہر کوئی نہ جائے تو یہ مشکل ہے" اجیت سنگھ نے کہا "رجنی تو ویسے بھی نہیں جاتی کہیں۔ مگر ماں کو روکنا مشکل ہوگا۔ میں نہیں جاؤں گا تو پھر ماں کو جانا ہی پڑے گا۔"

میں نے کہا "اچھا' پھر میں باہر بیٹھوں گا۔"

اجیت نے میرے لئے ایک چارپائی درخت کے نیچے ڈال دی۔ باہر فضا بہت پُرسکون تھی۔ دوپہر کی دھوپ میں نیلا آسمان روشن نظر آتا تھا اور ہوا میں بڑی راحت بخش حدّت شامل ہوگئی تھی۔ میرے لئے لیٹ کر آنکھیں کھلی رکھنا مشکل ہوگیا۔ میرا خیال تھا کہ شام تک غالب کو سونے کا موقع دوں گا اور پھر خود سو جاؤں گا مگر ہوا یہ کہ میری آنکھ لگ گئی اور میں اس وقت جاگا جب رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔

اجیت سنگھ نے مجھے اٹھایا "رات کو پیڑ کے نیچے نہیں سونا چاہئے۔"

میں ہڑبڑا کے اٹھا۔ مجھے شدت سے اپنی کوتاہی کا احساس ہوا۔ شاید پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ ہم سب سو گئے تھے۔ غلطی سو فیصد میری تھی۔ باقی سب نے مجھ پر بھروسہ کیا تھا کہ میں جاگ رہا ہوں۔ اگر اس غفلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اجیت کچھ کرنا چاہتا تو اسے روکنے والا کوئی نہ تھا۔ وہ سب نقد رقم لے سکتا تھا اور اسلحے پر قبضہ کرکے کسی پریشانی کے بغیر ہمیں پولیس کے حوالے کرسکتا تھا۔ اگر آنکھ کھلنے پر ہمیں معلوم ہوتا کہ ہر طرف سے پولیس کی رائفلوں کا رخ ہماری طرف ہے اور ہم اب جان دے کر بھی گرفتاری سے نہیں بچ سکتے۔ یہ سوچ کر ہی میرے وجود میں سرد لہر دوڑ گئی۔

اجیت نے مسکرا کے کہا "اطمینان رکھو۔ کچھ نہیں کیا میں نے۔ میں اپنے وعدے پر قائم ہوں۔"

میں نے سکون کی گہری سانس لی اور خدا کا شکر ادا کیا کہ میری اس مجرمانہ کوتاہی سے ناقابل تلافی نقصان نہیں ہوا۔ اجیت سنگھ نے بدعہدی نہیں کی۔ شاید اس لئے کہ ہم پہلے ہی اس کے حق میں فرشتۂ رحمت ثابت ہوچکے تھے۔ وہ ہمارے خیرسگالی کے جذبات کا خون کرنا نہیں چاہتا تھا ورنہ پیسہ تو اس کی دسترس میں تھا۔

باہر کافی خنکی تھی۔ اس کے مقابلے میں اندر کی فضا گرم تھی۔ جب میں نے غالب کو جگایا تو وہ حیران ہوا۔

"رات ہوگئی' کمال ہے۔ تم نے مجھے جگایا کیوں نہیں۔ کچھ دیر خود بھی سو جاتے۔"

میں نے خفت سے سر کھجا کے کہا "خود مجھے اجیت نے جگایا ہے ابھی۔ میں جاگنے کی پوری کوشش کرتا رہا' پھر پتا نہیں کیسے سو گیا۔"

"کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی نا؟"

"نہیں۔ آج تو بس خدا نے ہی بچایا۔" میں نے کہا۔

"ہمیشہ خدا ہی بچاتا ہے" غالب نے کہا "انہیں بھی دیکھو کیسے سو رہی ہیں"

"دراصل سب بہت تھکے ہوئے تھے۔ غسل کے بعد صاف ستھرے کپڑے ملے' اچھا کھانا ملا اور آرام دہ بستر تو نیند کیسے نہ آتی۔ مجھے تو خود پر حیرت ہے کہ بان کی کھری چارپائی پر سو گیا' اچھی ھنڈ تھی باہر۔ مجھے احساس بھی تھا کہ....."

"چلو چھوڑو یار۔ ہم سب انسان ہیں آخر۔ غلطی کیا۔ نہیں کریں گے" غالب نے کہا "کچھ ہوا نہیں تو سب ٹھیک ہے۔ اب انہیں بھی اٹھا دینا چاہئے۔"

"ہاں۔ رات کے وقت نکل جائیں گے تو محفوظ رہیں گے۔" میں نے کہا "پہلے میرا خیال تھا کہ اجیت کو کچھ بتانا نہیں چاہئے۔ ہمارا ارادہ ہو ٹرین سے جانے کا تو کہنا یہ چاہئے کہ کشتی سے جائیں گے۔"

"کیا فائدہ۔ اجیت سنگھ نے خود کو بھروسے کے قابل ثابت کر دیا ہے" غالب نے کہا۔

"ہم کشتی سے جائیں گے" میں نے کہا "ٹرین میں چیکنگ ہوسکتی ہے۔ ویسے بھی اتنے مسافروں میں سے کوئی پہچان لے" یہ خطرہ بھی ہے۔"

غالب نے گل اور نازو کے اوپر سے رضائی کھینچ لی "اٹھو۔ صورِ اسرافیل کی آواز سنائی نہیں دیتی کیا؟"

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟" نازو نے بگڑ کے کہا۔

"اتنا اچھا خواب دیکھ رہی تھی میں" گل نے بال سمیٹ کر کہا۔

"بیچ میں بول پڑے یہ صورِ اسرافیل صاحب" نازو نے غالب کی طرف اشارہ کیا۔

رات کے کھانے میں اجیت سنگھ کی بیوی نے خاصا تکلف کیا تھا۔ شاید اجیت سنگھ اپنے شکرگزاری کے جذبات کا اظہار مہمان نوازی کی صورت میں کررہا تھا۔

اس نے راز داری سے میرے کان میں کہا "میں نے مرغی روسٹ کرائی ہے۔"

میں نے کہا "مگر ہم نہیں کھا سکتے کیونکہ تم نے جھٹکا کیا ہوگا۔"

یہی تو بتا رہا ہوں میں۔ مسجد کے مولوی صاحب سے ذبح کرا کے لایا تھا۔ ماں کو نہیں معلوم" وہ بولا "ورنہ وہ نہ کھاتی۔"

"اور تمہاری بیوی؟"

"وہ اپنی طرح ہے۔ نہ ہندو نہ سکھ" وہ ہنسنے لگا۔

رات آٹھ بجے کے بعد ہم نے پھر سفر کی تیاری کی۔ اجیت کی ماں اس وقت سو چکی تھی۔ گاؤں میں سب ہی اس وقت سو جانے کے عادی تھے۔ ہمارے اصرار کے باوجود اجیت سنگھ ان کپڑوں کی قیمت لینے پر راضی نہیں ہوا جو ہم نے پہن رکھے تھے۔ رجنی کو دیکھ کر مجھے دکھ ہوا۔ اسے بالکل علم نہیں تھا کہ تھوڑی سی خوشی کے بعد قدرت اسے کتنی بڑی سزا دینے کا فیصلہ کرچکی ہے۔ اس زندگی کی توانائی سے بھرپور' خوب صورت اور محبت کرنے والی عورت کو دیکھ کر موت کا خیال آ ہی نہیں سکتا تھا۔ مجھے ایک لمحے کے لئے یہ خیال ضرور آیا کہ کہیں اجیت سنگھ کی کہانی جھوٹی تو نہیں تھی اور اس نے ہمدردی حاصل کرنے کا ڈراما تو نہیں رچایا تھا۔ پھر میں نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ اول تو وہ اداکاری نہیں تھی۔ اس

کے آنسو سچے تھے۔ پھر چالیس ہزار کی اس اعتماد کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہ تھی جس کا مظاہرہ اجیت سنگھ نے کیا تھا۔ اگر ہم نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ رجنی کی زندگی کو بچانے کے لئے ہم اسے تعاون کے طور پر چالیس ہزار دیں گے تو اس نے بھی ہمیں ہماری زندگی بخش دی تھی۔ یہ چالیس ہزار اگر برٹ اور اس کے ساتھ سفر کرنے والوں کے پاس ہوتے تو وہ اس کی شراب پی جاتے۔ اب وہی رقم ایک زندگی کو بچانے کی کوشش کا حصہ بنے گی۔ یہ احساس بھی ہمارے لئے باعثِ طمانیت تھا۔ بیل گاڑی روانہ ہوئی تو گلیوں میں پھرنے والے کتے کچھ دور اس کے ساتھ بھونکتے ہوئے آئے۔ اجیت سنگھ نے انہیں دھتکار کر بھگا دیا۔ ہم دن بھر روپوش رہے تھے اور آرام بھی کر چکے تھے۔ مجھے یقین آنے لگا کہ ہمارا تعاقب کرنے والے مایوس ہو کے بیٹھ گئے ہوں گے اور آج رات کے سفر میں ہمارے لئے خطرہ بہت کم ہو گا۔

اجیت سنگھ نے کہا "اب کیا خیال ہے؟"

میں نے کہا "دریا پر چلو۔ ہم کشتی سے جائیں گے لیکن کوئی پوچھے تو یہ مت بتانا۔ کہنا اسٹیشن جا رہا ہوں۔"

"غالب نے کہا "اگر کسی نے پوچھا کہ کسے چھوڑنے جا رہے ہو...

"میں بتا دوں گا کہ مہمان ہیں" اجیت سنگھ نے کہا۔

"ایسا نہ ہو کہ ہماری وجہ سے بعد میں تم پر مصیبت آ جائے۔ کون مہمان تھے کہاں سے آئے تھے۔ ان سب سوالات کا جواب سوچ سمجھ کے دینا" میں نے کہا۔

"آپ میری فکر مت کرو" اجیت سنگھ نے کہا اور بیلوں کو ہانکنے لگا۔

اندھیرے میں کچے راستے پر ہچکولے کھاتی بیل گاڑی کسی نامعلوم سمت میں رواں رہی۔ ہم اجیت سنگھ پر یقین کئے بیٹھے رہے کہ وہ ہمیں اس منزل تک پہنچا دے گا جہاں سے اگلی منزل کا سفر شروع ہو گا۔ جیسے ہوائی جہاز کے مسافر بحرِ اوقیانوس پر سے رات کو گزرتے ہوئے اس یقین کے ساتھ سوتے رہتے ہیں کہ پائلٹ جاگ رہا ہے اور انہیں نیویارک ہی پہنچائے گا' سڈنی نہیں۔ وہ باہر کچھ نہیں دیکھ پاتے' کسی راستے کا تعین نہیں کر سکتے اور پائلٹ بھی ان کے سامنے نہیں ہوتا۔

آخر کار بیل گاڑی دریا کے کنارے پہنچ گئی۔ گھاٹ تک تھوڑا سا فاصلہ ہمیں پیدل طے کرنا تھا جہاں قطار میں بہت سی کشتیاں بندھی ہوئی تھیں۔ ان کشتیوں پر اندھیرا تھا اور دریا کے کنارے پر کشتی چلانے والوں کی مختصر بستی بھی تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ہم اجیت سنگھ کے ساتھ چلتے گئے۔

"تم جانتے ہو کسی کشتی والے کو؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ جاننے والا کون سی رعایت کرتا ہے" وہ بولا۔

"میرا مطلب تھا کہ آدمی بھروسے کا ہو۔"

"جسے معاوضہ ملے گا اچھا' وہی بھروسے کا آدمی ہو گا۔ یہاں تو سب کا ایک ہی دھندا ہے۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں۔ رات کو بھی لوگ جاتے رہتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے' پھر تم ہی بات کر لینا" غالب نے کہا۔

"پہلے ایک بات اور سن لو" میں نے کہا "تمہیں ہمارے جانے کے بعد ایک کام کرنا ہو گا' صبح کسی وقت۔"

"کیا کام ہے؟" وہ رک گیا۔

میں نے اسے وہ پیکٹ تھما دیا جس میں برٹ کی گاڑی کے تار تھے' ایئر پمپ تھا اور ان سب کے پاسپورٹ تھے "تمہیں وہ جگہ یاد ہے نا جہاں سے ہم بیل گاڑی میں بیٹھے تھے؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا "یہ کیا ہے؟"

"اس میں کچھ سامان ہے۔ تم چاہو تو کھول کے بھی دیکھ سکتے ہو مگر کوئی چیز تمہارے کام کی نہیں ہے" میں نے کہا "یہ سب تم کو ایک جگہ پہنچانا ہے۔ میں تم کو اندازے سے سمجھا سکتا ہوں، صحیح نقشہ بنا کے نہیں دے سکتا۔ اس جنگل میں ہمارے کچھ ساتھی بیٹھے ہیں۔ چند غیر ملکی ہیں۔ ایک مرد اور دو عورتیں۔"

"غیر ملکی..... آپ کے ساتھی؟" وہ کچھ پریشان نظر آنے لگا۔

"ساتھی مت سمجھو۔ ہم نے ان کے ساتھ سفر کیا تھا' ان کی گاڑی میں" میں نے کہا۔

"زبردستی۔ ہم نے انہیں مجبور کر دیا تھا" غالب نے وضاحت کی "پھر ایک جگہ ہم انہیں چھوڑ کر چل پڑے۔ اس خیال سے کہ وہ ہمارا پیچھا نہ کریں' ہم نے ان کی گاڑی کی ہوا نکال دی تھی اور تار بھی ساتھ لے آئے تھے۔ اس پیکٹ میں تار ہیں اور پمپ ہے۔ ان کے پاسپورٹ ہیں۔ ہم نے کہا تھا' سب واپس کر دیں گے۔"

"مگر وہ تو بہت غصے میں ہوں گے" اجیت سنگھ بولا۔

"ہاں۔ غصے میں تو ہوں گے۔ سارا دن انتظار کرتے رہے ہوں گے کہ کوئی آئے ان کا سامان لے کر تو وہ جنگل سے نکلیں۔ رات کو بھی انتظار کریں گے۔ ہم نے کل شام تک کا وعدہ کیا تھا کہ کوئی یہ انہیں پہنچا دے گا۔ ان کے بغیر وہ کہیں نہیں جا سکتے۔ تم ہمارا یہ کام کر سکتے ہو؟"

"کر تو سکتا ہوں" وہ سوچ میں پڑ گیا "لیکن انہیں پہلے تو تلاش کرنا مشکل ہو گا۔ خیر میں پہنچ جاؤں گا۔ مگر ایسا نہ ہو کہ وہ مجھے دیکھتے ہی گولی مار دیں۔"

میں نے کہا "وہ خالی ہاتھ ہیں۔ ان کے پاس کسی قسم کا اسلحہ نہیں ہے۔ پھر اس بھی بہتر یہ ہو گا کہ تم اکیلے نہ جاؤ' کسی کو اپنے ساتھ لے جانا۔ ان کی گاڑی میں پٹرول بھی نہیں ہے۔ وہ فوراً روانہ نہیں ہو سکتے۔ کوئی جائے گا کہیں سے پٹرول لانے کے لئے۔ تم ان کی راہنمائی کر دینا اگر ممکن ہو۔ وہ اجنبی ہیں اس ملک میں۔"

"مرد ایک ہے اور وہ بھی تم سے زیادہ تگڑا نہیں ہے مگر تم کسی دوست کے ساتھ جاؤ تو اچھا ہے۔ دو افراد کے لئے انہیں تلاش

کرنا بھی آسان ہو گا۔" غالب نے کہا "اور تمہارے لئے خطرہ نہیں رہے گا۔"

میں نے کہا "ویسے اس میں خطرے کی کوئی بات نہیں' میں یہ یقین دلاتا ہوں۔ بس یہ کام ہے بہت ضروری۔"

پھر میں نے بیگ میں ہاتھ ڈالا اور وہ پچاس ہزار روپے نکال لئے جو ہم نے ٹام اور برٹ کو دے کر واپس لے لئے تھے۔

"یہ پچاس ہزار ہیں۔ امید ہے' تم باقی رقم کا بندوبست کر لو گے" میں نے کہا۔

مگر اسی وقت نازو نے کہا "ہمارے زیور دے دو اسے۔ ہمارے کس کام کے۔ اگر انہیں بیچ کے یہ رقم پوری کر لے گا تو اسے چاچی ماں کے زیورات نہیں چرانے پڑیں گے۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے" میں نے کہا اور بیگ میں ہاتھ ڈال کے زیور نکالنے لگا۔ یہ سب ایک جعلی پیر کا مال تھا جو اس نے معصوم اور سادہ لوح لوگوں سے ہتھیایا تھا اور ہمارے لئے بھی بوجھ بنا ہوا تھا۔

اجیت سنگھ کی عجیب حالت تھی "یہ پچاس ہزار..... مگر آپ نے تو چالیس کی بات کی تھی...."

"چاو رکھ لو۔ چالیس پچاس سے کیا فرق پڑتا ہے" غالب نے کہا۔

"نہیں۔ میں... دس ہزار زیادہ کیوں لوں؟ فرق کیسے نہیں پڑتا" وہ ہکلانے لگا۔ کیوں کہ اس کی عقل خبط ہو چکی تھی۔ جس دنیا میں دس روپے کے نوٹ کی خاطر آدمی کا گلا آدمی کاٹ دیتا ہو' عصمتوں کے سودے ہو جاتے ہوں اور بچوں کی معصومیت فروخت ہوتی ہو' وہاں ہم دس ہزار کے لئے کہہ رہے تھے کہ اس سے فرق نہیں پڑتا۔ اسے پیسے کی ضرورت تھی۔ وہ انکار نہیں کرنا چاہتا تھا مگر انکار پر مجبور تھا۔ اس پر احسان کا بار بڑھتا جا رہا تھا۔

جب نازو نے زیورات کا ڈھیر اس کے سامنے کیا تو وہ ایسے خوف زدہ ہو کے پیچھے ہٹ گیا' جیسے غلطی سے نازو نے اس کے سامنے سانپوں بھری پٹاری کھول دی ہو۔

"نہیں۔ میں یہ نہیں کر سکتا۔ میں کسی مصیبت میں پھنس جاؤں گا۔ مجھے جانے دو۔ اپنا پیسہ بھی رکھو۔ یہ چوری کا مال ہو گا۔ مجھے جیل جانا پڑا تو رجنی مر جائے گی۔"

میں نے اسے پکڑ لیا "بے وقوفی کی بات مت کرو۔ یہ سب ہمارا ہے۔ ہم نے وعدہ کیا تھا تم سے چالیس کا۔ دس ہزار ہم اپنی خوشی سے دے رہے ہیں۔ تم نے ہماری زندگی بچائی ہے۔ ہماری مدد کی ہے اور تم ضرورت مند ہو۔ تم نے تو کہا تھا کہ رجنی کے لئے تم چوری کرنے کا سوچ رہے تھے۔ ڈاکا ڈالنے کو تیار تھے' پھر ڈرتے کیوں ہو؟"

"میں یہ زیور نہیں لوں گا" وہ بضد رہا "ایسا نہ ہو رجنی کو کچھ ہو جائے۔ پتا نہیں یہ کیسا زیور ہے۔ کسی کا گلا کاٹا تھا تم نے۔ کسے مار کے حاصل کیا تھا؟"

مجبوراً میں نے اسے مختصر الفاظ میں بتایا کہ ہمیں یہ زیور اور نقد کہاں سے ملے تھے۔

"یہ ہمارے لئے بے کار ہیں" نازو نے کہا۔

"بے کار کیسے ہو گئے؟ یہ سب نہ ہوتا تو آپ سب لوگ پار کیسے اترتے۔ مجھ سے سودا کیسے کرتے۔ اسے آپ رکھو۔ آپ کے کام آئے گا بعد میں" وہ بولا۔

کچھ دیر کی بحث کے بعد نازو اور گل اسے قائل کرنے میں کامیاب ہوئیں اور اس نے زیور اس شخص کی طرح قبول کیا جس نے زندگی میں ملنے والی پہلی بھیک کو جیب میں رکھا ہو۔ اب احسان مندی سے زیادہ شرمندگی کے جذبات غالب تھے۔ وہ افسردہ تھا اور ندامت کا شکار تھا۔ اس کے پاس نہ ہمت تھی اور نہ الفاظ تھے کہ وہ ہمارا شکریہ ادا کر سکتا۔

"چاو اب کسی کشتی والے سے بات کرو" میں نے کہا۔

"آپ' پھر کبھی آؤ گے ادھر.....؟" وہ بولا۔

"مشکل ہے۔ مگر کیا پتا قسمت لے آئے۔ ہمیں امید ہے کہ تم جلد از جلد رجنی کو باہر لے جاؤ گے اور علاج سے وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔"

یہ بات کہتے ہوئے مجھے رامن کا خیال آیا۔ کتنی دکھ بھری تھی اس کی زندگی اور موت۔ ہم نے تو چاہا تھا کہ اس کو بدبختی کے گرداب سے نکال لیں۔ اس کی ماں واپس اپنے وطن کی مٹی دیکھے اور اسی مٹی کی ہو جائے۔ اس کی بہن باآبرو زندگی گزارے اور وہ خود ایک ٹیکسی کا مالک ہو۔ اس سے دوسری خریدے۔ مگر اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ رامن کی بدبختی نے ہماری خواہش کو شکست دی..... خدا کرے اجیت سنگھ کے ساتھ ایسا نہ ہو۔ ہماری خواہش پھر ناکام نہ ہو۔

رات کے ساڑھے نو بجے تھے جب ہم نے اسے الوداع کہا۔ وہ ہم سب سے گلے مل کے رویا اور ہماری کشتی کے روانہ ہونے کے بعد بھی کنارے پر کھڑا ہاتھ ہلاتا رہا۔ پھر اندھیرے میں اس کا وجود تحلیل ہو گیا۔ کشتی دریا کی خاموش موجوں کے سینے پر چلتی گئی۔ اس کا ملاح ایک بوڑھا آدمی تھا اور اس کا ساتھ دینے والا جوان بیٹا تھا۔ وہ بڑی محنت سے چپو چلاتے رہے۔ اگر ہم موٹر بوٹ لیتے تو بہت کم وقت میں دریا کو عبور کر لیتے جس کا پاٹ سردیوں میں سمٹ کر چند فرلانگ تک محدود ہو گیا تھا لیکن وہ بڈھا منت سماجت کرنے لگا تو مجھے اس پر رحم آ گیا۔ تیز رفتاری کے اس دور میں وہ مالی مشکلات کا شکار تھے۔ سب موٹر بوٹ اور لانچ میں سفر کرتے تھے۔ خصوصاً رات کے وقت لوگ کم سے کم وقت میں حفاظت کے ساتھ دریا پار کرنا چاہتے تھے۔ پانچ سو کی رقم اس کے لئے اتنا بڑا خزانہ تھی کہ وہ تقریباً ہمارے پاؤں پڑ گیا تھا کہ ہم اسے خدمت کا موقع دیں۔

آدھا راستہ بڑی مشکل سے ایک گھنٹے میں طے ہوا۔ کشتی کو دریا کے بہاؤ کے خلاف لے جانا سخت مشقت طلب کام تھا۔ اپنی پوری کوشش کے باوجود باپ بیٹا کشتی کو سیدھا نہیں لے جا سکتے تھے۔ وہ ترچھے رخ جا رہے تھے چناں چہ پاٹ کی اصل چوڑائی سے دگنا فاصلہ طے کر رہے تھے۔ یہ کشتی چلانے والوں کا اپنا اندازہ تھا کہ وہ کہاں سے روانہ ہوں گے۔ بہاؤ کے ساتھ کتنا ترچھا جائیں گے اور دوسرے کنارے پر کس جگہ اتریں گے۔

میں نے ایک گھنٹے بعد کہا "باباجی! تم بہت تھک گئے ہو' کچھ آرام کرلو۔"

"آرام ....." بڈھا ہانپتے ہوئے بولا "کیسی باتیں کرتے ہو سرکار.... ناؤ آگے نکل جائے گی۔"

"آگے کہاں؟" میں نے کہا۔

"جہاں.... آپ کو اترنا ہے اس سے آگے۔ بہاؤ کو دیکھ رہے ہو۔"

میں نے کہا "تمہارا بیٹا اور تم باری باری کشتی چلاؤ۔"

اس نے کہا "ناؤ آگے چلی جائے گی۔"

میں نے کہا "جانے دو۔"

اس نے مجھے حیرانی سے دیکھا "جانے دوں..... کہاں اترنا تھا آپ کو سرکار؟"

میں نے کہا "جہاں سب اترتے ہیں..... اس سے آگے میل دو میل سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

غالب نے کہا "ہم پیدل آجائیں گے' سیر کرتے ہوئے۔"

اس کی سمجھ میں ہماری بات نہیں آئی کہ ہم گھاٹ پر کیوں اترنا نہیں چاہتے اور اتنی رات کو اندھیرے میں پیدل چل کے واپس گھاٹ تک آنے میں کون سی تفریح ہے۔

"سرکار! ہمیں واپس آنا مشکل ہوگا۔ اتنی دور جانا آسان ہے۔ واپسی میں بہاؤ کے خلاف آنا پڑے گا۔"

میں نے کہا "یہ تو ٹھیک کہا تم نے۔ محنت واقعی زیادہ ہوگی۔ خیر ہم دو سو اور دے سکتے ہیں۔"

اس کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ پھر خوشی سے دمکنے لگا۔ اس نے ایک دم چپو اٹھا لیے۔ اس کا بیٹا جو خاموشی سے ساری گفتگو سن رہا تھا' کشتی کھیتا رہا۔ کچھ دیر دم لینے کے بعد بڈھے نے پھر چپو سنبھالے اور اس کا بیٹا رک گیا۔ ان کی عمروں میں شاید بیس سال کا فرق ہوگا مگر صحت کے لحاظ سے باپ بہتر تھا۔ بیٹا بلاوجہ ہنستا تھا اور کسی بات کا جواب نہیں دیتا تھا۔

"یہ گونگا ہے" اس کے باپ نے کہا "اور اس کو بددعا بھی لگی ہے۔"

"کس کی بددعا؟"

"ایک فقیر کی۔ اس کی عقل خراب ہے۔ کوئی بات نہیں سمجھتا۔" بڈھے نے کہا "اتنا بڑا ہوگیا ہے سرکار۔ مگر بچے سے زیادہ نادان ہے۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ ذہنی طور پر ابنارمل ہوگا۔ ذہنی پسماندگی ان غریب لوگوں کے نزدیک آسیب ہے یا فقیر کی بددعا۔ اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں جانتے۔ وہ نیم پاگل اور فاترالعقل لڑکا تھا مگر اپنے باپ کا مددگار تھا۔ اس کی جسمانی صحت ٹھیک تھی' باپ کے لیے یہی کافی تھا۔

ڈھائی تین گھنٹے بعد ہم جہاں دریا کے کنارے پر اترے وہاں مکمل ویرانی تھی۔ دریا کے خشک پاٹ پر کنکریوں کا فرش تھا جس پر چل کے ہم نے ایک فرلانگ کا فاصلہ طے کیا۔ پھر چکنی مٹی اور کیچڑ سے گزرے اور آخر کار اس سڑک تک پہنچے جو دریا کے پاٹ سے بہت دور چلی گئی تھی۔ اس پتلی سی سڑک پر گھنے درخت ایک قطار میں لگائے گئے تھے۔ ان کے نیچے گھاس تھی جو خشک ہوگئی تھی۔ ہم نے اس پر پاؤں رگڑ کے جوتے صاف کیے اور پھر گھاٹ کی مخالف سمت میں روانہ ہوگئے۔

رات کے ایک بجے ہم نے سامنے سے آنے والی بس کو دیکھا۔ اس سے پہلے کہ ہم بس کو رکنے کا اشارہ کرتے' بس ڈرائیور نے ہمارے قریب آکے بریک لگائے۔ سوتے ہوئے مسافر جاگ کر کھڑکی کے شیشوں سے باہر جھانکنے لگے۔

میں نے آگے بڑھ کے پوچھا "کہاں جا رہی ہے بس؟"

ڈرائیور نے مونچھوں پر تاؤ دیا "آپ بولو کدھر جاؤ گے؟"

میں نے کہا "ہم تو اِندور جائیں گے۔"

"تو پھر جاؤ۔" ڈرائیور بولا اور بس آگے بڑھ گئی۔ کچھ مسافر ہنس پڑے۔

"الو کا پٹھا۔" میں نے کہا "ایسی کون سی بات کہہ دی تھی آخر میں نے" پھر نہ جانے کیا ہوا بس کچھ دور جا کے رک گئی۔

اس بار غالب آگے گیا "یہ مذاق کا کون سا وقت ہے؟"

ڈرائیور نے مسافروں کو دیکھا "لو جی۔ الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ مذاق اس نے کیا تھا" اس نے میری طرف اشارہ کیا۔

"میں نے تمہارے سوال کا جواب دیا تھا" میں نے کہا۔

"کیا یہ بس اِندور نہیں جاتی؟" غالب نے کہا۔

"یہاں سے کوئی بس اِندور نہیں جاتی" ڈرائیور نے کہا "تم اجنبی ہو' کیا پہلے ادھر نہیں آئے؟"

"نہیں۔ اور دوبارہ آئیں گے بھی نہیں" میں نے کہا "یہاں جو ملتا ہے تم جیسا۔ سیدھی طرح بات نہیں کرتا۔ الٹا جواب دیتا ہے۔"

اس نے کہا "بابوجی' غصہ مت کرو۔ چلو بیٹھو۔ ابھی میں سمجھاتا ہوں تمہیں۔ عورتوں کو آگے بھیج دو۔ چلو خود بھی آجاؤ ادھر۔ چل بے ادھر سے اُٹھ۔"

اس نے دو مسافروں کو کھسکا کے ہم سب کو اپنے قریب جگہ فراہم کی۔ بس پھر چل پڑی۔ یہ دوسری جنگِ عظیم کے دور کی بس تھی جس میں پگڑیوں' مونچھوں اور دھوتیوں والے دیہاتی بھرے پڑے تھے اور ان سب کی نظر ہم پر جم کے رہ گئی تھی۔ دو چار عورتیں بھی اونگھتے اونگھتے جاگ اٹھی تھیں۔ بس کے اندر مسافروں کے علاوہ ایک بکری بھی استادہ تھی اور دائیں بائیں سر گھما کے مسافروں سے اظہارِ الفت کر رہی تھی مگر کوئی اس بے تکلفی کا برا نہیں مان رہا تھا۔

"یہ تو آپ کو قسمت سے جگہ مل گئی" ڈرائیور نے کہا "دن میں تو کھڑے رہتے سڑک پر۔ کسی بس میں جگہ نہ ملتی' نہ اندر نہ باہر چھت پر۔ خیر اب یہ بتاؤ کہ آئے کہاں سے ہو؟"

میں نے کہا "دریا پار سے۔"

غالب نے کہا "ہری پور سے' لالہ جی کے گھر سے۔"

"اپنے لالہ ودیا ناتھ جی کے گھر سے" ڈرائیور بولا "گاڑی نہیں بھیجی انہوں نے؟"

میں نے کہا "گاڑی خراب نہ ہوتی تو ہم اس بس میں نظر نہ آتے۔ مجبوری تھی۔"

ڈرائیور نے مونچھوں کو تاؤ دیا اور اب گل کے بجائے نازو کو گھورنے لگا "لالہ جی نے یہ نہیں بتایا کہ اِندور کتنی دور ہے اور وہاں جانے کے لئے تین بار بسیں بدلنی پڑتی ہیں۔"

"بتایا تھا" میں نے کہا "اب تم یہ بتادو کہ ہمیں کہاں تک لے جاؤ گے اور آگے ہم کون سی بس پکڑیں استاد۔"

"یہ ہوئی نہ بات۔ لاؤ کرایہ نکالو" ڈرائیور استاد کا خطاب پا کے خوش ہوگیا تھا۔

کرایہ وصول کرکے اس نے ہمیں بڑی وضاحت سے بتایا کہ ہمیں کہاں اترنا ہوگا۔ پھر کس وقت کون سی بس ملے گی اور اِندور لے جانے والی بس ہمیں کس وقت اِندور پہنچائے گی۔ ہمیں کس بس میں کتنا کرایہ ادا کرنا ہوگا۔

باری باری گل اور نازو کو گھورنے کے علاوہ استاد اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتا تھا۔ سگریٹ کو اس نے بند مٹھی میں دبا رکھا تھا اور جب وہ کش لیتا تھا تو اپنے ہاتھ کو حقے کی نے فرض کرکے شوں سے اندر سانس کھینچتا تھا۔ دھوئیں کو کافی دیر اپنے سینے میں روک کے ناک سے نکالتا تھا اور داد طلب نظروں سے دیکھتا تھا۔ اس کی نظر ڈرائیونگ کرتے ہوئے ہر جگہ تھی' سوائے سڑک کے۔

ساڑھے تین بجے ایک سنسان بس اسٹینڈ پر سارے مسافر اُتر گئے۔ ان میں سے بیشتر وہیں برآمدے جیسی جگہ میں پڑ کے سو گئے۔ وہ ویٹنگ روم تھا اور ان مسافروں کو غالباً صبح سے پہلے کوئی بس نہیں پکڑنی تھی۔ چند مسافر دوسری طرف لپکے۔ ان میں سے ایک نے ہمیں بھی اشارے سے بتایا کہ اب وہ بس آگے لے جائے گی۔ ڈرائیور نے اسے ڈانٹ کے بھگا دیا اور خود ہمیں اپنے ساتھ لے گیا۔ اس نے دوسرے ڈرائیور سے مذاکرات کیے اور ہمارے معزز ہونے کا یقین دلا کے رخصت ہوا۔ سپردم بہ تو مایہ خویش را۔

دوسرے ڈرائیور نے ہمیں بادل ناخواستہ معزز تسلیم کیا۔ وہ بھی اس لئے کہ ڈرائیور برادری کے ایک فرد نے ہماری سفارش کی تھی ورنہ اپنی نظر میں اس کے لئے اپنے سوا کوئی معزز نہ تھا۔ اس سے ہمارے تعلقات تمام راستہ سابقہ ڈرائیور کی طرح خوش گوار نہ ہو سکے۔ میری اور غالب کی خوش خلقی اور انسان دوستی کے جذبات بالکل کام نہ آئے۔ میرے کام کچھ نہ آیا یہ کمال نے نوازی۔ ہم بھینس کے آگے بین بجانے سے عاجز آگئے تو آپس میں باتیں کرنے لگے۔ ڈرائیور کے نزدیک ہم شہری تھے اور غالباً وہ ہر شہری کو پڑھا لکھا' مکار' چالاک' بے شرم اور بے دھرم سمجھتا تھا۔ جب ہم آپس میں انگریزی بولنے لگے تو کشیدگی بڑھ گئی۔

دوسری بس کے شریکِ سفر بھی کم دیہاتی نہ تھے۔ ان کا ہکا بکا ہو کے ہمیں دیکھنا فطری سی بات تھی مگر ان میں سے کوئی بداخلاق نہیں تھا۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک عورت کے بچے کی طبیعت بگڑ گئی اور اس نے اُلٹی کی تو میرے جوتے خراب ہوگئے۔

عورت بچے کو بھول کے مجھ سے معافی مانگنے لگی "سرکار' غلطی ہوگئی" وہ ہاتھ جوڑ کے بولی۔

میں نے کہا "نہیں۔ یہ کیا کر رہی ہو۔ بچے کو سنبھالو۔ کس بات کی معافی مانگ رہی ہو؟"

"آپ کے جوتے....." وہ جوتوں کو صاف کرنے لگی۔

میں نے کہا "جوتے خراب ہوگئے تو کیا۔ دھل جائیں گے۔ اس میں تمہاری کیا غلطی ہے۔ چلو چھوڑ دو۔"

نازو نے رومال سے بچے کا منہ صاف کیا کیوں کہ جس کپڑے سے وہ عورت جوتے صاف کرچکی تھی اسی سے بچے کا منہ صاف کرنا چاہتی تھی۔ "یہ گندا کپڑا پھینک دو" نازو نے کہا اور اسے اپنا رومال دے دیا "ایسے تو اور بیمار ہوگا یہ۔"

میں نے کہا "تم نے دوائیں رکھی تھیں نا؟"

گل نے اقرار میں سرہلایا "بچوں کی دوا تو کوئی نہیں۔"

میں نے کہا "اینٹی الرجک گولیاں ہیں نا' ایک گولی دے دو۔ کام چل جائے گا ابھی۔"

گل نے ایک پیکٹ سا مجھے تھما دیا۔ میں نے اس میں سے ایک گولی نکال کر عورت کو دی۔ "یہ اسے پانی کے ساتھ دے دو۔ صبح ڈاکٹر کو دکھا دینا۔"

یکلخت فضا بدل گئی۔ ڈرائیور شرمندہ نظر آنے لگا۔ ہم سب کی نظر میں نیکی کے فرشتے بن گئے۔ دیہاتی ہمارے رویّے سے متاثر ہونے لگے۔ اس دیہاتی عورت کا شوہر تو بندۂ بے دام ہوگیا تھا۔ غالباً بچے کو کسی چیز سے الرجی ہوگئی تھی۔ بس میں پٹرول کی بو سے بہت سے بڑے لوگ بھی متلی محسوس کرتے ہیں۔ صرف آدھے گھنٹے بعد نڈھال بچہ ٹھیک ہو کے مسکرانے لگا اور کھیلنے لگا تو میں ڈاکٹر صاحب بن گیا۔ ہر زبان پر ڈاکٹر صاحب کے دستِ شفا کا ذکر تھا۔ بس ایک گولی دی اور بچہ ٹھیک۔ کمال ہے یہ تو۔

دو گھنٹے کے سفر کے بعد جب یہ بس اپنے سفر کے آخری اسٹاپ پر پہنچی تو ڈرائیور نے ہمیں چائے پر مدعو کیا۔ وہاں مجھے کوئی چائے خانہ نظر نہیں آرہا تھا مگر بس اسٹینڈ کے پچھلے حصے میں اسٹاف روم تھا۔ وہاں اس نے خود چائے بنا کے پیش کی کیوں کہ اندر جانے والی بس کے آنے میں ایک گھنٹا تھا۔ اسٹاف روم میں دو کلینر سو رہے تھے جن کو ڈرائیور نے باہر نکال دیا اور ہم نے وہاں پون گھنٹا بڑے آرام سے گزارا۔ اسٹاف روم کے ساتھ باتھ روم بھی تھا۔ اور چائے جیسی بھی تھی، صبح کے سرد موسم میں اپنا کام دکھا گئی۔

ہم اندر جانے والی بس میں سوار ہوئے تو بالکل تازہ دم تھے۔ یہ بس بھی بہت بہتر تھی اور بس میں ہماری سیٹ آگے پیچھے تھی۔ آگے والی سیٹ پر نازو کھڑکی کے ساتھ تھی اور اس کے برابر غالب تھا۔ میرے ساتھ گل تھی اور کھڑکی سے لگی بیٹھی تھی۔ ہمارے بیگ سیٹوں کے نیچے محفوظ تھے۔

روانگی کے ایک گھنٹے بعد سورج نکلا تو ہم سب مبہوت بیٹھے اس منظر کی دلکشی کے ہر لمحے میں کھوئے رہے۔ آسمان کا رنگ دیکھتے دیکھتے آتشیں سے سنہرا ہوگیا۔ پرندوں کے پرے فضا میں پرواز کرتے نظر آنے لگے۔ بس کی بند کھڑکیوں کے باہر یقیناً سردی تھی مگر اندر کی فضا انسانوں کے جسم کی حرارت سے گرم تھی۔ دھند گہری ہوئی تو سورج کا زرد گولا ایسے افق پر طلوع ہوا جیسے چودھویں شب کا چاند ہو۔ پھر آہستہ آہستہ دھند چھٹنے لگی اور چاندنی جیسی دھوپ کا رنگ نکھرتا گیا۔ اُجلی سفید دھوپ میں دیہی زندگی کے نقش ابھرنے لگے۔ کھیتوں میں ہل چلانے والے، بستے اور تختیاں لٹکا کے اسکول جانے والے بچے، گھروں میں معمولات سرانجام دینے والی عورتیں، صبح دم روانہ ہوجانے والی برات جس میں عورتوں مردوں سمیت بیس پچیس افراد شامل تھے۔ کلف دار پگڑی باندھے اور گلے میں ہار ڈالے دولہا سب کے آگے شہنائی جیسا ایک ساز بجانے والے کے نقش قدم پر چل رہا تھا۔ عورتوں نے لال پیلے چھینٹ کے لہنگے اور رنگ برنگی چُنریاں اوڑھ رکھی تھیں۔ یہ منظر گزر گیا تو سڑک کے کنارے پولیس کے اہلکار کسی کو ہتھکڑی ڈالے نظر آئے۔ پھٹے کپڑوں والا خستہ حال ملزم ننگے پاؤں تھا اور سردی یا خوف سے کانپ رہا تھا۔

ہم سب خاموش تھے۔ بس خاصی رفتار سے رواں تھی اور ہمیں ایسا لگتا تھا کہ خطرات کی وہ دلدل جس میں ہم مدت سے پھنسے ہوئے تھے بہت پیچھے رہ گئی ہے۔ ایک بار پھر تحفظ اور سلامتی کے احساس نے ہمارے دلوں میں امید اور حوصلے کی دبی ہوئی چنگاری کو روشن کر دیا تھا۔ مایوسی اور ناکامی کا خیال ماحول کی دھند کی طرح چھٹ رہا تھا اور مستقبل پر یقین کی دھوپ پھیل رہی تھی۔

ابھی تک کہیں بھی کسی بس کو روک کر چیک نہیں کیا گیا تھا۔ شاید رات کے وقت قانون کے محافظ زیادہ مستعد نہیں رہتے۔ دن کے اجالے میں کیا ہوگا، یہ بہت جلد معلوم ہونے والا تھا۔ ہم اس راستے سے بھٹک کر بہت دور نکل آئے تھے جس پر ہمارے پیچھے لگے ہوئے شکاری ہر... سراغ سے ہماری منزل کا تعین کرلیتے تھے۔ اب ہم دور افتادہ اور گمنام راستوں کی بھول بھلیوں میں گم ہوگئے تھے اور ایسے علاقے میں پہنچ گئے تھے جہاں ابھی تک ہمارے افسانے نہیں پہنچے تھے۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے شہر کی سڑک پر جان بچا کے بھاگنے والا پرانے شہر کی گلیوں میں گھس جائے اور اس کا تعاقب کرنے والے ان بھول بھلیوں میں ناپتے رہ جائیں۔

دس بجے بس رکی اور مسافر اتر گئے۔ آس پاس اور بھی بہت سی مسافر بسیں مختصر قیام کے لئے آرہی تھیں اور روانہ ہورہی تھیں۔ ڈرائیور نے ہمیں مطلع کیا کہ یہاں ناشتا ملتا ہے، اس کے بعد بس دوپہر کے کھانے تک کہیں نہیں رکے گی۔

"ہم بھی کچھ کھا پی لیں۔" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "باہر بہت لوگ ہیں۔ ناشتا یہیں منگواتے ہیں۔ ایسا نہ ہو کوئی تاڑ لے تو اچھا خاصا پُرسکون سفر پھر جان بچانے کے لئے فرار کی کوشش کی نذر ہوجائے۔ کسی کو اشارہ کرکے بلالو۔"

ہماری طرح بس میں بیٹھے رہنے والے دو ہی مسافر تھے۔ ایک بہت بوڑھا شخص تھا اور دوسری کوئی مسلمان عورت جو پردے کی سخت پابند تھی اور شٹل کاک برقعے کے اندر روپوش بیٹھی تھی۔ غالب کے اشارے پر پہلے ایک اخبار والا آگیا۔ اس کے پاس سب ہندی کے اخبار تھے۔

"انگریزی اخبار نہیں ملے گا؟" میں نے کہا۔

"کون سا اخبار؟" وہ بولا۔

"ٹائمز آف انڈیا۔ اسٹیٹس مین..... یا کوئی اور۔"

"کل کا ملے گا" وہ بولا "ادھر شام کو آتا ہے۔"

میں نے کہا "کل کا ہی لادو۔ اور ذرا چائے والے کو بھیج دو تو بڑی مہربانی ہوگی۔"

ناشتے سے پہلے وہ اخبار لے آیا اور گزشتہ روز کے اخبار کے دو روپے لے گیا۔ اس کے پہلے صفحے کی خبریں پڑھ کر میری نظروں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ الفاظ آپس میں گڈمڈ ہونے لگے اور حروف کی سیاہی یوں بہنے لگی جیسے کاغذ پر لہو پھیل گیا ہو۔

میں نے ڈوبتے دل کے ساتھ کہا "مرزا ..... یہ ..... یہ کیا ہے؟ آخر یہ سب کیا ہے؟"

میرے لہجے کی وحشت نے غالب کو سراسیمہ کر دیا۔ اس نے اخبار مجھ سے چھین لیا۔

"مرزا، یہ سب جھوٹ ہوگا۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ آخر..... یہ سب سرخیاں......"

غالب نے کہا "تم ٹھیک کہتے ہو۔ یہ جھوٹ ہے، محض پروپیگنڈا۔ سرکاری اطلاعات۔"

نازو نے کہا "ایسے چلاؤ مت۔ لوگ نہ جانے کیا سمجھیں گے۔ آخر یہاں سب ہی اخبار پڑھ رہے ہیں۔ دیکھو باہر۔"

میں نے باہر دیکھا۔ بینچوں اور کرسیوں پر ناشتا کرنے والے اور چائے پینے والے بھی ہندی اخبار پڑھ رہے تھے۔ پڑھ کے سُنا رہے تھے اور سُننے والے بڑے انہماک سے بھارتی فوج کی فتوحات اور پیش قدمی کے شاندار افسانے سن رہے تھے۔ مغربی پاکستان کی سرحد پر لڑائی چھڑ گئی تھی۔ ہندوستانی فوجیں مشرقی پاکستان میں داخل ہوگئی تھیں۔ شیخ مجیب کی اپیل پر بھارتی ہائی کمان نے لبیک کہا تھا اور مشرقی پاکستان کے نہتے عوام کو پاکستانی فوج کے مظالم سے نجات دلانے اور بنگالیوں کی جدوجہدِ آزادی کو کامیاب بنانے کے لئے ہر طرف سے حملہ کردیا تھا۔ صورت حال اتنی سنگین تھی کہ مشرقی پاکستان کے ہر شہر، قصبے اور گاؤں میں جنگ ہورہی تھی۔ ہندوستانی اخبار یہ بتا رہے تھے کہ بنگالیوں کے جذبۂ حریت کو فتح حاصل ہورہی ہے اور پاکستانی فوج محصور ہوتی جارہی ہے۔ اور بنگلہ دیش کی تشکیل کے خواب کو تعبیر مل رہی ہے۔ بھارتی افواج کی مدد سے، ہندو سرمائے سے اور ایک بین الاقوامی سازش کے تحت مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان سے علیحدہ کرنے والے کامیاب ہورہے تھے۔

غصے کا آتش فشاں میرے اندر پھٹ پڑا۔ میں نے اس اخبار کو پھاڑ دیا "بکواس کرتے ہیں یہ سب اخبار والے۔"

غالب نے اخبار مجھ سے چھین لیا "سکندر! ہوش میں آؤ۔ ایسے جذبات کا مظاہرہ ہمارے حق میں خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔"

"کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟" میں نے خود کو سنبھال کے کہا۔

"اخبار میں جو کچھ ہے، سب جھوٹ نہیں ہو سکتا۔ اس میں کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور ہوگی" غالب نے کہا "مثلاً یہ خبر تو سب کے حوالے سے دی گئی ہے کہ مغربی پاکستان کی سرحد پر جنگ چھڑ گئی ہے، یہ غلط نہیں ہو سکتا۔"

"اور مشرقی پاکستان کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے؟"

"یہ بھی تصدیق طلب ہے۔ اگر انڈین آرمی پہنچ گئی ہے بنگال میں تو خونریزی لازمی ہے" غالب نے خبروں پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا "اب یہ خانہ جنگی نہیں، دو ملکوں، دو قوموں کی جنگ ہے۔ انہیں کیا حق پہنچتا ہے ہمارے ملک کے داخلی معاملات میں دخل دینے کا۔"

"حق! حق اور ناحق کی بات مت کرو۔ یہ مائٹ از رائٹ سوسائٹی ہے" میں نے تلخی سے کہا "غدار جب ہمارے درمیان ہیں تو ہم دوسروں کو کیا کہیں۔ خانہ جنگی کب سے چل رہی تھی۔ اب خود انہوں نے اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار لی ہے۔ اپنے دشمنوں کو بلالیا ہے مدد کے لئے۔ تو......"

ناشتے والا ایک ٹرے لے کر آگیا مگر اب بھوک کسی کو نہیں تھی۔ سب مایوس اور دل شکستہ تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے ہم ہار گئے۔ دلاور جیت گیا۔ ہماری سب جدوجہد رائیگاں گئی۔ ہر قربانی ضائع ہوئی۔ مشرقی پاکستان میں شہید ہونے والوں کے لہو کی آبرو مٹ گئی۔ قومیت پر یقین رکھنے والوں کا ایمان بک گیا۔ دل کی ہر دھڑکن تکرار کرتی تھی۔ ناممکن۔ ناممکن۔ ناممکن۔ عقل فریاد کرتی تھی کہ دو ڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا۔ حشر بپا ہوگیا۔ تم اب بھی ہوش میں نہیں آئے تو کب آؤ گے؟ حقیقت سے آنکھیں چرانے سے کیا ہوگا؟ کب تک نہ مانو گے تم کہ جو نہیں ہونا تھا وہ ہوگیا۔ ایسا تم نہیں چاہتے تھے۔ تمہارے کروڑوں ہم وطن۔ اسلام کے نام لیوا۔ پاکستان بنانے والے۔ وہ سب نہیں چاہتے تھے مگر مائٹ از رائٹ سوسائٹی۔ امریکا روس۔ اقوام متحدہ۔ یہودی اور اسلام دشمن عناصر، پاکستان کے وجود کو تسلیم نہ کرنے والے۔ سب ایک ہوگئے تھے۔

باہر والا آیا اور ناشتا جوں کا توں واپس لے گیا۔ اس نے چائے کے پیسے وصول کئے "کھانا پینا نہیں تھا تو کیوں منگوایا؟" اس نے کہا اور نیچے اتر گیا۔ مسافر پھر بس میں آبیٹھے، بس پھر چل پڑی۔ گل اور نازو کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے بار بار آنکھیں صاف کرتی تھیں۔ میرا دماغ گرم ہورہا تھا۔ میں چیخ چیخ کے رونا چاہتا تھا مگر ضبط کرنے پر مجبور تھا۔ میرے آس پاس لوگ اس صورت حال پر تبصرے کررہے تھے۔ وہ سب بھارتی تھے۔ ان کے لئے یہ خبر اچھی خبر تھی۔ وہ خوش تھے۔ بھارتی فوجیں فتح حاصل کررہی ہیں۔ بنگالی حُریت پسندوں کی مدد کررہی ہیں۔ پاکستان کے دو ٹکڑے ہورہے ہیں۔ مغربی پاکستان نے بہت ظلم کیا۔ بہت استحصال کیا بنگالیوں کا۔ شیخ مجیب ان کا نجات دہندہ ہے۔ اندرا گاندھی نے کہا ہے کہ ہم مظلوموں کے ساتھ ہیں۔ مظلوم کی پکار کو نظرانداز نہیں کرسکتے۔ بنگالیوں پر پاکستانی فوج کے انسانیت سوز مظالم کو خاموش تماشائی بن کے نہیں دیکھ سکتے۔

ہم [illegible] برداشت کرتے رہے۔ ہم نے اخبار کی ایک ایک سطر کو کئی بار پڑھا۔ بس میں ریڈیو بھی تھا۔ لوگ ہر ایک گھنٹے بعد نشر ہونے والا بلیٹن سننا چاہتے تھے۔ ڈرائیور بھی بھارتی تھا۔ سب کے ساتھ وہ بھی بڑھ بڑھ کے بول رہا تھا۔ وہ سب پاکستان کو گالیاں دے رہے تھے۔ پاکستان کے دشمنوں کے درمیان ہم چاروں ایسے تھے جیسے بھوکے بھیڑیوں کے درمیان خرگوش۔ اگر انہیں معلوم ہوجاتا کہ ہم کون ہیں تو وہ پولیس کے حوالے کرنے کے بجائے خود ہماری تکا بوٹی کر ڈالتے۔ اگر انہیں یہ احساس

ہو جاتا کہ ہم جذباتی طور پر ان کے ساتھ نہیں تو دشمن قرار پاتے۔

گل اور نازو کو روتا دیکھ کر ایک شخص نے کہا "کیا بات ہے بھائی؟"

میں نے کہا "ہم برباد ہو گئے ہیں۔ ہمارا سب کچھ لُٹ گیا ہے۔"

غالب نے فوراً کہا "ہمارا خاندان مٹ گیا ہے۔"

"کسی حادثے میں؟" ایک اور شخص نے کہا۔

"ہاں۔ بہت بڑا حادثہ تھا" میں نے کہا "کچھ نہیں بچا۔"

اب میں رو سکتا تھا۔ بہت سے لوگوں نے میرے الفاظ کا مطلب وہ سمجھا جو میرا مطلب نہیں تھا۔ وہ مجھے تسلی دینے لگے۔ غالب، نازو اور گل کو تسلی دینے لگے۔ حادثے کی تفصیلات پوچھنے لگے۔ ہم انہیں کیا بتاتے۔ تنگ آ کے انہوں نے ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیا۔

شام کو ہم اندور پہنچے۔ اب یوں لگتا تھا کہ ہمارے کرنے کو کچھ نہیں رہا۔ ہمارا عزم اور حوصلہ، جوش اور ولولہ شکست کے احساس میں تحلیل ہو گیا تھا۔ ہم اچانک خطرے کے وجود سے بے نیاز ہو گئے تھے۔

بہت دیر تک ہم بس اسٹینڈ کی گہما گہمی میں خاموش کھڑے رہے اور سوچتے رہے کہ ہمیں کیا سوچنا چاہئے۔ میں چاہتا تھا کہ کچھ نہ سوچوں۔ میں اپنے خیالوں کے عذاب سے اور احساس کی اذیت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے کچھ بھی کرنے کو تیار تھا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں سو جاؤں۔ لمبی نیند۔ اتنی لمبی کہ جب آنکھ کھلے تو احساس بھی مر چکا ہو۔ مجھے خواب آور گولیوں کی پوری شیشی کھانے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ میں زہر کھا کے لیٹ جانا چاہتا تھا۔ کبھی نہ اٹھنے کے لئے۔ میری زندہ رہنے کی خواہش مر چکی تھی۔

غالب نے کہا "اب کیا کریں؟"

میں نے کہا "اب کرنے کو کچھ نہیں رہا۔ ہمیں مر جانا چاہئے۔"

نازو نے کہا "ایسی باتیں مت کرو۔ ہار جیت تو ہوتی رہتی ہے۔"

میں نے کہا "شکست ہار نہیں ہے۔ دھوکا ہے۔ فریب ہے۔ خنجر گھونپا گیا ہے ہماری پیٹھ میں۔"

"دشمن سب کچھ کر سکتا ہے۔"

ہمارے چاروں طرف مصروف انسانوں کی دنیا تھی جن کو اپنے اپنے کاروبار، سود و زیاں کے سوا کسی کی فکر نہ تھی۔ سب معمول کے مطابق اپنا کام کر رہے تھے۔ اکثریت ان کی تھی جو نہ ملک کی سیاست سے دلچسپی رکھتے تھے اور نہ عالمی سیاست سے۔

کہاں کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے، اس کی انہیں پروا نہ تھی۔ انہیں شام کی روٹی دال اور آنے والے دن کا زیادہ خیال تھا۔ ان کے لئے گھر اور بیوی بچے زیادہ اہم تھے جن کی پرورش کا بار وہ اٹھاتے تھے۔ امریکا کیا چاہتا ہے، روس کیا کر رہا ہے، ہندوستان پاکستان کے درمیان کون ہے۔ وہ سوچتے بھی نہیں تھے۔ وہ عام لوگوں سے سنتے تھے کہ جنگ ہو رہی ہے تو فکر مند ہو جاتے تھے کہ جنگ کہیں بھوک اور بے روزگاری نہ لائے۔ وہ جنگ نہیں چاہتے تھے مگر انہیں بھی یہ اطمینان حاصل تھا کہ ہندوستان کا پلہ بھاری ہے۔ اور یہ بات بتانے والے اخبار پڑھ رہے تھے، بحث کر رہے تھے۔ کیا سچ ہے، کیا غلط ہے۔ سٹہ کھیل رہے تھے۔ شرطیں لگا رہے تھے۔ پیش گوئیاں کر رہے تھے۔ سیاسی پنڈت اور دانشور ریڈیو، ٹی وی اور اخبارات میں اظہارِ خیال کر رہے تھے۔ تجزیے اور تبصرے پیش کر رہے تھے۔

ہم چاروں کچھ نہیں کر رہے تھے۔ کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے۔

غالب نے کہا "یہاں سے تو چلو۔"

"کہاں چلیں؟" نازو نے کہا۔

"کہیں تو جائیں گے۔ یہاں کھڑے رہیں گے کیا؟" غالب نے کہا "اس سے کیا ہوگا۔"

"پھر کیا واپس چلیں؟" نازو نے کہا۔

"نہیں، ہم آگے جائیں گے" غالب نے کہا۔

"کیا ملے گا آگے جا کے؟"

"محسن ضرور ملے گا۔" گل نے کہا "وہ انتظار کر رہا ہوگا ہمارا۔"

اچانک مجھے پھر اپنی منزل مل گئی۔ راستہ مل گیا۔

"ہاں۔ محسن کو ساتھ لئے بغیر ہم کیسے واپس جا سکتے ہیں" میں نے بیگ اٹھا لیا "ہم ڈھاکا جائیں گے۔"

"کیسے جائیں گے ڈھاکا؟ اب تو فوجوں میں جنگ ہو رہی ہے۔" غالب نے کہا۔ ہم سب ایک سڑک پر چلنے لگے۔

"کہیں راستہ ضرور ہوگا۔ ورنہ ہم میدانِ جنگ سے گزر کے جائیں گے۔ یہاں سے کلکتہ پہنچنا تو مشکل نہیں" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "ہاں۔ اصل مسئلہ سرحد عبور کرنے کا ہے۔"

"میرا خیال ہے.... تم لوگ واپس جاؤ" میں نے کہا "میں اکیلا جا کے اسے لے آؤں گا۔"

"ہم سب ساتھ ہیں اور ساتھ رہیں گے" غالب نے گویا فیصلہ سُنا دیا "لیکن ابھی چلو۔ کہیں بیٹھ کے سوچتے ہیں کہ ان حالات میں ہمارا اگلا قدم کیا ہونا چاہئے۔"

ساری رات اور دن بھر سفر کرنے کے بعد سب کا تھکن سے بُرا حال تھا۔ جسمانی اذیت میں ذہنی عذاب شامل ہونے سے یکلخت سب کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ ایک چوک پر ہم سب رک گئے۔

نازو نے کہا "میں تو اب کھڑی بھی نہیں رہ سکتی، گر جاؤں گی بے ہوش ہو کے۔"

گل نے کچھ نہیں کہا مگر اس کی خاموشی نے سب بتا دیا۔ وہ رُکے بغیر آگے جانا چاہتی تھی، ڈھاکا تک جہاں محسن تھا۔

میں نے کہا "ہم کسی ہوٹل میں ٹھہر سکتے ہیں۔"

"ہاں، تھوڑا بہت سرمایہ ہے ہمارے پاس۔ نقد ہیں دس بارہ ہزار اور زیورات بھی ہیں۔"

"انہیں ابھی رہنے دو" میں نے کہا "سونا وہ کرنسی ہے جو ہر سرحد کے پار چلتا ہے۔ ہمیں نہ جانے کہاں کیش کرانا پڑے۔ اب تو ہم سرحد کے ادھر بھی خطرے میں ہیں اور اُدھر بھی۔"

ایک اجنبی شہر میں پھرتے ہوئے ہمیں ایک لمحے کے لئے بھی یہ خیال نہ آیا کہ کوئی ہمیں پہچان جائے گا۔ کوئی ہماری طرف متوجہ بھی نہیں تھا۔ اگر کوئی دیکھتا تھا تو گل اور نازو کی خوب صورتی کو۔ ہم کسی کی نگاہ غلط انداز کے بھی لائق نہ تھے۔ اپنے حُلیوں سے ہم یکسر بدل چکے تھے اور آج اتنے عرصے بعد ہمارا کوئی لاہور کا جاننے والا ملتا تو شاید ہمیں پہچان بھی نہ پاتا۔ ہمارے بال اتنے لمبے ہو گئے تھے کہ بیٹے نظر آتے تھے۔ داڑھی چہرے پر پھیل کر مونچھوں سے مل گئی تھی۔ سفر کی گرد میں بکھرے بالوں کے ساتھ ہم اُجڈ اور جنگلی لگتے تھے چناں چہ گل اور نازو کی جوڑی ہمارے ساتھ کچھ لوگوں کے لئے افسوس یا رشک و حسد کا سبب بنتی تھی۔

ہم نے ایک راہ گیر سے کسی ہوٹل کا پتا پوچھا تو وہ خود اجنبی نکلا۔ دوسرا نسبتاً معقول آدمی تھا۔ اس نے پہلے تو مصافحہ کیا۔

"پنجاب سے آئے ہو خیر سے؟" وہ بولا۔

میں نے کہا "ہاں" اس نے ہمارے لباس سے اندازہ کیا تھا کہ ہمارا تعلق پنجاب سے ہوگا مگر میں اس تعلق کی بنیاد پر زیادہ اپنائیت کا مظاہرہ کرنے اور بود و باش سے متعلق معلومات کا تبادلہ کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

وہ بھی جلدی میں تھا "ایک تو میں اونچے ہوٹل....."

میں نے کہا "ذرا نیچے آ جاؤ۔"

وہ مسکرایا "فیملی ہے تمہارے ساتھ۔ تم زمیں دار ہوٹل میں چلے جاؤ۔ وہ تمہاری سکھ برادری کا ہے۔ اگلے چوک سے دائیں ہاتھ۔"

"اُلو کا پٹھا" غالب نے اس کے جانے کے بعد کہا "ہم اسے سکھ نظر آ رہے تھے۔"

میں نے کہا "غالباً ہمارے جھاڑ جھنکاڑ بالوں سے۔"

"مگر پگڑی کہاں ہے ہمارے سر پر؟ اور بال اتنے تو نہیں بڑھے ہیں کہ کیس نظر آتے ہوں" غالب نے خفگی سے کہا۔

زمیں دار ہوٹل میں ایک ریچھ ٹائپ شخص نے ہمیں باری باری گلے لگایا اور خوش آمدید کہا۔ مگر اسے معلوم ہوا کہ ہم سکھ نہیں ہیں، مسلمان ہیں تو اس کا جذبۂ ایمان سرد پڑ گیا۔

"سکھ ہو نہیں تو نظر کیوں آتے ہو؟" اس نے بالکل سکھوں والا سوال کیا "اپنا نام پتا لکھو اس رجسٹر میں۔ ساتھ ساتھ لوگے کمرا آمنے سامنے۔ پانچ سو ابھی جمع کرا دو۔"

ہم نے فرضی نام پتے درج کئے اور ساتھ ساتھ رہنے کو ترجیح دی۔ کمرے دیکھنے کے بعد۔ ان کمروں کے پیچھے والے حصے میں کھڑکی کے نیچے بھی تقریباً دو فٹ چوڑا چھجا تھا جو دراصل نچلی منزل کے کمرے کی کھڑکی اور دروازوں کے اوپر تھا۔ ایمرجنسی میں ہم پچھلی طرف سے بھی رابطہ رکھ سکتے تھے۔ گو امکان بہت کم تھا کہ ایسی ہنگامی صورت حال پیدا ہو۔ کمرے کشادہ اور آرام دہ تھے۔

رات ہو گئی تھی۔ تھکن مٹانے کے لئے باری باری سب نے گرم پانی سے غسل کیا۔ پھر گل اور نازو ہمارے کمرے میں آ گئیں۔ سب کے دل بوجھل تھے اور ڈپریشن کا شکار تھے۔ مستقبل کے بارے میں سب فکر مند تھے۔ مگر یوں لگتا تھا جیسے سب اس موضوع پر بات کرتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ ایم آر ایس کے لائحۂ عمل کو بے یقینی کی بادِ سموم اُڑا لے گئی تھی اور جد و جہد، آزمائش، مصائب و آلام، دربدری اور غریب الوطنی، لامحدود نقصانات اور قربانیوں کے طویل دور کا انجام ہماری توقعات کے اتنا برعکس ہوا تھا کہ اس صدمے نے ذہنوں کو مفلوج کر دیا تھا۔ بے یقینی کے اس خلا سے نکلنا کیسے ہوگا؟ یہ سوال اپنا جواب مانگتا تھا مگر ابھی کوئی اس قابل نہ تھا کہ سوچے اور کچھ کہے۔ کوئی ایسی بات جو شکستہ دلوں کے درد کو درماں فراہم کر سکے۔ جو مداوائے غمِ دوراں کرے۔

غالب نے کہا "یار صورت حال اچانک اتنی خراب نہیں ہو سکتی۔ چند دن میں۔"

میں نے کہا "حالات بہت تیزی سے بگڑ رہے تھے۔"

"اگر ہم ریڈیو پاکستان سُن سکتے۔ یا بی بی سی؟" غالب نے گھڑی دیکھی "ابھی تو دکانیں کھلی ہوں گی۔ کیوں نہ چل کر ایک ریڈیو خرید لیں۔"

"چلو۔ کچھ کھانے کو بھی لے آئیں گے۔"

نازو نے کہا "کھانے کو یہاں بھی مل جائے گا۔ ریڈیو پر خبریں سُن کے کیا ہوگا۔ حقیقت بدل جائے گی؟"

گل نے کہا "ہم اکیلے نہیں رہیں گے۔ تم دونوں کیوں جا رہے ہو۔ یا تو ہمیں بھی ساتھ لے کر چلو۔"

میں نے کہا "اچھا غالب رہے گا یہاں۔ میں دیر نہیں لگاؤں گا۔ سردار جی سے پوچھ لوں گا کہ ریڈیو کہاں سے مل سکتا ہے۔ انہیں ہدایات بھی دے دوں گا کہ ہم جھٹکے کا گوشت نہیں کھاتے۔ دال سبزی پر گزارا کرلیں گے۔ ابھی چائے پئیں گے۔"

نازو نے کہا "یہ سب آپ روم سروس والوں سے کہہ سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "یہاں کوئی بٹن نظر آرہا ہے کال بیل کا؟ مجھے خود ہی جانا پڑے گا۔"

غالب نے کہا "جاؤ یار۔ انہیں بولنے دو۔ دیر مت کرنا۔"

ہوٹل زیادہ بڑا نہیں تھا۔ تین منزلہ عمارت میں شاید پچاس ہی کمرے ہوں گے۔ ہر منزل پر آمنے سامنے دس کمرے تھے۔ پانچ ایک طرف اور پانچ دوسری طرف۔ سردار جی نے جس طرح ہمیں انتخاب کا حق دیا تھا اس سے تو یہی پتا چلتا تھا کہ بیشتر کمرے خالی ہوں گے مگر ایسا نہیں تھا۔ گراؤنڈ فلور اور فرسٹ فلور کے سب کمروں میں لوگ ٹھہرے ہوئے تھے ہم سیکنڈ فلور پر تھے۔ ہمارے کمروں کے نمبر دو سو پانچ اور دو سو چھ تھے جس سے یوں لگتا تھا کہ ہوٹل میں دو سو سے زیادہ کمرے ہوں گے۔ مگر ہر ہوٹل میں کمرے کے نمبر کا پہلا عدد فلور کی نشان دہی کرتا ہے۔

میں فرسٹ فلور سے گھوم کر نیچے پہنچنے ہی والا تھا کہ میرے کانوں نے سردار جی کی آواز سنی۔ یہ آواز زینے کے دائیں طرف ایک روشن دان سے مجھ تک پہنچ رہی تھی جو تقریباً میرے سامنے تھا اور اس میں سے مجھے سردار جی خود بھی نظر آرہے تھے۔ وہ اپنے آفس کے پیچھے والے بیڈ روم میں تھے اور ٹیلی فون پر کسی سے لڑ رہے تھے۔

"اوئے پاگل دے پتر۔ میں ٹھیک بول رہا ہوں۔ ہاں یار، ایک بار نہیں دو بار غلطی ہوئی تھی مجھ سے۔ نشے میں بھول چوک ہوجاتی ہے مگر اس وقت نشے میں نہیں ہوں میں۔ واہگورو دی سوں۔ او کھوتے تو مانتا کیوں نہیں میری بات۔ میں جو کہہ رہا ہوں کہ وہی دونوں ہیں۔ بالکل ٹھیک پہچانا ہے میں نے۔ تیری ترقی ہوجائے گی...."

سردار جی نے اسے ایک ناقابل اشاعت گالی دی۔

"دیکھ میری بات مان۔ اپنی نفری لے کر فٹافٹ آجا۔ پکڑ لے سب کو۔ میرا کیا فائدہ ہے اس میں حرامی۔ بار بار وہی بات۔ میں نے صبح سے ہاتھ نہیں لگایا دارو کو۔ بے شک تو آکے یہ بھی دیکھ لے۔ تو اتنا بڑا افسر ہے پولیس کا۔ چار چھ بندے بھیج دے۔ تیرا کیا جاتا ہے۔ غلط ہوگا تو واپس چلے جائیں گے۔ لیکن دیکھ انعام سارا مجھے دلوا دینا اگر میری بات ٹھیک ہو۔ تو کیا کرے گا؟ روز اس سے زیادہ مال بنالیتا ہے....." انہوں نے مزید دو گالیاں دے کر فون رکھ دیا۔

میں الٹے پاؤں واپس گیا۔ شک کی اب کوئی بات نہیں رہی تھی۔ سردار جی نے ہمیں پہچان کے پولیس کو اطلاع دے دی تھی۔ ہمارے پاس فرار ہونے کے لئے بہت کم وقت تھا۔

غالب مجھے غور سے دیکھ کے بولا "کیا ہوا؟ کوئی مل گیا؟"

"ہاں۔ سردار جی نے..... پولیس کو فون کیا ہے" میں نے اپنے پیچھے دروازہ بند کرکے کہا۔ اور انہیں وہ سب بتادیا جو میں نے اتفاق سے سن لیا تھا۔

گل اور نازو کا رنگ اڑ گیا "یا میرے خدا! کیا اب واپسی کے راستے بھی بند ہوگئے ہیں۔"

میں نے کہا "بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ یہ وقت مایوسی کے ہسٹیریا میں مبتلا ہونے کا نہیں ہے۔ کون کہتا ہے راستے بند ہیں۔ راستے آدمی خود بناتا ہے اور بند راستے کھولے بھی جاسکتے ہیں۔"

گل نے کہا "بھائی سکندر! ہم نکلیں گے کیسے؟"

غالب نے کھڑکی سے باہر جھانکا "ادھر سے کود جائیں۔ مگر سڑک پر بہت ٹریفک ہے۔"

میں نے دیکھا تو مجھے ایک تنگ سی سڑک پر تانگوں اور سائیکلوں کے ساتھ پیدل چلنے والوں کا اژدھام نظر آیا۔

"سامنے سے ہمیں کون نکلنے دے گا" میں نے کہا۔

"سامنے سے جائیں گے تو کتنے لوگ راستہ روکنے والے ہوں گے؟ یہ سردار جی اور دو چار دوسرے" غالب نے کہا "بازار کی طرف اترے تو مجمع گھیر لے گا۔"

میں نے کہا "بالکل ٹھیک۔ ہم ادھر سے جاتے ہیں جدھر سے آئے تھے۔ اپنے اپنے ریوالور تیار رکھو۔ نازو، کوشش یہ کرنی ہے پہلے کہ فائرنگ کی نوبت نہ آئے ورنہ آواز باہر بھی سنی جائے گی اور ہوٹل میں بھی۔ بیگ اٹھالو۔ اور......"

ابھی میری بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے غالب کی طرف دیکھا۔ ایک ساتھ ہم دروازے کے قریب دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہوگئے۔ ریوالور سے میں نے نازو کو اشارہ کیا کہ دروازہ کھولے۔ گل باتھ روم میں غائب ہوگئی۔

نازو نے کہا "کون ہے؟"

"دلاور۔" دروازے کے پیچھے سے آواز آئی۔

یہ ایک لفظ میری سماعت پر بم کا دھماکا بن کے گرا۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات چودھویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں

جاسوسی ڈائجسٹ کا منفرد و مقبول سلسلہ
شکاری
چودھواں حصہ

شکاری

معاشرے کے اُن ناسوروں کی رُوداد جو گوشت پوست سے گزر کر انسانی ہڈیوں میں اُتر رہے تھے۔ ایک کفن بردوش نوجوان کی کہانی جس کے روز و شب موت کی بستی میں گزر رہے تھے۔ جلتے دن۔ سُلگتی راتیں آس و یاس۔ خوف و ہراس۔ شیریں خواب، تلخ حقیقتیں

زندہ کرداروں پر مشتمل روایت شکن سلسلہ

نئی سوچ۔ نیا رنگ۔ نیا لہجہ۔ نیا آہنگ
احمد اقبال کے شرر بار و شبنم فشاں قلم سے

بتانے والے نے اپنا نام دلاور ہی بتایا تھا مگر یہ آواز مجھے چوہدری دلاور کی نہیں لگتی تھی۔ یہ بات بھی بعید از امکان تھی کہ جہاں اس کے خیال کا گزر بھی ناممکن محسوس ہوتا تھا وہاں۔۔ خود آپہنچا ہو۔ ہم نے اپنے پیچھے کوئی نشان منزل نہیں چھوڑا تھا اور خود بھی اصلی راستے سے بھٹک کے اس طرح یہاں پہنچے تھے کہ دلاور کی روح بھی ہمارا سراغ لگانے نکلتی تو بھول بھلیوں سے زیادہ پُرپیچ اور دشوار گزرگاہوں پر نہ جانے کدھر نکل جاتی۔

جب دوسری بار دستک ہوئی تو میں نے غالب کے قریب جا کے سرگوشی میں کہا "یہ دلاور نہیں ہو سکتا۔"

غالب نے سر ہلایا "آواز سے تو نہیں لگتا۔ مگر آواز کا کیا ہے' بدلی بھی جا سکتی ہے۔"

"او بھئی کیا ہے۔ اندر آئے اور سو گئے۔ واہ جی واہ۔ ایسا بھی کیا سونا" باہر سے آواز آئی۔

نازو نے میرے اشارے پر دروازہ کھول دیا اور فوراً پیچھے ہٹ گئی۔ ہوٹل کا مالک سکھ اندر آ گیا اور حیرانی سے نازو کو دیکھنے لگا جو انتہائی جارحانہ انداز اختیار کئے کھڑی تھی۔ اس سے پہلے کہ سردار جی کی نظر ہم پر پڑتی' میں نے اور غالب نے اپنے ریوالور چھپا لئے۔ آہٹ پر سردار جی ایک دم پلٹے۔

"او یار و' کیا ہو گیا آخر۔ بھئی میں بندہ ہوں' کوئی بھوت نہیں ہوں۔ ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟ سب کی شکلوں پر......"

"بارہ بجے ہوئے ہیں؟" میں نے کہا۔

سردار جی کا موڈ خراب ہو گیا "اپنا بوتھا دیکھو پہلے۔ تم گاہک ہو میرے' مگر غلط بات تو سردار دلاور سنگھ نے اپنے سگے باپ کی نہیں سنی۔"

میں نے کہا "تو تمہارا نام دلاور ہے؟"

"اور کتنی بار بتاؤں۔"

میں نے کہا "سردار جی! ابھی تم کسے فون کر رہے تھے؟"

سردار جی نے رازدارانہ لہجے میں کہا "پولیس کو۔ تم کو کیسے معلوم ہوا؟"

میں نے کہا "سب سنا تھا میں نے..... آخر کیا چاہتے ہو تم؟"

اس نے کہا "اوئے یار ہولے بول۔ میں کوئی ڈورا تو نہیں ہوں۔"

غالب نے کہا "ہم بھی اندھے نہیں ہیں۔"

سردار جی نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے کہا "شش..... یہ آواز سنی تم نے؟"

میں نے غالب کی طرف اور غالب نے میری طرف دیکھا۔ سردار جی واقعی کچھ سننے کے لئے دیوار سے کان لگائے بیٹھے تھے۔ ساتھ والے کمرے میں ایک آہٹ سی سنائی دی۔ پھر کسی نے دبے دبے لہجے میں کچھ کہا۔ یہ کسی مرد کی آواز تھی۔ اس کی بات کا جواب کسی عورت کی چوڑیوں نے دیا۔ چوڑیوں کی کھنک کو ہنسی نے دبا لیا۔

"یہ۔ سنا تم نے؟" سردار جی نے میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے اپنی داڑھی کے برش سے صفائی بھی کر دی۔

"کیا ہے یہ معاملہ آخر؟"

"وہی دونوں ہیں نامراد۔ میری بھی مت ماری گئی تھی کہ انہیں پہلے جگہ دے دی' پھر پہچانا" سردار جی اٹھ کے ہاتھ ملنے لگے۔ "اب کیا کروں میں۔ کتنی بدنامی ہو گی جب پولیس آئے گی مگر میں خود تو ان پر ہاتھ ڈال نہیں سکتا۔ وہ مجھے لمبا ڈال دیں گے۔"

میں نے کہا "کون؟ کس کی بات کر رہے ہو؟"

غالب نے کہا "کون ہے ساتھ والے کمرے میں؟"

"وہی بدمعاش۔ اگروال۔ ابھی ایک ہفتہ پہلے پھر جیل سے بھاگ گیا ورنہ لٹکا دیا جاتا۔ یہ عورت اس کی یار خود بھی بڑی چیز ہے۔ ایسے نکال کے لے گئی اگروال کو جیسے لسی میں سے مکھن نکالتے ہیں اور مکھن میں سے بال۔ بہت مشکل کام تھا مگر اس نے جان کی بازی لگا دی۔ اپنی نہیں، دوسروں کی جان کی۔ تین بندے تو وہیں مار دئے۔ اس کے بعد دو اگروال نے مارے۔ ایک کی گاڑی چھینی تھی۔ ایک کے گھر میں رات بھر رہے تھے۔ اب میری باری ہے۔ واہگورو۔ مجھے کیوں مروا دیا....."

میں نے کہا "سردار جی! حوصلے سے کام لو۔ تم ابھی تک تو زندہ ہو۔ پولیس اسے ابھی پکڑ کے لے جائے گی اور اس عورت کو بھی۔"

"ہائے ہائے۔ یہ سب تو ٹھیک ہے، پر اس کے بعد کیا ہوگا؟ ان کے بندے مجھے کب چھوڑیں گے" سردار جی نے کانپتے ہوئے کہا۔ "جب ان کو پتا چلے گا کہ میں نے پکڑوایا تھا اگروال کو۔"

مجھے اور غالب کو صورتِ حال سمجھ میں آ گئی تھی مگر سردار جی کی بدحواسی دیکھ کے ہنسی بھی آ رہی تھی۔

"ایسی ہی بات تھی تو پھر نہ بلاتے پولیس کو۔"

"کیسے نہ بلاتا۔ بعد میں پتا چل جاتا تو پولیس تھانے لے جا کے ڈک دیتی۔ مجھے بھی ساتھی بنا دیتی اس کا۔ الزام آ جاتا کہ میں نے اس کی مدد کی، اسے چھپایا۔ ہوٹل کا بھی بیڑا غرق ہو جاتا۔ واہ سچے واہگورو۔ دونوں طرف سے مروا دیا۔"

میں نے اچانک ایک فیصلہ کر لیا "....... کیا تم چاہتے ہو کہ الزام تم پر نہ آئے اور اس سے جان بھی چھوٹ جائے؟"

"یہ اتنا آسان نہیں ہے کاکا۔"

میں نے کہا "ابھی سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم ایسا کرو کہ پولیس کو نہ آنے دو۔"

"کیسے نہ آنے دوں؟ خود بلایا ہے میں نے۔ وہ آتے ہی ہوں گے۔"

"جب وہ آئیں تو تم انہیں واپس کر دو۔"

"مذاق کرتے ہو میرے ساتھ" وہ کمرے میں ٹہلنے لگا "میں تو چاہتا تھا کہ وہ ادھر تمہارے کمرے سے نکل کے پیچھے کی طرف جائیں اور کھڑکی سے ساتھ والے کمرے میں داخل ہوں۔ یا ان کو گولی مار دیں۔ اب پتا نہیں وہ کیا کرتے ہیں، میں یہی بتانے آیا تھا۔"

میں نے کہا "سردار جی! پولیس مقابلہ ہوا یہاں تو کتنی بدنامی ہوگی تمہارے ہوٹل کی۔ کل خبر آئے گی کہ اگروال کو تم نے پناہ دے رکھی تھی۔ پھر کوئی شریف آدمی آئے گا یہاں؟ اور تم خود اندر ہو جاؤ گے تو ہوٹل کا بیڑہ غرق ہو جائے گا۔"

غالب نے کہا "اندر نہ ہوئے تو اگروال کے ساتھی تم کو فوت کر دیں گے۔"

"واہگورو" وہ اوپر منہ اٹھا کر بولا "اب میں کیا کروں؟"

میں نے کہا "تم آرام سے جا کے کاؤنٹر پر بیٹھو۔ جب پولیس آئے تو صاف انکار کر دو کہ تم نے کسی کو فون نہیں کیا۔ کسی نے تمہارے ساتھ بے ہودہ مذاق کیا ہے۔ تمہارے ہوٹل میں اگروال کا کیا کام۔ یہاں شریف لوگ ہیں سب۔"

"مگر انہوں نے کہا..... کہ اس کمرے میں کون ہے پھر؟"

"کوئی بھی ہو۔ انہیں یہ اختیار حاصل نہیں کہ کسی گمنام کال پر تمہارے ہوٹل کی تلاشی لیں اور ان کو پریشان کریں جو یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ رجسٹر میں کیا نام لکھوایا ہے اگروال نے؟"

"مسٹر اینڈ مسز رام ناتھ جوشی۔ حرامی نہ ہو تو......"

میں نے کہا "تم جاؤ۔ پولیس آنے ہی والی ہوگی۔ آرام سے ان کو ٹال دو۔ وہ نہ مانیں تو دھمکی دینا کہ میں ابھی افسران بالا سے اور اخبار والوں سے بات کرتا ہوں۔"

"ٹرخا دو انہیں۔" غالب نے کہا۔

"اور پھر؟ اس کا کیا ہوگا۔ اگروال....."

"اس سے بعد میں ہم نمٹ لیں گے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی" میں نے کہا "کتنی دیر ہوئی ہے اسے یہاں آئے ہوئے؟"

"بس تم آئے ہو، تم سے ذرا دیر پہلے یہ آئے تھے۔ میری تو مت ماری گئی تھی کہ انہیں پہچانا نہیں۔"

"پہچان لیتے تب بھی تم انکار نہیں کر سکتے تھے۔ اب اگر جان بچانی ہے اور بدنامی سے بچنا ہے تو جو ہم کہہ رہے ہیں وہی کرو۔ ورنہ بعد میں کچھ نہیں ہوگا" میں نے کہا۔

سردار جی نے بے یقینی سے ہمیں دیکھا "تم..... کیا کرو گے آخر؟"

میں نے کہا "سب ٹھیک کر لیں گے ہم۔ تم جاؤ۔"

جب میں نے اسے دھکیل کر کمرے سے نکال دیا تو نازو جو ابھی تک خاموش تھی، ایک دم پھٹ پڑی۔

"یہ کیا حماقت ہے۔ آپ کیا کریں گے؟ اور میں پوچھتی ہوں کہ ضرورت کیا ہے آپ کو کچھ کرنے کی۔ سردار جی سے کیوں اتنی ہمدردی ہو گئی ہے آپ کو۔ اس کی خاطر آپ اگروال جیسے مجرم کے ساتھ کیوں الجھنا چاہتے ہیں؟"

غالب نے کہا "کوئی فل اسٹاپ بھی لگاؤ گی؟ عقل کے گھوڑے کو اور زبان کی قینچی کو روکو نادان لڑکی۔"

میں نے تائید میں سر ہلایا "ہم نے بلاوجہ پنگا نہیں لیا ہے۔ پولیس یہاں آ جاتی اور ہمارے کمرے سے گزر کے جاتی تو کیا خیال ہے، ہماری اشکال پر غور نہ فرماتی؟ اگروال تو بعد میں پکڑا جاتا یا نہ پکڑا جاتا۔ ہم پہلے دھر لئے جاتے۔ یہ سب پولیس کو دور رکھنے کے لئے ضروری تھا۔"

"خوب! گڑھے سے بچنے کے لئے آپ نے کنویں میں چھلانگ

ماردی۔ اور اس پر اصرار یہ کہ بہت عقل مندی فرمائی ہے آپ نے۔ ناک کو الٹی طرف سے پکڑتے سنا تھا۔ مرغا بن کے ٹانگوں کے بیچ سے ناک پکڑنا اسی کو کہتے ہیں۔"

گل نے بھی کہا "سردار جی کو منع کر دیتے۔ کافی تھا۔"

نازو نے کہا "اب گرفتار بھی ہوں گے پولیس کے ہاتھوں اور ڈاکو اگروال کے ہاتھوں مارے بھی جائیں گے..... ممکن ہے پولیس مقابلے میں وہ بچ جائے اور ہم پکڑے جائیں۔"

"کیا فضول بولے جا رہی ہو؟" میں نے بھنا کے کہا "کیا ہمارے منع کرنے سے پولیس مان جاتی؟ نہ ہم ابھی تک پکڑے گئے ہیں اور نہ مارے گئے ہیں۔ میں اس موقعے سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں۔ بس تم وہی کرو جو میں کہوں۔"

"یا جو میں فرماؤں" غالب نے سر ہلایا "تم پر صرف اطاعت فرض ہے۔ اگر مگر مت کرو۔"

میں نے کہا "ہماری ناک ہے، ہم جیسے چاہیں پکڑیں۔ تمہاری ناک تو محفوظ ہے نا؟"

نازو برا مان کے اور منہ پھلا کے بیٹھ گئی۔ گل ویسے ہی خاموش تھی۔ تقریباً بیس منٹ بعد سردار جی پھر نمودار ہوئے۔

"اویارو! پولیس تو خیر دفع ہو گئی" انہوں نے خاصی بے اطمینانی کے ساتھ کہا "مگر یہ بلا کیسے دور ہو گی؟"

میں نے کہا "آہستہ بولیں۔ جیسے آپ ہر آہٹ پر کان دھرے بیٹھے ہیں ایسے ہی وہ بھی دوسری طرف ہمہ تن گوش ہوگا۔"

"کیا ہوگا؟ ممن گوشت....." سردار جی بوکھلا گئے۔

"میرا مطلب ہے وہ بھی سن رہا ہوگا کہ کوئی گڑبڑ تو نہیں ہے کہیں۔ مجرم زیادہ ڈرتا ہے۔ اس کے کان ہی نہیں، جملہ حواس خمسہ......"

"کیا؟ یارو یہ تم کیا بول جاتے ہو۔"

میں نے گہری سانس لے کر کہا "آپ یہ بتائیں کہ اس نے یہاں آنے کے بعد کسی سے بات تو نہیں کی؟ کوئی اس سے ملنے تو نہیں آیا؟"

سردار جی نے نفی میں سر ہلایا "فون نیچے ہے۔ بات کرے گا تو مجھے پتا چل جائے گا۔"

"میرا خیال ہے کہ آج رات وہ کچھ نہیں کرے گا، سوائے آرام کے۔ صبح یہاں سے نکل جائے گا۔"

"واہگورو کرے....." سردار جی نے دعا کی۔

"یا پھر صبح اپنے ساتھیوں سے رابطہ قائم کرے گا۔ انہیں یہ اطلاع دے گا کہ وہ کہاں ہے۔"

"یعنی سارے ڈاکو اکٹھے کر لے گا یہاں" سردار جی نے گھبرا کے کہا "میٹنگ کے لئے۔"

میں نے کہا "گھبرائیں نہیں۔ صبح تک ہم بھی ہاتھ پر ہاتھ رکھے نہیں بیٹھے رہیں گے۔"

"کیا کرو گے آخر تم؟ مجھے تو لگتا ہے کہ خود بھی مارے جاؤ گے اور مجھے بھی مروا دو گے۔ بڑی غلطی کی میں نے تمہاری بات مان کے۔ تم تو شکل سے ہی الو لگتے ہو۔ تم کیا کرو گے؟" سردار جی نے افسوس سے سر ہلایا۔

غالب نے کہا "ہماری شکل پر مت جاؤ۔ یہ عقل کا کام ہے۔"

نازو ہنسی "ہاں۔ اگر یقین نہیں ہے تو سر توڑ کے دیکھ لو۔ کتنی عقل بھری ہوئی ہے اندر۔ اگر بھوسہ نکلے تو صبر کرنا۔"

غالب نے کہا "تم اس کی باتوں پر مت جاؤ۔ اس کا پیٹ خالی ہے اس لئے بھوسے کی بات کر رہی ہے۔"

میں نے کہا "ہمارے لئے کھانا بھیج دو۔ ہم گوشت نہیں کھاتے۔ دال سبزی ملے گی؟"

"بالکل ملے گی۔ پوریاں تازہ تازہ اور آلو کی بھجیا" سردار جی بولے "مگر اس کے بارے میں کیا سوچا ہے؟"

میں نے کہا "کھانے کے بعد سوچیں گے۔ پیٹ میں کچھ نہ ہو تو دماغ بھی کام نہیں کرتا۔"

"اچھا یارو۔ جو واہگورو کی مرضی" سردار جی ٹھنڈی سانس لے کر بولے "میرے ساتھ ہی تم کو بھی مرنا تھا یہاں آ کے۔"

میں نے کہا "ایک بات اور۔ یہاں کہیں سے ریڈیو مل سکتا ہے؟ کوئی دکان ہے قریب۔"

"اس وقت تو مشکل ہے۔ صبح خرید لینا۔"

میں نے کہا "ذرا بی بی سی سننا تھا۔ جنگ کی کیا صورتِ حال ہے، کچھ پتا نہیں چلتا۔"

"جنگ۔ یارو جنگ تو ختم ہوئی۔ اب کیا رہ گیا ہے سننے کو۔ ویسے میں اپنا بجلی کا ریڈیو لا دیتا ہوں" سردار جی نے کہا۔

میرا دل چلتے چلتے رک گیا "جنگ ختم ہو گئی؟"

"ہاں۔ واہگورو کی کرپا سے" وہ بولے "پاکستانی سینا نے بڑا مقابلہ کیا مگر بھارتی سینا نے خانہ خراب کر دیا ہے۔"

اس سے پہلے کہ میں سردار جی کی بات کو جھٹلاتا، دروازے پر دستک ہوئی۔ میں اور غالب چونکنے ہو گئے۔ کسی نے باہر سے سردار جی کو پکارا "دلاور سنگھ!"

"کون ہے بھئی؟ کیا وخت پڑ گیا؟" سردار جی نے دروازہ کھول کے کہا اور گھبرا کے بولے "آپ..... جوشی صاحب۔"

"میں نیچے گیا تھا۔ پتا چلا تم سب یہاں ہو" کسی نے درشت لہجے میں کہا۔

"معاف کریں..... میں ذرا آرڈر لینے آیا تھا..... کھانے کا۔" سردار جی نے بات بنائی۔

"میں بھی کھانے کی بات ہی کرنا چاہتا تھا۔ کیا ملے گا اس وقت؟ مرغی روسٹ چاہئے مجھے۔"

"ملے گی۔ بالکل ملے گی۔ تھوڑا ٹائم لگے گا۔"

قدرتی طور پر میری دلچسپی بڑھ گئی۔ میں نے سردار جی کے پیچھے سے اگروال کو دیکھا اور حیران رہ گیا۔ وہ بہت مختصر اور منحنی سا عینک والا آدمی تھا جو ڈاکو سے زیادہ کسی ساہوکار کا مظلوم منشی نظر آتا تھا مگر اس کے لہجے میں بڑی گھن گرج تھی۔ میں نے نازو کو آگے آنے کا اشارہ کیا اور جوشی سے زبردستی ہاتھ ملایا "جوشی صاحب! آپ ساتھ والے کمرے میں ہیں؟"

"ہاں۔ کوئی اعتراض ہے تمہیں؟" وہ غرایا۔

"اعتراض۔ جی نہیں۔ میرا نام شیام سندر ہے۔ پروفیسر شیام سندر۔ آئیں' میں آپ کو اپنی پتنی سے ملواؤں۔ یہ موہنی ہے۔"

میرے اشارے پر نازو آگے بڑھ آئی تھی۔ اس نے ہاتھ جوڑ کے نمسکار کیا۔ جوشی نے ناگواری سے جواب دیا اور نازو کو گھورتا ہوا واپس اپنے کمرے میں گھس گیا۔

میں نے کہا "سردار جی! اب جاؤ یار۔ ہم بھی بھوکے بیٹھے ہیں۔ کب آئے گا بھوجن؟ بار بار کہتے ہو۔۔۔ ٹائم لگے گا۔ کیا صبح دو گے کھانے کو۔"

میں نے عمداً اونچی آواز میں بات کی تھی تاکہ اگروال بھی سن لے۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ کسی سے ملنا نہیں چاہتا اور کسی کو اپنی صورت نہیں دکھانا چاہتا۔ میرے خواہ مخواہ کے تعارف کا بھی اس نے برا مانا تھا اور خاصی بداخلاقی کا مظاہرہ کیا تھا مگر میں نے موقعے سے فائدہ اٹھالیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ نازو کو دیکھ لے۔

سردار جی کے جانے کے بعد نازو نے کہا "یہ کیا غلط حرکت کی تھی آپ نے؟ کیوں ملوایا مجھے اگروال سے؟"

"بھئی اتنا بڑا ڈاکو ہے۔ تمہیں تو آٹوگراف لینے چاہئیں اس کے" میں نے کہا "ایسے لوگوں سے روز کہاں ملاقات ہوتی ہے۔"

غالب نے کہا "سکندر! یہ سردار جی نے کیا بکواس کی تھی کہ جنگ ختم ہوگئی۔"

میں نے کہا "اس کے کہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ نہ اس کے چاہنے سے کچھ ہوتا ہے۔ اس نے وہی کہا تھا جو آکاش وانی نے بتایا ہوگا۔ باقی اس کے دل کی بات تھی۔ جھوٹ تھا۔"

"جھوٹ سچ کا پتا چل جائے گا۔ تم خود جا کے ریڈیو لے آؤ اس سے" غالب نے کہا "مجھے گھبراہٹ ہو رہی ہے۔"

"مرزا جی! حالات انتہائی تشویش ناک ہیں' یہ تو مجھے بھی اندازہ ہو رہا ہے" میں نے کہا "مگر ہم کیا کر سکتے ہیں؟ اب تو ہر بری خبر کے لئے تیار رہنا چاہئے۔"

"بری خبر سننے کی ضرورت ہی کیا ہے؟" نازو نے کہا۔

"حقیقت آنکھیں بند رکھنے سے بدلتی نہیں" میں نے کہا۔

"عالمی سیاست کے شاطروں کی نظر میں پاکستان کا وجود کھٹکتا تھا۔ ان کے ساتھ دلاور جیسے غدار مل گئے..... یہ تو ہونا ہی تھا۔"

ایک لڑکا منہ اٹھائے اندر آیا اور ایک انتہائی قدیم ریڈیو میز پر رکھ گیا "یہ ایریل کا تار ہے۔ کھڑکی سے باہر لٹکا دینا" اس نے جاتے جاتے کہا۔

میں نے ریڈیو کو **آن کیا**...... یہ والو والا ریڈیو تھا چناں چہ اس کے گرم ہونے میں آدھا منٹ لگا۔ غالب نے اتنی دیر میں تار کو پھیلا کے کھڑکی سے باہر نکال دیا۔ میں نے بینڈ بدلا اور سوئی کو آہستہ آہستہ گھمانے لگا۔ مجھے یاد نہیں تھا کہ ریڈیو پاکستان کی نشریات شارٹ ویو میں کس میٹر بینڈ پر سنی جاسکیں گی۔ اکتیس اور اکتالیس میٹر بینڈ پر بہت سے اسٹیشن صاف ریسیو ہو رہے تھے۔ ان میں سے ریڈیو پاکستان کی آواز سننا مشکل کام تھا۔ میں نے انیس اور پچیس میٹر بینڈ کو بھی کھنگالا۔ ہر جگہ ماسکو سنائی دیتا تھا یا بی بی سی۔ کچھ عربی کے اسٹیشن تھے مگر اردو کا ایک لفظ سننے کی کوشش رائگاں گئی۔ میری گھڑی میں مغربی پاکستان کے وقت کے مطابق آٹھ بجنے والے تھے اور یہ خبروں کے بلیٹن کا وقت تھا۔ آٹھ بجے میں نے مایوس ہو کے بی بی سی لگا دیا۔

بی بی سی کے اردو بلیٹن کی خبروں سے صورتِ حالات کی سنگینی مزید عیاں ہوگئی۔ یوں لگتا تھا کہ سازشی عناصر کامیاب ہو چکے ہیں۔ اور اب مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بننے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ خبروں کے بعد "جہاں نما" کے تجزیے نے جو تصویر پیش کی وہ انتہائی مایوس کن تھی۔ بھارتی فوج نے تخریب کاروں اور علیحدگی پسندوں کی مدد سے پاکستانی فوج کی رسد کاٹ دی تھی۔ مغربی پاکستان عملاً الگ ہو چکا تھا۔ مشرقی پاکستان میں کوئی حکومت نہیں تھی اور راج تھا تو مجیب الرحمان کا۔ اقوام متحدہ سے کی جانے والی اپیلوں کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا اور ہم سیاسی محاذ کے بعد فوجی محاذ پر بھی شکست کھا چکے تھے۔

بلیٹن ختم ہوا تو میں نے ریڈیو بند کر دیا۔ ہم سخت مایوس' دل گرفتہ اور پریشان بیٹھے رہے۔ بی بی سی کو جھوٹا کہنے سے بھی اب کچھ نہیں ہوتا تھا۔ دل گواہی دیتا تھا کہ تاریخ نے ایک اور عبرت ناک باب رقم کر دیا ہے۔ اب نہ پچھتانے سے کچھ حاصل ہوگا نہ رونے دھونے سے۔ نہ بحث کرنے سے کہ یہ سیاست دانوں کی غلطی تھی' فوجی کارروائی کا شاخسانہ تھا یا ہمارے اعمال کی سزا۔ وقت کا فیصلہ بہرحال ہمارے خلاف گیا تھا۔

غالب نے ایک آہ بھر کے کہا "سکندر! اب کیا ہوگا بنگالیوں کا۔"

"یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا۔"

"وہ سب جو محبِ وطن تھے' دو قومی نظریے پر یقین رکھتے تھے اور پاکستان کی سالمیت کی خاطر ہر قربانی دے رہے تھے۔ وہ کہاں جائیں گے۔ کیا وہ پھر ہجرت کریں گے؟ پھر اپنا سب کچھ لٹا کے دوسرے پاکستان جائیں گے..... اور ہماری فوج......."

میں نے کہا "مرزا غالب! مت سوچو یہ سب کچھ۔ یہ ہمارے سوچنے کی بات ہی نہیں۔ ہم تو صرف ایک دشمن سے لڑ رہے تھے۔۔۔

چودھری دلاور اینڈ کمپنی سے۔ ہم جنگ کی سیاست کے فریق نہیں تھے۔ ہمارے سامنے صرف ایک مقصد تھا کہ دلاور اینڈ کمپنی کے مذموم عزائم کی راہ میں دیوار بن جائیں۔ اسے اسلحے کے بدلے بے گناہ انسانوں کے لہو کی قیمت نہ وصول کرنے دیں۔ پاکستان کے دشمن کی مدد کرنے والے غداروں کے اس ٹولے کو تباہ کر دیں۔ اس مقصد میں ہم ناکام نہیں رہے۔ ان حالات پر ہمارا کوئی کنٹرول نہیں تھا جو ملک ٹوٹنے کا سبب بنے۔ آئندہ بھی ہمارے اختیار میں کچھ نہیں ہوگا۔ سیاسی فیصلے کرنے والے دوسرے لوگ ہیں جن سے ہم باز پرس تک نہیں کر سکتے۔ یہ بہت بڑا صدمہ ہے مگر ہم اسے کروڑوں پاکستانیوں کی طرح برداشت کرنے پر مجبور ہیں۔"

"ہاں۔ سوچنے اور فکر کرنے سے کچھ حاصل نہیں۔ جو ہونا تھا ہوگیا۔ اب بحث سے کیا ملے گا؟ سوائے تلخی کے اور بے مقصد دل آزاری کے" نازو نے کہا۔

"ہمیں تو اب واپسی کا سوچنا چاہئے۔ محسن کا پتا نہ ہوتا تو ہم یہیں سے لوٹ جاتے۔ مگر وہ ڈھاکا میں ہمارا انتظار کر رہا ہے۔ ہم ڈھاکا ضرور جائیں گے۔ ہم اسے ساتھ لئے بغیر واپس نہیں جاسکتے۔" میں نے کہا۔

گل کے افسردہ چہرے پر تھوڑی سی چمک آئی "معلوم نہیں وہ اس وقت کہاں ہوگا۔"

"کہیں سرِ راہ گزر بیٹھا ستم کش انتظار ہوگا" غالب نے کہا۔

"ہم اسے تلاش کرلیں گے گل۔"

"وہ بالکل اکیلا کتنا مایوس ہوگا۔ اس نے تو سب کچھ گنوا دیا۔" نازو نے دکھی لہجے میں کہا۔

"ہم سب کے دکھ اور عذاب سانجھے ہیں" میں نے برہمی سے کہا "کس نے کیا کھویا اور کیا پایا' اس کا حساب الگ نہیں ہے۔"

"اب حساب کر کے احساسِ زیاں کے سوا کیا ملے گا!" غالب نے کہا۔

"میں نے سود و زیاں کے خیال کو کبھی اہمیت نہیں دی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہم نے جو پایا' وہ اس سے کہیں زیادہ ہے جو ہم نے گنوا دیا" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "یہ نفع نقصان کا سودا ہی نہیں تھا۔ بس ایک سودائے سر تھا۔"

میں نے کہا "فائدے کا خیال ہوتا تو دلاور کی پیشکش قبول کرنے میں بہت فائدہ تھا۔ وہ منہ مانگی قیمت دے رہا تھا جو کروڑوں سے کم نہ تھی۔ مگر میں اپنے باپ کا مظلوم لہو بیچ سکتا تھا نہ اپنے وطن کی آبرو۔ ایک حساب تو بے باق ہوا۔ ہم نے دلاور کو بہت نقصان پہنچا کے پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ دوسرا حساب ابھی باقی ہے۔ میرے والد مرحوم وزیر خاں کے قاتل ابھی زندہ ہیں۔ اب میری اور اس کی ذاتی جنگ ہے۔"

سردار جی کھانے کے ساتھ خود بھی آگئے۔ اپنی پریشانی میں انہوں نے ہماری پریشان حالی پر غور ہی نہیں کیا۔

"اویار و' کھاؤ" انہوں نے کھانے کے برتن فرش پر رکھے اور خود بھی آلتی پالتی مار کے بیٹھ گئے۔

فرش پر بہت پرانا قالین تھا۔ ہم نے ایک پرانے اخبار کو دسترخوان کے طور پر استعمال کیا۔

"اس حرامی کو شک ہوگیا ہے" سردار جی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "حالاں کہ میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔"

"کیا شک ہوگیا ہے؟" میں نے کہا۔

"چور کی داڑھی میں تنکا" سردار جی نے اپنی داڑھی کو کھجا کے کہا "مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ تم وہاں کیا لینے گئے تھے؟ ساتھ والے کمرے میں۔ میں نے کہا کہ میری مرضی۔ ہوٹل کا مالک ہوں میں اور وہاں ٹھہرے ہوئے ہیں میرے سسرال کے لوگ۔"

"یہ کیوں کہا آپ نے؟" گل برا مان کے بولی۔

"اور کیا کہتا کڑئی۔ بس جو بات زبان پر آگئی وہ میں نے کہہ دی" سردار جی بولے "اب اگر تم سے کچھ پوچھے وہ تو میری بات کا خیال کرنا۔ ورنہ....."

"وہ پھر گیا تھا تمہارے پاس؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ بوتل مانگ رہا تھا۔ وہ بھی ولایتی" سردار جی نے شکایت کی "میں نے کہا کے بلیک میں ملے گی تو اس نے نوٹ مارے میرے منہ پر۔ سمجھو تھپڑ ہی مار دیا۔ کہنے لگا جتنے چاہئیں رکھ لو مگر مجھے اصلی ولایتی لا کے دو۔ میں نے بھی ہزار رکھ لئے پورے۔ جاتے جاتے کہہ گیا کہ بھنی مرغی نہ ملی آدھے گھنٹے میں تو تمہیں بھون دوں گا۔"

"پھر آپ یہاں کیوں بیٹھے ہیں؟" غالب نے کہا۔

"چھپ کے بیٹھا ہوں یارو۔ آدھا گھنٹا تو ہوگیا۔ اپنا جو رسویا ہے خود بھگت لے گا۔ وہ بھی بڑا سؤر دا پتر ہے۔ کسی کا لحاظ نہیں کرتا۔ اس کے سر پر پتیلی مارے گا۔ اچھا ہے اس کا دماغ درست کردے" سردار جی نے کہا۔

غالب نے کہا "اگر وہ آپ کو تلاش کرتا ہوا یہاں آگیا تو پھر؟"

میں نے کہا "ہاں۔ صرف خانساماں کے قتل سے اس کی تسلی نہ ہوئی۔ اور اس نے سچ مچ آپ کو بھون کے رکھ دیا۔ یہ ڈاکو وہی کرتے ہیں جو کہتے ہیں۔"

"اویارو' کیا تم کچھ نہیں کرو گے۔" سردار جی نے خوف زدہ لہجے میں کہا "باتیں تو بڑی کر رہے تھے۔"

میں نے کہا "اب آپ ایسا کریں' اگروال کے پاس جائیں اور اس سے کہیں کہ مرغی کا بندوبست نہیں ہوا۔"

"کیا.....؟" سردار جی کا رنگ اڑ گیا۔

"ہاں۔ ڈریں نہیں۔ کچھ بھی کہہ دیں کہ مرغی ملی نہیں یا ایک ہی مرغی تھی جو قبل از وقت فوت ہوگئی یا بھاگ گئی۔ یا رسویا اپنی

گرل فرینڈ سے ملنے چلا گیا۔"

"اوئے یار' کیوں میرا خون کراتے ہو۔ ابھی تو میرے بچے بھی نہیں ہوئے۔ میں کنوارا ہوں" سردار جی نے فریاد کی۔

میں نے کہا "آپ پنگا لیں اس سے۔ باقی ہم پر چھوڑ دیں۔ یہ لڑکی فوراً آپ کی مدد کے لئے پہنچ جائے گی۔"

"یہ...... یہ کاکی......؟" سردار جی نے بے یقینی کے ساتھ نازو کو دیکھا "اسے کیوں مرواتے ہو میرے ساتھ؟ خود مرد ہو کے پیچھے بیٹھے رہو گے۔ کچھ شرم کرو......"

غالب نے کہا "ہم یہاں شرم کرتے رہیں گے۔ آپ ہماری فکر مت کریں۔"

میں نے کہا "اگر آپ نے ہماری بات نہیں مانی تو پھر آپ جانیں اور آپ کے واہگورو۔"

سردار جی نے پھر نازو کو دیکھا اور کچھ حیران ہوئے کہ خود کاکی نے احتجاج نہیں کیا۔ پھر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اچھا۔ میں جاتا ہوں۔ جو کرے کرتار۔"

چند سیکنڈ کے بعد انہوں نے ساتھ والے کمرے کا دروازہ بجایا اور میں نے اُن کی آواز سنی۔

"جوشی بابو! مرغی بھاگ گئی" پھر جوشی با۔۔۔۔

"کیا بکتا ہے؟ مرغی بھاگ گئی۔ تیرے باپ کے ساتھ۔"

"اوئے۔ سور دے پتر۔ داڑھی چھوڑ میری" سردار جی نے واویلا کیا۔

نازو لپک کے دروازے تک گئی "ارے جوشی صاحب! یہ کیا کر رہے ہیں آپ۔ شرم نہیں آتی۔"

"تو چپ کر۔ اُلو کی پٹھی" اگروال نے مشتعل ہو کے کہا۔

نازو فوراً ان کے درمیان حائل ہو گئی "یہ کیا ہنگامہ کر رہے ہیں آپ ہوٹل میں؟ یہ آپ کے باپ کے برابر ہیں" نازو نے سردار جی کی داڑھی کو اگروال کی گرفت سے آزاد کرانے کی کوشش کی اور اس دھکم پیل میں اگروال سمیت کمرے کے اندر پہنچ گئی۔ میں اپنے کمرے کے دروازے کی اوٹ سے سب دیکھتا رہا۔ سردار جی اپنی داڑھی سمیت گھسٹتے گئے۔ غالباً اس فلور پر ہمارے سوا کوئی اور نہیں ٹھہرا ہوا تھا ورنہ اتنا شور سن کے تو سب نکل آتے۔

اگروال کی گالی گلوچ ایک دم ختم ہو گئی۔ سردار جی کی فریاد و فغاں بھی یکلخت خاموشی میں ڈھل گئی تو میں نے اس کمرے میں قدم رکھا۔

کمرے میں ایک عورت خوف سے منجمد بیٹھی تھی اور اتنی حیران تھی کہ اُسے اپنے بے لباس جسم کی طرف توجہ دینے کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ خود سردار جی دم بخود کھڑے تھے اور اپنی مظلوم داڑھی کو سہلاتے ہوئے کبھی نازو کو دیکھتے تھے تو کبھی فرش پر ساکت پڑے ہوئے اگروال کو۔ نازو ایسے کھڑی تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

میں نے اپنے پیچھے دروازہ بند کیا تو سردار جی چونکے۔ عورت نے ایک دم چادر کھینچی اور ستر پوشی کی۔

"کون ہو تم؟" وہ چلائی "نکل جاؤ۔"

میں نے کہا "شور مت مچاؤ۔ ورنہ......"

"مجھے دھمکی مت دو۔ تم نہیں جانتے یہ کون ہے۔" عورت ہسٹریا میں مبتلا ہونے لگی تھی۔

"سب جانتے ہیں ہم۔ یہ اگروال ہے۔ تم بتاؤ تمہارے ساتھ اس کا کیا تعلق ہے؟" میں نے کہا۔

عورت نے اچانک تکئے کے نیچے ہاتھ مارا مگر اس کے قریب کھڑی ہوئی نازو نے اسے ریوالور نکالنے کی مہلت بھی نہ دی۔ وہ ایک جست میں اس کے اوپر جا گری۔ عورت چلائی مگر نازو نے اس کی کلائی تھام کے جھٹکا دیا۔ ریوالور اس کے ہاتھ کی گرفت سے نکل کر فرش پر گر گیا۔ وہ کسی شیرنی کی طرح نازو سے لڑنے لگی' جس کی کچھار میں داخل ہو کے شکاری نے شیر کو ہلاک کر دیا ہو۔ وہ مارشل آرٹ تو نہیں جانتی تھی مگر اس میں بلا کی پھرتی تھی۔ نازو کی جگہ کمزور گل ہوتی تو وہ اس کی بوٹیاں نوچ کے کھا جاتی۔ اس کے لمبے ناخن والے ہاتھ اور دانت نازو کو اُدھیڑ دینا چاہتے تھے اور وہ اپنے جسم کی ساری توانائی کے ساتھ نازو کا مقابلہ کر رہی تھی۔

نازو کے لئے یہ صورتِ حال بالکل انوکھی اور پریشان کن تھی کہ اس سے گتھم گتھا ہونے والی ایک خوب صورت جوان عورت تھی جس کے تن پر لباس نام کی کوئی چیز نہ تھی مگر اسے پروا نہ تھی۔ نازو شاید اسے مغلوب کر کے خاموش رکھنا چاہتی تھی مگر یہ ممکن نہ رہا تو اس نے ایک کاری ضرب لگا کے اس عورت کی مزاحمت ختم کی۔ پھر وہ بیڈ سے اُتر آئی۔ میں نے آگے بڑھ کے اس پر چادر ڈال دی۔

نازو کا چہرہ خراشوں سے بھر گیا تھا اور اس کے بازو پر جگہ جگہ دانتوں سے کاٹنے کے نشان تھے جن سے خون رس رہا تھا۔

سردار جی نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے حلق سے مضحکہ خیز آواز نکالی "شاباش شیر دی بچی' شاباش۔ اوئے یار' میں تو سمجھا تھا......"

"لوگ اکثر غلط سمجھتے ہیں" میں نے کہا "آپ کا کوئی قصور نہیں سردار جی۔"

غالب نے نازو کو سنبھال لیا "پاگل ہو تم بھی۔ اسے کیوں اتنا موقع دیا۔ دیکھو کیا حال کر دیا ہے اس نے تمہارا۔"

نازو تکلیف کے باوجود مسکرائی "کچھ نہیں ہوا مجھے۔ میں اسے مارنا نہیں چاہتی تھی۔"

"کیوں؟ ایسی عورت پر ترس کھانا جو اتنے قتل کر چکی ہو کوئی عقل مندی ہے۔ تمہیں چھوڑتی وہ اگر موقع ملتا۔"

میں نے کہا "چلو اسے اپنے کمرے میں لے چلو۔ اس کی کچھ مرہم پٹی کرو۔ پانی سے زخم ہی صاف کر دو۔ صبح انجکشن لگوانے پڑیں گے۔ تم بھی جاؤ غالب۔"

"انجکشن۔ میں نہیں لگواتی کوئی انجکشن" نازو بولی۔

"میں ڈاکٹر کو بلا لیتا ہوں ابھی۔ وہ دوائی دے جائے گا۔ مگر اسے یہ مت بتانا" سردار جی نے خشک حلق کو تھوک نگل کے تر کیا۔

"پھر بھی انجکشن تو لگیں گے" میں نے کہا "اتنا کاٹ لے آدمی کو یا خود آدمی۔ گوشت کھانے والے ہر جانور کے دانتوں میں ایک ہی زہر ہوتا ہے۔"

نازو نے دروازے سے نکلتے نکلتے کہا "میں نے کہہ دیا نا کہ میں نہیں لگواؤں گی انجکشن۔"

"تمہارا تو باپ بھی لگوائے گا پورے بائیس انجکشن" غالب اُسے کھینچ کر لے گیا۔ کمرے میں صرف سردار جی رہ گئے اور دو ساکت پڑے ہوئے جسم۔ سردار جی سخت بدحواسی میں مبتلا تھے۔ انہوں نے کانپتے ہوئے کہا "اب...... اس کا کیا بنے گا؟ یہ تو مر گیا۔"

میں نے جھک کر اگروال کو دیکھا "نہیں۔ یہ زندہ ہے۔"

"زندہ ہے؟" وہ بلبلائے "اُف۔ یہ تو اور بھی بُرا ہوا۔ اب یہ مجھے نہیں چھوڑے گا۔"

"پھر کیا خیال ہے' اسے مار دوں؟" میں نے کہا۔

"نہیں نہیں۔ لاش..... لاش سے بہت ڈر لگتا ہے مجھے۔ پکڑے گئے تو پھانسی ہو جائے گی۔"

"اسے چھوڑا تو کسی دن یہ تمہیں پھانسی لٹکانے آ جائے گا" میں نے کہا۔

"ارے واہگورو۔ آخر کیا کروں میں؟ چھوڑوں تو مرتا ہوں' نہ چھوڑوں تو مرتا ہوں" سردار جی کی حالت غیر ہو رہی تھی۔

میں نے کہا "حوصلہ رکھیں سردار جی۔ آپ کا نام دلاور سنگھ ہے آخر۔ سنگھ تو شیر کو کہتے ہیں نا۔ دلاور شیر کیا اتنے ڈرپوک ہوتے ہیں۔ اب آپ کی جان صرف ایک صورت میں بچ سکتی ہے۔"

"وہ کیا....."

"آپ سمجھ لیں کہ یہاں نہ اگروال کبھی آیا تھا' نہ آئے گا۔ آپ کے ہوٹل میں جو مسٹر اور مسز جوشی ٹھہرے تھے انہیں کوئی نہیں جانتا۔ کوئی انہیں پوچھتا ہوا نہیں آئے گا۔ آپ صبح ان کو چیک آؤٹ کر دیں۔ وہ رات بھر ٹھہرے اور صبح چلے گئے۔ آپ کو نہیں معلوم کون تھے' کہاں سے آئے تھے اور کہاں گئے۔ رجسٹر میں جو اندراج ہے وہ غلط ہے تو اس کے ذمے دار آپ نہیں۔ دستخط اس نے آپ کے سامنے کئے تھے اور بس۔ تصدیق' تفتیش نہ آپ کا کام تھا اور نہ آپ کر سکتے تھے۔ وہ عورت اس کی بیوی تھی یا کوئی اور' آپ کو کیا معلوم۔ لیکن یہ سب پوچھنے کے لئے کوئی نہیں آئے گا۔"

"اور آ گیا تو؟"

"کون آئے گا؟ کیا کسی کو معلوم ہے کہ اگروال یہاں تھا؟"

"مجھے...... مجھے کیا معلوم۔"

"جب اس سے ملنے کوئی نہیں آیا' نہ اس نے کسی سے بات کی اور نہ کوئی پیغام آیا کسی کا۔ تو اس سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔"

"کچھ نہیں۔" سردار جی نے کہا "اس سے یہ بھی تو پتا نہیں چلتا کہ اگروال یہاں آنے سے پہلے کس کس سے ملا تھا۔ کیا پتا اس نے اپنے کسی آدمی کو اطلاع کر دی ہو کہ آج رات وہ کہاں ہو گا۔"

میں نے کہا "مشکل ہے۔ لیکن ایسا ہوا تو صبح تک کوئی اس سے ضرور رابطہ قائم کرے گا۔ خود آئے گا یا فون کرے گا۔"

"میں کیا کہوں؟ اگر کوئی آئے۔"

"وہی جو پولیس سے کہا ہے۔ یہاں اگروال کا کیا کام۔ گواہی کی ضرورت پڑے تو ہم حاضر ہیں" میں نے کہا "ہم بتا دیں گے کہ ساتھ والے کمرے میں کون تھا۔"

"تم بتاؤ گے؟" سردار جی اُچھلے۔

"میرا مطلب تھا کہ تمہارے بیان کی تائید کرتے ہوئے ہم بالکل غلط بیان دیں گے" میں نے کہا "ہم بتا دیں گے کہ مسٹر اور مسز جوشی دونوں پہلوان تھے۔ عمر پچاس کے لگ بھگ۔ دونوں کا مجموعی وزن ساڑھے چار اور پانچ من کے درمیان۔ مسٹر جوشی گنجے تھے اور ان کی بیگم دنیا کو ایک آنکھ سے دیکھتی تھیں۔ دونوں ڈاکٹر تھے۔ بھوپال سے آئے تھے۔ ہماری ملاقات ہوئی تھی۔"

"واہگورو خوش رکھیں۔ تم تو بہت سیانے بھی ہو۔ اب کچھ فرماؤ کہ انہیں میں کیسے غائب کروں" سردار جی نے طنز سے کہا۔

میں نے کہا "ان کو ہم غائب کر دیں گے۔ اور کل خود بھی غائب ہو جائیں گے۔"

سردار جی نے نفی میں سر ہلایا "کہاں لے جاؤ گے آخر تم انہیں۔ جہاں لے جا کے چھوڑو گے وہاں سے یہ سیدھے میری گردن دبانے آ جائیں گے کہ وہ تمہارے سسرالی رشتے دار تھے۔"

"یہ واپس نہیں آئیں گے۔"

"او یار کیسے نہیں آئیں گے۔ تم انہیں تھانے میں جمع کرا دو گے تب بھی کچھ نہیں ہو گا۔ یہ پھر جیل سے نکل آئے گا اور خود نہ آیا تو اپنا کوئی بندہ بھیج دے گا" سردار جی نے مایوسی سے کہا۔ اور پھر سرگوشی کے انداز میں بولے "اس کا تو بس ایک ہی طریقہ ہے۔"

میں نے انجان بن کے پوچھا "وہ کیا؟"

"دونوں کو خلاص کر دو۔"

"کیا مطلب ہے آخر آپ کا؟ انہیں قتل کر کے ہم بھی مجرم بن جائیں" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

"قتل؟ یہ قتل تو نہیں ہو گا۔ ان کی سزا یہی ہے۔ یہ حرامی جیل سے فرار نہ ہوتا تو آج صبح اس کو پھانسی لٹکایا جانا تھا۔ جتنے قتل اس

نے کئے ہیں ان کی یہ سزا بھی کم ہے۔ اور یہ عورت۔ اس کو بھی تو سزائے موت ہونی چاہئے کم سے کم۔ یہ کوئی ناانصافی نہیں ہوگی۔ اگر انہیں بخش دیا گیا تو یہ ظلم ہوگا۔ پتا نہیں اور کتنے مارے جائیں گے ان کے ہاتھوں۔ کتنے بچے اناتھ ہوں گے' عورتیں بیوہ ہوں گی۔"

میں نے حیرانی سے سردار جی کو دیکھا۔ وہ اس وقت ایک بالکل مختلف آدمی لگ رہے تھے۔ "اگر آپ اسے تقاضائے انصاف سمجھتے ہیں تو ان کی سزا پر عمل درآمد آپ خود کریں۔ یہ آپ کے مجرم ہیں اور آپ کی عدالت نے ہی انہیں سزائے موت کا مستحق سمجھا ہے۔"

سردار جی نے کچھ دیر سوچا "اچھا۔ ٹھیک ہے۔ اگر میں نے ان کو نہ مارا تو یہ مجھے ماردیں گے۔ مجھے اپنے دفاع کا حق بھی حاصل ہے۔"

"میں سمجھتا ہوں یہ حق مانگنے سے نہیں ملتا۔ جینے کا حق کوئی عدالت نہیں دلوا سکتی" میں نے کہا "اگر کل کو اگروال یا اس کے کسی ساتھی نے آپ کی زندگی ختم کرنے کا فیصلہ کرلیا تو قانون آپ کی کوئی مدد نہیں کرسکے گا۔ آپ جتنی چاہیں درخواست دیں۔ ہاں آپ خود بہت کچھ کرسکتے ہیں۔ پاگل کتے' سانپ یا بچھو کو مارنا جرم بھی نہیں اور پاپ بھی نہیں۔ معاشرے کا بھی حق ہے آپ پر کہ کوئی خرابی سامنے ہو تو اسے دور کریں۔"

سردار جی میرے دلائل کے بغیر بھی فیصلے پر پہنچ چکے تھے۔ چناں چہ انہوں نے سر ہلا کے کہا "تم جاؤ۔"

"میں چلا جاؤں؟"

"ہاں۔ کوئی گواہ تو نہ ہو چشم دید" سردار جی نے سپاٹ لہجے میں اور خلا میں دیکھتے ہوئے کہا۔

میں دروازہ بند کرکے اپنے کمرے میں آگیا۔ غالب اور گل نے نازو کے زخم دھو کر پاؤڈر لگا دیا تھا۔

"کیا ہوا؟" غالب نے میری صورت کو غور سے دیکھا۔

"کچھ نہیں" میں نے کہا "اگروال مرگیا۔ اور وہ بھی۔"

نازو نے بے یقینی سے کہا "یہ کیسے ہوسکتا ہے؟"

میں نے کہا "دیکھ لو جاکے۔ مگر اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔ انہوں نے خود اپنے لئے موت کا انتخاب کیا ہے۔"

"کیا پہیلیوں میں بات کررہے ہو" نازو بولی۔

"یہ ٹھیک ہے۔ وہ ہوش میں آگئے تھے۔ سردار جی نے کہا کہ انہیں پولیس کے حوالے کیا جائے گا۔ میں ریوالور لئے کھڑا تھا۔ ظاہر ہے اگروال کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ اگر وہ جیل سے فرار نہ ہوتا تو صبح اسے پھانسی دے دی جاتی۔ اس نے کہا کہ جیل جاکے پھانسی لگنے سے وہ اسی وقت مرنے کو بہتر سمجھے گا۔ زندگی اگر ختم ہوگئی ہے تو موت کو ٹالا نہیں جاسکتا۔ مزید الزامات کے ساتھ انتظار کا عذاب جھیلنے سے کیا فائدہ۔ اس نے مجھ سے اور سردار جی سے اجازت لی۔ اپنے سامان میں سے کوئی گولی نکالی۔ ایک خود کھائی اور ایک اس عورت کو دے دی۔ یہ لوگ ایسی چیزیں رکھتے ہیں۔"

غالب نے کہا "میں دیکھتا ہوں جاکے۔"

گل اور نازو نے میری بات کا یقین کرلیا تھا۔ میں نے کہا "بہتر ہے کہ تم دونوں سو جاؤ۔ سکون آور گولیاں ہیں۔ اور دروازہ بند کرلو۔"

"اور تم؟"

"ہم ذرا لاشوں کو ٹھکانے لگادیں" میں نے کہا۔

"تم کیوں پڑتے ہو اس چکر میں سکندر؟" نازو نے کہا۔

گل نے کہا "سردار جی کو اپنے معاملات سے نمٹنے دو۔"

میں نے کہا "یہ ہمارا معاملہ بھی بن گیا ہے۔ ہم سردار جی کی مدد کریں گے۔ پھر سردار جی ہماری مدد کریں گے۔"

جب میں واپس گیا تو سردار جی سکتے کے عالم میں کھڑے تھے۔ ان کے ماتھے پر سردی میں بھی پسینہ چمک رہا تھا اور وہ بار بار اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہے تھے۔ اگروال اب سیدھا لیٹا ہوا تھا۔ کمر کے بل اور اس کے ہاتھ پھیلے ہوئے تھے۔

"او یار دو..... یہ میرے بس کی بات نہیں" سردار جی نے شرمسار لہجے میں کہا۔

"تم نے..... کچھ نہیں کیا؟"

سردار جی نے نفی میں سر ہلایا "میں..... میں نام کا دلاور ہوں۔ اندر سے بالکل ..... ہوں" انہوں نے اپنی ذات کے لئے ایک ناقابلِ اشاعت لفظ استعمال کیا "میں کچھ نہیں کرسکتا۔"

میں نے کہا "اچھا۔ پھر ہمیں ہی کچھ کرنا پڑے گا۔ یہ بتاؤ گاڑی ہے تمہارے پاس کوئی؟"

"ایک..... چیز ہے۔ گاڑی سمجھو یا ٹرک۔"

"چلتی ہے نا؟ چلاتی تو نہیں؟" میں نے کہا۔

"میں روز اس پر سامان لاتا ہوں۔ بس اسٹارٹ دھکے سے ہوتی ہے۔"

غالب نے کہا "اور رسی کیسی ہے۔ اگر آس پاس کوئی کھمبا درخت یا بندہ نہ ہو؟"

"اب ایسی بات بھی نہیں۔"

میں نے کہا "اس وقت نیچے کی پوزیشن کیا ہے؟ کتنے مہمان ہیں ہوٹل میں اور کاؤنٹر پر کون ہے؟"

"کوئی نہیں۔ دن میں آجاتی ہے ایک کاکی۔ شام چھ بجے چلی جاتی ہے۔" سردار جی نے کہا "نائٹ کالج میں پڑھتی ہے۔ ماں ہے ایک چھوٹا بھائی ہے۔ ان کا خرچہ پورا کردیتا ہوں میں......"

"یہ سب کس نے پوچھا تھا؟" میں نے کہا "کون ہوگا اس وقت سامنے؟ اگر ہم ادھر سے جائیں۔"

"اس وقت .... چوکیدار آگیا ہوگا۔ کیا پتا کوئی مہمان نکل آئے .... رسویا سرغی لے کر آیا تھا۔ وہ میں نے لے لی اور اس کی چھٹی کردی۔ مگر شاید وہ صفائی کررہا ہوگا۔"

میں نے سوچ کے کہا "اچھا۔ پیچھے سے نکلنے کا کوئی راستہ ہے؟"

سردار جی نے نفی میں سر ہلایا "ادھر سے راستہ ہوتا تو مہمان نہ نکل جاتے' بل ادا کئے بغیر۔"

"پھر تو ابھی کچھ نہیں ہوسکتا۔ ان کے ہوش میں آنے کا انتظار کرو" میں نے کہا "پھر انہیں باہر لے جائیں گے ہم۔ تم کو تھوڑی سی اداکاری کرنی ہوگی۔ ایکٹنگ۔"

"ایکٹنگ۔ میں تو فلمیں بھی نہیں دیکھتا۔"

میں نے کہا "کوئی مشکل رول نہیں ہوگا۔ چلو' پہلے مجھے اپنی گاڑی دکھاؤ۔ اس کی چابی میرے حوالے کرو۔"

وہ مجھے نیچے لے گیا۔ دروازے پر موجود چوکیدار کو دیکھ کر مجھے ہنسی آئی۔ اس کے سر اور داڑھی کے سب بال سفید تھے اور وہ آدمی کو شناخت کرنے کے لئے آنکھوں پر ہاتھ رکھ کے اور گول شیشوں والے چشمے کو جما کے دیکھتا تھا۔ ایک لاٹھی کے سوا اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا اور یہ لاٹھی بھی وہ نہیں جس سے بھینس منسوب ہے۔ یہ بڑھاپے کا سہارا تھی۔

میں نے کہا "یہ بابا خاک چوکیداری کرتا ہوگا۔"

"فائدہ تو کوئی نہیں" سردار جی نے تسلیم کیا۔

"پھر اسے کیوں رکھا ہوا ہے؟"

"کہاں جائے گا اس بڑھاپے میں۔ رات کو دروازہ بند کردیتا ہے' صبح کھول دیتا ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں کرنا پڑتا اسے۔ بدلے میں دو ٹائم روٹی کھاتا ہے اور سال میں دو جوڑے لیتا ہے۔ میرے سوا دنیا میں اس کا کوئی نہیں ہے۔ اسے سو روپے بھی دیتا ہوں۔"

"تمہارا کوئی رشتہ ہے اس سے؟" میں نے کہا۔

"بڑا پرانا رشتہ ہے۔ باپ ہے میرا" سردار جی نے کہا۔

میں اچھل پڑا "والد صاحب تھے تمہارے؟"

"ہاں جی۔ اور یہ جو رسویا ہے نا۔ یہ اپنا چھوٹا بھائی ہے۔ اس کی بیوی بڑی ظالم تھی۔ گھر کا سارا کام کراتی تھی اس سے۔ مگر دیکھو وہی کام آج اس کے کام آرہا ہے۔ چار سو تنخواہ الگ ہے۔"

میں نے کہا "کمال ہے سردار جی۔ جو پہلے بیوی نے کیا اب وہی تم کررہے ہو۔ باپ کو دروازے پر بٹھا رکھا ہے۔ بھائی کو کچن میں لگا دیا ہے۔"

"اچھا ہے نا۔ اس طرح انہیں احساس نہیں ہوتا کہ مفت کی روٹیاں توڑ رہے ہیں اور میرے دروازے پر پڑے ہیں۔ کام کرتے ہیں۔ اپنا حق سمجھ کے سب لیتے ہیں۔ کسی اور کو کیوں دوں جو اپنوں کو دے سکتا ہوں۔"

میں نے اس کے فلسفے سے اتفاق نہیں کیا۔ اس کے نزدیک رشتوں کی جذباتی اہمیت کوئی نہیں تھی۔ اس نے باپ اور بھائی کو کاروباری تعلق کی زنجیر میں باندھ دیا تھا اور ایک ضرورت کو رشتوں کی بنیاد بنالیا تھا۔ تاہم یہ اس کا اپنا فعل تھا اور میں خود کو ان معاملات میں ملوث کرنا نہیں چاہتا تھا۔

باہر نکل کے ہم نے عمارت کے گرد پورا چکر لگایا۔ گاڑی عقبی حصے میں کھڑی ہوئی تھی۔ یہ واقعی عجیب چیز تھی۔ کسی کار کی باڈی کو ٹرک کا روپ دے دیا گیا تھا۔ اب نہ یہ کار تھی اور نہ اسے ٹرک سمجھا جاسکتا تھا۔ یہ تبدیلی بھی بڑے بھونڈے طریقے پر کی گئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ خود سردار جی نے ہی یہ کام بھی کیا ہوگا۔ بعد میں میرے پوچھنے پر انہوں نے تسلیم کیا کہ کار اور ٹرک کی مخلوط نسل کے والد وہی ہیں۔

"یہ دھکا لگانے والا مسئلہ ٹیڑھا ہے" میں نے کہا۔

"دھکا صبح لگانا پڑتا ہے۔ رات بھر میں بیٹری ٹھنڈی ہوجاتی ہے" سردار جی نے کہا "اس وقت تو ہاتھ لگاتے ہی چل پڑے گی۔"

میں نے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا "اچھا۔ لاؤ چابی۔"

"دیکھو یار۔ گاڑی لے کر بھاگ تو نہیں جاؤ گے؟" انہوں نے بادلِ ناخواستہ چابی مجھے دی۔

مجھے سخت غصہ آیا "اگر ایسی بات ہے تو پھر جو کرنا ہے خود کرو۔ ہم جارہے ہیں اسی وقت۔ رکھو اپنی چابی۔"

"او یار' خفا کیوں ہوتے ہو۔"

میں نے کہا "حد کرتے ہو تم بھی۔ ہماری بیویاں یہاں ہیں۔ ہم انہیں چھوڑ دیں گے اور اس بے ہودہ چیز کے ساتھ بھاگ جائیں گے۔" حقارت سے میں نے گاڑی کے ایک لات رسید کی۔ گاڑی کے اندر کوئی چیز ٹوٹ کر گری۔

سردار جی نے مجھے منالیا "او یار' غصہ مت کر۔ میں واقعی سکھ ہوں۔ بارہ بجے ہوئے ہیں میرے۔"

"اس گاڑی کو دروازے کے سامنے لے کر چلو" میں نے کہا۔

"اچھا میں خود ڈرائی کرتا ہوں۔"

گاڑی چلنے میں اتنی بری نہیں تھی جتنی دیکھنے میں نظر آتی تھی۔ میں نے اسے ہوٹل کے گیٹ سے چند قدم کے فاصلے پر روک دیا۔

"اب ہمیں پرانے میلے کپڑے دو۔ اپنے یا والد صاحب کے یا بھائی صاحب کے" میں نے کہا "حلیہ بدلنے کے لئے۔ ان کپڑوں میں ہم شریف آدمی نظر آتے ہیں۔"

"تو کیا ہم شریف آدمی نہیں لگتے؟"

میں نے کہا "ہمیں ڈھاٹے باندھنے کے لئے چادریں بھی دو۔ لال رنگ کی روشنائی ہوگی۔ نہیں ہے تو منگوالو اور اوپر آجاؤ۔"

سردار جی نے سر کھجایا "آخر کیا کرنا چاہتے ہو تم؟"

میں نے کہا "سب تمہارے سامنے ہی ہوگا۔ دیکھتے جاؤ۔"

اوپر جاکے میں نے غالب کو اپنی اسکیم سمجھائی تو وہ پریشان نظر آنے لگا "یار' یہ خطرناک کام ہے۔"

میں نے کہا "ہم اس وقت بھی خطرے میں ہیں اور اگروال ہمیں نکال سکتا ہے۔ ہم سردار جی کی مدد کے بہانے اپنی مدد کر رہے ہیں۔ ہم اگروال سے سودا کریں گے۔"

اگروال ہوش میں آنے لگا تھا۔ اس کی محبوبہ پر زیادہ کاری وار ہوا تھا۔ وہ بدستور آنکھیں بند کئے پڑی تھی۔ سردار جی پھر نمودار ہوئے تو ان کے پاس دو انتہائی میلے جوڑے تھے جن میں سے بدبو آرہی تھی۔ میں نے اور غالب نے انھیں اپنے کپڑوں کے اوپر ہی پہن لیا۔ ڈھاٹے باندھ کر ہم بھی ڈاکو نظر آنے لگے۔

ہماری ہدایات کے مطابق سردار جی نے اگروال کے کمرے میں ساکت لیٹنا منظور کر لیا۔ میں نے سرخ روشنائی ان کے کپڑوں پر ایسے ڈال دی کہ دیکھنے والے کو خون نظر آئے۔ یہ خون دل کے اوپر تھا اور قالین پر پھیلا ہوا تھا۔ ہاتھ میں ریوالور پکڑ کے میں اور غالب انتظار کرنے لگے کہ اگروال ہوش میں آئے۔

ہوش میں آتے ہی اس نے ہماری صورت دیکھی تو اس کی حالت غیر ہوگئی۔ اس نے سر کو جھٹکا اور آنکھیں ملیں۔

"کون..... کون ہو تم....."

میں نے ریوالور اس کی کنپٹی سے لگا دیا اور آواز کو بھاری بنا کے کہا "تیری موت اگروال۔"

غالب نے بھی ڈرامائی لہجے میں کہا "آج مرنا تھا تجھے اگروال۔ تو موت سے بھاگ آیا تھا۔"

"صبح ہوگئی ہے۔ تیار ہو جا۔ پھانسی نہ ہوئی تو کیا ہوا..... ہم آگئے ہیں۔"

"تم..... تمھیں کیسے معلوم ہوا..... کس نے بتایا کہ میں یہاں ملوں گا۔" اگروال نے خود کو سنبھال لیا۔

میں نے ولن ٹائپ قہقہہ لگایا "میں تیری لاش کو جیل سے باہر آتا دیکھنا چاہتا تھا۔ مگر یہ تجھے نکال لائی۔ ہم سائے کی طرح تیرے پیچھے تھے اگروال۔"

"تم..... تم راج ہو نا؟" اگروال نے مجھے غور سے دیکھا "تم سمجھتے ہو میں نے دھوکا کیا تھا سب کے ساتھ۔"

میں نے اس کے لات ماری "اب صفائی پیش کرنے کا وقت نہیں رہا....."

وہ گڑگڑانے لگا "دیکھو۔ میں تمھارا حصہ دے دوں گا۔ لیکن یہ کون ہے؟"

"یہ میرا خاص آدمی ہے۔ جیسے یہ تیرا خاص آدمی بن گیا تھا۔" میں نے سردار جی کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ؟ تم غلط سمجھے۔ یہ تو ہوٹل کا مالک تھا۔ اسے کیوں مار دیا تم نے؟" اگروال بولا۔

"چل اٹھ..... ہمارے ساتھ چل" میں نے اسے گالی دے کر کہا "زیادہ ٹائم نہیں ہے ہمارے پاس۔"

"میں چلتا ہوں تمھارے ساتھ۔ مگر آرام سے بات کرو مجھ سے۔ میرے ساتھ سودا کرلوگے تو فائدے میں رہوگے۔ مجھے مار کے تمھیں کچھ نہیں ملے گا۔ اپنے اس خاص آدمی سے کہو ریوالور کا رخ دوسری طرف کرلے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ گولی چل جائے۔"

اگروال نے کہا جو اب پہلے سے زیادہ پُراعتماد نظر آرہا تھا۔

یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ اگروال نے مجھے راج کیوں سمجھا۔ یہ چور کی داڑھی میں تنکے والا کیس تھا۔ یقیناً اس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ کہیں دھوکا کیا تھا اور مالِ غنیمت میں سے انھیں حصہ نہیں دیا تھا۔ چوری ڈاکے میں شریک افراد عام طور پر ایک دوسرے کے ساتھ بے ایمانی نہیں کرتے مگر ایسا لگتا تھا کہ کسی واردات میں لمبا مال ہاتھ لگا تو اگروال کی نیت میں فتور آگیا اور وہ سب کا حصہ پی گیا۔ اسے اپنے کسی ساتھی راج کی طرف سے ہی زیادہ اندیشہ ہوگا کہ وہ صبر کرکے خاموش نہیں بیٹھے گا۔

میں نے کہا "دھوکا مت کرنا ہمارے ساتھ اگروال۔"

اگروال نے کہا "دھوکا میں نے پہلے بھی نہیں کیا تھا۔ بس مجھے موقع نہیں ملا تھا۔ میں پھنس گیا تھا۔ مگر مال محفوظ ہے۔"

"کہاں؟"

"نیپال میں" اگروال نے کہا "میرے ساتھ نیپال چلو۔"

"نیپال! تیرا دماغ خراب ہے کیا۔ تجھے معلوم بھی ہے پچھے نیپال کہاں ہے" میں نے کہا "کیسے جائیں گے ہم نیپال؟"

"وہ سب انتظام کرلیا ہے میں نے۔ میں نے کیا' جو کچھ بھی کیا سب روبی نے کیا ہے۔ پھانسی گھاٹ سے باہر آنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ روبی نے کہیں مایا جال پھیلایا' کہیں خود جال بنی۔ نیچے سے اوپر تک سب کے سامنے اس نے دونوں چیزیں رکھ دیں۔ دولت بھی اور اپنی سُندرتا بھی۔ بڑی ہوشیاری سے اس نے سب بند ہو جانے والے دروازوں کے بیچ سے میرے لئے راستہ بنایا۔ صبح سویرے ایک گاڑی آئے گی ہمیں لینے۔"

"کون ہوگا اس گاڑی میں؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ روبی جانتی ہے۔ گاڑی تو ہمیں یہاں سے لے جائے گی۔ شہر سے باہر ایک ہیلی کاپٹر میں بیٹھ کے ہم نکل جائیں گے۔ نیپال تک کا پرمٹ مل چکی ہے۔"

"ہیلی کاپٹر کس کا ہے؟" میں نے کہا۔

"پرائیویٹ کمپنی کا ہے۔ کرائے پر حاصل کیا ہے۔ ایک غیر ملکی فلم ساز ہے جو انڈیا اور نیپال میں لوکیشن دیکھنے آیا ہوا ہے۔ روبی نے اسی کے نام سے ہیلی کاپٹر بک کرایا ہے۔"

"خود فلم ساز کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

"مدراس میں۔ وہاں سے وہ کلکتے جائے گا۔ روبی نے اس کی سیکریٹری بن کے یہ کام کیا۔ بڑی ہوشیار لڑکی ہے۔"

میں نے کہا "نیپال جا کے کیا ہوگا؟"

اگروال نے کہا "تمھیں تمھارا حصہ مل جائے گا۔ میں غائب ہو جاؤں گا۔ میں یہاں رہنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ کم سے کم ... سال میں بہت دور رہوں گا۔"

میں نے کہا "کیا ہم کلکتے نہیں جا سکتے؟"

"جا سکتے ہیں۔ مگر....."

"اگر تم کچھ نہیں۔ ہم کلکتے جائیں گے۔ مجھے ڈر ہے کہ تم ... پہنچ کر پھر حرامی پن کروگے۔"

اگروال نے بے بسی سے کہا "ایسی کوئی بات نہیں۔"

میں نے کہا "ہم اعتبار نہیں کرسکتے تم پر۔ تم ہمارے ساتھ رہوگے۔ ہم نہیں جائیں گے تمھارے ساتھ۔"

"ہیلی کاپٹر کا روٹ ایسے اپنی مرضی سے نہیں بدلا جا سکتا۔ ... کے لئے منظوری لینی پڑتی ہے۔ اطلاع دینی پڑتی ہے سول ایوی ایشن والوں کو۔"

"روبی بہت ہوشیار لڑکی ہے۔ تم نے ہی کہا تھا۔ کیا یہ کام اس کے لئے مشکل ہوگا؟" میں نے کہا۔

اگروال خاموش ہوگیا۔ یہ انتہائی غیر متوقع کامیابی ہمارے سارے مسائل کے حل کا شارٹ کٹ ثابت ہوسکتی تھی۔ اگر ہم ہیلی کاپٹر میں کلکتہ پہنچ جاتے تو پھر ڈھاکا پہنچنا بہت آسان تھا۔

"روبی کو اٹھاؤ۔ یہ کب سے سو رہی ہے؟" میں نے کہا۔

"روبی..... بے ہوش ہے" اگروال نے کہا۔

"کیوں بے ہوش ہے؟" میں نے کہا۔

"مارپیٹ ہوگئی تھی۔ ساتھ والے کمرے میں بڑے خطرناک ... ہیں" اگروال بولا "دہشت گرد ہیں سارے۔ دو مرد اور دو عورتیں۔ میں نے تو انھیں دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔"

"کیسے پہچان لیا تھا؟" میں نے اپنی آواز سے خوف ظاہر نہیں ہونے دیا۔

"اخبار میں تصویریں دیکھی تھیں میں نے" اگروال بولا "ان کی گرفتاری پر انعام ہے۔"

"مگر تم لے نہیں سکتے" میں نے کہا "تمھاری گرفتاری پر بھی انعام تھا۔"

"ہاں۔ مگر جس نے لیا تھا وہ اب کہاں ہے؟" اگروال ... حقارت سے بولا۔

"اس بار انعام کی رقم دگنی ہو جائے گی" میں نے کہا۔

"اگروال بار بار دوستی میں دھوکا نہیں کھا سکتا۔ ایک بار میں نے اعتماد کرلیا تھا' اب یہ غلطی نہیں کروں گا" وہ بولا۔

مجھے احساس تھا کہ سردار جی سیدھے ساکت لیٹے لیٹے تھک گئے ہوں گے۔ ان کے ذرا سا ہلنے سے ہمارا بنا بنایا کھیل خراب ہو جاتا۔ یہ ضروری تھا کہ ہم اس کمرے سے چلے جائیں یا سردار جی ... "لاش" ... سے ہٹوا دیں۔ صبح ہونے میں ابھی دیر تھی۔ میں ... اور نازو کو اپنے نظرثانی شدہ پروگرام سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ ... یقین تھا کہ میری ہدایات پر عمل کرتے ہوئے سکون آور گولی کھا کے سونا ان کے لئے ناممکن ثابت ہوا ہوگا۔ وہ جاگ رہی ہوں گی۔ شاید دیوار سے کان لگائے بیٹھی ہوں گی اور دوسرے کمرے میں ہونے والی گفتگو سننے کی کوشش کررہی ہوں گی۔

"میں اس لاش کو لے جاتا ہوں۔ تم روبی کو ہوش میں لانے کی کوشش کرو" میں نے کہا "خیال رکھنا کہ میرا یہ ساتھی میرے اشارے پر چلنے والی مشین ہے۔ یہ خود کچھ نہیں سوچتا۔ جو میں کہتا ہوں وہی کرتا ہے۔ تم نے کوئی غلطی کی تو یہ تمھیں نشانہ بنانے میں غلطی نہیں کرے گا۔"

غالب نے ریوالور کو کاؤبوائے اسٹائل میں اچھال کر پھر کیچ کرلیا۔ اور مہارت کے اس کامیاب مظاہرے پر میری طرف... دادطلب نظروں سے دیکھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ مظاہرہ ناکام نہیں ہوا۔ اور اپنا ریوالور جیب میں ڈال لیا۔

"کہاں لے جاؤ گے تم اسے؟" اگروال نے کہا۔

میں نے بھاری بھرکم سردار جی کو اٹھاتے ہوئے کہا "اس وقت کون ہے دیکھنے والا۔ کہیں بھی چھپا دوں گا۔"

میرے باہر آنے کے بعد جب غالب نے دروازہ بند کیا تو میں نے سردار جی کو پیروں پر کھڑا کر دیا اور انھیں خاموشی سے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ معمولی سی دستک پر گل نے دروازہ کھول دیا۔

"اُف۔ اتنی بھاری لاش میں نے پہلے کبھی نہیں اٹھائی" میں نے کہا "اپنا وزن کم کرو سردار جی۔"

"اویار' تم نے بڑی مشکل میں پھنسا دیا تھا مجھے" سردار جی نے کانوں کو ہاتھ لگایا "ایک چیونٹی چڑھ گئی تھی گردن پر۔ نامراد اوپر سے نیچے تک پھرتی رہی۔ شکر ہے واہگورو کا' ناک میں نہیں گئی۔"

میں نے کہا "ساری باتیں تم نے سن لی ہوں گی؟"

"ہاں۔ مگر یہ کیا بات کی تھی اس نے تمھارے بارے میں؟" سردار جی نے ہم سب کو بغور دیکھتے ہوئے کہا "کیا واقعی....."

"اس نے ٹھیک ہی کہا تھا" میں نے کہا "لیکن تم کو ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم نے تمھاری مدد کا وعدہ کیا تھا۔ صبح ہم بھی چلے جائیں گے ان کے ساتھ۔ اپنا بل ابھی وصول کراو۔"

سردار جی نے ہاتھ جوڑے "اوئے یارو' مجھے معاف کرو۔ واہگورو تمھیں خوش رکھے۔ تم اگروال کے بھی باپ ہو۔ بس میری جان بخشی کردی تم نے بھی اور اگروال نے بھی۔ یہی کافی ہے۔"

"امید ہے بعد میں تم کسی کو کچھ نہیں بتاؤ گے" میں نے کہا۔ "یہ غلطی کی تو پولیس ضرور لے جائے گی تمھیں۔ کبھی نہ کبھی ہم بھی پھر آجائیں گے۔"

"میرے باپ کی بھی توبہ۔ میں پاگل نہیں ہوں۔" وہ بولا اور ڈرتے ڈرتے دروازے کی طرف بڑھا "میں جاؤں؟"

میرا اشارہ پاتے ہی وہ بھاگ گیا۔ جب اس نے اگروال کو پکڑوانے کے لئے پولیس کو فون کیا ہوگا تو اسے قطعی اندازہ نہیں ہوگا کہ وہ کتنی بن بلائی آفات میں گرفتار ہو سکتا ہے۔ اپنی حماقت

سے اس نے خود کو ہر طرف سے محصور کر لیا۔ اس نے پولیس کو بلایا اور بڑی مشکل سے واپس بھیجا۔ پھر وہ ... گیا اور اگروال سے نجات کے چکر نے اسے مصائب کی دلدل میں اتار دیا۔ اگر وہ کچھ نہ کرتا اور خاموش بیٹھا رہتا تو ہم سب صبح ہوتے ہی اپنی اپنی راہ لیتے۔

اس کے جانے کے بعد میں نے گل اور نازو کو اپنے اور اگروال کے درمیان ہونے والی گفتگو سنا دی۔

"خدا نے چاہا تو شام تک ہم گنگٹ پہنچ جائیں گے۔ اور اگلے دن ڈھاکا....."

"لیکن اگروال کو معلوم ہو جائے گا کہ تم اس کے ساتھی نہیں ہو" نازو نے تشویش سے کہا۔

"اس سے کیا فرق پڑے گا؟" میں نے کہا۔

گل نے کہا "وہ بہت خطرناک آدمی ہے۔"

"ہم کیا کم خطرناک ہیں" میں نے کہا "اس نے خود ہی سب کچھ اگل دیا۔ اب وہ بچ کے نہیں جا سکتا۔ ہم اس کے ساتھ ہیلی کاپٹر میں جائیں گے ورنہ کوئی نہیں جائے گا۔ جو ایک ہی کشتی کے مسافر ہوں وہ ڈوبتے ہیں تو ساتھ ڈوبتے ہیں اور پار اترتے ہیں تو ساتھ۔"

"وہ کہیں دھوکا نہ دے رہا ہو۔"

"اپنی جان عزیز نہ ہوتی اسے تو وہ یوں جیل سے نہ فرار ہوتا۔ صبح آرام سے پھانسی چڑھ جاتا۔ اب اس کے پاس کون سا راستہ کھلا ہوا ہے۔ وہ ہمارا ساتھ نہیں دے گا تو کہاں جائے گا اور کیسے جائے گا؟" میں نے کہا "صبح گاڑی آئے گی۔"

"اور گاڑی میں اس کے ساتھی بھی ہوئے پھر....."

"پھر کیا۔ اگر وہ مقابلہ کرنا چاہیں گے تو ہم مقابلہ کریں گے۔ ورنہ کچھ نہیں ہوگا۔ ان کے ساتھ ہم بھی خاموشی سے نکل جائیں گے۔ ان کی سلامتی مشروط ہے ہماری سلامتی سے۔"

"ہیلی کاپٹر کے پائلٹ نے انکار کر دیا۔ اسے شک ہو گیا ہم پر۔ یا اگروال پر....." نازو سوچ میں پڑ گئی۔

"بابا' پائلٹ تو بہت مجبور ہوتا ہے۔ لوگ مسافروں سمیت ہوائی جہاز کو اغوا کر لیتے ہیں۔ وہ ایک بار آ گیا تو پھر جہاں ہم چاہیں گے جائے گا" میں نے کہا "اب تم بے فکر ہو کے سو جاؤ۔ خطرے کی کوئی بات نہیں رہی۔ صبح ہونے میں ابھی پانچ گھنٹے ہیں۔ صورتِ حال پوری طرح ہمارے قابو میں ہے۔"

میں لوٹ کر اگروال کے کمرے میں گیا تو غالب اسی طرح ریوالور تھامے مستعد کھڑا تھا۔ اگروال کی کوشش سے عورت ہوش میں آ چکی تھی اور کپڑے بھی پہن چکی تھی مگر ابھی تک کمرے میں ہماری موجودگی کا سبب اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

وہ بار بار اگروال سے پوچھ رہی تھی "یہ کون لوگ ہیں؟ تمہارے ساتھی..... یہ کیسے آ گئے..... اور وہ سور کی بچی کہاں ہے؟ اس کا خون پی جاؤں گی میں....."

اگروال نے کہا "ساونلی' ہوش میں آ..... یہ لے ایک گھونٹ پی لے....."

اگروال نے جسے ساونلی کہا تھا' وہ کھلتے ہوئے گندمی رنگ اور انتہائی تیکھے نقوش والی جوان عورت تھی جس کی ملاحت اور چہرے کے خدوخال میں بلا کی حیوانی کشش تھی۔ اپنے بکھرے بالوں اور بڑی بڑی لال آنکھوں سے وہ ایک خوب صورت چڑیل ہی نظر آتی تھی۔ اس کے بھرپور جسم کی آتش نشانی اس لباس میں کہیں زیادہ محسوس ہوتی تھی جو اس نے کامل بے نیازی سے پہن لیا تھا۔ اگروال کے مجبور کرنے پر ورنہ اسے نہ اپنے عورت ہونے کے احساس سے کوئی فرق پڑتا تھا اور نہ کسی مرد کی نظر سے۔

"ہم کسی ڈاکو کے ساتھی نہیں ہیں" میں نے اپنے منہ چھپانے والی چادر کی نقاب ہٹا دی۔

غالب نے میری تقلید کی "ڈاکو ہمارے مقابلے میں تو ... ہیں۔ نادان بچے۔"

اگروال اپنی جگہ پر منجمد ہو گیا "تم..... وہی ہو؟"

میں نے کہا "ہاں۔ ہم وہی ہیں جن کو تم نے پہچان لیا تھا اور بڑی اچھی بات ہے کہ جان بھی لیا۔"

عورت چلانے لگی "کیا چاہتے ہو آخر تم....."

میں نے کہا "اگروال! اپنی ساونلی کا منہ بند رکھ۔ ورنہ....."

غالب نے میری بات کاٹ دی "ہم اسی کو بلا لیں گے جس ساونلی نے گالی دی تھی۔ اس مرتبہ وہ ہمیشہ کی نیند سلا دے گی۔"

ساونلی کا چہرہ لال ہو گیا تھا مگر اگروال نے اسے خاموش رہنے پر مجبور کر دیا۔ "غصہ مت کر ساونلی۔ یہ بھی ہم جیسے ہی ہیں۔ اب ہمارے ساتھ ہی رہیں گے۔"

"ہمارے ساتھ۔" ساونلی نے احتجاج کیا۔

میں نے کہا "سفر کی حد تک۔ منزل پہ پہنچ کر ہمارے راستے جدا ہو جائیں گے۔ اسے سمجھا دو اگروال کہ اسے کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں کرنا چاہئے ورنہ....."

"میں سمجھا دوں گا۔ تم آرام سے بیٹھ جاؤ۔ خواہ مخواہ دھمکیاں مت دو" اگروال نے کہا۔

ہم آرام سے بیٹھ گئے۔ اگروال نے چپکے چپکے ساونلی کو اپنی مجبوری سمجھا دی۔ جیسے جیسے اس کا ہسٹریا کم ہوا اس کا دماغ حقائق کو قبول کرتا گیا۔ صبح تک رات کی مسافت یوں طے ہوئی کہ پہلے تین گھنٹے غالب نے سو کے گزارے۔ پھر میری باری آئی۔ اگروال اور ساونلی ہماری موجودگی سے بے نیاز تھے اور کچھ دیر بعد اسی طرح سو گئے تھے جیسے ہمارے آنے سے پہلے سو رہے تھے۔

صبح چھ بجے میں نے نیچے جا کے ٹھنڈے پانی سے غسل کیا اور سردار جی کو جگایا۔ انہوں نے اپنے بھائی کو جگانے کے بجائے مجھے کچن کا راستہ دکھایا اور پھر سو گئے۔ گل اور نازو نے ہاتھ منہ دھونے کے بعد چائے بنائی اور خاصا پر تکلف ناشتا تیار کیا۔ اس وقت باہر اندھیرا ہی تھا اور ہوٹل میں مقیم دوسرے مہمان سوئے ہوئے تھے۔ ہمارے اور اگروال کے درمیان کشیدگی شروع ہی کی بےمقصد ہو گئی تھی۔

مشرق کے افق پر سرخی نمودار ہونے لگی تھی کہ ایک جیپ ہوٹل کے دروازے سے کچھ دور آ کے ٹھہر گئی۔ عین اس جگہ وزنی ٹرک نما کار کے مقابل جس کے موجد سردار والا ور سنگھ تھے۔ میں اور اگروال اسی کے اندر بیٹھے ہوئے تھے اور اس کی پچھلی سیٹ پر نازو اپنی شبِ گزشتہ کی حریف ساونلی کے ساتھ تشریف فرما تھی۔ ساونلی کے عزائم سخت جارحانہ تھے مگر میں نے نازو سے دشمنی کے انجام پر اتنا حوصلہ شکن اور ڈراؤنا لیکچر دیا تھا کہ وہ اپنے دلی جذبات کا اظہار محض ناگواری سے کر رہی تھی اور نازو کو اس سوکن کی طرح برداشت کر رہی تھی جو شوہر کے دیوانہ پن کی بدولت بہتر بن چکی ہو۔ اس کا وہاں موجود رہنا اس لئے ضروری تھا کہ سب انتظامات اسی نے کئے تھے اور وہی آنے والوں کو پہچان سکتی تھی۔

جیپ کے رکتے ہی ساونلی نے کہا "گرو! یہی گاڑی ہے" اور اترنے کی کوشش کی۔ نازو نے اسے روک لیا۔

"یہ..... یہ تو پولیس کی جیپ ہے" اگروال نے تشویش سے کہا "آگے بھی پولیس والا ہے۔"

"میرا ہاتھ چھوڑ" ساونلی نے بگڑ کے کہا "گرو! دیکھ یہ پھر لڑ رہی ہے" غالباً وہ اگروال کو پیار سے گرو کہتی تھی۔

"استاد جی! کیا حکم ہے؟" نازو نے گرو کا متبادل تلاش کر لیا۔ "جانے دوں؟"

"ہاتھ چھوڑ دو۔ گردن دبوچ لو" میں نے کہا۔

اگروال نے برا سا منہ بنایا "ایسے نہیں چلے گا۔"

میں نے کہا "کیا نہیں چلے گا؟ یہ کٹارا یا ہیلی کاپٹر۔"

"تمہاری داداگیری نہیں چلے گی۔" اگروال بگڑ کے بولا "ہم تمہاری مدد کر رہے ہیں۔ اس کے بدلے....."

"ہم بھی شرافت سے کام لے رہے ہیں ورنہ اب تک تمہاری لاشیں پڑی ہوتیں کمرے میں۔ اس گاڑی کو اور ہیلی کاپٹر کو تمہاری مدد کے بغیر بھی لے جا سکتے تھے ہم" میں نے غرا کے کہا۔

اگروال اور ساونلی دونوں چپ ہو گئے۔ وہ یقیناً بہت بہادر تھے اور بے دھڑک قتل بھی کرتے رہے ہوں گے مگر اب ان کے مقابل دہشت گرد اور تخریب کار کا خطاب پانے والے لوگ تھے جن کے مقابلے میں ڈاکو واقعی طفلِ مکتب سمجھے جا سکتے ہیں۔

ساونلی نے کہا "یہ پولیس کی وردی میں اپنا ہی آدمی ہے۔ تم جا کے اس سے بات کرو۔"

اگروال نے کہا "یہ نہ ہو جیپ میں پولیس کی ساری نفری ہو۔ وہ سیدھے جیل لے جائیں مجھے۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو؟ وردی تو ہماری حفاظت کے لئے ہے۔ کیا خود پولیس ہمیں لینے آئے گی؟ وردی سے مت ڈرو۔"

میں نے کہا "بالکل ٹھیک۔ اب ہم اتر کے اس گاڑی میں بیٹھ جاتے ہیں۔"

ہم ایک ساتھ اترے اور جیپ میں سوار ہو گئے۔ ڈرائیور کی جگہ کانسٹیبل کی وردی میں بیٹھے ہوئے شخص کو حیران ہونے کا موقع بھی نہ ملا۔ ہم سب کی صورتیں اس کے لئے اجنبی تھیں مگر وہ ساونلی کو پہچانتا تھا۔

وہ بولا "یہ اور کون آ گیا ہے تمہارے ساتھ؟"

نازو نے کہا "ہم گرو کو سی آف کرنے جا رہے ہیں۔"

میں نے کہا "یہ گرو ہے اور میں مہاگرو۔ گرو کا باپ سمجھ لو تم مجھے۔"

میرے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر اس کی سٹی گم ہو گئی "یہ..... یہ کیا گڑبڑ ہے..... ساونلی..... الو کی پٹھی۔ مجھے پتا تھا تو مروائے گی۔"

"بکواس بند کر اپنی" ساونلی بپھر گئی "اور خاموشی سے گاڑی لے کر چل۔"

میں نے کہا "کزن! دو مسافر اور بھی ہیں۔ ہم انہیں چھوڑ کے کیسے جا سکتے ہیں؟"

"مہاگرو! میں انہیں لے آؤں اگر اجازت ہو؟" نازو بولی۔

"لے آؤ۔ اجازت ہے کزن۔"

"یہ بھی کزن ہے تمہاری اور ساونلی بھی" ڈرائیور بولا جو اصل صورتِ حال سے قطعی بے خبر تھا۔

"ہم سب ایک دوسرے کے کزن ہی ہوتے ہیں۔ دور کے۔ ہیں تو سب بابا آدم کی اولاد سے" میں نے کہا "بہت دن بعد ملے ہیں نا' اس لئے پتا نہیں چلتا کہ کون ماموں زاد ہے اور کون چاچے کا بیٹا ہے۔ کیا پتا میں تمہارا پھوپھا ہوں کہ تایا۔"

اگروال نے کہا "غصے میں آنے کی ضرورت نہیں۔"

میں نے کہا "ہاں۔ اس سے خون بڑھتا ہے' بلڈ پریشر ہائی ہو جاتا ہے اور عمر گھٹتی ہے۔ بعض اوقات عمر ختم ہو جاتی ہے۔ کھڑے کھڑے یا بیٹھے بیٹھے۔ جیسے فیوز اڑ جاتا ہے لوڈ زیادہ ہونے سے یا ٹائر برسٹ ہو جاتا ہے پریشر زیادہ ہو تو۔"

"اتنے لوگ کیسے سمائیں گے جیپ میں؟" ڈرائیور بولا۔

میں نے کہا "کزن۔ جگہ دل میں ہونی چاہئے۔ پھر اس میں تمہاری بارات بھی جا سکتی ہے اور گرو کی ارتھی بھی۔ تم دیکھنا' ابھی کیسے ہم سب تمہارے دل میں سما جاتے ہیں۔"

غالب اور گل بیگ سمیت نمودار ہوئے۔ انہوں نے بیگ درمیان میں رکھے اور خود اگروال کے دائیں بائیں فٹ ہو گئے۔ ساونلی ان کے بیچ میں سینڈوچ ہو گئی۔

میں نے مسکرا کے ڈرائیور کو دیکھا "تم بلاوجہ پریشان تھے

کزن۔ دیکھو گاڑی تو خالی پڑی ہے۔ بہت جگہ ہے ابھی۔"

ناز و ... "کزن سے کہو چلے۔ راہِ راست پر"

میں نے کہا "کزن کو معلوم ہے کہ راہِ راست سے ... والے کو اس کی تقدیر سیدھا نرک میں لے جائے گی۔"

ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کی تو میں نے تھوڑا سا پہلو بدلا اور اپنے ریوالور کا رخ عین اس کے دل کی جانب کرلیا۔ باہر خاصی سردی تھی اور کھلی جیپ سے اندر آنے والی ہوا میرے جسم کی ایک سائیڈ کو سن کر رہی تھی۔ بازار ابھی بند تھے اور سڑکوں پر آمد و رفت بھی برائے نام تھی۔ صبح دم ایک اجنبی شہر کا نظارہ میرے لئے انوکھا تجربہ تھا۔ اس سفر میں نہ جانے ایسے کتنے مقام آئے تھے جہاں سے گزرنے کا ہم نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ زندگی میں پھر کبھی ادھر سے کب گزر ہوگا۔ شاید کبھی نہیں۔

جیپ خاصی تیز رفتاری سے نامانوس راستوں کو طے کرتی جارہی تھی۔ میں نے بہت سے ایسے مناظر دیکھے جو میری آنکھوں کو اپنے شہر اور اپنے وطن کی یاد دلاتے تھے۔ سائیکلوں پر دودھ لانے والے، اخبار فروش، سڑک کے کنارے بستے گلے میں لٹکائے اسکول جانے کے لئے تیار کھڑے ہوئے بچے۔ چائے کی دکانوں سے اٹھنے والی خوشبو۔

جیپ شہر سے باہر نکل آئی تو میں نے کہا۔ "کزن! سردار جی کیوں باہر نہیں نکلے؟ ہم سے ملے بھی نہیں۔"

"بہت حالت خراب تھی ان کی" غالب نے ... انجام کا سوچ سوچ کے ان پر رقت طاری ہوتی تھی۔ میں نے بہت تسلی دی کہ آپ کا کوئی قصور نہیں تھا۔ یہ تو بس مقدر میں تھا....."

"کس سردار جی کی بات کر رہے ہو تم؟" اگروال بولا۔

مجھے فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا کیوں کہ ہوٹل کے مالک کو تو ہم بطور لاش پیش کر چکے تھے۔ میں نے کہا "کزن! اس ہوٹل کو تم ایک فیملی کمپلیکس سمجھو۔ یہاں جو چوکیداری کے اعلیٰ منصب پر فائز تھے وہ سردار جی کے والد ماجد تھے۔ اور جو ... سالاں کے فرائض سر انجام دیتے تھے وہ ان کے برادر کلاں تھے۔ بڑے بھائی۔ میرا کزن انہی کی بات کر رہا ہے کہ قسمت کو روتے تھے۔"

"قسمت کو تو میں بھی رو رہا ہوں، تم سے مل کے۔"

"ایسا مت کہو کزن۔ یہ دیکھو۔ سورج نکل آیا ہے اور یہ نیا دن ہے۔ جس کے بارے میں تم نہیں جانتے تھے کہ دیکھو گے یا نہیں۔ اگر سانولی کا مشن ناکام ہو جاتا تو سوچو اس وقت تم کہاں ہوتے؟ تمہاری اکڑی ہوئی سرد لاش پھانسی گھاٹ پر سے اتاری جا چکی ہوتی اور کسی چارپائی پر پڑی ہوتی۔ لمبی گردن اور باہر نکلی ہوئی زبان کے ساتھ۔ ڈاکٹر تمہاری موت کا سرٹیفکیٹ بنا رہا ہوتا اور باہر شاید سانولی ہی ہوتی، تمہاری لاش لینے کے انتظار میں۔ شام تک تم راکھ ہو جاتے۔ کتنے خوش نصیب ہو تم کہ زندوں میں شامل ہو، مُردوں میں نہیں۔"

"ٹھیک کہتے ہو تم۔ یہ دوسرا جیون ہے ..." اگروال نے ہونٹوں پر زبان پھیر کے کہا۔

"دو بالکل ویسا ہی ہوگا جیسا پہلا جیون۔ تم نیپال میں ... ڈالو گے اور قتل کرو گے۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "تمہیں نہیں معلوم۔ سانولی نے مجھے اسی شرط پر باہر نکالا ہے۔ جان کی بازی لگا کے اور اپنا سب کچھ داؤ پر لگا کے۔ کہ نیپال پہنچ کر ہم شادی کرلیں گے اور ایک نئی زندگی آغاز کریں گے، نئے نام سے۔ پرانے جیون کی کوئی بات اس نئے جیون میں نہیں ہوگی۔ آگے پتا نہیں۔"

میں نے کہا "اگر سانولی تمہارے لئے اتنا کر سکتی ہے تو تم بھی سانولی کے لئے سب کچھ کرنا چاہئے۔ یہ بھی تمہارے ساتھ ڈاکے ڈالتی تھی؟"

اگروال ہنسا "تم نے سانولی جیسی عورت نہیں دیکھی ہو گی کبھی۔ بہت بڑے باپ کی بیٹی تھی یہ۔"

"تھی کیا مطلب..... اب نہیں ہے؟"

"نہیں۔ اب نہیں ہے۔ وہ سب رشتے اس نے خود توڑ لئے میری خاطر" وہ بولا "اس گھر سے تعلق ختم نہ کرتی تو ... رہتی۔ لاکھوں میں کھیلتی۔ اس وقت ایم اے کے آخری ... تھی..... اب تک ایم اے کر چکی ہوتی۔ کہیں پروفیسر ہوتی۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ یہ عشق کا ایک اور انوکھا روپ میرے سامنے آیا تھا۔ اگروال جیسے شخص کی ذات میں سانولی نے آخر دیکھا؟ اس کی کون سی خوبی تھی جس نے اسے دیوانہ کر دیا؟ سانولی کے لئے ایک ڈاکو سے عشق کی مجبوری کیا تھی؟ فلموں کے اور رومانی ناولوں کے ہیرو تو بڑے خوبرو، وجاہت و ذہانت کا پیکر، خوش لباس اور خوش مزاج، اخلاق و کردار کا مثالی نمونہ اور تمام اعلیٰ صفات کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ کبھی شاعر، کبھی مصور، کرکٹر، ڈاکٹر، انجینئر۔ مگر اگروال تو ایک عادی مجرم تھا۔ ڈاکو اور قاتل تھا۔ غیر مہذب اور غیر تعلیم یافتہ تھا اور صورت شکل سے بھی اسے سانولی کے ساتھ دیکھ کر۔ پہلوئے حور میں لنگور خدا کی قدرت، والا محاورہ یاد آتی تھی۔ لیکن یہی تو عشق ہے۔ اسی بے بسی، دیوانگی اور بے اختیاری کا نام عشق ہے۔ جب عقل کا ہر جواز خود ایک دلیل ہو اور جذبات کے سامنے کسی مصلحت کی اہمیت نہ رہے۔

اگر جیپ اچانک نہ رک جاتی تو میں داستانِ عشق کے ان کرداروں سے اور بہت کچھ پوچھتا۔ یہ کہ سانولی اسے کیسے ملی وہ سانولی کا کیسے ہو گیا۔ سانولی کیسے اس کے رنگ میں رنگ گئی وہ کیوں اس جیسا نہ ہوا۔ ایم اے میں پڑھنے والی ایک لڑکی کس طرح اسے جیل کی دیواریں گرا کے موت کے منہ سے نکال لیا اور اگر وہ اپنے مقصد میں ناکام ہو جاتی تو کیا اکیلی جی لیتی.....

ہم کھیتوں کے درمیان ایک سپاٹ میدان میں کھڑے
نہ جانے کب شہر ختم ہوا تھا اور سڑک کے بعد کچا راستہ آگیا

میں اپنے خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ میں نے کچھ دیکھا ہی نہیں تھا۔ کھیت ہمارے دائیں بائیں خاصے فاصلے پر تھے۔ ان کے پیچھے درختوں کا پھیلاؤ تھا جو افق پر نیلے رنگ کو سبزے سے جدا کرتا تھا۔ سامنے زردی مائل بھورے پتھر کی پہاڑیاں تھیں اور ہر طرف گہرا سناٹا تھا۔ فضا میں خوشگوار و پرنم تازگی تھی اور دھوپ کی تمازت کے ساتھ لطیف ہوا کی مہک تھی۔

"ہیلی کاپٹر یہاں آئے گا" جیپ کے ڈرائیور نے کہا۔

"کس وقت آئے گا؟" اگروال نے متلاشی نظروں سے آسمان کی ویران وسعت کو دیکھا۔

"مجھے نہیں معلوم۔"

"آٹھ بجنے میں ابھی پانچ منٹ باقی ہیں" سانولی نے کہا۔

"اب میں چلتا ہوں" ڈرائیور نے کہا۔

"پانچ منٹ رک نہیں سکتے؟" سانولی نے اسے گھور کے دیکھا۔

"اب میرا کوئی کام نہیں....."

سانولی نے کہا "تمہیں کیا معلوم۔ ہیلی کاپٹر نہ آیا تو ہم واپس جائیں گے۔"

"کیا اس کا بھی امکان ہے؟" اگروال نے تشویش سے کہا۔

"امکان!" سانولی نے تلخی سے کہا "کوئی امکان تھا کہ ہم اس مصیبت میں بھی پڑ جائیں گے۔ پولیس کا ڈر تو تھا مگر....."

"تم مصیبت کہہ رہی ہو ہمیں؟" غالب نے کہا۔

"اور کیا کہوں؟ فرشتۂ رحمت کہوں" سانولی بگڑ گئی "صرف بدقسمتی ہے یہ۔ آگے پتا نہیں کیا ہوگا۔"

"ہیلی کاپٹر کا کریش نہیں ہوگا" غالب بولا۔

سانولی نے اسے گھور کے دیکھا "تم گارنٹی دیتے ہو؟"

"ہاں میں گارنٹی دیتا ہوں" غالب نے کہا۔

سانولی پھر ڈرائیور کی طرف متوجہ ہو گئی "یہاں سے تو ہمیں واپسی کے لئے سواری بھی نہیں مل سکتی۔ ہیلی کاپٹر آجائے پھر تم چلے جانا۔"

"ہیلی کاپٹر آگیا" غالب نے کہا۔

ہیلی کاپٹر کی مخصوص آواز میں نے بھی سن لی تھی اور سب کے ساتھ میری نظریں بھی مشرق کے روشن افق پر ایک سیاہ دھبا دیکھ رہی تھیں جو رینگتا ہوا بڑھ رہا تھا۔ چند منٹ میں ہیلی کاپٹر ہمارے سر پر آپہنچا اور پھر نیچے اترنے لگا۔ اس کی آواز بہت زیادہ نہیں تھی لیکن خاموشی میں محسوس زیادہ ہوتی تھی۔

ہیلی کاپٹر نے زمین کو چھوا تو آس پاس کے پودے تیز ہوا سے جھومنے لگے۔ پھر اس کا انجن بند ہو گیا مگر اوپر والا پنکھا گھومتا رہا۔ آہستہ آہستہ اس کی رفتار بھی کم ہو گئی اور کاک پٹ میں بیٹھا ہوا پائلٹ مسکراتا ہوا نیچے اترا۔ قریب آنے تک اس کا جوش و خروش باقی رہا۔

اس نے اپنا تعارف کرانے کے بعد کہا "آپ میں سے فلم ڈائریکٹر کون ہے؟"

میں نے کہا "کوئی بھی نہیں....."

اس نے سنجیدہ ہو کے کہا "مجھے کسی غیر ملکی فلم ساز کو نیپال لے جانا تھا۔"

"کسی وجہ سے وہ خود نہیں آسکا۔ ہم آگئے ہیں اس کی جگہ۔" میں نے کہا۔

"تم..... اس فلم یونٹ کے ارکان ہو؟"

میں نے کہا "ہم اس ہیلی کاپٹر کے مسافر ہیں۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ ہم کون ہیں۔"

ہیلی کاپٹر کے پائلٹ نے جیب سے ایک کاغذ نکالا اور بولا۔ "میرے پاس اس اجازت نامے کی رُو سے....."

میں نے آگے بڑھ کے وہ کاغذ اس کے ہاتھ سے چھین لیا اور پھاڑ کے پُرزہ پُرزہ کر دیا "بھول جاؤ اس اجازت نامے کو۔"

وہ سخت پریشان نظر آنے لگا "یہ کیا حرکت ہے اور آخر تم لوگ کون ہو؟ کیا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا "تمہاری کمپنی سے یہ ہیلی کاپٹر کرائے پر حاصل کیا گیا ہے۔"

"اور کرایہ ادا کیا جا چکا ہے" سانولی نے کہا "پھر یہ سوال جواب کس لئے؟ رسید دیکھ سکتے ہو تم۔"

سانولی نے اپنے گریبان کے خفیہ خانے سے ایک کاغذ نکال کے اس کی طرف پھینک دیا۔ "چار مسافر یہاں سے نیپال جائیں گے۔ ان کے نام پتے اور پیشے، قومیت مذہب اور ذات کے بارے میں تصدیق کرنا تمہارا کام نہیں ہے۔"

پائلٹ اس کے دبنگ لہجے سے مرعوب ہو گیا اور اس کی رواں انگریزی سے بھی۔ اس نے رسید اٹھا کے سر ہلایا۔

"رائٹ میڈم۔ مجھے بتا دیں وہ چار افراد کون ہیں۔ مجھے تو یہاں سات آدمی نظر آرہے ہیں۔"

"ایک آدمی واپس جائے گا" سانولی نے کہا "کچھ کو تم لے جاؤ گے۔"

پائلٹ نے انکار میں سر ہلایا "کرایہ چار کا ادا کیا گیا ہے۔"

"تم دو افراد کا اضافی کرایہ لے سکتے ہو۔"

"میں بس کنڈکٹر نہیں ہوں کہ جتنے مسافر چاہیں چڑھ جائیں انہیں ٹکٹ دیتا جاؤں" پائلٹ نے کہا "کرایہ کمپنی لیتی ہے اور رسید دیتی ہے۔ مجھے یہ اختیار حاصل نہیں۔"

"تم احمق ہو یا ضدی" سانولی نے بگڑ کے کہا "گولی مارو کمپنی کو۔ ہم سے خود بات کرو۔ کرایہ لو اور جیب میں رکھو۔ کمپنی دیکھ رہی ہے کیا؟"

پائلٹ خاموش ہو کے کچھ سوچنے لگا "لیکن میڈم..... جہاز میں چار افراد کی جگہ ہے..... اگر ایک میرے ساتھ بیٹھ جائے....."

"ایک بار تم اپنے درمیان فٹ کرلیں گے۔ اس کے لئے بات کی فکر مت کرو" میں نے کہا۔

اگروال نے ایک سوٹ کیس کھولا۔ اس میں نوٹ ہی نوٹ بھرے ہوئے تھے۔ پائلٹ کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ اگروال نے ایک گڈی اس کی طرف بڑھادی۔

"یہ پانچ ہزار ہیں......"

پائلٹ نے جھجکتے ہوئے ہاتھ بڑھایا۔ پھر پیچھے کھینچ لیا۔

"کیا بات ہے؟ یہ جعلی نوٹ نہیں ہیں۔"

"مجھے دال میں کچھ کالا نظر آرہا ہے" وہ بولا۔

"تمہاری نظر بالکل ٹھیک ہے" میں نے کہا "دال میں واقعی کالا ہے لیکن تم دال کھاؤ۔ جو کالا کالا ہے اسے چھوڑ دو۔"

"میں کسی مشکل میں تو نہیں پڑجاؤں گا؟" وہ بولا۔

"مشکل میں تم پڑ چکے ہو" میں نے ریوالور نکال لیا"۔ اب مشکل سے نکلنے کا طریقہ یہی ہے کہ ہم سے تعاون کرو۔ اپنی جان بچاؤ اور ہم سے جو فائدہ حاصل کرسکتے ہو کرلو۔"

غالب نے کہا "کمپنی کچھ نہیں کرسکتی۔ وہ تمہیں کسی طرح موردِ الزام نہیں ٹھہرا سکتی۔ تم نے کوئی غلط کام کیا ہی نہیں۔ اور اگر کیا تو مجبوری تھی۔ تم اکیلے تھے۔ چھ کا مقابلہ کیسے کرسکتے تھے؟ کمپنی نے تمہاری زندگی کو داؤ پر لگا کر منافع کمایا۔ تم نے کمپنی کا جہاز بھی بچالیا اور اپنی زندگی کو بھی۔ ان پر تو لازم ہوگا کہ تمہیں انعام دیں۔"

پائلٹ کا رنگ اُڑ گیا "تم..... اسمگلر ہو..... یا مفرور مجرم..... میں نے تمہیں دیکھا ہے..... مجھے یاد نہیں آرہا ہے کہ کہاں۔ شاید تصویر......"

میں نے ریوالور اس کی کنپٹی پر رکھ دیا "اگر کچھ یاد آرہا ہے تو ابھی وقت ہے' اسے بھول جاؤ۔ اور پھر کبھی یاد نہ کرنا۔ اگر تمہیں یاد آگیا تو اس سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ کمپنی کو دوسرا پائلٹ مل جائے گا مگر تمہیں دوسری زندگی نہیں ملے گی۔ تمہاری بیوی ہے تو اسے بھی دوسرا شوہر مل جائے گا مگر تمہارے بچوں کو دوسرا باپ نہیں ملے گا۔"

غالب نے کہا "سمجھداری سے کام لو۔ موقع سے فائدہ اٹھاؤ۔ ایسے مواقع ہر روز نہیں آتے۔ جب آدمی غیر جذباتی ہوکے ٹھنڈے دماغ سے کام لے تو بہت سے ادھورے خوابوں کی تعبیر اور خواہشوں کی تکمیل ممکن ہوجاتی ہے۔"

اگروال نے کہا "اس وقت ہمارے اور تمہارے سوا یہاں کوئی نہیں ہے' جو بعد میں تمہارے خلاف گواہی دے اور تم پر ضابطے کی خلاف ورزی کا الزام لگائے۔ یہ لو مزید پانچ ہزار۔ اب چلو۔"

اس نے دس ہزار لے لئے اور خالی خالی نظروں سے ہماری صورتوں کو دیکھتا رہا "یہ تم واپس بھی تو لے سکتے ہو۔ ایک گولی خرچ کرکے اپنا پیسہ بچا سکتے ہو۔ میری جان کی کیا اہمیت ہوگی تمہارے لئے۔"

میں نے کہا "حوصلے اور اعتماد سے کام لو نوجوان۔ زندگی ہم سب کے لئے ایک جُوا ہے۔ جُوا کھیلے بغیر ہارنے سے نہیں ڈرنا چاہئے۔ ہمیشہ جیت کے خیال کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔ سوچو کہ ہمیں کیا ضرورت ہے تم کو رشوت پیش کرنے کی یا دلیل سے قائل کرنے کی؟ ہم تمہیں ویسے ہی لے جا سکتے ہیں۔ تم جس گولی سے خوف زدہ ہو وہ اس وقت بھی میرے ریوالور میں موجود ہے۔"

"آل رائٹ۔ میں بھروسہ کرتا ہوں تم پر" پائلٹ نے رقم جیب میں ڈال لی "لیکن مجھے یہ بتاؤ کہ نیپال پہنچ کے کیا ہوگا۔ باہر کیسے جاؤ گے۔ پاسپورٹ ہیں تمہارے پاس؟"

میں نے پورے اعتماد سے کہا "ہاں۔ پاسپورٹ سب کے پاس ہیں۔"

"ایئرپورٹ پر میں کیا وضاحت کروں گا؟ کہ وہ فالساز کہاں ہے اور چار کی جگہ چھ مسافر کیوں آئے ہیں۔"

میں نے کہا "تم قبل از وقت اور بلاوجہ پریشان ہونے کے شوقین ہو۔ وہاں کے معاملات ہم پر چھوڑ دو۔ اپنی جان بچانے کے لئے تم سچ بتاؤ یا دس جھوٹ بولو۔ ہمیں اعتراض نہیں ہوگا۔"

"اب تم شرافت سے چلوگے یا ہم دوسرا طریقہ اختیار کریں۔ تم باتوں کے بھوت ہو یا لاتوں کے؟" غالب نے کہا۔

پائلٹ نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور بولا "تشریف رکھئے حضرات و خواتین۔"

نازو نے کہا "مجھے تو اندیشہ ہے کہ تم راستے میں جہاز گرادوگے۔"

پائلٹ تلخی سے مسکرایا "ہاں۔ کم سے کم یہ اختیار صرف میرے پاس ہے۔ لیکن میں بزدل آدمی ہوں۔ ورنہ صاف انکار کردیتا اور بہادری کی موت قبول کرلیتا۔ میں لالچی بھی ہوں ورنہ یہ دس ہزار دینے والے کے منہ پر کھینچ مارتا۔ جیب میں نہ ڈالتا۔"

ایک ایک کرکے سب ہیلی کاپٹر میں سوار ہونے لگے۔ پائلٹ کے ساتھ میں نے نازو کو بٹھادیا۔ اس کے پیچھے چار نشستوں پر میں نے اگروال کے ساتھ اور غالب نے سانولی کے ساتھ جگہ سنبھال لی۔ گل کو آخری حصے میں اسباب پر بیٹھنا پڑا۔ ریوالور ہم سب کے پاس تھے مگر سب معاملات افہام و تفہیم سے طے ہوجانے کے بعد کسی کو ضرورت نہ تھی کہ اسلحہ ہاتھ میں رکھے۔

ہیلی کاپٹر پر سوار ہونے والا آخری شخص میں خود تھا۔ میں نے پولیس کی وردی میں ملبوس شخص سے ہاتھ ملایا۔

"کیا تم واقعی پولیس میں ہو؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا "میں نے پہچان لیا ہے تمہیں۔"

"کوئی بات نہیں۔ غلطی کسی سے بھی ہوسکتی ہے" میں نے کہا "اب یہ بتاؤ کہ تم کیا پسند کروگے۔ میں تم کو ناک آؤٹ کرکے لمبا لٹا دوں یا تمہیں یہ موقع دوں کہ جیپ کے چاروں پہیوں کی ہوا نکال دو۔"

وہ چونکا "کیا...... یہ کیا کہہ رہے ہو تم۔"

میں نے اپنی بات دُہرائی "میں جیپ کی تلاشی بھی لوں گا۔"

"آخر کیوں؟"

میں نے کہا "فضول باتوں کا جواب دینے کے لئے وقت نہیں ہے میرے پاس۔"

وہ میری راہ میں حائل ہوگیا "میں اس کی اجازت نہیں دے سکتا" اس نے اچانک ریوالور نکال لیا۔

"اجازت کے بچے!" میں نے اس کے ایک بھرپور ہاتھ رسید کیا۔ اسے ریوالور اٹھانے کی مہلت بھی نہ مل سکی۔ تاہم اس نے فائر کردیا مگر گولی زمین میں دھنس گئی۔ پھر وہ خود بھی زمین پر گر گیا۔ میں نے اس کے ریوالور کی گولیاں نکال کے جیب میں ڈالیں اور ریوالور اس کے قریب پھینک دیا۔

جیپ کے گلوز کمپارٹمنٹ سے مجھے ایک ٹیلی فون ملا مگر وہ درحقیقت وائرلیس فون تھا اور اس ریڈیو کے ساتھ منسلک تھا جو ڈیش بورڈ پر نظر آرہا تھا اور ایک نظر میں عام سا ریڈیو لگتا تھا۔ سیٹ کے نیچے سے دوسرا ریوالور برآمد ہوا اور مجھے کوئی شک نہ رہا کہ اس شخص کے عزائم کچھ اور تھے۔ اس نے سانولی سے بھی اگروال کے فرار میں مدد دینے کا معاوضہ وصول کرلیا تھا۔ لیکن دوسری طرف اس نے فرض شناسی کا ثبوت دیتے ہوئے فرار کی کوشش کو ناکام بنانے کا بندوبست بھی کرلیا تھا۔ غالباً ہماری ساری گفتگو نشر ہورہی تھی اور کہیں مستعد پولیس افسران سب کچھ سن رہے تھے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ابھی تک ہم نے نہ ڈرائیور کے سامنے کلکتہ جانے کی بات کی تھی اور نہ ہیلی کاپٹر کے پائلٹ کے سامنے۔

میں نے وائرلیس فون کو تار کھینچ کر الگ کیا اور جیپ کی باڈی پر مار مار کے استعمال کے ناقابل بنادیا۔ ہیلی کاپٹر میں میرا انتظار کرنے والے یقیناً اس کارروائی کو حیرانی سے دیکھ رہے ہوں گے۔ جیپ کے پہیوں کی ہوا نکالنے کے بعد میں ہیلی کاپٹر پر سوار ہوا تو فکر مندی کے آثار اگروال کی صورت سے عیاں تھے۔

"تم نے دیکھا۔ تمہارا آدمی غدار تھا" میں نے کہا۔

سانولی کا رنگ بدل گیا "میری سمجھ میں نہیں آتا۔"

"اسے کتنا پیسہ دیا تھا؟" اگروال نے برہمی سے کہا۔

"پورے دس ہزار" سانولی نے کہا "اس کے باوجود....."

اگروال نے کہا "وقت کم ہے ہمارے پاس۔ چلو۔"

پائلٹ نے انجن اسٹارٹ کیا اور چند منٹ میں ہیلی کاپٹر فضا میں بلند ہوگیا۔ روانگی کے بعد میری نظر ہر سمت چھپے ہوئے دشمنوں کو تلاش کرتی رہی۔ اگر پولیس ہماری سب گفتگو سنتی رہی تھی تو پھر وہ ہمارے پیچھے کیوں نہیں آئے؟ وہ آواز کا تعاقب کرسکتے تھے اور ہمیں کسی بھی جگہ روک کے گرفتار کرسکتے تھے۔

غالب نے پائلٹ سے ایک دوربین لے کر گرد و پیش کا فضائی جائزہ لیا "مجھے تو کوئی بھی دکھائی نہیں دیتا۔"

میں نے دوربین اس سے لے کر دیکھا "نظر تو مجھے بھی نہیں آتا کہ کوئی تعاقب میں ہو۔"

سانولی کا اُڑا ہوا رنگ بحال ہونے لگا "تمہیں خوف نے شک میں مبتلا کردیا ہے۔ وہ ایسا آدمی نہیں تھا۔"

اگروال نے اس کی تائید کی "تم نے اسے بلاوجہ مارا۔ اگر وہ مخبری کرتا تو ہم ہوٹل کے دروازے پر ہی دھر لئے جاتے۔"

"ہوٹل پر رات کو ہی چھاپا پڑجاتا" سانولی نے کہا۔

شاید وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ ابھی تک کسی نے کہیں بھی ہمارا راستہ نہیں روکا تھا۔ ہیلی کاپٹر آزادی سے پرواز کررہا تھا اور زمین پر کہیں پولیس کی نقل و حرکت دکھائی نہ دیتی تھی۔

میں نے کہا "اس کے پاس وائرلیس فون تھا۔"

"اس کے پاس نہیں تھا۔ جیپ میں تھا" سانولی نے تلخی سے کہا "وہ آخر کیا کرتا۔ اسے نکال کے پھینک دیتا۔ ایک ڈی ایس پی کی جیپ ہے۔ وہ تو صرف ڈرائیور تھا۔"

میں نے کہا "چلو اچھا ہی ہوا کہ میں نے اسے جان سے نہیں مارا۔"

"اسے مارنے کی بھی کیا ضرورت تھی؟" سانولی برہم ہوگئی۔

"میں نے اسے موقع دیا تھا تاکہ جیپ کی ہوا نکال دے۔ مگر اس نے مجھ پر ریوالور نکال لیا تھا" میں نے کہا "میرا مقصد صرف اس کو کچھ دیر وہیں روکنا تھا۔"

"تم نے غلط سمجھا اُسے۔ اگر وہ تمہاری بات مان لیتا اور بعد میں ہیلی کاپٹر پر فائرنگ کردیتا تو تم اس کا کیا بگاڑ لیتے۔ وہ نہ چاہتا تو ہم ہیلی کاپٹر میں بیٹھ کے فرار نہیں ہوسکتے تھے۔" سانولی نے خفگی سے کہا "لیکن اب تمہاری وجہ سے وہ بھی مصیبت میں پڑجائے گا۔ رات بھر کی ڈیوٹی دینے کے بعد وہ وقت پر واپس پہنچ جاتا تو کچھ نہ ہوتا۔"

میں نے خفت سے کہا "آئی ایم سوری۔"

"سوری کہنے سے اب کیا ہوتا ہے۔ تم نے اس کی پوزیشن مشتبہ بنادی۔ وہ کیا بتائے گا کہ اس طرف جیپ لے کر کیوں آیا تھا۔ جیپ کے سب ٹائروں کی ہوا کیسے نکل گئی۔ وائرلیس فون کیسے تباہ ہوگیا۔ ریوالور کس نے خالی کیا۔"

غالب نے کہا "وہ جھوٹ بول کے اپنی جان بچالے گا۔"

"اور اس نے سچ بولنا بہتر سمجھا پھر۔"

"ہمارے ساتھ وہ خود بھی مارا جائے گا" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "ہاں۔ اس کا جرم بھی کم سنگین نہیں ہے۔ اُسے دس ہزار بہت مہنگے پڑیں گے' اگر اس نے سچ بولا۔"

اگروال نے کہا "چلو اب چھوڑو یہ بحث۔ آگے کی فکر کرو۔"

میں نے پائلٹ سے کہا "تمہارا کنٹرول ٹاور سے رابطہ ہے۔"

اس نے سر ہلایا "ہاں۔ ضرورت پڑنے پر میں ان سے بات کر سکتا ہوں۔"

میں نے کہا "مجھے امید ہے کہ تم انہیں صرف اپنی خیریت کی خبر دو گے۔ کیا تم نے انہیں روانگی کی اطلاع دے دی تھی؟"

"ہاں۔ کلیئرنس کے بغیر میں کیسے پرواز کر سکتا تھا۔"

"تمہارا کیا روٹ ہو گا" "یہ بھی معلوم ہے تمہیں؟" میں نے کہا۔

"ظاہر ہے۔ میں اپنی مرضی سے ہر جگہ نہیں اتر سکتا۔ راستے میں جتنے ایئرپورٹ آئیں گے وہاں مجھے اجازت نامہ دکھانا پڑے گا۔

"ظاہر ہے۔ میں اپنی مرضی سے ہر جگہ نہیں اتر سکتا۔ راستے میں جتنے ایئرپورٹ آئیں گے وہاں مجھے اجازت نامہ دکھانا پڑے گا۔ انہیں بھی پہلے سے اطلاع مل جائے گی اور ہر کنٹرول ٹاور مجھے لینڈ کرنے کے لئے ہدایات دے گا۔"

"کیا تمہارا لینڈ کرنا ضروری ہو گا؟"

وہ مسکرایا "نیپال تک نان اسٹاپ فلائٹ نہیں ہو سکتی۔ مجھے راستے میں دوبار فیول لینا پڑے گا۔ میرے روٹ پرمٹ پر ہی فیول ملے گا۔"

"اور اگر تمہیں راستہ بدلنا پڑے؟"

"آخر کیوں بدلنا پڑے....."

"فرض کرو، کوئی بھی ہنگامی صورتِ حال پیدا ہو جائے۔ آگے کا موسم خراب ہو۔ طوفان آنے والا ہو۔"

اس نے نفی میں سر لایا "محکمۂ موسمیات والوں سے جھوٹ نہیں بولا جا سکتا۔ وہ زیادہ جانتے ہیں۔ میں اس جرم کا مقصد ابھی تک نہیں سمجھا۔"

"مطلب بہت واضح ہے۔ ہم نیپال نہیں جا سکتے۔ تم اب اپنا رخ کلکتہ کی جانب کر لو" میں نے کہا۔

اس نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا "کیا تم پاگل ہو گئے ہو؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"یار، کیوں نہیں ہو سکتا" غالب بولا "اچھا بھلا آدمی کسی بھی لمحے پاگل ہو سکتا ہے۔ ہم تو پہلے ہی تھوڑے بہت پاگل ہیں۔"

"اتنے انکسار کی کیا ضرورت ہے" نازو بولی "آپ کے بارے میں وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ پورے پاگل ہیں، دیوانے ہیں۔"

"یہ بھی بتا دو کہ کس کے" غالب نے یوں کہا کہ نازو جھینپ کر باہر دیکھنے لگی۔

میں نے کہا "پائلٹ صاحب، اس مشکل کا حل بھی آپ ہی نکالئے۔ یہ کیسے ہو گا۔ کس طرح ہو گا۔ کس کی اجازت سے ہو گا۔ یہ سب سوچنا آپ کا کام ہے۔ ہم نے تو بتا دیا کہ نیپال نہیں جانا، کلکتہ جانا ہے۔ آخر ہم نے ہیلی کاپٹر کرائے پر لیا ہے۔ کوئی

شیڈول فلائٹ تو ہے نہیں۔ ہمارا پروگرام بدل گیا یا کوئی مجبوری پیش آ گئی۔ تم کیا زبردستی ہمیں نیپال لے جاؤ گے؟"

پائلٹ تشویش میں مبتلا ہو گیا "مجھے کمپنی سے بات کرنی پڑے گی۔ کنٹرول ٹاور کی معرفت۔"

"ضرور کرو۔ تمہاری گفتگو ہم بھی سنیں گے۔ اگر وہ تمہارے کہنے سے قائل نہ ہوئے تو ہم کر لیں گے" میں نے کہا۔

"یہ بہت مشکل اور لمبا طریق کار ہے۔"

"کیا اجازت ملنے تک ہم فضا میں چکر کاٹتے رہیں گے؟ تم رخ بدلو اور ہماری بات کر لو" میں نے کہا۔

پائلٹ نے مجبوراً وائرلیس پر رابطہ قائم کیا۔ چند منٹ بعد کنٹرول ٹاور نے جواب دیا "کیا مسئلہ ہے؟"

"یہ لوگ فلائٹ کو نیپال کے بجائے کلکتہ لے جانا چاہتے ہیں" پائلٹ نے کہا۔

"کون لوگ؟ کیا انہوں نے ہائی جیک کر لیا ہے ہیلی کاپٹر کو؟" کنٹرول نے کہا۔

"نہیں۔ انہوں نے چارٹر کیا تھا ہیلی کاپٹر کو۔ مجھے کمپنی سے اجازت نامہ بدلوانا ہے" پائلٹ نے کہا۔

کنٹرول ٹاور نے آخر کار اس کا رابطہ کمپنی سے کروا دیا۔ وہاں کوئی خبطی بیٹھا ہوا تھا جو پائلٹ کی بات سمجھنے پر آمادہ نہیں تھا۔

"آخر یہ چکر کیا ہے؟ کیوں جانا چاہتے ہیں یہ کلکتہ؟ نیپال میں کیا ہے، قیامت آ رہی ہے....."

میں نے پائلٹ کے ہاتھ سے مائکروفون چھین کر فرنچ میں چلانا شروع کیا "کون ہوتے ہو تم مجھ سے وجہ پوچھنے والے۔ میں نیپال جاؤں، کلکتے یا جہنم میں۔ مفت تو نہیں جا رہا ہوں۔"

وہ بوکھلا گیا "تم..... کون ہو؟ انگریزی میں بات کرو۔"

میں نے کہا "مجھے انگریزی نہیں آتی بے وقوف ورنہ میں فرنچ کیوں بولتا۔ بہتر ہے تم فرنچ میں بات کرو۔"

"تمہارے ساتھ کوئی انگریزی بولنے والا نہیں ہے؟" وہ پریشان ہو گیا۔

میں نے مائکروفون غالب کے حوالے کر دیا۔ اس نے وضاحت کی "بھئی یہ وہی غیر ملکی فلمساز ہیں جو انڈیا میں مختلف لوکیشن دیکھتے پھر رہے ہیں اور حکومت کی طرف سے ان کو سہولت فراہم کی جا رہی ہے۔"

"میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔ ایک فلم ساز مدراس میں ہے۔ اس کو بھی سرکار کی سہولیات حاصل ہیں۔ یہ دوسرا کہاں سے آ گیا؟"

"کیا بھارت آنے والے فلمسازوں کی تعداد پر پابندی ہے؟" غالب نے کہا "ایک وقت میں دو نہیں آ سکتے؟ اور یہ تو وہی والے ہیں.. .."

"مگر وہ مدراس گیا تھا۔ آج ہی صبح میری بات ہوئی ہے۔"

"تم بہت عقلمند آدمی ہو" غالب نے طنز سے کہا "تم ایک فلمساز کو ایک آدمی سمجھتے ہو۔ بھائی، فلم ساز کا پورا یونٹ ہوتا ہے جس میں بہت سے لوگ شامل ہوتے ہیں۔ پروڈیوسر سے رائٹر تک..... تم اس چکر میں نہ پڑو اور صرف ضابطے کی کارروائی پوری کرو۔ سمجھے؟"

"سمجھ گیا سر۔"

"پائلٹ کو کلکتے تک کلیئرنس دو" غالب نے کہا۔

"میں ابھی سب کرتا ہوں" وہ بولا "لیکن سر! چارجز....."

"وہ ہم کلکتہ پہنچ کر ادا کر دیں گے۔" غالب نے کہا۔

"لیکن فیول چارجز اور لینڈنگ چارجز وہاں کیش وصول کئے جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم دے دیں گے۔"

"مجھے ابھی بتا دیں کہ اس ہیلی کاپٹر کو کلکتہ سے آگے یا واپسی کے لئے بھی بک کیا جائے...."

غالب نے کہا "ہاں۔ ابھی ہیلی کاپٹر ہمارے پاس ہی رہے گا۔ حساب بعد میں ہو جائے گا۔"

"آپ اس کے ساتھ ہیں سر؟"

"میں سرکاری ترجمان ہوں" غالب نے کہا "انہیں صرف فرنچ آتی ہے نا۔"

"آپ اسے سمجھا دیں کہ آہستہ بات کرے اور شرافت سے۔ ایسے اپنی فرنچ کی مشین گن نہ چلائے۔ کیا اسے معلوم نہیں کہ یہاں انگریز بہادر کا راج تھا اور ہم غلام زادے انہی کی بولی سمجھتے ہیں۔"

غالب ہنسا "اب بھی آزاد نہیں سمجھتے تم خود کو؟"

"آزادی کیا ہوتی ہے؟ آزادی صرف حاکموں کو ملی ہے جو پہلے بھی اپنی مرضی سے حکومت کرتے تھے، آج بھی کرتے ہیں۔ کسان، مزدور اور کلرک کو کیا ملا اس آزادی سے؟" وہ خاصے باغیانہ خیالات رکھتا تھا اور اس کے لہجے میں تلخی حالات کا زہر تھا۔

غالب نے مائکروفون پھر پائلٹ کو دے دیا "اب تو کوئی پریشانی کی بات نہیں رہی؟"

پائلٹ نے نفی میں سر ہلایا "میرا کام صرف ہیلی کاپٹر اڑانا ہے اور مجھے اس کی تنخواہ ملتی ہے کمپنی سے۔ کمپنی اجازت دے تو میں جہنم میں بھی جا سکتا ہوں۔"

پھر وہ غالب سے ہماری فلم سازی کے پروگرام کی تفصیلات پوچھتا رہا اور غالب نے فراخ دلی سے جھوٹ بولتے ہوئے اس پر واضح کیا کہ بھوانی جنکشن کی طرح اس فلم پر کروڑوں ڈالرز کی لاگت آئے گی اور اس میں ہالی ووڈ کے کتنے نامور ستارے شامل ہوں گے۔ وہ ہکا بکا سنتا رہا اور شاید یہ سوچتا رہا کہ ہمارے فلم ساز ادارے سے تعاون کے نتیجے میں اس کو بھی فلم میں چانس مل سکتا ہے یا نہیں۔

میں چند قدم دور گل اور نازو کے ساتھ بیٹھا رہا۔ اگروال اور سانولی آپس میں نہ جانے کیا باتیں کرتے رہے۔ ہمیں یہاں تک لانے والی جیپ کا ڈرائیور بے سدھ پڑا رہا۔ دس پندرہ منٹ کے بعد غالب نے تالی بجا کے ہمیں متوجہ کیا اور اپنی طرف بلایا۔

پائلٹ کو کلکتہ تک کلیئرنس مل گئی تھی مگر اسے ہدایت کی گئی تھی کہ وہ ایئرپورٹ چارجز ہم سے کیش وصول کرے اور فلائٹ کے دوران اپنے روٹ کا خاص خیال رکھے۔ علاقے کے گرد و نواح میں فوجی صورتِ حال خاصی نازک تھی اور ملٹری آپریشن کی وجہ سے شیڈول کی فلائٹس بھی متاثر ہو رہی تھیں۔ "بغیر شیڈول کے کسی کا فضائی حدود میں داخل ہونا غلط فہمی کی بنا پر مداخلت بھی سمجھا جا سکتا ہے" پائلٹ کو بتایا گیا "ویسے تو روٹ کی کلیئرنس مل گئی ہے لیکن کوئی پوچھے تو اسے آرام سے سب بتا دو۔ کوئی روکے یا اتارنے کی کوشش کرے تو فوراً تعمیل کرو۔"

غالب نے کہا "اس سے پوچھو کہ مشرقی پاکستان کی کیا صورتِ حال ہے؟"

غالباً کنٹرول میں اس کی آواز سن لی گئی "صورتِ حال اب کیا ہو گی۔ پوری طرح ہمارے کنٹرول میں ہے۔"

"کیا مطلب؟" غالب نے مائیکروفون لے لیا۔

"مطلب یہ کہ اب کوئی مشرقی پاکستان نہیں۔ بنگلہ دیش ہے۔" اس نے بڑی مسرت، جوش اور جذبے کے ساتھ کہا۔

"اچھا! کیا مزاحمت ختم ہو گئی؟"

"معلوم ہوتا ہے سر کہ آپ فلم سازی کے چکر میں حالاتِ حاضرہ سے بالکل بے خبر رہے ہیں۔ اخبار وغیرہ تک نہیں پڑھتے۔"

"ہاں۔ کچھ ایسی ہی مصروفیت رہی....."

"مزاحمت عملاً ختم ہو چکی ہے سر.... کہیں کہیں مقامی جھڑپوں کا سلسلہ ہے۔ اصل جنگ ڈھاکا کے آس پاس تھی۔ وہاں محاصرہ بہت تنگ ہو گیا ہے۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ باقی دنیا کیا کر رہی ہے آخر اور اقوامِ متحدہ....."

وہ قہقہہ مار کے بولا "دنیا بھی تماشا دیکھ رہی ہے سر اور اقوامِ متحدہ بھی۔ ہمارے معاملے میں کون دخل دے گا۔ یہ سب تو پہلے سے طے تھا۔ ڈھاکا بھی آج شام تک خالی ہو جائے گا۔ ہماری بہادر سینا نے ملبہ کر دیا......"

کنٹرول ٹاور میں بیٹھا ہوا کوئی قوم پرست ہندوستانی مزے لے لے کر مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بننے کی باتیں کر رہا تھا۔ اس کی آواز ہم تک ایک چھوٹے سے اسپیکر کے ذریعے پہنچ رہی تھی، جس کا تعلق پائلٹ کے ہیڈ فون سے ہوتا ہے۔ اس کی آواز میرے دل

کے زخموں پر نمک پاشی کررہی تھی۔ شکست کی اذیت سب کے چہروں سے عیاں تھی اور پائلٹ یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ وہ حیران تھا کہ اس میں دکھ یا پریشانی کی کون سی بات ہے۔ خود اس کے لئے بھی یہ اچھی خبر تھی۔

آخر کار میرے ضبط کا حوصلہ جواب دے گیا۔ میں نے مائیکروفون اس کے ہاتھ سے چھین کر آف کر دیا "بند کرو اپنی بکواس۔ اور چلو۔"

وہ بھونچکا رہ گیا "تم...... ہندی جانتے ہو؟"

"میں سب کچھ جانتا ہوں" میں نے اپنا ریوالور نکال لیا۔ "لیکن تم کچھ نہیں جانتے۔"

پائلٹ کی نظر ریوالور پر جم گئی "یہ..... یہ سب کیا ہے؟ کون لوگ ہو آخر تم؟"

میں نے کہا "تمہارے لئے صرف مسافر۔ اس سے زیادہ جاننے کی کوشش بھی مت کرنا ورنہ....."

"ورنہ کیا؟ تم گولی مار دو گے مجھے؟" پائلٹ برہمی سے بولا "پھر کیا کرو گے؟ یہ زمین پر چلنے والی گاڑی نہیں ہے۔"

"یہ جہاز ایک پھر ہے" میں نے خطرناک لہجے میں کہا "اور میں جیٹ طیارے تک اُڑاتا رہا ہوں۔ امید ہے تم مجھے چیلنج نہیں کرو گے۔ میں تمہاری لاش اسی جگہ چھوڑ کر یہ ہیلی کاپٹر لے جا سکتا ہوں۔"

پائلٹ کا رنگ اُڑ گیا تھا۔ اس نے اقرار میں سر ہلایا اور بولا۔ "تم یہ بھی جانتے ہو گے کہ بین الاقوامی قوانین......"

"اچھی طرح جانتا ہوں میں تمام بین الاقوامی قوانین کو۔" میں نے دہاڑ کر کہا "کیا ان قوانین پر کسی نے مشرقی پاکستان میں عمل ہونے دیا؟ ساری اخلاقی اور سیاسی اقدار کا جنازہ نکل گیا....."

غالب نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا "اس بچارے کی تو کوئی غلطی نہیں تھی اس میں۔"

"پھر اس سے کہو کہ فضول بھونکنے کی غلطی نہ کرے" میں نے ریوالور جیب میں ڈال لیا۔

ہیلی کاپٹر کے پائلٹ پر اب تمام صورتِ حال روشن ہو چکی تھی چناں چہ اس کی نظروں میں دنیا اندھیر ہو گئی تھی۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ وہ سیاسی دہشت گردی کا شکار ہو چکا ہے اور ہم اسے ہائی جیک کر کے لے جارہے ہیں۔ عقلمندی سے کام لیتے ہوئے اس نے ہیڈ فون سر پر چڑھایا اور ہیلی کاپٹر کو اسٹارٹ کیا۔ ہمارے سر کے اوپر ایک بہت بڑا پنکھا تیزی سے گھومنے لگا۔ پھر ہیلی کاپٹر ایک جھٹکے سے اوپر اٹھا۔ پائلٹ نے کنٹرول کو روانگی کی اطلاع دی اور پھر مائک آف کر دیا۔

اب ہم فضا کی بیکراں وسعت میں محوِ پرواز تھے اور اوپر سے زمین کو کسی پرندے کی آنکھ سے دیکھ رہے تھے۔ انجانی بستیاں، گھنے جنگل، ویرانے، ندی نالے گزرتے جارہے تھے۔ کبھی اچانک سیاہ فیتے کی طرح زمین پر پھیلی ہوئی سڑک نظر آجاتی تھی جس پر چلنے والی گاڑیاں کھلونوں کی طرح لگتی تھیں۔

میں ہیلی کاپٹر کے ڈائل پر اس کی بلندی، ہوا کا دباؤ، رفتار اور بہت کچھ دیکھ سکتا تھا لیکن اس ہوائی راستے کو نہیں دیکھ سکتا تھا جس پر ہم پرواز کررہے تھے۔ زمین کے راستوں کی طرح فضا میں بھی ہوائی جہازوں کے لئے مخصوص خطوط پر سفر کرنا لازمی ہے مگر ان نظر نہ آنے والے خطوط کو صرف پائلٹ سمجھتا ہے۔ میں نے جھوٹ بولا تھا کہ میں پرواز کا تجربہ رکھتا ہوں لیکن میرے جھوٹ کے پُراعتماد انداز نے پائلٹ کو شک میں مبتلا نہیں ہونے دیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ غلط سمت میں پرواز کر کے اپنی جان گنوانے کی حماقت نہیں کر سکتا۔ صحیح سمت کا کچھ اندازہ میں سورج سے بھی کر سکتا تھا جو اَب ڈھلنے لگا تھا چناں چہ اب ہمیں سورج کو اپنے پیچھے رکھتے ہوئے آگے بڑھنا تھا۔ سورج ہماری طرف آرہا تھا اور ہم سورج کی طرف جارہے تھے، یوں وقت کی رفتار بڑھ گئی تھی۔ ساناز اور اگروال بیٹھے بیٹھے سو گئے تھے۔

شام ساڑھے چار بجے پائلٹ نے ہم سے کہا "اپنی اپنی گھڑیاں آدھا گھنٹا آگے کرلیں۔"

میں نے کہا "یہ مقامی وقت ہے؟"

پائلٹ نے سر ہلایا "کلکتہ پہنچ کر گھڑیوں کو پھر آدھا گھنٹا بڑھانا ہوگا۔"

"اس وقت ہم کہاں ہیں؟"

"جبل پور قریب ہے۔ مجھے یہاں سے فیول لینا ہوگا۔"

میں نے کہا "اس میں کتنا وقت لگے گا؟"

"تقریباً ایک گھنٹا" پائلٹ نے کہا۔

"مجھے امید ہے کہ تم کوئی ناخوشگوار صورتِ حال پیدا نہیں ہونے دو گے" میں نے کہا۔

"اور مجھے امید ہے کہ اس سفر کے بعد تم مجھے واپس جانے دو گے۔ میری آتما کو پرلوک کے سفر پر روانہ نہیں کرو گے۔ اسی امید پر میں تم سے پورا تعاون کررہا ہوں۔ اور یہ بھی وعدہ کرتا ہوں کہ...... جو کچھ ہمارے درمیان ہوا .... اس کا کسی سے تذکرہ نہیں کروں گا۔"

"یہ بھی تمہارے مفاد میں ہے" میں نے کہا "بات صرف حال کی نہیں۔ مستقبل کے تحفظ کی ہے۔"

"مجھے اپنے بچوں کے مستقبل کے تحفظ کی فکر نہ ہوتی تو شاید میں اتنا مجبور اور کمزور ثابت نہ ہوتا۔" اس نے ایک آہ بھری۔

"زندگی نے ایسی ہی مجبوریوں کی بیڑیاں ہم سب کو پہنا رکھی ہیں" میں نے اس سے اتفاق کیا۔

غالب نے کہا "یہ دنیا پہلے ہی مختصر تھی۔ اب فاصلے اتنے گھٹ گئے ہیں کہ آج کہیں پیچھے رہ جانے والا کل کہیں بھی پھر مل سکتا ہے۔"

"مثلاً ہم؟" میں نے کہا "ارادہ تو نہیں رکھتے کہ پھر تم سے ملیں مگر یہ ناممکن نہیں ہے۔ ہم گمنام لوگ ہیں۔ تم ایک نام پتا رکھتے ہو۔"

پائلٹ نے کہا "اسی لئے میں ڈرتا ہوں۔ میں یہ مان رہا ہوں کہ تم ایک فلم ساز ادارے کے نمائندے تھے۔ تم کو نیپال جانا تھا مگر پھر تمہارا پروگرام بدل گیا اور تم کلکتہ چلے گئے۔ بس۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ میں اب جہاز کو نیچے اتار رہا ہوں۔"

"ضرور اتارو۔ بس یہ مت بھولنا کہ ہم مسلح ہیں۔"

اس نے افسوس سے سر ہلایا "تم اعتبار کرنا نہیں جانتے۔"

"ہم باتوں سے مار نہیں کھاتے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ تم ہمارا اعتماد حاصل کرلو اور پھر دھوکا دو" میں نے کہا "تم اپنی بات کا ثبوت اپنے عمل سے دو گے۔"

مجھے کوئی جواب دیے بغیر وہ کنٹرول ٹاور سے مخاطب ہو گیا اور چند منٹ بعد اسے لینڈ کرنے کی اجازت مل گئی۔ یہ ایک پرائیویٹ ائرفیلڈ تھا جس پر بہت سے چھوٹے بڑے طیارے کھڑے ہوئے تھے۔ بعد میں پائلٹ نے مجھے بتایا کہ یہ جبل پور کی آرڈیننس فیکٹری کا ہوائی اڈہ تھا جو بعد میں سول ایوی ایشن کو دے دیا گیا۔

"جب تک جہاز میں فیول بھرا جائے گا اور ضابطے کی کارروائی ہوگی، اس وقت تک ہم کیا کریں گے؟" نازو نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے پائلٹ کی طرف دیکھا "کیا ہم یہیں بیٹھے رہیں گے؟"

"میں ریفرشمنٹ لوں گا" وہ بولا "آپ لوگ بھی چاہیں تو ریسٹورنٹ میں کچھ کھا پی سکتے ہیں۔ بہت اچھا ریسٹورنٹ ہے۔"

"ہم..... یہیں انتظار کریں گے" اگروال نے کہا "میں کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا۔"

"خطرہ تو ہم بھی مول نہیں لے سکتے" میں اس کی بات پر سوچ میں پڑ گیا "اس مرحلے پر کوئی ایسی ویسی بات نہ ہو جائے۔"

"گاڑی لے کر تو آدمی بھاگ جاتا ہے۔ ہیلی کاپٹر کے ساتھ فرار کی کوشش کا بھی تصور نہیں" غالب نے کہا۔

"مسٹر پائلٹ، کیوں نہ ریفرشمنٹ یہاں منگوائے جائیں؟" میں نے کہا۔

"اترنا تو مجھے پڑے گا" وہ زِچ ہو کر بولا "لاگ بک میں انٹری ہوگی اور مجھے سائن بھی کرنے ہیں۔ فیول اور لینڈنگ چارجز ادا کر کے رسید لینی ہے۔ اس کے لئے کوئی یہاں نہیں آئے گا۔"

"پھر تو مجبوری ہے۔ چلو میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔" میں نے کہا۔

پائلٹ نے مجھے ناگواری سے دیکھا مگر خاموش رہا۔ میں ایک ہاتھ جیب میں ڈالے اس کے ساتھ ساتھ ایپرن پر چلتا رہا۔ میرے اس ہاتھ کی گرفت میں ریوالور تھا لیکن میرا رویّہ انتہائی دوستانہ تھا۔ اس نے پہلے کاغذی کارروائی مکمل کی۔ پھر ادائیگی کر کے فارغ ہوا تو ہم ریسٹورنٹ میں گئے۔ ہر جگہ اس نے میرا تعارف فلم ساز کی حیثیت سے کرایا اور میں نے فرنچ میں خوش خلقی اور انکساری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ افسوس میں انگریزی سے نابلد ہوں۔ صرف پائلٹ جانتا تھا کہ یہ جھوٹ ہے اور وہ ہندی میں بھی سچ نہیں بول سکتا۔ لوگ مجھ سے ملتے تھے تو بڑے متاثر نظر آتے تھے اور میرے وحشیانہ حلیے کو اس لئے نظر انداز کر دیتے تھے کہ ان کی نظر میں ایک جینئس اپنی وضع قطع میں رسوم و قیود سے بالاتر ہوتا ہے۔

تاہم ایک جگہ قسمت نے مجھے بچا لیا۔ ریسٹورنٹ کا مینیجر کسی زمانے میں "ائر فرانس" میں اسٹیورڈ کی حیثیت سے خدمات انجام دے چکا تھا چناں چہ فرنچ بھی جانتا تھا اور فرانس بھی دیکھ چکا تھا۔ زمانۂ طالب علمی میں محسن کے ساتھ میں ہر ویک اینڈ پر برٹش چینل کراس کر کے پیرس چلا جاتا تھا اور چار سال کے عرصے میں ہم نے فرانس کے علاوہ جرمنی، آسٹریا، ہالینڈ اور سوئٹزر لینڈ کی بھی خوب سیاحت کی تھی۔ ان یورپی ممالک کے درمیان ویزے کی قید نہیں تھی چناں چہ ویک اینڈ پر دو دن کی چھٹی میں ہزاروں گاڑیوں میں لوگ اِدھر سے اُدھر آتے جاتے رہتے تھے۔ یہی تجربہ میرے کام آیا۔

مینیجر نے پہلے تو مجھے اپنی فرنچ سے امپریس کیا اور پھر فلم سازی کے موضوع پر آگیا۔ اس نے باقی سب لوگوں کے لئے چائے، کافی اور کھانے پینے کا سامان ہیلی کاپٹر میں بھیج دیا تھا مگر خود ہمارے ساتھ شریک ہو گیا تھا۔ اس نے مجھے اپنے ہی کمرے میں مدعو کر لیا تھا۔ اب پائلٹ احمق بنا بیٹھا تھا۔ اس کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آرہی تھی۔

مینیجر نے مجھ سے بہت کچھ پوچھا۔ "فرانس میں میرا قیام کہاں ہے۔ میں نے کتنی فلمیں بنائی ہیں۔ ان فلموں میں کسے کاسٹ کیا تھا۔ اور میرے تعلقات فلمی صنعت میں کس کس سے ہیں۔ اس نے صوفیہ لارین اور برجی باردت کے حوالے سے ایسے ذاتی سوالات کئے جن کا جواب نہ اثبات میں دیا جا سکتا تھا اور نہ انکار میں۔

میں بڑے سکون سے اس باتونی شخص کو بھگت رہا تھا اور پوری کوشش کررہا تھا کہ باتوں کے ساتھ ساتھ منہ بھی چلتا رہے۔ میری نظر ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہوئے دوسرے لوگوں پر بھی تھی۔

اچانک مینیجر نے کہا "کیا تم انڈین ہو؟"

میں نے چونکے بغیر کہا "انڈین؟...... میں فرنچ ہوں۔"

"نیشنلٹی لی ہوگی تم نے۔ یا تمہارے والدین نے۔ تم پیدائشی طور پر فرنچ ہو گئے۔"

"میں اس سوال کا مقصد نہیں سمجھا۔"

"مقصد کچھ نہیں۔ تم نسلاً یورپی نہیں ہو۔ تمہارا تعلق اسی علاقے سے رہا ہوگا۔ تمہارا لہجہ بھی یہی بتاتا ہے۔"

میں نے اعتراف کیا "بالکل صحیح اندازہ ہے تمہارا۔"

"مجھے تمہاری صورت بھی دیکھی ہوئی لگتی ہے" مینیجر اپنے

اندازے کی پہلی کامیابی پر مسرور ہو کے بولا "کہیں ایسا تو نہیں کہ تم نے فلمسازی سے پہلے اداکاری کی ہو۔ اسکرین کے سوا کہاں دیکھ سکتا تھا میں....."

میں نے کافی کا آخری گھونٹ حلق سے اتارا اور کھڑا ہوگیا۔ "یہ بھی بالکل ٹھیک ہے۔ مگر وہ فلمیں ایسی نہیں تھیں کہ انڈیا میں ان کی نمائش کی جائے۔ کچھ ڈاکومنٹری تھیں۔ یا آرٹ مووی....."

پائلٹ میرے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا تھا اور بل کی ادائیگی کرنے کے موڈ میں تھا لیکن مینجر نے بڑے اصرار کے ساتھ انکار کیا۔

"آپ مہمان تھے میرے۔ میری خوش قسمتی....."

اسی وقت ایک ویٹر نمودار ہوا جو ہیلی کاپٹر میں اشیائے خورونوش لے کر گیا تھا۔ اس نے مینجر کے کان میں کچھ کہا۔

"کیا..... اگروال....." مینجر نے چونک کر کہا "تمہارا دماغ خراب ہے یا نظر....."

"سر، آپ خود چل کر دیکھ لیں" ویٹر نے بڑے یقین کے ساتھ کہا "اخبار کی تصویر سے ملا لیں۔"

اب پائلٹ نے میری نظر کا اشارہ پا کے کہا "کیا بات ہے مینجر صاحب۔"

"سر..... اس ہیلی کاپٹر میں ..... اور کون ہے؟" ویٹر نے کہا۔ "مجھے شک ہے....."

"کیا شک ہے....." پائلٹ نے تیز لہجے میں کہا۔

"شک..... یہ ہے کہ ڈاکو اگروال اس میں موجود ہے" ویٹر نے بے خوفی سے کہا "شک کیا یقین ہے۔"

"ڈاکو اگروال کون ہے؟" پائلٹ نے خفگی سے کہا "اور اس کا میرے ہیلی کاپٹر پر کیا کام۔"

اب مینجر نے ایک اخبار اٹھا کے پائلٹ کے سامنے رکھ دیا۔ "یہ اس شخص کی بات کر رہا ہے۔ کہتا ہے اس نے خود دیکھا ہے۔"

پائلٹ کی نظریں تصویر پر جم گئی تھیں اور وہ اخبار میں دیے گئے سرکاری اشتہار کا متن پڑھ رہا تھا۔ میں اس کی صورت پر رونما ہونے والے تغیرات کا مشاہدہ کر رہا تھا اور یہ طے کرنے سے قاصر تھا کہ اب مجھے کیا قدم اٹھانا چاہئے۔ پائلٹ کو موقع دینا چاہئے کہ وہ خود صورت حال سے نمٹ لے اور اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرے۔ وہ اقرار کرتا تو اس جرم میں اپنے ملوث ہونے کا اعتراف کرتا، بعد میں اس کے لئے سخت مشکلات پیدا ہو جاتیں۔ اسے ڈاکو اگروال کے فرار کی سازش میں شریک سمجھا جاتا اور وہ کبھی ثابت نہ کر پاتا کہ اس کا ڈاکو اگروال سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ نہ اس نے اگروال کو اس ہیلی کاپٹر میں نکال لیجانے کا بھاری معاوضہ وصول کیا تھا۔ وہ تو اگروال کو پہچانتا بھی نہیں تھا۔ پولیس یہ سب نہ مانتی اور اس سے سب کچھ منوالیتی۔ اس کی نوکری بھی جاتی اور جیل جانے سے بچنے کے چکر میں وہ کنگال ہو جاتا۔ یہ جرم اتنا سنگین تھا کہ پولیس اس کے ساتھ سارے خاندان کو تفتیش میں شامل کر لیتی اور اسے یقیناً معلوم تھا کہ ایسے معاملات میں زیرِ تفتیش افراد کا کیا حشر کیا جاتا ہے۔

پائلٹ نے فوراً خود کو سنبھال لیا "تم نے ٹھیک کہا تھا، اس شخص کی آنکھیں بھی خراب ہیں۔"

"سر! ایسی بات مت کریں۔"

"شٹ اپ۔ اپنے جہاز کے مسافروں کو تم سے بہتر میں جانتا ہوں؟" پائلٹ نے اخبار پھینک دیا "یہ کوئی اور شخص ہے۔"

"یہ وہی شخص ہے" ویٹر اڑ گیا "اسی لئے وہ نیچے نہیں اترا۔"

"نیچے تو کوئی بھی نہیں اترا۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے مسافر ہیں۔ تین عورتیں ہیں۔ ایک یہ ہیں۔ ان کے دوسرے ساتھی ہیں۔"

"پھر وہ کس کا ساتھی ہے؟"

اب میں نے مداخلت کی۔ میں نے فرنچ میں کہا "آخر یہ کیا شور ہے؟ کس بات پر بحث کر رہے ہیں آپ سب لوگ؟"

مینجر نے اخبار مجھے دکھا کے کہا "اس ویٹر نے اپنی آنکھوں سے ڈاکو اگروال کو ہیلی کاپٹر میں دیکھا ہے۔"

میں نے حیران ہو کے کہا "ڈاکو..... یہ کیا بکواس ہے۔ وہ سب میرے ساتھی ہیں، میری مدد کر رہے ہیں۔ جہاز میں نے چارٹر کیا ہے۔"

مینجر نے سر کھجا کے کہا "اچھا..... اگر میں خود ان سب سے مل کر تصدیق کر لوں....."

"اس کے لئے تم کو پائلٹ کی اجازت کی ضرورت ہوگی۔ تم تلاشی لینے کے مجاز نہیں۔ اس سے بات کرو" میں نے کہا۔

مینجر نے پائلٹ کی طرف دیکھا "میں خود دیکھوں گا۔"

"تم کون ہوتے ہو" پائلٹ بگڑ گیا "کیا قانونی اختیار ہے تمہارے پاس۔ تم ایک ریسٹورنٹ کے مینجر ہو۔ پولیس افسر نہیں۔"

"جب تمہیں یقین ہے کہ وہ اگروال نہیں تو پھر ڈرتے کیوں ہو؟" مینجر نے کہا۔

"ڈرتا کون الو کا پٹھا ہے۔ یہ میری عزت کا سوال ہے۔ اگر میں اس وقت تمہارے گھر میں گھس کر چوری کا مال برآمد کرنے کی کوشش کروں تو تم مجھے اجازت دوگے؟ میں بھی کہہ سکتا ہوں کہ مجھے مصدقہ ذرائع سے اطلاع ملی ہے۔ تم اتنا سنگین الزام عائد کر سکتے ہو مجھ پر؟ اور میرے مقابلے میں ایک ویٹر تمہارے لئے زیادہ قابلِ اعتبار ہے؟ یہ انسلٹ ہے میری۔"

"نہیں یار، ایسی کوئی بات نہیں۔"

"گولی مارو یار کو۔ میں یار نہیں ہوں تمہارا۔ ایک ذمے دار پائلٹ ہوں۔ اس کے علاوہ تم کو یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ تمہاری ایک احمقانہ حرکت سے کتنے مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ یہ ایک غیر ملکی فلم ساز ادارے کی چارٹر فلائٹ ہے۔"

"مجھے تو اس کے بھی غیر ملکی ہونے میں شک ہے" مینجر مجھے

دیکھ کر بولا۔

"شک ہے تو پھر بلا لو پولیس کو۔ بعد میں خود بھگتنا جب سفارت خانے والے آجائیں گے اور یہ معاملہ پہنچ جائے گا بہت اوپر۔ وزارتِ خارجہ اور داخلہ تک۔ یہ سرکاری مہمان ہیں مینجر صاحب۔ ان کے ساتھ پنگا مت لو۔"

یکلخت مینجر کو احساس ہو گیا کہ اپنی حدود سے تجاوز کر کے وہ مصیبت میں پڑ سکتا ہے۔ وہ محض شک کی بنیاد پر اتنا بڑا قدم اٹھانے سے ڈر گیا۔ اس نے ویٹر کو جھاڑا۔

"چلو اپنا کام کرو۔ اگروال کی اولاد....."

"سر..... وہ اگروال نہیں تو پھر اس کا جڑواں بھائی ضرور ہے۔" ویٹر نے طنز آمیز تمسخر کے ساتھ کہا "آپ خود دیکھ لیتے....."

"دفع ہو جاؤ" مینجر نے گرج کے کہا "مت دیکھا کرو اتنی فلمیں کہ ہر جگہ فلمی اتفاق نظر آنے لگے۔ پاگل ہو جاؤ گے۔"

ظاہر ہے کہ ویٹر پاگل نہیں تھا۔ یہ اس کی نظر کا بھی قصور نہیں تھا اور کوئی فلمی اتفاق بھی نہیں تھا۔ لیکن ایک پائلٹ اور ایک فرنچ بولنے والے کے سامنے اس کی کیا اوقات تھی۔ وہ غیر معتبر ٹھہرا اور دھتکارا گیا۔ ہم مینجر کی معذرت قبول کر کے اور اس کی میزبانی کا شکریہ ادا کر کے روانہ ہو گئے، تاہم اب میرے دماغ میں خطرے کی لال بتی روشن ہو گئی تھی اور میرا سارا اطمینان رخصت ہو گیا تھا۔ میں یہ سوچنے پر مجبور تھا کہ اگر بعد میں اس شوریدہ سر ویٹر نے مینجر کو قائل کر لیا کہ وہ اپنے یقین میں کس حد تک حق بجانب تھا تو عین ممکن ہے مینجر اپنے شک سے پولیس کو آگاہ کر دے۔ قانون کی مدد کے لئے شک کا اظہار کوئی جرم نہیں سمجھا جا سکتا۔ اسے بے جا الزام تراشی نہیں قرار دیا جا سکتا اور نہ ہتک عزت۔

میں نے ہیلی کاپٹر کے پرواز کرتے ہی اپنے خدشات سے غالب کو اور اگروال کو آگاہ کیا۔

اگروال گالیاں بکنے لگا "مجھے بھی اس ویٹر کی باتوں نے شک میں ڈال دیا تھا۔"

سانولی نے سپاٹ لہجے میں کہا "اسے واپس جانے ہی نہیں دینا چاہئے تھا۔ تم نے میری بات نہیں مانی۔"

"اسے ہم کیسے روک سکتے تھے؟" نازو نے کہا۔

"اسے مہمان بنا کے رکھنا ضروری نہیں تھا۔ جہاز کے اڑتے ہی ہم اسے کہیں بھی گرا دیتے۔ شہر سے باہر کسی جنگل میں۔"

"اس سے ہم زیادہ مصیبت میں پڑتے" نازو نے کہا۔

"یہ بحث مت کرو۔ سوچو کہ اب کیا ہوگا۔"

پائلٹ نے ہیڈ فون اتار کے رکھے اور پلٹ کے بولا۔ "تمہارے ساتھ کیا ہوگا۔ جو ہوگا میرے ساتھ ہوگا۔ تم سب تو عادی اور پیشہ ور مجرم ہو۔ جیب کاٹنا یا گلے کاٹنا۔ اور پھر جیل کاٹنا سب آسان کام ہے تمہارے لئے۔ مارا تو میں گیا۔ مجھے بھی تمہارا ہی ساتھی سمجھ لیا جائے گا۔"

"کیا تم اپنی بے گناہی ثابت نہیں کر سکتے؟" اگروال بولا۔

"ثابت؟ ثابت تو سب بعد میں ہوگا۔ پہلے تو میری ہڈیاں چکنا چور کر دے گی پولیس۔ میری کھال میں بھس بھر دے گی کہ تم نے اگروال کو فرار میں مدد دی۔ کتنا پیسہ لیا اور کہاں ہے وہ پیسہ۔ میرا کیریئر تباہ ہو جائے گا۔ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا، جب اخبار میں میرے نام کے ساتھ میرے کارنامے کا ذکر آئے گا۔ میرا گھر برباد ہو جائے گا" پائلٹ غم و غصے کے جذبات سے اتنا مغلوب تھا کہ رونے کے قریب ہو گیا تھا۔

میں نے کہا "فکر مت کرو۔"

"اور کیا کروں۔ خودکشی کر لوں؟" وہ چلّانے لگا "میرے ساتھ دھوکا ہوا۔ میں نے زندگی میں کبھی کوئی کام خلافِ قانون نہیں کیا تھا۔ کتنا سنگین الزام آ گیا مجھ پر۔ تم نے جھوٹ بول کے ہیلی کاپٹر حاصل کیا اور زبردستی کی میرے ساتھ۔ تم سب....."

میں نے دہاڑ کے کہا "بکواس بند کرو اپنی اور میری بات سنو۔ مجھے احساس ہے کہ تم پر بلاوجہ مصیبت آ سکتی ہے لیکن ابھی تک کچھ ہوا نہیں ہے۔ پھر یہ قبل از مرگ واویلا کس لئے؟ تمہیں الزام سے بچا لیں گے ہم۔"

"مگر کیسے؟" وہ فریادی لہجے میں بولا۔

"کنٹرول ٹاور سے بات کرو" میں نے کہا "ان کو بتاؤ کہ تمہارے ہیلی کاپٹر کو اگروال اور اس کے ساتھیوں نے ہائی جیک کر لیا ہے۔ انہوں نے دھوکے سے جہاز کو چارٹر کیا تھا اور تمہیں کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ مسافر کون ہیں۔ پھر اگروال نے ریوالور نکال لیا۔"

"میرا نام لینے کی ضرورت نہیں" اگروال نے کہا۔

"بکو مت۔ ہم سب کے بچنے کی یہی ایک صورت ہے۔"

"مجھے مروا کے؟" وہ چیخ کر بولا۔

"تم تو ویسے بھی مرنے والے تھے۔ اب زندگی کے دوسرے چانس کو اپنی بے وقوفی سے ضائع مت کرو" میں نے کہا "ورنہ میں تمہیں مار کے نیچے پھینک دوں گا۔ تمہیں بھی اور تمہاری اس پاگل محبوبہ کو بھی جس نے اپنی عزت، آبرو اور زندگی سب تمہاری خاطر داؤ پر لگا دی ہے۔ اس سے ہمیں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ دنیا کو بھی تم جیسے شخص کے اس انجام پر افسوس نہیں ہوگا۔ خوشی ہوگی۔ اور اس سے ہمارا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ اس کے بعد کوئی ہمارے پیچھے نہیں آئے گا۔ تمہاری لاش مل جائے گی اور ہیلی کاپٹر کا پائلٹ ہمیں کہیں بھی چھوڑ کے واپس چلا جائے گا۔ یہ بتانے کے لئے کہ کس طرح اپنی بہادری، حاضر دماغی اور پھرتی سے کام لیتے ہوئے اس نے ڈاکو اگروال کو موقع پاتے ہی نیچے دھکیل دیا۔ جو عورت اس کے ساتھ تھی وہ خود ہی اس کے پیچھے کود گئی۔ پھر پائلٹ

کو سزا نہیں ملے گی' انعام ملے گا۔ اس کی بدنامی نہیں ہوگی' عزت افزائی ہوگی۔ ہر جگہ تعریف ہوگی۔ یہی ایک طریقہ ہے جس میں تمہارے سوا ہم سب کے لئے تحفظ اور سلامتی کی ضمانت ہے۔ مجھے مجبور مت کرو کہ میں ایسا ہی کروں۔"

سانولی کی آنکھوں میں خوف کے ساتھ مجھ سے نفرت کے جذبات اتر آئے تھے "آخر تم کیا کرنا چاہتے ہو؟"

پائلٹ کا ردِعمل اس کے برعکس اطمینان کا تھا اگر اگروال جیسے ڈاکو کا ڈر نہ ہوتا تو وہ اصرار کرتا کہ میں ایسا نہیں کروں۔ اس نے بے بسی سے کہا "میں کسی کا دشمن نہیں ہوں۔ اور نہ مجھے قانون اور فرض کی خاطر اپنی جان قربان کرنے کا شوق ہے۔ مجھے معلوم ہے یہاں اس کا کسی کو صلہ نہیں ملتا۔ مرنے والا مرجاتا ہے۔ رونے والوں کو ایک میڈل دے کر سب بھول جاتے ہیں۔ بعد میں کہتے ہیں کہ وہ بے وقوف تھا جس نے ملک و قوم' اصول اور انسانیت کے لئے جان دی۔"

"ٹھیک ہے مسٹر پائلٹ۔ تمہاری جان کو کچھ نہیں ہوگا" میں نے کہا "اب تم کنٹرول ٹاور سے رابطہ کرو اور میری ہدایات کے مطابق عمل کرو۔"

پائلٹ نے پھر جبل پور کے کنٹرول ٹاور سے مواصلاتی رابطہ بحال کیا اور انہیں فلائٹ کو ڈبتا کے اپنی پوزیشن سے آگاہ کیا۔

"ہیلو کنٹرول' میں بہت مشکل میں پڑ گیا ہوں۔"

"کیا بات ہے؟ انجن میں خرابی ہو گئی ہے کوئی؟"

"نہیں۔ تقدیر کی خرابی ہے۔"

"پھر بھگوان سے رجوع کرو۔"

میں نے لہجہ اور آواز بدل کے کہا "ڈائیلاگ مت بول۔"

"یہ..... یہ کون ہے؟" کنٹرول نے کہا۔

"یہ ڈاکو اگروال ہے" پائلٹ نے خوف زدہ لہجے میں کہا "جو کل جیل سے فرار ہو گیا تھا۔"

"اس کو بتادے کہ اگروال کو پھانسی نہیں دی جاسکتی" میں نے غرّا کے کہا "اگروال موت کو بھی شکست دے سکتا ہے۔"

"گڈ گاڈ۔ یہ اگروال ہے..... یہ تمہارے ہیلی کاپٹر میں کیسے پہنچا؟" کنٹرول سے بات کرنے والا بدحواس ہو کے بولا۔

"بتادے اسے کہ اگروال کہیں بھی پہنچ سکتا ہے" میں نے اونچی آواز میں کہا۔

پائلٹ نے کہا "دیکھو..... اگروال نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے ہیلی کاپٹر لیا تھا۔ فرضی نام سے۔ میں تو اسے نہیں پہچانتا تھا۔ پرواز کے بعد انہوں نے مجھے مجبور کیا کہ میں فلائٹ شیڈول بدل دوں۔ نیپال کے بجائے کلکتہ چلوں۔ میں کیا کرتا!"

میں نے خوف ناک آواز میں کہا "ہماری مرضی کے خلاف کچھ کرتا تو تیری لاش بھی نہ ملتی۔"

"اگروال..... مسٹر اگروال..... آپ مجھے پائلٹ سے بات کرنے دیں" کنٹرول نے کہا "بڑی مہربانی ہوگی۔"

"میں مجبور تھا جبل پور میں اترنے پر۔ وہاں سے ابھی فیول لیا تھا میں نے" پائلٹ نے کہا۔

"اس وقت کیوں نہیں بتایا تھا تم نے....؟"

میں نے باڑ کے کہا "ہماری مرضی کے بغیر یہ ایک لفظ بھی بول سکتا تھا۔"

پائلٹ نے کہا "ان کا ایک آدمی میرے ساتھ تھا۔ اور وہ مسلح تھا۔"

میں نے کہا "ہمارے پاس دستی بم ہیں۔ اور مشین گن۔"

کنٹرول ٹاور سے بولنے والا خاصا پُرسکون آدمی تھا اور اس صورتِ حال سے نمٹنے کی کوشش میں کامیاب تھا "مسٹر اگروال! اگر آپ خود سب کچھ بتانا چاہتے ہیں تو مجھے بتادیں۔"

"ہاں۔ سب سن لو اچھی طرح" میں نے ڈاکو کے خطرناک لہجے میں کہا "اب ہم اسے پھر نیپال کی طرف لے جارہے ہیں۔ خبردار جو کسی نے ہمارا راستہ روکا۔ سب کو بتادو کہ ہم پائلٹ کو بھی گولی ماردیں گے اور جہاز بھی تباہ کردیں گے۔ پولیس کچھ نہیں بگاڑ سکتی ہمارا۔ ہم ہیلی کاپٹر کو جہاں چاہیں گے لے جائیں گے۔"

پائلٹ نے کہا "میں کچھ نہیں کرسکتا۔ مجھے نیپال کے لئے کلیئرنس چاہئے۔ راستے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ ان کی ہر مانگ پوری کی جائے۔ ورنہ یہ مجھے مارڈالیں گے۔"

"تم فکر مت کرو۔ سب ٹھیک رہے گا" کنٹرول نے کہا۔

"ہمیں کوئی ائرپورٹ پر روکنے کی غلطی نہ کرے۔ ورنہ بہت لوگ ہلاک ہوں گے۔ اگروال ایسے ہاتھ نہیں آئے گا کسی کے۔" میں نے اسی لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے" کنٹرول نے کہا "ایمرجنسی میں کلیئرنس دی جارہی ہے۔"

"میں پھر درخواست کرتا ہوں کہ کسی قسم کی مداخلت نہ کی جائے ورنہ میں مارا جاؤں گا" پائلٹ بولا "ضرورت پڑنے پر میں رابطہ کروں گا۔"

جب اس نے مائکروفون بند کیا تو میں نے کہا "گڈ۔ تم میری توقع سے زیادہ سمجھدار ثابت ہورہے ہو۔"

"میرا خیال ہے کہ تم نے بلف کھیلا ہے۔ تم نیپال کی طرف جانا نہیں چاہتے" پائلٹ نے کہا۔

"رائٹ۔ ہم اپنی منزل نہیں بدلیں گے۔ تم ہیلی کاپٹر کا رخ کلکتہ کی جانب رکھو اور ہمیں پوزیشن بتاتے جاؤ" میں نے کہا۔

"اب اندازاً کتنا سفر باقی ہے؟"

اس نے گھڑی دیکھی اور پھر ایک چارٹ پر نظر ڈال کے بولا۔

"اگر ہم اسی رفتار سے چلتے رہے تو شاید چار پانچ گھنٹے میں ڈم ڈم پہنچ جائیں گے۔ کلکتہ کا ائرپورٹ ہے..... رات آٹھ بجے۔"

"اور اگر ہم رفتار بڑھادیں؟"

"ایک گھنٹا نکالا جاسکتا ہے۔ اس سے زیادہ نہیں۔ زیادہ رفتار پر فیول بھی زیادہ خرچ ہوگا۔ جتنا فیول ہمارے پاس ہے وہ کافی ہونا چاہئے ورنہ راستے میں کہیں اترنا پڑے گا۔"

میں نے کہا "نو۔ اب کہیں اترنے کا کوئی سوال نہیں۔"

اس کے بعد خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا جس میں ہم سب اعصابی کشیدگی میں مبتلا آسمان اور زمین کے نظاروں میں خطرہ دیکھتے رہے۔ وہ خطرہ جو بظاہر کہیں بھی نہ تھا مگر کسی لمحے کہیں سے بھی اچانک نمودار ہو سکتا تھا۔ اوپر پھیلے ہوئے نیلے آسمان پر تیرنے والے بادلوں میں سے۔ اُجلی دھوپ میں سے یا زمین کی نیالی اور سرسبز فضا میں سے۔ میں خلا کو دیکھ رہا تھا اور کچھ نہیں سوچ رہا تھا۔ سوائے تاریک امکانات کے۔ کہیں اچانک فوجی طیارے نہ نمودار ہوجائیں اور ہیلی کاپٹر کو نیچے اترنے پر مجبور نہ کردیں۔ اب تک فضا کی وسعت کو کھنگالنے والے دیکھ چکے ہوں گے کہ ہیلی کاپٹر کا رخ نیپال کی جانب نہیں ہے۔ پائلٹ کو زمین سے بھی نشانہ بنانے کی دھمکی دی جاسکتی ہے اور اترنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے۔ قانون کی طاقت اور اختیار رکھنے والے اس قسم کی صورتِ حال میں کیا کریں گے؟ کیا وہ ایک مفرور مجرم کو نکل جانے دیں گے جس نے نظامِ انصاف کے مضبوط حصار کو ریت کی دیوار سمجھ کر گرادیا ہے۔ یہ پورے نظامِ انصاف کے منہ پر طمانچہ تھا کہ وہ کسی ملزم سے زیادہ طاقتور نہیں ہے۔ اس سے حکومت کی عزت پر حرف آتا ہے۔ پھر کیا وہ ایک ہیلی کاپٹر اور ایک مجبور پائلٹ کو اپنی بالادستی قائم رکھنے کے لئے قربان کردیں گے۔ ایک آدمی اہم ہے یا ایک نظام کی شکست۔

شاید میری طرح غالب بھی خیالات کے دشت میں سرگرداں تھا۔ نازو اور گل اپنی اپنی امیدوں کے گلشن کو مایوسی کی خزاں اور بادِ سموم سے بچانے کی کوشش میں مصروف تھیں۔ وہ ماضی سے حال اور حال سے مستقبل کے راستوں پر گم کردہ راہ مسافروں کی طرح بھٹک رہی تھیں۔ اور سب کے خیالوں کا محور ایک ہی تھا۔ اب کیا ہوگا؟ کل کیا ہوگا؟ جو تھا نہیں ہے' جو ہے نہ ہوگا۔ وہ سب کہاں ہیں جو ہم سفر تھے' جو اپنی تقصیر سے بے خبر تھے۔ جو مٹ گئے ہیں غبار ہو کر' فریب راہ کا شکار ہو کر۔

میں نے محسوس کیا کہ اچانک ہم سب کی شخصیت کی دیواروں میں رخنے پڑ گئے ہیں۔ مایوسی اور عدم اعتماد کی بددلی اور احساسِ محرومی کے۔ ہم بدل گئے ہیں۔ ہم وہ نہیں رہے جو کبھی گردشِ ایام اور سختی حالات کی انتہا میں بھی یقین سے محروم نہیں ہوئے تھے۔ ستم ہائے روزگار اور گردشِ دوراں جن کے لبوں سے مسکراہٹ' انداز سے شوخی اور اطوار سے زندہ دلی نہیں چھین سکتی تھی۔ ہم بدترین مشکلات اور آزمائشوں کے حصار میں قید ہوجاتے تھے تب بھی ہنستے کھیلتے نظر آتے تھے۔ ہمارے دشمن اس شوخی گفتار سے چراغ پا رہتے تھے۔ ہمیں جو کر کہتے تھے اور دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتے تھے کہ ہم کس مٹی کے بنے ہوئے ہیں کہ پریشان ہونا ہی نہیں جانتے۔

لیکن اب شاید شکست نے ہمارے اعصاب کو توڑ دیا تھا اور ایک دوسرے کی رفاقت کا احساس بھی ہمارے دل سے احساسِ زیاں کو مٹانے میں ناکام تھا۔ ہم مستقبل میں روشنی دیکھنے کی صلاحیت سے محروم ہوگئے تھے یا وقتی طور پر اندھیرے کی پناہ لینے پر مجبور ہوگئے تھے۔ چناں چہ ہم سب خاموش تھے۔ نہ غالب کسی بہانے نازو کو چھیڑ رہا تھا۔ نہ نازو اس پر ادائے ناز سے مشقِ ستم کی خواہاں نظر آتی تھی۔ میں بھی رابعہ کے خیال اور اس کے تصور کی رعنائی سے بہت دور تھا اور وہ میری یادوں سے گریزاں تھی۔ شاید ایک گل تھی جس کے لئے وقت کے ہر لمحے کے ساتھ کم ہونے والا فاصلہ جذبات کی آتشِ شوق کو جگا رہا ہو۔ مجھے اس پر ترس آیا۔ کب سے وہ محسن کو مقصود و مطلوب بنائے خاموشی سے اپنی محبت کے ساتھ قید تنہائی کاٹ رہی تھی۔ وہ پہلے بھی مجبور تھی۔ آج اس کی مجبوری میں اذیت بھی شامل ہے۔ وہ محسن سے کیسے کہے گی کہ اب تو میرے اور تمہارے درمیان شہلا نہیں ہے۔ وہ ایسا سوچے گی تو خود اپنی نظر میں گر جائے گی۔ محبت کبھی اتنی خود غرض نہیں ہوتی۔ حقائق کتنے ہی تلخ کیوں نہ ہوں' جذبات کو شکست نہیں دے سکتے۔ گل اپنی شرمندگی کے باوجود اس خیال سے دامن نہیں چھڑا سکتی کہ اب وہ محسن کو اپنا سکتی ہے۔ اسے جیت سکتی ہے۔ شہلا کی یادوں کے جال سے نکال کے اپنی دنیا میں لاسکتی ہے۔

سات بجے کے قریب سورج غروب ہونے لگا تو میں نے نیچے دیکھا۔ منظر کچھ بدلا ہوا لگتا تھا۔ دور اُفق کے ساتھ ہی سمندر کی لکیر مل رہی تھی مگر نیچے زمین کا رنگ گہرا سبز ہو گیا تھا۔

"یہ خلیج بنگال ہے" پائلٹ نے میرے سوال کے جواب میں کہا۔

"گویا ہم بنگال کی سرحد کے قریب ہیں۔"

پائلٹ نے اقرار میں سر ہلایا تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ یہ سفر کسی کی مداخلت کے بغیر خیروعافیت کے ساتھ پورا ہو گیا تھا اور اب ہم اپنی منزل کی قربت کو محسوس کرسکتے تھے۔ اوپر کی پُرسکون فضا کو دیکھ کر یہ خیال ہی نہیں آتا تھا کہ نیچے زمین پر فساد جاری ہے اور سیاست کے شکاری' انسانوں کے خون سے تاریخ کا وہ باب لکھ رہے ہیں جو آنے والے وقت کے مؤرخ کو حیران کرے گا۔ یہ سب کیسے ہوا اور کیوں ہوا؟ اسلام کے نام پر متحدہ پاکستان کہلانے والے دو ملکوں میں کیسے بٹ گئے؟ مسلمانوں نے اپنے ہم وطن مسلمانوں کے خلاف ہتھیار کیوں اٹھائے؟ اس نفرت کا بیج کس نے بویا اور کس نے نفرت کی اس کھیتی کو پروان چڑھایا؟ ایسے اَن گنت سوال ہوں گے جن کا صحیح جواب کسی کے پاس نہیں ہوگا۔ جواب تو بہت ہوں گے تاویلیں بہت ہوں گی۔ اسباب و علل کی دنیا میں عقل کے گھوڑے دوڑانے والے ہر زاویے سے کوئی دلیل یا جواز

لے آتے ہیں مگر سچ جو صرف سچ ہوتا ہے اور کسی دلیل کا محتاج نہیں ہوتا، کبھی لکھا نہیں جاتا اور تسلیم نہیں کیا جاتا۔ تاریخ اس لئے سب سے زیادہ مظلوم ہے کہ اس کے ساتھ کوئی مؤرخ انصاف نہیں کرتا۔ غیر جانب داری سے واقعات کا ریکارڈ شاید صرف خدا کے پاس ہو گا۔

پائلٹ نے کہا "مجھے اب ڈم ڈم کنٹرول ٹاور سے کلیئرنس لے لینی چاہئے۔"

میں نے چونک کر کہا "نہیں۔ انہیں اطلاع دینے کی ضرورت نہیں۔"

پائلٹ نے پریشانی سے کہا "لیکن یہ وار زون ہے۔ ہم ریڈار سے چھپ نہیں سکتے۔ ہمیں اسپاٹ کرلیا گیا ہو گا۔"

میں نے کہا "جہاز کو نیچے لے جاؤ۔ جہاں تک ممکن ہو۔"

"یہاں" پائلٹ نے نیچے جھانکا "جنگل میں؟"

"کوئی صاف جگہ تلاش کرو" میں نے کہا "کوئی میدان یا کھیت۔ پلے گراؤنڈ۔"

ہیلی کاپٹر نیچے اتر آگیا۔ ابھی اندھیرا پوری طرح غالب نہیں آیا تھا مگر بلندی سے سطح زمین پر گہرے سائے پھیل چکے تھے۔ میں نے دوربین سے گردوپیش کا جائزہ لیا۔ پائلٹ بہت کم بلندی پر تھا اور جھک کر نیچے دیکھتے ہوئے موزوں جگہ تلاش کررہا تھا۔ میں نے بہت سے گاؤں دیکھے جن کے درمیان تالاب تھے یا جھیلیں اور ندی نالے تھے جو ان جھیلوں سے نکلتے تھے یا ان میں شامل ہو جاتے تھے۔ سڑکوں پر ٹریفک بہت کم تھی اور جگہ جگہ پل نظر آرہے تھے مگر ابھی تک اس علاقے میں نہ فوجی گاڑیاں نقل و حرکت کرتی دکھائی دی تھیں۔ نہ جنگ کے آثار..... نظر آئے تھے۔ کہیں سے دھواں نہیں اٹھ رہا تھا اور دھماکوں کی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔

اچانک مجھے گھنے درختوں کے ختم ہوتے ہی ایک ہموار قطعۂ زمین نظر آیا۔ میں نے پائلٹ کو دوربین دی اور اسے حکم دیا کہ وہ ہیلی کاپٹر کو اس جگہ اتارنے کی کوشش کرے۔ اسی وقت بڑی آواز کے ساتھ دو فوجی طیارے ہمارے اوپر سے گزرے۔ ان کی گھن گرج نے گل اور نازو کو دہشت زدہ کردیا۔

"جلدی کرو۔ ایسا نہ ہو، ہم سے کوئی شناخت کرانے کو کہے یا دشمن سمجھ کر نشانہ بنالے" میں نے کہا۔

ہیلی کاپٹر ایک دم نیچے آگیا۔ میں دوربین سے آس پاس کے علاقے کا جائزہ لے رہا تھا۔ میدان کے چاروں طرف کچے جھونپڑے دکھائی دے رہے تھے۔ ان میں رہنے والے گھروں سے نکل کے منہ اٹھائے آسمان کو دیکھ رہے تھے۔ ہموار قطعۂ زمین دھان کے کھیت تھے۔

پائلٹ نے کہا "ہیلی کاپٹر یہاں نہیں اتر سکتا۔"

"کیوں نہیں اتر سکتا؟" میں نے کہا۔

"اس کے پہیے کیچڑ میں دھنس جائیں گے۔ زمین نرم ہے اور اس میں پانی کھڑا ہو گا" پائلٹ نے کہا "تم ایسے ہی کود جاؤ۔ بلندی زیادہ نہیں ہے۔ میں ہیلی کاپٹر کو اسی جگہ رکھوں گا؟"

"لیکن۔ بیس پچیس فٹ سے ہم کیسے کود سکتے ہیں؟" میں نے کہا "اور یہ دو عورتیں.....؟"

"کچھ نہیں ہو گا" پائلٹ نے کہا "دھان کے کھیت اور نرم گیلی مٹی میں چوٹ نہیں آتی۔"

"موچ تو آسکتی ہے" میں نے کہا "کوئی اور جگہ دیکھو۔"

"اتنا وقت نہیں ہے" وہ چلّانے لگا "ابھی ابھی جو فوجی طیارے گزرے تھے انہوں نے بھی ہمیں دیکھ لیا ہو گا۔"

ہیلی کاپٹر اب فضا میں اپنی جگہ پر ٹھہرا ہوا تھا۔ اس کے اوپر والے پنکھے کے بلیڈ گھومنے سے تیز ہوا نیچے آرہی تھی اور وہاں کے پودوں میں لہریں سی اٹھ رہی تھیں۔

میں نے غالب کی طرف دیکھا تو اس نے تائید میں سرہلایا اور بولا "ہم یہ موقع گنوا نہیں سکتے۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے۔ چلو پہلے تم۔"

غالب نے ہیلی کاپٹر کے دروازے میں رک کر دیکھا اور پھر باہر چھلانگ لگادی۔ میں نے اسے وہاں کے کھیت میں سیدھا اترتے دیکھا۔ کیچڑ میں کودنے سے اس کے سب کپڑے خراب ہو گئے تھے مگر خود اسے نرم زمین کی وجہ سے جھٹکا نہیں لگا تھا۔ اس نے ہاتھ پھیلا کے اشارہ کیا۔

"ایک زنانہ بنڈل پھینک دو۔" اس نے چیخ کر کہا مگر میرے کانوں تک اس کی آواز انجن کی پھٹ پھٹ کے شور میں مشکل سے پہنچی۔

"چلو نازو۔ ہیرو نیچے بانہیں پھیلائے کھڑا ہے" میں نے کہا۔

"مجھے کیچ نہیں کر سکتا تمہارا ہیرو" نازو نے کہا اور بلا جھجک دروازے سے کود گئی۔ غالب واقعی اسے کیچ نہیں کرسکا کیوں کہ وہ غالب کے اوپر گری تھی پھر وہ دونوں دھان کے کھیت میں گرے تھے۔ ان کی حالت ایک جیسی خراب ہو گئی تھی۔ کھیت میں پانی کھڑا ہوا تھا۔ وہ سر سے پاؤں تک کیچڑ میں بھر گئے تھے اور اب ان کی زبانی جنگ چھڑ چکی تھی مگر آواز مجھ تک نہیں پہنچ رہی تھی۔

گل نے چھلانگ مارتے ہوئے سخت بزدلی کا مظاہرہ کیا۔ مجبوراً میں نے اسے اٹھا کے نیچے پھینکا اور غالب نے اسے منہ کے بل کیچڑ میں گرنے سے تو بچالیا لیکن وہ خود کو نہ سنبھال سکا۔ نتیجہ یہ کہ دوسری بار گل کے ساتھ کیچڑ میں گرا۔ پھر میں نے ہیلی کاپٹر میں رکھا ہوا سامان نیچے گرایا۔ اب سانولی کی باری تھی لیکن اس نے صاف انکار کردیا "پہلے اگروال اترے گا۔ مجھے ہاتھ مت لگاؤ۔"

میں غصے کو پی گیا "چلئے اگروال صاحب۔"

مجھے حیرانی ہوئی جب اگروال نے نفی میں سرہلایا "میرا کوئی ارادہ نہیں ہے یہاں اترنے کا۔"

"پھر کیا ہے تمہارا ارادہ؟"

"میں تمہیں نہیں بتا سکتا۔ تم جاؤ" وہ بولا "میرے اور تمہارے راستے پہلے ہی الگ تھے۔ تم زبردستی میری راہ میں حائل ہوئے۔ اب نہ تمہیں میری ضرورت ہے نہ مجھے تمہاری۔"

پائلٹ نے پریشان ہو کے کہا "اگروال! مجھے اکیلا واپس جانے دو۔"

"تمہارے ساتھ میرا معاہدہ یہ تھا کہ تم ہمیں نیپال پہنچاؤ گے۔" سانولی نے کہا۔

"لیکن خود تم نے نیپال کے بجائے کلکتہ....."

"ہم نے نہیں۔ ان لوگوں نے تمہیں مجبور کیا تھا" اگروال نے کہا۔

"میں اب نیپال نہیں جا سکتا۔"

"نیپال کیوں نہیں جا سکتے؟ تمہارے لئے سب راستے کھلے ہوئے ہیں" اگروال بولا "جیسے تم نے پہلے راستہ بدلا تھا ایسے ہی اب پھر بدل دو۔ ہم ادائیگی کریں گے۔"

"بات ادائیگی کی نہیں۔ میں خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ اگر میں نے خود کو سول پولیس یا فوجی حکام کے حوالے نہ کیا تو مارا جاؤں گا۔ فوجی طیارے پیچھے لگ جائیں گے۔ یہ ہیلی کاپٹر کیسے مقابلہ کر سکتا ہے فوجی جہازوں کا؟ وہ اسے مار گرائیں گے، اگر میں نے اترنے سے انکار کیا" پائلٹ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"ابھی کسی نے نہیں دیکھا ہے تمہیں۔"

"تمہیں کیا معلوم.....اور اگر تم مرنا چاہتے ہو میرے ساتھ تو چلو۔ میں بتا رہا ہوں کہ جہاں بھی مجھ سے کہا جائے گا، ہیلی کاپٹر اتارلوں گا۔ پھر تم فرار بھی نہیں ہو سکو گے۔ تمہیں پولیس یا ملٹری گرفتار کرلے گی۔" پائلٹ نے کہا۔

میں نے کہا "یہ ٹھیک ہے۔ اس چانس کو مت گنواؤ۔"

اگروال اپنی بات پر قائم رہا "میں اسے چانس نہیں سمجھتا۔ تمہارے ساتھ رہنے میں زیادہ خطرہ محسوس ہوتا ہے مجھے۔ اس کا امکان کم ہے کہ ہیلی کاپٹر کا راستہ کوئی روکے۔ میں یہاں اتر گیا تو پھنس جاؤں گا۔ میرا نیپال جانا ہی بہتر ہے۔ وہاں پورا بندوبست ہے ہمارا۔"

"اب میں زبردستی نہیں کر سکتا تمہارے ساتھ" میں نے کہا اور نیچے کود گیا۔ پائلٹ چلاّتا رہ گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں اگروال کو اٹھا کے باہر پھینک دوں لیکن میرے لئے وقت اہم تھا اور میں اگروال کو اپنے ساتھ اضافی خطرہ سمجھتا تھا۔ ہم تو خیر مطلوب تھے ہی۔ ہم سے زیادہ اگروال کی جان کے طلب گار وہ تھے جو اسے دوبارہ تختۂ دار پر کھڑا کرنا چاہتے تھے۔

میرے قدم زمین پر لگے تو پانی اور کیچڑ کے چھینٹے اڑ کر میرے چہرے تک آئے۔ میرے جوتے کیچڑ میں دھنس گئے تھے اور زور لگا کے میں نے اپنے پاؤں اس دلدل جیسی زمین سے نکالے اور اوپر دیکھا۔ ہیلی کاپٹر کے انجن کی آواز زیادہ ہو گئی تھی اور وہ دوبارہ بلندی کی جانب اٹھ رہا تھا۔

غالب نے کہا "اگروال نہیں آیا؟"

"نہیں۔ وہ سانولی کے ساتھ نیپال جارہا ہے۔ ہم نے ان کا ہنی مون خراب کردیا تھا" میں نے کہا۔

"پائلٹ مان گیا؟"

"پائلٹ کی انھوں نے ایک نہیں مانی۔ پائلٹ خود کو مقامی حکام کے حوالے کرنا چاہتا تھا تاکہ اپنی جان بچائے۔ اگروال اڑ گیا کہ جیسے کلکتہ آئے تھے ویسے ہی نیپال چلو۔ کوئی مداخلت نہیں کرے گا اور فلائٹ چارجز ہم ادا کردیں گے" میں نے کہا "اب ہمیں کیا۔ ہماری طرف سے جہنم میں جائے۔"

نازو نے اپنا چہرہ صاف کرتے ہوئے کہا "پھر اس کا سامان کیوں اتارا تم نے؟ ہیلی کاپٹر میں ہی رہنے دیتے۔"

میں نے چونک کر کہا "اگروال کا سامان؟"

"ہاں۔ یہ بریف کیس ہمارا نہیں ہے جو تم نے پھینک دیا تھا" نازو نے کہا "ہمارے تو یہ دو بیگ تھے۔"

"کیا ہے اس میں؟" میں نے نازو کے ہاتھ سے بریف کیس لے لیا "تم نے دیکھا؟"

نازو نے نفی میں سرہلایا اور اوپر اٹھ کے واپس جاتے ہوئے ہیلی کاپٹر کو دیکھتی رہی۔

"یہ تو مقفل ہے" میں نے کہا۔

"اتنی جلدی کیا ہے؟ بعد میں دیکھ لیں گے۔ پہلے یہاں سے تو نکلو۔" غالب بولا "رات بھر اس موسم میں ہم یہاں نہیں کھڑے رہ سکتے۔ کیچڑ اور پانی میں۔"

گل نے بھی کہا "ہم سب بھوت بن گئے ہیں۔ لوگ نہ جانے کیا سمجھیں گے۔"

"کون لوگ؟" نازو نے کہا۔

"کہیں تو رات گزاریں گے۔ کسی بستی میں" گل بولی۔

"آبادی چاروں طرف ہے" میں نے کہا "کسی سمت بھی نکل چلو۔ آؤ میں تمہارا ہاتھ پکڑ لیتا ہوں۔ نازو کو غالب سنبھال لے گا۔"

ابھی ہم نے پہلا قدم بھی نہیں اٹھایا تھا کہ فضا پھر فوجی طیاروں کی گھن گرج سے گونجنے لگی۔ اس بار دو جیٹ طیارے ایک ساتھ گزرے تھے۔ پھر ان کے پیچھے دو طیارے آئے۔ اس وقت تک ہیلی کاپٹر ہماری نظر سے اوجھل ہو چکا تھا مگر یہ اندازہ کرنا مشکل نہ تھا کہ فوجی طیارے بھی اسی سمت میں گئے تھے جدھر وہ ہیلی کاپٹر گیا تھا۔ یہ ناممکن تھا کہ ہیلی کاپٹر ان چاروں کی نظر سے اوجھل رہے۔

ہم کیچڑ میں قدم جماتے دھان کے پودوں کے درمیان سے راستہ بناتے چند قدم دور ہی گئے تھے کہ ہم نے فضا کی خاموشی میں شیلنگ کی بھیانک آواز سنی۔ اس کے ساتھ ہی ایک خوف ناک

دھماکا ہوا اور ہم سب بے اختیار رک کر آسمان کی طرف دیکھنے لگے۔

"میرا خیال ہے کہ انہوں نے ہیلی کاپٹر کو مار گرایا" میں نے افسوس سے سرہلایا۔

غالب نے کہا "ہاں۔ دھماکا ہیلی کاپٹر کے پھٹنے کا تھا۔"

"شیلنگ نے اس کے پرخچے اُڑا دئے ہوں گے" نازو بولی۔

"بے چارہ پائلٹ!" گل نے کہا "اس خبیث اگروال کی وجہ سے مارا گیا۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ پائلٹ نے اترنے سے انکار کیا۔" غالب نے کہا "اور فرار ہونا چاہا۔"

"ہاں۔ راستہ روکنے والے شناخت مانگتے ہیں۔ پھر اترنے کا حکم دیتے ہیں اور وارننگ کے بغیر فائر نہیں کرتے۔"

"پائلٹ اتنا بے وقوف تو نہیں تھا" غالب بولا۔

"کیا پتا کیا ہوا۔ اگروال نے اس کے ساتھ زبردستی کی۔ یا اسے مجبور کر دیا کسی طرح" میں نے کہا "اسلحہ تو اگروال کے پاس تھا نہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اس نے مواصلاتی رابطے کا نظام تباہ کر دیا ہو۔ مثلاً مائکروفون کے تار توڑ دئے ہوں۔ پائلٹ کے لئے جواب دینا' اپنی شناخت کرانا اور اترنے پر آمادگی کا اظہار کرنا ممکن ہی نہ رہا ہو۔"

"اگروال ہمارے ساتھ آجاتا تو زندہ رہتا" گل بولی۔

"بات یہ ہے بی بی کہ موت کا ایک دن معیّن ہے" میں نے گل کا ہاتھ تھام کے چلتے ہوئے کہا "عدالت نے کل کا دن معیّن کیا تھا اور یہ طے کیا تھا کہ اسے پھانسی دے کر دنیا سے رخصت کیا جائے مگر قدرت کا فیصلہ مختلف تھا۔ اگروال کی زندگی کے اڑتیس چالیس گھنٹے باقی تھے اور اسے ہیلی کاپٹر پر فوجی طیاروں کی فائرنگ سے سانولی کے ساتھ ہلاک ہونا تھا۔ وقت' مقام' موت کا طریقہ' سب دنیا کی عدالت کے فیصلے کے تابع نہیں تھے چناں چہ وہی ہوا جو نوشتۂ تقدیر تھا اور بدلا نہیں جا سکتا تھا۔ پائلٹ بھی مرنا نہیں چاہتا تھا مگر دیکھو' موت اسے کہاں لے آئی۔ آج صبح اس کے ذہن میں یہ خیال تک نہ تھا کہ اسے نیپال کے بجائے کلکتہ جانا ہے جہاں سے واپسی پر فرشتۂ اجل سے ملاقات ہوگی اور اس کے ہیلی کاپٹر کو فوجی طیارے مار گرائیں گے۔ اس نظام الاوقات کو بھلا کون بدل سکتا ہے۔ بڑے عجیب اور ناقابلِ یقین طور پر انسان خود وہاں جاتا ہے جہاں اس کو مرنا ہو۔ کسی ارادے اور مرضی کے بغیر۔"

میں اکیلا بول رہا تھا۔ باقی سب پر اس حادثے کا اثر تھا۔ اس ماحول اور اپنی حالت نے انہیں تشویش اور فکر میں مبتلا کر رکھا تھا۔ دھان کے کھیت میں کیچڑ سے لت پت جوتوں اور پیروں کے ساتھ' گیلے کپڑوں اور اوپر تک مٹی میں لتھڑے ہوئے ہم چاروں ایک ہاری ہوئی فوج کے بے حوصلہ اور تھکے ہوئے سپاہی تھے۔ ہم اپنے مرکز اور مقصد سے بچھڑ گئے تھے اور اب واپسی کے راستوں کی تلاش میں دشمن سے بچتے ہوئے زندگی کی جدوجہد جاری رکھنے پر مجبور تھے۔ اب ہمارے سامنے کوئی لائحۂ عمل' کوئی مستقبل کا پلان اور آنے والے وقت کا کوئی نقشہ نہیں تھا۔ اگلے لمحے۔ آنے والے دن اور ماہ وسال میں کیا ہوگا' ہم کہاں ہوں گے' ہوں گے یا نہیں ہوں گے؟ یہ سب سوچنا بھی بے کار تھا۔ اس وقت اگر الٰہ دین کے چراغ کا جن ہمارے سامنے آکے کہتا کہ کیا حکم ہے آقا۔ تو سب کا ایک ہی جواب ہوتا۔ محسن سمیت ہم سب کو واپس وہیں پہنچا دو جہاں سے ہم چلے تھے۔ دل کے خوش رکھنے کو شاید یہ خیال اچھا ہے۔ کہ ہم نہیں ہارے۔ ہم نے دلاور اینڈ کمپنی کو ہر محاذ پر شکست دی' یہاں تک کہ وہ پسپا ہو کے فرار ہو گیا۔ سیاسی جنگ سے ہمارا کوئی تعلق نہیں تھا۔

دھان کے کھیت ختم ہوتے ہی ہم نے خود کو کچے جھونپڑوں اور بانس کے مکانوں کی ایک بستی کے مقابل پایا۔ بستی کے بہت سے لوگ جیسے ہمارے ہی انتظار میں تھے۔ پندرہ بیس افراد ایک ہجوم کی شکل میں خاموش کھڑے ہمیں یوں دیکھ رہے تھے جیسے ہم اُڑن طشتری کے ساتھ زمین پر اترنے والی خلائی مخلوق ہوں۔

وہ سب غریب' فاقہ کش لوگ تھے۔ ان کے سیاہ ناتواں جسم مفلسی کی منہ بولتی تصویر تھے۔ مرد' عورتیں' بچّے سب ہڈیوں کے ڈھانچے تھے۔ مردوں نے جسم کے زیریں حصے پر گھٹنوں تک ایک کپڑا لپیٹ رکھا تھا۔ آٹھ دس سال کی عمر کے بچّے اس تکلف کے بھی عادی نہ تھے۔ عورتوں نے دو چار گز سوتی کپڑے کو نیچے سے اوپر تک یوں لپیٹا تھا کہ آنچل کسی حد تک ان کے جسم کو عریانی کے الزام سے بچالیتا تھا تاہم ان کے شانے اور کمر اس "لباس" سے باہر تھے۔ جوتے کی عیاشی کا متحمل کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ اندھیرے میں ساکت وصامت کھڑے ہوئے لوگوں کی نظریں ہم پر تھیں اور سب خاموش تھے۔ ہمارے قریب پہنچ جانے کے باوجود ان کے سکوت اور جمود میں فرق نہ آیا۔

پھر بھیڑ کو چیر کر ایک سفید دھوتی اور سفید چگی داڑھی والا شخص آگے آیا جو لٹھے کی واسکٹ کے ساتھ ہوائی چپل بھی پہنے ہوئے تھا۔ ظاہر ہے اس کا تعلق امراء کے طبقے سے تھا اور وہ سردار قسم کی چیز ہو سکتا تھا۔ مجمع میں سے کسی نے کیا کہا' یہ تو میں نہ سمجھا مگر عبدل کا نام میری سمجھ میں آگیا۔ آگے آنے والا عبدل تھا تو گویا مسلمان تھا۔ عبدل میاں یا عبداللہ یا عابد علی کی عُرفیت عبدل ہی ہو سکتی تھی۔

میں نے خوش اخلاقی سے ہاتھ بڑھا کے کہا "السلامُ علیکم۔"

عبدل کی متانت ایک دم دوستانہ مسکراہٹ میں بدل گئی۔ اس نے خالص بنگالی لہجے میں "وعلیکم السلام" کہا اور مجھ سے ہاتھ ملا کے بنگالی میں کچھ پوچھنے لگا۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا مگر میں اندازہ کر سکتا تھا کہ وہ ہماری تشریف آوری کے اغراض ومقاصد کے علاوہ ہم سب کی اس

حالت کے اسباب جاننا چاہتا تھا اور رسمی تعارف مانگتا تھا۔ میں نے جواب میں اُردو بولی۔ اس نے اوپر سے نیچے گرنے کا اشارہ کیا اور میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ وہ بنگالی بولتا رہا' میں اُردو۔ اور کمال کی بات یہ ہے کہ ہم نے ایک دوسرے کا مفہوم ومُدّعا سمجھ لیا اور یہ جان لیا کہ ہم ایک دوسرے کے دشمن نہیں ہیں۔ ہمارے درمیان انسانیت کا رشتہ تھا اور مذہب کا اور ہم ایک ہی خطۂ زمین کے باسی تھے چناں چہ کسی ایک فریق کی جانب سے دوستانہ رویّے کا جواب نفرت اور دشمنی کے جذبات نہیں ہو سکتے تھے۔

عبدل نے ہمیں ہاتھ سے اشارہ کیا اور خود آگے آگے چلنے لگا۔ بھیڑ چھٹ گئی اور کچھ لوگ ہمارے پیچھے ہو لئے۔ باقی اپنے اپنے گھروں میں غائب ہو گئے۔ وہ بنگالی ہی بول رہے تھے مگر ان کا لہجہ قدرے مختلف تھا۔

غالب نے کہا "اگر ہم اس طرح افریقہ کے کسی علاقے میں ٹپک پڑتے تو سوال جواب کئے بغیر ہمارا سوپ بنانے یا ہمیں روسٹ کرنے کی کارروائی کا آغاز ہو جاتا۔"

میں نے کہا "یہ سب پرانی باتیں ہیں۔ افریقی پہلے جیسے وحشی اور غیر مہذب آدم خور نہیں رہے۔"

"کچھ علاقوں میں اب بھی سفید فاموں کو اسپیشل ڈش سمجھا جاتا ہے" غالب بولا۔

"وہ بھی نفرت کا ردِّعمل ہے۔ سفید فاموں نے ان کے ساتھ جانوروں سے بدتر سلوک روا رکھا ہے۔ جب انہیں موقع ملتا ہے تو وہ بھی کم نہیں کرتے۔ اپنا انتقام لیتے ہیں۔"

"ہم اس وقت کہاں ہیں؟" نازو نے کہا۔

"اپنی زمین پر اور قیدِ حیات میں۔ تمہیں کیوں شک ہو رہا ہے کہ یہ عالمِ خواب ہے یا ہم کسی نامعلوم سیارے پر اتر گئے ہیں" غالب بولا۔

"میرا مطلب تھا' یہ بھارت ہے' پاکستان یا بنگلہ دیش؟"

غالب نے سر کھجا کے کہا "بغیر نقشے کے اس سوال کا جواب تو علمِ جغرافیہ کا موجد بھی نہیں دے سکتا۔"

گل نے کہا "مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ معلوم نہیں یہ کون لوگ ہیں۔ نہ یہ ہماری بات سمجھتے ہیں نہ ہم ان کی۔"

"ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ میں سمجھ گیا ہوں" میں نے کہا۔ "یہ ہمیں مہمان کا درجہ دے چکے ہیں۔"

"کیا پتا آج رات مہمان رکھیں یا چودھویں رات کا چاند نکلنے تک' اور پھر کسی دیوتا کی خوشنودی کے لئے ہمیں بڑی عزت و احترام کے ساتھ قربان کر دیں؟" غالب نے کہا "یا ہمیں شیر کے سامنے ڈال دیا جائے اور ہم شیر کو ہلاک کر دیں تو یہ ہمیں دیوتا مان لیں۔"

"کیا اُلٹی سیدھی ہانک رہے ہو" نازو بولی۔

"میں نے دو فلموں میں ایسا ہوتے دیکھا تھا۔ اور دو ناولوں میں بھی پڑھا تھا" غالب نے کہا۔

عبدل اچانک ایک جھونپڑے کے سامنے رک گیا اور اشارے سے اس نے ہمیں اندر جانے کو کہا۔ جھونپڑے کی دیواریں سرکنڈوں اور بھوسہ ملی مٹی سے بنائی گئی تھیں اور اسے ایک گول کمرا فرض کیا جا سکتا تھا جس کی بلندی مشکل سے آٹھ فٹ تھی۔ اس کے اوپر نوکدار مخروطی چھت تھی اور ایک دروازے کے سوا روشنی یا ہوا کے آنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

میں کچھ جھک کر دروازے سے گزرا اور گھپ اندھیرے میں کھڑا اپنی آنکھوں کو اندر کے ماحول سے آشنا کرنے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔ میرے بعد غالب' گل اور نازو بھی اندر آگئے۔

"یہ لوگ کیا سمجھ رہے ہیں آخر؟ کیا ہم اندھیرے میں دیکھنے والی مخلوق ہیں؟" غالب نے کہا "اُلّو ہیں ہم؟"

"اگر تم اُلّو ہو تو بہت بڑے اُلّو ہو" نازو نے کہا۔

میں نے کہا "کچھ صبر کرو۔ میں جائزہ لے رہا ہوں۔"

"کسی کنویں میں مت اتر جانا یا کسی اژدھے کی دُم پر پاؤں مت رکھ دینا" غالب بولا۔

اسی وقت باہر سے ایک شخص مشعل کے ساتھ نمودار ہوا۔ لوہے کے ایک پائپ کے اوپر شعلہ روشن تھا۔ اس نے پائپ کو اندر کی دیوار کے ایک سوراخ میں پھنسا دیا اور واپس لوٹ گیا۔ اب ہم اس گول کمرے کے فرش پر بچھی ہوئی خشک گھاس کے فرش کو دیکھ سکتے تھے۔ گھاس' مٹی اور سرکنڈوں کی بُو میں اب مشعل کے جلنے سے پیدا ہونے والی بُو بھی شامل ہو گئی۔

نازو نے کہا "مجھے اس بُو سے وحشت ہو رہی ہے۔"

گل نے سر ہلایا "اگر ہم رات بھر اندر رہے اور یہ مشعل بھی جلتی رہی تو میرا دَم گھٹ جائے گا۔"

نازو نے کہا "اور اگر رات کو اس گھاس پھونس کے بیڈ پر سونا پڑا تو اس میں چھپے ہوئے نہ جانے کتنے زہریلے کیڑے کاٹیں گے۔"

اب پھر گل نے کہا "رہنے کی ایسی جگہ ہے تو کھانے کو پتا نہیں کیا ملے گا!"

غالب نے بگڑ کے کہا "میں بتاؤں کیا ملے گا؟ روسٹ کئے ہوئے مینڈک' چھپکلی کا سوپ اور سانپ کے انڈوں کا آملیٹ۔"

نازو نے اُبکائی لے کر کہا "مت کرو ایسی باتیں۔"

غالب نے کہا "نخرے مت دکھاؤ زیادہ۔ پسند نہیں یہ سب تو چلی جاؤ۔ کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں۔"

میں نے کہا "جانے سے پہلے فون کر کے ریزرویشن کرالینا۔"

"تمہارا حلیہ اور تمہاری صورتیں بھی ایسی ہیں کہ فائیو اسٹار ہوٹل والے بہت خوش ہوں گے دیکھ کے" غالب نے جوتے اتارتے ہوئے کہا اور پھر ایک کیچڑ میں لتھڑا ہوا بوٹ نازو کو دکھایا۔ "یہ تم ہو۔ اور یہ تم" اس نے دوسرا بوٹ گل کے سامنے

کیا۔

اب میں بھی جوتے اتار کے بیٹھ چکا تھا اور اگرچہ میرا تھکن سے بُرا حال تھا اور دل یہی چاہتا تھا کہ خود کو گھاس کے نرم بستر پر گرادوں اور آنکھیں بند کرلوں مگر یہ دیکھنا بھی ضروری تھا کہ ہمارے ساتھ میزبان کیا اندازِ میزبانی اختیار کرتے ہیں۔ روشنی میں مجھے دوسروں کے چہرے دیکھنے کا موقع ملا تو اپنی صورت کا تصور کرکے مجھے ہنسی بھی آئی اور دُکھ بھی ہوا۔ ہم انسانوں سے زیادہ کوئی انسان نما مخلوق لگتے تھے۔ ہم سب کے بالوں میں، منہ پر، ہاتھوں پر اور کپڑوں پر کیچڑ جم کر خشک ہوگئی تھی۔ ہمارے جوتوں کی طرح پاؤں بھی مٹی میں بھرے ہوئے تھے اور اس حلئے میں ہمارے اصلی چہرے پہچانے ہی نہیں جاتے تھے۔ غالب کے سر اور داڑھی کے بال آپس میں مل کے گارے سے چپک گئے تھے اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہم تہذیب اور انسانیت کو بھول کر آبادی سے دور کئی ماہ جنگل میں جانوروں کے ساتھ زندگی گزارتے رہے ہیں۔ یہ بڑے دُکھ کی بات بھی تھی کیوں کہ ہم سب زندگی کی اعلیٰ قدروں کے پرستار، شرافت اور شائستگی، وضع داری اور رکھ رکھاؤ، نفاستِ حسن اور لطافتِ آسائش اور تکلفات کے عادی تھے۔ گردشِ حالات ہمیں کہاں سے کہاں لے آئی تھی۔

گل اور نازو بھی ڈرتے ڈرتے گھاس پر بیٹھ گئی تھیں اور اپنے چہرے سے اور بالوں سے مٹی جھاڑ رہی تھیں۔

نازو نے کہا "میں واقعی ایسی ہی لگ رہی ہوں گل، جیسا کہ غالب نے مثال دے کر بتایا تھا۔"

گل مسکرائی "تمہیں کیسے اندازہ ہوا؟"

"تمہیں دیکھ کر" نازو بولی۔

دروازے میں ایک سر نمودار ہوا۔ جب جھک کر اندر آنے والا سیدھا ہوا تو میں نے اپنے مقابل ایک اجنبی کو دیکھا۔ گل اور نازو اسے دیکھ کر ڈر گئیں۔ چھ فٹ قد کا تندرست و توانا شخص ان سب لوگوں سے مختلف تھا جن کو ہم دیکھ چکے تھے۔ اس کا سر گٹھا ہوا اور جسم کی مناسبت سے بہت چھوٹا لگتا تھا مگر اس کے ہاتھ پاؤں بڑے بڑے اور وحشیانہ تھے۔ اس نے وہی گھٹنوں تک پہنچ کر ختم ہوجانے والی ہاف دھوتی باندھ رکھی تھی اور اوپر سوتی واسکٹ پہن رکھی تھی جس کے بٹن نہیں تھے چناں چہ اس کے سیاہ بدن کا ہر حصہ نمایاں تھا۔ اس کی آنکھیں لال تھیں اور وہ مسلسل ہمیں گھور رہا تھا۔

غالب نے آہستہ سے کہا "یہ کیا چیز ہے؟"

میں نے کہا "یہ لوکل ٹارزن ہے۔"

"اس سے پوچھو ایسے کتنی دیر گھورتا رہے گا ہمیں" نازو نے کہا۔

ٹارزن کے لب ہلے "کون ہو تم لوگ؟"

اس کی زبان سے اُردو سن کر میں نے کہا "ہم بالکل تم جیسے انسان ہیں۔ تم دیکھ سکتے ہو۔"

"کہاں سے آئے ہو، یہ لڑکیاں کہاں لے جارہے ہو؟ بیچنے کے لئے؟" وہ غرایا۔

میں نے کہا "یہ ہماری شریکِ حیات ہیں۔ اس لفظ کا مطلب سمجھتے ہو تم؟ زندگی کی ساتھی۔ اور کوئی اپنی زندگی کے ساتھی کو کسی قیمت پر نہیں بیچتا۔"

وہ مجھے گھورتا رہا اور اپنے اطوار سے مجھے خوف زدہ کرنے کی کوشش میں مصروف رہا۔

میں اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے سامنے جا کے میں نے کہا "مثال کے طور پر تمہارا یہ پیٹ" میں نے اس کے پیٹ میں انگلی کو خنجر کی طرح گھونپ کے کہا "اور تمہارے یہ بازو، یہ ناک۔" میں نے اس کی ناک کو چٹکی سے پکڑ کے ہلایا "یہ سب تمہاری زندگی کے ساتھی ہیں۔"

اس نے مجھے دھکا دیا۔ پھر ایک گالی دی۔ دھکے کے لئے میں تیار تھا چناں چہ ایک قدم میں پیچھے ہٹا تو میرے قدم جمے رہنے سے جھٹکا اسے بھی لگا۔ گالی کو میں پی گیا۔

"اپنی ناک بیچو گے؟" میں نے کہا۔

اس نے پھر مجھے گالی دی اور آگے بڑھا۔ وہ مشتعل ہوگیا تھا اور میں اس کے غصے کی آگ پر کچھ تیل چھڑک کے اسے نازو کے حوالے کرنا چاہتا تھا۔ پیچھے ہٹتے ہوئے میں نے کہا "جنگلی ریچھ کی اولاد۔ تیرے باپ نے کیا تیری ماں کو بیچا تھا؟"

اس نے مُکا گھمایا مگر میں جھک کر وار بچاگیا۔ میرے اشارے پر نازو نے اس کی ٹانگ پکڑلی اور ایک جھٹکا دیا تو وہ منہ کے بل گرا۔ میں نے اس کی کمر پر بیٹھ کر آرم لاک لگادیا اور اس کی گردن کو ایسے زاویے پر موڑ دیا کہ وہ اذیت سے چلّانے لگا۔ میں نے اسے اٹھنے کا موقع دیا۔ وہ ہانپتا ہوا اٹھا۔

میں نے کہا "اب کچھ سمجھ میں آیا کہ ہم کون ہیں؟ نہیں سمجھے تو بتادو۔ میں تم کو ٹانگ سے گھسیٹ کر باہر لے جاؤں گا اور سب کے سامنے مار مار کے تمہاری ہڈیاں توڑ دوں گا۔"

وہ پھر جست لگا کے آیا مگر میں ایک طرف ہوگیا۔

"میری بات نہیں سمجھتا یہ بن مانس۔ تم سمجھاؤ اسے" میں نے نازو سے کہا "مگر دیکھو۔ سختی سے نہیں۔"

نازو اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے مشتعل کرنے کے لئے نازو نے اس کے منہ پر طمانچہ مارا اور جب اس نے چہرہ نازو کی طرف کیا تو نازو نے اس پر تھوک دیا۔ وہ غصے میں پاگل ہوکے گالیاں بکتا ہوا نازو پر حملہ آور ہوا۔ نازو کے ہاتھ حرکت میں آئے۔ اس کے نازک بدن میں بھری ہوئی تباہ کن قوت ایک دم بیدار ہوگئی۔ اس نے ایک بھرپور وار اس کے بازو پر کیا۔ وہ بلبلایا اور بازو کو تھام کے کراہنے لگا۔ نازو نے گھوم کے لات ماری جو اس کی ٹانگ پر لگی۔ وہ وہیں گر گیا۔ نازو کا اگلا ہاتھ اس کے دوسرے بازو پر پڑا۔ میرے روکتے روکتے نازو نے اس کی دوسری ٹانگ بھی بے کار کردی۔ وہ اب درد سے بلبلا رہا تھا اور فرش پر لوٹ رہا تھا لیکن پوری کوشش کررہا تھا کہ اپنی آواز باہر نہ جانے دے۔

میں نے اس کے پاس بیٹھ کے کہا "اب بھی تم سمجھ لو کہ کسی وجہ کے بغیر آدمی کو آدمی کا دشمن نہیں ہونا چاہئے۔ تو اسی میں تمہارا فائدہ ہے۔ ورنہ یہ تماشا باہر سب کے سامنے ہوگا تو تمہاری کیا عزت رہ جائے گی؟ سب دیکھیں گے کہ تم ایسی کمزور عورت کے ہاتھوں پٹ رہے ہو۔ یہ واقعی تمہاری ہڈیاں توڑ سکتی ہے۔ گردن توڑ سکتی ہے۔"

وہ دہشت میں مبتلا ہوگیا تھا اور آہستہ آہستہ خود کو سنبھال رہا تھا۔ اس نے درد سے مفلوج ہوجانے والے ہاتھوں اور پیروں کو مالش کرکے اور ہلا جلا کے اس قابل کرلیا تھا کہ اٹھ کر بیٹھ سکے اور بات کرسکے۔

میں نے کہا "اب پہلے تم بتاؤ کہ تم کون ہو؟ یہ کیا جگہ ہے اور یہ سب جو اس بستی میں ہیں کس قبیلے کے لوگ ہیں؟"

اس نے سرہلایا "یہ سب ماہی گیر ہیں۔ پہلے یہی کام کرتے تھے۔ مچھلیاں پکڑنے کا۔"

"اب کیا کرتے ہیں؟"

"میں نے ان کو دوسرے کام پر لگادیا ہے" وہ بولا "جس میں انہیں زیادہ پیسہ ملتا ہے۔"

غالب بولا "تم نے۔ تم کیا سردار ہو اس قبیلے کے؟"

"سردار تو وہ بڈھا ہے جو تمہیں یہاں لایا تھا۔ مگر یہ میری مانتے ہیں۔"

"کیوں؟ ایسا کیا جادو کیا ہے تم نے۔"

"پیسہ ان کو مجھ سے ہی ملتا ہے۔ یہ سب پیسے کے غلام ہیں" وہ بولا "ان کا سردار بھی۔ وہ میری حفاظت کرتا ہے، میں اس کی حفاظت کرتا ہوں۔ اور اسے فائدہ بھی بہت ہے مجھ سے۔"

"کیا فائدہ؟ کیا کرتے ہو تم؟" میں نے کہا۔

"پہلے اپنا نام تو بتادو۔" غالب نے کہا۔

"میں.... نورل ہوں۔ نورالحسن نام تھا" وہ بولا "یہاں کلکتہ سے آیا تھا۔ اس علاقے میں...."

"چپ کیوں ہوگئے؟ کیا کرتے تھے تم یہاں؟"

"یہی۔ خرید و فروخت" وہ نازو اور گل سے نظر چرا کے بولا۔ "پھر میں نے سردار کو اس لائن پر لگادیا۔ وہ مجھے اطلاع دیتا تھا کہ مال کہاں ہے۔ کیسا ہے۔ کس قیمت پر مل سکتا ہے۔"

میں نے نفرت سے کہا "تم بردہ فروش ہو۔ وہ بڈھا بھی اور تم بھی۔ تمہیں تو سب کے سامنے لے جا کے ماردینا چاہئے۔"

"اعترافِ جرم کرانے کے بعد۔"

"تم غریب لوگوں کی بہنوں اور بیٹیوں کی تجارت کرتے ہو بے غیرت آدمی" میں نے کہا۔

"میں کیا۔ سب کرتے ہیں۔ یہ لوگ خود کیا کم ہیں۔ اپنی بیویاں تک بیچ آتے ہیں کلکتہ جا کے۔ میں ان کو زیادہ قیمت دیتا تھا اور اسی جگہ۔ انہیں بازار جا کے خراب ہونے سے بچالیتا تھا۔ کلکتہ میں بدمعاش ان کی عورتیں بھی ہتھیالیتے ہیں اور ان کو تھانے میں بند کرا کے مار لگواتے ہیں پولیس سے۔ بڑی مشکل سے جان بچا کے واپس آتے تھے یہ لوگ ورنہ جیل میں پڑے رہتے تھے۔ میں نے ان کی مدد کی۔ انہیں دلالوں کے ظلم سے بچایا۔"

اس قبیلے کی معاشرتی اقدار انسانیت اور اخلاق کے نام پر داغِ ذلّت تھیں مگر یہ قصور تھا معاشی مجبوریوں کی اس انتہا کا جہاں بھوک، مفلسی اور احتیاج کے تقاضے عزتِ نفس، رشتوں کی تقدیس اور غیرت و حمیّت کے جذبات پر حاوی آجاتے ہیں۔

میں نے نورل کو گردن دبوچ کے اوپر اٹھالیا "تم اپنی خباثت کو نیکی قرار دے رہے ہو۔ مجھے یہ بتارہے ہو کہ تم شیطان نہیں، ان بے ننگ و نام لوگوں کے لئے فرشتہ رحمت بن کے آئے ہو۔ بولو کیا ہونا چاہئے تمہارے ساتھ؟"

وہ منت سماجت کرنے لگا "مجھ سے غلطی ہوئی۔"

"اپنی غلطی کی سزا بھی خود بتاؤ" میں نے اس کی گردن دبا کے جھٹکا دیا اور اسے دیوار سے لگادیا۔

اس کی آنکھیں حلقوں سے اُبلنے لگیں "مجھے معاف کردو خدا کے لئے۔"

"خدا کے لئے؟" میں نے دباؤ اور بڑھادیا "اتنی جلدی خدا یاد آگیا۔ میں تو تم کو باہر سب کے سامنے ننگا کرکے درخت سے الٹا لٹکاؤں گا اور کوڑے مار مار کے تمہاری کھال کے چیتھڑے بکھیر دوں گا۔"

اس کا سانس رکنے لگا "ایسا مت کرو۔ میری بات سن لو...؟"

غالب نے کہا "ایک موقع دو اسے یار۔"

میں نے اسے چھوڑ دیا "بول۔ کیا کہتا ہے ذلیل کتے۔"

اس نے اپنی سانس درست کی "میں..... میں سب کچھ کرسکتا ہوں تمہارے لئے۔ تم جب تک چاہو یہاں رہو۔ سب تمہاری خدمت کریں گے۔ تمہارے ایک اشارے کے غلام ہوں گے۔ بس مجھے ان سب کے سامنے ذلیل مت کرو۔ ورنہ یہ وحشی لوگ ہیں۔ یہ تمہارے دشمن ہوجائیں گے۔ ان کے پاس زہریلے سانپ ہیں اور زہر میں بجھی ہوئی سوئیاں ہیں۔ زہریلے تیر ہیں۔ یہ جس کے دشمن ہوجائیں اس کو بڑی اذیت کے ساتھ ہلاک کرتے ہیں۔ لیکن یہ مجھ سے ڈرتے ہیں۔"

"ایسی کون سی طاقت ہے تمہارے پاس؟"

"پیسے کی طاقت" وہ بولا "یہ مجھے اپنی خوشحالی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ پہلے ان کی عزت دو کوڑی کی تھی۔ میں نے انہیں عزت کی صحیح قیمت وصول کرنا سکھایا۔ یہ پرانے طریقوں سے ماہی گیری کرتے تھے۔ میں نے ان کو مچھلیاں پالنا سکھایا۔ گہرے سمندر سے

مچھلی پکڑنے کے لئے لانچ کرائے پر دلوائی۔ ان کی عورتوں کو گھر میں کرنے کے کام لا کر دئے۔ جو مچھلیاں یہ پکڑتے ہیں وہ میں خرید لیتا ہوں اور خود منافع پر کلکتہ لے جاتا ہوں۔ ان کی عورتیں جو چیزیں تیار کرتی ہیں وہ بھی میں لیتا ہوں۔ مگرمچھ کی کھال کے جوتے اور لیڈیز ہینڈ بیگ۔ مچھلی کی ہڈیوں کے سگریٹ ہولڈر' نمائشی چیزیں اور بانس کی تیلیوں کی چٹائیاں۔ یہ بھی کلکتہ میں اچھے دام بک جاتی ہیں۔ لیکن یہ خود کچھ نہیں کرسکتے۔ ان کے سب معاملات میری مدد سے چلتے ہیں۔ میں نے ان کو منظم کیا' تربیت دی' پیسہ کمانا سکھایا اور اس میں مجھے پانچ سال لگے۔"

"اور جتنا پیسہ تم نے ان لوگوں کی محنت سے خود حاصل کیا' اس سے زیادہ ان کی بہو بیٹیوں کو بیچ کے کمایا۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔ یہ بھی کیا میں نے۔ مگر دیکھو' ایسا تو پہلے بھی ہوتا تھا۔ اگر میں چلا جاؤں گا تب بھی ہوگا۔ ان کی بیٹیاں جوان ہونے سے پہلے ہی کلکتہ کے عیار دلالوں کے ہاتھ لگ جاتی تھیں۔ آٹھ نو سال کی عمر میں وہ کسی بھی لڑکی کو سو پچاس روپے میں لے جاتے تھے اور دو چار سال بعد اس کو پانچ دس ہزار میں بیچ دیتے تھے۔ بردہ فروشوں کے ہاتھ۔ وہ دس بیس ہزار میں انہیں باہر بھجوا دیتے تھے۔ باہر جانے سے پہلے ان کے ساتھ یہاں کیا ہوتا تھا' یہ بتانے کی ضرورت نہیں۔ اب ایسا نہیں ہوتا۔"

"تم نے یہ کاروبار ختم کرادیا...؟"

"نہیں۔ لیکن میں نے ان کو احساس دلایا کہ وہ بہت گھاٹے میں ہیں۔ انہیں یہ سب کرنا ہے تو..... پورا فائدہ اٹھائیں۔ اب یہ کم عمر لڑکی کسی کے حوالے نہیں کرتے۔ جب وہ بڑی ہوجاتی ہے....."

"تو پانچ ہزار میں تم خرید لیتے ہو ان سے" میں نے نفرت سے کہا۔

اس نے سر جھکا لیا "میں انہیں پانچ ہزار تو نہیں دے سکتا مگر پانچ سو' ہزار ضرور دیتا ہوں۔ پہلے سے دس گنا۔ میرے یا تمہارے چاہنے اور کوشش کرنے سے برائی ختم نہیں ہوسکتی۔ میں نے ان کی حالت ضرور بہتر بنادی ہے۔ اب کلکتہ کے دلال یہاں نہیں آتے۔"

"تم ان کے پاس جاتے ہو۔ تم دلالوں کے دلال بن گئے ہو" میں نے کہا "اس کے باوجود تم ان کے نجات دہندہ ہو۔"

نورل نے کہا "یہ لوگ ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ تم ان سے پوچھ لو' یہ تمہیں بتائیں گے کہ پانچ سال میں ان کے لئے کیا کچھ کیا ہے میں نے۔"

"مگر انہیں یہ معلوم نہیں ہوگا کہ ان سے کیا وصول کیا ہے تم نے" غالب نے کہا "انہیں پانچ سو دے کر پانچ ہزار تم کماتے ہو۔ تم نے انہیں زر خرید غلام بنالیا ہے۔ خیر۔ چھوڑو یہ باتیں۔ ابھی تو ہم تھکے ہوئے ہیں۔ پہلے ہمارے نہانے دھونے کا' پھر کھانے پینے کا اور اس کے بعد آرام کا بندوبست کرو۔"

"سب ہوجائے گا۔" وہ مطمئن نظر آنے لگا۔

"بس ایک بات کا خیال رکھنا کہ تم ہم سے زیادہ چالاک نہیں ہو۔ نہ دھوکے سے اور نہ طاقت سے تم ہمیں نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ لیکن ہمیں شک بھی ہوا کہ تم کوئی سازش کررہے ہو تو تمہارے ساتھ وہی ہوگا جو میں بتا چکا ہوں۔ اس کے بعد ہم ان قبیلے والوں سے بھی نمٹ لیں گے۔ اگر تم ان پر کنٹرول حاصل کرسکتے ہو تو ہم یہ کام بہتر طور پر کرنے کے اہل ہیں۔ تمہیں تو پانچ سال لگے۔ ہم پانچ دن میں انہیں بندۂ بے دام بنالیں گے۔ ہمارے پاس پیسہ بھی ہے' طاقت بھی اور عقل بھی۔ تمہاری بغیر کھال کی لاش کو ہم تین دن درخت سے لٹکا کے رکھیں گے اور یہی لوگ ہر روز صبح شام اس پر تھوکیں گے۔"

اس کا جسم دہشت سے کانپنے لگا۔ "میں نے وعدہ کیا ہے۔ جیسا تم چاہو گے ویسا ہی ہوگا۔"

"تمہاری سب دولت جو تم نے پانچ سال میں کمائی تھی' تمہارے لئے کفن اور دو گز زمین بھی فراہم نہ کرپائے گی" میں نے کہا۔

اس جھونپڑے کے باہر جسے اب سرکاری گیسٹ ہاؤس کا درجہ حاصل ہوگیا تھا' قبیلے کے سردار کے علاوہ بھی بہت سے لوگ جمع تھے مگر وہ اندر ہونے والی کارروائی سے بے خبر تھے اور ہماری گفتگو کا ایک لفظ نہیں سمجھ رہے تھے۔

نورل نے باہر جا کے انہیں ہاتھ کے اشارے سے مطمئن کیا اور اپنی حاکمانہ' پُروقار مسکراہٹ کے ساتھ یقین دلایا کہ سب ٹھیک ہے۔ میں اس کے ایک طرف کھڑا ہوا تھا اور غالب دوسری طرف۔ اس نے لوگوں سے خطاب کرنے کے بعد میرا اور غالب کا ہاتھ پکڑ کے یوں اٹھایا جیسے باکسنگ رنگ میں ریفری جیتنے والے کا ہاتھ اٹھا کے اس کی فتح کا اعلان کرتا ہے۔ لوگوں کی صورت پردوستانہ جذبات سے معمور مسکراہٹ نے ہمیں یقین دلا دیا کہ یہ نورل کے الفاظ کا اثر ہے۔ آہستہ آہستہ بیشتر لوگ اپنی جھونپڑیوں میں گھس گئے۔ نورل نے چار جوان عورتوں کو روک لیا اور انہیں مزید ہدایات جاری کرتا رہا۔ وہ سب سر جھکائے اور ہاتھ باندھے کھڑی رہیں۔

نورل نے ان کے رخصت ہوتے ہی کہا "میں نے سب سمجھا دیا ہے۔ یہ عورتیں سارا انتظام کرلیں گی۔ اب میں چلتا ہوں۔"

غالب نے کہا "تم کہاں جارہے ہو ابھی سے؟"

نورل نے کہا "میں اپنے گھر جاؤں گا۔ لیکن تمہیں کوئی کام ہے مجھ سے تو میں رک جاتا ہوں۔"

غالب نے کہا "تمہارے گھر تک میں بھی تمہارے ساتھ ہوں گا۔"

نورل کا رنگ ذرا سی دیر کے لئے بدلا "وہ بھی ......ایسا ہی

ہے۔"

میں نے کہا "پھر تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہم یہاں رہیں یا تمہارے ساتھ۔"

گل اور نازو نے میری بات کا مطلب سمجھ لیا "بالکل ٹھیک۔ ہم الگ کیوں رہیں۔ جب ہم مسٹر نورل کے مہمان ہیں۔"

نورل پریشان نظر آنے لگا مگر انکار کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ بادل ناخواستہ ہمیں اپنے ساتھ لے گیا۔ بستی کے درمیان سے گزرتے ہوئے بہت سے لوگوں نے دروازوں سے سر نکال کے ہمیں دیکھا مگر کسی تعجب کا اظہار نہیں کیا۔ وہ بستی مشکل سے سو کچے گھروں پر مشتمل تھی جو سب بانس' خشک گھاس' جوٹ کی بنی ہوئی رسیوں اور چٹائیوں کی مدد سے بنائے گئے تھے۔ یہ گھر اپنے مکینوں کو موسم کے سرد و گرم سے بچاتے تھے اور انہیں جنگلی جانوروں سے تحفظ فراہم کرتے تھے۔ ان کو بنانے میں صرف محنت صَرف ہوئی تھی چناں چہ سیلاب انہیں بہا لے جائے' آگ لگ جائے یا زلزلہ آجائے تو انہیں دوبارہ تعمیر کرنا مشکل نہیں ہوتا تھا۔ نورل کی "معاشی اصلاحات" سے حاصل ہونے والے پیسے کی برکت سے ان گھروں کے اندر کیا تبدیلی آئی تھی اور زندگی کی کیا آسائش ملی تھی' یہ ہم نہ دیکھ سکے۔ گھروں میں رہنے والے سو چکے تھے۔

سردار کا گھر تین گول کمروں پر مشتمل تھا اور اس کے آس پاس بانس گاڑ کے باڑھ اسی طرح تعمیر کردی گئی تھی جیسے ایوانِ صدر کے گرد فصیل ہوتی ہے۔ صدر کے باڈی گارڈز کی طرح یہاں بھی ایک شخص ہاتھ میں بانس کا نیزہ لئے کھڑا ہوا تھا۔ راستے میں ہر جگہ ہم نے مچھلیوں کے تالاب دیکھے جو گھروں کے درمیان بڑی صفائی سے بنائے گئے تھے۔ بلاشبہ نورل ایک ہوشیار آدمی تھا جس نے افلاس زدہ انسانوں کی ایک بستی کو اپنی کالونی بنالیا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے انگریزوں نے تجارت کے بہانے انڈیا کو ایک محکوم نوآبادی میں تبدیل کردیا تھا۔ نورل نے بھی تاجرانہ [illegible] سے چار پانچ سو افراد کی آبادی پر تسلط حاصل کرلیا۔ سردار کی [illegible] حیثیت اب اس کٹھ پتلی نواب یا واسرائے جیسی ہوگئی تھی جسے تاجِ برطانیہ کی نمائندگی کے لئے برسرِاقتدار رکھا جاتا تھا تاکہ رعایا پر کنٹرول کا ذریعہ بنے۔

نورل کا گھر بھی گورنر ہاؤس سے کم نہ تھا۔ اس کے بھی تین حصے تھے اور ہر حصہ ایک وسیع گول کمرا تھا۔ اس کے چاروں طرف بھی باڑھ تھی اور باغ تھا۔ اندر جانے والے راستے کی پہریداری پر مامور شخص نے نورل کو گارڈ آف آنر کے انداز میں سیلوٹ کیا۔

میں نے کہا "یہ شخص تو مسلح ہے"

نورل نے سر ہلایا "ہاں۔ یہ رائفل رکھتا ہے اپنے پاس۔ نمائش کے لئے۔"

"کیا مطلب؟ رائفل چلا نہیں سکتا۔ یا رائفل خالی ہے؟"

میں نے کہا "ذرا میں بھی دیکھوں۔"

محافظ نے بوکھلا کے نورل کی طرف دیکھا اور پھر پیچھے ہٹنے کی کوشش کی مگر میرا ہاتھ رائفل پر جم چکا تھا۔ نورل کے اشارے پر اس نے رائفل چھوڑ دی۔

میں نے اس کے کندھے پر تھپکی دی "جاؤ۔ آج تمہاری چھٹی۔"

نورل نے احتجاج کیا "اسے یہاں رہنے دو۔"

میں نے کہا "خطرے کی کوئی بات نہیں ہوگی تو ہم نمٹ لیں گے۔ بلاوجہ اس کو تکلیف دینے سے فائدہ۔ تم جاؤ نورِ چشم۔" میں نے کہا اور رائفل ہاتھ میں ڈنڈے کی طرح پکڑ کے چل پڑا۔

"ایسے تو تم میرا سارا نظام خراب کردو گے" نورل نے غصے میں ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا "اسے کہو چلا جائے۔ ورنہ معاملہ خراب ہوجائے گا۔ اگر تم چاہتے ہو کہ یہ بھی تماشا دیکھے تمہارا تو پھر رہنے دو۔ کھڑا رہے ہمیں کیا۔"

نورل نے ایک گہری سانس لے کر کہا "دفع ہوجاؤ۔ جاؤ یہاں سے۔ مگر صبح آجانا۔"

"صبح نہیں۔ جب طلب کیا جائے" میں نے کہا "اس کی رخصتِ اتفاقیہ تا حکمِ ثانی جاری رہے گی۔"

"تم اس کمرے میں رہو گے" نورل نے محافظ کے رخصت ہوتے ہی ایک دروازہ کھول دیا۔

"تم حکم دے رہے ہو؟" غالب نے کہا "مجھے تو یہ کمرا بالکل پسند نہیں آیا۔ دوسرا دیکھتا ہوں۔"

نازو نے کہا "ہم دونوں تیسرے کمرے میں رہیں گی' بالکل الگ۔"

نورل کا حوصلہ جواب دے گیا۔ وہ چلانے لگا "آخر یہ سب کیا ہے؟ میرے گھر پر قبضہ کررہے ہو تم۔"

میں نے کہا "نہیں یار۔ گھر تمہارا ہی رہے گا ہمارے جانے کے بعد۔ ہم تو مہمان ہیں۔ مہمان جاتے وقت گھر کیسے ساتھ لے جاسکتے ہیں۔"

غالب نے مجھ سے اتفاق کیا "البتہ میزبان کو ساتھ لے جاسکتے ہیں۔ زندہ یا مُردہ۔"

نورل کی ہمارے سامنے ایک نہ چلی۔ وہ چالاک آدمی ہم سے معافی مانگ کر' ہمارے سامنے ہاتھ جوڑ کے اور منت سماجت کرکے ہمیں بے وقوف بنانا چاہتا تھا۔ اگر ہم مطمئن ہوجاتے تو رات کو کسی وقت وہ اسلحے کے ساتھ ہم پر شبخون مارتا اور ہم سوتے رہ جاتے۔ اٹھنے کی نوبت ہی نہ آتی۔ اس کے محافظ کی رائفل بھی بہترین حالت میں اور لوڈڈ تھی۔ اس کے قصرِ شاہی کو گھوم پھر کے دیکھنے سے ہم پر مزید انکشافات ہوئے۔ اس عشرت کدے میں وہ سب اسبابِ عیش تھے جو دولت کی قوتِ خرید میں ہوسکتے تھے۔ وہ

سب کچھ کلکتہ سے لایا تھا۔ سوائے ان کنیزان خوبرو کے جو وہاں اس کی خدمت کے لئے موجود تھیں۔ انہیں وہ اپنی بیویاں بھی کہہ سکتا تھا مگر میں جان چکا تھا کہ یہ اس کا مال تجارت ہے جو اس مال خانے سے کلکتہ کے بازار میں جاتا ہے اور درمیانی مدت میں نورل کے کام آتا ہے۔

صدر مملکت کے سب اختیارات ہم نے سنبھال لئے تھے چناں چہ نورل اپنی بدبختی اور شامت اعمال پر خون کے آنسو رونے اور خون کے گھونٹ پی کر صبر کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ ہم نے وہیں غسل لیا اور لباس بدلا۔ وہیں کھانا پکوایا اور کھایا اور اس کی کنیزوں نے ہماری خدمت نورل کے حکم پر کی۔ نورل نے جو کچھ کیا ہمارے حکم پر کیا۔

رات کے بارہ بجے تک ہم نورل کے گھر کی تلاشی بھی لے چکے تھے۔ تاہم کسی خفیہ مقام پر چھپا ہوا یا مدفون اسلحہ نکالنا عملاً ناممکن تھا۔ نورل سخت مشتعل تھا۔ کہ ہم نے اسے اسی کے گھر میں قیدی بنا رکھا ہے اور مہمان ہو کے ہم گھر کے مالک بن بیٹھے ہیں مگر وہ اپنے غصے کا اظہار کر کے اپنی رعایا کے سامنے اپنی عزت گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ ہماری خواہش پر اس نے کنیزوں کو بھی رخصت کیا اور ہدایت کی کہ وہ اس گیسٹ ہاؤس میں چلی جائیں جہاں ہم ... کا انتظام کیا گیا تھا۔ معلوم نہیں وہ کون لڑکیاں تھیں۔ ہمارے پاس ان کی کہانی سننے کا وقت نہیں تھا اور نہ ذریعہ۔ وہ ہماری زبان نہیں سمجھتی تھیں۔ ہمارے کہنے سے اپنی زندگی کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لینے سے قاصر تھیں اور عزت آبرو کا مفہوم جان کے انہیں کچھ حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ اس نظام اور اس انداز زندگی کو نوشتہ تقدیر سمجھتی تھیں اور اس کے خلاف ان کے دل میں وہ جذبات نہیں تھے جو ہمارے دل میں تھے۔ بقول علامہ مرحوم کے۔ خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی۔ نہ ہو احساس جس کو اپنی حالت کے بدلنے کا۔

ایک لمحے کے لئے مجھے خیال آیا کہ شاید یہاں سے نکل کے یہ لڑکیاں بھاگ جائیں۔ آزادی کے اس لمحے سے جو اچانک ان پر نئی زندگی کے راستے کھولنے آگیا تھا' فائدہ اٹھائیں اور اپنی تقدیر بدلنے نکل جائیں مگر ایسا نہیں ہوا۔ وہ خوف زدہ اور سہمی ہوئی خاموشی سے باہر نکل گئیں اور صبح مجھے معلوم ہوا کہ انہوں نے اپنے مالک و آقا کے حکم کی حرف بحرف تعمیل کی تھی۔

"بانگ درا" میں علامہ اقبال کی ایک نظم ہے "غلام قادر روہیلہ" نکالیں شاہ تیموری کی آنکھیں نوک خنجر سے۔ اور پھر اس کی شاہزادیوں کو رقص کا حکم دیا۔ وہ ناچنے لگیں۔ روہیلہ نے اپنا خنجر ایک طرف رکھا اور سوتا بن گیا۔ اور جب کسی شہزادی نے خنجر اٹھا کے اس کا کام تمام کرنے کی کوشش تک نہیں کی تو اسے یقین آیا کہ۔ حمیت نام ہے جس کا گئی تیمور کے گھر سے۔

ایسا ہی یہاں بھی ہو رہا تھا۔ ہم نے تو زنجیریں کاٹ دی تھیں مگر جن میں طاقت پرواز کا حوصلہ ہی نہ ہو ان کے لئے پر ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ نورل جیسا بے غیرت اور بزدل آدمی ان کے جسم و جاں کا مالک بنا ہوا تھا مگر ہمارے سامنے وہ پالتو کتے کی طرح دم ہلا رہا تھا۔ ہم نے واقعی اسے اپنے ہی گھر میں اسیر کر لیا تھا۔

ایک کمرے میں گل اور نازو کے سونے کے بعد میں نے پہلے غالب کو موقع دیا کہ وہ دوسرے کمرے میں سو جائے۔ خود میں تیسرے کمرے میں نورل کے ساتھ موجود رہا۔ وہ مجھے بتاتا رہا کہ یہ سب سامان وہ کلکتہ سے لاتا رہا ہے جسے ہم بے دریغ استعمال کر رہے تھے۔ ریشمی ساریاں۔ پتلونیں۔ جوتے اور قمیصیں۔ کھانے پینے کی اشیاء کے بند ڈبے۔ ولایتی شراب اور پرفیوم۔ چائے' سگریٹ اور کافی۔

"یہاں رہنے والوں کے لئے ان سب چیزوں کی کوئی اہمیت نہیں" اس نے کہا "میں بھی جب کلکتہ جاتا ہوں تو قمیص پتلون پہنتا ہوں۔ کبھی سگریٹ اور چائے ان میں بھی تقسیم کر دیتا ہوں۔"

"اور یہ ریشمی ساریاں؟" میں نے کہا۔

"ایک ریشمی ساری سے ایک عورت مل جاتی ہے" وہ بولا "یہ لوگ دس دس کوس کے گاؤں سے خبر لاتے ہیں کہ کہاں نقد رقم کی ضرورت پڑے گی۔ کہاں ریشمی ساری کی۔"

"کون قبول کرتا ہے یہ ریشمی ساری؟" میں نے بڑے دکھ کے ساتھ پوچھا۔

"کبھی کسی جوان لڑکی کی ماں۔ کبھی بڑی بہن۔ کبھی کوئی خالہ پھوپی" وہ بولا "یہ ساری ایسی رشوت ہے جس کے مقابلے میں کاغذ کے نوٹ بے کار ثابت ہوتے ہیں۔ پانچ سو نقد کے بجائے دو سو کی ساری....."

میں نے کہا "چھوڑو یہ ذکر۔ مت کرو یہ باتیں۔ مجھے شرم آتی ہے کہ تم اس عورت کی عزت کے بے وقعت ہونے کا حال سنا رہے ہو جس کے لئے بڑی شاعرانہ خیال آرائی کی تھی کسی نے کہ۔ اے ماؤ بہنوں بیٹیو۔ دنیا کی عزت تم سے ہے۔ جو ماں ہوتی ہے تو اس کے قدموں میں بیٹوں کی جنت ہوتی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ میں مشتعل ہو کے تمہیں جان سے مار دوں۔ مارنا نہیں چاہتا تم کو کیوں کہ تم سے مجھے ایک کام لینا ہے۔"

"کیسا کام؟" وہ بولا۔

"صبح بتاؤں گا۔ ابھی تم سو جاؤ۔" میں نے کہا۔

"اور تم...... جاگتے رہو گے؟" وہ بولا۔

"ہاں۔ میں جاگتا رہوں گا" میں نے کہا "اپنی اور اپنے دوستوں کی حفاظت کے لئے۔"

"انہیں کوئی خطرہ نہیں۔"

میں نے کہا "خطرہ جب نازل ہوتا ہے تو بتا کے نہیں نازل ہوتا۔ چناں چہ ہم سب ایسا موقع نہیں آنے دیتے کہ خواب غفلت کا خمیازہ بھگتنا پڑے۔"

"خطرہ تمہیں مجھ سے نہیں۔ کسی اور سے ہے۔" نورل نے کہا۔

"بلاوجہ اپنے دماغ کو زحمت مت دو۔ یہ مت سوچو کہ ہمیں کس سے خطرہ محسوس ہوتا ہے۔ اور کیوں۔ یہ سوچنا ہمارا کام ہے۔ تم صرف اپنی فکر کرو۔" میں نے ہنس کے کہا۔

نیند سے لڑنے کے لئے میں ٹھنڈی بلیک کافی پیتا رہا اور سگریٹ پھونکتا رہا۔ ... کیس کا خیال آیا جو میں نے غلطی سے اپنے سامان کے ساتھ پھینک دیا تھا۔ ہیلی کاپٹر اگروال اور سانولی کے ساتھ واپس چلا گیا تھا اور چند منٹ بعد تباہ ہو گیا تھا چناں چہ اب ہم ہی اس کے مالک تھے۔

میں نے بریف کیس سے ذرا بڑے سوٹ کیس کو اٹھا کے چاروں طرف سے دیکھا' سونگھا' ہلا جلا کے کان سے لگایا اور کوئی آواز سننے کی کوشش کی جو گھڑی کی ٹک ٹک سے مشابہ ہو مگر اس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ سوائے اس کے وزن کے۔ یہ وزن کپڑوں کا نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر اس میں سونا ہوتا تو وزن اتنا زیادہ ہوتا کہ ہم اسے اٹھا بھی نہ پاتے۔

تھوڑی دیر تجسس میں مبتلا رہنے کے بعد میں نے پھر اس کے لاک کا معائنہ کیا۔ یہ نمبروں سے کھلنے والا تالہ تھا۔ میں نے اسے کان کے قریب کیا اور ایک ایک نمبر کو گھماتے ہوئے کلک کی اس خفیف سی آواز کو سننے کی کوشش کرتا رہا جو صحیح نمبر کے فٹ ہونے پر آتی ہے۔ آدھے گھنٹے میں متعدد ناکام کوششوں کے بعد آخر کار میں نے ایک لیور کو دبایا تو لاک کھل گیا۔ دوسری طرف کے لیور کو دبا کے میں نے ڈھکنا اٹھا دیا اور پھر دم بخود بیٹھا رہا۔

سوٹ کیس نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس میں سب بڑے نوٹ تھے جن کو ربر کے چھلے چڑھا کے گنے بغیر گڈی کی شکل دے دی گئی تھی۔ یہ کسی بنک سے نہیں حاصل کئے گئے تھے کہ ہر گڈی میں سو نوٹ ہوتے۔ نوٹ سیریل نمبر میں بھی نہیں تھے اور مالیت کے لحاظ سے گڈی میں نہیں رکھے گئے تھے۔ کسی گڈی میں ستر اسی نوٹ تھے تو کسی میں سو سوا سو۔ سو پچاس اور دس کے نوٹ ایک ربر بینڈ میں باندھ دئے گئے تھے۔ ظاہر ہے اس طرح سوٹ کیس کی مجموعی رقم کا اندازہ کرنا بھی ناممکن تھا۔

یہ ڈاکوؤں کا مال تھا۔ انہوں نے لوٹا تھا یا لوٹ کے جمع کیا تھا۔ قیاس کی بنیاد پر میں کہہ سکتا تھا کہ اگروال کی رہائی کے بعد اسے ہیلی کاپٹر میں نیپال لے جانے کا سارا انتظام سانولی نے کیا تھا تو اسے مالی مسائل سے بچائے رکھنے اور دولت کی طاقت دینے کا بندوبست بھی اسی نے کیا ہوگا۔ کیا عجیب پاگل عورت تھی وہ بھی۔ محبت کرنے والی عورت عجیب اور پاگل ضرور ہوتی ہے۔

میں نے سوٹ کیس پھر بند کر دیا لیکن اس بار نمبر خود ملائے تاکہ یاد رہیں۔ یہ پیسہ ہمارے کام آسکتا تھا۔ اب تک ہمارے سارے مسائل اس پیسے نے حل کئے تھے جو میں نے ایک جعلی پیر سے چھینا تھا۔ وہ پیر بھی ایک طرح سے ڈاکو تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس کے پاس لٹنے والے بے وقوف خود چل کے آتے تھے اور عقیدت کے ساتھ لٹتے تھے۔ اگروال دہشت سے لوٹتا تھا اور اس کا شکار بے وقوف نہیں وہ عقلمند ہوتے تھے جو پیسے سے پیسہ کھینچنے کا فن جانتے تھے۔

صبح چار بجے تک میں اپنے مستقبل کے لائحہ عمل پر غور کرتا رہا۔ ناسازگار حالات کے بطن سے اچانک موافق نتائج پیدا ہو گئے تھے اور حادثات کی مدد سے مشکلات کا حل نکلنے لگا تھا۔ نورل ہمیں کلکتہ پہنچا سکتا تھا اور کروڑوں کی آبادی کے اس شہر میں گم ہو جانے کے بعد ہم ڈھاکا تک اپنا راستہ بنا سکتے تھے۔ اس کام میں تاخیر لاحاصل تھی۔

صبح چار بجے تک نورل خراٹے لیتا رہا۔ پہلے مجھے شک تھا کہ اس طرح وہ مجھے دھوکا دے کر چاہتا ہے کہ میں اس کی طرف سے غافل ہو جاؤں لیکن وہ واقعی بے خبری کی نیند میں تھا۔ اس سے میرا شک دور ہو گیا۔ اگر اس کے ذہن میں کسی سازش کے جراثیم کلبلا رہے ہوتے تو اسے نیند آنا مشکل تھی۔ غالب کو اپنی جگہ بٹھا کے میں سو گیا اور ایک منٹ میں دنیا و مافیہا سے غافل ہو گیا۔

میری آنکھ شور سے کھلی۔ یہ غالب اور نورل تھے جن کے درمیان اختلاف رائے کشت و خون کی انتہا تک پہنچ گیا تھا۔

"کیا میں قیدی ہوں؟" نورل نے چلا کے کہا۔

"تم ایک سزا یافتہ قیدی ہو۔ خود کو موت کی کال کوٹھری میں سمجھو۔ اتنے سنگین جرائم ہیں تمہارے کہ تم کو ایک بار نہیں ہزار بار پھانسی ہونی چاہئے" غالب نے کہا۔

"میں جا رہا ہوں۔ دیکھتا ہوں تم کیسے روکتے ہو مجھے"

"اگر تم نے اگلا قدم اٹھایا تو میں گولی مار دوں گا تمہیں۔"

اس کے ساتھ ہی فائر کی آواز سنائی دی اور پھر نورل کی چیخ۔ میں گھبرا کے اٹھا اور دوسرے کمرے کی جانب لپکا' جہاں نورل اپنی ٹانگ پکڑے بیٹھا تھا۔ گولی اس کی ٹانگ پر خراش ڈالتی ہوئی باہر نکل گئی تھی۔ غالب کے نشانے کی مہارت کو ہم سب مانتے تھے۔ اس کا مقصد بھی یہی ہوگا کہ نورل معذور نہ ہو ورنہ وہ گولی کو اس کے ٹخنے کے اوپر پنڈلی کی ہڈی سے بھی گزار سکتا تھا۔ نورل اس کے برعکس یہ سمجھ رہا تھا کہ غالب کا نشانہ خطا ہو جانے سے اس کی ٹانگ بچ گئی۔

"یہ کیسا شور ہے نورل؟" میں نے کہا۔

"اس نے..... اس نے گولی ماری مجھے" وہ خراش کی جلن سے بے چین ہو کے چلایا۔ اس کی پنڈلی پر ایک لال لکیر نمودار ہو گئی تھی۔

"میں نے کہا تھا تم سے کہ تمہیں باہر جانے کی اجازت نہیں

ہے۔" غالب نے کہا۔

"نو بج رہے ہیں۔ میں نظر نہ آیا تو لوگ کیا کہیں گے۔ بہت سے کام ہوتے ہیں مجھے" وہ احتجاج کرنے لگا۔

"لوگ فرض کرلیں گے کہ تم دنیا سے کوچ کر گئے یا پھر بسترِ مرگ پر ہو" غالب نے کہا۔

"سب سمجھیں گے تم نے مجھے قتل کر دیا ہے" وہ بولا۔

"لوگ کیا سمجھتے ہیں' ہم اس کی فکر کیوں کریں" غالب نے کہا' "ہم انہیں بھی سمجھا سکتے ہیں کہ وہ غلط سمجھے تھے۔"

فائر کی آواز پر کچھ لوگ فوراً آ گئے تھے۔ میں نے نورل سے کہا' "انہیں کہہ دو کہ کچھ بھی نہیں ہوا۔ غلطی سے گولی چل گئی تھی۔ تم کہاں جانا چاہتے تھے؟"

"صبح سے یہ وقت ہو گیا۔ گھر میں کوئی ملازمہ نہیں ہے۔ میں انہیں بلا کے لانا چاہتا تھا تاکہ کچھ کھانے پینے کا انتظام ہو سکے" نورل نے کہا۔

"اچھا تم جاؤ اس کے ساتھ" میں نے غالب کی طرف اشارہ کیا اور پھر غالب سے پوچھا "وہ دونوں کہاں ہیں؟"

غالب نے کہا "وہ صبح کی سیر کے لئے نکلی تھیں۔ میں بھی چاہتا تھا کہ وہ لوٹ آئیں تو میں اس کے ساتھ جاؤں۔"

نورل اور غالب کے جاتے ہی گل اور نازو بھی نمودار ہو گئیں۔ "یہ گولی کس نے چلائی تھی؟"

"میں نے نہیں چلائی" میں نے کہا۔

"غالب کہاں ہے؟" نازو تشویش میں مبتلا ہو گئی "اور نورل؟"

"گولی مارو غالب کو" میں نے کہا "تم کہاں بجلیاں گرا کے آ رہی ہو؟ ساری بستی میں ہر قدم پر کشتوں کے پشتے لگ گئے ہوں گے۔ ایک نے مار دیا ہو گا' دوسری نے خاک کر دیا ہو گا۔"

گل ہنسی "سچ بڑا مزہ آیا۔ اتنی حیرانی سے دیکھ رہی تھیں غریب عورتیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے۔ جیسے ہم اس دنیا کی مخلوق نہیں' کوہ قاف کی پریاں ہیں۔"

"مردوں کی تو سانس رک گئی تھی۔ دل دھڑکنا بند ہو گئے تھے۔ ایسے کھڑے تھے جیسے قبر سے نکل کے مُردے کھڑے ہوں" نازو نے بھی ہنستے ہوئے کہا۔

انہوں نے غلط نہیں کہا تھا۔ نہا دھو کے رات بھر آرام کرنے کے بعد انہوں نے رنگین ریشمی ساریاں باندھی تھیں تو ان کے حسن کی آب و تاب پر نگاہ نہیں ٹھہرتی تھی۔ مقامی عورتیں سوتی ساریاں بھی دھوتی کے انداز میں باندھتی تھیں۔ گل اور نازو کا اسٹائل وہ تھا جسے فلمی کہا جا سکتا ہے۔ ان کے مقابلے پر اس غربت زدہ بستی میں نیم مُردہ' سوکھے جسموں والی کالی عورتیں تھیں جن کے تن کو میلے کپڑے بھی پوری طرح میسر نہ تھے۔ گل اور نازو نے صبح میک اپ کیا تھا اور پرفیوم لگائی تھی۔ ان عورتوں کے وجود سے میل اور پسینے کی اور بدحالی کی بُو اٹھتی تھی۔

میں نے کہا "تمہیں ایسے گھومنے پھرنے سے گریز کرنا چاہئے۔ ایسا نہ ہو کہ کوہ قاف سے اترنے والی پریوں کا چرچا عام ہو جائے تو پولیس والے بھی شوقِ دید میں چلے آئیں۔"

"ہر وقت ڈراتے مت رہا کرو۔ جو ہونا تھا ہو چکا' اب اور کیا ہو گا؟" نازو نے کہا "آنے دو غالب کو۔ ابھی قینچی لے کر خود اس کی حجامت کرتی ہوں۔"

گل ہنسنے لگی "بھائی سکندر! اب آپ بھی یہ جھاڑ جھنکاڑ صاف کروا دیں۔ بہت دن ہو گئے آپ کا اصلی چہرہ دیکھے۔"

میں نے داڑھی مونچھوں پر ہاتھ پھیر کے کہا "اپنا اصلی چہرہ تو اب خود میں بھی نہیں پہچان سکتا۔ پولیس البتہ پہچان لے گی۔"

"میرا خیال ہے ہم اس خطرے کو بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ اور آگے صورتِ حال ایسی ہے کہ..... کچھ بھی نہیں ہو گا۔"

"ہاں۔ اس افراتفری میں کون پہچاننے والا ہو گا سکندر اور غالب کو۔ سوائے ایک محسن کے" میں نے کہا۔

گل کے چہرے پر بادل کا سایہ سا آ کے گزر گیا "بھائی سکندر! یہ شخص کلکتہ آتا جاتا ہے۔ اسے کہیں کہ آج ہی ہمیں کلکتہ پہنچا دے۔"

نازو نے اس کی تائید میں سر ہلایا "وہاں سے ڈھاکا جانا تو ایسا ہی ہو گا جیسے کراچی سے حیدر آباد جانا۔ یا لاہور سے راولپنڈی۔"

میں نے کہا "وہ لالچی آدمی ہے۔ پیسہ مانگے گا۔"

"پیسہ!" گل نے سوچ کے کہا "ہمارے پاس جو اتنا سونے کا زیور ہے۔ جس کا بوجھ اٹھائے پھر رہے ہیں ہم۔ وہ کس دن کام آئے گا؟"

"وہ بین الاقوامی کرنسی ہم ایسے ضائع نہیں کر سکتے گل۔" میں نے کہا "ابھی تو مجھے یہاں سے روانگی کے امکانات نظر نہیں آتے۔"

گل کی صورت اُتر گئی "کیا مطلب؟ ہم یہاں بیٹھے رہیں گے۔ آخر کب تک؟"

میں نے کہا "جب تک خطرہ باقی ہے۔ یہاں ہم محفوظ تو ہیں۔ اور جب تک کوئی ہماری رہنمائی کرنے والا نہ ہو' ہم ایسے منہ اٹھا کے کیسے نکل کھڑے ہوں۔ اس علاقے کا جغرافیہ بالکل مختلف ہے اور پھر سرحد کے دونوں جانب جنگ چل رہی ہے۔"

"جنگ تو ختم ہو چکی ہے" گل مُردہ لہجے میں بولی۔

"مگر فوجیں وہیں ہیں۔ کیسے گزر کے جا سکتے ہیں ہم میدانِ جنگ میں سے؟" میں نے کہا۔

میرا مقصد صرف اسے چھیڑنا تھا اور اس کے ردِ عمل سے لطف اندوز ہونا۔ وہ متفکر نظر آ رہی تھی اور اداسی کی سوچ میں ڈوب گئی

تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ نازو بھی مایوسی میں مبتلا ہو گئی تھی۔

"آپ بات تو کر کے دیکھیں نورل سے" گل نے کہا۔

میں نے مغموم سے لہجے میں کہا "بات کی تھی۔ وہ کہتا ہے کہ یہ ناممکن ہے ابھی۔ کم سے کم مہینہ لگے گا راستہ صاف ہوتے۔"

"ایک مہینہ!" گل کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "میں اتنی دیر انتظار نہیں کر سکتی۔"

"نہیں کا کیا مطلب؟ تم ہمارے ساتھ ہو۔ اکیلی تو جا نہیں سکتی ہو" میں نے کہا۔

اس نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا "میں اکیلی جا سکتی ہوں بھائی سکندر" اور خاموشی سے اندر چلی گئی۔

"یہ تو پاگل ہے" میں نے کہا "میں مذاق کر رہا تھا۔"

"پھر آپ خود پاگل ہیں جو پاگلوں سے مذاق کرتے ہیں" نازو نے خفگی سے کہا۔

اسی وقت غالب اور نورل نمودار ہوئے۔ ان کے پیچھے ایک جلوس تھا جس میں رات والی کنیزانِ باادب تھیں اور ان کے ہاتھوں میں طباخ' تھالیاں اور ڈول تھے۔ یہ سب کھانے پینے کا سامان تھا جو بقول نورل کے' بستی کے لوگوں نے مہمان نواز ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے بطورِ خاص ہمارے لئے ارسال کیا تھا۔ چاول' ناریل' مچھلی' پھل' سبزی اور دودھ سے بنی ہوئی ان اشیا میں سے ہم ناشتے میں کچھ بھی استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ اس سے نورل کو مایوسی ہوئی اور اس نے ہماری خواہش کے احترام میں چائے' انڈے' پراٹھے کا ناشتا فراہم کیا۔

نازو کے سمجھانے سے گل کی اداسی کا دورہ ختم ہو گیا تھا۔ جب ناشتے کے بعد میں نے انکشاف کیا کہ اگروال کے بریف کیس میں سے کیا برآمد ہوا ہے تو سب سے زیادہ خوش بھی وہی ہوئی۔

"اب تو کوئی مسئلہ نہیں رہا بھائی سکندر؟"

میں نے کہا "پگلی' مسئلہ پہلے کب تھا۔ اور ہم مسئلہ حل نہیں کر سکتے کیا؟ تمہیں بھروسہ نہیں ہم پر؟"

"بھروسہ کیوں نہیں۔ مگر......"

"مگر یہ کہ دیوانگی کا کوئی علاج نہیں۔" نازو نے کہا۔

"ہاں۔ ہوتا تو تم ٹھیک ہو جاتیں" غالب نے کہا۔

"مگر تمہارا علاج میرے پاس ہے۔" نازو نے کہا۔

ان کی لڑائی کو میں نے شروع ہونے سے پہلے ہی روک دیا۔ نورل اپنے حرم میں مفصل ناشتا کر رہا تھا۔ وہ سب کچھ جو ہمارے لئے لایا گیا تھا' اس نے کمال فراخدلی سے اپنی کنیزوں کے ساتھ بیٹھ کر کھایا تھا۔ جب میں نے اسے طلب کیا تو وہ منہ چلاتا ہوا آیا۔ اس کے ہاتھ میں شراب کی بوتل تھی۔

میں نے کہا "ناشتے میں بھی پیتے ہو تم؟"

"روز نہیں پیتا۔ آج ذرا دل بھاری تھا" وہ بولا "تمہاری وجہ سے میری بہت بے عزتی ہوئی ہے۔"

میں نے کہا "تم عزت کا مطلب سمجھتے ہو؟ تم تو خود عزتوں کے سوداگر ہو۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ ضرورت نے ہمیں مجبور کر دیا اور ہم نے سب کے سامنے تمہاری عزت نہیں اتاری۔"

وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا "میرے لئے کیا حکم ہے؟"

میں نے کہا "تم ہمیں کلکتہ پہنچا سکتے ہو؟ آج ہی۔"

"کیوں نہیں۔ میری اپنی کشتی ہے اور لانچ ہے۔" وہ بولا "مگر تم ایسے نہیں جا سکتے۔"

"کتنا پیسہ چاہئے تمہیں لالچی آدمی؟" گل بول پڑی۔

اس نے حیرانی سے گل کو دیکھا "مجھے کچھ نہیں چاہئے۔ میں تو آتا جاتا رہتا ہوں۔ لیکن راستے کھلے رکھنے کے لئے میں ہاتھ کھلا رکھتا ہوں۔ میرا کاروبار ہی ایسا ہے۔ میں تمہاری بات کر رہا تھا۔"

"ہم تمہاری جیب پر بوجھ نہیں بنیں گے۔ جس راستے سے چاہو ہمیں لے جاؤ لیکن راستہ محفوظ ہونا چاہئے" میں نے کہا "ہم راستے کے سب اخراجات ادا کریں گے۔"

"تمہیں اپنے حلئے بدلنے ہوں گے" وہ بولا "یہ کپڑے نہیں چلیں گے۔ تم کو ویسا ہی نظر آنا چاہئے جیسے یہاں کے لوگ ہیں۔ اجنبی نظر آؤ گے تو مشکل ہو جائے گی میرے لئے بھی۔"

"تم جو چاہو کرو۔ ہمارا حلیہ بدلو' لباس یا چہرے۔ تمہیں اختیار ہے۔ اگر تم نے ہمیں بحفاظت کلکتہ پہنچا دیا تو تمہیں اس کام کا منہ مانگا معاوضہ ادا کیا جائے گا۔ اور کوئی گڑبڑ ہوئی تو ہم سے پہلے تم مارے جاؤ گے۔"

اس نے سوچ کے کہا "ہم رات کو چلیں گے۔ اس وقت تک میں سارا بندوبست کر لوں گا۔ مجھے بڑی کشتی کا بھی انتظام کرنا ہے جس میں گیارہ بارہ آدمی آرام سے جا سکیں۔"

"گیارہ بارہ..... اور کون ہے؟"

اس نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا "یہ چھ لڑکیاں ..... انہیں بھی تو لے جانا ہے۔"

میں نے اس کے ایک جھانپڑ رسید کیا "صرف تم جاؤ گے ہمارے ساتھ۔ اور کوئی نہیں"

اس نے گال سہلا کے کہا "تم سمجھتے کیوں نہیں۔ اس وقت سرحد پار آنے جانے کا یہی ایک طریقہ ہے۔ کہ یہ دونوں بھی ان میں شامل ہو جائیں۔ اور تم میرے کاروباری شریک بن جاؤ۔"

میرے جسم کا سارا خون کھنچ کر چہرے پر آ گیا۔ گل اور نازو ان لڑکیوں میں جو کلکتہ کے بازار میں بکنے جا رہی ہیں..... اور ان کے ساتھ ہم بطور بردہ فروش۔ اس کا تصور ہی رسوائی کی انتہا تھی۔ نورل کی بات کا مجھ پر وہی اثر ہوا تھا جو غلیظ ترین گالی کا ہو سکتا تھا۔ مگر غالب کا ردِ عمل زیادہ شدید تھا۔ نورل نے بارود میں چنگاری پھینک دی تھی۔ غالب نے ایک دم ریوالور نکالا اور اسے شوٹ کر دیا۔ گولی نے اس کے سر کو پاش پاش کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی چیختی چلاتی لڑکیاں ایک دم باہر نکل گئیں۔

کچھ دیر کے لئے ہم سب سکتے کی سی کیفیت میں بیٹھے رہے اور نورل کی خاک و خون میں غلطاں لاش کو دیکھتے رہے۔ جس کی کھلی آنکھوں میں اب بھی ہمارے لئے کھلی دھمکی تھی کہ تم نے مجھے مار تو دیا مگر اب خود اس وحشی قبیلے کے غیظ و غضب اور انتقام کا نشانہ بننے سے کیسے بچو گے۔

میں نے سر پر ہاتھ مار کے کہا "غالب' یہ تم نے کیا کر دیا؟"

غالب نے سپاٹ لہجے میں کہا "وہی جو تم نہ کر سکے۔ میری قوت برداشت اتنی نہیں ہے جتنی تمہاری۔"

میں نے بے بسی سے کہا "یار' تم عقل سے کام نہیں لے سکتے تھے؟"

غالب نے اسی سرد لہجے میں کہا "ایسی گالی سُن کے تمہارے لئے عقل سے کام لینا ممکن تھا۔ میں نے جو کیا ٹھیک کیا۔ میری عقل نے بھی یہی کہا تھا۔ اب نہ مجھے اس پر ندامت ہے اور نہ خوف کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟"

"تم واقعی بہادر ہو" نازو نے کہا مگر اس کے لہجے میں طنز نہیں تھا فخر کے جذبات تھے۔

غالب نے ممنون ہو کے اسے دیکھا "میں نے غلطی تو نہیں کی نازو؟"

نازو نے اس کا ہاتھ تھام لیا "مجھے فخر ہے تم پر۔"

میں نے کہا "اب تیار ہو جاؤ مقابلے کے لئے۔ خواہ ہمیں اس قبیلے کے ایک ایک فرد کو جان سے مار کے اپنا راستہ بنانا پڑے مگر اب ہمیں نکل جانا چاہئے۔"

باہر ایک کہرام مچا ہوا تھا۔ نورل کے قتل ہوتے ہی اس کی زر خرید کنیزیں چیختی چلاتی فرار ہو گئی تھیں اور ہم باہر سے ان کا واویلا سُن سکتے تھے۔ ان کی زبان سے ناواقفیت کے باوجود یہ اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ سارے قبیلے کو ہمارے ہاتھوں نورل کے مارے جانے کی اطلاع دے چکی ہیں۔ ان کی فریاد و فغاں میں دوسری برہم آوازوں کا شور شامل ہو گیا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے نورل کے غلام' عقیدت مند اور پیروکار اپنے مالک' نجات دہندہ اور لیڈر کے قتل کا بدلہ لینے کے لئے ہر طرف اکٹھے ہو رہے ہیں۔ اپنی قوت کو مجتمع کر رہے ہیں تاکہ ہمارے جسموں سے کھال اور گوشت نوچ لیں اور ہماری ہڈیوں کو بھی چور چور کر دیں۔

میرے اشارے پر غالب' گل اور نازو نے اٹھ کے ریوالور نکال لئے تھے اور اب وہ میرے اگلے حکم کے منتظر تھے۔ مشتعل لوگوں کا ہجوم بھی باہر رکا ہوا شاید اپنے سردار کے اشارے کا انتظار کر رہا تھا۔

میں نے کہا "اس سے پہلے کہ یہ سب وحشی ہم پر ٹوٹ پڑیں' میں ان سے بات کر کے انہیں سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔"

غالب نے کہا "کیسے سمجھاؤ گے انہیں؟ یہ تمہاری زبان کہاں سمجھیں گے۔"

نازو نے کہا "زبان سمجھتے تب بھی ان کے جذبات کی شدت پر قابو پانا مشکل ہوتا۔"

گل نے کہا "باہر مت جائیں بھائی سکندر۔ یہ لوگ مار ڈالیں گے آپ کو۔"

"بے وقوف! مارے تو ہم اندر بھی جائیں گے۔ یہ کوئی قلعہ نہیں ہے جس میں ہم مورچہ بند ہو کے بیٹھ جائیں۔ گھاس پھونس کی دیواریں کب تک پناہ دیں گی آخر۔ میں کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا۔ غالب! تم میرے ساتھ آؤ۔ میرے پیچھے۔ نازو! تم کسی سوراخ سے ہجوم پر نظر رکھو۔ جو بھی حملے میں پہل کرے اسے بے دریغ گولی مار دینا۔ گل! تم پیچھے رہ کر ہم سب کو کور کرو۔ اچھا چھوڑو۔ تم دوسری طرف آجاؤ۔ کسی سوراخ میں سے تم بھی دیکھتی رہو۔"

میں نے دروازے سے سر نکالا ہی تھا کہ ایک سنسناتا ہوا تیر آیا اور میرے سر کے بالوں کو چھوتا ہوا گھاس پھونس کی دیوار میں پیوست ہو گیا۔ ایک لمحے کے لئے میرے وجود میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی لیکن میں نے اس خوف کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ ریوالور ہاتھ میں لے کر میں ساٹھ ستر افراد کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ان سب کی آنکھوں سے نفرت کا لاوا اُبل رہا تھا اور ان پر خون سوار تھا۔ ان کے نیم برہنہ جسم کی ساری ہڈیاں ناطاقتی کی مظہر تھیں مگر ان کے جارحانہ عزائم کی طاقت کم نہ تھی۔ ان کے پیٹ خالی تھے مگر دل عداوت کی آگ سے پُر تھے اور وہ جانتے تھے کہ خشک تنکی کمزور ہوتی ہے مگر وہ مل کے ایک گٹھا بن جائیں تو درخت کے تنے کی مضبوطی حاصل ہو جاتی ہے۔

میں نے تیر کو کھینچ کر نکالا اور چلا کے کہا "یہ کس کی حرکت تھی؟"

میرا سوال میرے لہجے اور میری صورت سے عیاں تھا چناں چہ الفاظ کے نہ سمجھنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ سب ایک دم چیخ چیخ کر اندر کی جانب اشارہ کرنے لگے اور ہوا میں مکے لہرانے لگے۔ ان کے ہاتھوں میں نیزے' لاٹھیاں' ڈنڈے اور لوہے کے سریے تھے۔ جس کو کچھ نہیں ملا تھا اس نے بھی پتھر اٹھا لیا تھا۔

میرے سوال کا عملی جواب ایک شخص نے یوں دیا کہ اپنا ہاتھ اٹھا کے اس نے پتھر کھینچ مارا۔ میں اس کے لئے تیار تھا۔ اپنا سر جھکا کے میں نے خود کو بچایا۔ پتھر دیوار پر لگا لیکن اس کے ساتھ ہی فائر کی آواز آئی۔ وہ شخص اچھل کر زمین پر گرا اور تڑپنے لگا۔

ایک لمحے کے لئے مجمع ساکت ہوا۔ پھر ایک نوجوان چیخ مار کے نیزہ میرے سینے میں اتارنے کے لئے لپکا۔ اس نے کچھ فاصلے سے ہی نیزہ پھینک دیا تھا۔ نیزا میرے دائیں ہاتھ کو چھوتا ہوا گزرا۔ پھر دوسرا فائر ہوا اور وہ بھی پلٹ کے زمین پر ایڑیاں رگڑنے لگا۔

اب مجمع کا جوش و خروش سرد پڑ گیا تھا۔ دو افراد کے خون نے

جذبات کی آگ کو بجھا دیا تھا اور مرنے والوں کا کرب دیکھ کر جینے والوں کو ہوش آ گیا تھا۔

میری نگاہیں سردار کو تلاش کر رہی تھیں۔ وہ سب سے پیچھے ساکت و صامت کھڑی ہوئی عورتوں کے مجمع کو چیرتا ہوا نمودار ہوا اور چیختا چلاتا میرے سامنے آگیا۔ وہ بار بار ہاتھ اٹھا کے دو لاشوں کی طرف اور اندر کی جانب اشارہ کر رہا تھا اور کچھ پوچھ رہا تھا۔

میں نے کہا "نورل نے ہمیں قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کوشش میں وہ خود مارا گیا۔"

سردار نے پھر چیخ کر کچھ کہا۔

میں نے کہا "یہ دونوں بھی اپنی موت کے خود ذمے دار ہیں۔ ہم کسی کو مارنا نہیں چاہتے تھے لیکن کوئی یہ سمجھتا ہے کہ ہم اس غول بیابانی سے ڈر جائیں گے تو۔۔۔۔"

سردار نے میری بات کاٹ دی اور ہاتھ ہلا ہلا کے اپنے لوگوں سے کچھ کہنے لگا۔ ان سب نے نیزے' لاٹھیاں اور سریے اٹھا کے ایک ساتھ نعرہ لگایا۔ غالباً سردار نے سوال کیا تھا کہ کیا میرے حکم پر تم ان قاتلوں پر ٹوٹ پڑو گے۔ ان سب نے ایک آواز میں اسے اپنی جاں نثاری کا یقین دلایا تھا۔

صورت حال خطرناک ہو گئی تھی۔ اس کا واحد علاج یہ تھا کہ سردار کو یرغمال بنا لیا جائے۔ میں نے ایک دم اسے دبوچ کے اپنے سامنے کر لیا اور ریوالور کی نال اس کی کنپٹی پر رکھ دی۔

"ان سے کہو واپس چلے جائیں" میں نے حکم دیا اور ہاتھ سے اشارہ بھی کیا۔

میرے بائیں بازو کے حلقے میں سردار کی گردن پھنس کے رہ گئی تھی اور وہ بری طرح تڑپ رہا تھا' لاتیں چلا رہا تھا اور سانس لینے کی جدوجہد کر رہا تھا۔ میرے ہاتھ کا اشارہ بہت واضح تھا۔ سردار نے بڑی مشکل سے کچھ کہا۔ اوپر اٹھے ہوئے تیر' نیزے اور لاٹھیاں نیچے ہو گئے۔ پیچھے سے اٹھارہ بیس سال کا لڑکا آگے بڑھا۔

"اپن بات کرے گا" اس نے قریب آنے کی اجازت طلب کی۔

میں نے کہا "آگے آجاؤ۔"

اس نے نزدیک آ کے کہا "سردار کو چھوڑ دو۔"

میں نے کہا "سردار سے کہو' اپنے قبیلے کو واپس جانے کا حکم دے۔"

"سردار اپنا باپ ہوتی۔۔۔۔" اس نے عاجزی سے کہا۔

"اچھا۔ تو تم سردار کے بیٹے ہو" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "تم حکم دو سب کو کہ واپس لوٹ جائیں ورنہ ہم سردار کو مار ڈالیں گے۔ کسی کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

لڑکے نے بے بسی سے مجمع کی طرف دیکھا اور ہمارے تکلمات کی ترجمانی کر دی۔ لوگ اسی طرح کھڑے رہے۔ ان کے پیچھے عورتوں کا اور بچوں کا ہجوم مسلسل رونے پیٹنے میں مصروف تھا۔ میری نظر کو ان چھ عورتوں کی تلاش تھی جن کو نورل نے بطور خاص ہماری میزبانی کے لئے منتخب کیا تھا اور جو اس کے قتل کی عینی شاہد بن چکی تھیں مگر وہ مجھے اس حلقہ غم گساراں میں دکھائی نہ دیں۔

"یہ باپ کا بات مانتی" لڑکے نے اپنی مجبوری بتائی۔

"پھر اپنے باپ صاحب سے کہو کہ ہم بات کرنے کے لئے تیار ہیں اور جرمانہ بھی دیں گے مگر پہلے ان سب سے کہو کہ اپنے گھر جائیں ورنہ ہم فائر کھول دیں گے اور بہت خون خرابہ ہوگا۔"

لڑکا کچھ دیر میری صورت تکتا رہا۔ پھر بات اس کی سمجھ میں آگئی اور اس نے اپنے والد محترم سے کچھ کہا۔ والد نے جاں کنی کے عالم میں کچھ فرمایا۔ لڑکے نے اپنی رعایا سے پھر خطاب کیا اور ایک نعرہ لگایا جس کے جواب میں سردار نے سر ہلا کے کہا کہ محاصرہ ختم کر دیا جائے۔ آہستہ آہستہ لوگوں نے مراجعت اختیار کی اور اپنے ساتھ وہ دونوں لاشیں بھی اٹھا کے لے گئے۔

اب میں نے سردار کو باعزت طور پر اندر تشریف لانے اور مذاکرات کے ذریعے معاملات طے کرنے کی پیش کش کی۔ اس کا بیٹا بطور مترجم شریک ہوا اور ہمارے درمیان کسی دشواری کے بغیر سمجھوتہ ہو گیا۔ انہیں نورل صرف اس لئے عزیز تھا کہ وہ ان کے معاشی مفادات کا تحفظ کرتا تھا۔ نورل کے بغیر انہیں اقتصادی بحران کا خطرہ درپیش تھا اور وہ خود کو اتنا ہی غیر محفوظ سمجھتے تھے جتنا کوئی اندھا خود کو لاٹھی کے بغیر محسوس کرتا ہے۔

نازو نے بڑی ذہانت کا مظاہرہ کرتے ہوئے سونے کے تمام زیورات کی پوٹلی آگے بڑھا دی "نورل یہ سب چھین لینا چاہتا تھا۔ اس نے کل رات بھی چوری کرنی چاہی تھی۔"

سردار کی آنکھیں خالص سونے کے ڈھیر کو دیکھ کر پھٹی رہ گئیں۔ اس نے اپنے ولی عہد کی طرف وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔ ولی عہد نے اسے نازو کی بات کا مطلب سمجھایا۔

"باپ صاحب بولتی نورل چور نہیں ہوتی۔" سردار کے بیٹے نے کہا۔

"وہ چور بھی تھا اور ڈاکو بھی" میں نے برہمی سے کہا "اس زیور کے لئے وہ ہماری جان لینا چاہتا تھا۔"

سردار نے اپنے سپوت کی معرفت کہا "آخر تم لوگوں کے پاس اتنا سونا کہاں سے آیا؟"

میں نے جواب دیا "تمہیں یہ سوال پوچھنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ یہ ہماری جائز ملکیت ہے۔"

اس نے کہا "تم اتنے امیر آدمی نہیں ہو۔ تم نے بھی یہ کسی سے چھینا ہوگا۔"

میں نے غصے کو پی کر کہا "اس بحث سے کیا حاصل ہوگا آخر؟ نورل کی موت سے ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن تم لوگ سمجھتے ہو کہ تمہارا نقصان ہوا ہے تو ہم یہ زیور تمہیں دے سکتے ہیں۔"

ولی عہد نے ہماری فراخدلانہ پیشکش سے سردار کو آگاہ کیا تو اس کی جذباتی کیفیت ایک دم بدل گئی۔ وہ نورل کی موت پر جتنا مغموم اور مشتعل نظر آتا تھا اب اتنا ہی مطمئن اور مسرور نظر آنے لگا۔

"والد صاحب پوچھتے ہیں کہ یہ سب تم کس کو دوگے۔ سارے قبیلے کو؟"

میں نے کہا "والد صاحب کی خدمت میں عرض کرو کہ ہم یہ سب ان پر چھوڑتے ہیں۔ اس کی تقسیم وہ خود کریں۔ چاہیں تو سب اپنے پاس رکھیں۔ قبیلے کو محض حکم دیں کہ نورل کی مغفرت کے لئے دعا کی جائے کیوں کہ وہ گناہ گار اور روز خی تھا۔ آدھا اپنے پاس رکھ کے باقی آدھا سب میں بانٹ دیں یا انصاف اور مساوات کے اصولوں کی پاسبانی مطلوب ہو تو سب کو برابر حصہ دیں۔"

ولی عہد نے جو صورت سے غبی اور فاترالعقل لگتا تھا' میری بات پر کافی دیر غور کیا اور مطلب سمجھ لینے کے بعد والد صاحب کو متن کا خلاصہ پیش کیا۔ والد صاحب کی بتیسی نظر آنے لگی اور انہوں نے سونے کے ڈھیر کو اپنے قبضے میں کرلیا۔

"مہمانوں سے کہو کہ وہ بالکل فکر مند نہ ہوں۔ قبیلہ ہمارے

میں نے کہا "مجھے قبیلے کے نوجوانوں کا رویّہ خاصا باغیانہ لگتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ہماری حمایت کے جرم میں سردار کا تختہ الٹ جائے۔"

یہ بات سمجھنا ولی عہد کے لئے دشوار ثابت ہوا کہ تختہ کیسے الٹا جاتا ہے مگر اس کے والد صاحب کی ناقص عقل میں تو یہ بات ہی نہیں آئی کہ بغاوت کا علم کیوں اور کیسے بلند کیا جاتا ہے اور سرداری کے منصب پر ان کی وفاتِ حسرت آیات کے بعد ولی عہد کے سوا کوئی دوسرا شخص کیسے فائز ہوسکتا ہے۔

غالب نے کہا۔ "یار ان کو سب سمجھانے کی کیا ضرورت ہے؟"

نازو نے کہا "سردار کی ضمانت کافی ہے۔"

میں نے کہا "میں ایک اندیشے کا اظہار کررہا ہوں۔ ممکن ہے نوجوان' سرکش خون میں اطاعت کا موروثی جذبہ کمزور پڑگیا ہو۔ جیسا کہ ساری دنیا میں ہورہا ہے۔ غلام بھی اب سر اٹھا کے سوال کرتے ہیں اور اختلاف کا حق مانگتے ہیں۔ ساری دنیا میں......"

غالب نے کہا "دنیا کو گولی مارو۔ سردار سے صاف بات کرو کہ یہ جرمانہ ہی نہیں' معاوضہ بھی ہے۔ وہ ہمیں بہ حفاظت یہاں سے نکالنے کا پابند ہوگا اور اگر کسی قسم کی بدعہدی ہوئی تو عین ممکن ہے کہ قبیلے پر اس کے خاندان کی حکومت کا دور ختم ہوجائے اور رعایا جمہوری روایات کے مطابق اپنا سردار خود منتخب کرلے۔"

"جہاں بھی بادشاہت اور آمریت ہو وہاں حکمراں موت سے اتنا نہیں ڈرتے جتنا عوام کے جمہوری شعور سے ڈرتے ہیں۔" نازو نے ایک عظیم فلسفیانہ حقیقت بیان کی۔

میں دنگ رہ گیا "نازو! یہ اچانک تمہارے وجود میں کس کی روح حلول کرگئی ہے! برٹرنڈ رسل کی۔ یہ تم بول رہی تھیں؟"

غالب نے کہا "پتا نہیں کب کالج کی کسی تقریب میں کوئی تقریر کی ہوگی۔ اس کا ایک جملہ یاد رہ گیا۔"

خلاف توقع نازو نے برا ماننے کے بجائے مسکرا کے کہا "ہاں یہ رات بھر جاگ کے تقریر یاد کی تھی۔ بڑی مشکل سے۔ اور پھر بھی عین وقت پر گڑبڑ ہوگئی تھی۔"

"کیا؟ مخالفت میں بولنا تھا اور موافقت میں دلائل دے دیئے تھے۔"

نازو نے جھینپ کر کہا "کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔"

میں اور غالب ہنسنے لگے۔ سردار اور ان کا ہونہار بیٹا ہمیں بے وقوفوں کی طرح دیکھتے رہے۔ ان کے لئے اس صورت حالات میں لطیفے جیسی کوئی بات نہ تھی کہ ہم نے یکے بعد دیگرے تین قتل کر ڈالے تھے اور پھر ہنسی خوشی سونے کا ایک ڈھیر جرمانے کے طور پر پیش کردیا تھا۔ جب کہ ہمارے لئے کشتوں کے پشتے لگا کے لاشوں پر سے اپنا راستہ بنانا بھی مشکل نہ تھا۔ ہم ایسے مجرم ثابت ہوئے تھے کہ ہم نے جرم کی سزا بھی رضاکارانہ طور پر قبول کی تھی۔ وہ بھی خود اپنی عدالت کے فیصلے پر۔

آخر کار تمام تصفیہ طلب امور پر اتفاق رائے ہوگیا اور سردار نے ہم سے معاہدہ کرلیا کہ وہ ہمیں اس لانچ تک پہنچادے گا جو نورل کی ملکیت تھی۔

"ابا بولتی کہ ہم رات کو جاتی۔ کسی کو معلوم نہ ہوتی۔" ولی عہد نے کہا۔

"یعنی ہم خاموشی سے وہ لانچ لے کر فرار ہوجائیں۔ قبیلے کو کچھ پتا نہ چلے؟" میں نے کہا۔

اس نے اثبات میں سر کو جنبش دی "ہم آپ کو لے جاتی اور لانچ دکھاتی۔ لانچ چلاتی۔ واپس آتی۔"

میں نے سرہلا کے کہا "اللہ آپ کو جزا دیتی مگر یہ بھی بتادو کہ تم نے اور والد صاحب نے اس دولت کی تقسیم کے لئے کیا اصول وضع کیا ہے؟ مقتولین کے ورثاء کو بھی کچھ ملے گا یا نہیں؟"

غالب نے کہا "آخر آپ کیوں متفکر ہیں کہ ہمارے جانے کے بعد کیا ہوگا؟ حق اور انصاف کے معاملات پر غور مت فرمائیں صرف اپنے بارے میں بات کریں۔"

میں نے آہ بھر کے کہا "تم مجھے خود غرضی اور کمینگی سکھار ہو دوست۔ مجھے اپنے جیسا بنانا چاہتے ہو۔"

"اس وقت یہ بقا کی جدوجہد ہے" غالب نے کہا "یہاں اصول' اخلاق پر کوئی مذاکرہ یا سیمینار نہیں ہوسکتا۔"

سردار سے مذاکرات ختم ہوئے تو صورت حال میں بڑی ڈرامائی تبدیلی رونما ہوئی۔ سردار نے پہلے تو ولی عہد کو زبانی ہدایات دے کر کہیں بھیجا۔ غالباً سونے کے زیورات کی پوٹلی کو چھپانے

لئے اور عوامی جذبات کا رخ بدلنے کے لئے۔ سردار ایک کامیاب سیاست داں تھا اور اپنے ولی عہد کی تربیت اس طرح کررہا تھا کہ بعد میں وہ عنانِ حکومت سنبھالے تو اتنا ہی بااختیار ہو جتنا صدرِ امریکا ہوتا ہے۔ فرق صرف برسراقتدار آنے کے طریقے کا تھا لیکن سیاست کی بساط کے اصول وہی تھے۔ پیادے یہاں بھی آگے رہ کر مرتے تھے۔ وزیر سے فیل تک سب شاہ کی حفاظت کرتے تھے اور شاہ کے لئے صرف مات تھی۔ موت نہیں۔

سردار نے بڑی عیاری سے اپنی رعایا کو یقین دلایا کہ نورل درحقیقت ایک شیطان تھا جس نے فرشتے کا روپ دھار لیا تھا۔ سردار پہلے بھی جانتا تھا کہ نورل کس طرح ان جاہل اور غریب انسانوں کی محنت' جان و مال اور عزت کی سوداگری سے اپنے ہوس کے خزانے بھرتا ہے مگر وہ خود اس کا شریک کار تھا چناں چہ نورل کا کوئی جرم نہیں تھا مگر وہ نہیں رہا تو سردار نے اس کی لاش پر سیاست کی۔ اسے بدترین اخلاقی مجرم ثابت کردیا اور اس کو قتل کرنے پر ہمیں غیبی نجات دہندہ کی حیثیت عطا کردی۔

اس نے قبیلے کے لوگوں پر اپنی خطابت سے جادو کردیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ سب جو کچھ دیر پہلے ہماری جان کے درپے تھے' ہماری عقیدت میں اتنا آگے بڑھ گئے کہ ہمارے ہاتھ چومنے لگے اور پیر پکڑنے لگے۔ گل اور نازو نے بھی یہ تماشائے حیرت بڑی دلچسپی سے دیکھا۔ میں اور غالب' سردار کی ساحری اور قبیلے والوں کی سادگی پر حیرانی اور افسوس کے جذبات کا شکار رہے۔ حالاں کہ جو تماشا اس چھوٹے سے' دور افتادہ' نیم وحشی قبیلے میں ہوا تھا' وہی ترقی یافتہ' مہذب اور بڑے ممالک کی سیاست میں بھی ہوتا تھا۔

نورل کے اخلاقی جرائم کی نوعیت ایسی تھی کہ اس کے لئے دنیاوی قوانین کے تحت دی جانے والی سخت ترین سزائیں بھی ناکافی تھیں مگر ان دو نوجوانوں کا قصور اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ وہ فرطِ جذبات میں وفاداری پر زندگی قربان کر بیٹھے تھے۔ اس کے باوجود انہیں کچھ نہ ملا۔ نہ کوئی شجاعت کا تمغہ' نہ وفاداری کا انعام' نہ ستائش اور نہ کوئی اعزاز۔ الٹا وہ مجرم کی حمایت کرنے والے ملعون اور بدبخت قرار دیئے گئے۔ قبیلے کی روایات کے مطابق انہیں آخری رسوم سے محروم کرکے ایک گڑھے میں ڈال دیا گیا اور زمین برابر کرکے اس جگہ ایک کانٹے دار پودا لگادیا گیا جس کے پھل کو چھونے سے بھی خارش ہوجاتی تھی۔ یہ گویا ان کی روح کے لئے بعد از مرگ آزار کا اہتمام تھا۔

نورل کے بغیر اس کا ایوانِ صدارت خالی خالی اور سونا محسوس ہوتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کی بدروح اچانک کسی گوشے سے نمودار ہوجائے گی اور دیکھتے ہی دیکھتے حالات پھر پلٹا کھائیں گے تو قبیلہ ہمارے خون کا پیاسا ہوجائے گا۔ قبیلے کے محکوم و مجبور لوگ انسان سے زیادہ کٹھ پتلیاں تھے جو نورل کے' سردار کے' ہمارے' مافوق الفطرت طاقتوں کے اور سفلی قوتوں کے اشاروں پر چلتے تھے

اور ان کی اطاعت کے جذبات کا رخ ایک سمت سے دوسری سمت اور پھر پہلی سمت میں ہوسکتا تھا۔

شام تک ہم نے عجیب سی اعصابی بے کلی میں وقت گزارا۔ گل اور نازو سونے کی کوشش کرتی رہیں یا خاموش بیٹھی خلا میں گھورتی رہیں' میں اور غالب باری باری پہرا دیتے رہے اور کسی نامعلوم خطرے سے مقابلے کے لئے مستعد رہے۔ میرا دل سکون سے محروم تھا اور تحفظ کا وقتی احساس میرے اطمینان کو خود فریبی کی طرح لگتا تھا۔

شام کے سائے ڈھلنے لگے۔ کھانے کی خواہش کا اظہار کسی نے بھی نہیں کیا تھا ورنہ وہاں سب کچھ میسّر تھا۔

میں نے کہا "گل بانو! اتنی اداسی کس لئے؟"

وہ زبردستی مسکرائی "خوش ہونے کی بھی تو کوئی بات نہیں سکندر بھائی۔"

"خوشی کو تلاش کرنا پڑتا ہے۔ خوشی خیالوں کے سمندر کا موتی ہے" میں نے کہا "جیسے ہر سمندر میں ہر جگہ موتی نہیں ملتے ایسے ہی سب خیال خوشی نہیں دیتے مگر تم چاہو تو اداس کرنے والے خیالوں اور مایوسی کے سمندروں سے دور رہ سکتی ہو۔"

"صرف میں.....؟"

"نہیں۔ ہم سب.... مگر بات وہی ہے کہ گزرے ہوئے کل کو مت یاد کرو۔ آنے والے کل کے سنہرے سپنے دیکھو۔ خوش آئند مستقبل کی توقعات کا دامن امید سے اور امید کا یقین سے باندھو۔ خوب صورت خواب آنکھوں میں بسالو۔"

"اور کل جب آنکھ کھلے۔ اور تلخ حقیقت کا سامنا ہو؟" نازو نے کہا۔

غالب نے ہنس کے کہا "بابا' کل اگر نصیب میں رونا ہے تو پھر کل روئیں گے۔ آج ہی سے رونی صورت بنا کے کیا ملے گا۔ آج کی جھوٹی ہنسی بھی بہتر ہے۔"

میں نے کہا "نازو بی بی! چلو تم کچھ ثواب کماؤ۔ بزرگوں کی خدمت کرو۔ کافی بنا کے لاؤ۔"

گل مسکرائی "یہ بزرگی کا دعویٰ کیوں۔ کافی تو ویسے بھی مل جاتی۔"

غالب نے کہا۔ "بڑے تو ہم ہیں تم دونوں سے۔ پس تمہارے بزرگ ہوئے۔"

"ایسے بزرگوں کی تو خدمت نہیں' اچھی خاطر تواضع کرنی چاہئے" نازو نے اٹھے بغیر کہا "کبھی مرد بن کے حکم چلاتے ہیں کبھی بزرگ بن کے خدمت کراتے ہیں۔ چلو جاؤ خود کرو اپنا کام۔"

"کرلیں گے۔ تم کیا سمجھتی ہو' ہم محتاج ہیں تمہارے" غالب نے اٹھتے ہوئے کہا "تمہیں کمپلیکس ہے۔"

"کمپلیکس تمہیں ہے۔"

"ہم تو کل بھی کسی کے سرتاج' مجازی خدا وغیرہ ہوں گے۔ تم ہی رہو گی پاؤں کی جوتی۔ کنیز اور خادمہ۔ ہمارا کیا ہے بابا۔ چار رکھ سکتے ہیں" غالب نے دوسرے کمرے سے کہا

"ہاں۔ہاں۔ رکھ لینا۔ مجھے کیا سناتے ہو۔ چاروں کی غلامی کرنا۔ سب کے جوتے کھانا۔" نازو نے چلا کے کہا۔ "ہر ایک کے ہوں بارہ بچے تو اڑتالیس کو سنبھالنا۔"

"اڑتالیس کیوں؟ ہاف سنچری ہوگی۔ تم کر سکتی ہو؟ آئی ہیں ہمارا مقابلہ کرنے" غالب نے بھی چلا کے جواب دیا۔

گل کو بے اختیار ہنسی آئی۔ اس سے پہلے کہ نازو مزید گل افشانی کرتی' غالب نے ایک چیخ ماری۔ میرا خیال تھا کہ اس کا ہاتھ جل گیا ہوگا یا کوئی ایسی ہی بات ہوگی۔ میرے ساتھ نازو نے بھی دوڑ لگائی۔ لیکن غالب مزے سے ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔

"یہ کیا حرکت فرمائی تھی؟" نازو نے کہا۔

"ایک کاکروچ آگیا تھا" غالب نے کہا

"کاکروچ دیکھ کے ایسے چیخ مارتے ہیں؟"

"پھر کیسے چیخ مارتے ہیں؟" غالب بولا "ہم نے تو کبھی یہ اعتراض نہیں کیا کہ آپ نے چھپکلی دیکھ کے ایسی چیخ کیوں ماری یا ویسی چیخ کیوں ماری۔ اور مجھے کاکروچ دیکھے بغیر بھی چیخ مارنے کا حق حاصل ہے۔یوں۔" اس نے ایک اور چیخ ماری۔

باہر سے کسی نے بدحواسی میں چلا کے کہا "کیا ہوتی؟ آپ کاہے کو چلاتی۔"

میں نے واپس جا کے دیکھا تو سردار کا بیٹا ہونق صورت بنائے کھڑا تھا "فکر کی کوئی بات نہیں۔"

اس نے اطمینان کا سانس لیا "ہم سمجھتی سانپ کاٹ لیتی ہمارا باپ صاحب ادھر آتی۔"

میں نے کہا "تمہارا باپ.... سانپ۔ کیا کہہ رہے ہو؟"

وہ جھینپ کر بولا "ہم پوچھتی آپ سردار کو دیکھتی؟"

میں نے کہا "نہیں۔ وہ تمہارے پیچھے ہی گیا تھا۔ اس کے بعد سے نظر نہیں آیا۔"

"ہم بہت دیکھتی۔ کہیں نظر نہیں آتی" وہ پریشانی سے سر ہلا کے بولا۔

نہ جانے کیوں مجھے شک ہوا کہ اس کی پریشانی مصنوعی اور بے سبب ہے۔ سردار کا دو تین گھنٹے نظر نہ آنا کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ وہ تشویش کا شکار ہو جائے۔ وہ ادھر ادھر کہیں بھی جا سکتا تھا۔ جنگل دور دور تک پھیلا ہوا تھا اور ابھی رات نہیں ہوئی تھی کہ اس کے بارے میں فکر کی جائے۔

میں نے کہا "ہو سکتا ہے وہ کسی کام سے چلا گیا ہو۔"

"کام سے جاتی؟" وہ چونکا۔

"ہاں۔ کیا سردار کبھی کسی کام سے نہیں جاتا؟"

غالب نے کہا "ممکن ہے وہ ہمارے ہی کام سے گیا ہو۔ دیکھنے کے لئے کہ نورل کی کشتی اپنی جگہ پر ہے یا نہیں۔"

وہ مسکرانے لگا "آپ ٹھیک بولتی۔ وہ آپ کا کام کے لئے جاتی۔"

اس کے جانے کے بعد غالب نے مجھے کافی کا مگ تھما کے کہا "یہ نوجوان آخر کیا ہے! حد سے زیادہ احمق یا عیار؟"

"میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔"

"اس کی بدحواسی دیکھی تم نے؟"

"وہ بہت خوف زدہ سا لگتا تھا۔ مگر خوف کو چھپانے کی کوشش بھی کر رہا تھا" نازو نے کہا۔

"بہت عجیب لگا مجھے اس کا رویّہ" میں نے کہا "وہ نروس تھا۔"

رات کو وہ پھر ذرا سی دیر کے لئے نمودار ہوا تو پہلے سے زیادہ گھبرایا ہوا اور پریشان حال تھا۔

میں نے کہا "آپ کے والد ماجد کا کچھ پتا نشاں ملا؟"

اس نے کہا "نہیں...... ہاں..... وہ جنگل میں جاتی۔ اس کو سانپ کاٹتی۔"

غالب بولا "کیا.... سردار کو سانپ نے کاٹ لیا؟"

میں نے کہا "سانپ زہریلا تھا؟ سردار کی حالت تو ٹھیک ہے؟"

اس نے پھر کہا "نہیں.... ہاں۔ ابھی ہم تم کو لے جاتی تھوڑی دیر میں۔ تم تیار رہوتی۔ ہم ابھی آتی۔"

اس کا رویّہ اتنا پُراسرار اور مشکوک ہوگیا تھا کہ میں متفکر ہوگیا۔ وہ جیسے آیا تھا ویسے ہی دبے پاؤں غائب ہوگیا۔ وہ ہمیں یہ بتانے آیا تھا کہ ہم تیار رہیں مگر خود ان سوالوں کا جواب دینے کے لئے تیار نہیں تھا جو میں نے اخلاقاً پوچھ لئے تھے۔ میرا مقصد نہ تفتیش تھا اور نہ مجھے سردار کی گمشدگی پر تشویش میں مبتلا ہونے کی ضرورت تھی مگر سردار کے بیٹے نے بلا ارادہ انکار اور پھر اقرار سے میرے شکوک کو تقویت پہنچائی۔

"آخر یہ چکر کیا ہے؟" غالب کے ذہن میں بھی شاید وہی بات تھی جو میں سوچ رہا تھا "کیا ہوا ہے سردار کو؟"

"کچھ نہ کچھ ہوا ضرور ہے" نازو نے کہا "سردار خیریت سے نہیں ہے۔"

"اس کا بیٹا ہم سے کیوں چھپا رہا ہے؟ کسی مملکت کے سربراہ' اہم سیاسی یا کاروباری شخصیت کی علالت کو بعض اوقات مصلحتاً چھپایا جاتا ہے" میں نے کہا "ملک کے اندر اور باہر کی صورت حال کو دیکھا جاتا ہے۔ موت کے اعلان سے پیشتر بھی انتظامی امور اور سیاسی لائحۂ عمل طے کرلئے جاتے ہیں۔ مگر ایک چھوٹے سے قبیلے کے سردار کی بیماری یا موت کو کیسے چھپایا جا سکتا ہے۔"

"اس کی ضرورت بھی کیا ہے۔ یہ تو ولی عہد کے لئے خوش خبری ہے کہ عزرائیل کی مدد سے وہ سرداری کے منصب پر فائز ہونے والا ہے۔ یا ہو چکا ہے" غالب نے کہا۔

"اتنی کم عمری میں قسمت نے اسے مرتبہ اور اختیار بخش دیا ورنہ باپ صاحب کا کیا تھا۔ سو سال زندہ رہتی تو ولی عہد صاحب اسی سال میں تخت نشین ہوتی۔"

"یا باپ صاحب سے پہلے ہی سردار بننے کی حسرت دل میں لئے دنیا سے جاتی" نازو نے کہا۔

"خیر ہمیں کیا' ہمارے جانے کے بعد کچھ بھی ہو۔ کوئی بھی سردار بنے" غالب بولا۔

"کہیں اس نے باپ صاحب کو قتل تو نہیں کر دیا؟" نازو نے اچانک کہا۔

میں نے کہا "یہ خیال کیسے آیا تمہیں مس نازو۔ اور کیوں؟"

"خیال پر کوئی قدغن نہیں۔ تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ میرا خیال بے سروپا اور بے بنیاد ہے۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا "ولی عہد کے رویّے کو دیکھتے ہوئے میں تمہارے خیال کو منطقی سوچ کا نتیجہ قرار دے سکتا ہوں۔"

گل نے ڈر کے کہا۔ "آخر بیٹا کیوں قتل کرے گا؟"

غالب ہنسنے لگا "تم بہت بھولی ہو گل بانو۔ زر' زن اور زمین کے اسباب ہر دور اور ہر زمانے میں موجود رہے ہیں اور ابھی کچھ دیر پہلے ہم نے خود ایک سبب فراہم کر دیا تھا۔ وہ اتنا سونا تھا کہ اس کے لئے مہذب اور دولت مند بیٹے بھی خون کے رشتوں کا خون کر سکتے ہیں۔"

گل نے سر ہلایا "شاید ایسا ہی ہو۔"

"لالچ کا یہ ہتھیار خود ہم نے اسے دیا تھا" نازو بولی۔

"ہتھیار خود کسی کو قتل نہیں کرتا" غالب نے برہمی سے کہا۔ "گولی انسان کی جان نہیں لیتی' انسان لیتا ہے۔ ارادہ اس کے ذہن میں جنم لیتا ہے پھر اس کا ہاتھ ریوالور اٹھاتا ہے۔"

میں نے کہا "کیا قبیلے والے اتنے بے وقوف ہیں سب کہ سردار کے قتل پر خاموش رہیں گے؛ اس کی موت کو طبعی سمجھ کے قبول کرلیں گے؛ ولی عہد پر کوئی شک نہیں کرے گا؟"

"چھپانا تو ناممکن ہے...." نازو بولی۔

غالب نے جھنجلا کے کہا "یہ کس الجھن اور بحث میں پڑ گئے ہیں ہم۔ نہ ہم اس قبیلے میں ہیں اور نہ ہمارا کوئی تعلق ان معاملات سے ہے۔ کچھ دیر میں ہم چلے جائیں گے اور سب بھول جائیں گے۔ پھر کیا فائدہ یہ سب سوچنے سے۔ ہمارے لئے اتنا کافی ہونا چاہئے کہ بخیر و عافیت یہاں سے نکل جائیں اور کلکتہ پہنچ جائیں۔"

"اور پھر ڈھاکا" گل نے کہا۔

میں نے کہا "اور پھر لاہور۔"

"ہم سب کو اپنی منزلِ مراد کو نظر میں رکھنا چاہئے" غالب نے کہا۔

شاد باد منزلِ مراد۔ ہاں۔ میرا وطن' میں نے سوچا' میرا گھر۔ میری محبت۔ ان سب کے سوا مجھے اب کسی کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہئے۔ دنیا کے بکھیڑے بہت لمبے ہیں' کاروبار حیات میں الجھاؤ بہت ہیں اور فرصتِ زندگی بہت کم ہے۔ میری زندگی کا ہر لمحۂ گزراں تقاضا کرتا ہے کہ میں اپنی سوچ اور اپنی محبت کو اپنی استطاعت کی حد تک سمیٹ لوں۔ سارے جہاں کے درد کے لئے میرا جگر ہی کیوں۔ اور غمِ جہاں سے آگے فکرِ دو جہاں ہے۔ کائنات کی لامحدود وسعت ہے۔ ستاروں پر کمند ڈالنے کے لئے تو عمرِ خضر بھی کم ہے مگر وہ جو میری تقدیر کا ستارہ ہے۔ وہ مجھے بلاتا ہے۔ کوئی پکارو کہ اِک عمر ہونے آئی ہے۔ کہیں تو قافلۂ صبح و شام رک جائے۔

میرے منتشر' بے سمت خیالوں کا سفر یکلخت ختم ہوگیا۔ سردار کے بیٹے نے اندر آ کے کہا "ابھی سب چلتی۔"

میں نے گل اور نازو کی طرف دیکھا "کیا خیال ہے' چلیں؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے" گل نے کہا۔

"پوچھا اس لئے کہ شاید تمہیں تیاری کرنی ہو۔"

"کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب تیار بیٹھے ہیں۔" غالب نے اٹھ کے اپنی بیلٹ ٹائٹ کی۔

"کیا ہم اسی لباس میں جائیں گے؟" میں نے سردار کے بیٹے سے سوال کیا۔

اس نے کچھ دیر سوچ کے نفی میں سرہلایا "آپ امیر نظر آتی' راستے میں خطرہ ہوتی۔ کوئی لوٹ لیتی۔"

"ہم غریب کیسے نظر آتی؟" غالب نے کہا۔

ولی عہد نے ہمیں مفید مشوروں سے نوازا اور کہا کہ اگر ہم تلاش کریں تو ہمیں اسی گھر میں ایسے کپڑے مل جائیں گے جن میں ہم اجنبی نہیں لگیں گے۔

"چیف کے ٹو" غالب نے کہا "کیا یہ ہمیں مشورہ دے رہا ہے کہ ہم بھی صرف منی لنگی کا فیشن اختیار کرلیں؟"

"منی لنگی" گل ہنسنے لگی۔

"ہاں۔ لنگی کم سے کم ٹخنوں تک پہنچتی ہے۔ یہاں کمر سے شروع ہو کے گھٹنوں سے پہلے ختم ہوجاتی ہے۔" غالب نے کہا۔

"سنگل پیس سوٹ۔"

"کیا خرابی ہے اس میں؟ ٹارزن بھی تو ایسے ہی سوٹ پہنتا ہے اور بہت اسمارٹ نظر آتا ہے" نازو نے کہا۔

میں نے کہا "مگر غالب اور ٹارزن میں بہت فرق ہے۔"

"چلو میں نہیں لوں گا منی لنگی۔ یہ بھی پہن سکتی ہیں یہاں کے فیشن کی منی ساری جس میں بلاؤز نہیں ہوتا" غالب نے کہا۔

نازو نے جھینپ کے کہا "فضول باتیں مت کرو۔"

گل نے مسکرا کے اپنی ریشمی ساری کو دیکھا "اس کی جگہ سوتی ساری البتہ باندھی جاسکتی ہے۔"

"ہمیں چاند نکلنے سے پہلے نکل جانا چاہئے" میں نے کہا۔

اس نے اثبات میں سرہلایا "ابھی اندھیرا ہوتی۔"

"ہمیں چوروں کی طرح تاریکی میں چھپ کر فرار ہونے کی کیا ضرورت ہے؟" غالب نے کہا۔

"کیا ہربات پر اختلافِ بحث اور جرح کرنا لازمی ہے؟" نازو نے کہا۔

"ہاں۔ آدمی کو معلوم ہونا چاہئے کہ جو کچھ وہ کررہا ہے' کیوں کررہا ہے" غالب نے متانت سے کہا۔

میں نے کہا "اصولی طور پر یہ ٹھیک ہے مگر عملاً ہمارے پاس ہر مسئلے پر غور کرنے کے لئے وقت نہیں ہے' اس لئے فوراً تیار ہوجاؤ۔ یہ فیصلہ خود کرو کہ ہمیں کیسا نظر آنا چاہئے۔ یہ میرا حکم ہے۔"

دس منٹ بعد سب اس حکم کی تعمیل کرچکے تھے اور ہمارے حلئے اس حد تک اطمینان بخش ہوگئے تھے کہ سردار کے بیٹے نے سر ہلا کے اطمینان کا اظہار کیا۔ ہمارا اسبابِ سفر دو میلی چادروں کی گٹھری پر مشتمل رہ گیا تھا۔ یہ گٹھریاں میں نے اور غالب نے اٹھا رکھی تھیں اور یہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ آسکتا تھا کہ ان گٹھریوں میں لاکھوں روپے نقد اور خطرناک اسلحہ ہوگا۔ ہم نے وہ کپڑے اوپر رکھ لئے تھے جو ابھی اتارے تھے۔ کلکتہ پہنچ کر ہم پھر معزز اور شریفانہ حلیہ اختیار کرسکتے تھے۔ گل اور نازو کے پاس بھی چھوٹی چھوٹی گٹھریاں تھیں مگران میں بسکٹ تھے اور کچھ دوائ

ہم نورل کے ویران گھر کے عقبی حصے کو عبور کرکے باہر سے گزرے۔ سردار کا بیٹا آگے آگے تھا اور بہت تیز رہا تھا۔ گل اور نازو کے لئے اس تیز رفتاری کا ساتھ دینا تھا۔ چناں چہ ہم بھی باربار رکنے پر مجبور ہوجاتے تھے۔ ایک یہ بھی تھی کہ ہم سب نے چپل پہن رکھے تھے اور ہمار سالار کا اصرار تھا کہ آواز نہ پیدا ہو۔ ایک بار تو اس نے مطالبہ کیا کہ ہم چپل اتار کے ہاتھوں میں پکڑلیں اور اس ننگے پیر چلیں مگر گل اور نازو سے پہلے ہی میں نے اور غالب مطالبے کو مسترد کردیا۔ سردار کا بیٹا اسی جنگل میں پلا بڑھا اس کی عمر گزری تھی اسی دشت کی سیاحی میں۔ اس کے پاؤ کی سختی' کنکر پتھر' گھاس پھونس اور کانٹوں کی چبھن کے عا اور اتنے سخت ہوچکے تھے کہ پیروں کے تلوے بالکل جو سول بن گئے تھے۔ ہمارے پاؤں اس راستے پر چالیس قدم لہولہان ہوجاتے۔ ان کیڑوں مکوڑوں یا سانپ بچھو کے خوف الگ تھا جو رات کے وقت جنگل میں آزادانہ پھر رہے

قافلے کے لیڈر کو کسی چیز کی پروا نہیں تھی۔ اس نے پاؤں زمین پر مارا اور جھٹکا اور کسی نہ معلوم' نظر نہ آ کیڑے مکوڑے کو گالی دی جس سے اندازہ کیا جاسکتا تھا کسی چیز نے کاٹا ہوگا۔

جنگل بہت گھنا تھا اور اس میں راستہ تلاش کرنے میں کا تجربہ اور اس کی حیوانی جبلت کام آرہی تھی۔ میری سامنے چھوٹے بڑے درختوں کی تاریک دیوار کے سوا کچھ اندھیرے میں زمین پر کسی پگڈنڈی کے آثار بھی نظر نہ آتے

ایک جگہ میں نے اس کو روکا۔ "ذرا آہستہ چلو۔ لڑک رہ گئی ہیں۔"

اس نے رک کے اپنا توازن ایک پاؤں پر قائم دوسرے پیر کی ایڑی سے کوئی کانٹا نوچ لیا۔ نہ جانے کتنی اس کانٹے کی اذیت کو برداشت کرتے ہوئے چل رہا تھا۔

میں نے کہا "تم کو ڈر نہیں لگتا کہ کوئی زہریلا جانور گا؟"

اس نے دانت نکالے "سانپ کاٹتی۔ بچھو کاٹتی۔"

"سانپ بچھو کاٹتے رہتے ہیں؟" میں نے حیران ہو

وہ پھر چل پڑا "بوہت کاٹتی۔ اب زہر اثر نہیں کرتی

میں نے کہا "یہاں زہریلے سانپ ہوتے ہیں؟"

اس نے سرہلایا "بوہت۔ ابھی ہم دیکھتی۔ تم کو دکھا

میں نے جلدی سے کہا "نہیں۔ بڑی مہربانی۔ تم خود ہمیں مت دکھاؤ۔"

"سانپ آدمی سے ڈرتی۔ اس پر پاؤں رکھتی تو کا بولا۔ "تم بچ کر چلتی۔"

میں نے کہا "مجھے سانپ نظر آئے گا تو بچ کے چلوں گا نا۔ اں سانپ بغیر ہیڈ لائٹ کے پھرتے ہوں گے۔ اندھیرے میں کالا نپ کون دیکھ سکتا ہے۔"

اس نے ایک دم جھک کے ایک سانپ کی دُم پکڑلی اور اسے نکے سے اوپر اٹھالیا "ہم دیکھتی۔"

گل اور نازو نے ایک چیخ ماری۔ وہ ہم سے چند قدم ہی پیچھے تھیں۔ سانپ کو سردار کے بہادر بیٹے کے ہاتھ میں لہراتا ں رہی کھاتا دیکھ کے میری حالت غیر ہورہی تھی۔ ان کا دہشت زدہ ہونا کل جائز تھا۔

غالب نے کہا "یہ کیا حرکت ہے؟"

"یہ سانپ ہے" اس نے گویا غالب کی لاعلمی پر افسوس کا ظہار کیا اور پھر سانپ کو گھما کے پھینک دیا۔

ظاہر ہے اس کے بعد گل اور نازو کی رفتار میں مزید کمی واقع گئی۔ وہ پھونک پھونک کر قدم اٹھارہی تھیں اور آنکھیں پھاڑ اڑ کے نیچے دیکھنے کی ناکام کوشش میں باربار رک جاتی تھیں۔ لب اور میں بھی کم خوف زدہ نہ تھے مگر مجبور تھے کہ بے خوفی کا ظہار کریں اور ان کا حوصلہ بڑھائیں۔ گھاس کا پتہ بھی سرسراتا ا تو کبھی گل چیخ مارتی تھی' کبھی نازو۔ سر کے نیچے کنکر بھی آتا تو وہ چھل پڑتی تھی۔

غالب نے ان کے ذہن سے خوف دور کرنے کے لئے دوسری نیں شروع کردیں "ناجائز فائدہ مت اٹھاؤ اس ڈر کا۔"

"کیا مطلب۔ کیسا ناجائز فائدہ؟" نازو نے کہا۔

"اس بہانے تم باربار میرے زیادہ قریب آنے کی کوشش ررہی ہو۔ ایسی حرکت میں کرتا تو تم فوراً الزام لگاتیں۔"

"بے ہودہ کہیں کے۔ تم الزام نہیں لگارہے ہو؟"

"میں حقیقت بیان کررہا ہوں" غالب نے کہا "اندھیرے کا طلب یہ نہیں کہ سب اندھے ہوگئے ہیں۔"

"غالب! کچھ شرم کرو۔" نازو بگڑ کے چلائی۔

"شرم میں کروں۔ الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ جو کچھ تم کررہی اس پر میں پانی پانی ہورہا ہوں۔"

اس کے بعد یہ ہوا کہ نازو اپنا ڈر' خوف بھول گئی اور مشتعل کے اس نے ایک دم غالب کو اٹھالیا۔ دوسرے ہی لمحے غالب ا میں اڑتا ہوا ہمارے قافلۂ سالار پر گرا۔ پھر وہ دونوں نیچے رے۔ غالب تو خیر کپڑے جھاڑ کے کھڑا ہوگیا مگر سردار کے بیٹے پر جیسے سکتہ طاری ہوگیا۔ وہ نازو کو ایسے دیکھ رہا تھا جیسے اچانک اس کے سر پر سینگ نکل آئے ہوں۔

"تمہارا..... عورت تم کو مارتی؟" وہ اپنی حیرت پر قابو پا کے لا۔

"کیا تمہاری عورت تمہیں نہیں مارتی؟ کمال ہے!" غالب نے بھی حیران ہو کے کہا "اس کا مطلب ہے وہ تم سے محبت نہیں کرتی۔"

اس کی حیرت مزید بڑھ گئی "جو عورت محبت کرتی وہ مارتی؟"

غالب نے آہ بھر کے کہا "جان لے لیتی ہے میاں یہ محبت تو۔ اور عشق میں کیا نہیں ہوتا۔ اب چلو۔ میں تمہیں قیس اور کوہ کن کے بارے میں بتاتا ہوں کہ وہ کیسے مارے گئے۔ غالب کا ایک شعر ہے....."

ظاہر ہے ہمارا لیڈر دم بخود وہ سب سننے پر مجبور تھا جو اس کی سات پشتوں کی سمجھ میں نہیں آسکتا تھا۔ غالب کی باتوں پر مجھے بھی ہنسی آرہی تھی' نازو اور گل کا تو ہنس ہنس کر برا حال تھا۔ غالب کی زبان بے لگام ہوگئی تھی اور وہ جو منہ میں آرہا تھا کہتا جارہا تھا۔ درمیان میں وہ کبھی اچانک اپنے مخاطب سے کوئی سوال کر بیٹھتا تھا یا کوئی فرمائش کہ تمہیں معلوم ہے شیکسپئر میٹرک پاس بھی نہیں تھا۔ اچھا نہیں معلوم۔ تو شیخ سعدی کا کوئی شعر سناؤ۔ اس نے اپنا ایک خواب بیان کیا (ظاہر ہے اس میں نازو کا بہت اہم کردار تھا) اور ایک خاندانی شجاعت کا واقعہ جس میں اس کے پردادا کی ایک آدم خور شیر سے پنجہ آزمائی کا ذکر تھا۔ جب شیر ہار گیا تو غائب ہوگیا۔

"غائب ہوگئی؟ کیوں؟"

"شرم کے مارے۔ دراصل وہ ایک بھوت تھا" غالب بولا۔

"بھوت کون ہوتی؟"

"بھوت۔ ایک تو میرا سسر ہے۔ فادر اِن لا بلکہ آؤٹ لا" غالب نے کہا۔

غالب اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا۔ جنگل کا باقی راستہ ہنستے کھیلتے کٹ گیا تھا اور خوف جو سب کے اعصاب پر سوار تھا' ایسے ختم ہوگیا جیسے کسی عامل کے عمل سے جن اتر جاتا ہے۔ دروغ برگردن راوی۔ یہ تماشا میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

دریا یوں ہمارے سامنے آیا کہ ایک لمحے کے لئے ہم سب حیران رہ گئے۔ گھنے درختوں کا پردہ ہٹتے ہی ہم نے گدلے پانی کی دھندلی چمک دیکھی اور لہروں میں چاندنی کو جھلمل کرتا دیکھا۔ دریا کی روانی میں بڑا سکون اور ٹھہراؤ تھا۔ یوں لگتا تھا کہ دریا خوابیدہ ہے اور نیند سے بوجھل دھارا آنکھیں موندے بہہ رہا ہے۔

دریا کے کنارے' پانی کے اوپر قوس کی شکل میں جھکے ہوئے درخت کے ساتھ ایک کشتی بندھی ہوئی تھی۔ دیکھنے میں یہ بہت چھوٹی کشتی لگتی تھی مگر ہم قریب پہنچے تو اس کے ایک کنارے پر لگا ہوا چھوٹا سا انجن بھی نظر آگیا۔ یہ موٹر بوٹ تھی جس میں چھ سے آٹھ افراد بہ آسانی سفر کرسکتے تھے۔

میں نے پہلے کشتی میں چھلانگ لگائی اور اپنا توازن قائم کرکے کھڑا ہوگیا۔ غالب نے باری باری گل کو اور نازو کو ایک ہاتھ سے سہارا دے کر آگے بڑھایا۔ انہوں نے ڈرتے اور چیختے چلاتے دوسرا ہاتھ میری طرف بڑھایا تو میں نے انہیں کھینچ لیا۔

نازو کی حالت دیکھ کے مجھے ہنسی آئی "کیا ہوگیا ہے تمہیں؟ کانپ کیوں رہی ہو؟"

"مجھے بہت ڈر لگتا ہے پانی سے۔"

"پہلے بھی تم ایک بحری جہاز پر رہی ہو۔"

"یہ بحری جہاز نہیں ہے۔ ڈوبنے والی کشتی ہے۔ دیکھو کیسے ڈول رہی ہے" نازو نے کہا۔

گل نے گھبرا کے کہا "یہ کشتی ڈوب جائے گی؟"

غالب نے جمپ لگائی تو کشتی کا توازن پھر بگڑا۔ نازو نے اور گل نے ایک ساتھ شور مچایا "دماغ خراب ہے کیا۔ ڈبودو گے سب کو۔"

"ڈبوئیں گے تمہیں تمہارے اعمال۔" غالب ہنس کے بولا۔ "اور جناب یہ تو ہے پانی۔ ہمیں تو اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے۔ تمہارے ساتھ۔"

"تم ڈوبو شوق سے۔ چلو بھر پانی کافی نہیں تو یہاں موقع ہے۔" نازو نے کہا۔

"اس پر بھی عرض کیا ہے کہ ہم جو ڈوبیں گے صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے۔ ویسے تمہارے ساتھ ڈوبنے سے زیادہ تیرنے میں مزہ ہے۔ اپنے گھر میں ایک سوئمنگ پول بنوائیں گے اور جب ایسی ہی چاندنی رات ہوگی نا....."

"غالب! میں پھینک دوں گی پانی میں۔"

"ذرا پھینک کے دکھاؤ۔ ساتھ لے کر نہ جاؤں تو غالب نام نہیں۔" غالب نے ڈھٹائی سے کہا۔

اسی وقت ہمیں یہاں تک لانے والے جوان لڑکے نے ساحل سے ایک سوٹ کیس اٹھا کے کشتی میں رکھا۔ پھر ایک پوٹلی اٹھا کے لایا۔ پوٹلی اس کے ہاتھ سے چھٹ کر گری تو میں نے اسے بری طرح بدحواس ہو کے چونکتے ہوئے دیکھا۔ وہ یوں میری طرف پلٹ کے دیکھ رہا تھا' جیسے رنگے ہاتھوں چوری کرتے ہوئے پکڑا جانے والا دیکھتا ہے۔ بظاہر ایسی کوئی بات نہ تھی مگر میرے ذہن میں نئے شکوک پیدا ہونے لگے۔ اس کا پراسرار رویہ کسی مجرمانہ خوف کا غماز تھا۔

"ابھی..... ہم چلتی۔" اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کے کہا۔ "چابی..... چابی....."

"کیسی چابی؟ یہ انجن اسٹارٹ کرنے کیلئے کسی چابی کی ضرورت پڑتی ہے؟"

اس نے نفی میں سرہلایا اور دیوانہ وار اپنی واسکٹ کی ہر جیب دیکھنے لگا۔ میں نے غور کیا تو مجھے موٹر بوٹ کے ساتھ منسلک زنجیر نظر آئی جو پانی میں ڈوبی ہوئی تھی اور زنگ لگنے کے باعث گدلے پانی میں دکھائی بھی نہ دیتی تھی۔ اس زنجیر کا ایک حصہ کشتی کے ساتھ ویلڈ کر دیا گیا تھا اور دوسرا حصہ درخت کے قریب شاید کسی ہک میں لگا ہوا تھا یا اس کے تنے پر لپیٹ دیا گیا تھا۔ چابی اس تالے کی تھی جو کنارے پر زنجیر کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ نورل نے کشتی کی حفاظت کے لئے صحیح انتظام کیا تھا۔

"چابی گرتی۔ اب کیا ہوتی۔" وہ سخت پریشان ہو کے بولا۔

"تالا توڑ دو۔" میں نے مشورہ دیا۔

"اتنا بڑا تالا ہوتی۔" اس نے اپنے بند ہاتھ کی مٹھی دکھا کے کہا۔ "اف۔ ہم اب مرجاتی۔"

میں نے کہا۔ "بھئی چابی گر گئی ہے تو اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟ زنجیر توڑ دو۔ اکھاڑ لو۔"

اس نے نفی میں سرہلایا۔ "آپ دیکھتی۔ کتنا موٹا زنجیر ہوتی۔ ہم اس کو....."

اچانک وہ خاموش ہوگیا اور ایک ہاتھ کان پر رکھ کے کچھ سننے لگا۔ اس کی صورت پر وحشت اور دیوانگی کے آثار نمودار ہونے لگے۔

"آپ کچھ کرتی۔" اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "ورنہ سب آجاتی۔ ہم کو مارتی۔ آپ کو مارتی۔"

"کون؟" میں نے کہا۔

"آپ سنتی؟ ادھر سے آواز آتی۔ یہ ظالم لوگ ہوتی۔"

میں نے رات کی خاموشی میں آوازوں کا ایک شور سا جو آہستہ آہستہ واضح ہونے لگا تھا۔ "یہ..... تمہارے قبیلے کے لوگ ہیں۔؟"

"ہاں۔ یہ ہم کو مارتی۔ تم کو مارتی؟" وہ رونے پر آگیا اور جوڑنے لگا۔ "ادھر سے نہیں جاتی تو مرتی۔"

گل اور نازو کے علاوہ غالب کو بھی اس شور نے متوجہ کیا تھا۔ یہ کسی غول بیابانی کے چیخنے چلانے کی آوازیں تھیں۔ وہ بہت سے تھے اور ان کی پر اشتعال صداؤں میں غصہ تھا۔

"یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ تمہارا قبیلہ کیسے ہمارے پیچھے آگیا؟" غالب نے کہا۔

"کیسے کی بات نہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیوں؟ کیا اعتراض ہے ان کو ہمارے جانے پر؟ ہم ان کے قیدی تو نہیں تھے۔ اور اگر اس نے ہماری مدد کی ہے تو کوئی جرم نہیں کیا۔ تمہارے باپ نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ہمیں کلکتہ پہنچا دے گا۔ اس سے پہلے نورل نے یہی وعدہ کیا تھا۔ اب کون سی ایسی بات ہوگئی ہے؟"

"آپ جلدی کرتی۔ خدا کا واسطے۔ زنجیر توڑتی۔ ورنہ آپ' سب مرتی۔" وہ میرے قدموں میں گرگیا اور زار و قطار رونے لگا۔

"لاحول ولا قوۃ۔ یہ کیا کر رہے ہو تم؟" میں نے کہا۔

غالب نے کہا۔ "یہ اس سے بعد میں پوچھیں گے کہ معاملہ کیا ہے۔ تم زنجیر توڑو۔"

"کیسے توڑوں یار؟ اتنی موٹی رسی ہوتی تو بھی مشکل تھا" غالب نے کہا۔ "گولی مار کے توڑ دو۔ میں کب کہہ رہا ہوں ہاتھوں سے توڑو۔ جلدی کرو۔ وہ وحشی قریب آگئے ہیں"

میں نے ریوالور نکالا۔ "فائر کی آواز پر وہ سیدھے ادھر ہی آئیں گے۔"

"وہ ویسے بھی سیدھے ادھر ہی آرہے ہیں۔" نازو نے کہا۔ "ایسا نہ ہو' ہم سچ مچ مارے جائیں۔"

گل نے کانپتے ہوئے کہا۔ "جتنا یہ خوفزدہ ہے' اس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے۔"

میں نے نشانہ لے کر فائر کیا اور زنجیر اس جگہ سے الگ ہوگئی جہاں اسے کشتی کے ساتھ ویلڈ کیا گیا تھا۔ شور اب بہت قریب محسوس ہوتا تھا۔ فائر کی آواز کے ساتھ ہی درختوں کے آشیانوں میں خوابیدہ پرندے سہم کر اٹھے اور چیختے چلاتے فضا میں پرواز کرنے لگے۔

"اب کیا ہے بے وقوف؟ انجن اسٹارٹ کرو۔" میں نے چڑ کر کہا۔ "ورنہ ان کے زہریلے تیروں کا نشانہ بن جائیں گے سب"

"انجن..... ہم نہیں چلاتی۔" وہ لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولا۔

میں دوڑ کر انجن کی طرف گیا اور اس کی ڈوری پکڑ کر کھینچی۔ انجن خاموش رہا۔ میں نے پھر کوشش کی۔ بار بار کوشش کرنے سے میرا سانس پھولنے لگا۔ ادھر ہماری جان کے دشمن لوگوں کا ہجوم سر پر آپہنچا تھا۔ ادھر انجن اسٹارٹ ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

اچانک سردار کا بیٹا میری طرف بڑھا۔ "یہ لیتی۔" میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ ہاتھ پھیلائے کھڑا تھا۔ اس کی ہتھیلی پر اسپارک پلگ کی کیپ رکھی ہوئی تھی۔ میرا جی چاہا کہ اس کے ایک جھانپڑ ماروں۔ الو کا پٹھا وہ چیز مٹھی میں دبائے کھڑا تھا جس کے بغیر انجن اسٹارٹ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہ بات وہ خود بھی جانتا تھا ورنہ وہ کیپ ساتھ لے کر کیوں آتا۔ اب اتنا بھی وقت نہیں تھا کہ میں کیپ کو تار میں لگاؤں اور انجن کے اسپارک پلگ پر فٹ کروں۔ میں نے تار کو براہ راست پلگ سے جوڑا اور انجن اسٹارٹ ہوگیا۔

موٹر بوٹ مشکل سے بیس گز دور گئی ہوگی کہ قبیلے والے کنارے پر پہنچ گئے۔ وہ پاگلوں کی طرح چیخ رہے تھے۔ پتھر پھینک رہے تھے اور تیر چلا رہے تھے۔ ہمارے آس پاس پانی میں کئی پتھر گرے اور ایک تیر کشتی کی سائیڈ میں لگا۔ میں نے کشتی کے انجن کو ریس دی اور اسے سیدھا رکھنے کی کوشش کرتا رہا۔

"سب اپنا سر جھکا کے لیٹ جاؤ۔" میں نے چلا کے کہا۔

"تم کشتی کو سنبھالو۔" غالب نے جواب دیا۔

یکلخت سردار کے بیٹے نے ایک بھیانک چیخ ماری "کیا ہوا؟" میں نے پلٹ کے دیکھا۔

"اس کے شانے میں تیر لگ گیا ہے۔" غالب نے کہا۔ "رفتار بڑھاؤ۔ وہ پانی میں اتر آئے ہیں۔"

نازو نے کہا۔ "وہ تیر کر ہم تک پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں"

میں نے کہا۔ "اتنا بدحواس کیوں ہو تم سب؟ ریوالور نکالو اور فائر کرو۔"

میرے ساتھ غالب نے اندھیرے میں نشانہ لے کر فائر کئے۔ کسی گولی کا تعاقب کرنے والوں کے لگنا محض اتفاق ہو سکتا تھا مگر ہم نے فائر جاری رکھے۔ پھر ہمارے ریوالور خالی ہوگئے اور ہم نے محسوس کیا کہ وہ شور بھی ختم ہوگیا ہے جو خون کے پیاسے لوگوں کی دیوانگی کا مظہر تھا۔ یہ عقدہ ابھی وا نہیں ہوا تھا کہ آخر ہم اچانک ان کی نظر میں پھر مجرم کیسے بن گئے تھے۔ سردار نے تو انہیں قائل کرلیا تھا کہ ہم نے نورل کو مار کے ان پر احسان کیا تھا اور وہ اپنی احسان مندی کے جذبات کا اظہار بھی کر چکے تھے۔

جواب بھی ایک دم مجھ پر وحی کی طرح نازل ہوا۔ قبیلے والے ہمارے نہیں' اس شخص کے دشمن ہو رہے تھے جو ان کے سردار کو قتل کر کے فرار ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہم تھے تو انہوں نے ہمیں بھی صفِ مجرماں میں شامل کرلیا تھا۔ ولی عہد بہادر اپنی سلطنت سے بلا وجہ تو فرار نہیں ہو رہے تھے۔ وہ ہمیں چھوڑنے نہیں آیا تھا' اپنا قبیلہ ہی ہمیشہ کے لئے چھوڑ آیا تھا۔ اسی لئے وہ خوف زدہ تھا کہ پکڑے جانے کی صورت میں اسے اپنے قبیلے کی سرداری نہیں سزائے موت ملتی۔

کشتی اب ساحل سے بہت دور آچکی تھی۔ تعاقب کرنے والے بھی بہت پیچھے رہ گئے تھے اور ہم دریا کی روانی کے ساتھ ساتھ خاصی رفتار سے اپنی مسافت طے کر رہے تھے۔

سردار کا بیٹا بھی اب مطمئن اور پُراعتماد نظر آنے کی پوری کوشش کر رہا تھا مگر ہم سب کی نظروں کا مقابلہ کرنا اس کے لئے مشکل تھا۔

آخر کار میں نے کہا "تمہارا قبیلہ بہت پیچھے رہ گیا ہے' اب تم بتا سکتے ہو کہ وہ تمہاری جان کے دشمن کیوں ہو رہے تھے۔ یقیناً اس کی وجہ ہم نہیں تھے۔ ہم انہیں مل کے اور خدا حافظ کہہ کے آتے تو انہیں قطعی اعتراض نہ ہوتا۔ شاید وہ جلوس کی صورت میں ہمیں ساحل تک چھوڑنے آتے اور ان کے جذبات بالکل مختلف ہوتے۔"

سردار کے بیٹے نے فقط سر کو اثبات میں جنبش دی مگر زبان سے کچھ کہنے کے لئے اس کے پاس نہ الفاظ تھے اور نہ ہمت۔

غالب نے کہا "تم اس قبیلے کی سرداری کو لات مار کے نکل آئے ہو۔ اس قبیلے سے آئندہ بھی تمہارا کوئی تعلق نہیں ہوگا۔"

"یا ہوگا تو وہی جو مفرور قاتل کا مقتول کے لواحقین سے ہوتا ہے" میں نے کہا "تم کبھی لوٹ کر گئے تو وہ تمہیں اسی طرح جان سے مار ڈالیں گے۔ جیسے تم نے ان کے سردار کو مارا تھا۔"

اس کا رنگ فق ہوگیا "سردار کو..... سانپ کاٹتی۔"

میں نے اس کے منہ پر الٹے ہاتھ کا بھرپور طمانچہ رسید کیا۔ "پھر قبیلے والے سانپ کے دشمن کیوں نہیں ہوئے؟ تمہارے

تعاقب میں کیوں آئے؟ تم کو ڈرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"اسے سانپ نے کاٹا تھا تو کیا ہمیں چھوڑنے کے بعد تم سردار کی جگہ لینے واپس جاؤ گے؟" غالب نے اسے پھر کھڑا کر دیا۔

میں نے اس کے دوسرا چانٹا مارا "کیا قبیلے والے اتنے بے وقوف ہیں کہ تم میں اور سانپ میں فرق ہی محسوس نہیں کر سکتے؟ تمہیں وہ سانپ سمجھتے ہیں تو ٹھیک ہی سمجھتے ہیں۔ تم آستین کے سانپ ہو۔ انہیں اپنے سردار کی موت کا صدمہ ہے مگر تمہیں اپنے باپ کو مار کے پچھتاوا محسوس نہیں ہوتا۔"

وہ دہاڑیں مار مار کے رونے لگا۔ اپنی ٹوٹی پھوٹی گرامر کے لحاظ سے مؤنث اردو میں اس نے اعترافِ جرم کر لیا۔ اس نے کہا۔ "میں وہاں نہیں رہنا چاہتا تھا۔ مجھے اپنے باپ سے بھی نفرت تھی۔ جیسے وہ دوسروں کی عورتوں کو بیچ دیتا تھا ایسے ہی وہ میری ماں کو بھی بیچ چکا تھا۔ مجھے نہیں معلوم اسے کتنی دولت ملی تھی مگر مجھے اس دولت کا اندازہ ہے جو مجھ سے چھن گئی تھی۔ اس کو عورتوں کی کمی نہ تھی۔ ہر عورت اس کے لئے صرف عورت تھی مگر میری ماں کا بدل تو مجھے نہیں مل سکتا تھا۔ جس عورت نے مجھے جنم دیا تھا وہ کہیں کلکتہ میں اپنا جسم فروخت کر رہی تھی۔ شاید اب اس قابل بھی نہ رہی ہو کہ جسم بیچ کے پیٹ کی آگ بجھا سکے۔ جسم کی خوب صورتی کا خزانہ اگر مالِ غنیمت کی طرح خرچ کیا جائے اور اسے لوٹنے والے سیکڑوں ہزاروں ہوں تو وہ زیادہ دن ساتھ نہیں دیتا۔ میں دس سال کا تھا جب وہ چلی گئی تھی۔ آٹھ سال بعد میں تصور نہیں کر سکتا کہ وہ کس حال میں ہوگی۔ کوئی لٹی پٹی روح اور جسم کے ناسوروں سے گلتی سڑتی عورت۔ جو عورت کے نام پر کلنک کا ٹیکہ بھی سمجھی جاتی ہوگی' جس سے سب نفرت کرتے ہوں گے' دور دور رہتے ہوں گے۔ وہ بھی جو پانچ دس روپے میں اس کے جسم پر حق ملکیت حاصل کرنے آتے ہوں گے۔ پھر جب مال پرانا ہو گیا ہوگا تو بھاؤ گر گیا ہوگا۔ پرانی عورت۔ رعایتی ریٹ پر۔ کٹ پرائس سیل۔ تین روپے۔ دو روپے۔ اچھا ایک۔ اللہ کے نام پر آٹھ آنے۔ مگر ایسی ہی عورتیں ہوتی ہیں جن کے جسم غیروں سے ملنے والی شرمناک بیماریوں کو سمیٹتے ہیں اور یہی عورتیں اچھوت ہو جاتی ہیں۔ ان کے قریب جاتے ہوئے بھی لوگ منہ پر رومال رکھ لیتے ہیں۔ وہ سڑک کے کنارے کسی فٹ پاتھ پر پڑی رہتی ہیں۔ کسی کوڑے وان جیسی ریڑھی میں اپنے آتشک زدہ جسم کو داستان عبرت بنائے آنے جانے والوں سے رحم نہیں موت مانگتی رہتی ہیں مگر زندہ' صحت مند' پاک صاف انسان انہیں سکے دے کر اللہ سے اور بھگوان سے ثواب اور پُن' رحم اور دیا مانگتے ہیں کہ ان کا ایسا حال نہ ہو۔ جب میں یہ سب سوچتا ہوں تو میرا جسم اور میری روح انگاروں میں جلنے لگتے ہیں۔ میں نے بہت پہلے سوچ لیا تھا کہ پہلے میں اپنی ماں کو تلاش کروں گا اور جب وہ مل جائے گی تو اسے واپس اپنے باپ کے سامنے لاؤں گا پھر میں اپنی ماں کا انتقام لوں گا۔ اس کی نظروں کے سامنے۔ تاکہ کچھ قرار اسے بھی ملے۔ کلکتہ بہت بڑا شہر ہے۔ کہ ہیں دنیا کا سب سے بڑا شہر ہے۔ یہاں سب سے زیادہ انسان رہتے ہیں۔ کئی بار میں نے یہ سوچا کہ اب آٹھ سال بعد میں اسے کیسے تلاش کروں گا اور کیسے پہچانوں گا مگر اس کا جواب ہمیشہ ایک ہی آیا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ خود مجھے نہ پہچانے اور میں اسے دیکھوں تو میرا دل خود پکار کے نہ کہے کہ یہی ہے وہ عورت جس کے وجود کا تو ایک حصہ ہے۔ جیسے چاند اس زمین کا حصہ ہے۔ وہ مجھے چاند ہی کہتی تھی۔ اگر میں چاند تھا تو وہ میری دھرتی ماتا تھی۔ مجھے یقین تھا کہ میں اسے تلاش بھی کر لوں گا اور پہچان بھی لوں گا۔ مجھے کسی مناسب وقت کا انتظار تھا۔ کلکتہ جیسے شہر میں مجھے مزدوری نہیں کرنی تھی۔ کوئی بھی کام نہیں کرنا تھا' سوائے اپنی ماں کو تلاش کرنے کے۔ اگر میں صبح کسی مل یا کارخانے میں کام کرتا اور شام تک مزدوری کرتا تو میرے پاس سونے کے لئے رات کے آٹھ گھنٹے نکال کے کتنا وقت بچتا جس میں یہ کام ہوتا۔ نہیں۔ میں طے کر چکا تھا کہ صبح سے شام تک صرف ایک ہی کام کروں گا۔ رات کے اندھیرے میں صورتیں نظر نہیں آتیں۔ رات کو میں اس کو دیکھ بھی نہیں سکتا تھا تو پہچانتا کیسے۔ یہ صرف دن کے اُجالے میں کیا جانے والا کام تھا۔ لیکن کلکتہ میں کام کئے بغیر' کمائے بغیر کوئی رہ سکتا ہے۔ اس کام میں کئی مہینے بھی لگ سکتے تھے اور کئی سال بھی۔ اتنا عرصہ زندہ رہنے کے لئے میرے پاس بہت پیسہ ہونا ضروری تھا۔ یہ پیسہ مجھے اسی شخص سے وصول کرنا تھا جس نے میری ماں کے بدلے میں پیسہ لے کر اپنے خزانے میں جمع کیا تھا۔ نورل شیطان اس کے ساتھ تھا' اس لئے میں ڈرتا تھا۔ پیسہ ہر وقت دسترس میں تھا مگر میں سمجھتا تھا کہ نورل سے چھپ کر میں کلکتہ کہیں بھی نہیں رہ سکتا۔ وہ کسی نہ کسی ذریعے سے مجھے تلاش کر لے گا۔

"جب تم نے نورل کو مار دیا اور اس کے ساتھ ہی میرے باپ کو سونے کا ایک ڈھیر بھی دے دیا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں جس وقت کا انتظار کر رہا تھا وہ آگیا ہے اور خدا میرے ساتھ ہے' مددگار ہے۔ اس نے تمہیں میری مدد کے لئے بھیج دیا ہے۔ اس رات جب میرے باپ نے کہا کہ اس سونے کو میرے کمرے میں رکھ دو تو میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں نے وہ سونا دوسری جگہ چھپا دیا۔ میرے باپ کے کمرے میں زمین کے نیچے ایک لوہے کا صندوق دفن ہے۔ اس میں بہت دولت ہے۔ لیکن اس کی چابی نورل کے پاس تھی۔ خود نورل بھی اپنا پیسہ اسی میں رکھتا تھا۔ کئی بار میں نے دیکھا کہ وہ اس صندوق کو بغیر چابی کے کھول رہا ہے۔ وہ اس پر کچھ پڑھتا تھا یا جادو کرتا تھا۔ وہ جھک کر اپنے ہاتھوں سے کچھ کرتا تھا اور تالا کھل جاتا تھا (ظاہر ہے وہ نمبر والے تالے کی بات کر رہا تھا جس کے کمبی نیشن کو سمجھنا اس کے لئے مشکل تھا)

"میں نے نورل کی لاش کی تلاشی لی تھی مگر اس کے پاس سے مجھے کوئی چابی نہیں ملی ورنہ میں ان کا خزانہ خالی کر آتا۔ اب تو صرف وہی سونا اپنے ساتھ لایا ہوں جو تم نے اسے دیا تھا۔ یہ کم نہیں ہے' اس لئے میں مطمئن ہوں۔ میں اسے تھوڑا تھوڑا کر کے بیچوں گا تو شاید کئی سال چلے گا۔"

جب وہ خاموش ہوا تو خاموشی کا پُرافسوس وقفہ آیا۔ گل اور نازو کا دل اس کی داستانِ حیات سن کے پانی ہو گیا تھا اور یہ پانی ان کی آنکھوں میں اشک بن کے اتر آیا تھا۔ دکھ مجھے بھی ہوا تھا اور غالب کو بھی۔ وہ ایک بدبخت آدمی تھا جس کی ماں بک گئی تھی۔ وہ ان سے ہزار گنا بدبخت تھا جن کی مائیں مر جاتی ہیں۔ کئی لاکھ گنا بدبخت تھا کہ اس کی زندگی کی تصویرِ عبرت اپنے تصور میں دیکھنا اور جینے پر مجبور تھا۔ اس تصور کو زندہ رکھنے پر مجبور تھا۔

آخر کار میں نے کہا "تم نے اپنے باپ کو کیسے مارا؟"

"اس کو مارنا کیا مشکل تھا" وہ بولا "جب وہ کمرے میں آیا اور اس نے صندوق کھول کے دیکھا تو اسے وہ سونا نظر نہیں آیا جو تم نے اسے دیا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا اور میں نے کہا کہ ہاں وہ سونا میں نے اپنے پاس رکھ لیا ہے۔ مجھ سے ایک غلطی ہو گئی۔ میں نے اسے صندوق پھر بند کرنے کی مہلت دے دی۔ وہ بہت بھاری اور مضبوط لوہے کا ڈھکن ہے جس پر وہ سانپ کی طرح کنڈلی مار کے سوتا تھا۔ اس نے صندوق بند کیا اور مجھے گالیاں دینے لگا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کی گردن دبوچ لی اور اس سے پوچھا کہ تو نے میری ماں کو کتنے میں بیچا تھا؟ اگر تو بتا دے گا تو میں تجھے چھوڑ دوں گا ورنہ تیرا گلا گھونٹ دوں گا۔ جب اس نے میرے ارادے کو میری آنکھوں میں پڑھ لیا تو وہ ڈر گیا اور اس نے مجھے میری ماں کی قیمت بتا دی۔ معلوم ہے یہ قیمت کیا تھی؟ صرف سوا سو روپے۔ سوا سو روپے میں کون بیچ سکتا ہے اپنی ماں کو۔ سوا سو نہیں' سوا لاکھ' سوا کروڑ میں بھی کوئی میری ماں لا کر دے سکتا ہے؟ ویسے تو ہر عورت ایک ماں ہوتی ہے مگر اپنی ماں ایک ہی ہوتی ہے۔ یہ سن کے میں نے اسے مار دیا۔"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

میں نے اسے تسلی دی "چلو اب جو ہونا تھا ہو چکا۔"

غالب نے کہا "ہاں۔ تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔"

میں نے کہا "لیکن ..... یہ بات دوسرے لوگوں کو کس نے بتائی کہ تم نے سردار کو مار دیا ہے؟"

اس نے اپنے آنسو پونچھے اور شانے پر ہاتھ رکھ کے کراہنے لگا "وہ ..... ایک لڑکی دیکھتی۔ اس وقت جب ہم باہر نکلتی۔ ہم اس سے بولتی۔ ہم تیرا ساتھ شادی کرتی۔ تو ابھی خاموش رہتی۔"

"تم نے اس لڑکی سے شادی کرنے کا جھوٹا وعدہ کر لیا تھا' جو عینی دید گواہ تھی۔" میں نے کہا "پھر جب تم وہاں سے بھاگ آئے تو اس نے تمہارا راز فاش کر دیا؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔

"اب قبیلے کا سردار کون ہوگا؟" غالب بولا۔

"اپنا چاچا ہوتی۔ سردار کا چھوٹا بھائی۔"

گل نے کہا "تمہارا نام کیا ہے؟"

"ہاں۔ یہ تو بہت پہلے پوچھنا چاہئے تھا ہمیں" میں نے غالب کی طرف دیکھ کے کہا۔

"ماں چاند بولتی۔ چندو بولتی" وہ نقاہت سے ہانپنے لگا۔

اس کے شانے سے تیر تو کھینچ کر نکال دیا گیا تھا مگر زخم سے بہنے والا خون ابھی تک بند نہیں ہوا تھا حالاں کہ نازو نے اس پر ایک ساری پھاڑ کے مضبوطی سے پٹی باندھ دی تھی۔ اب اس پر کمزوری غالب آ رہی تھی۔ شاید یہ بہت دیر بولنے کا نتیجہ بھی تھا۔ میں نے اسے کشتی میں آرام سے لٹا دیا۔

"ہم راستے میں مر جاتی۔ ماں سے کبھی نہیں ملتی" اس کی آنکھوں سے پھر آنسو بہنے لگے۔

میں نے کہا "ایسی باتیں مت کرو چندو۔ یہ معمولی زخم ہے۔ تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

"نہیں۔ ہم مر جاتی۔ تیر میں زہر ہوتی۔"

میرا دل بیٹھنے لگا۔ یہ خیال تو مجھے آیا ہی نہیں تھا کہ تیر کی نوک زہر میں بجھی ہوئی ہوگی۔ معلوم نہیں کیسا زہر تھا اور اس کے اثرات کتنی دیر میں ہلاکت کا سبب بنتے تھے۔ ابھی ہمارے پاس ان چند دواؤں کے سوا کچھ نہیں تھا جو گل نے چلتے ہوئے احتیاطاً رکھ لی تھیں۔ ان میں اینٹی بائیوٹک گولیاں بھی تھیں۔ زخم کو بگڑنے سے

بچانے کے لئے میں نے اسے ڈبل ڈوز دے دی مگر اس کے باوجود میری تشویش کم نہ ہوئی۔

"چندو! ہم کلکتہ کب تک پہنچ جائیں گے؟"

"صبح۔ اگر کشتی اسی طرح چلتی رہی" نازو نے جواب دیا۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"چندو نے بتایا تھا مجھے۔ لیکن موٹر بوٹ میں تیل کم ہے۔ نورل تیل کے ڈبے بھر کے ساتھ رکھتا تھا" نازو نے بتایا۔

"اس کا مطلب ہے... ہم آدھے راستے میں کہیں بھی پھنس جائیں گے اور کشتی صرف بہاؤ کے آسرے پر چلے گی۔"

"اس میں چپو بھی تو نہیں ہیں" غالب نے کہا۔

آہستہ آہستہ رات کے ساتھ ستاروں کا قافلہ بھی چلتا گیا۔ چاند ڈھلنے لگا۔ ہم سب جاگتے رہے اور خاموش بیٹھے انتظار کرتے رہے۔ اس لمحے کا جب تیل ختم ہوگا اور کشتی کا انجن دم توڑ دے گا۔ اس کے بعد کیا ہوگا؟ ہم صبح ہونے تک ایسے ہی بیٹھے رہیں گے؟ صبح شاید کوئی اور موٹر بوٹ یا لانچ ادھر سے گزرے تو ہماری مدد کرے۔

چندو پر غشی طاری ہونے لگی تھی۔ اس کا جسم بخار میں تپ رہا تھا اور ہم اسے خاموشی سے مرتا دیکھنے کے سوا کچھ نہیں کرسکتے تھے۔ کسی ہسپتال میں اس کی جان بچ سکتی تھی مگر ہسپتال کلکتہ میں تھے۔ کسی ڈاکٹر کے اعجاز مسیحائی یا قدرت کی معجزہ نمائی سے وہ پھر زندگی کی راہ پر گامزن ہوسکتا تھا اور اپنی حسرتوں کی تکمیل اور اپنے مقصد کے حصول کی جدوجہد جاری رکھ سکتا تھا۔ وہ زندہ رہنا چاہتا تھا اور اس کے پاس قوتِ ارادی کا سرمایہ بھی تھا مگر شانے کے زخم سے جسم میں اتر جانے والا زہر اس کے عزائم کی ناکامی کا سبب بن رہا تھا۔ اس زخم سے اس کی مدافعت اور مزاحمت یوں ختم ہو رہی تھی جیسے کسی ٹیوب کے پنکچر سے ٹائر کی ہوا ختم ہوتی جاتی ہے۔ پھر وہ ٹائر باقی ٹائروں کی جادہ پیمائی کا ساتھ نہیں دے سکتا اور گاڑی رک جاتی ہے۔

موٹر بوٹ رات ایک بج کر بیس منٹ پر رک گئی۔ اس کے انجن نے چند جھٹکے لئے اور آخری ہچکی کے بعد خاموش ہوگیا۔ ہم سب آدھی رات کے سناٹے میں بے بسی کی تصویر بنے بیٹھے رہے۔ سبک رفتار دریا کی لہروں پر کشتی یوں بہنے لگی جیسے کوئی لاش سطحِ آب پر تیرتی ہے۔

غالب نے کہا "یہ بڑی بے وقوفی ہے۔ کشتی میں کم سے کم ایک چپو ہونا چاہئے۔ ایک انجن کا کیا ہے۔ کہیں خراب بھی ہو سکتا ہے۔"

میں نے کہا "ہونا تو بہت کچھ چاہئے' مثلاً تیل کا فاضل ذخیرہ۔ مگر ہمیں ان مسائل کا اندازہ کہاں تھا۔"

"اس اُلو کے پٹھے کو تو ہوگا۔ یہ جانتا تھا کہ جتنا تیل موٹر بوٹ کے ٹینک میں ہے وہ ناکافی ہوگا۔"

"اس کی عقل مفلوج تھی۔ اس کے ذہن پر خوف اور اند... سوار تھے" میں نے کہا۔

"اب اس بحث سے کیا فائدہ۔ یہ سوچو کہ ان حالات می... کرنا چاہئے" نازو نے کہا۔

"ان حالات میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کے اپنی بے چارگی پر کڑھنے کے سوا اور مجبوری کو صبر کا نام دینے کے سوا اور... کرسکتے ہیں۔"

گل نے سادگی سے کہا "ہم دعا کرسکتے ہیں اور خدا سے... رکھ سکتے ہیں کہ وہ ہم سب کو خیروعافیت کے ساتھ اپنی منزل... پہنچائے گا۔"

اس نے سب کو خاموش کردیا اور شرمندہ کردیا۔ بحث... لڑنے اور اندیشوں کا شکار ہونے سے یہ کہیں بہتر تھا کہ ہم... رہیں اور اپنے معاملات خدا کو سونپ دیں۔ اس نے آزمائش... گھڑی میں ہمیں حوصلہ دیا تھا اور ہماری مشکلات کو آسان بنا...

"اس کا بخار بڑھتا جارہا ہے" نازو نے چندو کا ہاتھ ت... کہا۔

"اور اسپرین دے دو" میں نے کہا "بخار کا ہمارے پا... علاج ہے۔"

نازو کے چہرے پر مایوسی تھی۔ اسے بھی معلوم تھا کہ یہ... سے اترنے والا بخار نہیں ہے مگر اپنے محدود وسائل کے... موت سے نبرد آزما رہ سکتے تھے۔ اس نے چندو کا منہ کھولا ا... سہارا دے کر اوپر اٹھایا۔ پھر دریا کے پانی کے ساتھ اسپر... گولیاں چندو کے حلق سے اتار دیں۔

کشتی بہت سست رفتاری سے بڑھ رہی تھی۔ صبح ہو... سے کم بھی چار گھنٹے باقی تھے۔ خشک بسکٹ کھاتے ہوئے ا... پانی پیتے ہوئے میں نے اور غالب نے رات کے تاریک... روشنی کے سراب کی جستجو جاری رکھی۔ کہیں کوئی چراغ... کسی لالٹین یا ٹارچ کا اجالا نظر آئے' آگے یا پیچھے سے... لانچ گزرے۔ ساحل پر کہیں آبادی کا نشان ملے تو مدد حا... کی کوشش کی جائے۔

اب سردی بھی ناقابل برداشت ہوتی جارہی تھی۔ کسی گھر کی چاردیواری میں بڑی پُر تحفظ' آسودگی بخش حرا... نرم بستروں اور گرم لحافوں میں صرف راحت ہوگی... آسمان کے نیچے اور پانی کی سرد چادر پر سردی کی شدت انتہ... گل اور نازو نے سب فاضل کپڑے چندو پر ڈال د... خود سردی میں ٹھٹھر رہی تھیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ... گھٹنے سمیٹے اور ہاتھوں کو گھٹنوں کے گرد لپیٹے سردی... کر رہی تھیں۔ ایسی بے سروسامانی میں سفر کی صعوبت... تجربہ تھا۔ پھر بھی میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ہم بھوکے... ہیں اور کسی سمندر کی بے کراں ڈپُر خطر وسعت میں نہیں...

ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ صبح کوئی ہماری مدد کرنے ضرور آئے گا اور ہمیں دریا کے اس پار پہنچادے گا۔ اس کے بعد کلکتہ کی باقی مسافت بھی طے ہوجائے گی۔

عجیب بات یہ تھی کہ اس وقت میرے ذہن میں اور کوئی خیال نہیں تھا۔ نہ اس شکست کا جو سیاسی سازش گروں نے ہماری کوتاہیوں اور کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کے دی تھی۔ ہماری قومی شناخت کے تصور پر کاری ضرب لگی تھی اور وقتی طور پر ہم اس یقین سے بھی محروم ہوگئے تھے جو اس ملک کے وجود کی بنیاد بنا تھا۔ مجھے دلاور جیسے غداروں کے خون سے اپنے انتقام کی آگ بجھانے کا خیال نہ تھا۔ دلاور نے مالی نقصانات کے صدمے برداشت کئے تھے اور اپنی ہار کو اپنی نادانی کی سزا سمجھ کے قبول کرلیا تھا۔ وہ واپس جاچکا تھا اور شاید اپنے نقصان کی تلافی کے لئے دولت کمانے کے نئے امکانات کا جائزہ لے رہا تھا یا نئے پروگرام پر عمل پیرا ہوچکا تھا۔ یہ اس کے نزدیک غیر اہم تھا کہ دولت کے حصول کا کوئی ذریعہ غیر قانونی یا غیر اخلاقی ہے۔ مگر ہم اس دشت کی ویرانی میں سرگرداں تھے اور ناامیدی سے بچنے کے لئے دست غیب کی امداد کے انتظار میں تھے۔ مجھے رابعہ کا خیال بھی نہ تھا جو اپنے اکیلے پن کی سزا کاٹ رہی تھی۔ میرے سامنے صرف کالی رات تھی۔ گل اور نازو کے افسردہ چہرے تھے۔ غالب تھا جو اپنی مایوسی کو چھپانے میں ناکام تھا۔ دریا پر بہنے والی کشتی لہروں کے رحم و کرم پر تھی اور چندو کی زندگی کے چراغ کی لو تیزی سے کم ہو رہی تھی۔ میں صرف اجالا چاہتا تھا اور مدد چاہتا تھا۔ ساحل پر اترنے اور چندو کے مرنے سے پہلے کلکتہ پہنچ جانے کی آرزو کے سوا میرے دل میں کوئی آرزو نہ تھی۔ مجھے محسن کا خیال تک نہ تھا جو ڈھاکا میں ہمارے لئے چشم براہ تھا۔

اچانک غالب نے کہا "سکندر! وہ کیا ہے؟"

میں نے چونک کر دیکھا "روشنی؟ دریا کی سطح پر!"

"ہاں۔ اس کا عکس پانی میں پڑ رہا ہے۔"

"کہیں یہ سراب نہ ہو" میں نے کہا۔

نازو نے کہا "کوئی لانچ آرہی ہے۔"

گل نے بھی خوش ہو کے کہا "ہاں۔ ہماری طرف ہی آرہی ہے۔"

غالب نے کہا "میں اس کے انجن کی آواز سن رہا ہوں۔"

"آواز مجھے بھی سنائی دے رہی ہے۔" نازو بولی۔

لانچ بڑی تیزی سے آرہی تھی۔ اب میں بھی اس کی آواز سن رہا تھا اور دور سے جھلملانے والی روشنی بھی واضح ہوگئی تھی۔

"کہیں یہ فوجی نہ ہوں" نازو نے کہا۔

"کون سے فوجی؟" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "اس سرحد پر ہمارے فوجی نہیں ہوسکتے۔"

"میں نے رات بھر میں نہ کوئی فائر کی آواز سنی' نہ کوئی جنگی ہوائی جہاز اوپر سے گزرا۔ اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ہم محاذِ جنگ سے دور ہیں" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "یہ پولیس بھی ہوسکتی ہے۔ اسمگلر بھی ہوسکتے ہیں۔"

"اب جو بھی ہو۔ ہم ان سے مدد کی درخواست کریں گے اور خدانخواستہ مشکل میں پڑ گئے تو پھر مقابلہ کریں گے۔ ضروری نہیں کہ ان کا رویہ دوستانہ ہو ہمارے ساتھ۔ ہمیں مقابلے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔"

لانچ ہمارے بہت قریب آگئی۔ ہماری لانچ کے مقابلے میں یہ کسی بحری جہاز سے کم نہ تھی۔ اس کے عرشے پر کھڑے ہوئے کسی شخص نے ہم پر تیز ٹارچ لائٹ ڈالی۔ میں نے اور غالب نے ہاتھ ہلا ہلا کے انہیں اپنی طرف بلایا۔ ٹارچ کی روشنی کا دائرہ گل اور نازو پر گیا لیکن لانچ کی رفتار میں کمی نہیں آئی۔

میں نے چلا کے کہا "رکو۔ ہمیں مدد کی ضرورت ہے۔"

غالب نے بھی چیخ کر یہی بات انگریزی میں دہرائی۔

"ہمارے ساتھ ایک بیمار ہے" میں نے چلّا کے کہا "اسے طبی امداد نہ ملی تو وہ مرجائے گا۔"

"ہمارے پاس تیل ختم ہوگیا ہے" غالب چلّایا۔

لیکن لانچ ہماری چیخ و پکار سے بے نیاز گزرتی گئی۔ ٹارچ لائٹ سے موٹر بوٹ کا جائزہ لینے والا مطمئن ہوگیا تھا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ وہ لائٹ بجھا کے وہیں کھڑا ہمیں دیکھ رہا تھا لیکن ہماری آواز جیسے اس کے کانوں تک پہنچ ہی نہیں رہی تھی۔

"کیا انہوں نے سنا نہیں؟" غالب بولا۔

"یہ کیسے ہوسکتا ہے!"

"پھر کیا وہ سمجھے نہیں؟"

"اس میں سمجھنے کی کون سی بات تھی۔ ہم انہیں بلا رہے تھے۔ وہ اشارہ دیکھ سکتے تھے" میں نے کہا "رک کر یہ تو پوچھ سکتے تھے کہ کیا بات ہے۔"

لانچ والوں کی بے نیازی اور بے حسی نے مجھے غصے سے پاگل کردیا۔ میں نے چیخ چیخ کر انہیں گالیاں دیں۔ غالب نے مجھ سے زیادہ شور مچایا مگر جواب میں ان کی طرف سے کسی ردِعمل کا اظہار نہیں ہوا۔

یہ طیش کی انتہا تھی کہ میں نے نازو سے ریوالور چھین کر ان پر گولی چلادی۔

غالب نے میرا ہاتھ پکڑ لیا "سکندر!"

میں نے کہا "میں انہیں ماردوں گا۔ یہ انسان نہیں ہیں۔"

غالب نے کہا "اور جواب میں انہوں نے بھی فائر کھول دیا تو کیا ہوگا؟ ہم سب مارے جائیں گے۔ یہیں غرق ہوجائیں گے۔"

لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ اس کے برعکس تھا۔ لانچ کی رفتار میں کمی آئی۔ کسی نے چلّا کے کچھ کہا اور لانچ رک گئی۔ آہستہ آہستہ ہماری کشتی لانچ کے قریب پہنچنے لگی۔

لانچ پر سے کسی نے ایک رسّی پھینکی جو میرے ہاتھ میں آگئی۔ میں نے اسے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ دوسری جانب سے کوئی رسّی کو کھینچنے لگا۔ کشتی عین لانچ کے نیچے پہنچ گئی۔

اوپر سے کسی نے ٹارچ کی روشنی ڈال کے پھر ہمارا جائزہ لیا اور انگریزی میں کہا "کیا تم پاگل ہو؟ گولی کیوں چلائی تھی؟"

میں نے چلاّ کے کہا "اور ہم کیا کرتے؟ تمہارے کان ہماری آواز جو نہیں سن رہے تھے۔"

"بے وقوف! تم سب مارے جاتے....."

"ہم سب ویسے بھی مر رہے تھے۔ تم سے مدد مانگی تھی ہم نے لیکن تم نے ایسی بے رحمی کا مظاہرہ کیا۔"

"او کے۔ کیا چاہئے تمہیں؟"

میں نے کہا "یا تو نیچے آکے بات کرو۔ یا مجھے اوپر آنے دو۔"

اس نے اپنے دو ساتھیوں سے مشورہ کیا "رسّی پکڑ کے اوپر آسکتے ہو؟"

دو منٹ بعد میں اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ صورت سے کوئی دولت مند' عیاش' مغرور اور بددماغ آدمی لگتا تھا۔ اس کے ساتھ کھڑے ہوئے دونوں آدمیوں کے ہاتھوں میں خود کار اسلحہ تھا۔ وہ اس کے باڈی گارڈ تھے جو مجھے خوں آشام کتّوں کی طرح گھور رہے تھے۔ مجھے شدت سے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ اپنی مشین گن سے ایک برسٹ مار کے وہ ہمیں بوٹ سمیت دریا کی تہہ میں پہنچا سکتے تھے۔ لیکن تقدیر مہربان ہو تو آدمی کی حماقت بھی اس کے لئے فائدہ مند بن جاتی ہے۔

"کون ہو تم لوگ؟" اس نے بڑی رعونت سے کہا۔

اس سے پہلے کہ میں جواب دیتا' ایک عورت کی نیند یا نشے میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی "ڈارلنگ..... کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں ہوا۔ تم نیچے جاؤ" اس نے عورت کو سخت لہجے میں حکم دیا "تم ہوش میں نہیں ہو۔"

عورت کو واقعی اپنا ہوش نہ تھا ورنہ وہ اوپر آنے سے پہلے اپنے جسم کی بے لباسی کو ضرور دیکھتی۔ وہ برائے نام شفاف نائلون کے نائٹ گاؤن میں تھی جو ہر طرف سے کھلا ہوا تھا۔

"اسے نیچے لے جاؤ" اس نے اپنے ایک محافظ سے کہا کیوں کہ عورت اس کے حکم کی پروا کئے بغیر آگے چلتی آرہی تھی۔

اب میں سمجھ چکا تھا کہ ہماری فریاد و فغاں کو انہوں نے کیوں درخورِ اعتنا نہیں سمجھا تھا۔ یہ ایک دولت مند کا سطحِ آب پر تیرتا ہوا عشرت کدہ تھا۔ ان کی جگہ پولیس کی لانچ ہوتی یا ماہی گیروں کی' وہ ہماری چیخ و پکار کو ایسے نظرانداز نہ کرتے مگر ایک عیش پرست آدمی کو کسی بھی مصیبت زدہ کے چکر میں پڑ کے اپنے لطف کی ساعتوں کو مُکدر کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ جب میں نے اس پر گولی چلائی تو اس کی بے حس انا کے شیشے پر ضرب پڑی۔ وہ کوئی عام قسم کا بدمعاش یا کم ظرف ہوتا تو فورا حکم دیتا کہ جوابی کارروائی کی جائے

اور جس نے بھی یہ گستاخی کی ہے اسے عبرت ناک سزا دی جائے گ[illegible] وہ ہماری فریاد و فغاں بھی دیکھ چکا تھا۔ جذباتی طور پر وہ ٹھنڈے مزاج کا آدمی تھا۔ میرے فائر کرنے سے اس نے اندازہ کیا کہ ہم نے قدم انتہائی مایوسی کے باعث اٹھایا اور اسے صورت حال کی نگ[illegible] کے خیال نے رکنے پر مجبور کردیا۔

جب محافظ' عورت کو زبردستی نیچے لے گئے تو اس نے [illegible] سوال دُہرایا۔

میں نے اتنی دیر میں ایک گول مول جواب سوچ لیا تھا "[illegible] بڑی مشکل میں ہیں جناب۔ پٹرول ختم ہوگیا ہے۔"

"اتنے لمبے سفر پر کیوں نکلے تھے؟" اس نے اپنی عقابی نظر[illegible] مجھ پر جما کے کہا۔

"مجبوری میں سر۔ جان بچانے کے لئے۔"

اس نے سوچ کے کہا "ہوں۔ کہاں جارہے ہو اب؟"

میں نے کہا "کلکتہ سر۔ عورتوں کا ساتھ ہے۔ چھوٹا بھائی [illegible] میں تپ رہا ہے۔ پانی میں اترا تھا' شاید کسی سانپ نے کاٹ لی[illegible] کلکتہ نہ پہنچے تو وہ دوا دارو سے پہلے ہی مرجائے گا۔"

"لیکن میں تمہیں کیسے کلکتہ پہنچا سکتا ہوں؟" اس کے [illegible] میں کچھ نرمی اور تاسف کے جذبات آگئے "ابھی واپسی بھی [illegible] نہیں۔"

"آپ ہمیں ساحل پر چھوڑ دیں سر۔"

"ساحل پر! یہاں؟ تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ یہ کون ک[illegible] ہے؟" اس نے کہا "یہاں ہر طرف جنگل ہی جنگل ہے۔"

"کسی سڑک تک پہنچ جائیں گے۔"

"بے وقوف آدمی! دس میل تک کچھ نہیں ہے۔ [illegible] جاؤ گے؟ عورتیں جنگل سے پیدل گزر سکتی ہیں؟ اور وہ جو بھا[illegible] تمہارا' اسے لاد کے چل سکتے ہو تم؟ راستے میں ہی مرجائے[illegible] تم بھی مارے جاؤ گے۔ ہاں ایک صورت ہے" اس نے چٹکی [illegible] "میں تمہیں پٹرول دے سکتا ہوں۔ اتنا کہ تم صبح تک کلکتہ [illegible] جاؤ گے۔"

میں نے کہا "حضور کو خدا اس نیکی کا اجر دے۔"

وہ چونکا "تم مسلمان ہو؟"

اب انکار سے کچھ حاصل نہ ہوتا "جی سر....."

"بنگال سے فرار ہوئے ہو؟" وہ بولا۔

"جی سر..... جنگ میں سب تباہ ہوگیا۔"

اس نے کہا "تو کلکتہ کیوں جارہے ہو؟ پاکستان جاؤ۔"

میں نے اس کے لہجے میں طنز کو محسوس کیا اور سمجھ[illegible] ہندو ہے "کلکتہ میں اپنے عزیز ہیں جناب۔ ابھی ان کے پا[illegible] جائیں گے۔ جنگ ختم ہونے کے بعد واپس گھر لوٹیں گے۔"

"جنگ تو ختم ہوگئی۔ بنگلہ دیش بن گیا اور تمہارے پا[illegible] فوج کو شکست ہوگئی" اس نے مسکرا کے کہا۔

میں نے اپنے جذبات کو قابو میں رکھا "ہمیں کیا لینا سیاست سے حضور۔ آپ ہمیں پٹرول دے دیں۔"

"اُردو انگریزی بہت صاف بولتے ہو تم۔ کیا کرتے تھے ڈھاکا میں؟" وہ بولا۔

"پڑھاتے تھے کالج میں" میں نے کہا۔

"جو کچھ تم پڑھاتے رہے' اب نہیں پڑھا سکو گے۔ خیر۔ مجھے کیا" اس نے ایک محافظ کی طرف رخ کر کے کہا "دیکھو ان کو دے دو بیس لیٹر۔"

"بیس لیٹر..... ہمیں کم نہ پڑ جائے سر۔"

"جو میں کہہ رہا ہوں وہ کرو" اس نے بگڑ کے کہا "دفع ہوجاؤ۔"

محافظ فورا دفع ہوگیا اور کچھ دیر بعد بیس لیٹر پٹرول کا جیری کین تھامے نمودار ہوا۔

"بیس روپے نکال بھک منگے" اس نے آہستہ سے کہا۔

میں نے چلاّ کے کہا "بیس روپے کس بات کے؟ سیٹھ صاحب نے پٹرول بیچنے کی بات تو نہیں کی تھی۔"

سیٹھ نیچے جاتے جاتے رک گیا "کیا بات ہے؟"

محافظ نے فورا کہا "کچھ نہیں سر۔ میں نے کہا کہ جیری کین خالی کردو تو شور کر رہا ہے۔"

"سارا پٹرول کیسے ڈال دوں۔ اتنا بڑا ٹینک نہیں ہے کشتی کا" میں نے کہا۔

سیٹھ نے ہاتھ ہلایا "دے دو جیری کین بھی" اور نیچے غائب ہوگیا۔

محافظ نے دانت پیس کے کہا "لے۔ دفع ہو"

میں اس کی گالی کو پی گیا اور اس سے جیری کین لے لیا "ایک سگریٹ تو پلادے یار۔"

"اب جاتا ہے یا.....؟"

میں نے جیب سے سو کا نوٹ نکالا "لو۔ پٹرول کے بیس کاٹ کے باقی واپس کردو۔"

وہ بھونچکا رہ گیا "ابے تو پاگل ہے کیا؟"

میں نے کہا "کھلاّ نہیں ہے تو باقی کے سگریٹ دے دو۔ اور کیا ہے تمہاری دُکان میں؟ چائے ملے گی؟"

اس نے سو کا نوٹ اچک لیا۔ جیب سے سگریٹ کا پیکٹ اور [illegible]س نکال کے مجھے تھمائے اور بولا "اب زیادہ سر مت چڑھو۔ شکر [illegible]رو جان بچ گئی۔ سیٹھ اچھا آدمی ہے ورنہ میں تو چھلنی کردیتا سب [illegible]۔"

میں نے جیری کین سمیت رسّی پر پھسلتے ہوئے کہا "چھلنی کے بچے! اتنا ہمت والا ہے تو یہ جا کے بتا سیٹھ کو..... کہ مجھ سے سو کا [illegible]ٹ لیا ہے تو نے بھک منگے۔ مجھے سیٹھ کا لحاظ نہ ہوتا تو میں تیری [illegible]ی کی تیسی کردیتا۔"

ظاہر ہے وہ تلملانے اور جواب میں گالیاں بکنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ گالیاں بکتے ہوئے اپنی آواز بھی کم رکھنے پر مجبور تھا۔ کشتی میں پہنچ کر میں نے مزید اشتعال انگیزی کی اور اس کی بے بسی پر ہنسا۔ اچانک ہم سب کا موڈ اچھا ہوگیا تھا۔ پلک جھپکتے میں ناامیدی کا گھپ اندھیرا دور ہوگیا تھا اور امید کے سورج کی روشنی بڑی آب و تاب سے سب کے دلوں میں اتر آئی تھی۔

"سب ہندو شیطان نہیں ہوتے" غالب نے انجن کے فیول ٹینک میں پٹرول ڈالتے ہوئے کہا۔

"جیسے سب مسلمان فرشتے نہیں ہوتے" میں نے دور جاتی ہوئی لانچ کو دیکھ کے کہا "ان میں دلاور جیسے بھی ہوتے ہیں اور حاجی عبداللہ جیسے پاپی بھی۔"

"اچھائی اور برائی آدمی کی ذات سے منسوب ہے کسی مذہب سے نہیں" نازو نے کہا "مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا۔"

میں ہنس پڑا "یہ بھی کسی تقریر کا حصہ تھا؟"

وہ بھی ہنس پڑی "اسی تقریر کا۔"

موٹر بوٹ کا انجن پھر اسٹارٹ ہوا اور دو بج کر چالیس منٹ پر سو فیصد تائید ایزدی سے ہم نے دوبارہ اپنے سفر کا آغاز کیا۔ چندو کی حالت بدستور تشویش ناک تھی اور یقین کے ساتھ کچھ نہیں جا سکتا تھا کہ وہ کلکتہ پہنچنے تک زندہ رہے گا یا مرجائے گا۔ سیٹھ نے بھی کہا تھا کہ ہم صبح تک کلکتہ پہنچ جائیں گے۔ میں تھوڑا سا پُر امید اس لئے بھی تھا کہ چندو زہر کے خلاف ایک فطری قوتِ مدافعت رکھتا تھا۔ اس نے خود ہی راستے میں بتایا تھا کہ سانپ بچھو کے کاٹنے سے اس کو کچھ نہیں ہوتا۔ بچپن سے اب تک اسے زہریلے جانوروں نے اتنی بار کاٹا تھا کہ اس کے خون میں زہر شامل ہوگیا تھا۔

چندو کی جگہ یہ تیر ہم میں سے کسی کو لگ جاتا تو شاید وہ بہت پہلے مرچکا ہوتا مگر چندو میں جو قوتِ مدافعت پیدا ہو چکی تھی وہی اس کو زہر کے مہلک اثرات سے بچا رہی تھی۔ اس کے شانے سے اب خون نہیں بہہ رہا تھا مگر جتنا خون بہا تھا اس کے ساتھ ہی کافی زہر بھی فورا خارج ہوگیا تھا۔

غالب نے چندو کی نبض دیکھتے ہوئے سرہلایا "بیچارا!"

میں نے کہا "کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں ہوا ابھی تک تو۔ مگر....."

"بری بات مت نکالو منہ سے" نازو نے بگڑ کے کہا۔

گل نے اس کی تائید کی "اللہ اچھا کرے۔ یہی کہنا چاہئے۔"

غالب مسئلۂ قضا و قدر کے حوالے سے کوئی جواب دیتا تو بلاوجہ بحث چھڑ جاتی۔ میں نے کہا "مرزا جی! یہ قبیلے والے تیروں اور نیزوں کی انی پر کس قسم کا زہر لگاتے ہوں گے؟"

"ایسے قبیلوں کو جڑی بوٹیوں کے خواص کا علم ہوتا ہے۔ کسی پودے کا عرق استعمال کرتے ہوں گے یا ممکن ہے سانپ کے حلق سے زہر برآمد کرلیتے ہوں" غالب نے کہا۔

"سانپ اس علاقے میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ اگر یہ سانپ کا زہر ہوا تو شاید چندو بچ جائے۔"

"مگر ہم سردی سے اکڑ کے مرجائیں گے صبح تک" نازو نے کہا۔ "سردی بڑھتی جارہی ہے۔"

"صبح تک اور بڑھے گی" گل نے کہا۔

"افسوس کہ ہم اپنی کھال اتار کے آپ کو نہیں پہنا سکتے۔ صرف مفید مشورے دے سکتے ہیں سردی سے بچنے کے لئے۔ وہ بھی بالکل مفت" غالب نے کہا "پہلا مشورہ تو یہ ہے کہ سردی کو بھول جاؤ۔"

"یہ فرض کرلیں کہ جون کا مہینہ ہے اور دوپہر کا سورج سر پر ہے" نازو نے طنز سے کہا۔

"بس۔ ساری بات احساس کی ہے۔ احساس نہ ہو تو گرمی سردی دکھ درد کسی چیز کا پتا نہیں چلتا۔ جیسے بے ہوش آدمی کو بالکل پتا نہیں چلتا کہ اس کے جسم کو کہاں سے کاٹا جارہا ہے۔ میرا دوسرا مفید مشورہ یہ ہے کہ بے ہوش ہوجاؤ" غالب نے کہا "تم عورتوں کے لئے تو یہ معمولی کام ہے۔ اچھی خبر سنی تو بے ہوش۔ بری خبر سنی تو بے ہوش۔"

"میں کردوں تمہیں بے ہوش؟" نازو نے جارحانہ لہجے میں کہا۔

"لڑکی۔ ابھی بہت سے مشورے باقی ہیں۔ اتنے بے صبرے پن کا مظاہرہ مت کرو۔" غالب نے کہا "تیسرا مشورہ تو بہت ہی آسان ہے۔ جسم کو گرم رکھنے کے لئے ورزش کرو۔ چھلانگیں لگاؤ۔ رسی کودو۔ باکسنگ کرو آپس میں۔ کشتی کے اندر ہی دوڑ لگاؤ۔ قسم خدا کی سردی میں پسینہ نہ آجائے تو کہنا۔"

خوشی کا ایک اور وقفہ صبح ساڑھے چار بجے آیا جب میں کشتی کے انجن کی ٹنکی میں پھر پٹرول ڈال رہا تھا۔ اینٹی بایوٹک گولیوں کی دوسری خوراک چندو کو کچھ دیر پہلے ہی دی گئی تھی اور اس کے ساتھ ہی اسپرین بھی۔ شفا کی کوشش اور توقع ہم انہی دو دواؤں سے وابستہ کرسکتے تھے۔ شفا دینے والا بہرحال وہ مالک ارض وسما تھا جس کے قبضے میں چندو کی اور ہماری جان تھی۔

اچانک میں نے چندو کے کراہنے کی آواز سنی۔ پھر نازو اور گل نے ایک ساتھ خوشی سے چلا کے کہا "اسے ہوش آگیا۔"

میرے ہاتھ سے پٹرول کا جیری کین گرتے گرتے بچا۔ پٹرول ٹینک کا ڈھکن بند کرکے اور جیری کین میں بچا ہوا پٹرول سنبھال کر رکھنے کے بعد میں چندو کے قریب بیٹھ گیا۔

"اس کا بخار بھی کچھ کم ہوا ہے۔" گل نے کہا۔

نازو اس کے حلق میں پانی ٹپکا رہی تھی اور چندو پھر بھی پانی مانگ رہا تھا۔ غالب نے اس کے سر کو تھوڑا سا اوپر اٹھایا اور نازو نے وہ سلور کا گلاس اس کے لبوں سے لگادیا جس میں دریا کا گدلا پانی تھا۔ چندو کی آنکھیں بند تھیں اور نقاہت کے باعث وہ بیٹھ بھی نہیں سکتا تھا مگر اس نے ہاتھوں سے گلاس پکڑا ۔۔۔ ہی رہ گئی اور وہ سارا پانی غٹاغٹ پی گیا۔

پانی پینے کے ساتھ ہی اسے الٹی آگئی۔ وہ پھر پانی مانگنے لگا۔ یوں ہاتھ پیر چلانے لگا جیسے شدید اذیت میں ہو۔

گل ڈر گئی "بھائی سکندر۔۔۔ یہ کیا ہورہا ہے اسے؟"

میں نے اس کا برف جیسا سرد ہاتھ تھام کے کہا "یہ اچھا ہے۔ بخار کی وجہ سے پیاس لگ رہی ہے۔ یا شاید یہ بھی زہر کا اثر ہوگا۔ ممکن ہے اس کے ہاتھ پاؤں جل رہے ہوں اور اندر سے لگی ہوئی محسوس ہوتی ہو۔"

اگلے ڈیڑھ گھنٹے میں اس نے کئی بار پانی پیا اور الٹی کی۔ اس کے بخار میں نمایاں کمی واقع ہوگئی تھی مگر اس کا جسم سرخ پڑ گیا تھا اور ہم اسے نہ روکتے تو وہ کھرچ کھرچ کے اپنی کھال زخمی کرلیتا۔ واضح طور پر زہر کے اثرات تھے۔

آہستہ آہستہ افق کی سیاہ لکیر مٹنے لگی اور صبح کاذب کے ہراول دستے نے صبح صادق کی نوید دی۔ آسمان پر اجالا پھیلنے لگا اور اس کے ساتھ ہی سردی میں اضافہ ہوا۔ گل اور نازو سردی سے کانپ رہی تھیں مگر ہم انہیں برداشت کی تلقین کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کرسکتے تھے۔ چندو کو سردی سے بچانا زیادہ ضروری تھا۔ اگر بیمار نہ ہوتا تو ہم سب کے اضافی کپڑے خواتین کو سردی سے تحفظ فراہم کرتے۔

نازو نے کہا "یہ کیسے معلوم ہوگا کہ ہم کلکتہ پہنچ گئے ہیں؟"

غالب ہنسنے لگا "یہ کیسے معلوم ہوگا کہ سورج نکل آیا ہے؟"

نازو نے خفا ہوکے کہا "یہ کیا بات ہوئی؟"

"احمقانہ بات خود کرتی ہو۔ پھر مجھ سے پوچھتی ہو یہ کیا بات ہوئی۔ بابا کلکتہ کوئی رسالہ خورد ہے کہ گزر جائے گا اور پتا نہیں چلے گا؟ دنیا کا سب سے زیادہ آبادی والا شہر ہے۔"

نازو نے کہا "مگر ہم رات بھر ایک ہی سمت میں چلتے رہے ہیں۔"

"سب دریا ایک ہی سمت میں بہتے ہیں۔ ایسا دریا میں نے تو نہیں دیکھا جو کبھی الٹا بہتا ہو کبھی سیدھا۔"

"الٹی کھوپڑی ہے تمہاری" نازو جھلا کے بولی۔

"چلو الٹی ہے تو الٹی ہی سہی۔ یہ تو نہیں ہے نا تمہاری طرح کبھی الٹی کبھی سیدھی" غالب نے کہا "گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ۔ جب جی چاہا۔ خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد۔"

اب میں نے نازو کا دفاع کیا "یار لڑکیوں کو پریشان کرتا ہے! اس کا مطلب تھا کہ کہیں ہم غلط سمت میں تو سفر نہیں کررہے۔ اندھیرے میں کیا پتا چلتا ہے۔"

نازو نے ممنونیت سے مجھے دیکھا۔ لیکن غالب نے تنقید کی اور بولا "یہ لو۔ یک نہ شد دو شد۔ فرماتے ہیں اندھیرے میں کیا پتا چلتا ہے۔"

"کون سی ایسی بات ہے اس میں ہنسنے کی؟"

"میرے بھائی۔ آدمی سمت بھول سکتا ہے، دریا نہیں۔ ہمارے سب دریا ایک ہی سمت میں بہتے ہیں۔ شمال سے جنوب کی سمت۔ بھارت کے بھی اور پاکستان کے بھی۔ کچھ سمجھے آپ یا نقشے کی مدد سے سمجھاؤں کہ دریا ہمالیہ سے نکلتے ہیں جو شمال میں ہے اور سمندر میں گرتے ہیں جو نیچے جنوب میں ہے" غالب نے کہا۔

میں نے سر کھجا کے کہا "اچھا؟ یہ ہمالیہ پہاڑ کو شمال میں کس نے کردیا۔ جب ہم جغرافیہ پڑھتے تھے تو شاید جنوب میں تھا۔"

"آپ نقشہ الٹا دیکھتے ہوں گے۔ ممکن ہے کتاب بھی الٹی پکڑ کے دیکھتے ہوں جغرافیہ کے پیریڈ میں" غالب نے کہا۔

"مرزا جی۔ تم واقعی ماہر جغرافیہ داں ہو۔ کولمبس ہو بلکہ واسکوڈی گاما ہو۔ اب یہ بتاؤ کہ آخر یہ دریا کون سا ہے؟"

غالب نے سوچ کے کہا "یہ ہگلی ہو سکتا ہے یا اس کی ذیلی شاخ۔ کوئی چھوٹا دریا جو آخر کار ہگلی سے جاملتا ہو، معلوم ہوجائے گا۔"

روشنی پھیلی تو ہمارا اشتیاق بڑھ گیا۔ غالب کا خیال بالکل ٹھیک ثابت ہورہا تھا۔ دریا پھیل رہا تھا اور یوں لگتا تھا کہ گھوم کے سمندر میں شامل ہوجائے گا مگر وہ سمندر نہیں دوسرا بہت بڑا دریا تھا اور ہم دونوں دریاؤں کے سنگم پر تھے۔ بہت دور بائیں طرف آبادی کے آثار نمودار ہونے لگے تھے اور آسمان پر اٹھنے والا دھواں کسی صنعتی شہر کی نشان دہی کرتا تھا۔

غالب کے مشورے پر میں نے موٹربوٹ کو موڑا اور ساحل کے رخ کردیا۔ یہ چھوٹی سی موٹربوٹ بے حد وفادار ثابت ہورہی تھی اور کسی حادثے کا شکار ہوئے بغیر ہمیں منزل تک لے آئی تھی۔

گل اور نازو بہت خوش تھیں اور بار بار بچوں کی طرح پوچھ رہی تھیں "یہ کلکتہ ہے نا؟"

تنگ آکے غالب نے کہا "اتنی بار تو یقین دلا دیا میں نے۔ اب تم خود پوچھ لینا کلکتہ سے۔ حد ہوگئی یار۔ بھلا اس راستے پر کاچھاپا چھانگا مانگا آسکتا ہے۔"

"اب ہم ڈھاکا بھی پہنچ جائیں گے نا؟" گل نے کہا۔

"دیکھو نیک بیبیو! سارے احمقانہ سوالات مجھ سے مت کرو۔ اپنے سکندر صاحب بھی تو ہیں اور مشن کمانڈر وہی ہیں۔ کچھ ان سے بھی پوچھو" غالب نے بھنا کے کہا۔

ساحل تک پہنچتے پہنچتے دھوپ پھیل گئی تھی اور اس کے ساتھ ہی سردی کا زور ٹوٹ گیا تھا۔ میں نے رات بھر کشتی چلائی تھی اور اس کا رخ سیدھا رکھا تھا۔ یہ مشکل کام نہیں تھا مگر میں تھک گیا تھا۔ آخری لمحات میں کسی مناسب جگہ کی تلاش کرنا مجھے زیادہ دشوار محسوس ہورہا تھا۔

آخر کار میں نے ایک ہموار کنارا دیکھا اور موٹربوٹ کی رفتار بڑھا کے اسے سیدھا لے گیا۔ جہاں تک پانی تھا کشتی چلتی گئی۔ پھر کیچڑ سے گزری اور کنارے پر پھنس گئی۔ انجن نے اچھا سا زور لگایا اور ناکام ہوکے رک گیا۔

میں نے اطمینان کی گہری سانس لی "خدا کا شکر ہے کہ یہ مرحلہ بھی طے ہوا۔"

غالب نے کہا "اصل مرحلہ تو اب درپیش ہوگا۔"

میں نے کہا "اس کی ابھی سے فکر مت کرو۔ پہلے نیچے اترو۔ چندو کو اتارو۔"

گل اور نازو پہلے ہی کنارے تک پہنچ کے کنکروں پر دھوپ میں سیدھی لیٹ گئی تھیں اور آنکھیں بند کئے سورج کی حرارت سے توانائی حاصل کررہی تھیں۔ میں نے اور غالب نے چندو کو سہارا دے کے اٹھایا اور ان کے قریب لٹادیا۔ وہ اب پوری طرح ہوش میں تھا مگر اس کا بخار کم ہوکے پھر بڑھ گیا تھا۔ ہم نے دوسرا پھیرا لگایا اور اپنا اسباب کشتی سے اتار لائے۔

ہمارے چاروں طرف وہی گھنا جنگل تھا اور ویرانی تھی مگر مجھے معلوم تھا کہ آبادی اس جگہ سے زیادہ دور نہیں ہوسکتی۔ میں نے چند بسکٹ کھائے اور ایک سگریٹ جلا کے خالی ڈبیا پھینک دی۔

"اب میں جاتا ہوں سروے کرنے" غالب نے کہا "یہ دیکھتا ہوں کہ قریب ترین آبادی کہاں ہے۔"

میں نے کہا "نہیں، ہم سب ساتھ چلیں گے۔ ہم یہ رسک نہیں لے سکتے کہ کوئی اکیلا جائے تو راستہ بھولنے کی صورت میں باقی سب سے بچھڑ جائے یا خدا نخواستہ کسی حادثے کا شکار ہوجائے تو دوسرے انتظار کرتے رہ جائیں۔"

"بالکل ٹھیک۔ اکیلا کوئی کہیں نہیں جائے گا۔" نازو نے میری تائید کی۔

"چندو کا کیا ہوگا؟" غالب نے کہا۔

"اسے ہم اٹھالیں گے باری باری" میں نے کہا "آخر کتنی دور جانا پڑے گا ہمیں؟ دو میل۔ چار میل۔ اس کے بعد کوئی سواری ضرور مل جائے گی۔ اب یہ مضحکہ خیز لباس بدلو۔ لیڈیز، آپ اگر چاہیں تو منہ دھولیں۔ اس کے بعد وہی ساریاں باندھ لیں جو نورل کے گھر میں باندھ رکھی تھیں۔ ہم بھی قمیص پتلون اور جوتے پہن کے چلتے ہیں۔ کلکتے میں ہم دیہاتی نہیں، معزز شہری بن کے داخل ہوں گے۔ میں سمجھتا ہوں اتنے بڑے شہر میں ہمارے لئے کوئی خطرہ نہیں۔ ہم خطرے کو بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ یہاں ہمیں پہچاننے والا کوئی نہیں ہوگا اور ہم پوری کوشش کریں گے کہ گمنام رہیں۔ بمبئی کی طرح ہمارے کلکتہ پہنچتے ہی کوئی ایڈونچر نہ ہو۔"

"اب کیا ایڈونچر ہوگا" غالب نے آہ بھر کے کہا۔

یہاں میں عمداً وہ سب کچھ دہرانا نہیں چاہتا جو آپ بھی جانتے ہیں۔ ہماری قومی تاریخ کا وہ المیہ اب ماضی کا حصہ ہے اور اس کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے اور لکھا گیا ہے۔ سیاست دانوں سے جرنلوں تک اور اخباری تجزیہ نگاروں سے حمود الرحمٰن

کمیشن تک مشرقی پاکستان کی مغربی پاکستان سے علیحدگی کے اسباب اور واقعات پر ہر رُخ سے روشنی ڈالی گئی ہے لیکن اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ ابھی تک ہم سب پورا سچ نہیں جانتے یا جان ہی نہیں سکتے۔ سچ ایک آئینے کی طرح تھا جس کو سنگسار کر دیا گیا اور اس سچ کے ریزے، چھوٹے بڑے ٹکڑے انہوں نے چن لئے جو سچ کو عزیز رکھتے تھے مگر ان لوگوں کے پاس صرف ٹکڑے ہیں، مکمل سچ نہیں ہے۔ ان ٹکڑوں کو جوڑ کے پھر وہ آئینہ کون بنا سکتا ہے جس میں پورا سچ نظر آئے۔ میں فقط داستان گو ہوں۔ آپ بیتی کہتا ہوں۔ جگ بیتی میں میری آپ بیتی شامل ہے مگر میری آپ بیتی کسی طرح بھی جگ بیتی نہیں۔ نہ میں نے سب دیکھا، نہ سنا، نہ پرکھا اور نہ سمجھا۔ پھر مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ کسی پر حرف زنی کروں۔ کوئی رائے دوں اور اسے صائب جانوں۔ بہت سے حقائق کے چہرے میں نے تب دیکھے جب وہ مسخ ہو چکے تھے۔ ان گنت تاریخ کے ٹکڑے میری نگاہ سے اوجھل رہے۔ پھر میں کوئی فیصلہ کس حوالے سے صادر کروں۔ یہ بہت متنازعہ، بڑا دل آزار اور تلخ موضوع ہے۔ پس میں صرف کہانی کہتا ہوں۔ سیاست میں ہر طرف کیا تھا۔ کیا ہو رہا تھا اور کیا نہیں ہو رہا تھا۔ کیا ہونا چاہئے تھا اور کیا نہیں ہونا چاہئے تھا۔ یہ سب میں حذف کرتا ہوں اور یہ بتاتا ہوں کہ سکندر بخت نے کیا کیا۔ کیوں کہ یہ بہرحال اسی کی کہانی ہے۔ اس کہانی میں اب سکندر بخت کے سیاسی ردِ عمل، نظریات اور عقائد کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔ آج بھی خبروں اور بیانوں کے بین السطور اصل تاریخ کا مظلوم چہرہ کون نہیں دیکھ سکتا۔ حُرِ ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی۔ تو اس کہانی میں جو سکندر بخت کی آپ بیتی ہے وہ سب نظر آجائے گا جو کہانی نہیں ہے۔

دریا کے کنارے سے پہلی انسانی آبادی تک ہمارا سفر قوتِ ارادی کی آزمائش کا سخت ترین مرحلہ ثابت ہوا۔ کوئی ہمیں راستہ بتانے والا نہ تھا چناں چہ ہم اندازے کو بنیاد بنا کے چلتے گئے۔ چندو کو اٹھا کے ان دشوار گزار راستوں پر سفر کرنا مشکل سے مشکل ہوتا گیا۔

گل اور نازو نے بھی پوری رات جاگ کے کاٹی تھی اور اس کے ساتھ شدید اعصابی دباؤ برداشت کیا تھا۔ دن نکلنے کے ساتھ ہی ایک سفر کے اختتام نے انہیں حوصلہ عطا کر دیا تھا مگر رفتہ رفتہ جسمانی تھکن غالب آرہی تھی۔ وہ بسکٹ بھی ختم ہو چکے تھے جو گل ساتھ لے آئی تھی۔ دھوپ چڑھتے ہی جنگل میں حبس بڑھ گیا اور ہمارے جسموں کی توانائی پسینہ بن کے خارج ہونے لگی تھی۔

میں نے اور غالب نے گل اور نازو کو تھک کر بیٹھنے نہیں دیا اور انہیں اپنے ساتھ گھسیٹتے ہوئے چلتے گئے۔ مجھے معلوم تھا کہ قدم ایک بار رک گئے تو دوبارہ اٹھنا مشکل ہوگا۔ عین اس وقت جب خود میرا حوصلہ ختم ہو رہا تھا اور میرے قدم لڑکھڑانے لگے تھے، جنگل ختم ہو گیا اور ہم نے خود کو ایک دیوار کے مقابل دیکھا۔

یہ کسی قلعے کی فصیل جیسی بارہ چودہ فٹ بلند دیوار تھی جس کے اوپر کانٹے دار تاروں کی باڑھ تھی۔ دیوار کے اوپر ہر دس دس فٹ کے فاصلے پر ایک فولادی کھمبا تھا جو اوپر سے باہر کی طرف مڑا ہوا تھا۔ اس میں چھ چھ انچ کی دوری سے کانٹے دار تاروں کی پانچ متوازی لائنیں تھیں۔ دیوار سے پہلے ہی تقریباً دس فٹ چوڑی خندق تھی جس میں خار دار تاروں کے ڈھیر گول لچھوں کی صورت میں پڑے ہوئے تھے۔

کچھ دیر اس ممنوعہ علاقے کا جائزہ لینے کے بعد میں نے کہا "یہ کیا جگہ ہو سکتی ہے؟ کوئی ملٹری کیمپ؟"

غالب نے کہا "خاموشی سے تو لگتا ہے کہ یہاں کوئی بھی نہیں رہتا۔"

میں نے دونوں جانب نظر دوڑائی "اس خندق کو عبور کرنے کا بھی کوئی راستہ نہیں ہے۔"

"راستہ ہوتا تب بھی ہم دیوار کے دوسری طرف کیسے جاتے؟" غالب نے کہا۔

"ان تاروں میں کرنٹ بھی ہو سکتا ہے" میں نے خندق میں جھانک کر اور اوپر دیکھ کے کہا۔

نازو نے میرا ہاتھ پکڑ لیا "اس خیال کو دل سے نکال دو۔"

"کس خیال کو؟" میں نے کہا۔

"کہ تم یہاں سے دیوار پر چڑھنے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔"

میں نے کہا "اگر میں اس قابل ہوتا تو ایسا ضرور سوچتا۔ لیکن اس وقت تو یہ کام میرے لئے کوہ ہمالیہ کی بلند ترین چوٹی کو سر کرنے سے زیادہ مشکل ہے۔"

غالب نے کہا "ہم چکر لگا کے دیکھ سکتے ہیں۔ اندر جانے کا کوئی راستہ ضرور ہوگا۔"

"اندر جانے کا راستہ تو مل جائے گا۔ باہر آنے کا راستہ ملے گا یا نہیں" نازو نے کہا۔

"میں غیب کا علم نہیں رکھتا" غالب نے چڑ کے کہا۔

ہم نے پھر چلنا شروع کیا۔ دیوار کی لمبائی دو سو گز کے قریب ہوگی۔ اس وقت یہ فاصلہ ہمیں دو سو میل محسوس ہوا۔ پہلا موڑ کاٹتے ہی میں نے خندق پر بنے ہوئے پُل اور فصیل کے دروازے کو دیکھا۔ لکڑی کے بنے ہوئے پُل پر فولادی جنگلا تھا اور اس کے دونوں طرف دو فوجی جدید خود کار بندوقیں لئے کھڑے تھے۔

ہم پر نظر پڑتے ہی انہوں نے بندوقوں کا رخ ہماری طرف کر دیا اور چلّا کے کچھ کہا۔

میں نے غالب سے کہا "ایسے ہی چلتے رہو۔"

"اگر انہوں نے گولی چلا دی؟"

"میں نے چندو کو اٹھا رکھا ہے۔ تم ہاتھ اوپر اٹھا دو۔ تاکہ انہیں شک نہ ہو کہ ہم جارحانہ عزائم رکھتے ہیں" میں نے کہا۔

لکڑی کے پُل تک پہنچنے والی پتلی سی سڑک پر ایک ٹرک نمودار

ہوا۔ دونوں فوجی مستعد ہو گئے۔ ان میں سے ایک دوڑ کر ہماری طرف آیا۔ ہاتھ کے اشارے سے اس نے ہمیں وہیں بیٹھ جانے کا حکم دیا۔

میں نے چندو کو زمین پر ڈال دیا اور سب کے ساتھ زمین پر بیٹھ گیا۔ فوجی بنگالی میں کچھ کہہ رہا تھا۔ ہماری سمجھ میں ایک لفظ نہیں آرہا تھا۔ پھر ہم کسی سوال کا انکار یا اقرار میں کیسے جواب دیتے۔

اس وقت چندو نے ہماری مدد کی۔ وہ ہمت کر کے اٹھ بیٹھا اور اس نے بنگالی میں بات کی۔ فوجی کے لہجے اور چہرے کی کرختگی قدرے کم ہوئی اور وہ چندو سے سوالات کرنے لگا۔ میں نے لکڑی کے پُل پر سے گزرنے والے ٹرک کو دیکھا۔ یہ ہر طرف سے بند ویسا ہی ٹرک تھا جیسا زیرِ سماعت مجرموں کو جیل سے عدالت لے جانے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ ٹرک جب گیٹ میں داخل ہو گیا تو فوجی نے ہمیں اٹھنے کی اجازت دی۔

چندو شاید اسے مطمئن کرنے میں کامیاب رہا تھا۔ فوجی نے پیچھے رہتے ہوئے ہمیں آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ میں نے پھر چندو کو اٹھا لیا اور ہم دونوں فوجیوں کی نگرانی میں گیٹ تک پہنچے۔ گیٹ پر متعین فوجیوں نے باہر والوں سے نہ جانے کیا پوچھا اور معلوم نہیں انہوں نے کیا جواب دیا۔ چند منٹ بعد بھاری بھرکم فولادی گیٹ میں ایک کھڑکی سی کھل گئی اور ہم سر جھکا کے باری باری اندر داخل ہوئے۔

غالب نے آہستہ سے کہا "یار کہیں ہم جنگی قیدی تو نہیں بن گئے ہیں؟"

"یہ مجھے فوجی نہیں لگتے" میں نے کہا۔

"پھر کیا لگتے ہیں؟"

"ان کی وردی پر مت جاؤ۔ چال ڈھال دیکھو۔ فوجی ایسے نہیں چلتے۔ ان کے قدم....."

ایک فوجی نے بندوق کا کُندا مار کے غالب کو خاموش کر دیا۔ "بات نہیں کرے گا۔ شٹ اپ کرے گا۔"

غالب لڑکھڑا کے گرا اور پھر کھڑا ہو گیا۔ اندر وسیع میدان کے وسط میں ایک مربع عمارت نظر آرہی تھی۔ ایک منزلہ عمارت کی تعمیر جیل کے انداز میں ہوئی تھی۔ سپاٹ دیواروں میں اوپر صرف ایک روشن دان تھا جس میں مضبوط سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ اندر جانے کا صرف ایک ہی راستہ تھا اور وہاں بھی خطرناک ہتھیاروں والے فوجی پہرا دے رہے تھے۔

مجھے اب کوئی شک نہیں رہا تھا کہ ہم آسمان سے گر کر کھجور میں اٹک چکے ہیں اور کسی وجہ کے بغیر جیل میں ٹھونسے جا رہے ہیں۔ اس جیل سے کب نکلنا ہوگا اور کیسے، یہ سوچنے کا اب کوئی فائدہ نہ تھا۔ اگر ہمیں معلوم ہوتا کہ یہ کسی جیل کی فصیل ہے تو ہم ادھر کا رخ ہی کیوں کرتے۔ جیل کے قریب سے گزرنا کوئی جرم نہیں تھا۔ ہمارا جرم یہ تھا کہ ہم بنگالی نہیں بول سکتے تھے۔

اندر کا منظر دیکھ کے مجھے یقین آگیا کہ نہ یہ جیل خانہ ہے اور نہ کوئی فوجی علاقہ۔ یہ کوئی دہشت گردوں کا عقوبت خانہ تھا جہاں سیاسی مجرم لائے جا رہے تھے۔ جو ٹرک میرے سامنے سے گزر کے اندر آیا تھا اس میں سے چیختے چلّاتے مرد عورتیں برآمد کئے جا رہے تھے۔ انہیں ٹرک میں بھیڑ بکریوں کی طرح ٹھونسا گیا تھا اور اب زبردستی کھینچ کر باہر نکالا جا رہا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ان میں کوئی بچہ نہ تھا۔ وہ سب جوان لوگ تھے۔

ہمیں برآمدے کی طرف موڑ دیا گیا اور پھر ایک کمرے میں دھکیل کر دروازے کو باہر سے بند کر دیا گیا۔

گل اور نازو دہشت سے بے ہوش ہونے کو تھیں۔ وہ فرش پر ڈھیر ہو گئیں اور سسکیاں لے کر رونے لگیں۔

"یہ ہم کہاں پھنس گئے؟" غالب بولا۔

میں نے چندو سے پوچھا "یہ کون لوگ ہیں اور یہ کیا جگہ ہے؟ تم سے کیا بات ہوئی تھی ان کی؟"

چندو نے رُک رُک کر ہانپتے ہوئے کہا "ہم بولتی۔ ہم راستہ بھول جاتی۔ کشتی میں جاتی شکار کا واسطے۔ کشتی خراب ہوتی۔ ادھر سے ہم پیدل آتی۔ سب کلکتہ میں رہتی۔"

"ہمارے بارے میں تم نے کیا بتایا؟"

"ہم بولتی۔ صاب لوگ بوہت امیر ہوتی.... ادھر بوہت بڑا کاروبار ہوتی" چندو نے کہا "یہ ان کا بی بی ہوتی۔ ہم نوکر ہوتی۔"

"اور انہوں نے یقین کر لیا؟" غالب نے کہا۔

میں نے کہا۔ "یہ نہیں پوچھا کہ ہم ہندو ہیں یا مسلمان؟"

"ہم آپ کو ہندو بولتی۔"

"مگر یہ کون لوگ ہیں؟" میں نے پھر کہا۔

"ہم نہیں جانتی۔ وہ نہیں بتاتی۔ کہتی سب کو بڑا افسر کا سامنے پیش کرتی۔"

میں نے کہا "بڑا افسر..... خیر....."

اسی وقت دروازہ کھلا اور مشین گن والے دو فوجی ٹائپ شخص اندر آگئے۔ انہوں نے ہم سب کو گردن سے دبوچ کر سجدے میں گرنے پر مجبور کر دیا۔ پھر وہ ہمارے پیچھے کھڑے ہو گئے۔ میں نے تیسرے شخص کے بھاری، متوازن قدموں کی آواز سنی اور اس کے جوتوں کو اپنے چہرے سے ایک فٹ دور دیکھا۔

"تم بنگال سے بھاگ کر آئے ہو؟" اس نے انگریزی میں کہا۔

"یہ غلط ہے" میں نے انگریزی میں جواب دیا "ہم کلکتہ میں رہتے ہیں۔ یہاں ہمارا پرانا بزنس ہے۔"

بوٹ کی ٹھوکر میرے شانے پر لگی "جھوٹ بکتے ہو تم۔ کلکتہ میں پرانا بزنس ہے مگر تم بنگالی نہیں جانتے۔"

میں نے درد کی ٹیس کو دبا کے کہا "سر! میں کمپنی کا ملازم ہوں۔ پہلے میری پوسٹنگ دہلی میں تھی۔ اس سے پہلے میں سنگاپور میں۔ یہ ایک انٹرنیشنل فرم ہے۔"

"کیا نام ہے فرم کا؟"
"گریوز کاٹن ....." میں نے ذہن میں آنے والا پہلا نام کسی تذبذب کے بغیر بتادیا۔
"کیا کرتی ہے یہ فرم؟"
"پاور جنریشن۔ انڈسٹریل ائیرکنڈیشننگ۔"
"تم کیا کرتے ہو؟"
"میں ڈائریکٹر مارکیٹ ریسرچ ہوں۔ سوبھاش چندر۔ یہ میرے ساتھ چیف اکاؤنٹ آفیسر ہے ڈی سوزا ..... اگر تم اجازت دو تو میں باقی سوالات کا جواب کھڑے ہو کر دوں؟"
"او کے۔ کھڑے ہو جاؤ۔ تم سب" اس نے کہا۔
میں نے اٹھتے ہوئے کہا "تھینک یو۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں.....؟"
میری بات پوری ہونے سے پہلے میرے مُنہ پر اس کا بھرپور مکا پڑا "تم نے جواب دینے کے لئے کھڑے ہونے کی اجازت مانگی تھی' سوال تم نہیں کرسکتے۔"
وہ چالیس سال کا ہٹا کٹا' پستہ قد' بھاری بدن والا سیاہ فام شخص تھا۔ صورت سے وہ خطرناک ذہنی مریض نظر آتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جنون اور وحشت کے آثار تھے اور اس کے اطوار میں کسی خونی درندے کی جبلت کارفرما محسوس ہوتی تھی۔
مکا لگنے سے میں ایک قدم پیچھے ہو گیا تھا۔ پیچھے کھڑے ہوئے محافظ نے مجھے آگے دھکا دے کر پھر قطار میں شامل کرنے کی کوشش کی تھی مگر میں بلاارادہ اس سے ٹکرا گیا جو افسرِ اعلیٰ کی حیثیت سے تفتیش کرنے آیا تھا۔
وہ ایک ایسا لمحہ تھا جب میں نے جان کی بازی لگادی۔ نہ جانے کیسے میرے جسم میں اتنی قوت آگئی کہ میں نے ایک سیکنڈ میں اس کی گردن کے گرد اپنے ایک ہاتھ کو شکنجے کی طرح کس لیا اور اس کے دوسرے ہاتھ کو موڑ کے کمر کے پیچھے کر دیا۔ خود گھوم کر اس کے پیچھے ہو گیا اور اسے ڈھال بنا کے دیوار سے لگ گیا۔ میرا ایک گھٹنا اس کی کمر پر تھا اور دوسرا پاؤں زمین پر مضبوطی سے جما ہوا تھا۔
وہ سخت اذیت میں چیخ رہا تھا اور محافظوں کو حکم دے رہا تھا کہ مجھے شوٹ کر دیں مگر محافظ پتھر کا بت بنے کھڑے تھے۔ اگر وہ گولی چلاتے تو اپنے افسر کے جسم کو چھلنی کرتے۔ اس کے جسم سے گزرے بغیر کوئی گولی مجھ تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔
"ان سے کہو ہتھیار ڈال دیں" میں نے اسے حکم دیا "جلدی کرو۔ میں صرف تین تک گنوں گا۔ پھر تمہاری گردن توڑ دوں گا۔"
میری گرفت سے اس نے اتنا اندازہ ضرور کر لیا تھا کہ یہ کسی اناڑی کی گرفت نہیں ہے اور میں اپنی دھمکی پر عمل کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہوں۔ اس سے پہلے کہ میں تین تک گنتا ایک اور نوجوان بڑی افسرانہ شان سے کمرے میں داخل ہوا۔ اندر قدم رکھتے ہی وہ ٹھٹک کر رکا اور کسی سے کچھ پوچھے بغیر اس نے صورت حال کو سمجھ لیا۔
اس نے ریوالور نکالنے میں دیر نہیں کی لیکن ایک ایسی غلطی کر بیٹھا جو آج سے پہلے بھی اکثر لوگوں نے کی تھی۔ اس نے نازو کو کھینچ لیا تھا اور اس کی کنپٹی پر ریوالور رکھ دیا "کرنل کو چھوڑ دو ....."
اس سے زیادہ کہنے کی اسے مہلت ہی نہ ملی۔ نازو نے اس کے ساتھ وہی کیا جو میں نے کرنل کے ساتھ کیا تھا۔ نازو ایک جوان مرد کو جسمانی طاقت کے بل پر قابو میں نہیں رکھ سکتی تھی۔ اس نے زیادہ آسان نسخہ استعمال کیا اور نوجوان افسر سے ایک سیکنڈ میں ریوالور چھین لیا۔ دوسرے سیکنڈ میں وہ اس افسر کے پیچھے پہنچ گئی اور وہی ریوالور اس کی گدی سے لگا دیا۔
میں نے چلا کے کہا "ایک ..... دو....."
کرنل صاحب کے حلق سے ایک چیخ سی برآمد ہوئی۔ دونوں مسلح محافظ پہلے ہی بے بسی کی تصویر بنے کھڑے تھے۔ اشارہ پاتے ہی انہوں نے اپنی خود کار رائفلیں زمین پر ڈال دیں۔
"کیا ایسے تم ..... یہاں سے نکل سکتے ہو؟" کرنل نے کراہ کے کہا۔
میں نے اس کی کمر پر گھٹنا مارا "تمہارا سوالات کرنے کا اختیار باقی نہیں رہا۔"
کرنل درد سے بلبلایا اور میں نے اسے جھٹکا دے کر آگے جھکا دیا۔ نوجوان افسر جتنا حاضر دماغ ثابت ہوا تھا اتنا ہی جذباتی بھی ثابت ہوا۔ یہ اس کی عمر کا تقاضا اور گرم خون کی تاثیر تھی۔ ایک کمزور اور دھان پان سی عورت کے ہاتھوں مار کھا کے اس کی حالت زخم خوردہ سانپ کی طرح ہو رہی تھی۔ وہ خود کو سخت بے عزت اور بے غیرت محسوس کر رہا تھا۔
جب نازو نے اسے بھی سجدے میں گرنے کا حکم دیا تو اس کی قوت برداشت کا فیوز اُڑ گیا۔ اس نے پلٹ کے نازو کو گالی دی اور اس کے ریوالور کی زد سے بچتے ہوئے جھک کر نازو کو ٹکر ماری۔ نازو کو دیوار سے ٹکرا کے گرانا چاہتا تھا مگر اس وقت نازو بھی بجلی بن گئی تھی۔ وہ ایسے درمیان سے ہٹ گئی جیسے وہاں تھی ہی نہیں اور اس نے پیچھے سے نوجوان افسر کو ایسے لات ماری کہ اس کی رفتار بڑھ گئی۔ اس کا سر بڑی آواز کے ساتھ دیوار پر لگا۔ ابھی گرا بھی نہ تھا کہ نازو کی دوسری لات حرکت میں آئی اور اس کی گردن پر پڑی۔ وہ کوئی آواز نکالے بغیر مر گیا۔ آخری آواز جو وہاں سب نے سُنی اس کی گردن کی ہڈی کے ٹوٹنے کی تھی۔ اس کا جسم بھی کچھ دیر پھڑکتا رہا اور پھر ساکت ہو گیا۔
اب کرنل کی سب خوش فہمی دور ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی دونوں محافظ بھی سجدہ ریز ہو گئے۔ میں نے اور غالب نے خود کار ہتھیار اٹھا لئے۔
"کم آن کرنل۔ اب تمہاری باری ہے۔ تمہیں بہت سے

سوالوں کے جواب دینے ہوں گے" میں نے کہا "مگر ہمیں کوئی جلدی نہیں ہے۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تمہارا آفس کہاں ہے؟"
"اسی برآمدے کے آخری حصے میں" وہ بولا۔
میں نے غالب سے کہا "اس کی جامہ تلاشی لو۔ دیکھو اس کے پاس بھی کوئی ریوالور ضرور ہو گا۔"
غالب نے اس کی وردی کی ایک جیب سے ریوالور برآمد کر کے اور گل کی طرف بڑھا دیا۔
میں نے کہا "تمہارے علاوہ یہاں کتنے افسر ہیں؟"
"دو باقی ہیں اب۔ تین تھے" وہ بولا۔
"ان کو تم اپنے آفس میں طلب کرو گے۔ ہم یہاں سے تمہارے آفس جائیں گے۔ میں اور تم۔ وہاں تم زندہ پہنچتے ہو یا مردہ اس کا انحصار تمہارے رویے پر ہے۔ اب ہم اس پوزیشن میں ہیں کہ سب کو بھون کے رکھ دیں۔ جو بھی مزاحمت کرے......"
"مزاحمت کوئی نہیں کرے گا۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تم جہاں چاہو گے وہاں پہنچائے جاؤ گے" کرنل بولا "کیا اب میں اٹھ سکتا ہوں؟"
"یس" میں نے اس کے شانے پر جوابی ٹھوکر مار کے کہا اور نازو کو اشارہ کیا "تم میرے ساتھ چلو۔ ان دونوں کے لئے ہمارے دو آدمی کافی ہیں۔"
"تم چاہو تو اسے بھی لے جاؤ" غالب نے گل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
"تم انہیں لے کر پانچ منٹ بعد نکلو گے" میں نے کہا "اور ہمارے پیچھے پیچھے آؤ گے۔ کوئی معمولی غلطی کرے تو تمہیں احکامات کی ضرورت نہیں۔ کِل دیم لائک ڈاگس۔ تم آفس کے باہر ٹھہرو گے۔"
کرنل کے ساتھ برآمدے میں چلتے ہوئے میں نے بہت سی خالی کوٹھریاں دیکھیں۔ پہلے یہ یقیناً کوئی جیل خانہ تھا جو اب ان لوگوں کے قبضے میں آگیا تھا۔
کرنل کا آفس بہت وسیع اور شاندار تھا۔ میں نے باہر بھی ایک محافظ کو مسلح کھڑا دیکھا۔ اس کی مشکوک نظریں مجھ پر پہلے سے تھیں۔
میں نے اسے حکم دیا "دروازہ کھولو اور اندر چلو۔"
"کیا ..... ؟ تم ....."
کرنل نے اسے ہاتھ اٹھا کے خاموش کر دیا "دروازہ کھولو اور اندر چلو۔ خاموشی سے۔ کوئی احمقانہ حرکت مت کرنا۔"
اندر داخل ہوتے ہی میں نے کرنل کو مزید احکامات جاری کئے۔ "اپنی جگہ پر بیٹھو۔ یہ کیا ہے۔ انٹرکام؟ اپنے باقی دو افسروں کو طلب کرو۔ اس محافظ سے کہو کہ ہتھیار یہاں رکھ کے خود باہر بیٹھے۔ جب افسران تشریف لائیں تو انہیں کچھ نہ بتائے۔ نہ زبان سے' نہ اشارے سے' نہ رویے سے۔ ورنہ باہر بھی ہمارے آدمی موجود ہوں گے۔"
کرنل نے تعمیل کی اور دونوں افسروں کو اپنے آفس پہنچنے کی ہدایت کی۔ میں اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ خود کار رائفل کا رخ کرنل کی جانب رہا۔
"یہاں کوئی ڈاکٹر ہے؟" میں نے کہا۔
"ان افسروں میں سے ..... ایک ڈاکٹر ہے" کرنل نے کہا۔
"ہمارے ایک ساتھی کو فوراً طبی امداد کی ضرورت ہے اور ہمیں بھی کھانے پینے کو کچھ چاہئے" میں نے کہا "جو بھی مل جائے۔"
"سب کچھ ملے گا" کرنل نے کہا "جو تم چاہو گے۔ کیا اس کے بعد تم چلے جاؤ گے؟"
میں نے کہا "یو ایڈیٹ! کیمپ اب ہمارے قبضے میں ہے اور تم خود بھی ایک قیدی ہو۔ صرف اپنی زندگی کی دعا مانگو۔ سوال مت کرو ہم سے۔"
چند منٹ بعد دونوں افسران آئے اور اندر آتے ہی منجمد ہو گئے۔ کسی مزاحمت کے بغیر انہوں نے اپنے ہتھیار نازو کے حوالے کر دئے۔ میں نے غالب اور گل کو بھی اندر بلا لیا۔ سارے قیدی دیوار کے ساتھ کھڑے کر دئے گئے۔ تین ماتحت اور تین افسر۔ ان سب کی حالت غیر تھی۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ کیمپ پر کسی نے قبضہ کر لیا ہے مگر یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ ہمارا تعلق کس گروہ سے ہے اور ہم اچانک کہاں سے نازل ہو گئے۔
آدھے گھنٹے بعد جب ہم چائے کافی' سینڈوچ اور بسکٹ وغیرہ کھا پی کے تازہ دم ہو گئے اور چندو کو ڈاکٹر نے انجکشن لگانے کے بعد شانے کے زخم پر مرہم پٹی سے فارغ کر دیا تو میں نے کہا۔
"کرنل۔ اب مقدمے کی کارروائی شروع ہوتی ہے۔"
"مقدمہ! ..... کیسا مقدمہ؟" کرنل کا رنگ فق ہو گیا۔
"تمہیں ایم آر ایس کی عدالت کے سامنے پیش ہو کے استغاثہ کے سوالات کے جواب دینے ہوں گے۔ اپنی صفائی میں تم جو کہو گے وہ بھی سنا جائے گا۔"
"واٹ دا ہیل از ایم آر ایس؟" کرنل نے کہا۔
میں نے اسے کرسی سے گھسیٹ لیا اور خود اس کی جگہ بیٹھ گیا۔
"یہ ہماری عدالتِ انصاف ہے۔ جہاں ہم اپنے قوانین کے مطابق اپنی سزا دیتے ہیں۔ ہم مدعی' منصف اور سزا پر عمل درآمد کرنے والے سب خود ہیں۔ ایم آر ایس کا مطلب ہے مائٹ از رائٹ سوسائٹی۔ یہ تم بھی جانتے ہو گے کہ اس وقت ساری دنیا میں اسی نظریہ پر سیاست بھی ہو رہی ہے اور انصاف کا بھی یہی اصول ہے۔"
"میں نہیں مانتا ایسی کسی عدالت کو" کرنل چلایا۔
"عدالت سے تعاون کر کے تم رعایت حاصل کر سکتے ہو۔

ورتِ دیگر تم سے تعاون حاصل کرنے کا پُراذیت مرحلہ پہلے آئے سزا اس کے بعد زیادہ ملے گی۔ تم سے جو پوچھا جائے اس کا ب دو۔ یہاں تمہاری نہیں ہماری مرضی چلے گی" میں نے کہا۔ رے لئے کوئی سوال کئے بغیر تمہیں گولی ماردینا کیا مشکل تھا مگر ہم ہیں ایک موقع دینا چاہتے ہیں۔"

"اوکے ..... پوچھو۔ کیا پوچھنا ہے" کرنل نے خشک لبوں پر بان پھیری۔

"یہ کیا جگہ ہے۔ کوئی جیل خانہ؟"

"یہ پہلے پاگل خانہ تھا۔"

"پاگل کہاں گئے؟"

"کرنل نے کہا "مرگئے۔"

"کیسے مرگئے؟" میں نے کہا "تم نے ماردیا سب کو۔"

کرنل نے مجبوراً اقرار میں سرہلایا "وہ سب خطرناک پاگل تھے۔"

"خطرناک پاگلوں کو دنیا میں کہیں قتل نہیں کیا جاتا۔ تم نے یسا کیوں کیا؟"

"ہمیں..... ان کے خون کی ضرورت تھی" کرنل نے کہا۔

میں نے چیخ کر کہا "خون کی؟ ان کے جسم سے خون کشید کرلیا تم نے! کس لئے، کس کے لئے؟"

"زخمیوں کے لئے" کرنل نے کہا۔

"کون سے زخمی؟" میں نے کہا "جو بنگال میں لڑ رہے تھے۔ پاکستان کی فوج سے؟ بھارت کے فوجی۔"

"اس نے کہا "ان کے علاوہ۔ بنگالی۔ جو اپنی آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے۔"

میرے وجود میں غصے کی آگ ایک دم بھڑک اٹھی تھی مگر میں نے ضبط اور برداشت سے کام لیا۔ میں ان قاتلوں کی فوج کے ناپاک جسم کا آخری قطرۂ خون بھی نچوڑ لینا چاہتا تھا مگر اس سے پہلے میں ان کی زبانی اس انسانیت سوز ظلم کی پوری تفصیل جاننا چاہتا تھا۔

"کتنے پاگل قتل کئے تم نے اس طرح؟"

"تقریباً دو سو" کرنل نے کہا۔

"اور ان کی لاشیں کہاں گئیں؟"

"ہم نے یہاں دفنا دیں۔ اسی احاطے میں" کرنل نے کہا۔

"کیا یہ سب حکومت کے علم میں نہیں ہے؟ تم کون ہو؟"

"ہم شیوسینا کے رضاکار ہیں۔ ہم نے دو ہفتے پہلے اس جگہ پر قبضہ کیا تھا۔ ابھی تک یہ بات عام نہیں ہوئی۔ صرف ہم جانتے ہیں اور ہمارے کچھ ساتھی۔"

"اس عرصے میں کسی پاگل کا کوئی عزیز ملنے نہیں آیا؟"

"خطرناک پاگلوں کا کوئی دوست یا عزیز نہیں ہوتا۔"

میں نے کہا "اور یہاں کی انتظامیہ؟"

"اسے بھی ہم نے ٹھکانے لگادیا تھا۔ ان کا خون بھی کام آگیا تھا" کرنل نے کہا۔

"تم کو اندازہ ہے کچھ اپنے جرم کی سنگینی کا؟ اگر یہ بات حکومت کو معلوم ہوجائے۔ دنیا کو پتا چل جائے تو کیا ہوگا؟"

کرنل نے کہا "اس سے پہلے ہی ہم بھاگ جاتے۔ فوری طور پر اس کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ ہمیں سپلائی مل رہی تھی، راشن فراہم ہو رہا تھا۔"

"اگر ہم تمہیں مغلوب نہ کرتے۔ تو تم ہمارا خون بھی نکال لیتے؟" میں نے کہا۔

کمرے میں ایک بھیانک خاموشی تھی۔ گل اور نازو پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان جنونی قاتلوں کو دیکھ رہی تھیں اور خون ریزی کی ایسی لرزہ خیز کہانی سن رہی تھیں جو اس سے پہلے صرف جرمن نازی کیمپوں کے بارے میں مشہور ہوئی تھیں۔ اگر یہ بات مہذب دنیا تک پہنچ جاتی تو ساری انسانیت چیخ اٹھتی مگر اب اس کا امکان باقی نہیں رہا تھا۔ قدرت نے ہمیں ان بے گناہوں کے خون کا بدلہ لینے بھیج دیا تھا جو شیوسینا کے ان درندہ صفت قاتلوں کے ہاتھوں قتل ہوئے تھے۔ میں اب پُرسکون تھا اور فیصلہ سنانے سے پہلے مزید تفتیش کے خیال سے رُکا ہوا تھا ورنہ انہیں سزائے موت دینے کے لئے ان کا اعترافِ جرم کافی تھا۔

"ابھی کچھ دیر پہلے ایک ٹرک میں جو نوجوان مرد اور عورتیں یہاں لائے گئے تھے، وہ کون تھے؟" میں نے کہا۔

"وہ سب مجرم تھے۔ قیدی بنا کے لائے گئے تھے بنگال سے۔"

کرنل نے کہا "مجھے معلوم ہے کہ تم معاف کرنے والے نہیں ہو۔ تم بہت پہلے ہی فیصلہ کرچکے ہو کہ ہمیں قتل کردو گے مگر ہم اب موت سے نہیں ڈرتے۔ ہم نے جو کچھ کیا ٹھیک کیا۔ اپنا فرض سمجھ کے کیا۔ دشمن کے ساتھ جنگ میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ جرمنوں اور جاپانیوں نے جنگِ عظیم میں جو کچھ کیا تھا ساری دنیا جانتی ہے۔ کوریا اور ویت نام میں مہذب جمہوریت پسند امریکی افواج نے کیا سلوک کیا تھا۔ اب میں نے تمہیں پہچان بھی لیا ہے۔ مجھے تمہارا نام یاد نہیں آرہا ہے مگر مجھے سب معلوم ہے کہ تم نے کیا کارنامے سر انجام دیے ہیں۔ یہ میرے لئے واقعی حیرانی کی بات ہے کہ تم یہاں کیسے آپہنچے۔ یوں سمجھ لو کہ ادھر ہم بھی وہی ہیں جو سرحد پار پاکستان میں تم تھے۔"

میں نے کرنل کو گولی ماری۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کے جھکا تو میں نے کہا "یہ گولی اس الزام کے جواب میں ہے جو تم نے ہم پر عائد کیا۔ ہم نے کبھی کسی بے گناہ کا خون نہیں بہایا۔ صرف اسی کو مارا جو ہمارا دشمن تھا یا ہمارے وطن کا دشمن تھا۔"

کرنل نیچے گرا تو میں نے اسے ایک اور گولی ماری جو اس کے سینے میں دوسری طرف لگی "اور یہ گولی اس سزا کے طور پر جو تمہیں دو سو قابلِ رحم انسانوں کو بے رحمی سے ہلاک کرنے کے جرم پر دی گئی۔ اور یہ آخری گولی اس ظلم کی سزا جو تم نے مشرقی پاکستان کے لوگوں پر کیا۔ وہ سب ہمارے ساتھی تھے۔"

تیسری گولی اس کے سر پر لگی تو وہ آخری بار تڑپا اور ساکت ہوگیا۔ اس کا خون فرش پر پھیل گیا تھا اور اس خون کے چھینٹے دیواروں تک پہنچے تھے۔ میری آخری گولی کے ساتھ ہی نازو نے نیم دیوانگی کے عالم میں چیختے ہوئے باقی لوگوں پر فائر کھول دیا۔ وہ سب وہیں دیوار کے ساتھ گر کے ایڑیاں رگڑنے لگے۔ نازو ان پر فائر کرتی رہی۔

غالب نے اس کے ہاتھ سے رائفل چھین لی مگر اس پر جنون کا دورہ پڑا ہوا تھا۔ اس نے غالب کو اٹھا کے پھینک دیا اور دوبارہ رائفل حاصل کرلی۔ گل نے ایک دہشت ناک چیخ ماری۔

"بھائی سکندر! اسے روک لیں۔"

نازو دروازے سے باہر جانے کے لئے لپکی تو میں نے دوڑ کر اسے قابو کیا۔ اس نے میری گرفت سے نکلنے کی دیوانہ وار کوشش کی مگر ناکام رہی۔ میں نے ایک ہاتھ مار کے اسے ناک آؤٹ کردیا اور وہیں میز پر لٹا دیا۔

فائرنگ کی آواز پر کیمپ میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ میں اور غالب باہر نکلے تو ایک ساتھ چار محافظ دوڑتے نظر آئے۔ ایک ستون کی اوٹ سے غالب نے ان چاروں کو نشانہ بنالیا۔

"ابھی باہر والے باقی ہیں" میں نے کہا۔

"نہیں میں باہر جا کے ٹھکانے لگاتا ہوں" غالب نے کہا۔ اور میرے منع کرنے کے باوجود برآمدے میں دوڑتا چلا گیا۔ خود اس پر جنون کی کیفیت طاری تھی اور میرے لئے ضروری ہوگیا تھا کہ اسے تحفظ فراہم کروں۔ میں اس کے پیچھے بھاگا۔

گیٹ تک پہنچنے سے پہلے ہی میں نے غالب کو پکڑ لیا اور اسی کمرے میں گھسیٹ لیا جس میں ہم اندر آنے کے بعد کچھ دیر قید رہے تھے "ہوش میں آؤ مرزا۔ ایسے سامنے جا کے کیوں خودکشی کرنا چاہتے ہو۔ ہماری ساری جدوجہد زندگی کے لئے ہے۔ موت کے لئے نہیں۔"

غالب نے ایک گہری سانس لی "آئی ایم سوری۔ میرے جذبات قابو میں نہیں رہے تھے۔ اس حرام زادے کی بات سن کر۔"

"آخر میں نے بھی تو وہ سب سنا تھا۔"

"اسی لئے تم مشن کمانڈو ہو۔ چیف کے ٹو" وہ مسکرایا "یہ بات ہم مذاق میں ضرور کہتے ہیں مگر یہ حقیقت ہے کہ تمہاری قائدانہ خوبیوں میں سب سے اہم یہی ہے۔ ہنگامی صورت حال میں جذبات پر کنٹرول رکھنا اور دوسروں کو بچانا۔"

اسی وقت باہر کے محافظ دوڑتے ہوئے ہمارے سامنے سے گزرے۔ میں نے غالب کو آہستہ آہستہ دبے پاؤں آگے آنے کا اشارہ کیا۔ وہ ہم سے چند قدم دور ہی گئے تھے کہ پیچھے سے ہم دونوں نے فائر کئے اور وہ برآمدے میں ہی لیٹ گئے۔

"اب کون بچا ہے؟" میں نے ایک کی مشین گن اٹھا کے کہا جو لوڈڈ تھی۔

"شاید کوئی نہیں" غالب نے بھی اپنی رائفل پھینک دی اور ایک مشین گن اٹھالی "ہوگا تو اس سے بھی نمٹ لیں گے۔"

لیکن وہ اس خونی کیمپ میں شیوسینا کے آخری محافظ تھے۔ میں اور غالب لاشوں کے اوپر سے چھلانگ لگاتے ہوئے اس آفس تک پہنچے جہاں اس خودساختہ کرنل کی اور اس کے باقی ساتھیوں کی لاشیں خون کے بنے ہوئے ایک تالاب میں پڑی ہوئی تھیں۔ کمرا تازہ خون اور بارود کی بُو سے بھرا ہوا تھا۔

گل بڑی بہادری سے میز پر لیٹی ہوئی نازو کو ہوش میں لانے کی کوشش کررہی تھی اور کسی حد تک اپنی کوشش میں کامیاب بھی ہو چکی تھی۔

"نازو۔ اٹھو۔ آنکھیں کھولو" گل نے اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارتے ہوئے کہا۔ پھر غالب نے اس کے گالوں پر آہستہ آہستہ تھپڑ مارے اور نازو نے ایک دوبار اوں آں کرتے ہوئے آنکھیں کھولیں اور پھر اٹھ بیٹھی۔ اسے کچھ دیر صورت حال کا اندازہ کرنے میں لگی اور وہ سوچتی رہی کہ آخر وہ میز پر کیوں بیٹھی ہے۔ پھر اسے سب یاد آگیا۔

اس نے انگلیوں سے بال سنوارے۔ ساری کو درست کیا اور میز سے اتر آئی۔ گل نے کہا "طبیعت کیسی ہے اب؟"

نازو شرمندگی سے مسکرائی "ٹھیک ہوں۔ پتا نہیں ایک دم کیا ہوگیا تھا مجھے۔"

"تمہیں کچھ بھی نہیں ہوا تھا" غالب نے اسے سہارا دیتے ہوئے کہا "آؤ اب چلیں۔"

باہر سے اب بھی شور کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں مگر یہ شور مخالف سمت کے کمروں سے اٹھ رہا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ تم دونوں گیٹ پر رکو" میں نے گل اور نازو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "میں اور غالب ابھی آتے ہیں، قیدیوں کو رہا کرکے۔"

غالب نے کہا "راستے میں بھی چار لاشیں پڑی ہیں۔ دو کی مشین گنیں ہم نے لے لی تھیں۔ تم چاہو تو باقی دو اٹھا لینا۔"

وہ سیدھی برآمدے میں بڑھ گئیں۔ میں اور غالب درمیانی صحن کو عبور کرکے قیدیوں کی طرف گئے۔ وہ ٹرک ابھی صحن میں کھڑا ہوا تھا جس میں جوان، صحت مند انسانوں کا تازہ ریوڑ لایا گیا تھا کہ ان کے بدن سے قطرہ قطرہ خون نچوڑ کے بے مصرف جسم کو کہیں گاڑ دیا جائے۔

میں نے کہا "غالب، یہ کتنی عجیب بات ہے کہ جسے یہ لوگ دشمن قرار دیتے تھے انہی کا لہو دے کر اپنوں کی زندگی بچاتے تھے۔ لوگ خون کا عطیہ دیتے ہیں انسانی ہمدردی کی بنا پر۔ نیکی کرنے کے لئے اور ثواب کمانے کے لئے۔ عداوت اور نفرت کے جذبات سے مغلوب ہوکے نہیں۔ جب کسی کی رگوں میں آپ کا لہو دوڑ رہا ہو

وراسے آپ کے خون سے زندگی ملی ہو' پھر وہ دشمن کہاں رہا۔ س سے تو خون کا رشتہ استوار ہوگیا۔"

"یہ سب کچھ انسان سوچتے ہیں۔" غالب نے کہا "شیطان نہیں۔ ان کی ذہنی کیفیت تو یہ تھی کہ اگر بس چلتا تو یہ خون سے محروم کرنے کے بعد جسموں کو مٹی میں نہ گاڑتے۔ اپنے کتوں کو کھلا دیتے۔"

دو طویل برآمدوں کی قطار میں تیس کوٹھریاں تھیں اور ہر کوٹھری میں دو دو آدمی جانوروں کی طرح بند تھے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ یہاں ان کے جسم سے خون کشید کیا جائے گا۔ مگر وہ دیوانوں کی طرح چلّا چلّا کے رو رہے تھے۔ سلاخوں سے سر ٹکرا رہے تھے۔ اپنے کپڑے پھاڑ رہے تھے اور گالیاں بک رہے تھے۔

"یہ سب دروازے تو مقفل ہیں" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "چابیاں کسی کی جیب میں ہوں گی۔ میں لاتا ہوں۔"

غالب کے آنے تک میں نے ان لوگوں کو تسلی دی۔ اور انہیں سمجھایا کہ ہم انہیں رہا کر رہے ہیں۔ وہ میری بات تو نہیں سمجھے مگر میرے دوستانہ رویّے اور محبت بھرے انداز نے انہیں کچھ حوصلہ دیا۔ پھر ایک کوٹھری میں مجھے ایک اُردو بولنے والا مل گیا۔ اس نے روتے روتے مجھے بتایا کہ وہ سرحدی علاقے کے رہنے والے لوگ ہیں۔ جنگ میں ان کے گھربار تو تباہ ہوئے ہی تھے۔ انہیں ریلیف کیمپ میں پہنچانے کے بہانے یہاں پہنچا دیا گیا۔

میں نے کہا "آپ سب ایک ہی علاقے کے لوگ ہیں؟"

"ایک ہی گاؤں کے" وہ بولا "پورے پورے خاندان...."

میں نے کہا "بوڑھے اور بچے کہاں ہیں؟"

اس نے کہا "مجھے نہیں معلوم۔ جب چلے تھے تو سب ساتھ تھے۔ دو ٹرک تھے۔ ایک میں بوڑھے اور بچّے تھے۔"

میں سمجھ گیا کہ دوسرے ٹرک والوں پر کیا بیتی ہوگی۔ بوڑھوں کو یقینی طور پر ہلاک کر دیا گیا ہوگا۔ وہ کسی کام کے نہیں تھے۔ نہ خون دے سکتے تھے اور نہ غلاموں کی منڈی میں بیچے جا سکتے تھے۔ بچّوں کو غلاموں کے تاجر لے گئے ہوں گے۔ لاوارث بچّوں کی خرکاروں اور گداگری کے ٹھیکے داروں اور غلام فروشوں کو ہمیشہ ضرورت رہتی ہے۔ یہ سب کچھ اسی بیسویں صدی کے مہذب ترقی یافتہ کہلانے والے معزز معاشرے میں ہوتا تھا جس میں ہم زندہ تھے۔ غالب چابیاں لے کر آیا تو میں نے باری باری قفل کھول کے انہیں آزاد کیا۔ انہیں قید کرنے والوں نے کسی درجہ بندی کے بغیر الگ الگ کوٹھریوں میں رکھا تھا۔ ایک کی بیوی کسی کے ساتھ تھی تو بہن کسی اور کے ساتھ۔ وہ سب درمیان میں اکٹھے ہو کے اور آپس میں گلے مل مل کے رونے لگے۔

میں نے تین افراد کو منتخب کیا جو اُردو سمجھ سکتے تھے "انہیں سمجھاؤ کہ حوصلے اور صبر سے کام لیں۔ ہم انہیں یہاں سے نکال کے آزاد کر دیں گے۔ آگے یہ جہاں چاہیں جائیں۔ خود فیصلہ کریں۔ ہم اس سے زیادہ ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔"

"یہ لوگ خالی ہاتھ کہاں جائیں گے؟" ان میں سے ایک بولا۔

میں نے کہا "اچھا ہم تھوڑی بہت مالی مدد بھی کریں گے۔ بس تم انہیں خاموش کرا دو۔ اور ان کو ٹرک میں سوار کرلو۔"

"میں ٹرک کی چابیاں بھی لے آیا ہوں" غالب نے کہا۔

"ہم ان سب کو اسی ٹرک میں بھریں گے" میں نے کہا "اور خود بھی اسی میں جائیں گے۔"

میرے سوال کا جواب اس شخص نے دیا جو لوگوں کو یہ سمجھانے گیا تھا کہ ہم انہیں باہر لے جا کے چھوڑ دیں گے۔

"جناب۔ کچھ لوگ میری نہیں مان رہے ہیں۔ کسی کی سننے پر تیار نہیں" وہ واپس آکے بولا۔

"کیا مطلب۔ کیا وہ آزادی نہیں چاہتے؟"

"نہیں۔ وہ ٹرک میں سوار ہونے پر راضی نہیں۔ وہ ڈرتے ہیں کہ انہیں دھوکے سے کسی دوسری جگہ لے جایا جا رہا ہے۔"

"اچھا" میں نے سوچ کے کہا "پھر یہ لوگ کیا چاہتے ہیں۔ صرف آزادی؟ ٹھیک ہے۔ جانے دو انہیں جو جانا چاہیں۔"

اس شخص نے واپس جا کے اعلان کیا تو لوگ ایک دم خاموش ہو گئے۔ اب ان کی نظریں بند گیٹ پر تھیں جہاں گل اور نازو مسلح کھڑی تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں مشین گن دیکھ کر کوئی آگے بڑھنے کی ہمت نہیں کر رہا تھا۔

مجھے ان مردم گزیدہ لوگوں پر ترس بھی آیا اور ان کی اس ذہنی کیفیت پر دکھ بھی ہوا "اب شاید یہ سمجھ رہے ہیں کہ انہیں گیٹ سے گزرتے ہوئے گولیوں کا نشانہ بنایا جائے گا۔ چلو۔ ہم ان کا خوف دور کر دیں۔"

غالب کے ساتھ میں پہلے کمرے میں گیا جہاں ابھی تک ہمارا سامان ویسا ہی رکھا ہوا تھا۔ کسی نے ان پوٹلیوں کو کھول کر دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ ان میں پرانے کپڑوں' جوتوں یا باسی کھانے کے سوا کیا ہوگا۔ اگر ہمارے ہاتھوں میں جدید وضع کے سوٹ کیس اور قیمتی بریف کیس ہوتے تو وہ سب دولت محفوظ نہ رہتی جو ان گٹھریوں میں بندھی پڑی تھی۔

میں نے ایک گٹھری کھولی جس میں ڈاکو اگروال کا مال تھا۔ میں نے غلطی سے اس کا نوٹوں سے بھرا ہوا سوٹ کیس بھی ہیلی سے گرا دیا تھا۔ یہ غلطی بھی شاید غیب کا اشارہ تھی کیوں کہ منٹ کے بعد وہ ہیلی کاپٹر گرا دیا گیا تھا۔ سوٹ کیس اگروال کے پاس رہ جاتا تو یہ دولت اس کے کام بھی نہ آتی۔

جب گیٹ کھولا گیا اور لوگوں نے ایک ایک دو دو کر کے نکلنا شروع کیا تو میں نے شمار کئے بغیر ان کے ہاتھوں میں نوٹوں کے بنڈل تھما دیئے۔ یہ ملے جلے نوٹ تھے چناں چہ نہ مجھے اندازہ تھا کہ کس کو کتنی رقم دے رہا ہوں اور نہ لینے والوں کو۔ وہ میرے

طمانیتِ قلب کا اور احساسِ مسرت کا انوکھا تجربہ تھا۔ آزادی پا کے بھی جو لوگ شکوک اور اندیشوں کا شکار تھے اور اسے بھی تقدیر کا دھوکا سمجھ رہے تھے، اچانک اپنے ہاتھوں میں نوٹ دیکھتے تھے تو ان کا چہرہ ناقابلِ یقین خوشی' احسان مندی کے جذبات اور امید سے دمکنے لگتا تھا۔ وہ ہاتھ اٹھا کے ہمارے حق میں دعائیں کرتے تھے۔ ہمارے پاؤں چھونے کی کوشش کرتے تھے اور پھر چیخیں مارتے ہوئے گیٹ سے باہر بھاگ جاتے تھے۔ انہیں اندازہ نہ تھا کہ ہم کو خدا یہاں نہ بھیجتا تو ان کے ساتھ کیا ہوتا مگر وہ اتنا ضرور سمجھتے تھے کہ ہم نے ان کو نئی زندگی بخشی ہے۔

بہت سے لوگ پیسے وصول کرنے کے بعد واپس ٹرک کی طرف چلے گئے۔ ہم نے ان کا اعتماد حاصل کر لیا تھا اور وہ ہمارے ساتھ ہی جانے پر تیار ہو گئے تھے۔ اس کے باوجود نصف سے زائد یوں فرار ہوئے جیسے اچانک زنجیریں کٹ جائیں' دیواریں گر جائیں اور زنداں کے دروازے کھل جائیں تو سزائے موت کے منتظر قیدی دیوانہ وار نکل جائیں۔ کوئی سمت دیکھے بغیر اور راستے کی پروا کئے بغیر جلد از جلد اس جگہ سے دور جانے کے لئے دوڑتے جائیں جہاں وہ دستِ اجل کے اسیر تھے۔

غالب نے کہا "اب ہمیں بھی وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے۔ ایسا نہ ہو کوئی آجائے۔"

میں نے کہا "نہیں۔ اب یہاں وہی آئے گا جس کی قضا لائے گی۔ اور کوئی دو ہفتے تک نہیں آیا تو اب کیوں آئے گا۔ میں ذرا وہ جگہ دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"کون سی جگہ؟" غالب نے کہا۔

"جہاں یہ زندہ انسانوں کے جسموں سے خون کشید کرتے تھے" میں نے کہا۔

غالب نے مجھے روک لیا "مت جاؤ ادھر۔ ورنہ تمہاری آنکھیں وہ منظر نہ دیکھ لیں جو تمہارے خیالوں کا آسیب بن جائے۔"

"مجھے کوئی شوق نہیں ہے مرزا۔ لیکن ایسا نہ ہو کہ وہاں کچھ لوگ بند رہ جائیں۔ وہ جن کی باری آگئی تھی یا آنے والی تھی۔ بعد میں انہیں کون بچانے آئے گا۔" میں نے کہا۔

غالب نے کچھ دیر سوچا اور پھر میرے ساتھ چل دیا۔ ہم نے سارے احاطے کا چکر لگا کے ہر کوٹھری میں جھانکا مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ گیٹ کے قریب آخری کمرے کا دروازہ کھولتے ہی میرے دماغ کو شدید جھٹکا لگا۔ یوں جیسے میرے سر سے چار سو چالیس وولٹ کرنٹ کا تار چھو گیا ہو۔ اندر سے اٹھنے والی بُو ویسی ہی تھی جیسے کسی کمیلے کی متعفن فضا میں محسوس ہوتی ہے۔ یہ خون کی بو تھی جو فرش پر جما ہوا تھا۔ سیاہ دھبوں کی صورت میں اور دیوار پر سرخ پینٹ کی طرح۔

میں نے دل کڑا کر کے کمرے میں قدم رکھا اور بائیں طرف والے دروازے کی طرف بڑھا جو بند تھا۔ یہ پاگلوں کے علاج کا کمرا تھا جہاں شاید انہیں الیکٹرک شاک بھی دیئے جاتے ہوں گے مگر اب یہ ایک مذبح خانہ تھا۔

دوسرے کمرے میں آٹھ نو فٹ کی بلندی پر لوہے کا ایک پائپ چوڑائی کے رخ لگا ہوا تھا اور اس کے دونوں کنارے مخالف دیواروں میں پیوست تھے۔ اس پائپ کے ساتھ لوہے کے دو ہُک لٹکے ہوئے تھے اور نائلون کی خون آلود رسیاں پڑی تھیں۔ فرش پر دو ڈرم رکھے ہوئے تھے۔ اس منظر کو دیکھ کر میری روح تک لرز اٹھی۔ چشمِ تصور سے میں نے دیکھ لیا کہ دو زندہ انسانوں کے پاؤں رسّی سے باندھ کے انہیں ہُک سے لٹکا دیا گیا ہے۔ ذبح کئے جانے والے بکروں کی طرح۔ پھر ان کی گردن کی ایک رگ کاٹ دی گئی ہے اور اس میں سے بہنے والا تازہ خون تھیلیوں میں بھرا جا رہا ہے۔ ڈرم صرف اس لئے تھا کہ ایک تھیلی بھرنے کے بعد دوسری لگانے تک جتنا خون گرے اس میں گرے۔

مجھے سخت متلی محسوس ہوئی اور میں ابکائیاں لیتا ہوا باہر بھاگا۔ غالب مجھ سے پہلے واپس چلا گیا تھا مگر مجھے پتا نہیں چلا تھا۔ اسے میں نے برآمدے کے فرش پر چت پڑا دیکھا۔ میں وہاں بیٹھ کے اُلٹیاں کرنے لگا۔ مجھے سخت کمزوری محسوس ہوئی اور ذرا سی دیر کے لئے میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا آگیا۔ میرا جسم پسینے میں ڈوب گیا۔

گل اور نازو ہماری حالت دیکھ کر پریشان ہو گئی تھیں اور گیٹ کی پہریداری بھول کے ہمیں سنبھال رہی تھیں۔ میں نے اپنے منہ پر پانی کے چھینٹے محسوس کئے تب مجھے پتا چلا کہ میں بھی بے ہوش ہو گیا تھا۔ غالب میرے قریب ہی لیٹا ہوا تھا۔

چند منٹ بعد میں اٹھ بیٹھا "غالب!"

غالب نے آہستہ سے کہا "میں نے منع کیا تھا۔"

میں نے اقرار میں سر ہلایا "مجھے کیا معلوم تھا۔ خیر۔ اٹھو' ہم اس منحوس جگہ سے نکل جائیں۔"

"میں یہ منظر کبھی نہیں بھلا سکوں گا۔" غالب نے اٹھتے ہوئے کہا۔ نازو کے ہاتھ سے پانی کا گلاس لے کر اس نے ایک گھونٹ لیا اور گلاس مجھے تھما دیا۔ پانی پی کر میں نے اپنی حالت بہت بہتر محسوس کی۔

"یہ کیا ہو گیا تھا تم دونوں کو ایک ساتھ؟" نازو نے تشویش سے پوچھا۔

"یہ نہ پوچھو تو اچھا ہے" میں نے کہا۔

"خدا کا شکر ادا کرو کہ جو ہم نے دیکھ لیا' وہ تم نے نہیں دیکھا۔ ورنہ تم پاگل ہو جاتیں" غالب نے کہا۔

ہم سے کچھ فاصلے پر وہ سب قیدی خاموش کھڑے تھے جن کو ہم نے قید سے رہائی دلا کے اپنا بنا لیا تھا۔ وہ ہمارے دکھ پر اتنے دکھی تھے کہ اپنا دکھ بھول گئے تھے۔

"چلو۔ سب ٹرک میں" میں نے کہا "راستے میں جس کو جہاں اترنا ہو بتا دے۔ ایک آدمی جو راستے سے واقف ہو آگے ہمارے

ساتھ بیٹھ جائے۔"

دس منٹ بعد ٹرک اس پاگل خانے سے نکلا تو میں ڈرائیونگ کررہا تھا۔ میرے ساتھ ایک میاں بیوی بیٹھے تھے۔ بیوی نرس تھی اور اس کا شوہر ٹیچر تھا۔ وہ کلکتہ کے راستوں سے واقف تھے اور میری رہنمائی کررہے تھے۔

یہ کلکتہ کے مضافات تھے۔ پاگل خانہ ضرورت کے تحت شہر سے بہت فاصلے پر بنایا گیا تھا۔ مگر صنعتی شہر کا کینسر وہاں تک پھیل گیا تھا۔ آس پاس نئے کارخانوں کی بنیادیں کھودی جارہی تھیں یا تعمیرات جاری تھیں۔ بہت سے لوگ پاگل خانے کی گاڑی دیکھ کر ہنستے نظر آئے۔ انہیں کیسے اندازہ ہوسکتا تھا کہ دیوانے وہ خود ہیں جو حقیقت سے بے خبر ہیں اور اپنی بے خبری پر ہنس رہے ہیں۔ اس گاڑی میں ان سے زیادہ ذی عقل' باہمت اور ہوشیار لوگ تھے۔

کلکتہ تک ایک طویل مسافت تھی۔ مضافات' کارخانے' نئی آبادیاں' کچی بستیاں' جھونپڑیاں اور محلات گزرتے جارہے تھے۔ انسانوں کا ایک سمندر تھا جس کی وسعت کا اندازہ کرنا ممکن نہیں تھا تاہم ایک فرق جو میں نے بمبئی اور کلکتہ میں محسوس کیا افلاس زدہ انسانوں کے تناسب کا تھا۔ بمبئی میں کچھ خوشحالی نظر آتی تھی اور ایک طلیمر تھا۔ یہاں غربت کی انتہا نے آبادی کی اکثریت کے چہروں پر پریشانی اور دکھ' سختی اور خرابی کی چھاپ لگا رکھی تھی۔ یہ فرق یوں بھی زیادہ نظر آتا تھا کہ جنوبی ہند کے رہنے والے دوسری نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے جسم گٹھے ہوئے' مضبوط اور جفاکش لگتے تھے۔ بنگالی نسلاً لاغر' کمزور تھے اور لباس بھی کم پہنتے تھے چناں چہ ان کے استخوانی بدن اور کوتاہ قد فاقہ کشی کے تاثر کو ابھارتے تھے۔

میرے ساتھ بیٹھے ہوئے ٹیچر نے مجھے بہت سی خون رُلانے والی کہانیاں سنائی تھیں جو حقیقت پر مبنی تھیں مگر۔ رنج کا خوگر ہو انساں تو مٹ جاتا ہے رنج۔ میں سب کچھ سن رہا تھا اور کسی ردِّعمل کا اظہار نہیں کررہا تھا۔ میں نے جنگ کے نتائج کی ہولناکی اور تباہی کو منطقی انداز میں قبول کرنا شروع کردیا تھا۔ میری یہ بے حسی بالکل فطری تھی۔ آپریشن ٹیبل پر مریض مرجائے تو ڈاکٹر ہاتھ دھوکے باہر نکل جاتا ہے اور سگریٹ جلا کے اپنے کسی ساتھی سے شام کی پارٹی یا فلم کے بارے میں بات کرنے لگتا ہے۔ گورکن قبر کھودنے اور مُردے کو دفنانے کے بعد اپنی کمائی پر خوش ہوکے سکون سے سوجاتا ہے۔ اجنبی سڑکوں اور پُرہجوم شاہراہوں پر ہر قسم کی ٹریفک کے درمیان کوئی اس گاڑی کو دیکھ کر ہنس بھی نہیں رہا تھا جس پر مینٹل ہاسپٹل کا نام لکھا ہوا تھا۔ کسی کو اتنی فرصت ہی نہ تھی کہ کسی اور کی طرف نظر اٹھا کر دیکھے۔

میں گاڑی چلاتے چلاتے تھک گیا تھا۔ رات بھر کے سفر اور اس کے بعد ایک پُراذیت تجربے نے میرے جسم اور اعصاب کی ساری توانائی ختم کردی تھی۔ یہ صرف قوت ارادی کی آخری رمق تھی جو مجھے رواں دواں رکھنے میں کام آرہی تھی۔ اس کے ختم ہونے سے پہلے میں رک جانا چاہتا تھا۔ ورنہ مجھے یقین تھا کہ ٹرک میرے قابو میں نہیں رہے گا اور میں کسی بس یا ٹرام سے ٹکرا جاؤں گا۔

ایک مصروف چوک سے گزرتے ہی میرا سر اسٹیئرنگ پر لگا اور ٹرک تھوڑا سا لہرایا۔ مجھے نرس کی چیخ نے بیدار کردیا۔ میں نے عین وقت پر آنکھیں کھول کے بریک لگائے مگر اس کے باوجود ٹرک فٹ پاتھ پر چڑھ گیا اور پھر اتر کے سڑک کے کنارے رک گیا۔

"اب تم لوگ جاؤ" میں نے کہا "ان سب سے کہہ دو کہ یہ بھی جائیں۔ جہاں ان کا دل چاہے۔"

پیچھے سے غالب اتر کے آگے آیا "یہ کیا ہوا تھا؟"

میں نے کہا "کچھ نہیں۔ سب کو یہاں اتار دو۔"

"پیچھے تو اب کوئی نہیں ہے۔"

"کیوں؟ وہ سب لوگ....." میں نے نیچے اتر کے کہا۔

"وہ راستے میں اتر گئے۔ باری باری۔ جہاں بھی ٹرک کی رفتار کم ہوتی تھی۔ کسی موڑ پر یا چوراہے پر۔ میں دو چار افراد کو اتار دیتا تھا۔" غالب نے کہا۔

"گڈ۔ یہ تم نے عقل مندی کی۔ انہیں سمجھا دیا تھا اچھی طرح کہ وہ آج کے دن کو اپنی زندگی سے خارج کردیں۔ یہ سمجھ لیں کہ صبح اب ہوئی ہے۔"

"ہاں۔ میں نے انہیں بتادیا کہ وہ آج کے واقعات کو بالکل بھول جائیں۔ نہ کبھی خود یاد کریں نہ کسی کو بتائیں۔ اسی میں ان کی بہتری ہے" غالب نے کہا

"اچھا تم آگے آجاؤ۔ ٹرک چلاؤ" میں نے کہا۔

نرس اور ٹیچر نیچے اتر گئے تھے۔ انہوں نے کہا "آپ کی بہت مہربانی۔ آپ کا بہت احسان۔"

میں نے ان سے ہاتھ ملایا اور ٹرک میں ان کی جگہ بیٹھ گیا۔ غالب نے ٹرک کو آگے بڑھادیا۔

"اب کہاں چلیں؟"

میں نے کہا "پہلے اس ٹرک سے نجات حاصل کرنی ضروری ہے۔ اس کے بعد کسی ہوٹل میں چلو۔"

دو بجے ہم نے ٹرک کو ایک ریلوے اسٹیشن کے سامنے روک دیا۔ وہ کلکتہ کے بہت سے لوکل اسٹیشنوں میں سے ایک تھا۔ کسی نے ہمیں شک کی نظروں سے یا غور سے نہیں دیکھا۔ ہم میں ایسی کوئی بات ہی نہ تھی۔ ہم جیسے ہزاروں تھے۔ ہم سے بھی زیادہ عجیب حلیوں میں اور زیادہ مضحکہ خیز نظر آنے والے۔

چندو کی حالت پھر خراب ہورہی تھی۔ مسلسل بیماری اور مناسب علاج نہ ملنے سے وہ قریب المرگ ہورہا تھا۔ میں نے اور غالب نے اسے سہارا دے کر اتارا اور ہم کچھ فاصلے پر سڑک کے کنارے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے جہاں بہت سے قلی مزدور چادر تانے سو رہے تھے۔ ہمارے سامنے اور ہمارے پیچھے لوگوں کا ایک ہجوم تھا جو دُکانوں اور ریستورانوں میں بیٹھے تھے۔ خریداری کررہے تھے۔ آپس میں لین دین کررہے تھے۔ باتیں کررہے تھے اور لڑرہے تھے۔ زندگی اپنی پوری گہما گہمی کے ساتھ وقت اور پیسے کے پیچھے دوڑ رہی تھی۔ وقت دولت ہے' دولت وقت ہے۔ انسان کی تمام مصروفیت کا محور اور کچھ نہیں۔ ایک روٹی کا مسئلہ بھی اتنا ہی اہم ہوجاتا ہے جتنا ایک نایاب ہیرے کے حصول کا مسئلہ۔

غالب نے کہا۔ "چندو! تم کلکتہ پہنچ گئے۔"

"ہاں! ابھی تم جاتی۔ ہم کو ادھر چھوڑ دیتی۔" وہ غالب کی بات سمجھ کے بولا۔

نازو نے احتجاج کیا "ابھی تمہاری حالت ایسی نہیں ہے چندو۔ ٹھیک ہوجاؤ تو چلے جانا۔"

میں نے کہا "ہم چندو کے ٹھیک ہونے تک یہاں نہیں رک سکتے۔ اس کی امانت اسے لوٹا دو۔"

گل نے سونے کے زیورات کی پوٹلی چندو کی طرف کھسکادی۔

"اس کی حفاظت کرسکو گے تم؟"

"کسی کو پتا چل گیا تو وہ تمہارا سر بھی کاٹ کے ساتھ ہی لے جائے گا" غالب نے کہا۔

وہ کچھ متفکر نظر آنے لگا "ابھی یہ آپ رکھتی۔"

"نہیں۔ ہم یہ ذمّے داری قبول نہیں کرسکتے۔ ہمارا کچھ پتا نہیں کل کہاں ہوں" میں نے کہا۔

نازو نے کہا "کل تک تو چندو ہمارے ساتھ رہ سکتا ہے۔"

میں نے کہا "ہمارے ساتھ؟ نہیں۔ مگر یہ ہوسکتا ہے کہ ہم اسے کسی ہسپتال میں داخل کرادیں۔ اس کے علاج معالجے کے اخراجات ادا کردیں اور جب تک یہاں ہیں اسے دیکھنے جاتے رہیں۔ اسے ہم اپنے ساتھ ہوٹل میں نہیں رکھ سکتے۔"

میری تجویز سے سب نے اتفاق کیا۔ پھر غالب نے وہیں کھڑی ہوئی ایک ٹیکسی کے ڈرائیور سے بات کی۔ بیشتر ٹیکسی ڈرائیور فرفر انگریزی بولتے تھے۔ ایک جوشیلے نوجوان نے کہا۔

"آپ لوگ اجنبی ہیں۔ بمبئی سے آئے ہیں؟"

غالب نے فوراً تردید کی "ہم دہلی سے آئے ہیں۔ گھومنے پھرنے۔"

"اچھا تو پھر میں آپ کو کلکتہ کی سیر کراؤں گا۔ میں خود اس ٹیکسی کا مالک ہوں۔ دوسرے ڈرائیوروں کے پاس اپنی ٹیکسی نہیں ہے۔ وہ آٹھ گھنٹے کی شفٹ لیتے ہیں۔ ان کے ساتھ آپ کو پرابلم ہوگی۔ میں چوبیس گھنٹے آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں۔ میرا کوئی گھربار نہیں۔ بیوی بچے نہیں ——— میں گریجویٹ ہوں۔ پروفیشنل گائیڈ رہا ہوں۔ آپ مجھ پر بھروسہ کرسکتے ہیں۔ میں آپ کا ہر کام کرسکتا ہوں" اس نے ایک سانس میں کہا۔

میں نے کہا "اگر تم پھر اتنی لمبی تقریر نہ کرنے کا وعدہ کرو تو ہم تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہیں۔"

وہ مسکرایا "اب کیا رہ گیا ہے بتانے کو۔ میں وہ سب پہلے ہی بتادیتا ہوں جو لوگ مجھ سے بعد میں پوچھتے ہیں۔ اگر آپ کہیں گے تو میں ہونٹ سی لوں گا۔"

نازو اور گل اسے دلچسپی سے دیکھ رہی تھیں۔ میں نے سامان ڈکی میں رکھا اور چندو کو پیچھے بٹھادیا۔

"پانچ آدمی۔ دس روپے زیادہ ہوں گے۔"

"تم نے ابھی سے گڑبڑ شروع کردی" میں نے کہا۔

"یہ میری جیب میں نہیں جائیں گے۔ راستے میں پولیس لے گی" وہ بولا "میرے تو لگے بندھے سو روپے روز کے ہیں۔"

"اچھا پہلے ہمیں کسی درمیانے درجے کے اچھے ہسپتال میں لے چلو" میں نے کہا "ہمارا یہ دوست بیمار ہے اور زخمی ہے۔"

اس نے کہا "گولی کا زخم ہے یا خنجر کا؟"

میں نے کہا "اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"پڑتا ہے۔ خیر۔ میں آپ کو وہاں لے جاؤں گا جہاں آپ سے کوئی کچھ نہیں پوچھے گا۔ بھروسے کے لوگ ہیں اور ایک لیڈی ڈاکٹر ہے جو ایسے کیس کے دو سو روپے زیادہ لیتی ہے۔ سو پولیس کے سو اس کے اپنے۔"

"تم جانتے ہو اسے؟"

"وہ میری چھوٹی بہن ہے۔ اسے میں نے ہی ڈاکٹر بنایا تھا۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"بہت بدمعاش ہو تم؟"

"بہن کو ڈاکٹر بنانے میں کیا بدمعاشی ہے؟"

میں نے کہا "تم خود اس کے لئے کیس لے جاتے ہو۔"

"پھر کون لے جائے گا؟ اور لے جانے والے تو بہن کے لئے گاہک بھی لے جاتے ہیں۔ شاید دہلی میں ایسا نہ ہو مگر کلکتہ میں ہوتا ہے۔ تم کو تجربہ ہوجائے گا۔ یہاں صرف پیسہ چلتا ہے۔ کوئی اصول قانون نہیں۔"

"تم کمال کے آدمی ہو۔ ٹیکسی کیوں چلاتے ہو آخر؟ اپنی بہن کے ساتھ مل کے ہسپتال کیوں نہیں چلاتے؟"

"چھوٹی بہن کی کمائی کیوں کھاؤں میں۔ اسے میں نے اس لئے تو ڈاکٹر نہیں بنایا تھا کہ وہ کمانے لگے تو میں وہ سب وصول کروں جو اس پر انوسٹ کیا تھا۔ میں خود کما سکتا ہوں۔ اس کے برابر نہ سہی' اس سے آدھا ضرور کمالیتا ہوں اور ٹیکسی چلانا کیا جوئے کے اڈے' شراب خانے یا چکلے چلانے سے بہتر نہیں ہے؟"

مجھے اس کی دوٹوک' بے باک باتیں پسند آئیں۔ وہ حد سے زیادہ صاف گو اور خوددار آدمی تھا۔ ایسے لوگ ایمان دار' دل کے کھرے اور بااصول ہوتے ہیں۔

غالب نے کہا "تمہارے یہ جذبات واقعی قابل تعریف ہیں۔ مگر دوست' اس دنیا میں تم کیسے گزارا کرتے ہو' جہاں لوٹ کھسوٹ بے ایمانی' منافقت اور دھوکے بازی ہے....."

"میری دنیا سب سے الگ ہے۔ اور میں اس دنیا میں بہت خوش اور مطمئن ہوں" اس نے غالب کی بات کاٹ دی۔

"ہم کسی ہوٹل میں قیام کریں گے" میں نے کہا "ہوٹل بھی

اوسط درجے کا اور شریفانہ ہو۔ اگر ہسپتال کے قریب ہو تو سب سے بہتر۔"

"قریب اور دور سے کیا فرق پڑتا ہے۔ بڑے شہر کے فاصلے بھی بڑے ہوتے ہیں۔ دلوں کے فاصلے اور گھروں کے فاصلے۔ آبادیوں کے فاصلے' انسانوں کے فاصلے..."

"تم تو فلاسفر ہو یار" غالب نے کہا۔

اس نے ٹیکسی کو ایک دم موڑ دیا "یہ ہسپتال ہے' دس روپے روز والا کمرا لے لو۔ ایک ہزار ایڈوانس جمع کرا دو۔ اور پیسہ کم ہے تو دو روپے روز کا بیڈ لے لو جنرل وارڈ میں۔ رکمنی نام ہے میری بہن کا۔ اسے بولنا کمار نے بھیجا ہے۔"

"تم ساتھ نہیں چلو گے؟"

"نہیں۔ میری اس سے لڑائی ہے۔ بات چیت بند ہے۔"

"کس بات پر؟" نازو نے حیرانی سے کہا۔

"ہوتی رہتی ہے۔ میرے پیچھے پڑی رہتی ہے کہ میرے ساتھ رہو اور شادی کرو۔ میں دونوں کام نہیں کر سکتا۔"

"آخر کیوں؟"

"میری مرضی دیوی جی' آپ یہ مت پوچھیں۔"

چندو کا داخلہ کسی دشواری کے بغیر ہو گیا۔ رکمنی بڑی نازک اور پیاری سی لڑکی تھی۔ بھائی کا نام سنتے ہی وہ چونکی۔

"کمار کہاں ملا تھا تمہیں؟ وہ خود لایا ہو گا تم کو۔"

میں نے کہا "نہیں۔ وہ ہمیں چھوڑ کے واپس چلا گیا۔"

غالب نے کہا "ہمارا دوست ٹھیک ہو جائے گا نا؟"

"ٹھیک کیوں نہیں ہو گا۔ لاؤ بارہ سو روپے نکالو" اس نے کہا' "اپنا نام پتا بولو۔"

میں نے کہا "ہم کسی ہوٹل میں ٹھہریں گے۔"

اس نے چین دانتوں میں دبا کے کہا "اچھا جاؤ' میں لکھ لوں گی جو بھی لکھنا ہو گا۔ یہ خنجر کا زخم ہے۔ کم سے کم بارہ گھنٹے پرانا۔ مگر تم فکر مت کرو۔ پولیس کو کچھ نہیں معلوم ہو گا تمہارے بارے میں۔"

میں اور غالب واپس آئے تو کمار نے کہا "اس نے میرے بارے میں پوچھا تو ہو گا؟"

میں نے کہا "نہیں۔ تمہارا نام لینے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔"

اس کا چہرہ اتر گیا "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

میں ہنس پڑا "عجیب چیز ہو تم بھائی بہن۔ اسے تو یہ بھی یقین تھا کہ ہمیں تم ہی لائے ہو۔ میں نے جھوٹ بول دیا کہ تم ہمیں چھوڑ کر واپس چلے گئے تھے۔ اس کا چہرہ بھی ایسے ہی اتر گیا تھا۔"

نازو نے کہا "کب تک چلے گی یہ لڑائی؟"

اس نے ٹیکسی چلاتے ہوئے کہا "ابھی چلے گی۔ ورنہ وہ کبھی یقین نہ کرتی تم پر۔ باہر آ کے مجھے پکڑ لیتی۔"

"اس کی شادی ہو گئی ہے؟"

"نہیں۔ ضد پر اڑی ہوئی ہے کہ پہلے میں شادی کروں۔ اس کا جو پریمی ہے' ڈاکٹر ہے وہ بھی۔ بیچارا مجھے اور اسے مناتا رہتا ہے اور صبر کئے بیٹھا ہے۔ کہتا ہے پچاس سال تو انتظار کروں گا۔ اس کے بعد نہیں۔ ابھی بتیس سال کا ہے بیاسی کا ہو جائے گا۔"

"اس کے بعد شادی کرے گا" نازو نے ہنستے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ اس کے بعد خود کشی کرے گا۔"

"مجھے تو تم سب پاگل لگتے ہو" نازو کا ہنس ہنس کے بُرا حال ہو گیا۔

غالب نے کہا "ایسا کیوں نہیں کرتے کہ ایک ہی دن دونوں شادی کر لو۔"

اس نے نفی میں سر ہلا دیا "رکمنی کا تو گھر ہو گا۔ میرے پاس ابھی رہنے کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ پہلے گھر بناؤں گا پھر بساؤں گا۔ شادی کے بعد بہن کے گھر میں رہوں' یہ ناممکن ہے۔ رکمنی کو عقل سے کام لینا چاہئے۔"

"یہ مسئلہ ہی جذبات کا ہے۔ عقل کیا کرے گی" میں نے کہا۔

اس نے ٹیکسی روک لی "ایک تو یہ ہوٹل ہے۔"

میں نے پانچ منزلہ وسیع و عریض عمارت کو دیکھا جس کے باہر والے گیٹ پر "ہوٹل وائسرائے" لکھا ہوا تھا اور اندر پارکنگ ایریا میں سیکڑوں کاریں کھڑی تھیں۔ یہ فائیو اسٹار تو نہیں مگر فور یا تھری اسٹار ہوٹل یقیناً تھا۔

"ہم وائسرائے تو نہیں ہیں یار" غالب نے کہا۔

نازو نے بھی کہا "اس کا کرایہ بہت ہو گا۔"

لیکن میں نے فیصلہ کر لیا کہ ہم ایسے ہی ہوٹل میں زیادہ محفوظ ہوں گے۔ اگرچہ ہمارا سامان اور حلیہ انتہائی مضحکہ خیز تھا مگر اصل چیز پیسہ تھی جو ہمارے پاس کم نہ تھا۔

"ٹھیک ہے مسٹر کمار۔ ہم یہاں قیام کریں گے۔ تم یہ سو روپے رکھو۔ ایڈوانس۔"

اس نے کہا "تھینکس۔ میں اسی جگہ موجود رہوں گا۔"

"کل صبح تک شاید تمہاری ضرورت نہ پڑے۔"

"پھر بھی میں کہیں جانے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ اگر ضرورت محسوس ہو تو آپ کسی ویٹر کے ذریعے مجھے طلب کر سکتے ہیں" کمار نے کہا۔

ہوٹل کے دربان اور پورٹر نے ہمارا استقبال کرتے ہوئے ناک بھوں چڑھائی۔ یہاں آنے والے کاروں سے اترتے تھے اور ان کے پاس غیر ملکی سوٹ کیس ہوتے تھے۔

میں نے کاؤنٹر پر جا کے کہا "ہمیں دو ڈبل روم چاہئیں۔"

کلرک نے مجھے غور سے دیکھا اور طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا "تم کو معلوم ہے کرایہ..."

میں نے اتنے زور سے کاؤنٹر پر مُکا مارا کہ وہ اچھل پڑا "تم کو جرأت کیسے ہوئی یہ پوچھنے کی؟ کیا میں حقیر نظر آتا ہوں تمہیں؟ یا کوئی جاہل۔ میں دنیا کے ہر بڑے شہر کے ہر بڑے ہوٹل میں ٹھہرا ہوں مگر ایسی بدتہذیبی سے کسی نے بات نہیں کی۔ آخر تم سمجھتے کیا ہو خود کو۔ اپنے منیجر کو بلاؤ۔"

شور نے دوسرے مسافروں کو متوجہ کر لیا تھا جو وہاں بکنگ لے چکے تھے یا اس انتظار میں تھے کہ پورٹر ان کا سامان اٹھائے۔ ان میں سے کچھ مسکرائے۔ ایک غیر ملکی نے فرنچ میں ساتھی عورت سے کہا "یہ پُراسرار لوگ ہیں۔"

میں اس پر برس پڑا "کیا پُراسراریت ہے مجھ میں؟" میں نے فرانسیسی کی ساری مہارت بروئے کار لاتے ہوئے کہا "میرے سر پر سینگ ہیں۔ جب میں پیرس کے کسی ہوٹل میں جاتا تھا تو وہاں کسی کی مجال نہ تھی کہ مجھ پر ایک تمسخر کی نگاہ بھی ڈال سکے..."

فرانسیسی بری طرح بوکھلا گیا "موسیو۔ میں.... میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔"

"مطلب میں خوب سمجھتا ہوں۔ پُراسرار تو مجھے تم لگتے ہو۔ ضرور یہاں جاسوسی کرنے آئے ہو گے" میں نے کہا۔

"تم حد سے بڑھ رہے ہو" وہ گرم ہو گیا۔

اتنے شور کے بعد منیجر کا باہر آنا یقینی تھا۔ جب اسے ساری بات معلوم ہوئی تو ظاہر ہے کہ شامت غریب کلرک کی آئی۔ نزلہ بر عضو ضعیف۔ منیجر نے بہت معذرت کے بعد خود ہمیں کمروں کی چابیاں دیں اور رجسٹر میرے سامنے رکھ دیا کہ اس میں ناموں کا اندراج کر دوں۔ میں یہی چاہتا تھا کہ بلاوجہ کی پوچھ گچھ اور تصدیق کا مسئلہ درپیش نہ ہو۔ میں نے ایک نام "مسٹر اور مسز آفندی" اور پتا "بائیس راج بلڈنگ' اجمل خان روڈ' قرول باغ دہلی" لکھا۔ دوسرا نام میں نے "مسٹر اینڈ مسز ڈی سوزا" لکھا۔ پانچ ہزار روپے ایڈوانس دینے کے بعد ہم معتبر ہو گئے۔

اس وقت تک دوپہر کے کھانے کا وقت گزر چکا تھا لیکن کھانا ضروری تھا۔ روم سروس سے کافی' چائے اور سینڈوچ منگوا کے کھاتے ہی ہم نے باہر "ڈونوٹ ڈسٹرب" کا بورڈ سیدھا لٹکایا اور کمرے اندر سے بند کر کے سو گئے۔ ایک کمرے میں گل اور نازو تھیں اور ساتھ والے میں' میں اور غالب۔ یہ بے ہوشی کی ایسی نیند تھی کہ زلزلہ بھی آ جاتا تو مجھے خبر نہ ہوتی۔

جب میری آنکھ کھلی تو گھڑی میں آٹھ بج رہے تھے۔ مجھے حیرانی ہوئی کہ میں صرف چار گھنٹے سویا۔ لیکن پردوں کے پیچھے کھڑکی کے شیشے تاریک نہیں تھے۔ رات ہوتی تو کمرا ابھی اتنا روشن نہ ہوتا۔

میں اٹھ کر کھڑکی تک گیا اور پردے ہٹا کے باہر دیکھا تو مجھے یقین آیا کہ اس وقت صبح کے آٹھ بجے ہیں اور میں سولہ گھنٹے بعد جاگا ہوں۔ غالب ابھی تک سو رہا تھا اور ساتھ والے کمرے کی خاموشی بھی بتاتی تھی کہ گل اور نازو کی آنکھ بھی نہیں کھلی ہے۔

میری ساری تھکن دور ہو گئی تھی لیکن جسم کا عضو عضو درد کر رہا تھا۔ مجھے گرم پانی سے غسل کرنے کی ضرورت تھی۔ اس سے پہلے میں نے سگریٹ جلا کے ایک کش لیا تو دھواں خالی پیٹ میں گھونسے کی طرح لگا۔ میں نے سگریٹ بجھا کے روم سروس سے کافی منگوانے کا سوچا' ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھایا اور کھینچ لیا۔ کیوں نہ پہلے میں اپنا حلیہ درست کر لوں۔ یہ جھاڑ جھنکاڑ صاف کرا دوں۔ داڑھی اور سر کے بال آپس میں یوں مل گئے تھے کہ میں حلئے سے پہاڑوں کی گپھا میں رہنے والا جوگی نظر آتا تھا۔ یہی حال مرزا غالب کا بھی تھا۔ اس ہیئت کذائی کے ساتھ ہوٹل وائسرائے میں ہمارا جو استقبال ہوا تھا وہ غلط بھی نہ تھا۔ ایسے حلئے کے لوگ یہاں آتے بھی ہوں گے تو باہر سے ہی دھتکار دئے جاتے ہوں گے۔ ہمارے ساتھ گل اور نازو نہ ہوتیں تو شاید دربان ہمیں بھی "معاف کرو بابا" کہہ کے روک دیتا۔ ہوٹل والے غلط قسم کے افراد کو روکنے کے لئے "حقوق داخلہ محفوظ ہیں" کا بورڈ آویزاں رکھتے ہیں۔ اگر میں انگریزی اور پھر فرانسیسی نہ بولتا تو عین ممکن تھا کہ منیجر بھی مجھے کمرا دینے سے انکار کر دیتا۔

حلیہ بدلنا مشکل اور لمبا کام تھا۔ میں نے فون اٹھا کے روم سروس سے بات کی "کیا یہاں ہیئر ڈریسر ہے۔"

"یس سر۔ بیس منٹ میں سیلون ہے۔"

"میں اسے یہاں مانگتا ہوں" میں نے کہا۔

"سوری سر۔ ہیئر ڈریسنگ کے لئے روم سروس نہیں ہے' آپ کو زحمت کرنی پڑے گی۔"

"او کے۔ ہم زحمت کریں گے بعد میں۔ ابھی ہمارے لئے دو بلیک کافی بھیجو" میں نے کہا اور فون رکھ دیا۔

دوسری کافی میں نے غالب کے لئے منگوائی تھی جو میری آواز سن کے جاگ گیا تھا۔

"میں بہت دیر سے سوچ رہا تھا کہ پہلے کیا کروں۔ نہاؤں' کافی پیوں یا انسانوں کی شکل میں آنے کے لئے بالوں کا یہ جنگل صاف کراؤں" میں نے کہا۔

غالب نے گھڑی دیکھی اور انگڑائی لے کر بولا "وہ ابھی سو رہی ہیں۔ خیر سونے دو۔"

میں نے کہا "آج میں سکندر بخت کا چہرہ دیکھوں گا۔ بہت عرصے بعد...."

غالب نے کہا "میں تو بھول گیا ہوں کہ میں کیسا تھا اور کیا تھا۔ اب تو یقین نہیں آتا کہ میں ایک صحافی تھا۔"

"ہم ایسا کرتے ہیں کہ کافی پی کے باہر چلتے ہیں" میں نے کہا "کمار کو ساتھ لیتے ہیں۔ پہلے اسی حلئے میں تصویریں بنوائیں گے یادگار رکھنے کے لئے۔ پھر کہیں سے بال کٹوائیں گے اور ریڈی میڈ کپڑے خریدیں گے۔"

"گل اور نازو پریشان ہوں گی کہ ہم بغیر بتائے کہاں نکل گئے" غالب نے کہا۔

"ان کے لئے دروازے کے نیچے سے پیغام چھوڑ جائیں گے کہ بازار جا رہے ہیں۔ وہ نہا دھو کے ناشتا کر لیں۔"

غالب نے مجھ سے اتفاق کیا اور کافی ختم کرتے ہی ہم ہوٹل سے نکل گئے۔ ہمارا کمرا تیسرے فلور پر تھا چنانچہ جب ہم زینے سے

اتر رہے تھے تو بہت سے اوپر آنے والوں نے ہمیں حیرانی اور دلچسپی سے دیکھا۔ ہم ہال سے گزرے تب بھی لوگوں نے ہمارے بارے میں مختلف تبصرے کئے۔ ہمیں خبطی، ہپی، جوگی وغیرہ قرار دیا گیا۔ ایک خاتون نے تو یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ ہمارے بال اصلی نہیں ہیں اور ہم نے بھیس بدل رکھا ہے۔

کمار اپنی ٹیکسی کو صاف کر رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ تیر کی طرح آیا "گڈ مارننگ سر۔"

میں نے کہا "تم رات کو کہاں تھے؟"

"وہ.... دراصل .... رکمنی لے گئی تھی مجھے کان سے پکڑ کے' کیا آپ نے تلاش کیا تھا مجھے؟" وہ خفت سے بولا۔

"نہیں۔ مگر رکمنی یہاں کیسے آگئی تھی؟"

"وہ بہت چالاک ہے۔ اس نے یقین کب کیا تھا آپ کی بات کا۔ گاڑی لے کر پیچھے چل پڑی تھی" کمار نے کہا "آپ کے دوست کی حالت بہت اچھی ہے اب۔"

میں نے کہا "یہ اچھی خبر سنائی تم نے۔ اب فوری طور پر ہسپتال جانا ضروری نہیں رہا۔"

"پھر کہاں جانا ہے پہلے؟"

میں نے اسے اپنا پروگرام بتا دیا۔ ٹیکسی روانہ ہو گئی۔

اس نے کہا "ایک مشورہ دوں۔ برا تو نہیں مانیں گے؟"

میں نے کہا "مفت کچھ بھی ملے' ہم لے کر خوش ہوتے ہیں۔"

اس نے کہا "آپ بال ضرور کٹوائیں۔ مگر فرنچ کٹ داڑھی رہنے دیں۔ آپ پر اچھی لگے گی۔"

میں نے حیرانی سے غالب کی طرف دیکھا "یہ لڑکا تو بہت ہی سمجھ دار ہے۔ ہم سے بھی زیادہ۔"

"تم سے زیادہ' مجھ سے کم" غالب نے کہا۔

ایک گھنٹے بعد ہم پھر ہوٹل میں داخل ہوئے تو بہترین سوٹ' ٹائی' سلیقے سے بنے ہوئے بالوں اور نفاست سے تراشی ہوئی فرنچ کٹ داڑھی کے ساتھ ہماری شخصیت بالکل بدل چکی تھی۔ دربان نے ہمیں سیلوٹ کیا اور ہمارے گزر جانے کے بعد ہمیں پہچانا۔ کاؤنٹر کلرک نے استقبالیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا "یس سر۔" پھر جیسے اسے الیکٹرک شاک لگا۔ وہ دم بخود کھڑا ہمیں اوپر جاتا دیکھتا رہا۔

لیکن جتنی حیرت گل اور نازو کو ہوئی اس سے کہیں زیادہ ان کی خوشی تھی۔ میں نے دروازے پر دستک دی تو وہ جاگ رہی تھیں۔ ان کے باتیں کرنے کی آواز باہر سنائی دے رہی تھی۔ گل نے دروازے کے قریب آ کے کہا "کون...."

میں نے کہا "مسٹر آفندی اور مسٹر ڈی سوزا۔"

گل نے دروازہ کھولا اور بے اختیار ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے بار بار ہمیں دیکھا اور خوشی سے ایک چیخ ماری۔

"بھائی سکندر.... آپ.... غالب.... یہ.... اف کتنے اچھے لگ رہے ہیں آپ دونوں" اس نے معصومیت سے دمکتے چہرے اور بھرپور ہنسی کے ساتھ کہا۔

میں نے ان کے کپڑوں کے پیکٹ بیڈ پر ڈال دئے۔ نازو بالکل سحر زدہ سی کھڑی تھی اور رونے کے قریب ہو گئی تھی۔

"کیا ہوا' تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟" غالب نے کہا۔

نازو کے آنسو چھلک پڑے "خوشی ... مجھے یوں لگتا ہے جیسے میری کھوئی ہوئی خوشیاں مجھے واپس مل گئی ہیں۔ کہیں یہ خواب نہ ہو۔"

میں نے کہا "ابھی یہ خواب ہی ہے نازو۔ حقیقی خوشی کے لئے ابھی کچھ دن اور انتظار کرنا پڑے گا۔ ابھی تو صرف ہمارے چہرے واپس ملے ہیں۔ وہ زندگی نہیں ملی جس سے ہم بچھڑ گئے تھے۔"

"وہ بھی مل جائے گی اب" غالب نے کہا۔

"جب محسن ملے گا" گل نے کہا اور پھر ایک دم رو پڑی۔

میں نے اسے گلے لگا کر تسلی دی "پاگل۔ روتی کیوں ہے۔ محسن بھی مل جائے گا۔ چند دن کی بات ہے۔ اللہ نے چاہا تو ہم آج ہی ڈھاکا روانہ ہو جائیں گے کسی وقت۔ آج نہ جا سکے تو کل بہر حال چلیں گے۔ ڈھاکا کون سا بہت دور ہے۔ بس وہاں پہنچنا تھوڑا سا مشکل مسئلہ ہے۔ حالات کی وجہ سے۔ وہ ہمارا منتظر ہوگا۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ ہر روز شاہ باغ ہوٹل کے سامنے خود موجود رہے گا یا اپنا پیغام چھوڑ جائے گا۔ اس کا پتا ہے ہمارے پاس۔ اسے تلاش کرنا تو کوئی مسئلہ نہیں۔ بس اس کے ملتے ہی ہم واپس آ جائیں گے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا' چلو اب یہ رونا دھونا چھوڑو۔"

"ہاں۔ تمہارے لئے بھی کپڑے لائے ہیں ہم۔ کپڑے بدلو پھر بات کرتے ہیں" غالب نے کہا "ہم بھی نہا دھو لیں۔"

"تم نے ناشتا کیا؟" میں نے کہا۔

گل نے نفی میں سر ہلایا "ابھی نہیں۔ آپ کا انتظار تھا۔"

"اچھا۔ ہم ابھی اکٹھے ناشتا کرتے ہیں" میں نے چٹکی بجا کے کہا۔

کسی نے دروازے پر دستک دی۔ اس سے پہلے کہ میں آگے بڑھتا' دروازہ کھلا اور پولیس اندر آگئی۔ ایک انسپکٹر کے ساتھ چار مسلح پولیس والوں نے ہمیں ہر طرف سے گھیر لیا۔ ان کے ساتھ ہوٹل کا منیجر بھی تھا۔

"یہی ہیں وہ انسپکٹر۔ انہوں نے حلئے بدل لئے ہیں آج تو ہوتے ہی" منیجر نے کہا۔

انسپکٹر نے کہا "یہ لوگ حلئے بدلتے رہتے ہیں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں انہیں۔ اچھا اب آپ جائیں۔"

منیجر نے کہا "میرے ہوٹل کی نیک نامی کا خیال رکھئے گا۔ میں نے آپ سے پورا تعاون کیا ہے۔"

وہ دروازہ بند کر کے نکل گیا۔ انسپکٹر نے حکم دیا کہ ہم ہاتھ اٹھالیں اور دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جائیں۔

مقابلے کی صورت میں ہماری کامیابی کے امکانات بہت کم تھے۔ وہ کامیاب شکاری تھے جو اپنے شکار کو ہر طرف سے گھیر چکے تھے اور گولی چلانے کے لئے انہیں صرف بہانے کی ضرورت تھی۔ میں نے ایک لمحے کے لئے یہ بھی سوچا کہ کیا وہ ایک اعلیٰ درجے کے ہوٹل میں فائرنگ کریں گے؟ عام طور پر ہوشیار منیجر اپنے ہوٹل سے متعلق کوئی ایسی خبر بننے ہی نہیں دیتے جو شائع ہو کے منفی پبلسٹی کا باعث بن جائے۔ لیکن پولیس اپنے فرائض کی راہ میں رشوت کے سوا کسی بھی طاقت کی مداخلت برداشت نہیں کرتی۔

ابھی معاملہ اس کمرے کی چار دیواری تک محدود تھا۔ کیا اسے رشوت کی طاقت سے محدود رکھا جا سکتا ہے؟ میں نے سوچا۔ کوشش کر لینے میں حرج ہی کیا ہے۔ اگر رشوت بھی کام نہ آئی تو پھر مہلت مل جائے گی کہ ہم طاقت کو سوچ سمجھ کے استعمال کریں۔

میں نے کہا "انسپکٹر صاحب! یہ معاملہ کیا ہے آخر؟"

انسپکٹر نے کہا "معاملے کے بچے! تم قانون کو اندھا سمجھتے ہو۔"

"قانون تو اندھا ہی ہوتا ہے جناب۔ بلکہ اب تو بہرا اور لنگڑا لولا بھی ہو گیا ہے۔" میں نے کہا "میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ سننے میں کوئی حرج کی بات تو نہیں ہے۔ ممکن ہے آپ کے فائدے کی بات نکل آئے۔"

انسپکٹر نے مجھے ایک گالی دی "میں تیری باتوں میں آنے والا نہیں ہوں۔ ان سب کی تلاشی لو۔ اور ان کے سامان کی بھی۔"

دو افراد نے ہماری جامہ تلاشی لی مگر سوائے اس رقم کے جو خریداری کے بعد بچ گئی تھی' ہمارے نئے سوٹوں میں سے کچھ بھی برآمد نہیں ہوا۔ ہمارا سب اسلحہ بھی دوسرے کمرے میں تھا۔ مشین گن وغیرہ کو ہم نے ٹرک میں چھوڑ دیا تھا۔ صرف ریوالور ہمارے پاس تھے' جو ہم نے بیڈ کے نیچے چھپا دئے تھے۔ تلاشی میں وہ برآمد ہو جاتے تو ہم قطعی لاعلمی کا اظہار کر سکتے تھے۔ یہ ہوٹل والے بتائیں کہ ہم سے پہلے یہاں کون ٹھہرا ہوا تھا۔ نقد رقم کتنی بھی ہو' اس وقت تک مسروقہ نہیں سمجھی جا سکتی جب تک مسروقہ ثابت نہ ہو۔ سونے کے زیورات پہلے ہی چندو کے سپرد کئے جا چکے تھے ورنہ انہیں بھی گل اور نازو کی ملکیت قرار دیا جا سکتا تھا۔

"یہاں سے تو کچھ نہیں ملا جناب!" ایک ماتحت نے مایوسی سے کہا۔

"ان بنڈلوں میں کیا ہے؟" انسپکٹر نے کہا "کھول کے دیکھو۔"

دوسرے ماتحت نے تعمیل کی اور بولا "اس میں زنانہ کپڑے ہیں سر۔ استعمال شدہ۔"

"اسلحہ نہیں ہے؟"

"نہیں سر۔ ہم نے باتھ روم کا ٹائلٹ بھی دیکھ لیا۔ فلش ٹینک میں بھی....."

اچانک میرے دل میں امید کی ایک کرن پیدا ہوئی۔ انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ دوسرا کمرا بھی ہمارے پاس ہے۔ غالباً منیجر نے کمروں کے نمبر بتانے کے بجائے پولیس کو سیدھا ہم تک پہنچا دینا بہتر سمجھا تھا۔

میں نے کہا "انسپکٹر صاحب! آپ کو غلط فہمی تو نہیں ہوئی؟"

اس نے کہا "غلط فہمی کیسی؟ ہمیں خود منیجر نے مطلع کیا تھا کہ ڈاکوؤں کا گروہ یہاں موجود ہے۔ وہ کل آئے تھے تب بھی ان کے حلئے بدلے ہوئے تھے اور آج انہوں نے پھر......"

میں نے اطمینان کا سانس لیا اور پھر ہنس کے کہا "آپ خود اتنے معقول اور تجربہ کار آدمی ہیں۔ کبھی ہم جیسے ڈاکو بھی دیکھے ہیں؟ کیا ڈاکو صورت سے اتنے معزز اور شریف نظر آتے ہیں اور ان کے ساتھ ایسی مہذب خواتین ہوتی ہیں۔"

انسپکٹر کی خاموشی ظاہر کرتی تھی کہ وہ عدم اعتماد کا شکار ہو گیا ہے۔

میں نے اپنی بات جاری رکھی "ہم قانون سے تعاون کرنے والے لوگ ہیں۔ مقابلہ کرنے والے نہیں۔ ہوٹل کے منیجر سے تو بعد میں نمٹ لیں گے ہمارے وکیل۔ لیکن آپ کوئی غلط قدم اٹھا کے اپنی نوکری کو خطرے میں کیوں ڈالتے ہیں۔"

انسپکٹر نے کہا "اچھا۔ ہاتھ نیچے کر لو اور سیدھے کھڑے ہو جاؤ۔ منہ میری طرف کر لو۔"

میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا ہوں؟ مجھے یقین نہیں آتا تھا۔ مگر یہ سب ٹھنڈے دماغ سے کام لینے کا نتیجہ تھا۔ اگر میں مقابلے پر اتر آتا اور نازو کو بھی اشارہ کر دیتا تو عین ممکن تھا کہ ہم پانچ افراد سے نمٹ لیتے اور انہیں قابو بھی کر لیتے مگر اس کوشش میں ایک دو کا مارا جانا بھی بعید از قیاس نہیں تھا۔ فائرنگ کی آواز اسی کمرے تک محدود نہ رہتی۔ تین منزلیں اتر کے فرار ہونے سے پہلے ہی منیجر' پولیس سے ہنگامی امداد طلب کر لیتا اور ہوٹل کو چاروں طرف سے گھیر لیا جاتا۔

میں نے انسپکٹر کی طرف منہ کر کے کہا "اب بتاؤ' یہ سب کارروائی کیا تھی؟ کیوں چھاپا مارا گیا تھا؟"

انسپکٹر نے ایک ماتحت کو حکم دیا "اس حرامی کی یہ داڑھی نوچ کے اس کے ہاتھ میں پکڑا دو۔"

ایک سپاہی نے میری داڑھی کو نقلی سمجھتے ہوئے جھٹکا دے کر چہرے سے الگ کرنے کی کوشش کی۔ میں نے بلبلا کے اسے دور دھکیل دیا اور گالیاں بکنے لگا "میں ایسی کی تیسی کر دوں گا سب کی۔ تم نے کیا میری داڑھی کو نقلی سمجھ رکھا ہے؟"

غالب الگ چلا رہا تھا "سؤر کے بچے! کبھی اپنے باپ کی داڑھی کھینچ کر دیکھنا۔ وہ تو نقلی نہیں ہے۔ تم نے بے عزتی کی ہے میری' میں تمہارا خانہ خراب کر دوں گا۔"

"داڑھی تو اصلی ہے جناب" ایک سپاہی نے مردہ لہجے میں رپورٹ دی۔

"داڑھی اصلی ہے؟ کیا کہہ رہے ہو!" انسپکٹر بولا۔
"داڑھی بالکل اصلی ہے سر۔ آپ خود دیکھ لیں" دوسرے نے پریشان لہجے میں کہا۔

انسپکٹر کی صورت پر رونما ہونے والے تغیرات نے مجھے ایک قدم آگے بڑھنے کا حوصلہ عطا کر دیا "تم۔ ایک معمولی انسپکٹر۔ تم اپنے اختیارات سے اس حد تک تجاوز کر سکتے ہو۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ ہندوستان کی وزارتِ داخلہ نے پولیس کو فرعون کی فوج بنا دیا ہے۔ کوئی شریف آدمی اگر اس ہوٹل میں محفوظ نہیں تو پھر اس کے لئے تحفظ کہاں ہے؟......" میں نے رواں انگریزی میں کہا۔

انسپکٹر نے کہا "مینجر کو بلاؤ۔"

میں نے فون اٹھا لیا "کہاں ہے تمہارا مینجر؟ اسے اوپر بھیجو۔ مجھے اپنا حساب برابر کرانا ہے۔ اس سے کہو حساب ساتھ لے کر آئے۔ ایڈوانس میں سے رقم کاٹ لے۔ باقی ایک ایک پیسہ یہاں لے آئے۔ ہم اب اس ہوٹل میں ایک منٹ بھی نہیں رک سکتے۔" میں نے ریسیور کو دھڑ سے مارا۔

"آپ خفا نہ ہوں۔" انسپکٹر ایک دم عاجزی پر اتر آیا "لیڈیز! آئی ایم سوری۔ آپ تشریف رکھیں۔"

اب محاذ نازو نے سنبھال لیا "تشریف تو میں ضرور رکھوں گی۔ مگر انسپکٹر! اگر اتنی بے عزتی کے بعد میں نے تمہیں محکمے سے برطرف کرا کے جیل نہ بھجوایا تو میں وزارتِ خارجہ کے سیکریٹری کی نہیں کسی بھنگی کی بیٹی۔ میرا یہ شوہر تو کاٹھ کا الو ہے۔ زبان ہی نہیں ہے اس کے منہ میں ورنہ یہ بھی بتا سکتا تھا کہ یہ خود کیا ہے۔"

انسپکٹر کو پسینہ آگیا "دیوی جی! شما کر دیں مجھے۔ مجھے تو مینجر نے اطلاع دی تھی کہ یہاں دو ڈاکو ٹھہرے ہوئے ہیں۔ وہ نقلی داڑھی لگا کے آئے تھے۔ فر فر انگریزی بولتے تھے۔ صبح انہوں نے دوسری داڑھی لگا لی۔ وگ بھی بدل لی۔"

میں نے گرج کے کہا "وگ؟ یعنی ہمارے سر پر جو بال ہیں وہ بھی نقلی ہیں۔ اومائی گاڈ۔"

مینجر بوکھلایا ہوا اندر آیا۔ اندر کا نقشہ دیکھتے ہی اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔

"مینجر صاحب! آگے تشریف لائیے" انسپکٹر نے طنز سے کہا "بڑی دور کی کوڑی لائے تھے آپ۔ کمال کی نظر پائی ہے آپ نے۔ نقلی وگ۔ نقلی داڑھی۔ خوب پہچانتے ہیں آپ۔"

"جی.... کیا.... میں سمجھا نہیں۔"

میں نے چلا کے کہا "سمجھ جاؤ گے تم بھی۔ میں ابھی بلاتا ہوں دہلی سے اپنے وکیلوں کو۔ وہ خود تمہارے خلاف کیس کریں گے۔ ہتکِ عزت کا کیس تو بعد میں ہوگا۔ پہلے غیر قانونی کارروائی کا مقدمہ درج ہوگا۔ تم نے ٹریس پاس کیا۔ غلط بیانی کی۔ سرچ کے لئے کوئی وارنٹ نہیں تھا مگر تم ہمارے کمرے میں گھسے۔ سامان کی تلاشی لی۔ ہمیں مارا پیٹا۔ خواتین پر دست درازی کی۔"

انسپکٹر کی حالت غیر ہوگئی۔ "سر۔ پلیز۔ میرا کوئی قصور نہیں اس میں۔ غلط اطلاع دینے والا یہ تھا۔"

"غلط کارروائی تم نے کی۔ کس نے اختیار دیا ہے تمہیں چھا مارنے کا؟ کسی مجسٹریٹ کی عدم موجودگی میں تم نے جو کچھ کیا ا اختیارات کا غلط استعمال تھا جو تمہیں اس وردی کی وجہ سے ہیں۔ یہ وردی نہ ہوتی تمہارے جسم پر تو میں تمہارے دانت تو تمہارے ہاتھ پر رکھ دیتا۔ میں بلیک بیلٹ رکھتا ہوں جوڈو میں۔ آ کے دیکھ لو۔ تمہارے یہ ہتھیار سب بے کار تھے۔ تم نے اس کا مطلب لیا۔ شرافت کو آج کل آدمی کی کمزوری سمجھ لیا جاتا ہے۔

غالب نے ڈرامے کو فائنل ٹچ دیا۔ اس نے چلا کے آپر سے کہا "کیا بات ہے تم بہری ہو یا انگریزی سمجھنے سے قاصر ہو کون سی لاطینی بول رہا ہوں میں۔ چرن لال رندھاوا اینڈ کمپ ایڈووکیٹس قرول باغ دہلی۔ نمبر......"

مینجر نے بدحواسی میں لائن کاٹ دی "پلیز سر۔ مجھے مو دیں۔ ایک بار۔ میری عرض تو سن لیں۔ میں وضاحت کر ہوں۔"

اس کے بعد صورتِ حال بالکل پلٹ گئی۔ مینجر کی دونو طرف سے شامت آگئی تھی۔ پولیس اس "غلط فہمی" کا اسے ذ دار قرار دیتی تھی اور ہم بھی اپنی بے عزتی کا سارا الزام اس پر عا کرتے تھے۔ بہت سی معافی تلافی کے بعد آخر کار ہم نے بھی فر دلی سے کام لیا اور سب کو معاف کر دیا۔ مگر اس ہوٹل میں ا منٹ نہ رکنے کا اعلان کرتے ہوئے سامان اٹھا لیا۔

پولیس جس راستے سے آئی تھی اسی راستے سے واپس گئی۔ مینجر انہیں پچھلی طرف سے لایا تھا۔ ہر ہوٹل کی طرح د بھی بہت سے غیر قانونی دھندے ہوتے تھے مگر انتظامیہ اور پو کے درمیان ایک پُر امن بقائے باہمی کا معاہدہ تھا کہ وہ "شرفا ہاتھ نہیں ڈالیں گے اور پولیس کو اس کی فرض شناسی کا "انع ملتا رہے گا۔ تاہم کبھی کبھی خود ہوٹل کی انتظامیہ انہیں کارکردگی دکھانے کا موقع فراہم کرتی تھی۔

ہماری آمد کو مینجر نے ایک ایسا ہی موقع سمجھنے کی غلطی اس غلطی کا سبب چند دن قبل کی ایک واردات تھی۔ ایک بینک اور ایک جوہری کی دکان کو دو ڈاکوؤں نے لوٹا تھا اور د جگہ چشم دید گواہوں کے مطابق وہ بھیس بدل کر گئے تھے جوان آدمی تھے مگر انہوں نے نقلی بالوں کی نقلی وگ لگا رکھی تھ ان کی داڑھی بھی نقلی تھی۔ ظاہر ہے وہ میک اپ کے معا بہت اناڑی ہوں گے کہ عام لوگ بھی دھوکا نہ کھا سکے۔ پو انہیں تلاش کرنے میں ناکام رہی تھی لیکن شہر کے مخبروں کی ا کے مطابق ڈاکو فرار نہیں ہوئے تھے بلکہ شہر میں ہی مزید وارد کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔

ہوٹل کے مینجر کی طرف سے ملنے والی یہ اطلاع کہ ڈا

کے ہوٹل میں مقیم ہیں، یقیناً بہت بڑی اطلاع تھی اور اگر پولیس انسپکٹر سچ مچ ان ڈاکوؤں کو گرفتار کر لیتا تو یہ اس کے کیریئر کی سب سے بڑی کامیابی ہوتی جس پر اس کے لئے ترقی کے سارے راستے کھل جاتے۔ ادھر ہوٹل کے لئے اس خبر میں بدنامی کی کوئی بات نہیں تھی۔ پولیس نے عام مسافروں کو پریشان کئے بغیر ڈاکوؤں کے ایک گروہ کو عین اس وقت پکڑ لیا تھا جب وہ بڑی بے خوفی سے مزید وارداتوں کے منصوبے بنا رہے تھے۔ خبر یہ بھی بنائی جا سکتی تھی کہ وہ پکڑے نہ جاتے تو رات کو ہر مسافر سے نقد رقم، سونے چاندی کے زیورات اور ہیرے جواہرات سب رکھوا لیتے اور دو چار کو یرغمال بنا کے نکل جاتے۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ ڈاکو تو ملے نہیں مینجر کے حصے میں پریشانی اور پولیس کے حصے میں پشیمانی آئی۔ پولیس والے ہمیں کیا دیتے۔ یہی غنیمت تھا کہ وہ کچھ لئے بغیر چلے گئے جب کہ میں انہیں رشوت طاقت سے زیر کرنے کی سوچ رہا تھا۔ مینجر نے بڑی کوشش کی کہ ہم رک جائیں مگر اب ہم خود اسے خلافِ مصلحت سمجھتے تھے۔ پھر اس نے بل کی ساری رقم خیر سگالی کے جذبات کا اظہار کرنے کے لئے چھوڑنی چاہی مگر ہم نے ساڑھے چھ سو روپے اس کے منہ پر مارے پھر واک آؤٹ کر گئے۔

کمار کو کچھ اندازہ نہ ہو سکا کہ ہمارے ساتھ ہوٹل میں کیا ہوا۔ اسے کچھ بتانا قطعی غیر ضروری تھا۔ ہم نے اپنا سامان اس کی ٹیکسی میں رکھا اور اسے کسی دوسرے ہوٹل میں چلنے کو کہا۔

"کیا ہوا؟ یہ ہوٹل پسند نہیں آیا۔"

"ہاں۔ یہاں تو ویٹر ہیں۔ خوفناک شکل اور لمبی مونچھوں والے۔" غالب نے کہا "ہمارا خیال تھا کہ ویٹرس ہوں گی۔ نرم و نازک۔"

"تو وہاں لے چلوں....."

"ان دونوں کو لے جاؤ" نازو نے کہا "ہمیں تو ایسی جگہ لے کر چلو جہاں ان سے بھی زیادہ شاندار مونچھوں والے ہینڈسم ویٹر ہوں۔ ہیرو ٹائپ۔ مردانہ وجاہت کے نمونے۔"

میں نے کہا "مجھ پر خواہ مخواہ بگڑ رہی ہو۔ بگڑا ہے یہ محض تمہاری وجہ سے۔"

"میری وجہ سے؟" نازو چمک کر بولی۔

"ہاں۔ تم نے اتنی ڈھیل کیوں دے رکھی ہے" میں نے کہا۔

"مجھے تو یہ تمہاری صحبت کا نتیجہ لگتا ہے" نازو بولی۔

"بالکل ٹھیک کہا ہے تم نے۔ ورنہ میں تو اتنا سیدھا، بھولا بھالا اور شرمیلا تھا پہلے" غالب نے معصوم صورت بنا کے کہا "کہ تم جیسی لڑکی نے بھی اتنی آسانی سے اُلّو بنا لیا مجھے۔"

نازو ہنسنے لگی "گدھے کو اُلّو کون بنا سکتا ہے۔"

دوسرا ہوٹل بھی پہلے والے ہوٹل کے معیار کا ہی تھا مگر اس جگہ سے پندرہ کلومیٹر دور تھا۔ اس مرتبہ ہم نے یہ کیا کہ راستے میں رک کے دو سوٹ کیس خرید لئے جو ہم جیسے معززین کے شایانِ شان ہوں۔ ظاہر ہے اس مرتبہ ہمیں وی آئی پی سمجھا گیا اور ہوٹل کا سارا عملہ بہترین کاروباری اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے دیدہ و دل فرش راہ کئے رہا۔

"خدا کا شکر ہے کہ پھر بچ گئے" گل نے کمرے میں پہنچتے ہی کہا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سب ہمارے ساتھ ہی کیوں ہوتا ہے" غالب نے کہا "کلکتہ میں ہزاروں لوگ باہر سے آتے ہوں گے۔ ہم نے قدم رنجہ فرمایا تو کہاں۔ سر منڈاتے ہی اولے پڑنے والا محاورہ سچ ہو گیا۔"

میں نے کہا "ہاں یار۔ ہم کچھ کرنا نہیں چاہتے، پھر بھی کچھ نہ کچھ ہو جاتا ہے۔ اس پاگل خانے کے بارے میں سوچتا ہوں تو اب بھی میرے جسم پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ کیسے سفاک اور شیطان صفت لوگ تھے وہ سب۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ انہیں بہت کم سزا ملی۔ اور یہ شاید کبھی کسی کو معلوم نہیں ہوگا کہ وہاں کیا خونی کھیل کھیلا گیا تھا۔"

"چھوڑو اس ذکر کو۔ مجھے بھی وحشت ہوتی ہے۔" غالب نے کہا "یہ بتاؤ اب ہم ڈھاکا کیسے جائیں گے اور کب؟"

میں نے کہا "بہت سے مسائل ہیں جن کے بارے میں ہماری معلومات صفر ہیں۔ لیکن ہمارے وسائل کافی ہیں۔ ایک تو سرحد پار کی صورتِ حال معلوم ہونی چاہئے۔ پھر راستے کا انتخاب ہے۔ ہم کچھ نہیں جانتے کہ وہاں پہنچنے کے لئے بس یا ٹرین سروس دستیاب ہے یا نہیں۔"

غالب نے کہا "فی الحال سرحدیں بند ہوں گی۔ ٹرین سروس بھی معطل ہوگی۔ سڑکوں پر فوجی نقل و حمل جاری ہوگی۔"

"رائٹ۔ دوسرا فضائی راستہ ہے۔ کلکتہ ائرپورٹ تو کھلا ہوگا مگر ڈھاکا کا ائرپورٹ بند ہے۔ ہمارے پاسپورٹ بھی نہیں ہیں۔" میں نے کہا "چناں چہ تیسرا راستہ وہ ہے جو اسمگلر استعمال کرتے ہوں گے۔ خفیہ راستے۔ یہاں سڑکیں کم ہیں، آبی راستے زیادہ ہیں۔ نہریں دریا اور جھیلیں۔ ان راستوں سے ہمیں کون گزار کے لے جا سکتا ہے۔"

"کمار" نازو نے اچانک کہا۔

"کمار۔" میں نے کہا "رائٹ وہ ہماری مدد کر سکتا ہے۔"

"اس نے کہا تھا کہ وہ ہر کام کر سکتا ہے" غالب بولا "اگر وہ خود ساتھ نہ گیا تو کوئی بندوبست ضرور کر دے گا۔ کسی سے ملوا دے گا جو ہمیں بحفاظت سرحد پار پہنچا دے۔"

"پیسہ لے کر؟" نازو نے کہا۔

"ظاہر ہے۔ کوئی خدمتِ خلق کے جذبے سے سرشار ہو کے یہ کام نہیں کرے گا ہمارے لئے۔" غالب نے کہا "کبھی غلطی سے عقل کی بات کہہ دیتی ہو تو فوراً حساب برابر کر دیتی ہو اگلی بات سے،"

جو انتہائی احمقانہ ہوتی ہے۔"

"تم بلاوجہ مت بولا کرو" نازو نے بگڑ کے کہا "احمق تم خود ہو جو غلط مطلب نکالتے ہو۔"

"صحیح بات کا غلط مطلب نکالا ہی نہیں جا سکتا۔"

"جس کی کھوپڑی الٹی ہو وہ نکال لیتا ہے۔"

میں نے کہا "بس۔ سیز فائر۔ یہ بتاؤ ہمارے پاس اس وقت نقد رقم کتنی ہے۔"

"زیادہ نہیں ہوگی۔ تم نے حاتم طائی بن کے بانٹ جو دی تھی" نازو نے کہا۔

"وہ بھی ضروری تھا۔ مال حرام تھا مگر حرام تو نہیں گیا نا۔ شاید وہی نیکی کام آگئی ورنہ پولیس کو رشوت دینے ہی والا تھا میں۔"

"مال حرام تو اب بھی ہے" غالب نے کہا۔

"جیسے بلیک منی وائٹ ہو جاتی ہے، ایسے ہی اب ہم اسے اپنی ضرورت پر خرچ کر سکتے ہیں" میں نے کہا۔

نازو نے گل کی مدد سے نوٹ الگ الگ کئے اور حساب کر کے بتایا "ایک لاکھ ستاون ہزار پانچ سو چودہ۔"

"اور تم کہہ رہی تھیں زیادہ نہیں ہوگی" غالب نے کہا۔

"ہماری ضروریات کے لئے کافی ہے" میں نے کہا۔

غالب باہر گیا اور کمار کو اپنے ساتھ لے کر لوٹا۔

"کیا پرابلم ہے؟" اس نے کہا۔

میں نے کہا "بیٹھو۔ پرابلم ایک نہیں ہے لیکن ہمارا خیال ہے کہ تم حل کر سکتے ہو۔"

وہ کرسی پر بیٹھ گیا اور سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"تم ہماری مدد کر سکتے ہو" غالب نے کہا۔

"پہلے مجھے معلوم ہونا چاہئے کہ مسئلہ کیا ہے۔"

"تم نے کہا تھا کہ ہر کام کر سکتے ہو" غالب نے اسے یاد دلایا۔

"ہر کام کا مطلب غیر قانونی کام نہیں" وہ بولا "تم یہ چاہو کہ میں کسی کو قتل کر دوں..... تو یہ ناممکن ہے۔"

میں نے کہا "کام تو غیر قانونی ہے مگر چوری، قتل، ڈاکے جیسا نہیں۔ ہم سرحد پار کر کے ڈھاکا جانا چاہتے ہیں۔"

"ڈھاکا؟" اس نے نفی میں سر ہلایا "ابھی تو بہت مشکل ہے۔ بس، ٹرین، ہوائی جہاز۔ سب بند ہیں۔"

میں نے کہا "یہ تو ہم بھی جانتے ہیں مگر مشرقی اور مغربی بنگال کے درمیان سرحد پار کرنے کے کئی راستے ہیں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے، لوگ ادھر سے ادھر آتے جاتے رہتے ہیں۔ ڈھاکا سے کلکتہ کے درمیان باقاعدہ تجارت ہوتی ہے اور آمدورفت کی پابندیاں برائے نام ہیں۔"

"پہلے ایسا ہی تھا لیکن اس وقت سرحدیں بند ہیں۔ دونوں جانب فوجوں کے مورچے ہیں۔"

"سرحد بہت لمبی ہے۔ لمبا راستہ ضرور ہوگا جہاں حالات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہوگی۔ وہ علاقے جنگ سے محفوظ ہوں گے" میں نے کہا۔

اس نے سوچ کے کہا "آج کل بڑی تعداد میں لوگ وہاں نکل رہے ہیں۔ لیکن وہ نیپال کے راستے فرار ہو رہے ہیں۔"

"فرار ہو رہے ہیں!" میں نے حیران ہو کے کہا "کون لوگ؟"

"وہی جو بنگلا دیش کے مخالف تھے اور جنہوں نے مجیب کی مخالفت کی تھی، اس کے خلاف مسلح جدوجہد کی تھی، پاکستانی افواج کا ساتھ دیا تھا۔"

مجھے دکھ سے زیادہ اشتعال کے جذبات نے مغلوب کر لیا "انہیں مار کے نکالا جا رہا ہے؟ آخر کس جرم میں؟"

"وہ اب وہاں کیسے رہ سکتے ہیں؟"

"کیوں، کیا وہ پاکستانی نہیں ہیں؟"

"جو پاکستان تھا وہ اب بنگلہ دیش ہے۔ ان کا ٹھکانا پاکستان ہے اور پاکستان جانے کا وہی ایک راستہ کھلا ہوا ہے۔ جو والے ہیں وہ ایجنٹوں کے ذریعے سرحد پار کرتے ہیں۔ بسوں ٹرکوں سے۔"

غالب نے کہا "تم کسی ایجنٹ سے واقف ہو؟"

کمار نے نفی میں سر ہلایا "اگر پاسپورٹ وغیرہ بنوانا ہو تو ان لوگوں سے ملوا سکتا ہوں جو یہ کام کرتے ہیں۔"

"اصلی پاسپورٹ ہوں گے؟"

"ویسے تو جعلی بھی بنا دیتے ہیں دھوکے باز لیکن میں اصلی بنوا کے دوں گا۔"

"کسی تصدیق، تفتیش کے بغیر؟"

"میں سمجھا نہیں! آپ لوگ دہلی میں رہتے ہیں۔ شریف معزز آدمی ہو۔ کاروبار بھی اچھا ہی ہوگا ورنہ ایسے مہنگے عالی شان ہوٹلوں میں قیام نہ کرتے۔ تصدیق سے کیوں ڈرتے ہو؟"

میں نے کہا "ایسے تو کوئی بھی پاسپورٹ بنوا سکتا ہے۔"

اس نے کہا "پھر آپ بنوالیں۔ میں تو جلدی کی بات کر رہا تھا۔ ایجنٹ چار گھنٹے میں پاسپورٹ لاوے گا۔ آپ چار چکر لگاؤ گے۔"

میں نے کہا "کمار! یہ مسئلہ کچھ اور ہے۔ پاسپورٹ تو ہمارے پاس ہیں۔ ہم فرضی ناموں سے دوسرے پاسپورٹ بنوانا چاہتے ہیں۔"

"صرف ڈھاکا جانے کے لئے؟"

"ہاں۔ ہم نہیں چاہتے کہ ہمارے اصلی ناموں کا کہیں اندراج ہو۔ کسی کو یہ معلوم نہ ہو کہ ہم ڈھاکا گئے تھے۔"

وہ مجھے نظر جما کے دیکھتا رہا۔ "آپ لوگ مجھ پر بھروسہ نہیں کرتے؟"

میں نے کہا "بھروسہ نہ کرتے تو تم سے یہ سب کیوں کہتے۔"

"اصل بات مجھے نہیں بتانا چاہتے۔ کہ آپ کو ڈھاکا جانا کیوں ہے اور اس طرح چھپ کے ایسے خطرناک حالات میں۔"

میں نے کہا "ہم کوئی تخریب کار یا دہشت پسند نہیں ہیں کمار۔ کیا ہم صورت سے ایسے لگتے ہیں؟"

"صورت سے تخریب کار پہچانے جاتے تو آسانی سے پکڑے جاتے۔" کمار نے منطقی بات کی۔

میں نے ہنس کے کہا "خیر یہ تو ٹھیک ہی کہا ہے تم نے مگر ہمارا مسئلہ کچھ اور ہے۔ ہم تخریب کار ہوتے تو سرحد پار کرنے کے لئے تم سے مدد مانگتے؟ ہم بہت پہلے اندر پہنچ چکے ہوتے۔"

وہ ایک دم قائل ہو گیا "پھر کیا بات ہے، آپ مجھے بتا کیوں نہیں دیتے۔ میں قسم نہیں کھاتا، صرف وعدہ کر سکتا ہوں کہ جو کچھ مجھے معلوم ہوگا وہ میری ذات تک محدود رہے گا۔ اگر میں نے اصولی اختلاف کیا اور آپ کی کوئی مدد نہ کی تب بھی میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔ اور مدد کر سکا تو ضرور کروں گا۔"

میں نے یہ ظاہر کیا جیسے میں کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ پھر غالب کی طرف تائید طلب نظروں سے دیکھا اور سر ہلا کے کہا "اوکے مسٹر کمار۔ ہمارا ایک دوست ڈھاکا میں پھنس گیا ہے۔ بالکل اکیلا رہ گیا ہے۔ اس کے سب ساتھی مارے جا چکے ہیں یا پکڑ لئے گئے ہیں۔ اس کے پاس کچھ بھی نہیں اور وہ ڈھاکا میں ہی چھپا ہوا ہے۔ ہم نے بہت پہلے اس سے رابطہ کیا تھا تو اس نے بتایا تھا کہ حالات بہت خراب ہیں۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ مستقبل کی صورت حال کیا ہوگی۔ حفظ ماتقدم کے طور پر اس نے ہمیں مطلع کر دیا تھا کہ حالات زیادہ خراب ہو گئے تو وہ روپوش ہو جائے گا اور اس نے دو تین مقامات کی نشان دہی کی تھی مگر وہ وہاں نہیں ہے۔ ہم اسے تلاش کریں گے۔"

کمار نے کہا "کیسے تلاش کرو گے اور کہاں؟"

"یہ ہم ڈھاکا جا کے دیکھیں گے۔ وہاں کیا لائحہ عمل ہوگا، یہ ہم یہاں کیسے بتا سکتے ہیں۔"

"تمہیں کیسے یقین ہے کہ وہ مارا نہیں گیا؟ اس کے تمام ساتھی پکڑے گئے یا مارے گئے۔ وہ اکیلا محفوظ رہا....."

میں نے کہا "یار! اس میں بحث کی گنجائش کہاں ہے۔ ہم تو ایک امید پر جا رہے ہیں۔ امید پر دنیا قائم ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ مگر اتنے لوگ! یہ کام تو ایک آدمی بھی کر سکتا تھا۔ دو عورتوں کا ساتھ جانا......"

میں نے کہا "چھوڑو یار! تم بے کار آدمی ہو۔ فضول سوالات سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ تم کچھ نہیں کر سکتے ورنہ دو ٹوک بات کرتے۔ ہاں یا نہ۔ کام ہو سکتا ہے یا نہیں۔"

"دنیا کا ہر کام ہو سکتا ہے....."

میں نے کہا "ہم پیسہ خرچ کرنے کے لئے تیار ہیں۔"

"اگر ایک پاسپورٹ پر پانچ ہزار مانگے کسی ایجنٹ نے تو دو گے؟" کمار نے کہا۔

"پانچ ہزار......"

"وقت وقت کی بات ہے۔ یہی کام پہلے دو ہزار میں ہو جاتا اور اگر تمہیں جلدی نہ ہوتی تو دہلی یا بمبئی سے آج بھی پاسپورٹ بنوانے میں ہزار روپے خرچ ہوتے ہیں۔ ایک دو یا چار۔ جتنے چاہو لے لو۔ پر رسک تو تمہارا اپنا ہے۔ کلکتہ میں ریٹ ایک دم بڑھ گئے ہیں" کمار نے کہا "یہاں سے جاری ہونے والا پاسپورٹ بھی کئی بار بکتا ہے۔"

"وہ کیسے؟" میں نے کہا۔

"یہاں سے ایک فیملی کو پاسپورٹ جاری ہوتا ہے۔ ڈھاکا میں دوسرا گروہ ان پر تصویریں بدلتا ہے اور ایک فیملی کو جہاز سے سیدھا کراچی روانہ ہونے کے لئے ٹکٹ مل جاتا ہے۔ ایرانڈیا سے دہلی، وہاں سے دبئی پھر کراچی۔ یہ پیسے والوں کا کھیل ہے۔ وہ پہلے ہی نکل گئے تھے اور جو باقی رہ گئے ہیں وہ حالات کے معمول پر آتے ہی نیپال یا سیلون کے راستے پرواز کر جائیں گے۔"

"تمہاری معلومات حیرت انگیز ہیں" میں نے کہا "ایسا لگتا ہے جیسے خود تم بھی یہی کرتے ہو۔"

"میں ایسا کوئی کام نہیں کرتا۔ صرف ٹیکسی چلاتا ہوں۔ مگر سارے شہر میں پھرتا ہوں۔ آنکھیں اور کان کھلے رکھتا ہوں اور دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کی خبر مل جاتی ہے مجھے۔ اب یہ بتاؤ کہ پاسپورٹ بنوانے کے لئے بیس ہزار خرچ کر سکتے ہو یا نہیں۔"

میں نے کہا "بغیر پاسپورٹ کے سرحد پار نہیں کر سکتے؟"

"میرا مشورہ ہے کہ یہ خطرہ مول مت لو۔ اگر پکڑے گئے تو جیل میں پڑے رہو گے۔ انڈین پاسپورٹ کی آج کل خاصی اہمیت ہے۔ تمہیں کوئی نہیں پوچھے گا۔ ہوٹل شاہ باغ میں ٹھہر جانا۔"

"شاہ باغ میں؟"

"ہاں۔ غیر ملکی عموماً وہیں جاتے ہیں۔ تم لوگوں کے معیار کا ہے اور تمہارے لئے محفوظ ترین جگہ" کمار نے کہا۔

میں نے کہا "اگر تم نے یہ کام کرا دیا تو....."

"کرا دیا؟" وہ ہنسا "میں خود کروں گا یہ کام۔"

میں حیران رہ گیا "پھر پہلے کیوں نہیں بتا دیا؟"

"کیا میں نے بتایا نہیں تھا کہ میں ہر کام کر سکتا ہوں۔ تمہیں پاسپورٹ کب چاہئیں؟"

میں نے کہا "آج۔ بلکہ ابھی۔"

"ابھی۔" وہ ہنسنے لگا "کل تک ہوگا یہ کام۔ نکالو بیس ہزار روپے۔"

میں نے غالب کی طرف دیکھا، غالب نے نازو کی طرف۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں ہم نے ایک دوسرے سے سوال کیا کہ کیا اتنی بڑی رقم کسی ضمانت کے بغیر اس کے حوالے کر دینی چاہئے؟ اگر وہ بھاگ گیا تو ہم کیا کریں گے؟ ہم تو اس کی رپورٹ بھی نہیں لکھوا سکتے۔

کمار نے کہا "تم لوگ ڈر رہے ہو نا' کہ میں بیس ہزار لے کر غائب ہو جاؤں گا؟"

نازو نے بیس ہزار اس کے سامنے ڈال دئے "مجھے پورا اعتبار ہے تم پر۔ جو بھائی اپنی چھوٹی بہنوں سے اتنی محبت کرتے ہوں وہ دھوکے باز نہیں ہو سکتے۔"

نازو کا تجزیہ بالکل درست تھا۔ کمار کو پیسے کا لالچ ہوتا تو وہ رکمنی کے پیسے کو اپنا حق سمجھ کے قبول کرلیتا۔ اس کا سرپرست بن کے رہتا۔ جتنی محنت اس نے رکمنی کو ڈاکٹر بنانے میں کی ہوگی اسے اپنی انوسٹمنٹ سمجھتا تو اس کی آمدنی سے اپنا قرض وصول کرتا۔ مگر وہ اس حد تک اصول پرست تھا کہ اپنی ٹیکسی چلاتا تھا اور بہن کے گھر میں رہنے پر تیار نہ تھا۔ بے غرضی اور بے نیازی کے اس انداز میں ایک قلندرانہ شان تھی۔ اتنا خود دار آدمی پیسے کے لالچ میں کسی کے اعتماد کو دھوکا نہیں دے سکتا تھا۔

"ہمارے نام پتے کیا ہوں گے؟" میں نے کہا۔

"جب پاسپورٹ ملیں تو دیکھ لینا" وہ رقم جیب میں ڈالتے ہوئے بولا "ایک بات میں ابھی واضح کر دیتا ہوں۔ میں پوری کوشش کروں گا کہ پیسہ کم خرچ ہو لیکن بیس ہزار سے جتنے بچ جائیں گے وہ میری کوشش اور محنت سے بچیں گے۔ وہ میں واپس نہیں کروں گا۔"

میں نے ہنس کے کہا "حق محنت اپنی جگہ....."

اس نے کہا "کلکتہ میں پیسہ کمانا آسان ہے۔ جمع کرنا مشکل کام ہے۔ مجھے پیسہ جمع کرنا ہے اپنا گھر بنانے کے لئے۔ جب تک میرا کوئی چھوٹا موٹا گھر نہیں بنے گا' شادی کا مسئلہ اٹکا رہے گا۔ فکر مجھے اپنی بہن رکمنی کی ہے۔ میری وجہ سے وہ بھی بیٹھی ہوئی ہے۔"

نازو نے کہا "اتنا کرنے والے تم جیسے بھائی کے لئے رکمنی کی یہ قربانی بہت معمولی ہے۔"

"مجھے تصویریں چاہئیں۔ آپ سب کی۔"

"تصویریں تو نہیں ہیں" میں نے کہا "خیر بنوا لیتے ہیں تمہارے ساتھ چل کے۔"

"چندو کو بھی دیکھ لیں گے" گل نے کہا۔

دوپہر کے کھانے کا وقت قریب تھا۔ ہم نے کمار کو بھی لنچ پر مدعو کیا۔ وہ ماڈرن قسم کا ہندو تھا جو ماس کھاتا تھا اور بہت سے فرسودہ ہندو عقائد پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ بنیادی طور پر وہ ذہین آدمی تھا مگر اس کی ذہانت ضائع ہو رہی تھی۔ ان ہزاروں نوجوانوں کی طرح جو سفارش نہ ہونے یا موقع نہ ملنے کے باعث ہر جگہ خوار و زبوں پھرتے ہیں اور ان سے کہیں کم تر صلاحیت رکھنے والے عیش کرتے ہیں۔

ہسپتال جاتے ہوئے کمار نے پھر کہا "رکمنی کو مت بتانا....."

نازو نے اس کی بات کاٹ دی "آج تو میں ضرور بتاؤں گی بلکہ تمہیں ساتھ لے کر جاؤں گی۔"

"میں نہیں جاؤں گا۔ رات پھر لڑائی ہو گئی تھی۔"

نازو نے کہا "میں دیکھوں گی کیسے نہیں جاؤ گے۔"

وہ حیران ہو گیا "مجھے زبردستی لے جا سکتی ہو تم؟"

"ہاں۔ یہ بھی دیکھ لینا۔"

میں نے کہا "نازو! یہ کیا فضول بات ہے۔ یہ بہن بھائی کا کا معاملہ ہے۔ اور یہ روٹھنا بھی تو پیار کی ایک ادا ہے۔ کھیل ان کا۔ تم کیوں ٹانگ اڑاتی ہو؟"

"میری مرضی۔"

غالب نے کمار سے کہا "بیٹا! مارے گئے تم۔ اب شرافت سے اتر کے چل پڑنا ورنہ ہڈی پسلی تڑوا لوگے۔ تم نہیں جانتے ا... کو۔ ہم تو بھگت رہے ہیں۔"

کمار ہنسنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ مذاق ہے اور میں ... تھا کہ نازو خواہ مخواہ اڑ گئی ہے۔ ہسپتال کے سامنے ہی تر... ہو جائے۔ نازو کا کیا ہے' کمار کو اٹھا کے اندر پھینک دے... معاملہ سیریس ہو جائے گا۔

جب ٹیکسی ہسپتال کے سامنے رکی اور نازو نے کمار سے چلنے کو نہیں کہا تو میں نے سکون کا سانس لیا کہ وہ مذاق میں نہیں بڑھی۔ اس سے زیادہ خوشی مجھے کمار کو اپنے پیچھے آتا ... ہوئی۔

غالب نے کہا "بس۔ اکڑ فوں تمام۔ ڈر گئے؟"

کمار مسکرایا "ہاں۔ میں ڈر گیا۔ رکمنی سے۔ وہ ابھی مجھے پکڑ کے اندر لے جاتی۔"

رکمنی اپنے کمرے میں آرام کر رہی تھی۔ ہمیں دیکھ... نے کتاب نیچے رکھ دی۔ مجھے وہ پریشان اور بدحواس سی لگی! ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"ہم چندو کو دیکھنے آئے ہیں۔ کیا حال ہے اس کا" ... کہا۔

"چندو....." وہ ہونٹوں پر زبان پھیر کے بولی۔

میرا ماتھا ٹھنکا "کیا بات ہے' وہ ٹھیک تو ہے نا؟"

رکمنی نے چشمہ اتار کے آنکھیں ملیں اور ایک گہر... لے کر پھر چشمہ لگا لیا۔ "آئی ایم سوری۔ وہ مر گیا۔"

"مر گیا؟" ہم سب تقریباً ایک آواز میں چلائے۔

"ہاں۔ وہ صبح دس بجے مر گیا" رکمنی نے کہا "اس کی... پولیس لے گئی ہے۔ پوسٹ مارٹم کے لئے۔"

"مگر وہ تو ٹھیک ہو رہا تھا" میں نے کہا۔

"ہاں۔ بہت بہتر ہو گئی تھی اس کی حالت۔ آج صبح تھوڑا سا دلیہ کھایا تھا اور دودھ پیا تھا۔ پھر اچانک اس کو... خون کی۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ ایسی کیا بات ہو... ابھی میں یہ کتاب دیکھ رہی تھی۔ میں نے پولیس سرجن ... بات کی۔ وہ اتفاق سے راجن کا دوست ہے۔"

"کون راجن؟" میں نے کہا۔

کمار نے کہا "اس کا ہونے والا شوہر۔"

"پولیس سرجن خفا ہونے لگا مجھ پر کہ تم نے یہ کیس کیوں لیا۔ ... کا زخم کسی عام خنجر کا زخم نہیں تھا۔ زخم کے آس پاس کا ...ت گل گیا تھا اور اس میں سے عجیب سی بدبو اٹھ رہی تھی۔ ... نے کہا کہ یہاں تو ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اس نے مجھے بتایا ...ہ چاقو لگ گیا ہے اور میں نے مان لیا' مرہم پٹی کر دی۔ لیکن ...س سرجن غلط نہیں کہتا۔ اس کا زخم کسی ایسے خنجر کا تھا جس ... زہر تھا۔ اور یہ زہر بھی عام زہر نہیں تھا۔ اس کا اثر دو مرحلوں ... ہوتا ہے۔ بہت خطرناک زہر ہوتا ہے۔ پہلے مرحلے سے آدمی ...ر ہو جاتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ وہ بچ گیا۔ بارہ گھنٹے بعد دوسرے ...طے کے مہلک اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔ چندو کے ساتھ کیا ہوا ...؟"

میں نے کہا "مجھے نہیں معلوم۔"

"لیکن اسے تم لوگ ہی لائے تھے۔"

میں نے کہا "وہ راستے میں ملا تھا۔ اس نے ہاتھ کا اشارہ دیا تو ... نے گاڑی روک لی۔"

"کون سی گاڑی؟" کمار بولا۔

"ایک دوست کی گاڑی تھی۔ وہ ہمیں یہاں چھوڑ کے واپس ...گیا تھا" میں نے فوراً ایک جھوٹ بولا "چندو بیمار تھا اور اس کی ...ت خراب تھی۔ پہلے اس نے کہا کہ اسے سانپ نے کاٹا ہے۔ ... میں تسلیم کیا کہ جھگڑا ہوا تھا کسی سے اور اس کے چاقو سے یہ ... آیا ہے۔"

"اس نے تم سے بھی جھوٹ بولا تھا۔" رکمنی نے کہا "وہ چاقو ...خم نہیں لگتا۔ یہ بات بھی پولیس سرجن نے بتائی ہے مجھے۔ وہ ... نیزے یا تیر کے گھپ جانے کا زخم تھا۔ میں تو بڑی مشکل میں پڑ... ہوں۔"

"اب کیا مسئلہ ہے؟" میں نے کہا "پولیس سرجن سے کہو کہ ...لہ دبا دے۔ اس کو لاوارث سمجھ کر جو کرنا ہے کرے۔ ہم خود ...کی ذمے داری قبول نہیں کر سکتے۔"

رکمنی نے مجھے غور سے دیکھا "تم نے کہا تھا کہ وہ تمہارا بھائی ...۔"

"اور کیا کہتا میں۔ پوری بات اب بتا دی ہے تمہیں۔"

"نہیں۔ پوری بات تم نے ابھی تک نہیں بتائی ہے" اس نے ... اور میز کے نیچے سے وہ پوٹلی اٹھا کے اوپر رکھ دی جس میں ...نے کے زیورات تھے "یہ کیا ہے؟"

میں نے پوری کوشش کی کہ میری صورت پر حیرت کے سوا کسی ...ے جذبات کا عکس نظر نہ آئے "کیا ہے؟"

رکمنی نے پوٹلی کھول دی "یہ کم سے کم ایک کلو سونے کے ...رات ہیں۔ یہ چندو کے پاس کہاں سے آئے؟"

اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ ہم سب مکمل انجان بن کے چندو کے معاملات سے قطعی لاعلمی کا اظہار کریں۔

میں نے حیرانی سے کہا "سونا! یہ سونا ہے؟"

"کیا تم سونے اور پیتل میں فرق محسوس نہیں کر سکتے؟" رکمنی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

میں نے نازو کی طرف دیکھا "ذرا تم دیکھو۔"

نازو نے انتہائی حیرت کے ساتھ ایک ایک زیور کو اٹھایا۔ الٹ پلٹ کر دیکھا اور گل کی طرف بڑھا دیا۔ یہ سب زیور مدت سے ہمارے پاس تھا اور ان کا ہزار بار کا دیکھا ہوا تھا مگر اب انہوں نے اپنی اداکاری سے یہ ثابت کیا کہ اس زیور کو وہ پہلی بار دیکھ رہی ہیں۔

"لگتا تو اصلی ہے" گل نے کہا۔

رکمنی نے برہمی سے کہا "میں جو بتا رہی ہوں کہ سونا ہے۔"

میں نے کہا "بی بی آپ ڈاکٹر ہیں' کوئی سنار نہیں ہیں کہ ہم آپ کی بات پر آنکھ بند کر کے یقین کر لیں۔"

غالب نے بھی کہا "سونے کی جتنی پرکھ آپ کو ہوگی اتنی ہی انہیں بھی ہے۔"

گل اور نازو نے اتفاق رائے سے سونے کو اصلی قرار دے دیا تو میں نے کہا "وہ آدمی تو غریب لگتا تھا۔ اتنا زیور کہاں سے مار لایا وہ؟"

غالب نے کہا "میرا خیال ہے کہ وہ اسی چکر میں مارا بھی گیا۔ زر' زمین اور زن کی ساری خرابی ہے۔"

میں نے ایک آہ بھری "لالچ بری بلا ہے۔"

رکمنی نے کہا "وہ تو سب ٹھیک ہے مگر اب میں کیا کروں؟ کیا بتاؤں پولیس کو؟"

"پولیس کو؟ پولیس کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

"نہیں ہے تو آجائے گی" غالب نے کہا "ڈاکٹر صاحبہ ابھی خود بلائیں گی پولیس کو۔"

میں نے کہا "خود کیوں بلائیں گی؟ یعنی بیل سے کہیں گی کہ آ بیل مجھے مار۔ اتنی بے وقوف نہیں ہیں ڈاکٹر صاحبہ۔"

"یہ بے وقوفی کی بات نہیں' قانونی تقاضا ہے بے وقوف۔" غالب نے کہا "اور قانون کا بہت احترام کرتی ہیں ڈاکٹر صاحبہ۔"

رکمنی نے چلا کے کہا "شٹ اپ۔ پلیز شٹ اپ! یہ کیا تم آپس میں بک بک کئے چلے جا رہے ہو۔ جو میں پوچھ رہی ہوں بس اس کا جواب دو۔ اگر تمہارے کہنے پر میں نے اسے علاج کے لئے داخل کر لیا تھا تو کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ جھوٹ اس نے بولا تھا یا تم نے بولا تھا۔ میں اگر اندازہ نہیں کر سکی کہ زخم مہلک ہے تو یہ میری نااہلی ہے یا غلطی۔ اسے کوئی میرا جرم نہیں بتا سکتا۔ سمجھے۔"

میں نے سر ہلایا "بالکل سمجھ گیا۔"

غالب نے کہا "تم سے پہلے تو میں سمجھ گیا تھا۔"

"خاک سمجھ گئے تھے۔ تم کیا زیادہ عقل مند ہو مجھ سے۔"

"ہاں۔ یہ تو سب ہی جانتے ہیں۔"

میں نے کہا "خود کو عقل مند کہنے والا سب سے بڑا بے وقوف ہوتا ہے۔"

رکمنی کا حوصلہ جواب دے گیا "یہ کیا مصیبت ہے۔ تم نے کیا تماشا شروع کر رکھا ہے۔ بند کرو اپنی بکواس اور مجھے سچ سچ بتاؤ کہ یہ کیا معاملہ ہے ورنہ میں پولیس کو بلاتی ہوں۔ تم کو اندازہ نہیں ہے کہ یہ کتنی سنگین صورتِ حال ہے۔ مجھے نہیں بتاؤ گے تو پولیس خود پوچھ لے گی تم سے۔"

"پولیس اور کیا پوچھے گی؟ جو ہمیں معلوم تھا وہ ہم نے آپ کو بھی بتادیا اور پولیس کو بھی بتادیں گے۔" میں نے گرم ہو کے کہا۔ "آپ کیا دھمکی دیتی ہیں ہمیں۔ ہم نے کون سا جُرم کیا ہے۔"

غالب نے کہا "ہاں۔ شہر سے باہر کسی ویران مقام پر کوئی بھی زخمی آدمی مدد کی درخواست کرے تو کیا گاڑی روک کے اسے ساتھ بٹھالینا جرم ہے؟ اسے علاج کے لئے ہسپتال لے جانا جُرم ہے؟"

میں نے کہا "ہسپتال میں وہ مر جائے تو کیا یہ ہمارا جرم سمجھا جائے گا؟ اور اگر اس کے پاس سیر بھر سونے کے زیورات تھے تو اس کو بھی ہمارا جُرم شمار کیا جائے گا؟"

کمار خاموشی سے سب کچھ سن رہا تھا لیکن کم پریشان نہ تھا۔ اب اس نے معاملات کو اپنے ہاتھ میں لینے کا فیصلہ کیا۔

"دیکھو، میں کل سے سب کچھ دیکھ رہا ہوں اور بہت سی باتیں ہیں جو میری سمجھ میں بھی نہیں آئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ تم نے اپنا حلیہ کیوں بدلا۔ ایک ہوٹل سے دوسرے ہوٹل میں شفٹ ہونے کا فیصلہ کیوں کیا؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔ وہ ہوٹل پسند نہیں آیا تھا ہمیں۔" میں نے کہا۔

کمار نے نفی میں سرہلایا "جب تم ملے تھے تو تمہارے حلئے ایسے نہیں تھے جیسے اس وقت نظر آرہے ہیں۔ تم جنگلوں میں بھٹکتے پھر رہے تھے اور تمہیں بال کٹوائے اور شیو بنوائے اتنا عرصہ ہو گیا تھا کہ تم جنگلی نظر آتے تھے۔ آخر کیوں؟ کیا مجبوری تھی؟ کس کا خوف تھا کہ تم اتنا عرصہ انسانوں کی دنیا سے دور رہے؟ میرا خیال ہے کہ تم مفرور تھے۔"

غالب بولا "تمہارا خیال غلط ہے۔ ہم مفرور نہیں مجبور تھے۔"

"اس کے بعد تم نے کہا کہ فرضی نام سے پاسپورٹ بنوا کے تمہیں ڈھاکا جانا ہے اور میں اس کام میں تمہاری مدد کروں۔"

رکمنی چلائی "راجو! ایسی بے وقوفی مت کرنا۔"

میں نے کہا "راجو ہم سے معاہدہ کر چکا ہے۔"

غالب بولا "اور ہم سے ایڈوانس بھی لے چکا ہے۔"

"ہم معاہدے کی خلاف ورزی برداشت نہیں کرتے" ...
سرہلایا "کوئی اور ہوتا تو ہم پتا نہیں کیا کرتے۔ لیکن تمہارا
راج کمار عرف راجو اچھا آدمی ہے اس لئے چھوڑتے ہیں۔

"مگر ہماری رقم واپس لاؤ۔" غالب نے کہا "یہ کام تو
آدھی قیمت میں کوئی بھی کردے گا۔ خود پولیس ہماری مد
گی۔"

رکمنی نے فون اٹھالیا "ٹھیک ہے۔ میں پولیس کو بلاتی
تم ان کے پیسے منہ پر مارو راجو۔"

میں نے فون پر ہاتھ رکھ دیا "ڈاکٹر صاحبہ کا غصہ بے
معلوم ہوتا ہے۔ میرا تو مشورہ ہے کہ آپ کسی چکر میں نہ پڑیں

"اسی لئے تو پولیس کو بلا رہی ہوں۔ میں انہیں سب بتا
گی۔"

"کیا وہ آپ کے سچ کو مان لیں گے؟" غالب نے کہا۔

"ان کے آنے سے پہلے ہم تو بھاگ جائیں گے
پکڑوائیں گی آپ؟ کون ہو گا آپ کے بیان کا گواہ؟" میں
"میری مانیں تو یہ سب اپنے پاس رکھیں۔ یہ زیور۔"

غالب نے کہا "کسی کو اس کے بارے میں کچھ بھی
نہیں۔ آپ بھی خاموش رہیں۔ ہم بھی چندو کو بھول جاتے

رکمنی کا غصہ ایک دم ٹھنڈا پڑ گیا "یہ...... میں رکھ لوں

"ہاں۔ کیا حرج ہے اس میں۔ سونے کا زیور ہے۔ خود
کریں۔ اپنی بھابی کو دیں۔ بری میں یا منہ دکھائی میں۔"

"آپ نے ایسا نہ کیا تو یہ سونا پولیس کے پاس چلا جا
وہ آپس میں تقسیم کرلیں گے" میں نے کہا "جس کا
بہرحال نہیں ملے گا۔ آپ نے یہ کسی سے چھینا نہیں، ما
یہ تو خدا کی دین ہے۔"

لالچ آدمی کی سب سے بڑی کمزوری ہے اور سونا تو وہ
جس میں ہر عورت بہ رضا و رغبت خود پھنس کے خوش ہو
رکمنی کی ساری مزاحمت یکلخت خوشی آمیز دلچسپی میں بدل
نے زیورات کو اٹھا کے دیکھا اور پھر رکھ دیا۔

"مجھے یہ بتادو، کیا وہ تمہارا ساتھی نہیں تھا؟ اور تم
ہو؟"

میں نے کہا "مس رکمنی! کیا ڈاکو اتنے احمق ہوتے
غنیمت کو بھی بھول جائیں؟ ہم ڈاکو ہوتے اور وہ ہمارا سا
کیا ہم یہ سونا آپ کو پیش کرتے؟ اس سے کہیں زیادہ آ
ہوتا کہ ہم آپ دونوں پر دو گولیاں خرچ کرتے اور چلے جا

غالب نے کہا "راج کمار! تم ہی سمجھاؤ اپنی بہن کو۔
کبھی ڈاکو نہیں دیکھے؟ ان کے بارے میں سنا اور پڑھا تو ہ
اتنے مہذب اور شریف لوگ ہوتے ہیں؟ کل سے تم
دیکھ رہے ہو۔"

راج کمار نے تذبذب کے ساتھ کہا "وہ تو ٹھیک ہے"

"مگر کیا؟ تم بھی شک کرتے ہو ہم پر تو لاؤ بیس ہزار واپس دو
بلالو پولیس کو۔ کل سے آج تک تم نے ہمارا ساتھ دیا ہے اور
ہاری بہن نے بھی۔ تمہارے تعاون کو پولیس اپنی نظر سے دیکھے
تو ہمارے ساتھ تمہیں بھی لپیٹ لے گی۔"

غالب نے راج کمار کی قوتِ مدافعت ختم ہوتی دیکھی تو کہا،
ل جب اخبار میں خبر آئے گی کہ ڈاکوؤں کی مدد کے الزام میں
ی ڈاکٹر اور اس کا بھائی گرفتار۔ مال مسروقہ برآمد....."

"میں کہتا ہوں چھوڑو ساری باتیں۔ ہمارے سوا کسی کو بھی
لوم نہیں کہ چندو یہاں آیا تھا۔ کہاں سے آیا تھا اور کیسے آیا
۔ وہ مر گیا تو اسے بھول جاؤ۔ ہم بھی سب کچھ بھول جاتے ہیں۔
میں ہم سب کا فائدہ ہے۔ کوئی کبھی تم پر شک نہیں کر سکتا اور
ی تم تک پہنچ ہی نہیں سکتا۔ یہ عقل مندی تو نہیں ہو گی کہ سیر بھر
ا پولیس کو بطور معاوضہ دیا جائے اور پھر وہ ہم سب کی کھال میں
س بھردیں۔ مال ہضم کر جائیں اور ہمیں رُسوا کر کے چھوڑ دیں۔
تو خیر یہاں سے چلے ہی جائیں گے۔ تمہارا مستقبل برباد ہو جائے
۔"

راج کمار نے سوچ کے کہا "شاید تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔"

رکمنی نے ایک گہری سانس لے کر کہا "میں انکل کو فون کرتی
ہے۔ وہ لاوارث لاش کسی کے حوالے کر دیں۔ مردہ خانے سے
ب کروادیں۔"

میں نے کہا "انکل کو نہیں اپنے ساجن کو فون کرو۔"

"ساجن نہیں۔ راجن" کمار بولا۔

"وہ ایک ہی بات ہے" میں نے کہا "ہم تمہیں کمار کہتے رہے
ں کہ تم راج کمار تھے۔"

"راج پاٹ نہیں تھا اس کے باوجود....." غالب بولا۔

"بہن تمہیں راجو کہتی ہے۔ کیا فرق پڑتا ہے اس سے؟
ن ہو یا ساجن۔ کیا کہا تھا کسی نے کہ گلاب کے پھول کو جس
ے چاہو پکارو وہ گلاب ہی رہے گا۔"

غالب بولا "جیسے کدو کو کچھ بھی کہو کدو ہی رہے گا۔"

رکمنی ہنسنے لگی "تم ایسی ہی باتیں کرتے ہو ہمیشہ؟"

"ہمیشہ؟ ساجن کی باتیں....."

"میرا مطلب تھا..... خیر۔ میں راجن کو کیا کہوں؟"

"اس سے کہو۔ بلکہ اسے حکم دو کہ اپنے ماما سے بات کرے۔
اور اسی وقت۔"

"ماما نہیں، وہ چاچا ہیں راجن کے۔"

میں نے کہا "ہاں ہاں وہی۔ راجن کا ماما یا ساجن کا چاچا۔ جو
وہ کرے گا وہی سول سرجن کرے گا۔"

"سول سرجن نہیں، پولیس سرجن۔"

میں نے سر پر ہاتھ پھیرا "بی بی تمہیں بھی عادت ہے بیچ میں
نے کی۔ پولیس سرجن چاچا سے جب ان کا بھتیجا کہے گا تو وہ اور

بات ہوگی اور چاچا کے لئے یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ وہ لاش کو انسانیت کی فلاح کے لئے وقف کردیں۔"

"انسانیت کی فلاح کے لئے؟" کمار دم بخود رہ گیا۔

"میرا مطلب یہ نہیں تھا کہ چندے میں دے دیں۔ بردھان منتری کے امدادی فنڈ میں۔ میڈیکل کے طلبا کو ریسرچ اور تجربات کے لئے لاش دینا بھی انسانیت کی خدمت ہے۔ وہ زہر اور اس کی نوعیت کے بارے میں جو کچھ معلوم کریں گے..."

نازو نے کہا "آپ مختصریات نہیں کر سکتے؟"

میں نے کہا "جہاں خط لکھنا ضروری ہو وہاں میں تار نہیں دیتا۔ الفاظ بچا کے کیا ملے گا؟"

"تھوڑا سا وقت۔ دوسرے کاموں کے لئے" نازو نے طنز سے کہا "اب ڈاکٹر رکمنی مان گئی ہیں تو باقی سب ان پر چھوڑ دو۔"

"یہ زیور سنبھال کے رکھیں۔ معلوم نہیں کون سی نیکی تھی جو آپ کے کام آئی۔ چندو کے مقدر میں نہیں تھا یہ سب۔ اور اگر نصیب کھوٹے ہوں تو کوشش سے کچھ نہیں ہوتا۔" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "کھرا بھی کھوٹا ہو جاتا ہے۔ ورنہ کھوٹے سکے بھی چل جاتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "تمہارا یہ خبطی بھائی اب شادی کر سکتا ہے۔ اپنا گھر بنوا سکتا ہے۔"

"یہ سونا میرا نہیں ہے۔" کمار نے احتجاج کیا۔

"اور کس کا ہے" رکمنی نے چمک کے کہا "تم ہی لائے تھے اسے۔ میں لینے نہیں گئی تھی۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"کیوں فرق نہیں پڑتا؟ تم لائے تھے، تم ہی لے جاؤ اور جو چاہو کرو" رکمنی کو بولنے کا موقع مل گیا۔

"مگر یہ تمہیں دئے ہیں انہوں نے....."

"یہ کون ہوتے ہیں پرایا مال کسی کو دینے والے؟" رکمنی نے کہا "ان کی چیز ہوتی تو اور بات تھی۔"

میں نے کہا "ہم تو ایسے ہی کرتے ہیں۔"

"کیا کرتے ہو؟" کمار بولا۔

میں نے کہا "حلوائی کی دکان پر نانا جی کی فاتحہ اور کیا۔"

کمار ہنس پڑا "تم عجیب لوگ ہو۔ میں تمہیں سمجھ نہیں سکا۔"

"آدمی اگر آدمی کو سمجھ لے تو دنیا کیا، عاقبت بھی سنور جائے اس کی" غالب بولا۔

میں نے کہا "خود اپنے آپ کو سمجھ لے تو....."

نازو نے بگڑ کے کہا "کیا مصیبت ہے! کب تک بولتے رہو گے یہ فلسفہ؟ اب چلو بھی یہاں سے۔"

رکمنی نے کہا "ایسے نہیں۔ آج کھانا میرے ساتھ کھاؤ۔"

میں نے کہا "نہیں۔ آپ ہمارے ساتھ کھائیں۔ ہمیں راجن عرف ساجن سے ملوائیں۔"

"کیوں نہ ہم انہیں بھی ساتھ لے چلیں؟" غالب نے کہا۔

وہ رکمنی جو کچھ دیر پہلے تشویش میں مبتلا تھی اور سخت فکرمند تھی، اب بے حد مسرور نظر آرہی تھی اور ہمارے، اس کے درمیان غیریت کا رشتہ، شکوک کی فضا اور بدخواہی کے جذبات سب اپنا وجود کھو چکے تھے۔ اس نے چہک کر کہا "ٹھیک ہے۔ مگر ایک مہمان اور ہوگا۔"

میں نے کہا "کون؟ علاقے کا تھانیدار۔"

"تھانیدارنی سمجھ لو" رکمنی مسکرائی "اس علاقے میں ایک ایسا عادی مجرم بھی ہے جسے اور کوئی قابو نہیں کرسکتا۔"

"اچھا۔ اتنا زبردست ہے کوئی؟" نازو بولی۔

غالب نے کہا "تم کیا سمجھتی ہو، بس تم ہی ایک چیز ہو۔ بڑی بڑی بلائیں پڑی ہیں دنیا میں۔ جو کسی کے پیچھے پڑ جائیں....."

"میں بلا ہوں؟" نازو نے چراغ پا ہوکے کہا۔

غالب نے ایک دم لہجہ نیازمندانہ کرلیا "قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو۔ ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے۔"

غالب کے دو الگ اشعار سے غالب نے جو مفہوم پیدا کیا وہ لاجواب تھا، جس نے نازو کو بھی لاجواب کردیا۔ ہم سب بڑے خوش گوار موڈ میں ایک ساتھ نکلے۔ اب کمار کی ٹیکسی کے پیچھے ڈاکٹر رکمنی کی گاڑی تھی جو ریل کا زنانہ ڈبا بن گئی تھی۔ ہم نے ایک جگہ سے راجن کو اٹھایا۔ پھر دوسری جگہ سے اس لڑکی کو ساتھ لیا جو کمار کے وعدہ فردا پر بڑی استقامت کے ساتھ زندگی سے پُرامید سمجھوتا کئے بیٹھی تھی۔ اس کا نام پارو تھا اور وہ تھی بھی بہت پیاری سی۔ جب ہم نے کمار کی طرف سے اسے یہ مژدہ سنایا کہ اس کا انتظار ختم ہوا تو اس کی آنکھیں خوشی کے آنسوؤں کو نہ روک سکیں۔ یہ اطلاع خود راجن کے لئے بھی اتنی ہی خوشی کا باعث بنی۔ آخرکار کمار نے ایک گھر خریدنے کا ارادہ کرلیا تھا اور یوں دو طرفہ ہجر کا عذاب تمام ہوا۔

وہ ایک خوب صورت دن تھا جب ہم نے جانتے بوجھتے اپنے آج اور کل کے سارے دکھوں کو بھلا دیا اور اپنے ان نئے دوستوں کے ساتھ ان کی خوشیوں میں بھرپور شرکت کی۔ ایک مدت کے بعد ہم خوب ہنسے، انہیں بھی ہنسایا اور ہنستے کھیلتے کلکتہ دیکھتے رہے۔ یہ ایک دن کی مستعار خوشی تھی۔ ہمارے اندیشہ ہائے دور و دراز کے بیاباں میں راحت کا ایک نخلستان جہاں ہم نے وقتی رشتوں کے خلوص کا سہارا لیا جو سفر کے اگلے مرحلے کی ضرورت تھا۔ جیسے طویل مسافتوں کے درمیان سیاح اپنی گاڑی کو سروس کراتے ہیں۔

ہم میں سے کسی نے چندو کو یاد نہیں کیا اور اس خیال سے دل افسردہ نہیں کیا کہ وہ اپنی منزل کا نشان پا کے کیوں مرا؟ اس کو مرنا تھا تو بہت پہلے مرجاتا۔ اپنی ماں کے خریداروں کو قتل کرکے یا اس مقدس رشتے کو بیچنے والے کی جان لے کر پھانسی چڑھ جاتا۔ یا خودکشی کرلیتا۔ زندگی میں مرنے کے لئے مواقع کی کمی نہ تھی لیکن وہ اس موقعے کی تلاش میں تھا جب وہ کلکتہ جا کے اپنی ماں کی تلاش کے مشن کو کامیاب بنا سکے۔ احمق! جب یہ موقع ملا تو گیا۔ کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور۔

چندو سے پہلے رامن مرگیا تھا۔ وہ بھی اپنی ماں کی خواہش پوری کرنے کے لئے تقدیر کے مہرباں ہونے کی دعا مگر یہ دعا قبول ہونے کا وقت آیا تو خود قضا سے جا ملا۔ رامن اور چندو۔ وقت کی مسافت پر بہت پیچھے رہ جانے وا استاد ٹیڈی اور میرے والد وزیر خاں۔ اور سفرِ آرزو کی را ہوجانے والی شہلا اور اس کا بیٹا۔ ان کے مقدر میں محرو موت کیوں تھی؟

میں نے یہ سب نہیں سوچا۔ میں نے مشرقی پاکستان کے اور اپنے مسائل کے بارے میں نہیں سوچا۔ ہاں مگر میں کو اس رات بہت یاد کیا۔ بالکل اسی طرح جیسے خاموشی نے محسن کو بہت یاد کیا۔ اس دن ہم دونوں ہی تنہا تھے اور اندر کی ویرانی کو اور خلا کو خوش گوار باتوں اور مجبوری کی نہیں بھر سکتے تھے۔ پھر بھی ہم نے سب کا ساتھ دیا۔

رات گئے ہم لوٹ آئے۔ راجن اور رکمنی ہم سے کہیں اور چلے گئے۔ کمار اپنی پارو کو چھوڑنے کے بہا چھوڑ گیا اور ہم دوسری ٹیکسی میں بیٹھ کے ہوٹل پہنچے۔ ہماری تصویریں اتروالی تھیں اور وعدہ کیا تھا کہ اگلے دن ہ پاسپورٹ مل جائیں گے۔ اس نے راجن کو اور پارو کو متعلق صرف یہ بتایا تھا کہ ہم دوست ہیں اور ہمیں ڈھاکا مگر ہمارے پاسپورٹ گم ہوگئے تھے۔ کلکتہ ائرپورٹ پر سامان میں سے ایک بریف کیس غائب ہوگیا تھا۔ انہوں جھوٹ سمجھا یا سچ، اس کی ہم نے پروا نہیں کی۔

ہوٹل کے کمرے میں پہنچ کے ہم نے روم سروس طلب کی۔ سب کی نیند اچانک روٹھ گئی تھی۔ مستعار خوش ختم ہوتے ہی سب پھر اداسی اور ڈیپریشن کا شکار ہو رہے نہیں چاہتا تھا کہ کوئی افسردہ کرنے والی بات کرے اور افسردہ کردے۔

میں نے کہا "آج کا دن اچھا گزر گیا۔ ہنستے کھیلتے۔"

غالب نے سرہلایا "اس لئے کہ ہم بے حس، خود فراریت پسند ہوگئے ہیں۔ حالات نے ہمیں ایسا بنادیا۔ اپنے آپ کو خوشی کا فریب دیتے ہیں۔ ورنہ آج ہمیں ر تھا۔ اس بدنصیب شاہزادے چندو کو جس کی لاش کا وا نہیں۔ غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا۔

نازو نے ٹھنڈی سانس لی "کس کس کو روئیں گے ہم"

میں نے کہا "ہاں۔ اتنے تو آنسو بھی نہیں ہوں پاس۔"

"بیچارا کتنے ارمان لے کر آیا تھا۔" گل نے سادگی۔

"جذباتی ہوگیا تھا" میں نے کہا "غیر جذباتی لوگ جہ

لئے گدھے کو باپ بنالیتے ہیں تو کیا وہ کسی کو ماں نہیں بنا سکتا کیا ضرورت تھی اس عورت کے لئے راج پاٹ کو لات مارنے جس کو کچے ہوئے بھی زمانہ ہوگیا۔"

غالب نے کہا "یہ رشتہ ہی ایسا تھا کہ عقل سے کام لینا اس لئے ناممکن ہوگیا تھا۔ محبت کی انتہا نفرت کے جذبات کو جنم دیتی ہے۔ رقابت پیدا کرتی ہے۔ انتقام کی آگ کو ہوا دیتی ہے۔ اس چھوٹے بڑے، پڑھے لکھے یا ان پڑھ کی تخصیص نہیں۔ دیکھ لو ندو نے اپنے باپ کو ماردیا۔ نفرت کی یہ انتہا اس کی ماں سے نتائی محبت کا شاخسانہ تھی۔"

نازو نے شرمندگی سے کہا "اور کتنے اطمینان سے ہم نے کہہ کہ اس کی لاش کو لاوارث قرار دے کر ٹھکانے لگوادو۔ کیا وہ وارث ہوتا ہے جس کے ہم جیسے دوست ہوں؟"

"وہ ہمارا دوست نہیں تھا" غالب نے کہا۔

"اس نے ہماری مدد کی تھی۔"

"ہم نے اس کو معاوضہ دیا تھا۔ دوستی کا معاوضہ نہیں ہوتا۔" لب نے کہا۔

گل نے اداس ہوکے کہا "کتنا ظلم ہے کہ ماں اس شہر میں بدر ہو رہی ہے اور اسے نہیں معلوم کہ اس کا کوئی بیٹا بھی ہے۔ اسے بھول نہیں سکا تھا اور اس کی تلاش میں کلکتہ تک آگیا ا۔"

"مگر اب اس کی لاوارث لاش مردہ خانے میں پڑی ہے۔ اش کوئی ایسا طریقہ ہوتا کہ ہم انہیں ملوا سکتے۔ کوئی ایسی طاقت تی ہمارے پاس" نازو نے بے بسی سے کہا۔

"یا کم سے کم اتنے بہادر ہوتے ہم کہ اس کی آخری رسوم ادا رسکتے۔ اسے عزت کے ساتھ رخصت کرتے۔ مگر ہم نے اپنی ن بچائی" میں نے کہا۔

"جان چھڑائی" غالب نے کہا۔

"بھائی سکندر! وہ سونا بڑا منحوس ہے۔ آپ نے دیکھا کہ اس ملکیت میں کتنی نحوست ہے" گل بولی۔

"ہاں۔ اگرچہ یہ سب تقدیر کے کھیل ہیں اور میں سمجھتا ہوں سب کچھ منجانب اللہ ہے" میں نے کہا "مگر جب میں اس جعلی کی موت کا منظر یاد کرتا ہوں۔ رامن کا تصور کرتا ہوں۔ اور چندو مرجانے کا سوچتا ہوں تو تمہاری بات بھی غلط نہیں لگتی۔"

"چلو اچھا ہوا اس سونے سے ہماری جان چھوٹی" گل نے نوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

"اللہ نے چاہا تو کل پاسپورٹ مل جائیں گے۔ پرسوں ہم ماں سے ضرور نکل جائیں گے۔" میں نے کہا "اور پرسوں ہی ھاکا پہنچ جائیں گے۔"

"اگر کمار نہ آیا؟" گل نے سوال کیا۔

"کیوں نہ آیا؟ کیا وہ بیس ہزار لے کر بھاگ جائے گا؟" غالب نے کہا۔

"آدمی کی نیت بدلتے کیا دیر لگتی ہے۔"

"پریشانی میں تمہیں ایسی باتیں سوجھ رہی ہیں گل۔ کمار ایسا آدمی نہیں ہے۔" میں نے کہا "پھر وہ بھاگ کے جا بھی کہاں سکتا ہے۔ اس کی بہن ہے یہاں اور پارو ہے۔ رشتوں کی یہ زنجیریں توڑنا اس کے بس کی بات نہیں۔"

"جاگتی رہوگی تو فضول خیالات دماغ میں آتے رہیں گے۔" غالب بولا "کہیں پاسپورٹ جعلی نہ ہوں۔ ہم پکڑے نہ جائیں۔ ڈھاکا پہنچنے سے پہلے ہی مارے نہ جائیں۔ کیا پتا محسن نہ ملے۔ واپس وطن جانے کے بجائے اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ راجِعُون نہ ہوجائیں۔ بابا جو ہونا ہے سو ہوتا ہے۔ اسے اپنی کوشش سے کون روک سکتا ہے۔ بہتر ہے کہ تم اچھی باتیں سوچتے ہوئے سوجاؤ تاکہ اچھے خواب آئیں۔ اور تم صبح مسکراتی ہوئی اٹھو" غالب نے کہا۔

میں نے اس سے اتفاق کیا "ہم سب کو انتشار پیدا کرنے والے خیالات سے دور رہنے کی شعوری کوشش کرنی چاہئے۔ اگر یہ خودفریبی ہے تو یوں ہی سہی۔"

"ہاں۔ حقیقت پسندی سے کیا ملا ہے اور کیا ملے گا۔ سوائے قنوطیت، مایوسی اور بددلی کے۔ بس خوش رہو کہ جو ہوگا سب اچھا ہی ہوگا" غالب نے کہا۔

"اور اچھا نہ ہوا پھر؟"

"پھر رولیں گے۔ ابھی تو سوسکتے ہیں۔ جاؤ، چلو اٹھو۔ نکلو یہاں سے۔ اپنے کمرے میں جاکے سوجاؤ۔ خبردار جو آپس میں کوئی رونے دھونے والی بات کی۔" غالب نے برہمی سے کہا۔

"اور ہم نہ جائیں تو دھکّے دے کر نکالوگے؟"

"نہیں۔ ہم خود چلے جائیں گے" غالب اٹھ کھڑا ہوا "اٹھو یار سکندر۔ اپنا دماغ خراب کرنے سے کچھ حاصل نہیں۔"

لیکن دوسرے کمرے میں آجانے کے بعد غالب نے سیدھا بستر کا رخ نہیں کیا اور لائٹ آف کرکے سونے کی کوشش نہیں کی۔ وہ کھلی کھڑکی سے کلکتہ کی رات کے اندھیرے میں نہ جانے کیا دیکھتا رہا۔ میں نے بیڈ پر لیٹ کر ایک سگریٹ جلائی اور دھوئیں کے مرغولوں میں وہی دیکھتا رہا جو غالب تاریکی میں دیکھ رہا تھا۔

کچھ دیر مجھے گل اور نازو کی آواز سنائی دی۔ پھر شاید وہ سو گئیں۔ میں نے دروازے سے باہر جا کے دیکھا، ان کے کمرے کی لائٹ دروازے کے نیچے نظر نہیں آرہی تھی۔

"کیا وہ سوگئی ہیں؟" غالب نے کہا۔

"ہاں۔ تم کیا دیکھ رہے ہو باہر؟"

غالب نے کہا "یار، وہ ہسپتال کہاں ہوگا، کس طرف ہوگا؟"

"کون سا ہسپتال، رکمنی کا؟"

"نہیں۔ جہاں چندو کی لاش پڑی ہے۔"

میں نے کہا "مجھے کیا معلوم۔ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

غالب نے کہا "یار، تم معلوم کرسکتے ہو۔ رکمنی سے پوچھ لو۔"

"بات کیا ہے؟"

"مجھے اپنی خود غرضی کی سوچ پر شرم آرہی ہے۔ آدمی کو اتنا بھی کمینہ نہیں ہونا چاہئے۔ ہم نے چندو کے لئے کچھ نہیں کیا۔ بالکل بے تعلق ہوگئے اس سے" غالب بولا۔

میں نے کہا "یہ خلش تو میرے دل میں بھی ہے کہ ہم نے اچھا نہیں کیا۔ اتنا ڈرنے کی ضرورت نہیں تھی۔"

"ہم اس کے کریا کرم کا بندوبست کرسکتے تھے۔"

"کریا کرم۔ وہ مسلمان تھا" میں نے کہا "کفن دفن کہو۔"

غالب بولا "یہ فرض ہم چکا سکتے ہیں سکندر۔ ابھی وقت ہے۔ چلو۔"

"اس وقت! کہاں چلیں؟"

"ہسپتال اور کہاں۔"

"ہوش کی دوا کرو مرزا۔ رات کے وقت ہم لاش لے کر کہاں جائیں گے۔ کیسے بندوبست کریں گے کفن دفن کا۔ ہمیں تو اس شہر کے سرپیر کا علم نہیں۔ خواہ مخواہ پھنس جائیں گے اگر لاش لے کر پھرتے رہے۔"

غالب نے نفی میں سرہلایا "ہم لاش نہیں لیں گے۔ کسی سے کہہ دیں گے کہ وہ ہماری طرف سے تجہیز و تکفین کرادے۔ ویسے تو بہت سے ادارے بھی یہ کام کرتے ہوں گے لیکن ہمیں ان کا پتا نہیں۔ کوئی مسلمان اسے نیکی کا کام سمجھ کے کردے گا۔"

"نیکی کا کام!" میں نے تلخی سے کہا "یہاں کیا ہندو اور کیا مسلمان، سب کا دھرم پیسہ ہے۔ سب پیسہ کماتے ہیں، ثواب کمانے کی کسی کو فرصت نہیں۔"

"تو ہم پیسہ دے سکتے ہیں۔ پیسہ لے کر کوئی بھی یہ کام کردے۔"

"وہ پیسہ رکھ لے گا اور کفن دفن کا خرچ لے کر لاش کو سمندر میں ڈال دے گا۔ میں تو ایک کروڑ انسانوں کو پیسے کی خاطر عزت، ایمان سب بیچ کر نوٹ گنتے دیکھ رہا ہوں۔ یہاں بھوک اور مفلسی نے رشتوں کو اور جذبات کو دو کوڑی کا کردیا ہے۔"

"مگر یار، سب لوگ ایک جیسے نہیں ہوتے۔"

"ہمیں اچھا آدمی کیسے ملے گا، کہاں ملے گا؟ پہچان کیا ہوگی اس کی؟" میں نے کہا۔

"تو بہت تلخ ہو رہا ہے بھائی۔ چل اٹھ۔ نیک نیتی کے ساتھ نکلیں گے تو نیک آدمی بھی مل جائے گا" غالب نے میرا ہاتھ پکڑ کے کھینچا۔ "یہ وقت نکل گیا تو..."

میں نے اس کی بات کاٹ دی "گل اور نازو کو بتادیں۔"

"کوئی ضرورت نہیں۔ انہیں سونے دو۔ دو تین گھنٹے کی تو بات ہے" غالب نے کہا "انہیں پتا بھی نہیں چلے گا اور ہم واپس آجائیں گے۔"

"اور پتا چل گیا تو؟"

"تو کیا قیامت آجائے گی۔ ہم بتادیں گے، کہاں گئے تھے۔"

میں نے آہستہ سے دروازہ مقفل کیا اور ہم دبے پاؤں کار... سے گزر کے زینہ اتر گئے۔ میں نے چابی کاؤنٹر پر دیتے ہوئے ... سے فون کی اجازت مانگی۔ اس نے ہال کے آخری حصے کی طر... اشارہ کیا جہاں شیشے کے پانچ کیبن نظر آرہے تھے۔ یہ سب پ... کال آفس تھے۔

نمبر ملتے ہی رکمنی نے فون اٹھالیا "کیا بات ہے راجن؟"

میں نے ہنس کے کہا "نہ میں راجن ہوں نہ ساجن۔"

اس نے کہا "اوہ۔ دراصل ابھی تو میں واپس آئی ہوں۔"

"اور آتے ہی اس کے فون کا انتظار کرنے بیٹھ گئیں۔"

وہ ہنسی "نہیں۔ میں سمجھی شاید..... خیر تم بتاؤ"

میں نے کہا "وہ.... مجھے پتا بتاؤ اس ہسپتال کا۔"

"کیوں؟" وہ چونکی "اس کی کیا ضرورت پڑ گئی؟"

میں نے کہا "کیا تم نے اپنے انکل سے کہہ دیا تھا کہ اس کو لاوارث قرار دے کر ٹھکانے لگادیں؟"

"ہاں۔ تم نے ہی کہا تھا۔ ابھی چند منٹ پہلے میری انکل ... بات ہوئی ہے" وہ بولی۔

"پھر تو ہم پہنچ جائیں گے" میں نے کہا "جلدی سے ... سمجھادو، ہسپتال کے اندر کا۔"

"آخر تم کیا کررہے ہو؟ مجھے بھی تو بتاؤ۔"

میں نے کہا "ہم اپنے دوست کی آخری رسوم میں خود ... نہیں ہوسکتے مگر یہ انتظام تو کرسکتے ہیں کہ کوئی اور یہ کام کر... معاوضہ جتنا مانگے گا ہم دیں گے۔"

"تمہاری مرضی" وہ کچھ دیر بعد بولی "بس مجھے کسی نئی ... میں مت ڈالنا۔ تم صبح کس وقت جاؤ گے؟"

"ہم ابھی اور اسی وقت جارہے ہیں۔"

"اس وقت! اس وقت کون سا ادارہ کھلا ہوگا، آدھی ... کے وقت یہ کام کون کرے گا؟"

میں نے کہا "اس کی فکر تم مت کرو۔ مُردہ خانے کا ... بتاؤ۔ اور یہ بتاؤ کہ وہاں کون ملے گا؟"

"وہی ہوگا۔ پاگل۔ ایک بڈھا ہے۔ وہیں مُردوں کے ... سوتا ہے" وہ بولی "چوبیس گھنٹے مردہ خانے میں رہتا ہے۔"

"گھربار نہیں ہے اس کا؟"

"اسی کو اپنا گھر کہتا ہے۔ مُردوں کو اپنا مہمان۔ تمی... سال ہوگئے ہیں اس بات کو۔ مگر اس کے دماغ پر ایسا اثر ہو... وہ مردہ خانے سے نکلتا ہی نہیں۔ وہ بڑا بدمعاش تھا جوانی ... بار جیل گیا۔ باہر نکلتا تھا تو پھر وہی چوری چکاری، مارپیٹ ... بار کسی نے پیٹ میں خنجر گھونپ کے آنتیں نکال دیں۔ ا... سمجھ کر مُردہ خانے میں پھینک دیا گیا۔ یہ وہاں مُردوں کے ... رہا۔ ہوش آیا تو اس کا دماغ الٹ گیا۔ شاک سے۔ ...

...کٹروں نے کوشش کی اور اسے بچالیا۔ حالاں کہ ڈاکٹر ہی اسے ...دہ قرار دے چکے تھے۔"

"پھر تو یہ کہو ناکہ خدا نے بچالیا۔"

"ہاں۔ یہ معجزہ ہی تھا کہ مُردہ زندہ ہوگیا۔ مگر اس دن کے بعد اپنی دنیا میں لوٹ کر نہیں گیا۔ رات کو مُردوں سے باتیں کرتا ...ہے۔ تم جا کے دیکھنا کیا تماشا ہے۔"

"تماشائے عبرت" میں نے کہا "کیا نام ہے اس کا؟"

"...صل نام تو خود اسے بھی یاد نہیں ہوگا۔ سب بدرُو کہتے ہیں۔ ...لے بدروح کہتے تھے، جو بعد میں بدرُو ہوگیا۔ بابا بدرو۔"

...پا سمجھ کے میں نے ریسیور رکھا اور ہم باہر نکل آئے۔ باہر کی ... بدستور آباد تھی اور رات کے سارے کاروبار جاری تھے۔ ایک ...ی نے ہمیں ہسپتال پہنچادیا جو کسی چھوٹے موٹے شہر سے کم نہ ... ہم پیدل پھرتے تو تلاش میں دو گھنٹے لگ جاتے۔ ٹیکسی ڈرائیور ... ہمیں عین مُردہ خانے کے گیٹ پر اتار دیا جو شعبۂ حادثات کے ...تھ ہی تھا۔

بابا بدرُو کو ہم نے مُردہ خانے کے باہر ہی دیکھ لیا۔ وہ ساٹھ ستر ...ں کا تندرست و توانا بوڑھا تھا جس کے لمبے جٹادھاری بال سفید ... اس کی داڑھی بھی سفید تھی اور بھویں تک سفید ہوگئی تھیں ... اس کا لباس سیاہ تھا۔ سر سے پیر تک ایک کالا چغہ۔

"آگیا۔ آگیا۔ ایک اور مہمان آگیا۔ خوش آمدید" اس نے ...ریچر سے ایک لاش کو اٹھالیا۔ لاش لانے والے اس کی بات پر نہیں مسکرائے۔ وہ اس پاگل بدروح کی باتوں کے عادی تھے۔

"ہاں بھئی، کیا نام ہے میاں تمہارا" وہ ہماری طرف متوجہ ...ئے بغیر مُردے سے مخاطب رہا "جان تو اچھی پائی ہے لیکن کیا ...رہ پہلوان۔ یہاں کون سی کشتی لڑو گے تم۔ میرے مہمان ہو تم ...کچھ نہیں۔ نہ پہلوان نہ داوا، نہ راجہ نہ بھکاری۔ کب تک ...وگے یہاں۔ گھڑی دو گھڑی۔ پھر ایسے جاؤ گے کہ لوٹ کے بدرُو ...پاس نہیں آؤ گے۔ لو۔ یہاں لیٹو مزے سے۔ کیسی ہے یہ جگہ۔ ...نگا فساد، نہ وہ دوڑ بھاگ لین دین کی۔ نہ چکر دنیاداری کے، نہ ...کے رشتے داری کے۔ یہ جو تمہارے ساتھ سو رہا ہے نا، یہ ابھی ...و دیر پہلے ہی تو آیا ہے۔ بھائی نے اس کی جھونپڑی پر قبضہ کرلیا۔ ...جورو پر۔ لیکن بچوں کو باہر نکال دیا۔ اس بیچارے کو کیسے معلوم ...ا۔ یہ تھا جیل میں۔ اور ہاں، مزے کی بات یہ کہ جیل اسی بھائی ... خاطر گیا تھا، اسے بچانے کے لئے۔ جب باہر آیا تو اپنا کچھ نہیں ... نہ بیوی، نہ بچے، نہ گھربار۔ بھائی سے جھگڑا ہوا..... وہ تھا ذرا ...۔ چلا ہوا تمہاری طرح۔ اس نے میرے پاس بھیج دیا اسے۔ ... یہ دوسری طرف جو لیٹا ہے نا۔ اس کو پولیس نے بھیجا ہے۔ ...۔ بڑا ضدی ہے بھئی۔ پولیس نے ایک ہفتہ اتنی کوشش کی کہ ...ی مان لے۔ بار بار وہی کہتا تھا کہ جب چوری کی نہیں تو کیسے ...ل۔ پاگل۔ مان جاتا۔ اپنے گھر میں رہتا۔ اب مجھ سے کوئی کہے بدرُو، مان لے کہ تُو کانا ہے۔ تو میں مان لوں گا بھئی۔ کانا تو نہیں ہوں نا میں۔ دیکھ لو۔ دونوں آنکھیں ٹھیک ہیں۔"

میں اور غالب مردہ خانے کے وسیع ہال میں کھڑے تھے۔ اندر لمبی لمبی بینچوں پر، میزوں پر اور زمین پر درجنوں لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ کچھ تازہ کچھ پرانی۔ کچھ ٹوٹی پھوٹی اور کچلی ہوئی۔ کچھ صحیح سالم۔ تازہ ترین لاش جس سے بدرو باتیں کررہا تھا، کسی ہٹے کٹے شخص کی تھی جس کے سینے پر خون کا داغ کسی گولی کے زخم کی نشاندہی کرتا تھا۔ بدرو واقعی ان سب کے درمیان بیٹھا ہوا ان سے یوں ہمکلام تھا جیسے وہ سب زندہ انسان ہوں۔ ابھی تک اس نے مجھے اور غالب کو درخور اعتنا نہیں سمجھا تھا۔

دروازہ کھلا اور ایک عورت روتی پیٹتی اندر آئی۔ اس کے پیچھے ایک مرد تھا جو اپنی مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا اور زیرلب بڑی رعونت سے مسکرا رہا تھا۔ یہ اسی شخص کی بیوی تھی جس کی عدم موجودگی میں اس نے بھائی سے شادی کرلی تھی اور یہ شخص وہی احسان فراموش تھا جس نے اپنے محسن بھائی کو مار کر اس کو گھربار سے بھی محروم کردیا تھا۔ غالباً انہوں نے اس قتل کے الزام سے خود کو بچالیا تھا اور پولیس سے مل کے اس قتل کو نامعلوم قاتلوں سے منسوب کرانے میں کامیاب رہے تھے۔ ان کا رونا پیٹنا اور ان کی جھوٹی اداکاری خود ان کا پول کھول رہی تھی۔ قانون کا سر شرم سے جھکا ہوا تھا۔ انصاف کی ترازو ٹوٹ گئی تھی۔ مگر دنیا میں وہ سب ہو رہا تھا جو پہلے نہیں ہوتا تھا۔ وہ بڑے بوڑھے پاگل تھے جو ہر ناقابلِ یقین برائی پر آسمان کی طرف منہ اٹھا کے کہتے تھے کہ یہ کلجگ ہے۔ قربِ قیامت کی نشانیاں ہیں۔ ہے کہاں روزِ مکافات اے خدائے داروگیر۔

جب خود کو بیوہ کرنے والی اور بھائی کا قاتل، لاش کو لے گئے تو بدرو کو ہمارا خیال آیا کہ ہم بہت دیر سے خاموش تماشائی بنے کھڑے ہیں۔

"ہاں بھئی، تم کون ہو؟ کس کو لینے آئے ہو؟"

میں نے کہا "بدرو چاچا....."

وہ چلانے لگا "ایسی کی تیسی تمہارے چاچا کی۔ مت رشتہ جوڑو مجھ سے۔ لعنت بھیجتا ہوں میں تمہارے سارے جھوٹے رشتوں پر۔ میں بدروح ہوں۔ بدکار نہیں۔"

میں نے کہا "بدرو! ہم بھی کسی کو لینے آئے تھے۔"

"کس کو؟ کسے بھیجا تھا تم نے میرے پاس؟" وہ بولا۔

"ہم نے تو نہیں بھیجا تھا۔"

"ہاں ہاں۔ تم لوگ بڑے بھولے ہو، بڑے معصوم ہو۔ تم نے خود نہیں بھیجا ہوگا، کسی کے ہاتھ بھجوایا ہوگا۔" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا "بولو کیا نام ہے اس کا؟"

"چندو۔" میں نے کہا "اس کے کندھے پر زہریلے تیر کا زخم ہے۔"

"اچھا اچھا۔ اِدھر آؤ۔ کس نے مارا تھا وہ تیر؟ تم نے یا تم نے؟" وہ میری اور غالب کی طرف دیکھ کے بولا اور پھر ہمیں جواب کا موقع دیئے بغیر چل پڑا۔

"ہم نے نہیں مارا تھا وہ تیر....."

"ارے چھوڑو۔ بدرو سب جانتا ہے۔ تیر کس کا ہے' ہاتھ کس کا اور نشانہ کس کا" اس نے میری بات کاٹ دی "یہ رہا تمہارا چندو۔ مگر..... اس کی پرچی پر نام تو ہے ہی نہیں۔ خیر اپن کو کیا۔ بہت سے مہمان آتے ہیں ایسے جن کا نام پتا ہی نہیں ہوتا۔"

میں نے لاش کے انگوٹھے سے بندھا ہوا کارڈ دیکھا جس پر چندو کے نام کا خانہ خالی تھا۔ صرف ایک نمبر کا اندراج تھا۔

"یہی ہے چندو" میں نے کہا۔

"اور تم کون ہو؟ میرے مہمان کو کیوں لے جانا چاہتے ہو؟ بولو۔ شرماؤ نہیں۔ رشتہ کیا تھا اس سے تمہارا؟"

میں نے کہا "رشتہ تو کوئی نہیں تھا۔ اور اگر تھا تو بس انسانیت کا۔"

وہ ہنسنے لگا۔ اس کی ہنسی بڑی عجیب تھی۔ پُرآسیب اور ڈراؤنی۔ "انسانیت! یہ کیا چیز ہوتی ہے؟ کہاں ملتی ہے؟ اس گھر کے باہر؟ چندو کے مہمان خانے میں تو چلتا ہے یہ رشتہ۔ دیکھو' یہاں سب انسان ہیں۔ صرف انسان۔ باہر کوئی ہندو تھا کوئی مسلمان' کوئی برہمن کوئی اچھوت۔ کوئی مال دار' کوئی غریب۔ کوئی چاچا ماما اور کوئی باپ بیٹا۔ یہاں سب ایک ہیں۔"

DEATH THE LEVELLER۔ تیری سرکار میں پہنچے تو سب ہی ایک ہوئے۔ بندہ صاحب و محتاج و غنی۔

بدرو نے کہا "بھئی اپنا رشتہ بتاؤ۔ کیا ہو تم اس کے؟ بھائی؟ دوست؟ پڑوسی؟ نام بتاؤ۔ رشتے کا لیبل لگاؤ۔ اجازت نامہ بنواؤ اور لے جاؤ۔ مجھے کیا" بدرو نے بڑبڑاتے ہوئے کہا "جاؤ ادھر ہے دفتر۔ باہر۔"

وہ چندو سے مخاطب ہوگیا۔ "اونہہ۔ آجاتے ہیں پتا نہیں کہاں سے۔ انسانیت کا رشتہ ہے۔ بدرو کو بے وقوف سمجھ رکھا ہے۔ یار' تُو میرا مہمان ہے۔ بالکل فکر مت کر۔ کس کی مجال ہے کہ تجھے زبردستی لے جائے۔ زبردستی یہاں بھیج تو سکتا ہے ہر کوئی لیکن ایسے لے جا نہیں سکتا کوئی سالا تجھے بیچنے کے لئے۔ مجھے پتا ہے ان سب کا۔ یہ چور ہیں۔ میرے گھر میں بھی چوری کرتے ہیں۔"

میں نے بڑی مشکل سے کہا "بدرو! نہ ہم اس کو چُرانا چاہتے ہیں' نہ ساتھ لے جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ تم بات تو سن لو ہماری۔"

"بولو' کیا کہنا ہے۔" اس نے ایک لاش کے بکھرے ہوئے بال سنوارتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا "چندو کا کوئی وارث نہیں ہے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" وہ پھر ہنسنے لگا "صاف کہو نا کہ کوئی وارث بننا نہیں چاہتا۔ سب نے رشتہ توڑ لیا ہے اس سے۔"

میں نے کہا "اچھا یہی سمجھ لو۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس کے دفن کا انتظام ہو جائے۔ اس کی لاش کو لاوارث سمجھ کے ٹھیکیدار کے حوالے نہ کیا جائے۔ فروخت نہ کیا جائے۔"

وہ پھر چلّانے لگا۔ "تم تو پاگل ہو۔ یہاں کس کی اجازت سے آئے ہو؟ نکل جاؤ۔ میرے مہمانوں کو میرے گھر میں بے عزت کرتے ہو۔"

غالب نے مجھے پیچھے سے کھینچا "اس سے بات کرنا بیکار ہے۔"

میں نے کہا "کیوں؟"

"یہ نہیں سمجھے گا ہماری بات۔ اور سمجھ گیا تو ٹال دے گا" غالب بولا "اس کے لئے ڈاکٹر آن ڈیوٹی سے بات کرنی پڑے گی۔ اس کی اجازت کے بغیر کچھ نہیں ہوگا۔"

میں نے کہا "وہ پہلے شناخت مانگے گا۔"

غالب نے کہا "باہر چل کے کسی اور سے بات کرتے ہیں۔"

میں اور غالب شکست خوردہ اور رذیل خود اپنی نظر میں باہر آگئے۔ ایک لاش اور آگئی۔ بدرو نے ایک اور مہمان وصول کرلیا۔ وہ ہماری طرف دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔ رات کا اندھیرا اور اس کے مہمان خانے میں اس وقت بھی لوگ آرہے جارہے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ مسئلہ کیسے حل ہو۔

اچانک ایک کبڑا سا شخص لاٹھی کے سہارے آیا ہوا اندر چلا گیا۔ جب وہ میرے قریب سے گزرا تو میں نے آواز سنی "ایسا ظلم نہ کرنا مجھ پر میرے مولا۔ باری مت میری ہے" اس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو اس کی داڑھی تر کر رہے تھے "تو بڑا رحیم و کریم ہے۔ اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔"

غالب نے کہا "یہ مسلمان ہے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ پتا نہیں اس پر کیا اُفتاد آئی۔ کیا کہہ رہا تھا یہ۔ میری سمجھ میں تو آئی نہیں اس کی بات۔"

"باری مت بھولنا کہ میری ہے" غالب نے کہا "کیا ہوا اس کا؟ پہلے یہ خود مرنا چاہتا تھا۔ کسی اور کی جگہ۔"

"اپنی آرزو کر رہا تھا بیچارا۔ ورنہ موت باری باری آتی ہے۔ کہ جو دنیا میں پہلے آیا ہے وہ پہلے جائے گا۔"

غالب نے کہا "ممکن ہے' اپنے بیٹے کے لئے ایسا چاہتا ہو۔ باپ چاہتا ہے کہ پہلے اسے موت آئے۔"

کبڑا بڈھا باہر آیا تو اس کے چہرے پر خوشی' طمانیت اور شکر گزاری کے جذبات سے بھرپور مسکراہٹ تھی۔ "پروردگار' ہزار بار شکر ہے تیرا۔ کوئی اور تھا وہ۔ تو نے سن لی۔ میرے بیٹے کو بخش دیا۔ شکر ہے تیرا میرے معبود"

میں نے آگے بڑھ کے پوچھا "چچا میاں! خیریت ہے؟"

وہ چونکے "ہاں..... اللہ کا ہزار شکر ہے۔ سب کچھ بھی نہیں ہوا میرے اکبر کو۔ اللہ اکبر..... اللہ اکبر۔"

میں نے کہا "کیا اکبر کے بارے میں..... خدانخواستہ۔"

"ہاں بیٹا..... پتا نہیں کس نے ایسی منحوس بات کی۔ کون تھا وہ بدخواہ میرا اور میرے بیٹے اکبر کا بھلا کون دشمن ہو سکتا ہے؟ کوئی بھی تو نہیں۔ پھر کسی نے مذاق کیا ہوگا۔ مگر نہیں۔ ایسا بے ہودہ مذاق بھلا میرے ساتھ کون کرے گا۔ میرا ہارٹ فیل ہو جاتا پھر؟"

وہ میرے سوال کا جواب دینے کے بعد خود سے ہم کلام ہو گیا تھا مگر اسے احساس نہ تھا۔ وہ بہت خوش تھا کہ مرنے والا اس کا بیٹا نہیں کوئی اور تھا۔

اچانک اس نے آنکھوں پر ہاتھ کا چھجا سا بنا کے کہا "تم..... کون ہو؟ اکبر کے دوست۔ میں اس کے سب دوستوں کو جانتا ہوں۔ ضرور کسی کو غلط فہمی ہوئی۔ وہ لڑکا' جو اندر لیٹا ہوا ہے' اکبر سے ملتا جلتا ہے مگر اکبر نہیں ہے۔ تم بھی دیکھ لو جا کے۔"

میں نے کہا "چچا میاں! اللہ آپ کے بیٹے کو سلامت رکھے۔ ہمارا نہ آپ سے کوئی تعلق ہے نہ اکبر سے۔ ہم اجنبی ہیں یہاں۔"

"مسلمان ہو۔ الحمد للہ۔" وہ بولا۔

میں نے سر ہلایا "الحمد للہ۔ اور مسلمان ہونے کے ناتے آپ سے ایک درخواست ہے۔"

"کیا' بولو۔"

"اللہ نے آپ کے اکبر کو بچا لیا' آپ کی دُعا سن لی۔ اس کے صدقے میں آپ ایک مسلمان کی لاش کو کفن دے سکتے ہیں؟"

"کیا؟ کس کی لاش.....؟" وہ چونک کر بولا۔

میں نے کہا "ایک لاوارث لاش پڑی ہے اندر۔ اس کا نام نہیں لکھا ہوا ہے۔ پرچی پر صرف نمبر ہے۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ اس کا نام چاند خاں تھا۔"

"چندو کہتے تھے سب" غالب نے میری تائید کی۔

"آپ اس کی تجہیز و تکفین کرا دیں۔ اپنی نگرانی میں۔ وہ بھی کسی کا اکبر تھا۔ اب اس کا کوئی وارث نہیں۔ یہاں جو گدھ بیٹھے ہیں وہ اس کی لاش کو لاوارث قرار دے کر بیچنا چاہتے ہیں۔"

"لاش کو بیچنا چاہتے ہیں؟" وہ خوف زدہ ہو کے بے یقینی سے بولا "کفن چور تو سنے تھے۔ یہ لاشوں کے سوداگر کہاں سے آگئے؟ کون خریدتا ہے ان سے لاشیں؟"

میں نے کہا "جو ضرورت مند ہوتے ہیں۔ چیر پھاڑ کرنے والے میڈیکل کے طالب علم۔ آپ اسے بچا سکتے ہیں۔ اس کو کفن دے کر مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرا دیں۔ اپنے اکبر کی زندگی کا صدقہ سمجھ کے یہ نیکی کما لیں۔ اخراجات ہمارے۔ یہ لیجئے ایک ہزار۔"

اس نے ایک دم ہاتھ پیچھے کرلیا "لاحول ولا قوۃ۔ رکھو یہ ہزار روپے اپنے پاس۔ اکبر کا واسطہ بھی دیتے ہو' نیکی اور صدقے کی بات کرتے ہو اور کفن کے پیسے دیتے ہو۔ شرم نہیں آتی تمہیں؟ تم خود کیوں نہیں کرتے یہ کام؟"

میں نے کہا "ہم ضرور کرتے لیکن بدقسمتی ہے ہماری کہ ہم اسی وقت جا رہے ہیں واپس' دہلی۔ ہم سامنے نہیں آسکتے۔"

"لاش کو اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتے" غالب بولا۔

وہ سوچ میں پڑ گئے "اب میں کس منہ سے انکار کروں۔ میاں' میرے بڑھاپے پر رحم کرو۔ مجھے سچ بتا دو کہ کہیں یہ معاملہ میرے گلے تو نہیں پڑ جائے گا۔ یہ نیکی مہنگی تو نہیں پڑے گی مجھے۔"

میں نے کہا "ہم حلف اٹھا کے کہہ سکتے ہیں کہ آپ پر آنچ نہیں آئے گی۔"

"اللہ مالک ہے" وہ بولے "میں کروں گا یہ کام۔"

"پھر ہم جائیں؟" میں نے کہا "مطمئن ہو کے۔"

"جاؤ میاں جاؤ۔ تم جو بھی ہو' جھوٹ بول رہے ہو یا سچ اور چندو یا چاند خاں سے تمہارا کوئی رشتہ تعلق ہے یا نہیں۔ اب وہ میری ذمے داری ہے۔ کسی لاش کو کفن اور دو گز زمین دینا کوئی جُرم نہیں ہو سکتا۔ یہ اکبر کی زندگی کا صدقہ ہے تو میں اس نیکی سے ہاتھ نہیں کھینچ سکتا" انہوں نے کہا اور واپس ہو گئے۔

"آؤ مرزا' ہم بھی چلیں" میں نے آہ بھر کے کہا "ہمارا کام ہو گیا۔ اللہ نے ایک فرشتے کو بھیج دیا۔"

"دنیا میں نہیں جن کا کوئی اُن کا خدا ہے۔ یہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔" غالب نے کہا "چندو کیسے جان سکتا تھا کہ اسے مٹی دینے والے ہاتھ کس کے ہوں گے۔ اکبر کے باپ کو غلط اطلاع دینے والا کیسے جان سکتا تھا کہ اس طرح وہ دستِ قدرت کے حسنِ انتظام میں شریک ہو رہا ہے۔ اکبر کا باپ کیسے جان سکتا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کی لاش کو نہیں' کسی اور کے بیٹے کو دفنائے گا۔ اللہ نے اس کی دُعا شاید اسی لئے قبول کی تھی۔"

میں نے اس کبڑے بڈھے کو آفس میں داخل ہوتے اور پھر ایک بیزار صورت ڈاکٹر کے ساتھ باہر آتے دیکھا۔ وہ مُردہ خانے میں گئے اور دس منٹ بعد چندو کی لاش اسٹریچر پر باہر آئی۔ بدرو اس کے پیچھے تھا۔

"جاؤ بھئی' اپنے مہمان خانے میں تمہارا اتنا ہی قیام تھا۔" بدرو نے چندو کو مخاطب کر کے کہا "لو۔ تمہاری جگہ لینے والا آگیا۔"

بدرو نے ایک اور مہمان کو وصول کیا اور اسے اندر لے گیا۔ چندو کی لاش ایک ایمبولینس میں رکھی گئی اور ایمبولینس روانہ ہو گئی۔ غالباً بڑے میاں پر کسی نے شک نہیں کیا تھا کہ وہ دھوکے سے کوئی لاش لے جا سکتے ہیں۔ ان سے شناخت مانگے بغیر چندو کی لاش ان کے حوالے کر دی گئی تھی جس کا کوئی والی وارث ابھی تک نہیں آیا تھا۔ بڑے میاں صورت سے نہ لاشوں کے سوداگر لگتے تھے اور نہ دھوکے باز۔ کوئی شریف آدمی بھلا پرائی لاش کیوں لے جائے گا۔ اسی بھروسے میں ڈاکٹر نے ان کے کہنے کو تسلیم کر لیا تھا۔

انہوں نے چندو کو کیا بتایا تھا؟ اپنا بیٹا' بھانجا' بھتیجا یا کچھ اور۔ اگر انہوں نے جھوٹ بھی بولا تھا تو یہ سچ سے زیادہ ثواب رکھتا تھا۔

میں اور غالب چھپ کے سب کچھ دیکھتے رہے تھے۔ جب ایمبولینس چلی گئی تو ہم آہستہ آہستہ واپسی کے راستے پر چلنے لگے۔ مُردہ خانے کا نظارہ ویسے بھی انتہائی عبرت ناک ہوتا ہے۔ بدروح عرف بدرُو کی باتوں نے اور اکبر کے باپ کے رویّے نے ہمیں زیادہ دکھی اور شرمسار کر دیا تھا۔ آدمی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب۔ موت کیا ہے انہی اجزا کا پریشان ہونا۔ ہم زندگی کے عناصر میں ترتیب کے باعث اپنے قدموں پر چل رہے تھے چندو کسی نامعلوم مدفن کی جانب جا رہا تھا۔ مٹی صرف مٹی ہے۔ آدمی کا جسم کس مٹی میں ملتا ہے' اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ چندو کی ماں کا بھی کیا پتا' وہ کس مٹی میں ملی۔

میں اپنے ذہن کے پراگندہ خیالوں میں اس درجہ محو تھا کہ جب غالب نے میرا ہاتھ پکڑ کے کھینچا اور میں نے کسی گاڑی کے زبردست بریک لگانے کی آواز سنی تو مجھے احساس ہوا کہ میں اِدھر اُدھر دیکھے بغیر سڑک پار کر رہا تھا۔ عین شعبۂ حادثات کے سامنے میں حادثے کا شکار ہونے والا تھا۔

کسی نے گالی دے کر کہا "اندھا۔ سالا۔"

غالب نے کہا "بھائی صاحب! آپ بدرو کے مہمان بننے کا ارادہ رکھتے ہیں کیا؟"

مجھے جھرجھری آگئی۔ زندگی کیسے ہر قدم پر سبق دیتی ہے۔ وہ ایک لمحے کی بات تھی جب میں نے موت کو چشمِ تصور سے دیکھا۔ میں بدرو کا مہمان تھا۔ میرا جسم اسی طرح پڑا ہوا تھا جیسے چندو کا۔ غالب رو رہا تھا' گل اور نازو کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ہم رات کو انہیں کچھ بتائے بغیر کیوں نکلے تھے اور یہ حادثہ کیسے پیش آیا تھا۔ ایم آر ایس کا خاتمہ۔ اب کوئی اور کرے پرورشِ گلشنِ غم۔ محسن کو خبر دو اور بتاؤ رابعہ کو۔ دیوانہ مر گیا آخر تو ویرانے پہ کیا گزری۔

ٹیکسی میں بیٹھ کر میں نے ایک لمبی سانس لی اور تین بار آیت الکرسی پڑھی۔ خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے میرے ذہن میں اس کبڑے کی آواز گونجتی رہی۔ تیرا شکر ہے۔ ہزار بار شکر ہے میرے معبود۔ اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ میں زندہ ہوں اور زندہ ہونا کتنی بڑی نعمت ہے۔

رات کے تین بجے ہم واپس ہوٹل پہنچے۔ گل اور نازو کے کمرے کی لائٹ آف تھی۔ وہ سو رہی تھیں۔ انہیں کچھ پتا نہیں چلا تھا کہ ہم سونے کے بجائے بدرو کے مہمان خانے چلے گئے تھے اور تین گھنٹے میں زندگی اور موت کے اس کھیل کے چند مناظر دیکھ آئے تھے جو ہر جگہ ہر گھڑی جاری رہتا ہے مگر ہماری نظر اسے دیکھ نہیں پاتی۔

واپس آ کے میں بہت اطمینان محسوس کر رہا تھا۔ میرے دل سے خلش آزار مٹ گئی تھی اور شاید کچھ ایسی ہی کیفیت غالب کی تھی۔ ہم دونوں جو پڑ کے سوئے تو صبح نو بجے دروازے پر دستک کے جاگے۔

میں نے اٹھ کے دروازہ کھولا تو گل اور نازو کو اپنے مقابل دیکھا کہ بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ نہا دھو کے کپڑے بدل چکی تھیں۔ تھوڑے سے میک اَپ نے ان کے اندازِ حسن میں ایک نظر حسن آفرینی اور عشوہ گری کا جادو جگا دیا تھا۔ کچھ رنگ پیراہن جلوہ سامانی تھی لیکن ان کے روپ میں یہ نکھار سکون اور آرام وقفے کا نتیجہ بھی تھا۔ دو دن وہ ہر قسم کے جسمانی اور اعصابی سے آزاد رہی تھیں اور انہیں گھومنے پھرنے' ہنسنے بولنے کا موقع ملا تھا۔

نازو نے اندر آ کے کہا "ایسی بھی کیا نیند۔"

میں نے کہا "تمہیں کیا معلوم رات ہم کتنی دیر سے سوئے تھے۔"

"ہم سے تو پہلے ہی سو گئے تھے" نازو بولی۔

غالب نے کمبل سے سر نکال کے کہا "تمہیں کیا معلوم۔"

"معلوم کیوں نہیں۔ ساڑھے بارہ بجے بھی دروازہ بجایا مجال ہے جو کسی کے کان پر جوں بھی رینگی ہو" نازو نے غالب کا کمبل کھینچ کر دور پھینک دیا۔

"ساڑھے بارہ بجے؟" غالب نے میری طرف دیکھا اور بیٹھا "آخر پریشانی کیا تھی؟"

گل ہنسنے لگی۔ پھر نازو بھی ہنسنے لگی۔ ہم احمقوں کی طرح صورتیں دیکھتے رہے اور منتظر رہے کہ وہ ہمیں کچھ بتائیں۔

"کچھ پتا بھی چلے کہ بات کیا ہے" غالب نے کہا "تاکہ فیصلہ کریں کہ ہنسنا چاہئے یا رونا چاہئے تمہاری عقل پر۔"

"رات ایک بھوت آ گیا تھا" گل نے کہا۔

غالب نے قہقہہ مارا "بھوت۔ ارے یار' وہ میرا سسر کمرے بدل گئے تھے نا ہمارے۔ وہ ادھر پہنچ گیا۔"

نازو نے بگڑ کے کہا "کوئی بھوت وغیرہ نہیں تھا۔"

"تمہیں معلوم ہے بھوت کیسا ہوتا ہے جو مجھ سے پوچھ رہی ہے؟"

"کیسا ہوتا ہے؟" نازو تنک کر بولی۔

"میں ایک خاتون کو جانتا ہوں لیکن نام نہیں لے سکتا۔ ان کے والد کی شبیہ" غالب نے کہا "وہی ناک نقشہ....."

نازو آگے بڑھی "ابھی بتاتی ہوں ناک نقشہ بگاڑ کے۔ بھوت نظر آؤ گے۔"

میں نے اسے روک لیا "یہ کیا صبح صبح نہ سلام دُعا نہ آداب۔ لڑائی سے دن کا آغاز ہوگا تو سارا دن لڑائی میں گزرے گا۔ یہ بتاؤ ساڑھے بارہ بجے رات کو کیا ہوا تھا آخر؟"

گل نے کہا "کچھ بھی نہیں سکندر بھائی۔ وہ..... ہماری کھڑکی پر کوئی دستک دیتا تھا۔ جھانک کے دیکھتا تھا اور پھر چھپ جاتا تھا۔"

"تمہارا کیا خیال ہے' وہ ہم تھے؟" غالب نے کہا۔

"وہ..... کچھ بھی نہیں تھا۔ ہم نے واپس آ کے دیکھا اور نازو نے ہمت سے کام لے کر اسے ڈانٹا۔ کہ کون بدتمیز ہے۔ شامت آئی ہے کیا۔ کیا دیکھ رہے ہو چھپ چھپ کے۔ خواتین کے بیڈروم میں جھانکتے ہو۔ پولیس کے حوالے کر دوں گی۔ گولی مار دوں گی۔ ہاتھ پیر توڑ کے نیچے پھینک دوں گی۔"

ایک بار پھر ان پر ہنسی کا دورہ پڑا۔ ہنستے ہنستے دونوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"پھر اس بدمعاش نے کوئی جواب دیا؟" غالب بولا "کون تھا آخر وہ؟ اور اتنی لمبی تقریر کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ ایسے لوگوں کو گولی مار دینی چاہئے۔ فوراً۔"

"کوئی ہوتا تو گولی مارتی نا" نازو نے ہنستے ہوئے کہا "وہ تو شاخ تھی کسی درخت کی جو کھڑکی پر جھک آئی تھی اور ہوا سے جھول رہی تھی۔ روشنی اس کے پیچھے تھی چناں چہ بار بار اس کا سایہ پڑتا تھا۔"

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ان پر ہوٹل سے ہمارے تین گھنٹے غائب رہنے کا راز افشا نہیں ہوا۔

"ہم تو صبح تین بجے تک جاگتے رہے" غالب بولا۔

"کیوں۔ پیٹ میں درد تھا' مروڑ اٹھ رہے تھے؟" نازو نے کہا۔

"آہ۔ یہ مت پوچھو" غالب نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا' کباب سیخ تھے اور کروٹیں ہر سُو بدلتے تھے۔ جو جل اٹھتا تھا یہ پہلو وہ پہلو بدلتے تھے۔ کیسا شعر ہے؟"

"اچھا ہے۔ جب واپس جا کے کباب کی ریڑھی لگاؤ تو اس پر لکھوا لینا" نازو نے کہا۔

"نادان لڑکی' ہم صحافی ہیں۔ واپس جا کے پھر میدانِ صحافت میں دھوم مچائیں گے۔ ذرا ہم پٹڑی سے اتر گئے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ صحافت چھوڑ دی۔ وہ تو اپنے خون میں ہے۔ یہ محبت اپنے دل میں ہے" غالب نے یوں کہا کہ نازو کا رنگ گلابی ہو گیا۔ اس کے لب مسکرانے لگے اور آنکھیں اعترافِ محبت میں جھک گئیں۔ غالب نے اس کا نام نہیں لیا تھا مگر نازو نے یہ سنا کہ نازو۔ محبت تم ہو اور تم ہی میرے دل میں ہو۔ دل کی ہر دھڑکن میں ہو۔

ہم غسل سے فارغ ہوئے تو دس بجے تھے۔ میں نے روم سروس سے ناشتا طلب کیا۔ باتوں باتوں میں چندو کا ذکر بھی آیا۔ گل اور نازو اس کے لئے بہت جذباتی ہو رہی تھیں۔ میں اور غالب اس موضوع پر اظہارِ خیال سے گریز کرتے رہے۔ ہمیں کوئی کام نہیں تھا سوائے کمار کا انتظار کرنے کے۔ کمار نے کہا تھا کہ وہ خود ہمارے پاسپورٹ لے کر آئے گا۔ کمار نے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ کس وقت آئے گا چناں چہ ہم ہوٹل میں اس کا انتظار کرنے پر مجبور تھے۔

دوپہر گزر گئی۔ لنچ کا وقفہ ختم ہو گیا۔ ہم باتیں کرتے رہے۔ گزرے ہوئے وقت کی اور آنے والے وقت کی۔ حالات کی جو اچانک بدل گئے تھے اور ہماری توقعات کی شکست کا سبب بنے تھے۔ سب کا خیال یہی تھا کہ کمار آیا تو دوپہر کے بعد آئے گا۔ ہوٹل کی طرف سے انگریزی کا ایک اخبار فراہم کیا گیا تھا۔ اس کی تمام خبریں مشرقی پاکستان کے سیاسی انقلاب کے تذکروں سے بھری پڑی تھیں۔ ہمارے لئے ان خبروں میں صرف فرسٹریشن تھی۔

غالب نے غصے میں اخبار ایک طرف پھینک دیا "کل سے میں اخبار کی شکل نہیں دیکھوں گا۔"

میں نے کہا "اس سے کیا ہوگا؟ اخبار بند ہو جائے گا؟"

"میں بے خبر رہنا چاہتا ہوں۔ ریڈیو ٹی وی سے بھی کوئی خبر نہیں سنوں گا۔" غالب نے کمرے میں چکر لگاتے ہوئے کہا۔

"ریڈیو اور ٹی وی اسٹیشن ہی بند کرا دو" نازو نے کہا۔

"بھاڑ میں جائیں سب۔ نہیں چاہئے مجھے کوئی خبر۔ سکون چاہئے مجھے۔ ذہنی پریشانی کے سوا کیا ملتا ہے خبروں سے۔ خون جلتا ہے میرا اور بلڈ پریشر بڑھتا ہے۔ وہ اَن پڑھ مزدور فائدے میں ہے جو سارا دن بوجھ ڈھوتا ہے اور شام کو چار روٹیاں کھا کے بے خبر سو جاتا ہے۔ وہ کسان اچھا ہے جو صرف ہل چلاتا ہے۔ خبر رکھتا ہے تو صرف اپنے بیلوں کی' فصل کی اور موسم کی۔ روس' امریکا' ہندوستان' پاکستان۔ سیاست معیشت کچھ نہیں جاننا۔ ہمیں بھی کیا ضرورت ہے جاننے کی۔ کیا کر لیں گے ہم اگر حقیقت جان لی تب بھی۔ ہوا کا رخ بدل سکتے ہیں ہم۔"

"میں بدل سکتی ہوں" نازو بولی "یہ دیکھو۔"

اس نے کھڑکی کے ایک پٹ کو تھوڑا سا کھولا۔ ساحل کی طرف سے آنے والی ہوا میرے چہرے سے ٹکرائی۔ اس نے پٹ کو اور کھولا۔ ہوا سے اخبار اُڑنے لگا۔

"تم سب کچھ کر سکتی ہو۔ بھوت کی بچّی" غالب ہنس پڑا۔

گل نے کہا "کمار کیوں نہیں آیا ابھی تک؟"

میں نے کہا "آ جائے گا۔ چار پاسپورٹ بنوانے تھے۔ آفس شاید چار بجے تک کھلے رہتے ہیں۔"

غالب نے کہا "یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کام میں دیر لگ جائے۔ غیر قانونی کام ایسے ہی ہوتے ہیں۔"

"اتنا پیسہ کس لئے خرچ کر رہے ہیں ہم۔"

"بعض اوقات پیسہ بھی دغا دے جاتا ہے۔ پیسے سے اتنی زیادہ توقعات وابستہ مت کرو۔" غالب لڑنے کے موڈ میں تھا۔ "ہر آدمی خریدا نہیں جا سکتا۔ کیا پتا' کمار کا واسطہ پڑ جائے کسی ایماندار آدمی سے۔ وہ کمار کو اندر کرا دے۔"

گل کا چہرہ اتر گیا "اس کا مطلب ہے....."

میں نے کہا "اس کا کوئی مطلب نہیں۔ کمار شام تک آجائے گا۔ وہ تجربہ رکھتا ہے اور جانتا ہے یہ کام کیسے ہوتے ہیں۔ مرزا' تم اپنی قنوطیت کے جراثیم مت پھیلاؤ۔"

غالب نے کہا "میں قنوطی نہیں' حقیقت پسند ہوں تم سب خواب پرست ہو۔ یہ سمجھتے ہو کہ جیسا تم چاہو گے ویسا ہی ہو گا۔ جب نہیں ہوتا تو روتے ہو۔ ناامیدی میں بڑی برکت ہے۔ ناکامی کا رنج نہیں ہوتا۔ کامیابی کی غیر متوقع خوشی ملتی ہے۔"

"بہتر ہے تم سو جاؤ" نازو نے کہا۔

"یہ بھی ٹھیک کہا تم نے۔ چینی کہتے ہیں کہ جب آدمی بیٹھ سکتا ہو تو اسے کھڑا نہیں رہنا چاہئے۔ جب لیٹ سکتا ہو تو بیٹھنا نہیں چاہئے اور سو سکتا ہو تو جاگنا نہیں چاہئے۔"

"پھر بھی چینی قیلولہ نہیں کرتے" میں نے کہا۔

"مگر میں کرتا ہوں۔ کیوں کہ میں چینی نہیں ہوں" غالب نے کہا اور منہ پر کمبل لپیٹ کر پڑ گیا۔

میرے دل کو عجیب سی بے قراری تھی۔ جی چاہتا تھا کہ ابھی اور اسی وقت ہوٹل سے نکلوں اور اُڑ کے ڈھاکا پہنچ جاؤں۔ وہاں سے محسن کو ساتھ لوں اور لاہور۔ مگر بات وہی تھی کہ وصال یار فقط آرزو کی بات نہیں۔ ابھی نہ جانے کتنے مرحلے اور طے کرنے تھے۔ سفر کی اگلی منزل کا فاصلہ بہت کم بھی لگتا تھا اور اس کے باوجود نشان منزل بے یقینی کی دُھند میں گم تھا۔

شام تک نہ کمار آیا نہ اس کا کوئی پیغام ملا تو مجھے وحشت ہونے لگی۔ ہم نے یومیہ بنیاد پر کمار کی ٹیکسی حاصل کی تھی اور وہ ایسا شخص بہرحال نہیں تھا کہ پاسپورٹ کے حصول کو بہانہ بنا کے دن بھر کے لئے غائب ہو جائے۔

مغرب سے کچھ دیر قبل ہم نے چائے پی۔ انتظار کی کوفت نے سب کو بیزار کر دیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ہم اس ہوٹل میں قید کر دئے گئے ہیں۔

غالب نے نازو سے کئی بار لڑائی مول لینے کی کوشش کی مگر اس پر اثر نہ ہوا۔ پھر گل رونے لگی۔

"تمہیں کیا ہوا ہے؟" غالب نے کہا۔

"کچھ نہیں۔"

"تو پھر یہ رونا کس لئے؟ دل چاہ رہا ہے؟ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ لڑکیوں کو رونے کا اتنا شوق کیوں ہوتا ہے۔ بس بہانہ چاہئے۔ ہاں تم ہنستی ہوئی اچھی لگتی ہو" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "گل! یہ آنسو پونچھ لو۔ جہاں اتنا صبر کیا ہے وہاں ایک دو دن اور گزر جائیں تو کیا فرق پڑتا ہے۔"

"ہر روز کوئی نئی بات ہو جاتی ہے۔" گل نے روتے ہوئے کہا۔ "ایک ایک دو دو کر کے کتنے دن گزر گئے ہیں۔ کسی نہ کسی بہانے دیر ہوتی جا رہی ہے۔ آخر محسن کب تک انتظار کرے گا؟ آخر کار وہ مایوس ہو جائے گا کہ اس کا پیغام کسی کو نہیں ملا۔ اب کوئی ڈھاکا نہیں آئے گا۔"

میں نے کہا "ایسی مایوسی کی باتوں سے کیا فائدہ ہے گل۔ جانتی ہو کہ ہم سب پوری کوشش کر رہے ہیں۔"

"کوئی کچھ نہیں کر رہا ہے۔ سب ہنس کھیل رہے ہیں' گھوم رہے ہیں۔ محسن اکیلا ہے۔ اس کے ساتھ کوئی نہیں ہے۔ بچے بھی اس کے مارے گئے ہیں۔ اور کسی کا کیا گیا۔ رابعہ لا[ہور] میں بیٹھی ہے مزے سے۔ ہم سب ساتھ ہیں اور ہوٹل کے کمر[ے] میں آرام سے بیٹھے ہیں۔ اس پر پتا نہیں کیا بیت رہی ہوگی۔ م[علوم] نہیں وہ کس حال میں ہوگا۔ کہاں رہتا ہوگا' کیا کھاتا ہوگا' کیا [کرتا] ہوگا۔ کہیں اسے بھارتی فوجیوں نے پکڑ کے جیل میں نہ ڈال [دیا] ہو۔"

وہ روتی گئی اور بولتی گئی۔ یہ اس کے دل میں جمع ہو جانے [والے] اندیشوں کا غبار تھا جو اس کے آنسوؤں میں ڈھل گیا تھا۔ اس [کے] ذہن پر چھائے ہوئے آزار دینے والے خیالوں کے بادل تھے جو برس پڑے تھے اور اس کی قوتِ برداشت سے زیادہ لبریز ہو جا[نے] والا صبر کا پیالہ تھا جو اچانک چھلک گیا تھا۔ میں نے اور غالب [نے] اسے کسی دلیل سے قائل کرنے کی اور کسی جواب سے مط[مئن] کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ سب کچھ کہ[ہ دے] جو اس نے خود پر جبر کر کے آج تک نہیں کہا تھا اور سارے [رکے] ہوئے آنسوؤں کو بہہ جانے دے۔ اس کی بہت سی باتیں غلط [تھیں] اور الزام کی طرح تھیں لیکن میں نے اسے ایک جذباتی طور پر [ٹوٹی] لڑکی سمجھتے ہوئے درگزر کیا۔ وہ محسن کو دیوانگی کی حد تک [چاہتی] تھی۔ اس وقت بھی جب اسے حاصل کرنے کی تمنا کرنا بھی [چاند] سے اس کی چاندنی مانگنے کے مترادف تھا۔ اور آج بھی جب اس کا تصور باقی تھا۔ اسے اپنے دکھوں کا نہیں' محسن کے دکھوں کا خیال رُلا رہا تھا۔

غالب کے اشارے پر نازو اسے خاموش کرانے لگی اور [ہم] اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

"جیسے گل کا نروس بریک ڈاؤن ہوا ہے' ایسے ہی م[یرا] ہو جائے گا" غالب نے کہا۔

"گڈ۔ ایسا کب ہوگا؟" میں نے کہا "مجھے پتا چل جا[ئے تو] اپنے بارے میں کچھ بتاؤں۔"

"یہ مذاق نہیں ہے۔"

"میں کب کہہ رہا ہوں کہ یہ مذاق ہے۔ یہ ہسٹریا ہے [جس کا] علاج کچھ نہیں۔ دورہ پڑتا ہے' ختم ہو جاتا ہے۔ وقتی طور پر [اسے] سکون ملتا ہے" میں نے کہا۔

"یار' تم رکمنی کو فون کرو" غالب نے کہا "اس سے [پوچھو] راج کمار صاحب کہاں تشریف لے گئے ہیں۔"

"تمہارا کیا خیال ہے کہ رکمنی کو معلوم ہوگا؟ تم سمجھ[تے ہو وہ] فارغ بیٹھا ہوگا وہاں" میں نے کہا "وہ وقت ضائع کرنے وا[لا آدمی]

نہیں ہے۔ ہوگی کوئی ایسی مصروفیت....."

"مثلاً یار۔....." غالب نے میری بات کاٹ دی۔

"یعنی وہ کام چھوڑ کے اس کے ساتھ گھوم رہا ہوگا؟ ناممکن۔"

"پوچھ لینے میں کیا حرج ہے یار" غالب نے فون اٹھا کے میرے سامنے رکھ دیا۔

"یہ کام تم بھی کر سکتے ہو" میں نے فون واپس کیا۔

"مجھے تو نمبر نہیں معلوم" غالب نے پھر فون مجھے تھما دیا۔

"نمبر میں بتا دیتا ہوں" میں نے دوسری بار فون اس کو پکڑایا' "ملاؤ نمبر۔ جو پوچھنا ہے پوچھو۔"

غالب نے میرے بتائے ہوئے نمبر پر ڈائل گھمایا اور کچھ دیر ریسیور کان سے لگائے بیٹھا رہا "کیا مصیبت ہے!" اس نے بڑبڑا کے کہا اور پھر نمبر ملایا۔

"گھنٹی بج رہی ہے۔ ریسیور کوئی نہیں اٹھاتا" غالب نے ریسیور کو کریڈل پر رکھ دیا۔

"ممکن ہے فون خراب ہو" میں نے کہا۔

"کیا ممکن ہے اور کیا ممکن نہیں ہے' یہ سب یہاں بیٹھ کے سوچتے رہیں گے ہم؟"

"اور ہم کیا کر سکتے ہیں؟"

"ہم خود جا کے معلوم کر سکتے ہیں۔"

"اور ہمارے جانے کے بعد کمار آگیا تو؟" میں نے کہا۔

"تو گل اور نازو ہیں۔ وہ پاسپورٹ لے لیں گی۔ اسے بٹھا کے چائے پلائیں گی۔ ہمارے آنے تک اس کا دماغ کھائیں گی۔" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "چلو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں بھی تو تنگ آگیا ہوں اس قید سے۔"

"ایک بات اور بتاؤ چیف۔"

"کیا؟" میں نے کہا۔

"اگر کسی وجہ سے کمار ہمارے لئے پاسپورٹ حاصل کرنے میں ناکام رہا تو ہم کیا کریں گے؟"

"کچھ نہیں۔ ہم ساری عمر کلکتہ کے اسی ہوٹل میں گزار دیں گے۔" میں نے بھنا کے کہا "یہ نہایت احمقانہ اور فضول سوال کیا ہے آپ نے مرزا جی۔ جواب آپ جانتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ہمارا ڈھاکا پہنچنا کسی چیز سے مشروط نہیں۔ پاسپورٹ تو سہولت اور تحفظ کے لئے تھے۔ ورنہ اس سے پہلے ہم جہاں گئے ہیں کیا ویزا لے کر گئے ہیں؟"

غالب نے کہا "یار' آئی ایم سوری۔ دراصل گل نے مجھے بھی کچھ ڈیپریس کر دیا تھا۔"

اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھا لیا۔

"آپ کے لئے ایک پیکٹ ہے سر" کسی نے ہوٹل آفس سے کہا۔

"کیسا پیکٹ؟"

"لوکل کوریئر سروس سے ملا ہے۔ کیا میں کمرے میں پہنچا دوں؟"

"ایک منٹ" میں نے ریسیور پر ہاتھ رکھ کے کہا اور غالب سے مشورہ کیا "ہمارے نام کون پارسل بھیج سکتا ہے؟ کس کو معلوم ہے ہمارا فرضی نام اور یہ پتا۔"

"صرف ایک شخص کو۔ کمار کو" غالب بولا۔

"رائٹ۔ اور وہ پارسل میں بم نہیں بھیج سکتا۔" میں نے مطمئن ہو کے کہا اور دوبارہ آفس سے بات کی "پیکٹ اوپر پہنچا دیں پلیز۔"

چند منٹ کے بعد ویٹر نے دروازے پر ناک کیا اور پیکٹ مجھے تھما دیا۔ میں نے اسے پانچ روپے ٹپ دی اور دروازہ بند کر کے پیکٹ سب کے بیچ میں رکھ دیا۔

"یہ کمار نے نہیں بھیجا" غالب نے کہا "کوئی چوپٹ لال پوپٹ ہے۔ لاحول ولا قوۃ۔ یہ کیا نام ہوا۔"

میں نے کہا "کمار اپنا اصلی نام نہیں لکھنا چاہتا تھا۔ اس میں ہمارے پاسپورٹ ہوں گے۔ ان پر بھی فرضی نام ہوں گے۔"

غالب نے کہا "یعنی میں کھول لوں اسے۔ کلمۂ شہادت پڑھ کے۔ نازو' میرا کہا سنا معاف کرنا۔ بلکہ وہ بھی معاف کر دو جو میں نے نہ کہا نہ سُنا۔"

نازو نے اس سے پیکٹ چھین کر کھول لیا۔ میرا خیال بالکل ٹھیک ثابت ہوا۔ اس کے اندر سے آج کی تاریخ میں جاری ہونے والے چار پاسپورٹ برآمد ہوئے۔ ہم سب نے اپنی اپنی تصویریں دیکھیں اور اپنے نام دیکھے۔ کمار نے سارا کام بڑی ہوشیاری سے کیا تھا مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ خود نہیں آیا تھا۔ اس نے کوئی وجہ بھی بیان نہیں کی تھی کہ اسے کوریئر سروس استعمال کرنے کی کیا مجبوری لاحق تھی۔ اگر وہ چاہتا تو ایک پرچے پر مختصراً یہ مجبوری بیان کر سکتا تھا۔

غالب نے نازو کی طرف دیکھ کے کہا "بھئی مبارک ہو۔"

"بکومت۔" نازو نے جھینپ کے کہا۔

"اب یہ ایک دستاویزی ثبوت ہے۔ اسے کون جھٹلا سکتا ہے۔ میں اور تم مسٹر اور مسز راجن۔ گویا تم رکمنی۔"

میں نے مسکرا کے کہا "اور ہم ہو گئے مسٹر اور مسز راج کمار۔ پتا وہی جو ڈاکٹر رکمنی کے ہسپتال کا ہے۔"

"آخر کمار نے ایسا کیوں کیا؟ نام بہت تھے۔ پتا کچھ بھی ہو سکتا تھا" غالب بولا۔

"میرا خیال ہے' اس نے عقلمندی کی۔ اگر کبھی کہیں بھی تصدیق کی ضرورت پڑی تو تصدیق ہو جائے گی۔ اور خدانخواستہ کوئی گڑبڑ ہوئی تو ان پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ نہ راجن اور رکمنی

پر، نہ کمار اور پارو پر۔ وہ کہہ سکتے ہیں کہ کسی نے ان کا نام پتا استعمال کر کے کسی ایجنٹ سے پاسپورٹ بنوائے تو اس میں ان کا کیا قصور۔ تصویریں تو ان کی نہیں ہیں" میں نے کہا۔

"مجھے کمار کے نہ آنے سے تشویش لاحق ہو رہی ہے۔ کیا وجہ ہو سکتی ہے اس کے نہ آنے کی؟" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "ہم چل کے معلوم کر آتے ہیں۔ ہم دونوں"

نازو نے احتجاج کیا "پھر چھوڑ کے جا رہے ہو ہمیں۔"

"پھر؟ پھر کا کیا مطلب؟" غالب بولا۔

"رات بھی نکل گئے تھے کہیں۔"

میرا اور غالب کا ردِ عمل یکساں تھا "رات کو۔"

وہ فاتحانہ انداز میں مسکرائی "اب تم نے اعتماد کرنا بھی چھوڑ دیا ہے ہم پر۔ میں تو دیکھ رہی تھی کہ کب تک نہیں بتاتے تم۔"

غالب نے سر کھجا کے کہا "عزیزہ! کیا خیال ہے تم کچھ غلط فہمی کا شکار نہیں ہو؟"

"میرے عزیز! غلط فہمی تمہیں ہے کچھ میرے بارے میں کہ میں بے وقوف ہوں۔"

"واللہ۔ اس میں کیسی غلط فہمی۔ آپ جدّی پُشتی خاندانی بے وقوف" غالب نے ہاتھ مل کے کہا۔

گل نے حیرانی سے کہا "رات کی کیا بات ہے؟"

نازو نے کہا "یہ دونوں چپکے سے سٹک لئے تھے کہیں۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ ہم تو سو گئے۔ ہمیں کیا معلوم ہو گا۔ صبح سے پہلے واپس لوٹ آئیں گے۔ پوچھو ذرا ان سے۔"

"اچھا۔ ابھی سے یہ حرکتیں۔" گل ہنسنے لگی۔

غالب نے سر ہلایا "اس میں کوئی شک نہیں کہ عام طور پر شادی کے دو چار سال بعد شوہر ایسا کرتے ہیں۔ اور بیویاں اسی طرح ان کی چوری پکڑ لیتی ہیں تو ایسے ہی ڈانٹتی بھی ہیں مگر ہم کیوں ڈریں۔ گئے تھے تو گئے تھے۔ ڈنکے کی چوٹ پر گئے تھے۔"

"تمہیں کیسے پتا چلا؟" میں نے مسکرا کے کہا۔

"جب ہم نے دروازہ بجایا اور تم لوگ اٹھے نہیں تو مجھے شک ہو گیا تھا" نازو بولی "تمہاری نیند ایسی نہیں ہو سکتی۔ غالب سو سکتا ہے گدھے بیچ کے۔"

"اتنا بے عزت تو مت کرو سب کے سامنے۔ محاورے کی مار تو مت مارو" غالب نے کہا۔

"مجھے بھی نہیں بتایا تھا آپ نے۔"

"تم کو بتانے سے کیا ہوتا۔ اس وقت تم ویسے ہی ڈری ہوئی تھیں" نازو بولی "تمہاری آنکھ لگی تو میں نیچے گئی اور کاؤنٹر سے معلوم کیا تو پتا چل گیا۔ چابیاں وہاں موجود تھیں۔ یہ لوگ کمرا لاک کر کے گئے تھے۔ اندر سے بند کر کے نہیں سو رہے تھے۔"

"اب تو بتا دیں کہاں گئے تھے؟" گل نے کہا۔

غالب ڈھیٹ بن گیا "بتا دیں گے۔ جلدی کیا ہے، ذرا سوچ لیں کوئی اچھا سا بہانہ۔ اسٹوری ایسی تو ہو کہ چل جائے۔"

میں نے بھی کہا "ہاں واپس آ کے بتائیں گے۔"

"میری واپسی تک میرے سوا کسی کے بارے میں سوچنا بھی نہیں۔ اور مجھے ایسے چھوڑ کے مت جانا جیسے میں چلا گیا تھا۔ نہ اس ہوٹل سے نہ اس جہان سے۔ بس میرے نام کی مالا جپتی رہنا۔"

میں نے اسے کھینچ لیا ورنہ اس کی بکواس جاری رہتی۔ باہر اندھیرا پھیل گیا تھا اور اسٹریٹ لائٹس روشن ہو گئی تھیں۔ مین گیٹ سے باہر رکشا ٹیکسی والے اور اونچے ہوٹلوں میں دھندا کرنے والی طوائفوں کے ایجنٹ کسی گاہک کے منتظر تھے۔ ان سب نے ہم پر یلغار کی۔ سر، ایک نمبر ٹیکسی۔ ایک دم میم کا مافک جوان چھوکری صاب۔ گولڈن ہیئر بلیو آئیز فار جسٹ فائیو ہنڈرڈ سر۔ آپ کا دل خوش ہو جائے گا صاب۔ فور ہنڈرڈ۔ کشمیری پنجابی......

"نہیں چاہئے" میں نے مشتعل ہو کے کہا "بھاگ جاؤ۔ دفع ہو جاؤ سب۔"

مگر وہ بے غیرت اور بے شرم لوگ تھے۔ انہوں نے ہمارا تعاقب جاری رکھا اور مختلف رنگ روپ، عمر اور قومیت کی الگ الگ قیمت، بڑی فحش تفصیلات کے ساتھ بتاتے رہے اور کوشش کرتے رہے کہ ہماری قوتِ خرید کا اندازہ کرتے ہوئے ہمیں کسی طرح شکار کر لیں۔

ایک ٹیکسی میں بیٹھ کے میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

"یہ بڑی مصیبت ہے یہاں۔ معلوم ہوتا ہے سب سے بڑا بزنس یہی ہے" غالب بولا۔

"مجھے بھی تعجب ہوتا ہے۔ لگتا ہے اس شہر میں کوئی بھی شریف عورت نہیں رہتی۔ کتنی بے غیرتی کے ساتھ یہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں کہ میری بیوی ہے۔ میری بہن ہے۔ اس بچے کو دیکھا

ٹیکسی ڈرائیور نے سر گھما کے مجھے دیکھا اور ہنسا "نو سر۔ سب جھوٹ نہیں بولتے۔"

میں دم بخود رہ گیا "کیا مطلب؟ وہ واقعی ان کی بیویاں ہوتی ہیں؟"

"یس سر..... یہ لوگ شریف ہی سمجھے جاتے ہیں، جہاں رہتے ہیں۔ سفید پوش بھی ہیں مگر کیا کریں، حالات سے تنگ ہیں۔ مہنگائی اتنی ہے کہ گزارا نہیں ہوتا۔ بے روزگاری اتنی ہے کہ مردوں کو مزدوری تک نہیں ملتی۔ کبھی ملتی ہے دو چار دن۔ ہفتہ بھر ایسے گزر جاتا ہے۔ پکی نوکری والے بھی مجبور ہیں۔ کرائے بہت ہیں، تنخواہ کم ہے۔ بچے زیادہ ہیں۔ ماں باپ یا بہن بھائی کا بوجھ ہے"

"ماں باپ بوجھ ہوتے ہیں؟"

"یس سر۔ پیسہ بوجھ اٹھاتا ہے، آدمی نہیں۔ اگر کھانے کو بہت ہو تو رشتے چلتے ہیں۔ ایک روٹی کی طرف چار یا آٹھ ہاتھ بڑھتے ہیں تو کوئی رشتوں کو یاد نہیں رکھتا۔ بھوک بڑی ظالم چیز ہے۔ میں نے سنا ہے کہ بنگال میں قحط پڑا تھا تو ایک مٹھی چاول میں عورت ملتی تھی۔ ماں اپنا بچہ تک بیچ دیتی تھی۔ ابھی ویسے حالات تو نہیں مگر زندہ رہنے کی مجبوریاں بڑھ گئی ہیں۔"

میں نے کہا "تم پڑھے لکھے آدمی ہو؟"

"میں اسکول ٹیچر ہوں۔ دن میں پڑھاتا ہوں، رات کو یہ ٹیکسی کرائے پر چلاتا ہوں، اس لئے میری بیوی گھر میں رہتی ہے۔ ہفتے کے سات دن۔ کچھ عزت اور غیرت کے ساتھ سمجھوتا کر لیتے ہیں۔ ہفتے میں ایک آدھ مرتبہ بیوی کو گھر سے لے جاتے ہیں۔ سب نہیں، کچھ۔ بہت تھوڑے۔ مگر ایسے لوگ ہیں۔ بعد میں دو چار بار بھی وہ ایسا کرتے ہیں تو وہ خوش ہوتے ہیں کہ صبح چار پیسے لائے گی۔ کلرک کی ایک مہینے کی تنخواہ بیوی کی ایک رات کی کمائی کے برابر ہو تو پھر یہی ہو گا سر۔ امارت اور غربت ساتھ ساتھ ہوں گے تو شرافت کیسے نہیں بکے گی۔"

"تمہاری باتوں نے تو مجھے دہلا دیا ہے۔"

وہ مسکرایا "معلوم ہوتا ہے آپ بڑے شہروں میں نہیں رہے۔"

"میں لندن، پیرس اور بہت سے شہروں میں رہا ہوں۔"

"اُدھر نہیں سر، اِدھر۔ سنگاپور، ہانگ کانگ، بنکاک، کلکتہ، ٹوکیو۔ سب جگہ ایک دنیا یہ بھی ہے۔ وہ جو بچّہ تھا، اس کو میں جانتا ہوں۔ اور وہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔"

"کیا؟ یعنی خود ماں نے بھیجا تھا اسے؟"

"جی سر۔ ماں اچھی ہے ابھی۔ خوب صورت بھی ہے۔ شوہر کارخانے میں تھا۔ لائن پار کر کے فیکٹری جاتا تھا۔ ایک دن تاروں میں پاؤں الجھ گیا۔ کانٹا بدلنے والے لوہے کے تار جو پٹڑی کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں، ان میں۔ ادھر سے انجن آرہا تھا۔ شنٹنگ کرتا ہوا۔ دونوں پاؤں کٹ گئے۔ بچ گیا مگر معذور ہو گیا۔ ابھی وہ ہوٹل کے سامنے بھیک مانگتا ہے۔ وہ بیٹا ہے اس کا جو باپ کو ریڑھی میں ڈال کے ادھر لاتا ہے۔ دن بھر اس کے ساتھ رہتا ہے۔ اخبار بیچتا ہے اور پڑھتا بھی ہے۔ رات کو اِدھر......"

میرے جسم کا رُواں رُواں کھڑا ہو گیا تھا۔ مجھے واقعی معلوم نہ تھا کہ ان شہروں میں غربت نے انسانوں کو اس حد تک غریب کر دیا ہے کہ وہ اپنی عزت خود بیچتے ہوئے نہیں شرماتے۔ اسٹریٹ گرلز اور کال گرلز سے لندن بھی بھرا پڑا ہے۔ دنیا کا کوئی شہر اس لعنت سے محروم نہیں مگر میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ لاہور یا کراچی میں شرافت اور انسانیت کی یہ تذلیل ناقابل تصور ہے۔ وہاں لوگ بہت خوش حال سمجھے جا سکتے ہیں کہ انہیں اپنی غیرت پر جان دینا بھی آتا ہے اور جان لینا بھی۔ اور وہاں عورت اتنی رُسوا نہیں ہے کہ رشتوں کی آبرو نہ رہے۔ وہاں ہر ماں، ہر بیٹی اور ہر بیوی عزت کے اثاثے پر فخر کرتی ہے اور خواہ نوبت فاقہ کشی کی آجائے مگر یہ اثاثہ محفوظ رہتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں طوائف کا لفظ ایک گالی ہے۔ خون ریزی اور قتل کے تین بنیادی اسباب زر، زمین اور زن شمار کئے جاتے ہیں مگر زر اور زمین بنیادی طور پر ایک ہی سبب بنتے ہیں اور اعداد و شمار ثابت کرتے ہیں کہ سب سے زیادہ قتل کے اسباب ہمارے عزت و عصمت کے تصورات اور غیرت و حمیّت کے جذبات فراہم کرتے ہیں۔ ایک مادر پدر آزاد معاشرے میں عورت وجہِ نزاع نہیں بنتی کیوں کہ وہ کسی رشتے کے حوالے سے محترم و معتبر نہیں۔ بلکہ صرف جنس بازار ہے۔

ہسپتال آ گیا تھا۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو کرایہ دے کر رخصت کیا۔ بیرونی احاطے کا گیٹ کھلا ہوا تھا لیکن اندر کی لائٹس بھی آف نظر آ رہی تھیں۔ میں قریب جا کے کال بیل تلاش کر رہا تھا کہ غالب نے مجھے ایک نوٹس کی طرف متوجہ کیا جو کاغذ پر موٹے مارکر سے لکھ کر دروازے پر چپکا دیا گیا تھا۔

"یہ کیا ہے؟"

میں نے کہا "ہندی میں کچھ لکھا ہوا ہے۔ یا شاید بنگالی میں۔"

اسی وقت کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ میں چونک کر پلٹا تو مجھے ایک وردی والا پولیس مین نظر آیا۔

"کیا کر رہے ہو تم لوگ؟" اس نے مجھے اور غالب کو اوپر سے نیچے تک دیکھا۔

میں نے کہا "کچھ نہیں۔ ہم ڈاکٹر رکمنی سے ملنے آئے تھے۔"

"اچھا!" اس کے لبوں پر طنز آمیز، معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ "ڈاکٹر رکمنی سے ملنے آئے تھے۔"

"ہاں۔ ہم ان کے مریض ہیں۔ انہی سے علاج کراتے ہیں۔"

غالب نے کہا "اپنی بیویوں کا۔"

پولیس مین کی نظر ہم پر جم گئی "نظر تو پڑھے لکھے آتے ہو شکل سے۔"

"ہم واقعی پڑھے لکھے ہیں" میں نے کہا۔

"کیا کرتے ہو، کہاں رہتے ہو؟ نام پتا بتاؤ اپنا۔" اس نے خالص پولیس والوں کے تفتیشی لہجے میں کہا۔

میں نے کہا "معاملہ کیا ہے؟ یہ سب کیوں پوچھا جا رہا ہے ہم سے؟"

"یہاں بتاؤ گے یا تھانے جا کے؟" اس نے سخت لہجے میں کہا۔ "میں یہاں اسی لئے بیٹھا ہوں کہ جو مشکوک نظر آئے اس سے پوچھ گچھ کروں۔ اور ضروری ہو تو تھانے لے جاؤں۔"

میں غصے کو پی گیا "ہم کیوں اور کیسے مشکوک نظر آتے ہیں؟ کون سی غلط حرکت کی ہے ہم نے؟"

"تم اندر داخل ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔"

"یہ غلط ہے۔ ہم ڈاکٹر رکمنی سے ملنا چاہتے تھے۔ دروازہ بند تھا اس لئے میں کال بیل تلاش کر رہا تھا۔ تم یہ الزام......"

پولیس مین نے میرے منہ پر اچانک تھپڑ مار دیا۔ میرا ایک گال دہکنے لگا لیکن میں نے اس ذلت کو صرف اس لئے برداشت کیا کہ میں معاملے کو بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔

"الو کے بچے۔ بکواس کئے جاتا ہے.....‘‘ پولیس مین نے مجھے گالی دے کر کہا ’’پرلوک میں جا کے ملے گا تو رکمنی سے۔ مجھے بے وقوف بناتا ہے..... کوئی مانے گا تیری بات کہ یہ تو نے نہیں دیکھا تھا۔‘‘

’’یہ۔‘‘ میں نے نوٹس کی طرف دیکھا ’’یہ کیا ہے؟ مجھے بنگالی نہیں آتی۔‘‘

اس نے میرے دوسرا جھانپڑ رسید کرنے کی کوشش کی ’’یہ ہندی ہے۔‘‘

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا ’’مجھے ہندی بھی نہیں آتی لیکن ایک اور بھاشا آتی ہے جو تم آسانی سے سمجھ سکو گے۔ میں نے وردی کی وجہ سے تمہیں کچھ نہیں کہا تھا لیکن اب میں تمہاری زبان میں بات کروں گا۔‘‘

اس نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی بے سود کوشش کی۔ میرے تیور اور میری گرفت دیکھ کے اسے بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ طاقت کی زبان میں وہ میرا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

’’ہاتھ چھوڑو میرا۔ ورنہ.....‘‘

’’ورنہ کیا؟‘‘ میں نے اسے ایک جھٹکا دیا ’’تھانے لے جائے گا؟ چل تھانے تیری تو.....‘‘ وہ جھٹکے سے آگے آیا تو میں نے گھٹنا اوپر اٹھایا اور اسے اوپر سے گزار کے پھر قدموں میں کھڑا کر دیا۔ زمین کو قدموں کے نیچے سے نکلتے اور آسمان کو اوپر سے گزرتا دیکھنے کے بعد وہ کچھ دیر ہکا بکا کھڑا رہا۔

میں نے کہا ’’پولیس والے ہر جگہ دو زبانیں بولتے ہیں۔ ابھی تم نے مجھ سے اپنی مادری زبان میں بات کی تھی۔ اب میں تمہاری ہی فادری زبان میں بات کرتا ہوں۔ یہ لو‘‘ میں نے اس کے ہاتھ میں سو کا ایک نوٹ تھما دیا۔

’’اگر تم نے پیسے کی زبان نہ سمجھی تو پھر ہم طاقت کی زبان میں بات کریں گے‘‘ غالب نے کہا۔

پولیس مین نے بے یقینی سے سو کے نوٹ کو دیکھا۔ کچھ دیر تذبذب کا شکار رہا۔ غصے سے ہونٹ کاٹتا رہا اور شاید یہ سوچتا رہا کہ اسے دھمکی سے ڈرے بغیر ایک فرض شناس پولیس مین کا رول ادا کرنا چاہئے یا مصلحت کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے سو کے نوٹ کو پُرامن سمجھوتے کی دستاویز کے طور پر قبول کر لینا چاہئے۔ جذبات پر عقل نے فتح پائی اور اس نے نوٹ جیب میں ڈال کے ایک گہری سانس لی۔

’’کیا چاہتے ہو تم؟‘‘

میں نے کہا ’’کچھ نہیں۔ بس یہ پڑھ کے سنا دو۔ اس میں کیا لکھا ہے؟‘‘

وہ حیران ہوا۔ شاید اسے امید نہیں تھی کہ جو اس کی مادری اور فادری زبان پر اتنا عبور رکھتے ہیں وہ اتنا معمولی مطالبہ پیش کریں گے۔

اس نے کہا ’’ڈاکٹر رکمنی کے سورگباش ہونے کے کارن ہسپتال بند رہے گا۔‘‘

’’کیا ہوا ہے ڈاکٹر رکمنی کو؟ کل تک وہ ٹھیک تھیں۔‘‘

پولیس مین نے کہا ’’ان کی ہتیا ہو گئی ہے۔ مرڈر۔‘‘

’’مرڈر!‘‘ غالب نے یوں کہا کہ پولیس مین بے اختیار ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ ’’کیسے..... کب..... کس نے کیا ہے ان کا مرڈر؟‘‘

’’اگر تمہیں معلوم ہو جائے تو پولیس کو بتا دینا۔ بڑی مہربانی ہو گی‘‘ وہ بولا ’’قتل کرنے والے کا نام پتا سب لکھوا دینا اور یہ بھی کہ کارن کیا تھا۔‘‘

میں نے کہا ’’اگر تم نے ساری بات نہ بتائی تو مجھے پھر تمہاری مادری یا فادری زبان استعمال کرنی پڑے گی۔‘‘

’’مجھے فادری زبان پسند ہے‘‘ وہ پیچھے ہٹ کے بولا۔

میں نے اسے دوسرا نوٹ دیا ’’اس سے زیادہ نہیں بول سکتا میں فادری زبان۔ تم مجبور کرو گے تو مادری زبان میں بات ہو گی۔‘‘

وہ نوجوان جوشیلا اور احمق نظر آتا تھا مگر خاصا ذہین اور معاملہ فہم ثابت ہوا ’’آج صبح یہاں کچھ لوگ آئے تھے۔ ہسپتال میں کام کرنے والی ایک نرس، ایک مڈوائف اور ایک بھنگن نے بتایا ہے کہ صبح نو بجے ہسپتال کھلا تو وہ پہلے سے باہر موجود تھے۔ عجیب جنگلی قسم کے لوگ تھے اور مضافات کے دیہات کی زبان بولتے تھے جو کسی قبیلے کی زبان سے ملتی جلتی۔ نرس اندر مصروف تھی۔ بھنگن جھاڑ پونچھ کر رہی تھی اور مڈوائف ڈاکٹر رکمنی کے پاس تھی۔ انہوں نے کسی مریض کے بارے میں پوچھا۔‘‘

’’کس مریض کے بارے میں؟‘‘

’’انہوں نے نام نہیں بتایا۔ صرف یہ کہا کہ کیا یہاں کوئی شخص زخمی حالت میں لایا گیا تھا جس کے جسم پر کوئی زہریلے تیر کا زخم ہو؟‘‘

’’زہریلے تیر کا؟‘‘ میں چونکا۔

’’اس میں چونکنے کی کیا بات ہے؟‘‘ وہ بولا۔

’’چونکنے کی بات تو ہے۔ یہاں لوگ خنجر یا گولی کے زخم کی بات کرتے ہیں۔ تیر کون چلاتا ہے؟‘‘ میں نے کہا۔

’’خیر انہوں نے براہ راست یہی سوال کیا تھا۔ ڈاکٹر رکمنی نے کہا کہ ہاں۔ ایک زخمی آیا تو تھا۔ تمہارا کیا تعلق ہے اس سے اور تم یہ بات کیسے جانتے ہو کہ زخم کسی زہریلے تیر کا تھا۔ انہوں نے ڈاکٹر رکمنی کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا اور کہا کہ اب وہ زخمی کہاں ہے اور وہ لوگ کہاں ہیں جو اسے لائے تھے۔ ڈاکٹر رکمنی نے بتایا کہ زخمی تو مر گیا اور جو اسے لائے تھے وہ معلوم نہیں کہاں گئے۔ انہوں نے زخمی کے بارے میں مزید سوالات کئے۔ ڈاکٹر رکمنی نے پولیس کو بلانے کی کوشش کی۔ اس نے کہا کہ تمہارے سوالوں کا جواب پولیس دے گی اچھی طرح۔ بس اس کے بعد انہوں نے رکمنی کو مارا۔ نرس کو بھی مارا اور سب کو باتھ روم میں بند کر دیا۔ کپڑے اتار کر۔‘‘

’’کپڑے اتار کر!‘‘

’’ہاں۔ تاکہ وہ شور نہ کریں اور بعد میں سیدھی باہر جا کے لوگوں کو نہ بلائیں‘‘ پولیس مین بولا ’’فون انہوں نے زمین پر مار کے توڑ دیا تھا۔ باتھ روم میں باہر کنڈی نہیں تھی ورنہ وہ کنڈی لگا جاتے، ان کے کپڑے نہ اتارتے۔ ظاہر ہے بعد میں انہیں کچھ دیر لگی۔‘‘

’’عجیب بے وقوف لوگ تھے۔ ہسپتال کو باہر سے کیوں نہیں لاک کر گئے‘‘ میں نے کہا۔

’’باہر جانے کے دو دروازے ہیں۔ وہ کسی کھڑکی سے بھی نکل سکتی تھیں۔‘‘ پولیس مین بولا۔

’’کیا اتنی دیر میں کوئی مریض یا ملاقاتی نہیں آیا؟‘‘

’’آیا ہو گا۔ مگر انہوں نے باہر یہ نوٹس لگا دیا تھا۔ یہ انہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔‘‘ اس نے دروازے پر چسپاں کاغذ کی طرف اشارہ کیا۔

’’یہ کیسے معلوم ہوا؟‘‘

’’کیوں کہ اور کسی نے یہ نوٹس نہیں لکھا۔ نہ ہسپتال کے عملے نے اور نہ رکمنی دیوی کے کسی جاننے والے نے۔ پولیس نے سب سے پوچھ لیا ہے۔ اگر کسی نے لکھا ہوتا تو مان لیتا۔ اس میں جرم کیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ کسی کی ہینڈ رائٹنگ نہیں۔ مارکر ہسپتال کا ہے اور کاغذ بھی۔ انہوں نے یہ نوٹس یہاں آنے کے بعد لکھا اور باہر لگا دیا۔‘‘

میں نے کہا ’’گویا وہ پہلے سے طے کر کے آئے تھے۔ انہیں یہ معلوم ہو چکا تھا کہ ان کا مطلوبہ آدمی اس ہسپتال میں ہے؟‘‘

’’ہاں۔ مگر زخمی سے زیادہ وہ ان لوگوں کے متعلق جاننا چاہتے تھے جو اسے لائے تھے‘‘ پولیس مین بولا۔

’’تم تو تفتیش کے سارے نتائج سے باخبر ہو۔ ہر بات معلوم ہے تمہیں‘‘ میں نے کہا۔

’’ساری تفتیش میں خود کرتا رہا ہوں‘‘ وہ دانت نکال کے بولا۔ ’’اور اس وقت بھی تفتیش ہی کر رہا ہوں۔ گپ شپ نہیں کر رہا ہوں تمہارے ساتھ۔ میں ڈیوٹی پہ ہوں۔‘‘

’’یعنی تم ہمارے بارے میں بھی رپورٹ دو گے؟‘‘

’’ہاں۔ تفصیل سے‘‘ وہ بولا ’’تمہارا حلیہ اور تم سے ہونے والی یہ گفتگو میری رپورٹ میں شامل ہو گی۔‘‘

’’اپنی رپورٹ میں دو سو روپے بھی نتھی کرو گے؟‘‘

’’کیوں نہیں۔ ان پر تمہارے فنگر پرنٹ ہیں۔ ویسے بھی وہ رشوت تھی۔ ظاہر ہے رشوت کوئی بلاوجہ نہیں دیتا۔ صبح سے اب تک نہ جانے کتنے لوگ آ چکے ہیں اور مجھ سے پوچھ چکے ہیں کہ ڈاکٹر رکمنی کو کس نے قتل کر دیا اور کیوں۔ کسی نے مجھ سے مادری یا فادری زبان میں بات کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔‘‘

میں نے کہا ’’گویا تمہاری نظر میں ہماری حیثیت مشکوک ہے؟‘‘

’’سخت مشکوک ہے‘‘ وہ بولا۔

’’اچھا۔ یہ بات ہے تو پھر باقی اسٹوری بھی سنا دو تاکہ ہم کسی نتیجے پر پہنچ سکیں‘‘ میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

’’اور کیا رہ گیا ہے بتانے کو۔ تمہیں سب معلوم ہے‘‘ وہ بولا ’’وہ تمہارے بارے میں ہی پوچھ رہے تھے۔‘‘

میں اور غالب اس انکشاف پر شدید ردِعمل کا اظہار نہ کرتے، یہ کیسے ممکن تھا۔ مگر اس نے اچانک ریوالور نکال لیا۔

میں نے کہا ’’ہمیں۔ تمہارا دماغ خراب ہے؟‘‘

’’نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس زخمی کو تم لوگ لائے تھے اور تم اس کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہو۔ تمہارا حلیہ بالکل وہی ہے جو قاتلوں نے ڈاکٹر رکمنی کو بتایا تھا۔ نرس اور مڈوائف دونوں نے سنا تھا اور ان کے بیان میں شامل ہے۔ تمہارے ساتھ دو عورتیں بھی تھیں۔‘‘ پولیس مین بولا ’’تاہم ڈاکٹر رکمنی نے اس کا اعتراف نہیں کیا، مرتے دم تک۔ انہوں نے اسے بہت اذیت دی۔ باتھ روم میں بند عورتوں نے اس کی چیخوں کو سنا تھا۔ وہ بار بار یہی کہہ رہی تھی کہ مجھے نہیں معلوم۔ میں کسی کو نہیں جانتی۔ وہ زخمی کو چھوڑ کر فرار ہو گئے تھے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ جھوٹ تھا۔ وہ تمہیں بچانے کی کوشش میں ماری گئی۔ پہلے میں نے تمہیں عام آدمی سمجھا تھا۔ تم تو خاص آدمی ہو۔‘‘

ہم بری طرح پھنس گئے تھے۔ وہ بے وقوف نظر آنے والا پولیس مین، جس نے مزاحمت کئے بغیر رشوت بھی قبول کر لی تھی اور یہ ظاہر کرتا رہا تھا کہ وہ ہم سے تعاون کر رہا ہے، بے حد چالاک اور نڈر ثابت ہوا تھا۔ اس نے باتوں باتوں میں تفتیش مکمل کر لی تھی اور ہمیں سب بتا کے ہم سے سب پوچھ لیا تھا۔

’’اب تم ہمیں گرفتار کرو گے؟‘‘ میں نے کہا۔

اس نے اقرار میں سر ہلایا ’’صرف تم ہی وہ سب کچھ بتا سکتے ہو جو ڈاکٹر رکمنی نے نہیں بتایا تھا۔ مثلاً یہ کہ وہ زخمی کون تھا اور اب کہاں ہے۔‘‘

’’ڈاکٹر رکمنی نے ٹھیک کہا تھا۔ وہ مر چکا ہے اور اس کی لاش بھی کوئی لے گیا ہے۔ تم کرزن ہسپتال سے معلوم کر لو۔‘‘

’’وہ میں معلوم کر لوں گا‘‘ وہ بولا ’’ایک بات اور بتاؤ۔ وہ لوگ سونے کا ذکر کر رہے تھے۔ نرس نے بھی سنا، وہ بار بار پوچھتے تھے کہ سونا کہاں ہے؟‘‘

’’پھر۔ ڈاکٹر رکمنی نے کیا بتایا؟‘‘

"کچھ نہیں۔ وہ کہتی رہی کیسا سونا۔"
"سونے کے بارے میں تو ہمیں بھی نہیں معلوم۔"
"یعنی باقی باتوں کا علم ہے تمہیں؟" وہ خوش ہوکے بولا "کیا تم ایک اور بات جانتے ہو؟"
"وہ کیا بات ہے؟"
"یہ کہ میں عام پولیس مین کی وردی میں اے ایس پی ہوں۔ اور مجھے تمہارا ہی انتظار تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ تم لوگ آؤ گے" وہ بولا "میں دیکھنا چاہتا تھا کہ آخر وہ کون لوگ ہیں جن کی خاطر ڈاکٹر رکمنی نے جان دے دی مگر ان کا پتا ٹھکانا نہیں بتایا۔"
"تم واقعی بہت ہوشیار شکاری ہو" میں نے کہا "تم نے خود کو ایک عام بے وقوف' بزدل اور لالچی پولیس مین ظاہر کیا حالاں کہ تم ایک ذہین اور فطین افسر ہو۔"
"یہ معاملہ ہی اتنا پُراسرار اور دلچسپ تھا۔"
"بالکل ٹھیک۔ اور غالباً تم معاملے کی تہ تک پہنچ گئے ہو؟"
"ہاں" اس نے کہا "کسی حد تک۔ اس واردات کے پیچھے سونا ہے۔"
"زر۔ زمین۔ زن" میں نے سرہلایا "رکمنی جیسی حسین عورت سونے کے چکر میں ماری گئی۔ یہی بات ہے نا؟"
"یہ سونا کس کا تھا؟" وہ بولا "اور کتنا تھا' کہاں سے آیا تھا؟"
میں نے غالب کی طرف دیکھا "سونا کہاں سے آتا ہے؟"
غالب نے کہا "سونا کان سے نکلتا ہے۔ میرے کانوں کی طرف مت دیکھو۔ میں اس کان کی بات کررہا ہوں....."
"مجھے معلوم ہے۔ تمہارے کان سے صرف میل نکلتا ہے مگر پیسہ ہاتھ کا میل ہوتا ہے تو کیا سونا کان کا میل نہیں سمجھا جاسکتا؟" میں نے کہا۔
"شٹ اپ۔ بہت سن لی تمہاری بکواس میں نے" وہ ریوالور ہلا کے بولا "اب پولیس اسٹیشن چل کے بولنا۔"
میں نے کہا "تمہارا ایک اندازہ غلط ہوگیا اے ایس پی صاحب۔"
"وہ کیا؟"
"تم نے یہ کیسے فرض کرلیا تھا کہ ہم تمہارے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ہنسی خوشی تھانے چلے جائیں گے؟"
"تمہارا تو باپ بھی جائے گا" وہ بولا۔ "میں تین تک گنوں گا۔"
"کیوں۔ دس تک کیوں نہیں؟" میں نے غیر سنجیدہ لہجے میں کہا اور ایک قدم آگے بڑھا۔
وہ ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔ "خبردار! اب تم نے ایک قدم بھی بڑھایا تو میں گولی ماردوں گا۔"
صورتِ حال یکلخت سنگین ہوگئی تھی۔ اے ایس پی پہلے ہی اندازہ کرچکا تھا کہ میں جوڈو کراٹے کے داؤ پیچ جانتا ہوں اور وہ مجھے قریب آنے کا موقع نہیں دے رہا تھا۔ ہسپتال کے احاطے میں مجھے پولیس کی کوئی گاڑی نظر نہیں آرہی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہاں وہ اکیلا ہے مگر وہ مسلح تھا اور اس کے تیور بتاتے تھے کہ وہ گولی چلادے گا۔ جیسے وہ پہلے ہمیں عام آدمی سمجھا تھا ویسے ہی ہم اسے عام پولیس مین سمجھے تھے۔ پھر وہ سنبھل گیا تھا مگر میں نے اپنی تنہا[ئی] کو غلط وقت پر استعمال کرکے اپنی کمزوری بنالیا تھا۔
اس نے ریوالور اٹھا کے کہا "ایک.....دو....."
میں نے ہاتھ اوپر اٹھادئے "اوکے۔ ہم چلتے ہیں۔"
"اسی طرح گھوم جاؤ اور چلنا شروع کردو۔ میں بالکل تمہارے پیچھے ہوں۔ اگر کوئی غلط حرکت کی تم نے تو کھوپڑی اڑادی جائے گی" وہ بولا "میں کوئی رسک نہیں لے سکتا۔"
"اس طرح کہاں تک لے جاؤ گے تم ہمیں؟"
"تھانے تک" وہ بولا "باہر پولیس کی نفری موجود ہے۔"
میں نے اور غالب نے پلٹ کے گیٹ کی طرف چلنا شروع کیا۔ میں اب بھی پُرامید تھا کہ مجھے اے ایس پی کوئی موقع ضرور فراہم کرے گا جب میں تھوڑا سا خطرہ مول لے کر اس کی کامیابی ناکامی میں بدل دوں گا لیکن اندر ہی اندر یہ خیال بھی ڈرا رہا تھا کہ ایسا نہ ہوا تو کیا ہوگا۔ تھانے پہنچ جانے کے بعد ہمارے لئے رہائی کے امکانات معدوم ہوجاتے تھے اور ہمارے اعمال کے سارے دفتر کھل جانے کے امکانات بہت روشن ہوجاتے تھے۔
مجھے یوں غیر متوقع طور پر پکڑے جانے کا جتنا افسوس تھا اس سے کہیں زیادہ رنج رکمنی کی دردناک موت کا تھا۔ مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ وہ سیدھی سادی لڑکی جو کل رات تک ہمارے ساتھ تھی اور ہم سے اپنے مستقبل کے خوابوں کی باتیں کرتی رہی تھی۔ بہت خوش تھی کہ اب سارے مسئلے حل ہوجائیں گے۔ پارو اور کمار گھر بن جائے گا تو وہ راجن کے ساتھ شادی کرسکے گی۔ وہ لڑکی اب زندہ نہیں ہے۔ اس کا مظلوم' تشدد کی تاب نہ لا کے بے جان ہو جانے والا' زخموں سے چُور اور شکستہ بدن کسی مُردہ خانے کی نیلی [روشنی میں] پوسٹ مارٹم کے عمل سے گزر رہا ہے یا کسی چِتا کے شعلوں میں راکھ ہورہا ہے۔
بہت سے سوالات کا جواب حالات نے فراہم کردیا تھا۔ رکمنی کی جان لینے والے اسی قبیلے کے لوگ تھے جن کے سردار کا قاتل اسی کا بیٹا تھا مگر وہ ہمارے ساتھ فرار ہوکے کلکتہ پہنچ گیا تھا۔ شاید انہوں نے اندازہ کرلیا تھا کہ نورل کی لانچ میں ہم اور کہیں جا نہیں سکتے۔ انہیں یہ بھی یقین تھا کہ ہم میں سے کوئی ان کے نشانہ ضرور بنا ہوگا۔ انہوں نے حیرت انگیز مستعدی اور عقل مندی کا ثبوت دیا اور ہمارے پیچھے پیچھے کلکتہ پہنچ گئے۔ شاید وہ رات ہر ہسپتال میں گئے۔ یا انہیں اگلا پورا دن ملا اور آخر کار ایک ایسے زخمی کا سراغ لگانے میں کامیاب ہوگئے جس کے شانے پر زہریلے تیر کا زخم تھا۔

مجھے رکمنی پر تعجب تھا کہ اس نے ہماری خاطر اتنی اذیت کیوں جھیلی؟ اسے کیا ضرورت تھی یوں مرنے کی؟ وہ قبیلے والوں کو بتاسکتی تھی کہ فلاں ہوٹل میں جاؤ' تمہیں وہ لوگ مل جائیں گے جو چندو کو لے کر آئے تھے۔ وہ بتاسکتی تھی کہ چندو کی لاش فلاں ہسپتال میں پڑی ہے۔ یہ سمجھ میں نہ آنے والی بات تھی کہ اس نے ہمارے لئے یا سیر سوا سیر سونے کی خاطر زندگی قربان کردی۔ یہ ہوسکتا تھا کہ قبیلے والے اسے مارنا نہ چاہتے ہوں اور وہ خود بھی تھوڑی بہت مزاحمت پر آمادہ ہو' مگر حادثاتی طور پر اور بلا ارادہ پڑنے والی کسی چوٹ نے اس کی جان لے لی ہو یا زیادہ مشتعل ہوجانے والے کسی شخص نے اس پر مہلک وار کردیا ہو۔ ایک امکان اس بات کا بھی تھا کہ وہ اپنے بھائی کمار کو بچانا چاہتی ہو۔ اسے معلوم ہوگا کہ سونا تو کمار کے پاس ہے اور اس نے قاتلوں کو ہمارا پتا بتایا تو کمار انہیں خود ہی مل جائے گا۔ اور یہی بات زیادہ قرین قیاس لگتی تھی۔ اس کے باوجود کمار کا ہم سے ملنے کے لئے نہ آنا اور کوریئر سروس سے پاسپورٹ ارسال کرنا سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کیا کمار کو معلوم ہوگیا تھا کہ رکمنی کا قتل ہوگیا ہے؟ اس کو قتل کرنے والے کون تھے اور انہوں نے اسے کیوں مارا؟ ممکن ہے یہ سب اسے دیر سے معلوم ہوا ہو۔ وہ ہمارے پاسپورٹ بنوانے کے چکر میں تھا۔ اس کام سے فارغ ہوکے وہ رکمنی کی طرف گیا تو اس نے پولیس کو دیکھا اور اسے بہن کے قتل ہونے کی خبر ملی تو وہ خود اپنی جان بچا کے بھاگ گیا۔ اسی نے پاسپورٹ ہمیں کوریئر سروس سے بھجوادئے۔ شاید اسے ڈر ہوگا کہ وہ خود ہم سے ملنے گیا تو ہمارے ساتھ ہی پکڑا جائے گا۔ رکمنی کے قاتل وہاں موجود ہوں گے۔ یہ اسے کیسے معلوم ہوسکتا تھا کہ رکمنی نے قاتلوں کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ ویسے بھی سونا اس کے پاس تھا اور قاتل وہی سونا مانگ رہے تھے۔ کیا کمار کو سونا اتنا عزیز تھا! اسی سونے کی وجہ سے رکمنی کی جان گئی تھی۔ اس کی موت کے ذمے دار ہم تھے۔ وہ سونا قبیلے والوں کے حوالے کرکے انہیں بتا سکتا تھا کہ یہ ہیں تمہارے مطلوبہ آدمی۔ یا وہ سونا پولیس کو دے کر ہماری نشان دہی کرسکتا تھا۔
مگر اس سے کمار کو کیا فائدہ ہوتا؟ رکمنی مرچکی تھی اور واپس نہیں آسکتی تھی۔ وہ ہمیں پکڑواتا یا سونا واپس کرتا تو ہمارے ساتھ ہی خود بھی خون کے پیاسے قبیلے والوں کی نظر میں آتا یا پولیس والوں کے ہتھے چڑھ جاتا۔ اس نے عقلمندی سے کام لیا اور خود روپوش ہوگیا۔ اپنی جان بچا کے ہی وہ کچھ کرسکتا تھا۔ ہم سے انتقام لینے کی تو کوئی تک نہیں تھی۔ یہ ہوسکتا تھا کہ وہ ہم سے مل کے قبیلے والوں سے اپنی بے گناہ بہن کے خون کا بدلہ لے۔ اس کی مدد ہم کرسکتے تھے۔ چناں چہ اس کی نظر میں رکمنی کے قاتل ہم نہیں ہوسکتے تھے۔ اس خیال کے ساتھ ہی میرے دل میں امید کی ایک کرن پیدا ہوئی۔ شاید کمار ہم سے رابطہ کرے گا۔ ممکن ہے وہ چھپ کے سب دیکھ رہا ہو۔ آخر اس نے ہوٹل فون کیوں نہیں کیا؟ اس ڈر سے کہ کال ٹریس ہوجائے گی؟ مگر کال کیسے ٹریس ہوسکتی ہے؟ وہ کسی پبلک کال آفس سے فون کرسکتا تھا۔ ہمیں خبردار کرسکتا تھا کہ ہوٹل سے نکل جائیں۔ اب ہوٹل میں گل اور نازو کیا کریں گی؟ جب انہیں معلوم ہوگا کہ ہم گرفتار ہوگئے۔ مگر انہیں معلوم کیسے ہوگا؟ کون بتائے گا انہیں؟ گیٹ تک آتے آتے میرا ذہن سوالوں میں الجھا رہا۔ پولیس کی کوئی گاڑی مجھے پہلے نظر نہیں آئی تھی مگر اب سڑک کے پار میں نے ایک جیپ دیکھ لی۔ اے ایس پی اتنا چوکس تھا کہ میں نے جب بھی پلٹ کے دیکھنے کا ارادہ کیا اس نے مجھے خبردار کردیا اور میں مجبور ہوگیا کہ اپنے سر کو پاش پاش ہونے سے بچانے کے لئے چپ چاپ اس کی اطاعت کرتا رہوں۔ یہ سر ہی آخر کار مجھے بچاسکتا تھا۔ اسی سر کا سلامت رہنا جسم کی سلامتی کا ضامن ہوسکتا تھا۔
اے ایس پی نے یقیناً کوئی اشارہ کیا ہوگا کہ جیپ چلی اور سڑک عبور کرکے عین ہمارے سامنے آرکی۔ میں نے مُردہ صورت کے ساتھ غالب کی طرف دیکھا۔ اس کی نظروں میں وہی پیغام تھا جو حسبِ حال تھا کہ میاں سکندر بخت۔ گیدڑ کے بارے میں کسی فلسفی نے ایسے ہی تو نہیں فرمایا کہ شامت اعمال اسے شہر کی جانب گھیرلاتی ہے۔ ہم بھی خود ادھر نہ آتے ٹیلی فون پر ہی تصدیق کرلیتے یا کمار کے آنے کا انتظار کرتے تو ایسے نہ پکڑے جاتے۔ صبح اخبار دیکھنے سے معلوم ہوجاتا کہ ڈاکٹر رکمنی پر کیا بیتی اور ظاہر ہے اس کے بعد یہاں سے بھاگ لیتے۔
اگر ہم تھوڑا سا رُک کے صورت حال کا جائزہ لیتے تو یوں منہ اٹھائے اندر نہ جاتے۔ دال میں کچھ کالا تو ہم نے محسوس کرلیا تھا مگر ہماری چھٹی حس دغا دے گئی تھی جس نے ہمیں خطرے سے آگاہ نہیں کیا۔ دراصل ڈاکٹر رکمنی کا اس قبیلے والوں کے ہاتھوں قتل ہونا اتنا بعید از قیاس تھا کہ ہماری چھٹی حس بھی غافل رہی۔ نتیجہ یہ کہ ہم سیدھے چوہے دان میں چلے گئے تھے اور چوہوں کی طرح پکڑے گئے تھے۔ اگر ہم رکمنی کے قتل پر غیر معمولی ردِعمل کا اظہار نہ کرتے اور اس کائیاں پولیس افسر سے نہ بھڑتے تو وہ عام لوگوں کی طرح ہمیں ایک جھانپڑ مار کے رخصت کردیتا۔ خود کو

خاص آدمی ثابت کرنا ہی بُرا ہوا۔ ہمارے اس انجام سے یہ بھی ثابت ہوا کہ آدمی ترکی میں ہو اور زبانِ یار نہ سمجھتا ہو تو ترکی تمام شد والا معاملہ ضرور ہوتا ہے۔ ہم ہندی سے واقف ہوتے تو اس نوٹس کو پڑھتے ہی بھاگ لیتے مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

جیپ قریب آکے رک گئی تو اے ایس پی نے مجھے اشارہ کیا "تم چلو پہلے اندر۔ ہاتھ اٹھا کے بیٹھ جاؤ۔ ہلنا مت ذرا بھی ورنہ مجھے گولی مارنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔"

میں نے کہا "تمہیں تو کوئی پیدا ہونے سے نہیں روک سکا اور پولیس میں بھرتی ہونے سے نہیں روک سکا۔ مگر میرا فرض بنتا ہے کہ تم کو ظلم سے روکوں۔"

"بکومت" اس نے دہاڑ کے کہا اور مجھے دھکا دیا۔

میں جیپ میں سوار ہوگیا اور آگے جا کے بیٹھ گیا۔ جب غالب جیپ میں چڑھ رہا تھا تو مجھے صورت حال کو اپنے حق میں کرنے کا ایک موقع ملا تھا۔ میں غالب کو واپس دھکیل کر اے ایس پی پر پھینک سکتا تھا اور اسے آف بیلنس کرکے آسانی سے قابو کر سکتا تھا مگر اس میں مرزا غالب کا شہید ہوجانا لازمی تھا چناں چہ میں نے صبر سے کام لیا اور خود کو قائل کیا کہ ابھی اور بھی مواقع ملیں گے۔ اگر قدرت کو ہمیں بچانا منظور ہوگا تو وہ خود بہانہ فراہم کرے گی ورنہ ہم اپنی جان پر کھیل جائیں گے لیکن اتنی بے بسی کے ساتھ حوالات میں بند نہیں ہوں گے۔

جیپ کو چلا کے لانے والے کی صورت ابھی تک میں نے نہیں دیکھی تھی۔ اے ایس پی نے پولیس کی نفری کا ذکر کیا تھا مگر یہاں ایک ڈرائیور کے علاوہ وہ خود تھا۔ تیسرا کوئی نہیں تھا ورنہ اتر کے ضرور آتا۔ یہ ایک اُمید افزا خیال تھا کہ اب اے ایس پی بھی ہمارے ساتھ بیٹھے گا۔ اگر اس نے ڈرائیو کرنے کو ترجیح دی تو یہ مزید بہتر ہوگا کیوں کہ ایک پولیس جیپ کا ڈرائیور کسی اے ایس پی سے زیادہ خطرناک نہیں ہو سکتا۔ وہ ہوگا کوئی سال خوردہ کانسٹیبل یا ہیڈ کانسٹیبل۔ ایک نوجوان اور ذہین، براہ راست افسر بن کر آنے والے اے ایس پی کے مقابلے میں اس سے مقابلہ کرنا یقیناً آسان ہوتا۔ راستے میں تمہیں جھٹکا لگے گا یا موڑ آئے گا۔ ممکن ہے کوئی چھوٹا موٹا حادثہ ہوجائے۔

اے ایس پی نے بگڑ کے کہا "وشوا ناتھ! کیا اب میں آگے آکے تم سے درخواست کروں کہ پیچھے آؤ اور میرے ساتھ بیٹھو۔ وشوا ناتھ!"

کسی وشوا ناتھ نے افسر کو "یس سر" نہیں کہا تو میرے کان کھڑے ہوگئے۔ وشوا ناتھ خود ڈرائیور تھا یا ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔

"ڈرائیور! کیا ہوا ہے اس وشوا ناتھ کو؟ سو تو نہیں گیا ہے اسے لات مار کے نیچے گرا دو باسٹرڈ کو۔"

میں اور غالب جیپ کی درمیانی پارٹیشن سے دوسری طرف نہیں دیکھ سکتے تھے ورنہ ہمیں پتا چل جاتا کہ ڈرائیور کے علاوہ بھی آگے کوئی بیٹھا ہے تو وہ افسر کے حکم کی تعمیل کیوں نہیں کرتا اور خود ڈرائیور کیوں خاموش ہے؟

غالباً خود اے ایس پی کو بھی یہی بات حیران کر رہی تھی تاہم وہ پریشان نہیں تھا۔ اسے پریشان ہونے کی مہلت بھی نہیں ملی۔ ابھی آخری الفاظ اس کے لبوں سے ادا ہی ہوئے تھے کہ ایک ہاتھ آگے بڑھا اور بھرپور انداز میں اس کی گردن پر پڑا۔

میں نے اس ہاتھ کو پہچان لیا اور چلاّ کے کہا "نازو!"

اے ایس پی کے گرتے ہی نازو سامنے آگئی "جلدی کرو۔"

غالب نے ہکلا کے کہا "مگر...... تم...... یہاں؟"

"اسے اٹھا کے اندر ڈالو مسٹر ہکا اینڈ مسٹر بکا۔ آگے میرے ساتھ وشوا ناتھ تو نہیں۔ گل ہے۔"

میں نے بے حس پڑے ہوئے اے ایس پی کو اٹھا کے جیپ میں ڈال دیا "شاباش۔ تم نے آج اپنا سہاگ اجڑنے سے بچا لیا۔"

"نازو!" غالب نے کہا "تم واقعی بھوت کی بچّی ہو۔"

نازو نے کوئی جواب نہیں دیا اور جیپ اسٹارٹ کردی۔ میں نے درمیان میں پڑے ہوئے اے ایس پی کو دیکھا، دور نظر سے اوجھل ہوتے ہسپتال کو دیکھا اور ایک لمبی گہری سانس لی۔

"تم نے بالکل ٹھیک کہا مرزا۔ یہ تمہارے مستقبل کی شریک حیات بھوت کی بچّی ہے۔ بلکہ خود بھوت ہے۔ جن ہے۔"

غالب نے فخریہ مسکراہٹ کے ساتھ اس خراج تحسین کو قبول کیا "پتا نہیں یہ کیسے پہنچ گئی۔"

میں نے کہا "پتا کیوں نہیں۔ اس نے پیچھا کیا ہوگا ہمارا۔ کل رات کی بات سے معاملہ گڑبڑ ہوگیا ہے تمہارا۔"

"صرف میرا...... وہ کیسے؟"

"بھائی، ابھی سے اعتبار اٹھ گیا تیرا۔ بعد میں کیا ہوگا؟" میں نے کہا "شوہر پر بھروسہ نہ ہو بیوی کو تو زندگی ایسے گزرتی ہے کہ بس خدا دشمن کی نہ گزارے۔"

"آپ نے مروایا تھا مجھے۔"

"قسم خدا کی، میں کبھی جھوٹ نہ بولتا رابعہ سے، سب سچ بتا دیتا کہ کہاں گیا تھا" میں نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

"خیر، اس وقت وہی بے اعتباری کام آگئی۔ اس کی وجہ سے رابعہ کا سہاگ بھی اُجڑنے سے بچ گیا۔" غالب بولا۔

"سوال یہ ہے کہ اپنے وشوا ناتھ جی کہاں گئے؟"

"نازو نے انہی کی وردی پہن رکھی ہے" غالب نے کہا۔

"اس وردی میں دو تو سما نہیں سکتے" میں نے کہا "جیسے ایک نیام میں دو تلواریں۔"

"میرے پاس ایک تلوار بھی ہوتی تو اس بات پر آپ کا سر بھٹے کی طرح اُڑا دیتا" غالب نے کہا۔

"سوال یہ ہے کہ اب ہم کہاں جارہے ہیں؟ پہلے تو خیر تھانے جارہے تھے۔"

"اب کھانے جارہے ہیں۔ ڈنر" غالب بولا۔

اسی وقت جیپ رک گئی اور ایک ساتھ گل اور نازو مضحکہ خیز حلیوں میں نمودار ہوئیں۔ انہوں نے جو پولیس والوں کی وردی پہنی تھی وہ ان کے سائز سے بہت بڑی تھی۔

"تم نے پیچھا کیا تھا ہمارا؟" غالب نے اسے ڈانٹا۔

"شکر کرو، وقت پر پہنچ گئے" نازو بولی۔

میں نے کہا "قدرت کا کوئی کام مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔ اب یہی دیکھ لو کہ رات ہم چوری چھپے نہ نکلتے تو تمہارے دل میں شک پیدا نہ ہوتا اور شک نہ ہوتا تو تمہیں تعاقب کرنے کا خیال نہ آتا۔ مگر تم نے کیسے اندازہ کرلیا کہ دال میں کالا ہے؟"

نازو نے کہا "دماغ سے کام لے کر۔ اور عقل سے کام لے کر۔"

غالب قہقہہ مار کے ہنسا اور چپ ہوگیا۔

"اب ہنستے ہو۔ کیسی بھیگی بلی بنے تھانے جارہے تھے، ذرا بھی عقل ہوتی تو دیکھ لیتے کہ باہر پولیس کھڑی ہے اور اندر اندھیرا ہے۔ بھلا ہسپتال بھی بند ہوتا ہے کبھی۔"

میں نے شرمندگی سے کہا "تم اندر بھی آئی تھیں؟"

"ہاں۔ دروازے تک گئے تھے۔ تم ہینڈز اپ کئے کھڑے تھے۔ وشوا ناتھ جی سے پوچھا کہ کیا بات ہے تو انہوں نے سمجھا کہ ہم ڈاکٹر رکمنی کی مریض ہیں۔ اور بھی دو عورتیں پوچھ کے جا چکی تھیں کچھ دیر پہلے۔ اس نے ہمیں بتا دیا کہ ان کو قتل کر دیا گیا ہے۔"

"اس نے بتایا کہ قتل کرنے والے کون تھے؟"

"نہیں۔ خود میں نے اندازہ کرلیا کہ وہی ہوں گے جن کے سردار کا قتل ہوگیا تھا۔ وہ چندو کو تلاش کرتے پھر رہے ہوں گے۔"

"تمہاری ذہانت نے تو مجھے دنگ کر دیا ہے بی بی" میں نے کہا "تم شرلاک ہومز کا زنانہ ایڈیشن ہو۔"

"وشوا ناتھ اور جیپ چلانے والا، دونوں مارے گئے حالانکہ میں مارنا نہیں چاہتی تھی انہیں" نازو نے افسوس سے سر ہلایا۔ "وہ وشوا ناتھ تو میری توقع سے زیادہ نازک ثابت ہوا۔ ڈرائیور نے مقابلہ کرنے اور شور مچانے کی کوشش کی تھی۔"

"انہیں کہاں چھوڑا ہے؟" میں نے کہا۔

"وہیں۔ ایک کنارے پر ڈال دیا تھا" نازو بولی "فکر کی کوئی بات نہیں۔ انہیں کسی نے دیکھا بھی تو صبح ہونے سے پہلے نہیں دیکھے گا۔"

"اور اس سے پہلے بھی دیکھ لیا تو کیا ہوگا؟ کچھ بھی نہیں۔ وہ کسی کو کیا بتائیں گے" گل نے کہا۔

"مگر یہ جو ہمارے ساتھ ہے۔" میں نے کہا "یہ ہوش میں آتے ہی ہنگامہ کھڑا کر دے گا۔"

"اب ہمیں فوراً اس ہوٹل سے اپنا سامان اٹھا لینا چاہئے" غالب نے کہا "اس واردات کے بعد مجھے یوں لگتا ہے جیسے قبیلے والے ہماری تلاش میں ہوں گے۔ وہ جاہل اور بے وقوف نظر آنے والے لوگ میری توقع سے زیادہ خطرناک ثابت ہوئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ کمار کو ڈھونڈھ نکالیں اور کمار کے ذریعے ہم تک پہنچنے میں کامیاب ہوجائیں۔"

میں نے کہا "یار، اب اتنا ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ کلکتہ بہت بڑا شہر ہے۔ یہاں کسی کو پتے کے بغیر تلاش کرنا ایسا ہی ہے جیسے بھوسے کے ڈھیر میں سوئی کو تلاش کرنا۔"

"مگر اس کے باوجود انہوں نے چندو کا پتا چلا لیا۔"

"وہ...... اتفاق، بدقسمتی کچھ بھی کہہ لو" میں نے کہا۔

"ایسا ہی اتفاق ہمارے ساتھ بھی ہو سکتا ہے، اگر ہسپتالوں کی طرح وہ ہوٹلوں میں دیکھنے لگے۔"

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ انہیں سردار کے قاتل کی تلاش تھی۔ وہ اس کو سزا دینا چاہتے تھے۔ ہم سے ان کی کیا دشمنی۔ ہمارا کوئی جرم ہے تو بس اتنا کہ ہم نے ان کے مجرم کی مدد کی اور خود بھی اس کے ساتھ فرار ہوگئے۔ چندو مر گیا۔ یہ بات معلوم ہوجانے کے بعد وہ واپس لوٹ گئے ہوں گے۔"

"پھر وہ سونا کیوں مانگ رہے تھے؟"

"ظاہر ہے ان کی چیز تھی۔ انہیں حق حاصل تھا مانگنے کا، مگر اس کی خاطر وہ کلکتہ کی خاک چھانتے پھریں، یہ مشکل لگتا ہے مجھے۔ پھر بھی میں اس تجویز سے متفق ہوں۔ ہمیں بلا تاخیر اس ہوٹل سے نکل جانا چاہئے" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "ہوٹل سے کیوں؟ شہر سے کیوں نہیں؟"

"ہاں۔ اب کیا مشکل ہے؟" نازو بولی "پہلے ہمارے پاس کوئی شناخت نہیں تھی مگر اب ہم انڈین نیشنل ہیں۔ پاسپورٹ کی رو سے۔"

"پیسہ بھی ہے ہمارے پاس۔" گل نے کہا "ہم ہوائی جہاز میں بیٹھ کے کہیں بھی جا سکتے ہیں۔"

میں نے ہنس کے کہا "کیا بچّوں جیسی باتیں کرتی ہو۔ صرف پاسپورٹ ملنے سے ہر بھارتی کو دنیا کے کسی بھی ملک میں جانے کا حق حاصل نہیں ہوجاتا۔ اس کے لئے متعلقہ ملک کے سفارت خانے سے ویزا حاصل کرنا پڑتا ہے۔ بنگلہ دیش کو ابھی تک بین الاقوامی سطح پر سفارتی مراعات حاصل نہیں ہوئیں۔ اسے تسلیم کرلینا الگ بات ہے مگر ابھی تک ان کی کرنسی پاکستانی ہے۔ پاسپورٹ بھی وہی ہوں گے۔ ہوائی جہاز سے وہاں جانے کے لئے ہمیں پاکستانی سفارت خانے یا کونسلیٹ سے رجوع کرنا ہوگا۔"

"ابھی یہ مسئلہ تو حل کرو" نازو نے جیپ کی طرف دیکھا۔

"میرا خیال ہے کہ جیپ کو چھوڑ دینا چاہئے۔ اور تم بھی یہ

مضحکہ خیز وردیاں اتار دو۔ دن کا وقت ہوتا تو نہ جانے کتنے لوگ دیکھ کر ہنستے اور شکوک میں مبتلا ہوتے" غالب نے کہا "تمہارے اپنے کپڑے کہاں ہیں؟"

"اس وردی کے نیچے" نازو نے کہا۔

"اور وہ دونوں، کیا ایسے ہی پڑے ہوئے ہیں؟"

"ظاہر ہے۔ اتنا وقت کہاں تھا ہمارے پاس کہ انہیں اپنے کپڑے پہناتے" نازو نے کہا "اور یہ تھا بھی بہت مشکل کام۔"

گل اور نازو نے وردیاں اتار کے جیپ میں ڈال دیں۔ ساری پر پتلون پہننا کوئی آسان کام نہ تھا چنانچہ جیپ کی اوٹ میں رہتے ہوئے انہوں نے پھر ساری کو ٹھیک کیا۔ کلکتہ میں بھی بڑے شہروں کی طرح لوگوں کو نظر اٹھا کے کسی کی طرف دیکھنے کی نہ فرصت تھی اور نہ ضرورت۔ کوئی کیا کررہا ہے اور کیوں کررہا ہے۔ کوئی پروا نہیں کرتا تھا۔ کسی کا حلیہ بھی لوگوں کو متوجہ نہیں کرتا تھا۔ لوگ ہر قسم کے حلئے میں نظر آتے تھے۔ لنگوٹی سے تھری پیس سوٹ تک اور ترکی ٹوپی سے ہیٹ تک۔ وہاں ہر قومیت کے لوگ آباد تھے اور جسے جو میسر آتا تھا وہ بلا تکلف پہن لیتا تھا۔

سڑک کے ایک کنارے کھڑی ہوئی جیپ کو بہت سے لوگوں نے دیکھا تھا اور گزر گئے تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ راستے کے ہر اسٹریٹ لیمپ کو یا ہر گزرنے والی کار کو دیکھتے تھے مگر دیکھنے کے اس عمل کا تعلق آنکھوں سے تھا' دماغ سے نہیں۔ اگر گل اور نازو سب کے سامنے ساری پر سے وردی اتار دیتیں تب بھی شاید کوئی رک کر نہ پوچھتا کہ یہ کیا چکر ہے۔

ابھی تک میں طے نہیں کرپایا تھا کہ اس اے ایس پی کا کیا کروں۔ اسے مارنا بے مقصد تھا اور بلا ضرورت اس کی جان لینا کوئی بھی منظور نہ کرتا۔ اسے مسلسل بے ہوش رکھنا بھی مشکل تھا اور ایسی کوئی جگہ بھی نہ تھی جہاں اسے قید رکھا جاتا۔

اس موقع پر غالب نے ایک تجویز دی "کیوں نہ ہم اسی کے ساتھ نکل جائیں۔ اسی جیپ میں۔"

میں نے کہا "اسے یرغمال بنا کے؟"

"ہاں۔ جیپ اسے ڈرائیو کرنے دیں۔ یہ ہمارے تحفظ کا ضامن بن جائے تو ہم اس کو یہ ضمانت فراہم کردیں کہ اسے خیروعافیت کے ساتھ واپس آنے دیا جائے گا۔ ایک پولیس آفیسر ہمیں بارڈر کراس کرا سکتا ہے۔"

"اور اگر یہ نہ مانا؟" میں نے سوچ کے کہا۔

"یہ پھر دیکھیں گے" غالب نے کہا "ابھی تو ہم چل کے ہوٹل سے سامان اٹھاتے ہیں اور نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ رات بھر میں ہم کافی دور جا سکتے ہیں۔ کوئی رکاوٹ حائل نہ ہو تو ڈھاکا پہنچ سکتے ہیں۔"

اس تجویز سے سب نے اتفاق کیا اور ایک بار پھر ہم جیپ میں سوار ہوگئے۔ اب جیپ میں چلا رہا تھا۔ رات کے وقت پولیس کی جیپ اس وقت پہچانی جاتی تھی جب گزر جاتی تھی۔ میرے جسم پر وردی نہیں تھی مگر افسران عموماً سرکاری جیپوں کو ذاتی استعمال میں رکھتے ہیں اور ڈیوٹی کے اوقات میں بھی وردی کے بغیر نظر آتے ہیں۔

میں نے اے ایس پی کو نازو کی نگرانی میں چھوڑا اور نازو کی حفاظت کے لئے غالب کو جیپ میں بیٹھے رہنے کی تاکید کی۔

"ہم ابھی آتے ہیں۔ بل ادا کرکے" میں نے کہا۔

"زیادہ دیر مت کرنا" نازو بولی۔

"اگر اس عرصے میں یہ ہوش میں آنے لگے....."

"تو میں اس سے نمٹ لوں گی" نازو نے میری بات کاٹ دی "بلکہ اس سے بھی نمٹ لوں گی جو میرے محافظ کی طرف بری نیت سے دیکھے گا۔"

غالب نے کہا "تم سے زیادہ بدنیت کون ہوگا۔"

میں نے کہا "مصروفیت کے لئے شوق سے لڑو مگر خود کو تماشا مت بنانا۔ یہ نہ ہو کہ ہم واپس آئیں تو اردگرد مجمع ہو۔"

مجھے ہوٹل سے اسباب اٹھانے اور بل ادا کرکے باہر آنے میں تقریباً آدھا گھنٹہ لگ گیا۔ ہمارا سامان ہی کیا تھا۔ صرف ایک سوٹ کیس جو ہم نے معتبر نظر آنے کے لئے خریدا تھا۔ کچھ کپڑے اور ایک بریف کیس جو دیکھنے میں بھی بہت قیمتی لگتا تھا۔ اس میں ہمارا سارا اثاثہ محفوظ تھا۔ نقد رقم' پاسپورٹ اور ریوالور۔ میں نے احتیاطاً یہ کی کہ نوٹ اور اسلحہ سوٹ کیس میں کپڑوں کے نیچے چھپادئے اور بریف کیس میں تھوڑی سی رقم کے ساتھ پاسپورٹ اور اخبارات وغیرہ ڈال لئے۔

ہوٹل کا پورٹر سوٹ کیس گیٹ پر چھوڑ کر اور ٹپ لے کر رخصت ہوگیا تو میں نے بریف کیس گل کو تھمادیا اور ... خود سوٹ کیس اٹھا کے اس طرف چل پڑا جہاں پولیس کی جیپ میں غالب اور نازو ہماری واپسی کے انتظار میں تھے۔ ابھی میں چند قدم دور رہ گیا تھا کہ کسی نے پیچھے سے مجھے آواز دی۔ اس نے میرا نام لئے بغیر کہا تھا "سر!" چنانچہ پہلے میں نے یہی سمجھا کہ پکارنے والا کسی اور کو پکار رہا ہے۔ پھر مجھے آواز جانی پہچانی لگی اور میں نے رک کر پیچھے دیکھا۔ اس وقت تک کمار تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا میرے قریب آگیا تھا۔ وہ بہت پریشان تھا اور بار بار پلٹ کر دیکھتا تھا۔

"خدا کا شکر ہے کہ میں وقت پر پہنچ گیا۔"

میں اپنی حیرانی پر قابو پاچکا تھا۔ "کمار! تم کہاں تھے؟"

کمار نے کہا "لمبی بات ہے۔ پھر بتاؤں گا۔ آپ ہوٹل چھوڑ کے جارہے ہیں؟"

"ہاں' ہم نے بہت انتظار کیا تمہارا۔"

"کہاں جارہے ہیں آپ؟" وہ بولا۔

میں نے کہا "ابھی کچھ پتا نہیں۔ شاید کسی دوسرے ہوٹل میں۔ یا کہیں اور۔"

"میری مانیں سر۔ تو کسی ہوٹل میں مت جائیں۔" وہ میرے ساتھ چلنے لگا "باقی لوگ کہاں ہیں؟"

"وہ۔ ادھر جیپ میں بیٹھے ہیں۔ تمہاری ٹیکسی کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

"ٹیکسی ...... وہ میں نے آج بیچ دی۔ کھڑے کھڑے سودا کرلیا" وہ بولا۔

"مگر کیوں؟"

"بہت خطرہ تھا ٹیکسی چلانے میں۔ سب جانتے ہیں مجھے' کوئی بھی بتادیتا کہ راج کمار کی ٹیکسی کون سی ہے اور کہاں ہے۔ میری بہن کے قاتل میری تلاش میں پھر رہے ہیں۔"

میں نے کہا "یقین کرو' ہمیں بہت دکھ ہوا۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ وہ وہاں پہنچ جائیں گے۔ ورنہ ہم چندو کو کہیں اور لے جاتے۔"

اس نے آنکھوں میں آجانے والے آنسو آستین سے صاف کئے۔ "چھوڑیں سر' ہونے والی بات تھی۔ آپ کا کیا قصور ہے اس میں۔ وہاں آپ ہوتے تو آپ بھی مارے جاتے۔ میں بال بال بچ گیا۔"

ہم جیپ تک پہنچے تو نازو نے کہا "کمار۔"

میں نے کہا "یہ وقت پر پہنچ گیا۔ ورنہ ہم تو نکل جاتے۔"

"میں بہت دیر سے کھڑا تھا وہاں۔ میں نے آپ کو اندر جاتے بھی دیکھا تھا" وہ بولا "میں اندر نہیں جاسکتا تھا۔"

"اندر کیا تھا؟" میں نے کہا۔

"میں ڈرتا تھا..... آپ بھی خدا کا شکر ادا کریں کہ ابھی تک وہ یہاں نہیں پہنچے۔ وہ ضرور ہوٹلوں میں دیکھ رہے ہوں گے۔ یہ ذرا اونچا ہوٹل ہے اس لئے ان کا دھیان ادھر نہیں گیا ہے۔ وہ ابھی عام مسافر خانوں اور ہوٹلوں میں تلاش کررہے ہوں گے۔"

"تم بلاوجہ ڈرے ہوئے ہو۔ اتنے یقین کے ساتھ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"مجھے معلوم ہے سر۔ معلوم ہے۔ وہ ایسے ہی لوگ ہیں۔ ضدی اور کینہ پرور۔ کبھی ہار نہ ماننے والے" وہ بولا۔

"تم سے کیا دشمنی ہے ان کی؟"

"رکمنی سے کیا دشمنی تھی انہیں؟" وہ بولا۔

"رکمنی نے ..... انہیں بتادیا ہوتا ....." میں نے کہا "ہمارے بارے میں.... اور اس سونے کے بارے میں۔"

"کیسے بتاتی وہ۔ اسے کچھ معلوم ہوتا تو بتاتی۔ میں نے اسے نہیں بتایا تھا کہ آپ لوگ کس ہوٹل میں ہو۔ ہاں میرے بارے میں کچھ نہ بتا کے اس نے غلطی کی۔ وہ میرا پتا بتادیتی۔ میں سونا ان کے حوالے کردیتا۔ پھر وہ چلے جاتے۔ مگر رکمنی نے مجھے بچایا۔ اور اس سونے کو جس سے میں نے ......" وہ اچانک پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

میں نے اسے تسلی دی "حوصلے سے کام لو۔ ہم تو خیر اب جارہے ہیں۔ بعد میں اپنا خیال رکھنا۔ اور پارو کا۔"

"ہم آپ کے ساتھ جائیں گے سر۔ میں اور پارو۔ اسے میں نکال لایا ہوں۔ ورنہ وہ اس کو پکڑ لیتے اور پھر مجھے۔"

میں حیران رہ گیا "تم اسے بھی لے آئے ہو! کہاں ہے وہ؟"

"ادھر۔ ایک گاڑی میں بیٹھی ہے۔ ٹیکسی بیچ کے جو رقم ملی تھی مجھے' اس کی گاڑی لی ہے میں نے۔ یہ جیپ تو پولیس کی ہے۔ اور یہ۔ اندر کون لیٹا ہے؟" اس نے جھانک کے کہا۔

میں نے کہا "کمار' میرا خیال ہے کہ تم جاؤ۔ ہمارا اور تمہارا ساتھ نہیں بنتا۔ میرا مشورہ ہے کہ اپنی اور پارو کی جان بچاؤ۔ اپنی زندگی سے زیادہ کسی چیز کی اہمیت نہیں ہوتی۔"

"ایک چیز اہم ہوگئی ہے سر۔"

"وہ کیا؟"

"انتقام۔ رکمنی کے قاتلوں سے" وہ بولا۔

"فضول باتیں مت کرو۔ پارو کے ساتھ جاؤ اور انہیں وہ سونا واپس کردو جس کی خاطر وہ تمہارے پیچھے پھر رہے ہیں۔ ان کی چیز انہیں دے دو۔ جان مت دو۔" میں نے کہا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا "اب یہ نہیں ہوسکتا۔ پہلے ہوسکتا تھا۔ اگر وہ رکمنی کو نہ مارتے تو میں سب کچھ انہیں دے سکتا تھا۔ اپنی جان بھی۔ مگر اب یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میں رکمنی کے خون کو بھول جاؤں۔ کتنے ارمانوں سے پالا تھا میں نے اسے۔ اتنا بڑا کیا تھا۔ ڈاکٹر بنایا تھا۔ اب اس کی شادی ہونے والی تھی۔ راجن پاگل ہوگیا ہے۔ تم کہتے ہو میں یہ سب بھول جاؤں" وہ چلانے لگا۔

"اچھا دوست" میں نے کہا "کیا کروگے آخر تم؟ کیسے بدلہ لوگے ان سے؟ تمہیں کیا معلوم کہ قبیلے کے کتنے افراد تھے اور کون تھے۔"

"میں معلوم کرلوں گا۔" وہ بولا۔

"تم خود بھی مارے جاؤ گے۔ پارو کا ہی کچھ خیال کرو۔"

"وہ پاگل تو خود میری جان نہیں چھوڑتی۔ میں اسے چھوڑ کے بھاگ جاتا۔ مگر وہ دھمکی دیتی ہے کہ اپنی جان لے لے گی۔ اور مجھے معلوم ہے وہ ایسا ہی کرے گی۔ ایسا کرسکتی ہے وہ۔"

میں نے کہا "اچھا۔ ہم کہیں اور جا کے بات کریں گے۔ تم جاؤ' اپنی گاڑی یہاں لے آؤ۔"

وہ نفی میں سر ہلانے لگا "نہیں۔ آپ یہ جیپ لے کر میرے ساتھ چلو۔ مجھے معلوم ہے آپ بھاگ جاؤ گے مجھے چھوڑ کر۔"

"کمار! خدا کے لئے سوچو کہ تم کیسے جاسکتے ہو ہمارے ساتھ۔ تمہیں کچھ معلوم نہیں کہ ہم کون ہیں" میں نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے کون ہو تم۔ سب جان چکا ہوں میں۔ پہلے مجھے شک ہوا تھا کہ تم مفرور مجرم ہو۔ تمہارا رویہ پُراسرار تھا۔ پھر میں نے معلوم کرلیا۔"

میں نے اس پر نظر جما کے کہا "کیسے معلوم کرلیا؟"

غالب نے کہا "کیا معلوم کرلیا؟"

"میں نے اخبار دیکھے۔ پرانے اخبار۔ ان میں تمہاری تصویریں ہیں۔" وہ بولا "اکثر لوگ بھول چکے ہیں مگر پھر بھی تمہیں غور سے دیکھنے والا پہچان لے گا۔ اگر اس کا حافظہ کمزور نہ ہوا۔"

ہم سب کو اس انکشاف نے سُن کردیا تھا۔ یہ حیرت سے زیادہ خوف کا ردِّ عمل تھا اور اپنی کوتاہی کا احساس تھا۔ ہم مطمئن تھے کہ یہاں کوئی خطرہ نہیں۔ خطرہ ہر گھڑی ہر لحظہ ہمارے ہمرکاب تھا۔

میں نے کہا "سب کچھ جان لینے کے بعد بھی تم نے کچھ نہیں کیا۔"

"میں نے اس راز کی حفاظت کی۔"

میں نے کہا "آخر کیوں؟ تم کو انعام وصول کرنے کا خیال نہیں آیا؟"

"میرے دل میں عزت نہ ہوتی آپ سب کی۔ اس مقصد کی جس کی خاطر آپ لوگ مصیبت اٹھارہے ہو تو میں ایسا ہی کرتا مگر میں خود قوم پرست ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ میں بھارتی ہوں اور تم پاکستانی ہو۔ اگر یہ سب بھارت میں ہوتا جس کے خلاف تم میدانِ عمل میں کودے تو شاید میں بھی یہی کرتا۔ خود کچھ نہ کرتا تو بھارت کے غداروں سے لڑنے والوں کا ساتھ ضرور دیتا۔ ساتھ بھی نہ دے پاتا تو ان کی مدد ضرور کرتا اور مدد بھی نہ کرسکتا تو حمایت ضرور کرتا۔ ایک اچھے کام کی اور نیک مقصد کی حمایت تو کوئی بھی کرسکتا ہے۔ میرے نزدیک تم اچھے آدمی ہو جو اپنے ضمیر کی آواز سُن کے خاموش نہیں رہتا۔ عملاً کچھ کرتا ہے۔ قربانی دیتا ہے اور مخالفت مول لیتا ہے۔ دشمنوں کا سامنا کرتا ہے اور جان خطرے میں ڈال کے بھی اپنے ارادے پر قائم رہتا ہے۔"

"تم بھارتی ہو اور ہم پاکستانی۔ کیا یہ فرق بھول سکتے ہو تم؟ ہمارے درمیان سیاسی فاصلہ ہے جو ہمیں دور کرتا ہے۔"

"مگر یہ کام جو تم کررہے ہو' یہ سیاسی مسئلہ نہیں ہے۔ اخلاقی مسئلہ ہے۔ تم غداروں سے لڑ رہے ہو۔ بھارت سے یا بنگلہ دیش بنانے والوں سے نہیں لڑ رہے ہو۔ مجھے حمایت کرنی چاہئے تمہاری۔ بالکل اسی طرح جیسے مجھے دنیا کے کسی بھی حصے میں ہونے والی لڑائی میں اس فریق کا ساتھ دینا چاہئے جو انسانی اور اخلاقی مسئلے سے لڑ رہا ہو۔ مثلاً بھوک سے یا بیماری سے۔ یہ تو میں نہیں کرسکتا کہ کسی انعام کی خاطر ایک نیک مقصد کو ختم کردوں۔"

میں نے مسکرا کے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا "اوکے۔ میں قائل ہوگیا۔ اب زیادہ لمبی تقریر کی ضرورت نہیں۔ باقی باتیں پھر کریں گے۔ ابھی چلو' تمہاری گاڑی کہاں ہے؟ میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔"

وہ میرے ساتھ چل پڑا "آپ نے بہت غلطیاں کی ہیں سر۔ کئی بار آپ نے نام لیا میرے سامنے۔"

"اس میں ارادے کو دخل نہیں تھا۔"

"مگر ایسی غلطی آپ کو غیرارادی طور پر بھی نہیں کرنی چاہئے۔ اب یہ پولیس کی جیپ کہاں سے لے آئے ہیں آپ؟"

میں نے اسے مختصراً ساری بات بتادی لیکن اسے اپنا ردِّ عمل ظاہر کرنے کا موقع نہیں ملا۔ ہم ایک پرانی سی گاڑی تک پہنچ گئے تھے۔ یہ دس سال پرانی اوپل ریکارڈ تھی۔ ایک مضبوط اور بھروسے کے قابل گاڑی جس پر ابھی تک زرد رنگ کی نمبرپلیٹ لگی ہوئی تھی۔

میں نے کہا "یہ ہے تمہاری گاڑی۔ یہ تو....."

"مجھے معلوم ہے" وہ بولا "یہ چوری کی ہے۔ ڈھاکا سے لایا تھا ایک شخص۔ مجھے پانچ ہزار میں دے دی۔"

"مگر یہ ڈپلومیٹک نمبرپلیٹ سفارتی عملے کے زیرِاستعمال گاڑیوں کے لئے ہوتی ہے" میں دروازہ کھول کے اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔

"ابھی کون پوچھنے والا ہے" وہ بولا "اُدھر افراتفری ہے۔ لوگ بھاگ رہے ہیں۔ جس کے ہاتھ جو لگتا ہے وہ لے آتا ہے۔ اس گاڑی کو روکتا کوئی نہیں۔"

"اور جس ملک کے سفارت خانے کی یہ نمبرپلیٹ ہے؟"

"اگر کوئی دیکھ بھی لے گا تو یہی سمجھے گا کہ شاید ڈھاکا سے ہماری گاڑی آئی ہے۔ آج کل سفارت کار بھی ادھر اُدھر پناہ لے رہے ہیں۔ زیادہ تر کلکتہ میں ہیں" وہ بولا۔

"بعد میں کیا کروگے؟"

"چھوڑدوں گا اسے کہیں بھی۔ پانچ ہزار میں پانچ ہزار میل کی سواری کیا بری ہے۔ اور جس مقصد کے لئے میں نے لی ہے وہ ایسی گاڑی میں آسانی سے پورا ہوگا۔ کوئی اور گاڑی مجھے اتنی سستی کہاں ملتی۔ جو پیسہ بچا اس سے میں نے اسلحہ خریدا۔ وہ بھی آج کل بہت سستا ہے۔ اسمگل ہوکے آرہا ہے" اس نے گاڑی چلاتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ "ایک چائنیز آٹومیٹک رائفل مل گئی۔"

پچھلی سیٹ پر سے پارو نے کہا "سر' آپ اسے سمجھاؤ۔ یہ تو پاگل ہوگیا ہے بالکل" وہ رو رہی تھی اور ٹوٹی پھوٹی اُردو بولتی تھی۔

میں نے چونک کر پیچھے دیکھا "پارو! معاف کرنا میں نے تمہیں دیکھا ہی نہیں تھا۔ باتوں میں الجھ گیا تھا۔"

"بکواس بند کر۔ اُلّو کی پٹھی۔ مجھے پاگل کہتی ہے" کمار نے بگڑ کے کہا "کوئی تجھے ایسے مار جاتا تو میں دیکھتا تیرا بھائی کیا کرتا۔ میرا ساتھ نہیں دے سکتی تو اُتر جا۔"

میں نے بہتر سمجھا کہ فی الحال اس مسئلے کو نہ چھیڑوں۔ کمار کے جذبات کا آتش فشاں اتنا بلند تھا کہ اسے ٹھنڈا کرنے کے لئے الفاظ کا سمندر بھی ناکافی ہوتا۔ اس کا غم ابھی تازہ تھا۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ زخم کو مندمل ہونے کی مہلت ملے۔ وقت سب سے بڑا چارہ گر ہے جو ہر غم کی شدت کو ایسے کم کردیتا ہے کہ پتا بھی

نہیں چلتا۔ جیسے بہار کا سورج پہاڑوں کی برف کو پگھلاتا ہے۔ آہستہ آہستہ بے برگ زمین نمودار ہوتی ہے۔ پھر پودے اور خزاں دیدہ شاخوں پر شگوفے نمودار ہوتے ہیں اور جب بہار آتی ہے تو کسی کو وہ برف یاد بھی نہیں آتی جس نے زمین کو سفید کفن پہنا رکھا تھا۔ پھولوں کے رنگ' سبزہ اور نیلا آسمان نظر میں رہتا ہے۔

اتفاقِ رائے سے ہم نے جیپ کو وہاں سے دو میل دور ایک سڑک کے کنارے چھوڑ دیا۔ اے ایس پی نے ہوش میں آنے کے بعد کسی قسم کی مزاحمت نہیں کی تھی اور خود کو ہمارے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ غالباً نازو نے اسے اپنے طور پر سب سمجھادیا تھا اور وہ سمجھدار آدمی تھا کہ سمجھ گیا تھا۔

میں اور غالب اگلی سیٹ پر کمار کے ساتھ تھے۔ یہ بینچ ٹائپ سیٹ اتنی بڑی تھی کہ اس پر تین افراد کے لئے گنجائش تھی۔ پچھلی سیٹ پر پارو' گل اور نازو کے درمیان اے ایس پی کو مجبوراً فٹ ہونا پڑا تھا۔ وہ ہر طرف سے زنانہ فورس میں محصور تھا۔ عام حالات میں ایسی محفل میں خود کو راجہ اندر سے کم نہ سمجھتا مگر اب وہ خود کو اس کوّے کی طرح محسوس کررہا تھا جو بلیوں کی قید میں ہو۔ جیپ چھوڑنے کے بعد میں نے گھڑی دیکھی تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔

میں نے کمار کا اصلی نام لینے سے احتراز کیا۔ "تمہاری نظر میں کوئی ایسی جگہ ہے جہاں ہم آج کی رات گزارلیں' اپنے مہمان کے ساتھ۔"

غالب نے کہا "ہوٹل کی بات مت کرنا۔"

کمار نے سوچ کے کہا "جگہ تو ہے مگر....."

میں نے کہا "اے ایس پی صاحب کچھ نہیں کہیں گے۔ انہیں معلوم بھی نہیں ہوگا۔ ہم ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ دیتے ہیں۔"

جب نازو نے اے ایس پی کی آنکھوں پر پٹی باندھی تو اس نے قطعی احتجاج نہیں کیا۔ کمار نامعلوم سڑکوں اور گلیوں سے گاڑی گزار کے لے گیا اور نہ جانے کہاں ایک دروازے کے سامنے رک گیا۔ دروازہ مقفل تھا مگر وہ گاڑی سے اتر کے عقبی حصے میں گیا اور کچھ دیر بعد کھڑکی کھول کے جھانکنے لگا۔

"آجاؤ ادھر سے سب لوگ۔" اس نے کہا۔

میں نے کہا "یہ کیا ہے' کس کا گھر ہے؟"

اس نے کہا "جلدی کرو۔ اندر آکے پوچھ لینا جو بھی پوچھنا ہے۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔"

میں نے باری باری گل' نازو اور پارو کو اندر پہنچا کے اے ایس پی کو آگے بڑھایا اور اس کے پیچھے میں اور غالب بھی اندر اتر گئے۔ کمار نے کھڑکی بند کی' پردے برابر کئے اور لائٹ جلادی۔

"یہ ایک سیٹھ کی کوٹھی ہے۔ میں اس کا ڈرائیور تھا۔ وہ فیملی کے ساتھ لندن میں رہتا ہے" کمار بولا "کبھی آتا ہے تو یہاں ٹھہر جاتا ہے۔"

"آج رات تو نہیں آئے گا نا؟" میں نے کہا۔

"ہماری قسمت خراب ہوگی تو ضرور آئے گا" نازو بولی۔

"ہماری نہیں۔ خود اس کی" غالب بولا "اب تو ہم بن بلائے مہمان بلائے جان بن چکے۔ اسے نہیں آنا چاہئے یہاں۔"

"یہاں کھانے پینے کو کچھ ملے گا؟" میں نے کہا۔

"سب ملے گا" کمار بولا "ڈیپ فریزر بھرے پڑے ہوں گے۔ سیٹھ کی کوٹھی ہے۔ کسی کنگلے کی جھونپڑی نہیں۔"

کمار نے ٹھیک کہا تھا۔ وہاں عیش و عشرت کے لوازمات تک موجود تھے۔ دو گھنٹے بعد ہم سب کھاپی کے فارغ ہوچکے تھے اور چائے پی رہے تھے۔ اے ایس پی نے حالات سے مفاہمت کرلی تھی اور ہم سے مکمل تعاون پر آمادہ تھا۔ ہم اسے یقین دلا چکے تھے کہ ہم دہشت گرد ہیں اور تخریب کاری کے لئے بنگلہ دیش آتے جاتے رہتے ہیں چناں چہ وہ ہمارے بارے میں تجسس سے گریز کرے اور کوئی ایسی بات نہ پوچھے جس کا جواب جھانپڑ کے سوا کچھ نہ ہو۔ دو غلط سوال کرنے پر وہ دو جھانپڑ پہلے ہی کھا چکا تھا۔

اس نے سوچ سمجھ کے ایک سوال کیا "میں اپنے گھر والوں کو مطلع کرنا چاہتا ہوں۔"

کون گھر والے؟" غالب نے کہا۔

"ماں ہے۔ بیوی بچے ہیں اور کون۔"

"ان سے کیا کہوگے؟" غالب نے جرح کی۔

"یہی۔ کہ وہ فکر نہ کریں۔"

"انہیں فکر کرنے دو۔ بلکہ غور و فکر کرنے دو۔ دنیا میں کون ہے جسے فکر نہیں۔"

"یہ بہت ضروری ہے۔ پلیز' ورنہ وہ میرے آفس والوں سے پوچھیں گے اور آفس والے ایکٹو ہوگئے تو ہر جگہ میرے لاپتا ہونے کی خبر پہنچ جائے گی۔ یہ نہ ہو ہم بارڈر پر پکڑ لئے جائیں۔" وہ بولا۔

"اوکے۔ ان سے بات کرلو لیکن....."

"دھمکی مت دو۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم مجھے گولی ماردوگے ایک غلط لفظ منہ سے نکالنے پر۔ میں پوری کوشش کررہا ہوں اپنی جان بچانے کی۔ میں ایسی حماقت نہیں کرسکتا۔ میری ماں کا بھی میرے سوا کوئی نہیں ہے اور بیوی بچے تو خیر ہوتے ہی اپنے ہیں۔ آفس والوں کو بتانا بھی ضروری ہے۔"

نازو نے کہا "غالب! انہیں بات کرنے دو۔"

اے ایس پی نے ممنونیت کے ساتھ اسے مسکرا کے دیکھا "تھینک یو فار دی سفارش۔ میں تمہارا وار ابھی بھولا نہیں ہوں ظالم حسینہ۔"

اس نے اپنے گھر والوں سے مختصر بات کی اور انہیں صرف یہ کہا کہ وہ آفیشل ڈیوٹی پر دو تین دن کے لئے باہر جارہا ہے۔ پھر اس نے اپنے کسی افسر سے بات کی۔ بہت ہوشیاری سے اس نے کہا کہ وہ اچانک بیمار ہوگیا تھا اس لئے گھر چلا گیا اور ممکن ہے دو تین دن

ڈیوٹی پر نہ حاضر ہو۔

"اب بتاؤ تمہارا پلان کیا ہے؟"

"یہ سوال ایک جھانپڑ کے قابل ہے۔ دہشت گردوں سے ان کا پلان پوچھ رہے ہو۔ کیا یہ تھانہ ہے اور ہم قید کر کے یہاں لائے گئے ہیں؟" غالب نے ہم پر زور دے کر کہا۔

"تم نے کہا تھا کہ میں تمہیں بارڈر کراس کرا دوں۔ مجھے اتنا تو معلوم ہونا چاہئے کہ تم کون ہو۔ تمہیں کہاں جانا ہے اور کب؟" وہ بولا۔

میں نے کہا "پہنچنا تو ہمیں ڈھاکا ہے۔"

"تم جانتے ہو ڈھاکا فال ہو چکا ہے۔ اس کے بعد سے وہاں صورت حال کتنی خراب ہے۔ تمام سروسز بند ہیں۔ کوئی غیر ملکی آجا نہیں سکتا۔"

"نہ تم غیر ملکی ہو، نہ ہم" میں نے کہا "وہاں انڈین ملٹری کا کنٹرول ہے اور تم ایک پولیس افسر ہو۔"

"مگر تمہارے متعلق میں کیا بتاؤں گا کہ تم کون ہو؟"

"تم کہہ سکتے ہو کہ یہ ہمارے ہمدرد لوگ ہیں جن کو میں محفوظ مقام پر منتقل کر رہا ہوں۔ وہاں دو قسم کے لوگ غیر محفوظ ہوں گے۔ ایک وہ جو پاکستان کے حامی تھے اور بنگلہ دیش یا مکتی باہنی کے نزدیک غدار۔ دوسرے وہ جو مکتی باہنی میں شامل تھے، جنہوں نے چھپ کے انڈین آرمی کی مدد کی۔ تم ہمیں اس دوسرے گروہ کے ارکان قرار دے سکتے ہو۔ اس وقت جو بھی انتظامیہ ہے وہ انہی کی حفاظت کر رہی ہو گی۔ دوسری قسم کے لوگ تو عوام، حکومت اور بھارتی فوج تینوں کے ہاتھوں عذاب میں ہوں گے۔"

"میں سمجھ گیا۔ اب یہ بتا دو کہ تم کب جانا چاہو گے؟"

"ہم تو ابھی جانا چاہتے ہیں" میں نے کہا۔

"تو پھر انتظار کس کا ہے؟" وہ بولا "چلو۔"

"تمہارا کیا خیال ہے۔ رات کا سفر محفوظ رہے گا یا دن کا؟" میں نے کہا۔

"میرا مشورہ اگر کوئی اہمیت رکھتا ہے تو صبح روانہ ہونا بہتر رہے گا۔ رات کو ایک تو راستے سے بھٹک جانے کے امکانات کو مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ دوسرے بارڈر پر خطرہ زیادہ ہو گا۔ فوج کی طرف سے بھی اور چھاپا ماروں کی طرف سے بھی۔ ہم غلط فہمی رفع کرنے سے پہلے ہی نہ مارے جائیں۔ ہم تین آدمی بنگالی بول سکتے ہیں۔ باقی کو شاید لوگ اپنا دشمن سمجھ لیں۔ اس وقت انتقامی جذبات عروج پر ہیں۔ اور سیاسی لڑائی کے علاوہ غنڈہ عناصر کو کھلی چھوٹ ملی ہوئی ہے" وہ بولا۔

میں نے کہا "تم انگریزی بہت اچھی بولتے ہو۔ اور قائل بھی کر سکتے ہو۔ تمہارا مشورہ بالکل ٹھیک ہے۔ اب اگر تم سونا چاہو تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ درمیان والا دروازہ کھلا چھوڑ دینا۔ ہم سامنے ہی بیٹھے ہیں۔ دوسرے بیڈ کا دروازہ بند کر دینا۔"

اس نے پھر شکریہ ادا کیا اور اٹھ کے ساتھ والے مرے میں چلا گیا۔ وہاں دو بیڈ لگے ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور بیڈ روم تھا جس میں ہمارے اصرار پر گل، ناز و اور پارو سو رہی تھیں۔

اب میں، غالب اور کمار ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے اور ہمیں موقع مل گیا تھا کہ جس موضوع سے اب تک گریز کر آئے ہیں اس پر بات کر سکیں۔

میں نے کہا "کمار، تمہارا فیصلہ قطعی ہے۔"

اس نے اقرار میں سر ہلایا "ہاں۔ مجھے اور پارو کو تم راستے میں اتار دینا جہاں وہ بستی آئے۔"

میں نے حیرانی سے کہا "اس کا تو ہمیں پتا نہیں۔ چندو نہ جانے کس طرف سے آیا تھا۔"

"مجھے معلوم ہے" اس نے کہا "تمہارا راستہ پھر اُدھر سے گزرے گا۔ دریا کے اس پار سے مجھے کشتی مل جائے گی۔"

"اور تمہاری یہ گاڑی؟"

"یہ تم لے جاؤ" اس نے کہا "تمہارے زیادہ کام آئے گی۔"

میں نے کہا "تم پاگل ہو گئے ہو۔ ایسے منہ اٹھا کے جاؤ گے اس قبیلے میں۔"

اس نے کہا "تم کو میں نے ابھی تک اپنا پلان نہیں بتایا۔ تو وہاں ان لوگوں سے معافی مانگنے جاؤں گا۔ اور یہ ظاہر کروں گا میں خود ان کی امانت لوٹانا چاہتا تھا مگر مجھے موقع نہیں ملا۔ میں کہوں گا کہ رکمنی بے وقوف تھی۔ اس نے واقعی غلطی کی تھی، ان لوگوں کی مدد کر کے اور ان کا پتا نہ بتا کے۔ اس کی طرف سے اب میں معافی مانگتا ہوں اور اگر کچھ لوگ میرے ساتھ کر دئے جائیں تو میں ان کو سیدھا وہاں لے جا سکتا ہوں، جہاں چندو کے مددگار تمہارے سردار کے قاتل موجود ہیں۔ ظاہر ہے پھر وہ مجھے کچھ نہیں کہیں گے۔ الٹا میری خاطر تواضع ہو گی اور مجھے بہادر، باضمیر آدمی سمجھ کے وہ مجھ پر اعتبار کریں گے۔ میں کہوں گا کہ ایک ... سے وہی لوگ میری بہن کی موت کے ذمے دار ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ رکمنی کو مارنے والے واپس پہنچ چکے ہوں۔ ناکام ہو جانے کے بعد۔ انہیں دوبارہ میرے ساتھ کر دیا جائے گا۔ اگر وہ نہ ملے تو میں ان کا انتظار کروں گا۔ آخر کب تک تلاش جاری رکھ سکتے ہیں۔ ان کی واپسی تک میں قبیلے کا مہمان رہوں گا۔ اور پھر ان سے کہوں گا کہ اب میرے ساتھ چلو۔"

میں دکھ، حیرانی اور پریشانی کے ساتھ سب کچھ سنتا رہا اور اس کی صورت دیکھتا رہا "تمہارا پلان واقعی مکمل ہے، مگر ایک بات بتاؤ، اگر انہوں نے تمہاری بات پر اعتبار نہ کیا؟"

"اعتبار کیوں نہیں کریں گے۔ میں خود سوا سیر سونا ان کو پیش کروں گا تو پھر کیا بات رہ جائے گی۔ کون دستبردار ہوتا ہے مفت میں ملنے والے خزانے سے۔ اس سے ثابت ہو گا کہ میں معتبر ہوں۔"

"اچھا۔ اگر انہوں نے تمہاری تلاشی لی اور تمہارے پاس سے وہ چار ٹینیز آٹومیٹک رائفل برآمد ہو گئی۔ تو کیسے یقین دلاؤ گے انہیں کہ تم یہ بھی خیرسگالی کے جذبات کا اظہار کرنے کے لئے لائے تھے؟" غالب نے کہا۔

"میں ان کی بستی میں پہنچنے سے پہلے ہی سارا اسلحہ کہیں چھپا دوں گا۔" کمار بولا "بالکل خالی ہاتھ جاؤں گا میں۔ مجھے یہ بھی اندازہ ہے کہ وہ میری نگرانی کریں گے۔ مگر میرا رویّہ خود انہیں قائل کر لے گا کہ میرے عزائم غلط نہیں۔ رات کو کسی وقت میں خود یہ اسلحہ نکال لاؤں گا۔ اگر موقع ملا تو سوتے میں ہی سب کو چُن چُن کے مار ڈالوں گا۔ ورنہ صبح ایسی جگہ رکھ دوں گا کہ چلتے وقت آسانی سے اٹھایا جا سکے۔ میرا سامان وہی ہو گا جس کی وہ تلاشی لے چکے ہوں گے۔ ایک بیگ میرے ہاتھ میں ہو گا، ایک پارو کے پاس۔ مجھے رخصت کرتے وقت وہ کیسے شک کر سکتے ہیں کہ راتوں رات میرے پاس ان کی موت کا سامان آ گیا ہے۔ ہم کشتی سے یا لانچ سے کلکتہ روانہ ہوں گے اور راستے میں سب کا حساب برابر۔ سب کی لاشیں دریا اپنے ساتھ لے جائے گا اور سمندر میں پھینک دے گا۔" وہ کسی جنونی کی طرح بول رہا تھا۔

"اور اس کے بعد؟ باقی عمر تم چھپتے پھرو گے۔ ظاہر ہے پھر ان کی باری ہو گی۔ آخری بازی یہ لوگ کھیلیں گے۔ تمہیں، تمہاری بیوی کو اور شاید بچے کو مار کے" میں نے کہا۔

"نہیں۔ میں انہیں ایسا موقع فراہم نہیں کروں گا۔" کمار نے کہا "یہ لوگ اپنے آدمیوں کی واپسی کا انتظار کریں گے۔ جو کبھی لوٹ کر نہیں آئیں گے۔ ان کی لاشیں دریا میں گرانے کے بعد میں لانچ کا رخ بدل لوں گا۔ میں واپس کلکتہ نہیں جاؤں گا۔"

"پھر کہاں جاؤ گے؟"

"میں ڈھاکا پہنچ جاؤں گا۔ میں اور پارو کہیں بھی رہ سکتے ہیں۔ ابھی بڑے پیمانے پر آبادی کا انخلا ہو رہا ہے اور ہم تو ویسے بھی ہندو ہیں۔ اگر مسلمان ہوتے تو شاید مشکل میں پڑتے۔ ہم سے پوچھا جاتا کہ ہم کہاں کے رہنے والے ہیں اور کس کے ساتھی ہیں۔ لیکن کسی ہندو سے یہ کوئی سوال نہیں کرتا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ مسلمانوں کے علاقے سے جان بچا کے بھاگے ہیں، ہمارے لئے بنگلہ دیش کے دروازے کھلے ہیں۔"

"اور یہ دروازے کھولنے والے بھی ہندو ہی ہیں۔ تمہارا ففتھ کالم۔ جو ہمیشہ بنگال کے مسلمانوں کی پیٹھ میں خنجر گھونپتا آیا ہے؟" میں نے تلخی سے کہا۔

"دیکھو۔ میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔ میں بتا چکا ہوں کہ میرے دل میں تمہارے لئے اچھے جذبات ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے میں سیاہ فاموں کے حقوق کی جدوجہد کرنے والے مارٹن لوتھر کنگ یا تنظیم آزادیٔ فلسطین کے یاسر عرفات کے لئے رکھتا ہوں۔"

"تم مجھے بانس پر چڑھا کے ان لوگوں سے ملا رہے ہو جو قطب مینار سے بھی زیادہ بلند ہیں" میں نے کہا۔

"میں چاہتا ہوں تمہارا دل میری طرف سے صاف رہے۔"

میں نے کہا "مسٹر راج کمار! یہ بات تو مانی جا سکتی ہے مگر مجھے یہ بتاؤ کہ ہمارے ساتھ جانے پر کیوں اصرار تھا تمہیں؟ تم نے یہ گاڑی ایسے ہی خرید لی تھی۔ اب تم کہتے ہو ہمارے لئے لی تھی۔"

"دراصل۔ مجھے اکیلے جانے میں ڈر تھا کہ راستے میں ہی نہ پکڑا جاؤں۔ قبیلے کے لوگوں نے دیکھ لیا تو میری بات سُنے بغیر مجھے مار ڈالیں گے۔ میں نے سوچا کہ بھیس بدل کے اس گاڑی میں نکل جاؤں گا۔ اس گاڑی کو پولیس بھی نہیں روکے گی۔ میں اس بستی کے بالکل قریب پہنچ کے گاڑی کو جنگل میں چھپا دوں گا اور اپنا کام ختم کر کے اسی میں لوٹ آؤں گا۔ پھر مجھے تمہارا خیال آیا کہ اس گاڑی سے تمہارا کام آسان ہو جائے گا چنانچہ میں نے تمہارے ساتھ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں اور پارو ڈکی میں چھپ کے بھی جا سکتے تھے لیکن بعد میں مجھے یہ پلان سوجھ گیا کہ میں دشمن کو اس کے گھر میں جا کے اور اپنا بنا کے ماروں۔ بھیس بدل کے انہیں مارنے سے بات نہیں بنتی تھی۔ انہیں معلوم ہونا چاہئے تھا کہ بدلہ لینے والا کون تھا۔ تمہارے ساتھ ایک پولیس افسر بھی ہے اس لئے اب راستے میں تو کوئی خطرہ نہیں۔ گاڑی کی مجھ سے زیادہ تمہیں ضرورت ہے۔ تم چاہو تو اس کی قیمت دے دو۔ مجھے پیسے کی زیادہ ضرورت ہو گی۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے۔ پانچ ہزار تمہیں مل جائیں گے مگر کمار......"

"دیکھو، مجھے لیکچر مت دینا کہ معاف کر دینے میں بڑائی ہے اور مجھے قانون کو اپنے ہاتھ میں نہیں لینا چاہئے ورنہ میں مجرم بن جاؤں گا، میرا ضمیر مجھے تمام عمر ملامت کرے گا اور میرا بیٹا ایک قاتل کا بیٹا کہلائے گا۔ یہ سب کتابی باتیں ہیں۔ قانون میری مدد نہیں کرے گا۔ میں یہ بات سمجھتا ہوں۔ مجرم کو معاف کرنا جرم کی حوصلہ افزائی کے مترادف ہوتا ہے۔ میرا ضمیر اس وقت مجھے ملامت کرے گا جب میں نے اپنی بزدلی پر مفاہمت کا پردہ ڈال کے بدلہ نہ لیا۔ میرا خون سفید نہیں ہوا ابھی ورنہ سوا سیر سونا لے کر ڈھاکا چلا جاتا اور عیش کرتا۔ آرام سے زندگی گزارتا۔ خود کو سمجھا لیتا کہ بہن مر گئی تو کیا اس کی خاطر مجھے مر جانا چاہئے۔ یہ میرے لئے ناممکن ہے....."

میں نے ایک گہری سانس لی "اچھا۔ خدا تمہیں اپنے مقصد میں کامیاب کرے اور سکون دے۔ محفوظ رکھے۔ معلوم نہیں یہ تم اچھا کر رہے ہو یا برا۔ میں فیصلہ نہیں کر سکتا۔"

غالب نے کہا "پارو کو اپنا گھر چھوڑنے کا دکھ نہیں؟"

"گھر! اس کا گھر تو ایک قید خانہ تھا جہاں اسے میں نے روک

رکھا تھا ورنہ وہ کب کی آزاد ہو کے بھاگ جاتی" کمار بولا "اس کا باپ سوتیلا ہے۔ اس نے بہت کوشش کی کہ پارو مان جائے تو کسی مال دار کے ہاتھ بیچ دے۔ اس کی شادی تو یہاں کے رواج کے مطابق بہت کم عمری میں ہوگئی تھی۔"

"پارو شادی شدہ ہے؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔

کمار ہنسنے لگا "یہاں لڑکی کی شادی تیرہ چودہ سال کی عمر کو پہنچنے سے پہلے ہی کردی جاتی ہے۔"

میں نے کہا "یہ بات تو مجھے معلوم ہے مگر....."

"پارو کے باپ نے بھی اس کی شادی گیارہ سال کی عمر میں طے کردی تھی۔ وہ جوان آدمی تھا۔ اگر پارو اس کے ساتھ چلی جاتی تو خوش رہتی۔ جیسے کہ سب لڑکیاں رہتی ہیں۔ آج خود پانچ چھ بچوں کی ماں ہوتی اور دو چار سال بعد اپنی لڑکی بیاہنے کی فکر کرتی۔"

"پھر پارو گئی کیوں نہیں اس کے ساتھ؟"

"بس تقدیر نے اسے میرے نام لکھ دیا تھا" وہ بولا "رخصتی کا دن مقرر ہو چکا تھا۔ وہ اپنے کچھ رشتے داروں اور دوستوں کے ساتھ پارو کو لینے آیا تھا کہ راستے میں ناؤ الٹ گئی۔ پوری بارات غرق ہوگئی۔ برسات میں یہاں ایسے حادثات ہوتے رہتے ہیں۔ پارو منحوس قرار دے دی گئی اور دو سال بیٹھی رہی۔ پھر اس کے سوتیلے باپ نے ایک ساٹھ سال کے بڈھے سے ہزار روپے لے لئے اور پارو کا نکاح پڑھوا دیا۔ ذرا سوچو کہ پارو کی عمر اس کی عمر کا ایک چوتھائی تھی۔ خود اس کی پوتیاں اور نواسیاں پارو سے بڑی تھیں۔"

"یعنی پارو کی دوسری شادی بھی ہو چکی ہے؟" غالب نے کہا۔

"ہاں۔ دوسری بار اس کی رخصتی ہوئی اور اس نے شوہر کے گھر میں دو مہینے گزارے۔ پھر یہ بیوہ ہوگئی۔ بڈھا دمے کا مریض تھا۔ اسے بیوی کی نہیں، کسی دیکھ بھال کرنے والی نوکرانی کی ضرورت تھی۔ اس کی دو بیویاں مر چکی تھیں اور تیسری بھاگ گئی تھی۔ صرف چار مہینے پہلے۔ اس کے بیٹے اپنی بیویوں کے غلام تھے اور بیویاں انہیں لے کر الگ ہوگئی تھیں۔ پارو نے بھی دن رات اس کی کھانسی سننے، اسے دوا دینے اور اس کے غلیظ کپڑے دھونے کے سوا کچھ نہیں کیا۔ جب یہ بیوہ ہوگئی تو بڈھے کے وارثوں نے اسے گھر سے نکال دیا اور یہ پھر ماں باپ کے گھر آبیٹھی۔ پھر یہ چار سال نحوست کا لیبل لگائے کسی رشتے کا انتظار کرتی رہی۔"

"اور اس کے بعد ہیرو آگیا۔"

"ابھی نہیں" کمار ہنسنے لگا "ابھی ایک شادی باقی ہے۔"

"کیا! تین شادیاں...... اُف.... عشق کی ایسی فضول کہانی میں نے پہلے کبھی نہیں سنی۔ جس میں ہیرو کا قطار میں چوتھا نمبر ہو۔"

میں نے کہا "تیسرا شوہر کہاں گیا؟"

"اسے میں نے قتل کردیا تھا" کمار بولا۔

کچھ دیر میں اور غالب اس اعتراف اور انکشاف پر ہکا بکا بیٹھے رہے۔ اس امید میں کہ کمار کچھ اور کہے لیکن وہ نہ جانے کہاں کھو گیا تھا۔ شاید وہ چشمِ تصور سے قتل کا منظر دیکھ رہا تھا۔

"اس کی تیسری شادی طے ہونے سے پہلے ہی میں پارو کی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ لیکن ابھی پارو کے باپ سے بات کرنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ جب مجھے پارو نے یہ بتایا کہ اس کا رشتہ تیسری بار پکا ہو گیا ہے اور وہ کوئی چمار ہے جو مُردہ جانوروں کی ہڈیاں جمع کرتا پھرتا ہے لیکن اچھے خاصے پیسے کما لیتا ہے۔ پارو نے صاف کہا کہ وہ اس بار خود پر تیل چھڑک کے آگ لگا لے گی مگر اس شخص کے ساتھ نہیں جائے گی جو اسے بھی کوڑے کرکٹ کے ڈھیر سے ہڈیاں چُننے کے لئے لگا دے گا۔ میں نے کہا کہ فکر نہ کر۔ تیرا بیاہ اس سے نہیں ہوگا۔ اور پھر یہی ہوا، اس کی لاش کوڑے کے ایک ڈھیر پر پڑی ہوئی ملی۔"

میں نے کہا "کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ تم پارو کے باپ سے مل کر رشتہ مانگ لیتے، تم ہر لحاظ سے بہتر تھے، زیادہ پیسہ بھی دے سکتے تھے۔"

"ہاں، میں نے سوچا تھا۔ مگر پارو نے کہا کہ اس کا باپ انکار کردے گا۔ وہ پارو کو زیادہ سے زیادہ اذیت میں دیکھ کر خوش ہوتا ہے، وہ اسے سکھی نہیں دیکھ سکتا۔ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ ابھی کسی کو میرے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ پارو کے باپ نے انکار کردیا اور پھر میں نے کچھ کیا تو الزام مجھ پر آئے گا۔ آسان طریقہ تھا کہ پارو پر نحوست کی ایک اور چھاپ لگادی جائے تاکہ پھر کوئی اس کی طرف ہاتھ بڑھانے سے پہلے اپنے کریا کرم کی سوچے اور ایسا ہی ہوا۔ اب یہ پانچ سال سے میرا انتظار کر رہی تھی۔ باپ اسے دھکے دے کر نکال دیتا مگر میں اسے ہر ماہ گزارے کے لئے رقم دیتا تھا۔ یہ گویا طے تھا کہ پارو اب میری بیوی ہے جو میکے میں اس لئے رہتی ہے کہ ابھی میں اس کو اپنے گھر نہیں لے جا سکتا۔ بڈھے کو اب پارو کے جانے کا نہیں اس آمدنی کے ختم ہو جانے کا صدمہ ہوگا جو اسے پارو کے خرچ کے نام پر کئی سال سے ہو رہی تھی۔"

میں نے کہا "یہ دنیا کے مشہور عشق کی داستانوں سے بالکل مختلف کہانی ہے، کیونکہ یہ زندگی کی حقیقت ہے۔"

غالب نے کہا "اس لئے فلم بنی تو فلاپ ہو جائے گی۔"

رات کا باقی حصہ بھی باتیں کرتے ہی گزرا۔ کمار دو مرتبہ چائے بنا کے لایا۔ وہ ہم سے ہمارے بارے میں پوچھتا رہا اور ہم نے اس کے تجسس کو دور کرنے کے لئے بہت کچھ بتایا مگر کوئی ایسی بات نہیں بتائی جو ہمارے لئے پُرخطر ہوتی۔

صبح چھ بجے گل اور نازو سے پہلے پارو جاگ اٹھی۔ وہ صبح اٹھنے کی عادی تھی۔

اس نے ٹوٹی پھوٹی اُردو میں پوچھا کہ کیا ہم لوگ رات بھر سوئے نہیں؟

غالب نے کہا "ہم تمہاری باتیں کرتے رہے، تمہاری تین شادیوں کی۔"

پارو کا رنگ ذرا سی دیر کے لئے بدلا "اس نے بتایا۔"

میں نے کہا "ہاں، کمار بہت اچھا آدمی ہے۔ تم خوش قسمت ہو کہ بالآخر تم کو اپنی منزل مل گئی۔"

وہ کچھ کبھی نہیں "ہم ایک دم منوش ہے۔ اپن منوس قسمت نہیں ہوتا۔"

میں نے کہا "نہیں، یہ سب غلط ہے۔ تم کو منحوس کہنے والے جاہل تھے۔ ہر خرابی میں کوئی تعمیر کی صورت مضمر ہوتی ہے، میرا مطلب ہے.... اللہ اچھا کرتا ہے۔ یہ تمہارے لئے اچھا ہوا۔"

"آپ اس کو بولا...." وہ کمار کی طرف دیکھ کے رک گئی۔

"کیا بولا؟ تو سمجھتی ہے ان کے منع کرنے سے میں مان جاؤں گا؟" کمار ایک دم بگڑ گیا۔

پارو ڈر کے خاموش ہوگئی۔ وہ اٹھارہ اُنیس سال کی لڑکی تھی مگر اپنی عمر سے کہیں زیادہ نظر آتی تھی۔ بنگالی عورت جسمانی صحت کے اعتبار سے بہت کم اچھی نظر آتی ہے۔ کچھ تو اس میں نسلی صفات کا دخل ہوتا ہے مگر بیشتر صورتوں میں غربت اور سخت حالات اس کے ذمے دار ہوتے ہیں، ناقص اور ناکافی خوراک، غلط ماحول اور خوشی سے محرومی ان کے چہروں پر شباب کی رعنائی اور شگفتگی کے دَور کو مختصر کردیتی ہے اور ابھی وہ جوان ہی ہوتی ہیں کہ بوڑھی نظر آنے لگتی ہیں۔ جو پچیس سال کی عورت چھ آٹھ بچے پیدا کر چکی ہو وہ جوان کیسے رہ سکتی ہے۔ پارو بھی انہی حالات کی پیداوار تھی۔ وہ خوب صورت تو کیا قبول صورت بھی نہ تھی مگر کمار اس پر اتنا ہی فریفتہ تھا جتنا میں رابعہ پر یا غالب نازو پر۔ ہم خوش نصیب تھے کہ رابعہ اور نازو کو خدا نے دولتِ حسن سے مالا مال کیا، یا شاید یہ نظر کی بات تھی۔ پارو بھی کمار کو اتنی ہی حسین لگتی تھی۔

گل اور نازو کے اٹھتے ہی گویا کوچ کا بگل بج گیا۔ اے ایس پی رات بھر خراٹے لیتا رہا تھا۔ شروع میں مجھے شک ہوا تھا کہ کہیں وہ ہمیں دھوکا دینا تو نہیں چاہتا اور یہ خراٹے مصنوعی تو نہیں۔ اس کا خیال ہو کہ اسے گہری نیند میں دیکھ کر ہم بھی سو جائیں گے کہ فکر کی کوئی بات نہیں، لیکن ہمیں نیند ہی نہیں آئی اور بعد میں یہ بھی معلوم ہوگیا کہ خراٹے اصلی ہیں۔

میں کوئی رسک لینا نہیں چاہتا تھا چنانچہ اسے باتھ روم میں بھیجنے سے پہلے میں نے خود باتھ روم کا معائنہ کیا۔ اس میں خاصی بلندی پر ایک روشندان تھا مگر وہ بہت چھوٹا تھا اور اس میں ایگزاسٹ فین بھی لگا ہوا تھا۔

کمار کوٹھی کے ہر حصے سے واقف تھا اور جب پانی ختم ہوگیا تو اس نے باہر جا کے موٹر چلائی۔ میں اور غالب اس کے ساتھ تھے۔

"میں نے چار سال یہاں بہت عیش کی" وہ بولا "سیٹھ مجھ پر بہت بھروسہ کرتا تھا۔ جب وہ یہاں نہیں ہوتا تھا تو گاڑی بھی میرے پاس رہتی تھی۔"

میں نے کہا "کمار، یہ اے ایس پی تمہیں جانتا ہے؟"

وہ چونکا "جانتا ہے!"

"ہاں۔ کیا اسے معلوم ہے کہ تم رکمنی کے بھائی ہو؟"

"ضرور معلوم ہوگا۔" وہ بولا۔

"مگر اس نے تم سے کوئی بات نہیں کی۔"

"بات کرتا تو کیا فائدہ ہوتا" غالب بولا "کیا ہم اسے یہاں تحقیق اور تفتیش جاری رکھنے دیتے۔"

میں نے کہا "وہ بعد میں کمار کے لئے مسئلہ بن سکتا ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"اسے کمار کے بارے میں معلومات حاصل ہوں گی۔ اس کا نام کیا ہے۔ حلیہ کیا ہے۔ یہ پتا چل جائے گا کہ وہ ٹیکسی چلاتا تھا، ٹیکسی اس نے کس کو بیچی تھی۔ کیوں بیچی تھی۔ اگر اس نے یہ معلوم کرلیا کہ کمار نے بہن کے قتل کا انتقام لینے کے لئے اس رقم سے اسلحہ خریدا تھا اور پانچ ہزار میں یہ چوری کی گاڑی لی تھی تو کمار کے جرائم کی فہرست لمبی ہو جائے گی۔ وہ قبیلے تک جا پہنچے گا اور وہاں اسے قبیلے والے بتادیں گے کہ کمار کتنے افراد کا قاتل ہے۔ ظاہر ہے اس کے بعد کمار اشتہاری مجرم ہوگا۔"

کمار نے کہا "اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

میں نے کہا "تمہاری تصویر اخبار میں چھپ جائے گی۔"

"یہاں کے اخباروں میں چھپنے دو۔"

میں نے کہا "تم احمق ہو۔ حکومتوں کے درمیان مجرموں کے

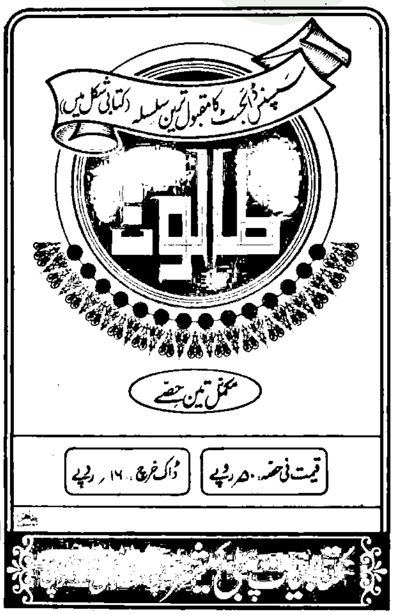

تبادلے کا معاہدہ ہو تو ایک مجرم کو دوسرے ملک سے بھی لایا جاسکتا ہے۔ تم بنگلہ دیش میں بھی اشتہاری مجرم بن جاؤ گے اور پہچان لئے گئے تو گرفتار کر کے بھارت بھیج دیئے جاؤ گے۔ پارو اکیلی رہ جائے گی۔"

وہ کچھ متفکر نظر آنے لگا "پھر کیا کرنا چاہئے مجھے؟"

میں نے کہا "آسان کام تو یہ ہے کہ تم اپنے ارادے سے باز رہو۔"

"نہیں۔ میں مشکل کام کروں گا" اس نے ضدی اور فیصلہ کن لہجے میں کہا "اے ایس پی بھی ایک آدمی ہے۔ جہاں اتنے خون بدلہ لینے کے لئے کروں گا وہاں ایک خون اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کے لئے بھی....."

میں نے اس کی بات کاٹ دی "یہ نہیں ہو سکتا۔ ہم اس اے ایس پی کو زبان دے چکے ہیں کہ اسے بحفاظت واپس جانے کا موقع دیں گے۔"

"زبان تم نے دی ہے۔ میں نے نہیں۔"

"ہم اپنی زبان کا پاس رکھنا جانتے ہیں کمار۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

اس کا رنگ متغیر ہو گیا "سوری سر۔ میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔"

"اور کیا مطلب نکالا جاسکتا ہے تمہاری بات کا؟" میں نے کہا۔

"تم کیا چاہتے ہو' ہمارا ساتھ دینا یا ہمارے خلاف جانا؟" غالب نے کہا "ابھی وقت ہے' فیصلہ کرلو۔"

"میں۔ ایسا سوچ بھی نہیں سکتا" اس نے پریشان ہو کے کہا' "میں وعدہ کرتا ہوں کہ پھر ایسی بات نہیں کہوں گا۔ ایسا خیال بھی دل میں نہیں لاؤں گا۔ اگر پولیس بعد میں میرے پیچھے پڑتی ہے تو پھر میں خود کو بچاؤں گا۔ جیسے بھی ممکن ہوا' میں نام بدل لوں گا۔ بھیس بدل لوں گا' جگہ بدلتا رہوں گا۔ جب تک میں محفوظ نہیں ہو جاتا۔"

مجھے یوں لگا جیسے صرف مجھے مطمئن کرنے کے لئے وہ جھوٹ کا سہارا لے رہا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ جو بات غلطی سے اس کے منہ سے نکل گئی تھی وہ ختم ہو جائے۔ وہ شرمساری کی اداکاری بھی ٹھیک ہی کر رہا تھا اور میں مجبور تھا کہ اس کے وعدے پر اعتبار کروں مگر میں محتاط رہنے کا فیصلہ بھی کر چکا تھا۔

اس نے کہا "آپ اس سے بات کیوں نہیں کرتے؟"

میں نے کہا "کس سے۔ اے ایس پی سے؟"

"ہاں۔ اس کو بھی سمجھائیں کہ وہ میرے پیچھے نہ پڑے۔"

میں نے کہا "ابھی وہ میری ہر بات مانے گا لیکن بعد میں اس کو ادائے فرض سے کون روکے گا۔"

"آپ لوگ اسے دھمکی سے روک سکتے ہیں۔ یہ سمجھا[ئیں] ہیں کہ بعد میں کمار کو کچھ ہوا تو اچھا نہیں ہوگا۔ وہ آپ لوگو[ں کو] جانتا ہے۔"

"جانتا ہے' تمہیں کیسے معلوم؟"

"آپ کو خود اندازہ کرلینا چاہئے۔ جب میں نے سمجھ لیا تو وہ کیسے نہیں سمجھے گا۔ وہ تو پولیس کا آدمی ہے۔ آپ خود ا[سے] بتاچکے ہیں کہ وہشت گرد ہیں۔ ڈھاکا میں کسی اور ملک کے دہش[ت] گرد یا تخریب کار تو جانے سے رہے۔ بھارتی ایجنٹ خود اپنی شناخ[ت] کرادیتے۔ وہ سمجھ گیا ہوگا کہ آپ پاکستانی ہو۔ اگر ابھی اسے نہیں آیا ہوگا تو واپس کلکتہ آ کے وہ معلوم کرلے گا بڑی آسانی [سے]۔"

میں نے کہا "یہ تم نے بالکل ٹھیک کہا۔ مگر ہم اس کی [پروا] نہیں کرتے۔ اور ڈرتے بھی نہیں کہ بعد میں کیا ہوگا۔"

"مگر اسے ڈرا تو سکتے ہیں۔ مجھے بچانے کے لئے۔ وہ مان [جائے] گا کہ آپ لوگوں کی دھمکی محض دھمکی نہیں ہوتی۔ اسے اپنی [اور] بیوی بچوں کی سلامتی عزیز ہوگی تو وہ خاموشی کو ترجیح دے گا۔" [اس] نے کہا۔

ابھی میں کمار کی تجویز کے مثبت اور منفی پہلو کا جائزہ [لے] رہا تھا کہ گل اور نازو نے شور مچادیا۔ وہ ہمیں ناشتے کے لئے بل[ا رہی] تھیں اور سارے گھر میں تلاش کرتی پھر رہی تھیں۔

"آپ لوگ یہاں ہیں" نازو نے کہا۔

میں نے کہا "بے وقوف۔ تم کو ہمارے پیچھے آنے [کی] ضرورت تھی' وہ اے ایس پی کہاں ہے؟"

غالب نے کہا "اس کے ساتھ تو صرف پارو ہوگی یا گل۔"

اسی وقت میں نے پارو کی چیخ سنی۔ پھر کسی نے زور زو[ر سے] دروازہ بجانا شروع کیا۔

"کون ہے اندر' باہر آؤ....."

میں اور غالب اندر پہنچ چکے تھے۔ اس کے اور میرے [ذہن] میں ایک ساتھ خوف زدہ کرنے والے خیالات نے یلغار کی۔ کمار کو تلاش کرتے ہوئے رکمنی کے قاتل ہمارا سراغ لگا۔ کامیاب ہو گئے ہیں۔ کمار کی گاڑی باہر موجود تھی اور یہ با[ت] بھی معلوم کرسکتا تھا کہ ٹیکسی ڈرائیور کمار نے اپنی ٹیکسی بیچ [کر] گاڑی خریدی تھی۔

لیکن اس سے بھی زیادہ پُرخطر بات یہ تھی کہ کہیں باہر [والوں سے] نہ ہو۔ اے ایس پی کو موقع مل چکا تھا کہ وہ کھڑکی کھول [کے فرار] ہو جائے۔ گل یا پارو میں سے کوئی بھی جسمانی طور پر اس کا [راستہ] روکنے کی اہل نہیں تھیں۔ یہ کام صرف نازو کرسکتی تھی ا[ور اس] سے نادانستگی میں ایک بھول ہوگئی تھی۔

وہ پارو کو اے ایس پی کے رحم و کرم پر چھوڑ گئی تھی اور اگر وہ اس موقعے سے فائدہ نہ اٹھاتا تو خود کو وہ احمق ثابت کرتا جن کے سر پر سینگ نہیں ہوتے۔ اس نے بائیں بازو کے حلقے میں پارو کی گردن دبا رکھی تھی اور دائیں ہاتھ سے ڈبل روٹی کاٹنے والی چھری اس کے حلق پر یوں رکھ دی تھی کہ پارو خود کو چھڑانے کی جدوجہد کرتی تو چھری کی تیز دھار اس کے نرخرے تک پہنچ جاتی۔ وہ شکاری باز کے پنجوں میں پھڑپھڑا کے نیم جاں ہو جانے والی چڑیا کی طرح پھٹی پھٹی آنکھوں سے گل کو دیکھ رہی تھی اور دستِ قاتل کے مقابل اپنی بے چارگی و بے بسی کا اعتراف کرچکی تھی۔

پہلی چیخ اس نے بلا ارادہ ماری تھی۔ اب خوف اور دہشت نے اس کے جسم کو سُن اور زبان کو گنگ کردیا تھا۔ وہ کانپ رہی تھی اور اس کا چہرہ کسی لاش کی طرح سفید پڑچکا تھا۔ گل ان کے سامنے ریوالور لئے کھڑی تھی چناں چہ کچھ پوچھے بغیر میں نے ساری بات سمجھ لی۔

باہر سے کسی نے پھر دروازہ بجا کے کہا "بھئی اندر کون گھسا ہوا ہے؟"

میں نے اے ایس پی سے کہا "اس لڑکی کو چھوڑ دو۔"

"نہیں۔ میں بتا رہا ہوں کہ.... میں اس کی گردن کاٹ دوں گا اگر کسی نے میری طرف ایک قدم بھی بڑھایا" اے ایس پی نے پارو کی گردن پر دباؤ بڑھا دیا۔

میں نے کہا "غالب' جا کے دیکھو باہر کون ہے۔ انہیں باہر ہی روکو۔"

"تم کچھ نہیں کرسکتے۔" اے ایس پی بولا "اس کی جان بچانا چاہتے ہو.... تو مجھے جانے دو۔"

گل نے ریوالور اوپر اٹھالیا "اگر تم نے خودکشی کا سوچ ہی لیا ہے...."

میں نے کہا "نہیں گل۔ یہ قصائی پارو کو مار دے گا۔"

اچانک کمار نے کہا "سوچو مت۔ گولی مار دو اسے۔"

اے ایس پی کا چہرہ تاریک ہو گیا "فائر کی آواز سب سن لیں گے۔ ان سے کیا کہو گے تم؟"

باہر ایک ساتھ کئی افراد دروازے پر ٹکّے مارتے ہوئے ہنگامہ آرائی میں مصروف تھے۔ وہ گالیاں بک رہے تھے اور دھمکیاں دے رہے تھے۔

غالب نے چلّا کے کہا "ارے کیا مصیبت ہے۔ کون ہے؟"

"پولیس" باہر سے کوئی غرا کے بولا۔

"پولیس ہے تو کیا کپڑے پہنے بغیر دروازہ کھول دوں؟ نہانا مشکل کردیا۔ ایک منٹ صبر نہیں کرسکتے" غالب نے اس طرح چیخ کے کہا جیسے وہ باتھ روم میں سے جواب دے رہا ہے۔

میں نے کہا "مسٹر اے ایس پی! اس لڑکی کو مار کے بھی تمہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ ہمارے ساتھ بعد میں کیا ہوگا' یہ دیکھنے کے لئے تم زندہ نہیں رہو گے۔ عقل سے کام لو.... ہمارا راستہ کوئی نہیں روک سکتا۔ یہ دس بیس آدمی بھی خواہ مخواہ مارے جائیں گے۔"

اے ایس پی کا جارحانہ رویّہ کھوکھلے اعتماد کا آئینہ دار تھا۔ آہستہ آہستہ اس کی صورت پر ناکامی کے دکھ اور احساسِ جرم کے پُرخوف سائے پھیلنے لگے۔ اس کے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور پارو تڑپ کے اس کی قید سے نکلی تو کمار کے پھیلے ہوئے بازوؤں کے حصار میں سمٹ گئی۔ کمار اسے دوسرے کمرے میں لے گیا۔

اے ایس پی کا وہ ہاتھ بھی نیچے آگیا جس میں چھری تھی۔ اب گل کے لبوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس سے پہلے وہ خود اتنی نروس تھی کہ ریوالور اس کے ہاتھ کی گرفت میں کانپ رہا تھا اور مجھے یہ اندیشہ لاحق تھا کہ کہیں اسی کیفیت میں وہ بلا ارادہ گولی نہ چلادے۔

"نازو!" میں نے کہا "اس حرام زادے کو اندر لے جاؤ اپنے ساتھ۔ اگر ذرا بھی شک ہو کہ اس کے حلق سے آواز نکلنے والی ہے تو ہاتھ مار کے اس کی گردن توڑ دینا۔ تم بھی جاؤ گل' پارو کو سنبھالو اور کمار کو بھیج دو۔ جلدی کرو۔"

باہر شور کرنے والے غالب کے جواب پر چند منٹ کے لئے دروازہ توڑنے کا پروگرام ملتوی کرچکے تھے مگر بہ آوازِ بلند اپنے شکوک کا اظہار اور اپنے خطرناک عزائم کا اعلان کرنے میں مصروف تھے۔ تاخیر ان کے آتشِ اشتعال کو بھڑکا رہی تھی۔ آوازوں سے اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ جہاں پہلے چند افراد تھے وہاں اب ایک ہجوم ہے۔

میری اجازت پا کے کمار نے دروازہ کھولا تو ایک ساتھ آٹھ دس افراد کا ریلا اندر آگیا۔ اس جلوس کی قیادت پولیس کا ایک حوالدار کر رہا تھا۔ وہ دُبلا پتلا' سیاہ رو اور پستہ قد شخص تھا مگر اس کی آواز دبنگ تھی۔

"کیا بات ہے' ایسے منہ اٹھا کے سب کیوں اندر آگئے ہو تم سب؟" کمار نے انگریزی میں کہا اور حوالدار کے مقابل دیوار بن گیا۔

حوالدار کے پیچھے اندر آجانے والے رک گئے "اتنی دیر کیوں لگی دروازہ کھولنے میں؟"

کمار نے کہا "تم مجھے اپنی آمد کی پہلے سے اطلاع دیتے تو میں دروازہ کھولے تمہارا استقبال کرنے کے لئے موجود رہتا۔ میں بتا چکا ہوں کہ میں باتھ روم میں تھا۔"

"اور یہ' کیا یہ بھی تمہارے ساتھ تھا؟" حوالدار نے ایک چھڑی سے میری طرف اشارہ کیا "یہ بہرا ہے کیا؟"

دو افراد قہقہہ مار کے ہنسے' باقی مسکرادیئے۔

میں نے ابھی تک طے نہیں کیا تھا کہ مجھے کس حد تک دخل در معقولات کرنا چاہئے۔ اس بحران سے نمٹنے کے لئے کمار کی

ہمت اور ذہانت پر انحصار کیا جا سکتا تھا اور جب تک اس کی ناکامی کے واضح امکانات پیدا نہ ہوں' میرا ان مذاکرات سے الگ رہنا ہی بہتر تھا۔ حوالدار کی بات نے فوراً مجھے ایک راہ سجھا دی۔

میں نے کانوں کو ہاتھ لگا کے اشارے سے کہا کہ میں نے کچھ نہیں سنا اور سچ مچ بہرا بن گیا۔

"میں ان سوالات کا مقصد سمجھنے سے قاصر ہوں۔ کیا چاہتے ہو آخر تم اور یہ جلوس یہاں کیوں آیا ہے؟" کمار نے برہمی سے کہا "ان سب سے کہو کہ فوراً نکل جائیں۔"

ایک نوجوان نے اپنا مدقوق سینہ نکال کے اور عینک کو ناک پر جما کے کہا "کیسا اکڑتا ہے سالا' جیسے اس کے باپ کا گھر ہو۔"

کمار نے اس کو غور سے دیکھ کے کہا "تمہیں معلوم ہے کہ تمہارا باپ کون ہے؟ اپنی ماں سے پوچھا ہے کبھی؟"

اب پھر دو افراد قہقہہ مار کے ہنسے۔ نوجوان کو کمار سے اتنے سخت و رسوا کن جواب کی توقع نہ تھی۔ اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔

"حوالدار صاحب! آپ سنا..... یہ گالی دیا میرے کو۔"

"میں کہتا ہوں گیٹ آؤٹ۔ آل آف یو" کمار نے چیخ کے کہا "حوالدار! اتنے بدمعاشوں کے ساتھ تم نے حملہ کیا ہے گھر پر۔ ساری ذمے داری تمہاری ہے۔ رپورٹ کروں گا میں۔"

"ہم کو بدمعاش بولا۔ سالا!" ایک دھوتی پوش بنگالی بابو نے اچھل کر کمار کو چھڑی سے چھونے کی کوشش کی۔

کمار نے اسے نظر انداز کر دیا "کوئی بات تھی تو تم معلوم کرنے کے لئے آسکتے تھے۔ تم نے سرکاری وردی پہن رکھی ہے۔ تمہیں یقیناً اختیار حاصل ہے مگر یہ کون لوگ ہیں؟ نکالو انہیں باہر۔"

حوالدار کو کمار کے اعتماد نے کچھ پریشان کر دیا تھا۔ اس نے فوراً کارروائی کی اور تین افراد کے سوا باقی کو ریوڑ کی طرح ہانک دیا۔ ان میں سے ایک وہی بنگالی بابو تھا جو چھڑی کو ایک دفاعی ہتھیار سمجھتا تھا۔ بارش' دھوپ اور بدمعاش کے خلاف۔ اس کا نصف سر تیل سے چمک رہا تھا۔ اس نے باقی رہ جانے والے گنتی کے چند بالوں کو خضاب سے یوں سیاہ کیا تھا کہ سر کی چمڑی بھی کالی ہو گئی تھی۔ دوسرا نسبتاً خاموش طبع اور مہذب صورت شخص تھا جس نے علی گڑھ پاجامے پر سیاہ اچکن پہن رکھی تھی۔ اس کی خشخشی داڑھی کے بالوں پر سفیدی غالب تھی۔ وہ مسلسل پان چبا رہا تھا اور پیک اپنے کلوں میں جمع کرتا جا رہا تھا۔ تیسرا وہی نوجوان تھا جس کی جوانی دیکھ کر ایک عبرت ناک بڑھاپے کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا تھا۔ مگر وہ فرط جذبات سے "تو ذرا چھیڑ تو دے تشنہ مضراب ہے ساز" کی عملی تفسیر بنا ہوا تھا۔

حوالدار پر کمار کی دھمکی اثر کر گئی تھی یا اپنی سرکاری وردی کے اختیارات کے تسلیم ہوتے ہی اس نے تمام کارروائی قانون کے مطابق کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

اس نے کہا "جھگڑے کی کوئی بات نہیں۔ ہم آرام سے بیٹھ کے گفتگو کر سکتے ہیں۔"

"کس مسئلے پر؟" کمار نے ماتھے پر بل ڈال کے کہا۔

حوالدار نے ایک صوفے پر تشریف رکھنے کے بعد باقی لوگوں کو ہاتھ کے اشارے سے کہا کہ وہ بیٹھ جائیں "ایک معمولی سی غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی۔ یہ سب یہاں کے رہنے والے ہیں۔"

"اپن بنرجی۔ ڈی سی آفس میں کلرک ہے" چھڑی والے نے بڑے دبدبے کے ساتھ اعلان کیا۔

اچکن والے بزرگوار نے منہ آسمان کی طرف اٹھا کے اور پان کی پیک سے غرارے کرتے ہوئے کہا "غم غوغیاں غیغنغ غے غنچے۔" جس کا مطلب تھا کہ ہم تو میاں پنشن لے چکے۔ انہوں نے اپنے نام عاشق علی خان کے ہر جزو کو بھی غین سے ادا کیا۔

باغی نوجوان نے آتش فشاں لہجے میں کہا "میں گریجویٹ بے روزگاروں کی ایسوسی ایشن کا اعزازی سیکریٹری ہوں۔ محلہ امن کمیٹی کا رکن بھی ہوں۔"

"چنانچہ تمہیں لائسنس مل گیا ہے امن عامہ میں خلل ڈالنے کا؟ امن و امان ہوگا تو تمہیں کون گھاس ڈالے گا؟ تم اندیشہ نقض امن میں سب کو پکڑوا سکتے ہو مگر خود آزاد ہو۔ آخر کیا ہوا ہے یہاں؟ لڑائی جھگڑے' مارپیٹ کی آواز سنی تھی کسی نے؟ مدد کے لئے پکار رہا تھا کوئی؟ قتل ہونے والا تھا کسی کا؟" کمار نے کسی کو بولنے کا موقع دیے بغیر اپنا جارحانہ خطاب جاری رکھا۔

کمار کے اعتماد نے نوجوان کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ جواب میں اس نے پولیس مین سے بنگالی میں کچھ کہا۔ چھاتا بردار بنگالی بابو نے بھی چھڑی کو شمشیر بے نیام کی طرح لہراتے ہوئے قانون سے مطالبہ کیا کہ ملزمان کے خلاف فوری کارروائی کا آغاز کیا جائے مگر قانون کے لمبے ہاتھ بھی کمار تک پہنچنے سے گریزاں تھے۔ کمار نے زیادہ روانی سے بنگالی میں بات کی۔ پھر ایک مختصر وقفہ ایسا آیا جب سننے والا کوئی نہیں رہا کیوں کہ وہ سب بول رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے اب کسی بھی لمحے بات ہاتھا پائی تک پہنچ جائے گی۔ میں سمجھ کچھ بھی نہیں رہا تھا لیکن جذبات کی شدت سے صورت حال کی سنگینی کا اندازہ کر سکتا تھا اور گونگا بہرا بن کے بیٹھنے پر مجبور تھا۔

خلافِ توقع سب سے زیادہ صلح جو اور امن پسند خود پولیس والا ثابت ہوا۔ عام طور پر پولیس معمولی اختلافات کو لڑائی تک پہنچا کے صورت حال کو اس مقام تک لے آتی ہے جہاں فریقین کے خلاف نقضِ امن' مارپیٹ' بلوہ یا اقدامِ قتل جیسی فوجداری دفعات کا فراخدلانہ استعمال کیا جا سکے۔ مدعی اور مدعا علیہ' محمود و ایاز سب کو ایک صف میں کھڑا کر کے زیر دفعہ ایک سو اکیاون اندر کر دیا جائے اور پھر چھتر کاری کے ذریعے ان سے حسب استطاعت معاف کرنے کا نذرانہ وصول کر کے چھوڑ دیا جائے۔

حوالدار نے ایک دم دہاڑ کے سب کو خاموش کر دیا "خبردار جو اَب کوئی بولا۔ بس جو میں پوچھوں اس کا جواب دو۔ اس گھر میں آپ داخل ہوئے؟"

"پچھلی طرف سے دیوار پھاند کے اور کھڑکی کے راستے۔" کمار نے بے خوفی سے کہا "کوئی اعتراض؟"

"یہ جرم ہے....."

"جرم میرے لئے نہیں ہے" کمار نے اس کی بات کاٹ دی' "مجھے اس گھر کا مالک سمجھا جا سکتا ہے۔"

"سمجھا جا سکتا ہے کا کیا مطلب؟"

"گھر کے مالکوں نے مجھے یہ اختیار دے رکھا ہے کہ میں جب چاہوں آجا سکتا ہوں۔ انہیں اعتماد ہے مجھ پر۔ وہ باہر رہتے ہیں" کمار نے کہا "میری حیثیت خاندان کے ایک فرد سے کم نہیں۔ سب کچھ مجھے سونپ کر جاتے تھے۔ یہ بات تم کسی سے بھی معلوم کر سکتے ہو۔ کسی بھی پرانے آدمی کو لے آؤ اگر وہ کہہ دے کہ یہ غلط ہے تو جو چور کی سزا وہ میری سزا۔"

کمار نے ایک سانس میں دس نام گنوا دیے۔ ایک نام پر امن کمیٹی کا جنگجو ممبر چونکا "یہ تو میرے ڈیڈی ہیں۔"

"جاؤ انہیں بلا لاؤ۔ وہ پہچان لیں گے مجھے۔"

پولیس مین نے کہا "اگر تم اتنے ہی معتبر ہو تو ایسے چوروں کی طرح گھر میں کیوں داخل ہوئے تھے؟ باہر تالا لگا ہوا ہے اور تم اندر پہ بیٹھے ہو۔"

کمار نے گالی دے کر کہا "چھپنے والے کی..... ہم رات کو پہنچے اور افراتفری میں ڈھاکا سے روانہ ہوئے تھے اور بہت سی چیزوں کے ساتھ چابی وہیں رہ گئی۔"

"اور کون ہے تمہارے ساتھ؟ اس بہرے کے علاوہ۔ کیا یہ گونگا بھی ہے؟" پولیس مین نے مجھے غور سے دیکھا۔

میں نے چہرہ سپاٹ رکھا اور محض دانتوں کی نمائش کی۔

"اس کا آلۂ سماعت بھی ساتھ نہیں لا سکے۔ ویسے یہ گونگا نہیں ہے۔ تم اس سے لکھ کے کچھ پوچھ سکتے ہو۔ فرنچ میں" کمار نے کہا۔

"فرنچ میں!" پولیس مین مایوسی سے بولا "یہ غیر ملکی تو نہیں نا۔"

"ہاں۔ تم لگتے ہو غیر ملکی" کمار نے حوالدار کے خالص بنگالی خدوخال' رنگ اور جثے پر طنزیہ نگاہ کی۔

حوالدار نے خفت سے اِدھر اُدھر دیکھا "باقی لوگوں کو بھی بلاؤ۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔"

بنرجی نے چھڑی لہرا کے کہا "ان کے ساتھ عورتیں بھی ہیں۔ ہم نے آوازیں سُنی تھیں۔"

امن کمیٹی کے ممبر رو بن نے پوچھا "کون ہے یہ غیر ملکی؟"

"یہ ڈھاکا میں اٹلی کے پریس اینڈ کلچرل اتاشی تھے۔ مسٹر البرتو موراویا" کمار نے کہا۔

کمار کی بات نے مجھے حیران کیا۔ وہ عالمی ادب کی اس قد آور شخصیت سے واقف تھا اور اسے یقین تھا کہ باقی لوگ اس عالمی شہرت یافتہ اطالوی ادیب کو نہیں جانتے جو نوبل پرائز حاصل کر چکا تھا اور ایک باکمال کہانی نگار تھا۔ یہاں تو پڑھے لکھے شیکسپیئر کو اس لئے جانتے ہیں کہ وہ نصاب میں گھسا ہوا ہے کم بخت۔

بے روزگار گریجویٹ ایسوسی ایشن کے جنرل سیکریٹری نے سر کھجا کے کہا "البرتو موراویا..... چندر گپت موریا....."

"ان کا آپس میں کوئی رشتہ نہیں۔ جیسے اندرا گاندھی کا راجہ اندر سے یا اندور سے کوئی تعلق نہیں" کمار نے کہا "یہ جہالت کی باتیں سن کے تمہاری بے روزگاری غلط نہیں لگتی۔"

اچکن والے بزرگوار جو صرف جگالی میں مصروف تھے' منہ اٹھا کے ہنسے تو وہ بند ٹوٹ گیا' جس نے پیک کے بہاؤ کو روک رکھا تھا۔ ایک دم سرخ چھینٹوں کی پھوار ہر طرف گری۔ بنرجی کی سفید دھوتی داغدار ہو گئی۔ حوالدار کی آستین پر' قالین پر اور امن کمیٹی کے رکن کے چشمے پر سرخ چھینٹے نظر آنے لگے۔

بنرجی نے چھڑی کو لہرا کے کہا "ستیاناس۔ ایک دم ستیاناس۔ ابھی دھونا پڑے گا اسے" وہ اٹھ کے باہر لپکا۔

نوجوان نے چشمے کا شیشہ صاف کرتے ہوئے غصے سے کہا "اگر یہ خون ہوتا تمہارا تو مجھے خوشی ہوتی" اور احتجاجاً واک آؤٹ کر گیا۔

مگر عاشق علی خان نے سکون کا سانس لے کر ہونٹ اپنی آستین سے صاف کئے اور بولے "میاں! ہم نے پہچان لیا تم کو۔ ہم سوچ رہے تھے' کہاں دیکھا ہے یہ چہرہ۔ سو بھئی حوالدار صاحب! ہم تو چلے۔ شک کی کوئی بات ہی نہیں رہی اب تو' آداب۔" انہوں نے اٹھ کے سب کو جھک کر آداب کیا اور باہر نکل گئے۔

میدان صاف ہو گیا تو حوالدار نے اپنی حکمت عملی پر نئے سرے سے غور کیا "باقی سب لوگوں کو بلالو۔"

"کیوں' اب کیا ہے؟" کمار بولا۔

"میں ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں سب کو۔ کل کوئی ایسی ویسی بات ہو تو الزام مجھ پر نہ آئے۔" حوالدار نے عیاری سے کہا "علاقے میں مشتبہ افراد کی آمد و رفت پر نگاہ رکھنی پڑتی ہے۔"

"ان میں کوئی مشتبہ آدمی نہیں۔"

"یہ فیصلہ کرنا میرا کام ہے۔ میں تصدیق کروں گا۔ ان لوگوں کے پاس اپنی شناخت کا ثبوت ہونا چاہئے۔"

"لوگ مجھے جانتے ہیں اور یہ میرے مہمان ہیں۔ کیا یہ کافی نہیں؟" کمار اڑ گیا۔

"یہ غیر ملکی ہیں۔ ان کے پاسپورٹ....."

اس کی بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ ایک جست لگا کے اے ایس پی باہر آگرا "انہیں تھانے لے جاؤ۔ پکڑو انہیں۔ یہ سب وہشت گرد ہیں" اس نے چیخ کے کہا اور منہ کے بل لیٹ کے ایک دم پلٹ گیا "میں ایک اے ایس پی ہوں۔ یہ حکم ہے میرا۔"

حوالدار ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا چہرہ ایک سوالیہ نشان بن گیا تھا۔

میں نے سکون سے کہا "آرام سے اپنی جگہ پر بیٹھ جاؤ۔"

حوالدار کو ایک اور جھٹکا لگا "تم......"

دروازے کے پیچھے سے نازو نمودار ہوئی۔ ہماری طرف دیکھے بغیر اس نے ریوالور کا رخ اے ایس پی کے سر کی جانب کر دیا جو ایک صوفے کے نیچے گھس کے دیوار سے جا لگا تھا۔

میں نے چلا کے کہا "یہ کیا کر رہی ہو؟ گولی مت چلانا۔"

لیکن نازو نے سائلنسر والے ریوالور سے فائر کر دیا۔ گولی صوفے سے گزر کے کہیں دیوار میں پیوست ہو گئی تھی۔ اے ایس پی دہشت زدہ ہو کے بلبلایا اور صوفے کے نیچے سے نکل آیا۔

"مجھے معاف کر دو۔ میں پاگل ہو گیا تھا۔ غلطی ہو گئی تھی مجھ سے...... مجھے مت مارو۔" وہ نازو کے پیروں میں لوٹنے لگا۔

نازو نے اس کی پسلیوں میں ٹھوکر ماری "اٹھ کے مرغا بن جاؤ۔"

اے ایس پی نے بڑی مستعدی سے تعمیل کی اور اسکول کے بچوں کی طرح کان پکڑ لئے۔ نازو اس پر یوں بیٹھ گئی جیسے وہ اسٹول ہو۔

میں نے حوالدار سے دوبارہ کہا "میں نے تم سے کہا تھا کہ بیٹھ جاؤ۔ تم ابھی تک کھڑے کیوں ہو؟"

"یہ...... کیا چکر ہے" حوالدار نے بیٹھتے ہوئے کہا "کیا یہ...... واقعی اے ایس پی صاحب ہیں؟ اور تم...... تم تو......"

میں نے اس کے سامنے بیٹھ کے کہا "سب سوالات بھول جاؤ۔ یہ بتاؤ خاموشی کے بدلے کیا قبول کرو گے؟ معاوضہ یا موت۔"

"کیا مطلب...... ہے اس فضول...... بات کا؟" وہ ہکلا کے بولا۔

"فیصلہ کرو جلدی۔ ہمیں جانا ہے" میں نے کہا۔

غالب ڈرامائی طور پر ریوالور کے ساتھ قریب آیا اور میری طرف یوں دیکھنے لگا جیسے تختۂ دار پر کھڑا ہوا جلاد لیور کھینچنے کے لئے جیلر کے اشارے کو دیکھتا ہے۔

حوالدار کے ماتھے پر پسینہ آ گیا "میں...... کچھ نہیں چاہتا...... بس مجھے جانے دو۔"

اے ایس پی کی ٹانگیں جواب دے گئیں۔ وہ فرش پر لڑھک گیا۔ نازو بڑی پھرتی سے اٹھ کھڑی ہوئی "کیا تکلیف ہے آخر تمہیں؟ آرام سے بیٹھنے بھی نہیں دیتے۔"

اے ایس پی پھر مرغا بن گیا۔ نازو پھر اس کی کمر پر ٹک گئی۔ نازک اندام نازو بہت ہلکی پھلکی تھی مگر اے ایس پی کو مرغا بننے کی پریکٹس نہیں تھی۔ ذرا سی دیر میں اس کی ٹانگیں کپکپانے لگی تھیں۔ یہ سب ذلت وہ ایک جذباتی غلطی کا کفارہ ادا کرنے کے لئے برداشت کر رہا تھا' جب اسے اپنے اعصاب پر قابو نہیں رہا کامیابی کے امکانات شمار کئے بغیر اس نے رہائی حاصل کرنے کی ایک احمقانہ کوشش کی تھی۔ نازو نے جان بوجھ کے نشانہ نہیں بنایا تھا۔ گولی اس کے شانے کو چھوتی ہوئی گزری تو وہ سمجھ رہا تھا کہ اتفاق یا خوش قسمتی کے باعث اس کی جان بچ گئی ورنہ وہ موت کی دہشت کا شکار تھا۔

حوالدار شاید دل ہی دل میں اس لمحے کو کوس رہا تھا جب وہ بے وقوفوں کے ایک دستے کی کمان کرتا ہوا قانون کی بالادستی رکھنے کے لئے اس گھر میں داخل ہوا۔ سارے بے وقوف چشم دید گواہ ہو سکتے تھے' اسے تنہا چھوڑ کر رخصت ہو گئے' اور وہ عقل مندی کا نمونۂ عبرت بنا بیٹھا ہے اور عقل بھی کسی طرح رسہ تڑا کے گھاس چرنے کے لئے جانے پر آمادہ ہے۔

غالب بولا "حوالدار صاحب فیصلہ نہیں کر پا رہے ہیں۔"

نازو نے کہا "چلو فیصلہ تم کرو۔ وقت ضائع ہو رہا ہے۔"

غالب نے سر ہلایا "ان کو پیک کر کے ساتھ رکھ لیتے ہیں۔ ٹکڑے ہوں گے؟"

میں نے کہا "دیکھ لو۔ ڈبے چھوٹے ہیں۔ آٹھ دس ٹکڑے کر لو۔"

حوالدار کی حالت غیر ہو گئی "میں...... ہاتھ جوڑتا ہوں۔ توبہ۔ میرے باپ کی' چچا کی' تایا کی توبہ۔ مجھے جانے دو۔"

میں نے اسے ایک جھٹکے سے سیدھا کھڑا کر دیا "جو کچھ جیب میں ہے' خود ہی نکال کے میز پر ڈال دو۔ مجھے رحم آ گیا ہے تم پر۔"

اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ہر جیب خالی کر دی "...... اور کچھ نہیں ہے۔"

میں نے غالب سے کہا "یہ کاغذات اٹھا کے چیک کرو نام پتا کچھ ہے یا نہیں۔"

غالب نے شناختی کارڈ دیکھ کے سر ہلایا "تمہارا رہائشی پتا یہی ہے یا بدل گیا ہے؟"

"یہ پرانا پتا ہے...... میں اب سسرال میں رہتا ہوں۔" وہ اتنا خوفزدہ تھا کہ رضاکارانہ طور پر سب بتا رہا تھا۔

"اچھا' خیر سے گھر داماد ہو۔ اس کاغذ پر پتا لکھو۔ اپنا نام لکھو۔ سالوں اور بہن بھائیوں کے نام پتے سب لکھو جو کچھ کرتے ہیں" غالب نے اسے قلم پکڑا دیا۔

میں نے غالب سے کہا "تم فٹافٹ جاؤ اور تصدیق کر کے آؤ۔"

حوالدار کا ہاتھ لرز رہا تھا "یہ سب...... کیوں لکھوا رہے ہو؟"

"صرف اسی شرط پر چھوڑا جا سکتا ہے تمہیں کہ تم کوئی غلط نہ لکھو۔ ایک بھی جھوٹ بولا تم نے تو پھر تمہیں کوئی

نہیں بچا سکے گا۔ ہم تمہارے ٹکڑے الگ الگ ڈبوں میں ڈال کے تمہارے عزیزوں رشتے داروں کو بھجوا دیں گے۔ وہ تمہیں دوبارہ مکمل کر کے تمہارا کریا کرم کریں یا تمہارے اجزائے ترکیبی کو گٹر میں ڈال کے اپنی جان چھڑائیں۔ یہ ان کی مرضی۔"

حوالدار بھوں بھوں کر کے رونے لگا "بھگوان کے لئے مجھ پر دیا کرو۔ میں کچھ نہیں کہوں گا کسی سے۔ کبھی نہیں کہوں گا۔"

میں نے نرمی سے کہا "یہ نام پتے ہم صرف ضمانت کے لئے اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہیں۔ کہیں بعد میں تم پر بہادری کا بھوت سوار ہو جائے یا تمہیں غلط فہمی ہو جائے کہ قانون کی طاقت کے ساتھ تم ہم سے پنگا لے سکتے ہو تو تمہارے سارے خاندان کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے۔ جو بھی لکھو' انگریزی میں صاف صاف لکھنا۔"

"ہم کسی کو بھی اٹھا لیں گے اور اس کے آٹھ پیس ارجنٹ پارسل سے روانہ کر دیں گے" غالب نے کہا۔

اے ایس پی پھر گرا۔ نازو نے اسے بالوں سے پکڑ کے کھینچا اور اس کے چیخنے کی پروا کئے بغیر مقابل کی دیوار پر دے مارا۔ وہ ٹکرا کے واپس آیا تو نازو نے اسے پاؤں سے ایسے اٹھا لیا جیسے کھلاڑی فٹ بال کو اٹھاتے ہیں۔ اس کا ہاتھ پکڑ کے گھمایا اور حوالدار پر پھینک دیا۔ حوالدار نے حقیقی زندگی میں ایسا بھیانک تماشا پہلے کب دیکھا ہوگا۔ اس کے لئے اپنی آنکھوں پر یقین کرنا مشکل تھا۔ کہ جو کچھ وہ دیکھ رہا ہے' کسی ڈراؤنے خواب کا حصہ نہیں ہے' اب جو کچھ اس کے کان سن رہے ہیں' فریبِ سماعت کا نتیجہ نہیں ہے۔

غالب قطعی بے نیازی کے ساتھ ریوالور سے کھیلتا رہا اور ٹہلتا رہا' جیسے اس کے لئے نہ کوئی بات غیر معمولی ہے نہ دلچسپ بلکہ وہ ایسی باتوں کا عادی ہے۔

اب میں نے اے ایس پی کو نازو کی طرف پھینک دیا' کسی مردہ کتے کی لاش کی طرح۔ وہ نیم جاں ہو چکا تھا اور اس کی شکستہ حالی کا نظارہ حوالدار کو قائل کرتا تھا کہ ہم کتنے سفاک اور خونی لوگ ہیں۔

"اسے لے جاؤ اور پیک کر دو" میں نے سکون سے کہا۔

نازو نے کہا "یس باس۔ کتنے پیس کروں؟"

"ہر بات مجھ سے مت پوچھو' کچھ اپنی عقل بھی استعمال کیا کرو" میں نے غرا کے کہا "کام صفائی سے ہونا چاہئے۔ کہیں کوئی نشان باقی نہ رہے۔"

اے ایس پی چلایا "پرماتما کے لئے......"

نازو اسے گھسیٹ کر لے گئی۔ حوالدار نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایک اے ایس پی کو پیکنگ کے لئے جاتا دیکھا۔ اس کا سارا بدن لرزنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ اس کی پتلون تک گیلی ہو چکی ہے مجھے اس پر ترس آیا۔ ہمارا ڈراما ضرورت سے زیادہ ظالمانہ ہو گیا تھا مگر یہ سب خود حفاظتی کے انتظام کا حصہ تھا۔ اس کے لئے قلم پکڑنا بھی مشکل ہو رہا تھا مگر وہ مجبور تھا اور لکھتا جا رہا تھا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔

غالب نے گھڑی دیکھ کر برا سا منہ بنایا "کیا مصیبت ہے! تیز ہاتھ نہیں چلا سکتے؟ مجھے ان سب سے مل کے بھی آنا ہے۔"

حوالدار نے پرچہ آگے بڑھا دیا "یہ...... یہ لو۔"

غالب نے اس پر ایک نگاہ ڈالی اور پھر حوالدار کی طرف دیکھا تو وہ تذبذب اور "گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل" کی عملی تفسیر بن گیا تھا۔

"خبیث! ایک نام نہیں لکھا ہے نا تم نے۔"

خوف نے حوالدار کی عقل کو مفلوج نہ کیا ہوتا تو وہ سوچتا کہ یہ بات غالب کو کیسے معلوم ہو سکتی ہے اور اپنی بات پر قائم رہتا کہ فہرست مکمل ہے مگر چور کے پاؤں نہیں ہوتے "میں...... میں نے بس...... اپنی بہن کا نام پتا نہیں لکھا ہے۔ اسے چھوڑ دو۔ وہ پہلے ہی بہت دکھی ہے۔"

غالب نے کچھ سوچ کے سر ہلایا "اچھا۔ لیکن باقی سب کے بارے میں جو کچھ تم نے لکھا ہے' سو فیصد درست ہونا چاہئے۔"

حوالدار نے ہاتھ جوڑ دئیے "آپ معلوم کر لو۔"

میں نے کہا "اچھا۔ تم اندر چلو۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا اور میں نے اسے آخری بیڈ روم سے متصل غسل خانے میں بند کر کے باہر سے کنڈی لگائی لیکن اس طرح کہ وہ دو چار مرتبہ دروازے کو ہلاتا تو سوراخ کے کنارے پر اٹکی ہوئی کنڈی کا سرا الگ ہو جاتا۔

میں نے وہیں سے چلا کے کہا "تم گئے نہیں ابھی تک۔"

غالب نے چلا کے جواب دیا "بس جا رہا ہوں۔ ذرا اپنے اے ایس پی صاحب کی پیکنگ میں مدد کر رہا تھا۔"

"پیک بھی ساتھ لے جانا۔"

"اچھا۔ تم وردی والے کا خیال رکھنا۔ وہ بھاگ نہ جائے۔"

"فکر مت کرو۔ میں یہیں بیٹھا ہوں" میں نے کہا۔

میں کچھ دیر کمرے میں سیٹی بجاتا رہا اور گانے کی کوشش کرتا رہا۔ مجھے یقین تھا کہ باتھ روم میں قید حوالدار نے میری اور غالب کی گفتگو کا ہر لفظ سنا ہوگا اور اب تک اسے یقین آ گیا ہوگا کہ غالب کی واپسی تک میں ساتھ والے کمرے میں موجود رہوں گا چنانچہ اس کے حق میں یہی بہتر ہوگا کہ وہ سکون سے بیٹھ کے بھگوان سے جیون کی پرارتھنا کرے۔

غالب اور کمار نے روانگی کی تیاری شروع کر دی تھی اور میں ان کی آوازیں سن سکتا تھا۔ کسی بات پر کمار نے پارو کو ڈانٹا "اتنا ڈر لگتا ہے تو آئی کیوں تھی میرے ساتھ؟ جب دیکھو رونا پیٹنا' آنسو بہانا۔ کانپنے لگتی ہے' بے ہوش ہونے لگتی ہے موقع محل دیکھے بغیر۔ آخر یہ بھی تو لڑکیاں ہیں۔"

پھر نازو نے کمار کو ڈانٹا "مت پریشان کرو اسے۔ معلوم ہے تم

کتنے بڑے سو رہا ہو۔"

گل نے بھی کہا "پہلے میں بھی بزدل تھی۔ پھر سب کے ساتھ رہی تو دل سے ڈر نکل گیا۔"

میں نے کمرے میں بجلی سے چلنے والا ایک ریڈیو گرام دیکھا جو پہلے بہت مقبول تھا اور امیروں کے ڈرائنگ روم میں ہی نظر آتا تھا۔ یہ گرنڈگ آف جرمنی کا بہترین پالش کی ہوئی لکڑی کے کیبنٹ والا ریڈیو گرام تھا جو دیوار کے ساتھ چار ٹانگوں پر بڑی شان و شوکت کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ اس میں چار بینڈ کے ریڈیو اور ریکارڈ پلیئر کے لئے چھ اسپیکر تھے چنانچہ اس کی آواز واقعی شاندار تھی۔ میں نے وہاں ریکارڈروں کے البم میں سہگل' خورشید اور لتا کے ایل پی ریکارڈر دیکھے اور ایک ریکارڈ بجانے کی کوشش کی۔ لتا کی مدھر' الم کے بھرپور تاثر میں ڈوبی ہوئی فریاد جیسے رابعہ کی آواز بن گئی۔ "تم نہ جانے کس جہاں میں کھو گئے۔ ہم بھری دنیا میں تنہا ہو گئے....."

میں نے ریکارڈر پر سے سوئی ہٹالی اور ریڈیو کو آن کر دیا۔ غالب نے دروازے سے سر نکال کے سیٹی بجائی اور مجھے انگلی سے اشارہ کر کے بلایا۔ میں دبے پاؤں دروازے کی طرف بڑھا۔

"چلو۔ سب گاڑی میں بیٹھ چکے ہیں" غالب نے سرگوشی میں کہا۔

"باہر کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے؟"

"نہیں۔ میں کھڑکی سے باہر نکلا تھا۔ پھر نازو نے کھڑکی اندر سے بند کر دی" غالب نے کہا۔

"پھر تم اندر کیسے آئے؟"

"جیسے کل آئے تھے۔ گاڑی پیچھے کھڑی ہے۔ کمار آگے سے گھما کے لے آیا ہے" غالب نے کہا "حوالدار کا کیا بنے گا؟"

"کچھ نہیں۔ وہ خود ہی نکل آئے گا باہر' جب اسے یقین آجائے گا کہ گھر میں کوئی نہیں ہے سوائے ریڈیو کے۔ کسی کی آواز سنائی نہیں دے گی تو سمجھ جائے گا کہ ہم اسے بے وقوف بنا کے نکل گئے۔ ابھی کچھ دیر تو وہ ریڈیو سنتا رہے گا۔"

غالب ہنسا "اس وقت تک ہم بہت دور پہنچ جائیں گے۔" میں نے کہا "ویسے بھی حوالدار اتنا ڈر گیا ہے کہ یہاں سے فرار ہو گا تو خدا کا شکر ادا کرے گا۔"

"ہاں۔ خوش قسمتی سمجھے گا کہ سالم ایک پیس میں واپس جا رہا ہے اور اپنے پیروں پر چل کے۔ آٹھ پیس میں ڈاک سے نہیں۔"

میں اور غالب باری باری عقبی حصے کی دیوار کے اوپر سے گلی میں اتر گئے۔ کار کے اگلے حصے میں کمار کے ساتھ پارو اور کھڑکی سے لگی ہوئی نازو بیٹھی تھی۔ ان کے پیچھے گل تھی اور اے ایس پی تھا جو پشت سے سر لگائے سو رہا تھا یا آنکھیں بند کئے پڑا تھا۔ میں ایک دروازے سے اور غالب دوسرے دروازے سے اندر بیٹھ گئے۔ گل [illegible] کنارے پر رہی۔ اے ایس پی کو میں نے اپنے اور غالب کے بیچ میں رکھا۔

"اللہ تیرا شکر ہے" نازو نے کہا "اس مصیبت سے نکلے"

گل مسکرائی "دعا کرو اب ڈھاکا پہنچنے تک کچھ نہ ہو۔"

"یہ دعا تمہیں مانگنی چاہئے پھر قبول ہو گی۔ دل سے نا" غالب بولا۔

گل نے کہا "کیا تم دل سے ایسا نہیں چاہتے؟"

"ہمارے اور تمہارے چاہنے میں فرق ہے" غالب نے [illegible] جو دعا مانگو گی اس میں فراق کا درد ہو گا اور دل مجبور ہو گی۔"

"فضول باتیں مت کرو۔" گل نے جھینپ کے کہا۔

"بالکل صحیح عرض کر رہا ہوں میں۔ اس وقت صورت ہے کہ لاہور پہنچنے کی دعا میں اسپیشل اثر اپنے سکندر صاحب رکھتے ہیں۔ ڈھاکا پہنچنے کی درخواست برائے خصوصی توجہ نہ میرٹ پر قبول ہو گی۔ میں یا نازو کہیں بھی جا سکتے ہیں۔ ایسے پارو ہیں۔"

"تمہیں خوش فہمی ہے کہ میں ہر جگہ تمہارے ساتھ ہوں۔" نازو نے کہا "مثلاً پاگل خانے نہیں جا سکتی میں۔"

"بالکل ٹھیک۔ دوبارہ کون جاتا ہے لوٹ کر اپنے طرف" غالب نے کہا "اور تمہیں وہاں سے نکالا ہی میں واپس کیسے لے جا سکتا ہوں۔"

"جہنم میں بھی اکیلے جاؤ گے تم۔" نازو نے بھنّا کے کہا۔

"یہ بھی کسی حد تک ٹھیک ہے۔ جب میں جاؤں گا تو پہلے سے بیٹھی ہو گی گھونگٹ نکالے' لال جوڑا پہنے۔"

گل اور پارو نے کھی کھی کر کے ہنسنا شروع کیا تو غصے سے نازو کا چہرہ لال پڑ گیا "فائدہ مت اٹھاؤ پیچھے بیٹھ کے۔"

"فائدہ۔ ایمان سے میں تو بڑے نقصان میں رہا" غالب [illegible] صورت بنا کے بولا "آگے آجاؤں پارو کی جگہ؟"

نازو نے ہاتھ پیچھے کی طرف گھمایا مگر غالب نے [illegible] اپنے آپ کو بچالیا۔ کسی قصور کے بغیر جھانپڑ اے ایس [illegible] پڑ گیا۔ وہ چونک کے ہم سب کی طرف مظلومیت سے دیکھنے [illegible] سب ہنس رہے تھے۔

"یہ بھی ہو گا میرے ساتھ۔ کسی وجہ کے بغیر ذلیل کر [illegible] مجھے" اس نے مجروح لہجے میں کہا۔

میں نے کہا "سوری۔ اس کا نشانہ غلط ہو گیا۔"

"جب برے دن آتے ہیں تو یہی ہوتا ہے" اس نے [illegible] دیکھتے ہوئے کہا "کسی کی گالی یا گولی راستہ بدل لیتی ہے۔ [illegible] بھی ہو محفوظ رہتا ہے۔"

نازو نے کہا "اب بلاوجہ فلسفہ مت بولو۔ غلطی مجھ [illegible] میں معافی چاہتی ہوں۔"

اے ایس پی ایک خوش گوار حیرانی میں مبتلا ہو گیا۔

[illegible] مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔ آخر یہ سب کیوں [illegible] عجیب لوگ ہو۔ [illegible] کر رہے ہو؟ کیا حاصل ہوا ہے اب تک تمہیں؟"

"اب تک؟" میں نے کہا "حاصل کچھ نہیں ہوا' گنوایا بہت کچھ۔ تم جان کے کیا کرو گے؟"

"یہ ٹھیک ہے کہ تم نے جبر کیا اور جان بچانے کے لئے میں نے تمہاری ہدایات مانی" وہ بولا "لیکن آہستہ آہستہ میں یہ سمجھنے لگا ہوں کہ تم کیا ہو۔ تم جنونی (FANATIC) ہو۔ کسی بھی مقصد کے حصول کو ایک مقدس فریضہ بنا لینے والے لوگ۔"

"ہم قانون کی نظر میں مجرم ہیں۔" غالب نے طنز سے کہا۔

"قانون کو تم مجھ سے زیادہ نہیں جانتے۔ میں تمہیں مجرم نہیں سمجھ سکتا" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"کیوں؟"

"تم کیا کر رہے ہو؟ نہ ڈاکے ڈال رہے ہو نہ قتل کرتے پھر رہے ہو بے گناہوں کو دولت کے لئے۔ حالاں کہ تمہارے لئے یہ کام بہت آسان ہے" وہ بولا "مجھے اختلاف ہو سکتا ہے تمہارے جذبات سے کیوں کہ ہمارے درمیان سیاسی اور مذہبی منافرت کے فاصلے ہیں لیکن اپنی اپنی جگہ تم بھی ٹھیک ہو اور میں بھی ٹھیک ہوں۔"

"سچ کے دو چہرے [illegible] ہو سکتے۔"

"ہوتے ہیں۔ ساری دنیا میں ہوتے ہیں" اس نے اصرار کے ساتھ کہا "اسرائیل جو ویت نام [illegible] گوریلوں کو ہلاک کر رہے ہیں' انہیں دہشت گرد اور تخریب کار کہتے ہیں۔ جو گوریلوں کے ہاتھوں مارے جاتے ہیں ان کے لئے کہا جاتا ہے کہ بہادری سے ادائے فرض پر قربان ہو گئے۔ خود تمہاری خبروں میں کہا جاتا ہے کہ اتنے بھارتی ہلاک ہوئے اور اتنے مجاہدین شہید۔ آکاش وانی اس کے برعکس کہتا ہے۔ یہ بات تو محض جذبات کی ہے۔ میں تمہارا نقطۂ نظر سمجھنا چاہتا ہوں۔"

"اس سے تمہارے خیالات نہیں بدلیں گے۔"

"ہاں۔ مجھے معلوم ہے۔ مگر ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو سمجھنے سے بھی بڑا فرق پڑتا ہے" وہ بولا "میں تمہاری خوشنودی حاصل کرنے کے لئے تمہیں بے وقوف بنانے کی کوشش نہیں کروں گا۔ مجھے واقعی تمہارے بارے میں زیادہ نہیں معلوم' تجسس ضرور ہے۔ باتیں کرتے رہنے سے راستہ کٹ جائے گا اور اعتماد ہو گا تو کشیدگی کم ہو گی۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا "آخر مجھے کیا ضرورت ہے تم پر اعتماد کرنے کی؟ تم میرے دشمن ہو۔"

اس کا چہرہ اتر گیا۔ اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں اور سر پیچھے ٹکا کے خاموش ہو گیا۔ کمار کلکتہ کے راستوں سے آشنا تھا۔ گاڑی انسانوں کے ہجوم' بازاروں اور سڑکوں کے اژدھام' ٹریفک کے مسلسل رواں اور شور کے درمیان اپنا راستہ بناتی تیزی سے بڑھتی جا رہی تھی۔ مضافات کے ایک پمپ سے کمار نے پٹرول لیا اور ٹینک فل کرا لیا۔

کلکتہ کے مضافات کی کوئی حد نہیں۔ ایک کروڑ سے زائد انسانوں کو اپنی بے کراں وسعت میں سمیٹ لینے والے اس شہر نے بھی اپنی کم مائیگی اور کوتاہ دامنی کا اعتراف کر لیا تھا۔ کارخانوں' ملوں اور فیکٹریوں' ورکشاپوں اور کاروباری اداروں' دفتروں اور دکانوں' کھوکھوں' ریڑھیوں اور غیر قانونی اور غیر اخلاقی دھندوں کے باوجود اس کی آدھی آبادی بھوک اور فاقہ کشی کے جنگل میں تھی۔ ان کے لئے روزگار نہیں تھا اور اس [illegible] پر بھی کوئی کام نہیں تھا جہاں آدمی اپنی عزتِ نفس' ڈگری اور انسانیت کو بھول کے بھی کچھ کما سکے۔ محنت کا کوئی مول نہیں تھا لیکن [illegible] کی قیمت تھی۔ پورے پورے خاندان کھلے آسمان کے نیچے فٹ پاتھ پر پڑے رہنے کا حق حاصل رہنے کے لئے جمعدار کو بھاڑا اور پولیس کو بھتہ دیتے تھے مگر دوسری طرف فائیو اسٹار ہوٹلوں سے عالی شان محلوں تک ہر روز ہزاروں عشرت کدوں میں رات جاگتی تھی' جگمگاتے فانوس بے حسی سے عصمتوں کے چراغوں کو بجھتا دیکھتے رہتے تھے۔ صبح مٹھی میں ایک نوٹ دبا کے لوٹنے والی عورت اپنے پیٹ کی اور اپنے پیٹ سے جنم لینے والے بچوں کی بھوک کا سامان مہیا کرتی تھی یا کسی معذور شوہر' بیمار باپ اور نشہ کرنے والے بھائی کے لئے اپنے جسم کو زندہ رکھتی تھی تاکہ وہ رات کو پھر قتل ہو سکے۔ سوکھی روٹی کھا کے نل کا پانی پینے والے مزدور سارا دن رکشا کھینچتے تھے' بھٹی جھونکتے تھے اور پتھر کوٹتے تھے تو خون تھوکنے لگتے تھے لیکن ان کے لئے کسی سرکاری ہسپتال میں رنگین پانی تک نہیں تھا۔ معصوم بچے ہر راہ گیر کے سامنے ہاتھ پھیلاتے تھے اور پھر کوڑے کچرے میں کچھ کھانے کے لئے تلاش کرتے تھے۔

یہ مناظر دیکھ دیکھ کر پہلے میری روح کانپ اٹھتی تھی اور مجھے اپنے انسان ہونے پر شرمندگی کا احساس کچوکے دیتا تھا مگر رفتہ رفتہ میں بھی بے حسی کا شکار ہو گیا تھا۔ بمبئی سے کلکتہ تک کروڑوں انسانوں کی زندگی کا ایک ہی انداز تھا۔ میں نے اپنے لئے اس خیال میں پناہ تلاش کر لی تھی کہ انسان خود ہی انسانیت کی تذلیل کے ذمے دار ہیں' جو محلوں کے خواب دیکھتے ہیں اور فٹ پاتھوں پر بچے پیدا کرتے ہیں۔ کیوں نیلام کرتے ہیں وہ اپنی مجبوریوں کا اور کیوں استحصال کی بنیادیں مضبوط کرتے ہیں۔ ایک روٹی کو عزت پر ترجیح کیوں دیتے ہیں؟ وہ خودی کو بلند کیوں نہیں رکھتے!

جہاں یہ عبرت کا مقام تھا وہیں شکر کا بھی کہ میرے وطن میں ہزار خرابیاں دیکھنے والوں نے بھی کراچی یا لاہور کی کسی فٹ پاتھ پر زندگی کی یہ رسوائی نہیں دیکھی ہو گی۔ غربت اور افلاس کی اس انتہا کا یہ تصور ابھی وہاں ناپید ہے۔ خاندانوں کو ایک چھت کا سایہ ضرور میسر ہے' خواہ وہ کسی جھگی کی چھت ہو یا کچے گھروندے کی۔ اور کھانے کو ایک وقت روکھی سوکھی ضرور ملتی ہے مگر عزت کے

ساتھ۔

کار سڑک پر دوڑتی جارہی تھی اور میں خیالات کے صحرا کی بادِسموم میں کسی تنکے کی طرح اُڑ رہا تھا۔ سڑک پر آگے پیچھے سیکڑوں گاڑیاں رواں دواں تھیں۔ کناروں پر سائیکلوں اور رکشاؤں کی قطار چل رہی تھی اور آدھے ادھورے لباس میں سوکھے‘ کالے جسموں والے مرد اور عورتیں ننگے پاؤں چل رہے تھے۔ وقفے وقفے سے فوجی گاڑیاں گزرتی تھیں تو وہ سہم کر اور دور ہوجاتے تھے۔ ایک جگہ سامنے سے آنے والے ملٹری کانوائے کے دیو ہیکل ٹرک نے سائیکل رکشا میں سوار ایک مسافر کو کچل دیا تھا۔ رکشا والا زخمی ہونے کے باوجود اپنے چُرمُر ہوجانے والے ذریعۂ معاش کو رو رہا تھا اور مُردہ مسافر کی طرف بالکل متوجہ نہ تھا۔ کانوائے رکے بغیر گزر گیا تھا۔ میں نے بھی یہ دیکھنے اور جاننے سے عملاً اجتناب کیا تھا کہ اس کے پچھلے حصے میں جنگی قیدی کون تھے۔

سڑک بہت کشادہ اور تیز رفتاری کے لئے موزوں تھی مگر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ملٹری پولیس ٹریفک کو کنٹرول کر رہی تھی۔ سڑک کا ایک حصہ فوجی گاڑیوں کی آمدورفت کے لئے وقف کردیا گیا تھا چنانچہ آمنے سامنے سے آنے والی دوسری گاڑیاں نصف حصے کو استعمال کر رہی تھیں۔ کوئی ملٹری والوں سے یہ نہیں پوچھ رہا تھا کہ انہوں نے آدھی سڑک پر کیوں قبضہ کر رکھا ہے۔ کوئی اپنے شہری حقوق اور قانون کی بات نہیں کر رہا تھا۔ سب جانتے تھے کہ جنگ میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ جو یہ جانتے تھے کہ جنگ کہاں اور کیوں ہورہی ہے وہ اپنی سینا کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کرتے تھے۔ انگلیوں سے وی کا نشان بناتے تھے اور ہاتھ ہلاتے تھے۔ ظاہر ہے اس سے "فاتح" فوج کے ہونٹوں کی مسکراہٹ میں اور انداز میں غرور آجاتا تھا۔ ہم سب جو کار میں خاموش بیٹھے تھے‘ ایک سے پُرعذاب خیالوں میں مبتلا تھے اور وہ سب دیکھنے پر مجبور تھے جو ہم کبھی تصور میں بھی دیکھتے تو ناممکن سمجھتے اور شرمسار ہوتے کہ آخر ہمارے ذہن میں ایسا رُسوا کن خیال کیوں آیا۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ مشرقی پاکستان الگ ہو کے بنگلہ دیش بن جائے اور ہماری فوج محصور ہو کے ہتھیار ڈال دے۔ وہ بھی بھارتی فوج کے سامنے۔ اس نظارے سے خوشی حاصل کرنے والا صرف اے ایس پی تھا جو اَب پہلے سے زیادہ چاق و چوبند بیٹھا تھا۔ اسے ہماری صورتوں پر اذیت دیکھ کر وہی مسرت مل رہی ہوگی جو اس کی ذلت پر ہم نے محسوس کی تھی۔ تاہم وہ خوف کی وجہ سے نہ سیاسی صورت حال پر بات کر رہا تھا اور نہ اپنی خوشی کا اظہار۔ کمار بھی بھارتی تھا مگر وہ جذباتی طور پر کسی کے ساتھ نہیں تھا۔ اس کا سارا مسئلہ ذاتی تھا۔

ایک گھنٹے بعد ہم نے صرف تیس کلومیٹر طے کئے۔ اس سے اگلے گھنٹے میں چالیس۔ مضافات سے گزرنے کے بعد تیسرے گھنٹے میں پچاس کلومیٹر کے بعد کمار نے گاڑی کو بائیں جانب موڑ لیا۔ اب دو بج چکے تھے۔ سائڈ روڈ پر ٹریفک نسبتاً کم تھی اور ملٹری کی مداخلت بھی نہ تھی چنانچہ کمار نے خطرناک حد تک تیز رفتا مظاہرہ کیا اور بیس منٹ بعد کار کو ایک قصبے کا بازار ختم ہو روک لیا۔ اس وقت تک ہم مین روڈ سے چالیس کلومیٹر اندر تھے۔

"ہم یہاں کھانا کھائیں گے" کمار بولا "اس کے بعد تم راستے پر واپس چلے جاؤ گے۔"

"اور تم؟" نازو نے کہا۔

"میں آگے جاؤں گا۔ پارو کے ساتھ۔ یہاں سے دریا دور نہیں ہے۔ شام تک میں پار اتر جاؤں گا" وہ گاڑی سے ا ہوئے بولا۔

"یعنی تم نے اپنا فیصلہ نہیں بدلا" میں نے کہا۔

وہ ہنسا "کچھ فیصلے ہی ایسے ہوتے ہیں۔ ناقابلِ تنسیخ۔"

غالب نے کہا "کیا پارو کی محبت بھی ایسا ہی فیصلہ ہے؟"

کمار نے سرہلایا "ابھی تک تو ہے۔"

"گویا تمہیں آئندہ کا یقین نہیں؟" میں نے کہا۔

اس کے جواب دینے سے پہلے پارو نے کہا "کمار! بدل دو۔"

کمار چونکا "کون سا فیصلہ؟"

"انتقام کا۔"

کمار نے نفی میں سرہلایا "مجھے دھمکی مت دینا پارو۔"

پارو نے اداسی سے کہا "تم تو خود ہی کہتے تھے .... تمہارے بغیر جی نہیں سکتا۔"

"ہاں۔ مگر مر تو سکتا ہوں۔ سب کو مارنے کے بعد معلوم بھی نہیں ہوگا......"

"ایسی باتیں مت کرو۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"ڈر مت۔ ان کے ساتھ چلی جا۔ میں زندہ رہا تو آ ورنہ صبر کرلینا۔ یہاں رونے دھونے کا ڈراما مت کر۔ ہوں‘ سب اپنی زندگی سے بڑھ کر کسی کو نہیں چاہتے۔ کچھ سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ ماں باپ بھی جوان اولاد کا صا جاتے ہیں اور زندہ رہتے ہیں۔ میاں بیوی کا ساتھ چھوٹ ساری عمر کوئی اکیلا نہیں رہتا۔ دوسرا ساتھی مل جاتا ہے۔"

گل نے کہا "اتنے بے رحم مت بنو۔"

میں نے کہا "اور ایسا ہی ہے تو تم وقت کو موقع دو۔ تم بھی رکمنی کے قتل کو بھول جاؤ گے۔"

"مجھے معلوم ہے۔ اس وقت سے پہلے ہی مجھے بدل ورنہ بعد میں میرا خون سفید ہوجائے گا۔ میری عقل بہا کرنے لگے گی۔ خدا کے لئے میری راہ میں دلیلوں کے بچھاؤ۔ جاؤ اپنی اپنی زندگی کے راستوں پر" وہ ایک د ہوا۔

ہم سب سڑک کے کنارے اس ریسٹورنٹ کے ا

میں بیٹھے تھے اور انتظار کر رہے تھے کہ بیرا ہماری طرف متوجہ ہو۔ کمار کی آواز اچانک بلند ہوگئی تھی۔ کچھ لوگوں نے سر گھما کر اسے دیکھا۔ پھر پارو اس کے پیچھے لپکی۔

"یہ تو پاگل ہوگیا ہے" غالب نے اُردو میں کہا اور ایک بار پھر سننے والوں نے ہماری طرف دیکھا۔

"جاؤ اسے پکڑ کے لاؤ" میں نے کہا "اچھا ٹھہرو‘ میں خود جاتا ہوں" پارو اسے روکنے میں ناکام ہوگئی تھی۔ کمار اس سے ہاتھ چھڑا کے باہر نکل گیا تھا۔ نازو اور گل دکھی نظر آنے لگی تھیں۔

میں نے ریسٹورنٹ سے باہر آکے ادھر اُدھر دیکھا مگر کمار تو جیسے چھلاوا بن کے غائب ہوگیا تھا۔ بنگال میں پردے کا رواج نہیں ہے چنانچہ ہر جگہ مرد اور عورتیں ساتھ ساتھ نظر آتے ہیں۔ بس میں‘ بازاروں میں اور دُکانوں میں‘ کہیں کوئی عام عورت کی طرف آنکھ اٹھا کے بھی نہیں دیکھتا۔ گل اور نازو کو سب نے دیکھا تھا مگر پارو کا کسی نے بھی نوٹس نہیں لیا تھا۔ میں نے بہت سے افراد سے پوچھا جو وہیں موجود تھے۔ صرف ایک نے بتایا کہ ایک مرد کے پیچھے جو عورت روتی ہوئی دوڑ رہی تھی وہ اس کے ساتھ گھاٹ کی طرف جانے والی ٹیکسی میں بیٹھ گئی تھی۔ ٹیکسی وہاں اس رکشا کو کہتے تھے جس کے تین پہیے ہوتے تھے اور اس میں ڈرائیور کے علاوہ چھ افراد کے بیٹھنے کی گنجائش ہوتی تھی مگر آٹھ دس آسانی سے سفر کرتے تھے۔

میری اُردو اور میرا لب و لہجہ ایک منفی اور ناپسندیدہ ردِّعمل کو جنم دیتا تھا۔ لوگ بے رُخی اور کسی حد تک جارحانہ بے اعتنائی کے ساتھ جواب میں "پتا نہیں" کہتے تھے یا منہ پھیر لیتے تھے۔

مجھے کمار کے متعلق بتانے والا بنگالی نہیں تھا مگر "ہر کہ در کان نمک رفت‘ نمک شد" کے مصداق وہ بھی مجھے معاندانہ نظروں سے گھور رہا تھا۔

میں نے کہا "گھاٹ کتنی دور ہے؟"

"پانچ میل" اس نے پنجہ پھیلا کے کہا۔

"یہاں تو مجھے کوئی ٹیکسی نظر نہیں آرہی ہے۔"

"آئے گا۔ ادھر سے آئے گا۔" اس نے بڑی سڑک کی طرف اشارہ کیا اور پلٹ کے نہ جانے کدھر روانہ ہوگیا۔

میں مایوس ہوکے اندر لوٹ آیا۔ میز پر دال چاول اور مچھلی کا شوربے والا سالن رکھے ہوئے تھے لیکن کسی نے بھی ابھی تک کھانے کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ وہ سب بے چینی سے میری واپسی کے منتظر تھے۔ مجھے اکیلا واپس آتا دیکھ کر ان کی صورتوں پر مایوسی اور فکر کا تاریک سایہ پھیل گیا۔

"کیا ہوا‘ وہ آئے نہیں؟" نازو نے کہا۔

میں تھک کر بیٹھ گیا "وہ ملے ہی نہیں۔ مل جاتے تو میں لے آتا۔"

غالب نے کہا "اتنی جلدی کہاں نکل گئے۔ اور کیسے؟"

"اتفاق یا بدقسمتی۔ مین روڈ کی طرف سے کوئی ٹیکسی رکشا آکے رُکا ہی تھا کہ کمار سیدھا اس میں بیٹھ گیا۔ ظاہر ہے پارو کچھ نہیں کرسکتی تھی‘ اس کے ساتھ روانہ ہوجانے کے سوا۔"

گل نے کہا "معلوم تو کرتے وہ کہاں گئے ہیں"

میں نے کہا "وہ گھاٹ کی طرف گئے ہیں۔ گھاٹ پانچ میل دور ہے۔ سڑک کی طرف سے دوسرا کوئی رکشا نہیں آرہا تھا۔"

"تم گاڑی لے جاؤ" غالب نے کہا۔

میں نے چڑ کے کہا "کیوں‘ کیا فائدہ اس کے پیچھے جانے سے؟ کیا وہ آجائے گا واپس؟ چھوڑو اس کا خیال۔ اس پر دیوانگی طاری ہے۔ اسے کوئی نہیں سمجھا سکتا۔ کھانا کھاؤ اور چلو۔"

نازو نے کہا "مجھے بھوک نہیں ہے۔"

اے ایس پی بولا "آگے شاید کچھ نہ ملے کھانے کو۔ شام تک یا رات تک۔"

گل نے کہا "تم کھالو۔ ہم کھانا ساتھ لے لیں گے۔"

غالب نے افسوس سے سرہلایا "سب کچھ چھوڑ گیا ہمارے پاس۔ خالی ہاتھ نکل گیا۔"

"کم سے کم اسلحہ تو ساتھ لے جاتا" میں نے کہا "اور یہ سونا......"

"یہ منحوس سونا پھر ہمارے پاس رہ گیا؟" نازو نے بگڑ کے کہا۔

میں نے کہا "آہستہ بولو۔ لوگ سن رہے ہیں۔"

اے ایس پی ہماری باتوں پر حیران ہو رہا تھا۔ انتقام۔ اسلحہ۔ سونا۔ یہ سب باتیں اس کی سمجھ میں کچھ آرہی تھیں کچھ نہیں مگر وہ خاموشی سے کھانے میں لگ گیا تھا۔ اس کا رویّہ کچھ ایسا ہوگیا تھا کہ جب میری سنتے نہیں‘ مانتے نہیں اور مجھے کچھ بتاتے نہیں تو بھاڑ میں جاؤ۔ اس نے ایک دفاعی رویّہ اپنا لیا تھا کہ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ نہ خود مرنے کی ضرورت ہے نہ مرنے سے ڈرنے کی۔

ہم نے لوگوں کی پروا کئے بغیر کھانا ساتھ لیا اور پیسے ادا کرکے گاڑی میں بیٹھ گئے۔ مجموعی صورت حال ہمارے خلاف نہیں تھی تو ہمارے حق میں بھی نہیں تھی۔ کسی بھی وقت کوئی بات ہماری سلامتی کو خطرے میں ڈال سکتی تھی۔ ابھی تک اے ایس پی کی موجودگی نے سب کو دور رکھا تھا مگر وہ خود موقعے سے فائدہ اٹھا کے لوگوں کے ساتھ مل جاتا تو ہمارے لئے قتلِ عام کرنا ناگزیر ہوجاتا۔ ہم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں چاہتا تھا۔

اب ڈرائیونگ غالب نے سنبھال لی تھی۔ اس کے ساتھ گل بیٹھ گئی تھی اور پچھلی سیٹ پر میں نے اور نازو نے دونوں طرف سے اے ایس پی کے فرار کا راستہ مسدود کردیا تھا۔

"جیسے بھی ہو‘ کمار تک پہنچنے کی کوشش کرو" نازو نے حکم دیتے ہوئے کہا "گھاٹ اگر پانچ میل دور ہے تو ہم اسے پکڑ لیں گے۔ دریا پار جانے سے پہلے۔"

کوئی فائدہ نہیں" غالب نے کہا۔
"کوشش کئے بغیر ایسا مت کہو۔ وہ مل گیا تو......"
"تو کیا ہوگا؟ کیا وہ واپس آجائے گا یا سرِ تسلیم خم کردے گا تمہارے سامنے؟" غالب نے بگڑ کے کہا "اپنی بہن کے قاتلوں کو ٹھکانے لگائے بغیر اس کا دماغ ٹھکانے نہیں آئے گا۔ اس کے پاگل پن کا یہی علاج ہے۔"
میں نے کہا "ہاں۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔ اس پاگل پن پر وہ اپنا سب کچھ قربان کر سکتا ہے۔ پارو کو بھی۔"
"خدا کرے وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو" گل بولی۔
"یہ دعا ہے یا بددعا؟" غالب نے کہا۔
"بددعا کیوں؟"
"بھئی تم کہہ رہی ہو کہ خدا کرے وہ سب کو قتل کردے۔"
میں نے کہا "دشمنوں کو مارنا بہادری ہے۔"
نازو نے کہا "معاف کرنا اس سے بھی بڑی بہادری کی بات ہے۔"
"ہاں۔ مگر ہر شخص اتنا بہادر کیسے ہو سکتا ہے۔ ہم سب اپنی فطرت کے اعتبار سے مختلف ہیں۔ ہماری مجبوریاں اور کمزوریاں' خوبیاں اور خامیاں الگ ہیں۔ کمار بھی عام آدمی ہے جو ولی نہیں ہوتا کہ نفرت اور عداوت' بغض اور کینہ جیسے سفلی جذبات سے یکسر بیگانہ رہے۔ جب تک انتقام کی آگ اسے جلاتی رہے گی وہ اپنے مستقبل کی آسودگی' کامیابی اور خوش حالی کے بارے میں کیسے سوچے گا؟ اس کی نظر تو ماضی کے عذاب ناک خواب دیکھتی رہے گی۔"
غالب نے کہا "کیا انتقام لینے کے بعد اسے سکون مل جائے گا؟ کہیں وہ پشیمانی کے عذاب میں نہ مبتلا ہو جائے۔"
"کچھ بھی نہیں ہوگا" نازو نے دکھ اور غصے کی تلخی کے ساتھ کہا "تم لوگ بلاوجہ بحث کر رہے ہو۔ قسمت نے ساتھ دیا تو وہ بچ کے نکل جائے گا اور پھر ساری عمر بھاگتا رہے گا۔ کبھی آباد نہیں ہوگا۔ ورنہ مارا جائے گا۔ ہمیں معلوم بھی نہیں ہوگا۔"
ہم سب خاموش ہو گئے۔ نازو نے غلط نہیں کہا تھا۔ کمار کی زندگی کا راستہ بدل گیا تھا۔ وہ کچھ تھوڑے سے وقت کے لئے ہمارا شریکِ سفر رہا مگر اس گزرے ہوئے وقت کے خیال کی اب کوئی اہمیت نہیں رہی تھی۔ اس کے بارے میں سوچنا بے کار تھا۔
اگلے تین گھنٹے کے سفر میں راستہ زیادہ دشوار ہو گیا۔ اچانک کوئی دریا ہماری راہ میں حائل ہو جاتا تھا۔ ہمیں سڑک چھوڑ کے دریا کے ساحل کے ساتھ ساتھ چلنا پڑتا تھا اور کسی پل کی تلاش میں میلوں تک دائیں بائیں جانا پڑتا تھا۔ ہم کئی بار راستے سے بھٹکے اور لوگوں نے ہمیں آگے جانے کا نیا راستہ بتا دیا۔ اس علاقے میں سڑکوں کی حالت بھی ناگفتہ بہ تھی۔ گھنے جنگل اور ندی نالوں کی اس سرزمین پر کار کے ذریعے سفر کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ سب لوگ

بسوں کے ذریعے ایک جگہ سے دوسری جگہ آتے جاتے تھے۔ کوئی ندی آتی تھی وہاں سے مسافر کشتی یا لانچ سے سفر کا[illegible] طے کرتے تھے اور اسی طرح کہیں خشکی پر اور کہیں آبی [illegible] قسطوں میں مسافت طے کرنا عام معمول تھا جس سے [illegible] تھے۔
رات کا اندھیرا پھیلنے لگا تو ہم قریب ہونے کے با[illegible] منزل سے بہت دور تھے۔ مشرقی اور مغربی بنگال کی سرحد [illegible] اور اس کے بعد کھلنا' باریسال اور نارائن گنج کے راستے [illegible] ہماری توقعات سے کہیں زیادہ مشکل کام ثابت ہو رہا تھ[illegible] سے سب کا برا حال تھا۔ یہ خوف اس کے علاوہ تھا کہ [illegible] سرحدی محافظوں کی نظر میں نہ آجائیں کیوں کہ اب ا[illegible] میں ہمارے سوا کوئی نہ تھا۔ گاؤں تو بہت تھے مگر ابھی [illegible] راستے پر کوئی ایسا قصبہ نہیں آیا تھا جہاں ہم آرام کے لئے [illegible] سکتے۔ بنگال کے گاؤں بھی مختلف تھے۔ بانس' چٹائی او[illegible] پھوس کے جھونپڑوں کی کسی بھی آبادی میں ہمیں ایک ہم[illegible] زبان نہیں ملا۔ ظاہر ہے وہاں ہمارے رکنے کا کوئی سوال نہ [illegible]
نازو اور گل پر گھبراہٹ سوار تھی۔ خود میں بے چینی [illegible] اعتماد کا شکار تھا۔ ہمیں راستہ بتانے والا ایک ہی شخص [illegible] ہمارا قیدی اے ایس پی تھا۔ ہم اس کی راہنمائی پر بھروسہ [illegible] تو کیا کرتے۔ اگر وہ ہمیں غلط راستوں پر لے جاتا تو ہم [illegible] زیادہ اس کی جان لے سکتے تھے مگر اس سے منزل تک [illegible] مشکل ہو جاتا۔ وہ خود بھی موت سے نہ ڈرتا تو یقیناً [illegible] پیاری تھی اور یوں مفادِ باہمی کے رشتوں نے ہمیں ایک [illegible] کی ضرورت بنا دیا تھا۔
آخرکار ایک ندی کے کنارے غالب کا حوصلہ جو[illegible] گیا۔
"مجھ میں اب ہمت نہیں ہے جنگل میں بھٹکنے کی" [illegible] اتر کے قدرتی گھاس کے ایک قطعے پر دراز ہو گیا "بہتر ہو[illegible] اسی جگہ فوت ہو جاؤں۔"
میں نے کہا "آپ چاہیں تو باعزت طور پر بھی جان [illegible] ہیں۔ ندی میں چلو بھر پانی یقیناً ہے۔"
"ہم سب کو واقعی ڈوب مرنا چاہئے شرم سے" نا[illegible] گھاس کا ایک تنکا چباتے ہوئے کہا "جس ٹیم کا لیڈر یہ [illegible] کہ لیڈرشپ کیا ہوتی ہے' جسے نہ راستوں کا پتا ہو نہ منزل [illegible]
گل نے قریب بیٹھ کے کہا "آخر اب کتنی دور ہے [illegible]
میں نے کہا "صوبہ سرحد مغربی پاکستان میں ہے۔ کا[illegible] یہاں سے۔"
نازو اپنے ساتھ اے ایس پی کو لے آئی تھی "تم بتا[illegible] یہ چکر کیا ہے؟ تم کہاں لے آئے ہو ہمیں؟"

اے ایس پی مسکرایا "میں؟ میں لایا ہوں آپ کو۔ نہیں خاتون۔ آپ سب مجھے لائے ہیں یہاں۔ زبردستی۔"
میں نے کہا "ہم ڈھاکا سے اب کتنی دور ہیں؟"
غالب نے سر ہلایا "تم نے جو فاصلہ بتایا تھا اتنا ہم نے طے کر لیا ہے لیکن ابھی تو کھلنا یا باریسال بھی نہیں پہنچے ہیں ہم۔"
اے ایس پی آرام سے ہمارے قریب بیٹھ گیا "ہم بائی ائر نہیں جا رہے ہیں۔ جس راستے سے میں تمہیں لے جا رہا ہوں وہ لمبا ضرور ہے لیکن محفوظ ہے۔ میں اس علاقے کے چپے چپے سے واقف ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ سرحدی اور حفاظتی چوکیاں کہاں ہیں۔ کہاں بھارتی فوج سے مڈبھیڑ کا امکان ہے اور کہاں پاکستانی فوج ہو سکتی ہے۔ اس راستے پر نہ کھلنا آئے گا نہ باریسال۔ یہ اسمگلروں کا راستہ ہے۔ چور راستہ۔ صبح تک میں تمہیں ڈھاکا پہنچا دوں گا' اگر خلافِ توقع کہیں کسی نے ہمارا راستہ نہ روکا لیکن......"
"لیکن کیا؟" میں نے کہا۔
"اب اس کار کو چھوڑ دو۔ اسی جگہ۔" وہ بولا۔
"کار کو چھوڑ دیں؟" نازو نے کہا۔
"یہاں سے پیدل چلیں؟" گل نے سہم کے کہا "جنگل میں رات کے وقت!"
اے ایس پی نے کہا "رات کو سفر کرنے میں خطرہ کم ہے لیکن آپ لوگ تھک گئے ہیں تو ٹھیک ہے' صبح تک رک جاتے ہیں۔"
میں نے غالب کی طرف دیکھا "یہاں رکنے میں کوئی خطرہ ہے؟"
اے ایس پی نے کہا "ہاں۔ رات کو گشت کرنے والے فوجی کسی وقت بھی آسکتے ہیں۔ وہ دریا کے کناروں پر نظر رکھتے ہیں۔"
"کیا تم انہیں مطمئن نہیں کر سکتے؟" نازو بولی۔
"میں کوشش ضرور کروں گا لیکن وہ مطمئن نہ ہوئے تو سب کو پکڑ کر لے جائیں گے" اے ایس پی بولا "ہماری پوزیشن..... میرا مطلب ہے تمہاری پوزیشن پہلے ہی مشکوک ہے۔ میں تو اپنی شناخت کرا دوں گا اور بچ جاؤں گا۔ تم کیا کرو گے؟"
"تمہارے خیال میں کیا کرنا چاہئے ہمیں؟" میں نے کہا۔
"کار میں سفر کرنا ایک بنیادی غلطی تھی" وہ بولا۔
"یہ بات تم نے روانگی سے پہلے کیوں نہیں کہی؟" غالب نے بگڑ کے کہا۔
"اگر میں تمہیں منع کرتا تو کیا تم مان جاتے؟" اے ایس پی نے کہا "تم سمجھتے' میں چکر دے رہا ہوں۔ ابھی تک اعتماد حاصل نہیں کر سکا ہوں میں حالاں کہ......"
میں نے کہا "چھوڑو یہ بات۔ ہم کار میں نہ آتے تو کیا ہوائی جہاز سے سفر کرتے؟"
"اس خطے میں سڑکیں بہت کم ہیں۔ تم دیکھ رہے ہو کہ

تھوڑے تھوڑے فاصلے پر دریا ہیں اور ندی نالے ہیں۔ اگر تم عام لوگوں کی طرح بس سے سفر کرتے' جہاں ندی آتی کشتی میں سوار ہو جاتے' پھر بس پکڑ لیتے۔ تو آٹھ دس گھنٹے میں ڈھاکا پہنچ جاتے' عام حالات میں۔ آج کل سرحد کے اس طرف سے دوسری طرف جانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ ایک طرف پاکستانی فوج ہے' دوسری طرف بھارتی فوج۔ سرحد پار کرانے والے ایجنٹ مخصوص مقامات سے دریا پار کراتے ہیں یا سندربن کی طرف سے لے جاتے ہیں۔ یہ ایک دن کا نہیں کئی دن کا سفر ہے۔ لیکن میں تمہیں محفوظ اور مختصر ترین راستوں سے یہاں تک لے آیا ہوں۔ ایک زمانے میں میری پوسٹنگ اسی علاقے میں تھی۔ مجھے دن رات اسمگلروں کا تعاقب کرنا پڑتا تھا' اس لئے مجھے سارے راستوں کا علم ہے۔ اس سے آگے کار جا ہی نہیں سکتی۔ جنگ نہ ہوتی تو میں کار سمیت تم کو فیری میں سوار کرا دیتا اور کنارے پر اتر کے تم پھر سڑک پر روانہ ہو جاتے مگر ان راستوں پر آج کل کوئی بھی نہیں جا سکتا۔ لانچ اور فیری سروس بند ہے' بسیں بند ہیں اور کشتیاں تک دور دراز مقامات سے چوری چھپے مسافر اٹھاتی ہیں۔ ایجنٹ یہی کام پیسہ لے کر کر رہے ہیں جو تم مجھ سے زبردستی کروا رہے ہو۔ وہ ایک آدمی کو سرحد پار کرانے کے دس ہزار تک لیتے ہیں۔"
میں نے کہا "کیا تم معاوضہ طلب کر رہے ہو؟"
نازو نے اچانک سونے کی وہ پوٹلی اس کے سامنے رکھ دی جو کمار چھوڑ گیا تھا "یہ لو۔ معاوضہ ہم نقد تو نہیں دے سکتے مگر یہ کافی ہونا چاہئے تمہیں......"
اے ایس پی نے حیرانی سے پوٹلی کو دیکھا "اس میں کیا ہے؟"
"خالص سونا" نازو بولی "یہ سب تم کو مبارک ہو۔"
"یہ وہی سونا ہے نا جس کو تم نے منحوس قرار دیا تھا؟" اے ایس پی بولا "پھر میرے حق میں یہ مبارک کیسے ثابت ہو سکتا ہے؟ اسے اپنے پاس رکھو' تمہارے کام آئے گا۔"
"تم ڈرتے ہو اس سے؟" غالب نے کہا۔
اے ایس پی بولا "میں بتا چکا ہوں کہ میرا کام اسمگلروں کو پکڑنا تھا۔ ایسا کئی بار ہوا کہ بارڈر سیکیورٹی فورس والوں نے سونے کی اسمگلنگ کرنے والوں کا راستہ روکا۔ انہوں نے سیروں کے حساب سے سونا پیش کیا......"
"جو تم نے نہیں لیا" نازو نے طنز کیا "کیوں کہ تم ایک بہادر' فرض شناس اور ایماندار افسر تھے۔"
اے ایس پی ہنسنے لگا "نہیں۔ میں نے ایسا کوئی دعویٰ نہیں کیا۔ میں نے رشوت میں سونا لیا اور اسمگلروں کے راستے سے ہٹ گیا۔ آٹھ دس سیر سونا ضرور ہوگا میرے پاس مگر کیا وہ سونا میری جان بچا سکتا ہے اس وقت؟" اس نے نفی میں سر ہلایا "تم نے سونے کا انڈا دینے والی مرغی کی کہانی سنی ہوگی۔ کیا سونے کا انڈا اس مرغی کی جان بچا سکا تھا؟ نہیں۔ مرغی اپنی جان سے گئی تھی

لیکن اس کا بے وقوف مالک یقیناً کافی امیر ہو گیا تھا۔ وہ مرغی پہلے تو اسے ہر روز سونے کا ایک انڈا دیتی رہی تھی......"

میں نے کہا "فضول باتوں کے لئے وقت نہیں ہے ہمارے پاس۔"

غالب نے سونا اٹھا کے پھر نازو کو تھمادیا "اسے سنبھال کے رکھو۔"

نازو نے اسے نیچے پھینک دیا "مجھے نہیں چاہئے یہ منحوس سونا"

غالب نے بھنّا کے کہا "کیا چیز منحوس ہے اور کیا مبارک' یہ فیصلہ تم کیسے کر سکتی ہو؟ اپنی ناقص عقل کے ساتھ قدرت کی کسی مصلحت کو سمجھنے کی کوشش بھی مت کرو۔ کیا پتا اس میں ہمارے لئے بھلائی ہو۔"

اے ایس پی نے کہا "اب اس سے پہلے کہ گشتی دستے یہاں پہنچ جائیں' اس کار کو غائب کردو۔"

"ہم میں سے کوئی جادوگر نہیں ہے" غالب نے کہا۔

"اسے دریا میں اتاردو۔ یا واپس لے جا کے جنگل میں چھپادو" اے ایس پی بولا "اگر رات کو قیام کا ارادہ ہے تو پھر اسی میں لوٹ جانا بہتر ہو گا۔ کنارے سے میل ڈیڑھ میل دور ہم جنگل میں رات گزار کے صبح بھی روانہ ہو سکتے ہیں۔"

"مگر تم نے کہا تھا کہ رات کا سفر ہی محفوظ ہے۔"

"ہاں۔ لیکن دن میں سفر آسان ہو گا۔ اس وقت دریا پار کرنے کے لئے کشتیاں نہیں ملیں گی۔ اور دریا پار کرلیا تو بس سروس نہیں ملے گی" اے ایس پی نے کہا "صبح ہم کسی ایجنٹ کو پکڑیں گے اور عام لوگوں کی طرح سفر کریں گے۔"

"مگر ہم عام لوگ نہیں ہیں۔ ہم تو یہاں کی زبان تک نہیں جانتے" میں نے کہا "آخر تمہاری یہ وردی کب کام آئے گی؟"

"جب اس کی ضرورت پڑے گی" وہ بولا۔

گل اور نازو میں پیدل سفر کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ انہوں نے صبح تک قیام کے فیصلے کی تائید کی۔

"خواتین!" غالب نے کہا "کیا تمہیں معلوم ہے کہ سندر بن کا علاقہ یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے؟"

اے ایس پی نے سرہلایا "ہم اس علاقے کو چھوتے ہوئے گزر رہے ہیں۔ چند میل کا فرق ہے۔"

نازو نے کہا "جنگل تو یہ بھی ہے۔"

غالب بولا "مگر سندر بن میں شیر ہوتے ہیں۔ اصلی' آدم خور شیر۔ ان کے بارے میں جم کاربٹ نے کتنی کہانیاں لکھی ہیں۔"

"کہانیوں کے شیر تو چڑیا گھر کے شیر سے بھی کم خطرناک ہوتے ہیں۔" نازو نے کہا

"چلو ٹھیک ہے۔ ہمارا کام تو خبردار کرنا تھا۔ جب کوئی شیر اٹھا کے لے جائے گا تو پتا چلے گا۔"

"شیر مجھے کیوں اٹھائے گا؟ گوشت تم پر زیادہ ہے۔"

"اگر حسن پرست شیر ہوا تو....."

میں نے کہا "چلو اٹھو۔ آج رات اسی جنگل میں بسیرا ہو گا۔ واپس چلتے ہیں۔"

غالب نے اٹھتے ہوئے کہا "مجھے تو بھوک بھی لگ رہی ہے۔"

نازو نے کہا "یہاں جو ملے وہ کھالو۔ جنگل کے پھل پھول' پتے۔ گھاس' ٹھنڈی ہوا' حشرات الارض یا جو بھی جانور ہاتھ... کیوں کہ اور کچھ نہیں ہے ہمارے پاس۔"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟" غالب نے فریاد کی "رات بھر بھو... پیاسے رہیں گے ہم؟"

"پیاسے بہرحال نہیں رہو گے" نازو بولی "بہتا دریا ہے' ... چاہو پانی پیو۔ براہ راست منہ ڈال کے۔"

"تم بھی میرے ساتھ پیو تا کہ شیر بکری کے ایک گھاٹ پانی... کا محاورہ سچ ہو جائے" غالب نے کہا۔

ابھی ہم نے کار کی طرف قدم بڑھایا ہی تھا کہ ایک ساتھ... طرف سے ہم پر تارچ کی روشنی پڑی۔ درختوں کے پیچھے سے ا... ساتھ چھ فوجی نمودار ہوئے اور انہوں نے ہر طرف سے... محصور کرلیا۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں جن کا رخ ہما... طرف تھا۔

کسی نے انتہائی کرخت لہجے میں کہا "ہالٹ۔"

میں نے غالب کو اشارہ کیا اور ہم سب نے اپنے ہاتھ اٹھالئے۔ وہ سب اتنی خاموشی سے آئے تھے کہ ہمیں بالکل... نہیں چلا تھا یا ہم اپنی باتوں میں ایسے محو تھے کہ ان کے قدمو... آہٹ نہیں سن پائے تھے۔ ہم نے باتوں میں وقت نہ ضائع کیا... تو شاید ان کے آنے سے پہلے ہی وہاں سے نکل جاتے۔ مہ... فوراً اے ایس پی کے ساتھ پوزیشن لے لی تھی اور میرا ہاتھ... میں تھا۔ ساتواں آدمی چند سیکنڈ کے وقفے سے نمودار ہوا۔ وہ... نوجوان لیفٹیننٹ تھا اور اس کی عمر بائیس چوبیس سال سے ز... تھی۔ نئی افسری کے زعم میں وہ خاصا اکڑ کے چل رہا تھا او... آف آنر کا معائنہ کرنے کے انداز میں قدم اٹھا رہا تھا۔

قریب آکے اس نے باری باری ہم سب کی صورتوں سے معائنہ کیا۔ پھر اس کی نگاہ کار پر گئی۔ ڈپلومیٹک نمبر پلیٹ پڑتے ہی اس کی صورت کے تاثرات بدل گئے۔

اس نے انگریزی میں کہا "یہ کیا سلسلہ ہے؟ کون ہو تم آخر؟"

میں نے موقعے سے فائدہ اٹھا کے ہاتھ نیچے کر... فرانسیسی بولنی شروع کردی۔ لیفٹیننٹ کی آنکھوں میں جھنج... نمودار ہوئی۔

"یہ کیا مصیبت ہے! مجھے فرنچ نہیں آتی۔ کیا تم انگری... بات نہیں کر سکتے؟" اس نے غالب کی طرف دیکھا اور ا...

...الیس پی کی وردی کو "تم...... تم انڈین پولیس آفیسر ہو؟"

...ٹھیں۔ اور میرا رینک وہی ہے جو تمہارا" اے ایس پی نے کہا "اپنے ماتحتوں سے کہو کہ خود کو بلاوجہ نہ تھکائیں۔ ان توپوں کا رخ آسمان کی طرف کرلیں۔ غیر ملکیوں کے کچھ حقوق ہوتے ہیں"

لیفٹیننٹ کا چہرہ سرخ پڑ گیا لیکن اس نے ضبط سے کام لیا اور سپاہیوں سے کہا کہ وہ رائفلیں نیچی کرلیں "تم ان کے ساتھ کیا کر رہے ہو یہاں؟"

"یہ لوگ راستے سے بھٹک گئے تھے۔ میں ان کو واپس ڈھاکا پہنچانا چاہتا ہوں۔"

"یہ لوگ ڈھاکا سے آئے ہیں؟" لیفٹیننٹ کی حیرانی بڑھ گئی' "مجھے یہ لڑکیاں تو غیر ملکی نہیں لگتیں۔"

"یہ سو فیصد انڈین ہیں مگر سفارتی عملے میں شامل ہیں۔" اے ایس پی بولا۔

لیفٹیننٹ نے پھر نازو اور گل کو دیکھا "تم کیا کرتی ہو؟ نام کیا ہے تمہارا.....؟"

"میرا نام اوشا ہے" نازو نے انگریزی میں جواب دیا "میں فرسٹ سیکریٹری کی اسٹینو ہوں اور یہ آشا ہے میری بہن۔ یہ سیکنڈ سیکریٹری کے ساتھ ہے۔"

"کیا یہ دونوں تمہارے باس ہیں جن کے ساتھ تم جنگل میں منگل منا رہی ہو؟" لیفٹیننٹ اب اردو بولنے لگا۔

"یہ ہمارے باس نہیں ہیں" نازو نے درشت لہجے میں کہا' "خواہ مخواہ وہ باتیں فرض مت کرو جن سے یہ ظاہر ہو کہ تم کسی عورت کو قابل عزت نہیں سمجھتے۔ جو پوچھنا ہے وہ پوچھو۔"

لیفٹیننٹ کی طنزیہ مسکراہٹ غائب ہوگئی "مجھے یہ دونوں بھی غیر ملکی نہیں لگتے۔"

"پھر میں کیا کر سکتی ہوں؟" نازو نے کندھے ہلائے۔

لیفٹیننٹ نے غالب کو مخاطب کیا "تم بھی صرف فرنچ بولتے ہو؟"

غالب نے سادگی سے کہا "آپ مجھ سے اردو' فارسی' ہندی یا پنجابی میں بات کر سکتے ہو۔"

"کس ملک کے سفارت خانے سے تعلق ہے تمہارا؟"

"ارجنٹائن" غالب نے نمبر پلیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

"تم کیا کرتے ہو؟"

"میں سفارت خانے میں خانساماں ہوں۔ بلکہ تھا۔"

"خانساماں...... یعنی باورچی" لیفٹیننٹ مسکرایا۔

"کچھ بھی کہہ لیں۔ کک۔ رسوئیا۔ شیف۔ داروغۂ مطبخ کام ایک ہی ہے" غالب نے کہا۔

"مگر ارجنٹائن والوں کو دیسی خانساماں کی کیا ضرورت پڑ گئی؟" لیفٹیننٹ نے ایک احمقانہ سوال کیا "مسور کی دال' بینگن کا بھرتا یا ملائی پکواتے ہیں تم سے؟"

"جی۔ اکثر' بلکہ ہر روز پکاتا تھا کچھ۔ وہاں عام لوگوں سے لے کر پردھان منتری تک سب آتے ہیں۔ لنچ اور ڈنر کے لئے۔"

"آئی سی۔ تم ان کی زبان کیسے سمجھتے ہو؟"

"مطلب کی بات تو گونگے بہرے بھی سمجھا دیتے ہیں۔ عملے کے بیشتر لوگ فرنچ کے ساتھ انگلش جانتے ہیں اور ہم انگلش بول بھی سکتے ہیں۔ ہمارے ساتھ مترجم بھی ہوتا ہے" غالب نے کہا۔

"تم میں سے کون ہے مترجم؟" لیفٹیننٹ نے باری باری سب کو دیکھا۔

"اس وقت نہیں ہے" غالب نے کہا "وہ ہمارے ساتھ ہی دوسری گاڑی میں فرار ہوا تھا مگر راستے میں ہم بچھڑ گئے۔ وہ تو شاید کلکتہ پہنچ بھی چکے ہوں گے۔ ہم یہاں بھٹک رہے ہیں۔"

"تم لوگ فرار کیوں ہوئے تھے؟"

"جان بچانے کے لئے" غالب نے مختصراً کہا۔

"تمہیں تو معلوم ہو گا کہ انڈین آرمی کیا کر رہی ہے ڈھاکا میں؟" نازو نے تلخ لہجے میں کہا۔

"اور جو پاکستانی فوج کر رہی ہے...." لیفٹیننٹ نے چراغ پا ہو کے کہا۔

"ہماری بلا سے۔ تم آپس میں لڑو یا پبلک کو مارو۔ لیکن ان حالات میں وہاں کون محفوظ ہے؟ ہم کیا' سب سفارت کار پریشانی میں مبتلا ہیں کہ ان کا کیا بنے گا۔ جو سمجھدار تھے وہ پہلے ہی نکل گئے تھے۔ ہم پھنس گئے تھے اپنے محترم سفیر صاحب کی وجہ سے۔ ان کا خیال تھا کہ کچھ نہیں ہو گا۔ دو چار دن میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آخری وقت میں خیال آیا کہ عملے کو محفوظ مقام پر منتقل کر دیا جائے اور اہم دستاویزات تلف کر دی جائیں۔ ہم دو گاڑیوں میں روانہ ہوئے تھے لیکن یہاں کے راستے ایسے ہیں کہ توبہ! سیدھی سڑک تو ہے ہی نہیں کہ آدمی گاڑی لے کر نکلے تو کلکتہ پہنچ جائے" نازو نے بڑی ذہانت اور خوب صورتی سے لیفٹیننٹ کو باتوں میں الجھالیا اور وہ نازو کے اندازِ دلبری' شوخیٔ گفتار اور ادائے حسن کی معصومیت کا شکار ہو گیا۔

لگتا یوں تھا جیسے نازو کو لیفٹیننٹ کی وردی اور مردانہ وجاہت نے متاثر کیا ہے۔ یہ خوش فہمی کسی بھی مرد کو ذہنی طور پر جھوٹے احساسِ تفاخر کے جال میں گرفتار کر سکتی تھی کہ نازو جیسی طرح دار حسینہ اس کی جانب ملتفت ہے۔ لیفٹیننٹ بھی ساری اکڑ فوں بھول گیا۔ اس کے جارحانہ' متکبرانہ اور افسرانہ رویّے میں پہلے جیسی تندی نہ رہی۔ وہ ہمارے بارے میں شکوک و شبہات کی تصدیق و تفتیش بھول گیا۔ ایک اے ایس پی کی موجودگی نے پہلے ہی بے اعتباری کی فضا کو ختم کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا اور صورت حال کی تمام نامعقولیت کے باوجود ہم مجرم یا قانون شکن تو کیا مشتبہ افراد بھی نہیں رہے تھے لیکن لیفٹیننٹ اتنی آسانی سے جان چھوڑتا نظر نہیں آتا تھا۔

"آپ کی بہن اوشا....."

"اوشا میں ہوں' یہ آشا ہے؟" نازو مسکرا کے بولی "اتنی جلدی بھول گئے۔"

"سوری مس اوشا" لیفٹیننٹ نے خفت سے کہا "میں......"

"لیفٹیننٹ۔ میں مس نہیں مسز اوشا ورما ہوں۔ یہ میرے پتی ہیں مسٹر ورما" نازو نے غالب کی طرف اشارہ کیا۔

غالب ابھی تک نازو کی عشوہ طرازی اور لیفٹیننٹ کی بڑھتی ہوئی دلچسپی پر اندر ہی اندر کسی آتش فشاں کی طرح کھول رہا تھا مگر ایک دم اس کا سارا غصہ صابن کے جھاگ کی طرح ختم ہو گیا اور اس کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔ نازو کی شرارت میں اس کے لئے دل بستگی کے ہزار انداز تھے۔ غرورِ عشق کے لئے سند اعتبار تھی اور عہدِ وفا کا اعلانِ عام تھا۔

اس کے برعکس لیفٹیننٹ کے جذبات پر اوس پڑ گئی اور اس کی صورت پر جذبات کا تغیر دیکھ کے مجھے بھی اپنی مسکراہٹ چھپانی پڑی۔

"آپ......ان کی..... مسٹر ورما.....یعنی یہ خانساماں...... خیر......" لیفٹیننٹ نے اپنی حیرت اور بوکھلاہٹ پر فوراً قابو پالیا۔

وہ کہنا چاہتا ہو گا کہ آپ جیسی پری جمال کے حسن و شباب اور ناز آفرینی کے جملہ حقوق ایک خانساماں کے نام کیسے منتقل ہو گئے۔ کہاں یہ حسن شعلۂ ساماں کہاں اِک خانساماں جس کی قسمت پر رشک کرنا بھی گویا خود شرمندہ ہوتا ہے۔

اے ایس پی نے کہا "لیفٹیننٹ تم کچھ رہنمائی کر سکتے ہو ہماری؟"

لیفٹیننٹ نے طنز سے کہا "یہ دعویٰ غالباً تم نے کیا تھا کہ تم ان کی رہنمائی کے لئے ساتھ ہو۔"

"ہاں۔ مگر اب میں خود کنفیوز ہو گیا ہوں۔"

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تمہاری ان لوگوں سے ملاقات کہاں اور کیسے ہو گئی؟ یہ تو کہتے ہیں کہ راستہ بھول گئے اور بھٹک کے اِدھر آ گئے۔ تم کیا کہتے ہو؟ تم یہاں کیا کر رہے تھے؟"

"میرا خیال ہے کہ تمہیں اپنے ہم مرتبہ پولیس افسر سے تفتیش کرنا زیب نہیں دیتا" اے ایس پی بولا "تم یہ پوچھنے کے مجاز نہیں کہ میں یہاں کیوں موجود ہوں۔ بالکل اسی طرح جیسے میں تم سے یہ احمقانہ سوال نہیں کروں گا کہ تم یہاں کیوں گھومتے پھر رہے ہو۔ ظاہر ہے کہ تم بھی ڈیوٹی پر ہو۔"

لیفٹیننٹ ٹھنڈے مزاج کا آدمی تھا۔ وہ پھر اس بے عزتی کو پی گیا "تم اکیلے ڈیوٹی پر ہو؟"

اے ایس پی نے اپنا شناختی کارڈ نکالا "یہ تم کو مطمئن کرنے کے لئے ہے۔ میں کوئی جعلی پولیس افسر نہیں ہوں۔"

اس کا شناختی کارڈ نکالنا ایک غلطی بن گیا۔ لیفٹیننٹ نے اس پر صرف ایک نگاہ ڈالی اور غالب کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "تم لوگوں کے پاس کیا ثبوت ہے کہ تم سفارتی عملے کے ارکان ہو؟"

غالب نے کہا "کوئی ثبوت نہیں۔"

نازو نے کہا "ہمارے پاسپورٹ' سفری دستاویزات اور شناخت کے سب کاغذات ایک جگہ تھے۔"

"اس گاڑی میں جو الگ ہو کے کلکتہ چلی گئی۔" لیفٹیننٹ نے پھر شک بھرے لہجے میں کہا۔

"ہاں۔ اس میں خود فرسٹ سیکریٹری تھے اور انہی کے بریف کیس میں......"

"گویا تمہارے پاس کچھ نہیں' اس کار کے سوا جس کی نمبر پلیٹ ڈپلومیٹک ہے" لیفٹیننٹ نے کہا "مگر اس کا کیا ثبوت ہے کہ تم نے یہ کار چرائی نہیں ہے اور تم اسمگلر نہیں ہو؟ اسمگلرز کا اور پولیس کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔"

"تم کو سوچ سمجھ کے بات کرنی چاہئے" اے ایس پی نے کہا

"میں کبھی سوچے سمجھے بغیر نہیں بولتا" لیفٹیننٹ نے کہا "یہ فوجی نگرانی کا علاقہ ہے جہاں تم کھڑے ہو مسٹر اے ایس پی۔ میں تم کو گرفتار کر رہا ہوں اور ان سب کو بھی جو تمہاری قیادت میں جا رہے تھے۔ اب میں ان کو سیدھا راستہ دکھاؤں گا۔ اپنے کیمپ کا۔"

لیفٹیننٹ کے اشارے پر فوجیوں نے پھر بندوقیں تان لیں۔

"یہ تم ٹھیک نہیں کر رہے ہو" اے ایس پی نے کہا۔

"شٹ اَپ۔ مجھے معلوم ہے کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ سیدھی طرح چلو۔ سب ایک لائن میں۔ تم کو میں کرنل صاحب کے سامنے پیش کر دوں گا' اس کے بعد میری ذمّے داری ختم۔ وہ مطمئن ہو جائیں گے تو تمہیں چھوڑ دیں گے۔ عین ممکن ہے حفاظت سے کلکتہ پہنچا دیں۔ سفارتی عملے کو تحفظ فراہم کرنا ذمّے داری ہے۔"

لیفٹیننٹ بہت کائیاں تھا اور اسے بے وقوف بنانا بھی آسان نہ تھا مگر اب مجھے اے ایس پی کی طرف سے بھی خطرہ لاحق تھا۔ ابھی تک وہ ہمارے رحم و کرم پر تھا اور اسے یقین تھا کہ افشائے راز کی صورت میں ہم کچھ بھی کر گزریں گے۔ ہم اسے ضرور جان سے مار دیں گے۔ ملٹری کی حفاظت میں پہنچ جانے کے بعد وہ ہمارا سارا حساب بے باق کر سکتا تھا۔ وہ خود اسی ملک کی پولیس کا افسر تھا جس کی فوج کا افسر وہ لیفٹیننٹ تھا۔ اے ایس پی کو معلوم تھا کہ میرا ہاتھ جیب میں کیوں ہے۔ ریوالور میرے ہاتھ کی گرفت میں تھا لیکن میں اسے صرف ایک بار استعمال کر سکتا تھا۔ ایک گولی سے میں اے ایس پی کی زبان کھلنے سے پہلے بند کر دیتا۔ اس کے بعد دوسری گولی کوئی فوجی پیچھے سے میرے سینے کے پار کر دیتا۔ جنگ میں کسی فوجی کے ہاتھوں ایک مسلح مجرم کا مارا جانا جرم نہیں کہلاتا اور وہاں تو سب لاقانونیت تھی۔ سیکڑوں ہزاروں بے گناہ ہر روز مارے جا رہے تھے اور کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔

میرا خیال ہے کہ خود اے ایس پی نے بھی یہی منطقی نتیجہ اخذ کر لیا تھا کہ اس نے منہ سے کوئی غلط لفظ نکالا تو نتائج کی پروا کئے بغیر میں اسے شوٹ کر دوں گا۔ بعد میں کوئی مجھے جان سے مارتا ہے یا نہیں' اس سے اے ایس پی کو فرق نہیں پڑتا تھا۔ میری موت سے اسے زندگی نہیں مل سکتی تھی۔ یہی سوچ کے وہ خاموش رہا اور اس نے اپنے ہم وطنوں کے بجائے دشمنوں کا ساتھ دینے کو ترجیح دی۔

لیفٹیننٹ کی ہدایات کے مطابق فوجی عملاً ہمیں سنگین کی نوک پر لے کر چل رہے تھے۔ ان میں سے دو ہمارے دائیں بائیں جانب تھے اور دو پیچھے۔ ظاہر ہے اس حالت میں شرافت سے سیدھا چلتے رہنے کے سوا ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ تاہم میں مایوس نہیں ہوا تھا۔ میرے لئے اطمینان کی ایک بات یہ تھی کہ فوجیوں نے ہماری تلاشی نہیں لی تھی ورنہ ہم اسلحے سے محروم ہو جاتے اور اس کے بعد اے ایس پی ہمارے خلاف پوری فردِ جرم پڑھ دیتا۔

امید کا دوسرا سلسلہ نازو سے وابستہ تھا۔ پہلے ہم سب کسی ترتیب کے بغیر ایک ساتھ چل رہے تھے۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد گل اور غالب خود ہی پیچھے ہو گئے۔ میں اور اے ایس پی ان کے آگے رہے۔ نازو نے بڑی ہوشیاری سے لیفٹیننٹ کے ساتھ چلنا شروع کیا اور ہم سے چند قدم آگے ہو گئی۔ کسی نے اسے آگے بڑھنے سے نہیں روکا۔ نازو نے کہا "لیفٹیننٹ! کتنی دور پیدل لے جاؤ گے تم مجھے؟"

لیفٹیننٹ کو ایک دھان پان' کمزور اور نازک لڑکی سے کیا خطرہ محسوس ہو سکتا تھا چنانچہ اس نے نازو کی جرأت کا برا نہیں مانا۔ "زیادہ دور نہیں۔ آگے جیپ کھڑی ہے۔"

"اور کیمپ کتنی دور ہے تمہارا؟"

"یہ سیکرٹ انفارمیشن ہے" لیفٹیننٹ بولا۔

"کمیشن کب لیا تم نے؟" نازو اس سے بے تکلف ہو گئی۔

"گزشتہ سال" لیفٹیننٹ نے مختصراً کہا "دو سال بعد میں کیپٹن ہو جاؤں گا۔"

"ہاں۔ بشرط زندگی۔"

"کیا مطلب! تم سمجھتی ہو میں مارا جاؤں گا یہاں؟"

"ہر فوجی کی زندگی ہر وقت داؤ پر لگی رہتی ہے' جب وہ میدانِ جنگ میں ہو" نازو نے کہا۔

وہ کچھ دیر خاموشی سے چلتے رہے' پھر لیفٹیننٹ نے کہا "تم نے جھوٹ بولا تھا مجھ سے۔"

"کیا؟" نازو نے معصومیت سے کہا۔

"یہی کہ تم.....اس خانساماں کی بیوی ہو..... مجھے تو وہ ذرا بھی خانساماں نہیں لگتا۔"

نازو نے ایک آہ بھری "زندگی اسی کا نام ہے۔ بھگوان نہ کرے کہ کبھی تمہارے ساتھ یہ ظلم ہو۔ ہو گا بھی نہیں کیوں کہ تم مرد ہو۔ تم کو انتخاب کا حق دیا جاتا ہے۔ میں لڑکی ہوں....."

لیفٹیننٹ کی دلچسپی پھر بیدار ہو گئی "زبردستی تمہاری شادی کی گئی تھی اس سے؟"

"زبردستی کیسی' ماں باپ کی مرضی تھی" نازو تلخی سے بولی۔

"مگر تمہاری مرضی نہیں تھی" لیفٹیننٹ بولا۔

لیفٹیننٹ کیسے اندازہ کر سکتا تھا کہ اس سے یوں باتیں کرنے والی لڑکی کے ذہن میں کیا ہے۔ وہ بے خبری میں مارا گیا۔ نازو بھی شاید انتظار میں تھی کہ پہلے جیپ نظر آ جائے۔ میں حیران تھا کہ آخر ہم نے کسی جیپ کے انجن کی آواز نہیں سنی تھی۔ جیپ کو دیکھ کر مجھے ایک خیال اور بھی آیا کہ اس میں لیفٹیننٹ سمیت سات افراد کیسے بیٹھتے ہوں گے؟ ان میں سے ایک ڈرائیور کی سیٹ پر ہو گا جو خود لیفٹیننٹ بھی ہو سکتا تھا۔ ساتھ والی سیٹ پر دوسرا بیٹھا ہو گا تو پیچھے باقی پانچ افراد میں سے دو ایک سیٹ پر ہوں گے۔ تین دوسری سیٹ پر بڑی مشکل سے پھنس کر سمائے ہوں گے۔ ہم پانچ افراد کے لئے اس میں کوئی جگہ نہ تھی۔

بظاہر اس بات کا امکان نظر نہیں آتا تھا کہ وہ سب جیپ میں سفر کریں گے اور ہمیں پیدل لے جائیں گے مگر ایک تو لیفٹیننٹ چڑ گیا تھا' اس کے علاوہ ہم ممنوعہ علاقے میں پکڑے گئے تھے اور اگر ہمارے ساتھ جنگی قیدیوں والا سلوک کیا جاتا تو لیفٹیننٹ کو روکنے والا کوئی نہ تھا۔ وہ جونیئر افسر تھا اور سفارتی عملے کے ساتھ زیادتی کے الزام سے بچنا چاہتا تھا چنانچہ یہ ہو سکتا تھا کہ وہ خواتین کے ساتھ رعایت برتے' انہیں جیپ میں اپنے ساتھ لے جائے اور ماتحت فوجیوں کو حکم دے جائے کہ ہمیں کیمپ تک مارچ کرا کے لائیں۔ اے ایس پی بھی خود کو افسر ثابت کر چکا تھا۔ صرف میں اور غالب ہی تھے جو رعایت کے معاملے میں غیر مستحق سمجھے جا سکتے تھے۔

میرے اندیشوں کی فوراً تصدیق ہو گئی۔

جیپ کے قریب پہنچ کر لیفٹیننٹ نے بغل میں دبی ہوئی چھڑی سے اشارہ کیا "میرے ساتھ جیپ میں یہ ڈرائیور جائے گا اور یہ لیڈیز۔"

"باقی لوگ کیسے جائیں گے؟" اے ایس پی بولا۔

"ان کے لئے دوسری گاڑی آئے گی" غالب نے سمجھانے کے انداز میں کہا "یا دوسرے پھیرے میں......"

لیفٹیننٹ نے اس کی بات کاٹ دی "شٹ اُپ۔ تم مرد ہو اور صحت مند ہو۔ چار پانچ میل پیدل چلنے سے مر نہیں جاؤ گے۔"

غالب نے مشکوک لہجے میں کہا "کیا تم مرد نہیں ہو؟"

میں نے بڑی مشکل سے ہنسی کو ضبط کیا مگر لیفٹیننٹ کا ایک گستاخ ماتحت ہنس پڑا۔

"یو ایڈیٹ" لیفٹیننٹ کا پارہ چڑھ گیا "بہت بے قابو ہو رہے ہو تم۔ سب ہنسی بھول جاؤ گے جب تمہیں ایڈجوٹنٹ کے سامنے پیش کیا جائے گا۔"

"معاف کردیں سر۔ غلطی ہوگئی۔" سپاہی نے سیلوٹ مار کے کہا "آپ بولیں تو میں اس کا دماغ درست کردوں؟"

لیفٹیننٹ نے غالب کی طرف دیکھا "تم ایک معمولی خانساماں! تمہاری یہ جرأت کہ میرا مذاق اڑاؤ۔ میں سمجھ لوں گا تم کو۔"

اے ایس پی نے آگے بڑھ کر کہا "تم بھی میرے ساتھ یہ رویّہ اختیار نہیں کرسکتے۔ تم افسر ہو تو میں بھی افسر ہوں۔"

لیفٹیننٹ نے اُسے نظر جما کے دیکھا اور عیّاری سے بولا "میں تسلیم کرتا ہوں تمہاری افسری کو مگر تمہیں اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا۔"

"آخر کیوں؟ جیپ میں جگہ ہے......"

"جگہ یقیناً ہے لیکن میں تم کو اضافی ذمّے داری سونپ رہا ہوں۔ ان سب کو کیمپ تک اپنی نگرانی میں لانے کی" لیفٹیننٹ مسکرایا "میرے ماتحت اب تمہارے ماتحت ہیں۔ تم انہیں کمان کروگے۔ یہ تمہارے احکامات کے تابع ہوں گے۔"

لعنت کمان کرنے والے پر......" اے ایس پی مشتعل ہوگیا "تم خود سنبھالو اپنی ذمّے داری۔"

غالب نے پھر شرارت کی "چلو لیفٹیننٹ صاحب! غصہ چھوڑو۔ میں سنبھال لیتا ہوں یہ ذمّے داری۔"

"دیکھو، مجھے اتنا غصہ مت دلاؤ کہ میں تمہیں شوٹ کردوں۔ کوئی نہیں پوچھے گا مجھ سے کہ میں نے ایسا کیوں کیا۔"

"آخری ہچکی لینے سے پہلے میں ضرور پوچھوں گا" غالب بولا۔ "کہ آخر میرا کیا دوش تھا...... جو چُپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا۔"

نازو نے نظر بچا کے مجھے اور غالب کو آنکھ ماری "گاڑی میں بیٹھنے کا بڑا شوق ہے۔ ساری عمر جوتیاں چٹخاتے رہے۔"

لیفٹیننٹ نے ڈرائیور کو اشارہ کیا اور جیپ روانہ ہوگئی۔ اے ایس پی کو سخت مایوسی ہوئی۔ شاید اس نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لیفٹیننٹ کے ساتھ نکلنا چاہا تھا۔ لیفٹیننٹ کے اور اے ایس پی کے درمیان افسری حائل نہ ہوتی تو وہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوجاتا۔ جب اس نے زبردستی خود کو افسر تسلیم کرانے کی غلطی کی تو لیفٹیننٹ نے ضد میں اسے بھی عام لوگوں میں شامل کردیا۔ اگر لیفٹیننٹ مان جاتا تو میں اے ایس پی کو نہ روک پاتا اور دونوں افسران جیپ میں آگے بیٹھ جاتے تو اے ایس پی ہمارے بارے میں لیفٹیننٹ کو تفصیلی معلومات فراہم کرتا اور ہم سے اپنی ذلت و رسوائی کا بدلہ لینے میں کوئی کسر نہ چھوڑتا۔ تاہم ایسی صورتِ حال کے لئے میں ذہنی طور پر تیار تھا اور مجھے یقین تھا کہ غالب اور نازو کا بھی یہی فیصلہ ہوگا۔ ہم دیکھتے کہ معاملات ہمارے قابو سے باہر ہورہے ہیں تو آخری وفاع کے طور پر اے ایس پی کے ساتھ لیفٹیننٹ کو بھی یرغمال بنالیتے۔ یا اے ایس پی کو گولی مار کے لیفٹیننٹ کو اور اس کے ماتحت فوجیوں کو اچانک اپنی ما[illegible] قوت استعمال کرتے ہوئے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کردیتے۔ ا[illegible] اشارے پر میں اور نازو ایکشن میں آجاتے تو چار افراد کو نا[illegible] آؤٹ کردیتے اور دو کو غالب اور گل ہینڈز اَپ کرالیتے۔ اے ا[illegible] پی جانتا تھا کہ لیفٹیننٹ کی سپاہ کچھ نہیں کرسکتی۔ انہیں تو پ[illegible] نہیں چلے گا اور بازی الٹ جائے گی۔

جب ہم فوجیوں کے نرغے میں روانہ ہوئے تو غالب کے ا[illegible] میرے درمیان اے ایس پی تھا۔ ایک فوجی ہم سے چند قدم آ[illegible] تھا۔ تربیت کے اصول و قواعد کے مطابق دو پیچھے چلتے رہے اور [illegible] ہمارے دائیں بائیں۔

غالب نے بڑی بے تکلفی سے اے ایس پی کے کندھے پر ہا[illegible] مارا "یار، بڑی کوشش کی تم نے مگر تمہاری چلی نہیں۔ جان چ[illegible] کے بھاگنا چاہتے تھے استاد۔"

اے ایس پی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"خیر...... جو ہوا اچھا ہوا۔ ہم کیا تمہیں جانے دیتے۔ رخص[illegible] کرنا ہی پڑتا تو دنیا سے رخصت کرتے" غالب آہستہ آہستہ بولا "یہ سالے بڑے غلط وقت پر آئے۔ مجھے تو نیند بھی آنے لگی تھی کچھ نہ ملتا تو گھاس چر کے سوجاتا۔ اب پیدل چلنا ہی پڑے گا دور تک۔"

"یہ بھی بتادو اس کے بعد کیا ہوگا؟" اے ایس پی نے [illegible] سے کہا۔

"کچھ نہیں۔ نازو ابھی لوٹ آئے گی جیپ لے کر۔ ا[illegible] لیفٹیننٹ کو شامتِ اعمال لے آئی تھی ہماری طرف" غالب بولا

"اب ہم قیام نہیں کرسکتے" میں نے آہستہ سے کہا "را[illegible] رات جتنی دور نکل جائیں اچھا ہے۔"

غالب نے کہا "اس لشکر کا کیا ہوگا جو ہمارے ساتھ چل [illegible] ہے۔"

"نمٹ لیں گے ان سے بھی۔ یہ دشمن ہیں، انہیں مار دینا عقل مندی ہے ورنہ ہم خود مارے جائیں گے۔" میں نے کہا۔

ایک فوجی نے کہا "چوپ۔ شالا لوگ۔"

اسی وقت جیپ کی آواز سنائی دی۔ اندھیرے میں ہیڈ لا[illegible] کی روشنی پھیلنے لگی پھر جیپ نمودار ہوئی۔ فوجیوں نے ہمیں ر[illegible] جانے کا حکم دیا اور جیپ کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگے۔ [illegible] ہے وہ اپنے افسر کی واپسی کو کسی ناگہانی آفت، شکست یا موت [illegible] خیال سے منسوب نہیں کرسکتے تھے مگر میں اور غالب مقابلے [illegible] لئے تیار ہوگئے۔

جیپ کی ہیڈ لائٹس کی چُندھیا دینے والی روشنی میں ا[illegible] اسکرین کے پیچھے کسی کی صورت نظر نہیں آتی تھی مگر مجھے معلو[illegible] کہ جیپ کو نازو ڈرائیو کررہی ہے۔ جیپ سامنے آکے رکتے ر[illegible] ایک جست لگا کے آگے بڑھی۔ اس سے پہلے کہ فوجی کچھ سمجھ[illegible]

سنبھلتے، نازو نے دو کو کچل دیا۔ تیسرا جو پیچھے تھا، بہت دیر سے بھاگا۔ نازو نے کسی تذبذب اور توقف کے بغیر جیپ کو یکدم موڑا اور تیسرے کے اوپر سے گزار دیا۔

نازو کی نیت تو میں نے جیپ کا رخ دیکھتے ہی سمجھ لی تھی۔ چنانچہ میں نے ہکّا بکّا کھڑے ہوئے دونوں فوجیوں کو کسی دشواری کے بغیر ناک آؤٹ کردیا۔ ایک تو گردن ٹوٹتے ہی گر گیا تھا۔ دوسرے نے رائفل اٹھالی تھی مگر میری لات پڑی تو وہ سنبھل نہ سکا۔ رائفل کے ساتھ ہی نیچے گرا پھر نازو نے چیخ کر کہا "ہٹ جاؤ سکندر۔"

میں ایک دم جست لگا کے پیچھے ہوگیا ورنہ میرا ارادہ آگے بڑھ کر دشمن کے آخری سپاہی کو خود فنا کرنے کا تھا۔ نازو نے بڑی پھرتی اور مہارت کے ساتھ دس گز قطر کے نصف دائرے میں جیپ کو دوبارہ انتہائی خطرناک رفتار پر گھمایا تھا۔ تین فوجیوں کے اوپر سے جیپ گزارنے کے بعد بھی وہ رکی نہیں۔ اس نے دیکھ لیا ہوگا کہ میں دو سے لڑ رہا ہوں چنانچہ وہ میری مدد کے لئے پلٹ کر آئی۔ چوتھے آدمی کی بھیانک چیخ کے ساتھ ہی جیپ کا انجن بند ہوگیا۔ نازو کے ساتھ گل نے جیپ سے چھلانگ لگائی۔

میں نے اٹھ کر کپڑے جھاڑے "ویل ڈن لیڈیز۔ دشمن کے ساتھ تم نے مجھے بھی مار ہی دیا تھا۔"

"سوری...... تم ٹھیک ہو نا؟" نازو نے کہا۔

غالب نے کہا "وہ کہاں ہیں جن کے ساتھ تم فرار ہوئی تھیں؟"

نازو نے کہا "وہ تو ہمیں اغوا کرکے لے گئے تھے اور تم دیکھتے رہے۔"

"غلط" غالب نے کہا "تم بہ رضا و رغبت جیپ میں سوار ہوئی تھیں۔ اس لئے کہ میں ایک معمولی خانساماں ہوں اور وہ ایک فوجی افسر تھا۔"

گل ہنسنے لگی "بیچارا۔ آیا تھا محاذِ جنگ پر۔ مارا گیا دل کے ہاتھوں مجبور ہو کے۔ نوجوان تھا نا، جذبات پر قابو نہیں تھا۔"

غالب نے کہا "کیا مطلب...... کیا اس نے کوئی بدتمیزی کی تھی؟"

"وہ بدتمیزی کی کوشش تو کرسکتا تھا" نازو نے کہا "جیپ میں اسی لئے وہ اپنے ساتھ کسی کو بھی نہیں لے گیا تھا۔ تھوڑی دور جا کے جیپ روکی اور خود اتر کے پیچھے آگیا۔"

"تم نے جال ہی ایسا پھیلایا تھا۔ اور اسے کیا معلوم تھا کہ تم شکاری ہو۔" گل نے کہا "وہ تو خیر جلد باز تھا، تم نے بھی بہت جلدی کی۔ کم سے کم اسے اتنی مہلت تو دی ہوتی کہ تم سے حالِ دل کہہ لیتا۔"

"وقت کم تھا گل بانو۔ ورنہ میں اسے اظہارِ عشق کے لئے چند منٹ ضرور دیتی۔ اس کی آخری خواہش پوری ہوجاتی" نازو نے کہا۔

میں نے کہا "اب یہ بتاؤ کہ اپنے اس کشتۂ تیغِ ستم کو چھوڑا کہاں ہے؟"

نازو نے ہاتھ سے اشارہ کیا "دونوں پیچھے پڑے ہیں۔"

غالب نے کہا "انہیں ایسے پڑا چھوڑ کے نہیں جاسکتے ہم۔"

"پھر کیا رات ان کی آخری رسوم ادا کرتے ہوئے گزار دیں گے؟" نازو نے کہا۔

میں نے کہا "غالب ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ایک ساتھ چھ فوجی، افسر اور جیپ کے ساتھ غائب ہوگئے تو ان کے والی وارث خاموش نہیں بیٹھے رہیں گے۔ وہ ایک حد تک انتظار کریں گے پھر ان کی تلاش شروع ہوگی اور لاشیں ملیں گی تو اپنا سراغ خود دیں گی۔"

"مگر سکندر! سوچو ذرا، سات لاشیں دفنائیں گے ہم یا جلائیں گے؟" نازو نے کہا۔

"ہم انہیں سپردِ خاک بھی نہیں کریں گے اور راکھ بھی نہیں کریں گے۔ دریا بُرد کریں گے" میں نے کہا "رات بھر میں دریا کا بہاؤ انہیں جہاں بھی لے جائے۔ بس ان کی وردیاں اتار لو تاکہ فوری شناخت ممکن نہ رہے۔"

اے ایس پی سب کچھ سن رہا تھا اور دیکھ رہا تھا۔ شاید زندگی میں پہلی بار اس کا واسطہ حقیقی دہشت گردوں سے پڑا تھا اور وہ ہم سب کے روپ میں فلمی کردار دیکھ رہا تھا، جو ناقابلِ یقین حد تک افسانوی تھے۔ ہالی ووڈ نے ایسی بہت فلمیں بنائی ہیں جو پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کے دوران کمانڈوز کے کارناموں پر مبنی ہیں۔ اے ایس پی کا ہماری رفاقت کے دور کا تجربہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ وہ چوروں، بدمعاشوں سے نمٹنے والا شخص ایسے کسی گروہ کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا جو ہنستے کھیلتے سات مسلح فوجیوں کو ٹھکانے لگادیں اور ان کی لاشیں سپردِ آب کرکے ہاتھ جھاڑتے ہوئے آگے روانہ ہوجائیں۔ وہ بے حد خائف اور مرعوب تھا۔

میں اور غالب جیپ لے کر پیچھے گئے اور دونوں لاشیں جیپ میں ڈال کر لے آئے۔ لیفٹیننٹ کا جسم ابھی تک گرم تھا اور یوں لگتا تھا جیسے وہ مرا نہیں بے ہوش ہے۔ جو آدمی کچھ دیر پہلے افسری اور وردی کی اکڑفوں کے سامنے کسی کو خاطر میں لانے پر آمادہ نہ تھا وہ محض ایک لاش رہ گیا تھا۔ ہم نے اس لاش پر کپڑوں کا کفن بھی نہیں چھوڑا اور اسے ایک نسبتاً بلند مقام سے یوں دریا میں پھینکا کہ بہاؤ اسے کنارے سے دور رکھے۔

جو چار افراد جیپ سے کچلے گئے تھے، ان کے جسم ٹوٹ پھوٹ گئے تھے اور ان کی وردیاں خون آلودہ چیتھڑے ہوگئی تھیں۔ ان وردیوں کو بدوضع گوشت کے ریشوں سے الگ کرنا دل گردے کا کام تھا اور ایک بھیانک تجربہ لیکن اس کے بنا چارہ نہ تھا۔ لاشوں کو وردی کے ساتھ بہانا خطرناک ثابت ہوسکتا تھا۔ ہم نے گل اور نازو کو دور رکھا اور اے ایس پی سے مدد کے لئے کہا مگر وہ انتہائی

بودا ثابت ہوا۔ خون کی مہک اور پھٹے ہوئے جسم سے کپڑے کو الگ کرتے ہوئے اسے متلی ہونے لگی۔

میں نے غالب کے ساتھ مل کر چاروں مسخ شدہ لاشوں کے کپڑے ایک گٹھری کی صورت میں باندھے۔

"اسے کہیں دفن کردیتے ہیں" غالب نے کہا۔

میں نے نفی میں سرہلایا "خون کی بُو جنگلی جانوروں کو کھینچ لے گی۔ وہ اسے کھود نکالیں گے۔ زیادہ گہرا گڑھا کھودنے میں صبح ہوجائے گی۔"

غالب نے دوسری تجویز پیش کی "پھر اسے آگ لگادیتے ہیں۔"

میں نے کہا "خون کے جلنے کی بُو دور تک جائے گی۔ اس بنڈل کو اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ جہاں موقع ملا وہاں پھینک دیں گے۔ کسی کنوئیں یا جھیل میں۔"

"اسے ساتھ لے جانا بھی تو مشکل ہوگا" غالب نے لڑکیوں کی طرف دیکھا جو بڑے صبر اور استقلال کے ساتھ انتظار کررہی تھیں۔

"دیکھو' جیپ میں کوئی بیگ ہو یا تھیلی" میں نے کہا۔

غالب نے سیٹوں کے نیچے سے ایک پلاسٹک کا واٹرپروف بیگ نکال لیا۔ وردیاں اس میں ٹھونس کے پیچھے رکھ دی گئیں۔ خالی جگہ میں فوجی رائفلیں ڈالنے کے بعد میں نے وقت دیکھا تو رات کے دس بجے تھے۔ ہم نے دوپہر سے اب تک کچھ بھی نہیں کھایا تھا اور صبح ہونے سے پہلے کچھ ملنے کی امید بھی نہیں تھی۔ حالات اچانک ایسے ہوگئے تھے کہ بھوک پیاس کا خیال بھی کسی کے دل میں نہیں آیا تھا۔ پہلا مسئلہ اس پُرخطر علاقے سے خود کو بحفاظت دور لے جانے کا تھا۔

"ہمارے پاس تین فوجی وردیاں ہیں" میں نے کہا "یہ دیکھو کہ کس کے سائز پر کون سی فٹ آتی ہے۔"

"مجھے کسی وردی کی ضرورت نہیں" اے ایس پی بولا۔

"رات کے وقت دو فوجیوں کے ساتھ ایک پولیس مین۔ اور وہ بھی فوجی جیپ میں۔ کہیں دوسری گشتی پارٹی مل گئی تو انہیں شک ہوجائے گا۔"

میں نے بھی کہا "ہاں۔ ویسے ہم خود ایک فوجی پٹرول پارٹی نظر آئیں گے۔"

"دو لڑکیوں کے ساتھ!" اے ایس پی طنز سے بولا۔

"لڑکیوں کو ہم چھپا کے رکھیں گے۔ یا ان کے لئے کوئی اسٹوری بنالیں گے کہ انہیں غنڈوں' حملہ آوروں سے بچا کے لائے ہیں" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "ہم بھی اپنے کپڑے سنبھال کر رکھیں گے۔ صبح تم بھی پھر پولیس افسر بن جانا۔ جیپ صرف رات کے سفر کے لئے ہے۔"

آخر کار اے ایس پی مان گیا۔ ہم نے وردیاں پہن لیں۔ بالکل فٹ تو نہ تھیں مگر جیپ میں بیٹھے ہوئے ان کی ناموزونیت زیادہ احساس نہیں ہوتا تھا۔ جیپ کے پچھلے حصے میں خون آلود وردیوں کے بنڈل پر اپنے کپڑوں کی گٹھری ڈال کے ہم نے گل اور نازو کو سوار کیا۔ وہ پیچھے کی دو آڑی سیٹوں پر سمٹ کر لیٹ گئیں اور ہم نے واپسی کا سفر شروع کیا۔

چند منٹ میں ہم پھر وہیں پہنچ گئے جہاں ڈپلومیٹک نمبر والی لاوارث کھڑی تھی۔

"اب اس کا کیا کریں؟" غالب نے کہا۔

میں نے سوچ کر کہا "تم اس کو لے کر آگے چلو۔ راستے میں جہاں کوئی مناسب جگہ ملی اسے چھوڑ دیں گے۔"

مناسب جگہ بیس پچیس میل کے بعد ملی۔ یہ ایک سڑک تھی جو دریا تک پہنچ کے اچانک ختم ہوگئی تھی۔ دریا پر شاید پہلے کوئی پل ہوگا جس کے اب آثار تک باقی نہ تھے۔ پُل کی بلندی تک یہ سڑک انتہائی خستہ حالت میں تھی۔

میں نے غالب سے مشورہ کیا اور کار کو دریا کی طرف موڑ کے کھڑا کردیا۔ ہم نے جیپ میں سے خون آلود وردیوں کا بنڈل نکال کے کار کی سیٹ پر پھیلادیا۔ سیٹوں کے درمیان فرش پر رائفلوں کا ڈھیر کیا اور وہ سب اسلحہ بھی جو اس فوجی جیپ میں تھا۔

جیپ کے پیچھے بیس لیٹر والا جیری کین بندھا ہوا تھا۔ میں نے اس کا کلیمپ کھول کر جیری کین کو الگ کیا۔ اس میں سے نصف پٹرول جیپ میں ڈالا تو ٹینک فل ہوگیا۔ باقی دس لیٹر پٹرول میں نے کار میں سیٹوں کے اوپر ڈال دیا۔ خون آلود وردیاں پٹرول میں تر ہوگئیں اور پٹرول نیچے بہہ کر فرش پر اکٹھا ہوگیا جہاں اسلحہ پڑا تھا۔ اسلحے میں رائفلیں ہی نہیں میگزین بھی تھے اور گولیوں کے ڈبے بھی تھے۔ ان گولیوں میں بارود بھرا ہوا تھا چنانچہ یہ سب آتش گیر تھا جسے صرف ایک تیلی دکھانا کافی تھا۔

غالب نے کار کا انجن اسٹارٹ کیا تو نازو کی حالت غیر ہوگئی۔ ابھی تک وہ گل کے ساتھ ساری کارروائی کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔

"مسٹر غالب! کیا پروگرام ہے آخر آپ کا؟"

غالب نے کہا "تم ایک عظیم اسٹنٹ شو دیکھو گی خواتین! ماضی کا ایک عظیم صحافی ایک سنسنی خیز کمال کا مظاہرہ پیش کرنے والا ہے۔ جلتی ہوئی کار میں......"

"تمہارا دماغ چل گیا ہے کیا؟" نازو نے چلّا کے کہا "پاگل ہوگئے ہو دونوں۔"

"مجھ پر کیوں خفا ہوتی ہو۔ میں آرام سے کھڑا ہوں یہاں" میں نے کہا "میں صرف ماچس کی تیلی جلاؤں گا۔"

نازو نے مجھے قہر آلود نظروں سے گھورا "جہنم خود روشن کرو اور دوست سے کہو گے کہ کود جائے اس میں؟"

"یہ میرا نہیں غالب کا آئیڈیا ہے۔ تم چاہو تو اس کے ساتھ بیٹھ جاؤ" میں نے کہا "یا اس کی جگہ....."

غالب نے ایکسیلریٹر پر ایک پتھر رکھا۔ انجن کی رفتار بہت زیادہ ہوگئی۔ اس نے دوسرا پتھر رکھا تو دباؤ بہت کم رہا۔ تیسرے پتھر کو اس نے اوکے کردیا۔ اب فیصلہ کلچ کا تھا۔ اس کے لئے خاصا وزن درکار تھا۔ میں نے تقریباً پانچ کلو کا لمبوترا سا پتھر تلاش کیا۔ اس پتھر سے کلچ اتنا دب جاتا تھا کہ گیئر نیوٹرل نہ ہو تب بھی گاڑی کھڑی رہتی تھی اور انجن شور کرنے لگتا تھا۔

جیپ میں سے مجھے کوئی رسّی نہیں ملی لیکن گاڑی کی ڈکی میں سے آٹھ دس فٹ لمبی زنجیر مل گئی۔ معلوم نہیں اس کی وہاں موجودگی کا مقصد کیا تھا۔ زنجیر کو پتھر سے باندھنے کے لئے مجھے کپڑے کی لمبی لمبی پٹیاں استعمال کرنی پڑیں۔ زنجیر اتنی چھوٹی تھی کہ پتھر پر نہیں لپیٹی جاسکتی تھی۔

اب نازو نے بھی سمجھ لیا تھا کہ ہم کیا کرنے والے ہیں چنانچہ وہ کچھ خفیف اور برہم سی کھڑی تھی۔

غالب نے کہا "اچھا مس نازو! مجھے اللہ کے سپرد کرو' موت کا کھیل شروع ہونے والا ہے۔"

میں نے کہا "اب بھی وقت ہے۔ غالب کا اس دنیا میں ساتھ دیا ہے تو پھر آگے بڑھو' آگے بھی ساتھ دو۔"

"آپ دونوں اکٹھے جائیں جہنم میں" نازو نے کہا۔

غالب ہنسنے لگا "ابھی تو رو رو کے التجا کررہی تھیں....."

"التجا کرتی ہے میری جوتی" نازو نے بگڑ کے کہا۔

"گویا وہ سب ڈراما تھا۔ تمہارے حقیقی جذبات نہیں تھے؟" غالب نے افسوس سے سرہلایا "تمہاری المیہ اداکاری....."

میں نے کہا "یار بس کرو۔ بولو سب ٹھیک ہے۔"

"ایک دم ٹھیک ہے استاد۔ ابھی تم لائٹ مارو" غالب بولا۔

میں نے احتیاط سے ڈرائیونگ سائیڈ کا ایک دروازہ بند کیا۔ انجن ایکسیلریٹر کے دباؤ سے غراتا رہا۔ غالب نے دوسری طرف سے کلچ پر پتھر رکھا اور گاڑی کو گیئر میں ڈال دیا۔ آہستہ آہستہ احتیاط سے اس نے زنجیر کا سرا اپنے ہاتھ میں لیا اور گاڑی سے پانچ چھ فٹ دور کھڑا ہوگیا۔

میں نے ماچس نکال کے تیلی جلائی اور اندر پھینک دی۔ پٹرول کے بخارات کار میں جمع ہوچکے تھے۔ ایک شعلہ لپکا اور غالب نے زنجیر کو ایک جھٹکا دیا۔ کلچ پر رکھا ہوا پتھر ہٹ گیا۔ گاڑی پہلے گیئر میں تھی اور انجن کی خاصی رفتار تھی۔ ایک بھڑکتا ہوا الاؤ بن جانے والی کار جست لگا کے آگے بڑھی۔

یہ بڑا دلکش منظر تھا۔ متحرک شعلہ فضا میں بلند ہوا تو گولیاں چلنے لگیں۔ کار سڑک کے اختتام تک دوڑتی ہوئی گئی تو اس کی رفتار شاید چالیس میل فی گھنٹا سے زیادہ تھی۔ وہ خلا میں کچھ اوپر اٹھی اور پھر نیچے جانے لگی۔ اسی وقت پٹرول ٹینک دھماکے سے پھٹا اور کار کے جلتے ہوئے ٹکڑے منتشر ہوگئے۔ بہت سے چھوٹے چھوٹے شعلے ندی میں شہاب ثاقب کی طرح گرے اور غائب ہوگئے۔

یہ سب ایک منٹ کا تماشا بھی نہیں تھا۔ جلتی ہوئی کار نے گرد و نواح کے جنگل کو روشن کردیا تھا۔ ایک منٹ بعد کچھ نہ رہا۔ نہ روشنی' نہ کار' نہ بھارتی فوجیوں کی خون آلود وردیاں' نہ ان کا اسلحہ۔ فضا پھر سکوت اور تاریکی میں ڈوب گئی۔

رات کے ساڑھے گیارہ بجے ہم پھر جیپ میں بیٹھے اور اے ایس پی کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے لگے۔ راستے میں متعدد گاؤں بھی آئے جہاں لوگ سکون سے سو رہے تھے۔ اگر ہم چاہتے تو گاؤں والوں کو جگا کے ان سے زبردستی سب کچھ حاصل کرسکتے تھے۔ بھارتی فوجی یہی کررہے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ہم تمہارے نجات دہندہ ہیں۔ تمہیں پاکستانی فوج کے مظالم سے نجات دلانے آئے ہیں۔ پھر وہ خود ان سادہ دل لوگوں سے سب کچھ چھین لیتے تھے۔ مال و زر' عزت و آبرو' متاعِ حیات' یہ سب کچھ ہم نہیں کرسکتے تھے۔ ہم اخلاقی پستی کی اس انتہا تک گرنے کا تصور بھی نہیں کرسکتے تھے۔ اس کے علاوہ ہم اپنے پیچھے بدنامی یا نیک نامی کی کوئی داستان چھوڑنا نہیں چاہتے تھے جو ہمارے راستوں کا سراغ دے۔ خاموشی کے ساتھ گمنام رہتے ہوئے اپنی منزل کی جانب بڑھتے رہنا تحفظ کی ضمانت تھا۔

سنسان رات کی پُرآسیب ہولناکی سب کے اعصاب کو متاثر کررہی تھی۔ ہر لمحہ خوف اور بے یقینی کا لمحہ تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس شب کی سحر ہونے تک کیا ہوگا۔ امید کی روشنی منزل کا نشان دے گی یا ہم اندیشوں کے سراب میں بھٹکتے رہ جائیں گے۔

میں اور غالب باری باری ڈرائیونگ کررہے تھے۔ غراتا ہوا طاقتور انجن سامنے کی دشواریوں کو نظرانداز کرتا ہوا جیپ کو آگے بڑھا رہا تھا۔ اس کے سب فولادی اعضا بھرپور قوت کے ساتھ مصروفِ عمل تھے اور چاروں مضبوط ٹائر مسلسل دوڑ رہے تھے۔ انسان مشین بناتا ہے اور اسے قوت فراہم کردیتا ہے' پھر مشین کارکردگی میں اپنے خالق سے مقابلے میں ہزار گنا بہتر ثابت ہوتی ہے مگر آدمی کی غلام رہتی ہے۔

جیپ کوئی آرام دہ سواری نہیں ہوتی۔ ناہموار' پُرپیچ اور دشوار گزار راستوں پر جھٹکے بہت زیادہ محسوس ہوتے ہیں۔ ایک پورا دن سفر میں کٹ گیا۔ پھر رات آئی تو آرام کی مہلت ملی اور نہ جسم کو توانائی۔ کچھ کھائے پئے بغیر ہم سفر کو جاری رکھنے پر مجبور ہوگئے۔ ذہنی و اعصابی تھکن الگ تھی۔ دل چاہتا تھا کہ جیپ روک دی جائے اور ہم آسمان کی چادر کے نیچے زمین کے بستر پر لیٹتے ہی سو جائیں لیکن عقل اس خواہش کے خلاف برسرِپیکار تھی اور مسلسل خبردار کرتی تھی کہ جاگتے رہو' چلتے جاؤ۔ رکنے کی غلطی کی تو راستے بند ہوجائیں گے۔ منزل دور ہوجائے گی۔

گل اور نازو پچھلی سیٹ پر پاؤں سمیٹ کر سونے کی ناکام

کوشش میں مصروف تھیں۔ ہم سب خاموش تھے اور اپنے اپنے خیالات کے گرداب میں غوطہ زن۔ ہنسی مذاق تو دور کی بات تھی، آپس میں بات کرنا بھی غیر ضروری محسوس ہوتا تھا۔ خاموشی میں عافیت تلاش کرنا زیادہ مشکل کام تھا۔

جیپ کی لائٹ دور دور تک سڑک کو روشن کررہی تھی مگر تاحدِ نظر ہمارے سوا کوئی بھی حرکت میں نہ تھا۔ ہوا رکی ہوئی تھی، درخت ساکت تھے، آسمان پر ستارے ٹھہرے ہوئے تھے۔ وقت بھی جیسے منجمد ہو کے تھم گیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ہم کبھی ڈھاکا نہیں پہنچ پائیں گے اور مایوسی کے خلا میں سفر کبھی ختم نہیں ہوگا۔

اس جمود کو پہلے ایک ندی نے توڑا جو خاموشی سے ہماری راہ میں حائل ہوگئی۔ کنارے پر دو کشتیاں بندھی ہوئی تھیں۔ سارا دن لوگوں کو دریا پار لانے لے جانے والے تھکے ہوئے آڑے ترچھے پڑے تھے مگر ایک بوڑھا جاگ رہا تھا، بیڑی پی رہا تھا اور کھانس رہا تھا۔ اس نے ہمیں خوف سے کانپتے ہوئے بتایا کہ ندی پر پُل تو بہت دور ہے مگر مشرق کی جانب ایک ڈیڑھ میل کے فاصلے پر گھاٹ سے فیری چلتی ہے۔ وہ ہمیں جیپ سمیت دوسرے کنارے پہنچادے گی۔

گھاٹ تک پہنچنے میں ہمیں کوئی مشکل پیش نہیں آئی مگر آدھی رات کے وقت دریا پار جانے والا کوئی نہیں تھا۔ فیری کا مالک ہمیں دیکھ کر پریشان ہوگیا۔ صرف ایک گاڑی لے کر جانا اور خالی واپس آنا اس کے کاروباری نقطۂ نظر سے گھاٹے کا سودا تھا مگر وہ خاکی وردی والوں کو انکار کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔

اس نے ہاتھ جوڑ کے کہا "صبح تک انتظار کرلیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔"

میں نے دہاڑ کے کہا "مہربانی کے بچے! ہم کیا سیر کرنے آئے ہیں۔ یہ سرکاری ڈیوٹی ہے۔"

غالب نے اس کے کندھے پر تھپکی دی "چلو، تمہارا نقصان میں ہوگا۔"

"ہم غریب آدمی ہیں جناب۔"

"فیری کے مالک ہو اور غریب کہتے ہو خود کو" میں نے اسی بلالی لہجے میں کہا "شرافت سے نہیں چلوگے تو......"

"چلیں گے، چلیں گے کیوں نہیں" وہ بولا اور احکامات جاری کرنے چلا گیا۔ اس نے لات مار مار کے اپنی گھروالی کو اور عملے کے دیگر افراد کو بیدار کیا۔ انہوں نے پہلے احتجاج کیا اور ان کے درمیان کچھ چخ چخ بھی ہوئی لیکن فیری کے مالک نے ہماری طرف اشارہ کیا تو جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا۔ وہ ایک دم مستعد ہو کے کام میں لگ گئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم پندرہ منٹ بعد جیپ سمیت دریا عبور کررہے تھے۔

تقریباً ایک گھنٹے میں فیری نے ہمیں دوسری طرف اتار دیا۔ غالب نے مجھ سے مشورے کے بعد نازو کو سمجھادیا تھا کہ فیری والے کو مناسب معاوضہ ادا کردے، جو اتنا زیادہ بھی نہ ہو کہ صبح ہر شخص کو ان دریا دل فوجیوں کے بارے میں معلوم ہوجائے جو آدھی رات کے وقت حاتم طائی کی قبر پر لات مارتے ہوئے فیری کے مالک کو قارون کا خزانہ بخش گئے تھے۔ اور نہ اتنا کم ہو کہ فیری کا مالک ظلم ظلم چلاتا پھرے۔

نازو نے اسے سو روپے دیے جو اس نے چپ کر کے رکھ لئے۔ جیپ خشکی پر اترتے ہی پھر دوڑنے لگی۔ ابھی ہم نے مشکل سے دس پندرہ میل کا فاصلہ طے کیا تھا کہ سامنے ایک لائٹ نظر آنے لگی۔ پھر وہ روشنی کی لکیر سی بن گئی جو آہستہ آہستہ لمبی ہوتی گئی۔ یہ ایک ملٹری کانوائے تھا جس میں چالیس پچاس چھوٹی بڑی، ہلکی بھاری گاڑیاں شامل تھیں۔ کانوائے کی قیادت ایک جیپ کررہی تھی جو بالکل ہماری جیپ جیسی تھی۔ اس سے میں نے اندازہ کیا کہ وہ بھارتی فوجی تھے مگر درمیان میں چند ٹرک مجھے پاکستانی فوج کے لگے۔

کانوائے کو کراس کر کے میں نے اطمینان کا سانس لیا "خدا کا شکر ہے کہ انہوں نے ہمیں روکا نہیں۔"

غالب نے کہا "ہاں۔ ہم اُن کے ایک بھی سوال کا جواب نہیں دے سکتے تھے۔ انجام یہ ہوتا کہ اسی کانوائے میں شامل ہوتے اور واپس......"

اچانک رات کے سکوت میں فائرنگ کی آوازیں گونجنے لگیں۔

"یہ...... کیا ہورہا ہے؟" نازو نے ڈر کے کہا۔

"میرا خیال ہے بچّے پٹاخے چھوڑ رہے ہیں۔ شب برات پر ایسا ہی ہوتا ہے" غالب نے جواب دیا۔

"یہ تو گولیاں ہیں" گل سادگی سے بولی۔

غالب ہنس پڑا "کون سی، کھٹی میٹھی یا ہاضمے کی۔"

میں فائر کی آوازوں سے فاصلے کا اندازہ کرنے کی کوشش کررہا تھا "کیا ہم عین اسی سمت میں جارہے ہیں جہاں فائرنگ ہورہی ہے؟"

غالب نے اقرار میں سرہلایا "اور جا بھی کہاں سکتے ہیں۔ ایک ہی سڑک ہے۔ آگے جائیں یا پیچھے۔"

نازو نے کہا "واپس چلو۔"

گل نے کہا "غور سے سنو۔ یہ کیسی چیخ پکار ہے۔"

ہم سب خاموش ہوگئے۔ مردوں اور عورتوں کے چلّانے کا شور بہت واضح ہوگیا تھا۔ فائرنگ اب بند ہوگئی تھی۔

"کیا یہ بھارت اور پاکستان کی جنگ ہورہی ہے؟" نازو نے کہا۔

غالب نے کہا "چل کے دیکھ لیتے ہیں۔ بلکہ پوچھ لیتے لڑنے والوں سے۔"

"ڈھنگ کی بات مت کرنا...... " نازو بگڑ کے بولی۔

"تم بھی کوئی ڈھنگ کا سوال کرو" غالب نے کہا "جنگ ایسی ہوتی ہے؟ چند فائر ہوئے اور ختم۔ نہ توپ خانہ کام آیا نہ ٹینک۔"

میں نے کہا "یہ معاملہ واقعی کچھ اور ہے۔"

گل نے کہا "آخر ہم لوگ رک کیوں نہیں جاتے؟ ایسا نہ ہو کسی مشکل میں پڑجائیں۔"

"اگر یہ کارروائی بھارتی فوج کی ہے تو ہمیں اس سے دور رہنا چاہئے۔ کوئی آپس کا جھگڑا ہے تو ٹانگ نہیں اڑانی چاہئے۔"

غالب نے کہا "یہاں لوگ آپس کے جھگڑوں کو آدھی رات کے وقت گولیاں چلا کے طے نہیں کرتے۔"

"جو سیاسی طور پر ایک دوسرے کے حریف اور دشمن ہیں وہ کچھ بھی کرسکتے ہیں۔" میں نے کہا "اور کسی بھی وقت کرسکتے ہیں۔"

اس وقت میں جیپ چلا رہا تھا۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ ان حالات میں مجھے چلتے رہنا چاہئے یا کہیں سائڈ میں رک کر سب کی حفاظت کی فکر کرنی چاہئے کہ سڑک اچانک دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ فائرنگ اور چیخ پکار دائیں طرف سے سنی گئی تھی۔ دوسری سڑک بائیں جانب یعنی مخالف سمت جارہی تھی۔ اے ایس پی سے کچھ پوچھے بغیر میں بائیں طرف مڑگیا۔

"اگر یہ راستہ غلط ہے تو ہم واپس آجائیں گے" میں نے کہا۔

اے ایس پی نے کہا "ہمیں اِدھر ہی جانا تھا۔ آگے دریا آئے گا۔"

"ایک اور دریا۔ رات کے دو بجے" میں نے کہا۔

اے ایس پی ہنسنے لگا "ابھی سے گھبرا گئے۔ ابھی تو بہت سے ندی نالے اور دریا آئیں گے۔ اور ان پر پُل بھی نہیں ہوں گے۔"

میں نے کہا "کوئی ایسا راستہ بھی تو ہوگا جس پر سڑک رکے بغیر چلتی جائے۔ اور یہ آخر تک کیا ہے دریا پر پُل نہ بنانے کی؟"

اے ایس پی بولا "دراصل تمہارے ذہن میں اپنا ملک ہے جہاں گنتی کے چند دریا ہیں۔ پنجاب کے تین دریا اور ایک سندھ کا؟"

غالب نے کہا "پنجاب کا چوتھا دریا بھی تھوڑا سا ہمارے پاس ہے۔"

"یہاں برساتی ندی نالوں کو شامل کیا جائے تو سیکڑوں دریا ہیں اور آبادی اتنی گنجان ہے کہ ہر قدم پر ایک پُل چاہئے۔ پُل بڑی بڑی سڑکوں اور شاہراہوں کو ملاتے ہیں مگر وہ بہت کم ہیں۔ ہم اس طرف سے نہیں جاسکتے تھے۔" اے ایس پی نے کہا "یہ عام راستہ نہیں ہے۔ چور راستہ ہے۔"

دریا ایک برساتی ندی ثابت ہوا۔ اس میں پانی نہ ہونے کے برابر تھا۔ درمیان میں پانی کا دھارا بیس پچیس فٹ کی چوڑائی میں بہہ رہا تھا اور بظاہر اس کی گہرائی بھی زیادہ نہیں لگتی تھی۔ چکنی مٹی اور کیچڑ سے فور وہیل ڈرائیو جیپ کسی دشواری کے بغیر گزر گئی۔ عام گاڑی ہوتی تو اس کے پہیے ایک ہی جگہ دھنس کر رہ جاتے۔

میں نے جیپ کو پانی سے گزارنے کا ارادہ کیا تو نازو اور گل نے شور مچادیا۔

"یہ کیا کررہے ہو؟" نازو بولی "اپنے ساتھ ہمیں بھی ڈبوؤگے۔"

"نہیں۔ ہم پار اتر جائیں گے۔ تم ڈوب جاؤگی انشاء اللہ۔"

غالب نے کہا "مطلب یہ کہ اگر خدا نے چاہا۔ کیوں کہ تمہارے اعمال ہی ایسے ہیں۔"

گل نے کہا "خدا نے تو منع کیا ہے خودکشی سے۔"

میں نے کہا "ہمارے آباو اجداد نے بحرِ ظلمات میں گھوڑے دوڑائے تھے۔ یہ تو ایک ناچیز دریا ہے اور گھوڑے کے مقابلے میں ایک جیپ ہے کئی ہارس پاور کی۔"

غالب نے کہا "چلو یار، ان بزدل لڑکیوں کی خاطر پہلے گہرائی دیکھ لیتے ہیں۔"

"گہرائی کیسے دیکھیں گے؟" میں نے کہا۔

"تم اللہ کا نام لے کر پانی میں اتر جاؤ۔" غالب نے کہا "میں تمہارے پیچھے پیچھے جیپ لاتا ہوں۔ جہاں گہرائی زیادہ ہو اور تم ڈوبنے لگو تو مجھے روک دینا۔"

"مجھے تیرنا آتا ہے۔" میں نے کہا "فکر اس وردی کی ہے، یہ بھیگ جائے گی۔"

"وردی اتار کے ہمارے پاس امانت رکھوادو۔ پار اتر کے پھر پہن لینا۔"

میں نے کہا "یار، مجھے شرم آتی ہے۔"

غالب نے حیران ہو کے کہا "اچھا؟ یہ تو کمال کا انکشاف کیا ہے آپ نے۔ ہم تو آپ کو بالکل بے شرم سمجھتے تھے۔ خیر ہم ایسا کرتے ہیں کہ آنکھیں بند کرلیتے ہیں کیوں کہ پردہ آنکھ کا ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "میں اِدھر اُدھر دیکھ کے آتا ہوں کہ کون سی جگہ بہتر ہے۔"

ہیڈ لائٹس آف کر کے میں پہلے دائیں طرف گیا۔ تقریباً بیس پچیس گز کے بعد پانی کا دھارا تین حصوں میں تقسیم ہورہا تھا۔ درمیان میں خشکی کے پتلے جزیرے سے ابھر آئے تھے۔ یہ جگہ ہر اعتبار سے موزوں نظر آتی تھی۔ میں نے جسم پر صرف انڈرویئر رہنے دیا اور وردی اتار کے بنڈل سا بنالیا۔ آہستہ آہستہ قدم جما کے میں پانی کے ایک دھارے سے گزرا۔ پھر درمیانی ڈیلٹا پر چل کے دوسرے دھارے میں اترا۔ کہیں بھی پانی کی گہرائی میرے گھٹنوں سے اوپر نہیں تھی۔

میں نے وردی اور جوتے پہنتے ہوئے غالب کو چلّا کے آواز دی۔ اس نے جیپ کو اسٹارٹ کیا اور میری طرف لے آیا۔ آہستہ آہستہ جیپ بہتے پانی میں ہچکولے کھاتی اور چھینٹے اُڑاتی آگے آئی۔

میں اب پیچھے بیٹھ گیا۔

غالب نے کہا "اسے دریا کہنا سخت مبالغہ آرائی ہے۔"

اے ایس پی بولا "اکثر برسات میں اس کا پاٹ کئی فرلانگ تک پھیل جاتا ہے۔ کنارے کی آبادیاں سیلاب کی زد میں آجاتی ہیں۔"

"دریا کا پاٹ ہمارے عزائم میں حائل نہیں ہو سکتا" غالب نے سینے پر ہاتھ مار کے کہا "ہم بحرِ ظلمات سے گزر جاتے۔"

"اور اسلاف میں شامل ہو جاتے" نازو نے کہا۔

اس سے پہلے کہ غالب مزید کچھ بولتا' اندھیرے میں کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس چمکنے لگیں جو دائیں طرف اور کافی دور تھی مگر اجالے کی دو متوازی لکیریں درختوں کو روشن کر رہی تھیں اور بڑھتی ہوئی روشنی کم ہوتے فاصلے کا پتا دیتی تھی۔

"لائٹس بجھادو۔ اور گاڑی روک لو ایک طرف" نازو نے کہا۔

"کوئی فائدہ نہیں۔ جیسے ہم نے روشنی دیکھی ہے ایسے ہی ہماری جیپ کی لائٹس کا اجالا نظر آگیا ہوگا" غالب نے کہا۔

"یہ کون ہو سکتا ہے؟" گل نے گھبرا کے کہا۔

"اب جو بھی ہوگا۔ دوست ہوگا یا دشمن' سامنے آجائے گا۔" میں نے کہا "بلاوجہ اور قبل از وقت پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

وہ ایک فوجی جیپ تھی' بالکل ایسی ہی جیسی ہمارے پاس تھی۔ اس نے سامنے آکے لائٹ دوبار جلائی بجھائی۔ میں نے جوابی سگنل دیا۔ جیپ چند قدم کے فاصلے پر آکے رک گئی۔ میں پہلے نیچے اترا۔ سامنے والی جیپ میں سے بھی کوئی ٹارچ لے کر نکلا۔ اس کے پیچھے چار فوجی تھے۔

"کون ہو تم؟" اس نے روشنی میرے چہرے پر ڈالی "وہیں رک جاؤ۔"

میں نے انگریزی میں کہا "میں دشمن نہیں دوست ہوں۔"

اس نے لائٹ بجھادی "او کے۔ نام بتاؤ اپنا۔"

میں نے کہا "لیفٹیننٹ پرشوتم ورما۔ تم؟"

"کیپٹن یوگیش" اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا "تم اِدھر کیا کر رہے ہو؟"

میں نے کہا "نوکری۔ حکم کی تعمیل' بلاچون وچرا۔"

غالب اور اے ایس پی میرے بعد جیپ سے اترے تھے۔ انہوں نے کیپٹن کو سیلوٹ مارا۔

"اور کون ہے تمہارے ساتھ؟" کیپٹن نے جیپ میں جھانکا پھر سیٹی بجائی "دو لڑکیاں؟"

میں نے کہا "ادھر گاؤں میں بلوہ ہو گیا تھا۔"

کیپٹن نے پھر ٹارچ روشن کی اور غور سے گل اور نازو کو دیکھا۔ "ہاں مجھے بھی معلوم ہوا تھا۔ یہ مالِ غنیمت ہاتھ لگا ہے تمہارے۔"

میں نے پُرسکون رہتے ہوئے کہا "ان لڑکیوں کا سارا خاندان قتل ہو گیا تھا۔"

کیپٹن اوباشوں کی طرح ہنسا "پھر تو تم کو کسی کا ڈر نہیں۔ کوئی پوچھنے والا ہی نہیں۔"

میں نے متانت سے کہا "یہ اپنے رشتے داروں کے پاس جانا چاہتی ہیں۔ قریب ہی کسی گاؤں میں ان کے چاچے ماے رہتے ہیں۔"

"گولی مارو چاچے ماے کو۔"

"کرنل صاحب نے مجھے حکم دیا ہے کہ انہیں بحفاظت پہنچا کے آؤں..." میں نے سخت لہجے میں کہا۔

کیپٹن ہنسا "ٹو ہیل ود یور کرنل۔ سمجھو تم نے انہیں بحفاظت پہنچادیا۔"

وہ آگے بڑھا تو میں اس کے سامنے آگیا "میں اس وقت تک ایسا نہیں سمجھ سکتا جب تک یہ لڑکیاں واقعی اپنے گھر نہیں پہنچ جاتیں۔ میں کرنل کے احکامات پر سو فیصد عمل کروں گا' نیک نیتی کے ساتھ اور ایک پروفیشنل سولجر کی طرح۔ تم انہیں ہاتھ نہیں لگاؤ گے۔"

"شٹ اَپ۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں تم جیسے ایماندار' فرض شناس حکم کے غلاموں کو" وہ مشتعل ہو کے بولا "میں ناجائز مطالبہ نہیں کروں گا۔ ان میں سے ایک میرے حوالے کردو۔"

"یہ لڑکیاں میری تحویل میں ہیں' ان کی حفاظت میں کروں گا۔" میں نے کہا "اگر تمہیں اپنی عزت کا خیال ہے تو جاؤ اپنا راستہ لو۔"

"ورنہ۔ کیا کرو گے تم؟" وہ غرّا کے بولا۔

"میں تمہاری رپورٹ بعد میں کروں گا' اس سے پہلے میں خود تمہیں ایسا سبق دوں گا جو دوسروں کے لئے بھی درسِ عبرت ہوگا۔" میں نے کہا "تم پھر کبھی دوسروں کو بُری نظر سے دیکھنے کے قابل نہیں رہو گے۔"

"کیا؟" کیپٹن نے بے یقینی سے کہا "تم خود......"

"ہاں میں خود" میں نے مضبوط لہجے میں کہا "اگر تم اپنی بے عزتی کرانا چاہتے ہو اپنے ماتحتوں کے سامنے تو ان لڑکیوں کی طرف ایک قدم بڑھا کے دیکھو۔"

"کیا ثبوت ہے تمہارے پاس کہ تم انہیں رشتے داروں کے پاس چھوڑنے جا رہے ہو۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ تم انہیں اٹھالائے ہو" کیپٹن بولا "میں پوچھوں گا ان سے۔"

"میرا کہا وہ سچ ہے جو کسی ثبوت کا محتاج نہیں میں تمہیں تصدیق کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

اس نے مجھے دھکّا دیا "ہٹ جاؤ میرے راستے سے ورنہ....."

اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ وہ نشے میں ہے۔ میں نے کچھ سوچا اور پھر ایک طرف ہو گیا "او کے کیپٹن یوگیش۔ ٹیک دِس گرل۔" میں نے نازو کی طرف اشارہ کیا۔ نازو خاموشی سے اتر آئی۔

کیپٹن قہقہہ مار کے ہنسا "تاؤ دیٹ از اے گڈ بوائے۔ یہی طریقہ ہے صحیح کہ آدمی مل بانٹ کے کھائے۔ کیا نام ہے تمہارا سوئٹی۔"

"گیدڑ کی موت" نازو نے اطمینان سے کہا۔

"واٹ؟ گیدڑ.... کون گیدڑ؟" کیپٹن ہنسنے لگا "تم مجھے گیدڑ کہہ رہی ہو؟ کیپٹن یوگیش کو۔ تم خود کیا ہو؟ شیر کی خالہ؟"

"میں تمہاری بہن ہوں" نازو نے کہا "تم تو عادی ہوگے اپنی کسی بھی بہن کو داشتہ رکھنے کے۔ اپنی یا کسی اور کی۔"

کیپٹن اتنی بڑی گالی کے لئے تیار نہ تھا۔ خود میں نازو کی زبان سے یہ بات سن کے حیران ہوا مگر وہ شعلہ بن کے بھڑک چکی تھی اور برقِ تپاں کی طرح بے قرار تھی۔

کیپٹن یوگیش نے اسے چیخ کر گالی دی "زبان دراز کتیا۔"

اس نے نازو کی کلائی پکڑ کے اسے اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کی۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا غیر متوقع نہ تھا۔ ہم سب اس کے لئے تیار ہو چکے تھے۔ نازو نے پے درپے وار کئے اور اس سے پہلے کہ کیپٹن کے ساتھی کچھ سمجھ پاتے' ان کا افسر چیختا چلاّتا زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ نازو نے اسے لاتوں اور ٹھوکروں سے مارا۔

"دیکھ کیا رہے ہو؟ شوٹ کرو انہیں" کیپٹن چلاّیا۔

اپنے افسر کی آواز پر ان سب نے ایک ساتھ رائفل اٹھائی مگر انہیں گولی چلانے کی مہلت نہ ملی۔ میں نے اور غالب نے کسی تذبذب کے بغیر ریوالور نکالے اور ان کے سروں میں سوراخ کردئے۔ فائرنگ کی آوازوں نے آشیانوں میں خوابیدہ پرندوں کو بیدار کردیا۔ وہ خوف زدہ ہو کے اُڑے اور فضا میں شور مچاتے چکر لگانے لگے۔

کیپٹن بڑی مشکل سے اٹھا۔ ایک سکتے کی کیفیت میں وہ اپنے ماتحتوں کو دم توڑتا دیکھتا رہا "تم...... تم نے قتل کردیا سب کو!"

"ہاں۔ اور اب تمہاری باری ہے" میں نے کہا۔

"مجھے مت مارو" وہ دہشت زدہ ہو کے چلاّیا۔

"میں نے کہا تھا نا کہ میں تمہیں ایسا سبق سکھاؤں گا جو دوسروں کے لئے باعثِ عبرت ہوگا۔ پھر تم کبھی کسی کو بُری نظر سے دیکھنے کے قابل نہیں رہو گے" میں نے کہا اور نازو کی طرف دیکھا۔ "یہ تمہارا مجرم ہے' تم اسے جو سزا چاہو دو۔"

نازو نے اسے سر کے بال پکڑ کے جھٹکے سے اٹھایا اور ایک ہاتھ اس کی گردن پر مار کے چھوڑ دیا۔ وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح گرا اور اس کا جسم کرب میں اِدھر سے اُدھر ڈولنے لگا۔

"اب چلو۔ کچھ دیر میں صبح ہو جائے گی۔" میں نے کہا۔

"کیا ان کو یہاں ایسے ہی چھوڑ دیں؟" غالب نے کہا۔

"ہمارے پاس انہیں ٹھکانے لگانے کے لئے وقت نہیں ہے۔" نازو نے کہا۔

غالب بولا "ٹھیک ہے۔ مگر ان کو ایک طرف ڈال دیتے ہیں۔ کتنی دیر لگے گی۔ یہاں سڑک کے بیچ میں تو نہ پڑے رہیں۔"

میں نے اس کی مدد کی اور ہم نے لاشوں کو گھسیٹ کر درختوں اور جھاڑیوں کے پیچھے چُھپادیا۔ پھر غالب جیپ کو چلا کے لے گیا اور جنگل میں چھوڑ آیا جہاں سڑک پر سے گزرنے والے کی نگاہ نہیں جا سکتی تھی۔

اگلے دو گھنٹوں میں ہم نے کسی مداخلت کے بغیر سفر کیا اور اسّی کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے میں کامیاب رہے۔ راستے میں دو برساتی نالے' تین چھوٹی ندیاں اور ایک نسبتاً بڑا دریا آیا۔ نالوں سے ہم جیپ میں گزر گئے۔ ندی پر ایک شکستہ حال کشتیوں کا پُل تلاش کرنے میں کچھ وقت لگا مگر دریا پار کرنے میں دیر نہیں لگی۔ اس پر نیا پختہ پُل تھا۔

صبحِ صادق کے آثار ہویدا ہو رہے تھے کہ اے ایس پی نے اچانک اعلان کردیا "ہم ڈھاکا کے نواح میں پہنچنے والے ہیں۔"

"سچ؟" گل نے جذبۂ بے اختیار شوق کے ساتھ کہا "کتنی دیر میں؟"

"تیس چالیس کلومیٹر کا فاصلہ ہوگا" وہ بولا۔

میں نے کہا "پھر تو ہمیں یہ وردی اور جیپ چھوڑ دینی چاہئے۔ ڈھاکا کے آس پاس اور ڈھاکا کے اندر فوج ہی فوج ہے۔"

غالب نے کہا "جب ہر طرف فوج ہوگی تو ہمیں کون شک کی نظر سے دیکھے گا۔ کیا ہم فوجی نظر نہیں آتے۔"

نازو نے اس کی تائید کی "فوجی بھی عام لوگ ہوتے ہیں مگر وردیوں میں۔ ان کے سر پر سینگ تو نہیں ہوتے۔"

غالب نے کہا "تھینک یو میڈم۔ کسی موقعے پر میں آپ کی حمایت کروں گا' خواہ بات کتنی ہی احمقانہ کیوں نہ ہو۔"

"کیا میں احمقانہ باتیں کرتی ہوں؟" نازو نے خفگی سے کہا۔

"جی اکثر۔ انجانے میں عقل مندی کی بات منہ سے نکل جائے وہ الگ مسئلہ ہے" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "دیکھو' یہ لڑائی شروع کرنے کا وقت نہیں ہے۔"

"ہاں' صبح ہو رہی ہے۔ ہم منزل تک پہنچ رہے ہیں" گل نے خوشی سے کہا۔

"یہاں حالات بہت خراب ہیں۔ خانہ جنگی اور انتشار' لاقانونیت اور کسمپرسی کا عالم ہے" اے ایس پی نے نصیحت کے انداز میں کہا "تم کو بہت محتاط رہنا ہوگا۔"

میں نے کہا "تم نے ہماری رہنمائی کا فریضہ بڑی خوش اسلوبی سے پورا کیا۔ میں تمہارا شکر گزار ہوں۔"

"ہم سب بہت ممنون ہیں" غالب بولا "تمہاری مدد کے بغیر ہم اتنے کم وقت میں یہ مسافت طے نہیں کر سکتے تھے۔ یا تو ہم بھٹکتے

رہتے یا کسی مشکل میں پڑ جاتے۔"

میں نے کہا "ایک بات بتاؤ۔ آخر تم نے یہ کام نیک نیتی سے کیوں کیا؟"

"نیک نیتی سے؟" وہ بولا "میں مجبور تھا۔"

"ہاں۔ ابتدا میں تم واقعی جبر کے تحت تعاون کر رہے تھے لیکن بعد میں تم کو بہت سے مواقع ملے۔ جب تم ...... کچھ کر سکتے تھے ہمارے خلاف۔ حالات سے فائدہ اٹھانا چاہتے تو اٹھا سکتے تھے۔ مگر تم نے کچھ نہیں کیا۔"

وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر اس نے کہا "سچ بتادوں؟ میں کچھ قائل ہو گیا تھا کہ تم جس مقصد کی خاطر یہ سب دکھ جھیل رہے ہو' وہ غلط نہیں ہے۔ تمہارا مشن تخریب کاری نہیں تھا۔ میں تمہاری ٹیم اسپرٹ سے متاثر ہو گیا۔ تمہارے درمیان ایک ایسی اعتماد کی فضا ہے' ایسی مفاہمت ہے اور ایسی جذبات کے رشتوں کی ہم آہنگی ہے کہ مجھے اس خاندان میں شامل ہونا اچھا لگنے لگا۔ تم سب کے ساتھ تعلق میں کوئی ایسی کشش تھی کہ میں نے دامن چھڑانے کی کوشش ہی نہیں کی۔"

میں اسے حیرانی سے دیکھتا رہا "تم کو اس خیال نے شرمندہ نہیں کیا کہ تم دشمنوں کا ساتھ دے رہے ہو؟"

"یہ احساس ہوتا تھا مجھے۔ مگر بعض اوقات آدمی دشمن کی تعریف کرنے پر بھی مجبور ہو جاتا ہے" وہ بولا "مثلاً ابھی جو کچھ اس کیپٹن کے ساتھ ہوا' غلط نہیں سمجھا جا سکتا۔ وہ مستحق تھا اس سزا کا۔ مگر اس کے علاوہ یہ بھی سچ ہے کہ میں بہت دہشت زدہ تھا۔ تم سب بہت خطرناک بھی ہو۔ اور مجھے اپنی زندگی عزیز تھی۔ میں اپنے خاندان میں واپس لوٹ جانے کے لئے بے چین تھا اور اسے تم میری خود غرضی سمجھ لو کہ میں اپنے قول و فعل سے تم کو ناراض کرتے ہوئے ڈرتا تھا۔ مجھے امید ہے تم مجھے وعدے کے مطابق جانے دو گے۔ میرا کام ختم ہو گیا۔"

میں نے کہا "ہاں۔ ہم اپنے وعدے پر قائم ہیں۔"

نیم پختہ' ٹوٹی پھوٹی سڑک اچانک ایک بڑی سڑک سے مل گئی جس پر دونوں جانب سے ٹریفک آ رہی تھی۔

"دائیں جانب ڈھاکا ہے" اے ایس پی نے کہا "تم مجھے یہاں چھوڑ سکتے ہو۔"

"یہاں!" میں نے کہا "تم کیسے واپس جاؤ گے؟"

اس نے مسکرا کے کہا "میں چلا جاؤں گا۔ چور راستوں سے آنا مشکل تھا' سیدھے راستے سے واپسی بہت آسان ہو گی۔"

"او کے۔ تم جہاں کہو گے وہاں جیپ روک لوں گا میں۔"

"بس اسی جگہ روک لو" اس نے کہا۔

میں نے بریک لگائے "اچھا خدا حافظ۔ تمہارے ساتھ جو ظلم زیادتی ہوئی' وہ ہماری ضرورت تھی۔ پھر بھی سوری۔"

اس نے ہم سب سے ہاتھ ملایا "میں یہ سب بھول جاؤں گا۔"

نازو نے کہا "تمہارے پاس واپسی کے لئے پیسے ہیں؟"

"پیسہ۔ میں پیدا کر لیتا ہوں" وہ مسکرایا "میں یہ وردی بدل کے پھر اے ایس پی بن جاؤں گا تو کون کرایہ مانگے گا مجھ سے۔"

ہم نے اسے سڑک کے کنارے چھوڑا اور جیپ آگے روانہ ہو گئی۔ سامنے سے میں نے کئی فوجی گاڑیاں اور کانوائے آتے دیکھے۔ شہری گاڑیاں بہت کم تھیں اور مجموعی طور پر ماحول میں خوف کا احساس ہوتا تھا۔

دس منٹ بعد افق کے کنارے روشن ہونے لگے اور ایک زرد' بجھے بجھے سورج نے مشرق کے افق سے سر نکالا۔ سڑکوں پر سائیکل رکشا نظر آنے لگے۔ بسوں میں مسافر چھت کے اوپر بھی لدے ہوئے تھے۔ وہ ہماری طرف دیکھتے تھے تو ان کی آنکھوں سے نفرت کی چنگاریاں پھوٹتی محسوس ہوتی تھیں۔

اچانک غالب نے کہا "سکندر! میرا خیال ہے کہ ہم یہ وردیاں اتار کے عام آدمی بن جائیں۔ کہیں ان کی وجہ سے ہم کسی بڑی مشکل میں نہ پڑ جائیں۔"

میں نے کہا "ایسی بہت سی فوجی گاڑیاں گزر رہی ہیں......"

"مگر ان میں کوئی عورت نہیں ہے" غالب نے کہا "اور نہ جانے کیوں مجھے اے ایس پی کی طرف سے اطمینان نہیں ہے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ جھوٹ بول رہا ہو' ہمیں بے وقوف بنانے کے لئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ہمارے حلئے بتا دے اور ہم عین اس وقت پکڑ لئے جائیں جب منزل سامنے ہو۔"

میں نے سوچ کے کہا "تمہاری بات دل کو لگتی ہے۔"

"اس کے علاوہ ہمیں کہیں رک کے آرام کرنا چاہئے۔ سب کا برا حال ہے" غالب نے کہا "ان وردیوں کے ساتھ ہم کسی روڈ سائڈ کیفے میں بیٹھ کے چائے بھی نہیں پی سکتے۔"

میں نے اس کی بات پر جتنا غور کیا اتنا ہی اس کی معقولیت کا قائل ہوتا گیا۔ سڑک کے کنارے اکا دکا مکانات نظر آ رہے تھے مگر ان میں مکین نظر نہ آتے تھے۔ وہ ابھی سو رہے تھے یا شاید گھر چھوڑ کے کہیں چلے گئے تھے۔

ایک فرلانگ دور آنے کے بعد میری نگاہ پندرہ بیس افراد کے ہجوم پر گئی۔ ان سب کے ہاتھوں میں بانس' ڈنڈے' سریے اور لوہے کے پائپ تھے۔ وہ ننگے پاؤں اور ننگے بدن تھے جسم کے زیریں حصوں پر انہوں نے دھوتی باندھ رکھی تھی اور وہ صورت سے ہی وحشی نظر آتے تھے۔ چیختے چلاتے انہوں نے سڑک عبور کی اور دوڑتے ہوئے پچاس ساٹھ گھروں کی ایک بستی میں گھس گئے۔ بستی میں چیخ پکار مچ گئی۔

میں نے جیپ روک لی "یہ کیا ہو رہا ہے آخر؟"

غالب نے کہا "وہی جو ایسے حالات میں ہوتا ہے۔ لوٹ مار۔"

نازو نے کہا "تم چلو آگے۔ جو ہوتا ہے ہونے دو۔"

میں نے کہا مگر دیکھو ذرا' یہ لوگ کس طرح تالے توڑ رہے ہیں

اور کس طرح زبردستی گھروں میں گھس رہے ہیں۔ کوئی روکنے والا نہیں۔"

"جب قانون کو حکومت کی اور حکومت کو قانون کی پشت پناہی حاصل نہ رہے تو یہی ہوتا ہے" غالب نے کہا "ابھی یہاں کسی کے پاس نہ اقتدار ہے نہ اختیار۔ اندھیر نگری چوپٹ راج۔"

میں نے کہا "یار' یہ لیکچر چھوڑو۔ ہم انہیں روک سکتے ہیں۔"

"کیا ہم یہاں نظم و نسق سدھارنے اور امن و امان قائم کرنے آئے ہیں؟" غالب نے طنز سے کہا۔

میں نے جیپ موڑتے ہوئے کہا "یہ ضرور مسلمانوں کی آبادی ہو گی۔"

"مسلمان تو سب ہی ہیں۔ مارنے والے بھی اور مرنے والے بھی۔"

"میرا مطلب تھا' پاکستان کے حامی مسلمان ہوں گے۔ اس وقت حملہ آور موقعے سے فائدہ اٹھا رہے ہیں" میں نے کہا "آس پاس نہ پولیس ہے نہ فوج۔"

گل نے کہا "بھائی سکندر! خواہ مخواہ......"

میں نے اسے ڈانٹ دیا "میں کوئی کام خواہ مخواہ نہیں کرتا۔"

بلوائی' لوگوں کو گھروں میں گھس کر مار رہے تھے۔ عورتوں کی چیخوں کے ساتھ بچوں کے چلانے کی آواز سنائی دے رہی تھی اور یوں لگتا تھا کہ صرف وہی ظلم کا نشانہ بن رہے ہیں۔ مقابلے پر مرد ہی نہیں یا ہیں تو جان بچانے کے لئے چھپ گئے ہیں۔ مگر یہ بات ناقابل فہم تھی۔ ایسے بے غیرت اور بزدل مرد کہاں ہوتے ہیں جو اپنے گھر کی حفاظت نہ کریں۔

ایک گھر کے دروازے پر لگے ہوئے تالے کو توڑ کر دو افراد میرے سامنے اندر گئے تھے۔ جیپ روک کے میں نے ریوالور نکال لیا۔

"کون ہے اندر؟" میں نے گرج کے کہا "باہر آجاؤ۔"

غالب نے ایک شخص کو پکڑ لیا جو زبردستی ایک عورت کو اپنے ساتھ کھینچ کر لے جا رہا تھا۔ ایک فوجی کو دیکھتے ہی وہ حواس باختہ ہو گیا اور عورت کو چھوڑ کر بھاگا۔

عورت چلانے لگی "ہمارا گہنا لے گیا۔ چور۔"

غالب نے فرار ہونے والے شخص کو پیچھے سے گولی ماردی اور عورت سے کہا "جاؤ۔ اپنا گہنا واپس لے لو۔"

تالا توڑ کے اندر گھسنے والے ایک گٹھری میں مال غنیمت باندھ کے نکلے تو انہوں نے مجھے مقابل دیکھا۔ وہ گٹھری پھینک کر بھاگنے لگے۔ میں نے ان دونوں کو نشانہ بنالیا۔ فائرنگ کی آواز نے لوٹ مار کرنے والوں کو بدحواس کر دیا تھا۔ وہ شور مچا رہے تھے "فوج آگیا" "فوج آگیا" اور مختلف گھروں سے نکل نکل کے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔

تین کو غالب نے مار گرایا' چار میرے ہاتھوں جہنم رسید ہوئے اور دو کا نازو نے جھٹکا کیا۔ باقی مختلف سمتوں میں فرار ہو گئے۔ چند منٹ میں ہمارے گرد روتی چلاتی عورتوں کا مجمع لگ گیا۔ وہ سب بنگالی میں اپنی اپنی کہہ رہی تھیں لیکن ہم کچھ نہیں سمجھ رہے تھے۔

پھر ایک جوان لڑکی آگے آئی۔ اس نے انگریزی میں کہا۔ "آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ نہ آتے تو یہ غنڈے سب کچھ لے جاتے۔"

میں نے کہا "کون تھے یہ لوگ؟"

وہ میرے سوال پر کچھ حیران ہوئی "وہی مکتی باہنی کے غنڈے۔ کتنا ظلم کیا ہے انہوں نے' دیکھو۔"

میں نے اس کے ہاتھ دیکھے تو کانپ گیا۔ اس کے ہاتھ کی ایک انگلی نہیں تھی۔ ایک انگوٹھی اتارنے کے لئے کسی نے وہ انگلی کاٹ دی تھی اور اس میں سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کے باوجود وہ رو نہیں رہی تھی۔

نازو نے کہا۔ "بے وقوف لڑکی! پٹی باندھو اس پر۔"

میں نے کہا "آخر یہ کیا معاملہ ہے؟ اس بستی کے مرد کہاں ہیں؟ انہوں نے غنڈوں کو مارا کیوں نہیں مقابلہ کیوں نہیں کیا؟"

اس لڑکی نے کہا "وہ اسی لئے آئے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ گھروں میں صرف عورتیں اور بچے ہیں۔ وہ ایسا ہی کرتے ہیں۔ ایک دن پہلے پولیس جوان لڑکوں اور مردوں کو پکڑ کے لے جاتی ہے' دوسرے دن غنڈے گھروں میں گھس جاتے ہیں۔ لوٹ مار کرتے ہیں اور عورتوں کو اٹھالے جاتے ہیں۔ گلے میں سونے کا زیور ہو تو گلا کاٹ دیتے ہیں۔"

ان سب کو یقین تھا کہ ہم بھارتی فوجی ہیں جن کے بروقت آجانے سے ان کی عزت' آبرو اور جان و مال محفوظ رہے۔ دہشت زدہ عورتیں خود رو رہی تھیں اور روتے ہوئے بچوں کو دلاسا دے رہی تھیں۔ میں نے ان سب کو تسلی دے کر اپنے اپنے گھروں میں جانے کو کہا۔ جس لڑکی نے ترجمانی کے فرائض سرانجام دئے تھے وہ بھی اپنی ادھوری انگلی پر پٹی باندھنے چلی گئی تھی۔ وہ بلاشبہ ایک بہادر لڑکی تھی جو اتنی تکلیف کو سکون سے برداشت کر رہی تھی۔

اس نے جاتے جاتے کہا "ابھی آپ نہ جائیں' بڑی مہربانی ہو گی۔ ورنہ وہ کمینے پھر آجائیں گے۔"

میں نے کہا "تم جا کے گھر میں بیٹھو اور سب سے کہہ دو کہ باہر کوئی نہ نکلے۔ دروازے بند رکھو اور جب تک آواز نہ پہچانو کسی کے لئے دروازہ مت کھولو۔ اگر ان میں سے کسی نے پھر حملہ کرنے کی غلطی کی تو اس کا بھی یہی حشر ہو گا" میں نے ادھر ادھر پڑی ہوئی لاشوں کی طرف اشارہ کیا۔

سب عورتیں غائب ہو گئیں تو میں نے غالب سے کہا "تم جیپ کو پیچھے لے جاؤ' سڑک پر سے نظر نہ آئے۔"

"اب کیا انتظار فرمائیں گے ہم کہ کوئی آئے اور اس بہادری کے کارنامے کی تفصیلات پوچھے' ہم سے شناخت مانگے؟" غالب

نے بگڑ کے کہا "خواہ مخواہ مصیبت میں پڑ جائیں گے سب۔"

میں نے کہا "بس چند منٹ کی بات ہے یار۔ یہاں سے حلئے بدل کے نکلیں گے۔ جیپ کو چھوڑ جائیں گے۔ جیپ کھڑی رہے گی تو عورتوں' بچّوں کو اطمینان رہے گا کہ فوج موجود ہے۔ غنڈے بھی لوٹ کر نہیں آئیں گے۔"

غالب نے میری بات سمجھ لی۔ گل اور نازو کا رویّہ بھی ایک دم مصالحانہ ہوگیا۔ ان کو پرائے معاملات میں میری دخل اندازی کی پالیسی سے قطعی اتفاق نہ تھا۔ عام حالات میں وہ اختلاف نہ کرتیں مگر اس وقت انہیں جلد از جلد ڈھاکا پہنچنے کی بے چینی تھی۔

ہم بے خوف و خطر اس گھر میں داخل ہوگئے جس کا تالا توڑنے والے مالِ غنیمت پھینک کر بھاگ گئے تھے۔ اندر ابتری کی حالت تھی۔ اس گٹھری میں بھی ایسی کوئی چیز نہ تھی جسے وہ اٹھا کر لے جا رہے تھے۔ اس میں چند کپڑے تھے' کچھ برتن اور چاندی کے زیور۔ وہ کسی غریب کا گھر تھا جسے کوئی غریب چور لوٹنے آیا تھا۔

غالب نے اندر آکے دروازہ بند کر دیا "اب دیر مت کرو' کپڑے بدلو اور چلو۔" اس نے گل اور نازو سے کہا۔

میں نے کہا "بس وردیاں اتار کے اپنے کپڑے پہنتے ہیں اور چلتے ہیں۔"

غالب نے کہا "میرا مشورہ ہے کہ وہ کپڑے بھی چھوڑو۔"

"پھر کیا کریں؟"

غالب نے اِدھر اُدھر دیکھا "یہ جو کپڑے دیوانیوں پر لٹکے ہوئے ہیں' یہ ٹھیک ہیں۔"

"اتنے میلے اور پھٹے ہوئے!"

"یار' ہمارے حلئے بالکل ویسے ہی ہونے چاہئیں جیسے عام لوگوں کے۔ اس اے ایس پی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ اگر اس نے کسی کو ہمارا حلیہ بتایا تو یہ بھی بتا دے گا کہ ہم نے کیسے کپڑے پہن رکھے ہوں گے۔" غالب نے کہا۔

"تمہیں اس اے ایس پی کا فوبیا ہوگیا ہے۔ وہ اتنا بُرا آدمی نہیں تھا۔ جان بچی سو لاکھوں پائے۔ وہ ادھر نہیں آئے گا' لوٹ کے گھر جائے گا۔ میری چھٹی حس کہتی ہے کہ وہ بُدھو تھا۔"

"مگر میری ساتویں حس کہتی ہے کہ وہ بہت عیّار اور مکار شخص تھا۔ اس نے بڑے ٹھنڈے دماغ سے کام لیا اور ہم سے تعاون کرکے اپنی جان بخشی کرالی مگر اس کے دل میں کچھ اور تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ہم ڈھاکا پہنچنے کے بعد غائب نہیں ہوسکتے۔ پولیس' فوج اور انٹیلی جنس کے ادارے ہمیں ڈھونڈھ نکالیں گے۔ رِسک لینے کی کیا ضرورت ہے۔"

میں نے اس کی بات مان لی "چلو تم بھی دیکھو اور پسند کرو اپنے لئے کوئی لباسِ فاخرہ۔"

نازو نے کہا "کتنی غلط بات ہے کہ ہم پہلے تو مالک مکان کی اجازت کے بغیر گھر میں گھسے۔ پھر اس کے کپڑے بھی پہن لیں۔"

"اور یہ فوجی وردیاں چھوڑ جائیں جو اُن کے کسی کام کی نہیں" گل نے کہا "الٹا انہیں مصیبت میں ڈال سکتی ہیں۔"

"ہاں' وہ بیچارے کیا بتائیں گے تفتیش کرنے والوں کو کہ فوجی وردی میں وہ کون لوگ تھے اور ان کے ساتھ دو عورتیں کون تھیں" غالب نے تائید میں سرہلایا "اچھی نیکی کی ان کے ساتھ۔ چوروں سے بچایا اور پولیس کی تحویل میں دے دیا۔"

"آسمان سے اتارا اور کھجور میں لٹکا دیا" نازو بولی۔

میں نے کہا "تم لوگ بلاوجہ جذباتی ہو رہے ہو۔ پتا نہیں وہ کون تھے' کہاں گئے۔ لوٹ کر آئیں گے یا نہیں مگر پھر بھی میں تم سے متفق ہوں۔ ہماری وجہ سے ان کو پریشانی نہیں ہونی چاہئے۔ ہم ایسا کرتے ہیں کہ اپنے کپڑے اور وردیاں ساتھ لے جاتے ہیں۔"

"ساتھ لے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ جیپ میں چھوڑ دیتے ہیں" غالب نے کہا۔

"جیپ کہاں کھڑی کی ہے؟"

"اس گھر کے نزدیک نہیں ہے" غالب نے کہا۔

نازو نے کہا "یہ بہت غریب لوگ ہیں۔ ان کے لئے پرانے کپڑوں کا چوری ہونا بھی نقصان ہے۔ اس کی تلافی ضروری ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ کچھ رقم کہیں چھوڑ دینا۔ جو ملے تو صرف انہی کو ملے" میں نے کہا۔

دس منٹ بعد ہم اس گھر کی دیواریں پھاند کے نکلے اور پچھلی طرف سے پیدل سڑک کی جانب روانہ ہوگئے۔ اب ہم جیسا دیس ویسا بھیس کے مصداق بالکل مقامی حلئے میں تھے اور کسی نے ہمیں باہر نکلتے نہیں دیکھا تھا۔ میلے کپڑے کی ایک پوٹلی نازو نے اٹھا رکھی تھی اور دوسری گل نے۔ ایک میں ہمارے ریوالور تھے اور دوسرے میں باقی بچی ہوئی نقد رقم کے ساتھ وہ سونا تھا جو ابھی تک کسی کے بھی کام نہ آیا تھا اور ہمارا ساتھ نہیں چھوڑ رہا تھا۔

ڈھاکا کی سمت جانے والی ہر بس کھچا کھچ بھری ہوئی آرہی تھی۔ ان میں مرد اور عورتوں کو جس طرح ٹھونسا گیا تھا اسے دیکھ کر گل اور نازو کو سفرِ آخرت زیادہ آسان محسوس ہوتا تھا۔

"میں تو دم گھٹنے سے مرجاؤں گی" نازو نے کہا۔

"زیادہ نخرے مت دکھاؤ۔ تمہارے لئے ائرکنڈیشنڈ کوچ نہیں آئے گی یہاں" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "اوپن ائر کلاس میں جگہ مل سکتی ہے۔"

"کیا مطلب؟ چھت پر۔" گل نے گھبرا کے کہا۔

"ہاں۔ کھلی فضا اور اس خوب صورت ماحول سے لطف اندوز ہوتے جائیں گے" میں نے کہا۔

"یہ الگ بات ہے کہ راستے میں کہیں گولیاں چل رہی ہوں تو نشانہ ہم بن جائیں۔ یا بس الٹ جائے تو....."

"فضول باتیں مت کرو" نازو نے کہا۔

وہیں کھڑے کھڑے ایک گھنٹا گزر گیا لیکن کوئی ایسی بس نہ آئی جس میں ہمارے لئے کھڑے ہونے کی جگہ بھی ہوتی۔ وہاں مرد' عورتوں کے لئے الگ الگ خانوں کا رواج نہیں تھا چنانچہ حضرات و خواتین سفر کے دوران ایک دوسرے کے ساتھ قابلِ اعتراض حد تک شیر و شکر ہو جاتے تھے مگر انہیں نہ اس کا احساس تھا اور نہ کسی کو پروا تھی۔ تاہم گل اور نازو کے لئے یہ بعید از قیاس تھا کہ وہ ہر طرف سے سینڈوچ ہو جائیں اور وہ بھی صرف دھوتی پہن کے ننگے پاؤں سفر کرنے والے مردوں میں جن کے جسم سے پسینہ بہہ رہا ہو اور پسینے میں مچھلیوں کی بو ہو۔

آخر کار قدرت کو ہم پر رحم آیا۔ اچانک ایک ٹیکسی نمودار ہوئی۔ میں نے اسے غور سے دیکھا۔ ٹیکسی خالی تھی۔ اسے روکنے کے لئے میں نے تقریباً سڑک کے وسط میں جست لگائی۔

ٹیکسی ڈرائیور نے ایک دم بریک لگائے اور پھر کھڑکی سے سر نکال کے مجھے نہ جانے کیا کچھ کہا۔

گالیاں کھا کے بے مزہ ہوئے بغیر میں نے کہا "ڈھاکا۔"

اس نے مزید کچھ ارشاد کیا اور باری باری ہم سب پر غور کیا۔ ہم حلئے اور صورت سے ہرگز اتنے معزز نہ لگتے تھے کہ ٹیکسی میں سفر کریں۔ تاہم اس نے یہ اندازہ کرلیا کہ ہم اس کی زبان نہیں سمجھتے۔

اس نے کہا "سو ٹکا۔"

میں نے کہا "ون ہنڈرڈ۔ اوکے۔ یو اسپیک انگلش۔"

وہ بھونچکا رہ گیا۔ اس نے سرہلایا اور بولا "یو ناٹ بنگالی؟"

میں نے ٹیکسی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا "ٹورسٹ۔ سری لنکا"

اس نے دوبارہ گل اور نازو کے سراپا پر نظر ڈالی۔ ان کے لباس مشرقی پاکستان کی عورتوں جیسے تھے اور رنگ روپ سے وہ ذرا بھی سری لنکا کی نظر نہ آتی تھیں۔ تاہم اس نے مزید تجسّس کا اظہار غیر ضروری سمجھا اور ہم نے ٹیکسی میں بیٹھ کے خدا کا شکر ادا کیا۔

راستے میں ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ غالب اگلی سیٹ پر تھا۔ میں گل اور نازو کے ساتھ پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔

میں بہت زیادہ تھک چکا تھا۔ رات بھر جیپ کا سفر انتہائی سخت جسمانی قوتِ برداشت کا امتحان تھا۔ جیپ کسی کار کی طرح آرام وہ نہیں ہوتی۔ پھر وہ سڑک بھی شہر کی ہموار شاہراہ نہیں تھی۔ رہی سہی کسر ندی نالوں سے گزرنے اور دریا پار کرنے میں پوری ہوگئی تھی۔ ستم بالائے ستم یہ کہ اس رات کے سفر میں نہ ہم آرام کے لئے قیام کرسکے تھے اور نہ ہمیں کھانے پینے کے لئے کچھ میسر آیا تھا۔

'جب میری یہ حالت ہے تو گل اور نازو کا کیا حال ہوگا' یہ سوچ کے مجھے دکھ بھی ہوا کیوں کہ انہیں مصائب اور مشکلات کی اس انتہا تک لانے کا ذمے دار میں ہی تھا۔ مجھے ان پر فخر بھی محسوس ہوا۔ ان میں صدمات جھیلنے' دکھ اٹھانے' بھوک پیاس اور مسافرت کی تکالیف برداشت کرنے اور ذہنی و جسمانی اذیت کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت بھی غیر معمولی تھی۔ رفاقت کا حق ادا کرنے' عہدِ وفا نبھانے اور صبر و شکر کے ساتھ ہر حال میں خوش رہنے کا سلیقہ بھی ان کو قدرت نے بڑی فیاضی سے ودیعت کیا تھا۔

اب جب کہ کٹھن راستوں پر آزمائش کے جان لیوا سفر کا یہ مرحلہ ختم ہو رہا تھا' میں انہیں یاد کرنے پر مجبور تھا جو آغازِ سفر میں بچھڑ گئے تھے' راستوں میں کھو گئے تھے' بہت پیچھے رہ گئے تھے یا اتنا آگے نکل گئے تھے جہاں سے لوٹ کر آنا ان کے بس میں نہ تھا' کسی کے بھی اختیار میں نہیں ہوتا۔ لیکن ان سب کے مقابلے میں اس وقت میرے خیالوں میں محسن کا چہرہ ابھر آیا تھا۔ سب عکس مدّھم پڑ گئے تھے اور میرے بچپن کے اس دوست کا تصور کسی زندہ تصویر کی طرح روشن ہوگیا تھا۔

کیا وہ اب بھی امید لگائے چشم براہ ہوگا؟ کہیں سرِ راہ گزار بیٹھا ستم کشِ انتظار ہوگا؟ یقین اور ناقابلِ شکست رشتوں پر ایمان کے ساتھ منتظر ہوگا کہ ایم آر ایس کے جاں نثار حلیف' اس کے دوست۔ سکندر اور غالب' رابعہ' گل اور نازو' یہ سب پہنچنے ہی والے ہوں گے۔ یہ ناممکن ہے کہ وہ نہ آئیں۔ اسے بھول جائیں اور واپس چلے جائیں۔

ہم نے اس عشق میں کیا کھویا ہے کیا پایا ہے؟ سب نے ویسے تو عمر کا ایک حصہ نذر کیا۔ زندگی کی راحتوں اور نعمتوں سے منہ موڑا۔ عیش و آرام کو قربان کیا اور اس کے بدلے میں ذلت و خواری' دربدری اور بے سروسامانی کی اذیت قبول کی۔ عداوتوں کا سامنا کیا اور موت کے پُرخطر راستوں پر چلے۔ شکست و فتح مقدر سے ہے ولے اے میر۔ مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا۔ ایم آر ایس جس جذبے کا نام تھا' اسے دوام ہے۔ کوئی نمرود' کوئی یزید یا ہلاکو خان آدمی کی انسانیت کو نہیں مار سکا۔ اس کے حق' نیکی اور راستی پر ایمان کو نہیں ختم کرسکا۔ ہم سب کے لئے ہمارا یہی غرور سب سے بڑا انعام تھا کہ ہم برحق تھے چنانچہ شرمسار اور پشیمان نہیں تھے۔ پاکستان کو بگاڑنے والے یا توڑنے والے' بنگلہ دیش کے وجود کے اسباب اور اسے معرضِ وجود میں لانے کے ذمے دار' سیاست داں' دانشور' فوجی اور بین الاقوامی سازشوں کے پروردگار شاید کبھی احساسِ جرم کی خلش اپنے ضمیر میں محسوس کرتے ہوں مگر ہم نہیں۔ ہم مطمئن تھے کیوں کہ شکست نہ ہمارے مقصد کو ہوئی نہ جذبے کو۔

غالب بھی کسی گردابِ خیال میں غوطہ زن تھا اور میرے ساتھ بیٹھی ہوئی نازو اور گل سیٹ پر آنکھیں بند کئے نڈھال پڑی تھیں۔ انہیں بالکل احساس نہ تھا کہ ان کی آنکھوں میں رکے ہوئے سیلِ اشک نے ضبط کی دیواروں کو عبور کرلیا ہے۔ یہ آنسو ان کے خیالوں کی تصویرِ درد تھے جو حد سے گزر گیا تھا تو دوا بن گیا تھا۔

میں بے خیالی میں سامنے سے آنے والی ٹریفک کو دیکھ رہا تھا جو شہر کے نواح میں اچانک بڑھ گئی تھی۔ اچانک میرے ذہن کو ایک جھٹکا لگا۔ میں نے بے اختیار پلٹ کے دیکھا۔ ایک جیپ تیزی سے گزر گئی تھی۔ اس میں سب اجنبی چہرے تھے۔ بھارتی فوجی جوانوں کی صورت پر فاتحانہ خوں آشامی کا غرور تھا۔ اس شکاری کی طرح جو بندوق کی طاقت سے جنگل کے بادشاہ کو مار ڈالے اور پھر اس کی لاش پر پاؤں رکھ کے تصویر بنوائے۔ ان خونی چہروں کے درمیان مجھے ایک آشنا صورت دیکھ کر جھٹکا لگا تھا۔

یہ صورت اے ایس پی کی تھی۔ وہ آگے ایک فوجی افسر کے ساتھ اپنی وردی پہنے بیٹھا تھا اور اس کی پُر کینہ نگاہیں بڑے انتقامی تجسس کے ساتھ آتے جاتے لوگوں پر پڑ رہی تھیں۔ یہ محض میرے خیال کا واہمہ یا نظر کا فریب نہیں تھا۔ غالب نے بھی اس کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ پھر میرے ساتھ وہ بھی پلٹ کر جاتی ہوئی جیپ کو دیکھنے پر مجبور ہو گیا تھا مگر جیپ کے پچھلے حصے میں دوسرے فوجی تھے۔

غالب نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر میں نے اسے اشارے سے روک دیا۔ اس کی نگاہوں میں وہی سوال تھا جو میرے دل میں تھا اور شاید غالب نے بھی میری آنکھوں میں پڑھ لیا ہو گا۔ دوسرے لمحے سوال کی جگہ جواب کا عکس نمایاں ہو گیا اور ہم نے زبانِ خاموشی میں کہا "ہاں۔ یہ وہی تھا۔"

غالب کی خفیف سی مسکراہٹ نے کہا "دیکھا، میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ وہ حرامزادہ ہمیں اُلو بنا رہا تھا اپنی باتوں سے۔"

میری جھکی ہوئی نظر نے کہا "واقعی تم نے اسے صحیح سمجھا تھا۔"

خاموشی کی زبان میں غالب نے کہا "ہم بال بال بچ گئے۔"

میں نے اسی زبان میں جواب دیا "مگر محض میری وجہ سے۔ اگر ہم اسی جیپ میں سڑک پر چلتے جاتے تو اب تک گرفتار ہو جاتے"

ہماری باتوں کو نہ ڈرائیور نے سنا، نہ گل اور نازو نے مگر پھر بھی ہم نے ایک دوسرے سے سب کچھ کہہ دیا۔ غالب بولا "تم کو شکر گزار ہونا چاہئے میری چھٹی حس کا، جس نے تمہیں خبردار کر دیا تھا۔"

"ہم سے الگ ہوتے ہی اس خبیث نے ایک لمحہ ضائع نہیں کیا ہو گا اور جو پہلی فوجی گاڑی نظر آئی ہو گی اسے سب کچھ بتا دیا ہو گا۔"

"ہاں۔ مگر جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔"

"سالا حیران پریشان تو ہو گا کہ اتنی جلدی ہم کدھر نکل گئے۔ کہیں جیپ نظر آئی، نہ ہماری شکلیں۔"

"وہ جیپ کو تلاش کر لیں گے۔"

"کر لیں۔ اس وقت تک ہم ڈھاکا کی بھیڑ میں گم ہو جائیں گے۔"

. ے درمیان یہ خاموش مکالمے جاری رہتے، اگر ٹیکسی والا ہم سے سوال نہ کرتا کہ ڈھاکا میں ہم کہاں جائیں گے۔ ڈھاکا شہر کے بارے میں میری معلومات نہ ہونے کے برابر تھیں۔ سوائے چند مقامات کے جن کا ذکر اکثر اخبارات میں آتا تھا، میں کسی جگہ کا نام نہیں لے سکتا تھا۔ پلٹن میدان۔ شہید مینار۔ مسجد بیت المکرم۔ میں نے پہلا ہی نام لے دیا۔

شہرِ مفتوحہ پر دشمنوں کا راج تھا۔ قابض فوجی ہر طرف دندناتے پھر رہے تھے۔ ان کا ساتھ دینے والے خوشیاں منا رہے تھے۔ پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگانے والے اپنے خوابوں کی شکست پر نوحہ خواں تھے اور ایک بار پھر بے وطن ہو جانے کے خیال سے پریشان تھے۔ ہر قدم پر مجیب کی تصویر تھی، بنگلہ دیش کے حق میں نعرے تھے اور پاکستان کے خلاف۔ سڑکوں اور بازاروں میں بہت بھیڑ تھی مگر لوگوں کے چہرے سپاٹ اور بجھے بجھے تھے۔ وہ اپنے اندیشوں اور خوف کے جذبات کو دبانے کی فکر میں مبتلا نظر آتے تھے۔ بڑی بڑی دکانیں بند تھیں۔ بہت سی دکانیں لوٹی جا چکی تھیں۔ بہت سے گھر جلائے جا چکے تھے۔ فضا میں وہ سکوت تھا جو کسی میدان جنگ میں توپوں، ٹینکوں کی گولہ باری، جہازوں کی بمباری اور مشین گنوں کی فائرنگ بند ہو جانے کے بعد ایک آسیب کی طرح مسلط ہو جاتا ہے۔

عام ضروریاتِ زندگی کے لئے دکانیں کھلی ہوئی تھیں اور لوگ خریداری بھی کر رہے تھے۔ ایک جائز آئینی حکومت ختم ہو گئی تھی۔ بیرونی مداخلت کاروں نے اپنی مرضی سے دوسری حکومت کے قیام کو جواز فراہم کر دیا تھا مگر ابھی تک اس حکومت کا اقتدار قائم نہیں ہوا تھا اور لوگ گومگو... کی کیفیت کا شکار نظر آتے تھے کہ کس کی مانیں اور کس کی نہ مانیں، کسے غلط قرار دیں اور کسے صحیح۔ یہ تبدیلی وقتی اور عارضی ہے یا بھارتی فوج کی واپسی کے بعد بھی وہ فاصلے ختم نہ ہوں گے جو دلوں کے درمیان پیدا ہو گئے ہیں۔ جغرافیائی فاصلوں سے کبھی فرق نہیں پڑا تھا اور ملک کے دو حصے جسم کے دو بازوؤں کی طرح تھے کہ ایک بھی جدا ہو تو ادھورا جسم معذور ہو جاتا ہے، نظر آتا ہے اور سمجھا جاتا ہے۔

ٹیکسی رک گئی "دِس پلٹن میدان" نیم خواندہ ٹیکسی ڈرائیور نے بددلی سے کہا "یو ٹورسٹ بٹ ناٹ فرام سری لنکا" (تم سیاح ہو مگر سری لنکا کے نہیں ہو)

میں نے اسے سو کا نوٹ دیا "ہاؤ یو نو؟"

اس نے سوچ کے کہا "یو ناٹ سیف۔ یو لک پاکستانی" (تم محفوظ نہیں ہو کیوں کہ تم پاکستانی نظر آتے ہو)

میں نے کہا "پھر ہمیں کیا کرنا چاہئے؟"

اس نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہا "خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ میں جاہل ہوں، متعصب اور دشمن نہیں ہوں۔ یہ لباس بدلوا کے انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل یا شاہ باغ ہوٹل میں کمرا لے لو، اگر چاہتے ہیں۔ ورنہ کسی مسجد میں چلے جاؤ۔"

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا "ہم شاہ باغ ہوٹل جا سکتے ہیں مگر یہ لباس کیسے تبدیل کریں؟ اس لباس میں ہمیں وہاں کون داخل ہونے دے گا؟"

اس نے کہا "میں یہ کر سکتا ہوں کہ تمہیں شاہ باغ ہوٹل لے جاؤں۔ تم پہلے ہی بتا دیتے تو اچھا تھا۔ چلو بیٹھو۔"

ہم پھر ٹیکسی میں بیٹھ گئے تو میں نے کہا "ایک ذاتی سا سوال ہے۔ تم کیا ہو، ہندو یا مسلمان؟"

اس نے پلٹ کے دیکھے بغیر کہا "میں بدھ مذہب کو مانتا ہوں، اس لئے خون خرابے سے نفرت کرتا ہوں۔ مہاتما بدھ کا پیغام ہے شانتی اور محبت۔"

میں نے کہا "ویسے تو سب مذاہب کا یہی پیغام ہے....."

اس نے میری بات کاٹ دی "مگر تم اس پر عمل نہیں کرتے۔ ورنہ یہ سب کیوں ہوتا؟ تم کو مجھ سے جھوٹ بولنے کی ضرورت نہ پڑتی اور تم ایسے بھیس بدل کے نہ پھرتے۔ یہ سب سیاست ہے نفرت کی جس نے خوف پیدا کیا ہے۔"

اس نے مجھے شرمندہ اور لاجواب کر دیا تھا۔ اس بحث سے کچھ حاصل بھی نہ تھا۔ عداوتوں کے زہر سے مسموم شہر میں ملنے والا پہلا آدمی انسانیت پرست ثابت ہوا تھا۔ پُرامید رہنے کے لئے یہ نیک شگون ایک اچھا سہارا تھا۔

میں نے کہا "دیکھو، ہم تمہیں اپنی دکھ بھری کہانی سنا کے متاثر کرنا نہیں چاہتے۔ تم سمجھو گے یہ بھی جھوٹ ہے۔"

"یہاں ہر قدم پر کوئی اپنی دکھ کی داستان لئے بیٹھا ہے۔"

میں نے کہا "تم اگر ہماری تھوڑی سی مدد کر دو گے تو ہم اس نیکی کو یاد رکھیں گے۔ اور اگر مانگو گے تو اس کا معاوضہ بھی دیں گے۔"

اس نے خفگی سے کہا "کیا نیکی معاوضہ لینے کے بعد نیکی رہتی ہے؟"

میں نے کہا "سوری۔ دراصل ہم بڑی مصیبت میں ہیں اور خود کچھ نہیں کر سکتے۔ ہم اس شہر میں اجنبی ہیں۔ نہ ہم راستوں سے واقف ہیں اور نہ لوگوں سے۔ اگر تم کسی طرح ہمارے لئے مناسب کپڑوں کا بندوبست کر دو۔"

"مَیں.... میں کہاں سے کر دوں؟"

"بازار سے، قیمت ہم دیں گے۔ تم خرید کر لا دو" میں نے کہا، "ہم کو تو شاید دکاندار بھی انکار کر دے گا۔"

"سب لوگ بُرے نہیں ہیں۔ اکثریت میں اچھے لوگ ہیں مگر وہ بُرے لوگوں سے ڈرتے ہیں۔ شریف لوگ ہر جگہ غنڈے بدمعاشوں کے آگے بے بس ہوتے ہیں۔ ان کی وجہ سے سب کے رویئے بدلے ہوئے لگتے ہیں۔ کچھ دن بعد سب ٹھیک ہو جائے گا جب یہ نفرت کے جذبات کی چڑھی ہوئی آندھی اترے گی۔ تم لوگ ٹیکسی میں بیٹھے رہو، میں کپڑے لاتا ہوں" اس نے ایک جدید قسم کے شاپنگ سینٹر میں پہنچنے کے بعد کہا۔

میں نے اسے پانچ سو روپے دیئے۔ وہ فٹ پاتھ پر چلتا ہوا ایک دکان تک گیا اور آگے پیچھے دیکھ کر اندر داخل ہو گیا۔

غالب نے کہا "یہ شخص تو فرشتۂ رحمت بن کے آ گیا۔"

میں نے کہا "جب میں نے ٹیکسی روکی تھی تو کتنا مشتعل ہوا تھا۔ اب بالکل بدل گیا ہے۔ انگریزی بھی فرفر بول رہا ہے۔"

"احتیاط پسندی حالات کا تقاضا ہے۔" غالب نے کہا۔

نازو نے کہا "پتا نہیں ایسی باتیں کیوں سوجھ رہی ہیں تمہیں۔ پیٹ خالی ہو تو دماغ بھی خالی ہو جاتا ہے۔"

گل نے بھی کہا "واقعی، اب تو میں بے ہوش ہونے والی ہوں۔"

غالب نے گھڑی دیکھ کے پوچھا "کتنی دیر میں؟"

"مذاق کی بات نہیں، میری قوتِ برداشت جواب دے چکی ہے" گل نے بگڑ کے کہا "سب کی جان پر بنی ہوئی ہے۔"

میں نے اسے تسلی دی "بس تھوڑا سا حوصلہ گل۔ مجھے اندازہ ہے کہ تم نے بڑی ہمت سے کام لیا ہے۔"

موٹر سائیکل پر ایک پولیس مین گزرتے گزرتے رک گیا۔ اس نے بنگالی میں کچھ کہا جو میری خاک سمجھ میں نہیں آیا۔

میں نے کہا "جو کچھ کہا ہے اس کا انگریزی میں بامحاورہ ترجمہ کرو۔"

وہ جھلا کے بولا "یہ ٹیکسی یہاں کیوں کھڑی ہے؟"

میں نے احمقوں کی طرح اسے دیکھا "اس لئے کہ انجن بند ہے۔"

اس نے اتر کے موٹر سائیکل کو اسٹینڈ پر کھڑا کر دیا "آخر کون ہو تم لوگ جو مجھ سے اس لہجے میں بات کر رہے ہو؟"

"ہم نے تم سے کوئی بات نہیں کی، تم خود رکے تھے۔ تم نے سوال کیا ہم نے جواب دیا" میں نے کہا "اور بھی جو پوچھنا ہے پوچھ لو۔"

"کہاں رہتے ہو تم؟" اس نے مجھے گھور کے کہا اور پھر سب پر ایک قہر آلود نگاہ ڈالی۔ مجھے اس کا لہجہ خالص پنجاب کا لگا تھا۔

"کہیں نہیں۔ جب رہیں گے تب بتا دیں گے" میں نے کہا۔

"کیا مطلب ہے اس بات کا؟" وہ چراغ پا ہو کے بولا۔

میں نے کہا "ابھی ہم نے طے نہیں کیا کہ ہوٹل شاہ باغ میں قیام کریں گے یا انٹر کان میں۔ اور طے کرنے سے کیا ہوتا ہے، جہاں جگہ ملے گی وہاں کا کمرا نمبر بتا دیں گے۔ تم اپنا فون نمبر دے جاؤ۔"

"باہر نکلو تم سب" وہ غصے میں آتش فشاں بن گیا۔

میں نے کہا "میں اس غیر قانونی حکم کو ماننے سے انکار کرتا ہوں۔ ٹیکسی کے اندر وارنٹ کے بغیر داخل ہونے کی کوشش مت کرنا اور دست درازی بھی مت کرنا ورنہ پیٹی اتر جائے گی۔ ہمیں سفارتی تحفظ حاصل ہے۔"

"سفارتی تحفظ.... تم مجھے غیر ملکی نظر نہیں آتے" اس کا جوش و خروش کچھ سرد پڑ گیا۔

"پھر کیا نظر آتے ہیں' سرکس کے جوکر؟ اور نظر آنے کی کیا بات کرتے ہو۔ تم نے کبھی غور کیا کہ تم کیا نظر آتے ہو؟" غالب نے کہا "بالکل پولیس والے....."

"نظر آنے کا کیا مطلب!" وہ تیز ہو کے بولا "میں پولیس مین ہوں۔ کسی فلم کی شوٹنگ کے لئے پولیس کی وردی اور میک اپ میں نہیں ہوں۔"

"اچھا؟" نازو نے بے حد حیران ہو کے گل سے کہا "بھئی یہ اصلی پولیس مین ہے' بالکل......"

میں نے اسے بولنے کا موقع دیئے بغیر کہا "خیر۔ تمہارا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتے ہم۔ تم ڈیوٹی پر جا رہے ہو۔ یہ بتاؤ تم سے پھر ملنا ہو تو کہاں ملیں؟ ہم انٹرکان میں ہیں۔"

ہماری باتوں نے اسے پہلے ہی بوکھلا دیا تھا۔ وہ چونکا "کیوں ملنا چاہتے ہیں آپ مجھ سے؟"

میں نے کہا "تم پولیس مین ہو' شہر کے اندر کے حالات بتا سکتے ہو۔ ہم غیر ملکی صحافی ہیں' خبریں تلاش کرنے نکلے تھے۔"

"اور اسی لئے یہ حلیہ بنایا تھا" غالب نے کہا۔

اس کا رویّہ بالکل بدل گیا۔ اس نے جیب میں سے ایک کارڈ نکال کے مجھے دیا "یہ میرا پتا ہے۔"

میں نے کارڈ لے لیا "اے ایس آئی۔ سی اے دِتّا۔ یہ سی اے سے کیا بنتا ہے؟"

"چوہدری اللہ دِتّا" وہ بولا۔

"تم لاہور کے رہنے والے ہو؟" میں نے اردو میں کہا۔

وہ حیران ہو کے بولا "خاص لاہور کا۔ آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

میں نے کہا "ادھر ایک ایس ایس پی تھے۔ ضامن رضوی۔"

"بالکل تھے جناب۔ اللہ مغفرت کرے۔ ایسے لوگ کہاں ہوتے ہیں پولیس میں۔ انسان نہیں فرشتہ تھے۔ میں نے تین سال گزارے ان کے ساتھ۔ پھر ادھر پوسٹنگ ہوگئی۔ اب پتا نہیں واپسی کا کیا بنے گا۔ مگر آپ ضامن صاحب کو کیسے جانتے ہو؟"

میں نے کہا "ایک ایس ایس پی سراج تھا۔"

"کیسی عجیب بات ہے۔ پہلے آپ نے فرشتے کا حوالہ دیا پھر شیطان کا" وہ بولا۔

میں نے کہا "اللہ دِتّا چوہدری! تم سے پھر ملیں گے اسی شہر میں۔ ہم بھی لاہور سے ہی آئے ہیں' غیر ملکی وغیرہ خاک نہیں ہیں۔"

"وہ تو میں سمجھ گیا تھا" وہ مسکرایا۔

"ٹیکسی والا آرہا ہے' اسے کچھ مت بتانا" میں نے کہا۔

غالب نے اس سے ہاتھ ملا کے کہا "تمہاری واپسی کا بندوبست کردیں گے ہم۔"

"بڑی مہربانی ہوگی جناب۔ اِدھر تو ہر وقت خطرہ ہے۔ جتنے بھی اُدھر سے آئے تھے سب مشکل میں ہیں۔ نوکری کی خیر ہے' جان بچ جائے اور واپس گھر پہنچ جائیں" وہ بولا "آپ سفارت خانے میں ہیں' سب کچھ کرسکتے ہیں۔ میرے لئے کوئی خدمت ہو تو ضرور بتانا۔"

ٹیکسی ڈرائیور کپڑوں کے بنڈل اٹھائے آگیا تھا اور ہمیں ایک ٹریفک سارجنٹ سے گفتگو کرتا دیکھ کے حیران تھا۔ اس نے ٹیکسی واقعی غلط جگہ کھڑی کی تھی۔ وہاں کرب پارکنگ تھی یعنی فٹ پاتھ کے متوازی۔ جب سارجنٹ اس سے کوئی سوال کئے بغیر چلا گیا تو وہ مزید حیران ہوا۔

"یہ کیا کہہ رہا تھا؟"

"کچھ نہیں۔ ٹیکسی کا چالان کرنا چاہتا تھا۔ ہم نے پیسے دے کر رخصت کردیا" میں نے کہا۔

ٹیکسی ڈرائیور شکر گزار نظر آنے لگا۔ "کتنے پیسے لے گیا؟"

میں نے کہا "اس کا ذکر چھوڑو۔ تم نے ہمارا کام کیا' ہم نے تمہارا ایک چھوٹا سا کام کیا کہ تمہارا چالان نہیں ہونے دیا۔ یہ بتا[ؤ] کپڑے مل گئے؟"

"مل گئے۔" اس نے باقی رقم میرے حوالے کی "یہ دو سو اٹھائیس روپے اور یہ رسید۔"

"صرف دو سو بہتّر خرچ ہوئے" میں نے حیرانی سے کہا "اب راستے میں کہیں سے ایک سوٹ کیس بھی لیں گے تاکہ شاہ باغ ہوٹل میں معزز مہمانوں کی طرح داخل ہوں۔ وہاں جگہ مل جائے گی؟"

اس نے ٹیکسی اسٹارٹ کی "آپ کے لئے ضرور ہوگی۔ نہیں ہوگی تو وہ نکال لیں گے۔ وہاں اسسٹنٹ مینجر میرا بھائی ہے۔ میں اس سے کہہ دوں گا۔"

"تھینک یو" میں نے کہا "اب یہ بھی بتادو کہ ہم اپنا لباس کہاں تبدیل کریں؟"

"میرے کوارٹر میں کرلیں" وہ بولا "قریب ہی ہے مگر میری بیوی.......خیر۔"

میں نے کہا "تمہاری بیوی شک کرے گی؟"

"ہاں۔ اپنی فطرت سے مجبور ہے۔ وہ بنگالن ہے اور مسلمان ہے اس لئے تم سے تعصب بھی قدرتی بات ہے" وہ بولا۔

"یہ عجیب بات ہے۔ تم بدھ اور وہ مسلمان۔ تمہیں کیسے قبول کرلیا تھا اس نے؟"

"وہ اور بات تھی" وہ مسکرایا "اس بات کا تعلق عقل سے نہیں جذبات سے تھا اور وہ پرانی بات ہوگئی۔ اب تو ساتھ نباہ رہے ہیں۔"

اس کا کوارٹر دیکھ کے مجھے تعجب ہوا۔ کثرتِ آبادی کے باعث بنگال میں عموماً اور ڈھاکا شہر میں خصوصاً جگہ نایاب ہے اور یہ بڑے گنجان آباد شہر کا المیہ ہے کہ وہاں اکثر لوگ ڈربے جیسے گھروں میں رہتے ہیں جن کو دیکھ کر لگتا ہے کہ ان میں چلنا پھرنا تو کجا' سانس لینا بھی مشکل ہوگا۔ مگر یہ کوارٹر خاصا کشادہ اور خوب صورت تھا۔

اندر جانے سے پہلے میں نے کہا "یار' یہ تو بتادو کہ ہمیں تمہاری بیوی کے سامنے کیا کہنا ہے اور کیا نہیں کہنا ہے۔ ابھی تک تم نے اپنا نام تک نہیں بتایا۔"

"تم نے کب بتایا ہے" وہ بولا "میں جے دیو ہوں اور میری بیوی ہے کستوری بیگم۔ یہ گھر اسی کا ہے جس میں ہم رہتے ہیں۔ اس کا باپ بڑا آدمی تھا۔ بڑے سے میری مراد ہے پیسے والا۔ اس نے سب بیٹیوں اور بیٹوں کے نام ایک ایک مکان خرید کے ڈال رکھا تھا۔ اپنا کالا دھن چھپانے کے لئے۔ چنانچہ یہ مکان نہیں چھن سکا وہ بنی سے۔"

ہم نے اپنے نام بتائے تو اس نے کسی خاص ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔ اگر وہ ہمارے پس منظر سے واقف ہوتا تو چونکتا۔ اس کی بیوی کستوری ایک خوب صورت عورت تھی۔ اس نے ہمیں خوش آمدید نہیں کہا تو ہماری موجودگی پر ناگواری کے جذبات کا اظہار بھی نہیں کیا۔ ہم نے بہتر یہی سمجھا کہ لباس بدلتے ہی وہاں سے نکل جائیں۔ جے دیو بعد میں اپنی بیوی کے سامنے کیا وضاحت پیش کرتا ہے' یہ اس کا کام تھا۔

دوپہر سے کچھ پہلے ہم ہوٹل شاہ باغ پہنچے۔ حسبِ توقع ڈیسک پر بیٹھی ہوئی لڑکی نے ہمیں ہری جھنڈی دکھادی۔ عام حالات میں اس کا رویّہ معزز مہمانوں کے ساتھ شائستگی آمیز ہوتا ہوگا اور وہ ان کا خیر مقدم بڑی میٹھی مسکراہٹ سے کرتی ہوگی مگر ایک انار کے طلب گار سو بیمار ہوں تو انار بیچنے والا کیسے سب کو خوش آمدید کہے۔ اور کیا ضرورت ہے اسے خود کو اچھا سیلز مین ثابت کرنے کی۔ اس نے خاصے روکھے اور حوصلہ شکن لہجے میں بتادیا کہ کمرا تو وی آئی پی کے لئے بھی نہیں ہے کیوں کہ جتنے وی آئی پی ہیں وہ سب پہلے سے وہاں پناہ گزیں ہیں۔

میں نے باہر آکے جے دیو سے یہ صورت حال بیان کی۔

اس نے کہا "مجھے تو معلوم تھا مگر میں نے سوچا' شاید سیدھے طریقے سے مقصد پورا ہوجائے۔ اب میں چور دروازہ کھولتا ہوں۔ تم یہیں میرا انتظار کرنا۔ میں اپنے بھائی کو لے کر آتا ہوں۔ اور ہاں' ایک ضروری بات......"

"کہو۔ رک کیوں گئے؟"

"میرا بھائی میری طرح نہیں ہے" وہ بولا۔

"کیا مطلب؟ وہ بدھ مذہب کا پیروکار نہیں ہے؟"

"مہاتما بدھ کی تعلیمات کو تو مانتا ہے مگر ان پر عمل نہیں کرتا" وہ بولا "خصوصاً کاروبار کے معاملات میں۔"

میں نے کہا "یہ تو دنیا کا چلن ہے۔ ایسے ہی لوگ کامیاب ہیں جو دین و دنیا سے الگ رکھتے ہیں اور اسے جائز قرار دے سکتے ہیں۔"

غالب نے کہا "ہم اس سے سودا کرلیں گے۔ تم کو اپنے بھائی کے لئے یا کسی اور کے لئے شرمسار ہونے کی ضرورت نہیں۔"

جے دیو چلا گیا تو مجھ پر انکشاف ہوا کہ گل موجود نہیں ہے۔ ٹیکسی میں صرف نازو بیٹھی ہوئی تھی۔

"یہ گل بانو کہاں چلی گئی؟" میں نے کہا۔

غالب نے انگلی سے اشارہ کیا لیکن زبان سے کچھ نہیں کہا۔

میں نے اُدھر دیکھا تو گل ہوٹل کے سامنے والے کھمبے کا طواف کررہی تھی۔ اس کی نظر نیچے سے اوپر تک لگے ہوئے پوسٹروں اور اشتہاروں کے درمیان اس پیغام کو تلاش کررہی تھی جس کی آس میں ہم اس شہرِ بے وفا تک عذاب کے ہزار مرحلوں کا سفر طے کرکے پہنچے تھے۔

مین گیٹ کے سامنے تین کھمبے تھے مگر ان سب پر سیاسی اور اشتہاری پوسٹر ایک کے اوپر ایک چپکائے گئے تھے۔ ان سب کے نیچے یا بیچ میں کہیں محسن نے ہمارے لئے کوئی پیغام چھوڑا تھا تو ابھی تک گل کی نظر نے نہیں دیکھا تھا اور یہ خاصی مایوس کرنے والی بات تھی۔ گل کی بے قرار نگاہیں اس تحریر کو سب سے پہلے دیکھ سکتی تھیں مگر شاید وہاں اس کے دلِ مضطر کی تسکین کا سامان تھا ہی نہیں۔ میں اسے گردوپیش سے بے خبری کی کیفیت میں ہر کھمبے کے گرد چکر لگاتے اور پوسٹر کھرچ کر اکھاڑتے دیکھتا رہا۔ وہ دیوانہ وار تہہ در تہہ چپکے ہوئے پوسٹر اتار رہی تھی۔

میں نے غالب سے کہا "یار' یہ کیا خود کو تماشا بنانا چاہتی ہے؟ ابھی لوگ جمع ہوجائیں گے۔"

نازو نے پریشانی سے کہا "تم جا کے اسے واپس لاؤ۔"

"اسے جانے ہی کیوں دیا تھا تم نے؟" میں نے کہا۔

"نہ اس نے اجازت لی تھی ہم سے' نہ کچھ کہا تھا۔ اُتر کے چل پڑی۔ نازو نے پوچھا تو کہنے لگی کہ میں دیکھ آؤں...."

میں تیز تیز قدموں سے سڑک عبور کرکے گیا۔ اس وقت تک تین چار آدمی دلچسپی اور حیرانی سے ایک خوب صورت' تعلیم یافتہ اور مہذب نظر آنے والی لڑکی کا شغلِ دیوانگی دیکھ رہے تھے اور اس کے جنون اور وحشت پر خندہ زن تھے۔

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا تو ایک شخص سامنے آگیا۔

"کیا کرتا ہے؟" اس نے بدمعاشوں کی طرح سینہ تان کے کہا۔

ادھر گل نے مزاحمت کی اور اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتی رہی "چھوڑو مجھے' چھوڑو' میں نہیں جاؤں گی۔"

وہ ہسٹریا میں مبتلا ہوگئی تھی۔ یہ مایوسی کا خفیف سا جھٹکا تھا جس نے یکلخت اسے جذباتی عدم توازن کے تاریک خلا میں گرادیا۔ بالکل اسی طرح جیسے برسوں ایک کنکر کی نوک پر قائم رہنے والی چٹان طوفانِ باد و باراں یا زلزلے سہہ جاتی ہے مگر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ پرندہ پھڑپھڑائے تو ہوا کا جھونکا اسے گرادیتا ہے۔

بدمعاش نے میرا کالر پکڑلیا "اے بابو! چھوکری کو زبردستی لے جاتا ہے۔ یہ تیرا کیا لگتا ہے؟"

میں نے بڑی مشکل سے گل کو قابو کیا تھا۔ بدمعاش یہ سمجھ رہا تھا کہ میں گل کو زبردستی اور اس کی مرضی کے خلاف لے جارہا ہوں۔ شاید وہ خود کچھ غلط عزائم رکھتا تھا۔ اس نے سوچا ہوگا کہ

اس پاگل عورت کو اپنے ساتھ لے جانا کوئی مشکل کام نہ ہوگا۔ میں نے مداخلت کی تو وہ مشتعل ہوگیا۔

میں نے کہا "میرا کالر چھوڑو' ورنہ....."

"ورنہ کیا...." اس نے مجھے گالی دی "اپن تیرا تھوبڑا بگاڑ دے گا سالا۔"

وہ اپنی زبان' لہجے اور داداگیری کے انداز سے بمبئی کا لگتا تھا۔ اس کی بکواس پر کچھ لوگ اور اکٹھے ہوگئے تھے۔ گل میری گرفت سے نکلنے کے لئے مچل رہی تھی اور یہ تماشا تادیر جاری نہیں رہ سکتا تھا۔ مجھے غصہ غالب اور نازو پر بھی آرہا تھا جو دور ٹیکسی میں مزے سے بیٹھے تھے۔ وہ میری مدد کے لئے آجاتے تو میں گل کو ان کے حوالے کرتا اور بدمعاش خود دفع نہ ہوتا تو میں اس کی اکڑفوں نکال کے خود بھی نکل جاتا۔ مگر وہ تو جیسے اِدھر دیکھ ہی نہیں رہے تھے۔ اصل بات یہ تھی کہ ان کے اور میرے درمیان تماشا دیکھنے والے حائل ہوگئے تھے۔

جب اور کوئی چارہ نہ رہا تو میں نے گل کے پاؤں پر اپنا پاؤں مارا۔ وہ درد سے بلبلائی مگر ایک جھٹکے سے اس کا ذہن سنبھل گیا۔ میں نے اسے چھوڑا تو وہ لڑکھڑائی اور نیچے گر گئی۔

"اب بتاؤ' تم کو کیا اعتراض ہے' اگر میں اپنی بہن کو واپس لے جانا چاہتا ہوں؟" میں نے بدمعاش کے ہاتھ سے اپنا کالر چھڑا کے اس کی گردن دبوچ لی۔

"ارے۔ سالا... گردن چھوڑ۔ تیرا تو..... ابھی پہلے کاہے کو نئیں بولا کہ یہ تیرا بہن ہے" وہ خود کو چھڑانے کی جدوجہد کرتے ہوئے بولا۔

میں جھگڑا نہیں چاہتا تھا "جاؤ۔ آئندہ ہر معاملے میں ٹانگ مت اُڑانا اور یہ مت سمجھنا کہ ہر شریف نظر آنے والا کمزور بھی ہوتا ہے۔"

بدمعاش نے بھی اپنے جارحانہ عزائم سے دستبرداری میں ہی عافیت جانی۔ کچھ فاصلے پر فوجی موجود تھے اور جھگڑے کی صورت میں وہ کسی سے بھی کچھ نہ پوچھتے' سب کو پکڑ کر لے جاتے اور بُرا حشر کرتے۔ آمرانہ اختیارات نے بھارتی فوج کو دہلی میں قتل عام کرنے والی نادر شاہ کی فوج بنا دیا تھا۔

اسی وقت ایک نئی صورتِ حال نے جنم لیا۔ مجمع میں سے کسی نے کہا "شاید پاکستانی۔"

اس کے لہجے میں نفرت اور حقارت تھی۔ پاکستان کا لفظ اس نے کسی گالی کی طرح ادا کیا تھا۔ ایک اور شخص نے بنگالی میں چیخ کر کچھ کہا' تیسرے نے کہا "پان جابی گونڈا شالا" چوتھے نے مجھے پٹھان کہا اور اس کے ساتھ ہی دلال۔ میں نے مشتعل ہونے سے گریز کیا اور گل بانو کو اٹھا لیا مگر مجمع اتنی دیر میں عداوت کے جذبات کی رو میں بہنے لگا تھا۔

اس وقت ایک عجیب بات ہوئی۔ اس بدمعاش نے لمانی دار چاقو نکال لیا۔ میں نے پھل کے دستے سے برآمد ہونے کی مخصوص آواز سنی۔

"سالا' محمد بھائی کا سامنے گالی دیتا ہے۔ پاکستانی ہے تو کیا ہوا' ہے چھوکری کا۔ کون سالا اس کو دلال بولا؟ سامنے آوے' اپن کا پیٹ پھاڑ دے گا۔ بولو کون حرامی اس کو گالی دیا؟ ابھی ایک سارا اندر کا مال باہر کرے گا۔"

اسی وقت غالب بھی نمودار ہوا "کیا بات ہے؟"

میں نے کہا "کچھ نہیں۔ بات ختم ہوگئی۔ گل کو لے کر یہاں سے چلو۔"

مجمع کا جوش و خروش محمد بھائی کے خنجر کی آب دیکھتے ہی سرد پڑ گیا تھا۔ پلک جھپکتے میں شرپسند کھسک گئے لیکن فوجی نمودار ہوگئے۔

"کیا ہو رہا ہے یہاں؟" ایک کیپٹن نے گرج کے کہا "کیوں جمع ہیں اتنے سارے لوگ؟"

محمد بھائی نے بڑی صفائی سے چاقو غائب کر دیا اور لمبی لمبی مونچھوں پر ہاتھ پھیر کے بڑے میٹھے' خوشامدانہ لہجے میں بولا "کچھ نہیں کرنل صاحب' ابھی یہ شریف آدمی اپنی بہن کو لے جاتا ہے سالا....."

کیپٹن نے مجھے دیکھا اور پھر گل کو "کیا پرابلم ہے؟"

میں نے پُرسکون لہجے میں کہا "کچھ بھی پرابلم نہیں۔ یہ میری بہن ہے۔ ہم یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ شاہ باغ میں۔ یہ باہر نکل آئی تھی اور میں اسے زبردستی واپس لے جا رہا تھا۔ کچھ لوگ غلط سمجھے۔"

"کیا ثبوت ہے کہ یہ تمہاری بہن ہے؟" کیپٹن میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بولا۔

"اسی سے پوچھ لو۔"

ایک شخص نے موقعے سے فائدہ اٹھایا "سر' یہ کھمبا نوچ رہی تھی۔"

ایک مسخرے ٹائپ شخص نے کہا "کھسیانی بلّی....."

کیپٹن نے اسے گھورا تو وہ خاموش ہوگیا "زبردستی کیوں کی تم نے؟"

میں نے کہا "سر' آپ تو جانتے ہیں باہر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ بے شک آپ لوگ موجود ہیں ہماری حفاظت کے لئے مگر...."

ایک اور شخص نے میری بات کاٹ دی "اس سے پوچھیں کہ یہ کھمبوں پر سے پوسٹر کیوں پھاڑ رہی تھی؟"

میں نے خود ہی اسے جواب دے دیا "اس لڑکی کو کسی کا انتظار تھا۔ اس نے کہا تھا وہ اس کھمبے پر پیغام چھوڑ جائے گا۔ ان کا چکر چل رہا تھا لیکن وہ اچھا آدمی نہیں ہے اور شادی شدہ بھی ہے۔ اب واپس مغربی پاکستان جانے کے لئے تیار بیٹھے ہیں تو اس پر پاگل پن سوار ہے۔ اس کا پیغام نظر نہیں آیا تو دورہ پڑ گیا..."

کیپٹن مسکرایا۔ گل بانو کا چہرہ شرم سے لال ہوگیا تھا۔ وہ سب کی نظروں میں مجرم بن گئی تھی اور اچھی طرح سمجھ رہی تھی کہ میری پوزیشن اس کی وجہ سے خراب ہو رہی ہے۔ اس نے ندامت سے سر جھکا کے گویا میری بات پر مہرِ صداقت ثبت کی۔

محمد بھائی نے کہا "ابھی جاؤ۔ لڑکی لوگ کو سمجھاؤ' عزت کا معاملہ ہے' کچھ خیال کرے۔ کیا؟"

میں نے کہا "تھینک یو کیپٹن۔ تم نے بروقت مدد کی۔"

کیپٹن واپس لوٹ گیا مگر جاتے جاتے محمد بھائی کو مشورہ دے گیا کہ اتنی بڑی مونچھیں نہ رکھے جو اس کی بدمعاشی کا سائن بورڈ نظر آئیں۔

"سالا حرامی۔" محمد بھائی نے اس کے جاتے ہی کہا "ابھی اس کا پاس بندوق نہ ہوتا تو اپن اس کو مونچھوں سے لٹکا کے پھانسی دیتا۔ کیا؟"

میں نے کہا "محمد بھائی! تم بھی جاؤ۔ جو کچھ ہوا اس کے لئے سوری۔"

محمد بھائی نے میرے کندھے پر ہاتھ مارا "اپن غلط سمجھا۔ تم اپن کو معاف کر دیا۔ ابھی کوئی کام بولو۔ تم پاکستانی ہے تو اپن کون ہے؟"

"تم پاکستانی ہو؟" میں نے چلتے ہوئے کہا۔

وہ میرے ساتھ چلنے لگا "یہ سب پاکستانی ہے۔ کل تک تھا۔ آج کیا ہوگیا سالا لوگ کو؟ سب کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ اپن تو اُدھر کراچی میں پیدا ہوا۔ اُدھر لیاری میں بڑا ہوا۔ شادی بنایا۔ اپن کا فیملی اُدھر ہوتا۔ اپن آج بھی پاکستانی' کل بھی۔"

میں نے مصافحہ کر کے اس سے جان چھڑانے کی کوشش کی مگر وہ ٹلنے پر آمادہ نظر نہ آتا تھا۔ ٹیکسی کے پاس غالب نے گل کو نازو کے سپرد کر دیا تھا اور خود کسی اجنبی سے باتیں کر رہا تھا۔ یہ جے دیو کا بھائی ہی ہو سکتا تھا۔ جے دیو کے مقابلے میں وہ بہت لمبا چوڑا اور ہٹا کٹا تھا۔ یہ غالباً ہر روز مرغن غذائیں اور مالِ مفت سے حاصل ہونے والی خوشحالی کا نتیجہ تھا۔

میرے پہنچنے تک کاروباری معاملات طے پا چکے تھے۔ جے دیو کا دیوزاد بھائی واپس چل پڑا تھا اور جے دیو ٹیکسی میں بیٹھ رہا تھا۔ غالب نے میرے ساتھ آنے والے چھ انچ سے بھی زیادہ لمبی' گھنی اور اکڑی ہوئی مونچھوں والے محمد بھائی کو غور سے دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھا کہ یہ کیا چیز ہے۔

میں نے اسے اشارہ کیا کہ ٹیکسی میں بیٹھ جائے اور خود پھر محمد بھائی سے ہاتھ ملایا "اچھا محمد بھائی......"

"تم اِدھر سے جانے کا ہے؟" اس نے کہا۔

"ہاں۔ بس کچھ بندوبست ہوگیا ہے" میں نے جان چھڑانے کے لئے کہا۔

"اچھا۔ اپن کا ایک کام کرو" اس نے اِدھر اُدھر دیکھ کے نیفے سے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی "تم کراچی جاتا پڑا ہے۔ یہ اُدھر اپنا فیملی کو دے گا۔ ابھی ایڈریس لکھو۔"

میں بھونچکا رہ گیا "محمد بھائی.... اتنی بڑی رقم...."

"دس ہجار ہے۔ بہت بڑا رقم نئیں ہے۔ ابھی تم پتا لکھو۔ اُدھر اپنا ماں ہے اور بی بی لوگ ہے۔ ان کو بولے گا.... کیا..."

میں نے کہا "محمد بھائی! یہ تم کیا کر رہے ہو؟ تمہیں ہمارا نام پتا کچھ معلوم نہیں۔ ہم یہ رقم لے کر بھاگ گئے تو..."

اس نے قہقہے کے ساتھ میرے کندھے پر ہاتھ مارا "ابھی محمد بھائی ایسا پاگل نئیں ہے۔ آدمی کا تھوبڑا دیکھتا ہے اور اندر تک سب جان لیتا ہے۔ کیا؟ کون اندر سے بے ایمان ہے' کون شریف ہے۔ اتنا ٹائم پاس کیا' کراچی' بمبئی' کلکتہ' سب جگہ رہا۔ اپن کو مالوم ہے تم جھوٹ نئیں بول سکتا۔ محمد بھائی کو دھوکا نئیں دے سکتا۔"

مجھے سخت شرمندگی ہوئی "دیکھو محمد بھائی! وہ میں نے اس کیپٹن کے سامنے تھوڑا سا جھوٹ بولا تھا۔ ہم جا نہیں رہے ہیں' ابھی آئے ہیں۔ شاہ باغ ہوٹل میں جگہ نہیں تھی۔"

اس کا چہرہ اتر گیا۔ اس نے رقم واپس سینے میں دبالی "اچھا۔ ابھی کدھر جائے گا؟ انٹر کان۔"

میں نے کہا "وہاں بھی جگہ نہیں ملے گی...."

"ابھی محمد بھائی بولے گا تو ایک دم جگہ ملے گا۔ اِدھر اپن کو انکار کون سالا کرے گا۔ کیا؟ تم بولو..."

میں نے کہا "بہت بہت شکریہ محمد بھائی۔ لیکن یہاں بندوبست ہوگیا ہے۔ اس ٹیکسی ڈرائیور نے مدد کی تو جگہ مل گئی ہے۔"

غالب نے کہا "ہاں۔ ہم پیچھے سے جائیں گے۔"

غالب اور جے دیو کے علاوہ گل اور نازو بھی خوف اور دلچسپی کے ساتھ محمد بھائی کو دیکھ رہی تھیں جو چہرے مُہرے سے کسی طرح بھی شریف آدمی نظر نہیں آتا تھا اور اس کیپٹن نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اتنی بڑی مونچھیں اس کی بدمعاشی کا سائن بورڈ تھیں۔

محمد بھائی نے کہا "اچھا۔ اپن کا واسطے کوئی کام بولو۔ کیا؟ اپن اِدھر نئیں ملے گا تو کسی سے پوچھو۔ بیرا لوگ سے' ٹیکسی والوں سے کہ محمد بھائی کو بولنے کا ہے۔ اپن کو مالوم ہو جائے گا۔"

پھر اس نے ایک عجیب حرکت کی۔ وہ ٹیکسی پر جھکا اور ہاتھ جوڑ کے گل سے مخاطب ہوا "اپن غلطی کیا بہن۔ ابھی میرے کو ماف کرنے کا ہے۔ پر دیکھ تو بھی تھوڑا خیال کر اپنی عزت کا۔ کیا؟"

گل پانی پانی ہوگئی۔ اس نے بڑی مشکل سے سر ہلایا۔ پھر میں ٹیکسی میں بیٹھا اور محمد بھائی پلٹ کے روانہ ہوگیا۔ وہ چھ فٹ سے نکلتے قد کا بھاری بھرکم آدمی تھا۔

"یہ کیا عجیب کیریکٹر تھا؟" غالب نے کہا "ایسی بلندی' ایسی پستی' اتنی بدمعاشی اور یہ عاجزی۔"

میں نے کہا "بڑے اور اصلی بدمعاش ایسے ہی ہوتے ہیں۔ شہدے' لفنگے اور خاندانی بدمعاش کے رویے میں وہی فرق ہوتا ہے جو خاندانی رئیسوں کے اور نودولتیوں کے خرچ کے انداز میں نظر آتا ہے۔ خیر گولی مارو اسے۔ تم یہ بتاؤ رہائش کے مسئلے کا کیا بنا؟"

"پانچ سو روپے نذرانہ وصول کیا جے دیو کے بھائی نے۔"

جے دیو شرمندگی سے بولا "میں نے کہا تھا نا کہ وہ بہت مختلف ہے۔"

"تم کیوں شرمندہ ہوتے ہو" غالب نے کہا اور پھر مجھ سے مخاطب ہو گیا "ہوٹل میں تو جگہ تھی نہیں۔ سرونٹ کوارٹر میں اس کا اپنا کمرا ہماری خوش نصیبی کے باعث دستیاب تھا۔ آج ہی خالی ہوا تھا۔ وہ سو روپے روز پر ہمارا ہو گیا۔"

"کیا مصیبت ہے سو روپے روز میں سرونٹ کوارٹر۔"

"اس کا کہنا ہے کہ آرام اور آسائش میں کمی نہیں ہوگی۔ ہوٹل کی سروس دستیاب ہوگی اور ہمیں گھر کا آرام ملے گا" غالب نے کہا۔

"کتنے کمرے ہیں؟"

"دو۔ باتھ روم ایک ہے۔ ٹیلی فون کی لائن رات کو جوڑ دی جائے گی" غالب نے کہا "کوئی سوال جواب نہیں کرے گا۔"

نازو نے کہا "میرا تو خیال ہے کہ یہ بہتر انتظام ہو گیا۔ ہوٹل میں اپنا نام لکھواتے۔ آتے جاتے لوگوں سے ڈر رہتا۔ انٹیلی جنس والے بھی نظر رکھتے ہوں گے۔"

ٹیکسی رک گئی اور جے دیو نے کمپاؤنڈ وال کے چور دروازے سے ہمارا اسباب اندر پہنچا دیا۔

"میرا بھائی لالچی ہے مگر دل کا اچھا ہے۔ ہر آدمی کی کوئی نہ کوئی کمزوری تو ہوتی ہے" جے دیو بولا "اگر پھر میری ضرورت پڑے تو اس سے کہہ دینا، مجھے پیغام مل جائے گا۔"

اس کے جانے کے بعد غالب نے کہا "کیسا کھیل ہے قسمت کا۔ کہاں تو منزل تک سب راستے بند محسوس ہوتے تھے اور یہاں آ کے لگتا ہے کہ سارے بند دروازے کھلتے جا رہے ہیں۔ ایک پولیس مین، ایک بدمعاش اور ایک ٹیکسی ڈرائیور رضاکارانہ طور پر اپنی خدمات پیش کر چکے ہیں۔"

"یہ باتیں کیا بعد میں نہیں کر سکتے؟" نازو نے کہا "پہلے بندوبست کرو کچھ کھانے کا۔"

"میں کیا بندوبست کروں۔ بازار سے کھانا لاؤں۔"

میں نے کہا "دیکھو، شاید جے دیو کا بھائی خود ہی پوچھنے آ جائے۔ لو، نام لیا شیطان کا اور وہ حاضر۔"

دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ میں نے دروازہ کھولا تو جے دیو کا بھائی موجود تھا "سر! کیا کھائیں گے آپ؟"

"پورا ہوٹل" غالب نے کہا "کھانے پینے کی جتنی بھی چیزیں اس وقت دستیاب ہیں سب لا کے یہاں ڈھیر کر دو۔"

"لنچ کا مینو" اس نے ایک فولڈر بڑھایا۔

غالب نے اس کو کھول کے دیکھا "نمبر ایک سے نمبر ایک سو ایک تک سب لے آؤ۔ کولڈ ڈرنک بھی، کافی بھی، آئس کریم بھی۔ کیا نام ہے تمہارا؟"

"اشوک" اس نے کہا "کیا واقعی یہ سب لانا ہے؟"

میں نے کہا "اشوک! ہم پہلے لنچ کریں گے۔ چار افراد کے لئے لنچ لاؤ اور جو اچھی چیز ہو وہ مناسب مقدار میں لے آؤ۔ زیادہ تم جانتے ہو کہ یہاں کیا کھانے کے قابل ہے اور کیا کے۔ اس کے بعد کافی۔ اور ہاں، جب واپس آؤ تو سگریٹ کارٹن لیتے آنا۔ اسٹیٹ ایکسپریس۔"

وہ میری بات ختم ہونے کے بعد بھی کھڑا رہا تو میں سمجھ نازو سے کہا کہ اسے کچھ ایڈوانس ادا کر دے تاکہ اسے اط حاصل ہو جائے کہ یہ کھا پی کے بل ادا کئے بغیر بھاگ جانے مہمان نہیں ہیں۔ نازو نے اسے ایک ہزار دئے تو اس نے نکال کے فرشی سلام کیا اور الٹے پاؤں واپس ہو گیا۔

"سب پیسے کے غلام ہیں۔" نازو نے کہا۔

"سوائے میرے۔ میں تمہارا غلام ہوں" غالب نے کہ دو تو اس کھڑکی سے کود جاؤں۔"

نازو ہنسنے لگی کیونکہ کھڑکی گراؤنڈ فلور پر زمین سے تین فٹ تھی۔ میں نے تولیہ اٹھا لیا اور باتھ روم میں گھس گیا۔ میل پسینہ اور تھکن اتارنے کے بعد مجھے یوں لگا جیسے میں ایک ہوں۔ تازہ دم، پُرامید، حوصلہ مند، پرانا سکندر بخت۔ میری لوٹ آئی اور زندگی پر میرا اعتماد بحال ہوتے ہی دنیا مجھے بد نظر آنے لگی۔ یہی باقی سب کے ساتھ ہوا، سوائے گل پژمردہ اور بجھی بجھی تھی۔ شرمندگی کے باعث وہ کچھ کہہ نہیں تھی ورنہ مطالبہ کرتی کہ ابھی چلو اور محسن کو تلاش کرو۔ میر کسی اور نے اسے کچھ بھی نہیں کہا تھا پھر بھی وہ احساسِ ندا شکار تھی۔

کھانے کے بعد کافی پینے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اس۔ ہی سب پر نیند نے حملہ کیا اور جو جہاں تھا وہیں سو گیا۔ مجھے فکر تھی۔ میں اسے سلانے کے بعد سویا۔ یہ بے ہوشی کی نیند جس میں زلزلہ بھی آ جاتا تو کسی کو پتا نہ چلتا۔

حسبِ توقع میری آنکھ کھلی تو باہر اجالا تھا۔ رات بیت چکی تھی۔ نازو مجھ سے پہلے بیدار ہوئی تھی اور گل شاید اس سے بھی پہلے ہی جاگ اٹھی ہوگی۔ وہ دونوں کھلی کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھیں۔ میں نے گھڑی دیکھی تو آٹھ بجے تھے۔ میں تقریباً سترہ اٹھارہ گھنٹے سوتا رہا تھا۔ میں نے غالب کو جگانے کی کوشش کی مگر اس پر اثر نہیں ہوا۔ نازو کچھ متفکر نظر آتی تھی مگر گل کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔

میں نے کہا "کیا بات ہے گل؟ تم کھلی جا رہی ہو۔"

اس نے نازو کی طرف دیکھا اور ہنسی "آپ سنیں گے تو بھی بہت خوش ہوں گے۔ محسن کا پتا چل گیا ہے۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا "کیا...... محسن......"

"جی۔ یہ دیکھئے" گل نے مسرت سے بے قابو ہو کے کاغذ کا ایک پُرزہ میری طرف بڑھا دیا "محسن کا پیغام۔ ہم لئے۔"

میں نے وہ پُرزہ لے لیا۔ میری نظر اس کی عبارت پر جم

میں نے کاغذ کے اس بوسیدہ پھٹے ہوئے پُرزے کو غور سے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ "یہ کہاں سے آیا؟"

گل نے بڑی امید سے بھرپور لہجے میں کہا۔ "یہ محسن نے لکھا ہے۔"

میں نے کہا۔ "مگر تمہارے پاس کہاں سے آ گیا یہ پیغام۔ کیا وہ خود دے گیا تمہیں؟"

گل ہنسی۔ "آپ مذاق کر رہے ہیں۔ میں لے کر آئی ہوں۔"

"تم باہر گئی تھیں؟" میں نے کہا "اکیلی؟"

"ہاں۔ سب سو رہے تھے۔ میں نے سوچا ایک نظر دیکھ آؤں ذرا۔ اچھا ہی کیا میں نے......"

"خاک اچھا کیا تم نے۔" میں نے دہاڑ کے کہا "کل اچھا خاصا تماشا بن گئے تھے ہم سب۔ کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی تم نے خود کو پاگل خانے اور ہمیں جیل خانے پہنچانے میں۔ بچا لیا اس بدمعاش منہ بھائی نے اور وہ کیپٹن بھی برا آدمی نہیں تھا ورنہ......"

گل رونے لگی "آپ تو بلاوجہ خفا ہو رہے ہیں مجھ پر۔ کیا غلطی کی ہے آج میں نے؟"

نازو نے مجھے گھور کے دیکھا اور گل کو تسلی دینے لگی "تم نے بالکل ٹھیک کیا تھا گل۔ سکندر کی بات کا برا مت مانو۔"

میں نے بے بسی سے نازو کو دیکھا "نازو! کل جو تماشا دیکھنے والے تھے وہی آج بھی دیکھ رہے ہوں گے۔ کیا سوچتے ہوں گے وہ کہ اس کھمبے میں ایسی کیا بات ہے۔ کیوں دیوانی ہے یہ لڑکی اس کھمبے کے پیچھے۔"

"مجھے کسی کی پروا نہیں۔" گل نے روتے روتے کہا "مجھے معلوم تھا کہ محسن کا پیغام ضرور ملے گا۔"

"گل، یہ محسن کا پیغام نہیں ہے۔ نہ اس کی ہینڈ رائٹنگ ہے، نہ کہیں نام ہے اس کا۔" میں نے کہا "یہ کسی چھپے ہوئے پوسٹر کا حصہ ہے۔"

"مگر اس میں صاف تو لکھا ہے۔ آج رات آٹھ بجے۔ پلٹن میدان۔ کیا مطلب ہے آخر اس کا؟ محسن نے جگہ بتا دی ہے اور وقت لکھ دیا ہے۔"

میں نے افسوس سے زیادہ گل کی ذہنی کیفیت پر دکھ محسوس کیا۔ وہ جذبات سے اس درجہ مغلوب تھی کہ عقل سے محروم ہو گئی تھی۔ وہ کسی پھٹے ہوئے پوسٹر کا ٹکڑا اتار لائی تھی جس پر اتنی ہی عبارت تھی۔ یہ کسی سیاسی جلسے کے وقت اور مقام کا اعلان ہوگا مگر گل نے اس ایک سطر کو محسن کا پیغام سمجھ لیا تھا۔ جب بھوک غالب ہو تو بقول شاعر۔ انساں کو چاند میں نظر آتی ہیں روٹیاں۔ ایسے میں جب عشق کا جادو سر چڑھ کے بولنے لگے تو جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے والی کیفیت ہو جاتی ہے۔ ہر صدا میں محبوب کی پکار سنائی دینے لگتی ہے۔ ہر تحریر اس کا پیغام بن جاتی ہے۔ جو راہ ادھر کو جاتی ہے مقتل سے گزر کر کرتی جاتی ہے...... پھر کوئی بچ کے کہاں جا سکتا ہے!

گل کی اور میری آواز سن کر غالب بھی اٹھ بیٹھا "کیا ہو گیا صبح صبح۔ فساد کیوں ہو رہا ہے؟"

میں نے کاغذ کا وہ پُرزہ غالب کو تھما دیا "گل کو یقین ہے کہ یہ محسن کا پیغام ہے۔"

غالب ہنس پڑا "پیغام یا اعلان۔"

میں نے کہا "ہنسنے کی بات نہیں۔ خاتون اکیلی نکل گئی تھیں اور یہ اسی کھمبے پر سے اتار لائی ہیں۔"

غالب نے کہا "باقی پوسٹر کیوں نہیں اتارا؟"

گل نے کہا "یہ پوسٹر نہیں تھا۔ بس اتنا ہی تھا۔"

"باقی تم نے کل پھاڑ دیا ہوگا" غالب بولا "اچھا ہوا شیخ مجیب یا بھاشانی کے کسی حامی نے نہیں دیکھا ورنہ ہنگامہ ہو جاتا۔"

میں نے کہا "یہ پرانا پوسٹر تھا۔ آج کل پلٹن میدان میں جلسے جلوس کہاں ہو رہے ہیں۔ ہم سو رہے تھے اور یہ پاگل لڑکی باہر نکل گئی تھی۔ اسے سمجھاؤ کہ عقل سے کام لے۔ یہ لاہور یا کراچی نہیں ہے۔"

نازو نے کہا "اب اس کا پیچھا چھوڑو خدا کے لئے۔ میں اسے سمجھا لوں گی۔"

"تم کیسے سمجھاؤ گی؟" غالب نے کہا "تم اس سے زیادہ ناسمجھ ہو۔"

نازو کے جواب دینے سے پہلے دروازے پر دستک ہوئی اور کوارٹر کے مالک کا متفکر اور ملول چہرہ نظر آیا۔

میں نے اسے خاموش دیکھ کر کہا "کیا بات ہے بھئی۔ ایسے کیا دیکھ رہے ہو ہمیں؟"

اس نے کہا "سر، آپ سے بات کرے گا۔"

میں نے کہا "بات کرنے سے کس نے روکا ہے تمہیں۔"

"ایک دم پرائیویٹ بات کرے گا۔" وہ بولا "آپ باہر آئے گا۔"

میں نے غالب کی طرف دیکھا اور سر ہلایا "ٹھیک ہے۔ باہر چلو۔"

میں اس کے ساتھ باہر چلا گیا۔ وہ کوارٹر کی سائیڈ میں کھڑا ہو گیا "سر، ہم بہت غریب آدمی ہوتا۔"

میں نے کہا "ہم بھی کسی ریاست کے نواب یا کوئی صنعت کار، بنکار وغیرہ نہیں ہیں۔ غریب ہی ہیں۔"

اس نے کہا "ہم بہت ڈرتا ہے۔ خدا سے۔ قانون سے۔ بیوی سے۔"

میں نے مسکرا کر کہا "ہر شریف آدمی ڈرتا ہے۔"

"رات کو پولیس آتا۔ رجسٹر چیک کرتا۔ منیجر سے بک بک کرتا پھر ملٹری آتا۔ سب دیکھتا۔ سارا کمرا میں جاتا۔"

میں نے کہا "ہوٹل کی تلاشی لی ملٹری نے؟"

"پولیس کا ساتھ ملٹری آتا۔ آپ کو پوچھتا۔" وہ بولا۔
میں نے چونک کر کہا "ہمیں ..... کیا مطلب : انہیں کیسے معلوم ہوا ہمارے بارے میں؟"
"یہ ہم نہیں جانتا۔ ہمارا بھی پیشی ہوتا۔" وہ بولا "سب ویٹر' شیف' ڈش واشر ہیلپر لوگ کو بلاتا۔ انڈین پولیس کا ایک اے ایس پی بوہت شور کرتا۔ گالی بکتا سالا۔"
میں نے سوچ کر کہا "اے ایس پی..... کیا حلیہ تھا اس کا؟"
اس نے حلیہ بتادیا۔ یہ اسی اے ایس پی کا حلیہ تھا جس کو ہم زبردستی اپنا راہنما بنا کے ڈھاکا تک لائے تھے۔ غالب کے اندیشے درست ثابت ہوئے تھے۔ وہ ہمیں اپنی باتوں سے اور اپنی اداکاری سے یقین دلانے میں کامیاب رہا تھا کہ اس کا دل ہماری طرف سے بالکل صاف ہے۔ اب ہم دشمن نہیں دوست ہیں جب کہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ اس نے موقع پاتے ہی ہمارا تعاقب شروع کر دیا تھا اور ہمارے بارے میں قانون نافذ کرنے والے اداروں کو ضروری معلومات فراہم کر چکا تھا۔ وہ اس کے ساتھ ہر ہوٹل میں چھاپے مارتے پھر رہے تھے۔ عام حالات میں اعلیٰ درجے کے ہوٹل جہاں معززین اور وی آئی پی قسم کے لوگ قیام کرتے ہیں' قانون کے لمبے ہاتھوں کی دسترس سے محفوظ رہتے ہیں اور وہاں پس پردہ عیش و عشرت کے جملہ لوازمات جو عوام کے لئے گناہ اور جرم کا درجہ رکھتے ہیں' بطور استحقاق فراہم کئے جاتے ہیں۔ ساغر شراب سے میخانہ شباب تک۔
مگر یہ عام حالات نہیں تھے۔ بڑے بڑے ہوٹلوں میں غیر ملکی سفارت خانوں کے اہلکار۔ سابقہ حکومت پاکستان کے نمائندے۔ وزرا اور بیوروکریٹ۔ صنعت کار اور سیاست داں پناہ گزیں تھے۔ ان میں سے بہت سے نئی حکومت کو مطلوب تھے یا انقلابی ہائی کمان کے نقطۂ نظر سے مجرم تھے چناں چہ تمام مراعات اور تحفظات کے باوجود "ملک دشمن عناصر" کے لئے کہیں بھی جائے امان نہ تھی اور ہم اپنا شمار ایسے ہی لوگوں میں کر سکتے تھے۔ یہ ستم ظریفی حالات کی تھی جس نے ہماری حب الوطنی کی سند کو فرد جرم بنا دیا تھا۔ یہاں ہم اس لئے بھی مجرم تھے کہ پاکستانی تھے اور اس لئے بھی کہ ہم نے بنگلہ دیش کے دوستوں سے دشمنی کی تھی۔ ان دوستوں میں چوہدری دلاور جیسے لوگ شامل تھے۔ تریونی تھا اور کرنل تھا۔
"سر' آپ ناراض مت ہوتا؟"
میں نے کہا "ناراض ..... کس بات پر ..... تم نے جو کچھ کہا....."
"ہم غلط کرتا۔ ہم پکڑا جاتا تو مارا جاتا۔ گاڈ ہم کو ایک بار بچالیا۔ بار بار نہیں بچاتا۔ آپ ادھر سے جاتا۔ بڑا بہت مہربانی ہوتا۔ ہم کسی کو نہیں بولتا۔"
میں نے کہا "تم بلاوجہ ڈر رہے ہو۔ ہمیں کون تلاش کرنے آئے گا۔ کیا کسی نے نام لیا تھا ہمارا؟"
"وہ آپ کا نام لیتا۔ سکندر بابو۔ محسن بابو اور آپ کا لوگ کا نام بولتا۔ رابعہ بی بی' نازو بی بی۔"
میں نے اپنی جذباتی کمزوری اور خوف کا اظہار نہیں ہونے دیا اور مسکرا کے بولا "مگر یہ ہمارے نام نہیں ہیں۔"
"وہ حلیہ بتاتا۔ ایک دم آپ کا۔"
میں نے ہنس کے کہا "کیا خاص بات ہے ہمارے حلیے میں۔ ایسے تو نہ جانے کتنے لوگ اس ہوٹل میں مقیم ہوں گے۔"
میرے اعتماد نے اسے چکرا دیا "پھر آپ..... کون ہوتا؟"
"یہ تم نے اس وقت کیوں نہیں پوچھا تھا جب ہم آئے تھے؟" میں نے کہا۔
"ہمارا بھائی' جے دیو آپ کو لاتا۔"
"دیکھو' تم چاہو تو ہم اپنے پاسپورٹ دکھادیں۔ آؤ' اندر آؤ۔ یہ بات تم سب کے سامنے بھی کر سکتے تھے۔"
میں نے اندر آ کے کہا۔ "بھئی رکمنی' اس کو ذرا سب کے پاسپورٹ دکھادو۔ ویسے میں بتاتا ہوں۔ یہ رکمنی ہے اور یہ راجن مسٹر اور مسز راجن۔ یہ پارو ہے اور میں ہوں کمار۔ ہم سب کے پتے اچھی طرح دیکھ لو۔"
نازو نے سمجھ لیا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ غالب نے گل نے بھی کسی حیرانی یا پریشانی کا اظہار نہیں کیا۔ سوٹ کیس سے ہم سب کے انڈین پاسپورٹ نکال کے پیش کر دیئے گئے۔ تذبذب اور احساس ندامت میں مبتلا تھا۔ معزز مہمانوں پر شک کرکے اس نے آدابِ میزبانی کی سخت خلاف ورزی کی تھی انعام و اکرام حاصل کرنے کے مواقع گنوا دیئے تھے۔
"سوری۔ سوری سر....... اپن غلط سمجھا۔"
میں نے کہا "اب تسلی کر لو اپنی" میں نے اسے زبردستی پاسپورٹ تھمادیئے "تاکہ تمہارے دل سے ڈر نکل جائے ہمیشہ کے لئے......"
غالب نے کہا "ہاں۔ ایسا نہ ہو کل پھر کوئی تمہیں بدگمان کردے۔" اس نے پاسپورٹ کھول کر دیکھے۔ ہماری تصویریں اصلی تھیں اور کسی دوسرے شخص کے پاسپورٹ پر فوٹو چینج یونٹ کی مدد سے نہیں لگائی گئی تھیں۔ پاسپورٹ بھی اصلی تھے اس پر لگی ہوئی ہر مہر بھی۔ اشوک نے ان کا معائنہ کسی ماہر کی طرح کیا۔ تمام اندراجات کا مطالعہ فرمانے کے بعد اس نے بھویں چڑھا کے ایک انگلی سے ناک کھجائی۔
"اس پر ویزا اسٹمپ اور تاریخ نہیں ہوتا۔"
وہ ایک ایسے ہوٹل کا ویٹر تھا جہاں ہر ملک کے شہری قیام کرتے تھے۔ قاضی جی کے گھر کے چوہے بھی سیانے مشہور ہیں۔ اشوک کو اتنی آسانی سے بے وقوف نہیں بنایا جا سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ پاسپورٹ میں کیا ہیرا پھیری ہوتی ہے۔
میں نے کہا "ہاں۔ وہ ہم لگوالیں گے۔"

"ابھی..... ادھر کیسے ہوتا؟"
میں نے کہا "تم فکر مت کرو۔ دنیا میں سب کچھ ہوتا۔"
"دنیا میں تو بہت گڑبڑ ہوتا......"
میں نے اس سے اتفاق کیا اور پاسپورٹ واپس لے لیا "پیسہ ہو تو کوئی گڑبڑ نہیں ہوتی۔ سارے کام ٹھیک ہو جاتے ہیں۔"
اس وضاحت نے اشوک کو مطمئن نہیں کیا "ہم جانتا...... مگر......"
غالب نے کہا "دیکھو مسٹر اشوک کمار! جب ہم کلکتہ سے روانہ ہوئے تو بہت جلدی میں تھے۔ ہمیں فوراً یہاں پہنچنا تھا۔ دیر ہو جاتی تو بہت بڑا نقصان ہو جاتا۔ ہم نے ویزا لگوانے کی کوشش کی مگر اُدھر کوئی نہیں تھا۔ نہ پاکستان کا کونسلیٹ نہ بنگلہ دیش کا۔ ابھی تک بنگلہ دیش کے سفارت خانوں میں پوری طرح کام شروع نہیں ہوا۔"
میں نے کہا "اس کے علاوہ اتنی بڑی فوج کون سا ویزا لگوا کے آئی ہے؟"
اشوک کمار نے برا سا منہ بنایا "وہ اور بات ہے۔"
میں نے کہا "یہ بھی اور بات ہے۔ ہم انڈین ہیں۔ تمہاری مدد کرنے آئے ہیں۔ تمہیں مصیبت سے بچانے آئے ہیں اور تم شکر گزار ہونے کے بجائے ہم سے ویزا طلب کرتے ہو؟ ویری بیڈ۔"
غالب نے کہا "سیکڑوں انڈین آفیشل ہر روز جہاز میں ادھر سے اُدھر آتے جاتے رہتے ہیں..... کسی پاسپورٹ کے بغیر۔"
میں نے غصے میں کہا "اسے سمجھانا بے کار ہے۔ اس سے کہو کہ منیجر کو بلائے۔ ہم اس سے بات کریں گے۔"
جو بات منطقی دلائل سے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی وہ ایک دھمکی نے سمجھادی۔ آہستہ آہستہ دنیا میں بدمعاشی کو بالادستی حاصل ہونے لگی ہے۔ مالک لاکھ قانونی اور اخلاقی حوالے دے کر بھینس کو اپنا ثابت کرے' لاٹھی والا ہی اسے ہانک کر لے جاتا ہے اور اسے عین انصاف بھی قرار دیتا ہے۔ ہماری "مائٹ از رائٹ سوسائٹی۔" یا ایم آر ایس بھی انہی حالات کے ردِعمل کی پیداوار تھی۔
منیجر کو بلا کے لانا اشوک کے لئے شامت اعمال کو بلانے سے کم نہ تھا۔ وہ اپنے سرونٹ کوارٹر میں مسافروں کو ٹھہرانے اور ان سے کرایہ وصول کرنے کے جرم میں خود بے گھر اور بے آسرا ہو جاتا۔ ہوٹل کے اندر دوسرا غیر قانونی مسافر خانہ چلانا ایک ریاست کی حدود میں اپنی حکومت قائم کرنے کے مترادف تھا۔ اشوک اس لئے بھی ڈر گیا تھا کہ بات منیجر تک پہنچ گئی تو ہم مزید سنسنی خیز انکشافات کریں گے۔ مثلاً یہ کہ ہمیں ہوٹل کے طعام خانے سے کھانا فراہم کیا جا رہا ہے اور وہ مالِ مسروقہ کی پوری قیمت وصول کر رہا ہے۔
غالب نے کہا "اب کھڑے کیوں ہو۔ جا کے ناشتا لاؤ۔ ہر چیز ڈبل۔ سوائے قیمت کے۔ چلو ڈبل مارچ کرو۔"
"یس سر!" اشوک نے مُردہ لہجے میں کہا اور پلٹ کے جانے لگا۔
میں نے کہا "ڈبل کراس مت کرنا ہمیں ورنہ......"
"تم اپنا ڈبل نقصان کرو گے۔" غالب نے کہا۔
اس کے جانے کے بعد غالب تو نہانے کے لئے باتھ روم میں گھس گیا۔ میں نے کھڑکی میں بیٹھ کر باہر کی دنیا کو دیکھا۔ ہر نئے شہر کی فضا میں اجنبیت کا احساس ایک فطری بات ہے مگر ڈھاکا میں ہوائے بُغض و عداوت نے مجھے اپنے ہی وطن میں جلاوطن بنا دیا تھا۔ عدم تحفظ' خوف اور بے یقینی کے ماحول میں دوست اور دشمن میں تمیز کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ کل کا دوست آج کا دشمن تھا اور آنے والے دن کے بارے میں کوئی نہیں جانتا تھا کہ کسے دوستی کا تاوان ادا کرنا ہوگا اور کسے دشمنی کا خراج دینا پڑے گا' کس کا سایہ پیٹھ میں خنجر گھونپے گا اور کون بے چہرہ قاتل کسی کو جرمِ بے گناہی کی سزا دے گا۔
بظاہر جنگ ختم ہو گئی تھی لیکن ایک سطحی' مصنوعی اور عارضی محسوس ہونے والے امن کی راکھ ابھی گرم تھی اور اس کے نیچے نفرتوں کی آگ بجھی نہیں تھی۔ ان چنگاریوں کو ہوا دینے والے عفریت اپنی مکروہ صورتوں پر عصبیت کی نقاب ڈالے شریف انسانوں کے لہو سے ہولی کھیلتے پھر رہے تھے۔ رات بھر ادھر اُدھر سے فائرنگ کی آوازیں سنائی دیتی رہی تھیں۔ اس وقت بھی کئی جگہ سے دُھواں اٹھ رہا تھا اور فضا میں جلے ہوئے بارود کی بُو کا آسیب باقی تھا۔ وقفے وقفے سے گزرنے والی فوجی گاڑیوں کو دیکھ کر لوگ سہم جاتے تھے اور ڈر کے راستہ چھوڑ دیتے تھے۔ دُکانیں کھلی ہوئی تھیں مگر خریدار مفقود تھے۔ بازاروں میں پھرنے والے وہ تھے جو گھر سے نکلنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ چہروں سے خوشی اور لبوں سے مسکراہٹ ناپید تھی۔ چشمِ بنگال' زلفِ بنگال اور سحرِ بنگال۔ نذرالسلام اور ٹیگور کی سرزمین۔ رقص اور موسیقی کا گہوارہ۔ سونار دیش' سب لوگ سوگ میں تھے۔
خود میں نے بے حسی کی قبا پہن لی تھی اور دل کو خوگرِ صدمات کر لیا تھا۔ میرے اطراف میں کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے' ظلم کیا ہے' ظالم کون اور مظلوم کون' یہ سب بے معنی ہو گیا تھا۔ مجھے اب صرف محسن کی تلاش سے سروکار تھا۔ گرمیٔ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک۔ تلاش ختم ہو گی تو رشتے بھی ختم ہو جائیں گے۔ رشتے جو اخوت' ہم وطنی اور یگانگت کی بنیادوں پر استوار رہے۔ ہم پہ مشترکہ تھے احسان غمِ الفت کے۔ مگر اب ہم سارے رشتوں سے منکر ہیں۔
ایک اخبار والا سائیکل کو تیز تیز پیڈل مارتا اور کسی سنسنی خیز سرخی کو اعلان کی طرح نشر کرتا گزرا۔ میں نے اسے روکنے کے لئے ہاتھ اٹھایا اور کھینچ لیا "یہ تو بنگالی کے اخبار تھے۔"

غالب نے کہا "انگریزی اخبار بھی ہوگا اس کے پاس۔"
میں نے سرہلایا "خبریں تو ایک ہی ہوں گی، محض دل دُکھانے والی۔"

"خبر صرف خبر ہوتی ہے۔ ایک فریق کے لئے شکست کی خبر ہی دوسرے کے لئے فتح کی خبر ہوگی۔"

"میرے لئے اچھی خبر صرف یہ ہو سکتی ہے کہ محسن شیروانی کا سراغ مل گیا۔ وہ خیریت سے ہیں اور ایک بیان میں انہوں نے اس یقین کا اعادہ کیا ہے کہ وہ بہت جلد اپنے دوستوں سے ملاقات کریں گے۔ محسن شیروانی کی تلاش میں مغربی پاکستان سے آنے والے ایم آر ایس کے سربراہ نے ہوٹل شاہ باغ میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ...... ناشتا آگیا ہے۔ نوش فرمایئے۔" میں نے کھڑکی سے اترتے ہوئے کہا۔ نازو ہنسنے لگی۔ اشوک کمار نے ایک ٹرے درمیان میں میز پر رکھی اور حیران ہو کے نازو کو دیکھنے لگا۔

"مسٹر اشوک کمار!" غالب نے کہا "تم اور کیا کرتے ہو؟"

"اور...... کیا...... ہم اور کیا کرے گا سر، بس ویٹر ہے۔"

"ہاں۔ مگر میں نے تمہاری فلمیں بھی سب دیکھی ہیں۔ وہ جو فلم تھی نا 'تمہاری قسمت'" غالب ناشتے پر ٹوٹ پڑا۔

"تمہاری قسمت؟ ایسی تو کوئی فلم نہیں بنی۔" میں نے غالب کے سامنے بیٹھ کے کہا۔

"پھوٹ گئی قسمت۔" غالب نے سر پر ہاتھ مارا۔ "بابا صرف قسمت۔"

"پھوٹ گئی قسمت؟ بابا صرف قسمت؟" میں نے کہا "اس نام کی کوئی فلم اگر کسی نے بنائی ہے تو مجھے نام بتاؤ اس کا۔"

غالب پھر اشوک کمار کی طرف متوجہ ہوگیا "فلم قسمت میں تم نے ایک گانا بھی گایا تھا۔ میرا بلبل سو رہا ہے شور و غل نہ مچا۔ یہ بلبل مؤنث ہے یا مذکر؟"

"بلبل مؤنث ہے۔ اس کا مذکر ہے بلبلا۔ آدمی بلبلا ہے صابن کا" میں نے کہا۔

"سر! ہم ایکٹر نہیں ہے۔" اشوک کمار گھبرا کے بولا۔

"یار، کیوں انکسار سے کام لیتے ہو۔" غالب نے ہاتھ اور منہ ایک ساتھ چلاتے ہوئے کہا "فلم دیدار میں کیا غضب کی اداکاری کی تھی تم نے۔ دلیپ کمار کو مات کر دیا تھا۔"

ویٹر بوکھلا گیا "وہ۔ وہ دوسرا اشوک کمار ہے۔ ہم نہیں ہے سر۔"

"اچھا؟...... معاف کرنا، میں دھوکا کھا گیا۔" غالب نے کہا۔

میں نے اسے ڈانٹا "ہر چیز مت کھایا کرو۔ ناشتے میں دھوکا کھالیا۔ اس کے بعد دھکے کھانے نکل جاؤ گے۔ شام تک جوتے کھا کے لوٹو گے۔"

"بھوک میں سب حلال ہے" غالب نے نازو کی طرف دیکھ کر سر ہلایا "مثلاً چھپکلی کا سوپ۔ مینڈک فرائی۔ کاکروچ پکوڑے۔"

نازو نے منہ پر ہاتھ رکھ کے اُبکائی لی "مجھے اُلٹی آجائے گی۔"

"اُلٹی تم خود ہو۔ تمہیں سیدھی آئے گی" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "اس کا ناشتا حرام مت کرو۔"

غالب نے کہا "یہ سب چیزیں دنیا میں کھائی جاتی ہیں یہاں ہے۔"

"مگر تمہیں شوق ہو رہا ہے مار کھانے کا۔" نازو نے بڑ کہا۔

"دیکھو مجھے دھمکی مت دو۔ میرا سسر بھوت ہے۔ میں اس سے شکایت کروں تو وہ آج ہی رات کو آجائے گا اور تمہارا دماغ درست کر دے گا۔ بند دروازے اور کھڑکیاں اس کا راستہ نہیں روک سکتے۔ بڑا خوف ناک بھوت ہے۔"

"تم باز نہیں آؤ گے؟......"

"لاحول ولا قوۃ۔ کیا میں نے تمہارے ابا کو کچھ کہا ہے؟" غالب بولا۔

"اور کسے بھوت کہا ہے۔" نازو نے چلا کے کہا۔

"اپنے سسر کو۔ تم کیوں میرے گلے پڑ رہی ہو۔ ہزار بار کہا ہے کہ میں اپنی بیوی کے باپ کو بھوت کہتا ہوں تو تم کیوں ہو۔" غالب نے بھی چلا کے کہا۔

اشوک ہنسنے لگا "سر، کیا یہ آپ کا پتنی لوگ نہیں ہے؟"

غالب کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا "وہ.... ہاں......"

نازو نے موقعے سے فائدہ اٹھایا "وہ ہاں کیا۔ جن بھوتوں کے خاندان سے تمہارا تعلق ہوگا، سب لاتوں کے بھوت ہوں گے تمہاری طرح۔"

میں نے فوراً مداخلت کی "شانتی، شانتی۔ ہم یہاں لڑنے آئے۔ بھارتی سینا کی طرح۔"

"آپ لوگ یہاں کیوں آئے ہیں سر؟" اشوک کمار نے سوال کیا۔

میں نے کسی تذبذب کے بغیر کہا "حالات کا جائزہ لینے۔ ایم آر ایس کے نمائندے ہیں۔"

"ایم آر ایس۔ یہ کیا ہوتا ہے؟" اشوک کمار سوچ میں پڑ گیا۔

غالب نے مجھے گھور کے دیکھا "مسلم ریشنلسٹ سوسائٹی۔ تم نے انڈین ہسٹری پڑھی ہے تو یہ نام ضرور دیکھا ہوگا۔ جسٹس امیر علی یا سرسیّد میں سے کسی نے قائم کی (RATIONALIST) کا مطلب ہوتا ہے منطقی سوچ والا۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس تھا۔ غالب نے بات نبھا دی ورنہ عین ممکن تھا کہ یہ نام ویٹر کو کھٹکتا تو وہ کسی اور کے سامنے ذکر کر دیتا۔ کیا پتا کون اصل مطلب سمجھ لیتا۔

ویٹر ناشتے کی ٹرے اٹھا کے چلا گیا تو غالب میرے پیچھے پڑ گیا "آپ کیا عقل کو سرحد پار چھوڑ آئے ہیں۔"

میں نے کہا "سوری یار۔ بس زبان پر نام آگیا۔ تم بھی تو بھول گئے تھے کہ یہ نازو نہیں مسز راجن ہے اور تم راجن ہو۔"

"ہم سب کو بہت محتاط رہنا چاہئے۔ بھول جاؤ ایم آر ایس کو فی الحال۔ بس محسن کو تلاش کرنا اور خیر و عافیت کے ساتھ واپس جانا ہی ہمارا مشن ہے۔" غالب نے کہا۔

"وہ کہاں ملے گا؟ کب ملے گا؟" گل نے اچانک کہا۔

"پلٹن میدان میں۔ آج رات آٹھ بجے" غالب بولا۔

گل دُکھی نظر آنے لگی۔ مجھے غالب کا مذاق بہت سفاک محسوس ہوا "مل جائے گا۔ ملے گا کیوں نہیں۔" میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا "آخر ہم سب مل کے تلاش کریں گے اسے تو وہ کیسے نہیں ملے گا۔"

غالب نے کچھ شرمسار ہو کے کہا۔ "وہ بھی تو ہمیں ڈھونڈ رہا ہوگا۔ دیکھ لینا وہ خود ہم سے رابطہ قائم کرے گا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اتنے عرصے بعد ہماری نظریں اسے نہ دیکھ پائیں۔"

نازو نے بھی کہا "ہاں۔ اس کی صورت اور حلیہ بدلا ہوا ہو۔"

گل کی مسکراہٹ جاگ اٹھی "مگر میں پہچان لوں گی اسے۔"

میں نے کہا "کیوں نہیں۔ تم اسے دیکھ لو گی تو ہم بھی پہچان لیں گے۔ وہ خود دیکھ لے گا ہمیں۔"

"پھر ہم اس کے ساتھ واپس چلے جائیں گے۔" گل کی آنکھیں خواب دیکھنے لگیں۔ "یہ سارے دُکھ دور ہو جائیں گے، زندگی میں سُکھ ہی سُکھ ہوگا۔ بے شک اس کا دل زخمی ہے، وہ بابا کی موت کے بعد سے اکیلا ہے، اس کا بیٹا بھی مر گیا ہے جس نے کبھی باپ کو دیکھا ہی نہیں تھا لیکن میں اس کے ہر زخم دل پر مرہم رکھوں گی۔ وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ آہستہ آہستہ میں اس کو واپس زندگی کی طرف لے آؤں گی۔ وہ پھر ویسا ہی ہو جائے گا جیسا تھا۔ وہ بیچارا تنہا، سب سے زیادہ اکیلا ہو گیا تھا۔ میں اسے اکیلا نہیں چھوڑوں گی۔ اس کا اکیلا پن دور ہو جائے گا میرے ساتھ......"

میں، غالب اور نازو حیرت آمیز مسرت اور پُرستائش احترام کے جذبات کے ساتھ گل کے اعترافِ محبت کو سن رہے تھے۔ اعتراف سے زیادہ یہ اعلان تھا۔ بے باک، بے خوف اور بے تاب محبت کا بے لوث منشور۔ اس کے یقین کا آئینہ دار اور عزائم کا ترجمان۔ یہی ہم سب کے خواب تھے مگر گل کی بات مختلف تھی۔ اس نے کسی امید کا دامن تھامے بغیر محسن کو چاہا تھا۔ اس کا عشق بے سبب تھا۔ وہ جانتی تھی کہ محسن کبھی اس کا نہیں ہوگا۔ وہ شہلا کا تھا اور رہے گا۔ آج بھی وہ صرف اس کے دُکھ پر دُکھی تھی۔ وہ شہلا کے مرنے پر خوش نہیں تھی۔ اس احساس سے رنجیدہ تھی کہ محسن اکیلا رہ گیا اور اس کی تنہائی کے درد کا درماں ضروری ہے۔

مسئلہ یہ تھا کہ محسن کی تلاش کا آغاز کہاں سے کیا جائے؟ اس نے بہت عرصہ قبل ایک سراغ چھوڑا تھا کہ وہ ہوٹل شاہ باغ کے سامنے ہر صبح ہمارا انتظار کرے گا اور اگر ہم نہ پہنچے تو صدر دروازے کے مقابل کھمبے پر ہمارے لئے پیغام چھوڑ جائے گا۔ یہ بات بہت پرانی ہوگئی تھی۔ اب اس خیال سے دامنِ امید باندھنا لاحاصل محسوس ہوتا تھا کہ اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود محسن ہر روز آتا ہوگا۔ اس نے مایوسی کے خیالوں سے ہار نہیں مانی ہوگی اور ناقابلِ شکست یقین کے ساتھ وہ ہمارے لئے پیغام چھوڑنے کے معمول پر کاربند ہوگا۔

اس کھمبے پر محسن کا کوئی پیغام نہیں تھا۔ ہوتا تو سب سے پہلے گل کی نظر اسے دیکھتی۔ اس کے باوجود یہ ضروری تھا کہ ہم یادِ ماضی کے سراغ کو پُرامید مستقبل کا نشانِ راہ تسلیم کرتے ہوئے جستجو کے سفر کا آغاز اسی مقام سے کریں جہاں محسن نے ہمارا انتظار کیا ہوگا۔ اس خیال نے مجھے بڑی اذیت دی کہ مایوسی کی انتہا تک پہنچنے سے پہلے اور امید کی آخری کرن کو مایوسی کے اندھیرے میں گم کرنے سے پہلے محسن کتنے صبر آزما مراحل سے گزرا ہوگا۔ اس نے ہر آتی جاتی صورت کو دیکھا ہوگا۔ ہر دعا کو پھر آنے والے دن اور اس کے بعد طلوع ہونے والے سورج کی پہلی کرن سے منسوب کر دیا ہوگا۔ وفا اور دوستی پر ایمان کی بنیادوں کو استوار رکھنے کے لئے اس نے خود فریبی کے ہزار اسباب تلاش کر لئے ہوں گے۔ وہ آج نہیں آسکے۔ کوئی بات نہیں۔ کل ضرور آئیں گے۔ ان کا سفر دشوار ہے۔ قدم قدم پر آزمائش کے مراحل ہیں۔ دشمن گھات میں ہیں۔ شکاری جال پھیلائے بیٹھے ہیں۔ حادثات اور خطرات... ہمرکاب ہیں۔ مگر جو ہم سے عہدِ وفا استوار رکھتے ہیں۔ علاجِ گردشِ لیل و نہار رکھتے ہیں۔

"لوٹ آیئے حقائق کی دنیا میں۔" غالب نے میری ناک کے سامنے چٹکی بجائی "نا نا کہ۔ تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا۔ مگر اس وقت فلائٹ کینسل کریں۔"

میں نے ہنس کے کہا "کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور۔ چلو میں آگیا واپس زمیں پر۔"

"میرے قابلِ رشک ذہن میں ایک لاجواب خیال آیا ہے۔" غالب نے کہا "توجہ چاہتا ہوں مس نازو اور مس گل۔"

"کچھ بکو بھی۔" نازو نے کہا۔

غالب بولا "ہم تلاش کا آغاز کرتے ہیں منفی سوچ سے، یعنی پہلے تاریک پہلو کو دیکھتے ہیں۔ ناممکنات سے ممکنات کی جانب چلتے ہیں۔ یہ بڑا باریک نکتہ ہے۔ ناامیدی کے ساتھ امید کی طرف جانے میں کبھی خوش فہمی کے جال میں گرفتار ہونے کا امکان نہیں اور نہ دل شکنی کا۔"

"مرزا جی! آسان اُردو میں عرض کیجئے جو بھی کہنا ہے۔"

غالب نے سر کھجایا "مرزا غالب کو بھی ابتدا میں یہی مسئلہ

درپیش تھا۔ وہ مشکل کہتے تھے اور کوئی سمجھتا نہیں تھا۔ میں اپنے زمانے کے جاہلوں میں پھنس گیا ہوں۔"

"پاگل خانے میں ہر شخص کہتا ہے یہ میں کہاں پاگلوں میں پھنس گیا ہوں۔" نازو نے کہا۔

غالب نے کہا "یہ اپنے چوہدری اللہ دِتا نے تمہیں ایک کارڈ دیا تھا، جس پر اس کا فون نمبر تھا۔"

"ہاں۔ کارڈ محفوظ ہے میرے پاس۔"

"کیا خیال ہے، وہ بندہ قابل اعتماد ہے یا نہیں؟ ہے تو اپنے شہر لہور کا۔" غالب نے کہا "اور وہ بھی مصیبت میں گرفتار ہے۔"

"پھر؟" نازو نے کہا "ہم کیا کریں؟ یہاں تو سب ہی مصیبت میں گرفتار ہیں۔ ہم اللہ دِتا کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔"

"خاتون، وہ ہماری مدد کر سکتا ہے۔" غالب نے سکون سے کہا "کیا ہے وہ فارسی میں۔ کند ہم جنس باہم جنس پرواز۔ کبوتر با کبوتر باز بہ باز۔ یعنی ایک مصیبت زدہ دوسرے کا ساتھ دے سکتا ہے تم اسے بلاؤ۔"

"اور بلا کے کیا کہوں؟" میں نے کہا۔

"اب آپ لوگ اپنے جذبات پر قابو رکھیں۔ حقیقت پسندی کا یہ تقاضا ہے کہ ہم تمام امکانات کا جائزہ لیں۔ فرض کرو۔ میرے منہ میں خاک۔ محسن پکڑا گیا ہو۔"

گل کا رنگ اُڑ گیا "اللہ نہ کرے..... یہ تم....."

"سنو۔ سنو۔" غالب نے کہا "عقل سے کام لو۔ گم شدہ افراد کی تلاش ایسے ہی کی جاتی ہے۔ یہاں اس وقت جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب جانتے ہیں۔ ان حالات میں یہ ناممکن یا بعید از قیاس نہیں ہے کہ محسن کو پولیس یا ملٹری نے گرفتار کر لیا ہو۔"

"آخر کیوں؟ ایسی منحوس بات......" گل چلّائی۔

میں نے اسے ڈانٹ دیا "گل! ایسے کام نہیں چلے گا۔ غالب ٹھیک کہتا ہے۔ یہاں سب کچھ ہو رہا ہے جو نہیں ہونا چاہئے۔ مگر ہمارے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ تم خود جانتی ہو کہ ہمارے راستوں پر کہیں گلاب نہیں بچھے ہوئے تھے۔ کانٹے تھے اور پتھر تھے۔ اس سفر میں ہم نے کیا صعوبت برداشت نہیں کی۔ ہر قدم پر موت کا سامنا کیا مگر خطرات سے نہیں ڈرے۔ ہم خوش قسمت ہیں کہ اکٹھے اور صحیح سالم یہاں تک آ گئے مگر ہمارے کتنے ساتھی ہمیشہ کے لئے ساتھ چھوڑ گئے۔ محسن تو آج بھی ہمارے ساتھ ہے۔ سفر میں یہ تو ہوتا ہے کہ کوئی آگے نکل گیا کوئی پیچھے رہ گیا۔ جدا ہونے والے کل پھر ملیں گے۔ یہ امید نہ ہوتی تو ہم صرف محسن کی تلاش کا مقصد لے کر اتنی طویل مسافت کیوں طے کرتے؟ ہمارا مقصد ہرگز مشرقی پاکستان کو فتح کرنا اور بھارتی فوج کو شکست دے کر ملک سے نکالنا نہیں تھا۔"

گل شرمندہ نظر آنے لگی "آپ ٹھیک کہتے ہیں بھائی سکندر۔"

میں نے کہا "دنیا میں زندہ رہنے کا یہی اصول ہے گل۔ اچھا... کی امید رکھو مگر برائی لے لئے تیار رہو۔ خوشی کے شادیانے بجاؤ... یہ نہ بھولو کہ زندگی میں رنج والم اور دکھ درد بھی ہیں۔ جو... انسانوں کا مقدر ہے وہی ہمارا بھی ہے۔ ہمیں تقدیر نے کسی خصوصی... رعایت کے تحت دائمی مسرت اور غموں سے تحفظ کی کوئی گا... نہیں دی ہے۔ میں یا تم، غالب یا نازو آج اکٹھے ہیں، ہنس... رہے ہیں اور ایک ساتھ ہیں۔ کل کیا پتا ہم میں سے کون نہ ہو... اس خیال پر آج کے دن کی رفاقت کے لطف کو قربان نہیں کیا... سکتا۔"

غالب نے ہاتھ مل کے کہا "وہ... میرا خیال ہے کہ آج اتنا... کافی ہے۔ فلسفۂ حیات کے لیکچر کا حصہ دوم کل کی نشریات میں۔"

میں نے مسکرا کے کہا "تم جیسے کند ذہن شاگرد صرف چھ... سے غرض رکھتے ہیں۔"

"پروفیسر صاحب! عمل سے زندگی بنتی ہے۔ باتوں سے... نہیں۔" غالب بولا "چلیں میدان عمل میں کود جائیں۔ پہلے یہ... لیں کہ محسن اپنے وعدے کے مطابق کھمبے کے ساتھ کھمبا بنا تو نہیں... کھڑا ہے۔"

"صبح تو نہیں تھا" گل بولی۔

"کیا پتا اب آ گیا ہو۔ فراغت کے دن ہیں۔ صبح دس بجے... کھمبے پر ڈیوٹی دیتا ہو اور بارہ بجے لنچ کے لئے چلا جاتا ہو۔ اگر وہ نہ... ملتا تو پھر ہم جاسوسی اور سراغ رسانی کی خداداد صلاحیت کو کام... لاتے ہیں۔ جو خدا نے یہاں کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے۔" غالب... اور انگلی سے اپنا سر بجایا۔

"یہاں تو بھوسا بھرا ہوا ہے۔" نازو نے کہا۔

"جیسے بلی کو خواب میں چھیچھڑے نظر آتے ہیں ایسے... گائے بھینس کو ہر جگہ بھوسا دکھائی دیتا ہے۔" غالب نے کہا "... عظیم کھوپڑی میں جتنی عقل ہے اتنی تمہارے سارے خاندان... سات پشتوں کے پاس نہیں تھی۔"

نازو نے بگڑ کے کہا "خاندان اور سات پشتوں تک مت جاؤ..."

"ورنہ تم کیا کرو گی؟"

"تمہارا سر توڑ دوں گی۔ بہہ جائے گا عقل کا دریا۔ تو... عقل کا۔"

"پہلے ذرا اپنے سر کو دیکھو۔" غالب نے ایک انگلی مار... "دیکھا، کیسی ٹن سے آواز آئی۔ جیسے ٹین کا خالی ڈبا۔ بھوسا... نہیں ہے۔"

"اُف۔ یہ تم لوگ وقت بے وقت سب کچھ بھول کے... میں کیوں الجھ جاتے ہو" میں نے کہا "کیا بات ہو رہی تھی اور... کیا شروع کر دیا۔"

"گل نے کہا "میں..... چکر لگا کے آتی ہوں۔"

میں نے کہا "بیٹھی رہو آرام سے۔ تم ضرورت سے...

...بھی چلتے ہیں۔ پہلے یہ طے کر لیں کہ ہمیں کرنا ...ہم ...جذباتی ہو رہی ہو۔ ...کیا ہے۔"

...غالب نے کہا "تم بلاؤ مسٹر سی اے ڈی کو۔ دیکھو وہ بھروسے ...کے قابل ہے یا نہیں۔ پھر اس کے سپرد یہ کام کردو کہ محسن کو ...تھانوں کی حوالات سے جیل تک تلاش کرے۔"

"یہ ایک دن میں ہونے والا کام نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔ ہر روز سیکڑوں پکڑے جاتے ہیں۔ کچھ چھوٹ جاتے ہیں اور کچھ دوسروں کے جرم کی سزا کاٹتے ہیں۔ یہاں محسن کا والی ...وارث کون تھا۔ خدا نخواستہ وہ پکڑا گیا ہوگا کہ ایں ہم بچہ ...شتر است۔"

"اس کا کیا مطلب ہوا؟" گل نے سادگی سے کہا۔

غالب ہنس پڑا "بھئی ایک لومڑی بھاگی جا رہی تھی۔ کسی نے ...پوچھا کہ آخر ہوا کیا ہے۔ کہنے لگی کہ پولیس والے اونٹوں کو ...پکڑ رہے ہیں۔ پوچھنے والے نے کہا کہ پھر تمہیں ڈرنے کی کیا ...ضرورت ہے۔ لومڑی نے کہا کہ بابا، ان پولیس والوں کا کوئی بھروسہ ...ہے؟ کہہ دیں کہ یہ بھی اونٹ کا بچہ ہے اور مجھے پکڑ لیں پھر؟ تو خدا ...نخواستہ ایسے ہی محسن پکڑا گیا ہو کہ یہ بھی شرپسند ہے یا پاکستانی فوج ...کا ایجنٹ ہے۔ لیبل لگانے والے اس کام کے ماہر ہوتے ہیں۔ مکتی ...باہنی کا آدمی بنا دیں یا کسی محبِ وطن تنظیم کا۔ ادھر والے نہ پکڑیں ...تو ادھر والے پکڑ لیں۔ کون تصدیق، تفتیش کرتا ہے۔ یوں پکڑے ...جانے والوں کی تو کسی عدالت میں پیشی تک نہیں ہوتی۔ نہ فردِ جرم ...عائد ہوتی ہے، نہ ضمانت۔ بس پڑے رہتے ہیں جیل خانوں میں ...قسمت کے رحم و کرم پر۔ اگر ایسی کوئی بات ہوگی تو اے ڈی پتا ...لگا لے گا۔"

"اے ڈی ایک معمولی سب انسپکٹر ہے" میں نے کہا۔

"مگر اس کے مراسم ہوں گے۔"

"جن سے مراسم تھے وہ سب یارِ اغیار ہو گئے ہیں۔"

"سب نہیں۔ یہاں اس کے ہم زبان، رازدار بہت ہوں گے۔ ...مغربی پاکستان سے ہزاروں لاکھوں لوگ بھیجے گئے تھے، انتظامی امور ...سنبھالنے کے لئے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں اے ڈی کو بلاتا ہوں اور اس سے بات کرتا ...ہوں۔ تم جا کے محسن کو دیکھو۔ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ سامنے نہ ہو۔ ...کہیں چھپ کے کھڑا ہو اور تمہیں دیکھ لے۔ اکیلے نہ جانا......"

"میں ساتھ جاؤں گی" گل نے کہا۔

"نہیں۔ تم میرے ساتھ رہو گی۔" میں نے کہا۔

گل نے ضد کی "نازو کیوں نہیں رہ سکتی تمہارے ساتھ؟"

میں غصے کو پی گیا "اس لئے کہ وہ غالب کی حفاظت بھی کر سکتی ...ہے اگر کہیں ضرورت پڑے تو مقابلہ کر سکتی ہے۔" میں نے کہا۔ ...مگر گل سمجھنے پر آمادہ نہ تھی "ریوالور سب کے پاس ہیں۔"

میں نے کہا "بے وقوف لڑکی! یہاں اسلحہ استعمال کیا تو سمجھو پکڑے گئے یا مارے گئے۔ ایک گولی چلائی کسی نے تو بلوہ ہو جائے گا یا آرمی شوٹ کر دے گی۔ یہاں تو اسلحہ لے کر پھرنا بھی خطرناک کام ہے۔ جہاں تک ممکن ہو جھگڑے فساد سے دور رہو۔ کوئی گلے پڑے زبردستی تو جان چھڑانے کے لئے ہاتھ پیر چلانے میں کوئی حرج نہیں۔ تم غالب کے ساتھ جاؤ گی تو نہ غالب تمہاری مدد کر سکے گا نہ تم غالب کو بچا سکو گی۔ اس لئے میں تمہیں اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں۔"

نازو اٹھ کھڑی ہوئی "چلو میرے ساتھ۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ میں تمہاری محافظ ہوں۔"

غالب نے آہ بھر کے کہا۔ "یہ شرم سے ڈوب مرنے کا مقام ہے میرے لئے۔"

"ایسے مقام تو پہلے بھی اکثر آئے ہیں۔"

"اچھا آج ڈوب مروں گا تمہارے ساتھ۔ کوئی مناسب جگہ نظر آئے تو بتانا، مثلاً کوئی سوئمنگ پول۔" غالب بولا۔

میں نے کہا "زیادہ دور مت جانا۔ آج آس پاس ہی نظر رکھو۔ ایک دوسرے سے الگ رہو اور کچھ فاصلے پر۔"

"یہ دوری کی شرط آخر کیوں؟" غالب بولا۔

میں نے کہا "ایک تو اس لئے کہ اکٹھے رہو گے تو کام بھول کے آپس میں لڑتے رہو گے۔ دوسرے اس لئے کہ محسن کو ایک نظر نہ آئے تو دوسرا نظر آ جائے۔ دو مختلف مقامات سے ہر طرف جائزہ لینے میں آسانی رہے گی۔"

ان کے جاتے ہی میں نے فون اٹھایا تو ریسیور سے کوئی ٹون سنائی نہ دی۔ مجھے یاد آیا کہ اشوک نے صرف رات کے وقت ٹیلی فون لائن دینے کی پیشکش کی تھی۔ دن میں ایکس چینج پر بہت لوڈ ہوتا ہوگا۔ اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ میں ہوٹل کے لاؤنج سے فون کروں یا کہیں باہر جاؤں۔ باہر جانے کی صورت میں میرا غیر بنگالی ہونا مجھے مسائل سے دوچار کرتا۔ تعصب کے جذبات کی شدت انتہا پر تھی۔ کسی کے پاس فون ہوتا تو محض اُردو بولنے کے جرم میں وہ مجھے دھتکار بھی سکتا تھا۔

لاؤنج میں بھی صورتِ حال مختلف نہیں تھی۔ کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی بد مزاج مگر خوب صورت آنکھوں والی سانولی سی لڑکی نے کہا "ٹیلی فون صرف ان کے لئے ہے جو یہاں مقیم ہیں۔"

میں نے ایک ڈراما کیا اور کاؤنٹر پر زور سے مُکا مارا۔ کون کہتا ہے؟ کس قانون اور قاعدے کے تحت کہتا ہے، بلاؤ مینجر کو۔" میں نے دہاڑ کر کہا۔ جیب سے اپنا پاسپورٹ نکالا اور اسے ایک جھلک دکھا کے واپس رکھ لیا۔

لڑکی کا رنگ فق ہو گیا۔ اس نے پاسپورٹ کے اندر میری تصویر دیکھ لی تھی یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ پاسپورٹ نیا اور بھارتی ہے۔ میرے مُکے اور پُر اعتماد جارحانہ انداز تخاطب نے اسے خوف زدہ کر دیا کہ شاید غلطی سے اس نے کسی وی آئی پی کو انکار کر دیا ہے۔

لاؤنج میں موجود ہر شخص کی نظر گھوم گئی تھی اور کاؤنٹر پر موجود دوسرے لوگ بھی گھبرا گئے تھے۔ ایک نوجوان فوراً صورتِ حال کو سنبھالنے کے لئے آگے آیا۔

"پلیز ڈونٹ مائنڈ سر۔ آپ اِدھر سے فون کرلیں۔ یہ فون ویسے بھی خراب ہے۔" اس نے مجھے اپنی طرف بلالیا۔

میں نے خوب صورت آنکھوں والی لڑکی پر ایک قہر آلود نگاہ ڈالی اور دوسرے فون کا ریسیور اٹھالیا۔ نمبر ملانے کے بعد میں نے چند سیکنڈ انتظار کیا۔ دوسری طرف گھنٹی بج رہی تھی۔

آخر کار کسی نے ریسیور اٹھا کر کہا "پولیس اسٹیشن......"

میں نے بیچ میں کہا "کون بول رہا ہے۔ نام بتاؤ۔"

بات کرنے والا گھبرا گیا "جی ...... انسپکٹر جلیل۔ ایس ایچ او۔"

میں نے کہا "سب انسپکٹر سی اے دِتا کہاں ہے؟"

"کون بول رہا ہے؟" وہ ذرا محتاط ہو کے بولا۔

"تمہارے خیال میں کون ہوسکتا ہے۔ میں کمار بول رہا ہوں۔"

"اوہ۔ ڈی ایس پی صاحب۔ سوری سر...... میں نے آپ کی آواز نہیں پہچانی۔"

اس دلچسپ اتفاق پر میں محظوظ ہوا "تمہارا کیا ہے کسی دن اپنے باپ کو پہچاننے سے انکار کردو گے۔ اللہ دِتا کہاں ہے۔"

"ابھی.... ابھی بلاتا ہوں سر۔"

کچھ دیر میری گفتگو میں رسمی سی دلچسپی لینے کے بعد کاؤنٹر پر بیٹھنے والے پھر مصروف ہوگئے تھے اور کسی حد تک مطمئن بھی کہ بات زیادہ نہیں بگڑی۔ خوب صورت آنکھوں والی سانولی لڑکی اب گل کو خاصے رشک اور حسد کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔

اللہ دِتا کی آواز سن کے میں نے کہا "کیا ہورہا ہے مسٹر اے ڈی۔ فارغ ہو؟"

اس نے کنفیوز ہو کے کہا "جی۔ میں نے پہچانا نہیں آپ کو۔"

"کل تم نے مجھے کارڈ دیا تھا۔ واپس جانا چاہتے ہو تم۔ دیکھو شور مت کرنا۔ یہ تمہارا احمق ایس ایچ او مجھے ڈی ایس پی سمجھ رہا ہے۔ کمار نام کا کوئی ڈی ایس پی ہے یہاں؟"

"ہمارے علاقے کا تو نہیں ہے۔ مگر ہے۔ خیر حکم کریں۔"

"حکم یہ ہے کہ تم فوراً مجھ سے ملو۔ بہت ضروری کام ہے۔"

"مگر کہاں؟ آپ کہاں سے بول رہے ہیں اس وقت؟"

"تم بتاؤ کوئی جگہ۔ جہاں ہم اطمینان سے بات کرسکیں۔ مجھے تو کچھ پتا نہیں ہے ابھی۔ یا تم ایسا کرو، ٹیکسی یا کار لے کر ہوٹل شاہ باغ کے سامنے آجاؤ۔ میں وہیں ملوں گا۔"

"رائٹ سر۔ میں حاضر ہوتا ہوں۔" اس نے کہا۔

میں نے ریسیور رکھا اور جیب سے پرس نکالا "کتنے پیسے؟"

کاؤنٹر کلرک نے خفت سے کہا "کچھ نہیں سر۔ آپ شرمندہ نہ کریں۔"

میں نے کہا "اچھا دیکھو" تم ایک پیغام لے سکتے ہو؟ ...نام ہے تمہارا؟"

"علی شاہ۔" وہ بولا۔

"علی شاہ! میں آنند کمار ورما ہوں۔ ڈپٹی سیکریٹری افیئرز۔ دہلی۔" میں نے کہا "یہ ہوسکتا ہے کہ کیرین ہیڈکوارٹر سے کوئی آئے اور مجھے پوچھے۔ دراصل میرا خیال تھا کہ مجھے یہاں مل جائے گا چناں چہ میں نے کچھ اہم لوگوں کو رابطے کے لئے دے دیا تھا جو میری غلطی تھی۔ میری کون سی ایڈوانس بکنگ یہاں۔ میں اب انٹر کان میں ہوں۔ اسی لئے آیا تھا اوہ وقت بھی کسی کو آنا تھا۔" میں نے کلائی کی گھڑی دیکھی "خیر"

"بعد میں کوئی آئے گا تو میں بتادوں گا اور پیغام بھی دے دوں گا۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔ آپ مجھ پر بھروسہ کرسکتے ہیں۔"

"گڈ۔ مسٹر علی شاہ! بھروسہ بہت ضروری ہے۔ پیغام اور...... رازداری کا متقاضی ہے۔"

"سر! آپ اگر چاہیں تو......"

"یس" میں جاتے جاتے پلٹ گیا۔

"میں ایک کمرا نکال سکتا ہوں آپ کے لئے دوپہر کینیڈا کے ٹریڈ کونسلیٹ خالی کریں گے۔"

میں نے بے حد مسرت اور تھوڑی سی حیرت کے ساتھ

"واقعی؟ یہ تو بہت ہی اچھا ہے۔ تھینک یو مسٹر شاہ۔"

"میں مسٹر اور مسز کمار ورما کے لئے بکنگ شو کرادوں"

"بالکل۔ اس میں پوچھنے والی کون سی بات ہے" میں اور گل کا ہاتھ تھام کے باہر چلا گیا۔ اصولاً مجھے کلرک کو دینا چاہئے تھا مگر میرے پاس صرف پاکستانی کرنسی تھی جو میرے دعوؤں کی قلعی کھول دیتی۔ کلرک مجھ سے اتنا مرعوب ہو چکا تھا کہ اس نے مجھے روک کر کچھ مانگنے کی ہمت ہی نہیں کی۔

باہر آکے میں نے ادھر اُدھر دیکھا اور گل سے کہا "تمہیں بے حد سے زیادہ حیران یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ برا ماننے کی۔ خود کو بچانے اور چھپائے رکھنے کے لئے ہم جھوٹ بولیں گے۔ جھوٹ جنگ کی حکمتِ عملی میں اہمیت رکھتا ہے، خواہ وہ پروپیگنڈا ہو یا اسٹریٹجی۔"

"میں یہ سب نہیں سمجھتی۔"

"اسی لئے سمجھا رہا ہوں تمہیں۔ اس کلرک کی طرح دوسرے لوگ بھی تمہیں اور مجھے مسٹر اور مسز کمار سمجھیں گے۔ انہیں ایسا سمجھنے دو۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ عام آدمی کی سوچ ایسی ہی ہوتی ہے۔"

گل نے کہا "غالب اور نازو نظر نہیں آرہے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "باہر انہیں مسٹر اور مسز راجن کہنے والو۔"

"مگر وہ ہیں کہاں؟"

"اب کیا ہم ان پر نظر رکھیں گے؟ انہیں اپنا کام کرنے دو۔" میں نے نرمی سے کہا "آؤ ہم ادھر بس اسٹاپ پر کھڑے ہوجاتے ہیں۔ اے ڈی اس طرف سے گزرا تو ہمیں دیکھ لے گا ورنہ ہم دیکھ لیں گے۔"

بس اسٹاپ پر بہت سی عورتیں اور مرد کھڑے تھے۔ عورتوں نے سوتی ساریاں باندھ رکھی تھیں۔ وہ سب بیس سے تیس سال کی عمر میں جوان ہی سمجھی جاسکتی تھیں مگر ان کی جوانی، رنگ روپ اور آسائش کے اسباب سے محرومی کا نوحہ تھی۔ سوکھے جسموں پر سیاہ چمڑی، بے رونق چہرے اور روکھے بال، ویران آنکھیں اور پژمردہ رخسار۔ وہ بھرپور شادابی جو عورت کے جسم کو نشیب و فراز، گداز اور قوس و خم عطا کرتی ہے سختیٔ حالات کی بھینٹ چڑھ گئی تھی۔ غربت اور فاقہ کشی سے زیادہ یہ کم سنی کی شادیوں کا نتیجہ تھا۔ ایک انتہائی افسوس ناک بات جو وہاں عام مشاہدے میں آئی یہ تھی کہ بعض خاصے متمول اور پڑھے لکھے لوگ بھی بارہ تیرہ سال کی لڑکی کو شادی کرکے رخصت کردیتے تھے۔ بیس بائیس سال کی عمر کو پہنچنے تک وہ چھ بچے جن لیتی تھی۔ اس کا شوہر اور اس کے بچے کسی PARSITE کی طرح چمٹ کر اس کے جسم کا سارا حسن، صحت اور توانائی، یہاں تک کہ خون تک نچوڑ لیتے تھے اور وہ پچیس سال کی عمر میں بوڑھی ہوجاتی تھی۔ تیس سال کی عمر کو پہنچنے سے پہلے نانی بن جاتی تھی اور شاید چالیس سال سے پہلے ہی زندگی کا وہ سفر تمام ہوجاتا تھا جو ستر سال بھی جاری رہ سکتا تھا۔

مرد بھی زیادہ صحت مند نہیں تھے۔ ان پر بھی خاندان کی گاڑی کھینچنے کی ذمے داری قبل از وقت ڈال دی جاتی تھی۔ وہ خود جیسی زندگی گزار چکے تھے ویسی ہی زندگی ان کے وارث پاتے تھے جس میں ایک وقت پیٹ بھر کھانا خوش نصیبی سمجھا جاتا تھا۔ تعلیم غیر ضروری عیاشی تھی جو بھوک کا تدارک نہیں کرسکتی تھی اور اسی طرح دوا دارو، علاج معالجہ بھی عیاشی کے زمرے میں آتے تھے جو سب کا مقدر نہیں ہوسکتی چناں چہ بیماری سے کسی کا مرجانا بھی بالکل جائز اور برحق تھا۔ تاہم شہری آبادی کے حالات قدرے بہتر تھے۔

اچانک دو افراد نے اونچا بولنا شروع کیا۔ وہ زمین پر آلتی پالتی مارے بیٹھے ایک ہی اخبار پڑھ رہے تھے کہ کسی خبر پر نظریاتی اختلاف پیدا ہوگیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بات بڑھ گئی اور وہ اچھل اچھل کر مرغوں کی طرح لڑنے لگے۔ وہ مرغوں کی طرح کُڑکُڑا بھی رہے تھے۔ لوگوں نے انہیں الگ کیا مگر وہ پھر الجھ گئے۔ اخبار تو ٹکڑے ٹکڑے ہو ہی چکا تھا۔ انہوں نے ایک دوسرے کے بال بھی نوچے۔ کپڑے بھی پھاڑے اور مکے بھی مارے۔ ایک کی ناک سے خون بہنے لگا، دوسرے کی آنکھ نیلی پڑ گئی۔ متعدد بسیں آئیں اور چلی گئیں۔ انہیں لڑانے اور چھڑانے والے بدل گئے۔ میں پریشانی سے ادھر اُدھر نظریں دوڑاتا رہا کہ اے ڈی نظر آجائے تو ہماری جان چھوٹے۔ اپنے رنگ روپ سے ہم الگ نظر آتے تھے اور سب سے الگ بھی کھڑے ہوئے تھے۔ چناں چہ ہر سوالیہ نگاہ اٹھتی تھی تو شکوک بڑھ جاتے تھے۔ پھر اچانک ایک لڑاکا مرغے کو ہوش آیا اور وہ دوڑ کر بس پر چڑھ گیا۔ دوسرے کو بھی شاید اسی بس سے جانا تھا مگر وہ دیر سے بھاگا۔ اگر وہ بس پر سوار ہوجاتا تو ان کی نظریاتی جنگ جاری رہتی مگر دوسرے شخص کی چھٹی ہوئی دھوتی دغا دے گئی۔ وہ الجھ کے گرا اور بس اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔

مجھے ہنسی آئی مگر میں نے ہنسنے سے گریز کیا۔ پھر کسی نے پیچھے سے میرے کندھے پر بھاری بھرکم ہاتھ رکھا تو میں چونک پڑا۔

محمد بھائی کا چہرہ دیکھ کر مجھے مسکرانا پڑا "تم یہاں کیسے؟"

"ابھی اپن ادھر لفڑا دیکھا" اس نے گل پر نظر جما کے کہا "پھر تم کو۔ اپن سمجھا یہ سالا لوگ تم کو تنگ کرتا ہے۔"

میں نے کہا "نہیں۔ ہمیں کسی نے پریشان نہیں کیا۔"

اس نے نفی میں سرہلایا "ایسا مافک نئیں چلے گا۔ تم بس میں جائیں گا تو لفڑا ہوئیں گا۔ یہ سب سالا پاکستان کا دشمن ہے ابھی۔ کیا؟"

میں نے جان چھڑانے کے لئے کہا "بھئی ہم بس سے نہیں جارہے ہیں۔"

اس نے کہا "اپن اُدھر بھی پوچھا رات کو۔ سالا لوگ بولتا کہ اِدھر کوئی نئیں۔" عادت کے مطابق اس نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیا۔

"تم نے ہوٹل والوں سے پوچھا تھا۔ کیوں؟"

"اپن جگہ دیکھا تمہارے واسطے، ایک دم فسٹ کلاس۔ ایک پاکستانی فیملی کا گھر ہے۔ وہ ادھر سے چلا گیا۔ پتا نئیں کدھر گیا۔ اپن ادھر سب کو بول دیا کہ کوئی حرامی اندر جائیں گا تو اس کا لاش باہر آئیں گا۔ کیا؟" وہ مونچھوں پر ہاتھ پھیرتا رہا۔

میں نے کہا "محمد بھائی! ہماری رہائش کا معقول انتظام ہوگیا ہے۔ کمرا بھی مل گیا ہے شاہ باغ میں......"

"ادھر کاہے کو پیسا دیں گا۔ ادھر ایک دم اپنا گھر ہے۔ سالا بھارتی فوج گھس جائے گا، غنڈہ لوگ۔ کیا؟"

میں نے کہا "اچھا محمد بھائی۔ پھر بات کریں گے۔"

وہ مسلسل گل کو گھور رہا تھا اور مجھے اس کی آنکھوں میں ہوس کارفرما نظر آتی تھی۔ خود گل اس سے بہت نروس تھی اور میرے پیچھے چھپنے کی بے سود کوشش کررہی تھی۔ بظاہر محمد بھائی کی پیشکش خلوص پر مبنی تھی مگر مجھے اس میں چھپی ہوئی غرض صاف محسوس ہورہی تھی۔ میں اسے جھڑک کر دفع ہونے کو کہتا تو شاید وہ مشتعل ہوجاتا اور میں کسی قیمت پر جھگڑا نہیں چاہتا تھا۔ خدا نے بروقت مدد کی اور چوہدری اللہ دتا عرف اے ڈی کی کار سامنے آکے رک گئی۔

میں نے فوراً کار کا پیچھے والا دروازہ کھول کر گل کو اشارہ کیا' "تم بیٹھو" اور پھر محمد بھائی کی طرف ہاتھ بڑھایا "بہت شکریہ تمہاری پیشکش کا۔ ضرورت پڑی تو تم سے رابطہ کریں گے۔"

اے ڈی حیرانی سے مجھے اور محمد بھائی کو دیکھ رہا تھا "تم..... ایک دوجے کو جانتے ہو!"

میں نے اس کے ساتھ بیٹھ کے کہا "ہاں۔ آگے چلو پھر بتاؤں گا۔"

میں نے محسوس کیا کہ محمد بھائی کو میرا حوصلہ شکن اندازِ بے رُخی کچھ پسند نہیں آیا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ ناگواری کا اظہار کرتا اے ڈی نمودار ہوگیا اور اسے دیکھتے ہی محمد بھائی کے چہرے پر پسپائی کے آثار نظر آنے لگے۔ وہ کچھ عجلت میں ہاتھ ملا کے کھسک گیا۔

"تم بڑے وقت پر آئے ہو اے ڈی" میں نے کہا۔

"لوجی۔ چوہدری اللہ دِتا ہے میرا نام" وہ بولا "آپ نے اے ڈی کر دیا۔"

"اے ڈی زیادہ اچھا لگتا ہے" میں نے کہا "یہ محمد بھائی خواہ مخواہ ہمارے پیچھے پڑ گیا ہے۔"

"او تھے ہی بتانا تھا نا جی۔" وہ کار کو بریک لگا کے بولا "میں تو خود حیران تھا کہ آپ لوگوں کا اس ہسٹری شیٹر سے کیا تعلق۔"

میں نے اسے تعلق کی وجہ بتائی۔ وہ سنتا رہا اور گاڑی اجنبی راستوں سے گزرتی ہوئی ایک نسبتاً خاموش علاقے میں پہنچ گئی' جسے کراچی کی ڈیفنس سوسائٹی یا لاہور کے گلبرگ کی طرح خواص کا مسکن سمجھا جا سکتا تھا۔ عالی شان کوٹھیاں اور وسیع بنگلے اپنے مکینوں کی دولت مندی اور شان و شوکت کی زندگی کے آئینہ دار تھے۔ ایسے تمام علاقے آفاتِ ارضی و سماوی سے تحفظ کی خصوصی ضمانت بھی رکھتے ہیں۔ بقول علامہ اقبال۔ برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر۔ ایسی عالی مرتبت ہاؤسنگ سوسائٹی میں پانی کے نلکوں پر ہنگامہ نہیں ہوتا۔ چاہے عوام پینے کے لئے ڈول بھر پانی کے لئے بھٹکتے پھریں ' یہاں کاروں اور کتوں کو دھونے اور گھاس کے لان کو سیراب کرنے کے لئے پانی ملتا ہے۔ یہاں بجلی اور گیس کا بریک ڈاؤن نہیں ہوتا۔ ٹیلی فون خراب نہیں ہوتا۔ مین ہول کھلے نہیں ملتے۔ کرفیو نہیں لگتا۔ سیاسی جلسے نہیں ہوتے اور جلوس نہیں آتے' یہاں تک کہ احترامِ رمضان آرڈیننس کا بھی ادھر سے گزر نہیں ہوتا۔

یہ سب خیال مجھے اس لئے آئے کہ شہر کی سہمی ہوئی فضا کا یہاں وجود نہیں تھا۔ خوش حال' غم دو جہاں سے آزاد اور تفکرات سے بے نیاز لوگ اپنی دنیا میں شاد و آباد تھے۔ کیا پاکستان اور کیسا بنگلہ دیش۔ ٹو ہیل ود پالیٹکس۔ اپنا دھندا چلے گا۔ بینک اور تجوریوں میں مال رہے گا اور اپنی زندگی ایسے ہی عیش سے گزرے گی۔ ڈھاکا مشرقی پاکستان کا کیپٹل ہو یا بنگلہ دیش کا۔ وزیر اعظم آتے جاتے۔ فوج اگر فوج سے لڑتی ہے تو لڑے' ہمیں کیا۔

"اب کیا سوچ رہے ہیں آپ؟" اے ڈی نے دروازہ[illegible] کے کہا۔

گل مجھ سے پہلے ہی اتر چکی تھی۔ میں نے خفت سے مگر[illegible] کہا "سوچ رہا تھا کہ یہ کون سی جگہ ہے؟ جنگ' خانہ جنگی' خونریزی یہاں کیوں نہیں؟"

"لوجی" اے ڈی مسکرایا "آپ نے آکھیا تھا کہیں ا[illegible] سے بیٹھ کے گل بات کرنی ہے۔ یہ میرا گھر ہے۔ مگر کرائے[illegible] ڈھائی ہزار روپے ماہانہ۔"

میں دم بخود رہ گیا "یہ کار بھی تمہاری ہے؟"

"آہو جی" اس نے ڈھٹائی سے سر ہلایا "سو فیصد میری اب یہ مت پوچھنا کہ سب انسپکٹر کی تنخواہ میں یہ سب کیسے ہے۔ ھذا من فضل ربی۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے مسٹر اے ڈی۔ جب تم نے اعترا[illegible] ہی لیا ہے تو پھر ہمیں کیا۔ تم جانو اور تمہارا ایمان۔ یہاں [illegible] رہتے ہو؟"

"آج کل چھڑا چھانٹ ہوں۔ بیوی بچے پہلے ہی بھجوا[illegible] میں نے۔" اس نے اندر ہماری راہنمائی کرتے ہوئے کہا۔

اندر کوٹھی کی آرائش کے انداز میں بھی شان ریاست[illegible] تھی۔ فرنیچر' پردے اور قالین سے لے کر سجاوٹ کی اشیاء[illegible] چیز بیش قیمت اور رشوت کی کمائی سے خریدی ہوئی تھی۔ پ[illegible] بیشتر چھوٹے چھوٹے افسران کے پاکستان میں بھی یہی ٹھا[illegible] تھے۔ پھر وہ خاندان کے ہر فرد کے نام پر جائیدادوں اور کا[illegible] مالک تھے اور بے خوف تھے کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ انہی[illegible] والا کوئی نہیں۔ جو پوچھے گا وہ بلحاظِ عہدہ ہی ان سے بڑا نہی[illegible] ان سے بڑا مجرم سرمایہ دار بھی ہوگا اور انہی کی طرح جر[illegible] سے کالے دھن کا مالک بنا ہوگا۔

"تم نے بنگالیوں کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا ہے اے[illegible] نے کہا "یہاں سے جانا پڑا تو کیا کرو گے؟"

وہ ہنسنے لگا "لوجی۔ اللہ تو شکر خورے کو شکر دیتا ہے[illegible] میں ہو یا لہور میں۔ کھلے ڈلے ہو کے بیٹھو تے گل کرو۔ بھرجائی بڑی چپ چاپ ہے۔"

"بھرجائی تو ہے مگر اس کا گھر والا میں نہیں ہوں[illegible] کہا۔

"اچھا' معاف کرنا..... تمہاری کیا ہے...."

"بھرجائی سمجھ لو..... بہن سمجھ لو....." میں نے کہا۔[illegible] یہاں ڈھاکے میں گم ہو گیا ہے۔"

وہ متفکر ہو کے بولا "گم ہو گیا ہے.... کب.... اور[illegible] کھل کر بتاؤ لیکن! ایک منٹ' ٹھنڈا کہ گرم۔ کیا چلے گا؟"

میں نے کہا "گرم' اگر کافی ہو تو واہ واہ... چائے ہو[illegible]"

وہ ہنسنے لگا اور دروازے کی طرف منہ کر کے چلانے لگا "او[illegible] نوری' حوری کہاں مرگئی۔"

[illegible] ایک لڑکی دوڑتی ہوئی اندر آئی' پھر دوسری۔ ان دونوں کی عمر[illegible] تھی۔ دونوں کے رنگ صاف تھے اور نقوش تیکھے۔ دونوں [illegible] ایک سے کپڑے پہن رکھے تھے اور ایک ہی طرح کے پھول [illegible] میں لگا رکھے تھے۔ دونوں کے بے حساب لمبے گھنے بال کمر سے [illegible] نیچے تک پہنچتے تھے۔ دونوں کے جسم ایک سے گدرائے ہوئے تھے۔ [illegible] کی بات تو یہ تھی کہ ان کی شکلیں بھی ایک تھیں۔

[illegible] لو جی' یہ نور النساء ہے۔ یہ حور النساء۔ دونوں جڑواں بہنیں [illegible] اے ڈی بولا "یہ میرے پاس ملازم ہیں۔"

"صرف ملازم؟" میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"صرف ملازم۔ ان کے ماں پیو میرے پاس ملازم تھے۔ انہیں [illegible] انہوں نے مار دیا۔ یہ مسجد میں چھپ گئی تھیں۔ اسی مسجد کے پیش [illegible] امام میرے بچوں کو پڑھانے آتے تھے۔ انہوں نے مجھ گنہگار کو اس [illegible] سمجھا۔ ان کو میرے کول چھڈ گئے۔ کہ پتر ایہہ نیکی کما لے۔ [illegible] رب تیرے بگڑے کام بنائے گا۔ ان کی حفاظت کرنا۔ میں نے [illegible] کھائی کہ ایسا ہی ہوگا۔ میری بیوی بھی یہاں تھی۔ اس نے [illegible] صاحب کو روکا کہ آدھی رات کا ویلا ہے۔ صبح چلے جانا مگر [illegible] کا ٹیم پورا ہو جائے تو اسے کون روک سکتا ہے۔ صبح ان کی [illegible] لاش ملی۔ کسی نے عین دل وچ خنجر گھونپ دیا تھا۔"

نوری اور حوری چپ کھڑی تھیں۔ ان کی صورت پر دکھ کا [illegible] ایک سایہ اتر آیا تھا۔

"یہ کب کی بات ہے؟" میں نے کہا۔

"چھ مہینے ہو گئے۔" وہ بولا "اب تم جو سمجھو انہیں۔ میں ان [illegible] ایسے ہی رکھتا ہوں' جیسے اپنی بہنوں کو رکھتا۔ جے [illegible] دونوں۔"

"کیا ہوا انہیں؟"

"چھڈو جی پرانی گلاں ہیں' دل دکھانے والی۔" اس نے کہا اور [illegible] سے مخاطب ہو گیا "جا پتر' چائے بنا کے لا اور حوری' اج کیا ہے [illegible] کھانے میں بھی۔"

اس نے اقرار میں سر ہلایا اور زبردستی مسکرائی "ابھی لائے"

"ابھی لائے گا' ایک دم فرائی کر کے۔ جا اللہ تجھے حور بنائے۔" [illegible] اٹھتے ہوئے بولا "جا میری اکھیاں کے نور۔ فٹافٹ چائے"

[illegible] وہ دونوں جیسے آئی تھیں ویسے ہی قلانچیں بھرتی غائب [illegible] ہو گئیں۔ ان کی نظریں مسلسل گل پر رہی تھیں اور صاف ظاہر تھا [illegible] وہ ہمیں ایک قابلِ رشک جوڑی سمجھ رہی تھیں۔

اے ڈی نے الماری سے بوتل نکالی۔ "معاف کرنا....." اس نے بوتل سے دو گھونٹ لے کر بوتل کو پھر الماری میں رکھ دیا۔ "ابھی گھر والی نہیں ہے نا۔ وہ نامراد اسی کے پیچھے پڑی رہتی ہے۔ چھپا چھپا کر رکھتا ہوں۔ وہ نکال لیتی ہے ہر تھاں سے۔ لڑتی رہتی ہے۔ بڑی بکواس کرتی ہے۔ میں اس کان سے سنتا ہوں' اس سے اڑا دیتا ہوں۔ چنگی پالیسی ہے نا۔ خوش رہتا ہے بندہ۔"

میں نے کہا "تم اسے چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟"

"او چھڈو جی' کیا کیا چھوڑیں۔ سب ہی حرام ہے یہاں تو۔ اس سے تو اچھا ہے بندا دنیا چھوڑ دے۔" وہ ہنسا "بس' دسو کی گل اے۔"

آدمی مجموعہ تضادات ہے۔ چوہدری اللہ دِتا دنیا کی سب برائیوں میں ملوث تھا۔ جانتا تھا کہ رشوت بھی حرام ہے' شراب بھی مگر اس کے باوجود وہ اپنے نفس پر قابو پانے میں ناکام تھا۔ اپنی فطرت کی خامیوں اور کوتاہیوں سے پوری طرح آشنا تھا۔ خود کو گنہگار اور جہنمی مانتا تھا۔ دوسری طرف ایک پیش امام نے اسے ایک بہت بڑی ذمے داری سونپتے وقت اس کی نیت پر شک نہیں کیا تھا اور وہ صدقِ دل سے کوشش کر رہا تھا کہ اس امانت میں خیانت نہ ہونے پائے۔ بے شک اس کے پس منظر میں بھی کوئی المیہ تھا جس کا شکار اے ڈی کی بہنیں ہوئی تھیں لیکن اے ڈی نے انتقامی رویّہ اختیار نہیں کیا تھا جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے۔ کسی نے اس کی بہنوں کے ساتھ زیادتی کی تھی۔ وہ کسی اور کی بہنوں سے اس کا بدلہ لے سکتا تھا مگر وہ ثابت قدمی سے نوری اور حوری کو اپنے گھر میں ملازم ظاہر کر کے بہنوں کی طرح پال رہا تھا۔ چوہدری اللہ دِتا مجھے اس حاجی عبداللہ کے مقابلے میں ہزار درجہ بہتر انسان لگا جو اپنے ظاہر سے تقویٰ اور پرہیزگاری کا دھوکا دیتا تھا۔ اس کا باطن خباثت سے پُر تھا اور وہ نام کی رعایت کے برعکس اللہ کا بندہ نہیں شیطان کا چیلہ تھا۔

"تو چھ مہینے سے بندا غائب ہے؟" اے ڈی نے غور کرتے ہوئے خود سے کہا۔ "ناں کی اے بندے دا؟"

میں نے کہا "نام..... اصل نام تو محسن شیروانی ہے مگر ہو سکتا ہے اس نے نام اور چہرہ بدل لیا ہو۔"

وہ احمقوں کی طرح میری صورت دیکھنے لگا۔ "لوجی' سب کچھ بدل لیا ہوگا تو پھر کیا ہوگا؟ کیسے پہچانا جائے گا۔ چلو پہلے ایہہ دسو کہ بندا غائب کیسے ہوا۔"

میں نے کہا "وہ ڈھاکا آیا تھا۔ ایک خفیہ مشن پر۔"

"خفیہ مشن' جناب' بات خفیہ ہے تو پھر مجھے کیوں بتاتے ہو؟ بھروسہ نہیں ہے تو چھڈو پراں۔" وہ بولا۔

"تم خواہ مخواہ برا مان گئے۔ میں تم سے کچھ خفیہ نہیں رکھوں گا۔ اس کا مشن تھا مجیب کے چھ نکات کی تحریک کو ناکام بنانے کا۔ بنگلہ دیش کی علیحدگی کے آثار تو پہلے ہی عیاں تھے۔ بہت سے لوگ پاکستان کو متحد دیکھنا چاہتے تھے۔"

"میں بھی چاہتا ہوں" وہ تلخی سے بولا "تم بھی چاہتے ہو گے مگر ہوتا وہی ہے جو منظورِ خدا ہو۔"

"اب تو یہی کہا جا سکتا ہے۔ کوئی چلتی گاڑی کے آگے لیٹ جائے، بادشاہی مسجد کے مینار سے کود جائے یا تیزاب پی کر مرجائے۔ تو یہ کہنا کہ خدا کو ایسا ہی منظور تھا، یہ بالکل غلط بات ہے۔ خدا نے عقل دی ہے اور فیصلوں کا اختیار دیا ہے۔ کیکر بونے والا آم نہیں کھا سکتا۔ اگر وہ کہے کہ یہ خدا کو ہی منظور نہ تھا ورنہ آم لگتے۔ تو یہ پاگل پن ہے ایسا سوچنے والے کا۔ ہم نے اسباب بہت پہلے پیدا کردئے تھے اور یہ محض نتیجہ ہے۔ خیر۔ اس بحث سے اب کیا حاصل۔ میں اور میرا دوست عملاً مزاحمت کرنے والوں میں شامل تھے۔ جیسے یہاں البدر اور الشمس جیسی تنظیمیں ہیں۔ ایسی ہی مغربی پاکستان میں ایک تنظیم تھی۔ تھی کیا، ہے۔ وہ یہاں علیحدگی پسندوں سے لڑنے والوں کی مدد کر رہے تھے۔ میرا دوست بھی ایسے ہی ایک کام سے یہاں آیا تھا۔"

"لو جی، تمہیں یہ تو معلوم ہوگا کہ اس کا رابطہ کس سے تھا؟"

"جن سے رابطہ تھا وہ روپوش ہو گئے ہیں، مارے گئے ہیں یا پکڑے جا چکے ہیں۔ اب کسی کا کچھ پتا نہیں چلتا کہ کون کہاں گیا۔"

"تمہارا دوست اکیلا ہی تھا؟"

"ہاں۔ یہ کوئی بہت بڑی تنظیم نہیں تھی۔ اس کے گنے چنے ارکان تھے جو صرف نقد امداد فراہم کرتے تھے۔ پیسے سے سب کچھ خریدا جا سکتا ہے۔ اسلحہ۔ ضروریاتِ زندگی۔ پوشیدہ ٹھکانے۔ تحفظ اور سلامتی۔"

"کیا نام تھا تمہاری اس تنظیم کا؟" اے ڈی نے کہا۔

"اپنا" میں نے کہا "ایک پاکستان نظریاتی اتحاد۔"

اس نے سرہلایا "اچھا نام تھا۔ کام بھی اچھا تھا مگر ضائع گیا۔"

میں نے کہا "اس سے فرق نہیں پڑتا۔ نیک نیتی اور خلوص کے ساتھ جدوجہد میں اصل کامیابی خود اپنا اطمینان ہے۔"

نوری اور حوری چائے کے ساتھ تلی ہوئی مچھلی رکھ کے خاموشی سے لوٹ گئیں۔ گل نے چائے بنائی۔

"فیر دسّو جی کیا کرنا ہے؟" اے ڈی بولا۔

"محسن کو تلاش کرنا ہے ورنہ یہ مرجائے گی" میں نے کہا "اسی کی خاطر ہم ایسے خطرناک حالات میں نکل کھڑے ہوئے۔"

"دوست کی خاطر نہیں؟" اے ڈی نے سوال کیا۔

میں نے کہا "ظاہر ہے دوست کی خاطر۔ وہ دوست نہ ہوتا تو ہماری بلا سے کچھ بھی ہوتا۔ اب تم ذرا یہ معلوم کرو کہ پولیس نے گزشتہ چھ مہینوں میں کتنے بندے پکڑے ہیں۔"

"کیا! چھ مہینوں میں۔ او بھائی، کیسی گلاں کرتے ہو۔ پولیس نے سیکڑوں نہیں ہزاروں بندے پکڑے ہوں گے۔ سیکڑوں تو روز تھانوں میں ایسے ہی ڈک دیے جاتے ہیں" وہ بولا۔

میں نے کہا "بالکل ٹھیک مگر ان میں سے اکثر صبح چھوڑ [illegible] جاتے ہیں۔ سودا ہو جاتا ہے کچھ دے دلا کر۔ کچھ سفارش سے [illegible] جاتے ہیں۔ کچھ بدقسمت جن کا آگے پیچھے کوئی نہ ہو اور جی[illegible] جیب میں بھی کچھ نہ ہو کسی نہ کسی الزام کے مستحق سمجھے [illegible] ہیں۔ ضابطۂ فوجداری کی کوئی نہ کوئی دفعہ ان پر لگ جاتی ہے اور کا جرم ان کے سر منڈھ دیا جاتا ہے اور ایسے لوگوں کا [illegible] ہوتا ہے۔"

"پھر بھی یہ بہت اوکھا کام ہے۔"

"مشکل کام نہ ہوتا تو ہم تمہیں کہتے؟ تم اپنے لوری [illegible] ہو، اتنا بھی نہیں کر سکتے اپنی بھرجائی کے لئے۔"

نہایت مناسب وقت پر گل نے رونا شروع کر دیا۔ ا[illegible] آنسو بالکل اصلی تھے اور جذبات بھی مگر اس نے عقل مند[illegible] کہ انہیں روک کے رکھا اور ٹھیک وقت پر ریلیز کر دیا۔ اس کا [illegible] اور خاطر خواہ اثر ہوا۔

اے ڈی نے پریشان ہو کے کہا "او پاگل، جھلی۔ رونے [illegible] بات ہے۔ او مل جائے گا تیرا گھروالا۔ بندا ہے کوئی مکھی مچھر بھوت تو ہے نہیں کہ غائب ہو جائے۔ میں پتا کروں گا۔"

میں نے کہا "کیسے پتا کرو گے؟"

اس نے کان میں انگلی ڈال کے ہلائی "لو جی، یہ اوکھا ہے۔ کوئی فوٹو شوٹو ہوتی اس کی تو پھر کام آسان ہو جاتا۔ [illegible] کتنے تھانے ہیں ڈھاکا شہر اور چھاؤنی میں۔ سب جگہ کسی نہ [illegible] واقفیت نکالنی پڑے گی اور آج کل تو واقف بھی ناواقف ہیں۔ لیکن اپنے بندے ہیں ابھی تھانوں میں۔"

میں نے جیب سے محسن کی ایک تصویر نکالی جو اخبار [illegible] تصویر کے ساتھ شائع ہوئی تھی اور میں اسی مقصد کے لئے لایا تھا۔ "یہ ایک تصویر ہے، کوئی سال بھر پرانی۔ ہم نے پہلے گمشدگی کا اشتہار شائع کرایا تھا۔"

"کس اخبار میں؟"

"بمبئی اور دہلی کے اخباروں میں۔"

"بندا ڈھاکے میں تے اشتہار دلی بمبئی وچ۔"

میں نے کہا "دراصل وہ مختلف وسیلوں، رابطوں اور [illegible] سے ڈھاکا پہنچا تھا۔ ہم خود بہت چھپتے چھپاتے آئے ہیں۔ بھارت کی پولیس بھی ہماری تلاش میں ہے۔ بنگلہ دیش میں [illegible] ہی دشمن ہیں سوائے ان کے جو محبِ وطن ہیں مگر وہ بھی [illegible] دبکے ہوئے ہیں۔"

اے ڈی نے تصویر پر غور کیا "لو جی، بندا دیکھا ہوا [illegible] ہو سکتا ہے فوٹو دیکھی ہو کہیں۔"

میں نے کہا "اس کے ساتھ میری تصویر بھی ہو گ[illegible] اشتہار بمبئی کی پولیس نے دیا تھا۔"

"اچھا؟ اشتہاری مجرم ہو خیر سے۔"

"ہاں۔ اور ہمارا جرم ہے پاکستان سے محبت۔ پاکستان کے دشمنوں سے نفرت۔ یہاں وہ طاقت ور ہیں اور اقتدار بھی لے چکے ہیں۔"

"پھر تو میاں تم خطرے میں ہو مجھ سے زیادہ۔ ایسے کیوں گھومتے پھرتے ہو؟ کسی نے پہچان لیا تو ٹھنڈا ٹھار کر دے گا۔ آج کل کسی کو مارنا سب سے آسان کام ہے۔" وہ بولا "میں یہ فوٹو رکھ لیتا ہوں۔۔۔۔"

"فوٹو ضرور رکھو مگر اس بات کا بھی خیال رکھنا کہ کسی دشمن کے سامنے مت نکالنا ورنہ خود بھی پھنس جاؤ گے۔"

"لو جی، اب تم پولیس والوں کو ہدایت دے رہے ہو" اس نے ہنسنا شروع کیا۔

میں نے کہا "ممکن ہے اس کی شکل صورت بدل گئی ہو۔ داڑھی بڑھا لی ہو اس نے۔ یا خود ہی بڑھ گئی ہو۔"

اے ڈی نے کہا "وہ میں نے سوچ لیا ہے۔ میں اس تصویر سے تین چار تصویریں بنواؤں گا۔ کسی آرٹسٹ سے۔ یہ جو سینما کے سائن بورڈ وغیرہ بناتے ہیں، واہ واہ آرٹسٹ ہوتے ہیں۔ نیلو کی مورت بناتے ہیں تو نشو نہیں لگتی۔ ایک اسکیچ داڑھی کے ساتھ ہو۔ دوسرا مونچھوں کے ساتھ۔ تیسرا داڑھی مونچھوں والا۔ لمبے بالوں والا۔ گنجے سر کے ساتھ۔ پھر چہرہ ایک ہو۔ تو کام آسان ہو جائے گا۔"

میں نے اس کی ترکیب کو پسند کیا "یہ تم نے ذہانت کی بات کی۔"

وہ ہنسنے لگا "لو جی اپنا کیا کمال ہے اس میں۔ ہمارے پاس ہوتا ہے شناختی تصویر بنانے کا سامان۔ مختلف ٹوٹے ہوتے ہیں۔ کبھی سر بدل دیا۔ آنکھیں، ناک، ہونٹ، ٹھوڑی۔ باری باری انہیں جوڑ کے بندے کی شکل بدلتے ہیں۔ کوئی موقعے کا گواہ ہو تو پوچھتے رہتے ہیں کہ اب کیا خیال ہے۔ شکل ایسی تھی۔ فرق ہے تو کہاں۔ اور گواہ نے بندے کو چنگی طرح دیکھا ہو تو وہ بتاتا جاتا ہے کہ بال کچھ چھوٹے تھے یا بھورے تھے۔ ناک چپٹی تھی۔ آنکھیں ذرا بادامی۔ آخر کار ایک شکل بن جاتی ہے جو گواہ کے نزدیک مجرم کی صورت سے نوّے فیصد ملتی ہے۔ اس تصویر کو ہم مشتہر کر دیتے ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔ اسے (IDENTITY KIT) کہتے ہیں نا" میں نے کہا۔

اے ڈی نے کہا "یار، معلوم تھا تو پہلے بولتے۔ میں اتنا نہ بولتا۔ خیر اب میں اس تصویر سے بندہ تلاش کرلوں گا۔ بھرجائی بلا جے تے بندہ حوالات یا تھانے سے گزرا ہے اور جیل میں بھی ہے تو مل جائے گا۔ مطلب یہ کہ سراغ مل جائے گا۔ یہ وعدہ نہیں کہ تمہیں مل جائے گا۔ عمر قید کاٹ رہا ہوگا یا کال کوٹھڑی میں۔۔۔۔"

گل نے ایک چیخ ماری "ایسا مت کہو" اور دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"او یار، او بابا مینوں ماف کر دے۔ میری توبہ۔ میرا یہ مطلب تو نہیں تھا" اے ڈی حواس باختہ ہو گیا "او جھلی، کچھ نہیں ہو گا اسے۔ میں لا کے دوں گا تجھے تیرا گھروالا۔ چل چپ کر۔"

لیکن گل اتنی آسانی سے چپ ہونے والی نہیں تھی۔ اس کی سسکیاں ہچکیوں میں ڈھل گئی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ ہسٹریا کی طرف بڑھ رہی تھی جو ایک خطرناک بات تھی۔ دورے کی کیفیت میں وہ میرے جھوٹ کا بھانڈا پھوڑ سکتی تھی اور سچ تو ایک ایسا آتش فشاں تھا جو پھٹ جاتا تو اس کا لاوا کسی سیلاب کی طرح ہم سب کی سلامتی اور بقا کی کوششوں کو خاک کر دیتا۔ ہماری مصلحت کوشی اور دور اندیشی پر مبنی خود حفاظتی انتظامات کو تہس نہس کر دیتا اور غیروں کے جور و جبر و جفا سے عافیت کے ساتھ بچ نکلنے والے ایم آر ایس کے پسماندگان اپنوں کے اسیرِ ستم ہوتے۔

گل کو ہوش میں لانے کے لئے میں نے اس کی کلائی بظاہر پیار سے پکڑی مگر اس پر اپنی گرفت اتنی سخت کر دی کہ گل درد سے تڑپ اٹھی "دیکھو، رونے سے کیا فائدہ" میں نے نرمی سے کہا۔

گل نے کراہ کے کہا "سکندر بھائی! میرا ہاتھ۔۔۔۔۔"

میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا "جاؤ اندر جا کے منہ دھولو۔ یار اے ڈی، ذرا بلاؤ انہیں۔ حور اور نور کو۔"

میرا خیال ہے کہ اے ڈی تاڑ گیا تھا مگر اس نے چشم پوشی اختیار کی اور دونوں لڑکیوں کو بلا لیا۔ وہ گل کو اپنے ساتھ لے گئیں۔

اے ڈی پھر اٹھا الماری میں سے بوتل نکال کے اس نے دو گھونٹ لئے اور بوتل واپس رکھتے ہوئے بولا "شراب سمجھ کے نہیں پیتا میں۔ یہ تو دوائی ہے میری۔ دو گھونٹ کی خوراک ہے، اس سے زیادہ نہیں۔ نشہ نہیں ہوتا مجھے بالکل بھی۔ چنگا بھلا ہوں میں۔"

میں نے کہا "یہ صفائی کیوں پیش کر رہے ہو؟ اس لئے کہ تم خود اپنے احساس جرم و گناہ میں مبتلا ہو۔ تم جانتے ہو یہ دوا نہیں مرض ہے۔"

وہ میرے پاس آ کے بیٹھ گیا۔ ایک لمبی گہری سانس لے کر اس نے کہا "ہاں یار۔ بندہ کیا کرے جب بیماری لگ جائے اور جان نہ چھوڑے۔ جیسے ٹی بی۔ یا کینسر۔ کیا علاج کرے کوئی؟ بس انتظار کرتا ہے کہ رب کی طرف سے کچھ ہو جائے۔ کوئی معجزہ۔۔۔۔"

"تم خود کچھ نہیں کر سکتے؟ اتنی عقل اور توانائی دی ہے خدا نے تمہیں" میں نے کہا۔

"او چھڈو جی۔ جب بندا اپنے پیراں پر خود کلہاڑی مارلے تو پھر پیراں پر کھڑا کیسے ہو۔ کیا تم کو ایسی کوئی بیماری نہیں ہے جس کا علاج تم خود کر سکتے ہو مگر نہیں کرتے۔ فرشتے ہو تم؟ نہیں۔ تم بھی انسان ہو میری طرح۔ تم میں بھی کمزوریاں اور خامیاں ہیں، خرابیاں ہیں لیکن تم چھپاتے ہو۔ کچھ چھپاتے ہو، کچھ کا تمہیں پتا

ہی نہیں ہوگا۔"

"خدا سے کسی کا حال پوشیدہ نہیں۔" میں نے کہا۔

"لو جی۔ خدا کی کیا بات کرتے ہو۔ تم میرے جیسے گناہ گار، عقل کے اندھے کی دھوکا کھانے والی آنکھوں سے کچھ نہیں چھپا سکتے۔" وہ ہنسنے لگا "تم کو جھوٹ کی بیماری ہے۔ ہے نا؟ جھوٹ بھی حرام ہے، شراب بھی حرام ہے۔ ایک حرام کام میں نے کیا، دوسرا تم نے۔ پوچھو کیا؟ تم نے ایک جھوٹی اسٹوری سنائی۔ اب میں بتاؤں؟ تمہارا نام ہے سکندر بخت۔ ہے نا؟"

مجھ پر شرم سے گھڑوں پانی پڑ گیا۔ اس نے مجھے لاجواب ہی نہیں کیا تھا میرے ہاتھ کا طمانچہ میرے ہی منہ کی جانب لوٹا دیا تھا۔ یہ عذر امتحان جذب دل کیسا نکل آیا۔ میں الزام اس کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا!

"اس کاکی نے جب تمہارا نام لیا نا' تو بس اک دم گھنٹی بج گئی' اور جیسے سینما ہال میں گھنٹی بجتی ہے تو اندھیرا ہوجاتا ہے مگر اسکرین روشن نظر آنے لگتا ہے' ایسے ہی میرے دماغ میں سب واضح ہوگیا۔ میں نے سب تصویریں دیکھی تھیں۔ تمہاری۔ محسن کی۔ اور ایک بندا تھا غالب جو کل تمہارے ساتھ تھا۔ اس کاکی سے تو واقف نہیں میں۔ گل نام ہے نا اس کا؟ مگر وہ جو غالب کے ساتھ تھی۔ نازو....." وہ قہقہہ مار کے ہنسا۔

میں نے کہا "جب تم جانتے ہو..... تو پھر۔ میں کیا کہوں؟"

اس نے ایک دم ریوالور نکال لیا "کچھ نہیں۔ اب جو کہنا ہے نا' پولیس اسٹیشن جا کے کہنا۔ ملٹری انٹیلی جنس کو بتانا۔ رج کے جھوٹ بولنا ان کے سامنے۔ سچ وہ خود اگلوالیں گے۔ ہاتھ اٹھاؤ اوپر۔ کھوتے۔"

"اللہ دتا! تم تو بڑے کمینے اور دغا باز ہو" میں نے ہاتھ اٹھا کے کہا "ہم وطن اور ہم زباں ہو کے بھی تم نے ہمارے اعتماد کا بھرم نہیں رکھا۔ تم بکتے ہو کہ تمہیں نشہ نہیں ہوتا..... تمہارا ہاتھ کانپ رہا ہے۔"

وہ پھر ہنسا "اچھا؟..... مجھے تو تم بھی کانپتے ہوئے نظر آرہے ہو۔ بندے کی موت اسے کہاں لاتی ہے گھیر کے۔"

میں نے کہا "میں موت سے نہیں ڈرتا۔"

"پھر کس سے ڈرتے ہو؟" وہ تمسخر آمیز لہجے میں بولا "اپنی بیوی سے؟ میں بھی ڈرتا ہوں۔ میری بیوی چوہے سے ڈرتی ہے مگر..... مجھ سے نہیں ڈرتی۔ کاکروچ تک سے ڈرتی ہے۔ میں چوہے اور کاکروچ سے بھی گیا گزرا ہوں۔ تمہاری بیوی کیا کرے گی جب اسے معلوم ہوگا' تم خیر سے شہید ہوگئے ہو۔"

میں نے کہا "ابھی کوئی بیوی نہیں ہے میری جو بیوہ ہو۔ ایک لڑکی ہے' وہ فخر کرے گی میری شہادت پر اور لعنت بھیجے گی تم جیسے دوست بن کے دشمنی کرنے والے پر۔ اگر میں دشمنوں کے ہاتھوں مارا جاتا تو مجھے افسوس نہ ہوتا چوہدری اللہ دتا۔"

"اے ڈی" وہ بولا "مجھے بھی اے ڈی اچھا لگا تھا۔ سنا ہے تم بڑے جوڈو ماسٹر ہو۔ گولی پر کوئی داؤ چلتا ہے؟ خبردار! اپنی تھاں سے مت ہلنا۔ میں بالکل نشے میں نہیں ہوں۔ تمہارا دل صاف نظر آرہا ہے مجھے سینے کے اندر دھڑکتا ہوا۔ ایکس رے کر سکتا ہوں میں۔ پوسٹ مارٹم بھی کر سکتا ہوں۔ بتا سکتا ہوں کہ بندا کیسے فوت ہوا تھا۔"

وہ خبیث نشے میں ہونے کے باوجود بے حد مستعد اور ہوشیار تھا۔ اس کی نظر ایک لمحے کے لئے مجھ پر سے نہیں ہٹی تھی اور اس نے اپنے ریوالور کا رخ ایک سوت نہیں بدلا تھا۔ اس نے میری نفسیاتی چال کو بھی رد کر دیا تھا کہ اس کا ہاتھ کانپ رہا ہے۔ اگر وہ ہاتھ کی طرف توجہ دیتا تو میں ایک کوشش ضرور کرتا کہ ریوالور چھین لوں۔

"تم مجھے کیش کرا سکتے ہو۔" میں نے کہا "میرے دشمن میرے سر کی بولی لگائیں گے۔ مکتی باہنی والے سب سے زیادہ قیمت ادا کرسکتے ہیں۔ میں انہی کا مجرم ہوں۔ تمہارا کیا بگاڑا ہے میں نے؟"

اس نے قہقہہ مارا اور ریوالور جیب میں رکھ لیا "چلو خیر چھوڑو پراں' ہم بھی گولی نہیں مارتے تمہیں۔"

میں بھونچکا رہ گیا اور کچھ دیر بے وقوفوں کی طرح اسے گھورتا رہا "یہ کیا مذاق تھا اے ڈی؟ اس میں تمہاری یا میری کسی کی جان بھی جاسکتی تھی۔"

"لو جی' میری کیسے؟" وہ ہنسا "تم کیا جیب سے توپ نکال لیتے؟"

میں نے کہا "اس سے پہلے بہت لوگ اسی خوش فہمی میں مارے گئے ہیں کہ انہوں نے اسلحے کی طاقت پر بھروسہ کرتے ہوئے مجھے کمزور سمجھ لیا تھا۔ اگر موقع ملتا مجھے تو اس سے پہلے کہ تمہیں پتا چلتا' میں تمہاری گردن توڑ دیتا۔"

"مجھے معلوم ہے۔ مگر میں جُوا بھی کھیلتا ہوں۔ سارے شرعی عیب ہیں میری ذات میں" وہ بولا "خیر سبق چنگا سی۔ یاد رہے گا تمہیں۔"

"میرے لئے کیا سبق تھا اس میں۔"

"سبق یہ تھا بھائیاجی کہ بندے کو اکھاں بند کر کے ہر ایک پر اعتبار نہیں کرلینا چاہئے۔ بندہ لہوردا ہووے تے بھاویں جھنگ دا۔ اگر کھوتے دا پتّر ہے تو انسان نہیں بن سکتا۔ میری گل سمجھ آرہی ہے! یہ سارے رشتے بس ایسے ہی ہیں۔ اب ان بنگالیوں کو دیکھو۔ کتنا مضبوط تے سچا رشتہ تھا ہمارا۔ پاکستان انہوں نے بھی بنایا تھا' مسلمان یہ بھی ہیں مگر پاکستان کے دشمن ہوگئے ہیں۔"

میں نے کہا "ایکس رے میں نے بھی کرلیا تھا تمہارا اے ڈی۔ اندر تک دیکھ لیا تھا میں نے تمہیں۔ کبھی فرصت ملی تو بتاؤں گا کہ ہزار میل کے اس سفر میں انسانوں کے ہزار روپ دیکھے ہیں میں نے۔ زندگی کے اور موت کے' جھوٹ اور سچ کے ہزار چہرے میری نظر سے گزرے ہیں۔ آدمی کے ظاہر سے باطن کا اندازہ کرنا آگیا ہے مجھے۔ حادثات اور تجربات نے سکھادیا ہے۔ خط کا مضمون بھانپ لیتے ہیں لفافہ دیکھ کر۔"

وہ بات بات پر ہنسنے کا عادی تھا "کاکابلّی' ایک لفافہ اور ہے۔ محمد بھائی۔ اس کا مضمون پڑھ کے سناؤنا مجھے۔ کیا لکھا ہے اس میں۔"

"محمد بھائی! تم نے بتایا ہے وہ ہسٹری شیٹر ہے۔ ظاہر ہے کوئی اچھا آدمی نہیں ہے۔ جرائم پیشہ رہا ہوگا مگر کل اس نے ایک دشمنِ جاں مجمع کے سامنے خود کو پاکستانی ثابت کیا۔ مجھے بھی بچالیا۔ وہ دل سے پاکستان کا حامی ہے' شاید جان دے بھی سکتا ہے اور لے بھی سکتا ہے پاکستان کی خاطر۔"

"ٹھیک۔ اور کچھ....."

میں نے سر کھجا کے کہا "اور..... اور یہ کہ اس کی نیت کچھ ٹھیک نہیں لگتی مجھے۔ کل اس نے گل کو اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔ رات کو وہ ہوٹل پہنچا مگر اتفاق سے ہم سرونٹ کوارٹر میں تھے۔ ہوٹل میں کمرا نہیں ملا تھا۔ آج ملے گا۔ صبح وہ نہ جانے کہاں تاک میں بیٹھا تھا کہ بس اسٹاپ پر آگیا اور جن نظروں سے وہ گل کو دیکھ رہا تھا' اس سے مجھے خطرہ محسوس ہوا تھا گل کے لئے۔ اچھا ہوا تم آگئے ورنہ میرے لئے ضبط سے کام لینا مشکل ہوجاتا۔ وہ کوئی گھٹیا بازاری حرکت کرتا اور میں اسے مارتا۔"

"گل تمہاری حقیقی بہن تو نہیں ہے۔"

"نوری اور حوری بھی تمہاری سگی بہنیں نہیں ہیں۔ کیا تم محمد بھائی جیسے کسی غنڈے کو اجازت دو گے....."

اس نے میری بات کاٹ دی "محمد بھائی نے چھ بندے کرچ کردئے تھے۔ وہ ایک گرلز اسکول کی استانی کو اٹھانے گئے تھے۔ اس کے گھر والوں کو وہ پہلے ہی ختم کر آئے تھے۔ وہاں بہت لوگ تھے۔ کوئی اسے بچانے نہیں آیا۔ سب بھاگ گئے۔ جو وہاں تماشا دیکھ رہے تھے وہ بس شور کررہے تھے۔ محمد بھائی کو بھی چاقو لگے پر بندہ ہے جی دار۔ مقابلے پر شہدے تھے۔ شہدے اور بدمعاش وچ بڑا فرق ہوندا ہے۔ محمد بھائی نے کہا کہ اکیلی لڑکی پر ہاتھ ڈالتے ہو نامردو۔ خنجر کے استعمال میں محمد بھائی فنکار ہے۔ اور خنجر بھی اس کا بجلی ہے۔ بلیڈ کی دھار ہے اس کی۔ ادھر سے اُدھر تک پیٹ ایسے کاٹ دیتا ہے جیسے مکھن کو گرم چھری۔ بندے کو پتا ہی اس وقت چلتا ہے جب گردے شردے آنتوں کے ساتھ باہر آجاتے ہیں۔"

میں نے کہا "چھ قتل کردیے اس نے اور پکڑا نہیں گیا۔"

"پکڑیا جاندا۔ پھانسی بھی لٹک جاتا" اے ڈی بولا "پر ایک بہت بڑے آدمی نے اسے بچالیا۔ اس بہت بڑے آدمی کا پتّر اسی استانی کے چکر میں تھا اور استانی بھی اس بہت وڈے بندے کی بہو بننے والی تھی۔ سارا جھگڑا خاندانی دشمنی کا تھا۔ اس بہت وڈے بندے نے کہہ دیا کہ محمد بھائی تو اس کے ساتھ تھا سارا دن اور وہ خود فلاں سے ملا اور فلاں سے ملا تب بھی محمد بھائی ساتھ تھا۔ پوچھ لو فلاں فلاں سے۔ یہ جو فلاں فلاں تھے یہ بھی وڈے بندے تھے مگر بہت وڈے بندے کو سلام کرنے والے۔ وہ کیسے کہتے کہ یہ جھوٹ ہے۔ بہت وڈا بندا جو بولتا ہے وہی سچ ہوتا ہے۔ ایویں جو چھوٹے موٹے چشم دید گواہ بن گئے تھے ان کو بھی چھتر پڑے تو وہ مان گئے کہ انہوں نے کچھ نہیں دیکھا تھا۔ محمد بھائی نے اس بہت وڈے بندے کے چھ دشمن کرچ کردئے تھے۔ اس کا بدلہ تو وڈے بندے نے ادا کرنا ہی تھا۔ وہ آج بھی بہت بڑا آدمی ہے۔ پہلے سے بھی بڑا ہوگیا ہے۔ پہلے مینار تھا تو اب قطب مینار ہوگیا ہے اس لئے محمد بھائی اپنی جنگلی مونچھوں کو تاؤ دیتا پھرتا ہے مگر اسے کوئی بدمعاش نہیں کہہ سکتا۔"

میں نے کہا "یہ تو اور مصیبت ہوگئی۔ کڑوا کریلا نیم چڑھ گیا ہے' اگر وہ گل کے پیچھے پڑ گیا تو میں کیا کروں گا؟"

اے ڈی ہنسنے لگا "لو جی' یہ میں بتاؤں کہ تمہیں کیا کرنا چاہئے؟ بھرجائی میری ہے کہ تمہاری؟ جیسے میری گردن توڑ رہے تھے ویسے ہی اس کی گردن توڑ دو۔ ذرا پیار محبت سے۔"

"پیار محبت سے؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"ہاں۔ لڑائی جھگڑا کرکے نہیں اور کسی کے سامنے نہیں۔ اگر وہ تمہاری بھرجائی کے پیچھے لگ گیا ہے تو بھرجائی سے کہو اسے بلائے۔ ایسے مت گھورو مجھے۔ شکار تگڑا ہو تو شکاری کو چالاک ہونا چاہئے۔ شیر کو سامنے بلا کے تارزن بھی نہیں کہتا کہ آ شیر مجھے مار' تیری تو....."

مجھے ہنسی آگئی "تمہارا... مطلب ہے' دھوکے سے کہیں اکیلے میں بلا کے اس سے نمٹ لوں۔ یہ تو بڑی غلط بات ہوگی۔"

"فیر صحیح بات دسّو مینوں" وہ جھلّا کے بولا۔

"پہلے میں بات کرلوں اس سے۔ سمجھانے کی کوشش کروں شرافت سے۔" میں نے کہا۔

اے ڈی ہنس پڑا "شرافت سے! معاف کرنا یار' تم بالکل وہ ہو۔ بلّو کے اٹھّے۔ تم اسے سمجھاؤ گے کہ رب کے راستے پر چلے۔ شرع کے مطابق داڑھی رکھے اور نماز پنج وقتہ پڑھے۔ تسبیح گھمائے۔"

میں نے کہا "تم مذاق مت سمجھو اسے۔ میں اسے جان سے مارے بغیر بھی اس کا دماغ درست کر سکتا ہوں۔"

"اچھا اچھا۔ کرو' جو دل چاہے کرو۔"

میں نے کہا "تم یہ کام کب تک کرو گے جو میں نے کہا ہے؟"

"لو جی' بس ابھی جاتا ہوں" اس نے دوبارہ الماری کا ر..... "شام تک دیکھتا ہوں کس کس سے بات کی جاسکتی ہے۔ دو چار دن تو لگیں گے۔"

"ہم بھی کوشش کریں گے۔"

"گرفتار ہونے کی؟" وہ منہ صاف کرکے بولا "ایسے پھرتے

رہو گے تو انشاء اللہ جلد کامیابی ہو گی۔ تمہیں پہچاننے والے بہت ہیں۔ انڈین پولیس اور فوج میں سارے ان پڑھ اور بے خبر لوگ نہیں ہیں۔ سب نے نہ سہی آدھے، آدھے نہیں تو ایک چوتھائی اخباروں میں تمہاری شکل مبارک دیکھ چکے ہوں گے۔ انٹیلی جنس کے بندے بھی بہت ہیں۔ وہ چُن کے لئے جاتے ہیں اور تمہاری طرح کھا گل پوتے نہیں ہوتے۔"

"کھا گل پوتے" میں نے غور کر کے کہا "تمہارا مطلب ہے پاگل کھوتے اس سے پہلے تم نے مجھے اُلو کا پٹھا کہا تھا....."

"میں نے تمہیں پلو کا اٹھا کہا تھا" اے ڈی نے بے نیازی سے کہا۔

"اچھا گل کو بلاؤ" میں نے کہا "بہت دیر ہو گئی"

"ہاں۔ کھانے میں کچھ دیر ہو گئی۔" وہ سرہلا کے بولا اور اندر کی جانب منہ کر کے دہاڑا "او حورا! نورا!"

حورا اور نورا نے کورس میں کہا "کیا ہے، ہم کام کر رہے ہیں۔"

"تمہارا سر۔ بھرجائی کو واپس کرو۔ کیا اسے بھی کام پر لگا دیا ہے" اے ڈی نے اندر جھانک کر کہا "بڑی بری بات ہے۔ پرائی چیز ہے۔ ٹھیک کرنے کو دی تھی۔ تم نے استعمال شروع کر دیا۔"

میں بیٹھ گیا۔ گل ان لڑکیوں کے ساتھ کچن میں ہاتھ بٹانے لگی ہو گی۔ کسی بھی عورت کے لئے کچن میں جا کے کچھ نہ کرنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا ہیرا پھیری کے مواقع ملنے پر بھی چور کا کچھ نہ کرنا۔ یہ گل کے لئے اچھا تھا۔ کچن کی فضا اس کے اعصاب کے لئے سکون آور ثابت ہو گی۔ وہ کچھ دیر کے لئے محسن اور اس کی ذات سے منسوب اندیشوں کو بھول جائے گی۔

ہم کھانے کے بعد واپس پہنچے تو غالب اور نازو کا کہیں پتا نہ تھا مگر سامانِ حیرت کی صورت میں محمد بھائی کمرے میں براجمان تھا۔ گل کو دیکھتے ہی اس کے چہرے سے ایک ایسی مسرت آمیز دلچسپی کے جذبات جھلکنے لگے کہ میرے خون میں حدّت پیدا ہو گئی مگر اے ڈی کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے میں نے اپنے اشتعال کے جذبات کو دبا دیا۔

"محمد بھائی! تم یہاں کیسے آ گئے؟" میں نے کہا۔

"اپن اور کیا کرتا۔ تم ایک دم گاڑی میں بیٹھ کے پولیس کا ساتھ چلا گیا۔" محمد بھائی بولا "وہ سالا ہم کو کیسا ماٹک دیکھتا پڑا تھا۔ جانتا نہیں اپن کون ہے۔ کیا؟"

میں نے کہا "اچھی طرح جانتا ہے وہ تمہیں اور اب میں بھی جان گیا ہوں۔ مگر یہ بتاؤ کہ تم اندر کیسے آئے؟ گل، جاؤ تم دوسرے کمرے میں۔"

"کیوں، اپن کا راستہ کون روکے گا؟ اپن پیٹ کا بچ سے چھری پھیرتا ہے تو نہ چھری کو پتا چلتا ہے نہ پیٹ کو۔"

میں نے ماتھے پر بل ڈال کے کہا "یہی باتیں کر سکتے ہو تم تو جاؤ اور اپنا خنجر بھی ساتھ لے جاؤ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آج تم سے تمہاری یہ طاقت چھن جائے جس پر تم اکڑتے پھرتے ہو۔ کیا؟"

محمد بھائی کا رنگ بدل گیا "ابھی تم اپن کو تڑی دیتا ہے بے؟"

میں نے کہا "ہاں۔ نکالو خنجر اور وار کرو مجھ پر۔ میں خالی ہاتھ ہوں۔ آؤ تمہیں اپنی ماں کے دودھ کی قسم۔ بزدل۔ نامرد۔"

میرا مقصد اسے مشتعل کرنا تھا۔ اس حد تک کہ وہ خنجر سے مجھ پر حملہ کرنے پر مجبور ہو جائے۔ یہ قسم اتنی بڑی تھی کہ وہ آتش فشاں کی طرح پھنکار تا اٹھا۔

"اپن تیرے ساتھ بات کرنے کو آیا تھا۔ پر تو گالی دیا میرے کو۔ ابھی دیکھ ... محمد بھائی......"

"کل تو چھوڑ دیا تھا میں نے تمہیں۔ تم نے میری بہن کا ہاتھ پکڑا تھا۔ آج میرا ہاتھ پکڑ کے دکھاؤ اگر مرد کے بچے ہو۔" میں نے اسے للکارا۔

وہ جنگلی بھینسے کی طرح خرخر کرتا مجھ پر حملہ آور ہوا۔ اس کے خنجر کی آب لمحہ بھر کے لئے میری آنکھوں میں لہرائی۔ ایک جست کر کر اس نے خنجر کو دائیں سے بائیں اور اوپر سے نیچے تک لہرایا۔ پھرتی اور مہارت کا یہ ایسا کارنامہ تھا کہ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو اس کے چار ٹکڑے ہو جاتے مگر میں نے غوطہ مارا اور پھر لات گھما کے محمد بھائی کے شانے پر ماری۔ اس کا ہاتھ اوپر اٹھا اور وہ درد سے کراہا۔ میں نے ایڑی پر گھوم کے دوسری لات اس کے پیٹ پر رسید کی۔ اس کا اوپر اٹھا ہوا ہاتھ نیچے آیا اور وہ درد سے بلبلاتا ہوا دہرا ہو کے فرش پر گر گیا۔ کسی دشواری کے بغیر میں نے خنجر اس سے چھین لیا اور آرم لاک لگا کے ایک گھٹنے سے اسے دبا لیا۔

"اب بولو" میں نے خنجر کو اس کی گردن پر شہ رگ کے قریب رکھ کے کہا "میری بہن کی طرف پھر بری نظر سے دیکھو گے؟ خدا کی قسم اس خنجر سے تمہاری آنکھیں نکال کے ہتھیلی پر رکھ دوں گا۔"

اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئی تھیں "اللہ پاک کی قسم ..... تم اپن کو غلط سمجھا۔ تو میرے کو ماں کا دودھ کا قسم دیا۔ اپن ادھر دودھ کا قسم کھا کے بولتا ہے۔ تیرا بہن اپنا بہن ہے۔ اپن سالا اتنا حرامی نہیں ہے کہ جس کو بہن بولے اس پر بری نظر رکھے۔"

وہ بری طرح ہانپ رہا تھا اور خنجر کو رگِ جاں کے قریب پا کے جتنا خوف زدہ تھا اتنا ہی مشتعل بھی۔ میں نے اسے چھوڑ دیا کیونکہ گل بیچ کے دروازے میں کھڑی مسلسل چلا رہی تھی "بھائی سکندر بھائی سکندر۔"

میں نے گرج کے کہا "تم سے کس نے کہا تھا یہاں آنے کو؟ جاؤ اندر چپ کر کے بیٹھو۔"

میں نے اس سے کبھی اس لہجے میں بات نہیں کی تھی۔ وہ ڈر کر چپ ہو گئی اور دروازے سے غائب ہو گئی۔ محمد بھائی اب بیٹھا تھا اور ایک ہاتھ سے اپنا شانہ دبا رہا تھا۔

"چلو اٹھو۔ چلتے پھرتے نظر آؤ۔ دوبارہ دیکھا میں نے تو یہ خنجر ہو گا اور تمہارا گلا لیکن دوسری بار میرا ہاتھ نہیں رکے گا" میں نے خنجر اس کی طرف پھینکتے ہوئے کہا۔

اس نے خنجر کو وہیں پڑا رہنے دیا اور صوفے پر بیٹھ گیا "دیکھو، ابھی میرا بات سن لو۔ اپن کا اس میں کوئی فائدہ نہیں ہے۔ کل اپن جو کیا وہ بھی ایک راز کا بات ہے"

"کیسی راز کی بات؟" میں نے محتاط ہو کے کہا۔

"ہم برانیت سے کچھ نہیں کیا سکندر بادشاہ" اس نے کہا۔

میں اس کے منہ سے یہ نام سن کے اچھل پڑا۔ ایک تو مجھے بالکل امید نہ تھی کہ محمد بھائی جیسا ہسٹری شیٹر تک مجھے پہچان جائے گا اور اسے میرا نام بھی معلوم ہو گا۔ دوسرے اس طرح مجھے سکندر بادشاہ کہنے والا ایک ہی شخص تھا جو اب اس دنیا میں نہیں تھا۔ اس ایمان و استقامت کی آزمائش کے سفر میں سب سے پہلے شہادت کی منزل تک پہنچنے والا استاد ٹیڈی تھا جو پہلے محمد بھائی کی طرح ایک بدمعاش تھا۔ پھر قسمت نے اسے ہمارا ہم سفر کر دیا اور وہ بھٹکا ہوا مسافر جب صراطِ مستقیم پر آیا تو اس شان سے کہ اس کی شرافت اور انسانیت پر حاجی عبداللہ جیسے دس متقی اور پرہیزگار قربان کئے جا سکتے تھے۔ محمد بھائی نے مجھے سکندر بادشاہ کہا تو میرے دل میں سوئی ہوئی کسک یوں جاگی جیسے کوئی مندمل ہوتے زخم پر سوئی کی گرم نوک رکھ دے۔ مجھے یوں لگا جیسے استاد ٹیڈی ایک نئے روپ میں میرے سامنے کھڑا مسکرا رہا ہے اور پوچھ رہا ہے۔ کیوں حیران ہوا نہ سکندر بادشاہ۔ ارے ہم جدا کب ہوئے تھے تم سے۔ قسم مولا علی کی ہم تو بس نظر سے اوجھل ہو گئے تھے مگر تمہارے دل میں تو تھے نا۔ ہاں۔ ایک یاد کا پرتو تھا۔ ایک خیال تھا جو مجسم ہو گیا تھا۔ استاد ٹیڈی اب محمد بھائی بن کے آ گیا تھا۔

میں بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ میں خنجر آب دار دیکھ کر میں اتنا نروس نہیں ہوا تھا جتنا میں اس کے لبوں سے سکندر بادشاہ کے دو لفظ سن کر ہو گیا تھا۔

میں نے کہا "استاد..... محمد بھائی، تم مجھے کیسے جانتے ہو؟"

محمد بھائی نے کہا "اپن کو تمہارے یار نے سب بتایا تھا۔"

"کس یار نے؟" میں نے کہا۔

"تمہارا جگری یار بولتا تھا اپنے کو۔ محسن شیروانی......"

مجھے یوں محسوس ہوا کہ محمد بھائی نے اچانک جیب سے دستی بم نکال کر مجھے تھما دیا ہے جس کی پن وہ پہلے ہی نکال چکا تھا۔ دھماکے نے میرے اعصاب شل کر دئے اور میرے ہوش و حواس کو مختل کر دیا۔ ایک لمحے کے لئے میرا جسم مفلوج ہو گیا۔ پھر اس میں لامحدود توانائی بھر گئی اور میں اچھل کے محمد بھائی پر جا گرا۔

"تم..... تم بکتے ہو۔ جھوٹ بولتے ہو" میں نے اس کی گردن دبوچ کے کہا "اس کا نام کسی شکاری نے بتایا ہے تمہیں تاکہ تم مجھے مچھلی کی طرح شکار کر سکو۔ میں اس نام کو چارے کی طرح نگل لوں تو تم مجھے مجبوری کی ڈور سے کھینچ کر لے جا سکو۔"

محمد بھائی تڑپا "ارے ..... سکندر بادشاہ۔ ماں قسم اپن سچ بولتا ہے۔ کیسا پاگل ماٹک آدمی ہے تم۔"

مجھے ایک دم ہوش آ گیا۔ میں نے اسے چھوڑ دیا "محمد بھائی! میں واقعی پاگل ہو گیا تھا یہ نام سن کر۔ دوبارہ بتاؤ۔ کیا نام لیا تھا تم نے؟"

"محسن شیروانی۔ شیروانی جانتا۔ اچکن۔ وہ ہم کو بولا اچکن یاد رکھو" محمد بھائی ہانپتے ہوئے بولا "تم سالا اپن کو نہیں چھوڑے گا ابھی بازو توڑا۔ ابھی گردن موڑا۔ ابھی سر چھوڑا تو اپن ایک دم مر جائیں گا۔ بات کرنے سے پہلے ہی جہنم میں داخل ہو جائیں گا۔"

میں نے لجاجت سے کہا "مجھے معاف کر دو محمد بھائی۔ تم واقعی محسن سے مل چکے ہو؟ کہاں؟ اسے جانتے ہو۔ کیسے؟ مجھے بتاؤ۔ کیا کہا تھا اس نے...... وہ کیسا تھا...... ٹھیک تھا نا؟"

محمد بھائی مسکرانے لگا "ایسا ماٹک سوال کریں گا تو جواب کیسے دیں گا اپن سکندر بادشاہ۔ تھوڑا ٹیم دو۔"

"ایک منٹ" میں نے اندر جھانک کے دیکھا۔ گل کونے میں چپ بیٹھی تھی اور دیوار کو گھور رہی تھی۔

"گل! خفا ہو گئی ہو؟" میں نے مسکرا کر کہا "چلو سوری۔ غلطی ہو گئی مجھ سے کہ میں نے تم سے ایسے بات کی۔ معاف کر دو مجھے۔"

"بھائی سکندر!" وہ چلائی "ایسی باتیں مت کریں۔ کبھی چھوٹی بہن سے معافی مانگتے ہیں بڑے بھائی۔"

میں نے کہا۔ "وہ..... دراصل میری کوئی چھوٹی بہن نہیں تھی نا......"

"میرا تو بڑا بھائی تھا۔ بہت مارتا تھا مجھے بچپن میں لیکن جب میں بڑی ہوئی تو صرف ایک بار تھپڑ مارا تھا اس نے۔ وہ میری ماں کی جگہ بھی تھا اور باپ کی جگہ بھی اور وہ شیش ناگ ڈاکو تھا۔ میں ناگ منی تھی۔ اس کے باوجود معافی نہیں مانگی تھی اس نے۔ وہ رات بھر روتا رہا تھا اکیلا۔ صبح اس نے کہا تھا کہ ناگ منی، میں نے جو کیا ٹھیک کیا۔ میں معافی نہیں مانگوں گا تجھ سے اور میں نے کہا تھا کہ بھیا، اگر غلط بھی کیا تھا تو معافی آپ نہیں مانگیں گے۔ ایسے نہیں۔ میں نے کہا تھا کہ تو معافی نہیں مانگے گا بھیا۔ اپنی عزت کا کچھ خیال کر" گل میرے سینے سے لگ کر رونے لگی "اب میں گل بانو ہوں تو کیا ہوا، آپ کی عزت تو وہی ہے جو شیش ناگ کی تھی۔ اس سے زیادہ ہے۔ آپ تھپڑ بھی مار سکتے ہیں مجھے۔"

میں نے بڑی مشکل سے آنسو روکے اور زبردستی مسکرا کے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا "اچھا چل آنسو مت بہا۔ بھوک لگی ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "غالب اور نازو آ جائیں۔ پھر کھانا کھائیں گے۔"

میں نے کہا "اچھا دیکھو، میں ابھی آتا ہوں۔"

وہ چونکی "کہاں جا رہے ہیں آپ، محمد بھائی کے ساتھ؟"

میں نے اقرار میں سرہلایا "ابھی آتا ہوں....."

"نہیں۔ میں نہیں جانے دوں گی آپ کو اس بدمعاش کے ساتھ اکیلا۔ میں بھی ساتھ چلوں گی۔ میں اکیلی نہیں رہوں گی یہاں۔"

میں نے کہا" اب تو واقعی تھپڑ کھائے گی۔ پاگل' ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ محمد بھائی دوست ہے ہمارا۔ میں غلط سمجھا تھا۔ وہ بات کرنا چاہتا تھا مجھ سے....."

"تو کیا بات یہاں نہیں ہوسکتی۔"

"ہوسکتی ہے۔ مگر وہ کہتا ہے باہر چلو" میں نے کہا۔

"ضرور کوئی چال ہوگی اس کی۔ کسی نے بھیجا ہوگا اسے۔ کہاں لے جانا چاہتا ہے آخر وہ تمہیں؟"

میں نے کہا "دیکھو' پھر وہی دیوانگی کا دورہ پڑ رہا ہے تمہیں۔ میں بتا رہا ہوں کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ تم دروازے بند کر کے بیٹھو۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

"نہیں۔ میں ساتھ چلوں گی۔ تم مار دیا جو چاہو کرو' میں اکیلا نہیں جانے دوں گی تمہیں بھائی سکندر۔ ایسی کون سی بات ہے جو میری موجودگی میں یہاں نہیں ہوسکتی۔ میرے سوا کون ہے سننے والا۔"

"یہ بات نہیں ہے گل....." میں نے کہا۔

"بھائی سکندر! کیا محسن کا کچھ پتا چلا ہے؟" وہ مجھے غور سے دیکھ کر بولی۔

میں اس کی ذہانت اور منطقی سوچ کا قائل ہوگیا۔ اس نے بالکل صحیح نتیجہ اخذ کیا تھا اور ایسی کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی تھی جو گل کے سامنے نہ کی جا سکتی ہو۔ شاید میری صورت پر اس نے میرے خیالات کا عکس پڑھ لیا تھا۔

"آپ بالکل پریشان نہ ہوں" گل نے میری خاموشی پر کہا "میں کوئی غلط حرکت نہیں کروں گی۔ اپنے جذبات پر قابو رکھوں گی۔ بالکل خاموش بیٹھوں گی۔"

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر ہتھیار ڈال دئے "اچھا۔ آجاؤ تم بھی۔"

محمد بھائی شاید سب کچھ سن رہا ہوگا۔ دونوں کمروں کے درمیان ایک دروازہ ہی تو تھا اور وہ بھی کھلا ہوا تھا۔ گل سر جھکائے آئی اور صوفے پر ایسے بیٹھ گئی جیسے بدتمیز بچہ اندر سے مار کھا کے آئے تو مہمانوں کے سامنے شرافت کا نمونہ بن جائے۔

میں نے کہا "محمد بھائی! اب بتاؤ تمہاری محسن سے کہاں ملاقات ہوئی تھی؟"

"اپن اس کے ساتھ تھا سکندر بادشاہ" محمد بھائی نے کہا۔

"محمد بھائی"! گل نے جھٹکے سے سر اٹھایا "میرے بھائی کا نام سکندر بخت ہے۔ سکندر بادشاہ کیوں کہتے ہو؟"

میں نے مسکرا کر کہا "گل! یہ وعدے کی خلاف ورزی ہے۔"

"یہ سکندر بادشاہ نہیں کہے گا تمہیں" گل اُڑ گئی "اسے بتا دو۔"

محمد بھائی ہکا بکا بیٹھا تھا "اچھا بابا' نیئں بولے گا۔ ایسا مافک ناراضی کا کون سا بات ہے۔ اپن بادشاہ بولا فقیر تو نہیں بولا۔"

میں نے کہا "یہ بات میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا کہ مجھے سکندر بادشاہ کہنے سے اس پاگل لڑکی کو دورہ کیوں پڑتا ہے۔ تم محسن کی بات کرو۔"

"اپن محسن کے ساتھ حوالات میں تھا" محمد بھائی نے کہا۔

گل کو پھر شاک لگا۔ اس نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا اور پھر منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔

میں نے کہا "حوالات میں۔ کب..... کیوں پکڑے گئے تھے وہ اور تم؟"

"ابھی کتنا ٹیم ہوگیا" وہ سوچتے ہوئے بولا "دو مہینہ..... دس دن..... اپن چھ آدمی خلاص کیا۔ سالا لوگ ایک عورت کو اٹھاتا تھا۔ استانی کو۔ اپن بہت خراب آدمی ہے۔ بدمعاش اور ہسٹری شیٹر ہے مگر عورت کے سامنے کیسا بدمعاشی۔ ایک عورت کا سامنے چھ مرد کیسا مرد۔ اور پھر وہ استانی۔ اپن استاد کو باپ کے برابر جانتا۔ اپن سب کو کاٹ دیا۔"

چوں کہ یہ کہانی میں سن چکا تھا اس لئے میں نے بے چینی سے کہا "اس کے بعد تمہیں پولیس نے پکڑ لیا اور ایک بہت بڑے آدمی نے چھڑا لیا..... محسن کہاں ملا تھا تمہیں؟"

وہ میری معلومات پر کچھ حیران ہوا "وہ..... ادھر بیٹھا تھا پہلے سے۔ حوالات کا اندر۔ تین دن رات اپن اُدھر رہا۔"

"کیسا تھا وہ؟" گل نے بے اختیار کہا پھر میری طرف دیکھ کر [illegible] گئی۔

میں نے اسے گھور کے دیکھا "محمد بھائی بتا تو رہا ہے۔"

"وہ کیسا تھا؟ ابھی کیا بولے۔ ایک دم جوگی بابا کا مافک اس اتنا بڑا داڑھی تھا۔" محمد بھائی نے ٹھوڑی کے نیچے بالشت بھر ہا[تھ] پھیلایا "لمبا لمبا بال تھا۔ لال لال آنکھیں چرس پینے سے۔"

"چرس! محسن چرس پینے لگا تھا؟" میں نے کہا "یہ غلط ہے۔"

محمد بھائی نے اقرار میں سرہلایا "اپن اس کو چرس پلائی کی[ا]۔ اپنا تھانے میں چلتا ہے۔ ہر تھانے میں مہمان رہتا تھا اپن۔ تھانیدار آج اس تھانے میں' کل دوسرے تھانے میں۔ سب کا[م] اپن ہی پہنچاتا تھا۔ حوالات میں اپن جو مانگتا تھا وہ ملتا تھا۔ ایک گھر کا مافک۔ سالا گھر میں کیا ہے' ایک چارپائی اور دو برتن۔"

میں نے کہا "محسن پر کیا الزام تھا؟"

"وہ ادھر ہوٹل کے سامنے پھرتا تھا۔ روز صبح آتا تھا اور [کھمبا] کا مافک کھڑا ہو جاتا تھا۔ ادھر ٹیکسی والا' رکشا والا' گاڑی صا[ف] کرنے والا چھوکرا لوگ بولتا سی آئی ڈی کا آدمی ہے۔ ہوٹل کا[ؤنٹر] کیپر دیکھتا تو منیجر کو بولتا اور منیجر خفیہ پولیس کا افسر سے بات کر[تا]۔

ابھی ایسا کیا لفڑا ہے کہ اپن کا دروازہ پر آدمی کھڑا کیا ہے۔ وہ بولتا کہ پولیس کا آدمی ہوگا۔ پولیس بولتا ملٹری انٹیلی جنس کا ہوگا۔ ایک دن وہ کھمبا پر کچھ لکھتا اور چلا جاتا۔ منیجر پولیس کو بلاتا۔ پولیس خفیہ پولیس کو بولا۔ اس کھمبے پر ٹائم ہوتا اور ایک جگہ۔ ادھر جاتا تو کچھ نہیں۔ سب سمجھتا کوئی گھپلا ہوئیں گا۔ جاسوسی کا چکر ہوئیں گا۔ دھماکا ہوئیں گا۔ دوسرا دن محسن پھر آتا۔ دوسرا ٹائم اور دوسرا جگہ لکھتا اور جاتا۔ پولیس پھر ادھر جاتا اور کچھ نہیں ہوتا۔ تیسرا دن محسن کو پکڑتا۔ اس سے پوچھا کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ کاہے کو ہر روز آکے تم کھمبا پر ایسا مافک ٹائم لکھتا اور جگہ لکھتا۔"

وہ دم لینے کے لئے رکا تو میں نے کہا "محسن نے کیا بتایا؟"

"کچھ نہیں۔ پولیس بہت مارا اس کو۔ اپن تین دن دیکھا۔ رات بھر اس کو الٹا لٹکاتا۔ کپڑا اتار کے مارتا۔ وہ بہت چلاتا..... بکرے کا مافک۔"

میں نے گل کی طرف دیکھا۔ وہ کانپ رہی تھی اور چپکے چپکے رو رہی تھی۔ محمد بھائی کو کیسے اندازہ ہوسکتا تھا کہ اس کی باتوں سے گل کے دل پر اور خود میرے دل پر کیا بیت رہی ہے۔ محسن نے وعدے کے مطابق ہمارا انتظار کیا تھا۔ وہ ہوٹل شاہ باغ کے سامنے آکے کھڑا ہوتا رہا' ہمارے لئے پیغام لکھتا رہا اور اس بات سے بے خبر رہا کہ وہ دیکھنے والوں کی نظر میں مشتبہ ہوگیا ہے۔ وہ کیا بتاتا کہ اسے کس کا انتظار تھا اور وہ کس کے لئے پیغام چھوڑتا تھا۔ پولیس کو خدا اپنی درندگی اور سفاکی کے مظاہرے کا موقع دے۔ وہ تو فرہاد پر بھی تخریب کاری کا الزام عائد کر دیتے اور اس کی ایک نہ سنتے کہ وہ شیریں کے لئے جوئے شیر نکال رہا تھا۔ پہاڑ چرا کے نہیں لے جا رہا تھا۔

"وہ اپن سے بھی نہیں بولتا تھا۔ مار کھا کے سارا دن روتا رہتا تھا" محمد بھائی نے پھر بات شروع کی۔ "تیسرا دن اپن اس کو بولا کہ تیرا مغز خراب ہے کیا' کاہے کو پھوکٹ میں مار کھاتا پڑا ہے۔ سالا اپن کو بتا بات کیا ہے۔ اپن بہت قسم دیا کہ محمد بھائی کا چمڑی بہت سخت ہے مگر دل بہت نرم ہے۔ اپنا اسٹوری بتا۔ اپن چھڑائے گا تیرے کو۔ پھر اس نے سب بتا دیا۔"

"سب کیا؟" میں نے کہا۔

"یہ کہ وہ اپنا یار دوست کا انتظار کرتا ہے ادھر۔ فقیر کا مافک حلیہ بنا کے پھرتا ہے۔ تاکہ شک نہ ہووے کسی کو۔ اس نے سب کا نام بتایا اور میرے کو بولا کہ میں باہر جا کے دیکھوں۔ ادھر ہوٹل شاہ باغ کا گیٹ ہے۔ گیٹ کا سامنے کھمبا ہے۔ ادھر کوئی ضرور آئے گا۔ سکندرِ اعظم۔ مرزا غالب۔ نازو یا گل بانو۔ اپن بہت پوچھا کہ کون ہے' کیوں آئے گا اور کب آئے گا تو وہ بولا کہ اپنا یار ہے سب اپنا جان ہے اور زندگی ہے۔ پر اپن یہ نہیں جانتا کہ کب آئے گا....."

"پھر..... آگے بولو" گل چلائی۔

میں نے اس کے ہاتھ پر تھپکی دی "ہاں محمد بھائی! پھر کیا ہوا؟"

"پھر..... اپن کا ضمانت ہوگیا۔ ایک بہت بڑا آدمی ادھر آکے اپن کو چھڑایا۔"

"محسن کو نہیں رہا کرایا تم نے؟ وعدہ کرنے کے باوجود۔"

محمد بھائی نے سرہلایا "سالا تھانیدار اَڑی کر گیا۔ اپن کو بولا کہ ابھی ہم اس کو کچھ نہیں کہے گا۔ مارے گا بھی نہیں۔ آرام سے رکھے گا مگر اس کو چھوڑے گا نہیں۔"

"کیوں؟ تم تو جانتے تھے کہ وہ بے قصور ہے۔ کیا تم اس بہت بڑے آدمی سے نہیں کہہ سکتے تھے؟" میں نے برہمی سے کہا۔

"اپن بولا۔ پر وہ کیس خراب ہوگیا تھا۔ وہ بڑا آدمی ہم کو بولا کہ محمد بھائی' تم اپن پر احسان کیا' اپن تم کو بچائے گا۔ اس کو چھوڑو۔ اس کا ضمانت نہیں ہوگا۔ ابھی ملٹری والا لوگ اس سے بات کرے گا۔"

"ملٹری..... ملٹری انٹیلی جنس" میں نے بمشکل تمام کہا۔

"ہاں..... یہی بولا وہ۔ تھانیدار مجبور ہوتا لیکن وہ محسن کا خیال کرتا۔ ہم بھی جاتا۔ تین دن حوالات میں اس کو چائے' سگریٹ' چرس' کھانا پہنچاتا۔ تو پہلے دن وہ نہیں ملتا۔ تھانیدار بولتا اس کو چھوڑ دیا۔ وہ چلا گیا" محمد بھائی نے کہا۔

"وہ تمہیں نہیں ملا؟" میں نے کہا۔

"نہیں" محمد بھائی نے مختصراً کہا۔

"تم نے معلوم بھی نہیں کیا؟"

"اپن کس سے معلوم کرتا۔ تھانیدار بولا کون سالا کدھر جاتا ہے ادھر سے نکل کے۔ اپن کیا ان کا رجسٹر میں لکھتا ہے۔ وہ بھی ٹھیک بولا سکندر بادشاہ لیکن....." وہ سوچ میں پڑ گیا۔

"لیکن کیا؟"

"اپن کو ایسا مافک لگتا کہ تھانیدار جھوٹ بولتا پڑا تھا۔"

"کیا مطلب؟ اسے معلوم تھا کہ محسن کہاں ہے مگر اس نے تمہیں نہیں بتایا؟"

"اپن کو شک ہے ابھی لیکن....."

"لیکن کو چھوڑو۔ کون تھا وہ تھانیدار؟" میں نے کہا۔

"بدلی ہوگیا ہے ابھی۔"

"بدلی ہو کے بھی ڈھاکا میں ہی ہوگا نا۔ کسی دوسرے تھانے میں" میں نے کہا۔

اس نے نفی میں سرہلایا "وہ بھاگ گیا جان بچا کے۔ ادھر پبلک اس کا تکا بوٹی کرتا۔ چھاترو لیگ کا ایک لیڈر حوالات میں مرجاتا۔ ادھر اسٹوڈنٹ لوگ بہت لفڑا کرتا۔ تھانہ کا گھیراؤ کرتا۔ آگ لگاتا۔ وہ جان بچا کے نکلتا اور افسر لوگ اس کو معطل کرتا۔ اس کا جان بچانے کا واسطے واپس پاکستان بھیجتا۔"

"وہ پاکستان سے آیا تھا؟ کہاں سے؟"

"اپن کو نہیں مالوم" محمد بھائی نے کہا۔

"معلوم تو ہو سکتا ہے؟" میں نے کہا۔

"معلوم کریں گا مگر کیا فائدہ ہوئیں گا۔ وہ پھر بولے گا اپن کو نہیں پتا۔"

"تمہارا کیا خیال ہے؟"

"اپن لوگ کا خیال کچھ نہیں۔ اپن تو بس ادھر گھومتا پڑا تھا کہ اس چھوکری کو دیکھا۔ یہ کھمبا پر سے پوسٹر پھاڑتا تھا اور پھر تم آگیا۔ تم بولا کہ یہ کھمبا پر کسی کا پیغام دیکھتا پڑا ہے۔ اپن کو پہلے شک تھا، پھر اپن سمجھ گیا کہ تم محسن کا دوست ہے..... اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اپنا جان بچانے کا واسطے تم جھوٹ بولا تھا۔ پھر اپن تم کو آزمایا۔ دس ہزار دیا کہ کراچی میں اپنا گھر والا کو دو مگر تم کراچی جاتا نہیں تھا۔ تم کراچی سے آیا تھا۔ اس کا بعد ہم کوشش کیا تم سے بات کرنے کا۔"

میں نے کہا "تمہارا اندازہ بالکل درست تھا محمد بھائی۔ اب یہ اندازہ بھی کرو کہ محسن تھانے سے نکل کے کہیں ملٹری انٹیلی جنس والوں کے پلے تو نہیں پڑ گیا" میں نے کہا۔

محمد بھائی گھڑے جیسا سر ہلانے لگا "یہ بھی ہوتا۔"

میں نے متفکر ہو کے کہا "ملٹری انٹیلی جنس سے نمٹنا تو بہت مشکل ہو جائے گا۔ نہ وہ رشوت لیتے ہیں نہ سفارش مانتے ہیں۔ اگر انہوں نے محسن کو کہیں اور بھیج دیا ہو گا تو؟"

"تو ہم بھی چلے جائیں گے وہاں" گل نے جذباتی لہجے میں کہا "ہم کہیں بھی جا سکتے ہیں۔ کیوں بھائی سکندر؟"

میں نے نرمی سے کہا "بالکل ٹھیک کہا تم نے۔ اگر ہمیں معلوم ہو گیا کہ وہ کہیں اور ہے تو ہم ڈھاکا میں رک کے کیا کریں گے۔ پہلے ذرا پتا تو چلے۔ کوئی سراغ تو ملے اس کا۔"

"یہ بہت مشکل کام ہے بہن" محمد بھائی بولا۔

میں نے کہا "محمد بھائی! مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم نے ایک استانی کو اغوا ہونے سے بچایا تھا اور جس کی وہ ہونے والی بہو تھی، وہ بہت بڑا آدمی ہے۔ اس نے اپنی گواہی سے تمہیں صاف بچا لیا۔ وہ بہت اثر و رسوخ رکھتا ہے۔ اس کے کہنے سے دو معتبر گواہ اور مل گئے جو خود بھی بڑے آدمی تھے۔ یہ بہت بڑا آدمی کون ہے؟"

محمد بھائی کے چہرے پر تذبذب اور حیرانی کے آثار نظر آنے لگے "اپن اس کا نام نہیں بتائے گا۔"

میں نے کہا "وہ استانی کون تھی؟"

اس نے پھر نفی میں سر ہلایا "نہیں بولے گا۔"

میں نے کہا "محمد بھائی! تم ہماری مدد کر سکتے ہو۔ ایک آدمی ہے تمہارے پاس جو کام آ سکتا ہے۔ تم اس سے کچھ نہیں کہہ سکتے تو استانی سے درخواست کرو۔ وہ تمہاری سفارش کر سکتی ہے۔ آخر تم نے اتنی بڑی نیکی کی تھی اس کے ساتھ....."

"بابا! نیکی کیا تھا اپنا واسطے، کسی پر احسان نہیں کیا تھا۔ اپن کا مغز پھر گیا تھا سالا۔ ایسا مافک کسی بھی لڑکی پر ظلم کرتا کوئی تو محمد بھائی کا مغز پھر جاتا۔ اپن کو نئیں معلوم تھا وہ کون ہے۔ استانی ہے کہ کوئی اور۔ جب مالوم پڑا استانی ہے تو اپن سب حرامی پلا لوگ کو کاٹ دیا۔ ایک دم خلاص کر دیا۔ ماں قسم یہ ہم کو کسی نے نئیں بتایا تھا کہ وہ کس فیملی کا ہے۔ اپن تو ریڈی تھا پھانسی کا واسطے۔ اتنا لوگ دیکھا تھا کہ محمد بھائی چھ مرڈر کیا۔ اپن بولا ہاں کیا۔ پھر وہ آگیا۔ استانی کا سُسر۔ ابھی اس کا شادی ہو گیا ہے۔ اس وقت نہیں ہوا تھا۔ وہ بولا محمد بھائی! تم اپن پر احسان کیا۔ اپن بولا جاؤ بابا، اپن تم کو نئیں جانتا پھر تم پر کیسا احسان۔ پھر وہ ہم کو ادھر سے نکالا۔ احسان کا بدلہ برابر ہو گیا۔ ابھی ہم اس سے کچھ نئیں مانگے گا۔ وہ بولے گا محمد بھائی بے ایمان ہو گیا ہے۔ فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ روز آئے گا۔ آج یہ کرا دو۔ آج وہ کرو دو۔ احسان کا قیمت مانگے گا....."

میں نے لاجواب ہو کے کہا "یہ بات نہیں محمد بھائی۔ تم نے جو کچھ کیا تھا، نیک نیتی سے کیا، انعام کے لالچ یا معاوضے کی امید میں نہیں کیا تھا۔ نہ تم کسی پر احسان کرنا چاہتے تھے اور نہ تمہیں نیکی یا ثواب کمانے کا خیال آیا تھا۔ تم نے تو ایک غلط کام ہوتا دیکھا اور انجام کی پروا کئے بغیر میدان میں کود پڑے لیکن اب ہم ایک غرض لے کر آئے ہیں تمہارے پاس۔ یہ بھی ایک زندگی کا سوال ہے۔ تم اپنے لئے تو کچھ نہیں مانگ رہے ہو۔ ہماری خاطر اس سے بات کر کے دیکھو، شاید نیکی کا جذبہ اس کے دل میں بھی اتنا ہی طاقت ور ہو جتنا تمہارے دل میں ہے۔ اگر تم اس سے پیسہ مانگو، پلاٹ مانگو، نوکری مانگو تو غلط ہو گا۔ تم اپنے لئے کچھ مت مانگو۔ ہماری سفارش کرو۔"

محمد بھائی کچھ نرم پڑ گیا۔ "اپن سالا کیا سفارش کرے گا۔"

میں نے کہا "وہ تمہاری بات نہیں ٹالے گا۔ جب وہ دیکھے گا کہ اس کام سے تمہارا کوئی مفاد وابستہ نہیں اور یہ بھی ایک نیکی ہے جو تم دوسروں کے ساتھ کر رہے ہو تو شاید، شاید کیا یقیناً تمہاری مدد کرے گا۔"

محمد بھائی خاموش ہو کے سوچنے لگا "ابھی کیا بولے گا اپن اس کو۔ وہ پوچھے گا محسن کون ہے تیرا۔"

"تم سچ بتا دینا کہ میرا اس سے کوئی رشتہ نہیں مگر مغربی پاکستان سے یہ لوگ بڑی مشکلوں سے اس کو تلاش کرتے ہوئے یہاں آئے ہیں۔ انہوں نے بہت مصیبت اٹھائی ہے اور ان کا یہاں کوئی نہیں جو مددگار ہو۔ وہ صرف اتنا کرے کہ محسن شیروانی کے بارے معلومات حاصل کر کے ہمیں بتا دے۔ اسے صرف فون کرنے گے۔ اگر اس کے سیاسی تعلقات ہیں تو وہ فوج کی ہائی کمان سے بھی رابطہ کر سکتا ہے۔ انڈین آرمی کا دعویٰ تو یہی ہے کہ وہ بنگلہ دیش کے عوام کی مدد کے لئے آئے ہیں۔ وہ بنگلہ دیش کے لئے

کی بات کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔"

خاموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد محمد بھائی نے گل کے سر پر ہاتھ رکھا "ابھی مت رو میرا بہن۔ اپن کچھ کرے گا۔ اپن سالا جائے گا سیٹھ کے پاس۔ اس کا سامنے ہاتھ جوڑے گا، پاؤں پکڑے گا اس کا اور کہے گا کہ تیرا محسن کو لائے۔"

گل کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔ وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔

"محمد بھائی! مجھے لے چلو اپنے سیٹھ کے پاس....."

"نہیں۔ تو ادھر بیٹھ آرام سے۔ اپن جائے گا" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"پھر کب آؤ گے؟" میں نے کہا "آؤ گے نا؟"

"آئے گا۔ اپن بھاگنے والا نہیں ہے۔"

میں نے شرمندہ ہو کے کہا "میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ تم اگر مناسب سمجھو تو مجھے اس کے سامنے پیش کر دو تاکہ جو اسے پوچھنا ہو مجھ سے پوچھ لے۔"

محمد بھائی نے سر ہلایا "اپن بات کرے گا، پھر بتائے گا۔"

محمد بھائی چلا گیا تو میں نے گل سے کہا "اب تو رونا بند کرو۔ محسن کے ملنے کی امید ہو گئی ہے۔"

گل نے آنسو پونچھے "وہ..... چھوڑ دیں گے اسے؟ فوجی....."

"وہ اگر ان کی تحویل میں ہوا..... تو پھر کوشش کی جا سکتی ہے۔ پہلے یہ تصدیق تو ہو جائے کہ تھانے سے اس کو واقعی ملٹری انٹیلی جنس والے ہی لے گئے تھے" میں نے کہا "ابھی تک تو وہ لاپتا ہے۔ اس کا پتا مل جائے اور یہ معلوم ہو جائے کہ وہ کہاں ہے تو پھر ہم سب کچھ کر سکتے ہیں اسے واپس لانے کے لئے۔ سفارش نہ چلی تو رشوت چلائیں گے۔ جو کچھ ہمارے پاس ہے وہ سب دے دیں گے۔ وہ کم پڑے گا تو چوری کر کے، ڈاکا ڈال کے کمی پوری کریں گے اور کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی تو ہم سر دھڑ کی بازی لگا دیں گے۔ ہم جان پر کھیل کے اسے نکالیں گے۔ ہم اسے ساتھ لے کر ہی واپس جائیں گے ورنہ یہیں ماریں گے اور مر جائیں گے" میں نے کہا۔

گل کا چہرہ روشن ہونے لگا "محمد بھائی کا احسان....."

میں نے کہا "وہ احسان کو سمجھتا ہی نہیں۔ بس یہ جانتا ہے کہ مظلوم کی مدد کرنی چاہئے خواہ اس میں جان بھی چلی جائے۔ اگر اس کی کھوپڑی میں یہ بات بیٹھ گئی کہ محسن مظلوم ہے تو پھر وہ کود پڑے گا میدانِ عمل میں، نتائج کا خیال کئے بغیر۔"

"محسن سے زیادہ کون مظلوم ہو گا" گل نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔

سہ پہر کے وقت میں نے ہوٹل کا رخ کیا۔ کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے علی شاہ نے مسکرا کے میرا استقبال کیا اور ایک چابی دراز میں سے نکال کر مجھے تھما دی۔

"آپ کا روم خالی ہے سر!" وہ بولا۔

میں نے کہا "تم انڈین کرنسی قبول کرو گے؟"

"کیوں نہیں سر!" وہ بولا۔

صورتِ حالات بدل جانے سے انڈین کرنسی کا بھاؤ کچھ چڑھ گیا تھا اور اسے پاکستانی کرنسی کی طرح سکہ رائج الوقت تسلیم کر لیا گیا تھا۔ ابھی بنگلہ دیش صرف ایک نام تھا۔ حکومت اگر تھی تو سرکاری بیانات اور امورِ خارجہ پر ساری توجہ دے رہی تھی۔ داخلی امور کا نظم و نسق درہم برہم تھا یا بھارتی فوج کے کنٹرول میں تھا۔ ڈاک کے ٹکٹ، لفافے، پاسپورٹ اور کرنسی کے علاوہ سکوں پر ابھی حکومت پاکستان کا نام تھا لیکن بنگلہ دیش چھاپنے اور پاکستان کے لفظ کو حرفِ غلط کی طرح مٹانے کی دیوانگی عوام سے خواص اور سرکاری و نجی دفاتر میں نیچے سے اوپر تک کسی وبا کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ کل تک دشمن سمجھے جانے والے بھارتی اچانک دوست اور نجات دہندہ کہلانے لگے تھے۔ چناں چہ ان کی کرنسی بھی پاکستان کی کرنسی سے زیادہ مقدس ہو گئی تھی۔

میں نے چار ہزار روپے ایڈوانس جمع کرا دیے اور کہا "مسٹر علی شاہ! تھینک یو۔ فار دی فیور....."

اس نے کہا "ڈونٹ مینشن اٹ سر۔"

"کیا مستقبل قریب میں یہ ممکن ہو گا کہ ایک کمرا اور مل جائے؟"

"میں کوشش کروں گا سر....."

"اگر مجھ سے کبھی کوئی کام ہو تو بلا تکلف بتا دینا۔"

اس نے جھجکتے ہوئے کہا "اگر آپ برا نہ مانیں تو..... ایک درخواست ہے۔"

"کہو کہو۔" میں نے مُربیانہ شان سے کہا۔

"وہ... مجھے یہ نوکری بالکل پسند نہیں۔ میں باہر جانا چاہتا ہوں۔ پاسپورٹ بھی ہے میرے پاس۔ آپ فارن افیئرز میں ہیں۔ اگر کبھی کوئی موقع ملے....."

میں بات کر کے پھنس گیا تھا مگر میں نے اسے متانت سے کہا، "کہاں جانا پسند کرو گے تم؟ ملک بتاؤ۔ امریکا، کینیڈا، برطانیہ یا مڈل ایسٹ۔"

اس کا چہرہ کھل اٹھا "اگر آپ میری پسند پوچھتے ہیں تو۔ کینیڈا، پھر امریکا، پھر برطانیہ یا مڈل ایسٹ لیکن یہ شرط نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں خیال رکھوں گا واپس جانے کے بعد" میں نے کہا اور چابی لے کر اوپر چلا گیا۔ یہ فرسٹ فلور پر وی آئی پی روم تھا اور ہر اعتبار سے بہترین تھا مگر اس میں ہم سب اکٹھے نہیں رہ سکتے تھے۔ حفاظت کے نقطۂ نظر سے دو افراد کا یہاں منتقل ہو جانا فائدہ مند ثابت ہو سکتا تھا۔ خدانخواستہ چھاپا پڑتا تو ایک ہی جگہ سے نہ پکڑے جاتے۔ گزشتہ رات کو پولیس نے ملٹری کے ساتھ مل کے ہماری تلاش میں ہوٹل کو کھنگال ڈالا تھا۔ انہوں نے مکینوں کو کمروں سے نکال کر اپنا اطمینان کیا تھا اور ہم محض دستِ قدرت

کے حسن انتظام سے بچ گئے تھے جس نے ہمیں ایک سرونٹ کوارٹر میں محفوظ کر دیا تھا۔ اب ہوٹل پر دوبارہ چھاپا پڑنے کا احتمال نہ تھا۔ اگر مخبری ہو جاتی تو سرونٹ کوارٹرز اور دوسرے مقامات کا محاصرہ ممکن تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ غالب اور نازو کے واپس آتے ہی ہم اس کمرے میں شفٹ ہو جائیں گے۔ میں اور گل تو بے خوف و خطر اس وی آئی پی روم میں ٹھہر سکتے تھے۔ غالب اور نازو کو ہم چھپا کے رکھ سکتے تھے۔ اس طرح کہ انتظامیہ کو پتا نہ چلے۔

میں لوٹ کر سرونٹ کوارٹر میں گیا تو میرا بھوک کے مارے برا حال تھا۔ مجھے غالب اور نازو پر تاؤ آ رہا تھا جو کچھ بتائے بغیر غائب ہو گئے تھے اور ابھی تک لوٹ کر نہیں آئے تھے۔ یقین کے ساتھ کچھ بھی کہنا مشکل تھا کہ وہ محسن کی تلاش میں کسی سراغ کے پیچھے نکل کھڑے ہوئے ہیں یا اپنے رومانٹک مو۔۔۔ میں تلاش کے بہانے سیر گشت کر رہے ہیں۔

انہیں کمرے میں موجود پا کر میرا غصہ فرو ہو گیا۔ میرے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی غالب نے سوال کر دیا "ڈائننگ ہال سے آ رہے ہو؟ مجھے تمہارے وجود سے قورمے پلاؤ کی خوشبو محسوس ہوتی ہے۔"

میں نے کہا "یہ دیوانگی کی اولین علامات ہیں۔ دوسرے مرحلے میں تم کو ہر طرف پلاؤ قورمہ نظر بھی آئے گا۔"

نازو نے کہا "آخری مرحلے میں تم ہر چیز کو پلاؤ و قورمہ سمجھ کے منہ مارو گے۔"

"مثلاً تمہیں" غالب بولا "حالاں کہ تم گھر کی مرغی ہو۔"

"یہ بتاؤ تم کہاں منہ اٹھا کے چلے گئے تھے؟" میں نے کہا۔

غالب نے نازو کی طرف دیکھا "میں سچ نہیں بول سکتا۔"

"کیوں نہیں بول سکتے؟ بول کہ لب آزاد ہیں تیرے۔"

"میری جان کو خطرہ لاحق ہے۔" غالب نے آہ بھری "میں مجبور ہوں دوست۔"

نازو نے چڑ کے کہا "میں نے روکا ہے تمہیں؟ بتا دو جو بتانا ہے۔ میں خود بتا دیتی ہوں۔ وہ۔ دراصل ہم محسن کے پیچھے لگ گئے تھے۔"

غالب نے کھی کھی کر کے ہنسنا شروع کیا "یہ تو عنوان ہے خاتون کے حماقت نامے کا۔ ہم ادھر اُدھر کے لوگوں سے پوچھ رہے تھے کہ ان میں سے کسی نے محسن کو یہاں منڈلاتے تو نہیں دیکھا تھا؟"

میں نے کہا "کیا! تم براہِ راست نام لے کر پوچھتے پھر رہے تھے؟"

غالب نے کہا "یار اب ایسا بھی نہیں ہے کہ ہم نے دل کے ساتھ عقل کو بھی گروی رکھ دیا ہے۔ میں بہت ہوشیاری، چالاکی، معاملہ فہمی، عقل مندی، راز داری وغیرہ کے ساتھ بالکل سیکرٹ ایجنٹ اعشاریہ زیرو زیرو سیون کی طرح تفتیش کر رہا تھا۔ میں نے ایک

فقیر کے پاس بیٹھ کے سوا روپیہ نذر کیا۔ اس سے پوچھا کہ میری شادی کب ہو گی اور بچے کتنے ہوں گے۔"

"اچھا۔ کیا بتایا اس نے؟"

"اس نے بڑا حوصلہ شکن اور مایوس کن جواب دیا" غالب منہ لٹکا کے بولا۔

نازو کا چہرہ غصے سے سرخ ہونے لگا تھا لیکن وہ بولی نہیں اور ظاہری بے نیازی سے کھانا کھانے میں مصروف رہی۔

"فقیر نے۔ واضح ہو کہ وہ بہت پہنچا ہوا درویش تھا۔ اس نے کہا کہ بچہ بھاگ جا۔ ابھی وقت ہے۔ تو چوہے دان کی طرف بڑھ رہا ہے۔ مارا جائے گا۔ قیدِ با مشقت کاٹے گا ساری عمر۔ ایک بلا تیرے پیچھے پڑ گئی ہے۔"

"تعویذ کیوں نہیں لے لیا اس بلا سے جان چھڑانے کا؟" نازو نے بگڑ کے کہا۔

"افسوس! اس بلا پر کوئی تعویذ، جادو ٹوٹکا، سفلی عمل، کچھ بھی کارگر نہیں ہوتا" غالب آہ بھر کے بولا۔

گل مسکرانے لگی "اور دوسرے سوال کا جواب کیا ملا؟"

"دوسرا سوال؟ اچھا۔ انہوں نے کہا تیرے بچے نہیں ہوں گے۔ ہو ہی نہیں سکتے خواہ تو ایک نہیں چار شادیاں کر لے" غالب نے رونی شکل بنا کے کہا "کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔"

"یار ایسی کیا بات ہے؟" میں نے کہا "وہ فقیر بکتا ہے۔"

"نہیں، اس نے ٹھیک کہا تھا۔ بچے میری بیوی کے ہوں گے" غالب بولا۔

اس نے اتنی مظلومیت کے ساتھ یہ بات کی تھی کہ میرے ساتھ گل کو ہی نہیں، نازو کو بھی ہنسی آ گئی "بڑے بے شرم ہو۔"

میں نے کہا "کھانا جاری رکھو اور باقی بات بھی بتا دو۔"

غالب نے کہا "فقیر سے میں نے سوا روپیہ فی سوال کا سودا کر لیا۔ پہلے دس سوالات تو ایسے ہی تھے۔ بے تُکے۔ پھر میں نے کانٹا بدلا اور اسے دوسری پٹڑی پر لے آیا۔ اس سے پوچھا کہ یہاں کوئی مجنوں دیوانہ یا مجذوب قسم کا مشکوک بندہ تو نہیں دیکھا اس نے جو ہر وقت اس کھمبے کے آس پاس نظر آتا ہو۔ اس نے میں سر ہلایا اور بڑے یقین سے کہا کہ وہ آج کل پارٹ ٹائم مخبر ہے پولیس کا۔ اسے مشتبہ افراد پر نظر رکھنے کی خدمت کے بدلے چرس بھری سگریٹ بیچنے کا اجازت نامہ حاصل ہے۔"

میں نے چونک کر کہا "چرس والی سگریٹ؟"

غالب نے قمیص کی جیب میں ہاتھ ڈالا "یہ لو۔ شوق فرماؤ۔ دم مٹے غم۔ یہ تحفۂ درویش ہے۔ ایک روپے کے رعایتی نرخ پر....."

نازو نے سگریٹ چھیننے کی کوشش کی "یہ کیا حرکت ہے....."

میں نے کہا "ٹھہرو۔ اسے سنبھال کے رکھو۔ عین ممکن ہے اس سے کوئی سراغ ملے۔ پہلے تم اپنی بات ختم کرو، پھر میں

ہوں۔"

"بس اور تو کسی نے کچھ نہیں بتایا۔ ایک جوتشی نجومی قسم کا نیلی مخص بھی بیٹھا تھا۔ اس سے بھی میں نے وہی سوالات پوچھے تھے۔ وہ پتا نہیں کیوں جلا بھنا بیٹھا تھا۔ کہنے لگا چار شادیاں ہوں گی تیری۔ ہر ایک سے تیرہ بچے ہوں گے۔ تیرہ کا عدد منحوس ہے۔ شادی کے تیرہ سال بعد تیرہ تاریخ کو تجھے تیرہ نمبر کے چھتر سے مار پڑے گی۔ میں نے کہا انشاء اللہ یعنی اگر اللہ نے چاہا ورنہ مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے۔ پھر اس سے میں نے تیرہ روپے فی سوال کا سودا کیا۔ وہ بہت خوش ہوا۔ میں نے تیرہ سوال پوچھے۔ وہی کہ اس نے آس پاس کسی کو دیکھا تو نہیں۔ اس حلیے میں اور ایسی حالت میں۔ اب کرنا خدا کا دیکھو کہ وہ بھی پولیس کا مخبر نکلا۔ یوں لگتا ہے کہ آس پاس جتنے بھی لوگ نظر آتے ہیں ان کی خدمات مستعار لے لی گئی ہیں آتے جاتے لوگوں پر نظر رکھنے کے لئے۔"

میں نے کہا "اسے بھی چرس والی سگریٹ بیچنے کا اجازت نامہ ملا ہوا تھا؟"

"نہیں۔ اس کا ذرا اونچا دھندا تھا۔ مجھ سے پوچھنے لگا آنکھ مار کے۔ حالاں کہ ایک آنکھ پہلے ہی ماری جا چکی تھی اس کی۔ کہ مال چاہئے۔ میں نے کہا کیوں نہیں اور اس کا مال لے کر بھاگ گیا۔ ایک پیسہ نہیں دیا۔ وہ شور مچاتا رہ گیا لیکن عین اسی وقت خاتون نے بدحواسی کے عالم میں مجھے بتایا کہ وہ جا رہا ہے محسن۔ اور بس میری بھی مت ماری گئی۔ جادو یا نظر بندی اسی کو کہتے ہیں۔ مجھے بھی لگا کہ وہ محسن ہی ہے۔ وہ رکشا میں بیٹھ رہا تھا۔ ہم بھی رکشا لے کر اس کے پیچھے لپکے۔ رکشا والے سے کہا کہ بس آگے والے رکشا کو اوجھل مت ہونے دینا۔ سو روپے ملیں گے۔ وہ تو فرشتۂ اجل کی طرح پیچھے لگ گیا۔ ایک سائیکل والے کو سائیڈ ماری۔ وہ سائیکل سمیت روڈ سائیڈ ہیئر ڈریسنگ سیلون میں گھس گیا جہاں ایک شخص کو سرِ عام مونڈا جا رہا تھا۔ دوسری جگہ اس نے ایک رکشا سے ریس لگائی ہماری جان ہتھیلی پر رکھ کے۔ اور ہارا۔ نہ جانے کتنے لوگ بال بال بچے اور گالیاں بکتے رہ گئے۔ آخر کار محسن ایک بلڈنگ میں گھس گیا۔ ہم بھی سو کا نوٹ پھینک کر دوڑے۔ وہ پانچویں منزل پر ایک دروازے کے پیچھے غائب ہو رہا تھا۔ ہم بھی سیڑھیاں چڑھتے اور ہانپتے ہوئے پہنچ گئے۔"

ہنستے ہنستے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے "اور پھر پتا چلا کہ وہ محسن نہیں تھا۔"

"نہیں۔ یہی تو کلائمکس ہے۔ وہ محسن تھا" غالب بولا۔

میری ہنسی ایک دم رک گئی "محسن تھا؟ تم مذاق کر رہے ہو۔"

"قسم خدا کی وہ محسن تھا۔"

"پھر۔ اب کہاں ہے وہ؟ تمہارے ساتھ کیوں نہیں آیا....." گل نے بے قراری سے کہا۔

"وہ محسن شیروانی نہیں تھا، محسن میاں تھے" غالب بولا "حد ہو گئی۔ میں نے دروازہ بجایا تو اس نے کہا کہ کیا بات ہے۔ میں نے پریشان ہو کے کہا کہ ہم محسن سے ملنے آئے تھے۔ اس نے کہا "ہم محسن میاں ہے۔ پیسہ لایا ہے تم تو اندر آ جاؤ" اب اسے پتا نہیں کس کا انتظار تھا۔ میں نے تو کہا کہ پیسہ لانا تو ہم بھول گئے اور اس نے گالی دے کر دروازہ بند کر دیا کہ پھر دفع ہو جاؤ۔ ہم اُلٹے قدم لوٹ آئے۔ خیر ایک محسن تو ملا ہمیں۔ تم نے کیا تیر مارا؟"

میں نے کہا "ہم نے تقریباً نشانے پر تیر مارا۔"

میں نے اے ڈی اور پھر محمد بھائی سے ملاقات کا تفصیلی حال بتایا۔ غالب اور نازو دم بخود بیٹھے رہے۔ اس دوران میں اشوک آیا اور کھانے کے برتن سمیٹ کر لے گیا۔ میں نے اسے کافی لانے کا کہا۔

غالب بولا "تم نے محمد بھائی سے پوچھا کہ وہ رہتا کہاں ہے؟"

میں نے کہا "نہیں۔ ایسے لوگوں کا کیا پتا ٹھکانا۔"

"اگر ہم کو ملنا ہو تو ہم کہاں جائیں گے؟"

"وہ خود آئے گا" میں نے کہا "اس نے کہا تھا۔"

"یار وہ نہ آیا پھر؟" غالب بھنّا کے بولا۔

میں نے کہا "وہ ہسٹری شیٹر ہے۔ اے ڈی سے معلوم ہو جائے گا۔ بہت ہوں گے اس کے جاننے والے۔ اب میں اور گل شفٹ ہوتے ہیں اپنے کمرے میں۔ تم فی الحال یہیں ٹھہرو۔ رات کو ملاقاتی بن کے آ جانا۔"

"ہوٹل والوں کو معلوم ہو جائے گا۔"

"کیسے معلوم ہو جائے گا۔ ہم کسی کو اندر داخل ہونے نہیں دیں گے۔ اگر روم سروس سے کچھ منگوائیں گے تو دروازے پر ہی لے لیں گے۔ ڈو نوٹ ڈسٹرب کا بورڈ لٹکا دیں گے۔"

"پھر بھی صفائی کرنے والے تو آتے ہیں اور ایسے کب تک چھپ کر رہیں گے ہم، کیا باہر نہیں نکلیں گے؟"

میں نے کہا "باہر جانا منع نہیں ہے۔ ہم الگ الگ جائیں یا ایک ساتھ۔ میں نے دوسرے کمرے کی بات کی ہے۔ امید ہے ہو جائے گا۔"

ابھی ہم کافی پی رہے تھے کہ محمد بھائی پھر نمودار ہو گیا۔ وہ خاصا مضطرب نظر آ رہا تھا اور بیٹھنے پر آمادہ نہ تھا۔

"اپن یہ بتانے کو آیا ہے کہ رات کو وہ ملے گا۔"

"کون ملے گا؟" میں نے کہا۔

"عبدالستار چوہدری ...... اپن بات کیا تھا استانی سے" محمد بھائی نے کہا۔

"اچھا۔ میں سمجھ گیا۔ یہ تو بڑی اچھی بات ہے" میں نے کہا۔

"اپن ایک بات بولے گا۔ تم مجبور کیا تو اپن مجبور ہو گیا۔ محمد بھائی ایک دم زبان کا پکّا ہے پر دوسرے کا دل میں کیا ہے۔ یہ اوپر والا جانتا ہے۔ ایسا ویسا کوئی بات ہوئیں گا تو اپن کو مت بولنا کہ محمد بھائی دغا کیا۔ کیا؟"

میں نے کہا "کیا مطلب ؟ تم سمجھتے ہو اس میں دھوکا بھی ہو سکتا ہے ؟"

"بابا' یہ بڑا لوگ پالی ٹکس کھیلتا ہے۔ ایک دم اوپر والا پالی ٹکس اپن نئیں جانتا۔ صاف بات بولتا ہے تم کو' اس میں رسک تمہارا ہے۔ اپن کو چوہدری بولا کہ محمد بھائی' تمہارا فرینڈ ہمارا فرینڈ۔ اس کو لاؤ۔ ہم اس سے بات کرے گا اور اس کا مدد کرے گا۔"

"تم سمجھتے ہو' اس سے ملنے میں خطرہ ہے؟" میں نے کہا "کیا وہ بہت بڑا آدمی ... جو تمہارا احسان مند ہے' تم سے بھی دھوکا کر سکتا ہے۔"

"اپن کو امید تو نہیں پر سالا پالی ٹکس میں سب چلتا ہے...."

"کیا چوہدری بھی پاکستان دشمن عناصر کا ساتھی ہے؟" غالب نے پوچھا۔

"ساتھی؟ وہ لیڈر ہے یار۔ مجیب کا خاص آدمی تو نہیں لیکن اوپر والا لیڈر ہے۔ سب جانتا ہے وہ ضرور وزیر بنے گا۔ اس کا سیٹ پر اور کوئی نہیں آسکتا۔" محمد بھائی بولا۔

"کیوں نہیں آسکتا۔ اگر عوامی لیگ کسی کو نامزد کرے گی۔"

محمد بھائی مسکرایا "بابا' یہ لیگ وہ لیگ' ان کو کیا فرق پڑتا ہے۔ ابھی کل یہ مسلم لیگ میں تھا آج عوامی لیگ میں ہو گیا۔ پھر کل کہیں اور ہوئیں گا۔ جو بھی طاقت میں ہو گا یہ اس کا ساتھی اور یہ اس کا طاقت۔ پبلک تو اپنا مافک تماشا دیکھتا ہے۔ کیا؟"

میں نے کہا "میں سمجھ گیا لیکن ایسا آدمی تو واقعی ناقابل اعتبار ہے۔ اگر اسے معلوم ہو گیا کہ ہم بنگلہ دیش کی مخالفت کرنے والوں کے ساتھی تھے تو وہ ابن الوقت کہیں ہمیں پکڑوا نہ دے۔"

"اپن بولا نا' چوہدری ہم سے وعدہ کیا لیکن اس کا نیّت اندر سے خراب ہووے تو کیا پتا۔ خیر۔ وہ بھی جانتا ہے کہ محمد بھائی کو دھوکا دے کر کوئی سالا بہت دن زندہ نہیں رہا۔ وہ اپنا لائف کم کرے گا اور سارا وائف کو بیوہ کرے گا۔ کیا؟"

نازو نے کہا "کتنی بیویاں پال رکھی ہیں چوہدری نے؟"

غالب بولا "تم تو ایسے پوچھ رہی ہو جیسے بھیڑ بکریاں پالنے کی بات ہے۔"

"یہ لوگ اور کیا سمجھتے ہیں پرائی بہو بیٹیوں کو؟ بھیڑ بکریاں۔ جب چاہا خرید لائے' ہانک لائے۔ ایک گھر کے باڑے میں بند کر دیا۔ چارہ ڈال دیا اور دل سے اُتر گئی تو قصابوں کو بیچ دیا۔"

"ابھی تم ٹھیک بولا۔ یہ چوہدری حرامی ایسا مافک کرتا ہے۔ ایک کو نکال دیتا ہے' ایک لے آتا ہے۔ اسٹاک میں چار ہی رکھتا ہے۔ اس کا چمچہ لوگ چُن کے چھوکری لاتا ہے اور وہ شادی بنا کے گھر میں رکھتا ہے سال دو سال۔ پرانا والا مال نکال دیتا ہے۔ اپن جانتا نہ اس کا عورت کدھر جاتا ہے۔" محمد بھائی نے غصے سے کہا۔

"کدھر جاتی ہے وہ بدنصیب۔"

"ایک ہی جگہ ہوتا ہے اس کا۔ قبریا بازار۔ خریدار اسے ایکسپورٹ کر دیتا ہے۔ شور کرے تو اس کا پتا بھی نہیں چلتا۔ وہ بول دیتا ہے کہ طلاق دیا۔ اسے گھر بھیج دیا۔"

"اور گھر والے کچھ نہیں کہتے؟ وہ شور نہیں کرتے۔"

"غریب لوگ شور کرتا ہے تو اپنا خانہ خراب کرتا ہے۔ پولیس اس کو پکڑتا ہے کہ سالا حرامی تو بردہ فروش ہے۔ اپنا چھوکری کو خود بیچا۔ خیر چھوڑو یہ بات۔ اپن رات کو آئے گا۔"

میں نے کہا "رات کو کس وقت؟"

"وہ بارہ بجے بولا۔"

"بارہ بجے' آدھی رات کو!" میں نے تشویش سے کہا "اس سے پہلے ملنے میں کیا ہے؟"

"ٹائم نہیں ہے اس کا پاس۔ اس کا سیکریٹری بولا۔ کہ محمد بھائی کل آنا۔ اپن شور کیا کہ تم سالا اپنا ٹانگ اڑاتا ہے۔ چوہدری صاحب خود باہر آیا۔ سیکریٹری کو بولا محمد بھائی کو کبھی مت روکو۔ پھر ہم کو بولا رات کو آؤ۔ بارہ بجے کا بعد۔ کیا؟"

"تمہاری بات سُنے بغیر کہہ دیا؟"

"نہیں۔ اپنا بات سُن کے بولا" محمد بھائی نے کہا۔

"وہ رہتا کہاں ہے؟" غالب نے کہا۔

"ابھی نیا بنگلہ بنایا شہر سے باہر۔ نیا آبادی ہے۔ ہم لے جائے گا تم کو" محمد بھائی نے کہا۔

میں نے کہا "رات کو تم آؤ تو ہوٹل میں آنا۔ کاؤنٹر سے پوچھ لینا کہ آنند کمار ورما' ڈپٹی سیکریٹری فارن افیئرز گورنمنٹ آف انڈیا کہاں ہیں۔"

محمد بھائی گڑبڑا گیا "کیا بولا! یہ سالا کون ہے؟"

میں نے کہا "میں۔ فرسٹ فلور پر وی آئی پی روم۔"

محمد بھائی نے شرمندہ ہو کے کہا "ابھی..... نام پھر بولو۔"

میں نے کہا "آنند کمار ورما۔ تم صرف مسٹر ورما پوچھ لینا۔"

اس نے سر ہلایا اور زیر لب کچھ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔ وہ ایک امید افزا خبر لایا تھا مگر ہمیں اندیشوں میں بھی مبتلا کر گیا تھا۔

غالب نے کہا "کیا عبدالستار چوہدری جیسے بے کردار اور بے ضمیر آدمی پر اعتبار کیا جا سکتا ہے؟"

"محمد بھائی اس کا محسن ہے" نازو نے کہا۔

میں نے کہا "جو ضمیر فروش ہوں وہ احسان فراموش تو ہوتے ہی ہیں۔"

نازو بولی "مگر محمد بھائی جیسے بدمعاش کی دشمنی بھی اسے مہنگی پڑے گی۔"

غالب نے کہا "بی بی! سیاست جیسے مشکل موضوع کو اپنی زنانہ جذباتیت کی عینک سے مت پڑھو۔ یہ سیاست داں ہیں جو غنڈے بدمعاشوں کو پالتے ہیں۔ غنڈے بدمعاش کسی سیاست داں

کے سرپرست نہیں ہوتے۔ اگر چوہدری نہ چھڑاتا تو محمد بھائی کی ساری بدمعاشی دھری رہ جاتی۔ اس کی ہسٹری شیٹ میں آخری اندراج یہ ہوتا کہ اس نے حوالات میں خودکشی کرلی یا وہ پولیس مقابلے میں مارا گیا۔ ورنہ پھانسی کی تاریخ پر اس کی تاریخ کا آخری باب ختم ہو جاتا۔ چوہدری تو سمجھتا ہو گا کہ احسان اس نے کیا محمد بھائی پر۔"

نازو نے مایوسی سے کہا "پھر کیا تم لوگ نہیں جاؤ گے؟"

"اب اتنے بھی بزدل نہیں ہیں ہم۔ اور نہ بے مُروّت" میں نے کہا "اتنی دور چل کے کیا اسی لئے آئے ہیں کہ عبدالستار چوہدری جیسے بزدل آدمی کا مقابلہ کئے بغیر واپس چلے جائیں۔"

"دشمن کو بزدل سمجھنا نادانی ہے" نازو نے کہا۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ ابھی وہ دشمن ہوا نہیں ہے۔ محض اندیشے یا قیاس کی بنیاد پر حتمی فیصلہ صادر کرنا زیادہ بڑی نادانی ہے۔" غالب بولا "دوسری بات یہ ہے کہ بے ضمیر آدمی' منافق' دھوکے باز اور دروغ گو' یہ سب بزدل ہوتے ہیں۔ بزدل نہ ہوں تو اپنے ضمیر کی آواز سے کیوں ڈریں۔ منافقت کیوں کریں۔ کھل کے سامنے کیوں نہ آئیں۔ سچ کیوں نہ بولیں۔"

میں نے غالب کی تائید کی "وہ بزدل نہ ہوتا تو سیاسی وفاداریوں [illegible]ام نہ کرتا۔ اصولی مؤقف پر ڈٹا رہتا مگر وہ برسرِاقتدار رہنے والوں کا ہمنوا ہو جاتا ہے۔ صرف اس لئے کہ وہ ڈرتا ہے۔ ہم اس کی فطرت سے واقف ہو گئے ہیں تو محتاط بھی رہیں گے اور جوابی کارروائی کے لئے تیار بھی رہیں گے۔"

"اگر اس نے تمہیں پہچان لیا یا معلوم کر لیا تمہارے بارے میں' تو وہ تمہارے گرد بہت مضبوط جال پھیلائے گا۔"

"پھیلانے دو۔ ہم نے بہت شکاری دیکھے ہیں۔ چوہدری دلاور سے عبدالستار چوہدری تک کوئی ہماری راہ میں حائل نہیں ہو سکا اور ہمیں کوئی گزند نہیں پہنچا سکا کیوں کہ ان خود ساختہ' فرعون صفت خداؤں کے مقابلے میں سارے جہاں کا خدا ہمارا حامی و ناصر' محافظ و پاسبان ہے۔ تم نے اس چیونٹی کی مثال سنی ہے جو آتش فشاں پہاڑ پر چڑھ رہی تھی کہ آتش فشاں میں گڑگڑاہٹ ہوئی۔ چیونٹی نے خود سے کہا' میری بھی کیا ہیبت ہے۔ پہاڑ میرے قدموں سے کانپ رہا ہے اور گڑگڑا رہا ہے۔ آتش فشاں پھٹا تو راکھ کے کھربوں اربوں ذرات میں چیونٹی یوں غائب ہو گئی تھی جیسے سمندر میں ایک قطرۂ اشک گم ہو جائے" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "اللہ کرے زورِ بیان اور زیادہ۔ یہ بتاؤ اس چوہدری سے ملنے کون جائے گا؟ ہمارا لائحۂ عمل کیا ہو گا؟"

"ملاقات کے لئے میں جاؤں گا" میں نے کہا۔

"نہیں۔ میں جاؤں گی" گل نے کہا "میں سب سے زیادہ گمنام ہوں۔ میرا مطلب ہے' جتنی شہرت بھائی سکندر' غالب اور محسن کو ملی یا رابعہ باجی اور نازو کو ملی' اس سے میں بچی رہی۔ اس لئے کہ میں پہلے ناگ منی تھی اور بہت بعد میں گل بانو بن کے شامل ہوئی۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا" غالب بولا۔

"فرق کیسے نہیں پڑتا۔ خود تم نے میرے اور محسن کے درمیان جس رشتے کو مشتہر کر دیا ہے' اس کے بعد یہ میرا حق بنتا ہے کہ میں محسن کی تلاش میں آگے آگے رہوں۔ یہ بالکل فطری بات نظر آئے گی۔ میں ایک عورت ہونے کا فائدہ بھی حاصل کر سکتی ہوں" گل نے کہا۔

میں مخمصے میں گرفتار ہو گیا۔ گل کی دلیل کو مسترد بھی نہیں کیا جا سکتا تھا اور اسے یوں خطرات کی دلدل میں کود پڑنے کی اجازت بھی نہیں دی جا سکتی تھی۔ وہ ہم سب کے مقابلے میں ایک کمزور فریق تھی اور اپنی حفاظت خود کرنا اس کے لئے ممکن نہ تھا۔

"تمہارا اکیلے وہاں جانا کسی صورت مناسب نہیں" غالب بولا۔

"میں چلی جاتی ہوں گل کے ساتھ" نازو نے کہا۔

"اور ہم کیا کریں؟ پاؤں میں مہندی رچا کے اور ہاتھوں میں چوڑیاں پہن کے بیٹھ جائیں گھر میں" غالب نے کہا "بڑے شرم کی بات ہو گی۔"

"ایسی تو بہت سی باتیں ہیں جن پر تم کو شرم آنی چاہئے مگر نہیں آتی" نازو نے کہا۔

"تمہیں کیا معلوم مجھے کتنی شرم آتی ہے۔ اس بات پر کہ میرا سُسر ایک بھوت ہے اور وہ بھی خاصا احمق قسم کا۔ شرم مجھے آتی ہے تمہاری عقل پر۔ اور جب تم بدمعاشوں کی طرح غیر مردوں سے مار پیٹ کرتی ہو۔ اور اس وقت جب تم غالب کے شعر کو بازار کے بھاؤ کی طرح پڑھتی ہو۔"

میں نے فوراً مداخلت کی "فیصلہ ہم رات کو کریں گے کہ کون محمد بھائی کے ساتھ جائے گا اور کون ان کے پیچھے حفاظتی دستے کے طور پر چلے گا۔ خطرہ ہے یا نہیں ہے' ہے تو اس سے کیسے نمٹا جا سکتا ہے' ایسے سب سوالوں کا جواب حالات پر منحصر ہو گا" میں نے کہا۔

نازو نے کہا "ہمارے پاس نقد رقم بہت کم باقی رہ گئی ہے۔"

"کل جیب کاٹیں گے کسی کی یا ڈاکا ڈالیں گے کسی بنک میں" غالب بولا۔

"سوا سیر سونا آخر کب کام آئے گا؟" نازو نے کہا۔

"میری شادی پر۔" غالب بولا۔

"وہ منحوس سونا ہے" میں نے ہنس کے کہا۔

"شادی کون سی مبارک ہو گی" غالب نے کن انکھیوں سے نازو کو دیکھتے ہوئے کہا "بلا پڑ جائے گی اپنے گلے۔"

نازو نے جل کے کہا "تو کیا ضرورت ہے شادی کرنے کی۔ کچھ اور کر لو۔ خودکشی کر لو۔ لیٹ جاؤ گاڑی کے آگے۔"

"پہلے تم گاڑی تو خریدو" غالب نے آہ بھر کے کہا "پھر یہ بھی کردکھائیں گے تمہیں۔"

"یہ تم لوگ سنجیدہ باتیں کرتے کرتے پٹڑی سے کیوں اُتر جاتے ہو؟" میں نے بھنا کے کہا "بالکل بچوں کی طرح لڑنے لگتے ہو موقع محل دیکھے بغیر۔ بات ہو رہی تھی سونے کی۔"

"میں سمجھتا ہوں جلدی سونے اور جلدی اٹھنے کی عادت کے بارے میں جو کچھ بزرگوں نے فرمایا ہے، وہ ٹھیک ہی ہوگا" غالب سر کھجا کے بولا۔

مجھے ہنسی آگئی "محمد بھائی سے بات کرتے ہیں' اگر وہ سونا فروخت کرادے۔"

غالب نے کہا "یہ کام اے ڈی بہتر طور پر کر سکتا ہے۔ غیر قانونی کام کو قانون کے رکھوالے سے بہتر کون سمجھتا ہے۔"

میں نے کہا "یہ بھی ٹھیک ہے۔ چلو میں اسی کو بلوالیتا ہوں۔ اب میں اور گل جاتے ہیں ہوٹل۔ میں وہیں سے فون کروں گا۔ تم اپنی باقی لڑائی جاری رکھو جو اِن اہم معاملات کی وجہ سے ادھوری رہ گئی تھی۔"

"میری کیا مجال کہ نازو سے لڑوں۔ یہ تاب' یہ مجال' یہ طاقت نہیں مجھے" غالب بولا "یہ خود ہی لڑنے لگتی ہے۔"

نازو نے کہا "میں لڑتی ہوں؟ بات تم کرتے ہو ایسی۔"

"کبھی سچ بات بھی نکل ہی جاتی ہے منہ سے" غالب بولا "اور سچ کڑوا ہی لگتا ہے۔ تم میں حوصلہ ہونا چاہئے سچ کو برداشت کرنے کا۔"

"مجھ میں حوصلہ ہے۔ ایسی کون سی سچی بات ہے جو مجھے بری لگتی ہے؟ لیکن غلط بات نہیں سن سکتی میں۔"

"اس میں کیا غلط بات ہے کہ میرا سُسر بھوت ہے۔ نہایت شرپسند قسم کا۔ مجھے پٹی پڑھاتا رہتا ہے کہ بیوی کو پاؤں کی جوتی بنا کے رکھو بیٹا ورنہ میری طرح پچھتاؤ گے۔"

جب میں اور گل نکلے تو ان کی باقاعدہ لڑائی کا ایک اور راؤنڈ شروع ہوچکا تھا مگر ابھی ہم مشکل سے چند قدم دور گئے تھے کہ ان کے کھلکھلا کے ہنسنے کی آواز سنائی دی۔ وہ دونوں قہقہے لگا رہے تھے۔ میرے ساتھ گل بھی مسکرانے لگی۔ ہم سامان کے ساتھ گھوم کے صدر دروازے کی طرف چلنے لگے۔

"بڑا اچھا لگتا ہے..... جب یہ لڑتے ہیں اور پھر ذرا سی دیر میں سب بھول کے ہنسنے لگتے ہیں۔" گل نے حسرت آمیز لہجے میں کہا۔

میں نے کہا "محبت ایسی ہی ہوتی ہے۔ جیسے سورج کی روشنی کا رنگ جس میں سات رنگ ہوتے ہیں۔ شوخ بھی اور ہلکے بھی۔ وہ بھی جو آنکھ دیکھ سکتی ہے اور وہ بھی جو کسی کو نظر نہیں آتے۔"

"بڑا فرق ہے دونوں کی فطرت اور عادت میں۔ پھر بھی......"

میں نے کہا "گل! غور کرو تو تمہیں فرق نہیں لچک محسوس ہوگی ان کے درمیان۔ ابھی ایک شعلہ ہے تو دوسرا شبنم۔ پھر کسی لمحے یہ پانی ہے تو وہ آگ۔ اسی پر مفاہمت اور تعلق کا رشتہ استوار ہوتا ہے۔ دیکھنے میں نٹ اور بولٹ بالکل الگ لگتے ہیں مگر جب ملتے ہیں تو کیا انہیں کوئی طاقت جدا کر سکتی ہے۔ میں ان سے اتفاق نہیں کرتا جو سمجھتے ہیں کہ مزاج اور طبیعت ایک ہوں تو زندگی اچھی گزرتی ہے۔"

گل نے حیرانی سے کہا "کیوں؟ یہ تو ضروری ہے۔"

میں نے کہا "سب کتابی باتیں ہیں۔ اگر دونوں کا غصہ تیز ہو، دونوں ضدی ہوں تو ہار کون مانے گا؟ کون کسے منائے گا؟ دونوں شاعر ہوں گے تو شعر کون سُنے گا؟ ایک زیادتی کرے تو دوسرا برداشت کرے۔ ایک فضول خرچ ہو تو دوسرا کفایت شعار۔ ایک حال مست ہو تو دوسرا دور اندیش۔ پھر زندگی کی گاڑی یکساں رفتار سے اور کسی رکاوٹ کے بغیر رواں دواں رہتی ہے۔"

گل نے کہا "آپ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ حالاں کہ ایسی بات میں نے پہلے کبھی سنی نہیں۔"

"اب ذرا مسکراؤ۔ علی شاہ سمجھے گا ہم لڑ کے آرہے ہیں" میں نے کہا۔

علی شاہ نے مسکرا کے ہمیں خوش آمدید کہا "آپ کا پیغام تو کوئی نہیں آیا سر۔"

"علی شاہ! ایک آدمی کا پتا چلانا ہے" میں نے کہا "اگر وہ مل جائے تو کمرے میں میری بات کرادو۔"

"نام بتائیں سر۔"

میں نے کہا "وہ سب انسپکٹر ہے۔ چوہدری اللہ دِتّا۔ یہ معلوم نہیں کہ گھر پر فون ہے یا نہیں۔ تم تھانے کا نمبر لکھ لو۔ وہاں سے شاید گھر کا نمبر مل جائے۔"

"میں کوشش کرتا ہوں سر۔"

ابھی میں نے کمرا کھول کے سامان رکھا ہی تھا کہ کمرے میں رکھے ہوئے فون کی گھنٹی بجی۔ میں سمجھا کہ علی شاہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوچکا ہے مگر ریسیور اٹھا کے مجھے مایوسی ہوئی۔ کسی نے فرنچ میں چلانا شروع کیا" آخر یہ کیا ہو رہا ہے۔ مجھے کیوں نظر بند کیا گیا ہے اپنے ہی گھر میں۔ کوئی بھی میری سفارتی مراعات تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔"

"میں ٹریڈ کونسلیٹ نہیں ہوں تمہارا۔" میں نے فرنچ میں کہا "پھر بھی تمہیں مشورہ دے سکتا ہوں کہ موجودہ حالات میں اپنی مراعات کو بطورِ حق طلب مت کرو۔ منّت سماجت' خوشامد سے خیرات میں لے لو۔ یہی ڈپلومیسی ہے۔"

وہ حیران ہو کے بولا "تم..... کون ہو؟"

میں نے کہا "ایک مخلص مشیر۔ دوبارہ اس نمبر پر فون مت کرنا۔ یہ کمرا خالی ہے اب۔"

اے ڈی کا فون اس وقت آیا جب میں غسل کر رہا تھا۔ گھنٹی بجی تو میں نے دروازے سے کان لگا کے سنا۔

گل کہہ رہی تھی "جی آپ دس منٹ بعد فون کرلیں۔"

میں نے دروازہ بجا کے کہا "اس کا فون نمبر لے لو۔ میں خود بات کرلوں گا۔"

گل نے کہا "آپ اپنا نمبر دے دیں جی۔"

دس منٹ سے بھی پہلے میں نے اے ڈی کے گھر کا نمبر ملایا۔ وہ شاید فون سے چپکا بیٹھا تھا کہ پہلی گھنٹی پر ہی ریسیور اٹھالیا۔

"خیر ہے نا جناب؟" وہ بولا "اچھی خبر ہے کہ بری؟"

میں نے کہا "خبر کوئی نہیں ہے۔ تم کسی سونے کے تاجر کو جانتے ہو؟ دکاندار نہیں، تاجر۔"

"لوجی' چوہدری اللہ دتا کو سب سُنار جانتے ہیں۔ اپنی ڈیوٹی ادھر تھی تو چھاپے شاپے مارتے تھے۔"

میں نے کہا "یار کسی سے دوستی بھی ہے یا سب دشمن ہیں۔"

"پولیس والوں کا دوست کون ہوتا ہے" وہ بولا "لیکن گل کی اے۔"

"گل اے ہے سرجی کہ ہمارے پاس کوئی سوا سیر سونا ہے جو ہم بیچنا چاہتے ہیں" میں نے کہا "خود تو یہ کام کر نہیں سکتے۔ پکڑے جائیں گے یا سونا خریدنے والا مٹی کا مول لگائے گا۔"

"چن جی' ہم سے لے لو جتنا پیسہ چاہئے۔"

میں نے کہا "میں اُدھار کی بات نہیں کر رہا تھا۔"

"چلو سونا ہم خرید لیتے ہیں" وہ نشے میں بولا "ہم تو مٹی بھی سونے کے مول لے سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "نہیں۔ کسی سُنار کو ساتھ لا سکتے ہو تو ہوٹل میں آجاؤ۔ نام یاد ہے نا میرا؟"

وہ ہنسنے لگا "بادشاہو، کیسی گلاں کرتے ہو۔ تمہارا نام بھی بھول سکتے ہیں ہم آنند کمار ورما۔ تم تو میرے چاچے کے پُتّر ہو۔ چاچے ہو۔ ماے ہو..... وہ قوالی ہے نا۔ میرا کوئی نہیں ہے تیرے سوا......"

میں نے ریسیور رکھ دیا۔ وہ باقاعدہ گا رہا تھا۔ غالباً ہمارے آجانے کے بعد اس نے احتیاط کی حدود کو بالائے طاق رکھتے ہوئے پی تھی۔

اس کے باوجود وہ ایک گھنٹے بعد اپنے ساتھ ایک کارٹون لے کر آگیا۔ کارٹون سطح زمین سے پانچ فٹ بلند تھا اور درمیان میں اس کی گولائی بھی اتنی ہی تھی۔ معلوم نہیں توند کے اس گنبد پر دھوتی کیسے ٹھہری ہوئی تھی۔ اس کا شفاف سر گردن کے بغیر ہی کندھوں پر رکھا ہوا تھا اور نہرو کیپ اس کی پیشانی تک آرہی تھی۔

اس نے ہانپتے ہوئے کہا "بندگی سرکار۔"

خوشامدانہ لہجہ۔ گُربہ مسکینی۔ پُرعیار عاجزی۔ منافقانہ انکساری۔ یہ ہندو بنئے کے وہ ہتھیار تھے جن سے اس نے کاروبار کی دنیا میں مسلمانوں کے قدم نہیں جمنے دئے تھے' جو سلطنت گنوا دینے کے بعد بھی اکڑفوں میں رہتے تھے کہ "پدرم سلطان بود" اور آج بھی اپنے ماضی کے کارناموں پر جتنا فخر کرتے تھے اتنا سبق اپنے ماضی کی غلطیوں سے لینا گوارا نہیں کرتے۔

میں نے کہا "لالہ جی تشریف رکھئے۔"

اے ڈی نے کہا "یہ لالہ لاجپت للوانی ہیں۔ دہلی' بمبئی اور کلکتہ میں ان کا وسیع کاروبار ہے۔"

لالہ جی پھر مسکرائے "تابعدار ہیں آپ کے جی۔"

میں نے اے ڈی سے کہا "کیا تم نے انہیں ساری بات بتادی ہے؟"

لالہ جی نے کُرتے کے اندر سے ایک پوٹلی سی برآمد کی "حجور' یہ پکے بائیس ہجار ہیں۔ باجار کا بھاؤ دیکھ لیں......"

میں نے کہا "اس کی کوئی ضرورت نہیں۔"

میرے اشارے پر گل نے سونے کی پوٹلی اس کے حوالے کردی "آپ بھی تول لیں.... پرکھ لیں کسوٹی پر۔"

لالہ جی نے ہاتھ جوڑے "اجت دار لوگ ہیں آپ۔ کھوٹ ہوتا ہے گریب کی نیت میں جب وہ جرورت مند ہوتا ہے۔ سوچتا ہے چار پیسے جیادہ مل جائیں۔ آپ کی جبان کسوٹی ہے۔"

اے ڈی نے کہا "تم اپنی زبان کا خیال رکھنا۔ ایسا نہ ہو کہ مجھے سچ مچ کاٹنی پڑے؟"

"اِتی اپنی جبان سے کچھ نکلے تو جبان نہیں گلا کاٹ دینا۔"

"وہ تو کاٹنا ہی پڑے گا زبان باہر نکالنے کے لئے" اے ڈی نے تھانیدارانہ لہجے میں کہا "اب تم جا سکتے ہو۔ بلکہ دفع ہوسکتے ہو۔"

میں نے کہا "کچھ چائے شربت......"

اے ڈی نے کہا "یہ صرف غریبوں کا خون پیتے ہیں جو یہاں نہیں ملتا۔"

لالہ جی نے ہاتھ جوڑ کے نمسکار کیا اور لڑھکتے ہوئے دروازے سے نکل گئے۔ مجھے اے ڈی کی بداخلاقی پسند نہیں آئی تھی۔

"اس شریف آدمی کے ساتھ یہ سلوک مناسب نہیں تھا۔"

"وہ شریف اسی لئے تھا کہ میں نے اس کے ساتھ صحیح سلوک کیا۔ اس کی شرافت دیکھنی ہے تو اس وقت دیکھو جب یہ کسی حاجت مند بیوہ کا زیور گروی رکھتا ہے" اے ڈی بولا۔

"بہرحال' اس نے وقت پر ہماری مدد کی۔"

"خاک مدد کی۔ اس نے بزنس کیا اپنا۔ اسے معلوم ہے کہ بازار کا بھاؤ اس وقت گرا ہوا ہے۔ حالات ٹھیک ہونے پر چڑھے گا تو اس نے اونے پونے ہر ضرورت مند سے جتنا زیور خریدا ہے سب مہنگا بکے گا۔"

گل نے کہا "مہمان تو تھا ہمارا۔"

"مہمان بن کے آتا تو مہمان ہوتا۔ سودا کرنے آیا تھا' سودا کرکے گیا۔ اللہ اللہ خیر صلاّ" اے ڈی نے کہا۔

"ایسا آدمی خطرناک بھی ہوسکتا ہے اے ڈی....."

"خطرناک ہر بندہ نظر آؤندا ہے' جب بندہ آپ خطرے میں ہو۔ بندہ اگر کھوہ وچ گر گیا تے اس کو پانی ہی نظر آئے گا ناہر طرف" وہ ہنسنے لگا۔

"پھر کیا کریں؟"

"میری مانو تو کھوہ میں سے نکل جاؤ۔ ایہہ ہوٹل بالکل ٹھیک نہیں۔ خطرہ ہی خطرہ بھرا ہوا ہے اس میں" اے ڈی بولا "پولیس کے مخبر اور سادہ کپڑوں وچ بندے ہر ویلے پھرتے رہتے ہیں۔ کوئی رپورٹ غلط بھی مل جائے تے چھاپا مار دیتے ہیں۔"

"یہاں سے نکل کے کہاں جائیں؟"

ابھی اس نے جواب نہیں دیا تھا کہ باہر شور مچ گیا۔ میں نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کے دیکھا تو مجمع لگا ہوا تھا اور کسی کو کچھ معلوم تھا یا نہیں مگر ہر شخص چلا رہا تھا۔ چند سیکنڈ میں چند نوجوان بڑے اشتعال کے عالم میں مجمع سے نکلے اور انہوں نے ادھر اُدھر دوڑتے ہوئے لوگوں کو چھرے گھونپنے شروع کئے۔ میری نظروں کے سامنے تین آدمی سڑک پر گر کے تڑپنے لگے۔ ایک چیخ پکار اور بھگدڑ مچ گئی۔ کچھ لوگ دیوانہ وار چیخ رہے تھے "پولیس پولیس" کچھ محض تماشائی بنے کھڑے تھے۔ چاقو سے راہ گیروں اور تماشائیوں پر حملے کرنے والے غائب ہو چکے تھے مگر نئے لوگ میدان میں اتر آئے تھے اور لڑنے والوں کے دو گروہ بن گئے تھے۔ ایک گروہ "مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی" کے اصول پر عمل پیرا تھا۔ دونوں فریق مومن تھے مگر نہ سپاہی تھے نہ ان کے پاس تیغ و تبر تھے چناں چہ وہ اناڑی پن سے ایک دوسرے کو مُکے مار رہے تھے۔ نیچے گرا کے کپڑے پھاڑ رہے تھے اور منہ نوچ رہے تھے۔ دوسرے بہت کم فریق ایسے تھے جو مقابلے پر چاقو چلا رہے تھے۔ ابھی تک نہ پولیس آئی تھی اور نہ ملٹری۔ بازار میں افراتفری کا عالم تھا اور کسی معمولی بات پر شروع ہونے والے ہنگامے نے فساد کی صورت اختیار کر لی تھی۔ چناں چہ تماشائی بھی جان بچا کے بھاگنے لگے تھے اور دُکانیں بند ہو رہی تھیں۔

پھر میں نے وہ معمولی بات دیکھ لی۔ مجمع منتشر ہوا تو مجھے عین سڑک کے وسط میں لالہ لاجپت للوانی نظر آیا۔ کسی نے اس کا پیٹ پھاڑ دیا تھا اور اس کا خون سڑک پر پھیلتا جا رہا تھا۔ حملہ کرنے والے نے کئی وار کئے تھے چناں چہ لالہ جی کی انتڑیاں تک باہر آ گئی تھیں۔

یہ بڑا کراہیت پیدا کرنے والا منظر تھا مگر میری نظریں لالہ جی کی کھلی آنکھوں والی لاش پر جم گئی تھیں۔ یہ ناقابلِ یقین لگتا تھا کہ ابھی مشکل سے پانچ منٹ پہلے یہ شخص زندہ سلامت ہمارے سامنے عجز و انکساری کا پیکر بنا کھڑا تھا۔ اس نے ہمیں بائیس ہزار روپے نقد دئے تھے اور وہ پوٹلی نہ کھول کر دیکھی تھی نہ تول کے جس میں سونے کا زیور تھا۔ اسے اپنے ہاتھوں کے لمس پر بھروسہ تھا کہ اس نے سونا ہی اٹھا رکھا ہے' لوہا یا پیتل نہیں اور سونا کسی صورت سوا سیر سے کم نہیں۔

میں نے کہا "اے ڈی! یہ کیا ہوا؟"

اے ڈی متفکر نظر آنے لگا تھا "وہ تو جو ہونا تھا ہو گیا۔ سوچو آگے کیا ہوگا۔"

"مگر اے ڈی...... کس نے مار دیا اسے؟"

"لو جی بندہ ہی مارتا ہے بندے کو۔ چاقو یا پستول خود تو نہیں مارتے نا۔ اب یہ مت پوچھنا کہ بندہ کون تھا۔ جیسے تم نے نہیں دیکھا ایسے ہی میں نے نہیں دیکھا۔"

"کسی کو کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ لالہ جی کے پاس سوا سیر سونا ہوگا؟" میں نے سوچتے ہوئے افسوس سے سر ہلایا۔

اے ڈی نے کہا "چھڈو پراں۔ اپنی فکر کرو۔ تم نکلو یہاں سے۔"

گل نے کہا "یہ سونا واقعی منحوس تھا۔ ابھی پتا نہیں اور کس کس کی جان لے گا۔"

میں نے کہا "شکر کرو ہمارے پاس سے گیا۔ اب منحوس تھا یا مبارک تھا' ضرورت میں ہمارے کام آ گیا۔"

اے ڈی نے کہا "لو وہ پولیس بھی آ گئی۔"

میرے کانوں نے ایک سائرن سنا "کوئی پولیس کو ضرور بتائے گا کہ لالہ جی اس ہوٹل سے برآمد ہوئے تھے۔ پھر وہ علی شاہ سے پوچھیں گے اور علی شاہ انہیں سیدھا یہاں بھیج دے گا۔"

"تم اپنا سامان چکو۔ فٹافٹ۔ دو تے بندے کہاں ہیں؟"

میں نے کہا "پیچھے سرونٹ کوارٹر میں۔"

"ان کو بھی ساتھ لو اور پہنچ جاؤ میرے گھر۔ میں جاتا ہوں ورنہ سب سے پہلے میں ہی پکڑا جاؤں گا۔" اے ڈی نے کہا "گھر دیکھ لیا ہے نا تم نے۔ میں نہ ملوں تو نوز حور دروازہ کھول دیں گی۔"

"کیوں؟ تم یہاں سے کہیں اور جاؤ گے؟"

"میری ڈیوٹی کا ٹائم ہو گیا ہے یار۔ شام کی ڈیوٹی ہے آج۔ میں بھی کوئی بندوبست کر لوں نا اپنا۔ کوئی گواہی ہو کہ میں تو چار بجے تھانے میں ہوں۔ ابھی بجے ہیں پانچ۔ تم پانچ منٹ میں نکل جاؤ" بولا اور دروازہ بند کر کے نکل گیا۔

میں نے پلٹ کے دیکھا تو گل کانپ رہی تھی "بھائی سکندر اللہ دِتا ٹھیک کہتا ہے۔ علی شاہ نے بھی دیکھا ہوگا لالہ جی کو آ... اور پتا نہیں کس کس نے دیکھا ہوگا۔"

میں نے کہا "تم سامان کے ساتھ چلو۔ نیچے سے کسی پورٹر بلا لو۔"

"میں...... اکیلی۔"

"ہاں۔ سامان ٹیکسی میں رکھو اور گھوم کر پیچھے آ جاؤ۔ میں ادھر سے نمٹ کر پہنچتا ہوں۔"

گل نے فون اٹھایا "ہیلو۔ دیکھیں کسی بیل بوائے کو بھیج دیں"

میں نے کہا "گھبرانا نہیں۔ میں جا کے صورتِ حال کو د... اور غالب کے ساتھ سامان اٹھا کے پیچھے پہنچتا ہوں۔"

گل نروس تھی مگر اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ میں نے دروازہ کھولا ہی تھا کہ بیل بوائے نظر آیا "آپ بلایا صاب؟"

میں نے کہا "بیگم صاحب کو جانا ہے۔ ان کا سامان لے جاؤ۔"

بیل بوائے نے کہا "یس سر" اور اندر چلا گیا۔

میں اطمینان سے نیچے اترا۔ حسب توقع علی شاہ نیچے موجود تھا اور اس نے بڑی خوش اخلاقی سے مجھے گڈ ایوننگ کہا۔

میں نے کہا "علی شاہ! یہ باہر کیا ہنگامہ ہے؟"

"ہوتا رہتا ہے سر۔ ابھی پولیس یا ملٹری آ جائے گی تو سب کو پکڑ لے گی۔ بدمعاش چھوٹ کے نہیں۔"

میں نے کہا "میں ذرا مارکیٹ تک جا رہا ہوں۔"

علی شاہ نے کہا "ابھی...... میرا مشورہ مانیں تو کچھ دیر بعد چلے جائیں۔ یہ ہنگامہ ختم ہو جائے۔"

میں نے گھڑی پر نظر ڈالی "مجھے بہت ضروری کام تھا۔"

اسی وقت گل نیچے اتری اور میں نے اسے ہاتھ ہلا کے خدا حافظ کہا۔

"آپ کی مسز کہیں جا رہی ہیں؟" علی شاہ بولا۔

"ہاں۔ ان کی فلائٹ ہے دہلی کے لئے۔ میرا تو کچھ پتا نہیں کب تک رکنا پڑے۔ عورتوں کو گھر کی فکر ہو جاتی ہے۔ میں تو اسے ائرپورٹ پر سی آف کرنے بھی نہیں جا سکتا۔"

"ائرپورٹ تو بند ہے سر۔"

"میرا مطلب تھا ملٹری ائر بیس۔ اسے میں نے ایک ہیلی کاپٹر میں نٹ کرا دیا ہے۔ میرا اپائنٹمنٹ تھا میجر جلیل کے ساتھ۔ کیا کروں؟" میں نے کہا "ادھر تو بہت گڑبڑ ہے۔"

"آپ ایسا کریں پیچھے سے نکل جائیں۔ لابی سے ہو کے سرونٹ کوارٹرز کی سائڈ سے" علی شاہ نے مشورہ دیا۔

"یہ ٹھیک ہے" میں نے کہا "تھینک یو۔"

سرونٹ کوارٹر میں پہنچنے تک مجھے دھڑکا لگا رہا۔ کہ اچانک علی شاہ کی قیادت میں یا اشوک کے ساتھ پولیس نہ آ گئی تو بلوائی آ جائیں گے اور فرار ہونے سے پہلے ہی میں پکڑا جاؤں گا۔ جب معلوم ہوگا کہ نہ میں ڈپٹی سیکریٹری ہوں' نہ آنند کمار ورما بلکہ سکندر بخت ہوں تو پھر لالہ جی مرڈر مسٹری میں میرا نام مشتبہ افراد کی فہرست میں سب سے اوپر ہوگا۔

غالب اور نازو پتا نہیں کس بات پر ہنس رہے تھے۔ میری صورت دیکھ کے ان کی شکل پر بھی بارہ بج گئے۔

"خیریت تو ہے؟ اکیلے آئے ہو' گل کہاں ہے؟"

میں نے کہا "گل نکل گئی۔ اب ہمیں نکلنا ہے فوراً۔ بات کرنے کا وقت نہیں ہے۔ ذرا بھی دیر کی تو مارے جائیں گے سب" میں نے کہا "سامان اٹھاؤ اور بھاگو۔"

سامان ایک سوٹ کیس کے سوا کیا تھا۔ وہ غالب نے اٹھایا اور چند منٹ میں ہم دیوار پھاند گئے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس وقت اشوک نمودار نہیں ہوا ورنہ شور مچا دیتا۔ اس کے پینگ گیسٹ معاوضہ ادا کئے بغیر فرار ہو رہے تھے۔

باہر آ کے میں نے غالب سے کہا "تم ادھر جاؤ۔ میں دوسری طرف جاتا ہوں۔"

غالب نے کہا "اچھا خدا حافظ۔ دنیا واقعی گول ہے اور ہم ناک کی سیدھ میں چلتے رہے تو دوسری طرف ملیں گے۔ جہاں ہم کھڑے ہیں' اس کے بالکل نیچے کسی جگہ۔"

میں نے کہا "گل آئے گی ٹیکسی میں۔ ادھر سے یا اُدھر سے۔ اس کو روک لینا۔ نازو کو اپنے ساتھ رکھو۔"

گل کے نمودار ہونے تک میں نے انتظار کے چند منٹ پُراضطراب' خوف آمیز انتظار میں ہر سمت بے وجود اندیشوں کا حصار تنگ ہوتا محسوس کیا۔ میرے دل میں ایک ایسی بے کلی تھی جسے میں اپنی چھٹی حس کی شرارت بھی سمجھ سکتا تھا۔ نہ جانے کیوں یقین نہیں آتا تھا کہ لالہ کا قتل کسی بے رحم اتفاق کا نتیجہ تھا اور کسی نے اس کی تحویل میں سوا سیر سونے کا راز فاش ہو جانے کی وجہ سے اس کی جان لے لی تھی۔ لالہ بے وقوف نہیں تھا کہ ایسے حالات میں سونے کو اچھالتا ہوا جاتا۔ اگر یہ ذاتی دشمنی کا نتیجہ تھا جو پہلے سے چلی آ رہی تھی تو اس دشمن نے دیدہ و دانستہ پرانے قرض کا حساب چکانے کے لئے وقت اور جگہ کا تعین کیا۔ خون کا حساب تھا تو بے باق ہوا اور لین دین کا جھگڑا تھا تو وہ بھی ختم ہوا۔ لالہ جیسے لوگوں کے دشمن ضرور ہوتے ہیں مگر اس سے زیادہ دشمن ہمارے تھے۔ کہیں انہوں نے ہمیں زیرِ دام لانے کے لئے تو یہ انتظام نہیں کیا تھا کہ ایک تیر سے دو شکار کر لئے جائیں۔ لالہ جی کے قتل کے الزام میں قانون کے ہاتھ ہم کو دھکیل کر تختۂ دار کی جانب لے جائیں۔ لیکن دستِ قاتل پر لہو کی سرخی کوئی نہ دیکھے۔ وہ سوا سیر سونے کو خدمات کا معاوضہ قبول کرتے ہوئے اپنی کامیابی کے جشن منانے کے لئے آزاد ہوں۔ وہ سونا واقعی منحوس تھا۔ میں نے سوچا مگر پھر اس خیال کو اپنے پریشان ذہن کی پیداوار سمجھ کر خدا سے توبہ کی۔ اچھا برا' نیکی بدی یا زندگی اور موت اگر اس کے حکم اور اس کی قدرتِ کاملہ سے ہے تو بندہ اپنے افعال و کردار کو ظاہر سے کیوں منسوب کرے۔ کیا پتا اس میں بھی کاتبِ تقدیر نے کوئی مصلحت پوشیدہ رکھی ہو۔

گل دوسری سمت سے نمودار ہوئی۔ اس کے ساتھ پچھلی سیٹ پر غالب اور نازو بھی بیٹھے تھے۔ ٹیکسی میرے قریب آ کے رکی اور میرے بیٹھتے ہی چل پڑی۔ میں نے سوالیہ نگاہوں سے پیچھے دیکھا تو ان سب کے اترے ہوئے پُرخوف چہرے دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ نگاہوں کی زبان میں انہوں نے مجھے محتاط رہنے اور سوال یا تبصرہ کرنے سے منع کر دیا تھا۔

ٹیکسی ڈرائیور سے بھی میں نے کوئی بات نہیں کی۔ اسے کہاں

جاتا ہے یہ پہلے ہی اس کے علم میں تھا ورنہ وہ از خود دائیں بائیں موڑ کاٹنے سے پہلے پوچھتا کہ اب کدھر جانا ہے۔ ٹیکسی انٹرکان ہوٹل کے سامنے رکی اور غالب نے اسے دس کا نوٹ دے کر رخصت کیا۔ اس میں ٹپ کا عنصر غالب تھا۔ کرایہ بہت کم بنتا تھا مگر سیاسی کشیدگی کو بڑھانے کے لئے ڈرائیور نے ہمیں نہ سلام کیا اور نہ ہمارا شکریہ ادا کیا۔ اس نے گل اور نازو پر آخری نظر کی اور بے زار صورت پر نفرت کے جذبات نمایاں کر کے چلا گیا۔

میں نے کہا "اس الو کے پٹھے کو کرایہ دے کر باقی ایک ایک پیسہ وصول کرنا تھا۔"

غالب نے کہا "وہ میں نے وصول کر لیا ہے" اور مجھے ایش ٹرے دکھائی جو اس نے پچھلی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے نکال لی تھی "کیا یاد رکھے گا۔"

گل نے کہا "آپ کو پتا ہے......"

غالب نے کہا "ہم یہاں کھڑے رہ کے باتیں نہیں کر سکتے۔ اندر چلو۔"

ہم رسماً اندر گئے اور دو ٹوک انکار سن کے واپس باہر آ گئے۔ حسب توقع نہ وہاں کوئی کمرا خالی تھا اور نہ ہونے کی امید تھی۔ عملے کا رویہ بھی ایسا تھا جیسے ہم نے یہ سوال کر کے بھی ناقابل معافی جرم کیا ہو۔ ہم خود فوراً باہر نہ آتے تو شاید دھکے دے کر نکالے جاتے۔ میرا غصہ اور بڑھ گیا۔ عام آدمی کا ردِ عمل شدید جذباتی تھا اور اس کے ذہن پر کچھ حالات کا اور کچھ اس پروپیگنڈے کا اثر تھا کہ مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والا ہر شخص استحصال جبر اور ظلم کی فرد جرم رکھتا ہے اور ایک جارح کی حیثیت سے جارحانہ طرزِ عمل کا مستحق ہے۔

"ہماری یہاں ایڈوانس بکنگ تو نہیں تھی کہ ایسے سامان اٹھا کے آ گئے" میں نے کہا۔

"یہ اپنے دفاع کو مضبوط بنانے کی سیاسی حکمتِ عملی کا مظاہرہ تھا" غالب نے کہا "اب چلو جہاں سینگ سمائیں۔"

"سینگ کس کے سر پر ہیں" نازو نے کہا۔

"سب کے سر پر۔ اسی لئے تو ہم ہر جگہ نمایاں ہیں" غالب بولا۔

سامان فٹ پاتھ پر رکھ کے غالب ٹیکسی والوں سے مذاکرات کرنے گیا اور مسکراتا ہوا لوٹا۔ ٹیکسی مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد کی لگتی تھی اور اسے مہاراجہ بہ نفسِ نفیس چلا بھی رہے تھے۔ ڈرائیور کی صورت مہاراجہ رنجیت سنگھ کی اس تصویر سے بہت ملتی تھی جو میں نے تاریخ کی غیر مستند کتابوں میں دیکھی تھیں۔ اس کی ایک آنکھ بھی نہیں تھی۔ مہاراجہ سے ان گنت لطیفے منسوب تھے اور ٹیکسی ڈرائیور بھی کسی لطیفے سے کم نہ تھا۔

اس نے ہمیں دیکھ کر ایسی خوشی کا اظہار کیا جیسے ہم اس کے برسوں سے بچھڑے ہوئے سسرالی عزیز ہوں۔ گفتگو ست سری اکال سے آغاز ہوئی اور ٹھیٹھ پنجابی میں ہوئی۔ سردار جی ہوش... ہر کس و ناکس کی والدہ و ہمشیرہ کی ذات کو کسی دشنام میں ملوث... تھے اور انہیں قطعی احساس نہ ہوتا تھا کہ پیچھے "زنانیاں" بھی... ہیں۔

غالب نے کہا "سردار جی! کوئی ایسی جگہ بتا دو جہاں ... ایسا نہ لگے کہ ہمارے چاروں طرف پاگل کتے غراتے پھر... ہیں۔"

"آپ فکر ہی نہ کرو جی" وہ بولے "میں سب سمجھتا ... بڑے ...... ہیں۔ لیکن ہمارے آپ کے درمیان پکی دوستی ... دوبار میں ننکانہ صاحب گیا ہوں۔ حسن ابدال میں پنجہ صاحب ... میں جہاں گیا آپ کے لوگوں نے مجھے سر آنکھوں پر بٹھایا ... عزت دی اور بڑی خاطر مدارات کی۔ آپ کی حکومت نے ... سے وہ سلوک نہیں کیا جو خود ہماری حکومت یہاں کرتی ہے ... آپ میرے مہمان ہو۔ کسی ..... کی مجال ہے جو آپ کی طرف ... نظر سے دیکھے۔ سوں واہگورو کی۔ کرپان سے ...... پھاڑ دوں گا ..."

میں نے کہا "کچھ پتا بھی چلے تم کہاں لے جا رہے ہو۔"

"ہے ایک جگہ۔ میری بیوی رہتی ہے وہاں۔ چھ بچے ... جو مجھے اپنا باپ کہتے ہیں۔ پتا نہیں ..... ہیں بھی کہ نہیں۔ ... اپنا ہی سمجھ کے پال رہے ہیں۔ بیوی تو اپنی ہی ہے نا جوانی ... شے تھی..... کہ یہ مدھوبالا تو اس کی نقل ہے۔"

"وہ خفا تو نہیں ہو گی کہ یہ جلوس کہاں سے لے آئے ..."

"خفا ہو گی! زبان سے چوں بھی کرے تو ..... کی زبان نکا... ہتھیلی پر رکھ دوں۔ پاگل کتے کی زبان لگا دوں اس کی جگہ۔ ... بولتی نہیں گاتی ہے۔ پھر بھونکنے لگے گی......"

سردار جی کی باتوں پر سب ہنس رہے تھے اور شاک... کیفیت پہلے جیسے نہ رہی تھی جو لالہ جی کے قتل کے بعد ہو... فرار ہوتے وقت تھی۔ سردار جی رہتے بھی ڈھاکا کی آخر... میں تھے مگر ایک تو ان کا گھر کشادہ تھا۔ ان کی بے حد تنگ... بیوی کا دل اس سے زیادہ کشادہ تھا۔ ننکانہ صاحب اور پنجہ ... کی زیارت کے سفر میں وہ بھی سردار جی کے ساتھ تھی ... پاکستانیوں کے جذبۂ مہمان نوازی سے بے حد متاثر تھی۔ ... اپنی جملہ پیداوار کو ہانک کر ایک کمرے میں منتقل کیا اور ... ہمارے حوالے کر دیا کہ جب تک دل چاہے رہو۔ ڈھاکا کی ... تنگی نے کشادگی کا مفہوم بھی بدل دیا ہے۔ یہ کوئی ہزار گز ... پر محیط جگہ نہ تھی۔ زیادہ سے زیادہ سو مربع گز پر ٹین کی ... والے تین کمرے تھے۔ ٹین میں اتنے سوراخ تھے کہ را... سوراخ سے کوئی ستارہ نظر آتا رہا اور میں یہ محسوس کرتا ... کھلے آسمان کے نیچے سو رہے ہیں۔ جب اچانک بادل بر... ہم سب نے شاور کا لطف لیا۔ اس کے باوجود تحفظ اور ا... فضا نے سب کو آسودگی فراہم کی تھی اور کھانا کھاتے ہی ...

...گئے تھے۔

کھانا دال چاول پر مشتمل تھا جس کے بعد سویٹ ڈش کے طور ... پیش کیا گیا تھا۔ سردار جی نے بلا تکلف پاؤ بھر گڑ کھانے کے بعد ... "نیک بخت، کل کے لئے کچھ مت بچا۔ مہمانوں کے سامنے ... رلا کے رکھ۔"

نیک بخت نے کہا "مہمانوں کو مت بدنام کرو۔ سب نے مل ... آدھی چھٹانک بھی نہیں کھایا ہو گا۔ آدھا سیر تم کھا گئے۔"

"کیسی جھوٹی عورت ہے..." سردار جی نے ڈھٹائی سے کہا۔ ... ایک چھٹانک کی ڈلی سامنے رکھی تھی۔ زیادہ سے زیادہ آدھی کھالی ... نے......"

"کچھ خیال کرو اپنا۔ شکر کی بیماری ہے تمہیں۔"

"شکر کہاں کھائی ہے۔ گڑ کی بیماری ہوتی تو گڑ سے پرہیز کرتا۔ ... میرا کھانا اچھا نہیں لگتا تجھے" سردار جی بولے۔

"میٹھا زہر ہے تمہارے لئے۔"

"میٹھا زہر تو خود بھی ہے تو۔ جا چلی جا، نہیں تو تجھے بھی ... جاؤں گا......" سردار جی نے کہا۔

رات گیارہ بجے کے قریب میں نے کسی کے ہاتھ کا لمس ... کر کے آنکھیں کھولیں تو نازو نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے مجھے ... چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ اندھیرے میں وہ کچھ عجیب سی لگ رہی ... میں دبے پاؤں باہر آیا تو اس کا ڈھیلا ڈھالا لباس اور بدلا ہوا ... دیکھ کے حیران رہ گیا۔

اس نے چارپائی پر پڑی ہوئی گھیردار شلوار کرتے کی طرف ... کیا "یہ پہن لو۔ میں سردار جی کی پگڑی چرا کے لاتی ہوں۔"

میں نے سر پکڑ لیا "پگڑی چراؤ گی۔ ان کی خواب گاہ میں جا ..."

مگر میری بات کو اہمیت دئے بغیر وہ اندر گھس گئی۔ میں نے غسل خانہ کہلانے والے ڈربے میں گھس کے کپڑے بدلے۔ ... عمل میں میرا سر دوبار چوکھٹ سے لگا اور میری کہنی کئی بار دیوار ... ٹکرائی۔ سر پر پگڑی سجا کے میں بالکل سکھ بن گیا۔

"تم سو فیصد سکھ نظر آ رہے ہو۔ دماغ کو بچا کے رکھنا کہیں بارہ ... نہ ہو جائے۔" نازو ہنسی۔

"وہ رات کے نہیں دن کے بارہ بجے ہوتا ہے" میں نے کہا "لیکن ... ابھی سکھ کی مونث نہیں لگ رہی ہو مس نازلی۔"

"پھر کیا لگ رہی ہوں؟" وہ متفکر ہو گئی۔

"کسی بھوت کی بچی" میں نے کہا اور اسے خفا ہونے کا موقع ... بغیر باہر لے گیا۔ ابھی تک نہ اس نے مجھے بتایا تھا نہ میں نے ... اس سے پوچھا تھا کہ ہمیں یہ بھیس بدل کے کہاں جانا ہے۔ ہمیں محمد ... سے ملنے کے لئے واپس ہوٹل شاہ باغ جانا تھا۔ اس نے بارہ ... کے بعد ہمیں عبدالستار چوہدری سے ملوانے کا وعدہ کیا تھا چناں... چہ ہمارا وقت سے پہلے وہاں موجود ہونا ضروری تھا۔ ہم خاموشی سے باہر آ گئے۔

"کچھ دیر ہو گئی ہے" نازو بولی "محمد بھائی واپس نہ لوٹ جائیں۔"

میں نے کہا "اب ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ گھڑی دیکھ کے ٹھیک بارہ بجے چلا جائے۔"

نازو بولی "وہ اس سے پہلے ہی مایوس ہو کے واپس جا سکتا ہے، جب اسے بتایا جائے گا کہ وہ دکان اپنی بڑھا گئے۔"

"پھر محمد بھائی کو ہم تلاش کریں گے اور وہ ایسی چیز نہیں ہے جو کھو جائے تو پھر نہ ملے" میں نے کہا "یہ تو بتاؤ ہم جائیں گے کیسے۔"

نازو ہنسی اور اس نے مٹھی میرے سامنے کھول دی "تم گاڑی چلانا بھولے تو نہیں ہو گے۔"

میں بھونچکا رہ گیا "تم۔ ٹیکسی کی چابی بھی چرا لائی ہو؟"

"ہاں۔ پگڑی میں تھی" وہ بولی "زیادہ تلاش نہیں کرنی پڑی۔"

"میزبان کے گھر میں چوری ڈاکا۔ اللہ تمہیں معاف کرے" میں نے ہنس کے کہا "اور مجھے تمہارا ساتھ دینے پر......"

ٹیکسی تنگ گلی کے آخر میں کھڑی تھی۔ میں نے اسے اسٹارٹ کیا تو اس نے بیک فائر کیا۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ کہیں کوئی اسے فائر کی آواز سمجھ لیتا تو ساری بستی جاگ اٹھتی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ دہائی دیتے کہ مہمان ہی اسے لوٹ کر لے گئے تاہم نفٹی پرسنٹ مہمانوں کا ایک جوڑا حوالۂ پولیس کرنے کے لئے دستیاب ہے۔

دوسری بار میں انجن شرافت سے رواں ہو گیا تو میں نے کہا "اب دعا کرو کہ ہم صراطِ مستقیم پر چلیں اور وہیں پہنچ جائیں جہاں ہم کو پہنچنا ہے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ بھٹک گئے تو..."

نازو نے کہا "کیا تمہیں راستہ یاد نہیں رہا؟"

"اگر تمہیں یاد ہے تو رہنمائی کرتی جاؤ۔"

"مجھے یاد ہے۔ بس سیدھے ہوٹل شاہ باغ چلو۔" نازو بولی۔

"سیدھا تو راکٹ بھی نہیں گزر سکتا۔ راستے میں سیکڑوں دیواریں حائل ہوں گی۔ کہو تو اڑا کے لے جاؤں؟" میں نے کہا۔

گیارہ بجے بھی سڑکوں پر ویرانی تھی۔ جنگ و جدل اور فساد و خونریزی سے ڈرے ہوئے لوگ جلد گھروں میں بند ہو جاتے تھے۔ تفریح گاہیں اور بازار جو آدھی رات کے بعد بھی آباد نظر آتے ہوں گے اُجاڑ پڑے تھے اور سڑکوں پر پولیس یا ملٹری کی گاڑیوں کے علاوہ بہت کم گاڑیاں تھیں۔ ہمیں بھی دو جگہ چیک کیا گیا مگر نازو کے جواب نے انہیں مطمئن کر دیا۔ ایک جگہ تو وہ گرم ہو گئی کہ کیا شہر میں کرفیو نافذ کر دیا گیا ہے۔ نہیں تو پھر ہوٹل شاہ باغ جانے والوں سے یہ سوال کرنا چہ معنی دارد کہ وہاں کیوں جا رہے ہو۔ جو ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہوں وہ ہوٹل نہیں جائیں گے تو کیا تھانے

جائیں گے۔

کئی جگہ ہم ہوٹل کا راستہ پوچھنے پر مجبور ہوئے اور اس سے پہلے کہ کوتوال سامنے آکے چور سے پوچھتا کہ۔ جاتے ہو کس طرف کو کدھر کا خیال ہے۔ چور نے خود کوتوال سے پوچھ لیا کہ جاؤں کدھر کو میں؟ پولیس والوں نے ہی ہمیں راستہ سمجھایا۔

ٹیکسی کو ہم نے گیٹ کے سامنے کھڑی ہوئی ٹیکسیوں سے کچھ فاصلے پر روک لیا جہاں سے ہم دونوں جانب نظر رکھ سکتے تھے۔ محمد بھائی ایسی چیز نہیں تھا کہ نظر سے اوجھل رہ سکتا۔ میرا خیال تھا کہ اس کا چھ فٹ سے زیادہ قد اوسطاً پانچ فٹ کے بنگالیوں میں نمایاں نظر آئے گا مگر نازو نے کہا کہ اس کی بڑی بڑی مونچھیں پہلے نظر آئیں گی لیکن ہم دونوں کے اندازے غلط ہو گئے۔ محمد بھائی نے ساڑھے گیارہ بجے ٹیکسی میں منہ ڈال کے کہا "السلامُ علیکم" تو میں اور نازو اچھل پڑے۔ وہ پیچھے سے آگیا تھا۔

میں نے کہا "تم... تم نے دیکھ لیا ہمیں؟"

نازو نے کہا "آخر کیسے.....؟"

پیچھے بیٹھتے ہوئے وہ مسکرایا "اپن فون کیا تھا۔ کوئی سالا حرامی بولا کہ وہ آنند کمار ورما ایک دم فراڈ۔ مرڈر کرکے بھاگ گیا۔ اپن بولا کہ دارو پی کے کاہے کو بیٹھتا ہے ادھر۔" وہ بولا "...... خیر چھوڑو۔ یہ کیا لفڑا ہے؟"

میں نے ٹیکسی چلاتے ہوئے کہا "پہلے تم بتاؤ کہ تم سیدھے ہماری طرف آگئے تھے؟"

"بابا اپن ایک دم اُلو بھی نہیں ہے۔ جب ہم کو مالوم ہوا کہ تم بھاگ گیا ہے تو ہم سوچا اب ہم کدھر جاوے۔ پھر عقل ہم کو بولا کہ سالا تم ایک دم بُدھو۔ تم کاہے کو ادھر اُدھر جائے گا۔ وہ خود آجائے گا ٹیم پر لیکن چھپ کر آئے گا۔ اپن ابھی یہی دیکھتا پڑا تھا۔ پیچھے سے گزرا تو ایک ٹیکسی میں گھپلا تھا۔ ماف کرنا اپن سمجھا ایسا۔ ایک چھوکرا اور ایک چھوکری لوگ ادھر کیا کرتا پڑا ہے۔ یہ دیکھنے کا واسطے آیا تو تمہارا شکل دیکھا۔ تم ابھی ایک دم سردار لگتا ہے۔ کیا؟"

"اور یہ؟" میں نے نازو کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ سردارنی۔ سکھ کا بی بی" وہ بولا "ابھی ناراض نئیں ہوئیں گا۔ تمہارا بی بی لوگ کا بیوٹی ایک دم خطرناک ہے۔ کیا؟"

نازو کچھ شرمائی۔ میں نے کہا "خطرناک کیسے ہے؟"

"بابا جو ایک بار دیکھے گا دیکھتا رہ جائے گا۔ بھول نہیں سکتا۔ یہ خطرناک بات ہے کہ نہیں؟ اگر تم ہمارا بات مانے تو ہم بولے گا کہ اپنا بی بی کو اس سالا حرامی ستار چوہدری کا سامنے مت لے جاؤ۔"

میں نے کہا "یہ میرا بی بی لوگ نئیں ہے۔"

"اچھا! پھر کون ہے؟" محمد بھائی کان کھجا کے بولا۔

"اپنا یار کا بی بی ہے" میں نے بتایا "اپن اکیلا ہے۔"

"تمہارا ایک بھی نہیں ہے۔ آدھا بھی نہیں ہے۔ کیا؟"

میں نے ہنس کے کہا "ایک ہے تو سہی مگر وہ بہت دور ہے لاہور میں۔"

"ابھی یہ مرڈر کا کیا لفڑا ہے؟ تم کسی ہندو کو مارا۔"

میں نے اسے ساری بات بتائی۔ وہ بڑے غور سے سنتا "ابھی یہ ایک دم گھپلا ہے۔"

"کیسا گھپلا؟" میں نے کہا۔

"سازش۔ کوئی تم کو پھنسایا۔ پھانسنے کا کوشش کیا۔"

میں نے کہا "محمد بھائی' تم آدمی ذہین ہو۔ یہ خیال تو مجھے بھی آیا تھا مگر سوال یہ ہے کہ وہ کون ہو سکتا ہے؟"

"وہی سالا حرامی اے ڈی۔ اور کون۔ اپن شرط لگائے گا اپنا مونچھیں صاف کروے گا ایکدم....."

میں نے کہا "شک کی بنیاد پر اتنی بڑی شرط مت لگاؤ۔"

"اپن بتائے گا" وہ بولا "ابھی گاڑی ادھر روکو۔ ہمارا سا صرف تم جائے گا۔ کیا؟"

میں نے گاڑی روک دی اور نازو سے کہا "تم میری واپسی کا انتظار کرو۔"

"کتنی دیر تک؟"

"جب تک میں واپس نہ آؤں" میں نے کہا "یہ حکم ہے میرا۔"

نازو نے کہا "ایک گھنٹا۔ اس کے بعد ایسی کی تیسی تمہارے حکم کی۔"

"کیا کروگی آخر تم؟ ٹینک لے کر اندر گھس جاؤگی۔ عقل کی کوئی چیز اگر ہے تمہارے پاس تو وہ ٹینک سے زیادہ کار آمد ثابت ہو سکتی ہے۔ میں واپس کیوں نہیں آؤں گا آخر؟ محمد بھائی میرے ساتھ جا رہا ہے۔ یہ تو واپس آئے گا۔ کوئی ایسی ویسی بات ہو تو تمہیں بتادے گا۔"

"ایسا ویسا کوئی بات نہیں ہوگا" محمد بھائی نے اپنی مونچھوں کو بل دے کر کہا۔

"بہ فرض محال میں نہ آیا تو تم واپس چلی جاؤگی خاموشی سے ورنہ گل اور غالب کو کیسے پتا چلے گا کہ ہم پر کیا بیتی۔ اور سردار انہیں بند کرادیں گے ٹیکسی کی چوری کے الزام میں۔"

نازو نے سرہلایا اور کہا "اچھا۔ جاؤ۔ خدا حافظ۔"

میں اور محمد بھائی کچھ دور پیدل گئے۔ پھر ایک گیٹ کے سامنے محمد بھائی رک گیا۔ اس علاقے میں سب عالی شان کوٹھیاں تھیں جن کے ایسے ہی بھاری بھرکم مضبوط اور بارعب گیٹ تھے۔ ان پر لائٹس نصب تھیں اور چوکیدار اندر مورچہ بند بیٹھے تھے۔

محمد بھائی کی دستک پر چوکیدار نے گیٹ میں چھوٹی سی کھڑکی کا پٹ سرکا کے باہر دیکھا اور پھر بند کر دیا۔ چند منٹ انتظار کے بعد محمد بھائی نے گیٹ پر لات ماری۔ کھڑکی کے جو کھلنے میں

نظر آیا مگر اس بار بندوق کی نال کے پیچھے۔

"کیا بات ہے؟ تمہارا نظر اتنا کمزور ہے کہ تم کو محمد بھائی نظر نہ آیا؟ پھر یہ نوکری چھوڑو۔ بیٹھو سڑک پر اور بھیک مانگو۔ اللہ کا اندھا محتاج کو چار آنہ" محمد بھائی نے بندوق کی نالی کو حقارت سے دیکھ کر کہا۔

چوکیدار نے کہا "اندھا تم سالا۔ ہم کسی محمد بھائی کو نہیں جانتا۔"

"پھر جا کے اپنا باپ کو بولو۔ وہ جانتا ہے۔ اسی نے بلایا ہے ہم کو اس وقت۔" نہیں جائے گا تو ہم تمہارا بندوق کا نالی میں گھس جائے گا گولی کا مافک۔ اور تمہارا...... میں گھس جائے گا۔"

چوکیدار اپنی بندوق سمیت غائب ہو گیا۔ غالباً اس نے اپنے انٹرکام پر چوہدری سے رابطہ قائم کیا اور اجازت ملنے پر دروازہ کھول دیا۔

اس سے پہلے کہ محمد بھائی اسے قتل کرتا' چوکیدار نے اس سے ہاتھ ملا کے کہا "معاف کرنا محمد بھائی! ادھر جو آتا ہے ایسا مافک ہے۔"

"اور تم بعد میں ایسا مافک معافی مانگ کے جان بچاتا ہے۔ ہم بھی معاف کیا" محمد بھائی نے کہا "لیکن اپن ایک بات بولتا' کسی دن کوئی اُلٹا کھوپڑی والا آئے گا اور وہ تم کو ماف نئیں کرے گا۔"

چوکیدار نے دانت نکال کے کہا "ایک آیا تھا۔ چھ مہینے پہلے۔ قیامت کے انتظار میں لیٹا ہے کہیں۔ دنیا سے ایک دم غائب ہو گیا ہے۔ ابھی جاؤ۔"

میں نے محمد بھائی کو کھینچ لیا۔ محمد بھائی بہت بڑا بدمعاش تھا جسے اپنی طاقت پر ناز تھا مگر اس کے مقابل جو شخص تھا وہ جانتا تھا کہ بندوق کی گولی کے سامنے کوئی اُلٹی کھوپڑی والا بھی نہیں ٹھہر سکتا۔ اسے بات ناز تھا عبدالستار چوہدری کی طاقت پر اور اس اختیار پر جو اسے عبدالستار چوہدری نے بندوق کے ساتھ ہی دیا تھا۔ دبلا پتلا ہونے کے باوجود چوکیدار ہی زیادہ طاقت ور تھا کیوں کہ وہ اپنے ہاتھ میں قانون کی لگام رکھنے والے مالک کا غلام تھا۔

مفلسی' غربت' بے روزگاری' خانہ جنگی اور انتشار کی سیاست کے مارے ہوئے ننگے بھوکے عوام کا لیڈر جتنا بڑا تھا اتنی ہی بڑی کوٹھی میں رہتا تھا۔ اتنی ہی بڑی کار میں گھومتا تھا اور اتنی ہی بڑی دولت کا خزانہ رکھتا تھا۔ عبدالستار چوہدری کی وسیع و عالی شان کوٹھی کے احاطے میں اس وقت بھی درجن بھر کاریں کھڑی تھیں۔ ملاقاتی جمع تھے اور ملاقات کے خواہاں ضرورت مند اس کی نگاہِ التفات کے انتظار میں صبر کے ساتھ ذلت برداشت کر رہے تھے۔

میرا خیال تھا کہ اس ہجوم میں میری باری شاید صبح ہوتے ہی آئے گی۔ میں ایک ڈرائنگ روم میں بیٹھ گیا جہاں دیوار کے ساتھ لگے ہوئے صوفوں پر بہت سے اکڑی ہوئی گردنوں والے پہلے سے موجود تھے۔ انہوں نے مجھے بے نیازی اور ناپسندیدگی سے دیکھا مگر محمد بھائی کی مونچھوں کی دہشت کے باعث خاموش رہے۔ یہ خواص کی انتظار گاہ تھی۔ میں عوام جیسا لگتا تھا چناں چہ مجھے باہر برآمدے میں یا فرشِ خاک پر اپنی باری کا انتظار کرنا چاہئے تھا۔

بجّو جیسا ایک شخص سیکریٹری کے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ وہ قمیص پتلون میں تھا اور حد سے زیادہ مستعد نظر آنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ اس نے محمد بھائی سے مسکرا کے ہاتھ ملایا۔ بنگالی میں آہستہ آہستہ بات کی۔ مجھے غور سے دیکھا اور سرہلا کے اندر چلا گیا۔ میں اور محمد بھائی اس کے واپس نکل آنے کے بعد بھی خاموش بیٹھے رہے۔ حیرت انگیز طور پر تمام خاص مہمانوں کو آدھے گھنٹے میں فارغ کر دیا گیا۔ کوئی دو منٹ اندر ٹھہرا تو کوئی دس منٹ۔ میں اس دروازے کو کھلتا اور بند ہوتا دیکھتا رہا جس کے پیچھے شاندار قالین' آفس فرنیچر اور پردوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔

آخر کار بجّو سیکریٹری نے محمد بھائی کو اشارہ کیا اور ہم ایک ساتھ آگے بڑھے۔ ریوالور ابھی تک میری جیب میں تھا اور کسی نے چیک نہیں کیا تھا۔ میں دروازے سے گزرنے لگا تو اچانک ایک آلہ بیپ دینے لگا اور بجّو سیکریٹری نے دوڑ کر میرا راستہ روک لیا۔

"کیا ہے تمہارے پاس؟" اس نے اِدھر اُدھر ہاتھ مار کے کہا۔

میں نے کہا "تم کیا تلاش کر رہے ہو؟ کوئی توپ یا ٹینک۔"

"یہ میٹل ڈیٹیکٹر (METAL DETECTOR) پاگل نہیں ہے۔" اس نے بُرا سا منہ بنا کے کہا۔

عین اس وقت جب وہ کپڑوں کی نچلی تہ میں پوشیدہ ریوالور تک پہنچنے والا تھا محمد بھائی نے جیب سے خنجر نکالا "ابے یہ لے۔"

بجّو نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور میں اس موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تھوڑا سا آگے بڑھ گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس قسم کے الارم نظر نہ آنے والی شعاعوں کی مدد سے کام کرتے ہیں۔ یہ شعاعیں جسم سے تو گزر جاتی ہیں مگر درمیان میں دھات کی بنی ہوئی چیز آجائے تو روشنی کی یہ شعاعیں رک جاتی ہیں اور سرکٹ بریک ہو جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ٹی وی کے ریموٹ کنٹرول کسی چیز کے درمیان میں حائل ہونے سے کام نہیں کرتے۔

میں ان ناقابلِ دید شعاعوں کی زد سے نکل گیا تھا اور بجّو سیکریٹری ایک مہلک خنجر برآمد کرنے کے بعد مطمئن ہو گیا تھا کہ اس نے حفاظتی نظام کی اطلاع پر فرض شناسی کا بہترین مظاہرہ کیا۔

محمد بھائی اور بجّو کے درمیان کچھ تلخ کلامی بھی ہوئی مگر پھر اندر سے عبدالستار چوہدری نے انٹرکام پر کچھ کہا اور ہمیں فوراً شرفِ باریابی حاصل ہو گیا۔

عبدالستار چوہدری ادھیڑ عمر' انتہائی خرانٹ نظر آنے والا پُرفریب ظاہر و باطن کا مالک شخص تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی مگر آنکھیں دل کے کینہ کی چغلی کھاتی تھیں۔ ابن الوقت سیاست دانوں کی طرح اس نے بھی عجیب کی وضع قطع بنالی

تھی۔ اس کے پیچھے سنہرے فریم میں مجیب کی قدِ آدم تصویر آویزاں تھی اور میز پر عوامی لیگ کا جھنڈا تھا۔

مجھ سے ہاتھ ملانے کا احسان کرتے ہی وہ بولا "تمہارا دوست گم ہوا ہے۔ کیا تمہیں معلوم ہے وہ ملٹری انٹیلی جنس کی تحویل میں ہے؟"

میں نے کہا "مجھے معلوم ہے۔"

اس نے ہاتھ باندھ کر ٹہلنا شروع کیا "پھر تو تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ اس کو کس الزام میں پکڑا گیا ہے؟"

میں نے کہا "معلوم ہے۔ اس کا جرم یہ ہے کہ وہ پاکستانی ہے۔"

عبدالستار چوہدری ایک جھٹکے سے مُڑا اور غصے سے بولا۔ "پاکستانی تم بھی ہو۔ پھر تو تم بھی مجرم ہوئے۔ کیا میں تمہیں بھی ملٹری کے حوالے کردوں؟"

"اگر تم سمجھتے ہو کہ......"

اب محمد بھائی نے فوراً مداخلت کی "ابھی کام کا بات کرو نا چوہدری صاحب سے۔ کاہے کو فالتو بک بک کرتا ہے۔"

میں نے کہا "چوہدری صاحب کل تک آپ بھی پاکستانی تھے۔ آج اگر آپ نے اپنی قومیت بدل لی ہے تو کیا ہوا، آپ کا تشخص تو نہیں بدلا۔ آپ کل بھی مسلمان تھے، آج بھی ہیں الحمدُللہ۔ اور مرتے دم تک رہیں گے میری طرح۔ بالکل اسی طرح جیسے ہندوستان کی آزادی کے وقت میں ہندوستانی تھا۔ چودہ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستانی ہوگیا مگر میرے اور آپ کے درمیان ملی رشتہ وہی ہے......"

چوہدری چلتے چلتے رک گیا "اچھا۔ بس کرو یہ بھاشن۔ میرے پاس فضول باتیں سننے کے لئے وقت نہیں ہے۔"

میں نے کہا "وقت نہیں ہے یا حوصلہ نہیں ہے سچ سننے کا؟ آپ ہمیشہ کہتے ہیں بلکہ فرماتے ہیں لوگ سنتے ہیں اور پھر تعریف کرتے ہیں۔ ایک بڑے سیاست داں میں یہ خوبی سونے پہ سہاگا ہوتی ہے کہ وہ۔ خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے۔"

خلافِ توقع چوہدری مشتعل نہیں ہوا۔ اس نے کہا "بیٹھ جاؤ۔"

میں بیٹھ گیا "میرا تو خیال تھا کہ اب آپ مجھے مرغا بننے کو کہیں گے۔"

"تم نے ابھی ایک شعر پڑھا تھا۔ اقبال کا تھا نا؟"

میں نے کہا "مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ ہمارے قومی شاعر کو جانتے ہیں۔"

"وہ تمہارا قومی شاعر ہے" چوہدری پھر اپنی وسیع گھومنے والی کرسی پر میز کے دوسری طرف بیٹھ گیا "ہمارا قومی شاعر ٹیگور ہے۔"

"ویسے شاعر کسی قوم کی ملکیت نہیں ہوتا۔ انسانیت کا ورثہ ہوتا ہے۔"

"تم نے ٹیگور کو پڑھا ہے؟"

میں نے شرمندہ ہو کے کہا "میری بدقسمتی اور جہالت ہے میں نے "گیتا نجلی" بھی نہیں پڑھی جس پر ادب کا نوبل پرائز ملا تھا۔"

"تمہارے قومی شاعر کو صرف انگریزوں سے سر کا خطاب ملا تھا" چوہدری نے طنز سے کہا "تمہارے سب قومی لیڈر انگریز کے پٹھو تھے، اسی لئے سر کا خطاب دیا گیا تھا انہیں۔"

میں نے برہمی سے کہا "وہ خطاب انہوں نے جوتے کی طرح کھینچ مارا تھا انہی انگریزوں کے منہ پر۔ اس وقت وہ تمہارے بھی لیڈر تھے۔ تم نے بھی قائداعظم زندہ باد۔ بن کے رہے گا پاکستان کے نعرے لگائے ہوں گے اور پاکستان کے حصول کی جدوجہد میں اسی طرح بڑھ چڑھ کے حصہ لیا ہوگا جیسے آج پاکستان کو توڑنے اور بنگلہ دیش بنانے میں لیا ہے۔"

"بکواس بند کرو" چوہدری نے میز پر مُکا مارا "تم جانتے ہو میرے ایک اشارے پر......"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "میں اندر ہو سکتا ہوں۔ مجھے گولی مار کے ہزاروں لاکھوں شہیدوں کی طرح گمنام قبر میں دبایا جاسکتا ہے مگر کیا سچ کو دبایا جاسکتا ہے چوہدری صاحب؟"

اب محمد بھائی کی قوتِ برداشت پھر جواب دے گئی "سالا تو بک بک کرتا پڑا ہے۔ اپن کو مالوم ہوتا تم ایک دم پاگل ہے تو چوہدری صاب کا سامنے ہاتھ باندھ کے تیرا جان بخشی نہ کراتا۔ اپن آج تک اپنا واسطے ہاتھ نہیں جوڑا۔ پر تیرا واسطے یہ بھی کیا۔ تو اپنا خیال کر۔"

میں نے محمد بھائی کی طرف دیکھا۔ وہ سخت غصے میں تھا۔ اچانک میں اس کے بارِ احسان سے دب گیا۔ اگر واقعی اس نے میری خاطر اپنی خودداری اور انا کو بالائے طاق رکھتے ہوئے چوہدری کے سامنے میری جان بخشی کی خاطر دست بستہ درخواست کی تھی تو یہ احسان مجھ پر کیا تھا۔ چوہدری کمینہ آدمی تھا مگر وہ ایک کمینے کے سامنے بھی جھک گیا تھا۔ شاید میں ایسا نہ کرپاتا کہ کسی اور کے سامنے سر جھکا دوں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ رحمان نہیں شیطان ہے۔ جب جھکا تو غیر کے آگے نہ تن تیرا نہ من۔ مگر اس نے اپنا من قربان کیا تھا اور میں اس کی قربانی کو ضائع کرکے اسے ندامت کے احساس میں مبتلا کر رہا تھا۔

میں نے کہا "میں معافی چاہتا ہوں چوہدری صاحب۔"

چوہدری مسکرایا "معاف تو پہلے ہی کر چکا تھا میں محمد بھائی کے کہنے پر۔ ورنہ تم اس کمرے میں قدم نہ رکھ پاتے۔ گیٹ پر تمہارا استقبال کرنے والے موجود ہوتے جو تمہیں محسن سے ملوا دیتے۔"

میں خاموش رہا کیوں کہ محمد بھائی میری طرف ملتجی نظروں سے دیکھتے ہوئے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کررہا تھا۔

چوہدری نے کہا "تم صرف اپنے دوست کی رہائی کے

لئے ڈھاکا آئے تھے؟"

"یہی سمجھ لیں۔"

"سمجھتا میں سب ہوں، وہ بھی جو تم سمجھتے ہو کہ مجھے معلوم نہیں۔ میرے پاس ایک ایک رپورٹ ہے" چوہدری نے ایک دراز کھولی اور اس میں سے ایک فائل نکال کے میری طرف بڑھا دی "یہ دیکھو۔"

میں نے فائل لے کر سرسری طور پر ورق گردانی کی۔ اس میں ہماری ہر فردِ جرم کی نقل تھی۔ ہم نے کب کیا کیا تھا۔ ہمارے خلاف کیا الزامات تھے۔ کتنے مقدمات زیرِ سماعت تھے۔ پاکستان سے بھارت کے راستے میں ہم نے کتنے معرکے سر کئے تھے۔ ان کی تفصیلات جن اخبارات میں شائع ہوئی تھیں اور جن میں ہماری تصاویر شائع ہوئی تھیں۔ وہ سب ایک جگہ موجود تھی۔

میں نے فائل لوٹاتے ہوئے کہا "آپ نے یقیناً کافی محنت کی ہوگی۔"

"میں نے؟" وہ طنز سے بولا "اصل محنت تو تمہاری ہے کہ تم نے اس فائل کے لئے مواد فراہم کیا۔ رپورٹیں مجھے پولیس اور دیگر خفیہ اداروں نے فراہم کی ہیں۔"

"میں سمجھا تھا آپ ایم آر ایس پر کوئی تھیسس لکھ رہے ہیں یا آپ نے شوقیہ یہ سب جمع کیا ہے" میں نے بھی طنز کیا۔

چوہدری بولا "یہ فائل چند گھنٹوں میں تیار کرکے بھجوائی گئی ہے مجھے مسٹر سکندر بخت عرف کبیر خان۔ تم سمجھتے ہو کہ تمہاری پوزیشن کتنی نازک ہے، تم کتنے مجبور ہو......"

"میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ آپ کیوں مجبور ہیں۔ آپ میں انسانیت کی تھوڑی سی رمق باقی ہے جس کی وجہ سے آپ نے محمد بھائی جیسے ہسٹری شیٹر کی بات مانی۔ آپ نیکی، عدل و احسان کا مطلب ضرور سمجھتے ہیں چناں چہ میرا خیال ہے کہ آپ اس فائل کو اپنے مہمان کے خلاف استعمال نہیں کریں گے۔ لیکن میری توقعات کے برعکس آپ نے محمد بھائی سے جھوٹ بول کے مجھے یہاں بلوایا ہے اور آپ کا وعدہ محض ایک جال تھا تو آپ ایک کامیاب شکاری ہیں چوہدری صاحب۔ اپنے چوہدری دلاور کی طرح۔"

چوہدری کا چہرہ غصے میں سرخ پڑ گیا تھا مگر نہ جانے کیوں اس نے ضبط سے کام لیا۔ میز کی دراز سے ایک گولی نکال کے پانی کے ساتھ نگل کر وہ کچھ دیر خاموش بیٹھا مجھے گھورتا رہا۔ غالباً وہ ہائی بلڈ پریشر یا انجائنا کا مریض تھا۔ بالواسطہ طور پر میں نے اسے احساس دلا دیا تھا کہ میں بھی بہت کچھ جانتا ہوں اور مجھے معلوم ہے کہ محمد بھائی نے اس کے ساتھ کیا نیکی کی تھی۔

اس نے فائل واپس میز کی دراز میں ڈال دی "تم نے ٹھیک کہا ہے میں اس فائل کو تمہارے خلاف استعمال نہیں کروں گا۔ بشرطیکہ تم خود کو میرے حوالے کردو۔"

میں ذرا سی دیر کے لئے گڑبڑا گیا "آپ کے حوالے...... میں سمجھا نہیں، میں آپ کے سامنے موجود ہوں۔"

اس نے گھنٹی بجائی۔ بجو ٹائپ سیکریٹری ایسے اندر آیا جیسے کسی نے اسے لات مار کے اندر کیا ہو "سر؟"

"آئی وانٹ اے ڈرنک اور ان کے لئے بھی۔"

میں نے کہا "مجھے معاف رکھیں۔"

"ان کے لئے چائے لاؤ" وہ فوراً سمجھ گیا "تم کو پتا ہے میں نے آج کچھ نہیں کھایا۔"

"یس سر۔"

"یس سر کے بچے، یہ خیال رکھنا تمہارا کام ہے۔ گھر میں جو کام بیوی کا ہے وہی یہاں تمہارے فرائض میں شامل ہے۔ سوائے بچے پیدا کرنے کے۔ اب جاؤ۔ میری بیوی جیسی شکل مت بناؤ۔"

بجو سر جھکا کے باہر نکل گیا۔ چوہدری ہنسا۔

محمد بھائی خوشامدانہ انداز میں مسکرایا "بہت کام کرتا ہے آپ چوہدری صاحب۔ سیاست میں بڑا لفڑا ہے۔"

چوہدری نے ایک آہ بھری "ہاں محمد بھائی۔ خدمت خلق ہے یہ بلکہ بیگار ہے۔ خدمتِ خلق میں آدمی اپنی مرضی سے کھانے سونے کے لئے وقت تو نکال سکتا ہے، یہاں تو دن رات وہی ایک چکر ہے۔ لوگوں کے مسائل حل کرتے رہو۔ جس کا جب دل چاہے گا آجائے گا اور جس کا بھی کام نہ ہوا وہی گالیاں دے گا۔"

میں بہت کچھ کہہ سکتا تھا مگر مصلحت آڑے آئی اور میں نے خاموشی اختیار کی۔ میں کہہ سکتا تھا کہ چوہدری صاحب، یہ خدمتِ خلق نہیں، پیشہ ہے آپ کا اور اس پیشے کو برصغیر میں سب سے زیادہ منافع بخش کاروبار سمجھا جاتا ہے۔ یہ کوٹھی، کار، اختیار سب اسی کے طفیل ہیں۔ ذرا یہ حساب بھی تو لگایئے کہ روٹ پرمٹ، امپورٹ ایکسپورٹ لائسنس، الاٹمنٹ آرڈرز، سفارش، تقرر ناموں اور غیر قانونی کام کرانے کا آپ نے عوام سے کیا معاوضہ لیا۔ کتنے مخالفین کا جینا عذاب کیا۔ کتنوں کو جیلوں میں ڈلوانے کے لئے ان پر جھوٹے مقدمات بنائے۔ کتنوں کو مروا دیا۔ کس کس کی بہو بیٹی کو اٹھوایا۔

بجو سیکریٹری ایک ٹرے میں وسکی سوڈا اور شغل مے نوشی کے دیگر لوازمات لے کر اندر آیا اور میز پر رکھ کے لوٹ گیا۔ چوہدری صاحب نے ایک جام اپنے لئے بنایا اور دوسرا محمد بھائی کے لئے۔ مجھے بڑی حیرانی ہوئی جب اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا "ابھی چوہدری صاحب، اپن کو معاف کرو۔"

چوہدری ہنسا "اچھا؟ تم بھی پارسا ہو۔ بہت خوب۔ دنیا کی ہسٹری شیٹ میں خواہ کچھ بھی لکھا جائے، نامۂ اعمال جو آخرت کے لئے ہے صاف رہے۔"

"اپن بہت گنہگار آدمی ہے سر۔ سارا گناہ کیا، بس ایک گناہ سے بچ گیا۔ پتا نہیں کیسے بچ گیا۔ ابھی بچا رہے تو اچھا ہے" محمد بھائی نے کچھ خود ملامتی کے انداز میں کہا۔

"تو میں کہہ رہا تھا کہ سب کچھ ویسا ہی ہوگا جیسا تم چاہتے ہو۔ تم کو محسن مل جائے گا۔ تمہارے سب ساتھی خیروعافیت کے ساتھ یوں واپس پہنچ جائیں گے" اس نے چٹکی بجائی "رابعہ سمیت۔"

میں اچھل پڑا "رابعہ...... وہ۔"

"وہ بھی ادھر ہی ہے۔ تم کو نہیں معلوم" چوہدری نے دوسرا جام بھرا "اور میں تم سے جھوٹ نہیں بول رہا ہوں، نہ یہ بات نشے میں کہہ رہا ہوں۔"

میں اب ابتدائی شاک سے سنبھل گیا تھا "آپ بقائمی ہوش و حواس مجھے بلیک میل کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں چوہدری صاحب اور وہ بھی جھوٹ بھول کر......"

"تمہارا کیا خیال ہے رابعہ کہاں ہے؟"

"جہاں اسے ہونا چاہئے" میں نے کہا۔

"نہیں۔ رابعہ وہاں ہے، جہاں اسے نہیں ہونا چاہئے۔"

میرا غصہ برداشت کی آخری حد کو چھونے لگا "چوہدری! ایسا نہ ہو کہ تمہارے مرتبے اور اپنی عاقبت کا خیال کئے بغیر میں کچھ کر بیٹھوں۔"

وہ قہقہہ مار کے ہنس پڑا "تم کیا کرو گے؟ تم اور تمہاری ایم آر ایس سب ایک خود فریبی کے خیال کا شکار ہو۔ کہ تم آزاد ہو اور کہیں بھی آجا سکتے ہو۔ اور میں نے تمہیں بات کرنے کے لئے بلایا ہے، لڑنے کے لئے نہیں۔ اس لئے تم طیش میں کچھ بھی کہو، میں برا نہیں مانوں گا۔"

بجو دوبارہ آیا اور میرے سامنے چائے رکھ کے لوٹ گیا۔

محمد بھائی نے کہا "چائے پیو اپنا سکندر بادشاہ۔ تم اپن کا ساتھ آیا ہے، پھر فکر کا کیا بات ہے۔"

چوہدری نے ترنگ میں کہا "سکندر اعظم ثانی! اے ڈی بہت اچھا آدمی ہے۔ تمہارا ہم وطن ہے۔"

میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ چوہدری کے لہجے اور اس کی معنی خیز مسکراہٹ نے مجھے سب سمجھا دیا "وہ... اس حرام زادے نے سب اطلاعات فراہم کی ہیں تمہیں۔ وہ مارِ آستین......"

"وہ پولیس والا ہے۔ جو کسی کا دوست نہیں ہوتا ہمارے ملک میں۔ سوائے پیسے کے۔ دو لڑکیاں بھی ہیں وہاں۔ نور اور حور۔ وہ بہت کام کرتی ہیں۔"

غصے اور صدمے سے میرا برا حال ہوگیا۔ کیسا جھوٹ بولا تھا اس نے مجھ سے ان لڑکیوں کے بارے میں۔ یہ بے غیرتی اور بے ضمیری کی انتہا تھی۔ اس نے مجھے ایسی کہانی سنائی تھی کہ میں جذباتی ہوگیا تھا۔ اب مجھے کوئی شک نہ رہا کہ لالہ جی کو ہوٹل میں لانے والا اے ڈی تھا تو اس کے پیچھے کسی قاتل کو لگانے والا بھی وہی تھا۔

"اگر تم خود نہ آتے تو اے ڈی تمہیں لے آتا۔ اس نے کہا کہ وہ تو خود ہی آرہا ہے محمد بھائی کے ساتھ" چوہدری نے کہا۔

محمد بھائی کا چہرہ تاریک ہوگیا "چوہدری! ابھی اپن کے ساتھ بھی دغا مت کرنا۔ یہ اپنا یار ہے۔ اس کو کچھ نہیں ہو گا میں جب تک محمد بھائی زندہ ہے۔"

"ارے نہیں محمد بھائی۔ کیسی باتیں کرتے ہو" چوہدری... "تم سے میں نے جو وعدہ کیا تھا وہ اپنی جگہ۔ لیکن تمہارے دوست مزاج بہت گرم ہے۔ یہ سچ کو بھی سچ نہیں مانتا۔ میں اسے بتا رہا ہوں کہ رابعہ یہاں ہے تو یہ گڑگڑ کرتا ہے حقے کی طرح۔ خود کو سمجھتا ہے آتش فشاں۔"

میں نے کہا "کیا ثبوت ہے تمہارے پاس کہ رابعہ یہاں ہے۔"

"ہاں یہ ہوئی نا ڈھنگ کی بات" وہ بولا اور ایک فون کا ریسیور اٹھا کے سیکریٹری سے بات کرنے لگا "ذرا مس رابعہ قاری سے بات کراؤ۔"

ایک لمحے کے لئے مجھے اپنے ذہنی توازن کے بگڑ جانے کا اندیشہ لاحق ہوا، پھر میں نے خود کو سنبھال لیا۔ یہ جھوٹ ہے، ڈراما ہے۔ ناممکن بات ہے کہ رابعہ یہاں ہو اور مجھے معلوم نہ ہو۔ بے شک عرصہ دراز سے میرا اس کا رابطہ نہیں مگر......

"یہ لو سکندر اعظم ثانی! بات کرو" اس نے لائن کا سگنل ملتے ہی ریسیور اٹھا کے مجھے تھما دیا۔

میرا ہاتھ کانپنے لگا اور دل کی دھڑکن بے قابو ہونے لگی۔ یقین کا مضبوط حصار یوں بکھرنے لگا جیسے ریت کی دیوار۔ میرا... سراب کی طرح تحلیل ہونے لگا۔ نہیں۔ چوہدری اتنے اعتماد کے ساتھ مجھے ریسیور نہ تھماتا اگر اس کی بات جھوٹ ہوتی۔

بڑی مشکل سے میں نے کہا "ہیلو۔"

دوسری طرف سے رابعہ نے کہا "ہیلو۔ کون...... س..."

میں نے بولنے کی کوشش کی مگر آواز میرے حلق میں پھنس... اور میرا دل میرے سینے میں مرغ بسمل کی طرح تڑپنے لگا۔ سردی کے باوجود میرا جسم پسینے میں ڈوب گیا اور میں نے سخت کمزوری محسوس کی۔

رابعہ نے چلا کے کہا "بولتے کیوں نہیں! کون ہو تم اگر... نہیں ہو! تمہاری آواز اتنی ملتی کیوں ہے سکندر سے؟"

میں نے لمبے لمبے سانس لے کر کہا "رابعہ... تم رابعہ ہو... کہاں ہو تم......؟"

"میں؟ مجھ سے پوچھتے ہو؟" وہ چلاتی رہی "مجھے بلا کے... غائب ہو۔ کتنی مشکل سے پہنچی ہوں میں ڈھاکا۔"

میں نے کہا "رابعہ... میری بات سنو۔ خدا کی قسم میں نے تمہیں نہیں بلایا تھا۔ مگر خیر، تم آگئی ہو تو یہ بتاؤ کہ کہاں ہو... کوئی پریشانی تو نہیں ہے...... کسی نے کوئی زیادتی تو نہیں کی تمہارے ساتھ۔"

ایک دم لائن کٹ گئی۔ بالکل صحیح وقت پر لائن کاٹ دی گئی۔ سیکریٹری نے اپنے آقا کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے مناسب لمحے کو میرے اور رابعہ کے درمیان دوری کی دیوار بنا کے کھڑا کر دیا اور رابعہ جو چند منٹ پہلے میرے تصور میں ہزاروں میل دور تھی، میرے قریب آکے میرے احساس کی گرفت سے نکل گئی۔

میں نے کریڈل کو زور زور سے ہلایا "ہیلو۔ رابعہ۔ ہیلو۔" اور ریسیور کراس پر دھڑ سے دے مارا۔ کریڈل ٹوٹ گیا اور ریسیور لٹکنے لگا۔

چوہدری نے ایک اور جام کو حلق میں انڈیلا "میں بتا سکتا ہوں کہ رابعہ آرام سے ہے اور اس کے ساتھ کسی قسم کی کوئی زیادتی نہیں ہوئی۔"

"سنو چوہدری!" میں نے اس کی منت کرتے ہوئے کہا "صرف ایک بار اور میری بات کرادو اس سے۔ پانچ منٹ۔"

چوہدری نے نفی میں سر ہلایا۔

"اچھا چار منٹ...... تین منٹ...... دو منٹ...."

"اوکے۔ دو منٹ" چوہدری بولا "مگر تم اس سے صرف محسن کے بارے میں پوچھو گے۔ اور کچھ نہیں۔ اس شرط پر بات کر سکتے ہو۔"

میں نے لجاجت سے کہا "مجھے منظور ہے۔"

یکلخت میں ایک مختلف آدمی بن گیا تھا۔ میری خودی اور خودداری۔ احساسِ عزتِ نفس۔ غیرت و حمیت۔ آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی۔ سب ختم ہوگئے تھے۔ یہ عجیب کایا کلپ تھی جیسے کوئی آگ کو برف میں بدل دے۔ چاند کو پھونک مار کے گل کر دے۔ صحنِ گلشن میں کھلے پھولوں کو کاغذی پھولوں میں بدل دے۔ میری عقل مفلوج ہی نہیں بے وجود ہوگئی تھی۔

دوسرے فون پر لائن پھر ملی۔ رابعہ نے کہا "اب کہاں سے بول رہے ہو؟ فون کرنا ضروری تھا، آ نہیں سکتے تھے۔"

میں نے کہا "رابعہ! محسن کہاں ہے؟"

"میرے ساتھ ہے۔ دوسرے کمرے میں۔"

"تمہارے ساتھ؟ رابعہ، میں پاگل ہو جاؤں گا۔ وہ تمہارے پاس ہے اور مجھے خبر نہیں۔ کیسا ہے وہ؟"

"ٹھیک ہے۔ شملا کو یاد کرتا ہے مگر وہ ایک فطری بات ہے۔ سب کی راہ دیکھتا رہتا ہے۔ راتوں کو سوتا نہیں، انتظار کرتا ہے ...کا۔ نیند کی گولیاں دینی پڑتی ہیں...."

لائن پھر کٹ گئی۔ میں نے آرام سے ریسیور رکھا اور دیوار کو گھورنے لگا۔ یہ ڈراما نہیں ہو سکتا تھا۔ کوئی عورت مجھے رابعہ کی آواز بنا کے دھوکا نہیں دے سکتی تھی۔ کوئی رابعہ کو مجبور نہیں کر سکتا تھا کہ وہ محسن کے بارے میں جھوٹ بولے۔

چوہدری نے کہا "تمہارے سب دوست محفوظ ہیں اور محفوظ رہیں گے۔ محسن اور غالب، باہر جو لڑکی ٹیکسی میں بیٹھی تمہاری واپسی کا انتظار کر رہی ہے۔ غالب کی محبوبہ نازو۔ اور گل بانو۔ یہ سب واپس چلے جائیں گے۔ میں انہیں نیپال کے راستے ہوائی جہاز سے کراچی پہنچا دوں گا۔ سب انتظام میرا۔"

میں نے اسے خالی خالی نظروں سے دیکھا "اب اپنی شرائط بتاؤ۔"

"وہ میں بتا چکا ہوں۔ خود کو میری تحویل میں دے دو۔ ان سب کی خاطر جو تمہیں اتنے عزیز ہیں، تم یہ قربانی دے سکتے ہو....."

میں نے ایک لمبی گہری سانس لی "چوہدری صاحب! کھل کر بات کریں تاکہ مجھے سمجھنے میں آسانی ہو۔"

"میری ایک لڑکی ہے۔ دماغ خراب ہے اس کا۔ کئی ڈاکٹروں، حکیموں، ویدوں کو دکھایا۔ پیروں فقیروں سے تعویذ لئے۔ بہت خوب صورت لڑکی ہے۔ دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ پاگل ہے۔ ایک باپ کی حیثیت سے مجھے یہ کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ مگر کیا کروں، اکلوتی اولاد ہے۔ وہ تم پر مرتی ہے۔ میرا جو کچھ ہے اسی کا ہے۔ تم اس سے شادی کرلو۔ اور یہیں رہو میرے پاس"

اس وقت جیسا کہ ہونا چاہئے تھا، میرے دماغ کا فیوز بھک سے اڑ گیا۔ میں نے چیخ کر چوہدری کو گالی دی اور جیب سے ریوالور نکال کے کھڑا ہوگیا۔

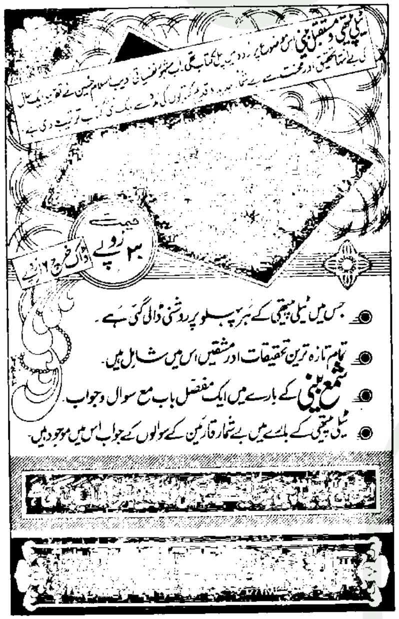

عبدالستار چوہدری ذرا بھی خوف زدہ نہیں ہوا۔ وہ حیران و پریشان بھی نہیں ہوا۔ ہر کامیاب سیاست داں کی طرح وہ ایک کامیاب اداکار بھی تھا اور مشکل صورت حال میں آسان راستہ اختیار کرنے کا فن جانتا تھا۔

"یہ ریوالور اصلی ہے؟" اس نے میرا تمسخر اڑانے کے انداز میں کہا "اصلی ہی ہوگا۔ دراصل مجھے ان ہتھیاروں کی پہچان نہیں ہے۔"

"ہاں۔ تمہارے ہتھیار دوسرے ہیں۔ جن سے تم قتل بھی کرتے ہو تو پتا نہیں ہوتا۔ تمہارے ہاتھ صاف رہتے ہیں اور تمہارے دامن پر کوئی داغ نہیں آتا" میں نے پُرسکون رہتے ہوئے کہا "تم' لوگوں کے جذبات میں آگ لگا کے انہیں لڑاتے ہو اور فتنہ و فساد کے بعد لواحقین کو صبرِ جمیل کی تلقین کرنے کے لئے ان کے گھر جاتے ہو تو اخباروں میں تصویر کی اشاعت کا پہلے بندوبست کرتے ہو۔ تم ہی دستِ قاتل میں خنجر تھماتے ہو اور تم ہی فریادی بھی بن جاتے ہو۔ تم بلیک میلنگ کرتے ہو۔ ووٹ لینے کے لئے خوب صورت وعدوں کے پُرفریب جال بچھاتے ہو اور اس کے بعد!!"

عبدالستار چوہدری نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ تالی بجائی' "واہ۔ کیا تقریر ہے۔ کیا فصاحت کا دریا ہے اور بلاغت کا سمندر ہے۔ تم میرے مشیرِ خاص بن سکتے ہو۔ پی آر او اچھا نہیں ہے آج کل میرے پاس......"

"تمہارے پاس تو ایک پاگل بیٹی کے لئے خصم تک نہیں ہے' ضمیر نہیں ہے اور سکون نہیں ہے کیوں کہ دنیا و عاقبت میں تمہارے لئے صرف روپیہ ہی ہے......"

"بند کرو اپنی بکواس کُتے" ستار چوہدری ایک دم کسی بم کی طرح پھٹ گیا اور اس نے خالی جام میرے منہ پر کھینچ مارا "بہت بھونک چکے تم......"

میں نے اطمینان سے اپنے سر کو بچالیا "اپنی دخترِ نیک اختر کی شادی خانہ آبادی تم کس کُتے سے کروگے عبدالستار چوہدری؟ بھونکنے والے کُتے سے یا کاٹنے والے کُتے سے؟ کیسی زبردست تصویر آئے گی اخبار میں کہ تم اپنے ڈوبرمن یا بل ٹیریر داماد کے پٹے کی زنجیر تھامے اپنی پاگل بیٹی کے ساتھ کھڑے ہو اور اپنے مستقبل کے پوتوں کی تصویر تمہاری آنکھوں میں نظر آرہی ہے۔ چھوٹے چھوٹے پلّے۔"

میری توقع کے عین مطابق عبدالستار چوہدری چیخنے لگا۔ اس پر نشے میں دیوانگی کا دورہ پڑ گیا تھا۔ وہ فحش گالیاں بکتے ہوئے اپنے سیکریٹری کو پکار رہا تھا۔ محمد بھائی کی حالت غیر تھی۔ وہ کبھی مجھ سے خاموش ہونے کی التجا کرتا تھا تو کبھی چوہدری سے مگر اس کی سننے والا کوئی نہ تھا۔ اس نے میرے ہاتھ سے ریوالور لینے کی کوشش بھی کی مگر میں نے اسے دوسرے ہاتھ سے دور دھکیل دیا۔

"سکندر! یہ کیا کر رہا ہے تم! چریا ہوگیا ہے سالا...."

میں نے کہا "میں تو ہوں ہی پاگل۔ مجھے سیانا سمجھنے والے غلط فہمی میں مارے جاتے ہیں محمد بھائی۔ میں سیانا ہوتا تو اتنی اچھی پیشکش کو قبول نہ کرلیتا۔ اتنے بڑے آدمی کا داماد اور اس کا وارث بن کے میں کتنے فائدے میں رہتا۔ رابعہ کا کیا ہے' جیسی ایک عورت ویسی دوسری۔ جسم تو ایک پاگل عورت کا بھی وہی ہوتا ہے اور سچ پوچھو تو کیا رابعہ پاگل نہیں ہے۔ ہم سب خطرناک پاگل ہیں یا محمد بھائی جو نفع چھوڑ کے نقصان قبول کرتے ہیں' کسی پچھتاوے کے بغیر......"

بجّو ایک دم اندر آیا۔ اس کے ساتھ دو مسلح افراد تھے جن کے ہاتھوں میں اتنے ہی خطرناک ہتھیار تھے جتنے خطرناک ان کے ارادے۔

چوہدری نے بجّو کو ایک سو ایک فحش ترین خطابات سے نوازا' "کہاں مر گیا تھا...... اتنی دیر میں تو جنازہ اٹھ جاتا میرا..... اور آخر یہ ریوالور لے کر اندر کیسے آگیا؟ تو کیا اپنی ماں......"

"میں نے دیکھا تھا سر...." بجّو کی آواز میں رقت پیدا ہوگئی۔

"دیکھا تھا...... مشین کس لئے لگی ہے باہر...... کیا مشین خراب تھی؟"

"مشین تو ٹھیک تھی سر...." بجّو نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کے مجھے خون آشام نظروں سے گھورا۔

"نکل جا.... اسی وقت...... دفع ہوجا...... کی اولاد...... اتنا ہی کافی ہے کہ تیری لاش......"

بجّو دھاڑیں مار مار کے رونے لگا "سر! غلطی معاف کریں..... ایک موقع دیں مجھے۔ میں کہاں جاؤں گا؟"

چوہدری مسلح افراد کی طرف متوجہ ہوگیا "تم کیا دیکھ رہے ہو؟ کس بات کا انتظار ہے تمہیں؟ حرام کی کھاتے ہو اور کام کا وقت آتا ہے تو حرامی ہونے کا ثبوت دیتے ہو۔ پکڑلو اس کُتے کو۔"

"چوہدری صاحب! اپنی پاگل بیٹی کے لئے آپ گلی کا کُتا پکڑ کر منگوالیں۔ اچھی نسل کا کتا تو شاید اسے قبول نہ کرے..." میں نے کہا۔

"گولی ماردو اسے" چوہدری نے چیخ کر کہا۔

مجھے معلوم تھا کہ ایسی دھماکا خیز صورتِ حال میں میری شرر فشانی کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ اپنی بات مکمل کرتے ہی میں غوطہ مار کر چوہدری کی میز کے نیچے گھس گیا۔ گولیوں کی ایک بوچھاڑ میرے سر کے اوپر سے گزری اور میں نے شیشے بکھرنے کا چھناکا سنا۔ گولیاں دیوار میں پیوست نہیں ہوئی تھیں وہ کھڑکیوں کے شیشوں کو توڑتی ہوئی نکل گئی تھیں۔

میں ایک لمحے کے دوسرے نصف حصے میں میز کی دوسری جانب طلوع ہوا تو نقشہ بدل چکا تھا بلکہ محاورے کے مطابق بھی الٹ چکی تھی۔ میں نے چوہدری کے پاؤں پکڑ کے کھینچ لئے اور وہ

...کے بل گرا۔ میری لات لگنے سے میز الٹ گئی۔

...چوہدری کی پشت پر بیٹھ کے میں نے ریوالور اس کی گُدی پر رکھ... مسکرانے لگا "سیکریٹری! ہماری تصویر بناؤ۔ ہم نے ایک ... اور ... کو شکار کیا ہے۔ اس نے دھوکے' منافقت' جھوٹ اور ... سے اپنے حلقے میں کامیابی حاصل کی ہوگی اور کسی بہت ... حریف کو ہرایا ہوگا۔ آج یہ خود ہار گیا۔ اپنی زندگی تک ہار ...یا۔"

بجّو کا منہ کھلا ہوا تھا اور دونوں محافظ ہکّا بکّا کھڑے تھے۔ ...دری چلّا رہا تھا مگر اس کی مدد کے لئے آگے بڑھ کے کچھ کرنے کی ...ت کسی میں نہیں تھی۔

...چوہدری کو اب بھی یقین تھا کہ اس کے مسلح محافظوں کی ...ت کے سامنے میری حیثیت اتنی بھی نہیں جتنی شیر کے مقابلے ...بلی کی ہوسکتی ہے مگر دیکھنے والے اس کی زندگی اور موت کے ...میان بال برابر فرق دیکھ رہے تھے اور یہ بال بھی صرف چوہدری ...کی گُدی پر تھے۔ باقی سر میں تو پینسل سے نشان لگا کر سوراخ کیا جا ...سکتا تھا۔

محمد بھائی الگ چلّا رہا تھا "سکندر! چھوڑ دے اس کو سالا ...۔ خود بھی مرے گا اپن کو بھی مروائے گا۔"

"دوستی میں جان دینے سے ڈرتے ہو محمد بھائی......"

"سکندر، دیکھ گولی مت مارنا اس کو۔ اپن کا لاش بھی باہر نہیں ...یں گا۔ اپن ادھر سے نہیں نکل سکتا سکندر۔ اس گھر میں اپنا قبر ...نہیں ملے گا۔"

میں نے کہا "محمد بھائی! نکالو اپنا خنجر اور چاک کردو ان سب کا ...۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ آج تم ہاتھ کی صفائی دکھاؤ گے۔ انہیں ...وہم بھی نہیں ہوگا کہ کب ان کے سر خود انہی کے قدموں میں ...گے۔ تم نے مجھے مایوس کیا محمد بھائی" میں ہنستا رہا۔

محمد بھائی نے ہاتھ جوڑ دئے "دیکھ' تیرے کو اللہ رسول کا ...طہ۔"

"محمد بھائی! یہ اللہ رسول کا حکم ہی تو ہے جس کی وجہ سے میں ...ہوں۔ اس جیسے مسلمانوں کے دشمن' فتنہ و شر کے ...مفسد اور منافق' شراب پینے والے اور زناکار کو میں کیسے ...سکتا ہوں۔ یہ غدار بھی ہے' میرا دشمن بھی ہے۔ اور اپنی بقا کا ... ہو تو قتل بھی قتل نہیں ہوتا۔"

آخرکار چوہدری کے اعصاب شکست کھاگئے۔ اس نے میری ...کے خلاف بہت دیر مزاحمت کی۔

"سکندر! مجھے چھوڑ دو۔ ہم...... بیٹھ کے بات کرتے ہیں۔ تم ...تے ہو' وہی ہوگا" چوہدری نے سخت احساسِ ذلت کے ساتھ ...

...میں نے کہا "اچھا۔ پہلے تو اپنی فوج کو پسپا ہونے کا حکم دو۔"

چوہدری نے پھر بجّو کو گالیاں دیں "تیری عقل میں نہیں آتا ... کہ کیا کرنا چاہئے۔ دیکھتا نہیں...... کہ میری جان خطرے میں ہے۔"

بجّو نے فوراً اپنے آقا کی خواہش کے مطابق احکامات صادر کئے۔ دونوں مسلح محافظ شرمندہ' مجبور اور بے بس تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ادائے فرض میں ناکامی ان کا کتنا بڑا جرم بن چکی ہے اور اس کی سزا کیا ہوگی۔ وہ بادل ناخواستہ واپس گئے۔

میں نے کہا "محمد بھائی! بجّو کو روکو۔"

"بجّو کون؟ کدھر ہے بجّو؟" محمد بھائی کی عقل خبط ہوگئی۔

"یہی جو تمہارے پاس کھڑا ہے۔" میں نے کہا اور چوہدری کو گردن سے پکڑ کے کھڑا کردیا۔

میز الٹ جانے سے اسباب شان و شوکت بھی تہس نہس ہوگئے تھے۔ جھنڈا سوگ میں سرنگوں پڑا تھا۔ ٹیلی فون ٹوٹ گئے تھے اور غالباً مرچکے تھے یعنی ڈیڈ ہوگئے تھے۔

محمد بھائی نے بجّو سے کہا "ابھی تم ادھر بیٹھو یار۔ سالا بہت لفڑا ہوگیا ادھر تو۔"

بجّو نے صوفے پر گر کے کہا "ابھی کیا ہوا ہے' اس کے بعد جو ہوگا...."

میں نے چوہدری کو گھومنے والی کرسی پر دھکیل کر بٹھادیا' "تمہارا یہ سیکریٹری تو پاگل ہوچکا ہے۔ تم نے سنا' یہ کیا کہہ رہا تھا؟ اس کا مطلب تھا کہ ابھی بہت کچھ ہونا باقی ہے۔ تمہارا انتقال' سوئم' چہلم۔ اچھی بات نہیں نکالتا منہ سے کہ آپ کی بیٹی کا گھر آباد ہوگا۔ وہ صاحبِ اولاد ہوگی۔ اس کے بچّے آپ کے ساتھ کھیلیں گے۔ ایک ساتھ چھ پوتے ہوجائیں گے۔ اس کو حکم دیں کہ حجلۂ عروسی سجائے۔"

چوہدری دھاڑیں مار مار کے رونے لگا "سکندر...... مجھے معاف کردو خدا کے لئے۔ یہ سوچو کہ میں ایک باپ ہوں۔ کوئی سکھ نہیں دے سکا میں بیٹی کو۔ اس کی خوشی نہیں دیکھ سکا۔ ساری عمر اس کا غم میرے دل کا گھاؤ بنا رہا۔ پاگل وہ نہیں' میں ہوں کہ اس نے مجھ سے چاند مانگا اور میں نے کہا کہ میں ستارے بھی ساتھ لاؤں گا۔"

یکلخت مجھے اس پر ترس آیا۔ اب وہ میرا دشمن نہیں رہا' ایک با اثر سیاست داں عبدالستار چوہدری نہیں رہا۔ وہ محض ایک مصیبت کا مارا باپ رہ گیا۔ بیٹی تو اللہ کی رحمت ہوتی ہے مگر اس نے یا حالات نے رحمت کو مصیبت بنادیا تھا۔

کمرے میں اب صرف محمد بھائی تھا جو یقیناً پچھتا رہا تھا کہ وہ مجھے یہاں کیوں لے کر آیا تھا۔ صورتِ حال اتنی مشکل ہوگئی تھی کہ اسے اپنی گردن میں پھانسی کا پھندا ہر صورت میں محسوس ہوتا تھا خواہ مارا کوئی بھی جائے۔ چوہدری یا میں۔ ڈیل ڈول میں وہ ہاتھی تھا۔ ہاتھیوں کی لڑائی میں حشرات الارض پس جاتے ہیں' یہ تو ہوتا ہی ہے مگر یہاں ہاتھی کی طاقت کا پیمانہ جسمانی برتری نہیں تھا۔

عبدالستار چوہدری جیسا بڑی طاقت رکھنے والا سیاست داں ایک طرف تھا اور میرے جیسا شہرت یافتہ دہشت گرد دوسری طرف۔ وہ اپنے خنجر کو آزما کے کیا کرتا۔ دُہائی اور اللہ رسول کے واسطے دینے سے قیام امن کی کوششوں میں اسے کوئی کامیابی نہیں ہو رہی تھی اور عقل کی بات سننے پر کوئی تیار نہ تھا۔ مایوس ہو کے اس نے سب کچھ تقدیر پر چھوڑ دیا تھا۔

چوہدری کی آہ و زاری سے میرا ہی نہیں محمد بھائی کا دل بھی پسیج گیا تھا۔ اس نے ایک بار پھر مجھ سے مؤدبانہ درخواست کی۔ "اے بھائی! اے میرا باپ! ابھی اس گدھے پر سواری چھوڑ۔ اس کا بات سن۔ میرا بات سن...."

میں پہلے ہی گدھے کی پیٹھ سے اترنے کا اصولی فیصلہ کر چکا تھا چناں چہ میں نے محمد بھائی کی درخواست قبول کرنے کا اضافی فائدہ حاصل کیا۔ ابھی میں اٹھا ہی تھا کہ اس ڈرامے کا دوسرا سین شروع ہو گیا اور پردہ گرنے سے پہلے اس لڑکی نے انٹری دی جس کو سائیڈ ہیروئن سمجھا جا سکتا تھا۔

اسے دیکھ کر میں دم بخود رہ گیا۔ وہ حیرت انگیز بلکہ سنسنی خیز حسن کی مالک جواں سال لڑکی تھی۔ سفید ساری میں ملبوس اس کا گدرایا ہوا بدن شراب کی بند بوتل کی طرح تھا جس میں نشہ ہی نشہ بھرا ہوا ہو۔ اس کے لمبے کالے بال اس کے شانوں پر بڑے سلیقے سے پھیلے ہوئے تھے اور اس کی کالی آنکھوں میں کاجل خود قدرت نے بھرا تھا۔ دیکھنے میں وہ ذرا بھی پاگل نہیں لگتی تھی لیکن اسے دیکھنے والا ضرور پاگل ہو سکتا تھا۔

"اسے ماردیں یا چھوڑ دیں سکندر صاحب۔ میرے غیرت مند باپ کے پاس آپ کو دینے کے لئے ایک میں تھی' دوسری اس کی اپنی زندگی" اس نے رواں' شستہ اردو میں کہا "مجھے آپ ٹھکرا ...."

میں نے بوکھلا کے کہا "آپ ...... چوہدری کی ....."

"جی۔ میرا نام کاجل ہے" وہ بولی۔

میں نے میز سیدھی کی۔ چوہدری اپنی کرسی پر بیٹھ چکا تھا اور دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کے رو رہا تھا۔ میں اس کے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔

"چوہدری نے غلط بتایا تھا آپ کے بارے میں؟"

"نہیں۔ میرے باپ نے جو بھی کہا تھا ان کے نقطۂ نظر سے ٹھیک ہی تھا۔ میرے بارے میں عام خیال یہی ہے کہ میں پاگل ہوں" وہ محمد بھائی کے قریب بیٹھ گئی۔

"جو تیرے کو پاگل بولے وہ سالا خود پاگل" محمد بھائی بولا۔ کاجل کے حسن نے اس کی نگاہوں کو خیرہ اور عقل کو خبط کر دیا تھا۔

میں نے تائید میں سرہلایا "ایسی غلط بات نہیں کرنی چاہئے کسی کو بھی۔"

وہ مسکرائی۔ بالکل خفیف' معلوم نہ ہونے والی مگر محسوس ہونے والی مسکراہٹ کا اجالا اس کے سانولے چہرے پر یوں پھیلا جیسے رات کے چہرے پر صبح کاذب کی سفیدی۔

"کون پاگل ہے اور کون پاگل نہیں ہے' اس کا فیصلہ کرے گا کون آخر؟ ایک وہ پاگل تھا جو کہتا تھا سورج نہیں زمین گھومتی ہے۔ حالاں کہ سب اندھے نہیں تھے اور دیکھ سکتے تھے سورج مشرق سے مغرب کی طرف روز جاتا ہے۔ پاگل وہ بھی تھا جس نے کہا تھا کہ زمین گول ہے حالاں کہ یہ بات کہتے وقت وہ خود بھی ہموار' چپٹی زمین پر کھڑا تھا اور اس کے لئے یہ ثابت کرنا ناممکن مشکل تھا کہ عین اس قطع زمین کے نیچے زمین کی گولائی کے دوسرے نصف کرے میں اگر لوگ اسی طرح قدم جمائے کھڑے ہیں تو کیا الٹے لٹک رہے ہیں؟"

میں نے سرکھجا کے کہا "آپ تو فلسفی ہیں۔"

"کیا فلسفی پاگل نہیں سمجھے جاتے؟" وہ بولی "بات صرف یہ ہے کہ فیصلہ رائے عامہ کرتی ہے۔ آپ کسی ایک سے پاس جا کے کہیں کہ سانپ کے تو کان ہی نہیں ہوتے تو وہ کہے گا کہ تمہارا دماغ خراب ہے۔ کیا تم نے اسے بین کی دھن پر سر ہلاتا' جھومتا نہیں دیکھا؟ تم نے کہا کہ چمگادڑ تو اندھی ہوتی ہے تو تم خود عقل کے اندھے کہلاؤ گے سب جانتے ہیں کہ چمگادڑ اندھیرے میں پرواز کرتی ہے۔"

"رائے عامہ نے آپ جیسی باشعور لڑکی کو دیوانہ کیوں قرار دے دیا آخر؟ ایسا کون سا سچ بولا تھا آپ نے؟"

وہ پھر اسی طرح زیرلب مسکرائی کہ مسکراہٹ کی ایک لہر روشن ہوئی اور غائب ہو گئی "لوگ کہتے ہیں کہ میں .... کے گھر پیدا ہو گئی تھی۔ عبدالستار چوہدری کے گھر میں ..... ہو گئی۔ بنگلہ دیش کا حامی' بیٹی پاکستان کی وحدانیت اور مسلم قومیت کے نظریے کی حامی۔ میں جو کچھ کہتی اور کرتی ہوں وہ مجھے دیوانگی کا خطاب عطا کرنے کے لئے کافی ہے چناں چہ میرے باپ نے مجھے مشہور کر دیا۔ وہ ایسا نہ کرتا تو اس کی لیڈری اور ..... زندگی اور خطرے میں پڑ جاتے۔"

عبدالستار چوہدری اب بیٹے ہوئے مہرے کی طرح سر جھکائے بیٹھا تھا اور واقعی شرم سے پانی پانی ہو رہا تھا۔ ..... کیا جا سکتا وہ اس میں ڈوب مرتا مگر یہ ممکن تھا نہ وہ خود ..... غیرت مند تھا۔

میں نے کلائی کی گھڑی دیکھی "مس کاجل! ..... آپ کے فہم و فراست اور بصارت و بصیرت کو ..... تحسین پیش کرتا ہوں اور اس سے زیادہ آپ کی شخصیت ..... صورت حسنِ سیرت میں کیا آپ کے پاس زیادہ ہے' یہ ..... نہیں سکتا۔ اگر میں مجبور نہ ہوتا تو آپ کے والد کی ..... کو دنیا کا سب سے بڑا انعام سمجھ کے خوشی سے پاگل ہو جاتا اور پھر خوب زور لگا کے قہقہے دیوانے دو....."

"مجھے معلوم ہے کہ آپ کی مجبوری کا نام کیا ہے" اس نے اداس دل شکستہ اور مظلوم مسکراہٹ سے کہا۔ "پھر خدا کے لئے میری مدد کریں۔ سب کچھ ہے آپ کے اختیار میں۔ عبدالستار چوہدری تک ہے جو ایک دن اس ملک کا بنے گا یا سفیر۔ اس سے کہیں مجھے جانے دے۔ باہر ایک اور لڑکی ٹیکسی میں بیٹھی میری واپسی کی منتظر ہے اور وہ خطرناک پاگل ہے۔ اگر میں واپس نہ گیا تو وہ اکیلی ہی اس قلعے پر حملہ کر دے گی۔ وہ اتنی پاگل ہے کہ اکیلی اور خالی ہاتھ بنگلہ دیش فتح کرنے کا سوچ سکتی ہے۔"

وہ مسکرائی۔ اس مرتبہ مسکراہٹ واضح تھی۔ جیسے صبح کاذب کے مقابلے میں صبح صادق کا اجالا واضح اور یقینی ہوتا ہے۔

"لاؤ' اپنا یہ پستول مجھے دو۔"

میں نے کنفیوز ہو کے کہا "پستول؟ مگر یہ تو ریوالور ہے۔"

"ممکن ہے یہ توپ ہو۔ میں وہ چیز مانگ رہی ہوں جو تمہارے ہاتھ میں ہے۔"

میں نے کہا "مس کاجل! آپ تو خود ایک ایسی دو دھاری تلوار اور شمشیر آبدار ہیں ....."

اس نے میری بات کاٹ دی "تم فضول باتوں میں اپنا وقت گزار رہے ہو۔"

میں نے کہا "آخر کیا کریں گی آپ اس کا؟ والد صاحب آپ کو پاگل قرار دے چکے ہیں۔ میں ریوالور تھما دوں آپ کے ہاتھ میں؟"

"فکر مت کرو۔ نہ میں تمہیں گولی ماروں گی نہ کسی اور کو۔"

عبدالستار چوہدری چلایا "اس کو مت دینا ریوالور۔ یہ مجھے گولی مار دے گی۔"

میں نے فوراً ریوالور کاجل کو دے دیا "پھر تو کوئی پریشانی کی بات نہیں۔"

محمد بھائی نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا "یا میرے مولا! اپن کدھر کون کے بیچ میں پھنس گیا۔"

اچانک کاجل نے ریوالور اپنی کنپٹی پر رکھ لیا "بابا! ان کو کچھ نہیں ہوگا۔ وعدہ کر' میری قسم کھا۔"

عبدالستار چوہدری کا چہرہ لاش کی طرح سفید پڑ گیا "پاگل! کیا کر رہی ہے تو؟"

"ابھی تو پاگل کر سکتے ہیں۔ بول' سودا منظور ہے؟" وہ ہنسی اور اس بار مجھے بھی اس کے اطوار میں دیوانگی کی جھلک محسوس ہوئی۔

"کاجل! میری بات سن۔ میں تیرے بھلے کی بات کر رہا ہوں۔"

کاجل نے چیخ کے کہا "میری موت میں بھلائی ہے تیری؟ بول۔ میرے مرنے کے بعد جو دل چاہے کرنا۔ ابھی تو میری بات مانے گا۔"

عبدالستار چوہدری کا ایک دم نروس بریک ڈاؤن ہو گیا "تو مجھے مار دے کاجل۔ میری جان چھٹ جائے اس روز روز کی مصیبت سے۔ تیری خاطر سب کیا میں نے۔ تو بھی کچھ کر میرے لئے" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

محمد بھائی نے گلوگیر لہجے میں کہا "کاجل بی بی! کوئی کسی کو گولی مت مارو۔ یہ تیرا باپ ہے' تو اس کا بیٹی ہے۔ سکندر کو بھی کوئی رونے والا ہے۔ اس کا زندگی بھی کسی کو پیارا ہے۔ کوئی پیار کرتا ہے اس سے اور یہ پیار کرتا ہے کسی سے۔ تیرا باپ تیرے کو بہت پیار کرتا ہے ...... بس اپن سالا کسی کا نہیں ہے۔ کوئی اپن کو پیار نہیں کرتا۔ تو اپن کو گولی مار دے۔ ایک گولی چلانا اتنا ضروری ہے تو ادھر چلا۔ اپن سالا بہت حرامی پن کیا دنیا میں۔ دنیا کا جان اپن سے چھٹے گا' اپنا جان دنیا سے۔"

کاجل نے کہا "تم محمد بھائی ہو نا؟"

"ہاں۔ ہسٹری شیٹر۔ سالا اپنا کھاتا میں سب کچھ ہے۔ ہر جرم کیا اپن۔ چوری ڈاکا' قتل اور بدمعاشی میں بہت نام کمایا اور کبھی چھ مہینہ جیل میں رہا کبھی چھ سال۔ اپن کو وکیل بچالیا' پیسہ بچالیا یا کوئی بڑا آدمی بچالیا ورنہ اپن کو بہت پہلے پھانسی ہو جاتا۔ ابھی سالا اپنا ڈھانچہ ہوتا قبر میں۔ پر اب اپن بولتا ہے خود تیرے کو......"

"محمد بھائی! تم تو بہت شریف آدمی ہو۔ ان شریفوں سے بھی زیادہ جنہوں نے تم کو بدمعاش بنایا۔ تم واپس جاؤ۔ اس لڑکی کو بھی ساتھ لے جاؤ جو اکیلی بنگلہ دیش فتح کرنے کا سوچ رہی ہوگی......"

"اور اپنا یار سکندر بادشاہ؟"

"سکندر بادشاہ میرے پاس رہے گا۔ تمہاری امانت کے طور پر" کاجل نے کہا "اپنے دوستوں کے ساتھ۔ رابعہ کے ساتھ۔"

"لیکن کب تک ..... اور کیوں؟" محمد بھائی نے پریشان ہو کے پوچھا۔

"جب تک خطرہ ٹل نہیں جاتا" کاجل نے سوچ کے کہا "یہ میرا مہمان رہے گا۔"

"اور اپنا کیا بنے گا؟"

"تمہیں بھی کچھ نہیں ہوگا" عبدالستار نے اچانک سر اٹھا کے کہا اور پکار کے بجو کو آواز دی۔

بجو یوں اندر آیا جیسے اپنی تقدیر کا فیصلہ سننے آیا ہو۔

"محمد بھائی کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ اس کو حفاظت سے واپس پہنچا دو' جہاں یہ کہے۔ اور اس کے ساتھ آنے والی لڑکی کو بھی۔" عبدالستار چوہدری بولا۔

محمد بھائی اپنی جگہ کھڑا رہا "اپن ساتھ آیا تھا' ساتھ ہی واپس جائے گا۔ تم تازو کو بلالو۔"

میں نے سرہلایا "بالکل درست فرماتے ہیں محمد بھائی۔"

کاجل نے کہا "نہیں۔ صرف تم یہاں رہو گے۔ جاؤ' بابا نے جو کہا ہے وہ کرو ورنہ......"

"ورنہ کیا؟" میں نے کہا۔

"تم سب کو رہنا پڑے گا یہاں" کاجل نے کہا۔
میں نے کہا "آخر تم کیوں روکنا چاہتی ہو مجھے؟ کیا مقصد حاصل ہوگا اس سے؟ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ تم محسن کو اور رابعہ کو میرے ساتھ کردو۔"
اس نے خوابیدہ لہجے اور پُر اسرار انداز میں کہا "دیکھو' میں تمہارے لئے اتنا کررہی ہوں' تم میری ایک بات نہیں مان سکتے؟"
میں نے اس کی بات پر غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ انکار کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اگر اس نے نازو کو بھی اندر بلوالیا تو غالب اور گل کی پریشانی دو چند ہوجائے گی۔ سردار جی جو پاکستانی قوم کے حقِ مہمان نوازی کا قرض چکانے کے لئے جذباتی ہورہے تھے ٹیکسی کی چوری کا علم ہوتے ہی ان کے دشمن ہوجائیں گے اور سارے زمانے میں کہتے پھریں گے کہ کبھی پاکستانی پر اعتبار مت کرنا۔ میں نے انہیں مہمان رکھا عزت دار سمجھ کے مگر وہ تو لڑکی سمیت میری ٹیکسی لے کر بھاگ گیا۔ اگر محمد بھائی اور نازو واپس پہنچ گئے تو انہیں صورتِ حال کا علم ہوجائے گا اور پھر وہ کچھ نہ کچھ ضرور کریں گے۔
میں نے کہا "اچھا کاجل! میں نے خود کو تمہارے باپ کے حوالے تو نہیں کیا تھا مگر تمہارے حوالے کرتا ہوں۔ بشرطیکہ تم محمد بھائی کو واپس جانے دو۔"
کاجل کا چہرہ روشن ہوگیا "انہیں کب روکا ہے میں نے۔"
میں نے کہا "کیا میں دو منٹ بات کرلوں محمد بھائی سے؟"
"جو کہنا ہے میرے سامنے کہو۔"
میں نے کہا "کیا میں قیدی ہوں تمہارا؟"
"نہیں۔ تمہاری قیدی میں ہوں" اس نے سوچے سمجھے بغیر کہہ دیا "میرا مطلب تھا جیسے زنجیر کے ساتھ ہتھکڑی ہو۔ تو قیدی کے ساتھ ہتھکڑی اور ہتھکڑی کے ساتھ زنجیر تو رہتی ہے....."
اس بے تکی مثال نے مجھے پہلی بار شک میں مبتلا کیا کہ کاجل واقعی ذہنی عدمِ توازن میں مبتلا ہے۔ اسے پاگل پن کہنا غلط تھا۔ وہ خبطی' سنکی' جھکی یا الجھی ہوئی شخصیت تھی۔ یہ الجھاؤ کہیں بھی بے وجہ نمودار ہوجاتا تھا۔ جیسے ہموار میدانوں میں بہنے والی پُرسکون ندی کی راہ میں کہیں کوئی چٹان آجائے۔ وہ پڑھی لکھی اور خاصی ذہین لڑکی خود اپنے خیالوں کے طلسم میں اسیر تھی اور اپنی ذات کی بھول بھلیوں میں اپنا الگ راستہ تلاش کرنا چاہتی تھی۔ یہی اس کا پاگل پن تھا کیوں کہ بھول بھلیوں سے باہر آنے کا راستہ ایک ہی ہوتا ہے۔ اپنی مرضی کا راستہ ڈھونڈنے والا ہمیشہ بھٹکتا رہتا ہے۔
میں نے محمد بھائی سے کہا "تم جاؤ محمد بھائی۔ نازو کو بھی لے جاؤ۔ یہاں جو کچھ ہوا' کسی کو مت بتانا۔ بس یہ کہہ دینا کہ میں خیریت سے ہوں اور اپنے ساتھ محسن کو بھی خیروعافیت کے ساتھ لے کر لوٹوں گا' ایک آدھ روز میں۔ رابعہ کا ذکر مت کرنا۔ انہیں یقین دلادینا کہ نہ میں قید میں ہوں اور نہ پریشان ہوں۔ جاؤ' ورنہ وہ پاگل لڑکی چل پڑے گی۔"
"اچھا!" محمد بھائی نے ٹھنڈی سانس لی "ابھی تم بولتا پڑا' اپن جاتا ہے لیکن خدا کا قسم' اس میں دھوکا ہوا نا تو اپن کری نہیں چھوڑے گا۔"
عبدالستار چوہدری مشتعل ہوگیا "دھمکی دیتا ہے مجھے۔"
"ہاں۔ تیرے ساتھ نیکی بھی کیا میں' اب اپن کا برائی ب دیکھنا۔ اپن تیرا گھر کو آگ لگادے گا۔ بم پھینک دے گا تیرا کا میں سالا حرامی۔ تیرا چھوکری کو اٹھالے گا۔"
چوہدری آگ بگولا ہو کے اٹھا مگر کاجل ایک دم بیچ میں "تم جاؤ۔ ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔ سکندر کو کچھ ہوگا نہ کسی کو۔"
"تم کیا چیز ہے چھوکری۔ اپنا باپ کو بولو۔ یہ کیوں چپ ہے"
"آپ کیوں خاموش ہیں بابا؟ آپ کو میری قسم' ان کو بتا کہ میرا وعدہ آپ پورا کریں گے۔"
"تم مجھے بلیک میل کرتی ہو بے بی" چوہدری نے پاؤں ہوئے کہا "ایسے تو کسی دن میں قسم بھی توڑ دوں گا۔"
"آپ قسم کھائیں۔"
"اچھا بابا۔ قسم کھاتا ہوں میں۔ تیرے ہاتھوں سے توز کھاسکتا ہوں میں۔ تجھے معلوم ہے یہ بات" چوہدری نے بے سے کہا۔
محمد بھائی چلا گیا تو کاجل نے کہا "میرے ساتھ چلو۔"
میں نے کہا "کہاں چلوں؟"
"رابعہ اور محسن سے نہیں ملوگے؟"
میں نے کہا "وہ کہاں ہیں؟ انہیں یہاں بلوالو۔"
"وہ نہیں آسکتے۔ تم کو جانا ہوگا میرے ساتھ۔ اٹھا پڑے گا میرا" اس نے التجا کی اور میرا ہاتھ تھام لیا۔
"بے بی! یہ ریوالور......" چوہدری بولا۔
"یہ میرے پاس رہے گا۔ اپنی جان دے کر سکندر کو بچانے کے لئے" وہ ہنسی "اپنے وعدے پر قائم رہنا بابا ورنہ کھودو گے۔"
میں اس کا ساتھ دینے پر مجبور ہوگیا۔ اس کی نیت مجھے نہیں لگتی تھی مگر دشمن کے قلعے میں محصور ہوجانے والے میں جھوٹے سہاروں کی پناہ نہ لیتا تو کیا کرتا۔ اب کچھ نہیں تھا۔ کاجل آگے آگے ہوا میں تیرتی چل رہی تھی۔ اس کی خرامی سے "موج خرام یار بھی کیا گل کترگئی" والا شعر یاد اس کے بے داغ' سفید بادلوں کے اور چاند کی کرنوں ہوئے شہکار لباس میں سے اس کے سانولے بدن کا ہر نقش دیدرہا تھا۔ آتشِ شوق کو بھڑکاتا تھا اور چیلنج دیتا محسوس ہو میں کسی سحرزدہ' ہپناٹائز ہوجانے والے معمول کی طرح کے پیچھے چلا گیا۔ میرے سامنے وہ تھی۔ پھر اچانک اس کا سراپا سما گیا اور فضا اس کے قُرب کی خوشبو سے بھر گئی۔
رابعہ میرے ذہن میں رابعہ کا خیال تھا اور نظر میں کاجل تھی چٹان جیسے مور بھٹک گیا۔ نہ جانے کیوں میں ایک مقناطیسی کشش کے زیر اثر اس کے نقشِ پا میں رابعہ کا عکس دیکھتا ہوا اس کے بیڈ روم تک جا پہنچا۔
جب اس نے دروازہ بند کیا تو مجھے ہوش آیا۔
میں نے کہا "کاجل! یہ تم مجھے کہاں لے آئی ہو' رابعہ کہاں ہے؟"
"صرف ایک رات کی مسافت پر" اس نے میرے قریب ہو کر خود سپردگی کے انداز میں کہا "آج تم مجھے ملے ہو' صبح وہ تمہیں مل جائے گی۔"
میں نے اسے دور دھکیل دیا "یہ ناممکن ہے۔"
اس نے مجروح لہجے میں کہا "اتنے ظالم مت بنو۔ بہت دنوں سے تم میرے خوابوں پر قابض ہو' میرے خیالوں میں شامل ہو۔"
میں نے کہا "کاجل! تم نے مجھے پہلے کبھی نہیں دیکھا' ملاقات تو دور کی بات ہے۔ اگر تم خواب میں نظر آنے والی کسی صورت یا خیالوں کے تراشے ہوئے پیکر سے محبت کرتی رہی ہو تو یہ دیوانگی ہے کیوں کہ حقیقی زندگی کسی خواب کی تعبیر یا خیال کا عکس نہیں ہوتی۔ قصے کہانیاں افسانے اور فلمیں....."
اس نے بڑے دکھ سے کہا "تم نے بھی مجھے پاگل کہہ دیا نا۔ یہاں بیٹھو۔ ڈرو نہیں مجھ سے۔ میں عورت ہوں' عام عورت۔ کہیں نہیں جاؤں گی۔ میں بتاتی ہوں تمہیں خواب اور حقیقت کیا ہے۔"
میں ایک بیڈ کے کنارے پر ٹک گیا۔ بیڈ روم میں عجیب سی خوشبو بھری ہوئی تھی۔ اس کے اسبابِ آرائش میں دولت کی نمائش سے زیادہ نفاست ذوقِ جمال اور اپنائیت کا حسن شامل تھا۔ اس کی فضا میں نرمی اور محبت تھی اور ایک ایسی کشش تھی جسے کوئی نام نہیں دیا جاسکتا تھا۔
مجھے اپنے احساس پر ندامت ہونے لگی۔ یہ مجھے کیا ہونے لگا ہے۔ میرے حواس پر اس ماحول کا طلسم کیوں اثر انداز ہورہا ہے۔ میرے ذہن میں بے وفا خیالات کے چور دروازے کیوں کھل رہے ہیں۔ مجھے سنبھل جانا چاہئے ورنہ میں الف لیلوی کہانی کے کسی شہزادے کی طرح پتھر ہوجاؤں گا جو بھٹکتا ہوا کسی پری کے قید خانے تک جا پہنچا ہو۔
کاجل نے ڈریسنگ وارڈ روب میں سے ایک مجلد البم نکالا اور اس کے ساتھ مجھ سے لگ کے بیٹھ گئی۔ تب مجھے یقین آیا کہ اس جادوگر خوشبو کا منبع کاجل کا بدن تھا۔
میں گھبرا کے کچھ دور ہوگیا "کاجل! یہ سب مت کرو۔"
"ابھی تک تو کچھ بھی نہیں کیا میں نے۔ تمہاری مدد کررہی ہوں" وہ معصومیت سے بولی مگر اس معصومیت کے پیچھے اسی حوّا کی بیٹی کی ترغیبِ گناہ تھی جسے شیطان نے ورغلایا تھا۔ میں اب واقعی خوفزدہ تھا۔ اقرار کی گنجائش نہ تھی اور انکار سے اپنے حسن کی قوتِ تسخیر پر غرور کرنے والی عورت کا شیشۂ پندار بکھر جاتا تھا۔ ایسی عورت کچھ بھی کرسکتی تھی۔ جان دینے سے جان لینے تک۔ عشق کے ہر امتحان سے گزر جانا اس کے اختیار میں رہتا ہے کیوں کہ وہ اپنی ناکامی برداشت نہیں کرسکتی اور تذلیل قبول نہیں کرسکتی۔
کاجل نے کہا "یہ ایک خواب ہے جو آج بھی ادھورا ہے۔ اسے تم بھی دیکھو کیوں کہ تم اس میں شامل ہو۔"
میں نے البم لے لیا "کاجل! خواب کبھی پورے نہیں ہوتے۔ تعبیر مل جانے کے بعد بھی ادھورے رہتے ہیں کیوں کہ ہر خواب خواہشوں کی زنجیر ہے۔ کبھی ختم نہ ہونے والی۔ دم نکلنے تک ایسی خواہشیں ساتھ رہتی ہیں کہ ہر خواہش پہ دم نکلے اور ہزاروں بار زندگی ملے تب بھی یہ حسرت رہ جائے کہ بہت نکلے میرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے۔"
"میں ایسا نہیں سمجھتی......"
"تم کو سمجھنا پڑے گا کاجل۔ دیکھو' ہم زندگی بھر انہی خوابوں کے پیچھے دوڑتے رہتے ہیں جو ہماری خواہشوں کا روپ ہوتے ہیں۔ کسی کو چاہنے اور اسے پانے سے مسافت تمام نہیں ہوتی۔ یہ کسی فلم کا انجام تو ہوسکتا ہے کہ ہیرو یا ہیروئن ظالم سماج اور ولن کی رخنہ اندازی اور بدخواہی پر مبنی سازشوں کے باوجود مل جائیں مگر زندگی میں اس انجام سے خواہشات کے سفر کی ہزار راہیں کھل جاتی ہیں۔ شادی ایک دروازہ ہے۔ اس میں داخل ہونے والے کو ہر سمت میں ہر قدم پر دروازے نظر آتے ہیں جن کو وہ کھولنے پر مجبور ہوتا ہے۔ خوشی اور خوش حالی' صحت اور زندگی' اولاد اور ان کے مستقبل پر اپنے ارمانوں کا مکمل اختیار۔ وہ نیک ہوں' قسمت والے ہوں' قابلِ فخر ہوں۔ پہلے اپنا گھر بنے۔ اس میں آرائش' آسائش اور عیش کے اسباب ہوں۔ کار ہو یا کاریں ہوں اور اتنی دولت ہو جس کی قوتِ خرید میں دنیا ہو۔ پھر بچوں کے پاس اور ان کے بچوں کے پاس یہ سب ہو۔ یہ سارا سلسلہ کہاں سے شروع ہوتا ہے؟ ایک عورت کی محبت یا ایک مرد کی رفاقت کے خواب کی تعبیر مل جانے سے۔ مگر اس کے بعد کیا ہوتا ہے؟ کتنے محبت کرنے والے ازدواجی زندگی کی منزل پالینے کے بعد اپنے سارے ارمانوں کی تکمیل کی طمانیت پاتے ہیں؟ کون کہتا ہے کہ میں نے جو چاہا پالیا؟ جسے سب مل جاتا ہے وہ بھی کہتا ہے کہ ایک زندگی اور ہوتی تو میں بہت کچھ کرلیتا جو میں کر نہ سکا۔"
"آخر تم کیا سمجھانا چاہتے ہو مجھے؟ کیا یہ سب میں نہیں سمجھتی؟ میں نے تو اپنے خوابوں کو دیواروں میں قید کر دیا ہے۔ خواہشوں کے گرد محرومی کے حصار کھینچ دئے ہیں۔ خود اپنے خیالوں کے پَر کاٹ دئے ہیں اور ان کی پرواز چھین لی ہے۔ غلط تم

سمجھے ہو میری دیوانگی کو۔ میں تم سے کوئی تعبیر نہیں مانگتی مگر کم سے کم میرے خواب دیکھ تو لو۔ انہیں میں نے لمحہ لمحہ محفوظ کر رکھا ہے۔ کھولو اس قبرستان کا بند دروازہ اور دیکھو کہ گڑی ہیں کتنی صلیبیں۔"

میں نے کہا "تم کمال کی اردو بولتی ہو بنگالی ہو کے۔"

اس نے کہا "میں وہ سب کرتی ہوں جو ایک کامیاب بنگالی سیاست داں کی بیٹی کو نہیں کرنا چاہئے۔ چناں چہ میں پاگل پن کا الزام قبول کرلیتی ہوں۔ میں اپنے باپ کی کامیابی کو ناکامیوں میں بدلنا نہیں چاہتی۔ اس نے بڑی جدوجہد کی ہے اس مقام تک پہنچنے کے لئے اور اس کے مجھ پر بہت احسانات ہیں جن کا بدلہ چکانا ممکن ہی نہیں۔ مجھے یہ بھی احساس ہے کہ میں نے اسے مایوس کیا اور صرف دکھ دیئے۔ کوئی بیٹی اگر جانتے بوجھتے ماں باپ کے ارمانوں کا گلشن اُجاڑے، ان کی خوشیوں کی جھولی میں انگارے ڈال دے، ان کی پُرطمانیت مسکراہٹ کو پُرعذاب آنسوؤں میں بدل دے تو اسے تم کیا کہو گے؟ وہ میں ہوں۔ کاجل۔ میں نے انہیں اپنے گھر اور خاندان کو بچانے کے لئے یہ الزام قبول کرلیا ہے کہ میں پاگل ہوں۔ کاش میں اس سے زیادہ کچھ کر سکتی اور ان میں بھی اتنی ہمت ہوتی کہ مجھے پاگل خانے میں ڈال کے بھول جائیں۔"

"تم نے یہ الزام قبول کرکے یقیناً قربانی دی ہے۔"

"قربانی!" وہ طنزیہ انداز میں ہنسی "قربانی کا بکرا کب چاہتا ہے کہ اس کی جان لی جائے مگر اس کے اختیار میں کیا ہوتا ہے؟ خیر چھوڑو۔ مجھ سے ملو، یہ میں ہوں۔ وہ جو میں تھی۔ یہ ہے میری عمر گزشتہ کی کتاب۔"

البم کے پہلے صفحے پر اس کے بچپن کی تصویریں تھیں، کچھ پیدائش کے بعد کی۔ پہلی سالگرہ سے چوبیسویں سالگرہ تک اس کی زندگی کے ہر سال کا عکس ایک تسلسل کے ساتھ وقت کی صناعی کا اور عمر کی پیش قدمی کا افسانہ سناتا تھا۔ پھر وہ تصویریں آئیں جو خاندانی تقاریب میں اتاری گئی تھیں۔ ان میں کچھ چہرے جو پہلے موجود تھے، بعد کی تصاویر میں غیر موجود ہوگئے۔ میں کسی سے آشنا نہ تھا چناں چہ نہ مجھے کسی کے وجود سے دلچسپی تھی نہ عدم سے۔ ان تصویروں کو میں نے محض کاجل کا دل رکھنے کے لئے دیکھا۔ بس ایک سرسری نگاہ سے۔ مگر پھر جو تصویریں آئیں انہیں دیکھ کر میں چونکا۔

یہ آؤٹ ڈور فوٹوگرافی تھی۔ اسکول، کالج، بازار، تفریح گاہیں، مزارات، باغ اور نہریں۔ یہ سب مقامات میرے اپنے تھے۔ جانے پہچانے۔ یہ لاہور تھا جہاں وہ ہر جگہ نظر آرہی تھی۔ کبھی چڑیا گھر میں۔ کہیں زمزمہ کے پس منظر کے ساتھ۔ مقبرہ جہانگیر کے اندر۔ شالیمار باغ میں......

میں نے کہا "تم لاہور بھی رہی ہو؟"

"میں لاہور میں پیدا نہیں ہوئی تھی لیکن وہیں پلی بڑھی ہوں۔ میں نے دھرم پورہ کے گلستان اسکول سے میٹرک کیا تھا۔ لاہور... فاروڈیمن کے بعد فاطمہ جناح میڈیکل کالج میں دو سال رہی۔"

"پھر تم ڈاکٹر کیوں نہیں بنیں؟"

"نہ میں ڈاکٹر بننا چاہتی تھی، نہ مجھ میں اس کی صلاحیت تھی... میں اور پاکستان ایک ساتھ ایک ہی دن پیدا ہوئے تھے... اگست کو جب پاکستان بنا تو میں نے آنکھیں کھولیں۔ پیدائش... ہوئی تو میں لاہور میں ہی تھی۔ بابا کے ساتھ قصور سے آئے... کرن کے قصبے تک ہو آئی تھی۔ اُنیس سو اڑسٹھ میں یحییٰ خان... اقتدار پر غاصبانہ قبضہ کیا۔ پھر جو تین سو تین افسر نکالے گئے ان میں... میرے بابا بھی تھے۔ وہ کہتے ہیں ان کا قصور صرف یہ تھا کہ... محفلوں میں وہ مشرقی پاکستان کے ساتھ ہونے والی ناانصافی کا... کرتے تھے۔ بہت سے متعصب لوگ ان کے دشمن تھے۔ انہوں... نے خبر تو پہلے ہی آگے پہنچادی تھی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ بابا... سب کچھ چھوڑ کے فرار ہونا پڑا۔ سیاست میں یہی ہوتا ہے... ضرور معلوم ہوگا کہ شیر بنگال فضل حق کو غدار تک قرار دے... تھا۔ ایسے ہی لوگوں نے پاکستان کی سالمیت کے خلاف سازش... بالواسطہ شرکت کی۔ انہوں نے نفرت کو پروان چڑھایا۔ عمل... ردِعمل تو ہوتا ہے۔ یہاں آکے بابا نے اپنا کاروبار کیا۔ ان کو... اور شہید کا درجہ تو بنگالی پہلے ہی دے چکے تھے۔ وہ پیدائشی طور پر... بنگالی تھے۔ موقع ملا تو وہ اپنے کریڈٹ کے ساتھ سیاست کے میدان... میں کود پڑے اور کامیاب ہوگئے۔"

میں محویت کے عالم میں یہ سب سن رہا تھا "کیا صدق دل... بھی تمہارے بابا یہی چاہتے تھے کہ مشرقی پاکستان الگ ہوجائے؟"

"نہیں۔ یہ میں جانتی ہوں" وہ بولی "مگر بابا اس کا اعتراف... نہیں کرتے۔ وہ کٹر پاکستانی تھے مگر اب سیاسی مصلحت کا تقاضا... کہ وہ پاکستان دشمن زبان بولیں۔ نفرت کو ہوا دیں۔ بنگلہ دیش کی... حمایت کریں۔ حب الوطنی کا انہیں کیا صلہ ملا تھا؟"

"ہاں!" میں نے افسوس سے کہا "بعد کے حالات نے بہت... سے مخلص کارکنوں کو دل شکستہ اور مایوس کر دیا تھا۔ کچھ تو... بندے تھے جو صبر کرکے خاموش ہوگئے۔ کچھ انتقامی ردِعمل کا شکار... ہوئے اور لوٹ مار میں لگ گئے۔ انہوں نے دیکھا کہ بہتی گنگا... سب ہی ہاتھ دھو رہے ہیں تو ہم کیوں پیچھے رہ کے بے وقوف... کہلائیں اور نقصان اٹھائیں۔ خیر چھوڑو۔ یہ بہت لمبا اور تکلیف... دہ موضوع ہے۔"

"میرے بابا بھی اندر سے دکھی ہیں کہ یہ سب کیوں ہوا مگر... کو اپنی سیاست کی دکان چلانی ہے۔ اب انہوں نے بھی نظریے... خلوص پر یقین کو بالائے طاق رکھ دیا ہے اور یہ طے کرلیا ہے... سیاست میں اصول پرستی انہیں کچھ نہیں دے گی۔ وہ میرے... خیال ہیں مگر مجبور ہیں کہ مجھے سب کے سامنے غلط اور پاگل... میں پہلے سب کے سامنے بولتی تھی۔ انہوں نے کیا ڈراما کیا... پہلے ایک ماہر نفسیات کے سپرد کیا۔ پھر نفسیاتی علاج کے ایک کلینک میں داخل کرادیا اور اس بات کو بہت پبلسٹی دی۔ اس طرح سب کو یقین آگیا کہ میں کریک ہوں۔ بابا کے سیاسی مستقبل کو نقصان نہیں ہوا۔ وہ نفسیاتی کلینک میں میرے پاس آکے روتے تھے کہ بیٹا میں نے اپنی زندگی اصول پرستی میں گنوادی۔ میں مرگیا تو تمہارے پاس کیا ہوگا؟ آج کون پوچھتا ہے ناظم الدین، حسرت موہانی اور لیاقت علی خاں کی اولاد کو۔ کہ بعد میں ان پر کیا بیتی۔ کسی نے انہیں وہ عزت تک نہیں دی جس کے وہ مستحق تھے۔ عزت دار وہ اسمگلر بن گیا جو چار ہاتھ لمبی کار میں گھومتا ہے۔ میں بھی ہار گیا ہوں بیٹی۔ میں تم سب کو عزت کے وہ اسباب فراہم کروں گا جو اَب بدل چکے ہیں اور اس کے لئے میں اپنے آپ کو بیچوں گا۔"

میں بھونچکا رہ گیا "یہ تم اپنے والد کا اعترافِ جُرم پڑھ رہی ہو؟"

"میں حقیقت بتا رہی ہوں" وہ بولی "وہاں سب کے سامنے انہوں نے جو کہا اسے بھول جاؤ۔"

"انہوں نے مجھے مروانے میں کوئی کسر تو باقی نہیں چھوڑی تھی۔" میں نے برہمی سے کہا۔

"لیکن تم مرے تو نہیں۔ انہیں یقین تھا کہ تم ان کے ڈرامے کو اتنا حقیقی بنادو گے کہ کسی کو شک کی گنجائش ہی نہیں رہے گی۔ وہ ویسے بھی شک سے بالاتر ہو چکے ہیں۔ ورنہ تمہیں مروانا ہوتا تو انہیں کسی کی خدمات حاصل کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ خود تمہیں گولی مار دیتے۔ وہ بہت خطرناک انداز میں ڈبل گیم کھیل رہے ہیں۔ انہوں نے بہت سے تخریب کار، علیحدگی پسندوں کو خود گولی ماری لیکن الزام دوسروں پر آیا۔ پاکستانی ایجنٹوں پر۔ اسی طرح انہوں نے کئی پاکستانی خاندانوں کی مدد کی چھپ کر......"

"اگر کبھی ان کا راز فاش ہوگیا؟"

"تو وہ مارے جائیں گے، انہیں معلوم ہے۔ مگر اب انہیں فکر نہیں ہے۔ وہ میرے اور بھائیوں کے لئے بہت جائیداد بنا چکے ہیں۔ ماں کے اور بیٹوں کے اکاؤنٹ میں لاکھوں روپے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مجھے خود کو بیچ کر بڑی اچھی قیمت ملی ہے۔"

میں نے کہا "کاجل! مجھے افسوس ضرور ہے کہ تمہارے بابا نے اپنے آپ کو بیچا۔ پھر بھی میں ان سے معافی مانگ لوں گا۔ یہ اپنا البم رکھو اور مجھے بتاؤ محسن اور رابعہ کہاں ہیں۔"

"مجھے نہیں معلوم۔" اس نے ہاتھ پھیلا کے کہا۔

"تمہیں نہیں معلوم؟" میں نے چیخ کر کہا۔

"چلاؤ مت۔" وہ خود آتے ہی ہوں گے۔ جیسے انہوں نے تم کو بچالیا ہے، ایسے ہی رابعہ اور محسن بھی ان کی وجہ سے محفوظ ہیں۔ لیکن اتفاق سے معلوم ہوگیا تھا کہ محسن کو پولیس نے پکڑ لیا ہے۔ انہوں نے بڑا لمبا چکر چلایا اور محسن کو ملٹری انٹیلی جنس کی تحویل میں دے دیا۔ وہ بنگلہ دیش کی فوج کی قید میں رہا۔ فوج میں سب غدار نہیں ہیں۔ فوج میں غداری کا تصور بھی نہیں اور اس جرم کی سزا موت ہے۔ پھر بھی جو دل سے پاکستانی ہیں، وہ میرے بابا کی طرح موقعے سے فائدہ اٹھا جاتے ہیں۔"

اچانک دروازہ کھلا اور چوہدری اندر آگیا۔ ایک لمحے کے لئے اس کی اور میری نظریں ملیں۔ پھر وہ شکست خوردہ آدمی کی طرح صوفے پر گر گیا۔ زبان سے میں نے بھی کچھ نہیں کہا تھا، کاجل بھی چپ رہی تھی اور چوہدری بھی خاموش تھا لیکن اس کے باوجود ہم اعتراف کر چکے تھے کہ اب ہمارے درمیان کوئی غلط فہمی نہیں رہی۔

میں نے کہا "چوہدری صاحب! کاجل نے مجھے سب کچھ بتادیا ہے۔"

چوہدری چھت کو گھورتا رہا "پھر تم نے کیا سوچا ہے؟"

"میں نے؟ کس بارے میں؟"

"کاجل کے بارے میں" چوہدری بولا۔

میں نے کہا "میں صرف رابعہ اور محسن کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔ وہ کہاں ہیں؟"

"وہ جہاں بھی ہیں خیریت سے ہیں۔"

"پھر یہ تاخیر کیوں؟ تم مجھے ان سے ملواتے کیوں نہیں؟"

"یہ بھی ہوجائے گا" وہ بولا "تم سب کو بحفاظت روانہ کردیا جائے گا۔ تم خیروعافیت کے ساتھ پاکستان پہنچ جاؤ گے۔ کاجل کے ساتھ۔"

"کاجل کے ساتھ؟"

"کاجل تمہارے ساتھ جائے گی" وہ بولا۔

"اگر یہ شرط ہے تو مجھے نامنظور ہے" میں نے بگڑ کے کہا۔

"یہ شرط نہیں ہے، مجبوری ہے" وہ دکھی لہجے میں بولا۔

"یہ مجبوری تمہاری ہے۔"

"نہیں۔ میں ایک بیٹی کو قربان کر رہا ہوں، باقی سب کی بھلائی

پر۔ مجھے تو زیادہ دن نہیں جینا مگر اس کی چار چھوٹی بہنیں ہیں۔ تین بھائی ہیں اور ماں ہے۔ ان سب کی سلامتی اور بقا کے لئے یہ ضروری ہے کہ میں ذلت اور بدنامی کا ٹیکا خود اپنے ماتھے پر سجالوں۔ جب تم سب نکل جاؤ گے تو میں رپورٹ لکھوادوں گا کہ میری بیٹی کاجل ایک دشمن کے ایجنٹ کو اپنے ساتھ لے کر فرار ہوگئی جسے میں نے بڑی چالاکی سے قید کیا تھا۔ میں یہ اعلان بھی شائع کرادوں گا کہ کاجل اب میری بیٹی نہیں رہی' میں اس سے قطع تعلق کرتا ہوں اور اسے عاق کرتا ہوں۔" وہ اچانک رونے لگا۔

میں نے کہا "لیکن ..... میں یہ ذمّے داری قبول نہیں کر سکتا۔"

"کیوں؟ تم اکیلے تو نہیں ہو۔ محسن اور غالب ہیں تمہارے ساتھ۔ نازو اور گل ہیں' رابعہ ہے۔ اس قافلے میں کاجل کسی پر بوجھ کیسے ہوسکتی ہے؟ میں اس کا خرچ دوں گا۔ سب کے لئے راستہ میں آخر کیوں بنارہا ہوں؟ کیوں میں نے سب کو اتنا خطرہ مول لے کر چھپا رکھا ہے؟"

کاجل نے خود چھلک آنے والے آنسو صاف کئے "میں تم پر نہیں بنوں گی۔ بعد میں بھی۔ بس تم مجھے لاہور میں چھوڑ دینا۔ ...ل میرے بہت دوست ہیں۔ پرانے ہمسائے ہیں۔ میں اپنا ٹھکانہ بنالوں گی اور کسی نہ کسی طرح گزارا بھی کرلوں گی۔"

میں نے کہا "اچھا۔ میں کاجل کو لے جاؤں گا' تمہارے احسان کا بدلہ چکانے کے لئے۔"

"احسان کی بات مت کرو۔ میں کاجل کو بھی بچانا چاہتا ہوں اور خود کو بھی" چوہدری بولا "سب جانتے ہیں کہ یہ پاگل ہے۔ پاگل خانے میں رہ چکی ہے۔ اس کے بھاگ جانے پر نہ کسی کو تعجب ہوگا نہ دکھ۔"

میں نے کلائی کی گھڑی دیکھی "تم بہت خطرناک کھیل میں الجھ گئے ہو۔"

"اور تم؟ تمہارے لئے کوئی خطرہ نہیں تھا اس کھیل میں۔"

میں نے کہا "ہم مطمئن تو تھے۔"

"اطمینان باہر سے نہیں' اندر سے ملتا ہے۔ میں مطمئن ہوں کہ مجھے ایسا ہی کرنا چاہئے۔ یہی مسئلے کا حل ہے۔"

"تم اس وقت بھی مطمئن تھے جب پاکستانی تھے؟"

"پاکستانی میں آج بھی ہوں مگر اندر سے۔ باہر کی فکر تم مت کرو۔ اب چلو میں تمہیں رابعہ اور محسن کے پاس لے چلتا ہوں" وہ اٹھ کھڑا ہوا "ہم پیچھے سے جائیں گے۔ تم کاجل کے ساتھ آؤ۔ میں گاڑی لے کر گیٹ سے نکلتا ہوں تاکہ چوکیدار مجھے دیکھ لے۔ تم تیار ہو کاجل؟"

"میری تیاری مکمل ہے۔" کاجل نے کہا اور ایک بیگ کندھے پر ڈال لیا۔

میں حیران رہ گیا "بس..... یہی تمہاری تیاری ہے؟"

"اور کیا میں اونٹ' گھوڑے' بستر اور خیمے ساتھ لے کر چلوں۔ اس میں نقد رقم ہے اور میری ڈگریاں ہیں۔ باقی سب یہاں ہے یا یہاں" اس نے باری باری سر کو اور دل کو انگلی سے چھوا۔

"کیا..... تم لوٹ کر نہیں آؤ گی؟"

"شاید اس کا موقع نہ ملے۔"

"اپنی بہنوں سے اور بھائیوں سے بھی نہیں ملوگی؟ ماں سے.....؟"

اس نے میری بات کاٹ دی "دشمن کے ساتھ فرار ہونے والی لڑکیاں گھر سے ایسے رخصت نہیں ہوتیں جیسے اور سب ہوتی ہیں۔ آؤ چلو۔"

میں حیران پریشان' شرمندہ اور تذبذب میں جتلا کھڑا رہا "تم بعد میں بھی تو آسکتی ہو؟"

"بعد میں کب؟" وہ بولی "کیا پتا ہم صبح ہونے سے پہلے روانہ ہوجائیں۔"

"صبح ہونے سے پہلے۔ چار گھنٹے میں!"

"روانہ ہونے والے چار منٹ میں روانہ ہوجاتے ہیں۔ جیسے میں۔" وہ مسکرائی۔

"مجھے تو یہ ناممکن ہی لگتا ہے۔"

"اگر صبح روانہ ہونے کی نوبت نہ آئی تو کل یا پرسوں۔ موقع ملتے ہی ہم نکل جائیں گے اور اس وقت میں کیسے آؤں گی؟ مجھے موقع نہ ملا پھر کیا ہوگا؟! اچھا اب چلو بھی۔ بابا ہم سے پہلے کار لے کر پیچھے پہنچ جائیں گے۔"

میں کاجل کے ساتھ روانہ ہوا تو مجھے ایسا لگتا تھا جیسے یہ سب خواب ہے۔ میں تو عبدالستار چوہدری سے یہ درخواست کرنے آیا تھا کہ وہ محسن کا سراغ لگانے میں ہماری مدد کرے۔ اس کے بعد صورتِ حال اتنی تیزی سے بدلی تھی کہ اب چند گھنٹوں میں رابعہ اور محسن کے ساتھ واپس اپنے وطن اور اپنے شہر کی جانب سفر کے آغاز کا تصور بھی بعید از قیاس لگتا تھا۔

کاجل دبے پاؤں چلتی ہوئی میرا ہاتھ پکڑے کچن کے راستے باہر نکلی۔ ہم نے مختصر سے پائیں باغ کو طے کیا۔ ایک کتا مجھے دیکھ کر بھونکا۔ کاجل نے اسے ڈانٹ کر کہا "ایڈوائر' چلو واپس۔"

میں نے کہا "اپنے کُتّے کا نام تم نے ایڈوائر کیوں رکھا ہے؟"

"میرا خیال تھا تم سمجھ لوگے" وہ بولی "ایڈوائر وہ شخص تھا جس نے جلیانوالہ باغ میں گولی چلانے کا حکم دیا تھا۔ بریگیڈیر جنرل۔ اس میں میرے دادا کو شہادت نصیب ہوئی تھی۔ تم نے کبھی تصویر دیکھی ہے اس قتلِ عام کی۔"

"ہاں۔ ایک تصویر دیکھی ہے۔ جس میں بہت سے شہید جسم خار دار تاروں کی باڑھ پر لٹکتے نظر آتے ہیں۔ تمہارے بابا کے دفتر میں بھی لگی ہوئی ہے۔"

"بالکل ٹھیک۔ ہمارے پاس وہی ایک تصویر ہے۔ اس میں میرے دادا صاف پہچانے جاتے ہیں۔ وقت نہیں ہے ورنہ تمہیں دکھاتی اور بتاتی کہ دادا کون سے ہیں۔"

...یلی احاطے کے چھوٹے سے گیٹ سے باہر آتے ہی مجھے ...ندیہ صدمے کا سامنا ہوا اور میں نے خود کو شہر میں وارد ہونے ...الے اس دیہاتی کی طرح محسوس کیا جس نے اعتماد کرتے ہوئے ...سی سے مسجد کا پتا پوچھا ہو مگر پتا بتانے والے نے اسے حوالات ...پہنچادیا ہو۔

باہر پولیس کی ایک گاڑی کھڑی تھی اور دیوار کے ساتھ چار ...ولیس والے اپنی بندوقوں کا رخ میری جانب کئے موجود تھے۔ ...یک ڈھول جیسے پیٹ والا سپاہی تھانیدار ثابت ہوا۔ میں نے ایک ...م کاجل کو دبوچ لیا۔ اسے چلانے کی مہلت ہی نہ ملی اور میرے ...ئیں ہاتھ نے اس کی گردن کو جکڑ لیا' دوسرا ہاتھ اس کی کمر اور پیٹ ...ے گرد حائل ہوگیا۔ اس کے وجود کی ساری نرمی اور تپش یکلخت ...بے معنی ہوگئی اور میرے لئے اس کی حیثیت ایک دغا سرشت ...وائف کے سرد' پتھر دل وجود سے زیادہ نہ رہی۔ وہ مچلی اور تڑپی مگر ...ود کو چھڑا نہ سکی۔

ایک پولیس انسپکٹر نے پنجابی میں کہا "اوئے پاگل دے پُتر۔ ...چھڈ ایہوں۔"

میں نے کہا "میں اسے جان سے ماردوں گا۔ کہاں ہے اس کا ...دغلی نسل کا کُتا باپ۔"

عبدالستار چوہدری گاڑی سے کود کے اترا "سکندر! خدا کے لئے عقل سے کام لو۔"

میں نے کہا "اب عقل آئی ہے مجھے۔ پہلے میں جذبات کی رو ...میں بہہ گیا تھا۔"

"سکندر! یہ اپنے لوگ ہیں" چوہدری نے کہا "یہ تمہیں گرفتار ...کرنے نہیں آئے ہیں۔"

کاجل نے بڑی مشکل سے سر کو اوپر نیچے حرکت دی۔

میں نے بے یقینی کی کیفیت میں پولیس والوں کو دیکھا "جھوٹ بکتے ہو تم۔ کیا ثبوت ہے کہ یہ بھی دھوکا نہیں ہے؟"

انسپکٹر نے کہا "او یار! ہم تو لینے آئے ہیں تمہیں۔ تھانے میں ...بڑے آرام سے رکھیں گے۔ تیری ایسی خاطر تواضع کریں گے کہ تو ...یاد رکھے گا۔"

میں نے چوہدری سے کہا "سن لیا تم نے۔"

چوہدری نے کہا "یہ مذاق کررہا ہے' یہ تم کو بحفاظت لے جائیں گے اور جہاں تم کہو گے پہنچادیں گے۔ رابعہ اور محسن بھی ...انہی کے مہمان ہیں۔"

میں نے کہا "اور کس حال میں ہیں! یہ بھی بتادو۔ جو ان کے ...مہمان ہوتے ہیں ان کی میزبانی فرشتۂ اجل کرتا ہے۔"

انسپکٹر ہنس پڑا "میاں جی۔ تم کو بڑا تجربہ ہے حوالات میں قیام ...فرمانے کا۔ مگر ہم چھتر نہیں قورمہ تے بریانی کھلائیں گے تمہیں۔ ...کھا کھا کے سؤر ہوجاؤ گے ہماری طرح۔ ہم بھی پاکستانی ہیں یار اور ...تمہارے تو سکے ہیں۔"

"سکھے.....؟"

"ہاں۔ سکھے یعنی FAN۔ تُو بڑا ہی ڈاڈا بندا ہے بھئی۔ اچھا ٹکرا ہے دلاور جیسے..... کے یاروں کو۔ بڑی واہ واہ کرتے تھے ہم کہ ساری قوم اگر سکندر ہوجائے تو ہم دنیا فتح کرلیں پچی پچی....."

"میں تم پر اعتبار نہیں کرسکتا۔" میں نے کہا۔

"اچھا بھئی۔ تیری مرضی۔" وہ بولا۔

اسی وقت پیچھے سے دو افراد نے مجھے دبوچ لیا۔ وہ اتنی خاموشی سے آئے تھے کہ میں نے قدموں کی آہٹ تک محسوس نہیں کی تھی۔ وہ تھے بھی میاں والی کے لمبے تڑنگے جوان جو مجھ سے بھوت کی طرح چمٹ گئے۔ موقع پاتے ہی کاجل تڑپ کر میری گرفت سے نکل گئی اور ڈھول سپاہی یعنی تھانیدار نے بڑی پھرتی سے آگے بڑھ کے میرے سر پر ریوالور کا دستہ مارا۔

"اعتبار دا پُتّر" تھانیدار کے آخری الفاظ میں نے کاجل کی چیخ کے ساتھ سنے۔ پھر اس کے باپ نے کچھ کہا جو میری سماعت تک پہنچا مگر سمجھ میں نہ آیا۔ میں بے ہوش نہیں ہوا تھا مگر چوٹ سے میرا دماغ چکرا گیا تھا اور میری آنکھوں کے سامنے اندھیرے میں جگنو اُڑنے لگے تھے۔ دوسرے لمحے چار ہاتھوں نے اٹھا کے مجھے ٹرک میں ڈال دیا۔

میں نے ٹرک کو حرکت کرتا محسوس کیا اور سر کو جھٹکا۔ میرے حواس بحال ہونے لگے تھے۔ اس وقت میں تھوڑی سی مکاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے پوری طرح ہوش میں آنے تک خاموش لیٹا رہتا تو ڈھول کے پیٹ والے انسپکٹر سمیت دو افراد کو باہر پھینک دیتا اور دو کو اپنی جگہ لٹا دیتا مگر اس وقت عقل بھی میری دشمن ہورہی تھی اور میں عقل کا۔ میں نے سر اٹھایا ہی تھا کہ کوئی سخت چیز پھر میرے سر پر لگی اور میں نے تھانیدار کی آواز بہت دور سے آتی ہوئی سنی "بڑی سخت چیز ہے بھئی" پھر میں اندھے کنویں میں گرتا گیا اور سب آوازیں معدوم ہوگئیں۔

ہوش . انے پر میں نے بلاارادہ فلمی اداکاری کی۔ آنکھیں کھولتے ہی میں نے چاروں طرف دیکھا اور کہا "میں کہاں ہوں؟"

"آپ جہنم میں ہیں۔ اپنے اعمال کی وجہ سے۔" کسی فرشتے نے کہا۔

میں فرشتے کی اردو سن کے بہت حیران ہوا۔ کیا وہ دوسری دنیا میں پہنچنے والے ہر شخص سے اس کی مادری یا فادری زبان میں بات کرتے ہیں۔ پھر مجھے اس لغو اور بے سروپا خیال نے حیران کیا جو بالکل پاگل ہوجانے والے کسی شخص کے دماغ میں ہی آسکتا تھا۔ مگر میں پاگل نہیں ہوا تھا۔ بس ہوش کی باؤنڈری پار کرگیا تھا' اس بال کی طرح جسے ظہیر عباس کے بیٹ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہو۔ اب میں کسی فیلڈر کے ہاتھ میں تھا اور واپس ہوش میں آرہا تھا۔

روشن ہوکے دھندلکے میں غائب ہوتے چہرے آخر کار میری

نظرے فوکس میں آنے لگے۔ اس کے بعد پھر مجھے شک ہوا کہ میں فوت ہو چکا ہوں۔

میں نے کہا "کیا یہ عالم ارواح ہے؟ تم یہاں کیسے پہنچے اور کب پہنچے مسٹر محسن شیردانی۔"

"میں براستہ ڈھاکا تشریف لایا تھا' اسی فلائٹ سے جو بعد میں آپ نے پکڑی" محسن بولا "دنیا کا کیا حال ہے؟ تمہاری بیوہ اور اس کی جملہ پیداوار' یعنی صبرِ جمیل وصول کرنے والے لواحقین کتنے ہیں؛ تیرے دنیا سے کوچ کرنے پر خوش تو ہوں گے کہ کروڑوں کے وارث بن گئے۔"

میں ایک دم اٹھ بیٹھا "محسن...... تُو...... یہ تُو ہے؟"

"اے بھائی کبیر خان! چھوڑ مجھے۔ کیا سچ مچ مجھے اپنے آباد اجداد میں شامل کرے گا؟" محسن نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی' "بھیا' میری روح کو بدروح مت بنا۔"

میں نے کہا "مجھے یقین نہیں آتا محسن...... تُو ٹھیک ہے نا؟"

محسن ہنسا "ابھی تک تو ٹھیک تھا۔ آگے تیری مرضی۔ چھوڑ دے' مجھے نہیں تو میں ڈھول سپاہی کو بلاتا ہوں۔"

میں نے کہا "کون ڈھول سپاہی؟" میں نے اسے چھوڑ دیا۔

"وہی جو تیرا جنازہ یہاں لایا تھا" محسن بولا "میرا تو خیال تھا اتنے دنوں میں تُو عاقل و بالغ ہو گیا ہو گا مگر افسوس! تُو وہی کے تو ہے۔"

میں نے کہا "محسن! مذاق مت کر' مجھے بتا ہم کہاں ہیں۔ دوسرے لوگ کہاں ہیں؟"

"حیا آتی ہے رابعہ کا نام لیتے ہوئے۔ تُو واقعی بڑا شرمیلا بچہ ہے۔" محسن بولا اور جس بستر پر میں لیٹا ہوا تھا اس کے قریب پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"اگر ہم قید میں ہیں تب بھی یہ بڑے سکون اور قرار کی بات ہے کہ ہم کو شامت اعمال نے یکجا کر دیا ہے" میں نے کہا "میں تو سمجھتا تھا کہ اب اس دنیا میں شاید ملاقات ہی نہ ہو۔ یہ کون سی جگہ ہے؟"

"یہ تیسری دنیا ہے" محسن بولا "ایک دنیا وہ تھی جس میں ہم نے سرزمینِ پاکستان پر قدم رنجہ فرمانے تک قیام کیا۔ دوسری وہ جس میں ہم چوہدری دلاور اینڈ کمپنی سے لڑتے رہے' مرتے رہے اور مر مر کے جیتے رہے' بچھڑتے رہے اور بھٹکتے رہے۔ یہ تھانے کا گوشۂ عافیت ہے۔"

"تھانہ اور گوشۂ عافیت؟"

"کیا صحرا میں نخلستان نہیں ہوتے؟" محسن بولا "تُو دیکھ سکتا ہے کہ ہم حوالات میں نہیں ہیں۔ مگر یہ تھانے کا ہی ایک کمرا ہے جسے بطور خاص ہمارے لئے گیسٹ ہاؤس میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے۔ تُو بول کیا کھائے گا؟"

"یہاں کا مینو تو وہی ہو گا۔ تیرہ نمبر کا چھتر۔ ڈنڈا وہ سرخ مرچ۔ الیکٹرک شاک۔ لاتیں مُکّے گالیوں کی سلاد کے ساتھ۔"

محسن ہنسا "تجھے یقین نہیں آتا؟ اچھا دیکھ تماشا۔"

اس نے چیخ کر کہا "اُلو کا پٹھا۔"

ایک دُبلا پتلا شخص دوڑتا کانپتا آیا "آپ آواز دیا شور۔"

"شور نہیں' سر بولو۔"

"شر......" بنگالی بڑی مشکل سے بولا۔

"میں نے تم سے کہا تھا چائے لاؤ۔ اس کے ساتھ مکھن' سلائس اور انڈے......"

بنگالی کی حالت غیر ہو گئی "کب بولا......"

"جب تم سو رہا تھا۔ ابھی جاگ رہا ہے یا نہیں؟" محسن نے ڈانٹا۔

"ایک دم جوگ رہا ہے شور۔ ایک دم۔" بنگالی نے کہا اور رفوچکر ہو گیا۔

میں نے کہا "تُو اس کا نام لے کر اسے کیوں نہیں بلاتا؟"

محسن ہنسا "میں بلند آواز میں کچھ بھی کہوں۔ بینگن کا بھرتا' گدھے کا سینگ۔ یہ حاضر ہو جاتا ہے۔ میں نے اسے سو پیاز اور سو جوتے کھا کے ہلاک ہونے سے بچا لیا۔ اپنی سفارش پر۔"

"اس کا کوئی نام تو ہو گا۔"

"ہے۔ استجاب الزماں۔ میرے حلق میں پھندا لگ جاتا ہے پورا نام لینے سے' اس لئے آسان نام سے پکارتا ہوں۔"

"تو نے کب کہا تھا اسے چائے لانے کا؟"

"ابھی تیرے سامنے کہا ہے نا۔ باقی تو ایسے ہی کچھ تھانے کی فضا کا اثر ہو گیا ہے مجھ پر" محسن بولا۔

میں نے کہا "فضول باتیں چھوڑ۔ یہ بتا رابعہ کہاں ہے۔"

"الحمد للہ بالکل خیریت سے اپنے گھر میں شاد و آباد ہے۔ چار بچے ہیں اس کے صرف دو سال میں۔ اس کا میاں دال چاول آڑھتی ہے۔ خوب کھچڑی پکتی ہے ان کی......"

میں نے کہا "تاریخ میں پہلی بار تھانے جا کے دوست کے ہاتھوں دوست مار کھائے گا۔ اسی کوالٹی کی جو تھانے دار کے ہاتھوں چوری کے جھوٹے الزام میں پکڑا جانے والا کھاتا ہے۔ شرافت سے سنجیدہ ہو کے بات کر ورنہ۔"

میں نے جملہ مکمل ہونے سے پہلے محسن کو اٹھا لیا اور تھوڑا اچھال کے اپنے بیڈ پر گرا دیا۔ وہ ہنسنے لگا۔ ہنستے ہنستے رونے لگا۔

"قسم خدا کی' میں پھر زندہ ہو گیا ہوں۔ ورنہ میں مر گیا تھا تم سے بچھڑ کے۔ پتا نہیں کتنی بار سوچا کہ خودکشی کر لوں۔ پھر خیال تم سب کا۔ کہ تمہیں دکھ ہو گا اور گلہ ہو گا۔ مایوسی ہو گی کہ محسن کم ہمت تھا۔ بس اسی خیال نے مجھے ہر دن کا عذاب کاٹنے کا حوصلہ دیا۔"

"ہم جنگ ہار گئے ہیں محسن" میں نے اپنے آنسو پی کے کہا۔

"ایسی کی تیسی جنگ کی۔ ہم زندہ ہیں اور پھر مل گئے ہیں ہماری زندگی پھر مل گئی ہے ہمیں جو ہم سے روٹھ گئی تھی۔ اور ہار جیت کیا چیز ہے کبیر خان! اصل چیز ہے نظریئے اور اصول پر یقین۔ ہم اس لئے نہیں ہارے ہیں کہ ہم اس یقین میں غلط نہیں تھے چنانچہ آج پشیمان نہیں ہیں۔ ہمیں اپنے کئے پر ندامت نہیں' فخر ہے۔ ہم نے اپنی بساط سے بڑھ کر کیا۔ باقی سب سیاست ہے یا کچھ اور۔ ہمیں اس سے کیا......"

میں نے کہا "محسن! کیا رابعہ بھی ہے یہاں؟"

"ہاں۔ وہ سب ہوٹل گئے ہیں۔" محسن بولا۔

"کون سب؟"

"جو تجھے یہاں لائے تھے۔ ہمارے میزبان۔ رابعہ کو اس لئے ساتھ لے گئے ہیں کہ کہیں تازو ایک آدھ بندے کی دو چار ہڈیاں نہ توڑ دے۔ یار' اپنے مرزا غالب دھائیں دھائیں پستول نہ داغنے لگیں۔ تیری طرح مزاحمت تو وہ بھی کرتے' اگر پولیس انہیں گرفتار کر کے لاتی۔ اب پہلے رابعہ انہیں سمجھائے گی اور چند منٹ بعد چھاپا پڑ جائے گا۔"

"یہ اصلی پولیس والے ہیں؟"

"بالکل اصلی۔ گرفتاری ایک ڈراما ہے پبلک کو خوش اور متاثر کرنے کے لئے۔ چوہدری اپنی پوزیشن محفوظ رکھتا ہے۔"

"مگر رات کے وقت کون دیکھ رہا تھا؟ جب مجھے لایا گیا تھا۔"

"آپ کاجل کے ساتھ یک جان دو قالب نہ ہوتے تو کچھ نہ ہوتا۔ بے شک لڑکی اچھی ہے مگر آدمی کو جذبات پر قابو ہونا چاہئے۔ بنگال کی سوغات ہے۔ اپنے ساتھ لے جائیں گے۔"

میں نے کہا "تُو کر لے عقد ثانی اگر اچھی لڑکی ہے۔ مجھے رابعہ کافی ہے۔"

بات کے زبان سے نکلتے ہی مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا مگر یہ کمان سے نکلا ہوا تیر تھا جو سیدھا محسن کے دل میں پیوست ہو گیا۔

اس کا مسکراتا چہرہ ایک دم غم کے تاریک سائے میں ڈوب گیا۔ وہ خلا میں غیر موجود' متحرک یادوں کے آسیب دیکھ رہا تھا' جو اس کے ماضی کے قبرستان سے بدروحوں کی طرح نکل آئے تھے۔ ابھی وہ حال میں زندہ تھا کہ میں نے اسے ماضی میں لے جا کر مار دیا۔

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا "محسن!"

وہ بُت بنا بیٹھا رہا۔ اس کی صورت دیکھ کے مجھے خوف آنے لگا۔

"محسن!" میں نے اسے جھنجوڑا "ایسے مت دیکھ مجھے۔ کچھ بول۔ مجھے بتا میں کیا کروں؟ مجھے سزا دے میرے جرم کی۔ یہ سب میری وجہ سے ہوا تھا۔ میں۔ میں نے تجھ سے تیری زندگی کی روشنی چھین لی۔ میں قاتل ہوں شہلا کا" میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

محسن نے میرا ہاتھ پکڑ لیا "ایسا مت کہہ سکندر۔ تیرے آنسو دیکھ رہی ہے شہلا۔ اور دیکھ' کتنی دکھی ہے وہ۔ اسے میں کبھی نہیں رویا۔ خدا نے مجھے حوصلہ دیا۔ صبر دیا اور قوتِ برداشت عطا کی۔ یہ احسان تھا اس کا۔ پھر میں ناشکرا پن کیسے کرتا؟ زندگی اسی کا نام ہے سکندر' اور اس سے سمجھوتا کرنا ہی پڑتا ہے۔ یہ کسی انسان کے نہیں' تقدیر کے فیصلے ہوتے ہیں جن سے فرار ممکن نہیں۔ کوئی بھی نہیں جانتا کہ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے کیوں ہوتا ہے۔ شہلا کو جانا ہی تھا تو وہ میری زندگی میں کیوں آئی تھی اور جاتے وقت وہ مجھے ساتھ کیوں نہیں لے گئی۔ اپنے بیٹے سے اسے زیادہ پیار تھا' یہ میں ضرور پوچھوں گا اس سے میدانِ حشر میں۔ لیکن وہ بیچاری کیا جواب دے گی۔ اس کے اختیار میں کیا تھا؟"

فرطِ غم سے میرا دل پھٹنے کے قریب تھا مگر میں فولادی اعصاب اور چٹان جیسا حوصلہ رکھنے والے اس انسان کو دیکھ رہا تھا جس نے حالات سے شکست کھانے سے انکار کر دیا تھا اور حقیقت کی بے رحمی کے سامنے اپنے یقین کی استقامت کے ساتھ ڈٹا رہا تھا۔ شاید اس کی جگہ میں ہوتا تو پاگل ہو جاتا مگر یہ بھی میرا خیال تھا۔ قدرت کے حسنِ انتظام نے بقا کی جدوجہد کرنے والے انسان میں ایسی مافوق الفطرت قوتوں کو مخفی رکھا ہے جن کا ادراک خود اسے نہیں ہوتا۔ جب تک کہ حادثات و صدمات کی یلغار میں اس کے لئے حوصلے کے آخری تنکے کا سہارا لینا بھی ممکن نہ رہے' تب اچانک اسے کوئی دستِ غیب سپرٹین بنا دیتا ہے۔ چوہے میں بلی سے لڑ جانے کی طاقت آجاتی ہے' کمزور پرندہ اپنے آشیانے کو بچانے کے لئے انسان پر حملہ کر دیتا ہے۔ کنجشک فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دے۔ یہ علامہ اقبال نے ایسے ہی نہیں کہا تھا۔ محسن اتنا بڑا صدمہ جھیل کر بھی پاگل نہیں ہوا تھا۔ وہ مجھ سے زیادہ پُرسکون تھا۔

میں شہلا کے بارے میں باتیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ سب باتیں جو صرف محسن کے لئے تھیں۔ اسی طرح محسن کا بس چلتا تو وہ مجھ سے اور کوئی بات ہی نہ کرتا لیکن عملاً ہم دونوں نے بزدلی کا ثبوت دیتے ہوئے فرار میں پناہ تلاش کی۔ مجھ سے پہلے خود محسن نے موضوع بدل دیا۔

اس نے کہا "بہت دیر ہو گئی انہیں گئے ہوئے۔"

میں نے کہا "یہ رابعہ کیسے پہنچ گئی واپس؟"

"میں نے بلوا لیا۔ ابھی گزشتہ ہفتے ہی تو آئی ہے۔"

"گزشتہ ہفتے تو کہاں تھا؟"

"جہاں اب ہوں" وہ بولا "مگر اکیلا تھا۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ رابعہ کو بلا لوں کہ آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں۔ تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل۔ گل کی بات پر یاد آیا' گل بانو عرف ناگ منی اب کیسی ہے؟"

"اب کا کیا مطلب؟ وہ گل بانو ہی ہے۔ مجھے رابعہ کے بارے میں بتا۔ اس نے تیری کیسے مان لی؟"

"زمانہ خراب ہے دوست۔ سچ کوئی نہیں سنتا۔ جھوٹ کا سکہ چلتا ہے۔ میں نے بھی جھوٹ کا سہارا لیا کہ سکندر اعظم ہندوستان فتح کرتا ہوا بنگال پہنچا ہی چاہتا ہے۔ آؤ اس کا استقبال کریں۔ وہ بھی جیسے بہانہ ہی ڈھونڈ رہی تھی۔ بھاگی چلی آئی۔"

"اور اگر میں نہ آتا۔ پھر؟"

"پھر کیا، ہم انتظار کا آدھا آدھا دکھ بانٹ لیتے مگر تُو دیکھ کہ جھوٹ بھی نیک نیتی اور خلوص کے ساتھ بولا جائے تو سچ کی طرح اثر کرتا ہے۔"

"کیا مطلب؟ تُو رابعہ کو نہ بلواتا تو میں نہ آتا۔"

"ہاں۔ تُو گرفتار ہو جاتا۔ پولیس کے ہاتھوں یا کاجل کی زلفِ گرہ گیر میں۔ یہ جادوگروں کا دیس ہے۔ کوئی کاجل ہے، کوئی سرمے والی۔"

"گل تیرے لئے سب سے زیادہ پریشان تھی۔ میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ پریشان اور فکرمند ہم سب تھے مگر اس کی حالت......"

"وہ پاگل ہے۔" محسن نے نظر چراتے ہوئے آہستہ سے کہا، جیسے وہ اس موضوع پر بات کرتے ہوئے ڈرتا ہو۔

"سنا ہے تجھے پولیس نے پکڑ لیا تھا۔ پھر ملٹری والے لے گئے تھے۔ جان کیسے چھوٹی ان سے؟" میں نے کہا۔

"چیف کے ٹو! یہاں کے سیاسی و معاشرتی حالات کا تُو نے بھی مشاہدہ کیا ہوگا۔" محسن بولا "بے شک مجیب کے حامی غالب اور بااختیار ہیں اور سکہ بھی انہی کے نام کا چلتا ہے مگر اسکی وجہ عوامی لیگ یا ان کے منشور کی مقبولیت نہیں۔ کچھ اثر مجیب کی شخصیت کا ہے۔ بالکل اسی طرح ہٹلر کی شخصیت نے جرمن جیسی ذہین قوم کی عقل کو مفلوج کر دیا تھا۔ باقی ان کی دہشت ہے۔ وہ انتہا پسند جنونی اور خونی انتقام کے جذبات سے مغلوب ہیں۔ نہ مخالفت برداشت کرتے ہیں اور نہ پاکستان کی حمایت، خواہ وہ جائز ہو۔ اکثریت کو مظلومیت، احساسِ محرومی نا انصافی اور استحصال کی شکایت ضرور ہے مگر اس کا علاج وہ پاکستان سے علیحدہ کسی ریاست کے قیام کی صورت میں نہیں چاہتے۔ اکثریت میں ابھی وہ لوگ ہیں جو پاکستان بنانے کے سارے عمل میں شریک تھے اور یہ نہیں سمجھتے کہ ان سے کوئی سیاسی غلطی سرزد ہوئی تھی۔ وہ مجیب کے بنگلہ دیش کو ایک سیاسی المیہ سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک جسم کے کسی بیمار عضو کا واحد اور پہلا علاج یہ نہیں کہ اسے کاٹ کے الگ کر دیا جائے۔ سیاسی مسائل بات چیت، مذاکرات، احتجاج اور مظاہروں کے دباؤ سے بھی حل کئے جاتے ہیں۔ حالات اتنے برے بھی نہیں کہ پھر آزادی کا مطالبہ کر دیا جائے۔ بھئی ابھی تو آزادی حاصل کی ہے انگریز سے۔ چوتھائی صدی بھی نہیں گزری۔"

"چوتھائی صدی بیت چکی ہے۔" میں نے کہا۔

"آج واقعی پچیس سال سے زیادہ ہو گئے ہیں مگر علیحدگی کا نعرہ تو بہت پہلے لگا دیا گیا تھا۔" محسن بولا "میں اپنی زندگی کا منحوس ترین دن سولہ دسمبر کو شمار کرتا ہوں جب بنگلہ دیش نے اعلانِ آزادی کیا تھا۔ اپنوں سے کیسی آزادی یار۔"

"تو چھوڑ یہ دل دکھانے والی باتیں۔ مجھے یہ بتا کہ ڈھاکا پہنچ کے کیا ہوا تھا۔"

"کچھ نہیں۔ میں چند دن ہوٹل شاہ باغ کے سامنے والے کھمبے پر اپنے پیغام کو خود پڑھتا تھا۔ سارا دن انتظار کرتا تھا اور رات کو ایک پاکستان کے حامی مجاہد کے گھر لوٹ آتا تھا۔ اس مجاہد کی کہانی الگ ہے جو پھر کبھی فرصت میں سناؤں گا۔ میں نے اس کے ساتھ بڑے معرکے سر کئے۔ کئی بار شرپسندوں کو ٹھکانے لگایا اور ان کے عزائم کو خاک میں ملایا۔ بہت سے محصور ہو جانے والوں کو بچایا۔ کچھ کو نہ بچانے کا صدمہ مجھے ہمیشہ رہے گا۔ پھر وہ مجاہد مارا گیا مگر میں بے گھر نہیں ہوا کیونکہ دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں۔ یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں۔ وہ سب گھر میرے ہو گئے تھے جن کو بچانے کی خدا نے مجھے توفیق دی تھی۔ وہ خود کو شکرگزار، احسان مند اور مقروض سمجھتے تھے۔ میں جب گھر بدلتا تھا تو ان کا پتا فرنچ میں لکھ آتا تھا۔ اس طرح کہ کوئی سمجھ بھی لے تو براہ راست وہاں تک نہ پہنچ پائے۔ اول تو مطلب ہی نہ سمجھے اور سمجھے تو صرف سکندر بخت۔ کوڈ ورڈز میں ہوتا تھا پیغام۔ کئی بار ایسا ہوا کہ اس پر کوئی اپنا اشتہار یا پوسٹر لگا گیا۔ اعلان۔ اطلاع عام۔ خوش خبری۔ اعلان کسی سیاسی جلسے کا۔ اطلاع عام کسی اشتہاری مجرم کے لئے۔ خوش خبری ان جوانوں کے لئے جو ستاروں پر کمند ڈالنے کے بجائے دیگر لغویات میں جوانی لٹا چکے ہوں اور شبِ عروسی میڈیکل میں رہ گئے ہوں۔"

میں ہنس پڑا "یہ وضاحت ضروری نہیں تھی۔"

"میں گیدڑ تو نہیں ہوں پھر بھی شامت مجھے شہر لے آئی۔ مجھے کوئی اندازہ نہ ہوا کہ میں بھی کسی کی نظر میں ہوں۔"

"کون تھی وہ؟" میں نے کہا۔

"تھی نہیں، شکاری تھے۔" محسن بولا "وہ تاڑ چکے تھے کہ یہ بندہ کوئی پُراسرار گیم کھیل رہا ہے۔ انہوں نے مجھے بار بار کچھ لکھ کے کھمبے پر چپکاتے دیکھ لیا ہوگا۔"

"ماشاء اللہ سے آپ بھی اتنے عقل مند ہیں کہ سمجھتے ہوں گے، مجھے تو کوئی دیکھ ہی نہیں سکتا" میں نے کہا۔

"کسی نے کہیں سے ایک فرانسیسی کو پکڑا اور اس سے ترجمہ کرا لیا۔ بس اس کے بعد میری نگرانی ہونے لگی۔ ایک دن، دو دن، ایک ہفتہ، دو ہفتہ، مہینہ پورا ایسے ہی نگرانی میں گزر گیا تو پولیس کا حوصلہ بھی جواب دے گیا کہ آخر یہ آدمی کچھ کرتا کیوں نہیں جو قابل دست اندازیٔ پولیس ہو۔ تنگ آ کے انہوں نے مجھے پکڑا اور بڑی محبت سے پوچھا کہ میاں یہ ماجرا کیا ہے۔"

"کتنی محبت سے؟" میں نے کہا۔

"بس یار، تُو جانتا ہے ان کی محبت کو" محسن نے آہ بھری "وہ تو رات مجھے بجاتے رہے مگر اللہ کو کچھ اور منظور تھا۔ اچانک کاجل ...دار ہوئی۔ اس وقت ناچیز مرغا بنا ہوا تھا اور نامعقول تھانے دار ...تھا کہ میں انڈا دوں۔ ملاحظہ فرمایا آپ نے ان کی عقل کو۔ ...غے سے اذان دینے کا مطالبہ تو کیا جا سکتا ہے۔ انڈا دینے پر ...س کو مجبور کرتے تو جواز بھی ہوتا۔ کیا شعر ہے وہ۔ پہلے تو روغن ...بھینس کے انڈے سے نکال۔"

"تُو کاجل کی بات کر رہا تھا۔"

"ہاں۔ کاجل بڑی من موہنی لڑکی ہے۔ اس پر کوئی بھی عاشق ...سکتا ہے۔ افلاطون سے مجنوں تک۔ مگر وہ ایک مرغے پر فریفتہ ...ئی جب اسے معلوم ہوا کہ مرغا لاہور کا ہے اور مشکوک ہے یا ...ب ہے......"

"وہ کیا لینے آئی تھی وہاں؟"

"کسی کو پوچھتی ہوئی آئی تھی" محسن بولا "اب یہ تو تجھے معلوم ...کیا ہوگا کہ کاجل غلطی سے ڈھاکا میں پیدا کر دی گئی۔ ورنہ وہ ہے ...ی جہاں کے ہم بھی ہیں۔ اس کا باپ دوغلا ہے۔ ڈبل ایجنٹ۔ ...ے پاکستانی، دماغ سے بنگلہ دیشی۔ ایسے یہاں بہت ہیں۔"

"نفتھ کالم کے لوگ۔"

"ان سب کے درمیان ایک خفیہ رابطہ ہے۔ یہ ایک ...رے کی مدد کرتے ہیں اور پاکستان کے حامی عناصر کو بچانے کے ...نیچے سے اوپر تک قابلِ اعتبار ذرائع استعمال کرتے ہیں۔ یہ ...خطرناک کام ہے۔ پکڑے جاتے ہیں تو پھر ایک نہیں سب ...ے جاتے ہیں مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ایک زنجیر ٹوٹتی ...تو دوسری کا سرا ہاتھ میں آ جاتا ہے۔ کاجل نے باپ سے کہا۔ ...انے پتا نہیں کس سے۔ ایک چوہدری اللہ دتا ہے اپنے لہور ..."

میں چونکا "وہ سالا حرامی۔ اس نے تو مروا دیا تھا مجھے۔"

محسن ہنسا "ابے وہ بڑا فنکار ہے۔ ایکٹنگ ایسی کرتا ہے کہ کوئی ...دھوکا کھا جائے۔"

"یار، ہم نے اس کی معرفت سوا سیر کے قریب سونا بیچا تھا۔ وہ ...ل ایل کو لے آیا۔ لالہ لاجپت للوانی۔ وہ بائیس ہزار دے ...نکلا تو اسے مروا دیا۔ ہم فرار نہ ہوتے تو پکڑے جاتے۔"

"تو نہیں سمجھتا اسے۔ وہ سونا بھی واپس لا دے گا تمہیں۔"

"کیا؟ سونا واپس لا دے گا؟" میں نے کہا "نہیں محسن۔ وہ بڑا ...ن سونا ہے۔ لعنت اس سونے پر۔ گل اور نازو ٹھیک ہی کہتی ...تھیں میں پہلے ان کا مذاق اڑاتا تھا مگر......"

"مگر کیا؟ اب تُو قائل ہو گیا ہے اس نظریے کا کہ سونا منحوس ...ہے۔ حالاں کہ ہر مبارک موقع پر پہنا جاتا ہے۔ سونا صرف ...زرد رنگ کی دھات ہے اور عورت کی کمزوری ہے۔"

"اچھا پھر کیا ہوا؟ کاجل نے کیا تیر مارا۔"

"اِک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے۔ تُو جانتا ہے کہ میرا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ ہے مگر اثر وقتی سا ہوتا ہے۔ تیر اس کے باپ نے مارا۔ اس نے مجھے ملٹری والوں کے پاس پہنچا دیا۔ چولھے سے نکال کے بھاڑ میں جھونک دیا گویا۔ کم سے کم میں یہی سمجھا تھا پہلے۔ مگر وہ بڑا شاطر ہے۔ اس نے بہت دیکھ بھال کے انتخاب کیا تھا۔ اس یونٹ کا کرنل اور تقریباً ساری نفری پاکستانی تھی۔ دو بنگالی تھے مگر پاکستان کے حامی۔ کاجل تو ہمیں یوں جانتی ہے جیسے ہمارے ساتھ رہی ہو۔ اس نے باپ کے ذریعے ہمارے تحفظ کو یقینی بنایا۔ ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لئے ہی پولیس نے خاکسار کی کھال میں بھُس بھرا تھا۔ تھانے دار بعد میں معافی مانگ رہا تھا اور اپنی مجبوری بتا رہا تھا۔ حرام زادہ۔ میرے ساتھ جتنے جیب کترے، چور پکڑے جاتے تھے، انہیں بھی میرے برابر راشن ملتا تھا جوتا کاری کا۔ کاجل کی معرفت مجھے اطلاع مل گئی تھی کہ مجھے تھوڑی سی ہمت اور قوتِ برداشت سے کام لینا ہوگا۔ مجھ سے جرح تفتیش ضرور کی جائے گی مگر یہ رسمی کارروائی کرنے والے بھی کیا کریں۔ وہ مجبور ہیں۔ ان کے اوپر نگرانی کرنے والے بیٹھے ہیں جو نتائج مانگتے ہیں، اعلیٰ کارکردگی کی توقع رکھتے ہیں۔۔ ملٹری فیلڈ انٹیلی جنس یونٹ میں ایک لیفٹیننٹ سخت متعصب قسم کا قوم پرست تھا۔ ایک دن اس نے تفتیش کی۔ بس یار اس دن تو واقعی کلمہ پڑھ لیا تھا میں نے۔ دراصل اس دن کرنل کہیں ہائی کمان کی میٹنگ میں تھا اور سیکنڈ ان کمانڈر کے ہاتھ میں سارے معاملات تھے ورنہ ایسا نہ ہوتا۔ عام طور پر جو لوگ تفتیش کرتے تھے وہ مجھے الگ کمرے میں لے جا کے بالکل بدل جاتے تھے۔ وہ تفتیش کا سارا شور و غل ریکارڈ کرتے تھے۔ جو تم بیزار اور گالی گلوچ کی آوازیں۔ میری فریاد و فغاں۔ ایک ریڈیو ڈراما ہوتا تھا جس میں صوتی اثرات کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ بعد میں یہ رپورٹ کرنل کو پیش کی جاتی تھی۔ میں جب کرنل کے سامنے جاتا تھا تو ظاہر یہ کرتا تھا کہ دم واپسیں بر سرِ راہ ہے۔

پھر ایک دن مجھے رات کے وقت بلایا گیا۔ مجھے معلوم ہے وہ بھی ڈراما تھا۔ میری پیشی کرنل صاحب کی خدمت میں کی گئی۔ مجھے بتایا گیا کہ میرا سمری کورٹ مارشل ہوگا۔ اس میں سیکنڈ ان کمانڈر اور ایڈ جوٹنٹ بطور معاون شریک ہوئے۔ میری فرد جرم پڑھ کے سنائی گئی۔ مجھ پر الزام تھا کہ میں جاسوسی اور تخریب کاری کی غرض سے بنگلہ دیش آیا تھا اور میرا جرم ثابت ہو چکا ہے چناں چہ مجھے سزائے موت دی جاتی ہے۔ یہ سب کچھ ایک گھنٹے میں ہو گیا۔ استغاثہ کا بیان، فرد جرم، میرا صفائی کا بیان اور فیصلہ۔ اپیل کی گنجائش ہی نہ تھی۔ مجھے صبح پانچ بجے گولی مار دینے کا حکم صادر کرنے کے بعد سمری کورٹ مارشل ختم ہو گیا اور مجھے ایک طرح سے ڈیتھ سیل میں پہنچا دیا گیا۔ اس رات میری عجیب ذہنی کیفیت تھی۔ کاجل کی طرف سے یقین دہانی پر میرا اعتقاد متزلزل ہو رہا تھا۔

مجھے یوں لگتا تھا جیسے یہ ڈراما نہیں حقیقت ہے اور مجھے واقعی صبح پانچ بجے گولی ماری دی جائے گی۔

چار بجے کے قریب دو فوجی آئے اور مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ ایک کیپٹن نے میرے ہاتھ میں ریوالور دیا "لو۔ اب بھاگ جاؤ۔"

میں نے حیرانی سے کہا "بھاگ جاؤں! یعنی فرار ہو جاؤں؟"

"ہاں۔ تمہارے فرار کے سب انتظامات مکمل ہیں" کیپٹن نے کہا "ہم نے بائیں طرف سے خاردار تاروں میں راستہ بنادیا ہے۔ یہ جوان تمہیں راستہ دکھائیں گے۔"

میں نے کہا "فرار ہو کے میں کہاں جاؤں گا؟"

کیپٹن نے مجھے ایک نقشہ پکڑا دیا جو سادہ کاغذ پر پینسل سے بنایا گیا تھا "یہاں تم کو ایک کار ملے گی۔ ڈارک براؤن مرسیڈیز۔" اس نے مجھے نمبر بھی بتادیا تھا جو اَب مجھے یاد نہیں مگر وہ عبدالستار چوہدری نے بجھوائی تھی اور اسے کاجل چلا رہی تھی۔ کیپٹن نے مزید کہا کہ جیسے ہی مجھے فرار کا سگنل ملے گا' گارڈ فائرنگ شروع کردیں گے اور تم مارے جاؤ گے۔"

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا "مارا جاؤں گا!"

کیپٹن مسکرایا "حوصلے سے کام لو جوان۔ فائرنگ تم پر نہیں ہوگی۔ عین اسی وقت ایک اور ملزم کو فرار کا موقع فراہم کیا جارہا ہے۔ وہ ایک ہسٹری شیٹر قسم کا بدمعاش ہے جس پر قتل و خونریزی کے متعدد الزامات تھے مگر پولیس نے اسے کھلی چھٹی دے رکھی تھی۔ اسے قربانی کا بکرا بنایا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ دائیں طرف جائے' اُدھر سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں۔ وہ عین باڑھ کے قریب گولیوں کا نشانہ بن جائے گا۔ اپنے کپڑے اتاردو۔ یہ کپڑے قربانی کا بکرا پہنے گا۔"

میں نے کہا "کیا میں ارشمیدس کی طرح بھاگوں؟"

کیپٹن سمجھا نہیں چناں چہ مجھے بتانا پڑا کہ لباس کے بغیر میں نہیں بھاگ سکتا۔ میں تو شرم سے زمین میں گڑ جاؤں گا۔ اس نے کہا کہ اندھیرے میں کون دیکھنے والا ہے اور جان بچانے کے لئے اتنا تو کرنا ہی پڑے گا۔ بس بھائی کبیر خان! اس رات بے شرمی کی انتہا ہوگئی۔ میں ایسے ہی بھاگا اور ابھی میں خاردار تاروں کی باڑھ سے نکلا بھی نہ تھا کہ تڑتڑ گولیاں چلنے لگیں اور محافظوں کی سیٹیاں گونجنے لگیں۔ سرچ لائٹس روشن ہوگئیں مگر کسی کا رخ میری طرف نہیں ہوا۔ میں اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے براؤن کار تلاش کررہا تھا۔ براؤن رنگ کا تو خاک پتا چلتا مجھے مگر کار میں نے دیکھ لی۔ اس کا انجن اسٹارٹ تھا۔ اس وقت تک مجھے یہ علم نہیں تھا کہ اسے چلانے والی کاجل ہوگی۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور دروازہ کھول کے کار میں گھس گیا۔ جب کاجل ہنسی تو مجھے صورتِ حال کے انتہائی قابلِ اعتراض ہونے کا احساس ہوا اور میں کیا بتاؤں۔ زندگی میں اتنی شرمندگی میں نے کبھی نہیں اٹھائی تھی۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا کہ ستر پوشی کے لئے کچھ ہو مگر کار میں کیا ملتا۔ کار اندھیرے میں دوڑتی جارہی تھی اور کاجل مجھے تسلی دے رہی تھی کہ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ مجھے سخت طیش آیا اور میں نے کہا کہ اچھا پھر تم بھی میری طرح ہو جاؤ۔"

ہنستے ہنستے میرا بُرا حال ہوگیا "اگر وہ ہو جاتی پھر؟"

"میں چلتی کار سے کود جاتا" محسن نے کہا "اور دوڑتا ہوا رضاکارانہ طور پر پاگل خانے پہنچ جاتا۔ بڑی عجیب و غریب صورتِ حال تھی۔ مگر کچھ دیر بعد میری عقل ٹھکانے آئی تو میں نے کار کا سیٹ کور اتار کے پہن لیا۔

"وہ کیسے؟"

"بس پہن لیا۔ ضروری حصے پر اسے لپیٹ لیا' غیر ضروری حصے بہر حال جامے سے باہر رہے۔ تُو نے دیکھا ہے کبھی کسی کو سیٹ کور میں ملبوس؟ ایسا لگ رہا تھا میں جیسے کسی افریقی قبیلے کا پہلوان اکھاڑے میں اترنے والا ہو۔ کوئی زولو ڈانس کرنے کے لئے۔ اسی خلعتِ فاخرہ کے ساتھ میں عبدالستار چوہدری کے دردولت پر پہنچا اور ان کی خدمت میں پیش ہوا۔ کاجل نے راستے میں تو ذرا بھی نوٹس نہیں لیا۔ وہاں کھی کھی کرنے لگی کہ بالکل ٹارزن لگ رہے ہو جو ایسے ہی سوٹ میں شاخ سے لٹک کر جھولتا ہوا باقی اردو سرے درخت تک جاتا ہے۔ میں نے بڑی متانت سے فرمایا کہ سیٹ کور دوسرا حصہ اتار کے والد صاحب قبلہ کے لئے بھی ایسا ہی سوٹ بنوالو۔ والد صاحب نے خاصا برا مانا مگر پھر مجھے زیرِ زمین کرا دیا۔ وہاں ایک انڈر گراؤنڈ فلور ہے پورا۔ دو ہفتے میں وہاں روپوش رہا۔ سرکاری طور پر میں وفات پا چکا تھا۔ میں نے سزائے موت عدالتی فیصلے پر عمل درآمد سے پہلے ہی مرنے کا فیصلہ کیا اور محافظ کو دھوکا دے کر بھاگا مگر باڑھ عبور کرنے سے قبل ہی مجھے گولی ماردی گئی۔ میری شناخت کے بعد میری لاش وہیں دفنادی گئی۔ معلومات کاجل کے ذریعے مجھے ملیں مگر اسے شاید چوہدری نے ہوگا۔ مجھے کبھی معلوم نہیں ہوگا کہ وہ کون بدنصیب قربانی کا بکرا جس نے میرے کپڑے پہن کر زندگی کی امید میں موت قبول اسے بھی کہا گیا ہوگا کہ بھیس بدل کے تم آسانی سے ہو جاؤ گے۔ اس کھیل میں زندگی صرف ایک کے لئے تھی اور فال میرے نام نکل چکا تھا مگر وہ نہیں جانتا تھا۔ دو ہفتے تک تمہاری تلاش میں رہی اور اس نے اے ڈی کو بھی اس خدمت پر مامور کیا۔ واضح ہو کہ اے ڈی کاجل کے عشاق میں سرفہرست اور اس حد تک دیوانہ ہے کہ کاجل کہے تو اپنی بیوی کو ہی نہیں کو بھی طلاق دے ڈالے۔ اس کی بیوی اسی وجہ سے ناراض ہو کر چلی گئی ہے۔"

"خبیث مجھ سے کہہ رہا تھا کہ حالات کے پیش نظر فیملی کو واپس بھیج دیا ہے۔ ویسے یار' کیا یہ واقعی پولیس ہے؟"

"نہیں۔ پہلے تھا۔ پھر کسی نے اس کی عمارت پر بم پھینک دیا کیوں کہ یہاں ایک طلبہ تنظیم کے صاحبِ صدر تفتیش کی تاب نہ لاتے ہوئے راہیِ ملکِ عدم ہوگئے تھے۔ تھانے کا کچھ حصہ تباہ ہوگیا۔ تھانہ دوسری عمارت میں شفٹ کردیا گیا۔ اس کے دو کمرے باقی بچے تھے۔ وہ ہمارا گیسٹ ہاؤس بنادیے گئے۔ اس کھنڈر کی طرف کون آتا ہے اور یہ جگہ ہے بھی الگ تھلگ۔ رات کو یہاں فقیر اور چرسی سونے کے لئے آتے ہیں۔ انہیں پہلی رات ہی پکڑ لیا گیا اور اصلی تھانے پہنچادیا گیا۔ وہ ایسے خبیث کہ تین دن بعد پھر موجود۔ ان کا خیال تھا کہ وہ اتفاق سے پکڑے گئے تھے ورنہ ٹھکانہ اچھا ہے۔ یہ اتفاق دوبارہ ہوا تو انہیں یقین آیا کہ وہ بے گھر ہو چکے ہیں۔ پھر ایک رات علی بابا چالیس چور والا کیس ہوگیا۔ لُوٹ مار تو ہر طرف ہو رہی تھی۔ جو پہلے بے روزگار تھے مگر ہمت والے تھے' وہ خاصے فارغ البال ہوگئے۔ اٹھائی گیرے چور اور چور ڈاکو بن گئے۔ چار نو آموز نہ جانے کہاں سے لمبا ہاتھ مار کے آئے تھے۔ مجھے تو پتا بھی نہ چلتا' رابعہ نے جگا کے کہا کہ دوسرے کمرے میں کوئی ہے۔ میں نے چھپ کے دیکھا تو وہ موم بتی جلائے مالِ غنیمت تقسیم کررہے تھے۔ ریوالور میرے پاس تھا۔ میں نے گرج کے کہا' تمہو تمہاری تو ...... اور دھائیں سے پستول داغ دیا۔ وہ ایسے بدحواس ہو کے بھاگے کہ دروازے سے گزرتے ہوئے آپس میں ٹکرا گئے۔ میں نے پھر گولی چلائی۔ میرا خیال ہے ان میں سے ایک تو حوائجِ ضروریہ سے بھی فارغ ہوگیا تھا۔ دوسرے کی دھوتی کھل گئی تھی۔ بھاگتے چور کی لنگوٹی والا محاورہ درست ثابت ہوا۔ رابعہ اور میں جب مال گن رہے تھے تو ان کی حالت کا تصور کرکے ہمیں بار بار ہنسی آتی تھی۔ تقریباً ستر ہزار روپے تھے۔ رابعہ کا خیال تھا کہ پولیس کو ساری بات بتادی جائے اور رقم بھی ان کے حوالے کردی جائے۔ پولیس کے کچھ اہلکار بھی ہماری خدمت پر مامور تھے اور صبح شام حاضری دیتے تھے' ناشتا کھانا لاتے تھے اور ہمارے ہر حکم کی تعمیل کو ان پر فرض کردیا گیا تھا۔ ایک پٹھان تھا' دوسرا سندھی۔ اپنے اپنے گھروں کو یاد کرکے چار چار آنسو بہاتے تھے اور ہم سے پوچھتے تھے کہ واپس جانا بھی نصیب ہوگا یا نہیں۔ میں ہر روز ایک ہی جواب دیتا تھا۔ بے شک ہم سب کو لوٹ کر جانا ہے۔"

"پھر وہ رقم واپس کردی تم نے؟"

"مالِ غنیمت حلال ہوتا ہے۔ اسے حرام خوروں کے حوالے کردیتا؟ وہ کون سا سرکاری خزانے میں جمع کراتے۔ پھر بھی غیر سرکاری ایف آئی آر لکھوانے کے لئے میں نے دس فیصد اثاثے ظاہر کردیے اور وہ خاصے مایوس ہوئے اور میرے بیان پر شک میں بھی مبتلا رہے لیکن زبان سے کیسے کہتے کہ میں اصل رقم گول کر گیا ہوں۔ انہوں نے سات ہزار آپس میں بانٹ لئے صبر شکر کے ساتھ۔ مگر وہ تھے پولیس مین' رات کو آگئے کہ چور پھر آئیں گے تو ان سے تفتیش کے ذریعے اصل رقم معلوم ہو جائے گی۔ صبح تک جماہیاں لیتے رہے اور پہرا دیتے رہے اور بہت مایوس واپس گئے۔"

میں نے ہنس کے کہا "اگر وہ آجاتے اور بتادیتے کہ رقم سات نہیں ستر ہزار تھی۔ پھر؟"

"پھر کیا۔ ہم کہتے کہ صفر اس نے خود لگایا ہے۔ کیا یہ سچا ہے اور ہم جھوٹے؟" محسن بولا "وہ ہم سے ڈرتے بہت تھے۔ معلوم نہیں ان پر کس کا دباؤ تھا۔ یار' یہ رابعہ نہیں آئی باقی لوگوں کے ساتھ۔ مجھے تو اب تشویش لاحق ہو رہی ہے۔"

میں نے کہا "کاجل ان کے ساتھ ہے اور انتظام پکا ہے تو ڈر کیسا۔ یہ بتا کبھی اپنے منظر ایڈووکیٹ سے بات کرنے کا موقع ملا؟"

"ہاں۔ ایک دن عبدالستار چوہدری کے گھر سے فون کیا تھا۔ اطلاع دے دی تھی کہ خیر سے بدھو لَمر کو آنے والے ہیں۔ ان کے سواگت کا خاطر خواہ انتظام رکھنا۔ تمہارے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ میں نے کہا کہ یار مجھے کیا معلوم کہاں ہیں اور کب آئیں گے تو شور کرنے لگا کہ پھر رابعہ کو کیوں بلایا ہے۔ تیری نیت خراب معلوم ہوتی ہے۔ قانونی طور پر سات سال آدمی لاپتا رہے تب اُس کی بیوی مال پر اور کوئی چاہے تو بیوی پر قبضہ کرسکتا ہے۔ اندر ہو جائے گا تو۔ میں نے کہا کہ میں باہر کب ہوں۔ اندر گیا' نیچے مدفون ہوں اور باقاعدہ ہلاک ہو چکا ہوں۔ اس کے اب چودہ بچے ہیں۔ کہتا تھا تیرہ کا عدد منحوس ہوتا ہے۔"

میں نے ہنستے ہنستے پوچھا "اکرام شیخ کی خبر بھی ملی اس سے یا کسی اور ذریعے سے؟"

"وہ وہیں کراچی میں ٹیکسی چلا رہا ہے۔ ایسا وعدے کا پکا ہے کہ ہماری واپسی سے پہلے اسے وزارت کی پیشکش ہو تو ٹھکرا دے گا اور ٹیکسی چلاتا رہے گا۔ البتہ ٹیلر بھی شوہر کے منصب پر فائز کرنے کے لئے طلب کرے تو اس اعزاز سے محروی قبول کرلے گا۔ بس اپنے چوہدری دلاور صاحب کا کچھ پتا نہیں۔ سنا ہے خیر سے واپس پہنچ گئے ہیں۔"

"اب لاہور جا کے ہی خبر لیں گے اُن کی" میں نے کہا۔

اسی وقت محسن کی نظر نے رابعہ کا راز فاش کردیا۔ وہ ایسے نہ مسکراتا تو مجھے معلوم بھی نہ ہوتا کہ رابعہ دبے پاؤں میرے پیچھے آکے کھڑی ہوگئی ہے۔ میں نے ایک دم پلٹ کے دیکھا اور کھڑا ہوا تو بُت بن گیا۔ جیسا کہ ہر بار بچھڑ کر ملنے کے بعد ہوتا تھا۔ الفاظ کام نہ آئے اور جذبوں نے الفاظ کا کام کیا۔

وہ بہت بدل گئی تھی۔ صعوبتوں کے سفر میں تختیِ حالات نے اس کے حسن کو گہنا دیا تھا۔ اب وہ پھر حسن کے ماہِ کامل کی تابانی کے ساتھ وہی رابعہ بن گئی تھی جس کے جمال سے محفل نہیں ساری کائنات روشن ہو جائے۔ میں بھول گیا کہ مجھے اس سے شکوہ کرنا تھا کہ وہ اچانک کیوں چلی گئی تھی۔ پوچھنا اسے بھی بہت کچھ ہوگا مگر وہ بھی صرف دیکھتی رہی۔ پھر اس کی آنکھ سے ایک موتی ٹپکا اور اس کے عارض کے گلابوں پر ٹھہر گیا۔ میرے ضبط کا حوصلہ

جواب دے گیا اور میں نے اسے ایک دم اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

اسی وقت نازو نے کہا "بھئی ہم اندر آ سکتے ہیں؟" اور اس کی شوخ ہنسی نے سارا راز فاش کر دیا۔ اس کے پیچھے پیچھے غالب آ گیا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے یہاں؟" اس نے ڈانٹ کر کہا "کیا سمجھایا تھا تمہیں کہ رونے دھونے کا سین آیا تو شاٹ کٹ۔"

"اور درمیانی فاصلہ تین فٹ سے کم ہوا تب بھی سین کٹ؟" نازو نے بھی دہاڑنا شروع کیا "اتنی رومانٹک فلم نہیں چل سکتی۔"

"اور تم یہ جو مگرمچھ کے آنسو بہا رہے ہو اس کی حقیقت خوب جانتا ہوں میں" غالب بولا "میں نے سب بتا دیا ہے کہ ہجر میں جناب کی جذباتی کیفیت کیا تھی۔ میں لگام اپنے ہاتھ میں نہ رکھتا تو......"

میں جھینپ کر رابعہ سے الگ ہو گیا تھا۔ رابعہ کا رنگ بھی لال پڑ گیا تھا اور وہ آنسوؤں کے ساتھ مسکرانے لگی تھی۔

"بڑے بدمعاش ہو تم دونوں" میں نے کہا۔

"لو۔ الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ کتنی شرافت سے کھڑے ہیں ہم، ایک دوسرے کی طرف دیکھ بھی نہیں رہے ہیں چوری چوری" غالب بولا۔

"یہ کیا نامعقولیت تھی" میں نے کہا "چھپ کر دیکھ رہے تھے اور پرائیویٹ باتیں سن رہے تھے ہماری۔ شرم آنی چاہئے تمہیں۔"

"افسوس! شرافت کا زمانہ نہیں رہا" محسن بولا "ہم نے تو خصوصی اجازت دی تھی مشروط طور پر کہ بچھڑے ہوئے مل لیں۔"

میں نے کہا "کاجل کہاں ہے؟"

محسن بولا "جواب دو رابعہ! تم سے پوچھا ہے۔ نینوں کا کجرا کہاں گیا......"

میں نے کہا "اب تو مار کھائے گا۔"

"بھئی یہ اسے پوچھ رہے ہیں، جس کے ساتھ تھے، جب رابعہ یہاں نہیں تھی" نازو نے معنی خیز انداز میں کھنکار کے کہا۔

میں نے کہا "چھاج بولے سو بولے، چھلنی کیا بولے جس میں نو سو چھید۔ اس سے پوچھو کہ جب یہ کاجل کے ساتھ فرار ہوا تھا تو کس حال میں نکلا تھا۔"

محسن نے ہاتھ بڑھا کے کہا "آپ تو بلیک میلنگ پر اتر آئے۔ بخدا ہم مذاق کر رہے تھے۔ آپ سے تو کوئی اختلاف رائے ہی نہیں۔"

غالب باہر گیا اور گل کے ساتھ ایک سوٹ کیس گھسیٹتا نمودار ہوا مگر کاجل کا ابھی تک کچھ پتا نہیں تھا۔

میں نے کہا "کاجل کہاں ہے؟"

محسن ہنسا "یار، انہیں کہیں سے کاجل لا دو۔ بہت تڑپ رہے ہیں اس کے بغیر۔"

نازو نے رابعہ کی طرف دیکھ کے کہا "اس سرمے سے کام نہیں چلتا۔"

گل نے کہا "وہ ہمیں چھوڑ کے چلی گئی۔ ہمارے لئے کسی دوسری جگہ کا بندوبست کرے گی۔ کہتی تھی کہ سب یہاں کیسے رہو گے۔"

میں نے کہا "ایک تم ہی ہو عزیزہ جس نے ڈھنگ سے بات کی ہے۔ باقی سب پر تو بھوت سوار ہے بہت خبیث قسم کا۔"

غالب نے شور مچایا "دیکھو خبردار جو میرے سسر کا نام لیا اور تم نے اسے خبیث کیسے کہہ دیا میرے سامنے۔ میں تو حشر نشر کر دوں گا۔ میرا ذاتی سسر ایک شریف بھوت ہے۔ کیوں نازو؟"

نازو نے کہا "مگر تم لاتوں کے بھوت ہو۔ باتوں سے نہیں مانتے" اس نے غالب کو اٹھایا اور پلٹ کے پھینک دیا۔

غالب چلّایا "چیف کے ٹو! تم دیکھ رہے ہو یہ ظلم و تشدد؟ کیا میں نے اس کے باپ کو کچھ کہا تھا؟ آہ اب میں خود ایک بھوت بننے والا ہوں" وہ بستر پر گرا تھا اور اٹھ کے بیٹھ گیا تھا مگر خواہ مخواہ یہ ظاہر کر رہا تھا جیسے اس کی سب ہڈیاں ٹوٹ گئی ہیں "میں اپنا خون معاف کرتا ہوں نازو مگر میرا بھوت سسر تم کو نہیں چھوڑے گا..."

گل ہنس رہی تھی، رابعہ ہنس رہی تھی، میں اور محسن ہنس رہے تھے۔ ایک بار پھر قدرت کے حسنِ انتظام اور اعجازِ مسیحائی نے فرقت کے درد کا درماں کیا تھا اور ہم سب آزمائش کے ہزار حوصلہ شکن اور صبر آزما مرحلوں سے کامیاب گزرنے والے پھر ایک جگہ ایک ساتھ تھے۔ کل تک یاس اور ناامیدی کے احساس سے دل زدہ، مسافرت کے عذابوں کی انتہا سے نیم جاں۔ نفرتوں اور عداوتوں کے جنگل میں راہِ گم کردہ ہم سب کسی معجزے کے انتظار میں تھے جو ہمیں ملا دے اور آج وہ معجزہ رونما ہو گیا تھا۔ چوہدری اللہ دتا، محمد بھائی، عبدالستار چوہدری اور کاجل۔ سب وسیلے تھے جو ہمارے تحفظ کے ضامن دستِ غیب نے پہلے سے فراہم کر دئے تھے اور ہماری مدد پر مامور تھے۔ وقت مقررہ پر وہ سامنے آتے گئے۔ ہم نے انہیں تلاش نہیں کیا۔ وہ خود ایک مقصد کی تکمیل میں معاون ہوئے۔ یہ جانے بغیر کہ ان سے پہلے کون تھا اور ان کے بعد کون ہو گا جو ہمیں سلامتی کی راہ پر لے جائے گا۔

اچانک میں نے محسوس کیا کہ جو کچھ میں سوچ رہا تھا وہ صرف میرے خیالات کی رو نہیں تھی۔ وہ سب کے خیالوں کی بازگشت تھی جس کی گونج میرے ساتھ دوسروں نے بھی سنی ہو گی۔ وہ خاموش بیٹھے تھے، اس لئے کہ انہیں ایک دوسرے کی سوچ آوازِ غیب کی طرح سنائی دے۔

غالب اور محسن دیوار سے ٹیک لگائے اور پیر پسارے کھڑکی سے باہر خلا میں دیکھ رہے تھے۔ گل بُت بنی محسن کو دیکھ رہی تھی۔ رابعہ کو معلوم بھی نہ تھا کہ اس کی آنکھیں رو رہی ہیں۔ نازو پوری

کوشش کر رہی تھی کہ اس جذباتی فضا کو اپنے اعصاب پر مسلط نہ ہونے دے۔ اس کی نظر مجھ سے ملی تو میں مسکرانے لگا۔ کسی وجہ کے بغیر مگر سخت کوشش کے بعد۔ پھر نازو نے ایسا ہی کیا۔ یہ اشارہ صاف اور واضح تھا کہ خاموشی ٹوٹنی چاہئے۔ برف پگھلنے کا موسم آ گیا۔ خبر بہار کی لایا ہے کوئی گل پارہ۔ احساس پر جمنے والی دکھ اور آلام کی، احساسِ زیاں کی ملامتوں اور حسرتوں کی، غمِ رفتگاں کی اور روح کے ہر زخم پر خاموشی سے اترنے والی برف کو جھاڑ دو۔ مسکراہٹوں کی دھوپ کو جگہ دو۔ روشنی کے لئے راستے بناؤ۔

پہلے میں نے کہا "رابعہ، تم بولو گی نہیں؟"

رابعہ نے چشمِ نم اور بوجھل پلکیں اٹھا کے کہا "کیا بولوں؟ تم ہی کچھ کہو۔"

میں نے کہا "تم اتنی حسین کبھی نہ تھیں۔ بہت بدل گئی ہو تم"

میرا خیال ہے کہ یہ بات خلوت کی تھی جو میں نے جلوت میں کہہ دی۔ رابعہ کے رخسار شہابی ہو گئے مگر میری بات نے منجمد چہروں پر مسکراہٹ بکھیر دی۔

محسن بولا "اس کا مطلب سمجھ رہی ہو نا؟ یہ تم سے بھی جواب میں ایسی ہی بات سننا چاہتا ہے حالاں کہ اس کی صورت ہی نہیں سیرت بھی بدل گئی ہے۔ پہلے یہ انسان کا بچہ لگتا تھا۔"

"اور اب کیا لگتا ہے؟" غالب نے سوال کیا۔

"اب اُلو کا پٹھا لگتا ہے" محسن بولا۔

"مجھ سے پوچھو کہ تم مجھے کیا لگتے ہو" غالب نے کہا۔

محسن نے آستین چڑھائی "بولو ذرا۔ کیا لگتا ہوں میں۔"

"بالکل محسن شیروانی" غالب نے کہا "جان بچانے کے لئے یہ جھوٹ بولنا پڑا۔"

اچانک گل نے کہا "میں کیسی لگتی ہوں تمہیں؟"

میں حیران رہ گیا کیوں کہ اس کا روئے سخن واضح طور پر محسن کی طرف تھا۔ وہ لڑکی جذبات کی رَو میں اتنی بے اختیار ہو گئی تھی کہ مجھے اس پر ترس آیا۔

محسن نے اسے نظر بھر کے دیکھا "سب کے سامنے بتا دوں؟ جیسے سکندر نے بتا دیا تھا۔"

میں نے سکون کا سانس لیا۔ میری طرح سب نے اس جواب کے انتظار میں سانس روک لی تھی۔ محسن نے بڑی خوبصورتی سے بات کو نبھایا۔ گل کا چہرہ دمک اٹھا۔ وہ ایسا ہی جواب چاہتی تھی۔ اگر محسن ایسا نہ کہتا تو اچھا نہ ہوتا۔ میں نے نظروں ہی نظروں میں محسن سے اظہارِ تشکر کیا۔

باہر صبح کا اجالا افق کو روشن کرنے لگا تھا۔ مجھے رابعہ سے بہت سی باتیں کرنی تھیں۔ ہم سب کو ایک دوسرے سے بہت کچھ کہنا تھا اور پھر یہ طے کرنا تھا کہ اب واپسی کی کیا صورت ہو گی مگر سب کاجل کی واپسی کے انتظار میں تھے۔ دو خستہ حال کمرے محسن اور رابعہ کو پناہ دینے کے لئے کافی تھے مگر ہم سب ملا کے چھ افراد یہاں نہیں رہ سکتے تھے۔ ڈیوٹی پر موجود پولیس مین بیزاری کے عالم میں مستعد کھڑے ہوئے تھے لیکن ہم سے اتنی دور تھے کہ ہماری باتیں نہیں سن سکتے تھے۔ ابھی تک ہم نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی جس کا راز میں رہنا ضروری ہوتا۔

"یہاں چائے کا بندوبست تک نہیں ہے" میں نے کہا۔

محسن بولا "یہ ہوٹل نہیں ہے۔"

"پھر ہوٹل سے کیوں بلایا تھا ہمیں؟" نازو بولی۔

"واپس چلی جاؤ۔ روکا کس نے ہے" غالب نے کہا "میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے نخرے بڑھتے جا رہے ہیں۔"

"میں ابھی دماغ درست کر دوں گی غالب......"

"اس کے لئے بھی دماغ چاہئے۔ وہ کہاں سے لاؤ گی؟" غالب بولا۔

کھڑکی کے شیشے پر روشنی ایک جھلک دکھا کر غائب ہو گئی۔ پھر میں نے کار کے انجن کی سرسراہٹ سنی "کاجل" میں نے کہا۔

محسن نے کہا "رابعہ! نوٹ کر لو یہ عالم شوق کا۔ اور یہ بھی سن لو کہ کاجل ہمارے ساتھ جا رہی ہے۔ ان کے اصرار پر......"

رابعہ مسکرائی "پھر کیا ہوا؟"

"ارے بابا، تم کو ایک عورت کی طرح سوچنا چاہئے۔ کہیں وہ سوکن نہ بن جائے تمہاری۔ مجھے آثار ٹھیک نہیں لگتے۔ یہ بنگال کا جادو ہے۔"

رابعہ نے کہا "تم اگر نازو سے کہتے تو کچھ ہوتا۔"

غالب نے کہا "کیا ہوتا؟ میں بزدل نہیں ہوں۔ چاہوں تو اسی وقت کاجل کے عشق میں مبتلا ہو سکتا ہوں۔"

"کچھ کر کے دکھاؤ" نازو نے کہا "زبانی دعوے تو سب کر لیتے ہیں شہزادہ گلفام۔"

"تم چیلنج کر رہی ہو مجھے؟"

"ہاں چیلنج کر رہی ہوں" نازو نے کہا۔

"مجھے منظور ہے" غالب نے کہا "شرط کیا ہو گی؟"

کاجل کے اندر آنے سے بات ختم ہو گئی۔ سب کو معلوم تھا کہ غالب اور نازو مذاق میں لڑتے ہیں اور لڑائی میں مذاق کرتے ہیں لیکن بعد میں غالب نے جو کچھ کیا وہ سب کی توقعات کے خلاف تھا۔

کاجل کے اندر آتے ہی غالب نے کہا "لو سورج نکل آیا۔"

کاجل نے پریشان بال سنوار کے حیرانی سے کہا "ابھی سے؟"

غالب بولا "تمہیں دیکھ کر کچھ ایسا ہی لگا۔ رخِ روشن کی تابانی صبح کی دھوپ سے کم تو نہیں۔"

نازو نے غالب کو گھور کے دیکھا مگر وہ ایسی والہانہ فریفتگی سے کاجل کو تک رہا تھا کہ کاجل متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ کوئی عورت جو حسین بھی ہو، خراجِ تحسین کو اپنا حق سمجھ کے وصول کرتی ہے۔

ایک حیا آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کاجل نے کہا "کیوں بناتے ہو؟" جس کا دوسرا مطلب یہ تھا کہ تم نے ٹھیک کہا۔

وہ اب بھی سفید لباس میں تھی مگر لباس مختلف تھا۔ اس نے میکسی پہن رکھی تھی جو سرسراتے نرم اور چمکیلے ساٹن کی تھی اور اس کے پیکر میں یوں ڈھالی گئی تھی کہ لگتا تھا اس کا جسم ایک بہتا دھارا ہے جو راہ کے ہر نشیب و فراز میں سماتا چلا گیا ہے۔

کاجل وہیں بیٹھ گئی "مجھے کچھ دیر ہو گئی۔"

میں نے کہا "کوئی بندوبست ہوا؟"

"ہاں۔ ایک بہت بڑی کوٹھی مل گئی۔ اس کے مالک پاکستان جا چکے ہیں۔ یہاں صرف بنگالی چوکیدار تھا۔"

"وہ کیسا آدمی ہے؟"

"وہ صرف چوکیدار ہے۔" کاجل نے کہا "عام آدمی جسے نہ سیاست سے سروکار ہے نہ ان حالات سے۔ کل جب بنگلہ دیش بن جائے گا تب بھی وہ چوکیدار ہی رہے گا' ڈپٹی کمشنر نہیں ہو جائے گا۔"

غالب نے کہا "ایک بات کہوں' بُرا تو نہیں مانو گی؟"

"بُرا کیوں مانوں گی" کاجل مسکرائی۔

"حُسن اور ذہانت کا ایسا متوازن انداز میں نے آج تک کسی عورت میں نہیں دیکھا۔ خدا کسی کو حسن دیتا ہے تو اوپر کی منزل خالی چھوڑ دیتا ہے اور دماغ دیتا ہے تو صورت ایسی دیتا ہے کہ آدمی صبح دیکھ لے تو سارا دن خراب گزرے" اس نے نازو کی طرف دیکھ کے کہا۔

کاجل شرما کے اٹھلائی "چھوڑو بھی۔ کیسی باتیں کرتے ہو۔ آؤ چلیں۔"

میں دیکھ رہا تھا کہ غالب کی لفاظی کا جادو اثر کر رہا ہے۔ کاجل بڑی تیزی سے اس کے پھیلائے ہوئے جال میں گرفتار ہونے کے لئے آگے بڑھ رہی تھی اور کسی ماہر شکاری کی طرح غالب حلقۂ دام کو تنگ سے تنگ تر کرتا جا رہا تھا۔ نازو جو پہلے مشتعل نظر آتی تھی' اب کچھ شکست خوردہ اور اداس تھی۔ گل اور رابعہ برہم تھیں مگر غالب بڑی ڈھٹائی سے نظر چُرا رہا تھا اور کاجل پر فریفتہ نظر آنے کی کوشش میں کامیاب تھا۔ وہ عورت ہی کیا جو کسی مرد کے اندازِ پرستش کو اور اس کے جذبات کی گہرائی کو ایک نظر میں نہ بھانپ لے۔ غالباً اب تک کسی نے یوں کھل کے اس بے باک لہجے میں سب کے سامنے اس سے نہیں کہا تھا کہ وہ خالق حسن کی صناعی کا اچھوتا شاہکار ہے۔ ایک مدت سے وہ پاگل مشہور تھی۔ اس کے باپ کی سیاسی مصلحت کے تقاضے یہی تھے مگر اب کوئی اس کے لئے پاگل ہو رہا تھا تو وہ کیسے ملتفت نہ ہوتی۔

غالب کی یہ حرکت مجھے ہی نہیں محسن کو بھی پسند نہیں آئی تھی مگر وہ نازو کو جلانے کے لئے سنجیدگی سے کاجل پر ڈورے ڈال رہا تھا اور چیلنج کو مذاق کی بات سمجھنے پر آمادہ نہ تھا۔

"اب اور کتنے دن رہیں گے ہم یہاں؟" میں نے کہا۔

"بابا کوشش کر رہے ہیں" وہ بولی "سیدھا راستہ تو کوئی نہیں ہے۔ نیپال کے راستے کسی فلائٹ سے بندوبست ہو گیا تو ٹھیک ورنہ پھر بائی روڈ۔"

میں نے کہا "سڑک کے راستے۔ یہ تو بڑا لمبا سفر ہو گا؟"

صرف غالب نے خوشی کا اظہار کیا "ذرا اپنا ہاتھ دکھانا۔"

کاجل نے بڑی نزاکت سے اپنا ہاتھ آگے کر دیا "نجومی ہو تم؟"

"میں سب کچھ ہوں۔ دیوانہ بھی" وہ بولا "تمہارے اور میرے ہاتھ کی ریکھائیں کتنی ملتی ہیں۔ کمال ہے! مجھے یقین ہے ستارے بھی ملتے ہوں گے مگر اس کے لئے حساب لگانا پڑے گا۔"

"بات سفر کے انتظام کی ہو رہی تھی" میں نے کہا۔

غالب نے سرہلایا "ذاتی طور پر میں ہوائی جہاز سے اُڑ کر پہنچنے پر بس کے طویل سفر کو ترجیح دوں گا۔ کیوں کاجل؟"

کاجل مسکرائی "ہاں۔ راستہ اتنا خوب صورت ہے......"

"کوئی راستہ خوب صورت نہیں ہوتا۔ کسی کو سزائے موت دینے کے لئے اسی راستے سے لے جاؤ۔ اور کوئی تمہارے ساتھ ہم سفر ہو۔ سارا فرق تو اس سے پڑتا ہے۔"

کاجل کا ہاتھ ابھی تک غالب کے ہاتھ میں تھا "چلو پھر ہم بائی روڈ چلیں گے۔"

"صرف میں اور تم۔ ان کو جانے دو جہاز میں" غالب بولا۔

میں بھونچکا رہ گیا۔ وہ لڑکی محبت کی اتنی بھوکی ہو گی' یوں جھوٹے لفظوں کے جال میں پھنس کے رہ جائے گی' اتنی جلدی پکے ہوئے پھل کی طرح غالب کی جھولی میں آ گرے گی' یہ شاید خود غالب کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو گا۔ اس نے تو مذاق میں پیش قدمی کی تھی اور نازو سے شرط جیتنے کی خاطر اپنی وارفتگی کا ڈراما رچایا تھا مگر کاجل نے اس کا مطلب کچھ اور لیا تھا۔ وہ سمجھی تھی' غالب واقعی دیوانہ ہو گیا ہے۔ اس پر مرمٹا ہے اور اسے واقعی اپنے جذبات پر قابو نہیں رہا۔ میری طرح دوسرے بھی کاجل کی بے وقوفی پر حیران اور پریشان تھے۔ سوچے سمجھے بغیر اس نے خود سپردگی کا وہ انداز اپنا لیا تھا جو ہماری نظر میں ناپسندیدہ اور غیر شریفانہ تھا۔ صرف فلرٹ کرنے والی لڑکیاں ہی ایسا RESPONSE دیتی ہیں۔

کار میں بیٹھتے وقت بھی غالب نے بڑی چالاکی سے کام لیا۔ اس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ سب بیٹھ چکے تھے اور وہ اکیلا باہر رہ گیا تھا۔ میں نے کوشش کی تھی کہ اسے میرے ساتھ بیٹھنا پڑے تو میں راستے میں ہی اس کے عشق کے غبارے کی ہوا نکال دوں۔ مجھے نازو کی صورت دیکھ کر دکھ ہو رہا تھا۔ عین وقت پر غالب نے مجھے آنکھ ماری اور آگے چلا گیا۔

"کاجل! گاڑی میں چلاؤں گا' تم آگے کھسک جاؤ۔"

مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ یہ پیشکش میں یا محسن بھی کر

سکتے تھے۔

کاجل بلاوجہ ہنسی "اچھا۔ اگر تم چاہتے ہو تو......"

"چاہنے کی تو ساری بات ہے" غالب بولا "میں بس تمہارا ساتھ چاہتا ہوں۔ پھر کار ہو یا ٹرک، میں ماؤنٹ ایورسٹ تک چلا جاؤں گا"

کاجل اِٹھلائی "خالی باتیں ہی کرتے ہو۔"

"ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ انہیں اتار کے دنیا کے سفر پر چلتے ہیں۔ جب تک زندگی کی گاڑی چلے گی ہم بھی چلتے رہیں گے اس گاڑی میں۔"

میں نے بِھنّا کے کہا "اب گاڑی چلاتے ہیں آپ یا میں سیلف مار کے آپ کو اسٹارٹ کروں!"

غالب نے کہا "آگے چار آدمی نہیں بیٹھ سکتے۔ چلو نازو، تم پیچھے جاؤ۔"

نازو نے اتر کے دروازہ دھڑ سے مارا۔ اس نے سخت بے عزتی محسوس کی تھی اور مجھے ڈر تھا کہ کہیں مذاق اس کی قوتِ برداشت سے بڑھ گیا تو وہ غالب کے ساتھ کاجل کا بھی آملیٹ بنا دے گی۔ آگے اب دروازے کے ساتھ گل تھی۔ بیچ میں کاجل جو غالب سے چپکی بیٹھی تھی۔ پیچھے میں اور محسن تھے۔ پھر رابعہ کے ساتھ نازو آگئی۔

اب میں بھی غالب کی احمقانہ روش پر برہم تھا۔ اس مذاق کا نقصان دُہرا تھا۔ نازو تو خیر ابھی خفا ہے، اسے منایا بھی جا سکتا ہے مگر کاجل کا کیا ہوگا جب اسے معلوم ہوگا کہ یہ نازو اور غالب کی شرط تھی، محبت نہیں تھی۔

ہم سب دل گرفتہ اور خاموش تھے اور اس مذاق کے انجام سے خائف بھی۔ غالب بڑی مستی میں کار چلا رہا تھا اور بار بار جھک کر نہ جانے کاجل کے کانوں میں کیا کہہ رہا تھا۔ کاجل بار بار ہنستی تھی اور اس کے لمبے گھنے بال غالب کے شانوں تک پہنچ جاتے تھے۔ بنگال میں عورت مرد کے درمیان وہ حجاب نہیں جو مغربی پاکستان کے معاشرے میں نظر آتا ہے اور لڑکے لڑکیاں عشق کے معاملات میں یورپ کی تقلید کرتے نظر آتے ہیں۔ بوس و کنار کی نوبت تو نہیں آتی مگر نوجوان جوڑے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے سرِعام نظر آتے تھے اور کوئی نظر اٹھا کے نہیں دیکھتا تھا کہ کون کس کے ساتھ ہے۔ کاجل بھی اسی معاشرے کی پیدائش تھی لیکن اس کی ساری زندگی لاہور میں گزری تھی۔ میں حیران تھا کہ وہ ایسی بے شرمی کا مظاہرہ کیوں کر رہی ہے۔ کیا اسے معلوم نہیں کہ نازو اور غالب ایک دوسرے کے ہو چکے ہیں اور انہیں جدا کرنا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا آگ سے حِدّت کو جدا کرنا۔ کوئی ان کے درمیان حائل نہیں ہو سکتا۔ جیسے زمین اور کششِ ثقل کے درمیان حائل ہونے کی کوشش کرنے والا منہ کے بل گرتا ہے۔

جب گاڑی رکی تو میں نے اس کوٹھی کو دیکھا اور پھر نازو کو۔ اس کی صورت رونے والی ہو رہی تھی۔ کاجل کے ساتھ غالب اتر کے اندر چلا گیا۔ میں نے آہستہ سے کہا "کیا ہو گیا ہے تمہیں نازو؟ یہ مذاق ہے۔"

نازو نے دانتوں سے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا "میں جان سے مار دوں گی اسے۔"

رابعہ نے کہا "پاگل مت بنو۔ اتنی سمجھدار ہو کے ایسی باتیں کرتی ہو۔"

"نہیں۔ وہ ذہین بھی ہے اور حسین بھی" نازو نے کہا "مگر اسے معلوم نہیں کہ میں نازو ہوں۔"

گل اور رابعہ بھی اندر جا چکی تھیں۔ محسن میرے ساتھ تھا۔ اس نے نازو کا ہاتھ پکڑ کے اندر کھینچ لیا "وہ بھی غالب ہے۔ کیا وہ کسی اور کا ہو سکتا ہے، تم خود سوچو۔ اتنی بے اعتمادی......"

ہم اندر پہنچے تو ایک ساتھ سب ہنسنے لگے۔ کاجل نے آگے بڑھ کے نازو کو سینے سے لگا لیا "لوگ مجھے پاگل کہتے ہیں۔ پاگل تو تم ہو۔ بے وقوف! کیا مجھے معلوم نہیں تھا کہ غالب صرف تمہارا ہے۔ وہ شرارت پر آمادہ تھا۔ میں نے بھی کہا کہ چلو تھوڑی سی دل لگی سہی۔ میں نے تو سنا تھا تم بہت ہمت والی ہو۔"

"یہ اُلو کی پٹھی شرط ہار گئی ہے" ہنستے ہنستے غالب کا بُرا حال ہو گیا "ذرا شکل دیکھو اس کی۔ میں غلط نہیں کہتا تھا کہ اس کے دماغ میں بھوسہ بھی نہیں۔"

نازو کچھ نہیں بولی، بس اپنے غصے کو ضبط کرنے کی کوشش کرتی رہی اور دانتوں سے اپنے ناخن کاٹتی رہی۔

اندر جا کے میں نے کہا "کاجل، تم نے مجھے بھی ڈرا دیا تھا۔ غالب کا تو مجھے پتا تھا۔"

"کیا پتا تھا؟" کاجل نے کہا۔

"کہ نازو اسے واقعی جان سے مار دے گی اور پھر خود بھی مر جائے گی جس دن ایسا ہوا" میں نے کہا "اور یہ خود بھی کیا کم ہے۔ یہ بھی زندہ نہیں رہ سکتا نازو کے بغیر۔ مجھے تمہاری فکر تھی۔"

"آپ اپنے بارے میں جو چاہیں کہیں" غالب بولا "نہ میں مرتا ہوں کسی پر اور نہ کسی کے لئے مر سکتا ہوں۔"

نازو ہنس پڑی "جھوٹے۔ کمینے۔ بہت خوش ہو شرط جیت کے۔ یہ تو کاجل نے سازش کی تھی۔"

"سازش نہیں" کاجل بولی "شرارت۔ ایمان سے مجھے نہیں معلوم تھا کہ تمہارا دل دُکھا رہی ہوں میں۔"

محسن نے کہا "یہ لڑائی مار کٹائی میں جتنی بہادر ہے اندر سے اتنی ہی کمزور اور بزدل ہے۔ آج ثابت ہو گیا۔"

رابعہ نے بھی کہا "حیرانی ہے نازو کہ تمہیں اپنے آپ پر بھی اعتماد نہیں۔"

"رابعہ!" نازو نے نظر اٹھا کے کہا "کبھی سکندر نے ایسا سنگدلانہ مذاق کیا ہے تمہارے ساتھ؟"

"نہیں۔ مگر......"

"اس دن دیکھوں گی تمہارے اعتبار اور اعتماد کو جس دن سکندر نے سب کے سامنے تمہارے جذبات کی یوں توہین کی" نازو نے اسکی بات کاٹ دی "ہم سب کی موجودگی میں سکندر تمہارے منہ پر تھپڑ مار دے اور پھر کہے کہ یہ مذاق تھا تو تم پر کیا گزرے گی؟" وہ ایک دم پلٹی اور دوسرے کمرے میں بھاگ گئی۔

غالب اس کے پیچھے لپکا "اے نازو! خدا کی قسم، ہے نا بھوت کی بچی۔ بابا میں معافی مانگتا ہوں۔"

کاجل بھی اب شرمندہ نظر آ رہی تھی "مجھے شرارت میں بھی غالب کو لفٹ نہیں دینی چاہئے تھی۔ یہ بڑے نازک جذبات کا معاملہ تھا۔"

"غلطی تو غالب کی ہے جس نے یہ بات نہیں سمجھی" محسن خفا ہو کے بولا "خیر...... وہ بہت ڈھیٹ چیز ہے۔ اسے منا لے گا۔ اب ہمارے لئے کیا حکم ہے؟"

"حکم کچھ نہیں۔ جب تک روانگی کا انتظام نہیں ہو جاتا، تم لوگ یہاں رہو۔ یہاں سب کچھ ہے۔ کھانے پکانے کی چیزیں البتہ بازار سے لانی ہوں گی اور وہ سب میں لا دوں گی۔ بہتر یہی ہے کہ تم باہر نہ نکلو۔ ناشتے کا سامان میں ساتھ لے آئی تھی۔ گاڑی میں پڑا ہے۔ اب میں رات کو آؤں گی۔"

اس کے جانے کے بعد میں نے دوسرے کمرے میں جا کے دیکھا۔ نازو کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس کی صورت بتاتی تھی کہ وہ روتی رہی ہے۔ غالب دیوار کی طرف منہ کئے کھڑا تھا اور اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا۔

میں نے حیرانی سے کہا "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"یار تُو میری جاں بخشی کرا" غالب نے رونی آواز بنا کے کہا۔

میرے پیچھے رابعہ آگئی تھی۔ اس نے کہا "سزا تو ملنی چاہئے تمہیں۔"

نازو نے غالب کو ڈانٹا "چلو۔ صاف بولو اور اونچا بولو۔ ابھی صرف ایک سو گیارہ بار کہا ہے تم نے۔ ایک ہزار بار کہو یا لکھ کر دو۔"

غالب نے اڑ جانے والے ریکارڈ کی طرح بولنا شروع کیا۔ "میں اُلو کا پٹھا ہوں۔ میں نے مذاق میں نازو کا دل دکھایا۔ آئندہ کے لئے میرے باپ کی توبہ۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا "نازو! یہ تو ظلم ہے۔"

رابعہ نے بھی سفارش کی "نازو! اتنا کافی ہے۔"

غالب نے پلٹ کے کہا "کاغذ لاؤ۔ میں لکھ کر دوں گا۔"

گل ناشتا تیار کر رہی تھی اور محسن اس کی مدد کر رہا تھا۔ میں نے کاغذ پینسل تلاش کئے۔ خالی کوٹھی میں صرف مکین نہیں تھے مگر ان کا سب اسباب موجود تھا۔ ایک کمرا غالباً بچوں کا تھا۔ اس میں اسکول کی کتابوں کے ساتھ کاپی اور پینسل ہر بستے میں موجود تھے۔ بستے بھی یوں تیار رکھے تھے جیسے ابھی کچھ دیر میں اسکول کی بس ہارن دے گی تو وہ ناشتا ادھورا چھوڑ کے دوڑتے ہوئے آئیں گے اور بستے اٹھا کے باہر دوڑ جائیں گے۔ ممّی ٹاٹا۔ بائی بائی ڈیڈی۔ ماں برتن سمیٹتے ہوئے مسکرائے گی اور ڈیڈی اخبار پڑھتے پڑھتے کہیں گے 'بائی بائی بیٹا۔ یہ عام زندگی کا منظر تھا جو ہر خوش حال اور آباد گھر میں ہر صبح دہرایا جاتا تھا مگر اس کی یکسانیت میں تعمیر اور تکمیل کے عمل پیہم کی تسکین ہوتی ہے۔ مقاصدِ حیات کے حصول میں کامیابی کے احساس پر طمانیت کا اور اپنی ذات کے رشتوں پر اعتماد کا غرور شامل رہتا ہے۔ چناں چہ ہر صبح یہ منظر نئی خوشی دیتا ہے۔ نہ جانے وہ کون تھے جو کسی ارادے اور اختیار کے بغیر اس زندگی کی ساری خوب صورتی سے دست بردار ہونے پر مجبور ہوئے۔ عیش و عشرت میں ماں کی ممتا اور باپ کی شفقت کے سائے میں پرورش پانے والے وہ بچّے اب کہاں ہیں؟ کسی کیمپ میں فاقہ کشی اور ذلت کی وہ زندگی گزار رہے ہیں جس کا ان کے معصوم ذہن میں کوئی تصور نہ تھا؟ میں نے ایک بستہ کھولتے ہوئے سوچا۔ زندگی اور مستقبل پر اعتماد بھی بعض اوقات کتنا دھوکا اور دکھ دیتا ہے۔ آدمی سمجھتا ہے کہ سب کچھ یوں ہی رہے گا۔ خوب صورت یونیفارم پہن کے قطاروں میں کھڑے بچّے صبح کا آغاز دعا سے کرتے رہیں گے۔ لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری۔ زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری۔ ڈیڈی ہر صبح بریف کیس لے کر کار میں آفس جاتے رہیں گے۔ ممّی مسکراتی رہیں گی اور ان سب کے لئے ٹیبل پر مزے مزے کے کھانے سجاتی رہیں گی۔ یہ خوشی، یہ مسکراہٹ اور یہ نعمتوں سے مالا مال زندگی اسی طرح رواں دواں رہے گی مگر اچانک حادثہ ہو جاتا ہے۔ جنگ کا عفریت اپنی بدصورتی کے ساتھ سب کچھ تہس نہس کر دیتا ہے۔ سیلاب، زلزلہ، بیماری اور آفاتِ سماوی خواب چکنا چور کر دیتے ہیں اور اچانک زندگی کا دوسرا اَن دیکھا بدصورت اور بھیانک روپ سامنے آتا ہے۔

میں کاپی واپس لے کر لوٹا تو میرا دل اداسی سے بوجھل تھا۔

"تمہیں کیا ہو گیا؟ مجھے تو خیر اعمال کی سزا ملی ہے" غالب بولا۔

میں نے کہا "وہ جو یہاں رہتے تھے، انہیں کیا ہوا؟ کہاں گئے وہ سب لوگ؟ کیا وہ کبھی لوٹ کر آئیں گے؟"

غالب نے کہا "ان سب سوالات کا جواب میں فرصت ملتے ہی دوں گا۔"

دوپہر تک یہ ہوا کہ کبھی غالب کاپی پینسل لے کر بیٹھ جاتا تھا۔ ہماری سفارش سے اس کی کو چھٹی مل جاتی تھی کہ ناشتا کر لے۔ کچھ دیر بعد وہ کاپی پھینک دیتا تھا کہ میں اور نہیں لکھ سکتا اور دیوار کی طرف منہ کر کے چلّانے لگتا تھا "میں اُلو کا پٹھا ہوں......" پھر تھک کر بیٹھ جاتا تھا کہ ایسے تو میں پاگل ہو جاؤں گا اور کاپی اٹھا کے لکھنا شروع کر دیتا تھا۔ ہم سب کا ہنس ہنس کے بُرا حال تھا۔ نازو کسی قسم کی رعایت دینے پر آمادہ نہ تھی۔ غالب نے

بھی ثابت کر دیا کہ سو پیاز اور سو جوتے والی بات محض محاورہ نہیں۔ اس نے ہزار بار لکھا بھی ہو گا اور زبان سے اقرار بھی کیا ہو گا۔

وہ سارا دن ہم نے باتیں کرتے گزارا۔ پہلے محسن اپنی اسیری کی رُوداد سناتا رہا۔ سفر کے آغاز سے دوبارہ ملنے تک اس پر کیا بیتی۔ یہ سب ہی جاننا چاہتے تھے۔ نازو اور غالب ایسے بیٹھے تھے جیسے ان کے درمیان کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ ایک نے غلطی کی اور سزا کاٹ لی تو بات ختم۔ انہیں سمجھنا بھی اتنا ہی مشکل تھا جتنا ان کی محبت کو۔

تھکن اور نیند کی کمی کا اثر سب پر تھا مگر سونے پر کوئی تیار نہ تھا۔ محسن اپنی کہہ چکا تو میری باری آئی۔

غالب نے کہا "یہ فلم میری دیکھی ہوئی ہے۔ بلکہ اس کا ہیرو ہی میں تھا۔ میرے لئے اس میں کوئی دلچسپی نہیں۔"

غالب کے ساتھ نازو بھی اٹھ کھڑی ہوئی "میں نے کبھی ایک فلم دوبار نہیں دیکھی۔ مجھے بھی کوئی دلچسپی نہیں۔"

میں نے کہا "مجھے معلوم ہے تمہیں اب کس میں دلچسپی ہے۔"

نازو بولی "آخر ہم کیوں سنیں وہ سب جو ہمیں معلوم ہے۔"

میں نے کہا "اچھا بابا جاؤ۔ ایک دوسرے سے لڑو اور پھر مناؤ ایک دو ترسے کو۔"

"میں ادھر سونے جا رہا ہوں" غالب دائیں جانب والے کمرے میں گھس گیا۔

"میں ادھر سو رہی ہوں۔" نازو نے بائیں طرف کے کمرے کا رخ کیا۔

کچھ دیر بعد میں نے اور رابعہ نے جا کے دیکھا تو نہ وہ دائیں کمرے میں تھے اور نہ بائیں کمرے میں۔ سیاہ اجڑے ہوئے باغ کی ایک بینچ پر نازو بیٹھی تھی۔ غالب سوکھی ہوئی گھاس پر اس کے قریب بیٹھا تھا اور وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر تھے۔ یہ اتنا خوب صورت منظر تھا کہ میرے پاس کیمرہ ہوتا تو اسے محفوظ کر لیتا مگر کیمرہ صرف عکس کو منجمد کرتا ہے۔ وہ حسن جو کسی ایسے ہی منظر میں جذبات سے آتا ہے تصویر میں کیسے آ سکتا ہے۔

ہماری آپ بیتی بہت طویل تھی۔ میں، غالب، نازو اور گل جن حالات سے دوچار ہوئے تھے ان سے محسن بے خبر رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ گل بھی بور ہو کے اٹھ جائے گی اور باتیں کرنے کے لئے صرف میں اور محسن رہ جائیں گے۔ رابعہ کے لئے دونوں طرف کے واقعات میں دلچسپی کی نوعیت ایک جیسی تھی۔ مگر گل چپ بیٹھی رہی اور اچانک مجھے اپنی بے وقوفی کا احساس شدت سے ہوا۔ گل میری وجہ سے چپ تھی۔

میں نے کہا "گل، یہ سب تو تم بھی بتا سکتی ہو محسن کو۔"

محسن بولا "کاش یہ بات آپ کی عقل شریف میں پہلے آ جاتی لیکن آپ اب بات پوری کر کے جائیں۔"

"بھئی، گل سنا دے گی......."

"نہیں۔ میں آپ سے سنوں گا" محسن بولا۔ اور پھر ہنس پڑا۔ "یار، ہمیں چکر دیتا ہے۔ تیری رگ رگ سے واقف ہوں میں۔"

"چکر کی کون سی بات ہے اس میں" میں نے کہا۔

"میاں کبیر خان! جاؤ عیش کرو۔ رابعہ سے اکیلے میں داستان ہجر و فراق کہنا چاہتے ہو نا۔ ہماری طرف سے اجازت ہے۔"

جس علاقے میں یہ کوٹھی واقع تھی اسے بھی ڈھاکا میں وہی حیثیت حاصل تھی جو لاہور میں گلبرگ کو ہے۔ یہاں خوش حال اور مال دار لوگ رہتے تھے۔ بزنس مین، صنعت کار، بیوروکریٹس اور بیرون ملک جا کے دولت کمانے والوں سے لے کر اسمگلر تک۔ جدی پشتی رئیس اور خاندانی نسب و نام کے ساتھ صاحب ثروت رفتہ رفتہ عنقا ہو رہے تھے۔ شرافت و عزت کا پیمانہ جب سے دولت کو سمجھا جانے لگا تھا، شجرۂ نسب پر غرور ایک مذاق بن گیا تھا اور کہنے والے کہتے تھے کہ رسی جل گئی مگر بل نہیں گیا۔ دھن صرف دھن ہے۔ کالا ہو یا سفید۔ کیا حرام اور کیا حلال۔ جائز و ناجائز کچھ نہیں۔ معاشیات کا اخلاقیات سے کیا تعلق۔

میں اور رابعہ برآمدے میں بیٹھ گئے۔ کرسیوں پر دھول پڑی ہوئی تھی۔ میں نے گدیوں کو پلٹ کے رکھ دیا۔ ہم سے کچھ فاصلے پر باغ کے آخری گوشے میں غالب اور نازو بیٹھے تھے مگر ان کی آواز ہم تک نہیں پہنچ رہی تھی جس سے اندازہ ہوتا کہ وہ لڑ رہے ہیں یا لڑنے کے بہانے ڈھونڈھ رہے ہیں۔ کوٹھی کے احاطے کا گیٹ کھلا ہوا تھا اور اس وقت وہاں کوئی چوکیدار نہیں تھا۔ دیوار کے اوپر سے بھی ہمیں ویران سڑکیں نظر آ رہی تھیں۔ کوٹھیاں بھی اتنی خاموش تھیں کہ بے مکین لگتی تھی۔ فضا ایک عجب سوگوار سناٹے میں ڈوبی محسوس ہوتی تھی۔

جب رابعہ نے کہا "تم خفا ہو مجھ سے؟"

تو میں چونکا "میں خفا ہو سکتا ہوں تم سے؟"

"تمہیں حق ہے خفا ہونے کا" رابعہ نے کہا "میں تم کو چھوڑ کر چلی گئی تھی تمہیں کچھ بتائے بغیر۔"

میں نے کہا "پہلے میں خفا تھا، اب نہیں ہوں۔"

"اب کیوں نہیں ہو؟"

"تم خود ہی واپس جو آ گئی ہو۔"

"یہ تو پوچھو کہ میں نے ایسا کیوں کیا تھا" رابعہ نے کہا "اور مجھے ایسے مت دیکھو۔"

"چلو تم ہی بتا دو کیسے دیکھوں؟" میں نے کہا۔

رابعہ نے شرما کے کہا "آخر کیا دیکھ رہے ہو؟ پہلے دیکھا نہیں کیا؟"

"سچ بتا دوں؟ ویسے تو ہر بار تمہارا روپ نیا لگتا ہے لیکن اس بار کچھ اور بات ہے۔ اس کا سبب یہ نہیں کہ دوری نے میرے

جذبات کی آتش شوق بھڑکا دی ہے۔ تم واقعی اتنی حسین کبھی نہ تھیں۔ لگتا ہے یہ وقت تم نے سارے جہاں کے حسن کا خزانہ لوٹ کر جمع کرنے میں ہی گزارا ہے....."

"میں نے بڑا ظلم کیا خود پر بھی اور تم پر بھی۔ تمہارا خیال رکھنے کے لئے مجھے تمہارے ساتھ رہنا چاہئے تھا۔ دیکھو کیا حال ہو رہا ہے تمہاری صحت کا۔ تم کتنے کمزور ہو گئے ہو۔"

میں نے ہنس کے کہا "مہینہ بھر میکے رہ کے واپس آنے والی بیویوں جیسی بات مت کرو۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "اس فرق کو صرف میں محسوس کر سکتی ہوں کیوں کہ میں نے تم کو بہت پہلے دیکھا تھا۔ اس وقت تمہاری یہ حالت نہیں تھی۔ یہ میری خود غرضی تھی یا سنگدلی کہ میں واپس لوٹ گئی لیکن سکندر! یہ بہت مشکل فیصلہ میں نے خود اپنے خلاف کیا تھا۔"

"آخر کیا ضرورت تھی اس فیصلے کی؟"

"میں محسوس کرتی تھی سکندر کہ میں تم پر بار ہوں۔ صرف ساتھ دینا ہی تو کافی نہیں تھا۔ میں کسی اور کے لئے کیا، خود اپنے لئے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔"

"تمہاری یہ سوچ محض جذباتی کمزوری تھی۔ ورنہ....."

"نہیں سکندر۔ میں خود بھی کمزور تھی" رابعہ نے میری بات کاٹ دی "نہ میں نازو تھی اور نہ ناگ منی۔ گل بانو بن جانے کے باوجود وہ کتنی دلیر اور نڈر ہے۔ نازو کی تو بات ہی الگ ہے۔ میں تو گل کی برابری کا دعویٰ بھی نہیں کر سکتی۔ میں نے سوچا جب میں کچھ کر ہی نہیں سکتی تو پھر واپس کیوں نہ چلی جاؤں۔" رابعہ نے کہا۔

میں نے کہا "تم میرا حوصلہ تھیں، میرا سہارا تھیں۔"

"غلط۔ میں تمہاری کمزوری بن چکی تھی" رابعہ نے کہا "جیسے کچھ لوگ ہوتے ہیں نا کہ صبح اٹھتے ہی انہیں چائے کا کپ نہ ملے یا سگریٹ نہ ملے تو وقتی طور پر وہ مفلوج محسوس کرنے لگتے ہیں خود کو۔ ذہنی طور پر بھی اور جسمانی طور پر بھی۔ تم نے اس مشہور مقرر کی بات تو سنی ہو گی جو فصاحت و بلاغت اور جوش خطابت سے مجمع پر جادو کر دیتا تھا مگر اسے عادت تھی اپنے کوٹ کا بٹن گھمانے کی۔ ایک روز کسی بدخواہ نے وہ بٹن غائب کر دیا اور مقرر جب تالیوں کے شور میں اسٹیج پر آیا تو بٹن کو غائب پا کے بولنا تک بھول گیا۔ عادت یا جذباتی کمزوری بھی بیساکھی بن جاتی ہے جس کے بغیر آدمی محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک قدم نہیں چل سکتا۔ حالاں کہ بعد میں اس کی خود اعتمادی لوٹ آتی ہے......."

"اس مقرر کا کیا ہوا؟ اس نے کوٹ میں دوسرا بٹن لگوایا، بٹن کے بغیر تقریر کرنے لگا یا اس شوق سے تائب ہو گیا؟" میں نے کہا۔

"میں جانتی ہوں تم نے میری بات سمجھ لی ہے" رابعہ مسکرائی۔ "شروع میں تم کو بہت غصہ آیا ہو گا۔ پتا نہیں کیا کچھ سوچا ہو گا تم نے اور کیا سمجھا ہو گا۔ مگر پھر تم نے میرے بغیر اپنی خود اعتمادی کے سہارے آگے بڑھنا سیکھ لیا ہو گا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ تم کامیاب ہوئے اور آج پھر میرے سامنے ہو۔"

میں نے مظلوم لہجے میں کہا "مگر میری صحت کتنی خراب ہو گئی ہے۔"

رابعہ ہنسی "میں سب ٹھیک کر لوں گی۔ میں تمہیں لینے آئی تھی اور اپنے ساتھ لے کر جاؤں گی۔ واپس اپنے گھر۔"

"اپنے گھر۔" میں نے دل میں ٹھنڈک اور سکون کی راحت محسوس کی "وزیر خاں کے گھر؟"

"وہ اب تمہارا گھر ہے اور میرا گھر ہے۔"

میری آنکھیں خواب میں کھو گئیں۔ میرے تصور میں وہ گھر آ گیا جو ماڈل ٹاؤن میں تھا۔ سرسبز و شاداب درختوں میں گھرا ہوا۔ اس گھر میں میرے بچپن کی ہر یاد زندہ تھی۔ اس گھر سے کچھ تلخ، جگر خراش اور دل فگار یادیں بھی وابستہ تھیں۔ وہ گھر وزیر خاں کے عزم نو کا آئینہ دار تھا۔ اس نے ماضی کے کھنڈر پر مستقبل کی امیدوں کے ساتھ یہ محل تعمیر کیا تھا۔ میرے لئے۔ اور مجھے بتائے بغیر وہ اس گھر سے بے آبرو ہو کے نکلا۔ ذلت کو صبر اور خاموشی سے برداشت کرتا رہا اور قتل ہو گیا۔ اس کے قاتل آج بھی آزاد گھوم رہے تھے۔ اسی شہر میں جہاں سے اس کی قبر کا نشان تک مٹا دیا گیا تھا اور اس کی ہڈیاں غائب کر دی گئی تھیں۔ یہ سب یاد کر کے میرے لہو میں انتقام کی وہ آگ پھر روشن ہو گئی جسے میں نے ضرورت اور مصلحت کی مٹی ڈال کے دبا دیا تھا۔

رابعہ نے مجھے جھنجھوڑ کے کہا "سکندر..... ہوش میں آؤ۔"

میں چونکا اور مجھے احساس ہوا کہ مجھ پر جنونی کیفیت طاری تھی۔ میرا سانس تیز تیز چل رہا تھا، چہرہ تپ رہا تھا اور میرے ہاتھوں نے اتنی سختی سے کرسی کے بازو کو گرفت میں لے رکھا تھا کہ بازو کی سب رگیں ابھر آئی تھیں۔ میری انگلیاں درد کرنے لگی تھیں اور میرے اعصاب کے تار ٹوٹنے کے قریب تھے۔

آہستہ آہستہ میں نے ایک گہری لمبی سانس لی۔ بدن کو ڈھیلا چھوڑ کے میں نے سر کو کرسی کی پشت سے لگا لیا اور آنکھیں بند کر کے ان پھولوں کا تصور کرنے لگا جو میرے گھر کے سبزہ زار میں رنگین حاشیہ بناتے تھے۔

میں نے کہا "رابعہ! مجھے اس گھر کے بارے میں بتاؤ۔ اپنے گھر کے بارے میں۔ اکیلی تم وہاں کیا کرتی رہیں؟"

رابعہ نے کہا "اکیلی کب تھی میں۔ اکیلا تو میں نے کبھی محسوس نہیں کیا خود کو۔ تم کہو گے یہ جھوٹ ہے اور اکیلے پن نے ہی مجھے نفسیاتی مریض بنا دیا تھا۔ منظر کو یقین تھا کہ میں پاگل ہو چکی ہوں۔"

"اس کا تو دماغ خراب ہے مگر تمہارے بارے میں ایسی رائے کیوں قائم کی اس نے؟"

رابعہ نے کہا "تم ہنسو گے مجھ پر۔"

"کیا پتا تمہاری عقل پر رونا پڑے" میں نے کہا۔

"ایسا کئی بار ہوا جب رات کو میں نے دستک سنی اور دروازہ کھولا تو تم تھے۔"

میں ہنسنے لگا "پھر تو منظر نے ٹھیک سمجھا۔"

رابعہ خفا ہو گئی "تم بھی سمجھتے ہو میں جھوٹ بول رہی ہوں۔ وہ میرا وہم تھا۔ فریبِ خیال تھا۔ منظر کہتا تھا کہ HELLUCINATION سے باقاعدہ دیوانگی کا آغاز ہوتا ہے۔ اب یا تو تم واپس چلی جاؤ یا اس کو کسی طرح بلالو۔ اس نے گالی بھی دی تھی جو میں نہیں دہرا سکتی۔ کہتا تھا کہ سکندر کا تو باپ بھی آئے گا۔ میں ابھی تار دیتا ہوں کہ رابعہ بسترِ مرگ پر تمہیں یاد کر رہی ہے۔ میں نے کہا تار کس پتے پر دو گے تو سر کھجانے لگا۔"

مجھے ہنسی آگئی "مشورہ غلط نہیں تھا اس کا۔"

"مگر اندازہ غلط تھا یہ بات وہ سمجھ ہی نہیں سکتا تھا اور تم بھی نہیں سمجھ رہے ہو" رابعہ نے کہا "بولو' میں کس کی قسم کھاؤں؟ اس محبت کی جو مجھے تم سے ہے۔ تم تین بار آئے' وہاں بیٹھے اور تم نے مجھے وہ باتیں بتائیں جو اَب سچ ثابت ہو رہی ہیں۔"

"کون سی باتیں؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔

"آج تم نے بہت سے واقعات سنائے تھے محسن کو جو میری واپسی کے بعد پیش آئے تھے۔ کچھ باتیں تم مجھے بتا چکے تھے۔ مجھے معلوم تھیں۔"

میں نے کہا "یعنی میں بھوت بن کے پہنچا تھا۔ ٹیلی پیتھی...."

"مجھے نہیں معلوم یہ کیا تھا مگر یہ غلط نہیں ہے۔"

"تم کو ڈر نہیں لگا تھا؟" میں نے کہا۔

"اس وقت تو نہیں لگا تھا" وہ سوچ کے بولی "بعد میں اس خیال سے ڈر لگا تھا کہ شاید مجھ پر دورے پڑنے لگے ہیں۔ کوئی ذریعہ نہیں تھا تم سے تصدیق کرنے کا۔ فون کر کے پوچھ سکتی تو پوچھ لیتی کہ کیا ایسا ہوا تھا۔ اس کے بعد میں عادی ہو گئی۔ تم اکثر نظر آجاتے تھے اور غائب ہو جاتے تھے۔"

"گویا باقاعدہ ملاقات صرف تین بار ہوئی۔"

"تم اب بھی مذاق اُڑا رہے ہو نا۔ مت کرو یقین میری بات کا۔ میں کب کہتی ہوں کہ مانو۔ ٹھیک ہے میں پاگل ہو گئی تھی۔ مجھ سے تو تمہارے والد بھی ملنے آتے تھے۔ بڑی ڈھارس بندھا کے گئے تھے۔ تم جھوٹ سمجھتے ہو تو سمجھتے رہو" رابعہ نے غصے سے کہا اور کھڑی ہو گئی۔

"تم تو ناراض ہو گئیں۔ آئی ایم سوری۔"

"نہیں۔ بات کرنے کا کیا فائدہ جب تمہیں اعتبار نہیں۔"

میں نے اسے ہاتھ پکڑ کے بٹھالیا "دیکھو' یہ بات کوئی اور نہ مانے' میں مانتا ہوں" میں نے کہا "خود مجھے ایسے تجربات ہوئے ہیں جب میں نے خود تمہیں دیکھا اور تم سے باتیں کرتا رہا مگر میں نے کسی سے ذکر نہیں کیا۔ ہر شخص ایسے تجربات اور مشاہدات کا گواہ خود ہوتا ہے۔ ایک بار میں بھی اپنے والد کو دیکھ چکا ہوں۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ زندگی میں تھے۔ خیر چھوڑو' یہ بتاؤ' اب وہ گھر کیسا ہے؟"

"جیسا پہلے تھا" رابعہ کا منہ پھولا رہا۔

"اتنا عرصہ تم وہاں کیا کرتی رہیں؟"

"جھک مارتی رہی۔ قیدِ تنہائی کاٹتی رہی۔"

میں نے اندھیرے میں تیر چلایا "جھوٹ اب بول رہی ہو تم۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ تم نے اسے نئے سرے سے ڈیکوریٹ کیا ہے۔"

"ضرور منظر نے بتایا ہو گا" وہ مسکرانے لگی "میں نے منع بھی کیا تھا اسے مگر اس کے پیٹ میں بات کہاں ٹھہرتی ہے۔"

میرا تیر نشانے پر لگا تھا "میں تم سے سننا چاہتا ہوں۔"

اس نے کہا "ظاہری شکل و صورت تو میں بدل نہیں سکتی تھی۔ میں نے نیا پینٹ کرایا ہے' اندر اور باہر۔ اپنی کلر اسکیم کے مطابق۔ معلوم نہیں تم پسند کرو گے یا نہیں۔"

میں نے کہا "جب میں تمہیں اتنا پسند کرتا ہوں تو تمہاری پسند کو کیسے ناپسند کر سکتا ہوں۔"

"وقت گزاری کا یہی ایک مشغلہ رہ گیا تھا میرے پاس جس میں میرے لئے تسکین کا سامان بھی تھا اور خوشی کا بھی۔ میں نے سب پرانا رنگ و روغن اپنی نگرانی میں صاف کرایا۔ کئی جگہ سے پلستر خراب تھا' وہ ٹھیک کرایا۔ کھڑکیوں کے جو شیشے ٹوٹے ہوئے تھے' وہ بدلے۔ دروازوں کا رنگ بھی اُڑ گیا تھا۔ باتھ روم کی فٹنگ بہت خراب ہو گئی تھی۔ ان میں ٹائل کا اضافہ کیا ہے میں نے۔ اس کے بعد فرنیچر اور پردوں کی باری آئی تو میں خود پھرتی رہی۔ ایک ملازمہ رکھ لی تھی میں نے۔ وہ ہر جگہ ساتھ جاتی تھی۔ بعد میں ایک مالی کی ضرورت پڑی تو اس کا شوہر آگیا۔ وہ کہیں اور کام کرتا تھا مگر وہاں ان کے پاس رہنے کی جگہ نہیں تھی۔ میں نے سرونٹ کوارٹر بھی دیا اور تنخواہ بھی پہلے سے زیادہ کر دی۔ ظاہر ہے وہ بہت خوش ہیں اور مطمئن۔ مالی نے دن رات ایک کر کے باغ لگایا ہے۔ آدمی ذرا خبطی ہے۔ میری ہدایات پر بالکل عمل نہیں کرتا تھا۔ کہتا تھا کہ بیگم صاحبہ آدمی کو جس کام کا پتا نہ ہو اس میں دخل نہیں دینا چاہئے۔ اب میں اگر آپ کو قانونی مشورے دینے لگوں تو آپ کو کیسا لگے گا۔ باغ لگانا میرا کام ہے۔ آپ کو پسند نہ آئے تو جوتے مار کے نکال دیں۔"

میں نے کہا "کوئی خاندانی باغبان ہے؟"

"ہاں۔ کہتا ہے میرے باپ اور دادا نے یہی کام کیا۔ دادا انگریزوں کے ساتھ ولایت چلا گیا تھا اور وہیں مر گیا۔ بچوں کو چھوڑ گیا تھا لیکن وہ اس وقت تک اپنے پاؤں پر کھڑے ہو چکے تھے۔ باپ انڈیا میں رہ گیا' یہ اکیلا پاکستان چلا آیا لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنے کام میں ماہر ہے۔ اس کی محنت کا نتیجہ اب سامنے آیا ہے تو مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ وہی اُجاڑ باغ ہے۔"

میں نے کہا "تم جو یہ سب کرتی رہیں' اس میں تو بہت پیسہ خرچ ہوا ہو گا۔"

"پیسہ اور کس لئے ہوتا ہے۔"

"مگر وہ پیسہ آیا کہاں سے؟" میں نے کہا۔

"کہیں سے بھی آیا' تمہیں کیا" وہ بولی۔

میں نے کہا "بابا! یہ تو بتا دو کہ چوری کی' ڈاکا ڈالا یا لاٹری کا انعام نکلا؟"

"میری فرم پھر اچھی چل رہی ہے۔ تم جانتے ہو نا' میرا ایک بڑا ہونہار شاگرد تھا۔ ایسا فرماں بردار' وفادار اور روشن دماغ کہ سب چلے گئے مگر وہ وہیں بیٹھا رہا۔ آمدنی برائے نام رہ گئی تھی۔ عین وقت پر منظر نے معاملات کو سہارا دیا۔ واجبات ادا کئے۔ جو کیس وہ نہیں لے سکتا تھا ادھر بھیجنے شروع کئے۔ شاہد علی۔ یہ اس کا نام ہے جو میری عدم موجودگی میں صبر و استقامت کے ساتھ اچھے دنوں کی آس لگائے بیٹھا رہا۔"

"یہ تو بڑی عجیب بات ہے" میں نے کہا "مجھے اس شاہد علی سے رقابت کا حسد محسوس ہو رہا ہے۔"

رابعہ ہنسی "رقابت کے بغیر محبت کا کیا مزہ۔ جیسے تیز مرچ مسالے نہ ہوں تو چاٹ پھیکی۔"

"اچھا لاہور پہنچ جائیں تو یاد دلانا۔ سب سے پہلے رقیب رو سیاہ کو قتل کرنا ہے" میں نے کہا۔

"رو سیاہ کہاں گورا چٹا جوان لڑکا ہے۔"

"لڑکا! گورا چٹا' جوان" میں نے سر پکڑ لیا "تم بیٹھو یہاں' میں آتا ہوں اسے قتل کر کے۔ کم سے کم میرے سامنے اس کی تعریف مت کرو۔ کیا میں اس سے مل چکا ہوں؟"

"ضرور ملے ہو گے میرے آفس میں۔"

"بس وہیں غلطی ہو گئی۔ خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری جو اسے چھوڑ دیا..... خیر یہ بتاؤ۔ شادی شدہ ہے۔"

"پہلے تو نہیں تھا اب ایک بچے کا باپ ہے" وہ ہنسنے لگی۔

"کیا ایک غلط کام کیا اس نے میری عدم موجودگی میں۔"

"کیا مطلب؟ اسے انتظار کرنا چاہئے تھا تمہارا؟"

"بے وقوف آدمی۔ ادھر آمدنی نہیں رہی' ادھر بھائی نے گھر بسالیا۔ عشق تو پرانا تھا مگر حالات کچھ ایسے ہو گئے تھے کہ خانہ آبادی کے مسئلے کو حالات کے عذر پر مزید نہیں ٹالا جا سکتا تھا۔ ایک دن اس لڑکی کا باپ آگیا۔ اس نے دروازہ بند کر کے ریوالور نکال لیا اور بولا۔ تم نے یہ کیا کھیل شروع کر رکھا ہے۔ کب ٹھیک ہوں گے تمہارے حالات اور بھاڑ میں جائیں حالات۔ دو وقت کی روٹی نہیں کھا سکتے کما کے تو دھکے کیوں کھا رہے ہو اس پیشے میں۔ کوئی اور کام کرو۔ ریڑھی لگاؤ' ہنڈیاں بیچو لیکن شادی تو اب تمہارا باپ بھی کرے گا۔ میں اور انتظار نہیں کر سکتا۔ ابھی اور اسی وقت فیصلہ کرو ورنہ فیصلہ میں کرتا ہوں۔ ظاہر ہے اس کے بعد وہ نہ کیسے کہتا۔ مگر دیکھو سکندر! وہ جو لوگ کہتے ہیں نا کہ بیوی اپنی تقدیر ساتھ لاتی ہے۔ تو اس کے آتے ہی حالات سدھرنے شروع ہو گئے۔ منظر نے سپورٹ کیا اور کیس آنے لگے۔ جب میں واپس پہنچی ہوں تو وہ اپنے ساتھ دو نئے لڑکے رکھ چکا تھا اور اچھا خاصا کما رہا تھا۔ گاڑی بھی لے چکا تھا۔"

"تم نے کچھ نہیں کیا' بس امورِ خانہ داری میں لگی رہیں۔ وکالت کا پیشہ بھی بھلا دیا؟"

"نہیں۔ میں بھی چکر لگا لیتی تھی' ایک دن چھوڑ کے۔ ہاں ابھی تک کورٹ میں نہیں گئی۔"

"کیوں۔ ڈرتی ہو؟"

"ہاں۔ دل تو چاہتا تھا مگر ڈر لگتا تھا۔ خود منظر نے منع کر دیا تھا کہ ابھی گھر سنبھالو اور خود کو سنبھالو۔ اس یتیم کو تو لاوارث چھوڑ آئی ہو" رابعہ ہنسنے لگی "عموماً شام کو بیوی بچوں سمیت آجاتا تھا یا مجھے لے جاتا تھا۔"

میں نے کہا "بیگم رضوی کا حال کیسا ہے؟"

"وہ لندن چلی گئی ہیں اور وہیں سیٹل ہیں۔ اچھا کیا' یہاں اب کچھ نہیں تھا سوائے پریشانیوں کے۔ وہ سب جو انکل رضوی کے زمانے میں صبح شام سلام کرنا فرض سمجھتے تھے' ہر تقریب میں بلا کے عزت دیتے تھے' کسی موقعے پر بھولتے نہیں تھے۔ سب نے انہیں بھلا دیا تھا۔ اس لئے کہ اب وہ کسی ایس ایس پی کی بیوی نہیں رہی تھیں۔ کچھ بے مروت تھے تو کچھ بزدل۔ ڈرتے تھے کہ دلاور ان کا دشمن نہ ہو جائے۔ تاہم کچھ نیک دل لوگ تھے جو انکل کے ساتھی اور ماتحت رہے تھے۔ انہوں نے مشورہ دیا اور پھر انتظام بھی کیا کہ وہ باہر چلی جائیں۔"

میں چوہدری دلاور کا نام لینے سے بھی گریز کر رہا تھا۔ اتنی خوب صورت گفتگو میں اس شیطان کا حوالہ بھی میرے موڈ کو خراب کر دیتا مگر اب رابعہ نے ذکر کیا تو میں پوچھنے پر مجبور ہو گیا "وہ حرام زادہ بمبئی سے بھاگ گیا تھا۔"

"بھاگ کے کہاں گیا؟" رابعہ بولی۔

"کیوں۔ لاہور نہیں پہنچا؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ لاہور میں تو نہیں ہے وہ۔"

"اس نے گھر بدل لیا ہو گا" میں نے کہا۔

"بمبئی اس نے بھی بیوی بچوں کو غائب کر دیا تھا۔ ملک سے باہر ہی بھیجا ہو گا۔ وہ خود لوٹ کر پاکستان نہیں گیا۔ وہیں چلا گیا ہو گا جہاں اس کے بیوی بچے ہوں گے۔ ہاں استاد پیڈرو نظر آیا تھا منظر کو اور وہ حاجی عبداللہ ایک دن شاہد علی کے پاس گیا تھا اور پوچھ رہا تھا کہ مس رابعہ قاری کب آرہی ہیں واپس۔"

میں چونکا "وہ...... وہ کیوں پوچھ رہا تھا؟"

"مجھے کیا معلوم۔ شاہد تو کچھ جانتا نہیں تھا۔ پتا نہیں کتنے

مؤکل یہی سوال کرتے ہوں گے۔ اس نے کہا کہ کوئی کام ہو تو مجھے بتایئے۔ کہنے لگا کہ میاں' ویسے تو ماشاء اللہ سے تم بھی ہونہار لگتے ہو مگر ہمارا معاملہ کچھ اور ہے۔ تمہارے بس کا نہیں۔ اس کے بعد وہ لوٹ کے نہیں آیا۔"

"خیر۔ یار زندہ صحبت باقی۔ ابھی پرانے کھاتے بند نہیں ہوئے ہیں۔ مجھے ان سے حساب لینا ہے" میں نے کہا "اپنا حساب ..."

"چھوڑو سکندر۔ پرانی باتوں کو بھول جاؤ" رابعہ نے کہا۔

میں نے برہمی سے کہا "بھول جاؤں؟ یہ بھول جاؤں کہ وزیر خاں کیسی کسمپرسی کے عالم میں مرا تھا!"

"بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ وہ سب معاملات پرانے ہو گئے ہیں اور حالات کی گرد میں دب گئے ہیں" رابعہ نے کہا "اس گرد کو چھیڑو گے تو خود ہمارے خلاف دبے ہوئے تمام قانونی مسائل پھر اٹھ کھڑے ہوں گے۔"

میں نے کہا "تم کیا سمجھتی ہو' میں فریاد لے کر عدالت میں جاؤں گا؟ وہاں تو ملزم میں ہوں' قتل کا الزام مجھ پر ہے لیکن حقیقت کیا ہے' یہ میں بھی جانتا ہوں اور تم بھی سمجھتی ہو۔ میرے والد کے ساتھ کس نے فراڈ کیا' کیسے کیا اور کس طرح ان کی لاکھوں کی جائیداد ہتھیا کے انہیں پیسے پیسے کا محتاج بنایا گیا وہ ایک صنعت کار تھے مگر وہ مرے تو ایک گھریلو ملازم کی حیثیت سے ان کا جنازہ بھی ان کے گھر سے نہیں اٹھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ ان سب معاملات کی خبر مجھے لندن میں نہیں ہونے دی گئی۔ یہ سب کچھ ایک ہفتے یا ایک مہینے میں نہیں ہوا ہو گا۔ میں وہاں ٹھاٹ سے پڑھتا رہا اور عیش کرتا رہا۔ یہ فرض کئے بیٹھا رہا کہ وزیر خاں کو میں جس خوشحالی کی منزل پر چھوڑ کے آیا تھا اب وہ اس سے کہیں آگے دولت مندی کی منزل پر ہوں گے مگر وہ یہاں بیماری میں اپنے لئے دوا تک نہ خرید سکے اور سرکاری ہسپتالوں کا رنگین پانی پیتے پیتے مر گئے۔ کیا مجبوری لاحق تھی انہیں کہ انہوں نے حالات کو مجھ سے چھپایا اور انہیں مجبور کرنے والا کون تھا؟ ان کے نمک خوار' دوست احباب اور شناسا سب کیوں خاموش تماشائی بنے رہے؟ کسی نے بھی ان کی مدد نہیں کی آخر کیوں؟"

رابعہ نے کہا "ان کے ساتھ اتنا ظلم ہوا اور قانون کچھ نہیں کر سکا۔ انہوں نے کسی عدالت کا دروازہ نہیں کھٹکھٹایا' کسی سے انصاف نہیں مانگا' کسی کو وکیل نہیں کیا۔"

"وہ جانتے ہوں گے رابعہ کہ یہ سب بے کار ہے۔ قانون کتنا بے بس ہے' جھوٹے گواہوں اور جھوٹی شہادت لانے والوں کے سامنے۔ انصاف کرنے والے کیا کر سکتے ہیں جب مظلوم کی حمایت میں کوئی زبان سے سچ بولنے کی ہمت بھی نہ کرے۔ یہ بھی نہ بتائے کہ اس نے کیا دیکھا تھا اور کیا سنا تھا۔ چشم دید گواہ اندھے بہرے بن جائیں۔ اور قسم اٹھانے پر تیار ہو جائیں کہ وہ تو جائے واردات کے آس پاس ہی نہیں تھے۔ نہیں رابعہ! اب میرا معاملہ ایسے نظام انصاف سے طے نہیں ہو گا جو گواہی اور شہادت کی بیساکھی پر چلتا ہو۔ جہاں خدا' رسول اور قرآن کی قسم کھا کے جھوٹی گواہی دینے والے تو میسر آجاتے ہوں' خریدے جا سکتے ہو مگر کوئی حقیقی گواہ سچ بولتے ہوئے اپنا فرض' اپنا ضمیر' خوفِ خدا اور معاشرے کے حقوق' سب کچھ بھول جاتا ہو اور صرف ذاتی مفاد یا اپنی ذات کے تحفظ کی خاطر خاموشی سے کسی بے گناہ کو تختۂ دار تک جاتا دیکھنا قبول کر لیتا ہو۔"

"پھر کیا کرو گے تم آخر؟"

"رابعہ! ایم آر ایس کی عدالت نے کتنے فیصلے کئے تھے' کتنے مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچایا تھا' یہ تم بھی جانتی ہو۔ کیا وہ فیصلے غلط تھے؟ کسی کے ساتھ ناانصافی ہوئی تھی یا کسی بے گناہ کو سزا دی تھی ہم نے؟" میں نے کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے مگر......"

"اگر مگر کچھ نہیں۔ یہ میرا معاملہ ہے جسے وقتی طور پر میں نے عظیم تر ملکی و قومی مفادات کی خاطر التوا میں رکھا تھا۔ اب مجھے انصاف حاصل کرنا ہے۔ خود کرنا ہے یہ کام۔ ہر مجرم کو میں خود تلاش کروں گا اور خود سزا دوں گا' ان کا اعترافِ جرم حاصل کرنے کے بعد۔ ان کے ہاتھوں میں نے ہی نہیں تم نے بھی بہت نقصان اٹھائے ہیں۔ وہ سب ناقابلِ تلافی نقصانات تھے۔ ہم سب ظلم کا شکار ہوئے اور شکاری اپنے تمام وسائل کی قوت کے ساتھ ہمارے تعاقب میں رہے۔ ان کی طاقت تھی دولت۔ اس سے انہوں نے پولیس کو خرید لیا' شہادتوں کو خرید لیا یہاں تک کہ انصاف کرنے والوں کو خرید لیا۔ اب شکاری ہم ہیں مگر ہماری طاقت دولت نہیں' ہمارا یقین ہے۔ تم دیکھنا' میں انہیں کیسے شکار کرتا ہوں۔ ابھی مہلت ہے ان کے پاس۔ جہاں چاہے جا کے چھپ جائیں مگر وہ مجھ سے بچ کے کہیں نہیں جا سکتے۔ میں ان کو ڈھونڈ نکالوں گا' خواہ کوئی میرا ساتھ دے یا نہ دے۔"

"کوئی سے کیا مراد ہے تمہاری؟" رابعہ نے برہمی سے کہا۔

"تم ساتھ دو گی میرا؟"

"یہ سوال پوچھ کے تم میری توہین کر رہے ہو۔ کیا تمہیں شک ہے کہ میں انکار کر دوں گی؟"

میں نے خفت سے کہا "دراصل...... تم قانون داں ہو نا......"

"میں تمہارے لئے صرف رابعہ ہوں۔ تمہاری اور میری زندگی کے راستے ایک ہیں مگر......"

"مگر کیا؟ کھل کے بات کرو۔"

"کیا غالب اور نازو تمہارے ذاتی انتقام کی اس جنگ میں بھی اسی طرح تمہارا ساتھ دیں گے؟ یہ مقصد اور تھا' اس میں ذاتی پہلو کوئی نہیں تھا لیکن اس کے بعد مقصد کی نوعیت بدل جائے گی۔"

رابعہ بولی "کوئی بھی اپنی زندگی کے خواب تمہاری خواہشوں پر قربان نہیں کر سکتا۔ دوستی کے خلوص کو آزمانے کی ایک حد ہوتی ہے۔ دوستی میں وفاداری کا مطلب یک طرفہ اجارہ داری نہیں ہے۔"

"تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟ اجارہ داری......"

"دیکھو' ٹھنڈے دماغ سے سوچو' دل سے مت سوچو۔ کیا غالب کی اور نازو کی اپنی کوئی زندگی ہے؟ ان کے ارمان ہیں اور خواب ہیں؟ اگر ہیں تو انہیں کیا اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنی زندگی میں اپنی خوشیوں کے رنگ بھر سکیں؟ تم تو چاہتے ہو کہ بس وہ تمہارے مقاصد کی تکمیل کے آلۂ کار بنے رہیں۔"

میں نے بگڑ کے کہا "یہ الزام ہے مجھ پر۔ وہ اپنی مرضی سے اس مشن میں ساتھ دے رہے تھے۔"

"مگر اس کے بعد والا مشن؟ کیا اس میں بھی تم انہیں اپنے ساتھ گھسیٹو گے؟ ممکن ہے محسن تم سے اتفاق کرے مگر تم دیکھ لینا' آخر کار گل اسے جیت لے گی۔ جب وہ گل کا ہو جائے گا تو تمہارا نہیں رہے گا۔"

"تم غلط سوچ رہی ہو۔ وہ ایسا دوست نہیں ہے۔"

"دوستی کے درمیان جب خاندانی رشتے' بیوی بچوں کی محبت' ذمے داریاں اور مجبوریاں حائل ہو جاتی ہیں تو بہت کچھ پہلے جیسا نہیں رہتا۔ کیا تم نے دیکھا نہیں کہ کتنی آسانی سے لوگ گھر چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ گھر جس میں ماں باپ بھائی بہن ہی پیدائش سے بیس پچیس سال تک آدمی کا سب کچھ ہوتے ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ ماں کے پیروں تلے جنت ہے مگر اس جنت کی خاطر کون بیوی کی زندگی کو جہنم بناتا ہے؟ چند مہینوں یا سال دو سال میں وہ عورت جو بیوی ہوتی ہے' بچوں کی ماں بن جاتی ہے اور سب سے زیادہ اہم ہو جاتی ہے۔ پھر جب بچے بڑے ہونے لگتے ہیں تو سب کچھ غیر اہم ہو جاتا ہے۔ ان کی پرورش' ان کی خواہشات کی تکمیل' ان کی خوشی کے لئے جدوجہد' ان کی کامیابی کے وسائل کا حصول' یہ سب آدمی کو تمام بیرونی رشتوں سے بے نیاز کر دیتے ہیں۔ اصول' نظریات اور جذباتی فلسفے سب بے مصرف ہو جاتے ہیں۔ آدمی خود غرض' بزدل اور بے بس ہو جاتا ہے۔ میں عام آدمی کی بات کر رہی ہوں۔ لاکھوں میں چند ایک ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی زندگی اور اپنی بچوں تک کو قربان کر دینے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔"

میں اسے دیکھتا رہا۔ وہ بڑے منطقی انداز میں دلائل دے رہی تھی۔ اس وقت وہ پھر ہائی کورٹ کی وکیل بن گئی تھی۔ پہلا مقدمہ مسٹر اور مسز غالب بنام سکندر بخت' دوسرا مقدمہ مسٹر اور مسز محسن بنام سکندر بخت۔ رابعہ وکیل استغاثہ بن کے میرے خلاف بول رہی تھی۔ آخر کیا حق پہنچتا تھا ملزم سکندر بخت کو کہ وہ محبت کرنے والوں کا جذباتی استحصال کرے؟ ان سے دوستی کے نام پر ارمانوں کی قربانی طلب کرے؟ انہیں ذاتی مقاصد کے لئے استعمال کرے؟ اور انہیں ازدواجی زندگی کی مسرتوں سے محروم کرے؟ ملک اور قوم کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دینا ایک مقدس فریضہ تھا اور زندگی ایک سچے پاکستانی کی حیثیت سے اس جہاد میں ملزم سکندر بخت کے ساتھ رہے' اس کی حمایت کرتے رہے اور اس کے ہر حکم کی تعمیل کرتے رہے مگر اپنے والد کے ساتھ ہونے والے ظلم کا انتقام لینا ایک بالکل مختلف اور متنازعہ موضوع ہے......

"میں وکیل استغاثہ سے اتفاق کرتا ہوں" میں نے کہا۔

رابعہ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا "کیا؟ تم کہاں تھے سکندر؟ یہ وکیل استغاثہ کہاں سے آ گیا؟ اس کا مطلب ہے تم میری بات سن ہی نہیں رہے تھے۔"

میں نے چونک کر خفت سے مسکراتے ہوئے کہا "سب سن کے ہی تو میں نے اتفاق کیا ہے تم سے۔ تم نے بالکل ٹھیک کہا۔ یہاں سے واپس جانے کے بعد میں' غالب اور محسن صرف دوست رہ جائیں گے۔ اگر خود انہوں نے میرا ساتھ دینا چاہا تو میں انہیں اجازت نہیں دوں گا۔ وہ اپنے گھر میں خوش اور آباد رہیں۔"

"تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ مان جائیں گے؟ اور کہیں گے کہ اچھا کبیر خاں جاؤ اپنا انتقام لو۔ اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔ زندگی رہی تو پھر ملیں گے۔ نہیں سکندر! وہ اتنے کمینے اور خود غرض نہیں ہیں۔ انہیں آزمائش میں مت ڈالو۔ وہ مجبور ہو جائیں گے کہ تمہارا ساتھ دیں۔"

"آخر تم چاہتی کیا ہو؟" میں نے جھنا کے کہا۔

"جو میں چاہتی ہوں' وہ تم نہیں چاہتے اس لئے میری بات چھوڑو۔ میں ہر حال میں تمہارے ساتھ ہوں" رابعہ نے کہا' "تمہیں عفوودرگزر کی فضیلت پر لیکچر دینا بے کار ہے۔ تمہیں اپنا انتقام اپنے گھر سے زیادہ عزیز ہے تو یوں ہی سہی۔ مگر ابھی غالب اور نازو سے کچھ مت کہنا۔ محسن اور گل کو بھی مت بتانا کہ تمہارے عزائم کیا ہیں۔ تمہیں جو کرنا ہو لاہور جا کے کرنا۔ بالکل خاموشی سے اور اس وقت جب وہ اپنی ازدواجی زندگی کے سفر پر روانہ ہو جائیں اور پیچھے مڑ کر نہ دیکھیں کہ اب تم کیا کر رہے ہو۔ وعدہ کرو مجھ سے۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں" میں نے شکست خوردہ اور کھوکھلے لہجے میں کہا۔

رابعہ اٹھی اور اندر چلی گئی۔ اس کے دلائل نے مجھے یقین اور اعتماد سے محروم کر دیا تھا۔ میرے جذبات میں انتشار پھیلا دیا تھا اور میرے خیالوں کو دھندلا دیا تھا۔ میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ کیا ان حالات میں گھر بسا کے میں رابعہ پر ظلم نہیں کروں گا؟

رابعہ اس سے زیادہ واضح الفاظ میں مجھے نہیں سمجھا سکتی تھی کہ آج اور کل میں کیا فرق ہو گا۔ کل غالب اور نازو شاید مجبور نہ ہوں۔ ان کے پاس اپنی زندگی پر اپنا اختیار ہو گا جس سے وہ کسی قیمت پر دستبردار نہیں ہوں گے۔ محسن اور گل کی مجبوریاں بھی مختلف ہوں گی۔ میرا اختیار باقی رہے گا تو صرف رابعہ پر اور اس کی مجبوری ہو گی' وہ محبت جس سے میں فائدہ اٹھا سکتا ہوں۔ اس سے

کہہ سکتا ہوں کہ آؤ میرے ساتھ چلو اور وہ کوئی سوال کئے بغیر اس گھر کو خدا حافظ کہہ دے گی جس کو اس نے دن رات جاگتی آنکھوں میں خواب بسا کے ارمانوں کے رنگ سے سجایا تھا۔ نہیں۔ میں یہ ظلم نہیں کر سکتا۔ میں رابعہ کی محبت کی مجبوری سے فائدہ نہیں اٹھاؤں گا۔ اس کی زندگی اور جذبات کی کمزوری سے نہیں کھیلوں گا۔ یہ تو سراسر کمینگی ہوگی کہ ان مقاصد کی خاطر جس سے صرف مجھے تسکین حاصل ہو' میں اسے بھی اپنے ساتھ مصائب و آلام' خطرات اور موت کی دلدل میں گھسیٹتا پھروں۔

یہ فیصلہ کرلینے کے بعد مجھے قدرے سکون ملا۔ اس وقت تک شام کے دھندلکے پر رات کا اندھیرا غالب آنے لگا تھا۔ صبح کا ناشتا سب نے اتنی دیر سے کیا تھا کہ دوپہر کے کھانے کی ضرورت کسی نے بھی محسوس نہیں کی تھی۔ ویسے بھی باتوں سے دل نہیں بھرا تھا تو پیٹ بھرنے کا خیال کسے آتا۔

نازو اور غالب میں جنگِ عظیم کے بعد صلح نامہ ہوچکا تھا مگر وہ چھوٹی موٹی جھڑپیں حسبِ سابق جاری تھیں جن کے بغیر شاید انہیں محبت کا مزہ ہی نہیں آتا تھا۔ رابعہ بھی پُرسکون تھی مگر مجھ سے نظریں چُرا رہی تھی اور شاید سچ کا کڑوا زہر میرے حلق سے اتارنے کے بعد اپنی زیادتی کے احساس سے پشیمانی میں مبتلا ہونے لگی تھی۔ سب سے نمایاں فرق گل کے رویئے میں آیا تھا۔ وہ اپنی خاموشی اور اداسی کے خول سے نکل آئی تھی اور پہلے کی طرح ہنس بول رہی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ اس تبدیلی کا ذمے دار محسن ہے۔ یہ ناممکن تھا کہ وہ اتنی جلدی شہلا کو بھول جائے مگر اس کے لئے بے رخی اور بے اعتنائی سے کسی کا دل توڑنا بھی اتنا ہی ناممکن تھا۔

کاجل آٹھ بجے نمودار ہوئی۔ اس کا حلیہ بالکل بدلا ہوا تھا۔ وہ شلوار قمیص اور دوپٹے میں تھی اور اس نے بالوں کی چوٹی گوندھ لی تھی۔ اس کے لمبے' کالے بال پشت پر کسی سیاہ ناگ کی طرح لہرا رہے تھے اور کانوں میں بڑی بڑی نازک بالیاں جھول رہی تھیں۔ وہ اچانک بنگالن سے پنجاب کی مٹیار بن گئی تھی۔

"معاف کرنا مجھے کچھ دیر ہوگئی" وہ بولی "دن میں تم نے کیا کھایا؟"

غالب نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا "تمہارا غم کھایا۔"

کاجل ہنس پڑی "اچھا!"

نازو نے غالب کو گھورا تو اس نے فوراً وضاحت کی "میرا مطلب تھا ہم سب کو تمہاری فکر رہی۔"

"مرزا! تم ایک بزدل آدمی ہو۔ بلکہ آدمی ہو ہی نہیں۔ تم نے ناک کٹوادی ہم سب مردوں کی" محسن نے کہا۔

"تمہاری ناک تو نہیں کٹی نا" غالب بولا۔

"مجھے شرم آتی ہے تمہیں اپنا دوست کہتے ہوئے۔ تمہاری جگہ میں ہوتا یار' تو ایک بار منہ سے وہ شرم ناک الفاظ نہ نکالتا۔ ایک بار لکھ کر نہ دیتا جو تو نے ہزار بار لکھ دیا۔"

"پھر کیا کرتے؟" نازو نے کہا۔

"میں...... میں ہاتھ پکڑتا کاجل کا اور نکل جاتا سینے پر ہاتھ... کے کسی نکاح خواں کی تلاش میں۔ تم دوڑی آتیں پیچھے... رگڑتی ہوئی اور میں... ہزار بار کہتا......"

کاجل نے ایک دم اپنا ہاتھ بڑھادیا "لو' پکڑو میرا ہاتھ۔ یہ... جانتی ہوں ایک نکاح خواں کو۔"

محسن نے گڑبڑا کے کہا "وہ...... وہ تو میں غالب کی جگہ ہو... کرتا...... فی الحال میں اپنی جگہ پر ہوں۔"

اب غالب کی باری تھی۔ اس نے کہا "آؤ یہاں میری ج... آ کے ہمت کرو۔ ورنہ ڈوب مرو۔ گل کی طرف کیا دیکھ رہے ہو؟"

گل کا رنگ گلابی ہوگیا۔ اس نے گھبرا کے کہا "بھئی مجھے... لڑائی میں مت کھینچو۔"

کاجل نے کہا "پہلے کھانا کھالیں آپ لوگ۔ پھر میں ا... خوش خبری سناؤں گی۔"

میں نے کہا "خوش خبری پہلے سناؤ۔ ممکن ہے اس کے... کھانے کی ضرورت ہی نہ رہے۔"

"اسی لئے تو کھانا پہلے ضروری ہے۔ خود میں نے نہیں کھا... سخت بھوک لگی ہے" وہ بولی "کوئی جا کے گاڑی میں سے کھانا... آئے۔"

یہ نیک کام محسن نے کیا۔ کاجل کسی ہوٹل سے کھانا پ... کرا کے لائی تھی۔ اس کی خوشبو اتنی اشتہا انگیز تھی کہ کھانا سا... آتے ہی سب ٹوٹ پڑے۔

"ہمارے جانے کا انتظام ہوگیا ہے" کاجل نے کھانے کے... اعلان کیا۔

"سچ!" نازو نے خوشی سے بے قابو ہو کے کہا "کب؟"

"کل سے روانگی شروع ہوجائے گی" اس نے کہا۔

"کل سے...... کیا ہم سب ایک ساتھ نہیں جائیں گے..." میں نے کہا۔

"ایک ساتھ تو بہت مشکل ہے" وہ بولی "جہازوں پر بکنگ کا... رش ہے کہ باقاعدہ سیٹوں کی بلیک ہو رہی ہے۔ تین چار گنا قیمت... بھی سیٹ نہیں ملتی۔ پھر ڈائریکٹ فلائٹ تو ہے نہیں۔ ایک را... کولمبو سے ہے' دوسرا نیپال کی طرف سے۔ دونوں بہت لمبے ر... ہیں چنانچہ کرائے ویسے ہی ڈبل ہوجاتے ہیں۔"

میں نے مایوسی سے کہا "یہ تو بہت مہنگا بھی پڑے گا۔"

محسن نے کہا "کتنا مہنگا پڑے گا یار۔ ساٹھ ہزار میرے پ... ہیں۔"

"بائیس ہزار سے زیادہ ہمارے پاس ہیں" نازو نے کہا۔

"یہ تو بہت ہے" کاجل بولی "اور پیسہ میں بھی لا سکتی ہو... مسئلہ جگہ کا ہے۔ ہر فلائٹ میں ایک دو افراد کی سیٹیں خرید... سکتی ہیں یا انہیں غیر قانونی طور پر کہیں فٹ کیا جا سکتا ہے؟ ..."

...ت دے کر مگر ایک ساتھ چھ سات سیٹوں کا سوال ہی پیدا نہیں... فی الحال دو کے جانے کا بندوبست ہوا ہے کل کی فلائٹ سے ...ل کے راستے۔"

"صرف دو" غالب نے کہا "باقی کب جائیں گے؟"

"جب جگہ ملے گی۔"

"جگہ کب ملے گی؟" غالب بولا۔

"یہ میں کیسے بتا سکتی ہوں۔ قسمت کی بات ہے' باقی سب ایک ...تھ نکل جائیں یا اگلی فلائٹ میں ایک بھی نہ جا پائے۔ انتظار تو ...نا پڑے گا اور صبر سے کام لئے بنا چارہ نہیں۔"

"بائی روڈ سب ساتھ جا سکتے ہیں نا؟" محسن نے کہا۔

"ہاں۔ مگر وہ بہت لمبا' تکلیف دہ اور غیر محفوظ سفر ہے۔ اس ...یہاں انتظار کرنا آسان ہے" کاجل نے کہا۔

میں نے کہا "او کے۔ دو کل چلے جائیں گے۔"

رابعہ نے کہا "کون دو؟"

میں نے کہا "کوئی بھی دو۔ نازو اور گل چلی جائیں۔"

نازو نے صاف انکار کردیا "میں بعد میں جاؤں گی۔"

اس کے انکار کا مطلب بھی صاف تھا کہ میں غالب کے ساتھ ...ں گی۔ اسے اکیلا چھوڑ کے نہیں جاؤں گی۔

"رابعہ اور گل" میں نے کہا۔

اب رابعہ نے انکار کردیا "مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔ ایسا کرو ...ن کو...... اور اس کے ساتھ گل کو روانہ کردو۔"

محسن نے کہا "تم چلی جاؤ نا سکندر کے ساتھ۔"

کاجل نے کہا "یہ کیا مصیبت ہے! آخر کوئی تو جائے گا۔ چلو ...رانداز ی کرلو۔"

میں نے کہا "بالکل ٹھیک ہے۔ اعتراض بالکل نہیں چلے گا ...میں۔"

"ہاں۔ خواہ غالب کا اور کاجل کا نام نکل آئے" محسن بولا۔

"میں ابھی سے انکار کرتا ہوں۔ مجھے یہیں مرنا قبول ہے۔" ...ب نے احتجاج کیا۔ "میں راستے میں کود جاؤں گا جہاز سے اگر ...ہلاک کی گئی۔"

کاجل نے ہنس کے کہا "اب میں اتنی بُری بھی نہیں ہوں۔"

غالب نے کہا "مگر میں گرفتارِ بلا ہوں۔ وہ بلا مجھے نہیں ...وڑے گی۔ مجھے پھر ایک ہزار مرتبہ لکھ کے دینا پڑے گا۔"

نازو ہنسی "جانا تو پڑے گا تمہیں۔ قرعہ اندازی آخر کس لئے ...رہی ہے۔ ایسے تو فیصلہ کبھی نہیں ہوگا۔"

جب قرعہ اندازی میں محسن کا نام نکلا تو غالب نے سب سے ...پہلے نعرہ لگایا "بچ گیا۔ میں تو بچ گیا' مدعی لاکھ بُرا چاہے......"

اگلا نام گل کا نکل آیا تو پھر شور مچا "بے ایمانی ہوئی ہے۔"

"کیا بے ایمانی ہوئی ہے؟" غالب نے کہا۔

"جان بوجھ کے یہ نام نکالا گیا ہے؟" محسن بولا۔

"نام سب کے سامنے نکالا گیا ہے" میں نے کہا اور کن انکھیوں سے گل کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ میں فتح مندی کا غرور تھا اور اس کی آنکھیں اپنی خوش نصیبی کا اعلان کرتی محسوس ہوتی تھیں۔ اگر اس نے دعا مانگی تو وہ قبولیت کی گھڑی تھی۔ اگر یہ جذبۂ دل کی تاثیر تھی تو اس میں کلام نہیں تھا۔ اگر یہ حسنِ اتفاق تھا تو بڑا حسین اتفاق تھا۔ مجھے ایک بار پھر یوں لگا جیسے محسن کا احتجاج بھی رسمی اور سطحی ہے۔ وہ گل کو احساس دلانا چاہتا ہے کہ در حقیقت وہ بھی اس قرعہ اندازی کے نتیجے سے اتنا ہی خوش ہے جتنی گل۔

بات صرف اتنی تھی کہ محسن پہلے سے گل کے جذبات سے آگاہ تھا۔ جب شہلا زندہ تھی تب بھی اس میں ہمت نہ تھی کہ وہ گل کی دل شکنی کرسکے۔ کچھ اس لئے کہ ڈاکو شیش ناگ کی بہن ناگ منی سے جب وہ گل بانو بنی تو اس کو جذباتی سہاروں کی ضرورت تھی۔ بھائی کے مرنے کے بعد وہ دنیا میں لاوارث و تنہا رہ گئی تھی۔ ایسے میں ہم نے اسے اپنایا اور اس نے محسن کو پسند کرلیا' یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ شہلا کا ہوچکا ہے اور وہ تمام عمر اس کے پیچھے بھاگتی رہے گی تب بھی اس کو نہ پاسکے گی۔ اب دل کس پر آتا ہے اور کیوں آتا ہے' اس کی کیا توضیح اور کیا دلیل۔ جو نہ مصلحت دیکھے نہ مصالحت کرے' اسے کوئی کیا سمجھائے۔ ہم نے بھی محسن کو مجبور کیا تھا کہ گل کو نئی زندگی کی راہ پر چلتے رہنے کی استقامت صرف ہمارا رویّہ دے سکتا ہے۔ اس راہ پر ایک تلخ تجربہ اس کو پھر صراطِ مستقیم سے بھٹکا دیتا اور وہ جذباتی عدم توازن کا شکار ہو کر مہرووفا کے نام سے ہی بدظن ہوجاتی تو تمام عمر زمانے کی ٹھوکروں میں رہتی۔ یہی وجہ تھی کہ محسن نے اسے کبھی یک طرفہ محبت کے حق سے محروم نہیں کیا کہ اگر وہ یوں خوش ہے تو یوں ہی سہی۔ لیکن اب اچانک شہلا نہیں رہی تھی۔ اس کی تمام زندگی قربانی سے عبارت تھی۔ یہ قربانی اس نے پہلے بھائی کے لئے دی تھی' پھر شوہر کے لئے اور آخر میں بیٹے کے لئے اور ہم سب کے لئے۔ لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس نے گل کو بھی زیرِ بارِ احسان کیا۔ وہ گل سے کبھی نہیں ملی اور اس نے گل کو دیکھا تک نہیں۔ جب گل نے اسے دیکھا تو وہ شیشے کے تابوت میں خوابیدہ ایک لاش سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ اسے کیسے معلوم ہوسکتا تھا کہ گل بانو نام کی ایک لڑکی جو پہلے ڈاکو ناگ منی تھی' اب اس کے شوہر سے دل لگا بیٹھی ہے۔ اگر یہ بات اسے کوئی بتا بھی دیتا تو شاید مرتے وقت اس کے دل میں ایک خلش رہ جاتی کہ کہیں اس میں پچاس فیصد نہ سہی' دس فیصد' ایک فیصد یا برائے نام ہی سہی' غلط فہمی کی بات سہی' قصور محسن کا تو نہیں تھا؟ لوگ تو کہتے ہیں تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی اور دھواں وہیں سے اٹھتا ہے جہاں آگ ہو۔

لیکن خدا نے اسے محبت پر اعتماد' محسن پر اعتبار اور وفا پر یقین کے سکون سے محروم نہیں کیا اور اس نے بے مثال صبر' درد فرقت

کے عذاب کو شکر کے ساتھ جھیلنے کی بے مثل ہمت اور قربانی کی بے مثل روایت قائم کرنے کا حوصلہ دیا اور اس کے ساتھ ہی وہ گل کو تمام عمر کے لئے زیر بارِ احسان کر گئی کہ سپردم بہ تو مایہ خویش را۔ میں تو اسے سنبھال کے نہ رکھ سکی۔ تم اسے سنبھال کے رکھنا۔

محسن نے بھی حیرت انگیز اور ناقابل یقین صبر کے ساتھ اپنی زندگی کے سب سے بڑے جذباتی سانحے کو برداشت کیا تھا۔ شاید اس کی جگہ میں ہوتا تو ہوش کھو بیٹھتا مگر اس نے نوشتہ تقدیر کو خدا کی رضا سمجھ کر قبول کیا اور ثابت کر دیا کہ وہ ناقابل شکست ہے۔ اپنی وفا میں، اپنی محبت میں، اپنی دوستی میں، اس کا خلوص ایک جذبہ جاوداں ہے۔

بدلے ہوئے حالات میں وہ گل کے ساتھ پہلے کی طرح مہربانی اور التفات کا رویہ اپنائے ہوئے تھا مگر گل کا اندازِ عشق بدل گیا تھا۔ اب وہ زیادہ پُرامید تھی اور محسوس کرنے لگی تھی کہ یہ سب انتظام دست غیب ہے۔ یہ تو سوچنا ہی غلط تھا کہ اس کے دل کے کسی گوشے میں شہلا کی موت پر خوشی یا اطمینان کا خیال بھی موجود ہو گا لیکن یہ سمجھنے میں وہ حق بجانب تھی کہ جب اس نے ایسا کبھی نہیں چاہا تھا پھر بھی قدرت نے اس کا راستہ صاف کر دیا تو وہ خود کو مجرم کیوں سمجھے اور کیوں محسن کو نہ اپنائے۔ اسے کیوں نہ چاہے۔ اتنی ہی شدت سے اور خلوصِ نیت کے ساتھ، جیسے شہلا نے چاہا تھا۔ وہ اس کے لئے شہلا کیوں نہ بن جائے اور اس خلا کو اپنی کوشش کی انتہا تک پُر کرنے کی خواہش کیوں نہ کرے جو محسن کی زندگی میں پیدا ہو گیا ہے۔

کاجل رات دس بجے گئی تو دو پولیس مین ڈیوٹی پر آ چکے تھے مگر وہ نئے آدمی تھے۔ گل اور محسن کی پرواز اگلے دن دوپہر کو روانہ ہونے کا امکان تھا۔ جہاز شیڈول کے مطابق نہ آ رہے تھے اور نہ جا رہے تھے مگر اس نے کہا کہ وہ دس بجے آ کے انہیں اپنے ساتھ لے جائے گی۔

ابھی وہ رخصت ہو کے زیادہ دور نہیں گئی تھی کہ ہم نے فائرنگ کی آواز سنی۔ یہ مشین گن کے فائر تھے۔ میں نے اور محسن نے خواتین کو اندر رہنے کی تاکید کی اور غالب کو ان کے پاس چھوڑ کے باہر گئے۔ اِدھر اُدھر کی کوٹھیوں سے بہت سے لوگ نکل آئے تھے اور اپنے اپنے نوکروں کو صورتِ حال معلوم کرنے کے لئے بھیج رہے تھے۔

بظاہر کہیں کچھ نہیں ہوا تھا مگر اچانک میری نگاہ گیٹ پر گئی۔ دونوں پولیس مین جو رات کی ڈیوٹی دینے آئے تھے، غائب تھے۔

میرا ماتھا ٹھنکا "محسن! مجھے دال میں کچھ کالا نظر آ رہا ہے۔"

محسن نے سر ہلایا "فائرنگ بہت قریب ہوئی تھی۔ مجھے تو یوں لگا جیسے دو...ے ہی دروازے پر۔ کہیں ان کا نشانہ کاجل تو نہیں تھی۔"

"یہ ہو سکتا ہے" میں نے کہا "ویسے تو عبدالستار چوہدری نے اسے پاگل مشہور کر رکھا ہے مگر جاننے والے جانتے ہوں گے کہ یہ پاگل پن ہے۔ وہ کار لے کر پھرتی ہے۔ نت نئے فیشن کرتی ہے اپنی مرضی سے آتی جاتی ہے اور باتوں سے اتنی ہوش مند لگتی ہے کہ اسے پاگل کہنے والا خود پاگل....."

محسن نے کہا "کچھ لوگوں کو ضرور معلوم ہو گا کہ وہ بنگلہ دیش کی دل سے حامی نہیں اور پاکستانی ہے۔ کہیں کسی نے اس کے اور ہمارے تعلق کا پتا تو نہیں چلا لیا۔ اللہ خیر کرے۔"

ابھی ہم اندھیرے کی اوٹ میں کھڑے اپنے اندیشوں کے اسباب تلاش کر ہی رہے تھے کہ اصل پولیس مین نمودار ہوئے میں نے کہا "تم لوگ کہاں چلے گئے تھے؟"

ان میں سے ایک نے کہا "سائیں ہم کو مافی دو۔ اپنے کو تم دیر ہو گیا۔"

میں نے کہا "ابھی یہاں فائرنگ ہوئی تھی؟"

دوسرا پولیس مین بولا "آہو جی۔ آوازاں تو ہم نے بھی سنی تھیں۔ اِک بندے نے بتایا کہ کسی نے گڈی پر گولیاں چلائی تھیں۔"

میں نے کہا "کس کی گاڑی پر؟"

"یہ تو نہیں پوچھا میں نے۔ پر وہ بندہ کہہ رہا تھا کہ کوئی لڑکی گڈی چلا رہی تھی۔ اندھیرے میں گڈی کا رنگ نظر نہیں آیا۔"

میں نے کہا "اندھیرے میں کون سا رنگ نظر نہیں آتا؟ سفید گاڑی صاف نظر آتی۔ پیلی بھی نمایاں ہوتی۔ ہاں لال یا کالی ڈارک براؤن رنگ شناخت کرنا مشکل ہو گا۔"

محسن بولا "اب تم دھیان سے پہرا دو۔ ہمیں شک ہے کہ کسی نے چوہدری صاحب کی گاڑی پر گولیاں چلائی تھیں۔"

میں نے کہا "تم فون کر کے معلوم کر سکتے ہو؟"

ان کو عبدالستار چوہدری کا فون نمبر معلوم نہیں تھا۔ بات تشویش کی تھی مگر تصدیق کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ میں نے اور محسن نے طے کیا کہ خواتین کو کچھ نہ بتایا جائے اور انہوں نے پوچھا تو ہم نے خاصی لاتعلقی سے ٹال دیا کہ پتا نہیں کیا معاملہ تھا۔ یہاں حالات ایسے ہیں کہ کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ مگر ہم تو محفوظ ہیں۔ میں نے انہیں مطمئن کر کے سونے پر مجبور کر دیا اور خود بھی سب کے ساتھ ہی لیٹ گیا مگر نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی اور مجھے ہر سمت سے خطرے کی آہٹ محسوس ہوتی تھی۔

کچھ دیر بعد میں نے محسن کو اٹھ کر باہر جاتے دیکھا اور خود دبے پاؤں باہر نکل گیا۔ ہم باغ کے آخری گوشے میں اسی جگہ گئے جہاں دن میں غالب اور نازو بیٹھے رہے تھے۔ حفظِ ماتقدم کے طور پر ہم نے ریوالور اپنے پاس رکھے اور ان پولیس والوں پر نظر رکھی جو پہرے پر مامور تھے۔

محسن نے کہا "یار سکندر! میری جگہ کل تُو نہیں جا سکتا؟"

میں نے کہا "نہیں۔ فیصلہ ہو گیا ہے۔"

"بات فیصلے کی نہیں ہے یار، حوصلے کی ہے۔ تُو جا سکتا ہے اس گھر میں، جو تیرا اپنا ہے۔ تو اسے آباد کر سکتا ہے۔ میں اس گھر میں نہیں جا سکتا جہاں اب شہلا نہیں ہے۔ گل کے ساتھ جاتے ہوئے میں خود کو مجرم محسوس کرتا ہوں۔"

میں نے کہا "یہ ضروری تو نہیں کہ تُو اپنے گھر جائے۔ تو ہمارے گھر میں رہ سکتا ہے۔ گل کو منظر کے پاس چھوڑ سکتا ہے اور چاہے تو خود بھی وہیں قیام کر سکتا ہے۔ ہم سب کی واپسی تک۔"

وہ کچھ دیر چپ رہا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ شہلا کا نام اس کے لب پر بے سبب نہیں آیا تھا۔ یہ آنے والے طوفان کا پیش خیمہ تھا۔ ابھی تک اس نے ضبط سے کام لیا تھا۔ وہ کسی اور کے سامنے رونا نہیں چاہتا تھا۔ اب میں اور وہ تنہا تھے تو اس نے خود اپنے دل کے ناسور میں خنجر اتار دیا۔ وہ شہلا کی باتیں کرنے لگا اور پھر جذبات کا آتش فشاں پھٹ گیا۔ وہ سب لاوا جو اس کے وجود میں جمع تھا، بہہ نکلا۔ وہ رونے لگا اور میرے کندھے پر سر رکھ کے آنسو بہانے لگا۔

میں نے اسے روکا نہیں۔ صبر کی تلقین بھی نہیں کی۔ میں خود اس کے ساتھ روتا رہا اور شہلا کو یاد کرتا رہا۔ اسے وہ سب بتاتا رہا جو ابھی تک وہ نہیں جانتا تھا۔ کسی سفاک مسیحا کی طرح میں نے اس کے زخم کا سارا مواد بڑی ہوشیاری سے نکال دیا۔ اس کے درد کا درماں یہی تھا۔ اس کو شفا صرف ایسے ہی مل سکتی تھی۔

وہ رات بھر روتا رہا اور شہلا کے ساتھ گزرنے والی زندگی پر آنسو بہاتا رہا۔ یادوں کے قبرستان میں ہر لمحے کی قبر پر اشکوں کے پھول نچھاور کر کے اسے کچھ سکون ملا۔ صبح ہوتے ہوتے وہ نارمل تھا۔ فضا ساکت تھی۔ رات اتنی خاموش تھی کہ پتا بھی گرتا تھا تو آواز سنائی دیتی تھی۔ باہر خاصی سردی تھی اور خزاں کی ہوا تھی مگر ہمیں خنکی کا احساس بھی نہیں ہوا۔ ہم اپنی یادوں میں اور اپنی باتوں میں اتنے منہمک تھے کہ ہم نے ایک بار بھی پلٹ کر نہیں دیکھا۔

پھر اچانک مجھے اپنے پیچھے ایک سایہ سا نظر آیا۔ میں ایک دم اٹھا تو اس سائے نے فرار ہونے کی کوشش کی۔ میں نے ایک جست میں اسے جا لیا۔ یہ گل تھی جو نہ جانے کب پیچھے آ کے کھڑی ہو گئی تھی اور شاید اس نے سب کچھ سنا بھی تھا۔

گل نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی "جانے دو مجھے۔"

وہ ہسٹریا سے مغلوب تھی اور اس میں غیر معمولی طاقت آ گئی تھی۔ اسے قابو کرنے کے لئے مجھے دونوں بازوؤں کے حلقے میں اسیر کرنا پڑا۔

وہ پھر بھی مچلتی رہی "چھوڑ دو مجھے۔ میں شہلا نہیں ہوں۔ میں محسن کے لائق نہیں ہوں۔"

میں نے اس کا چہرہ اپنی طرف کیا "گل! ہوش میں آؤ۔ پاگل مت بنو۔"

"میں پاگل ہوں۔ میں پاگل ہی رہوں گی۔"

میں نے اس کے ایک جھانپڑ مارا۔ اس نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا اور مزاحمت ترک کر دی۔ پھر میں اسے کھینچ کر محسن کے پاس لے گیا جو احساسِ ندامت سے مغلوب وہیں بیٹھا تھا۔ "آج سے اس کی ذمے دار تم ہو گل۔ تم وہ سب کچھ کرو گی محسن کے لئے جو شہلا کرتی تھی۔ مجھے معلوم ہے کہ تم کر سکتی ہو کیوں کہ تم کرنا چاہتی ہو۔ تم شہلا نہیں ہو مگر شہلا سے کم بھی نہیں ہو۔"

پھر میں پلٹا اور اسے زار و قطار روتا چھوڑ کے اندر چلا گیا۔ جیسی کہ مجھے امید تھی، محسن نے اسے سنبھال لیا۔

دوسری حیرت کا سامنا مجھے رابعہ اور نازو کو دیکھ کر ہوا۔ وہ دونوں ایک کھڑکی سے لگی کھڑی تھیں اور سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔

"کیا دیکھ رہی ہو، کوئی تماشا ہو رہا ہے؟" میں نے کہا۔

"انسانی تماشا" رابعہ نے کہا "میں خود ہی تماشا ہوں اور خود ہی تماشائی۔"

نازو نے کہا "گل کیا کہہ رہی تھی؟"

میں نے کہا "کچھ بھی کہہ رہی تھی......"

رابعہ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "یعنی اب شہلا کا باب ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا ہے۔"

"ہاں۔ کتابِ زندگی ایسے ہی رقم ہوتی ہے۔ یہ دستِ تقدیر کے اختیار میں ہے کہ جس باب کو جہاں چاہے ختم کر دے۔ اور ہم پر لازم ہے کہ رضائے الٰہی کے سامنے صبر کا اظہار کریں۔ وقت کے کارواں کے ساتھ چلتے رہیں۔ آج سے کوئی شہلا کا ذکر نہیں کرے گا۔"

وہ دونوں گم صم سی بیٹھ گئیں۔ ایک عورت کی حیثیت سے انہیں یہ سب اچھا نہیں لگا تھا۔ ان کے جذبات اس وقت عقل کے تابع نہیں تھے۔

"کتنی جلدی بھلا دیا محسن نے اسے" رابعہ بولی۔

میں نے کہا "یہ ناممکن ہے کہ محسن اسے بھلا سکے۔ جب کوئی کسی کی زندگی کے ایک حصے میں شامل ہو تو اسے یادوں سے کیسے نکالا جا سکتا ہے مگر اسے یاد رکھنے کا مطلب یہ نہیں کہ آدمی دنیا و آخرت کو بھلا کے اس کے مزار کا مجاور ہو جائے۔ تمام عمر اسے رونے میں گزار دے۔"

"وفاداری تو اسی کا نام ہے" نازو بولی۔

میں نے کہا "یہ وفاداری نہیں بے وقوفی ہے، پاگل پن ہے۔ مرنے والوں کے ساتھ کون مرتا ہے؟ ایسا صرف شیریں فرہاد کی داستان میں ہوتا ہے......"

رابعہ نے کہا "چھوڑو نازو! کس سے بحث کر رہی ہو۔ یہ بھی تو مرد ہیں۔"

"سب مرد ایک جیسے بے وفا ہوتے ہیں۔ ساتھ چھوٹتے ہی بھول جاتے ہیں" نازو نے فیصلہ صادر کیا۔

"یہ سب دردناک زنانہ رومانی ناولوں کے ڈائیلاگ ہیں۔ گل کو کچھ نہیں کہا تم نے۔ اس نے کیوں جگہ لے لی شہلا کی؟ وہ بھی تو کچھ قربانی دیتی اور شہلا کی محبت کے احترام میں کبھی محسن کا خیال بھی دل میں نہ لاتی" میں نے اب مرد کی حیثیت سے دنیا کے سب مردوں پر آنے والے الزام کا دفاع ضروری سمجھا "حقیقت یہ ہے کہ عورت ہی عورت کی سب سے بڑی دشمن ہے۔"

"یہ غلط ہے۔"

"کیا غلط ہے؟ کوئی عورت جب جانتے بوجھتے کسی شادی شدہ مرد پر غاصبانہ قبضہ کرتی ہے......"

"مرد ورغلاتا ہے اسے۔ شیطان بن کر۔"

"بالکل ٹھیک۔ مرد خود ڈورے ڈالتے ہیں......" نازو بولی۔

میں نے کہا "پھر تم تسلیم کر لو کہ عورت کے پاس عقل نام کی کوئی چیز ہوتی ہی نہیں ورنہ وہ کیوں کسی کے چکر میں آئے۔ اس کے پاس صرف جذبات ہوتے ہیں۔ مجھے کوئی ورغلا کے تو دیکھے۔"

"رہنے دو یہ پارسائی کے دعوے" نازو بولی "دیر نہیں لگتی جذبات کے دھارے کا رخ بدلنے میں۔"

"مگر یہ بات یک طرفہ نہیں ہے۔ ثبوت کے طور پر میں نے سچ بولا تو تم دونوں ناراض ہو جاؤ گی۔"

نازو نے تنک کر کہا "ہم کیوں برا مانیں گے۔"

"سچ سننے کا حوصلہ ہے ہم میں" رابعہ بولی۔

میں نے کہا "تو بی بی نازو! پوچھو اپنی رابعہ باجی سے کہ انہوں نے کس طرح اپنے جذبات کا رخ میری طرف بدلا تھا۔ اور تم مس نازو! ذرا خود سوچو اور یاد کرو کہ تم نے پہلے کسے چاہا تھا۔ پھر غالب کی کیسی ہو گئیں تم؟"

رابعہ کا رنگ ذرا سی دیر کے لئے بدلا "طعنے مت دو۔"

میں نے کہا "دیکھا، بُری لگی نا میری بات۔"

رابعہ نے کہا "حقیقت یہ ہے کہ اس کے لئے میرے دل میں جذبات تھے ہی نہیں جس کا تم حوالہ دے رہے ہو......"

میں نے کہا "میں چائے بنا کر لاتا ہوں" اور کچن کی طرف بھاگ گیا۔ میں بحث میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ مجھے احساس تھا کہ یہ سچ بہت تلخ ہو گا مگر گل کے مفاد میں یہ اعتراف ضروری تھا کہ ہم سب ایک سے انسان ہیں۔ ہم سب کی زندگی ضرورتوں اور مجبوریوں سے عبارت ہے اور ہم سب جذباتی مفاہمت کرتے ہیں ورنہ جینا محال ہو جائے۔ رابعہ کی پہلی شادی ایک ایسے شخص سے ہو گئی تھی جو شادی کے قابل ہی نہ تھا اور اس شریف آدمی نے اپنی محرومی کا رابعہ سے کوئی انتقام نہیں لیا تھا۔ وہ ایک کامیاب زندگی گزارتا رہا تھا اور بعد میں بھی اس نے بہت ترقی کی۔ شادی اس نے صرف دنیا کا منہ بند کرنے اور ایک الزام سے بچنے کے لئے کی تھی۔ اس کے بعد وہ محفوظ ہو گیا۔ اس نے عورت کی بے سرشت سے نفرت کو دوبارہ شادی نہ کرنے کا جواز بنا لیا۔ رابعہ کو باعزت طور پر معافی مانگ کے آزاد کرنے کے بعد۔

آج برسوں بعد اس حوالے نے رابعہ کے احساس کو ٹھیس پہنچائی تھی۔ اسے یقیناً مجھ سے ایسی بے رحمی کی امید نہ ہو گی۔ جس طرح نازو نے پہلے مجھے ٹوٹ کے چاہا تھا اور دیوانگی کی حد تک... میں نے اسے دوٹوک الفاظ میں بتا دیا تھا کہ میں رابعہ کو چاہتا ہوں اور اس زندگی میں یہ ناممکن ہے کہ کسی اور کا خیال بھی میرے دل میں رہے تو مایوسی کے طویل ردِعمل سے گزر کے اس نے غالب کو قبول کر لیا۔ وہ باہمت لڑکی تھی اور مایوس ہو کر خودکشی نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے جینے کا ایک اور بہانہ تلاش کر لیا۔

اور مختلف حوالوں سے ان دونوں کی زندگی میں دو مرد آ چکے تھے۔ ان میں سے ایک میں تھا۔ میں رابعہ کی زندگی میں دوسرا تھا اور نازو کے لئے پہلا۔ اس حقیقت کا ادراک گل اور محسن کے لئے باعزت انداز میں تسلیم کرانے کے لئے ضروری تھا۔ یہ نہ محسن کا جرم تھا اور نہ گل کا قصور تھا۔ یہ حالات کا جبر تھا اور ایک حادثہ تھا۔ ملنا بھی حادثہ ہوتا ہے بچھڑنا بھی۔ حادثے سے بھلا کون بچ سکا ہے۔

میں چائے بنا کے لایا تو رابعہ اور نازو خاموش بیٹھی تھیں۔ میں نے کہا "صبح بخیر خواتین۔ آج بڑا مبارک دن ہے۔ ہم لوٹ کر زندگی کی طرف جا رہے ہیں۔"

"لوٹ کر؟" رابعہ نے طنز سے کہا۔

"سوری۔ الفاظ بدل لئے جائیں۔ ہم زندگی کی اس منزل کی طرف رواں ہو رہے ہیں جو ہماری منزلِ مراد ہے۔ شاد باد منزلِ مراد۔ شیرینی تقسیم کرتا اس موقعے پر۔ فی الحال اس چائے کی پیالی پر گزارا کیجئے۔"

نازو مسکرائی "تم بڑے بے رحم ہو سکندر۔"

میں نے کہا "یعنی میں منافق نہیں ہوں۔ تھینک یو۔ اپنے بارے میں میری بھی یہی رائے ہے۔ کیا خیال ہے، انہیں بھی جگا دیں؟"

غالب ایک دم اٹھ بیٹھا "گولی مارو انہیں۔ چائے مجھے دو۔"

نازو نے خالص زنانہ انداز میں کہا "ہائے۔ تم جاگ رہے تھے مکار کہیں کے" اور اپنا کپ غالب کو تھما دیا۔

"آپ لوگ بک بک فرما رہے تھے۔ میں سونے کی ناکام کوشش کر رہا تھا" غالب نے کہا "تم نہیں پیو گی چائے؟"

"میرا موڈ نہیں ہے" وہ بولی۔

"ویری گڈ۔ چائے ویسے بھی کوئی اچھی چیز نہیں ہے۔ آپ کے لئے چاہ بہتر ہے۔"

"دو معنی ہیں چاہ کے۔ یہ چاہ کن را چاہ در پیش کا حوالہ تو ہے؟" میں نے کہا "کہ جو دوسروں کے لئے گڑھا کھودتا ہے وہ خود گرتا ہے اس میں۔"

"ماشاءاللہ سے آپ سمجھ دار ہیں" غالب بولا۔

"اور میں ناسمجھ ہوں۔ میرے لئے کنواں بہتر ہے" نازو نے کہا "کون سا کنواں کھودا ہے میں نے تمہارے لئے؟"

"آپ جیسے چراغ تلے نہیں بلکہ بلب کے اوپر اندھیرا ہے، ایسے ہی جو دوسروں کے لئے کنواں کھودتا ہے اس میں دوسرے ہی گرتے ہیں۔ تم خود وہ کنواں ہو جس میں بہ رضا و رغبت، باہوش و حواس میں خود ڈوب مرا" غالب نے کہا۔

"کتنی دیر ہے صبح ہونے میں؟" رابعہ نے باہر جھانک کر کہا۔

"سرکاری طور پر صبح ہو گئی ہے" میں نے کہا "اجالا پھیلنے میں ابھی... چار بجے ہیں ابھی۔"

"میں تو سو رہی ہوں" رابعہ بولی "وہ دونوں آ رہے ہیں۔"

"پھر تو سمجھو میں اٹھی ہی نہیں" نازو ایک دم لیٹ گئی۔

میں نے اور غالب نے ان کی تقلید کی۔ جب گل اور محسن اندر آئے تو ہم سب گہری نیند میں تھے۔ گل نے سمجھا ہو یا نہ سمجھا ہو مگر چائے کے کپ دیکھ کر محسن ضرور سمجھ گیا ہو گا کہ ہم انہیں خفت سے بچانے کے لئے سوتے بن گئے ہیں۔ گل دبے پاؤں گزر کے دوسرے کمرے میں چلی گئی تو محسن نے کہا "یہاں تو سب مرے پڑے ہیں۔ چلو ہم بھی سو جاتے ہیں" مگر لیٹنے کے بجائے اس نے ایک بتی بنا کے میری ناک میں گھمائی۔ میں نے چھینک ماری۔ محسن نے وہی بتی غالب کی ناک میں گھمائی۔

"کیا مصیبت ہے؟" غالب اٹھ بیٹھا "سونے کیوں نہیں دیتا؟"

میں نے اٹھ کے کہا "یہ خود تو اُلّو ہے۔ رات بھر جاگتا ہے۔"

"اچھے ایکٹر ہو دونوں" محسن بولا "شکر کرو بتی ناک میں گھمائی۔"

"ورنہ......" غالب نے آستین چڑھالی۔

"ورنہ کان میں بھی ڈال سکتا تھا" محسن دانت نکالنے لگا، "مجھے نیند نہیں آ رہی ہے" اس نے بیچ کا دروازہ بند کر دیا۔

"نیند کیوں رات بھر نہیں آتی" غالب نے سوال کیا۔

میں نے کہا "ہمیں معلوم ہے اور کس کی نیندیں اُڑ گئی ہیں۔"

غالب نے کہا "انہی کی جو خود اُڑنے والے ہیں۔"

اچھا تو لیٹ، میں کہانی سناتا ہوں، پھر نیند آ جائے گی۔ ایک تھی چڑیا، ایک تھا چڑا" میں نے کہا "دونوں نے مل کے......"

غالب نے میری بات کاٹ دی "یہ گل و بلبل کی کہانی ہے۔ یار تو اپنا تخلص بلبل کر لے۔ وہ گانا ایسا فٹ بیٹھے گا تم پر۔ ایک تھا گل اور ایک تھی بلبل" اس نے آہستہ آہستہ گانا شروع کیا۔

"بلبل کے بچے! تو بہت چہک رہا ہے" محسن نے غالب کو ہاتھ پکڑ کے کھینچ لیا "باہر چل میرے ساتھ۔ تم بھی سکندر اعظم۔"

"ہے یہ کہانی بالکل سچی، میرے نانا فرماتے تھے" غالب نے باہر کا رخ کرتے ہوئے گانا جاری رکھا۔

"کہتے تھے" میں نے تصحیح کی۔ "گانے کا بیڑا مت غرق کرو۔"

"یہ گانے کی بات نہیں۔ میرے نانا ہمیشہ فرماتے تھے، کہتے نہیں تھے۔"

باہر آ کے ہم خشک گھاس والے لان میں ٹہلنے لگے۔ حسبِ توقع محسن نے کہا "یار! میں کیا کروں؟"

میں نے کہا "آپ واپس جائیں اور ایک عقل مند، ہوش مند اور دانش مند آدمی کی طرح زندگی گزارنے کے لئے نئے سرے سے جدوجہد کا آغاز کر دیں" میں نے کہا۔

"تمہارے حق میں یہی فائدہ مند، سود مند اور اقبال مند ہے" غالب نے سہلایا۔

"میں دُہرے عذاب میں گرفتار ہوں۔ مجھے شہلا سے بے وفائی کا احساسِ جرم الگ پریشان کرتا ہے۔ میں گل کا دل بھی نہیں توڑ سکتا۔ اس کے خلوص کو نہیں ٹھکرا سکتا۔"

میں نے کہا "شہلا سے بے وفائی کا کیا سوال۔ جب تک وہ زندہ رہی کیا بے وفائی کا خیال بھی آیا تجھے۔ لیکن اب وہ زندہ نہیں تو کیا اس کے لئے مرجانا وفاداری کہلائے گا اور دیکھ بھائی! زندگی کے کچھ حقائق بڑے بے رحم ہوتے ہیں۔ انسان مجبور ہے کہ صبر کرے اور غم کو جلد از جلد فراموش کرنے کی کوشش کرے۔ ماں باپ مرجاتے ہیں۔ ماں باپ کے سامنے جوان اولاد دم توڑ دیتی ہے۔ پچاس سال ازدواجی زندگی کے سفر میں ساتھ رہنے والے بچھڑ جاتے ہیں لیکن زندہ رہنے والوں کو اپنی زندگی کے لئے سہارے تلاش کرنے ہی پڑتے ہیں۔ کسی کی زندگی صرف اس کی اپنی ذات تک محدود نہیں ہوتی۔ ہم دوسروں کے لئے بھی جیتے ہیں۔ اس لئے بھی غم میں جان نہیں دیتے کہ پھر ان سب کو اور دکھ ملے گا جو زندہ ہیں اور پہلے ہی دکھی ہیں۔ ہم انہیں بچاتے ہیں ورنہ ایک کی خاطر دوسرا مرنے لگے تو چند دن میں دنیا ویران ہوجائے۔"

محسن نے کہا "میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ میں مانتا ہوں گل بہت اچھی لڑکی ہے......"

غالب نے کہا "صرف یہ نہیں کہ وہ اچھی لڑکی ہے، اصل بات یہ ہے کہ اسے بھی سہارے کی ضرورت ہے۔ ہم سب نے اس کے لئے اپنی بساط سے بڑھ کر کیا مگر جو تو کر سکتا ہے بھائی! وہ ہم نہیں کرسکتے۔ اس کا ہاتھ تھام لے، سہارے کی ضرورت تجھے بھی ہے۔"

میں نے کہا "مرنے والوں کے لئے صبر کرنا گناہ نہیں خدا کی رضا کو قبول کرنا ہے۔ یہ ثواب کا درجہ رکھتا ہے مگر کسی کا دل توڑنا اور کسی کی محبت کو ٹھکرانا یقیناً گناہ کبیرہ ہے۔ دل بدست آور کہ حج اکبر است......"

غالب نے کہا "ذرا سلیس اردو میں سمجھایئے اس اَن پڑھ کو۔"

"کسی کی دلداری ثواب میں حج اکبر سے کم نہیں۔ اب خیال لاکھ شاعرانہ ہو مگر انسانیت اسی کا نام ہے" میں نے کہا۔

صبح کا اجالا ہونے تک ہم باہر ٹہلتے رہے۔ رفتہ رفتہ ہم محسن کو قائل کرنے میں کامیاب ہوگئے کہ اب اسے ماضی کے اندھیرے سے مستقبل کی روشنی کی جانب سفر کرنا ہوگا اور اس کے لئے ایک شعوری جدوجہد کرنی ہوگی۔ مجھے مفتی ہونے کا دعویٰ نہیں مگر میرے نزدیک شہلا کی موت شہادت کا درجہ رکھتی تھی اور شہید کبھی مرتے نہیں۔ وہ زندہ رہے گی مگر ہمارے دل میں، ہماری یادوں میں اور خیالوں میں۔

صبح کا سورج طلوع ہوا تو اس کی دھوپ قدرے میلی تھی۔ ماحول میں ایک نامعلوم اداسی کی نظر نہ آنے والی دُھند محسوس ہوتی تھی۔ میں، غالب اور محسن اندر گئے تو خواتین بھی بیدار ہوچکی تھیں۔ نیند ان میں سے کس کو آئی ہوگی مگر آپس میں ظاہرداری کا ایک پردہ سا تھا جس نے تھوڑی سی اجنبیت کی فضا پیدا کردی یا یوں کہا جائے کہ انسانیت کے اعتماد کو مجروح کیا تھا۔ اس سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ ہم نے ایک دوسرے سے اپنے خیالات اور دلی جذبات چھپائے ہوں۔ گل کو شک تھا کہ رابعہ اور نازو سب جانتی ہیں اور ان کا سوتے رہنا بھی تجاہل عارفانہ کا ایک انداز تھا لیکن وہ یقین کے ساتھ یہ بات ان کے منہ پر نہیں کہہ سکتی تھی۔

گل کا دل رکھنے کے لئے اور نارمل نظر آنے کے لئے نازو اور رابعہ ہنس بول رہی تھیں مگر وہ اپنی خوش دلی اور خوش مزاجی کا مصنوعی پن چھپانے میں پوری طرح کامیاب نہ تھیں۔

اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی تھی کہ ہم سب کو گل اور محسن سے جدا ہونے کا ملال تھا۔ ایک طرف یہ خوشی تھی کہ وہ لوٹ کے اپنے وطن کی دلدار، دوست دار اور وضع دار دنیا میں جارہے ہیں اور نئی زندگی کے سفر کا آغاز نیک امیدوں کے ساتھ کرنا چاہتے ہیں... دوسری طرف ایک خوف بھی تھا کہ نہ جانے ہم انہیں پھر کب دیکھیں گے۔ اگر جہاز پر جگہ مل گئی پھر تو چند دن، ہفتے دو ہفتے یا مہینے بھر کا انتظار بھی کیا جاسکتا ہے مگر اس وقفے میں سلامتی کی ضمانت بھی درکار ہوگی۔ اور اگر جہاز سے نہ جاسکے تو پھر سڑک کے راستے نیپال اور وہاں سے پاکستان پہنچنا ہجرت کا ایک اور صبر آزما مرحلہ ہوگا۔

گل کچھ خجل تھی اور ہم سے نظر چُرا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خوف ایک سوال بن کر اتر آیا تھا۔ سچ بتاؤ تم سب مجھ سے خفا تو نہیں ہو۔ کہ میں نے شہلا کی جگہ لے لی اور اب محسن کے ساتھ رخصت ہورہی ہوں۔ اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ کچھ کہہ سکے ورنہ وہ اصرار کرتی کہ اس کی جگہ نازو یا رابعہ کو بھیج دیا جائے۔ وہ جانتی تھی کہ ہمارا جواب کیا ہوگا۔

ناشتے کے دوران غالب اور نازو کے درمیان ایک چھیڑ ہوئی مگر وہ بھی پھیکی رہی۔

پھر محسن نے کہا "یار! میرا دل نہیں مانتا۔"

میں نے کہا "تو دل کی مت مان۔ حساب برابر۔"

"کیوں نہ ہم ایک ساتھ چلیں یا تھوڑے دن انتظار کرلیں" محسن نے کہا۔

اب گل نے بھی لب کھولے "مجھے اچھا نہیں لگ رہا، سب کو چھوڑ کے جانا۔ وسوسے اٹھ رہے ہیں دل میں۔"

"تم دونوں کے دل کا ایک ہی معاملہ ہے" غالب نے زور لہجے میں کہا "بکری کے دل ہیں۔ بزدل۔"

میں نے کہا "محسن کا دل تو بکرے کا ہوگا یار۔"

مزید باتوں کی نوبت ہی نہیں آئی۔ باہر بڑے طوفانی انداز میں ایک کار آکے رکی۔ اس کا انجن اور پھر دروازہ بند ہوا۔ ہم

نظر دروازے پر جم گئی۔ پس منظر کی روشنی میں کاجل نمودار ہوئی مگر اس کا پیکرِ حسن ایک تصویرِ خرابی نظر آرہا تھا۔ اس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے اور بال الجھے ہوئے۔ وہ آہوئے صیاد دیدہ سے زیادہ خوف زدہ تھی۔

میں نے کہا "کاجل! رک کیوں گئیں؟ اندر آؤ۔"

رابعہ نے کہا "یہ کیا حال بنا رکھا ہے تم نے اپنا؟"

وہ اندر آئی اور بیڈ پر گر گئی "دیکھو...... وقت کم ہے...... چلو۔"

میں نے کہا "پہلے بتاؤ یہ معاملہ کیا ہے۔"

اس نے ایک لمبی سانس لے کر کہا "معاملات خراب ہوگئے ہیں۔ رات کسی نے مجھے جان سے مارنے کی کوشش کی تھی۔"

"وہ فائرنگ تمہاری کار پر ہوئی تھی؟" میں نے کہا۔

اس نے اقرار میں سر ہلایا "خدا نے بچالیا۔ ان کا نشانہ اس لئے چُوک گیا کہ میں کار بہت تیز چلاتی ہوں۔ اور نہ جانے کیوں، عین وقت پر مجھے لگا کہ کچھ گڑبڑ ہے اور میرا پاؤں ایکسیلیٹر پر جم گیا۔"

"تمہیں چوٹ تو نہیں آئی؟"

"نہیں۔ گاڑی میں سوراخ ہوگئے، شیشے ٹوٹ گئے مگر میں نے پلٹ کے نہیں دیکھا لیکن مجھے معلوم ہے وہ کون تھے۔ بیک ویو مرر میں مجھے ان کے چہروں کی ایک جھلک نظر آگئی تھی۔ وہ یہاں ڈیوٹی دے رہے تھے۔ نئے آدمی تھے۔ مگر میں نے شک نہیں کیا" وہ بولی۔

"کس نے بھیجا تھا انہیں؟" نازو نے کہا۔

"کون بھیج سکتا ہے انہیں، سوائے ان کے جو دشمن ہیں۔ اُن کے سوا کیا نام دیا جاسکتا ہے انہیں۔ رات ہمارے گھر پر بھی حملہ ہوا۔ کسی نے دستی بم پھینکا تھا مگر وہ باہر ہی گر کے پھٹ گیا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ...... تمہارے بابا کے کردار کا دوسرا رخ بھی سامنے آگیا ہے۔ ان کی زندگی بھی خطرے میں ہے۔"

"ہاں۔ رات کو آرمی آگئی تھی" وہ بولی "انہوں نے ہر طرف پہرے بٹھادیئے ہیں مگر اس سے کیا ہوتا ہے؟ کیا وہ گھر میں چُھپ کر رہ سکتے ہیں؟ باہر تو جانا ہی پڑے گا انہیں، پبلک کے سامنے۔ اس وقت ملٹری کیا کرے گی؟ انہوں نے رات کو مجھے بہت بُرا بھلا کہا کہ سب میری وجہ سے ہورہا ہے۔ انہوں نے مجھے کمرے میں بند کر دیا تھا۔ میں دوسری منزل پر سوتی ہوں۔ وہ خود رات بھر جاگتے رہے یہ دیکھنے کے لئے کہ میں موجود ہوں یا نہیں۔ مجھے صبح موقع ملا، ایک فوجی نے مدد کی۔"

"فوجی نے؟" میں اور محسن ایک ساتھ بولے۔

"ہاں۔ میں نے اسے اشارے سے قریب بلایا اور وہ اندر آگیا۔"

"اوپر کیسے چڑھا؟"

"میں نیچے آگئی تھی۔ ممی کے کمرے میں تھی" وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ "وہ بھارتی سورما جو ہماری حفاظت کے لئے آئے تھے...... جب وہ گیا تو...... سب کچھ لے گیا...... میرا زیور بھی...... اور اس کے بدلے...... مجھے اس نے اجازت دی کہ میں نکل جاؤں۔"

میں، غالب اور محسن اس کے بکھرے بالوں، پھٹے کپڑوں اور چہرے کی خراشوں سے نظر نہیں ملا سکتے تھے۔ گل، رابعہ اور نازو کے چہرے آتشِ غضب سے دہک رہے تھے۔ یہ ایک مظلوم لڑکی پر ایک فاتح مرد کی عنایت کا شاخسانہ تھا۔ وہ کہانی تھی جو ہر جگہ ایسے ہی دُہرائی جارہی تھی۔ مختلف نام ہونے سے آغاز یا انجام پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جب انسان کے اندر کا درندہ بے لگام ہوجاتا ہے تو پھر نہ وہ ماں کو دیکھتا ہے اور نہ بہن کو اور نہ بیٹی کو......

کاجل نے آنسو صاف کئے اور بولی "چلو، جلدی کرو۔ ابھی کسی کو کچھ معلوم نہیں۔"

"کیا معلوم نہیں؟"

"تمہارے اور میرے پروگرام کے بارے میں۔ تم ڈرائیونگ کرسکتے ہو؟" وہ بولی "کون جارہا ہے؟"

"محسن اور گل" میں نے کہا "محسن کو ڈرائیونگ آتی ہے۔"

"تم گاڑی لے جاؤ۔ ائرپورٹ چلے جاؤ۔"

"تم ساتھ نہیں جاؤ گی؟" محسن نے کہا۔

"نہیں۔ جاؤ خطرے کی کوئی بات نہیں" اس نے ٹکٹ تھما

کے کہا "یہ لو۔ یہ میرا رومال ساتھ لے جاؤ۔ اسے ہاتھ میں رکھنا۔ یہ زرد رومال تمہاری پہچان ہوگا۔ ایک آدمی تمہیں جہاز پر سوار کرادے گا۔ کسی قسم کی روک ٹوک کے بغیر۔ ائر انڈیا کی فلائٹ ہے۔"

"مگر تم خود......"

"میں ان لوگوں کو یہاں سے کہیں اور لے جارہی ہوں۔ یہ جگہ اب محفوظ نہیں رہی" کاجل نے کہا۔

"تو تم ایسا کرو' انہیں بھی ساتھ بٹھالو۔ جہاں ان کو چھوڑنا ہے پہلے وہاں چلتے ہیں" محسن نے کہا "پھر ائرپورٹ چلے جائیں گے۔"

تھوڑی سی بحث کے بعد کاجل مان گئی۔ ایک بار پھر ہم اس دارالامان سے فرار ہوئے۔ کاجل باربار گھڑی دیکھتی رہی۔

"آج کل سیکورٹی بہت سخت ہے۔ وقت پر پہنچنا پڑتا ہے۔" اس نے کہا "کم سے کم ایک گھنٹا پہلے۔"

"تم اپنی نظر سڑک پر رکھو۔" میں نے کہا "ورنہ ہم وقت سے پہلے عدم آباد پہنچ جائیں گے۔"

یہ مذاق بے محل تھا مگر اس کا مقصد اسے تھوڑا سا سکون پہنچانا تھا تاکہ وہ کچھ ایزی ہوجائے۔

وہ مسکرائی "فکر مت کرو۔ ہوں گے تو ساتھ ہی نا۔"

بیس منٹ بعد اس نے ایک گھر کے دروازے کے سامنے گاڑی روک کے گھنٹی بجائی۔ ایک بوڑھی عورت نے دروازہ کھولا۔

"تارا بائی! یہ میرے مہمان ہیں۔ دوست ہیں۔ ان کو اندر لے جاؤ" اس نے کہا "میں ابھی تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔"

میں نے کہا "رابعہ! تم اور نازو جاؤ۔ میں اور غالب انہیں ائرپورٹ پہنچا کے آتے ہیں۔"

رابعہ نے کہا "انہیں سی آف کرنے ہم کیوں نہیں جاسکتے؟"

"ہاں۔ کاجل بھی تو واپس آئے گی۔"

میں نے سخت لہجے میں کہا "جاؤ' بحث مت کرو۔ ہم ائرپورٹ کے اندر تک نہیں جائیں گے۔"

کاجل نے بھی کہا "ہاں۔ باہر ہی ڈراپ کردیں گے۔"

محسن نے ان کا سامان جو ایک سوٹ کیس پر مشتمل تھا' اتار کے اندر رکھا اور انہیں خدا حافظ کہہ کے لوٹ آیا "خبردار جو کسی نے روتی شکل دکھائی مجھے' اندر بیٹھو جاکے۔" اس نے پھر کار میں بیٹھ کر کہا۔

کار پھر ڈھاکا کی سڑکوں پر دوڑنے لگی۔ بظاہر سب ٹھیک تھا مگر خطرے کا احساس ہمارے اندر چھپا بیٹھا تھا۔ سڑکوں پر سے جب پولیس یا ملٹری کی گاڑی گزرتی تھی' میرے اعصاب خود بخود کھنچ جاتے تھے۔

گاڑی کو میں نے پارکنگ ایریا سے گزار کے روکا۔ یہ رات والی گاڑی نہیں تھی۔ وہ تباہ شدہ گاڑی تو فوراً سب کی نظروں میں آجاتی۔ کاجل اپنے باپ کی دوسری گاڑی لائی تھی جس پر بنگلہ دیش کا نیا پرچم لہرارہا تھا۔ ابھی لوگ بنگلہ دیش کی حکومت کے اعلیٰ حکام کو پہچانتے نہیں تھے۔ چنانچہ ہم ہر جگہ سے سیلیوٹ وصول کرتے گزر گئے تھے۔

محسن اور گل کو ہم نے گلے مل کے الوداع کہا۔

"میں فون کروں گا منظر کو" میں نے کہا "آج رات نو بجے۔"

"ہم وہیں ہوں گے۔ اگر کراچی سے لاہور کی فلائٹ مل گئی۔ ورنہ منظر کو فون پر خیریت سے پہنچ جانے کی اطلاع دے دیں گے۔"

"پیسے ہیں تمہارے پاس؟ گل......"

محسن بولا "ہیں۔ اب تم جاؤ۔ یہ الوداعی تقریبات کا وقت نہیں ہے۔"

کاجل نے کہا "ہاں۔ تم بھی جاؤ۔ خدا حافظ۔"

اسی وقت ایک شخص نے قریب آکے کاجل کو سلام کیا "یہ ہیں آپ کے دوست۔ آئیں میرے ساتھ۔ بہت لیٹ ہوگئے ہیں آپ لوگ مگر میں نکال دوں گا۔"

میں اور غالب انہیں ڈیپارچر لاؤنج سے گزرتا دیکھنا چاہتے تھے مگر کاجل نے کہا "چلو۔ کہیں کوئی مجھے پہچان نہ لے۔"

میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور پرچم لہراتی گاڑی پھر انہی سڑکوں پر روانہ ہوگئی جن سے چند منٹ پہلے گزری تھی۔ سڑکوں پر پھر ہر جگہ بنگلہ دیش کے پرچم کو سیلیوٹ ملا تو مجھے دکھ اور شرمندگی کے احساس نے گھیر لیا۔ میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور حالات کی مجبوری کو نوشتہ تقدیر سمجھ کے قبول کرلیا۔ ہم سب کچھ نہیں کرسکتے تو یہی کرتے ہیں۔

آدھے گھنٹے بعد ہم پھر تارا بائی کے دروازے پر تھے۔ غالب نے گھنٹی بجائی اور کچھ دیر انتظار کیا۔ دوسری بار گھنٹی بجانے کے بعد کاجل نے دروازے کو دھکا دیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔

"تارا بائی!" کاجل نے چلا کے کہا مگر اندر سے جواب ایک خوف زدہ کرنے والی موت کے سناٹے جیسی خاموشی نے دیا۔ اندر کوئی بھی نہیں تھا۔ ہم دیوانہ وار ایک سے دوسرے کمرے میں' غسل خانے اور کچن میں گئے مگر وہاں نہ تارا بائی تھی نہ رابعہ اور نہ نازو۔ گھر کا سب سامان تتربتر پڑا تھا اور جگہ جگہ فرش اور دیوار پر تازہ خون کے چھینٹے بھی نظر آئے۔

شبے کی قطعی گنجائش نہ تھی۔ دشمن اتنے بے خبر نہیں تھے کہ ہمیں نکل جانے دیتے۔ انہوں نے ہمارا تعاقب کیا تھا۔ شاید ائرپورٹ تک۔

گل اور نازو کے اغوا ہوجانے کا خیال ہی اتنا روح فرسا تھا
کہ مشکلات و مصائب کا دور ختم ہونے اور حصول مقصد میں
امیابی کے بعد ایک پرمسرت' پرامید اور پرعزم' خوابوں کی
بیبوں سے عبارت اور خواہشات کی شادکامی سے معنون زندگی
ریب خیال محسوس ہونے لگی۔ یہ تقدیر کا ایک بے رحم مذاق تھا
س نے ہمیں منزل کے سراب میں سرگرداں رکھا۔ ہربار ہم خود
ے فریب نظر کا شکار ہوتے رہے مگر شرطِ سفر سے دست بردار
دنا کبھی اپنی عالی ہمتی اور شوقِ طالع آزمائی نے قبول نہ کیا۔

غالب پر صدمے' اشتعال' بے بسی اور جھنجلاہٹ کے
ذبات غالب تھے "سکندر انہیں زبردستی اغوا کیا گیا ہے؟"

میں نے آہستہ سے سرہلایا "ہاں۔ یہ خون' مزاحمت کے آثار
ور یہ بے ترتیبی۔ اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے۔"

غالب نے جھک کر خون کے چھینٹوں کو دیکھا "یہ خون کس کا ہے؟"

میں نے اسے افسوس سے دیکھا "خون سے صرف یہ معلوم
ہوسکتا ہے کہ اس کا گروپ کیا ہے۔ خون کسی کا نام نہیں بتاتا۔"

"کتنا اچھا ہوتا اگر ہم ان کی بات مان لیتے ... انہیں بھی
ساتھ ہی لے جاتے" غالب نے برہمی سے کہا۔

کاجل نے کہا "مجھے معلوم ہے یہ کس کی حرکت ہے۔"

غالب نے ایک دم اسے پکڑلیا "پھر خاموش کیوں ہو اتنی دیر
سے منہ سے بکتی کیوں نہیں ہو' نام بتاؤ ان کا......"

"غالب! چھوڑو مجھے" کاجل چلائی "میں ان کے نام جانتی تو
رات کو ہی انہیں نہ اٹھوالیتی۔ انہوں نے صرف مجھ پر فائرنگ
نہیں کی تھی' میرے گھر کو بھی دستی بم سے تباہ کرنے کی کوشش
کی۔ میرا باپ اگر چاہتا......"

"تمہارے باپ کے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔" غالب نے
کاجل کے شانوں پر سے ہاتھ اٹھائے "جو کچھ وہ چاہتا ہے اس کے
دوست نما دشمن بھی اس سے واقف ہیں۔ جو کچھ وہ کررہا ہے وہ بھی
ان آستین میں خنجر چھپا کر وفاداری کا دم بھرنے والوں سے پوشیدہ
نہیں کاجل۔ اس کی طاقت کا غرور اور اختیارات کا ڈھونگ سب
دھوکا فریب ہے۔"

کاجل نے کہا "غلط خیال ہے تمہارا۔ وہ براہ راست شیخ مجیب
سے بات کرسکتا ہے۔"

"وہ بڑی خوش فہمی ہے تمہاری کاجل' جو وقت آنے پر خود
دور ہوجائے گی۔" غالب نے کہا "شیخ مجیب کے حواری بہت پہلے
معلوم کرچکے ہوں گے کہ اس نے تمہیں کیوں دیوانہ مشہور کر رکھا
تھا۔ صرف تمہاری جان بچانے کے لئے۔ اس لئے کہ تم بنگلہ دیش
کے خیال کی مخالفت' پاکستان کی اور دو قومی نظریے کی تبلیغ کرتی
پھرتی ہو۔ انہیں رپوٹ مل چکی ہوگی کہ درپردہ خود عبدالستار چوہدری
پاکستان کے حامی عناصر کا مددگار ہے۔ یہ اسی کی سزا ہے۔ شاید وہ
تصدیق کررہے تھے' مہلت دے رہے تھے کہ عبدالستار چوہدری راہ راست پر آجائے۔ یا ابھی ان کو تمہارے باپ کی حمایت کی ضرورت تھی' جواب نہیں رہی۔"

"کیا پتا؟" کاجل کا چہرہ تاریک ہوگیا "شاید..... تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔"

میں نے کہا "غالب! یہ ٹھیک ہے کہ ہم عبدالستار چوہدری کی خفیہ مدد پر انحصار نہیں کرسکتے مگر ہم خود تو کچھ کرسکتے ہیں۔"

غالب نے تلخی سے کہا "کیا کرسکتے ہیں ہم؟ کون بتائے گا ہمیں کہ نازو اور رابعہ کہاں ہیں؟ ان کو یہاں سے کون لے گیا ہے؟ وہ زندہ ہیں یا....."

میں نے مایوسی سے کہا "بہت دھوکا ہوا ہمارے ساتھ۔ ہم خود اپنی حفاظت کے خیال سے غافل ہوگئے تھے۔"

"اس عورت کی وجہ سے" غالب نے انگلی اٹھا کے کاجل کی طرف اشارہ کیا۔

"نہیں..... میرا کوئی قصور نہیں اس میں" وہ چلائی۔

"تُو لائی تھی ہمیں یہاں۔ تجھ پر بھروسہ کیا تھا ہم نے۔ لیکن تُو نے دھوکا دیا ہمیں۔ دغاباز شکاری ہے تُو" غالب پر جنون سوار ہونے لگا تھا "میں تیرا گلا گھونٹ دوں گا۔ تو نے گل اور محسن کو کہاں بھیجا ہے؟ بول! کن قصائیوں کے حوالے کیا ہے؟ اور......" وہ آگے بڑھتا گیا۔

کاجل نے ایک چیخ ماری کیوں کہ غالب کے ہاتھ اب اس کی گردن کی طرف بڑھ رہے تھے اور کاجل کا راستہ پیچھے ایک دیوار نے روک لیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اشتعال کے اس دورے میں وہ کاجل کو سچ مچ مار ڈالے گا' خواہ بعد میں یہ قتل اس کی غلط فہمی کا نتیجہ ثابت ہو۔

میں نے غالب کو پیچھے کھینچ لیا "پاگل ہوگیا ہے تو!"

"ہاں میں پاگل ہوگیا ہوں۔ پوچھو اس دوغلی ناگن سے کہ نازو اور رابعہ کو کس نے اغوا کیا ہے؟"

"مجھے...... مجھے نہیں معلوم۔ خدا کی قسم" کاجل پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"وہ سب جھوٹ تھا' فریب تھا" غالب کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا "نہ کسی نے فائرنگ کی تھی تجھ پر' نہ تیرے گھر پر دستی بم پھینکا تھا کسی نے۔ تیرے باپ نے تجھے ہمارے پیچھے لگایا تھا۔ وہ غدار ہمارا دشمن ہے۔"

کاجل نے روتے روتے کہا "کیا ہوگیا ہے تمہیں؟ کبھی تم کچھ کہتے ہو' کبھی کچھ۔ ابھی تم کہہ رہے تھے کہ اس نے مکتی باہنی والوں کو اپنا دشمن بنالیا ہے' اب اسے اپنا دشمن قرار دے رہے ہو۔"

میں نے کہا "چھوڑو یہ بحث' سوال یہ ہے کہ اب کیا کرنا چاہئے ہمیں؟ مجھے بھی شک ہے کہ گل اور محسن غلط ہاتھوں میں پڑگئے ہوں گے۔ انہیں نیپال جانے والے جہاز پر سوار کرانے

والے کہیں اور لے گئے ہوں گے۔ ایسا نہ ہو کہ ہم بھی پکڑے جائیں۔ پہلے تو یہاں سے نکل جانا چاہئے۔"

"ہاں۔ مگر اس عورت کے ساتھ۔ یہ اس وقت تک ہمارے قبضے میں رہے گی جب تک رابعہ اور نازو کا پتا نہیں چل جاتا۔ یہ معلوم نہیں ہوجاتا کہ گل اور محسن کہاں ہیں۔ ہم اسے یرغمال رکھیں گے" غالب نے کہا "اور اگر ان میں سے کسی کو کچھ ہوا تو خدا کی قسم....."

باہر سے کسی نے سہمے ہوئے لہجے میں پکارا "کاجل، او کاجل!"

کاجل چلائی "تارا بائی!"

دوسرے لمحے تارا بائی کا لاش جیسا سفید، دہشت زدہ چہرہ نمودار ہوا "تم آگئی ہو۔ خدا کا شکر ہے۔"

کاجل اس کی طرف لپکی "تارا بائی! وہ..... وہ دونوں کہاں ہیں؟"

تارا بائی نے ساری کے پلو سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا "وہ ٹھیک ہیں، بالکل ٹھیک ہیں۔ بس خدا نے میری عزت رکھی۔ میں انہیں بچا کے لے گئی ورنہ وہ ظالم....."

میں نے تارا بائی کو ایک کرسی سیدھی کرکے بٹھادیا "یہاں بیٹھ کے بتاؤ۔ آرام سے اور سکون سے بات کرو۔"

غالب نے کہا "کاجل! تارا بائی کو پانی پلاؤ۔"

کاجل نے کہا "ابھی لائی۔"

مگر تارا بائی نے کہا "میں ٹھیک ہوں..... بس تم چلو میرے ساتھ۔ کہیں وہ پھر نہ آجائیں۔ خونی، لٹیرے....." وہ سسکی لے کر پھر آنسو صاف کرنے لگی "وہ تو بس..... عین وقت پر مجھے اندازہ ہوگیا اور میں نے ایک دم دروازہ بند کرکے لڑکیوں سے کہا کہ نکل جاؤ پیچھے سے....."

میں نے کہا "یہ سب بعد میں بتانا۔ پہلے ہمیں بتاؤ کہ وہ اس وقت کہاں ہیں؟"

"مولوی شمس الضحیٰ کے حجرے میں" وہ بولی "آؤ چلیں....."

میں نے غالب سے کہا "پہلے کیوں نہ ایک نظر باہر دیکھ لیں۔"

غالب نے سر ہلایا "ہاں۔ دشمن گھات میں نہ ہوں۔"

کاجل کی گاڑی باہر موجود تھی۔ اس کے اور ہمارے دشمن یقیناً عبدالستار چوہدری کی دوسری گاڑی کو پہچانتے ہوں گے۔ باہر کھڑی ہوئی یہ گاڑی کسی گھر کی چھت پر لہرانے والے پاکستانی پرچم سے کم خطرناک نہ تھی جو دشمن کے دل میں انتقامی جذبات کو ہوا دے۔

میں نے احتیاط کے ساتھ کھڑکی کھولی اور باہر جھانک کر دیکھا۔ بظاہر سب ٹھیک تھا۔ آتے جاتے لوگوں کے چہروں سے دوست اور دشمن کی تمیز کرنا محال ہی نہیں، ناممکن تھا۔ غالب نے دوسری کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے سے کسی شکاری کو تاڑنے کی کوشش کی مگر باہر سب عام لوگ تھے جن کے چہرے سپاٹ اور بے تاثر تھے۔ ان سے کچھ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ کس کے دوست اور کس کے دشمن ہیں، اپنے دل میں کتنا بغض و عناد رکھتے ہیں اور سیاست کے موجودہ، منافرت اور تعصب پر مبنی نظریات سے کس حد تک اختلاف یا اتفاق کرتے ہیں۔ راہ چلتے آدمی کا چہرہ کچھ نہیں بتاتا کہ اگلے لمحے وہ کیا کرے گا۔ پتھراؤ کرنے والوں میں شامل ہوجائے گا، جذبات سے مغلوب ہو کے کسی بھی اجنبی کو دشمن فرض کرتے ہوئے خنجر گھونپ دے گا یا جان بچا کے بھاگ کھڑا ہوگا۔

میں نے کہا "چلو تارا بائی! راستہ صاف ہے۔"

غالب نے میری تائید کی "خطرے کی کوئی بات نہیں۔"

تارا بائی کھڑی ہوگئی "کیا تمہاری آنکھیں خطرہ دیکھ سکتی ہیں؟"

میں نے غالب کی طرف دیکھ کے خفت سے کہا "نہیں....."

تارا بائی مسکرائی "پیچھے سے چلو، ادھر کوئی نہیں ہوگا۔"

اب میں نے کہا "تارا بائی! کیا تمہاری آنکھیں دیکھ سکتی ہیں کہ پچھلی طرف خطرہ نہیں ہے؟ کیا پتا وہ اب پیچھے کھڑے ملیں جن کو سامنے سے آکے کچھ نہیں ملا تھا۔"

تارا بائی نے سوچ کے کہا "کہتے تم ٹھیک ہو لڑکے۔ ہونے والی بات تو ہو کے رہتی ہے۔ پھر عقل کے حساب پر بھروسا کرنے کا کیا فائدہ۔ چلو خدا پر بھروسا کرو۔"

ہم سامنے سے نکلے۔ میں نے اور غالب نے ایک ہاتھ جیب میں ڈال لیا اور ریوالور کو اپنی گرفت میں بالکل تیار رکھا۔ اس کا سیفٹی کیچ ہٹا ہوا تھا اور خدانخواستہ کوئی اچانک حملہ کرتا تو ہماری جوابی کارروائی میں ایک لمحے کی تاخیر نہ ہوتی۔

تارا بائی کے پیچھے چلتے ہوئے ہم ایک گلی میں داخل ہوئے پھر مختلف گلیوں کے موڑ کاٹتے ہوئے ایک مسجد کے عقب میں نکلے۔ وہاں ایک چھوٹے سے کوارٹر کا دروازہ تھا مگر اس پر زنجیر کنڈی لگی ہوئی تھی اور کنڈی پر پرانا قفل نظر آرہا تھا۔ غالباً کوارٹر کا دوسرا دروازہ مسجد کے صحن کی جانب کھلتا ہوگا۔ میں نے سوچا۔

تارا بائی نے پریشانی سے قفل کو دیکھا "یہ مولوی صاحب کہاں چلے گئے؟"

میں نے کہا "میں مسجد کی طرف سے جاکے دیکھتا ہوں۔"

تارا بائی نے نفی میں سر ہلایا "ادھر سے کوئی راستہ نہیں ہے۔"

میں نے کہا "پھر وہ مسجد میں کیسے جاتے ہیں؟"

"گھوم کے صدر دروازے کی طرف سے، جہاں سے سب اندر جاتے ہیں۔"

میں نے کہا "پانچوں وقت؟"

تارا بائی نے بے خیالی میں سر ہلایا "ہاں۔ اس کے علاوہ بھی بچوں کو پڑھانے....."

"پھر اب وہ کہاں ہوسکتے ہیں؟" غالب نے جھنجلا کر کہا۔

تارا بائی کی نظریں ہر سمت میں نادیدہ دشمنوں کے اور بے وجود خطرات کے سائے منڈلاتے دیکھ کر دہشت سے پھیلی ہوئی تھیں۔ "مجھے..... کیا معلوم۔"

"سوچو، ان کا یہاں کون تھا۔ کوئی عزیز، بھائی، بہن، بیٹا یا بیٹی جس کے گھر کو وہ اپنے حجرے سے زیادہ محفوظ سمجھتے ہوں۔"

تارا بائی نے نفی میں گردن ہلائی "وہ تو بالکل اکیلے تھے..... بچے سب مر گئے تھے۔ ایک نابینا بیوی تھی اور وہ....."

غالب پھر گرم ہونے لگا "پھر تم نے کوئی عقل مندی نہیں کی تھی تارا بائی کہ انہیں یہاں لے آئی تھیں۔"

"اور کیا کرتی میں؟" وہ رقت آمیز لہجے میں بولی "کہاں لے جاتی ان کو؟ اور کسی پر میں بھروسا نہیں کرسکتی تھی۔"

"اچھا بھروسا کیا تم نے....."

تارا بائی کا دکھ دگنا تھا۔ رابعہ اور نازو کے غائب ہوجانے کی پریشانی الگ تھی، امانت کی حفاظت میں کوتاہی اور غفلت کے جرم کا احساس الگ تھا اور وہ بوڑھی عورت غالب کے تند و تلخ لہجے کی ذلت برداشت کرنے پر مجبور تھی۔

ہم بلاوجہ گلی میں کھڑے تھے اور آتے جاتے لوگوں کی شک بھری نظروں کا نشانہ بن رہے تھے۔ تارا بائی نے پڑوس کے گھروں سے معلوم کیا لیکن مولوی صاحب کسی کو کچھ بتا کے نہیں گئے تھے۔ پریشانی مجھے بھی لاحق ہورہی تھی۔

غصے میں غالب نے ایک غلط بات کی "چھوڑو تارا بائی! وہ مولوی بھی جان بچا کے بھاگ گیا۔"

"نہیں۔ ایسا نہیں ہوسکتا" تارا بائی نے دکھی لہجے میں کہا۔

"ایسا ہوچکا ہے۔"

"مولانا صاحب بھاگنے والوں میں سے نہیں تھے۔ وہ تو کہتے تھے کہ موت جہاں لکھی گئی وہیں آئے گی۔ پھر میں خدا کے گھر کی دیوار کے سائے میں ہوں۔ اس سے زیادہ محفوظ جگہ کون سی ہوگی....."

ایک آٹھ نو سال کے بچے نے گزرتے گزرتے تارا بائی کی ساری کا پلو کھینچا اور بنگالی میں آہستہ سے کچھ کہا۔ تارا بائی کا غم زدہ چہرہ یکلخت خوشی کی مسکراہٹ سے روشن ہوگیا۔ اس نے آنکھوں سے نکل آنے والے آخری آنسو کو انگلی سے صاف کرکے جھٹک دیا اور ہمیں اشارہ کرکے اس بچے کے ساتھ چل پڑی۔

میں اور غالب اس سے کچھ فاصلے پر چلنے لگے۔

"کوئی پیغام دیا تھا اس لڑکے نے" میں نے کہا "وہ کہیں سے دیکھ رہا ہوگا۔"

"الو کا پٹھا اتنی دیر تک کیا دیکھتا رہا؟"

میں نے کہا "بچہ ہے۔ یقین کرتے ہوئے بھی ڈرتا ہوگا کہ ہم وہی لوگ ہیں جن کے لئے پیغام تھا۔"

"کہیں یہ مروا نہ دے۔ دشمنوں کا آلہ کار نہ ہو۔"

میں نے کہا "دماغ چل گیا ہے آپ کا۔ معصوم بچے کا بھی اعتبار نہیں۔"

غالب نے کہا "معصوم بچے سے ہر کام لیا جاسکتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور دے کر ٹریگر دبانے کو بھی کہا جاسکتا ہے اور اس کی معصومیت پر کوئی حرف بھی نہیں آتا۔ آخر کہاں لے جارہا ہے یہ ہم سب کو؟"

تارا بائی نے پلٹ کر کہا "اپنے گھر۔ اس کی ماں نے بھیجا تھا۔"

"مولوی صاحب کیا اس کے گھر میں ہیں؟"

"رابعہ اور نازو اسی کے گھر میں ہیں" تارا بائی نے کہا۔

"اور مولوی صاحب؟" میں نے کہا۔

"ان کے بارے میں بچے کو معلوم نہیں۔"

میں نے کہا "تم جانتی ہو تا اس بچے کو....."

"خدا پر بھروسا رکھو۔ نیت کا حال وہی جانتا ہے۔ ویسے اس کا باپ سرحد کا پٹھان ہے، جو قول پر جان دیتا اور مہمان کی حفاظت کے لئے اپنی زندگی کو قربان کرنا جانتے ہیں۔ تمہیں تو معلوم ہوگا؟"

"یہ سب پرانی باتیں ہیں۔" غالب سخت قنوطی ہورہا تھا۔

میں نے کہا "یہ بچہ پٹھان نہیں لگتا۔"

"اس کی ماں بنگالن ہے" تارا بائی نے کہا۔

"یہ بنگالی کیسے بولتا ہے؟"

"جیسے دوسرے بچے بولتے ہیں۔ مادری زبان تو کہنے کی بات ہے۔ بچہ جو زبان سنتا ہے وہی سیکھتا ہے۔ بچوں میں رہتا ہے تو انہی کی زبان بولتا ہے۔"

بچہ ایک دروازے پر رک گیا۔ اس نے کنڈی بجائی تو اندر سے کسی عورت نے کہا "سوک دے؟" (کون ہے؟)

بچے نے ہنس کے کہا "استا مزمان راغلے دے" (تمہارے مہمان آئے ہیں۔)

عورت نے دروازہ کھول دیا اور فوراً ایک پردے کے پیچھے غائب ہوگئی جو دروازے پر اندر کی طرف لٹکا ہوا تھا۔ وہ سخت پردہ دار قسم کا مسلمان گھرانا تھا جس کی تہذیبی روایات نے مشرقی پاکستان کے معاشرتی ماحول کا کوئی اثر قبول نہیں کیا تھا۔ تارا بائی پردہ ہٹا کر اندر چلی گئی۔ میں اور غالب گلی میں کھڑے رہ گئے۔ اندر سے رابعہ اور نازو کی آواز آئی تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

"چلئے۔ آگے قدم بڑھایئے" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "پہلے آپ۔"

میں نے کہا "یہ کیسے ہوسکتا ہے قبلہ کہ اس غیرت مند پٹھان کی گولی کا نشانہ پہلے میں بن جاؤں۔"

غالب بولا "دیکھئے، آپ لیڈر ہیں۔ پہلے شہید ہونے کا اعزاز آپ کے لئے ہے۔"

میں نے کہا "یار' ایسے بلا اجازت کیسے موت کے مُنہ میں چلا جاؤں۔ اندر وہ بیٹھا ہو گا' بندوق دیوار پر لٹکی ہو گی۔ نامحرموں کو ایسے مُنہ اٹھا کے اندر آتا دیکھے گا تو سوال بعد میں کرے گا۔"

"ہاں۔ قاعدہ تو یہی ہے ان کا...... خیر۔ آپ کو گولی مارنے کے بعد وہ سوال کرے گا تو جواب میں دوں گا۔"

تارا بائی نے پردہ ہٹا کے جھانکا "ارے تم یہاں کھڑے ہو ابھی تک؟ اندر کیوں نہیں آتے؟"

میں نے سر کھجا کے کہا "میں نے تو کہا تھا اس سے...."

غالب بولا "مجھے اندر کا راستہ معلوم نہیں تھا کہ دائیں طرف جانا ہے یا بائیں طرف۔ غلط سمت میں مڑ جاتے تو مارے جاتے۔"

میں نے کہا "گھس جاتے باورچی خانے یا زنان خانے میں تو...."

"اچھا اب اندر آجاؤ۔ کوئی مشکل راستہ نہیں ہے" تارا بائی نے زبردستی مسکرا کے کہا۔

پردہ ہٹاتے ہی پورے گھر کا نقشہ اس کے مکینوں کی زندگی کی تصویر ماضی و حال کے ساتھ سامنے آگیا۔ وہ مختصر ترین صحن تھا جس میں ہمارے سامنے چارپائی پر ایک شخص نیم دراز تھا۔ اس کے پیروں پر کمبل تھا اور وہ چہرے سے بھی بیمار لگتا تھا مگر جسمانی ساخت کے اعتبار سے اس کا جسم صحت اور توانائی کا مظہر تھا۔ اس کی گھنی' سیاہ داڑھی جو پہلے نفاست سے تراشی جاتی ہو گی' اب قدرے بے ترتیب تھی۔ وہ ہمیں دیکھ کر خوش دلی سے مسکرایا تو اس کے مضبوط سفید دانت نظر آئے۔

"آؤ آؤ۔ برادر" اس نے اپنا ہاتھ مصافحے کے لئے آگے بڑھاتے ہوئے کہا "خو باہر کیوں رک گیا تھا؟"

میں نے ہاتھ ملا کے کہا "ذرا پردے کا خیال تھا۔"

وہ ہنسا "او یارا! تم اپنا مسلمان بھائی' اپنا پاکستانی برادر اور مجاہد لوگ ہے۔ اپنا بی بی خو پاگل کا بچہ' او مرجانا! دے خوارا شہ۔"

میں اور محسن اس کے پیروں کے پاس بیٹھ گئے۔ عملاً ہم نے اس واحد کمرے کی طرف دیکھنے سے گریز کیا جس کے دروازے پر رِچق پڑی ہوئی تھی۔ رابعہ اور نازو اسی کے پیچھے کسی سے باتیں کر رہی تھیں۔ صحن کے ایک گوشے کو کھانے اور دوسرے کو حوائج ضروریہ سے فراغت کے لئے وقف کر دیا گیا تھا۔ تین فٹ' چار فٹ کے ان کونوں کھدروں کو کچن یا باتھ روم کہنا غلط ہو گا۔ وہ پورا گھر مشکل سے ڈیڑھ سو مربع فٹ جگہ تھی۔ سولہ سترہ مربع گز۔ اور اس میں ایک پورا خاندان آباد تھا۔

نازو کے پیچھے رابعہ اور پھر مرجان برآمد ہوئی۔ وہ صحت مند اور گوری چٹی پٹھان عورت کبھی یقیناً بہت خوب صورت رہی ہو گی۔ اس کی عمر زیادہ نہیں تھی لیکن مفلسی کا گھن لگ جائے تو شباب کی رعنائی کا دور مختصر ہو جاتا ہے۔ آرائش و زیبائش کی حیثیت تو ثانوی ہے' کھانے کو بھی مشکل سے روکھی سوکھی ملے تو جسم کیسے تر و تازہ رہ سکتا ہے۔ پچیس تیس سال کی مرجان چالیس پینتالیس سال کی لگتی تھی۔ اس نے دوپٹے کو چہرے کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ قریب آکے اس نے ہمیں سلام کیا اور پھر سیدھی گزر کے چولہے کے پاس جا بیٹھی۔

پٹھان نے کہا "خو یارا! تم میں کون سکندر ہے؟"

میں نے کہا "میں سکندر ہوں۔ تمہیں میرا نام کیسے معلوم ہوا؟"

"تمہارا بی بی لوگ بولا" اس نے کہا اور غالب کی طرف متوجہ ہو گیا "ابھی ہم سمجھ گیا' تم غالب ہے۔"

غالب نے کہا "بالکل ٹھیک لیکن تمہارا نام نہ بی بی لوگ بولا نہ تم۔"

وہ مسکرانے لگا "اپنا تو مغز میں وٹہ ہے۔" اس نے سر پر ہاتھ مارا "ہمارا نام ہے سیف اللہ۔ اللہ کا تلوار۔ ابھی یہ تلوار نہیں' بے کار چیز ہے۔"

میں نے کہا "کیوں' کیا ہوا ہے تمہیں؟"

اس نے ایک دم کمبل ہٹا دیا۔ کمبل کے نیچے اس کے دونوں پاؤں کولہے تک سفید پلاسٹر آف پیرس میں چھپے ہوئے تھے "یہ دیکھو' ابھی اس کو کیا بولے گا؟ لکڑی کا ٹانگ بھی کام آتا ہے' یہ تو پتھر ہو گیا ہے پتھر۔ ہم کسی کافر کا سر بھی نہیں توڑ سکتا اس سے۔"

غالب نے کہا "یہ فریکچر کیسے ہوا؟"

"ایک گولی ادھر' ایک اُدھر" اس نے دائیں ٹانگ پر انگلی رکھ کے نشاندہی کی' پھر بائیں ٹانگ پر "ایک ادھر' دوسرا اُدھر۔ ہڈی کا تین ٹکڑا ہو گیا۔ ابھی چھ مہینہ ہم آدھا آدمی ہے' آدھا پتھر۔ اس کا بعد خدا خبر ہم کیسا چلے گا؟ انسان کی طرح کہ بندر کی طرح۔"

رابعہ اور نازو چپ کھڑی تھیں۔ میں اور غالب اپنا غم و غصہ' خوف اور اندیشے سب بھول گئے تھے۔ یہ بھی بھول گئے تھے کہ ان سے اس گھر میں پناہ لینے سے پہلے پیش آنے والے واقعات کے بارے میں ہی کچھ پوچھ لیں۔

میں نے کہا "تم ٹھیک ہو جاؤ گے سیف اللہ۔"

اس نے کہا "انشاء اللہ بولو۔ ایک اللہ کا بندہ ہم کو ڈاکٹر جوشی کا اسپتال لے گیا۔ جو بوہت بڑا ہڈی کا ڈاکٹر ہے۔ وہ بھی بولا کہ تم پٹھان ہے' مسلمان ہے۔ انشاء اللہ بولو۔ ڈاکٹر جوشی کا بڑا نام ہے لیکن سب سے بڑا نام کس کا ہے؟ تم اللہ بولتا ہم ایشور"

میں نے متاثر ہو کے کہا "اللہ بھی شفا انہی کے ہاتھ میں دیتا ہے جو اس پر بھروسہ کرتے ہیں' اپنے علم اور اپنی مہارت پر نہیں۔"

غالب نے کہا "مگر یہ ہوا کیسے؟ گولی کس نے ماری تھی؟"

وہ ہنسنے لگا "خو یارا' خدا خبر۔ ہم کو مالوم ہوتا تو ہم اس داؤس کو بھوڑتا۔"

میں نے کہا "کوئی دشمن تھا تمہارا؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "سیف اللہ کا دشمن ادھر اپنا ملک میں بھی نہیں ہے' جو ہم سے بدلہ لے۔ ہم کو لوگ بدنام بوہت کیا کہ پٹھان بدلہ ضرور لیتا ہے۔ ایسا نہیں ہے یارا! ہم معاف بھی کرتا ہے۔ سب ایک جیسا لوگ کدھر ہوتا ہے؟ کون سا قوم کا سارا لوگ اچھا یا برا ہوتا ہے؟ ہم کو گولی دشمن نے مارا مگر وہ امارا دشمن نہیں تھا۔"

نازو نے کہا "کیا مطلب؟ غلط فہمی میں تم کو گولی مار دی؟"

سیف اللہ پھر ہنسا "نہیں بی بی' وہ دشمن تھا انسان کا' پاکستان کا' شرافت کا اور اپنا عقل کا دشمن تھا کوئی۔ ہم اس کا نام نہیں جانتا' اس کو پہچانتا بھی نہیں۔ ہم تو ادھر اپنا کام کا واسطے گیا تھا۔"

میں نے کہا "کیا کام کرتے تھے تم؟"

"چوکیدار تھا ہم ایک سیٹھ کا' ایک ہندو سیٹھ کا۔ ادھر ہندو لوگ اپنا حفاظت کا واسطے گورکھا بھی رکھتا مگر اعتبار نہیں کرتا۔ سیٹھ دشوا ناتھ کا باپ ہم کو رکھا۔ دس سال ہوا۔ وہ مر گیا تو اس کا لڑکا ہم کو بولا کہ تم چاچا ہے ہمارا۔ اس کا جوٹ مل میں چار سو آدمی کام کرتا ہے۔"

"اور اتنے بڑے سیٹھ نے تم کو یہاں اس حال میں ڈال رکھا ہے؟ تمہارے لئے اس کی کوٹھی میں کوارٹر بھی نہیں تھا؟"

وہ کچھ دیر خلا میں دیکھتا رہا اور اداسی نے اس کی آنکھوں میں پل بھر کے لئے آنسوؤں کی نمی پیدا کی' پھر وہ مسکرانے لگا۔ وہ بہادر آدمی تھا۔ اسے اپنے دکھوں پر مسکراہٹ کا پردہ ڈالنا آتا تھا۔ وہ اپنے زخموں کی ٹیس کو اپنی ہنسی میں چھپا سکتا تھا۔

"خو یارا! ابھی ایسا دنیا ہے کہ جو ساتھ چل سکتا ہے اس کا ساتھ دیتا ہے' جو رک جاتا ہے اس کو چھوڑ دیتا ہے پیچھے' بھول جاتا ہے۔ سیٹھ کا گھر پر ہم رات بھر جاگتا تھا۔ ہم بولا کہ سیف اللہ جب تک ادھر ہے' اندر کوئی نہیں آسکتا۔ ایک بار ڈاکو لوگ آیا۔ ہم ایک کو مار دیا' دوسرا زخمی کیا۔ سیٹھ ہم کو دس روپیہ انعام دیا۔"

"دس روپے؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔

"جان بچانے کا معاوضہ صرف دس روپے؟" غالب بولا۔

"وہ جان کے علاوہ مال بھی لے جاتے پھر؟" نازو نے کہا۔

سیف اللہ مسکرایا "دس روپیہ انعام دیا' معاوضہ نہیں یارا۔ تنخواہ الگ ملتا ہم کو۔ ابھی ادھر بوہت لوٹ مار ہوتا' خون خرابہ ہوتا۔ غنڈہ لوگ کا کیا ایمان اور مذہب لیکن سیف اللہ کا ہے۔ ایک مسلمان لڑکا دن میں ہم کو بولتا کہ آج رات تمہارا سیٹھ کا خانہ خراب کرے گا۔ تم چھٹی کرو آج یا اپنا بندوق رکھو اور سو جاؤ۔ ہم بولا کہ خنزیر کا بچہ' سیف اللہ کو ایسا بولتا۔ وہ بولا کہ تمہارا سیٹھ کافر ہے۔ ہم بولا کہ ہمارا کام اس کا حفاظت ہے اور وہ ہم کرے گا' اپنا جان دے کر بھی اس کو بچائے گا۔ تمہارا باپ بھی آئے گا تو ہم گولی مارے گا اس کا مغز میں۔ وہ بولا کہ ہم تم کو بھی حصہ دے گا۔ بس پھر ہم بندوق اٹھایا تو وہ داؤس بھاگ گیا۔ ہم یہ بات سیٹھ کو بولا اور سیٹھ پولیس کو۔ ایک ہفتہ بعد پولیس کا سنتری چلا گیا۔ رات کو غنڈہ لوگ حملہ کیا۔"

"تم نے پہچان لیا تھا انہیں؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "وہ نقاب ڈال کے آیا۔ آٹھ دس آدمی تھا۔ ہم دو کو مار دیا۔ مغز میں گولی مارا۔"

"ان میں وہ بدمعاش لڑکا بھی تھا جس نے تم سے بات کی تھی؟" میں نے کہا

ایک بار پھر سیف اللہ نے نفی میں سر ہلایا "مرنے والوں میں نہیں تھا۔ پکڑا کوئی بھی نہیں گیا۔ دو دن بعد ہم واپس آتا تھا کہ کوئی فائر کیا۔ ہم کسی کو نہیں دیکھا۔"

"ظاہر ہے یہ انہی کی انتقامی کارروائی تھی۔" غالب نے کہا۔

نازو بولی "آپ کو معلوم تو ہو گا کہ وہ لڑکا کون تھا۔ اس کا نام...."

"خو بی بی! ہم دیکھا نہیں کسی کو تو نام کیسے لے گا۔ اس کا نام ہم جانتا بھی نہیں۔ سامنے آئے گا تو پہچانے گا۔ ہم ادھر گر گیا۔ ایک شیطان کا بچہ ہم کو گولی مارا' دوسرا انسان کا بچہ گاڑی میں اسپتال لے گیا۔ ابھی ہم ادھر لیٹا ہے۔"

میں نے کہا "اس بار تمہارے سخی سیٹھ نے جاں نثاری کا کیا انعام دیا۔"

وہ تلخی سے مسکرایا "ابھی چھوڑو اس کو۔ سیف اللہ نے اپنا فرض پورا کیا۔ یہ بات اللہ نے دیکھا' ابھی وہی کچھ کرے گا۔ سیٹھ جو ہم کو چاچا بولا تھا' ہم کو بھول گیا ہے۔"

"اس نے تمہارے علاج معالجے کا بندوبست تو کیا ہو گا؟" غالب نے کہا۔

"کچھ نہیں کیا وہ۔ اس سے زیادہ غیروں نے کیا" سیف اللہ نے دکھ اور تاسف کے ساتھ کہا "وہ ہم کو نوکری سے جواب دیا۔ بولا' سیف اللہ ہم چھ مہینہ انتظار نہیں کر سکتا۔ ہم دوسرا چوکیدار رکھا ہے۔ ابھی تم چھٹی کرو۔ داؤس۔ ہم چھٹی نہیں کرے گا تو کیا ڈیوٹی کرے گا؟"

"یعنی جب تک تم زیر علاج ہو' چھٹی پر رہو گے؟" نازو نے سادگی سے سوال کیا۔

"پکّا چھٹی بی بی۔ ایک دم" وہ بولا "ایک مہینہ کا تنخواہ دیا اور بس۔ ہم کو دیکھنے ایک دفعہ بھی نہیں آیا۔ اس کا نوکر لوگ آیا۔ بولا سیٹھ ڈرتا ہے۔ تم مسلمان ہے اور پاکستانی ہے۔ تمہارا ساتھ بات کرے گا تو مکتی باہنی والا غدار بولے گا' کوٹھی پر بم مارے گا۔ وہ اپنا بیوی بچہ کا ساتھ لندن چلا گیا ہے۔ ادھر بھی کوٹھی ہے اس کا۔ گڑبڑ ٹھیک ہو گا تو آئے گا۔"

"اور تم کیا کرو گے؟" رابعہ نے کہا۔

"کیا کرے گا؟ صبر کرے گا۔ دعا کرے گا اللہ ان کو عقل دیوے۔ ہم کیا کر سکتا ہے بی بی؟"

"تم واپس نہیں جاؤ گے تو یہاں کیسے گزارا ہوگا؟"

"واپس ییسے جائے گا ابھی!" اس نے اپنی پتھر ہو جانے والی ٹانگ کی طرف افسوس سے دیکھا "دو ٹانگ والا بھی نہیں جاتا۔ راستہ بند ہے۔ ایجنٹ لوگ پیسہ مانگتا ہے۔"

"اگر پیسے کا بندوبست ہو جائے....."

"پھر بھی نہیں جا سکتا۔ ہم کو اٹھا کے کون لے جائے گا؟ کون بس پر سوار کرے گا؟ کون اتارے گا؟ بس بار بار بدلنا پڑتا ہے' جگہ جگہ پیدل چلنا پڑتا ہے۔ پہاڑی راستہ ہے۔" اس نے بے بسی اور بے چارگی سے کہا "خو ابھی تم جاؤ اندر بیٹھو۔ چائے پیو۔"

مرجان بالکل خاموشی سے کئی بار گزر کے اندر گئی تھی اور ہم دیکھتے رہے تھے کہ وہ چائے کے ساتھ کھانے پینے کے لوازمات کا بندوبست بھی کر چکی ہے۔ تارا بائی اور کاجل کمرے سے نہیں نکلی تھیں اور بنگالی میں نہ جانے کیا باتیں کر رہی تھیں اور رو رہی تھیں۔

سیف اللہ کی باتوں سے میرا دل بہت دُکھا تھا۔ اس پورے معاشرے کے غیر منصفانہ' غیر انسانی اور غیر اخلاقی طرز عمل کے ذمے دار صرف وہ دوغلے کردار اور منافقانہ سوچ رکھنے والے راہنما تھے' جو طاقت اور پیسے کے بل پر قیادت پر قابض تھے۔ سیاست کے خود ساختہ ٹھیکیدار جن کے کوئی سیاسی نظریات نہیں تھے اور اگر تھے تو سو فیصد ذاتی مفادات سے وابستہ رہتے تھے۔ وہ نام نہاد علماء جو مذہب کے نام پر منافرت اور تعصب پھیلاتے تھے اور جن کے دامن فرقہ پرستی کی جنگ میں مرنے والوں کے لہو سے داغ دار تھے۔ جو دن رت جلسے جلوس' بیانات اور پریس کانفرنسوں کے ذریعے اپنی عوام دوستی کے جھوٹ کا ڈھنڈورا پیٹتے تھے مگر عام آدمی کے ساتھ ہونے والے ظلم پر ان کی زبان اور ان کی آنکھیں بند رہتی تھیں۔ آئے دن بے گناہ' پولیس کے تشدد سے ہلاک ہوتے تھے۔ بیواؤں کی غیرت دن دہاڑے لٹ جاتی تھی اور یتیموں کا مال کھانے والے انہیں کرائے کے قاتلوں کے حوالے کرتے تھے کہ انہیں صفحہ ہستی سے یوں مٹا دیا جائے جیسے وہ لوح جہاں پر حرف کمتر تھے۔ لیکن آج تک کسی لیڈر نے یا فرقہ پرست مُلا نے کسی تھانے کے باہر مظاہرہ کیا؟ کسی بے گناہ کی ہلاکت پر احتجاج کے لئے ایک بینر بھی لگایا یا کسی بیوہ اور یتیم کے حقوق کی پامالی پر مذمت کا ایک بیان بھی جاری کیا؟ کسی مظلوم کی داد رسی کے لئے کوئی مہم چلائی؟ سیاست اگر عوام کی خدمت کا نام ہے تو مذہب انسانیت کی خدمت کا مگر انہیں گھناؤنے لوگوں نے مکروہ پیشہ بنا دیا ہے۔

جب رابعہ نے میرے بازو پر تھپکی دے کر کہا "چلو' سب انتظار کر رہے ہیں تمہارا۔"

تو میں چونکا "معاف کرنا" میں نے سیف اللہ سے کہا "ابھی تک میں نے تمہارا شکریہ بھی ادا نہیں کیا۔ تم نے....."

"خو ابھی ایسا بات مت کرو یارا۔ جاؤ کچھ کھا پی لو" سیف اللہ خوش دلی سے مسکرایا "بی بی لوگ کو تسلی دو۔ رونے سے کچھ نہیں ہوتا' کوشش سے ہوتا ہے۔"

چھوٹے سے کمرے میں صاف ستھری دری پر سفید چادر بچھی ہوئی تھی۔ ایک دیوار کے ساتھ اوپر تلے ٹین کے چار پرانے صندوق رکھے ہوئے تھے۔ کمرے میں روشنی کم تھی مگر اس کی دیواریں اُجلی تھیں۔ کہیں گرد و غبار یا جالے نظر نہیں آتے تھے جس سے مرجان کی صفائی پسندی اور سلیقے کا پتا چلتا تھا۔ دیوار کے ایک طاق میں کلام پاک کو ریشمی گوٹے والے غلاف میں پورے احترام کے ساتھ محفوظ کر دیا گیا تھا۔ فریم کئے ہوئے "یا اللہ" اور "یا محمدؐ" اور خانہ کعبہ کی تصویر ایک مخصوص افتاد طبع اور عام مسلمان گھرانے کے روایتی مزاج کی عکاسی کرتی تھی۔ یہ عام طرز عمل ہے کہ قرآن پاک کسی بلند مقام پر اسی طرح خوب صورت غلافوں میں بصد احترام محفوظ رہتا ہے۔ اسے گھر بدلتے وقت سب سے پہلے پہنچایا جاتا ہے۔ دلہن کو اس کے سائے میں رخصت کیا جاتا ہے یا مہلت ملے تو مرنے والے کے سرہانے سورۃ یٰسین پڑھنے کے لئے کھولا جاتا ہے۔ جو اسے باقاعدگی سے پڑھتے بھی ہیں تو سمجھتے نہیں اور جو آٹے میں نمک کے برابر سمجھنے والے ہیں' وہ اس پر عمل نہیں کرتے۔ وہ قوم جس نے خدا کا کہا نہیں مانا' بھلا قائد اعظم کے فرمودات اور علامہ اقبال کے ارشادات پر کیا عمل کرتی۔ نتیجہ ساری دنیا میں مسلمانوں کی رسوائی' پاکستان سے پاکستانی کی دوری۔

میرے ذہن کو حالات اور حادثات نے تاریکی' مایوسی اور قنوطیت پسندی کی طرف دھکیل دیا تھا۔ حد سے زیادہ حقیقت پسندی سے فرسٹریشن کے سوا کیا ملتا ہے۔ سنگِ دشنام اور تیرِ الزام کے سوا۔ جو سچ بولے وہ جھوٹا' جو اصل ایمان کی بات کرے وہی کافر' جو حق پرست ہو وہی گردن زدنی۔

سیف اللہ پر ہونے والے ظلم پر یہی کہہ کر خاموش رہا جا سکتا تھا کہ یہ نوشتۂ تقدیر تھا' اس کی آزمائش تھی اور خرابی کے پیچھے کیا اسباب مصلحت ہیں' یہ خدا جانتا ہے۔ وقتی ردِعمل سب کا ایک سا تھا۔ کسی حد تک احتجاجی کہ ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی۔ بندہ خطا کار اور کم ظرف ہے' اپنی ہستی کو بھول جاتا ہے اور اس سے شکوہ کرنے لگتا ہے جو زندگی دیتا ہے' اسے دائم و قائم اور رواں دواں رکھتا ہے۔

میں نے بے دلی سے چائے ختم کی۔ کاجل سب سے زیادہ متفکر نظر آ رہی تھی۔ اس نے چائے بھی نہیں پی۔ گونگی بن کے سب سے زبان خاموشی میں التجا کرنے والی ہماری میزبان کچھ شرمسار تھی کہ شاید مہمانوں کی خاطر مدارات ان کے شایان شان نہیں تھی

تارا بائی نے اچانک کہا "میں جاتی ہوں۔"

کاجل نے اسے روک لیا "مولوی صاحب کا انتظار نہیں کرو گی؟"

"کب تک انتظار کروں' میرا گھر....."

"تمہارے گھر میں اب کیا ہے" رابعہ نے کہا "جو ہوا تھا ہماری وجہ سے ہوا تھا۔ اب اس اُجڑے گھر کو اُجاڑنے کوئی نہیں آئے گا۔"

نازو نے بھی سہلایا "ایسا نہ ہو تم اکیلی جاؤ تو وہ اپنی ناکامی کا بدلہ تم سے لیں۔"

میں نے کہا "وہ کون تھے؟ تم نے دیکھا تو ہوگا۔ کسی کو پہچانتی ہو؟"

تارا بائی خلا میں دیکھنے لگی "میری آنکھوں میں جالے آ گئے ہیں۔ چہرے مجھے صاف دکھائی نہیں دیتے۔"

میں نے کہا "یہ خوف کے جالے تو نہیں ہیں تارا بائی؟ تم جانتی ہو کہ وہ کون تھے۔ ان کے چہرے اور نام نا آشنا نہیں لیکن تم ڈرتی ہو۔"

"تارا بائی کو کس کا ڈر۔ بچپن سے آج تک جو تھا' سب کچھ تو دنیا نے لوٹ لیا۔ اب نہ مال ہے نہ وہ جسم کہ ڈاکا پڑے۔"

کاجل نے کہا "وہ میرے پیچھے آئے تھے۔ میں دیکھتی تو پہچان سکتی تھی مگر اس سے کیا ہوتا۔"

تارا بائی نے کہا "تم یہاں سے چلی جاؤ ورنہ وہ یہاں بھی آ جائیں گے۔ میں بوڑھی عورت ہوں' اکیلی اور بے سہارا ہوں۔ سختی نہیں برداشت کر سکتی۔ اتنا دم نہیں ہے میری بوڑھی ہڈیوں میں کہ جوان ہاتھوں کی مار سہہ سکیں۔ میں بتانے پر مجبور ہو جاؤں گی کہ تم سب کہاں ہو۔"

"پھر تمہارا واپس جانا کیوں ضروری ہے؟" میں نے کہا۔

"ضروری ہے" تارا بائی نے بے چینی سے کہا اور کسی کے روکنے سے پہلے ہی باہر نکل گئی۔

کاجل نے کہا "اسے اپنی شاگرد لڑکیوں کی فکر ہے۔"

"تارا بائی..... کیا پڑھاتی ہے؟" میں نے کہا۔

"رقص کی تعلیم دیتی ہے۔ یہ خود بھی بڑی زبردست ڈانسر' بہت بڑی فنکار تھی۔ نامور نہیں ہوئی کیوں کہ اسے صرف فن سے پیار تھا' شہرت یا دولت کی اس نے کبھی پروا نہیں کی۔ اسٹیج یا فلموں میں بھی ڈانس نہیں کیا حالاں کہ آفر کرنے والے بہت تھے۔ کبھی کسی دولت مند کے محل میں مُجرا کرنے نہیں گئی۔ اس کا شوہر بھی رقاص تھا۔ میاں بیوی ایک دوسرے کے لئے پاگل تھے اور لوگ انہیں پاگل کہتے تھے۔ کبھی میاں ناچ رہا ہے تو کبھی بیوی۔ کبھی دونوں کے درمیان مقابلہ چل رہا ہے۔ کلاسیکل ڈانس میں تارا بائی سے بڑا نام کوئی نہیں ہو سکتا مگر لوگ اس نام کو نہیں جانتے' صرف وہی جانتے ہیں جو فن کو سمجھتے ہیں یا خود فنکار ہیں۔ تمام عمر رقص سکھاتے گزر گئی۔ کبھی کسی سے ایک پیسہ فیس نہیں مانگی۔ ان کے شاگرد کہاں سے کہاں نکل گئے۔ بین الاقوامی شہرت حاصل کر کے لکھ پتی ہو گئے۔ فلموں میں چلے گئے۔ وہی ان کی ہر ضرورت پوری کرتے تھے۔ تحفے تحائف اور نذرانے بھی زبردستی دے جاتے تھے۔ شوہر رقص کرتا تھا تو بیوی طبلے پر سنگت کرتی تھی۔ بیوی ناچتی تھی تو شوہر طبلہ لے کر بیٹھ جاتا تھا۔ گھنٹوں ریاض کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ ابھی تو کچھ نہیں سیکھا۔ ودّیا ایک ساگر سمان ہے۔ ہم نے ایک بوند پالی تو اسے سمندر کیسے کہیں۔ عجیب وجدانی سی کیفیت ہوتی تھی ان کے رقص میں' جس میں یہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتے تھے۔ کھانے پینے کا ہوش تک نہیں رہتا تھا۔ ممکن ہے یہ سب تمہیں عجیب اور معیوب لگے مگر یہاں کا یہی کلچر ہے۔ یہ بات ہے روح کے جذبوں کی۔ جیسے ممتا ایک جذبہ ہے جسے صرف عورت سمجھتی ہے۔ جذبہ ہی کسان کی محنت کو بھی ہریالی اور خوشحالی دیتا ہے۔ بس ہر جذبے کا رنگ جدا ہے' مفہوم الگ ہے' مقصد اور مُدعا مختلف ہے۔ اس کا رقاص شوہر ایک دن اسی سرشاری کی الہامی کیفیت میں رقص کرتے کرتے گرا اور مر گیا۔ زندگی ختم ہو گئی تو رقص ختم ہو گیا یا یوں کہہ لو کہ رقص ختم ہوا تو زندگی ختم ہو گئی۔ زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب۔ دل کی دھڑکن کا رقص' ترتیب' توازن اور تسلسل کی کیفیت' نبض اور سانس کی رفتار کے ساتھ حرکتِ قلب اور دورانِ خون کی ہم آہنگی۔ یہی زندگی کا رقص ہے۔ حرکت کا یہ توازن تو ساری کائنات میں ہے۔ سورج' چاند' ستارے' متحرک مشینوں کے پرزے' موسموں کی رت' ساون کی جھڑی اور دریا کی روانی' سب میں ترتیب توازن اور ہم آہنگی ہے۔"

میں دم بخود بیٹھا تھا "تم تو فلاسفر ہو کاجل۔"

"غلط۔ میں پاگل ہوں۔ اتنی دیر سے بولتی جا رہی ہوں" اس نے ہنس کے کہا "دراصل میں تارا بائی کے لئے بہت دکھی اور فکر مند ہوں۔"

غالب نے کہا "کیا تم بھی شاگرد ہو اسی کی؟"

"ہاں۔ مگر ایک ایسی شاگرد جس نے استاد کا نام روشن نہیں کیا۔" وہ بولی "آج میری وجہ سے اس کا گھر تہس نہس ہوا۔ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ محلے والے اسے بچانے آ گئے۔ سب تارا بائی کی عزت کرتے ہیں مگر جو تارا بائی کو نہیں جانتے وہ اسے کب معاف کریں گے۔"

میں نے کہا "کیا اس کے بیٹے نہیں ہیں؟"

"اور اتنے شاگرد ہیں اس کے تو وہ کسی کے گھر کیوں نہیں چلی جاتی؟" غالب نے کہا۔

"اولاد خدا نے نہیں دی" کاجل بولی "مگر میرا خیال ہے کہ اولاد ان کی نہیں ہو سکتی تھی اور یہ اولاد کے نہیں ہو سکتے تھے' اس لئے اچھا ہی ہوا جو بھی ہوا۔ خود انہیں کبھی اولاد کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اب آدمی اپنے احساس محرومی سے خود ہی سمجھوتا کرلے تو الگ بات ہے" رابعہ نے کہا۔

"اچھا؟" میں نے مسکرا کے اس کی طرف دیکھا۔

رابعہ کا چہرہ گلابی ہوگیا۔ اس نے عام بات کی تھی' میں نے ایک لفظ سے اسے خاص مفہوم دے دیا مگر یہ بات کاجل نہیں سمجھی۔

"تارابائی خود کہتی تھی۔ اگر بھگوان مجھے ماں بنا دیتا تو میں مر جاتی۔ ماں کے مقابلے میں نرتکی کی بھلا کیا حیثیت۔ ماں بڑی طاقت ور ہوتی ہے۔ ممتا کا جذبہ کلاکار کی کلا کو مار ڈالتا ہے۔ کسی شاگرد کے گھر جا کے رہنا اس کی خوددار طبیعت کو گوارا نہیں ہوگا۔ ویسے بھی اس نے خود تو اسی دن رقص چھوڑ دیا تھا جس دن اس کا شوہر مرا تھا۔ کہتی تھی اب دل میں کچھ ہے ہی نہیں۔ بس خلا ہے۔ خلا میں پاؤں ٹکتے ہی نہیں تو رقص کیسے کروں۔ بعد میں رقص سکھانے لگی۔ شوہر کی موت پر بڑا رشک کرتی ہے۔ کہتی ہے اگر مجھے معلوم ہوجائے پہلے سے کہ میرا وقت پورا ہوگیا ہے تو میں یم دوت سے کہوں گی کہ بس چند منٹ ٹھہر جائے۔ میں گھنگرو باندھ لوں اور آخری رقص شروع کردوں۔ آگے اس کی مرضی' جب چاہے رقص کو ختم کردے۔ بالکل پاگل عورت ہے۔"

میں نے کہا "مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ کسی نہ کسی پہلو سے ہم سب پاگل ہوتے ہیں۔ کیا سیف اللہ پاگل نہیں ہے جسے سیٹھ سے کوئی شکوہ ہی نہیں؟ نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا۔"

غالب نے کہا "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک مسجد کے پیش امام نے تارابائی جیسی عورت کی خاطر جان کو خطرے میں کیوں ڈالا؟"

"اے ڈی کا معاملہ بھی ایسا ہی تھا۔ اس جیسے شرابی' راشی پر ایک دیندار شخص نے اعتبار کیا تھا۔ حور اور نور کو اس کے سپرد کر گیا تھا اور خود مارا گیا تھا۔ دراصل جان دینا اس شخص کے لئے ایک سعادت ہے جو سمجھتا ہو کہ جان دی ہوئی اسی کی تھی اور اگر حق ادا ہوجائے تو ایسی موت برحق۔ اور وہ زندگی بارنا حق جو صرف اپنے لئے ہو۔"

نازو نے کہا "آخر وہ اپنی نابینا بیوی کے ساتھ کیوں نکلے تھے؟ وہ ہمیں یہاں چھوڑنے کے لئے خود آجاتے۔"

رابعہ نے کہا "ہاں۔ یہ مجھے بھی عجیب لگا تھا جب انہوں نے اپنی بیوی سے کہا تھا کہ نیک بخت' برقعہ اوڑھ لے اور چل میرے ساتھ۔ اندھی عورت بھلا کیا راستہ دکھا سکتی تھی۔ کمال یہ ہے کہ اس عورت نے بھی کوئی سوال نہیں کیا کہ یہ کہاں جانے کا فیصلہ کرلیا اچانک۔"

"وہ تم جیسی نافرمان اور گستاخ بیوی نہیں ہوگی" غالب بولا "اپنے مجازی خدا کے ساتھ جنت میں جائے گی۔"

"تمہارے بھی ساتھ ہوگی جہنم میں" میں نے کہا۔

"وہ تو جیتے جی جہنم میں جھونکی جائے گی" نازو نے کہا "زندگی جہنم ہوگی اس کی۔"

"ہوسکتا ہے اپنے بارے میں تمہارے خدشات غلط ثابت ہوں۔"

"میں اپنی بات نہیں کررہی تھی" نازو نے بگڑ کے کہا۔

غالب نے کہا "تم جہنمی کہاں ہو۔ تم تو جنت میں رہوگی میرے ساتھ۔"

آخری دو الفاظ اس نے عمداً آہستہ سے کہے تھے جو میں نے سنے مگر نازو نے نہیں سنے چناں چہ بات وہیں ختم ہوگئی۔

کاجل نے کہا "مولوی صاحب کا پتا کرنا چاہئے۔ وہ ہمیں دروازے تک چھوڑ کے چلے گئے تھے۔"

"تم نے دیکھا نہیں تھا کہ وہ واپس گئے تھے اسی راستے پر یا......؟"

کاجل نے کہا "یہی تو پریشانی ہے۔ وہ آگے نکل گئے تھے۔"

"شاید سیف اللہ کو معلوم ہو" میں نے کہا۔

سیف اللہ کو کچھ معلوم نہیں تھا "ہم کو بی بی لوگ بولا تھا کہ مولبی صاب آیا ہے۔ اپنا استاد صاب ہے۔ ہم بدبخت ان کو لینے کا واسطے دروازے تک نہیں گیا۔ وہ دروازے تک آکے چلا گیا' ہم اپنا بی بی کو بولا کہ ان کو اندر لاؤ مگر وہ نہیں تھا۔"

"تم انہیں کب سے جانتے تھے؟" غالب بولا۔

"ہم بوہت چھوٹا بچہ تھا۔ والد صاحب ادھر اکوڑہ خٹک میں بھیجا۔ تم کو مالوم ہے ادھر کتنا بڑا دارالعلوم ہے؟ جہانگیرو کا پاس۔"

میں نے کہا "میں نے دیکھا ہے۔"

"بس ہم بدبخت ادھر ناظرہ ختم کیا۔ پھر والد صاب قضائے الٰہی سے فوت ہوگیا۔ ہمارا چاچا اس کو قتل کیا۔"

"تمہارے سگے چچا نے! کیوں؟"

"خوبارا' زمین کا واسطے۔ کیسا نامراد ہے یہ زمین۔ ابھی ہم چاچا کو قتل کرتا' پھر وہ ہمارا بیٹا کو۔ پھر ایسا سب دو گز زمین لیتا تو زمین ختم ہوجاتا' دشمنی ختم نہ ہوتی۔ ہم زمین اس کو دیا اور ادھر آگیا۔ ہمارا استاد صاب بعد میں آیا۔ اس کا پیرومرشد حکم دیا۔ ابھی خدا خبر کیا حکم ہوا' وہ کدھر گیا۔"

میں نے کہا "میں دیکھ کے آتا ہوں۔"

بے اختیار رابعہ نے کہا "کوئی ضرورت نہیں۔"

میں نے اسے دیکھا تو وہ شرمندہ نظر آنے لگی "میرا مطلب تھا کہ......وہ بچہ جو ہمیں یہاں لایا تھا' وہ بھی تو معلوم کرسکتا ہے۔"

غالب اور نازو اس کے ہمنوا ہوگئے "ہاں۔ رابعہ ٹھیک کہتی ہے۔ ہمارا باہر جانا خطرے سے خالی نہیں۔"

"اور اندر ہم محفوظ ہیں' اس کی کیا گارنٹی ہے؟" میں نے کہا۔

کاجل نے کہا "تم سب بیٹھو' میں جاتی ہوں۔ مجھے ویسے بھی گھر جا کے بابا کی خیریت معلوم کرنی ہے۔ وہ میری وجہ سے پریشان ہوں گے۔"

"تم کیسے جاؤگی؟ کار تو وہیں چھوڑ دی تھی تم نے۔"

"کار وہیں ہوگی' میں لے جاؤں گی" کاجل نے کہا۔

رابعہ نے مضطرب لہجے میں کہا "کاجل! اکیلی مت جاؤ۔"

"حالات ٹھیک نہیں ہیں" نازو بولی۔

"تم فکر مت کرو' مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ میں واپس آؤں گی۔ جب تک میں نہ آؤں تم یہاں سے مت نکلنا۔"

میں نے کہا "اس کی گارنٹی ہم نہیں دے سکتے۔ تم نہ جانے کب آؤ۔"

"میں بندوبست کرکے آؤں گی۔ کوشش کروں گی' کوئی گاڑی مل جائے جس میں ہم سب نکل جائیں۔ بس کا سفر مشکل اور لمبا ہوگا۔ راستے میں جگہ جگہ روکنے والے بھی بدمعاشی کرتے ہیں۔ روپیہ پیسہ اور زیور چھین لیتے ہیں۔"

"اور پولیس کچھ نہیں کرتی؟"

"یہ سب پولیس ہی تو کرتی ہے" کاجل نے کہا "سرحد پار کرانے والے ایجنٹ بھی ان سے ملے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ پولیس کو بتا دیتے ہیں کہ کس کے پاس کتنا نقد ہے اور کتنا سونا۔ مجبور لوگ کچھ بول نہیں سکتے۔ ایجنٹ واپسی میں اپنا حصہ وصول کرلیتا ہے۔ بس یا ٹرک بھی اسی کا ہوتا ہے۔"

"اور یہ سب جانتے ہوئے بھی لوگ ان پر بھروسا کرتے ہیں؟"

"بھروسا نہ کریں تو کیا کریں؟ کہاں جائیں اور کیسے جائیں؟ آخر جان تو بچانی ہے" کاجل نے کہا "کار والے بچ جاتے ہیں۔ پولیس بھی ڈرتی ہے کہ نہ جانے اس میں کون ہو۔"

میں نے کہا "پھر تم ہر قیمت پر کار یا جیپ حاصل کرو۔ ہم اس پر بوگس نمبر پلیٹ لگا کر نکل جائیں گے۔"

"بوگس نمبر پلیٹ؟"

"ہمارے پاس انڈین پاسپورٹ ہیں" میں نے کہا "اگر انڈیا کے کسی شہر کا رجسٹریشن نمبر مل جائے۔"

غالب نے کہا "یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ آج کل بھارتی گاڑیاں بہت آگئی ہیں۔ کوئی بھی نمبر نوٹ کرلو اور نمبر پلیٹ بنوالو۔ اس سے یہ فائدہ بھی ہوگا کہ اصل نمبر کی کار تو ڈھاکا میں ہوگی۔ پولیس کے پاس اس کے گم یا چوری کی رپورٹ نہیں ہوگی کہ ہمیں کوئی بارڈر پر روکے۔"

"بارڈر پر ہمیں لازمی روکا جائے گا" میں نے کہا "بنگلہ دیش کی سرحد کے بعد' نیپال میں داخل ہونے سے پہلے۔"

"روکنے والے جب پاسپورٹ دیکھ لیں گے تو گاڑی کے کاغذات چیک نہیں کریں گے" غالب نے کہا۔

نازو نے کہا "گاڑی تو مل جائے گی' بوگس نمبر پلیٹ کون بنا کے دے گا؟"

"اور سرحد تک راستہ کون بتائے گا؟" رابعہ نے کہا۔

"راستہ جاننے والا ڈرائیور ہے" کاجل نے کہا "شاید وہ بوگس نمبر پلیٹ بھی بنوادے۔"

"بھروسے کا آدمی ہے نا؟" غالب نے کہا۔

"بھروسا کون کس پر کرسکتا ہے؟ ویسے تو...... میری بات نہیں ٹالے گا" کاجل نے کہا "میں اسے ساتھ لے آؤں گی۔"

نازو بولی "ہم اسے آنے جانے کا اچھا معاوضہ دے سکتے ہیں۔"

"پہلے رقم تو کاجل کے حوالے کرو" میں نے کہا "گاڑی مفت تو نہیں ملے گی۔"

"مال نکالو جو اس منحوس سونے کے بدلے ملا تھا۔ خزانے پر سانپ بنی بیٹھی ہو" غالب نے کہا۔

"لعنت بھیجتی ہوں میں اس خزانے پر" نازو نے خفگی سے کہا "وہ میرے پاس ہے بھی نہیں۔"

"کیا! ارے نازو' خدا کے غضب سے ڈرو۔ اتنا بڑا غبن کررہی ہو؟ پیرجی کی بدروح چمٹ جائے گی تم سے" غالب نے کہا۔

"پیسے میرے پاس ہیں" رابعہ نے کہا۔

غالب نے سر کھجا کے کہا "میں بھی حیران تھا کہ نازو جیسی ایمان دار' نیک' شریف اور خدا ترس لڑکی کو کیا ہوا......"

"تم ہو بڑے کمینے دوست" میں نے کہا۔

کاجل کے رخصت ہوجانے کے بعد ہمارے پاس کرنے کے لئے کچھ نہیں رہا' سوائے انتظار کے۔ سیف اللہ کا اکلوتا بیٹا مولوی صاحب کے گھر تک گیا اور ایک گھنٹے میں لوٹ کر آیا تو یہ خبر لایا کہ ان کے حجرے میں بدستور تالا پڑا ہوا ہے۔ مولوی صاحب نے ظہر کی نماز بھی نہیں پڑھائی تھی۔ مسجد میں کسی نے اذان بھی نہیں دی تھی۔

سیف اللہ نے کہا "اللہ توبہ' اللہ توبہ۔ یہ اچھا شگون نہیں ہے۔"

میں نے کہا "ایسی باتوں پر کیوں یقین رکھتے ہو سیف اللہ؟ شگون کا اچھا برا ہونا بے معنی بات ہے' جب دنیا میں سب کچھ خدا کی مرضی اور اس کے حکم سے ہوتا ہے۔ یہی عقیدہ ہونا چاہئے ہمارا۔ ہندوؤں کے ساتھ رہ کے ہم توہم پرست ہوگئے ہیں۔"

"مگر مسجد میں اذان نہیں ہوا۔"

لڑکے نے کہا "ابا' میرا بات پورا نہیں سنا آپ۔ میں ادھر گیا تو میرے کو وہ لالہ دکاندار بولا کہ مولبی صاب پاکستان بھاگ گیا ہے۔ آج تو اذان بھی نہیں ہوا۔ پھر میں اذان دیا۔"

"کیا؟ تو اذان دیا" سیف اللہ نے تڑپ کر اٹھنے کی ناکام کوشش کی اور پھر اپنے ہاتھ پھیلادئے "خو ادھر آ بچہ ' بابا کا جان۔"

اس نے بیٹے کو سینے سے لگالیا۔ وہ حد درجہ جذباتی ہو رہا تھا۔ اس نے بیٹے کو چوما اور رونے لگا۔

"روتا کیوں ہے بابا؟" بچہ ڈر گیا۔

"یہ خوشی کا آنسو ہے بچہ۔ تو میرے کو سرخ رو کیا' تو اللہ کا گھر میں ازان دیا۔ آفرین۔ ہمارا استاد ہوتا تو تیرے کو اپنا خاص شاگرد بناتا۔"

"مولبی صاب پہلے بھی میرے کو ازان کا واسطے بولا" لڑکے نے خوش ہو کے انکشاف اور اعتراف کیا۔

"اور آفرین۔ مرحانا! تو سنا' تیرا بیٹا کیا بولتا۔ آگے بول' جب تو ازان دیا تو نماز کا واسطے آیا کوئی؟"

"ہاں۔ سب آیا۔ میں بھی نماز پڑھا۔ دس آدمی تھا۔"

"امامت کس نے کی؟" سیف اللہ بولا۔

"حاجی بابا نے۔ وہ ادھر تھا۔ میرے کو بولا بچہ' ابھی ہم ازان نہیں دے سکتا۔ اس کا آواز کیا ہوا بابا؟"

"اللہ نے لے لیا" سیف اللہ بولا اور پھر ہم سے مخاطب ہو گیا "کینسر ہو گیا تھا۔ گلے کا آپریشن ہوا۔ ابھی مشین کا مدد سے بولتا ہے۔ گلے پر مشین رکھتا ہے تو مشین سے آواز نکلتا ہے۔ قریب کا لوگ ہی سنتا ہے۔"

مرجان نے دوپہر کا کھانا بنانے میں رابعہ اور نازو کی مدد قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا اور اپنے اصرار سے انہیں مجبور کر دیا کہ وہ صرف مہمان بن کے آرام سے بیٹھ جائیں۔ وہ مہمان کو سر آنکھوں پر بٹھانے والے پٹھان تھے' جن کی نسلی روایات قید زمان و مکاں سے آزاد تھیں۔ وہ نہ وقت کے ساتھ انہیں چھوڑتے تھے اور نہ زمین کے رشتے ختم ہو جانے کے بعد۔ وہ اتنی خاموش طبع اور صابر و شاکر عورت تھی کہ بلا ضرورت کسی سے بات نہیں کرتی تھی لیکن سب کی سنتی تھی اور مسکراتی رہتی تھی۔ نہ سختیٔ حالات کا گلہ نہ اپنی پریشانیوں کا ذکر' نہ تقدیر سے شکوہ' نہ زمانے کے سلوک سے۔ نہ کسی کی غیبت' نہ برائی۔ اس سے کوئی بات پوچھی جاتی تھی تو وہ ہاں یا نا میں جواب دینے کی کوشش کرتی تھی ورنہ کم سے کم الفاظ میں۔

دوپہر کے کھانے سے فراغت پاتے ہی سب نے سو جانا بہتر سمجھا۔ نیند ایک ضرورت بھی تھی اور پناہ بھی۔ تفکرات اور خدشات کی اذیت اور انتظار کے کرب سے نجات پانے میں ذہن اور جسم کے لئے بہتری کے ہزار اسباب تھے۔ آنے والا وقت ناقابل اعتبار تھا۔ واپسی کے سفر سے پہلے اور سفر کے دوران حالات کس حد تک مخالف ہوں گے اور ان سے نبرد آزما ہونے کے لئے کتنے ذہنی سکون اور کتنی جسمانی توانائی کی ضرورت پڑے گی' یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔

میری آنکھ کاجل کی آواز پر کھلی۔ وہ زار و قطار رو رہی تھی اور سیف اللہ اس کو تسلی دے رہا تھا۔

میں گھبرا کے باہر آیا "کاجل! کیا ہوا؟"

اس نے میری طرف دیکھا اور بلا جھجک مجھ سے لپٹ کے رونے لگی۔ میں نے اسے بڑی مشکل سے الگ کیا اور اس کے دونوں شانوں کو تھام کے اسے جھنجوڑا۔

"اب کیا ہوگا سکندر؟" وہ روتے روتے بولی۔

میں نے سخت لہجے میں کہا "پہلے منہ سے تو کچھ کہو کہ ایسی کیا بات ہو گئی ہے؟ مجھے معلوم تو ہو۔"

سیف اللہ نے کہا "اس کا بابا گم ہو گیا ہے۔"

"گم ہو گیا ہے؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔

"ہاں۔ ان کا کچھ پتا نہیں" کاجل نے ہچکیوں کے درمیان کہا۔

"پتا چل جائے گا۔ اس میں رونے کی کیا بات ہے۔"

"وہ دوپہر سے پہلے گئے تھے اور ابھی تک نہیں لوٹے۔"

میں نے کہا "بھئی' وہ سیاست داں ہیں' ہزاروں ان سے ملنے گھر پر آتے ہیں تو سیکڑوں سے وہ خود ملنے جاتے ہوں گے۔ آج کل تو زیادہ ہی مصروف رہتے ہوں گے۔"

اس نے کہا "وہ بتا کے جاتے ہیں۔"

"کس کو بتا کے جاتے ہیں؟"

"مجھے' اپنے سیکریٹری کو' گھر کے کسی نوکر کو۔"

میں نے کہا "بعض اوقات اچانک جانا پڑتا ہے۔ موقع نہیں ملتا کسی سے بات کرنے کا بھی۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "بابا کہتے تھے' یہ بہت ضروری ہے کہ تم کو میرے بارے میں معلوم ہو کہ میں کہاں ہوں۔ اور خدانخواستہ میں واپس نہ آؤں تو تم معلوم کر سکو۔ ان کا پروگرام سیکریٹری کے پاس ہوتا تھا مگر انہیں اچانک کہیں جانا پڑتا تھا تب بھی وہ سیکریٹری سے کہتے تھے کہ یہ لکھ لو' مجھے کس نے کہاں بلایا ہے۔ عام طور پر سیکریٹری ان کے ساتھ جاتا تھا اور کار تو وہ کبھی خود نہیں چلاتے تھے۔"

اب نازو' رابعہ اور غالب بھی اٹھ کے آ گئے تھے اور میرے پیچھے کھڑے ہو گئے تھے۔ میں نے کاجل کو رابعہ کے حوالے کر دیا۔ "اسے آرام سے بٹھاؤ' پانی پلاؤ تاکہ اس کے حواس بحال ہوں" میں نے کہا۔

"تم نے ڈرائیور سے پوچھا؟" غالب بولا۔

"ڈرائیور تو گاڑی سمیت موجود ہے" وہ بولی۔

"پھر وہ کیسے گئے ہیں؟" نازو نے کہا۔

"یہی تو پتا نہیں چلتا۔ میں نے سب نوکروں سے پوچھ لیا۔ نوکر بھی کتنے ہیں' ایک شوفر' ایک مالی' ایک خانساماں اور اوپر کے کام کرنے والی شوفر کی بیوی۔ سب پرانے ملازم ہیں۔ کسی کو کچھ نہیں معلوم۔"

"سیکریٹری کیا کہتا ہے؟"

"اس کا کہنا ہے کہ مجھے چوہدری صاحب نے بھاشانی صاحب کے پاس پھول دے کر بھیجا تھا۔ ان کی طبیعت کچھ ناساز تھی۔ وہ واپس آیا تو بابا اپنے کمرے میں موجود نہیں تھے۔ ان کا آفس اور بیڈ روم ساتھ ساتھ ہیں۔ آفس میں ہر چیز اپنی جگہ موجود تھی۔ یوں جیسے وہ اٹھ کے باتھ روم گئے ہوں۔ جس بات نے مجھے پریشان کیا وہ ان کے چشمے کی موجودگی تھی۔ چشمہ وہ صرف سوتے وقت اتارتے تھے لیکن آفس میں ان کے سونے کا کیا سوال؟ سونا ہوتا تو وہ بیچ کا دروازہ کھول کے بیڈ روم میں چلے جاتے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے ذرا سی دیر کے لئے چشمہ اتار کے رکھا اور میز پر سر رکھ کے یا کرسی کی پشت سے سر لگا کے آنکھیں بند کی ہوں اور بس اتنی دیر میں کچھ ہو گیا ہو۔" وہ پھر رونے لگی۔

"حوصلہ رکھو کاجل۔ سوچو کیا ہو سکتا ہے۔"

"کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ چپکے سے کوئی اندر گھسا اور پھر انہیں اغوا کر لیا گیا۔"

"کیا یہ ممکن ہے...... میرا مطلب ہے' کیا اتنی بڑی واردات خاموشی سے ہو سکتی ہے؟ ایسے کہ گھر میں کسی کو بھی پتا نہ چلے؟" میں نے کہا "آخر کوئی چھپ چھپا کے اندر پہنچ بھی گیا تھا تو چوہدری صاحب کا اغوا اکیلے آدمی کا کام نہیں ہو سکتا۔ کم سے کم دو یا تین افراد مل کر ایسا کر سکتے تھے۔ فرض کرو پہلے شخص نے اچانک اندر جا کے انہیں بے ہوش کر دیا۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ کسی نے کلوروفارم میں بھیگا ہوا رومال ان کے منہ پر رکھ دیا....."

"مگر کاجل' اس کے بعد؟" میں نے کہا "انہیں وہ اٹھا کے کیسے لے گئے ہوں گے؟ ایک آدمی کھڑکی کے راستے داخل تو ہو سکتا ہے۔ کسی بھاری بھرکم آدمی کا بوجھ اٹھا کے کھڑکی کے راستے واپس جانا بہت مشکل ہے بلکہ ناممکن لیکن ایک لمحے کے لئے فرض کر لو کہ ایسا ہی ہوا' کیوں کہ انہیں دروازے سے باہر لے جایا جاتا تو گھر میں کوئی دیکھ لیتا۔ باہر تو پولیس کا پہرا ہے اور اب تو ملٹری موجود ہے۔"

"برا وقت آ جائے تو جن پہ تکیہ ہو وہی پتے ہوا دینے لگتے ہیں" کاجل نے کہا۔

"تم نے ان سے پوچھا؟"

"ہاں۔ انہیں بھی کچھ نہیں معلوم۔"

"وہ سب اپنی اپنی جگہ پر موجود رہے تھے؟"

"کوئی ہلا بھی نہیں۔ مجھے یہی بتایا انہوں نے۔ سب سے الگ الگ بات کی تھی میں نے۔ اگر انہوں نے دشمنی میں انکار کیا ہو تو اور بات ہے مگر سب جھوٹ نہیں بول سکتے۔"

میں نے کہا "یہ تو ماننے والی بات ہی نہیں کہ چوہدری صاحب گھر سے نکلے اور کسی پہریدار نے بھی نہیں دیکھا۔ وہ دیوار پھاند کے جاتے تب بھی معلوم ہو جاتا۔ گزرے تو وہ دروازے سے ہی ہوں گے۔ اپنی کار میں نہ سہی' کسی اور کی کار میں۔"

کاجل نے کہا "یہی تو الجھن والی بات ہے۔ سنتری صرف ان کاروں کو روکتا ہے جو اندر آتی ہیں۔ انٹر کام پر سیکریٹری کو بتاتا ہے' وہ بابا کو اطلاع دیتا ہے اور اجازت ملے تو کار اندر آتی ہے ورنہ سنتری وہیں سے واپس کر دیتا ہے کوئی جھوٹ بول کر۔ صاب میٹنگ میں ہیں' سو رہے ہیں' ان کی طبیعت خراب ہے۔ لیکن واپس جانے والی کار کو نہیں روکا جاتا۔"

"اس نے دیکھا تو ہوگا کہ آج کتنی گاڑیاں آئی تھیں اور ان میں کون کون تھا؟" غالب بولا۔

"دیکھا تھا مگر وہ کسی گاڑی کا نمبر اور ملاقاتی کا نام پتا کسی رجسٹر میں نہیں لکھتا" کاجل نے کہا "دو چار نام اسے یاد ہیں۔ یہ یاد ہے کہ وہ کس رنگ کی گاڑی میں آئے تھے۔"

"سیکریٹری کیا کہتا ہے؟"

"اس کے پاس دو درجن سے زیادہ افراد کے نام لکھے ہوئے ہیں کہ کون کتنے بجے آیا تھا۔ ان میں سے چند نام تو ایسے ہیں کہ ان پر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔"

"میرا خیال ہے کہ شبے کے بغیر تفتیش شروع ہی نہیں ہوتی۔ اور شبہے سے اپنے سائے کو بھی بالاتر نہیں سمجھنا چاہئے۔" غالب نے کہا۔

کاجل بولی "سیکریٹری سب کو فون کر چکا ہے۔ پولیس بھی آ گئی تھی اور ان کے نزدیک چند نام تصدیق طلب ہیں۔ یہاں سیکڑوں ادارے ہیں' ہر شخص نے کوئی انجمن یا تنظیم بنا رکھی ہے۔ بہبود گداگراں سے لے کر فلاح جیب تراشاں تک۔ سب فراڈ ہیں اور کھانے کے بہانے۔ ایسے بہت سے وفود یا کسی تنظیم کے ارکان بھی بابا سے ملنے آتے تھے جن کا وہ نام بھی نہیں جانتے تھے مگر وہ مل لیتے تھے۔ ایک کارڈ یا لیٹر ہیڈ چھپوا کر آدمی اعتبار حاصل کر لیتا ہے۔ نام پتے کی تصدیق فوراً کیسے ہو سکتی ہے۔"

"تمہارا خیال ہے کہ ایسے ہی کسی آدمی نے....."

"یہ میرا نہیں پولیس کا خیال ہے" کاجل نے میری بات کاٹ دی "کوئی ان سے ملنے آیا اور انہیں گن پوائنٹ پر لے گیا۔ وہ خاموش رہنے پر مجبور تھے۔ اگر سیکریٹری اپنے کمرے میں ہوتا تو اسے بھی خاموش کر دیا جاتا مگر انہیں معلوم تھا کہ اس وقت سیکریٹری موجود نہیں۔ وہ ان کو اپنی کار تک لے گئے اور پھر ناک آؤٹ کر کے نیچے ڈال دیا۔ گیٹ سے گزرتے وقت کار میں وہ کسی کو بھی نظر نہیں آتے۔ اب پولیس ان سب سے معلومات حاصل کر رہی ہے جن کا ریکارڈ ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ گمنام لوگوں کا بھی پتا چلا لیں گے۔"

"پھر ابھی سے رونا دھونا کیوں؟" غالب نے کہا۔

کاجل بولی "وہ مجھے تسلی دینے کے لئے ایسا کہہ رہے ہیں۔ سب کا سراغ لگانا ممکن ہی نہیں۔"

"کتنے گھنٹے ہو گئے ہیں انہیں گئے ہوئے؟" نازو نے کہا۔
"چھ' ساڑھے چھ گھنٹے۔"
"پھر تو ایسی پریشانی کی بات نہیں" نازو نے کہا۔
رابعہ نے کہا "تم نے اعلیٰ حکام سے بات کی تھی؟"
"اعلیٰ حکام؟" کاجل نے تلخی سے کہا "سیکریٹری سب کو بتا چکا ہے۔ ان سب کے پاس وہی کھوکھلے الفاظ ہیں' دوغلے پن سے بھرپور یقین دہانیاں ہیں کہ چوہدری صاحب کو کچھ نہیں ہو سکتا۔ وہ عوامی راہنما ہیں' اتنے مقبول ہیں۔ ان کا دشمن کوئی نہیں ہو سکتا' ہوا تو بچ نہیں سکتا۔ بکواس' محض بکواس۔"
رابعہ نے کہا "تمہارے اعصاب پر گزشتہ شب کے واقعات کا بھی دباؤ تھا اور آج اس میں مزید اضافہ ہوا اس لئے تم....."
"تمہارا مطلب ہے میں پاگل ہو گئی ہوں' سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو گئی ہوں؟" کاجل نے چلا کے کہا اور پھر رونا شروع کر دیا۔
"آئی ایم سوری کاجل! میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا" رابعہ نے کہا۔
"تم سب..... نہیں سمجھو گے" وہ سسکیاں لیتے ہوئے بولی "میں کسی جھوٹی تسلی! بے بنیاد بہلاوے اور خواہ مخواہ کی دلجوئی سے مطمئن نہیں ہو سکتی۔ خود میری عقل کے دلائل بھی وہی ہیں جو تمہارے۔ کہ مجھے تفتیش' تحقیق اور تصدیق کے نتائج کا انتظار کرنا چاہئے۔ مگر ایک بات جو میرا دل کہتا ہے' میری چھٹی حس بتاتی ہے' وہ ساری دلیلوں پر بھاری ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ کچھ ہوا ہے یا ہونے والا ہے۔"
ہم سب خاموش رہے۔ کسی کے پاس اب کہنے کو کچھ نہیں تھا۔
کاجل نے پھر آنسو صاف کئے اور بولی "مجھے..... اس طرح بات نہیں کرنی چاہئے تم سے۔ تم ہی تو اب میرے لئے سب کچھ ہو۔ میرا سہارا' میرے دوست' میرا خاندان۔ رابعہ باجی! میں پاگل ہوں' سارا زمانہ جانتا ہے۔ نہیں ہوں تو ہو جاؤں گی۔"
رابعہ نے اس کے سر کو کندھے سے لگا کے تھپکا "خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم واپس جاؤ گی تو بابا تمہیں گھر پر ملیں گے۔"
میں نے بہتر سمجھا کہ موضوع بدل دیا جائے "کاجل! وہ ڈرائیور ملا تمہیں؟ کوئی بات ہوئی اس سے؟"
"نہیں۔ ابھی تو نہیں ہوئی" وہ دل گرفتہ لہجے میں بولی "اس کے لئے مجھے اس کے گھر جانا ہو گا۔ آج رات۔ صبح وہ سب کچھ کرے گا۔"
میرے دل میں ایک پھانس سی چبھ گئی۔ وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہیں تھا' وہ کاجل کی نظروں نے اور اس کے لہجے نے بیان کر دی تھی۔ کیا میرے سوا کسی نے کچھ نہیں سمجھا تھا؟
یہ صرف میرے شکی مزاج میں پھیلی ہوئی بے اعتمادی کی دھند سے نمودار ہونے والا خیالی پیکر تھا۔ وہ رات کو کیوں جائے گی؟ اور اس کے گھر جانے کی ضرورت کیوں؟ کیا وہ خود نہیں آ سکتا؟ صبح وہ سب کچھ کرے گا۔ کیا اس لئے کہ اسے وہ سب مل جائے گا جو وہ چاہتا ہے۔ کاجل جیسی شعلہ ساماں شباب اور سیمابی حسن رکھنے والی لڑکی آخر کتنے دشمنوں کو دوستی کا خراج دے گی؟ نہیں۔ مجھے ایسا نہیں سوچنا چاہئے۔ اگر ایک بھارتی سورما نے اس کو رشوت میں حاصل کر لیا تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ کاجل اپنی ہر ضرورت کو اپنی ذات کی رشوت سے پورا کرتی ہے۔
"میں اب جاتی ہوں' صبح آؤں گی" اس نے کہا "ابھی صرف اس لئے آئی تھی کہ میرے نہ آنے سے تم پریشان ہو جاتے اور نہ جانے کیا کیا سوچتے۔ صبح تک کچھ مت کرنا۔ اس گھر سے باہر بھی مت نکلنا۔ خدا نے چاہا تو کل ہم ایک ساتھ نکلیں گے۔"
"گاڑی کا......"
"وہ بھی ہو جائے گا کل..... صبح....." اس نے جھنجلا کے کہا "جیسے الہ دین کے چراغ کا جن تھا نا' ایسے ہی میرے قبضے میں ایک جن ہے۔"
میں نے کہا "الہ دین کا چراغ تم خود ہو؟"
اس کا چہرہ بجھ گیا۔ اس نے بڑی زخمی اور شکایت کرنے والی' فریادی نظروں سے مجھے دیکھا۔ اس کی کاجل بھری آنکھوں نے تڑپ کے کہا۔ تم بھی ایسا کہتے ہو سکندر؟....... (YOUTOO BRUTUS) اور اس ایک نظر نے وہ راز فاش کر دیا جو شاید ابھی تک میرا گمان تھا یا آوارہ خیال تھا اور پردے کے پیچھے چھپے ہوئے چور کا سایہ تھا۔
کاجل ایک دم پلٹی اور باہر نکل گئی۔ کسی نے اسے کچھ بھی نہیں کہا تھا مگر وہ گھر سے اس عورت کی طرح گئی تھی جو چوری چھپے رات بھر باہر رہنے کے بعد مٹھی میں اپنی کمائی دبا کے گھر لوٹتی ہے۔ رابعہ' نازو اور غالب نے عملاً ایک دوسرے کی طرف دیکھنے سے گریز کیا ورنہ ہم سب مزید شرمندہ ہوتے۔
سیف اللہ نے رات کے کھانے کے بعد مجھے باہر بلایا۔ مرجان کی زبان اب کچھ کھل گئی تھی۔ وہ اندر نازو اور رابعہ سے باتیں کر رہی تھی۔ اپنے بچپن کی' جوانی کی' شادی کی' اپنے گھر کی اور گھر والوں کی۔ اس سادہ دل اور سادہ لوح عورت کو ان باتوں کے علاوہ کوئی بات کرنی نہیں آتی تھی۔ غالب کچھ دیر پہلے سیف اللہ کے بیٹے کو ساتھ لے کر مولوی صاحب کے بارے میں معلوم کرنے گیا تھا۔
"ہم کو تمہارا یار بولا' تم پٹھان ہے؟ تمہارا باپ وزیر خان تھا۔"
میں نے کہا "اگر سب خان پٹھان ہوتے ہیں تو پھر میں انکار نہیں کر سکتا۔ میرا اپنا نام پہلے کبیر خان تھا مگر اب میں ان چیزوں کا

قائل نہیں۔ میں پہلے مسلمان ہوں' پھر پاکستانی۔ انسان تو ہم سب ہیں۔"
وہ چپ ہو گیا "ہاں۔ تم ٹھیک بولا۔ ہمارا ایک کام کرے گا؟ ہم تمہارا احسان....."
"احسان کی بات کرو گے تو میں کوئی کام نہیں کروں گا۔ ویسے تمہارا حق بنتا ہے کہ تم مجھ سے جو کہو وہ میں مانوں" میں نے کہا۔
"پکا وعدہ۔ ابھی ہاتھ ملاؤ" سیف اللہ نے کہا "اپنا بات یاد رکھنا۔" میں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا مگر میں الجھن میں پڑ گیا تھا۔ سیف اللہ نے کسی عیار شکاری کی طرح مجھے میرے ہی الفاظ کے شکنجے میں کس لیا تھا۔
"تم بولا کہ میرا ہر بات مانے گا؟"
میں نے کہا "اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ تم کہو' مجھے گولی مار دو تو میں ریوالور نکال لوں گا۔"
وہ ہنسنے لگا "خوا ابھی ہم معذور ہے' پاگل نہیں ہوا ہے۔ ہم کو تمہارا مدد کا ضرورت ہے۔ بولو مدد کرے گا؟"
"مدد ضرور کروں گا' خواہ اس کے لئے مجھے جان بھی دینی پڑے۔"
"جان دینے کی ضرورت نہیں' بہت چھوٹا سا کام ہے" وہ بولا "اور تم کر سکتا ہے۔ صرف تم اور تمہارا دوست لوگ۔"
میں نے کہا "کام بتاؤ سیف اللہ۔"
اس نے کہا "تمہارا بیوی بچہ کو لے جاؤ اپنا ساتھ۔ واپس پاکستان۔"
"کیا؟" میں نے کہا "اور تم......"
"میرا بات چھوڑو۔ ابھی جو میں بولا......"
میں نے کہا "یہ کیسے ہو سکتا ہے سیف اللہ؟"
"آہستہ بولو۔ تم زبان دیا ہے' مردوں والا وعدہ کیا ہے کہ میرا بات مانے گا' میرا مدد کرے گا" سیف اللہ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔
"اس حالت میں تم کیسے جا سکتے ہو؟"
"میں اپنا نہیں بولا۔ مرجان کا اور اپنا بیٹا کا بات کیا۔ ادھر ہم رہ سکتا ہے۔ وہ نہیں رہ سکتا۔"
"تم بھی اکیلے کیسے رہ سکتے ہو؟" میں نے کہا۔
"اس کا فکر تم مت کرو۔ ہم تم کو مدد کا واسطے بولا ہے۔ یہ کام تمہارا واسطے مشکل نہیں ہے" سیف اللہ نے سرگوشی کی۔
"سیف اللہ! کیا مرجان مان جائے گی؟ کہ اسی حالت میں تمہیں یہاں چھوڑ دے اور اپنے بچے کے ساتھ ماں باپ کے گھر چلی جائے۔ اگر تم ایسا سمجھتے ہو اسے تو واقعی پاگل ہو گئے ہو۔ وہ تمہارے ساتھ مر جائے گی مگر تمہارا ساتھ نہیں چھوڑے گی۔ یہ مشرق کی ریت ہے' ہماری روایت ہے۔"
"اس کو ہم راضی کرے گا۔"
"اس کا راضی ہونا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا سورج کا مغرب سے

نکلنا۔"
"خود دیکھو یارا! ہم تھوڑا سا جھوٹ بولے گا۔ ایسا جھوٹ اللہ معاف کرتا ہے جو زندگی بچانے کا واسطے بولا جائے۔"
"کیا جھوٹ بولو گے تم؟" میں نے پریشان ہو کے کہا۔
"ہم بولے گا کہ تم سکندر خان کا ساتھ جاؤ۔ گاڑی میں۔ ہم تو اس میں نہیں جا سکتا مگر ہمارا بندوبست بھی ہو گیا ہے۔ ہم کو ایک ٹرک والا لے جائے گا۔ چارپائی کا ساتھ اٹھا کے ٹرک میں ڈالے گا۔"
"لیکن اس کے بعد یہ ہو گا کہ تم اکیلے پڑے رہو گے۔ اپنی جگہ سے اٹھ کے تم ایک قدم بھی چلو تو تمہیں بیساکھی کا سہارا کافی نہیں ہوتا۔ تمہاری دوسری بیساکھی مرجان ہے۔ وہ تمہیں سنبھالتی ہے' کھلاتی' پلاتی ہے' صاف ستھرا رکھتی ہے۔ اس کے چلے جانے کے بعد تم بھوکے پیاسے پڑے رہو گے۔ تمہیں پوچھنے والا کوئی نہیں ہو گا۔ تم گر گئے تو اٹھانے والا نہیں ہو گا۔ نہیں سیف اللہ' میں یہ نہیں کر سکتا۔ مجھے وعدہ شکن اور جھوٹا کہلانا منظور ہے۔ تم مجھے احسان فراموش کہو یا کچھ اور میں برا نہیں مانوں گا۔"
اس نے بے بسی سے کہا "خو یارا' تم وعدہ کیا تھا مدد کا۔"
"یہ مدد نہیں ظلم ہے۔ میں نے ظلم کرنے کا وعدہ نہیں کیا تھا" میں نے اٹھتے ہوئے کہا "میں تم کو یہاں کسمپرسی کے عالم میں مرتا ہوا چھوڑنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ ہاں' میں کوشش کروں گا کہ تم سب کے لئے واقعی کسی ٹرک کا بندوبست ہو جائے مگر یہ وعدہ نہیں ہے۔"
"خو ایک بات سنو۔ بیٹھو" وہ بولا۔
میں پھر بیٹھ گیا "کوئی اور بات ہے تو کہو۔"
"دیکھو یارا' مرجان کو چھوڑو ادھر۔ کلیم اللہ کو لے جاؤ۔ اس کا لئے جگہ ہو گا تمہارا گاڑی میں۔ اس کو بچالو ان ظالموں سے۔"
میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا "کیا مرجان مان جائے گی؟"
"مرجان کو ہم راضی کرے گا۔"
میں نے سر ہلا کے کہا "یہ بہت بڑی آزمائش ہے میرے لئے سیف اللہ۔ بہت مشکل کام ہے۔ اتنی بڑی ذمے داری کا بوجھ مت ڈالو مجھ پر۔"
"وہ تو چھوٹا لڑکا ہے سکندر خان۔ تم اٹھا سکتا ہے اس کو۔ اس کا باپ کو بھی اٹھا سکتا ہے تم" سیف اللہ مسکرانے لگا۔
میں نے کہا "مجھے سوچنے دو' اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرنے دو اور تم بھی مرجان سے بات کر لو۔ وہ بھی کہے گی تو میں کلیم اللہ کو لے جاؤں گا۔"
"ابھی پھر وعدہ کرتا ہے! اچھا کہ پکا؟"
میں نے کہا "نہیں' یہ پکا وعدہ ہے۔ صبح بتا دینا کہ مرجان کیا کہتی ہے۔ بلکہ میں خود پوچھوں گا اس سے۔ یہ بھی بتا دینا کہ کلیم

اللہ کو کہاں لے جانا ہوگا اور کس کے حوالے کرنا ہوگا۔"
"بڑا مہربانی" اس نے میرا ہاتھ دبایا "ہم تمہارا احسان نہیں بھولے گا۔"
میں نے بگڑ کے کہا "پھر وہی احسان کی بات! کیا میں غیر ہوں؟"
وہ ہنسنے لگا۔ عجیب کھوکھلی، ویران اور نوحہ خواں ہنسی تھی اس کی "اچھا یارا، ابھی تم اس کا چاچا ہے، ہمارا بھائی ہے۔ ٹھیک؟"
"ٹھیک" میں نے کہا "لیکن سیف اللہ، تم بھی ایک وعدہ کرو کہ مرجان سے زبردستی کچھ نہیں منواؤ گے۔"
"زبردستی۔ توبہ یارا۔ کیا ہم اس کو مارے گا؟"
میں نے کہا "نہیں۔ زبردستی زبان سے بھی ہوتی ہے۔ مثلاً تم اسے اپنی قسم دے دو تو وہ کیا کرے گی۔"
"وہ بھی جانتی ہے سکندر خان، ہم ادھر محفوظ نہیں ہے اور ابھی تو معذور آدمی ہے۔ اپنا حفاظت نہیں کر سکتا تو بیوی بچہ لوگ کو کیسے بچائے گا۔ اللہ اس کو زندگی دے۔ ہمارا کیا ہے، قسمت میں ہوگا تو پھر ملے گا۔۔۔ اپنے گھر، اپنے خاندان سے۔"
میں نے کہا "تم تو سب کو چھوڑ آئے تھے۔"
"ایسے چھوڑنے سے کیا ہوتا ہے۔ یہ خون کا رشتہ کبھی نہیں ٹوٹ سکتا۔ ابھی ہمارا وہ چاچا بھی نہیں ہے۔ اس کا کوئی اولاد نہیں تھا۔ سارا زمین ہمارا بسن کو ملا۔ وہ بولتا ہے بھائی ادھر آؤ، اپنا حصہ لو۔ خو حصہ ہم کیا کرے گا یارا۔ یہ کافی ہے کہ اپنا لوگ بلاتا ہے۔ اپنا ادھر کون تھا۔" وہ سخت جذباتی ہو رہا تھا۔
غالب کچھ دیر بعد آگیا۔ مولوی صاحب کا ابھی تک کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ اچانک کہاں چلے گئے۔ رات کو کھانے سے فراغت پاتے ہی رابعہ اور نازو نے مرجان کو اپنے تجربات سنانے شروع کئے تو وہ ان کی آپ بیتی کو ایسے سنتی رہی جیسے یہ جن بھوت چڑیلوں اور پریوں کی الف لیلوی داستان ہے۔
میں نے اور غالب نے صحن میں سیف اللہ کی چارپائی کے ساتھ ہی بستر بچھالیا۔ رات گئے تک وہ اپنے گاؤں، آباؤ اجداد، ان کی رقابتوں اور روایتوں، محبتوں اور نفرتوں کے قصے سناتا رہا۔ اچانک وہ جو اپنوں سے خون کے سب رشتوں کو توڑ کے آگیا تھا، اپنی عمرِ گزشتہ کی کتاب کا ہر ورق پلٹتے ہوئے ماضی کی جانب لوٹ گیا تھا۔ اس کی حالت بالکل اس شخص جیسی تھی جو زندگی کی آخری سرحد پر پلٹ کر دیکھے تو آرزو کے سراب کا شکار ہو جائے اور خواہشات کے طلسم کا اسیر ہو کے گزری ہوئی زندگی کی تمنا کرنے لگے کہ ایک بار اور، صرف ایک بار پھر وہ سحر و شام لوٹ آئیں، وہ لوگ مل جائیں جو بچھڑ گئے تھے۔ پرانی خوشی کے جذبے اور سنسنی خیزی سے بھرپور لمحے پھر اپنے نئے پن کا احساس جگانے آجائیں۔ ایک زندگی اور مل جائے تو نا تمام حسرتیں پوری ہوں۔ وہ سب نہ ہو جو ندامتوں کا قرض بنا۔ ایک زندگی کا تجربہ دوسری بار بہتر طور پر جینے کے کام آتا ہے۔
لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ تقدیر کی نارسائی سے ہی تدبیر کی کامیابی کا غرور ملتا ہے۔ نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیسا۔ میں سیف اللہ کی ذہنی کیفیت کو سمجھ رہا تھا اور میرا دل غم کے احساس سے بوجھل تھا کیوں کہ اس کی یادوں میں محرومی کا دکھ تھا، امید کی روشنی نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ واپسی ممکن نہیں رہی۔ کلیم اللہ کو وہ آنے والے کل کے لئے اپنے سفیر کے طور پر بھیج رہا تھا کہ وہ سب جو اسے بھول چکے تھے، اس کے بیٹے کو باپ کے حوالے سے جانیں اور کہیں کہ وہ ہے سیف اللہ کا بیٹا۔ بالکل اپنے باپ پر گیا ہے نا۔ ہو بہو سیف اللہ کی تصویر ہے۔
نہ جانے کب سیف اللہ خاموش ہوا۔ میں اس کی باتیں سنتے سنتے اپنے خیالوں کی دنیا میں پرواز کرنے لگتا تھا، گل اور محسن کے ساتھ۔ کیا ان کا جہاز لاہور کے ہوائے اڈے پر اتر گیا ہوگا؟ کراچی سے ان کو لاہور کی فلائٹ مل گئی ہوگی؟ اس وقت وہ کہاں ہوں گے؟ منظر کے گھر میں یا کراچی میں اکرام شیخ کے ساتھ اس کی ٹیکسی میں پھر رہے ہوں گے؟ اسے وہ سب بتا رہے ہوں گے جو ہم سب پر بیتی۔
اچانک غالب نے کہا "یار، ہم نے محسن سے وعدہ کیا تھا کہ اسے منظر کے گھر فون کریں گے۔"
"بھولا تو میں بھی نہیں ہوں یار مگر مسئلہ یہ ہے کہ فون کہاں سے کریں اور کیسے کریں؟"
"ہاں اس کے لئے باہر جانا پڑے گا۔"
"بہت دور جانا پڑے گا" میں نے کہا "اور کوئی ایسا فون تلاش کرنا پڑے گا جس کا مالک ہمیں غیر بنگالی سمجھنے کے باوجود فون کرنے کی اجازت دے دے اور وہ بھی کراچی۔"
"ہم انگریزی میں بات کر سکتے ہیں۔"
"لہجے کو پھر بھی نہیں چھپا سکتے۔ بنگالی اور طرح سے انگریزی بولتے ہیں۔ جیسے مدراسی، پٹھان یا کوئی اور زبان بولنے والے۔"
غالب نے کہا "اس سے یہ تو معلوم ہو جاتا کہ وہ خیر و عافیت کے ساتھ منزل پر پہنچ گئے ہیں۔"
میں نے کہا "منزل! منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی۔ جب سفر آغاز کیا تھا تو منزل کا مفہوم کچھ اور تھا۔ آج منزل کا مطلب ہے مقام آغازِ سفر۔"
"پس ثابت ہوا کہ مسافر، راستے، منزلیں سب وقت کے ساتھ بدل جانے والی چیزیں ہیں" غالب نے کہا۔
"گردشِ رنگِ چمن ہے ماہ و سالِ عندلیب۔"
غالب نے کہا "یہ میں نے فرمایا تھا۔ میں کبھی غلط نہیں فرماتا۔"
میں نے کہا "مرزا غالب کی طرح صبح تک تمہارا بھی بس نام رہ جائے گا۔ سردی کا یہی حال رہا تو پہلے تمہیں ڈبل نمونیہ ہوگا پھر ڈبل

کا ڈبل۔"
"میں خود کو ایک بہت بڑی قلفی کی طرح جمتا ہوا محسوس کر رہا ہوں۔ کچھ دیر میں دانت بجنے لگیں گے، پھر کوچ کا نقارہ بجے گا۔"
"ایسے تو مجھے نیند نہیں آئے گی، آئی تو ہمیشہ کی نیند ہوگی۔ اس کا کوئی علاج ضروری ہے۔"
غالب نے کہا "سیف اللہ کو دیکھئے اور قوت ارادی کو بطور کمبل استعمال کیجئے۔ ایمان کی حرارت سے کام چلائیے یا فرض کر لیجئے کہ جون کا مہینہ ہے۔"
میں نے مایوسی سے بند کمرے کی طرف دیکھا۔ "کتنی بے مروّت ہیں یہ لڑکیاں بھی۔ دروازے بند کر کے سوگئی ہیں مزے سے۔"
غالب نے کہا "ایک تجویز ہے۔"
"پیش کرنے میں کوئی حرج نہیں۔"
غالب نے کہا "کائنات کے اسرار و رموز اور سائنسی نظریات پر غور فرمانے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ چارپائی کو دو طرح سے استعمال کیا جا سکتا ہے۔"
"پیدا ہونے کے لئے اور مرنے کے لئے۔"
"نہیں۔ ایک آدمی اس کے اوپر سو رہا ہو تو دو نیچے بھی سو سکتے ہیں۔" غالب نے کہا "چاروں طرف چادر لٹک رہی ہے۔ براہ راست ہوا اور خنکی سے کچھ بچاؤ ہو جائے گا۔"
میں نے کہا "مرزا، میں شرمندہ ہوں۔ میں تمہاری ذہنی سطح کے بارے میں بہت غلط رائے رکھتا تھا۔"
چارپائی تین فٹ، چھ فٹ کے مدفن کی طرح تھی جس کے نیچے ہم مردوں کی طرح سیدھے لیٹنے پر مجبور تھے مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ نسبتاً باہر کے مقابلے میں کم سردی تھی۔
کچھ دیر بعد غالب نے کہا "یار، محسن اور گل نے ہمارے فون کا انتظار کیا ہوگا۔ بلکہ کر رہے ہوں گے۔"
"کرنے دو۔ یہ اس سے بہتر ہے کہ ہم فون کرنے جائیں اور خون ہو جائے ہمارا۔ پھر وہ ساری عمر انتظار کرتے رہیں۔" میں نے چادر سے ہاتھ باہر نکال کے جوتا اٹھایا "یہ لو۔"
"کیا کروں اس کا؟" غالب نے بے خیالی میں جوتا پکڑ لیا۔
"کھاؤ۔ تمہارا منہ ایسے ہی بند ہوگا۔ میں سونا چاہتا ہوں۔"
غالب نے آہ بھری "جوتے کھا کے ہی سونا ہے ہمارے نصیب میں۔ نہ جانے وہ دن کب آئے گا جب خوشبوؤں سے مہکتی خواب گاہ میں۔۔۔۔"
میں نے کہا "کٹ۔ اس کے بعد کا سین سنسر۔ میں خواب میں دیکھ لوں گا۔"
علی الصبح سیف اللہ نے شور مچا دیا "مرجانا، او مرجانا، دیکھ کوئی ہمارا مہمانوں کو اٹھا کر لے گیا۔"
مرجان۔ نے جائے واردات کا معائنہ کیا اور عادتاً کہا "ہاں۔"
میں نے چادر اٹھا کے سر نکالا اور کہا "السلام علیکم۔"
غالب بھول گیا کہ وہ چارپائی کے نیچے ہے۔ اس نے ہڑبڑا کے اٹھنے کی کوشش کی تو اس کا سر پٹی سے لگا۔ سیف اللہ اور ہنسنے لگا۔ پھر اپنی بیوی پر خفا ہونے لگا کہ اس نے سردی کا خیال کرتے ہوئے ہمیں دو کمبل کیوں نہیں دئے تھے۔ جب بیوی نے خاموش نظروں سے اسے یاد دلایا کہ گھر میں یہی ایک کمبل بچا تھا تو وہ چپ ہو گیا۔
سیف اللہ سارا دن لیٹا رہتا تھا اور جلد سو جانے کا عادی تھا۔ وہ منہ اندھیرے اٹھ گیا تھا۔ ہم بہت دیر سے سوئے تھے مگر مرجان نے گرم سبز چائے پیش کی تو ہماری آنکھوں سے نیند کا خمار غائب ہو گیا۔ میں نے صبحِ وطن کا تصور کیا اور ان بے شمار صبحوں کا جو مسافرت کی مختلف منزلوں میں آئیں۔ یہ ایک اور صبح تھی جو اپنا الگ انداز رکھتی تھی۔ شاید یہ نوید سفر دینے والی صبح تھی۔ اپنے ہی وطن میں ہم پر تنگ ہو جانے والی زمین کی آخری صبح تھی۔ ہجر کے موسم کی الوداعی صبح تھی۔ اگلی صبح کہاں ملے گی اور اس کے بعد کتنی صبحوں کی مسافت ہوگی، صبحِ وطن کی وید تک۔
دروازے پر دستک سن کے میں نے خالی گلاس نیچے رکھ دیا۔
"کون آگیا اتنی صبح؟" سیف اللہ نے قدرے پریشانی سے کہا۔
"میں دیکھتا ہوں" غالب بولا۔
اس نے ایک ہاتھ اپنی جیب میں رکھا اور کُنڈی کھول کے پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے بالکل پیچھے میں آنے والوں کا استقبال کرنے کے لئے تیار تھا اور آنے والا غلط عزائم کے ساتھ آتا تو اسے صبح کا سورج دیکھنا نصیب نہ ہوتا لیکن وہ ایک مظلوم صورت، ہکا بکا قسم کا نوجوان تھا جو بعد میں مخبوط الحواس بھی ثابت ہوا۔ اس کا جسم بہت بڑا تھا اور دماغ بہت چھوٹا۔
اس نے دانت نکال کے کہا "ہم کو مس کاجل نے بھیجا ہے۔ ہمارا نام تو سہد ہے مگر وہ ہمیں سوسا کہتی ہیں۔"
"سوسا یا سرمہ؟" غالب نے اس کی آنکھوں میں پائی جانے والی سرمے کی کثیر تعداد پر غور کر کے کہا۔
"آپ کی تشریف آوری کا مقصد؟" میں نے کہا۔
"ہم سے مس کاجل نے کہا کہ سوسا! ہمارا ایک کام کرو گے؟ ہم نے کہا کہ ہم تو غلام ہیں آپ کے۔"
"وہ خود کہاں ہیں؟"
"کون؟ مس کاجل؟" وہ دھوتی کا کونا اٹھا کے ناک صاف کرنے لگا "ہم ان کے ساتھ تھے رات بارہ بجے تک۔ ایک عینک والا گنجا اور بانس کی طرح پتلا آدمی تھا، اس سے ملنے گئے تھے۔ پتا نہیں وہ کون تھا۔ اکیلا تھا اتنی بڑی کوٹھی میں۔ ہم نے تو آسانی سے اس کا گلا بھی گھونٹ دیا۔"
میں اچھل پڑا "کیا! گلا گھونٹ دیا؟ مار دیا اسے؟"
"ہم نے بس گلا دبایا تھا، وہ خود ہی مر گیا" سوسا نے یوں کہا

جیسے یہ کسی کو قتل کرنے کی بات نہیں' کسی معمولی واقعے کا تذکرہ ہے۔

"سوریا!" میں نے کہا "یہاں بیٹھو آرام سے' تم نشے میں تو نہیں ہو؟"

اس نے سادگی سے کہا "ہم نشہ کرتے ہیں۔ بیڑی پیتے ہیں۔ بیڑی ہوگی آپ کے پاس؟"

میں نے اسے ایک سگریٹ دی "ذرا پھر بتاؤ' تم کہاں گئے تھے مس کاجل کے ساتھ؟ کس کے گھر؟ پھر کیا ہوا تھا؟"

اس نے وہی سب دہرادیا "ہم کو مس کاجل لے گئی تھیں۔ ہم یہ نہیں جانتے وہ کون تھا۔ ہم تو پہلے کبھی اس کے گھر بھی نہیں گئے تھے۔"

"پھر تم نے کیوں قتل کردیا اسے؟" غالب نے جھنجلا کے کہا "یار' تم آخر چیز کیا ہو' خود تو پاگل ہو' ہمیں بھی کردو گے۔"

"یار' ایسے بات مت کرو اس سے۔ یہ چھ فٹ قد کا آدمی ذہنی طور پر بچہ ہے۔ اور پسماندہ ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ کاجل نے اس کو کسی خاص مقصد کے لئے استعمال کیا تھا" میں نے غالب کو ایک طرف لے جا کے کہا۔

"اچھا تم ہی پوچھو اس سے جو پوچھنا ہے۔"

میں نے کہا "سوریا! تم کیسے جانتے ہو مس کاجل کو؟"

اس نے سوال پر غور کیا "ہم..... بس جانتے ہیں۔ ان کے گھر میں ہی رہتے ہیں ہم۔"

"اچھا مس کاجل نے کہا کہ اس آدمی کو ماردو؟"

اس نے اقرار میں سرہلایا "جب وہ اندر گیا تو مس کاجل نے ہم سے کہا کہ سوریا' جب یہ دوبارہ آئے تو اس کی گردن پکڑ لینا اور خوب دبانا۔ اتنے بڑے بڑے ہاتھ ہیں ہمارے۔ یہ دیکھو" اس نے اپنے پنجے پھیلا کے فخر سے کہا۔

"واقعی۔ بہت طاقت ور بھی ہو تم۔"

وہ خوش ہو کے دانت نکالنے لگا "اس کی گردن بہت پتلی تھی' ہم نے آسانی سے دبالی۔ مس کاجل نے کہا شاباش۔ چھوڑنا نہیں ابھی' جب تک میں نے کہوں ہم تو ساری رات نہ چھوڑتے۔ وہ ٹانگیں چلاتا رہا' پھر مرگیا تو ہم نے مس کاجل کے حکم پر اسے چھوڑ دیا۔"

"اس کے بعد؟" میں اور غالب دم بخود بیٹھے رہے۔

"اس کے بعد؟" وہ سوچ کے بولا "ہم کو مس کاجل نے باغ میں ایک جگہ دکھائی۔"

"کون سے باغ میں؟"

"اسی گھر کے پیچھے چھوٹا سا باغ تھا۔ اس میں ایک اُلو بھی تھا۔" وہ ہنسنے لگا "مس کاجل نے ہمیں کدال اور بیلچہ دیا اور کہا سوریا' یہاں گڑھا کھودو اور اس لاش کو دبا کے مٹی برابر کردو۔ کرلوگے یہ کام؟ ہم نے کہا یہ کون سا مشکل کام ہے۔ پھر وہ چلی گئیں۔"

"چلی گئیں۔ کہاں چلی گئیں؟"

"ہمیں کیا معلوم" وہ بولا "ہم تو اپنا کام کرتے رہے۔ ہم نے گہرا گڑھا کھودا' پھر اس عینک والے گنجے کو اٹھا کے لائے اور اس میں ڈال کے مٹی برابر کی۔ پھر ہم وہیں بیٹھے رہے۔"

"کیوں؟ پولیس کا انتظار کرتے رہے" غالب بولا۔

میں نے اسے گھور کے دیکھا "تم کو مس کاجل کہہ گئی ہوں گی کہ ہماری واپسی کا انتظار کرنا۔"

"ہاں۔ یہی کہا تھا انہوں نے۔ ہم پولیس کا نہیں مس کاجل کا انتظار کررہے تھے" وہ بولا۔

"پھر وہ کب آئیں؟"

"وہ نہیں آئیں" سوریا نے اداسی سے کہا "انہوں نے کسی اور کو بھیج دیا۔"

"کسی اور کو؟ کون تھا وہ؟"

"ہم نہیں جانتے۔ بس اس نے آکے پوچھا سوریا' کام ختم ہوگیا؟ ہم نے کہا کہ ہوگیا مگر مس کاجل کیوں نہیں آئیں؟ اس نے کہا کہ انہوں نے بلایا ہے تمہیں۔ آؤ چلو میرے ساتھ۔ ہم اس کے ساتھ کار میں بیٹھ کے آگئے۔ مس کاجل کہاں ہیں؟"

"مس کاجل؟" میں نے گڑبڑا کے کہا "کیا اس نے کہا تھا کہ وہ یہاں ملیں گی۔"

"ہاں۔ اس نے بتایا تھا کہ اس گھر میں چلے جاؤ۔"

"وہ خود کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

سوریا نے کہا "ادھر۔ گلی ختم ہوتی ہے وہاں کار میں بیٹھا ہے۔"

"اُلو کا پٹھا" غالب نے دانت پیس کے کہا "پہلے نہیں بتا سکتا تھا یہ بات۔"

اس کا کوئی قصور نہیں۔ تم اسے روکو' میں دیکھ کر آتا ہوں۔ میں نے انگریزی میں کہا۔

"یار' میں اس گوریلے کو کیسے روکوں گا؟"

"اسے کہو کہ مس کاجل ابھی آتی ہیں۔" میں نے کہا اور خود باہر نکل گیا۔ سوریا ذہنی طور پر فاترالعقل تھا اور اس کی باتوں نے مجھے پریشان کردیا تھا۔ وہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا بلکہ کچھ زیادہ ہی سچ بول رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس بچے کو کاجل نے ایک آدمی کی جان لینے اور اسے زمین میں دفن کرنے کے لئے کیوں استعمال کیا تھا؟ وہ آدمی کون تھا اور جو سوریا کو یہاں لایا ہے وہ کون ہے؟

ان سوالات کا جواب ایک سیاہ رُو' چیچک سے داغدار چہرے اور لمبی مونچھوں والا کریہہ صورت شخص تھا' جو غیر ملکی ساخت کی کار میں شیشے چڑھائے بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کے اس نے شیشہ اتارا اور منہ باہر نکال کے پان کی پچکاری ماری۔

"اے بابو! ادھر آؤ" اس نے بدتمیزی سے کہا "اتنی دیر سے آیا ہے تم۔"

میں نے قریب جا کے کہا "تم نے مجھ سے کہا ہے کچھ؟"

"اور کیا دیوار سے باتیں کررہا ہوں؟" وہ بولا۔

میں نے دروازہ کھول کے اسے باہر کھینچ لیا "پہلی بات تو یہ ہے کہ مجھے دوبارہ بابو مت کہنا۔ بابو ایک گالی ہے میرے لئے۔ انگریزوں نے جو غلام ابن غلام کلرک زادے بنائے تھے' وہ بابو تھے۔ میں ایک عزت دار آزاد شہری ہوں۔ دوسری بات یہ کہ میں بدتمیزی پسند نہیں کرتا۔"

اس نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑالیا "بڑی گرم چیز ہے تم یار۔"

میں نے کہا "تم بھی بہت بگڑے ہوئے ہو۔ بہت کچھ سکھانا پڑے گا تمہیں۔ ابھی تو بات کرنی بھی نہیں آتی تمہیں۔"

اس نے کہا "تم کو میرے ساتھ چلنا ہے۔ ابھی۔ میں نے اس پاگل کے بچے کو بھیجا تھا کہ فوراً تم کو بلالائے۔ وہ بیٹھ گیا ہوگا اپنی کتھا سنانے۔"

"تم کو کاجل نے بھیجا ہے؟"

وہ بے شرمی سے مسکرایا اور آنکھ مار کے بولا "کوئی اعتراض؟"

میں نے غصے کو پی کر کہا "اعتراض نہیں' ثبوت۔ کیا ثبوت ہے کہ تم کو کاجل نے بھیجا ہے؟"

"ثبوت کاجل سے پوچھنا یا اس سوریا سے پوچھو۔ فالتو باتیں مجھے پسند نہیں ہیں۔ چلنا ہے تو چلو میرے ساتھ ورنہ میں واپس جا کے اسے بتادوں گا کہ تم نے ساتھ آنے سے انکار کردیا۔"

"خود کاجل کہاں ہے؟"

"کاجل!" وہ ہونٹوں پر زبان پھیر کے بولا "میرے گھر میں۔ تمہارا انتظار کررہی ہے۔ جلدی کرو۔ ورنہ نکلنا مشکل ہوجائے گا۔"

میں نے کار پر اور اس کی نمبر پلیٹ پر ایک نگاہ ڈالی "یہ گاڑی کس کی لائے ہو؟"

"میں اب کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔ تم کیا تھانیدار ہو کہ مجھ سے تفتیش کررہے ہو؟ جو پوچھنا ہے کاجل سے پوچھنا؟ بلاؤ سب کو۔ بس اس سوریا کو چھوڑدو۔"

میں پلٹتے پلٹتے رک گیا "کیا؟ اس کو یہاں چھوڑدوں؟"

"میں نے بنگالی تو نہیں بولی۔ سوریا نہیں جاسکتا ہمارے ساتھ۔ نہ گاڑی میں جگہ ہے اور نہ کوئی عقلمندی ہے اس کو لے جانے میں" وہ بولا۔

"ہاں۔ اس پاگل کو عقل مندوں نے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرلیا۔ اب وہ بے مصرف ہوگیا ہے۔ چلے ہوئے کارتوس کی طرح۔ میں اسے چھوڑ کے نہیں جاسکتا۔"

"تو پھر تم خود رک جاؤ" وہ بولا "بعد میں آجانا۔"

میں طے کرچکا تھا کہ اپنے غصے کو قابو میں رکھوں گا چنانچہ میں اس حد درجہ بیہودہ اور بدزبان شخص کی ساری بداخلاقی برداشت کررہا تھا۔ میں ابھی تک سوریا' کاجل اور اس تیسرے شخص کے رشتے کی نوعیت کو سمجھنے سے قاصر تھا اور الجھن سے بچنے کا آسان طریقہ یہی تھا کہ وضاحت کاجل سے مانگی جائے مگر اس سے پہلے مجھے اس خطرناک شخص کے ساتھ جانے یا نہ جانے کا فیصلہ کرنا تھا۔ میں نے رابعہ اور نازو کو تیار ہونے کا حکم دیا اور ایک طرف لے جا کر غالب کو کم سے کم الفاظ میں ساری صورت حال سمجھانے کی کوشش کی "میرا خیال ہے کہ کاجل نے اپنے آپ کو داؤ پر لگا کے یہ بازی کھیلی ہے۔ اس نے سوریا سے کسی کو قتل کرا کے جرم کا نشان بھی مٹوادیا۔ سوریا کے بیان کے مطابق وہ کوٹھی میں اکیلا تھا۔ کسی نے یہ جرم سرزد ہوتے نہیں دیکھا اور یوں سوریا بچ گیا۔ اگر کوئی دیکھ لیتا تو سوریا ہی پکڑا جاتا۔ کاجل صاف بچ جاتی کیوں کہ وہ کہیں اور چلی گئی تھی۔"

"کہیں اور کہاں؟"

"غالباً اس خبیث کے پاس۔ مجھے شبہ ہے کہ اس کے اور کاجل کے درمیان ایک غیر قانونی اور غیر اخلاقی سودا ہوا' جس کی رو سے یہ طے پایا کہ یہ شخص ہمیں سرحد پار کرائے گا اور ہمارے لئے سب کچھ کرے گا۔" میں نے کہا "اس کی خدمات مشروط تھیں اور کاجل کو شرائط کا علم تھا۔"

"چناں چہ اس کی خدمات کے بدلے میں کاجل نے وہ سب کچھ کیا جو اس نے چاہا" غالب نے تلخی سے کہا۔

"ہاں۔ یہ سودا غالباً ایسے ہی ہوا۔ اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے۔"

"یہ کاجل نے اچھا نہیں کیا۔"

"اچھا کیا ہے اور برا کیا' اس کا فیصلہ کرنے والے ہم کون ہوتے ہیں" میں نے کہا "یہ کاجل کا ذاتی فعل تھا' جس کے لئے ہم نے اسے مجبور نہیں کیا تھا۔ اگر ہمیں معلوم بھی ہوجاتا کہ حصول مقصد کے لئے کاجل یہ طریقہ اختیار کرے گی تو ہم اسے منع کردیتے۔"

"ایسی آزادی پر ہم اسیری کو ترجیح دیتے۔"

"یہ ڈائیلاگ اب بے کار ہیں۔" میں نے کہا "اب اہم انکار بھی نہیں کرسکتے ورنہ کاجل کی قربانی اور اس کی تمام جدوجہد رائیگاں جائے گی۔"

"کاجل نے سوریا سے قتل کرایا۔ ایک معصوم بچے کو جو صرف طاقت ور جسم رکھتا تھا' قاتل بنادیا" غالب بولا "بڑی بے رحمی ہے یہ۔ آخر وہ انسان ہے' اسے کسی سدھائے ہوئے جانور کی طرح اپنے اشاروں پر چلانا اور اس کے ہاتھوں کسی دوسرے انسان کا خون کرادینا' ایسی بے حسی کے ساتھ۔ یہ جرم ہی نہیں'

گناہ ہے سکندر۔ قابل شرم۔ کاجل کے اپنے گناہ سے زیادہ شرم ناک۔ اب یہ حرام زادہ کہتا ہے کہ سوہا کو یہاں چھوڑ دو۔"

"پھر تم ہی بتاؤ کہ ہم کیا کریں؟ سوہا کو کیسے ساتھ لے جائیں۔ وہ تو پاگل ہے۔ کہیں بھی پھر سچ بولنا شروع کردے گا تو ہمیں بھی مروادے گا" میں نے کہا "ہم سیف اللہ کے بیٹے کی ذمے داری بھی قبول کرچکے ہیں۔ یہ ہمارے لئے آخری موقع ہے۔"

"سکندر! کیا یہ آدمی بھروسے کے قابل ہے۔ کہیں یہ جھوٹ ہی نہ بول رہا ہو۔ وہ ہمیں کاجل کے پاس نہ لے جائے، کہیں اور لے جائے۔ کیا پتا اس نے کاجل کو بھی مار دیا ہو۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے؟"

"سب کچھ تو ہوچکا ہے سکندر، اب کیا نہیں ہوسکتا۔ وہ گاڑی کس کی لایا ہے؟"

"غیر ملکی گاڑی ہے۔ شیورلٹ امپالا۔"

"کسی فارن مشن کی؟" غالب نے کہا۔

"یہی سمجھ لو۔ نمبر پلیٹ مہاراشٹر کی ہے۔ گاڑی امریکن ہے، بہت بڑی۔" میں نے کہا "اور میرا خیال ہے اسی بدنصیب کی ہے جسے ہوش سے بیگانگی اور نادانستگی میں سوہا نے خود مار کے اپنے ہاتھوں سے دفن کردیا۔ غالباً کار حاصل کرنے کے لئے کاجل نے ایسا کیا۔"

"اس نے تو کہا تھا کہ گاڑی خریدے گی، نمبر پلیٹ بنوائے گی۔" غالب نے برہمی سے کہا۔

"یہ کاجل ہی بتائے گی کہ اس نے مشکل طریقہ کیوں اختیار کیا۔ میں ایسا کرتا ہوں کہ پہلے اکیلا جاتا ہوں اس شخص کے ساتھ۔"

"وہ کیوں؟" غالب بولا۔

میں نے کہا "یہ دیکھنے کے لئے کہ اس میں کوئی دھوکا تو نہیں ہے۔"

"اور آپ خود شکار ہوگئے دھوکے سے پھر؟"

"اس کی زندگی میرے پاس گروی رہے گی" میں نے کہا "یہ بات میں اسے اچھی طرح سمجھا دوں گا۔ وہ مجھے لے کر جائے گا تو واپس بھی لائے گا۔ ورنہ میں اس کی لاش سڑک پر پھینک سکتا ہوں اور خود گاڑی لے کر واپس آسکتا ہوں۔"

"یہ بہت خطرناک کام ہے۔ میں تمہیں اکیلا نہیں جانے دوں گا۔"

"عقل سے کام لو یار۔ تم لڑکیوں کو تیار کرو۔" میں نے کہا اور غالب کے کچھ کہنے سے پہلے باہر نکل گیا۔

وہ شخص پھر شیشے چڑھائے بیٹھا تھا۔ ان سیاہ شیشوں کے اندر بیٹھا ہوا آدمی نظر نہیں آتا تھا مگر اندر سے باہر دیکھا جاسکتا تھا۔

"اب کیا ہوگیا؟ باقی لوگ کیوں نہیں آئے؟" اس نے شیشہ اتار کے ناگواری سے کہا۔

میں دروازہ کھول کے اس کے ساتھ بیٹھ گیا "میں چل رہا ہوں تمہارے ساتھ۔ باقی لوگ جائیں بھاڑ میں۔"

"کیا مطلب؟"

"میں کوئی بنگالی تو بول نہیں رہا ہوں" میں نے اسی کی بات دہرائی "وہ نہیں جانا چاہتے تمہارے ساتھ تو پھر کہیں بھی جائیں۔ تم چلو۔"

وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتا رہا "مگر کاجل نے کہا تھا......"

"جو کاجل نے کہا تھا، وہ کاجل پھر کہہ دے گی" میں نے ریوالور نکال لیا "دیکھنا یہ ہے کہ تم کو کاجل نے ہی بھیجا ہے یا اس کے دشمنوں نے؟"

"اوہ۔ تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں ہے گویا" اس نے گاڑی سخت غصے میں اسٹارٹ کی اور اتنی تیزی سے واپس لے گیا کہ ایک دھوتی والا جو مسواک کرتا آرہا تھا، خود کو بچانے کی کوشش میں دیوار سے ٹکرا گیا۔ بلاشبہ گاڑی بہت اچھی تھی، ڈرائیور اس سے بھی اچھا تھا مگر اس کی صورت سے زیادہ سیرت مکروہ تھی۔ غصے میں وہ اور بھی بھیانک لگ رہا تھا۔ اس نے میرے ریوالور نکالنے پر کوئی احتجاج نہیں کیا تھا اور نہ تبصرہ۔ اس نے گاڑی چلاتے ہوئے ایک بار بھی میری طرف نہیں دیکھا اور یہ نہیں پوچھا کہ میں ریوالور پکڑے کیوں بیٹھا ہوں۔

وہ ساٹھ ستر میل کی رفتار سے شہر میں گاڑی دوڑاتا رہا۔ آدھے گھنٹے میں اس نے جتنے موڑ کاٹے، خطرناک انداز میں کاٹے۔ ہر بار مجھے لگتا تھا کہ گاڑی الٹ جائے گی۔ وہ مجھے دہشت زدہ کرکے مجھ پر ایک نفسیاتی غلبہ حاصل کرنا چاہتا تھا اور میں اسے محتاط ڈرائیونگ کا مشورہ دے کر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ میں خوف زدہ ہوں۔

جب اس نے گاڑی کو ایک دم بریک لگا کے روکا تو میرا سر ڈیش بورڈ سے ٹکرایا۔ میں نے دل ہی دل میں اسے گالی دی۔

وہ مسکرایا "جاؤ، اس دروازے سے اندر جاکے مل لو کاجل سے۔"

میں نے کہا "تم نہیں چلوگے؟"

وہ قہقہہ مار کے ہنسا "میں اور وہ رات بھر مل چکے ہیں۔"

اگر ممکن ہوتا تو یہ بات سن کے میں اسے گولی مار دیتا مگر میں سب کچھ برداشت کرنے پر اور نظر انداز کرنے پر مجبور تھا۔ میں نے دروازے پر دستک دی تو مجھے کاجل کا چہرہ نظر آیا۔ وہ جیسے دروازے سے لگی کھڑی تھی۔ اس کی ظاہری حالت میں۔ یہ اڑی اڑی سی رنگت یہ کھلے کھلے سے گیسو۔ تیری صبح کہہ رہی ہے تیری رات کا فسانہ۔ والی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ بہت نکھری ہوئی اور دھلی دھلائی، بال سنوارے، میک اپ کئے اور بہترین استری کی ہوئی ساری باندھے کھڑی تھی۔

"تم...... اکیلے آئے ہو؟ باقی سب کہاں ہیں؟"

میں نے کہا "میں اس شخص پر آنکھ بند کرکے بھروسا نہیں کر سکتا تھا جس کے ظاہر و باطن سے خباثت ٹپکتی ہے۔ کون ہے یہ؟"

"یہ جابر ہے۔ میں نے کہا تھا......"

"تم نے جو کہا تھا، وہ نہیں کیا اور جو کیا وہ سب غلط تھا مگر میں یہ بحث کرنے نہیں آیا ہوں" میں نے کہا "ایک تو مجھے تصدیق کرنی تھی کہ اسے تم نے بھیجا ہے۔ دوسرے یہ پوچھنا تھا کہ تم سوہا کو کیا سمجھتی ہو؟ وہ انسان ہے یا قربانی کا بکرا؟ تم نے اس سے ایک قتل کرادیا، اس قتل کا سراغ مٹوایا اور اب چاہتی ہو اسے لاوارث چھوڑ دیا جائے۔"

کاجل کا رنگ اُڑ گیا "اس کے وارث بن کے تم ثواب کمانا چاہتے ہو تو بے شک ساتھ لے آؤ مگر یہ سمجھ لو کہ اس کی موجودگی ہم سب کی زندگی کے لئے موت کا پیغام بن جائے گی۔ تم سنبھالو گے اسے۔ وہ قربانی کا بکرا ہے یا نہیں، انسان کی شکل کا ایک جاندار ضرور ہے جسے برے بھلے اور اپنے پرائے کی تمیز نہیں۔ وہ حالات کے رحم و کرم پر زندہ ہے۔ اس کی بہتری اسی میں ہے کہ اسے یوں ہی چھوڑ دیا جائے۔"

"یہ تم نے کل رات کیوں نہیں سوچا تھا؟"

"فضول باتیں مت کرو۔ یہ جنگ ہے فنا اور بقا کی۔ جنگ میں سب جائز ہوتا ہے۔ جنگ میں اخلاقیات کے اصول کام آتے تو وہ سب نہ ہوتا جو ہو رہا ہے۔ جو.... میرے ساتھ ہوا......" ایک دم اس کا نروس بریک ڈاؤن ہوگیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور پھر دھڑ سے دروازہ بند کرکے بھاگ گئی۔

میں چند سیکنڈ بے وقوفوں کی طرح کھڑا رہا، پھر شکست خوردگی کے احساس سے مفاہمت کرکے واپس ہوا اور گاڑی کا دروازہ کھول کے بیٹھ گیا۔

جابر کے ہونٹوں پر فتح مندی کی مسکراہٹ تھی "تسلی ہوگئی؟"

میں نے دہاڑ کے کہا "جابر! مجھے مجبور مت کرو کہ میں انجام کی پروا کئے بغیر تمہیں گولی مار دوں۔ اپنی وجہ سے نہیں، دوسرے بہت سے لوگوں کی وجہ سے میں تمہیں برداشت کر رہا ہوں جن کی سلامتی کا میں ذمے دار بن گیا تھا۔ مجھے مشتعل کرکے جان سے جانے کا رسک مت لو۔"

اس نے گاڑی آگے بڑھا دی "میں جان سے جاؤں گا تو تم کیسے جاؤ گے اس دنیا سے؟" اس نے آہستہ سے کہا۔

باقی راستہ خاموشی سے کٹا۔ اب وہ پرسکون تھا مگر میں اندر سے کھول رہا تھا اور ان سب حقائق کو تسلیم کرنے کی کوشش کر رہا تھا، جو میرے ضابطہ حیات کے اخلاقی اصولوں سے متصادم تھے۔ یہ کام حرام کھانے سے کم مشکل نہ تھا مگر مجبوری آدمی سے سب کچھ کرا سکتی ہے۔

رابعہ اور نازو تیار تھیں مگر ان کے چہرے دیکھ کر میں ٹھٹکا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اپنے آنسوؤں کو ضبط کر رہی ہیں۔ خود غالب سخت نروس تھا اور کلیم اللہ کا ہاتھ پکڑے کھڑا تھا۔ کمرے کا دروازہ بند تھا اور سیف اللہ کی خالی چارپائی پر سوہا سو رہا تھا۔ جابر نے یہ سب قطعی بے حسی کے ساتھ دیکھا۔

"بہت دیر کی تم نے" غالب نے بگڑ کے اور چلّا کے کہا۔

میں نے کہا "کیا ہوگیا ہے تجھے؟"

"کچھ نہیں۔ تم چلو سب کو لے کر۔ رابعہ! نازو! کیا سنا نہیں تم نے۔ چلو۔" غالب نے کہا "کلیم کو اپنے ساتھ رکھو۔ جاؤ سکندر! ان کو گاڑی تک لے جاؤ۔"

"اور تم؟"

"میں بھی چل رہا ہوں یار۔" غالب نے کہا "چلو، نکلو۔"

اس نے تقریباً مجھے دھکیل کر کنڈی لگادی۔ رابعہ اور نازو لڑکھڑاتی ہوئی آگے جارہی تھیں اور کلیم کو اپنے ساتھ کھینچ رہی تھیں۔ غالب نے باہر سے کنڈی لگائی تو میں نے کہا "یار، یہ کیا ہو رہا ہے؟"

غالب نے ایک لمبی گہری سانس لی "سب ہوچکا جو ہونا تھا۔ اب تو بس نکل چلو۔ تم کیا دیکھ رہے ہو؟ گاڑی چلاؤ۔"

جابر نے اپنی جیبوں میں اور ڈیش بورڈ پر دیکھا "سگریٹ ماچس تھی میرے پاس۔ شاید اندر ہی رہ گئی" وہ اتر کے واپس گیا۔

موقع پاتے ہی میں نے کہا "سیف اللہ اور مرجان کہاں ہیں؟"

"کمرے میں" غالب نے کہا اور میرے ہاتھ میں کاغذ کا ایک رقعہ تھمادیا۔

رابعہ اور نازو پچھلی سیٹ پر تھیں اور غالب بھی انہی کے ساتھ کھڑکی سے لگا بیٹھا تھا۔ کلیم کو انہوں نے اپنے بیچ میں بٹھالیا تھا۔

"ہم کدھر جارہے ہیں چاچا؟" وہ بار بار پوچھ رہا تھا۔

"اپنے گھر۔ تم اپنے چاچا کا گھر نہیں دیکھو گے؟" غالب نے کہا۔

"اور بابا، اماں۔ وہ پہلے کیوں چلے گئے؟"

جابر کے آتے ہی گاڑی روانہ ہوگئی۔ میں نے بیک ویو مرر میں رابعہ کو روتے دیکھا۔ وہ منہ کھڑکی کی طرف کئے چپکے چپکے آنسو بہارہی تھی اور کوشش کر رہی تھی کہ دس سال کے کلیم کو پتا نہ چلے۔ نازو درمیان میں زیادہ مجبور تھی کہ اس سے باتیں کرے، اس سے مسلسل جھوٹ بولتی رہے۔ اسے تسلیاں دیتی رہے اور بہلاتی رہے کہ ہم اس کے ماں باپ سے ملنے ہی جارہے ہیں۔

گاڑی کے روانہ ہوتے ہی میں نے مٹھی کھول کے وہ کاغذ کا رقعہ نکال لیا۔ اس پر شکستہ خط میں لکھا تھا۔

میرا بھائی، تم پر اللہ کا فضل ہو۔

ابھی ہم اپنا بچہ خدا کے بعد تم کو سونپتا۔ ہم کاغذ پر اس کا گاؤں لکھا ہے۔ ادھر تم کسی سے ہمارا والد صاب کا حویلی پوچھے گا تو

بتائے گا۔ اس کا نام عظمت اللہ تھا اور ہمارا دادا کا نام پر گاؤں کو گڑھی حکمت بولتا ہے۔ راستہ اچھی طرح سمجھ لو۔ بہت آسان ہے۔ ادھر کلیم اللہ کا پھوپی ہے۔ وہ اس کا ماں بنے گا اور اس کا پرورش کرے گا۔ گڑھی حکمت پہنچانے کے بعد تمہارا ذمے داری ختم۔ اس دنیا میں ہم تمہارا احسان کا بدلہ نہیں چکا سکتا کہ تم ہمارا خاندان کو واپس اپنا زمین کا مالک اور وارث بنایا۔ ہم جانتا تھا کہ یہ کام اس کا باپ نہیں کر سکتا۔ اللہ نے فرشتہ لوگ کو کلیم کا چاچا بنا کے بھیجا۔ مرجان بے وقوف عورت اس دنیا میں ہمارا بوہت ساتھ دیا۔ ابھی ادھر بھی ہمارا ساتھ جانے کا ضد کرتا ہے۔ بولتا ہے ابھی کیا غم ہے۔ کلیم اللہ اپنوں میں پہنچ جائے گا‘ اپنا زمین کا مالک ہوگا۔ اس کو جانے دو۔ اچھا ہوتا اگر ہم سب ساتھ جاتے لیکن یارا جو اللہ کا مرضی۔ ہم مرجان کو اپنا ساتھ لے جاتا ہے۔ ہمارا غلطی معاف کرنا۔ اللہ ہمارا غلطی معاف کرے کہ ہم اس کی رحمت سے مایوس ہوا۔ اگر زندہ رہتا تو شاید ہم بھی پہنچ جاتا مگر ہم نہیں بچے گا۔ ہمارا ٹانگ اندر سے ختم ہوگیا ہے۔ اس میں پیپ پڑ گیا ہے۔ زخم کا زہر پھیل رہا ہے۔ ابھی کون علاج کرے گا ہمارا؟ ہمارا بعد مرجان کیسے رہے گا؟ اس لئے ہم مجبور ہے کہ اپنا جان خدا کے حوالے کرے۔ تمہارا بھائی۔

سیف اللہ (مرحوم)

میں نے اس مختصر تحریر کو بار بار پڑھا‘ یہاں تک کہ اس کا ہر لفظ مجھے ازبر ہوگیا۔ میں نے کسی سے کچھ نہیں پوچھا مگر چشم تصور سے دو لاشوں کو دیکھا۔ غربت جن کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا۔ ان کو مٹی دینے والا وارث اپنی یتیمی کے احساس سے بے نیاز ہمارے ساتھ جا رہا تھا اور کچھ نہیں جانتا تھا کہ اس کے ماضی اور مستقبل کو ملانے والا پل عبور کرنے کی اس کے ماں باپ کو کیا قیمت ادا کرنی پڑی ہے۔ ہر پل پر سے گزرتے ہوئے ٹول ٹیکس تو دینا پڑتا ہے۔ کلیم اللہ کے والدین نے ٹول ٹیکس میں اپنی جان دے دی تھی لیکن اپنی آنے والی نسل کو بچالیا تھا۔

گاڑی رکی تو مجھے ہوش آیا۔ رابعہ اور نازو کے ساتھ کلیم اللہ بھی اتر کے اندر چلا گیا۔ میں نے عمداً اترنے میں تاخیر کی۔

"یہ سب کیسے ہوگیا غالب؟" میں نے پیچھے پلٹ کے دیکھے بغیر کہا "تم تو تھے وہاں۔"

غالب نے کہا "ہاں۔ میں تھا وہاں۔ سب کچھ میں نے کیا اور سب کچھ دیکھا بھی لیکن مجھے بعد میں پتا چلا کہ میں نے انجانے میں کیا کردیا ہے۔ مجھ سے تو سیف اللہ نے درخواست کی تھی کہ اسے اندر لے جا کر لٹادوں کیوں کہ باہر دھوپ آرہی ہے۔ دھوپ واقعی آرہی تھی مگر اتنی تیز نہیں تھی کہ ناقابل برداشت ہوتی۔ اس نے ایک طرف سے بیساکھی کا سہارا لیا اور دوسری طرف سے میرے کندھے کا۔ میں نے اسے اندر لٹادیا تو اس نے مرجان سے پینسل اور کاغذ مانگا جو اس نے کلیم اللہ کے بستے سے نکال کر دیئے۔ وہ آرام سے دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے لکھتا رہا۔ کہنے لگا اپنے گاؤں کا پتا لکھ رہا ہوں۔ درمیان میں ہی اس نے مرجان سے کہا کہ وہ درد کی دوا کہاں رکھی ہے جو میں نے تجھے دی تھی۔ مرجان نے ایک ٹرنک میں سے وہ شیشی نکال کر اسے دی۔"

"تم پھر بھی نہیں سمجھے؟"

"یار‘ مجھے الزام مت دو۔ تم بھی نہیں اندازہ کرسکتے تھے کہ وہ دنیا سے روانگی کی تیاری کر رہا ہے۔ وہ بالکل نارمل تھا۔ اس نے کوئی ایسی بات نہیں کی تھی جس سے مجھے شک ہوتا یا میں اندازہ کر سکتا کہ وہ کیا کرنے والا ہے۔ بڑے آرام سے لکھتے لکھتے اس نے تھوڑی سی دوا حلق میں انڈیلی اور پانی مانگا جو مرجان نے اسے دے دیا۔ اب مرجان نے باقی زہر کب پیا‘ یہ میں نے واقعی نہیں دیکھا۔"

"کیا اسے معلوم تھا......؟"

"ممکن ہے اسے معلوم ہو۔ سیف اللہ نے برے وقت میں بچنے کے لئے انتظام پہلے سے کرلیا ہو۔ وہ غیرت مند آدمی تھا۔ اپنی آنکھوں کے سامنے گھر بار اور غیرت لٹتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ جانتا تھا کہ اب اس کا وجود زمین کا بوجھ ہے۔ اس نے مرجان کو قائل کرنے کی کوشش کی ہوگی کہ ہمارے ساتھ چلی جائے مگر وہ مشرقی عورت ہی کیا جو شوہر کو چھوڑ دے اور زندگی سے چمٹی رہے۔ اس نے واضح طور پر بیٹے اور شوہر میں سے شوہر کا ساتھ دینے کا فیصلہ کرلیا ہوگا۔ اس لئے کہ بیٹا بہرحال محفوظ ہاتھوں میں تھا اور اس کا مستقبل بھی محفوظ تھا۔ شوہر مر رہا تھا......"

"یہ بات بھی جانتی تھی وہ؟"

"ضرور جانتی ہوگی یار۔ میاں بیوی جب رفاقت کا اتنا طویل سفر طے کرلیتے ہیں تو ایک دوسرے کے جذبات تک پڑھ لیتے ہیں۔ وہی بات ہو جاتی ہے کہ سنگ تجھ پہ اٹھے اور زخم آئے مجھے۔ سیف اللہ نے لاکھ چھپایا ہو مگر مرجان کے علم میں یہ ہوگا کہ اب اسے زندگی کے آخری سفر پر شوہر کے ساتھ ہی روانہ ہونا ہے۔ اس کے فیصلے سے سیف اللہ واقف تھا یا نہیں؟ اس نے سیف اللہ سے کیا کہا تھا؟ اس کا دل رکھنے کو یہ بات مان لی تھی کہ وہ بھی کلیم کے ساتھ جانے کو تیار ہے؟ سیف اللہ نے اسے زہر پیتے دیکھا تھا یا نہیں۔ کیا ان کے درمیان دنیا سے ایک ساتھ جانے کا کوئی معاہدہ پہلے سے ہی ہوچکا تھا؟ ان سب سوالوں کے جواب کوئی نہیں دے سکتا‘ سوائے ان دونوں کے جو اب زندگی کے سب دکھوں سے نجات پا کے سکھی ہوگئے ہیں۔ وہ حرام موت قبول کرنے پر مجبور ہوگئے تھے۔ اللہ ان کے گناہ کو معاف کرے۔ وہ سب کی مجبوریوں کو جانتا ہے اور نیت کا حال بھی۔"

"کلیم نے کچھ نہیں دیکھا تھا؟"

"نہیں۔ اسے سیف اللہ نے تیار کردیا تھا کہ چاچا کے ساتھ جاؤ۔ ہم سب جا رہے ہیں" غالب بولا "رابعہ نے اور نازو نے اسے باہر ہی رکھا تاکہ ماں جذباتی نہ ہو۔ بیٹے کی جدائی کے خیال سے۔ انہیں کہاں معلوم تھا کہ وہ ایک انتہائی غیر جذباتی فیصلہ کرچکی ہے۔ سیف اللہ نے خط لکھ کے میرے حوالے کیا ہی تھا کہ مرجان بیٹھے بیٹھے گر گئی۔ میں نے گھبرا کے رابعہ کو بلایا اور نازو سے کہا کہ کلیم کو باہر ہی رکھے۔ میرا ابھی خیال تھا کہ مرجان کی یہ حالت بیٹے سے بچھڑنے کی وجہ سے ہوئی ہے۔ وہ جذبات کا گلا گھونٹ کر چپ رہنے والی عورت تھی۔ ایسی عورتیں ہسٹریا کا شکار ہو جاتی ہیں۔ رابعہ نے آ کے اسے سنبھالنے کی کوشش کی۔ اس کے لئے پانی لائی لیکن پانی کا ایک گھونٹ بھی اس کے حلق سے نہیں اترا۔ مجھے نہیں معلوم کہ کب سیف اللہ نے آخری سانس لیا۔ ہم تو مرجان کو سنبھال رہے تھے۔ اس کی موت کا احساس ہوتے ہی میں نے سیف اللہ کو پلٹ کے دیکھا تو وہ کھلی آنکھوں سے چھت کو گھور رہا تھا اور بالکل اسی حالت میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس وقت مجھ پر اچانک انکشاف ہوا کہ ہم خاموش تماشائی بنے ان کو ہر لمحہ موت کی طرف بڑھتا دیکھتے رہے اور فرشتہ اجل کے قدموں کی چاپ تک نہ سن سکے۔ ظاہر ہے اس کے بعد کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ بہت ضروری اور ناگزیر ہوگیا تھا کہ ہم کلیم کے ساتھ جلد از جلد وہاں سے نکل جائیں۔ میں اسے تھوڑی دیر کے لئے باہر لے گیا اور اتنی دیر میں رابعہ نے دروازہ بند کردیا۔ ہم نے کلیم کو بتایا کہ تمہارے والدین آگے چلے گئے ہیں دوسری گاڑی میں۔ ایک گاڑی میں سب نہیں جاسکتے تھے۔"

میں دل پر غم کی بوجھل چٹان اٹھائے کھڑا رہا "ہم کب تک کلیم سے چھپائیں گے؟"

"گڑھی حکمت اللہ پہنچنے تک۔ پھر ہم بھاگ آئیں گے مگر اس کی پھوپی اور خاندان کے دوسرے لوگوں کو سب بتا کے۔ وہ جیسے چاہیں کلیم کو سنبھالیں" غالب نے کہا "بس خدا ہمیں توفیق دے کہ ہم اس امانت کو صحیح ہاتھوں تک پہنچادیں۔"

"غالب! کیا سو رہا بھی......" میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

غالب نے نفی میں سر ہلایا "وہ سو گیا تھا۔ میں نے بہت سوچا۔ میرا ذہن فیصلہ کرنے سے قاصر تھا۔ تم ہوتے تو مشورہ کرتا۔ میں نے رابعہ سے پوچھا۔ رابعہ کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ آخر کار میں نے وہ فیصلہ کیا جو میرے ضمیر کی آواز کے خلاف تھا۔ میں نے جبر کیا‘ ظلم کیا خود پر‘ شاید احساس جرم مجھے ہمیشہ رہے گا مگر میں اور کیا کر سکتا تھا۔ میں نے اسے وہیں سونے دیا۔ وہ ہمارے ساتھ نہیں آسکتا تھا۔ اس سے ہم سب کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی تھی۔"

"اب اس کی زندگی خطرے میں پڑ گئی ہے۔"

"نہیں۔ شاید وہ بچ جائے گا۔ پولیس اسے گرفتار تو کرے گی مگر جب یہ ثابت ہو جائے گا کہ وہ فاتر العقل ہے اور کیس قتل کا نہیں‘ خودکشی کا ہے تو وہ چھوٹ جائے گا۔"

"بشرطیکہ اس سے پہلے ہی وہ گزشتہ شب کے جرم کا اعتراف نہ کر بیٹھے۔" میں نے کہا "اسے جھوٹ بولنا آتا ہی نہیں۔"

میں اور غالب آپس میں باتیں کرتے وقت جابر کی طرف سے بالکل بے خبر تھے اور ہمارے نزدیک اس کے کچھ جاننے سے فرق بھی نہیں پڑتا تھا۔ وہ پہلے ہی بہت کچھ جانتا تھا۔

"کہیں وہ پولیس کو ہمارے بارے میں کچھ نہ بتادے" غالب نے کہا۔

جابر نے اچانک کہا "ڈرو مت یار۔ جابر نے اس کا بھی بندوبست کردیا ہے۔ اب کسی کو کچھ نہیں بتا سکتا وہ۔"

میرا دل صدمے سے ڈوبنے لگا۔ مجھے یاد آیا کہ وہ ہمیں گاڑی میں چھوڑ کے چند منٹ کے لئے اندر گیا تھا۔ اس وقت ہم نے کوئی اہمیت نہیں دی تھی مگر اب میں نے بھی اور غالب نے بھی سمجھ لیا کہ ان چند منٹوں میں کیا ہوا ہوگا۔

میں نے ایک دم اس کی گردن دبوچ لی "تم نے اسے مار دیا سور کے بچے۔"

جابر نے اپنے سر سے میرے سر کو ٹکر ماری اور خود کو چھڑا کے باہر نکل گیا۔ ٹکر اتنی شدید تھی کہ مجھے چکر آگیا۔ میں نے سر کو جھٹکا اور بے اختیار میرا ہاتھ اپنے ریوالور کی طرف گیا مگر جابر بھاگ کے اندر گھس گیا۔

غالب نے کہا "نمٹ لیں گے اس سے بھی یار۔ مگر ابھی نہیں۔"

"کتنا ظلم کیا اس نے یار!" میں نے اترتے ہوئے کہا "کتنی سفاکی ہے یہ!"

"تم جذباتی ہو رہے ہو" غالب نے کہا "کتا اگر پاگل ہو جائے تو اسے گولی مارنی پڑتی ہے‘ خواہ وہ کتنا ہی قیمتی کیوں نہ ہو۔ گھوڑے کی ایک ٹانگ ٹوٹ جائے تو اس کو بھی مار دیتے ہیں‘ اسی کی بھلائی کے لئے۔ اسے دکھوں سے بچانے کے لئے۔"

"مگر وہ انسان تھا۔"

"نہیں۔ وہ انسان کا بچہ ضرور تھا‘ انسانوں سے مشابہت کی حد تک مگر وہ عقل و شعور سے محروم تھا۔ معلوم نہیں آج تک کیسے زندہ تھا۔ اب تو اس کی نجات موت میں ہی تھی اور شاید اسی میں بہتری بھی۔"

"میں نہیں مانتا۔ ایسے قتل میں کبھی بہتری نہیں ہوتی‘ جو سوچ سمجھ کے کیا جائے۔ کیا دنیا دیوانوں کو جینے کا حق نہیں دیتی؟ ہزاروں پاگل خانے اور ذہنی امراض کے شفاخانے‘ نفسیاتی کلینک اور ذہنی طور پر معذور افراد کی امداد کرنے والے ادارے قائم کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ انہیں سیدھا جیل لے جا کے پھانسی دی جاسکتی تھی۔ یہ ایک وحشیانہ فعل تھا اور میں اسے قتل ہی کہوں گا۔ جو سوہا نے کیا تھا‘ اسے میں نادانی میں سرزد ہو جانے والی حرکت سمجھ سکتا ہوں۔ اسے احساس نہیں تھا کہ وہ ایک سنگین جرم کا مرتکب ہو رہا ہے مگر جابر جانتا تھا۔"

"شاید یہ احساس جابر کو بھی نہیں ہوگا۔"

"جابر کو چھوڑو' تم کیا سمجھتے ہو؟" میں نے برہمی سے کہا۔
"مجھے بھی چھوڑو" غالب نے کہا اور اتر کے اندر چلا گیا۔
میں اپنے احساس کے ساتھ اکیلا رہ گیا۔ کیا واقعی میں جذباتی ہو رہا ہوں؟ غالب بھی سمجھتا ہے کہ جو ہوا ٹھیک ہوا؟ نہیں' میری اور اس کی سوچ میں اتنا فرق نہیں ہے۔

اندر ایک کمرے میں سب خواتین گلے مل مل کے رو رہی تھیں۔ کلیم ہکا بکا کھڑا تھا۔ جابر ایک کرسی پر بیٹھا سگریٹ کے کش لے رہا تھا اور اس جذباتی بحران سے قطعی بے نیاز نظر آتا تھا۔

غالب نے چلانا شروع کیا "آخر یہ کیا بے ہودگی ہے؟ کس بات کا ماتم ہے؟ عقل ماری گئی ہے تم سب کی۔ کسی کو خیال نہیں اپنی ذمے داری کا۔ ہم یہاں رونے پیٹنے کے لئے آئے ہیں؟ صبح سے یہ وقت ہو گیا ہے' کسی نے ابھی تک اس بچے سے بھی نہیں پوچھا ناشتے کے لئے۔ جو ہو گیا سو ہو گیا' خدا کے لئے یہ سوچو کہ آگے کیا کرنا ہے۔"

جابر نے کہا "چلنا ہے اور کیا کرنا ہے۔ اپنے پاس فالتو ٹائم نہیں ہے بالکل۔"

رابعہ نے سب سے پہلے خود کو سنبھالا اور آنسو پونچھ کے کلیم کو اپنے ساتھ لپٹا لیا "بھوک لگی ہے بیٹا؟"

"نہیں۔ اماں ابا کہاں ہیں میرے' پہلے یہ بتاؤ؟"

"بتایا ہے نا کہ ہم سب ایک جہاز میں نہیں جا سکتے تھے۔ ہم نے ان کو ہوائی جہاز سے بھیج دیا ہے۔ تمہارے بابا کو اب کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ ہم تکلیف اٹھا سکتے ہیں۔ ہم کار میں جائیں گے اور تم بھی۔"

نازو نے کہا "اتنے بہادر لڑکے ہو تم' کوئی بچے تو نہیں ہو۔"

کاجل نے کہا "تم سب کے لئے ناشتا بنا کے رکھا تھا میں نے۔ ناشتا کر لو پھر چلتے ہیں۔"

رابعہ نے کہا "کلیم کو کچھ دے دو' مجھے بھوک نہیں ہے۔"

میں نے اسے گھورا "سب کو بھوک لگی ہے۔ سب کھائیں گے کلیم کے ساتھ۔"

نازو نے بھی میری بات کا مطلب سمجھ لیا اور خواہش نہ ہونے کے باوجود ہم سب نے چائے لی۔ کاجل نے ڈبل روٹی' مکھن اور جام بیچ میں رکھ دیے تھے مگر ان کو کسی نے ہاتھ نہیں لگایا۔ جابر نے ڈٹ کے کھایا اور ہم سب سے الگ بیٹھا رہا۔ مجھے اس شخص کی صورت سے نفرت ہو گئی تھی اور اس کے لبوں کی شیطانی مسکراہٹ دیکھ کر میرا دل چاہتا تھا کہ اسے شوٹ کر دوں۔ وہ ہم سب کی مجبوری کی پوری قیمت وصول کر رہا تھا۔ یہ جانتا تھا کہ ہم اس کی مدد کے محتاج ہیں اور اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ کاجل اس سے نظر نہیں ملا رہی تھی۔ ہمارے اور اس کے درمیان صرف اجنبیت ہی حائل نہیں تھی' معاندانہ جذبات کی دیوار تھی جو گرائی نہیں جا سکتی تھی اور یہی بے بسی احساسِ جرم و ندامت کی خلش بن گئی تھی۔

اس ایک کمرے کے کوارٹر میں کاجل کو الگ لے جا کے بات کرنے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ پھر بھی میں نے اسے باہر مختصر برآمدے میں بلا لیا۔

"کاجل! میں اس حرام زادے کو برداشت نہیں کر سکتا۔"

"تمہیں اس کو برداشت کرنا پڑے گا" کاجل نے کہا "آخر مجھے دیکھو' کیا تم میری قربانی کو بھی ضائع کر دو گے؟ میں نے خود اس کو اس کی ہوس کی بھینٹ کیوں چڑھایا تھا آخر؟"

"کیا اس کے سوا چارہ نہیں تھا؟ کوئی باعزت طریقہ نہیں تھا؟" میں نے برہمی سے کہا۔

"ہوتا تو مجھے کیا شوق تھا خود اپنی نظر سے گرنے کا؟ میں وہی کر سکتی تھی جو میرے اختیار میں تھا" وہ بگڑ کے بولی "میری نظر میں صرف جابر تھا جو ہمارے سب کے مسائل حل کر سکتا تھا لیکن اس کی ایک قیمت تھی جو تم نے نہیں' میں نے ادا کی۔"

"میں محسوس کرتا ہوں کہ زندگی کے لئے میں بہت ذلت قبول کرنے پر مجبور کر دیا گیا ہوں۔ میں موت کو ترجیح دیتا اگر سب کا خیال نہ ہوتا۔ میں اس کو جان سے مار دیتا لیکن رابعہ ہی نہیں' تم اور نازو' غالب اور کلیم۔ ہم سب گٹر میں گر گئے ہیں اور باہر سب ہی نکلنا چاہتے ہیں۔"

"ہاں۔ ہم گٹر میں ہیں اور گٹر میں گر جانے والے کو غلاظت کو قبول کرنا چاہئے۔ جو کچھ بھی گٹر میں ہے ناگزیر ہے۔ اس میں اپنے پرائے سب کی نالیوں سے بہہ کر آنے والی گندگی ہے۔ اس سے نفرت کرو یا کراہیت محسوس کرو۔ یا تم ڈوب سکتے ہو اس میں یا ہاتھ پاؤں چلا کے اس سے باہر نکل سکتے ہو۔ ہاتھ پاؤں چلاؤ گے تو چھینٹے اڑیں گے' غلاظت تمہارے منہ میں' آنکھوں میں اور ناک میں جائے گی۔"

نہ جانے کب غالب میرے ساتھ آ کے کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا "کاجل ٹھیک کہتی ہے۔ ہمیں اپنا راستہ بنانا ہے تو راستے کی ہر رکاوٹ کو دور کرنا پڑے گا۔ جیسے فوجی میدان جنگ میں راستہ بناتے وقت جذبات کو بھول جاتے ہیں۔ ٹینک پھولوں کے تختوں پر سے بھی ایسے ہی گزر جاتے ہیں جیسے ریت کے ٹیلوں پر سے مگر وہی فوجی جو ٹینک چلاتا ہے' امن کی حالت میں شہر کے پارک میں لگے ہوئے ایک پھول کو توڑنا غلط سمجھتا ہے۔"

"تم ثابت کرنا چاہتے ہو کہ کاجل نے جو کیا ٹھیک تھا۔ اس نے اپنی آبرو کی بھینٹ دے کر اچھا کیا۔ اس بے شعور' بے عقل لڑکے سے خون کرا کے اچھا کیا اور جابر نے اسے مار کے اچھا کیا؟" میں نے چلا کے کہا "نہیں۔ یہ سب اچھا نہیں ہے۔"

"ہم کب اچھا کہتے ہیں۔ یہ بہت برا ہے مگر مجبوری میں بہت کچھ برا بھی اچھا ہو جاتا ہے۔"

"میں نہیں مان سکتا۔ برا کبھی اچھا نہیں ہو سکتا' وہ برا ہی رہے گا۔ بس یہ کہو کہ ہم نے مجبوری میں برائی کو قبول کیا۔"

"یار' یہاں کوئی مباحثہ ہو رہا ہے؟" غالب بگڑ گیا "ہم الگ

الگ روسٹرم پر کھڑے ہیں؟ اپنا پوائنٹ ثابت کرنے کے لئے اور کوئی کپ جیتنے کے لئے۔ میں کہتا ہوں چلو۔ بس کرو خدا کے لئے۔ کوئی بات نہیں ہو گی اب۔"

میں نے ہتھیار ڈال دیے "اچھا....."

"اچھا کیا۔ تم اب جابر کو کچھ نہیں کہو گے۔ کاجل کو یا کسی کو بھی کچھ نہیں کہو گے۔ پورے سفر کے دوران۔ ہم سب واپس جانا چاہتے ہیں سکندر۔ ایک ایک لحہ بھاری ہے ہم پر۔ ہمیں ہر قیمت پر گھر پہنچنا ہے۔ اپنی پرانی زندگی کی طرف لوٹنا ہے۔ یہ اتنا آسان نہیں ہے' جیسے کوئی کراچی سے نیویارک کا ہوائی ٹکٹ لے اور جہاز میں اُڑ کے نکل جائے۔ ہمیں اپنا راستہ بنانا ہے اور اپنی زندگی کی منزل تک پہنچنے کے لئے وہ سب کچھ کرنا ہے جو اپنا حق حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے۔ جائز ناجائز۔"

وہ ایک دم پلٹا اور اندر چلا گیا' پھر کاجل بھی اندر چلی گئی۔ میں برآمدے میں اکیلا کھڑا سگریٹ کے دھوئیں میں خیالات کے انتشار کو تحلیل کرتا رہا' خود کو قائل کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ میری ہی سوچ غلط ہے۔ باقی سب ٹھیک کہتے ہیں' اس لئے کہ وہ اکثریت میں ہیں۔ اکثریت غالب آ جاتی ہے' خواہ وہ غلطی پر ہی کیوں نہ ہو۔

رابعہ نے آہستہ سے میرا ہاتھ پکڑا "آؤ چلیں سکندر۔ اپنے گھر چلیں۔" میں نے سہلایا اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ مجھے اندر لے گئی' پھر باہر لے گئی جہاں کمر باندھے ہوئے چلنے کو سب تیار بیٹھے تھے۔ میں کسی دل گرفتہ بچے کی طرح رابعہ کے ساتھ چلتا رہا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔

ایک بچے کے علاوہ گاڑی میں سات افراد ہو گئے تھے مگر کار اپنی وسعت میں جہاز جیسی تھی اور اس کی پیچھے والی نشست پر چار افراد بہ آسانی بیٹھ سکتے تھے۔ ایک کھڑکی کے ساتھ رابعہ کو جگہ ملی' دوسری طرف مجھے اور درمیان میں نازو کے ساتھ کلیم کو۔ آگے جابر کے ساتھ غالب رہا اور کار آہستہ سے آگے بڑھی۔ میں نے پلٹ کے ایک الوداعی نظر اس گھر پر ڈالی جہاں مجھے کبھی لوٹ کے نہیں آنا تھا مگر اس کی یادوں کے پُرالم نقوش کو وقت نہیں مٹا سکتا تھا۔

واپسی کے سفر کا احساس ایک بالکل نیا' سنسنی خیز تجربہ تھا۔ بیک وقت خوشی اور بے قراری تھی' خوف اور بے یقینی کے جذبات تھے اور مایوسی کے ساتھ رنج و الم کے پُرندامت خیالوں کا آزار تھا۔ خوشی اور جلد واپس اپنے گھر پہنچنے کی بے قراری ایک فطری ردِعمل تھا۔ خوف ان مشکلات اور مصائب کا تھا جو راہ میں حائل ہو سکتی تھیں اور بے یقینی اس لئے تھی کہ سلامتی کے ساتھ وطن کی مٹی پر اترنے کا تصور ہزاروں صبر آزما مرحلوں کی مسافت تھا اور قبل از وقت ان مراحل سے کامیاب و کامران گزرنے کی نہ ضمانت دی جا سکتی تھی اور نہ پیش گوئی کی جا سکتی تھی۔ رنج و الم کے اسباب بہت تھے۔ ہم نے اس عشق میں کیا کھویا ہے کیا پایا ہے۔ معاملات سود و زیاں کا حساب لاحاصل تھا۔ بہت آگے گئے ان کا تو ذکر ہی کیا۔ اپنے پیچھے ہم تین مجبور' لاوارث اور بے گور و کفن لاشوں کو چھوڑ کر جا رہے تھے۔ اگرچہ اطمینان کا پہلو اپنی جگہ تھا کہ ہم اپنے مقصد میں کامیاب رہے اور ہم نے چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کے عزائم کو ناکام کیا مگر مشرقی پاکستان کی علیحدگی نے اس خیال کو بے وقعت کر دیا تھا۔ پچھتاوا تھا تو اس بات پر کہ اگر یہی سب کچھ ہونا تھا تو پھر ہم نے یا ایم آر ایس نے اپنی جدوجہد سے کیا پایا؟ ہم نے اپنا فرض ادا کیا' ضمیر کی آواز پر لبیک کہا اور راہ حق میں جہاد کیا' اس احساس میں جو اطمینان کا پہلو تھا' اس میں بھی شک کی تھوڑی سی خلش تھی کہ انجام کچھ بھی ہو جدوجہد کی بنیاد میری اور دلاور کی ذاتی دشمنی تھی۔ اگرچہ بعد میں اس کے وطن دشمن عزائم کا انکشاف ہونے پر یہ ذاتی دشمنی نہیں رہی تھی اور اس میں انتقام کا عنصر شامل نہیں تھا مگر میں اس حقیقت کے وجود کو تسلیم کرنے پر مجبور تھا کہ دلاور میرا دشمن نہ ہوتا تو میں اس جنگ میں ملوث نہ ہوتا۔ میں اس آگ کے دریا میں کود گیا تو محسن خاموش تماشائی بن کے کیسے کھڑا رہتا۔ اس کے بعد رابعہ' پھر نازو اور غالب۔ ایک ایک کر کے سب دوست ایک منزل کے لئے حصولِ نیت کا زادِ راہ لے کر شریک سفر ہوتے گئے اور کارواں بنتا گیا۔ ان سب نے میرا ساتھ دیا' میری غیر مشروط اطاعت کی۔ عہدِ وفا پر جان و مال کو قربان کر دیا اور سب رشتوں کو بھلا دیا۔ ان کا احسان مجھ پر تھا مگر میں نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں نے پاکستان پر احسان کیا تھا۔ مجھ سے ہزاروں ہوں گے جو وطن کے لئے زیادہ مخلصانہ قربانی دینے کا حوصلہ اور نیت رکھتے تھے' نذرانۂ جاں دے کے وطن کی مٹی کو سرخرو کر گئے تھے۔ جن کی راہ طلب میں ہمارے قدم۔ مختصر کر چلے درد کے فاصلے۔ لیکن ان کی کسی چوہدری دلاور اینڈ کمپنی سے جنگ نہیں تھی۔ انہوں نے کوئی ایم آر ایس تشکیل نہیں دی۔ میدان جنگ میں ہزاروں گمنام سپاہی جام شہادت نوش کر گئے اور نہ کسی نے ان کا نام جانا' نہ مدفن دیکھا۔

میری طرح سب خاموش تھے اور شاید ایسے ہی خیالات کے گرداب میں غوطہ زن تھے۔ گاڑی ڈھاکا شہر سے گزر رہی تھی جہاں زندگی بجھی بجھی اور خوف زدہ' اپنی تباہی پر نوحہ کناں اور بے بسی پر حیراں' معمول کی جانب لوٹنے کی کوشش کرتی نظر آتی تھی۔ دکانیں اور بازار گہما گہمی سے محروم تھے مگر کاروبار حیات کو رواں دواں رکھنے کی مجبوری اور فکر معاش' جنگ سے سہمے ہوئے لوگوں کو پھر اپنے گھروں کی پناہ گاہوں سے نکال لائی تھی۔ میں نے ان کے چہرے دیکھے تو مجھے متضاد جذبات کے عکس نظر آئے۔ کچھ اندر سے دل شکستہ تھے مگر ان کے لئے مسکرانا ضروری تھا۔ کچھ اپنی فتح مندی کے جشن طرب پر خنداں تھے اور نہیں جانتے تھے کہ وہ گردش سیاست دوراں کا شکار ہوئے۔ اصل شکاری بہت دور واشنگٹن یا ماسکو میں ان سے زیادہ مطمئن بیٹھے تھے کہ ان کی چال کامیاب رہی۔

رابعہ کے آنسو تھم گئے تھے۔ آخر وہ کب تک روتی۔ رونے

کے ایسے ہزار بہانے ہر قدم پر موجود تھے اور یادوں پر رونے کے لئے تو ساری عمر پڑی تھی۔ اس کے آنسو خشک ہو جاتے مگر سکون پھر بھی نہ ملتا۔ صدمات اور حادثات کے تسلسل نے میرے دل کو پتھر تو نہیں کیا تھا مگر کسی حد تک بے حس ہو جانا سکھا دیا تھا۔ رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج۔ تماشائے روز و شب نے آنکھوں سے حیرانی چھین لی تھی اور حقائق کا ذاتی جذبات کے بغیر مشاہدہ کرنے کی عادت سی ہو گئی تھی۔

ایک جابر تھا جو احساس کی ذہنی سطح سے بیگانہ تھا اور زندگی کو محض جسمانی ضروریات کی تکمیل سمجھتا تھا چناں چہ وہ خوش تھا کہ اس نے جو مانگا اسے مل گیا۔ کسی نے کیا کھویا' اس سے اسے کیا غرض۔ ظاہر ہے جب ایک کچھ پاتا ہے تو دوسرا کچھ گنواتا ہے۔ زندگی نفع نقصان کی بیلنس شیٹ ہے۔ غالب کی غزل نہیں کہ آدمی ہائے ہائے کرے یا واہ واہ۔

اس نے گاڑی روکی تو سب کے خیالات کی قلم ٹوٹ گئی۔

غالب نے کہا "یہاں کتنا وقت لگے گا؟"

"یہ کیا جگہ ہے؟" میں نے ایک وسیع' پرشکوہ عمارت کو دیکھ کر کہا "کیوں رکے ہیں ہم یہاں؟"

جابر نے کسی کے سوال کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا اور بولا "پاسپورٹ نکالو اور پیسے بھی۔"

کاجل نے چاروں پاسپورٹ اس کے حوالے کئے۔ میرا' نازو اور غالب کے پاسپورٹ وہی تھے جو ہم نے کلکتہ میں ایک ایجنٹ کے ذریعے بنوائے تھے۔ کل کے پاسپورٹ پر اس نے بڑی صفائی سے رابعہ کی تصویر لگوا دی تھی۔

"پیسے کام ہو جانے کے بعد....." کاجل نے کہا۔

"میں ادھار نہیں کرتا" وہ بولا۔

"بیس ہزار لے چکے ہو' اب بھی اعتبار نہیں کرتے؟"

"جابر نے اپنے باپ پر بھی اعتبار کرنا نہیں سیکھا۔ اور تم نے کون سا احسان کیا ہے مجھ پر۔ جان بچانے کی قیمت دی ہے۔"

کاجل نے نوٹوں کی ایک گڈی اس کی طرف پھینک دی "اچھا زیادہ مت بھونکو۔"

اس نے نوٹ جیب میں ڈالے اور گاڑی سے اتر کے گیٹ تک گیا جہاں ایک مسلح محافظ فولادی گیٹ کے پیچھے مستعد کھڑا تھا۔ اس نے جابر سے کچھ بات کی' پھر اس کے لئے بڑے پھاٹک میں ایک چھوٹا سا دروازہ کھول دیا گیا اور وہ اندر داخل ہو گیا۔

"یہ جابر کون ہے؟" میں نے کہا "کیا کرتا ہے؟"

"یہی سب کچھ کرتا ہے جو تم دیکھ رہے ہو" کاجل نے تلخی سے کہا۔

"میرا مطلب تھا کہ کیا دھندا ہے اس کا؟"

"یہ ملازم تھا شرما کا۔"

"کون شرما؟" میں نے کہا۔

کاجل کے بجائے غالب نے کہا "بھارتی سفارت خانے کا ایک اہم اہلکار تھا۔ جابر اس کا شوفر ہے اور یہ اسی کی کار ہے لئے کوئی اس پر شک نہیں کر سکتا اور وہ اندر چلا گیا ہے۔"

میں نے کہا "تو اس کا نام شرما تھا۔ جابر شاید یہ اطلاع دے گا کہ شرما صاحب علیل ہیں اور آج حاضر نہیں ہوں گے کہے گا کہ......"

"وہ کیا کہے گا' یہ سوچنا ہمارا کام نہیں ہے" غالب نے بات کاٹ کے کہا۔

"رائٹ۔ شرما تردید کے لئے تو آنے سے رہا۔ ابھی دو تو کسی کو پتا ہی نہیں چلے گا کہ..... ہو سکتا ہے کبھی پتا نہ چلے کسی کو کچھ بتائے بغیر کہاں غائب ہو گیا" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "تم کیوں متفکر ہو اس کے لئے؟ تمہارا تھا وہ؟ مر گیا تو مر گیا۔ دفن بھی ہو گیا۔ اب گڑے مُردے اکھا کا فائدہ؟"

میں خاموش ہو گیا۔ میری جرح واقعی لاحاصل تھی۔ ا صرف کاجل کی دل آزاری ہو رہی تھی۔ اس نے جو کچھ ہمارے لئے کیا تھا۔ اس نے شرما ہی کو نہیں' خود کو بھی قتل تھا۔ اور میں تھا کہ احسان مند اور شکر گزار ہونے کے بجا اس کے زخموں پر نمک پاشی کر رہا تھا۔

میں نے کہا "کاجل! آئی ایم سوری۔"

اس نے بے رُخی سے کہا "مجھے کسی کی ہمدردی چاہئے۔"

میں نے کہا "مجھے معلوم ہے تم مجھ سے خفا ہو لیکن کروں' میں خود اپنے آپ سے بہت خفا ہوں۔ کہ میں نے یہ کیوں کیا تھا؟"

"پلیز شٹ اپ" غالب نے کہا "اور کوئی بات نہیں کر تو خاموش رہو۔"

نازو نے کہا "تم نے تو کاجل سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ ا والد کا کچھ پتا چلا۔"

میں نے پلٹ کے شرمندگی سے کہا "کیا..... ابھی تک۔"

کاجل نے سر ہلایا "ابھی تک وہ لوٹ کر نہیں آئے او اب آئیں گے بھی نہیں۔"

"پولیس....."

اس نے میری بات کاٹ دی "پولیس بھی نہیں چاہتی کہ سراغ ملے۔ ان کی تفتیش محض ڈراما ہے' خانہ پری کی کارروائی ہے۔ وہ سب جانتے ہیں۔ اگر وہ نہیں تو اوپر والے جانتے ہیں' اسی لئے کوئی بھی پولیس پر دباؤ نہیں ڈال رہا ہے کے بغیر وہ کچھ نہیں کرتے۔ اوپر والوں کو اشارہ مل چکا ہوگا کہ دکھانے کے لئے دوڑ دھوپ جاری رکھو مگر نتیجہ کچھ نہیں نکا اور مجھے تو جابر نے بتا دیا ہے۔"

"جابر نے..... اسے کیسے معلوم ہوا؟"

غالب نے کہا "یار' وہ شرما کا شوفر تھا۔ اس کی گاڑی م

جانے کتنے لوگوں نے کیسی کیسی راز کی باتیں کی ہوں گی۔ یہ نوکر' ڈیٹر اور شوفر قسم کے لوگ ہم سے زیادہ جانتے ہیں۔ ہم اخبار پڑھتے ہیں۔ جو خبر ہی نہیں بنتی اس بات سے تو اخبار والے بھی بے خبر رہتے ہیں۔"

بجلی کی طرح میرے ذہن میں ایک خیال آیا "کہیں ایسا تو نہیں شرما....."

"جی۔ یہ بات آپ کی عقل شریف میں آگئی ہے تو امید ہے' مزید سوالات سے گریز فرمائیں گے" غالب نے کہا۔

ظاہر ہے' اس کے بعد کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی باقی نہیں تھی۔ شرما نے خود سازش کی یا سازش کرنے والوں کے سر تسلیم خم کرتے ہوئے عبدالستار چوہدری کو اغوا کرایا۔ ان یں ملتی رہی ہوں گی کہ عبدالستار چوہدری کی بیٹی ذرا بھی پاگل ہے۔ بس مغربی پاکستان میں رہ کے اس کی بنگالی قومیت کا جذبہ ہے اور وہ خطرناک حد تک پاکستانی ہو گئی ہے۔ خود عبدالستار ی اپنی سیاسی لیڈری کی دکان چلانے کے لئے بنگلہ دیش کا حامی ہے ورنہ درپردہ وہ پاکستان کے حامی عناصر کے لئے اپنے دل گوشہ رکھتا ہے۔ کاجل بچ گئی تھی مگر ستار چوہدری کو غداری ب قرار دینے والوں نے خاموشی سے مار دیا ہوگا اور یہ خبر تک جابر کے ذریعے پہنچی ہو گی۔ اس نے کاجل کو بتایا ہو گا کہ ے باپ کا اصل قاتل تو شرما ہے اور کاجل کو اس سے انتقام تو جابر ہی اس کی مدد کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ جابر کو اپنی زندگی کی ایک رات دے دے۔ اور جب کاجل نے سوچا ہو گا تو اسے مہنگا نہیں لگا ہو گا۔ وہ جابر سے اور بھی بہت سے کام لے ی۔ اس کی مدد سے وہ جان بچا کے واپس مغربی پاکستان پہنچ ی اور ہمیں اپنے ساتھ نکال کے لے جا سکتی تھی۔ جابر کسی کا خوار یا وفادار نہیں تھا۔ وہ ہوس کا پیکر تھا اور اپنی نفسانی ات میں کسی حیوان سے کم نہ تھا۔ کاجل نے اسے منہ مانگی ادا کر دی تو اس نے اپنے ہی مالک کو قتل کرانے کی ذمے بھی قبول کر لی اور نقد معاوضے کے بدلے بھارتی سفارت سے ہمارے لئے کلیرنس حاصل کرنے کا وعدہ بھی کر لیا۔

جواب طلب سوال صرف دو تھے۔ ایک یہ کہ کاجل کا جابر سے رابطہ ہوا اور ایک معمولی شوفر کی رسائی عبدالستار چوہدری تک کس وسیلے سے ہوئی؟ دوسرا یہ کہ سودا کون تھا اور اسے ار کس نے بنایا تھا؟ اس وقت میں کچھ نہیں پوچھ سکتا تھا۔ محسوس کرتی تھی کہ وہ آزادی اور زندگی کے سودے میں ت کے مقام سے گر کے طوائف کی سطح پر آ گئی اور عزت نفس بان کر کے اس نے باپ کے قاتل سے انتقام لینے کا فیصلہ بھی میں کیا۔ کسی ثبوت کے بغیر اس نے جابر کی بات کو سچ تسلیم جب کہ عبدالستار چوہدری کی پُراسرار گمشدگی ہنوز پردہ راز میں ہے۔

انہی اسباب کی بنا پر وہ یہ بھی سمجھتی تھی کہ ہماری نظروں میں اس کی عزت و وقعت پہلی جیسی نہیں رہی ہو گی اور ہمارے دل میں اس کے لئے عقیدت و احترام کے جذبات کو یقیناً ٹھیس پہنچی ہو گی۔ درحقیقت ایسا ہرگز نہیں تھا۔ ہم سب کی نظر میں کاجل کی قربانی وہ احسان تھا جس کا بدلہ ہم کبھی ادا نہیں کر سکتے تھے اور جو کچھ کاجل نے ہمارے لئے کیا تھا' اس کے بعد کاجل کے لئے ہمارے دل میں پہلے سے زیادہ عزت اور محبت پیدا ہو گئی تھی۔ اسے دلجوئی اور تسلی کی ضرورت تھی۔ اس یقین دہانی کی ضرورت تھی کہ وہ بے گھر لاوارث اور تنہا نہیں ہے۔ وہ ہمارے خاندان میں شامل ہو چکی ہے اور ہم اسے اپنا چکے ہیں۔ مشرقی پاکستان یا بنگلہ دیش میں اس کے لئے جگہ نہ سہی' پاکستان پہلے بھی اس کا تھا' آج بھی ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ نفرت کی کالی آندھی نے اس سے گھربار اور والدین کو چھین لیا تھا تو ہم سے بھی خود ہمارے اہل وطن نے جینے کے سارے سہارے چھین لئے تھے۔ ہم سب حالات کے مختلف دھاروں میں بہتے ہوئے تنہا لوگ اکٹھے ہو گئے تھے تو یہ حادثات و اتفاقات کا انوکھا کرشمہ تھا۔

ابھی صبح کے دس بجے تھے اور محسوس یوں ہوتا تھا جیسے وقت کی پرواز تھم گئی ہے۔ گزشتہ دو گھنٹوں میں بہت کچھ ہو گیا تھا جو ناقابل تصور تھا اور ناقابل یقین تھا۔ میری نظروں میں سیف اللہ اور مرجان کے چہرے تھے۔ زندگی کی تپش اور توانائی سے بھرپور۔ نہ جانے کیوں میں ان کی بے جان لاشوں کا تصور کرنے سے قاصر تھا جو بہت دور ایک چھوٹے سے کمرے کے فرش پر پہلو بہ پہلو پڑی تھیں۔ ان کی سپرد کی ہوئی امانت ہمارے ساتھ تھی اور وہ وقت مجھے خیال کی حد سے بھی دور نظر آتا تھا جب ہم سیف اللہ کی طرف سے اس کے وارثوں کو بیک وقت آنسوؤں کا اور خوشیوں کا یہ تحفہ پیش کریں گے۔ وہ بہت روئیں گے کہ ناراض ہو کے گھر' خاندان' گاؤں اور ملک سے چلا جانے والا سیف اللہ اب اتنا آگے چلا گیا ہے کہ وہ اس سے اپنے سابقہ رویّے پر معافی بھی نہیں مانگ سکتے۔ انہوں نے سیف اللہ کو اس کے حق سے محروم کیا تھا' اس کے باپ سے زمین اور پھر اس کی زندگی چھین لی تھی مگر عالی ظرف اور فراخ دل سیف اللہ نے انہیں معاف کر دیا تھا۔ کسی سے انتقام نہیں لیا تھا مگر ان سے سب رشتے توڑ لئے تھے جن کے نزدیک زر' زمین یا زن کی قیمت لہو کے رشتوں سے زیادہ تھی۔ اب اس کی اگلی نسل اور نام و نسب کا مالک لوٹ آیا تھا تو یہ خوشی کا مقام بھی تھا۔

میں نے بہت دیر سے کلیم کی آواز نہیں سنی تھی۔ پلٹ کے دیکھا تو وہ رابعہ کے کندھے سے لگا سو رہا تھا۔ مجھے اس معصوم پر بہت ترس آیا جس کو ہم جھوٹ سے بہلا رہے تھے کیوں کہ وہ سچ کا بھیانک چہرہ دیکھنے کی ہمت اور طاقت نہیں رکھتا تھا۔ ایک بہت بڑے جھوٹ کا بھرم رکھنے کے لئے ہمیں اور نہ جانے کتنے جھوٹ

بولتے تھے۔ جب ہم اسے اپنوں کے حوالے کرکے بھاگ آئیں گے اور اسے معلوم ہوگا کہ ہم بہت جھوٹے لوگ تھے تو اس کا ردِ عمل کیا ہوگا؟ اس کا معصوم ذہن اس حقیقت کو کیسے تسلیم کرے گا کہ وہ ماں باپ جن کے بارے میں اسے یقین دلایا گیا تھا کہ گاؤں میں اسے منتظر ملیں گے' ان کی لاشیں تو منتظر ہی رہ گئیں کہ ان کا وارث انہیں مٹی دے اور سیکڑوں ہزاروں میل پیچھے لوٹ کر جانا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا اپنے ماضی میں سفر کرنا۔

غالب باہر نکل کے گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑا تھا اور بے چینی سے بار بار اپنی گھڑی دیکھتا تھا۔ رابعہ اور نازو نے موقع پاتے ہی سر جوڑ کے آنسو بہانا شروع کر دیا تھا۔ ان کی فطرت بھی مجموعہ تضادات تھی۔ وہ پُرخطر حالات میں آگ اور خون کے دریا سے ہنستے کھیلتے گزر چکی تھیں۔ انہوں نے دشمنوں کے سینے گولیوں سے چھلنی کئے تھے اور ان کے دماغ پاش پاش کئے تھے۔ وہ لاشوں کو ہر حال میں دیکھ چکی تھیں۔ مسخ شدہ' کچلی ہوئی' شکستہ و نامکمل اعضا کے ساتھ' سوختہ اور لہولہان۔ اور وہ ان لاشوں پر سے ایسے گزر آئی تھیں جیسے وہ راستے کے پتھر ہوں۔ انہوں نے قید و بند میں بدترین جسمانی و ذہنی تشدد جھیلا تھا اور ہار نہیں مانی تھی۔ آج وہی ایک یتیم بچے کو ساتھ لے جاتے ہوئے اس پر ہونے والے تقدیر کے ظلم پر آنسو بہائے جا رہی تھیں۔

میں بھی بیٹھے بیٹھے تھک گیا تو باہر نکل آیا حالانکہ گاڑی کے سیاہ شیشوں کے پیچھے کوئی بھی ہماری صورت نہیں دیکھ سکتا تھا اور ہم زیادہ محفوظ تھے۔ دھوپ میں کھڑی ہوئی گاڑی میں اتنے لوگوں کی موجودگی سے حبس اور گرمی کا احساس ہوتا تھا۔ باہر کی ہوا میں فرحت بخش خنکی تھی۔

غالب نے کہا "آپ کی رونمائی ضروری تھی؟"

میں نے کہا "لوگ اتنی دیر سے تمہاری شکل کو برداشت کر ہی رہے تھے۔"

"یہ جابر کہاں مر گیا؟ آدھا گھنٹا ہو گیا۔"

"وہ مر گیا تو ہم مارے جائیں گے" میں نے ایک سگریٹ نکال کے جلائی۔

"کسی نے آکے پوچھ لیا کہ آپ مسٹر شرما کی کار میں کیوں بیٹھے ہیں تو کیا ہوگا؟"

"سوال کرنے والا شرمندہ ہوگا اور بغیر دانتوں والا منہ لے کر جائے گا۔" میں نے کہا "میرا جواب ہی ایسا دنداں شکن ہوگا۔"

"کیا کہیں گے آپ؟ میں سالا ہوں شرما جی کا۔"

"ہاں۔ اور آپ سسر" میں نے کہا "اگر کسی نے سوال کیا کہ داماد سے سسر کی عمر اتنی کم نہیں ہو سکتی تو اس کے لئے میرے پاس ایک لاجواب کر دینے والا سوال موجود ہے کہ کیا میں شرما کے سُسر کا سُسر نظر آتا ہوں؟ ہمارے پاس سدا بہار جوانی کا نسخہ ہے ورنہ میری عمر ہے اسّی سال اور شرما جی کے سُسر ہیں ساٹھ سال کے نوجوان۔"

"پہلے کہیں گے کہ میں سالا ہوں۔ پھر بتائیں گے کہ سسر کا سسر ہوں" غالب نے ہنس کے کہا۔

"کچھ رشتوں کے الٹ پھیر ایسے ہوتے ہیں" میں نے کہا "خواتین تو فوراً بتا دیتی ہیں کہ سدھیانے کے ایک رشتے سے فلاں بزرگ اس بچے کے نواسے ہیں اور ددھیال کی طرف سے نانا۔ یار' یہ کاجل اور جابر کا کیا چکر ہے؟"

"تقدیر کے چکر تو ایسے ہی ہوتے ہیں سکندر بادشاہ۔"

میں نے کہا "یہ کیسے جانتا تھا کاجل کو؟"

"کاجل کا باپ سیاسی لیڈر تھا۔ ہر قسم کے لوگ آتے تھے اس کے پاس" غالب نے کہا "ان میں شرما جی بھی تھے۔ جابر ان کو لے کر آتا تھا۔ کاجل ذرا بے باک قسم کی لڑکی ہے۔ اس نے جابر کی دلچسپی کو نوٹ کیا اور اسے بے وقوف بنا کے بہت سے کام لئے۔ یہ سب کام ایسے تھے جن سے اس کے باپ کی سیاسی ساکھ کو نقصان پہنچ سکتا تھا اور یہ ثابت ہو جاتا تھا کہ کاجل کا دماغ خراب نہیں ہے۔ وہ بہت سے سیانوں سے زیادہ سیانی ہے۔ جابر کے معاملے میں وہ دھوکا کھا گئی۔ وہ اسے چوری چھپے مکتی باہنی کے ہاتھوں مارے جانے والوں کے لواحقین کے گھر لے گیا۔ کاجل نے ان کی مدد کی اور بعض اوقات انہیں محفوظ مقامات پر پہنچایا۔ اس کے روابط پاکستان کے حامی عناصر سے بھی تھے۔ جابر اس کی توقعات کے برعکس بہت عیار ثابت ہوا۔ اس نے بہت سے ثبوت اکٹھے کر لئے اور پھر کاجل کو بلیک میل کیا۔ کاجل کی ساری ہوشیاری دھری رہ گئی۔ بے وقوف بن کے اسے لوٹنے والا مرد بہت بڑا شکاری تھا۔"

"خوش فہمی یا غلط فہمی میں کیا فرق ہے؟" میں نے کہا "خود کو بہت بڑا شکاری سمجھنے والا بھی تو شکار ہو سکتا ہے۔ کاجل اسے پھر گھیر لائی ہے اور اس بار وہ ہمارے مقابل ہے۔"

غالب نے کہا "یہ سوچنا تو بہت آسان ہے کہ اپنا کام نکل جانے کے بعد جابر کا کام تمام کر دیا جائے۔ کاجل کی تو عین یہی خواہش ہوگی۔ خود رابعہ اور نازو کے ذہن میں بھی یہ خیال آیا ہوگا مگر کیا معلوم جابر نے کیا سوچ رکھا ہے۔ وہ اپنی حفاظت کے خیال سے غافل نہیں ہوگا اور اس نے یقیناً کوئی ایسا بندوبست کیا ہوگا کہ ہم بعد میں بھی اسے نقصان پہنچانے کی نہ سوچیں۔ جانتا ہے کہ ہم سب اس کے دشمن ہیں اور پھر بھی وہ ہمارے ساتھ جا رہا ہے۔"

"کیا شرما کو واقعی خود اس نے مروایا تھا؟"

"اس نے کاجل کی خاطر یہ شرط منظور کی تھی۔ سوما کو بھی وہی لایا تھا۔"

"کہاں سے لایا تھا؟"

"اسے وہ سڑک پر لاوارث پھرتا ہوا ملا تھا۔ غالباً اس کا گھر اور گھر والے سب خانہ جنگی کی نذر ہو گئے تھے۔"

"اس کے ذہن پر صدمے کا اثر ہے؟"

"نہیں۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ وہ ذہنی طور پر پسماندہ ہے۔ ممکن ہے وہ کسی نفسیاتی ہسپتال یا کسی خیراتی ادارے سے نکل بھاگا ہو۔ جابر اسے اپنے گھر لے گیا۔ اس نے کاجل سے کہا کہ یہ لڑکا تمہارا ہر کام کر سکتا ہے' اگر تم اسے یقین دلا دو کہ تم ہی اس کی بہن ہو۔ یہ سڑک پر لوگوں سے پوچھتا پھر رہا تھا کہ میری بہن کو تو نہیں دیکھا ہے تم نے۔ کاجل نے پہلے انکار کر دیا تھا۔ پھر جابر نے اسے یقین دلایا کہ شرما ہی نے اس کے باپ کو اغوا کرایا اور قتل کرکے اپنی کوٹھی کے باغ میں گاڑ دیا ہے۔ اس نے قسم کھا کے کہا کہ وہ اس قتل کا چشم دید گواہ ہے۔"

"کیا جابر نے سچ بولا تھا؟"

"میرا خیال ہے نہیں۔ اسے خود شرما سے اپنا کوئی پرانا حساب برابر کرنا تھا۔ اس نے کاجل کے جذبات میں انتقام کی آگ بھڑکائی اور اسے اس حد تک عقل و ہوش سے بے گانہ کر دیا کہ وہ سوما جیسے نادان کو قربان کرنے پر تل گئی۔ بعد میں اس نے جو کیا تمہیں معلوم ہے۔"

"کیا واقعی عبدالستار چوہدری کو قتل کر دیا گیا ہے؟"

"اگر ایسا ہوا ہے تو اس میں تعجب کی کون سی بات ہے۔ یہاں دن رات لوگ مارے جا رہے ہیں۔ دوست دشمن کی تمیز اور تخصیص نہیں رہی۔ تاہم یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ اسے اغوا کرانے یا مروانے والا شرما ہی ہوگا۔ اور بھی بہت دشمن تھے اس کے۔"

"کاجل کی ماں بھی تو تھی۔"

غالب نے حیران ہو کے کہا "کیا تمہیں نہیں معلوم؟"

"کیا نہیں معلوم؟" میں نے کہا۔

"جب عبدالستار چوہدری کو اغوا کیا گیا تو اس کی بیوی نے حملہ آوروں کا راستہ روکنے کی کوشش کی تھی۔ کسی نے اس کے سر پر کوئی چیز ماری۔ وہ بے ہوش ہو کے گر گئی۔ اسے بعد میں ہسپتال لے گئے تھے اور وہ انتہائی نگہداشت کے یونٹ میں تھی۔ اسے ہوش نہیں آیا تھا۔ برین ہیمرج ہو گیا تھا۔ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تھا اور کہا تھا کہ انہیں گھر لے جاؤ لیکن کاجل نے کہا کہ گھر میں کس کے پاس لے جاؤں۔ کون ہے وہاں۔ میرا خیال ہے وہ مر چکی ہوگی۔"

"ماں کے لئے بھی کاجل کے دل میں کوئی جذبات نہیں؟"

"پہلی بات تو یہ کہ وہ سوتیلی ماں ہے جس کی وجہ سے عبدالستار چوہدری نے بہت کم عمر میں ہی کاجل کو گھر سے دور بھیج دیا تھا۔ وہ آٹھ سال کی تھی جب اس کی ماں کا انتقال ہو گیا تھا۔ سولہ سال وہ لاہور میں رہی۔"

"کہاں؟"

"زیادہ تر ہوسٹل میں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی گھر سے وہ جذباتی وابستگی نہیں رہی جو عام طور پر سب گھر میں رہنے والوں کی ہوتی ہے۔"

"کاجل نے مجھے بتایا تھا کہ وہ چودہ اگست' سن سنتالیس کو پاکستان کے ساتھ پیدا ہوئی تھی" میں نے کہا "اور اس کا باپ ان تین سو تیس سرکاری افسران میں شامل تھا جو نااہلی کے الزام میں برطرف کئے گئے تھے اور یہ کہ سن پینسٹھ کی جنگ ہوئی تھی تو وہ لاہور میں تھی۔ اس وقت اٹھارہ سال کی ہوگی۔"

"ہاں۔ یہ سب ٹھیک ہے" غالب نے کہا "عبدالستار چوہدری پیدائشی طور پر تو بنگالی تھی مگر ملازمت کے دوران وہ ایک بار کراچی میں بھی رہا تھا۔ اس کا باقی سارا وقت بنگال کے مختلف اضلاع میں گزرا۔ اس کی دوسری بیوی کٹر کانگریسی ذہن کی ہندو عورت ہے۔"

"اس نے ہندو عورت سے شادی کی تھی؟"

"تم ایسے حیران ہو رہے ہو جیسے یہ دنیا میں پہلی بار ہوا ہو۔ بمبئی کی فلم نگری میں تو ایسی مثالیں عام ہیں مگر یہاں بھی کم نہیں۔ مسلمانوں کے ساتھ قریبی اختلاط تھا۔ معاشرت اور معیشت پر ہندو غالب رہے۔ چناں چہ مسلمانوں نے بھی ان کے اطوار اپنا لئے۔ لو یار' وہ آ گیا۔"

میں نے پلٹ کے دیکھا تو جابر گیٹ سے باہر آتے ہوئے سنتری سے ہنس ہنس کے باتیں کر رہا تھا۔ غالباً وہ کو نسلیٹ کا پرانا ملازم تھا اور اسے سب جانتے تھے۔ ہمارے ساتھ بات کرتے ہوئے اس کا لب و لہجہ بالکل مختلف ہو جاتا تھا۔ کسی حد تک جارحانہ اور گستاخانہ۔

"چلو اندر بیٹھو" اس نے قریب آ کے حکم دیا۔

میں نے غرا کے کہا "پہلے یہ بتاؤ کام ہوا ہے کہ نہیں؟"

وہ بولا "جابر جائے اور کام نہ ہو۔"

"جابر جائے جہنم میں۔ ہم نے پیسہ دیا ہے نقد" میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

جابر نے پاسپورٹ پیچھے پکڑا دیے "پیسہ' پیسہ کیا چیز ہے؟ اگر میں اندر جا کے بیٹھ جاتا یا کسی دوسری گاڑی میں نکل جاتا تو تم میرا کیا بگاڑ لیتے؟"

"ہم بہت کچھ کر سکتے تھے" میں نے کہا۔

اس نے گاڑی اسٹارٹ کی "تم خاک بھی نہیں کر سکتے تھے۔ میں اندر سے پولیس کو صرف ایک فون کر دیتا تو کافی ہوتا۔ تم سب شرما جی کی کار میں پکڑے جاتے۔ باقی سب پولیس خود اگلوا لیتی۔"

رابعہ نے میرا پیر دبا دیا چناں چہ میں نے اس اشتعال انگیزی کو نظر انداز کر دیا "چلو تم نے احسان کیا ہم پر' یہی کہلوانا چاہتے تھے نا تم؟"

اس نے کہا "شیشے بند کر دو۔ میں اے سی چلا رہا ہوں۔"

کاجل نے پاسپورٹ غور سے دیکھنے کے بعد مجھے تھما دئے۔ میں نے اس پر ویزا اسٹمپ کو غور سے دیکھا۔ یہ ہمارے بنگلہ دیش میں داخل ہونے کا اجازت نامہ تھا جس پر تاریخ بھی پرانی ڈالی گئی تھی۔

غالب نے کہا "اگر ہم نیپال کے راستے جا رہے ہیں تو کیا اس پر نیپال کا ویزا نہیں ہونا چاہئے؟"

"عام حالات میں سرحد پر ویزا چیک ہوتا ہے' آج کل نہیں ہو رہا" جابر نے کہا "سیکڑوں ہزاروں ہر روز جان بچا کے فرار ہو رہے ہیں اور قافلوں کی صورت میں سرحد عبور کر رہے ہیں۔"

"نیپال کی حکومت اعتراض نہیں کرتی؟" غالب نے کہا۔

"حکومت پاکستان اور نیپال کے تعلقات اچھے ہیں۔ ہوائی جہاز بھی نیپال کے راستے آتے تھے۔ درمیان میں بھارت کے اوپر سے گزرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اب مہاجرین کو بھی نیپال سے ہی پاکستان جانے کی سہولت فراہم کی جا رہی ہے۔"

"مہاجرین!" میں نے تلخی سے کہا "اپنے وطن کے ایک صوبے سے دوسرے صوبے میں جانے والے آج مہاجر ہو گئے۔ ایک بار ہندو' سکھوں نے مارا تھا تو بے گھر ہوئے تھے۔ آج انہی کے ہاتھوں بے گھر ہوئے جو مسلمان ہیں اور پاکستان بنانے کی تحریک میں ان کے ساتھی تھے۔"

جابر نے کہا "میں سیاست کو نہیں سمجھتا۔"

میں نے ایک سرد آہ بھر کے کہا "ہم بھی کہاں سمجھتے ہیں اس سیاست کو۔ اخباری بیان' پریس کانفرنس' اعلانات' احتجاج اور مظاہروں' ہڑتالوں اور پاکستان مخالف جلسوں کی اس سیاست کو ہم سمجھ سکتے تو یہ سب کیوں ہوتا!"

"یہ سیاست کہاں' ایک سیاسی سازش تھی جسے خود سیاست داں بھی نہیں سمجھ پائے" غالب بولا۔

"بڑے اور پیشہ ور سیاست داں سب جانتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں' کس کے لئے کر رہے ہیں اور اس کا نتیجہ کیا نکلے گا مگر وہ صرف اقتدار چاہتے تھے۔ ہر قیمت پر۔"

میرا لہجہ اتنا تلخ ہو گیا تھا کہ غالب نے خاموشی اختیار کر لی ورنہ یہ ناگوار بحث مزید تلخی پیدا کرتی۔ کار اب خاصی رفتار سے رواں تھی اور ہم ڈھاکا شہر کے مضافات سے گزر رہے تھے مجھے وہ وقت یاد آیا جب ہم کلکتہ سے ڈھاکا پہنچے تھے اور انہی مضافات سے بڑی پریشاں حالی و درماندگی کے عالم میں خطرات کے ہمرکاب گزرے تھے۔ ہم اپنے بچھڑ جانے والے دوست محسن کی تلاش میں تھے اور محسن کے مل جانے کے بعد صورت حال یکسر تبدیل ہو گئی تھی۔ وہ گل کے ساتھ واپس جا چکا تھا اور ہم ایک ائرکنڈیشنڈ کار میں سفر کر رہے تھے جو لمحہ لمحہ خطرات کو پیچھے چھوڑتی جا رہی تھی اور ہمیں تحفظ کے یقین سے ملنے والا اعتماد عطا کر رہی تھی۔

جابر ایک ماہر ڈرائیور تھا اور اسے راستوں سے بھی شناسائی تھی۔ کہیں وہ اچانک مین روڈ چھوڑ کے سائڈ روڈ پکڑ لیتا تھا اور چکر لگا کے پھر بڑی سڑک پر طلوع ہوتے وقت بتاتا تھا کہ درمیانی حصہ خراب تھا۔ بیچ میں کوئی چیک پوسٹ تھی جو ملٹری کیمپ تھا۔ ہم اس کی تمام اطلاعات کو درست اور مصدقہ تسلیم کرنے پر مجبور تھے۔ خود کاجل ان راستوں سے ناواقف تھی۔ اس کی موجودگی کا یہ فائدہ ضرور تھا کہ ہمیں ایک بنگالی ترجمان میسر تھا جو وقت ضرورت ہمارا مقصد و مدعا فریق ثانی تک پہنچا دے اور بات کو ادھر سے ادھر کرتے وقت ہیرا پھیری نہ کرے۔ جابر اس معاملے میں قطعی ناقابل اعتبار تھا۔

تین گھنٹے میں ہم ڈھاکا سے دو سو کلو میٹر دور پہنچ گئے تھے۔ منظر ہر جگہ وہی تھا۔ گھنے درخت' ندی نالے' کچے اور بانس کے بنے ہوئے مکانات' مچھلیوں کے تالاب اور دلدلی زمین۔ حشرات الارض کی طرح زمین پر بسنے والے انسانوں کی زندگی کا انداز بھی ایک سا نظر آتا تھا۔ وہی انتہا کو پہنچی ہوئی غربت اور بے سروسامانی۔ کم اور ناقص خوراک اور حد سے زیادہ محنت مشقت کے مارے ہوئے لاغر ہڈیوں کے ڈھانچے بدن۔ ننگ دھڑنگ بچے اور برائے نام لباس میں ستر پوشی کے احساس سے بے نیاز عورتیں۔ یہ صدیوں سے ان کا رہن سہن تھا۔ ان کے آباواجداد بھی ایسے ہی جیتے تھے اور ان کی آنے والی نسلوں کے لئے بھی یہی زندگی ہو گی۔ کون بدلے گا ان کی حالت؟ کہاں سے نکلے گی ان کے نام مقدر کی وہ لاٹری جو خوش حالی' صحت' تعلیم اور بیسویں صدی کی آسائشوں سے ان کی زندگی کو بھی جینے کے اور لطف اندوز ہونے کے قابل بنا سکے۔

آرام دہ ہونے کے باوجود اس سفر میں کوئی مزہ نہیں تھا۔ ہم سب ساتھ ہوتے ہوئے بھی اپنے اپنے خیالات کے حصار میں تھے اور ہم سفر ہو کے بھی تنہا تھے۔ اجنبیت کے احساس کی فضا کے ذمے دار تین افراد تھے' جابر' کاجل اور کلیم اللہ۔ کاجل کے اپنے دکھ تھے۔ کچھ جسم کے' کچھ روح کے۔ کلیم کی بے خبری اور معصومیت کے مقابل ہم سب خود کو مجرم محسوس کرتے تھے اور جابر کا وجود نفرت انگیز تھا۔ ورنہ واپسی کے سفر میں رابعہ' نازو اور غالب میرے ساتھ ہوتے تو ہم ان راستوں سے پیدل گزرتے ہوئے بھی رفاقت کے ہر لمحے سے لطف اندوز ہوتے۔ مشکلات اور تلخئ حالات میں بھی ہنستے کھیلتے ایک دوسرے کا حوصلہ بڑھاتے۔ ابھی تو ہم سب اپنی فطری خوش مزاجی' بے تکلفی اور زندہ دلی کو بھی بھولے ہوئے تھے۔

دو بجے سے پہلے ہی کلیم جاگ اٹھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر ڈرتے ڈرتے کہا "چاچا مجھے بھوک لگی ہے۔"

اس ایک معصوم سوال نے جیسے جمود کی برف توڑ دی۔

رابعہ نے کہا "بھوک تو بھئی مجھے بھی لگی ہے مگر دیکھو نا تمہارے چاچا کو ذرا بھی خیال نہیں کہ گاڑی روکنے کو کہیں۔"

"چاچی تم کہو نا" وہ بولا "تمہاری تو مانیں گے چاچا۔"

غالب اور نازو کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی "بچہ ٹھیک کہ رہا ہے....."

رابعہ نے کہا "آخر میری کیوں مانیں گے؟"

...بابا بھی مانتا تھا اماں کی بات" کلیم نے کہا۔

...بھئی کیسی چاچی ہو تم" غالب نے کہا "ہماری خاطر نہ سہی ...خاطر ہی کہو اس کے چاچا سے۔"

...کیا تم چاچا نہیں ہو؟" رابعہ نے جھینپ کے کہا۔

...نہیں۔ میں ماما ہوں" غالب بولا۔

جابر نے کہا "آگے میرا گاؤں ہے۔ ہم کچھ دیر وہاں ٹھہریں ...

میں نے کہا "وہ کس لئے؟ ہم تمہاری میزبانی قبول نہیں ...

..."مت کرو۔ میں تھوڑی دیر کے لئے اپنے گھر جاؤں گا۔ تم کو ...پر چھوڑ دوں گا۔ ایک جگہ ہے جہاں تمہیں کھانا مل جائے ...جابر نے کہا۔

چند منٹ بعد ہی اس نے ایک روڈ سائڈ ریسٹورنٹ کے ...گاڑی روک دی۔ یہ بانس اور گھاس پھوس کی چھت والا ...سا تھا جس میں دو خستہ حال بسیں مخالف سمت میں منہ کئے ...تھیں۔ بسوں کے تمام مسافر دیہاتی تھے اور بے تکلفی سے ...پر آلتی پالتی مارے اپنے خاندانوں سمیت دال چاول کا ملغوبہ ...میں مصروف تھے۔ ہر خاندان کے بیچ میں ایک تھال رکھ دیا گیا ...تھال کا سائز خاندان کے سائز کی مناسبت سے تھا اور اسی ...ت سے اس میں چاولوں کے ڈھیر پر دال ڈال دی گئی تھی۔ وہ ...مہارت کے مطابق دائیں ہاتھ سے دال اور چاول کا ایک گولا ...ر کرتے تھے اور اسے بڑی مہارت سے حلق میں ڈال کے نیچے ...جاتے تھے۔ جتنے کم وقت میں وہ دوسرا گوال داغتے تھے' اس ...والے کو چبانے کی مہلت ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ...چھ سال کے بچے بھی اس طرح خوارک کو معدے میں منتقل ...نے کا فن جانتے تھے۔ اس سے کم عمر بچوں کی مدد ان کی مائیں ...رہی تھیں چناں چہ ان کا کام دگنا ہو گیا تھا۔

"یہاں بس یہی ملے گا" جابر نے کہا "اور ایسے ہی کھانا بھی ...ے گا۔"

نازو نے کہا "مجھے تو کراہیت محسوس ہو رہی ہے۔ دیکھو' کیسے ...الوں کی طرح ان کے پنجے چل رہے ہیں۔ پورے ہاتھ کی ...یاں اور ہتھیلی تک استعمال ہو رہی ہے۔"

غالب نے کہا "اگر تمہیں بتایا جائے کہ تمہارے آباواجداد ...بھیڑیے کی طرح شکار کو زندہ بھنبھوڑ کے کھا جاتے تھے۔ کتے' ...گدھے' گھوڑے کچھ نہیں چھوڑتے تھے۔"

"وہ تمہارے آباواجداد ہوں گے" نازو نے بگڑ کے کہا۔

"کیوں' تمہارے آباواجداد کیا ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ کے چھری ...کانٹے کی مدد سے اور نیپکن لگا کے کھاتے تھے؟" غالب نے کہا۔

"میں نہیں کھا سکتی اس طرح۔"

"مت کھاؤ۔ بھوکی بیٹھو گاڑی میں" غالب نے باہر نکل کے کہا اور کچھ دیر ہوا میں ہاتھ پاؤں چلا کے اطمینان سے زمین پر لیٹ گیا۔ پھر میں اترا اور میں نے بھی اکڑے ہوئے ہاتھوں پیروں کو قابل استعمال بنانے کے لئے ورزش کے انداز میں حرکت دی اور غالب کے قریب ہی لیٹ گیا۔ اس علاقے میں زمین کا مطلب مٹی دھول نہیں ہوتا۔ درختوں اور خودرو پودوں کے درمیان جہاں بھی جگہ ہوتی ہے وہاں گھاس اپنی قدرتی تازگی کے ساتھ سبز فرش بچھا دیتی ہے۔ اوپر آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے تیرتے ہوئے ایک سمت میں جمع ہو رہے تھے۔ رابعہ اور نازو کو بھی آخر کار باہر نکلنے پر مجبور ہونا پڑا۔ جابر کھانے کا آرڈر دینے چلا گیا۔

ہم مجمع عوام سے کچھ فاصلے پر تھے۔ ایک کار اور اس میں سے برآمد ہونے والی کوہ قاف کی پریوں جیسی مخلوق نے ایک دم سب کو دم بخود کر دیا تھا۔ ہوٹل کی انتظامیہ نے خواص کے لئے خصوصی انتظامات کا آغاز یوں کیا تھا کہ دیگر مہمانوں پر گرجنا برسنا شروع کر دیا تھا جو ہماری تشریف آوری سے قبل ضرور معزز تھے مگر ہماری موجودگی میں کسی اعزاز کے مستحق نہیں رہے تھے۔

میں نے کاجل سے کہا "یہ بڈھا کیا شور مچا رہا ہے؟ کیوں ڈانٹ رہا ہے ان بے چاروں کو؟"

غالب نے کہا "انہوں نے کھانا جو چھوڑ دیا ہے۔ غالباً انہیں خوش خوراکی کے فوائد بتا رہا ہے۔"

رابعہ نے کہا "کیسے ہکا بکا بیٹھے ہیں سب۔"

"اور کیسے پلک جھپکائے بغیر دیکھ رہے ہیں بے چارے!" نازو نے کہا۔

کاجل نے بتایا کہ پروپرائٹر اسی بات پر خفا ہو رہا ہے کہ کیا ان کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ انہوں نے پہلے امیر لوگ نہیں دیکھے۔ بس جلدی سے کھانا ختم کرو اور بس میں بیٹھ کے روانہ ہو جاؤ ورنہ ایسے ہی اٹھا دوں گا۔"

"کیا مطلب؟ پورا کھانا بھی نہیں کھانے دے گا!" رابعہ بولی۔

نازو نے کہا "پھر پورے پیسے کون دے گا؟"

کاجل نے کہا "یہاں ان سے پیسے پہلے وصول کر لئے جاتے ہیں۔"

"یعنی بل پہلے' کھانا بعد میں؟"

"ہاں۔ کسی کا کچھ پتا نہیں ہوتا کہ پورے خاندان کا پیٹ بھر جائے تو وہ گالیاں جوتے کھانے کے لئے تیار ہو کے کہنے لگے کہ کھایا پیا اللہ کے نام پر معاف کرو۔ ہوٹل والا یہ رسک نہیں لے سکتا۔ کس کس کو مارے اور مارنے سے نقصان تو پورا نہیں ہوتا۔ ان کے کپڑے بھی اتروا لے تو کہاں رکھے ضبط شدہ سامان کو۔ اس کے لئے الگ اسٹور بنائے۔ پھر اس سامان کا کیا کرے؟ آسان طریقہ یہی سمجھا جاتا ہے کہ فی عدد کے حساب سے رقم لے کر کھانا دے دیا جائے۔" کاجل نے کہا۔

"بچہ بڑا سب برابر۔"

"سات سال سے کم کا کچھ نہیں' اس سے اوپر کا پورا" کاجل نے کہا۔

"کیا یہ برتھ سرٹیفکیٹ پیش کرتے ہیں کسی بچے کے بل سے بچنے کے لئے؟" غالب نے کہا۔

کاجل مسکرائی "یہ اختیارات ہوٹل کے مالک کو حاصل رہتے ہیں کہ وہ کس کی عمر سات سال سے کم مانتا ہے اور کس کی زیادہ۔ کوئی رحم دل ہو تو آٹھ نو کو بھی سات کا تسلیم کرلیتا ہے۔ زیادہ یہودی ٹائپ پانچ چھ سال والے کے بھی پورے پیسے مانگتا ہے۔ یہ لوگ منت سماجت کے عادی ہوتے ہیں۔"

"مس کاجل! اگر کسی کے پاس کھانے کے پیسے نہ ہوں۔ یا پورے پیسے نہ ہوں۔ پھر؟" غالب نے کہا۔

"کم پیسے ہیں تو کم کھائے۔ جتنا ملے سب مل بانٹ کے کھالیں۔ پیسہ نہیں ہے تو بس میں ہی بیٹھے رہیں" کاجل نے کہا۔

میری نظر بے اختیار بس کی طرف چلی گئی۔ ہر بس میں کم سے کم دس بارہ افراد خاموش بیٹھے کھڑکی سے جھانک رہے تھے اور کھانے والوں کو زبان خاموشی سے یہ احساس دلانے کی ناکام کوشش کررہے تھے کہ وہ بھی بھوکے ہیں مگر ان کی التجا سے کسی کے دل پر اثر نہیں ہورہا تھا۔ کھانے والے کامل بے حسی کے ساتھ کھارہے تھے اور بھوکی نظروں سے دیکھنے والوں کا ان کے نزدیک کوئی وجود نہیں تھا۔ ان میں مجھے چھوٹے چھوٹے بچے بھی نظر آئے۔ معلوم نہیں کیا مجبوری تھی کہ انہوں نے بس کا سفر اختیار کیا۔ شاید وہ کسی کی موت پر جارہے تھے یا شادی میں اور جتنی رقم تھی وہ کرائے پر خرچ کرچکے تھے اور اب بھوک کو برداشت کرنے پر مجبور تھے۔

اس منظر نے ہم سب کے دلوں پر ایک سے دکھ کے احساس کی چٹان لڑھکادی تھی۔ بھوکے لوگوں کی نگاہیں اب چاول کے اس اجلے بھاپ دیتے ڈھیر کے ساتھ ساتھ گھوم رہی تھیں جو ایک بنگالی لڑکا جابر کی قیادت میں ہماری طرف لے کر آرہا تھا۔ ہوٹل کا مالک بڑے خوشامدانہ انداز میں دال سے بھرا ہوا پیالہ لئے خود پیچھے پیچھے تھا۔

اس اذیت ناک منظر نے ہم سب کے جذبات کو ایک ہی انداز میں متاثر کیا تھا۔ یکلخت دنیا دو حصوں میں تقسیم ہوگئی تھی۔ یہ تقسیم جغرافیائی' لسانی' تہذیبی یا سیاسی بنیاد پر نہیں تھی۔ دنیا دو ٹانگوں پر چلنے والے حیوان ناطق یا سوشل اینیمل کا خطاب پانے والے انسانوں کے دو متحارب گروہوں میں تقسیم ہوگئی تھی۔ یہ فساد بھا جنگ لڑنے والے' حیوانی خواہشات اور جذبات سے مغلوب خود غرض انسانوں کی وہ دنیا تھی جس میں ایک طرف فائیو اسٹار ہوٹل' نائٹ کلب' ائرکنڈیشنڈ کاروں' بنگلوں' ایل پی ریکارڈز' اعلیٰ ترین عورت' شراب' خوشبو اور ہیروں کے خریداروں کی ریل پیل تھی تو دوسری طرف ایک مٹھی چاول کے لئے بلکتے بچوں' فاقہ کشی سے دم توڑتے بیمار بوڑھوں اور پانچ روپے کے حقیر کاغذی نوٹ کے لئے جسم کو گروی رکھنے والی عورتوں کی دنیا تھی۔

یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میں پہلے طبقے میں شامل تھا جو اس وقت میرے لئے بد قسمتی کے عذاب سے بڑھ کر احساس کی شرمندگی بن گئی۔ اور ایسا صرف میرے ہی ساتھ نہیں ہوا' ہم سب نے انسانوں کے درمیان اس فرق کی اذیت کو محسوس کیا۔

"شاب شولام" بنگالی لڑکے نے اور پھر اس کے مالک نے ہاتھ اٹھا کے بہ آواز بلند کہا "میم شاب شولام۔"

میرے کچھ بولنے سے پہلے رابعہ نے کہا "یہ کھانا ادھر لے جاؤ۔"

نازو نے سرہلایا "ہاں' یہ لوگ جو بس میں بیٹھے ہیں ان کو دے دو۔"

بنگالی کا منہ کھلا رہ گیا "کیا بولا؟"

اب میں نے کہا "کاجل! اس کو تم سمجھاؤ کہ ان سب کو پیٹ بھر کے کھانا کھلائے' قیمت ہم ادا کریں گے۔ جو لوگ کھانا کھارہے ہیں انہیں بھی پریشان نہ کرے۔"

غالب نے کہا "کہہ دو کہ سب کا بل ہم سے وصول کرلے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ پہلے سب کو کھانا دے' پھر ہمارے لئے لائے۔ ہم انتظار کرسکتے ہیں۔"

کاجل نے یہ بات ریسٹورنٹ کے بنگالی مالک کو سمجھائی تو وہ ہم سب کو ایسے دیکھتا رہا جیسے اسے شک ہے کہ ہم اگر پاگل نہیں ہیں تو پھر نشے میں ہیں۔ تاہم اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا اور سرہلاتا چلا گیا۔ اس کے بعد ہم نے ایک اور تکلیف دہ منظر دیکھا۔ بس میں بیٹھے ہوئے بھوکے انسانوں کا گروہ ایسے باہر نکلا جیسے عمر قید کاٹنے والے قیدیوں پر اچانک کسی نئی حکومت کے حکم پر جیل کے دروازے کھول دیئے جائیں۔ وہ باہر نکلتے ہی کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ میں نے بچوں کو ہی نہیں' کچھ بڑوں کو بھی دونوں ہاتھوں سے کھاتا ہوا دیکھا۔ چاول کے کئی تھال خالی ہوگئے۔ دوسری طرف ان سب نے ایک ساتھ ریسٹورنٹ کے مالک کو گھیر لیا جو کھانے کی قیمت پیشگی ادا کرچکے تھے۔ بھوک نے انہیں تہذیب اور احساس سے اتنا عاری کردیا تھا کہ کسی نے ہمارا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا اور یہ بھی نہیں دیکھا کہ ان کے محسن کون ہیں۔ جو پہلے پیٹ بھر چکے تھے' انہوں نے اس دعوت عام سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دوبارہ کھانا شروع کردیا اور چلا چلا کے اپنے بیوی بچوں سے کچھ کہنے لگے۔ کاجل نے بتایا کہ وہ ان کو مجبور کررہے ہیں اور سمجھا رہے ہیں کہ ابھی موقع ہے' شام کا کھانا بھی پیٹ میں ڈال لیں۔ عورتوں کے پیٹ پہلے ہی پھولے ہوئے تھے۔ ان کے لئے اپنے مجازی خداؤں کے اعمال کی سزا میں ہر سال ایک بچہ جننا گویا ان کی تقدیر کا نوشتہ تھا۔ مجھے یقین آنے لگا تھا کہ بسیار خوری کے باعث ان میں سے کچھ ضرور بدہضمی اور اسہال کا شکار ہوں گے۔

جب یہ ہنگامہ فرو ہوا اور ریسٹورنٹ کے بنگالی مالک نے ہم سب کو رقوم کی وائگی کے جنجال سے نجات پائی تو مسافر بسوں میں

بھرنے لگے۔ ایک ہڈیوں کا ڈھانچہ نوجوان جس نے صرف نیکر پہن رکھی تھی اور ایک بوڑھا جو بالکل چلتی پھرتی لاش تھا' ڈرتے ڈرتے ہماری طرف آئے۔ قریب آکے بوڑھے نے اپنی چندھیائی ہوئی آنکھوں سے ہمیں دیکھا اور کانپتی آواز میں کچھ کہتے ہوئے اس نے میرے پیر چھونے کی کوشش کی کیوں کہ سب سے آگے میں ہی تھا۔

"کاجل! اسے منع کرو' سمجھاؤ کہ انسان کو صرف خدا کے آگے جھکنا چاہئے۔" میں نے پیچھے ہٹ کے کہا۔

کاجل نے پہلے اسے روکا اور پھر میری طرف مڑ کے بولی "تمہارا یہ فلسفہ اس کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔ ان کے لئے وہی خدا ہے جو ان داتا ہو۔"

نوجوان نے انگریزی میں کہا "سب کی طرف سے میں انسانی ہمدردی کے اس مظاہرے پر آپ لوگوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں لیکن کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ نے تصویریں کیوں نہیں بنائیں؟"

میں نے حیران ہو کے کہا "تصویریں؟"

"ہاں۔ کیمرے تو ضرور ہوں گے آپ کے پاس۔ پھر آپ نے یہ موقع کیوں ضائع کردیا؟ بہت اچھی تصویریں بن سکتی تھیں اور کہیں بھی شائع ہوسکتی تھیں۔"

میں نے کہا "میں اس بات کا مطلب نہیں سمجھا!"

"یہ تماشا دیکھنے والے' ہمارے غریب ملک میں آتے رہتے ہیں۔ کبھی غیر ملکی اخباری نمائندے' فوٹو گرافر اور سیاح۔ فاقہ کش ننگے بھوکے انسانوں کو کتوں کی طرح چھین جھپٹ کر کھاتا دیکھنے کے لئے وہ ایسی فیاضی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور پھر یادگار تصویریں بنا کے لے جاتے ہیں' اخبارات اور رسائل میں چھپوانے کے لئے۔ بعض اوقات وہ کلرک کی اسامی کے لئے ضرورت ہے کا اشتہار دیتے ہیں جب ایک بے قابو ہجوم اکٹھا ہوجاتا ہے تو وہ جیب سے کاغذ کے نوٹ نکال کے اچھال دیتے ہیں اور اعلان کرتے ہیں کہ جو سلامت نوٹ پیش کردے گا اسے ملازمت مل جائے گی۔ ظاہر ہے ہر نوٹ پرزہ پرزہ ہوجاتا ہے۔ ملازمت کسی کو بھی نہیں ملتی مگر ان کو چند بہترین شاٹ مل جاتے ہیں' کوئی انعامی تصویر بن جاتی ہے۔"

اس نوجوان کی بات چونکادینے والی ہی نہیں افسوس ناک بھی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ پڑھا لکھا اور حساس آدمی ہے جس نے مجبوری دیکھی ہے اور برداشت کی ہے۔

میں نے کہا "یہ ترقی یافتہ کہلانے والے نام نہاد مہذب ممالک کے لوگ غریب قوم کے ساتھ ایسا مذاق کرتے ہیں۔ ایشیائی' افریقی ممالک کے ساتھ تو ان کا رویہ ہمیشہ تذلیل کا ہوتا ہے مگر ہم پاکستانی ہیں' تمہارے ہم وطن اور ہم مذہب ہیں۔ یہ نیک کام ہم نے تمہاری غربت یا بے بسی کا تماشا دیکھنے کے لئے نہیں کیا تھا۔ ہمارے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ ہمارے اتنے قریب بچے تک بھوکے بیٹھے ہوں اور ہم اپنا پیٹ بھر کے ان کی طرف دیکھے بغیر چلے جائیں۔"

"ایک وقت ان کا پیٹ بھردینے سے کیا ہوگا؟ آپ کے دل کو کچھ تسلی حاصل ہوگی کہ آپ نے نیک کام کیا" وہ اسی تلخی سے بولا "کچھ ثواب بھی ملے گا لیکن یہ کل پھر بھوکے ہوں گے۔"

میں نے کہا "نوجوان! دنیا کو رزق دینے والا خدا ہے۔ ہم نے محض ہمدردی کے جذبے سے مجبور ہو کے ایسا کیا۔ ہم بھلا کیسے دعویٰ کرسکتے ہیں کہ کل بھی سب کے پیٹ بھریں گے۔ کسی کی غربت' امارت میں بھی ہمارا کیا دخل ہے۔ یہ تو صرف اتنی سی بات ہے کہ اس وقت ہم سب ایک دسترخوان پر اکٹھے ہوئے تھے۔ جو سب نے کھایا' ہم بھی کھائیں گے۔ یہ ناممکن تھا کہ اسی جگہ کچھ لوگ بھوکے بیٹھے رہیں۔ ہم نے سب کے ساتھ کھانا شیئر کیا ہے۔ اسے احسان مت سمجھو اور نہ ہماری نیت پر شک کرو کہ ہم تم پر امیر ہونے کا رعب ڈالنا چاہتے ہیں یا ہم نے ثواب کمانے کی غرض سے ایسا کیا۔"

وہ کچھ شرمندہ نظر آنے لگا "اچھا۔ آئی ایم سوری" اس نے جاتے ہوئے پلٹ کے کہا اور پھر رکا "اور ہاں۔ ان سب کی طرف سے میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ انہیں نہ احساس ہے اور نہ تمیز' تہذیب۔"

"ہمیں ضرورت نہیں ہے تمہارے شکریے کی" رابعہ نے اسے ڈانٹا۔

میں نے کہا "ایک بات بتاؤ گے سچ سچ؟"

اس نے کہا "پوچھئے۔"

میں نے کہا "تم نے غیر ملکی سیاحوں اور اخباری نمائندوں کے ذلت آمیز سلوک کی شکایت کی تھی۔ کتنی بار دیکھا ہوگا تم نے ان کا غیر انسانی تماشا؟"

"کئی بار۔۔۔۔"

"اور ہر بار تمہاری اپنی پوزیشن کیا تھی؟ تم خود بھی تماشا تھے؟ یا تماشائی رہے؟" میں نے کہا۔

اس نے سوال کو سمجھ لیا اور ندامت سے اس کا چہرہ فق ہوگیا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور تین مڑے تڑے' میلے ہوجانے والے نوٹ نکالے۔

"یوں سی؟ یہ امریکن ڈالر ہیں" اس نے کہا "ہر ایک پر تاریخ پڑی ہوئی ہے کہ یہ میں نے کب لوٹا تھا۔ مجھے یاد ہے وہ کون لوگ تھے اور انہوں نے سالم نوٹ پیش کرنے والے کے لئے نوکری کا اعلان کیا تھا۔"

"پھر تمہیں نوکری ملی؟" نازو نے پوچھا۔

"نہیں۔ نوکری ان کے پاس نہیں تھی۔ جب میں نے سالم نوٹ ان کی خدمت میں پیش کیا تو ان سب نے ایک جیسی بے غیرت اور ڈھیٹ مسکراہٹ کے بعد قہقہے لگاتے ہوئے کہا کہ ویل ڈن نوجوان' تم واقعی نوکری کے اہل ہو۔ جیسے ہی ہمیں کسی نوکری کی ضرورت پڑی ہم تمہیں امریکا بلالیں گے۔ اپنا نام پتا بتادو۔ بعد میں انہوں نے تسلیم کیا کہ وہ صرف مذاق تھا اور میں نے ان سے کہا کہ میں اس نوٹ کو ایک تعلیم یافتہ' مہذب اور جمہوریت پسند قوم کے

مذاق کی سند کے طور پر محفوظ رکھوں گا کیوں کہ یہ مذاق نہیں' تمہاری تہذیب اور شائستگی کے منہ پر طمانچہ ہے کیوں کہ تم سفاک لوگ انسانیت کی تذلیل کو مذاق اور تماشا کہتے ہو۔"

میں نے کہا "مجھے خوشی ہوئی کہ تم نے خاموش تماشائی کا کردار ادا نہیں کیا اور اپنی قوم کی طرف سے ان کے منہ پر اچھا طمانچہ مارا۔"

غالب نے کہا "ایک ہمدرد ہم وطن اور ہم مذہب کی حیثیت سے میں تمہیں ایک پیش کش کرتا ہوں۔ اپنا نام پتا مت دو' میرا نام پتا لکھ لو۔ اگر ضرورت محسوس ہو تو مجھے خط لکھ دینا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں ملازمت مل جائے گی' باعزت طور پر اور کسی احسان کے بغیر۔"

"شکریہ" اس نے رکھائی سے کہا "تم میرے ہمدرد اور ہم مذہب ضرور ہو اور اچھے آدمی بھی ہو مگر میرے ہم وطن نہیں ہو۔ تم بھی غیر ملکی ہو اور میں ملازمت کے لئے اپنا وطن چھوڑ کے تمہارے وطن نہیں آسکتا۔ میں یہیں بھوکا مرنا پسند کروں گا۔"

وہ ایک دم پلٹا اور چلا گیا کیوں کہ بس میں مسافر ٹھونسے جا چکے تھے اور دو بار ڈرائیور نے ہارن دے کر اس نوجوان کو متوجہ کرانے کی کوشش کی تھی۔ پھر رائے عامہ اور ریسٹورنٹ کے مالک نے اسے مجبور کر دیا کہ صبر سے کام لے۔ جاتے جاتے وہ نوجوان جو تعلیم یافتہ تھا' حساس ذہن رکھتا تھا اور غیرت مند بھی تھا' ہمارے منہ پر بھی طمانچہ مار گیا تھا۔ مجھے اس سے امید نہ تھی کہ وہ بھی ذہنی طور پر نفرت اور تعصب کے جذبات میں اندھا ہو گا' اس حد تک کہ ہم بھی جو کل تک اس کے ہم وطن پاکستانی تھے آج "غیر ملکی" ہو جائیں گے۔

رابعہ نے افسوس سے کہا "یہ کتنے دکھ کی بات ہے کہ پڑھے لکھے لوگ بھی ہم سے بدظن ہو گئے ہیں۔"

میں نے کہا "یہ اجتماعی شعور کی مسموم فضا کا نتیجہ ہے۔ ایسے ہی ہٹلر نے اپنی پوری قوم کو جنگ کے جنون میں مبتلا کر دیا تھا اور اس جذبات کے ریلے میں پڑھے لکھے' ذہین اور دانشور تک بہہ گئے تھے۔"

غالب نے کہا "شاید ان کے جذبات کی یہ کیفیت ایک وقتی ردِ عمل ہے۔"

"شاید نہیں' یقیناً" میں نے کہا "یہ ایسا ہی ہے جیسے بڑے بھائی کے غلط رویے پر احتجاج کرتے ہوئے چھوٹا بھائی گھر چھوڑ دے۔ اسے بہت جلد پشیمانی کا احساس ہونے لگتا ہے کہ اس کا ردِ عمل مجہانہ حد تک غلط تھا۔ مگر بہرحال گھر گھر ہوتا ہے' گھر کے جھگڑے گھر میں ہی طے کئے جا سکتے ہیں' اس کے لئے گھر کو ختم نہیں کیا جا سکتا اور نہ گھر سے تعلق کو۔ بہکانے والے اور لڑانے والے تو موقع ڈھونڈتے ہیں۔"

غالب نے کہا "ہاں۔ ابھی ان بیچاروں کو کیا معلوم کہ عالمی سیاست کے سازشی شکاری ان کا گھر انہی کے ہاتھوں تباہ کرا چکے ہیں۔ انہوں نے اسی طرح کوریا کے دو حصے کئے تھے اور ویتنام کے۔ تقسیم کرو اور حکومت کرو۔ ان کا پرانا فارمولا ہے' اسی سے ان کی بالادستی قائم ہے۔ یہ پہلے اپنا اسلحہ بیچتے ہیں اور لڑاتے ہیں' پھر جنگ سے مفلوج اور معذور ہو جانے والوں کے ہمدرد بن کے پہنچ جاتے ہیں۔ تعمیر نو اور آباد کاری کے نام پر اپنا فالتو مال نکالتے ہیں اور فالتو افرادی قوت کو کھپاتے ہیں۔ فوجی طاقت کا توازن بحال کرنے کے لئے متروک ساز و سامان دیتے ہیں۔ ان کے پرانے اسلحہ بنانے والے کارخانے بند نہیں ہوتے۔"

ہمیں باتیں کرنے کا موقع اس لئے مل گیا تھا کہ دال چاول ختم ہو گئے تھے اور ہمارے لئے اسپیشل ڈش کے طور پر مچھلی بھی پکائی جا رہی تھی۔ یہ سب جلد تیار ہو جانے والی چیزیں تھیں۔ اسی دوران جابر بھی اپنے گھر چلا گیا تھا۔ پندرہ منٹ کے بعد جب ہمیں کھانا فراہم کیا گیا تو اس کا ڈھنگ ہی اور تھا۔ عام کھانے میں موٹے چاول تھے' اب بہترین خوشبودار باسمتی پکائے گئے تھے۔ دال میں بگھار دیا گیا تھا اور مچھلی اضافی تھی۔ تاہم اسے کھانا مشکل کام تھا۔ ایک تو مچھلی کو تالاب سے پکڑ کے براہ راست پکا لیا گیا تھا۔ ان کی صفائی ضروری نہیں سمجھی گئی تھی چناں چہ شوربے کے ایک تالاب میں مچھلیاں ناک' منہ اور آنکھوں سمیت ڈوبی ہوئی تھیں۔

نازو نے برا سا منہ بنا کے کہا "میں تو نہیں کھا سکتی یہ مچھلی۔"

غالب نے کہا "کھاؤ گی کیسے؟ کھانے سے پہلے پکڑنے کے لئے تمہارے پاس بنسی اور ڈور ہے؟"

میں نے کہا "مچھلی کی جان مفت میں گئی۔ پانی کے تالاب سے نکلی تو اس شوربے کے تالاب میں ڈوب گئی۔ کھایا کسی نے بھی نہیں۔"

غالب نے کہا "میں اپنے کمینے میزبان کا دل رکھنے کی کوشش ضرور کرتا مگر مجھے معلوم ہے' اس مچھلی کے کھانے سے کیا ہو گا۔"

"کیا ہو گا؟" میں نے کہا۔

"انتقال پُرملال" غالب نے دال چاول کو مضحکہ خیز انداز میں ہاتھوں سے منہ میں ڈالنا شروع کیا "وہ ایسے کہ اس میں ہوں گے صرف کانٹے۔ یہ بنگالی ایسی ہی مچھلی پسند کرتے ہیں جس میں مچھلی کم سے کم اور کانٹے زیادہ سے زیادہ۔"

نازو ہنسنے لگی "ہاں۔ اور ایسے ماہر ہوتے ہیں یہ لوگ کہ منہ میں کانٹے جمع کرتے جاتے ہیں اور پھر پان کی پیک کی طرح تھوک دیتے ہیں۔"

"لیکن میں تو ماہر نہیں ہوں۔ ایک مچھلی کھائی تو دس کانٹے حلق میں پھنس جائیں گے۔"

میں نے کہا "ہم اس کا سوپ تو استعمال کر سکتے ہیں مس رابعہ۔"

"تم کرو" رابعہ نے کہا "دیکھتے نہیں مچھلی کے پیٹ سے آلائش تک تو نکالی نہیں ہے۔"

"مچھلی پکانے والے کے جذبات کا خون ہو گا' نقصان الگ" میں نے کہا۔

"بالکل غلط" نازو بولی "وہ تو بہت خوش ہو گا۔ پوری قیمت وصول کر لے گا اور یہ مچھلی اگلی بس کے مسافروں کو خصوصی رعایتی قیمت پر فروخت کر دے گا۔"

"یہ تو ہم سے اسپیشل ریٹ چارج کرے گا۔ سمجھ گیا ہے تاکہ ان سے پیسہ کھینچا جا سکتا ہے۔" رابعہ نے اس کی تائید کی۔

"تم دیکھنا' میں کیسے حساب کرتا ہوں اس سے ایک ایک پیسے کا۔" غالب نے کہا۔

"اب تم کچھ نہیں کر سکتے۔ بسوں کے مسافر گئے۔ کس نے کتنے پیسے دیئے تھے۔ اس کو کتنے واپس ملے' یہ حساب تو اسی وقت ہو سکتا تھا جب وہ لوگ موجود تھے۔ اب وہ جو مانگے خاموشی سے دے دو" نازو نے کہا۔

نازو کی بات بالکل ٹھیک تھی۔ ہم سب کھانے سے فارغ ہوئے تو ہوٹل کے مالک نے اپنی طرف سے بہت حساب کتاب کرنے کے بعد مجموعی رقم چار سو پچاس روپے پچاس پیسے بتائی۔ پھر بولا "پوچاش پیسہ سورو۔"

"جی؟ کیا فرمایا آپ نے" غالب بولا۔

میں نے کہا "تمہیں خصوصی ڈسکاؤنٹ دے رہا ہے کہ پچاس پیسے چھوڑ دو۔ چار سو پچاس روپے دے دو۔"

"چار سو پچاس؟" غالب نے چلّا کے کہا "سور کا بچہ لوٹنا چاہتا ہے ہمیں۔ فائیو اسٹار ہوٹل کے ریٹ لگا رہا ہے۔ چار سو پچاس جوتے ماروں گا۔"

"یہ کاروبار ہے مسٹر مرزا غالب۔ اس کی جگہ تم ہوتے تو تم بھی یہی کرتے۔" نازو نے غالب سے کہا "اب شور مت کرو۔"

"تم کہہ رہی ہو کہ میں بھی اتنا ہی کمینہ ہوں" غالب نے کہا۔

"نہیں۔ وہ کچھ کم ہے تم سے" نازو نے کہا۔

"اچھا تو پھر تم یہیں رہ جاؤ۔ اسی کے ساتھ باقی زندگی گزار دو۔ دال بھات اور مچھلی کھاؤ' ہوٹل چلاؤ اور خوش رہو" غالب نے کہا "میں اس سے زیادہ کمینہ ہوں۔ میں واپس جا کے شادی کر لوں گا مسرت نذیر سے یا نیلو سے اور اپنے بھوت سسر سے کہوں گا کہ تم کو فوراً عاق کرے۔"

ہوٹل کا مالک کچھ سمجھا تھا اور کچھ نہیں سمجھا تھا کہ فساد کی وجہ کیا ہے۔ وہ مظلوم صورت بنا کے نقش فریادی بنا کھڑا تھا۔

"شاب! ہومارا پیشہ۔ ہم گوریب۔"

غالب نے کہا "غریب کے بچے! یہ ساڑھے چار سو کیسے ہو گئے؟ کیا لیتے ہو تم ایک آدمی سے دال بھات کا؟ مجھے اس لڑکے نے سب بتا دیا ہے۔"

غالب کی چال کامیاب رہی "اسّا شوب۔ زو آپ کا کھوسی۔ ہم سار شو بولتا" اس نے چار انگلیوں سے وضاحت کی۔

"چار سو؟" غالب بضد تھا کہ اس سے پیسے پیسے کا حساب کرے "ہم ایک بات بولے گا۔ دو سو۔"

اس نے واویلا شروع کیا "ہم مور زائے گا شوب۔ گوریب آدمی۔"

غالب نے ڈانٹ کے کہا "سیدھی طرح حساب کرو۔ ایک آدمی کا کیا لیتے ہو تم۔ ایک روپیہ۔ دو بسوں میں کتنے مسافر تھے جن کو تم نے ہماری طرف سے کھانا کھلایا؟ اور یہ جو کھانا ہم نے کھایا' یہ کیا تھا آخر؟ مچھلی کس نے مانگی تھی؟ اور ہم مچھلی پکڑتے کیسے بغیر بنسی ڈور کے۔ کیا غوطہ مارتے شوربے میں؟"

چوں کہ ابھی تک جابر لوٹا نہیں تھا اسلئے ہم نے محض تفریح کے لئے یہ بحث چلنے دی۔ کاجل ابھی تک کلیم کے ساتھ الگ بیٹھ کے کھا رہی تھی اور اسے کھلانے میں اتنی مصروف تھی کہ ہماری گفتگو میں شریک نہیں تھی۔ اب اس کو ثالث کا کردار ادا کرنا پڑا۔ میزبان مصر تھا کہ ہر بس میں اندر باہر' اوپر نیچے سب ملا کے سو افراد سے کم نہیں تھے۔ غالب اس حساب کو غلط ثابت کرنا چاہتا تھا۔ آخر کار تین سو پر سودا ہو گیا' بشرطیکہ اس میں چائے بھی شامل کی جائے جو ہم پئیں گے۔

غالب نے اسے تین نوٹ پکڑائے تو اس کی ساری خوشی خاک میں مل گئی جو اسے ہم جیسے سخی اور فیاض طبع دولت مند مہمانوں کی آمد پر ہوئی تھی۔ ہم میں سے ایک حساب کتاب میں کسی بنیئے سے کم نہیں تھا۔

جابر کے آتے ہی ہم نے جلدی جلدی چائے ختم کی اور گاڑی میں جا پہنچے۔ جابر کے ساتھ ایک اور شخص بھی آیا تھا جو ہم سب کو غور سے دیکھتا رہا اور پھر واپس چلا گیا۔

"یہ کون تھا؟" میں نے کہا "ایسے کیوں گھور رہا تھا ہمیں؟"

"یہ میرا بڑا بھائی تھا" جابر بولا "اسے میں نے بتا دیا ہے کہ میں کس کے ساتھ اور کہاں جا رہا ہوں تاکہ تم مجھے کہیں مار کے میری لاش کسی پہاڑ سے نیچے نہ پھینکو۔ میں نے رقم بھی اس کے پاس رکھوا دی ہے۔"

"ایسی صورت میں کیا اسے خوشی نہیں ہو گی کہ تمہارے ساتھ سچ مچ یہی کیا جائے" غالب نے برہمی سے کہا "ابھی تک یہ ہمارے دماغ میں نہیں تھا۔"

"دماغ میں کوئی خیال کسی وقت بھی آ سکتا ہے" وہ بولا۔

میں نے کہا "اگر ہم نے ویسا ہی کیا جیسا تمہیں اندیشہ تھا۔ تو تمہارا یہ بڑا بھائی کیا کر لے گا؟"

"یہ میں ابھی نہیں بتا سکتا" وہ بولا "تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ جابر کچا شکاری نہیں ہے۔"

"تم شکاری ہی نہیں ہو جابر۔ ابھی تم نے شکاری دیکھے بھی

نہیں ہوں گے۔" میں نے کہا "خدا کا شکر ادا کرو کہ ہم دھوکے میں رکھ کے کسی کو نہیں مارتے اور زبان کا پاس رکھنا جانتے ہیں۔ ورنہ تمہارا یہ بھائی کیا، کوئی بھی نہ تمہیں بچا سکتا تھا اور نہ ہمارا کچھ بگاڑ سکتا تھا۔ لیکن ایک بات کا خیال رکھنا تم بھی۔ کوئی یہ سمجھے کہ ہمیں دھوکا دے سکتا ہے، ہماری مجبوری سے فائدہ اٹھا کے ہمیں بلیک میل کر سکتا ہے تو....."

"لعنت دھوکا دینے والے پر" جابر نے کہا "دھوکا دینے کے لئے میں تمہارے ساتھ اتنی دور کیوں آتا؟ وہیں پکڑوا دیتا تمہیں۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ جنگ ختم ہوگئی ہے مگر وہ انعام باقی ہے جو تمہاری گرفتاری پر تھا۔"

کاجل نے فوراً مداخلت کی "چلو چھوڑو، جب کسی کی نیت میں فتور نہیں تو پھر بحث سے کیا فائدہ۔"

گاڑی پھر پوری رفتار سے پہاڑی راستے پر دوڑنے لگی۔ آہستہ آہستہ پہاڑوں کی بلندی میں اضافہ ہو رہا تھا اور سڑک جو پہلے سیدھی جا رہی تھی۔ اب جگہ جگہ موڑ کاٹ رہی تھی۔ پھر دیکھتے دیکھتے بادل گہرے ہوگئے اور دس منٹ بعد موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ پہاڑوں کے اوپر سے پانی کا ریلا سڑک پر آ رہا تھا اور ڈرائیونگ زیادہ خطرناک ہوگئی تھی لیکن جابر نے گاڑی روکی نہیں تھی۔

اچانک رابعہ نے میرے کان میں کہا "وہ شخص جو جابر کے ساتھ آیا تھا وہ جابر کا بھائی نہیں ہو سکتا۔"

"کیا تم نے اس کی ولدیت نوٹ کی تھی؟" میں نے کہا۔

"مذاق کی بات نہیں۔ نازو نے بھی دیکھا تھا؟"

"کیا دیکھا تھا۔"

"ان کے چہرے بالکل مختلف تھے" رابعہ نے کہا "جسمانی ساخت کے اعتبار سے بھی وہ......"

میں نے کہا "بی بی جی! یہ تھیوری جس کی بنیاد قیاس پر ہے......"

رابعہ نے میری بات کاٹ دی "یہ قیاس آرائی نہیں ہے۔ جب میں نے کاجل سے پوچھا تو اس نے تصدیق کی۔ اس نے دونوں کی گفتگو سنی تھی۔ شاید وہ بھول گئے تھے کہ ہم میں ایک بنگالی سمجھنے والی بھی ہے۔ کاجل انجان بن گئی تھی اور کلیم سے باتیں کرنے لگی تھی مگر اس کا دھیان ان کی طرف تھا۔"

"کون تھا وہ؟" میں نے سنجیدہ ہو کے کہا۔

"کوئی پولیس کا آدمی تھا" رابعہ نے کہا "اس نے کہا تھا کہ تم فکر مت کرو۔ میں آگے ہر چوکی پر اطلاع کر دوں گا۔"

"کیا اطلاع کرے گا؟"

"پولیس چوکی والوں کو کیا اطلاع فراہم کی جا سکتی ہے؟" رابعہ نے چڑ کے کہا۔

"ضروری تو نہیں کہ اطلاع ہمارے بارے میں ہو" میں نے کہا۔

"اور کس کے بارے میں ہوگی؟"

میں نے کہا "خاتون! اطلاع سے یہ نتیجہ اخذ کرنا محض قنوطیت ہے۔ ممکن ہے وہ اپنے بھائی کی مدد کرنے کے لئے اس کے راستے کی رکاوٹیں دور کرنا چاہتا ہو۔"

"وہ اس کا بھائی نہیں تھا" رابعہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "تم چاہو تو پوچھ لو۔"

"یعنی جابر سے پوچھوں؟ کیا کہوں اس سے کہ اسے اپنا بھائی ثابت کرے ورنہ....."

"کاجل نے ایسی باتیں بھی سنی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ بھائی نہیں تھے" رابعہ نے کہا۔

"مثلاً؟ میں ذرا دور ہوں ورنہ خود انٹرویو لیتا کاجل کا۔"

"پہلے تو جابر نے اسے بتایا کہ وہ ماں اور بیوی کی وجہ سے پریشان ہے۔ دونوں کو لڑنے کے سوا کوئی کام نہیں۔ اس حد تک ایک دوسرے کی ضد ہیں وہ کہ ساس خودکشی کرنے کا اعلان کرے تو بہو کہے گی کہ بڑھیا تو جان چھڑانا چاہتی ہے مجھ سے۔ ٹھہر، پہلے میں مروں گی۔ بہو زہر کھانے لگے تو ساس چھین لے گی کہ ڈائن کیا سب تو کھا جائے گی" مجھے ہنسی آئی تو جابر نے پلٹ کے دیکھا۔

"آہستہ بولو" میں نے رابعہ کو ڈانٹا۔

رابعہ نے خفگی سے کہا "خود ٹھٹھا مار کے ہنسے تھے، اپنے آپ پر کنٹرول نہیں ہے۔"

میں نے کہا "میرا کنٹرول تمہارے ہاتھ میں ہے۔ خیالات کا، جذبات کا اور کسی حد تک حرکات و سکنات کا۔ میرے مستقبل کا، گھربار اور بال بچوں کا۔"

رابعہ دوسری طرف دیکھنے لگی۔ یہ اعلان تھا کہ اس طرح مجھ سے کوئی بھی بات نہیں کی جا سکتی کیوں کہ میں سنجیدہ نہیں ہوں۔

مجبوراً مجھے سنجیدہ ہونا پڑا "بھئی سوری۔ چلو میں تمہاری اطلاع پر تشویش میں مبتلا ہو جاتا ہوں۔"

"نہیں، آپ ہنستے رہیں۔"

"دراصل ہنسی مجھے اس خیال پر آئی تھی کہ تمہاری بھی ساس زندہ ہوتی تو کیا ہوتا؟ یہ ایک بین الاقوامی مسئلہ ہے بلکہ بیماری ہے، جو تقریباً ہر عورت کو ایک خاص عمر کو پہنچ کے لاحق ہوتی ہے اور اس کا وائرس بہو اپنے جہیز میں ساتھ لاتی ہے۔ تم اے ایس بی کا انجکشن لگوا لو" یہ آخری بات میں نے زور سے کی۔

"کیوں، مجھے کیا ہوا ہے؟" رابعہ نے منہ پھلا کے کہا۔

"ہوا تو نہیں مگر احتیاط کے طور پر چیچک، پولیو اور ٹائی فائڈ وغیرہ سے بچاؤ کے ٹیکے بھی تو لگوائے جاتے ہیں۔ اے ایس بی" میں نے آواز بلند کہا۔

نازو فوراً متوجہ ہوگئی "اے ایس بی کا انجکشن! یہ کیا ہوتا ہے؟"

میں نے کہا "حفظ ماتقدم کے طور پر تمہیں بھی لگوا لینا چاہئے۔"

غالب نے سر گھما کے دیکھا "یہ کون سا حفاظتی ٹیکہ ہے اور کس لئے؟"

میں نے کہا "صرف عورتوں کو لگتا ہے۔ جب وہ ساس بنتی ہیں نا، تو ان پر ایک خطرناک وائرس حملہ کرتا ہے جس سے بہو کے خلاف دل میں فاسد خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ بہو کو بھی لگایا جائے تو دہرے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ زندگی امن و سکون کے ساتھ گزرتی ہے" میں نے کسی محقق کی طرح کہا "اے ایس بی یعنی اینٹی ساس بہو وائرس کا ٹیکہ....."

غالب ہنسنے لگا "مگر یار، یہ تو محفوظ ہیں اس وائرس سے۔"

میں نے کہا "برخوردار! یہ مستقبل کی منصوبہ بندی ہے۔ تیرا کیا خیال ہے، یہ کبھی ساس نہیں بنیں گی؟"

غالب نے عقیدت سے سر ہلایا "بجا ارشاد۔ کہاں سے ملے گا یہ انجکشن؟"

"مجھے کیا معلوم۔ جب ایجاد ہوگا تو ہر جگہ ملے گا اور سب سے زیادہ لگوایا بھی جائے گا۔"

نازو نے جھلا کے کہا "سٹھیا جانے کا وائرس بھی تو ہوتا ہے۔ تم ابھی سے اس کا انجکشن لگوالو۔"

"اب بے کار ہے نازو" رابعہ نے کہا "ان پر وائرس کا حملہ ہو چکا ہے۔ یہ سٹھیا چکے ہیں۔"

جابر بھی ہمارے ساتھ ہنسنے لگا "سکندر خان نے ٹھیک کہا۔ میری بیوی ویسے بڑی اچھی عورت ہے۔ فرماں بردار، ہنس مکھ اور ملنسار۔ ماں بھی سب کے ساتھ بڑی شفقت اور محبت کا سلوک کرتی ہے۔ دنیا میں کسی کو ان سے شکایت نہیں ہوگی، سوائے ایک دوسرے کے۔ یہ واقعی مرض ہوتا ہے جس کا کوئی علاج نہیں۔"

"علاج تو ہے جابر خاں" غالب نے کہا۔

"کیا علاج ہے جی؟"

"تم مزید تین شادیاں کر لو۔ ایک ساس کے مقابلے میں چار بہوئیں ہوں گی تو ظاہر ہے طاقت کا توازن......"

جابر ہنسا "مگر پھر وہ جو آپس میں لڑیں گی؟"

غالب نے کہا "اس کا بھی حل ہے۔ خدا نے ہر مسئلے کا حل رکھا ہے جابر خاں۔ بہت آسان علاج ہے۔ ان سب کو ایک دائرے میں کھڑا کرو۔ ایک بیوی کو مشرق میں، دوسری کو مغرب میں، تیسری بہو شمال میں تو چوتھی جنوب میں۔ خود درمیان میں کھڑے ہو جاؤ اور چاروں طرف گھوم کے ایک درجن بار کہو۔ طلاق۔"

رابعہ نے کہا "مگر اپنے کفن دفن کا انتظام پہلے کر لینا۔"

اب نازو بھی بولی "ہاں۔ بہتر ہوگا اگر سر سے کفن باندھ کے یہ عمل قبرستان میں ہی کیا جائے۔"

ہمیں مسلسل ڈرائیونگ کرتے ہوئے پانچ گھنٹے ہوگئے تھے۔

جابر نے راستے میں دو بار ٹینک میں پٹرول بھروایا تھا اور بیس بیس لیٹر کے دو جیری کین ابھی تک گاڑی میں محفوظ تھے۔ اس پورے سفر میں بھی ان گنت ندی نالے اور دریا آئے تھے مگر جابر ان راستوں سے اچھی طرح واقف تھا، جیسے ہم لاہور، پنڈی کے راستے کو جانتے تھے کہ کہاں موڑ آئے گا، کہاں پٹرول پمپ ہوگا اور کہاں پل۔ کس شہر سے گزرتے ہوئے کون سی سڑک پر یک طرفہ ٹریفک ہوگی اور باہر جانے والا راستہ کدھر ملے گا۔ جہاں ضرورت محسوس ہوئی اس نے کشتی یا فیری کے ذریعے کار کو پار اتارا مگر بیشتر مقامات پر اس نے گھوم پھر کے کوئی پل تلاش کر لیا یا ایسی جگہ دیکھی جہاں پانی کم تھا اور کار کو اس میں سے گزارا جا سکتا تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ کہاں پانی کی گہرائی خطرناک نہیں ہوگی اور پانی کی سطح کے نیچے خطرناک گڑھا یا دلدلی زمین نہیں ہوگی۔

رات کا اندھیرا پھیلنے لگا تو اس نے ہم سے پوچھا کہ کیا ہمارا ارادہ کہیں رک کر رات گزارنے کا ہے۔

میں نے کہا "تمہارا تجربہ کیا کہتا ہے۔ کیا رات کا سفر غیر محفوظ ہوگا؟"

"نہیں۔ خطرے کی بات تو کوئی نہیں" وہ بولا

"پھر کیا بات ہے؟"

"آپ لوگ مسلسل سفر سے تھک گئے ہوں گے۔"

میں نے کہا "تھکن کا علاج تو یہ ہے کہ کچھ دیر کے لئے رک جائیں۔ رات کا کھانا آخر کہیں تو کھائیں گے۔"

اس نے سوچ کے کہا "ہوٹل تو کوئی ہوگا نہیں۔ ہوا تو بند ملے گا اس تو لیکن کھانے کا بندوبست ہو جائے گا۔"

"کیسے ہو جائے گا؟"

"کسی کے گھر سے۔ یہ غریب لوگ ہیں، پیسے لے کر سب کچھ کر دیتے ہیں۔" وہ بولا "اپنا سب کچھ بیچ سکتے ہیں۔"

"تمہارا مطلب ہے ضمیر، ایمان؟"

"میرا مطلب تھا، بیوی بچے تک" وہ تلخی سے بولا "ایمان وہ اپنے پاس رکھ لیتے ہیں دوسری دنیا کے لئے۔"

"وہ کھانا پکا کے دیں گے؟" غالب نے کہا۔

"آپ کسی کو سو کا نوٹ دکھائیں" وہ بولا "وہ کھانا پکائے گا اور حکم ہوگا تو ایک ٹانگ پر کھڑا رہ کے کھلائے گا۔ دوسرا نوٹ دکھائیں گے تو اپنی بہو بیٹی کو رات بھر آپ کی خدمت پر مامور کر کے خود گھر سے چلا جائے گا۔ غریبی بری چیز ہے سر۔ آپ کا اس سے واسطہ نہیں پڑا ہوگا۔ یہاں نہ نوکریاں ہیں نہ روزگار۔ دفتر، کارخانے کاروبار سب شہروں میں ہوتے ہیں لیکن پیٹ تو یہاں بھی اتنا ہی کھانے کو مانگتا ہے۔ یہ تو چوری بھی نہیں کر سکتے اور نہ ڈاکے ڈال سکتے ہیں۔ سب ایک سے کنگال ہیں۔ جو میلوں میں کوئی دولت مند ہے تو اس کا گورکھا یا پٹھان چوکیدار آدمی کو ایسے گولی مار دیتا ہے معمولی سے جرم پر جیسے وہ انسان نہیں پاگل کتا ہے۔ اور حقیقت

بھی یہی ہے۔ یہ انسان کہاں ہیں' جو کتے سے بدتر زندگی گزارتے ہیں۔ نہ ان کے لئے تھانے نہ کچہری ہے۔ سوری..... میں بہت بول گیا۔ میں نے سوچا' آپ کو اس دنیا کا ظاہری حسن تو نظر آرہا ہے' اس کے پیچھے کتنی بدصورتی ہے' وہ بھی نظر آجائے۔"

میں نے کہا "جابر خان! ایسا تو ہر جگہ ہے۔ افریقہ بڑا خوب صورت ملک ہے۔ کشمیر کو دیکھو یا مری سے سوات تک پھیلے ہوئے حسن قدرت کو۔ غربت بھی وہیں زیادہ ہے۔"

اس نے کار کو ایک کچے مکان کے عقب میں لے جاکر روک لیا جہاں سے کوئی اسے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ پھر اس نے سامنے سے دروازے پر دستک دی اور ایک بوڑھے آدمی سے باتیں کرتا رہا۔ اس نے اچھی طرح دیکھنے کے بعد وہ گھر منتخب کیا تھا۔ وہاں مرغیوں کے دڑبے بھی نظر آرہے تھے۔ اس کا اندازہ بھی درست تھا۔ سو روپے میں ہم نے تازہ پکا ہوا کھانا کھایا جس میں بھنی ہوئی مرغی کے ساتھ گرم روٹی تھی جو بیک وقت دو عورتوں نے الٹے توے پر گیلی لکڑیوں کے دھوئیں کی پروا کئے بغیر پکائی تھیں۔ جابر کی باتیں سننے کے بعد مجھ میں اتنی ہمت نہ رہی تھی کہ میں اندر جھانک بھی سکتا اور دیکھتا کہ ان کوہساروں' آبشاروں اور مرغزاروں کی حسین آغوش میں پرورش پانے والی عورت کے حصے میں کتنا حسن آیا ہے۔

ہمارا میزبان اس لئے خاموش رہا کہ وہ ہم سے مرعوب تھا اور ہم نے اس سے کوئی بات اس لئے نہیں کی کہ ہم اپنی "امارت" سے شرمندہ تھے اور ہماری خوش حالی جو رنگ روپ' لباس اور کار کے علاوہ سو کے نوٹوں سے عیاں تھی' ہمارے احساس کے لئے ایک جرم بن گئی تھی۔

تقریباً دو گھنٹے بعد ہم پھر روانہ ہوئے تو تازہ دم تھے۔ رات کا باقی حصہ خاموشی سے سفر میں کٹا۔ میں اور رابعہ کچھ دیر آپس میں باتیں کرتے رہے' پھر میں آگے غالب کی جگہ بیٹھ گیا اور غالب پیچھے آکے سو گیا۔ کلیم بالکل خاموش رہا تھا اور سب سے پہلے سو گیا تھا۔ کاجل بھی اپنی ساری شوخی اور طراری بھول گئی تھی اور شاید گھر سے دوری کا احساس اور ماں باپ کو ایک ساتھ کھو دینے کا غم وقت کے ساتھ ساتھ بڑھنے والا بوجھ ہو گیا تھا کہ وہ بار بار رونے لگتی تھی لیکن کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیتی تھی کہ وہ رو رہی ہے۔

رات کا آخری پہر تھا جب اچانک سڑک کے بیچ میں ٹارچ لائٹ کی چندھیا دینے والی روشنی دکھائی دی۔

"سرحدی پولیس" جابر نے مجھے ہوشیار کرنے کے لئے کہا۔

کار کے سامنے دو باوردی افراد بندوق کا رخ ہماری طرف کئے کھڑے تھے۔ اشارے سے انہوں نے مجھے اور جابر کو اترنے کا حکم دیا۔ وہ ہمیں لکڑی کے بنے ہوئے چھوٹے سے کیبن میں لے گئے۔ وہاں ایک افسر قسم کی چیز لکڑی کی میز کے پیچھے کرسی ڈالے بیٹھی تھی۔ وہ صورت سے ہی خبیث' خرانٹ اور خطرناک لگتا تھا۔ میرے پیچھے پیچھے غالب بھی اندر آگیا۔

میرا اور غالب کا بغور معائنہ کرنے کے بعد اس نے کہا "تم سب نیپال میں پناہ لینے جا رہے ہو؟"

اس نے انگریزی میں بات کی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں انگریزی میں جواب دیتا' جابر نے اردو میں کہا "یہ بھارتی شہری ہیں سر۔ آپ کو......."

افسر نے غرّا کے کہا "اس بلا ضرورت بھونکنے والے کتے کو پہلے خاموش کرو۔"

رائفل کا ایک بٹ جابر کے سر پر پڑا۔ وہ لڑکھڑایا اور گرنے لگا تو دو افراد اسے کھینچ کر لے گئے۔

"اس نے ٹھیک کہا تھا۔ ہم بھارتی سفارت خانے سے تعلق رکھتے ہیں اور اپنی اپنی فیملی کے ساتھ سفر کر رہے ہیں" میں نے انگریزی میں کہا "تم کو ہمارے ڈرائیور کے ساتھ یہ سلوک نہیں کرنا چاہئے تھا۔"

"مجھے کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں' یہ بتانا تمہارا کام نہیں۔ پاسپورٹ نکالو سب کے" اس نے دہاڑ کر میز پر ہاتھ مارا۔

میں نے اور غالب نے اپنے' رابعہ اور نازو کے پاسپورٹ اس کے سامنے ڈال دئے۔

"کار میں جتنے لوگ ہیں سب کو لے آؤ" اس نے ایک ماتحت کو حکم دیا۔

چند منٹ بعد نازو' کاجل اور کلیم کے ساتھ رابعہ کو حاضر کر دیا گیا افسر نے پاسپورٹ کی تصویر سے باری باری سب کا چہرہ ملایا اور سر ہلانے لگا۔

"یہ عورت کون ہے؟" اس نے کاجل کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ عبدالستار چوہدری کی بیٹی ہے۔ کاجل" میں نے کہا "اور یہ اس کا بیٹا ہے۔ وہ بنگلہ دیش کے اہم سیاسی لیڈر اور شیخ مجیب کے دست راست ہیں۔"

اس نے سر ہلایا "ان کو الگ کر دو۔"

"مگر کیوں؟" میں نے احتجاج کیا۔

وہ کرسی سے اٹھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا رابعہ کے سامنے رک گیا۔ رابعہ کا پاسپورٹ اس کے ہاتھ میں تھا۔

"یہ..... جعلسازی ہے" اس نے کہا "اس پر تصویر بدلی گئی ہے۔"

"یہ غلط ہے۔" میں نے کہا۔

اس نے گھوم کے میرے منہ پر بھرپور تھپڑ مارا "میری آنکھوں میں کوئی دھول نہیں جھونک سکتا۔"

پھر اس نے اپنے ایک ماتحت کو حکم دیا کہ کار کو قبضے میں کر لے۔ باہر سے جابر کے چلانے کی آواز آئی۔ پھر ایک فائر ہوا۔

صورت حال کی یہ ڈرامائی تبدیلی اس حد تک غیر متوقع اور ہمارے خلاف تھی کہ میری قوت فیصلہ بھی بروئے کار نہ آئی۔ مجھے ہی نہیں ہم میں سے کسی کو بھی یہ امید نہ تھی کہ ایک چھوٹی سی سرحدی چوکی پر ہم اچانک پکڑے جائیں گے۔ ہم سب کو خدا پر بھروسا تھا کہ وہ بڑا کارساز ہے' تو یہ سمجھنے کی بات نہیں تھی بلکہ جزو ایمان تھی۔ سمجھا ہم نے یہ تھا کہ جابر انتہائی معاملہ فہم ہے۔ راستہ بھی جانتا ہے اور اسے بند راستوں کی رکاوٹیں دور کرنے کے سب جنتر منتر بھی آتے ہیں۔ اس نے اپنے انڈر گراؤنڈ کنکشن سے لائن کلیرنس حاصل کر لی ہوگی ورنہ جہاں ضرورت محسوس ہوگی وہاں وہ تعلقات کے حوالے یا رشوت کے فارمولے سے کام چلانے کی پوزیشن میں ہوگا۔

گرفتاری کے ساتھ ہی جابر کے ساتھ ہونے والے سلوک نے اچانک ہم سب کے اعتماد کو متزلزل کر دیا اور جب میں نے فائر کی آواز سنی تو یوں لگا جیسے ہم ایک راہ گم کردہ کارواں ہیں جس کو نشان منزل دکھانے والا کوئی نہیں رہا۔ میں نے اپنے منہ پر پڑنے والے تھپڑ کو بھی صبر و ضبط کے ساتھ برداشت کر لیا تھا اور کسی ایسے جوابی ردعمل سے گریز کیا تھا جس کا خمیازہ سب کو سفر کے پہلے مرحلے کی کامیابی سے محروم کر دیتا لیکن فائر کے ساتھ جابر کی چیخ بھی سنائی دی تو میں خاموش نہ رہ سکا۔

میں نے چیخ کر کہا "یو باسٹرڈ' اگر تم نے اُسے مار دیا ہے تو یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔"

وہ واپس اپنی کرسی پر جا بیٹھا تھا "تم مجھ سے اچھائی کی امید رکھتے ہو؟ کیا میں اچھا آدمی ہوں؟ تم جانتے ہو مجھے؟"

میں نے کہا "وہ ایک بہت اہم بھارتی سفارت کار کا سرکاری شوفر تھا۔ تمہیں اس جرم کی جواب دہی کرنی ہوگی۔"

وہ نازی فوج کے کسی افسر کی طرح ایکٹنگ کر رہا تھا جس نے ذاتی کوشش سے اتحادی جاسوسوں اور تخریب کاروں کو گرفتار کر لیا ہو۔ اپنی برتری اور ہماری بے بسی' اپنی طاقت اور ہماری ناطاقتی' اپنے اختیار اور ہماری بے اختیاری پر تفخر د غرور کی نمائش میں وہ اوور ایکٹنگ کر رہا تھا۔

میرا یہ اندازہ غلط ہو گیا تھا کہ وہ کوئی چھوٹی سی سرحدی چوکی ہے۔ کھڑکی کے اس کیبن کے پیچھے یقیناً اور بھی بہت سے کیبن تھے یا کوئی بیرک تھی جہاں خاصی تعداد میں مسلح افراد موجود تھے۔ دو افراد جابر کو کھینچ کر باہر لے گئے تھے تو ان کی جگہ چار اندر آگئے تھے۔ پھر دو کاجل اور کلیم کو دھکیل کر لے گئے تھے تو مزید چار نے ان کی جگہ لے لی تھی۔ مجموعی طور پر اب ہم آٹھ افراد کے حصار میں تھے جن کی بندوقوں کا رخ ہماری طرف تھا اور وہ کوئی عام قسم کی دقیانوسی بندوقیں نہیں تھیں۔ وہ روسی ساخت کی خودکار رائفلیں تھیں۔

ان کے افسر اعلیٰ نے جو بلحاظ عہدہ کیپٹن تھا' انتہائی سکون اور خود اعتمادی کا مظاہرہ کرتے ہوئے' جذبات سے عاری اور سپاٹ لہجے میں آہستہ آہستہ ہر لفظ ادا کرتے ہوئے سارے سوالات کئے تھے اور پھر یوں مسکرانے لگا تھا جیسے وہ جانتا ہے کہ ہم اس کے کسی سوال کا جواب دے ہی نہیں سکتے۔

میز پر پڑے ہوئے سگریٹ کے پیکٹ کو اپنی طرف کھینچ کر اس نے ایک سگریٹ نکالی' اس کے دونوں سروں کا غور سے معائنہ کیا پھر میز پر ٹھونکا اور انگلیوں میں گھما کے کچھ سوچتے ہوئے ہونٹوں میں دبا لیا۔ اسے سلگانے میں اور پہلے کش کا دھواں چھت کی جانب چھوڑنے میں اس نے پورا ایک منٹ گزار دیا۔ میں اس نفسیاتی دباؤ سے اعصاب کو کشیدہ کرنے والے ذہنی تشدد کے پہلے مرحلے کو سمجھ چکا تھا چنانچہ میں نے سب کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور خود بھی زیر لب مسکرانے لگا۔

"میں ایک سفاک اور مکار افسر سمجھا جاتا ہوں۔" اس نے آخر کار کہا "یہ جو میرے ماتحت ہیں' پیٹھ پیچھے مجھے بہت کچھ کہتے ہیں۔ بھیڑیا مشہور ہوں میں اور میں برا نہیں مانتا۔ یہ ایک ایسی صفت ہے جس نے مجھے افسران اعلیٰ کی نظر میں بے عزت نہیں کیا' سرخ رو کیا ہے۔"

اچانک اس نے میز پر ہاتھ مارا اور گرج کے بولا "اور تم کہتے ہو مجھے جواب دہی کرنی ہوگی! کس کے سامنے؟ تمہارے سامنے؟ تم کیا سمجھتے ہو کہ میرا کورٹ مارشل کروا دو گے؟ اگر میں نے ایک معمولی ڈرائیور کو شوٹ کر دیا تو کیا میں تم سب کو شوٹ نہیں کر سکتا؟ کیوں زندہ چھوڑوں گا میں کسی ایسے شخص کو جس سے مجھے اندیشہ ہو کہ وہ ایک چشم دید گواہ کی حیثیت سے میرے خلاف اعلیٰ حکام کو بے بنیاد الزامات پر مبنی شکایت نامہ بھیج سکتا ہے؟ کون روک سکتا ہے مجھے اس جرم کا سراغ مٹانے سے؟ اگر یہ مان لیا جائے کہ میں نے جرم کیا تھا۔ یہاں ہر روز اسمگلر' سرحد پار کرانے والے ایجنٹ اور سرحد کو ناجائز طور پر پار کرنے والے مارے جاتے ہیں۔ یہی کام سونپا گیا ہے مجھے اور میں اپنا فرض ادا کرنے میں کوتاہی نہیں کرتا' خوشی محسوس کرتا ہوں۔ میں رشوت قبول نہیں کرتا اور کسی کے پاس پردھان منتری کا خط بھی ہو تو پھاڑ کے پھینک دیتا ہوں۔"

اب میں اس کو سمجھ چکا تھا۔ یا تو وہ نفسیاتی مریض تھا جو اپنے احساس کمتری کو مٹانے کے لیے اپنی اہمیت کی تشہیر کرتا تھا۔ وہ اپنے اختیار و اقتدار کے اعلان سے خوشی حاصل کرتا تھا اور لوگوں کو خوف و دہشت میں مبتلا دیکھ کر اس کی خود اعتمادی بڑھ جاتی تھی۔ یا وہ محض ڈراما کر رہا تھا۔

میں نے کہا "یہ سب تم مجھے کیوں بتا رہے ہو؟ کیا میں مجرم اور اسمگلر ہوں؟ ناجائز طور پر سرحد پار کر رہا ہوں؟ میں نے رشوت دینے کی کوشش کی یا پردھان منتری کا خط پیش کیا؟ تمہاری باتوں سے میں خوفزدہ نہیں ہو سکتا۔"

اس نے پاؤں میز پر پھیلا کر سگریٹ کے کش لیتے ہوئے میری

بات ایسے سُنی جیسے نہیں سُنی اور چھت کی طرف ایسے دیکھتا رہا جیسے اپنے خیالات میں محو ہو۔ پھر اس نے محافظوں کو مخاطب کیا۔

"تم نے تلاشی لی ان سب کی؟"

ایک نے دوسرے کی طرف اور دوسرے نے تیسرے کی طرف دیکھا لیکن جواب کسی نے نہیں دیا۔

"اگر ابھی ان میں سے کوئی اچانک ریوالور نکال لے مجھے شوٹ کرنے کے لیے تو تم سب احمق کیا کرو گے؟" اس نے طنزیہ کہا "مجرم کو شوٹ کرو گے؟ اس سے مجھے کیا فائدہ ہوگا؟ البتہ تمہارے خلاف دو الزامات ہو جائیں گے۔ ایک فرائض میں غفلت برتنے کا' دوسرا کسی قانونی اختیار کے بغیر قتل کا۔ اصولاً تمہارا کام یہ ہونا چاہیے کہ ملزم کو قانون کے حوالے کرو۔"

سکون سے بات کرتے کرتے وہ ایک دم گرجا "شکل کیا دیکھ رہے ہو ایک دوسرے کی! تلاشی لو ان کی اور گاڑی کی۔"

یہ اس کا خاص انداز تھا۔ محافظ ایک دم اچھل پڑے اور انہوں نے سب سے پہلے مجھے تلاشی کے لیے منتخب کیا۔ دو محافظ مجھے دھکیل کر باہر لے گئے۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ آخرِ شب کے ملگجے اندھیرے میں بھی کچھ فاصلے پر مجھے ایک اور کیبن اور اس کے ساتھ ہی نسبتاً طویل بیرک نظر آئی۔ درمیانی فاصلہ سو گز کے قریب تھا اور اونچی نیچی چٹانوں اور پتھروں کے دائیں بائیں لہراتا راستہ ہموار جگہ کو صاف کرکے بنایا گیا تھا اور نشاندہی کے لیے اس کے دونوں جانب قطار میں رکھے گئے پتھروں کو چونے سے سفید کردیا گیا تھا چنانچہ تاریکی میں بھی یہ راستہ صاف نظر آتا تھا۔ میں کسی مزاحمت کے بغیر دونوں محافظوں کے آگے چلتا گیا۔ اگر میں چاہتا تو پلٹ کر ایک سیکنڈ میں ان کا خاتمہ کرسکتا تھا۔ میرے لیے بے خبری میں ان کے سر آپس میں ٹکرا دینا کچھ مشکل نہ تھا۔ ان کے سر ناریل کی طرح کسی چٹان پر مار کے بھی توڑے جاسکتے تھے اور میں آسانی سے ان کی خود کار رائفلیں چھین سکتا تھا لیکن اس سے کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ الٹا نقصان یہ ہوتا کہ میرے باقی ساتھیوں کی رہائی کے امکانات معدوم ہوجاتے۔ میں عجلت میں کوئی غلط قدم اٹھانا نہیں چاہتا تھا۔ اس سے پہلے یہ ضروری تھا کہ حریف کی قوت کا صحیح اندازہ کرلیا جائے اور مناسب منصوبہ بندی کے بعد اس موقع کا انتظار کیا جائے جو خوش قسمتی سے بھی مل جاتا ہے۔

میں یہ بھی جاننا چاہتا تھا کہ کاجل اور کلیم اللہ کو انہوں نے کہاں رکھا ہے اور انہیں کس لیے الگ کرنا ضروری سمجھا گیا تھا۔ جابر کی چیخ سے اندازہ تو یہی ہوتا تھا کہ گولی اسے ماری گئی ہوگی۔ اس کے قتل پر میرا فوری ردِعمل ایک احتجاجی کیفیت کا حامل تھا ورنہ مجھے اس کی موت کا کوئی جذباتی صدمہ نہیں تھا۔ اب مجھے تجسس تھا کہ جابر سے کیا غلطی سرزد ہوئی تھی؟ اس کے انتظام میں کیا خامی رہ گئی تھی اور اس کے اعتماد کی شکست کے پیچھے کیا عوامل کارفرما تھے؟ کیا کسی نے اس سے دشمنی کرتے ہوئے مخبری کی تھی یا شامت اعمال کے باعث اس کے جرائم کا راز فاش ہوگیا تھا۔

محافظ مجھے بیرک کے بجائے علیٰحدہ بنے ہوئے کمرے میں لے گئے۔ وہاں بھی لالٹین جل رہی تھی۔ اس کی زرد دھندلی روشنی میں لکڑی کی دیواروں والے کیبن کا ماحول زیادہ پُر خوف ہوگیا تھا۔ میں نے کاجل کو ایک کرسی پر اداس اور مضمحل بیٹھا دیکھا۔ کلیم اللہ اس کے قریب ہی چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ شاید کاجل نے اسے زبردستی سُلانے کی کوشش کی تھی مگر وہ جاگ رہا تھا اور مجھے دیکھتے ہی اٹھ بیٹھا۔

"چاچا جی! یہ کون بدمعاش تھا جس نے تم کو مارا؟"

میں نے کہا "تم سو جاؤ....."

"نہیں۔ پہلے بتائیں اس نے کیوں مارا تھا تمہیں؟"

میں نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے کاجل سے کہا "تم...."

اس نے میری بات سمجھ کے سر ہلایا "میں ٹھیک ہوں۔"

میں نے کہا "تمہارے ساتھ کسی نے بدتمیزی تو نہیں کی؟"

"نہیں۔" وہ بولی "انہوں نے کیوں روک لیا ہے ہمیں سکندر؟"

میں نے کہا "انہیں اس کا اختیار ہے مگر فکر کی کوئی بات نہیں۔"

"فکر کی بات کیوں نہیں۔ جابر کو مار چکے ہیں یہ لوگ اور ہمارے بارے میں بھی ان کے عزائم ٹھیک نہیں لگتے۔"

"جابر کو اس کے کیے کی سزا ملی۔ یہ بہت ٹھیک ہوا۔"

"مگر ہم آگے کیسے جائیں گے؟" کاجل نے کہا۔

میں نے کہا "ڈرائیونگ مجھے بھی آتی ہے۔ ہم سب کو آتی ہے۔"

اس تمام عرصے میں محافظ میرے کپڑوں کی ہر جیب ٹٹول کر خالی کرچکے تھے۔ انہوں نے میرے جوتے اتروائے اور میرے سارے جسم پر ہاتھ مار کے کسی خفیہ مقام پر موجود اسلحہ برآمد کرنے کی ناکام کوشش کی۔ ہم اتنے احمق نہیں تھے کہ ایسے خطرناک راستے پر سفر کرتے ہوئے اسلحہ جیب میں رکھتے اور کہیں بھی تلاشی لینے والوں کو اپنے خلاف ایک فردِ جرم بنانے کا موقع فراہم کرتے۔ ناجائز طور پر سرحد عبور کرنا ان دنوں کوئی سنگین جرم نہیں تھا۔ نیپال کے حکام عمداً پاکستانی مہاجرین سے چشم پوشی کررہے تھے اور انہیں پاکستان پہنچانے کے لیے انتظامات بھی کررہے تھے لیکن لائسنس کے بغیر اسلحہ رکھنا یقیناً جرم تھا۔ اب مجھے افسوس ہورہا تھا کہ ہم نے آرام کی خاطر کار میں سفر کیوں کیا۔ ہم کسی بھی قافلے کے ساتھ روانہ ہوجاتے تو بلا روک ٹوک نیپال پہنچ جاتے۔ یہ بہت لمبا اور تکلیف دہ سفر تھا مگر پورے پورے خاندان عورتوں اور بچوں کے ساتھ یہ سختی جھیل رہے تھے تو ہم بھی برداشت کرسکتے تھے۔

محافظوں کو اطمینان ہوگیا کہ اب میرے پاس کوئی خطرناک چیز

نہیں رہی تو انہوں نے مجھے واپسی کا اشارہ کیا۔

اسی وقت کاجل نے کہا "سکندر! بابا کا نام سن کے انہوں نے مجھے کیوں الگ کردیا تھا؟ کیا یہ بھی دشمن ہیں ان کے؟"

میں نے رک کے کہا "ابھی میں کیا بتا سکتا ہوں۔"

"یہ ضرور مجھے روک لیں گے اور تم کو جانے دیں گے۔" وہ رونے لگی۔

میں نے کہا "بے وقوف لڑکی! کیا ہم تمہیں چھوڑ کر جاسکتے ہیں؟ یہ بھی تو سوچو۔"

وہ اسی طرح آنسو بہاتی رہی "سکندر! ان سے کہنا کہ....."

اب محافظوں نے مجھے دروازے کی جانب دھکا دیا "چلو۔"

کاجل چلّائی "تم بات ضرور کرنا کم سے کم اس معصوم اور یتیم بچّے کو تو جانے دیں۔"

کلیم اللہ نے کہا "کیا میں یتیم ہوں؟"

میں پھر رک گیا "نہیں بیٹا! تمہارے تو ماں باپ زندہ ہیں۔" میں نے کاجل کو غصے سے دیکھ کر کہا۔

محافظوں کے دوسرے دھکے سے میں باہر جاگرا۔ میرے کانوں میں اس وقت بھی کلیم کی آواز آرہی تھی۔

"بتاؤ نا مجھے 'کیا میں یتیم ہوگیا ہوں؟ تم نے یتیم کیوں کہا تھا مجھے؟ تم جھوٹ بولتی ہو۔ تم سب جھوٹے ہو۔" وہ چلّانے لگا تھا۔

غالباً اسے پہلے سے شک تھا کہ ہم اس کے ساتھ غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں۔ یہ بات اس کی عقل و فہم سے بالاتر تھی کہ آخر والدین نے اس سے پہلے الگ روانگی کیسے اختیار کرلی تھی۔ اس کا باپ تو معذور تھا' اپنی ٹانگ تک نہیں ہلا سکتا تھا۔ پھر وہ غریب آدمی تھا' جہاز میں بیٹھ کے کیسے چلا گیا اور اپنے بیٹے کو پیچھے چھوڑنا اس نے کیوں منظور کرلیا؟ وہ ذہین بچّہ تھا اور عین ممکن تھا کہ ان سوالات کے جواب خود تلاش کرتا رہا ہو۔ شاید اسے ہم پر کچھ اعتبار بھی تھا چنانچہ اس نے شک کا اظہار نہیں کیا اور اس امید میں خاموش رہا کہ ہم اسے بحفاظت لے جارہے ہیں تو گھر بھی پہنچا دیں گے۔ کیا پتا ہم سچ ہی کہتے ہوں۔

لیکن کاجل کی زبان سے بے اختیاری میں نکل جانے والے ایک لفظ نے اس کے شک کو یقین میں بدل دیا اور اسے دُہرا صدمہ پہنچا۔ ایک اس خیال سے کہ اب وہ ماں باپ سے محروم ہوچکا ہے۔ دوسرا ہم سب کے ناقابلِ اعتبار ثابت ہونے سے۔ اب وہ بے قابو ہوگیا تھا اور اس کے زور زور سے رونے کی آواز مجھے رات کی خاموشی میں دور تک سنائی دیتی رہی۔ کاجل کی تسلی اور زیادہ بڑے جھوٹ سے اپنی غلطی پر پردہ ڈالنے کی کوشش کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

واپس کیپٹن کے کمرے میں قدم رکھتے ہی میرے قدم رک گئے۔ کمرے میں اب کوئی نہیں تھا۔ غالب' رابعہ اور نازو ہی نہیں' وہ خود بھی غائب تھا۔

میں نے ایک محافظ سے کہا "یہ سب لوگ کہاں ہیں؟"

ان میں سے ایک ٹوٹی پھوٹی اُردو بول لیتا تھا "نئیں مالم۔"

"تمہارا کپتان صاحب بتا سکتا ہے؟"

"نئیں مالم۔"

"کیا انہیں بھی تلاشی کے لیے....."

"نئیں مالم" اس نے غرا کر میری بات کاٹ دی۔

"ایسی کی تیسی تمہارے نئیں مالم کی۔" میں نے بھنا کے کہا۔ اور کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ نئیں مالم نے مجھے کھینچ کر کھڑا کرنے کی کوشش کی تو ایک دم میرا غصہ بے قابو ہوگیا۔ میں نے ایک ہاتھ مارا۔ کلائی ٹوٹنے کے بعد وہ رائفل پکڑنے کے قابل نہیں رہا۔ وہ درد سے بلبلاتے ہوئے ہاتھ پکڑ کے دُہرا ہوگیا۔ میں نے رائفل کا رخ دوسرے محافظ کی طرف کردیا جو ابھی تک طے نہیں کرپایا تھا کہ بغاوت کے جرم میں وہ خود مجھے شوٹ کرنے کے قانونی اختیارات رکھتا ہے تو کیا ان کا استعمال بھی کرسکتا ہے؟ یہ تذبذب کی کیفیت غالباً کپتان صاحب کے رویّے نے پیدا کردی تھی۔

میں گھوم کر کپتان کی کرسی پر جا بیٹھا لیکن اس دوران میں نے اپنی رائفل کا رخ نہیں بدلا۔ دوسرے محافظ نے شکست قبول کرلینا تذبذب سے بہتر سمجھا اور سر ہلا کے آرام سے کھڑا ہوگیا۔ اس نے رائفل کو بھی "ایٹ ایز" کے انداز میں فرش پر رکھ دیا۔ میں نے میز پر رکھی ہوئی سگریٹ کی ڈبیا میں سے ایک سگریٹ نکال کر جلائی تب بھی وہ معترض نہیں ہوا حالانکہ یہ اس کے افسر کی ملکیت تھی اور میں صریحاً چوری یا ڈکیتی کا مرتکب ہورہا تھا۔ کسی کی چیز کو اس کی مرضی کے بغیر زبردستی حاصل کرنا خالص تھانیدارانہ نقطۂ نظر سے اور کچھ نہیں سمجھا جاسکتا تھا گکھ دی بھی چوری تے لکھ دی بھی چوری۔ بات تو صرف ملزم کی حیثیت کی ہے۔ وہ تنکا چرائے اور جیل جائے یا لاکھ اٹھالے اور گھر چلا جائے۔ ضابطہ فوجداری کیا ہے؟ اصل مرضی ہے تھانیدار کی کہ وہ کسے مجرم بناتا ہے۔

جس محافظ کی کلائی ٹوٹی تھی وہ اب کسی ناقابلِ فہم زبان میں اپنے اس ساتھی پر بگڑ رہا تھا جس نے انتہائی بزدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہتھیار ڈال دیے تھے اور اس کی کوئی مدد نہیں کی تھی۔ دونوں کی صورتوں کے نقوش نیپال اور اس سے ملحق سکم' بھوٹان کے رہنے والوں کی طرح چینی' جاپانی قوم سے مشابہ تھے جو منگول نسل سے تعلق رکھتے ہیں مگر نیپالی قد و قامت میں آریہ قوم کی کچھ صفات رکھنے کے باعث دراز قد ہیں اور پہاڑوں میں رہنے کی وجہ سے سخت جان نظر آتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ آپس میں بھی نیپالی زبان ہی بول رہے تھے۔

کیپٹن دس منٹ بعد آیا تو اندر کا نقشہ دیکھتے ہی ہکا بکا رہ گیا۔ اس نے پُر نفرت اور پُر ملامت نظروں سے اپنے مسلح محافظوں کو دیکھا جن میں سے ایک اپنی کلائی کے ٹوٹ جانے پر مسلسل واویلا کررہا تھا اور دوسرا مسلح ہونے کے باوجود کچھ کرنے پر آمادہ نظر نہ

آتا تھا۔ اس کا ہاتھ اپنی جیب کی طرف گیا تو میرا ہاتھ خود کار رائفل کی طرف بڑھا۔

"تم کیا چاہتے ہو؟ میں تم کو گولی ماردوں اور اس ناکارہ فوج کی کمان سنبھال لوں؟" میں نے کہا۔

"تم مجھے گولی مارو گے؟" اس نے طنز اور تمسخر آمیز لہجے میں حقارت سے سوال کیا۔

میں نے کہا "جس کے ہاتھ میں بندوق ہو وہ اپنے دشمن کو بڑی آسانی سے گولی ماردیتا ہے۔ گولی نہ مارنا زیادہ مشکل کام ہے۔ تمہارے تھپڑ کا جواب میں گولی سے دینا نہیں چاہتا۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دینا چاہیے مگر چٹان لڑھکانا میرے نزدیک زیادتی ہے۔ اپنے پیچھے دروازہ بند کردو۔"

"ایک رائفل کی مدد سے کیا تم پوری بٹالین کو ختم کردو گے؟ میں تمہیں بتارہا ہوں کہ اس طرح تم بچ کے نہیں نکل سکتے۔" اس نے مجھے گھورتے ہوئے کہا اور دروازہ بند کردیا۔

میں نے کہا "اس اطلاع کا شکریہ۔ تم ابھی میرے ہاتھ میں ایک رائفل دیکھ رہے ہو۔ ابھی میں تمہارے دوسرے ماتحت کو حکم دوں گا تو وہ بھی اپنی رائفل مجھے پیش کردے گا' ایک ریوالور تم بھی نذر کرو گے۔ اس کے بعد جو آتے جائیں گے ایسے ہی نذرانے دیتے رہیں گے۔ یہاں اسلحے کا ڈھیر لگ جائے گا۔"

"اور تم اکیلے وہ سب اسلحہ استعمال کرو گے۔ تمہارے ہر ہاتھ میں دو رائفلیں ہوں گی۔ دو رائفلیں تم پیروں سے پکڑ کے چلاؤ گے' ایک منہ میں پکڑ کے۔" وہ میرا مذاق اُڑانے لگا۔

میں نے اطمینان سے اپنی سگریٹ بجھائی اور اٹھ کھڑا ہوا "میں مذاق کا بالکل برا نہیں مانتا بلکہ مجھے وہ لوگ اچھے لگتے ہیں جن کی حسِ مزاح ہنگامی حالات سے مجروح نہیں ہوتی۔ اپنے اس ماتحت سے کہو منہ بند رکھے' ہاتھ صرف ٹوٹا ہے' جسم سے الگ نہیں ہوا ہے۔ اور اس دوسرے شریف آدمی سے کہو کہ رائفل کو ہاتھ سے چھوڑ دے۔ خود اسی پوز میں کھڑا رہے۔"

میں آگے بڑھا ہی تھا کہ کیپٹن نے بڑی پُھرتی سے جیب میں ہاتھ ڈال کر ریوالور نکالنے کی کوشش کی اور جہاں کھڑا تھا وہیں بیٹھ گیا۔ میں ذہنی طور پر مستعد تھا چنانچہ ایک خود کار عمل کے طور پر میں نے کِک ماری۔ میرا نشانہ اس کا ہاتھ تھا مگر وہ بیٹھنے لگا تو ٹھوکر اس کی پسلی پر پڑ گئی' اور وہ کراہ کے ایک طرف گر گیا۔ اس کی پسلی ٹوٹ گئی تھی مگر وہ باہمت آدمی تھا۔ اس نے گرتے گرتے بھی پلٹ کے فائر کیا۔ اس کا نشانہ خطا ہوا اور گولی کہیں چھت کی طرف نکل گئی۔

میں نے اسے دوسرا فائر کرنے کی مہلت نہ دی اور پے در پے ٹھوکریں مار کے اس کو اٹھنے کے قابل نہ چھوڑا۔ وہ چلاتا رہا اور اپنے ماتحت کو گالیاں دیتا رہا یا شاید حکم دیتا رہا کہ اپنی جان افسر پر قربان کردے کہ تقاضائے تابعداری یہی ہے۔ ایک مرحلے پر اس کی فرض شناسی کی رگ پھڑکی تھی اور اس نے رائفل اٹھانے کی تھوڑی سی ہمت کی تھی مگر وہ میری دسترس میں تھا۔ ایک ہاتھ بھرپور انداز میں پڑا تو وہ بغیر آواز نکالے اپنے افسر کے قدموں میں گر گیا۔ اس کی گردن ٹوٹ گئی تھی۔

میں نے ایک ٹھوکر سے اس کی رائفل کو دور کیا اور کیپٹن سے پوچھا۔

"اب بتاؤ میرے باقی ساتھی کہاں ہیں؟" میں نے اس کو دیوار سے لگا کے اس کی گردن دبوچ لی "اور اس بات کا خیال رکھو کہ اندر کوئی نہ آئے۔"

کیپٹن سخت تکلیف میں تھا اور اس کی پھٹی پھٹی نظریں لاش پر جمی ہوئی تھیں۔ شاید اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ اس کے وہ ماتحت جن پر اس نے ہمیشہ بھروسا کیا تھا' اتنے نازک تھے کہ ایک ہاتھ کی مار برداشت نہ کرسکے۔ ایک کا بازو ٹوٹ گیا اور دوسرے کی گردن۔ خود اس کی پسلی ٹوٹ چکی تھی اور وہ تصور کرسکتا تھا کہ یہ مقابلہ ایسے ہی جاری رہا تو فرداً فرداً جو بھی اندر آئے گا اسی قسم کے انجام سے دوچار ہوگا۔ یہاں تک کہ پوری بٹالین لنگڑے لولے' معذور اور ہڈی پسلی ایک کرا کے صف بستہ ہوگی تو یوں محسوس ہوگا جیسے وہ فوجی نہیں کسی آرتھوپیڈک وارڈ کے مریض ہیں۔

مجھے حیرت تھی کہ فائر کی آواز سن کے بھی کوئی ابھی تک ادھر نہیں آیا تھا۔ مگر پھر کسی نے دستک دی اور میں نے ایک ساتھ بہت سے لوگوں کے باتیں کرنے کی آواز سنی۔

"ان سب سے کہہ دو کہ واپس چلے جائیں۔" میں نے کیپٹن کا ریوالور اس کی گردن پر رکھ دیا "ہم کچھ بھی نہیں کریں گے۔ کوئی دخل اندازی نہ کرے۔"

اس نے سرہلایا اور بلند آواز میں بولا "کیا بات ہے؟"

باہر سے کسی نے پوچھا "ہم نے گولی کی آواز سنی تھی سر۔"

"تو اس میں حیرانی کی کیا بات ہے؟"

"حیرانی تو نہیں سر' پریشانی تھی آپ کی طرف سے۔"

کیپٹن نے کہا "میں خیریت سے ہوں۔ جاؤ اور جب تک میں نہ بلاؤں اِدھر کوئی نہ آئے اور تم... تم بھی جا کے اپنے ہاتھ کی مرمت کرو۔"

"یس... یس سر۔" ٹوٹے ہوئے ہاتھ والا فوراً رخصت ہوگیا۔

"گڈ!" میں نے کہا "تم نے اپنے ساتھ ان کی جان بھی بچالی۔ اگر تم اسی طرح تعاون کرو گے تو بات صرف ایک پسلی کی شکست پر ختم ہوجائے گی۔ کچھ عرصہ تم ملٹری اسپتال میں رہو گے تو پسلی پھر جڑ جائے گی لیکن جب تک پلاستر رہے گا تم کو احساس رہے گا کہ تم نے مجھے تھپڑ مار کے غلطی کی تھی۔ اس کے جواب میں....."

اس نے کہا "تم نے جواب دینے میں جلدی کی۔ خیر... تمہاری جگہ میں ہوتا تو شاید یہی کرتا یا اس سے بھی زیادہ۔ میں سخت تکلیف میں ہوں۔ کیا تم مجھے اجازت دو گے کہ میں بیٹھ جاؤں بلکہ لیٹ جاؤں اس میز پر؟ تم جا کے باہر کھڑے ہوجاؤ۔ اندر کوئی نہ آئے۔" اس نے دوسرے سپاہی کو حکم دیا' جو میری ضربِ مومن سے بچ گیا تھا۔ اس نے عملاً ثابت کردیا تھا کہ اسے ادائے فرض سے زیادہ اپنی جان بچانے کی فکر ہے۔ اس کا بال بھی بیکا نہیں ہوا تھا۔ صرف محاورے کے مطابق ورنہ اس کے سر پر ایک بھی بال نہیں تھا۔

"ٹھیک ہے' لیٹ جاؤ۔" میں نے کہا اور پھر اس کی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"تمہارے سب ساتھی خیریت سے ہیں۔" اس نے لیٹ کر ایک ہاتھ سے پسلی کو دبالیا اور گہری سانس لے کر بولا "ذرا یہ فائلیں میرے سر کے نیچے رکھ دو۔ یا وہ گدی جس پر تم بیٹھے ہو۔"

میں نے کہا "تمہاری گدی تم کو مبارک' میں اس کے بغیر بھی تشریف رکھ سکتا ہوں۔"

اس نے سر اٹھایا تو میں نے گدی نیچے رکھ دی۔ ہلنے سے اس کی ٹوٹی ہوئی پسلی کی اذیت بڑھ جاتی تھی اور درد کو برداشت کرتے ہوئے اس کا چہرہ سرخ ہوجاتا تھا۔

"تھینک یو۔" اس نے ایک گہری سانس لی "میں واقعی احمق ہوں۔ پسلی کے جُڑنے تک مجھے یہ بات یاد رکھنی چاہیے۔"

"تم تھوڑے سے عقلمند بھی ہو کہ اپنی زندگی بچالی۔ اس خیال سے تمہیں کچھ تسکین مل سکتی ہے۔" میں نے کہا۔

"احمق تم مجھ سے زیادہ ہو۔" اس نے ایک لمبی سانس لی "یہ تم نے آخر کار ثابت کردیا۔ جب تمہیں کچھ کرنا چاہئے تھا' اس وقت تم نے کچھ نہیں کیا' صبر اور ضبط سے کام لیا اور بعد میں ایک فضول سی بات پر مشتعل ہوگئے' اس حد تک کہ ایک آدمی کو معذور کردیا اور دوسرے کو ہلاک کرنے کی کوشش کی۔ تاہم... غلطی میری تھی۔ میں اس معاملے کو حد سے آگے لے گیا۔ سنو' پہلے مجھے اپنی بات ختم کرلینے دو۔ بولنا مشکل کام ہے میرے لیے' سانس لینے سے بھی تکلیف ہوتی ہے۔ ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے' اس کے بعد بات بگڑ جاتی ہے۔ بے شک میں محتاط تھا..... اور بات میری عدم موجودگی میں بگڑ گئی۔ میں ہوتا تو صورت حال کو کنٹرول میں رکھتا اور تم کو سمجھا دیتا کہ یہ سب کچھ نہیں....."

میں نے کہا "کیا کچھ نہیں؟"

"وہی۔ جو ہوا....." اس نے کہا "سب ایسے ہی تھا۔ مجھے موقع نہیں ملا تم کو اشارے سے سمجھانے کا۔ میں تم سے اکیلے میں بات کرنا چاہتا تھا..... تم کو تلاشی کے لیے بھیجنے کا مقصد یہی تھا کہ جب تم واپس آؤ تو اور کوئی نہ ہو۔ تمہارے باقی ساتھیوں کو..... میں نے بعد میں سمجھا دیا تھا کہ وہ تھوڑی سی زیادتی برداشت کریں۔ تفتیش کی رسمی کارروائی ضروری تھی۔ میں رعایت کرتا تو گڑبڑ ہوجاتی۔"

"کیا مطلب ہے آخر تمہارا؟ یہ سب ڈراما تھا؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ مجھے اپنے آپ کو بھی بچانا تھا۔ ورنہ یہی جو میرے ماتحت ہیں' ان میں سے کوئی اوپر رپورٹ بھیج دیتا کہ میں نے رشوت لی یا مسلمان ہونے کی وجہ سے تم سب کو نکل جانے دیا۔ یہ الزام بہت آسانی سے لگادیا جاتا ہے یہاں۔ ہم مسلمانوں کی وفاداری ہمیشہ مشکوک رہی ہے اور رہے گی۔ آج کل تو خیر حالات ہی ایسے ہیں۔"

میں نے افسوس سے کہا "تم مسلمان ہو؟"

"کیپٹن حمید عباسی۔" وہ مسکرایا اور اس نے اپنا ایک ہاتھ مصافحے کے لیے آگے بڑھایا "سکندر بخت کا دوست جو غلط فہمی میں مارا گیا۔"

میں نے ہاتھ ملا کے کہا "آئی ایم سوری! تم نے پہلے بتادیا ہوتا....."

"مجھے تو... اشارہ کرنے کا موقع بھی نہیں ملا۔ ورنہ تم سمجھ لیتے۔ خیر... تم نے اینٹ کا جواب پتھر سے دے دیا۔"

میں نے کہا "کپتان صاحب' اور شرمندہ مت کرو۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ میں ہڈی پسلی توڑ سکتا ہوں' جوڑ نہیں سکتا۔"

"ہاں۔ مجھے معلوم ہے اس کام میں تم بہت تیز ہو' بس مجھے تھوڑی سی دیر ہوگئی۔ میں باقی سب لوگوں کو بیرک تک لے گیا تھا۔ پوچھ گچھ کرنے والوں کو یہ سمجھانا بھی ضروری تھا کہ وہ زیادہ سختی نہ کریں۔"

میں نے کہا "گویا تھوڑی سختی کی اجازت تم دے آئے تھے؟"

"وہ ... کچھ تو ضروری تھا ... آخر ہم نے گرفتار کیا ہے تمہیں' تم کوئی مہمان بن کر نہیں آئے تھے۔" وہ بولا۔

"یہ کم سختی کی کیا تعریف ہے تمہاری لُغتِ تفتیش میں؟" میں نے کہا "اور آلاتِ تفتیش میں تیرہ نمبر کا چھتر شامل ہے یا..."

اس نے نفی میں سرہلایا "وہ پولیس کے طریقے ہیں۔"

"کیپٹن حمید! کچھ معلوم تو ہو کہ اس بیرک میں میرے ساتھیوں کے ساتھ کیا سلوک ہوگا؟ انہیں الٹا لٹکا کے یا بجلی کے جھٹکے دے کر تم کہو گے کہ یہ کم سختی تھی بلکہ عین مہربانی تھی تو میں نہیں مانوں گا کہ تمہارا یہ فعل دوستانہ تھا۔"

"ایسی کوئی غیر شائستہ حرکت نہیں ہوگی۔ بس وہ ذرا ان پر سرچ لائٹ ڈالیں گے' تھوڑی بہت دھونی دیں گے۔"

"مرچوں کی؟" میں نے چلاّ کے کہا۔

"ایک آدھ تھپڑ ماریں گے ..." اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ "دوچار بید رسید کریں گے۔ تھرڈ ڈگری کے ابتدائی مرحلے تو برداشت کرسکتے ہیں تمہارے ساتھی؟"

میں نے کہا "یو باسٹرڈ! تھرڈ ڈگری کی اولاد! ان عورتوں کے ساتھ یہ زیادتی ہوئی تو میں سب کی....."

اس نے کہا "سکندر بخت! پلیز! میری بات سنو۔ گالیاں جتنی دینا چاہو مجھے دو مگر میری مجبوری کو سمجھو۔ میں ایسے تمہاری مدد نہیں کرسکتا کہ کسی کو شک ہو جائے۔ کل کو مجھ پر الزام آئے تو میری نوکری جائے یا میرے خاندان کے لیے مسائل اور مشکلات پیدا ہو جائیں۔ میں تمہارے فائدے کے لیے یہ سب کچھ کررہا ہوں۔"

"اس لیے تم رِسک نہیں لے سکتے؟"

"ہاں۔ میں رِسک نہیں لے سکتا۔ میں اکیلا ایک پورے خاندان کی کفالت کرتا ہوں۔ ایک ماں ہے' بیمار اور معذور۔ ایک بہن ہے شادی کے قابل۔ ایک بھائی ہے' بے روزگار' گریجویٹ۔ تم لوگ تو بہت کچھ برداشت کرچکے ہو۔ ہر قسم کے حالات کی سختی جھیل چکے ہو۔ دشمنوں کے ساتھ قید میں جو سلوک ہوتا ہے اس کا عشرِ عشیر بھی کسی کے ساتھ نہیں ہوگا۔ میری مجبوری سمجھ کے اسے قبول کرلو۔ یہ آخری آزمائش سمجھ لو۔ میں ہاتھ جوڑ کے تم سے معافی مانگ رہا ہوں لیکن یقین کرو میں نے بہت سوچ سمجھ کے یہ سارا منصوبہ بنایا تھا جس میں تم بھی محفوظ رہو گے اور مجھے بھی کچھ نہیں ہوگا۔ میں آج رات تمہیں بحفاظت نیپال پہنچانے کا پکا بندوبست کردوں گا۔ بس آج کے دن یہ زبردستی کی مہمانی قبول کرلو۔"

"یہ انتہائی ذلت کی بات ہے جس کو تم مہمانی کہہ رہے ہو۔ تم کو شرم آنی چاہیے کہ تمہارے مہمان دن بھر بھوکے پیاسے رہیں گے۔ صرف جوتے اور گالیاں کھائیں گے؟" میں نے برہمی سے کہا۔

"کیا وہ اس سے بہتر ہوتا' اگر میری جگہ کوئی تمہارا دشمنِ جاں ہندو افسر ہوتا اور وہ تمہاری کھال میں بھُس بھر کے جسم کو گولیوں سے چھلنی کردیتا اور تمہاری لاشوں کو جنگلی بھیڑیوں کی ضیافت کے لیے ان پہاڑوں میں پھینک دینے کے بعد ہاتھ جھاڑ کے اطمینان سے بیٹھ جاتا کہ خس کم جہاں پاک۔ اپنے سفر کی اس منزل پر پہنچ کے جہاں تم کو یقین تھا کہ اب کوئی خطرہ نہیں رہا' تمہیں احساس ہوتا کہ موت کتنی بے رحم اور عیار شکاری ہے جو تمہیں ڈھیل دیتی رہی اور کہاں سے کہاں لے آئی۔ زندگی پر اعتبار عطا کرکے مارنے کے لئے۔ تم اپنی خوش قسمتی پر خدا کا شکر ادا نہیں کرتے کہ یہاں میں ہوں۔ یہ بچانے والے ہاتھ کا انتظام ہے۔ میری خواہش یا کوشش کو اس میں ایک فیصد بھی دخل نہیں۔ مجھے تو بطور سزا کے گھر سے اتنی دور بھیجا گیا تھا۔ کچھ ناپسندیدہ مقامات ہوتے ہیں جہاں ناپسندیدہ افراد کی پوسٹنگ اس لیے کی جاتی ہے کہ انہیں قواعد و ضوابط کی مار ماری جائے۔ کل کیا' ابھی رات تک میرے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ اس راستے سے تم گزرو گے۔ اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں ضرور تمہارے استقبال کے لیے موجود رہتا لیکن یہ تو میری سزا تو تھی جو تمہاری کسی نیکی کی جزا بن گئی۔ بعد میں کیا ہوتا ہے میرے ساتھ' یہ تمہیں کبھی معلوم نہیں ہوگا لیکن مجھے بہرحال ایک اطمینان حاصل رہے گا کہ میں نے اپنی کم ہمتی اور بزدلی کے باوجود تمہاری مدد کی۔ تم کو میرا شکر گزار ہونے کی ضرورت نہیں مگر خدا سے اور تقدیر سے تو شکوہ مت کرو۔ قدرت نے تو یہ سب انتظام بڑی ٹائمنگ کے ساتھ بطور خاص تم سب کے لیے ہی کیا ہوگا۔"

وہ بولتے بولتے تھک کر ہانپنے لگا۔ سانس تیز لینے سے اس کی پسلی چلنے لگی تھی اور وہ سخت تکلیف میں تھا۔

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے کہا "معاف کرنا دوست! میں نے بہت زیادتی کی تمہارے ساتھ۔ اگر تقدیر مہربان نہ ہوتی تو ہم واقعی مارے جاتے۔ تم کو خدا نے فرشتۂ رحمت بنا کے بھیجا تھا مگر میری نظر تمہیں نہ پہچان سکی۔ میں گناہ گار تم سے بھی شرمندہ ہوں اور خدا کے سامنے بھی شرمسار ہوں۔"

"یہ باتیں چھوڑو۔" اس نے کہا "میری بات دھیان سے سنو۔ آج دن میں تم سے باقاعدہ تفتیش ہوگی۔"

"ابھی کیا بے قاعدہ تفتیش ہو رہی ہے؟"

وہ مسکرایا "تم بہت زیادہ متفکر ہو اپنے ساتھیوں کے لئے۔ میں نے یہ کام ایک سکھ نائب صوبیدار کے سپرد کیا ہے۔ دوسرا نائب صوبیدار مرہٹہ ہے اور تیسرا بنگالی مسلمان۔ تفتیش میں ان کا رویّہ انتقامی ہوتا۔ میں ان سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ زیادہ سختی نہ کی جائے۔ سکھ نائب صوبیدار کو یہ ہدایات دینے میں کوئی رِسک نہیں تھا۔ میں نے کم کہا ہے تو وہ بہت کم کرے گا۔ اس کے ماں باپ ہر سال پنجہ صاحب حسن ابدال جاتے ہیں اور ننکانہ صاحب کی یاترا کرتے ہیں۔ اس کے جذبات پاکستان کی حکومت اور عوام کے لیے دوستانہ حد تک موافق ہیں۔"

میں نے کچھ اطمینان محسوس کیا "میری خاصی فکر کم ہوگئی۔"

"مگر آج دن میں جو تفتیش ہوگی اس میں میرے ساتھ تمہارے سب دشمن بھی شامل ہوں گے۔" وہ بولا "تین نائب صوبیداروں میں سے ایک سکھ ہی تمہارے ساتھ کچھ رعایت کرے گا۔ میں غیر جانبدار رہوں گا لیکن اصل تشویش ہے کان ستھ صوبیدار کی۔ وہ میرے بعد سب کا افسر ہے۔ طبعاً بھی کمینہ ہے اور کسی قدر بے رحم بھی۔ وہ سب کچھ کرسکتا ہے۔"

"سب کچھ۔ یعنی گولی بھی مار سکتا ہے؟"

"نہیں نہیں۔ اس کا افسر میں ہوں آخر۔ فیصلہ میں ہی صادر کروں گا لیکن یہ میں پہلے ہی بتا دینا بہتر سمجھتا ہوں کہ فیصلہ تمہارے حق میں نہیں ہوگا۔" حمید نے کہا۔

"مطلب یہ کہ تمہاری افسری دھری رہ جائے گی۔"

"فضول باتیں مت کرو۔ وہ کثرتِ رائے سے فیصلہ دیں گے۔ تین تمہارے دشمن ہیں۔ مرہٹہ نائب صوبیدار' بنگالی مسلمان اور کان ستھ صوبیدار۔ سردار جی غیر جانبدار رہیں گے اور میں نہ ادھر نہ اُدھر۔ اپنی بھی جان بچاؤں گا اور تمہاری بھی لیکن ایسے نہیں کہ تم کو ہر الزام سے بَری کرکے باعزت طور پر سرحد پار کرنے کی اجازت دے دوں۔ میں ٹربیونل کے متفقہ فیصلے کو برقرار رکھوں گا'

بطور چیف جسٹس۔"

"یہ فیصلہ کیا ہوگا؟ تم اندازہ تو کرسکتے ہو۔"

"ہاں۔ فیصلہ یہ ہوسکتا ہے کہ تم سب کو....."

"گولی مار دی جائے ایک قطار میں کھڑا کرکے۔"

"نہیں۔ یہ اختیار کہاں ہمیں۔ ہم تو بس یہ فیصلہ کریں گے کہ تمہارے خلاف الزامات کو بے بنیاد قرار دیتے ہوئے سفر جاری رکھنے کی اجازت دی جائے یا تمہیں زیرِ حراست واپس بھیج دیا جائے متعلقہ حکام کے پاس۔"

میں اچھل پڑا "کیا! واپس بھیج دیا جائے گا۔ ناممکن۔"

اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کے کہا "میرا..... میرا خیال ہے کہ پسلی ٹوٹی نہیں تھی۔ شدید چوٹ کا اثر تھا۔ اب میں بہتر محسوس کررہا ہوں۔"

"لیکن میں یہ محسوس کررہا ہوں محترم چیف جسٹس کہ تمہارے ساتھ انصاف نہیں ہوا۔" میں نے کہا "اگر تم ٹربیونل کے اس فیصلے پر عمل درآمد کا ارادہ رکھتے ہو تو مجھ پر بھی لازم آتا ہے کہ تمہاری یہ پسلی سچ مچ توڑ دوں اور دیگر ہڈیاں بھی....."

"ابھی نہیں....." وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"ہاں ابھی نہیں۔ جب تم ہمیں واپس بھیجو گے اس وقت یہی ہوگا۔ ہم ایسے شرافت سے عدالت کا حکم ماننے والے نہیں ہیں۔ ہم تو تمہارے اس جرگے کو عدالت ہی تسلیم نہیں کرتے جس میں ایک مرہٹہ ہو' ایک سکھ' ایک مسلمان اور ایک کان ستھ براہمن۔ چنانچہ ہم اس عدالت کی بھی اینٹ سے اینٹ بجادیں گے مسٹر چیف جسٹس۔" میں نے اعلان کیا۔

"دیکھو' کافی دیر سے میں تفتیش کررہا ہوں۔" کیپٹن حمید نے کہا "میرے ماتحت یہی سمجھ رہے ہوں گے کہ تم کوئی خاص مجرم ہو یا ان سب کے سرغنہ ہو اس لیے تم کو خود میں نے پوچھ گچھ کے لیے منتخب کیا۔ مگر جیسے کہ کہا جاتا ہے' انصاف ہونا بھی چاہیے اور انصاف ہوتا نظر بھی آنا چاہیے۔ ایسے ہی تفتیش ہو تو نظر بھی آنی چاہیے کہ تفتیش ہو رہی ہے بلکہ سنائی دینا چاہیے باہر۔"

"کیا مطلب؟"

"کیا تھانے سے باہر معلوم نہیں ہوجاتا کہ اندر تفتیش ہو رہی ہے؟" وہ بولا "تمہارے اور ہمارے تھانوں کی تہذیب ایک ہے۔ میں اب تمہیں زدوکوب کرنے کے صوتی اثرات دوں گا۔ امید ہے تم مجھ سے تعاون کرو گے۔"

میں اس کا مطلب سمجھ گیا اور میں نے ایک چیخ ماری "ہائے' آہ میں مرگیا۔ اُف!"

اس نے بید سے میز پر دو تین مرتبہ وار کیے پھر کئی بار تالی بجائی اور میں نے یہ ظاہر کیا کہ آواز تھپڑ پڑنے کی تھی۔

"میں کھال کھینچ لوں گا تمہاری۔ بڑے بڑے بدمعاش جو جلیبی کی طرح تھے' میرے سامنے ایسے سیدھے ہوگئے جیسے کُتے کی دُم۔"

میں نے سر پر ہاتھ مار کے آہستہ سے کہا "اور کوئی مثال نہیں تھی؟ بھلا کُتے کی دُم بھی سیدھی ہوئی ہے۔ بارہ سال نلکی میں رکھنے کا تجربہ کیا جاچکا ہے۔"

اس نے کہا "چلو چھوڑو' یہ محاورے کہاں سمجھتے ہیں میرے ماتحت۔"

میں نے اس کے پیکٹ میں سے ایک سگریٹ نکال کے کہا' "مجھے بھوک پیاس اور چاس سب کچھ لگ رہا ہے۔"

"میں ابھی بندوبست کرتا ہوں۔" وہ بولا "لیکن پہلے تم یہ بات سمجھ لو کہ میرا کیا پروگرام ہے۔"

"تم اپنا پروگرام بتا چکے ہو' اب ہم کو اپنا پروگرام طے کرنا ہے۔ ہم بھی تمہیں بتادیں گے تاکہ تم بچ جاؤ۔ باقی سب کا ہم وہی حشر کریں گے جو نادر شاہ نے دلی کا کیا تھا۔"

وہ بولا "تم جلد باز ہو' مجھے بات پوری کرنے نہیں دیتے اور خود بولنے لگتے ہو۔ عدالتی فیصلے کے بعد....."

"سوری۔" میں نے کہا "میں پھر مداخلت کررہا ہوں۔ مجھے یہ تو معلوم ہو کہ ہمارے خلاف الزامات کیا ہیں۔ کیا یہ سب لوگ ہمیں پہچان گئے ہیں؟"

"تمہیں صرف میں نے پہچانا تھا۔" وہ بولا "باقی لوگوں کو تمہارے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔"

"لیکن تم نے کہا تھا کہ کسی نے مخبری کی ہے۔"

"ہاں۔ یہ جو ڈرائیور صاحب ہیں تمہارے ساتھ۔ مسٹر جابر۔ ان کے کسی بھائی نے اطلاع دی تھی۔" وہ بولا۔

"گویا رابعہ کا شک درست ہی تھا۔" میں نے اپنے آپ سے کہا۔

"کیسا شک؟"

"کچھ نہیں۔ وہ سُور کا بچّہ بھائی نہیں تھا اس کا۔ یہ ہے کُتے کا بچّہ۔ ظاہر ہے ان میں بہت فرق ہے اور ہم نے یہ فرق نوٹ کرلیا تھا۔ خیر... فون کرنے والے نے کیا فرمایا تھا؟"

"اس نے کہا تھا کہ جو لوگ بھارتی سفارت خانے کی کار میں سرحد عبور کرنے والے ہیں ان کے پاس جعلی کاغذات ہیں۔ ایک عورت رابعہ کی تصویر بدل کے لگائی گئی ہے۔ باقی سب کے پاسپورٹ تو اصلی ہیں مگر ان کے نام پتے غلط ہیں۔ ان میں کوئی مسٹر یا مسز راجن ہے' نہ مسٹر اور مسز کمار۔ ان کے اصل نام سکندر' رابعہ اور غالب ہیں۔"

"یہ سب جانتا تھا وہ! اور اسے کچھ معلوم نہیں تھا؟" میں بھونچکا رہ گیا۔

"اور کیا؟"

"کیا اسے ہمارے کرتوتوں کا علم نہیں تھا؟ یہ معلوم نہیں تھا کہ ہم کتنے مشہور و معروف لوگ ہیں اور ہماری گرفتاری پر کتنا انعام ہے؟"

"میں بتا چکا ہوں کہ خوش قسمتی تمہارا ساتھ دے رہی ہے۔ اس کو صرف نام معلوم تھے۔ نام کے ساتھ منسوب کارناموں کا

اور تم سب کے اشتہاری مجرم ہونے کا اسے ذرا بھی علم ہوتا تو وہ تمہیں وہیں پکڑا دیتا۔"

"پھر اس نے یہ نیک کام کیوں کیا؟ کیا حاصل ہوتا اسے اگر ہم یہاں روک لیے جاتے؟" میں نے کہا۔

"یہ جابر کا حرامی پن ہے۔" کیپٹن حمید نے کہا "اس نے تم سے بھاری معاوضہ وصول کیا ہوگا سرحد پار کرانے کا؟"

میں نے کہا "ہاں۔ اس نے تو لوٹ لیا ہمیں۔ وہ بھارتی سفارت خانے میں ملازم تھا۔ ایک مسٹر شرما تھے جن کی یہ کار ہے۔"

"تھے کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اب نہیں ہیں۔ جابر نے ان کو قتل کر کے انہی کے گھر میں گاڑ دیا ہے۔" میں نے کہا۔

کیپٹن حمید حیرانی سے پلکیں جھپکاتا رہا "تم مذاق کر رہے ہو!"

"مذاق میں ایسی فضول بات نہیں کر سکتا میں۔ یہ حقیقت ہے۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ...."

میں نے کہا "ہمیں خود جابر نے بتایا۔ دراصل یہ ایک لمبی کہانی ہے جو میں پھر کسی وقت سناؤں گا۔ اس کے دامن پر ایک نہیں دو افراد کے لہو کا داغ ہے۔"

"بہتر ہوگا کہ تم ابھی بتادو۔ اختصار سے۔"

میں نے اسے کم سے کم الفاظ میں وہ سب بتادیا جو جابر کے نامۂ اعمال میں درج تھا۔ حمید غور سے سنتا رہا۔ اب وہ میز کے دوسری جانب والی کرسی پر آرام سے بیٹھا ہوا تھا لیکن ایک ہاتھ سے پسلی کی مالش میں مصروف تھا۔

"میں سمجھ گیا۔" اس نے سب سننے کے بعد کہا۔

"کیا سمجھے؟ مجھے بھی سمجھادو۔" میں نے کہا۔

"فون خود جابر نے کرایا ہوگا۔" وہ بولا "وہ تم کو اسی جگہ چھوڑ کے واپس جانا چاہتا ہوگا۔ اسے تو سفارتی تحفظ حاصل ہے۔ اسے بھروسا ہوگا کہ ہم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے لیکن تم کو روک سکتے ہیں۔ اس نے معاوضہ کھٹمنڈو پہنچانے کا لیا ہوگا مگر وہ تم کو نیپال کی سرحد پر چھوڑ کے واپس چلا جاتا۔ آگے تمہارے ساتھ کیا ہوتا ہے' یہ فکر اسے کیوں ہو۔ اسے تو معاوضہ پورا مل گیا ہوگا۔ اگر وہ کھٹمنڈو جاتا تو وہاں بھارتی سفارت خانے والے اس کار کو دیکھ کر پہچان جاتے۔ اسے ڈر ضرور ہوگا کہ کوئی دیکھ نہ لے' دیکھ لے گا تو پوچھے گا کہ تم یہاں کیسے؟ شرما جی کہاں ہیں؟ کس کام سے آئے ہو؟ یہاں تک تو اس کے آنے کا ریکارڈ بھی نہیں۔ وہ ثابت کر سکتا ہے کہ ڈھاکا سے باہر نہیں گیا۔ کھٹمنڈو میں اس کے خلاف گواہ پیدا ہو جاتے چنانچہ اس نے یہیں سے واپسی میں عافیت جانی۔ ایک ٹیلی فون کال کرے گا وہ اپنے بھائی کو...."

"یار' وہ بھائی نہیں تھا۔"

"او کے۔ اس سُور کے بچے کو ہزار دو ہزار دے گا وہ واپسی میں اور خیر سے ڈھاکا لوٹ جائے گا۔ یہ خیال ہوگا اس کا۔ مگر اب میرا خیال کچھ اور ہے۔ اسے واپس وہیں بھیج دیا جائے جہاں ہم سب کو لوٹ کے جانا ہے ایک دن۔" کیپٹن حمید بولا۔

"اسے کچھ بھونکنے کی مہلت مت دینا۔ ایسا نہ ہو کہ وہ خود کو مصیبت میں دیکھے تو ہمارے خلاف بولنا شروع کردے۔ وہ سب جانتا ہے۔ پتا نہیں اس نے بتایا کیوں نہیں۔"

"وہ بتاتا تو خود بھی شریکِ جرم سمجھا جاتا۔ ابھی تو وہ معصوم بنا ہوا ہے نا کہ اسے کیا معلوم پاسپورٹ اصلی ہیں یا نقلی۔ کس نے تصویر بدلی ہے اور کس نے غلط اندراج کیا ہے۔ اسے تو شرما جی نے کہا تھا کہ ان مہمانوں کو نیپال کی سرحد کے پار پہنچادو۔"

"یہ کہا ہے اس حرامزادے نے؟" میں نے برہمی سے کہا۔

"ابھی تک تو یہی بیان ہے اس کا۔" حمید بولا۔

"یعنی وہ ابھی زندہ ہے۔ وہ گولی اور اس کی چیخ کی آواز؟"

"گولی اس کی ٹانگ پر ماری گئی تھی۔ اس نے بھاگنے کی کوشش کی تھی۔" حمید نے کہا "اب تم اس کی بات چھوڑو' سمجھ لو کہ وہ دنیا میں تھا ہی نہیں۔ اپنے خلاف الزامات کی نوعیت سمجھ لی تم نے؟"

"سمجھ لی" میں نے کہا "لیکن میں ابھی تک فیصلے کی مصلحت کو نہیں سمجھ پایا۔ اگر تم ہماری مدد کر رہے ہو تو ہمیں قانونی کارروائی کے لیے واپس ارسال کرنا چہ معنی دارد؟"

"سب سمجھ جاؤ گے تم۔" اس نے گرج کے کہا اور میز پر بید کی چھڑی ماری۔ میں نے فریاد و فغاں کا غلغلہ بلند کیا اور حلق سے ایسی آوازیں نکالیں جو ہر تھانے میں زیرِ تفتیش ملزم ہی نکال سکتے ہیں۔

حمید نے کہا "ضروری نہیں کہ ہر بات اسی وقت بتادی جائے۔ جو کچھ بھی ہوگا تمہارے سامنے آجائے گا۔ تم خود سمجھ لو گے کہ کیا ہو رہا ہے اور اس کا اصل مقصد کیا ہے۔ میرے پیشِ نظر تمہاری بھلائی ہے...."

میں نے کہا "مگر یہ تو بتادو کہ بھلائی کہاں ہے' کس طرف کو ہے' کدھر ہے۔ قیدی کی حیثیت سے ہم واپس جائیں گے تو تمہارے یہی ماتحت ساتھ ہوں گے...."

حمید نے کہا "تم کتنی بار جیل سے فرار ہوئے ہو؟"

میں نے کہا "ایک بار بھی نہیں۔ اس لیے کہ میں جیل کبھی نہیں گیا۔"

"یہی اطوار رہے تو ایک دن ضرور جاؤ گے۔" وہ بولا "خیر دشمن کی قید سے، فرار ہونے کا تجربہ تو ہے نا؟ جان ہتھیلی پر رکھ کے اور سر سے کفن باندھ کے؟"

میں نے کہا "اس کا تجربہ سب رکھتے ہیں۔"

"بس تو اسی تجربے سے فائدہ اٹھانا۔ محافظوں کو ٹھکانے

لگا کے نکل جانا۔" حمید نے کہا۔

"کیا یہ اتنا آسان ہوگا؟" میں نے کہا۔

"بہت آسان ہوگا۔" حمید نے مجھے یقین دلایا "میں مزید آسان بنادوں گا۔ مجھے معلوم ہے کہ میرے کتنے ماتحت حرام خور' بزدل اور کاہل ہیں۔ دراصل انہی اوصافِ حمیدہ کے باعث انہیں یہاں بھیجا گیا ہے۔ چنانچہ فرض تو سب ادا کر رہے ہیں مگر مجبوری میں اور مطمئن بالکل نہیں ہیں۔ ایک غیر مطمئن کارکن کبھی مستعد نہیں ہوتا اور اس سے اعلیٰ کارکردگی کی امید نہیں رکھی جاسکتی۔ میں سب سے زیادہ ناخوش اور ناکارہ افراد کو محافظ کی حیثیت سے بھیجوں گا جو ہرگز اپنی جان پر کھیل کر ادائے فرض نہیں کریں گے۔ تم ان کو رشوت دے سکو گے' بے وقوف بنا سکو گے اور بہ آسانی زیر کرلو گے۔ کچھ تمہارے طرف دار بھی ہوں گے اور ممکن ہے' خود تمہیں موقع فراہم کریں۔ اس سے زیادہ تمہارے لیے کیا آسانی پیدا کر سکتا ہوں میں۔"

میں نے غور فرمانے کے بعد سر ہلایا "تم میرے پہلے پسندیدہ دشمن اور جیلر ہو۔ تم جیسے جیلر ہر جگہ ہوں تو دنیا میں سب آزاد انسان نظر آئیں' اسیر کوئی بھی نہ ہو۔ جیل خانے خالی ہو جائیں۔"

اس نے دروازہ کھولا اور...... چیخ کر کہا "جوان! کھڑے کھڑے سو رہے ہو! دن نکل آنے کے بعد بھی؟"

افسر کی آواز پر وہ اچھل پڑا "نو.... نو سر۔"

"نو سر کا بچہ!" حمید نے کڑک کر کہا "یہ باقی لوگ آج کیا کر رہے ہیں؟"

"حاضری میں ہیں سر۔" اس نے جواب دیا "حوالدار کے ساتھ پریڈ گراؤنڈ میں۔"

"احمد سنتری کی ڈیوٹی والے کہاں ہیں؟ ان کو بلاؤ۔"

"یس سر۔" وہ سیلوٹ کر کے رخصت ہوگیا تو حمید نے کہا "اب میں تم کو تمہارے ساتھیوں کے پاس پہنچاتا ہوں۔ جو میں نے تمہیں سمجھایا' تم انہیں سمجھا دینا تاکہ گڑبڑ کوئی نہ ہو۔"

"تم یہ گڑگڑ کی آواز سن رہے ہو۔ حقے جیسی؟"

"ہاں۔ کوئی ہیلی کاپٹر ہے کہیں۔"

"غلط۔ یہ میرا پیٹ ہے' خالی پیٹ جس میں آنتیں قل ہو اللہ کے بعد سورۂ فاتحہ پڑھ رہی ہیں۔" میں نے کہا۔

وہ مسکرایا "خاطر تواضع بھی ہوگی۔ بہت اچھی طرح۔" اس نے ذو معنی لہجے میں کہا "دس بجے تک تمہیں فرصت ہے کہ ایک دوسرے سے گلے مل لو۔ نصیحت وصیت جو کرنا ہے کرلو کیوں کہ اس کے بعد عدالتی کارروائی شروع ہوگی۔"

"نصیحت کا تو کسی پر اثر ہوتا نہیں' ہوتا تو ہم اس حال کو کیوں پہنچتے۔ ہمارے ایک انکل تھے۔ ایس ایس پی ضامن رضوی مرحوم۔ پولیس کی سروس میں رہے مگر ایمانداری کا یہ حال تھا کہ مرتے وقت تک اپنا گھر نہ بنا سکے۔ انہیں دیکھ کر ہی یقین آتا تھا کہ واقعی پولیس میں نیک انسان بھی ہوتے ہیں اور انسانوں میں فرشتے۔ انہوں نے بہت سمجھایا تھا، ہر روز بلکہ ہر وقت نصیحت کرتے تھے کہ ان چکروں میں مت پڑو۔ راہِ راست پر چلنا بہت مشکل کام ہے' اس لیے اپنے کام سے کام رکھو۔ آج تمہیں دیکھ کر وہ یاد آرہے ہیں۔ تمہاری صورت میں ان کی مشابہت ہے۔ افسوس ناک حد تک۔"

"افسوس کی کون سی بات ہے اس میں؟"

"خیال آتا ہے' کہیں تمہارا بھی انجام انہی جیسا نہ ہو۔" میں نے کہا۔

دو مسلح افراد اندر آئے اور سیلوٹ کر کے اٹین شن ہوگئے۔

"اس خطرناک قیدی کو وہیں لے جاؤ جہاں باقی سب ہیں۔" حمید نے ایک دم لہجہ اور رویّہ بدل لیا "اور دیکھو' یہ فرار ہوگیا تو تمہیں بھی جانا پڑے گا اس دنیا سے۔"

محافظ میرے آگے پیچھے ہوگئے۔ ان کے ہاتھ بڑے قاتلانہ انداز میں خودکار رائفلوں کے ٹریگر پر تھے۔ میرا ایک قدم بھی اِدھر اُدھر پڑجاتا تو شاید اسے وہ فرار کی کوشش سمجھتے ہوئے مجھے فوراً منصبِ شہادت پر فائز کردیتے۔ دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا والی بات ہوتی چنانچہ میں صراطِ مستقیم پر چلتا رہا اور دعا کرتا رہا کہ ان کا پیر اونچی نیچی زمین پر نہ لڑکھڑائے ورنہ ٹریگر پر خفیف سا دباؤ بلا ارادہ بڑھ جائے گا۔ رائفل ویسے بھی خودکار تھی۔

طویل بیرک پتھروں کو بڑی صفائی سے تراش کے بنائی گئی تھی۔ یہ زرد اور سلیٹی رنگ کے پتھر مقامی پہاڑوں سے حاصل کیے گئے تھے اور دیواروں میں سیمنٹ سے اس طرح چنے گئے تھے کہ مضبوطی کے ساتھ خوب صورتی کا پہلو بھی اُجاگر ہوگیا تھا۔ پس منظر کے پہاڑوں اور سبزہ و گل میں یہ عمارت اپنی ڈھلوان مخروطی چھت کے ساتھ ایک خوب صورت منظر کا حصہ لگتی تھی تاہم یہ میری نظر کا بھی کمال تھا کہ میں نے اس حُسن کو محسوس کیا اور یہ کمال اس یقین سے پیدا ہوا تھا کہ ہمارے لیے کسی حقیقی خطرے کا وجود نہیں۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ اس بیرک میں قید رکھنے کے بعد اس خوب صورت پس منظر میں کھڑا کر کے مجھے گولی ماردی جائے گی تو مجھے احساسِ حسن کہاں ہوتا۔ مجھے یہ کال کوٹھری اور پھانسی گھاٹ سے زیادہ بدصورت' خوفزدہ کرنے والی اور منحوس عمارت لگتی اور قدرت کا سارا حُسن آنکھوں میں پھرنے والی موت کی تصویر میں غائب ہو جاتا۔

بیرک کے آخری حصے میں ایک کمرے کے فرش پر دیگر اسیرانِ کرام تشریف فرما تھے۔ مرزا غالب مٹی' دھول میں ایسے سکون سے ٹانگ پہ ٹانگ رکھے لیٹے تھے کہ فکرِ سخن میں غلطاں نظر آتے تھے۔

نازو اور کاجل ایک دیوار کے قریب پھسکڑا مارے کانا پوسی میں مصروف تھیں اور موضوع سخن شاید غیر شریفانہ یا زنانہ تھا کہ نازو نے ہنسنے کے لیے منہ سے "کھی" کی آواز نکالی اور ایک دم خاموش ہوگئی۔ رابعہ اور کلیم دوسری دیوار کے ساتھ استاد شاگرد والے پوز میں بیٹھے تھے۔ رابعہ فرش پر انگلی سے نہ جانے کیا بنا رہی تھی۔ کلیم اللہ بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے تعجب ہوا کہ رابعہ نے کیسے اتنے کم وقت میں کلیم اللہ کے خیالات کو اپنے حق میں کرلیا۔ وہ جوان لڑکا ہوتا تو میں سمجھتا کہ اس پر بھی حُسن کا جادو چل گیا مگر ابھی وہ بچہ تھا۔ حقیقت حال معلوم ہو جانے کے بعد وہ ہم سب سے بدظن ہوگیا تھا مگر اب ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی تھی۔

میں نے غالب کے قریب بیٹھ کے دردناک آواز نکالی "آہ!"

غالب گھبرا کے بیٹھ گیا "کیا بات ہے؟ کوئی تکلیف ہے؟"

میں نے سرہلایا "بڑا سخت' ظالم اور بے رحم آدمی ہے۔"

رابعہ کا رنگ اڑ گیا "تم پر تشدد کیا اس نے؟"

میں نے اسے پرملامت نظروں سے دیکھا "اور کیا... وہ مجھ سے رشتے کی بات کررہا تھا۔ بیت بازی ہورہی تھی۔ بید بازی کا ماہر ہے وہ۔"

غالب نے فوراً میرے مکر کو سمجھ لیا۔ اس نے میری کمر پر ایک مُکا رسید کیا "بید بازی کے بعد آدمی ایکٹنگ نہیں کرسکتا مرنے کی۔"

"میں سچ مچ فوت ہورہا ہوں۔" میں نے کراہ کر کہا "کیوں میرے قتل کا الزام لیتے ہو اپنے سرپر۔ بلاوجہ۔ آہ رابعہ! تم بھی مسکرا رہی ہو۔ ظالم حسینہ عرف کوئن آف ہارٹ۔ تم سے کسی نے تفتیش نہیں کی؟"

غالب نے کہا "ہوئی تھی مگر تفتیش کرنے والے سردار جی کے بارہ بجے ہوئے تھے صبح صبح۔ ان کی باتیں لطیفے سے کم نہیں تھیں۔ بڑی شرافت سے یقین دلاتے رہے کہ واہگورو کی کرپا سے سب ٹھیک ہوجائے گا کُڑیو۔ بیک وقت تینوں پر فریفتہ نظر آتے تھے۔ غالباً فیصلہ کرنا مشکل ہورہا تھا ان کے لیے۔ آخر میں رابعہ کی طرف زیادہ ملتفت تھے اور خاصے بے تکلف بھی ہوگئے تھے۔ پہلے بزرگانہ شفقت سے سرپر ہاتھ پھیرتے رہے۔"

رابعہ کا چہرہ سرخ پڑ گیا "کچھ شرم کرو' ان کی عمر کا لحاظ کرو۔"

غالب ہنسنے لگا "میں نیت کی بات کررہا تھا' جس کا عمر سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔"

نازو نے بھی احتجاج کیا "اپنے جیسا سمجھتے ہو سب کو؟"

"بالکل ٹھیک۔ میں بچپن سے ہی بدنیت تھا اور بقول شاعر میرا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ تھا۔ جوانی تو خیر ہوتی ہی دیوانی ہے مگر مرتے دم تک حُسن پرستی کا جذبہ قائم ودائم رہے گا۔"

میں نے کہا "کیا بک بک شروع کردی تم نے؟ تمہارے ساتھ کوئی زیادتی تو نہیں کی کسی نے؟"

"میرے ساتھ تو نہیں ہوئی۔" غالب نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جھوٹ مت بولو۔" رابعہ نے کہا۔

"بھئی تفتیش میں کچھ تو ہوتا ہی ہے۔" غالب نے کہا "آخر ہم سب زیرِ حراست ہیں۔ ہمارے ساتھ اس سے بہت کم ہوا جو زیرِ تفتیش ملزمان کے ساتھ ہوتا ہے اور معمولی واقعات کو بڑھا چڑھا کے بیان کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ کیوں نہ ہم سب کچھ بھول جائیں مس رابعہ۔"

"چلو بھول جائیں گے۔" میں نے کہا "مگر مجھے کچھ معلوم تو ہو۔"

"ابتدا تم کرو۔ سچ سچ بتاؤ کہ تم سے کس طرح تفتیش کی گئی۔ پہلے جھانپڑ سے شروع کرو۔" غالب نے کہا۔

میں نے جھینپ کر کہا "وہ سب ڈراما تھا۔"

غالب نے قہقہہ مارا "سن رہی ہیں آپ خاتونِ اوّل۔ ناظرین میں آپ بھی شامل تھیں۔ آپ کو کیسا لگا تھا وہ ڈراما؟ خصوصاً ہیرو کی بہادری۔"

میں نے کہا "اُس وقت میں بہادری کا مظاہرہ کرتا تو اس وقت تم یوں ہنسنے کے قابل نہ رہتے۔ کیپٹن حمید خود مجرم ہے اور یہاں سزا کاٹ رہا ہے۔"

کاجل نے حیرانی سے کہا "کیا جرم کیا تھا اس نے؟"

"اس کا جرم نوعیت کے اعتبار سے وہی ہے جو تمہارا۔ وہ مسلمان ہے' فرض شناس ہے اور پاکستان کا حامی ہے۔" میں نے کہا "چنانچہ اسے گھر سے دور اس ویرانے میں پھینک دیا گیا ہے اور ایک ایسی فوج کی کمان دے دی گئی ہے جس میں سب ہی ناپسندیدہ افراد شامل ہیں' جن کو کوئی اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتا۔ وہ خود بڑی مشکل میں ہے تاہم اس نے ہماری مشکل کو آسان بنانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ انشاء اللہ ہم آج شام سے پہلے واپس روانہ ہوجائیں گے۔"

"واپس؟" تقریباً سب نے ایک ساتھ چلّا کے کہا۔

"سنو' ذرا صبر سے پوری بات سنو۔" میں نے کہا اور پھر کیپٹن حمید کے ساتھ ہونے والی تمام گفتگو کا خلاصہ پیش کردیا۔ تاہم خلاصہ کوئی نہیں چاہتا تھا۔ درمیان میں مجھ سے اتنے سولات کیے گئے کہ کوئی بات باقی نہیں رہی۔

غالب بولا "مجھے خوشی ہوئی کہ جابر کو اس کے جبر کی سزا ملی۔"

"ابھی ملی نہیں' ملے گی۔" میں نے کہا۔

"ایسے لوگوں کا انجام یہی ہوتا ہے۔ بہت غرور ہوگا اسے اپنی چالاکی اور مکاری پر۔ سوچ رہا ہوگا کہ سب کو پھنسا کے سیٹی بجاتا ہوا واپس لوٹ جاؤں گا۔" غالب نے کہا۔

نازو بولی "بڑا شکاری سمجھتا تھا خود کو۔ اپنے ہی پھیلائے ہوئے

جال میں گرفتار ہوگیا۔"

کاجل نے کہا۔ "تم کیپٹن حمید سے بات کرنا۔"

"ایسی کیا بات ہے؟" میں نے کہا۔

"اس سے کہنا کہ مجھے موقع دے۔ میں خود گولی ماروں گی اسے۔" کاجل نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ ناممکن ہے۔ یہ کوئی کھیل نہیں ہے ہاکی کا۔ کہ ریفری سب کو ایک طرف کھڑا کردے اور تمہیں پنیلٹی اسٹروک لگانے کا موقع دے۔ اتنا کافی ہے کہ اسے اپنے کیے کی سزا مل جائے گی۔" میں نے کاجل کو سمجھایا۔

"اچھا... تو اس سے کہو کہ مجھے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھنے دے۔" کاجل کے وجود میں سویا ہوا نفرت کا لاوا اُبلنے لگا۔ "میرے سامنے...."

"میں ایسا کوئی احمقانہ مطالبہ نہیں کرسکتا۔ وہ فلم کی شوٹنگ نہیں ہوگی۔" میں نے کہا۔

"اچھا... سامنے نہ سہی میں چُھپ کر دیکھ لوں۔"

میں نے بگڑ کے کہا "کاجل! کیا ہوگیا ہے تمہاری عقل کو؟"

اس نے چلّا کر کہا "یہ مجھ سے پوچھتے ہو کہ میری عقل کو کیا ہوگیا ہے! میں نے بھی تو سب سے بڑی قیمت ادا کی ہے۔ تم سب کی آزادی کی خاطر کیا نہیں گنوایا میں نے! اپنے ماں باپ کو' گھربار کو' عزت کو۔ کہاں سے لاؤں میں وہ عقل جو میرے احساس کی لاش کو آنسو بہائے بغیر دفن کردے۔ میں جذبات سے عاری ہوجاؤں اور سب کچھ بھول جاؤں۔"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ رابعہ نے اسے بڑی مشکل سے چپ کرایا۔ اس دوران میں دو افراد اندر آئے اور ناشتا رکھ کر چلے گئے۔ المونیم کی ایک کیتلی میں اُبلتی ہوئی چائے تھی۔ چائے میں اس کے تمام اجزا پہلے ہی ملا دیے گئے تھے۔ چائے پینے کے لیے کپ کی جگہ بلوّر کے مگ تھے اور انہیں ہونٹوں سے لگانے سے بھی ہونٹ جلتے تھے۔ کھانے کے لیے عجیب لمبوتری سی تندروی روٹیاں تھیں اور ایک پیالہ مکھن سے بھرا ہوا تھا۔ کاجل خاموش ہوگئی تو میں نے خاموشی سے ناشتا کیا۔ اس کے ہسٹریا نے سب کو متاثر کیا تھا۔ بلاشبہ اس کا یہ ردعمل فطری تھا۔ صبروضبط اور قوت برداشت کی حد وہ پہلے ہی پار کرچکی تھی۔ کوئی عورت یوں اپنے آپ کو قربان کرکے کسی اور کے لیے آزادی کا سودا نہیں کرسکتی تھی۔ ہم سے اس کا اتنا قریبی تعلق بھی نہ تھا کہ ہم اس سے قربانی کی توقع رکھتے۔ ایسی قربانی تو رابعہ اور نازو کے لیے بھی ناممکن تھی۔ جان دینا بہت آسان ہوتا ہے۔ اپنی آن اور اَنا کو خود اپنے ہاتھوں سے قتل کرنا' یہ صرف کاجل ہی کرسکتی تھی۔ اور میں اس سے کہہ رہا تھا کہ عقل سے کام لو۔ عقل تو میری ماری گئی تھی۔

ناشتے سے فراغت پانے کے بعد غالب نے مجھے خاصی سنجیدگی سے بتایا "سردار جی کا خیال تھا کہ ہم پاکستانی جاسوس ہیں۔ اس کے ساتھ ایک نائب صوبیدار بنگالی مسلمان تھا۔ وہ کاجل سے بنگالی میں بات کرتا رہا۔ کاجل نے بعد میں بتایا کہ اسے سب سے پہلے الگ لے جاکر یہی پوچھا گیا تھا کہ وہ بنگلہ دیش سے کیوں فرار ہورہی ہے اور وہ بھی بھارتی سفارت خانے کی گاڑی میں۔ انہوں نے' یعنی تفتیش کرنے والوں نے کہا کہ وہ بنگلہ دیش کے ایک ممتاز سیاستداں کی بیٹی ہونے کا دعویٰ بھی رکھتی ہے۔ یہ بھی کہتی ہے کہ اس کا باپ شیخ مجیب کا دستِ راست ہے۔ انہوں نے کاجل کی اس بات کا یقین نہیں کیا کہ وہ فرار ہونے میں ہماری مدد کررہی تھی۔"

"کیا انہوں نے تھرڈ ڈگری کا استعمال کیا؟"

"تھوڑا بہت۔ کاجل نے بھی یہی کہا تھا کہ زیادہ سختی نہیں ہوئی۔"

"مگر سختی ہوئی؟"

"ہاں۔ سختی تو کی انہوں نے۔ دھمکیاں دے کر خوفزدہ کرنے کی کوشش کی۔ کاجل کو یہ معلوم نہیں تھا کہ ہمارے اصل نام تفتیش کرنے والوں کو معلوم ہوچکے ہیں۔ وہ اس سے اعتراف کرانا چاہتے تھے کہ ہم پاکستانی جاسوس ہیں مگر اس نے نہیں مانا۔ یہ بنگالی نائب صوبیدار جو مسلمان ہے' یہی سب سے زیادہ خطرناک دشمن ثابت ہوا۔ اس نے کاجل کو گندی گالیاں دیں۔ ایسی کہ وہ بتا بھی نہیں سکتی تھی۔ انتہائی فحش کلامی کے ساتھ اس نے کاجل پر ہر الزام لگایا جس میں غدار کی بیٹی کا خطاب بھی شامل تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ تشدد میں حد سے بڑھ جاتے مگر کیپٹن حمید آگیا اور اس نے بنگالی کو کسی کام سے بھیج دیا۔ اس نے میرے ساتھ بھی ڈراما کیا۔"

میں نے ہنس کے کہا "ویسا ہی جیسا میرے ساتھ ہوا تھا؟"

"اس سے بھی زیادہ۔" غالب جھینپ کر بولا "خبیث نے سردار جی کے سامنے مجھے مارا اور بہت گرجا برسا کہ کھال کھینچ کے بُھس بھرنے کا ماہر ہوں میں۔ اس کے ساتھ ہی سردار جی بھی شروع ہوگئے مگر حمید نے مجھے آنکھ ماردی جس کا مطلب میں فوراً تو نہیں سمجھا تھا تاہم اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں نے مار خاموشی سے برداشت کی۔ کیپٹن حمید نے سردار جی کو تفتیش جاری رکھنے کے لیے کہا اور خود چلا گیا تم سے پوچھ گچھ کرنے کے لئے۔ بعد میں سردار جی نے خاصی محبت سے مجھے پنجابی میں گالیاں دیں کہ کھوتے دے پُتر' جے توں جسوس ایں تے مینوں دس دے کن وِچ۔" ان کا مطلب تھا کہ شرافت سے مان جاؤں ورنہ ..... اس ورنہ کے بعد کچھ نہیں تھا' میرے سمجھنے کی بات تھی۔ سردار جی نے باری باری رابعہ' نازو اور کاجل سے بھی تفتیش کی۔ میں مذاق نہیں کررہا تھا۔ وہ سردار جی واقعی ٹھرکی ہیں۔ ان کا رویّہ خاصا اشتعال انگیز تھا اور میں ڈر رہا تھا کہ کہیں نازو ان کا حشر نشر نہ کردے۔ میں پیچھے کھڑا اسے اشارے کرتا رہا اور ہاتھ جوڑ کے خاموش رہنے کی اپیل کرتا رہا۔"

میں نے کہا "انہوں نے گاڑی کی تلاشی بھی لی ہوگی؟"

"ہاں۔ اور تلاشی میں سب کچھ نکل آیا۔ اسلحہ بھی' مال بھی۔ ہمارے پاس بس اللہ کا نام ہے۔" غالب بولا۔

"یہ سب جابر کی خباثت کے باعث ہوا۔" میں نے کہا "اس نے ہمارے ساتھ دھوکا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اب دیکھو اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔"

غالب نے کہا "وہ خود ہے کہاں؟"

"مجھے تو نہیں معلوم۔"

"زندہ تو ہے نا؟" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "ہاں۔ ابھی تک تو زندہ ہے۔ اس نے بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ ایک ٹانگ میں گولی ماردی انہوں نے۔"

"جابر ہمارے خلاف بولے گا۔ وہ سب بتادے گا جو کسی کو بھی معلوم نہیں۔" غالب نے اپنے اندیشے کا اظہار کیا۔ "بلکہ ممکن ہے اب تک وہ بتا بھی چکا ہو لیکن اسے ڈر بھی ہوگا کہ جتنا وہ ہمارے بارے میں جانتا ہے اس سے زیادہ ہم اس کے بارے میں بتا سکتے ہیں۔"

"وہ تو میں بتا چکا ہوں کیپٹن حمید کو۔" میں نے کہا۔

"پھر اس سے امید مت رکھو کہ وہ خاموش رہے گا۔ وہ اپنی جان بچانے کے لیے خاموش رہ سکتا تھا۔" غالب نے کہا۔

"مگر جو کچھ میں نے بتایا ہے' ابھی تک کیپٹن حمید کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا "میں اس سے بات کرسکتا ہوں۔"

"اب کیا بات کروگے؟"

"یہی کہ جابر ہمارا راز فاش نہ کرے تو اس کے جرائم پر بھی پردہ پڑا رہنے دیا جائے۔" میں نے کہا۔

"کیا وہ مان جائے گا؟"

"اگر وہ ہماری مدد کرنا چاہتا ہے تو ضرور مانے گا۔ ابھی تک تو ہم پر کوئی بہت سنگین الزام نہیں' سوائے اس کے کہ ہم مسلمان ہیں اور ہندو ناموں سے بھارتی پاسپورٹ لے کر سفر کررہے تھے۔ رابعہ کے پاسپورٹ میں بھی ردّوبدل کیا گیا تھا مگر یہ کوئی نہیں جانتا کہ ہم ایم آر ایس کے وہ اراکین ہیں جو ہر قیمت پر ہر حکومت کو مطلوب ہیں۔ پہلے پاکستان میں پولیس کو مطلوب تھے' پھر بھارت میں اور اب بنگلہ دیش میں ہمارے خلاف تخریبی سرگرمیوں سے لے کر ڈکیتی اور قتل و غارت گری کے نہ جانے کتنے مقدمات درج ہیں۔"

غالب بولا "یار' کیا اب بھی پاکستان میں پولیس ہمیں پریشان کرے گی؟ وہ پرانے مقدمات پھر زندہ ہوں گے؟ وہ فائلیں دوبارہ نکالی جائیں گی؟"

"یہ تو وہاں جا کے ہی پتا چلے گا۔" میں نے کہا "فکر آج کی کرو مرزا جی۔ ایسا نہ ہو کہ پاکستان پہنچنے سے قبل ہی پہلے بنگلہ دیش میں پھانسی ہو اور پھر بھارت میں۔"

غالب نے کہا "میرا خیال ہے کہ تم کیپٹن حمید سے بات کرلو اور اس سے پہلے جابر سے۔"

"جابر سے مجھے کون ملنے دے گا؟"

"کیپٹن حمید کے اختیار میں سب کچھ ہے۔" غالب نے کہا "وہ عہدے کے لحاظ سے چھوٹا افسر ہے مگر یہاں وہی حاکم ہے۔ اگر ابھی تک جابر نے ہمارے کارناموں کا ذکر نہیں کیا ہے تو ہم بھی اس کے جرائم کی پردہ پوشی کریں گے۔ اس سے معاہدہ کرلو۔"

میں نے کہا "میں کوشش کرتا ہوں۔"

باہر برآمدے میں دو نیپالی سپاہی رائفلیں لٹکائے ٹہل رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بندوق کا رخ میری طرف کرکے لپکے اور اپنی زبان میں مجھے فوراً واپسی کا حکم دینے لگے۔ الفاظ ناقابلِ فہم تھے مگر اشارے واضح تھے۔

میں نے ہاتھ اٹھا کے کہا "بلاوجہ شور مت کرو۔ میں فرار نہیں ہورہا ہوں۔ مجھے کیپٹن حمید سے ملنا ہے۔"

کیپٹن حمید کے نام پر وہ رک گئے ورنہ ایک نے تو بٹ مارنے کے لیے رائفل اٹھالی تھی۔ انہوں نے آپس میں تبادلۂ خیال کیا اور مجھے اپنے ہمراہ چلنے کا اشارہ کیا۔ بیرک کے دوسرے حصے میں دو نائب صوبیداروں کا کمرا تھا۔ ان میں سے ایک ہمارا دشمن نمبرون بنگالی تھا۔

مجھے دیکھتے ہی اس کا چہرہ بگڑ گیا اور اس نے کچھ پوچھے بغیر پہلے مجھے چند گالیوں سے نوازا پھر اس کی نفرت اور تعصب پر مبنی قومیت کے جذبات کا لاوا ابلنے لگا اور اس نے مغربی پاکستان میں رہنے والے سب افراد کو ظلم اور استحصال کرنے والی قوم کا خطاب دیا۔ اس نے اپنی تقریر میں کہا کہ ہم انگریزوں سے زیادہ کمینے تھے۔ ہم نے بنگالیوں کو غلام بنا کے رکھا' ان کے حقوق پامال کئے اور ان کی کمائی کھا گئے۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی چنانچہ میں نے مشتعل ہوکے جواب دینے سے گریز کیا۔

دوسرے نائب صوبیدار نے مداخلت نہ کی ہوتی تو اس کی بکواس جاری رہتی "یہ بھی تو پوچھو اس سے کہ یہاں کیوں آیا ہے؟"

میں نے کہا "نائب صوبیدار کی شاید اور کوئی نہیں سنتا۔ انہیں بولنے دو۔ فضول بول کے یہ اپنی انرجی ضائع کررہے ہیں۔"

"میں فضول بول رہا ہوں۔" وہ مشتعل ہوکے اُچھلا۔

"میں نے ذرا شریفانہ الفاظ استعمال کئے ورنہ درحقیقت تم بھونک رہے تھے۔" میں نے کہا۔

دوسرا نائب صوبیدار مرہٹہ تھا۔ اس نے میرے منہ پر تھپڑ مارا "مجھ سے بات کرو اور تمیز سے بات کرو۔ کیا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا "میں اپنے تمام سابقہ اور آئندہ جرائم و عزائم کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔ کیا کرچکا ہوں آج تک اور کل کیا کروں گا۔"

"کل تم زندہ رہو گے تو کچھ کروگے۔" مرہٹے نے کہا۔

"میں مر کے بھی بہت کچھ کرسکتا ہوں۔ بھوت بن کے تمہیں چمٹ سکتا ہوں یا جن بن کے تمہاری بیوی پر عاشق ہوسکتا ہوں۔" میں نے کہا۔

اس نے پھر تھپڑ مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ میں نے اس کی کلائی پکڑلی "ابھی تک مجھ پر کوئی جرم ثابت نہیں ہوا ہے۔ تفتیش کے بعد اگر یہ ثابت ہوجائے کہ میں نے کسی جرم کا ارتکاب کیا ہے تب بھی تمہیں سزا دینے کا اختیار حاصل نہیں ہے نائب صوبیدار۔ اپنی حد میں رہو۔ تم سرحد پار کرنے والوں کو روک سکتے ہو اور واپس بھیج سکتے ہو' اس سے زیادہ تم کچھ نہیں کرسکتے۔ تفتیش بھی تم محدود اختیارات کے ساتھ کروگے کیونکہ تم پولیس نہیں ہو۔ تمہارا کام صرف گرفتار کرنا اور ملزموں کو متعلقہ حکام کے حوالے کرنا ہے۔"

"بکواس بند کرو اپنی۔" وہ چلّایا "تم نے ایک قتل کیا ہے یہاں۔ ایک آدمی کا ہاتھ توڑ دیا ہے اور کپتان صاحب پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔"

"ہاں' یہ سب کیا ہے میں نے مگر تم نہ عدالت ہو' نہ تفتیشی افسر۔ تم مجھے پھانسی نہیں دے سکتے اور نہ جیل بھجوا سکتے ہو۔ میں جانتا ہوں' ملٹری کے قوانین کیا ہیں۔ کورٹ مارشل تمہارا ہوسکتا ہے' میرا نہیں۔ میرے خاندان کے بہت لوگ ملٹری میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ ایک نام میجر جنرل ملہوترا کا ہے اور ایک بریگیڈیئر تسیم کا۔ وہ بھارتی فوج کے ساتھ ڈھاکا میں ہیں۔"

نائب صوبیدار کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا "تم جھوٹ بولتے ہو۔"

"یہ جھوٹ ہوتا تو تمہارا کیپٹن حمید ہمارے ساتھ سختی نہ کرنے کی ہدایت کیوں دیتا؟ وہ خود ڈرتا ہے۔" میں نے طنز آمیز تمسخر کے ساتھ کہا۔

بنگالی نے کہا "وہ آرہا ہے کیپٹن حمید۔"

میں نے پلٹ کے دیکھا تو کیپٹن حمید برآمدہ طے کرکے ادھر ہی بڑھ رہا تھا۔ غالباً وہ ہم سے ملنے گیا تھا اور وہاں کسی نے بتادیا تھا کہ میں خود اس سے ملاقات کے لیے نکلا تھا۔

"کیا بات ہے؟" اس نے کمرے میں قدم رنجہ فرماتے ہی گرج کے کہا۔

"تمہارا یہ ماتحت تمہارے خلاف بول رہا تھا۔" میں نے بنگالی کی طرف اشارہ کیا "اس کا خیال ہے کہ تم مسلمان ہو اس لیے غدّار ہو۔"

بنگالی کا منہ حیرت سے کھُلا رہ گیا۔ یہ جھوٹ اس کے لیے اتنا غیر متوقع تھا کہ وہ سنبھل ہی نہ سکا۔ اس کا خیال ہوگا کہ اگر میں نے شکایت کی تو مرہٹے کی کروں گا جس نے مجھے تھپڑ مارا تھا۔

"یہ جھوٹ کہتا ہے سر!" بنگالی چلّانے لگا۔

"بس اتنا ہی حوصلہ تھا؟" میں نے طنز سے کہا "جو پیٹھ پیچھے بھونک رہے تھے وہ مُنہ پر کہو۔"

"میں نے کچھ نہیں کہا....."

"کیوں' تم نے نہیں کہا کہ یہ مسلمان اپنے عہدے کا ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے۔ غیر قانونی طور پر سرحد پار کرنے والوں اور اسمگلروں کو پکڑتا ہے اور رشوت لے کر چھوڑ دیتا ہے۔ ساری رقم خود ہضم کرجاتا ہے۔ جب میں آیا تو تم کیا باتیں کررہے تھے آپس میں؟"

اب مرہٹہ بھی چونکا "یہ بالکل غلط ہے سر۔"

کیپٹن حمید نے انہیں شعلہ بار نظروں سے دیکھا "اس کا فیصلہ بھی بعد میں ہوجائے گا۔ ابھی یہ بتاؤ کہ تم کیوں ملنا چاہتے تھے مجھ سے؟"

میں نے کہا "میں ان کے سامنے بات نہیں کرسکتا۔ یہ میری جان کے دشمن ہورہے ہیں۔ یہ بنگالی مجھے دہشت زدہ کررہا تھا کہ انڈین آرمی کا کوئی بریگیڈیئر تسیم اس کا سسر ہے جو آج کل ڈھاکا میں ہے۔"

بنگالی نے غصے میں پاگل ہوکے کہا "یہ بھونکتا ہے سر!"

میں نے اسے جواب دیے بغیر مرہٹے کی طرف دیکھا "اور یہ کسی میجر جنرل ملہوترہ کا ماموں ہے۔ ابھی کہا ہے اس نے۔"

مرہٹہ بھی چیخنے لگا "بکواس کرتا ہے یہ....."

کیپٹن نے ہاتھ اٹھا کے کہا "اچھا بند کرو یہ شور ہنگامہ۔ جب تحقیقات ہوں گی تو سب سامنے آجائے گا۔ اور تم باہر چلو۔"

میں اس کے ساتھ معصوم صورت بنائے باہر آگیا۔ ان الزامات کے پیش نظر جو میں نے بنگالی اور مرہٹہ نائب صوبیداروں پر عائد کیے تھے اب تحقیقاتی کمیشن میں ان کی شمولیت مشکوک ہوگئی تھی اور ان کی ساکھ کو سخت نقصان پہنچا تھا۔

میں نے برآمدے میں آ کے کہا "میں جابر سے ملنا چاہتا تھا۔"

"پہلے یہ بتاؤ کہ تم نے جھوٹ بولا تھا..."

میں نے کہا "بالکل نہیں۔ مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟ میں تو کسی بریگیڈیئر تسیم یا میجر جنرل ملہوترا کو جانتا تک نہیں۔ یہ لوگ آپس میں باتیں کررہے تھے۔ میں نے اتفاق سے سن لیا۔"

"کیا واقعی انہوں نے کہا تھا کہ میں رشوت لیتا ہوں اور سب ہضم کرجاتا ہوں؟" کیپٹن حمید متفکر ہوگیا۔

"جھوٹ سچ کا علم تو تمہیں ہوگا۔ یہ ان کی رائے تھی۔ اور بھی نہ جانے کس کس کا یہ خیال ہوگا۔ یا ممکن ہے یہ دونوں تمہارے خلاف زہرافشانی کرتے ہوں۔"

کیپٹن حمید نے سرہلایا "مجھے پہلے بھی رپورٹ ملی تھی کہ میرے خلاف باتیں ہوتی ہیں لیکن باتیں کون کرتا ہے' یہ آج معلوم ہوا۔ مجھے انہی دونوں پر شک تھا۔ ان کا سابقہ ریکارڈ بھی زیادہ اچھا نہیں

ہے۔ خیر.... تم جابر سے کیوں ملنا چاہتے تھے؟"
میں نے کہا "مجھے اس سے یہ معلوم کرنا ہے کہ اس نے ہمارے خلاف تو کچھ نہیں بکا۔ وہ ہماری اصلیت سے واقف ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ سب کے سامنے بتادے۔"

کیپٹن حمید نے کہا "گویا تم باہمی مفاد کا سودا کرنا چاہتے ہو؟"

"ہاں۔ ابھی تک ہمارے متعلق اگر کسی کو تمام حقائق کا علم ہے تو وہ تم ہو اور جابر کے بارے میں تم کو میں نے ہی بتایا تھا۔"

"تم چاہتے ہو میں اسے چھوڑ دوں؟"

"یہ تمہاری مرضی پر منحصر ہے۔ اگر ہم پر کوئی سنگین جرم ثابت نہیں ہوتا تو تم ہمارے جانے کے بعد اس سے مزید پوچھ گچھ کرسکتے ہو اور اسے بھارتی حکام کے حوالے بھی کرسکتے ہو' شک کی بنا پر کہ یہ لوگوں کو پیسے لے کر سرحد پار کراتا ہے۔ اس کے پاس سفارت خانے کی گاڑی تھی جسے یہ ناجائز کام کے لیے استعمال کررہا تھا اور چاہو تو کسی گمنام ٹیلی فون کا حوالہ دے سکتے ہو کہ غالباً اس نے شرما جی کو قتل کیا ہے' جن کا یہ ڈرائیور تھا۔ باقی کام پولیس والے خود کرلیں گے۔"

"او کے۔ چلو دس منٹ ہیں تمہارے پاس۔"

"دس منٹ کے بعد کیا ہوگا؟"

"کریا کرم' یعنی تمہاری آخری رسومات' فوجی تحقیقاتی کمیشن کے ہاتھوں۔" حمید نے کہا۔

جابر پچھلے حصے میں واقع ایک کابک نما کیبن میں اکیلا بند تھا اور باہر ایک ہیبت ناک مونچھوں والا جلاّد صفت دیو زاد بندوق کو کسی کھلونے کی طرح پکڑے کھڑا تھا۔ خالی ہاتھ بھی وہ جابر جیسے چار کو کافی تھا۔ اس نے کیپٹن حمید کو سیلوٹ کیا اور حلق سے چند ناقابلِ فہم آوازیں نکال کے اشاروں میں کچھ سمجھانے لگا۔ وہ گونگا تھا۔

حمید نے اس کی بات سمجھتے ہوئے سرہلایا "اچھا ٹھیک ہے۔ میں سمجھ گیا' بالکل ٹھیک کیا تم نے۔"

میں نے کہا "یہ کیا کہہ رہا تھا؟"

"جابر نے خودکشی کی کوشش کی تھی۔"

"کیسے؟"

"چادر پھاڑ کے رسّی بنالی تھی اور چھت کی کڑی سے لٹک کر پھانسی دینا چاہتا تھا خود کو مگر پرانی چادر کی رسی مضبوط ثابت نہ ہوئی۔ جب اس نے لات مار کر کرسی ہٹائی' جس پر وہ گلے میں پھندہ ڈال کر کھڑا ہوا تھا تو فرش پر گرا۔ اس کی چیخ سن کر یہ اندر گیا تو وہ ٹانگ پکڑے بیٹھا تھا' جس ٹانگ میں گولی لگی تھی۔"

میں نے کہا "چلاّیا کیوں تھا؟ دوسری کوشش کرتا۔"

"یہ اسی سے پوچھ لینا۔" حمید نے کہا۔

جابر ننگے فرش پر خود بھی ننگا بیٹھا تھا۔ اس کی حفاظت پر مامور شخص نے حفظِ ماتقدم کے طور پر نہ صرف یہ کہ کیبن میں سے بستر' چادر وغیرہ ہٹادیے تھے بلکہ اس کے کپڑے تک اتروا لیے تھے کہ کہیں وہ دوسری کوشش اپنی شلوار کے ازاربند سے نہ کرے۔ سوائے دیوار سے سر ٹکرانے کے اب اس کے پاس مرنے کا کوئی طریقہ نہیں رہا تھا اور یہ مشکل ہی نہیں ناممکن طریقہ تھا کیونکہ دیواریں لکڑی کی تھیں۔

حمید کے لوٹ جانے کے بعد میں نے کہا "جابر کو مجبور دیکھ کر مجھے خوشی ہورہی ہے۔ لباسِ قدرت میں تم کو آزادی کا مزہ آرہا ہوگا۔ اتنے آزاد تو ہم بھی نہیں ہیں۔"

اس کی ساری اکڑفوں ختم ہوچکی تھی "سکندر صاحب! آپ کچھ کرو ورنہ یہ لوگ ہمیں مار ڈالیں گے۔"

"اب میں کیا کروں؟ یہ سب تمہارا ہی کیا دھرا ہے جو سامنے آرہا ہے۔" میں نے کہا "البتہ میں ایک کام کرسکتا ہوں۔"

اس نے پُرامید نظریں اٹھائیں "وہ کیا؟"

"میں تم کو فرار ہونے کا موقع فراہم کرسکتا ہوں۔ باہر جو موت کا فرشتہ کھڑا ہے' اس سے نمٹنا تمہارا کام۔"

وہ مایوس نظر آنے لگا "میں نے ایک کوشش کی تھی۔"

"تم ایک کوشش اور کرسکتے ہو۔ دوسری ٹانگ ابھی باقی ہے۔"

"تم مذاق کررہے ہو۔" وہ کراہ کے بولا۔

"میں نے کہا "مذاق کیسا! کیا تم نے اس مکڑی کی کہانی نہیں سنی جو کنگ رابرٹ بروس کے سامنے چھ بار گری مگر اس نے اوپر چڑھنے کی کوشش جاری رکھی۔ یہاں تک کہ ساتویں بار کامیاب ہوگئی اور بعد میں جب کنگ رابرٹ مکڑی کی مثال سامنے رکھ کے کامیاب ہوا تو ایک شاعر نے نظم لکھ ماری۔ لیکن تم نہ کنگ رابرٹ ہو اور نہ مکڑی۔"

"معلوم ہوتا ہے تم نے ان سے کوئی سازباز کرلی ہے' اس لیے بے فکر ہو۔"

میں نے کہا "سازباز تم نے کی تھی۔ بعض اوقات وہ بات سچ بھی ہوجاتی ہے کہ گڑھا کھودنے والا خود ہی اس میں گرتا ہے۔ تم ہمیں دھوکا دے کر نکلنا چاہتے تھے۔ دیکھو تقدیر نے کیسا پھنسایا ہے تمہیں۔"

"مجھ سے غلطی ہوئی' میں مانتا ہوں۔"

"اب ماننے کا فائدہ؟" میں نے کہا "آخری وقت میں توبہ بھی قبول نہیں ہوتی۔ اور تم کس غلطی کی بات کررہے ہو؟ تمہاری تو یہ زندگی بھی تمہارے باپ کی ایک غلطی تھی۔ جو تم ساری عمر کرتے رہے وہ گناہ تھے یا جرائم تھے۔ اخلاقی اور قانونی جرائم۔ ایسے ہی وقت میں آدمی کو وہ سب یاد آتا ہے جو اس نے زندگی کے اختیار' طاقت اور غرور میں کیا تھا۔ جب وہ زمین پر یوں اکڑ کر چلتا تھا جیسے اسے پھاڑ دے گا اور یہ نہیں سوچتا تھا کہ زمین ہی اسے کھائے گی۔ صبح سزائے موت پانے والے زندگی کی آخری رات میں خود اپنے

اعمال کا حساب کرتے ہیں اور توبہ کرتے ہیں مگر اس سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔"

اس نے سر جھکالیا "میں مانتا ہوں۔ میں کاجل سے معافی مانگنے کو تیار ہوں۔"

میں نے تلخی سے کہا "کیا معافی سے اس کو وہ سب مل جائے گا جو تم نے اس سے چھینا تھا؟ ایک عورت کے پاس اس غرور کے سوا ہوتا کیا ہے کہ وہ آبرومند ہے۔ اگر یہی سب کچھ کوئی تمہاری بہن کے ساتھ کرتا اور بعد میں کہتا سوری۔ تو کیا تم مطمئن ہوجاتے؟ تمہاری بہن کی عزت اسے واپس مل جاتی؟ وہ عزت جو اپنے لیے وہ اپنی نظر میں رکھتی تھی۔"

"پھر تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟" وہ رونے لگا۔

میں نے کہا "ہم سب ایک چانس لے سکتے ہیں۔"

"کیسا چانس؟" وہ سر اٹھا کے بولا۔

"وہ کون شخص تھا جس نے ہمارے بارے میں مخبری کی؟ وہی جسے تم نے اپنا بھائی بتایا تھا؟"

"وہ.... بھائی نہیں تھا میرا۔"

"مجھے معلوم ہے۔ تم تفتیش کے دوران اس کا نام پتا بتادو اور کہو کہ اس نے جھوٹ بولا تھا۔"

"اس سے کیا ہوگا؟"

"یہ لوگ اسے پکڑ لائیں گے اور اسے جھوٹ بولنے کی سزا دیں گے۔ یہی ایک صورت ہے ہمارے بچنے کی۔"

جابر نے نفی میں سرہلایا "اس کا سچ ثابت ہوگیا ہے۔"

میں نے کہا "کیا ثابت ہوگیا ہے؟ ابھی کچھ ثابت نہیں ہوا۔ ان کو نہ ہمارے بارے میں کچھ معلوم ہے' نہ تمہارے متعلق۔"

"غلط خیال ہے تمہارا۔ انہیں معلوم ہوگیا ہے کہ تم سکندر ہو۔ باقی سب کے نام بھی..."

میں نے کہا "نام سے کچھ نہیں ہوتا۔ سکندرِ اعظم سے لے کر سکندر بخت تک ہزاروں نام کے سکندر گزرے ہیں۔ انہیں ابھی تک یہ نہیں معلوم کہ میں کون سا سکندر بخت ہوں۔ انہیں میرے ساتھیوں کے کارناموں کا علم نہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہم جعلسازی کے سوا کسی جرم میں ملوّث نہیں اور جعلی پاسپورٹس پر غلط ناموں سے سفر کررہے تھے۔ تم ان کو یقین دلا سکتے ہو کہ پاسپورٹ اصلی ہیں۔"

"وہ میری بات کب مانیں گے؟"

"مانیں گے۔ جب تم بتاؤ گے کہ تم سفارت خانے کے ملازم ہو اور شرما جی کے ڈرائیور ہو۔ شرما جی کے بارے میں تو ابھی ہمارے سوا کوئی بھی نہیں جانتا کہ وہ سورگ یا نرک میں ہیں۔ تم ذرا رعب سے بات کرنا کہ شرما جی کوئی معمولی آدمی نہیں ہیں چنانچہ ان کے ڈرائیور کا بال بھی بیکا ہوا تو ان سب کی وردی اتر جائے گی۔ جیسے تمہاری اتری ہے۔ تم تصدیق کرسکتے ہو کہ پاسپورٹ اصلی ہیں کیونکہ خود تم نے بنوا کے دیے تھے۔" میں نے کہا "کیا تمہارے پاس شناختی کارڈ نہیں ہے؟"

"ہے۔ میں دکھا چکا ہوں۔" وہ بولا۔

"بس تو کام بن گیا۔ ان کا تو باپ بھی مانے گا کہ تم خاص آدمی ہو اور وہ مجبور ہوجائیں گے تم کو چھوڑنے پر۔ ان سے کہنا کہ وہ چاہیں تو کسی بھی سفارت خانے سے تصدیق کرلیں۔ بنگلہ دیش کے سفارت خانے سے یا نیپال کے سفارت خانے سے۔ شرما جی کے ڈرائیور کو سب ہی جانتے ہوں گے۔"

اس کا اعتماد بحال ہونے لگا تھا "بالکل جانتے ہیں۔ میں شرما جی کے خاص پیغام لے کر دہلی بھی جاتا تھا۔"

"ویری گڈ! تم ہمیں بھی بچا سکتے ہو اور خود بھی بچ سکتے ہو۔ ہم اعتراف کرلیں گے کہ پاسپورٹ میں ہمارے نام غلط ہیں۔ ہم سمجھے تھے کہ انڈین نیشنل کی حیثیت سے ہم زیادہ آسانی سے سرحد عبور کرجائیں گے۔ درحقیقت ہم مسلمان ہیں۔ جان بچا کے فرار ہورہے تھے اور پاکستان جانا چاہتے تھے۔ اس کے بعد وہ ہمیں کچھ نہیں کہیں گے سیکڑوں ہزاروں مسلمان روز نیپال جاتے ہیں۔"

"اور میرا کیا بنے گا؟"

"وہ مجبور ہوں گے کہ تم کو باعزت طور پر واپس جانے دیں۔ ایک معمولی کیپٹن میں اتنی ہمت نہیں کہ تمہیں نقصان پہنچائے۔ وہ شیخی زیادہ بگھارتا ہے اور چیخ چلاّ کے اپنی دہشت قائم کرنے کی کوشش ضرور کرتا ہے مگر تم بھی جانتے ہو کہ اس کا کام صرف چیک کرنا ہے' کسی کو سزا وہ کیسے دے سکتا ہے؟ چیکنگ کے دوران کوئی مشتبہ شخص پکڑا جائے تو اس کی صرف اتنی ذمّے داری ہے کہ اسے قانون کے حوالے کردے۔"

"تم نے ٹھیک کہا۔" جابر بولا۔

"مجھے صرف دس منٹ کے لیے تم سے بات کرنے کی اجازت ملی تھی۔" میں نے گھڑی دیکھ کے کہا "ہمارا مقدمہ ایک عدالت کے سامنے پیش ہوگا۔"

"عدالت؟ ایسی کی تیسی ان کی...."

میں نے کہا "غصے میں مت آؤ۔ وہ صرف تفتیش کریں گے' یہ معلوم کرنے کے لیے کہ ہم سچے ہیں یا جھوٹے' مشتبہ ہیں یا نہیں۔ ہمیں پولیس کے حوالے کیا جائے یا چھوڑ دیا جائے۔ اس سے زیادہ نہ ان کے اختیارات ہیں اور نہ وہ کچھ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس لیے میری بات دھیان سے سنو۔ تم کو بیان دیتے وقت صرف یہ کہنا ہے کہ ہم مسلمان ہیں اور تم نے ہمیں سرحد عبور کرانے کی ذمّے داری لی تھی۔"

"پیسہ لے کر؟"

"یہ تمہاری مرضی کہ ہمیں اپنا دوست' رشتے دار کہو یا پیسہ لے کر ہماری مدد کرنے کی بات کرو۔" میں نے کہا "تم یہ کہو گے کہ پاسپورٹ بنوانے کا مشورہ تم نے ہی دیا تھا بلکہ پاسپورٹ خود تم نے

ہی بنوا کے دیے تھے کیونکہ تم سمجھتے تھے' اس طرح ہم سو فیصد محفوظ ہو جائیں گے۔ مزید یہ کہ ہمارے نام سکندر اور غالب وغیرہ نہیں ہیں۔"

"پھر کیا نام ہیں؟"

"فرض کرو میرا نام ہے محمد علی۔ رابعہ ہو گئی مسز محمد علی۔ مسلمانوں میں یہ بہت عام نام ہے۔ رابعہ کا اپنا نام زبیدہ یا سلطانہ بتا دینا۔"

"ایک نام طے کر لو۔"

"اچھا سلطانہ کہہ دینا۔ غالب کا نام عبداللہ اور نازو کا نام رکھ لو پروین۔ کاجل تو کاجل ہی رہے گی۔"

"اوہ وہ بچہ کلیم؟ کہیں وہ تو نہیں مروا دے گا؟"

"میں اسے سمجھا دوں گا۔ ابھی تک کسی نے اس سے کچھ نہیں پوچھا ہے۔" میں نے کہا۔

میرا خیال ہے کہ حمید دروازے سے لگا سب کچھ سن رہا تھا۔ میری بات ختم ہوتے ہی وہ اندر آگیا۔

"دس منٹ ہو گئے۔" اس نے دہاڑ کے کہا۔

باہر آ کے میں نے کہا "تھینک یو۔"

اس نے کہا "ٹھیک کر لیا ہے نا؟"

"ہاں۔ بس تم یہ کرنا کہ سب کو الگ الگ بلانا۔ اس کا بیان الگ لینا۔" میں نے کہا۔

"یہی ہو گا۔" حمید نے مجھے یقین دلایا "طریقہ بھی یہی ہے۔"

واپس اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچ کے میں نے انہیں جابر سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں مختصراً بتایا اور انہیں بھی سمجھا دیا کہ کس کو کیا کہنا ہے۔

"آخر کتنے نام بدلیں گے ہم؟" نازو نے کہا۔

"خاتون! آپ ایک گلاب ہیں۔ آپ کو کسی بھی نام سے پکارا جائے' آپ کو کیا فرق پڑتا ہے۔" غالب نے کہا۔

"جیسے نام رکھنے سے یہ مرزا غالب نہیں بنا۔" میں نے کہا۔

"اُلٹا مرزا غالب کے نام کو بدنام کیا۔" نازو بولی۔

غالب نے کہا "بدنام تم نے کم کیا ہے مجھے۔"

"میں نے؟ میں نے کیا بدنام کیا ہے؟" نازو تیوری پر بل ڈال کے بولی۔

"سب باتیں کرتے ہیں کہ.... کیسا کاٹھ کا اُلّو ہے۔ عقل ماری گئی ہے۔ دماغ ہوتا تو اس پر مرتا جس کی صورت نہ شکل...."

نازو کا پارہ چڑھنا لازمی تھا "کبھی اپنی شکل دیکھی ہے؟"

"دیکھی ہے۔ میرا بیٹا بالکل میرے جیسا ہو گا اگر اسے کچھ کہا تم نے تو میں...."

"تو کیا کرو گے؟" میں نے اس سے کہا کیونکہ اب نازو کو خفت' شرم اور بے بسی نے لاجواب کر دیا تھا۔

غالب نے سر کھجایا "پھر میں بیٹی کو ترجیح دوں گا۔" اس نے یوں نازو کی طرف دیکھ کر کہا کہ مفہوم سب پر عیاں ہو گیا۔ "حالانکہ قدرت بھی شاہکار ایک بار ہی تخلیق کرتی ہے۔"

رابعہ نے کہا "بہت بدمعاش ہو تم غالب!"

غالب کورنش بجالایا اور بولا "بس آنٹی! ہم جو کچھ ہیں آپ کی وجہ سے ہیں۔"

اب رابعہ کے جھینپنے اور نازو کے ہنسنے کی باری تھی۔

میں نے کہا "بھتیجے وقت کم ہے۔ اپنا اپنا بیان سمجھ لو' کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔"

غالب نے کہا "کلیم اللہ کا کیا ہو گا' اگر اس نے سچ بول دیا؟"

رابعہ نے بھی سرہلایا "کیا ہم اسے بھی جھوٹ بولنا سکھائیں گے؟"

"بات جھوٹ سچ کی نہیں' ہم اسے اعتماد سکھائیں گے۔ مشکل حالات سے نمٹنے کے لیے عقل کی طاقت سے کام لینا سکھائیں گے۔ یہ بتائیں گے کہ زندگی جو خدا کی دی ہوئی ایک نعمت ہے اور ہم پابند ہیں کہ اس کی حفاظت کریں' اسے بے وقعت نہ جانیں۔ ابھی اس کے سامنے ایک عمر کی مسافت ہے۔ اسے جینے کا ڈھنگ آنا چاہیے ورنہ یہاں تو ہر قدم پر شکاری ملیں گے جو اس کو جان و مال سے محروم کرنا چاہیں گے۔ رابعہ! تم کاجل سے بات کرو۔ وہ کلیم کو سمجھا سکتی ہے۔"

"کلیم اس کے ساتھ نتھی ہو گیا ہے۔"

"نتھی ہونے پر مجھے اعتراض ہے۔" نازو نے کہا "یہ جذباتی وابستگی ہے۔"

"جیسی تم کو مجھ سے ہے۔" غالب نے معصوم بن کے کہا۔

"غلط فہمی ہے آپ کی۔" نازو نے کہا۔

"پھر تم ہی صاف بتا دو کہ یہ کیا ہے۔ تم کو محبت ہے مجھ سے' عشق ہے' تم مرتی ہو مجھ پر؟ کیا ہے یہ چکر آخر...."

نازو چلائی "غالب کے بچے...."

غالب فوراً میرے پیچھے آگیا "الفاظ کا الٹ پھیر ہے سب۔ اصل بات یہی ہے کہ تم نتھی ہو گئی ہو میرے ساتھ زبردستی۔"

نازو نے اسے پکڑنے کی کوشش کی "میں تھوکتی بھی نہیں تم پر۔"

غالب دوسری طرف آگیا "ہاں۔ بڑی منتوں مرادوں سے تو ایک اُلو کا پٹھا ملا ہے۔ اس پر بھی تھوک دیا تو دوسرا کیا افریقہ سے امپورٹ ہو گا۔ کوئی کالا بھجنگ حبشی؟"

میں نے بڑی مشکل سے دونوں کو روکا "چلو بعد میں فیصلہ کر لینا۔"

رابعہ نے ہنس کے کہا "تمہارا گھر بھی چڑیا گھر ہو گا' بندروں کا پنجرہ۔ ہر وقت یہی ہو گا۔"

غالب نے کہا "اور آپ کا گھر ہو گا عجائب گھر۔ مہاتما بدھ کے مجسموں کی طرح آمنے سامنے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بیٹھے ہوں گے ہر وقت۔ چپ چاپ...."

اب نازو ایک دم غالب کی طرفدار ہو گئی "نہیں۔ کبھی کبھی یہ لوگ ٹھنڈی سانس لے کر کوئی شعر پڑھ دیں گے مرزا غالب کا جو وکیل صاحب کی سمجھ میں خاک نہیں آئے گا مگر یہ شرماتی رہیں گی۔"

رابعہ نے کہا "نازو! بہت بولنے لگی ہو تم بھی۔"

غالب بولا "ہمارے گھر کو چڑیا گھر کیوں کہا تھا؟"

"ہم عجائب گھر بھی نہیں کہہ سکتے۔" نازو بولی۔

"کیا ہم عجوبہ ہیں؟" میں نے کہا۔

"تو کیا ہم بندر ہیں؟۔" غالب بولا "میں اور نازو...."

نازو نے پھر سائڈ بدل لی "میں تو نہیں۔ ہاں تم کچھ لگتے ہو۔ اگر دُم ہوتی...."

اس قید خانے میں بھی ہم دل کھول کر ہنسے۔ اپنے آپ پر ہنس کے آدمی کتنا ہلکا پھلکا محسوس کرتا ہے۔ دوسروں پر ہنسنے والے بعض اوقات خود سے شرمسار ہوتے ہیں۔

کیپٹن حمید کے ایک نمائندے نے اندر قدم رنجہ فرما کے اعلان کیا "کھڑے ہو جاؤ سب!"

وہ بہت پستہ قد آدمی تھا۔ غالب نے کہا "پہلے تم تو کھڑے ہو جاؤ دوست۔"

ہم سب کو بیرک کے وسطی حصے میں لے جایا گیا۔ وہاں ایک میز کے پیچھے تین کرسیوں پر تین افسران تشریف فرما تھے۔ بنگالی مسلمان نائب صوبیدار اور مرہٹہ کو کیپٹن حمید نے کورٹ آف انکوائری میں شامل کیا تھا۔ اسی طرح کلیم بھی ملزمان میں شامل تھا۔

جابر کا بیان ہم سے پہلے لیا جا چکا تھا اور اسے بیرک میں واپس بھیج دیا گیا تھا۔ اس نے وہی کہا تھا جو میں نے اسے سمجھایا تھا چنانچہ ہماری پوزیشن بہت بہتر ہو گئی تھی۔ سب سے پہلے میرا نمبر آیا اور میں نے بھی اپنے بارے میں جھوٹ کو سچ بنا کے پیش کیا۔ ایک کہانی سنائی کہ کس طرح ہمارا گھر اور خاندان بنگلہ دیش کی خانہ جنگی میں ختم ہوا اور کس طرح جابر نے ہماری جان بچائی۔ وہ سب خاصے متاثر ہوئے' سوائے حمید کے جو زیرِ لب مسکراتا رہا۔

میرے بعد غالب' رابعہ اور نازو کے بیانات ہوئے۔ بیان کے بعد جرح سے فارغ ہو کے جو بھی واپس آتا تھا وہ بتاتا تھا کہ ابھی تک سب ٹھیک جا رہا ہے لیکن میں کاجل اور کلیم اللہ کی طرف سے متفکر تھا کیونکہ وہ جھوٹ نہیں بول سکتے تھے۔ اور ہوا بھی یہی۔ کاجل کی باری آئی تو اس نے کہا کہ میرا بیان سب کے سامنے ریکارڈ کیا جائے لیکن اس کی یہ درخواست مسترد کر دی گئی۔

"یہ ضابطے کے خلاف ہے۔" بنگالی مسلمان نے اعتراض کیا۔

"مگر وہ سب گواہ ہیں۔" کاجل نے احتجاج کیا۔

"وہ سب ملزم ہیں۔" مرہٹہ بولا "جیسے تم ملزم ہو۔"

کیپٹن حمید نے فیصلہ صادر کر دیا۔ "ایک ملزم کا گواہ دوسرا ملزم نہیں ہو سکتا۔"

قانونی طور پر یہ فیصلہ درست تھا یا غلط' اس سے قطع نظر لیکن مجھے کاجل کی بات نے چونکا دیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ کیا کہے گی اور پھر یہی ہوا۔

کاجل نے ایک ایک کر کے وہ سب مظالم گنوا دیے جن کا ہدف اُس کی ذات تھی۔ وہ ظلم جو اس کے والدین پر بنگلہ دیش بنانے والوں نے کیا تھا۔ اس کا گھرانا کیسے بیداگروں نے لوٹا تھا۔ کس طرح مظلوموں کی مددگار بھارتی سینا کے ایک جیالے سورما نے اس کی آبرو کو اسی گھر کی چھت کے نیچے پامال کیا تھا۔ پھر کیسے جابر نے اس کے جسم سے ہوس کا خراج وصول کیا تھا۔

جہاں یہ نام نہاد عدالتی کارروائی ہو رہی تھی' وہ لکڑی کی دیواروں والا ایک کمرا تھا۔ ہم سب دوسرے کمرے میں تھے اور درمیان میں لکڑی کے تختوں سے بنی ہوئی ایک دیوار حائل تھی۔ ایک جھری سے دوسری طرف کا منظر صاف دکھائی دیتا تھا اور کان لگانے سے آواز بھی سنی جاتی تھی۔ ہم سب نے ایک دوسرے کے بیان کا ہر لفظ سنا تھا چنانچہ اختلاف یا تضاد بیانی کا کوئی مسئلہ پیدا ہی نہیں ہوا۔ میں یہ فرض نہیں کر سکتا تھا کہ ایسا کیپٹن حمید کی بے وقوفی کے باعث ہوا تھا اور اسے یہ بات معلوم نہیں تھی۔ اگر وہ چاہتا تو ہم سب کو بیک وقت نہ طلب کیا جاتا۔ بیرک کے ایک کنارے سے صرف ایک ملزم کو لایا جاتا اور اسے بیرک کے دوسرے کنارے پر بیان دینے کے بعد واپس پہنچا دیا جاتا۔ یہ بہت بڑی رعایت تھی جو کیپٹن حمید نے دانستہ دی تاہم اس کے ماتحت اعتراض کرتے تو خود کو اس الزام سے بچانے کے لیے وہ سختی سے تفتیش کے طریقۂ کار پر عمل کرتا۔

جیسے بنگالی نے ہم مذہب ہونے کے باوجود ہم سب کے ساتھ انتہائی ذلت آمیز' جارحانہ اور اشتعال انگیز رویّہ اپنایا' ایسے ہی مرہٹہ نائب صوبیدار نے بھی انصاف کے تقاضوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنے کینہ پرور انتقامی ردِ عمل سے ثابت کر دیا کہ تفتیش محض ایک ڈراما ہے تاہم اسی ڈرامے کی وجہ سے ہم محفوظ رہے۔ کیپٹن حمید نے یہ چکر نہ چلایا ہوتا تو وہ اپنے ہاتھوں سے ہمیں گولی مار کے بہت محظوظ ہوتے اور مطمئن بھی کہ انہوں نے جو کیا وہ عین تقاضائے انصاف تھا۔ آخر کار اس عدالت کا فیصلہ کیا ہو گا؟ یہ سب جانتے تھے۔ بظاہر کیپٹن حمید کا رویّہ بھی تذلیل آمیز اور پُر عداوت تھا مگر درحقیقت وہی ہمیں تحفظ فراہم کرنے والی دیوار بن کے ہمارے اور ان دشمنوں کے درمیان حائل ہو گیا جو ہمارے خون کے پیاسے تھے۔ اس نے افسر کی حیثیت سے اپنی بالادستی قائم رکھی اور کسی ماتحت کو اس حد تک بے لگام نہیں ہونے دیا کہ وہ اپنی حیوانی درندگی کا مظاہرہ کر سکے۔

جیسا کہ مجھے توقع تھی' آہستہ آہستہ کاجل کے جذبات کی آتش فشانی میں اضافہ ہوتا گیا اور وہ ہسٹریا کا شکار ہونے لگی۔ اب وہ جابر کے انسانیت سوز مظالم کا ذکر کر رہی تھی۔

"....مجھے نہیں معلوم کہ اس کا ماضی کیا تھا لیکن جو کچھ اس نے میرے ساتھ کیا' جو کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا' جو کچھ میرے جسم نے برداشت کیا' میرے احساس کا آزار بنا اور میری روح کے ہر زخم کو رِستا ہوا ناسور بنا گیا' اس کے بعد میں جابر کا ماضی بھی دیکھ سکتی ہوں۔ وہ جرم اور گندگی کی پیداوار' جرم اور گندگی کا پروردہ' جرم اور گندگی کا وہ ڈھیر ہے جو شریف اور پاک نفس انسانوں کی دنیا کے ماتھے پر ایک رسوا کن' بدنما داغ ہے' جس کو مٹ جانا چاہیے۔ میں مظلوم اور مجبور تھی اور کمزور تھی۔ جسمانی طور پر نہیں' ضرورت اور حالات کے باعث۔ اگر میں اسے مارنا چاہتی تو اس کے دل میں خنجر بھی اتار سکتی تھی۔ ایک گولی سے اس کا دماغ نکال کے گٹر میں بہا سکتی تھی مگر میں نجات چاہتی تھی۔ اس زنداں سے' اس عقوبت خانے سے' اس خطۂ زمین سے جو کبھی میرا گھر تھا' میرا وطن تھا۔ اور میں اکیلی نہیں تھی' میرے ساتھ کچھ مجھ سے بھی زیادہ ستم رسیدہ تھے' ایک یتیم بچّہ تھا۔ میں کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی معزز اراکین عدالت' محترم جج صاحبان۔"

یہ آخری الفاظ اس نے انتہائی تلخ اور طنزیہ لہجے میں ادا کیے تھے۔ کیپٹن حمید کے ماتحتوں نے مجبوراً یہ ذلت برداشت کی۔

رابعہ نے تشویش سے میرے کان میں کہا "کاجل کو کیا ہو گیا ہے؟ کیا ضرورت ہے یہ سب بتانے کی؟"

نازو نے بھی سر ہلایا "اور کیا۔ کس کا دل پسیجے گا ان الفاظ سے یا اس کی باتوں سے۔ بے وقوف!"

میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے کہا "بے وقوفی تم کر رہی ہو۔ ہم اسے بولنے سے تو نہیں روک سکتے مگر ہماری آواز کسی کے کانوں تک پہنچ گئی تو ہمیں ضرور روک دیا جائے گا یہ سب سننے سے۔"

کاجل کا بیان جاری تھا۔ اب وہ رو رہی تھی اور ہچکیاں لے رہی تھی "آپ کے پاس طاقت ہے' اختیار ہے۔ اس شیطان کے وجود سے انسانیت کا نام بدنام ہوتا ہے۔ اسے زمین میں بھی گاڑا گیا تو یہ مٹی ناپاک ہو جائے گی۔ سمندر میں اس کی راکھ ڈالی جائے تو اس بارش کی ہر بُوند ناپاک ہو گی جو اس پانی سے اٹھنے والے بادل برسائیں گے۔"

کیپٹن حمید نے اسے ٹوک دیا "فضول' جذباتی باتوں سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ یہ رونا دھونا بند کرو اور کوئی الزام ہے جابر کے خلاف تو بتاؤ۔"

کاجل نے خود کو سنبھالا اور آنسو صاف کیے "ایک الزام نہیں' دس الزام ہیں جن کی گواہ میں خود ہوں' مجھے معلوم ہے اس نے کتنے قتل کیے ہیں اور قتل ہونے والے کون تھے۔ اس کے خلاف بڑی لمبی فردِ جرم ہے۔ اس نمک حرام نے اپنے مالک کا خون کیا اور اسے اپنے ہی گھر میں دفن کرا دیا حالانکہ وہ ایک شریف النفس انسان تھا اور اپنے اس ملازم پر خصوصی اعتماد کرتا تھا۔ وہ اکیلا آدمی تھا جس کی بے گور و کفن لاش اسی گھر کے عقبی حصے میں انصاف کی منتظر اپنے مدفن میں لیٹی ہوئی ہے۔"

بنگالی نے کاجل کو ٹوکا "کیا تم بتا سکتی ہو کہ جابر نے ایسا کیوں کیا تھا؟"

"کوئی آدمی قتل کیوں کرتا ہے؟" کاجل نے اُلٹا سوال کر ڈالا۔ "لالچ میں یا انتقام لینے کے لیے۔ جابر کی اس سے کوئی دشمنی نہیں ہو سکتی تھی۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟" بنگالی بولا۔

"شرماجی کا دشمن کوئی نہیں تھا۔"

"کیا تم شرماجی کو ذاتی طور پر جانتی تھیں؟" بنگالی نے کہا۔

"ہاں۔ وہ میرے والد سے ملنے آتے تھے۔ ہمارے سیاسی خیالات' مذہب اور قومیت کا فرق اپنی جگہ مگر میں ان کی ذاتی شرافت کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتی۔ جابر کے ساتھ ان کا سلوک کبھی ایسا نہیں رہا کہ وہ ان کا دشمن ہو کے انہیں قتل کرنے کی سوچتا۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ قتل اس نے لالچ میں کیا۔"

"کیا شرماجی لالچی آدمی تھے؟" مرہٹہ نے کہا۔

"کیا مطلب؟ میں جابر کو لالچی کہہ رہی ہوں۔" کاجل نے تیز ہو کے کہا۔

"اتنا مال و زر جس کے لیے ایک قابلِ اعتماد ملازم کے دل میں قتل کا خیال آ جائے' کسی لالچی اور کنجوس آدمی کے پاس ہی ہو سکتا ہے؟" مرہٹہ نے کہا۔

ایک لمحے کے لیے کاجل لاجواب ہو گئی' پھر اس نے کہا "یہ ضروری نہیں کہ ان سے جابر کو کروڑوں یا لاکھوں ملے ہوں۔ آخر وہ ایک سینئر ڈپلومیٹ تھے۔ ان کے پاس نقد رقم رہتی ہو گی' کسی بھی ہنگامی ضرورت کے لیے۔ اور ہزاروں کا زیور تو ایک عام' متوسط طبقے کے آدمی کے گھر میں بھی ہوتا ہے۔ لیکن جابر نے ایک اور وجہ سے شرماجی کو قتل کرنا ضروری سمجھا۔ وہ شرماجی کی گاڑی حاصل کرنا چاہتا تھا۔"

"لیکن گاڑی تو ہر وقت اس کے پاس رہتی تھی اور جیسا کہ تم نے بتایا' شرماجی اس پر بھروسا بھی کرتے تھے۔" بنگالی نے اعتراض کیا۔

"شرماجی کے پاس ایک نہیں دو گاڑیاں تھیں مگر وہ سرکاری گاڑی کے استعمال میں بہت محتاط تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان حالات میں جن سے بنگلہ دیش دوچار تھا' بھارتی سفارت کار کی گاڑی کسی بھی واردات میں ملوث ہو یا غلط جگہ پر پائی جائے چنانچہ وہ جابر سے پوچھتے ضرور تھے کہ کون سی گاڑی کہاں کہاں گئی تھی۔ ممکن ہے تصدیق بھی کرتے ہوں۔ جابر اس گاڑی میں ہم سب کو سرحد پار کرانا چاہتا تھا۔ اس نے پاسپورٹ وغیرہ حاصل کرنے اور ویزا لگوانے میں ہماری مدد کی تھی۔ اگر وہ شرماجی سے گاڑی مانگتا تو وہ صاف انکار کر دیتے اور بغیر بتائے نکل جاتا تو اس کی رپورٹ ہو جاتی جب کہ جابر یہ کام خاموشی سے کر کے واپس پہنچ جانا چاہتا

تھا تاکہ جلد از جلد ان کے غائب ہونے کی اطلاع متعلقہ حکام کو دے سکے۔ اس نے ہم سے تو بھاری معاوضہ لیا ہی تھا‘ یہ بھی معلوم کیا جاسکتا ہے کہ شرما جی کو مار کے اسے کیا ملا....."

"کیا پولیس اس پر شک نہیں کرے گی؟" کیپٹن حمید نے کہا۔

"شک کی اب گنجائش کہاں رہی ہے؟ میں آپ کو بتا رہی ہوں کہ وہ قاتل ہے۔ اس نے لاش کو کہاں دفن کیا ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ اس کے ارادے کیا تھے۔ وہ لوٹ کر واپس جانا چاہتا تھا یا نہیں مگر وہ چالاک اور عیار آدمی ہے‘ اس نے اپنے خلاف کوئی ثبوت اور شہادت نہیں چھوڑی ہے۔ اس نے لاش کو بھی غائب کردیا ہے۔ جہاں ہر روز سیکڑوں افراد نامعلوم لوگوں کے ہاتھوں قتل ہو رہے ہوں‘ روپوش ہوجاتے ہوں یا لاپتا وہاں ایک سفارت کار کے اغوا یا قتل کو کسی بھی انتہا پسند تنظیم سے منسوب کرنا کیا مشکل ہوگا۔ اس کے علاوہ جابر نے یہ قتل اپنے ہاتھوں سے نہیں کیا۔"

بنگالی ایک دم چونکا "کیا؟ ابھی تم نے کیا کہا تھا؟"

"آپ میری بات سن لیں۔ اس نے یہ قتل ایک ایسے شخص سے کرایا جو کہنے کو انسان تھا مگر اپنے قول و فعل پر اختیار سے محروم تھا۔ جس کے پاس عقل و شعور نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اس کا جسم ایک بالغ مرد کا جسم تھا مگر وہ چھ سال کے بچّے سے بھی زیادہ ناسمجھ تھا۔ جابر نے جیسا کہا اس نے ویسا ہی کیا۔ جابر نے کہا کہ شرما جی کا گلا گھونٹ دو اور اس نے تعمیل کی‘ سوچے سمجھے بغیر اور کچھ پوچھے بغیر۔ دُبلے پتلے‘ کمزور شرما جی اس بے شعور‘ طاقت ور انسان کا مقابلہ نہیں کرسکتے تھے۔ جابر نے اسی کے ہاتھوں شرما جی کو دفن کرایا....."

"پھر تو جابر کو قاتل نہیں قرار دیا جاسکتا۔" بنگالی نے کہا۔

"کیوں؟ صرف اس لیے کہ قتل کرنے والے ہاتھ کسی اور کے تھے؟ وہ ہاتھ تو ایک وسیلہ تھے جن کو جابر نے اسی طرح استعمال کیا جیسے کوئی شخص ریوالور یا خنجر کو استعمال کرتا ہے۔ ریوالور کسی اور کا ہو‘ خنجر کا مالک دوسرا آدمی ہو‘ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اس ناسمجھ بچّے کے ہاتھوں پر اختیار کس کا تھا؟ کیا وہ خود انہیں قتل کے لیے استعمال کرسکتا تھا؟ نہیں۔ اس کے ہاتھ جابر کے ہاتھوں میں تھے۔ اگر کوئی کسی اندھے کو قتل کرنے کے لیے سڑک پار کرانے کے بہانے لے جائے اور ٹریفک کے درمیان چھوڑ کے ہٹ جائے تو کیا وہ قاتل نہیں ہوگا؟ کیا یہ کہا جائے گا کہ مرنے والا اس لیے مارا گیا کہ وہ دیکھ نہیں سکتا تھا؟ کیا یہ قتل نہیں سمجھا جائے گا؟ جابر نے اس شخص کی طاقت کو بندوق سے نکلنے والی گولی کی طاقت کی طرح استعمال کیا اور پھر جیسے کوئی آلۂ قتل کو غائب کردیتا ہے‘ جابر نے بھی اس معصوم قاتل کو قتل کردیا‘ خود اپنے ہاتھوں سے۔ وہ انسان نہیں آلۂ قتل تھا۔ میں بتا سکتی ہوں کہ وہ آلۂ قتل کہاں ہے۔ میں وہ جگہ بتا سکتی ہوں جہاں ایک نہیں تین لاشیں پڑی ہیں۔ ایک اس جواں مرد بچّے کی جس کو مرتے وقت بھی معلوم نہ ہوگا کہ اسے کیوں مارا جارہا ہے۔ اس کے گلے پر جابر کی انگلیوں کے نشانات ہوں گے۔ اگر آپ اسے انسان سمجھتے ہیں تو اس کا خون کرنے والا جابر دُہرے قتل کا مرتکب ہوا ہے۔"

"تم نے تین لاشوں کا ذکر کیا ہے۔" کیپٹن حمید بولا۔

"باقی دو لاشیں اس بچّے کے ماں باپ کی ہیں جو ہمارے ساتھ ہے۔"

"تم نے اسے اپنا بیٹا بتایا تھا۔"

"ہاں‘ وہ میرا بیٹا ہے۔ وہ تمہارا بھی بیٹا ہے۔ وہ ان سب انسانوں کا بیٹا ہے جو انسانیت پر ایمان رکھتے ہیں۔" کاجل نے چیخ کر کہا "وہ انسان کا بیٹا ہے‘ ایک ایسے انسان کا جو مفلوج پڑا تھا۔ بے مروّت انسانوں کے ظلم کی چکی میں پس جانے والا آدمی جس نے اپنی زندگی کو اپنا نہیں سمجھا تھا اور شرطِ وفا نبھانے کے لئے‘ ادائے قرض کی خاطر اور نمک کا قرض چکانے کے لیے اپنے آقا‘ مالک اور اَن داتا پر قربان کردی تھی۔ وہ کوئی اسمگلر‘ جرائم پیشہ ہسٹری شیٹر یا بدمعاش ہوتا تو آج کل کے حالات میں یوں بے بسی سے نہ مرتا۔ وہ لوٹ مار کرنے والوں میں شامل ہوجاتا‘ دولت کے ڈھیر قبول کرلیتا اور ایمان بیچ دیتا مگر اس پٹھان کے لیے اپنا ایمان اپنی جان سے زیادہ گراں بہا تھا اور اس کی بیوی کے لیے شوہر کا ساتھ دینا ہی دنیاوی فرائض میں سب سے مقدس فریضہ تھا۔ ایمان آبرو کی سلامتی کی طرح وہ اپنے مجازی خدا کے لیے بھی اپنی جان دیتے ہوئے کسی کمزوری یا تذبذب کا شکار نہیں ہوئی۔ اس نے اپنا بیٹا ہمارے حوالے کردیا اور خود شوہر کے ساتھ سفرِ آخرت پر روانہ ہوگئی۔ اب میں اس بچّے کی ماں ہوں اور خدا کی قسم مرتے دم تک رہوں گی۔ کوئی اسے مجھ سے نہیں چھین سکتا‘ کوئی نہیں چھین سکتا۔" وہ ایک دم دہاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

بنگالی نے بڑی بے رحمی سے کہا "تم اس کو کیسے لے جاسکتی ہو؟"

"کیوں نہیں لے جاسکتی؟" کاجل نے چیخ ماری۔

"اس لیے کہ نہ تم اس کی ماں ہو‘ نہ قانونی طور پر اس کی گارجین۔ اگر اس کے والدین نے یہ اختیار تمہیں دیا تھا تو اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں۔ تمہارا اس سے کوئی خونی رشتہ ہوتا تو الگ بات تھی۔"

"میں اسے لے جاؤں گی‘ ضرور لے جاؤں گی۔ دیکھوں گی مجھے کون روکتا ہے؟" کاجل دیوانہ وار چیخنے لگی "تم خود اس سے پوچھ لو۔"

مرہٹے نے کہا "وہ نابالغ ہے‘ اس کی رائے کی کوئی حیثیت نہیں۔ تمہارے پاس گارجین کورٹ کا اجازت نامہ نہیں ہے۔"

"ایسی صورت میں یہ اغوا کی واردات کہلائے گی۔" بنگالی بولا۔

دوسرے کمرے میں میری اور غالب کی ساری توانائی خود کو یہ سمجھانے میں صَرف ہورہی تھی کہ عدالتی فیصلہ ہر صورت میں ہمارے خلاف ہوگا مگر کیپٹن حمید ہمیں اس فیصلے پر عمل درآمد کو روکنے کے لیے موافق حالات فراہم کرے گا۔ خود کو الزام سے بچانے کے لیے اس نے انہی دونوں کو اپنے ساتھ رکھا تھا جن کو بھی جھوٹے الزامات لگا کے اپنا دشمن بنا چکا تھا چنانچہ یہ بالکل بعید از قیاس تھا کہ وہ ہمیں کسی قسم کی رعایت دیں۔ ان کی جگہ سردار جی ہوتے تو شاید فیصلہ مختلف ہوتا مگر بعد میں بنگالی اور مرہٹہ نائب صوبیدار اس کے خلاف الزامات کا طومار باندھ دیتے۔ اب کیپٹن حمید کو اپنی جیوری کے فیصلے پر مہر تصدیق ثبت کرنا تھی اور بس۔ بعد میں کیا ہوتا ہے‘ کیا نہیں ہوتا‘ یہ اس کی ذمّے داری نہیں بنتی تھی۔

کاجل نے سب کچھ بتادیا تھا اور اس کے بعد کسی کے بتانے کو کچھ باقی نہیں رہا تھا مگر کیپٹن حمید نے بنگالی نائب صوبیدار کے مشورے پر حکم دیا کہ کلیم کو لایا جائے۔

"وہ نہیں آئے گا۔" کاجل نے چیخ کے کہا۔

"تم اب جاسکتی ہو۔" حمید نے سرسری لہجے میں کہا۔

"میں کہہ رہی ہوں کہ اس بچّے کو بخش دو۔ خدا کے لیے اسے یہاں مت بلاؤ۔ ہم نے بڑی مشکل سے اور بڑی کوشش سے اس کو سنبھالے رکھا ہے‘ صبر اور حوصلے سے محروم نہیں ہونے دیا ہے۔ اسے نہیں معلوم کہ وہ یتیم ہوچکا ہے۔ وہ پاگل ہوجائے گا صدمے سے۔ وہ ہم سب سے نفرت کرنے لگے گا‘ ہم پر اعتبار نہیں کرے گا اور ہمیں جھوٹا سمجھے گا۔"

"مگر اس سے پوچھے بغیر سچ کا کیسے پتا چل سکتا ہے؟" بنگالی نائب صوبیدار نے کہا۔

کیپٹن حمید نے اس کی تائید کی "یہ ٹھیک ہے۔ اس کے بیان سے ہی تمہارے بیان کی تصدیق ہوگی۔ اسے بلاؤ۔"

کاجل ہاتھ جوڑ کے التجا کرنے لگی "کپتان صاحب! رحم کریں اس بچّے پر۔"

"دوسرے الفاظ میں تم کہہ رہی ہو کہ ہم تمہاری کہی ہوئی ہر بات کو من و عن تسلیم کرلیں اور تمہارے سچ‘ تمہاری انسانی ہمدردی اور ممتا کے مصنوعی جذبات اور تمہارے آنسوؤں میں ڈوبے ہوئے دردناک بیان سے متاثر ہوکے تم کو باعزت طور پر بری کردیں اور خود بھی شریکِ جرم ہوجائیں‘ ایک نابالغ کے اغوا کے معاملے میں۔ کلیم اللہ کو پیش کیا جائے۔" کیپٹن حمید نے دہاڑ کے کہا اور سپاہیوں کو حکم دیا کہ کاجل کو واپس دوسرے کمرے میں پہنچا دیا جائے۔

ہسٹریا کی جنونی کیفیت میں کاجل نے سپاہیوں کے خلاف سخت مزاحمت کی۔ چیختے چلّاتے ہوئے اس نے لاتیں چلائیں‘ اپنے دانتوں سے ان کو کاٹا اور ان کے کپڑے پھاڑ دیے۔ اس کشمکش میں خود کاجل کے کپڑے بھی تار تار ہوئے اور اس کو چوٹیں بھی آئیں مگر طاقتور محافظ اسے کسی زخمی شیرنی کی طرح زندہ پکڑنے میں کامیاب ہوگئے۔

انہوں نے کاجل کو کمرے میں دھکیلا اور دروازہ بند کردیا۔ رابعہ اور نازو پہلے ہی نروس بریک ڈاؤن کا شکار ہوکے آنسو بہا رہی تھیں اور ہمارے سمجھانے کا ان پر کوئی اثر نہیں ہورہا تھا۔

نازو نے بیچ کا دروازہ کھول کے معزز اراکینِ عدالت کو مخاطب کیا "تم درندے ہو‘ سب وحشی ہو۔ تم میں انسانیت نام کی کوئی چیز ہوتی تو تم اس عورت کے ساتھ یہ سلوک نہ کرتے۔"

رابعہ نے بھی نازو کا ساتھ دیا "شرم آنی چاہیے تم سب کو۔ انصاف کی کرسی پر بیٹھ کے ناانصافی کرتے ہوئے۔ اس بچّے نے کیا جرم کیا ہے؟"

عدالت کے تینوں ارکان کامل بے حسی کے ساتھ اپنی شرمندگی کو چھپاتے رہے اور خون آشام نظروں سے ان پاگل عورتوں کو گھورتے رہے جو سب اپنے ہسٹریا پر قابو پانے میں ناکام تھیں۔

میں نے رابعہ کو پیچھے کھینچا اور غالب نے نازو کو۔ نازو اتنے غصے میں تھی کہ اس نے غالب کو اٹھا کر دور پھینک دیا "خود کچھ کرتے نہیں‘ مجھے بھی روکتے ہو۔"

اب مجھے آگے بڑھنا پڑا۔ میں نے کہا "نازو! میں لحاظ نہیں کروں گا۔ کیا تم میرا مقابلہ کروگی؟"

ایک لمحے کے لیے مجھے یوں لگا جیسے اس نے میرا چیلنج قبول کرلیا ہے مگر دوسرے لمحے اس نے ایک گہری سانس لی اور دروازہ بند کرکے اپنی ہار مان لی۔

میں نے کہا "رابعہ! تم نے قانون پڑھا ہے‘ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ قانون میں جذبات کی نہیں‘ حقائق کی اہمیت ہوتی ہے۔ اگر وہ کلیم اللہ کا بیان لینا چاہتے ہیں تو اس میں کون سی غیر قانونی بات ہے؟"

"یہ زیادتی تو ہے۔" رابعہ نے دبے دبے لہجے میں کہا۔

"ممکن ہے یہ ظلم ہو تمہاری نظر میں مگر تم عورت کی نظر سے دیکھ رہی ہو۔ قانون....."

"باربار قانون کا حوالہ مت دو۔" رابعہ نے بگڑ کے کہا "ان کو کس قانون کے تحت عدالتی اختیارات حاصل ہوگئے ہیں؟ میں نہیں مانتی اسے عدالت۔"

"مت مانو۔ یہ عدالت ہے ہی نہیں۔ یہ لوگ صرف بیان لے رہے ہیں‘ سزا نہیں سنا رہے ہیں۔ تحقیق ان کا حق ہے اور اس میں کوئی بات غلط نہیں۔ پھر تم جانتی ہو کہ کیپٹن حمید تو یہ سب پہلے ہی بتا چکا تھا کہ کیا ہوگا اور کیسے ہوگا۔"

"اب مجھے اس پر بھی اعتبار نہیں رہا۔ وہ بے بس ہے۔"

میں نے کہا "ہم تو بے بس نہیں ہیں۔ ابھی دیکھو اور انتظار

کرو۔ حوصلے اور صبر کے ساتھ۔ قبل از وقت کوئی جذباتی غلطی سب کو مہنگی پڑے گی۔"

کاجل بے ہوش ہوگئی تھی اور نازو اس پر پانی کے چھینٹے ڈال رہی تھی۔ یہ پانی بھی اس نے کیپٹن حمید سے منگوایا تھا۔ اس دوران میں دو محافظ بیرک کے دوسرے کنارے سے کلیم کو لانے کے لیے جا چکے تھے۔ پریشانی مجھے بھی لاحق ہو رہی تھی کہ کلیم کے بیان کو ہمارے خلاف سمجھا گیا تو اس سے دو طرفہ مشکلات پیدا ہوں گی۔ کیپٹن حمید کے لیے الگ اور ہمارے لیے الگ۔ ہم اپنے جھوٹ کو نبھانے میں ناکام رہے تھے۔ کلیم کو معلوم ہو چکا تھا کہ اس کے والدین آگے نہیں گئے ہیں' جیسا کہ ہم نے اسے سمجھایا تھا بلکہ پیچھے رہ گئے ہیں اور شاید وہ کبھی اسے نہیں ملیں گے۔ اس کی نظر میں ہم جھوٹے اور دغاباز لوگ تھے مگر وہ ہمارا ساتھ دینے پر مجبور تھا۔ وہ خود بھی بتا سکتا تھا کہ ہم کون ہیں۔ کس طرح اس کے گھر پہنچے تھے اور کس کے ذریعے۔ اس سے سچ اُگلوایا بھی جا سکتا تھا جس سے ہماری شناخت کے رازہائے سربستہ فاش ہو جاتے اور ان سنسنی خیز انکشافات کے بعد کیپٹن حمید کے لیے ہمیں بچانا عملاً ناممکن ہو جاتا۔

میں نے کلیم کو بڑے سکون سے آتا دیکھا۔ تختوں کی جھری سے میں نے یہ بھی دیکھا کہ کورٹ آف انکوائری کے تینوں ارکان کی نظریں اس پر جمی ہوئی ہیں مگر وہ اعتماد کی تصویر بنا کھڑا ہے۔ پھر کیپٹن حمید نے اسے کرسی پر بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔

حسبِ توقع سوالات میں پہل بنگالی نائب صوبیدار نے کی "کیا نام ہے تمہارا؟ اصل نام بتاؤ۔"

"کلیم اللہ۔" اس نے کہا "باپ کا نام سیف اللہ۔"

"کس نے کہا تھا تم سے کہ کوئی پوچھے تو یہی نام بتانا۔" بنگالی بولا۔

"ہمارا ایک نام ہے اور ایک باپ۔ تمہارا کتنا ہے؟" کلیم نے سادگی سے کہا۔

حمید مسکرانے لگا۔ مرہٹہ ہنسا اور بنگالی کا چہرہ غصے سے لال ہوگیا "تم تو سالا بہت حرامی ہے۔"

کلیم نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا "حرامی تم ..... تمہارا باپ... کافر... خزیر کا بچہ...."

گالیوں کی بوچھاڑ نے بنگالی کو بوکھلا دیا۔ اس نے کیپٹن حمید کی طرف دیکھا اور بولا "آپ سن رہے ہیں اس کی زبان۔"

"تم نے بہت غلط سوال کر کے اسے یہ موقع دیا' اب تم کوئی بات نہیں کرو گے۔" حمید نے اسے شرربار نظروں سے دیکھا۔

مرہٹہ نائب صوبیدار نے کہا "کلیم! تمہارا باپ کیا کرتا تھا؟"

کلیم نے جواب میں وہ سب بتایا جو سیف اللہ نے ہمیں بتایا تھا۔

"تم ان کو چھوڑ کے جا رہے ہو۔ کیوں؟" حمید نے کہا۔

"ہم اپنے ملک جاتا ہے واپس۔ اپنا پھوپی کے پاس۔ ادھر ہمارا زمین ہے۔" کلیم نے کہا "ہمارا والد بولا کہ تم جاؤ۔"

"وہ خود تمہارے ساتھ کیوں نہیں آئے؟"

"وہ کیسا آتا۔ گاڑی میں جگہ نہیں تھا۔ وہ ادھر رہ گیا۔"

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے ماں باپ دونوں مر چکے ہیں؟" بنگالی نے پھر زہر افشانی کی۔

"ہم کو معلوم ہے۔" کلیم نے اتنے اطمینان سے کہا کہ میں حیران رہ گیا "اگر وہ زندہ ہوتا تو ضرور ہمارا ساتھ آتا۔ اس نے ہم کو بولا کہ تم جائے گا۔ اپنا چاچا کے ساتھ اور ماما کے ساتھ۔"

"کون چاچا ماما؟"

"تم ان کو پکڑا' ابھی ہم سے پوچھتا ہے!" کلیم بگڑ گیا۔

"بے وقوف! تمہارے ماما چاچا نے انہیں مار دیا ہے۔" بنگالی چلّایا۔

"شٹ اَپ... ول یو" حمید نے دھڑ سے میز پر ہاتھ مارا۔

"تم بکواس کرتا ہے۔" کلیم نے بے خوفی سے کہا "تمہارا ماما چاچا تمہارا ساتھ ایسا کر سکتا ہے۔"

مرہٹے نے کہا "کیا تمہیں معلوم ہے کہ یہ لوگ تمہیں کہاں لے جا رہے ہیں؟"

"ہاں۔ ہمارا گاؤں۔ اپنا زمین پر۔ پھوپی کے پاس۔"

"تمہارا ان سے کوئی رشتہ نہیں ہے جن کے ساتھ تم جا رہے ہو۔"

"ہم بولا وہ ہمارا ماما اور چاچا ہے۔ رشتہ اور کیا ہوتا ہے؟" کلیم نے کہا "وہ ہمارا باپ کا پکا دوست ہے۔ ادھر آتا تھا۔"

"تم سمجھدار لڑکے ہو' یہ بتاؤ کہ جابر کیسا آدمی ہے؟"

"وہ داؤس ہے۔ اس نے ہمارا گھر میں ایک خون کیا۔ اور بھی قتل کیا وہ۔ شرماجی کو مارا اور دفن کیا۔ اس کا مال اٹھا لیا۔"

"یہ تم کیسے جانتے ہو؟" حمید حیران ہو کے بولا۔

"وہ بات کرتا تھا اور ہم سنتا تھا۔" کلیم نے کہا۔

"اسے سبق پڑھایا گیا ہے۔" بنگالی نائب صوبیدار بولا۔

"ابھی معلوم ہو جائے گا۔ کلیم اللہ! شروع سے سب بتاؤ۔ تم نے کیا دیکھا اور کیا سنا؟" حمید نے کہا۔

میرا دل بیٹھ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ اب وہ ہماری آمد سے واقعات کا بیان شروع کرے گا۔ یہ بتائے گا کہ ہمیں ایک امام مسجد اپنی حفاظت میں اس کے گھر چھوڑ گئے تھے مگر وہ خود لاپتا ہو گئے۔

"یہ جابر کو ہمارا باپ بولا کہ تم ادھر سے کچھ بندوبست کرے گا۔" کلیم اللہ نے کہا "ہم اپنا بیوی بچہ کو بھیجے گا اور اپنا فیملی کا کچھ لوگ بھی ہے۔ لڑکے کا چاچا ہے اور ماما ہے' ان کا بی بی لوگ ہے۔ وہ بولا۔ ہم ایک آدمی کا بیس ہزار لیتا ہے۔ تمہارا لڑکا کو چھوڑ دے گا اور ایک لاکھ لے گا۔ ہوائی جہاز میں سیٹ دے گا۔"

میں نے اور غالب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا "یہ کیا کہہ رہا ہے' اس نے کب سنا؟"

"اور جو کہا ہی نہیں گیا وہ سنا کیسے؟" غالب نے سرگوشی کی۔

میں نے کہا "اچھا سنو' وہ اور کیا کہہ رہا ہے۔"

کلیم اللہ کا بیان جاری تھا "وہ بولا ہم پاسپورٹ بھی لائے گا۔"

"تمہارے باپ کے پاس ایک لاکھ روپیہ تھا؟" بنگالی نے طنز سے پوچھا۔

"ہوتا تو وہ بھی جہاز پر جاتا۔ وہ محنت کرتا تھا' حرام نہیں کھاتا تھا۔" کلیم اللہ نے کہا۔

"پھر یہ رقم کس نے فراہم کی؟" مرہٹہ نے سوال کیا۔

"اس کا دوست۔ ہمارا چاچا اور ماما سب مل کے دیا۔ کاجل اپنا گھر سے لایا' ہمارا ماں کا زیور بیچا۔" کلیم کا اعتماد ذرا بھی متزلزل نہیں ہوا۔

"کاجل تمہاری کیا لگتی ہے؟" بنگالی نے کہا۔

"وہ ہمارا بہن ہے' ماں ہے۔ سب کچھ ہے۔" کلیم نے کہا۔

"مگر تم پٹھان ہو' وہ بنگالن ہے۔" بنگالی نائب صوبیدار نے کہا۔ "تم جھوٹ بول رہے ہو کسی کے کہنے پر۔"

"جھوٹا آدمی سب کو جھوٹا سمجھتا ہے۔" کلیم نے یوں کہا کہ میں پھر حیران رہ گیا۔

"کیا تمہارا باپ' عبدالستار چوہدری کو جانتا تھا؟ یا اس کے پاس ملازم رہا تھا؟ آخر کاجل کے تمہارے ساتھ تعلقات کیسے ہوئے؟" بنگالی بال کی کھال نکالنے پر آمادہ تھا۔

"یہ ہم نہیں جانتا۔" کلیم نے مختصراً کہا "ہم بہت چھوٹا تھا جب وہ آتا تھا۔"

"تم نے کبھی اپنے باپ سے بھی نہیں پوچھا؟"

حمید نے کہا "چھوڑو یہ بات..."

"سر! بات تو پوری کرنے دیں مجھے۔" بنگالی نائب صوبیدار نے برہمی سے کہا "کون سا غلط سوال کیا ہے میں نے؟"

مرہٹے نے بھی کہا "یہ لڑکا غلط بیانی کر رہا ہے۔"

"تم ثابت کر سکتے ہو؟" کیپٹن حمید نے کہا۔

"آپ موقع تو دیں۔" بنگالی نے شہ پا کے کہا "ایک غریب پٹھان چوکیدار کے تعلقات اتنے خوش حال اور تعلیم یافتہ لوگوں سے کیسے ہو گئے؟ جابر کو کیسے جانتا تھا وہ آخر؟"

"او کے۔ پوچھو۔ مگر میں یہ عدالتی کارروائی سارا دن جاری نہیں رکھ سکتا۔" حمید نے کہا۔

اب بنگالی صوبیدار نے زیادہ اختیارات کے ساتھ سوال کیا "ہاں بیٹا! اب بتاؤ کہ یہ جو تمہارا چاچا' ہے اس کا نام کیا ہے؟"

"سکندر بخت۔" کلیم نے جواب دیا۔

"اچھا۔ اور تمہاری چاچی کا؟"

"رابعہ قاری۔"

"تمہارا چاچا کیا کرتا ہے؟"

"اچھا بات کرتا ہے' اچھا کام کرتا ہے' کھانا کھاتا ہے' سوتا ہے' چائے پیتا ہے۔"

بنگالی نے خفیف ہو کے کہا "میرا مطلب تھا' کہیں نوکری کرتا ہے یا اس کا کوئی بزنس ہے؟ وہ ڈاکٹر ہے وکیل ہے' کیا ہے؟"

"وہ ہمارا چاچا ہے؟" کلیم نے کہا۔

بنگالی نے زچ ہو کے کہا "چاچا کو آمدنی کہاں سے ہوتی ہے؟"

"ہم کو نہیں معلوم۔ اسی سے پوچھو' وہ بتائے گا۔"

"اچھا وہ رہتا کہاں تھا؟"

کلیم نے بڑے یقین کے ساتھ ایک پتا بتایا۔

غالب نے مجھے کہنی ماری "نوٹ کرلو سکندر اعظم۔"

میں نے سر ہلایا اور اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

"تمہارے چاچا کی شادی کب ہوئی تھی؟"

"جمعہ کے دن۔" کلیم نے کہا۔

اب مرہٹہ بھی مسکرانے لگا "تاریخ یاد ہے؟ مہینہ اور سال۔"

"نہیں۔" کلیم نے کہا "ہم چھوٹا تھا۔"

"تمہاری چاچی کس کی بیٹی ہے؟" بنگالی نے کہا۔

"اپنے باپ کی۔" کلیم نے پھر بڑی سادگی سے کہا۔

بنگالی نے سر پکڑ لیا "اف! یہ جتنا چھوٹا ہے اتنا ہی خبیث ہے۔"

"تم بہت بڑا خبیث ہے۔ بچّہ کو گالی دیتا ہے۔" کلیم بگڑ گیا۔

مگر بنگالی بہت ڈھیٹ تھا۔ سوالات کا ایک اور ایسا ہی سلسلہ اس نے ماما کے بارے میں شروع کیا اور کسی پیشہ ور گواہ کی طرح کلیم نے اسے پھر وہی جواب دیے جو اس نے چاچا کے بارے میں دیے تھے۔

اب اس میں شک کی کوئی گنجائش نہ رہی تھی کہ ان سوالات کے سارے جواب اسے کاجل نے بتائے تھے۔ اسے معلوم تھا کہ پوچھنے والے کلیم سے کیا کچھ پوچھ سکتے ہیں۔ وہ اس کے ساتھ الگ بیٹھی رہی تھی اور اسے یہی سبق یاد کراتی رہی تھی۔ اس کی دور اندیشی اور ذہانت نے ہم سب کا راز فاش نہیں ہونے دیا تھا اور ہمارے بیانات کو اعتبار کی سند دلوادی تھی۔

کلیم نے ایک گھنٹا سوالوں کے جواب دینے میں صرف کیا اور ذرا نروس نہیں ہوا۔ اس نے ہمارے بیان پر مُہرِ تصدیق لگادی اور ثابت کردیا کہ ہم سب نے جو کچھ کہا تھا وہ سچ تھا۔ آخر کار جب کیپٹن حمید کی مداخلت پر یہ سلسلہ ختم ہوا تو غصے اور جھنجلاہٹ سے بنگالی نائب صوبیدار کی حالت غیر تھی۔ مرہٹہ سب کچھ سمجھنے کے باوجود خاموش بیٹھا مسکرا رہا تھا اور کیپٹن حمید شاید دل ہی دل میں اس ننھے گواہ کے حوصلے اور اعتماد کو سراہ رہا تھا جس نے کورٹ آف انکوائری کے چالاک' ذی فہم اور تجربہ کار معزز اراکین کا بڑی پامردی سے مقابلہ کیا تھا۔

جب کلیم کو جانے کی اجازت ملی تو ہم سب کے رکے ہوئے سانس بحال ہوئے۔ اسی وقت مجھے احساس ہوا کہ جھک کر جھری سے آنکھ اور کان لگائے ایک گھنٹا گزرنے کے بعد میں سیدھا بھی نہیں ہو سکتا۔ بوڑھوں کی طرح کمر پر ہاتھ رکھ کے میں آہستہ آہستہ اس قابل ہوا کہ سر اٹھا کے کاجل کو دیکھ سکوں۔ یہی کیفیت غالب کی تھی۔ رابعہ اور نازو ہمارے مقابلے میں کوتاہ قامت تھیں چنانچہ ان کی صرف گردن ٹیڑھی ہوئی تھی۔ صرف کاجل تھی جو سکون و اطمینان کی تصویر بنی دیوار کے ساتھ کمر لگائے بیٹھی تھی۔ اس ماسٹر کی طرح جس نے سارا سال اپنے شاگرد کو دن رات محنت کرا کے اس یقین کامل کے ساتھ امتحان دینے بھیجا ہو کہ اس کی محنت رائیگاں نہیں جائے گی اور یہ ناممکن ہے کہ اس کا ہونہار شاگرد فیل ہو کے اسے رسوا کرے۔

جب کلیم اندر آیا تو میں نے اسے گلے سے لگا لیا "تم تو بڑے چھپے رستم نکلے۔"

مگر اس نے بے رخی سے خود کو چھڑا لیا "تم بھی رستم ہے چاچا' ہم جانتا ہے۔"

پھر غالب کی ہمت نہ پڑی کہ اسے روکے اور عدالت میں اپنی شاندار پرفارمنس پر شاباشی دے۔ وہ سیدھا کاجل کے پاس گیا۔ کاجل نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"ابھی کیوں روتا ہے دیدی؟ کیا ہم غلط بولا؟ غلطی کیا ہم کوئی؟ وہی بولا جو تم بولا۔" وہ کاجل کو منانے لگا۔

کاجل نے اسے بے تحاشا چوما "نہیں بیٹا! تم نے تو وہ کام کیا ہے جو کوئی اور نہیں کرسکتا تھا۔ تم نے مجھے اور ہم سب کو بچالیا۔"

"مگر میں نے جھوٹ بولا دیدی۔"

"نہیں بیٹے۔ یہ جھوٹ میں نے بولا۔ اور ایسا جھوٹ گناہ نہیں ہوتا جو کسی بے گناہ کی جان بچائے۔ یہ تو ثواب ہی ثواب ہے۔ اگر عذاب بھی ہے تو مجھ پر کیونکہ میں نے تم سے کہا تھا۔"

میں' غالب' رابعہ اور نازو اس کے پاس چپ چاپ کھڑے تھے۔ سرنگوں اور شرمسار۔ اس کے بارِ احسان سے دبے ہوئے۔ اس کی قربانیوں کا قرض پہلے ہی کم نہ تھا کہ ہم ادا کرتے۔

میں نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کے کہا "تم نے کمال کردیا کاجل' تم نے ثابت کردیا کہ تم بہت عظیم ہو۔"

"ایسی باتیں مت کرو مجھ سے۔" وہ چلّائی "میں ایک آبرو باختہ عورت ہوں۔ بے گھر اور لاوارث' ماں باپ کو چھوڑ کے فرار ہونے والی' ان کی بربادی کی ذمّے دار۔ میں پاگل ہوں' سب جانتے ہیں۔"

وہ بُری طرح رو رہی تھی۔ اس کے ہسٹریا کا جن اس کے اعصاب پر سوار تھا اور اترنے پر آمادہ نہ تھا۔ وہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ گئی تھی اور اپنی ذات پر اعتماد سے محروم ہو چکی تھی۔ بھارت کے ایک سپاہی نے اور پھر جابر نے اس کے جسم کو پامال کر کے اسے خود اپنی نظر میں بے آبرو کردیا تھا۔ ہماری طرح اس کا ذہن یہ ماننے پر تیار نہ تھا کہ اس کی قربانی عظیم تھی۔ عورت کے پاس تمام عمر کا اندوختہ وہی غرور ہوتا ہے جو وہ اپنی عزت کے بے داغ آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ کر محسوس کرتی ہے۔ اسے اپنی رُوسیاہی اور تن کے داغ داغ پر ندامت کا احساس مارے ڈالتا تھا۔ جو کچھ ہوا تھا' سرِعام نہیں ہوا تھا مگر سرِعام کہا اور سنا گیا تھا۔ اسے خود بتانا پڑا تھا اور اپنی تذلیل خود کرنی پڑی تھی۔

رابعہ اور نازو نے اسے سنبھالنے کی بہت کوشش کی مگر وہ کسی کے قابو میں نہیں آئی' سوائے کلیم کے۔ جب وہ رونے لگا تو کاجل کو شاک لگا۔ وہ کاجل کو دیدی کہنے لگا تھا جو بنگالی میں بڑی بہن کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

"دیدی! ہم بھی مرجائے گا۔ ہم جھوٹ بولا تمہارے واسطے لیکن تم ہم سے خفا ہے۔ ہم بھاگ جائے گا' واپس چلا جائے گا۔"

اب کاجل اسے منانے لگی اور رونا دھونا سب بھول گئی۔ اسی وقت ہمیں ایک ساتھ طلب کرلیا گیا اور میں سمجھ گیا کہ جیوری نے اپنا فیصلہ مرتب کرلیا ہے۔ اعلان سے قبل ہی مجھے فیصلے کا اندازہ تھا۔

بنگالی نے ہم پر ایک نگاہ ڈالی اور کہا "کاجل اور اس کا بیٹا کدھر ہے؟"

میں نے غرّا کے کہا "ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"کیا جھوٹ بولنے سے ہاضمہ خراب ہوگیا ہے؟" بنگالی بولا۔

میں نے کہا "مروڑ تو تمہارے پیٹ میں اٹھ رہا ہے۔"

کیپٹن حمید نے گرج کے کہا "خاموش۔ میں اپنا فیصلہ بدل بھی سکتا ہوں۔ مجھے مجبور مت کرو کہ تم سب کو فائرنگ اسکواڈ کے سپرد کردوں۔"

میں نے کہا "کیپٹن! کورٹ مارشل ہوتا ہے فوجیوں کا اور اگر ہم سب فوجی ہوتے تب بھی تم جیسے معمولی عہدے کے افسر کو یہ اختیار بھی حاصل نہیں کہ ہمیں جیل بھیج سکتا۔"

"اسٹاپ بارکنگ" کیپٹن حمید نے میز پر مکّا مارا "میں جابر کو انڈر اریسٹ رکھوں گا۔ اسے سفارتی مراعات حاصل ہیں اس لیے خود بھارتی سفارتخانے والے اس کے جرائم پر مزید کارروائی کریں گے۔ باقی سب کے لیے میرا حکم ہے کہ انہیں ایک ٹرک میں فوجی محافظوں کے ساتھ واپس بھیج دیا جائے اور پہلی پولیس پوسٹ پر قانون کے حوالے کردیا جائے۔ ان کے تمام معاملات کی مکمل تفتیش قانون کے مطابق ہوگی۔"

"لیکن کیوں' ہمارا جرم کیا ہے؟" میں نے چیخ کر کہا۔

"تمہارے پاسپورٹ جعلی ہیں۔ ان پر تمہارے نام غلط ہیں۔ ایک عورت کی تصویر بدلی گئی ہے۔ یہ ثابت نہیں ہوسکا کہ تم سب کا آپس میں کوئی رشتہ ہے یا نہیں اور تمہارے دیگر کوائف کس حد تک درست ہیں۔" کیپٹن حمید نے کہا "تم کو شام چھ بجے واپس جانا ہوگا۔ جابر کو ہم کل اس کی کار میں ڈھاکا بھیج دیں گے۔ کورٹ ڈسمس۔"

"کورٹ!" میں نے تلخ لہجے میں دہاڑ کے کہا "واٹ بلڈی کورٹ! کون مانتا ہے تمہاری اس عدالت کو اور اس کے فیصلے کو؟ ہاں تم اپنے جنگل کے قانون سے کام لیتے ہوئے ہم سب کو گولی بھی مار سکتے ہو مگر انصاف کا نام کیوں بدنام کرتے ہو۔ لالچی کُتّے ہو تم' بھیڑیے ہو۔"

جب تک وہ اٹھ کر چلے نہیں گئے' میں اسی طرح چیختا دہاڑتا رہا۔ جواب میں بنگالی نائب صوبیدار نے بھی بہت کچھ کہا جو میں نے نہیں سنا کیونکہ میں اپنا شور سن رہا تھا۔ اگر سچ کی عدالت ہوتی تو میں توہینِ عدالت کا مرتکب قرار پاتا اور میری سزا میں مزید سال چھ مہینے کا اضافہ ہوجاتا مگر اس رسمی قسم کی تحقیقات کرنے والے ایک کمیشنڈ افسر اور دو جے سی اوز پر مشتمل ٹریبونل کی کوئی قانونی حیثیت تھی ہی نہیں۔

مسلح محافظ ہمیں دھکیل کر واپس لے گئے اور شام تک کے لیے ہم سب کو ایک کمرے میں قید کردیا گیا جو دس فٹ چوڑا اور بارہ فٹ لمبا تھا۔ اس میں پہلے دو چارپائیاں تھیں۔ ان کو ہٹا کے اب زمین پر دری بچھا دی گئی تھی۔ وہ کمرے سے میز کرسیاں وغیرہ بھی اٹھا کے لے گئے تھے۔ اس کمرے میں ایک کھڑکی پیچھے کی طرف

تھی مگر وہاں بھی دو فوجی پہرے پر متعین کر دیے گئے تھے۔ دو برآمدے کی طرف کھلنے والے دروازے پر مستعد کھڑے تھے اور دو ذرا آگے سیڑھیوں کے پاس۔

کاجل اور کلیم اب بھی ایک دوسرے کے ساتھ تھے لیکن ان کے جذباتی عدم توازن کا دورہ ختم ہو چکا تھا۔ رابعہ اور نازو حقیقت حال سے باخبر ہونے کے باوجود خوفزدہ اور بجھی بجھی تھیں۔

میں نے کہا "لیڈیز! اس مہلت کو غنیمت جانتے ہوئے ذہن کو تفکرات سے آزاد رکھیے۔ طعام کے بعد قیلولہ فرمایئے اور اٹھ کے رختِ سفر باندھیے۔"

"مگر اس سے پہلے تشریف رکھیے۔" غالب نے کہا۔

"تشریف رکھتا ہے آدمی صوفے یا قالین پر' کرسی پر یا کم سے کم چاندنی پر۔ اس غلیظ دری پر تو صرف بیٹھ سکتا ہے۔" نازو نے کہا۔

"دری غلیظ ہے تو ہٹا دو۔ فرش صاف ہے۔" غالب نے کہا۔

رابعہ نے کہا "کیا یہ لوگ واقعی ہمیں واپس بھیج رہے ہیں؟"

غالب نے کہا "معاف کرنا آنٹی' آپ کا سوال اتنا احمقانہ ہے کہ اس کا جواب دینا بھی حماقت ہوگا۔"

"تم سے کس نے کہا ہے بک بک کرنے کو۔" رابعہ بگڑ گئی۔

میں نے کہا۔ "وکیل صاحبہ! ہم سخن فہم ہیں' غالب کے طرف دار نہیں۔ آپ جانتے بوجھتے ایسا مایوسی پھیلانے والا اور قنوطیت پسند رویہ کیوں اپنا رہی ہیں؟ کیپٹن حمید بتا چکا تھا کہ یہ ڈراما ہوگا۔"

"مجھے یہ ڈراما حد سے زیادہ حقیقی نظر آتا ہے۔"

"یہ تو ڈرامے کی کامیابی کا ثبوت ہے۔" میں نے کہا۔

"آپ تو اس وقت بھی یہی فرمائیں گے جب وہ ہمیں ٹرک میں لاد کر کے بیک ٹو دی پویلین کر دیں گے۔" غالب نے کہا۔ "فرض کرو حمید کی رائے بدل گئی یا اس کا دماغ چل گیا...."

"ابھی تو تمہارا دماغ چل گیا ہے۔" نازو بولی۔

"دماغ چل گیا ہے' دل چلا گیا ہے۔" غالب ٹھنڈی سانس لے کر بولا "باقی بچا ہے مرزا غالب کا یہ ڈھانچا۔"

"ڈھینچوں ڈھینچوں کرنے والا۔" نازو نے لقمہ دیا۔

"ہمارے پاس پانچ گھنٹے ہیں۔" میں نے گھڑی دیکھ کر کہا "کیا ہم یہ وقت رونے دھونے' سونے اور کھانے میں گزار دیں گے؟"

"پہلے دو کام تمہارے اور رابعہ کے لئے۔ باقی دو میں اور نازو کر لیں گے۔" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "کاجل! کچھ تم بھی بولو۔ ہمیں تو تم نے بولنے نہیں دیا۔"

وہ اداسی سے مسکرائی "کیا بولوں' بولنے سے کیا ہوگا؟"

"بولنے سے دل کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے۔ ویسے بھی تم ہنستی ہوئی اچھی لگتی ہو۔" غالب نے کہا اور پھر نازو کی طرف دیکھ کر بولا "تم تو خیر مجھے ہر حال میں اچھی لگتی ہو' اس لیے ڈونٹ مائنڈ۔"

دو فوجی مارچ کرتے اندر آئے اور بڑے بڑے تھال ہمارے درمیان رکھ کر لوٹ گئے۔ ایک تھال میں بھاپ دیتے ہوئے چاول تھے اور دوسرے میں گوشت کے بڑے بڑے اشتہا انگیز خوشبو والے بھنے ہوئے ٹکڑے۔ ان میں سب سے چھوٹا ٹکڑا بھی آدھا سیر کا تھا۔

میں اور غالب فوراً بیٹھ گئے "یہ غالباً یہاں کی اسپیشل ڈش ہے۔ لیمب روسٹ۔"

غالب نے گوشت کا ایک ٹکڑا چکھتے ہوئے اعلان کیا "یہ لیمب نہیں ہے۔"

"تو پہاڑی بکرا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"یہ ہرن ہے یا نیل گائے۔" غالب نے کہا۔

"یا ہمالیہ کا برفانی ریچھ یا آسٹریلیا کا کنگارو۔" نازو نے اس کا مذاق اُڑاتے ہوئے کہا "تم ایسے کہاں کے ماہر شکاری ہو گئے کہ گوشت کے ذائقے سے جانور کو پہچان لو!"

غالب نے سرد آہ بھر کے کہا "ہم نے تو تمہیں بھی ایسے ہی پہچان لیا تھا۔"

میں نے کہا "کیا مطلب؟ بات گوشت کے ذائقے کی ہو رہی تھی۔"

نازو نے جھینپ کے کہا "بات کو ایسا موڑتے ہو تم۔"

"جیسے تم نے میری زندگی کا رخ موڑا۔ یا بقول فلمی شاعر۔

ایک ہی انکل تھے میرے ان کو ماما کر دیا
ہیٹ تھا سر پر میرے اس کو عمامہ کر دیا
خود ہوئیں جامے سے باہر اور کہا فیشن ہے یہ
میری اِک پتلون تھی اس کو پاجامہ کر دیا

ہم سب کی ایک دم ہنسی چھوٹی۔ ہمارے قہقہے سن کے دونوں محافظوں نے اندر جھانکا اور کچھ حیران ہوئے کہ ہم اتنے پُرلطف کھانے کو دیکھ کر ہنس رہے ہیں جو بطور آخری طعام ہمارے لیے کپتان صاحب کی طرف سے بھیجا گیا تھا۔ انہوں نے فرض کر لیا ہوگا کہ ہم سب پاگل ہو چکے ہیں۔

نازو نے ہنستے ہنستے آنسو پونچھے "یہ کہاں سے یاد آ گیا تمہیں؟"

— غالب تسلیم بجا لا کے بولا "فی البدیہہ عرض کیا ہے' ابھی ابھی۔"

میں نے کہا "بکواس مت کرو۔ یہ اکبر الٰہ آبادی کا قطعہ ہے۔"

"اکبر الٰہ آبادی کیا' کسی بھی شاعر کا ہو یہ میرے سوا تو لگا لو شرط۔ سال دو سال جب تک چاہو تصدیق کرو اور ہار جاؤ تو میرے پاس آ کے بیعت کر لینا میرے ہاتھ پر۔" غالب نے کہا۔

"گویا تم واقعی شاعر ہو؟" نازو نے کہا۔

"بابا' گھر کی مرغی ہوں' اُڑا لو میرا مذاق۔ میں فطری عاجزی اور طبعی انکساری کے باعث کچھ کہتا نہیں ورنہ کہاں میں کہاں غالب!"

اس کی بات کے دونوں مطلب نکالے جا سکتے تھے۔ وہ مرزا غالب کو عرش قرار دے رہا تھا اور خود کو فرش یا پھر اس کے برعکس۔ تاہم مجھے کچھ یقین آنے لگا تھا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے۔ ممکن ہے فی البدیہہ اس نے نہ کہا ہو' پہلے کبھی طبع آزمائی کی ہو مگر اس وقت دو اشعار نے وہ کام کیا جو دس لطیفے بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اس نے ایک دم سب کا موڈ بدل دیا' یہاں تک کہ کاجل بھی مسکرانے لگی اور کلیم جو کچھ نہیں سمجھا تھا' کاجل کو دیکھ کر ہنسنے لگا۔ نہ جانے کیوں اس نے اپنے آپ کو اس حد تک کاجل سے وابستہ کر لیا تھا کہ اسے اداس دیکھ کر وہ رونے لگتا تھا اور اس کے ہونٹوں کی ہنسی پر خود بھی ہنستا تھا۔ یہی کیفیت کاجل کی تھی۔ عورت کے وجود میں ممتا کی جتنی ہمہ گیری ہے' وہ ایک سائبان کی طرح کلیم پر سایہ فگن تھی اور کاجل اسے اپنی ذات کی پناہ فراہم کر رہی تھی۔ اسے ماں بننے کا کوئی تجربہ نہ تھا مگر شاید اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

جب دو رنگروٹ کھانے کے برتن اٹھا کر لے گئے تو میں اور غالب ایک طرف لیٹ گئے۔ رابعہ' نازو اور کاجل کچھ فاصلے پر دراز ہو گئیں اور کچھ دیر بعد سو بھی گئیں۔ میں اور غالب اپنے اپنے خیالات میں محو تھے اور سونے کی کوشش میں کامیاب ہونے والے تھے کہ کھڑکی میں پل بھر کے لیے ایک چہرہ نمودار ہوا۔ ہم ایک ساتھ اٹھ بیٹھے۔ وہ کسی فوجی کا مونچھوں والا کرخت چہرہ تھا جو پل بھر کے لیے نظر آیا' پھر اس نے کوئی چیز کھڑکی میں رکھی اور غائب ہو گیا۔

میرے ذہن میں آنے والا سب سے پہلا خیال یہ تھا کہ وہ ٹائم بم یا دستی بم ہے اور مونچھوں والا اسے پن نکال کے رکھ گیا ہے۔ دستی بم پن نکالنے کے بعد پانچ سیکنڈ میں پھٹ جاتے ہیں۔ اتنے کم وقت میں سب کو جگانا' خطرے سے خبردار کرنا اور ان کو محفوظ رکھنے کے لیے اس جگہ سے منتقل کرنا ناممکن تھا چنانچہ ایک ہی خیال کے تحت میں اور غالب ایک سیکنڈ میں کھڑکی تک جا پہنچے کہ وہ دستی بم ہو تو اسے پھٹنے سے پہلے باہر اچھال دیں۔ اس وقت مجھے قطعی علم نہ تھا کہ وہ دستی بم ہے تو اس کی پن کو کھلے ہوئے تین سیکنڈ گزر چکے ہیں یا چار اور وہ میرے ہاتھ لگاتے ہی پھٹ گیا ہوگا۔

لیکن وہ دستی بم نہیں تھا۔ عین وقت پر میں نے اسے دیکھ لیا اور اٹھا کر پھینکتے ہوئے اس کے بہت کم وزن نے میرا ہاتھ روک لیا۔ دستی بم اتنے ہلکے نہیں ہوتے۔ اس کے علاوہ شکل سے بھی وہ بم نہیں بلکہ واکی ٹاکی لگتا تھا۔ میں نے اسے پلٹ کے دیکھا تو مجھے اسپیکر کی جالی اور آن آف کرنے والا سوئچ نظر آئے۔

غالب باہر دیکھ رہا تھا اور آگے جھک کر اس شخص کو تلاش کر رہا تھا جو یہ تحفہ چھوڑ کے غائب ہو گیا تھا۔

میں نے کہا "مرزا! یہ تو فرشتۂ اجل کا تحفہ نہیں ہے۔"

"لیکن وہ تھا کون؟ کس نے بھیجا تھا اسے؟ یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔"

"وہ کوئی بھوت تھا۔" میں نے کہا۔

"یعنی میرا سسر۔ نہیں' اس کی مونچھیں نہیں ہیں۔" غالب بولا۔

نازو بھی شاید ابھی سوئی نہیں تھی چنانچہ ہماری بھگدڑ پر وہ بھی اٹھ کے آ گئی تھی مگر اس نے غالب کی بات کو سنا ہی نہیں۔

"کہیں یہ خفیہ قسم کا بم نہ ہو۔" نازو بولی۔

"یہ خفیہ بم ہے تو تمہیں کیسے نظر آ رہا ہے؟" غالب نے سوال کیا "اور بائی دی وے خفیہ بم ہوتا کیا ہے؟"

"میرا مطلب تھا' واکی ٹاکی جیسا۔ کھلونا بنا کے اندر بم نہ فٹ کر دیا گیا ہو۔ آن کرتے ہی پھٹ جائے۔" نازو نے بگڑ کے کہا۔

میں نے اس کا معائنہ کرتے ہوئے کہا "میں اس امکان کو ذہن میں رکھتے ہوئے بھی یہ خطرہ مول لوں گا۔"

"گویا خودکشی بقائمی ہوش و حواس۔" غالب نے کہا "کیا اس کے لیے آپ مجھے اور مسماۃ نازو کو اتنی مہلت دیں گے کہ ہم اس کھڑکی سے کود کے فرار ہو جائیں اور کم سے کم پچاس گز دور چلے جائیں؟ آخر کوئی تو باقی رہنا چاہیے جو لواحقین کا رول کر سکے۔"

میں نے اسے آن کر دیا "یہ اجتماعی خودکشی ہوگی۔ لواحقین سمیت۔"

ٹیلی فون ریسیور جیسے اس آلے میں سے ہلکی سی سرسراہٹ

سنائی دے رہی تھی۔ میں نے اسے کان سے لگایا مگر اور کوئی آواز نہ سن سکا۔ پھر نازو نے ریسیور لے لیا اور بولی "مجھے تو کچھ سنائی نہیں دیتا۔"

غالب ہنس پڑا "مجھے وہ مشہور لطیفہ یاد آرہا ہے۔"

میں نے کہا "میں نے سنا ہے۔"

"مگر میں پھر سناؤں گا۔ ایک پاگل آدھے گھنٹے سے دیوار کے ساتھ کان لگائے بیٹھا تھا۔ ایک وارڈن ادھر سے گزرا تو وہ بھی پاس بیٹھ گیا اور کچھ دیر بعد بولا کہ مجھے تو کچھ سنائی نہیں دیتا۔ پاگل نے افسوس سے سرہلا کے کہا کہ بے وقوف کے بچّے، جب آدھے گھنٹے سے مجھے کچھ سنائی نہیں دیا تو پانچ منٹ میں تجھے کیا سنائی دے گا۔ لاؤ یہ چیز مجھے دو۔"

"کیا تم وارڈن ہو؟" نازو نے کہا۔

"بھئی، عین ممکن ہے، تم دونوں کی سماعت متاثر ہو چکی ہو مگر تمہیں پتا نہ ہو۔" غالب نے ریسیور کان سے لگالیا "بالکل ٹھیک۔ تم لوگ تو واقعی بہرے ہو۔"

میں نے اسے مذاق سمجھا "کس کی آواز سن رہے ہو؟ کسی بھوت کی؟"

غالب نے نفی میں سرہلایا "میرے سُسر محترم ڈائریکٹ بات کرتے ہیں۔ وائرلیس اور ٹیلی فون غیر محفوظ، شیطانی آلے ہیں۔"

بات کرتے کرتے وہ ایک دم سیریس ہوگیا اور پھر ریسیور اس نے مجھے تھما دیا۔ اس میں کوئی بہت آہستہ سرگوشی میں بول رہا تھا۔

"ہیلو ہیلو، ڈو یو ریڈی؟"

میں نے کہا "آئی ریڈیو۔ کون ہو تم؟"

"تمہارا دوست۔ وقت کم ہے اس لیے جو میں کہہ رہا ہوں وہ غور سے سنو۔" اس نے کہا "تمہارا سب اسلحہ ضبط کرلیا گیا ہے۔ وہ بھی جو تم نے کار میں چُھپایا تھا۔"

"یہ کوئی نئی اطلاع نہیں۔"

"تمہیں شام چھ بجے ایک ٹرک واپس لے جائے گا۔ اس میں حفاظت کے لیے پانچ آدمی ہوں گے۔ ڈرائیور سمیت چھ۔ ایک آگے بیٹھے گا۔ چار تمہارے ساتھ پیچھے ہوں گے۔ ان کے پاس خودکار ہتھیار ہوں گے۔"

"ہم ان سے نمٹ لیں گے۔ مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی۔"

"تیغ اور آٹومیٹک رائفل میں بہت فرق ہوتا ہے۔" وہ ہنسا اور میں نے فوراً پہچان لیا کہ وہ درپردہ ہماری مدد کرنے والا کیپٹن حمید تھا۔

"پھر ہم شہادت کا درجہ حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔" میں نے کہا۔

"میں نے کچھ انتظام کیا ہے۔" اس نے کہا "ٹرک کے پیچھے والے ٹائر کے اوپر مڈگارڈ کے نیچے ایک ریوالور موجود ہے۔"

"کون سے ٹائر کے اوپر؟ رائٹ یا لیفٹ۔"

"ڈرائیور سائیڈ۔" وہ بولا "ریوالور ایک پلاسٹک بیگ میں لپٹا ہوا ہے اور انڈی کیٹر لائٹ کے ساتھ باندھا گیا ہے۔"

میں نے کہا "بڑی مشکل جگہ ہے۔ میں وہاں کیسے پہنچ سکتا ہوں؟ تمہیں کوئی آسان جگہ نظر نہیں آئی تھی؟"

"آسان جگہ پر دوسرے بھی دیکھ لیتے۔"

"مگر اب میں اسے حاصل کرنے کے لیے ٹرک کے نیچے کیسے گھُسوں گا؟"

"یہاں سے دس میل کے بعد ایک موڑ آئے گا۔ وہاں ٹرک کا ٹائر فلیٹ ہو جائے گا۔ کم سے کم ایک۔"

میں نے حیرانی سے کہا "کیا تم علمِ غیب بھی رکھتے ہو؟"

وہ پھر ہنسا "میں پکا بندوبست رکھتا ہوں۔ یہ انتظام بھی میں نے کیا ہے کہ موڑ کاٹتے وقت بائیں جانب کا ایک ٹائر پنکچر ہو جائے۔ بائیں طرف پہاڑ ہوگا، دائیں طرف کھائی۔"

میں نے کہا "اگر اگلا ٹائر برسٹ ہوگیا تو ٹرک بے قابو ہو جائے گا اور ہم جائیں گے سیدھے کھائی میں۔"

اس نے کہا "ٹائر نئے ہیں، برسٹ نہیں ہوسکتے۔ اس کے علاوہ ملٹری کے ٹرک اس علاقے میں حدِ رفتار سے نہیں بڑھ سکتے۔ یہ رفتار پندرہ سے بیس میل ہوتی ہے۔ یعنی زیادہ سے زیادہ بیس میل فی گھنٹا۔ تم روانگی کے آدھے گھنٹے بعد توقع کرسکتے ہو کہ ٹرک دس پندرہ منٹ کے لیے رکنے والا ہے۔ ٹائر بدلنے میں اتنا ہی وقت لگے گا۔ تم اس مہلت سے فائدہ اٹھا سکتے ہو۔"

"وہ کیسے؟ کیا میں محافظوں سے درخواست کروں کہ مجھے ٹرک کے نیچے گھسنے کی اجازت دیں؟ یا خود ریوالور نکال دیں تو بڑی مہربانی۔"

"تم حوائجِ ضروریہ سے بے نیاز تو نہیں ہو۔ اچانک کسی کو اس کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ ٹو آنسر دی کال آف نیچر۔"

"بجا ارشاد۔ مگر کیا محافظ اتنے احمق ہیں کہ سر پر بندوق تانے نہیں کھڑے رہیں گے؟"

وہ بولا "تمہارے ساتھ خواتین بھی ہیں۔ ان میں سے ایک تو مومنہ ہے۔"

میں نے کہا "وہ سب مومنہ ہیں....."

"میرا مطلب تھا بے تیغ لڑنے والی۔ دوسری کا اسلحہ ہے اس کی زبانت۔ اس نے آج استغاثہ کے سب سے اہم گواہ ایک بچّے کے ہاتھوں جرح کرنے والوں کی ایسی تیسی کرادی۔ ایسا سبق پڑھایا تھا اسے....."

"تمہاری مراد کاجل سے ہے؟"

"اس کا نام بھی خوب ہے، آنکھوں کی مناسبت سے۔ فرصت ہوتی یا موقع ملتا تو میں اس پر فریفتہ ہو جاتا۔ بعد میں اسے بتاتا کہ اس کا ایک غائبانہ عاشق میں بھی تھا۔ نازو اور کاجل بہت کچھ کرسکتی ہیں۔"

میں نے کہا "محترم عاشق صاحب! آپ تیسری خاتون کو نظر انداز کرکے میرے جذبات کو مجروح کررہے ہیں۔ کیا وہ بے وقوف ہے؟"

"دراصل..... اس نے کوئی عقلمندی کی بات نہیں کی میرے سامنے..... اور ہے بھی ذرا ایسی ہی... معصوم سی، بھولی بھالی سی۔ بلاشبہ وہ سب سے حسین ہے مگر..."

"تھینک یو۔ تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ وہ بہت قابل اور کامیاب وکیل بھی ہے۔ بیرسٹر ہے۔"

"ہے نہیں، تھی کہو۔ یہاں تو عدالت میں اس کی آواز بھی نہیں نکلی۔"

"وہ عدالتِ عالیہ کی وکیل ہے اور یہ تو قبائلی جرگہ بھی نہیں تھا۔" میں نے خفگی سے کہا "تم نے مزید مجروح کردیا ہے میرے جذبات کو۔"

وہ ہنسنے لگا "کہیں زخموں کی تاب نہ لا کے تمہارے جذبات دَم نہ توڑ دیں۔"

"اس سے پہلے میں یہ بکواسی آلہ توڑ دوں گا..... تمہارا سر توڑ دوں گا۔"

"کیا وہ بھی تمہیں اتنا ہی چاہتی ہے؟"

"میں اس کی طرف سے بیانِ حلفی داخل کرسکتا ہوں۔"

"معاف کرنا، پھر تو مجھے شبہ ہے اس کی ذہانت میں۔ خیر..... میں نے کہا تھا کہ وقت کم ہے اور خود بھول گیا۔"

"وقت کی کمی کے باعث میں نے تمہاری گستاخی کو معاف کیا۔"

"جیسے ہی ٹرک رکے، مس کاجل کی طرف سے درخواست کی جائے کہ وہ اشد ضرورت محسوس کرتی ہے۔"

"ٹو آنسر دی کال آف نیچر۔"

"رائٹ۔ سپاہی تمہارے سر پر تو بندوق لے کر کھڑے ہوسکتے ہیں مگر عورت کے معاملے میں تم عزت اور غیرت کے مشتعل جذبات کا مظاہرہ کرو گے تو وہ دور کھڑا ہو جائے گا جہاں سے وہ براہِ راست کاجل کو نہ دیکھ سکتا ہو۔ زیادہ بے وقوف ہوا تو پیٹھ پھیر کے کھڑا ہو جائے گا۔ وہاں کوئی درخت یا جھاڑی ہے تو بلندی پر۔ ظاہر ہے کوئی عورت اوپر چڑھ کے نہیں بیٹھ سکتی اور فرار بھی نہیں ہوسکتی۔ آگے پیچھے کھلی سڑک ہے۔ ٹرک کی اوٹ میں رہتے ہوئے اس کا نیچے گھس جانا اور ریوالور نکال لینا عین ممکن ہے۔ وہیں ڈرائیور بھی ٹائر بدل رہا ہوگا لیکن اس کی ساری توجہ ٹرک کو جیک سے اوپر اٹھانے یا نٹ بولٹ کھولنے پر ہوگی۔ ویسے بھی اس وقت تک اندھیرا ہو جائے گا اور ٹرک کے نیچے اسے کوئی نقل و حرکت محسوس نہیں ہوگی، بشرطیکہ اس میں احتیاط کی جائے اور کوئی غیر متوقع حادثہ نہ ہو۔ مثلاً اسے اچانک چھینک نہ آئے، اس کا سر اوپر کسی چیز سے نہ ٹکرائے اور وہ "اوئی" کی آواز نہ نکالے، ہائے اللہ وغیرہ نہ کہے۔"

"نہیں کہے گی۔" میں نے اسے یقین دلایا "البتہ چھینک نہ آنے کی ضمانت نہیں دے سکتا۔ عشق اور مشک کی طرح اسے بھی چھپایا نہیں جاسکتا۔ خیر فرض کرو اس نے ریوالور حاصل کرلیا۔ اس کے بعد؟"

"پھر کیا۔ سب سے پہلے تو گولی مار دے ڈرائیور کو۔ اس ٹیم میں وہ اکلوتا ڈرائیور ہے۔ پھر اس محافظ کو جس نے اسے نیچے گھسنے کی اجازت دی تھی۔"

میں نے کہا "وار پلان تو ہم بنالیں گے مگر پہلے ایک اور سوال کی وضاحت ضروری ہے۔"

"جلدی سے پوچھ لو، مجھے جانا ہے۔"

"کیا تم یہ اسلحہ ہم تک اسی طرح نہیں پہنچا سکتے، جیسے یہ آلۂ گفت و شنید پہنچایا تھا؟ وہ مونچھوں والا تو چھلاوہ تھا۔"

"تمہیں ٹرک پر سوار کرانے سے پہلے تلاشی ہوگی۔ دستور کے مطابق اس وقت تمہاری جیب سے پن بھی برآمد کرلی جائے گی۔"

"کیا تم تلاشی نہیں لے سکتے؟ یا کسی ایسے شخص کو اس فرض پر مامور نہیں کرسکتے جو ہماری جیب میں توپ بھی دیکھے تو نظر انداز کردے؟"

"نہیں۔ جو میں نے کیا ہے اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کرسکتا۔" کیپٹن حمید نے کہا "تمہیں اندازہ نہیں کہ میری پوزیشن کتنی نازک ہے۔ تمہارے دشمن پہلے ہی بہت جھلّائے ہوئے ہیں کیونکہ میں نے اس کیس میں ساری کارروائی عین قانون کے مطابق کی، جو میں ہمیشہ نہیں کرتا۔ اور اس طرح تم سب کو مارے جانے سے بچالیا ورنہ وہ بہت مشتعل تھے۔ تم نے مارپیٹ کی تھی اور ایک قتل کردیا تھا۔ مرنے والا انہی کا ساتھی تھا۔ تمہیں کیفرِ کردار تک پہنچانے کی کارروائی وہ خود کرنا چاہتے تھے مگر اس لیے بھی نہ کرسکتے تھے کہ تم انڈین پاسپورٹس پر سفر کررہے تھے اور پاسپورٹ جعلی نہیں تھے۔"

"مگر ہمارے نام تو غلط لکھے ہوئے تھے۔"

"وہ ایک گمنام فون کال تھی۔ اسے معتبر نہیں سمجھا جاسکتا اور اسے بنیاد بنا کے قطعی فیصلہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے سب کے کان میں یہ بات ڈال دی تھی کہ وہ اس اطلاع پر بھروسا نہ کریں۔ عین ممکن ہے کسی نے دشمنی میں بھی فون کردیا ہو اور پاسپورٹ کے اندراجات درست ہوں۔ اس کے بعد میں نے تمام معاملات تمہارے دشمنوں کے سپرد کردیے ہیں۔ محافظوں کا انتخاب بھی خود انہوں نے کیا ہے اور وہ بنگالی نائب صوبیدار کی کمان میں ہوں گے۔"

"گویا یہ بھی ممکن ہے کہ ان کا خفیہ منصوبہ ہمیں راستے میں ہی ٹھکانے لگانے کا ہو؟" میں نے کہا۔

"بالکل ٹھیک سمجھے تم۔ قیدیوں پر فرار کی کوشش کا الزام عائد کر کے انہیں گولی مار دینا بہت آسان کام ہے۔"

"اور یہ نیک کام انہوں نے ٹائر فلیٹ ہونے سے پہلے ہی کر لیا پھر؟"

"نہیں۔ وہ جلدی نہیں کریں گے۔ پوری رات کا سفر ہو گا تو وہ اس کے لیے آدھی رات کے بعد کا وقت بہتر سمجھیں گے' جب ٹریفک بالکل نہیں ہوتی۔ بنگالی نائب صوبیدار آگے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا ہو گا اور جب ٹائر بدلا جائے گا تب بھی بیٹھا ہی رہے گا مگر کاجل کی درخواست منظوری کے لیے اسی کے سامنے پیش ہو گی۔ اس وقت وہ ضرور اترے گا اور کاجل' ڈرائیور کو گولی مارنے کے بعد اسے یرغمال بنا لے تو......"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "تمہارا پلان اچھا ہے لیکن ہم موقع محل اور صورتِ حال کے مطابق کچھ نہ کچھ کر لیں گے۔ ایک ریوالور بہت ہے' باقی ہماری ہمت اور ہماری قسمت۔ تھینک یو ویری مچ۔ خدا کرے یہ آخری احسان کا قرض ہو۔ اب تک نہ جانے ہم کتنے لوگوں کے مقروض ہو چکے ہیں۔"

"مجھے قرض خواہوں میں مت شامل کرو۔ قرض میں سے ایک نقطہ کم کر کے فرض کر لو۔"

"کیا تمہارا یہ فرض تھا؟"

"اچھا ایک نقطہ اور کم کر لو۔ فرض نہیں یہ مرض تھا۔ جذباتی عارضہ' جیسے تمہیں لاحق ہے۔ اس میں آدمی کی عقل کے بریک فیل ہو جاتے ہیں۔"

اس کی بات اچانک ختم ہو گئی۔ ریسیور میں صرف سرسراہٹ رہ گئی۔ "یہ کیا ہوا؟" میں نے تشویش سے کہا۔

پہلے غالب اور نازو بالکل خاموش کھڑے ریسیور کی وہ آواز سننے کی ناکام کوشش کرتے رہے تھے جو براہِ راست میرے کان میں داخل ہو رہی تھی۔ یہ آواز اتنی کم تھی کہ خود میں بڑی مشکل سے سن رہا تھا۔ پھر غالب اور نازو نے میری یکطرفہ باتوں سے ساری گفتگو کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔

غالب نے ریسیور لے کر کان سے لگایا اور ہنسا "کچھ بھی تو نہیں ہوا' یہ پہلے کی طرح خاموش ہے۔"

"پھر کیا سکندر کو کچھ ہو گیا ہے؟" نازو نے کہا "یہ اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا۔"

غالب نے ٹھنڈی سانس لی "ہاں' سکندر کو بھی وہی ہوا ہے جو مجھے۔ میں بھی اپنے آپ سے باتیں کرتا رہتا ہوں۔ کہو تو اقتباس سناؤں۔"

"رہنے دو' مجھے معلوم ہے۔" نازو نے ناک بھوں چڑھا کے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

"اچھا تو پھر تم سناؤ" غالب بولا "اگر ہمت ہے۔"

"ہمت کی کیا بات ہے؟"

"ہمت کی بات تو ہے۔ خود میں وہ سب نہیں دُہرا سکتا کسی کے سامنے تو تم کیا سناؤ گی۔ اتنی بے شرم تو نہیں ہو تم۔"

جھلّا کے میں نے کہا "یار' چونچیں بعد میں لڑانا۔"

غالب نے مسکرا کے نازو کو دیکھا "کیوں' ٹھیک ہے نازو؟ سکندر کی بات کو ٹالا تو نہیں جا سکتا۔ بعد میں چونچیں لڑائیں گے۔"

"تم اپنی چونچ بند کرتے ہو یا نہیں!" نازو اسے پکڑنے کے لیے لپکی مگر وہ بھاگ گیا۔ اس ہنگامے سے پہلے ہی رابعہ اور کاجل اٹھ گئی تھیں۔ وہ رابعہ کے پاس بڑے مؤدبانہ انداز میں جا بیٹھا۔ نازو کی پیش قدمی خود بخود رک گئی۔

اب میں نے آواز آہستہ رکھتے ہوئے کیپٹن حمید سے ہونے والی تمام گفتگو سب کے سامنے دُہرائی۔ وائرلیس ریسیور اس وقت آف تھا۔

کاجل نے یہ ذمّے داری قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ "مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے۔ ایسا نہ ہو کہ میری وجہ سے تمہارا سارا پلان فیل ہو جائے۔"

میں نے رابعہ کی طرف دیکھا۔ اس نے اقرار میں سر ہلایا۔

"ابھی تک مجھے کیپٹن حمید کے پیش کردہ منصوبے میں کسی خامی کا احساس نہیں ہوا۔ اگر ہر کام اس کے مطابق ٹھیک وقت پر ہوتا رہا تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوں۔" میں نے کہا۔

"میں بہت سی وجوہات گنوا سکتا ہوں۔" غالب نے کہا۔

میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا "گنواؤ۔"

"کیا یہ ناممکن ہے کہ حمید کو ریوالور چھپانے میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑے؟ اس کی بھی بہت سی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ریوالور جھٹکوں سے راستے ہی میں گر جائے یا خراب ہو جائے' عین وقت پر فائر نہ کرے۔ یا ہم سے پہلے ہی کوئی اس کی موجودگی کا پتا چلا لے۔ یا وہ خبیث بنگالی' رابعہ کو اجازت ہی نہ دے اترنے کی۔ رابعہ کی جگہ نازو کو رکھو۔"

"اس سے یہ وجوہات ختم ہو جائیں گی؟" میں نے کہا۔

"کم ہو جائیں گی۔ وہ مومنہ ہے بقول کیپٹن حمید۔ ریوالور نہ ملا یا گولی نہ چلی تب بھی اس کے ہاتھ پیر تو چلیں گے۔" غالب نے کہا۔

رابعہ کا چہرہ ذرا سی دیر کے لیے اترا "ہاں یہ تو ہے۔"

میں نے کہا "نہیں۔ ہم ایک فیصد ناکامی کے اسباب کو ننانوے فیصد کامیابی کے خیال پر ترجیح نہیں دے سکتے۔ رابعہ ہی کرے گی یہ کام۔ کیپٹن حمید نے کہا تھا کہ وہ پکا بندوبست کرتا ہے۔ ریوالور کے گر جانے' کسی کی نظر میں آنے یا کام نہ کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"چلو فرض کر لو کہ ہمارا یہ آپریشن کامیاب ہو گیا' جسے ہم کوئی بھی موزوں نام دے سکتے ہیں۔ آپریشن کال آف دی نیچر۔" غالب

نے کہا۔

سب کے ہونٹوں پر ہنسی آگئی "اچھا نام ہے۔" میں نے کہا۔

"اس کے بعد کیا ہوگا واپسی؟"

"ظاہر ہے" میں نے کہا "اب تم پوچھو گے کیسے؟"

"نہیں۔ یہ احمقانہ سوال ہے۔ نازو کرے گی۔"

نازو نے اسے قہر آلود نظروں سے گھورا "مجھے معلوم ہے' ہم اسی ٹرک میں لوٹیں گے۔ ہمارے قبضے میں آٹومٹک فوجی رائفلیں ہوں گی اور جسم پر فوجی وردیاں۔ اس چوکی پر ہمیں روکنے کی کوشش کوئی نہیں کرے گا۔ جب ہم سیدھے گزرتے چلے جائیں گے تو انہیں ہوش آئے گا کہ معاملہ کچھ اور ہے۔ پھر وہ تعاقب میں دوڑیں گے لیکن ہم سب کو بھون کے رکھ دیں گے۔ اس سے پہلے کہ مزید کمک آئے اور دشمن زیادہ قوت کے ساتھ دوسری کوشش کرے' ہم سرحد پار کرچکے ہوں گے۔ سرحد یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔"

میں نے بے اختیار تالی بجا کے کہا "اس وقت تو تم نے ثابت کردیا ہے کہ عورت کو ناقص العقل سمجھنے والا خود عقل نہیں رکھتا۔ کیا مکمل منصوبہ بیان کیا ہے۔ بالکل وہی جو میرے ذہن میں تھا۔ جی تو چاہتا ہے کہ ذہانت کے اس مظاہرے پر تمہارا .... خیر چھوڑو"

نازو کا رنگ لال ہوگیا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ نامکمل جملے کا باقی حصہ کیا ہوگا۔ "منہ چوم لوں"۔ یہی کہنا باقی رہ گیا تھا جو محاورے کی رو سے غلط نہ ہوتا مگر اس سے بڑی خانہ جنگی پھیل جاتی۔ رابعہ الگ ناراض ہوتی۔ غالب ہنگامہ کرتا اور نازو شور مچاتی۔ اب بات ہنسی میں ٹل گئی۔

رابعہ نے کہا "بس ڈر گئے؟"

"آگے بول کے تو دیکھے۔ ابھی ایم آر ایس قیادت سے محروم ہوجائے گی۔ نیا لیڈر آجائے گا۔" غالب نے آستین چڑھائی۔

"بابا' میں نے کچھ کہا ہے؟ میں تو کہنا چاہتا تھا کہ تمہارا نام چاند بی بی اور رضیہ سلطانہ کو ملا کے سی بی آر سلطانہ رکھ دوں۔ بہادری' حسن اور ذہانت کا مرکب اور بالکل الٹرا ماڈرن نام۔" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "رکھ دو' مجھے کیا۔ سینٹرل بورڈ آف ریونیو سلطانہ کہیں گے لوگ۔ سی بی آر اسی کا مخفف ہے۔"

سونے کا وقت نہیں رہا تھا۔ ہنسی مذاق میں کاجل شریک نہیں تھی۔ وہ گم صم بیٹھی تھی اور کبھی مسکرا دیتی تھی لیکن اسے نہ چھیڑنا ہی بہتر تھا۔ کسی خوابیدہ آتش فشاں کی طرح اس کے وجود میں جذبات کا خاکستر کردینے والا لاوا پک رہا تھا۔ اس کے غم کا مداوا کسی کے پاس نہیں تھا۔ زخم تازہ تھے اور ابھی اس نے ہماری طرح رنج کا خوگر ہونا نہیں سیکھا تھا۔ اس کا علاج وقت کرسکتا تھا اور یہ سفاک مسیحا! ہمارے قبضے میں نہ تھا۔ وہ سوچوں اور یادوں میں گم ہوجاتی تھی تو اس کا چہرہ تاریک نظر آتا تھا۔ اسے اپنے ساتھ ہونے والے جبر کا خیال آتا تھا تو اس کی آنکھوں کی ویرانی بڑھ جاتی تھی اور اسے معلوم بھی نہیں ہوتا تھا کہ کب آنسو ٹپک گئے۔ وہ نظر بچا کے آنسو پونچھ لیتی تھی اور ہماری کسی بات پر مسکرانے لگتی تھی۔ اس کی ساری توجہ سوئے ہوئے کلیم اللہ پر تھی۔ وہ بار بار محبت سے اس کے سر پر' بالوں میں ہاتھ پھیرتی تھی اور اسے تھپکنے لگتی تھی۔ ایک بار مجھے یہ خیال بھی آیا کہ پاکستان پہنچنے کے بعد جب آخر کار ہم کلیم کو اس کے آبائی گاؤں لے جائیں گے اور اس کی پھوپی کے حوالے کریں گے تو کاجل اچانک ان جذباتی رشتوں سے کیسے لاتعلق ہوگی جو زیادہ سے زیادہ استوار ہوتے جارہے تھے۔

شام کو غالباً کیپٹن حمید کی مہربانی سے چائے ارسال کی گئی۔ فوجی میس کی ریڈی میڈ چائے تو ہم کئی بار پی چکے تھے۔ یہ باقاعدہ چائے تھی' یعنی چینی الگ اور دودھ الگ۔ اس کے ساتھ دو بڑی پلیٹوں میں اخروٹ کی گری تھی جس نے چائے کے ساتھ بڑا مزہ دیا۔ یہ قدرت کا تحفہ اس علاقے میں بہ افراط تھا۔

ٹھیک پونے چھ بجے بنگالی نائب صوبیدار بڑے کروفر کے ساتھ نمودار ہوا اور اس نے ہمیں حکم دیا "ایک لائن میں ہوجاؤ اور اپنے ہاتھ اٹھالو۔"

غالب نے کہا "کون سا ہاتھ' دایاں یا بایاں؟"

اس نے خونی نظروں سے غالب کو دیکھا "دونوں۔"

میں نے کہا "وہ لائن کہاں ہے جس پر ہمیں چلنا ہے؟ ایک لائن پر کوئی گاڑی چلتی ہے؟"

اس نے چیخ کے مجھے گالی دی "یو بلڈی ڈاگ۔ سن آف اے جوکر۔ کیا تم چاہتے ہو کہ....."

مگر اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی میں نے ایک جست لگا کے اسے دبوچ لیا "پھر گالی دی تو تمہاری زبان حلق سے کھینچ کے نکال لوں گا اور اسے پکا کے تمہارے اس بلڈاگ افسر کو کھلادوں گا۔ سمجھے؟"

میرے چھوڑتے ہی وہ چلانے لگا۔ پلک جھپکتے میں چھ فوجی اندر آگئے اور انہوں نے سنگین کی نوک پر ہمیں دھکیل کر ایک قطار میں کردیا۔ ہمیں جنگی قیدیوں کی طرح کیمپ سے باہر لایا گیا۔ نائب صوبیدار اس صدمے سے سنبھل گیا تھا جو اسے چند لمحے میری گرفت میں ذلت کی موت کا تصور کرنے سے ہوا تھا۔ وہ اندر سے زخم خوردہ سانپ ہوگیا تھا مگر ملٹری کے قواعد و ضوابط کے باعث وہ سب کے سامنے مجھے ڈسنے سے قاصر تھا۔ اس کے ذہن میں اگر ہم سب کو "حادثاتی موت" کے نتیجے میں راہیٔ ملک عدم کرنے کا خیال تھا تو اب یہ خیال مجھے ایک عبرت اذیت اور عذاب ناک موت دینے کا فیصلہ بن گیا ہوگا۔

جب تلاشی شروع ہوئی تو میں نے چلانا شروع کیا "کہاں ہے وہ حرامزادہ؟ تمہارا کمانڈنگ افسر۔ جج کی اولاد۔ کس نے اختیار دیا ہے تمہیں کہ تم ہماری یوں تذلیل کرو؟ ہمارے پاسپورٹ کہاں ہیں؟ تم ان کو ضبط نہیں کرسکتے۔ بہت جلد تم سب کو معلوم ہوجائے گا کہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔ تم سب کی وردیاں نہ اتروادیں میں نے تو....."

ظاہر ہے ان دھمکیوں کا کسی پر کیا اثر ہوتا۔ ہم چاروں طرف سے بندوقوں کی زد میں تھے اور تلاشی کا عمل جاری تھا۔ پہلے میری جیب میں سے ایک چمچہ برآمد ہوا جو نائب صوبیدار کو دکھایا گیا۔ پھر غالب کی جیب میں سے ایک پڑیا برآمد ہوئی جس میں چینی تھی۔

"یہ کیا ہے؟" صوبیدار نے چینی کو غور سے دیکھا۔

"پوٹاشیم سائنائیڈ۔ بہترین زہر ہوتا ہے کتے مارنے کے لئے۔ میں تمہیں دینا چاہتا تھا۔" غالب نے کہا "ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟ کھالو۔"

کیپٹن حمید کا کہیں پتا نہ تھا لیکن وہ کہیں سے ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔ جب خواتین کی تلاشی کا مرحلہ آیا تو میں اور غالب بپھر گئے۔

"کوئی ہاتھ تو لگا کے دیکھے میری بیوی کو۔" غالب نے کہا "آج تک میں نے اسے ہاتھ نہیں لگایا۔"

وہ سب دانت نکالنے لگے۔ خود نائب صوبیدار مسکرانے لگا۔

"میرا مطلب تھا.... ہاتھ نہیں اٹھایا۔" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "از روئے قانون لیڈی پولیس سرچ ہی یہ کام کرسکتی ہے۔"

"ایسی کی تیسی تمہارے قانون کی۔" نائب صوبیدار دہاڑا۔

میں نے چیخ کر کہا "تم مسلمان ہو؟ بے غیرت! یہ سوچو' کل یہی ہندو تمہاری ماں بہن کے ساتھ کیا کریں گے۔"

نائب صوبیدار غصے میں ہونٹ کاٹنے لگا۔ اچانک' خلافِ توقع اس نے عورتوں کی تلاشی لینے کا حکم منسوخ کردیا "ان کے ہاتھ کمر کے پیچھے مضبوطی سے باندھو۔ ایک ہی رسّی سے۔"

میں نے پھر احتجاج کیا "یہ کس کے حکم پر ہورہا ہے؟"

اس نے قریب آکے میرے منہ پر زناٹے دار تھپڑ رسید کیا۔ "میرے حکم پر۔ اور آگے بہت کچھ میرے حکم پر ہوگا۔"

اسی وقت کیپٹن حمید سامنے آگیا "یہ کیا ہورہا ہے؟ صوبیدار! میں نے قیدی تمہاری تحویل میں اس لیے نہیں دیے ہیں کہ تم ان پر تشدد کرو۔"

صوبیدار نے پلٹ کر دیکھا "پھر کیا یہ قیدی تشدد کریں گے مجھ پر؟ تم نے ان کا رویّہ دیکھا ہے؟ اس نے حملہ کیا تھا مجھ پر۔ اس نے عورتوں کی تلاشی پر اعتراض کیا میں نے مان لیا۔ مگر کیا میں ان کے ہاتھ بھی نہ باندھوں؟"

کیپٹن حمید نے کہا "اس کا اختیار ہے تمہیں۔"

میں نے کہا "اختیار کی ناجائز اولاد۔ میں بتاؤں گا تمہیں کہ میرے اختیار میں کیا تھا۔ یہاں اس بندوق کی طاقت سے تم مجھے ڈرا سکتے ہو۔ بعد میں....."

"آئی ڈیم کیئر کہ بعد میں کیا ہوتا ہے۔ تم مجھے پھانسی نہیں لگوا سکتے' یہ مجھے معلوم ہے۔" کیپٹن حمید نے کہا اور پلٹ کے چلا گیا۔

نائب صوبیدار کے پاس اب مکمل اختیارات تھے کہ وہ ہمارے ساتھ جیسا چاہے سلوک کرے۔ اس نے کاجل' رابعہ اور نازو کے ہاتھ اتنی سختی سے بندھوائے کہ رسّی ان کی کلائیوں میں گڑ گئی۔ اس نے کلیم کو بھی نہیں بخشا۔ وہ بہت لمبی اور مضبوط رسّی تھی' جس میں سب باری باری باندھے گئے اور یکے بعد دیگرے ٹرک پر سوار کیے گئے۔ مجھے اور غالب کو آگے رکھا گیا تھا۔ اس کے بعد خواتین تھیں اور کلیم تھا۔ آخر میں خود کار ہتھیاروں سے لیس چار سپاہی چڑھے۔ دو ایک طرف بیٹھ گئے اور دو نے دوسری طرف پوزیشن سنبھال لی۔ وہ اتنے مستعد تھے کہ لگتا تھا' گولی چلانے کا اشارہ پانے کے منتظر ہیں۔ یہ بہت خطرناک بات تھی کیونکہ ناہموار پہاڑی راستے پر کسی جھٹکے سے ٹریگر پر انگلی کا دباؤ بڑھ جاتا تو ہم میں سے کوئی بے سبب مارا جاتا۔

نائب صوبیدار کے بیٹھتے ہی ٹرک روانہ ہوگیا۔ ہم سب نے حسبِ توفیق سب کو گالیاں دینے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ جابر کو' اس کے حرامی بھائی کو' ہمیں اسیر کرنے والوں کو' تقدیر کو اور زمانے کو۔ ان سب کے نزدیک یہ اُن کتوں کے بھونکنے کا شور تھا جو کاٹ نہیں سکتے تھے۔ ہر مجرم احتجاج کرتا ہے مگر اس سے قانون کے لمبے ہاتھ کمزور نہیں ہوتے۔

میں اور غالب ٹرک کے کیبن کی پشت کا سہارا لیے فرش پر بیٹھے تھے۔ زنجیر کی اگلی کڑی نازو تھی' پھر رابعہ' کاجل اور کلیم تھے۔ میں عادت کے مطابق کلائی پر نظر ڈالتا تھا مگر انہوں نے گھڑی تک اتار لی تھی چنانچہ میں وقت کا صرف اندازہ کرسکتا تھا اور وہ بھی گزرتے ہوئے سنگ میل دیکھ کر۔ میرا رخ سڑک کی جانب تھا مگر ہر سنگ میل مجھے اس وقت نظر آتا تھا جب ٹرک سو گز آگے نکل جاتا تھا۔

غالب آہستہ آہستہ میرے کان میں کہہ رہا تھا "یہ دوسرا' یہ تیسرا' یہ چوتھا۔"

میں نے کہا "سنگ میل مجھے بھی نظر آرہے ہیں۔ اگر ماہ و سال کے حساب سے اپنی اولاد شمار کررہے ہو تو چار کافی ہیں۔"

نازو نے لال پیلی ہو کے کہا "تم اپنی فکر کرو سکندرِ اعظم۔"

میں نے مسکینی سے کہا "خاتون' غالب کے بچوں کی تعداد سے آپ کا بھی کوئی تعلق ہے؟ سوری..... اس کا سسر تو بھوت ہے۔"

"خالص بھوت ہے؟" غالب نے سر ہلایا "اب کہیں تم اپنے ابّا کا ذکر مت لے آنا بیچ میں۔"

رابعہ نے کہا "چھوڑو نازو' ان کے منہ مت لگو۔"

"آخر کب تک نہیں لگوگی۔ بکرے کی ماں..."

"مرزا بکرے ..... نو میل ہوگئے۔" میں نے کہا "تیار ہو جاؤ بکرے کی ماں۔ سوری۔ وہ غالب نے کہا تھا تو میری زبان پر بھی آگیا۔ میرا مطلب تھا محترمہ نازلی بیگم۔"

ٹرک نے موڑ کاٹا اور ایک دم اس کے ٹائر سے ہوا نکلنے کی آواز آنے لگی۔ میں نے مسکرا کے غالب سے کہا "مبارک ہو۔"

"کیا مبارک ہو؟ بکرے کی ماں؟" غالب نے کہا "وہ کب تک خیر منائے گی۔"

ایک محافظ نے جو ہماری گفتگو سن کے سمجھنے کی بے سود کوشش میں مصروف تھا، جھک کر نیچے دیکھنے لگا "رکو۔ بکرا پھس ہوگیا۔ ہوا نکل گئی۔"

میں نے بھی چلّا کے کہا "بکرا پُھس ہوگیا۔ غضب ہوگیا۔"

ایک دم سب کو ہنسی آئی تو خفت سے سپاہی کا برا حال ہوگیا۔ وہ بکرا بکرا سنتے ہوئے ٹائر کو بکرا کہہ گیا تھا۔ ہماری ہنسی ان سب کو مشتعل کر رہی تھی لیکن وہ خون کے گھونٹ پی کر برداشت کرنے پر مجبور تھے۔

ٹرک رک گیا۔ فلیٹ ہونے والا ٹائر بائیں ہاتھ پر تھا، یعنی پہاڑ کی طرف۔ ٹرک اسی طرف جھکا ہوا تھا۔ ڈرائیور نے نیچے اتر کے ٹائر کا معائنہ کیا اور اس کی رپورٹ نائب صوبیدار کو دی۔

اسی وقت نازو نے پیٹ پکڑ کے چلّانا شروع کیا۔

ایک فوجی نے کہا "کیا ہوا ہے اسے؟"

میں نے کہا "جو ہر صبح ہوتا ہے۔ آج یہ باتھ روم نہیں گئی تھی۔"

غالب نے کہا "اس کو نیچے اتارو ورنہ....."

"ورنہ کیا.؟" وہ غرایا۔

"سارا ٹرک گندہ ہو جائے گا۔ تم بھی بیٹھے رہو گے اسی میں رات بھر۔"

یہ دھمکی کام کر گئی۔ فوجی اتر کے نائب صوبیدار کے پاس گیا اور اسے دوسری رپورٹ دی۔ اس وقفے میں ڈرائیور نے جیک نکال لیا تھا اور نیچے جھک کر اسے کہیں فٹ کر رہا تھا۔ نائب صوبیدار اتر کے نیچے آیا۔

"یہ کیا بدمعاشی ہے؟" اس نے کہا۔

"یہ بدمعاشی ہے تو کیا تم نہیں کرتے؟" غالب نے اور میں نے بڑی مشکل سے ہنسی ضبط کی "تمہارے گھر میں..."

"اچھا اچھا۔ بکواس بند کرو۔" نائب صوبیدار بولا۔

اس نے نازو کو ٹرک سے اتارنے کا حکم دیا۔ وہ پہلے بھی متعدد مواقع پر اپنی اداکاری کے جوہر دکھا چکی تھی۔ اس وقت بھی نازو نے نائب صوبیدار کو قائل کر لیا۔ آپریشن کال آف دی نیچر شروع ہو چکا تھا۔ ہم سب ایک ہی رسّی سے بندھے ہوئے تھے مگر ایک ناز کو اتارنے کے لیے اس لڑی میں پروئے ہوئے سب دانوں کو نیچے نہیں اتارا جا سکتا تھا چنانچہ انہوں نے پہلے کلیم اور کاجل کو کھولا پھر رابعہ کو کھول کے انہوں نے نازو کو الگ کیا اور باقی سب کو پھر باندھ کے اسے نیچے اتار دیا۔

نائب صوبیدار نے کہا "ادھر، ادھر کہاں جاتی ہے؟"

نازو نے چلّا کے کہا "کیا سڑک پر بیٹھ جاؤں؟"

بے بس اور مجبور نائب صوبیدار نے کہا "تو کیا پہاڑ پر جائے گی۔"

نازو نے کہا "اس ٹرک کے پیچھے۔"

"اچھا۔ مگر دیکھ، میں گولی مار دوں گا اگر کوئی چالاکی ہوئی۔ بھاگنے کی کوشش مت کرنا، میں دیکھ رہا ہوں۔"

جتنا شور نازو نے کیا، اس سے زیادہ ہم نے کیا۔ غالب نے تو خاصی اشتعال انگیزی کی کہ کیا تمہارے اپنے گھر میں یہی دستور ہے؟ خواتین باتھ روم جاتی ہیں تو حضرات دیکھتے ہیں؟ نائب صوبیدار پریشان ہوگیا۔

نازو نے کہا "بھاگ کے میں کہاں جاؤں گی؟ ادھر پہاڑ ہے، آگے پیچھے سڑک ہے۔ دونوں طرف توپیں لگا دو۔"

نائب صوبیدار نے یہی کیا۔ وہ خود ہٹ گیا مگر اس نے سڑک پر دس قدم دور ایک سپاہی کو کھڑا کر دیا اور اسی طرح پیچھے۔ ان دونوں کو حکم تھا کہ اپنی نگاہ سڑک پر رکھیں۔ ڈرائیور جیک پر ٹرک کو اٹھا چکا تھا اور پہیئے کے نٹ بھی کھول چکا تھا۔ اس نے فلیٹ ہو جانے والا ٹائر ایک طرف رکھا ہم سب سانس روکے ایک ایک لمحہ شمار کرتے رہے۔ ہم سب کے اعصاب پر ایک ہی سوال کا دباؤ تھا۔ کیا نازو کامیاب ہو جائے گی؟ یا عین وقت پر کوئی اسے دیکھ لے گا؟ ابھی اندھیرا زیادہ گہرا نہیں ہوا تھا۔ مغرب کی جانب کہیں سورج غروب ہونے والا تھا مگر ٹرک پر پہاڑوں کا تاریک سایہ پھیل چکا تھا۔

ڈرائیور نے دوسرا ٹائر فٹ کیا اور نٹ بولٹ کسنے لگا۔ اب یہ مشکل سے چند سیکنڈ کی بات رہ گئی تھی۔ زیادہ سے زیادہ ایک منٹ۔ نازو کو ٹرک کے نیچے گھسے ہوئے دس منٹ ہونے والے تھے۔

نائب صوبیدار کا اضطراب بھی بڑھ رہا تھا "جلدی کر بھئی ٹرک ....." ابھی جملہ پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ پہلا فائر ہوا اور ٹرک ڈرائیور ایک کربناک چیخ مار کے سڑک پر گر گیا۔ دوسرے لمحے میں نے نازو کی آواز سنی۔

"خبردار! ہاتھ مت ہلانا۔ گولی مار دوں گی سر میں۔ کوئی نہ ہلے اپنی جگہ سے ورنہ تمہارا یہ نائب صوبیدار مارا جائے گا۔ چلو ہاتھ اوپر اٹھا لو۔ آہستہ، بہت آہستہ۔ اب گھوم جاؤ۔ آہستہ۔ تیزی مت دکھاؤ۔ اب حکم دو اپنے ماتحتوں کو، ہتھیار ڈال دیں۔ جلدی کرو سُور کے بچے!"

نائب صوبیدار چلّایا۔ غالباً نازو نے اس کے ہاتھ مار دیا تھا۔ اس نے کراہتے ہوئے حکم جاری کیا "تم سب اندھے ہو، پاگل ہو، کچھ نہیں دیکھا کسی نے۔ ایک لڑکی نے بے وقوف بنا دیا، آنکھوں میں دُھول جھونک دی۔ تم نے خاک تلاشی لی تھی۔"

"بک بک کرنے کو نہیں کہا تھا میں نے۔" نازو نے اس کے دوسرا ہاتھ مارا۔

وہ پھر بلبلایا "ارے میں مر جاؤں گا تب کچھ کرو گے۔ اترو ....." اس نے گالیاں دینی شروع کیں۔

ایک ایک کر کے فوجیوں نے اپنی آٹومیٹک رائفلیں نیچے رکھ دیں اور نازو کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ٹرک کے پیچھے قطار میں الٹے لیٹتے گئے۔ ان میں سے ایک نے حاضر دماغ اور بہادر ہونے کا ثبوت دینا چاہا اور اپنے ہاتھ میں آ جانے والا پتھر اچانک نازو پر کھینچ مارا۔ اس کا نشانہ خطا گیا۔ عجلت اور بدحواسی میں یہی ہو سکتا تھا مگر نازو نے اسے ایک موقع اور دیا۔

"کھڑے ہو جاؤ۔ دوسرا پتھر اٹھاؤ۔ اٹھاؤ۔" اس نے دہاڑ کے کہا اور گولی چلا دی۔ نائب صوبیدار نے عین اسی وقت نازو کی کلائی پکڑلی اور ریوالور پر ہاتھ مارا۔ مگر وہ نازو ہی کیا جو دشمن کی طرف سے بے خبر ہو کے مار کھا جاتی۔ یہ سب ہماری نظروں کے سامنے ہو رہا تھا، بالکل کسی فلم کے سین کی طرح۔ ابھی تک ہمیں خیال نہیں آیا تھا کہ ٹرک سے اتر جائیں۔

نازو نے پلک جھپکتے میں جمعدار کے لات رسید کی۔ گردن پکڑ کے اسے آگے کھینچا اور اوپر اٹھا کے پہاڑ پر دے مارا۔ وہ تھوڑا سا اٹھا اور پھر لڑھکتا ہوا اپنے ماتحتوں کی قطار پر گرا۔ یہ میں نے ٹرک کی سائیڈ کی جھری سے جھانک کر دیکھا۔

"اب تم یہ پتھر مجھے مارو۔ اچھی طرح نشانہ لے کر۔ اگر پتھر مجھے لگ گیا، کہیں بھی چھو گیا تو میں تم کو چھوڑ دوں گی ورنہ میری گولی تم کو نشانہ بنا لے گی۔ میرا نشانہ کبھی خطا نہیں ہوتا۔ یہ سب دیکھ لیں گے۔ چلو جلدی کرو۔ دس تک گنوں گی میں۔ ایک ..... دو ..... تین۔"

گنتی چار تک پہنچی تھی کہ پتھر نازو کو چھوئے بغیر گزرا۔ بڑی پُھرتی سے نازو نے خود کو بچایا اور اس کے ساتھ ہی فائر کیا۔ فضا ایک اور چیخ سے مرتعش ہوگئی۔ نازو نے پہلا شکار دم توڑ چکا تھا۔ نائب صوبیدار بالکل لاش کی طرح بے حس و حرکت پڑا تھا۔ یہ تیسرا شخص، نائب صوبیدار کے قدموں میں تڑپ رہا تھا۔ اب باقی بچ جانے والے تین فوجی شاید کال آف دی نیچر کا جواب دے چکے تھے۔

نازو کے حکم پر جب ایک اٹھا اور ہماری رسیاں کھولنے آیا تو اس کی پتلون تر تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے اور وہ زیرِ لب نہ جانے کیا بڑبڑا رہا تھا۔ اس کے لیے یہ سب کسی بھیانک خواب سے کم نہ تھا۔ زندگی میں اس نے فرشتۂ اجل کا زنانہ روپ پہلے کہاں دیکھا ہوگا۔

آپریشن کال آف دی نیچر کا دوسرا مرحلہ بھی کامیابی سے ہمکنار ہو چکا تھا۔ میں نے نیچے اترتے ہی ڈرائیور کی لاش کو گھسیٹ کر نیچے نشیب کی جانب لڑھکایا کیونکہ سڑک کی طرف سے کسی گاڑی کی آمدورفت متوقع تھی۔ باقی سب ٹرک کے پیچھے تھے اور انہیں کوئی دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔

اگلے دس منٹ میں ہم نے دوسری لاش کو بھی کھائی میں پھینکا۔ نائب صوبیدار کی وردی اتاری اور اسے باندھ کے ٹرک میں ڈالا۔ یہ وردی غالب کو بھی چھوٹی تھی مگر ٹرک میں آگے بیٹھ کر وہ بالکل نائب صوبیدار نظر آنے لگا تھا۔ دو فوجیوں کا ہم نے کریا کرم کر دیا تھا۔ ان کی خون آلود وردیاں ویسے بھی ہمارے کام کی نہیں رہی تھیں۔ ایک فوجی میرے قدوقامت کا تھا۔ اس کی وردی میں نے چڑھا لی۔ باقی دو وردیوں کو رابعہ اور نازو نے پہنا اور کاجل کے بارے میں فیصلہ کیا گیا کہ وہ چھپ کر بیٹھے اور جب ضرورت پیش آئے تو ٹرک میں لیٹ جائے۔

ہم سب نے وردیاں انہی کپڑوں پر چڑھا لی تھیں جو ہم نے پہن رکھے تھے چنانچہ نائب صوبیدار اور باقی تین فوجیوں کے پاس لباسِ قدرت کے سوا کچھ نہ بچا تھا۔ نائب صوبیدار ابھی تک ہوش سے بیگانہ تھا مگر دوسرے فوجی شرم سے پانی پانی ہو رہے تھے اور عرقِ انفعال میں ڈوب کے مر جانا چاہتے تھے۔ ان کی عقل کو ایک لڑکی نے مات دے دی تھی۔ پھر ان کی مردانگی دھری رہ گئی تھی اور ان کے لمبے چوڑے ڈیل ڈول کے باوجود ایک دھان پان سی لڑکی نے

انہیں دُھن کے رکھ دیا تھا۔ اور اب انتہا یہ تھی کہ دست و پابستہ قیدیوں نے خود کو آزاد اور انہیں اسیر کرکے ان کے کپڑے تک اتروا لیے تھے اور اتنی بے عزتی کے بعد بھی وہ زندہ تھے۔

باری باری ان سب کو میں نے ٹرک میں سوار کیا اور اسی رسّی سے غالب نے انہیں بنڈل بنایا جس سے ہم بندھے پڑے تھے۔ انہوں نے تعاون کے بے مثل جذبے کا مظاہرہ کیا اور ہمارے ہر حکم کی تعمیل کی۔ غالب نے انہیں لیٹ جانے کو کہا تو وہ لیٹ گئے۔ غالب نے کپڑا ٹھونسنے کے لیے ان کو منہ کھولنے کی ہدایت کی تو انہوں نے فوراً منہ کھول دیے۔ غالب نے ان پر ایک چادر ڈال کے انہیں خاموش پڑے رہنے کی تاکید کی تو انہوں نے فوراً سر ہلا دیا۔

میں نے فلیٹ ہو جانے والے ٹائر کو اس کی جگہ پر فٹ کیا اور ڈرائیونگ کے لیے آگے جا بیٹھا۔ ایک ریوالور نائب صوبیدار کے پاس سے برآمد ہوا تھا' وہ رابعہ نے اپنے پاس رکھا اور میرے ساتھ بیٹھنے لگی۔

میں نے اسے ڈانٹا "آگے افسر لوگ بیٹھیں گے۔ تم سپاہی ہو۔"

رابعہ نے کہا "وہ۔۔۔ دراصل نازو نے کہا تھا مجھ سے۔"

"نازو نہیں' نائب صوبیدار صاحب۔" میں نے کہا۔

"اس کا خیال تھا کہ وہ اور غالب پیچھے قیدیوں سے بہتر طور پر نمٹ لیں گے۔۔۔"

"خاک نمٹ لیں گے۔ وہ آپس میں لڑتے رہیں گے اور دشمن اس خانہ جنگی سے فائدہ اٹھالے گا۔" میں نے کہا۔

"ان کا دل نہیں لگتا ایک دوسرے کے بغیر۔"

"نہ یہ دل لگانے کی جگہ ہے نہ موقع ہے۔" میں نے کہا "جو کام نازو کر سکتی ہے وہ تم بھی کر سکتی ہو۔"

"نہیں۔ تم جانتے ہو کہ ایسا نہیں ہے۔" رابعہ نے کہا "میرا اور اس کا کیا مقابلہ۔"

"تم طنز کر رہی ہو یا احساسِ کمتری کا اظہار؟ دونوں صورتوں میں یہ غلط ہے۔"

"یہ حقیقت ہے۔ میں صرف گولی چلا سکتی ہوں۔"

"گولی ہی چلانی ہے تمہیں' کوئی توپ نہیں۔" میں نے کہا۔

"اچھا پھر میں پیچھے جاتی ہوں۔" رابعہ نے کہا۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ میرے رویّے سے کچھ آزردہ ہے۔ اس نے مجھے احساس دلانے کی کوشش کی تھی کہ نازو کے پیچھے رہنے کی ایک اور بھی وجہ ہے مگر اس وجہ کو میں نے درخورِ اعتنا نہیں سمجھا تھا۔

"اے لڑکی!" میں نے کہا "اِدھر بیٹھو' ہمارے ساتھ۔"

"کیوں' اب کیا ہو گیا؟"

"ہمارا موڈ اچانک رومانٹک ہو گیا ہے۔" میں نے کہا۔

رابعہ ہنسی اور میرے ساتھ بیٹھنے کے لیے اوپر چڑھ گئی۔ میں نے اسے ہاتھ پکڑ کے کھینچ لیا۔ پیچھے غالب نے نائب صوبیدار صاحب کی اسپیشل پیکنگ کی تھی اور انہیں بھی چادر کے نیچے ڈال دیا تھا۔ ٹرک کے آخری کنارے پر وہ نازو کے سامنے خود کار رائفل لے کر بیٹھ گیا تھا۔ کاجل اور حلیم کے لیے دو خالی بینچوں پر بہت جگہ تھی اور وہ آرام سے سیدھے لیٹ گئے تھے۔

میں نے سر نکال کے کہا "اوئے کلینز دے پُتر! چلاں کہ نا؟"

غالب نے عین کلینز کی طرح جواب دیا "چلو نا استاد جی۔ آل رائٹ ڈبری ٹائٹ۔ سب ٹھیک ہے۔"

آدھے گھنٹے بعد ٹرک پھر روانہ ہوا۔ مجھے واپسی کے لیے یوٹرن لینا تھا اور یہاں اتنی جگہ ہی نہ تھی۔ مزید ایک میل کے بعد مجھے موقع ملا تو میں نے ٹرک کو آگے پیچھے کیا اور تھوڑا تھوڑا کرکے اس کا رخ بدلنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ خاصی مہارت اور محنت کا کام تھا۔ دوبار ٹرک تھوڑا سا آگے بڑھا تو عین کھائی کے کنارے تک پہنچ گیا۔ اور خوف سے رابعہ کا بُرا حال ہو گیا۔ اس کا خیال تھا کہ اگلے دو پہیے کھائی میں اتر کے معلق ہو چکے ہیں لیکن مجھے اندازہ تھا کہ ابھی ایک فٹ کا فاصلہ ہے تاہم یہ فاصلہ بہت کم تھا۔ ٹرک کے وزن سے کنارا ٹوٹ جاتا تو ٹرک کو نیچے جانے سے روکنا ناممکن ہو جاتا اور ہزاروں فٹ کے نشیب تک پہنچتے پہنچتے نہ ہم بچتے' نہ ٹرک کا کوئی پُرزہ سلامت ملتا۔

جب آخر کار ٹرک واپس اسی سڑک پر روانہ ہوا تو میں نے بھی سکون کا سانس لیا "تم اتنا ڈرتی ہو؟ افسوس! فلمی شاعر فرماتا ہے کہ ساتھ جئیں گے ساتھ مریں گے۔۔۔"

رابعہ ہنسی "ذرا اپنا حال دیکھو' پسینے پسینے ہو رہے ہو۔"

میں نے کہا "میری جگہ فلمی شاعر ہوتا تو کچھ اور فرماتا۔ شاید بغیر فرمائے ہی خوف سے مر جاتا۔ یہ بتاؤ تم نے کسی فلم میں ایسا سین دیکھا ہے کبھی؟"

"کیسا سین؟"

"یہی کہ ہیرو فوجی وردی میں ہے اور ہیروئن بھی اور وہ جنگل یا پہاڑ سے گزرتے ہوئے دوگانا گا رہے ہوں۔ ساتھی ہے خوب صورت' موسم بہت حسیں ہے۔" میں نے گانا شروع کیا۔

رابعہ ہنسنے لگی "خدا کے لیے بس کرو۔ میں ویسے ہی مان لیتی ہوں کہ تم گا سکتے ہو۔ آشیانوں میں لوٹنے والے پرندے کیا کہیں گے!"

"کیا کہیں گے؟" میں نے سخت برا مان کے کہا۔

"یہی کہ جنگل میں یہ نیا جانور کہاں سے آگیا۔ ایسی ڈراؤنی آواز والا۔"

پیچھے سے غالب نے چلاّ کے کہا "استاد جی' خیر ہے نا' رو کیوں رہے ہو؟ گھر والی مار رہی ہے کیا؟"

میں نے رونی آواز بنا کے کہا "ہاں کھوتے کلینز۔ یہ تیری گھر والی نے اس کو بھی غلط راستے پر ڈال دیا ہے۔"

"کوئی بات نہیں استاد جی' ہماری طرح تم بھی سیدھے ہو جاؤ گے۔" غالب بولا۔

رابعہ نے کہا "مجھے اب بھی یقین نہیں کہ ہم وطن واپس جانے کے لیے آزادی حاصل کرلیں گے۔"

میں نے علامہ اقبال کا ایک مصرعہ پڑھا "یقیں پیدا کر لے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے" اور اسے دوسرے مصرعے سے جوڑ دیا۔ "قریب ہے شبِ غم کی سحر اداس نہ ہو۔"

رابعہ مسکرائی "ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آخری وقت میں کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔"

اب میں نے غالب کی زبان میں کہا "ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا۔"

"معلوم ہے' میں نے یہاں آنے سے پہلے ایک منّت مانی تھی۔" وہ بولی۔

میں نے کہا "اچھا! کیا منّت مانی تھی؟"

"میں نے داتا صاحب سے وعدہ کیا تھا کہ واپس آکے سو دیگ چاول غریبوں میں تقسیم کروں گی۔ تمہارے ساتھ جا کے۔"

"بہت اچھا کیا تھا۔" میں نے کہا "چاول کا مطلب ہو گا پلاؤ' تو رائتہ میری طرف سے اور سویٹ ڈش کے طور پر زردہ۔"

"تم مذاق اُڑا رہے ہو نا میرا؟"

"میری کیا مجال۔ میں تو پتنگ تک نہیں اُڑا سکتا' جو ہر بچہ اُڑا سکتا ہے۔" میں نے کہا "کیا تم سنگ میل دیکھ رہی ہو؟"

"ہاں۔ سات گزر چکے ہیں۔"

ٹرک چلاتے ہوئے میں بہت محتاط تھا۔ مجھے پہاڑوں کے پُرپیچ اور تنگ راستوں پر بھاری گاڑی چلانے کا کوئی تجربہ نہ تھا اور اندھیرے میں یہ کام زیادہ مشکل ہو گیا تھا۔ ہیڈ لائٹس بھی کمزور تھیں اور زیادہ سے زیادہ بیس گز تک راستے کو روشن کرتی تھیں۔ جہاں موڑ آتا تھا وہاں کچھ پتا نہیں چلتا تھا کہ دوسری طرف سڑک بلندی کی جانب رواں ہو گی یا نشیب کی طرف مائل ہو گی۔ رات کے سناٹے میں جنگلی جانوروں کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں اور اندھیرے نے پورے منظر کو اس طرح نگل لیا تھا کہ مجھے اپنے اطراف ایک سیاہ زمین اور آسمان کی چادر پھیلی نظر آتی تھی جس میں درخت' پہاڑ سب روپوش تھے۔ اوپر آسمان پر بھی نہ چاند تھا اور نہ ستارے۔ بادلوں کے پَرے جو شام تک سُرمئی تھے' اب کالے ہو گئے تھے اور مجھے سب سے زیادہ خوف بارش کا تھا۔ بارش کے بعد پہاڑی راستے زیادہ خطرناک ہو جاتے ہیں۔ سڑک پر ٹائروں کی گرفت بہت کم رہ جاتی ہے اور بریک بھی صحیح طور پر کام نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ وِنڈ اسکرین کے دُھندلا جانے اور ہیڈ لائٹس کے اجالے میں کمی کے باعث حدِّ نگاہ بھی آٹھ دس گز سے زیادہ نہیں ہوتی۔

جب چوکی سے پہلے آنے والا سنگِ میل بھی گزر گیا تو میں نے ذرا سی دیر کے لیے ٹرک کو روکا' اس کے ہینڈ بریک کھینچے اور پیچھے جا کے غالب سے ایکشن پلان پر آخری بار مشورہ کیا۔

"میرا خیال ہے کہ ہیڈ لائٹس آف کر دو۔" غالب نے کہا۔

"تمہارا دماغ خراب ہے۔ اندھیرے میں ٹرک نیچے اتر جائے گا اور ہم سب اوپر چلے جائیں گے۔" میں نے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔

"ہیڈ لائٹ انہیں پہلے سے خبردار کردے گی کہ کوئی گاڑی آرہی ہے۔"

میں نے کہا "وہ ہیڈ لائٹ کے بغیر بھی فوجی گاڑی کے انجن کی آواز پہچان سکتے ہیں۔ اس خاموشی میں' ایک فرلانگ دُور سے بھی۔"

"بس تو پھر چلو۔ وہ فوجی گاڑی سمجھ کے شاید ہمارا راستہ نہ روکیں۔" غالب بولا۔

"راستہ تو نہیں روکیں گے مگر ہمارے سیدھا گزرتے ہی انہیں شک ہو جائے گا لیکن تم انہیں پہلے فائر کرنے کا موقع مت دینا۔ تمہیں معلوم ہے کہ چوکی پر گارڈ کہاں کھڑے ہوتے ہیں؟"

"فکر مت کرو' میں سب کو اُڑا دوں گا۔"

نازو نے کہا "ایک گاڑی بھی ہر وقت موجود رہتی ہے۔ اسے میں ختم کردوں گی۔"

"رائٹ۔ اس کے بعد میں ٹرک کو بھگا دوں گا۔ جتنی رفتار سے بھی ممکن ہوا۔" میں نے کہا۔

نازو نے کہا "دو چار میل کے بعد ہم ٹرک چھوڑ کیوں نہ دیں؟"

غالب نے کہا "اور خود پیدل ہو جائیں تاکہ وہ آسانی سے ہمارا پیچھا کرکے ہمیں پکڑ لیں۔"

"نہیں۔ ٹرک کو نشیب کی جانب روانہ کردیں تاکہ وہ سمجھیں' ہم سب فرار کی کوشش میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔"

میں نے کہا "بات تمہاری بھی غلط نہیں ہے مگر یہ دیکھو کہ ٹرک سے محروم ہو کے ہم رات بھر میں کتنی دور جائیں گے۔ ان راستوں پر پیدل چلنا بہت دشوار کام ہے۔ صبح تک ہم دس بارہ میل دور بھی نہیں جا پائیں گے۔ صبح انہیں معلوم ہو جائے گا کہ ٹرک میں ہماری لاشیں نہیں ہیں تو وہ پھر ہمارے تعاقب میں آئیں گے اور یہاں ہمارے لیے پناہ نہیں ہے۔ نہ ہم پہاڑ پر چڑھ کے چھپے رہ سکتے ہیں اور نہ وادی میں اتر کے۔"

غالب نے کہا "ہمیں تو یہ بھی نہیں معلوم کہ سرحد کتنی دور ہے۔"

"سرحد زیادہ دور نہیں ہو سکتی۔" نازو نے یقین سے کہا۔

"بہتر ہے کہ ہم رات بھر میں بنگلہ دیش کی سرحد سے جتنا دور جا سکتے ہیں چلے جائیں۔" میں نے کہا "اگر تعاقب میں کوئی گاڑی آئے گی تو اس سے بھی تمہیں ہی نمٹنا ہو گا۔"

اچانک وادی کی طرف سے ایک زبردست دھاڑ سنائی دی اور نازو نے زنانہ عادت کے مطابق ایک چیخ مارنا ضروری سمجھا "شیر!"

غالب نے بگڑ کے کہا "شیر نے تمہیں کھا تو نہیں لیا ہے جو اتنا چلاّ رہی ہو۔ اس علاقے میں شیر چیتے سب ملتے ہیں۔"

نازو نے خفت سے کہا "وہ تو معلوم ہے مجھے..."

میں نے کہا "ڈرو نہیں۔ شیر جنگل میں اتنا ہی بے ضرر ہوتا ہے جتنی لومڑی۔ جب تک وہ بھوکا نہ ہو یا آدم خور نہ بن گیا ہو۔"

غالب نے کہا "ویسے تو یہ شیر کے ڈنر کا وقت ہے، بھوکا ہی ہوگا۔ وہ آدم خور ہے یا نہیں' اس کا پتا تو تب ہی چلے گا جب وہ نازو کو کھا کے ڈکار لے گا۔"

"مجھے کیوں' تمہیں پہلے کھائے گا۔ تم پر چڑھا ہوا ہے گوشت' مجھ میں ہڈیاں ہی ہڈیاں ہیں۔"

"یہ بھی شیر کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ کس کو ترجیح دیتا ہے۔ کیا پتا وہ سویٹ ڈش کے طور پر تمہیں نوش فرمالے۔ یو آر سو سویٹ!"

میں نے کہا "اب میں اسٹارٹ لیتا ہوں۔ ریڈی؟"

"ایک دم ریڈی باس۔" غالب نے کہا۔

ٹرک پھر روانہ ہوا تو میں نے رفتار معمول کے مطابق رکھی۔ آہستہ آہستہ فوجی چوکی کی لائٹ نظر آنے لگی۔ کسی نے ٹارچ کی روشنی چمکائی مگر ہیڈ لائٹس کے مقابلے میں ٹارچ بے مصرف تھی۔ میں نے بہت قریب پہنچ کے دو افراد کو دیکھا جو بندوقیں تھامے بالکل مطمئن کھڑے ہوئے تھے۔ ایک جیپ ان سے کچھ فاصلے پر موجود تھی۔

عین اس وقت جب انہوں نے ٹرک کو راستہ دینے کے لیے بیریئر اٹھایا' میں نے ایکسیلریٹر دبا دیا۔ ٹرک کا انجن گرجا اور رفتار ایک دم بڑھی۔ اس کے ساتھ ہی خود کار رائفلوں کے مسلسل فائر ہوئے۔ میں پیچھے کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا مگر مجھے یقین تھا کہ غالب اور نازو نے آسانی سے دونوں محافظوں اور جیپ کو نشانہ بنا لیا ہوگا۔ انہیں جوابی فائر کرنے کی مہلت بھی نہیں ملی۔

ایک راؤنڈ کے بعد فائرنگ بند ہوگئی۔ میں نے ٹرک کی رفتار اور بڑھا دی۔ اب میری ساری توجہ سڑک پر تھی۔ بھاری بھرکم' دیوہیکل ٹرک چالیس کی رفتار پر بھاگ رہا تھا جو ان راستوں پر انتہائی خطرناک رفتار تھی۔ میری نظر نے ایک ایک میل کی مسافت کو ایک گھنٹے میں طے ہوتا محسوس کیا۔

اچانک مجھے بیک ویو مرر میں دور روشنی کے نقطے نظر آئے۔ یہ تعاقب کرنے والے ہی ہوسکتے تھے۔ اپنے سامنے مجھے اندھیرے میں ایک مدھم سی روشنی دکھائی دے رہی تھی جو میرے خیال میں اگلی سرحدی چوکی ہوسکتی تھی۔ میں نے اس کے بارے میں غالب سے کوئی بات نہیں کی تھی مگر مجھے امید تھی کہ وہ ان پر فائر کرنے کی حماقت نہیں کرے گا۔ دوسرے ملک میں داخل ہوتے ہی اس ملک کے سرحدی محافظوں کو مار دینا نئی دشمنی کے آغاز کے مترادف ہوتا اور اب ہم کسی دشمنی کے متحمل نہیں ہوسکتے تھے۔ ہمارے پیچھے بھی دشمن تھے چنانچہ آگے ہمیں دوستوں کی ضرورت تھی۔

تعاقب کرنے والے تیزی سے قریب آرہے تھے۔ میں روشنی کے نقطوں کو ہر لمحہ بڑھتا محسوس کررہا تھا۔ اب غیر ارادی طور پر میرا پاؤں ایکسیلریٹر کو دباتا جارہا تھا۔ سامنے والی روشنی قریب آگئی۔ میں نے سڑک کے بیچ میں دو افراد کو دیکھا جو ہمیں رکنے کا اشارہ کررہے تھے۔ میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر وہی کیا جو میں چاہتا تھا کہ غالب نہ کرے۔ ایک لمحے نے میرے خیال کو بدل دیا۔ میں نے سوچا کہ اگر میں رک گیا تو پیچھے آنے والے بھی پہنچ جائیں گے اور وہ سرحدی محافظوں کو یقین دلا دیں گے کہ ہم بھگوڑے ہیں اور ان کا فوجی ٹرک لے کر فرار ہورہے ہیں۔ ہمارے ساتھ نائب صوبیدار سمیت چار فوجی قیدی بھی تھے جو ہمارے خلاف گواہ بن جاتے۔

میں نے رابعہ سے کہا "فائر" اور ٹرک کو سیدھا نکال کرلے گیا۔ رابعہ نے ایک گولی چلائی۔ ایک شخص چلایا۔ دوسرے نے بڑی کوشش کی کہ کود کر الگ ہوجائے مگر ٹرک کے بھاری پہیے اس کو پیستے ہوئے گزر گئے۔ پھر پیچھے سے غالب یا نازو نے پورا راؤنڈ چلا دیا۔

"اوہ مائی گاڈ!" میں نے سر پر ہاتھ مارا "یہ کیا کردیا انہوں نے؟"

رابعہ نے کہا "اور کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ وہ پہنچ جاتے تو ہمیں واپس لے جاتے۔"

"کیسے لے جاتے؟ ہمارے پاس ویزا ہے۔ زبردستی ایک ملک سے کسی کو یوں نہیں لے جایا جاسکتا۔ ہم انڈین ہیں' بنگلہ دیش کی پولیس ہمیں تیسرے ملک میں پکڑنے کے لیے داخل نہیں ہوسکتی۔"

"مگر یہاں تو صرف سرحد ہے' قانون کہاں ہے۔" رابعہ نے کہا "یہاں جنگل کا قانون چلتا ہے۔"

اس نے ٹھیک کہا تھا۔ ہمارے تعاقب میں آنے والی بنگلہ دیشی فوجی گاڑی سرحد کی پروا کیے بغیر تیزی سے آگے آرہی تھی۔ ویسے بھی ان کو روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ جو تھے انہیں خود ہم نے مار دیا تھا۔

رات کے سکوت کو تیسری بار مسلسل فائرنگ نے ختم کردیا مگر اس بار گولیاں دونوں طرف سے چل رہی تھیں۔ اچانک ٹرک لڑکھڑانے لگا۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات پندرھویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں

جاسوسی ڈائجسٹ کا منفرد و مقبول سلسلہ
شکاری
پندرہواں حصہ
SMITH & WESSON

نئی سوچ، نیا رنگ، نیا لہجہ، نیا آہنگ
احمد اقبال کے شہر بہار و شبنم فشاں قلم سے

معاشرے کے اُن ناسوروں کی
روداد جو گوشت و پوست سے گزر کر
انسانی ہڈیوں میں اُتر رہے تھے۔ ایک کفن بردوش
نوجوان کی کہانی جس کے شب و روز موت
کی بستی میں گزر رہے تھے جلتے دن
سُلگتی راتیں، آس و یاس، خوف و
ہراس، تلخ حقیقتیں
شیریں خواب

میں نے کہا "رابعہ! ٹرک کا ٹائر برسٹ ہو گیا ہے۔"

"پھر کیا ہوا؟" اس نے عقب نما آئینے میں دیکھا "ایک ٹائر نہ سہی، تین پر چلو۔"

"یہ ٹرک ہے، ٹرائی سائیکل نہیں" میں نے ٹرک کی رفتار کم کی اور اسے سیدھا سڑک پر چلانے کی جدوجہد کرتا رہا۔ ٹرک ایک جانب سے جھک گیا تھا۔ اس کا سارا بوجھ بھی جھکاؤ کی طرف منتقل ہو گیا تھا اور میں اسٹیئرنگ کو بائیں جانب کاٹ کے نہ پکڑتا تو ٹرک دائیں طرف کی کھائی میں اتر جاتا۔

"یہ بتاؤ اب کوئی پیچھے ہے؟" میں نے چلّا کے کہا۔

رابعہ نے بیک ویو مرر کو قریب سے دیکھا "نظر تو کوئی نہیں آتا۔"

"جو ٹرک ہمارا پیچھا کر رہا تھا، اس کی ہیڈ لائٹس تو نظر آ رہی ہوں گی۔"

رابعہ نے نفی میں سر ہلا دیا "یا ہیڈ لائٹس ٹوٹ گئی ہیں یا پھر ٹرک سے جان چھوٹ گئی ہے۔"

میں نے رفتار کو دس میل پر رکھا اور ایک گہری، لمبی سانس لے کر پسینہ اپنی آستین سے صاف کرنے کی کوشش کی جو میری آنکھوں میں آ رہا تھا۔

رابعہ نے اپنے دوپٹے سے میری پیشانی کو صاف کر دیا۔

میں نے اسے مسکرا کے دیکھا "تھینک یو۔ مگر تم کو ایسا کرنا نہیں چاہیے۔"

"آخر کیوں؟" اس نے بُرا مان کے کہا۔

میں نے کہا "اس سے حادثہ ہو سکتا تھا۔ اس دوپٹے میں تمہاری زلفوں کی مہک بسی ہوئی تھی جو بہت مدہوش کرنے والی تھی۔"

رابعہ مسکرانے لگی "میرا خیال ہے کہ ٹرک روک لو۔"

میں نے سر ہلایا "میں بھی اس ساڑھے تین ٹانگوں والی سواری کو قابو میں رکھنے سے تھک گیا ہوں۔"

ٹرک کو میں نے پہاڑ کے دامن میں انتہائی بائیں جانب کر کے کھڑا کر دیا۔ کسی چٹان کے گرنے سے وہاں ایک ایسا خلا نمودار ہو گیا تھا جس کی پتھریلی دیواروں میں ٹرک کو پھنسایا جا سکتا تھا۔ احتیاط برتنے کے باوجود انجن کا آگے والا حصہ چٹانوں کے نوکیلے حصوں سے ٹکرا گیا۔ رگڑ نے دونوں مڈگارڈ اُدھیڑ دیے۔ دھات کے پتھر پر رگڑنے سے ایک سمع خراش شور پیدا ہوا جو رات کے سناٹے میں زیادہ بھیانک لگا۔ کچھ پتھر ٹوٹ کے بونٹ پر گرے اور سکوتِ شب میں ان کی آواز بھی بم کے دھماکوں کی طرح گونجی۔

غالب نے ٹرک کے رکنے سے پہلے ہی چھلانگ لگا دی تھی، "اگر ہم سڑک پر سیدھے چلتے جاتے تو کیا تھا؟"

"ہم سیدھے نہیں جا سکتے۔"

"ہم اس پہاڑ میں سے بھی تو نہیں گزر سکتے" غالب نے کہا۔

"کوشش کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا؟" نازو نے تنگ جگہ میں پھنسے ہوئے ٹرک کو ملاحظہ فرما کے کہا "ذرا رفتار بڑھا کے اور نعرۂ تکبیر لگا کے کوشش کرتے تو شاید سرنگ بناتے ہوئے پہاڑ کی دوسری جانب نکل جاتے۔ اچھا شارٹ کٹ تھا۔"

"شارٹ کٹ ٹو ہیون میڈ ایزی" غالب بولا۔

میں نے کہا "ہمارے پیچھے لگ جانے والے شکاری کتے کہاں گئے؟"

"جہاں بالآخر انہیں جانا تھا" غالب نے ہاتھ جھاڑ کے کہا۔ "سیدھے جہنم میں۔ تم تو جانتے ہو میرا نشانہ خطا نہیں جاتا۔"

نازو نے کہا "تو کیا میرا نشانہ خطا ہوتا ہے؟"

"تمہارے تیرِ نظر کا نشانہ خطا نہیں ہوا تھا' میں مانتا ہوں۔ مگر اس وقت ہم بات کر رہے ہیں اصلی ریوالور اور بندوق کی گولی کی۔ میں نے کیا غضب کا نشانہ لیا تھا۔ وہ جو ٹرک ڈرائیور تھا نا' اس کی دائیں آنکھ کا۔ حالانکہ آنکھ چہرے پر تھی اور چہرہ ونڈ اسکرین کے پیچھے اندھیرے میں تھا....."

رابعہ ہنسی "ٹرک تو بہت پیچھے تھا۔"

نازو نے کہا "اور ڈرائیور کانا تھا پہلے سے۔ اس کی دائیں آنکھ تھی ہی نہیں۔"

"یہ تم نے کیسے دیکھ لیا؟" غالب خفا ہونے لگا۔

"جیسے تم نے دیکھا تھا۔"

"میں تو الّو ہوں" غالب نے جھلّا کے کہا۔

"پھر میں چمگادڑ ہوں" نازو ہارماننے والی نہیں تھی۔

میں نے ہاتھوں پیروں کو ورزش کے انداز میں جھٹکا اور ایک انگڑائی لے کر خوابیدہ پہاڑوں اور جنگلوں کی سرد' لطیف ہوا میں لمبا گہرا سانس لیا "میرے تو ہاتھ پاؤں سُن ہو رہے تھے۔"

"ابھی سارا جسم اکڑ جائے گا۔ اتنا پسینہ آرہا تھا اور جناب کچھ پہنے بغیر نکل آئے ہیں اتنی سردی میں" رابعہ نے بالکل کسی محبت کرنے والی بیوی کی طرح میری بے پروائی پر مجھے ڈانٹا۔

"کیا!" میں نے منہ کھول کے کہا "کچھ پہنے بغیر؟ یار غالب! مُڑ کے دیکھ ذرا' کیا میرے جسم پر کچھ نہیں ہے؟"

غالب نے بدمعاشی سے کہا "نظر ایکسرے کرنے والی ہو تو پھر بقول شاعر۔ قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا..... والی بات ہو جاتی ہے۔"

رابعہ نے ٹرک میں سے جرسی نکال کے مجھے دی "ڈبل نمونیہ ہو گیا تو بھول جاؤ گے سب شوخی۔"

میں نے جرسی پہن لی "میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں نہیں بھولوں گا۔"

غالب نے پیچھے کی خالی سڑک کے اندھیرے کو دیکھا "ایسا لگتا ہے کہ ہم دشمنوں کے نرغے سے نکل آئے ہیں۔ ہمارے تعاقب میں کوئی ہوتا تو اتنی دیر میں آجاتا۔"

میں نے کہا "ہاں۔ وہ رکنے پر آمادہ ہی نہ تھے۔ سرحد کی پروا کیے بغیر ہمارا پیچھا کر رہے تھے۔ میرا خیال ہے ان کا ٹرک کھڈ میں گر گیا ہو گا۔"

نازو بولی "ان کے لیے بھی راستہ تو ہم نے ہی صاف کر دیا تھا۔"

"ورنہ وہ کون سے رک جاتے" میں نے کہا "خیر..... جو ہوا اچھا نہیں ہوا۔ کوئی زندہ نہیں بچا ہو گا ان میں سے۔"

"تمہیں کیوں افسوس ہو رہا ہے؟" غالب بولا۔

"میں سرحدی چوکی کے محافظوں کی بات کر رہا تھا۔ وہ خواہ مخواہ سب مارے گئے۔" میں نے کہا "یہ بات زیادہ سے زیادہ صبح ہونے تک چھپی رہ سکتی ہے۔"

غالب نے نفی میں سر ہلایا "ہمیں کیا معلوم کہ سب مارے گئے یا کوئی بچ گیا۔ عام طور پر ایک شخص چوکی میں وائرلیس سیٹ پر بیٹھا رہتا ہے۔ کانوں پر ہیڈ فون چڑھائے۔ اس کا رابطہ دوسری سرحدی چوکیوں سے اور مرکزی کمان سے رہتا ہے۔"

"ایسا ہوا تو اب تک آگے اطلاع پہنچ گئی ہو گی ہماری تشریف آوری کی اور اگلی چوکی پر ہمارے استقبال کی تیاری مکمل ہو گی۔"

رابعہ نے پریشانی سے کہا "پھر پکڑے جائیں گے ہم؟"

"انشاء اللہ۔ یعنی اللہ نے چاہا تو" غالب بولا "پکڑے تو ہم اکثر جاتے ہیں۔ اب تک تمہیں بھی عادی ہو جانا چاہیے۔"

"مگر یہاں پہنچ کے؟ آزادی کی منزل کے اتنا قریب آ کے؟"

غالب نے کہا "منزل بڑا دھوکا دینے والا لفظ ہے خاتون۔ چوہا اس روٹی کے ٹکڑے کو منزل سمجھ لیتا ہے جو چوہے دان میں لگایا جاتا ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ اس کی منزل موت ہے۔ منزل کا سراب....."

میں نے کہا "لاحول ولا قوۃ۔ کیا یہ فلسفہ جھاڑنے کا وقت ہے مرزا؟ یہ بتاؤ اب کیا کریں۔"

"کیا کریں؟ ٹرک کا ٹائر بدلیں اور روانہ ہو جائیں" نازو نے کہا۔

"یہ تمہاری ناقص العقلی کی دلیل ہے کہ تم سے رائے نہیں مانگی گئی اور تم دے رہی ہو" غالب نے کہا "اور وہ بھی ہمیشہ کی طرح غلط۔"

نازو نے بگڑ کے کہا "پھر کیا اسی لنگڑے ٹرک کو لے جائیں گے ہم؟ ٹائر بدلے بغیر۔"

میں نے کہا "ہم ٹرک کو نہیں لے جائیں گے۔ یہ چوری کا ٹرک ہے۔ ہم اس کا سراغ تک مٹا دیں گے۔"

رابعہ نے کہا "پھر کھٹمنڈو کیسے جائیں گے؟"

"سواریاں زیادہ ہیں' اس لیے ایک پر نہیں دو تانگوں پر جائیں گے۔" میں نے کہا "کاجل کہاں ہے؟ وہ اتری نہیں۔"

"وہ بچے کو گود میں لیے بیٹھی ہے۔ وہ سو رہا ہے کاجل کی گود میں سر رکھ کے" نازو نے کہا۔

"یہ کاجل تو ممتا کے سارے خزانے نچھاور کر دے گی اس پر اور بعد میں روئے گی۔" غالب نے افسوس سے کہا "جب اسے چھوڑ کے آنا پڑے گا۔ کلیم تو ماں کو بھول گیا ہے۔"

میں نے کہا "جا کے اسے کہو کہ ٹرک خراب ہو گیا ہے۔ ضروری سامان اٹھا لو اور چلنے کی تیاری کرو۔"

رابعہ اور نازو کے جاتے ہی میں نے اور غالب نے بڑی مہارت کے ساتھ سائنٹیفک بنیادوں پر اس ٹرک کا حشر نشر کیا۔ میں نے اس کی سب تاریں نکال کے نیچے پھینک دیں۔ اسپارک پلگ توڑ دیے اور ڈسٹری بیوٹر کیپ توڑ دی۔ غالب نے چاروں پہیوں کے نٹ بولٹ کھول لیے اور سیکڑوں فٹ گہرے کھڈ میں اچھال دیے۔ کار ہوتی یا جیپ تو ہم اسے دھکیل کر نیچے لڑھکا دیتے مگر ٹرک بہت بھاری تھا۔ ہم سب مل کے اسے ایک انچ نہیں ہلا سکتے تھے۔ اس لیے بھی کہ ایک ٹائر فلیٹ تھا اور اس لیے بھی کہ ٹرک چٹانوں میں پھنسا ہوا تھا۔ ہم اسے آگ لگاتے تو شعلے دور بیٹھے دشمنوں کو متوجہ کرتے اور ہماری نشاندہی کر دیتے۔ اب ٹرک اپاہج اور ناکارہ ہو گیا تھا۔ تار لگانے کے بعد بھی کوئی پہیوں کی طرف دھیان دیے بغیر اسے چلانے کی کوشش کرتا تو پہیے آزاد ہو کے اپنی راہ لیتے اور ٹرک کی باڈی وہیں دھری رہ جاتی۔ میں نے گھڑی دیکھی تو مجھے حیرت ہوئی۔ رات کے دس بجنے والے تھے مگر یہاں ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے آدھی رات گزر چکی ہے۔ ہم شہر کے رہنے والے رونق اور چہل پہل سے بھی وقت کا حساب لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کوئی ایسی جگہ رہتا ہو جہاں رات کے بارہ بجے تک چہل پہل' روشنی اور گہما گہمی کم نہ ہوتی ہو تو سنسان بازار اور گلیاں دیکھ کر اسے لگتا ہے کہ رات کے دو بجے ہوں گے' خواہ اس وقت نو بجے ہوں۔ گاؤں والے سرِ شام سونے کے عادی ہوتے ہیں اور وہاں نو بجے ہُو کا وہی عالم ہوتا ہے جو لاہور کی مال پر رات دو بجے بھی نہیں ہوتا۔ یہاں تو نہ آدمی تھا نہ آدم زاد۔ سنسان پہاڑوں میں رات کا اندھیرا اور سکوت جیسے منجمد ہو گئے تھے۔ کبھی کبھی خاموشی کو بھیڑیے یا گیدڑ کے چلّانے کی آواز مجروح کر دیتی تھی۔ سردیوں میں گیدڑوں کا چلّانا ایک عام سی بات ہے مگر اس وقت ہم سب کو خوف نے مفلوج کر دیا جب قریب ہی سے کوئی شیر دہاڑا۔ شیر نیچے وادی میں تھا مگر اس کی دہاڑ سے پیدا ہونے والی گونج کی بازگشت چاروں طرف پھیلے ہوئے پہاڑوں کی پتھریلی دیواروں سے ٹکرائی تو کچھ اور بھیانک ہو گئی۔

کاجل ابھی کلیم کے ساتھ ٹرک سے اتری ہی تھی۔ اس نے سب سے پہلے چیخ ماری اور کلیم کو کھینچنے لگی "اوپر چڑھو اوپر۔"

نازو نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "شیر....." اور رابعہ سے لپٹ گئی۔

رابعہ خود کون سی بہادر تھی۔ اس نے بدحواسی میں کہا "شیر..... یہ اصلی شیر کی آواز ہے۔"

میں نے متانت سے کہا "آواز سے کچھ پتا نہیں چلتا کہ شیر اصلی ہے یا نقلی۔"

غالب نے میری تائید کی "کیا پتا کوئی لومڑی خواہ مخواہ دہشت پھیلا رہی ہو شیر کی آواز بنا کے۔ بہت مکار چیز ہے لومڑی۔ عورت سے بھی زیادہ۔"

رابعہ نے اپنے ساتھ نازو کو بھی کھینچ لیا "یہاں کھڑے رہنا ٹھیک نہیں۔ ٹرک پر چڑھ جاتے ہیں۔"

"ہاں۔ کیا پتا شیر آدم خور ہو" نازو نے کہا اور رابعہ کے ساتھ پھر ٹرک میں گھس کے بیٹھ گئی۔

"اب آپ زیادہ بہادر نہ بنیں" رابعہ نے کھڑکی سے سر نکال کے کہا "شیر کے آنے سے پہلے اندر آجائیں۔"

غالب نے کہا "پہلے یہ تو دیکھ لیں کہ شیر آدم خور ہے یا نہیں۔"

"یہ کیسے دیکھو گے تم؟" نازو بولی۔

میں نے کہا "اگر اس نے مجھے کھایا تو غالب دیکھ لے گا اور تمہیں بتا دے گا ورنہ میں آپ کو مطلع کروں گا۔"

"اور ہم دونوں کو کھا لیا تو ظاہر ہے آپ کو کل کا اخبار دیکھ کے پتا چل جائے گا کہ شیر واقعی آدم خور تھا" غالب بولا۔

"ہمالیہ کی ترائی میں آدم خور شیر ہوتے ہیں۔ جم کاربٹ نے لکھا ہے" کاجل نے کہا۔

"گویا یہ ہمالیہ کی ترائی ہے۔ گڈ!" میں نے سگریٹ کا کش لے کر چاروں طرف کا جائزہ لیا "واپس جا کے میں بھی کوئی کتاب لکھوں گا کہ کس طرح میرا گزر آدم خور شیروں کی بستی سے ہوا....."

"ایک سفرنامہ میں بھی رقم فرما دوں گا کہ کیسے میرا گزر کوہ قاف پر سے ہوا جہاں مجھے پریوں نے روکنے اور ورغلانے کی بہت کوشش کی مگر میں کہاں ان کے قابو میں آنے والا تھا۔" غالب نے کہا۔

میں نے ہنس کے کہا "ہاں۔ جیسے یورپی ممالک کے سفرنامے لکھنے والے سندبادی لکھتے ہیں کہ انہوں نے ایمان کی سلامتی کو عزیز جانتے ہوئے نہ کسی میم کو منہ لگایا نہ دخترِ انگور کو۔ جیسے پارسا گئے تھے ویسے ہی....."

میری بات ادھوری رہ گئی۔ رابعہ اور نازو نے یہ سمجھتے ہوئے کہ ہم سمجھنے والے نہیں ہیں' خود کو ٹرک کے کیبن میں بند کر لیا تھا۔ انہیں کچھ خفت بھی تھی کہ صرف آواز سن کے وہ شیر کی دہشت میں مبتلا ہو گئیں۔ میں اور غالب نسبتاً پُرسکون اور مطمئن تھے کیونکہ سامنے کچھ نہیں تھا۔ شیر کی آواز بہت دور سے سنائی دی تھی اور ہمارا خیال تھا کہ وہ نیچے کہیں وادی میں گھوم رہا ہو گا۔ اب یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ آواز کسی اور شیر کی تھی اور ہمارے سامنے

خاموشی سے دوسرا شیر آگیا۔ یا ہم نے آواز سن کے جو اندازہ قائم کیا تھا' وہ غلط تھا۔ پہلے تو اچانک سڑک پر اندھیرے میں دو چراغ سے روشن نظر آئے۔ جہاں پہلے رات کی سیاہ چادر میں کچھ دکھائی نہ دیتا تھا وہاں دو مدھم سی چنگاریاں دیکھتے ہی جیسے میرا دل دھڑکنا بھول گیا اور نامکمل جملہ میرے حلق میں پھنس گیا۔ ہم سے پندرہ بیس گز کے فاصلے پر عین سڑک کے بیچ میں کوئی شیر موجود تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ شیر' چیتے اور بھیڑیے کی آنکھیں اندھیرے میں روشن نظر آتی ہیں۔ شیر کا پیٹ خالی نہ ہو تو وہ کسی بھی جانور پر حملہ نہیں کرتا اور آدم خور تو شاذونادر بحالتِ مجبوری بنتا ہے مگر اس کے نام کی وہشت اچھے اچھے سورماؤں کے ہوش اڑا دیتی ہے۔

غالب نے میرے اچانک خاموش ہونے یا میری صورت کے تاثرات سے کچھ اندازہ کیا اور پلٹ کے دیکھا۔ پھر ہم دونوں بھاگے اور ٹرک کے عقبی حصے سے اندر کود گئے۔ وہاں کاجل بھی کلیم کو سینے سے لگائے بیٹھی تھی۔ اس کی سوالیہ نظروں کا جواب میں نے سرہلا کے دیا اور اپنا ریوالور نکال لیا۔

"شیر..... تو سچ مچ آگیا" غالب نے کہا "اگر یہ سچ مچ آدم خور ہوا اور سچ مچ ہمیں کھا گیا..."

میں نے بہادری سے کہا "دانے دانے پہ لکھا ہے کھانے والے کا نام۔"

"یعنی ہم میں سے کسی پر اس شیر کا نام لکھا ہوا ہے؟" غالب بولا "تم ذرا پوچھ لو شیر سے کہ وہ نام کس کا ہے۔"

"اس سے کیا ہوگا؟"

"ہم دیکھ لیں گے کہ کس دانے کو رخصت کرنا ہے۔ کم سے کم گلے مل کے تو رخصت کریں گے اسے۔ بائی دا وے' یہ شیر کتنا پڑھا ہوا ہے؟ یہ کیسے پڑھے گا کسی دانے پر اپنا نام ....؟" اس نے ریوالور کا رخ سڑک کی طرف رکھا۔

"یہ سب کچھ تم براہ راست شیر سے بھی پوچھ سکتے ہو۔"

"وہ .... سکندر بادشاہ! تم تو جانتے ہی ہو' میں کتنا بزدل آدمی ہوں" غالب نے کہا۔

شیر بڑے وقار سے چلتا نمودار ہوا اور عین ہمارے سامنے پہنچ کے رک گیا۔ کاجل کی تو گھگھی بندھ گئی تھی اور وہ کلیم سمیت فرش پر یوں اوندھی پڑی تھی جیسے لوگ بم باری کے وقت لیٹتے ہیں۔ میں اور غالب شیر کو دم سادھے دیکھتے رہے۔ جنگل کے بادشاہ سے منسوب ہلاکت آفرینی اور خون آشامی کی سب روایات' قصے اور واقعات جو ہم نے سنے اور پڑھے تھے یا فلموں میں دیکھے تھے' ذہن میں تازہ ہوگئے تھے اور جیسا کہ مشہور ہے' ہم سمرائز ہوگئے تھے۔ سرکس یا چڑیا گھر کے پالتو اور بے بس' غلام شیر کو دیکھنے کی عادت میں اب تفریح کا بھی کوئی پہلو باقی نہیں رہا تھا لیکن یہ ایک پُرخطر' پُرخوف اور سنسنی خیز تجربہ تھا جہاں ہم بے بس تھے۔ انسان کی فطری ذہانت پر ایک جانور کی حیوانی جبلت کو برتری حاصل تھی۔

ہم سے ہزار گنا جسمانی طاقت رکھنے والا شیر ایک جست لگاتا تو ہماری فائرنگ بھی اسے روک نہیں سکتی تھی۔ ریوالور کی گولی اس کی بے پناہ قوت کے مقابلے میں بہت حقیر چیز تھی۔

شیر کچھ دیر ٹرک کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کی روشن' انگارہ آنکھیں مجھے خود پر مرتکز محسوس ہوئیں۔

"خبردار! گولی مت چلانا" غالب نے سرگوشی کی۔

میں نے سرہلایا "کوئی حرکت بھی مت کرنا جو اسے مشتعل کردے۔"

خوف کی سرد لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں اتر چکی تھی مگر میرے حواس باقی تھے۔ رابعہ اور نازو کی آواز ہی بند ہوگئی تھی۔ غالباً انہیں بھی احساس تھا کہ اس وقت چیخ پکار سن کے مدد کرنے والا تو کوئی نہیں آئے گا مگر شیر کو شاید یہ ہنگامہ آرائی پسند نہ آئے۔

شیر کا بھاری بھرکم' سیاہ پیکر جاہ وجلال کی تصویر بنا سڑک کے وسط میں موجود تھا اور ابھی تک اس کے رویے سے ٹرک کی موجودگی پر برہمی کا اظہار نہیں ہوا تھا۔ وہ اس مشینی جانور کو اپنی مملکت میں دخل اندازی کی سزا دینے کے موڈ میں ہوتا تو پہلے غرا کے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار ضرور کرتا مگر وہ پُرسکون تھا۔

وہ چند منٹ ہم پر چند گھنٹوں سے زیادہ بھاری تھے۔ جب ہم شیر کو دیکھتے رہے اور وہ اپنے غرور آمیز اندازِ بے نیازی سے ہماری حالتِ زار پر غور فرماتا رہا۔ غالباً وہ ڈنر سے فارغ ہوچکا تھا اور شکم سیری کے بعد کی غنودگی کا شکار تھا یا طبعاً ایک امن پسند اور رحم دل شیر تھا۔ بالآخر اس نے حرکت کی اور چند قدم چل کے پھر رک گیا۔

"تھینک یو سر" غالب نے گہری سانس لے کر کہا "کہ آپ نے ہمیں معاف کیا۔"

"حالانکہ ہمارے ہم جنسوں نے آپ کی نسل کا خاتمہ کرنے میں بڑی سفاکی سے کام لیا" میں نے ریوالور پر اپنی گرفت ڈھیلی کردی۔

"یہ ایک شریف النفس' نیک دل اور جمہوری مزاج رکھنے والا بادشاہ تھا جو شاید اپنی رعایا کا حال معلوم کرنے کے لیے سلطنت کا دورہ کرنے نکلا ہے" غالب نے کہا "میں بھی معلوم کروں کہ دوسری طرف کیا حال ہے۔"

"دوسری طرف؟"

"ہاں۔ زنانہ ڈبے میں" غالب بولا "دنیا کا سب سے بڑا جھوٹ بھی آج سچ ثابت ہوگیا۔"

میں نے کہا "کون سا جھوٹ؟"

"جس پر جھوٹ بولنے کے عالمی مقابلے میں پہلا انعام ملا تھا کہ ایک جگہ دو بے تکلف سہیلیاں خاموش بیٹھی تھیں۔"

میں نے ہنس کے کہا "یہ خاموشی نہیں بے ہوشی ہے غالباً۔"

"میں نیچے اتر کے دیکھتا ہوں۔"

"ابھی کوئی ضرورت نہیں۔ بادشاہ سلامت سامنے کھڑے ہیں۔ اسے گستاخی نہ سمجھ لیں۔"

اسی وقت شیر نے یوں سر گھما کے دیکھا جیسے اس نے ہمارے ریمارکس نوٹ کرلیے ہوں' پھر وہ آگے بڑھ گیا۔

آگے سے نازو کی کانپتی ہوئی آواز سنائی دی "غالب' تم کہاں ہو؟"

"میں یہاں ہوں" غالب نے اس کی نقل اتاری "اور خوف سے بے ہوش پڑا ہوں۔ آکے مجھے لخلخہ سنگھاؤ۔"

شیر کے اور ہمارے درمیان اب بیس پچیس گز کا فاصلہ تھا اور وہ ایک موڑ پر کھڑا ہوا تھا۔

نازو نے کہا "شیر تو چلا گیا۔"

غالب نیچے اتر گیا "تم کہو تو پھر بلا لاؤں۔ کان سے پکڑ کے تمہاری خدمت میں حاضر کردوں۔"

"اس نے ہمیں کچھ بھی نہیں کہا" نازو بولی۔

"تمہاری دہشت ہی ایسی ہے" غالب نے کہا "میری آواز نہیں نکلی تو اس بلی کے بھتیجے کی کیا مجال....."

"بھانجے کی" نازو نے تصحیح کی "شیر کی خالہ ہوتی ہے بلی۔"

میں نے کاجل کو تسلی دے کے اٹھایا "حد ہوگئی۔ تم اتنی ڈرپوک ہو۔ شیر انسانوں سے تو زیادہ ظالم نہیں ہوتے۔"

کاجل نے سرہلایا "مجھے کلیم کی فکر تھی۔"

"مگر میں تو نہیں ڈرا تھا" کلیم نے کہا۔

"تم بہادر باپ کے بہادر بیٹے ہو نا" کاجل نے کہا۔

میں نیچے اتر کے کیبن کے دوسری جانب گیا اور دروازہ بجا کے رابعہ سے کہا "ہیلو۔"

وہ غالب کی طرف متوجہ تھی۔ میری آواز پر اچھل پڑی۔

میں نے کہا "بابا میں شیر نہیں ہوں۔"

غالب نے کہا "آدم خور تو ہو۔"

اسی وقت آسمان پر روشنی کا کوندا سا لپکا۔ پھر یہ روشنی اندھیرے میں لہرانے لگی۔

غالب نے کہا "یہ کیا ہے؟"

"کوئی گاڑی آرہی ہے۔ راستے کے نشیب وفراز سے لائٹ اوپر نیچے ہورہی ہے" میں نے کہا۔

"اس وقت ادھر کون آسکتا ہے؟"

"شکاری ہمارے تعاقب میں تھے۔ ان کے سوا کون ہوگا۔ اب تو ٹرک سے نکل کے کہیں دور جا کے چھپنے کا وقت بھی نہیں رہا" میں نے کہا۔

غالب بولا "کوئی بات نہیں۔ یہ مورچہ بھی مقابلے کے لیے برا نہیں۔"

رابعہ نے کہا "ہم سے پہلے تو ان کا مقابلہ جنگل کے بادشاہ سے ہوگا۔"

"رائٹ۔ اگر بادشاہ سلامت دُم دبا کے فرار نہ ہوئے۔"

غالب نے کہا۔

"اس شیر کو اتنا ذلیل بھی مت کرو" نازو بولی "وہ کوئی چوہا نہیں ہے تمہاری طرح۔"

"تم نے سنا سکندر؟ اس نے مجھے سرِعام چوہا کہا ہے اور وہ بھی آدھی رات کے وقت۔ ساری دنیا نے سنا ہوگا...."

غالب کا احتجاج جاری تھا کہ شیر دہاڑا۔ وہ موڑ کاٹ کے ہماری نظروں سے اوجھل ہوگیا تھا مگر پھر بھی اس کی آواز نے سب کے اوسان خطا کردیے۔ شیر کے دہاڑنے کا یہ انداز بھی مختلف تھا۔ اب وہ غصے میں گرج رہا تھا۔

میں اور غالب دوڑ کے واپس ٹرک کے پچھلے حصے میں پہنچ گئے۔ روشنی بہت قریب سے جھلک دکھا کے غائب ہوچکی تھی اور شاید اسی چندھیا دینے والی لائٹ نے شیر کو مشتعل کردیا تھا۔ میرے کان اب کسی ٹرک کے انجن کی آواز بھی سن رہے تھے۔ شیر پھر گرجا۔

"آخر ہے نا جانور۔ عقل ہوتی تو خاموشی سے گھر چلا جاتا۔" غالب نے کہا "مارا جائے گا اس اکڑفوں میں۔ ہم نے تو معاف کردیا تھا مُروت میں ورنہ....."

غالب کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی شیر کی زبردست دہاڑ کے ساتھ فائر ہوا اور پھر جیسے قیامت آگئی۔ ایک ساتھ بہت سے انسانوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں' شیر کی مسلسل گرج اور فائرنگ کے شور سے جنگل اور پہاڑ گونجنے لگے۔ کسی گاڑی کا ہارن شارٹ ہوکے ایک بھیانک چیخ بن گیا۔ فولادی ڈھانچے اور چٹانوں کے ٹکرانے کی سمع خراش آوازوں کے ساتھ ہی ہیڈلائٹس کا رخ کئی بار بدلا۔ روشنی کی عمودی لکیروں نے تاریک آسمان کا نشانہ لیا پھر گھوم کر وادی کے نشیب کی طرف گئیں اور غائب ہوگئیں۔

شیر اب بھی دہاڑ رہا تھا مگر اس کی گھن گرج میں پہلے جو غیظ وغضب تھا' وہ اب اذیت بھری فریاد میں ڈھل گیا تھا۔ میں نے چشمِ تصور سے وہ پورا منظر دیکھا جو میری آنکھوں سے اوجھل تھا۔ زخمی شیر سڑک پر دم توڑ رہا تھا اور ہمارے تعاقب میں آنے والی دوسری فوجی گاڑی اس کے حملے سے بے قابو ہوکے ہزاروں فٹ کی گہرائی میں گرتی جارہی تھی۔ اس گاڑی میں بیٹھے ہوئے افراد کے جسم بھی ٹوٹ پھوٹ گئے تھے اور گاڑی کے اجزا کی طرح بکھرتے جارہے تھے۔ وہ سب جو چند منٹ پہلے زندگی کی بھرپور توانائی کے ساتھ حوصلے اور عزم سے امید کا رشتہ قائم کیے اپنی طاقت کی برتری ثابت کرنے کے لیے بڑھتے چلے آرہے تھے اور موت کے تصور سے بھی دور تھے' اچانک زندگی سے محروم ہوگئے تھے۔ کوئی شکاری نہیں جانتا کہ سب سے زیادہ پُرفریب اور سفاک شکاری وہ اجل ہے جو لحہ لحہ زندگی کے ساتھ ہم قدم چلتی ہے اور کہیں' کسی بھی لمحے اگلے قدم سے پہلے راستہ کاٹ دیتی ہے۔

جب غالب نے کہا "او مائی گاڈ! تو میں ہی نہیں' ہم سب

چونکے۔ ہم سب کی آنکھوں کے سامنے ایک ہی بھیانک تصویر تھی جسے ہم دم سادھے' پلک جھپکائے بغیر دیکھ رہے تھے۔

وادی کی گہرائی میں ایک شعلہ سا روشن ہوا اور پھر ایک دھماکا سنائی دیا۔ میں اور غالب ٹرک سے کود کر موڑ کی جانب لپکے۔ رابعہ اور نازو نے چلا کے ہمیں روکنے کی بے سود کوشش کی۔ پھر وہ بھی ہمارے پیچھے دوڑنے لگیں۔

"غالب! سنو۔ دیکھو شیر کے قریب مت جانا۔" نازو نے چیخ کر کہا۔

رابعہ نے فوراً مجھے ٹوکا "سکندر! کیا پتا ان میں سے کوئی سڑک پر کود گیا ہو' ٹرک کے گرنے سے پہلے۔ آگے مت جاؤ۔"

لیکن میں اور غالب ان کی سنے بغیر موڑ تک جا پہنچے۔ میرا سانس پھول گیا تھا حالانکہ درمیانی فاصلہ سو گز سے بھی کم تھا لیکن یہ پہاڑی راستہ تھا جس میں ہمارے سامنے پندرہ سے بیس درجے کی چڑھائی تھی۔

موڑ کے قریب میں نے غالب کو روک لیا۔ ہم اپنے اپنے ریوالور ہاتھ میں پکڑے دوسری طرف کی آوازوں پر کان لگائے کھڑے رہے۔ رابعہ اور نازو بھی ہانپتی ہوئی ہمارے ساتھ شامل ہو گئیں۔

نازو نے بدحواسی میں ایک احمقانہ سوال کیا "کیا شیر مر گیا؟"

غالب نے اسے گھور کے دیکھا "ہاں۔ یہ اس کی روح کے کراہنے کی آواز ہے۔"

"میرا مطلب تھا.... کیا وہ مر جائے گا؟" نازو بوکھلا گئی۔

"ابھی اس کا طبی معائنہ کر کے بتاتا ہوں۔ مر گیا تو شہید کہلائے گا" غالب بولا "اب تیسرا احمقانہ سوال کیا تو اٹھا کے زخمی شیر کے سامنے ڈال دوں گا۔"

میں نے چند قدم آگے جا کے چٹان کی اوٹ سے دیکھا۔ شیر سڑک پر پڑا ہوا دم توڑ رہا تھا اور اس کے حلق سے نکلنے والی دہاڑ اب ایک پُرعذاب خرخراہٹ میں تبدیل ہو گئی تھی۔ نیچے وادی میں ایک بڑا شعلہ کسی الاؤ کی طرح بھڑک رہا تھا۔ آس پاس چند دیے بھی روشن تھے۔ یہ گاڑی کا جلتا ہوا ڈھانچہ تھا جس کے کچھ شکستہ ے ابھی جل رہے تھے۔

آہستہ آہستہ شیر خاموش ہو گیا۔ ہم سب دور سے اس کو مرتا ہوا دیکھتے رہے جو ہماری جان لینے نہیں ہماری جان بچانے کے لیے اپنی جان قربان کرنے آیا تھا۔ اسے بھی انتظامِ دستِ غیب کے سوا کچھ اور نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ہم اس سے ڈر رہے تھے جب کہ وہ فرشتۂ غیب کی طرح ہمیں دشمنوں سے نجات دلانے کے لیے آیا تھا۔ اس نے گاڑی پر حملہ کیا ہوگا۔ اس سے ڈرائیور کا بدحواس ہونا لازمی تھا۔ دوسرے لوگوں نے اسے دیر سے دیکھا ہوگا اور فائرنگ کر کے شیر کو ہلاک کرنے کی کوشش میں دیر کی ہوگی۔ شاید جست لگا کے شیر گاڑی کے بونٹ پر گرا ہوگا۔ اس کے بعد ڈرائیور کو سامنے کچھ نظر نہ آیا ہوگا۔ اس کے لیے گاڑی کے اسٹیئرنگ پر کنٹرول رکھنا بھی ناممکن ہو گیا ہوگا۔ ایک تو خوف اور دہشت کے باعث اور دوسرے شیر کے وزن کی وجہ سے جو مشتعل ہونے کے باعث مسلسل حرکت کر رہا ہوگا۔ اور ممکن ہے اس کے حملوں نے ونڈ اسکرین کو بھی توڑ دیا ہو۔ میں نے یہ سب نہیں دیکھا تھا مگر میں جانتا تھا کہ یہی ہوا ہوگا۔ میں اس حادثے کا پورا منظر اپنے تصور میں دیکھ رہا تھا۔

میں نے ایک قدم اور آگے بڑھایا تو غالب نے مجھے روک لیا' "بس۔ اور آگے مت جاؤ۔"

میں نے کہا "کیوں' اب کیا ہے؟ شیر کی لاش سے کیا ڈرنا۔"

غالب نے نفی میں سر ہلایا "دور سے ایسا ہی لگتا ہے مگر شیر ابھی مرا نہیں ہوگا۔ مرنے سے پہلے وہ آخری سانسیں لینے کے لیے اٹھے گا۔"

نازو نے اسے پیچھے کھینچا "تم اتنے قریب کیوں کھڑے ہو؟"

غالب نے خفگی سے کہا "میں قریب کھڑا ہوں' تم خود میرے قریب آ کے کھڑی ہوئی ہو۔ تم نے خود میرا بازو پکڑا اور اب خود اپنی طرف کھینچ رہی ہو' شرم تم کو مگر نہیں آتی...."

نازو نے اسے دھکا دیا "اچھا جاؤ' مرو۔ آگے جا کے شیر کی مونچھیں اکھاڑ لو۔"

غالب نے ایک پتھر اٹھایا اور شیر کی طرف پھینکا۔ پتھر بڑی آواز کے ساتھ سڑک پر گرا مگر شیر کو نہیں لگا۔

"کیا پاگل ہوئے ہو؟" نازو نے کہا۔

"شیر زندہ ہوتا تو پتھر کی آواز پر چونکتا" رابعہ نے فیصلہ دیا۔

"ابھی پتا چل جاتا ہے" غالب بولا اور اس نے دوسرا پتھر اٹھا کے شیر کو مارا' جو شیر کے سر پر لگا۔

ایک آخری زبردست دہاڑ کے ساتھ شیر نے تڑپ کر سر اٹھا اور پھر جسم کی باقی ماندہ توانائی کے ساتھ اٹھنے کی کوشش کی۔ ؟ سب پلٹ کے بھاگے۔ بھاگنے والوں کی قیادت غالب کر رہا تھا. اپنے ساتھ وہ نازو کو بھی ایسے کھینچ کر لے جا رہا تھا جیسے ٹرین کا انجن صرف ایک بوگی کو لے کر بھاگا جا رہا ہو۔ دوسرا انجن یعنی میں ا ٹریک پر رابعہ کے ساتھ دوڑ رہا تھا۔

چند قدم دوڑ کے مجھے خاموشی کا اور اس سے زیادہ اپنی بزدلی احساس ہوا۔ میں نے پلٹ کے دیکھا تو شیر وہیں پڑا ہوا تھا۔

"مبارک ہو مرزاجی! شیر مر گیا" میں نے کہا۔

غالب نے رک کر پیچھے دیکھا اور زبردستی دانت نکال کے بولا "دیکھا کیسا تاک کے نشانہ لیا تھا۔"

نازو نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا "بڑی بہادری کی۔ مرے کو مار۔ شاہ مدار...."

رابعہ نے بھی نازو کی حمایت کی "ہاں۔ پتھر مارنے کی ضرورت تھی آخر؟ وہ ویسے ہی مر جاتا۔"

"خاتون! وہ میرا پتھر لگنے سے ہلاک ہوا ہے۔ زنانہ تعصب اور حسد کی عادت کے باعث تم مجھے کریڈٹ نہ دینا چاہو تو میں تمہیں مجبور نہیں کر سکتا۔" غالب بولا "کیا تم نے دیکھا نہیں اپنی آنکھوں سے کہ اتنی گولیاں لگی تھیں مگر وہ زندہ تھا۔ میں نے بس ایک پتھر مارا اور وہ مر گیا۔"

میں نے غالب کی تائید کی "اب تم ایک سند یافتہ شکاری ہو۔ ہم سب گواہ ہیں کہ تم نے ہمالیہ کی ترائی میں ایک ببر شیر کو خالی ہاتھوں سے پتھر مار کے شکار کر لیا تھا۔ ایسا تو جم کاربٹ بھی نہیں کر پایا تھا۔ وہ بڑی توپ قسم کی رائفلیں استعمال کرتا تھا۔"

غالب انکساری سے بولا "مومن ہو تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی۔"

میں نے اس کی کمر پر ہاتھ مار کے کہا "چلو سپاہی' اب اگلے مورچے کی طرف مارچ کرو۔"

"دسمبر کے مہینے میں مارچ کیسے ہو سکتا ہے؟" غالب بولا مگر نازو کے ساتھ چل پڑا "تم دیکھنا' میں کیسی تہلکہ خیز کتاب لکھتا ہوں واپس جا کے۔ شیر کا شکار تو ہمارے آباواجداد نے خواب میں بھی نہیں کیا ہوگا حالانکہ وہ بھی شکاری تھے۔ خاندانی شکاری۔"

نازو نے جھلا کے کہا "اپنی عقل کے پیچھے لٹھ لے کر پھرتے ہوں گے۔ اسی کا شکار کرتے ہوں گے۔"

"نہیں۔ میں نے بچشم خود انہیں متعدد جانور ہلاک کرتے دیکھا تھا۔ مجال ہے جو ان کی نظر سے کوئی چھپکلی' چوہا یا کاکروچ اور مچھر بچ کے نکل جائے۔ اس سے بڑا جانور صرف بلی تھی جسے وہ شادی کی پہلی رات ہی مار چکے تھے۔ وہ جو محاورہ ہے نا 'گربہ کشتن روزِ اول۔ وہ انہی سے منسوب ہے۔"

"غالب! خدا کے لیے بند کرو یہ بک بک" نازو بولی۔

غالب نے افسوس سے سر ہلایا "تم دیکھنا' وہ کتاب کیسے دھڑا دھڑ بکے گی۔ ایسے شیر کو پتھر مار کے ہلاک کرنے والا واقعہ آج تک کوئی ہوا ہے؟ میں تھوڑی بہت رنگ آمیزی ضرور کروں گا' زیب داستاں کے لیے۔ مثلاً یہ کہ چاندنی رات تھی اور تم میرے ساتھ تھیں۔ زبردست منظر کشی ہوگی کہ کیسے تم نے شیر کی دہاڑ سنی اور ڈر کے چیخ ماری...."

اس کے ساتھ ہی غالب نے چیخ ماری کیونکہ نازو نے اسے خاموش کرنے کے لیے آخری حربے کے طور پر ایک جھٹکے سے اوپر اٹھا کے آگے اچھال دیا تھا۔ وہ میرے قریب آ کے گرا۔ میں اور رابعہ ٹرک کے پاس کھڑے غالب کی باتوں پر ہنس رہے تھے۔ اس نے ہمیں ہنسا کر ہمارے اعصاب کو خوف سے نجات دلا دی تھی اور اس حادثے کے ذہنی دباؤ کو ختم کر دیا تھا۔

غالب کپڑے جھاڑ کے اٹھا "یہ لڑکی نفسیاتی مریض ہے' کچھ قاتلانہ رجحانات رکھتی ہے' احساس کمتری کا شکار ہے اور کسی سے سچ بھی نہیں سن سکتی.... تم تو مانتے ہو نا مجھے عظیم شکاری؟"

میں نے کہا "بالکل مانتا ہوں۔ تمہاری کتاب کا دیباچہ میں ہی لکھوں گا مگر ابھی چلنے کی فکر کرو۔"

رابعہ نے کہا "ہاں۔ پہلے ہی بہت دیر ہو گئی ہے۔"

غالب نے کہا "کیا آپ کو کسی پارٹی میں وقت پر پہنچنا تھا خاتون؟ فکر نہ کریں' ایک دو گھنٹے کی تاخیر سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

رابعہ جھینپ کر مسکرانے لگی "میرا مطلب تھا کہ صبح ہو گئی تو ہمارا چھپے رہنا مشکل ہو جائے گا۔"

میں نے کہا "ہاں۔ شیر کی لاش ملتے ہی خبر دور دور تک پھیل جائے گی۔ پھر حادثے کا سراغ مل جائے گا اور ہمارا یہ ٹرک....."

غالب بولا "جسے آپ نے پہاڑ سے گزارنے کی کوشش کی تھی۔"

"کوشش کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا۔ سوئی کے ناکے سے لوگ اونٹ گزار لیتے ہیں" رابعہ بولی۔

میں نے تالی بجا کے کہا "کم آن۔ گپ شپ کے لیے وقت نہیں ہے۔ سامان اٹھاؤ اور چلو۔ یہ وردیاں اسی ٹرک میں چھوڑ دو' صرف اپنے کپڑے کافی ہیں۔"

رابعہ نے کہا "مگر یہاں تو بہت سردی ہے۔"

"میرا تو خون بھی جمنے لگا ہے" نازو نے کہا۔

"خون سفید ہو تو جلد جم جاتا ہے" غالب بولا "مگر میں خواتین کے مؤقف کی حمایت کرتا ہوں۔ اس سردی سے بچانے والی یہی گرم فوجی وردیاں تھیں۔"

میں نے کہا "یار' یہ ہمارے لیے مصیبت بن جائیں گی۔ کوئی بھی دیکھے گا تو شک میں پڑ جائے گا کہ آخر فوجی قافلہ پیدل کیوں جا رہا ہے۔ اور اس قافلے میں ایک بچہ کیوں شامل ہے۔ یہ وردیاں کسی کو بھی فٹ نہیں تھیں۔ ٹرک میں بیٹھے ہوئے تھے تو پتا نہیں چلتا تھا مگر اب ذرا ملاحظہ کرو' مس رابعہ قاری ایڈووکیٹ کو' کتنی بڑی ہے ان کی وردی۔"

غالب نے کہا "کیوں نہ یہ دونوں مل کے ایک ہی وردی پہن لیں۔ ایک تہائی نازو کو کافی ہوگی' دو تہائی میں رابعہ آ جائے گی۔"

میں نے کہا "سردی کا علاج یہ ہو سکتا ہے کہ ہم کمبل کو بکل مار کے استعمال کریں۔ چلنے سے بھی جسم میں گرمی پیدا ہوگی۔"

"پیدل چلنا بھی تو مشکل ہے" رابعہ نے رونی صورت بنا کے کہا۔

"اللہ حساب لے گا تم سے اس ظلم کا جو اس وقت ہم پر ہو رہا ہے" نازو نے کہا۔

پیدل چلنا واقعی بہت مشکل کام تھا۔ فروری کا مہینہ تھا' جب ان پہاڑوں پر درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے نیچے رہتا ہے۔ آدھی رات کے بعد سردی انتہا پر تھی۔ اندھیرے راستے پر ایک ایک قدم اٹھانا ہم سب کی قوتِ برداشت کا امتحان بن گیا۔ اس پیش

قدی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ کمبل تھا۔ رابعہ اور نازو نے تو اسے شال کی طرح اوڑھ لیا تھا اور انہیں شال کو دوپٹے کی طرح استعمال کرنا بھی آتا تھا مگر میں اور غالب بغل مار کے چلنا نہیں جانتے تھے۔ ہمارے ہاتھوں میں ضروری سامان بھی تھا۔ خاکی زین کا ایک بیگ میرے ہاتھ میں تھا۔ اس میں سارا اسلحہ اور نقد رقم تھی اور ہمارے پاسپورٹ تھے۔ دوسرا تھیلا غالب نے اٹھا رکھا تھا جس میں کھانے پینے کا سامان بھر لیا گیا تھا۔ کمبل بار بار میرے کندھوں پر سے پھسل جاتا تھا اور میں اسے ٹھیک کرتا تھا تو باہر کی یخ بستہ ہوا کا جھونکا جسم کی ساری گرمی کو کھا جاتا تھا۔ یہی حال غالب کا بھی تھا۔ کمبل کو ساتھ رکھنا مشکل تھا مگر اسے چھوڑنا زیادہ مشکل تھا۔

کاجل نے بڑی صفائی سے کلیم کو بھی اپنے ہی کمبل میں لپیٹ لیا تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنی عمر کے اعتبار سے کلیم نے ہم سب سے بڑھ کر ہمت اور قوت برداشت کا ثبوت دیا۔ نہ اس نے نیند کی شکایت کی نہ بھوک کی، نہ وہ سردی سے گھبرایا اور نہ تھکن سے۔ الٹا وہ کاجل کا حوصلہ بڑھاتا رہا اور اسے بتاتا رہا کہ سرحد کے پہاڑی علاقوں میں اس سے بھی زیادہ سردی پڑتی ہے۔

کاجل نے کہا "تمہیں کیسے معلوم؟"

"ہمارا باپ نے بتایا۔ ادھرا ہمارا سب لوگ رہتا ہے۔ ہم پٹھان لوگ کا زندگی بہت سخت ہے۔ ادھر بجلی، گیس، پانی کچھ نہیں ہوتا۔ سڑک بھی نہیں ہوتا۔ اسکول تھانہ کچھ نہیں۔"

"گاڑیاں پھر کیسے چلتی ہیں؟"

کلیم ہنسنے لگا "جب سڑک نہیں ہے تو گاڑی کہاں سے آئے گا؟ سب پیدل چلتا ہے یا گھوڑے پر۔ غریب لوگ کئی میل دور سے پانی لاتا ہے۔ ادھر اسپتال بھی نہیں ہے، علاج کا واسطے شہر جانا بہت مشکل ہوتا ہے۔"

"پھر وہاں لوگ زندہ کیسے رہتے ہیں؟" کاجل نے حیرانی سے کہا۔

"بس زندہ رہتا ہے۔ تھوڑا فصل ہوتا ہے، تھوڑا مویشی۔ اپنا مکان پتھر سے خود بناتا ہے۔"

"اور تم ایسی جگہ رہ لوگے؟ شہر سے جا کے..."

"ہاں دیدی۔ اپنا لوگ ہے ادھر، وہ بھی تو رہتا ہے" کلیم نے بڑے اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔

میں اور غالب ان کے آگے چلتے ہوئے ساری گفتگو سن رہے تھے۔ سب سے پیچھے نازو اور رابعہ تھیں اور ان کی خاموشی بتاتی تھی کہ کلیم کی باتیں انہیں بھی متاثر کر رہی ہیں۔

غالب نے کہا "کیا سوچ رہے ہو؟"

میں نے کہا "سوچ رہا ہوں کوئی معجزہ رونما ہو جائے۔ اچانک ایک گھر ملے۔ اس گھر کا میزبان دروازے پر ہمیں خوش آمدید کہنے کے لیے موجود ہو، اندر آتش دان روشن ہو اور حرارت ہو۔ میز پر چائے کی کیتلی اور پیالیاں رکھی ہوں، فضا میں چائے کی مہک ہو۔"

"کون سی چائے؟"

"کوئی سی بھی، سبز چائے یا گلابی، کشمیری ارغوانی..."

"یار، خواب تو ڈھنگ سے دیکھو۔ چائے کی جگہ کافی ہو۔ اس کے ساتھ کلب سینڈوچ۔ فضا نغمۂ ساز سے معمور ہو۔ میزبان ہوں صاحبِ خانہ کی دخترانِ مہ لقا۔ منی اسکرٹ میں اور..."

میں نے کہا "بس۔ اب تم پٹڑی سے اتر گئے ہو۔ نازو کو بتاؤں کہ تمہاری آخری خواہش کیا تھی۔ ابھی خواب اور حقیقت کا پتا چل جائے گا۔ مرزا جی، ہم لندن میں نہیں ہیں، ان پہاڑوں کی ویرانی میں سرگرداں ہیں۔"

غالب نے ایک سرد آہ بھری "ایک تو تم مجھے اپنی مرضی سے خواب تک نہیں دیکھنے دیتے۔ جو بھاری تھیلا تھا وہ مجھے پکڑا دیا ہے کیونکہ ہماری بدقسمتی ہے یا بے وقوفی کہ تم کو مشن کمانڈر بنا لیا۔"

"مشن پورا ہو چکا۔ یہ عہدہ خالی ہے۔ تم چاہو تو میری جگہ لے لو" میں نے کہا "باقی رہی تھیلے کی بات، تو یہ لو۔"

غالب نے اپنا تھیلا مجھے پکڑا دیا "جب دلّی اُجڑ گئی تو کہتے ہو تخت سنبھالو۔ پہلے بتاتے مشن کمانڈر تو میں دیکھتا۔"

"تم کیا دیکھتے؟ وہی جو ہم نے دیکھا۔"

"میں ایک گھر دیکھ رہا ہوں" غالب نے اچانک رک کے کہا "غالباً یہ سراب ہے۔ تم بتاؤ، کیا واقعی کچھ ہے گھر جیسا؟"

میں نے کہا "یہ تو میرے خواب کی تعبیر لگتی ہے۔ مرزا! یہ سراب نہیں حقیقت ہے۔ آؤ ادھر چلتے ہیں۔"

دائیں جانب درختوں کے درمیان اور چٹانوں کے بیچ میں ایک کمرے کا مکان نظر آ رہا تھا جو پتھروں کو چُن کے بنایا گیا تھا۔ مکان تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا اور تاریکی کا حصہ نظر آتا تھا۔

غالب نے کہا "اب آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔ کیا پتا میزبان واقعی دروازے پر ہمیں خوش آمدید کہے اور بڑے تپاک سے اندر لے جائے۔ یا پھر گولی مار دے۔ صورت دیکھتے ہی۔"

میں نے کہا "وہ کیوں؟"

"مجھے کیا معلوم۔ جب وہ گولی مار دے گا تو پوچھ لیں گے کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟" غالب بولا "ممکن ہے وہ کوئی خطرناک پاگل ہو یا مفرور مجرم۔ پھر وہ دوسری گولی سوال پوچھنے والے کو مار دے۔ خواب کی تعبیر بعض اوقات اُلٹی بھی ہو جاتی ہے۔"

لیکن اس وقت مجھے کوئی شک نہ رہا کہ ہر دعا کے لیے قبولیت کی ایک گھڑی ہوتی ہے اور جب میں نے ایک معجزہ رونما ہونے کی خواہش کا اظہار کیا تھا تو وہ ایسی ہی گھڑی تھی کہ میں تاج و تخت بھی مانگتا تو مل جاتا۔ ابھی ہم پتھر کے بنے ہوئے ناہموار زینوں پر چڑھ ہی رہے تھے کہ دروازہ کھٹاک سے کھلا اور ایک شخص ہاتھ میں لالٹین اٹھائے نمودار ہوا۔ اس کی آنکھوں میں حیرانی کے جذبات رفتہ رفتہ تجسس اور پھر خوف میں ڈھل گئے۔ غالباً اس نے انسانی آوازیں

سن کے دروازہ کھولا تھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ اس وقت اور اس موسم میں کون ہے جو اس سے ملنے آیا ہے مگر اپنے سامنے دو مردوں، تین حسین اور جوان عورتوں کے ساتھ ایک بچے کو دیکھ کر وہ وہم میں مبتلا ہو گیا کہ ہم انسان نہیں۔ نہ ہمارے حلئے اس علاقے کے لوگوں جیسے تھے، نہ چہرے۔ عام لوگوں کی طرح اس کا بدارواح پر عقیدہ رہا ہوگا جو ایسے ہی انسانی روپ میں نمودار ہوتی ہیں، چڑیلیں خوب صورت عورتیں بن جاتی ہیں اور آدھی رات کو بھٹکتی پھرتی ہیں۔ صرف ایک بچے کی موجودگی کے باعث یہ خیال غلط ہو رہا تھا۔

میں نے اس کے تذبذب کو دیکھ کر کہا "السلامُ علیکم، ہم مسافر ہیں اور راستہ بھٹک گئے ہیں۔"

غالب نے مجھے کہنی ماری "آداب عرض۔ دراصل ہماری گاڑی کے ساتھ ایک حادثہ پیش آ گیا تھا۔"

ہم نے ایک جیسی دوستانہ بلکہ خوشامدانہ مسکراہٹ کے ساتھ ہاتھ آگے بڑھایا تھا۔ جواب میں بوڑھا مسکرایا اور اس نے ہم دونوں سے ہاتھ ملا کے دروازہ کھول دیا۔ پھر اس نے ناقابلِ فہم زبان میں کچھ کہا جو بنگالی نہیں تھی مگر اس سے کچھ ملتی جلتی زبان تھی۔ اس وقت مسئلہ زبان کا نہیں، پناہ کا تھا۔

کمرے کی چاروں دیواریں پتھروں سے اٹھائی گئی تھیں جو ناہموار اور بے ہنگم تھے۔ اس کی چھت میں درختوں کی شاخیں اور تنے بطور شہتیر استعمال ہوئے تھے اور چھت پر سوکھے پتوں اور گھاس پھوس کی موٹی تہ تھی۔ اس کے اوپر مٹی اور گارے کی تہ میں نے صبح دیکھی۔ فرش پر خشک، لمبی لمبی گھاس کو چٹائی کی طرح بُن کے ڈال دیا گیا تھا۔ اس چٹائی کے اوپر میلے کچیلے لحاف اور بستر نظر آ رہے تھے۔ ایک لحاف میں پھنسی ہوئی بوڑھی عورت کچھ خوف زدہ ہو کے بیٹھ گئی تھی۔ دوسرے لحاف میں سے ایک نوجوان سر نکال کے ہمیں گھور رہا تھا۔ وہ چہرے کے نقوش میں بوڑھے سے مشابہ تھا۔ تیسرے لحاف میں کوئی ابھی تک روپوش تھا۔

کمرے کی فضا میں جلی ہوئی لکڑی کے دُھوئیں کی بُو تھی اور کوئلے کی گیس کا حبس تھا جس کا مکینوں کو قطعی احساس نہیں تھا مگر ہم باہر کی تازہ ہوا کے بعد اندر کی محبوس فضا میں اس فرق کو محسوس کر سکتے تھے۔ تاہم وہ حرارت جس کی ہمارے جسموں کو اشد ضرورت تھی، اس کمرے میں گھٹن، بُو اور مفلسی کی ناگزیر ناپاکی کے ساتھ دستیاب تھی۔

میں نے تھیلا نیچے رکھ کے کمبل اتارا اور اس بستر پر بیٹھ گیا جس کو چھوڑ کے بوڑھا دروازہ کھولنے گیا تھا۔ پھر غالب نے بھی ایسا ہی کیا اور باری باری ہم سب بیٹھ گئے۔ بوڑھے نے اپنی زبان میں چند سوال کیے تھے مگر اس کا لہجہ ہمدردانہ تھا اور وہ باری باری ہم سب کی صورتوں کو دیکھ کر افسوس سے سہلاتے ہوئے کچھ پوچھتا جا رہا تھا۔

میں نے کاجل سے کہا "یہ کون سی زبان ہے؟"

کاجل نے کہا "نیپالی۔ اس میں بہت سے الفاظ بنگالی کے ہیں۔"

"بہت سے کتنے؟ پچاس فیصد" غالب بولا "پھر تو تم کو مفہوم اخذ کر لینا چاہیے۔"

اچانک نوجوان بیٹھ گیا۔ اس نے تکیے کے نیچے سے چشمہ نکالا اور ہماری صورتوں کو غور سے دیکھنے لگا۔ چشمے کے شیشے بہت موٹے تھے چنانچہ میں نے اندازہ لگایا کہ اب تک وہ صرف آوازیں سنتا رہا ہوگا۔ ہمارے چہرے اسے چشمہ لگانے کے بعد ہی نظر آئے ہوں گے۔

"یو ٹورسٹ؟" اس نے انگریزی کا حلیہ بگاڑ کے کہا۔

میں نے فوراً کہا "یس۔ انڈین ٹورسٹ۔"

اس نے مزید انگریزی کا خون کیا "یہاں کیوں آئے ہو؟"

میں نے کہا "تقدیر لے آئی ہے لیکن یہ سوال جواب تم بعد میں بھی کر سکتے ہو۔ ایسا نہ ہو کہ ہم سردی اور بھوک سے فوت ہو جائیں۔ ہم تمہارے مہمان ہیں۔"

اس نے نیپالی لہجے میں انگریزی کے الفاظ کو گرامر کے بغیر جوڑتے ہوئے کہا "ہم مہمان نہیں رکھ سکتے۔ ہم غریب لوگ ہیں۔ تم امیر ہو، قیمت ادا کر سکتے ہو۔"

میں نے کہا "تمہاری صاف گوئی نے مجھے متاثر کیا۔ ہم منہ مانگی قیمت دیں گے، چائے اور کھانے کی۔"

"اپنے منہ سے بتاؤ کیا دو گے؟" وہ لڑکا انتہائی بے مروّت اور کاروباری ذہن کا مالک تھا اور موقعے سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ جیسے اس گھر کا ملنا ہم اپنی خوش نصیبی سمجھ رہے تھے، ایسے ہی وہ بھی سمجھ رہا تھا کہ آدھی رات کو خوش قسمتی نے اس کے دروازے پر دستک دی ہے تو وہ مروّت چھوڑ کے کاروبار کی بات کیوں نہ کرے۔ ضرورت ہمارے درمیان قدرِ مشترک تھی اور ضرورت مند صرف ہم ہی نہیں، وہ بھی تھے۔ ان ضروریات کی نوعیت مختلف تھی مگر مقصد وہی ایک تھا، یعنی بقائے جسم و جاں کا۔

میں نے کہا "جب ایک بار کہہ دیا کہ جو مانگو گے وہ مل جائے گا تو پھر قیمت کے مسئلے پر کسی اختلاف یا اندیشے کی گنجائش نہیں رہی۔"

اس نے مسکرا کے کہا "کیا تم ایک روٹی کے ایک لاکھ بھی دے سکتے ہو؟ قیمت ہمیشہ ضرورت کی ہوتی ہے۔ یہاں تمہارے لیے پیسہ اتنا ہی بے مصرف ہے جتنا صحرا کے پیاسے مسافر کے لیے تیل جو اسی ریت سے نکلتا ہے اور سیّال سونا کہلاتا ہے۔"

میں نے حیرانی سے کہا "تم تو فلسفی بھی ہو، تاجر بھی اور سیاست داں بھی۔ اتنی خوبیاں تم میں کیسے یکجا ہو گئیں؟ بظاہر تو ایک ان پڑھ اور جاہل آدمی لگتے ہو۔"

اس نے کہا "میں کھٹمنڈو میں رہتا ہوں۔ پرائمری اسکول ٹیچر

ہوں۔ میں نے بی اے تک پڑھا تھا لیکن یہاں تعلیم سے کچھ نہیں ملتا۔ سوائے ایسی ہی فضول سی نوکری کے جس سے حالات نہیں بدلتے۔"

"اور تم چاہتے ہو کہ آج راتوں رات تمہارے حالات بدل جائیں؟" میں نے کہا "تبدیلی دو طرح آتی ہے۔ جمہوری طریقے سے یا طاقت کے ذریعے۔"

"جمہوریت!" وہ ہنسنے لگا "دنیا میں کہیں ہے یہ جانور؟ اس کی نسل تو پیدا ہونے سے قبل ہی معدوم ہو گئی اور اس کے تحفظ کے لیے دنیا میں کہیں کوئی ادارہ کام نہیں کر رہا ہے۔"

"رائٹ۔ اب دوسرا طریقہ یہ ہے جو دنیا میں رفتہ رفتہ مقبول ہونے لگا ہے۔" میں نے اسے اپنے بیگ میں سے ریوالور نکال کے دکھایا "اگر ہمارے درمیان مذاکرات ناکام رہے تو یہ ہے مارشل لاء۔"

بڈھا جو اب تک خاموشی سے ہماری گفتگو سن رہا تھا اور سر گھما کے کبھی مجھے دیکھتا تھا تو کبھی اپنے لائق فائق، عالم فاضل سپوت کو، اب چلّانے لگا۔ اس کی ماں نے بھی واجبی سی چیخ ماری اور اسی وقت چوتھی رضائی میں سے ایک چہرہ برآمد ہوا۔ جیسے گھنے، کالے بادلوں سے اچانک چودھویں کا چاند طلوع ہو جائے۔ وہ سترہ اٹھارہ سال کی انتہائی حسین اور دلکش لڑکی تھی جس کے حسن و شباب کی رعنائی کو میلے کچیلے کپڑے، غربت زدہ ماحول اور افلاس کی سختی بھی دبا نہیں سکی تھی۔

اب باپ بیٹے میں کوئی بحث چل رہی تھی۔ باپ کے لہجے میں برہمی غالب تھی اور بیٹے کے لہجے میں سرکشی۔ صاف ظاہر تھا کہ موضوعِ سخن ہم تھے، ہماری تشریف آوری اور وہ اسباب جن کی بنا پر میں نے ریوالور کی نمائش کی تھی۔ ایسا میں ہرگز نہ کرتا، اگر وہ لڑکا ضرورت سے زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش نہ کرتا۔ میں بحث کے موڈ میں نہیں تھا۔ ہم سب تھکے ہوئے تھے، بھوک سے بے حال تھے اور سردی میں ہماری عقل تک منجمد ہو رہی تھی۔ یہ فلسفہ بولنے یا سمجھنے کا وقت نہیں تھا۔

بالآخر لڑکے نے مایوسی اور شکست تسلیم کرنے والے لہجے میں کہا "میرا بے وقوف باپ کہتا ہے کہ مہمانوں سے پیسے کی بات مت کرو۔"

"تم ایک وضع دار اور شریف آدمی کو جو تمہارا باپ بھی ہے، بے وقوف کہہ کے خود کو کیا ثابت کر رہے ہو؟" میں نے جوتے اتارتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ اسی وضع داری اور شرافت کے باعث یہ یہاں پڑا ہوا ہے ورنہ یہ شاہِ نیپال کا ہیڈ مالی بھی بن سکتا تھا۔ اسے موقع ملا تھا، جو اس نے اپنی حماقت سے گنوا دیا" وہ بولا "خیر...... اب تم عیش کرو۔ یہ میرا نہیں، میرے باپ کا گھر ہے۔ میں سو رہا ہوں۔"

وہ لحاف میں غائب ہو گیا۔ اس کے باپ نے اپنی بیوی اور بیٹی کو بتا دیا تھا کہ ہم کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟ وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ ماں چولھے میں لکڑیاں سلگا رہی تھی اور بیٹی ایک گھڑے میں سے آٹا نکال چکی تھی۔ ان کے درمیان آپس میں ہونے والی گفتگو غالباً اس شخص کے بارے میں تھی جو ایک کا بیٹا اور دوسری کا بھائی تھا۔ وہ باربار افسوس سے اس کی طرف دیکھتی تھیں۔ وہ سیدھے سادے، پہاڑی لوگ تھے جو طبعاً اور نسلاً مہمان نواز ہوتے ہیں اور اعتقاد رکھتے ہیں کہ مہمان باعثِ خیر و برکت ہوتا ہے۔

رابعہ اور نازو جوتے اتار کے اپنے پاؤں دیکھ رہی تھیں جن پر سرخ دھبّے سے نمودار ہو گئے تھے۔

"پیدل چلنے سے چھالے پڑ گئے ہیں" نازو نے کہا۔

"یہ چھالے نہیں ہیں، اسے فراسٹ بائٹ کہتے ہیں" غالب نے کہا "یعنی تمہیں سردی اور برف نے کاٹ لیا ہے۔"

میں نے کہا "انتہائی سرد علاقوں میں ایسا ہوتا ہے مگر دو چار میل چلنے سے نہیں۔ مستقل رہنے سے برفانی علاقوں میں فراسٹ بائٹ کی شکایت ہو جاتی ہے۔"

نازو نے گھبرا کے کہا "پھر اب کیا ہو گا؟"

غالب نے بڑی مسرت سے کہا "اب ہو گا یہ کہ تمہارے چھالے رفتہ رفتہ زخم بن جائیں گے، پھر پاؤں گل سڑ جائیں گے اور بالآخر تم کو نیچے سے کاٹ کے چھوٹا کر دیا جائے گا۔ تقریباً ساڑھے چار فٹ کی لمبائی باقی بچے گی اور تم ایسے نظر آؤ گی جیسے تمہاری ٹانگوں کی جگہ کرسی کی ٹانگیں لگا دی گئی ہیں۔ بھول جاؤ گی یہ ناز نخرے جو تم اونچی ایڑی کی سینڈل پہن کے دکھاتی پھرتی ہو۔ پنجوں کے بغیر......"

رابعہ سمجھ گئی کہ غالب انہیں خوف زدہ کرنا چاہتا ہے "بولتے رہو، تمہارے کہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔"

"پنجابی میں کہتے ہیں نا، کہ کوؤں کی بددعا سے مویشی نہیں مرتے" نازو بولی۔

"یہ تم نے مجھے کوّا کہا ہے یا خود کو مویشی تسلیم کیا ہے؟" غالب بولا۔

"بلاوجہ کائیں کائیں کرنے والے کو اور کیا کہوں؟" نازو نے کہا۔

"تم خود کو اللہ میاں کی گائے سمجھتی ہو نا، لیکن کیا گائے کا شمار مویشیوں میں نہیں ہوتا؟ رنگ روپ کے علاوہ گائے کی ایک اور صفت بھی پائی جاتی ہے تم میں۔ تم بھی بلاوجہ سینگ مارتی ہو۔"

میں نے کہا "یار، دَم لیتے ہی کیا فضول باتوں میں الجھ گئے؟"

غالب نے کہا "مسٹر افلاطون، ہم اس وقت فضول باتیں ہی کرنا چاہتے ہیں۔ فرصت ملتے ہی کام کی بات شروع کر دیں، یہ نہیں ہو سکتا۔"

"غالب ٹھیک ہی کہتا ہے" میں نے سوچا۔ ریلیکس کرنے کے لیے یہ DIVERSION ضروری ہے۔ یہ تب ہی ممکن ہے جب ہم کوشش کر کے ذہن کو ان تمام واقعات اور حادثات کی یادوں سے دور لے جائیں جن کے آسیب نے ہمارے اعصاب کو تفکرات اور اندیشوں کی زنجیر میں جکڑ رکھا ہے۔ سکون کے لیے ضروری ہے کہ ہم فکرِ فردا اور غمِ دوراں کو بھول جائیں۔ ان مسائل کے بارے میں سوچیں بھی نہیں جو آنے والے دن کا حصہ ہوں گے۔

میں آرام سے اس غلیظ گدّے پر لیٹ گیا اور جب بوڑھے نے اپنے لیے ایک گھٹیا سی سگریٹ جلائی تو میں نے اس کی سگریٹ لے لی۔ وہ بہت خوش ہوا۔ ہم باری باری کش لگاتے رہے اور اس طرح میں اپنے دوستانہ جذبات سے مساوات قائم کرنے میں کچھ کامیاب ہوا۔ پھٹا ہوا تکیہ تیل سے چکنا ہو رہا تھا اور اس میں سے میل کی بو آ رہی تھی لیکن اس وقت میرے لیے اس کمرے کی ہر چیز میں راحت تھی، تحفظ کی ضمانت تھی اور تائیدِ غیبی کا اشارہ تھا۔

غالب اور نازو کے لیے فرصت کا بہترین مشغلہ لڑائی تھا اور وہ لڑائی کے لیے کسی سبب کے محتاج نہ تھے۔ لڑائی ایسی بات پر بھی شروع ہو جاتی تھی جس میں اختلاف کی گنجائش ہی نہ ہو۔ رابعہ اور کاجل آپس میں چپکے چپکے کچھ باتیں کر رہی تھیں اور باربار اپنے پیروں کو دیکھ رہی تھیں جن پر سرخ نشان زیادہ نمایاں ہو گئے تھے۔ کلیم کچھ کھائے پیے بغیر ہی سو گیا تھا۔ اچانک بوڑھا اپنی جگہ سے اٹھا اور ایک کونے میں دیوار پر لٹکی ہوئی تھیلی میں سے کچھ نکالنے لگا۔ بہت سی شیشیوں اور ڈبیوں میں سے اس نے بالآخر ایک ڈبیا نکالی، اسے لالٹین کے قریب لا کر غور سے دیکھا اور مطمئن ہو کے مسکرایا۔ اس نے وہ ڈبیا کھول کے رابعہ کو دی اور اپنی زبان میں کچھ کہا مگر اشارے سے یہ بھی بتا دیا کہ اس دوا کو وہ اپنے پاؤں پر چھالوں کی جگہ لگا لیں۔ رابعہ نے قدرے تذبذب کا اظہار کیا اور میری طرف دیکھا۔ انکار سے بوڑھے کی دل شکنی ہوتی جو ہمدردی میں اپنی طرف سے اچھا ہی کر رہا تھا مگر شہر کی پروردہ اور اسپیشلسٹ ڈاکٹروں کے مشورے پر پیٹنٹ دوائیں استعمال کرنے والی رابعہ اس دیسی علاج کو اپنی جِلد پر آزماتے ہوئے ڈرتی تھی تاہم میرے اشارے پر اس نے ڈبیا لے لی۔

میں نے اور غالب نے بڑی دلچسپی سے ان کے تاثرات کا مشاہدہ کیا۔ وہ دوا کو غور سے دیکھ رہی تھیں اور سونگھ رہی تھیں۔ دوا سے الرجی نہ ہو جائے، ان کی جلد متاثر نہ ہو، معلوم نہیں اس میں کیا ہے اور کس مرض کی دوا ہے؟ کتنی پرانی ہے اور کب سے بنا رکھی تھی؟ ایک مقررہ مدت کے بعد تو تریاق بھی زہر ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی اندیشے ان کی صورت سے عیاں تھے۔ دوسری طرف وہ شہر کی تہذیب اور میڈیکل سائنس کے اسرار و رموز سے ناواقف، پہاڑوں میں بسنے والا بوڑھا تھا جس کے آباؤاجداد نے بھی یہی زندگی بالکل اسی انداز میں گزاری ہو گی۔ اس کے لیے زندگی کا تجربہ اور نسلوں پرانا علم اتنا ہی معتبر تھا جتنی کسی ڈاکٹر کے لیے ایم بی بی ایس کی سند ہوتی ہے۔ جو یقین اسے حاصل تھا، نیا نہیں تھا مگر رابعہ اور نازو کا یہ تجربہ نیا تھا۔ ڈرتے ڈرتے انہوں نے تھوڑا سا مرہم انگلی پر لگا کے ایک زخم پر مَلا اور پھر ایک دوسرے کی طرف تسلی دینے کے انداز میں دیکھا کہ مجبوری میں وہ بھی کرنا پڑتا ہے جو دل نہیں مانتا۔ خیر اللہ مالک ہے۔

میں نے بوڑھے کی صورت پر طمانیت دیکھی۔ وہ میرے پاس بیٹھ کے کچھ کہنے لگا جو میری سمجھ میں خاک بھی نہیں آیا۔

غالب نے کہا "جواب تو دو کسی بات کا، کچھ بولو۔"

"کیا بولوں؟ زبانِ یارِ من ترکی...!"

"تم جواب میں فرنچ بھی بول سکتے ہو۔ بے شک اسے ژاں پال سارتر کے اقتباس سنا دو۔ نہ تمہیں کوئی فرق پڑے گا نہ اسے اور نہ سارتر کو" غالب نے کہا۔

میں نے بوڑھے کے بیٹے کی رضائی کھینچی "اٹھو۔ مجھے معلوم ہے تم سو نہیں رہے ہو۔"

"کیا کروں گا اٹھ کے؟" اس نے رضائی کے اندر سے جواب دیا۔ اس کھنڈو کے پرائمری اسکول ٹیچر کی انگریزی اتنی ہی بامحاورہ تھی جتنی کسی انگریز لارڈ کی اردو ہو سکتی ہے۔ "یہاں میری کوئی نہیں سنتا۔ مجھے احمق سمجھا جاتا ہے۔"

میں نے اس کے الفاظ کو جوڑ کے مطلب اخذ کرنا سیکھ لیا تھا "اگر تم خود کو ایسا نہیں سمجھتے تو پھر برا ماننے کی کون سی بات ہے؟ اب کوئی مجھے گنجا کہے تو میں کیوں برا مانوں گا۔ مجھے معلوم ہے میرے سر پر کتنے بال ہیں؟"

وہ اٹھ بیٹھا "اچھا۔ یہ تو تم نے ٹھیک کہا۔ گویا تم تسلیم کرتے ہو کہ احمق میں نہیں ہوں، میرا باپ ہے۔"

"میں نے ایسا نہیں کہا۔ اگر میں گنجا نہیں ہوں تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ تم گنجے ہو۔"

اس نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا "یہ بھی ٹھیک ہے۔ خیر، تم کیا کہنا چاہتے تھے؟"

"میں چاہتا ہوں کہ تم مترجم کے فرائض انجام دو" میں نے جیب سے سو روپے کا ایک نوٹ نکال کے اسے دیا "یہ اس کا معاوضہ ہے۔ جو بات تمہارا باپ کہے، وہ مجھے سمجھاؤ اور میری بات اپنے باپ تک پہنچا دو۔ ایمانداری سے۔"

اس نے سو کا نوٹ اچک لیا "یہ تو بھارتی کرنسی ہے۔ خیر، میں اسے تبدیل کرا لوں گا۔ ڈالر نہیں ہیں تمہارے پاس؟"

میں نے انکار میں سر ہلایا "میں کوئی چلتا پھرتا فارن ایکسچینج بینک نہیں ہوں۔"

اب ہمارے درمیان معلومات کا تبادلہ ہوا۔ بوڑھے نے بتایا کہ وہ سو سال کا ہو گیا ہے اور ابھی مزید بیس سال نہیں مرے گا کیونکہ اس کے باپ دادا، سب سنچری بنانے کے بعد بھی بیس پچیس سال گزارے بغیر نہیں گزرے تھے۔ یہ سب غلط تھا۔ ان پہاڑوں

میں رہنے والوں کی طویل عمری کے نظریے کو تسلیم کیا جا سکتا تھا مگر کسی کا سوا سو سال زندہ رہنا بعد از قیاس تھا۔ اسے اپنی تاریخ پیدائش کسی بھی حوالے سے یاد نہیں تھی۔ اسے نہ جارج پنجم کی تخت نشینی کی علم تھا' نہ انیسویں کے بعد بیسویں صدی کے شروع ہونے کا۔ اتنی طویل زندگی گزار کے اس نے اپنے حساب سے عمر کو سو سال سمجھ لیا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ ستر سال کا تھا یا شاید اسی کا لیکن اس سے زیادہ کا نہیں۔ اس نے مترجم کو اپنا سولھواں بیٹا اور اس کی بہن کو گیارھویں لڑکی قرار دیا تو میں بھونچکا رہ گیا۔ پھر اس نے وضاحت کی کہ یہ سب تین بیویوں کی پیداوار تھے۔ چوتھی سامنے ہے۔ بقیہ اولاد کا حساب کچھ یوں تھا کہ آدھے تو وہ غنچے تھے جو بن کھِلے مرجھا گئے۔ جو بڑے ہوئے انہیں دنیا لے گئی' یعنی وہ گھر چھوڑ کے دنیا میں کہیں گم ہو گئے۔ لڑکیاں بھی شادی کر کے گئی تھیں۔ اب معلوم نہیں کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں' کتنے بچوں کی ماں ہیں اور زندہ ہیں یا مر گئیں۔ یہ ایسی ہی دنیا تھی اور ایسی ہی زندگی تھی۔ یہاں بقا کی جدوجہد کے مقابلے میں جذباتی رشتوں کو شکست ہو جاتی تھی۔ خاندان کی مرکزی حیثیت باقی رکھنا ناممکن تھا۔ جو بڑا ہو جائے اور اپنا پیٹ خود بھر سکے وہ جائے اور دنیا میں اپنا رزق خود تلاش کرے۔ ان پرندوں کی طرح جو اڑنا سیکھتے ہی آشیانوں سے پرواز کر جاتے ہیں اور پھر کبھی لوٹ کے نہیں آتے۔

کھانے اور چائے کے دوران ہم نے اپنے اپنے سوالات سے یہ سب معلومات حاصل کی تھیں۔ اس کے بعد ہماری باری آئی۔ ہم نے بتایا کہ ایک حادثے میں ہماری کار ختم ہو گئی' ہم اس لیے بچ گئے کہ کار میں نہیں تھے۔ کار ایک سائڈ پر کھڑی تھی کہ ایک ٹرک نے ٹکر مار کے اسے نیچے گرا دیا۔ ہم ٹرک کو دوڑ کے پکڑنے میں ناکام رہے۔

مترجم نے کہا "تم کار سے اترے ہی کیوں تھے؟"

میں نے کہا "گاڑی گرم ہو گئی تھی۔ ویسے بھی کوئی چوبیس گھنٹے کار میں نہیں رہتا۔ کیا تم باہر نہیں جاتے؟ باہر کوئی تم کو اسی طرح ٹکر مار کے گرا دے تو یہ سوال احمقانہ ہوگا کہ تم گھر سے نکلے ہی کیوں تھے۔"

اس نے سوچ کے کہا "یہ تو ٹھیک ہے۔ تم نے اتنی عقلمندی کی باتیں کس سے سیکھیں۔"

میں نے اسے ایک پرانا جواب دیا "بے وقوفوں سے۔"

"ان عورتوں میں سے تمہاری بیوی کون ہے؟" وہ بولا۔

"ایک بھی نہیں" میں نے کہا۔

پھر اس نے یہی سوال غالب سے کیا اور یہی جواب سن کے شک میں پڑ گیا۔ دو مرد' تین عورتیں۔ نہ کوئی کسی کی بیوی نہ کوئی شوہر۔ بچہ پھر کہاں سے آ گیا؟ یہ گتھی سلجھانا اس کے لیے بڑا مشکل ہو گیا۔ ایک ایک کر کے رابعہ' نازو' کاجل اور کلیم سب سو گئے۔ پھر غالب کی باری آئی۔ بوڑھے کی چوتھی بیوی اور گیارھویں بیٹی ایک کونے میں بیٹھی رہیں۔ ان کے سونے کے لیے اب کوئی جگہ ہی نہیں بچی تھی۔ بوڑھا بے خوابی کا مریض تھا' وہ مجھ سے سر کھپاتا رہا۔ اس کا بیٹا مترجم بننے پر مجبور تھا کیونکہ وہ سو کا نوٹ جیب میں اُڑس چکا تھا۔ اس نے کئی بار مجھے بھی سونے کا مشورہ دیا مگر میں کوئی رسک لینا نہیں چاہتا تھا۔ وہ ایک لالچی آدمی تھا اور ہمیں لوٹ کے فرار ہو سکتا تھا۔ معلوم نہیں اپنے باقی بھائیوں کی طرح وہ ابھی تک گیا کیوں نہیں تھا۔ شاید اسی لیے وہ خود کو احمق تسلیم کرتا تھا۔ خود اس نے کہا کہ پڑھ لکھ کے میں بزدل اور ناکارہ ہو گیا۔ میں وہ سارے کام نہیں کر سکتا جو میرے بھائیوں نے کسی احساسِ پشیمانی یا کمتری کے بغیر کر لیے۔ ان کے نزدیک رشتے بھی اہم نہیں رہے' خواہ وہ زمین کے ہوں یا خون کے۔ چنانچہ وہ جہاں بھی ہوں گے جو کچھ بھی کر رہے ہوں گے' عدم اطمینان کا شکار نہیں ہوں گے۔ جب کہ میں پرائمری ٹیچر بن کے انسان بن گیا ہوں۔ انسان بہت مجبور ہوتا ہے اور غلام ہو جاتا ہے۔ بندشوں کا' خواہشوں کا اور اپنی کمزوریوں کا۔ جانور آزاد رہتا ہے۔

اگرچہ وہ اپنے خیالات کو الفاظ کا جامہ پہنانے میں خاصی دشواری محسوس کرتا تھا مگر میں اس کی سوچ کو سمجھ رہا تھا۔

اچانک اس نے کہا "تم میری بہن سے شادی کیوں نہیں کر لیتے؟"

میں بھونچکا رہ گیا "یہ تم.... کیا فضول بات کر رہے ہو؟"

"کیوں؟ اتنی اچھی اور خوب صورت لڑکی ہے وہ اور تم نے ابھی تک کسی کو بیوی نہیں بنایا ہے۔ یہ لڑکیاں جو تمہارے ساتھ ہیں' میری بہن کے مقابلے میں کچھ نہیں۔ نہ یہ اتنی حسین ہیں اور نہ اتنی خدمت کر سکتی ہیں تمہاری۔ پھر یہ کہ خرچ بھی زیادہ نہیں' پانچ ہزار دے دو...."

"بکواس بند کرو۔" میں نے گرم ہو کے کہا۔

"اچھا چار ہزار....."

میں نے کہا "بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں کسی لڑکی کو خرید کے شادی نہیں کروں گا۔"

"پھر کیا ایسے ہی کسی کو بھگا کے لے جاؤ گے' مفت میں۔ یہ تو بڑی غلط بات ہو گی۔"

"غلط بات کے بچے! ہم شادی کے لیے عورت خریدتے نہیں' میں نے بگڑ کے کہا "لڑکی راضی ہو' اس کے والدین راضی ہوں اور خود وہ لڑکی' آدمی کو پسند ہو' تب بات بنتی ہے۔"

"پھر تو بات بن گئی سمجھو۔ لڑکی ضرور راضی ہو جائے گی۔ وہ شہر جانا چاہتی ہے۔ تم جوان اور خوبصورت آدمی ہو۔ وہ تمہیں پسند بھی کر لے گی۔ ماں باپ کیسے راضی نہ ہوں گے۔ چلو تم تین ہزار دے دینا۔"

میں نے کہا "اب تم نے شادی کی بات کی تو میں ایک جھانپڑ ماروں گا۔ ان لڑکیوں میں سے ایک میری بیوی بنے گی' یہ فیصلہ میں

کر چکا ہوں۔"

"پھر کیا ہوا' آدمی جتنی شادیاں چاہے کر سکتا ہے۔ یہ لڑکی تم نے کتنے میں لی اور کہاں سے لی جسے تم بیوی بناؤ گے؟"

میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ اسے شادی کے پورے معاشرتی پس منظر سے آگاہ کرنا' خاندان کی اہمیت سمجھانا اور اس رشتے کی جذباتی اہمیت پر لیکچر دینا بے سود تھا۔ وہ میری بات نہیں سمجھ سکتا تھا کیونکہ میرے اور اس کے درمیان دو دنیاؤں کا فاصلہ تھا۔ ہم ایک ہی سیارے پر رہتے تھے مگر ایک دوسرے کے لیے مریخ کی مخلوق سے زیادہ اجنبی تھے۔ ہم ایک دوسرے کی زبان' خیالات' نظریات' عقائد اور رسوم سے بیگانہ تھے۔ جسمانی ساخت اور ضروریات کے اعتبار سے ہم بلاشبہ ایک تھے مگر ذہنی سطح پر ہمارے درمیان دو ہی معاملات کو سمجھنے کی صلاحیت مشترک تھی۔ ایک انگریزی جو اظہار کا ذریعہ بنی۔ دوسری سکّہ رائج الوقت کی زبان۔

میں نے کہا "تم سب باتیں چھوڑو' مجھے یہ بتاؤ کہ ہم کھٹمنڈو کیسے پہنچ سکتے ہیں؟"

اس نے کہا "یہ سڑک سیدھی کھٹمنڈو جاتی ہے۔"

میں نے کہا "اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں؟ تم تو یہاں کے رہنے والے ہو' خفیہ راستے بھی جانتے ہو گے۔"

اس نے مجھے غور سے دیکھا "تم خفیہ راستے سے کیوں جانا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا "یہ بتانا ضروری نہیں۔ میری بات کا جواب دو۔"

اس نے سوچ کے کہا "خفیہ راستے بہت ہیں مگر ان پر سفر کرنا آسان کام نہیں ہے۔ ہر راستہ محفوظ بھی نہیں ہے۔ کہیں پہاڑ ٹوٹ کر گر جاتے ہیں یا اوپر سے برف پھسل کے آ جاتی ہے۔ خطرناک شیر' چیتے اور بھیڑیے مل جاتے ہیں۔ سڑک محفوظ ہے؟"

"سڑک کے بعد کون سا راستہ محفوظ ہے۔"

"اس راستے پر تم جاؤ گے کیسے؟ وہ بہت لمبا راستہ ہے۔ لوگ جو تبت کی طرف جاتے ہیں' وہ خچروں پر سفر کرتے ہیں' قافلوں کی صورت میں" اس نے کہا۔

"یہ قافلے کہاں سے گزرتے ہیں؟"

"اُدھر سے" اس نے ہاتھ ہلا کے کہا "پرسوں ایک قافلہ گیا تھا' اب پھر پرسوں جائے گا۔"

"تمہیں پہلے سے معلوم ہو جاتا ہے؟"

"سب کو معلوم ہو جاتا ہے۔ جسے جانا ہو ان کے ساتھ چلا جاتا ہے' کچھ خریدنا ہو تو ان سے خرید لیتا ہے۔ وہ جگہ جگہ رکتے جاتے ہیں اور مال بھی جمع کرتے رہتے ہیں۔ میرے باپ نے سب لڑکیاں قافلے والوں کو دیں۔ انہیں اچھے شوہر مل گئے۔"

"اور تمہارے باپ کو اچھے پیسے!" میں نے غصے سے کہا۔ "شرم نہیں آتی تم لوگوں کو؟ اپنی عورتوں کو بیچتے ہوئے..."

وہ میرے غصے پر حیران ہوا "شرم کی کیا بات ہے؟ خود میرے باپ نے تین بیویاں بیچ دیں۔"

"بیویاں بیچ دیں! کیوں؟"

"اسے پیسوں کی ضرورت تھی" وہ بولا "خود میں نے قافلے سے ایک بیوی خریدی تھی' سال بھر بعد واپس کر دی۔ جس سے لی تھی وہ خود آیا تھا کہ ایک ہزار زیادہ لے لو۔ میں نے بھی فائدہ اٹھایا۔ دو ہزار زیادہ لے کر دی۔"

صدمے سے میرا برا حال ہو گیا۔ ان لوگوں کے نزدیک عورت کی وہ حیثیت تھی جو شہروں میں کار کی ہوتی ہے۔ خریدی' استعمال کی' اچھے پیسے ملے تو بیچ دی۔ سیکنڈ ہینڈ لے لی' بدل لی۔

اپنے بلڈ پریشر کو کنٹرول کر کے میں نے کہا "دیکھو' میں اس قافلے کے ساتھ جانا چاہوں تو مجھے کیا کرنا ہوگا؟ کتنے دن میں ہم پہنچ جائیں گے کھٹمنڈو؟"

اس نے سوچ کے کہا "تم نہیں پہنچو گے۔"

"کیوں؟ کیا وہ ہمیں ساتھ لے جانے سے انکار کر دیں گے؟ ہم انہیں اچھا معاوضہ دے سکتے ہیں۔"

"بات معاوضے کی نہیں۔ راستے میں تم غائب ہو جاؤ گے' تمہارے ساتھ جو عورتیں ہیں ان کو شوہر لے جائیں گے' خرید کے۔"

میں نے کہا "بکواس بند کرو۔ ان معاملات سے نمٹنا ہم جانتے ہیں۔ ایک ایک کو گولی مار دیں گے۔ جو بچ گیا وہ ہمیں کھٹمنڈو پہنچا دے گا۔"

"اگر معاوضہ دو تو یہ کام میں بھی کر سکتا ہوں" وہ بولا۔

"حد ہو گئی۔ یہ بات تم پہلے نہیں بک سکتے تھے۔ بولو کتنا ہوگا تمہارا معاوضہ؟"

"پانچ آدمی۔ پانچ ہزار" وہ اپنی پانچوں انگلیاں پھیلا کے بولا۔

"چلو یہ بات طے ہو گئی۔" میں نے کہا "تمہارے پانچ ہزار پکے۔"

"بچے کو تو میں بھول ہی گیا تھا۔"

میں نے بھنّا کے کہا "پانچ سو اس کے۔ اور بولو۔"

"تم پیدل نہیں جا سکتے۔ خچروں کا کیا ہوگا؟"

میں نے کہا "تم بتاؤ۔ خچر کرائے پر ملتے ہیں یا ہمیں خریدنے پڑیں گے؟"

"تم خچر واپس کر دو گے؟"

"اور کیا اپنے ساتھ پاکستان لے جاؤں گا" میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

وہ مسکرانے لگا "تم کو پاکستان جانا ہے۔ ایسے بولو نا۔ آج کل کھٹمنڈو میں ہزاروں لوگ پڑے ہیں۔ ان کے پاس رہنے کے لیے جگہ نہیں اور کرایہ بھی نہیں۔ کرائے پر بس یا ٹرک میں لوگوں کو لے جانے والے بھی خوب مال کما رہے ہیں۔ میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ وہ پیسہ لیتے ہیں اور لوگوں کو آدھے راستے میں اتار دیتے ہیں۔

زبردستی۔ اچھی لڑکیاں اور عورتیں غائب ہوجاتی ہیں۔ کھٹمنڈو جاؤ گے تو خود دیکھ لوگے۔"

میں نے اپنے دکھ کے احساس کو دبا کے کہا "تقدیر سے کوئی نہیں لڑ سکتا۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ تم ہمیں کھٹمنڈو پہنچادو' اس کے بعد تمہاری ذمّے داری ختم۔ تم نے کہا تھا کہ وہاں کسی پرائمری اسکول میں پڑھاتے ہو۔"

"ہاں۔ گورنمنٹ اسکول ہے۔ میں وہاں تمہاری رہائش کا انتظام بھی کرسکتا ہوں۔ دن میں کلاسیں ہوتی ہیں مگر رات کو تم وہاں سوسکتے ہو' کسی برآمدے میں۔"

"جگہ کا کرایہ دے کر؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ مفت میں آج کل وہاں کچھ نہیں ملتا۔ بیٹھنے یا کھڑے ہونے کی جگہ کے پیسے لینے بھی کوئی آجائے گا" وہ بولا۔

"چلو' جو سب پر بیت رہی ہے' ہم پر بھی گزر جائے گی۔ تم بتاؤ کھٹمنڈو جانے کے لیے خچر کہاں سے آئیں گے؟"

"میں لاؤں گا" وہ بولا "ایک خچر کا سو روپیہ روز۔ تمہارے پاس پستول ہے' تمہیں راستے میں کوئی خطرہ نہیں۔ کیا تم واقعی گولی ماردیتے ہو؟"

میں نے کہا "یقین نہیں آتا تو تمہیں مار کے دکھاؤں؟"

"نہیں نہیں" وہ گھبرا کے بولا "میرا مطلب تھا' راستے میں کہیں اچانک شیر چیتا آجائے۔ ویسے تو وہ کچھ نہیں کہتے کسی کو۔"

"خطرے کی بات ہوگی تو ہم انہیں ماردیں گے" میں نے کہا۔

"تم کب جانا چاہتے ہو؟ سفر لمبا ہے۔"

"کیا ہم رات کو بھی سفر کرسکتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"اگر صبح سورج نکلتے ہی روانہ ہوجائیں تو رات سے بہت پہلے ہی کھٹمنڈو پہنچ سکتے ہیں" وہ بولا۔

"پھر کل صبح کا پروگرام پکّا سمجھو" میں نے کہا "آج ہم آرام کریں گے۔"

"ابھی تو کافی وقت ہے" وہ بولا "تم بھی سوجاؤ۔"

نہ جانے کیوں مجھے شک ہوا کہ وہ میرے سوجانے کے بعد کچھ کرے گا۔ اس نے کم سے کم چھ بار یہی بات کی تھی۔ وہ لالچی آدمی تھا اور اس کے ساتھ ہی شدید احساسِ محرومی میں مبتلا تھا۔ اسے قسمت سے' زمانے سے' اپنے گھر اور والدین سے' سب سے گلہ تھا کہ کسی نے اسے خوشحالی کے مواقع فراہم نہیں کیے اور وہ ازلی وابدی بد نصیبی سے چھٹکارا پانے کی خواہش میں ہمیشہ ناکام رہا۔ دولت مندی اس کے لیے ایک شجرِ ممنوعہ رہی کیونکہ وہ پڑھ لکھ کے کم ہمت اور جذباتی احمق بن گیا تھا۔

اس نے باتوں باتوں میں اندازہ کرلیا ہوگا کہ ہماری حقیقت کچھ بھی ہو۔ ہم ہندوستانی ہوں یا پاکستانی۔ مفرور مجرم ہوں یا نو سرباز وں کا ٹولہ۔ ہمارے پاس اتنی دولت ہے کہ ہم سب کچھ خرید سکتے ہیں چنانچہ اس نے ہر معاملے میں سودے بازی کی تھی۔ اپنی طرف سے جو قیمت اس نے طلب کی وہ حد سے زیادہ تھی۔ شاید اس امید میں کہ وہ اس سے آدھی بھی وصول کرنے میں کامیاب ہوا تو وارے نیارے ہوجائیں گے مگر میں نے منہ مانگے معاوضے کی بات کی تھی۔ ممکن ہے اسے صدمہ ہوا ہو کہ وہ اپنی کم ہمّتی کے باعث نقصان میں رہا ورنہ اس سے دگنا یا دس گنا بھی لے سکتا تھا۔ مانگ تو سکتا تھا۔ ملنا نہ ملنا بعد کی بات تھی لیکن ایک بار پھر اس نے موقع گنوادیا۔

اس کی نظر بار بار ہمارے بیگ کی طرف جاتی تھی۔ ایک میں سے میں نے ریوالور برآمد کیا مگر دوسرا کسی نے کھولا ہی نہیں تھا۔ اس کی تمام توجہ اسی بیگ کی طرف رہی تھی۔ محض اسے آزمانے کے لیے میں نے سونے کا فیصلہ کیا۔

میرے لیٹتے ہی وہ بھی دوسری طرف جا کے سوگیا' جہاں اس کی ماں اور بہن نے اپنے لیے ایک گوشے میں جگہ بنالی تھی۔ وہ ایک ہی کمبل میں گٹھری بنی سو رہی تھیں۔ کمرے میں لالٹین کی روشنی کم کردینے کے بعد وہ کچھ دیر ساکت پڑا رہا اور میں نیند سے لڑتے ہوئے اپنی آنکھیں کھلی رکھنے کی کوشش میں مصروف رہا۔ اس نے ایک بار سر اٹھا کے مجھے دیکھا۔ میں نے خود کو گہری نیند میں ظاہر کرنے کے لیے خرّاٹے شروع کیے تو اس نے مجھے پھر دیکھا اور اٹھ بیٹھا۔ اس کی نظر بیگ کا طواف کررہی تھی۔ اس بیگ میں جتنا کھانے پینے کا سامان تھا' وہ ہم راستے میں ہی ختم کر آئے تھے اور اب اس بیگ میں فالتو کپڑوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ کپڑوں کا ایک ایک جوڑا ہم نے وقتِ ضرورت اپنا حلیہ بدلنے کے لیے رکھا تھا۔

میں اسے ایک آنکھ کو تھوڑا سا کھول کے دیکھتا رہا۔ وہ کچھ دیر بیٹھا رہا اور پھر لیٹ گیا۔ دوبارہ اٹھا اور اپنا سر کھجاتا رہا۔ اس کی ہمت اور قوتِ فیصلہ میں کشمکش جاری تھی۔ یہ نیکی بدی کی متحارب قوتوں کی خانہ جنگی تھی جس میں اس کا ضمیر پِس رہا تھا۔ بالآخر ہوس کا پلّہ بھاری رہا۔ وہ چور نظروں سے ہم سب کو اور اپنے گھر والوں کو دیکھتا ہوا اٹھا اور دبے پاؤں بیگ کی طرف بڑھا۔ آخری وقت میں پھر اس کا حوصلہ جواب دے گیا۔ وہ واپس گیا اور پھر لوٹ کے آیا۔ میں اندازہ کرسکتا تھا کہ چوری کرتے وقت اس کے دل کی کیا حالت ہوگی۔ اسے یقین ہوگا کہ میں جاگ اٹھا تو کوئی سوال کیے بغیر اسے گولی ماردوں گا۔ معلوم نہیں کامیابی کی صورت میں وہ کیا کرتا۔ اگر اس کے ہاتھ پندرہ بیس ہزار یا پچاس ہزار لگ جاتے تو کیا وہ راتوں رات فرار ہوجاتا؟ اس نے یقیناً طے کرلیا ہوگا کہ خوش نصیبی کی "لاٹری" نکل آئی تو وہ کہاں جائے گا اور کیا کرے گا۔

اس نے بڑی احتیاط کے ساتھ بیگ کی زِپ کھولی اور اندر ہاتھ مارا۔ اس کے چہرے پر اضطراب واشتیاق' امید اور تجسّس' خوف اور احساسِ جرم کے سارے جذبات کا رنگ الگ اور بہت واضح تھا۔ اس کا سانس تیز چل رہا تھا اور بیگ میں کپڑوں کے سوا کچھ نہ پا کے اس نے شدید مایوسی میں احتیاط کو بھی بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ وہ اب ایک ایک کپڑے کو نکال کے بیگ کی تلاشی لے رہا تھا۔

اس وقت میں نے سوچا کہ اسے رنگے ہاتھوں پکڑلوں مگر پھر میں رک گیا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ کیا وہ دوسرے بیگ میں بھی قسمت آزمائی کرے گا جو غالب کے سر کے نیچے تھا۔ اس نے حفاظت کے خیال سے بیگ کا تکیہ بنالیا تھا مگر نیند میں غالب نے کروٹ لی تھی تو اس کا سر بیگ پر سے ہٹ گیا تھا۔ اب یہ بیگ میرے اور غالب کے بیچ میں تھا اور گویا انتہائی خطرناک علاقے میں تھا۔

اس نے سخت مایوسی کے ساتھ کپڑے واپس بیگ میں ڈالے اور زپ بند کردی۔ کچھ دیر وہ دوسرے بیگ کو دیکھتا رہا اور اپنی ہمت کے طیّارے کو خوابوں کی تعبیر کے آسمان تک اڑانے کے لیے جدوجہد کرتا رہا مگر اتنی طاقتِ پرواز وہ کہاں سے لاتا۔ چیونٹی کے پر نکل آئیں تب بھی وہ اس بلندی کو کہاں چھوسکتی ہے جہاں سے شاہین کی اڑان شروع ہوتی ہے۔

اسے کشمکش کے عذاب سے نجات دلانے اور یہ احساس دلانے کے لیے کہ ہم کتنے بھی غافل ہوں' خطرے کے وقت ہماری چھٹی حِس ہمیں بیدار کردیتی ہے' میں اٹھ بیٹھا۔

"کون... کون ہے؟" میں نے کہا اور ریوالور نکال لیا۔

وہ کھڑا ہوا ہی تھا کہ میری آواز پر اچھل پڑا۔ میں اندازہ کرسکتا تھا کہ اس کے دل کی کیا حالت ہوئی ہوگی۔ اس کا رنگ پیلا پڑگیا تھا اور وہ کانپنے لگا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ دھڑام سے گر کے بے ہوش ہوجائے گا۔

"تم.... یہ تم ہو" میں نے اطمینان اور خوش دلی کے ساتھ کہا "میں نے قدموں کی آہٹ سنی تو آنکھ کھل گئی۔ میں سمجھا کوئی چور آگیا اندر۔"

"چور.... چور.... کہاں سے آئے گا۔ میں.... میں اٹھا تھا" اس نے بڑی مشکل سے ہکلاتے ہوئے کہا اور اپنے خشک حلق کو تھوک نگل کے تر کیا "یہ دیکھیے.... دروازہ بند ہے۔"

"دروازہ بند ہے نا" میں نے کہا اور پھر لیٹ گیا۔

اس نے اقرار میں سرہلایا اور اپنی جگہ جا کے لیٹ گیا۔ اس کی حالت دیکھ کے مجھے افسوس بھی ہورہا تھا اور ہنسی بھی آرہی تھی۔ پیسہ بھی کیا چیز ہے۔ آدمی سے اس کا سب کچھ چھین سکتا ہے۔ اس کا انحصار طلب کی نوعیت اور شدت پر ہے۔ ضمیر اور ایمان' اپنی عزتِ نفس' غیرت اور حمیّت' عصمت وعفت سب کو حالات کی مجبوری شکست دیتی ہے تو انسان کے غرور کا آبگینہ یوں بک جاتا ہے جیسے مٹّی کا کوزہ۔

اس کے بعد میں اطمینان سے سوگیا۔ مجھے یقین تھا کہ ذرا سی دیر کے لیے ہوسِ زر پر جان دینے کے مرحلے سے گزرنے والا خود کو خوش قسمت سمجھ رہا ہوگا کہ وہ بال بال بچ گیا اور خدا کا شکر ادا کررہا ہوگا کہ وہ زندہ سلامت لیٹا ہے۔ اس کی لہو میں غرق' زخم خوردہ لاش اس بیگ کے قریب نہیں پڑی ہے جس میں اس کے لیے بدقسمتی کی آخری سند کے طور پر دستِ اجل کی تحریر کے سوا کچھ نہ تھا۔

صبح میں سب کے بعد اٹھا۔ رابعہ' نازو اور غالب میں سے کوئی بھی کمرے میں موجود نہ تھا۔ کاجل گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی تھی اور کلیم سو رہا تھا۔ بے اختیار میری نظر بیگ پر گئی۔ اس کی پوزیشن میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ عورتیں چولھے پر کچھ پکارہی تھیں اور ہمارے میزبان باپ اور بیٹے کے درمیان جنگ چل رہی تھی۔ وہ دبے دبے لہجے میں بات کررہے تھے مگر ان کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ ان میں اختلافِ رائے کی نوعیت معمولی نہیں۔

میں نے کاجل سے کہا "کاجل! تمہیں کیا ہوا؟"

اس نے سر اٹھا کے مسکرانے کی کوشش کی لیکن میں نے دیکھ لیا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو رکے ہوئے ہیں "کچھ نہیں۔"

میں نے کہا "تم کیوں ضرورت محسوس کرتی ہو جھوٹ بولنے کی؟ آخر اتنی بے اعتمادی کیوں؟"

"کون سا جھوٹ بولا ہے میں نے؟" وہ نظر چرا کے بولی۔

"تم اپنا دکھ چھپارہی ہو' ہم سب سے۔ ہمارے ساتھ ہوتے ہوئے بھی تم ہمارے ساتھ نہیں ہو۔ تم تنہا ہو' تم اپنی دنیا میں' اپنے احساس کی چتا میں جل رہی ہو اور یہ سمجھتی ہو کہ ہم سب اندھے' بہرے اور بے حس لوگ ہیں جو کچھ دیکھ نہیں سکتے یا دیکھتے ہیں تو پرائی آگ سے عمداً دور رہتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کاجل۔"

وہ رونے لگی "تم بتاؤ میں کیا کروں؟ کیسے خود کو تم جیسا سمجھوں؟ رابعہ اور نازو کے سامنے میرا دل چاہتا ہے کہ میں ڈوب کے مرجاؤں کسی گٹر میں۔ میرا تو سایہ بھی اتنا ناپاک اور گنہگار ہے۔ میں اپنا چہرہ نہیں دیکھ سکتی آئینے میں۔ اس پر مجھے خون ہی خون نظر آتا ہے۔ اپنے والدین کی قاتل ہوں میں۔ ایک آبرو باختہ لڑکی۔ میں کاجل کی قاتل ہوں جو ایسی ہی تھی' نازو جیسی اور رابعہ جیسی۔ مگر اب میرا وجود غلاظت سے بھرا ہوا ہے اور میں اس کو باہر نہیں نکال سکتی۔ کوئی مجھے پھر پاکیزگی کا غرور نہیں دے سکتا۔ اگر.... اگر کل کو میں نے محسوس کیا کہ میرے وجود میں گناہ کا ثمر پرورش پارہا ہے' میں بن بیاہی ماں بننے والی ہوں' تو میں کیا کروں گی؟ مجھے تو ابھی مرجانا چاہیے۔ لیکن میں کیا کروں؟ آج اس نے میرے لیے مرنا مشکل کردیا ہے۔ کلیم نے مجھے ماں بنالیا ہے حالانکہ یہ میرا بچہ نہیں ہے' کل اپنے بچے کو مار سکوں گی میں.... اور خود مرسکوں گی......"

میں نہیں جانتا تھا کہ میرا ایک سوال اتنے بڑے بارود کے ڈھیر میں چنگاری بن جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں کاجل کے ذہن کی اس سوچ کا تصوّر بھی نہیں کرسکتا تھا ورنہ میں یہ سوال کبھی نہ کرتا۔ جب اس نے سچ بولا تو اس کی تلخی نے مجھے مفلوج کردیا۔ یہ زہر تھا جس کا مزہ میں نے پہلے نہیں چکھا تھا۔ میں احمقوں کی طرح اس کی صورت دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ اس سے کیا کہوں؟

ہمارے میزبان باپ بیٹا اپنی لڑائی بھول کے ہماری طرف متوجہ ہوگئے تھے اور ہکا بکا بیٹھے تھے۔ میں نے تو بتایا تھا کہ ان عورتوں میں سے کوئی بھی میری بیوی نہیں مگر انہوں نے شاید میری بات کا یقین نہیں کیا ہوگا اور کچھ نہ سمجھنے کے باعث وہ سمجھے ہوں گے کہ ایک شوہر کی حیثیت سے میں نے کاجل پر کوئی ظلم کیا ہے چنانچہ وہ رو رو کے فریاد کررہی ہے۔

ان کی نظروں کے سوال کو دیکھے بغیر میں نے کاجل سے کہا "تم پاگل ہو کاجل۔ اتنا عرصہ ہوگیا تم کو ہمارے ساتھ اور ابھی تک تم نے اعتماد کا مطلب ہی نہیں سمجھا۔ کسی پر بھی بھروسہ نہیں کیا۔ مجھے یا غالب کو نہ سہی' رابعہ اور نازو کو تم عورت سمجھ کے اپنا دکھ بتا سکتی تھیں....."

"میں عورت نہیں ہوں' عورت کے نام پر گالی ہوں۔ جس عورت کی آبرو لٹ جائے اور جس کی وجہ سے گھر برباد ہو جائے' گھر والے مرجائیں' وہ عورت نہیں زہریلی ناگن ہے۔ طوائف بھی اپنا گھر تو نہیں اجاڑتی....." وہ روتے روتے بولی۔

میں نے برہمی سے کہا "مت کرو ایسی باتیں۔ تم ہم سب کے نزدیک اتنی ہی معصوم اور قابلِ احترام ہو جتنی ہر عورت ہوتی ہے' جتنی رابعہ اور نازو ہیں' میری ماں تھی اور بہن تھی۔ قابلِ نفرت وہ ہیں جو ظالم تھے۔ وہ شیطان تھے جنہوں نے تمہیں رسوا کرنے کی کوشش کی۔ رسوا وہ خود ہوئے۔ تم نے کچھ بھی نہیں گنوایا' انہوں نے اپنی انسانیت کا بھرم کھودیا۔"

"یہ سب باتیں ہیں' کھوکھلی باتیں' جو تم مجھے تسلی دینے کے لیے کرتے ہو۔"

"نہیں کاجل! یہ حقیقت ہے۔ تم مجھے اتنی ہی عزیز ہو جتنی رابعہ یا نازو ہیں۔ ہم سب میں سے کسی کی نظر میں تمہاری عزت کم نہیں ہوئی کیونکہ ظلم ہم سب نے سہا ہے۔ ہم سب مظلوم ہیں۔ ظلم کی نوعیت کچھ بھی ہو مگر ظلم سہنے والے ایک دوسرے کے زیادہ قریب ہوتے ہیں کیونکہ وہ ہمدرد ہوتے ہیں۔ اور یہ تم قبل از وقت کیسے اندیشوں میں مبتلا ہوگئی ہو؟ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ تم عزت آبرو کے ساتھ زندہ رہوگی' ہم سب کے درمیان۔ ویسے تو ہر گھر تمہارا گھر ہوگا لیکن سکندر بخت کا گھر تمہارے لیے ویسا ہی گھر ہوگا جیسا ماں باپ کا گھر تھا۔ اگر تم اپنے بھائی کے گھر کو اپنا گھر سمجھو۔ اس گھر میں تمہاری اتنی ہی عزت ہوگی' جتنی میری سگی بہن کی ہونی چاہیے۔ میں قسم کھانے کا عادی نہیں' جو میں کہتا ہوں وہ کرکے دکھاتا ہوں۔ تم دیکھوگی کہ میں نے آج تم سے جس رشتے کا عہد کیا ہے وہ کس حد تک حقیقی ہے۔"

کاجل نے آنسو بھری آنکھیں اٹھا کے مجھے بے یقینی سے دیکھا "آج کی بات تم کل بھول گئے تو....."

"میں نے کہا نا' وقت خود اس رشتے کی سچائی کا ضامن ہوگا۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ گل کیا تھی؟ ایک بدنامِ زمانہ ڈاکو شیش ناگ کی بہن ناگ منی۔ مرتے وقت اس ڈاکو نے اپنی بہن کو کسی تعلق یا تعارف کے بغیر ہمارے حوالے کردیا تھا۔ آج وہ گل بانو ہے اور جیسے اس نے ہمارا ساتھ دیا ایسے ہی ہم نے بھی اسے اعتماد کا سہارا دیا۔ اب وہ ہم میں سے ایک ہے۔ وہ اپنے ماضی کو بھول چکی ہے اور اسے کبھی احساس نہیں ہوا کہ اس کی حیثیت رابعہ یا نازو سے کم تر ہے۔ مجھے یقین ہے بالآخر وہ محسن کو بھی اپنی محبت سے جیت لے گی اور اس خلا کو بھی پر کردے گی جو شہلا کی موت نے محسن کے دل میں پیدا کردیا ہے۔ اب میں تمہارے ساتھ ظلم کرنے والوں سے اس ظلم کا حساب برابر کرنے کا وعدہ تو نہیں کرسکتا مگر یہ وعدہ ضرور کرسکتا ہوں کہ جب تک موت اس رشتے کی راہ میں حائل نہیں ہوگی' تم میرے گھر میں میری بہن کی طرح رہوگی۔ اس وقت تک جب تک میں خود تمہیں رخصت نہ کروں' اپنا گھر آباد کرنے کے لیے۔"

"لیکن....." اس نے فرطِ جذبات سے گلوگیر لہجے میں کچھ کہنے کی کوشش کی۔

"لیکن کیا۔ میں ہر ذمے داری قبول کرتا ہوں۔ نتائج کی پروا کیے بغیر۔ میں دنیا سے ڈرنے والا آدمی نہیں ہوں۔ خدا کے بعد میں کسی سے ڈرتا ہوں تو خود اپنے آپ سے' اپنے ضمیر سے۔ اگر میں تمہیں کسی بازار کے کوٹھے سے بھی اٹھا کے اپنے گھر لاتا اور بہن کہتا تو پھر بہن کی عزت بھی دیتا۔ تمہارے دامن کے ہر داغِ رسوائی کو تمہاری طرف اٹھنے والے ہر سنگِ ملامت کو اور ہر تیرِ دشنام کو میں قبول کرتا۔ تم تو مظلوم اور معصوم ہو۔"

وہ پھر رونے لگی "لیکن سکندر..... میں..... میں عورت ہوں جو مرد کے ظلم کا خمیازہ تمام عمر بھگتنے پر مجبور ہوتی ہے۔ اگر... خدانخواستہ....."

میں اس کا مطلب سمجھ گیا "اول تو کچھ ہوگا نہیں۔ اس وہم کو دل سے نکال دو۔ اور..... ہوا تو میں سمجھوں گا کہ میرے بھانجے کا بے غیرت اور بے ضمیر باپ اسے لاوارث چھوڑ کے چلا گیا' مرگیا۔ اس کی پرورش میں کروں گا۔ وہ ہم سب کے خاندان کا ایک فرد ہوگا۔ اسے کبھی احساس نہیں ہوگا کہ اس کا کسی سے خون کا رشتہ نہیں۔ ڈرنا چھوڑ دو کاجل۔ ظلم کا مقابلہ کرنا سیکھو' اعتماد کرنا سیکھو اور ہمارے ساتھ رہو۔ ہم سب مظلوم ہیں اور ہمارے درمیان یہ رشتہ خون کے رشتے سے زیادہ مضبوط ہے۔"

کاجل نے آنسو پونچھ لیے تھے "میں کوشش کروں گی۔"

"وعدہ کرو مجھ سے" میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کے کہا "تم آئندہ مرنے کا فضول خیال دل میں نہیں لاؤگی۔ تمہیں کس کی قسم دوں؟"

"میں وعدہ کرتی ہوں" وہ مسکرائی "قسم دینے کی ضرورت نہیں۔"

"نہیں۔ اس معصوم کی زندگی کی قسم کھاؤ" میں نے سوتے ہوئے کلیم کی طرف دیکھا "اس کے سر پر ہاتھ رکھ کے کہو کہ تم مجھے بڑا بھائی سمجھوگی۔ اپنے دکھ کو اپنی ذات تک محدود نہیں رکھوگی۔ اپنے ماضی کو بھول کر مستقبل میں یہ رشتہ نبھاؤگی۔ بہنوں کی طرح۔"

اس نے کلیم کے سر پر ہاتھ رکھا "میں..... قسم کھاتی ہوں۔"

دور بیٹھے ہوئے میزبانوں نے یہ منظر بڑی حیرانی سے دیکھا' ان میں سے کسی نے دخل اندازی نہیں کی تھی۔

میں نے کاجل سے کہا "یہ بات آج ختم ہوگئی' اسی وقت۔ اب دوبارہ نہیں ہوگی۔ کوئی مسئلہ ہو یا پریشانی ہو تو تم کسی سے بھی بات کرسکتی ہو۔ ہم سب ایک ہیں۔ ہر معاملے میں۔"

مرزا غالب نے دروازے میں نمودار ہو کے کہا "اٹھ گئے آپ۔ میں تو رابعہ کو تسلی دے چکا تھا کہ صبر کرے۔ اللہ نعم البدل دے گا۔"

میں نے کہا "بہت دیر سے سویا تھا میں۔"

"مجھے معلوم ہے۔ لوگ گھوڑے بیچ کے سوتے ہیں' تم خچر خرید کے سوئے تھے" غالب نے کہا۔

"اچھا تو تم جاگ رہے تھے' سونے کا ڈراما تھا۔"

"پہلے تو واقعی نیند آگئی تھی' بعد میں تمہاری باتوں سے آنکھ کھلی تھی۔"

میں نے کہا "وقت کیا ہوا ہے؟ ایسا لگتا ہے کہ دوپہر ہوگئی۔"

"میں بھی اٹھا تھا تو یہی سمجھا تھا۔ یہاں پہاڑوں پر سورج طلوع ہونے سے قبل ہی دوپہر ہو جاتی ہے۔ ابھی نو بجے ہیں۔ دو گھنٹے سے تو میں باہر بیٹھا تھا' اس وقت بھی اتنا ہی اجالا تھا۔"

"سردی بھی تو ہوگی؟"

"ہاں۔ مگر منظر اتنا حسین ہے باہر کہ مجھے احساس ہی نہیں ہوا۔ پھر رابعہ اور نازو آگئیں۔ ہم سب دم بخود بیٹھے رہے۔"

"کیا وہ ابھی تک دم بخود بیٹھی ہیں؟"

"تم دیکھو تو سہی باہر نکل کے" غالب نے کہا۔

باہر واقعی قدرت کا سارا حسن ایک سحر آفریں منظر بن کے پھیلا ہوا تھا۔ ایک طرف بادل تھے جو وادی کی گہرائی میں اترے ہوئے خزاں رسیدہ درختوں کی شاخوں پر اٹکے نظر آتے تھے۔ دوسری جانب برف پوش چوٹیوں پر دھوپ جگمگا رہی تھی اور اس کی خیرہ کن چمک انسان کے عزمِ تسخیر پر خندہ زن محسوس ہوتی تھی۔ پھر ہمالیہ کی سر بفلک چوٹیاں تھیں۔ اے ہمالہ' اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں۔ چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں۔ اس پُر ہیبت خاموشی اور سکوت میں مجھے اسی نظم کا آخری شعر بھی یاد آیا۔ ہاں دکھادے اے تصور پھر وہ صبح و شام تُو۔ دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تُو۔ یہ ہم سب کی آرزو تھی' دعا تھی۔ اور ہماری ساری جدوجہد پھر اپنے تصور کی صبح و شام تک رسائی کے لیے تھی۔ میں اور ہم سب اپنی پرانی زندگی کی طرف لوٹ رہے تھے۔ وطن کی زمین ہمیں کھینچ رہی تھی اور اپنے شہروں کی دلدار فضا کی یاد ہمیں پکار رہی تھی۔ اگر ہمارے بس میں ہوتا تو ہم راستے کی سب رکاوٹوں کو اڑ کے عبور کرلیتے۔ یہاں میں نے خود کو قدرت کے بہت قریب محسوس کیا اور میں نے دعا مانگی۔ وہ ایک خواہش تھی جس نے خود ہی دعا کا پیکر اختیار کیا۔ اس دعا کے لیے الفاظ کا وجود بے معنی ہوگیا لیکن میں اس یقین سے سرفراز ہوا جو بے اثر نہیں ہوتا۔

رابعہ اور نازو ایک چٹان کے ہموار حصے پر بیٹھی ہوئی تھیں جو دستِ قدرت کے تراشے ہوئے چبوترے کی طرح تھا اور کسی بے ستون چھت کی طرح آگے تک پھیلا ہوا تھا۔ یہاں سے سڑک مجھے سو گز دور نظر آئی۔ اس کا ایک حصہ دائیں جانب بلندی پر نظر آرہا تھا اور تھوڑا سا ٹکڑا بائیں طرف نشیب میں دکھائی دیتا تھا۔ باقی سڑک پہاڑوں کے نشیب و فراز میں گم تھی۔

میں نے کہا "مرزا جی! یہ سڑک تو خاصی دور ہے اس گھر سے۔"

غالب نے کہا "میں بہت پہلے حیران ہوچکا ہوں اس بات پر۔"

"رات تو ایسا لگا تھا کہ گھر بالکل سڑک کے ساتھ ہے۔ اتنی دور ہوتا تو ہم کیسے دیکھتے؟ جب یہاں سے سڑک دکھائی نہیں دیتی تو سڑک پر سے یہ گھر کیسے نظر آگیا تھا؟ وہ بھی رات کے اندھیرے میں۔"

"رابعہ اور نازو کا خیال ہے کہ ہم سے اندازے کی غلطی ہوئی تھی کیونکہ ہم تھکن' نیند اور سردی کے باعث اپنے حواس میں نہیں تھے۔ مگر میں یہ بات نہیں مان سکتا' مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہم سڑک پر چلتے جارہے تھے اور ہم نے اچانک یہ گھر دیکھا تھا۔ پھر وہ بوڑھا نکلا تھا لالٹین اٹھائے۔ جب ہم اس سے باتیں کررہے تھے تو تم کہاں کھڑے تھے؟ سڑک کے ساتھ ہی تو تھے۔"

"بالکل ٹھیک۔ مکان سڑک کے قریب تھا۔ زیادہ سے زیادہ دس گز کے فاصلے پر" میں نے کہا "یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔"

غالب نے کہا "میں سمجھا سکتا ہوں۔ آپ نے ایک معجزہ رونما ہونے کی دعا مانگی تھی۔ قدرت نے معجزہ دکھادیا۔ رات کو یہ مکان آگے آگیا تھا۔ جب ہم اندر داخل ہوگئے تو یہ پھر پیچھے اپنی اصل جگہ پر لوٹ آیا۔"

میں نے کہا "یار' یہ کیسے ہوسکتا ہے؟"

"جب انہونی کسی ناقابلِ فہم' ناقابلِ وضاحت اور ناقابلِ یقین وجہ سے ہونی بن جائے تو اسے معجزے کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا اور ایسے معجزے جب قدرت دکھاتی ہے تو انسان اپنی عقل کے منطقی استدلال سے ان کو کیسے سمجھ سکتا ہے۔ ہمارے میزبان کا آخری وارث صبح کہیں گیا تھا۔ میں نے دیکھا تو وہ اسی سمت سے آرہا تھا۔"

"جدھر ہم شیر کی لاش اور ٹرک چھوڑ کر آئے تھے؟"

"ہاں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ مارننگ واک کے لیے گیا تھا تو اس نے آہ بھر کے کہا کہ اپنی تو عمر گزر گئی جوتیاں چٹخاتے۔ اب اسے کوئی مارننگ واک کہے یا ایوننگ واک۔ واک واک آل دی ٹائم۔ تاہم اس سے میری صحت خراب ہو رہی ہے۔"

"اس کی مراد ذہنی صحت سے ہوگی۔"

"وہ خچروں کا بندوبست کرنے گیا تھا" غالب بولا "میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ پانچ چھ میل پیچھے خچروں' گدھوں' گھوڑوں کا ایک شوروم ہے جہاں ایک ہارس پاور کے گھوڑے' دو ہارس پاور کے خچر اور آدھے ہارس پاور کے گدھے ملتے ہیں۔ کرائے پر بھی اور سیکنڈ ہینڈ بھی۔"

"سیکنڈ ہینڈ؟"

"ہاں۔ ان کے اصل مالک یا تو ان راستوں پر سفر کے لیے خچر لیتے ہیں اور پھر قضائے الٰہی سے ملکِ عدم کے سفر پر چلے جاتے ہیں۔ ایسے گھوڑے اور خچر واپس آجاتے ہیں۔ کچھ ایسے ضرورت مند بھی ہوتے ہیں جو دور دراز سے یہ جانور چرا کے لاتے ہیں اور سو پچاس روپے میں بیچ جاتے ہیں۔ وہ ہر خچر یا گھوڑے کا زرِ ضمانت سو روپے رکھتا ہے۔ دس روپے روز کرایہ لیتا ہے۔ واپس آجائے تو ٹھیک ہے' نہ آئے تب بھی فائدہ۔"

میں نے حیرانی سے کہا "کرایہ صرف دس روپے؟"

"اس نیچر نے پانچ ہزار میں سودا کیا ہے تم سے؟" غالب بولا۔

"وہ بڑا استاد ہے۔ پانچ سو کے پانچ ہزار بنا لیے۔"

"ساڑھے پانچ۔ اس نے تو بچے کے بھی پانچ سو لگائے ہیں۔" میں نے کہا "میں کیا کرتا۔ مجھے ریٹ معلوم نہیں تھا اور میں منہ مانگی قیمت ادا کرنے کا وعدہ کر چکا تھا۔"

غالب نے مجھ سے اتفاق کیا "اس کی مدد کے بغیر ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ مردہ بدست زندہ۔ وہی واقف ہے یہاں کے راستوں سے بھی۔"

"کیا تمہاری اس سے بات ہوئی؟"

"ہاں۔ اس نے خود ہی سب بتا دیا' تم نے جو پروگرام بنایا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تم کہاں گئے تھے تو اس نے کہا کہ وہ پانچ چھ میل پیچھے گیا تھا۔ اسی سڑک پر لیکن کمال کی بات ہے کہ نہ اس نے کہیں کوئی شیر دیکھا جو سڑک پر مرا پڑا ہو' نہ اس نے کسی سے ایسی کوئی بات سنی۔ حالانکہ ایسا روز نہیں ہوتا۔ سڑک پر تو آج تک کبھی مردہ شیر کسی کو نظر نہیں آیا۔ زندہ شیر کبھی مل جاتے ہیں۔"

میں نے سوچ کے کہا "کمال ہے! کیا اس نے تم سے سوال کیا کہ تم شیر کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"اس نے پوچھا تھا" غالب بولا "میں نے کہا کہ جب ہم ادھر آ رہے تھے تو ہم نے دیکھا تھا۔"

"ممکن ہے کوئی اٹھا کے لے گیا ہو۔ شیر کی کھال اور چربی بہت قیمتی ہوتی ہے۔"

"اس نے ٹرک کا ذکر بھی نہیں کیا" غالب نے حیرانی سے سر ہلایا "پہاڑوں میں پھنسا ہوا ٹرک دیکھا تو ہوگا اس نے۔"

میرے کچھ کہنے سے پہلے میزبان نے ہانک لگائی اور اس کے نیچر بیٹے نے انگریزی میں چلانا شروع کیا "بریک فاسٹ۔ بریک فاسٹ" تو رابعہ اور نازو بھی اس تختِ شاہی سے اتر آئیں جس پر وہ یوگا کے انداز میں آلتی پالتی مارے خاموش بیٹھی تھیں۔

رابعہ نے کہا "کیسی خواب ناک جگہ ہے۔ جنت کی طرح لگتی ہے۔"

نازو نے کہا "واقعی۔ جی چاہتا ہے کہ آدمی یہیں رہ جائے۔"

غالب نے کہا "میری طرف سے اجازت ہے۔ یہ زندگی دنیاوی جنت میں گزار لو ورنہ مر کے تو جہنم رسید ہی ہونا ہے تم جیسے گنہگاروں کو۔"

"میں تو جہاں جاؤ گی تمہارے پیچھے جاؤں گی۔ چھوڑوں گی نہیں....."

"آخر ہے نا بھوت کی بچی" غالب نے آہستہ سے کہا۔

"کیا! تم نے پھر میرے ابا کو بھوت کہا" نازو نے مصنوعی غصے کا اظہار کیا۔

"ہاں ہاں۔ میرا سسر بھوت ہے۔ اب وہ تمہارا باپ ہو یا کسی اور کا میں نہیں ڈرتا کسی بھوت چڑیل سے" غالب نے چلا کے کہا۔

ہمارے میزبان بہت غریب لوگ تھے' پھر بھی ہماری مدارات کے لیے انہوں نے کچھ نہ کچھ بندوبست کر لیا تھا۔ غالباً صبح ہوتے ہی خچر کو اس کے باپ نے "شاپنگ" کے لیے بھیجا تھا۔ پتا نہیں کہاں سے وہ انڈے اور مرغیاں لایا تھا۔ ان غیر آباد نظر آنے والے پہاڑوں میں گدھوں' گھوڑوں کا شوروم اور "رینٹ اے ہارس" سروس دستیاب تھی تو کہیں کسی کا مرغی خانہ بھی ہوگا۔ آٹا دال بھی وہ کہیں سے تو لاتے ہی ہوں گے۔ مارکیٹ کا تصور تو یہاں محال تھا مگر ممکن ہے کوئی اپنے گھر میں سُپر اسٹور کھولے بیٹھا ہو۔ مہینے میں ایک بار کھٹمنڈو سے سپلائی لاتا ہو اور پورا مہینہ مقامی لوگوں کو فروخت کر کے دس گنا منافع کما لیتا ہو۔ خچر نے شاپنگ ٹرپ سے دُہرا فائدہ حاصل کیا تھا۔ وہ خچروں کے شوروم سے بھی معاملات طے کر آیا تھا۔

یہاں ناشتے کا تصور کھانے کی طرح تھا۔ انہوں نے موٹی موٹی روٹیاں تھوپ کے ہمارے سامنے رکھیں اور آدھی کچی پکی مرغی کے ساتھ ہی ابلے ہوئے انڈے بھی رکھ دیے۔ رات کو سبز چائے گڑ کے شیرے میں ملا کے ہمارے سامنے پیش کی گئی تھی۔ اس وقت بہت زیادہ دودھ اور سیاہ پتی والی چائے سفید چینی کے ساتھ ابال کے رکھی گئی۔ ہم نے خدا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے پیٹ بھرا اور دن کا باقی حصہ خوب صورت کوہساروں اور وادیوں کی دھوپ میں گھومتے گزرا۔ کاجل اب پہلے سے بہت زیادہ مطمئن تھی اور خوش نظر آ رہی تھی۔ وہ کلیم کے ساتھ تتلیاں پکڑنے کے لیے بھاگتی رہی۔ کچھ دیر نازو نے بھی اس کھیل میں شرکت کی' پھر نہ جانے کب وہ اور غالب غائب ہو گئے۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور کہا "رابعہ' یہ لیلیٰ مجنوں کے لڑنے کی آواز نہیں آ رہی ہے۔"

"وہ ہر وقت تو نہیں لڑتے" رابعہ مسکرائی۔

"جب روٹھے ہوئے ہوں تو واقعی نہیں لڑتے" میں نے کہا "کہیں واپسی کا راستہ نہ بھول جائیں۔ سارے پہاڑ ایک سے لگتے ہیں۔"

رابعہ نے کہا "وہ... وہ دیکھو' نازو کیا کر رہی ہے۔"

میں نے دیکھا تو نازو ایک سپاٹ تنے والے سیدھے درخت پر چڑھ رہی تھی اور غالب بے وقوفوں کی طرح مُنہ اٹھائے دیکھ رہا تھا۔

"کیا ہے یہ پاگل پن!" میں نے برہمی سے کہا "ایسے پُرخطر کھیل میں خواہ مخواہ چوٹ آگئی تو' اور اوپر جا کے کیا یہ سب کو بتانا چاہتی ہے کہ ہم یہاں ہیں۔"

ابھی وہ دس فٹ اوپر ہی گئی ہوگی کہ اس کا ہاتھ پھسلا۔ میرا سانس رک گیا۔ لیکن دوسرے لمحے غالب نے ہیرو بن کے دکھا دیا۔ اس نے نازو کو کیچ کر لیا۔ بلندی کم تھی اور نازو سب سے ہلکی پھلکی تھی پھر بھی غالب اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ وہ دونوں ایک ساتھ گرے اور پھر کپڑے جھاڑ کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ جب ان کی لڑائی شروع ہوئی تو میری جان میں جان آئی۔ اس کا مطلب تھا کہ سب خیریت ہے۔

رابعہ نے کہا "کیا ہم خچروں پر کھٹمنڈو جائیں گے؟"

"تمہیں کس نے بتایا؟" میں نے کہا اور اس کے ساتھ خودرُو قسم کے صحرائی پھولوں کی طرف چل پڑا جو ایک چٹان پر پھیلے ہوئے تھے۔

"مجھے غالب نے بتایا ہے۔ میں نے تو آج تک خچر پر سواری نہیں کی۔ اور ان پہاڑی راستوں پر......"

"بہت سے کام ایسے ہوتے ہیں جو آدمی زندگی میں پہلی بار کرتا ہے تو سمجھتا ہے' بہت مشکل ہوں گے لیکن وہ کر لیتا ہے۔ یہ سب کام جو ہم نے کیے' کیا یہ آسان تھے؟ پہلے کسی نے کیے تھے؟"

"اب ہمت نہیں رہی سکندر اور کچھ کرنے کی" وہ بولی۔

میں نے کہا "کیا غضب کرتی ہو۔ ابھی تو بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ اصل جہادِ زندگانی تو واپسی کے بعد شروع ہوگا۔ بینڈ باجے کے ساتھ۔"

وہ مسکرائی "یہ خواب تو پرانا ہو گیا۔"

"تعبیر تو نئی ہوگی" میں نے کہا۔

"پتا نہیں کیوں..... میرا یقین متزلزل ہو گیا ہے۔ حالانکہ ہم واپس گھر جا رہے ہیں مگر لگتا ہے' یہ سفر کبھی ختم نہیں ہوگا۔"

"اب تو بقول شاعر' چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز۔"

"چند روز! کتنے چند روز؟" اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "محسن اور گل پر رشک آتا ہے مجھے۔ کیسے پُھر سے اڑ گئے۔"

"دیر آید درست آید والی مثال پر غور کرو۔ ہم بھی بس پہنچنے ہی والے ہیں۔ ایک بار کھٹمنڈو پہنچ جائیں' پھر پاکستان پہنچنا کیا مشکل ہوگا۔ عین ممکن ہے ہمیں کسی فلائٹ میں جگہ مل جائے۔"

"ورنہ ہم قافلے کے ساتھ پیدل جائیں گے۔"

"یہ ضروری نہیں۔ وہاں سے گاڑیاں بھی مل جاتی ہیں" میں نے کہا۔

"سنا ہے وہ خوب لُوٹتے ہیں۔ دھوکے باز بھی ہیں جو سب کچھ چھین کے راستے میں مار ڈالتے ہیں۔"

میں نے کہا "بابا' تم کیوں بلاوجہ کے اندیشوں میں مبتلا ہو۔ ولاور اینڈ کمپنی جیسے دھوکے بازوں کے ہم نے چھکے چھڑا دیے تو ان چوروں' اٹھائی گیروں کی کیا حیثیت ہے ہمارے سامنے۔ محاذِ جنگ پر دشمن سے لڑ کر واپس آنے والے کا راستہ کتے روک سکتے ہیں؟ بھونکنے والے ہوں یا کاٹنے والے۔ بس تم کاجل کا خیال رکھو۔"

"کاجل کو کیا ہوا ہے؟" رابعہ نے کہا "وہ بہت اداس رہتی ہے۔"

میں نے کہا "وہ مرنا چاہتی ہے۔ کلیم ساتھ نہ ہوتا تو وہ کب کی خودکشی کر چکی ہوتی۔"

رابعہ دم بخود رہ گئی "خودکشی! وہ کیوں؟"

"مس رابعہ قاری! تم بہت اچھی ایڈووکیٹ ہو لیکن افسوس کہ تم نے اور نازو نے عورت ہو کے بھی عورت کے دکھ کو نہیں سمجھا۔ وہ احساسِ جرم و ندامت کی انتہا کو پہنچ کے یہ محسوس کرتی ہے کہ اس کا وجود ایک قابلِ نفرت چیز ہے۔ اس کی زندگی کے دامن پر صرف خون کے داغ ہیں اور اس رسوائی کے جو کاجل نے برداشت کی مگر ابھی ختم نہیں ہوئی۔"

رابعہ نے کہا "تم سے کچھ کہا ہے اس نے؟"

میں نے رابعہ کو اپنی اور کاجل کی ساری گفتگو بتا دی۔ وہ بے یقینی اور خوف کے ساتھ سنتی رہی اور میرے ساتھ چلتی رہی۔

"کب ہوئی یہ بات؟"

"آج صبح۔ اور اب ہم سب کے لیے یہ ایک چیلنج ہے کہ کاجل کی عزتِ نفس بحال ہو۔ خود اپنی نظر میں۔"

"جب تم نے ایک ذمّے داری قبول کر لی ہے تو ہم سب کی طرف سے بات ہو گئی" رابعہ نے کہا۔

"رابعہ! فرض کرو' بہ فرضِ محال ..." میں نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

رابعہ سمجھ گئی "کیا تم سمجھتے ہو..... کہ ایسے ماموں بننا مشکل ہوگا؟"

میں مسکرانے لگا "ماموں کے لیے کوئی مشکل نہیں۔"

"تو ممانی کے لیے کیوں ہوگا" وہ ہنسی اور شرمائی۔

شام کے سائے ڈھلنے لگے تو ہم واپس لوٹے۔ ہم سے پہلے غالب اور نازو واپس پہنچ چکے تھے۔

"یہ آوارہ گردی کی جگہ ہے؟" غالب نے مجھے ڈانٹا "کہاں پھر رہے تھے؟"

"نہیں۔ ہم تو درخت پر چڑھ کے گرنے کی پریکٹس کر رہے تھے" میں نے کہا "میں اندازہ کر رہا تھا کہ کتنی بلندی سے رابعہ کو کیچ کر سکتا ہوں۔"

"پھر کوئی بات نہیں۔ یہ تو آؤٹ ڈور اسپورٹس ایکٹیوٹی ہوتی ہے" غالب نے دانت نکال کے کہا۔

"اور اگر کیچ ڈراپ ہو جائے تو کیا ہوتا ہے؟"

"وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے" نازو بولی "اب اس کے بعد تو کسی اعتراض کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔"

میزبان نے ہماری فرمائش پر مٹی کے کوزوں میں سبز چائے پیش کی جو ہم نے باہر بیٹھ کے پی اور غروب ہوتے سورج کی زرنگار کرنوں کو ہمالہ کی برف میں گھُستا دیکھتے رہے۔

غالب نے کہا "وہ غالباً ماؤنٹ ایورسٹ ہے؟"

نازو نے فوراً اعتراض دائر کردیا "یہ کے ٹو ہے۔ نقشہ دیکھا ہے کبھی؟"

"تمہیں معلوم ہے جغرافیہ کسی مرد کا نام ہے یا عورت کا؟" غالب نے کہا "یہ ماؤنٹ ایورسٹ ہے۔ یقین نہیں تو میرے ساتھ چلو..."

"میں ہو آئی ہوں' یہ کے ٹو ہے" نازو بولی۔

میں نے کہا "اس بوڑھے کو زیادہ پتا ہوگا جس کی عمر انہی پہاڑوں میں گزری ہے۔ اس سے پوچھ لیتے ہیں۔"

بوڑھے نے باہر آ کے دیکھا اور بولا "یہ نانگا پربت ہے۔"

غالب نے سر کھجا کے کہا "اچھا وہ یہاں آگیا۔ پہلے کہاں تھا؟"

نازو نے کہا "پہلے تمہارے سر پر تھا۔ مانتے کیوں نہیں اپنی غلطی کہ یہ ماؤنٹ ایورسٹ نہیں ہے۔"

"غلطی تمہاری تھی جو اسے کے ٹو بتا رہی تھیں" غالب بولا۔

رات کو سردی بڑھنے لگی تو نیچے وادی میں گیدڑ اور بھیڑیے چیخنے لگے۔ میں نے سب کو گزشتہ رات کی ہر بات بتادی تھی چنانچہ میں نے اور غالب نے باری باری جاگنے اور سونے کا پروگرام بنالیا۔ ہمارے میزبان رات ہوتے ہی سو جانے کے عادی تھے۔ وقت گزارنے کے لیے یہاں سونا ہی سب سے اچھی اور واحد تفریح تھی۔ شہر میں تو خیر زندگی کے سب ہنگامے آدھی رات کے بعد بھی جاری رہتے ہیں مگر گاؤں بھی اب ٹی وی کی رونق سے محروم نہیں رہے۔ وہاں بھی سرِشام سونے کا تصور پہلے جیسا نہیں رہا۔ مگر اس ویرانے میں تو کوئی بات کرنے والا بھی نہ تھا۔

پہلے ہم اپنے میزبان سے اس کی تمام شادیوں کا احوال سنتے رہے۔ وہ مزے لے لے کر سب بتاتا رہا۔ اس کی تازہ ترین بیوی خاموشی سے سب سنتی رہی۔ اچانک اس نے ایک سوال کردیا۔

"میرے بیٹے نے تم سے شادی کی بات کی تھی۔ تین ہزار اگر بہت زیادہ ہیں تو دو ہزار دے دو۔ بہت اچھی لڑکی ہے میری بیٹی۔"

میں نے برہمی سے کہا "آخر تم اپنی بیٹی کو یوں کوڑیوں کے مول کیوں دینا چاہتے ہو؟ میں بتا چکا ہوں کہ یہ ناممکن ہے۔ تم مفت دو تب بھی۔"

وہ مایوسی سے بولا "میرا بیٹا واپس نہیں آئے گا' مجھے معلوم ہے۔ تم اس کو اتنا پیسہ جو دے رہے ہو۔ تم کو میرا خیال نہیں۔ وہ اس میں سے مجھے ایک پیسہ دینے کو تیار نہیں۔"

یہ سب گفتگو اسی ناخلف بیٹے کی معرفت ہو رہی تھی جو سمجھتا تھا کہ یہ اس کی خوش نصیبی ہے ورنہ آج تک وہ بد قسمت رہا۔ اس کے باپ کو بس ایک موقع ملا تھا جو اس نے اپنی بے وقوفی سے گنوادیا۔ وہ کہیں سڑک کے کنارے ایک پودا لگا رہا تھا کہ اُدھر سے شاہِ نیپال کی سواری گزری۔ نوشیرواں بادشاہ نے بھی ایک بوڑھے کو پھل دار پودا لگاتے دیکھا تھا تو پوچھا تھا کہ بڑے میاں' تمہاری اتنی زندگی تو رہی نہیں کہ اس درخت کا پھل کھاؤ۔ پھر یہ محنت چہ معنی دارد؟ اور پودا لگانے والے نے جو عاقلانہ جواب دیا تھا وہ آج تک کتابوں میں ملتا ہے کہ حضورِ والا' اس کا پھل میرے بعد آنے والے کھائیں گے۔ جیسے کہ میں نے گزر جانے والوں کی محنت کا پھل کھایا۔ شاہِ نیپال نے بھی اس کے قریب سواری روکی اور پوچھا کہ بڈھے' اس جنگل میں ایک پودا لگانے کا فائدہ؟ بڈھے نے سادگی سے جواب دیا کہ حضور' ایسے ہی کسی نے پہلا پودا لگایا ہوگا جہاں اب یہ جنگل ہے۔ بادشاہ کو یہ جواب اتنا پسند آیا کہ اس نے بوڑھے سے کہا کہ وہ چاہے تو شاہی محل میں مالی بن جائے۔ اس نے کہا کہ جناب مجھے تو مالی کا کام آتا ہی نہیں۔ شاہی سواری روانہ ہوگئی اور وہ بڈھا جو محل میں پہنچ جاتا تو شاید ہیڈ مالی بن جاتا اور اس کے بعد آنے والی نسلوں کے لیے خوش حالی کے سب دروازے کھول جاتا' اپنی راہ میں آجانے والی خوش نصیبی کے اس پہلے اور آخری موقعے کو ٹھوکر مار کے لوٹ آیا۔ اب اسے تقدیر سے گلہ کرنے کا حق حاصل نہیں رہا۔

رات کو سونے سے پہلے ہم نے اپنے وسائل کا جائزہ لیا۔ ہم سب کے پاس اپنے اپنے استعمال کے لیے اسلحہ تھا۔ صبح سے شام تک کے سفر میں کسی سے مقابلے کا امکان کم تھا مگر کسی بھی ممکنہ خطرے سے نمٹنے کے لیے پانچ بھرے ہوئے ریوالور کافی تھے۔ اضافی راؤنڈ بیگ میں تھے۔ فوجی وردیوں کی جیب میں سے نکلنے والی سب رقم ملا کے ہمارے پاس بیس ہزار نقد اور ایک لاکھ سے اوپر کی مالیت کے زیورات تھے جو کاجل اپنے ساتھ لائی تھی۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ صبح روانگی سے پہلے بڈھے کو خاموشی سے پانچ ہزار دے جائیں گے تاکہ اسے یہ گلہ تو نہ رہے کہ خوش نصیبی نے دستک اس کے دروازے پر دی تھی مگر جوان بیٹے نے اس سے یہ موقع بھی چھین لیا تھا۔ ہم کسی کی تقدیر نہیں بدل سکتے تھے۔ یہ صرف اپنے دل کے اطمینان کا سودا تھا۔ نہ یہ ممکن تھا کہ پانچ ہزار کو وہ کسی منافع بخش کاروبار میں لگائے اور باقی عمر آرام سے دال روٹی کھاتے گزار دے۔ یہاں کاروبار تھا ہی نہیں۔ اس سے یہ امید رکھنا بھی عبث تھا کہ وہ اس بچت کو آڑے وقت کے لیے سنبھال کر رکھ لے گا۔ اس سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ اگلے روز قافلے سے ایک اور اچھی سی بیوی خرید لائے۔

رات کو باپ بیٹوں کے درمیان اچھی خاصی جھڑپ ہوئی۔ میں اندازہ کر سکتا تھا کہ جھگڑے کا سبب وہی دولت ہوگی جو بیٹے نے ہتھیالی تھی۔ باپ اس میں سے اپنا حصہ طلب کر رہا ہوگا۔ جب معاملہ اس حد تک بڑھ گیا کہ بیٹے نے باپ کی داڑھی پکڑلی اور باپ نے بیٹے کو دھکا دیا تو میں نے مداخلت کی۔

"یہ کہتا ہے مجھے میرا حق دو۔ حق کی کیا بات ہے؟ میں نے سودا کیا اور ساری محنت میں کروں گا" بیٹے نے گویا باپ کے خلاف فردِ جرم عائد کرتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا "دیکھو' آخر وہ تمہارا باپ ہے۔ تم بیٹے ہو۔"

"میں اکیلا ہی تو اس کا بیٹا نہیں ہوں" وہ بولا "اور کس بیٹے سے حق مانگا اس نے اور کس نے یہ حق تسلیم کیا؟ اتنی بیٹیوں کی شادی کی اس میں سے میرا حق کبھی دیا؟"

"لاحول ولا قوۃ" میں نے کہا "اس میں بھی حق تھا تمہارا۔ پتا نہیں تم لوگوں کی اخلاقیات میں حقوق کیا ہیں اور فرائض کیا۔ تم کو لالچ نہیں کرنا چاہیے۔"

"لالچ میں کر رہا ہوں یا یہ بڈھا کر رہا ہے۔ اسے ایک پیسہ نہیں دوں گا میں۔" وہ بولا "اس دولت سے میں اپنی زندگی بناؤں گا۔ بڈھے کی زندگی تو گزر گئی۔"

میں نے کہا "کیا کرو گے تم اس دولت کا؟"

اس نے کہا "میں کھٹمنڈو میں مکان خریدوں گا۔ ایک کمرا مجھے کافی ہوگا۔ اور میں شادی کروں گا۔ میری مستقل ماہانہ آمدنی ہے۔"

"یعنی تم اب لوٹ کر نہیں آؤ گے؟"

"نہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں نیپال سے باہر چلا جاؤں۔ دہلی یا بمبئی" وہ بولا "میں تمہارے ساتھ کراچی چلا جاؤں اور پھر دُبئی۔"

"گویا بڑے اونچے ارادے ہیں" میں نے کہا "ایک بات بتاؤ۔ تم شہر میں رہتے ہو' پڑھے لکھے ہو۔ تم کو دہلی' کراچی اور دُبئی کا علم ہے۔ پھر کیا تم جانتے نہیں کہ عورتوں کی خرید و فروخت اخلاقی ہی نہیں قانونی جرم بھی ہے۔ مہذب لوگ اپنی بیویوں اور بیٹیوں کا سودا یا تبادلہ نہیں کرتے۔ یہ جہالت کی بیہودہ رسم ہے جو یہ ثابت کرتی ہے کہ ابھی تک آدمی محض حیوان ہے اور کمزور فریق یعنی عورت اس کی غلام ہے جسے وہ بیچ بھی سکتا ہے۔ ماں' بہن یا بیٹی کی حیثیت سے اس کی عزت کوئی نہیں۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو" وہ میری بات سن کے بولا "مگر ہمارا تعلق تبت کے ایک قبیلے سے ہے۔ ان علاقوں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ اچھی عورتیں باہر چلی جاتی ہیں۔ ذرائع معاش نہ ہونے کے برابر ہیں۔ خود شوہر بھی مجبور ہو کے یہی کرتے ہیں۔ گھر میں بیچنے کو اور کچھ ہوتا ہی نہیں۔"

"چنانچہ بیوی کو بیچ دیتے ہیں؟"

"آہستہ آہستہ اس علاقے میں عورتوں کی تعداد کم ہو رہی ہے۔ لوگ بچپن میں ہی ان کے پیسے کھرے کرنے لگے ہیں۔ جوان ہونے کا انتظار کون کرے۔ اس میں پرورش کا خرچ بھی بچ جاتا ہے۔"

میں نے افسوس سے کہا "اور ان بچیوں کو کون لے جاتا ہے؟ وہی بُردہ فروش جو انہیں دنیا کے بازاروں میں پہنچا دیتے ہیں۔ تمہیں معلوم ہے انجام کیا ہوتا ہے ان کا؟"

"نہیں۔ مجھے کیسے معلوم ہو سکتا ہے؟" وہ بولا "یہاں کے لوگ باہر نہیں جاتے۔ ایک عورت کے کئی شوہر ہوتے ہیں چنانچہ یہاں جنسی بیماریاں عام ہیں۔ سوزاک اور آتشک۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ لوگ مہینوں نہیں نہاتے۔ پانی نہیں ہے اور سردی بہت پڑتی ہے۔"

میں حیرانی سے ان انکشافات پر غور کرتا رہا۔ دنیا کے ہر خطّے میں لوگ الگ ہیں' ان کا طرزِ زندگی اور فلسفۂ اخلاق' سب الگ ہے اور شاید معاشی حالات کے تابع ہے۔ اس نظام کو بھلا کون بدل سکتا ہے۔

میں نے کہا "خیر اب تم اپنے بوڑھے باپ کو ایک خوش خبری سنادو۔ ہم جانے سے پہلے اس کو پانچ ہزار روپے دے جائیں گے۔"

وہ مجھے دیکھتا رہا جیسے میرا دماغ چل گیا ہو "پانچ ہزار دو گے! کس بات کے؟"

"بس مجھے رحم آرہا ہے اس پر۔"

"تم مجھے رحم کھا کے کچھ نہیں دو گے؟" وہ بولا "اس بوڑھے نے آخر تمہارے لیے کیا کیا ہے؟"

"کیا تو تم نے بھی کچھ نہیں ہے ابھی تک" میں نے غصے میں کہا' "ہم جس گھر میں ٹھہرے ہیں وہ تمہارا نہیں' تمہارے باپ کا ہے۔ اور تم یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ اس نے ہی تمہیں پیدا کیا تھا۔"

"مگر میں نے تو نہیں کہا تھا" وہ مظلوم لہجے میں بولا۔

میں نے اس کے جھانپڑ مارنے کی خواہش پر بڑی مشکل سے قابو پایا "تم ایک بیہودہ شخص ہو۔ مجھے زیادہ غصہ مت دلاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ میں اپنا ارادہ بدل دوں اور تمہاری جگہ اسے ساتھ لے جاؤں۔"

وہ سہم گیا "وہ..... تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔"

"کیوں نہیں کر سکتا؟ راستوں کا علم اسے تم سے زیادہ ہوگا۔ تم بھی ہمیں کندھوں پر بٹھا کے تو نہیں لے جاؤ گے۔" میں نے کہا' "ایک خچر پر وہ ہماری راہنمائی کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ میں تم کو زبردستی بھی لے جا سکتا ہوں' ایک پیسہ دیے بغیر۔ ایک گولی صرف ایک روپے کی ہوتی ہے۔ تم کیا پسند کرو گے' طے شدہ معاوضہ یا ایک گولی؟"

اس کی حالت غیر ہو گئی۔ وہ ایک دم میرے قدموں میں گر گیا اور میرے پاؤں پکڑ کے معافی مانگنے لگا۔ اس کا باپ بڑی دلچسپی سے یہ منظر دیکھتا رہا۔ پھر اٹھ کر میرے پاس آیا۔ میں نے بیٹے سے کہا کہ وہ مجھ سے نہیں' اپنے باپ سے معافی مانگے لیکن اسے ابھی نہ بتائے کہ ہم نے اسے بھی پانچ ہزار دینے کا فیصلہ کیا ہے۔

"مگر میں اپنا معاوضہ جانے سے پہلے لوں گا" وہ بولا "مجھے خچروں والے کو دینے ہوں گے۔ اس کے علاوہ میں تم پر اعتبار کرتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ تمہارا کیا ہے' کھٹمنڈو کے پاس پہنچ کے مجھے گولی مار دو۔"

میں نے کہا "ہم کسی کو دھوکا نہیں دیتے۔ جو وعدہ کرتے ہیں اس پر قائم رہتے ہیں مگر تمہارا ڈرنا بھی بجا ہے۔ معاوضہ تم کو روانگی سے پہلے ادا کر دیا جائے گا۔ یہ بتاؤ کہ اسے تم ساتھ رکھو گے یا کہیں دبا کے جاؤ گے؟"

وہ بولا "میں کچھ بھی کروں۔ تمہیں کیا؟"

میں نے ہنس کے کہا "ساتھ مت رکھنا ورنہ کوئی چھین لے گا۔ ہم خود ہی نکال لیں تمہاری جیب سے' تمہیں مارنے کے بعد۔"

"تم نے وعدہ کیا ہے....."

"ہاں۔ وعدہ تو کیا ہے لیکن فرض کرو کوئی ایسی بات ہو گئی' ہم نے کسی بات پر مشتعل ہو کے تمہیں گولی مار دی یا کوئی اور تمہارے پیچھے لگ گیا تو تمہاری جان بھی جائے گی اور یہ رقم بھی۔ خواہ تم اسے یہاں گاڑ کے جاؤ۔ وہ تمہارے کام تو نہیں آسکتی۔"

"پھر..... پھر میں کیا کروں؟" اس کی حالت غیر ہو گئی۔

"ہم پر اعتبار کرو۔ کھٹمنڈو پہنچ کے اپنا معاوضہ لینا" میں نے کہا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو" وہ بولا "مجھے تم پر اعتبار کرنا ہی چاہیے۔"

صبح جب میری آنکھ کھلی تو غالب جاگ رہا تھا۔ اس نے مجھے مطلع کیا کہ ٹرین آگئی ہے۔

"کون سی ٹرین؟" میں نے جماہی لے کر کہا۔

"دی میول ٹرین" اس نے کہا "باہر کھڑی ہے۔ اس میں سات بوگیاں ہیں۔"

میں ہنس پڑا "سات خچر آگئے ہیں۔"

"ہاں۔ آٹھواں ایک گدھا ہے جو انہیں لایا ہے" غالب نے کہا۔

"وہ گدھا اس ٹرانسپورٹ کمپنی کا مالک ہوگا" میں نے کہا' "بہت بڑا بزنس ہے اس کا۔ کیا اس کے سر پر سینگ ہیں؟"

"سینگ جیسی مونچھیں ہیں اس کی۔ وہ مجھے کوئی شریف آدمی نہیں لگتا" غالب بولا۔

"ظاہر ہے اس کا شرافت سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ وہ چوری کے گدھے' گھوڑے اور خچر خریدتا ہے۔"

"یہ بات نہیں۔ وہ ہمارے قافلۂ سالار سے کوئی بات کر رہا تھا۔ ان کی باتیں سن کے مجھے دل میں کالا محسوس ہوا۔"

میں نے کہا "تم باتیں سن کے سمجھ گئے؟"

"نہیں۔ سمجھا تو نہیں مگر دال میں کالا تو کسی کو بھی نظر آجاتا ہے" غالب نے عجیب منطق جھاڑی "اس کے لیے کسی خاص ...ان میں مہارت یا ڈگری کی ضرورت نہیں پڑتی۔"

"پھر تو میں بھی دیکھ لیتا۔ تم نے کیوں بتایا؟" میں نے اٹھتے ...ے کہا۔

یہاں پانی کمیاب تھا۔ عورتیں نہ جانے کہاں سے اور کتنی دور ...ے سر پر پیتل اور کانسی کی گاگریں رکھ کے پانی لاتی تھیں جو اتنا ہی ...تا تھا کہ کھانے پکانے اور پینے کو کافی ہو۔ ہاتھ منہ دھونے کا ...ریقہ یہ تھا کہ ایک کپڑے کو گیلا کر کے تمام ضرورت مند منہ پر ...رتے تھے پھر اسے خشک کپڑے سے رگڑ کر چمکا لیتے تھے۔ یا چلو بھر ...نی جو محاورے میں ڈوب مرنے کے لیے تو استعمال ہو سکتا تھا' منہ پر ...ر ہاتھوں پر لوشن کی طرح مل کے اور صاف کر کے فرض کر لیا جاتا ...ا کہ میل بھی صاف ہو گیا۔ نہانا تو امراء کی عیاشی تھی یا میّت کی ...ضرورت مگر یہ بات بھی میں اندازے کی بنا پر کہہ رہا ہوں' نہ میں نے ...سی امیر کو نہاتے دیکھا تھا' نہ کوئی میّت دیکھی تھی۔

وہ ہماری منہ دھونے کی فضول خرچی سے ضرور پریشان ہوں ...گے حالانکہ میں نے صرف ایک مگ پانی سے منہ اور آنکھوں پر ...چھینٹے مارے تھے تاہم ان کے لیے یہ مقدار اتنی تھی کہ پورے ...خاندان کو کافی ہوتی۔ میں باہر آیا تو ٹرین واقعی پلیٹ فارم پر موجود ...تھی۔ خچر ٹرین کے ساتوں خچر ایک قطار میں اِستادہ تھے اور منتظر لگتے تھے کہ ہم انہیں شرفِ باربرداری بخشیں۔ سمور کی ٹوپی اوڑھے' ...منہ کے گرد مفلر لپیٹے' لنڈے کی گرم پتلون اور کوٹ پہنے ایک شخص ...خچر ٹرین کے قریب کھڑا تھا اور ہمارے قافلۂ سالار سے کسی اختلافی ...موضوع پر بحث کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر دونوں چپ ہو گئے۔ دنیا فساد کے بنیادی اسباب میں زر' زمین اور زن کو شمار کرتی ہے۔ زمین ...یہاں صرف خدا کی تھی اور وہ بھی برف پوش پہاڑوں کی شکل میں۔ ...زن پاؤں کی جوتی یا تن کے کپڑوں سے بھی گئی گزری چیز تھی۔ اپنے ...ہوتے کپڑے نہ کوئی کسی کو بیچتا تھا نہ کسی سے بدلتا تھا۔ اس کے ...برعکس زن سکہ رائج الوقت کے عوض قابلِ فروخت اور قابلِ ...تبادلہ چیز تھی۔ قطع نظر اس سے کہ وہ خریدار یا فروخت کرنے ...والے سے کیا رشتہ رکھتی ہے چنانچہ اختلاف کا واحد سبب زر تھا۔

ہمارے میزبان کا بیٹا اپنے قول و فعل سے ثابت کر چکا تھا کہ ...پیسہ اس کے نزدیک تمام رشتوں سے افضل اور اہم تر ہے اور خود ...اپنے باپ کے ساتھ وجہ نزاع یہی پیسہ تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اس کا ...خچر ٹرین چلانے والے سے کسی اور مسئلے پر اختلاف نہیں ہو سکتا۔ ...ان کی اچانک خاموشی نے غالب کے خیال کی تصدیق کی اور مجھے بھی دال میں کالا نظر آنے لگا۔ خچر لانے والے نے آگے بڑھ کے اور مفلر سے منہ برآمد کر کے مسکراہٹ کا نمونہ دکھایا اور مجھ سے ہاتھ ملا کے بولا "پلیز ڈ ٹو میٹ یو سر۔"

قافلۂ سالار فوراً وہاں سے کھسک گیا "مجھے روانگی کا انتظام کرنا ہے۔"

میں نے کہا "تمہارا کیا نام ہے؟"

"ہوشنگ مترّ" وہ بولا "میں ایک بزنس مین ہوں اور یہاں آنے والے سیاحوں کی خدمت کرتا ہوں۔ آپ میرے گیسٹ ہاؤس میں بھی ٹھہر سکتے تھے۔ میں نے ایک کمرا مہمانوں کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ آپ کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہوتی۔"

"تمہیں ہمارے نہ ٹھہرنے سے ضرور تکلیف ہوگی۔ ہم تو یہاں بہت آرام سے رہے" میں نے اس کے تبتی بنگالی قسم کے چہرے کو غور سے دیکھ کر کہا جس پر خوشامدانہ مکاری یوں نظر آتی تھی جیسے روئے آب پر کائی۔ "کیا بزنس ہے تمہارا؟ چوری کے خچر اور گھوڑے خریدنے کے علاوہ۔"

وہ پہلے جھینپا پھر بے شرمی سے ہنسنے لگا "میں سب کچھ بیچتا ہوں۔"

"مثلاً اپنی پرائی بیوی بیٹی؟" میں نے کہا "سگریٹ ہوگی تمہارے پاس؟"

"یس سر" اس نے اوورکوٹ کی تھیلا نما جیب میں ہاتھ ڈال کے کیپسٹن کے دو پیکٹ برآمد کیے "دس روپے ایک پیکٹ کے صرف۔"

"صرف؟" میں نے کہا "چور بازاری کرتے ہو۔"

وہ منمنانے لگا "غریب آدمی اتنی محنت اور بہت دور سے کوئی چیز لائے اور چار پیسے کمائے تو یہ چور بازاری۔ اور فائیو اسٹار ہوٹل میں اس سے زیادہ کوئی وصول کرے تو جائز۔ آپ تو جانتے ہیں سر! قیمت ہمیشہ ضرورت کی ہوتی ہے۔ یہاں پچاس میل کے علاقے میں آپ کو یہ سگریٹ نہیں ملے گی۔"

میں نے سگریٹ کے پیکٹ لے لیے "پھر ٹھیک ہے۔ اور کیا مال لائے ہو؟"

اس نے دوسری تھیلا ٹائپ جیب میں ہاتھ ڈالا اور کافی کا ایک چھوٹا ٹن نکالا "ففٹی روپیہ سر۔ آنلی۔"

پہلے میں نے سوچا کہ انکار کردوں۔ وہ شخص واقعی بزنس کرنا جانتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ادھر آنے والے سیاح کیا مانگ سکتے ہیں۔ کافی اس سرد علاقے میں سب سے زیادہ کار آمد چیز تھی۔

"اور یہ پنیر سر" اس نے جیب سے دوسرا ڈبّا برآمد کیا "ٹِرس فارون ہنڈرڈ آنلی۔"

میں نے کافی لے کر اسے سو کا نوٹ دیا "ستّر روپے کاٹو' باقی مجھے واپس کردو اور اپنی دُکان سمیت دفع ہو جاؤ۔"

"چاکلیٹ' بسکٹ دس روپے....."

میں نے کہا "تیس روپے واپس کرو۔"

اس نے مایوسی سے سر ہلایا جس کا مطلب یہ تھا کہ تیس روپے وہ کیسے واپس کرے۔ اس کے پاس چینج نہیں ہے۔ یہ بھی اس کی عیاری تھی۔ اب میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا

کہ باقی تیس روپے کی خریداری کروں یا پھر خریدا ہوا مال واپس کردوں اور نوٹ لے لوں۔

"قاریو۔ آئلی فقتی" اس نے پنیر کے ڈبّے کی قیمت ایک دم آدھی کردی۔

میں نے ڈبّا لے کر کہا "چلو حساب برابر۔ اَب جاؤ۔"

اس نے فریاد کی "تھونٹی مور سر۔"

میں نے اس کی ایک نہیں سنی اور اندر چلا گیا۔ وہ میرے پیچھے شور مچا کے یہ ظاہر کرتا رہا کہ وہ لٹ گیا ہے اور میں نے اس کو معاشی طور پر تباہ کردیا ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ ان تینوں چیزوں کی مجموعی قیمت تیس روپے بھی نہیں تاہم اس کا احتجاج کرنا بھی جائز تھا۔ جن چیزوں پر وہ سات آٹھ سو فیصد منافع لینے کا عادی تھا ان پر اسے تین سو فیصد کا منافع بھی نہیں ملا تھا۔

ناشتے کے بعد ہم نے کافی پی تو مجھے بڑا عجیب سا لگا۔ قدرت کی معجزہ نمائی کا سلسلہ ابھی تمام نہیں ہوا تھا۔ جہاں چائے کی خواہش کرنا بھی پاگل پن سمجھا جاتا' وہاں کافی مل گئی تھی۔ سگریٹ' پنیر' چاکلیٹ اور بسکٹ بالکل ایسے ہی تھے جیسے بنی اسرائیل کے لیے من وسلویٰ۔ آسمان سے اترنے والی نعمتوں کی طرح۔ خدا کی دین ہے کہ موسیٰ آگ لینے گئے تھے تو پیغمبری مل گئی تھی۔ ہمارے میزبان کافی سے ناواقف تھے۔ کافی بنانے کا طریقہ انہیں نازو نے سمجھایا۔ وہ خاصے حیران ہوئے کہ ہم نے اپنے پانی میں کافی اور چینی گھول کے وہ تلخ مشروب پی لیا جو انہیں بہت بدذائقہ اور کڑوا لگا تھا۔ کلیم نے اور کاجل نے چائے کو ترجیح دی۔ پنیر نے ناشتے کی رونق بڑھادی تھی۔ اچھی طرح پیٹ بھرنے کے بعد اور دو دو کپ کافی کے پی کر ہم سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ رات بھر آرام کرنے کے بعد ہماری جسمانی توانائی اس حد تک بحال ہوچکی تھی کہ ہم پیدل بھی سفر کرسکتے تھے تاہم خچر ٹرین تیار تھی اور بار بار وسل دے رہی تھی۔

باقی لوگ باہر نکل گئے تو میں نے بوڑھے سے ہاتھ ملایا اور اسے پانچ ہزار روپے پیش کیے۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ میں نے شکر گزاری کے ساتھ اصرار کیا تو اس نے بڑی عجلت میں رقم چھپالی اور باہر کی طرف اشارہ کرکے کچھ کہنے لگا۔

میں سمجھ گیا "تمہارا مطلب ہے' اس کو نہ بتاؤں؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا اور اشاروں کی زبان سمجھ لی۔ اس کی بیوی اور بیٹی کو بالکل خوشی نہیں ہوئی تھی۔ وہ تو خود بھی بوڑھے کی کرنسی تھیں۔ شاید بیوی کو الٹا افسوس ہوا ہو کہ اب وہ زیادہ اچھی اور مہنگی بیوی لائے گا اور اسے اونے پونے بیچ ڈالے گا۔ بیٹی کو ایک دن جانا ہی تھا۔ جو روٹی کپڑا دے وہی شوہر' وہی آقا۔

باہر عجیب افراتفری تھی۔ بالکل ٹرین پر سوار ہونے والے مسافروں کی طرح۔ میں نے پوچھا تو پتا چلا کہ مسئلہ کلیم نے اور کچھ رابعہ نے پیدا کیا تھا۔ رابعہ خچر پر بیٹھنے سے ڈرتی تھی۔ غالب نے تجویز پیش کی کہ وہ میرے ساتھ بیٹھ جائے تو خچر کا مالک نہیں مانا۔ خ ان پہاڑی راستوں پر ڈبل سواری کے لیے نہیں بنائے گئے تھے۔ ان کے تو رِنگ پِسٹن بیٹھ جائیں گے' بال بیرنگ جواب دے جائیں گے۔ کلیم کو آدھی سواری کے طور پر کاجل کے ساتھ فٹ کردینے سے ایک خچر بچ گیا تھا۔ اگر رابعہ میرے ساتھ بیٹھ جاتی تو مالک کا مزید نقصان ہوتا۔ سب دو دو جاتے تو تین خچر فالتو ہوجاتے اور واپس کردیے جاتے۔ اس کے سوا پریشانی کی بات کوئی نہیں تھی۔ گھوڑے پر دو افراد آسانی سے سفر کرتے ہیں اور خچر تو ایجاد ہی وزن ڈھونے کے لیے ہوا تھا۔ جیسے میدانوں میں کار چلتی ہے تو پہاڑی پر فور وھیل ڈرائیو جیپ کام آتی ہے۔ مجھے یقین تھا کہ خچر بھی فور وھیل ڈرائیو کی طرح کارآمد ثابت ہوگا۔ عیار آدمی کو عیاری سے ہی شکست دی جاسکتی ہے۔

میں نے کہا "تمہارے خچر واقعی بہت کمزور ہیں۔"

"لیس سر۔ اگر ان پر دو آدمی بیٹھ گئے تو ان کی کمر ٹوٹ جائے گی۔" اس نے میری منصف مزاجی سے متاثر ہوکے کہا۔

"اور خچر کی کمر ٹوٹی تو سواروں کا کیا ہوگا؟ ممکن ہے ان کی بھی کمر ٹوٹ جائے یا ٹانگ ٹوٹ جائے۔" میں نے کہا "نہیں' ہم یہ رسک نہیں لے سکتے۔ ایک خچر پر ایک ہی سوار ہوگا۔"

"یعنی دو خچر اسپیئر ہوں گے؟" غالب نے کہا۔

"اچھا ہے نا۔ جو خچر پنکچر ہوا اسے وہیں چھوڑ دیں گے" نازو بولی۔

رابعہ نے مجبوری میں میرے فیصلے کو قبول کرلیا تھا۔ وہ غالب کی مدد سے سوار ہوئی۔ اس یقین دہانی کے بعد کہ خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔

"اول تو یہ سب سے شریف اور وضع دار خچر ہے۔ تم دیکھو اس کی آنکھوں میں مُروت ہے" غالب نے کہا "اور اس کی صورت پر غور کرو۔ بالکل میری طرح معصوم اور مظلوم نظر آتا ہے کہ نہیں ... اسے کسی کیریکٹر سرٹیفکیٹ کی ضرورت نہیں۔ یہ شوہر سے زیادہ تمہارے اشارے پر چلے گا۔ میڈیکل چیک اپ میں ہر چیز دیکھ لی ہے میں نے۔ چاروں پہیئے میرا مطلب ہے چاروں ٹانگیں بالکل ٹھیک لگی ہوئی ہیں۔ کوئی امکان نہیں کہ راستے میں ایک نکل جائے۔ یہ مکمل آٹومیٹک خچر ہے۔ یعنی اپنی مرضی سے چلتا ہے' اپنی مرضی سے دوڑتا ہے اور اپنی مرضی سے رکتا ہے۔ تم کو بالکل فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ جہاں گرانا ہوگا یہ خود ہی گرادے گا۔"

گھبرائی ہوئی رابعہ بھی اس کی باتوں پر ہنس پڑی۔ نازو اور کاجل تو پہلے ہی اپنے اپنے خچر پر بیٹھی مزے لے رہی تھیں۔

میں نے خچر ٹرین کے مالک سے کہا "اب تم کو کس کا انتظار ہے؟ ہم اور کچھ نہیں خریدیں گے۔ تم جاتے کیوں نہیں؟"

اس نے گھبرا کے کہا "چلا جاؤں گا سر۔ تھوڑی دیر بعد۔"

میں نے کہا "تم ہمارے ساتھ کیوں نہیں چلتے؟ یہ خچر تم سے مانوس ہوں گے۔ واپسی میں ایک آدمی سب کو کیسے لائے گا؟"

اس نے کہا "لے آئے گا۔ میں ساتھ نہیں جاسکتا۔"

میں نے کہا "میں ایک ہزار دوں گا۔ کل تک تم واپس آسکتے ہو۔ کیا دو دن میں یہاں بیٹھ کے تم ایک ہزار کمالو گے؟"

اس نے بوڑھے کے بیٹے یعنی ہمارے قافلۂ سالار کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا اور اس نے نظر بچا کے اشارہ کیا کہ انکار کردو مگر میں نے دیکھ لیا۔ وہ چوری پکڑے جانے پر بوکھلا گیا۔

"تم کو کیا اعتراض ہے؟" میں نے کہا۔

"مجھے... نہیں... اس کی اپنی مرضی ہے" وہ بولا۔

"میری مرضی نہیں ہے" ہوشنگ بولا۔

میرا شک پختہ ہوگیا کہ وہ ہماری روانگی کے بعد کچھ کرے گا۔

"اگر میں تم کو دو ہزار دوں؟"

اس نے پھر اجازت طلب نظروں سے دوسری طرف دیکھا۔ اس کی مزاحمت کمزور پڑتی جارہی تھی اور وہ مشکل میں پڑ گیا تھا۔ ہمارے قافلۂ سالار نے دوبارہ اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں انکار کرنے کا اشارہ کیا اور مجھ سے مخاطب ہوگیا "اس کو چھوڑو' یہ بے کار آدمی ہے۔ ہمیں فوراً روانہ ہوجانا چاہیے۔"

میں نے سر ہلایا اور اپنے خچر پر سوار ہوگیا جو دوسرے نمبر پر تھا۔ میرے پیچھے ترتیب وار نازو' پھر رابعہ' کاجل' کلیم اور آخر میں غالب تھا۔ تھوڑا سا فاصلہ طے کرنے کے بعد میں نے غالب سے کہا کہ وہ آگے آجائے۔ میں سب سے پیچھے ہوگیا۔

"تم لوگ آہستہ آہستہ چلو' میں آتا ہوں۔"

قافلۂ سالار نے گھبرا کے کہا "کیا بات ہے؟ تم واپس کیوں جارہے ہو؟"

"ایک چیز بھول آیا ہوں میں" میں نے کہا اور خچر کو موڑ لیا۔

"ٹھہرو' میں لے آتا ہوں۔ مجھے بتاؤ کیا چیز ہے؟" وہ میرے پیچھے آیا۔

غالب نے اس کا راستہ روک لیا "فکر مت کرو۔ وہ راستہ بھول نہیں سکتا۔ ابھی تو ہم چند قدم دور ہی آئے ہیں۔"

میں ابھی بوڑھے کے گھر سے دور ہی تھی کہ مجھے اس کے چیخنے چلّانے کی آواز آئی۔ میں نے خچر کو روک کے چھلانگ لگائی اور دوڑ کر اندر گیا تو ایک دم خاموشی ہوگئی۔ ہوشنگ جو بوڑھے کے سینے پر سوار تھا اور اس سے پانچ ہزار چھین چکا تھا' مجرم کی طرح کھڑا ہوگیا۔

میں نے کہا "یہ رقم واپس کردو ہوشنگ۔"

اس نے بدحواسی میں کہا "یہ... بڈھا... میرے پاس امانت رکھوانا چاہتا تھا تاکہ محفوظ رہے۔"

"بڈھے کو چھوڑو۔ اپنی حفاظت وہ جیسے چاہے کرے۔ تم ہمارے ساتھ چلو۔"

"کیا... میں نے پہلے بھی بتایا تھا" اس نے رقم واپس کرکے برہمی سے کہا "میں تمہارے ساتھ نہیں جاسکتا۔"

"تم کو ساتھ جانا پڑے گا۔ میں تم سے درخواست نہیں کررہا ہوں' تمہیں حکم دے رہا ہوں۔"

"اور اگر میں یہ حکم نہ مانوں؟ میں پابند نہیں ہوں۔"

میں نے اسے گردن سے دبوچ لیا اور دروازے کی طرف دھکیلا "میں تم کو پابند کرلوں گا۔ چلو' تمہارے بغیر خچر بھی ڈپریشن کا شکار ہیں اور تمہیں بہت یاد کررہے ہیں۔"

میں نے دوبارہ بوڑھے کو خدا حافظ کہا جو اپنی رقم مل جانے کے بعد بھی پریشان کھڑا تھا۔ اس کی بیوی اور بیٹی کو نہ اس کے دولت مند ہونے کی خوشی تھی نہ اس کے لٹنے کا غم۔ وہ خاموش تماشائی کی طرح ایک طرف سہمی سہمی بیٹھی تھیں۔

ہوشنگ سمجھ گیا تھا کہ وہ مزاحمت نہیں کرسکتا۔ باہر آتے ہی اس نے ہاتھ جوڑ کے معافی مانگنا اور منت سماجت کا ڈراما شروع کیا "آپ سمجھے' میں اس کو لوٹ رہا تھا سر! ہرگز نہیں۔ اس علاقے کے سب لوگ میرے پاس رقم رکھواتے ہیں۔ میں سب کو ضرورت پڑنے پر ادھار بھی دیتا ہوں۔ مجھے معاف کرو اور جانے دو۔"

اب میں نے اسے اٹھا کے خچر کی طرف پھینکا۔ وہ نیچے گرا ہی تھا کہ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے ایک جھٹکا دیا تو وہ اڑتا ہوا خچر پر جا گرا "چلو سیدھے بیٹھو ورنہ میں یہ رسی تمہارے گلے میں ڈال دوں گا اور تمہیں خچر کے ساتھ دوڑاتا ہوا لے جاؤں گا۔"

خوف سے اس کی حالت خراب ہوگئی۔ وہ سنبھل کے سیدھا بیٹھ گیا "سر' میں نے بڑی غلطی کی......"

"ہاں۔ تم نے پیدا ہوکے بہت غلطی کی" میں اس کے پیچھے بیٹھ گیا "پھر تم نے زندہ رہ کے غلطی کی۔ تم نے ہم سے جھوٹ بول کے غلطی کی کہ یہ خچر دو افراد کا بوجھ نہیں اٹھاسکتے۔ دیکھو ہم اس پر سوار ہیں اور خچر کوئی احتجاج نہیں کررہا ہے۔ تمہاری آخری غلطی میں نے وقت پر پکڑلی ورنہ تم اس بڈھے سے سب کچھ چھین لیتے لالچی آدمی۔ اب اگر تم نے مجھ سے جھوٹ بولا تو یہ غلطی تمہیں مہنگی پڑے گی۔ میرے ہر سوال کا جواب تمہیں سچ دینا ہوگا۔ سمجھے!"

اس نے بڑی مجبوری میں سر ہلایا "ہم سچا آدمی ہے سر۔"

"سچے آدمی! یہ بتاؤ کہ تم کو اس حرکت پر کس نے اکسایا تھا؟ کیا اس کے بیٹے نے کہا تھا کہ میرے جاتے ہی باپ کو لوٹ لینا؟"

"ہاں۔ اس نے مجبور کیا تھا ورنہ میں لالچی نہیں ہوں۔"

"تو تم یہ کام دوستی میں کررہے تھے یا ثواب کی خاطر؟ تم کو اس کارِ خیر کا کوئی اجر نہیں لینا تھا۔" میں نے کہا "جھوٹ! تم جھوٹ بول رہے ہو نا؟"

میں نے پیچھے سے ہاتھ ڈال کے اس کی گردن کو بازو کے شکنجے میں کس لیا۔ اس کا سانس رک گیا اور وہ تڑپنے لگا۔ میں نے ایک ہاتھ سے خچر کو قابو میں رکھا اور اس کا سر پیچھے موڑنے لگا "ابھی تمہاری گردن ٹوٹ جائے گی۔ تمہاری لاش کو میں نیچے پھینک دوں

گا اور چلا جاؤں گا۔ مجھے کون پکڑے گا؟ تمہاری لاش کو آج رات ہی بھیڑیے اور جنگلی درندے کھا جائیں گے ہڈیوں سمیت۔"

میں نے اسے اچھی طرح دہشت زدہ کہنے کے بعد تھوڑی سی مہلت دی۔ وہ لمبے لمبے سانس لینے لگا اور ہاتھوں سے گردن کو ملنے لگا۔ اسے یقین آچکا تھا کہ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ کرکے بھی دکھا سکتا ہوں۔

اب ہم اپنے باقی ساتھیوں کے پاس پہنچ گئے تھے۔ وہ ابھی تک وہیں موجود تھے جہاں میں نے انہیں چھوڑا تھا۔ ہوشنگ کو میرے ساتھ دیکھ کر قافلۂ سالار کی حالت غیر ہوگئی۔

"اب بتاؤ' تم کو کس نے مجبور کیا تھا؟" میں نے ہوشنگ کو نیچے گرا دیا "تم نے جس کا نام لیا تھا وہ سامنے ہے۔"

ہوشنگ نے دو جھانپڑ کھا کے سب قبول دیا "اس نے مجھے کہا تھا' میرے باپ کے پاس پانچ ہزار ہیں۔ وہ چھین لینا۔ آدھے تمہارے' آدھے میرے۔"

"کیا اسے ڈر نہیں تھا کہ تم ساری رقم مار جاؤ گے؟"

"اس نے مجھے بتا دیا تھا کہ وہ واپس نہیں آئے گا۔ اس نے مجھے کرایہ نہیں دیا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ وہ اپنے حصے کی رقم سارے خچر بیچ کر پوری کرلے گا۔ اور..... باقی کے دو ہزار..... اس نے کہا تھا کہ تم میری بہن کو لے جانا اور اس سے شادی کرلینا۔ حساب برابر ہو جائے گا۔"

"یہ جھوٹ بولتا ہے" قافلۂ سالار چلایا "میں نے اسے کچھ نہیں کہا تھا۔"

"پھر اسے کیسے معلوم ہوگیا تھا کہ تمہارے باپ کے پاس پانچ ہزار ہیں؟" میں نے کہا "یہ وہاں کیوں آیا تھا؟"

"ہم سگریٹ کافی لایا تھا سر......"

میں نے اس کے سر پر مکا مارا۔ وہ چکرا کے گرا اور پھر کھڑا ہو کے رونے لگا "آپ مجھے کیوں مارتے ہیں سر؟ اس نے مجھے منع کیا تھا کہ آپ کے ساتھ نہ جاؤں۔ میں تو راضی تھا۔ آپ مجھے دو ہزار دے رہے تھے۔ اس کے باپ سے مجھے ڈھائی ہزار ملتے۔"

میں نے کہا "اگر نہ ملتے تو تم کیا کرتے' اسے مار ڈالتے؟"

ہوشنگ نے اعترافِ جرم کے طور پر سر جھکا لیا۔ ہماری توجہ اس کی طرف پا کے دوسرے ملزم نے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ ہوشنگ کے بیان کے بعد بارِ جرم اس پر آگیا ہے۔ اس نے اچانک اس خچر کے ساتھ ایک انتہائی معیوب حرکت جس پر غالب سوار تھا۔ اس کے بالکل پیچھے میں کھڑا تھا۔ خچر نے مشتعل ہو کے احتجاج کیا اور دولتی جھاڑی۔ غالب کا توازن بگڑ گیا اور خچر کی ایک لات میری پنڈلی پر لگی۔ وہ ایک دم بھاگا۔ فوری طور پر میں اس کا تعاقب کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا اور غالب کو بھی گر کے سنبھلنے میں کچھ وقت لگا۔ اس نے اپنی راہ میں حائل ہوشنگ کو بھی دھکا دیا۔ وہ نشیب کی جانب لڑھک گیا۔ ناقابلِ یقین پھرتی کے ساتھ وہ خود بھی نیچے جانے لگا۔ اس کو معلوم تھا کہ سڑک پر سیدھا دوڑنے میں وہ پکڑا جائے گا' اوپر چڑھنا بھی مشکل کام تھا نیچے اترنے میں وہ تجربہ اور مہارت اس کے کام آرہے تھے جو بچپن سے آج تک ان پہاڑوں میں زندگی گزار کے اسے حاصل ہوئے تھے۔ وہ بندر کی طرح چھلانگیں مارتا' ایک پتھر سے دوسرے پر قدم رکھتا' ایک چٹان سے دوسری چٹان پر جست لگاتا اور درختوں کی شاخوں کو پکڑ کے اپنا توازن قائم رکھتا وادی میں غائب ہو رہا تھا۔

پہلے غالب نے اور پھر میں نے اسے خبردار کیا کہ وہ رک جائے مگر اس نے ہماری وارننگ کو نظرانداز کردیا۔ اس کے بعد غالب نے نشانہ لے کر گولی چلائی۔ غالب کا نشانہ ہم سب سے بہتر تھا اور اپنے کمال کا مظاہرہ وہ پہلے بھی کرچکا تھا۔ گولی نے فرار ہونے والے شخص کو اس وقت جالیا جب اسے یقین ہوگا کہ وہ اپنی چالاکی اور پھرتی سے جان بچا کے نکل جانے میں کامیاب ہوگیا ہے۔

وہ ایک دم اچھلا اور اس کی چیخ نے سربہ فلک پہاڑوں سے گھری ہوئی وادی کو بھر دیا۔ یہ آواز لاکھوں کروڑوں سال پرانے پتھروں کی بے حس دیواروں سے ٹکرا کے لوٹی' خزاں رسیدہ' بلند درختوں کی بے برگ شاخوں میں الجھی اور چوٹیوں کی دھوپ سے روشن برف میں ہمیشہ کے لیے دفن ہوگئی۔ صرف اس کا ساکت جسم قدرت کے حسن کی لازوال تصویر پر ایک بدنما داغ کی طرح رہ گیا۔ اس کے پاؤں اوپر ایک چٹان پر تھے اور پاش پاش ہو جانے والا سر نیچے ایک درخت کے تنے سے ٹکرا کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ غالباً گرنے کے ساتھ ہی اس کی گردن بھی ٹوٹ گئی تھی ورنہ اس کا سر تنے سے ٹکرا کے یوں نہ ٹھہرتا کہ نظریں اوپر ہماری طرف دیکھتی محسوس ہوتیں۔ اس کے دونوں بازو نیچے لٹک گئے تھے اور سر سے نکلنے والا خون ہاتھوں پر بہنے لگا تھا۔

فائر کی بازگشت اور سزائے موت پانے والے مجرم کی آخری چیخ کی گونج ختم ہو جانے کے بعد بھی ہمارے کانوں میں زندہ تھی۔ سب کچھ دیر بے حس وحرکت کھڑے اس شخص کو دیکھتے رہے جو خود کو احمق اور بدنصیب سمجھتا تھا تو غلط نہیں سمجھتا تھا۔ وہ زندہ رہ سکتا تھا مگر اس کی موت نے ہوس کا جال پھیلا کے اسے شکار کیا۔

ہوشنگ پر جیسے فالج گر گیا تھا۔ وہ بری طرح کانپ رہا تھا اور میں نے دیکھا کہ اس کی پتلون تک بھیگ چکی ہے۔ میں اپنی پنڈلی کی چوٹ کو سہلا رہا تھا۔

رابعہ نے پُرتشویش لہجے میں کہا "کیا زیادہ چوٹ آئی ہے؟"

میں نے کراہ کے کہا "اس سے زیادہ نہیں جو دل پر کھائی ہے۔"

سفر کے آغاز میں پیش آنے والے اس حادثے نے سب کو متاثر کیا تھا چنانچہ میری بات کا بھی خوشگوار اثر نہیں ہوا۔ غالب نے ہوشنگ کو حکم دیا۔

"جاؤ' اس کی جیب سے سب کچھ نکال لو۔"

ہوشنگ رونے لگا "مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ مجھے مت مارو۔"

"پانچ ہزار کے لیے تم ایک بوڑھے کی جان لینے کا سودا کرچکے تھے۔ اس لاش سے کس لیے ڈرتے ہو؟" غالب نے تلخی سے کہا' "وہ تو مزاحمت بھی نہیں کرے گا۔ جو معاوضہ اسے ملا تھا وہ اس کا حق نہیں رہا۔ اب ہمارے ساتھ تم جاؤ گے۔"

ہوشنگ نے اقرار میں سر ہلایا "جاؤں گا' ضرور جاؤں گا سر۔ لیکن آپ مجھ کو ماریں گے نہیں' وعدہ کریں۔ آپ کو گاڈ کا قسم' اپنی ماں کا قسم" اس نے میرے پاؤں پکڑ لیے "اپنے باپ کا قسم۔"

میں نے اسے لات مار کے دور کیا "کمینے آدمی! تم بہت چالاک بھی ہو۔ تمہاری سزا بھی موت ہوتی مگر تم نے ہم سے یہ اختیار چھین لیا ہے۔ تم نے قسم دے کر ہمارے لیے ناممکن بنا دیا ہے کہ تمہیں قتل کرسکیں مگر تم کو نیچے جا کے وہ رقم لانی پڑے گی جو لاش کے پاس ہے۔"

"میں..... مجھے اس کی ضرورت نہیں" وہ ہکلایا۔

"مگر ہمیں ہے۔ سفرِ آخرت میں اعمال کام آتے ہیں' نوٹ نہیں۔ یہ زندہ انسانوں کے استعمال کی چیز ہیں" غالب بولا۔

"اچھا..... میں جاتا ہوں لیکن....."

"لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ میرا نشانہ کبھی خطا نہیں ہوتا۔ بھاگنے کا خیال بھی دل میں مت لانا" غالب نے کہا۔

وہ ڈرتے ڈرتے نیچے گیا۔ ہر قدم پر پیچھے سے آنے والی گولی کی دہشت نے اسے لرزہ براندام رکھا۔ وہ کئی بار گرتے گرتے بچا مگر بالآخر اس جگہ تک پہنچ گیا جہاں وہ لاش تصویرِ عبرت بنی پڑی تھی۔ ایک مُردے کو لوٹتے ہوئے اس کے ہاتھ کئی بار آگے بڑھے اور رک گئے۔ پھر اس نے پلٹ کر دیکھا تو غالب نے ریوالور لہرا کے اسے جلدی کا اشارہ کیا۔ اس نے رقم برآمد کرنے کے لیے لاش کو کھینچا اور سیدھا کردیا۔

اوپر کے سب نوٹ خون میں بھر گئے تھے لیکن نیچے والے صاف تھے۔ میں نے خون سے خراب ہو جانے والے پانچ نوٹ ہوشنگ کے حوالے کیے "ان کو دھو کے استعمال کرلینا اگر داغ صاف ہو جائیں....."

ہوشنگ نے ہاتھ پیچھے کھینچ لیے "نہیں سر..... یہ میں نہیں لوں گا۔"

"اچھا تو انہیں پھاڑ کے پھینک دو۔ پُرزہ پُرزہ کردو اور اپنے دوست کی لاش پر نچھاور کردو۔"

اس نے بادلِ ناخواستہ تعمیل کی۔ نوٹوں کے ننھے ننھے پُرزے ہوا میں اڑتے گئے اور ان میں سے چند لاش پر جا کے ٹھہر گئے۔ کاغذ کے بے وقعت پھول جو خود اس کے لہو کا رنگ رکھتے تھے' اس آدمی پر خندہ زن تھے جو انہیں زندگی کے رشتوں سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ قافلۂ سالار وہیں پڑا رہا' قافلہ آگے چل پڑا۔

وہ سارا راستہ ایک سا تھا۔ تنگ' کچی اور ناہموار سڑک پہاڑوں کے ساتھ ساتھ چلتی تھی۔ یہ قدرتی راستہ انسان نے خود تلاش کیا تھا۔ پھر سیکڑوں' ہزاروں صدیاں بیت گئیں اور انسان کے قدم' گدھے' گھوڑے اور خچر اس کو روندتے رہے' یہاں تک کہ پتھروں اور جنگلوں کی وادی میں راستے کے نقوش واضح ہوگئے۔ دشوار گزار اور ناہموار نشیب وفراز سے گزرتا یہ راستہ اصل فاصلے سے کئی گنا زیادہ تھا۔ جو مسافت ہم نے طے کی وہ بہت زیادہ تھی۔ اگر ہم ہیلی کاپٹر میں افقی پرواز کرتے تو فاصلے کے ساتھ وقت بھی سمٹ جاتا۔ ہم نے جو سفر دس گھنٹے میں طے کیا وہ ایک گھنٹے سے کم وقت میں ختم ہو جاتا۔

راستے میں دو جگہ ہم نے کھانے کے لیے قیام کیا۔ ہمارے پاس باقی بچی ہوئی کافی تھی لیکن چولھا نہیں تھا اور ہم لکڑیاں جلا کے پانی ابالنے میں وقت ضائع نہیں کرسکتے تھے۔ ہوشنگ نے تو خشک لکڑیاں چن کے آگ جلانے اور کافی بنانے کی پیش کش کی تھی۔

راہ میں کئی جگہ ہمیں جنگلی جانور نظر آئے۔ سانبھر اور نیل گائے' ہرن اور بارہ سنگھے وادیوں میں گھومتے پھر رہے تھے اور ہم پر نظر پڑتے ہی چھلانگیں مارتے غائب ہو جاتے تھے۔ دن کے وقت ہمیں کوئی گیدڑ یا بھیڑیا نہیں ملا۔ قدرتی پانی کے دھارے ہر جگہ بہتے دکھائی دیتے تھے اور یہ پگھلی ہوئی برف کا سرد' شفاف پانی ذائقے میں منفرد تھا۔ یہ منرل واٹر تھا جو بڑے شہروں میں بڑے لوگ استعمال کرتے تھے اور مہربند بوتلوں میں ملتا تھا۔ تاہم جہاں خالص دودھ تک ناپید ہو وہاں سادہ پانی کو "منرل واٹر" کا لیبل لگا کے بیچنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ ملاوٹ والی ہر چیز کھانے والے خالص قدرتی پانی محض دل کے اطمینان کی خاطر خریدتے تھے اور ایک نفسیاتی تسکین ضرور حاصل کرلیتے تھے کہ وہ عوام کو نلکوں سے سپلائی کیا جانے والا گندہ پانی نہیں پی رہے ہیں۔ یہاں قدرت کی اس نعمت کی بہتات تھی اور بے دام تھی۔

شام کا سورج مغرب کی جانب اترنے لگا تھا کہ ہوشنگ نے نوید دی "کھٹمنڈو۔"

میں نے رک کے کہا "کہاں؟"

"ادھر' اس پہاڑی کے پیچھے سڑک ہے" وہ بولا "قافلے اسی سڑک پر سفر کرکے کھٹمنڈو پہنچتے ہیں۔"

"کھٹمنڈو تک کتنا فاصلہ ہوگا؟" غالب نے پوچھا۔

"شہر تو چار پانچ میل پہلے ہی شروع ہو جاتا ہے" وہ بولا۔

میں نے کہا "اچھا۔ پھر تم جاؤ' اپنے خچر بھی لے جاؤ۔ ہم باقی راستہ پیدل طے کرلیں گے۔"

اس کا چہرہ خوشی سے کھل گیا "آپ کا مہربانی ہے سر۔"

میں نے کہا "خدا کا شکر ادا کرو کہ زندہ واپس جا رہے ہو مگر یہ خیال رکھنا ہوشنگ کہ ہم پھر آئیں تو ہمیں وہ بڈھا زندہ ملے۔ ہم پھر تمہیں تلاش کرسکتے ہیں' تم شیطان کی طرح مشہور ہو۔"

اس نے مظلوم صورت بنائی "مگر وہ بڈھا آدمی ہے' کب تک

زندہ رہے گا۔ میں کیسے ضمانت دوں کہ وہ بیاری سے بھی نہیں مرے گا؟"

میں نے کہا "ہمیں معلوم ہوجائے گا کہ وہ بیمار ہو کے مرا' اچانک مرگیا یا غائب ہوگیا۔"

ایک ایک کرکے سب خچروں سے اتر گئے۔ یہ انتہائی سخت سفر تھا جس نے سب کے جسموں کی چولیں تک ہلادی تھیں۔ پہلے میرا خیال تھا کہ روانگی کے بعد ہر خچر پر دو ہوجائیں گے۔ ایک خچر کی ڈرائیونگ میں کروں گا اور دوسرے کی غالب مگر اس کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ خچر بہت فرمانبردار قسم کے تھے اور خود رابعہ کا خوف دور ہوگیا تھا۔ ڈبل سواری کی صورت میں خچر سست پڑجاتے اور شاید ہم رات ہونے سے پہلے کھٹمنڈو نہ پہنچ پاتے۔ خچر پر سواری کا تجربہ کسی کو نہیں تھا۔ جو شہسواری جانتے تھے انہیں بھی گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھے زمانہ ہوگیا تھا۔ چنانچہ ہر گھنٹے دو گھنٹے بعد سب خچر سے اتر کے کچھ فاصلہ پیدل طے کرتے تھے یا پانچ دس منٹ کے لیے کہیں لیٹ کر کمر سیدھی کرتے تھے۔ پھر میں کوچ کا حکم دیتا تھا تو سب پر گراں گزرتا تھا مگر وقت کی کمی اور جلد از جلد منزل تک پہنچنے کی آرزو سب کو مستعد کردیتی تھی۔

جب ہوشنگ اپنی خچر ٹرین کو واپس لے کر چلا گیا تو سب سے پہلے غالب نے کہا "ایسی بے ہودہ سواری پر لعنت!"

نازو نے کہا "اسی قسم کے جذبات خچر کے بھی ہوں گے مگر وہ بول کچھ نہیں سکتا تھا بے چارہ۔"

"تم کو ایک خچر کے جذبات کا زیادہ خیال ہے؟"

"تم کو شکر گزار ہونا چاہیے تھا کہ وہ تم کو تمہارے بارِ گناہ سمیت یہاں تک ڈھو کے لایا۔" نازو نے کہا "عین ممکن ہے' میدانِ حشر میں وہ تم پر سوار ہو۔"

"ابھی تو میرے اعصاب پر تم سوار ہو۔ بلائے بے درماں بن کے" غالب نے کہا۔

"کیا..... میں بلا ہوں! پھر پیچھا کیوں نہیں چھڑا لیتے مجھ سے؟"

"تم جیسی بلائیں تو جان لے کر ٹلتی ہیں" غالب بولا۔

ہم اب تارکول کی پکی سڑک پر چل رہے تھے۔ آگے پیچھے زندگی کے آثار کہیں نہ تھے۔ پھر اچانک میں نے انسانی آوازیں سنیں۔ میرے ساتھ سب کے قدم رک گئے۔ کوئی شخص بری طرح چیخ رہا تھا۔ ایک اور آدمی اونچی آواز میں کچھ کہہ رہا تھا اور غصے میں معلوم ہوتا تھا۔ ہم سب کی نظریں سڑک سے ہٹ کے بائیں طرف اندھیرے میں کسی آبادی کے نشان تلاش کررہی تھیں مگر وہاں نہ روشنی تھی اور نہ کسی بستی کا کوئی سراغ۔

میں نے کہا "ان درختوں کے جھنڈ کے پیچھے ہے کوئی۔"

غالب نے سرہلایا "غالباً کوئی قافلہ۔"

"یہ کیسے اندازہ کیا تم نے؟"

"غور سے سنو۔ جو شخص شور مچارہا ہے وہ گالیاں بک رہا ہے۔ اردو میں" غالب نے کہا۔

"میرے کان اتنے تیز نہیں ہیں" میں نے کہا "چلو چل کے دیکھتے ہیں۔"

"ایسے مت جاؤ" رابعہ نے کہا "پتا نہیں کون لوگ ہیں۔"

میں نے کہا "ہم جانتے ہیں سب سے نمٹنا۔"

غالب نے کہا "ہاں۔ ہم بُروں کے ساتھ بُرے ہیں' اچھوں کے ساتھ اچھے۔ یہ تو اپنے ہی ہم زباں لگتے ہیں' ان سے کیا ڈرنا۔"

غالب کا خیال درست تھا۔ درختوں کی گھنی پناہ میں تقریباً چالیس افراد پر مشتمل ایک قافلہ پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ ہم دبے پاؤں آگے بڑھے تھے مگر بالکل نزدیک پہنچنے تک ہمیں کچھ پتا نہیں چلا۔ وہ سب بالکل خاموش اور دم سادھے بیٹھے تھے۔ پانچ سے آٹھ دس افراد کا ایک خاندان جس میں عورتیں اور بچے بھی تھے۔ ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر گروہ کی صورت میں کھلے آسمان کے نیچے بیٹھا تھا۔ غالباً انہیں سختی سے تاکید تھی کہ خاموش رہیں۔ ہم نے جو چیخنے چلانے کی آواز سنی تھی وہ بھی اب بند ہوگئی تھی۔

میں اور غالب ایک دم سامنے آگئے۔ لوگوں میں ہلچل سی مچ گئی۔ عورتوں نے دبی دبی چیخ ماری' مرد ہڑبڑا کے اٹھے' بچے سہم کے ماؤں سے چمٹ گئے۔ ان کی آوازوں کا شور ایسے بلند ہوا جیسے کسی نے شہد کی مکھیوں کے چھتے پر پتھر ماردیا ہو۔ مرد' عورتیں سب دبے دبے لہجے میں پوچھ رہے تھے "یہ کون ہیں؟ کون لوگ ہیں؟"

میں نے کہا "ہم آپ ہی جیسے انسان ہیں۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔"

ایک لمبا تڑنگا شخص فوراً سامنے آگیا۔ اس کا جُثہ پہلوانوں کا اور انداز بدمعاشوں کا تھا۔ وہ کُرتے پاجامے اور گول قراقلی ٹوپی میں تھا اور اس کی مونچھیں سخت نقوش والے بھاری چہرے کی خوفناکی میں اضافہ کررہی تھیں۔

"یہ کس نے کہا ہے کہ ہم ڈر گئے؟ بول" اس نے مجھے دھکا دیا۔

میں ایک قدم پیچھے ہٹ گیا "پہلوان! تم بلاوجہ ناراض ہورہے ہو۔ یہی تو کہا ہے میں نے کہ ہم انسان ہیں......."

"ابے انسان تو میں بنادوں گا تجھے دو منٹ میں ....." وہ گالی دے کر بولا "کیسے آگیا تو ادھر آخر؟ بول۔ پردے دار عورتیں بیٹھی ہیں یہاں' تجھے خیال نہیں آیا۔"

میں نے کہا "دیکھو' میں بھی مسلمان ہوں۔ میرے ساتھ بھی عورتیں ہیں اور میں عزت کرنے والے کی عزت کرتا ہوں۔ ایک غلطی کو معاف بھی کرتا ہوں۔ دوبارہ مجھے گالی مت دینا۔"

وہ کچھ محتاط ہوگیا "ورنہ...... کیا کرے گا تو؟ میرا نام معلوم ہے' بول۔ مجھے سرکار کہتے ہیں۔"

میں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا "میرا نام سکندر ہے' یہ میرا بھائی ہے غالب۔ ہم پاکستانی ہیں۔"

"اچھا۔ پھر پہلے کیوں نہیں بتایا؟" اس نے مجبوراً اپنا ہاتھ آگے بڑھایا "میں اس قافلے کو پاکستان لے جارہا ہوں۔"

"تم سے مل کے کوئی خوشی نہیں ہوئی مسٹر خرکار" غالب نے زبردستی اس کا ہاتھ تھام لیا "مگر مجبوری ہے۔ ہم بھی اس قافلے میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔ اپنے خاندان سمیت۔"

سرکار نے اسے خوں خوار نظروں سے گھورا "خرکار نہیں سرکار۔ آئندہ غلط نام مت لینا بے۔"

"میں سمجھ گیا۔ سراور..... کار" غالب نے دُہرایا "سرکار۔ اچھا نام ہے۔ حکومت بھی کہہ سکتے ہیں تمہیں۔ گورنمنٹ بھی۔"

"دیکھ بے' تو مارا جائے گا میرے ہاتھوں۔ مجھ سے مذاق کرتا ہے!" سرکار نے غرا کے کہا۔

میں نے کہا "جانے دو پہلوان۔ اس کی عادت ہے موقع محل دیکھے بغیر مذاق کرنے کی۔ کیا ہم بیٹھ جائیں یہاں؟"

"یہاں نہیں۔ اُدھر جاؤ' آخر میں۔ خالی ہاتھ چل پڑے تھے گھر سے۔ سامان کوئی نہیں لائے؟" وہ بولا۔

میں نے کہا "بڑی مشکل سے جان بچا کے بھاگے۔ ساتھ کیا لاتے؟"

"تو پھر پاکستان کیسے جاؤ گے؟ مال وال تو لائے ہوتا؟"

"بس جو تھوڑا بہت تھا' وہ لے آئے" میں نے کہا "ابھی بات کرتے ہیں تم سے۔"

ہم سب کو آخری حصے میں جگہ الاٹ کی گئی تھی۔ کسی نے ہمارے لیے ایک دری بچھادی' ہم سب اس پر بیٹھ گئے۔

"سراور کار۔ دونوں کو مرمت کی ضرورت ہے۔" غالب نے کہا "میں نے خرکار کہا تھا تو غلط نہیں کہا تھا۔"

"دماغ خراب ہے تمہارا۔ آتے ہی فساد کرنے کی کیا ضرورت ہے؟" میں نے کہا "پہلے دیکھو' صورتِ حال کو سمجھو۔ اگر جھگڑے کے بغیر ہم ان کے ساتھ کھٹمنڈو پہنچ جائیں بلکہ پاکستان تو کیا حرج ہے۔"

غالب نے نفی میں سرہلایا "تم دیکھ لینا' یہ شخص دھوکے باز ہے۔ ان سب کو چکردے کر لایا ہے۔ ان سے پیسے وصول کرچکا ہوگا۔ آج رات کو غائب ہوجائے گا۔"

رابعہ نے کہا "اتنے یقین سے کہہ رہے ہو یہ بات جیسے تم خود بھی اس کے ساتھ شریکِ جرم ہو۔"

"تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں" غالب بولا "تم خود سوچو۔ کھٹمنڈو چار پانچ میل دور ہے۔ ابھی آدھی رات بھی نہیں ہوئی ہے۔ ایک گھنٹے میں یہ شہر پہنچ جاتے مگر اس نے یہاں روک لیا ہے سب کو۔ آخر کیوں؟ رات کے اندھیرے میں تو ان کا کھٹمنڈو پہنچنا آسان ہوتا۔"

میں قائل ہوگیا "تمہاری بات میں وزن ہے برخوردار۔"

رابعہ نے کہا "کیا یہ بہتر نہ ہوتا اگر ہم سیدھے گزر جاتے۔ اس قافلے میں شامل ہونا ضروری تھا؟"

"ہاں۔ اس قافلے میں ہم ایسے شامل ہوسکتے ہیں جیسے دریا میں لہر۔"

غالب نے کہا "قطرہ ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں۔"

"یہ بالکل بے موقع شعر ہے" میں نے کہا۔

"برمحل کیا ہے؟" غالب بولا "سب غلط ہے۔ مثلاً ہم سب کی یہاں موجودگی اور یہ حالات۔ وہ سب جو ہوا یا نہیں ہوا۔ کل جب ہم سوچیں گے تو اسی نتیجے پر پہنچنا ناگزیر ہوگا۔"

"یہ مجذوب کی بڑ ہے" نازو بولی۔

"یہ مسائلِ تصوف یہ مرا بیان غالب" غالب نے آہ بھر کے کہا "مجھے سب ولی سمجھتے جو نہ ایسے خوار ہوتا۔"

میں نے کہا "اسکول ٹیچر کی موت آئی تھی۔ وہ ساتھ ہوتا تو ہمارے بہت سے مسائل حل ہوجاتے۔ اس کی واقفیت تھی یہاں۔ وہ ہمارے قیام کا بندوبست کرسکتا تھا۔ اب ہم پانچ آدمی فوراً تاڑ لیے جائیں گے۔"

"گواچی گاں کی طرح بھٹکتے ہوئے" غالب بولا۔

"گواچی گاں کیا؟" کاجل نے کہا۔

نازو ہنسنے لگی "وہ گائے جو ریوڑ سے بچھڑ کے بھٹک رہی ہو۔ جسے گوالے کا بھی پتا نہ ہو۔"

میں نے کہا "گورنمنٹ سے بات کرتے ہیں' شاید بندوبست ہوجائے۔"

رابعہ حیرانی سے بولی "نیپال کی گورنمنٹ سے!" پھر خود ہی شرمندہ ہو کے بولی "تمہارا مطلب ہے مسٹر سرکار سے؟"

"گورنمنٹ خود مذاکرات کے لیے آرہی ہے" غالب بولا۔

"بھئی' تم نے کچھ کھایا پیا ہے؟" وہ سرپرستانہ لہجے میں بولا۔

"کیا ملے گا کھانے کو؟" غالب نے کہا "آج کا مینو کیا ہے؟"

"ابے باؤلا ہوا ہے مینو کے بچے" پہلوان بگڑ گیا۔

"کچھ مل جائے تو ٹھیک ہے ورنہ ایک رات بھوکے بھی رہ سکتے ہیں" میں نے کہا۔

"بھئی' میرا لنگر تو ہے نہیں۔ دال بھات کا وعدہ تھا۔ سو روپے نکالو تو پانچ کا کھانا بھجوادوں۔ مُسٹنڈے کا کچھ نہیں۔"

میں نے اسے سو روپے دے دیے۔ ایک طرف چند عورتیں کچھ پکانے میں مصروف تھیں۔ میں نے کاجل سے کہا کہ وہ ان میں شامل ہو کے مدد کے بہانے معلومات حاصل کرے۔ وہ کچھ دیر بعد دال چاول لے کر آئی تو اس نے بتایا کہ سرکار نے ہر خاندان سے ایک ایک ہزار روپیہ لیا تھا۔ کہا تھا' بیل گاڑیوں میں لے جائے گا مگر سب کو پیدل لایا ہے۔ مردوں نے احتجاج کیا تو اس نے دو چار کو مارا اور پولیس کے حوالے کرنے کی دھمکی دی تو سب خاموش

ہو گئے۔ کھانے کے پیسے الگ لیتا ہے اور انہی عورتوں سے پکواتا ہے جو قافلے میں شامل ہیں۔ بے چاروں کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہا ہے اور کوئی بولے تو غنڈہ گردی کرتا ہے۔ اس کی پولیس سے سلام دعا ہے۔ یہ خود اس نے بتایا تھا مگر سارے راستے میں اس قافلے کو کسی نے روکا ہی نہیں ورنہ شاید اس کے دعوے کی قلعی کھل جاتی۔ یہ کہتا ہے کہ سب میری وجہ سے ہوا۔"

میں نے کہا "شاباش! بہت کم وقت میں تم نے بہت کچھ معلوم کرلیا۔"

کاجل نے کہا "اور غالب کا خیال بھی ٹھیک ہے۔ اس نے کہا ہے کہ ابھی کھٹمنڈو ایک دن کی مسافت پر ہے۔ صبح چلیں گے تو شام کو پہنچ جائیں گے۔ انہیں چلتے ہوئے تیسرا دن ہے۔ دو راتیں گزاری ہیں انہوں نے سفر میں۔ ہر خاندان پانچ پانچ سو روپے تک کھانے کے دے چکا ہے۔"

ہم کھانے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ سرکار آگیا۔

"دیکھ بے، تو چپ کرکے بیٹھ" اس نے غالب سے کہا "اس سے بات کرلوں میں۔ تم سب کو پاکستان جانا ہے نا؟"

"مجھے تو لندن جانا ہے" غالب بولا "بائی ائر۔"

"ابے باؤلا ہوا ہے!" پہلوان غصے میں دہاڑ کے بولا۔

میں نے کہا "چھوڑو پہلوان۔ تم پاکستان پہنچا سکتے ہو؟"

"اور کیا بول رہا ہوں میں" سرکار نے مونچھوں پر ہاتھ پھیر کے کہا "ابے ہم کہیں بھی پہنچا سکتے ہیں تمہیں۔ پاکستان کہو تو پاکستان، جہنم کہو تو جہنم۔"

"تم تو جا چکے ہوگے۔ راستہ جانتے ہوگے" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "پہلوان! یہ کچھ کھسکا ہوا ہے، اسے معاف کردو۔ مجھے بتاؤ پاکستان کیسے پہنچاؤ گے؟ میرا مطلب تھا کس راستے سے؟"

"ابے راستے بہت ہیں۔ مشکل بھی اور آسان بھی۔" وہ معاملات طے کرنے آیا تھا، اس لیے بگاڑ نہیں چاہتا تھا "پیدل چلو تو دو ہفتے میں نیپال کی سرحد پار کرلو گے۔ آگے میرا کام نہیں۔ لیکن مجھے معلوم ہے مہینہ بھر لگ جاتا ہے قافلوں کو۔ موسم بڑا خراب ہے۔"

میں نے کہا "اس کے علاوہ کوئی آسان طریقہ ہے؟"

"ہاں۔ بس اور ٹرک جاتے ہیں۔ ویزا لینا پڑے گا سفارت خانے سے۔ ویزا کیا بس اجازت نامہ ہے۔ سب کے نام لکھوانے پڑیں گے۔ ہزار اس میں لگ جائیں گے۔"

"سب کے؟" میں نے کہا۔

"ابے ایک آدمی کے۔ پھر بس کا کرایہ دو ہزار روپے۔"

"سب کا؟" میں نے جانتے بوجھتے احمقانہ سوال کیا۔

"ابے باؤلا ہوا ہے! ایک آدمی کا۔ سب کے ہوں گے گیارہ ہزار۔ شاید دس میں کام چل جائے۔ پندرہ ہزار کا خرچا ہے۔"

میں نے کہا "پہلوان جی! بس میں خطرہ تو کوئی نہیں؟"

"ابے خطرہ ہی خطرہ ہے ہر جگہ۔ یہ کام ہی ایسا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ تم بھاگ کر جارہے ہو۔ پاسپورٹ ویزا کچھ ہے نہیں۔ یہ تو نیپال کے بادشاہ کی مہربانی ہے کہ کوئی روکتا نہیں۔"

"کیا ہوائی جہاز نہیں جاتا یہاں سے؟"

"ہوائی جہاز! ابے باؤلا ہوا ہے؟" یہ اس کا تکیۂ کلام تھا "پتا ہے کتنے لگتے ہیں جہاز سے جانے میں؟ ایک آدمی کے دس ہزار۔ بلیک میں ٹکٹ ملتے ہیں۔ رشوت کا ریٹ اونچا ہے۔ ساٹھ ستر ہزار کہاں سے لاؤ گے؟"

میں نے متانت سے کہا "یہ تو زیادہ نہیں۔"

"زیادہ نہیں!" اس نے مشتبہ نظروں سے مجھے گھورا۔

"کوئی پرائیویٹ جہاز کرائے پر نہیں ملتا۔ چار مسافروں والا، چھ آٹھ سیٹوں والا سیسنا" میں نے کہا "جو صرف ہمیں لے جائے۔"

اس نے پھر کہنا چاہا، ابے باؤلا ہوا ہے مگر میرے لہجے اور میرے سوال نے اسے سوچنے پر مجبور کردیا "سیسنا۔ چھوٹا جہاز۔"

میں نے کہا "ہاں۔ اگر ایک لاکھ تک مل جائے۔"

"ایک لاکھ! تیرے پاس ہیں، بول؟" وہ مجھے گھورنے لگا۔

"کچھ میرے پاس ہیں۔ پندرہ بیس ہزار......"

وہ ہنس پڑا "اور باقی تیرا باپ پورے کرے گا۔"

میں نے کہا "تمہارے پاس کتنے ہیں، ساٹھ ستر ہزار تو ہوں گے جو تم نے ان لوگوں کو بے وقوف بنا کے وصول کیے ہیں۔"

"ابے باؤلا ہوا ہے۔ سیدھی بات کر مجھ سے۔"

میں نے کہا "یہ سیدھی بات تو ہے۔ اُلو کے پٹھے! اور کون زبان سمجھتا ہے تو؟" میں نے ایک دم لہجہ بدل لیا۔

وہ ایک دم بھڑک اٹھا "تیری تو......"

میں نے اسے ہاتھ پکڑ کے جھٹکا دیا، وہ منہ کے بل گرا تو میں نے اس کی پسلیوں پر ہاتھ مارا۔ وہ ایک دم کراہ کے دُہرا ہو گیا۔ میں نے بال پکڑ کے اس کا سر اٹھایا اور دو بار زمین پر مارا۔

غالب نے کہا "اب کیوں بھول گیا پہلوان اپنی بات۔ پوچھ کہ ابے کیا باؤلا ہوا ہے۔"

"اب سیدھے بیٹھو شرافت سے" میں نے اسے بٹھا کے کہا "ابھی تک کسی نے تم کو شرافت نہیں سکھائی تھی کیونکہ ان میں کوئی بدمعاش نہیں تھا۔"

"میں..... میں تم کو پاکستان پہنچا دوں گا" وہ ہانپتے ہوئے اپنے منہ کو گرد سے صاف کرتے ہوئے بولا۔

"پاکستان ہم خود پہنچ سکتے ہیں" میں نے کہا "تم نے ان لوگوں کو کھٹمنڈو پہنچانے کی ذمے داری لی تھی یا پاکستان پہنچانے کی؟"

"کھٹمنڈو پہنچانے کی" وہ بولا۔

"جھوٹ" میں نے اس کے ایک مُکا رسید کیا "تم نے پاکستان پہنچانے کی فیس لی تھی۔"

وہ نیچے گر گیا۔ دور سے لوگ اس منظر کو حیرانی اور پریشانی سے دیکھ رہے تھے۔ انہیں یقین نہیں آرہا تھا کہ سرکار سے بھی بڑی سرکار ہو سکتی ہے۔ ابھی تک وہ ہمارے متعلق کچھ نہیں جانتے تھے۔

"تم نے ہر خاندان سے ایک ہزار روپے فی کس لئے تھے۔ پھر تم نے راستے میں پانچ پانچ سو کھانا فراہم کرنے کے لئے۔ اس دال بھات کے جو تم نے انہی سے پکوایا، بیس روپے روز کے بھی نہیں بنتے۔ ہم ابھی کھا کے دیکھ چکے ہیں۔ تم ان کو پیدل لائے اور تم نے کیا حرکت کی، یہ معلوم ہو جائے گا۔"

"تم...کون ہو تم؟" وہ خوف زدہ ہو گیا "کس نے بتائی ہیں تم کو یہ ساری باتیں، یہ سب جھوٹ ہے۔"

میں نے کہا "ابھی یہ لوگ تمہارے سامنے آکے پھر بتائیں گے، پھر تو مانو گے؟"

غالب اور نازو نے ایک ایک شخص کو بلانا شروع کیا۔ ہر خاندان کا ایک فرد ڈرتے ڈرتے آیا۔ سب کا خیال تھا کہ ہم پولیس کے لوگ ہیں اور انہیں غیر قانونی طور پر سرحد پار کرنے پر گرفتار کرلیں گے۔ غالب نے انہیں تسلی دی مگر اس کے باوجود کوئی بھی سرکار کے خلاف بیان دینے پر تیار نہیں ہوا۔

میں نے ان سب کو اکٹھا کرلیا۔ "تم سب کھٹمنڈو جارہے ہو۔ کیا تمہیں معلوم ہے کھٹمنڈو کتنی دور ہے؟"

ایک عینک والے شخص نے کہا "کل شام تک ہم کھٹمنڈو پہنچ جائیں گے۔ ایک دن کا سفر باقی ہے۔"

"یہ جھوٹ بولا ہے اس نے۔ کھٹمنڈو تم ایک گھنٹے میں پہنچ سکتے ہو۔ یہاں سے چار پانچ میل دور ہے۔ یہ شخص آج رات تم کو یہاں چھوڑ کے فرار ہونے والا تھا۔ ہم نے اسے پکڑ لیا ہے۔ اب تم کو اپنا پیسہ واپس چاہیے یا میں اسے چھوڑ دوں؟"

ایک دم شور سا مچ گیا۔ تین چار زیادہ جوشیلے مرد آگے بڑھ کے سرکار کو مارنے پر تُل گئے۔

"اتنا بڑا جھوٹ ہم سے؟ نکال ہمارے سب کے پیسے واپس" ایک نوجوان نے اس کی گردن دبوچ لی۔

دوسرے نے اس کا گریبان پھاڑ دیا "چور بدمعاش! ہم کو بیچ میں چھوڑ کے فرار ہونا چاہتا تھا۔ حرام کے پیسے تھے ہمارے؟"

میں نے کہا "ٹھہرو، ایسے نہیں۔ باری باری آؤ، اپنے اپنے پیسے لے جاؤ۔ کھٹمنڈو تک تمہیں ہم لے جائیں گے، ابھی۔ آگے تم خود جا سکتے ہو۔"

"میں کسی کے پیسے واپس نہیں کروں گا۔"

"ابے باؤلا ہوا ہے" غالب نے اس کے ایک لات رسید کی "مال برآمد کرنا جانتے ہیں ہم۔ تیری تو لاش بھی بیچ دیں گے کفن چور۔ نکال، کیا ہے تیرے پاس، یا ہم تیرے کپڑے اتاریں۔"

"تم ایسا نہیں کرسکتے" وہ چیخ کے بولا۔

"اگر تم مان لیتے تو اچھا تھا۔" میں نے کہا "ہم میں سے ہر ایک سب کچھ کرچکا ہے اور پھر کرسکتا ہے۔"

"سوائے شادی کے" غالب نے کہا۔

سرکار ایک دم کھڑا ہو گیا اور پلک جھپکتے میں اس نے ڈب میں سے ایک ریوالور برآمد کرلیا "میں جارہا ہوں۔ میرا یہی پروگرام تھا۔ میں ان کو یہاں تک لے آیا۔ آگے کا راستہ صبح یہ خود معلوم کرلیتے۔"

میں نے کہا "پہلوان! تم نے تو پاکستان پہنچانے کا وعدہ کیا تھا ان سب سے۔ ابھی سے واپس جارہے ہو۔ پاکستان تو بہت دور ہے۔"

"ابے باؤلا ہوا ہے۔ جہنم میں جائیں یہ سب۔ تم سنبھالو انہیں" وہ تھوڑا تھوڑا پیچھے ہٹتا گیا۔

قافلے کے بہت سے مرد چلّانے لگے "کوئی روکو اسے۔ یہ لٹیرا

ہے۔"

"ہمارے پاس کچھ بھی نہیں چھوڑا اس نے۔"

"ہم نے سب تو اسے دے دیا۔"

"اب ہم پاکستان کیسے جائیں گے؟"

"خبردار! کسی نے میرا راستہ روکا تو میں لحاظ نہیں کروں گا۔ گولی ماردوں گا۔" سرکار نے الٹے قدم چلتے ہوئے کہا "میں بلاوجہ خون خرابہ نہیں چاہتا۔"

اس کے پیچھے مظلوم صورت' پریشان حال غریب عورتوں کا ایک غول کھڑا اسے گالیاں اور کوسنے دینے میں مصروف تھا مگر ان کے مردوں میں بھی اتنی ہمت نہ تھی کہ کچھ کرسکتے' تو عورتیں زبان چلانے کے سوا کیا کرسکتی تھیں۔ تاہم انہی کے درمیان کہیں نازو تھی۔

"اچھا پہلوان جاؤ۔ مگر جاتے جاتے ایک بات تو بتاتے جاؤ" میں نے کہا "اگر تم کھٹمنڈو پہنچادیتے انہیں اور پھر واپس چلے جاتے؟"

"پہلوان!" غالب نے کہا "میں سمجھ گیا' تم ڈرتے ہو۔"

میں نے کہا "یار گورنمنٹ کسی سے نہیں ڈرتی۔"

"اس گورنمنٹ کو ڈر ہے کہ کھٹمنڈو میں پرانے دشمن نہ مل جائیں۔ سرکار نے پہلی بار تو ایسا نہیں کیا ہے نا۔ پہلے بھی کئی قافلے یہاں تک لاکے چھوڑ دئے ہوں گے۔ شاید وہ ابھی تک کھٹمنڈو کی سڑکوں پر پڑے ہوں گے۔ بھیک مانگ رہے ہوں گے بے چارے کہ کوئی انہیں ترس کھاکے پاکستان پہنچادے۔ یا وہ محنت مزدوری کی کمائی سے کچھ پس انداز کرلیں تو کرایہ اداکرکے وطن پہنچ جائیں مگر دونوں کام ناممکن ہیں۔ وہاں نہ کوئی ترس کھانے والا ملتا ہوگا نہ بھیک دینے والا اور مزدوری ملتی ہوگی تو مشکل سے پیٹ بھرتا ہوگا۔"

پہلوان رک گیا تھا "تم نے بالکل ٹھیک سمجھا۔ میرے دشمن بہت ہیں کھٹمنڈو میں ورنہ چار پانچ میل آگے جانے میں کیا تھا۔"

"شاید پولیس کو بھی تمہاری تلاش ہوگی" غالب بولا "کچھ اپنے لٹنے کی فریاد لے کر پولیس کے پاس بھی گئے ہوں گے اور انہوں نے تمہارا نام اور حلیہ بتادیا ہوگا۔"

وہ ہنسا "اے باؤلا ہوا ہے۔ میں اکیلا تو نہیں ہوں اس کاروبار میں۔ میرے جیسے بہت ہیں۔ پولیس کس کس کو پکڑے گی ہے؟"

"مگر اس بار تم پکڑے گئے پہلوان۔" میں نے کہا "سو دن چور کے تو ایک دن کوتوال کا۔"

وہ قہقہہ مار کے ہنسا "کوتوال کے بچّے! میرے پیچھے مت آنا۔"

"پہلے تم اپنے پیچھے تو دیکھو" میں نے کہا "تمہاری موت کھڑی ہے۔"

سرکار نے پلٹ کے دیکھا تو اسے نازو نظر آئی جو آہ و بکا کرتی عورتوں کے بیچ میں سے آگے نکل آئی تھی "یہ چھوکری....."

"ہاں میں ہوں تیری موت" نازو نے کہا "ایسے کیا دیکھ رہا ہے ہلا میرے پیسے واپس کر۔"

سرکار نے نازو کا آگے پھیلا ہوا ہاتھ پکڑ کے اپنی طرف کھینچنا چاہا "ارے پیسے سب تیرے۔ اگر تو....."

دوسرے لمحے جیسے طاقت اور کشش ثقل کے سارے کے سارے فارمولے غلط ہوگئے۔ نازو نے سرکار کو اپنی طرف کھینچ لیا اور اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا' اسے ایک ٹانگ اوپر اٹھاکے پلٹ دیا۔ اسے حیران ہونے کا موقع بھی نہ ملا۔ نازو نے اسے کمر کے بل زمین پر دے مارا مگر اس کی کلائی نہیں چھوڑی۔ اس کا ہاتھ مڑ گیا۔ وہ کراہ کے پھر اٹھنے پر مجبور ہوا اور نازو نے اسے قلابازی دے کر رکوع کی حالت میں کردیا۔ ریوالور اس کی گرفت سے پہلے ہی چھوٹ گیا تھا۔ نازو نے اسے گھما کے لات ماری تو وہ منہ کے بل گیا۔

"اٹھو پہلوان۔" میں نے کہا "بڑے شرم کی بات ہے۔ ایک عورت سے مار کھاگئے۔"

غالب نے کہا "دیکھو کہیں تمہیں پہلے راؤنڈ میں ہی شکست نہ ہوجائے۔"

وہ گالیاں بک رہا تھا اور چلّا رہا تھا۔ اسے اپنی ذلّت کا اندازہ تھا اور وہ سمجھ گیا تھا کہ اس نے بازی ہاردی تو وہ زندگی ہار جائے گا۔ وہ پھر اٹھ کے نازو پر حملہ آور ہوا۔ حیرت سے سُن ہوجانے والے مرد اور ہکابکا عورتیں نازو جیسی دبلی پتلی اور نازک اندام لڑکی کے ہاتھوں سرکار جیسے سانڈ کی یہ دُرگت بنتی دیکھ رہے تھے اور ان کے لئے یہ ایک فلمی منظر تھا جس میں کیمرا ٹرک سے ناممکن کو ممکن بناکے دکھادیا جاتا ہے۔

نازو نے دوسری بار اسے قریب بھی نہیں آنے دیا۔ وہ نازو کے ہاتھوں اور اس کی لاتوں کی زد میں رہا اور خود کو بچانے کی کوشش میں اس نے زیادہ مار کھائی۔ ایک لات اس کے منہ پر لگی' دوسری پیٹ پر۔ ہاتھوں کے وار اس کے بازوؤں پر ہوئے جو ضرب کی شدت سے شل ہوکے وقتی طور پر ناکارہ ہوگئے۔ وہ درد سے چیخنے لگا اور پھر زمین پر ڈھیر ہوگیا۔

غالب نے باکسنگ کے ریفری کی طرح گننا شروع کیا "ون' ٹو' تھری' فور....."

میں نے چلّا کے کہا "پہلوان! آخری راؤنڈ لڑکے دیکھو۔ تخت یا تختہ۔ عزت کی موت بہتر ہے اس ذلّت سے۔"

مگر سرکار سمجھ گیا تھا کہ دھوکا اس کی عقل یا نظر نے نہیں' تقدیر نے دیا ورنہ یہ نہیں ہوسکتا تھا کہ ایسی دھان پان لڑکی اس کو چیلنج کرے اور یہ مذاق ایک بھیانک حقیقت بن جائے۔ سنا اس نے بھی ہوگا مگر تجربہ اسے آج عملی طور پر ہوا کہ چیونٹی بھی ہاتھی کی موت بن جاتی ہے۔

وہ بڑی مشکل سے اٹھا "دیکھو... سب لے لو مجھ سے اور مجھے جانے دو۔"

اب میں نے آگے بڑھ کے اسے اٹھایا "یہ بات تم انہی سے کرو جن کو تم پاکستان پہنچانے کے وعدے پر لائے تھے۔ اگر یہ اپنی رقم واپس لے کر تمہیں جانے دیتے ہیں تو ٹھیک ہے۔ تم کھٹمنڈو سے لوٹ جانا۔"

"نہیں۔ کھٹمنڈو نہیں جاؤں گا" وہ بولا۔

میں نے کچھ سوچ کے کہا "اچھا۔ پہلے ایک معاملہ تو طے ہوجائے۔"

اب کوئی بھی اس پر اعتبار کرنے کو تیار نہ تھا۔ لوگوں نے یہ موقع غنیمت جانا اور اپنا ایک ایک پیسہ وصول کرلیا۔ سفر تو انہوں نے پیدل ہی کیا تھا مگر کھانے پینے کے اخراجات سرکار کے کھاتے میں گئے۔ میں نے انہیں ہدایت کی کہ وہ اسی وقت روانہ ہوکے کھٹمنڈو پہنچ جائیں اور پاکستانی سفارت خانے سے رابطہ کریں۔ انہیں کوئی نہیں پکڑے گا اور ان کے وطن پہنچنے کا کچھ نہ کچھ بندوبست ہوجائے گا۔

وہ سب ہم سے ہاتھ ملاکے' ہمیں دعائیں دیتے رخصت ہوگئے تو جہاں ایک قافلے کا پڑاؤ تھا وہاں صرف ہم رہ گئے۔

"کیا اب تم سچ سچ بتاؤ گے اپنے بارے میں سرکارِ عالی؟" میں نے کہا۔

"تم نے جو چاہا وہ میں نے کردیا۔ اب اور کیا چاہتے ہو؟" اس نے کہا۔

غالب نے کہا "ہم تفتیش کے ان سب طریقوں سے بھی واقف ہیں جن سے سچ اگلوایا جاتا ہے۔"

اس نے بے بسی سے غالب کی طرف دیکھا جو ایک درخت کی کانٹے والی شاخ کو صاف کررہا تھا۔

"تم کوئی مفرور مجرم ہو؟" میں نے پوچھا۔

"مفرور... نہیں۔ میں نے ایک جرم کیا تھا۔ اس کی سزا کاٹ کے چھ ماہ قبل رہا ہوا تھا۔ پھر نوکری نہیں ملی تو یہ کام پکڑ لیا۔"

"جرم کیا تھا تمہارا؟"

"میں پاسپورٹ آفس میں تھا۔" وہ بولا "جعلی پاسپورٹ بھی جاری کردیتا تھا۔"

"ویری گڈ" میں نے کہا "پھر تو تم ہمارے لئے کام کے آدمی ہو۔ تمہارا تعلق سب سے ہوگا۔ ٹریول ایجنسی سے' غیر قانونی طور پر باہر بھجوانے والوں سے' ایرلائنز سے۔"

اس نے اقرار میں سرہلایا "لیکن میں کھٹمنڈو نہیں جاسکتا۔ میں لوگوں کو یہاں تک لاکے چھوڑ دیتا ہوں۔ آگے دوسرے لوگ ہیں۔"

"سب کچھ تم رکھوالیتے ہو۔ آگے دینے کے لئے ان کے پاس کیا رہ جاتا ہے؟"

"یہ سب اتنے قلاش نہیں ہوتے جتنا ظاہر کرتے ہیں۔ لُٹ جانے کے ڈر سے یہ کچھ نہیں بتاتے۔ وہ پاگل ہی ہوگا جو خالی ہاتھ اتنے لمبے سفر کے لئے نکل کھڑا ہو۔ انہیں سب اندازہ ہوتا ہے کہ راستے میں کہاں کتنا خرچہ ہوگا۔"

میں نے کہا "چلو پھر ان کی بات چھوڑو۔ ہمارا مسئلہ حل کرو۔ ہم بھی پاکستان جانا چاہتے ہیں۔"

"تو جاؤ' میں نے روکا ہے" وہ تلخی سے بولا۔

"ایسے نہیں پہلوان! ہمارے ساتھ چلو۔ ہماری راہنمائی کرو۔ ہم سے ان لوگوں کو ملواؤ جو ہمیں مدد فراہم کرسکتے ہیں۔"

"تم تو ہر کام کراسکتے ہو' زبردستی......"

میں نے کہا "ہم معاوضہ دیں گے۔ تمہاری خدمات کا بھی۔"

"یہی جو ابھی دیا تھا' مجھے معاف کرو بھائی۔"

میں نے کہا "دیکھو' تمہارے سامنے دو راستے ہیں۔ ایک یہ کہ تم ہم سے تعاون کرو اور ہم تمہیں چھوڑ دیں۔ ہم بھی غیر قانونی طریقے سے واپس پاکستان پہنچنا چاہتے ہیں مگر ہمیں راستوں کا علم نہیں۔ قانونی طریقے سے پہنچ سکتے تو ظاہر ہے' مسئلہ کوئی نہ ہوتا۔ اس کے علاوہ ہم جلد از جلد جانا چاہتے ہیں۔ تم اپنے دوستوں سے بات کرو۔"

"نہیں۔ میں کھٹمنڈو نہیں جاسکتا۔"

"رات کے وقت تو کوئی خطرہ نہیں ہونا چاہئے۔ ہم بھی تمہارے ساتھ ہیں" میں نے کہا "راتوں رات کوئی بندوبست ہوجائے تو صبح تم واپس جاؤ اور اپنا دھندا جاری رکھو۔"

"اس کاروبار میں دوست کوئی نہیں ہوتا۔ سب پیسے کے یار ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا "ہم پیسہ دیں گے۔"

"کہاں ہے پیسہ؟" اس نے بے یقینی سے کہا۔

میں نے کہا "ہمارے پاس کچھ نقد ہے۔ باقی زیور ہے' تقریباً ایک لاکھ کی مالیت کا۔"

اس نے کچھ دیر سوچا "اچھا۔ میں تم کو ایک جگہ لے کر چلتا ہوں۔ میرے لئے بہت خطرہ ہے لیکن اگر تم نے میرے ساتھ دغا کی تو مجھ سے زیادہ خطرے میں تم گھر جاؤ گے۔ پاکستان کے بجائے تمہیں جیل جانا پڑے گا میرے ساتھ۔"

"ہم خطرات سے کھیلنے کے عادی ہیں" میں نے کہا۔

ہم رات نو بجے کے قریب اپنی کمیں گاہ سے نکلے اور سڑک پر چلنے لگے۔ جب آگے یا پیچھے سے کوئی گاڑی نمودار ہوتی تھی تو ہم سڑک کے کناروں پر پھیلے ہوئے گھنے جنگل کے درختوں اور جھاڑیوں کے پیچھے چھپ جاتے تھے۔ سخت سردی کے باعث گاڑیوں کی آمدورفت بھی خال خال ہی تھی۔ ایسے موسم میں چار پانچ میل چلنا بھی مشکل کام تھا۔ سرکار نے جو راستہ اختیار کیا وہ زیادہ طویل ثابت ہوا اور رات گیارہ بجے ہم دلّی روڈ کی ایک ویران کوٹھی میں داخل ہوئے تو تھکن سے بے حال تھے۔ میں اپنی حالت

سے اندازہ کرسکتا تھا کہ خواتین کس درجہ ہمت اور قوتِ برداشت کا مظاہرہ کرچکی ہیں۔

پرانی کوٹھی زیادہ بڑی نہیں تھی اور اس کا مختصر باغیچہ ویران پڑا تھا۔ کسی نے ہمیں گیٹ پر نہیں روکا۔ سرکار نے اندر جا کے برآمدے میں لگی ہوئی گھنٹی بجائی تو اندر ایک کھڑکی کے پیچھے روشنی نمودار ہوئی۔ پھر کسی نے دروازہ کھولا۔ وہ ایک دبلا پتلا' زرد رو بوڑھا تھا جس نے سردی سے بچنے کے لئے سر پر ٹوپی اوڑھ رکھی تھی۔

سرکار کو دیکھ کے اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ اس نے نیپالی میں کچھ کہا جس کا جواب سرکار نے بھی نیپالی میں دیا۔ اس نے ہمیں اندر آنے کی اجازت دے دی اور ہمیں اس کمرے میں لے گیا جہاں وہ ہمارے آنے سے پہلے سو رہا تھا۔ اس وسیع بیڈ روم میں وہ اکیلا تھا۔ بیڈ' قالین اور بھاری پردے سب بیش قیمت تھے مگر کمرے میں بے ترتیبی کا احساس ہوتا تھا۔ ایک گوشے میں فین ہیٹر چل رہا تھا چنانچہ کمرے کی فضا میں انتہائی راحت بخش حرارت تھی۔

"یہ میرا دوست ہے۔ رام ناتھ" سرکار نے کہا "اور یہ..... ان کو تم میرا دشمن سمجھ لو۔ مجھے نہیں معلوم یہ کون لوگ ہیں۔ یہ پاکستان جانا چاہتے ہیں۔"

رام ناتھ نے ہم سب کی صورت پر باری باری غور کیا اور سرہلایا "تم اپنے دشمنوں کو میرے پاس کیوں لائے ہو؟"

"اس لئے کہ تم بھی میرے دشمن ہو۔ تم آپس میں دوست بن سکتے ہو" وہ بولا۔

"میں تمہارا دشمن نہیں ہوں سرکار۔ مجھے یقین تھا کہ تم نے ہی میری بیوی کو قتل کیا تھا۔ میں نے تمہارے خلاف جھوٹی گواہی نہیں دی تھی۔ یہ بات مجھے اس وقت معلوم ہوئی تھی جب تمہاری سزا کی میعاد پوری ہونے والی تھی کہ اصل قاتل کوئی اور تھا۔ میں تم سے معافی مانگتا...."

"معافی سے مجھے میری وہ زندگی واپس نہیں مل سکتی جو میں نے کسی جرم کے بغیر جیل میں گزار دی۔"

"مگر جیل سے بھاگ کے تم نے اچھا نہیں کیا۔ اب تم واقعی مجرم ہوگئے ہو" وہ بولا۔

"میں فرار نہ ہوتا تو کیا کرتا۔ عمر قید کاٹتا؟" وہ بگڑ کے بولا "اور وہ آزاد پھرتا رہتا جو اصل قاتل تھا۔ باہر نکلنے کا موقع پاتے ہی میں نے پہلا کام یہی کیا کہ اسے بھی ٹھکانے لگا دیا۔"

"یہ بات سب کو معلوم ہے۔ پولیس کو بھی۔ اس کے باوجود تم یہاں آگئے۔ ایسی کیا مجبوری تھی؟"

اس نے ہماری طرف اشارہ کیا "یہ ہیں میری مجبوریاں۔ میں بھاگ کے بنگال چلا گیا تھا۔ پھر کچھ پرانے ساتھیوں سے رابطہ ہوگیا جو پاسپورٹ آفس میں میرے ساتھ تھے۔ میں لوگوں کو پاکستان بھجوانے لگا۔ مجھے معلوم ہے' تم بھی یہ کام کرتے ہو۔"

"لیکن میں ایسے کام نہیں کرتا جیسے سب کرتے ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔ یہ بھی ہوائی جہاز سے جانا چاہتے ہیں۔ اور یہ پیسہ بھی خرچ کرسکتے ہیں۔ انہوں نے مجھے بتایا ہے۔"

"ساٹھ ستر ہزار سے کم خرچہ نہیں ہوگا" وہ بولا۔

اب میں نے کہا "سیٹھ! ہمارے پاس نقد رقم کے علاوہ ایک لاکھ سے اوپر کی مالیت کے زیورات ہیں۔"

"زیورات۔ میں کیا کروں گا زیورات کا..."

"تم زیورات خرید سکتے ہو" سرکار نے کہا "اس میں بھی فائدہ ہوگا تمہیں۔ ایک لاکھ کے زیور تم کو پچاس ہزار میں مل جائیں گے۔"

میں نے احتجاج کیا "پچاس تو بہت کم ہیں۔"

"پھر کیا کرو گے تم؟ خود بازار جا کے بیچو گے؟ کیسے بیچو گے اور کون لے گا یہ زیورات؟" سرکار نے کہا "چوری کا مال....."

"یہ چوری کا مال نہیں ہے" کاجل نے برہمی سے کہا۔

"سمجھا تو جائے گا" سرکار بولا "مجبوری میں یہی ہوتا ہے۔"

"قیمت بعد میں طے ہوجائے گی" میں نے کہا "پہلے تو ہمیں کچھ کھانے پینے کو چاہئے۔ ہم سردی میں بہت دور سے پیدل چل کے آئے ہیں۔"

"میں اکیلا رہتا ہوں یہاں" وہ بولا "مگر میں تم کو کچن دکھا سکتا ہوں۔ میرا رسوئیا اس وقت نہیں ہے لیکن کچن میں سب کچھ ہے۔"

رابعہ نے کہا "ہم اپنا کام خود کرسکتے ہیں۔"

ان کے اندر جانے کے بعد میں نے سرکار سے کہا "تم نے اصل بات کیوں چھپائی تھی مجھ سے؟"

"تم یقین نہ کرتے اس لیے میں تمہیں سیدھا یہاں لے آیا۔ تم نے سب کچھ سن لیا۔"

غالب نے کہا "کتنا وقت گزارا تم نے جیل میں؟"

"سات سال" وہ بولا "صرف اس شخص کی وجہ سے۔ اب یہ معافی کی بات کرتا ہے۔ اب میں یہاں تک آگیا ہوں تو ان سات سالوں کی قیمت وصول کرکے جاؤں گا۔"

"اس نے اپنی غلطی تسلیم کرلی ہے" غالب بولا۔

"مگر غلطی کا کفارہ تو ادا نہیں کیا ہے۔ میری کیا غلطی تھی آخر؟"

میں نے کہا "جب قتل کسی اور نے کیا تھا تو الزام تم پر کیسے آگیا؟"

"اس لئے.... کہ میرے اس سے مراسم تھے' شادی سے پہلے

سے۔ جو شادی کے بعد بھی رہے" وہ بولا "یہ خود بھی جانتا تھا' سب لوگ جانتے تھے۔ شک مجھ پر ہی کیا گیا اور گواہ اس شخص نے آگے بڑھائے جو اصل قاتل تھا۔"

کھانے اور چائے کے بعد رابعہ' نازو اور کاجل لحافوں میں گھس کے سو گئیں۔ میں اور غالب دوسرے کمرے میں بیٹھے رہے جہاں موٹے اونی قالینوں پر روئی کی گدیاں رکھی ہوئی تھیں اور ہیٹر بھی جل رہا تھا۔ سیٹھ ان زیورات کا معائنہ کررہا تھا جو ہم نے فروخت کے لئے پیش کئے تھے۔ سرکار بھی خاموش بیٹھا تھا اور ہم سب اس کشیدگی کی فضا کو محسوس کررہے تھے جو اس ماحول میں موجود تھی۔

اچانک سیٹھ رام ناتھ نے زیورات کی پوٹلی سرکار کی طرف کھسکا دی "ٹھیک ہے۔ ان کی مالیت کے بارے میں مجھے کوئی شبہ نہیں۔ ایک لاکھ سے زیادہ ہی کے ہوں گے' یہ سب تم لے لو۔"

"میں لے لوں!" سرکار نے کہا۔

"ہاں۔ پہلی بات تو یہ کہ اس وقت میرے پاس نقد رقم نہیں ہے۔ میں نے آج تک زیورات خریدے بھی نہیں۔ اگر صبح میں نے کسی کو بلایا تو وہ ان کی آدھی قیمت ہی لگائے گا اور سو طرح کے سوال الگ کرے گا۔"

"تمہارا مطلب ہے' میں انہیں بیچنے جاؤں؟" سرکار گرم ہوگیا۔

"نہیں سرکار۔ یہ سب میں تم کو دے رہا ہوں۔ اپنے ساتھ لے جاؤ۔ مجھے معلوم ہے' تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی تھی۔ تمہارا جرم اتنا سنگین نہیں تھا جتنا بنا دیا گیا۔ میں خود تمہیں قتل کردیتا تو مجھے افسوس نہ ہوتا۔ میں نے آج بھی تمہیں معاف نہیں کیا ہے۔ میرے گھر کو برباد کرنے والے تم ہی تھے مگر تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی۔ یوں سمجھ لو کہ آج ہمارا ایک حساب برابر ہوا۔ تم نے اس قاتل کو مار کے میرا قرض بھی چکا دیا تھا۔ یہ اس کی قیمت بھی ہے اور تمہارے سات سالوں کی بھی جو تم نے جیل میں کاٹے۔ ان لوگوں کو میں اپنی ذمے داری پر پاکستان پہنچا دوں گا مگر تم مجھے دوبارہ نظر آئے تو پھر ہم اصلی دشمن ہوں گے۔ یہ حساب درمیان میں نہ ہوتا تو میں تم کو دیکھتے ہی گولی مار دیتا۔" اس نے کمبل کے نیچے اپنی واسکٹ میں سے ریوالور نکال کے دکھایا۔

سرکار خاموش بیٹھا اپنے ہونٹ کاٹتا رہا۔

"یہ اس وقت بھی میرے پاس تھا جب تم نے گھنٹی بجائی تھی۔ میں نے دروازہ کھولنے سے پہلے ہی تمہیں دیکھ لیا تھا۔ اگر میں تم کو مار دیتا تو قانون مجھے کچھ نہ کہتا۔ تم پہلے ہی مفرور ہو اور پولیس کو مطلوب ہو۔ میں آسانی سے کہہ سکتا تھا کہ تم مجھے قتل کرنے آئے تھے اور میں نے اپنے دفاع میں تم کو مار دیا۔"

"یہ میری زندگی کے سات سالوں کی قیمت ہے؟" سرکار نے زیورات کو دیکھتے ہوئے کہا "اگر یہ سات سال تمہارے ہوتے تو تم کیا لیتے؟"

"مانگنے سے کچھ نہیں ملتا سرکار۔ کون خریدتا ہے کسی سے اس کی زندگی کے سات سال۔ اور کون بیچتا ہے! میری اور تمہاری زندگی میں جو فرق ہے وہی فرق قیمت میں بھی ہوگا۔ بس بھگوان کا شکر کرو کہ تم زندہ واپس جارہے ہو۔ اپنی جان دینے کے بجائے کچھ لے کرہی جارہے ہو۔ قیمت کم ہے یا زیادہ' اسے اٹھاؤ اور نکل جاؤ۔"

"میں چلا جاؤں گا صبح ہونے سے پہلے۔"

"نہیں۔ اب میں تمہیں اپنے گھر میں برداشت نہیں کرسکتا۔ اس سے پہلے کہ میرا ارادہ بدلے اور تم نقصان میں رہو' بھاگ جاؤ۔"

میں نے سرکار کو اشارہ کیا اور وہ اٹھ کھڑا ہوا "اچھا ہے' میں راتوں رات نکل جاؤں۔ میں نے تمہارے ساتھ کوئی دھوکا نہیں کیا تھا۔ رام ناتھ وعدہ کرکے مکر جائے تو مجھے الزام مت دینا۔"

میں نے کہا "رام ناتھ ایسا نہیں کرسکتا۔ تم جاؤ۔"

اس نے دروازہ کھولا اور سرد رات کے اندھیرے میں گم ہوگیا۔ باہر ہوا اتنی تیز تھی کہ خزاں رسیدہ درختوں کی شاخوں سے سیٹی بجاتی گزر رہی تھی۔

"جہاز پر جگہ بڑی مشکل سے ملتی ہے۔" وہ کچھ دیر بعد بولا' "تمہارے پاس نقد رقم کتنی ہے؟"

میں نے کہا "دس پندرہ ہزار۔ شاید زیادہ ہو۔ کاجل کے پاس کتنی ہے' یہ مجھے معلوم نہیں ہے۔"

"کاجل کون ہے؟

میں نے کہا "میری بہن۔ جس کے ساتھ وہ لڑکا ہے۔"

"بہنوئی کہاں ہے تمہارا؟"

میں نے کہا "وہ..... مارا گیا۔"

"پاسپورٹ ہیں تم لوگوں کے پاس؟"

میں نے قدرے تذبذب کے ساتھ کہا "چار پاسپورٹ ہیں مگر وہ انڈین گورنمنٹ کے جاری کردہ ہیں۔"

"انڈین پاسپورٹ ہیں۔ پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ تم یہاں سے انڈین ایرلائن کے ذریعے دہلی یا بمبئی جاسکتے ہو۔"

میں نے کہا "کاجل کا پاسپورٹ نہیں ہے۔ اور اس لڑکے کا بھی....."

"ان کو میں نیپال کا پاسپورٹ بنوا دوں گا۔ وہ بعد میں آجائیں گے" رام ناتھ بولا۔

"نہیں سیٹھ رام ناتھ۔ ہم سب ایک ساتھ جائیں گے اور ہم دہلی یا بمبئی نہیں' براہ راست کراچی جائیں گے۔"

"ایک ساتھ۔ اس میں بہت دن لگ جائیں گے۔"

"ہم انتظار کرسکتے ہیں" میں نے کہا۔

"آگے کس فلائٹ پر چھ سیٹیں ایک ساتھ ملیں گی' یہ کہنا بہت مشکل ہے" وہ فکر مند ہو گیا۔

"یہاں سے چھوٹے جہاز بھی تو جا رہے ہیں۔ کوئی چھ یا آٹھ سیٹوں والا سیسنا نہیں مل سکتا؟"

وہ چونکا "چارٹر فلائٹ کوئی نہیں ہے۔ ایک شخص ہے جو غیر قانونی طور پر جہاز اڑا کے لے جاتا ہے۔ جہاز اس کا اپنا نہیں ہے۔ وہ پائلٹ ہے مگر بہت اثر و رسوخ والا آدمی ہے۔ شاہی محل میں اس کا آنا جانا ہے اس لئے کوئی کچھ نہیں کہتا۔"

"تم اس سے بات کر سکتے ہو۔"

"بات تو کر سکتا ہوں مگر بات موقعے کی ہے۔ اسے جب موقع ملتا ہے تو وہ ایک ڈیڑھ گھنٹے کے لئے جہاز لے جاتا ہے۔ وہ تمہیں کراچی یا لاہور نہیں پہنچا سکتا۔ کسی دوسرے ملک کی سرحد وہ کیسے عبور کر سکتا ہے؟"

"پھر کیا وہ نیپال سے پرواز کر کے نیپال ہی میں اتار دے گا ہمیں؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ وہ تمہیں عین سرحد پر کسی جگہ اتار دے گا اور واپس بھاگ آئے گا۔ پاکستان کی سرحد پر کسی ایسی جگہ جہاں روک ٹوک نہ ہو۔ اسے ایسی ہر جگہ معلوم ہے جہاں ایک چھوٹا طیارہ اتارا جا سکتا ہے" رام ناتھ نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ تم اس سے بات کرو۔"

"ابھی؟" رام ناتھ نے نفی میں سر ہلایا "صبح بات ہو گی۔"

میں نے کہا "اگر اس نے انکار کر دیا..."

"انکار تو وہ نہیں کرتا' لالچی آدمی ہے۔ اور یہ کوئی برائی بھی نہیں۔ سب لالچی ہوتے ہیں" رام ناتھ نے کہا "مگر کیا پتا' اسے کب موقع ملے۔ تمہارے لئے آسان ہوتا اگر تم دہلی کے راستے جاتے۔"

"اس کا کوئی سوال نہیں۔"

"یہ تو ہو سکتا ہے... کہ کچھ لوگ پہلے چلے جائیں۔ فرض کرو دو یا تین سیٹوں کا بندوبست ہوتا ہے۔"

میں نے سوچ کے کہا "ہاں یہ ہو سکتا ہے۔ ہم دونوں بعد میں جا سکتے ہیں۔"

"تمہیں معلوم ہے پرائیویٹ جہاز میں کتنا خرچ ہو گا؟"

"ہم اپنا سب کچھ دے چکے' باقی بھی دے دیں گے۔ اور اگر یہ کم ہو تو بتاؤ' ہم پاکستان سے تمہیں رقم ارسال کر دیں گے۔ ایک لاکھ کے بدلے دو لاکھ۔"

اس نے کہا "پھر تم اپنے سفارت خانے کے ذریعے بات کیوں نہیں کرتے؟"

میں نے غالب کی طرف اور غالب نے میری طرف دیکھا۔ پھر ہم ایک ساتھ ہنس پڑے۔

"واقعی۔ یہ خیال تو ہمیں آیا ہی نہیں" غالب بولا۔

"حالانکہ سب سے آسان طریقہ یہی تھا۔" میں نے کہا "بے شک سفارت خانے والوں کے رویّے کی شکایت عام ہے مگر ہمارے لئے وہ اتنا تو کر ہی سکتے تھے کہ لاہور میں منظر سے بات کرا دیں۔"

"یہ منظر کون ہے؟" رام ناتھ بولا۔

"ہمارا دوست ہے۔ بہت بڑا وکیل ہے" میں نے کہا "ہمارے ایک اشارے پر سب کچھ کر سکتا ہے۔"

"اور بہت کچھ کرا سکتا ہے" غالب بولا۔

"تمہیں اس کا نمبر معلوم ہے؟" رام ناتھ نے کہا۔

"ہاں۔ زبانی یاد ہے۔"

"پھر سفارت خانے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ یہاں سے فون کر لو۔ اس وقت آسانی سے کال مل جائے گی۔ لائنیں خالی ہیں"

"اس سے اچھی بات کیا ہو سکتی ہے" میں نے کہا۔

رام ناتھ نے آپریٹر سے بات کی اور اسے لاہور کے عبدالودود منظر ایڈووکیٹ کا نمبر دیا۔ "یہ ارجنٹ کال ہے۔"

کال خلافِ توقع فوراً مل گئی۔ چند منٹ بعد گھنٹی بجی تو آپریٹر نے کہا "لاہور بات کریں۔"

میں نے بہت ہلکی سی آواز سنی۔ کسی نے نیند میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا "ہیلو۔"

میں نے کہا "منظر!"

"کون منظر؟"

میں نے کہا "مجھے عبدالودود منظر ایڈووکیٹ سے بات کرنی ہے"

اس نے کہا "سوری۔ وہ یہاں نہیں رہتے۔ یہ گھر میں نے خرید لیا ہے اور میں بہت تنگ آ گیا ہوں اس کی کالوں سے۔ اسے کم سے کم اپنا نیا نمبر مجھے بتا کے جانا چاہئے تھا۔ تمہیں بھی سوچنا چاہئے کہ یہ کوئی وقت نہیں ہے کسی کو پریشان کرنے کا' خواہ وہ وکیل ہو اور تم نے قتل کر دیا ہو کسی کو۔"

وہ سخت بدتمیز آدمی تھا کہ اپنی کہہ گیا اور مجھے کچھ کہنے کا موقع دیئے بغیر فون بند کر دیا۔

"اُلّو کا پٹھا!" میں نے بھنّا کے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

اسی وقت باہر سے ایک ساتھ کئی گاڑیوں کے رکنے کی آوازیں آئیں۔ رام ناتھ نے پردہ ہٹا کے دیکھا تو دھندلائے ہوئے شیشوں کے پیچھے ہیڈ لائٹس کی روشنی بھی گل ہو گئی۔ اس نے ایک پٹ کھول کے جھانکا۔ میں نے جھری سے دیکھا تو اس کی کوٹھی کو پولیس نے گھیرے میں لے لیا تھا۔ تین گاڑیوں سے مسلح پولیس والے کود کے اتر رہے تھے۔ خوف سے سیٹھ رام ناتھ کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔

میں نے کہا "رام ناتھ! یہ سب کیا ہے؟"

"میں... میں کیا بتاؤں" رام ناتھ کی حالت غیر تھی۔ "یہ مصیبت تم لوگ ہی اپنے ساتھ لائے ہو۔"

میں نے برہمی سے کہا "اگر یہ حرکت اس کتے سرکار نے کی ہوگی تو اسے مہنگی پڑے گی۔"

پولیس اب گھر کے دروازے پر دستک دے رہی تھی۔

میں نے کہا "رام ناتھ! ہم کہاں جائیں؟"

"تم کو کہیں جانے کی کیا ضرورت ہے۔ تم یہاں ٹھہو' میں بات کرتا ہوں۔ یہ غلط فہمی معلوم ہوتی ہے۔"

غالب نے نازو اور رابعہ کو بھی جگا دیا تھا اور وہ سب اپنے اپنے طور پر گھر کے مختلف حصوں میں مورچہ بند ہو چکے تھے۔ غالب ساتھ والے کمرے کی دیوار سے لگا دروازے کے پیچھے تھا۔ رابعہ ایک باتھ روم میں تھی اور نازو دوسرے میں۔

"رام ناتھ! دروازہ کیوں نہیں کھولتے؟" باہر سے کسی نے انگریزی میں گرج کے کہا۔

رام ناتھ نے اندر سے کہا "کیا مصیبت ہے۔ تم انتظار نہیں کر سکتے دو منٹ۔"

پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا "آخر تم لوگوں کو کیا ہوا ہے؟ تم کیوں پریشان ہو۔ ایسے ریوالور ہاتھ میں لے کر چھپنے کا کیا مقصد ہے اور اس سے فائدہ؟ کیا تم پولیس والوں پر گولیاں چلاؤ گے؟"

میں نے کہا "حفظ ماتقدم....."

اس نے میری بات کاٹ دی "خاک دھول۔ تم میرے مہمان ہو' کوئی ڈاکو نہیں۔ آرام سے بیٹھ جاؤ۔ لڑکیوں سے کہو سو جائیں۔ بستر میں سے انہیں کون کھینچ کے نکالنے کی جرأت کر سکتا ہے۔ ایسے تم خواہ مخواہ پولیس کو موقع دو گے کہ وہ تمہیں گرفتار کریں اور پوچھ گچھ کے لئے لے جائیں۔ اور کچھ نہیں تو وہ تم سے اسلحے کا لائسنس ہی مانگ لیں گے۔"

میں نے اس کی بات پر غور کر کے کہا "کہتے تو تم ٹھیک ہی ہو۔"

"رام ناتھ! ہم دروازہ توڑ دیں گے" باہر سے کسی نے دروازے پر لات ماری۔

"توڑ کے دیکھو" رام ناتھ نے دہاڑ کے کہا "جو سب سے پہلے داخل ہو گا وہی میری گولی کا پہلا نشانہ بنے گا۔"

میں نے کہا "تم جا کے دروازہ کھولو' میں سب ٹھیک کر لیتا ہوں۔"

جب رام ناتھ نے دروازہ کھولا تو پولیس والوں نے اسے دھکا دے کر راستے سے ہٹایا اور سیدھے اندر آ گئے۔

"یہ کیا بدمعاشی ہے؟ یہ میرا گھر ہے' کوئی تھانہ نہیں کہ تم منہ اٹھائے اندر گھستے چلے آ رہے ہو" رام ناتھ نے مشتعل ہو کے کہا "اور آدھی رات کو میرے گھر پر چھاپا مار کے تم کیا برآمد کرنا چاہتے ہو؟"

"سرکار کو" ایک سب انسپکٹر نے کہا "سرکار کہاں ہے؟ ہم اسے گرفتار کرنے آئے ہیں۔"

"تمہارا دماغ خراب ہے۔ میں پولیس کمشنر..."

"ہاں کر دینا رپورٹ۔ پولیس کمشنر کو' شاہ بریندرا کو' جسے چاہو بتا دینا۔ مفرور مجرم کو پکڑنے کے لئے ہم کہیں بھی داخل ہونے کا پورا اختیار رکھتے ہیں" دوسرے انسپکٹر نے غرا کے کہا۔

"مگر سرکار کا یہاں کیا کام؟"

"کام... کام تو ایک ہی ہو سکتا ہے اسے تم سے۔ تمہیں قتل کرنا" پولیس انسپکٹر نے اِدھر اُدھر جھانکتے ہوئے کہا اور پھر اپنے ماتحتوں کو حکم دیا کہ وہ سارے گھر میں پھیل جائیں اور کونا کونا چھان ماریں۔

"کسی وارنٹ کے بغیر خانہ تلاشی غیر قانونی ہے۔" رام ناتھ نے احتجاج کیا۔

انسپکٹر نے کہا "مجھے معلوم ہے" اور بے پروائی سے ایک صوفے پر بیٹھ گیا "جب ہم چلے جائیں گے تو کیا ثبوت ہو گا تمہارے پاس کہ ہم یہاں آئے بھی تھے؟ ہم سب تو تھانے میں موجود ہیں اور اس بات کے گواہ بھی بہت ہیں۔ تم گواہ کہاں سے لاؤ گے؟"

میں اور غالب صوفوں پر یوں بیٹھے تھے جیسے ہم نیند سے جاگے ہوں۔ ہم اس ساری کارروائی کو ناگوار لاتعلقی سے دیکھ رہے تھے۔ رابعہ اور نازو کے لئے بھی گھوڑے بیچ کر سوتے رہنا محال تھا۔ اس ہڑبونگ میں وہ بھی آنکھیں کھولے بستر پر پڑی خوف زدہ نظروں سے پولیس والوں کو ہر کمرے' باتھ روم' الماری اور کونوں کھدروں میں جھانکتا دیکھنے پر مجبور تھیں۔

میں نے کہا "کیا تمہارے خیال میں میری گواہی قابلِ قبول نہیں ہو گی؟ میں نہ بچہ ہوں اور نہ ذہنی طور پر معذور۔"

غالب نے کہا "ہاں۔ تم جھوٹے گواہوں پر اتنا انحصار کرتے ہو تو رام ناتھ کو اناتھ کیوں سمجھتے ہو؟ پھر خاصے معتبر' چشم دید گواہ ہوں گے تمہاری لاقانونیت کے مظاہرے کے....."

"تم کون ہو؟" انسپکٹر نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں سوال کیا۔

میں نے غالب سے کہا "کیمرہ نکالو اور ان سب کی تصویریں بنا لو تاکہ سند رہیں اور کام آئیں۔"

انسپکٹر نے غالب کو روک لیا "ایک منٹ شریمان۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارا کیمرہ توڑنا پڑے اور کیمرہ بچانے کی کوشش کرو تو تمہارا سر ٹوٹ جائے۔"

"اپنی فکر کرو انسپکٹر۔ ہمارا کیمرہ یا سر ٹوٹنے کے بعد کہیں تمہارا محکمہ نہ ٹوٹ جائے" میں نے کہا "ہم غیر ملکی ہیں۔ میں اور میری بیوی ویسے تو ڈاکٹر ہیں مگر ہم دہلی گزٹ سے بھی منسلک ہیں۔"

انسپکٹر کا سارا مصنوعی کروفر غائب ہو گیا اور وہ سیدھا ہو کے بیٹھ گیا "سیٹھ رام ناتھ! تم نے اپنے مہمانوں کا تعارف نہیں

کرایا۔"

میں نے اپنے پاسپورٹ پیش کرتے ہوئے کہا "میں ڈاکٹر راجن ہوں اور یہ میری بیوی ڈاکٹر رکمنی۔ یہ میرا سالا ہے کمار اور وہ اس کی پتنی مسز کمار۔ اچھی طرح دیکھ لو۔ پاسپورٹ جعلی نہیں ہیں اور ان پر نیپال کی حکومت کا جاری کردہ ویزا ہے۔"

انسپکٹر کو میرے اعتماد نے ہی نروس کردیا تھا۔ اس نے پاسپورٹ کے اندراجات پر سرسری نظر ڈالی اور اٹھ کھڑا ہوا "آئی ایم سوری کہ آپ کو بھی اس وقت زحمت ہوئی۔ دراصل یہ معاملہ ہی ایسا تھا۔ ہمیں معلوم ہوا تھا کہ ایک قاتل جو جیل سے فرار ہوگیا تھا' اسے یہاں داخل ہوتے دیکھا گیا ہے۔"

اب رام ناتھ بھی گرم ہوگیا "کس الّو کے پٹّھے نے دی تھی یہ اطلاع؟ اسے میرے سامنے لاؤ۔ میں کوئی ایرا غیرا نہیں' سیٹھ رام ناتھ ہوں۔ سرکار کو جس نے دیکھا تھا میں اس کی آنکھوں کا ٹیسٹ پہلے کراؤں گا' دماغ کا بعد میں۔"

انسپکٹر نے چیخ کر اپنی فوج کو واپسی کا حکم دیا "برا مت مانیں سیٹھ صاحب۔ سرکار آپ کی جان کا دشمن ہے' یہ سارا زمانہ جانتا ہے۔ ہم کیا جواب دیتے اگر خدانا خواستہ آپ کو کچھ ہوجاتا؟"

"میں اپنی حفاظت کرسکتا ہوں" رام ناتھ نے اپنے ریوالور کی نمائش کی "بھگوان کے بعد اپنی رکھشا کے لئے میں اس پر بھروسا کرتا ہوں' تم پر نہیں۔"

وہ بڑی عجلت میں گاڑیوں پر سوار ہوکے روانہ ہوگئے۔

"آخر کس نے مخبری کی تھی' یہ تو بتا جاؤ" رام ناتھ بولا۔

"ہے ایک...." انسپکٹر نے اس کو گالی دے کر کہا "آج تک اس نے کبھی غلط اطلاع نہیں دی تھی۔"

"اچھا مت بتاؤ اس کا نام مگر اس سے خود ہی پوچھ لینا کہ اب وہ نشہ تو نہیں کرنے لگا ہے" رام ناتھ نے کہا اور دھڑ سے دروازہ بند کردیا۔

ایک ایک کرکے پولیس کے سارے ٹرک چلے گئے تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

رام ناتھ نے سرکار کو گالی دی "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس کو کیا کہوں۔ اس نے مجھے تباہ کردیا لیکن میں اس کا مقروض بھی ہوگیا تھا۔ اس کا قرض تو ادا کردیا میں نے لیکن ایسا لگتا ہے کہ مجھے یہ نیکی بھی مہنگی پڑے گی۔ اس کی دشمنی بھی جان کا روگ بنے گی۔"

میں نے کہا "رام ناتھ' آخر بات کیا ہے؟"

اس نے دروازہ بند کردیا اور سر پکڑ کے ایک کرسی پر بیٹھ گیا "ضرور کسی نے اسے دیکھا ہوگا۔ دکھشا کا خاندان بہت بڑا ہے۔ دس تو بھائی تھے اس کے۔"

"غالب نے کہا "یہ دکھشا کیا چیز ہے؟"

رام ناتھ نے دکھی نظروں سے اس کی طرف دیکھا "وہ میری دھرم پتنی تھی۔ میرے بڑھاپے کی وہ غلطی جس کا کفارہ میں آج تک ادا کررہا ہوں۔ دولت نے میری آنکھوں پر پٹی نہ باندھی ہوتی تو میں اپنی اور اس کی عمر کا فرق دیکھ لیتا۔ میں اندھا ہوگیا تھا کہ میں نے اس کی جوانی نہیں دیکھی۔ نہیں' صرف اس کی جوانی دیکھی اور دیوانہ ہوگیا۔ اس کی مجبوری نہیں دیکھی۔ نہیں' یہ بھی غلط ہے۔ مجبوری کو بھی دیکھا میں نے مگر سمجھا نہیں۔ میں نے سمجھا کہ مجبوری کی قیمت ادا کرکے میں دکھشا کو خرید سکوں گا۔ حالانکہ دکھشا صرف شریر نہیں تھی' آتما بھی تھی۔ کسی بھی خوب صورت عورت کا جسم خریدا جاسکتا ہے۔ ایک لاکھ روپے میں یا ایک کروڑ ڈالر میں۔ مگر اس کی آتما۔ وہ بن مول کسی کو اپنی آتما دان کردیتی ہے۔ کسی مفلس اور بے حیثیت آدمی کو۔"

میں نے کہا "دکھشا تمہاری دوسری بیوی تھی؟"

اس نے اقرار میں سرہلایا "پہلی نے جیون بھر ساتھ دیا۔ بڑا لمبا عرصہ تھا وہ اور بہت مشکل وقت بھی تھا۔ میرے پاس رہنے کو گھر تک نہیں تھا جب وہ آئی تھی۔ بس ایک جھونپڑی سی تھی۔ اسی کو آباد کرنے آگئی تھی وہ۔ بہت پرانی ہے یہ بات۔ دوسری جنگ عظیم سے بھی پہلے کی۔ اس جھونپڑی کو آباد ہی نہیں کیا اس نے آہستہ آہستہ ایک کمرے میں پھر ایک مکان میں اور کوٹھی میں بدل دیا۔ میری تقدیر تھی وہ۔ میں اس کے آنے سے پہلے کیا تھا۔ ایک مزدور۔ خود اپنا پیٹ بھرنا مشکل ہوتا تھا مجھے مگر ہم نے آدھا آدھا کھایا جو بھی ملا۔ پھر وقت بدلا۔ وہ عورت نہیں لکشمی تھی۔ میں نے جو مانگا اس نے مجھے دیا اور جب مانگنے کو کچھ نہ رہا تو وہ چلی گئی۔ جیسے وہ مجھے صرف دینے ہی آئی تھی۔ روپیہ پیسہ' عزت' اولاد اور خوشی۔ خود اس نے کبھی کچھ نہیں مانگا تھا۔ کوئی سکھ بھی تو نہ دے سکا میں اسے۔ بس ایک رات جیسے وہ چپ چاپ سرخ کپڑوں میں لپٹی گٹھری سی بنی آئی تھی ویسے ہی خاموشی سے چلی گئی۔ وہ بولتی بھی کم تھی۔ کوئی شکوہ نہیں' شکایت نہیں۔ میں اسے بہت کچھ کہہ جاتا تھا مگر وہ سن لیتی تھی اور خاموش رہتی تھی۔ اس کے دس بھائی تھے۔ چار چھوٹے' چھ بڑے۔ وہ سب بدمعاش ٹائپ تھے لیکن اس نے کبھی کسی کو بیچ میں نہیں بولنے دیا۔ وہ سب ناراض ہوکے الگ ہوگئے۔ اس سے ملنا تک چھوڑ دیا حالانکہ وہ ایک ہی بہن تھی۔ وہ مجھے قتل کردیتے' میری ہڈیاں توڑ ڈالتے مگر اس نے ایک دیوار کی طرح میری حفاظت کی۔ اس نے کہا کہ یہ میرے لئے بھگوان سمان ہیں۔ ان کی عزت میری زندگی ہے۔ بڑی عجیب عورت تھی وہ۔ خالص ہندوستانی عورت۔"

"ایک مشرقی عورت" میں نے کہا۔

"ہاں۔ بالکل مشرقی روایات پر پورا اترنے والی مثالی شوہر پرست بیوی۔ مگر میں نے اس کی قدر نہیں جانی۔ میں بہت جلد اسے بھلا بیٹھا۔ اس کے بنا جیون کا سونا پن مجھے کاٹتا تھا مگر میں نے نہیں سمجھا کہ اس خلا کو دنیا کی کوئی دوسری عورت کیسے پُر کرسکتی۔

اور میں بھٹکنے لگا۔ تیس سال اس نے مجھے نہیں بھٹکنے دیا۔ دولت بہت ہونے کے باوجود مجھے بھٹکنے کا خیال نہیں آیا۔ میں نے کبھی سوچا ہی نہیں کہ اس کے علاوہ کوئی دوسری عورت بھی ہے جو زیادہ حسین اور قابل توجہ ہے۔ ہے نا حیرانی کی بات؟ یہی کمال تھا اس کا۔ جب وہ راستے سے ہٹ گئی تو میں اس راستے پر چل پڑا جس پر سب ہی دولت مند بوڑھے ہوس کی لاٹھی تھام کے چلتے ہیں اور ان کی دولت کی طلب گار شکاری عورتیں اس راستے کے دونوں جانب اپنے حسن کا جال پھیلائے کھڑی رہتی ہیں۔ اپنی اداؤں کی' حسن وشباب کی اور جسم کی نمائش لگانے۔ پُرفریب' محبت بھری مسکراہٹ چہروں پر سجائے۔ گھریلو عورت یہ سب کچھ نہیں جانتی۔ وہ تو محبت کرنا جانتی ہے' خدمت کرسکتی ہے اور دکھ سہہ سکتی ہے۔ اچانک میری نظریں اس نمائش کی ہوشربا چمک دمک سے خیرہ ہوگئیں۔ میرے دن رات عیش وعشرت میں ڈوب گئے۔ یہ ایک نیا' انوکھا اور بڑا سنسنی خیز تجربہ تھا مگر ایک دن اچانک میری آنکھوں پر پڑا ہوا پردہ ہٹ گیا۔ وہ ایک عام سا تجربہ تھا جو میرے جیسے سب ہوس پرستوں کے لئے ایک سبق ہوتا ہے۔ ایک عورت کو میں نے اپنے کاروباری حریف کے ساتھ دیکھ لیا۔ بیک وقت وہ ہم دونوں سے محبت کررہی تھی' ہم دونوں کو لوٹ رہی تھی۔ اس حقیقت کا انکشاف ہوا تو ہم جو کاروباری حریف تھے' ایک دوسرے کے رقیب بن گئے۔ ہمیں احساس ہوا کہ ہماری اصل حریف تو وہ عورت تھی جو ایک ساتھ ہم دونوں کو بے وقوف بنا کے تباہ کررہی تھی۔ ہم دونوں مل کے بیٹھے اور سوچنے لگے کہ اسے کیا سزا دی جائے۔ اچانک یہ بھی ایک کاروباری معاملہ بن گیا اور ہم یوں متحد ہوگئے جیسے ہمیں کسی مشترکہ دشمنی کا سامنا ہے۔ حکومت کی غلط پالیسی یا کسی نئے ٹیکس کے خلاف بھی ہم سب کاروباری حریف اکٹھے ہوجاتے تھے جس سے ہمارے کاروبار پر زد پڑتی ہو۔ اتفاق رائے سے ہم نے اس عورت کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا جو ہم دونوں کو بہت نقصان پہنچا چکی تھی۔ کسی مشکل کے بغیر ہم نے اسے پرلوک بھیج دیا لیکن اس واقعے کے بعد میں سنبھل گیا۔ مجھے اندازہ ہوگیا کہ میں کتنا بے وفا اور بے وقوف ہوں۔ اگر مجھے عورت کی ضرورت ہی تھی تو مجھے دوسرا بیاہ کرلینا چاہئے تھا۔ اس کی صلاح مجھے سب دیتے تھے۔ یہ بات میری عقل میں آئی بھی تو ٹھوکر کھانے کے بعد۔ پھر میں نے سوچا کہ چلو صبح کا بھولا شام کو گھر لوٹ آیا۔ میں نے تلاش شروع کی اور اپنے گناہ کا کفارہ ادا کرنے کی کوشش میں پھر دھوکا کھا گیا۔"

وہ کچھ دیر کے لئے خاموش ہوگیا۔ اس کی داستان حیات کا یہ باب رابعہ اور نازو کے لئے باعث دلچسپی ہوگیا تھا۔ وہ لحاف میں سے منہ نکالے بڑی توجہ سے ساری بات سن رہی تھیں۔

میں نے یاد دلانے کے لئے کہا "پھر تمہیں دکھشا مل گئی۔"

وہ چونکا "ہاں۔ ایک شخص نے مجھے دکھشا کے بارے میں بتایا۔ میری شرط یہ تھی کہ وہ غریب گھر کی لڑکی ہو جو میرا گھر سنبھالے اور مجھے سنبھالے۔ مجھے کوئی حسین وجمیل' بڑے گھر کی لڑکی مل بھی نہیں سکتی تھی۔ میں تیس چالیس سال کی کسی عورت کو قبول کرنے کے لئے تیار تھا جس کی شادی کی راہ میں غربت رکاوٹ بنی رہی ہو۔ ایسی بہت ناریاں ہیں ہمارے دیش میں جو بن بیاہی رہ جاتی ہیں کیونکہ ان کے ماں باپ جہیز کی شرط پوری نہیں کرسکتے۔ میرا خیال تھا کہ دکھشا بھی ایسی ہی ہوگی۔ میں نے اسے دیکھا تو حیران رہ گیا۔ وہ اس وقت پچیس سال کی تھی۔ ایک بار بیوہ ہوچکی تھی۔ شادی کے چند دن بعد حادثے میں اس کا شوہر مرگیا تھا اور سسرال والوں نے اسے منحوس' ڈائن قرار دے کر گھر سے نکال دیا تھا۔ اس کے لئے دوسرے رشتے ایسے آئے جو کسی کو بھی قبول نہ تھے۔ نہ دکھشا کو' نہ اس کے ماتا پتا کو۔ وہ بڑی سُندر' کومل اور عجیب سی لڑکی تھی۔ اداس اداس' کھوئی کھوئی۔ اس کی آنکھوں میں بڑے گہرے دکھ کا ساگر ہلکورے لیتا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے وہ بات کرتے کرتے رو پڑے گی۔ اس کی آنکھوں سے کوئی آنسو چھلک پڑے گا۔ وہ جتنی دلکش اور خوب صورت تھی اس کی تقدیر اتنی ہی بدصورت اور بے رحم ثابت ہوئی تھی۔ دنیا نے اسے منحوس قرار دے کر بھلا دیا تھا حالانکہ خوبصورتی کو تو نحوست سے منسوب کرنا ہی غلط ہے۔ بس مجھے اس پر ترس آگیا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اسے دیکھتے ہی میرا دل اپنے تمام دکھ بھول گیا۔ وہ دکھ جو ایک وفاشعار بیوی کی جدائی نے دئے تھے اور وہ دکھ جو ایک خود فروش عورت کی بے وفائی نے دیے تھے۔ میں نے سوچا کہ وہ ان دکھوں کا مداوا بن کے آئی ہے۔ بھگوان نے مجھے بھٹکنے کی سزا دی اور پھر اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کا موقع فراہم کردیا۔ میں نے اس کے لئے پیغام دیا تو اس کے ماں باپ نے فوراً قبول کرلیا کیونکہ میں نے کوئی جہیز نہیں مانگا تھا۔ دکھشا کی نحوست کی بات کرنے والوں کی جہالت کو نظرانداز کردیا تھا اور..... اور دکھشا کے باپ کے سارے دلدر بھی دور کردئے تھے۔ وہ دلدر جو غربت کے ساتھ رہتے ہیں۔ میں نے اس کی یوں مدد کی کہ اس کی زندگی کو مفلسی کی دلدل سے نکال دیا۔ دکھشا کا سارا خاندان میرا شکرگزار تھا اور میرا خیال تھا کہ دکھشا بھی بہت خوش ہوگی۔ بہت احسان مند ہوگی۔"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "افسوس کہ یہ سب کچھ ایسا نہیں تھا۔ میں نے دکھشا کے باپ کی مجبوریوں کے بدلے دکھشا کا جسم خرید لیا تھا' اس کی روح کبھی میری نہ تھی۔ روح وہ پہلے ہی اپنے پریمی کو دان کرچکی تھی اور جس سے وہ پریم کرتی تھی وہ ایک جوان آدمی تھا۔ ایک معمولی سے خاندان کا لڑکا جو کبھی بڑا آدمی نہیں بن سکتا تھا اور جو کبھی دکھشا کو حاصل بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اس دنیا میں ان کا ملنا اتنا ہی ناممکن تھا جتنا زمین آسمان کا ملنا کیونکہ وہ مسلمان بھی تھا۔ اگر وہ دکھشا کی خاطر اپنا دھرم چھوڑتا تو اس کا سارا خاندان برباد ہوجاتا۔ اس کی بہنوں کے گھر اجڑ جاتے۔ خود

دکھشنا کے لئے بھی مسلمان ہونا اتنا ہی ناممکن تھا۔ اس کے بھائی اسے زندہ جلادیتے۔ یہ بات مجھے دکھشنا کی موت کے بہت عرصے بعد معلوم ہوئی کہ وہ کسی سے پیار کرتی تھی۔ یہ ایسی خاموش محبت تھی کہ نہ مجھے کبھی اس کا اندازہ ہوا' نہ کسی اور کو۔ وہ ڈرتی تھی کہ اس کے ظالم بھائیوں کے کان میں بھنک بھی پڑگئی تو وہ اس کے پریمی کو بڑی بھیانک موت ماریں گے۔ اگر وہ مجھے بتادیتی.... تو شاید میں اس کو آزاد کردیتا۔ آزاد نہیں' میں اس کی مدد بھی کرتا۔ یہ میں آج کہہ رہا ہوں۔ اس وقت کیا پتا میں مشتعل ہوکے اسے مار ڈالتا۔"

میں نے کچھ دیر بعد کہا "یہ سرکار بیچ میں کہاں سے آگیا تھا؟"

"سرکار.... وہ بس میرے پڑوس میں رہتا تھا" وہ بولا "اس نے دکھشنا کو دیکھا تو اس پر لٹو ہوگیا۔ بوڑھے آدمی کی جوان بیوی خوبصورت بھی ہو تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ مجھے سوچنا چاہئے تھا کہ دکھشنا جیسی لڑکی مجھ سے کیسے پیار کرسکتی ہے۔ میری عمر اس کے باپ کے برابر تھی۔ سرکار بہت بدمعاش تھا۔ اس نے ہر طرح سے دکھشنا کو ورغلایا۔ اسے میرے خلاف بھڑکاتا رہا کہ لعنت بھیجو اس بڈھے پر' میرے ساتھ بھاگ چلو۔ وہ پاسپورٹ آفس میں تھا۔ دکھشنا نے اسے بے وقوف بنایا۔ اس سے کہا کہ میرا ایک کام کردو پہلے۔ اس نے دو جعلی پاسپورٹ بنوائے۔ اپنے لئے اور اپنے پریمی کے لئے۔ سرکار اس کے چکر میں آگیا۔ وہ پاسپورٹ آفس میں کام کرتا تھا۔ اس نے جعلی پاسپورٹ لادئے۔ ان پر نام غلط تھے' باقی سب ٹھیک تھا۔ ایسا ہی ایک پاسپورٹ وہ اپنے لئے بنالایا۔ اس کا تو یہ دھندا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا مگر بہت پہلے سے خفیہ پولیس والوں نے اس کی نگرانی شروع کردی تھی۔ اس نے دکھشنا کے ساتھ فرار ہونے کے چکر میں ایک لمبا ہاتھ مارا اور چھ جعلی پاسپورٹ بنادئے۔ اسے کانوں کان خبر نہیں ہوئی کہ یہ خفیہ پولیس والوں کا پھیلایا ہوا جال تھا۔ وہ گرفتار ہوگیا۔ اپنی ساری کمائی رشوت میں دے کر وہ بچ تو گیا مگر اسے شک ہوگیا کہ اسے دکھشنا نے دھوکا دے کر پکڑوایا تھا۔ اس کے علاوہ.... شاید اسے یہ بھی معلوم ہوگیا تھا کہ وہ نہ میری پتنی ہے اور نہ اس کی محبوبہ.... وہ جسے چاہتی ہے وہ تو کوئی اور ہی ہے۔ وہ چالاک آدمی تھا۔ یہ بات مجھے نہ معلوم ہوسکی۔ غالباً اس لئے کہ میں اپنے کام سے کام رکھنے والا آدمی ہوں۔ شکی مزاج نہیں ہوں اور دھوکے باز نہیں ہوں چنانچہ کسی بھی تعلق کی ابتدا عدم اعتماد سے نہیں کرتا۔ اسے علم ہوگیا کہ وہ دکھشنا کے ہاتھوں برباد ہوا۔ اس کی نوکری بھی گئی' عزت بھی گئی اور دولت بھی۔ میں اس کا جانی دشمن ہوگیا اور میں نے ہی اسے زیادہ سے زیادہ سزا دلوانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ اس کی وجہ سے میری بہت رسوائی ہورہی تھی۔ وہ میری عدم موجودگی میں آتا جاتا تھا لیکن میں ایک بار بھی اسے رنگے ہاتھوں نہ پکڑسکا۔ دکھشنا اس سے کسی قسم کے تعلق کا کیسے اقرار کرسکتی تھی مگر میں زبان خلق کو جھٹلا نہیں سکتا تھا۔ جب تک مقدمہ چلتا رہا وہ ضمانت پر باہر رہا اور اس نے اپنے سازشی ہتھکنڈوں سے میری کوششوں کو ناکام کردیا۔ اس کے خلاف مقدمہ ختم ہوگیا مگر اس چکر میں وہ کہیں کا نہ رہا۔ اس کی ساری حرام کی کمائی نکل گئی' وہ ملازمت سے برطرف ہوگیا اور اس نے مار بھی بہت کھائی۔ پولیس سے بھی اور کرائے کے غنڈوں سے بھی' جو میں نے اس کے پیچھے لگائے تھے۔ پھر اچانک ایک دن کسی نے دکھشنا کو قتل کردیا اور پولیس نے اسے پھر گرفتار کرلیا۔ حالات کی گواہی اس کے خلاف تھی۔ اس کے اور دکھشنا کے تعلقات کے عینی شاہد بہت تھے جو سامنے آئے بغیر مجھے حالات کی خرابی سے آگاہ رکھتے تھے۔ اب پھر انہی لوگوں نے مجھے گمنام فون کئے اور کہا کہ تمہاری بیوی کا قاتل سرکار کے سوا کوئی نہیں ہوسکتا۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ میرے ہمدرد ہیں تو سامنے آئیں اور عدالت کو یہ بات بتائیں' کوئی ثبوت ہے تو پیش کریں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ میرے بہت سے پڑوسی چشم دید گواہ بن گئے۔ میں نے دو ملازموں کو گواہ بنا کے پیش کیا اور انہی حربوں سے کام لے کر جن کی مدد سے سرکار جعلسازی کے کیس میں سزا پانے سے بچ گیا تھا' میں نے اس کے گھر سے آلۂ قتل بھی برآمد کرادیا اور ماہرین کی رپورٹیں بھی حاصل کرلیں کہ قتل اسی آلے سے ہوا ہے۔ اب وہ قلاش تھا چنانچہ اپنی بے گناہی نہ ثابت کرسکا۔ اسے سزائے موت ہوگئی مگر پھر ملک میں ایک سرکاری جشن پر سزائے موت پانے والے سب مجرموں کو رعایت دی گئی تو موت کی سزا کو عمر قید میں بدل دیا گیا۔ مقدمے کے دوران ہی سرکار نے دکھشنا پر الزام لگایا تھا کہ وہ کسی اور سے محبت کرتی تھی مگر دولت مند رام ناتھ نے اسے خریدلیا۔ دکھشنا نے اپنے محبوب کے ساتھ فرار ہونے کا منصوبہ بنایا تھا کیونکہ وہ مسلمان ہے اور وہ یہاں شادی نہیں کرسکتے تھے۔ تاہم وہ دکھشنا کے محبوب کا نام نہیں بتاسکا اور نہ ہی یہ ثابت کرسکا کہ جس کے لئے اس نے جعلی پاسپورٹ بنوائے تھے وہ کون تھا۔ اس نے بارہا مجھے بھی گالیاں دیں اور کہا کہ میں اندھا' جاہل اور احمق ہوں کہ اپنی بیوی پر اعتماد کرتا ہوں اور یہ نہیں جانتا کہ وہ کسی اور سے پیار کرتی ہے۔ اور یہ کہ میں بلاوجہ اس کا دشمن ہورہا ہوں حالانکہ وہ خود بھی دکھشنا کے تریا چلتر کا شکار رہا ہے۔ دکھشنا پر کسی بات کا اثر نہیں ہوتا تھا۔ وہ پہلے کی طرح خاموش اور گم صم رہتی تھی۔ اتنا تو میں اندازہ کرچکا تھا کہ وہ خوش نہیں ہے اور میں نے اس سے شادی کرکے غلطی کی تھی۔ الزامات کی تردید وہ خود کردیتی تھی کہ یہ سب بکواس ہے اور مجھے فضول باتوں پر دھیان نہیں دینا چاہئے۔ پھر مجھے جیل سے اس کا پیغام ملا۔ وہ مجھ سے ملنا چاہتا تھا۔ مجھے اس سے کوئی ہمدردی نہیں تھی مگر تجسس مجھے کھینچ کرلے گیا۔ آخر میرا دشمن' میری بیوی کا آشنا اور قاتل مجھ سے کیا بات کرنا چاہتا ہے۔ یہی جاننے کے لئے میں جیل پہنچ گیا۔ تھوڑا سا پیسہ خرچ کرکے میں نے اس سے علیحدگی میں ملاقات کی رعایت حاصل کرلی

مگر اپنی حفاظت کے خیال سے غافل نہیں ہوا۔ وہ جوان آدمی تھا اور بہت صحت مند بھی۔ اکیلے میں وہ میرا گلا گھونٹ سکتا تھا۔ اسے تختۂ دار تک پہنچانے میں سب سے زیادہ تو میری ہی کوششوں کو دخل تھا۔ اس وقت تک خود اس کے یا بھگوان کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ قاتل نہیں ہے۔ اس شخص کی ذہنی کیفیت کیا ہوسکتی ہے جس کو یقین ہو کہ اسے ایک ناکردہ جرم کی پاداش میں زندگی سے محروم کیا جارہا ہے اور یہ ظلم بھی انصاف کے نام پر ہوگا۔ موت سے بچ جانے کے بعد بھی اسے شدت سے احساس تھا کہ عمر قید وہ کسی اور کے جرم میں کاٹ رہا ہے۔ جب میں اس سے ملا تو وہ پاگل ہورہا تھا۔ اگر اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں نہ ہوتیں تو وہ بیچ مجھے گلا گھونٹ کے ہلاک کردیتا۔ بہت ضبط سے کام لیتے ہوئے اس نے مجھے بتایا کہ میری پتنی دکھشنا کا قاتل اس سے ملنے آیا تھا۔ میں اس انکشاف پر اچھل پڑا۔ اس نے روتے روتے مجھے بتایا کہ گزشتہ روز اس سے ایک شخص ملنے آیا تھا۔ اس نے اپنا نام غلط لکھوایا تھا۔ وہ تقریباً تیس سال کا جوان اور خوب صورت آدمی تھا۔ میرے سامنے اس نے اعتراف کیا کہ وہ دکھشنا کا محبوب ہے اور اسی نے دکھشنا کا خون کیا تھا۔ اس کو معلوم ہے کہ میں بے گناہ ہوں اور مجھے دی جانے والی سزائے موت بھی اتنی ہی غلط تھی جتنی عمر قید کی سزا۔ وہ بہت پریشان تھا اور اس کا ضمیر اسے مسلسل ملامت کررہا تھا کہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی وہ خاموش ہے اور قانون لاعلمی کے باعث ایک بے گناہ کو پھانسی پر چڑھانے والا ہے۔ اگر اسے پھانسی ہوجاتی تو شاید وہ پاگل ہوکے خودکشی کرلیتا۔ موت کی سزا کے عمر قید میں تبدیل ہوجانے کے بعد اسے کچھ سکون ملا تو وہ اپنے جرم کا اعتراف کرنے آگیا ہے مگر اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں کرسکتا کیونکہ وہ مجبور ہے اور بزدل ہے۔ میں نے پہلے اس کی بات بے یقینی سے سنی' پھر اسے بہت گالیاں دیں اور اس پر بہت چیخا چلایا کہ مجبور اور بزدل ہی نہیں' وہ ایک بے ضمیر شیطان ہے۔ کوئی انسان کسی بے گناہ کو سزا پاتے نہیں دیکھ سکتا اور خاموش نہیں رہ سکتا۔ اس نے کہا کہ میں نے بہت سے لوگوں کو گمنام فون کئے تھے اور خط بھی لکھے تھے۔ وکیل سرکار سے لے کر چیف جسٹس تک سب کو بتایا تھا کہ سرکار قاتل نہیں ہے۔ لیکن ظاہر ہے گمنام خطوط کو عدالت یا وکیل اہمیت نہیں دے سکتے تھے۔ سمجھا یہی گیا ہوگا کہ میرے ہمدرد یہ کام کررہے ہیں یا میں خود یہ چکر چلارہا ہوں۔ اس نے اخباروں کے مدیروں کو بھی قائل کرنا چاہا تھا مگر وہ کہتے تھے کہ سامنے آکے بات کرو اور ثابت کرو۔ اس شخص کو اپنے سامنے پاکے جو مجھے تختۂ دار تک پہنچانے کا ذمے دار تھا اور جس کی وجہ سے میں عمر قید کاٹ رہا تھا' میں پاگل ہوگیا۔ اس کی دیدہ دلیری نے مجھے بہت مشتعل کیا کہ وہ اپنے جرم کا اعتراف کرنے آگیا تھا۔ میں مجبور تھا ورنہ وہیں اسے مار ڈالتا۔ میرے شور ہنگامے پر جیل کے حکام مجھے لے گئے۔ انہوں نے میری ایک نہیں سنی حالانکہ جو کچھ اصل مجرم نے کہا تھا وہ سب میں نے انہیں بتادیا تھا۔ لیکن وہ حرام زادہ جاچکا تھا اور جانے سے پہلے اس نے میرے شور کرنے پر کہا تھا کہ مجھے پاگل پن کا دورہ پڑگیا ہے۔"

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد میں نے کہا "سرکار نے اس سے کچھ نہیں پوچھا تھا کہ وہ کون ہے' کیا کرتا ہے اور کہاں رہتا ہے؟"

رام ناتھ بولا "اگر وہ عقل سے کام لیتا تو شاید معلوم کرلیتا مگر اس کی بات سن کے وہ واقعی پاگل ہوگیا تھا۔"

میں نے کہا "اس کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو پاگل ہوجاتا۔"

غالب نے کہا "اس نے جیل کے حکام سے یہ بھی نہیں کہا کہ اس شخص کو جانے مت دو۔"

رام ناتھ نے سرہلایا "کہا تھا مگر جیل والے مجرم کی بات کب سنتے ہیں۔ اصل مجرم باہر تھا اور آزاد تھا۔ وہ اپنی کہہ کے چلا گیا۔ میں تو سمجھتا ہوں' وہ بھی پاگل تھا۔ آخر اسے کیا ضرورت تھی سرکار سے مل کر اعتراف جرم کرنے کی؟ کیا ملا اسے آخر؟ ضمیر کی خلش اس اعتراف سے ختم تو نہیں ہوئی ہوگی۔ خیر' جب سرکار نے یہ سب مجھے بتایا اور رونے لگا تو مجھے اس پر یقین آگیا۔ اور مجھے اس سے ہمدردی بھی محسوس ہوئی۔ مجھے اپنے آپ سے شرم بھی آئی کہ میں نے ایک بے گناہ کو محض شک اور دھوکے میں مبتلا ہوکے موت کے گھاٹ اتارنے کی کوشش کی تھی اور اب وہ میری وجہ سے زندگی کے دن جیل میں کاٹ رہا ہے۔ زندگی بار بار تو نہیں ملتی۔ وہ عمر قید کاٹ کے نکلے گا تو اس کے پاس کیا رہ جائے گا۔ کیا کرے گا وہ دنیا میں لوٹ کے۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ میں اس کی مدد کروں گا اور اصل مجرم کا پتا چلاؤں گا۔ تاہم چھ مہینے تک جھک مارنے کے باوجود مجھے کچھ معلوم نہیں ہوا۔ سرکار نے اس کا حلیہ ضرور بتایا تھا مگر اس حلیے کے ہزاروں ہوں گے اور محض حلیہ ملنے سے تو کسی راہ چلتے کو پکڑا بھی نہیں جاسکتا۔ سرکار نے مجھے کئی بار بلوایا مگر میں اس سے ملنے کے لئے جیل نہیں گیا۔ میں جاکے کیا کرتا؟ اس کی عمر قید کا ایک دن بھی میں کم نہیں کراسکتا تھا اور یہ احساس میرے لئے عذاب بنتا جارہا تھا۔ پھر میں نے دوسرا طریقہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ اگر کسی کو دولت اور طاقت کی مدد سے جیل میں دھکیلا جاسکتا ہے تو کیا اسے طاقت سے رہا نہیں کرایا جاسکتا؟ قانونی طور پر یہ ناممکن تھا۔ وہ اب اپیل بھی کہیں نہیں کرسکتا تھا ورنہ اس کی طرف سے میں بہترین وکیل کرتا اور پولیس کے موقف کو بھی کمزور کردیتا مگر وہ مجرم ثابت ہوچکا تھا اور سزا کاٹ رہا تھا۔ اپنی غلطی کا کفارہ ادا کرنے اور پشیمانی کے عذاب سے نجات پانے کے لئے میں نے سرکار کو جیل سے فرار کا موقع دلوانے کا منصوبہ بنایا۔ اِدھر اُدھر کے بہت سے لوگوں کی مدد سے میں بالآخر اسے نکلوانے میں کامیاب ہوگیا۔ اس میں میرا کتنا پیسہ خرچ ہوا' مجھے نہیں معلوم۔ میں یہ بھی چاہتا تھا کہ سرکار اصل مجرم کا پتا خود چلائے۔ اس نے مجرم کو دیکھا تھا اور اس کے لئے یہ کام مشکل ضرور تھا مگر ناممکن

نہیں۔ جب وہ جیل سے فرار ہوا تو مجھے معلوم ہوگیا اور میں نے اپنی حفاظت کا پورا بندوبست کرلیا۔ یہ بات سرکار کو معلوم نہیں تھی کہ میں مدد نہ کرتا تو وہ کبھی جیل سے فرار نہ ہوپاتا۔ وہ بدستور میرا دشمن تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ اسے جیل پہنچانے والا میں ہی ہوں۔ وہ مجھ سے بدلہ لینے کے لئے کچھ بھی کرسکتا تھا جس میں میرا قتل بھی شامل تھا۔ ایک آدمی جس پر قتل کا الزام ہو جیل سے فرار ہونے کے بعد دوسرا یا تیسرا قتل کرکے ملک سے بھی فرار ہوسکتا ہے......"

میں نے اس کی بات کاٹی "رام ناتھ! کیا حرج تھا اگر تم اسے بتادیتے کہ اس کے فرار کے منصوبے کی کامیابی کے ذمے دار تم ہو؟"

"حرج یہ تھا کہ اگر وہ پکڑا جاتا تو تفتیش میں میرا نام بتادیتا۔ جیل سے فرار ہونے والے بیشتر مجرم پکڑے جاتے ہیں اور یہ بات سب ہی جانتے ہیں کہ ایک ملزم صرف اپنی کوششوں سے جیل کی سلاخیں یا دیواریں نہیں توڑ سکتا۔ ہمیشہ اندر یا باہر سے کوئی اس کی مدد کرتا ہے۔ پولیس اور جیل میں حفاظت کرنے والوں کو ساتھ ملاکے بااثر مجرم نکل جاتے ہیں اور انہیں یہ موقع فراہم کرنے والوں کو اتنا دے جاتے ہیں کہ بعد میں وہ معطلی کے دوران مالی مشکلات کا شکار نہ ہوں۔"

میں نے کہا "معطلی کا حکم تو رائے عامہ کو خاموش کرنے اور اخباروں کی آواز کو دبانے کے لئے جاری کیا جاتا ہے۔"

غالب نے سرہلایا "بعد میں وہ کب بحال ہوتے ہیں' یہ کسی کو بھی معلوم نہیں ہوتا۔ کاغذی کارروائی سے فائل کی خانہ پری بھی کردی جاتی ہے کہ اس معاملے میں کوئی بھی قصوروار نہیں پایا گیا۔ مالی مشکل کا شکار تو وہ کبھی ہوتے ہی نہیں۔"

میں نے کہا "ہاں۔ کچھ بڑے' مشکل کشا اور بابرکت ادارے ہیں جہاں پیسہ بن بلائے آتا ہے۔ نام لینے کی ضرورت نہیں۔ بیشتر سرکاری ادارے ایسے ہی ہیں جہاں ملازمت درحقیقت بادشاہت ہے۔ مظلوم رعایا اپنے کام نکلوانے کے لئے دست بستہ حاضر ہوتی ہے اور بڑی احسان مندی کے ساتھ ان کی ہمیشہ خالی نظر آنے والی جھولی بھرجاتی ہے۔ جب تک وہ خود قبر کو نہیں بھرتے' نہ ان کی نیت بھرتی ہے اور نہ جھولی۔ ایسے اداروں میں دوچار سال گزارنے والا پبلک کو اور حکومت کی نوکری کو لات بھی مارسکتا ہے۔ خیر' میں تو اپنی کہنے لگا' تمہاری بات رہ گئی۔"

رام ناتھ بولا "اور کیا رہ گیا۔ باقی سب تم جانتے ہو۔"

میں نے کہا "تم نے بتایا نہیں کہ سرکار نے اصل مجرم کو کیسے تلاش کیا؟"

"یہ کام اس نے خود کیا۔ وہ بھیس بدل کے پھرتا رہا حالانکہ یہ بڑی خطرے کی بات تھی اس کے لئے وہ سرکاری دفتروں میں گیا' اسکولوں کالجوں میں گیا کیونکہ یہ اسے بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ "باضمیر" شخص کام کہاں کرتا ہے۔ اس نے دن رات بسوں میں چائے خانوں میں اور بازاروں میں ایک چہرے کی جستجو جاری رکھی اور ایک مہینہ بھی نہیں لگا اسے۔ دراصل کھٹمنڈو زیادہ بڑا شہر نہیں ہے۔ دلی' بمبئی یا کلکتہ کی طرح۔ اس کے علاوہ اصل قاتل کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد بے خوف بھی ہوگیا تھا کہ اب تو معاملہ ختم ہوگیا۔ اسے کون پکڑے گا۔"

"کیا سرکار کے فرار کی خبر اس کے کانوں تک نہیں پہنچی تھی؟"

"پتا نہیں۔ یہ ایک چھوٹی سی خبر تھی۔ جیل سے ایک عام مجرم کے فرار کی خبر شہ سرخی تو بن نہیں سکتی۔ ممکن ہے وہ اخبار پڑھتا ہی نہ ہو یا اتنی تفصیل سے نہ دیکھتا ہو۔ سرکار نے اسے تلاش کیا اور پھر اس کا پیچھا کرتا ہوا اس کے گھر تک پہنچ گیا۔ اپنا انتقام لینے کے بعد اس نے کہیں سے اخبار والوں کو فون کیا اور ساری بات بتاکے فرار ہوگیا۔ میں نے اگلے دن کے اخبار میں پوری خبر پڑھی اور مجھے خوشی ہوئی کہ یہ جیسے بھی ہوا مگر انصاف کے تقاضے پورے ہوئے۔"

میں نے کہا "دو باتیں میری سمجھ میں نہیں آئیں۔ وہ شخص تمہاری بیوی دکھشا کے ساتھ جانے پر رضامند نہیں تھا تو دکھشا اس کے لئے اور اپنے لئے غلط ناموں سے پاسپورٹ کیوں حاصل کئے تھے؟"

"کیا پتا وہ ایسا سمجھتی ہو" رام ناتھ بولا "کہ اس کا پریمی اس کا ساتھ دے گا۔ اس نے دکھشا سے جھوٹا وعدہ کیا ہو۔ وہ بزدل آدمی تھا' مرد ہوکے بھی ڈرتا تھا۔ اس سے زیادہ بہادری کا ثبوت تو دکھشا نے دیا کہ سارا انتظام کرلیا جس کی اسے توقع نہ ہوگی۔"

غالب نے کہا "رام ناتھ! میں تمہارے جذبات کو مجروح کرنا نہیں چاہتا مگر یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ یہ سارا معاملہ یک طرفہ ہو یعنی صرف تمہاری بیوی کے جذبات کی یہ انتہا ہو۔ اس کا پریمی دل لگی کی حد تک تو اس کے ساتھ ہو مگر ایک شادی شدہ اور غیر مسلم عورت کی خاطر زندگی داؤ پر لگانے کو بے وقوفی سمجھتا ہو۔"

رام ناتھ نے اقرار میں سرہلایا "ہاں۔ ہوسکتا ہے۔ ایسے شکاری بھی ہوتے ہیں جو کسی مقصد کے بغیر شکار کرتے ہیں۔"

میں نے کہا "دوسری بات یہ کہ اس نے دکھشا کو کیوں قتل کیا؟ وہ بزدل آدمی تھا......"

رام ناتھ نے کہا "جب جان بچانے کے لئے فرار کے سب راستے بند نظر آتے ہیں تو چوہا بھی بلی کے سامنے ڈٹ جاتا ہے۔ ایک عام سی بات ہے۔ خطرے سے سب بچتے ہیں مگر جان بچانے کی صورت ہی کوئی نہ رہے تو ہر کمزور اپنے سے سوگنا یا ہزار گنا طاقتور دشمن کے مقابلے پر اتر آتا ہے۔ مرجاؤ یا ماردو والی بات ہے۔ میرا خیال ہے دکھشا نے سارا انتظام خود ہی کرلیا ہوگا۔ سارا روپیہ پیسہ اور اپنا زیور سب اس کے حوالے کردیا ہوگا تاکہ انہیں کسی دوسرے شہر میں چھپ کر رہنا پڑے تو وہ کسی پریشانی میں مبتلا نہ ہوں۔ اس کا محبوب کچھ عرصے بعد کوئی چھوٹا موٹا مکان خرید لے یا کاروبار کرلے اور معاملہ دب جانے کے بعد وہ باقی زندگی محبت کے گیت گاتے گزار دیں۔"

میں نے کہا "کیا تمہیں یقین ہے کہ دکھشا نے اسے سب کچھ دے دیا تھا؟"

"ہاں۔ بعد میں مجھے اس کا ایک بھی زیور نہیں ملا حالانکہ میں اس کی خاطر تحفے بھی لاتا رہتا تھا اور اس کی ہر فرمائش بھی پوری کرتا تھا۔ اب مجھے خیال آتا ہے کہ اس نے کبھی جوتے' کپڑے یا سامان آرائش کی فرمائش نہیں کی تھی اور کہیں تفریح کے لئے جانے کو نہیں کہا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ اسے صرف زیور پہننے کا شوق ہے۔ وہ تو مال جمع کررہی تھی۔ اور یہ مجھے کیسے معلوم ہوسکتا تھا کہ مال کہاں جارہا ہے۔ نہ میں کبھی چیک کرتا تھا......"

میں نے کہا "کوئی بھی معقول آدمی ایسا نہیں کرتا۔"

"معقول! میں تو گدھا تھا۔ آنکھوں کا بھی اور عقل کا بھی۔ لوگ کہتے ہیں کہ عشق اور مشک بھی کہیں چھپتے ہیں۔ بکواس کرتے ہیں سب۔ دیکھو یہ عشق آخری وقت تک کسی پر ظاہر نہیں ہوا۔ اور وہ اُلو کا پٹھا' ضمیر کی اولاد خود نہ جاتا سرکار کے پاس تو کچھ نہ ہوتا۔ سرکار اپنی سزا کاٹتا رہتا۔ کبھی رہا ہوتا تو باہر آتے ہی پہلا کام یہ کرتا کہ مجھے قتل کرتا۔ خود میں اس کے رہا ہونے سے پہلے روپوش ہوجاتا یا اسے جیل میں مروادیتا۔ لیکن بھگوان کو انصاف کرنا تھا خود۔ اس نے اسباب اور حالات پیدا کردیئے۔ مجرم کو خود منصف کے پاس پہنچادیا۔ وہ خود اپنا چہرہ نہ دکھاتا تو اسے پہچاننے والا کوئی نہیں تھا......"

میں نے کہا "اس نے دکھشا کو کس مجبوری میں قتل کیا تھا؟"

"مجبوری ایک ہی ہوگی۔ مجبوری سے نجات حاصل کرنے کی" رام ناتھ نے کہا "وہ کمبل کو چھوڑنا چاہتا تھا مگر کمبل اسے نہیں چھوڑتا تھا۔ پہلے اس نے سب کچھ ایک عورت کی مجبوری کا خراج سمجھ کے وصول کیا۔ شاید اس نے دکھشا کو سمجھایا بھی ہو کہ ان کا ملاپ ممکن نہیں مگر دکھشا نہ مانی ہو۔ عشق کا بھوت سر پر سوار ہو تو ایسی عقل کی بات کہاں سمجھ میں آتی ہے۔ اس نے کہا ہوگا کہ یہاں نہ سہی۔ ہم کہیں اور جاکے رہ سکتے ہیں۔ سارا بندوبست میں کرلوں گی تم فکر نہ کرو۔ اور اس کے بعد وہ مجبوری کے جال میں الجھتا چلا گیا ہوگا۔ اس نے دوسرے پہلو سے سوچا تو دکھشا اسے سونے کے انڈے دینے والی مرغی نظر آئی ہوگی۔ وہ ایک غریب آدمی تھا۔ اس کا باپ بھی غریب آدمی تھا اور وہ زندہ رہتا تو اس کی اولاد بھی غریب رہتی۔ جب تک تقدیر کی لاٹری نہ نکلے یا آدمی حلال کی کمائی کے چکر سے نہ نکلے مفلسی اور تنگ دستی کی زندگی ایک کے بعد دوسری نسل کو وراثت میں منتقل ہوتی رہتی ہے۔ اس نے بھی سوچا ہوگا کہ یہ لاٹری تو مقدر سے نکلی ہے۔ اسے ایمانداری شرافت اور ضمیر کے چکر میں پڑ کے کیا ملے گا۔ وہ بدنامی سے بچا ہوا تھا۔ دکھشا خود اس کی رکھشا کررہی تھی اور اس کے لئے کوئی رسک نہیں تھا۔ اس نے دکھشا سے محبت کا خراج تو وصول کرہی لیا تھا۔ اب اسے کچھ دن جھوٹے وعدوں اور خوابوں میں الجھا کے فائدہ اٹھایا جاسکتا تھا۔ اپنی خاندانی مفلسی کے عذاب سے نجات پانے کے لئے اگر اپنے ضمیر کو بھی جھانپڑ مار کے خاموش کرانا پڑے تو کیا حرج ہے۔ کسی عورت کو محبت کی قید میں گرفتار کرنا مشکل ضرور ہوتا ہے مگر اس زنجیر کو توڑنا کیا مشکل ہے۔ یہی سب سوچ کے اس نے دکھشا کے مال کو قبول کرنا شروع کیا۔ بدلے میں ایک جھوٹا وعدہ ہی تو کرنا تھا کہ موقع ملتے ہی وہ نکل جائیں گے۔ دکھشا نے سارا انتظام کرلیا۔ اس کا پریمی آخری وقت تک ٹالتا رہا' آج کل کرتا رہا' بہانے بناتا رہا اور عذر پیش کرتا رہا۔ ممکن ہے وہ کہتا رہا ہو کہ یہ سب تو بہت کم ہے جو تم نے میرے پاس رکھوایا۔ بڑے شہر کے بڑے خرچے ہوتے ہیں اور ہم کسی بڑے شہر میں ہی گم ہوسکتے ہیں' کسی قصبے یا گاؤں میں نہیں۔ شاید کسی اسٹیج پر دکھشا کو شک ہوگیا کہ اس کا پریمی اپنے پریم کی کند چھری سے اس کو ذبح کررہا ہے۔ اس نے آخری' فیصلہ کن اور دوٹوک جواب مانگا ہوگا پھر دھمکی دی ہوگی کہ وہ اس کو پکڑوا دے گی۔ سارا چوری کا مال برآمد کرادے گی اور بس۔ پریمی نے اسی وقت یہ کھیل ختم کردیا۔ سونے کے انڈے دینے والی مرغی کڑک ہوگئی تھی۔ اسے پالنا خطرے کو پالنے کے برابر تھا۔ اندازہ اسے پہلے سے تھا کہ ایک دن ایسا ہوگا اور وہ دن بالآخر آگیا۔ اس نے بزدل ہونے کے باوجود بڑی بہادری سے کام لیا اور محبت کی اس کہانی کو ختم کرکے خاموشی سے نکل گیا۔ ایسے بھی محبت کرنے والے ہوتے ہیں۔ ایسے بھی محبت ہوتی ہے۔"

خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا جس میں مجھے دکھشا کی صورت کا تصور کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی کیونکہ اس کی تصویر میں دیکھ چکا تھا مگر اس کی موت کا تصور میں نہ کرسکا۔ موت سے پہلے کے ان چند شرمسار' پشیمان اور ملامتی لمحات کا تصور نہ کرسکا جب دکھشا نے پہلی بار محبت جیسے لطیف' دلدار اور ستاروں کی طرح روشن' مہکتے رنگوں کی شوخی اور خوشبوؤں کی دھنک والے خواب آفریں جذبے کو ایک سفاک' خونی' عفریت کے بھیانک روپ میں دیکھا ہوگا۔ اور اس نے کتنی اذیت جھیلی ہوگی اس جاں کنی کے لمحے میں اپنی دہری موت پر۔ ایک اپنے جسم کی موت' دوسری اس محبت کی موت جسے وہ زندگی سمجھی تھی۔

رام ناتھ نے خود ہی پھر بات شروع کی "سرکار نے اسے ماردیا' اپنا اور میرا انتقام لے لیا اور کلکتے بھاگ گیا' وہاں سے ڈھاکا پہنچا۔ اور اس کے بعد آج میں نے پھر اسے اپنے دروازے پر دیکھا تو میں ڈر گیا تھا۔ حالانکہ ڈرنا مجرم کو چاہئے۔ میں نے کیا جرم کیا تھا دکھشا سے شادی کو میرا جرم تو نہیں سمجھا جاسکتا۔ زیادہ سے

زیادہ میری بے وقوفی کہا جا سکتا ہے' یہ کہا جا سکتا ہے کہ میں سٹھیا گیا تھا' ہوس کے جذبات نے میری عقل کو مفلوج کر دیا تھا۔ مگر یہ بے وقوفی میری گمراہی سے تو بہتر تھی۔ کیا شادی کرنا اس بے راہ روی سے اچھا نہیں ہوتا جس میں آدمی ہر عورت کو بکاؤ مال سمجھنے لگتا ہے؟ قصور تھا تو دکھشا کا۔ اس کی محبت غلطی تھی۔ وہ خود بھی بزدل تھی اور اس کا پریمی بھی بزدل تھا۔ محبت ہوتی تو وہ ساری دیواریں پھلانگ جاتے۔ ساری سماجی' مذہبی اور قانونی دیواریں گرا کے نکل جاتے۔ مگر وہ صرف اخلاقی حدود سے نکل سکے۔ پھر دکھشا نے دوسری غلطی کی کہ شادی پر راضی ہو گئی؟ میری بیوی بن کے میرے گھر آ گئی۔ یہ جھوٹ' فریب' ہوس اور بزدلی کی فردِ جرم بھلا محبت ہو سکتی ہے؟"

میں نے کہا "رام ناتھ! تم تو فلاسفر ہو۔ اتنی اچھی اردو کیسے بول لیتے ہو؟"

وہ تلخی سے مسکرایا۔ "اردو پر کیا تمہاری اجارہ داری ہے؟ کوئی اور غالب یا کرشن چندر کو نہیں پڑھ سکتا؟ کسی سیٹھ' ساہوکار کہلانے والے' ناجائز دھندے کرنے والے' اسمگلر یا بدمعاش کے بارے میں کوئی قانون ہے کہ اس کا ذوق اچھا نہیں ہو سکتا؟ جب سائنس داں' موسیقار اور مصور ہو سکتے ہیں تو اس میں حیرانی کی کیا بات ہے کہ میرے جیسا آدمی ادب سمجھتا ہے یا ادب بولتا ہے؟ میں ادیب یا فلسفی بن سکتا تھا مگر میں نے سیٹھ بننے کو ترجیح دی۔ یہ اپنی اپنی زندگی ہے اور اپنا اپنا راستہ۔ تم خالی خولی شہرت اور ناموری کے پیچھے ننگے بھوکے بھاگتے رہو یا مایا جال لے کر گھومو' دولت کے شکاری بن جاؤ۔ کوٹھی' کار اور عیش و عشرت تن کی دنیا ہے۔ میرے من کی دنیا الگ ہے اور اس میں میرے ساتھ دوسرے لوگ ہیں۔"

"غالب اور کرشن چندر" میں نے طنز سے کہا "ان سے زندگی کا یہی چلن سیکھا تم نے تو....."

"تو کیا؟ میں نے جو کیا اس پر مجھے کوئی ندامت نہیں۔ میری ذاتی لائبریری دیکھو گے تم؟" اس نے برہمی سے کہا "اردو' فارسی ادب کا سارا سرمایہ وہاں جمع ہے مگر وہ صرف میری ذات کے لئے دوسری قسم کی تسکین فراہم کرتا ہے۔ میرا باپ پنڈت دیا ناتھ بہت بڑا عالم تھا اور مہاراجہ کشمیر کے ساتھ تھا۔ اردو' فارسی اور عربی زبان میں اس کی مہارت مستند تھی۔ وہ تاریخ اور فلسفہ جانتا تھا۔ لیکن یہی علم اس کی ذلت اور موت کا سبب بن گیا۔ اس نے کشمیر کے سیاسی مسئلے کو اپنی علمیت کی نظر سے دیکھا' اس کو ایک مورخ کی حیثیت سے سمجھا اور پھر وہی کہا جو صحیح تھا۔ وہ جھوٹ بول ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کی زندگی کے آخری ایام بڑی عسرت میں گزرے۔ اسے کہیں نوکری نہیں مل سکتی تھی۔ اور وہ نوکری کر بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کے علم نے ساری خرابی پیدا کی اور میں نے اس کے انجام سے عبرت پکڑی۔ میں نے علم کو اپنی ذات تک محدود رکھا اور عمل کے معاملے میں دنیا کو ایک مقابلہ گاہ جانا۔ لو آج میرے پاس سب کچھ ہے۔ میرے باپ کے پاس صرف ... کا عذاب تھا۔ میرے پاس آگہی ہے مگر اس کا عذاب نہیں ہے"

وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا "اچھا۔ اب تم لوگ سو جاؤ ورنہ کیا ہے' میں ساری رات بولتا رہوں گا۔"

میں نے بھی اس اشتیاق کو دبا دیا جو اس کی لائبریری کے ... میرے دل میں جاگ اٹھا تھا۔ کتابیں میرے بچھڑ جانے وا... رفیقوں کی طرح تھیں لیکن یہ ان سے ملنے کا وقت اور موقع ... تھا۔ یار زندہ صحبت باقی۔ کتابوں سے دوستی کا رشتہ تو زندگی ... آخری سانس تک باقی رہے گا اور یہ علم کی دولت پھر حا... ہو جائے گی۔ شرط اول ہے زندگی اور فی الحال مجھے اسی کی ... چاہئے۔ خواتین پہلے ہی سو چکی تھیں' غالب بھی کچھ دیر بعد سو گ... میں بہت دیر تک دکھشا کے تصور میں گم رہا۔

صبح میں سب کے بعد اٹھا۔ غالب نے میری ناک میں دھا... کو بل دے کے نہ گھمایا ہوتا تو میں نہ جانے کب تک سوتا ر... میں ایک چھینک مار کے اٹھا تو وہ سب کھی کھی کرنے لگے۔

میں نے کہا "کیا پریشانی ہے آخر؟"

"خواب غفلت دیکھنے والے ذرا بیدار ہو" غالب نے کہا "خبر کل صبح نکلے کس طرف سے آفتاب۔"

میں نے کہا "اگر آفتاب کسی آدمی کا نام ہے تو اس کی ... کہ دروازے سے نکلے یا کھڑکی کے راستے۔ اور مراد سورج ہے تو یہ نہایت مہمل شعر ہے۔ سورج کبھی شمال یا جنوب سے ... نکلا۔ اور کل کے سورج کی آج کیا فکر کرنی۔"

"آج کا سورج تو سر پر آ گیا" نازو نے کہا۔

میں نے اوپر دیکھا "کس کے سر پر؟"

"شری رام ناتھ کے سر پر" غالب بولا "یقین نہیں تو جا کے دیکھ لو۔ وہ دھوپ میں اپنے سر کے بال سفید کر رہا ہے۔"

رابعہ بولی "اب ہیئر کلر لگا کے کرے گا بھی کیا۔"

نازو نے کہا "یہ مت کہو۔ پھر تلاش کرے گا کوئی دکھشا جو ... کے سفید بالوں کو نہیں' بینک بیلنس کو دیکھے گی۔"

غالب نے پُرملامت لہجے میں کہا "یہ تم کہہ رہی ہو؟ عو... کے بارے میں....."

رابعہ نے فوراً کہا "ہر عورت کی بات نہیں ہے۔ ایسی عو... کیا نہیں ہوتیں؟"

غالب نے دلچسپی سے کہا "اچھا! کہاں ہوتی ہیں؟"

نازو نے کہا "جب تم سٹھیا جاؤ گے رام ناتھ کی طرح تو خود نظر آ جائیں گی۔"

"یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ یعنی میں اتنا ہی دولت من... ہو جاؤں گا" غالب بولا۔

میں نے کہا "کیا باہر بہت سردی ہے؟"

"لحاف کے باہر واقعی بہت سردی ہے" غالب بولا اور اس نے میرا لحاف کھینچ کے پھینک دیا "ہم سب بھوکے بیٹھے ہیں تمہاری ... اور تم موسم کا حال پوچھ رہے ہو۔"

"جناب ہم نے ناشتا نہیں کیا ابھی تک" رابعہ بولی۔

"تو کر لو۔ میں بھی کر لوں گا تمہارے ساتھ۔"

"ایسے نہیں۔ اٹھو' ہم سب نہا دھو چکے۔" غالب نے مجھے اٹھانا شروع کیا "تم بھی نہا لو۔ پانی گرم ہے۔"

"مجھے تمہارے بیان کی صداقت پر شبہ ہے کیونکہ تمہارا چہرہ تو ... بالکل ویسا ہی لگ رہا ہے۔ غالب جیسا۔ یہ تمہارے من کا ... ہے جو تمہاری صورت پر نظر آ رہا ہے۔ آدمی کا چہرہ اس کے ... کا آئینہ ہوتا ہے اور اگر تم آئینے میں دیکھو....."

"آپ ایسے نہیں اٹھنے والے۔ میں بالٹی بھر کے لاتا ہوں ٹھنڈے پانی کی" غالب نے کہا۔

"تھینک یو۔ آخری غسل اٹھنے سے پہلے ہی ہو جائے گا" میں ... پھلانگ مار کے اترا اور دوڑ کر غالب سے پہلے باتھ روم میں گھس گیا۔

پانی واقعی بہت گرم تھا۔ میں اتنی دیر تک نہاتا رہا کہ باہر سے ... غالب نے دروازہ پیٹنا شروع کر دیا "اجی حضرت کیا غضب کرتے ہو۔ صابن کی طرح گھل گھل کے بہہ جاؤ گے۔ بس اب نکل آؤ پانی ... سے پانی کے بلبلے۔"

میں نے چلا کے کہا "نہیں آتا۔ مزہ آ رہا ہے نہانے میں۔ تم لوگ شام تک مرو گے نہیں۔ تھوڑا سا انتظار نہیں کر سکتے۔"

"نہیں کر سکتے" غالب نے دروازے کو لات ماری "مگر یہ کر سکتے ہیں کہ ناشتے سمیت اندر آ جائیں۔"

ناشتا خود نازو نے رابعہ کے ساتھ مل کے بنایا تھا کیونکہ رام ناتھ کے ہندو رسوئی نے ملیچھ مسلوں کی خدمت سے صاف انکار کر دیا تھا۔ نوکری جائے پر دھرم نہ جائے۔ اس نے اعلان کیا تھا۔ ... بڑا متعصب ہندو تھا مگر پرانا نمک خوار تھا چنانچہ رام ناتھ نے ... سے اجازت دے دی تھی کہ وہ ایک دن چھٹی کر لے۔ نیپال میں ہندو اور بدھ مذہب کے پیروکار اکثریت میں تھے۔ بدھ تو خیر ہوتے ہی اہنسا کے پجاری ہیں اور مذہب کے نام پر کیا' کسی بھی مسئلے پر اختلاف رائے میں تشدد کو حرام سمجھتے ہیں مگر وہاں کے ہندوؤں پر بھی مہاتما بدھ کی تعلیمات کا اثر نمایاں نظر آتا تھا۔ رام ناتھ کا رسوئیا بھی پرامن طور پر رخصت ہو گیا۔

دس بجے بھی سردی کم نہیں ہوئی تھی اور ہمارے پاس گرم کپڑے نہ ہونے کے برابر تھے۔ رام ناتھ سے ہم نے بازاروں کے بارے میں واجبی سی معلومات حاصل کر کے اجازت لی۔

"ہم پاکستانی سفارت خانے جا کے دیکھتے ہیں' شاید وہ کوئی انتظام کر دیں" میں نے کہا۔

"نہیں کرنا تو چاہئے مگر آج کل حالات مختلف ہیں۔ جانے والے ہزاروں ہیں۔ جو ہزاروں خرچ کر سکتا ہے وہ چلا جاتا ہے۔ باقی ہزار برس تک انتظار کرے یا جائے۔ پیدل جانے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ اگر سانس چلتی رہے اور ٹانگوں میں دم رہے تو آدمی ساری دنیا میں کہیں بھی پہنچ سکتا ہے۔"

میں نے کہا "تم آدمی دلچسپ ہو۔"

"عام خیال ایسا نہیں ہے" وہ بولا "میرے بارے میں تمہیں اچھی رائے دینے والا مشکل سے ہی ملے گا۔"

"ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں" غالب نے کہا "چلو۔"

کاجل نے کہا "میں کہیں نہیں جا رہی۔"

"کیوں؟" رابعہ نے کہا "گھر پر کیا کرو گی؟"

"کلیم کو بخار ہے۔ غالباً سردی لگ گئی ہے" وہ بولی۔

رام ناتھ مسکرایا "میں ڈاکٹر کو فون کر کے بلا لیتا ہوں۔ اتنا اداس اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ جانا چاہو تو تم بھی چلی جاؤ' میں اس لڑکے کو دکھا دوں گا۔"

"نہیں۔ میرا جانا ضروری نہیں۔ یہ لوگ کر لیں گے سارے کام۔" کاجل نے کہا "آپ ذرا ڈاکٹر کو بتا لیں۔ اور اسے کہیں جلدی آئے۔ وہ اچھا ڈاکٹر ہے نا؟"

"کوئی ڈاکٹر برا نہیں ہوتا" رام ناتھ بولا "آؤ میرے ساتھ۔"

اب ہم کاجل کو زبردستی ساتھ جانے پر مجبور نہیں کر سکتے تھے۔ ہم سڑک کے کنارے بنے ہوئے فٹ پاتھ پر پیدل چلنے لگے۔ میں اور رابعہ آگے تھے اور ہم سے چند قدم پیچھے غالب کے ساتھ نازو تھی۔ ریوالور ہمارے کپڑوں کی اندرونی جیبوں میں محفوظ تھے۔

نیپال کے لوگ اپنی مخصوص وضع کی ٹوپیاں پہنے ہر جگہ روزمرہ کے کاروبار میں مصروف نظر آتے تھے۔ اس علاقے کے لوگوں کا لباس وہی تھا جو سارے ہندوستان کا۔ عورتیں ساری میں تھیں اور ماتھے پر ایک سی بندیا لگاتی تھیں۔ فرق عمارتوں کے طرز تعمیر میں نظر آتا تھا۔ ایک کے اوپر ایک مخروطی چھتوں والے پگوڈا ہر قدم پر موجود تھے جن کی تعمیر میں لکڑی کا استعمال بڑی خوب صورتی سے کیا گیا تھا۔ ان کی دیواریں اور چھت سب کے نقش و نگار ہنرمندوں کی مہارت اور عبادت گاہوں سے جذباتی عقیدت کا منہ بولتا ثبوت تھے۔ بدھ بھکشو سردی کے باوجود کیسری رنگ کی دھوتی سے ایک شانے کو چھپا کے مطمئن پھر رہے تھے۔ ان کے اوپر والے جسم کا آدھا حصہ لباس نہ ہونے پر بھی موسمی حالات کی سختی کا عادی تھا۔ ان میں چھوٹے چھوٹے بچے بھی تھے جو سر منڈائے' تلک لگائے خود کو مہاتما بدھ کی تعلیمات کے لئے وقف کر چکے تھے۔

مقامی لوگوں کے درمیان ہر جگہ وہ بے خانماں لوگ بھی نظر آ جاتے تھے جن پر بنگلہ دیش کی زمین تنگ کر دی گئی تھی۔ وہ کسی پگوڈا کی دیوار کے سائے میں' کسی عمارت کے برآمدے میں اور خیموں میں اپنے اپنے خاندانوں کے ساتھ کسمپرسی کی تصویر

عبرت بنے پڑے تھے۔ ان کے چہرے مسافرت کی سختی، خوف اور بے یقینی کے عکاس تھے۔ زندگی میں دوسری بار وہ بے وطن ہوئے تھے اور جیسے انیس سو سینتالیس میں اپنی منزل آزادی کی جانب گامزن ہوئے تھے ایسے ہی آج پھر لٹ پٹ کے اپنے پاکستان جارہے تھے۔ پاکستان وہ پہلے بھی گئے تھے مگر اس وقت ان کے جذبات مختلف تھے۔ وہ امیدوں اور خوابوں کے ساتھ دلوں میں خوشی، امنگ اور حوصلہ لئے، مستقبل پر یقین کے ساتھ روانہ ہوئے تھے مگر آج وہ مایوس، دل گرفتہ اور بدبختی پر نوحہ خواں تھے اور اپنے ماضی پر پشیمانی کے دکھ میں مبتلا تھے۔

میں ان کے درمیان سے اجنبی بن کے گزرا۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ میں سکندر بخت ہوں جس نے ایم آر ایس کی بنیاد صرف اس لئے رکھی تھی کہ وہ ملک کو دولخت کرنے والے سازشی عناصر کے خلاف وطن پرست قوتوں کا ساتھ دینا چاہتا تھا۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ اب میں بھی انہی جیسا تھا اور میرے پاس بھی وہی پچھتاوے تھے۔ اپنے یا ایم آر ایس کے کسی کارنامے پر غرور سے سر اٹھا کے چلنا میرے لئے باعث عار تھا۔

چلنے سے بھی ہم انہی کی طرح تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ ہم نسبتاً بے فکر اور خوشحال نظر آتے تھے۔ کئی جگہ میرے اپنے ہم وطن مجھے ہاتھ پھیلائے نظر آئے۔ وہ بھکاری نہیں تھے، مسافر تھے لیکن ان کے پاس زاد راہ نہیں تھا۔ انہیں طویل سفر درپیش تھا لیکن ان کے وسائل ساتھ چھوڑ گئے تھے۔

ایک بوڑھا اچانک میرے سامنے آگیا "سیٹھ! میری بات سن لو بھگوان کے لئے..."

میں رک گیا "تم مسلمان ہو یا ہندو؟"

وہ شش و پنج میں پڑ گیا۔ اس نے ہمیں ہندوستانی سمجھ کے بھگوان کا حوالہ دیا تھا "میں... بنگلہ دیش سے آیا ہوں۔"

"اور تم کو پاکستان جانا ہے۔ تم یقیناً مسلمان ہو" میں نے کہا۔

"ٹھیک بولا آپ نے سیٹھ..."

"میں سیٹھ نہیں ہوں۔ مسلمان اور پاکستانی ہوں تمہاری طرح" میں نے کہا "مجھے بہت افسوس ہے کہ تم نے مجھے ہندو سمجھ کے بھگوان کا واسطہ دیا۔ کیا تمہیں افسوس نہیں ہے؟"

"چھوڑو جی۔ صرف لیکچر دینا ہے تو کسی اور کو دو" وہ بگڑ گیا "میرے کام نہ کوئی مسلمان آئے گا نہ کوئی پاکستانی۔ صرف پیسہ کام آئے گا۔ سب کچھ پیسہ ہی ہے میاں۔ دین ایمان، خدا بھگوان......"

میں نے کہا "تم بہت جلد حوصلہ ہار گئے۔ یہ تو بہت چھوٹی سی آزمائش تھی تمہارے ایمان کی۔"

"جس کا سب کچھ لٹ گیا ہو وہ اور کیا کرے؟ ایک گھر تھا وہ نہیں رہا، بیوی ساتھ چھوڑ گئی، بیٹے مارے گئے۔ دو لڑکیاں ساتھ ہیں۔ ان کی جوانی کو کس کس سے بچاؤں۔ جب ہر طرف بھیڑیے پھر رہے ہوں۔ تم کہتے ہو میں حوصلہ ہار گیا! اور کیا امتحان ۔ خدا میرے صبر کا۔ میں تو حرام موت بھی قبول کر لیتا مگر ان لڑکیو مارنے کا حوصلہ نہیں ہے مجھ میں۔ میں انہیں قتل کر سکتا تو۔ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا اور پھر ایک دم واپس چل پڑا۔

مجھے دکھ بھی ہوا اور ندامت کے احساس نے میرے دل کانٹے بھر دیے۔ میں نے ایک مجبور اور بے بس آدمی کے زخمو نمک پاشی کے سوا کچھ نہیں کیا تھا۔ مدد تو میں کسی کی نہیں کر سکا مگر اتنا تو کر سکتا تھا کہ کوئی مانگنے تو ہمدردی کے دو بول دے دوں

رابعہ نے کہا "اسے کچھ دے آؤ سکندر۔"

غالب نے کہا "خیرات کے طور پر کیونکہ اس نے ہاتھ ... تھا۔"

"نہیں۔ کسی کی مدد کرنے میں کیا حرج ہے۔"

غالب نے تلخی سے کہا "ہم خود مدد کے محتاج ہیں۔ ہم ... کریں گے کسی کی۔ اپنوں اور غیروں کے سامنے ہاتھ پھیلا والے آخر خدا کے سامنے ہاتھ کیوں نہیں پھیلاتے؟"

رابعہ نے کہا "یہ عادی بھکاری نہیں ہیں۔"

"تم چاہتی ہو کہ ہو جائیں؟" میں نے کہا "آج اس نے ہندو سیٹھ سمجھ کے بھیک مانگی تھی۔ اسے بھیک مل جاتی تو کل یہ کسی ہندو سے بھیک مانگتا۔"

نازو نے کہا "بھیک مانگنے والے کے لئے ہندو کیا اور مس... کیا۔"

"نہیں۔ یہ بات نہیں" میں نے کہا "اپنے مدد کرتے ہیں خیرات دیتے ہیں۔ ساری بات احساس کی ہے۔ اس کا ا مر گیا تو یہ بیٹیوں سے بھی کہے گا کہ ہاتھ پھیلاؤ۔ ایسے آدمی ک مارنا چاہئے۔"

"تم بڑے ظالم ہو سکندر" رابعہ نے کہا۔

غالب نے کہا "کسی کو بھکاری بنانا کوئی ہمدردی نہیں اس کے ساتھ دشمنی ہوتی ہے۔"

نازو نے کہا "آخر یہ لوگ کیا کریں؟ یہاں تو محنت مزدو نہیں کر سکتے۔"

"خدا پر بھروسہ کریں، انتظار کریں، حوصلہ کریں۔ ... غیرتی کے ساتھ ہاتھ پھیلانے یا عزت کو نیلام کرنے سے کہی ہے کہ تکلیف اٹھائیں، فاقے کاٹیں، سردی میں اکڑ کے مر میں نے کہا "یہ ایک آدمی یا ایک خاندان کا المیہ تو نہیں ہے قوم کا مسئلہ ہے اور اسی قوم کے نام سے ہماری شناخت ہ کسی پاکستانی کو یوں ہاتھ پھیلا کے رحم کی بھیک مانگتے دیکھن چاہتا۔ اس ملک میں پاکستان کا نام تو بدنام نہیں ہونا چاہئے۔

سب خاموشی سے چلتے گئے۔ مجھے معلوم تھا کہ خواتی سے اتفاق نہیں ہوگا۔ کسی کے رنج و غم پر ان کا ردِ عمل منط جذباتی ہی ہوگا۔ میرا ہم خیال صرف غالب تھا جس

پاکستانی کو بھیک مانگتا دیکھ کر اپنے آپ کو اتنا ہی بے توقیر محسوس کیا تھا جتنا کوئی بھی پاکستان کے نام سے جذباتی عقیدت اور محبت رکھنے والا محسوس کر سکتا ہے۔

بازاروں میں لوگوں کا اژدھام تھا۔ یہ کراچی یا لاہور جیسے بازار نہیں تھے اور نہ یہاں وہ چمک دمک، رونق اور شان و شوکت نظر آتی تھی جس کو انگریزی میں گلیمر کہا جاتا ہے۔ بیشتر لوگ روز مرہ کی اشیائے ضرورت خرید رہے تھے اور غربت زدہ نظر آتے تھے۔ ان میں نیپال کے راستے ہجرت کر کے پاکستان جانے والے بھی تھے جو بے سروسامانی کے عالم میں جان بچا کے بھاگے تھے تو صرف نقد اور زیور ہی اٹھا کے لا سکے تھے۔ گھر اور گھر کا سامان پیچھے رہ گیا تھا۔ وہاں بارش تو سارا سال ہوتی تھی مگر گرمی سردی کی شدت بھی قابل برداشت تھی۔ گرمی کا علاج وہ کم سے کم کپڑے پہن کے، نہا کے یا پنکھا جھل کے کر لیتے تھے مگر نیپال کی سردی میں جسم کی حفاظت کے لئے گرم کپڑے ضروری تھے جو ان کے پاس نہیں تھے۔ وہ پرانے کوٹ پتلونیں اور کمبل خرید رہے تھے اور اپنی اپنی حیثیت اور ضرورت کے مطابق کپڑے چھانٹ رہے تھے۔

اب دوپہر ہونے والی تھی چنانچہ دھوپ میں تمازت پیدا ہو گئی تھی اور موسم بہت خوشگوار محسوس ہوتا تھا۔ آسمان کا رنگ گہرا شوخ نیلا تھا اور درخت جو خزاں کی چیرہ دستی سے محفوظ تھے، اس پس منظر میں زیادہ سرسبز دکھائی دیتے تھے۔

میں نے غالب کے مشورے سے خریداری کو واپسی تک موقوف کیا اور ہم، لوگوں سے راستہ پوچھتے پاکستان کے سفارت خانے کی طرف چل پڑے۔ رام ناتھ نے بھی ہمیں راستہ سمجھایا تھا مگر ہم ایک اجنبی شہر کے راستوں پر چلتے ہوئے عدم اعتماد کا شکار تھے۔ غنیمت بات یہ تھی کہ انگریزی یہاں بھی تعلیم یافتہ طبقے کی زبان تھی اور لوگ عام طور پر خوش اخلاق تھے ستم ظریفی حالات نے ان ہجرت کرنے والوں پر "بہاری" کا لیبل لگا دیا تھا جو پاکستان کے ایک حصے سے دوسرے حصے میں پہنچنا چاہتے تھے۔ جب تک وہ مشرقی حصے میں تھے، غیر بنگالی کہلائے اور جب مغربی حصے میں پہنچے تو انہیں بلا تفریق بہاری کہا گیا حالانکہ صوبہ بہار سے تعلق رکھنے والے ان میں اتنے ہی تھے جتنے کسی اور صوبے کے لوگ مگر دہلی، لکھنؤ تک کے لوگ بہاری ہو گئے۔

جیسے جیسے ہم سفارت خانے کے قریب پہنچے، ہجرت کر کے نیپال پہنچنے والے پاکستانیوں کا ہجوم بڑھتا گیا اور سفارت خانے کے آس پاس تو ان کی پوری بستی آباد نظر آئی۔ حکومت نے اپنے تمام وسائل اور تعلقات کو بروئے کار لاتے ہوئے نیپال سے ان کی واپسی کا انتظام کیا تھا۔ خود نیپال کی حکومت کا رویہ انتہائی دوستانہ اور ہمدردانہ تھا لیکن ہجرت کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ تھی چنانچہ تمام انتظامات غیر موثر ہو کے رہ گئے تھے۔ عام آدمی کی سفارتی عملے تک رسائی مشکل ہو گئی تھی اور باہر ایجنٹوں کی حکومت تھی۔ وہ کسی کو اندر پہنچانے سے پاکستان پہنچانے تک تمام مسا
کی ذمے داری قبول کرتے تھے اور ہر ذمے داری کا الگ معا
وصول کر رہے تھے۔

یہ صورت حال بہت پریشان کن اور تکلیف دہ تھی۔ ہم دور سے ہی اس ہجوم کو دیکھا جو سفارت خانے کے اندر دھکے
تھا اور کوئی ان کا پرسان حال نہ تھا۔

"یہاں دال گلتی نظر نہیں آتی مرزا غالب" میں نے کہا۔

غالب نے آہ بھری "جس کے پاس دال ہوگی، گل جائے
ہمارے پاس تو دال بھی نہیں ہے۔"

"یہاں محمود و ایاز سب ایک ہیں" رابعہ نے کہا۔

"غلط۔ ہم محمود ہوتے تو دربان خود ہمیں عزت کے ساتھ
لے جاتا۔ یہ سب ایاز ہیں" میں نے کہا "ان کے ایک ہی
میں کھڑے ہونے کا زمانہ تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے۔
محمود کسی صف میں شامل نہیں ہوتے، سیدھے اندر جاتے
ایاز باہر صف بستہ رہتے ہیں اور قطار بنائیے یا انتظار فرما
ہدایت پر عمل کرتے ہوئے جھک مارتے ہیں۔"

کھانے کے لئے ہم ایک نسبتاً بہتر ریسٹورنٹ میں جا بیٹھے
میں اور عام لوگوں میں نمایاں فرق صورت شکل اور رنگ
تھا۔ رابعہ اور نازو کا حسن و جمال یہاں بھی لوگوں کو متوجہ کر
پھر وہ ہمیں دیکھتے تھے اور ہماری گفتگو سے سمجھ لیتے تھے
"بہاری" نہیں ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ ابھی تک ہم پر کسی ای
نظر کرم نہیں ہوئی تھی۔

ایک ویٹر نے ہماری صورت اور لب و لہجے پر غور
ہوئے ہمیں خصوصی توجہ کا مستحق سمجھا۔ اس نے بڑے اہتما
میز صاف کی اور پھر ایک مینو پڑھا جس کا بہت کم حصہ ہمار
میں آیا۔ آرڈر رابعہ نے دیا۔

میں نے کہا "غالب! کیا ہم کسی طرح بھی اس الّو کے پٹ
سے رابطہ نہیں کر سکتے؟"

نازو نے کہا "عجیب آدمی ہے۔ اچانک مکان بدل لیا۔"

غالب بولا "اسے وہ مکان چھوڑنا پڑا ہوگا۔ جلوہ کثرت ا
باعث۔"

میں نے کہا "وجہ کچھ بھی ہو۔ اسے یہ بھی سوچنا چاہ
ہم اس کے سوا کسی کو فون نہیں کرتے۔"

"اور کیا۔ کم سے کم اپنا فون نمبر ہی بتا دیتا نئے مالک کو۔"

"وہ بھی بدتہذیب آدمی تھا۔ ممکن ہے، منظر نے نمبر دیا
اس کو کال کرنے والوں سے تنگ آیا ہوا تھا۔"

"ہم نے فون بھی غلط وقت پر کیا تھا" نازو بولی "اگر ا
میں کوئی ہمیں بھی جگا کے کسی کے بارے میں پوچھے تو ہم
کے جہنم میں گیا۔"

"اس کی جگہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس نے شاد

ب بولا "اللہ کو پیارا ہوا یا بیوی کو پیارا ہوا۔"

"رخصت تو لڑکیاں ہوتی ہیں اپنے گھر سے اور وہ جہنم میں
میں جاتیں" نازو نے کہا۔

"عورت تو اپنے گھر کو اپنی جنت سمجھتی ہے" رابعہ نے کہا۔

"ہاں۔ فلموں میں ایسا ہی دکھایا جاتا ہے مگر سسرال کو میدان
گ بنا کے اور ساس نندوں سے....."

میں نے کہا "یار غالب! کبھی تو موقع دیکھ کر بات کیا کرو۔"

غالب نے کہا "سوری۔ موضوع تھا منظر کی گمشدگی۔ میرا
یال ہے کہ اس کا سراغ لگایا جا سکتا ہے۔"

رابعہ نے کہا "میرے آفس فون کرو۔"

میں نے کہا "تم خود بات کرو گی؟ کون ہوگا وہاں؟"

"تم بھول رہے ہو" رابعہ بولی "منظر نے بتایا تھا کہ میرے
آفس کے معاملات کو بھی وہی سنبھال رہا ہے۔"

"رائٹ" میں نے چٹکی بجا کے کہا "اور اس نے یہ بھی کہا تھا کہ پرانی ساکھ رفتہ رفتہ بحال ہو رہی ہے، تمہارے کلائنٹ پھر آنے لگے ہیں۔ اور کوئی لڑکا تھا وہاں جو بڑی وفاداری کے ساتھ اکیلا ہی بتا رہا تھا اور برے وقت میں فرم کو چھوڑ کے نہیں گیا تھا۔ کیا نام تھا اس کا....."

"وسیم یوسف" رابعہ نے کہا "بعد میں شادی کر لی تھی اس نے۔"

"کیا اس نے بھی شادی کر لی؟" غالب نے یوں کہا جیسے اس خبر سے اسے سخت حیرت ہوئی ہے یا صدمہ پہنچا ہے۔

میں نے ہنس کے کہا "تم ہی تو کہتے تھے، عقد سے کس کو رستگاری ہے۔"

"ہاں۔ آج تم کل ہماری باری ہے" وہ مصنوعی رقت آمیز لہجے میں بولا "میری آنکھوں میں آنسو آ رہے ہیں۔ نازو! ذرا رومال تو دینا۔"

"نہیں ہے رومال میرے پاس" نازو نے کہا۔

"تم تو اتنی رومانٹک بھی نہیں ہو جتنا یہ کھمبا۔ اچھی خاصی سچویشن پیدا کی تھی میں نے۔ تم اپنے آنچل سے میرے آنسو صاف کر سکتی تھیں۔"

"آپ اس کھمبے سے لپٹ کر رو لیں جتنا جی چاہے۔"

رابعہ پھر مجھ سے مخاطب ہو گئی "میرے آفس والوں کو ضرور منظر کا نیا فون نمبر معلوم ہوگا۔"

"اگر وہاں فون ہوا۔"

"فون کے بغیر منظر کا تو کام ہی ٹھپ ہو جاتا ہے۔ اس نے جہاں بھی گھر لیا ہوگا وہاں پہلے سے فون ہوگا یا اس نے لگوا لیا ہوگا۔"

ویٹر نے ہمارے سامنے دال چاول اور سبزی رکھ دی۔

غالب نے کہا "مس رابعہ! تم نے کھانے کے لئے کچھ نہیں منگوایا۔"

رابعہ مسکرائی "اور یہ کیا ہے؟"

"یہ کھائیں گے ہم!" غالب بے یقینی سے بولا۔

"یہاں گوشت نہیں ہوتا۔ بدھ اور ہندو ماس نہیں کھاتے۔ ویجیٹیرین ہوتے ہیں۔"

"گویا مویشی۔ مگر ہم تو مسلمان ہیں" غالب فریادی لہجے میں بولا "یا میرے مولا۔ امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے۔"

نازو نے کہا "سبزی کھانے والے لمبی عمر پاتے ہیں۔"

غالب نے کہا "دال سبزی کی سو سالہ عمر سے قورمے پلاؤ کی ایک سال کی زندگی بہتر ہے۔ ٹیپو سلطان سے معذرت کے ساتھ۔"

نازو نے اسے ڈانٹا "صبر شکر کے ساتھ کھا لو جو سامنے ہے۔"

"بابا یہی تو کر رہا ہوں۔ خفا کیوں ہوتی ہو" غالب نے مسکینی سے کہا۔

کھانا کھاتے ہوئے میں نے ساتھ والی میز پر بیٹھے ہوئے ایک شخص کو دیکھا۔ وہ بڑی توجہ سے ہماری باتیں سن رہا تھا۔ میرے دیکھتے ہی وہ شخص دوسری طرف متوجہ ہو گیا اور اپنے سامنے بیٹھے ہوئے شخص سے باتیں کرنے لگا۔

میں نے جان بوجھ کے بلند آواز میں کہا "اگر ہمارا منظر سے رابطہ نہ ہوا تو ہم پاکستان کیسے جائیں گے؟ سفارت خانے میں تو داخل ہونا بھی مشکل ہے۔"

غالب نے کہا "رام ناتھ کرے گا کچھ۔"

میں نے کہا "وہ بھی کسی ایجنٹ کے ذریعے ہی کرے گا۔ کوئی ایسا شخص مل جاتا جس سے ہم براہ راست معاملہ طے کر لیتے۔"

اب وہ شخص ایک دم اٹھ کے ہمارے قریب آ گیا جو ہماری باتیں سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ وہ کوئی ایسا ہی ایجنٹ تھا۔ جس شخص سے وہ بات کر رہا تھا وہ جا چکا تھا۔

"معاف کیجئے....." اس نے انگریزی میں کہا۔

غالب نے کہا "جاؤ معاف کیا۔ اب تم بھی ہمیں معاف کرو، ہم تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔"

"لیکن میں آپ لوگوں کی مدد کرنا چاہتا ہوں" وہ بولا۔

غالب بولا "دیکھا۔ میں نہ کہتا تھا کہ۔ ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں۔ کوئی فرشتہ غیب سے ضرور نمودار ہوگا۔ خضر راہ بن کے۔"

میں نے کہا "یہ خدمت خلق نہیں کرتے۔ منزل تک پہنچانا ان کا پیشہ ہے جس کا یہ معاوضہ لیتے ہیں۔"

اس شخص نے کہا "میرا نام بہرام ہے۔ کیا میں بیٹھ سکتا ہوں؟"

غالب نے کہا "پہلے کرسی کھینچ لو ورنہ نیچے بیٹھ جاؤ۔"

اس نے کرسی کھینچ لی "اگر میرا اندازہ درست ہے....."

میں نے کہا "چونکہ تم ہماری باتیں سن رہے تھے اس لئے اندازے کی بات نہیں۔ تمہارا خیال بالکل ٹھیک ہے۔"

وہ تھوڑا سا جھینپا "آپ سفارت خانے کی مدد کے چکر میں نہ پڑیں' وہ کسی کی نہیں سنتے۔"

غالب بولا "کمال ہے۔ حکومت نے سب بہرے ایک ہی ملک کے سفارت خانے میں جمع کر دئے۔ آلۂ سماعت سے بھی نہیں سنتے؟"

ایجنٹ مسکرایا "اس آلۂ سماعت کا نام ہے روپیہ پیسہ۔ دربان سے چپڑاسی اور پی اے تک رسائی حاصل کئے بغیر آپ کسی بھی ذمے دار افسر تک نہیں پہنچ سکتے۔ ایک ہزار میں آپ نے یہ مرحلہ طے کرلیا تو ذمے دار افسر سے یہ جواب ملے گا کہ نام لکھوادیں ویٹنگ لسٹ میں اور اپنی باری کا انتظار کریں۔ آپ لوگ ذرا معزز نظر آتے ہیں۔"

"ذرا کا کیا مطلب! اچھے خاصے معزز ہیں۔"

"ہیں نہیں۔ تھے" نازو نے کہا۔

"ایسی صورت میں وہ خوش اخلاقی سے آپ کو ایک کپ چائے بھی پیش کرے گا" بہرام بولا۔

"ایک ہزار روپے میں ایک کپ چائے تو مہنگی ہے" میں نے کہا۔

"آپ لوگوں کا تعلق مغربی پاکستان سے ہے۔ رائٹ؟" اس نے رازدارانہ انداز میں کہا۔

"رائٹ۔ اور کیا جانتے ہو تم ہمارے بارے میں؟" غالب بولا۔

"آپ لوگ غالباً سرکاری افسران ہیں یا کاروباری لوگ ہیں جو مغربی پاکستان سے غلط وقت پر مشرقی پاکستان گئے اور پھر وہاں پھنس گئے" بہرام بولا۔

"تم نے تو کمال کردیا" غالب نے کہا "کب سے ہمارے پیچھے لگے ہوئے تھے تم؟ کہیں تم شرلاک ہومز تو نہیں ہو؟"

نازو نے اسے گھورا "شرلاک ہومز کالا نہیں تھا۔ خالص انگریز تھا۔"

بہرام نے برا نہیں مانا اور مجھ سے مخاطب رہا "میرے پاس دو ٹکٹ ہیں ہوائی جہاز کے۔ ابھی جو شخص اس ٹیبل پر بیٹھا تھا' وہ مجھ سے سودا کر گیا ہے۔ کل کی فلائٹ ہے۔"

"اور تم اب ہم سے سودا کرنا چاہتے ہو" میں نے کہا "کتنے میں؟"

رابعہ نے کہا "دو ٹکٹ ہمارے لئے بے کار ہیں۔ ہم چھ آدمی ہیں۔"

"اور بھی انتظام ہو جائے گا۔ چند دن میں۔ یہ دو ٹکٹ تو آپ لے ہی لیں" وہ بولا "بیس ہزار۔۔۔۔"

"بیس ہزار!" غالب نے چلا کے کہا "بھاگ جاؤ یہاں سے۔"

اس نے ادھر ادھر دیکھ کے کہا "او کے۔ پندرہ۔ میں نے ا[...] میں بات کی ہے اور تین ہزار میرا حق بنتا ہے۔"

اس سے پہلے کہ کوئی اور بولتا' میں نے کہا "ٹکٹ کہا[ں] ہیں؟"

اس نے جیب سے ٹکٹ نکالے "شہناز کریم اور عبدالک[ریم] کے نام سے کنفرم سیٹیں ہیں کراچی تک۔"

میں نے کہا "لاؤ مجھے دو۔"

اس نے ٹکٹ مجھے دے دیے "آپ میں سے کوئی دو ا[...] جائیں۔"

غالب نے کہا "مثلاً ہم دونوں۔ یا یہ خواتین۔"

اس نے کہا "آپ بہت مذاق کرتے ہیں۔ میری مراد ا[...] جوڑے سے تھی۔"

"جوڑے خدا آسمان پر بناتا ہے۔ ہم یا تم کیسے بنا سکتے ہ[یں]"

غالب نے کہا "کیا میں نے غلط کہا نازو؟"

"ہاں۔ جوتوں کے جوڑے باٹا والے بناتے ہیں" نازو بول[ی]

میں نے کہا "رابعہ! اسے ادائیگی کردو۔ بارہ ہزار۔"

رابعہ نے احتجاج کیا "ہم نے طے کیا تھا کہ سب ساتھ جائیں گے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ ہم ساتھ ہی جائیں گے۔"

رابعہ سمجھ گئی کہ میں نے دو ٹکٹ کاجل اور کلیم کے خریدے ہیں۔ اس نے اپنے بیگ سے رقم نکال کے میرے حوا[لے] کردی اور میں نے ایجنٹ کو دے دی۔

"یہ تو انڈین کرنسی ہے" وہ خوش ہو کے بولا۔

میں نے کہا "اسی لئے بارہ ہزار ہیں۔ تم تبدیل کرو گے تو [...] ہو جائیں گے۔"

ایجنٹ کی خوشی کافور ہو گئی "میں نے پاکستانی کرنسی کی [بات] نہیں کی تھی۔"

میں نے کہا "ہم بنگلہ دیش سے آئے ہیں۔ وہاں کون سی [کرنسی] چلتی ہے؟ خواہ مخواہ چالاک بننے کی کوشش مت کرو۔ تم جا[نتے ہو] یہ سب غیر قانونی کام ہے۔ ان ٹکٹوں پر خریدنے والے [...] کوئی سفر نہیں کر سکتا۔ ہم بھی رسک لے رہے ہیں۔"

اس نے سرد آہ بھر کے کہا "او کے سر۔ میں چار سیٹوں [کا] بندوبست کردوں گا۔ اسی ہفتے میں۔"

"ایک ساتھ۔ ایک ہی فلائٹ پر" رابعہ نے کہا۔

"یہ تو مشکل ہوگا بلکہ ناممکن۔"

"پھر رہنے دو۔" رابعہ نے کہا۔

"اچھا میں کوشش کروں گا۔ لیکن۔۔۔۔ پیسے کچھ زیادہ ہو[ں] گے میڈم۔ یو سی' لوگ ضرورت کی قیمت لیتے ہیں۔ ایک [...] سستی مل جاتی ہے۔ یہاں پورے پورے خاندان ساتھ جاتا [...] ہیں۔ ان کے لئے کنفرم سیٹیں خریدنی پڑیں تو بھاؤ اونچا [...]

[...]"

"[...]ب مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہیں" نازو نے کہا۔

غالب نے اس کی طرف دیکھ کے ٹھنڈی سانس لی "سچ کہتی ہو [...]ی۔ مگر میں تم سے کیا کہوں۔"

رابعہ مسکرائی۔ غالب معصوم صورت بنا کے دوسری طرف [دیکھ]نے لگا۔

"[ا]ب آپ سے رابطہ کہاں قائم کیا جا سکتا ہے سر؟" بہرام [...]

میں نے کہا "تم اپنا پتا ٹھکانا یا نام پتا بتادو۔ فون نمبر دے دو۔"

وہ جلدی سے بولا "میں یہیں ملوں گا۔"

میں نے کہا "اس ریسٹورنٹ کا مالک تمہیں جانتا ہو گا۔ میں [...]ے پوچھتا ہوں۔"

وہ گھبرا گیا "اس سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"اور کیا تمہیں بارہ ہزار کے ساتھ جانے دیں؟ یہ ٹکٹ کیا [...]؟ صرف کاغذ۔"

"میں ذمے دار ہوں سر۔ جہاز پر سوار کرانا میرا کام ہے۔"

میں نے کہا "کل تم نظر ہی نہ آئے تو ہم کیا کریں گے؟"

غالب نے کہا "ہم ایئرپورٹ سے جہاز کو پرواز کرتا دیکھتے رہیں [گے] اور پھر سب واپس آجائیں گے۔ جتنے گئے تھے۔ پھر چراغ لے [کر] ڈھونڈنے سے بھی کوئی بہرام نہیں ملے گا۔"

"بعد میں پتا چلے گا کہ تم تو بہرام ڈاکو تھے۔ وہ بھی بھیس بدل [کر] پھرتا تھا۔" نازو نے کہا۔

بہرام کچھ گھبرا گیا تھا "نہیں سر۔ میں ایسا آدمی نہیں ہوں۔"

میں نے کہا "تم کیسے آدمی ہو' ہم یہی جاننا چاہتے ہیں۔"

وہ اٹھنے لگا تھا کہ میں نے اس کی کلائی پکڑ لی "ہم نے نقد رقم [ادا] کی ہے۔ اس بات کی ضمانت دئے بغیر تم نہیں جا سکتے کہ ہمارے [سا]تھ کوئی دھوکا نہیں ہوا ہے۔"

بہرام کی حالت پھر پکڑے جانے والے مفرور مجرم جیسی [ہو گ]ئی۔ اس نے زور لگا کے اپنی کلائی چھڑانے کی کوشش کی "چھوڑو [مجھ]ے۔"

میں نے کہا "تم چھڑا سکتے ہو تو چھڑا لو۔"

غالب نے سب کی نظر بچا کے اپنا ریوالور نکالا "اور بھاگ[نا] ہو تو بھاگ کے دکھاؤ۔"

اس کی ساری مزاحمت ختم ہو گئی "اچھا آپ ٹکٹ واپس [...]دیں' میں پیسے دیتا ہوں۔"

میں نے کہا "یہاں نہیں۔"

"کیوں۔ سودا جب یہاں ہوا تھا۔۔۔۔" وہ تیز لہجے میں بولا۔

"ہم یہاں ہنگامہ نہیں چاہتے مگر تم ہمیں مجبور مت سمجھنا" [...]ا نے کہا اور اپنی جیب سے پاسپورٹ نکال کے اسے دکھایا۔

"ڈاکٹر۔۔۔ ڈاکٹر راجن" اس نے بمشکل تمام کہا "تم نے جھوٹ بولا تھا مجھ سے۔۔۔"

اب غالب نے اپنا پاسپورٹ اس کے سامنے لہرایا "میرا نام ہے کمار۔ ہم سب انڈین فارن آفس کے لوگ ہیں۔ امیگریشن اور پاسپورٹ ڈویژن۔ تم جیسے لوگوں کی تلاش ہمارا کام نہیں ہے مگر ہم تمہیں متعلقہ حکام کے حوالے ضرور کر سکتے ہیں۔"

بہرام کی حالت غیر ہو گئی "سر۔۔۔ مجھے معاف کردیں۔ آئی ایم سوری۔ میں نے مجبوری میں یہ کام کیا۔ یہ میرا پیشہ نہیں ہے۔"

میں نے کہا "ہم باہر جا کے بات کریں گے۔ ایسی باتوں کے لئے یہ جگہ مناسب نہیں ہے۔"

بہرام بری طرح پھنس گیا تھا۔ اس کے لئے تعمیل کے سوا چارہ نہ تھا۔ باہر نکلنے تک میں نے اور غالب نے اسے دونوں طرف سے محصور رکھا۔ اس کا ایک ہاتھ بڑے دوستانہ انداز میں میرے ہاتھ میں تھا اور غالب جو اس سے لگ کے چل رہا تھا' یہ بتا چکا تھا کہ اس نے اپنی جیب میں ریوالور پکڑ رکھا ہے۔ ریوالور کی نوک بہرام کی ریڑھ کی ہڈی کو چھو رہی تھی۔

"تم لوگ مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟" وہ باہر آ کے مچل گیا۔

"تم اپنے پیروں پر چل کے بھی جا سکتے ہو اور بے ہوشی کی حالت میں بھی۔ کون سا طریقہ پسند کرو گے تم؟" میں نے کہا "ہم تمہیں رام ناتھ کے گھر لے جائیں گے۔ سیٹھ رام ناتھ کا نام ضرور سنا ہو گا تم نے۔"

ہمارے ٹیکسی میں بیٹھنے تک اسے یقین تھا کہ ہم جھوٹ بول رہے ہیں اور درحقیقت اسے سفارت خانے کی معرفت نیپال کی پولیس کے حوالے کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں مگر میں نے ٹیکسی والے کو پتا بتایا تو وہ کچھ مطمئن ہو گیا اور آرام سے بیٹھ گیا۔

ہم واپس رام ناتھ کی حویلی پہنچ کے ٹیکسی سے اترے تو ہمارے ساتھ ایک نئے آدمی کو دیکھ کر رام ناتھ نے کہا "یہ کون ہے؟"

میں نے کہا "یہ بہرام ڈاکو ہے۔ تم نے اس کے بارے میں بہت ناول پڑھے ہوں گے۔ اس نے ہمیں بھی لوٹنے کی کوشش کی تھی۔"

"میں۔۔۔۔ میں وہ سب واپس کرنے پر تیار تھا۔ یہ لوگ مجھے زبردستی یہاں لے آئے" اس نے رام ناتھ سے کہا "یہ تو بڑا ظلم ہے۔"

میں نے کہا "رام ناتھ جی! آپ اندر جائیں۔ لیڈیز! آپ بھی چلیں۔ ہم کچھ تفتیش کریں گے۔"

بہرام کا رنگ لاش کی طرح سفید پڑ گیا تھا "تم مجھے نہیں جانتے۔"

میں نے اسے دھکا دے کر بٹھا دیا "ہم تمہیں جاننا چاہتے ہیں' اسی لئے تو یہاں لائے ہیں۔ لیکن تمہارے بارے میں پھر بات کریں گے' پہلے یہ بتاؤ کہ شہناز کریم اور عبدالکریم کون ہیں؟"

"یا کون تھے؟" غالب نے کہا۔
اس نے کہا "یہ سب میں نہیں جانتا۔ میں نے تمہارے سامنے ہی ٹکٹ لئے تھے۔"
"کس سے لئے تھے؟" میں نے کہا "ہم اسے بھی اٹھوا لیتے ہیں۔"
"وہ اجنبی تھا میرے لئے۔"
میں نے پے در پے اس کے چہرے اور پیٹ میں مکے مارے۔ وہ چلانے لگا اور تڑپنے لگا۔
میں نے کہا "تم اتنے بے وقوف نہیں ہو کہ ایک اجنبی سے اتنا بڑا سودا کرلو۔ وہ تمہارے گروہ کا آدمی تھا...... یہ ٹکٹ کس کے ہیں؟"
اس نے ہانپتے کانپتے ہوئے کہا "مجھے نہیں معلوم۔"
میں نے کہا "مطلب یہ کہ آسانی سے تم نہیں بتاؤ گے۔"
"تم مجھے.... پولیس کے حوالے کردو" وہ چیخ کر بولا۔
میں نے اسے دوسری بار زیادہ بے رحمی سے مارا "پولیس کے ساتھ مل کے تم یہ ریکٹ چلاتے ہو نا؟ ہم جانتے ہیں۔"
غالب نے ریوالور کو اوپر اچھال کے پکڑنے کی کوشش کی مگر یہ مظاہرہ ناکام ہوگیا۔ ریوالور نیچے گرا تو وہ ایک دم اس پر جھپٹا۔
میں نے اس کے ایک کک رسید کی۔ وہ دور جا کے گرا اور اپنی پسلیوں پر ہاتھ رکھ کے دہرا ہوگیا۔ "مجھے معلوم ہے، پولیس تمہیں چھوڑ دے گی۔"
"ٹرائی، ٹرائی اگین۔" غالب بولا۔ "دیکھتے ہیں کون کامیاب ہوتا ہے۔" اس نے دوسری بار ریوالور اچھالا اور کیچ کرلیا۔
میں نے بہرام کو گھسیٹ کر.... ایک کرسی پر ڈال دیا "اگر تم نے سچ نہ بولا تو میں دوسرے طریقے استعمال کروں گا۔ میں بجلی کے جھٹکے دے دے کر تمہیں مار ڈالوں گا، تمہیں ننگا کرکے فریزر میں ڈال دوں گا، چھری سے تمہاری کھال اتار لوں گا۔ بتاؤ، شہناز کریم اور عبدالکریم کے ٹکٹ تمہارے پاس کہاں سے آئے؟"
آدھے گھنٹے بعد اس نے اپنے جرم کا اعتراف کرلیا۔ اس نے ایک پاکستانی فیملی کے دو افراد کو قتل کرکے ان سے یہ ٹکٹ حاصل کیے تھے۔ اپنے ایک ساتھی کی مدد سے اس نے لاشوں کے سر کاٹ کر الگ گاڑ دیے اور دھڑ یہاں سے دور ایک ایسی کھائی میں پھینک آئے جہاں وحشی درندے ان کی ہڈیاں تک کھا جائیں۔
اس لرزہ خیز قتل کی واردات نے میرے اور غالب کے دماغ کو شدید صدمے سے دوچار کیا۔ میں اس معاملے میں کسی دھوکے یا فراڈ کے امکانات دیکھ رہا تھا اور صرف یہ جاننا چاہتا تھا کہ یہ دھوکا کس کے ساتھ ہوا ہے۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ صرف بارہ ہزار کی خاطر وہ شخص دہرے قتل کا مرتکب ہوچکا ہے۔
اس نے اپنے جرم کا اعتراف اس امید میں کیا تھا کہ ہم اپنے وعدے پر قائم رہتے ہوئے اس کو چھوڑ دیں گے مگر اس سے پہلے وہ بہت مار کھا چکا تھا اور نیم جاں ہو رہا تھا۔ ہم نے اسے غسل خانے میں بند کردیا۔ اس بات کا قطعی کوئی امکان نہ تھا کہ وہ فرار ہوجائے۔ اس میں اٹھنے کا حوصلہ بھی نہ تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ یہ بھیانک انکشاف رابعہ اور نازو کی عدم موجودگی میں ہوا ورنہ ان کا تو نروس بریک ڈاؤن ہوجاتا۔
"اب اس کا کیا کریں؟" میں نے کہا۔
غالب نے کہا "وہی جو اس نے کیا۔ یہ شخص رحم کا مستحق نہیں۔"
"بالکل ٹھیک۔ اسے ہم ٹھکانے لگا دیں گے۔ یہ ایک قاتل ہے جس نے ہمارے دو ہم وطنوں کی جان لی تھی۔ اگر یہ معاملہ پولیس کے سپرد کیا گیا تو یہ صاف بچ جائے گا۔"
"پھر قصہ تمام کرو۔"
"میں کچھ اور سوچ رہا تھا" میں نے کہا "ابھی عبدالکریم اور شہناز کریم کے بارے میں کسی کو بھی کچھ معلوم نہیں۔"
"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟"
"اس نے پورے اعتماد کے ساتھ ٹکٹ بیچے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ جہاز کی پرواز کے وقت کوئی عبدالکریم یا شہناز کریم ائرپورٹ نہیں پہنچ سکتے۔ اور نہ پولیس اتنی جلدی ان کا سراغ لگا سکتی ہے۔"
"مجھے تو شک ہے کہ شہناز اور کریم کو بھی ٹکٹ اس نے ہی بنوا کے دیئے ہوں گے۔ ورنہ اسے کیسے معلوم ہوسکتا تھا کہ ان کے پاس فلاں فلائٹ کے ٹکٹ ہیں۔"
"اگر اسے ڈر نہیں تھا تو وہ گھبرا کیوں گیا تھا؟"
میں نے کہا "وہ تصدیق اور ضمانت طلب کرنے پر گھبرایا تھا۔ اسے ہم سے یہ امید نہیں تھی۔ اس نے تو سوچا ہوگا کہ ہم تھینک یو ویری مچ کہہ کے ٹکٹ جیب میں ڈالیں گے اور اپنی راہ لیں گے۔"
تفتیش کے دوسرے راؤنڈ میں اس نے مزید انکشافات کیے۔ عبدالکریم اور شہناز کریم اسے ایک کیمپ میں ملے تھے جہاں وہ دوسرے بہت سے ایجنٹس کی طرح شکار کی تلاش میں گھومتا تھا۔ شہناز ایک بنگالی لڑکی تھی اور کریم ایک سال سے مشرقی پاکستان میں تھا۔ فوجی اصطلاح میں وہ ایک بھگوڑا تھا مگر حقیقت یہ تھی کہ وہ دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہونے سے بچنے کے لیے روپوش ہوگیا تھا۔ اسے شہناز کے گھر میں پناہ ملی تھی جسے وہ پہلے سے جانتا تھا اور یقین دلا چکا تھا کہ اس سے شادی کرے گا۔ جب حالات خراب ہوئے تو یہ محبت کرنے والے بچھڑ گئے اور سارے وعدے خواب فراموش ہوگئے۔ شہناز اسے بھول گئی تھی کہ وہ اچانک آپہنچا اور شہناز کو اپنے ساتھ لے گیا۔ انہوں نے ڈھاکا پہنچ کے خفیہ طور پر نکاح پڑھوا لیا۔ شہناز کے والدین جو پہلے تیار تھے، اب اس شادی پر ہرگز رضامند نہ ہوتے۔ ڈھاکا سے وہ چھپتے چھپاتے نیپال پہنچے تھے اور کریم کا خیال تھا کہ واپس پہنچ کے وہ اپنی رجمنٹ کے سینٹر ...ں رپورٹ کردے گا۔ پاکستان میں وہ محفوظ ہوں گے اور ہنسی خوشی ...ندگی گزاریں گے۔ شہناز نے اپنے زیور اور کریم نے تمام نقد ...پیہ دے کر بہرام کی معرفت دو ٹکٹ حاصل کیے۔ اس کے لیے ...نہیں دو ہفتے انتظار کرنا پڑا۔ یہ دو ہفتے انہوں نے اپنے کیمپ میں ...اموشی سے گزارے۔ پکڑے جانے کے ڈر سے وہ باہر نہیں نکلتے ...تھے اور کسی سے بات تک نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے تو اپنے نام ...بھی غلط بتا رکھے تھے مگر بہرام کو انہوں نے سب کچھ بتا دیا تھا۔ یہ ...ان کی بے وقوفی تھی یا شامتِ اعمال۔ دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام ...رہ گیا تو فرشتۂ اجل کے روپ میں بہرام نے ان کے مستقبل کا ...راستہ روک لیا۔ وہ لاوارث اور گمنام لوگ تھے۔ بہرام کے لیے ...انہیں مار کے غائب کردینا بہت آسان کام ثابت ہوا۔ ان کا تو کوئی ...پوچھنے والا بھی نہ تھا جو ان کی اچانک روپوشی پر تشویش کا اظہار ...کرتا۔ انہیں ٹکٹ دکھا کے وہ اپنے ساتھ لے گیا اور کہا کہ اب ...اس کا کام ختم ہوا۔ جہاز پر انہیں دوسرا شخص سوار کرائے گا۔ کریم ...اور شہناز اس سے ملنے گئے اور واپس نہیں آئے۔ ہم نے اسے پھر ...بند کردیا۔
یہ سب سن کے رام ناتھ جیسا شخص بھی مشتعل ہوگیا "بند ...کیوں کر رکھا ہے اسے؟ ختم کرو۔ آج رات کو اس کی لاش سڑک پر ...پھنکوا دیں گے۔"
میں نے کہا "رام ناتھ! بہت سے لوگوں نے اسے ہمارے ...ساتھ دیکھا ہوگا۔ اس کی لاش بھی نہیں ملنی چاہیے۔"
"نہیں ملے گی۔ وہ خود ہمیں اس جگہ لے جائے گا جہاں....."
میں نے کہا "بالکل ٹھیک سوچا تم نے۔ مگر میں کچھ اور سوچ رہا ...تھا۔"
غالب نے کہا "تم ٹکٹ استعمال کرنا چاہتے ہو؟"
میں نے کہا "ہاں۔ شہناز اور کریم نے اس کی قیمت ایک بار ...نقد ادا کی، پھر اپنی جان دے کر۔ تیسری بار ہم نے یہ ٹکٹ بارہ ہزار ...میں لیے ہیں۔ انہیں ضائع کرنا کون سی عقلمندی ہے۔"
"کیا کاجل مان جائے گی؟"
میں نے کہا "کاجل کو کچھ معلوم نہیں۔ رابعہ یا نازو کو بھی کچھ ...بتانے کی ضرورت نہیں۔ کل ہم کاجل کے ساتھ کلیم کو روانہ ...کردیں گے۔ خود انہیں سی آف کرنے جائیں گے۔ پھر کل رات ...بہرام کو سی آف کردیں گے۔ جہاز کے ٹیک آف کرنے کے بعد۔"
"کل تک بہرام کو کہاں رکھیں گے ہم؟"
رام ناتھ نے کہا "اسی گھر میں۔ ایک تہ خانے میں۔"
"رابعہ اور نازو کہاں ہیں؟" میں نے کہا۔
"سو رہی ہیں سب۔" رام ناتھ نے کہا "یہی بہترین وقت ہے ...اسے نیچے لے جانے کا۔"
بہرام کو اپنی موت کا یقین آچکا تھا۔ جب اس نے چیخنا چلانا شروع کیا تھا تو ہم نے کپڑا ٹھونس کے اس کا منہ بند کردیا تھا۔ اب اسے اٹھا کے تہ خانے تک لے جانا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ اپنے پیروں پر چلنے کے قابل نہیں تھا چنانچہ اسے میں نے اٹھایا۔ رام ناتھ نے ہماری رہنمائی کی اور ہم کچن کے پیچھے سے زیرِ زمین چلے گئے۔
تہ خانہ اچھا خاصا بڑا بیڈ روم تھا جو پہاڑی کو کاٹ کے بنایا گیا تھا۔ یہ کمرا نہ بنایا جاتا تو باقی عمارت کو سہارا دینے کے لیے بہت بھرائی کرنی پڑتی اور ستون اٹھانے پڑتے۔ رام ناتھ سے پوچھے بغیر ہی میں سمجھ گیا کہ یہ ایک خفیہ عشرت کدہ تھا۔ پہلی بیوی کی موت کے بعد رام ناتھ نے بڑی رنگین زندگی گزاری تھی مگر اس سے پہلے بھی وہ کون سا پارسا ہوگا۔
ہم اس خواب گاہ سے متصل باتھ روم میں بہرام کو ڈال کر اوپر آگئے۔ اس قید خانے سے صرف اس کی روح باہر نکل سکتی تھی اور ہم نے اسے خودکشی کے امکانات سے محروم نہیں کیا تھا۔ اگر وہ خود اپنی جان لے لیتا تو ہم قتل کے الزام سے بچ جاتے۔ رام ناتھ کے نزدیک بھی یہ قتل نہیں انصاف تھا اور ضروری تھا۔
اٹھنے کے بعد رابعہ نے پہلا سوال یہ کیا "بہرام کہاں ہے؟"
میں نے کہا "وہ تو چلا گیا تھا۔ کچھ دیر بعد۔"
نازو بولی "مگر میں نے اس کے چلانے کی آواز سنی تھی۔"
"کیسے چلا رہا تھا وہ؟" غالب بولا "چلا کے بتاؤ۔"
میں نے کہا "اب پوچھ کچھ شرافت سے تو ہوتی نہیں۔"
"پھر کیا معلوم ہوا؟" رابعہ بولی۔
"کوئی خاص بات نہیں۔ ٹکٹ ٹھیک ہیں۔ وہ اپنا نام غلط بتا رہا تھا۔" میں نے کہا۔
"بے وقوف آدمی تھا" غالب بولا "معلوم نہیں اس کے ذہن میں کیا تھا۔ جھوٹ بول کے وہ کیا چاہتا تھا۔"
میں نے کہا "اسے ڈر تھا کہ ہم اسے پکڑوا دیں گے۔ ہمارے پاس فضول کاموں کے لیے وقت نہیں ہے۔ نام پتا معلوم ہوگیا تو ہم نے چھوڑ دیا۔"
رابعہ نے کہا "اب وہ تمہارا کام نہیں کرے گا۔"
"نہ کرے۔ اور بہت ہیں اس جیسے" میں نے کہا۔
نازو بولی "اور الٹا اس نے ہمارے بارے میں پولیس کو بتا دیا، پھر؟"
غالب نے کہا "کیا بتائے گا؟ ہمارے پاسپورٹ دیکھ چکا ہے وہ۔ یہ جانتا ہے کہ ہم رام ناتھ کے مہمان ہیں۔ غلط کام کر رہا ہے تو وہ خود۔"
"ہم کل انشاء اللہ کاجل اور کلیم کو کراچی بھیج دیں گے۔ تمہارے بھائی کے پاس" غالب نے کہا "ڈبل ایس آئی شیخ کے پاس۔"
نازو اداس ہوگئی "بھیا تو مایوس ہوچکے ہوں گے۔ انتظار کرنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ خاص طور پر ان کا جن کے زندہ واپس آنے

کا یقین ہی ادھورا ہو۔ کتنی پرانی بات لگتی ہے یہ جب ہم ان کو چھوڑ کر آئے تھے۔"

غالب نے کہا "مری رفیق، مری ہم سفر اداس نہ ہو۔ بہت جلد تم بھی ان سے جا ملو گی، ہم سب کا انتظار ختم ہونے والا ہے۔"

شام ہوتے ہی سردی پھر بڑھنے لگی۔ ہم نے ابھی تک گرم کپڑے نہیں خریدے تھے۔ رام ناتھ نے بڑی فراخدلانہ پیشکش کی کہ ہم اس کی گاڑی میں چلے جائیں لیکن ہم نیپال کے دلکش نظاروں والے دارالحکومت کی سیر بھی کرنا چاہتے تھے۔ کلیم کو ابھی تک بخار تھا اور کاجل اس کے لیے بہت متفکر تھی۔ اس نے ہمارے ساتھ جانے سے انکار کردیا۔

"تم کہو تو ہم بھی نہ جائیں" رابعہ نے کہا۔

جواب رام ناتھ نے دیا "بھئی ایسی کوئی بات نہیں۔ اس موسم میں ٹھنڈ لگ ہی جاتی ہے۔ میں نے ڈاکٹر سے کہا تھا کہ شام کو پھر دیکھ جائے۔"

کاجل نے کہا "ہاں۔ وہ آتا ہی ہوگا۔ تم لوگ جاؤ۔"

جب ہم باہر آرہے تھے تو دھواں چھوڑتی، شور مچاتی اور خطرناک انداز میں لہرا کے چلتی ہوئی ایک گاڑی اندر داخل ہوئی۔ میں نے چھلانگ مار کے خود کو ایک طرف کیا ورنہ میرا خیال ہے کہ حادثے کی صورت میں اس قدیم وضعیف کار کا کوئی حصہ ٹوٹ کے گر جاتا۔ اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر سرکس کے جوکر جیسا ایک شخص یوں اکڑا بیٹھا تھا جیسے منجمد ہوگیا ہو۔ اسے شاید امید نہ تھی کہ اندر سے بھی کوئی آسکتا ہے۔ کوشش کے باوجود وہ اسٹیرنگ پر کنٹرول نہ رکھ سکا اور گاڑی لان پر اتر گئی۔ سبزے پر سے گزری اور چار گملوں کے درمیان سے راستہ بنا کے رک گئی۔

نازو کو سب سے زیادہ ہنسی آئی "یہ کیا چیز تھی؟"

رابعہ بولی "ایک سوار تھا، دوسری سواری تھی۔ تم کس کو پوچھ رہی ہو؟"

میں نے کہا "غالباً یہی ڈاکٹر تھا۔"

وہ کار سے باہر آنے کے بعد ڈاکٹر ہی ثابت ہوا۔ کچھ دیر ہمیں گھورنے کے بعد اس نے افسوس سے سہلاتے ہوئے کار کے مضروب حصوں کو اسی طرح دیکھا جیسے وہ جاں بہ لب مریضوں کو دیکھتا ہوگا اور پھر اپنا سال خوردہ میڈیکل بیگ اٹھا کر اندر چلا گیا۔ لان پر ہل چلانے یا گملے توڑ کے پودوں کو بے گھر کرنے کا اسے کوئی ملال نہ تھا۔

"کمال ہے! ہمالیہ کی ترائی میں ایسی چیزیں بھی پائی جاتی ہیں۔" غالب بولا۔

میں نے کہا "تمہارے ملک میں سنیاسی بابا بھی تو ہیں جو ہمالیہ کے غاروں میں سو سال گزارنے کے دعوے رکھتے ہیں۔"

"جس کا دل چاہے نوشتۂ دیوار پڑھ لے۔ کہ وہ آئے تب جوان تھے۔ گھر لوٹ کر گئے تو زیادہ جوان تھے۔" غالب بولا۔

نازو نے کہا "کیا تم ملے ہو کبھی ایسے جوان بابا سے؟"

غالب نے کہا "نادان لڑکی! لوگ آتے ہیں مجھ سے ملنے۔"

میں نے کہا "یہی تو ہیں بابا مذکور۔ دیکھنے میں اٹھائیس کے لگتے ہیں مگر ایک سو اٹھائیس سال عمر ہے۔"

رابعہ ہنسی "پھر تو تمہیں سنیاسی بابا غالب کہنا چاہیے۔"

نازو بولی "میرے پردادا ہو گئے تم تو۔"

غالب نے کہا "دیکھا سکندر! ان عورتوں میں کیسی بری عادت ہے اپنی عمر میں ڈنڈی مارنے کی۔ اس نے تو ڈنڈا ماردیا۔ مجھ سے زیادہ ہی کم ہوگی اس کی عمر۔"

"سکندر صاحب!" پیچھے سے کسی نے مجھے نام لے کر پکارا۔

میں ایک دم گھوم گیا۔ میرے ساتھ ہی دوسرے سب لوگوں کے قدم رک گئے۔ مجھے آواز دے کر روکنے والا درمیانی عمر کا شخص تھا۔ جس نے ڈفل کوٹ پہن رکھا تھا۔ نہایت سرد علاقوں میں جہاں برف باری بھی ہوتی ہے، یہ کوٹ بہت کام آتے ہیں۔ پاکستان کے شمالی علاقوں اور اسلام آباد میں بھی لوگ یہ اوورکوٹ استعمال کرتے ہیں جس میں کالر کے ساتھ ہی سر کو ہر طرف سے ڈھانپ لینے والا حصہ بھی ہوتا ہے۔ ڈفل کوٹ والے نے مجھے بہت قریب آکے آواز دی تھی اور وہ بھی دبے دبے لہجے میں۔ میرے اچانک رک جانے سے اس کو بھی بریک لگانے پڑے۔ وہ نہ جانے کہاں سے ہمارے تعاقب میں تھا۔

کوٹ کی جیب سے ہاتھ نکال کے اس نے مجھ سے مصافحہ کیا "آپ سکندر بخت ہو نا؟ مجھے شک تھا۔"

"آپ کا شک غلط نہیں تھا" میں نے ہاتھ ملا کے حیرت کے سارے تاثرات کو چہرے پر جمع کرلیا۔

"جی.... آپ سکندر نہیں ہو!" اس نے سنبھل کے کہا اور عینک کے شیشے صاف کرکے پھر میری صورت کا جائزہ لیا۔

"معلوم نہیں آپ کس سکندر کی بات کررہے ہیں۔ جس کا مقابلہ پورس سے ہوا تھا وہ تو ساڑھے تین سو سال قبل مسیح میں ادھر آیا تھا۔"

غالب بولا "ادھر کا مطلب ہے ہندوستان۔ کھٹمنڈو وہ کبھی نہیں آیا تھا۔"

"آپ مذاق کرتے ہو جی" وہ خفت سے مسکرایا "ابھی آپ نے بھی ان کا نام لیا تھا۔"

"میں نے!" غالب حیران ہو کے بولا اور پھر قہقہہ مار کے ہنس پڑا "چشمہ تو صاف کرلیا تم نے۔ اب کان بھی صاف کراؤ۔ ارے بھائی میں اس کو مذاق میں چقندر کہتا ہوں، یہ مجھے شلجم کہتا ہے۔"

میں نے بھی سہلایا "اور انہیں ہم گاجر مولی کہتے ہیں۔"

وہ بخت مخمصے میں پڑگیا "چقندر.... شلجم...."

غالب نے بڑی حاضر دماغی کا ثبوت دیا تھا۔ مجھے سکندر سمجھنے والے شخص کو پورا یقین تھا کہ میں سکندر بخت ہوں یا اس سے ملتا جلتا کوئی اور آدمی ہوں چنانچہ وہ تصدیق کے لیے ہمارے پیچھے چلتا رہا تھا اور جب غالب نے میرا نام لیا تو اسے اپنی آنکھوں پر اعتبار آگیا مگر غالب نے بڑی چالاکی سے نظر کے دھوکے کو فریب سماعت کا نام دے دیا۔

میں نے پُراعتماد انداز میں اپنا پاسپورٹ نکالا "میں ڈاکٹر راجن ہوں اور یہ میری دھرم پتنی ڈاکٹر رکمنی۔ یہ مسٹر اور مسز کمار ہیں۔"

اس نے بے یقینی سے میرا پاسپورٹ لیا۔ اس پر میری تصویر اور نام کو دیکھا اور بولا "معاف کرنا...."

غالب نے کہا "ہمارے پاسپورٹ بھی دیکھ لو۔ تمہارا یہ شک بھی رفع ہوجائے گا کہ میں راجہ پورس تھا۔"

اس نے مجھے پاسپورٹ واپس کرتے ہوئے کہا "میں غلط سمجھا تھا۔ تم وہ نہیں ہو۔"

میں نے پاسپورٹ پھر جیب میں رکھ کے کہا "تم کس سکندر کو تلاش کرتے پھر رہے ہو؟"

غالب نے ہمدردی سے کہا "تمہارا بیٹا یا کوئی بھائی تھا جو گم ہوگیا ہے؟"

اس نے خفت کے ساتھ سہلایا "نہیں .... ایک دوست تھا۔ بمبئی میں ملا تھا۔ صرف ایک بار، ذرا سی دیر کے لیے۔ وہ ملاقات بھی کہاں تھی۔ دور سے ہی دیکھا تھا اسے۔ میں ریلوے کوارٹر میں اپنے ایک دوست کے ساتھ رہتا تھا اور وہ سامنے والے کوارٹر میں ٹھہرا تھا۔"

میں نے کہا "آخر وہ تھا کون؟"

"وہ.... تھا ایک مجاہد، ایک عظیم انسان" اس نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا "مجھے ہمیشہ افسوس رہے گا کہ میں نے اس کے لیے کچھ نہ کیا حالانکہ میری بڑی تمنا تھی۔ خیر...."

وہ واپس جانے کے لیے پلٹا تو میں نے کہا "عجیب آدمی ہو تم بھی۔ اگر وہ سکندر یہاں مل جاتا تو تم کیا کرتے، جب وہاں کچھ نہیں کرسکے تھے۔"

وہ پھر رک گیا "یہاں میں بھارتی سفارت خانے میں ہوں۔ ویسے تو چپراسی کچھ نہیں ہوتا مگر میں سفیر صاحب کا ذاتی چپراسی ہوں۔ میں اسے خبردار کردیتا کہ وہ خطرے میں ہے، فوراً نیپال سے نکل جائے۔ اچھا، میں چلتا ہوں، کوئی کام ہو تو آجانا میرے پاس۔"

غالب نے کہا "کام پڑسکتا ہے مگر نام تو معلوم ہو تمہارا۔"

"بندے علی" وہ جلدی سے بولا "معاف کرنا، میں نے آپ کا وقت ضائع کیا۔"

میں نے کہا "بندے علی! ایک کام تو ہے مگر بات یہاں سڑک پر کھڑے رہ کر نہیں کی جاسکتی۔ کیوں نہ ہم کہیں بیٹھ جائیں۔"

"تمہارے ساتھ ایک کپ چائے بھی پی لیں" غالب نے کہا "تمہیں کوئی ضروری کام تو نہیں ہے؟"

وہ مسکرایا "نہیں جی۔ ایسے ہی نکلا تھا بازار سے کچھ لانے کے لیے۔ یہاں آپ مہمان ہو، چائے میں پلاؤں گا۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے۔ ہمیں تو معلوم نہیں یہاں چائے کہاں اچھی ملتی ہے۔"

وہ بولا "بہت اونچی جگہ تو میں آپ کو نہیں لے جاسکتا۔ ایک خالص نیپالی ریسٹورنٹ ہے۔ چائے بھی خاص ہے اس کی۔"

غالب نے کہا "پھر تو ہم وہیں جائیں گے۔"

اس خالص نیپالی ریسٹورنٹ کا ماحول خاصا پراسرار تھا۔ باہر سے صرف ایک دروازہ نظر آتا تھا مگر اس کے پیچھے طویل سرنگ جیسا غار تھا۔ وہ دروازہ پہاڑی کے اس حصے میں تھا جہاں عمارات کے سائے نے پہاڑی کو چھپالیا تھا۔ یہ مصنوعی نہیں حقیقی غار تھا جسے ضرورت کے مطابق کچھ گہرا اور چوڑا کرلیا گیا تھا۔ اوپر سے مٹی اور پتھروں کو گرنے سے بچانے کے لیے جگہ جگہ سیمنٹ بھی بھرا گیا تھا مگر سیمنٹ کو بھی خاکی رنگ سے قدرتی چٹانوں کا حصہ بنادیا گیا تھا۔

نیچے پختہ فرش تھا جس پر سرخ قالین بچھا ہوا تھا۔ چٹان کی

دیواروں پر ایسی وال لائٹس نصب تھیں کہ دیکھنے سے قدیم طرز کی مشعل کا گماں ہوتا تھا۔ میزوں پر خوب صورت پھول سجے ہوئے تھے اور کہیں غاروں میں چھپے ہوئے اسپیکروں سے موسیقی کے سُر پھوٹ رہے تھے۔ یہ مغربی موسیقی نہیں تھی۔ خالص ہندوستانی' کلاسیکل موسیقی تھی۔ اور جب ہم ایک میز پر بیٹھے تو روی شنکر اور استاد علی اکبر خاں کے سروں کا ریکارڈ ختم ہوا پھر چند لمحے بعد... بسم اللہ خان کی شہنائی کا جادو جاگا۔

مجھے اس ماحول کے طلسم نے اسیر کرلیا تھا۔ اگر بندے علی نہ ملتا تو ہم اس خوب صورت جگہ سے اجنبی بن کے گزر جاتے اور بعد میں کبھی کوئی ذکر کرتا تو ہمیں ملال ہوتا کہ ہم کھٹمنڈو میں تھے تو کسی نے اس جگہ کے بارے میں کیوں نہیں بتایا تھا۔

ایک معصوم صورت نیپالی لڑکی نے قریب آکے سر خم کیا اور مسکرا کے کہا "ویلکم ٹو نیپال سر" اور مینو ہمارے سامنے رکھ دیا۔

اس کا خالص مشرقی لباس بھی متاثر کن تھا۔ اس نے ساری کے اوپر بڑی خوب صورت شال اوڑھ رکھی تھی اور بالوں کا جوڑا بنا کے ان میں پھول گوندھ رکھے تھے۔

مینو میں کھانوں کی اور مشروبات کی فہرست بہت طویل تھی اور بہت سے عام کھانوں کے ساتھ نیپال کی ہر خصوصی ڈش شامل تھی۔ بندے علی نے بہت اصرار کیا کہ ہم ڈنر کی دعوت قبول کرلیں مگر ہم میں سے کوئی بھی سرشام کھانے والا نہیں تھا اور ہم اس کو شرف میزبانی بخشنے نہیں آئے تھے بلکہ میں اس سے علیحدگی میں بات کرنا چاہتا تھا۔

میں نے کہا "بندے علی! تم نے چائے کا ذکر کیا تھا' بس وہی اسپیشل چائے چلے گی ورنہ کچھ نہیں۔"

بندے علی نے مایوسی سے کہا "اچھاجی۔ آپ کی مرضی۔"

اس سے زیادہ مایوسی ویٹرلیس کو ہوئی مگر اس نے اپنی دلربا مسکراہٹ سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا اور سر جھکا کے چلی گئی۔

پھر میں نے کہا "بندے علی! تم نے کہا تھا کہ سکندر بخت خطرے میں ہے اور اسے فوراً نیپال سے نکل جانا چاہیے۔"

"میں نے تو سکندر کہا تھا' سکندر بخت نہیں۔ اور وہ خطرے میں ہے تو آپ کو کیا؟ آپ تو ڈاکٹر راجن ہو" وہ عیاری سے بولا۔

اب اعتراف کے بنا چارہ نہ تھا "فرض کرلو کہ میں اس کا دوست ہوں اور جانتا ہوں کہ وہ کہاں ہے۔"

"آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ اس وقت وہ کہاں ہے۔ ہے کہ نہیں؟" وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بولا "مگر آپ ڈرتے ہو کہ کسی کو معلوم ہوگیا تو وہ پکڑا جائے گا۔ اچھاجی' مت بتاؤ مگر ہم بتادیتے ہیں۔"

اس نے جیب میں سے خاکی رنگ کا سرکاری لفافہ برآمد کیا جس پر گول' سرخ رنگ کی "ٹاپ سیکرٹ" کی مہر تھی۔ اس بھارتی سفیر کا نام لکھا ہوا تھا اور یہ ہدایت درج تھی کہ اسے عملے کوئی فرد نہ کھولے۔ اندر دوسرا لفافہ تھا جس پر کچھ تحریر نہیں تھا اسے لاکھ چپکا کے بند کیا گیا تھا۔ لفافے کے ہر جوڑ پر اور درمیان میں لاکھ گرم کرکے پیتل کے ابھرے ہوئے حروف والی مہریں لگا گئی تھی کہ سیل توڑے بغیر کوئی بھی لفافے میں سے کچھ نہیں نکا سکتا تھا۔ انتہائی خفیہ اور اہم نوعیت کی سرکاری ڈاک کو بھیجنے کا طریقہ ہر جگہ مروج تھا۔

"اسے مت کھولنا" بندے علی نے ہاتھ بڑھایا۔

میں نے لفافہ اسے واپس کردیا "پھر دیا کیوں تھا مجھے؟"

غالب بولا "اس میں کیا ہے آخر؟"

بندے علی نے لفافے کو احتیاط سے ڈفل کوٹ کی اندر جیب میں رکھا اور دوسری جیب سے ٹائپ کیا ہوا کاغذ نکال کے مجھے پکڑا دیا "یہ تھا اس میں۔ یہ اصل کی نقل ہے۔"

یہ بنگلہ دیش میں بھارتی ہائی کمان کی طرف سے نیپال کے سفیر کو جاری ہونے والا ایک مراسلہ تھا جس میں بتایا گیا تھا کہ بدنام زمانہ دہشت گرد سکندر بخت اور اس کے ساتھی فوجی لباس میں ایک بھارتی فوجی ٹرک لے کر سرحد عبور کرگئے ہیں اور نیپال پہنچ چکے ہیں۔ مراسلے میں ہمارے کارناموں کی تفصیل تو نہیں تھی مگر ان سب کے حلئے بیان کیے گئے تھے جو ایم آرایس کے بانی ارکان تھے۔ نیپال کی حکومت سے درخواست کی گئی تھی کہ ان پر کڑی نظر رکھے اور انہیں فرار ہوکے پاکستان جانے سے روکے۔ اگر گرفتار ہوجائیں تو ان کو خصوصی حفاظتی انتظامات کے ساتھ ڈھاکا بھیج دیا جائے۔ مراسلے میں ہم سب کے نام تھے' وہ نام بھی تھے ہم نے اختیار کررکھے تھے۔ ہمارے پاسپورٹس کے نمبر تھے اور اس ٹرک کا نمبر تھا جس میں ہم ایک سرحدی چوکی پر گرفتاری کے بعد فرار ہوئے تھے۔ اس کے نیچے "فار ملٹری آپریشنل کمانڈر نارتھ سیکٹر تھری" لکھا ہوا تھا مگر اوپر کیپٹن حمید کے دستخط تھے۔ ظاہر ہے کمانڈر وہ خود نہیں تھا۔ اس نے آپریشنل ہیڈ کوارٹر کو مطلع کردیا اور ان کی ہدایات کے مطابق یہ مراسلہ بھیجا تھا۔ وہ ذہین اور حوصلہ مند آدمی تھا جس نے بڑی ہوشیاری سے ہمیں بھی بچالیا اور اپنے آپ کو بھی۔

میں نے خط کے مضمون کو دوبار پڑھا اور پھر غالب کے حوالے کردیا۔ ویٹرلیس چائے کے برتن سجا گئی تھی اور تازہ چائے بنارہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب بندے علی سے کیا کہوں۔ میں نے جھوٹ بولا تھا اور وہ جانتا تھا کہ میں کیوں جھوٹ بولنے پر مجبور ہوں چنانچہ اس نے میری مجبوری کو قبول کرتے ہوئے اسے مان لیا تھا۔

بندے علی نے کہا "اب آپ بتادوگے نا سکندر بخت کو..."

میں نے کہا "بندے علی! میں ہی سکندر بخت ہوں۔ قصور نہ تمہاری نظر کا تھا نہ تمہارے کانوں نے غلط سنا تھا۔"

"آپ اچھی طرح سوچ لوجی۔ ہر ایک پر بھروسا کرنا اچھا نہیں ہوتا۔ ہم تو مان لیں گے کہ آپ ڈاکٹر راجن ہو۔"

میں نے کہا "اب اور شرمندہ مت کرو۔ تم جانتے ہو یہ احتیاط کا تقاضا تھا۔ ہماری جگہ تم ہوتے تو یہی کرتے۔ حالات ایسے ہیں کہ ہم دوست دشمن میں تمیز نہیں کرسکتے اور کئی بار بھروسا کرکے مصیبت میں پڑچکے ہیں۔"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "چلوجی' مت اعتبار کرو بندے علی پر۔ ہم قسم کھاکے کہیں گے تب بھی کیا ہوگا۔ تم کہوگے' کیا ثبوت ہے کہ یہ نقل مطابق اصل ہے۔"

غالب نے کہا "اصل کہاں ہے؟"

اس نے کوٹ پر ہاتھ رکھا "اس لفافے میں لیکن میں دوبارہ یہاں آپ کو لفافہ کھول کے نہیں دکھا سکتا۔"

"پہلی بار لفافہ کیسے کھولا تھا تم نے؟ اس پر تو ہر مہر سلامت ہے" غالب نے کہا۔

"ہیں جی اس کے بھی طریقے۔ لوگ تو جعلی نوٹ چھاپ لیتے ہیں اور کسی کو پتا نہیں چلتا۔"

میں نے کہا "گویا تم نے بھی ایک جعلی مہر بنوار کھی ہے۔ آخر کیوں؟ تم ٹاپ سیکرٹ سرکاری ڈاک کیوں کھولتے ہو؟"

غالب نے کہا "ظاہر ہے یہ کوئی پہلی بار نہیں کیا تھا تم نے۔ لفافہ دیکھ کر خط کا مضمون بھانپ لینا تو شاعرانہ بات ہے۔ عملاً یہ ناممکن ہے۔"

میں نے کہا "ایک سفارت خانے میں آنے والی سب ڈاک انتہائی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ اس میں حساس نوعیت کے راز ہوتے ہیں۔ یہ بہت سنگین نوعیت کی چوری ہے اور اس جرم کو غداری کی بدترین مثال سمجھا جاسکتا ہے۔"

اس نے اپنی صفائی میں کچھ بھی نہیں کہا اور سر جھکائے خاموشی سے چائے پیتا رہا۔

میں نے کہا "بندے علی! تم ایک معمولی چپراسی نہیں ہو۔ تم کسی کے ایجنٹ ہو۔ تم اپنے ملک کے خلاف جاسوسی کررہے ہو اور اس کا بھاری معاوضہ وصول کرتے ہو۔"

غالب نے کہا "کیا تمہیں احساس ہے کہ یہ کتنا خطرناک کام ہے؟ جاسوس کا دوست کوئی نہیں ہوتا۔ وہ پکڑا جائے تو نہ اسے اپنے معاف کرتے ہیں اور نہ وہ جن کے لیے وہ جاسوسی کرتا ہے۔"

اس نے سپاٹ لہجے میں کہا "چائے کیسی لگی آپ کو؟"

میں نے ایک گہری سانس لی اور چائے کا کپ خالی کردیا۔

بندے علی نے ہماری سب باتوں کو ایک کان سے سنا تھا اور دوسرے سے اڑادیا تھا۔ اس کے نزدیک یہ سب بکواس تھی۔ وہ سب اچھی طرح سمجھتا تھا اور اس کام کے تمام مضمرات سے واقف تھا۔ اسے کچھ سمجھانا یا لیکچر دینا بے سود تھا۔

غالب نے کہا "تمہیں یقین ہے کہ پہلے سے تمہاری نگرانی کوئی نہیں کررہا ہے اور کسی نے تم کو ہمارے ساتھ آتے نہیں دیکھا ہوگا......"

غالب کی بات نے مجھے چوکنا کردیا "ہاں بندے علی۔ عام طور پر یہ معاملات زیادہ دن پوشیدہ نہیں رہتے۔ تمہیں کیا معلوم کہ..."

"مجھے سب معلوم ہے" وہ میری بات کاٹ کے بولا "مجھے اتنا بے وقوف مت سمجھو کہ میں نے مدد کرکے تمہارے لیے مصیبت پیدا کردی ہوگی اور یہ نیکی تمہارے حق میں برائی بن جائے گی۔ نہیں سکندر بخت' کم از کم تمہارے ساتھ یہ نہیں ہوگا۔ یہ تو مجھ سے تفتیش کرنے والے سرکاری ادارے بھی معلوم نہیں کرسکتے کہ میں کس ملک کے لیے کام کرتا ہوں اور کیوں۔ کیوں کا جواب تو جانتے ہیں سب..."

میں نے افسوس سے کہا "کیا تم جانتے ہو کہ آج کل تفتیش کیسے کی جاتی ہے؟"

اس نے اقرار میں سرہلایا "جانتا ہوں۔ مگر میری لاش سے بھی کچھ نہیں اگلوا سکتے وہ۔"

غالب نے نظر بچا کے مجھے آنکھ ماری "فرض کرو بندے علی! یہ بوگس اطلاع ہو۔ اصل اطلاع کسی اور ذریعے سے سفیر کو فراہم کردی گئی ہو؟"

بندے علی نے کہا "اس میں کیا غلط ہے؟ مجھے بتاؤ۔"

میں نے جلدی سے کہا "کچھ نہیں۔ میں بہت شکر گزار ہوں تمہارا کہ تم نے اتنا بڑا خطرہ مول لے کر ہمیں تلاش کیا اور یہ اطلاع بر وقت فراہم کردی۔ اب بتاؤ اس کے بدلے میں ہم تمہارے لیے کیا کریں۔"

اس کا چہرہ جواب تک شکوک اور مایوسی کا مظہر تھا' ایک دم کھِل اٹھا "بس سکندر میاں! تم سلامت رہو اور خیریت سے واپس پہنچ جاؤ تو ہمارے لیے بھی دعا کرنا۔ ہم بھارت میں ہیں تو کیا' دل تو پاکستان کے ساتھ ہے ہمارا۔"

"تمہارے جذبات واقعی قابل قدر ہیں" میں نے کہا۔

"تم نہیں جانتے" آج دوسری بار تم سے مل کے مجھے کتنی خوشی ہوئی ہے اور میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں" وہ بولا "پہلی بار میں تمہارے لیے کچھ نہیں کرسکا تھا حالانکہ اس وقت بھی میں سمجھتا تھا کہ جو کچھ تم پاکستان کی خاطر کررہے ہو اس پر ہر مسلمان کو فخر ہونا چاہیے۔ تم نے جو کارنامے سرانجام دیے تھے اور جس طرح پاکستان کے دشمنوں کے دانت کھٹے کیے تھے' وہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ ہم تو۔۔۔"

میں نے کہا "چلو اب باقی باتیں رات کو کھانے کے بعد کریں گے۔"

"چائے تو ہم نے پی لی' تمہاری ڈنر کی دعوت بھی ہم قبول کرتے ہیں بندے علی۔ تم بھی کیا یاد رکھو گے کہ ہم قدر دانوں کے کیسے قدر دان ہیں۔"

"اچھا۔ تو پھر میں یوں گیا گھر اور یوں آیا" اس نے چٹکی بجا کے مسرت کا اظہار کیا "واقعی زندگی میں پھر نہ جانے کب ملیں۔ شاید کبھی نہ ملیں۔"

میں نے کہا "ہم اسی بازار میں ملیں گے۔ تھوڑی سی شاپنگ کرنی تھی۔"

"میں تلاش کرلوں گا تمہیں" وہ بولا۔

میں نے کہا "دیکھو اپنی بیوی کو کچھ مت بتانا۔ عورت کے کان میں بات گئی تو سمجھو کہ مائکروفون میں گئی اور لاؤڈ اسپیکر سے نشر ہوئی۔"

اس نے سرہلایا "بالکل ٹھیک کہا تم نے۔ خود اپنے بارے میں بیوی کو رازدار بنایا ہوتا تو کب کا سولی چڑھ چکا ہوتا۔"

جب وہ بل ادا کرکے چلا گیا تو رابعہ نے خفگی کے اظہار میں پہل کی "گویا ہم بھی ناقابل اعتبار ہوگئے سب کے ساتھ۔"

"تمہارے کان مائکروفون ہیں" نازو نے کہا۔

"آخر کون سی بات نشر کی ہم نے؟"

"لیڈیز۔۔۔ لیڈیز۔۔۔" غالب نے سمجھانے کے انداز میں "آپ کا احتجاج بے جا ہے۔ سکندر نے بیویوں کی بات کی تھی۔ مقام شکر ہے کہ آپ لوگ ابھی تک اس منصب پر فائز نہیں ہوئیں۔"

میں نے کہا "سبحان اللہ۔ مرزا جی' کیا لاجواب کرنے والا پیدا کیا ہے آپ نے۔ اب اٹھیے ورنہ بندے علی آجائے گا اور اسی جگہ بحث میں الجھے رہیں گے۔"

غالب نے ریسٹورنٹ سے باہر آکے کہا "بندے علی خطرناک آدمی ہے۔ تم نے اسے جانے کیوں دیا؟"

"میں چاہتا تھا کہ وہ ہماری طرف سے مطمئن ہوجائے۔"

"اگر وہ لوٹ کرنہ آیا پھر؟"

"وہ ضرور آئے گا۔ چاہو تو شرط لگالو۔"

ابھی ہم کپڑے خرید ہی رہے تھے کہ بندے علی آگیا اور نے رضاکارانہ طور پر کپڑوں کے انتخاب سے قیمت کے تعین تمام معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ پھر کھانے کے لیے اس ہمیں ایک اور اسپیشل ریسٹورنٹ لے جانے کی پیشکش کی جو دور نہیں تھا۔ اتفاق سے وہی ہماری واپسی کا راستہ بھی تھا۔ پیدل روانہ ہوئے۔ اس طرح کہ چند قدم آگے ہم تین مرد بندے علی کو ہم نے بیچ میں رکھا تھا۔ ہم سے چند قدم پیچھے رابعہ نازو تھیں۔ وہ بھی ہماری نیت کا اندازہ کرچکی تھیں۔

ایک جگہ بندے علی نے کہا "بس یہاں سے دائیں طرف۔۔۔"

میں نے کہا "دائیں طرف نہیں بندے علی۔ بائیں جانب

اس نے حیرانی سے مجھے دیکھا "تمہیں نہیں معلوم۔۔۔"

میں نے سنجیدگی سے کہا "تمہیں بھی نہیں معلوم بندے علی ہم تمہارے ساتھ نہیں جارہے ہیں' تم کو اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں۔ صورت حال کچھ بدل گئی ہے۔ اب تم مہمان ہو اور میزبان ہیں۔"

وہ چور تھا چنانچہ میرے لہجے سے کھٹک گیا "کیا بات ہے؟ لے جارہے ہو تم مجھے؟"

میں نے کہا "آہستہ بات کرو اور خاموشی سے چلتے رہو مجھے اچھی طرح جانتے ہو۔"

"اور اس چیز کو بھی" غالب نے جیب سے ریوالور نکال اسے دکھایا اور پھر جیب میں رکھ لیا۔

"یہ۔۔۔ یہ سب کیا ہے؟" اس نے چلّانا شروع کیا۔

میں نے ایک دم اس کا منہ دبالیا اور پھر اس کی کنپٹی پر ماری۔ وہ ایک جھٹکا لے کر تڑپا اور پھر کٹے ہوئے درخت کی ڈھیر ہوگیا۔

اس فٹ پاتھ پر آگے پیچھے جانے والے رک گئے۔ انہوں نے بندے علی کے چلّانے کی آواز سنی تھی مگر کچھ سمجھ نہیں پائے تھے۔ درمیانی فاصلہ اتنا تھا کہ کسی نے چند سیکنڈ میں مکمل ہوجانے والی کارروائی کو غور سے نہیں دیکھا تھا۔ بندے علی کو فٹ پاتھ پر پڑا دیکھ کر وہ ایک ساتھ بولنے لگے "کیا ہوا؟ کیسے گر گیا؟"

"یہ زندہ ہے کہ مرگیا؟"

ایک خاتون نے اپنے متجسس شوہر کو کھینچ لیا "چلو جی' کیوں بلاوجہ مصیبت میں پڑتے ہو۔"

میں نے جھک کر بیٹھتے ہوئے کہا "کوئی پریشانی کی بات نہیں۔ غالباً دل کا دورہ ہے۔"

"اور یہ پریشانی کی بات نہیں ہے!" ایک بزرگ نے مجھے ڈانٹا۔

"پلیز! آپ میں سے کوئی کچھ کرسکتا ہے تو کرے" میں نے کہا "ہم اسے گھر لے جانا چاہتے ہیں۔"

"گھر کیوں؟ اسپتال لے جاؤ سیدھا۔"

غالب نے کہا "کیسے لے جائیں کندھے پر ڈال کے۔ ارے بھائی' تم کسی گاڑی کو روکو۔"

ایک گاڑی فوراً روک لی گئی۔ کار والا رائے عامہ کے سامنے بے بس ہوگیا۔ میں نے اور غالب نے بندے علی کو گاڑی میں ڈالا اور اس سے پہلے کہ پبلک میں سے کوئی ہمارے ساتھ بیٹھتا' ہم سب گاڑی میں گھس گئے۔

گاڑی والے نے شور مچایا "اے بھائی' یہ کار ہے' بس نہیں کہ سب لد گئے۔ کیا میں اتر جاؤں؟"

غالب نے کہا "نہیں' ہم اتر جاتے ہیں۔ خفا کیوں ہوتے ہو؟"

رابعہ اور غالب نے رضاکارانہ طور پر پیدل مارچ کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اب گاڑی کی اگلی سیٹ پر نازو تھی اور پیچھے میں اپنے بیمار کے ساتھ۔ جب گاڑی روانہ ہوئی تو غالب لوگوں کو مطمئن کررہا تھا کہ معمولی سا دورہ تھا اور ایسے دورے تو انہیں پڑتے رہتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ بعد میں اس نے بندے علی کو اپنا سالا بھی ثابت کردیا ہوگا۔ خود میں نے کار ڈرائیور سے یہی کہا تھا۔ میرے ساتھ نازو تھی اور غالب کے ساتھ رابعہ چنانچہ بات بن گئی۔ کار والے نے ہمیں رام ناتھ کے گھر میں اتارا اور ایسے فرار ہوا جیسے وہ گھر نہیں تھانہ تھا۔

گاڑی کی آواز پر رام ناتھ باہر آیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ پوچھتا' میں نے اسے انگلی کے اشارے سے خاموش کردیا۔

"ایک اور شکار کرلائے" وہ گاڑی کے جاتے ہی بولا "یہ کیا چیز ہے؟"

میں نے کہا "یہ بندے علی ہے۔ اسے بھی وہیں بند کریں گے۔"

"وہ تو مرگیا جسے پہلے بند کرکے گئے تھے۔" رام ناتھ نے بدمزگی سے کہا۔

میں بندے علی کو گھسیٹ کر اندر لے گیا اور قالین پر ڈال دیا۔

"کیا اس نے خودکشی کرلی؟ اچھا کیا۔ ہمارا کام آسان کردیا۔"

نازو نے کہا "خودکشی کیسے کرلی؟"

"اس نے باتھ روم کے بجلی کے تار اکھاڑ لیے۔ چھت سے سوئچ بورڈ تک چھ سات گز تار تھا۔"

"اور اس تار سے خود کو پھانسی دے دی؟"

"نہیں۔ اس نے تو عجب مشکل کام کیا۔ میں تو دیکھ کے حیران رہ گیا۔ اس نے تار بڑی صفائی سے اتارے۔ ایک تار اپنی ٹانگ پر مضبوطی سے باندھا' دوسرا گلے میں۔ اس نے تار کو ایک ایک فٹ تک ننگا کرلیا تھا۔ باتھ روم میں لکڑی کے اسٹول پر بیٹھ کے اس نے دانتوں سے تاروں کو چھیلا ہوگا۔ تانبے کے تار کو اس نے ٹخنے کے اوپر اچھی طرح بل دیے تھے اور گردن کے گرد بھی۔ پھر اس نے ہاتھ سے سوئچ آن کردیا۔"

میں نے کہا "او مائی گاڈ! اس نے خود کو کرنٹ سے ہلاک کیا؟"

"ہاں۔ اس کی بھیانک چیخ سن کے میں تو اچھل پڑا اور ایک دم باتھ روم کی طرف لپکا۔"

"تم اس وقت نیچے تھے؟" نازو بولی۔

"ہاں۔ میں ایک کام سے گیا تھا" وہ بولا "میں نے دروازہ کھول کے دیکھا تو وہ تڑپ رہا تھا اور اینٹھ رہا تھا۔ یہ چند سیکنڈ کی بات ہے۔ پھر وہ مرگیا۔ ہاتھوں پیروں کے جھٹکوں سے تار ٹوٹ گئے مگر کھلے نہیں۔ بجلی کا تو ایک ہی جھٹکا کافی ہوتا ہے۔ اس کے جسم کو آزاد ہونے میں دس پندرہ سیکنڈ تو لگے ہوں گے۔ شاید زیادہ وقت لگا ہو۔"

میں نے نازو کے ہاتھ پر تھپکی دی جو خوف زدہ ہوکے مجھ سے لگی کھڑی تھی "میں دیکھ کے آتا ہوں۔"

"اب دیکھ کے کیا کرو گے؟" نازو نے مجھے روک لیا "پہلے اس کا کچھ کرو۔ یہ ہوش میں آرہا ہے۔"

رابعہ اور غالب کے آنے تک بندے علی اٹھ بیٹھا اور عجب پُروحشت نظروں سے ہم سب کو دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں الجھن ایک سوال بن گئی تھی کہ آخر یہ کیا ہے؟ یہ کیسی دوستی ہے اور کیسی احسان مندی ہے؟ میں نے تو بھلائی کی تھی تمہارے ساتھ۔ پھر میرے ساتھ ایسا سلوک کیوں؟

میں نے کہا "بندے علی! اصل خط نکالو۔"

بندے علی کا چہرہ زرد پڑگیا "وہ۔۔۔ بالکل وہی ہے۔ نقل خود میں نے تیار کی تھی۔ ذرا بھی فرق نہیں دونوں میں۔"

میں نے کہا "ہم تصدیق کریں گے۔"

اس نے نفی میں سرہلایا "ایسا مت کرو۔ میری نوکری خطرے میں پڑجائے گی۔"

میں نے کہا "بندے علی! تم نوکری کی کیا بات کرتے ہو تم نے تو اپنی زندگی کو خطرات کے جہنم میں جھونک دیا تھا۔ جو کچھ تم کرتے رہے تھے وہ کوئی اچھا کام نہیں تھا۔ اس کا انجام ایک دن یہی ہونا تھا۔"

وہ چلّایا "سکندر! میں نے تو تمہیں بچایا' تمہاری مدد کی۔"

میں نے کہا "تم نے غدّاری کی اپنے وطن سے' اپنے پیشے سے اور اپنے ضمیر سے۔"

وہ پھر چلّایا "مگر میں بھی مسلمان ہوں تمہاری طرح۔ دل سے پاکستانی ہوں۔"

میں نے انکار میں سرہلایا "یہی تو غلطی ہے تمہاری۔ مسلمان دنیا کے ہر ملک میں ہیں مگر وہ جہاں بھی ہیں اس ملک کے شہری ہیں اور ان پر لازم ہے کہ وہ اسی ملک کے قانون کے پابند رہیں۔ عہد شکنی اور اعتماد کو دھوکا دینا کسی مذہب کی تعلیم نہیں۔ ظاہر کو باطن سے الگ رکھنا منافقت ہے اور تمہارا مسئلہ صرف اخلاقی یا مذہبی نہیں' قانونی طور پر یہ ایک سنگین جرم تھا۔ نہ ہم اس جرم کی پردہ پوشی کرسکتے ہیں اور نہ تمہارے جرم میں شریک ہوسکتے ہیں۔"

غالب نے کہا "اگر تم جاسوسی کے الزام میں پکڑے جاتے تو کیا سزا ہوتی تمہارے جرم کی؟"

وہ چیخنے لگا "مجھے مت مارو۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔"

میں نے کہا "تم تسلیم کرتے ہو کہ دل سے تم پاکستان کے ساتھ ہو؟"

"ہاں۔ ہاں۔ میں قسم کھا سکتا ہوں۔"

"تو پھر سمجھ لو کہ تم نے پاکستان کی خاطر جان دی۔ ابھی تک تمہارے جرم کا راز فاش نہیں ہوا۔ تم عزت آبرو کے ساتھ جان دے سکتے ہو۔ بعد میں پکڑے جاتے تو کتنی رسوائی ہوتی تمہاری؟ بھارت کے دوسرے مسلمانوں کی وفاداری پر بھی حرف آتا۔ اس کے علاوہ تمہاری جائداد ضبط ہوجاتی۔ جو پیسہ تم نے جاسوسی کرکے کمایا تھا وہ بھی جاتا۔ اب کم سے کم بیوی بچوں کا مستقبل تو محفوظ ہے۔ تم نے ادائے فرض میں جان دی۔ ان کو فیملی پنشن بھی ملے گی۔"

خوف اور صدمے نے اسے مفلوج کردیا تھا۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ اس کی نیکی ہی اس کا جرم بن جائے گی۔ پھر اچانک جیسے اس نے حقیقت کو جان لیا اور پہچان لیا اور تسلیم کرلیا۔ وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہوگیا۔ وہ اب پہلے سے زیادہ مطمئن اور پرسکون تھا۔

اس نے جیب میں سے لفافہ نکال کے مجھے تھمایا "تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں غیروں کے ہاتھوں ذلت کی موت کیوں قبول کروں۔ جب کہ میں آج کفارہ ادا کرسکتا ہوں اور اس اطمینان کے ساتھ مرسکتا ہوں کہ میں نے سکندر بخت کی جان بچانے کے لیے اپنی جان دی۔"

میں نے لفافہ اس کے ہاتھ سے لے لیا "مجھے بہت افسوس ہوگا۔ میں تمہارا شکرگزار ضرور ہوں لیکن تم نے خود رابطہ کرکے ہم سب کی سلامتی کو غیریقینی بنادیا ہے۔ میں کوئی رسک نہیں لے سکتا۔"

رابعہ چلّائی "سکندر..... چھوڑدو۔ جانے دو اسے۔"

غالب نے کہا "بے وقوفی کی بات مت کرو۔ اس کے ساتھ نہ جانے کس کس نے ہمیں دیکھا ہوگا۔ اور یہ مت بھولو کہ بندے علی بھارتی سفیر کا چپراسی ہے۔"

بندے علی کی ذہنی رو ایک دم پلٹ گئی یا شاید اس کی اداکاری کا بھرم کھل گیا۔ وہ ایک دم بھاگا۔ اس کا رخ دروازے کی طرف تھا۔ جب وہ نازو کے پاس سے گزرا تو ایک دم اس کا ہاتھ اوپر اٹھا اور پھر بڑے بھرپور انداز میں بندے علی کی گردن پر لگا۔ بندے علی بند دروازے سے ٹکرا کے گرا۔ کچھ دیر وہیں موت کے کرب میں الٹ پلٹ کے بالآخر وہ ساکت ہوگیا۔

یہ ایک ناخوشگوار مگر ناگزیر تجربہ تھا جس نے وقتی طور پر ہم سب کو ذہنی صدمے سے دوچار کیا۔ پھر میں نے اصل لفافے کو پھاڑ کے وہ خط نکالا جس کی نقل بندے علی نے فراہم کی تھی۔ اس نے غلط نہیں کہا تھا۔ نقل اور اصل میں ایک لفظ کا بھی فرق نہیں تھا۔ میں نے جیب سے لائٹر نکالا اور دونوں خطوط کو جلا کے راکھ پاؤں سے مسل دی۔

رام ناتھ نے کہا "یک نہ شد دو شد۔ تم نے تو مجھے مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ اب کیا کروگے ان لاشوں کا؟"

میں نے کہا "جیسے ایک کو ٹھکانے لگاتے ویسے ہی دوسرے کو بھی لگادیں گے۔ افسوس دونوں کی موت کا رہے گا۔ پہلا ہمیں وہ جگہ بتائے بغیر مرگیا جہاں اس نے میرے دو ہم وطنوں کی بے سر والی لاشوں کو جنگل کے درندوں کی ضیافت کے لیے پھینکا تھا۔ میں اسے بھی وہیں پھینکنا چاہتا تھا۔ دوسرا بہرحال ہمارا محسن تھا۔ ہم محسن کش نہیں ہیں مگر ہم اسے معاف کردیتے تو ہمارا یہ فعل خودکشی کے مترادف ہوتا۔ خودکشی ہمارے نزدیک حرام موت ہے جو ہم قبول نہیں کرسکتے تھے۔"

رام ناتھ نے ہاتھ جوڑ کے کہا "میری سمجھ میں تمہاری باتیں نہ آئی ہیں نہ آئیں گی۔ تم تو بس اتنی کرپا کرو کہ ان مُردوں سے میری جان چھڑا دو۔ پتا نہیں کیا ہونے والا ہے۔ بھگوان نے بھی میرا ہی گھر دیکھ لیا ہے۔"

میں نے کہا "رام ناتھ! ہم بس آج کل کے مہمان ہیں۔"

"مجھے تو لگتا ہے' ایک رات کا مہمان بھی نہیں ہوں میں۔ میرا ہارٹ فیل ہوجائے گا" رام ناتھ بولا اور ماتھے سے پسینہ صاف کرتا ہوا اندر چلا گیا۔

"اتنی سردی میں پسینہ۔ اسے تو سچ ہارٹ اٹیک ہورہا ہے" غالب نے کہا۔

"اس کی جگہ لاہور میں خود کو فرض کرو۔ کوئی مفرور قاتل اور مجرم تمہارے گھر میں بن بلائے مہمان چھوڑ جائے اور وہ مہمان بلائے جان بن جائیں۔ دو بندے تمہارے گھر میں مار کے ڈال دیں تو کیا تم کو ہارٹ اٹیک نہیں ہوگا؟" میں نے کہا۔

"بس اب جلدی سے انہیں ٹھکانے لگادو۔" نازو نے گھبراہٹ میں کہا "زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں۔"

"رام ناتھ کے کمرے کا فرش کھود کے گاڑدیں؟" غالب بولا۔

"وہ اتنا پریشان ہے' کہیں پولیس کو نہ بلالے" رابعہ نے کہا۔

"اچھا تو تم دونوں کیوں فضول مشوروں سے نواز کے ہمیں پریشان کررہی ہو۔ جاکے رام ناتھ کو سنبھالو' اس کا دل بہلاؤ۔"

"سنبھالنے کا مطلب ہے اس پر نظر رکھو" غالب بولا۔

"اچھی نظر رکھوں کہ بری نظر؟" نازو نے کہا۔

رابعہ بولی "اور دل کس حد تک بہلائیں' یہ بھی بتادو۔"

"بڈھا ہے شوقین مزاج" نازو ہنسی۔

غالب نے چٹکی بجائی "سنو! اس نے ہمیں گاڑی پیش کی تھی بازار جانے کے لیے۔ لاشیں ڈھونے کے لیے نہیں دے گا۔ تم دونوں' چشم بددور اس سے سب کچھ منوا سکتی ہو۔"

نازو نے کہا "وہ گرگ باراں دیدہ ہے۔ اسے اُلّو نہیں بنایا جاسکتا۔"

"یار ہمیں کیسے بنالیا تھا۔ وہ بھی مرد ہے آخر اور مرد کا دل سدا جوان رہتا ہے۔ حسین عورت کی مسکراہٹ اور آنسو' دونوں سے پگھل جاتا ہے۔" غالب نے کسی فلسفی کی طرح ارشاد فرمایا۔

اس نے غلط نہیں کہا تھا۔ نازو کچھ دیر بعد نمودار ہوئی جب ہم نیچے والے تہ خانے کے باتھ روم سے ایک اکڑی ہوئی' بھیانک لاش کو اوپر لاکے بندے علی کے ساتھ ڈال چکے تھے۔

غالب نے کہا "ذرا ادھر آؤ۔ یہ نشان کیسا ہے تمہارے گال پر؟"

نازو نے سادگی سے کہا "شاید مچھر نے کاٹا تھا۔"

غالب نے کہا "یہاں اتنی سردی میں مچھر! جھوٹ مت بولو۔"

"اُفوہ۔ پھر ہوگا کوئی جانور....."

"کیسا جانور؟ جوان کہ بوڑھا؟ چوپایہ کہ دو ٹانگوں والا؟"

"میں بتاتی ہوں تمہیں" نازو نے دانت پیس کے کہا مگر میں نے بیچ میں آکے معاملہ وہیں ختم کردیا۔

"اس موضوع پر بعد میں لڑلینا۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ کل شام چار بج کے بیس منٹ پر۔ کیوں نازو؟"

"ٹھیک چار بیس پر۔ بھولنا مت" نازو جاتے جاتے بولی۔

میں اور غالب لاشوں کو ڈکی میں ٹھونس کر نکلے۔ راستوں کا نہ مجھے علم تھا نہ غالب کو۔ اس وقت کسی سے یہ پوچھنا بھی غلط ہوتا کہ کسی ویرانے کا پتا بتادو جہاں ہم دو لاشوں کو پھینک آئیں اور کوئی نہ دیکھے۔ میں اندازے سے ایک ہی سمت میں چلتا رہا۔

غالب نے ایک بار کہا "خیال رکھنا' کوئی سرحد نہ عبور کرجائیں۔"

میں نے کہا "ادھر کون سی سرحد ہوگی؟"

"مجھے کیا معلوم ہم مشرق کی طرف جارہے ہیں یا مغرب کی طرف۔ چین تبت' بھارت یا بنگلہ دیش نہ پہنچ جائیں اچانک" غالب بولا "اور یہ آپ جا کس طرف رہے ہیں آخر؟ واپسی کا راستہ یاد رکھے گا۔"

میں نے کہا "دلی روڈ کسی سے پوچھ لیں گے۔"

پندرہ بیس منٹ بعد ہم ایک پہاڑ کے گرد گھوم کے جانے والی سڑک پر تھے جب میرے کانوں نے کوئی آواز سنی۔

میں نے کہا "یہ کیا تھا؟"

غالب نے کہا "کوئی بھوت دیکھا ہے کیا؟ میرے سسر ہوں گے۔"

"یار ایسی کی تیسی تمہارے سسر کی۔ یہ آواز کیسی تھی؟"

غالب نے کہا "میرے سسر نے کچھ فرمایا ہوگا۔"

میں نے گاڑی روک کے پیچھے دیکھا "مرزا جی! ڈکی کھل گئی ہے۔"

غالب نیچے اتر کے پیچھے گیا اور بوکھلایا ہوا واپس آیا "یار سکندر! غضب ہوگیا۔ ایک مردہ بھاگ گیا۔"

میں نے کہا "کیا بکتے ہو!"

"خدا کی قسم۔ تم خود دیکھ لو۔ ڈکی میں صرف بندے علی ہے۔"

میں نے غالب کی سنجیدگی پر غور کرتے ہوئے پیچھے جاکے دیکھا۔ اس میں واقعی صرف بندے علی پڑا ہوا تھا۔

"میرا خیال ہے لاش پیچھے گرگئی" میں نے کہا۔

"کیسے گرگئی' خود بخود؟"

"ڈکی کا لاک ٹھیک سے بند نہیں ہوا تھا یا ڈھیلا ہوگا۔ ہم نے دو لاشوں کو زبردستی ٹھونسا تھا۔ جب موڑ کاٹا تو لاک کھلنے سے ایک لاش باہر جا پڑی۔"

"واپسی میں وہ ہمیں بیچ سڑک پر راستہ روکے نظر آئے گا" غالب نے کہا۔

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے کھینچ لیا "بھاگ چلو مرزا جی۔ اگر پیچھے سے کوئی گاڑی آگئی تو ہم ہی پکڑے جائیں گے۔ کہ لاش ہم نے نہیں پھینکی تھی تو سڑک پر لاش دیکھ کے رکے کیوں نہیں اور لاش کے اوپر سے کیا کار نے ہائی جمپ لگائی تھی۔"

وہاں سے دو کلومیٹر آگے آنے کے بعد غالب نے کہا "بس استاد جی' بریک لگاؤ۔ یہ جگہ ٹھیک ہے اپنے بندے علی کے لیے۔"

یہاں چاروں طرف بلند پہاڑ تھے جن کی برف پوش سفیدی بھی رات کے اندھیرے کا حصہ بن گئی تھی۔ سائیں سائیں کرتے درختوں کا شور وادی میں ایک ہولناک گونج پیدا کررہا تھا۔ رات کے ساڑھے دس بجے اس ویران سڑک پر ہمارے سوا کوئی نہ تھا۔ دو زندہ انسان اور ایک وہ شخص جو صراط مستقیم سے بھٹکا اور نیکی

کرتے ہوئے مارا گیا۔ معلوم نہیں آگے یہ سڑک کہاں تک جاتی تھی؟ ابھی تک تو ہمیں نہ کوئی آنے والی گاڑی ملی تھی اور نہ جانے والی۔ اس علاقے میں گاڑیاں یوں بھی کم تھیں اور خطرناک پہاڑی راستوں پر کوئی رات کو مجبوراً ہی نکلتا ہوگا۔

اچانک برف پڑنے لگی۔ برف کے ہلکے پھلکے گالے ہر طرف اترنے لگے۔ اس صورت حال نے ہمیں اور زیادہ پریشان کردیا۔ برف باری میں دیکھتے دیکھتے شدت آگئی۔ میں نے اور غالب نے بندے علی کی لاش سڑک کے ایک کنارے پر رکھی اور گاڑی میں بیٹھ کے انجن اسٹارٹ کردیا۔

واپسی کا مرحلہ زیادہ کٹھن ثابت ہوا۔ سڑک پر برف نے پھسلن پیدا کردی تھی۔ ونڈ اسکرین کے سامنے برف کے گالے دھند پیدا کرتے تھے اور اس دھند میں ہیڈ لائٹس کا اجالا بھی ناکافی محسوس ہوتا تھا۔ میں انتہائی محتاط انداز میں اسٹیرنگ کو کنٹرول کررہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میری معمولی سی کوتاہی کے نتیجے میں گاڑی پھسل کے سیکڑوں فٹ گہرے کھڈ میں پہنچ جائے گی۔ صبح نہ ہماری لاشوں کا سراغ ملے گا اور نہ بندے علی کی لاش کا۔ جب دھوپ سے برف کا کفن اترے گا تو بندے علی کی لاش نظر آجائے گی مگر ہم تو یوم حشر سے پہلے رابعہ اور نازو کو نہیں بتا سکیں گے کہ اس رات کیا ہوا تھا۔

برف کی چادر کے نیچے سڑک غائب ہوگئی تھی اور کنارا نظر ہی نہ آتا تھا۔ میں انتہائی بائیں جانب پہاڑ سے لگ کے چلتا رہا۔ کہیں گاڑی اچانک کسی پتھر پر چڑھ جاتی تھی یا باہر نکلی ہوئی چٹان کو چھولیتی تھی تو اسے سنبھالنا مزید مشکل ہوجاتا تھا۔ باہر ہوا رک گئی تھی اور سردی کا اثر بھی کم ہوگیا تھا مگر بند شیشوں سے برف کے گالوں کو دیکھ کر جسم پر کپکپی طاری ہوتی تھی۔ یہ خوف کچھ ماحول کا عطا کردہ تھا اور کچھ ہمارے احساس کی پیداوار تھا۔ غالب کی نظر بھی سڑک پر تھی اور مجھے معلوم تھا کہ اس کی نگاہیں کیا تلاش کررہی ہیں۔

جب ہم پھر شہر کے قریب پہنچے تو غالب نے کہا "یار، وہ لاش تو کہیں نظر نہیں آئی۔ کیا کسی نے اٹھالی؟"

"وہ بڑا تعاون کرنے والا آدمی تھا" میں نے کہا "خود ہی فوت بھی ہوگیا تھا، ہمیں تکلیف نہیں دی۔ خود ہی باہر گر گیا۔"

"گر کے کہاں گیا؟ کیا بھوت بن کے جنگل میں غائب ہوگیا؟"

"میرا خیال ہے کہ لاش جب باہر گری تو گاڑی حرکت میں تھی اور نیوٹن کے قوانین حرکت کے مطابق، لاش گر کے بھی حرکت میں رہی۔ نتیجہ یہ کہ کنارے سے نیچے لڑھک گئی۔"

"ثابت کرو کہ ایسا ہی ہوا تھا۔"

"تم ثابت کرو کہ ایسا نہیں ہوا تھا" میں نے کہا۔

"پھر تو ایک مفروضہ میں بھی پیش کرسکتا ہوں۔ ہوا یہ ہوگا برادر بزرگ۔ کہ اس ویرانے میں کہیں کوئی بھوتوں کا ڈیرا تھا جہاں سے ہم بے خوف و خطر گزر آئے۔ وہاں کسی بھوت نے مردوں کو ورغلایا کہ وہ ان کی قوم میں شامل ہوجائیں۔ ایک مردہ قائل ہوگیا، ایک نہیں ہوا۔ جسے یہ تجویز پسند آئی تھی وہ فی الفور نو بھوت بن کے غائب ہوگیا۔"

"نو بھوت؟" میں نے ہنس کے کہا۔

"یار، نو مسلم ہوتا ہے کہ نہیں۔ نوزائیدہ بھی ہوتا ہے۔ پھر نو بھوت کیوں نہیں ہوسکتا۔ جو نیا نیا بھوت بنا ہو" غالب نے کہا۔

"یہ تو کمال ہوگیا" میں نے کہا "میں راستہ یاد رکھنے میں کامیاب رہا۔ جواب نہیں میری قوت مشاہدہ کا اور یادداشت کا۔"

"دراصل میری چھٹی حس تمہاری راہنمائی کررہی تھی" غالب بولا۔

"افسوس اور شرم کی بات ہے کہ اس نے خود تمہیں ہمیشہ گمراہ کیا" میں نے کہا۔

برف باری اس وقت عروج پر تھی جب ہم نے گاڑی کو ویران کوٹھی میں کھڑا کیا۔ اس کے بند دروازوں اور کھڑکیوں کے پیچھے اندھیرا محسوس ہوتا تھا مگر گاڑی کا دروازہ بند ہوا تو ایک کھڑکی کا پردہ تھوڑا سا ہٹ گیا اور مجھے دھندلے شیشوں کے پیچھے انسانی سایہ نظر آیا۔ یہ غالباً رابعہ اور نازو میں سے کوئی تھا۔

رام ناتھ نے اپنی پریشانی میں ان کو زیادہ پریشان کیا تھا۔ اسے اپنی عقل اور جذباتی طبیعت پر طیش آرہا تھا کہ نتائج کی پروا کیے بغیر اس نے لڑکیوں کی بات مان لی اور گاڑی ہمارے حوالے کردی۔ اب اسے یقین آچکا تھا کہ ہمارے خیروعافیت کے ساتھ لوٹ آنے کی امید رکھنا بھی۔ خیال است و محال است و جنوں۔ اس نے برف باری میں انتقال پرملال کے سارے مناظر بڑی تفصیل سے بیان کیے تھے اور اپنی یاس آمیز بے بسی میں رابعہ اور نازو کو بھی مشورہ دے چکا تھا کہ ہماری مغفرت کے لیے کوئی دعا یاد ہے تو کریں۔ ہماری سلامتی کے ساتھ واپسی کے امکانات تو معدوم ہوچکے۔

ایسے میں ہماری تشریف آوری نے سب کو خوشی اور طمانیت عطا کی۔ رابعہ اور نازو کے اترے ہوئے چہرے کھل اٹھے۔

رام ناتھ نے کہا "دیکھا، میں نہ کہتا تھا کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ وہ کوئی بچے تو نہیں ہیں۔"

نازو نے اسے خون آشام نظروں سے گھورا "رام ناتھ جی! میرا منہ مت کھلوائیے۔ آپ نے تو انہیں پہنچادیا تھا دوسرے جہان میں۔"

"خواہ مخواہ ہمیں دہشت زدہ کررہے تھے کہ اب وہ لوٹ کر نہیں آنے والے، ان پر فاتحہ پڑھ لیں" رابعہ نے بھی کہا۔

"وہ..... دراصل پریشانی میں فضول خیالات پریشان تو کرتے ہی ہیں۔ خیر، تم بتاؤ سب ٹھیک ہوگیا نا؟"

میں نے رونی شکل بنا کے کہا "سب چوپٹ ہوگیا رام ناتھ۔"

غالب بھی دھڑام سے کرسی پر گر گیا "جلدی میں کام خراب کیا۔"

رام ناتھ نے سینے پر ہاتھ رکھا "میرا ہارٹ فیل ہوجائے گا۔ جلدی سے بتاؤ کیا کر آئے ہو۔"

"ہم نے کچھ نہیں کیا۔ بس تقدیر ہی خراب تھی" میں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا "عین وقت پر نہ جانے کہاں سے پولیس نمودار ہوگئی۔"

"پولیس!" رام ناتھ کے حلق سے ایک کراہ نکلی۔

"اصلی پولیس۔ ایک جیپ میں آگئی" غالب نے تقریباً رو کے کہا "میں ایک لاش پھینک چکا تھا سڑک پر۔"

"سڑک پر!" وہ اچھلا "تم سڑک پر لاش پھینک رہے تھے؟ تمہارا دماغ خراب ہے!"

"بس جی، ہم نے سوچا دور کیوں جائیں۔ سڑک خالی پڑی تھی۔ وہ خبیث پولیس والے تو جیسے آسمان سے ٹپک پڑے۔ میں جلدی سے گاڑی میں بیٹھ گیا اور ہم بھاگے لیکن وہ بھوت کی طرح پیچھے لگ گئے" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "مگر ہم بھی چھلاوہ ثابت ہوئے۔ ایسا چکر دیا انہیں کہ وہ نہ جانے کہاں رہ گئے۔ خوب ریس ہوئی۔"

رام ناتھ کی آنکھیں حلقوں سے باہر آنے لگیں "نمبر تو دیکھ ہی لیا ہوگا انہوں نے میری گاڑی کا۔"

میں نے مجرم نظروں سے غالب کی طرف دیکھ کے سر ہلایا "شاید دیکھ لیا ہو۔ کئی بار وہ قریب آگئے تو ہم ایک دم مڑ گئے یا ان کو سائڈ دے کر نکل گئے۔"

غالب نے احمقوں کی طرح کہا "خوب ڈزاڈز ہوئی۔"

رام ناتھ جہاں کھڑا تھا وہیں بیٹھ گیا "ہے رام۔ تم نے گولیاں چلائیں پولیس پر؟"

"اور کیا کرتے ہم؟ وہ بھی کوئی پھول نہیں پھینک رہے تھے ہماری طرف" میں نے کہا "بلکہ سچ تو یہ ہے کہ پہلا فائر ان کی طرف سے ہوا تھا۔ ہم کیا جواب نہ دیتے؟"

رام ناتھ کی آواز بند ہوگئی۔ رابعہ اور نازو سمجھ چکی تھیں کہ ہم اداکاری کررہے ہیں اور یہ سب جھوٹ ہے مگر وہ ہمارا ساتھ دے رہی تھیں۔ رام ناتھ نے بھی ان کو کم دہشت زدہ نہیں کیا تھا۔

"ارے..... کوئی..... قتل تو نہیں کردیا؟" رام ناتھ نے بڑی مشکل سے حلق میں پھنس جانے والی آواز نکالی۔

"ایک..... چیخ تو سنی تھی..... اب پتا نہیں....."

"دراصل ہم کو فکر تھی دوسری لاش کی۔ اسے ٹھکانے لگانے کا موقع ہی نہیں ملا" غالب بولا۔

رابعہ نے کہا "کیا..... تم اسے واپس لے آئے؟"

"اور کیا پولیس کو دے آتے تحفے میں؟"

"اب کہاں ہے لاش؟" نازو نے تشویش سے پوچھا۔

"وہیں رکھی ہے ڈکی میں" غالب بولا۔

رام ناتھ ایک دم باہر دوڑا "لاش میری گاڑی میں! تمہارا ستیاناس ہو۔ مجھے پھانسی لگواؤ گے۔ میں ابھی بلاتا ہوں پولیس کو۔"

اس کے جاتے ہی میں نے اور غالب نے ہنسنا شروع کیا تو رام ناتھ کے واپس آنے تک ہنسی پر قابو پانا مشکل ہوگیا۔ اس کی حالت واپسی پر زیادہ غیر ہوچکی تھی کیونکہ ڈکی میں اسے کوئی لاش نہیں ملی تھی۔ اس نے ہمیں ہنستا دیکھا تو بگڑ گیا۔

"یہ مذاق کررہے تھے تم... میرے ساتھ.... تمہیں اندازہ ہے کہ میں دل کا مریض ہوں۔ میرا ہارٹ فیل ہوجاتا پھر؟"

نازو نے کہا "حساب برابر ہوگیا رام ناتھ جی۔ تم نے بھی بہت ڈرایا تھا ہمیں۔"

رام ناتھ کرسی پر بیٹھ کے پسینہ صاف کرنے لگا "ایسا نہیں کرنا چاہیے کسی بوڑھے، بیمار شخص کے ساتھ۔ یہ بہت جان لیوا مذاق تھا۔"

میں نے اور غالب نے معافی مانگ کے اسے بڑی مشکل سے منایا۔ کلیم اب ٹھیک تھا اور کھانا کھا کے سوگیا تھا۔ ہماری عدم موجودگی میں کاجل نے کھانا تیار کرلیا تھا۔ ہم تو صرف گرم کپڑے لینے گئے تھے۔ اسے کیا معلوم تھا کہ باہر تقدیر کیا گل کھلانے والی ہے۔

رام ناتھ بھی کھانا کھا کے سوگیا تو ایک کمرے میں ہم سب نے قالین پر بستر بچھائے۔ رابعہ اور نازو چائے بنانے چلی گئیں۔

کاجل نے کہا "میں ادھر سونے جارہی ہوں۔ کلیم کے ساتھ۔"

میں نے کہا "چلی جانا، ابھی بیٹھو۔ تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔"

وہ بیٹھ گئی۔ کمرے میں فین ہیٹر چل رہا تھا اور باہر برف گر رہی تھی۔ کھڑکیوں کے بھاری پردوں اور شیشوں کے پیچھے ہمالہ کی سرد ترین رات میں درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے کافی نیچے تھا مگر کمرے میں بڑی راحت بخش اور آسودگی دینے والی حرارت تھی۔

میں نے کہا "کاجل! تم اور کلیم ہوائی جہاز سے نکل جاؤ۔ دو ٹکٹ ہیں ہمارے پاس۔"

کاجل نے انکار کردیا۔ "مجھے ڈر لگتا ہے۔ تم نے جھوٹ بولا تھا اس کے بارے میں کہ وہ چلا گیا۔ وہ نیچے قید تھا۔"

"اب اس سے کیا ڈرنا۔ وہ کچھ نہیں بگاڑ سکتا ہمارا۔ تم کراچی پہنچ کے ہماری واپسی کا انتظار کرو۔" میں نے کہا۔

"میں نہیں جاؤں گی۔ تم میں سے کوئی جائے۔ رابعہ اور نازو کو بھیج دو۔"

"کاجل! وہ نہیں جائیں گی" میں نے کہا۔

"پھر میں کیوں جاؤں؟"

"اس لیے کہ تمہارے ساتھ کلیم ہے۔ وہ ایک امانت ہے

جس کا خیریت کے ساتھ اپنی منزل تک پہنچنا ضروری ہے اور یہ ذمے داری ہم سب کی ہے لیکن وہ تمہارے علاوہ کسی کے ساتھ نہیں جائے گا' یہ تمہیں بھی معلوم ہے۔"

رابعہ ایک ہاتھ میں تھرماس اٹھائے اندر آئی۔ اس کے پیچھے نازو نے ٹرے میں مگ اٹھا رکھے تھے۔ میں دلائل سے کاجل کو قائل کررہا تھا کہ اس کا ہوائی جہاز سے جانا سب کے مفاد میں ہے۔

"ہم بھی موقع ملتے ہی نکل آئیں گے۔ ابھی دو ٹکٹ ہیں' انہیں ضائع نہیں ہونا چاہیے۔"

"مگر.... کراچی میں تو مجھے کوئی نہیں جانتا۔"

میں نے کہا "کراچی میں نازو کا بھائی ہے' اکرام شیخ۔ وہ ہم سب کی واپسی کی راہ دیکھ رہا ہے۔ ہمارے پاس اس کو اطلاع دینے کا ذریعہ کوئی نہیں ورنہ وہ تم کو ائرپورٹ سے اپنی ٹیکسی میں لے جاتا۔"

"وہ ٹیکسی چلاتے ہیں؟" کاجل نے کہا۔

"ہاں۔ میری طرح میرا بھائی بھی پاگل ہے" نازو بولی "اچھی بھلی پولیس کی نوکری تھی۔ نوکری کیا تھی بادشاہت تھی۔ اب تک تو انسپکٹر ہوکے کسی تھانے کا انچارج ہوتا مگر لات ماردی نوکری کو۔"

کاجل مزید حیران ہوئی "وہ کیوں؟"

"یہ بھی تو بغیر وجہ کے دولتی جھاڑتی ہے" غالب بولا۔

"تم خود گدھے" نازو نے برا مانے بغیر کہا۔ "وہ اس وقت اپنے بھائی کی بات کررہی تھی اور جذباتی ہورہی تھی "بہت بڑا آدمی ہے میرا بھائی کاجل۔ جو کچھ پولیس والے کرتے ہیں' وہ نہیں کرسکتا تھا۔ اور دوسرے اس کی ایمانداری اور فرض شناسی سے پریشان تھے۔ اس نے بہت مقابلہ کیا مگر اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا۔"

غالب نے کہا "چنانچہ شیخ صاحب اب بھاڑ جھونک رہے ہیں کراچی میں۔"

میں نے کہا "تمہیں اس کو تلاش کرنا پڑے گا لیکن یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ اس کی ٹیکسی کا نمبر یاد رکھنا۔ دوسرے ٹیکسی والے خود ہی بتادیں گے کہ وہ کس وقت کہاں مل سکتا ہے۔ ممکن ہے کوئی اس کا پتا ٹھکانا بھی بتادے۔ پھر وہاں گل اور محسن بھی ہوں گے۔"

"اور اگر وہ نہ ملے؟" کاجل نے کہا۔

"تو کوئی بات نہیں۔ کراچی شہر ہے' جنگل نہیں' کسی ہوٹل میں ٹھہر جانا یا ٹکٹ لے کر ٹرین میں بیٹھ جانا۔ لاہور میں منظر تمہیں ریسیو کرلے گا۔"

تھوڑی سی ردّوکد کے بعد وہ مان گئی۔ ہم نے اسے زیادہ تفصیل سے ایس آئی شیخ اور عبدالودود منظر کے بارے میں بتایا۔ ماضی کے جھروکوں سے جھانکنا اور عمرِ رفتہ کو آواز دینا ایک ایسا دلچسپ تجربہ تھا کہ ہم سب پرانی باتوں میں اور یادوں میں کھو گئے۔ بہت سی باتیں کاجل کو معلوم نہ تھیں۔ اس کے ساتھ ہم بھی ... رہے۔ کچھ یادیں رلانے والی تھیں جنھوں نے ہمیں اداس کرد... میں نے اپنے والد مرحوم وزیر خاں کو یاد کیا جن کے لہو کا قرض ... باقی تھا۔ وہ وقت یاد کرکے میرا دل پھر دکھی ہوا جب میں بے فکر... سے لندن میں تعلیم حاصل کررہا تھا اور دیارِ فرنگ کی رنگینیِ ... وسحر میں ایسا محو تھا کہ مجھے وطن میں اپنے تنہا والد کے سا... چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کے ظلم و ستم اور دغابازی کی خبر تک ... ہوئی۔ لاکھوں کا مالک صنعت کار اپنا سب کچھ گنوا بیٹھا مگر اس ... مجھے کچھ پتا نہ چلنے دیا۔ وہ پیسے پیسے کا محتاج ہوکے سرکاری اسپتا... کی بے اثر دوائیں لاتا رہا' اپنے ہی ایک نمک حرام ملازم کے ... میں کام کرنے پر مجبور ہوا اور کسمپرسی کے عالم میں مرگیا۔ ا... کے قاتل چوہدری دلاور اور استاد پیڈرو تھے۔ ایک نے انہیں ا... راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کیا تھا اور دوسرے نے اس فیصلے پر ع... درآمد کیا تھا۔ وزیر خاں کی ہڈیاں تک پوسٹ مارٹم سے پہلے قبر ک... کے نکال لی گئی تھیں اور اب مجھے فرصت ملی تھی کہ میں ظالموں ... ہر ظلم کا حساب لے سکوں۔ انہوں نے تو بہت چاہا تھا کہ مجھے خ... لیں اور جب اس میں ناکامی ہوئی تو انہوں نے قانون کو خرید لیا تھ... قانون کے محافظ بھی میرے دشمن ہوگئے تھے۔ مجھے رابعہ جیـ... وکیل اور رفیقِ سفر نہ ملتی تو میرا انجام تختۂ دار پر ہوتا۔ خود رابعہ ... میرا ساتھ دینے کی بڑی سخت سزا پائی تھی۔ اس کی ماں کو اپنا... میں ماردیا گیا تھا اور اس کے گھر کو خاکستر کردیا گیا تھا۔ بہت ... مہربان چہرے تھے جو ماضی کی گرد میں گم ہوگئے تھے۔ محسن کی ما... کے بعد اس کے والد شیروانی صاحب بھی دنیا سے رخصت ہو... تھے۔ ایس ایس پی ضامن رضوی۔ وہ باضمیر اور باہمت' فر... سیرت اور صاحب بصیرت انسان جس نے قانون کی بالادستی کو' ا... حق پرستی کے اصولوں کو' ایمانداری سے رزق حلال کمانے ... جدوجہد کو نامساعد حالات کی انتہا تک جاری رکھا اور ہمیں ا... وقت میں تحفظ اور شفقت کا سایہ فراہم کیا جب ہر طرف ... سفاک شکاری ہمیں محصور کرچکے تھے۔ ان سب کے ساتھ ... استاد ٹیڈی یاد آیا اور شہلا یاد آئی۔ ان سب کے قاتل کون تھے ... بھی میں جانتا تھا لیکن گردشِ حالات نے مجھے اسیر کرلیا تھا ا... دوسرے زیادہ اہم مسائل میں الجھادیا تھا۔ میں مجبور ہوگیا تھا ... اپنے ذاتی انتقام کے معاملات کو التوا میں ڈال دوں۔ آج پھر زند... مجھے پرانی ڈگر پر لے آئی تھی تو پرانے درد بھی جاگ اٹھے تھے۔

رات کے آخری پہر سب کے بعد میں بھی خود کو نیند ... پرسکون وادی میں دھکیلنے میں کامیاب ہوگیا مگر یہ نیند بے سکون ... اور لاشعور کے مدفن سے وہ سب یادیں نکل کے خواب میں ڈ... گئیں جن سے کہیں مفر نہ تھا۔ اس شہر بے نشان میں ہر قدم پر ... مصلوب لمحے کی تاریخ وفات درج تھی اور میری کتاب زندگی ... اوراق پریشاں تھے۔ ویران گلیوں میں بند دروازوں کے پیچھے یادیں پکارتی تھیں کہ آؤ اور ہمیں اس قید تنہائی سے نکالو۔

صبح میں نے رابعہ کو دیکھا' وہ دبے پاؤں باہر جارہی تھی۔ میں اس کے پیچھے چل پڑا۔ وہ کچن کی طرف جارہی تھی۔ قدموں کی آہٹ پر اس نے پلٹ کے دیکھا اور مسکرائی "رات بھر سو نہیں سکے نا؟"

میں نے اقرار میں سرہلایا "ہم اپنے ماضی کے اتنے قریب آگئے ہیں کہ مستقبل بھی کل کی بات لگتا ہے۔"

اس نے کچن میں بجلی کی کیتلی کا پلگ لگایا "چائے پیو گے یا کافی؟"

میں ایک اسٹول پر بیٹھ گیا "کل جب ہمارا گھر آباد ہوگا تو کیا ہر روز تم مجھ سے پوچھا کروگی؟ آج کیا پکاؤں جی' چائے میں چینی کتنی ڈالوں؟ گرے سوٹ کے ساتھ کون سی ٹائی میچ کرے گی۔ یہ سب تمہیں معلوم ہونے چاہیے پہلے سے۔ میرا موڈ' میری پسند اور عادات۔"

وہ منہ دوسری طرف کیے ہنستی رہی اور کچھ شرماتی بھی رہی۔

"تمہارا موڈ اور تمہاری عادتیں ایک سی رہنے والی چیزیں ہیں؟"

"یہ تو ٹھیک ہے عزیزہ۔ موڈ بھی خراب ہوجاتا ہے اور عادتیں بھی بگڑجاتی ہیں مگر یہ آرٹ تو سب اچھی بیویاں جانتی ہیں کہ انہیں ٹھیک کیسے کیا جائے۔"

غالب نے دیوار کے پیچھے سے سر نکال کے کہا "جیسے سب اچھے شوہر جانتے ہیں کہ بیویوں کا دماغ کیسے درست کیا جائے۔"

"آگیا نا شیطان جنت میں خلل اندازی کے لیے" میں نے کہا۔

"یار مجھے کافی کی خوشبو نے بتادیا کہ کہیں معاملہ گڑبڑ ہے۔"

"گڑبڑ تمہارے واہیات دماغ میں ہے" میں نے کہا۔

"اچھا۔ چوری اور سینہ زوری" غالب نے مجھے ڈانٹا "دیدوں کا پانی ڈھل گیا ہے۔ سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کے کچن میں چھپے ہوئے تھے دونوں۔ اور یہ باتیں کس قسم کی ہورہی تھیں؟ میں ظالم سماج بن کے بیچ میں آگیا نا تو سب دھرا رہ جائے گا۔"

میں نے کہا "ظالم سماج کا تو ہم حشر نشر کردیں گے۔"

غالب نے کہا "بی بی رابعہ! تمہارے بھلے کی ایک بات کہتے ہیں ہم تو۔ ابھی سے اتنا سر مت چڑھاؤ اسے۔ کیسا موڈ اور کیسی پسند۔ بس ٹنڈے پکائے اور دھردیے سامنے۔ کھاتے ہو تو کھاؤ ورنہ بھاڑ میں جاؤ۔"

میں نے کہا "قانون میں ایسی کوئی دفعہ نہیں جس کے تحت کسی بھی شوہر یا تم جیسے جورو کے غلام کو ٹنڈے کھانے پر مجبور کیا جاسکے" میں نے کہا۔

غالب نے سوچ کے کہا "وکیل صاحب! کیا واقعی قانون میں ایسی دفعہ نہیں ہے؟"

رابعہ ہنسی "ہوگی تو میں نازو کو بتادوں گی' تمہیں کیوں بتاؤں۔ لو کافی پی لو۔ ابھی سے متفکر ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"متفکر میں کسی اور وجہ سے ہوں" غالب نے کافی کا مگ پکڑ کے کہا "اللہ شاد آباد رکھے۔ دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو۔"

میں نے کہا "یہ وجہ ہے آپ کے متفکر ہونے کی؟"

رابعہ نے کہا "یہ ہر صبح کا آغاز اپنے لیے ایسی ہی دعا سے کرتے ہیں نا۔"

غالب بولا "یار' بندے علی نے تو ساری اسکیم فیل کردی۔ اب ہم نہ پاکستانی سفارت خانے جاسکتے ہیں اور نہ بھارتی۔ جیسے اس نے پہچان لیا تھا ایسے ہی کوئی اور بھی پہچان سکتا ہے۔"

"اسی بات سے دوسرا نکتہ پیدا ہوتا ہے۔ بندے علی نے ایک پیغام تو غتربود کردیا تھا مگر اس کی کیا ضمانت ہے کہ بعد میں کوئی اور مراسلہ نہیں بھیجا گیا ہوگا۔"

غالب نے کہا "یہ کیپٹن حمید نے کاغذی کارروائی کی تھی' خود کو محفوظ رکھنے کے لیے مگر اسے ہمارا خیال بھی ہوگا۔ وہ اس سے زیادہ مستعدی کا مظاہرہ نہیں کرے گا لیکن تمہاری بات میں خاصا وزن ہے' ہم کو محتاط رہنا چاہیے۔"

رابعہ نے کہا "اور سفارت خانے کے چکر میں بھی نہیں پڑنا چاہیے۔"

میں نے کہا "اور رام ناتھ کی پیشکش کو قبول کرلینا چاہیے۔"

"وہ ایک لاکھ کی بات کررہا تھا۔ وہ پائلٹ جو ہمیں ہیلی کاپٹر میں اسمگل کرکے پاکستان پہنچا سکتا ہے' ایک لاکھ مانگتا ہے۔"

میں نے کہا "رام ناتھ ایک لاکھ کے زیورات لینے کے بعد اخلاقی طور پر اس کو معاوضہ ادا کرنے کا پابند ہے۔"

"اس نے کب انکار کیا ہے۔ اس سے آج کہہ دیں گے کہ وہ جلد ازجلد ہماری روانگی کا انتظام کردے۔ اس پائلٹ سے بات کرے۔ وہ بھی موقع تلاش کرے گا۔"

اندر ٹیلی فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔ رام ناتھ نے باہر آکے کہا "ارے کوئی ہے؟ کیا کررہے ہو سب کے سب کچن میں؟"

میں نے کہا "آؤ کافی پیو۔"

اس نے برا سا منہ بنایا "صبح صبح کافی! دیکھو کس کا فون ہے۔"

میں نے حیرانی سے کہا "فون! ہمارے لیے؟"

"ہاں' ہاں۔ تمہیں ہی پوچھ رہا ہے۔ عجیب الٹی کھوپڑی کا آدمی ہے۔ میں نے کہا کہ نام بتاؤ' کس سے بات کرنا چاہتے ہو تو بولا کہ کسی سے بھی کرادو۔ یہ جو تمہارے گھر میں مہمان ٹھہرے ہوئے ہیں نا' ان میں سے کسی کو بھی بلادو۔ میں نے کہا کہ تم کون ہو تو کہنے لگا کہ میں ان سب کا کزن ہوں۔ پتا نہیں مذاق ہے یا مصیبت۔ آخر میرا نمبر کیوں دیا تھا تم نے کسی کو؟ ایسا کون ہے جو......"

میں نے کہا "خفا کیوں ہوتے ہو۔ ہم کسی کو تمہارا فون نمبر کیسے دے سکتے ہیں۔ نہ ہمیں یہ معلوم تھا کہ تقدیر کہاں پہنچائے گی۔ اور

فون نمبر تو اب بھی کسی کو پتا نہیں۔" میں نے کہا۔

"اچھا اچھا۔ جاؤ پہلے اس سے بات کرو" رام ناتھ بولا "اور لڑکی! ذرا دینا کافی۔ دیکھوں تم کیسی بناتی ہو۔ یہ جو میرا رسوئیا ہے نا' یہ تو باپ ہے میرا۔ اپنی مرضی سے مجھے کچھ نہیں کرنے دیتا۔ کہتا ہے صبح صبح کافی پینا پاپ ہے۔ پاپ کی اولاد۔"

میں نے کمرے میں جا کے ایک طرف رکھا ہوا ریسیور اٹھایا اور آواز بدل کے کہا "ہیلو!"

"وعلیکم ہیلو۔ تم کون ہو؟" آواز غالباً اس نے بھی بدلی تھی لیکن مجھے شک ہوا کہ وہ کیپٹن حمید ہے۔

"یہ پہلے تم کو بتانا چاہیے۔ فون تم نے کیا ہے۔"

"فون پر ٹاس تو ہو نہیں سکتا۔ اب کیا کریں' فیصلہ کیسے ہو گا کہ کسے نام پہلے بتانا چاہیے؟"

"جس کے نام کا پہلا حرف پہلے آتا ہو' حروف تہجی کی ترتیب میں۔ وہی پہل کرے۔"

"اچھا سکندر بخت۔"

"گڈ مارننگ کیپٹن حمید" میں نے کہا۔ پھر ہم دونوں ہنسنے لگے۔

"ثابت ہوا کہ ہم ایک دوسرے کو دھوکا نہیں دے سکتے" وہ بولا۔

میں نے کہا "تم نے ہمارا سراغ کیسے لگا لیا؟"

"میرا تعلق فیلڈ انٹیلی جنس یونٹ سے ہے۔ ذہین میں پیدائشی طور پر ہوں" حمید بولا "بندے علی ملا تم سے؟"

"بندے علی!" میری آواز مشکل سے نکلی "ہاں..... مگر....."

"شکر ہے" حمید بولا "پیغام مل گیا تمہیں؟"

"وہ..... تم نے..... میرا مطلب ہے کہ تم یہ بات جانتے تھے پہلے سے..... کہ حمید....."

"ہاں۔ میں نے ڈی آر کو ہدایت کی تھی کہ پیغام اسی کے حوالے کرے اور باقی بات زبانی کہلوا دی تھی۔"

"یہ ڈی آر کیا ہوتا ہے؟"

"ڈسپیچ رائڈر۔ عام زبان میں شہسوار قاصد۔ موٹر سائیکل پر ڈاک لے جاتا ہے۔" وہ بولا "بندے علی نے رسید پر سرکاری مہر لگا دی۔ رسید مجھ تک پہنچ گئی۔ میری پوزیشن محفوظ ہو گئی۔"

"اس کو معلوم تھا کہ ہم کہاں ہیں؟"

"نہیں۔ اس نے معلوم کیا اور پھر مجھے اطلاع دی۔ تم ابھی تک نیپال میں کیوں بیٹھے ہو؟ تمہیں تو فوراً نکل جانا چاہیے ورنہ حمید اس پیغام کو کب تک روکے گا۔ آج سفیر کو مل جائے گا۔"

میں نے بے خیالی میں کہا "مشکل ہے۔"

"کیا مشکل ہے؟ بندے علی نے نقل تمہیں بنا دی مگر اصل کو وہ کیسے غائب کر سکتا ہے۔ میں لمبی بات نہیں کر سکتا۔"

میں نے کہا "او کے۔ تھینک یو حمید۔ ہم آج ضرور نکل جائیں گے۔ تم نے جو کچھ ہمارے لیے کیا....."

لائن اچانک کٹ گئی۔ میں نے بوجھل دل کے ساتھ ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔ خدا نے میری مشکل آسان کی ورنہ میں کیپٹن حمید کو کیسے بتاتا کہ ہم نے اپنے اس محسن کو شکوک اور خوف کی بھینٹ چڑھا دیا ہے۔ ہم نے اپنے اندیشوں سے نجات پانے کے لیے اس پر غداری کا الزام عائد کیا اور اپنے فلسفہ اخلاق پر لیکچر دے کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس کی لاش بہت دور سڑک کے کنارے برف کا سفید کفن اوڑھے چپ چاپ لیٹی ہے۔

میں کچھ دیر انتظار کرتا رہا اور خوف زدہ نظروں سے ٹیلی فون کے آلے کو دیکھتا رہا کہ شاید حمید پھر لائن ملائے گا گھنٹی پھر بجے گی اور حمید مجھ سے پوچھے گا کہ تم نے بندے علی کو انعام بھی دیا کہ نہیں۔ جو انعام اسے ملا تھا وہ اب میرے احساس کی خلش اور ضمیر پر بار گناہ بن گیا تھا۔

لائن دوبارہ نہیں ملی یا حمید نے مطمئن ہو جانے کے بعد پھر گفتگو کا سلسلہ بحال کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ اب پچھتانے سے کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ بندے علی اگر مجرم تھا تو ہمیں اس کا معاملہ خدا یا قانون کے سپرد کر دینا چاہیے تھا۔ اس کے قول و فعل کے اور سزا و جزا کے ٹھیکے دار ہم تو نہیں تھے۔ ہم نے تو محض افشائے راز کے خوف سے اس کے وجود کو ختم کر دیا۔

میں نے فیصلہ کیا کہ اس پشیمانی کے عذاب میں کسی اور کو شریک نہ کروں۔ جو ہونا تھا ہو گیا تھا۔ اب اپنے ساتھ سب کو احساس جرم میں مبتلا کرنے سے کچھ حاصل نہ تھا۔

مجھے دیکھتے ہی غالب نے کہا "حمید کا فون تھا؟ اسے کیسے معلوم ہو گیا....."

میں نے کہا "اس کے اپنے وسائل ہیں۔ تم باہر سب سن رہے تھے؟"

"ہاں۔ کیا کہہ رہا تھا؟" رابعہ بولی۔

"پوچھ رہا تھا کہ گئے کیوں نہیں ابھی تک؟"

"رام ناتھ نے کہا ہے کہ وہ آج اس پائلٹ سے بات کرلے گا اور اس سے کہے گا کہ آج رات ہی ہمیں نکال لے جائے۔ مگر ظاہر ہے یہ سب اس کے اختیار کی بات نہیں" غالب بولا۔

رام ناتھ کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ وہ بستر میں لیٹا کھانستا رہا اور ہم بے چینی سے اس شخص کا انتظار کرتے رہے جو ہمارا نجات دہندہ بن کے پہنچنے والا تھا۔ رام ناتھ نے بڑا امید افزا بیان دیا تھا کہ پائلٹ صورت حال کا جائزہ لے کر بتائے گا مگر ایک لاکھ کی رقم اتنی بڑی ہے کہ وہ یہ موقع ہاتھ سے نہیں جانے دے گا۔ وہ کوئی نہ کوئی طریقہ خود ایجاد کر لے گا۔ چور ارادہ کرے تو چوری کے دس راستے تلاش کر لیتا ہے۔

میں نے کہا "آخر یہ پائلٹ ہے کون؟"

"ابھی آئے گا تو دیکھ لینا۔ کوئی کہتا ہے شاہ کے سالے کا سالا ہے یا دوست ہے۔ کوئی تعلق ضرور ہے اس کا شاہ سے۔ پہلے

...ن ائرلائن میں تھا۔ وہاں سے بھی اسی لیے نکالا گیا تھا کہ ...نگ کرتا تھا۔ اکیلا آدمی ہے اس لیے ڈرتا نہیں۔"

"اکیلا آدمی یہ سب کیوں کرتا ہے؟ اس کی ضروریات تو محدود ...ں گی۔"

رام ناتھ طنز سے مسکرایا "ضروریات محدود ہوتی ہیں شریف ...ی کی۔ اور شادی کے بعد تو وہ ہو جاتا ہے ذمے داریوں کا بوجھ ...نے والا گدھا جسے کوئی گھاس نہیں ڈالتا۔ سوائے اس کی گھر ...ے کے۔ جو وہ پکا کے سامنے رکھ دے' سر جھکا کے کھا لیتا ہے' جیسا ...ر ہو پہن لیتا ہے اور اپنے کیے کو بھگوان کی مرضی سمجھ کے قبول ...تا ہے۔"

مجھے اور غالب کو بے اختیار ہنسی آئی "سچ کہا تم نے۔"

رابعہ نے کہا "کہاں ہوتے ہیں ایسے شوہر؟"

"ہر جگہ ہوتے ہیں۔ زیادہ تر تو ایسے ہی ہوتے ہیں لیکن ...ز ف جیسے بھی حرامی ہوتے ہیں' پیدائشی بدمعاش۔"

"جوزف اس پائلٹ کا نام ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ جوزف پریرا۔ پرتگالی ہے مگر زیادہ عمر گوا میں گزاری۔ ...ہے شادی بھی کئی بار کی مگر سب کو چھوڑ کے بھاگ گیا۔ یا وہ خود ...ے چھوڑ کر بھاگ گئیں۔ اب اکیلا مست سانڈ کی طرح پھرتا ...ہے۔ شراب اور عورت سے جو بچتا ہے وہ جوئے میں ہار جاتا ہے۔ ...وہ آ گیا۔ ہے نا شیطان کہ نام لیا اور وارد۔"

باہر کوئی مسلسل گاڑی کا ہارن بجا رہا تھا۔ رام ناتھ نے کھڑکی ...ول کے گالی دیتے ہوئے کہا "او یار سن لیا' سن لیا۔ معلوم ہو گیا ...ر تو آ گیا ہے۔ بند کر یہ ہارن۔"

مگر ہارن بند نہیں ہوا۔ جوزف نے جواب میں کچھ کہا تھا جو ...ری سمجھ میں نہیں آیا۔ غالباً ہارن شارٹ ہو گیا تھا۔ اس کے شور ...ے ہمارے کان بھی خراب ہو رہے تھے۔ جوزف نے اسے بند کیا ...ایک دم سکون ہو گیا۔ پھر وہ دروازے میں نمودار ہوا۔ چھ فٹ ...ے زیادہ قد کا ایک دیوزاد جس کا جسم بے ہنگم طریقے پر پھیل گیا ...ا۔ اس نے آدھی آستین کی چیک والی قمیص پہن رکھی تھی اور ...ی زین کی پتلون کو توند کے وسیع گنبد پر روکنے کے لیے الاسٹک ...ڈ استعمال کیے تھے جو اس کے کندھوں پر سے کمر تک پہنچتے تھے۔ ...تنے بڑے جسم پر اس کا چہرہ بالکل کسی بچے جیسا تھا۔ معصوم اور ...رے نظر آنے والا۔ اس کے کردار کے عین برعکس۔

"ہیلو بابا رام ناتھ" اس نے اپنا فیلٹ ہیٹ اتار کے سر جھکایا ...ابھی تم آرڈر کیا اور جوزف از ہیئر۔"

"باتیں مت بناؤ جوزف۔ تم پیسے کی خاطر سر کے بل آئے ...ر" رام ناتھ بولا "ورنہ مجھے معلوم ہے....."

"او کے' او کے۔ ابھی کاہے کو ہمارا امیج خراب کرتا ہے۔ ہم ...دو اپنا انٹروڈکشن بولے گا۔" اس نے کہا اور پھر فیلٹ کو سینے سے ...ا کے ہم سب کی طرف جھکا "لیڈیز اینڈ جنٹلمین! ہم جوزف پریرا۔

ونگ کمانڈر....."

"جوزف! تم کسی ائرفورس میں نہیں رہے۔"

"دیکھو بابا! تم نہیں جانتا۔ ہم حساب لگایا' اگر ہم انڈین ائرلائن میں نہیں جاتا' ائرفورس میں جاتا تو ونگ کمانڈر ہوتا۔"

میں نے اس سے ہاتھ ملایا "میرا نام سکندر ہے۔ یہ میرا بھائی ہے غالب۔ یہ میری وائف' یہ غالب کی۔"

"ایک فالتو وائف کس کا ہے؟" وہ کاجل کی طرف دیکھ کے بولا۔

"جس کی وائف فالتو ہو وہ تمہیں مل جائے۔ خبیث!" رام ناتھ نے کہا "اب بھی وقت ہے' اپنی حرکتوں سے باز آ جاؤ۔"

جوزف نے ایک ایسا قہقہہ مارا کہ اس کا سارا جسم زلزلے کی زد میں آ گیا۔ اس نے پتلون کی جیب سے ایک چپٹی سی بوتل نکال کے دو گھونٹ لیے اور بوتل بند کرتے ہوئے بولا "سوری۔ یہ سالا اپنے واسطے پانی ہے پانی۔ ریڈی ایٹر گرم ہو جاتا ہے تو پانی ڈالنا پڑتا ہے بار بار۔ یہ بابا رام ناتھ کیسا بات بولتا ہے۔ اس کا مغز کنڈم ہو گیا ہے اولڈ ایج میں۔ جوزف جب تک زندہ ہے ایسے ہی زندہ رہے گا۔ مر جائے گا تو گاڈ کو بولے گا کہ اپن سالا بہت حرامی تھا۔ ابھی تمہارا مرضی جدھر بھیجو۔ ہیل آر ہیون۔ اپن خوش رہنا جانتا ہے۔ تم کو پاکستان جانے کا ہے؟"

میں نے کہا "تم بیٹھ جاؤ تو بات کریں۔"

وہ کرسی پر بیٹھا تو کرسی ٹوٹ گئی۔ وہ نیچے گرا اور ہنستے ہنستے بے حال ہو گیا "بلڈی اولڈ مین کا اولڈ چیئر۔ ابھی جوزف گاڈ کا زمین پر بیٹھے گا۔ ایک لاکھ میں سے کرسی کا قیمت کاٹ لو۔"

میں نے کہا "ایک لاکھ بہت زیادہ ہیں جوزف۔"

"تمہارے لیے بہت زیادہ ہے' جوزف کا واسطے بہت کم ہے۔ مگر ہم بابا رام ناتھ کو اسپیشل ڈسکاؤنٹ دے گا۔ چلو تم پانچ روپیہ کم دو" اس نے پھر ایک فلک شگاف قہقہہ مارا۔ اس کے ساتھ ہی بے تکلفی سے میرے کندھے پر ہاتھ مارا' پھر رابعہ کو آنکھ ماری۔

میں نے کہا "تم کب جا سکتے ہو؟ جلدی سے جلدی۔"

"آج ٹو نائٹ۔" اس نے پھر شراب کا ایک گھونٹ لیا اور سر اوپر اٹھایا "اگر گاڈ کا مرضی ہو گا۔"

"تمہاری اپنی مرضی کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"جوزف کا مرضی کیا؟ گاڈ کا مرضی سے کام بنتا ہے ینگ مین۔ ہم تو ایک مشین کو کنٹرول کرتا ہے۔ گاڈ ہم کو' ہمارا لائف اور ڈیتھ کو کنٹرول کرتا ہے۔ موسم کو کنٹرول کرتا ہے۔"

میں نے کہا "اگر موسم ٹھیک رہا اور حالات سازگار ہوئے تو کیا آج رات ہم فلائی کر جائیں گے؟"

"ایک بہت بڑا بات بولتا ہے تم۔"

"وہ کیا؟"

"روکڑا" اس نے ایک انگوٹھے اور انگلی سے نوٹ گننے کا اشارہ کیا "جوزف ایڈوانس مانگتا۔ ادھار نئیں چلے گا۔ گاڑی میں پہلے پٹرول ڈالتا ہے پھر انجن اسٹارٹ ہوتا ہے۔"

"لالچی آدمی" رام ناتھ نے اٹھ کے ایک دیوار میں نصب تجوری کھولی جو ابتک ہماری نظر سے اوجھل تھی کیونکہ سامنے رام ناتھ کے پتاجی کی قد آدم تصویر استادہ تھی "یہ لو۔ پورے ایک لاکھ۔"

"تھینک یو باباجی" جوزف نے ہر گڈی کو کیچ کرلیا۔

رام ناتھ نے تجوری کو پھر مقفل کردیا۔ اس کا تالا نمبروں والا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق تجوری میں اس وقت بھی دس لاکھ نقد ضرور موجود تھے۔

جوزف نے کھڑے ہوکر رام ناتھ کو سیلوٹ مارا "ابھی ہم جانے کو مانگتا۔ بہت کام کرنا ہے۔"

"شراب پینے اور بدمعاشی کرنے کے علاوہ تم کیا کرتے ہو؟"

وہ قہقہہ مار کے ہنسا "وہ بھی کام ہے۔ اس کا اپنا ٹائم ہے مگر ابھی ہم شاپنگ کرے گا۔ بہت لوگ ہے۔ کسی کا ایمان خریدے گا، کسی کا ضمیر خریدے گا، کسی کا مجبوری خریدے گا۔ آدھا رقم تو خرچ ہوجائے گا۔ پھر کہیں راستہ کلیئر ہوگا۔ ایسے کون جانے دیتا ہے جہاز تک۔ لیکن فکر کا بات نہیں۔ جوزف رائٹ ٹائم پر ادھر ہوگا، رائٹ ٹائم پر سب کو لے جائے گا اور بالکل رائٹ ٹائم پر فلائی کرجائے گا۔ گاڈ ہیلپ دس آل" اس نے منہ اوپر اٹھا کے سینے پر انگلی سے صلیب بنائی اور دھپ دھپ ریچھ کی طرح چلتا باہر نکل گیا۔

"کیا عجیب کیریکٹر ہے" رابعہ نے کہا۔

میں نے رام ناتھ سے پوچھا "اگر یہ نہ آیا پھر؟ تمہارے ایک لاکھ تو گئے۔"

رام ناتھ نے نفی میں سر ہلایا "جوزف جیسے لوگ کسی کو دھوکا نہیں دیتے۔ یہ جیسے اندر سے ہوں ویسے ہی باہر سے نظر آتے ہیں۔ اپنی ذات کے ہر عیب کو تسلیم کرتے ہیں۔ اس پر منافقت آمیز نیکی کا پردہ نہیں ڈالتے۔"

شام کو ہم کاجل کے ساتھ ائرپورٹ تک گئے۔ وہ بہت ڈری ہوئی تھی۔ ہم نے غیر قانونی طور پر ٹکٹ خریدے تھے۔ اگر اسے معلوم ہوجاتا کہ اصل مسافر قتل کیے جاچکے ہیں تو شاید ہماری ہر دلیل، ہر تسلی اسے سفر پر آمادہ کرنے میں ناکام رہتی۔ اندر سے تھوڑا سا خوف مجھے بھی تھا کہ عین وقت پر کوئی گڑبڑ نہ ہوجائے۔ مقتول عبدالکریم اور اس کی بیوی شہناز لاوارث اور گمنام لوگ تھے۔ اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ کوئی انہیں سی آف کرنے آجائے۔ تاہم یہ ہوسکتا تھا کہ کوئی ہمیں پہچان جائے۔

ائرپورٹ پر سخت افراتفری تھی اور جتنے مسافر تھے، ان سے زیادہ وہ لوگ تھے جن کو دھوکے بازوں نے جھوٹی امید کے آسرے پر یہاں بلالیا تھا۔ ان کا نام ویٹنگ لسٹ میں ظاہر کرکے کہا جہاز کی روانگی سے قبل انہیں سیٹ مل جائے گی۔ کنفرم [illegible] والی سیٹوں کے مسافر بعض اوقات آتے ہی نہیں اور کچھ [illegible] کرنے پر مجبور ہوجائیں تو سیٹ کینسل کروادیتے ہیں۔ ایسی سیٹوں کے حصول کی خاطر خریداروں کے درمیان مقابلہ [illegible] ضرورت مند، ایجنٹوں کے پیچھے بھاگ بھاگ کے بولی لگا رہے [illegible]

ہم اس ہجوم سے الگ تھر اندر جانے والے راستے کے کھڑے سارا تماشا دیکھ رہے تھے۔ میری نظریں مسافر [illegible] صورتوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ غالب کوشش کررہا تھا کہ کا[illegible] کراچی کا سارا جغرافیہ گھول کر پلادے۔

"ائرپورٹ پر بھی بہت ٹیکسیاں ہوں گی۔ پہلے ان سے [illegible] ٹیکسی کا نمبر یاد ہے نا؟ اکرام شیخ کی جگہ ڈبل ایس آئی شیخ [illegible] پہلے بھی اسے کافی لوگ جانتے تھے، اب تو ممکن ہے، وہ ڈرائیورز کی ایسوسی ایشن کا صدر وغیرہ بن گیا ہو۔ بفرض محال ٹیکسی والا نہ ٹیکسی کے نمبر سے کچھ بتائے نہ نام سے واقف [illegible] کسی بھی ٹیکسی میں بیٹھ جانا۔ میرا خیال ہے کہ تم شریف او[illegible] اعتبار آدمی کا انتخاب کرسکتی ہو۔ اس سے کہنا کہ جیسے بھی [illegible] ٹیکسی ڈرائیور کو تلاش کرنا ہے۔ جتنا کرایہ بنے گا دوں گی [illegible] صدر، ٹاور، لی مارکیٹ اور ریلوے اسٹیشن لے چلو جہاں بھی اسٹینڈ ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تمہاری تلاش کامیاب ہوگی۔ [illegible] کے کھیل نرالے ہیں اور یہ اتفاقات کی دنیا ہے۔ کیا پتا تم [illegible] ڈرائیور سے پوچھو اور وہ کہے چشم ما روشن دل ما شاد۔ ناچیز اکرام شیخ کہتے ہیں اور یہی ہے آپ کی منزل مراد۔ ٹیکسی کا [illegible] وہی ہو۔ تم نے دیکھا ہوگا، بے وفا شہری بابو کو دیہات کی لڑکی میں کیسے تلاش کرتی ہے۔"

نازو نے کہا "اب بس بھی کرو۔ دماغ چاٹ گئے اس کا۔"

"دماغ!" غالب بولا "ذائقہ تو کچھ بھوسے جیسا تھا۔"

اچانک میری نظر ایک آشنا صورت پر گئی اور بے [illegible] ردِعمل کے طور پر میں نے غالب کا بازو تھام کے اسے اپنی [illegible] کھینچ لیا۔ اب ہم دونوں کی پشت اندر جانے والے راستے کی [illegible] تھی اور ہم نے رابعہ کے ساتھ نازو کو بھی کور کرلیا تھا۔

"غالب! پیچھے پلٹ کر مت دیکھنا" میں نے کہا "رابعہ! [illegible] ہماری آڑ میں رہو۔ وہ خبیث تمہارا چہرہ نہ دیکھ لے۔"

غالب نے کہا "کون خبیث کے دیکھ لیا ہے آپ نے؟"

میں نے کہا "حاجی عبداللہ کو۔ وہ اسی فلائٹ سے جار[illegible] اس کے ساتھ ایک شخص اور بھی ہے۔"

"وہ پاجی عبداللہ..... یہاں!" غالب بھونچکا رہ گیا۔

رابعہ نے میری اوٹ سے اور نازو نے غالب کی او[illegible] جھانک کر دیکھا اور ان کے تاثرات نے میرے خدشات کی [illegible] کردی۔

"واقعی۔ یہ تو عبداللہ ہے۔ اندر جارہا ہے ایک مونچھوں [illegible]ے کے ساتھ۔ مونچھیں نقلی لگتی ہیں۔ ساڑھے تین انچ دائیں [illegible]، چار انچ بائیں طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ شخص غالباً بھینگا [illegible] ایک لڑکی سے ٹکرانا چاہتا تھا۔ ٹکرایا ہے ایک سکھ لوڈر [illegible] "نازو نے رننگ کنٹری جاری رکھی "نقلی مونچھوں والا [illegible] داڑھی والا عبداللہ اب اندر جاچکے ہیں۔ خطرے کی کوئی بات [illegible]رہی۔"

[illegible] غالب اور میں نے اطمینان کا سانس لے کر پیچھے دیکھا۔ لاؤنج [illegible] اسپیکر سے اعلان نشر ہورہا تھا کہ مسافر جہاز پر سوار ہوجائیں۔ [illegible]ن انگریزی، نیپالی اور بنگالی میں کیا جارہا تھا۔ پھر غالباً پاکستان [illegible] والوں کے لئے یہ اعلان اردو میں بھی ہوا۔

"جاؤ بی بی! فی امان اللہ" غالب بولا "مجھ پر سخت رقت طاری [illegible]ی ہے مگر رونے کے لئے ٹائم نہیں ہے۔ بعد میں نازو سے گلے [illegible] کے رولوں گا۔"

نازو سچ مچ رورہی تھی اور اس کا ساتھ رابعہ دے رہی تھی [illegible]چہ کاجل کا نہ رونا سخت خلافِ تہذیبِ نسواں ہوتا۔ اس نے [illegible] پھس پھس کرکے آنسو بہاتے ہوئے رابعہ اور نازو سے کہا [illegible]ی غلطی ہو تو معاف کردینا۔"

"ان کی طرف سے میں معاف کرتا ہوں۔ یہ خود اتنی غلطیاں [illegible]چکی ہیں کہ یہ کیا معاف کریں گی تمہیں" غالب بولا۔

میں نے کہا "یہ دردناک ڈائیلاگ آخر کس لئے؟ کیا یہ آخری [illegible]قات ہے؟ الہام ہوا ہے کہ یہ جہاز کریش کرجائے گا۔"

رابعہ نے کہا "کیسی باتیں کرتے ہو! اللہ نہ کرے۔"

میں نے کہا "تمہاری روتی بسورتی صورتوں سے تو یہی لگتا [illegible]۔ چلو بند کرو یہ ڈراما۔ جاؤ کاجل! تم جہاز میں بیٹھو۔ ایک دن کی تو بات ہے، کل ہم بھی پہنچ جائیں گے۔ اللہ حافظ۔"

"اللہ حافظ چاچا" کلیم نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔

"دیکھو، یہ کتنا بہادر لڑکا ہے" میں نے کہا "کلیم! اپنی دیدی کا [illegible]ال رکھنا۔ ان کو رونے مت دینا۔"

غالب نے کاجل کے سر پر بزرگانہ شفقت سے ہاتھ پھیرا [illegible]باؤ۔ بیٹی تو پرایا دھن ہوتی ہے، اسے ایک دن جانا ہی ہوتا ہے۔ [illegible]وڑ بابل کا گھر....."

کاجل مسکرائی اور آہستہ آہستہ ڈیپارچر لاؤنج کی طرف بڑھنے [illegible]۔ اس نے کلیم کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ شیشوں والے دروازے [illegible]ے پیچھے غائب ہونے سے پہلے اس نے پلٹ کر ہاتھ ہلایا۔

کچھ دیر بعد میں نے ان کے جہاز کو آسمان کی بلندی میں پرواز [illegible]ے لئے اٹھتے دیکھا۔ خوف کا کانٹا میرے دل سے نکل چکا تھا۔ [illegible]سری دنیا میں پہنچ جانے والے دو مسافروں کے ٹکٹ پر کاجل اور [illegible]لیم سفر کررہے تھے۔ جیسے لوگ کہتے ہیں کہ دانے دانے پر کھانے [illegible]الے کا نام لکھا ہوتا ہے، ایسے ہی شاید قدرت ہر راستے اور ہر منزل کے لئے مسافر کا نام لکھ دیتی ہے اور یہ ضروری نہیں کہ وہی نام ٹکٹ پر بھی ہو۔

"اللہ جو کرتا ہے اچھا کرتا ہے" غالب نے واپسی پر کہا "اب سوچو ذرا کہ اس فلائٹ پر کاجل اور کلیم اللہ کی جگہ ہم میں سے کوئی ہوتا تو کیا ہوتا۔ وہ پاجی عبداللہ تو گلے پڑجاتا کہ بھئی ماشاءاللہ سے کیا خوب ملاقات ہوئی ہے۔"

میں نے کہا "وہ حرام زادہ یہاں کیا کررہا تھا؟"

"ہم یہاں کیا کررہے ہیں؟" غالب نے کہا "جیسے تقدیر ہمیں لے آئی ایسے ہی اس کو بھی لے آئی۔"

میں نے کہا "نہیں مرزا جی۔ وہ ہم جیسے لوگوں کی طرح خوار ہونے والوں میں نہیں ہے۔ وہ گھربار لٹا کے ہجرت کرنے والوں میں بھی شامل نہیں ہوسکتا۔"

"صاف کہو نا کہ وہ ہماری تلاش میں تھا" غالب نے جھنجلا کے کہا۔

"میں اس امکان کو مسترد نہیں کرسکتا۔"

"میں آپ کو وہمی، خبطی اور نفسیاتی خوف کا مریض قرار دیتا ہوں" غالب نے کہا "تمہیں وہ فوبیا ہوگیا ہے جس میں آدمی کو سب اپنے دشمن نظر آتے ہیں۔"

"کیا حاجی ہمارا مخلص دوست ہے؟" میں نے کہا۔

"مگر یہ بھی نہیں کہ وہ اور کچھ نہیں کرتا۔ ہم سے دشمنی اس کا واحد مقصدِ حیات نہیں ہے۔ یار، وہ کاروباری دورے کرتا رہتا ہے اور ساری دنیا میں آتا جاتا ہوگا۔ نیپال میں نظر آگیا تو کیا ہوا۔ فارگیٹ دی باسٹرڈ۔"

میں خاموش ہوگیا۔ رابعہ اور نازو پہلے ہی خاموش تھیں۔ رام ناتھ کے گھر تک کا راستہ خاموشی میں کٹا مگر میں اپنے ذہن سے حاجی عبداللہ کے خیال کو جھٹک نہ سکا۔ غالب کی توضیح یقیناً منطقی تھی مگر سانپ کے ڈسے کو رسی سے ڈر لگتا ہے تو اسے وہمی یا خبطی نہیں سمجھا جاسکتا۔

فلائٹ کچھ تاخیر سے روانہ ہوئی تھی۔ رام ناتھ کے گھر پہنچنے تک نو بج گئے۔ اب ہم نے اپنے سفر کی تیاری شروع کی۔ ہمارے پاس اسباب سفر کچھ نہیں تھا مگر ذہنی طور پر اس ایڈونچر میں درپیش تمام خطرات کو سمجھنا ضروری تھا۔ یہ ایک غیر قانونی پرواز تھی۔ پہلے تو اس کا طے شدہ پروگرام کے مطابق روانہ ہونا ہی غیر یقینی تھا۔ دیگر خدشات کا سلسلہ پرواز کے بعد شروع ہوتا تھا۔ یہ ہوسکتا تھا کہ ہیلی کاپٹر کو روک لیا جائے، اسے اترنے پر مجبور کردیا جائے یا نشانہ بنالیا جائے۔ سو دن چور کے ہوتے ہیں تو ایک دن کوتوال کا بھی ہوتا ہے۔ جوزف پریرا جن لوگوں پر انحصار کرتا ہے کہ وہ خارج نہیں ہوں گے، وہ کوئی مخلص دوست نہیں ہوتے۔ غرض کے بندے ہوتے ہیں۔ خود کو اعانت مجرمانہ کے الزام سے بچانے کے لئے وہ کسی تذبذب کے بغیر جوزف پریرا کو مرواسکتے ہیں۔

یہ سب نہ ہو اور ہیلی کاپٹر نکل جائے تو مشکلات اور خطرات کے اگلے مرحلے میں اس علاقے کے ناسا عد جغرافیائی اور موسمی حالات کا سامنا ہوگا۔ ان پہاڑوں کی عام بلندی دس سے بیس ہزار فٹ کے درمیان تھی۔ یہاں آکسیجن کی کمی کے باعث ائرپاکٹس (AIR POCKETS) ہوں گی جن کا تعین نہیں کیا جاسکتا۔ یہ تجربے کار پائلٹ ہی جانتے ہیں کہ کس روٹ پر' کتنی بلندی پر اور کہاں اچانک فضا میں خلا نمودار ہوجائے گا۔ ایسے خلا میں جہاز ایک دم نیچے جاتا ہے۔ سیکڑوں فٹ تک یا ہزاروں فٹ تک۔ نیچے ہمالہ کی برف پوش چوٹیاں ہیں جو رات کو گہری دھند' برف باری یا بادلوں میں دکھائی بھی نہیں دیتیں۔ ایک ہیلی کاپٹر کی طاقت پرواز ہی کیا۔ وہ کسی بھی چوٹی پر کریش کرسکتا ہے۔

ہم میں نے اپنے اندیشوں کا کسی پر اظہار نہیں کیا۔ رابعہ اور نازو کا مورال پہلے ہی ڈاؤن تھا۔ میں انہیں یقین دلاتا رہا کہ جوزف بہت تجربے کار پائلٹ ہے اور یہ ایک ڈیڑھ گھنٹے کی پرواز ہوگی' پھر ہم پاکستان کی سرحد میں اتر جائیں گے۔

"خدا معلوم وہ کس ویرانے میں اتارے گا" رابعہ بولی۔

"میرا خیال ہے گلگت یا اسکردو کا علاقہ ہوگا۔ بالکل یہی حالات ہوں گے لیکن ہم اپنے پاکستان میں ہوں گے" غالب نے کہا۔

"کسی برف سے ڈھکی ہوئی پہاڑ کی چوٹی پر یا وادی میں اتار دیا تو مارے جائیں گے" نازو نے کہا "معلوم نہیں آبادی تک پہنچنے کے لئے کتنا پیدل چلنا پڑے۔"

"پیدل چلیں تمہارے دشمن" غالب بولا "تم تو جہاں قدم رنجہ فرماؤ وہیں قیام کرنا۔ کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں۔ میں جاکے لاہور یا راولپنڈی کرلے آؤں گا تمہارے پاس۔"

نازو نے برا سا منہ بنایا مگر کچھ بولی نہیں۔ رام ناتھ کے ویران گھر کے باہر دور خاموشی اور تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ وہ عجیب پُراسرار آدمی تھا۔ اس کے ذرائع معاش کیا تھے؟ یہ نہ ہم نے پوچھا تھا' نہ اس نے بتایا تھا۔ وہ کوئی شریفانہ کام نہیں کرتا تھا مگر ہم نے دو دنوں میں اسے کہیں آتے جاتے نہیں دیکھا تھا۔ نہ اس سے کوئی ملنے آیا تھا اور نہ ہم نے اسے کسی سے فون پر باتیں کرتے سنا تھا۔ بظاہر اس کی راہبانہ زندگی کا مقصد کوئی نہ تھا مگر اس کی دولت درختوں پر نہیں اگی تھی۔ اس کے لئے رام ناتھ نے جدوجہد ضرور کی تھی' خواہ وہ ناجائز تھی یا جائز۔ وہ کنجوس آدمی بھی نہیں تھا ورنہ اپنی ایک غلطی کا کفارہ ادا کرنے کے لئے یوں ایک لاکھ کے نوٹ جوزف پریرا کے سامنے نہ پھینک دیتا۔ اس کی جگہ دلاور ہوتا تو بس ایک گولی خرچ کرتا اور سرکار کو جہنم رسید کردیتا۔ نہ ضمیر' نہ اس کی خلش۔ سرکار کے ساتھ زیادتی ہوئی تھی تو کیا' وہ کون سا رام ناتھ کا خیر خواہ تھا۔ رام ناتھ بزدل بھی نہیں تھا۔ اس نے سرکار کو اپنے گھر میں بلانے کے بعد ریوالور اس وقت نکالا تھا جب خطرے کا احساس بھی غیر اہم ہوگیا تھا۔ رام ناتھ نے جوزف پریرا [...] ہماری موجودگی میں تجوری کھولی تھی اور ہم سب نے دیکھا [...] اس میں کتنی دولت موجود ہے مگر جتنا اعتماد اسے ہم پر تھا' [...] سے زیادہ اپنے آپ پر تھا۔

میرا خیال تھا کہ وہ اپنے کمرے میں لیٹا ہوگا۔ بھاری [...] کے باعث لائٹ باہر نظر نہیں آتی تھی۔ دوسرے سب کم[...] لائٹس آف تھیں۔ ہم اپنے کمرے میں پہنچے تو میں نے لائٹ [...] اور پھر فین ہیٹر کو آن کیا۔ گرم کپڑوں کے باوجود سب [...] سردی سے شل ہورہے تھے۔ رابعہ اور نازو نے کچھ دیر [...] ناخواستہ کافی بنانے کی ذمے داری قبول کی اور کچن کی طرف گئیں۔ میں اور غالب سفر کی ضروریات شمار کرتے رہے [...] کپڑے ایک کے اوپر ایک جتنے پہنے جاسکتے ہوں پہن لئے [...] کھانے پینے کا جتنا بھی سامان دستیاب ہو اور سب [...] اٹھا سکیں' تھرماس کافی سے بھر لئے جائیں۔

رابعہ اور نازو کافی بنا کے لوٹ آئیں مگر رام ناتھ نہیں [...] میں نے کہا "تم نے رام ناتھ کو دیکھا؟"

رابعہ نے اقرار میں سرہلایا "وہ سو رہا ہے۔ میں [...] مناسب نہیں سمجھا۔"

"اس کی طبیعت زیادہ خراب تو نہیں ہے؟" غالب بولا۔

"میں جاکے دیکھتا ہوں" میں نے کہا "ابھی وقت ہے' [...] بلایا جاسکتا ہے۔"

لیکن اس کے کمرے میں پہنچ کے مجھے احساس ہوا کہ اسے ڈاکٹر کی ضرورت نہیں رہی۔ رام ناتھ سوتے میں [...] تھا۔ ایک کروٹ پر وہ سوتا ہوا ہی لگتا تھا مگر میرے آواز دینے [...] جب اس نے حرکت نہیں کی تو میں نے لحاف ہٹا کے اس [...] ہلایا اور اس کی کھلی ہوئی ساکت آنکھوں کو دیکھا۔ اس کا جسم [...] میں ہونے کی وجہ سے ابھی تک گرم تھا چنانچہ یہ اندازہ کرنا [...] تھا کہ اسے مرے ہوئے کتنی دیر ہوچکی ہے؟

میں نے اسے سیدھا لٹایا اور اس کی آنکھیں بند کرکے [...] اوپر تک پھیلا دیا۔ موت کے مہیب سناٹے میں چند سیکنڈ [...] سے گزار کے میں واپس آگیا۔

میری صورت دیکھتے ہی غالب پریشان ہوگیا "کیا ہوا سکندر [...]" میں نے کہا "بہت برا ہوا یار۔ رام ناتھ مرگیا۔"

رابعہ کے ہاتھ سے کافی کا مگ چھوٹ گیا۔ "کیا!"

میرے ابتدائی الفاظ نے بم کا دھماکا کیا تھا جس نے سب کے [...] حواس مختل کردیئے تھے۔ آہستہ آہستہ میری بات کا مفہوم [...] ہونے لگا اور انہیں یقین آگیا کہ اتنی سنجیدگی کے ساتھ یہ بات [...] ہوئے میں اداکاری نہیں کررہا ہوں۔ ان سب کی نگاہیں [...] مرتکز ہوگئی تھیں۔

"میرا خیال ہے سوتے میں اس پر دل کا دورہ پڑا" [...] کہا۔

"دل کا دورہ" غالب نے یوں کہا جیسے یہ کوئی انہونی بات تھی۔

میں نے سرہلایا "اور کیا وجہ ہوسکتی ہے اچانک موت کی۔ ہم ائرپورٹ گئے تھے دو گھنٹے پہلے تو وہ زندہ تھا۔ اسے معمولی سا زکام تھا اور زکام سے آدمی مر نہیں سکتا۔"

"کیا پتا اسے نمونیا ہوگیا ہو۔ ڈبل نمونیا۔"

"بے وقوفی کی بات مت کرو۔ ڈبل نمونیا بھی ایک دم نہیں ہوتا اور ایک دم جان نہیں لیتا۔ رام ناتھ تو لحاف اوڑھے سو رہا تھا۔" میں نے کہا۔

غالب بولا "پھر اب کیا کریں؟ ڈاکٹر کو بلائیں یا پولیس کو؟"

"کسی کو نہیں" میں نے کہا "رام ناتھ کو سونے دو۔ جوزف آتا ہی ہوگا۔ ہم اسے بھی کچھ نہیں بتائیں گے۔ سوائے اس کے کہ رام ناتھ کو بخار ہے' وہ سو رہا ہے۔ صبح یہ خبر دنیا کو کیسے ملتی ہے اور کس سے ملتی ہے' یہ فکر ہم کیوں کریں۔"

"کتنی بری بات ہے' ہم ایسے ہی بھاگ جائیں!" رابعہ نے کہا۔

"اس سے زیادہ بری بات ہوگی اگر ہم پکڑے گئے۔ یہ مت بھولو کہ ہم بھاگ رہے ہیں' فرار کی حالت میں ہیں۔ پولیس یا ڈاکٹر کو اطلاع دے کر ہم نے خود اپنے لئے فرار کے راستے بند کردیئے تو ہمارا ٹھکانا کہاں ہوگا؟"

غالب نے کہا "بالکل ٹھیک۔ ہم ایسی نیکی کا رسک نہیں لے سکتے جو ہمیں مہنگی پڑے۔ وہ بھی اس مرحلے میں جب کہ ہم اپنی منزل کے بہت قریب ہیں۔"

میں نے کہا "جلدی سے کھانے پینے کا سامان باندھ لو۔ دیکھو گھر میں کتنے تھرماس ہیں۔ سب میں کافی بنا کے بھر لو۔ وقت بہت کم ہے۔"

رابعہ اور نازو نے گھر میں سے دو تھرماس فلاسک تلاش کئے۔ ان میں سے ایک بڑا تھا' دو لیٹر والا اور دوسرا چھوٹا ایک لیٹر کا۔ کچن میں کافی بناتے ہوئے بھی ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

میں نے کہا "دیکھو فریج میں جتنا مکھن اور پنیر ہے' سب پیک کرلو۔ اس موسم میں خراب کچھ نہیں ہوتا۔"

"ہم ذرا بازار جاکے آتے ہیں دس منٹ میں۔"

"کیا؟ ہمیں اکیلا چھوڑ کے جارہے ہو' دونوں کو" نازو بولی۔

"غالب بولا "اکیلی اور دونوں۔ واہ کیا انداز بیان ہے۔"

میں نے کہا "ایک لاش بھی تو ہے تمہارے ساتھ۔"

نازو نے کہا "مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"ایک مردے سے؟ کیا وہ بھوت بن کے چمٹ جائے گا تمہیں بھوت کی بچی" غالب بولا۔

میں نے کہا "ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ جب تک کریا کرم نہ ہوجائے' مرنے والے کی روح وہیں موجود رہتی ہے۔ جسم بوڑھا تھا اس کا مگر رام ناتھ کی روح جوان تھی اور حسن پرست بھی۔"

رابعہ نے کہا "سکندر! یا تم پہلے جاؤ یا غالب کو بھیج دو۔ ایسا کون سا بوجھ ڈھو کے لانا ہے۔ یہاں جوزف آگیا تو اس سے کون بات کرے گا؟"

"وہ چلا جائے گا سیدھا اندر بابا رام ناتھ کے پاس اور اسے اٹھانے کی کوشش کرے گا" نازو بولی۔

غالب نے ہار مانتے ہوئے کہا "اچھا بابا! میں جاتا ہوں۔ سکندر اعظم ہیں یہاں زندوں اور مردوں سے نمٹنے کے لئے۔"

میں نے کہا "کچھ بھولنا نہیں اور دیر مت لگانا۔"

غالب نے سرہلایا "بسکٹ کے ڈبے' اسپرین' اینٹی بایوٹک کیپسول' مرہم پٹی کا سامان' خشک دودھ اور چاکلیٹ' لپ اسٹک' نیل پالش' فیس پاؤڈر' بیوٹی لوشن....."

نازو نے کہا "یہ کس نے کہا ہے؟ میک اپ کا سامان....."

"کہا کسی نے نہیں' خود مجھے خیال ہے کہ تم واپس اپنے وطن جارہی ہو۔ جب دلہن میکے لوٹتی ہے تو اس کا ہار سنگھار....."

نازو نے اسے کپ کھینچ کے مارا مگر وہ بھاگ گیا۔ کپ دیوار سے ٹکرا کے ایک چھناکے سے بکھر گیا۔ رام ناتھ زندہ ہوتا تو پوچھتا۔ کیا توڑ دیا؟ ٹی سیٹ غارت کردیا' اب اس دنیا میں جو کچھ تھا اس کے لئے بے مصرف ہوگیا تھا۔ پہلے ہم اس کی گاڑی لے کر ائرپورٹ گئے تھے تو اس سے اجازت لی تھی۔ اب غالب کے لئے کسی سے کچھ پوچھنا ضروری نہیں رہا تھا۔ کمرے میں رام ناتھ کی تجوری نوٹوں سے بھری پڑی تھی۔ اگر ہم کوشش کرتے تو نمبروں والا تالا بھی کھول سکتے تھے۔ یہ دولت ہمارے کام آسکتی تھی۔

میں کچھ دیر تذبذب کا شکار رہا۔ کیا یہ چوری کہلائے گی؟ بے شک مالک کی اجازت کے بغیر جو چیز لی جائے وہ چوری کے زمرے میں آتی ہے مگر یہ صورت حال قدرے مختلف تھی۔ کل صبح جب اس کی موت کی خبر عام ہوگی تو پولیس آجائے گی۔ سب پولیس والے فرشتے نہیں ہوتے۔ پاس پڑوس کے لوگ جمع ہوں گے۔ ان میں سے کوئی بھی لواحقین کے آنے تک سارے معاملات اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کرے گا۔ لاوارث لاش پر گدھ فوراً آجاتے ہیں۔ ان میں سے کوئی تجوری پر بھی ہاتھ صاف کردے گا۔ جسے موقع ملا وہ کچھ نہ کچھ لے جائے گا۔ انہیں روکنے والا بھی کوئی نہیں ہوگا۔ رام ناتھ کے پاس تو بینک میں بھی بہت کچھ ہوگا۔ یہ بلیک منی تھی جو اس نے چھپا کے رکھی تھی۔ پولیس والوں سے یا چوروں سے زیادہ تو اس کی ضرورت ہمیں تھی۔

بند کمرے کا دروازہ کھول کے میں دبے پاؤں اس کمرے میں داخل ہوا جہاں رام ناتھ دنیا کے جھمیلوں سے بے نیاز سکون سے سو رہا تھا۔ میں نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کے نمبر والے قفل کو گھمانا شروع کیا اور کان اس کی گراری پر لگادیئے۔ پہلا نمبر ملتے ہی خفیف

سی کلک کی آواز سنائی دی۔ میں نے اسے دائیں بائیں گھمانے کا عمل جاری رکھا۔ باری باری میں نے ہر ہندسے کو آزمایا پھر دوسری بار صحیح عدد ملنے کی آواز آئی۔ اب شاید ایک نمبر باقی تھا۔ آہستہ آہستہ کان آہٹ پر لگائے میں نمبروں کے الٹ پھیر میں مصروف رہا۔ تیسری بار کھٹکا بہت ہلکا ہوا مگر مکمل سکوت میں میرے کانوں نے یہ آواز سن لی۔

ہینڈل گھماتے ہی تجوری کھل گئی۔ میرے سامنے اوپر نیچے رکھے ہوئے نوٹوں کے بنڈل آگئے۔ یہ سو سو کے نوٹ تھے جن پر ربر بینڈ چڑھا کے دس دس ہزار کی گڈی بنادی گئی تھی۔ وہاں تھیلی کوئی نہیں تھی چنانچہ میں نے رام ناتھ کی روح سے معذرت کی اور لاش کے سرہانے کے نیچے سے تکیہ نکال کے غلاف اتارلیا۔ تجوری کی رقم میرے اندازے سے بہت زیادہ تھی۔ ایک تکیے کے غلاف میں چوّن گڈیاں ہی بھری گئیں۔ پانچ لاکھ چالیس ہزار روپے۔ تجوری میں اتنی ہی رقم اور تھی۔ میں نے دوسرے تکیے کا غلاف بھی اتارلیا۔

رابعہ نے کمرے میں جھانک کے کہا "یہ کیا کررہے ہو؟"

"چوری" میں نے کہا اور دوسرے غلاف کو بھرنے میں مصروف ہوگیا۔

"کیا کریں گے ہم اس دولت کا؟" رابعہ بولی "کون اٹھائے گا اتنا بوجھ؟ اور یہ پاکستانی کرنسی تو ہے نہیں۔"

میں نے کہا "ہم اسے تبدیل کرالیں گے۔"

"اس وقت؟ ہم تو کسی کو جانتے بھی نہیں۔"

"جوزف پر یا کو معلوم ہوگا" میں نے کہا "یہ ایک احمقانہ سوال ہے کہ ہم دولت کا کیا کریں گے۔ ہم نہ لے گئے تو صبح یہ سب دوسرے لوگ لے جائیں گے۔ ہم پاکستان میں اتریں گے اور خالی ہاتھ ہوں گے تو مارے جائیں گے۔ اس بوجھ کو ڈھونا ہی پڑے گا۔ ابھی یہ دو تھیلے ہیں مگر تبدیل ہونے کے بعد ایک رہ جائے گا۔ پاکستانی کرنسی کی قیمت بہت کم چل رہی ہے اور چور بازار کے ریٹ تو نصف ہوں گے۔"

اسی وقت باہر سے جوزف کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ میں دونوں تھیلے اٹھاکے باہر نکلا۔ ان کے منہ باندھنے کا کام میں نے رابعہ کے سپرد کردیا۔

"ہیلو ایوری باڈی" جوزف نے اندر آکے خوش دلی سے کہا "اپن آگیا ہے سارا بندوبست کرکے۔ یو ریڈی؟"

میں نے کہا "سب تیار ہیں۔ بس ہمارا دوست آجائے۔ وہ بازار سے کچھ دوائیں لینے گیا ہے اور کچھ کھانے پینے کا سامان۔"

"ٹھیک ہے۔ ابھی ہم باباجی سے ملتا ہے۔"

میں نے کہا "رام ناتھ کو بخار ہے۔ ڈاکٹر نے دوا دی تھی' اس کے بعد وہ سوگیا۔ آؤ دیکھ لو۔"

وہ میرے ساتھ دروازے تک گیا۔ میں نے ایک پٹ کو تھوڑا سا کھولا اور جوزف کو کمرے کے اندر کا منظر دکھادیا۔ رام ناتھ کا چہرہ کھلا ہوا تھا اور وہ واقعی گہری نیند میں نظر آتا تھا۔

جوزف نے دروازہ بند کردیا "اولڈ مین کا ٹائم تو خلاص ہوگیا ہے۔ کسی دن سوئے گا تو اٹھے گا نہیں۔"

میں نے جلدی سے کہا "جوزف! تم کسی کرنسی ڈیلر سے واقف ہو جو نیپالی کرنسی کو پاکستانی کرنسی میں بدل دے۔"

"او یس۔ مگر ریٹ کم ہوگا۔ ففٹی پرسنٹ۔ کتنا کرنسی ہے؟"

میں نے کہا "تقریباً دس لاکھ۔"

"دس لاکھ!" جوزف کا سانس رک گیا اور آنکھیں پھیل گئیں۔

میں نے کہا "دس پرسنٹ تمہارے۔"

"میں نیپالی کرنسی کو ترجیح دوں گا۔" اس نے کہا۔

"مجھے منظور ہے۔ کیا یہ کام راستے میں ہوجائے گا؟"

"ایک دم ہوجائے گا" وہ بولا "لیکن تم اتنا کرنسی کدھر سے لایا؟"

میں نے کہا "لیڈیز کا زیور بیچا تھا۔ میرا خیال ہے ہم سامان رکھ دیں۔ غالب کے آتے ہی نکل جائیں۔"

اس نے سرہلاکے تائید کی۔ ابھی ہم نے سامان اٹھایا ہی تھا کہ غالب بھی لوٹ آیا۔ کرنسی سے بھرے ہوئے دونوں بیگ میں نے اٹھا رکھے تھے۔ رابعہ اور نازو نے غالب کے ساتھ مل کے کھانے پینے کا سامان اٹھالیا۔ ہم سب جوزف کی جیپ میں بیٹھ گئے۔

"میں یہ چابی رام ناتھ کو دے آؤں" میں نے گاڑی کی چابی دکھاکے کہا "اور اس سے کہہ دوں کہ دروازہ اندر سے بند کرلے۔ ویسے تو دروازہ باہر سے بھی لاک ہوجاتا ہے۔"

میں اندر گیا اور ایک منٹ بعد لوٹ آیا۔ جوزف کو ذرا بھی شک نہ ہوا کہ ہم سب نے مل کے کتنے بڑے سچ کا راز اپنی اداکاری سے فاش نہیں ہونے دیا۔ اس نے جیپ اسٹارٹ کی۔ سرد ہوا ہمارے جسموں کو کاٹتی گزرنے لگی۔ رام ناتھ کی موت نے سب کے اعصاب کو متاثر کیا تھا مگر جوزف نے اسے ایک غیر قانونی سفر کا خوف سمجھا۔

"ابھی کاہے کو ڈرتا ہے؟ جوزف کئی بار فلائی کیا' کبھی کچھ نہیں ہوا۔" اس نے ڈیش بورڈ کے خانے سے بوتل اٹھاکے شراب کا ایک گھونٹ لیا "ٹھیک دو گھنٹے بعد تم اپنا کنٹری میں ہوگا۔"

میں نے کہا "فار گاڈ سیک' اس وقت تو مت پیو۔"

اس نے قہقہہ مارا "یہ ٹانک ہے ٹانک۔ دیکھو اپن ایک شرٹ میں ہے"

میں نے کہا "اچھا وہ کام مت بھول جانا۔ اس میں کوئی خطرے کی بات تو نہیں ہے نا؟ اگر اس نے بدمعاشی کی تو ہم اسے شوٹ کردیں گے۔"

جوزف ہنسنے لگا "بابا وہ بہت بڑا ڈیلر ہے۔ ایک گودام بھرا ہوا ہے اس کا۔ ہر کنٹری کا کرنسی ہے۔"

جوزف نے غلط نہیں کہا تھا۔ بلیک میں کرنسی خریدنے اور بیچنے والا صبح سے شام تک یہی کام کرتا تھا۔ اس نے سرسری لہجے میں پوچھا کہ کرنسی کتنی ہے اور مجھ سے دونوں بیگ لے کر ایک طرف پھینک دیے۔

وہاں ہر دیوار کے ساتھ ڈھیر کی صورت میں ایسے ہی بہت سے بیگ پڑے تھے۔ بوریاں تھیں اور اوپر نیچے رکھے ہوئے قیمتی بریف کیس سے لے کر ٹین کے صندوق تک تھے۔ یہ سب کرنسی تھی۔ سکۂ رائج الوقت "زر" دنیا کی سب سے بڑی طاقت اور انسانوں کے درمیان مسابقت اور مطابقت کا سب سے موثر ذریعہ۔ رشتوں کو تقسیم اور تبدیل کرنے' وفاداری' اصول اور ایمان' ہیرے موتی سے پتھر کے محلوں اور سنگ مرمر کے مقبروں تک سب کچھ اپنی قوتِ خرید میں لانے والی طاقت۔ جو یہاں کاغذ کے ٹکڑوں کے ڈھیر کی شکل میں اسی طرح پڑی تھی' جیسے کچرا گھر میں شہر بھر کی بے مصرف چیزوں کا انبار۔

"کتنا ہے یہ سب؟" اس نے سرسری لہجے میں کہا۔

جوزف نے میری طرف دیکھا اور میں نے سر کھجاکے کہا "پتا نہیں' ہوگا اندازاً...."

"اچھا اچھا" اس نے بیگ کو دیکھ کر کہا "کتنا چاہیے؟"

میں حیران ہوگیا۔ نہ اس نے یہ پوچھا کہ نوٹ چھوٹے ہیں یا بڑے۔ نہ یہ سوال کیا تھا کہ کرنسی کون سی ہے اور اس کے بدلے میں مجھے کس ملک کی کرنسی درکار ہے۔ وہ نوٹوں کو تول کر مالیت کا اندازہ لگانے والا شخص تھا جو دو چار لاکھ کم یا زیادہ ہونے کی پروا نہیں کرتا تھا۔

میں نے کہا "یہ دس لاکھ انڈین کرنسی ہے۔ ہم کو پاکستانی کرنسی چاہیے' جتنی بھی مل جائے۔"

"وہ پانچ لاکھ اٹھالو" اس نے انگلی کے اشارے سے مجھے حکم دیا۔

میں نے اشارے کی سمت میں دیکھا "یہ.... بریف کیس؟"

"ہاں۔ اس میں پانچ لاکھ ہیں۔"

میں ڈرتے ڈرتے آگے بڑھا اور بریف کیس اٹھاکے واپس آگیا۔ میں بھی مجبور تھا کہ اس شخص پر اعتبار کروں جس نے میرے کہنے پر مان لیا تھا کہ اس بیگ میں دس لاکھ ہیں "تھینک یو" میں نے کہا۔

دروازہ بند ہوگیا اور جوزف نے میرا ہاتھ پکڑ کے کہا "ارے چلو بابا' کیسا تھینک یو۔ مال کے بدل مال لیا' بات خلاص۔"

میں نے ایک گہری سانس لی اور واپس آکے جیپ میں بیٹھ گیا۔ جیپ پھر چل پڑی اور شہر سے باہر ایک سنسان' تاریک مقام پر رک گئی جہاں کسی دیوہیکل فولادی پرندے کی طرح ہیلی کاپٹر کا سیاہ ہیولا زیادہ بھیانک محسوس ہوتا تھا۔

رابعہ نے کہا "اس بریف کیس میں کیا ہے؟"

میں نے کہا "پانچ لاکھ' تھوڑا کم یا زیادہ۔ یا پھر ٹائم بم۔ میں نے دیکھا نہیں۔"

جوزف نے جیپ سے چھلانگ مار کے کہا "ابھی ا...و۔ باتوں کا ٹائم نہیں ہے۔"

ایک ایک کرکے ہم سب ہیلی کاپٹر میں سوار ہوگئے۔ اس کے انجن نے اسٹارٹ لیا تو میرا سانس رک گیا۔ سسپنس اور اعصابی کشیدگی نے سب کو اپنی گرفت میں یوں جکڑ رکھا تھا کہ ہمارے جسم اور ذہن مفلوج ہورہے تھے۔ بالآخر ہم پاکستان جارہے تھے لیکن بے یقینی کی دھند ابھی تک باقی تھی۔ نامعلوم آوازوں کی سرگوشی ہر سمت سے صدا دیتی تھی۔ بھاگو' بھاگو' موت تعاقب میں ہے۔ اجل وہ شکاری ہے جو نظر نہیں آتا۔ اندھیرے میں پرواز کرکے تم کہاں تک جاسکتے ہو؟ وہ تو ہر جگہ ہے۔ ہر سانس کے پیچھے اور دل کی ہر دھڑکن کے ساتھ ہے....

ہیلی کاپٹر نے پرواز کی۔ میں نے رابعہ کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ اس کا ہاتھ برف کی طرح سرد ہورہا تھا اور وہ بری طرح کانپ رہی تھی۔ ہم سب ہیلی کاپٹر کے فرش پر ایک دوسرے کے ساتھ ملے بیٹھے تھے اور بار بار ایک دوسرے پر گر جاتے تھے۔

بالآخر جوزف نے ایک قہقہہ مارا۔ ہم سب اچھل پڑے۔

"ابھی کیا ہوگیا سالا تم کو؟ اتنا کاہے کو ڈرتا ہے" اس نے منہ

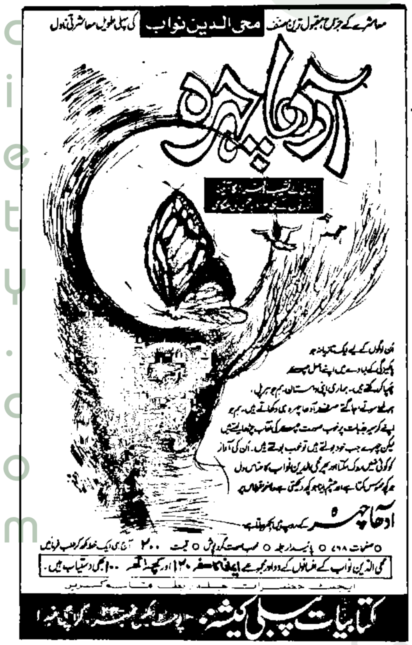

سے شراب کی بوتل لگائی "سمجھو تم اپنا کنٹری میں پہنچ گیا۔"

میں نے کہا "واقعی؟" تو میرے حلق سے عجیب، مضحکہ خیز سی آواز نکلی جو میری اپنی آواز نہیں لگتی تھی۔

"ایک گھنٹا، ساٹھ منٹ، چھتیس سو سیکنڈ۔" جوزف بولا "ہر سیکنڈ کو کاؤنٹ کرلو مگر اس سے پہلے ہمارا حصہ کاؤنٹ کرو۔ ہم کو ٹین پر سنٹ دے دو۔"

میں نے کہا "کیوں نہیں۔ رابعہ، بریف کیس میں سے پچاس ہزار نکال کے مسٹر جوزف کے لئے رکھ دو۔"

رابعہ نے بریف کیس کھولا۔ اس میں پاکستانی کرنسی تھی۔ یہ سو سو کے نئے نوٹ تھے۔ اس نے پانچ گڈیاں نکال لیں۔ جوزف نے ان کو کاک پٹ کی ایک پاکٹ میں ڈال دیا۔

اچانک غالب نے ایک انتہائی جذباتی مگر غلط حرکت کی۔ اس نے چیخ کر کہا "نازو! ہم گھر پہنچ گئے" اور ایک دم نازو کو اپنی طرف کھینچ کے چوم لیا "میری جان! ہم اپنے پاکستان....."

نازو نے سہم کر چیخ ماری اور غالب کو دور دھکیلا "تم..... تم پاگل ہو رہے ہو کیا؟" اس کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا تھا۔

"ہاں..... ہاں، میں پاگل ہو گیا ہوں" غالب نے زور زور سے ہنسنا شروع کیا اور مجھ سے لپٹ گیا "سکندر..... سکندرِ اعظم، چیف کے ٹوکی دم، تیری ایسی کی تیسی..."

میں نے اسے مکا مارا "الو کے پٹھے۔ مرزا غالب کی اولاد۔"

پھر ہم سب چیخ چیخ کے ہنسنے لگے اور ایک دوسرے سے گلے ملنے لگے۔ ہم واقعی پاکستان پہنچ گئے تھے۔ اپنے وطن، اپنے شہر۔ اپنے شہر کی گلیوں اور اپنے گھروں کا خواب ایک حقیقت بن کر سامنے آرہا تھا۔

جب جوزف نے کہا "او بابا! کیسا شور کرتا ہے تم سب لوگ۔ اپن کو بھی پاگل کرے گا کیا۔ تیاری کرو۔ ہم ابھی پاکستان کا بارڈر کراس کیا ہے۔"

میں نے اور غالب نے پھر چلا کے کہا "پاکستان۔" اور ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ ہم دونوں کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ رابعہ بھی رو رہی تھی، نازو بھی رو رہی تھی۔ بے خودی اور دیوانگی کے عالم میں رابعہ کے ساتھ میں نے بھی وہی جذباتی حرکت کی جو غالب نے کی تھی اور کمال یہ ہے کہ رابعہ نے مجھے کچھ بھی نہیں کہا۔ اس وقت ہم میں سے کسی کو بھی اپنا ہوش نہ تھا۔

"چلو اب تیاری پکڑو۔ ہم پچاس کلومیٹر اندر ہے۔ ادھر ہم ڈراپ کرے گا تم کو۔"

"ڈراپ کرے گا! کیسے؟" میں نے کہا "پیراشوٹ سے؟"

جوزف نے قہقہہ مارا "پیراشوٹ..... دیکھو ادھر ایک رسی ہے، اس کو پکڑو اور لٹک جاؤ۔ ہم ہیلی کاپٹر کو نیچے لے جائے گا۔"

"کیا مطلب، تم جہاز کو اتارو گے نہیں؟" میں نے چلا کے کہا۔

"نہیں۔ ہم بہت نیچے جائے گا۔ ... رسی ہے۔ تم تھوڑا چھلانگ مارے گا..." وہ بولا "کم آن، ڈرنے کا بات نہیں۔"

میں نے باہر جھانک کے دیکھا مگر اندھیرے میں مجھے کچھ نظر نہیں آیا۔ غالب نے ہیلی کاپٹر سے رسی نیچے لٹکا دی۔

"چلو..... جلدی....." جوزف چلایا "ہمت کرو تھوڑا۔"

غالب رسی پر پھسلتا ہوا اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ میں نے سرد، تاریک رات کی ہوا کو جسم پر آرے کی طرح محسوس کیا اور جب رسی کا تناؤ ختم ہوا تو سمجھ گیا کہ غالب لینڈ کر چکا ہے۔ کہاں اور کس حال میں، یہ ہم جان ہی نہیں سکتے تھے۔

"پہلے میں جاؤں یا تم جاؤ گی؟" میں نے کہا۔

نازو کا چہرہ خوف سے زرد پڑ گیا تھا مگر اس نے کہا "میں جاؤں گی، خدا حافظ۔ زندگی رہی تو پھر ملیں گے۔"

اب میں نے رابعہ کی طرف دیکھا۔ نیچے پہاڑ تھے اور درخت تھے یا ہموار میدان تھا۔ برف تھی یا چٹانیں تھیں، میں کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا اور مجھے یہ اندازہ بھی نہیں تھا کہ جہاں رسی ختم ہو گی وہاں سے زمین تک کتنا فاصلہ ہو گا۔

"میں..... میں جاؤں؟" رابعہ نے بمشکل تمام کہا اور پھر مجھ سے لپٹ گئی "سکندر! مجھے ڈر لگتا ہے۔"

میں نے اسے تسلی دی "میں تمہارے ساتھ ہوں۔ چلو ہم ایک ساتھ اترتے ہیں۔ تھوڑا سا آگے پیچھے۔ رسی کو مضبوطی سے پکڑے رکھنا اور نیچے مت دیکھنا۔ آنکھیں بند رکھنا۔ چلو شاباش۔"

رابعہ نے رسی کو پکڑا "تم..... آرہے ہو نا..."

اسی وقت ہیلی کاپٹر کو ایک جھٹکا لگا۔ جوزف نے چیخ کر کہا، "سالا کیا رومیو جیولیٹ کا ماٹک ڈائیلاگ بولتا پڑا ہے۔"

انجن نے دوسری ہچکی لی اور بند ہو گیا۔ جیسے آدمی کا دل چلتے چلتے ایک دم رک جائے۔ جوزف نے گالی دے کر اسے پھر اسٹارٹ کیا اور تھوڑا سا آگے لے گیا۔ ہیلی کاپٹر اوپر اٹھا اور پھر نیچے آیا۔ جوزف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے نیچے دیکھ رہا تھا اور گالیاں بک رہا تھا۔

"ابھی ٹھہرو، ابھی ہم بولے گا تو تم کودے گا۔"

رسی اندھیرے میں کسی لمبے، کالے سانپ کی طرح لہرا رہی تھی۔ میں نے رابعہ کو ایک ہاتھ سے سمیٹ کر اپنے ساتھ لگا رکھا تھا مگر وہ خزاں کی ہوا کا مقابلہ کرنے والے کمزور درخت کی طرح کانپ رہی تھی۔ ہیلی کاپٹر نہ جانے کدھر جا رہا تھا۔ غالب اور نازو بہت پیچھے رہ گئے تھے مگر مجھے یقین تھا کہ ہم انہیں تلاش کرلیں گے۔

ہم جوزف کے اشارے کے منتظر تھے، ہیلی کاپٹر نیچے ہو آگیا اور جوزف نے سر گھما کے ہمیں دیکھا۔ اسی وقت ایک زبردست دھماکا ہوا۔

پائلٹ نے چیخ کر گالی دی۔ ہیلی کاپٹر ایک دم کٹی پتنگ کی طرح بے قابو ہو کے فضا میں ڈولنے لگا۔

"آؤٹ... گیٹ آؤٹ..." جوزف دیوانوں کی طرح چلا کے "وائی یو وانٹ ٹو ڈائی ود می؟" (تم میرے ساتھ کیوں مرنا چاہتے ؟)

میں نے رابعہ کو کھلے دروازے کی طرف دھکیلا۔

"جمپ..... جمپ....." اس نے رابعہ کو ایک گندی گالی دی۔

ہیلی کاپٹر ایک دم اوپر اٹھا، پھر نیچے آیا اور پھر یوں گھوما جیسے ... گھومنے والی کرسی کو ہاتھ مار کے گھما دے۔ یہ دستِ اجل تھا ... نے اچانک ہیلی کاپٹر کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ ابھی تک ... نے وہ شعلہ نہیں دیکھا تھا جو ہیلی کاپٹر کی دُم پر بھڑک اٹھا تھا۔

اب مجھے صورتِ حال کی سنگینی کا احساس ہوا۔ ہیلی کاپٹر کسی ... لمحے گر کے تباہ ہو سکتا تھا۔ اس کے پچھلے حصے میں لگی ہوئی آگ ... نہیں جا سکتی تھی۔ رابعہ رسی کو تھام کے اتر چکی تھی۔

میں نے دروازے میں سے کہا "جوزف! یہ کیا ہو گیا اچانک"

اس نے ایک قہقہہ مارا جو بے جان، کھوکھلا اور موت کے ... سے اتنا ہی بھیانک محسوس ہوتا تھا جتنی پھانسی کے کنویں ... سنائی دینے والی کسی کی آخری چیخ۔

"ڈیتھ ایسے ہی پکڑتا ہے بابا۔" اس نے ہیلی کاپٹر کو قابو میں ... کھنے کی دیوانہ وار جدوجہد کو جاری رکھا "آئی ہیو بین ہٹ" (مجھے ... نشانہ بنا لیا گیا ہے۔)

"کس نے ہٹ کیا ہے؟" میں نے نیچے جھانک کر رابعہ کو رسی پر پھسلتا دیکھا۔

"یہ تمہارا پاکستانی گن تھا۔" وہ پھر ہنسا "یو سی، جوزف انڈین ... سالا۔ پاکستان میں آکے مرا۔ اینڈ یو نو، آئی ایم ناٹ اے شہید ... ون" (میں شہید بھی نہیں کہلاؤں گا۔)

میں نے کودنے سے پہلے آخری بار کہا "تم کود کیوں نہیں ... اتے؟"

"یو باسٹرڈ، تم جانتے ہو میں آخری وقت میں بزدل بن جاؤں، ... اپنے اس خوب صورت پرندے کو اکیلا جل جانے دوں؟ نو۔ وی ... ائی ٹو گیدر (ہم ایک ساتھ جان دیں گے) ناؤ جمپ۔ گیٹ ... سٹ۔"

میرے ہاتھوں نے رسی کو تھاما، دوسرے لمحے میں فضا کی گہرائی ... میں پھسلنے لگا۔ رسی کسی سانپ کی طرح بل کھا رہی تھی۔ ہیلی کاپٹر کی ... حرکت کے ساتھ ساتھ اس کا رخ بدل جاتا تھا۔ رسی کے آخری ... کنارے پر رابعہ ابھی تک آویزاں تھی۔ اوپر آگ نے ہیلی کاپٹر کی ... دم کو نگل لیا تھا۔ سرد، منجمد کردینے والی رات میں درختوں کے پتے ... دینے والی خزاں کی پاگل ہوا کا رقص جاری تھا۔ یہ ہوا شعلوں کو ... آگے دھکیل رہی تھی، ہیلی کاپٹر کے اس حصے کی طرف جہاں ایک ... پاگل شرابی پائلٹ اپنی جان اور پچاس ہزار نقد کی پروا کیے بغیر

موت کو ہنستے ہنستے گلے لگانے پر تیار بیٹھا تھا۔

عین رابعہ کے سر پر پہنچ کے میں نے زمین کو اچانک اوپر آتے دیکھا اور سمجھ گیا کہ ہیلی کاپٹر تیزی سے نیچے آرہا ہے۔

"رابعہ، رسی کو چھوڑ دو۔" میں نے چیخ کر کہا۔

رابعہ نے سر اٹھا کے مجھے دیکھا مگر رسی کو نہیں چھوڑا۔

اس روز پہلی بار میں نے رابعہ کو وہ گالیاں دیں جن کو یاد کر کے میں بعد میں اکثر شرمندہ اور حیران ہوا کہ آخر ایسے فحش الفاظ میری زبان سے اس عورت کے لیے کیسے ادا ہوئے؟ کیا یہ موت کا خوف تھا یا زندگی کی محبت تھی؟ رابعہ کے ساتھ مرنے جینے کی قسم کھانا آسان تھا مگر وقت آیا تو مجھے پتا چلا کہ میں اس کے ساتھ صرف جینا چاہتا تھا۔

رابعہ نے رسی کو چھوڑ دیا۔ تاریکی میں اس کا سفید سایہ کسی پاکیزہ آسمانی روح، کسی بادل کے بادبان یا کسی امن کی فاختہ کے پھیلے پروں کی طرح دکھائی دیا۔

نیچے زمین، میرے وطن کی زمین برف کی دبیز چادر اوڑھے چپ لیٹی تھی۔ ماں کی مہربان آغوش مجھے بلا رہی تھی۔ آؤ میرے بچو، میری عزت کے رکھوالو۔ آؤ اور سو جاؤ۔ دیکھو میں نے تمہارے آرام کے لیے کیسا بے داغ، سفید بستر بچھا دیا ہے۔ میرے سکندرِ اعظم، تم اور تمہاری رابعہ کتنے حسین لگ رہے ہو، ہنس کے جوڑے کی طرح پرواز کرتے ہوئے۔

میں نے رابعہ کو برف میں غائب ہوتے دیکھا۔ دوسرے لمحے میں خود اس برف میں اتر گیا جو دھنکی ہوئی روئی کی طرح تاحدِ نگاہ پھیلی ہوئی تھی۔ درد کی ایک لہر نے میری ٹانگ کو کاٹ دیا۔ تاریکی نے مجھ پر یلغار کی مگر اندھیرے کے سمندر میں ڈوبنے سے پہلے میری آنکھوں نے ایک شعلے کو رقصاں دیکھا۔ جیسے برق فروزاں ہو سرِ وادیٔ سینا۔ آخری آواز کیا تھی؟ کوئی دھماکا ہوا تھا۔ شاید زمین پھٹ گئی تھی یا آسمان گر گیا تھا۔ یہ کون ہنسا تھا؟ یو سی، جوزف بڑا لالچی اور کمینہ تھا، شرابی اور عیاش تھا۔ مگر وہ بزدل نہیں تھا۔ اس نے موت کو شکست دی۔ اگر وہ چاہتا تو ایک بٹن دبا کے خود کو ایجیکٹ (EJECT) کر سکتا تھا مگر اس نے رُسوا ہو کے جینے سے انکار کر دیا۔ وہ مر کے شہیدوں میں نام نہیں لکھوا سکتا تھا مگر وہ زندہ پکڑا جاتا تو اس پر ایک ملک میں جاسوسی کا اور پھر دوسرے ملک میں غداری کا الزام ضرور آتا۔ وہ بے گھر اور بے وطن ہوتا اور آخر کار اسے سزائے موت سنائی جاتی۔ چنانچہ اس نے باعزت موت کو ہنستے ہنستے گلے لگا لیا۔ رام ناتھ اپنے لاکھوں کے ساتھ بستر میں لیٹ کے مر گیا تو کیا اور جوزف اپنے پچاس ہزار کے ساتھ جل کر مر گیا تو کیا۔ جینے کی طرح مرنے کے بھی تو اپنے اپنے انداز ہوتے ہیں۔

نہ جانے کتنی صدیاں برف میں مدفون رہنے کے بعد میں نے آنکھیں کھول کے دنیا کو دیکھا تو نیلے آسمان کی شوخ چمک نے میری نگاہوں کو خیرہ کر دیا۔ میرے کپڑے بھیگے ہوئے تھے اور میرا جسم

ٹھوس برف کے اعضاً سے بنا ہوا لگتا تھا۔ میں برف کی ایک سل تھا یا مجسمہ تھا جو اب دھوپ کی تمازت سے پگھل رہا تھا۔

میں نے سر کو گھما کے دائیں اور بائیں جانب دیکھنے کی کوشش کی اور اس چھوٹی سی کامیابی نے وہی کام کیا جو ایک چھوٹا سا سوئچ کرتا ہے، جس سے کسی فانوس کے سارے چراغ روشن ہو جائیں۔ یا وہ لیور کرتا ہے جس کو دبانے سے دھماکا ہوتا ہے اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کے بکھر جاتے ہیں، دیو ہیکل مشینوں کے سارے پرزے متحرک ہو جاتے ہیں اور خلائی سفر پر روانہ ہونے والا راکٹ چاند اور مریخ کے راستے پر چل پڑتا ہے۔

میں ایک دم اٹھ بیٹھا۔ میری ٹانگ میں پھر درد نے انگڑائی لی لیکن اب یہ درد میرے احساس کو شکست دینے سے قاصر تھا۔ زندگی کا یقین قوی تر تھا اور ہر خوف کے خلاف عزم کی ڈھال بن گیا تھا۔

پہلے برف سے منعکس ہونے والی دھوپ کی اجلی روشنی نے مجھے چند لمحوں کے لیے اندھا کر دیا پھر آہستہ آہستہ اردگرد کا منظر میری آنکھوں پر عیاں ہونے لگا۔

مجھ سے پچاس قدم کے فاصلے پر رابعہ اوندھی پڑی تھی۔ اس کے اوپر کی برف بھی پگھل کر بہہ گئی تھی مگر اس کے چاروں طرف پرانی، ٹھوس برف پر دھوپ کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

اپنے ہاتھوں کو برف پر ٹکا کے اور ایک پاؤں پر سارا زور ڈال کے میں کھڑا ہو گیا۔ میری دوسری ٹانگ میں درد کی ٹیس اٹھی۔ میں نے اس کو دبا کے اور ہلا کے دیکھا۔ پنڈلی سے ٹخنے تک کا حصہ نیلا ہو رہا تھا اور سوج گیا تھا لیکن خوشی کی بات یہ تھی کہ ٹانگ کی کوئی ہڈی ٹوٹی نہیں تھی۔ درد کو برداشت کرتے ہوئے میں چل سکتا تھا۔

لنگڑاتے ہوئے میں نے وہ پچاس قدم کا فاصلہ دس منٹ میں طے کیا۔ میرے قدموں کے نیچے سب سے بڑا سہارا میرے وطن کی زمین تھی جو حوصلہ دیتی تھی اور اعتماد عطا کرتی تھی کہ یہاں میں محفوظ ہوں، میرے دشمن تعاقب میں نہیں ہیں اور اگر میں چاہوں تو زندہ بھی رہ سکتا ہوں اور وہی زندگی ایک تعبیر بن سکتی ہے جو آج تک میرا خواب تھی۔

میری نگاہیں دور دور تک برف دیکھ رہی تھیں۔ درخت اگر جاندار ہوتے ہیں تو بلاشبہ وہاں زندگی تھی مگر انسان کا وجود صرف میری ذات تک محدود تھا یا رابعہ اگر زندہ تھی تو ہم عرش کی بلندی سے فرش کی پستی میں پہنچنے والے آدم و حوا کی طرح اس کائنات کی ویرانی میں نسلِ انسانی کی علامت تھے۔ ہمارے سوا تاحدِ نظر کسی ذی روح کا وجود نہ تھا۔

تقریباً دو فرلانگ کے فاصلے پر اس برف کی چادر پر دوسرا داغ ایک ہیلی کاپٹر کا جلا ہوا سیاہ ڈھانچہ تھا جس کا نصف حصہ ٹھوس برف کو توڑتا ہوا زمین بوس ہو گیا تھا۔ جو حصہ برف سے اوپر تھا اس کی آگ بھی سرد پڑ چکی تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ہیلی کاپٹر کو گرے ہوئے کافی وقت گزر چکا ہے ورنہ اس کے م تھوڑا بہت دھواں بھی اٹھتا نظر آتا۔ فولادی ڈھانچے کے اند ایک انسانی ڈھانچہ بھی بکھرا پڑا تھا۔ کچھ ہڈیاں، کچھ گوشت ریشے اور کچھ خون کے داغ جن تک آگ نہ پہنچ سکی تھی۔ کیا ہے؟ عناصر میں ظہورِ ترتیب۔ موت کیا ہے؟ انہی ا پریشاں ہونا۔

میں نے بڑی مشکل سے جھک کر رابعہ کو سیدھا کیا۔ جسم برف سے زیادہ ٹھنڈا تھا مگر وہ زندہ تھی۔ جب میں نے ا ایک ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں دبا کر رگڑا تو حرارت کے آثا ہوئے۔ چلنے سے میرا اپنا جسم کچھ گرمی اور توانائی حاصل کر دھوپ کی تمازت نے اور اس سے زیادہ زندہ رہنے کی خواہ مجھے اتنا حوصلہ عطا کر دیا تھا کہ آخری سانس تک جاری رہنے سفر میں رابعہ کو اپنے ساتھ لے کر چل سکوں۔

میں نے اسے تھوڑا سا اوپر اٹھایا اور اس کا سر اپنے شانے پر رکھ لیا۔ وہ بے ہوشی میں بیٹھی رہی لیکن برف کی سے دور ہو کے اس کا جسم میرے جسم کی حرارت کو کر سکتا تھا۔ سامنے سے وہ دھوپ لے رہی تھی اور میں، دیکھ کہ اس کا چہرہ جو پہلے لاش کی طرح سفید تھا، رفتہ رفتہ حرارت سے زندگی پانے لگا تھا۔

ایک مشینی انداز میں رابعہ کے ہاتھوں اور پیروں ہوئے اور حرکت دیتے ہوئے میں نے یہ بھی دیکھا کہ چند چوٹوں کے سوا اس کے اعضا سلامت ہیں۔ یہاں کسی قسم امداد کا تصور بھی محال تھا اور کسی دوا کی آرزو کرنا اس فرمائش سے کم نہ تھا جو کھیلنے کے لیے چاند کی مٹی کا کھلونا مانگ

یہ عجیب بات تھی کہ اس وقت مجھے رابعہ کے سوا کسی کا آیا بھی تو بس خیالِ خوابِ فردا کی طرح۔ مجھے یاد تھا کہ حاد ہوا تھا اور حادثے سے پہلے کیا ہوا تھا۔ نازو کے بعد محسن ا اور وہ بھی برف کے اس صحرا کی ویرانی میں کہیں موجود تھے امید کے ساتھ زندہ کہ ہم آخر کار انہیں تلاش کر لیں گے اور انہیں بچانے آجائے گا۔ ممکن ہے ہماری طرح وہ بھی کس کا تعین کر رہے ہوں، کوئی سراغ تلاش کر رہے ہوں اور ا آسرے پر محوِ سفر ہوں یا کچھ بھی نہ ہو۔ نازو اور غالب وق کتبے پر لکھے ہوئے دو نام رہ گئے ہوں۔ یادوں کے مدفن میں کی دو نشانیاں۔ ان کے جسم بھی ایک دوسرے سے اتنے ہوں جتنی دور وہ زندگی سے تھے۔

لیکن یہ خیال مجھے رابعہ کو پھر زندگی کی طرف لاتے ہو۔ خواہشوں، دعاؤں اور کوششوں کے ساتھ نہیں آیا۔ یہ سب نے بہت بعد میں سوچا۔ اس وقت تو میں رابعہ کو پکارتا رہا اور آہستہ اس کے رخساروں پر نمودار ہونے والی سرخی کو یوں د جیسے صبح کا انتظار کرنے والا افق کے کناروں پر شفق کو دیکھتا

مجھے قطعی اندازہ نہ تھا کہ میری کوشش کب بار آور ہو گی اور میں نے یہ بھی نہیں سوچا کہ رابعہ کے ہوش میں آنے کے بعد میں کیا کروں گا۔ پوری یکسوئی کے ساتھ میں اس کے وجود میں اتنی حرارت اور توانائی بھرتا رہا جتنی اسے ایک بار آنکھیں کھول کر میرا نام پکارنے کے لیے درکار تھی۔

مجھے کسی حرفِ دعا کی ضرورت نہیں تھی۔ زبان کا ذریعۂ اظہار انسانوں کے لیے ہے۔ خدا تو دل کی آواز سنتا ہے اور میرے دل کی ہر دھڑکن ایک دعا تھی جو مسلسل عرش کے دروازے پر دستک دے رہی تھی۔ اس کے انصاف کو پکار رہی تھی جو رحمان ہے اور رحیم ہے۔ کہ مجھے رابعہ بھی چاہیے ورنہ یہ زندگی بھی نہیں چاہیے۔ کیونکہ میں نے اس سے وہ پیار کیا ہے جس کے دامن پر کوئی داغ نہیں، جس پر مجھے کوئی ندامت نہیں کیونکہ اس پر کسی لمحے کبھی ہوس کا الزام نہیں آیا۔

دوپہر کا سورج سر پر آیا تو رابعہ نے آنکھیں کھول کے اور کراہ کے کہا "سکندر! تم میرے پاس ہو نا۔"

اور میں نے اسے چوم کے کہا "میں کب تم سے دور تھا میری جان۔" رابعہ نے ایک گہری سکون کی سانس لی اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔

میں نے کہا "رابعہ اٹھو، آؤ اپنے گھر چلیں۔"

رابعہ نے پھر آنکھیں کھولیں "یہ... یہ اپنا گھر نہیں ہے کیا؟"

میں نے کہا "یہ اپنا پاکستان ہے۔ پاکستان میں ایک شہر ہے لاہور۔ وہ کہتے ہیں نا، جنے لہور نئیں ویکھیا او جمیا ای نئیں۔"

"لاہور" اس نے زیرِ لب کہا "ہاں۔ اور لاہور میں ماڈل ٹاؤن ہے۔ ہے نا؟ وزیر خان نے وہیں بنایا تھا ایک گھر ہمارے لیے۔ میں وہاں.. وہاں مرنا چاہتی تھی۔ مجھے وہاں لے چلو سکندر۔"

میں نے اس کے آنسوؤں کو پی لیا "میں تم کو وہیں لے جاؤں گا رابعہ مگر مرنے کے لیے نہیں، جینے کے لیے۔ میرے ساتھ جیو گی تم... تم نے وعدہ کیا تھا۔ اٹھو، ہمت سے کام لو۔ تمہیں کچھ نہیں ہوا ہے۔ تم اٹھ کے چل سکتی ہو نا۔ میں سہارا دوں گا تمہیں۔ شاباش، چلو اٹھو۔"

میں نے اسے سہارا دے کر کھڑا کرنے کی کوشش میں اپنے جسم کی ساری توانائی صرف کر دی۔ آخر کار وہ کھڑی ہو گئی اور لمبے لمبے سانس لینے لگی۔

میرا سانس پھول گیا تھا۔ یہ گلگت یا چترال کا علاقہ تھا اور ہم بہت بلندی پر تھے جہاں آکسیجن کم ہو جاتی ہے۔

میں نے کہا "دیکھو رابعہ! ہم کو اس برف کے صحرا کو عبور کر کے کسی آبادی تک پہنچنا ہے رات ہونے سے پہلے۔"

رابعہ نے خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھا "ہمیں پہلے ان کو تلاش کرنا ہے سکندر، نازو اور غالب کو۔"

"مجھے کوئی اندازہ نہیں کہ وہ کہاں کودے تھے لیکن ہم انہیں ضرور تلاش کریں گے۔ تم چل سکتی ہو نا؟ کوئی ہڈی تو نہیں ٹوٹی ہے؟"

رابعہ نے باری باری دونوں ہاتھ ہلائے پھر دونوں پیروں کو حرکت دی "نہیں، مگر چوٹیں آئی ہیں۔ میں نہ جانے کتنی بلندی سے گری تھی۔ بس برف نے بچا لیا۔ نرم روئی کی طرح برف کا ڈھیر تھا۔ اب تو پگھل کے بہہ گیا۔"

میں نے کہا "تمہارے کپڑے گیلے ہیں، سوکھ جائیں گے کچھ دیر میں۔ میں تو ڈر رہا تھا کہ تمہیں نمونیہ نہ ہو جائے۔"

وہ آہستہ سے مسکرائی "تمہارے ساتھ مجھے کچھ نہیں ہو سکتا۔ وہ...... وہ کیا ہے؟ ہیلی کاپٹر۔"

"ہاں۔ پہلے ادھر ہی چلتے ہیں۔" میں نے کہا اور رابعہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ہم آہستہ آہستہ قدم بڑھانے لگے۔

"یہ حادثہ کب ہوا تھا سکندر۔ کل رات یا پرسوں رات؟"

"میرا خیال ہے کل رات۔ پرسوں رات کی بات ہوتی تو ہم زندہ کیسے رہتے۔" میں نے کہا۔

"اس وقت کیا بجا ہو گا؟"

"بارہ، ساڑھے بارہ۔"

"گھڑی نہیں ہے کیا؟" رابعہ بولی۔

"ہے مگر دو بج کے دس منٹ پر رک گئی ہے۔" میں نے کہا، "حادثے کا یہی وقت ہو گا۔"

"یعنی دس گھنٹے ہو گئے۔ کیا یہ معجزہ نہیں ہے کہ ہم زندہ ہیں۔ اتنی دیر برف میں دفن رہ کے کون زندہ رہتا ہے۔"

"ہاں۔ ہم بہت خوش قسمت لوگ ہیں۔ جوزف اتنا خوش قسمت نہیں تھا۔"

"کیا وہ مر گیا؟"

میں نے ہیلی کاپٹر کے شکستہ اور سوختہ ڈھانچے کی طرف دیکھ کر آہ بھری "ہاں رابعہ! پاگل آدمی تھا وہ، بالکل پاگل۔ جیسے جیا ویسے ہی مر گیا اپنی مرضی سے۔ میرے کہنے سے وہ نہیں مانا۔"

"تم نے کیا کہا تھا؟"

"وہ ہیلی کاپٹر سے نکل سکتا تھا۔ بس ایک بٹن دباتا اور سیٹ خود اسے فضا میں اچھال دیتی۔ پیراشوٹ خود بخود کھل جاتا اور وہ آرام سے اتر جاتا۔"

"پھر اس نے کیوں نہیں مانی تمہاری بات؟"

"میرا خیال ہے، وہ ڈرتا تھا کہ پکڑا جائے گا تو دھوبی کا کتا ہو جائے گا۔ یہاں اس پر مقدمہ چلے گا کہ وہ غیر قانونی طور پر پاکستان کی فضائی حدود میں داخل ہوا، جاسوسی کرنے کے لیے۔ اسے نیچے سے کسی نے نشانہ بنایا تھا۔"

رابعہ نے حیرانی سے کہا "کس نے؟"

"غالباً سرحد کی حفاظت کرنے والوں نے۔ وہ کبھی غافل نہیں ہوتے۔ پہلے اتفاق رہا یا خوش قسمتی کہ وہ آتا تھا اور نکل جاتا تھا۔

ہر بار خوش قسمتی ساتھ نہیں دیتی۔"

"ہاں۔ اس بار شامت اعمال بن کے ہم جو ساتھ ہو گئے تھے۔ بڑے سبز قدم ہیں ہم لوگ۔" رابعہ نے احساس جرم کے ساتھ کہا "جس نے ہمارا ساتھ دیا' ہماری مدد کی' وہی مارا گیا۔"

"ایسا مت سوچو۔"

"مجھ سے اب چلا نہیں جاتا۔" رابعہ نے کہا "میرے بازو میں اور اس طرف پسلیوں میں... اور اس ٹانگ میں گھٹنے سے اوپر درد ہے۔"

میں نے کہا "گرنے سے چوٹ تو آتی ہے۔ یہ دیکھو کہ کوئی فریکچر ہوتا تو ہم ہل بھی نہ پاتے۔ وہیں پڑے پڑے سردی اور بھوک سے اکڑ کے مرجاتے۔"

"اب بھی کیا ہوگا۔" وہ مایوسی سے بولی۔

میں نے اسے کمر میں ہاتھ ڈال کے سہارا دے رکھا تھا اور خود بھی اس کے سہارے پر لنگڑاتا ہوا چل رہا تھا۔ ہمارے آس پاس لمبے تنوں والے پہاڑی درخت تھے جن کی خزاں رسیدہ' بے برگ شاخیں ویرانی کے تاثر کو مزید گہرا کرتی تھیں۔ بہت بلندی پر چیل یا عقاب جیسے پرندے سیاہ دھبوں کی طرح نمودار ہو گئے تھے۔ اچانک برف کی چٹان کے پیچھے سے ایک لومڑی نمودار ہوئی۔ اس نے غور سے ہمیں دیکھا اور دبے پاؤں لوٹ گئی۔ پھر ایک برفانی گلہری نے برف کے بِل سے سر نکالا۔

رابعہ نے سہم کے کہا "یہاں جنگلی جانور بھی ہوں گے۔"

میں نے کہا "ڈرو نہیں۔ یہ کسی کو کچھ نہیں کہتے جب تک بھوکے نہ ہوں۔"

"یہاں ان کو کھانے کے لیے کیا ملتا ہوگا؟"

"جس کا رزق جہاں ہو اسے مل جاتا ہے۔" میں نے کوئی اطمینان بخش جواب نہ پا کے ایک فلسفیانہ خیال پیش کیا۔

"ہمیں کیا ملے گا یہاں؟"

"دیکھو' ہیلی کاپٹر ایسے ہی حادثے کا شکار نہیں ہوا تھا۔ اسے زمین پر سے نشانہ بنایا گیا تھا۔ اس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟ یہی کہ اس علاقے میں بھی ہماری سرحدوں کے محافظ موجود ہیں۔ وہ ضرور گرنے والے ہیلی کاپٹر کا ملبہ تلاش کرتے پھر رہے ہوں گے۔ اگر ہم اس جگہ سے دور نہ گئے تو جب وہ یہاں آئیں گے..."

"کب آئیں گے؟ جب ہم بھوک اور سردی سے اکڑ کے مرچکے ہوں گے۔" رابعہ پر سخت قنوطیت طاری تھی۔

"نہیں' وہ بہت جلد آئیں گے۔" میں نے کہا۔

ہیلی کاپٹر کے قریب پہنچ کر میں نے رابعہ کو ایک خشک چٹان کے ہموار حصے پر بٹھا دیا۔ برف پگھل چکی تھی اور اب چٹان سے ایک توانائی بخش حرارت پھوٹ رہی تھی۔

میں نے کہا "تم یہاں آرام کرو' میں ہیلی کاپٹر کے اندر دیکھتا ہوں۔"

"اندر کیا دیکھو گے؟ جوزف کی جلی ہوئی لاش۔ مت... اسے۔" رابعہ بولی۔

میں نے کہا "ممکن ہے کچھ کھانے کو مل جائے یا پینے کو..."

"پینے کو اس کے پاس ایک ہی چیز تھی۔" رابعہ مسکرائی ... گے؟"

میں نے کہا "وہ میں تمہاری آنکھوں سے پی لیتا ہوں۔"

ہیلی کاپٹر کا ڈھانچہ ہر طرف سے ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ اس... ٹوٹے ہوئے ٹکڑے دور دور تک بکھرے پڑے تھے اور برف... جانے کے بعد دھوپ میں چمک رہے تھے۔ دروازہ برف کے... دھنسا ہوا تھا مگر مجھے اندر داخل ہونے کے لیے کسی درواز... ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی۔ حادثے کے بعد ہیلی کاپٹر کا در... حصہ یوں کھل گیا تھا جیسے کسی نے چھری سے اس کو چیر دیا ہو۔

میں دھوئیں سے سیاہ ڈھانچے کے اوپر چڑھا۔ یہ بہت م... اور خطرناک کام تھا۔ دھات کے نوکیلے اور تیز کنارے ہر زا... پر مڑ چکے تھے۔ میرا پیر کہیں بھی پھسل جاتا تو وہ نوکیلے کنارے م... جسم کے بخیے ادھیڑ دیتے۔

جوزف اندر کہیں نہ تھا۔ اس کے اعضا جسم سے الگ اندر ہی جل گئے تھے۔ اس کا دھڑ پائلٹ کی سیٹ پر رکھا رہ... کیونکہ وہ بیلٹ سے بندھا ہوا تھا۔ دھڑ بھی جلی ہوئی شکستہ ہڈ... ایک پنجر تھا جس کے نہ ہاتھ تھے' نہ پاؤں۔ سر کی جگہ ایک پُرہیبت گولا سا نظر آرہا تھا۔

براہ راست اندر آنے والی دھوپ نے اس بھیانک من... تمام تفصیلات کو روشن اور عیاں کر دیا تھا۔ میں نے تھوڑی د... کے بعد اس کا ایک ہاتھ دریافت کیا جو ٹین کے ایک ٹکڑے... نیچے روست ہو گیا تھا مگر سالم تھا۔ اس کے کپڑے اور کاغذ... سب جل گئے تھے۔ پھر وہ کاغذی نوٹ کیسے سلامت رہ سکتے تھ... کی خاطر اس نے زندگی کو داؤ پر لگایا تھا۔

میں نے ملبے کو کھنگالا تو مجھے وہ آدھا جلا ہوا بیگ مل گیا... میں ہم نے کھانے پینے کا سامان بھرا تھا۔ بسکٹ جل کر کوئلہ... تھے۔ مکھن اور پنیر پگھل کر بہہ گئے تھے لیکن کچھ ابلے... انڈے بیگ کے نیچے سے صحیح حالت میں نکل آئے۔ میں نے جیب میں ڈال لیا اور چند بسکٹ بھی تلاش کر لیے جو دھوئیں... کالے ہو رہے تھے مگر صاف کر کے کھائے جاسکتے تھے۔

مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ کسی بیگ میں کافی کے تھرماس... ایسے خوف ناک تصادم میں کسی تھرمس فلاسک کے اندر... نازک بوتل کا سلامت رہ جانا بعید از قیاس تھا مگر مجھے امید... دھات کا بنا ہوا بیرونی خول نہ ٹوٹا تو آگ کی حرارت سے متا... ہوا ہوگا۔ کافی اس کے اندر ہوگی اور شیشے کی بوتل کی ساری... بھی کافی میں شامل ہوں گی مگر اسے کپڑے سے چھان کے ا... کیا جاسکتا تھا۔

دس منٹ تک کونوں کھدروں میں جھانکنے کے بعد میں مایوس ہو چکا تھا۔ میری نظر اب باہر دھوپ اور برف میں پڑے ہوئے اسباب کا جائزہ لے رہی تھی۔ شیشے اور دھات کے چھوٹے بڑے ٹکڑے تقریباً سو میٹر کے دائرے میں بکھر گئے تھے۔

میں بڑی مشکل سے باہر آیا اور پاؤں کی ٹھوکر سے برف ہٹا ہٹا کے دبی ہوئی چیزوں کو باہر نکالنے لگا۔ ایسی ہی ایک ٹھوکر نے تھرمس کو دور پھینک دیا۔ میں نے اسے دوڑ کے اٹھایا۔ اندر شیشے کی کرچیاں چھنک اٹھیں مگر تھرمس کے وزن سے میں نے اس کے اندر بھری ہوئی کافی کا اندازہ کر لیا۔

میں نے تھرمس کا ڈھکن بڑی مشکل سے کھولا۔ سردی سے میری انگلیاں سُن ہو رہی تھیں اور تھرمس کا گیلا ڈھکن ٹیڑھا بھی ہو چکا تھا۔ میں نے ہاتھوں کو کپڑوں پر رگڑ کے خشک کیا اور کسی جیسے ڈھکن کو گھمانے میں کامیاب ہو گیا۔

ڈھکنے کے نیچے کارک کا اسٹاپر موجود تھا جس نے کافی کو بہنے نہیں دیا تھا۔ ظاہر ہے شیشے کی بوتل کے ٹوٹ جانے کے بعد کافی گرم نہیں رہ سکتی تھی۔ شیشے کے ہزاروں باریک اور تیز دھار والے ٹکڑے کافی میں شامل تھے اور کافی کا درجۂ حرارت وہی تھا جو برف میں دبے ہوئے ٹین کے ڈبے کا۔

میں نے کارک ہٹا کے کافی کی مہک کو محسوس کیا۔ یہ ٹھنڈی' یخ بستہ کافی بھی ایک ٹانک ثابت ہو سکتی تھی بشرطیکہ اس کو شیشے کے ذرات اور کرچیوں سے الگ کر کے پیا جائے۔ یہ مشکل کام تھا مگر ناممکن نہیں تھا۔ میں نے تھرمس کو سیدھا رکھ دیا۔ شیشے کا کوئی ذرّہ مائع کافی میں حل نہیں ہو سکتا تھا۔ کچھ دیر بعد تمام شیشوں کا تہہ میں بیٹھ جانا یقینی تھا۔

میں نے آج تک ایسی بہت سی کہانیاں پڑھی تھیں اور فلمیں دیکھی تھیں جن میں بحری یا ہوائی جہازوں کے حادثات میں بچ جانے والا کوئی ایک شخص یا ایک جوڑا' ہیرو اور ہیروئن کسی غیر آباد جزیرے پر جا اترتے ہیں۔ وہ کس طرح بقا کی جنگ لڑتے ہیں' ہمت نہیں ہارتے اور کیسے آخر کار اپنے گھر لوٹتے ہیں' یہ سب افسانوی باتیں آج میرے لیے زندگی کی حقیقت بن گئی تھیں۔

میں کسی غیر آباد جزیرے پر نہیں' اپنے وطن میں تھا اور مجھے کسی جنگلی قبیلے یا آدم خوروں کا سامنا نہیں تھا۔ میرا مسئلہ صرف یہ تھا کہ زندہ رہوں۔ رابعہ کو اپنے ساتھ رکھوں اور عزم سفر کے ساتھ تلاش جاری رکھوں۔ نازو اور غالب کی' کسی آبادی یا سڑک کی جہاں سے مجھے امداد مل جائے۔ خوراک' کپڑے' دوائیں اور ٹرانسپورٹ سب مجھ سے بہت زیادہ دور نہیں تھے۔ شرط صرف صحیح سمت میں سفر کی تھی۔

ایک بات میں جانتا تھا کہ یہ انتہائی شمال مغرب کا علاقہ ہے چنانچہ مجھے شمال اور مغرب کی طرف نہیں جانا چاہیے۔ گلگت یا چترال سے کاغان تک تقریباً دو سو کلو میٹر کا فاصلہ جنوب کی طرف تھا۔ وہاں سے بالا کوٹ اور مانسہرہ کے راستے ہم ایبٹ آباد پہنچ سکتے تھے۔ یا دوسری طرف سے ہم پہلے سوات اور پھر مردان جاسکتے تھے اور وہاں سے پشاور یا لاہور۔ سورج کی مدد سے میں نے جنوب مشرق کی سمت کا تعین کر لیا تھا۔

ایک تھرمس مل جانے کے بعد میں نے خود کو ایک عظیم مُہم جُو اور سراغ رساں تسلیم کیا۔ میرا دماغ ذہانت کے ساتھ صحیح خطوط پر سوچنے لگا۔ اگر تھرمس یہاں دفن تھا تو کیا اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ گردونواح میں کہیں دوسری چیزیں بھی ہوں گی جو اسی تھیلے میں تھیں جس میں تھرمس تھا۔ تھرمس ایک نہیں تھا' دو تھے۔ اسی میں اسپرین اور اینٹی بائیوٹک ادویات تھیں' مرہم پٹی کا سامان تھا' خشک دودھ کے ڈبے تھے اور چاکلیٹ تھی۔

بحیثیت سراغ رساں مجھے سخت ناکامی کا سامنا ہوا مگر میں اکیلا تھا چنانچہ صرف اپنے آپ سے شرمندہ ہوا۔ مجھے ان میں سے کوئی چیز نہیں ملی۔ میں نے تھرمس اٹھایا اور واپس چل پڑا۔ پھر مجھے ایک اور خیال آیا۔ میں نے تھرمس کو نیچے رکھا اور دوبارہ ہیلی کاپٹر کے اندر گیا۔ اندر آگ پکڑنے والی بہت سی چیزیں تھیں مگر میں ان سب کو ایک ساتھ اٹھا کے نہیں لے جاسکتا تھا۔

میں اس چٹان تک گیا جہاں رابعہ تنہا بیٹھی تھی۔

"میں آگیا" میں نے چلّا کے کہا "اور یہ دیکھو' میں کیا لایا ہوں۔" میں نے تھرمس کو کسی شیلڈ یا ٹرافی کی طرح بلند کیا۔ پھر میں نے ایک جیب سے ابلے ہوئے انڈے نکالے اور دوسری سے جلے ہوئے بسکٹ۔

"لیڈی! دی بریک فاسٹ از ریڈی۔" میں نے کسی بٹلر کی طرح سینے پر ہاتھ رکھ کے اور سر جھکا کے کہا۔

رابعہ نہیں مسکرائی۔ ان حالات میں میرا مذاق کرنا اسے اچھا نہیں لگا تھا۔

"میں نے یہاں سے چاروں طرف دیکھا۔ نازو اور غالب کہیں دور دور تک نظر نہیں آئے۔" رابعہ بولی۔

"دیکھو ڈیئر' جیسے ہم بچ گئے' ایسے ہی وہ بھی زندہ سلامت ہوں گے۔" میں نے کہا "وہ ہم سے پہلے اترے تھے جب ہیلی کاپٹر کو کچھ نہیں ہوا تھا۔ انہیں لینڈنگ کے لیے بہت سازگار حالات ملے تھے۔ ہیلی کاپٹر اپنی جگہ پر ساکت تھا اور بہت کم بلندی پر۔ رسّی بھی سیدھی لٹکی ہوئی تھی۔ وہ زیادہ آرام سے اور بہت سنبھل کے برف پر اترے ہوں گے۔ ہم تو ہنگامی حالات میں اترے تھے۔"

رابعہ کا چہرہ امید سے روشن ہو گیا "یہ تو تم نے ٹھیک کہا۔"

"میں غلط کب کہتا ہوں۔" میں نے کہا "مایوسی آدمی کے حوصلے کو آدھا کر دیتی ہے' اس لیے قنوطیت سے بچو اور زندگی کے روشن پہلو پر نظر رکھو۔ یہ سوچو کہ بچھڑ جانے کے باوجود ہم ساتھ ہیں' وہ ہمیں اور ہم انہیں تلاش کر رہے ہیں اور یہ تلاش صحیح سمت میں اور صحیح خطوط پر جاری ہے چنانچہ ہم ہر لمحہ ایک دوسرے

کے قریب ہوتے جا رہے ہیں اور خدا نے چاہا تو کسی ایک مقام پر مل جائیں گے۔ اور خدا ایسا کیوں نہیں چاہے گا۔ آخر اسی نے ہمیں بخیر و عافیت واپس پہنچایا اور سخت ترین حالات میں زندہ رکھا۔ اچھا باقی تقریر میں کچھ دیر بعد کروں گا۔"

"اب کہاں چل پڑے؟"

"کافی ٹھنڈی ہے۔" میں نے کہا "اسے گرم تو کرنا ہے کسی طرح۔"

ہیلی کاپٹر کے ڈھانچے میں ایک جگہ قطرہ قطرہ تیل ٹپک رہا تھا اور بالشت بھر چوڑے گڑھے میں جمع ہو رہا تھا۔ یہ گڑھا ہیلی کاپٹر کی باڈی میں بن گیا تھا۔ مڑ کر پیالے کی شکل اختیار کرنے والے ایک اور ٹکڑے کی مدد سے میں نے تھوڑا سا تیل نکال لیا اور ایک ہموار جگہ پر رکھ دیا۔ پھر میں نے سیٹوں کی ریگزین کو پھاڑا' استر کا کپڑا پھاڑا' کشن کا ربر نکالا اور لکڑی کے چند ٹکڑے دریافت کیے۔ یہ سب میں نے چمڑے کی بیلٹ سے باندھ کر ایک بنڈل سا بنا لیا۔ باہر مجھے ایک سوٹ کیس کا آدھا حصہ ملا۔ سوٹ کیس کا باقی حصہ کہاں پڑا تھا اور اس میں بھرا ہوا سامان کدھر گیا' یہ سوچنے کا وقت بھی نہیں تھا۔ میں نے آئل سے بھرا ہوا پیالہ اٹھایا اور واپس چل پڑا۔

رابعہ حیرانی سے مجھے سب سامان اکٹھا کرتا دیکھتی رہی۔ میں نے چٹان کی اوٹ میں رکھے ہوئے پلاسٹک اور ریگزین کے ڈھیر پر تیل ڈالا اور جیب میں سے لائٹر نکالا۔ انگوٹھے سے دباتے ہی لائٹر کا ننھا سا نیلا شعلہ مسکرانے لگا۔ سب سے اچھی بات یہ تھی کہ ہوا ساکت تھی ورنہ دھوپ کی تمازت میں بھی ہم ٹھٹھر جاتے۔

میں نے ہیلی کاپٹر تک ایک اور پھیرا لگایا۔ اس بار میں اپنے ساتھ ایک تار' تیل کا دوسرا پیالہ اور جلانے کے لیے مزید سامان لے کر لوٹا۔ اس وقت تک آگ روشن ہو چکی تھی اور فضا میں گہرا' بدبودار دھواں بلند ہو رہا تھا۔

رابعہ کھانسنے لگی تو میں نے کہا "نیچے آ جاؤ' کیمپ فائر کے پاس۔"

میں نے تار سے تھرمس کو باندھا اور اس تار کا دوسرا حصہ چٹان پر ایک پتھر کے نیچے دبا دیا۔ اب تھرمس آگ کے اوپر تھا۔ ٹین کے گول ڈبے میں شیشے کے ذرات کافی کی تہہ میں بیٹھ گئے تھے اور پیندے کو آگ کے شعلے چھو رہے تھے۔ کافی گرم ہو رہی تھی۔

"تم واقعی عجیب ہو' بہت عجیب۔" رابعہ نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"عجیب و غریب کہنے میں کیا ہے۔" میں نے آگ پر تھوڑا سا تیل ڈالا۔

"تم ہارنا نہیں جانتے' مایوس ہونا نہیں جانتے۔ خواہ حالات کتنے ہی مخالف کیوں نہ ہوں" رابعہ نے کہا "بالکل جن ہو تم۔"

"اونٹ جب تک پہاڑ کے نیچے سے نہ گزرے خود کو سب سے اونچا سمجھتا رہتا ہے۔ تم مجھے ایسا ہی اونٹ سمجھتی ہو مگر ا[...] کے بارے میں یہ کیوں بھول جاتی ہو کہ اس کی کوئی کل سیدھی نہیں ہوتی۔"

وہ مسکرانے لگی "تمہیں یقین ہے کہ نازو اور غالب [...] جائیں گے؟"

"مجھے تو یہ بھی یقین تھا کہ تم مل جاؤ گی حالانکہ اس وقت [...] میرا تمہارا وہ نہیں ہوا تھا۔ کیا کہتے ہیں اسے ٹاکرا یعنی آمنا سامنا [...] جب نینوں سے نین ملتے ہیں اور بس۔ محبت ہو جاتی ہے پہلی [...] میں۔ پھر فلم شروع۔"

رابعہ ہنسنے لگی "تمہارے خیال میں یہ فلم ہے؟"

"اور کیا یہ زندگی ہے؟" میں نے کہا "خالص فلمی چویشن [...] ہے۔ کیمرا ہوتا تو واہ واہ ہو جاتی۔ میرے جیسا ہیرو اور تم جیسی [...] ہیروئن۔"

رابعہ نے کہا "ہیرو صاحب' کافی ابل رہی ہے۔"

میں نے کہا "اسے کہتے ہیں ایک ٹکٹ میں تین مزے۔ [...] گرم ہو گئی۔ ہم نے اسموک سگنل دے دیا۔ ایس او ایس [...] یہاں ہیں۔ آگ بھی تاپ لی۔ اب آتا ہے مرحلہ نمبر دو۔ [...] تھرمس کو اتارنے کا اور کافی کو چھان کر شیشے سے الگ کرنے [...] شیشے کا مسیحا کوئی نہیں۔ جو ٹوٹ گیا سو ٹوٹ گیا۔ یہ غالباً تھرمس [...] بارے میں کہا ہو گا فیض نے۔ ہنسو نہیں بے وقوف' مگ کو مضبوطی سے پکڑو' میں کافی انڈیلتا ہوں۔"

"مگ ٹین کا ہے بے وقوف۔ میرا ہاتھ جل جائے گا۔"

"او کے۔ تم سے نہیں ہو گا کوئی کام۔ نیچے رکھو مگ کو اور [...] پر اپنی قمیص کا دامن پھیلاؤ۔"

"وہ کیوں؟"

"بابا کافی چھان کر پینی ہے۔ ورنہ جیسے پھول کی پتی سے [...] جاتا ہے ہیرے کا جگر' ایسے ہی کافی کے ساتھ شیشہ پی لیا تو تمہارا [...] دل کٹ جائے گا۔" میں نے کہا "شرماؤ نہیں' میں کافی کی طرف [...] دیکھ رہا ہوں۔"

رابعہ نے قمیص کا دامن مگ پر پھیلا دیا۔ میں نے اس پر [...] انڈیلی۔ گرم' مہکتی کافی چھن کر مگ میں جمع ہونے لگی۔ مگ بھر [...] رابعہ کی قمیص کے دامن پر داغ آ گیا لیکن اس میں کوئی شیشے کا [...] گرفتار نہیں ہوا۔ احتیاطاً اس نے دامن جھاڑ دیا۔

ہم نے ایک ایک ابلا ہوا انڈہ کھایا اور بغیر دودھ چینی کی تلخ کافی کو ایک ہی مگ سے پیا۔ مگ کا کنارہ بھی گرم ہو گیا [...] میرے ہونٹ جل گئے مگر مجھے کافی کو ٹھنڈا کر کے پینا منظور نہ تھا۔

رابعہ نے کہا "تم لنگڑا کر چلتے ہوئے بالکل لکڑ بگڑ لگ [...] تھے۔"

"خدا کا شکر ادا کرو کہ میں لنگڑا ہوا۔ کانا ہو جاتا تو ایک [...] دیکھتا ہوا نہ جانے کہاں نکل جاتا۔ شاید واپسی میں تم پر نظر پڑتی [...]

رابعہ ہنسنے لگی اور پھر ایک دم رک گئی "یہ... یہ آواز۔" [...] میں نے مگ نیچے رکھ کے اوپر دیکھا "ہوائی جہاز۔ کوئی آ گیا [...] رابعہ۔ وہ دھواں دیکھ لیں گے۔" میں نے خوشی سے چلا کے [...]

"مگر جہاز تو یہاں نہیں اتر سکتا۔" رابعہ نے کہا۔

ہم آسمان پر نظر جمائے بیٹھے رہے۔ دور افق پر نقطہ بن کے [...]دار ہونے والا پی آئی اے کا فوکر جہاز کچھ دیر بعد ہماری نظروں [...] سامنے سے پرواز کرتا سیدھا گزر گیا۔

"انہوں نے ہمیں نہیں دیکھا۔" رابعہ نے مایوسی سے کہا۔

"ضرور دیکھا ہو گا۔ اتنا کثیف دھواں ہے۔ برف کی سفیدی [...] زیادہ نمایاں ہو گیا ہو گا۔"

"پھر وہ رکے کیوں نہیں؟" رابعہ نے ایک احمقانہ سوال کیا۔

"کیا ہوا میں رک جاتے؟ جیسے سڑک پر کار بریک لگانے سے [...] جاتی ہے۔" میں نے کہا "کیا ہو گیا ہے تمہاری عقل کو۔"

"وہ ایک چکر لگا کے جا سکتے تھے۔ اس سے ہمیں معلوم ہو جاتا [...] انہوں نے دھوئیں کو ایس او ایس کا پیغام سمجھ لیا ہے۔"

"جہاز گلگت جا رہا ہے۔" میں نے کہا "گلگت پہنچ کر وہ کسی ہیلی [...]پٹر میں آئیں گے۔"

"پی آئی اے والے؟ اونہہ" رابعہ نے منہ بنا کے کہا۔

"میرا مطلب تھا مدد کرنے والے۔ پی آئی والے کسی کو ضرور [...]ئیں گے کہ فلاں جگہ دو افراد پھنسے ہوئے ہیں اور ایک ہیلی کاپٹر [...] ملبہ پڑا ہوا ہے۔ اس اطلاع پر فوجی ہیلی کاپٹر روانہ ہوں گے۔ تم [...] کافی پیو گی گرما گرم؟" میں نے کہا۔

رابعہ نے نفی میں سر ہلایا "تم پی لو۔"

میں نے پھر اس کے دامن کو چھلنی کے طور پر استعمال کیا "یہ [...] ختم کر کے میں جاؤں گا نازو اور غالب کو تلاش کرنے۔"

"میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔"

"یہ بڑی مصیبت ہے عورتوں کے ساتھ۔ ہر جگہ جانے کے لیے ضد کرنے لگتی ہیں۔ میں نے سمجھایا تھا تاکہ تم اسی جگہ رک کر انتظار کرو گی۔ میں بھی لوٹ کر ادھر ہی آؤں گا۔ ہیلی کاپٹر کو تلاش کرنے والے یا ہماری مدد کرنے والے بھی اسی جگہ پہنچ سکتے ہیں۔ یہاں کوئی تو ہونا چاہیے جو انہیں کچھ بتا سکے۔"

"مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"کس سے؟ جوزف سے کہ وہ اپنی جلی ہوئی ہڈیاں اور راکھ ہو جانے والے جسم کو جمع کر کے اٹھ کھڑا ہو گا؟" میں نے کہا "یا بھوت بن کے آ جائے گا تمہیں کھانے کے لیے۔ تم اچھی چیز ہو مگر مزیدار چیز نہیں ہو۔ ذوق اور ذائقے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔"

"مذاق مت کرو۔" وہ بگڑ گئی۔

"یہ مذاق نہیں ہے۔ بھوت ویسے بھی آدم خور نہیں ہوتے۔ جن البتہ کچھ عاشق مزاج ہوتے ہیں لیکن تم پر تو پہلے ہی ایک جن عاشق ہے۔ ابھی خود تم نے مجھے جن قرار دیا تھا۔ جن بھوت کے علاوہ تو یہاں کوئی تمہیں ڈرانے یا پریشان کرنے نہیں آ سکتا۔"

"کیوں؟ جنگلی جانور بھی تو آ سکتے ہیں۔ اور اس علاقے کا کیا پتا' یہاں کیسے لوگ رہتے ہیں۔"

مجھے بے اختیار ہنسی آئی "تم جیسی پڑھی لکھی لڑکیاں جب ایسی حماقت کی بات کریں تو پہلے ہنسی آتی ہے پھر رونا آتا ہے۔ جنگلی جانور اس موسم میں یا تو ہجرت کر جاتے ہیں یا زیرِ زمین چلے جاتے ہیں۔ مثلاً ریچھ سردی کے موسم میں سوتے رہتے ہیں۔ بہ فرضِ محال کوئی لومڑی آ نکلے تو اسے اپنا نام بتانا۔ وکیل کا نام سنتے ہی وہ بھاگ جائے گی۔ ورنہ اسے شوٹ کر دینا۔ ریوالور تمہارے پاس ہے۔ دیگر یہ محترمہ کہ ہم افریقہ کے اس خطے میں نہیں جہاں جنگلی' وحشی اور آدم خور قبائل رہتے ہیں۔ ہم چترال یا گلگت کے علاقے میں ہیں۔ یہاں جو بھی آئے گا تمہاری مدد کرے گا۔ یہاں کے لوگ انتہائی مہمان نواز ہوتے ہیں اور جسے پناہ دیتے ہیں اس کے لیے اپنی جان بھی دے سکتے ہیں۔ کچھ آیا عقلِ شریف میں؟"

وہ خاموش ہو گئی۔ میں نے کافی ختم کی۔ جیب سے ریوالور نکال کے چیک کیا اور ایک فائر کر دیا۔

رابعہ اچھل پڑی "یہ کیا حرکت ہے؟"

میں نے کہا "برفانی علاقوں میں آواز بہت دور تک سفر کرتی ہے۔ ہم جو باتیں کر رہے ہیں یہ آواز بھی ایک میل دور سنی جا سکتی ہے۔ فائر کی آواز چار پانچ میل قطر کے دائرے میں ہر طرف سنی جائے گی۔ کوئی بھی اس پر متوجہ ہو سکتا ہے۔ ایک فائر تم بھی کرو۔"

رابعہ نے ریوالور نکال کے اس کا رخ اوپر کی طرف کیا "یہاں متوجہ ہونے والا کون ہو گا؟"

مجھے فائر کی آواز مکمل سکوت میں بم کے دھماکے سے زیادہ محسوس ہوئی۔ "اس علاقے میں فائرنگ بلاوجہ نہیں ہوتی۔ مقامی آبادی کے لوگ بھی یہ آواز سن کر ادھر آ سکتے ہیں' یہ سمجھتے ہوئے کہ کہیں دو قبیلے تو آپس کی جنگ میں نہیں الجھ گئے۔ فائرنگ ان کو بھی متوجہ کر سکتی ہے جو ہماری سرحدوں کی حفاظت کے لیے یہاں موجود ہیں اور جنہوں نے ہیلی کاپٹر گرایا تھا۔"

"تم کتنی دیر میں واپس آؤ گے؟"

"گھڑی ہوتی تو میں بتا دیتا کہ میں دو بج کے انتیس منٹ پر واپس آؤں گا۔ ڈھائی بجے تک کھانا میز پر لگا دینا۔ کھانے میں چکن روسٹ ضرور ہو اور فروٹ کسٹرڈ..."

رابعہ بگڑ گئی "سیدھی طرح بات کا جواب نہیں دے سکتے؟"

"اس بات کا کیا سیدھا جواب دوں۔ بابا' تم کہتی ہو تو میں ساڑھے تین گز کے دائرے میں گھوم کے ساڑھے تین منٹ میں لوٹ آتا ہوں۔ ورنہ ساڑھے تین کلو میٹر تک گیا تو ساڑھے تین گھنٹے بھی لگ سکتے ہیں۔ پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ مزے سے دھوپ میں لیٹ کر آرام کرو۔ قدرت کا حسن دیکھو۔ سمجھو تم لاہور

سے یہاں تفریح اور آرام کے لیے آئی ہو۔ میں تمہیں چھوڑ کر تو بھاگنے سے رہا۔ پاؤں میں تمہارے عشق کی زنجیر ہے۔ لوٹ کر یہیں آؤں گا۔ تم خود کھینچ لو گی۔"

"اُف سکندر! بہت بولتے ہو تم اور بے مقصد۔ میرا مطلب تھا کہ۔۔۔ انتظار بہت مشکل ہو گا۔"

"یہ میں مانتا ہوں۔" میں نے کہا "لیکن تم چاہو تو فارغ وقت میں بہت کچھ کر سکتی ہو۔ خلا میں گھورنے اور جمائیاں لینے سے بہتر تو یہ ہے کہ تم تفتیش اور سراغرسانی کرو۔"

"نہ بابا' میں نہیں جاتی اس مردہ خانے میں۔"

میں نے کہا "اندر جانے کو کس نے کہا ہے۔ باہر ہیلی کاپٹر کے آس پاس گھوم پھر کر دیکھو۔ بہت سی چیزیں برف میں دفن ہیں جن کی ہمیں ضرورت پڑ سکتی ہے۔ مثلاً تم دوسرا تھرمس تلاش کرو۔ دواؤں کا بیگ' دودھ کے ڈبے' کچھ بھی مل جائے۔ یہ دلچسپ کام ہے۔"

"سکندر! تمہیں یقین ہے' وہ مل جائیں گے؟"

مجھے غصہ تو آیا مگر میں پی گیا "یقینِ محکم عملِ پیہم محبتِ فاتحِ عالم۔ یہی شمشیریں لے کر میں جہاد پر جا رہا ہوں۔ میری کامیابی کے لیے دعا کرنا۔ میں ضرور آؤں گا۔ ایسا نہ ہو کہ میں آؤں تو معلوم ہو تم جا چکی ہو۔ میرا انتظار کرو گی نا؟"

"کیسی باتیں کرتے ہو! میں کہاں جا سکتی ہوں۔"

میں نے آواز میں رقت پیدا کی "یہ ممکن ہے کہ دن' ہفتے' مہینے اور سال بیت جائیں۔ پچاس سال بعد ایک سفید بالوں والا بوڑھا لاٹھی ٹیکتا' کمر جھکا کر چلتا رابعہ رابعہ پکارتا آئے۔ اسے نظر کچھ نہ آتا ہو اور ہر قدم اٹھانا اس کے لیے ایک امتحاں ہو۔ نہ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔"

رابعہ ہنسنے لگی "میں پہچان لوں گی تمہیں' اب جاؤ۔"

میں پہلے سے طے کر چکا تھا کہ اس تلاش اور جستجو کے مختلف مراحل میں میری پلاننگ کیا ہو گی جس سے کامیابی کے امکانات زیادہ اور ناکامی کے کم سے کم ہوں۔

اس وقت دن کا اجالا تھا اور میری حدِ نگاہ ایک ڈیڑھ میل تک تھی۔ میں نے ہیلی کاپٹر کے ملبے کو نظر میں رکھا۔ اس کی اوپر اٹھی ہوئی' دھوئیں سے کالی ہو جانے والی دُم مجھے جہاں تک نظر آتی رہی' میں سیدھا چلتا رہا اور اس راستے پر دونوں طرف دیکھتا گیا۔ کہیں کوئی معمولی سی حرکت بھی ہوتی تو میری نظر سے اوجھل نہ رہتی۔ بلند تنوں والے ویران درختوں کے بیچ میں برف کی بے داغ سفیدی پر ایک دھبا بھی نظر آتا تو میں قریب جا کے دیکھتا۔

تقریباً دو کلو میٹر کے بعد میں نے دائرے میں سفر شروع کیا۔ اس دائرے کا مرکز ہیلی کاپٹر کا ملبہ تھا۔ دو کلو میٹر' نصف قطر یا چار میل قطر کے دائرے کا محیط بڑی لمبی مسافت تھی جسے میں نے لنگڑاتے ہوئے طے کیا۔ ایک طرف میں دو کلو میٹر دور ہیلی کاپٹر کو دیکھ سکتا تھا اور درمیانی فاصلے کا بغور جائزہ لے سکتا تھا تو دو...
طرف بھی اتنی ہی دور دیکھ سکتا تھا۔

مجھے یقین تھا کہ نازو اور غالب ہیلی کاپٹر سے چار کلو میٹر... اترے ہوں گے۔ اس یقین کی کوئی منطقی یا سائنسی بنیاد نہیں تھی... یہ میرا اندازہ تھا اور میرا ذہن اسے قبول کرتا تھا۔ نازو اور غالب... کے ہیلی کاپٹر سے کود جانے کے بعد ہم بہت زیادہ دور نہیں... تھے۔ چار کلو میٹر کے دائرے میں ان کا مل جانا مجھے قرینِ قیاس... تھا۔

میرے دل کو یہ اطمینان بھی حاصل تھا کہ غالب اور نازو... بخیر و عافیت اترے تھے۔ ان کے شدید زخمی ہو کے مر جانے کا... سوال نہ تھا اور یہ بھی بعید از قیاس تھا کہ وہ سردی یا بھوک... ہلاک ہو گئے ہوں۔ انہوں نے بھی گرم کپڑے پہن رکھے تھے... ایک رات وہ اپنے اپنے جسموں کی حرارت کو یکجا کر کے گزار... تھے۔ دس بارہ گھنٹے میں بھوک پیاس سے حوصلہ ہارنے کا بھی... امکان نہ تھا۔ اس سردی میں پیاس محسوس بھی نہ ہوتی تھی۔

پریشانی کا واحد سبب یہ خیال تھا کہ وہ ہمیں تلاش کر... ہوئے غلط سمت میں بہت دور نہ چلے گئے ہوں۔ مجھے غالب کی... اور ہمت پر پورا بھروسا تھا۔ وہ ایک بے حد ذہین صحافی تھا۔ ا... یقیناً معلوم ہو گا کہ یہ پاکستان کا کون سا علاقہ ہے۔ ہم نہ ملے... اس برف کے صحرا میں بھٹکتا نہیں پھرے گا۔ وہ پنڈی یا لاہور... کی کوشش کرے گا۔ اس یقین کے ساتھ کہ آخر کار ہم کو بھی... پہنچنا ہے اور جب ہم پاکستان پہنچ گئے تو پھر ہر جگہ ہماری دسترس... ہے۔

میں نے اپنا راؤنڈ آدھا مکمل کیا تھا کہ میری نگاہ نے برف... سفیدی میں ایک دھبا سا دیکھا۔ یہ سیاہ نقطہ ایک ابھار سا تھا مگر... سے دیکھنے پر اس کا رنگ براؤن ہو گیا۔ میں نے برف میں ا... خشک ٹہنی گاڑ کے اس پر اپنا سیاہ مفلر باندھ دیا تاکہ واپس اسی... آ کے باقی نصف دائرے کا سفر شروع کر سکوں۔

میں نے ناک کی سیدھ میں سفر کیا اور اس براؤن رنگ... ابھار پر غور کرتا رہا۔ جب میں سو گز کے فاصلے پر تھا تو میں نے... بریف کیس کو پہچان لیا جو نیپال کے کرنسی ڈیلر نے دیا تھا اور... میں جوزف کے پچاس ہزار نکالنے کے بعد اب ساڑھے چار... روپے پاکستانی رہ گئے تھے۔

بریف کیس کو جہاز سے پھینک دیا گیا تھا اور وہ برف میں گر... ایک کونے پر سیدھا کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کا ایک کونا نرم برف... دھنس گیا تھا اور رات بھر اس پر برف گرتی رہی تھی۔ صبح او... برف پگھل کے بہہ گئی تھی۔ بریف کیس اسی توازن کے ساتھ... رہ گیا تھا۔

بریف کیس بہت مضبوط تھا۔ اسے اگر دگنی بلندی سے... پھینکا جاتا تو نہ ٹوٹتا۔ جب میں نے اسے اٹھایا تو مجھے ساڑھے

...لاکھ روپے مل جانے کی کم خوشی ہوئی۔ زیادہ خوشی اپنی تلاش کے رائیگاں نہ جانے کی ہوئی۔

غالب اور نازو مل جاتے تو میری کامیابی ہی میری زندگی کا سب سے بڑا انعام بن جاتی مگر یہ بریف کیس بھی نہ ملتا تو خالی ہاتھ لوٹتے ہوئے اپنی ناکامی کا خیال زیادہ حوصلہ شکن اور پُر آزار ہوتا۔ بلاشبہ دولت یہاں بے مصرف تھی مگر اس کی طاقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے ریوالور پر گرفت سے تحفظ کا اعتماد حاصل ہوتا تھا' ایسے ہی ساڑھے چار لاکھ روپے کی ملکیت کا احساس باعثِ تقویت تھا۔ سفرِ حیات کے اگلے مراحل میں یہ طاقت ہمارے راستوں کی مشکلات کو دور کر سکتی تھی اور آسانیوں کو خرید سکتی تھی۔

واپس رابعہ کے پاس پہنچ کے میں نے بریف کیس کو چٹان پر پھینک دیا اور خود بھی اس کے پاس ہی گر پڑا۔ میں بہت تھک گیا تھا۔ میری ٹانگ میں درد بھی بڑھ گیا تھا۔ ایک درد چوٹ کا تھا' اب اس میں تھکن کا درد شامل ہو گیا تھا۔ میں کچھ دیر آسمان کی وسعت اور گہرائی میں گم رہا۔

پھر رابعہ نے کہا "اب کیا ہو گا سکندر؟"

میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا کیونکہ میں خود اس سوال سے گریز کر رہا تھا۔

میں نے کہا "مجھے ایک کپ کافی کا دو۔"

"کافی تو ٹھنڈی ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔ ٹھنڈی ہی دے دو۔"

رابعہ نے کہا "مجھے دو چیزیں ملی ہیں۔ ایک ڈبا ہے خشک دودھ کا' ایک پیکٹ دواؤں والا۔ دوسرا تھرمس بھی وہیں تھا مگر وہ اس طرح ٹوٹا کہ کافی سب بہہ گئی۔"

میں اٹھ کر بیٹھ گیا "ویری گڈ۔ تم نے اس وقت خود کو نصف بہتر ثابت کر دیا۔"

وہ تھوڑا سا شرمائی اور مسکرائی "بس میں وقت گزاری کے لیے ادھر ادھر دبی ہوئی چیزیں نکال رہی تھی اس سلاخ سے۔"

"تم نے پوچھا نہیں کہ میں نصف بدتر کیسے ہوا۔"

رابعہ نے مگ میں کافی چھانی مگر اب اپنے دامن کے بجائے ایک صاف کپڑا استعمال کیا "تم نے بھی کم محنت تو نہیں کی۔"

میں نے مگ لے لیا "مگر حاصل کیا ہوا؟ یہ کاغذ کے نوٹوں کا ڈھیر جو ہمارے کسی کام کا نہیں۔ تم نے اس مستحق کی کہانی تو پڑھی ہو گی جس کے پاس صحرا کے سفر میں سونے کا انبار تھا مگر پانی کا ایک گھونٹ نہیں بچا تھا۔ اس نے سارا سونا پھینک دیا مگر پھر بھی پیاسا مر گیا۔ بس یہی صورتِ حال ہماری ہے۔ ہم اس ساڑھے چار لاکھ سے یہاں کیا خرید سکتے ہیں؟ برف۔"

"وہ تو مفت ہے۔" رابعہ نے کہا۔

"ہاں۔ ہماری جان بچا سکتی ہیں یہ دوائیں اور دودھ کا یہ ڈبا ہمارے کام آ سکتا ہے۔" میں نے کہا "فوری طور پر تم مجھے درد کا احساس مٹانے والی دو گولیاں دے دو۔ اسپرین یا پیراسیٹامول۔"

اس نے مجھے پیراسیٹامول دی جو میں نے تلخ ٹھنڈی کافی کے ساتھ نگل لی۔ "تم نے بھی کچھ کھایا؟"

"یہی دو گولیاں۔" رابعہ بولی "پانی کے ساتھ۔"

"پانی کہاں سے آیا؟"

رابعہ نے کہا "سائنس پڑھی ہوتی تو ایسا سوال نہ کرتے۔ یہ جو برف ہے نا ہر طرف' یہ پانی سے بنی ہے۔ درجۂ حرارت جب نقطۂ انجماد سے گر جاتا ہے۔۔۔۔۔"

"کیا۔۔۔ کون کہاں سے گر جاتا ہے؟" میں نے گھبرا کے کہا۔

وہ ہنسی "میں نے برف کو مگ میں ڈال کے دھوپ میں رکھ دیا تھا۔ وہ پھر پانی بن گیا۔ بالکل صاف۔ اسی طرح ہم دودھ کے پاؤڈر کو پانی میں حل کر سکتے ہیں اور ایک ڈبا راشن بندی کے ساتھ کم سے کم تین دن تک ہم دونوں کو کافی ہو سکتا ہے۔"

"میں تم کو چیف کنٹرولر آف راشننگ مقرر کرتا ہوں۔ چار اُبلے ہوئے انڈے' آٹھ بسکٹ اور ایک مِلک پاؤڈر کا ڈبا تم اگر ایک مہینہ چلانا چاہو تو میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

"ایک مہینہ چل سکو گے؟" وہ ہنسی۔

"آزما کے دیکھو۔ تمام عمر ساتھ چل سکتا ہوں۔ ویسے عقلمندوں نے کہا ہے کہ آزمودہ را آزمودن جہل است۔" میں نے کہا۔

رابعہ نے کہا "تمہیں کچھ آئیڈیا ہے' ہمیں کس سمت میں جانا ہو گا اور کتنی دور؟"

میں نے کہا "آپ کے پاس ایک سگریٹ ہو گی خاتون؟"

"صرف سگریٹ؟" وہ بولی "اجی اس سے بھی بڑھ کے ایک چیز ہے اگر آپ پینا چاہیں۔" اس نے انگلی سے اشارہ کیا۔

"یہ شراب کی بوتل!" میں حیران رہ گیا "یہ تو جوزف اپنی جیب میں رکھتا تھا۔ کیا تم نے لاش کی جامہ تلاشی لی تھی؟"

"اگر یہ ہیلی کاپٹر میں ہوتی تو سلامت رہ سکتی تھی؟"

میں نے شرمندگی سے سر کھجایا "یہ بھی باہر ملی؟ مگر کیسے؟ میرا مطلب ہے شیشے کی بوتل ٹوٹی نہیں؟"

"ایسے حیرت انگیز واقعات پیش آتے رہتے ہیں۔ جہاز گرتا ہے تو سب مسافر مر جاتے ہیں۔ یا بلڈنگ میں آگ لگتی ہے تو سب ہلاک ہو جاتے ہیں مگر کوئی شیر خوار بچہ بچ جاتا ہے۔ تم نے دیکھا نہیں کہ یہ ابلے ہوئے انڈے نہیں ٹوٹے تھے۔ یہ بوتل بھی برف میں جا گری تھی۔ خیر اب توڑ دیتی ہوں میں اسے۔"

میں نے کہا "ارے! یہ کیا غضب کر رہی ہو۔ یہ برانڈی ہے۔"

اس نے آنکھیں نکال کے کہا "کیا کافی میں ڈال کے پیو گے؟"

میں نے کہا "دیکھو' یہ دوا ہے۔ جان بچانے کے لیے حرام کو بھی حلال کردیا گیا ہے۔ برانڈی نمونیہ میں فائدہ دیتی ہے۔ اس کے علاوہ شراب کا بنیادی جزو ہے الکحل۔ یہ جراثیم کش ہے۔ ہم ڈیٹول یا اسپرٹ کی طرح زخم پر لگا سکتے ہیں۔ خدانخواستہ زخم آجائے تو۔ اور آخری بات یہ کہ تیل نہ ہو تو ہم برانڈی ڈال کے لکڑیاں جلا سکتے ہیں' یہ آگ پکڑ لیتی ہے۔ اور بھی ایک فائدہ ہے۔"

"وہ بھی بتادو۔"

"دیکھو' میں نے یہ نسخہ آزمایا تو نہیں لیکن فلموں میں اکثر دیکھا ہے۔ یہ غم غلط کرتی ہے۔"

"تمہیں کیا غم ہے جی؟" رابعہ نے مجھے گھورا۔

میں نے آہ بھر کے کہا "ہائے ہم بھی رکھتے ہیں زادِ راہِ عدم۔ اپنا غم تیرا غم جہاں کا غم۔ کیا تم چلنے کے لیے تیار ہو؟"

رابعہ نے کہا "مجھے کیا تیاری کرنی ہے۔"

میں نے کہا "عورتوں کو مقررہ وقت سے دو گھنٹے پہلے تیاری کا نوٹس دینا پڑتا ہے تو وہ دو گھنٹے کی تاخیر سے تقریبات میں شریک ہو سکتی ہیں۔"

"تم مَردوں نے بدنام کر رکھا ہے۔" وہ کھڑی ہو گئی "اب بولو کون پہلے تیار رہوا۔"

میں نے کہا "تم تو برا مان گئیں سچ کا' اب اتنی جلدی بھی نہیں کرنی کہ ہم سامانِ سفر بھی چھوڑ جائیں۔"

"میں نے سب باندھ لیا ہے۔" رابعہ نے ایک پوٹلی کی طرف اشارہ کیا۔

"ایک بات اور سمجھ لو۔ عین ممکن ہے کہ آنے والی رات بھی اسی برف زار میں بسر ہو۔" میں نے کہا "جگہ بھی ایسی ہی ہو' کھلے آسمان کا سائبان ہو اور برف کا بستر۔"

"جو گرم کپڑے ہم نے پہن رکھے ہیں' کافی ہیں۔ انہی سے ہماری جان بچ گئی تھی۔"

"کیا تمہیں معلوم ہے' تمہاری جان میں نے کیسے بچائی تھی؟" میں نے معصوم شرارت آمیز لہجے میں کہا۔

اس کا رنگ گلابی ہو گیا "اب اٹھتے ہو یا......."

"یا کیا؟" میں نے اس کے رخساروں پر شفق کو پھوٹتا دیکھ کے اس وقت کو یاد کیا جب رابعہ کو ہوش میں لانے کے لیے میں نے اپنے جسم کی اور اپنے جذب دل کی ساری تپش اس کے لیے وقف کردی تھی۔

"یا میں بھی بیٹھ جاؤں؟" رابعہ نے ہنس کے کہا۔

میں اٹھ کھڑا ہوا "رابعہ! اس جگہ کو آخری بار دیکھو۔ اس منظر کی تصویر اپنے دل میں اتار لو۔ بعد میں کبھی ہم اپنے گھر کے اندر' ڈرائنگ روم میں مسٹر اور مسز غالب' مسٹر اور مسز محسن' مسٹر اور مسز اکرام سب اکٹھے ہوئے اور ایسا ہی موسم ہوا تو ہیٹر سے گرم کمرے میں صوفوں پر بیٹھ کے گرم کافی پیتے ہوئے اور خشک میوے کھاتے ہوئے اس وقت اور اس جگہ کو یاد کریں گے۔ اور ہمارا کتنا دل چاہے گا کہ صرف ایک بار ہم پھر اس جگہ سے اور اس وقت کے ٹکڑے سے گزریں مگر یہ ناممکن ہوگا۔ کون اپنے ماضی کی یاد کو حال کے زندہ لمحے میں لا سکتا ہے۔ دیکھو یہاں کتنا سکون' کتنی پاکیزگی اور کیسی خاموشی ہے۔ ایک میں ہوں' ایک تم اور ہم قدرت کے کتنے قریب ہیں۔"

رابعہ اداسی آمیز حسرت سے ماحول کو دیکھتی رہی۔ پھر ہم ایک دم چل پڑے۔ میرے بائیں ہاتھ میں ایک بریف کیس تھا۔ دائیں ہاتھ سے میں نے رابعہ کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ رابعہ نے کھانے پینے کے مختصر اسباب کی پوٹلی اپنی کمر پر ایسے باندھ لی تھی جیسے چائے کے باغات میں کام کرنے والی عورتیں اپنے شیر خوار بچوں کو ایک جھولی میں ڈال کر اٹھا لیتی ہیں تاکہ وہ دونوں ہاتھوں سے کام کر سکیں۔

"ہم جنوب مشرق کی طرف جا رہے ہیں۔" میں نے خود ہی رابعہ کو بتانا شروع کیا "میرے پاس قطب نما تو نہیں مگر میرے ذہن میں پاکستان کا نقشہ ہے۔ ہم انتہائی شمال مغرب میں ہو سکتے ہیں۔ آبادی مخالف سمت میں آئے گی۔"

"کتنی دور چلنے کے بعد؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا "یہ میں نہیں بتا سکتا کیونکہ مجھے اپنی صحیح پوزیشن کا علم نہیں۔ دو ڈھائی سو کلومیٹر سے پہلے ہی ہم کسی آبادی میں پہنچ جائیں گے۔"

رابعہ نے خوف زدہ لہجے میں کہا "دو ڈھائی سو کلومیٹر!"

"اور کیا میٹر" میں نے کہا "پیچھے مڑ کے مت دیکھنا۔ جب آدمی پہاڑ پر یا بلندی کی جانب سفر کرے تو کبھی نیچے نہ دیکھے ورنہ حوصلہ جواب دینے لگتا ہے۔"

"لیکن سکندر! ایک دن میں ہم کتنا چل سکتے ہیں آخر؟ دو ڈھائی سو کلومیٹر......"

میں نے ہنس کے کہا "بس ڈر گئیں۔ بابا وہ تو میں نے زیادہ سے زیادہ فاصلہ بتایا تھا۔ کوئی چھوٹی موٹی آبادی دس پندرہ کلومیٹر کے اندر بھی مل سکتی ہے۔ چالیس پچاس کلومیٹر کے اندر تو یقینی ہے۔ بشرطیکہ ہم انہیں نظر انداز کرتے ہوئے نہ گزرے۔"

"ہم کیوں نظر انداز کریں گے؟

"دانستہ نہیں کریں گے مگر کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم دو بستیوں کے درمیان سے گزر جائیں؟ ایک سیدھے ہاتھ پر دو چار کلومیٹر دور ہو اور دوسری الٹے ہاتھ پر۔ ہم کسی سڑک پر تو چل نہیں رہے ہیں کہ سیدھی کسی گاؤں یا قصبے جاتی ہو۔"

رابعہ متفکر ہو گئی "ایسے تو ہم بھٹکتے رہیں گے' نہ جانے کہاں تک۔ ممکن ہے غالب اور نازو بھی بھٹک رہے ہوں۔"

"اصل امکانات کی بات مت کرو۔ فلمی امکانات یا اتفاقات پر نظر رکھو۔ کیا پتا 'ادھر سے تم چلے اور ہم ادھر سے' والی بات ہو۔ ہم اچانک کسی جگہ مل جائیں۔ یا جیسا کہ فلمی فارمولا ہے' ماں بیٹا

یا بچھڑے ہوئے بہن بھائی اچانک گانے کی آواز سن لیں جو اُن کے سوا کوئی نہ گاتا ہو اور وہ بچپن سے ایک ہی دُھن میں مسلسل گاتے رہے ہوں۔"

رابعہ ہنسی "ایسا کوئی گانا ہے جو سوائے تمہارے اور غالب کے کوئی نہ گاتا ہو؟"

"نہیں' افسوس کی تو یہی بات ہے۔ ورنہ اب تک ہم مل نہ گئے ہوتے۔ ہم میں سے کسی نے گانے کی ہمت کی ہے تو صرف باتھ روم میں۔"

"باہر گاتے تو ایک سو سات سترہ میں پکڑے جاتے۔"

"یہ کیا' کون سی دفعہ لگادی وکیل صاحب؟ اپنے پلّے کچھ نہیں پڑا۔" میں نے کہا۔

"اندیشۂ نقصِ امن۔ اشتعال انگیزی۔"

"خیر اب اتنا برا بھی نہیں گاتا میں۔ اس بیان کے بعد تم پر بھی ہتکِ عزت کا کیس ہو سکتا ہے۔" میں نے برا ماننے کی اداکاری کی۔

"تم کہہ رہے تھے کہ یہاں آواز میلوں سنائی دیتی ہے۔"

میں نے کہا "ہمارے پاس ضائع کرنے کے لیے گولیاں نہیں ہیں۔"

رابعہ بولی "فرض کرو' تم غالب کو آواز دو اور وہ کہیں دو تین کلومیٹر دور ہوں تو کیا وہ سن لیں گے؟"

میں نے کہا "آئیڈیا اچھا ہے۔ اگر میں ڈرل سارجنٹ ہوتا تو میری آواز دس کلومیٹر تک سنی جاتی۔ ویسے میں کوشش کر کے دیکھتا ہوں۔" میں نے سینے کو پھلا کر اور پورا زور لگا کے آواز دی "غالب!" میری آواز برف کی بیکراں وسعت میں نہ جانے کہاں تک گئی اور گم ہو گئی۔ میں نے پوچھا "کتنی آؤٹ پُٹ تھی۔ پچاس واٹ کہ سو واٹ؟"

"کیا مطلب؟"

"اسپیکر ہوتے ہیں چھوٹے بڑے۔ آؤٹ پُٹ زیادہ ہو تو آواز زیادہ ہوتی ہے۔ فرض کرو میرے گلے کے اسپیکر کی آواز تھی پچاس واٹ۔"

"تو اب دو سو واٹ کی آواز نکالو۔ یا پانچ سو واٹ کی۔"

"بے وقوف لڑکی! تم چاہتی ہو اسپیکر پھٹ جائے۔ میرا ایمپلی فائر اتنا بڑا نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"میں وکیل ہوں' کوئی ریڈیو میکینک نہیں۔"

میں نے دوسری بار زیادہ طاقت کے ساتھ غالب کو آواز دی مگر اس بار بھی میری آواز خاموشی کی سرحدوں کو عبور کر گئی۔ اس کی کوئی بازگشت تک لوٹ کر نہ آئی۔ میرے گلے میں خراش سی ہونے لگی۔ غالب کو مسلسل پکارتے رہنا شغلِ دیوانگی تھا اور کوئی مجھے دیکھتا تو دیوانہ مجنوں سمجھتا۔ لیلیٰ لیلیٰ پکاروں میں بَن میں۔ ایسے ہی میں غالب غالب چلاتا پھر رہا تھا۔ ہر سو قدم کے فاصلے سے میں اسے آواز دیتا تھا۔ غالب کی اس علاقے میں موجودگی بعید از امکان نہ تھی۔ ہم دو چار کلومیٹر کے فرق سے ایک محدود فاصلے پر اترے تھے اور یہ ناممکن تھا کہ وہ ہم سے سیکڑوں میل دور چلا گیا ہو۔ مجھے غالب کی جغرافیائی معلومات پر اعتماد تھا چنانچہ میں جانتا تھا کہ اس نے بھی جنوب مشرق کی سمت اختیار کی ہوگی۔ اگر ہم ایک ہی سمت میں رواں تھے تو اس بات کے امکانات کو مسترد نہیں کیا جا سکتا تھا کہ کسی جگہ ہمارے درمیان فاصلہ دو چار کلومیٹر کا ہو اور ہم متوازی خطوط پر رواں ہوں۔ ایسی صورت میں وہ میری آواز سن سکتا تھا۔

دوپہر ڈھل گئی' شام کا سورج مغرب کی طرف ڈھلنے لگا۔ ہم اپنے اندازے کے مطابق آٹھ نو کلومیٹر کا فاصلہ طے کر چکے تھے لیکن سوائے موسم سرما میں نقل مکانی کرنے والے پرندوں اور کچھ برفانی آب و ہوا میں رہنے والے پرندوں کے ہمیں کوئی ذی رُوح نظر نہ آیا۔

شام پانچ بجے کے قریب میں نے کہا "مس رابعہ! یو نواٹ از ٹی ٹائم؟" (کیا تمہیں معلوم ہے چائے کا وقت ہو گیا ہے۔)

اس نے کہا "سوری سر' چائے نہیں ہے۔"

"او کے۔ کولڈ کافی لاؤ۔" میں نے ویٹر کو آرڈر دینے کے انداز میں کہا اور ایک پتھر پر بیٹھ گیا جس کی سطح اوپر سے ہموار تھی۔

اب گرد و پیش میں ایک خوشگوار تبدیلی یہ آئی تھی کہ برف بہت کم رہ گئی تھی۔ جگہ جگہ سے پتھریلی بنجر زمین جھانکنے لگی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نے سفید چادر میں خاکی پیوند لگا دیے ہوں۔ میرا خیال تھا کہ کچھ آگے جا کے صورتِ حال مزید بہتر ہو گی تو زمین کی خاکی چادر میں برف کے سفید پیوند رہ جائیں گے۔

کافی دیتے ہوئے رابعہ نے کہا "اس پتھر پر تم بالکل مہاتما بدھ کا مجسمہ لگ رہے ہو۔"

"خیر سے بدھو گھر کو جا رہے ہیں۔ تم نے غور کیا' یہاں سردی کی شدت کچھ کم ہے' برف بھی اتنی زیادہ نہیں رہی۔ شاید آگے بالکل ختم ہو جائے گی۔" میں نے سرد کافی کا ایک گھونٹ لیا۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ سردی رات کو کم نہیں ہو گی۔ ہم تو ابھی کہیں بھی نہیں پہنچے۔" رابعہ نے میرے ساتھ بیٹھ کے کہا۔

"ہم کہیں پہنچے ضرور ہیں۔ اتنی دیر سے ناک کی سیدھ میں چل رہے تھے' کسی دائرے میں نہیں گھوم رہے تھے۔ البتہ اس جگہ کا نام و نشان ہمیں نہیں معلوم۔" میں نے کہا۔

"اگر رات تک ہم کسی آبادی تک نہ پہنچے تو کیا ہو گا؟"

میں نے کہا "رات آٹھ بجے ڈنر ہو گا۔ ایک ایک اُبلا ہوا انڈا اور دودھ۔ خالص قدرتی غذا۔ پروٹین سے بھرپور۔"

"اُفوہ! ڈھنگ سے بات کیوں نہیں کرتے۔ رات کیسے گزرے گی' کہاں سوئیں گے صبح تک؟"

"باتیں کریں گے۔" میں نے کہا "سونا کیا ضروری ہے۔ یہ سمجھ لو کہ سو گئے تو پھر حشر کے دن ہی اٹھیں گے۔ معلوم نہیں یہاں سے میدانِ حشر کتنی دور ہو گا۔ خیر اٹھ کے جانا تو پڑے گا پیدل۔"

"تم سے بات کرنا فضول ہے۔"

میں نے ہنس کے کہا "یار' تم تو سیریس ہو گئیں۔ بھئی ٹیک اٹ ایزی' یہ سمجھو کہ ہم راستہ بھٹک گئے ہیں۔ یہ ایک ایڈونچر ہے' اسے انجوائے کرو۔ ایسا سفر زندگی میں پھر کب ہوگا۔ رات کو ہر طرف خاموشی ہوگی اور سکون ہوگا۔ شاید چاندنی بھی ہوگی۔ آسمان پر ستارے بکھرے ہوئے ہوں گے۔ ہم کو دنیا میں کہیں ایسی خلوت مل سکتی ہے؟ اتنی مکمل' بے خلل تنہائی کہیں نصیب نہ ہوگی۔ اپنا گھر ہوگا تو وہاں بھی آدھی رات کو فون چلّانے لگے گا۔ ریسیور اٹھانے پر کوئی کہے گا "غضب ہو گیا گنور بھائی' سالا مئی وعدے کا سودا ایک دم گر گیا۔ سوچو کہ گھبرا کے اٹھنے والے کا غصے سے کیا حال ہوتا ہے؟ صبح تک وہ شوں شوں کرتا رہتا ہے.....یا علی الصبح کوئی کال بیل بجا رہا ہے چھٹی کے دن' جب آدمی دس بجے تک سونا چاہتا ہے۔ اور دروازہ کھولو تو کوئی چگی داڑھی اور لنگی والا فراڈ مولوی ٹین کی صندوقچی بجا کے کہتا ہے۔ بکرا پیڑی میں مسجد کے لیے چندہ....."

رابعہ ہنستے ہنستے بے حال ہو گئی "یہ تو ہوگا۔"

میں نے کہا "ہاں' زندگی کے ساتھ زندگی کے سارے تفکرات اور ہنگامے ہوں گے۔ آنا جانا' کاروباری مصروفیات' مہمان داری' اتنے بل جمع کرانے ہیں' گاڑی کا سائلنسر پھٹ گیا ہے' نلکا لیک کر رہا ہے' جلدی سو جاؤ صبح بچوں کو اسکول چھوڑنے جانا ہے۔ وین خراب ہے۔"

"ابھی سے یہ بچے' اسکول اور وین کہاں سے آ گئے۔" رابعہ زیرِ لب مسکرائی۔

میں نے کہا "کیوں؟ بچے ہوں گے تو یہ سب بھی ہوگا۔ اس لیے مس رابعہ' مسز سکندر بننے سے پہلے فرصت اور محبت کے ہر لمحے کو غنیمت جانو اور اس کی بھرپور خوشیوں سے مسکراہٹ کشید کرلو تاکہ ہمارے یادگار لمحوں میں آج کی رات کا ہر لمحہ شامل ہو۔ چاندنی اور برف' ستاروں کی تنک تابی' یہ قرب اور بے خوابی' آج رات بھر کی باتیں اور صبح کا انتظار اور پھر نمودِ صبح کا منظر۔ یہ سب یاد رکھنے کے لیے دیکھو اور سوچو' ہم کتنے خوش نصیب ہیں کہ یہ لازوال نقش چھوڑنے والی رات ہمیں ملی۔ تم کو غالب اور ناز و کے سوا کوئی نہ ملے گا جو تمہارے تجربات کی پُر مسرت کسک اور سنسنی خیزی کو سمجھ سکے۔"

رابعہ نے اپنا سر میرے کندھے پر ٹکا دیا۔ خاموشی زبان بن گئی اور ہم اپنے ماضی سے کٹ کے مستقبل کا ایک خواب دیکھنے لگے۔

پھر اچانک رابعہ نے کہا "چلو سکندر۔"

میں نے کہا "چلو۔"

ہم پھر چلنے لگے۔ ہر قدم اٹھاتے ہوئے مجھے لگتا تھا کہ فاصلہ ایک قدم اور کم ہوا' گھر کچھ اور قریب آ گیا۔ شاید اگلے قدم پر کوئی مل جائے' کوئی بستی نظر آ جائے' اندھیرے میں جھلملاتے کسی چراغ کی لو ہمیں پکارے۔ ادھر آؤ مسافرانِ راہِ وفا یہاں تمہارے لیے نشانِ منزل ہے۔ یہاں بے سمت راستوں کا سفر تمام ہوا۔

آہستہ آہستہ سورج غروب ہونے لگا۔ شفق کا سارا آتشیں رنگ آسمان سے زمین تک پھیل گیا' برف کے دھبوں میں شامل ہو گیا۔ پھر آہستہ آہستہ آسمان تاریک ہونے لگا' رات نے ہر سمت سے یلغار کر دی۔ سردی بڑھ گئی۔

میری نظریں اب کسی جائے پناہ کو تلاش کر رہی تھیں۔ ناہموار زمین پر ہر طرف وہی بے برگ و بار درخت تھے اور برف پوش چٹانیں تھیں۔ اگر کسی چٹان کا سائبان مل جاتا تو ہم رات بھر کے لیے ٹھہر سکتے تھے۔ آثار بتاتے تھے کہ رات کو سرد ہوا کے ساتھ برف باری ہوگی۔ گزشتہ رات ہوا نہیں تھی اور نہ سارا دن چلی تھی مگر اب یخ بستہ ہوا کا پہلا جھونکا ہمیں خبردار کرنے آیا تھا۔

اس سے پہلے کہ ہوا تیز ہو کے طوفانی جھکڑ بن جاتی' میری نظروں نے ایک جگہ تلاش کر لی۔ اس چٹان کی بلندی زیادہ نہیں تھی مگر اس کا عقبی حصہ تھوڑا سا آگے جھکا ہوا تھا۔ ہوا کے رخ پر اس کا پھیلاؤ دو طرف یوں تھا کہ سامنے سے ٹکرانے والی ہوا رخ بدل کے دائیں بائیں ہو جاتی تھی اور پچھلے حصے میں تحفظ و عافیت کا بھرپور احساس ملتا تھا۔

رابعہ سردی سے کانپ رہی تھی۔ برفانی علاقوں میں درجۂ حرارت صفر سے نیچے ہو تب بھی سردی قابلِ برداشت رہتی ہے مگر جب ہوا چلتی ہے تو گرم کپڑوں سے گزر کر براہِ راست جسم کو کاٹتی ہے اور ہڈیوں تک اترنے والی سردی سے گودا تک منجمد ہونے لگتا ہے۔ کوئٹہ میں یہ قندھاری ہوا کہلاتی ہے۔ وہاں جو اس قاتل ہوا کا مقابلہ کرتے ہوئے رات کو باہر نکلتے ہیں' وہ خون کے منجمد ہونے سے بھی مر جاتے ہیں۔

میں نے رابعہ کو چٹان کے سہارے پر زمین صاف کر کے بٹھا دیا اور خود خشک لکڑیاں اور گھاس پھوس جمع کرنے نکل گیا۔ کبھی خزاں کی ہوا کے مقابلے کی تاب نہ لا کے زمین پر گرنے والا ایک درخت اس وقت عطیۂ خداوندی ثابت ہوا۔ میرے ہاتھ سن ہو رہے تھے مگر میں نے اس کی پتلی پتلی شاخوں کو توڑا۔ موٹی شاخوں کو پاؤں سے دبا کے الگ کیا اور لکڑیوں کا پورا گٹھا اُٹھا کے لوٹ آیا۔

رابعہ نے گھاس اور خشک پتوں پر پتلی ٹہنیاں توڑ کے رکھیں اور میں نے اس پر شراب کی آدھی بوتل انڈیل دی۔ اسے ختم کرنے سے پہلے جوزف کی زندگی ختم ہو گئی تھی مگر یہ قدرت کا انتظام ہے۔ وہی شراب ہمارے لیے زندگی کی ضامن بن گئی جس کا ایک قطرہ بھی مسلمان کے لیے اتنا ہی حرام ہے جتنا ایک مے خانہ۔

لائٹر جلاتے ہی شراب میں شامل الکحل نے آگ پکڑ لی۔ خشک گھاس اور پتوں کے ساتھ لکڑیاں جلنے لگیں۔ رابعہ بڑی مہارت سے ان پر زیادہ بڑی شاخیں رکھتی گئی۔ چٹان کے نیچے

...شنی پھیل گئی اور شعلوں کی حرارت نے ہمارے جسموں میں ...احت کا احساس بھر دیا۔

ایک بار پھر میں نے ٹین کے ڈبے جیسے تھرماس کو آگ پر لٹکایا ...ر کافی کو ابالا۔ یہ بڑا تھرماس تھا اور ابھی آدھا بھی خالی نہیں ہوا ...ا۔ رابعہ نے اپنی قمیص کے دامن سے کافی چھانی اور مجھے ایک ...لے ہوئے انڈے کے ساتھ پیش کی۔

میں نے کہا "آدمی کم سے کم اسبابِ زندگی کے ساتھ کیسے رہ ...کتا ہے' اس کا تجربہ بھی ہو گیا ورنہ کیا کیا تکلفات کے جھمیلے ہیں۔ ...یڈ روم' ڈرائنگ روم' ڈائننگ روم' ٹی سیٹ' ڈنر سیٹ' صوفہ ...یٹ۔ ہر چیز جیسے ضروری اور ناگزیر ہو جاتی ہے' جیسے اس کے بغیر تو ...ندگی ہی نہیں گزرے گی۔"

"پھر زندگی کے لیے کیا ضروری اور ناگزیر ہے؟"

میں نے سوچ کے کہا "ایک تو محبت' دوسرے قناعت اور طمینانِ قلب' اچھی صحت اور عزت۔"

"تم نے تو سب کچھ ہی مانگ لیا۔" رابعہ ہنسی۔

"سب کچھ خدا سے مانگ لیا تم کو مانگ کے۔ اٹھتے نہیں ہیں تھ میرے اس دعا کے بعد۔ مگر تم نے پوچھا تو میں نے بتا دیا۔"

جیسے جیسے رات گزرتی گئی' سردی کی شدت میں اضافہ ...وتا گیا۔ ہوا جو شام سے ہلکورے لے رہی تھی' طوفان کی رفتار سے ...رختوں کو جھنجوڑنے اور چٹانوں سے سر ٹکرانے لگی۔ خشک ...اخوں کی سیٹیاں تیز ہو گئیں اور دور سے چلّانے والے بھوکے ...ھیڑیوں اور سردی سے ٹھٹھرتے گیدڑوں کی چیخوں کا شور قریب ...گیا۔ رابعہ مجھ سے چمٹ کر بیٹھ گئی۔

"مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔"

میں نے کہا "سوچ لو' ڈر زیادہ لگ رہا ہے یا سردی زیادہ لگ رہی ہے۔"

رابعہ ہنس پڑی "دونوں' سکندر! سنا ہے بھیڑیا زیادہ سفاک ہوتا ہے' شیر اور چیتے سے بھی۔"

"میرے گناہ گار کانوں نے بھی کچھ ایسا ہی سنا ہے۔"

"اگر بھیڑیے قریب آ گئے تو؟"

"تو کیا' ہمیں کھا جائیں گے۔" میں نے اطمینان سے کہا "اس ...ے زیادہ وہ ہمارا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔ تم خواہ مخواہ پریشان ہو۔"

"ہم انہیں شوٹ کر دیں گے۔" رابعہ بولی۔

"گڈ آئیڈیا۔ ان سے کہیں گے کہ وہ قطار بنا کے حملہ کریں۔ ...یہ نہیں کہ سب ایک ساتھ ٹوٹ پڑیں۔ اس کے بعد ہم باری باری ...نشانہ لیتے جائیں گے' ایک کے بعد ایک کو گراتے جائیں گے۔ دس ...گولیاں ہیں ہمارے پاس۔ دس سے زیادہ ہوئے تو ہم کہہ دیں گے کہ ...بھئی مقابلہ ختم' اب کسی نے حملہ کیا تو فاؤل۔"

رابعہ بولی "تم بالکل خوفزدہ نہیں ہو؟"

"یہ تم سے کس نے کہا اور کیوں کہا؟"

"تمہیں مذاق جو سوجھ رہا ہے۔ ان حالات میں تو آدمی کا حوصلہ ہی نہیں' عقل بھی جواب دے جاتی ہے۔ دیکھو' کیسی خوفناک رات ہے اور اس ویرانے میں ہم تنہا ہیں۔ مر جائیں تو کوئی پوچھنے والا نہ ہو۔ میرے بدن میں تو ہوا کی آواز سے کپکپی طاری ہو رہی ہے' بھیڑیے الگ ڈرانے پر آمادہ ہیں۔"

میں نے اسے پیار سے تھپکی دی "دیکھو' آگ روشن ہے اور ہم اسے رات بھر روشن رکھیں گے۔ یہ جنگلی جانور آگ کے قریب نہیں آتے۔ اس چٹان کے نیچے تو سردی بھی نہیں ہے۔ میرا خیال ہے تم سو جاؤ۔"

"میں سو جاؤں؟ تم جاگتے رہو گے؟"

"ہاں' اس طرح تمہارا دماغ پریشانی سے بچا رہے گا ورنہ اپنے ساتھ تم مجھے بھی ڈی مورالائز کرو گی۔ چلو شاباش! آرام سے پاؤں پھیلا دو' سر میرے کندھے پر رکھو' ایسے۔ اب آنکھیں بند کرو۔"

اس نے ایک گہرا سانس لیا اور آنکھیں بند کر کے سو گئی۔ میرا خیال تھا کہ خوف اور ذہنی پریشانی میں اس کے لیے سونا مشکل ہوگا لیکن اسے مجھ پر اتنا اعتماد تھا کہ میری آغوش میں اس نے خود کو تمام خطرات سے محفوظ تسلیم کر لیا۔

وہ نہ جانے آدھی رات کے بعد کا وقت تھا یا اس سے پہلے' جب قریب آ کے ایک بھیڑیے نے غرانا شروع کیا۔ رابعہ ایک دم چیخ مار کے اٹھ بیٹھی۔ میں نے ایک جلتی ہوئی لکڑی اس کی طرف پھینکی تو بھیڑیا بھاگ گیا لیکن کچھ دیر بعد پھر لوٹ آیا۔ اس کے ساتھی کہیں قریب ہی شور مچا رہے تھے۔

"اسے..... شوٹ کر دو۔" رابعہ نے لرزتی آواز میں کہا۔

"نہیں۔ ایک کو مار دیا تو باقی مشتعل ہو جائیں گے۔ بھیڑیے اپنے غول کے ساتھ پھرتے ہیں۔" میں نے کہا۔

چند منٹ کے بعد دوسرا بھیڑیا آ گیا پھر تیسرا۔ وہ چٹان سے کچھ فاصلے پر ایک حلقہ بنا کے کھڑے ہو گئے تھے۔ میں نے رابعہ سے کہا کہ وہ حوصلے کے ساتھ آگ کو روشن رکھے۔ اس نے چند لکڑیاں اور جلنے کے لیے ڈال دیں۔ میں نے ایک جلتی لکڑی اٹھائی اور آگے بڑھا۔ بھیڑیے کچھ پیچھے ہو گئے لیکن ان کے عزائم جارحانہ محسوس ہوتے تھے۔

رابعہ نے تھر تھر کانپتے ہوئے کہا "آگے مت جاؤ سکندر۔"

میں نے کہا "ڈرو نہیں' میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ اس غول میں کتنے بھیڑیے ہیں۔"

جب مجھے یقین آ گیا کہ بھیڑیے صرف چھ ہی ہیں تو میں نے ایک خطرناک جوا کھیلنے کا فیصلہ کیا۔ شکاریات پر میری معلومات محدود تھیں اور مجھے بالکل معلوم نہیں تھا کہ ایک بھیڑیے کو شوٹ کرنے سے باقی بھاگ جائیں گے یا اپنے ساتھی کی موت کا انتقام لیں گے۔ میں نے رابعہ سے کہا کہ وہ بھی ریوالور نکال کے ایک

بھیڑیے کو نشانہ بنائے۔
"ہم ایک ساتھ فائر کریں گے۔"
"ٹھیک ہے۔ میں کسے نشانہ بناؤں؟"
"میں دائیں طرف والے کو گراتا ہوں' تم بالکل بائیں جانب والے کو گولی مارو۔ مگر دیکھو' پہلے پُرسکون ہو جاؤ۔ تمہارا ہاتھ نہیں کانپنا چاہیے۔ اگر نشانہ خطا ہوا تو....."
"نشانہ خطا نہیں ہوگا۔" رابعہ کا لہجہ پرسکون اور پراعتماد ہوگیا۔
"گولی سر میں لگنی چاہیے۔"
"میں کوشش کروں گی۔" رابعہ بولی۔
"او کے۔ تین پر گولی چلا دینا۔ ون۔ ٹو۔ تھری۔"
دو فائر ایک ساتھ ہوئے۔ دو بھیڑیے ایک بھیانک چیخ مار کے اچھلے اور زمین پر گر کے تڑپنے لگے۔ باقی چار میں سے تین بڑی سرعت کے ساتھ پلٹ کر فرار ہوئے۔ چوتھا شاید بدحواسی میں آگے آگیا۔ میں نے اسے ایک دم اپنے سامنے پایا۔ رابعہ کی چیخ کے ساتھ ہی میں نے دوسری گولی چلائی اور بھیڑیا پیچھے جاگرا۔
"کم آن گرل' اٹ از آل اوور۔" میں نے رابعہ کو جھنجوڑا جو مجھے بانہوں کے حلقے میں لے کر پیچھے کھینچ رہی تھی اور مسلسل "پیچھے آجاؤ' پیچھے آجاؤ" کی گردان کررہی تھی۔
"وہ چلے گئے۔ تین کو ہم نے ماردیا' تین بھاگ گئے۔ اب کوئی خطرے کی بات نہیں رہی۔" میں نے رابعہ کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ رابعہ کا جسم کانپ رہا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے اس کے ارتعاش کو کنٹرول کیا۔ کچھ دیر بعد وہ دھیرے دھیرے پرسکون ہوگئی اور مردہ بھیڑیوں کو دیکھنے لگی جو آگ کی روشنی میں اپنی کھلی آنکھوں اور خونی دانتوں کے ساتھ زیادہ بھیانک لگ رہے تھے۔
"صبح ہونے میں کتنی دیر ہے سکندر؟" آخرکار رابعہ نے ایک لمبی گہری سانس لے کر کہا۔
"معلوم نہیں۔ تین چار گھنٹے تو ضرور ہوں گے۔ چلو تم پھر سو جاؤ۔"
"نہیں' مجھے نیند نہیں آئے گی۔ تم سو جاؤ۔" وہ بولی۔
"میں سو جاؤں! تمہیں ڈر نہیں لگے گا؟" میں نے حیرانی سے کہا۔
"ڈر تو اس وقت بھی لگ رہا ہے۔" وہ بولی۔
میں نے کہا "بھیڑیے مدد لینے گئے ہیں۔ ممکن ہے اپنے ساتھ ہاتھی' شیر اور چیتے لے آئیں۔ ہاتھی کو تم سمجھ لو جنگل کا ٹینک' شیر کو ایک توپ۔ اس کی گرج بالکل توپ جیسی ہوتی ہے۔"
رابعہ آہستہ سے مسکرائی "ایسے ڈرنے والی نہیں ہوں میں۔ شیر کہاں سے آگیا پاکستان میں اور ہاتھی کا یہاں کیا کام۔ تم سو جاؤ۔"
"اچھا۔ زیادہ ڈر لگے تو بے ہوش ہونے سے پہلے مجھے جگا لینا۔

یہاں وحشی درندوں کے علاوہ بدروحیں بھی تو ہوں گی بھوت......."
اس نے مجھے زبردستی لٹادیا "بک بک مت کرو۔"
میں نے اس کی گود میں سر رکھا اور سونے کی اداکا[ری میں] مشغول ہوگیا۔ نیند آنے کا سوال ہی نہ تھا۔ میرا خیال تھا کافی گرم کرکے پینی چاہیے مگر میں اس کی آغوش میں سر رکھ[ا] تو مجھ پر ایک سحر سا طاری ہوگیا۔ میں نے اس کے بدن کی [...] کو اپنے حواس پر طاری ہوتے محسوس کیا اور میں نے [...] آنکھوں میں جھانکا تو میری آنکھیں جیسے نشے سے بوجھل ہو[...] میں سونا نہیں چاہتا تھا مگر سو گیا۔
میری آنکھ کھلی تو رات کا سفر تمام نہیں ہوا تھا۔ رابع[ہ] سکون سے دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھی تھی اور خلا م[یں ...] رہی تھی مگر اس کا ایک ہاتھ میرے بالوں میں ہولے ہو[لے ...] کررہا تھا۔ میں نیم باز آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا اور اپنی [...] رشک کرتا رہا جس نے مجھے اس کے قرب کی یہ حسین را[ت ...] کی۔ جب میرے اور اس کے درمیان محبت کے مقدس ر[شتے ...] حیات نو پائی۔ جدائی کے طویل عرصے اور فراق کے پُرعذا[ب ...] میں زندہ رہنے والی اس محبت کے لیے یہ تجدید عشق کی [...] گھڑی تھی۔ میں نے آہستہ سے ہاتھ بڑھا کر اس کے سر کو [...] اس کا چہرہ میرے قریب آگیا۔ اتنا قریب کہ میں نے زندگی [...] بار اس کے لب لعلیں کی حلاوت کو اپنے ہونٹوں پر محسوس [...] اس نے کامل خود سپردگی کے ساتھ مجھے اس گستاخی کی اجاز[ت] دے دی تھی مگر میں نے جذبات کی آگ کو ہوا دینے سے گریز [...]
میں نے جذباتی سرگوشی میں کہا "رابعہ! کاش یہ رات [...] نہ ہو۔"
"کیوں؟" اس نے میرے گالوں پر اپنے گال رکھ دیے [...] ہماری ہر صبح ایسی نہیں ہوگی؟ اور اس کے بعد آنے والی ہر [...] زیادہ دلنواز نہیں ہوگی؟ چلو خدا سے زیادہ مہربانی مانگیں' اپنی [...] کی زندگی مانگیں۔ صبح ہونے کو ہے۔ کیا پتا' یہ دعاؤں کے [...] ہونے کی گھڑی ہو۔"
میں نے اٹھ کے کہا "کیا واقعی صبح ہو رہی ہے؟ تم نے [...] اندازہ کیا؟"
رابعہ نے کہا "صبح کاذب کا اُجالا ختم ہونے کو ہے۔"
میں نے شرمندگی سے کہا "میرا ارادہ سونے کا نہیں تھا مجھے ایک نشہ سا ہوگیا تھا۔ مجھے افسوس ہے۔"
"کس بات کا؟"
"میرا فرض تھا کہ خود جاگتا اور تمہیں سونے دیتا' تم[ہاری] حفاظت کرتا' تم کو اکیلا نہ چھوڑتا۔"
"بولی "کیسی باتیں کرتے ہو۔ تم میرے ساتھ تھے' میر[ے ...] تھے تو میں محفوظ تھی۔ اور میں تم سے زیادہ سو چکی تھی۔ آخر [...]

[...] تو آرام کی ضرورت تھی۔"
[...] سردی اب اپنی انتہا پر تھی۔ لکڑیاں بھی ختم ہو رہی تھیں۔ [...]نے مجھے بہت روکا مگر میں اس پرانے' خشک درخت تک گیا [...] چند سوکھی شاخیں توڑ لایا۔ چٹان سے دور جا کے مجھے سردی کی [شد]ت کا صحیح اندازہ ہوا۔ رات بھر روشن رہنے والی آگ نے چٹان [...] نیچے سردی کے اثر کو کافی زائل کیا تھا ورنہ ہم واقعی [...]مر جاتے۔
آہستہ آہستہ صبح صادق کا اجالا پھیلنے لگا۔ جب افق کا رنگ [...] تو مجھے معلوم ہوا کہ مشرق ہمارے دائیں ہاتھ پر ہے۔ رات ہم [...] پرندوں کو آشیانوں میں لوٹتے نہیں دیکھا تھا مگر اس وقت نہ [جا]نے کہاں سے ڈھیروں پرندے نکل آئے۔ ان کی آوازوں نے [خام]وشی کے جمود کو توڑا اور ہماری تنہائی کے احساس کو ختم کردیا۔ [...]ی تک ہم خود کو قطب شمالی پر محسوس کرتے تھے لیکن اب ہمیں [یقی]ن آیا کہ یہ اپنے پاکستان کی وہی پُررونق اور آباد دنیا ہے۔
سورج کا زرد گولا نمودار ہوا اور دیکھتے دیکھتے ایک نئے دن کی [پہ]لی دھوپ نے آسمان اور زمین کو جگمگا دیا۔ ابھی دھوپ میں [حر]ارت ناپید تھی۔ میں نے اس وقت تک سفر آغاز کرنے کا ارادہ [ملت]وی کردیا جب تک فضا میں کچھ حرارت شامل نہ ہو۔
"دودھ کھاؤ گے؟" رابعہ نے کہا۔
"میرا خیال تھا کہ دودھ پینے کی چیز ہوتی ہے۔"
رابعہ نے خشک دودھ کا ڈبا میرے سامنے رکھ دیا "ذرا اسے پی [ک]ر دکھائیے۔"
میں نے کہا "خشک دودھ نکال لو' کسی کپڑے پر ڈھیر کرلو۔ میں [پا]نی لے کر آتا ہوں۔"
"پانی! پانی کہاں ملے گا؟" رابعہ بولی "اچھا' تمہارا مطلب [ب]رف سے تھا۔"
"جی' برف غالباً پانی کی منجمد شکل ہوتی ہے۔"
رابعہ نے خفت سے مسکراتے ہوئے ڈبے کو ایک کپڑے پر [ا]لٹ دیا۔ میں خالی ڈبا لے کر نکلا۔ تقریباً سو گز کے فاصلے پر مجھے [ب]رف کی سفیدی نظر آئی جو ایک پہاڑ کے ساتھ ساتھ پھیلی ہوئی تھی۔ قریب پہنچ کے میں نے پگھلی ہوئی برف کا شفاف پانی دیکھا جو ایک درز میں سے گزر کے نیچے پتھروں کے درمیان گڑھے میں جمع ہوگیا تھا۔ میں نے اس پانی میں انگلی ڈالی تو میری انگلی سن ہوگئی اور میں نے اس پانی سے منہ دھونے کا ارادہ فوراً بدل دیا۔
اس پگھلی ہوئی برف کے پانی سے بھرے ہوئے ڈبے کو اٹھا کے لانا بھی قوتِ برداشت کی آزمائش تھی۔ ڈبے کو میں نے انگاروں کے بیچ میں رکھ دیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کا درجۂ حرارت بہتر ہوگیا اور پندرہ بیس منٹ میں پانی ابلنے لگا۔ رابعہ نے اس میں دودھ کا پاؤڈر ملانا شروع کیا اور ایک لکڑی سے ہلاتی گئی۔ پھر مگ بھر بھر کے یہ گرم دودھ میں نے رابعہ کے ساتھ پیا اور خدا کا

شکر ادا کیا کہ اس بے سروسامانی کے سفر میں بھی اس نے ہمارے لیے رزق کی فراہمی کو یقینی بنایا۔
"کیوں' کیسی رہی یہ تکنیک؟" میں نے کہا۔
"بہت شاندار۔" رابعہ بولی "مگر اب چلنا چاہیے۔"
"او کے۔ کیمپ فائر کو بجھا دو۔"
"یہ خود ہی بجھ جائے گی۔ تم ایسا کرو' تھوڑا سا پانی لاؤ ڈبے کو دھو کے۔ گرم کرکے ہاتھ منہ دھولیں گے۔" رابعہ بولی۔
"میں نے سوچا تو تھا کہ وہیں منہ دھولوں لیکن دھولیتا تو معلوم ہے کیا ہوتا؟" میں نے کہا۔
"کیا ہوتا؟ زکام ہو جاتا۔"
"میرا چہرہ غائب ہو جاتا۔ پانی میں انگلی ڈالی تھی تو انگلی غائب ہوگئی تھی۔" میں نے باہر نکلتے ہوئے کہا۔
منہ دھوتے ہی ہم بالکل فریش ہوگئے۔ رات بھر کے آرام سے بھی بہت فرق پڑا تھا۔ میری ٹانگ کا درد بھی کم تھا اور رابعہ نے بھی کہا کہ اس کی چوٹوں میں اب پہلے جیسی تکلیف نہیں۔ روانگی سے پہلے ہم نے تیسری بار وہ کافی گرم کی جو تقریباً چھتیس گھنٹے پرانی ہوگئی تھی۔ اگر چائے ہوتی تو اس کا ذائقہ زیادہ خراب ہوتا۔ کافی کے ذائقے میں بھی فرق آیا تھا مگر تلخی میں محسوس نہیں ہوتا تھا۔ ہم نے ایک ایک ابلا ہوا انڈا کھالیا' کافی کے ساتھ درد کا احساس مٹانے والی دو گولیاں لیں اور سفر کے لیے تیار ہوگئے۔
رابعہ نے خشک دودھ کو پھر ڈبے میں بھرلیا۔ کھانے کے لیے اب ہمارے پاس چند بسکٹ اور اس دودھ کے سوا کچھ نہیں بچا تھا مگر فوری طور پر ہم اتنے تازہ دم تھے کہ دوپہر تک کچھ کھائے پیے بغیر سفر کرسکتے تھے۔ آگ اب بھی روشن تھی۔ اس سے کچھ فاصلے پر تین خونی بھیڑیوں کی اکڑی ہوئی لاشیں پڑی تھیں۔ اگر میرے پاس کیمرا ہوتا تو میں اس منظر کی تصویر ضرور اتارتا۔
ہم نے رات بھر پناہ دینے والی چٹان کے سائبان کو خدا حافظ کہا اور ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر چل پڑے۔ میرے اندازے کے مطابق اس وقت صبح کے نو بجے ہوں گے۔ سردی کے اثر کو زائل کرنے کے لیے میں نے تیز تیز چلنا شروع کیا۔ رابعہ نے میرا ساتھ دینے کی کوشش کی مگر کچھ دیر بعد اس کا حوصلہ جواب دے گیا۔
"بھئی یہ کیا ہے' کیوں بھاگے جارہے ہو؟" اس نے چلا کے کہا۔
"خاتون' اگر یہ بھاگنا ہے تو پھر چلنا کیا ہوتا ہے؟"
"مجھے تو دوڑنا ہی پڑ رہا ہے نا۔ اپنی تیز رفتاری سے یہ ثابت مت کرو کہ دو گھنٹے میں تم لاہور پہنچ جاؤ گے۔"
"میں تو پہنچ جاتا مگر خیر...... تمہاری خاطر حد رفتار دو گھنٹا فی میل۔ میرا مطلب ہے' دو میل فی گھنٹا کی کرلیتا ہوں۔" میں نے کہا۔
آہستہ آہستہ سفر کے حالات موافق ہونے لگے۔ برف غائب

ہوگئی۔ زمین پر کہیں کہیں خشک گھاس دکھائی دینے لگی۔ پھر کچھ ایسے خودرو پودے نمودار ہوئے جو موسمی حالات کے تغیر کا کوئی اثر قبول نہیں کرتے تھے۔ تاہم ابھی تک میں اپنے دائیں بائیں کسی آبادی کے آثار تلاش کرنے میں ناکام تھا۔ کسی ماہر کھوجی کی طرح میں زمین کو بھی غور سے دیکھتا جارہا تھا کہ کہیں کسی کا نقشِ قدم، کسی سائیکل، تانگے یا بیل گاڑی کے پہیوں کا نشان نظر آئے تو ہم اس کو منزل کا سراغ بنالیں اور نشانات کے ساتھ چلتے جائیں۔

دوپہر ہوگئی۔ چلتے چلتے میری ٹانگیں اکڑ گئیں۔ رابعہ نے میرا ساتھ دیا مگر وہ صنفِ نازک تھی۔ میں اندازہ کرسکتا تھا کہ اس کی قوتِ برداشت بھی بہت جلد ساتھ چھوڑ جائے گی۔ مایوسی کے آثار اس کی صورت پر عیاں تھے۔ مایوسی میرے اعصاب کو بھی شکست دینے لگی تھی مگر رابعہ کی خاطر میں نے اپنی شگفتہ مزاجی میں فرق نہیں آنے دیا۔ میں اس سے باتیں کرتا رہا اور اسے ہنسانے کی کوشش کرتا رہا۔

اچانک ایک جگہ رابعہ بیٹھ گئی "اب مجھ سے نہیں چلا جاتا۔"

میں نے منہ میں انگلی ڈال کے سیٹی بجائی "ٹیکسی۔ بدمعاش گزر گیا رکے بغیر۔ خیر ابھی دوسری آجائے گی۔"

رابعہ نے کہا "ٹیکسی نہیں ایمبولینس منگوالو فون کرکے۔"

میں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی لیکن ہر سمت وہی ویرانی تھی۔ یہاں برف بھی نہیں تھی جسے ہم پگھلا کے پانی بنالیتے اور اس میں دودھ حل کرکے پی لیتے۔ خشک ٹہنیاں اور پتے بہت تھے مگر انہیں سلگانا مشکل تھا۔ پہلے تو شراب نے تیل کا کام کیا تھا۔ کاغذ کے ٹکڑے بھی ہوتے تو کام چل جاتا مگر لائٹر کا ننھا سا شعلہ تو کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا۔

میں نے کہا "چلو کولڈ کافی پی لو اسپرین کے ساتھ اور بسکٹ کھالو۔"

رابعہ نے سرہلایا "یہ ہمارا آخری طعام ہوگا۔ اس کے بعد......."

میں نے تھرمس کے مگ میں کافی چھانی "اس کے بعد ہم صبر سے کام چلائیں گے۔ سنا ہے صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔"

کافی ختم ہوگئی تو میں نے تھرمس کو پھینک دیا۔ رابعہ کی قمیص پر سامنے کافی کے رنگ کا داغ پکا ہوگیا تھا۔ اس کے کپڑے میلے ہورہے تھے اور بال پریشان تھے۔ خود میری شیو اتنی بڑھ گئی تھی کہ خشخشی داڑھی قرار دی جاسکتی تھی۔

رابعہ اپنی پوٹلی کو سر کے نیچے رکھ کے لیٹ گئی۔ میں نے بریف کیس کو سر کے نیچے رکھا اور دھوپ سے روشن آسمان کو گھورنے لگا۔ یہ بڑی عجیب بات تھی کہ ابھی تک نہ ہمیں آبادی کے آثار ملے تھے اور نہ کوئی راہ گیر جو ہماری راہنمائی کرسکتا۔ بھولے بھٹکوں کو راستہ بتانے والے خواجہ خضر بھی نہ جانے ہمیں کیوں بھول گئے تھے۔ جغرافیائی حالات خاصے بدل چکے تھے اور یہ جگہ کسی بھی انسانی بستی کے لیے موافق ماحول فراہم کرتی تھی مگر اس آبادی کہیں نہ تھی۔ اس سے یہی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا تھا دائیں بائیں کسی گاؤں کو دیکھ نہ سکے اور بستی کے باہر کلومیٹر دور سے گزر گئے۔

فضا کی سکون بخش حرارت اور تھکن کے باعث غنودگی طاری ہورہی تھی۔ رابعہ پہلے ہی آنکھوں پر ہاتھ رکھے ہوئی تھی۔ اب ہمارے پاس کرنے کو بات بھی کوئی نہ رہی تھی تھے تو وہ سوالات جن کا جواب نہ تھا۔

اچانک میں نے مکمل سکوت میں ہلکا سا ارتعاش محسوس یہ ہلکی سی سرسراہٹ تھی جیسے شہد کی مکھیاں سیکڑوں ہزاروں تعداد میں پرواز کرتی میرے سر پر سے گزر رہی ہوں۔ بھنبھناہٹ زیادہ واضح ہوگئی اور میرے ساتھ ہی رابعہ بھی بیٹھی۔

"یہ.... یہ آواز سن رہے ہو تم سکندر؟"

"ہاں۔ یہ تمہاری آواز ہے جو میرے کانوں میں رس گھول رہی ہے۔"

"میرا خیال ہے کوئی گاڑی آرہی ہے؟" رابعہ کھڑی ہوگئی

"کون سی گاڑی؟ گدھا گاڑی، بیل گاڑی۔" میں نے وقت تک اندازہ کرلیا تھا کہ یہ جیپ کی آواز ہے۔

رابعہ اسی سمت میں دیکھ رہی تھی جدھر سے ہم پیدل سفر کر آئے تھے "سکندر، یہ کار کے انجن کی آواز ہے۔ ہے نا؟"

"کون سی کار؟ فورڈ، شیورلیٹ یا..."

"حکومت۔ یہ شرطیہ کار کے انجن کی آواز ہے اور کار اِدھر آرہی ہے۔" رابعہ نے خوشی سے کہا۔

"بالکل غلط۔ یہ کار کے انجن کی آواز نہیں ہے۔"

"پھر کیا ہے؟" رابعہ بولی۔

"یہ جیپ کے انجن کی آواز ہے مگر جیپ کہاں ہے؟ کیا یہ نظر نہ آنے والی جیپ ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"دیکھو، آواز کتنی واضح ہے۔"

"شاہِ جنات کی سواری گزرتی ہے جنگل سے تو ایسی ہی آواز سنائی دیتی ہے۔" میں نے اِدھر اُدھر نظریں گھماتے ہوئے کہا۔

"تم سیریس نہیں ہوسکتے؟" رابعہ بگڑ گئی۔

"لاحول ولا قوۃ۔ کیا میں قہقہے لگا رہا ہوں۔ اتنا سیریس تو ہوں۔"

"سکندر پلیز! جب ہم جیپ کی آواز سن سکتے ہیں تو وہ ہماری آواز ضرور سن لیں گے۔ جیپ ذرا دور ہے۔"

میں نے سرہلایا "دو کلومیٹر شمال مغرب، چالیس سے پینتالیس ڈگری۔ غالباً ان درختوں اور جھاڑیوں کے پیچھے۔ فاصلہ زیادہ بھی ہوسکتا ہے۔"

رابعہ نے میرا بازو پکڑ کے مجھے جھنجوڑ ڈالا "آواز دو ورنہ وہ نکل جائیں گے۔"

میں نے منہ پر دونوں ہاتھ رکھے اور گلا پھاڑ کے کہا "مسٹر جیپ والے۔ ہا..... ہو...... آہ... واہ..."

"یہ کیا کر رہے ہو؟"

"آوازیں نکال رہا ہوں۔ نام تو مجھے کسی کا معلوم ہے نہیں۔" میں نے کہا "مقصد تو شور مچا کے انہیں متوجہ کرنا ہے۔"

رابعہ نے سرہلایا۔ اشتیاق اور امید کے جذبات نے اس کے چہرے پر اضطراب کے رنگ بکھیر دیئے تھے۔

"ارے کوئی ہے؟ آ آہ.... ہو وو... او جیپ والے! ارے ہم اِدھر ہیں بھائی۔" میں نے گلا پھاڑنا جاری رکھا۔

میری محنت رائیگاں نہیں گئی۔ جب اچانک میرے کانوں تک پہنچنے والی جیپ کے انجن کی آواز نے رُخ بدلا تو میں نے اس تبدیلی کو فوراً محسوس کرلیا۔ آواز لحظہ بہ لحظہ قریب ہوتی گئی۔

"رابعہ! انہوں نے ہماری آواز سن لی۔ وہ آرہے ہیں۔" میں نے فرطِ مسرت میں رابعہ کو سمیٹ کر اٹھایا اور گول گول گھوم کر اسے اپنے ساتھ گھمانے لگا "خدا نے ہماری سن لی۔"

"ارے چھوڑو مجھے۔ پاگل ہوگئے ہو کیا؟" رابعہ نے ہنستے ہنستے کہا "اُف، دیکھو کوئی آجائے گا تو کیا کہے گا۔"

میں نے اسے نیچے اتار دیا "وہی کہے گا جو تم نے کہا۔ میں خود بتادوں گا انہیں کہ میں پاگل ہوں، دیوانہ ہوں۔ دیوانہ ہوں اس لڑکی کا۔ اور یہ لڑکی رابعہ ہے۔ میں سکندرِ اعظم ہوں۔ پہلے میں نے اس کو فتح کیا پھر دنیا کو فتح کیا۔ مجھے کسی کا ڈر نہیں۔ ڈر کا یہاں کیا کام۔ یہاں تو سب اپنے ہیں۔ سب پاکستانی ہیں۔"

رابعہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ یہ خوشی کے آنسو تھے۔ اگرچہ ہم نے ابھی تک آنے والوں کی صورت بھی نہیں دیکھی تھی مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ جو بھی تھے ہمیں اپنے ساتھ لے جاسکتے تھے اور صحیح راستہ دکھا سکتے تھے۔ اس کے بعد پنڈی، لاہور، کراچی سب ہماری پہنچ میں تھے۔

جیپ درختوں کے بیچ میں سے نمودار ہوئی تو ہم اس کی طرف لپکے۔ میں دوڑ کر آگے نکل گیا۔ جیپ رک گئی۔ اس میں آگے ڈرائیور کے ساتھ سویلین کپڑوں میں ایک سنجیدہ افسر ٹائپ شخص بیٹھا تھا۔ اس کی عمر چالیس سے اوپر تھی مگر صحت قابلِ رشک تھی۔ وہ ٹویڈ کے کوٹ اور گرے ورسٹیڈ کی پینٹ میں تھا۔ کوٹ کے نیچے اونی سوئٹر تھا جس کے وی شیپ گلے سے ٹائی بھی نظر آرہی تھی۔ اپنے ہیرکٹ سے وہ فوجی یا پولیس والا لگتا تھا۔

"آپ آوازیں دے رہے تھے ہمیں" اس نے ہاتھ ہلا کے پوچھا۔

"ہم نے جیپ کی آواز سن لی تھی۔" میں نے اس سے ہاتھ ملا کے کہا "ہم کل سے مسلسل سفر میں تھے۔ نہ ہمیں کوئی آبادی ملی، نہ راستہ بتانے والا ملا۔ اب تو ہمارا حوصلہ ہی جواب دینے لگا تھا۔ آپ لوگ نہ آتے تو نہ جانے ہم..."

اس نے کہا "ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ پہلے جیپ میں بیٹھو پھر باقی باتیں بھی ہوجائیں گی۔ یہ بیوی ہے آپ کی؟"

میں نے اقرار میں سرہلایا اور رابعہ سے کہا "آیئے پہلے آپ بیٹھئے، میں نے کہا تھا نا کہ مایوس ہونے کی ضرورت نہیں، کوئی ضرور ملے گا۔"

رابعہ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی تو میں بھی جیپ میں چڑھ گیا۔

"ہم بھی آپ ہی کو تلاش کررہے تھے۔" افسر ٹائپ شخص نے جیپ میں بیٹھنے کے بعد کہا اور جیب سے سگریٹ نکالی۔

"ایک سگریٹ مجھے بھی۔ پلیز!" میں نے بے اختیار کہا۔

"سوری۔ یہ آخری سگریٹ تھی۔ تم بھی چاہو تو شیئر کرلو۔" وہ بولا "آپ لوگوں نے واقعی کمال کیا۔ اتنی دور پیدل آگئے۔ تمہاری بیوی کی ہمت کی میں داد دیتا ہوں۔"

میں نے سگریٹ کے لیے ہاتھ بڑھایا اور کھینچ لیا۔ رابعہ مجھے گھور رہی تھی۔

"ہم کہاں سے آرہے ہیں، یہ جانتے ہیں آپ؟" میں نے کہا۔

"یس۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم آپ ہی کو تلاش کررہے تھے۔" اس نے کہا "ہم کل رات بھی خاصے پُرامید تھے مگر اندھیرے میں یہ کام مشکل تھا۔ اور آپ لوگ نہ جانے کہاں غائب ہوگئے تھے۔"

میں نے انگریزی میں کہا "آخر آپ کون ہیں اور ہمیں کیوں تلاش کررہے تھے؟"

اس نے کہا "میرا نام میجر شفیق ہے۔"

"اوہ! میں سمجھ گیا۔ آپ لوگوں نے ہی وہ ہیلی کاپٹر گرایا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"رائٹ۔ وہ ہیلی کاپٹر پاکستان کی فضائی حدود کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بہت اندر آگیا تھا۔" میجر شفیق نے کہا۔

"کیا اسے گرانے سے پہلے ضروری نہیں تھا کہ آپ اسے وارن کرتے؟" میں نے کہا۔

"ہم نے اسے وارننگ دی تھی۔" وہ بولا "ایک بار نہیں دو بار۔ اور اگر ممکن ہوتا تو ہم اسے انٹرسیپٹ (INTERCEPT) بھی کرتے۔ جب اس نے ہمارے کہنے کے باوجود لینڈ کرنے سے انکار کردیا......"

"آر یو شیور کہ اس نے انکار کیا تھا؟"

"واٹ ڈو یو مین بائی دیٹ۔ یہ مروّجہ طریق کار ہے۔ ہر جگہ، ہر ملک میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ کوئی غلطی سے کسی ملک کی سرحد عبور کرجائے۔ نیوی گیشن کے آلات کی خرابی سے ایسا ہوجاتا ہے تو اسے بغیر وارننگ کے کوئی شوٹ نہیں کرتا۔ دیٹ بلڈی باسٹرڈ۔ آئی ایم سوری! مجھے ایک خاتون کی موجودگی میں ایسی زبان استعمال

کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔ وہ جو ہیلی کاپٹر اڑا رہا تھا' اس نے ہمارا مذاق اڑایا' ہمیں مشتعل کیا اور چیلنج کیا کہ ہم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

میں ہکا بکا بیٹھا تھا "میں نے تو نہیں سنا۔"

"تم اس کے ساتھ تھے نا؟" وہ میرے رضاکارانہ اور غیرارادی اعترافِ جرم پر خوش ہو کے بولا "میں بتاتا ہوں اس نے کیا کہا۔ اس نے کہا تو ہیل ود یو۔ اور پھر وہ گانا گاتا رہا۔ "کیچ می اف یو کین" تم جانتے ہو کہ یہ گانا محمد علی کلے سے منسوب ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔" میں نے افسوس سے کہا "مگر یہ چیلنج نہیں تھا میجر شفیق۔"

"اور کیا تھا؟" وہ بگڑ کے بولا "وہ کہہ رہا تھا کہ مجھے پکڑ سکو تو پکڑو۔"

"وہ نشے میں تھا۔" میں نے کہا "سارا راستہ پیتا رہا تھا۔"

"پھر تو ٹھیک ہی ہوا اس کے ساتھ۔ ایسے لوگوں کو شوٹ ہی کر دینا چاہیے جو جہاز اڑاتے وقت پیتے ہوں اور غیرقانونی طور پر سرحد عبور کر کے کسی ملک میں دشمن کے جاسوس اتارتے ہوں۔"

"دشمن کے جاسوس! کون ہے دشمن کا جاسوس؟" میں نے محسوس کیا کہ میرا چہرہ اس گالی پر گرم ہو گیا ہے۔

"اور کون ہو تم؟" اس نے پلٹ کے کہا۔

"مائنڈ یو میجر شفیق۔ مجھے مشتعل مت کرو۔ میں اتنا ہی پاکستانی اور محب وطن ہوں جتنے تم۔ یہ بات دوبارہ مت کہنا۔ نادانستگی میں تم نے مجھے بہت بڑی گالی دے دی تھی۔ اب میں تمہیں بتاتا ہوں کہ میرا نام سکندر بخت ہے اور ابھی یہ میری بیوی نہیں ہے لیکن یہ مس رابعہ قاری بار ایٹ لاء' ایڈووکیٹ ہائی کورٹ لاہور ہے۔ میری شادی اسی سے ہوگی۔"

اس کی صورت کے تاثرات ایک دم بدل گئے "ایک بار پھر بتاؤ۔"

میں نے کہا "پہلے تم بتاؤ کہ ہمیں کہاں لے جا رہے ہو؟"

"اپنی یونٹ میں تفتیش کے لیے۔"

"او کے! پھر باقی باتیں ہم تفتیش کے وقت بتائیں گے۔ سب کچھ تمہیں راستے میں نہیں بتایا جا سکتا۔ تم کو سوچنا چاہیے کہ ہم ذہنی اور جسمانی طور پر کتنے خستہ حال ہیں۔ ہمیں پہلے خوراک' آرام اور طبی امداد چاہیے۔ میں یہ بھی بتا دوں میجر شفیق کہ میں کوئی عام آدمی نہیں ہوں۔ میں ایک صنعتکار کا بیٹا ہوں اور خود بھی....."

میجر شفیق مسکرایا "او کے او کے۔ آئی ایم سوری۔ اگر یہ سب سچ ہے اور اس کی تصدیق کی جا سکتی ہے تو پھر پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ ریلیکس۔ میں آپ سے بھی معذرت خواہ ہوں مس رابعہ۔"

رابعہ نے خوش دلی سے انگریزی میں کہا "میرا بھی آپ ... خلاف ہتکِ عزت کا کوئی دعویٰ کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔ یہ غلط ... تھی جو اب دور ہو چکی ہے۔"

میں نے کہا "میجر شفیق! کیا ہمارے علاوہ بھی آپ کو ... علاقے میں کوئی نظر آیا تھا؟ کل یا آج۔"

"آپ کے علاوہ کون تھا؟ آپ کا کوئی ساتھی۔"

میں نے اقرار میں سرہلایا "ایک جرنلسٹ مرزا غالب۔"

"جرنلسٹ! مرزا غالب تو شاعر تھے۔"

"وہ تھے' یہ ہیں۔" میں نے کہا "اور اس کے ساتھ بھی ... خاتون ہیں۔ مس نازلی۔"

"وہ کیا کرتی ہیں؟ میرا مطلب ہے ان کا پیشہ۔"

"مار دھاڑ" میں نے کہا "شوقیہ۔"

"میری سمجھ میں نہیں آئی یہ بات۔ آخر یہ کس قسم کا ایڈ... تھا جس میں ایک صنعتکار' ایک بیرسٹر خاتون' ایک جرنلسٹ ... ایک مار دھاڑ کرنے والی خاتون شامل تھیں۔ اس ہیلی کاپٹ... بارے میں ہم تصدیق کر چکے ہیں۔ وہ نیپال سے آیا تھا۔" میجر ... نے کہا۔

"ہم بھی نیپال سے آئے تھے۔" میں نے کہا "اور اگر ... اس ہیلی کاپٹر کو شوٹ کر کے نہ گراتے تو وہ ہمیں اتار کے واپس ... جاتا جیسے کہ وہ پہلے متعدد بار جا چکا تھا۔"

"متعدد بار؟"

"یس۔ اس نے ہم سے پچاس ہزار لیے تھے۔ نیپال ... پاکستان کی سرحد کے اندر پہنچانے کے۔ ہم مشرقی پاکستان میں ... جب وہ بنگلہ دیش بنا تو لاکھوں پاکستانیوں کی طرح ہم بھی وہاں ... نکلنے پر مجبور ہوئے مگر ہمارے پاس پیسہ تھا۔ ہم نے یہ ہیلی کاپٹ... افراد کے لیے چارٹر کر لیا تھا ورنہ ہم بھی قافلوں کے ساتھ پا... آنے پر پاکستان پہنچتے۔"

رابعہ نے کہا "آپ کو ہمارے ساتھی نہیں ملے میجر شفیق ..."

اس نے نفی میں سرہلایا "مجھے تو نہیں ملے اور میرا خیال ... کسی کو بھی نہیں ملے۔ عام خیال یہ تھا کہ اس جگہ سے آگے ... کے جانے کا کوئی امکان نہیں۔ رات کوئی کہاں گزارے گا ... کے مر جائے گا سردی میں۔ صبح مجھے خیال آیا کہ آدمی بہت ... جان ہوتا ہے اور ناممکن کو ممکن کر دکھاتا ہے۔ مجھے آگے تک ... چاہیے۔"

"اگر میں تم کو آواز نہ دیتا تو تم سیدھے آگے نکل جاتے ..."

"پتا نہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ واپس لوٹ جاؤں۔ شا... آگے سے گھوم کے آتا تو تم سے ملاقات ہو جاتی۔ اب یون... کے دیکھیں گے۔ کسی کی ملاقات تمہارے ساتھیوں سے ... نہیں۔ چانس کم ہے۔"

...میجر شفیق! وہ کہاں جا سکتے ہیں۔ وہ بھی پیدل ہوں گے۔ ...نہیں تلاش کرو' اتنی جلدی فیصلہ مت کرو۔"

"ہم پوری کوشش کریں گے' ایک بار پھر۔ اور اس مرتبہ ...نہیں بھی ساتھ رکھیں گے۔ رائٹ۔"

میں دیکھ رہا تھا کہ جیپ اسی راستے پر واپس جا رہی ہے جس پر ...ل کے میں اور رابعہ آئے تھے۔ ہم اس چٹان کے پاس سے گزرے جہاں ہم نے زندگی کی ایک یادگار' پھر کبھی لوٹ کر نہ آنے ...الی رات گزاری تھی۔ وہاں شاید ابھی تک تین بھیڑیوں کی لاشیں ...ڑی ہوں گی۔ آگ جو رات بھر سردی کے خلاف ایک ڈھال بن کے روشن رہی تھی' بجھ چکی ہوگی۔ آدھ جلی لکڑیوں اور کوئلوں پر راکھ کی تہ ہوگی اور چٹان کے نیچے ان انڈوں کے چھلکے پڑے ہوں گے جو ہم نے کھائے تھے۔

جو راستہ ہم نے دن رات اپنے قدموں سے برف میں چھپی ہوئی ناہموار زمین پر جسمانی تکالیف کو برداشت کرتے اور موسم کی سختی کو جھیلتے طے کیا تھا' وہ جیپ کے مشینی پیروں نے انتہائی تیز رفتاری سے دوڑتے ہوئے آدھے گھنٹے میں طے کر لیا۔

جب ہم دوبارہ برف میں دھنسے ہوئے ہیلی کاپٹر کے پاس سے گزرے تو وہاں ایک چھوٹا سا خیمہ نصب تھا اور چار پانچ افراد بڑی محنت سے اس کو کھود کر نکالنے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ ایک فوجی ٹرک کے قریب ہی جیپ کھڑی ہوئی تھی اور تین افراد آپس میں مصروفِ گفتگو تھے۔

میجر شفیق نے اپنی جیپ کو ان سے کچھ فاصلے پر روکا اور ایک شخص کو سیلوٹ کیا "وی گاٹ دیم سر۔"

جسے سیلوٹ کیا گیا تھا' وہ زیادہ عمر رسیدہ' متین اور بارعب چہرے والا شخص تھا۔ وہ آہستہ آہستہ آگے آیا۔

میں نے نیچے اتر کے اس سے ہاتھ ملایا "سکندر بخت میرا نام ہے۔ یہ خاتون رابعہ قاری بار ایٹ لاء' ایڈووکیٹ لاہور ہائی کورٹ ہیں۔"

مجھے اس شخص کی آنکھوں میں تحیّر کے جذبات نظر آئے۔ اس نے ہاتھ ملا کے کہا "کرنل جعفری" اور سوالیہ نظروں سے میجر شفیق کی طرف دیکھا۔ سوال بہت واضح تھا۔ تم نے تو کہا تھا میجر کہ ہم نے انہیں پکڑ لیا مگر یہ تو انڈین جاسوس نہیں ہیں؟

میجر شفیق نے قریب آ کر وضاحت کی۔ کرنل نے خاموشی سے اس کی بات سنی اور سگار پیتا رہا۔

"ان دیٹ کیس" اس نے میرے کندھے پر بزرگانہ شفقت سے ہاتھ رکھا۔ "کسی بات کا برا ماننے کی ضرورت نہیں۔ جا کے آرام کرو' شام کو بات کریں گے۔ میں ابھی تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔"

صاف ظاہر تھا کہ وہ اپنی تفتیش مکمل کیے بغیر اور مطمئن ہوئے بغیر ہمیں جانے کی اجازت ہی نہیں دیں گے۔ ہمیں کہیں پہنچانے کا انتظام تو بعد کی بات تھی' ان سے بحث کرنا اور انہیں قائل کرنا کہ وہ فوراً ہمیں جیپ سے یا ٹرک سے کسی سڑک تک پہنچا دیں یا فوری طور پر ہماری کسی سے بات کرا دیں' فضول سی بات ہوتی۔

میں نے کرنل سے ہاتھ ملایا اور جیپ ہمیں لے کر آگے روانہ ہو گئی۔ مزید ایک گھنٹے کا سفر طے کرنے کے بعد ہم ایک احاطے میں داخل ہوئے جس کے تین طرف بیرکس بنی ہوئی تھیں۔ گیٹ پر کھڑے ہوئے سنتری نے میجر شفیق کو سیلوٹ کیا اور جیپ سیدھی گزرتی بائیں جانب کی بیرک کے سامنے جا ٹھہری۔ اس راستے کے دونوں طرف سفید اور لال رنگ کی اینٹوں سے حاشیہ بندی کی گئی تھی اور ہر طرف وہ صفائی نظر آتی تھی جو ملٹری ڈسپلن کا خاصا ہوتی ہے۔

چند منٹ بعد ہم ایک کمرے میں تھے۔ میجر شفیق نے اپنے بیٹ مین کو تفصیلی ہدایات جاری کر دی تھیں اور بتا دیا تھا کہ ہم کرنل صاحب کے خاص مہمان ہیں چنانچہ ہمارے قیام و طعام کا خاص خیال رکھا جائے۔ اس کمرے میں دو بیڈ تھے۔ دو کرسیاں اور ایک میز یوں لگائی گئی تھیں کہ انہیں کھانے کے لئے بھی استعمال کیا جا سکتا تھا اور پڑھنے کے لئے بھی۔ دونوں بیڈز کے درمیان ایک چھوٹی سی ریک نما سائڈ ٹیبل تھی۔

بیٹ مین حیران تھا کہ ہم کیسے خاص مہمان ہیں جن کا حلیہ بگڑا ہوا ہے اور جن کے پاس ایک بریف کیس کے سوا کچھ بھی سامانِ سفر نہیں۔ اس علاقے میں کسی سویلین اور خاص طور پر ایک جوان اور حسین عورت کا پہنچنا ہی سب کے لئے تعجب خیز تھا۔

میں نے کہا "ہم پہلے نہائیں گے۔ میں شیو بھی کروں گا۔ پھر چائے یا کافی کے ساتھ کچھ کھائیں گے۔"

"یس سر" بیٹ مین بولا۔

"پھر کرنل صاحب کے آنے تک ہم آرام کریں گے" میں نے کہا "سب سے پہلے مجھے سگریٹ کا ایک پیکٹ لا کے دو۔ کوئی سی سگریٹ ہو۔"

"سگریٹ تو نہیں ہے سر" بیٹ مین نے کہا اور رخصت ہو گیا۔

"کل سے سگریٹ نہیں پی تھی تو مرے نہیں تھے" رابعہ نے خفگی سے کہا۔

"قریب المرگ ضرور ہو گیا تھا۔"

"جھوٹ مت بولو۔ کچھ نہیں ہوا تھا تمہیں۔ پہلے جیپ میں بیٹھتے ہی میجر شفیق کے آگے ہاتھ پھیلا دیا۔ اب اس بیٹ مین کو حکم دے دیا۔"

میں نے کہا "چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔ یہ نشہ ہے..."

"اسے نشہ سمجھتے ہو تو بابا چھوڑ دو" رابعہ نے کہا "اگر صرف

قوتِ ارادی کی بات ہے تو اس کی تمہیں کوئی کمی نہیں۔ بس ارادہ کرلو۔"

"کیا بات ہے۔ آج اچانک ہاتھ دھو کے پیچھے پڑگئی ہو۔ آج ہی چھڑا کے دم لوگی۔"

"بالکل۔ بڑا اچھا موقع ہے۔ جب تک ملتی رہی' پیتے رہے' اب نہیں ہے تو مجبوری مت سمجھو۔ طے کرلو کہ جیسے دو دن گزر گئے ایسے ہی تم اگلے دو دن' پھر دو ہفتے' دو مہینے اور دو سال بھی گزار لوگے۔ سگریٹ کے بغیر۔"

میں نے سوچتے ہوئے کہا "کہتی تو تم ٹھیک ہو عزیزہ مگر....."

"اگر مگر مت کرو۔ ایک بری عادت چھٹ جائے گی تو یہ بھی اس یادگار سفر کا یادگار تحفہ ہوگا۔ ہم یاد رکھیں گے اس بات کو بھی کہ کب اور کہاں تم نے سگریٹ نوشی ترک کرنے کا عہد کیا تھا۔ بولو' مانوگے میری بات؟ آج تک میں نے پہلے کبھی تم سے کچھ کہا' کوئی بات کی اس موضوع پر؟"

وہ بہت سیریس ہو رہی تھی۔ میں تکیے کو گود میں دبائے اس کی صورت کو دیکھتا رہا۔ "کیا چاہتی ہو تم آخر۔ میں جھوٹا وعدہ کرلوں؟"

"تم..... مجھ سے جھوٹا وعدہ کروگے؟" اس کا چہرہ یوں اتر گیا جیسے میں نے اس کی تذلیل کردی ہو۔ وہ رونے کے قریب ہوگئی۔

میں ہنس پڑا "پاگل۔ میں چھیڑ رہا تھا تمہیں۔"

"اچھا تو پھر وعدہ کرو" اس نے میرا ہاتھ پکڑ کے اپنے سر پر رکھ لیا "میری قسم کھا کے وعدہ کرو۔"

میں نے اپنا ہاتھ چھڑالیا۔ "کیا کرتی ہو۔ یہ ملٹری یونٹ ہے' ہمارا بیڈ روم نہیں ہے۔ تماشا بن جائے گا۔"

"بننے دو" اس نے پھر میرا ہاتھ پکڑلیا "میں نہیں ڈرتی کسی سے۔ تم کو ماننی پڑے گی میری بات ورنہ؟"

"ورنہ کیا.....؟"

"ورنہ میں کچھ کروں گی" اس نے عزمِ مُصمم کے ساتھ کہا۔ "قسم پھر میں کھاؤں گی کہ جب تک تم سگریٹ نہیں چھوڑوگے' میں کھانا چھوڑے رکھوں گی۔"

میں نے کہا "تم سچ مچ پاگل ہوگئی ہو۔"

"یہی سمجھ لو۔ مگر تمہاری قسم' ایسا ہی ہوگا۔"

رابعہ نے انگریزی محاورے کے مطابق لوہے پر اس وقت چوٹ لگائی تھی جب لوہا گرم تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میری سگریٹ نوشی کی عادت کبھی اس کے اور میرے درمیان وجہِ نزاع نہیں بنی تھی اور اس نے کبھی مجھے لیکچر دینے کی کوشش بھی نہیں کی تھی مگر اب اچانک وہ دھمکی دینے پر اتر آئی تھی اور اس پر عمل کرنے پر کمربستہ تھی۔ اس نے موقع غنیمت جانا تھا اور بالکل صحیح وقت پر اپنی بات منوانے پر تل گئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ دو دن سگریٹ کے بغیر گزار کے میں نے اس عادت کے خلاف آدھی جنگ تو جیت ہی لی ہے۔ اگر میں دو دن اور گزار لیتا تو طلسمِ مجبوری کے جال سے نکل سکتا تھا۔

میں نے ایک گہری سانس لی اور کہا "جانم' آج کے بعد یہ سگریٹ کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا' میرا تم سے وعدہ ہے۔"

اس نے ایک دم میرا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگالیا۔ اس کی آنکھوں کے جلتے پانی کی نمی مجھے اپنے ہاتھ کی پشت پر محسوس ہوئی۔ "بس' اب قسم مت کھانا۔ مجھے معلوم ہے تم مجھ سے جھوٹا وعدہ کر ہی نہیں سکتے۔"

بیٹ مین ایک دم دروازہ کھول کے اندر آگیا۔ وہ ہاتھ میں گرم پانی کی بالٹی رکھنے آیا تھا۔ یہ جذباتی' رومانی منظر دیکھ کر اتنا بدحواس ہوا کہ اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اس کے قدم ذرا دیر کے لئے رکے پھر وہ نظر چرا کے باتھ روم میں گھس گیا۔

جب وہ واپس جارہا تھا تو میں نے کہا "سنو جوان!"

"یس... یس سر۔" وہ سر جھکا کے کھڑا ہوگیا۔

"تم جب کسی کے کمرے میں جاتے ہو تو کیا ناک نہیں کرتے' دستک دے کر اجازت کا انتظار نہیں کرتے؟"

"معاف کردیں' غلطی ہوگئی سر" وہ بڑی مشکل سے بولا "میجر صاحب سے میری شکایت مت کریں۔"

"نہیں کروں گا۔ جاؤ" میں نے کہا اور وہ دروازہ بند کرکے نکل گیا۔

اس کے جاتے ہی میں نے رابعہ کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا رہی تھی حالانکہ آنسوؤں کی نمی اب بھی اس کی آنکھوں میں تھی۔

"مجھے باتھ روم میں سے شیونگ کا سامان دے دو اور تم نہا لو اتنی دیر میں" میں نے کہا۔

"سکندر" وہ اٹھی اور دروازے کی طرف ایک قدم اٹھا کے بولی "تم..... خفا تو نہیں ہو مجھ سے؟"

"خفا۔ کس بات پر؟" میں نے کہا۔

"میں نے تمہیں بلیک میل کیا۔"

میں ہنس پڑا "یہ وائٹ میل تھا۔ بلیک میل کیا جاتا ہے بُرے مقصد کے لئے۔ تم نے تو بقول شاعر۔ وہ کام کیا ہم نے جو رستم نہ ہوگا۔ اور یہ نیکی تھی جو تمہارے نامۂ اعمال میں لکھی گئی۔ میں مبارک باد دیتا ہوں تمہیں کہ تم نے اپنی محبت سے میری ایک کمزوری کو میری طاقت بنا دیا۔ یہ کام تم ہی کرسکتی تھیں۔"

رابعہ کا چہرہ مسّرت سے دمکنے لگا اور اس نے ایک ایسی حرکت کی کہ اگر وہ بیٹ مین اندر آکے دیکھتا تو چِت سے گر کے بے ہوش ہوجاتا۔ خود میں بھونچکا رہ گیا اور رابعہ باتھ روم میں غائب ہوگئی۔ میں نے آئینے میں اپنی صورت دیکھی۔ میرے عکس نے مجھ سے کہا۔ ابے مجنوں! یہ منہ اور مسور کی دال۔

اور میں نے قہقہہ مار کے اپنی بڑھی ہوئی داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ "مسور کی دال؟ کہاں ہے مسور کی دال؟" میں نے کہا۔ "یہ تو محبت ہے۔"

بیٹ مین پھر دستک دینا بھول گیا اور اندر آگیا۔ اب اس نے مجھے آئینے میں اپنے آپ سے باتیں کرتے دیکھا تو گڑبڑا کے واپس ہوا۔ باہر جا کے اس نے دستک دی اور میرے "یس" کہنے پر دوبارہ اندر آیا۔ وہ سخت شرمندہ تھا۔ "یہ سگریٹ سر..... میجر شفیق نے بھیجی ہے۔"

"ان کو میرا سلام اور تھینکس بولنا۔ سنو۔ کہاں بھاگے جارہے ہو؟ یہ سگریٹ واپس لے جاؤ۔ میجر صاحب سے کہنا کہ ابھی تین بج کر چوبیس منٹ پر میں نے سگریٹ پینا چھوڑ دی ہے۔ کیا کہو گے؟"

اس نے میری بات دہرائی اور سگریٹ کا آدھا پیکٹ اٹھا کے بھاگ گیا۔ بے شک ہم کرنل صاحب کے مہمان تھے مگر ہم نے اپنی مشتبہ حرکات و سکنات سے ثابت کردیا تھا کہ معزز مہمان بھی ذہنی عدم توازن کا شکار ہوسکتے ہیں۔

اس یونٹ تک سپلائی ایک مشکل کام تھی۔ وہاں بجلی بھی نہیں تھی۔ رات کے وقت ایک جنریٹر چلایا جاتا تھا جس سے ضروری اور اہم نوعیت کے فرائض کی ادائیگی ممکن ہوجاتی تھی۔ کھانے پینے کی ہر چیز کا راشن تھا۔ اس کے باوجود انہوں نے ہماری مہمان نوازی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

چائے کے ساتھ ہمارے کھانے کے لیے بہت کچھ تھا۔ بسکٹ' مٹھائی' خشک میوے اور تلے ہوئے مٹر۔ یہاں ہر چیز ٹن پیک رکھی جاتی تھی اور اس موسم میں فریج کے بغیر محفوظ رہتی تھی۔ زنانہ کپڑوں کا وہاں سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا تھا چنانچہ رابعہ نے بھی مردانہ شلوار قمیص پہن کے اوپر چادر اوڑھ لی تھی۔

ہم چائے پی کے فارغ ہی ہوئے تھے کہ کرنل جعفری دستک دے کر اندر آگیا۔

"یُو لک مچ بیٹر۔ اینڈ یو مچ پریٹر۔" اس نے رابعہ کی طرف دیکھ کے کہا (تم بہت بہتر لگ رہے ہو۔ اور تم زیادہ حسین)

میں نے کہا۔ "میں اس مہمان نوازی اور حسنِ انتظام....."

اس نے میری بات کاٹ دی۔ "ڈونٹ بی فارمل۔ مجھے کچھ بتایا ہے میجر شفیق نے لیکن میں تفصیل جاننا چاہتا ہوں۔"

وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور سگار کاٹنے لگا۔ وہ عادتاً انگریزی بولتا تھا۔ "خاتون! آپ اجازت دیں تو......" اس نے سگار سلگانے سے پہلے کہا۔

"یہ اجازت نہیں دیں گی۔ ابھی ابھی انہوں نے مجھ پر مکمل پابندی عائد کی ہے۔ دس سال پرانی سگریٹ پینے کی عادت میں نے ان کے اصرار پر تین بج کر چوبیس منٹ پر ترک کردی۔"

کرنل نے ایک زبردست قہقہہ لگایا۔ "میں نے سنا تھا میجر شفیق سے لیکن میں مذاق سمجھا تھا۔"

"یہ مذاق نہیں' حقیقت ہے کرنل۔"

"اوہ مائی گڈنس۔ یہ بیویاں سب کچھ کرسکتی ہیں۔" کرنل نے سگار اپنی جیب میں رکھ لیا۔

رابعہ نے شرم سے سرخ ہو کے کہا۔ "آپ سگار پئیں سر۔ آپ مہمان ہیں"

"میں مہمان ہوں؟" کرنل نے حیرانی سے کہا۔ "میرا خیال تھا' میں میزبان ہوں۔"

"اس یونٹ میں ہم آپ کے مہمان ہیں ادھر اس کمرے میں آپ ہمارے مہمان ہیں۔" رابعہ نے کہا۔

"یعنی یہ ہے قانونی پوزیشن۔" کرنل بولا۔ "اچھا آپ کی اجازت ہے تو پھر......" اس نے دوبارہ سگار نکالا اور جلا لیا۔

اگلے ایک گھنٹے تک اس نے ہماری سرگزشت سننے کے بہانے تفتیش کی مگر انتہائی شائستگی اور اخلاق کے ساتھ۔

"میرا وہاں زرعی مشینری کے آلات اور پرزے بنانے کا چھوٹا سا کارخانہ تھا۔" میں نے اپنے بیک گراؤنڈ کے حوالے سے بات کی۔ ڈھاکا کے صنعتی علاقے میں جب تباہی مچی تو وہ کارخانہ بھی تباہ ہوگیا۔ اس کی بعد میرے گھر کی باری آئی۔ میں اکیلا تھا اس لیے جان بچا کے فرار ہوگیا۔ گھر کا سارا اسباب بلوائیوں نے لوٹ لیا' پھر گھر کو آگ لگا دی۔ وہاں واپس جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں ہوٹل شاہ باغ میں فرضی نام سے رہا اور یہ میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے بینک سے اپنا سرمایہ نکلوانے کا موقع مل گیا۔ وہ غیر ملکی بینک تھا اس لیے محفوظ رہا ورنہ لوگ تو ایک پیسہ نہیں نکلوا سکے۔"

"آپ کا تو بہت نقصان ہوا ہوگا۔" کرنل بولا۔ "کارخانہ چھوٹا ہو پھر بھی لاکھوں سے کم کا نہیں ہوتا۔"

"جی۔ کارخانے کی بلڈنگ' مشینیں اور سب اثاثے تقریباً بیس بائیس لاکھ مالیت کے تھے۔ مکان بھی دو لاکھ کا تھا علاوہ سامان کے۔"

"اور آپ کتنا بچا کے ساتھ لاسکے مسٹر سکندر؟ اس نے بے حد ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

"تقریباً ساڑھے چار لاکھ۔ نقد۔ جو اس بریف کیس میں موجود ہے۔ آپ چیک کرسکتے ہیں۔ یہ سب پاکستانی کرنسی ہے۔"

"مجھے آپ پر اعتبار ہے مسٹر سکندر بخت۔" وہ بولا۔ "تاہم ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ آپ نے کہا تھا کہ یہ خاتون جو آپ کی مسز ہیں' لاہور ہائی کورٹ میں پریکٹس کرتی ہیں۔"

"پہلے تو میں وضاحت کردوں سر کہ ابھی تک یہ مسز سکندر بخت ہونے کا اعزاز حاصل نہیں کرسکیں۔" میں نے مسکرا کے کہا۔ "یہ میری منگیتر ہیں اور یوں سمجھ لیں کہ مجھے لینے آئی تھیں مگر خود بھی ڈھاکا میں پھنس گئیں۔"

"آئی سی۔" کرنل نے کہا۔ "یہ آپ کے ساتھ ہی مقیم تھیں؟"

"اوہ نو۔ یہ اپنے ایک عزیز کے گھر ٹھہری تھیں۔ انہوں نے میری بہت مدد کی۔ وہ عوامی لیگ کے مقامی عہدیدار تھے اس لئے ان کی چلتی تھی۔ انہی کے دم سے ہم نیپال پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔"

"یہ اب بھی رکن ہیں لاہور ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کی؟"

"آف کورس۔ ان کی اپنی لیگل فرم ہے جس کا دفتر لاہور کی مال روڈ پر ہے۔" میں نے کہا۔ "آپ ٹیلی فون نمبر لکھ لیں۔ ان کے اور میرے ایک مشترک دوست عبدالودود منظر ان کے معاملات کی نگرانی کر رہے تھے۔ وہ بھی لاہور ہائی کورٹ کے وکیل ہیں۔"

کرنل نے غالباً نمبر یادداشت میں محفوظ کرلیا۔ "آپ ڈھاکا میں اکیلے تھے۔ آپ کی فیملی کے باقی افراد......"

میں نے کہا۔ "میرے والدین کا تو انتقال ہو چکا۔ والد تقسیم کے وقت پاکستان آئے تھے۔ والدہ اور باقی سارے بھائی بہن فسادات کی نذر ہوگئے تھے۔ صرف میں بچا تھا۔ میرے والد نے لاہور میں مکان بنایا تھا جو آج میری ملکیت ہے۔ وہ ماڈل ٹاؤن میں ہے۔ نمبر لکھ لیں۔"

"اس کی کیا ضرورت ہے۔" کرنل نے کہا مگر وہ مزید معلومات کے انتظار میں مجھے متوقع نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"میرے ایک چچا تھے' مکرم شیروانی۔ وزارتِ خارجہ میں ڈپٹی سیکریٹری تھے۔ ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ تاہم ان کی بیٹی فوزیہ ہے اور میں یہ اعتراف کرتے ہوئے شرم محسوس نہیں کرتا کہ پہلے میں فوزیہ سے منسوب تھا۔ یہ ہمارے والدین کا فیصلہ تھا۔ مس رابعہ سے ملنے کے بعد میں نے اپنی مرضی سے اس فیصلے کو منسوخ کردیا۔ وجہ وہی تھی۔ میری اور فوزیہ کی افتادِ طبع میں مطابقت نہیں تھی۔ اس سے ہمارے خاندانی تعلقات بھی متاثر نہیں ہوئے اور بزرگ بھی خفا نہیں ہوئے۔ فوزیہ کا شوہر لائلپور میں لیکچرار ہے۔ رابعہ کے ایک چچا ایس ایس پی ضامن رضوی صاحب تھے۔ وہ بھی انتقال کرچکے ہیں۔ پورا پولیس کا محکمہ انہیں جانتا تھا کیونکہ وہ غالباً ایمانداری' فرض شناسی اور اصول پرستی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ رابعہ کا اپنا گھر گڑھی شاہو میں کراؤن سینما کے سامنے تھا مگر والدہ کے انتقال کے بعد یہ چچا کے گھر میں رہیں جو بانسوں والی سڑک پر رہتے تھے۔ آپ نے لاہور دیکھا ہے؟"

"میں لاہور میں ہی پلا بڑھا ہوں۔" کرنل جعفری نے سادگی سے کہا

"تو آپ جانتے ہوں گے کہ بانسوں والی سڑک دھرمپورہ ریلوے کراسنگ سے شروع ہوتی ہے۔ مسز ضامن رضوی نے شوہر کے انتقال کے بعد کرائے کا ایک مکان لیا اور اس میں اسکول چلایا۔"

"کرائے کا مکان! ان کا اپنا کوئی مکان نہیں تھا؟"

"صرف تنخواہ میں سے بچت کر کے مکان بنانا اتنا آسان نہ ہوتا کرنل جعفری۔ آپ کا ذاتی مکان ہے؟"

وہ چونکا۔ "نو... ابھی تک تو نہیں ہے۔ مگر ایک ایس ایس پی کا مکان نہ ہو۔ ان بلیو ایبل۔"

"میں نے اور میرے چچا زاد بھائی نے گریجویشن لاہور سے کی۔ پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن چلے گئے۔ وہاں ہم نے چار سال گزارے۔"

"تمہارا آبائی مکان لاہور میں ہے' بزنس ڈھاکا میں تھا" کرنل نے پھر سگار جلاتے ہوئے کہا۔

"اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں زیادہ مراعات حاصل تھیں مغربی پاکستان کے صنعتکاروں کو۔ بڑے منافع بخش (INCENTIVES) تھے۔ میرے والد نے اسے لاہور میں شروع کیا تھا مگر بعد میں ڈھاکا شفٹ کردیا۔"

کرنل کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ "یہ ہیلی کاپٹر آپ نے کیسے حاصل کیا تھا؟"

میں نے کہا۔ "میرے والد وزیر خاں کا ایک پرانا دوست تھا رام ناتھ۔ اس کا بنگلا دلی روڈ پر ہے۔ ہم اسی کے پاس ٹھہرے ہوئے تھے۔ اس نے سارا بندوبست کیا تھا۔"

"اور اس غیر قانونی پرواز کے لئے جوزف پریرا کو پچاس ہزار روپے دیے گئے تھے؟" کرنل ایک دم سے بولا۔

"آپ اس کا نام جانتے ہیں؟"

"ہم نے معلوم کرلیا ہے۔ نیپال کے پاکستانی سفارت خانے سے۔ جہاز کا نمبر وغیرہ مل گیا تھا۔ ہم مزید تفتیش کر رہے ہیں تاہم یہ ثابت ہوگیا ہے کہ ہیلی کاپٹر میں سراغرسانی اور جاسوسی کے آلات نہیں تھے۔"

سفارت خانے کے حوالے پر میرا دل ڈوبنے لگا تھا کہ شاید کرنل نے ہمارے بارے میں ہمارے کچھ بتانے سے قبل ہی سب کچھ معلوم کرلیا ہوگا۔ میں نے بڑے اعتماد کے ساتھ جھوٹ بولا تھا اور کرنل نے بھی بالکل ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ سچ جانتا ہے مگر میرے جھوٹ کو اخلاقاً تسلیم کر رہا ہے یا بعد میں میرے خلاف استعمال کرنے کے لیے۔ وہ بہت ذہین اور جہاں دیدہ آدمی تھا اور اس کے سامنے میری حیثیت طفلِ مکتب جیسی تھی۔ اس کی آخری بات سے مجھے کچھ سکون ہوا۔

"آپ نے یہ بھی معلوم کرلیا ہوگا کہ جوزف پریرا پہلے بھی اس قسم کی فلائٹ پر آتا رہا ہے؟" میں نے کہا۔

کرنل نے سرہلایا۔ "میرا خیال ہے وہ نفسیاتی مریض تھا۔ ایسے لوگ تم نے بھی دیکھے ہوں گے جو بالکل نارمل نظر آتے ہیں مگر ان میں خودکشی کے رجحانات غالب ہوتے ہیں۔ خودکشی' زہر یا خواب آور گولیاں کھا کے' خنجر سے شہ رگ کاٹ کے یا چھکے سے لٹک کر پھانسی چڑھ جانے سے ہی نہیں ہوتی۔ اس کے لاشعوری طریقے بھی ہوتے ہیں۔ سیفٹی فیکٹر کو نظرانداز کرتے ہوئے حد سے زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ گاڑی چلانا اور اسے ایڈونچر سمجھنا' لائف انجوائے کرنے کے نام پر شراب اور سگریٹ نوشی میں حد سے بڑھ جانا' بلاوجہ رسک لینا اور خود کو نڈر ثابت کرنا۔ یہ سب درحقیقت وہی ہے جسے ہم (SUICIDAL TENDENCY) کہتے ہیں۔ جوزف پریرا بھی اپنے آپ کو قتل کر رہا تھا اور مار دینا چاہتا تھا۔ اس کے لاشعور میں ایک احساس جرم تھا۔ دنیا کے سامنے وہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ عیاش اور خوش باش آدمی ہے جس کا غم سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ اس نے اپنے باپ کو قتل کردیا تھا' اس کے مکان پر قبضہ حاصل کرنے کے لیے۔ اس رات جوزف کا بہنوئی گھر میں تھا۔ وہ قتل کے الزام میں پکڑا گیا اور اسے موت کی سزا ہوگئی۔ جوزف کی ماں یہ بات جانتی تھی لیکن وہ منہ کھولتی تو بیٹا بھی ہاتھ سے جاتا۔ اسے یہ بات بھی دیر سے معلوم ہوئی تھی۔ بہن کہیں چلی گئی تھی۔ اس کے بارے میں پھر کبھی کسی نے کچھ نہیں سنا۔ وہ مرگئی تھی۔ تاہم جوزف جانتا تھا کہ اپنی ماں اور بہن دونوں کو خود اس نے بیوہ کیا تھا۔ یہی احساس جرم تھا جو اس کے لیے سوہانِ روح بنا۔ وہ دن رات شراب پیتا تھا۔ اس نے شادی بھی نہیں کی تھی۔ دو سال تک وہ موت کے کنویں میں موٹر سائیکل چلاتا رہا اور دو بار حادثے کا شکار بھی ہوا لیکن بچ گیا۔ ایک بار سو کلومیٹر کی رفتار پر گاڑی چلاتے ہوئے اس کی کار کے بریک فیل ہوگئے اور وہ سامنے سے آنے والے ٹرک میں گھس گیا مگر آدمی خوش قسمت تھا یا سمجھ لو کہ اس کی موت کا مقررہ وقت دور تھا۔ وہ پھر بچ گیا۔ ہمیں معلوم ہے وہ چار مرتبہ ہماری فضائی حدود میں داخل ہوا۔ ایک بار اس نے ہمیں جھوٹ بول کے ڈاج کیا' ایک بار وہ عین سرحد پر مسافروں کو اتار کر بھاگ گیا' دوبارہ وہ نشانہ چوک جانے کے باعث نکل گیا۔ بٹ ہی کلڈ ہم سیلف فائنلی۔ (لیکن آخرکار وہ اپنی جان لینے میں کامیاب رہا)"

میں دم بخود بیٹھا تھا۔ رابعہ کا رنگ فق ہوگیا تھا۔ کرنل جعفری نے جوزف پریرا کی پوری زندگی کو ہمارے سامنے کھلی کتاب کی طرح رکھ کے ثابت کردیا تھا کہ اس کی معلومات کس حد تک مکمل ہوسکتی ہیں اور وہ کتنے کم وقت میں اپنے وسائل کو بروئے کار لا کے جھوٹ اور سچ کا تفصیلی پوسٹ مارٹم کرسکتا ہے۔ وہ لاہور کا رہنے والا بھی تھا یا وہ مجھے اشارہ دے رہا تھا کہ میں اس سے جھوٹ نہ بولوں۔

میں نے کہا "کرنل جعفری! یہ سب آپ نے اتنے کم وقت میں کیسے معلوم کرلیا؟"

"ہمارے وسائل ہیں ینگ مین۔ ہم اپنا کام پیشہ ورانہ مہارت اور پرفیکشن (PERFECTION) کے ساتھ کرتے ہیں۔"

"اگر آپ لاہور کے رہنے والے ہیں تو آپ ایس ایس پی ضامن رضوی سے بھی واقف ہوں گے۔"

"اوہ لیس۔ ہی واز اے فائن مین۔" کرنل جعفری نے کہا۔

"آپ نے سول اینڈ ملٹری گزٹ بلڈنگ میں واقع رابعہ قاری اینڈ کمپنی کا دفتر بھی دیکھا ہوگا۔"

"وہ بلڈنگ تو ظاہر ہے مال پر ہے مگر مجھے کبھی کسی لیگل فرم کی خدمات کی ضرورت نہیں پڑی۔" وہ مسکرایا۔ "تاہم مجھے معلوم ہے ایک خاتون بیرسٹر تھیں۔ ان کی رہائش گڑھی شاہو میں تھی' کراؤن سینما کے سامنے۔ اور ان کا مکان غالباً دھماکے سے تباہ کردیا گیا تھا۔ عین اسی دن جس دن ان کی والدہ کی تدفین تھی۔"

"وہ..... وہ میں ہی تھی کرنل جعفری۔" رابعہ نے بڑی مشکل سے کہا اور پھر میری طرف دیکھ کر بولی۔ "سکندر! انہیں سب معلوم ہوگا۔"

میں نے اپنے ماتھے پر خفت کا پسینہ محسوس کیا۔ "کرنل جعفری! آپ جانتے ہیں کہ میں نے جھوٹ بولا تھا۔"

"لیں۔ تم نے جھوٹ کو سچ کے ساتھ ملا کے پیش کیا تھا۔" اس نے شاید دسویں بار سگار جلایا۔ "ڈھاکا میں تمہاری فیکٹری کی کہانی غلط تھی۔ یہ ہم جانتے ہیں کہ تم کس طرح ڈھاکا پہنچے تھے اور کیوں۔ میرا خیال ہے کہ بہت سے لوگوں کو معلوم ہوگا۔ اخبارات میں بھی بہت کچھ آیا تھا پہلے تو' بعد میں کچھ انڈین پریس نے رپورٹ کیا۔ تم سب کی تصویریں بھی شائع ہوئی تھیں اور کچھ ایم آر ایس کا نام بھی آیا تھا۔"

میں شرم سے پانی پانی ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ سب خوف اور اندیشوں کے آسیب نمودار ہوگئے جو میرے ماضی کی گرد میں گم ہوگئے تھے۔ خاموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد میں نے کہا۔ "اب مجھے کیا سمجھنا چاہیے کرنل جعفری! کیا میں زیرِ حراست ہوں؟"

"زیرِ حراست؟" آف کورس ناٹ۔ کیا جرم کیا ہے تم نے؟" کرنل جعفری بولا۔ "میرے نزدیک تم نے اس جنگ میں حصہ لیا تو کوئی غلطی نہیں کی۔ یو سی! ہم سب حالات اور واقعات کو اپنی اپنی نظر سے دیکھتے ہیں اور اپنا اپنا نقطۂ نظر رکھتے ہیں' زندگی کے ہر شعبے میں۔ خواہ وہ معاشرتی ہو یا سیاسی۔ چنانچہ یہ جو کچھ میں اپنی دانست میں اپنی سوچ کے مطابق کرتا ہوں اور اسے صحیح سمجھتا ہوں۔ صحیح اس لیے کہ میرا ضمیر مطمئن ہوتا ہے۔ وہی دوسرے شخص کے نزدیک غلط ہوسکتا ہے۔ مثال کے طور پر مشرقی پاکستان کے المیے کو لو۔ یہ کس کی غلطی تھی؟ فوج کی' سیاست دانوں کی یا بیوروکریسی کی جس نے ابتدا سے حالات کو اس حد تک بگاڑا۔ مستقبل کا مؤرخ خود فیصلہ کرے گا۔ آج تو ہم سب اس جرم میں برابر کے شریک ہیں اور ہر ایک سے شرمندہ ہیں کہ ہماری جدوجہد رائیگاں گئی۔ جدوجہد ہر سطح پر کی گئی تھی۔ مشرقی پاکستان کے محب وطن عوام نے اپنے طور پر مزاحمت کی تھی۔ اینڈ ٹو کٹ دی لانگ اسٹوری شارٹ (قصہ مختصر) اٹ از آل اوور ناؤ۔ سب ہمارے ماضی کا حصہ بن گیا۔ ہم

ایک جذباتی قوم ہیں۔ حقیقت جب خود اپنا وجود تسلیم کراتی ہے تو ہم مانتے ہیں' اس سے پہلے ہم خواب کی باتیں کرتے ہیں یا اپنے شاندار ماضی کے حوالوں سے دل بہلاتے ہیں۔ اب ضروری ہے کہ ہم اس باب کو بند کردیں۔ ایک دوسرے پر الزام تراشی سے کیا حاصل ہوگا۔ مزید انتشار اور عدم اعتماد کی فضا۔ اس سے کہیں بہتر ہوگا' اگر اپنے اپنے طور پر ہم اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کا جائزہ لیں۔ صرف جائزہ لینے کے لئے نہیں۔ اس لئے کہ ہم سے یہی غلطیاں پھر سرزد نہ ہوں۔ بے شک انسان خطا کا پتلا ہے۔ ہم دوسری غلطیاں کریں گے۔"

وہ یکلخت خاموش ہوگیا۔ اس کا چہرہ اندرونی کرب اور ذہنی اذیت کے جذبات سے تاریک ہورہا تھا۔ ہر سچے پاکستانی کی طرح وہ دکھی تھا اور اس کی زبان سے ادا ہونے والا ہر لفظ حقیقت کے آتش فشاں کا لاوا تھا۔

اب رات ہوگئی تھی۔ رابعہ نے اٹھ کے لائٹ جلانے کی کوشش کی مگر کمرا تاریک رہا۔

"سوری! ہم یہاں جنریٹر استعمال کرتے ہیں' روشنی کے لئے نہیں' کام کے لئے۔" کرنل جعفری نے کہا "یہاں بجلی پہنچی ہی نہیں۔ میں چائے بھی منگواتا ہوں اور موم بتی بھی۔"

اس نے بیٹ مین کو آواز دی جو شاید دروازے کے قریب ہی اٹین شن کھڑا ہوا تھا۔ وہ آرڈر پر سیلوٹ مار کے اور یس سر کہہ کے چلا گیا۔

"یہاں سپلائی بڑا مشکل کام ہے اور بہت مہنگا۔ پھر بھی ہمیں کبھی کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہوتی۔ سوائے بیوی بچوں کے۔ تو وہ ایک سپاہی کے لئے کوئی خاص بات نہیں۔ ہم یہاں ایک فیملی کی طرح رہتے ہیں۔ یہاں کسی پُر تکلف ضیافت کا اہتمام تو نہیں کیا جاسکتا پھر بھی رات کو ڈنر پر تم ہمارے مہمانِ خصوصی ہو۔"

میں نے کہا "کرنل جعفری! میں پہلے ہی بہت شرمندہ تھا' آپ نے میری عزتِ نفس کو بحال کیا اور مجھے اس درجہ اعتماد عطا کیا' اپنائیت دی اور یقین دیا۔ میں آپ کا شکریہ کیسے ادا کروں۔"

"ضرورت شکریے کی نہیں ہے ینگ مین۔ احتیاط کی ہے۔ تم کیوں خود کو اتنا محفوظ سمجھنے لگے ہو؟ تمہارا کیا خیال ہے کہ جو پہلے تمہارے دشمن تھے' وہ اب دوست ہوگئے ہیں اور تمہارے شایانِ شان استقبال کے لئے چشم براہ ہیں؟" کرنل جعفری نے کہا۔ "بے شک جو میری طرح سوچتے ہیں اور تمہارے جذبۂ حُب الوطنی کے معترف ہیں' ان سے تمہیں کوئی خطرہ نہیں۔ مگر جو پہلے بدخواہ تھے' کیا وہ تمہیں معاف کردیں گے' تمہیں الزامات سے بری کردیں گے؟ میرا اشارہ کس کی طرف ہے' تم سمجھ رہے ہونا؟"

"میں بالکل سمجھ رہا ہوں۔ اور آپ کی بات نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ جو مجھے پہلے نظر نہیں آرہا تھا' اب صاف نظر آرہا ہے" میں نے کہا "یہ بھی آپ کا احسان ہے کہ آپ نے مجھے خبردار کردیا۔"

"پرانے شکاری نیا جال بھی بچھا سکتے ہیں اور تم کو پرانے جال میں بھی گرفتار کرسکتے ہیں" کرنل جعفری نے کہا "جس کو تم بھولے ہوئے تھے۔"

"یو آر ویری رائٹ۔ مجھے بہت محتاط ہونے کی ضرورت ہے ورنہ میں پھر مشکل میں پڑ سکتا ہوں" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

"پہلے حالات کا جائزہ لے لو' دیکھو خطرہ ہے یا نہیں اور تم کس حد تک محفوظ ہو" کرنل نے کہا "اس کے بعد کچھ کرو۔"

میں نے کہا "آپ کے اس مشورے نے مجھے بچالیا ورنہ میں تو لاہور پہنچ کے اپنی آمد کا اعلان ڈھول بجا کے کرتا۔ اب میں خاموشی سے اور رازداری کے ساتھ دوستوں اور دشمنوں کی نیت اور ارادے کو دیکھوں گا۔"

بیٹ مین ناک کرکے آیا اور چائے رکھ کے چلا گیا۔ جانے سے پہلے اس نے کارنس پر دو موم بتیاں جلا کے رکھ دیں۔ رابعہ نے کمرے کی کھڑکیاں بند کردیں کیونکہ رات کے ساتھ ہی سردی پھر بڑھ گئی تھی۔

میں اور کرنل کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ میں نے اسے خاصے اختصار کے ساتھ اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات بتائے۔ وہ دلچسپی سے سنتا رہا۔ اب ہمارے درمیان دوستانہ اعتماد کا رشتہ قائم ہوگیا تھا اور کوئی حجاب نہیں رہا تھا چنانچہ میں نے کوئی بات نہیں چھپائی۔

آٹھ بجے وہ جانے کے لیے اٹھا۔ "کھانا ہم نو بجے کھائیں گے۔"

رابعہ نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "کرنل صاحب! میرا لباس...."

اس نے ایک قہقہہ مارا۔ "اٹ از آل رائٹ۔ وہاں میرے علاوہ صرف تین افسر ہوں گے میرے کمرے میں۔ میجر شفیق سے تم مل چکے ہو' باقی دو جونیئر افسر ہیں۔ ایک کیپٹن اور ایک لیفٹیننٹ۔ وہ سب شریف اور مہذب لوگ ہیں۔ انہیں معلوم ہے تمہاری مجبوری۔"

میں نے کہا۔ "کیا انہیں یہ سب بھی معلوم ہے جو آپ کو معلوم ہے؟"

"میرا خیال ہے نہیں۔" اس نے جاتے جاتے کہا اور پھر دروازے میں ذرا سی دیر کے لیے رکا۔ "تمہاری وہی اسٹوری بالکل ٹھیک ہے جو تم نے مجھے سب سے پہلے سنائی تھی۔"

اس نے دروازہ بند کردیا۔ میں اور رابعہ دم بخود بیٹھے رہے۔ پھر رابعہ نے کہا۔ "کیا کمال کا آدمی ہے یہ بھی۔"

"اب پھر مجھے یقین آیا کہ خدا کیسے ہماری حفاظت کررہا ہے۔ ہم ظاہر کی آنکھ سے تماشا کرنے والے اس کی مصلحت کو کہاں سمجھتے ہیں۔ سوچو رابعہ کہ یہ حادثہ نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔ ہم چھپتے چھپاتے لاہور یا پنڈی پہنچ جاتے۔ جو بات مجھے کرنل جعفری نے بتائی' وہ تو میرے ذہن میں دور دور تک نہ تھی۔"

رابعہ نے کہا۔ "مجھے بہت افسوس ہورہا تھا کہ ہم نے بلاوجہ تکلیف اٹھائی اور اتنا سفر کیا۔ ہم وہیں بیٹھے رہتے تو کچھ دیر بعد لوگ بھی پہنچ جاتے اور ہم اتنی دور سے واپس آنے کے بجائے جیپ میں بیٹھ کے یہاں پہنچ جاتے۔"

"بات وہی ہے کہ ہر کام کا ایک وقت ہے اور ہر وقت کے ایک کام ہے۔" میں نے کہا۔ "کرنل جعفری از گریٹ۔ وہ رے حق میں بالکل فرشتۂ رحمت ثابت ہوا۔ میں جتنا ماتم کروں عقل پر کم ہے۔ آخر میں کیوں بھول گیا تھا کہ مجھ پر پولیس کیس بات صرف چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کی نہیں۔ نہ قانون کی نظر میرے کارنامے میری بے گناہی کا جواز بنتے ہیں۔"

رابعہ نے کہا۔ "قانونی مسائل کا مجھے خیال تھا۔"

"ہاں۔ اب تو یہی کہو گی تم بھی۔ خیال تھا تو مجھے کیوں نہیں سمجھایا کہ ایسے منہ اٹھا کے لاہور گئے تو پکڑے جاؤ گے۔"

"منہ اٹھا کے جاؤ یا سر اٹھا کے' قانونی مسائل تو قانونی طریقے ہی حل ہوں گے۔" رابعہ نے کہا۔ "کیا تم نہیں جانتے کہ تم پر اپنے والد کے پارٹنر میر شرافت علی کے قتل کا الزام تھا۔ تم ضمانت پر رہا ہوئے تھے اور بھاگ گئے تھے۔ چھوٹے موٹے مقدمات کو چھوڑو۔"

میں نے کہا۔ "تم ٹھیک کہتی ہو۔ جب تک میرے والد کا اصل قاتل نہیں پکڑا جاتا اور میں میر شرافت علی کے قتل کے الزام سے بری نہیں ہوتا' میں نہ سکندرِ اعظم ہوں' نہ ایم آر ایس کا چیف کے ٹو۔ میں ایک عام مفرور مجرم ہوں۔ تختۂ دار آج بھی میرے انتظار میں ہے۔"

"اب اتنا پریشان ہونے کی ضرورت بھی نہیں۔ میں اور منظر مل کے سب ٹھیک کرلیں گے۔" رابعہ نے کہا۔

"اور سب ٹھیک ہونے تک میں کیا کروں؟ جیل میں قوالی گاؤں۔"

"بابا' ضمانت پھر ہو جائے گی تمہاری۔"

"مجھے بابا کہہ رہی ہو' داڑھی صاف کرنے کے بعد بھی۔ کیا میں تم سے عمر میں اتنا زیادہ ہوں' بڈھا ہوگیا ہوں کہ تم مجھے بابا کہہ کے مخاطب کرو؟" میں نے میز پر مکا مار کے کہا۔

"میز ٹوٹ گئی تو سرکاری املاک کو نقصان پہنچانے کا کیس بھی بن جائے گا۔" رابعہ بولی۔

میں نے کہا۔ "ایک بات بتاؤں۔ اس مردانہ لباس میں تم بہت قیامت لگ رہی ہو۔ بیچارے فوجی بعد میں بھی تمہیں تصور میں دیکھتے رہیں گے اور ٹھنڈی آہیں بھرتے رہیں گے کہ ایک رات کوہ قاف سے کوئی پری آئی تھی۔"

"چلو اب فضول ڈائیلاگ بازی مت کرو۔" رابعہ نے تھوڑا سا شرما کے کہا۔

ٹھیک نو بجے ہم کرنل کے کمرے میں تھے۔ میجر شفیق نے اپنے باقی ساتھیوں کا تعارف کرایا۔ وہ سب سینئر افسران کی موجودگی میں کچھ کم بول رہے تھے مگر ان کا رویہ انتہائی دوستانہ تھا۔ کرنل ہم سے مذاق کرتا رہا۔

"بھئی یہ جو کالج گرل ٹائپ لڑکی ہے نا' یہ بار ایٹ لاء ہے۔ اس کے سامنے کوئی ایسی ویسی بات مت کردینا۔ قانونی مسئلہ بن جائے گا' لاہور ہائیکورٹ سے نوٹس آجائے گا۔ اور ایک راز کی بات بتاؤں؟ جو میں جانتا ہوں' پہلے چھپالی تھی مجھ سے انہوں نے۔"

سب اخلاقاً ہنسے۔ میرا دل بیٹھ سیا۔ کیا وہ سب کے سامنے میرا راز فاش کرے گا؟

"یہ ابھی مسٹر اور مسز نہیں ہیں۔" کرنل نے رازداری سے کہا۔ "لیکن بہت جلد ہو جائیں گے۔ انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ ہمیں مدعو کیا جائے گا۔ ہم سب وِش کرتے ہیں کہ وہ مبارک دن جلد آئے۔"

جعفری نے کہا تھا کہ ان کی سپلائی محدود ہے مگر اس دعوت کے انتظام سے ایسا نہیں لگتا تھا۔ ٹیبل پر جو کھانے چنے گئے تھے۔ فرائیڈ رائس ود چکن' فرائیڈ فش' چکن کارن سوپ' فرائیڈ پرانز' چکن ویجی ٹیبل ود چلی۔ ظاہر ہے یہاں مچھلی' جھینگے اور مرغی کا گوشت بازار میں دستیاب نہیں تھا۔ یہ کسی شہر سے سپلائی ہوتا تھا اور اسٹور کیا جاتا تھا۔ انہیں پکانے والا باورچی بھی ماہر تھا۔ ان کے ساتھ پاکستانی کھانوں میں شامی کباب تھے' بھنی ہوئی مرغی اور کھیر تھی۔ کھانے کے بعد بالکل تازہ اور بہت اعلیٰ قسم کے مالٹے پیش کیے گئے اور آخر میں کافی۔ اس کے باوجود کرنل جعفری معذرت کرتا رہا کہ وہ دعوت کا خاطر خواہ انتظام نہ کرسکے اور فوجی زندگی میں یہاں بس اتنی ہی عیاشی کی گنجائش تھی۔ جتنا اس نے انکسار کا مظاہرہ کیا اتنی ہی ہمیں شرمندگی ہوئی۔ صاف ظاہر تھا کہ انہوں نے اپنے راشن کا سارا ذخیرہ جو شاید وہ ایک ہفتہ استعمال کرتے' ہماری تواضع پر ایک دن میں ختم کردیا تھا۔

رات کے گیارہ بجے میجر شفیق ہمیں رخصت کرنے ہمارے کمرے تک آیا۔ "کوئی ضرورت ہو تو بتادو۔"

میں نے کہا۔ "اتنا آرام اور اتنی خاطر تواضع تو گھر میں بھی نہیں ہوتی جو آپ لوگوں نے یہاں کی۔"

"یہ سب کچھ نہیں۔ ہم اتنا ہی کرسکتے تھے۔ سردی یہاں زیادہ ہوگی۔ میں نے تین تین کمبل رکھوا دیئے ہیں۔ کھڑکی دروازے بند رکھنا ورنہ جنگلی جانور بھی آجاتے ہیں۔"

"کمروں میں گھس جاتے ہیں؟" رابعہ نے پوچھا۔

"ہاں۔ ایک دو بار ایسا بھی ہوا ہے۔ شب بخیر۔"

اس کے جانے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ ہماری عدم موجودگی میں کمرے کی تلاشی لی گئی تھی۔ شاید یہ دعوت کا اہتمام

بھی اسی لیے تھا کہ وہ ہمیں بتائے بغیر اپنا اطمینان کرلینا چاہتے تھے۔ معلوم نہیں یہ کام کس نے کیا تھا۔ بظاہر کسی بھی چیز کو نہیں چھیڑا گیا تھا۔ بریف کیس میں پوری رقم موجود تھی۔ کپڑے جو ہم نے اتارے تھے' ایک ڈھیر کی صورت میں وہیں پڑے ہوئے تھے جہاں انہیں چھوڑا گیا تھا مگر اس ڈھیر میں پہلے رابعہ کے کپڑے نیچے تھے کیوں کہ وہ پہلے غسل کرکے نکلی تھی۔ میں بعد میں نہایا تھا اور میں نے وہ میلے کپڑے ان کے اوپر ڈال دیے تھے مگر اب کسی نے تلاشی لی تھی تو پہلے میرے کپڑے اس کے ہاتھ میں آئے تھے پھر رابعہ کے۔ چنانچہ ترتیب الٹ گئی تھی۔

میں نے یہ بات رابعہ کو بتائی تو وہ پریشان ہوگئی۔ "کیا انہیں ہم پر شک ہے؟"

میں نے کہا۔ "شک ہوتا تو وہ ہماری تلاشی بھی لیتے۔ یہ غالباً ضابطے کی کارروائی ہے۔ وہ مطمئن ہونا چاہتے تھے۔"

"اچھا ہوا ریوالور ہم نے اپنے ساتھ رکھے تھے۔" رابعہ بولی۔ "مجھے تو ڈر ہی لگ رہا ہے۔ اس مہمان نوازی کے پیچھے بھی کوئی بات نہ ہو۔"

"بات کیا ہوسکتی ہے۔ انشاءاللہ ہم صبح روانہ ہوجائیں گے" میں نے کہا۔ شام تک لاہور میں ہوں گے ورنہ پنڈی تو پہنچ ہی جائیں گے۔

"مجھے نازو اور غالب کی طرف سے تشویش ہے۔"

"تشویش تو مجھے بھی ہے مگر ہم کیا کرسکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"ہمارا براہِ راست لاہور پہنچنا ٹھیک نہیں۔ محسن اور گل تو کراچی میں ہوں گے۔ نازو بھی پہلے بھائی کے پاس پہنچے گی۔"

"ہم بھی پہلے اکرام شیخ سے مل کے یہاں کے حالات کی رپورٹ لیں گے" میں نے کہا۔ "ابھی تو سوجاؤ' کل کی کل دیکھی جائے گی۔"

میں نے پھونک مار کے موم بتی بجھادی۔ پھر اندھیرے میں لیٹ کر میں باہر کی اور اندر کی آوازیں سنتا رہا۔ یہاں بھی ہر طرف گیدڑ چلا رہے تھے۔ یونٹ میں کہیں جنریٹر چل رہا تھا اور اس کی آواز دور سے آنے والے جہاز کی طرح محسوس ہوتی تھی۔ مجھے گزشتہ رات یاد آگئی جب ہم ایک برفانی دشت کی ویرانی میں سرگرداں تھے اور ہم نے پوری رات ایک چٹان کے نیچے آگ جلا کے سوتے جاگتے کاٹی تھی۔

مجھے مستقبل کا خیال بھی پریشان کررہا تھا۔ کرنل جعفری نے مجھے بروقت خبردار کردیا تھا اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا تھا کہ کیا اپنے وطن پہنچ کر بھی میں اجنبی بن کر رہوں گا' کیا مجھے اپنا نام اور اپنی شناخت بدل کے اور چھپ کر زندگی گزارنی ہوگی؟ رابعہ اور منظر میرے قانونی مسائل سے نمٹنے کے لیے پہلے بھی موجود تھے مگر دلاور' استاد پیڈرو' حاجی عبداللہ اور ان کے حواری قانون کو کہاں خاطر میں لاتے تھے۔ ان کے سب دھندے غیر قانونی تھے اور آج بھی ہوں گے۔ کیا وہ مجھے چین سے بیٹھنے دیں گے؟

نہ جانے کب مجھے نیند نے آلیا۔ تھکن سارے خیالا[ت پر] غالب آگئی اور میں سویا تو میری آنکھ صبح اس وقت کھلی جب [رابعہ] نے مجھے جھنجوڑ کے بیدار کیا۔

میں نے کمبلوں سے سر نکال کے دیکھا تو بھونچکا رہ گیا اور آنکھیں پوری کھل گئیں۔ رابعہ زنانہ کپڑوں میں تھی اور یہ کپ[ڑے] زیادہ قیمتی نہیں تھے مگر اس کے جسم پر سج رہے تھے۔ اس [کا] روپ میرے لیے بے حد مسحور کن تھا۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟ اٹھو' نو بج رہے ہیں۔"

"یہ کپڑے کہاں سے آئے؟" میں نے پوچھا۔

"ہمارے میزبانوں نے بھجوائے تھے۔ میں نے بیٹ مین [سے] نہیں پوچھا" رابعہ بولی۔ "کہیں سے منگوائے ہوں گے۔ یہاں کسی کی فیملی ہے نہیں۔"

میں نے بستر سے نکلتے ہوئے مردانہ فوجی جرسی پہن لی اور منہ دھونے کے لیے غسل خانے میں گھس گیا۔ وہاں گرم پانی [سے] بھری ہوئی بالٹی رکھی تھی۔ یہاں نہ ٹھنڈے پانی کی لائن تھی او[ر نہ] گرم کی۔ گرم پانی کچن سے فراہم کیا جاتا تھا۔ ٹھنڈے پانی کے [لیے] ممکن ہے کوئی ٹیوب ویل ہو۔

میرے جاگنے سے پہلے رابعہ چائے پی چکی تھی۔ برتن ا[بھی] تک میز پر رکھے تھے۔ جب میں باتھ روم سے نکلا تو وہ بیٹ م[ین کو] ناشتے کا آرڈر دے رہی تھی۔

میں نے کہا۔ "کرنل کی طرف سے کوئی پیغام؟"

رابعہ نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس وقت وہ آفس میں ہو[ں گے] شاید..."

اس کی بات نامکمل رہ گئی۔ کرنل اپنی وردی میں مسکرا[تا ہوا] اندر آگیا۔

"آر یو ریڈی؟" اس نے کہا۔ "رات نیند کیسی آئی؟"

"مجھے تو رات کا پتا ہی نہیں چلا۔" میں نے کہا۔ "ناشتا [تو] کریں گے۔ کیا اس کے بعد ہماری روانگی کے لیے کوئی انت[ظام] ہوجائے گا؟"

"انتظام تو میں نے کردیا ہے۔" وہ بولا۔ "ایک جیپ تم دو[نوں] کو کالام پہنچادے گی۔ وہاں سے تم سیدو شریف اور مردان پہنچ [سکتے] ہو۔ ہم اپنی ٹرانسپورٹ اس سے آگے نہیں بھیج سکتے۔"

میں نے کہا۔ "یہ بہت کافی ہے۔"

رابعہ نے کہا۔ "یہ کپڑے آپ نے کہاں سے حا[صل] کرلیے؟"

"یہ میجر شفیق کا بندوبست تھا۔ اس نے رات کو کسی ت[رح انتظام کیا] تھا۔ اٹھارہ کلومیٹر کے فاصلے پر ایک گاؤں ہے۔ چھوٹی سی آبا[دی] ہے۔ وہیں سے منگوائے ہوں گے۔ خیر' تم ناشتا کرو۔ میں ا[پنے] آفس میں ہوں۔"

ناشتے کے بعد ہم باہر نکلے تو بیٹ مین موجود تھا۔ وہ ہمیں کرنل کے آفس میں لے گیا۔ جیپ بالکل تیار تھی۔ کرنل نے بڑی گرمجوشی کے ساتھ ہمیں خدا حافظ کہا۔ رات کے مقابلے میں وہ کچھ ریزرو تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ یونٹ کے سب جوان دور ہونے کے باوجود ہمیں بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ باری باری میجر شفیق اور دوسرے افسران نے مجھ سے مصافحہ کیا پھر جیپ آگے بڑھی۔ گیٹ سے گزری تو سنتری نے ہمیں باقاعدہ سلامی دی۔ میں نے پلٹ کے دیکھا تو وہ سب اپنے آفس کے باہر کھڑے تھے۔ میں نے انہیں ہاتھ ہلا کے الوداع کہا۔

اگلی سیٹ پر صرف ڈرائیور تھا۔ میں اور رابعہ پیچھے تھے۔ ہر طرف اجلی دھوپ بکھری ہوئی تھی اور تیزی سے دوڑتی ہوئی جیپ ہمیں اس یونٹ سے دور لے جارہی تھی۔ آہستہ آہستہ میرے دل میں بیٹھا ہوا خوف' میرے شکوک اور اندیشے پیچھے رہ گئے۔ میں نے رابعہ کی طرف دیکھا' وہ بے حد جذباتی ہورہی تھی۔

"اب تو کوئی شک نہیں رہا تمہیں کہ یہ صرف مہمان نوازی کا جذبہ تھا اور کوئی بات نہیں تھی؟"

رابعہ بولی۔ "مجھے اپنے آپ سے شرم آرہی ہے۔ کہ میں نے ایسا سوچا۔"

جیپ ڈرائیور ان راستوں سے واقف تھا جہاں راستوں کا کوئی نشان نظر نہ آتا تھا۔ دو گھنٹے بعد ایک کچی سڑک نمودار ہوئی۔ اس سڑک پر ہم نے مخالف سمت میں جانے والی ایک فوجی گاڑی بھی دیکھی۔ دوپہر گزر گئی اور ایک بار پھر ہم برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں سے گزرے۔ اس سڑک پر کئی جگہ ہم نے بلڈوزر دیکھے جو سڑک سے برف ہٹانے میں مصروف تھے۔

تیسرے پہر ہم کالام پہنچے تو سیدو شریف جانے والی آخری بس تیار تھی مگر ہماری وجہ سے روانگی مؤخر کردی گئی۔ فوجی ڈرائیور ہمیں اتارنے کے بعد سیلوٹ کرکے رخصت ہوا تو ڈرائیور بھی کچھ مرعوب ہوگیا۔ اس نے ہمیں اجازت دی کہ ہم چائے پی لیں اور کچھ کھاپی کے آجائیں۔ چند مسافروں نے واجبی سا احتجاج کیا مگر وہ سب مقامی لوگ تھے سوائے ایک غیر ملکی جوڑے کے جو اس موسم میں سوات پہنچا ہوا تھا۔ وہ ہپی تھے اور رائے عامّہ ان کے لیے ناپسندیدگی کے جذبات رکھتی تھی۔

ہم واپس آئے تو یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ خصوصی مراعات کے خود ساختہ قانون کے تحت ڈرائیور نے دونوں اگلی سیٹوں کو خالی کرالیا تھا جن پر وہ غیر ملکی جوڑا براجمان تھا۔ کوئی پاکستانی وی آئی پی ہوتا تو اسے اپنی توہین سمجھتا مگر انہیں عزت و ذلت کی خاک پروا نہ تھی۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ پاکستان میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ وی آئی پی کے لیے بس' ریل یا جہاز روکے جاسکتے ہیں یا ان کی روانگی مؤخر کی جاسکتی ہے۔ وقت کی پابندی ویسے بھی اس قوم کا شعار نہ تھا اور یہ مائٹ از رائٹ سوسائٹی تھی۔

بس کے پچھلے حصے میں مسافر ٹھونس کر بھرے گئے تھے اور جن کے لیے اندر جگہ نہ تھی انہیں اس سردی کے موسم میں کھلی چھت پر بٹھا دیا گیا تھا جہاں وہ براہِ راست مخالف ہوا کی زد میں تھے۔ تاہم یہ ایک ایسا معمول تھا جس کے مقامی لوگ عادی تھے۔ ہم آگے والی سیٹ پر ہونے کے باوجود آرام سے نہ تھے کیوں کہ بس قدامت کا نمونہ تھی مگر اس خوشی نے جو اپنے وطن میں' اپنے لوگوں کے درمیان پہنچ کے حاصل ہورہی تھی' ہر تکلیف کے احساس کو بے معنی کردیا تھا۔

بس سیدو شریف پہنچی تو رات ہوگئی۔ بس ڈرائیور نے ہمیں مطلع کیا کہ اب اگلی بس صبح ہی مردان جائے گی۔ ٹورسٹ سیزن میں یہاں چھوٹے بڑے بہت سے ہوٹل کھلے نظر آتے تھے۔ عام لوگ بھی گھروں کے ایک دو کمرے تھوڑی بہت آمدنی کے لیے وقف کردیتے تھے مگر موسم سرما میں ادھر کا رخ کوئی نہیں کرتا تھا۔

بس اسٹاپ پر کوئی سواری بھی نہ تھی۔ یہ چھوٹا سا قصبہ تھا جہاں آدمی کہیں بھی پیدل جاسکتا تھا۔ غیر ملکی جوڑا تو شاید اپنی رہائش گاہ کندھوں پر ڈالے پھرتا تھا۔ ان کے سامان میں کیمپ سلیپنگ بیگ وغیرہ ہوں گے کہ جہاں اچھا لگا وہیں خیمہ کھڑا کیا اور بیگ میں ہوا بھر کے سو گئے۔ صبح پھر سب پیک کرکے کندھے پر اٹھایا اور چل پڑے۔

ہمارے لیے قصبے کا واحد ہوٹل چشم براہ تھا۔ اسے مقامی حالات کے پس منظر میں تھری اسٹار ہوٹل کی حیثیت حاصل تھی اور سیزن میں ان کے ریٹ فور اسٹار ہوٹل سے کم نہ ہوتے تھے مگر وہاں الو بول رہے تھے۔ گول شیشوں کی عینک والے ایک اُلو نے کاؤنٹر کے پیچھے سے بولنا شروع کیا تو کچھ دیر بعد میں سمجھ گیا کہ وہ انگریزی میں مخاطب ہے اور ہمیں خوش آمدید کہہ رہا ہے۔ وہ ہوٹل کا مینجر اور مالک تھا۔

"کمرے تو بہت ہیں سر! مگر آپ کا سامان کہاں ہے؟"

میں نے کہا۔ "کیسا سامان؟ کھانے پکانے کا یا سونٹمنگ کا؟ ہم جہاں جاتے ہیں خالی ہاتھ جاتے ہیں۔"

"ایسی صورت میں آپ کو ایڈوانس دینا ہوگا۔" مینجر نے کہا۔

میں نے اس کی نظر بچا کے بریف کیس میں سے ایک ہزار روپے نکالے "میرا خیال ہے کہ ایک رات کے قیام کے لیے یہ ضمانت کافی ہوگی۔"

"تھینک یو سر۔ اتفاق سے ہمارے ہوٹل کا واحد وی آئی پی سویٹ خالی ہے..."

"یہ اتفاق موسم سرما میں روز کا معمول ہوگا۔" میں نے کہا۔ "ہم اگرچہ عام لوگ ہیں مگر ایک رات کے لیے وی آئی پی بننا پسند کریں گے۔"

وی آئی پی سویٹ بے حد آرام دہ اور دو کمروں پر مشتمل تھا۔

ان میں سے ایک بیڈ روم تھا اور دوسرا مہمانوں کو ریسیو کرنے کا کمرا۔ اسی حصے میں کھانے کی میز بھی تھی۔ ہر چیز پر گرد کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ ہمارے اندر قدم رکھتے ہی ایک بے حد مستعد ملازم نے اس دھول کو جھاڑنا شروع کیا تو دھول کمرے کی فضا میں اڑنے لگی اور کچھ دیر بعد وہیں بیٹھ گئی۔

میں نے ملازم سے کہا۔ "بس کرو' باقی گرد سانس کے ساتھ اندر چلی جائے گی۔ یہ بتاؤ کھانے کے لیے کیا ملے گا؟"

"آٹھ بجے تک بازار میں سب کچھ ہے صاحب۔ نان روٹی' دال سبزی' گوشت اور چپلی کباب۔ ہوٹل کا کچن تو بند ہے۔ سیزن نہیں ہے۔"

آٹھ بجنے ہی والے تھے۔ میں نے اسے بازار دوڑایا کہ نان اور چپلی کباب لے آئے۔ "ہوٹل میں چائے تو ملے گی۔"

"چائے ملے گا۔" اس نے کہا۔ "ہم بھی پیئے گا۔"

جب وہ چلا گیا تو رابعہ نے مجھے مطلع کیا۔ "اگر تم غسل کرنا چاہو تو باتھ روم میں مائع برف موجود ہے۔ تم ایک مگ بھر کے سر پر ڈالو گے تو ایسی حالت میں جم جاؤ گے کہ کسی ڈانسر کا مجسمہ نظر آؤ گے۔"

"اور مجھے اصلی حالت میں لانے کے لیے اسٹوو پر گرم کرنا پڑے گا۔" میں نے کہا۔ "تھینک یو۔ مجھے یہ آخری غسل منظور نہیں۔"

"یہ چپلی کباب کیا کھانے کی چیز ہوتے ہیں؟" رابعہ بیڈ پر بیٹھ گئی۔

"ہاں۔ انہیں چپل سے نہیں بنایا جاتا' بس ان کی شکل چپل کے سول جیسی ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔ "ممکن ہے انگریز انہیں مجرموں سے اعتراف جرم کرانے کے لیے بھی استعمال کرتے ہوں۔ آدھے کباب' آدھی مرچیں ہمراہ پشاوری چپل تیرہ نمبر کی مار کھا کے تو مجرم کا باپ بھی اعترافِ جرم کرلے۔"

میں صرف رابعہ کو ڈرا رہا تھا۔ چپلی کباب میں مرچیں برائے نام ہوتی ہیں یا بالکل نہیں ہوتیں۔ جو کباب ویٹر لایا وہ "اسپیشل" تھے یعنی اس میں مغز اور تلی کا گودا بھی ڈالا گیا تھا۔ کباب کی طرح نان بھی کچھ لمبوترے تھے۔ بالکل نقشے میں نظر آنے والے سری لنکا کی طرح۔ مگر ذائقے میں لاجواب تھے۔ چپلی کباب صوبہ سرحد کی تہذیب کا اتنا ہی لازمی جزو تھے جتنی پنجاب کی لسی یا کراچی کی نہاری۔ اس کے بعد عام طور پر یہاں سبز چائے پی جاتی تھی اور ہوٹل کی طرف سے بھی پیش کی گئی۔

رات نو بجے ہر سُو سناٹا چھا گیا۔ سردی کے باعث لوگ سرِ شام سونے کے عادی تھے۔ ویسے بھی باہر یا گھر میں ان کے پاس تفریح کے ذرائع مفقود تھے۔ ٹیلی وژن صرف امراء کے گھرانوں تک محدود تھا۔ عام آدمی کے لیے تو معاش کے ذرائع بھی محدود تھے۔ یہاں نہ کوئی صنعت تھی اور نہ سرکاری ملازمت۔ چھ مہینے اتنی سخت سردی پڑتی تھی کہ زراعت ناممکن ہوجاتی تھی چنانچہ ملا[...] بڑھ جاتی تھی تو فاقہ کشی کی نوبت آجاتی تھی مگر گداگری ممنو[ع] اور سزا میں بہت سخت تھیں۔ بچے' بوڑھے تصویرِ حسرت بنے بس کے اڈے پر آتے جاتے خوشحال سیاحوں کو پُرامید نظر[وں] سے تکتے رہتے تھے مگر دستِ سوال دراز نہیں کرتے تھے۔ یہ تجربہ مجھے صبح ہوٹل سے رخصت ہونے کے بعد ہوا۔

سرِ راہ میں نے بہت سے بوڑھوں کو دیکھا جو بھکاری نظر آ[تے] تھے۔ ان میں سے ایک نے ڈرتے ڈرتے اِدھر اُدھر دیکھ کر مجھ [سے] ایک روپیہ مانگا۔ میں نے اسے دس کا نوٹ دیا ہی تھا کہ نہ جا[نے] کہاں سے ایک پولیس مین نمودار ہوگیا۔ اس نے بڑی بے ر[حمی] سے بڈھے کو مارا اور اس سے دس کا نوٹ چھین کر مجھے واپ[س] کردیا۔ "بھیک مانگنا جرم ہے صاحب" اس نے مجھے مطلع کیا ا[ور] بوڑھے کو پکڑ کر اپنے ساتھ لے گیا۔ اس کے جاتے ہی بچوں [کے] ایک غول نے موقع غنیمت جانا اور ہمارے پیچھے لگ گئے۔ بوڑ[ھے] کے ساتھ پیش آنے والے واقعے پر مجھے شدید صدمہ ہوا تھا[۔] رابعہ بھی سخت خائف تھی مگر میں نے ان بچوں میں سب کھلے پ[یسے] تقسیم کردیے۔ میرے پاس صرف وہی چینج تھی جو ہوٹل والوں [نے] بل کاٹ کے دی تھی۔ یہ نوٹ ختم ہوگئے مگر میری فیاضی دیکھ کر [...] زیادہ عمر کے لوگ بھی آگئے۔ یہ ناممکن تھا کہ میں سو سو کے نو[ٹ] باٹنا شروع کردیتا۔

میری پریشانی کو ایک جوان آدمی نے دور کیا جو صاف پتلو[ن] قمیص اور اونی جرسی پر چمڑے کی واسکٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس [نے] پشتو میں ڈانٹ ڈپٹ کے اور ڈرا دھمکا کے خیرات مانگنے والوں [کو] رخصت کیا اور پھر ہم سے انگریزی میں مخاطب ہوا۔ اس کی انگریزی ٹوٹی پھوٹی اور اس حد تک کارآمد تھی کہ غیر ملکی سیاح ا[پنی] بات سمجھانے اور دوسروں کی بات سمجھنے کے لیے اس کی خدما[ت] شکریہ کے ساتھ قبول کرتے ہوں گے۔

اس کی بات کا مطلب کچھ یوں تھا کہ "سر! گداگری ایک لعنت ہے اور یہاں کے قانون میں اس کی سخت ممانعت ہے۔ گداگر دوسرے ملکوں سے آنے والے سیاحوں کے سامنے ہمار[ی] رسوائی کا سبب بنتے ہیں۔ ویسے تو گداگری کی حوصلہ افزائی بھ[ی] جرم ہے مگر نزلہ بر عضوِ ضعیف۔ پکڑے یہ غریب ہی جاتے ہیں۔ اب آپ نے جس دریا دلی کا مظاہرہ کیا ہے' وہ انہیں مہنگا پڑ[ے گا] جن کے ہاتھ میں ایک نوٹ آگیا کیونکہ جو خالی ہاتھ لوٹے وہ ان [کے] جرم سے پولیس کو آگاہ کردیں گے۔"

رابعہ نے کہا۔ "یہ تو بڑے افسوس کی بات ہے۔ ہمیں معلو[م] ہوتا تو ہم اس بوڑھے کو بھی کچھ نہ دیتے۔"

میں نے کہا۔ "تم کون ہو...... میرا مطلب ہے کیا کرتے ہو؟"

اس نے کہا۔ "میرا نام عبدل ہے اور میں ٹورسٹ لوگوں کی خدمت کرتا ہوں۔ میرے پاس ایک گاڑی بھی ہے۔"

"گاڑی۔ یعنی کار؟"

"یس سر۔ کار۔ ایک دم فرسٹ کلاس۔ میں آپ کو مردان لے جاسکتا ہوں۔ میرے پاس ڈرائیونگ لائسنس بھی ہے۔ صرف پانچ سو روپے۔"

میں نے کہا۔ "کونسی گاڑی ہے؟"

"اوپل ریکارڈ۔ میری اپنی ہے۔ میں پنڈی سے مری تک ٹیکسی چلاتا تھا۔ گھر کے حالات کی وجہ سے واپس آنا پڑا۔"

میں نے کہا۔ "راولپنڈی تک جاسکتے ہو؟"

"کیوں نہیں سر۔" اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ "پنڈی' لاہور' پشاور۔ جہاں آپ کہیں۔"

میں نے کہا۔ "راولپنڈی تک کیا لوگے؟"

"ایک ہزار سر۔" اس نے قدرے تذبذب کے ساتھ کہا۔

"ٹھیک ہے۔ گاڑی کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

"میں ابھی لے کر آتا ہوں سر۔ بس پانچ منٹ میں۔ آپ یہاں ٹھہریں۔"

گاڑی کے آنے تک ہم مرکز نگاہ بنے رہے۔ دو افراد نے ہمیں سوات کا خالص شہد مکھیوں کے چھتے سے نکال کر بیچنے کی کوشش کی۔ چھتے انہوں نے ہینڈ بیگ کی طرح اٹھا رکھے تھے اور ان پر مکھیاں بھی بیٹھی ہوئی تھیں لیکن میں ان سادہ لوح نظر آنے والے لوگوں کی چالاکی کے قصے سن چکا تھا۔ وہ ایسے ہی چھتے اٹھائے بسوں کے اڈوں پر منڈلاتے پھرتے تھے۔ جو ان پر اعتبار کرلیتے تھے ان کو یہ شہد نچوڑ دیتے تھے اور ایک بس کی روانگی کے بعد اسے دوبارہ شیرے میں ڈبو کے بھر لیتے تھے۔ یہ شہد کے رنگ اور خوشبو والا شیرا ہر بار اصلی سوات کے شہد کے نام پر بکتا تھا۔ اسے خرید کر لے جانے والا بعد میں سوائے صبر کرنے کے اور کیا کرسکتا تھا۔

عبدل واقعی پانچ منٹ میں گاڑی لے آیا۔ یہ سرخ رنگ کی چمکتی ہوئی گاڑی خاصی آرام دہ تھی۔ اس کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ کے میں نے پہلی بار خود کو پرسکون اور مطمئن محسوس کیا۔ اب میں واقعی پاکستان میں تھا اور ہر خطرے سے' ہر آفت سے محفوظ تھا۔ سارے شہر اور سب لوگ مجھ سے بہت کم فاصلے پر تھے اور یہ مسافت وقت کی تھی۔ اگر ہم بس سے جاتے تو شام تک راولپنڈی پہنچتے مگر کرائے کی گاڑی مل جانے سے یہ فاصلہ آدھا رہ گیا تھا۔ راولپنڈی سے ہم ٹرین پکڑتے تو شاید یہ فاصلہ چھبیس گھنٹے کا ہوتا مگر ہم پی آئی اے کی پرواز پر ٹکٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتے تو دو ڈھائی گھنٹے بعد کراچی میں ہوتے۔

عبدل ایک ماہر ڈرائیور تھا۔ وہ مری کے پُرپیچ راستوں پر ڈرائیونگ کرچکا تھا۔ اس کے لیے ان راستوں پر گاڑی دوڑانا بہت آسان کام تھا۔ اس کا انیس سو سی سی کا طاقتور انجن بھی عبدل کی خواہشات کا ساتھ دے رہا تھا اور گاڑی ستر اسی میل فی گھنٹے کی رفتار سے بھاگی جارہی تھی۔ گاڑی کے شیشے بند تھے اور میدانی علاقے کا موسم بھی خوشگوار تھا۔ مردان پہنچنے سے پہلے ہی بھاری بھرکم جرسی میں گرمی محسوس ہونے لگی۔ مردان میں ہم نے دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے تقریباً چالیس منٹ کا قیام کیا اور پھر روانہ ہوگئے۔

ایک بار پھر میرے سامنے اپنے وطن کے نظارے تھے۔ یہ زمین' آسمان' یہ فضا سب میرے لیے اپنائیت کا احساس رکھتے تھے۔ راولپنڈی لے جانے والی سڑک' اس کے دونوں جانب پھیلے ہوئے کھیت' گاؤں اور گاؤں کے کچے مکان' ان میں رہنے والے' قصبوں کی گلیاں اور بازار' ہل چلاتے کسانوں سے لے کر کارخانوں کی دھواں اگلتی چمنی تک ہر منظر میرا دیکھا بھالا تھا اور میری یادداشت میں ایسے محفوظ تھا جیسے البم میں تصویریں لگی ہوتی ہیں۔ میں اس ماحول کا پروردہ اور اس میں شامل تھا۔ اجنبیت کی وہ نامانوس اور نامہربان فضا جو بھارت اور بنگلہ دیش میں اعصاب کو ایک نامعلوم قوت کے دباؤ میں رکھتی تھی' یہاں محسوس تک نہ ہوتی تھی۔

شام ہوتے ہوتے عبدل نے ہمیں راولپنڈی پہنچا دیا۔ کار پشاور روڈ سے مال پر آگئی۔ میں پہلے سے طے کرچکا تھا کہ مجھے صدر میں اترنا ہے۔ پلازا کے سامنے میں نے گاڑی موڑنے کے لیے کہا اور اگلا چوراہا پار کرتے ہی عبدل نے میرے اشارے پر گاڑی روک لی۔ وہ ایک ہزار لے کر اور ایک ہزار دعائیں دے کر رخصت ہوگیا۔ اس نے اپنی دانست میں دُگنی رقم مانگی تھی۔ اس امید میں کہ پانچ سو میں سودا ہوجائے گا۔ ممکن ہے واپس جاتے وقت خوشی کے ساتھ اسے افسوس بھی ہو کہ اس نے ایک کے بجائے دو کیوں نہیں مانگے۔

میں نے صدر کے روشن بازاروں اور جگمگاتی دکانوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے عجیب سی سنسنی خیز مسرت کو اپنے رگ و پے میں دوڑتا محسوس کیا۔ مجھے گزرے ہوئے وقت کے بہت سے صبر آزما لمحے یاد آئے جب زندگی کے مقابلے میں ہم موت سے قریب تر تھے۔ سختیٔ حالات کے دور یاد آئے جب ہماری قوتِ برداشت جواب دینے لگی تھی اور وہ وقت یاد آیا جب ہم دشمنوں میں محصور تھے۔

میں نے رابعہ سے کہا۔ "تم نے دیکھا رابعہ! ہم لوٹ آئے ہیں۔ تم محسوس کرتی ہو اس خوشی کو جو اپنی زمین پر چلنے سے حاصل ہورہی ہے۔ دیکھو یہ سب اپنے لوگ ہیں' سب دوست ہیں۔ ان میں ایک بھی دشمن نہیں۔ اور یہاں کتنا سکون ہے' کتنی زندگی ہے۔"

رابعہ نے کہا۔ "مجھے تو یہ سب خواب لگتا ہے۔ ایسے خواب بہت دیکھے تھے میں نے کہ تم میرے ساتھ ہو اور ہم اپنی زندگی کی طرف ایک ساتھ بڑھ رہے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "کل ہم کراچی میں ہوں گے۔ اکرام شیخ' محسن

اور گل کے ساتھ۔ مجھے یقین ہے کہ ناز و اور غالب بھی وہیں پہنچ جائیں گے یا ہم سے پہلے پہنچ گئے ہوں گے۔"

"ہم آج رات کہاں ٹھہریں گے؟"

میں نے کسی رئیس ابنِ رئیس کی شان سے کہا۔ "جہاں بڑے لوگ ٹھہرتے ہیں۔ فلیش مین میں۔ لیکن وہاں جانے سے پہلے ہم تھوڑی سی شاپنگ کریں گے۔ سلور گرل میں چائے پئیں گے۔ ان کی کنفکشنری کا جواب نہیں۔"

"شاپنگ کیا کرنی ہے؟"

میں نے کہا۔ "یہ دیکھو' سامنے ووگ ہارس ہے۔ تم یہاں سے اپنے لیے کچھ کپڑے خرید لو۔ میں بھی سوٹ دیکھ لیتا ہوں۔"

رابعہ مسکرائی۔ "رام ناتھ کی روح کو بڑی تکلیف ہوگی۔"

میں ہنس پڑا۔ "ہونی تو نہیں چاہیے۔ اس کی دولت ضرورت مندوں کے کام آرہی ہے۔"

وہ ایک انتہائی حسین رات تھی۔ ہم نے دل کھول کے خریداری کی لیکن پچاس ہزار بھی خرچ نہ کرسکے۔ رابعہ نے اپنے لئے جدید ترین فیشن کا فرکوٹ لیا' جرسیاں اور ساریاں خریدیں۔ میں نے دو سوٹ لیے اور شرٹس کے ساتھ میچ کرتی ہوئی ٹائیاں۔ جب ہم ووگ ہارس سے برآمد ہوئے تو بالکل بدلے ہوئے لگ رہے تھے۔ میں نے بلیو بلیک سوٹ پہن لیا تھا اور بے داغ سفید قمیص پر نیلی دھاریوں والی ٹائی باندھ لی تھی۔ رابعہ نے بھی لیڈیز روم میں جاکے ساری باندھی تھی اور اپنے دیہاتی وضع کے کپڑے بیگ میں ڈال لیے تھے۔ اس کی ساری بھی نیلی تھی مگر اس پر وہ زرد پھول نہیں تھے جن کی مجھے تلاش تھی۔ میں احساس کی ایک پرانی' دلنواز اور سحر آفریں مسرت کا طلبگار تھا لیکن ایسی ساری تلاش کیے بغیر ملنا محال تھی۔ رابعہ کے حسن کا اوّلیں پر تو میرے تصور میں آج تک محفوظ تھا جب وہ آسمان کے رنگ کی ساری پہن کے مجھ سے جیل میں ملنے آئی تھی۔ اس کے زرد پھول ستاروں کی طرح روشن تھے اور پہلی ملاقات کا یہ نقش جاوداں تھا۔

رابعہ نے فرکوٹ بھی پہن لیا تھا۔ اب ہم وہاں گھومنے پھرنے والے بہت سے خوشحال' خوش پوش اور خوش و خرم جوڑوں کی طرح تھے جو غمِ دوراں اور غمِ جاناں سے بے نیاز نظر آتے تھے۔ ابھی تک ہمارے پاؤں میں وہی بد وضع جوتے تھے۔ کچھ دیر بعد ہم نے ان سے بھی نجات حاصل کرلی۔ ہم نے کاسموس شوز سے بہترین جوتے خریدے اور پہن کے دکان سے نکل آئے۔

رابعہ بہت خوش تھی "مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے سکندر! کہیں یہ خواب ٹوٹ نہ جائے۔"

"یہ خواب نہیں' خواب کی تعبیر ہے۔" میں نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ اس نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ "لوگ ویسے بھی ہمیں میاں بیوی ہی سمجھ رہے ہوں گے۔ شرط لگالو۔"

"لوگوں کو سمجھنے دو۔ اس کی نمائش مت کرو۔"

ہم ایک گھنٹا سلور گرل میں بیٹھے رہے۔ مجھ پر اس ماحول ایک نشہ سا طاری ہو رہا تھا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ سب کچھ جاؤں اور وقت کے اس حصے کو اسی جگہ اسیر کر کے خود بھی ساتھ یہیں ٹھہر جاؤں۔ نہ پیچھے دیکھوں' نہ آگے جانے کا میری حالت صحرا میں پیاسے سفر کرنے والے مسافر جیسی تھی ائر کنڈیشنڈ کمرے میں پہنچ گیا ہو جہاں سکون' راحت اور ٹھنڈک اور وہ اس سے باہر نہ نکلنا چاہے۔

رات کے ساڑھے نو بجے جب بازار بند ہونے لگے' میں سوٹ کیس اٹھائے ہوئے فلیش مین ہوٹل پہنچا تو رابعہ کا میرے ہاتھ میں تھا اور ایک ٹاپ کلاس ہوٹل کی حدود میں نے میری اس جسارت کو قابلِ اعتراض بھی نہیں سمجھا تھا۔ متوسط اور نچلے طبقے کی اخلاقیات کے معیار ان کے ماحول اور کی عکاسی کرتے ہیں۔ ایک متعصب اور تنگ نظر معاشرے عورت کا برقع پہنے بغیر گھر سے نکلنا یا لڑکیوں کا کالج جانا غلط متوسط طبقہ بے پردگی اور عورت کے بازار جانے یا اسکول ملازمت کو قبول کرتا ہے مگر اس کا کلب میں جانا اور مردوں آزادانہ اختلاط غیر اخلاقی سمجھتا ہے اور یوں پاکستان میں علاقہ سے لے کر بڑے شہروں میں خواص کی الٹرا ماڈرن ہاؤسنگ سو تک تعلیم و تہذیب کے اعتبار سے درجنوں معاشرے ہیں جہا سترھویں صدی سے لے کر اکیسویں صدی تک کی اخلاقی اقد رائج ہیں۔

فلیش مین ہوٹل ایک پاکستانی شہر میں یورپ کے معیار ہوٹل تھا جہاں غیر ملکی اور پاکستان کے بڑے لوگ قیام کرتے تھ طرزِ زندگی اور ذہنیت کے اعتبار سے یورپ کو قبلہ سمجھتے تھے۔ یہ وہ سب آزادیاں حاصل ہوتی تھیں جو یورپ کے کسی ہوٹل میں ہیں۔ اچھے ہوٹل پاکستان کے ہر بڑے شہر میں تھے جو ملکی یا اسلا قوانین کے دائرہ اختیار سے خود کو اتنا ہی باہر سمجھتے تھے جتنے سفار خانے۔

میں نے فلیش مین کا انتخاب محض اس لیے کیا تھا کہ وہ محفوظ ترین تھی۔ وہاں سے میں کراچی کی فلائٹ کے لیے ریزرو بھی حاصل کرسکتا تھا اور ائرپورٹ تک کار بھی۔ رات کے وقت مجھے کسی نے نہیں پہچانا تھا مگر میں دن میں یوں پھرنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا کہ کوئی مجھے پہچان لے اور مجھے پتا بھی نہ چلے۔

میں نے پورے اعتماد کے ساتھ "مسٹر اور مسز اعجاز" کے نام سے کمرا بک کرایا اور اپنا پتا "اسسٹنٹ کمشنر نوشہرہ" لکھوایا۔ کی جرأت نہ ہوئی کہ مجھ سے میرا شناختی کارڈ طلب کرسکے جس ثابت ہو کہ میں واقعی اسسٹنٹ کمشنر ہوں۔ پورے پاکستان میں سیکڑوں ایسے عہدے ہیں جن کے ساتھ کمشنر کا لفظ آتا ہے جن میں انکم ٹیکس کمشنر سے ہائی کمشنر تک سب شامل ہیں۔

کسی دشواری کے بغیر مجھے صبح کی پہلی فلائٹ سے کراچی

لیے فرسٹ کلاس کی ریزرویشن مل گئی اور ہماری سیٹیں بھی کنفرم ہوگئیں۔ ڈنر ہم نے کمرے میں منگوایا لیکن بہت تھوڑا کھایا۔ جلد از جلد کراچی پہنچ کے اپنے بچھڑے ہوئے ساتھیوں سے ملنے کی خواہش نے ہمارے دلوں کو اضطراب میں مبتلا کردیا تھا اور ہمارے لیے رات کاٹنا مشکل ہوگیا۔ آدھی رات تک ہم انہی کی باتیں کرتے رہے جو ہمارے ساتھ تھے پھر بچھڑ گئے۔ عارضی طور پر یا ہمیشہ کے لیے۔ رابعہ پر لاہور سوار ہوگیا تھا۔ وہ اپنی پرانی زندگی کے صبح و شام کے سوا کچھ نہیں مانگتی تھی اور اس کے لیے سب کچھ چھوڑنے پر تیار تھی۔ اسے معلوم تھا کہ لاہور صرف ایک سو ستر میل کے فاصلے پر ہے مگر کیا وہاں اسے اپنی پرانی زندگی ملے گی؟ اس سوال کا جواب سات پردوں کے پیچھے ایک رازِ سربستہ تھا۔

صبح جہاز کی پرواز سے دو گھنٹے پہلے ہماری ہدایات کے مطابق ناشتا کمرے میں سرو کیا گیا۔ کمرے کے کرائے میں ناشتے کے اخراجات شامل تھے چنانچہ ہمارے بل میں اضافی رقم صرف ڈنر کی شامل کی گئی۔ کرائے کی گاڑی نے ہمیں ایک گھنٹا قبل ائرپورٹ پہنچادیا۔ میں اور رابعہ اب خاموش تھے۔ ہمارے خیالات کی جذباتی کیفیت ایک سی تھی۔ ہم چشمِ تصور سے اپنے سب دوستوں کو دیکھ رہے تھے جو ہمارے لیے اتنے ہی مضطرب اور بے قرار تھے جتنے ہم۔

جہاز نے پرواز کی تو وقت کا ایک ایک لمحہ ہم پر بھاری ہونے لگا۔ گل اور محسن نے کراچی پہنچنے کے بعد ہم سے رابطہ نہیں کیا تھا مگر ان کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ خیر و عافیت سے کراچی میں اکرام شیخ کے ساتھ ہوں گے اور شاید اب تک کاجل بھی ان سے مل کے ہمارے بارے میں بتاچکی ہوگی کہ بہت جلد ہم بھی وارد ہوں گے۔ ان سب کو ہر لمحہ ہماری آمد کا انتظار ہوگا۔

جہاز نے کراچی میں لینڈ کیا تو موسم بالکل بدلا ہوا تھا۔ راولپنڈی کی سردی کے مقابلے میں یہاں گرمی تھی۔ مجھے اپنا کوٹ اتار کے ہاتھ پر ڈالنا پڑا اور اس کے ساتھ ہی رابعہ کا فرکوٹ بھی اٹھانا پڑا۔ گلگت سے سوات تک سردی کی شدت انتہا پر تھی اور ہم نے ایک طویل برفانی راستے پر پیدل سفر کیا تھا۔ راولپنڈی پہنچ کے حالات بدل گئے تھے اور ہم نے ضرورت کے مطابق گرم کپڑے خرید لیے تھے مگر کراچی کا موسم ہمیشہ کی طرح مہربان اور غریب نواز تھا۔ یہاں گرم کپڑوں کی ضرورت دسمبر' جنوری کے چند دنوں تک محدود تھی جب کوئٹہ کی سرد لہر کراچی کو پنڈی یا لاہور بنادیتی تھی۔

باہر آتے آتے مجھے پسینہ آگیا۔ روزِ روشن میں پہلی بار میں نے لوگوں کا سامنا کیا تھا۔ کسی دوست کے ملنے کا امکان تو نہ ہونے کے برابر تھا مگر میرے دل کے کسی گوشے میں اس خوف نے جگہ بنالی تھی کہ مجھے میرے نام اور ایم آر ایس کے رشتے سے جاننے والے بہت ہیں۔ دیارِ غیر میں بھی بالکل غیر متوقع طور پر ایسے لوگ

مل جاتے تھے مگر پاکستان پہنچتے ہی کرنل جعفری نے مجھے پہچان لیا تھا اور خبردار کیا تھا کہ میں محتاط رہوں۔

ائرپورٹ کی عمارت سے باہر ٹیکسیاں ایک قطار میں کھڑی ہوئی تھیں۔ ان کے ڈرائیور اپنی باری کے انتظار میں باہر کھڑے ہوئے تھے۔ رابعہ نے کہا "ان میں تو اکرام شیخ نظر نہیں آتا۔"

میں نے کہا "اگر تم نے اسے اطلاع کی ہوتی تو وہ تمہارے استقبال کے لیے ضرور موجود ہوتا۔"

"ان سے پوچھو تو سہی۔"

میں نے آخری ٹیکسی کے ڈرائیور سے بات کی "ہم ایک ٹیکسی ڈرائیور اکرام شیخ کے مہمان ہیں۔"

"کہاں رہتا ہے وہ؟" ٹیکسی ڈرائیور نے حیرانی سے کہا۔

میں نے کہا "یہ تو نہیں معلوم مگر ٹیکسی کا نمبر معلوم ہے۔"

اس نے ذہن پر زور دے کر نمبر یاد کرنے کی کوشش کی اور پھر نفی میں سرہلایا "میں دوسرے ڈرائیوروں سے معلوم کرتا ہوں' آپ ادھر ٹھہریں۔"

رابعہ اور میں وہیں کھڑے اس کو ہر ٹیکسی ڈرائیور کے پاس جاتا دیکھتے رہے اور ان کی لاعلمی کے اظہار سے مایوس ہوتے رہے۔ وہ سب نفی میں سرہلاتے تھے اور پھر ہمیں دیکھ کے حیران ہوتے تھے کہ ایسے معزز مہمانوں کا ایک ٹیکسی ڈرائیور سے کیا رشتہ ہوسکتا ہے۔ ہمارے سامنے بہت سی ٹیکسیاں جو قطار میں آگے تھیں' مسافروں کو لے کر نکل گئیں اور ان کی جگہ پیچھے والی ٹیکسیاں

آگئیں۔

آخر کار ٹیکسی ڈرائیور ناکام لوٹ آیا "سرجی، ان میں سے تو کوئی نہیں جانتا۔ ویسے ابھی جو دو چار گاڑیاں نکل گئی ہیں ان میں ایک اکرام کی تھی۔"

میں نے کہا "ان میں کوئی اکرام شیخ نہیں تھا۔ اچھا تم ہماری کچھ مدد کرو، یہ بتاؤ..."

اس نے معذرت آمیز لہجے میں کہا "میں تو جناب، سواریوں کے لیے کھڑا ہوں۔"

میں نے کہا "میں پوچھ رہا ہوں کہ دن بھر کا کرایہ کیا ہوگا؟ ہمیں اکرام شیخ کو تلاش کرنا ہے، جہاں بھی ٹیکسیاں کھڑی ہوتی ہیں وہاں جاکے۔"

اس کا رویّہ ایک دم بدل گیا "ویسے تو سرجی، تین سو ہوتے ہیں مگر آپ اپنے ہی بندے کے مہمان ہو، آپ دو سو دے دینا۔"

مجھے یہ بات اچھی نہیں لگی "دیکھو، بلاوجہ مجھ پر احسان مت کرو۔ مجھے معلوم ہے، ایک پورے دن کا کرایہ کیا ہوتا ہے۔ میں کوئی ولایت سے نہیں آیا ہوں۔"

"اچھا جی، جو آپ کی خوشی ہو دے دینا۔ بے شک کچھ مت دینا۔" وہ بولا "ناراض ہونے کی تو بات ہی نہیں۔"

ہم نے دو گھنٹے میں صدر سے ٹاور تک کے ٹیکسی اسٹینڈ دیکھ لیے۔ نمبر کے حوالے سے دو ڈرائیوروں نے کہا کہ یہ ٹیکسی تو ہے مگر ڈرائیور کا نام بادشاہ گل ہے۔ کھارا در کے ٹیکسی اسٹینڈ پر بادشاہ گل مل گیا۔ اس کی ٹیکسی کا وہی نمبر تھا جو پہلے اکرام شیخ کی ٹیکسی کا تھا۔

"خان، یہ کسی اکرام شیخ کا مہمان ہے۔" ہمارے ٹیکسی ڈرائیور نے اسے بتایا "صبح سے اس کو تلاش کرتا ہے۔"

میں نے کہا "یہ ٹیکسی پہلے اکرام شیخ چلاتا تھا۔"

"سرجی، ٹیکسی ہوتی ہے سیٹھ لوگوں کی۔ ڈرائیور بدلتے رہتے ہیں۔ وہ ٹیکسی ڈرائیور بولا جو ہمیں یہاں تک لایا تھا۔

"مجھے معلوم ہے، مگر اکرام شیخ مالک تھا۔"

بادشاہ گل نے اقرار میں سرہلایا "خو تم ٹھیک بولتا ہے۔ ابھی دو دن ہوا ایک عورت اور بچہ بھی ہم سے پوچھا۔"

رابعہ نے کہا "ہاں، وہ کاجل تھی..."

اس نے کہا "وہ بھی ایسا ہی پوچھتا تھا سب سے۔ ہم کو ادھر ملا ناظم آباد میں۔ غریب بہت خوار ہوا۔"

میں نے کہا "پھر تم اسے کہاں لے گئے؟ تمہیں معلوم ہے اکرام شیخ کہاں ہے؟"

اس نے آہستہ سے اقرار میں سرہلایا اور ایک گہری سانس لے کر خاموش ہوگیا۔ ایک نامعلوم سی اداسی نے اس کے چہرے کو تاریک کردیا۔

"ہمیں اس کے پاس لے چلو بھائی۔" رابعہ نے بے قرار[ی] سے کہا۔

"لے جائے گا بہن، کیوں نہیں لے جائے گا ابھی بیٹھو گاڑ[ی] میں۔"

میں نے پہلی ٹیکسی کو دو سو روپے دے کر رخصت کیا اور دوسری ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ بادشاہ گل عمر رسیدہ، باریش پٹھان تھا۔ اس کا رنگ سرخ و سفید تھا اور داڑھی کے بھی آدھے سے زیادہ بال سفید تھے۔

میں نے کچھ دیر بعد کہا "اکرام شیخ خیریت سے تو ہے نا۔ تم نے اسے آخری بار کب دیکھا تھا؟"

"خو ابھی تم کو کیا بتائے گا۔ تم کدھر سے آیا ہے؟"

"ہم تو بہت دور سے آئے ہیں۔ ڈھاکا سے۔" میں نے کہا۔

"بہت عرصے سے اس کی کوئی خیر خبر نہیں ملی تھی۔" رابعہ بو[لی]
"تم نے بتایا نہیں کہ اس سے کب ملے تھے۔"

بادشاہ گل نے ایک آہ بھری "بہن، ابھی کتنا دن ہوگیا ہم کو[؟] نہیں، ایک مہینہ سے اوپر ہوگیا، یہ فروری کا مہینہ ہے۔"

میں نے کہا "ہاں، بائیس تاریخ ہے آج۔"

بادشاہ گل نے کہا "خو ایک مہینہ اور انیس دن ہوگیا۔ [تین] جنوری کو ہم دیکھا تھا اس کو۔ ہم اس کا جنازہ میں گیا تھا۔"

ایک لمحے کے لیے میرے حواس یوں مختل ہوگئے جیسے [مجھے] گیارہ ہزار وولٹ کرنٹ کا جھٹکا لگا ہو۔ رابعہ نے ایک خوفزدہ [سی] پن کے ساتھ میرا بازو تھام کے اور چلّا کے کہا "سکندر! واپس [چلو]، ہم تو اکرام شیخ سے ملنے آئے تھے، یہ پتا نہیں کیا کہہ رہا ہے۔"

بادشاہ گل نے کہا "ہم ٹھیک بولا بی بی۔ ہم اکرام شیخ [سے] خریدا تھا یہ ٹیکسی۔ اس نے نیا ٹیکسی لیا تھا۔ اس کا ایکسی[ڈنٹ] ہوگیا، غلطی اس کا نہیں تھا۔"

میں نے کہا "تم غلط کہتے ہو، وہ کوئی اور ہوگا۔"

بادشاہ گل نے سر گھما کے مجھے دیکھا اور افسوس سے سر[ہلایا]
"ہم ایسا جھوٹ کیوں بولے گا۔ ابھی تم خود ادھر دیکھ لو۔"

اس نے ٹیکسی سڑک کے کنارے روک دی۔ اس کے ساتھ ایک دیوار پھیلی ہوئی تھی۔ سڑک پر ٹریفک رواں دواں [تھا]۔ دیوار کے عین سامنے اور دائیں بائیں انسانوں کی آبادی تھی۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس بستی کے بیچ میں یہ دیوار کسی خموشاں کی فصیل ہے۔

رابعہ نے رونا شروع کردیا تھا "سکندر! یہ جھوٹ کہتا ہے۔"

میں نے کہا "یہ مجھے بھی معلوم ہے مگر اس میں رونے [کی کیا] بات ہے۔"

"میں... میں اندر نہیں جاؤں گی۔ چلو ہم واپس چلیں۔

[...]ے معلوم کرتے ہیں۔" رابعہ میرا بازو پکڑ کے کھینچنے لگی۔
میں نے کہا "پاگل مت بنو، لوگ دیکھ رہے ہیں۔ تصدیق [کر]نے میں حرج ہی کیا ہے۔ ابھی معلوم ہوجائے گا کہ وہ کوئی اور [تھ]ا۔"

"مگر یہ ٹیکسی...... یہ تو اسی کی ہے۔"
میں نے کہا "اس نے دوسری ٹیکسی خرید لی تھی۔ بادشاہ گل! [اس کی] نئی ٹیکسی کا نمبر کیا تھا؟"

"خو یہ ہم کو نہیں مالوم" وہ دیوار کے ایک شکستہ حصے سے [قب]رستان میں داخل ہوگیا۔

میرا دل ڈوب رہا تھا۔ اندر کی ایک آواز کہتی تھی کہ اس سچ کو [جھٹ]لایا نہیں جاسکتا۔ بادشاہ گل اتنے یقین کے ساتھ کہہ رہا ہے کہ [وہ] اکرام شیخ کے جنازے میں شریک ہوا تھا۔ اسے اکرام شیخ کی [آ]خری آرام گاہ کا بھی علم ہے۔ وہ جانتا ہے اکرام شیخ حادثے میں [ہلا]ک ہوا تھا۔

میں نے کہا "بادشاہ گل! ایک عورت اپنے بچے کے ساتھ [اک]رام شیخ کو پوچھتی ہوئی آئی تھی؟"

"ہاں۔ ہم اس کو بھی ادھر لایا تھا۔"
"پھر وہ عورت اور اس کا بچہ کہاں گئے تھے؟"

اس نے نفی میں سرہلایا "خو یارا، ہم اس کو صدر میں چھوڑا تھا۔"

رابعہ نے کہا "اس سے پہلے بھی تو ایک مرد اور عورت آئے ہوں گے۔ محسن اور گل۔"

"کون گل؟" بادشاہ گل نے کہا۔
"گل بانو ہے اس کا نام۔" میں نے کہا "یہ تقریباً ایک ہفتہ پہلے کی بات ہے۔"

اس نے نفی میں سرہلایا "وہ ہمارا پاس نہیں آیا۔ کوئی اور اس کو بتایا ہوگا۔ جنازہ میں بہت ٹیکسی ڈرائیور تھا۔ جس کو معلوم ہوا وہ آگیا تھا۔"

رابعہ دھاڑیں مار مار کے رونے لگی۔
"خو صبر کرو بہن، اللہ کا مرضی۔ اسپتال میں ڈاکٹر لوگ اس کو بچانے کا بہت کوشش کیا۔ ہم بھی اس کا واسطے خون دیا لیکن..."

وہ چلتے چلتے رک گیا "یہ ہے تمہارا اکرام شیخ کا قبر۔" اس نے [م]ٹی کے ایک ڈھیر کی طرف اشارہ کیا۔

رابعہ نے ایک چیخ ماری اور گرنے لگی۔ میں نے اسے سنبھال لیا۔

*

قبر کے سرہانے کوئی کتبہ نہیں تھا۔ صرف ایک پتھر لگا دیا گیا تھا۔ میں بہت دیر تک اس سنگِ مزار کو گھورتا رہا اور دل شکستگی کے گھُپ اندھیرے میں سہارے کے لیے امید کی کوئی کرن تلاش کرتا رہا۔

یہ روشنی رابعہ نے فراہم کی۔ اس نے روتے روتے اچانک سر اُٹھایا اور بادشاہ گل سے کہا "تمہیں یقین ہے، یہ وہی قبر ہے؟"

بادشاہ گل نے کہا "خو ہم کیسے بھول سکتا ہے بیگم صاحب۔ ہم خود جنازہ کے ساتھ آیا تھا۔"

رابعہ بولی "یہاں کوئی کتبہ کیوں نہیں لگایا گیا؟"

بادشاہ گل نے خالی ہاتھ پھیلا کے کہا "کون لگائے گا کتبہ؟ اس کا ادھر کوئی ہوتا تو لگاتا۔"

"اس کے دوست نہیں تھے؟" میں نے کہا "تم جیسے...."

"دوست.... ہم واقف تھا جناب" وہ بُری طرح سے پریشان ہونے لگا تھا "دوست اور واقف میں بہت فرق ہوتا ہے۔ اور کتبہ لگانے سے کیا ہوتا ہے؟ ادھر دیکھو کتنا کتبہ ہے۔ کون دیکھتا ہے۔ خو مرنے والا کب پیدا ہوا، کب مرا۔ اس کے اوپر شعر شاعری لکھتا ہے۔ سب بے کار بات ہے۔"

میں نے کہا "اپنا فلسفہ چھوڑو۔ یہ کیسے ثابت ہوگا کہ یہ قبر اکرام شیخ کی ہے؟"

"خو یارا، کیسا بات کرتا ہے۔ ہم کدھر سے ثبوت لاوے۔ تم بولا جس کا یہ گاڑی ہے وہ کدھر ہے۔ ہم تم کو ادھر لایا۔"

"تم نے ہی کہا تھا کہ... یہ اکرام شیخ کی قبر ہے۔" میں نے کہا۔

"اس کا نام تم بولا......"

"کیا مطلب؟ تم خود نہیں جانتے تھے اس کا نام۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"تم بولا اس کا نام اکرام شیخ ہے۔ ہم نے مانا۔"

میں نے چلّا کے کہا "پاگل کے بچے، تم نے گاڑی کس سے لی تھی؟ کس کے بارے میں کہہ رہے تھے کہ اس کا حادثہ ہوا؟ کس کے جنازے میں شریک ہوئے تھے؟"

"جس کا گاڑی تھا۔" بادشاہ گل ڈر گیا۔

میں نے اس کی گردن دبوچ لی "اس کا کوئی نام تو ہوگا۔ اس نے تمہیں رسید دی ہوگی، ٹرانسفر لیٹر دیا ہوگا۔ کاغذات کہاں ہیں گاڑی کے؟" میں اسے کھینچتا ہوا باہر لے گیا جہاں اس کی ٹیکسی کھڑی تھی۔

رابعہ بھی رونا بھول گئی تھی۔ اچانک امید پیدا ہوگئی تھی کہ کہیں یہ صرف غلط فہمی نہ ہو۔ گاڑی بلاشبہ وہی تھی مگر کیا فروخت کرنے والا اکرام شیخ ہی تھا؟

بادشاہ گل چلانے لگا "خو ہمارا کیا غلطی ہے؟"

میں نے کہا "غلطی کی اولاد، تم کو نام معلوم نہیں تھا اور تم نے کہہ دیا کہ اکرام شیخ مرگیا۔ تم نے دیکھا تو ہوگا اسے، حلیہ بتاؤ، اس

کا۔"

صاب' گاڑی ہم نہیں لیا' سیٹھ لوگ لیا۔ ہم تو اس کا گاڑی چلاتا ہے۔" بادشاہ گُل نے منت سماجت کرتے ہوئے اپنی گلوخلاصی کی کوشش کی "وہ بُڈھا آدمی تھا۔ ہمارے جیسا......"

میں نے اسے چھوڑ دیا۔ اب کاغذات دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ ایک طرف اچانک میرا دل سکون' اطمینان اور شکرگزاری کے جذبات سے معمور ہو گیا تھا کہ اکرام شیخ زندہ ہے' وہیں دوسری طرف مجھے اپنے غصے پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ بادشاہ گُل کو اسی قبر میں گاڑ دوں جس کو اس نے اکرام شیخ کی قبر بتایا تھا۔ مگر یہ غلط فہمی ہم نے پیدا کی تھی۔ ہم نے کہا کہ اس گاڑی کا مالک اکرام شیخ ہے تو اس نے مان لیا کہ اکرام شیخ ہی ہوگا مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ وہ مر گیا۔

رابعہ نے مسرت سے کہا "سکندر' وہ کوئی اور تھا۔"

میں نے اقرار میں سرہلایا اور کہا "کاغذات نکالو۔"

بادشاہ گُل نے ٹیکسی کے کاغذات نکالے۔ یہ سارے فوٹو اسٹیٹ کاغذات تھے اور ان میں ابھی تک مالک کی جگہ اکرام شیخ کا نام ہی لکھا ہوا تھا۔ نام کے ساتھ پتا بھی تھا جو شاید پُرانا ہو چکا تھا۔ اس نے یہ گاڑی کسی کو اوپن لیٹر پر بیچ دی تھی۔ نیچے دستخط اکرام شیخ نے ہی کیے تھے مگر ٹرانسفر لیٹر میں خریدار کے نام کی جگہ خالی چھوڑ دی تھی۔

"تم نے تو اچھے بھلے آدمی کو مار دیا تھا' یہ سوچے بغیر کہ کہیں اس صدمے سے ہم نہ مر جائیں۔" رابعہ نے کہا۔

میں نے کہا "اب یہ بتاؤ کہ تمہارا سیٹھ کہاں ہے؟"

"کون سیٹھ؟"

"جس کی یہ گاڑی ہے۔ اور کون سیٹھ۔"

"وہ باہر رہتا ہے۔" بادشاہ گُل بولا "ابھی اس کا بیٹا ہے۔"

میں نے ٹیکسی میں بیٹھ کے کہا "ٹھیک ہے' اُسی کے پاس چلو۔"

رابعہ نے کہا "گاڑی کے کاغذات میں اکرام شیخ کا جو پُرانا پتا دیا ہوا ہے وہ نوٹ کر لو۔"

میں نے کہا "میرے پاس تو قلم نہیں ہے۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے مجھے ایک بال پوائنٹ پین دیا۔ میں نے وہ پتا ایک کاغذ پر اُتار لیا "یہاں سے شاید معلوم ہو جائے......"

رابعہ نے میری بات کاٹ دی "معلوم تو قبرستان کے ریکارڈ سے بھی ہو سکتا ہے۔ گورکن کے پاس رجسٹر اموات ہوتا ہے۔"

میں پھر ٹیکسی سے اُتر گیا "بالکل ہوتا ہے۔ تم یہیں بیٹھو' میں دیکھ کے آتا ہوں۔"

گورکن کو میں نے قبرستان کے ایک دور اُفتادہ حصے میں دریافت کیا۔ وہ ایک قبر کھود رہا تھا اور یہی وجہ تھی کہ مجھے نظر نہیں آیا تھا۔ پھر میری نگاہ نے اُڑتی ہوئی مٹی کو دیکھا جو ایک ڈھیر پر گرتی جا رہی تھی۔ یہ مٹی وہ اپنے بیلچے سے اوپر پھینک رہا تھا مگر [illegible] گہرائی میں روپوش تھا۔

میں نے مٹی کے ڈھیر پر بیٹھ کے اسے آواز دی تو اس [illegible] اٹھا کے مجھے دیکھا "قبر چاہیے؟"

میں نے کہا "ابھی نہیں۔ مجھے تم سے ایک اور کام [illegible] باہر آؤ۔"

وہ باہر آ کے مجھے شک آمیز نظروں سے گھورتے ہوئے [illegible] "کوئی مُردہ چاہیے؟ ایک ہزار کا ہوگا۔ تم بڑا ٹائم پر آیا [illegible] ادھر میت آنے کو ہے۔"

میں بھونچکا رہ گیا "کس کی میت ہے؟"

"اپن کو کیا معلوم۔ تم کو ضرورت ہے تو بولو۔"

میں نے کہا "تدفین کے بعد تم لاش نکال لو گے؟"

"رات کو۔" وہ بولا۔

"وارثوں کو پتا نہیں چلے گا؟ وہ دو چار دن تو فاتحہ [illegible] لیے آئیں گے۔" میں نے کہا۔

"آئیں' شوق سے آئیں۔ اوپر سے قبر اصلی حالت [illegible] ہوگی۔ بے شک پکی کرا لیں۔ دس سال آتے رہیں۔" وہ اپنے پیلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولا۔

"وہ ایک خالی قبر پر فاتحہ پڑھ کے جاتے رہیں گے۔ تم بھی کرتے ہو۔ ضمیر فروش' شیطان۔"

"تم کون ہے بابا؟" اس نے بے نیازی سے کہا۔

میں نے کہا "میں جو بھی ہوں' تم بتاؤ کہ تم یہ کیا دھندا [illegible] ہو؟ کیا تمہیں مر کے قبر میں نہیں جانا ہے؟ اگر کوئی تمہاری [illegible] دے پھر؟"

"بیچے بابا' بھلے بیچے۔ لاش کو کیا فرق پڑتا ہے۔"

میں نے کہا "کب سے کر رہے ہو یہ دھندا؟"

"یہ سوال چھوڑو' اپنا کام بتاؤ۔" وہ ایک لنگوٹ با[illegible] ہوئے تھا۔ اس کا کالا بدن دھوپ میں پسینے سے بھیگ گیا تھا اور [illegible] پر مٹی جم گئی تھی۔

میں نے کہا "اگر مجھے سچ سچ بتا دو گے تو کچھ نہیں ہوگا ور[illegible] تم کو چھوڑوں گا نہیں۔"

"کیا نہیں چھوڑے گا۔ ہم کو ترڑی دیتا ہے۔ ارے ادھر [illegible] ڈاکٹر لوگ آیا۔ آج بہت بڑا نام ہے اس کا۔ وہ ہم کو بچا لے [illegible] پولیس کو بھتہ دیتا ہے۔ تم جاؤ رپورٹ کرو۔" وہ اکڑ گیا۔

میں چوری اور سینہ زوری کے اس مظاہرے پر حیران [illegible] "اس کام میں پولیس بھی شریک ہے؟"

"پولیس کا مرضی کے بغیر کون سا غلط کام ہوتا ہے؟ بولو۔"

میں نے کہا "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنا پیسہ کما کے کرو گے۔ کس بات کا لالچ ہے تمہیں؟"

"پیسہ سب کماتا ہے۔ ہم مُردہ بیچتا ہے' لوگ تو زندہ آ[illegible] [illegible] ہے' بہو بیٹی کو بیچتا ہے۔" وہ بولا۔

میں نے کہا "یہ تو ٹھیک ہے مگر تم اپنے آپ کو دیکھو' کیا [illegible] تمہاری؟ تم کسی جھگی یا چھوٹے سے مکان میں رہتے [illegible] روایات ہیں [illegible] گے۔ اسی قبرستان میں۔ یہ زمین کارپوریشن کی ہے جس کی تم [illegible] وصول کرتے ہو۔ کس بات کا لالچ ہے تمہیں آخر؟"

"بابا' لالچ سب کو ہے۔ کروڑپتی سیٹھ بھی کالا دھندا کرتا ہے۔ [illegible] ں؟ کس چیز کا کمی ہوتا ہے اس کو؟ اپن پیسہ جمع کرتا ہے اس [illegible] اس کام کو چھوڑنے کا واسطے جو اپنا باپ کیا' دادا کیا۔ وہ قبر [illegible] کھودتے کھودتے خود بھی قبر میں چلا گیا۔ اپنا بیٹا یہ کام نہیں کرے [illegible] اپن ادھر سے چلا جائے گا' جب اتنا پیسہ ہوگا کہ کوئی کاروبار [illegible] کوئی مکان خریدے گا اور عزت سے رہے گا۔ اپنا بچہ [illegible] سکول میں جائے گا۔ کوئی اس کو نہیں بولے گا کہ تیرا باپ گورکن [illegible] ہے۔ یہ کام نہیں چھوڑے گا تو باپ دادا کی طرح سارا عمر قبر [illegible] کھودے گا۔"

میں دکھ افسوس اور حیرانی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ ہر شخص [illegible] ایک عذرِ گناہ رکھتا ہے جو گناہ سے بدتر ہوتا ہے۔ جیب کترے سے [illegible] لے کر کوٹھے پر بیٹھی ہوئی عورت تک۔ سب حالات کو الزام دیتے [illegible] ہیں۔

مجھے احساس ہوا کہ گورکن سے باتیں کرتے ہوئے میں نے [illegible] اپنا وقت ضائع کر دیا ہے۔ باہر رابعہ میری واپسی کا انتظار کر رہی [illegible] تھی لیکن گورکن کی بات ہی ایسی تھی کہ میں اس کے مذموم کاروبار کے بارے میں پوچھنے پر مجبور ہو گیا اور اپنا کام بھول گیا۔ ابھی زندگی [illegible] میں مجھے بہت کچھ دیکھنا تھا اور سننا تھا۔ میری عمر اور میرا تجربہ محدود [illegible] تھا۔ دنیا میں کہاں کیا کچھ ہو رہا ہے' یہ سب میں نہ جانتا تھا' نہ جان [illegible] سکتا تھا۔

گورکن کے انکشاف نے مجھے صدمے سے سُن کر دیا تھا اور [illegible] میں وقتی طور پر مشتعل ہو گیا تھا مگر جب مجھے احساس ہوا کہ یہ بھی [illegible] معاشرے کا ایک ناسُور ہے جس کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ بُرائی کا ایک لمبا چکر ہے جس میں ایک معمولی گورکن سے پولیس تک' سب ملوث ہیں تو میرا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ خرابی اس معاشرے کے رگ و پے میں یوں سرایت کرتی جا رہی تھی کہ اچھائی کے پیروکار بھی شکست خوردگی اور مایوسی کا شکار تھے اور پسپائی میں عافیت جانتے تھے۔

گورکن نے کہا "بابا' تم کیا یہی کام کا واسطے آیا تھا؟ ہمارا ٹائم بھی خراب کیا۔ ابھی میت آ جائیں گا۔"

میں نے کہا "ایک منٹ' میں وہ رجسٹر دیکھنا چاہتا ہوں جس میں تم مرنے والوں کا ریکارڈ رکھتے ہو۔"

"پچاس روپیہ دے گا؟"

"دوں گا میرے بھائی' کیوں نہیں دوں گا۔ ضرورت مند ہوں آخر۔" میں نے ہاتھ جوڑ کے کہا۔

وہ میرے ساتھ قبرستان کے کنارے پر بنی ہوئی جُھگی تک گیا اور اندر سے ایک رجسٹر نکال لایا۔ یہ رجسٹر ایک لمبی سی کاپی تھا جو دُہری کر کے رکھی گئی تھی۔ اس میں ہر مرنے والے کے کوائف درج تھے جو تدفین کے وقت ورثا لکھواتے تھے۔ میں صفحے پیچھے کی طرف پلٹتا گیا اور تاریخ دیکھتا گیا۔

اس رجسٹر کے پہلے صفحے پر پندرہ جنوری کا اندراج تھا۔ میں نے رجسٹر اسے واپس کرتے ہوئے کہا "اس سے پہلے کا رجسٹر لاؤ۔"

"وہ نہیں ہے۔" گورکن نے بے رُخی سے کہا۔

"کیوں نہیں ہے؟"

"بابا' گرمی کا ہے کو کھاتا ہے۔ پُرانا رجسٹر کارپوریشن جاتا ہے' ادھر جا کے دیکھو۔" وہ اپنی جُھگی میں گھس گیا۔

میں مایوس ہو کے لوٹا اور یہ بات رابعہ کو بتائی "ہمیں کارپوریشن جانا پڑے گا۔ شعبۂ اموات میں۔ وہاں کوئی اور کلرک بادشاہ بیٹھا ہوگا۔ وہ پُرانا ریکارڈ نکالنے کا معاوضہ طلب کرے گا۔"

رابعہ نے کہا "یہ تو ہوتا ہے۔ جتنا پُرانا ریکارڈ ہوتا ہے وہ اتنے ہی زیادہ پیسے مانگتے ہیں۔ بعض اوقات لوگ کئی سال بعد کسی کا ڈیتھ سرٹیفکیٹ بنوانے پہنچ جاتے ہیں۔ عدالت میں وراثت کے مقدمات دائر کرنے کے لئے ڈیتھ سرٹیفکیٹ پیش کرنا پڑتا ہے۔"

آدھے گھنٹے بعد ہم کارپوریشن کے دفتر پہنچے تو دوپہر گزر چکی تھی۔ کلرک بادشاہ لنچ سے آدھا گھنٹا قبل ہی لنچ کے لیے تشریف لے جا چکے تھے۔ ایک چپراسی نے مجھے بتایا کہ وہ کہاں دستیاب ہوں گے۔ میں نے انہیں ایک ریڑھی پر مرغ چھولے اور نان تناول کرتے ہوئے جا پکڑا۔ میں ان سے پوچھتا کہ وہ لنچ کا وقفہ شروع ہونے سے قبل ہی کیوں اٹھ گئے اور انہیں ادائے فرض یا وقت کی پابندی پر لیکچر دیتا تو وہ خفا ہو جاتے اور میرا کام خراب ہو جاتا۔

میں نے عرضِ مُدعا کی تو انہوں نے ایک شانِ استغنا کے ساتھ کہا "کیا کھانا چھوڑ کے تمہارے ساتھ چل پڑوں؟ دفتر میں انتظار نہیں کر سکتے تھے۔"

میں نے کہا "غلطی ہوئی سر' آپ اطمینان سے کھانا کھائیے۔"

وہ میری عاجزی سے متاثر ہوا "کس کا ڈیتھ سرٹیفکیٹ بنوانا ہے؟ بندہ کب فوت ہوا تھا؟"

میں نے اسے تاریخ بتائی "مجھے ڈیتھ سرٹیفکیٹ نہیں چاہیے' بس نام کی تصدیق کرنی ہے۔"

"مجھے تو رجسٹر اولڈ ریکارڈ سے نکالنا ہی پڑے گا۔" وہ بولا "سو روپے ہوں گے۔"

رزق اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ اتنی بے غیرتی کے ساتھ حرام مانگ رہا تھا کہ مجھے اس کی مُردہ ضمیری پر ترس آیا مگر میں نے کہا' "ٹھیک ہے سر۔"

سر نے مرغ چھولے کی ڈکار لی' چائے نوش فرمائی پھر ایک

دُکان سے میٹھا پان بارہ مسالے والا کھایا اور سگریٹ کا ایک پیکٹ لے کر مجھے حکم دیا "اسے سو کا نوٹ دے دو۔"

اس کا طریقۂ واردات بہت محفوظ تھا۔ اگر سو کے نوٹ پر اینٹی کرپشن والوں کے دستخط ہوتے تو اس کا کچھ نہ بگڑتا۔ سو کا نوٹ تو پان والے کے پاس پہنچ گیا تھا۔ باقی رقم کلرک بادشاہ نے وصول کی اور جیب میں ڈال لی۔

اپنے نحوست زدہ گرد آلود فائلوں اور بدرنگ' پُرانے فرنیچر والے آفس میں پہنچ کے اس نے رجسٹر تلاش کرنے میں آدھا منٹ بھی نہیں لگایا۔ اس کا ہاتھ سیدھا ایک شیلف کی طرف گیا اور اس نے سب سے اوپر والا رجسٹر میرے سامنے پھینک دیا۔

میں نے صفحے پلٹے اور مطلوبہ تاریخ کے اندراجات دیکھنے لگا۔ پھر ایک جگہ میری نظر رک گئی۔ اس دن سات افراد کی تدفین ہوئی تھی اور ایک کا نام اکرم شاہ تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اکرام شیخ اور اکرم شاہ کے ملتے جلتے ناموں کے باعث ہی بادشاہ گُل کو غلط فہمی ہوئی تھی۔ ایک مہینہ انیس دن بعد اس نے اکرام شیخ سنا تو اکرم شاہ سمجھا اور مجھے اس کی قبر پر لے گیا۔

میرا کام ہو گیا تھا۔ اب میں نے رجسٹر کلرک بادشاہ کے سامنے پھینکا "یہ لو' سنبھال کے رکھو۔ تم کو انہی مُردوں کے نام کی کمائی خود بھی کھانی ہے اور اپنی اولاد کو بھی کھلانی ہے۔"

وہ میرے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر خاموش ہو گیا۔

میں نے جاتے جاتے کہا "تم میں اور کفن چور میں کوئی فرق نہیں۔ یہ سب مُردے اور ان کے وارث قیامت کے دن تمہارا دامن پکڑیں گے۔"

"پکڑنے دو۔ تم بھی تو آؤ گے۔" وہ بولا۔

باہر آ کے میں اس قوم کی روبہ زوال اخلاقی حالت پر افسوس کرتا رہا جس کی ہدایت کے لیے قرآن جیسا ابدی و ازلی صحیفہ نازل کیا گیا۔ خدا سے ڈرنا تو لوگوں نے پہلے ہی چھوڑ دیا تھا' اب قانون کی سزا سے بے خوفی بھی حرام خوروں کے مزاج میں شامل ہو گئی تھی۔

رابعہ نے کہا "بہت دیر لگا دی۔ کیا خبر لائے ہو؟"

میں نے کہا "گڑے مُردے اکھاڑنے گیا تھا' جہنمی بن کے واپس آیا ہوں۔ سے نا بُری خبر؟"

"اتنے تلخ کیوں ہو رہے ہو؟"

"رشوت لینے والا اور دینے والا دونوں جہنمی ہوتے ہیں نا۔ میں صبح سے دوسری بار رشوت دے چکا ہوں۔ مگر خیر' خوش خبری یہ ہے کہ وہ نام اکرم شاہ تھا' اکرام شیخ نہیں۔"

بادشاہ گُل نے کہا "خو اللہ تمہارا بھلا کرے۔ تم اکرام شیخ بولا' ہم اکرم شاہ سمجھا۔"

میں نے کہا "تمہاری اس نا سمجھی نے کتنے مسائل پیدا کر دیئے ہیں' یہ تم نہیں جانتے۔ ہم نے تو جھک ماری اور تفتیش کرکے اصل حقیقت کا پتا چلا لیا مگر دو دن پہلے جو اکیلی عورت ایک ساتھ آئی تھی' اسے ہم کہاں تلاش کریں۔ معلوم نہیں ... بات پر یقین کرکے اس نے کتنی پریشانی اٹھائی ہوگی۔"

"اس کا بھی پتا چل جائے گا۔ ابھی بولو کدھر جائے گا۔"

میں نے کہا "اپنے سیٹھ کے گھر چلو پہلے۔"

ٹیکسی کا موجودہ مالک کاروں کا دلال تھا۔ صدر میں ... ہوٹل کے پاس کھڑی ہوئی گاڑیوں کا براہ راست سودا کر... اور دلال جمع تھے۔ بادشاہ گُل نے اسے ایک گلی میں ڈھونڈ... ہمارے پاس لے آیا۔

وہ دبلا پتلا' جوان آدمی تھا "جی' کیا حکم ہے سرکار؟"

میں نے کہا "یہ گاڑی تم نے اکرام شیخ سے لی تھی؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "میرے والد صاحب نے لی تھی۔"

"والد صاحب کہاں ہیں؟" میں نے کہا۔

"دبئی گئے ہیں۔ ایک ہفتے بعد آئیں گے سرکار۔"

میں نے کہا "تم کچھ جانتے ہو اس شخص کے بارے میں' اب کہاں رہتا ہے اور کیا کرتا ہے؟"

اس نے مجھے اور رابعہ کو غور سے دیکھا "معاملہ کیا ہے سرکار؟"

میں نے کہا "معاملہ یہ ہے کہ ہم ڈھاکا سے آئے ہیں۔ ہم گئے تھے تو اس کے پاس یہ ٹیکسی تھی۔ اس ٹیکسی کے ... اس کا پتا ٹھکانہ معلوم ہو جاتا تھا۔"

"اب دوسری ٹیکسی ہے اس کے پاس۔ ہم نے ... تھی۔ ایکسچینج کی تھی اس نے۔"

"اس کی نئی ٹیکسی کا نمبر معلوم ہے؟"

اس نے ذہن پر زور دے کر کہا "بڑا اچھا نمبر تھا۔ ... اللہ۔"

"یعنی نو سات سو چھیاسی؟" میں نے کہا۔

"بالکل صحیح سمجھے آپ سرکار۔" وہ مسکرا کے بولا۔

"یہ نہیں معلوم کہ وہ کہاں ملے گا؟ پتا کیا ہے اس کا؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "ٹیکسی والوں سے پتا کرو۔ یہ ... ہیں ایک دوسرے کو ورنہ کل موٹر آفس چلے جانا۔ ادھر ... کالج کے پاس ہے۔ آج تو آفس بند ہو گیا۔"

یہ اطلاع اتنی امید افزا تھی کہ ہم نے بادشاہ گُل کے ... نئے سرے سے اکرام شیخ کی تلاش شروع کی۔ وہ کھانے کے ... کہیں رکنا چاہتا تھا مگر ہماری تو بھوک ہی اُڑ گئی تھی۔ پہلے ... سے کہ اکرام اس دُنیا میں نہیں رہا اور اب اس کا سُراغ پا کے ... مجبوراً ہمیں بھی اس کا ساتھ دینا پڑا۔ ایک ریسٹورنٹ ... بادشاہ گُل نے ڈٹ کے کھایا اور اپنا فلسفۂ حیات بھی بیان ... آدمی کی ساری تگ و دو پیٹ کے لیے ہوتی ہے۔ آدمی ... کھائے تو پھر محنت سے فائدہ۔ ہم نے اس سے اتفاق کیا مگر ... کلیم اللہ سے ملنے کا اشتیاق اتنا غالب تھا کہ میں ...

...گُل' کاجل اور کلیم ... دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ میں نے اور رابعہ نے ... کھانے کی طرف ... ایک کپ چائے پر اکتفا کی اور بادشاہ گُل کو مسلسل جلدی ...نے کے لیے کہتے رہے۔

... تلاش کا دوسرا مرحلہ سہ پہر کے وقت شروع ہوا۔ ہم نے ... ٹیکسی اسٹینڈ پر پوچھنا شروع کیا۔ نائن سیون ایٹ سکس پر ...رہ ہر ... سوچ میں پڑ جاتے تھے۔ پھر کہتے تھے "اچھا تو نو بسم اللہ دیکھا ... بندے کو' رہتا کدھر ہے یہ معلوم نہیں۔"

... جگہ ہمیں بتایا گیا "ابھی ابھی نکلا ہے سواری لے کر' سخی ... گیا ہے۔" بھاگم بھاگ ہم سخی حسن پہنچے تو نہ وہ راستے میں نظر ... اور نہ تلاش کرنے سے ملا۔ سخی حسن کا علاقہ بہت وسیع تھا اور ... قبرستان کے آس پاس کا سارا علاقہ ہی سخی حسن کہلاتا تھا جس ... نارتھ ناظم کے کچھ بلاک اور بفرزون وغیرہ شامل تھے۔ تاہم ... تک ہم نے ہمت نہ ہاری اور جہاں بھی کسی ٹیکسی کو کھڑا دیکھا' ... کہہ دیا کہ اکرام شیخ تک ہمارا پیغام پہنچا دے اور اسے بتا دے ... رابعہ اور سکندر اسے تلاش کر رہے ہیں۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شام کو ایک ٹیکسی ڈرائیور نے ہمیں ... پرچی تھما دی۔ اس پر لکھا ہوا تھا "میں گھر پر تمہارا انتظار کر رہا ... پیچھے پتا اور راستے کا نقشہ بنا ہوا ہے۔"

میں نے ایک پُرمسرت نعرہ لگایا "بادشاہ گُل! چلو تمہارا کام ... ہوا۔ یہ پتا سمجھ لو اور چلو۔"

بادشاہ گُل نے آسمان کی طرف منہ اٹھا کے کہا "خو اللہ کا شکر ... ورنہ تم ہمارا جان نہیں چھوڑتا۔"

بادشاہ گُل کو نقشہ دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ کراچی کے ...ستوں سے آشنا تھا۔ وہ جس راستے سے گزرا' ہمیں بتاتا گیا "خو لسبیلہ ہے۔ ابھی پُل آئے گا' اس کے بعد گولیمار۔"

میں نے کہا "گولی مار! یہ کیا نام ہوا۔ کسی کو گولی ماری گئی تھی ...ں' کہ اس جگہ کا نام گولی مار ہو گیا۔"

بادشاہ گُل نے کہا "یہ تو ہم کو نہیں معلوم۔"

"ایسے ہی تین ہٹی۔" میں نے کہا "اس کا مطلب ہے تین ...کانیں۔ تو آخر وہ کون سی تین دُکانیں تھیں؟"

رابعہ نے کہا "کیا فضول سوالات کر رہے ہو۔ ایسے نام تو ...ر جگہ ہوتے ہیں۔ پنڈی میں تیلی محلہ ہے مگر وہاں تیلی نہیں رہتے۔ ...ہور کے بادامی باغ میں کون سا باداموں کا باغ تھا۔"

میں نے کہا "بس ایسے ہی گپ شپ کر رہا ہوں وقت گزاری ...کے لیے۔ سوچو کچھ دیر بعد ہم اکرام شیخ کے سامنے ہوں گے۔"

"باقی سب کو بھول گئے؟"

"وہ تو ہمارے ساتھ ہی تھے مگر اکرام شیخ تو بس ایک نام رہ گیا ...تھا' اس کی یاد باقی تھی ہمارے دل میں۔"

ٹیکسی ایک گلی میں مُڑتے ہی رک گئی۔ عین اکرام کی ٹیکسی کے سامنے۔ ہماری وجہ سے وہ دھندا چھوڑ کر گھر لوٹ آیا تھا۔ گھر کا نمبر کہیں نظر نہ آتا تھا مگر اکرام نے ہماری سہولت کی خاطر دروازے پر چاک سے اپنا نام "ڈبل ایس آئی شیخ" لکھ دیا تھا۔ جب وہ پولیس میں سب انسپکٹر تھا تو ہم اسے ایس آئی شیخ کہتے تھے۔ اس کا پورا نام سید اکرام شیخ تھا۔ ظاہر ہے یہ اس نے ابھی ابھی لکھا تھا۔

میں ٹیکسی سے چھلانگ مار کے اُترا اور دروازہ بجانے لگا مگر دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میری نظر سب سے پہلے کاجل اور کلیم اللہ پر پڑی۔ کاجل فرش پر دری بچھائے بیٹھی تھی اور چائے پی رہی تھی۔ کلیم اللہ اس سے کچھ دور بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔

کاجل ایک دم اٹھی "سکندر... تم آ گئے۔"

کلیم اللہ نے بھی چلّا کے کہا "سکندر چاچا۔"

اس کے ساتھ ہی کمرے میں سے اکرام شیخ بگولے کی طرح نمودار ہوا اور مجھ سے چمٹ گیا۔

"سکندر! تم سکندر ہو' مجھے یقین نہیں آتا۔ خدا کی قسم تم نے مجھے بہت ستایا' کتنا انتظار کرایا۔" اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

میں نے اپنے آنسو پونچھ کے کہا "رابعہ بھی ہے میرے ساتھ۔"

رابعہ میرے پیچھے کھڑی تھی اور اسے قطعی احساس نہ تھا کہ

آنسو خود بخود اس کی آنکھوں سے چھلک گئے تھے "اکرام.... تم ٹھیک ہونا؟" رابعہ نے بڑی مشکل سے کہا۔ پھر وہ اکرام کے گلے لگ کر رونے لگی۔

میں نے کہا "کیا ہوگیا ہے سب کو۔ اتنی خوشی کے موقعے پر رو رہے ہیں ہم سب۔"

اکرام نے کہا "یہ آنسو بھی کب سے رکے ہوئے تھے۔ آج کے دن کے انتظار میں۔ اس خوشی کے لیے میں کب سے تمہاری راہ دیکھ رہا تھا۔"

میں نے کہا "وہ اُلّو کا پٹھا کہاں ہے؟"

"کون، محسن؟" اکرام بولا "میں تو خود تم سے پوچھنے والا تھا۔ وہ گُل کے ساتھ روانہ ہوا تھا۔ مجھے کاجل نے بتایا۔"

میں نے کہا "تو کیا وہ یہاں نہیں پہنچا؟"

اکرام نے نفی میں سرہلایا "یہاں پہنچتا تو میرے ہی پاس آتا نا۔"

میری خوشی اتنی عارضی ہوگی' یہ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ ایک دم میرا دل بیٹھ گیا۔ رابعہ کی صورت پر اُداسی برسنے لگی۔

"اکرام! وہ کہاں جاسکتے ہیں آخر؟ ہم نے انہیں جہاز میں بٹھا کے خود رخصت کیا تھا۔"

"یہ بھی مجھے بتایا تھا کاجل نے۔ اور میں نے انہیں بہت تلاش کیا۔" اکرام شیخ بولا "لیکن وہ نہیں ملے۔ میں نے ہر ٹیکسی ڈرائیور سے پوچھا کہ کوئی مجھے پوچھتا ہوا تو نہیں آیا تھا' میری ٹیکسی کا نمبر تو معلوم نہیں کررہا تھا۔ اس کو تو پُرانا نمبر یاد ہوگا لیکن کچھ نہیں....."

میں نے کہا "یار' وہ لاہور چلا گیا ہوگا۔"

"میں نے معلوم کرلیا ہے۔"

"کس سے؟ منظر نے تو گھر بدل لیا۔ میں خود اسے فون کرتا رہا۔" میں نے کہا۔

"اچھا تم بیٹھو۔ بیٹھ کے آرام سے بات کرو۔" اکرام بولا "چلو اندر آجاؤ۔"

رابعہ نے کہا "میں یہاں کاجل کے پاس بیٹھی ہوں۔"

"تم نے یہ گھر کب لیا؟" میں نے کمرے میں پہنچ کے بستر پر دراز ہوتے ہوئے کہا۔

"دو مہینے ہوگئے۔" اکرام شیخ دوسرے بستر پر ٹانگیں لٹکا کے بیٹھ گیا "اور یہ میں نے صرف اس لیے لیا تھا کہ یہاں فون تھا۔"

میں نے کہا "فون...... فون ہے یہاں؟ لاحول ولا قوۃ ہم وہاں سوچتے رہتے تھے کہ تم سے کیسے رابطہ کریں۔"

"منظر نے نہیں بتایا تھا' اسے تو معلوم تھا۔" اکرام بولا۔

"اس سے بھی رابطہ کم ہی ہوتا تھا۔" میں نے کہا "مگر اس نے ذکر نہیں کیا' بھول گیا ہوگا۔ کرائے کا مکان ہے؟"

"اور کیا خرید کر رہوں گا میں۔ صرف فون کی وجہ سے کرایہ دو سو روپے ہے۔" وہ بولا "ایسی فضول سی آبادی میں دو ک مکان کا کرایہ سو' سوا سو سے زیادہ نہیں ہوتا مگر ٹیلی فو نعمت ہے جو خوش نصیبوں کو میسّر ہے۔ اس امید میں لیا تم سے یا نازو سے بات ہوجائے گی۔ وہ کہاں ہے اور غالب؟"

میں نے کہا "وہ بھی پہنچ جائیں گے ایک دو دن میں۔"

"مجھے وہ سب تو کاجل سے معلوم ہوگیا تھا جو مشرق میں تمہارے ساتھ ہوا تھا۔" اکرام بولا۔

"خاک دھول ہوا تھا۔ جھک ماری تھی ہم نے۔" میں سے کہا "مجھے تو اب افسوس ہوتا ہے کہ ساری جدوجہد را گئی۔"

"یار ایسا تو ہوتا ہے۔ جدوجہد کے دو ہی نتیجے نکلتے ہیں او اور ناکامی کی صورت میں۔ تمہاری نیت نیک تھی اور ارادے تھے۔ اب حالات ہی ناموافق ہوں۔ تقدیر ساتھ نہ دے اور پرائے ہوجائیں تو آدمی کیا کرے۔"

"نہیں یار' دکھ تو ہوتا ہے نا پھر بھی کہ ہم نے کیا سوچا تھا کیا ہوگیا۔" میں نے کہا۔

"دکھی ہم سب بھی ہیں۔ یہاں ہر پاکستانی کا دل رو رہا یار' ہم عالمی طاقتوں کی سازش کا مقابلہ تو نہیں کرسکتے۔"

"چھوڑو اس ذکر کو۔ اس بات سے بھی زخم جاگ اٹ ہیں۔" میں نے کہا "یہ بتاؤ کاجل یہاں کیسے پہنچ گئی؟ اسے معلوم ہوا تھا کہ تم فوت ہوگئے ہو۔"

اکرام ہنسا "کیا تمہیں بھی کسی نے میرا مزار دکھادیا تھا؟"

"ہاں یار' ہم نے تو بڑی مشکل سے تمہیں اس دُنیا میں تلا کیا۔ ایک خبیث ٹیکسی ڈرائیور تھا۔ اس کے پاس تمہاری پُر ٹیکسی تھی۔ کہنے لگا کہ جس کی ٹیکسی تھی وہ تو فوت ہوگیا اور ہ لے گیا ایک قبر پر۔ وہاں نہ کوئی کتبہ تھا نہ کوئی نشانی۔ کارپور جا کے رجسٹر اموات نکلوایا تو پتا چلا کہ وہ اکرم شاہ تھا۔"

"ہاں' میری گاڑی اکرم شاہ نے لی تھی۔ اس نے دو ایک شخص کو دے دی۔" اکرام بولا "وہ بروکر ہے اور باہر سامان لاتا رہتا ہے۔ اکرم شاہ ایک ہفتے بعد حادثے میں مرگیا۔"

"اس کی ٹیکسی کو کچھ نہیں ہوا؟"

"حادثہ اس وقت ہوا جب وہ پیدل جارہا تھا۔" اکرام شیخ کہا "میری ٹیکسی اس بروکر کے پاس تھی مگر ٹیکسی والے جانتے کہ میں نے نئی گاڑی لی ہے' اسی بروکر سے۔ اور اپنی گاڑی اکر شاہ کو دے دی ہے۔ بس اسی سے گڑبڑ پھیلی۔ تمہیں کون ملا تھا؟"

"بادشاہ گُل نام تھا اس کا۔ بڑے وثوق سے کہہ رہا تھا کہ خود جنازے میں شریک ہوا تھا۔ بعد میں حُلیہ بتایا تو میری جان جان آئی اور میں نے تمہیں ڈھونڈنا شروع کیا۔ اسی بروکر کے سے تمہاری نئی ٹیکسی کا نمبر لیا۔"

"کاجل نے بادشاہ گُل کی بات پر یقین نہیں کیا تھا۔" اکر ولا "بڑی ہمت والی لڑکی ہے اور بہت ذہین۔ اس نے بھی حُلیہ یا تو بادشاہ گُل نے کہا کہ وہ مکرانی تھا۔ کاجل کو شاید معلوم تھا کہ مکرانی بہرحال نہیں ہوں۔"

ہم نے بتادیا تھا کہ وہ ایک جوان رعنا ہے' خوبرو۔"

افسوس کی بات یہ ہے سکندر کہ جس نتیجے پر تم اتنی جھک مار ہنچے' وہ ایک عورت کے ذہن نے فوراً اخذ کرلیا۔"

"کیا نتیجہ؟"

"یہی کہ اکرام شیخ نے ٹیکسی بدل لی ہوگی۔ اس نے صدر ے ایک ہوٹل میں کمرا لیا اور ٹیکسی والوں کی یونین کے بارے معلوم کیا۔ کسی ٹیکسی ڈرائیور نے یونین کے دفتر کا ٹیلی فون نمبر یا۔ اس نے وہاں فون کیا اور پوچھا کہ اکرام شیخ ایک ٹیکسی ئیور تھا جس کے پاس پہلے اس نمبر کی گاڑی تھی۔ اب اس کے کون سی گاڑی ہے؟ اس کا نمبر کیا ہے اور وہ کہاں رہتا ہے۔"

میں نے سر کھجا کے کہا "یار' یہ تو بڑا آسان طریقہ تھا مگر یہ ی ہماری کھوپڑی میں نہیں آئی۔ اور آتی بھی کیسے' تمہارے تال پُرملال کی خبر اور تمہاری قبر دیکھ کے عقل کا تو فیوز اُڑ گیا تھا' غ بالکل مفلوج ہورہا تھا۔"

اکرام نے کہا "کاجل کو میری نئی ٹیکسی کا نمبر معلوم ہوگیا اور ۔اس کے بعد وہ دو گھنٹے میں یہاں آگئی۔"

"جہاں ہم سارا دن گنوا کے پہنچے۔" میں نے کہا "مگر یار' تم ں کم عقل مند نہیں ہو۔ کاجل کے آنے کے بعد کیا تم سب ٹیکسی لوں سے نہیں کہہ سکتے تھے کہ اب کوئی مجھے پوچھتا ہوا آئے تو رے گھر لے آنا۔"

"سارے شہر کے ٹیکسی والوں سے کیسے کہتا دو دن میں۔ کافی لوں کو بتادیا تھا' کچھ رہ گئے تھے۔ بس بدقسمتی تمہاری کہ وہ تمہیں رشاہ گُل ملا جسے کچھ معلوم نہیں تھا۔"

"یہی تو رونا ہے۔ اسے کچھ معلوم نہ ہوتا تو وہ کہہ دیتا کہ کسی رے پوچھو۔ اسے جو معلوم تھا وہ غلط تھا' مزید یہ کہ اپنی غلط علومات پر اسے صحیح ہونے کا یقین تھا۔ سالے نے مروادیا تھا ہمیں ی۔ لے جاکے قبر دکھادی۔ ہارٹ فیل ہوجاتا میرا یا رابعہ کا پھر؟"

"یار' اتنے کمزور دل تو نہیں ہونے چاہئیں تمہارے۔ تم سے کاجل اچھی رہی جو نہ گھبرائی نہ پریشان ہوئی حالانکہ اس شہر میں وہ جنبی تھی۔ دو گھنٹے میں آگئی یہاں۔ ہوٹل میں کمرا تو اس لیے لیا تھا کہ خدانخواستہ میں نہ ملوں تو اس کے پاس ایک ٹھکانا تو ہو۔ میں تو دن میں اس لڑکی سے بے حد امپریس ہوا ہوں۔ اس کی کہانی سُن کے تو میں دنگ رہ گیا۔ اتنی جرأت مند اور نڈر لڑکی۔ اور جن حالات میں وہ اپنا گھربار' خاندان اور وطن سب کچھ قربان کرکے یہاں آگئی۔ جتنی لگن کے ساتھ وہ کلیم اللہ کی ذمے داری کو پورا کررہی ہے اور جتنا اعتماد اس نے مجھ پر کیا۔"

میں اسے حیرانی سے دیکھتا رہا "بھائی صاحب' آپ کچھ ضرورت سے زیادہ جذباتی ہورہے ہیں۔"

"کیوں' کون سی بات غلط کی ہے میں نے؟"

"اچھا اس کی سیرت کے ساتھ صورت کا بھی کچھ آپ کے دل پر خوشگوار اثر ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"اب اگر میں نے کہا کہ لاجواب ہے تو تم میرے پیچھے ٹین باندھ دو گے' اس لیے میں جھوٹ بول کے جان بچانا بہتر سمجھتا ہوں۔ وہ اتنی بدصورت ہے کہ مجھے بالکل اچھی نہیں لگی۔"

اسی وقت کاجل اندر آئی اور اس نے چائے کا ایک مگ مجھے تھمایا' دوسرا اکرام کو دیا' بیچ میں بسکٹ رکھے اور واپس جانے لگی۔

میں نے کہا "کیا بات ہے۔ ہم سے پردہ ہے کیا؟"

وہ ہنسنے لگی "یہ خیال آپ کو کیوں آیا؟"

"تم نے اپنا زنانہ سیکشن الگ جو کرلیا ہے۔"

"آپ یہاں اکرام کو وہی بتارہے ہوں گے جو رابعہ مجھے بتارہی ہے۔ دو کی عقل ہو تو آپس میں باتیں ہوتی ہیں' چار ہوں تو جلسہ ہوجاتا ہے۔" کاجل بولی۔

"پانچ ہوں تو دفعہ ایک سو چوالیس کی خلاف ورزی ہوجاتی ہے۔" رابعہ نے برآمدے سے جھانک کے کہا۔

کاجل نکل گئی تو اکرام نے کہا "غالب اور نازو کیوں پیچھے رہ گئے؟"

"میں نے کہا "ہم بھی تو پیچھے رہ گئے تھے۔ بس کی زیادہ فکر

ہے۔"

اکرام بولا "ہاں یار' سچ تو یہی ہے کہ سب سے زیادہ مجھ پر نازو کی جُدائی شاق گزری۔ میں یہ کہوں کہ تم سب برابر ہو میرے لیے تو یہ غلط ہوگا۔ نازو تو روزِ اول سے میرے ساتھ ہے۔ بے شک میں اس سے بہت زیادہ بڑا نہیں ہوں' مجھ میں اور اس میں صرف پانچ سال کا فرق ہے مگر چھوٹی بہن تو چھوٹی بہن ہوتی ہے' خواہ وہ ایک سال چھوٹی ہو۔"

میں نے آہ بھر کے کہا "بالکل سچ کہتے ہو تم۔ لیکن افسوس کہ میں نہ کسی کا بڑا بھائی ہوں اور نہ چھوٹا۔ میں ان جذبات کی نعمت سے ہمیشہ محروم رہا جو بڑے یا چھوٹے بھائی کی حیثیت سے محبت کا الگ روپ رکھتے ہیں۔"

"تمہارے بہن بھائی تو تھے۔"

"تھے مگر مجھے تو کسی کی صورت یاد نہیں۔ بس اتنا معلوم ہے کہ وہ سب پاکستان پر قربان ہوگئے تھے۔" میں نے کہا "تمہیں نازو بہت یاد آتی تھی؟"

"بہت۔ اسے یاد کرکے کئی بار تو میں اتنا اُداس ہوا کہ رویا۔ اکیلے میں۔" اکرام بولا "عجیب جذباتی ڈیپریشن ہوجاتا تھا۔ اور یہ محبت ہی ہوتی ہے جو آدمی کو خوف زدہ کرتی ہے' بُرے بُرے خیالات سے ڈراتی ہے۔ کبھی کبھار دورہ سا پڑتا تھا اور میں جتنا اس کی یاد سے دامن چھڑانے کی کوشش کرتا تھا اتنا ہی اس کا خیال میرے اعصاب پر سوار ہوتا تھا۔ پھر میں باہر نکل جاتا تھا۔ محبت کرنے والے آدمی کے لیے تنہائی اس کی دُشمن ہوجاتی ہے۔ یہ نہیں کہ تم لوگ مجھے بالکل یاد نہیں آتے تھے۔ ایک زمانہ ہوا ہم سب آپس میں اتنے قریب ہیں جیسے ایک خاندان کے لوگ۔"

میں نے کہا "تمہیں استاد ٹیڈی کی موت کا پتا چلا تھا اور شہلا کی موت کا؟ وہ کس شان سے شہید ہوئے۔"

"ہاں یار۔ اور اس روز میں جان بوجھ کے اکیلا رہا۔ میں گھر سے نکلا ہی نہیں۔" اکرام شیخ بولا "ورنہ غم کا علاج میرے نزدیک محفل تھی۔ میں انہیں دوست تو نہیں کہہ سکتا لیکن گپ شپ کرنے والے کچھ لوگ ہیں جن کے ساتھ میرا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ سب ٹیکسی ڈرائیور تھے' پڑھے لکھے عالم فاضل لوگ نہیں تھے۔ میرے ہم ذوق بھی نہیں تھے مگر مخلص اور اچھے لوگ تھے۔ تمہاری عدم موجودگی میں وہی میرا سہارا تھے۔ ان کا خیال ہے کہ میرا دُنیا میں کوئی نہیں۔ درمیان میں عید' بقرعید آئی تو وہ مجھے اپنے گھر لے گئے۔ دو نے مجھے اپنے بیوی بچوں سے بھی ملوایا۔ ایک گھر میں تو مجھے باقاعدہ فیملی ممبر کی حیثیت حاصل ہے۔ لیکن اس دن میں اپنے کمرے میں لیٹا رہا اور کئی بار رویا۔ بہت سی باتیں مجھے یاد آئیں۔ وہ کیا تھا اور کیا ہوگیا تھا۔"

"حق مغفرت کرے' عجب آزاد مرد تھا۔ اگر کہیں اس کا مزار بنتا تو میں اس پر یہ ضرور لکھواتا۔" میں نے کہا "جب تک وہ ہم سے نہیں ملا تھا' بدمعاشوں کا ساتھی تھا اور خود کو بدمعاش فخر محسوس کرتا تھا۔"

"حالانکہ اندر سے وہ ایک شریف اور معصوم آدمی تھا۔ بدمعاش بن ہی نہیں سکتا تھا۔ جیسے ہیرا اگر کوئلوں میں گر جائے تو کوئلہ نہیں بن جاتا۔ ہماری محبت نے اس کے رنگ روپ کو نکھار دیا اور وہ ویسا ہی آدمی بن گیا جیسا وہ تھا۔ مگر دنیا نے نہ جینے دیا۔ اور دیکھو کیا قسمت پائی تھی اس نے۔ ہم سب میں سے ایک وہی شہادت کے منصب اعلیٰ پر فائز ہوا۔ رُتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا۔"

"استاد ٹیڈی کی موت نے مجھے زبردست جھٹکا دیا تھا۔ مجھ پر سخت مایوسی کا دورہ پڑا تھا۔" اکرام شیخ بولا "میں نے باری باری سب کے متعلق سوچا کہ ایک ایک کرکے تم سب مجھے چھوڑ جاؤ گے۔ یہ خیال کیے بغیر کہ یہاں میں تمہاری واپسی کے انتظار میں ایک ایک دن کا عذاب اکیلا جھیل رہا ہوں۔ مجھے پشیمانی تھی اور دکھ تھا کہ میں تمہاری بات مان کے پیچھے کیوں رہا۔ مجھے تمہارے ساتھ ہی رہنا چاہیے تھا مگر تم سب نے مل کر مجبور کردیا کہ یہاں بھی کسی کو ہونا چاہیے جو رابطے کا کام کرے۔ یہاں کی ذمے داری سنبھالے۔ بعد میں کیا ہوا۔ نہ کسی رابطے کی ضرورت پڑی اور نہ مجھے کوئی ذمے داری سونپی گئی۔"

میں نے کہا "بس ضرورت نہیں پیش آئی۔ ضرورت پیش آسکتی تھی۔"

"نہیں یار' میرے ساتھ زیادتی ہوئی۔" اکرام شیخ بولا "تم سب ایک ساتھ ہی تھے اور سارا ثواب بھی تمہارے ہی حصے میں آیا۔ میں ایک مرد ہوکے پیچھے رہا' کچھ نہیں کیا میں نے؟"

"اکرام! انگریزی کا ایک شاعر ہے ملٹن۔ وہ اندھا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ جو انتظار کرتے ہیں وہ بھی بہت کچھ کرتے ہیں۔ ایسی بات تھی کہ

"THEY ALSO SERVE WHO STAND AND WAIT"

"دلائل مجھے مطمئن نہیں کرسکتے۔ میرے احساس کو زائل نہیں کرسکتے۔ تم میدانِ جنگ میں لڑتے رہے۔ نازو بھی کام آئی اور اس کا بھائی جو بڑا بہادر اور فرض شناس پولیس افسر تھا۔ میں ٹیکسی چلاتا رہا۔ لعنت ہے مجھ پر۔"

"ایسا مت سوچو یار۔ ہمیں بھی احساس تھا کہ تم اکیلے انتظار کا عذاب اکیلے کاٹ رہے ہو۔" میں نے کہا "محسن ساتھ رہتے ہوئے اکیلا ہوگیا تھا۔ کیا تم نے اس سے زیادہ دکھ اٹھایا؟ وہ تو پاگل ہوگیا تھا اور اس کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو یہی ہوجاتا۔"

"شہلا کی شہادت سب سے بڑا سانحہ تھی مگر مرنے والے بے خبر رہتے ہیں کہ زندہ رہ جانے والوں پر کیا گزری۔ عجیب لڑکی تھی وہ بھی۔ اس نے اپنے ساتھ اپنی ممتا کو بھی منظور کرلیا مگر ہار نہیں مانی۔"

"کتنی محبت تھی محسن سے اسے اور کتنی بڑی قربانی دی اس نے محسن کے لیے۔ خود محسن کے ساتھ کتنا ظلم ہوا کہ شادی کرکے وہ خانہ آبادی کی ساری خوشیوں سے محروم رہا۔ اس نے اپنے بیٹے کو بھی قربان کردیا اور اُس بیوی کو بھی جسے وہ دیوانگی کی حد تک چاہتا تھا۔ بہت عرصہ وہ ہم سے بھی چھپاتا رہا کہ اسے سب معلوم ہے۔ وہ جانتا تھا کہ شہلا کو اور اس کے بیٹے کو یرغمال بنالیا گیا ہے اور وہ دشمنوں کی نہیں' غداروں کی قید میں ہیں لیکن ہم اس سے چھپاتے رہے اور وہ ہم سے چھپاتا رہا۔ یہ بڑی عجیب اور افسوسناک صورت حال تھی۔ ہم شہلا کا نام لیتے ہوئے ڈرتے تھے اور غالباً اسی سے محسن نے اندازہ کیا ہوگا کہ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔ ہم سے بس یہی غلطی ہوگئی مگر یہ بالکل غیر ارادی تھی۔ ہم دنیا جہان کی باتیں کرتے تھے۔ سب کا ذکر آتا تھا مگر شہلا کا نہیں۔ اگر ہم جھوٹ بول کے اس کی باتیں بھی سناتے رہتے تو محسن کو شک نہ ہوتا۔ اس نے تاڑ لیا ہوگا کہ ہم عمداً شہلا کے ذکر سے گریز کرتے ہیں۔ پھر یہ ہمارے درمیان ایک ایسا موضوع بن گیا جس پر اظہار خیال نہ کرکے ہم سب اعترافِ جرم کرتے جاتے تھے۔ محسن جانتا تھا کہ ہم کیا چھپا رہے ہیں اور کیوں مگر وہ ہمارا بھرم رکھتا تھا۔ ہم جانتے تھے کہ اس کے جذبات کا آتش فشاں اندر ہی اندر پک رہا ہے۔ اسے چھیڑنا خطرناک تھا۔ بس یہ سلسلہ ایسے ہی چلتا رہا۔ اب میں سوچتا ہوں کہ کتنا اچھا ہوتا اگر ہم کھُل کے بات کرلیتے۔ لاوا اندر ہی اندر پکتا رہا اور آخر کار ایک دن پھٹ گیا۔"

"مگر یار' اللہ بڑا مہربان ہے۔ وہ امتحان لیتا ہے تو انعام بھی دیتا ہے۔ وہ جبار و قہار ہے تو رحیم و کریم بھی ہے۔" اکرام بولا "مجھے معلوم ہوا تھا کہ گل بانو نے محسن کو سنبھال لیا ہے۔"

"کیسا انوکھا انتظام ہے قدرت کا۔ گل بانو کیا تھی پہلے' ناگ منی ایک ڈاکو کی بہن۔ وہ ڈاکو ہماری وجہ سے مارا گیا مگر مرتے مرتے ناگ منی کو ہمارے سپرد کرگیا اور وہ گُل بانو بن گئی۔ ہم انسان جو غیب کا علم نہیں رکھتے' کیسے جان سکتے تھے کہ قدرت کا سارا بندوبست آنے والے وقت کے لیے ہے۔ آج وہ گُل بانو ہی شہلا ہے۔ کتنی خوبی سے اور کتنی بہادری کے ساتھ' حسد اور رقابت کے جذبات سے خود کو دور رکھے ہوئے' اپنی محبت پر کامل اعتماد کے سہارے آہستہ آہستہ اس نے محسن کو جیت لیا۔ اسے یہ احساس دلائے بغیر کہ وہ شہلا کی جگہ لے رہی ہے۔ اس نے وہ خلا پُر کردیا جو محسن کے دل میں شہلا کی شہادت نے پیدا کردیا تھا۔ بے شک یاد کے زخم مندمل ہوجانے کے بعد بھی نشان چھوڑ جاتے ہیں اور یہ نشان وقت کی چارہ گری سے بھی نہیں مٹتے۔ یہ ناممکن ہے کہ محسن کے دل سے یاد کا نقش بھی مٹ جائے مگر اس نے اپنی زندگی گل کے حوالے کردی ہے۔ یہ گُل بھی کمال کی لڑکی ہے۔ وہ جانتی تھی کہ محسن کبھی اس سے محبت نہیں کرے گا۔ جب تک شہلا زندہ تھی یہ ناممکن تھا۔ اس کی موت کے بعد بھی ناممکن تھا۔ ہم بھی اسے سمجھاتے تھے مگر وہ بالکل یکطرفہ جذبات کے ساتھ محبت کرتی رہی' محسن سے چھپاتی رہی اور پوری کوشش کرتی رہی کہ اسے معلوم نہ ہو۔"

"حالانکہ یہ بھی ناممکن تھا۔"

"بالکل۔ محبت تو وہ روشنی ہے جس پر کوئی لاکھ پردے ڈالے اس کی کوئی کرن کہیں نہ کہیں سے راستہ بنالیتی ہے۔ اسے دل کی گہرائی میں جتنا گہرا چاہو دفن کردو' اس کا وجود رہے گا۔ یہ وہ کونپل ہے جو پتھر کی چٹان کے نیچے دبے ہوئے بیج کی طرح خود روشنی اور ہوا تلاش کرلیتی ہے اور خود پھوٹ نکلتی ہے۔ قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ اس نے ایک لمحے کے لیے بھی محسن پر اپنی ملکیت نہیں مانگی۔ اس نے کہا کہ وہ شہلا کا ہے تو رہے۔ مگر میں اس کو چاہتی ہوں تو یہ میری غلطی ہے' جرم ہے یا گناہ ہے۔ کچھ بھی ہے' میں اس سے دستبردار نہیں ہوسکتی۔ یہ میرے اختیار کی بات نہیں۔ اس نے کبھی شہلا کو اپنا رقیب نہیں سمجھا کبھی نہیں چاہا کہ وہ اس کے راستے سے ہٹ جائے۔ جب شہلا مرگئی تو وہ شدید احساسِ جرم میں مبتلا ہوگئی۔ اس کے لیے محسن کی چاہت زیادہ مشکل امتحان بن گئی۔ مگر یار' یہ قدرت کا قانونِ تلافی ہے۔ (LAW OF COMPENSATION) کہ آدمی سے سب کچھ چھین لیا جاتا ہے مگر اس کے باوجود وہ زندہ رہتا ہے۔ ان کے بغیر بھی جیتا ہے جن کے بغیر وہ سمجھتا تھا کہ جینا ناممکن ہوگا۔ پھر رفتہ رفتہ وہ نوشتۂ تقدیر کو قبول کرنے کا حوصلہ پالیتا ہے' صبر کرنا سیکھ جاتا ہے اور ایک دُکھ کے احساس کو مٹانے کے لیے دس متبادل حل تلاش کرلیتا ہے۔ آج حیرت ہوتی ہے محسن کو دیکھ کر۔ وہ بالکل پاگل ہوگیا تھا۔ ہم تو سمجھتے تھے کہ اب ٹھیک ہی نہیں ہوگا مگر گل کی محبت کے اعجازِ مسیحائی نے اسے پھر زندگی کی طرف کھینچ لیا۔"

"سوال یہ ہے یار کہ وہ دونوں گئے کہاں؟"

میں نے کہا "عبدالودود منظر کا فون نمبر اب کیا ہے؟"

اکرام نے کہا "نیا نمبر ہے' زبانی یاد نہیں۔ میں ڈائری لاتا ہوں۔"

ڈائری میں نمبر دیکھ کے میں نے کال بُک کرادی اور ہم پھر باتوں میں مصروف ہوگئے۔ درمیان میں گزرے ہوئے وقت کی باتیں اتنی تھیں کہ ایک رات میں بھی ختم نہ ہوتیں۔

"یار' یہ اتفاقات کے سلسلے بعض اوقات ناقابلِ یقین حد تک دراز ہوجاتے ہیں۔" اکرام شیخ نے کہا "کاجل کے ماں باپ بھی نہیں ہیں۔ ہم سب کی طرح۔"

"ہاں' ان کی موت کے حالات انتہائی افسوس ناک ہیں۔" میں نے کہا "والدین کسی کے بھی نہیں رہتے مگر ہم اس معاملے میں بدقسمت تھے۔ میری ماں تقسیم سے پہلے ہی دُنیا سے رخصت ہوگئی۔ باپ کی موت کا مجھے پتا نہ چلا۔ تمہارے اور محسن کے والدین نے

اگرچہ طبعی موت پائی مگر وہ بھی ساتھ ساتھ ہی گئے۔ ایک نہ رہا تو دوسرے نے زیادہ دن دُنیا میں نہیں گزارے۔ رابعہ کو اپنے والد کی موت یاد نہیں مگر اس کی ماں کو انہی لوگوں نے قتل کروایا تھا جو میرے والد کے قاتل تھے۔ گُل کو اپنے ماں باپ یاد ہی نہیں۔"

"لوگوں کے والدین لمبی عمر پاتے ہیں اور اولاد کی سب خوشیاں دیکھتے ہیں۔" اکرام شیخ بولا "پوتے پوتیاں' نواسے نواسیاں کِھلاتے ہیں۔ یہ سب ہمارے والدین کے نصیب میں نہ تھا اور اسی کو میں اتفاقات کا سلسلہ کہتا ہوں کہ ہم سب والدین کی نعمت سے محروم ہیں۔ ہمارے گھر ہیں تو خاندان نہیں۔"

اچانک فون کی گھنٹی چلّانے لگی اور آپریٹر نے کہا "لاہور کی کال آپ نے بُک کرائی تھی؟"

میں نے کہا "جی۔ عبدالودود منظر ایڈووکیٹ کے نام۔"

اکرام نے کہا "یہ تو کمال ہو گیا۔"

"کیا کمال ہو گیا؟"

"آدھے گھنٹے میں کال مل گئی۔ دوبارہ کہے بغیر۔"

"ابھی تو بس ہولڈ کرنے کا حکم ملا ہے۔" میں نے کہا "ممکن ہے دو گھنٹے ایسے ہی خاموش' ریسیور سے کان لگائے بیٹھا رہوں۔"

مگر ایسا نہیں ہوا۔ چند سیکنڈ کے بعد منظر کی مخصوص "ہیلو" سنائی دی۔

میں نے زنانہ آواز بنا کے کہا "جی آپ منظر صاحب ہیں نا؟"

منظر نے کہا "ہاں۔ آپ کون ہیں؟"

میں نے کہا "آپ کی ایک غائبانہ پرستار' محبت میں گرفتار۔"

میرا خیال تھا کہ منظر بوکھلا جائے گا مگر وہ ایک کائیاں تھا۔ پہچان گیا کہ بات کرنے والی کوئی عورت نہیں' مرد ہے۔

اس نے کہا "ابے تو میرا نہیں' میری بیوی کا کوئی پرستار لگتا ہے۔ میرا رقیب ہے کوئی۔ سالے وہ چودہ بچوں کی ماں ہے۔"

میں نے مردانہ آواز بنا کے کہا "پھر کیا ہوا۔ یہ عشق عشق ہے۔"

منظر بولا "واقعی! یار' تو پھر بڑی مہربانی ہو گی تیری۔ تو غائبانہ عشق چھوڑ اور فوراً حاضر ہو کے اسے لے جا۔ پندرھویں کی ولادتِ باسعادت تیرے گھر میں ہو۔ میں تو اختیار دیتا ہوں تجھے کہ اس کا والد بھی بن جا۔ آنے جانے کا کرایہ بھی دوں گا۔"

اب میں نے اصل آواز میں کہا "اُلّو کے پٹھے' طوطا چشم' بے وفا مچھّر۔ میں آ کے بتاتا ہوں بھابی کو۔ کراچی تو پہنچ گیا ہوں میں۔"

منظر خوشی سے بے قابو ہو کے چلّایا "ابے سکندر! بندر کی اولاد' کھوتے دے پُتّر۔"

جذبات سے بے قابو ہو کے اس نے مجھے کچھ ناقابلِ اشاعت خطابات بھی دیئے۔ میں خواتین کی موجودگی کے باعث مجبور تھا ورنہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیتا۔ رابعہ اندر آ گئی تھی۔

آخر کار اس نے کہا "یار! تو واقعی کراچی میں ہے؟"

"اور کیا عالمِ ارواح سے فون کر رہا ہوں ... میرے ساتھ ... بھی ہے۔"

"چھوڑ یار اسے۔ میں نے ابھی جو پیشکش کی تھی' میں ا... قائم ہوں۔" وہ قہقہہ مار کے بولا "جیسے چٹ منگنی پٹ بیاہ ہو ... نا' ایسے ہی آج شادی کل بچے۔ بہت فائدے میں رہے گا تو۔"

"یار' تجھے تو شرم آتی نہیں۔ میرے ساتھ بیٹھی ہے ... اس لیے اب سیریس ہو جا۔" میں نے کہا۔

وہ پھر ہنسا "سالے سکندرِ اعظم۔ ابھی سے ڈرتا ہے' مُرید۔"

میں نے آہ بھر کے کہا "اکبر ڈرے نہیں کسی سلطان کی ... نے لیکن شہید ہو گئے بیگم کی فوج سے۔"

"اور کون ہے تیرے ساتھ؟ سب مُڈھو خیر سے گھر لوٹے ... کوئی ہیرو ہیروئن رہ گئے بمبئی میں؟"

میں نے کہا "غالب اور نازو تو ہمارے ساتھ ہی تھے ... آج کل میں کراچی آ جائیں گے۔"

"اور وہ تیرا لنگوٹیا' لنگوٹی چور' شیروانی کی اولاد۔"

میں نے کہا "اس کے بارے میں تو میں پوچھنے والا تھا ... لاہور نہیں پہنچے؟"

"پہنچے! یعنی جمع کا صیغہ؟ ابے محسن تو ایک ہی تھا۔"

"اس کے ساتھ گُل تھی۔ مذاق چھوڑ' وہ ہم سے پہلے ... ہوئے تھے۔" میں نے کہا "سب کو کراچی پہنچ کے اکرام شیخ ... تھا۔"

"تو یار' پہلے اکرام شیخ سے پوچھو کراچی میں......"

میں نے کہا "اسی کے گھر سے بول رہا ہوں میں۔"

"گھر سے؟ کیا فون لگوا لیا ہے اس نے؟"

"ہاں۔ نمبر لکھ لے۔" میں نے کہا "اکرام کے گھر پر ... ہو کے ہم لاہور جانے یا نہ جانے کا فیصلہ کرتے۔ کاجل تو پہنچ گ...

"ابے وہاں سے بھی کچھ اٹھا لائے۔ چشم بنگال سے کاجل ... لائے۔" منظر نے کہا "نام تو بڑا پیارا ہے۔"

"خود بھی کم نہیں ہے۔ منظر صاحب! مجھے محسن کے بار... میں سخت تشویش ہے۔" میں نے کہا۔

"تشویش کی بات تو ہے۔ آخر وہ رہ گئے کہاں؟"

"ہم نے خود انہیں جہاز پر سوار کرا کے رخصت کیا تھا۔"

"کہاں سے' ڈھاکا سے؟"

"نہیں' کھٹمنڈو سے۔" میں نے کہا "اسپیشل فلائٹ تھی ... ہم نے بلیک میں ٹکٹ خریدے تھے۔ دو ہی ٹکٹ تھے چنانچہ ... بھیج دیا تھا۔"

"ان دنوں میں کوئی جہاز لاپتا بھی نہیں ہوا۔ کسی کریش ... بھی نہیں آئی۔" منظر بولا "ا...ر سے یہ تو ثابت ہو گیا کہ وہ ... سے اُترے بھی ہوں گے۔ لیکن اُترنے کے بعد کہاں گئے؟

... ال کے جوابات بہت ہیں۔ ممکن ہے وہ نکاح رجسٹرار کے دفتر چلے ... ئے ہوں سیدھے۔ تم دونوں بھی وہیں چلے جاؤ تو وہ مل جائیں ...۔"

"یار! مجھے فکر ہے' وہ کسی مشکل میں نہ پڑ گئے ہوں۔"

"یہ کون سی انوکھی بات ہو گی۔ اگر تم لوگ آسانی سے ... رافت کی زندگی بسر کرنے لگو' یہ خانہ بدوشی اور آوارہ گردی ترک ... کے گھر بسا لو اور اپنی عاشقی کو قیدِ شریعت میں لا کے میرے نقشِ ... م پر چلتے ہوئے ملک کی پیداوار بڑھانے لگو تو پھر واقعی فکر کی بات ... ی۔ بابا! تم لوگوں کا مشکل میں نہ پڑنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا کُتّے کی ... ا کا سیدھا ہونا۔" وہ اب خفا ہونے لگا تھا۔

میں نے کہا "اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ لاہور نہیں پہنچے؟"

"یہ میں کیا بتاؤں۔ ممکن ہے لاہور پہنچے ہوں اور سیدھے چلے ... ئے ہوں بیل کے سامنے کہ آ بیل مجھے مار۔ وہ بیل بھی کم حرامی ... یں ہے۔ سانڈ ہے اور وہ بھی پاگل سانڈ۔ وہ میرے پاس بہرحال ... یں آئے۔"

"تو نے اپنا گھر بھی تو بدل لیا تھا۔"

"ہاں' گھر نہ بدلتا تو کیا بیوی بدلتا۔ سالی باز ہی نہیں آتی۔" وہ ... "ہر سال نیا ماڈل لے آتی ہے۔"

"کہاں سے لے آتی ہے؟" میں نے کہا "میکے سے؟ اور اس ... ت کا گھر بدلنے سے کیا تعلق؟"

"تعلق کیوں نہیں۔ پہلے چار کمروں کا مکان لیا تھا۔ پھر چھ بھی ... پڑنے لگے تو یہ آٹھ کمروں کا لیا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کسی دن ... بکنگھم پیلس لینا پڑے گا۔ سُنا ہے اس میں چھ سو کمرے ہیں۔ مگر تم ... یوں جلتے ہو۔ ابے شادی کی ہے۔ تم کر کے دیکھو تو پتا چلے بیٹا کہ ... یا آسان ہے۔ زبانی عشق کر رہے ہو نا' اس لیے آٹے دال کا بھاؤ ... یں معلوم۔"

میں نے کہا "بکواس بند کر اپنی۔ میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ ... ہیں وہ تیرے پُرانے پتے پر نہ پہنچے ہوں۔"

"نہ وہ اتنے نادان ہیں اور نہ میں اتنا گمنام ہوں۔ کیا محسن کو ... یں معلوم کہ میرے ٹھکانے کہاں کہاں ہیں؟ صبح میں بار روم میں ... تا ہوں۔ کسی بھی کالے کوٹ والے سے میرا نام پوچھو' وہ بتا دے ... ا۔ شام کو میں اپنے چیمبر میں ملتا ہوں۔ چیمبر وہی ہے۔ اس کے ... علاوہ میں رابعہ کی فرم کے معاملات میں پنگا لے بیٹھا ہوں۔ ایک ... ن چھوڑ کے وہاں بیٹھتا ہوں۔"

میں نے کہا "یہ تو ٹھیک کہا تُو نے' وہ تجھے تلاش کر سکتے تھے۔"

"اگر کوشش کرتے۔" وہ بولا "مگر میری مان' وہ اِدھر آئے ہی ... یں۔ محسن کے ساتھ وہی ناگن منی تھی نا ڈاکو کی بیٹی؟"

"ڈاکو کی بہن۔ اب وہ گُل بانو ہے۔"

"ہو گی یار۔ تمہارے ساتھ تو واردات کر گئی۔ اپنے ساتھ ... سے اغوا کر کے لے گئی۔" منظر بولا "ہے تو یہ ڈکیتی مگر میں کہتا ہوں' بالکل ٹھیک کیا اس نے۔ تمہارے ساتھ رہتی تو اس کا انجام بھی وہی ہوتا جو شہلا کا ہوا۔"

میں نے کہا "تو بہت تلخ ہو رہا ہے۔"

"میں چاہتا ہوں کہ تم اب زندگی سے سمجھوتہ کر لو' باز آ جاؤ اس سالی سکندری سے۔ رابعہ سے کہو گھر سنبھالے' بچے پالے جتنے بھی ہیں۔"

میں نے کہا "کیا بکواس کر رہا ہے!"

"میرا مطلب تھا' جتنے بھی ہوں۔ پریکٹس گئی بھاڑ میں۔ شام کو گھنٹا بھر دفتر جا کے دیکھ لے۔ وہ جو اس کا ماتحت وکیل تھا نا' وہ تمام معاملات بڑی خوش اسلوبی سے چلا رہا ہے۔ تم سنبھالو اپنا اسپتال اور یہ خیراتی اسپتال کا چکر ختم کر کے اسے بنا دو ایک شاندار منافع بخش کاروباری ادارہ۔"

"سوری یار۔ پروگرام کا پہلا حصّہ تو ٹھیک ہے مگر دوسرے سے میں اتفاق نہیں کرتا۔"

"مت کرو' عقل کی کوئی بات تم نے پہلے کب مانی ہے۔ یہ بتاؤ کہ لاہور کب آ رہے ہو؟"

میں نے کہا "کراچی سے لاہور آنا کیا مشکل ہے۔ کچھ مسئلے ایسے اٹک گئے ہیں کہ ہم یہاں رکنے پر مجبور ہیں۔ سب سے پہلے تو غالب اور نازو کا انتظار ہے' پھر یہ دیکھنا پڑے گا کہ لاہور کی صورتِ حال کیا ہے۔"

"تمہارے جانے سے لاہور اُجڑا نہیں تھا۔"

"دیکھ میں لمبی بات نہیں کر سکتا۔ فون کا بِل تو اکرام ہی کو دینا ہے نا۔" میں نے کہا "ایک تو یہ بتا کہ ہمارے مقدمات کی کیا پوزیشن ہے؟"

"مقدمات میں بڑی برکت ہوئی ہے۔ قتل کے مقدمات میں ضمانت منسوخ ہو گئی تھی۔ پھر آپ کو مفرور مُجرم قرار دے دیا گیا تھا۔ بعد میں کچھ گواہ اللہ کو پیارے ہوئے' کچھ حاضر نہیں ہوئے چنانچہ ان کے بھی وارنٹ نکلے۔ استغاثہ ایک بھی گواہ نہ لا سکا۔ اس سے کیس خاصا کمزور ہو گیا مگر ختم نہیں ہوا۔ تاہم غیر حاضری میں تیرے خلاف یک طرفہ فیصلہ سنانے کی نوبت نہیں آئی۔ چھوٹے موٹے دوسرے مقدمات بھی گھسٹ رہے ہیں۔"

"پھر اب میں کیا کروں؟ لاہور آؤں یا نہیں؟"

"نہیں لاہور تو آ جاؤ۔ مقدمے کا کچھ کرتے ہیں تاکہ پھانسی ہو تمہیں تو ہماری جان بھی چھوٹے۔"

"جب تیرے جیسے وکیل ہوں گے تو اور کیا ہو گا۔ موت کے منظر۔"

"میرے جیسے! ابے منظر تو اس منظر میں بڑی دیر سے داخل ہوا تھا۔ پہلے تو وکیل تھی وہ جس نے پہلی پیشی میں ہی عشق کی عمر قید بامشقت کرا دی۔ وہ ہے کہاں' ریسیور دے اسے۔"

"دیتا ہوں' پہلے مجھ سے نمٹ لے۔" میں نے کہا "چل

مقدمات میں تو جو بھی ہوگا' قانون کے مطابق ہوگا اور ہم اپنا دفاع بھی کریں گے مگر وہ جو اپنے چوہدری صاحب ہیں' ان کے غیر قانونی معاملات کے لیے ہمارا وجود سر پر لٹکنے والی خطرے کی تلوار ہے۔"

"ابے تلوار کے بچے' چھوڑ دے یہ سب چکر۔ بھول جا پُرانی باتیں۔" منظر بولا "سیاست سیکھ لے۔"

"میں یہ کیسے بھول سکتا ہوں یار کہ دلاور نے میرے باپ کو کتنے عذاب کے ساتھ مارا تھا؟ کیسے بھول سکتا ہوں کہ استاد پیڈرو نے ان کی لاش تک قبر سے کھود کے نکال لی تھی۔ اس نے پھانسی کا پھندا میرے گلے میں ڈالا تھا اور رابعہ کی ماں کو قتل کروایا تھا۔"

"اچھا اچھا۔ مت بھول مگر ایسے مت چلّا ورنہ پولیس والے سُن لیں گے تو راستے میں ہی دھر لیں گے۔" منظر بولا "میں تو چاہتا تھا کہ... خیر' حکمتِ عملی فون پر نہیں بتائی جاسکتی۔"

"دلاور آج کل ہے کہاں؟"

"یہیں ہے لاہور میں۔"

میں نے کہا "کیا کر رہا ہے؟"

"وہی جو پہلے کرتا تھا۔ دھندے کچھ اور ہوں گے۔ ٹھاٹ باٹ ہیں۔ الیکشن میں کھڑا ہونا چاہتا ہے۔"

"کبھی استاد پیڈرو کو دیکھا؟"

"میں نے دلاور کو استاد پیڈرو کے بغیر کبھی نہیں دیکھا۔ وہ کچھ مطمئن ہیں کہ تم سے جان چھوٹ گئی۔ ضامن رضوی صاحب اور چوہدری سراج دونوں ہی نہیں رہے۔ مجھ سے بھی اس نے پنگا لینا چھوڑ دیا ہے۔ نیک نامی کمانے کے چکر میں ہے۔ ہوسکتا ہے تم سے بھی صُلح کرنا چاہے۔"

"اس کے چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں محسن اور گُل اس کے مہمان نہ ہوں۔"

"کیا اسے الہام ہوا ہوگا کہ وہ آنے والے ہیں؟"

میں نے کہا "ہم نے حاجی عبداللہ کو دیکھا تھا کھٹمنڈو میں۔"

"کھٹمنڈو میں؟ تیری نظر..."

"نظر ٹھیک ہے میری۔ اور یہ نظر کا دھوکا صرف مجھے ہی نہیں ہوا تھا۔ رابعہ' نازو اور غالب' سب نے دیکھا تھا اسے۔"

"مگر وہاں وہ کیا کر رہا تھا؟"

"جب وہ ملے گا تو اس سے پوچھیں گے۔ ایک فلائٹ پر وہ گیا' دوسری سے گُل اور محسن روانہ ہوئے۔"

"اس نے دیکھ لیا تھا تمہیں؟"

"اگر دیکھا تھا تو ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اسی سے مجھے شبہ ہوتا ہے کہ محسن اور گُل کو وہ لاہور میں اترتے ہی اپنے ساتھ نہ لے گئے ہوں۔ شکاری جنگل میں ایسے ہی نہیں گھومتے پھرتے۔"

"اگر یہ بات ہے۔" منظر متفکر ہوگیا "تو پھر میری بات غور سے سنو۔ تم لاہور ضرور آؤ مگر نہ جہاز سے نہ ٹرین سے۔"

"پھر کیا تانگے پر آئیں یا دو ٹانگوں پر۔"

"تم بائی روڈ آؤ اور نام بدل کے آؤ۔ تمہارے بدھو ہونے پر تو کسی کو شک نہیں لیکن لوٹ کے گھر مت جاؤ۔ لاہور پہنچ کے مجھے فون کرو۔ تمہارے پہنچنے سے پہلے ہی میں تمہاری رہائش کا وقتی بندوبست کردوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ اس کے بعد ہم مستقبل کا لائحہ عمل طے کریں گے۔"

"اگر تمہارا کوئی مستقبل ہوا۔ ہم مسلمانوں کا سارا اثاثہ بس اپنا ماضی ہے۔"

"تیری گھر والی کہاں ہے؟ اس سے بھی اخلاقاً سلام کرلوں۔"

"وہ گئی ہے اپنے میکے۔ اللہ نے اسے ایک اور بہن سے نوازا ہے۔"

میں بھونچکا رہ گیا "بہن! تیری بیوی کی بہن؟ یعنی تیرے سُسر کے بیٹی پیدا ہوئی ہے؟ تیرے بچوں کی نانی..."

"ہاں یار' بڑا زرخیز خاندان ہے۔ مگر یہ نانی نمبر تین ہے۔ تو ریسیور مس رابعہ کو دے' میں ان کی خبر لوں۔"

منظر کی زبان بگڑی ہوئی اولاد کی طرح اس کے قابو میں نہ تھی۔ رابعہ ہنستی رہی اور اس کی باتوں پر خفا ہو کے لال بھی ہوتی رہی۔

اکرام ہاتھ جوڑنے لگا "باقی باتیں لاہور جا کے مفت کرلیں۔ کرایہ بھی میں دے دوں گا۔ مگر اس کال کا بل مجھے دے جانا۔"

رابعہ نے پندرہ منٹ بعد ریسیور رکھ دیا "تم اتنے کنجوس کب ہوگئے ہو اکرام شیخ۔"

"کنجوس اور کمینے۔ فون لگ گیا ہے گھر میں تو دوستوں کو بات ہی کرنے دو۔"

"کرو' رات بھر بات کرو۔ میں بھی بھاگ جاؤں گا بل ادا کیے بغیر۔ بعد میں فون کٹتا ہے تو کٹ جائے' مالک مکان لگوائے گا۔"

"رقم تمہارے ایڈوانس میں سے کاٹ لے گا۔"

"کیسے کاٹے گا۔ یہ بل تو آئے گا دو مہینے بعد۔" اکرام دانت نکال کے بولا۔

رات کے کھانے کے لیے ہم نے باہر جانے سے گریز کیا۔ لحہ لحہ ہمیں غالب اور نازو کا انتظار تھا اور ہمارے کان منتظر تھے کہ کوئی بند دروازے پر دستک دے۔ میرے تصور میں وہ برف زار تھا جس کو میں نے رابعہ کے ساتھ دو مرتبہ عبور کیا تھا۔ ہماری کوشش کے بارے میں یقین سے کہنا مشکل تھا کہ اس میں ہم کس حد تک کامیاب ہوئے تھے اور آبادی سے کتنی دور تھے۔ قدرت نے ہماری مدد کے لیے وطن کے محافظوں کو بھیج دیا تھا۔ نازو اور غالب بھی اتنے ہی خوش قسمت تھے؟ یہ خیال مجھے پریشان کرتا تھا۔ میں سوچتا تھا کہ کہیں اس برف کے صحرا کی سمت ویرانی میں بھٹکتے ہوئے ان کے عزم کا زادِ سفر تمام نہ ہوگیا ہو۔ ہمیں تو ایک چٹان کی پناہ مل گئی تھی جہاں ہم آگ روشن کرنے میں بھی کامیاب رہے تھے اور ہم نے رات کافی پیتے گزار دی تھی۔ ان کے پاس تو کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ رات انہوں نے کہاں گزاری ہوگی اور کیسے؟

اکرام شیخ کا دل پتھر نہیں تھا مگر حوصلہ چٹان تھا۔ اس نے بڑے صبر و تحمل کے ساتھ ہمارے سفر کی رُوداد سنی۔

میں نے کہا "اکرام! تم پریشان نہیں ہوئے؟"

"کس بات سے؟" وہ بولا۔

"اس امکان سے کہ... کہیں وہ راستے سے بھٹک گئے تو کیا ہوگا؟"

"کچھ نہیں ہوگا' یہ میرا یقین ہے۔" اکرام نے کہا "جب تم سب یہاں نہیں تھے اور میں رات کو اکیلا ہوتا تھا تو میرے ذہن میں ہر بُرا خیال آتا تھا مگر رفتہ رفتہ مجھے احساس ہونے لگا کہ میرے ذہن کو شیطان گمراہ کرتا تھا۔ وہ سب خیالات غلط ہوتے تھے۔ تمہاری خیریت کی اطلاع کسی نہ کسی ذریعے سے کبھی نہ کبھی مل ہی جاتی تھی۔ دیکھو تم رابعہ کے ساتھ واپس بھی پہنچ گئے۔ تم نے بتادیا کہ محسن اور گُل تم سے پہلے پہنچ چکے ہیں اور غالب کے ساتھ نازو پہنچنے والی ہے تو میرے لیے شک یا خوف کی قطعی گنجائش نہیں رہی۔ خدا نے تمہیں اتنے لمبے سفر میں ساتھ رکھا' سلامت رکھا۔ پاکستان میں' پھر بھارت اور بنگلہ دیش میں جس نے تمہاری حفاظت کی اور تمہارے لیے مشکلات کو آسان کیا' تمہارے راستوں کا رُخ منزل کی جانب رکھا۔ کیا وہ خدا اب تمہاری طرف سے غافل ہوجائے گا؟ نہیں۔ یہ تو میرے اور تمہارے ایمان کے خلاف ہے۔ وہ میری بہن کو مجھ سے ضرور ملوائے گا۔ وہ غالب کو بھی لائے گا۔ اس کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں ہے۔ یہ بات ہے یقین کی۔"

میں نے کہا "یقین کے بھی درجے ہیں۔ تمہارے یقین پر مجھے رشک آتا ہے جس کی بنیادیں اتنی مستحکم ہیں۔"

"اسی یقین کی دولت کے سہارے تو میں نے انتظار کے صبر آزما دن گزارے تھے۔ اب میرے لیے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ اچھا اب تم بیٹھو یا نہانا دھونا چاہو تو اپنا گھر ہے۔ میں جا کے کچھ کھانے کے لیے لاتا ہوں۔ ہم سب چلتے ٹیکسی میں مگر ایسا نہ ہو بعد میں وہ آجائیں۔"

میں نے اس کی تائید کی "تالا نہیں ہونا چاہیے دروازے میں۔"

رابعہ نے کہا "تم کاجل کو ساتھ لے جاؤ۔"

"کیوں؟ میرا مطلب ہے کیا یہ جانا چاہتی ہیں؟" اکرام بولا۔

"آپ کلیم کو لے جائیں' ذرا دل بہل جائے گا اس کا۔" کاجل نے کہا۔

"دیدی! ہم اکیلا نہیں جائے گا۔" اس نے کاجل کی ساری کا پلّو پکڑ لیا۔

رابعہ نے کہا "چلی جاؤ کاجل۔ تم بھی ذرا دیکھ آؤ کراچی کی رونق۔"

کاجل کا موڈ نہیں تھا مگر وہ کلیم کی وجہ سے مجبور ہوگئی "کلیم' اب ہر روز تو سیر نہیں ہوتی نا۔"

رابعہ نے کہا "اچھا' روز سیر ہو رہی تھی۔"

"روز کہاں' کل گئے تھے اور پرسوں شام کو۔" اکرام نے کہا۔

اس وقت پہلی بار میں نے نوٹ کیا کہ اکرام اور کاجل کے اندازِ تغافل میں غالب کے اس شعر کی تفسیر ہے۔ کل تم جو بزمِ غیر میں آنکھیں چُرا گئے۔ کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے۔ بظاہر کاجل خاموش اور لاتعلق تھی اور اکرام بھی اس کے وجود کو نظرانداز کرتا رہا تھا مگر اب میں نے دیکھا کہ اکرام کی آنکھوں میں ایک خاموش سی التجا ہے اور کاجل کے انکار میں بھی خواہشِ اقرار کے سوا کچھ نہیں۔ دو دن انہوں نے ساتھ گزارے تھے لہٰذا یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ وہ خاموش' دور دور بیٹھے رہے ہوں۔ کاجل نے اپنی کہانی کہی ہوگی تو اکرام نے اپنی کتابِ زندگی کا ہر ورق اس کے سامنے کھول کے رکھ دیا ہوگا۔ کاجل کے لیے اکرام کے دل میں ہمدردی کے جذبات کا پیدا ہونا ایک فطری بات تھی مگر کاجل کو بھی معلوم ہوا ہوگا کہ وہ کوئی عام ٹیکسی ڈرائیور نہیں بلکہ اچھے خاندان کا اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان ہے جس نے پولیس کی افسری کو فرض شناسی اور ایمانداری پر قربان کردیا تھا۔ وہ نازو کا بھائی ہے اور اتنا ہی ذہین بھی ہے تو کاجل بھی متاثر ہوئی ہوگی۔ اکرام شیخ کی صورت بھی نازو سے ملتی تھی چنانچہ وہ جتنی حسین تھی' اکرام میں اتنی ہی مردانہ وجاہت تھی۔

جب وہ ٹیکسی میں بیٹھ کے چلے گئے تو رابعہ نے کہا "تم نے کچھ محسوس کیا؟ کچھ دیکھا؟"

میں ہنس پڑا "ہاں۔ دونوں اپنے اپنے دل کے چور کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے حالانکہ چور وہ تھا جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ... چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد۔"

"یہ بات اردو میں نہیں کہہ سکتے تھے؟"

"اصل کا مزہ کچھ اور ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ کیا بہادر چور ہے جو اندھیرے میں چُھپ کر نہیں بلکہ ہاتھ میں چراغ لے کر آتا ہے۔ کاجل نے تمہیں کچھ بتایا تھا؟"

"باتوں سے اندازہ کرلیا تھا میں نے۔ وہ اکرام کے کیریکٹر سے سخت متاثر ہوئی تھی۔" رابعہ بولی "رہی سہی کسر اکرام کی دلجوئی نے پوری کردی۔ وہ اس کو کراچی کی سیر کراتا رہا۔"

"گویا اڑتالیس گھنٹوں میں انہوں نے ایک دوسرے ہی کو دیکھا اور سمجھا۔" میں نے کہا "کراچی کی سیر تو بہانہ بن گئی۔"

"اگر ایسا ہوا تو کیا بُرا ہوا؟"

"کون کہتا ہے بُرا ہوا۔ اب تو ایسا لگتا ہے کہ جو میں نے چاہا

وہی ہوا۔" میں نے کہا۔

"تم نے؟ نہیں۔ جو میں نے چاہا تھا وہ ہوا۔"

ہم دونوں ہنس پڑے۔ شاید ایسا ہی نازو اور غالب نے بھی سوچا ہو۔ گل اور محسن کا خیال بھی یہی ہو۔ دو تنہا انسانوں کی زندگی کے احساس تنہائی کو دور کرنے کی سب ہی سوچتے ہیں۔ پھر قدرت کی طرف سے کوئی اشارہ مل جاتا ہے' کوئی بہانہ بن جاتا ہے۔

جب وہ واپس آئے تو میں نے ٹیکسی کی آواز نہیں سُنی۔ میرے کانوں نے کاجل کی مترنم ہنسی پہلے سُنی۔ میں حیران ہوا۔ ایسے تو کاجل کو میں نے کبھی ہنستے نہ دیکھا تھا۔ اس کی زندگی ایک عذابِ مسلسل تھی' الم نصیبی کی داستان تھی اور حادثات کے منحوس سایوں کا آسیب تھی۔ وہ اپنوں کے درمیان غیر تھی اور غیروں کے لیے محض مالِ غنیمت۔ اس نے اپنے نظریات اور عقائد پر اپنا سب کچھ لٹا دیا تھا اور اب اس گھر کی طرح تھی جس کی کھڑکیاں اور دروازے تک چور نکال کر لے گئے ہوں اور جو اپنی ویرانی پر خود ہی اپنا نوحہ بن گیا ہو۔

جب وہ اندر آئی تو مجھے یوں لگا جیسے اکرام نے اس سرد' ویران' اندھیرے گھر کو آباد اور روشن کرنے کا کام اسی طرح شروع کردیا ہے جیسے فرہاد نے ایک تیشہ اٹھا کے پہاڑ کاٹنے اور جوئے شیر لانے کا کام شروع کیا ہوگا۔ اصل تیشہ تو وہ جذبہ تھا جس نے فرہاد کو کامران کیا۔ میری آنکھوں نے ایک منظر دیکھا کہ اس گھر میں اکرام کھڑکیاں اور دروازے لگا رہا ہے جس کی دیواروں کے خلا سے تاریکی جھانکتی تھی۔ وہ ان میں شیشے لگا رہا ہے۔ دیواروں پر رنگ و روغن پھیر رہا ہے۔ اس نے فرش پر پھول دار قالین بچھا دیا ہے اور کھڑکیوں کے پیچھے رنگین پردے آویزاں کردیئے ہیں' چھت سے فانوس لٹکا دیئے ہیں اور دیواروں کے خالی پن کو زندگی کے رنگوں سے اور جذبوں کی رونق سے بھر دیا ہے۔

یہ سب چند سیکنڈ کی فلم تھی جس میں دیکھتے دیکھتے ایک کھنڈر سے ایک گھر بنا۔ ویسا ہی جیسا میرا گھر تھا یا ہم سب کے خوابوں کا گھر تھا۔ پہلے آدمی کی آنکھیں خواب دیکھتی ہیں' پھر ارادے جاگتے ہیں اور حوصلے انگڑائی لے کر اٹھتے ہیں تو صحرا میں پھول کھلتے ہیں اور ستارے آسمانوں سے اُتر کے مانگ میں افشاں بھرتے ہیں۔

رابعہ نے کہا "بھئی ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟ یہ کاجل ہے۔ کیا اس سے پہلے نہیں ملے؟"

میں چونکا اور میں نے کہا "نہیں۔ اس کاجل سے میں آج ہی ملا ہوں۔"

کاجل سمجھ گئی۔ اس کے عارض کی شاداب سُرخی نے مجھے بتا دیا کہ وہ سمجھ گئی ہے۔ اس نے اعتراف کرلیا تھا کہ بقول فلمی شاعر' محبت جُرم ہے تو جُرم کا اقرار کرتے ہیں۔

اکرام بولا "ہم ذرا آگے چلے گئے تھے۔"

رابعہ نے کہا "تم تو کافی آگے چلے گئے ہو' ہمیں معلوم ہے۔"

اکرام نے جھینپ کر بات گول کردی "بھئی آپ لوگوں کی خاطر مدارات اسی طرح ہو سکتی تھی۔ میں برنس روڈ سے نہاری لایا۔ پھر واپسی پر آئس کریم لینے کا خیال آگیا۔"

رابعہ مسلسل شرارت پر آمادہ تھی "بڑے اچھے خیالات ہیں آپ کے۔ اتنا خیال تھا ہمارا۔"

اکرام نے کہا "سب بازار سے ہی لانا پڑتا ہے۔ گھر میں تو کچھ نہیں تھا۔"

اب میں نے کہا "گھر میں کیا تھا کہ ترا غم جسے غارت کرتا۔"

رابعہ نے دوسرا مصرعہ پڑھ دیا "وہ جو ہم رکھتے تھے اک حسرتِ تعمیر سو ہے۔"

"میں جانتا ہوں سب کی حسرتوں کو۔" اکرام بولا "میرا منہ نہ کھلوائیں مس رابعہ قاری۔ اور آپ بھی سکندرِ اعظم صاحب! آپ کی فتوحات....."

میں نے ہاتھ ہلا کے کہا "او کے' او کے۔ بُرا ماننے کی کوئی بات ہے۔"

ہنستے ہنستے ہم سب نے کھانا کھایا۔ کاجل کے لیے نہاری عجیب چیز تھی۔ وہ اتنی مرچیں کھانے کی عادی نہیں تھی۔ اس کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔ خود مجھے بھی بعد میں آئس کریم کھانے کے باوجود ایسا لگتا تھا جیسے اِک آگ سی ہے معدے کے اندر لگی ہوئی۔

صبح دم مجھے اکرام نے جھنجوڑ کے جگایا "یار' وہ فون آیا ہے منظر کا۔ رابعہ بات کررہی ہے۔"

میں نے آنکھیں مل کے کہا "منظر اتنی صبح جاگنے والا آدمی تو نہیں' خیریت تو ہے نا؟"

"ہاں۔ خبر اچھی بھی ہے اور بُری بھی۔"

"پہلے بُری خبر سناؤ۔"

اکرام نے کہا "ایک ہی خبر کے دو حصے ہیں۔ گُل اور محسن سیدھے لاہور پہنچ گئے تھے۔"

"تھے کا کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ پھر غائب ہوگئے' کہیں چلے گئے۔"

میں نے بستر سے اُتر کے رابعہ سے ریسیور لے لیا "منظر! کیا یہ سچ ہے؟"

"جھوٹ میں عدالت جا کے نو بجے بولنا شروع کرتا ہوں۔ فجر کے وقت صرف سچ بولتا ہوں۔" منظر نے کہا۔

"اکرام نے بتایا ہے کہ محسن اور گُل....."

"ہاں۔ عجیب پُراسرار معاملہ ہے۔" منظر بولا "تم کہتے ہو محسن اور گُل کو تم نے کراچی کی فلائٹ پر خود سوار کیا تھا۔"

میں نے سوچ کے کہا "خود سوار کرانے والی بات سو فیصد ٹھیک نہیں۔ ہم نے انہیں ایئرپورٹ پر چھوڑا تھا۔ ہمارے سامنے وہ ڈیپارچر لاؤنج میں چلے گئے تھے۔ ان کی سیٹیں کنفرم ہو چکی تھیں اور جہاز پرواز کے لیے تیار کھڑا تھا۔ ہم نے انہیں جہاز پر سوار

ہوتے نہیں دیکھا تھا' اس سے پہلے ہی ہم لوٹ آئے تھے۔"

"خیر' وہ کراچی پہنچے اور اکرام شیخ سے ملے بغیر لاہور چلے آئے۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے؟" میں نے بے اختیار کہا۔

"جب محسن سے ملو تو یہ سوال اسی سے پوچھنا۔ جو میں جانتا ہوں وہ بتا رہا ہوں۔" منظر چڑ کے بولا "یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ وہ کراچی نہ گئے ہوں۔"

میں نے کہا "یار' عقل کی بات کر۔ جہاز کوئی گھوڑا تھا جس کی لگام محسن کے ہاتھ میں تھی کہ راستے میں رُخ بدل کے لاہور کی طرف کرلیا۔"

"ابے افلاطون' بعض اوقات موسم کی خرابی یا کسی اور وجہ سے بھی پرواز کا رُخ بدلنا پڑتا ہے۔ موسمی حالات خراب ہوں یا رن وے اور کنٹرول ٹاور کے آلات میں خرابی ہوجائے یا جہاز میں۔ تو کراچی کی پرواز کو راستے میں پنڈی یا لاہور میں اتارا بھی جاسکتا ہے۔ یہ کوئی ناممکن بات نہیں۔ میں معلوم کرلوں گا کہ کیا ہوا تھا مگر یہ ٹھیک ہے کہ وہ لاہور پہنچے اور پھر کہیں چلے گئے۔"

"رات تک تو ایسی کوئی بات نہیں تھی۔"

"مجھے بھی میری عبادت گزار بیوی نے ابھی بتایا ہے۔ وہ فجر کی نماز کے لیے اٹھی ہے نا۔" منظر بولا "ادھر وہ نماز سے فارغ ہوتی ہے' ادھر ایک بڑا خبیث قسم کا کھڑکی توڑ دودھ والا آجاتا ہے۔ پہلے دو دن تو اس نے ہمارے بیڈ روم کی کھڑکی پر ایسی باکسنگ کی کہ میں سمجھا' پھر جنگ چھڑ گئی۔ پڑوسیوں نے اسے سمجھادیا کہ وکیل صاحب غصے کے بڑے سور ہیں۔ ایذا رسانی اور املاک کو نقصان پہنچانے' اندیشۂ نقص امن اور بلوے کا کیس کردیا تو بھینس سمیت اندر ہوجاؤ گے۔ وہ ڈول باہر رکھ دیتی تھی اور دودھ والا دبے پاؤں آکے اس میں دودھ ڈال جاتا تھا۔ دو دن بعد کسی کو ڈول پسند آگیا۔ ہوگا کوئی تیرے جیسا نمازی۔ مسجد سے جوتے چُرا کے لوٹ رہا ہوگا ڈول بھی لے گیا۔ پھر میری بیوی نے ڈول کو دروازے کے کنڈے میں زنجیر سے باندھ کے اور زنجیر میں تالا ڈال کے لٹکانا شروع کیا۔ ایک ہفتے بعد کوئی جان بنانے والا دودھ کا ڈول خالی کرگیا۔ دوسرے دن پھر یہی ہوا۔ پورا دو سیر دودھ ڈول سے منہ لگا کر پی جاتا تھا اور خالی ڈول کو زنجیر سمیت وہیں چھوڑ جاتا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ کسی عام آدمی کے بس کی بات نہیں' کوئی پہلوان ہی ایسا کرسکتا ہے۔ تیسرے دن میں نے پہلوان کو رنگے ہونٹوں پکڑلیا۔ ہفتے بھر میں پولیس نے سارا کھایا پیا نکال دیا۔"

میں نے جھنجلا کے کہا "ابے اس کہانی کا محسن اور گُل سے کیا تعلق ہے؟"

"تعلق ہے' اسی لیے تو بتا رہا ہوں۔" منظر بولا "پہلوان کا دودھ چھڑانے کے بعد تو کچھ نہیں ہوا لیکن آج دودھ میں سے ایک رقعہ برآمد ہوا۔ جو محسن نے لکھا تھا۔"

"دودھ میں سے؟" میں بھونچکا رہ گیا "کیا کہہ رہا ہے!"

"ٹھیک ہی کہہ رہا ہوں۔ اس کا یہ مطلب مت نکالنا کہ محسن نے تیری دوستی اور ایم آر ایس پر لعنت بھیج کے گھر گھر پہنچانا شروع کردیا ہے۔ یا تو وہ خود نہار منہ آئے اور ڈول کو لیٹر بکس سمجھ کے اس میں خط ڈال گئے۔ بعد میں دودھ والا اپنا کام کرگیا۔"

"محسن پاگل نہیں ہے کہ ڈول کو لیٹر بکس سمجھ لے۔"

"یار' کیا دیر لگتی ہے اچھے بھلے آدمی کو پاگل ہونے میں عشق کرتے کرتے شادی کر بیٹھا ہے۔" منظر بولا "خیر' دوسرا امکان یہ ہے کہ محسن اور گُل نے خط کسی کو دیا کہ فلاں جگہ دے آ' اشارے سے میرا گھر بتادیا۔ اور وہ واقعی پاگل تھا کہ خط کو ڈول میں ڈال گیا۔ ورنہ دروازے کے نیچے سے اندر بھی کھسکا سکتا تھا۔ شاید ڈرتا ہوگا کہ کاغذ کی معمولی سرسراہٹ کسی نے سُن لی تو دروازہ کھول کے باہر آجائے گا۔ مفت کا دودھ پی کے جان بنانے والے جوتے کھانے والے پہلوان کا واقعہ زیادہ پُرانا نہیں ہے۔ یہ سب کو معلوم ہے اور وہ پہلوان جو کسی اکھاڑے میں جاتا تھا' غائب ہوگیا ہے۔ اس سے یہ بھی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ خط کو ڈول میں ڈالنے والا آس پاس کا کوئی آدمی تھا۔"

"اچھا اب یہ فرمایئے کہ خط میں کیا لکھا ہوا ہے۔"

"بس ایک سطر تھی۔ ہم ایک کام سے جارہے ہیں' جلد آئیں گے۔" منظر نے کہا۔

"اور یہ کیسے ثابت ہوا کہ خط گُل یا محسن کا تھا؟"

"محسن نے دستخط کیے تھے اپنے۔ میں اس کے دستخط بھی پہچانتا ہوں اور اس کا خط بھی۔ وہ ایم ایسے بناتا ہے۔ اب فون پر کیسے بتاؤں۔"

میں نے کہا "مجھے معلوم ہے۔"

"اور خود کو ایم ایچ کے شیروانی لکھتا ہے۔ شیروانی اس کے باپ نے کبھی نہیں پہنی۔"

میں نے کہا "کیا محسن کے ساتھ گُل کا نام بھی تھا؟"

"ہم کا اور کیا مطلب نکالا جاسکتا ہے۔"

میں نے کہا "مجھے تو دال میں کالا نظر آرہا ہے۔"

"بیٹا ساری عمر دال کھاؤ گے تم اور ہمیشہ اس میں کالا ہی آتا رہے گا تمہیں۔ میری بیوی کو دودھ میں کالا نظر آیا تھا تو اس نے نکال لیا۔ سیاہی پھیل تو گئی تھی مگر مٹی نہیں تھی۔ خالص دودھ میں دُھلی تحریر کو میں نے پڑھ لیا۔ وہ تمہارا بچھڑا ہوا جوڑا تو نہیں؟"

"نہیں' ابھی ان کی فکر ختم نہیں ہوئی تھی کہ گُل نے یہ گل کھلادیا۔ پتا نہیں اسے کہاں لے گئی۔"

"کیوں؟ کیا محسن اس قابل نہیں کہ گُل کو لے جائے؟"

"یار اسے تو محسن لے ہی گیا تھا اپنے ساتھ۔ اب لاہور آکے یہ کیسے ممکن تھا کہ محسن نہ مجھ سے ملتا نہ ہمارا انتظار کرتا۔ اس کا گھر معلوم کرنے میں بھی ایک دن لگا ہوگا۔ بار روم سے یا کسی وکیل سے پتا پوچھا ہوگا۔ میرا دل کہتا ہے کہ اسے گُل لے گئی۔"

"کہاں اور کیوں' یہ بھی پوچھ لے اپنے دل سے۔"

"ابھی اور کچھ نہیں بتا سکتا میں۔"

"کیا یہ ناممکن ہے کہ انہیں کوئی اور لے گیا ہو؟"

"اور کون؟ تیرا مطلب ہے ولاور اینڈ کمپنی کا کوئی شکاری؟"

منظر نے کہا "ہاں۔ ایک شکاری تو انہی کے ساتھ پہنچا تھا۔ اسی فلائٹ سے؟"

میں نے کہا "میرا تو دماغ ماؤف ہورہا ہے۔ تُو ایسا کر' کسی طرح یہ معلوم کر کہ کل تیرا پتا پوچھتا ہوا کون آیا تھا۔ رابعہ کے آفس سے معلوم کر' شاید کوئی بتادے۔"

"ایسے نہیں یار۔ اب تُو کراچی میں بیٹھ کے فون پر مجھے سُراغرسانی کے احکامات دے گا تو میری وکالت کا کیا بنے گا۔ اکرام شیخ کو وہیں چھوڑ کہ غالب اور نازو کی واپسی کا انتظار کرے۔ تم آجاؤ لاہور لیکن دیکھو' جذباتی ہوکے اپنے میکے مت جانا۔ میرا مطلب تھا ابا کے گھر۔ پہلے مجھے فون کرنا اور بتادینا کہ تم کہاں ہو' میں خود لینے آجاؤں گا اور تمہیں بحفاظت ایک ایسی جگہ پہنچادوں گا جہاں فوری طور پر کوئی خطرے کی بات نہیں ہوگی۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم آج ہی روانہ ہوجائیں گے۔ آج کوئی اچھی سی کار خرید لیں گے اور بائی روڈ رات بھر سفر کرکے کل صبح صبح لاہور پہنچ جائیں گے۔"

میں نے فون بند کردیا۔ رابعہ اور اکرام میری گفتگو سے بھی بہت کچھ سمجھ گئے تھے اور میرے اٹھنے سے پہلے رابعہ خود بھی منظر سے بات کرچکی تھی۔ کاجل نے کچھ نہیں سنا تھا' وہ کلیم کے ساتھ فرش پر گہری نیند میں تھی۔

رابعہ نے کہا "یہ تم نے کیا کہا تھا کہ محسن کو گُل لے گئی؟ وہ کہاں لے کر جائے گی اسے؟"

میں نے کہا "پتا نہیں۔ کیوں یہ خیال آیا تھا۔ واقعی گُل کو ایسا کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ بعض اوقات آدمی کی چھٹی حس جو بتاتی ہے وہ عقل نہیں سمجھتی۔ خیر اب ہمیں نکل جانا چاہیے' جتنی جلد ممکن ہو۔"

"دس ساڑھے دس بجے سے پہلے کوئی شوروم نہیں کھلتا۔" اکرام نے کہا "اور گاڑی خریدنے کے بعد رجسٹریشن وغیرہ........"

میں نے کہا "ہم اسے اوپن لیٹر پر لے جائیں گے۔"

"تم میں سے کسی کے پاس بھی ڈرائیونگ لائسنس نہیں ہے۔"

میں نے کہا "کیا سو کا نوٹ ڈرائیونگ لائسنس نہیں ہوتا؟"

ناشتے کے بعد بھی ہم اس مسئلے میں جتنا سر کھپاتے رہے اتنا ہی کنفیوز ہوتے رہے۔ اب لاہور پہنچ کے انتظار کے سوا کچھ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ محسن نے جلد واپس آنے کا کہا تھا۔ اب جلد سے اس کی کیا مراد تھی۔ چند گھنٹے یا چند دن۔ اور جہاں وہ گیا تھا وہاں سے واپس آنا اس کے اختیار کی بات تھی یا نہیں؟ اسے کیا جلدی تھی اور کیا ایمرجنسی تھی کہ وہ منظر سے بھی نہیں ملا؟ اس نے ہمارا انتظار بھی نہیں کیا اور ایک سطر چھوڑ کے چلا گیا۔ مجھے محسن پر طیش آنے لگا۔ اگر وہ منظر کو مختصر الفاظ میں کچھ بتا جاتا تو کون سی قیامت آجاتی۔ کیا پانچ دس منٹ کی تاخیر سے آسمان گر جاتا۔

اکرام اور میں ساڑھے نو بجے گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ میرے ہاتھ میں صرف اپنا بریف کیس تھا اور مجھے احساس ہورہا تھا کہ آج یہ پیسہ ساتھ نہ ہوتا تو میں خود کو کتنا بے بس ولاچار محسوس کرتا۔ رام ناتھ کے ساتھ تو یہ پیسہ سورگ یا نرک میں نہ جاتا۔ اسے وہی چور لے جاتے جو اس کے ذرا بھی حقدار نہ تھے۔ ہمارا پروگرام طے تھا۔ مجھے اکرام کے نام سے اور اسی کے پتے پر اپنے لیے ایک گاڑی خریدنی تھی۔ اکرام اس عرصے میں شہر کے راستوں سے ہی نہیں' کاروباری علاقوں سے بھی واقف ہوگیا تھا۔ وہ مجھے سیدھا گلزار ہوٹل لے گیا۔ صدر میں یہ جگہ بہت مشہور تھی۔ یہاں سڑک کے دونوں جانب صبح سے کاریں قطار میں لگنی شروع ہوجاتی تھیں۔ پھر گاہک اور دلال آنے لگتے تھے اور جو سودا شوروم میں ہوتا تھا وہی یہاں سڑک کے کنارے طے پاجاتا تھا۔

بیشتر کاروں کے مالکان موجود تھے مگر وہ بھی براہِ راست کسی گاہک سے معاملہ طے کرنے کے مجاز نہ تھے۔ یہ جگہ دلالوں کی تھی جو بدمعاشی کے زور پر اپنا کاروبار چلاتے تھے اور ان کی اصل طاقت تھی وہ بھتہ جو ماہانہ بنیادوں پر پولیس کو ادا کیا جاتا تھا اور جس کی وجہ سے اس نوپارکنگ زون میں بھی گاڑیوں کی قطار لگی ہوئی تھی۔ ہاں کوئی شریف آدمی اس قطار میں شامل ہوکے دلال کو کمیشن دیے بغیر سودا کرنے کی کوشش کرے تو قانون فوراً حرکت میں آجاتا تھا اور گاڑی والے کا چالان ہوجاتا تھا کہ اس نے وہاں گاڑی کھڑی کی جہاں پارکنگ کی اجازت نہیں۔ اس کی فریاد سننے والا کوئی نہیں ہوتا تھا کہ آخر یہ سیکڑوں گاڑیاں بھی تو کھڑی ہیں۔

میں نے آدھے گھنٹے میں یہ سب دیکھ لیا اور پھر اپنے لیے ایک کورونا منتخب کرلی جو دو سال پرانی تھی مگر مالک نے سنبھال کے رکھی تھی اس لیے نئی لگتی تھی۔ رقم ادا کرکے رسید لینے اور کاغذات کی جانچ پڑتال میں کوئی دیر نہ لگی۔ دس بج کر چالیس منٹ پر ایک بار پھر میں نے پاکستان کی سڑکوں پر کار چلانے کی مسرت کا تجربہ کیا۔

رابعہ بالکل تیار تھی اور فرصت سے تیار ہوئی تھی اس لیے اس کے حُسن کی تابانی پر نگاہ نہ ٹھہرتی تھی۔ گزشتہ رات ہم نے جو خریداری کی تھی اس میں رابعہ نے ایک سیاہ ساری بھی منتخب کی تھی جس میں چاندی جیسے چمکیلے پھول تھے۔ اس کے ساتھ ہی آتشیں گلابی ساری میں کاجل ایک شعلۂ جوالہ بنی کھڑی تھی اور سادگی و پُرکاری کے ہنر سے اس نے اپنے لمبے کالے بالوں کو ایسے کھلا چھوڑ دیا تھا اور آنکھوں میں کاجل کی لکیر کو تھوڑا سا پلکوں کے

کناروں تک یوں کھینچ دیا تھا کہ چشمِ بنگال اور زُلفِ بنگال کے ساتھ سحرِ بنگال نے اکرام کے حواس کو بھی مسحور کرلیا۔

اگر کلیم اللہ مداخلت نہ کرتا تو شاید میں رابعہ کو دیکھتا رہتا اور اکرام کی نظر کاجل پر جم کے رہ جاتی۔ اس نے ہم دونوں کے دل پر گزرنے والی قیامت کی پروا کیے بغیر اپنی معصومیت کے ساتھ کہا۔

"چاچا! ہم بھی جارہا ہے تمہارا ساتھ؟ اپنا گھر۔"

میں چونکا "تم...... نہیں کلیم۔ تم اپنی کاجل دیدی کے ساتھ ٹھہرو۔"

"کاجل دیدی بھی جارہا ہے۔" اس نے مسرت سے کہا۔

اکرام نے سوالیہ نظریں اٹھائیں۔ وہ کچھ مایوس اور دل گرفتہ نظر آنے لگا۔

"وہ...... اس نے مجبور کردیا۔" کاجل بولی "یہ بالکل رکنے پر تیار نہیں۔"

اکرام نے کہا "ہم اسے منالیں گے۔ ہم ابھی گھومنے چلتے ہیں۔ دیکھو تمہاری کاجل دیدی کتنی اچھی لگ رہی ہیں۔ ہم تو انہیں نہیں جانے دیں گے۔"

کلیم نے صاف انکار کردیا "ابھی ہم گھر جائے گا۔ تم دیدی کو رکھو۔"

کاجل کا رنگ گلابی ہوا اور پھیکا پڑگیا "میں نے کہا تھا نا۔"

اکرام نے کہا "چلو اسے جانے دو۔"

ایک ساتھ میں نے، رابعہ نے اور کاجل نے اسے دیکھا تو اسے احساس ہوا کہ فرطِ جذبات میں اس نے کوئی اچھی بات نہیں کی۔

وہ زبردستی ہنسا "میں.... مذاق کررہا تھا۔ ٹھیک ہے تم لوگ جاؤ۔ میں بھی چلتا مگر نازو......"

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا "دو چار دن کی بات ہے جہاں اتنا انتظار کیا ہے وہاں تھوڑا اور سہی۔"

"بے شک یہ انتظار زیادہ صبر آزما ہوگا۔" رابعہ نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا "غمِ فرقت کے ساتھ۔ میرا مطلب ہے مل کے بچھڑ جانے سے تمہارے جذبات...."

کاجل نے گھبرا کے کہا "چلو کلیم... سکندر.... دیر ہورہی ہے۔ چلو۔" پھر اس نے ایک نظر اکرام کو دیکھا "خدا حافظ۔"

اکرام نے مسکرا کے کہا "خدا حافظ۔ دیکھو لاہور سے اکیلی مت روانہ ہوجانا۔ غیر علاقے میں اکیلی عورت نہیں جاسکتی۔ یہ تو شاید بہت مصروف ہوجائیں گے وہاں۔ تم میرا انتظار کرنا۔ اگر سکندر نہ جاسکے......"

میں نے کہا "یہ لاہور جاکے دیکھیں گے۔ ممکن ہے کوئی اور صورت پیدا ہوجائے کلیم کو اس کے گھر پہنچانے کی۔ یہ تم نے ٹھیک کہا ہے۔ نہ اکیلی عورت وہاں جاسکتی ہے اور نہ اس حُلیے میں۔ وہاں جانے کے لیے تو شٹل کاک بُرقعہ لازمی ہے۔ جو ساتھ جائے گا وہ بھی پتلون میں نہیں ہوگا بلکہ شلوار قمیص میں جائے گا۔ تم فکر مت کرو، میں کسی پشتو بولنے والے کا بندوبست کرلوں گا جو تمہارے ساتھ چلا جائے۔"

"پشتو مجھے آتی ہے۔" اکرام نے کہا۔

رابعہ ہنس پڑی "ابھی ٹیسٹ ہوجائے گا۔ کلیم! پہلے ذرا ان سے کوئی آسان سوال کرو۔"

جب کلیم اور اکرام میں پشتو بولنے کا مقابلہ شروع ہوا تو میں واقعی حیران رہ گیا۔ رابعہ شرمندہ ہوگئی۔ کلیم بہت خوش نظر آرہا تھا۔

رابعہ بولی "تم تو چھپے رُستم نکلے۔ آج تک بتایا نہیں۔"

"تم نے پوچھا کب۔ اور تمہیں کیا معلوم کہ مجھے اور کتنی زبانیں آتی ہیں۔" اکرام نے فخر سے سینہ پُھلا کے کہا۔

رابعہ نے کہا "میں دیکھ رہی ہوں، نگاہوں کی زبان تو میں بھی سمجھتی ہوں۔"

"آخر کیوں نہیں سمجھوگی۔ تم نے تو قانون کی زبان چھوڑ کے اسی زبان میں پریکٹس جو کی ہے۔" اکرام کو جوابی وار کرنے کا موقع مل گیا۔

ہم ساڑھے گیارہ بجے روانہ ہوئے تو آگے میرے ساتھ رابعہ تھی، پیچھے والی سیٹ پر کاجل اور کلیم اللہ بیٹھ گئے تھے۔ اپنا مختصر سا اسباب ہم نے ڈکی میں رکھ دیا تھا۔ سپرہائی وے تک اکرام نے ہماری رہنمائی کی۔ وہ اپنے دروازے پر ایک کاغذ چپکا کے آگیا تھا جس پر غالب اور نازو کے لیے پیغام لکھا ہوا تھا کہ وہ انتظار کریں۔ میں حیران تھا کہ دو دن میں اکرام کو ایسا شدید عشق کیسے ہوگیا کہ اس کے لیے کاجل سے جُدائی اتنا مشکل مرحلہ بن گئی ہے۔ بلاشبہ کاجل ایسی لڑکی تھی کہ اس سے کسی کو بھی محبت ہوسکتی تھی۔ ان دونوں کی بدقسمتی تھی کہ آج تک وہ دونوں محبت سے محروم تھے یا خوش قسمتی تھی کہ قدرت آخرکار انہیں زندگی کے ایک موڑ پر کڑی آزمائشوں کے بعد ملانے کا فیصلہ کرچکی تھی اور جب وقت آیا تو وہ جان گئے کہ انہیں ایک دوسرے کے لیے ہی بنایا گیا تھا۔

سُہراب گوٹھ پر اکرام نے ہمیں خدا حافظ کہا اور میں نے حیدرآباد جانے والی سیدھی سڑک پر گاڑی کی حدِ رفتار آزمائی۔ نئی سڑک کسی حد تک عالمی معیار کی تھی اور نئی گاڑی نے اس پر سو کلومیٹر کی رفتار آسانی سے حاصل کرلی۔ حیدر آباد شہر سے نکلنے کے لیے مجھے راستہ پوچھنا پڑا مگر اس کے بعد سکھر تک کوئی دُشواری پیش نہیں آئی۔ نواب شاہ میں ہم نے کھانا کھایا۔ شام پانچ بجے ہم سکھر سے گزرے۔

سات گھنٹے کی مسلسل ڈرائیونگ سے میں تھک گیا تھا۔ ہم چائے پینے کے لیے رکے اور آدھے گھنٹے بعد پھر روانہ ہوئے تو ڈرائیونگ رابعہ نے سنبھال لی۔ رات گیارہ بجے تک چھ گھنٹے کے سفر میں کاجل نے بھی تین گھنٹے گاڑی چلائی۔ پھر ہم نے ایک روڈ

سائیڈ ریسٹورنٹ میں کھانا کھایا جہاں سب ٹرک ڈرائیور چارپائیوں پر بیٹھے کھانا کھارہے تھے یا سورہے تھے۔

رات کے باقی حصّے میں ڈرائیونگ دوبارہ میں نے سنبھالی۔ کلیم تھک کے سوگیا تھا اور کاجل بھی سر سیٹ کے پیچھے ٹکا کے سونے کی کوشش میں مصروف تھی مگر سڑک اتنی خراب تھی کہ اسے مسلسل جھٹکے لگ رہے تھے۔

موسم سرما کے اختتامی دور کی ایک کُہر آلود، سرد صبح کے ساتھ ہی میں نے پھر لاہور کو دیکھا اور اس کی خوشبو کو احساس کی پوری شدّت کے ساتھ پہچانا۔ گردشِ ایام نے مجھ سے سب کچھ چھین لیا تھا۔ وہ گلیاں جن میں پَل کے میں بڑا ہوا، وہ سڑکیں جن پر آوارہ گردی کرتے ہوئے میں نے آغازِ شباب کی سنسنی خیزی کو جانا، وہ دن جو میری عمرِ رفتہ کی یادوں کا لامتناہی سلسلہ تھے اور وہ لمحے جو عکس بن کے میرے لاشعور کے میوزیم میں ایک تاریخی ورثے کی طرح محفوظ ہوگئے تھے۔ وہ راتیں جو حسین خوابوں اور دلنواز تصوّرات کا خزینہ تھیں۔ جہاں وہ اسکول تھا جس کی دیواریں آج بھی مجھے دیکھ کر مسکرانے لگتی تھیں اور گورنمنٹ کالج تھا جس سے تعلق پر میرا غرور کبھی کم نہ ہوا تھا۔ یہاں میرے دوست بھی تھے اور دُشمن بھی۔ راوی اور انارکلی تھے۔ شالیمار اور جہانگیر کا مقبرہ تھے۔ میرا گھر تھا جو مجھ سے پہلے میرے والد وزیر خاں مرحوم کا گھر تھا۔ پھر ان سے چِھن گیا تھا اور دوبارہ اسے رابعہ نے خرید کر سجایا سنوارا تھا۔ یہاں وہ جیل تھی جہاں رابعہ نے برسوں بعد میرے دل کے دروازے پر دستک دے کر کہا تھا۔ میں تمہاری وکیل بھی ہوں اور مؤکل بھی۔ تمہاری گواہی بھی ہوں اور دعویٰ بھی۔ یہیں چوہدری دلاور کا گھر بھی تھا اور مرحوم ایس ایس پی ضامن رضوی کا بھی۔ ہاں دکھادے اے تصور پھر وہ صبح و شام تو۔ دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو۔ یہ میری دُعا تھی، میرے دل کی پُکار تھی۔ اور گردشِ ایام مجھے صدیوں کی مسافت میں زندگی اور موت کے تلخ و شیریں تجربات کا مزہ چکھا کے پھر وہیں لے آئی تھی جہاں سے یہ سفر آغاز ہوا تھا۔ نگری نگری پھرا مسافر گھر کا رستہ بھول گیا مگر گھر نے اسے آواز دی۔

اور میں نے رابعہ کو آواز دے کر کہا "دیکھو رابعہ! لاہور آگیا" اور آنسوؤں کی جھلملاہٹ میں مسکراہٹ کا اُجالا شامل کرکے رابعہ نے روتے ہنستے کہا "ہاں ہاں، مجھے معلوم ہے۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ میری دُعائیں بے اثر نہ تھیں۔ ہم لوٹ آئے سکندر۔ اپنی دُنیا میں، اپنے پاکستان اور اپنے شہر میں۔ میں بہت خوش ہوں سکندر۔ چلو اپنے گھر چلیں۔"

میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا "بس ہوگئیں نا جذباتی۔"

"تم چاہتے ہو، میں پتھر ہوجاؤں۔ جذبات سے نا آشنا ہو کے کون زندہ رہ سکتا ہے۔" رابعہ نے کہا "تم رہ سکتے ہو؟"

"نہیں۔ لیکن جذباتی ہو کے میں خودکشی بھی نہیں کرسکتا۔ اب ڈر کیسا، اب تو ہم زندگی کی طرف لوٹ آئے ہیں اور زندگی نے ہمیں اپنالیا ہے۔ یہ ناممکن تو نہیں تھا کہ صرف تم واپس آتیں یا میں اکیلا لوٹتا۔"

"یہ ناممکن تھا۔ بالکل ناممکن۔"

"کیوں؟ آخر شہلا بھی تو نہیں آئی۔" میں نے کہا۔

رابعہ کا چہرہ اُتر گیا "اس کی جگہ گُل آگئی۔ ہاں۔ تمہارے ساتھ بھی کوئی گُل آجاتی مگر میرے ساتھ صرف میری لاش آتی۔"

میں ہنس پڑا "اب ایسی باتیں کیوں سوچتی ہو۔ دیکھو ایسی کتنی صبحوں کا تصوّر ہمارے سامنے ایک حقیقت کے روپ میں آگیا ہے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے ہم کہیں گئے ہی نہیں تھے۔ اسی طرح ہم رات بھر پھرتے رہے ہیں اور اب گھر جاتے ہوئے ڈر لگ رہا ہے کہ انکل ضامن رضوی جاگ رہے ہوں گے۔ ابھی تو کچھ نہیں کہیں گے وہ مگر ناشتے کی میز پر خوب ڈانٹ پڑے گی۔"

رابعہ پُھوٹ پُھوٹ کے رونے لگی۔ اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپالیا "کوئی نہیں رہا۔ کوئی ہمارا استقبال کرنے والا نہیں رہا، ہماری واپسی پر خوش ہونے والے وہی لوگ تو تھے۔ انکل رضوی اور ان کی بیگم، محسن کے والدین، میری ماں، استاد ٹیڈی اور شہلا۔"

میں نے گاڑی کو سڑک کے کنارے ایک چھوٹے سے ریسٹورنٹ کے سامنے روک دیا جہاں کمبل لپیٹے چند مزدور ٹائپ لوگ چائے پی رہے تھے اور چولہے پر بھاپ دیتی کیتلی سے ایک شخص چائے کی سُنہری دھار کو ایک کپ میں گرا رہا تھا۔ وہیں دوسرا شخص مدھانی سے لسّی رڑک رہا تھا اور حلوہ پوری کھا کے مونچھوں پر روغن ملنے والے پہلوان ٹائپ شخص کی بے چین نظریں لسّی کے گلاس کی منتظر تھیں۔

"آؤ جی باؤ جی! بسم اللہ، حکم کرو سرکار۔" ریسٹورنٹ کے مالک نے خالص لاہوری لہجے میں حُسنِ اخلاق کا مظاہرہ کیا۔

میں نے کہا "پہلوان جی! چائے ملے گی؟"

"سویرے سویرے؟ او باؤ جی! ایہہ نامُراد چائے جگر نوں ساڑ دیندی اے۔" لسّی پینے والے نے تھوڑی سی ملائی مونچھوں پر ملتے ہوئی کہا "جے بندا ہووے خالی پیٹ تے ٹھا کرکے لگدی اے اندر۔"

میں نے ہنس کے کہا "ٹھیک کہا آپ نے۔ چلئے ہم حلوہ پوری کھائیں گے۔ بہت عرصے بعد...."

بہت سی سوالیہ نظریں ایک ساتھ میری طرف اٹھیں۔

"ہم باہر گئے ہوئے تھے ملک سے۔" میں نے وضاحت کی "کل کراچی اُترے، آج رات بھر سفر کرکے لاہور پہنچے ہیں۔"

ہم پنجابی میں بات کررہے تھے۔ میں سوٹ میں تھا، کار سے اُترا تھا مگر یہ میرے ہموطن تھے، ہم زبان تھے اور ہم مذہب تھے۔ ایک دم رنگِ محفل بدل گیا۔ ان سب نے دیارِ غیر سے لوٹنے

والوں کے اوّلیں میزباں ہونے کا شرف حاصل کرلیا۔ پہلے پہلوان نے پیسے دینے کی کوشش کی' پھر ریسٹورنٹ کا مالک اڑ گیا۔

"او جی خیر نال اپنے گھر آئے ہو۔ اج مہمان ہو' فیر کدی آؤ گے تے پیسے دی لواں گے بادشاہو۔ سوہنا رب ہور دیوے پیسے وچ ہووے برکت تے تھوڑا دی بہت....."

ان کی اپنائیت کے اظہار نے مجھے پھر یقین دلایا کہ میں اپنوں میں ہوں اور یہاں سب کچھ اپنا ہے۔ اب کاجل بھی جاگ اٹھی تھی اور کلیم کو جگا رہی تھی۔ ہم نے گرم گرم حلوہ پُوری کھا کے چائے پی اور اپنے میزبانوں کا شکریہ ادا کرکے رخصت ہوئے۔ ہم کہاں کہاں انسانوں کے کیسے کیسے روپ دیکھ آئے تھے مگر خلوص اور پیار کا یہ رنگ کہیں نہ دیکھا تھا جس میں غرض کی جھلک تک نہ ہو۔ وہ دولت کی طاقت' بدمعاش کے غرور' سیاست کی چالبازی اور کاروبار کی پُرہوس دُنیا تھی جس میں ہم نے نفرت اور تعصب' آگ اور خون' بارُود کی بُو اور لاشوں کے فریادی جسم دیکھے تھے۔ میرے وطن کی یہ دُنیا کتنی مختلف تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے ہم جہنم کے عذاب کی ایک عمر کاٹ کے جنت کی زندگی کا پہلا دن دیکھ رہے ہیں۔

صبح ہوچکی تھی اور یہ وہی صبح تھی جس کا کوئی روپ میرے لیے نیا نہ تھا۔ دودھ والوں کے ریڑھے۔ سائیکل پر تیزی سے پیڈل مارتے اخبار فروش لڑکے' کارخانوں کی سمت رواں محنت کش۔ گلوں میں بستے لٹکائے اسکول بس کا انتظار کرتے بچے' صبح کے سورج کی ٹھنڈی دُھوپ میں پرواز کرتے پرندے۔ میں اب ان نظاروں میں گم مزے سے نہر کے کنارے کنارے گاڑی چلاتا جارہا تھا۔ رابعہ کی نظریں بھی باہر کے منظر میں کھوئی ہوئی تھیں۔ گزرے ہوئے وقت اور آج کے دن کے درمیان جو بھی ہوا تھا وہ سب احساس کا سرمایہ تھا اور خیال کا اثاثہ تھا جسے ذہن نے سمیٹ کر یادوں میں محفوظ کردیا تھا۔ ہم انہی یادوں کے درمیان سرگرداں وحیراں تھے۔ جب وہ موڑ آیا جہاں سے ایک سڑک بائیں جانب جاتی تھی اور جو بانسوں والی سڑک کہلاتی تھی تو میرے پاؤں بریک پر جم گئے۔ اسی سڑک پر ذرا آگے ہماری پہلی پناہ گاہ تھی جہاں ایس ایس پی ضامن رضوی رہتے تھے اور جہاں ہم نے اپنی محبت کے نخلِ تمنا کو تمام حادثات و خطرات کے باوجود پہلے ایک کونپل اور پھر ایک قد آور شجرِ سایہ دار بنتے دیکھا تھا۔

میں نے اس سڑک کی ویرانی کو دیکھا۔ "رابعہ! ادھر چلیں؟"

خود رابعہ بھی ادھر ہی دیکھ رہی تھی مگر اس نے نفی میں سرہلایا' "نہیں آگے چلو۔ مجھے ڈر لگتا ہے قبرستانوں سے۔"

اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ ویرانے آباد کیے جاسکتے ہیں' قبرستان نہیں۔ ہم اس جگہ دوسرا گھر بناسکتے تھے جہاں پہلے رابعہ رہتی تھی۔ اس مُنہدم ہوجانے والے گھر کا ملبہ صاف ہوجانے کے بعد ایک قطعۂ زمین رہ گیا تھا جو رابعہ کی ملکیت تھا۔ میرے والد کے گھر کو بھی رابعہ نے دوبارہ حاصل کرلیا تھا اور اب وہ گھر ہمارے استقبال کے لیے چشم براہ تھا مگر ضامن رضوی کی سرکاری کوٹھی میں اب نہ جانے کون رہتا تھا۔ خود انکل ضامن رضوی نہ رہے تھے اور ان کے بیوی بچے بھی ملک چھوڑ گئے تھے۔

میں نے گاڑی آگے بڑھادی۔ ریلوے کراسنگ سے بائیں ہاتھ پر مُڑتے ہی گڑھی شاہو کا علاقہ شروع ہوجاتا تھا۔ کراؤن سینما کے چوک سے میں نے گاڑی کو پھر موڑلیا۔

جہاں رابعہ کے گھر کی زمین تھی وہاں ایک نیا تعمیر شدہ عالی شان گھر دیکھ کر مجھے حیرانی ہوئی۔ پہلے مجھے شک ہوا تھا کہ میں بھول گیا مگر وہاں دوسرا کوئی پلاٹ خالی ہی نہ تھا۔ بھولنے کا سوال اس لیے بھی پیدا نہ ہوتا تھا کہ اس گھر کے دونوں جانب پُرانی نشانیاں حسبِ سابق موجود تھیں۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ ہم نے ملبہ ہٹوانے کے بعد اس کے گرد ایک چار دیواری بنا کے گیٹ لگادیا تھا۔ اب نہ چاردیواری تھی اور نہ وہ گیٹ۔

میں نے رابعہ کی طرف دیکھا "یہ کیا چکر ہے؟"

رابعہ نے پریشانی سے کہا "لگتا ہے کسی نے اس پر ناجائز قبضہ کرلیا ہے۔"

"مگر کس نے؟ اور اتنی جلدی۔ ہم کوئی برسوں تو باہر نہیں رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

"قبضہ کرنے والے راتوں رات قابض ہوجاتے ہیں۔"

"بشرطیکہ وہ پہلے سے نیت کیے بیٹھے ہوں اور انہیں کسی کی طرف سے فوری دخل اندازی کا ڈر نہ ہو۔" میں نے کہا۔

"تم تو جانتے ہو انہیں۔"

"ہاں۔ مگر یہاں منظر بھی تو تھا۔ اس نے نہیں دیکھا۔ جب تعمیر شروع ہوئی تھی' وہ اسی وقت حکمِ امتناعی بھی حاصل کرسکتا تھا اور بے دخلی کے احکامات بھی۔"

"وہ اکیلا کیا کیا کرتا۔ اسے تو شاید خبر بھی نہیں ہوگی۔ کبھی وہ ادھر سے گزرا بھی ہوگا تو بے خیالی میں کچھ دیکھے بغیر نکل گیا ہوگا۔ وہ ہر محاذ پر تو لڑرہا تھا۔ ہمارے مقدمات تھے' اپنی پریکٹس' گھربار۔ پھر میرے آفس کے معاملات' ٹرسٹ اور اسپتال کا انتظام۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔ خیر' ہم نمٹ لیں گے ان سے بھی۔"

"نمٹ تو لیں گے مگر عدالتی جنگ لڑنے کے بعد۔" رابعہ بولی' "پہلے یہ تو پتا چلے کہ اتنی ہمت والا ہے کون؟"

میں سرہلا کے گاڑی سے اُترا اور کوٹھی کے سامنے والے کیبن تک گیا۔ وہ پان سگریٹ کا کیبن تھا۔ اس کے مالک کو میں نے صورت دیکھتے ہی پہچان لیا۔ جب رابعہ یہاں رہتی تھی تو بارہا میں نے اس سے سگریٹ کے پیکٹ خریدے تھے۔

میں نے سلام کے بعد کہا "استاد جی! تم تو بڑے پُرانے بندے لگتے ہو۔ کب سے ہو یہاں؟"

وہ چونکا "آہو جی۔ دس سال سے اوپر ہوگئے۔ پر آپ کیوں پوچھتے ہو؟"

"ڈرو نہیں' میں تمہارا کھوکھا ہٹوانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔" میں نے دوستانہ لہجے میں کہا "میں تو کچھ اور پوچھنا چاہتا تھا۔ تمہیں یاد ہوگا' یہاں ایک وکیل صاحبہ رہتی تھیں۔ لال رنگ کی گاڑی تھی ان کی' فاکس ویگن۔"

"میں سمجھ گیا جی۔ ان کا تو انتقال ہوگیا۔" وہ قطعی لہجے میں بولا۔

"انتقال ہوگیا! کب؟" میں نے محظوظ ہوکے کہا۔

"بڑے دن ہوگئے۔ پہلے ان کی ماں فوت ہوئی۔ فیر کسے حرامی نے ایتھے بم رکھا۔" اس نے اردو پنجابی ملا کے کہا "وکیل تھی نا جی لوی' سو دُشمن بھی ہوتے ہیں اناں کے۔ کسے دا کیس ہاریا ہوناا ے۔"

"تو کیا وہ بم کے دھماکے میں ہلاک ہوئی تھی؟"

"نہیں جی۔ اس دیلے تے بچ گئی تھی۔ بعد وچ کدھرے چلی گئی۔ او دی بہن نے دسیا کہ۔"

"بہن نے! اس کی کوئی بہن تھی؟"

"ہاں جی۔ وہی تو رہتی ہے اب یہاں۔" پان والے نے باتوں کے ساتھ ساتھ اپنا کام بھی جاری رکھا "چنگا جیا نام ہے۔ ہاں چاندنی بیگم۔ ہیرا منڈی میں کوٹھا تھا۔ ہن اک وڈے آدمی دے گھر بیٹھ گئی ہے۔"

میں نے کہا "ایک بہن وکیل تھی' دوسری ہیرا منڈی میں کوٹھے پر بیٹھی تھی۔ تم یقین کرتے ہو اس بات پر؟"

وہ مجھے حیرانی سے دیکھنے لگا "لو جی' دنیا وچ کیا نئیں ہوندا۔ نصیب ہور کس کو آکھتے ہیں؟"

میں نے غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا "اچھا وہ بڑا آدمی کون ہے؟"

وہ پان لگانا چھوڑ کے میری صورت دیکھنے لگا "آپ نے تو پکی انکوائری شروع کردی ہے۔ کون ہو جی آپ؟ سی آئی ڈی کے بندے؟"

میں نے کہا "نہیں یار۔ میں بھی ایک وکیل ہوں۔ رابعہ میرے ساتھ وکالت کرتی تھی۔ میں یہیں لاہور میں رہتا ہوں۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ اس کی کوئی بہن نہیں تھی اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ زندہ ہے۔ یہ سب تمہیں چاندنی بیگم نے بتایا ہے؟"

"میںوں نئیں صاب۔ لوکاں کو۔ میں نے بھی سنا ہے جو سب نے سنا ہے کہ وہ کدھرے انڈیا گئی تھی' ادھر یا روڈ پر ماری گئی۔ کی پتا اے' کی جھوٹ رب جانے۔ ہاں جس بندے نے گھر میں ڈیرا ڈالا ہے' وہ بڑا ڈاڈا بندا ہے۔ آپ میرا ناں لے کے مت بتانا کسی کو۔ ادھر موچی دروازے کے اکھاڑے وچ دنگل کرتا تھا۔ گولا ٹنڈ والا پہلوان مشہور تھا۔ غلام محمد نام تھا۔ سر او روز منڈاتا تھا' داڑھی مونچھ کے ساتھ۔ اس لیے گولا ٹنڈ والا بن گیا۔ آکھدے نے' اک دن اکھاڑے وچ زور کرادی کہ اک پٹھے نے غلط جگہ ہتھ پایا۔ ایہوں آگیا غصہ اور اس نے گردن توڑ دی۔ آپس وچ لگدی تھی اناں دی۔ فیر جی ایہہ جیل گیا تین سال واسطے اور اوتھوں بدمعاش بن کے آیا۔ چودھری غلام محمد ہوگیا ہے اب تو۔"

"اتنا پیسہ کہاں سے آگیا اس کے پاس؟"

وہ ہنسنے لگا "لو جی' پیسہ کیا شریفاں کول ہوتا ہے۔ میرے جیسے شریف تے ساری عمریاں پر کتھا چونا ملتے رہندے ہیں۔ پیسہ بدمعاشی وچ ای آتا ہے بھولے بادشاہو۔ ایہہ تے میرے پیچھے بھی لگ گیا تھا۔"

"تمہارے پیچھے کیوں لگ گیا تھا؟"

"بس جی' کوئی اس دا بندا تھا جو میرا کیبن لینا چاہتا تھا۔ جگہ پسند آگئی تھی اونوں۔ پر جی ساڈا وی رب اے اور کوئی لاوارث نئیں میں بھی۔ اپنے سینما کے مالک چنگے بندے ہیں۔ انہوں نے غلام محمد سے آکھیا کہ خبردار جو حکم دین کے نال پنگا لیا۔"

"حکم دین کون؟"

"میں جی' ہور کون" وہ بولا "جے تے او کڑی رابعہ زندہ اے اور یہ سب جھوٹ ہے۔ تو فیر جی آپ جگہ خالی کرادو نا۔ آپ کو معلوم ہوگا وہ کدھر ہے۔ انوں آکھو کہ کیس کرے۔"

"بالکل کریں گے اور جگہ بھی خالی ہوگی انشاء اللہ۔" میں نے کہا "تم سے بھی پھر ملاقات ہوگی حکم دین۔"

حکم دین کی باتوں سے صاف ظاہر تھا کہ وہ غلام محمد کے خلاف اپنے دل میں کینہ اور عناد رکھتا ہے۔ غلام محمد نے اس کا کیبن چھین کر اس کے پیٹ پر لات مارنے کی کوشش کی تھی اور کراؤن سینما کے مالکان اس کی پُشت پناہی نہ کرتے تو وہ یقیناً معاش کے اس ذریعے سے محروم ہوجاتا۔ شاید حکم دین کو بقا کی سخت جنگ میں بہت ذلت اٹھانی پڑی تھی۔ ممکن ہے اس نے ہڈیاں بھی تڑوائی ہوں۔ آخرکار وہ جیت گیا تھا مگر دلوں میں بُغض باقی رہ گیا تھا۔ ایک پان والے کا اتنے بڑے بدمعاش سے کیا مقابلہ جو ہیرا منڈی کی چاندنی بیگم کو داشتہ رکھے اور اسے شہر کے بیچ کسی کی زمین پر قبضہ کرکے ایک محل بنادے۔ اصل طاقت کا توازن پیسے والوں کی وجہ سے قائم تھا۔ ایک طرف غلام محمد تھا تو دوسری طرف حکم دین کے پیچھے کراؤن سینما والوں کا ہاتھ تھا۔ تاہم اس وجہ عناد سے ہم بعد میں فائدہ اٹھاسکتے تھے۔

میں نے ساری بات رابعہ کو بتائی تو وہ حیران بھی ہوئی اور مشتعل بھی۔ "کیا خیال ہے' میں اپنی بہن سے مل لوں ابھی؟ اسے بتادوں....."

میں نے کہا "شانتی' شانتی۔ جلدبازی میں بنا بنایا کام بگڑ جاتا ہے۔ چاندنی بیگم اور گولا ٹنڈ والا کچھ بھی ہوں' اس جگہ کے مالک نہیں ہوسکتے۔ انہوں نے ہمارا نہیں' اپنا نقصان کیا ہے۔ اس محل کو اٹھا کے وہ کہاں لے جائیں گے آخر۔ بے دخلی تو ہوگی۔ آج نہ

سہی کل۔ سال دو سال بعد۔ دس سال تو لگیں گے نہیں۔ اور ہمیں اس جگہ کی فوری ضرورت بھی نہیں ہے۔ جب فرصت ہوگی کیس کردیں گے مگر کیس کرنے سے پہلے ان کے ساتھ وہ کھیل کھیلیں گے جو بلی چوہے کے ساتھ کھیلتی ہے۔"

"میں سمجھی نہیں۔"

"سمجھ جاؤ گی۔ محل تو وہ بعد میں چھوڑیں گے' اس سے پہلے ان کی نیندیں حرام ہوجائیں گی۔ چاندنی ٹھہر سکتی ہے دُھوپ میں۔ اسے معلوم ہوگا تمہارا نام تو وہ اپنا نام تک بھول جائے گی۔ اچھا اب پہلے منظر کو فون کرلیں ورنہ وہ کورٹ چلا جائے گا۔" میں نے کہا اور گاڑی کو واپس موڑ کے علامہ اقبال روڈ پر لے آیا۔

چوک میں ایک لڑکا فٹ پاتھ پر اخبار پھیلائے بیٹھا تھا۔ میں نے اس سے ایک انگریزی کا اخبار لیا اور ایک اردو کا۔ پھر اس سے معلوم کیا کہ میں فون کہاں سے کرسکتا ہوں۔ اس نے مجھے انگلی کے اشارے سے ایک میڈیکل اسٹور دکھایا۔ میں نے اخبار گاڑی میں رابعہ کو پکڑایا اور خود فون کرنے چلا گیا۔

حسبِ عادت منظر نے میری آواز سنتے ہی گالی دی "نازل ہوگیا تو صبح صبح۔ کہاں سے بول رہا ہے؟"

"جہاں سے تُو بولتا ہے۔ دیسے میں چاندنی بیگم کے گھر کے قریب ہی ہوں۔" میں نے کہا۔

"چاندنی بیگم! ابے کیا سیدھا ہیرا منڈی چلا گیا لاہور آتے ہی۔"

میں نے کہا "منہ سنبھال کے بات کر۔ وہ رابعہ کی بہن ہے۔ جہاں رابعہ رہتی تھی نا' اسی جگہ بڑا شاندار گھر بنایا ہے۔ رابعہ کی موت کے بعد وہی وارث تھی۔"

"سکندر! کیا تو پینے لگا ہے یا کسی نے دھوکے سے چرس والی سگریٹ پلادی ہے۔" منظر سنجیدہ اور متفکر ہوگیا۔

"سگریٹ میں نے کب کی چھوڑ دی بیٹے۔ یہ بھی میں نشے میں نہیں کہہ رہا ہوں۔ میں آسمانی رنگ کی کورونا میں ہوں۔ ماڈل ۶۹۔ تیرے پاس کیا ہے؟"

"ابھی تو اسٹیشن ویگن ہے لیکن ٹرک لینا پڑے گا یا بس ہوگی اگر بس نہ کیا۔" وہ قہقہہ مار کے بولا اور ریسیور رکھ دیا۔

میں واپس آیا تو رابعہ اخبار پر نظر جمائے بیٹھی تھی۔

"سکندر! یہ دیکھو۔ غالب اور نازو کے بارے میں خبر ہے۔" اس نے میرے کچھ کہنے سے پہلے یوں چلّا کے کہا کہ قریب سے گزرنے والے لوگوں نے سر گھما کے دیکھا۔

میں نے سیٹ پر بیٹھ کے اخبار لے لیا "کیا خبر ہے' کہاں؟"

رابعہ نے انگلی رکھ دی "یہ پڑھو۔ وہ مل گئے ہیں۔"

میں نے خبر پڑھی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ گلگت کے برفانی علاقے میں پاکستانی فوج کے ہیلی کاپٹر نے دو افراد کی جان بچائی ہے جو طوفان میں بھٹک گئے تھے اور اگر بروقت امداد نہ ملتی تو وہ سردی اور بھوک سے ہلاک ہوجاتے۔ انہیں اتفاقاً دیکھ لیا گیا اور فوراً کے کمبائنڈ ملٹری اسپتال میں پہنچا دیا گیا جہاں ڈاکٹر ان کی جان بچانے میں کامیاب ہوگئے۔ معلوم ہوا ہے کہ ان میں سے ایک مشہور صحافی مرزا غالب ہیں جو کچھ عرصہ قبل لاپتا ہوگئے تھے اور دوسری ان کی بیوی۔ ملاقات پر پابندی کے باعث ہمارا نمائندہ ان سے تفصیلی گفتگو نہ کرسکا اور یہ معلوم نہ ہوسکا کہ ایسے موسم میں راستہ بھول کے گلگت کیسے جا پہنچے تھے اور اتنا عرصہ کہاں تھے۔

میں نے خبر کو دوبارہ پڑھا۔ پھر انگریزی اخبار میں دیکھا۔ انگریزی میں خبر نسبتاً مختصر تھی کہ سابق صحافی اور ان کی بیوی کو ملٹری رسکیو ہیلی کاپٹر نے ہلاک ہونے سے بچالیا۔

"چلو خدا کا شکر ہے! ان کا پتا بھی چل گیا۔" رابعہ بولی۔

کاجل نے بھی کہا "ہاں' اب کوئی فکر کی بات نہیں رہی۔"

میں نے اخبار رکھ دیا "یہ تو ٹھیک کہتی ہو تم لیکن بات اب بھی فکر کی ہے۔"

"اس میں لکھا ہے' جان بچالی گئی۔"

"جان تو بچائی ملٹری کے ڈاکٹروں نے۔ اخبار والوں نے تو ڈھول پیٹ کر اطلاع دے دی سب کو۔" میں نے کہا "ہم اپنی آمد خفیہ رکھنا چاہتے تھے مگر اب ہمارے دشمنوں کو بھی خبر مل گئی کہ ہم لوٹ آئے ہیں۔ ہم سے پہلے وہ نوشہرہ پہنچ کے غالب کی خبر لے سکتے ہیں۔"

رابعہ نے پریشان ہوکے کہا "پھر اب کیا ہوگا؟ ہم چلیں نوشہرہ۔"

میں نے کہا "ہم فوراً کیسے جاسکتے ہیں۔ نوشہرہ کوئی ڈائریکٹ فلائٹ تو ہے نہیں۔ پشاور سے جائیں تو اٹھائیس میل واپس پنڈی کی طرف آنا پڑتا ہے۔ ہم پہلے منظر کو بتائیں گے پھر اکرام کو اطلاع دیں گے کہ وہ وہاں مزید انتظار نہ کرے۔"

"خبر کراچی کے اخبارات میں بھی تو شائع ہوئی ہوگی۔"

"مشکل ہے۔ یہ کوئی بین الاقوامی خبر تو ہے نہیں۔ وہ لاہور کا صحافی تھا اس لیے لاہور کے اخباروں نے خبر چھاپ دی۔"

"اکرام کے گھر فون کردو۔"

"منظر کے گھر سے کریں گے۔ اس میں بھی وقت لگے گا۔ کال بُک کرانے کے بعد کال ملنے تک ہم انتظار کے سوا کیا کرسکتے ہیں۔" میں نے مایوسی سے کہا "آخر غالب کو کیا ضرورت تھی کسی کو بتانے کی کہ میں صحافی ہوں۔"

رابعہ بولی "ممکن ہے لوگ خود ہی پہچان گئے ہوں۔"

"کون لوگ؟ ملٹری کے ڈاکٹر؟" میں نے کہا "مشکل ہے۔ میں تو شرط لگا سکتا ہوں کہ اسے یہاں اس چوک میں لا کے کھڑا کردو تو اخبار والا اسے نہ پہچانے۔ اس ملک میں تو کوئی فیض احمد فیض کو نہ پہچانے' غالب کیا چیز ہے۔ اس نے خود ہی بتایا ہوگا۔"

"وہ اتنا بے وقوف بھی نہیں ہے۔" رابعہ نے اس کا دفاع کیا۔

"بے وقوف ہم سب ہیں۔" میں نے کہا "محسن کو دیکھو' انہوں نے کیا حرکت فرمائی ہے۔ یار جانا تھا تو کچھ بتا کے جاتے' وضاحت کرجاتے چند سطروں میں۔ معاملے کو اتنا پُراسرار بنانے کی کیا ضرورت تھی۔ ہم سے بے وقوفی یہ ہوئی کہ پلاٹ کو ایسے ہی چھوڑ دیا۔ کوئی چوکیدار چھوڑ جاتے۔"

"اس بات کو چھوڑو' یہ سوچو پہلے کہ غالب اور نازو کو کیسے نکالا جائے۔" رابعہ بولی۔

"تم بھی عجیب باتیں کرتی ہو۔ نکالنا کیا معنی۔ وہ حوالات میں ہیں کہ ہم ضمانت دے کر نکال لائیں۔" میں نے برہمی سے کہا "بابا' وہ ملٹری ہاسپٹل میں ہیں۔ ایسے کون گھس سکتا ہے وہاں۔ ملنا بھی ہوگا تو پہلے بتانا پڑے گا کہ ہم کون ہیں۔ اور جب تک ہم جائیں گے غالب کا بھائی اسے لے جائے گا۔ ابراہیم ذوق یا مومن خاں مومن۔"

"غالب کا بھائی! ابراہیم ذوق۔"

"جب تمہاری بہن چاندنی بیگم ہوسکتی ہے اور تمہارے پلاٹ پر محل بنا کے قابض ہوسکتی ہے تو دلاور اینڈ کمپنی کا کوئی آدمی غالب کا بھائی بن کے کیوں نہیں پہنچ سکتا۔" میں نے کہا "غالب' ذوق اور مومن ہم عصر تھے' یہ کون جانتا ہے۔ وہ چوہدری دلاور سالا خود ایسا ایکٹر ہے کہ اپنے آپ کو غالب کا باپ ثابت کردے۔"

میری جھنجلاہٹ اور میرا احساسِ بے بسی میرا غصہ بن گئے تھے چنانچہ ایک اچھی خبر بھی میرے لیے خوشی سے زیادہ تفکرات کا سبب بن گئی تھی۔ اچانک مجھے ایک کار میں منظر کا چہرہ نظر آیا۔ اس نے پوری بتیسی کی نمائش کرتے ہوئے ایک ہاتھ سے بہت غلط قسم کا اشارہ کیا مگر اس وقت رابعہ دوسری طرف دیکھ رہی تھی۔ منظر نے گاڑی روکی نہیں اور مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ کاجل تو اسے پہچانتی ہی نہیں تھی اور اس کے اشارے کا مطلب بھی نہیں سمجھ سکتی تھی۔ میں نے زیرِ لب کہا "سور کا بچہ" اور گاڑی اسٹارٹ کی تو رابعہ نے سامنے دیکھا۔

"یہ تو منظر ہے۔" اس نے مسرت سے کہا "اسی کی گاڑی ہے نا؟"

"ہاں۔ تم نے اب دیکھا ہے۔ میں نے اس کی منحوس شکل پہلے ہی دیکھ لی تھی۔"

رابعہ نے خفگی سے کہا "کیا ہوگیا ہے تمہیں۔ سب پر غصہ آرہا ہے۔ مجھ سے کیوں لڑ رہے ہو؟"

میں نے ایک گہری سانس لی اور کہا "سوری۔ میں کچھ ڈسٹرب ہوگیا تھا' تھکا ہوا بھی ہوں۔"

رابعہ نے کہا "گاڑی میں چلاؤں؟"

"اب تو تھوڑی دیر کی بات ہے۔" میں نے کہا "مگر یہ جا کدھر رہا ہے؟ اپنے پُرانے گھر کی طرف؟"

"کیا پتا' نیا گھر بھی کہیں قریب ہی ہو۔" رابعہ بولی اور پھر کاجل کو منظر کے بارے میں بتانے لگی۔ کلیم لاہور کے نظارے دیکھنے میں منہمک رہا۔ اسے نہر کے کنارے سفر میں بہت مزہ آیا تھا۔

صدر پہنچ کے منظر نے گاڑی اپنے پُرانے گھر کے دروازے پر روکی' خود اُتر کے گیٹ کھولا اور گاڑی کو اندر لے گیا۔ اس کے پیچھے میں گیا اور کار کو پورچ میں روک کے اُترا تو وہ گیٹ بند کررہا تھا۔ جب ہم نے گلے مل کے ایک دوسرے کو اٹھا اٹھا کے گھمانا شروع کیا اور مکّے مار مار کے گالیاں دیں تو کلیم ڈر گیا۔

"دیدی' چاچا کا لڑائی ہوگیا ہے۔"

رابعہ نے ہنستے ہوئے کہا "نہیں کلیم' یہ دوست ہیں نا' بہت عرصے بعد ملے ہیں۔"

آخرکار منظر نے مجھے چھوڑا اور رابعہ کی طرف متوجہ ہوا' "ارے وکیل صاحبہ! خدا کی قسم دل تو چاہتا ہے ایسے ہی تم سے بھی ملوں۔ مگر کیا کروں یہ سالا مار ڈالے گا مجھے۔ اور میں بھی کچھ شرمیلا ہوں۔ ورنہ تم تو بھئی قیامت ہوگئی ہو قیامت اور یہ بیٹا ہے تمہارا۔ ماشاءاللہ خاصا بڑا ہوگیا تھوڑے سے دن میں۔"

رابعہ نے خفت سے کہا "کچھ شرم کرو۔ یہ میرا بیٹا ہوسکتا ہے۔"

"کوشش کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا۔" وہ گلا پھاڑ کے ہنسنے لگا "خیر سے یہ کاجل ہوں گی۔ بھئی واہ! ان کی تو آنکھیں دیکھ کر ہی ان کا نام معلوم کیا جاسکتا ہے۔ اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا تھا ان کا نام۔ یہ کلیم ہے نا۔ آجا بیٹا! ابھی تجھے ملواتے ہیں تیرے پندرہ زادوں سے۔ ابے میں بھی تو چچا ہوں تیرا۔" اس نے کلیم کو لپٹا کے پیار کیا۔

شور سُن کر اندر سے منظر کی بیوی نکلی۔ وہ سیدھی سادی اور گھریلو عورت تھی۔ کسی تکلف کے بغیر وہ رابعہ اور کاجل سے گلے ملی اور پھر مجھ سے۔

"سکندر بھیا! لاہور تو سونا ہوگیا تھا تمہارے بغیر۔" وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

منظر نے قہقہہ مارا "ارے نیک بخت! اللہ نے چھپر پھاڑ کے پندرہ عدد لختِ جگر دیئے ہیں تجھے پھر بھی لاہور سُونا لگتا تھا۔"

منظر کی بیوی ہمیں اندر لے گئی "یہ تو ایسے ہی بولتے رہیں گے۔"

میں نے کہا "منظر! یہ تو وہی گھر ہے' تیرا نیا گھر کہاں ہے؟"

"میں نے تیرے لیے استقبالیہ کیمپ لگا رکھا ہے کل رات سے۔ نیا گھر ذرا دور ہے۔" وہ بولا "بعد میں دیکھ لینا۔"

"جب میں نے فون کیا تو یہاں کوئی اور تھا۔ کہہ رہا تھا کہ تو نے یہ گھر بیچ دیا ہے۔"

"سالا نشے میں بول رہا تھا۔ ایک رات کے لیے گھر لیا تھا اس

نے۔" منظر مجھے آنکھ مار کے بولا "میں نے تو سب انتظام تمہارے لیے ہی کیا تھا۔ یہاں کوئی نہیں جانتا کہ میں نے گھر بدل لیا ہے۔ میری گاڑی صبح و شام آتی جاتی رہتی ہے۔ ہفتے میں ایک بار اپنی پلٹن کو بھی لے آتا ہوں۔"

"مگر مقصد کیا ہے اس کا؟"

"مقصد یہ ہے کہ جب تم رہو تو لوگ سمجھیں' میں رہتا ہوں۔ کوئی تمہارے پیچھے لگ جائے تب بھی اندر نہیں گھسے گا۔ آخر منظر ایڈووکیٹ کا گھر ہے۔ وارنٹ کے بغیر ڈی آئی جی کے قدم بھی رک جائیں گے۔ لیڈی سرچ چاہیے اندر جانے کے لیے۔" منظر نے مجھے ڈرائنگ روم میں لے جاکے کہا۔

میں صوفے پر جوتوں سمیت دراز ہو گیا "یہ تو کچھ عقل مندی کی بات لگتی ہے مجھے۔"

اب اپنی گاڑی میرے حوالے کردو۔ جہاں جانا ہو میری گاڑی میں جاؤ۔ خیر یہ باتیں پھر کریں گے۔ مجھے کورٹ جانا ہے۔ تم نہادھو کے ناشتا کرو' آرام کرو اور جو چاہو کرو۔"

میں نے کہا "ایک منٹ۔ یہ خبر دیکھی تو نے؟"

"غالب کے بارے میں نا۔ سالا صحافی کی دُم۔ اب یہ کہہ دیتا کہ میں ایرا غیرا ہوں' لکڑہارا ہوں' گھسیارا ہوں۔ کون سی شان گھٹ جاتی۔ نام بھی بتادیا اور پیشہ بھی اور خبر لگوا کے اطلاع عام کردی۔"

"یار' وہ اتنا احمق نہیں ہو سکتا۔" اب میں نے رابعہ کی عدم موجودگی میں اُسی کی دلیل دی۔

"اتنا کیا' احمق تو احمق ہی ہوتا ہے۔ جیسے گدھا بس گدھا ہوتا ہے۔ چھوٹا بڑا کیا۔" منظر نے کہا "خیر سے تم سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہونا۔ محسن نے کیا کم گدھے ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ رہے تم خود تو تم سے تو گدھے بھی شرمندہ ہیں کہ تم نے ان کا نام بدنام کیا۔"

منظر رخصت ہو گیا تو اس کی بیوی نے بڑے گھریلو اور اپنائیت کے انداز میں مہمان نوازی پر کمر باندھ لی۔ ہم نے اسے قائل کرنے کی بے سُود کوشش کی کہ لاہور پہنچتے ہی ہم نے سب سے پہلا کام یہی کیا تھا کہ ناشتا کرلیا تھا۔

"پھر کیا ہوا۔ اتنی دور سے آرہے ہو۔ تھوڑا سا حلوہ پُوری کھانے سے بھی کوئی پیٹ بھرتا ہے۔" اس نے کہا "چلیں آپ لوگ نہادھولیں۔ ابھی تو میں نے بھی ناشتا نہیں کیا۔"

اس نے رابعہ بہن کو ایک باتھ روم میں دھکیلا اور کاجل بہن کو دوسرے میں۔ پھر کلیم کے بارے میں پوچھنے لگی۔ میں نے اسے مختصراً بتایا کہ اسے علاقہ غیر میں اس کی پھوپھی کے پاس پہنچانا ہے۔

"وہ بھابی۔ بڑا عجیب سا لگ رہا ہے۔ اتنی خاموشی ہے گھر میں۔ بچے کہاں ہیں؟"

"بچے! توبہ میری۔ ان کو ساتھ لاتی تو وہ چین سے بیٹھنے دیتے؟ اب تک چمٹ گئے ہوتے بھوت کی طرح۔"

"ہیں بھی تو بھوت کے بچے۔" میں نے کہا۔

"میرا تو دماغ خالی ہو جاتا ہے بھیا۔" اس نے بچوں کی افزا
اور ان کی پرورش' کنٹرول اور امورِ خانہ داری کے دُکھڑے رونا
شروع کیے جو ایک عام عورت کا مقدّر ہوتے ہیں۔ بچے یہ کرتے
ہیں۔ وہ کرتے ہیں۔ یہ نہیں کرتے' وہ نہیں کرتے۔ باپ کو ذرا فکر
نہیں۔ بس عدالت ہے اور اپنا دفتر ہے۔ دُنیا بھر کے بکھیڑے ہیں۔

اچانک اس نے کہا "بھیا! اب تم بھی ٹِک کے بیٹھ جاؤ۔"

میں نے چونک کے کہا "بیٹھا تو ہوں بھابی۔ بڑے آرام سے۔"

"ارے میرا مطلب تھا گھر بسالو۔ چھوڑو یہ سارے جہان کے
جھمیلے۔ اپنی جان کا روگ بنا رکھے ہیں۔ بھاگے پھرتے ہو ادھر سے
اُدھر۔ کچھ پتا نہیں چلتا کہاں ہو اور کیا کر رہے ہو۔ میں پوچھتی ہوں
کیا تم نے مل کے ہندوستان پاکستان کی جنگ رکوادی؟ بنگالیوں نے
مانی تمہاری بات؟ اپنا بنگلہ دیش الگ کرلیا نا۔"

وہ خالص زنانہ نقطۂ نظر سے اپنا لیکچر دیتی رہی اور اپنی معلومات
کی حد تک مجھے سمجھاتی رہی کہ زمانہ بڑا خراب ہے۔

"تمہیں کیا پتا لوگ کیسی کیسی باتیں کرتے ہوں گے۔ ایسا ہوتا
ہے دُنیا میں کہیں کہ جوان جہان لڑکیاں ساتھ ساتھ پھریں۔ اپنے
منگیتر کے سامنے بھی کوئی نہیں آتا۔ پردہ ہوتا ہے آنکھ کا۔"

میں نے کہا "بھابی آنکھ کا پردہ تو باقی ہے۔ رہی دُنیا کی بات تو
اس نے پیغمبروں کو نہیں بخشا پھر ہم کیا' ہماری اوقات کیا۔"

لیکن وہ قائل ہونے والی نہیں تھی۔ اس کا فلسفۂ حیات بہت
سادا تھا اور اس میں سمجھنے والی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ اس کے
نزدیک زندگی کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ آدمی پڑھے لکھے
کمائے اور ترقی کرے۔ شادی کرے' بچوں کی پرورش میں دلچسپی
لے' اللہ کو یاد کرے' آخر عمر میں توفیق ہو تو حج کرے اور جب
موت آئے تو مرجائے۔ میں سننے پر مجبور تھا۔ اس کی زبان رکے بنا
قینچی کی طرح چلتی تھی۔

بڑی مشکل سے موقع ملا تو میں نے کہا "بھابی ایک بات
پوچھوں۔ پندرہ بچے مل کے آپ کے برابر بول لیتے ہیں یا آپ کے
مقابلے میں بول ہی نہیں پاتے؟"

وہ بُرا ماننے والی عورت ہی نہیں تھی۔ اس نے پھر بچوں کا
موضوع پکڑلیا۔ جب رابعہ باتھ روم سے نکلی تو میں بھاگ گیا۔ اب
رابعہ پھنس گئی۔ نہاتے ہوئے میں اس کی حالت کا سوچ کے خوش
ہوتا رہا۔ مجھے یقین تھا کہ اس کی زیادہ شامت آئی ہوگی کیونکہ وہ
لڑکی تھی۔

ناشتے کے دوران اور اس کے بعد اگر ہم نے ایک سوال کیا تو
جواب میں ایک لیکچر سنا۔ میں نے پوچھ لیا "بھابی! یہ سارا سامان تو
یہیں ہے۔ نئے گھر میں کیا ہے؟"

"بھیا! نیا سامان' نیا تھا سب۔ تمہارے وکیل صاحب کو شوق

تھا مگر وہ پہلے والی بات کہاں۔ چار دن میں سب چیزوں کا وہ حال ہو گیا ہے کہ چار سال پُرانی لگتی ہیں۔"

اب اس نے روز بروز بڑھتی ہوئی مہنگائی' بے ایمانی' اخلاقی گراوٹ اور پُرانے وقتوں اور لوگوں کے موضوع پر بولنا شروع کیا تو زمانے کی خبر لے ڈالی۔ میں سوچتا رہا کہ دن بھر عدالت میں بولنے والے اور ہر وقت مذاق کرنے والے منظر کی اور اس کی بیوی کی اپنے گھر میں کیسے بسر ہوتی ہوگی۔ دونوں بولنے والے تھے۔ سنتا کون ہوگا۔ بیوی ہر بات میں شکایت کا کوئی پہلو تلاش کرنے والی' تقدیر سے' زمانے سے اور حالات سے شاکی۔ ہر چیز سے نالاں۔ شوہر اس کے بالکل برعکس' ہر وقت ہنسنے والا' ہر سنجیدہ بات میں کوئی غیر سنجیدہ پہلو نکالنے والا' بے فکر اور خوش باش۔ مگر کمال یہ تھا کہ ہم نے کبھی انہیں لڑتے نہیں دیکھا تھا۔ نہ بیوی نے شوہر کو بُرا کہا تھا' نہ ہم نے منظر کے منہ سے بیوی کے خلاف کچھ سنا تھا۔ عادات اور مزاج کے اعتبار سے تو ان میں کوئی بھی بات مشترک نہ تھی مگر زندگی کی گاڑی چل رہی تھی اور ہر سال ایک اسٹیشن تھا تو ہر بچہ ایک جنکشن۔ نہ ابھی تک کسی نے کانٹا بدلا تھا' نہ گاڑی روکی تھی۔

دس بجے کے بعد اس نے ہمیں سونے کی اجازت دی مگر الگ الگ کمروں میں "رابعہ! تم اس بیڈ روم میں چلی جاؤ۔ سکندر! تم اِدھر۔ میں اب جارہی ہوں گھر۔ بچوں نے میدانِ جنگ بنا رکھا ہوگا۔ نوکروں کے قابو میں کہاں آتے ہیں وہ۔ دوپہر کا کھانا..."

میں نے کہا "ہم نہیں کھائیں گے۔ شام تک سونے کا ارادہ ہے۔"

"اچھا تو پھر شام کو انہی کے ساتھ آجانا۔ وہ کہہ گئے تھے' کورٹ سے آج سیدھے اِدھر آئیں گے۔ آفس کی چھٹی کریں گے۔"

"آپ کیسے جائیں گی۔ میں چھوڑ آؤں؟" میں نے کہا۔

"ارے نہیں بھیا۔ میں ٹیکسی پکڑلوں گی۔ عادت ہے مجھے اکیلے ہر جگہ آنے جانے کی۔ انہیں کہاں فرصت ملتی ہے صبح سے رات تک۔ آفس سے بھی آتے ہیں تو کیس کی فائلیں ساتھ آتی ہیں۔ مؤکل گھر پر بھی پیچھا نہیں چھوڑتے۔ سب مجھے ہی کرنا پڑتا ہے۔"

اس نے ایک طویل تقریر میں بتایا کہ سودا سلف لانے سے تقریبات میں شرکت تک سب کچھ وہ اکیلی کیسے کرتی ہے۔ جب وہ رخصت ہو گئی تو میں نے دروازہ بند کرکے سکون کا سانس لیا۔

"کیسی اچھی لگ رہی ہے یہ خاموشی۔" میں نے آنکھیں بند کرکے کہا "ایسی عورت کا شوہر یا تو بہرا ہونا چاہیے یا منظر جیسا موٹی کھال والا' چکنا گھڑا جس پر کسی بات کا اثر ہی نہ ہو۔ بولتی ہے تو بولتی رہے۔"

رابعہ نے کہا "مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ منظر کے سامنے اسے بولنے کا موقع بھی نہیں ملتا ہوگا۔ ہر بات کو وہ مذاق میں اُڑا دیتا ہوگا۔ وہ خاموش بیٹھنے والا کہاں ہے۔"

"رابعہ! تم سو جاؤ۔ کاجل تو ناشتے سے پہلے ہی سوگئی تھی۔"

"اور تم کیا کرو گے؟" وہ بولی "تم بھی سو جاؤ۔ رات بھر کے تھکے ہوئے ہو۔"

میں نے کہا "تھکن سے زیادہ مجھے غالب کی فکر ہے۔ میں سوچ رہا ہوں اخبار کے دفتر فون کرکے اس کے کسی پُرانے ساتھی سے بات کی جائے۔"

"تم جانتے ہو کسی کا نام؟" رابعہ بولی۔

فون اسی کمرے میں تھا۔ میں نے انکوائری سے اخبار کا نمبر مانگا۔ نمبر آسانی سے مل گیا۔

"مجھے نیوز روم میں....."

میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی آپریٹر نے کہا "نیوز روم میں اس وقت کوئی نہیں ہے۔ شام کو آتے ہیں سب۔" اور فون بند کردیا۔

میں نے پھر نمبر ملایا "یار! اتنی جلدی میں کیوں ہو۔ میگزین میں تو ہوگا کوئی۔ ریڈیو مانیٹرنگ..."

"صوفی صاحب سے ملادوں؟"

میں نے کہا "صوفی' مُلاّ کسی سے بھی بات کرادو۔"

چند سیکنڈ کے بعد کسی نے کہا "صوفی۔"

میں نے کہا "صوفی صاحب' آپ کے اخبار میں ایک صاحب تھے مرزا غالب جن کے بارے میں آج خبر چھپی ہے۔"

"اچھا پھر میں کیا کروں؟ کیا خبر غلط ہے؟ غلط ہے تب بھی یہ نیوز ڈیسک سے پوچھو۔ میرا کام نہیں ہے۔" اس نے بھی فون بند کردیا۔

میں نے بھنّا کے کہا "لاحول ولا قوۃ ہر شخص آدم بیزار لگتا ہے۔ کسی کو شرافت سے پوری بات کہنے کی عادت نہیں یا فرصت نہیں۔"

میں نے کچھ دیر سوچا اور تیسری بار نمبر ملا کے کتابت کا شعبہ مانگا۔ ریسیور ہیڈ کاتب نے اٹھایا۔ وہ خاصا معقول اور مہذب آدمی ثابت ہوا۔

میرے سوال پر اس نے آہ بھر کے کہا "جی بالکل ہوتے تھے۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔ یاروں کا یار تھا۔"

میں نے کہا "اس کے بارے میں تو آج آپ نے ایک خبر لگائی ہے۔"

"اچھا! کیا خبر ہے؟ کون سے صفحے پر۔ میں دیکھتا ہوں۔"

میں نے کہا "ضرور دیکھیے۔ اس سے پتا نہیں چلتا کہ یہ خبر کس نے دی تھی۔ آپ کے نمائندے نے یا کسی خبر رساں ایجنسی نے۔ میں ان کا بڑا بھائی بول رہا ہوں۔"

"میں ابھی معلوم کرکے بتاتا ہوں۔ کل رات کی ردی کھنگالنی

پڑے گی۔ اے پی پی یا پی پی آئی کی خبر ہوگی تو ٹیلی پرنٹر سے آئی ہوگی۔ ہمارے نمائندے نے دی ہوگی تو فون پر کسی سب ایڈیٹر کو لکھوائی ہوگی۔"

اس نے خبر دیکھنے کے بعد کہا "آپ ایسا کریں' دس منٹ بعد پھر زحمت کریں۔"

"زحمت تو میں آپ کو دے رہا ہوں۔" میں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

دس منٹ بعد مجھے معلوم ہوگیا کہ خبر نوشہرہ کے نمائندۂ خصوصی نے دی تھی۔

میں نے کہا "نوشہرہ کے نمائندۂ خصوصی کا نام اور فون نمبر کہیں سے مل سکتا ہے؟"

"کیوں نہیں۔ آپریٹر بتادے گا۔"

"ایک بات اور۔ آپ کے ادارے میں اس کا قریبی دوست کون تھا؟"

"ویسے تو وہ سب کا دوست تھا مگر آج کل جو میگزین انچارج ہیں' صوفی صاحب۔ وہ اس کے خاص دوست تھے۔"

"صوفی صاحب۔ وہ تو عجیب آدمی ہیں۔ بات کیا کرتے ہیں کاٹنے کو دوڑتے ہیں۔"

وہ ہنسا "بظاہر ایسا ہی لگتا ہے مگر دل کے بہت اچھے ہیں۔"

میں نے ہیڈ کاتب کا شکریہ ادا کرکے پھر صوفی صاحب سے بات کی "دیکھیے جناب! میں مرزا غالب کا ایک بہت عزیز دوست بول رہا ہوں۔ سکندر بخت۔"

"کون؟ تم مجھ سے مذاق کرتے ہو۔" وہ بگڑ گیا۔

"صوفی صاحب! میں حلفیہ عرض کررہا ہوں۔ مجھے معلوم ہوا تھا غالب سے کہ آپ اس کے خاص دوست تھے؟"

اس کا لہجہ بدل گیا "وہ تو ٹھیک ہے لیکن سکندر یہاں کہاں۔"

میں نے کہا "صوفی صاحب! میں واپس پہنچ گیا ہوں۔ محسن مجھ سے پہلے آگیا تھا اور غالب پیچھے رہ گیا تھا۔"

"اچھا دیکھو' ایسی باتیں فون پر کرنے کی نہیں ہوتیں۔" صوفی بولا "تم کیا کررہے ہو؟ اخبار کے دفتر کیوں نہیں آجاتے۔"

"میں دن دہاڑے باہر نکلنا مناسب نہیں سمجھتا فی الحال۔ تفصیل بعد میں عرض کروں گا۔"

"اچھا کہاں سے عرض کررہے ہو۔ میں آجاتا ہوں۔"

میں نے اسے منظر کا نمبر دیا "آپ ضرور آئیں مگر ابھی نہیں۔ میں ایک کام آپ کے سپرد کررہا ہوں جس کا تعلق غالب کی ذات سے اور اس کے تحفظ سے ہے۔ یہ کام آپ ہی کرسکتے ہیں صوفی صاحب۔"

"صاحب نہیں' میں صرف صوفی ہوں۔" وہ بولا۔

"صوفی! وہ خبر نوشہرہ کے نمائندۂ خصوصی نے دی ہے۔ تم اس سے رابطہ کرسکتے ہو' اسی وقت؟"

"ہاں۔ وہ شوقیہ فنکار ہے۔ ہر اخبار کا نمائندہ بننے کا اعزاز حاصل کرنا چاہتا ہے۔ دفتر میں تین چار فون لگوا رکھے ہیں۔ اس کی حیثیت وہاں ڈپٹی کمشنر سے کم نہیں۔" صوفی بولا "مگر اپنا غلام ہے۔ ہم اس کی خبریں نہ لگائیں تو اس کی اکڑفوں کیسے قائم رہے شہر میں۔"

میں نے کہا "پھر تو کوئی مسئلہ نہیں۔ آپ فون پر اسے کہیں کہ وہ اسی وقت سی ایم ایچ جائے۔ ظاہر ہے اسے کوئی نہیں روک سکتا اور ملٹری اسپتال کے ڈاکٹر بھی اسے جانتے ہوں گے۔ وہ کوئی ایسا بندوبست کرے کہ غالب اور نازو سے ملاقات پر مکمل پابندی عائد ہوجائے' یہ بہت ضروری ہے۔ خبر کی اشاعت سے ان کی زندگی کو خطرہ لاحق ہوگیا ہے۔"

"کیسا خطرہ..... کس سے؟"

میں نے کہا "یہ فون پر نہیں بتایا جاسکتا۔ آپ وہ کریں جو میں نے کہا ہے۔ غالب یا نازو کا بھائی بن کے آئے کوئی یا باپ بن کے' ڈاکٹر صاف انکار کردیں۔ انہیں آئی سی یو میں منتقل کردیں یا کہیں اور۔ ان کے لیے یہ مشکل نہیں ہوگا۔"

"میں ابھی بات کرتا ہوں۔ اپنے نمائندے سے بھی اور سی ایم ایچ کے کمانڈنٹ سے بھی۔"

میں نے کہا "صوفی! تم جانتے ہو نا اس کے دُشمن کون تھے؟"

"ہاں' بہت اچھی طرح۔" صوفی طنز سے بولا۔

"وہ ایسے مکار لوگ ہیں کہ میرا نام لے کر بھی اندر پہنچنے کی کوشش کریں گے یا محسن کا نام لے کر۔ ڈاکٹر عام طور پر اپنا ضمیر نہیں بیچتے اور پیرامیڈیکل اسٹاف بھی وہاں سخت ڈسپلن کا پابند ہوتا ہے۔ مگر رابعہ کی ماں کو انہی کے ایک آدمی نے میو اسپتال کے وارڈ میں گھس کے مار ڈالا تھا۔ میو اسپتال میں سفید گاؤن اور اسٹیتھسکوپ کے ساتھ کوئی بھی جاسکتا ہے۔ سی ایم ایچ میں ایسا نہیں ہوگا۔ مگر صوفی' یہ دُنیا ہے۔ وہ سو فرشتوں میں ایک شیطان تلاش کرلیتے ہیں اور اسے آلہ کار بناسکتے ہیں۔"

"میں سمجھ گیا' سب سمجھ گیا۔ میں پکا بندوبست کرتا ہوں' بالکل فول پروف۔" صوفی بولا "ان کے لیے الگ کمرا ہوجائے گا' گارڈ ہوگی۔ مخصوص ڈاکٹر اور وارڈ بوائے' ان کے سوا طرّم خان کا سالا بھی اندر نہیں جائے گا۔ میں انہیں خبردار کردوں گا کہ ایسی ویسی بات ہوئی تو میں انہیں بخشوں گا نہیں۔ ساری ذمے داری ان پر ڈال دیتا ہوں۔ ابھی تھوڑی دیر میں رحمان صاحب آجاتے ہیں۔"

"کون رحمان صاحب؟"

"عجیب جاہل آدمی ہو یار۔ اخبار کے مالک اور کون۔ وہ ڈائریکٹر جنرل ہیلتھ سروسز سے بات کرلیں گے۔ ارے ہم تو انہیں اٹک فورٹ کے اندر رکھوا سکتے ہیں۔ شکاری بندوق کیا' توپ اور ٹینک لے کر بھی آجائیں تو نزدیک نہیں پھٹک سکتے۔"

"بس صوفی' میں سمجھ گیا تم سب کچھ کرسکتے ہو۔ اب دیر مت کرو۔ میں پھر بات کروں گا تم سے۔" میں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

رابعہ نے ساری بات سنی تھی "یہ بہت اچھا کیا تم نے۔ اب ان کا کوئی بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

"بس دُعا کرو' شکاری پہلے وار نہ کرجائیں۔" میں نے کہا "مجھے اطمینان تب حاصل ہوگا جب صوفی بتائے گا کہ غالب اور نازو کے لیے خطرہ نہیں ہے۔"

"اب اکرام کو بھی اطلاع کردو۔ وہ گھر پر ہی ہوگا۔"

"رائٹ" میں نے پھر ریسیور اٹھالیا اور کافی دیر کوشش کرنے کے بعد اکرام شیخ کا نمبر ملانے میں کامیاب ہوگیا۔

"اکرام' مبارک ہو۔ تمہاری بہن دریافت ہوگئی۔"

"کہاں؟ کوئی اطلاع ملی ہے یا..." وہ مضطرب ہوکے بولا۔

"خبر آئی ہے اخبار میں۔ سنو۔" میں نے کہا اور اسے پوری خبر پڑھ کے سنادی۔ پھر یہ بھی بتادیا کہ ہم نے صوفی کے ذریعے ان کی حفاظت کے لیے کیا بندوبست کیا ہے۔

"ویری گڈ! بہت اچھا سوچا تم نے۔ اب مجھے بتاؤ' میں کیا کروں؟ نوشہرہ چلا جاؤں' خود مل لوں۔"

میں نے کہا "کوشش کرکے دیکھو۔ گرفتار ہوجاؤ گے۔"

"اچھا میں لاہور آجاتا ہوں۔ اب میرا یہاں کیا کام ہے۔ ٹیکسی آج' ابھی بیچ کے نائٹ کوچ سے پہنچ جاؤں گا۔"

میں نے کہا "تھوڑا سا انتظار کرو۔ مجھے صوفی سے معلوم ہوجائے کہ اس نے بات کرلی ہے۔ پھر میں تم سے بات کروں گا۔"

"سکندر! یہاں انتظار کرنے کا فائدہ؟ خیریت تو مل گئی۔"

میں نے کہا "یار' فرض کرو وہ نوشہرہ سے کراچی کے لیے چل پڑے ہوں۔ اسپتال سے فرار ہونا آسان نہیں ہوتا مگر ان کے لیے ناممکن نہیں۔ غالب تو نازو کو کہتا ہی بھوت کی بچی ہے۔ مگر وہ خود بھوت سے کم ہے کیا۔ تم نہ ملے کراچی میں تو وہ کہاں جائیں گے۔ ان تک ہمارا پیغام پہنچ جائے پھر تم آجاؤ۔"

"ٹھیک ہے' تمہیں جیسے ہی کوئی بات معلوم ہو مجھے بتانا۔ میں ٹیلی فون کے پاس بیٹھا رہوں گا اور ہاں... محسن اور گُل کی بھی کچھ خبر ہے؟"

میں نے کہا "نہیں ابھی تک منظر سے تفصیلی بات نہیں ہوئی۔ ہم یہاں پہنچے تو وہ کورٹ جارہا تھا۔ اب شام کو ملاقات ہوگی۔"

میں کچھ دیر صوفی کے فون کا انتظار کرتا رہا اور لیٹ کر جاگنے کی کوشش کرتا رہا مگر تھکن اور نیند نے میری کوشش کو شکست دی۔ نہ جانے کب میں سوگیا۔ رابعہ بھی حقیقتاً سوگئی تھی ورنہ وہ کوئی بات کرتی تو شاید میں جاگتا رہتا۔

میری آنکھ شام کو منظر کے غل غپاڑے سے کھلی "اے بھائی! زندہ ہے تو اٹھ جا' مرگیا ہے تو بتادے کیسے مرا۔"

میں نے اٹھتے ہی دیوار پر لگی گھڑی کو دیکھا "چار..... چار بج گئے۔"

"چار تو روز بجتے ہیں۔ تیری صورت پر بارہ کیوں بج گئے۔"

میں نے کہا "اُف! صوفی نے فون کیا ہوگا شاید۔ فون تو مجھے کرنا تھا۔"

"کون صوفی؟ کیا گل اور محسن کا سُراغ لگانے کے لیے صوفی' درویش' قلندر اور فقیر کوئی عمل کریں گے؟"

میں نے اسے صوفی کے متعلق بتایا اور جب ٹیلی فون اٹھانے لگا تو مجھے اندازہ ہوا کہ اس کا ریسیور غلط رکھا ہوا تھا۔ میں نے بے خیالی میں ریسیور ایسے رکھ دیا تھا کہ لائن ڈس کنکٹ نہیں ہوئی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس عرصے میں کسی نے فون ملانے کی کوشش کی ہوگی تو اسے یہ نمبر انگیج ملا ہوگا۔ اکرام کے پاس یہی نمبر تھا۔ گل اور محسن کو بھی پرانا نمبر ہی معلوم تھا۔ ایسے ہی غالب اور نازو کو منظر کے نئے گھر اور نئے فون نمبر کا علم نہیں تھا۔ ان میں سے کوئی کسی بھی وقت رابطے کی کوشش کرتا تو نمبر مصروف تھا۔

میں نے افسوس سے سرہلاتے ہوئے صوفی کا نمبر ملایا "ہیلو صوفی صاحب سے بات کراؤ۔"

"صوفی صاحب چلے گئے۔"

"چلے گئے! کہاں چلے گئے؟" میں نے چلا کے کہا۔

"دیکھیے جناب' میں ٹیلی فون آپریٹر ہوں' ان کا سیکریٹری نہیں کہ وہ جہاں جائیں مجھے بتا کے جائیں۔"

"او یار' میگزین سیکشن پانچ بجے تک تو کھلا رہتا ہوگا۔ کسی دوسرے سب ایڈیٹر سے بات کرادو۔ شاید وہ کسی کو بتا کے گئے ہوں۔"

لیکن وہاں کوئی نہیں جانتا تھا کہ صوفی صاحب کہاں ملیں گے۔ کسی نے کہا کہ ایک انٹرویو کے لیے گئے ہیں۔ دوسرے نے بتایا کہ رحمان صاحب نے کوئی اسپیشل اسائنمنٹ دی ہے۔ وہ آئیں گے' نہیں آئیں گے۔ اخبار کے دفتر میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ کلرکی نہیں ہے کہ بندہ سیٹ پر ضرور ملے۔" ایک بدتمیز شخص نے کہا۔

میں نے مایوس ہوکے فون رکھ دیا۔ اب امید کا آخری سہارا یہی تھا کہ صوفی خود کہیں سے فون کرے یا مجھ سے ملنے آجائے۔ اب رابعہ بھی اٹھ گئی تھی مگر ساتھ والے کمرے میں کاجل اور کلیم اللہ گہری نیند میں تھے۔

"کھانا آگیا تھا دن میں؟" منظر نے پوچھا

میں نے کہا "کھانا ہم خاک کھاتے۔ تیری بیوی دماغ کھاگئی۔ بڑی مشکل سے جان چھڑائی اس سے۔ یار! وہ اتنا بولتی کیوں ہے؟"

"دیکھ یار! اب میں اس کو بولنے بھی نہ دوں تو یہ بڑا ظلم ہوگا اس پر۔ وہ پہلے ہی مظلوم ہے۔ اس طرح دل کا غبار نکالتی رہتی

ہے۔"

"تو سنتا رہتا ہے یا بہرا بن جاتا ہے؟"

اس نے کہا "میرے کان میں دیکھ' میل نہیں دیکھ اس سوراخ میں سے جھانک۔ دوسری طرف نظر آتا ہے نا۔ میں ایک کان سے سنتا ہوں تو دوسرے سے خود بخود نکل جاتا ہے۔ بیچ میں دماغ میں نہیں ٹھہرتا۔"

رابعہ نے کہا "محسن کا وہ خط کہاں ہے؟"

منظر نے بریف کیس کھولا اور بوسیدہ کاغذ کا ایک ٹکڑا نکال کے رابعہ کو پیش کیا۔ "دیکھ لو' خالص دودھ میں دُھلا ہوا ہے۔"

رابعہ نے وہ کاغذ مجھے پکڑا دیا مگر اس میں وہی کچھ تھا جو منظر بتا چکا تھا۔ یہ کسی کاپی سے پھاڑا ہوا صفحہ تھا اور تحریر کے نقوش باقی رہ گئے تھے مگر اس میں شک کی کوئی بات نہ تھی کہ وہ محسن کے دستخط تھے اور اسی کی تحریر۔

"حد کردی محسن نے" میں نے پھر غصّے سے کہا "بلاوجہ کا سسپنس پیدا کیا ہے۔ چند سطریں اور لکھ دیتا کہ کہاں جارہے ہیں اور کیوں۔ اس سے تو بہتر تھا کچھ بھی نہ لکھتا۔ ہم تلاش کرتے رہتے۔"

اچانک فون کی گھنٹی پھر بجی۔ میں نے لپک کے ریسیور اٹھایا "کون بول رہا ہے؟"

میں نے صوفی کی آواز پہچان لی "صوفی یار' سوری۔ میں سوگیا تھا۔"

"ریسیور نیچے رکھ کے؟" صوفی نے کہا "محاورے کو اب بدل دینا چاہیے۔ گدھے گھوڑے بیچ کر نہیں' ٹیلی فون اور کال بیل بیچ کے سونا زیادہ مناسب ہے۔ میں کب سے کوشش کررہا تھا۔"

میں نے کہا "کچھ پتا چلا؟"

"ہاں بھئی۔ بات تو ہوگئی مگر بات بنی نہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ میری اپنے نمائندے سے بات ہوئی۔ اس نے کہا کہ میں خود جا کے دیکھتا ہوں' آپ فکر نہ کریں۔ میں نے کہا کہ مجھے گھر پر بتانا' اس وقت بھی گھر سے بول رہا ہوں میں۔ تم نے دفتر فون کیا تھا؟"

"ہاں۔ کسی کو کچھ پتا نہیں تھا تمہارا۔"

"میں جان بوجھ کے کسی کو بتائے بغیر کھسک آیا تھا۔ اس نمائندۂ خصوصی نے دو بجے فون کیا اور بتایا کہ وہ نوشہرہ کے سی ایم ایچ میں تو نہیں ہیں۔"

"مگر خبر دینے والا تو وہ خود تھا۔" میں نے برہمی سے کہا۔

"ہاں۔ خبر غلط نہیں تھی۔" صوفی بولا "تمہارے دوستوں کو وہاں سے ڈسچارج کردیا گیا ہے۔"

"کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ صحت یاب ہوگئے تھے؟ اتنی جلدی۔"

"حالت زیادہ خراب نہیں ہوگی ان کی۔ ریکوری کے لیے دس دن کافی ہوتے ہیں۔ مزید یہ کہ انہیں خود ان کے اصرار پر ڈسچارج کیا گیا ورنہ ڈاکٹر چاہتے تھے کہ وہ دو دن اور آرام کریں۔ انہوں نے بڑا اچھا ٹریٹمنٹ دیا تھا۔ آفیسرز وارڈ میں رکھا تھا۔"

"کب ڈسچارج کیا گیا تھا انہیں؟"

"آج صبح دس بجے۔ یعنی اس وقت جب تم مجھے فون کررہے تھے۔" صوفی بولا "مگر ایک بات اور ہے۔ اسپتال سے وہ اکیلے نہیں گئے' کوئی آیا تھا انہیں لینے کے لیے۔ بظاہر تمہارے اندیشے بے بنیاد نہیں تھے۔ اس نے یہی کہا تھا کہ وہ غالب کا بھائی ہے۔ ہمیں ذرا سی دیر ہوگئی۔"

"او مائی گاڈ! انہیں لے جانے والا کون تھا؟ اس کا نام پتا! حلیہ۔ کسی نے کچھ پوچھا' دیکھا؟"

"میرا خیال ہے نہیں۔ جب غالب اور نازو نے اعتراض ہی نہیں کیا اور ہنسی خوشی اس کے ساتھ گاڑی میں چلے گئے۔"

"کون سی گاڑی تھی؟ گاڑی کا نمبر کیا تھا؟"

"یار' یہ کون یاد رکھتا ہے جب ضرورت ہی محسوس نہ ہو۔"

میں نے کہا "یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ ہنسی خوشی گئے تھے؟"

"بابا' وہ ملٹری اسپتال تھا۔ دروازے پر بھی پہرا ہوتا ہے۔ ہر آنے جانے والے کو نام پتا لکھوانا پڑتا ہے۔ بتانا پڑتا ہے کہ وہ کون ہے۔ وہاں سے کسی کو اغوا نہیں کیا جاسکتا گن پوائنٹ پر۔"

"یہی تو میں پوچھ رہا تھا کہ اس نے کیا نام پتا لکھوایا تھا۔ تمہارے اس خصوصی احمق نمائندے نے کیا معلوم کیا آخر؟" یہ سنا کہ غالب کو بھائی لے گیا اور فرض کرلیا کہ غالب ہنسی خوشی گیا تھا چنانچہ اس نے باقی انکوائری کی ہی نہیں۔"

"یار' وہ نمائندۂ خصوصی ہے کوئی شرلاک ہومز نہیں۔ میں مانتا ہوں کہ وہ احمق ہے مگر اس کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی مطمئن ہوجاتا۔ مجھے کیسے شک ہوسکتا تھا کہ کوئی ایسی ویسی بات ہوئی ہے۔ اسپتال میں غالب کا بھائی بن کے پہنچنے والے نے اپنا نام کبیر خان بتایا تھا۔"

میں اچھل پڑا "کیا کبیر خان؟ کوئی عورت بھی تھی اس کے ساتھ؟"

"ہاں۔ اس کی بیوی مگر تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

میں نے چلاّ کے کہا "صوفی' لعنت ہو تم پر اور تمہارے نمائندۂ خصوصی پر۔ جو بات کام کی تھی وہ تم نے آخر میں بتائی۔"

پھر میں نے ریسیور رکھ کے کہا "رابعہ! غالب اور نازو کو وہ لے گئے' محسن شیردانی اور گل۔"

"پھر وہی شیردانی۔ سالا لنگوٹی چور۔" منظر بولا "اور اس کی زوجہ گل۔ اللہ محفوظ رکھے اس کی نزاکت سے۔ کیا اُلٹے نام رکھ لیے ہیں دونوں نے۔"

"کبھی اپنے نام اور اپنی شکل پر غور کیا ہے؟" میں نے کہا' "منظر کی اولاد کون سا منظر ہے تیرے چہرے پر۔ کریہہ المنظر۔"

"وہ نوشہرہ کیسے پہنچ گئے؟" رابعہ کچھ سوچ رہی تھی۔

"اخبار دیکھ کر اور کیسے۔" میں نے کہا۔

"مگر اتنی جلدی! دس بجے صبح۔" رابعہ بولی "اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ وہ نوشہرہ میں ہی تھے۔ یا آس پاس کہ اخبار دیکھتے ہی چل پڑے۔"

میں نے سر کھجا کے کہا "رابعہ! خدا نے تمہیں عقل بھی دی ہے صورت کے ساتھ۔ جو ایک تحیّرا لعقول واقعہ ہے۔"

"تحیّرا لعقول واقعہ تو یہ بھی ہے کہ خدا نے رابعہ کے مقدر میں تجھے لکھ دیا حالانکہ دُنیا میں میرے جیسے مردانہ وجاہت اور عقل و دانش کے پیکر موجود تھے۔" منظر نے دانت نکال کے کہا۔

میں نے کہا "غالباً وہ پشاور میں تھے۔ وہاں سے نوشہرہ تک ایک گھنٹے کا راستہ ہے۔ کسی اوٹ پٹانگ جگہ پر ہوتے تو صبح صبح اخبار کہاں ملتا۔ سوال یہ ہے کہ پشاور وہ کیا لینے گئے تھے؟"

"میرا خیال ہے وہ علاقہ غیر کی جانب فرار ہورہے تھے۔ فرمودۂ اقبال پر عمل کرنے کے لیے کہ "تو شاہین ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر"" منظر بولا۔

رابعہ نے کہا "کیا یہ طے ہے کہ وہ محسن اور گل تھے؟"

میں نے رابعہ کی طرف دیکھا۔ آہستہ آہستہ میری خوشی جھاگ کی طرح بیٹھنے لگی "ایک منٹ میں تم نے دو عقل مندی کی باتیں کردیں۔ یہ غالباً عالمی ریکارڈ ہوگا۔ میرا یہ نام تو بہت سے لوگ جانتے ہیں۔ کوئی بھی استعمال کرسکتا ہے۔"

سب دوستوں کے مل جانے کی خوشی کی جگہ مایوسی نے لے لی۔ یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ غالب اور نازو کو لے جانے والے محسن اور گل بھی ہوسکتے تھے اور ہمارے پُرانے دُشمن بھی جو حالات سے فائدہ اٹھانا اور ہماری کمزوری کو اپنی شہ زوری بنانا جانتے تھے

منظر نے کہا "یار! ایسے رونی شکل بنانے سے کیا بگڑے کام بن جائیں گے۔ چلو اٹھو' اپنا نیا آشیانہ دکھاؤں تمہیں۔ میں آگے چلتا ہوں' تم میری گاڑی میں پیچھے آؤ۔"

رابعہ نے کہا "ابھی تو کاجل سو رہی ہے۔ اسے جگالوں۔"

"اوہ' اس نئی مہمان کو میں بالکل بھول گیا تھا۔ اس سے میرا تعارف بھی کرادو اتنی دیر میں۔"

جتنی دیر میں رابعہ اور کاجل نے تیاری کی' میں نے منظر کو کاجل کے بارے میں تھوڑا بہت بتادیا۔ سوائے اس کے کہ سابق سب انسپکٹر پولیس سید اکرام شیخ نے ہمارے آنے سے پہلے ہی محبت کا چالان کاٹ کے کاجل کو اسیر کرلیا ہے۔

وہ ہر بات تفصیل سے سننا چاہتا تھا مگر اس کے لیے لمبی فرصت درکار تھی اور ذہنی طور پر میں پُرسکون نہیں تھا۔ کبھی مجھے خیال آتا تھا کہ میں دلاور کو فون کروں اور اس سے پوچھوں کہ کیا گل اور محسن کو اس نے زبردستی مہمان بنالیا ہے لیکن وہ تحریر مجھے روک لیتی تھی۔ اگر وہ محسن سے زبردستی کچھ لکھواتا تو محسن کی تحریر چغلی کھاتی۔ وہ اپنے دستخط یوں بدل دیتا کہ ہمیں شک ہوجائے۔ تاہم یہ بھی حقیقت تھی کہ ان سے کچھ دیر پہلے ہی حاجی عبداللہ کراچی پہنچا تھا اور یہ ابھی تک کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کا کھٹمنڈو میں نظر آنا محض ایک اتفاق تھا یا ایک سازش کا انکشاف۔ کاروبار کے سلسلے میں وہ کہیں بھی جاسکتا تھا اور یہ بھی ہوسکتا تھا کہ اس نے سائے کی طرح ہمارا پیچھا کیا ہو مگر ہمیں علم نہ ہوا ہو۔ میں جانتا تھا کہ دلاور جیسے عیّار اور مکّار دشمن کو دھوکا دینا کتنا مشکل کام ہے۔ اُلٹا یہ ہوسکتا تھا کہ میرے سوال پر وہ جھوٹ کا جال پھیلا دے اور کہے کہ ہاں تمہارے دوست میرے پاس ہیں۔ آؤ اور لے جاؤ۔ یہی چکر مجھے حاجی عبداللہ بھی دے سکتا تھا۔

جب ہم روانہ ہوئے تو غلطی سے کاجل اس گاڑی میں بیٹھ گئی جس میں ہم کراچی سے لاہور پہنچے تھے۔ کلیم اس کے ساتھ رہا۔ بعد میں اس کی ڈرائیونگ منظر نے سنبھال لی تو میرے ساتھ رابعہ رہ گئی۔ صدر سے دھرمپورے تک ہم آگے پیچھے چلتے گئے۔ منظر کی گاڑی شاید پچاس گز آگے تھی اور میری ٹریفک میں تھی۔ ریلوے کراسنگ سے اس کی گاڑی گزری تو اچانک پھاٹک بند ہوگیا۔ رات کا وقت تھا یا منظر نے کاجل سے باتیں شروع کردی تھیں کہ اسے پیچھے دیکھنے کا خیال نہیں آیا اور وہ اس یقین کے ساتھ چلتا گیا کہ ہم پیچھے آرہے ہوں گے۔

جب ریلوے پھاٹک پھر کھلا تو ہم وہاں دونوں طرف جمع ہوجانے والی ٹریفک کے ریلے میں آگے بڑھے (مجھے منظر نے بعد میں بتایا کہ کچھ دور جا کے وہ لوٹا تو پھاٹک بند ملا تھا اور جب ٹریفک ایک ساتھ رواں ہوئی تو ہیڈ لائٹس کی چکا چوند میں وہ ہمیں نہ دیکھ سکا تھا اور ہم اسے نہ دیکھ پائے تھے۔ نتیجہ یہ کہ وہ صدر کی طرف نکل گیا تھا اور ہم گڑھی شاہو پہنچے تھے۔)

"یہ منظر کہاں نکل گیا؟" میں نے پریشانی سے کہا "بے وقوف آدمی منہ اٹھا کے چلتا گیا' پلٹ کے ہماری طرف دیکھا تک نہیں۔"

"اب ہم کہاں جائیں؟" رابعہ بولی۔

"سالے کو تھوڑا پریشان ہونے دو۔ اس کا نیا فون نمبر تو ہے نا ہمارے پاس' تھوڑی دیر بعد گھر سے بلائیں گے۔" میں نے کہا اور گاڑی کو بائیں جانب موڑ لیا۔

"چلو ٹھیک ہے مگر یہ تم کدھر چل پڑے؟" رابعہ بولی۔

"تمہارے گھر چلتے ہیں۔ ذرا تمہاری بہن سے تو مل لیں۔ دیکھیں کون چندے آفتاب ہے کون چندے ماہتاب۔"

غالباً خود رابعہ کے دل میں بھی یہ خواہش موجود تھی۔ وہ اپنے پُرانے گھر پر غاصبانہ قبضہ کرنے والوں کو دیکھنا چاہتی تھی کہ آخر وہ کون ہیں اور زمین کی اصل مالک کو رُوبرُو پا کے ان کا ردِعمل کیا ہوتا ہے۔ ہمارے سامنے منظر کی گاڑی تھی اور چاندنی بیگم یا غلام محمد

عُرف گولا ٹنڈوالا پہلوان میں سے کوئی بھی ہمیں نہیں پہچانتا تھا۔
میں نے گاڑی کو باہر روک لیا "ابھی اس کو اپنا نام مت بتانا۔ میں اور تم مسٹر اور مسز منظر ہیں۔"
"تم بتاؤ گے کہ تم عبدالودود منظر ایڈووکیٹ ہو؟ اور کیا کہو گے کہ کیوں ملنے آئے ہو؟" رابعہ بولی۔
"بس تماشا دیکھو" میں نے کہا اور کال بیل پر انگلی رکھ دی۔ ایک چوکیدار ٹائپ شخص نے چھوٹا گیٹ کھول کے جھانکا اور کار کو دیکھ کر مؤدب ہوگیا۔ میرا نام سُن کر وہ اندر گیا اور تھوڑی دیر میں لوٹ آیا۔ اس کے پیچھے چلتے ہوئے ہم ایک شاہانہ قسم کے ڈرائنگ روم میں پہنچے تو مجھے رابعہ کا پُرانا گھر یاد آیا۔ اس نئے قصرِ عالی شان کی پُرنخوت فضا میں اپنائیت کی وہ خوشبو دم توڑ چکی تھی جو اس پُرانے گھر کے در و دیوار سے نکل کے خوش آمدید کہتی تھی۔ وہ زمین اس محل کے بوجھ تلے اس طرح کراہ رہی تھی جیسے کسی طاقت کے نشے میں بدمست وڈیرے کے ہاتھوں بے آبرو ہوجانے والی غریب مزارع کی لڑکی۔ صرف میں اس کی خاموش کراہ کو سُن سکتا تھا یا رابعہ اس کے مجبور آنسو دیکھ سکتی تھی۔ وہ ظلم کے خلاف فریاد کناں تھی اور انصاف مانگتی تھی۔ رابعہ افسردہ تھی۔ اس جگہ یادوں کے مدفون خزانے تھے جن سے اچانک اس کا جذباتی ناتا ٹوٹ گیا تھا اور وہ اپنی زندگی کے ادھورے پن کا شکار ہوگئی تھی۔
میں نے غور سے آرائش کے اسباب کو دیکھا۔ ان سے دولت مندی کا غرور اور اپنی قوّت خرید کا مظاہرہ کرنے والا، ذوق جمال سے یکسر عاری تھا۔ آرائش کا حُسن دُنیا بھر کی قیمتی چیزوں کو ایک ہال میں ڈھیر کردینے سے نہیں پیدا ہوتا۔ اور ایسا عام طور پر وہی کرتے ہیں جن کے پاس دولت اچانک آجاتی ہے مگر اس کو خرچ کرنے کا سلیقہ نہیں آتا۔
میں حیران ہو رہا تھا کہ آخر کس بَل بوتے پر کسی نے پُرانی زمین پر اتنے کرّوفر کے ساتھ ایسی عالی شان عمارت کھڑی کردی۔ اس نے کیسے فرض کرلیا کہ اس کا قبضہ برقرار رہے گا اور قانون کی طاقت کو اس کی زبردستی شکست دے سکے گی۔ مال و اسباب تو خیر ہٹایا جاسکتا ہے مگر تعمیر پر اس نے جتنی دولت لُٹادی، اس کا زیاں تو ہوا۔ شاید کسی نے اسے دھوکا دیا اور اس زمین کو اپنا بتا کے جعلسازی سے بیچ دیا۔ حرام کی دولت کمانے والے احمق بہرحال نہیں ہوتے۔ وہ عام لوگوں کے مقابلے میں زیادہ ہی ہوشیار اور ذہین ہوتے ہیں۔ وہ اپنی دولت کو بھی چُھپا کے رکھتے ہیں اور قانون کو دھوکا دیتے ہیں۔ قانون کو چیلنج نہیں کرتے۔ یہاں تو یہ محل سرِعام قانون کا منہ چِڑا رہا تھا کہ کس میں ہمت ہے جو میرے وجود کو غلط ثابت کرسکے؟
رابعہ نے گھڑی دیکھ کے کہا "کیا صاحبِ خانہ تشریف نہیں رکھتے؟ دس منٹ ہوگئے۔"
"ہم صاحبِ خانہ کی اجازت کے بغیر اندر قدم رنجہ نہیں فرما سکتے تھے۔" میں نے کہا۔
"پھر ہمیں انتظار کیوں کرایا جارہا ہے؟"
"یہ بھی بڑے مگر کم ظرف لوگوں کی ایک ادائے خ
ہے۔ وہ یوں بھاگے چلے نہیں آتے جیسے بالکل فارغ بیٹھ
تزک و احتشام کے ساتھ تشریف لاتے ہیں تو ظاہر یہ کرتے
بے حد مصروف تھے۔"
"ممکن ہے کوئی چُھپ کے دیکھ رہا ہو۔"
"اندر بلانے کے بعد؟" میں نے نفی میں سر ہلایا "مگر
بات سے مجھے خیال آتا ہے کہ کہیں یہ استقبال ایک جال
ہے جو ہمیں گرفتار کرکے پولیس کے حوالے کرنے کے لیے
ہو؟"
رابعہ نے گھبرا کے کہا "پھر بیٹھے کیوں ہو، نکل چلو۔"
میں نے کہا "تم نے سنا نہیں، آنا اپنی مرضی سے ہوتا
دوسرے کی مرضی سے۔ اب پنگا لے لیا تو لے لیا۔"
"منظر کو پریشان کرنے کے لیے خود کو مصیبت میں ڈال
جواب نہیں اس عقلمندی کا۔"
اچانک پردہ ہلا اور ایک شخص اندر آگیا۔ میں نے کسی
کے بغیر اسے پہچان لیا۔ وہ اب پہلوان نہیں تھا مگر گولا
ضرور تھا۔ اس کا سر چمک رہا تھا اور اس کے کلین شیو چہر
مقابلے میں کچھ چھوٹا تھا۔ سر بڑا سردار کا، یہ تو میں نے سنا
اکثر دیکھا تھا کہ چھوٹے سر والے عقل و ذہانت میں کم تر تھے
محمد کا جسم تھل تھل کرتے گوشت کا بے ہنگم ڈھیر تھا۔
اکھاڑا چھوڑ دے مگر خوراک پُرانی رکھے تو اس کا حشر ایسا
ہے۔
غلام محمد کے پیچھے رابعہ کی منہ بولی بہن چاندنی بیگم آ
بلاشبہ اسمِ بامسمّیٰ تھی۔ اس کے آتے ہی گھر یا چراغوں میں
رہی۔ وہ حُسن و نفاست اور نزاکت کا اتنا دلفریب امتزاج
اسے ہیرا منڈی کی کراہیت انگیز فضا سے منسوب کرنا غلط لگا
ایسے ڈیل ڈول کے ساتھ گولا ٹنڈوالا نے جب حلق سے
نکالی تو وہ ایسی ہی تھی جیسے توپ کے دہانے سے گولی نکلے۔
انتہائی مضحکہ خیز باریک آواز میں کہا "اسلاماں لیں کم۔ م
محمد ہوں۔ اس گھر کاں مالک۔"
وہ ناک میں بھی بولتا تھا چنانچہ پورے جملے میں نون غنہ
رہتا تھا۔
"یہ غالباً چاندنی بیگم ہیں۔" میں نے اس سے ہاتھ ملا کے
غلام محمد کے چہرے پر سایہ سا آکے گزر گیا "جیں
جانتے ہیں؟"
میں نے کہا "ہاں۔ دیکھا تو یقیناً ہے۔ کسی محفل میں"
عام آدمی کے لیے "محفل" بے ضرر سا لفظ ہے
مطلب پارٹی کے سوا کچھ نہیں ہوتا مگر ایک طوائف کے
"محفل" رقص و طرب کا حوالہ بن جاتا ہے۔
"اب یہ میری بیویں ہیں۔" غلام محمد نے دُرشتی سے کہا، "آپ کوں چوہدری صاحب نیں بھیجاں ہوگا؟"
اسے یقیناً غلط فہمی ہوئی تھی مگر میں نے بڑی مشکل سے اپنی حیرت کے اظہار پر قابو پایا "جی۔ اور کون بھیج سکتا ہے۔"
"چوہدری دلانور نیں تو کہاں تھا...." وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا "اگر آپ اکیلیں آتیں تو اچھاں تھا۔"
چوہدری سے اس کی مراد چوہدری دلاور ہوگی، یہ میرے خواب و خیال میں نہ تھا۔ پہلی بار تو میں نے اپنے ردِعمل کو چھپا لیا تھا مگر دلاور کے نام پر میں تقریباً اچھل پڑا۔ تاہم مجھے فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہوگیا اور میں نے حیرت کے جذبات کو ناپسندیدگی اور غصّے میں بدل دیا۔
"یہ میری بیوی بھی ہے اور سیکریٹری بھی۔ اس کے بغیر میں کہیں نہیں جاتا غلام محمد صاحب۔" میں نے کہا۔
"اچھاں، اچھاں۔ خفاں ہونے کی کیا بات ہیں جیں۔ آپ کو چوہدری صاحب نے بتاں ہی دیا ہوں گا کہ معاملہ کیاں ہیں؟"
"زیادہ تفصیل سے نہیں۔" میں نے کہا "کچھ اس زمین پر قبضے کی بات تھی۔"
"کیاں؟" وہ حیران ہوکے بولا "زمین پر قبضاں؟"
میں نے اندھیرے میں تیر چلایا تھا اور وہ خطا ہوگیا تھا "آپ مالک ہیں نا اس محل کے۔ مگر یہ زمین......"
"زمین کو کیا ہوا ہے جی؟" چاندنی نے لب کھولے۔
"کچھ نہیں۔ زمین آپ کی ہے۔ آپ بہن ہیں نا رابعہ قاری کی۔" میں نے بات نبھانے کی جدوجہد جاری رکھی "وہ وکیل تھیں۔ اس کی واحد وارث آپ تھیں۔ غلام محمد صاحب نے اس پر یہ مکان بنا دیا آپ کو۔"
"اس میں اچانک شک کی بات کیسے پیدا ہوگئی جی؟" چاندنی نے بڑی ادا سے بالوں کو پیچھے جھٹکا جو پھسل کر چہرے پر آنے کے لیے بنائے گئے تھے۔
"ہاں۔ یہ کیاں بات شروں کردیں آپ نیں۔ مسلاں تو کچھ اور تھاں۔" غلام محمد نے بدتمیزی سے کہا "اور یہ مکان ہیں کہ کوٹھیں۔"
"غلام محمد صاحب! یہ نیا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا ہے۔" میں نے کہا "اور چوہدری صاحب نے کہا تھا کہ اس پر پہلے بات کرلینا۔ اب یہ مکان ہے کوٹھی یا محل، قانون کے مطابق اس کی تعمیر غلط ہوئی۔"
"تعمیر تو نقشے کے مطابق ہوئی تھی سرکار۔ اور نقشہ قانون کے مطابق پاس ہوا تھا۔" چاندنی نے مسکرا کے کہا۔
"رابعہ کی موت کے بعد۔" میں نے کہا "بالکل ٹھیک۔ کیا قانون نے آپ کو وارث تسلیم کرلیا تھا؟ وراثت کا سرٹیفکیٹ ہے آپ کے پاس؟ اور ڈیتھ سرٹیفکیٹ؟"
"بالکل ہے۔ لیکن آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں ہم سے؟"
چاندنی پریشان نظر آنے لگی۔
میں نے کہا "بات ہی پریشانی کی ہے۔ چوہدری صاحب کو میں نے بتایا کہ رابعہ زندہ ہے تو وہ مانتے نہیں تھے۔ میں نے بھی اس اطلاع کو غلط سمجھا تھا مگر...."
"مگر کیاں؟" غلام محمد کا منہ کھل گیا "رابعاں زنداں ہیں؟ کون سالاں بولتا ہیں ایساں۔ دانت توڑ دوں گاں میں اس کیں۔"
میں نے کہا "غلام محمد صاحب، غصّے ہونے سے کام نہیں چلے گا۔ آپ ذرا مجھے کاغذات دکھائیے۔ میری اطلاعات غلط بھی ہوسکتی ہیں مگر کل کو خدانخواستہ رابعہ نمودار ہوجائے تو ہمارے پاس اپنے دفاع کا بندوبست پکّا ہونا چاہیے۔"
غلام محمد کی محدود عقل جواب دے چکی تھی اور وہ احمقوں کی طرح مجھے گھُور رہا تھا یا چاندنی کی طرف ایسے دیکھ رہا تھا جیسے چوری کا مال بیچنے کی کوشش میں پکڑا جانے والا خریدار کو دیکھتا ہے۔
"قسم خداں کی یہ غلط ہوں گا چاندنی۔ تم کاں غذات لے آؤں۔"
چاندنی نے شاخِ گل کی طرح لچک کے اٹھنے کی کوشش کی اور پھر ارادہ ترک کردیا "اُف! ہمارا تو سر چکرانے لگا ہے یہ سن کے۔ ذرا تم ہی وہ فائل اٹھا لاؤ ڈارلنگ ہماری خاطر۔"
گولا ٹنڈوالا واقعی احمق تھا۔ صاف نظر آتا تھا کہ چاندنی اپنے حُسن و شباب کی جادوگری سے اس کے حواس پر قابض ہے اور اس سے اپنی بہت زیادہ قیمت وصول کررہی ہے۔ گولا ریشہ خطمی ہوکے اٹھا اور اندر غائب ہوگیا۔
"وکیل صاحب! اگر یہ سچ ہوا تو؟" چاندنی نے غلام محمد کے جاتے ہی کہا "ہمارا کیا بنے گا؟"
میں نے کہا "دیکھیے چاندنی بیگم! آپ کو فکرمند ہونے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔ آپ بُرا وقت آنے سے پہلے ہی جتنا سمیٹ لیں اچھا ہے۔ اور پھر اپنی دُنیا میں لوٹ جائیں۔ ایک دن کرنا تو یہی تھا آپ کو۔ سمجھ لیں وہ دن آگیا۔ آپ کو قدردانوں کی کمی تو نہیں ہوسکتی۔"
وہ تھوڑا سا مسکرائی "آپ کی دُعا ہے۔ ہم تو پہلے ہی مخالف تھے اس معاملے کے مگر چوہدری صاحب نے بھی کہا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ رابعہ مر کھپ چکی، اس کا والی وارث کوئی نہیں رہا۔"
میں نے کہا "آپ ابھی سے پریشان نہ ہوں۔ آخر ہم کس مرض کی دوا ہیں۔ رابعہ سچ مچ زندہ ہوکے سامنے آجائے تب بھی ہم اسے جھوٹا، جعلساز اور پاگل تک قرار دے سکتے ہیں۔ یہ کہہ سکتے ہیں کہ دُشمنوں نے شوشہ چھوڑا ہے۔ آپ کے محل پر اصل رابعہ بھی آسانی سے قبضہ نہیں کرسکتی۔ سالوں لگتے ہیں دیوانی مقدمات میں۔ اپیلوں میں عمر گزر جاتی ہے۔"

گولا ٹنڈ والا فائل بغل میں دبائے کسی چپراسی کی طرح لگ رہا تھا۔ اس نے فائل میرے سامنے پھینک دی "لوں۔ دیکھ لوں اچھیں طرح۔"

میں نے فائل کھولتے ہوئے کہا "چوہدری صاحب! ایک کپ چائے ملے گی۔ میرے سر میں درد ہو رہا ہے نہ جانے کیوں۔"

اس نے بُرا سا منہ بنایا مگر میں چاندنی کو واضح اشارہ کر چکا تھا اور وہ ذہین عورت تھی۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ میں اس سے اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔

"ہائے جان! ہم تو اٹھ بھی نہیں سکتے۔ چکر سے آرہے ہیں۔ تم ہی ذرا تکلیف کرو۔ ہمارے لیے۔" چاندنی نے بڑے پیار سے کہا۔

گولا پھر زر خرید غلام کی طرح اندر دوڑ گیا۔

میں نے کہا "چاندنی بیگم! کیا کل آپ اکیلی میرے پاس آفس میں آسکتی ہیں؟"

"کیوں نہیں۔ آفس کہاں ہے آپ کا؟ ہم آجائیں گے۔"

"بیڈن روڈ پر 'امرتسری حلوائی کے سامنے اوپر۔" میں نے کہا "شام کو آجایئے"

"شام کو کس وقت؟" اس نے اندر دیکھتے ہوئے کہا۔

"چھ بجے کے بعد۔ رات کے نو بجے تک۔" میں نے کہا، 'نیچے میرے نام کا بورڈ آپ کو نظر آجائے گا۔ عبدالودود منظر۔"

"جی ... عبدل ... کیا۔ خیر...... ہم تو منظر کہیں گے جی۔" وہ ٹھلا کے بولی "اتنا مشکل نام کیوں رکھ لیا آخر آپ نے؟"

"بس مشکل پسندی مزاج میں شامل ہے۔ یہ فائل میں لے اوں اگر آپ اجازت دیں۔"

"ہم اجازت دیں! اجی وکیل صاحب۔" اس نے ایسے سُریلے اور شیریں لہجے میں کہا کہ رابعہ نے خاصا بُرا مانا۔ اس کے نداز بالکل وہی تھے جو کسی بازاری عورت کے ہوسکتے ہیں مگر اس کے اطوار میں ایک لطافت اور نفاست آگئی تھی جس سے وہ نچلے رجے کی طوائف نہیں رہی تھی اور اشراف و اُمراء کے طبقے میں پنے قدم جما چکی تھی۔ گولا ٹنڈ والا سے پہلے بھی اس کے پرستار اور س کے حُسن و شباب کے خریدار ایسے ہی لوگ رہے ہوں گے جو خاندانی حسب نسب چاہے نہ رکھتے ہوں' مال و زر سے شرافت اور زت کی سند حاصل کر کے معاشرے میں معزز و معتبر ہوگئے تھے۔ س کی نظر میں ہروقت ایسے حُسن پرست اور ہوس کے شکاری رہتے ہوں گے جن کو ضرورت پڑنے پر اپنے حقوقِ ملکیت منتقل کیے جاسکتے ہوں۔ غالباً اس فہرست کے آخر میں اس نے میرا نام لکھ لیا تھا۔

گولا ٹنڈ والا پھر اندر آکے بیٹھ گیا۔ وہ کچھ مضطرب اور بے چین نظر آتا تھا "میں نے چائیں کیں لیٹیں کہہ دیاں ہیں۔" وہ لنگنایا۔

میں اٹھ کھڑا ہوا "لیکن اب میرے سر کا درد ٹھیک ہوگیا ہے اور میرا موڈ چائے پینے کا نہیں رہا۔"

چاندنی ہنسی "تو کچھ اور پی لیں۔"

میں نے مسکرا کے کہا "دردِ دل کی دوا ہوگی؟"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی "وکیلوں کے پاس بھی دل ہوتا ہے، نے تو آج ہی جانا۔ کبھی دوا بھی کردیں گے۔" اس نے اٹھ کے ہاتھ بڑھایا۔

گولا ٹنڈ والا اب برداشت نہ کرسکا "چاندنی! اب چکر نہیں آرہے تمہیں؟"

میں نے چاندنی کے ہاتھ کو نزاکت سے تھام لیا "ہم بھی دیکھیں گے آپ کا اعجازِ مسیحائی، جب دل دکھائیں گے۔"

رابعہ نے مجھے قہر آلود نظروں سے گھورا "ہارٹ اسپیشلسٹ خود عشق کے روگ کا ای سی جی سے اندازہ کرلیتے ہیں۔"

گولا ٹنڈ والا کچھ نہیں سمجھا تھا مگر چاندنی کی اور میری نظروں کو پہچان گیا تھا چنانچہ وہ بہت جزبز تھا "یہ فائل کہاں لیں جارہے ہوں؟"

چاندنی نے اس کے کندھے پر سر رکھ دیا "فائل ہم سے پوچھ کے لے جارہے ہیں لیکن ہم سے پوچھے بنا کیا لے جارہے ہیں، ہم جانتے ہیں۔"

رابعہ نے برہمی سے میرا ہاتھ پکڑ کے کھینچا "چلیے۔ بہت باتیں ہوگئیں ان کے کام کی۔ اور بھی کام ہیں۔"

چاندنی نے اسے ناگواری سے دیکھا۔ جیسے پوچھنا چاہتی ہو تم کیا مجھے چیلنج کررہی ہو؟ میرے مقابلے پر آکے دیکھو۔ تم بیگم ہو یا بیوی، میری قوتِ تسخیر کا خود اندازہ کرلو تو اچھا ہے۔

"چاندنی، ایسیں ہر ایک کوں فائل نہیں دیں، جانچیں آنکھیں بند کرکیں اعتبار کرلیاں۔"

"وہ تو ہم نے تم پر بھی کیا تھا۔" اس نے نشیلی آواز میں آنکھیں اٹھا کے کہا۔

گولا ٹنڈ والا نہیں چاہتا تھا کہ ہم وہ فائل لے جائیں مگر چاندنی کی مرضی کے خلاف وہ کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ اس کی تھوڑی سی عقل اور قوتِ مزاحمت چاندنی کے عشوہ و غمزہ و ادا کے ایک وار میں خلاص ہو جاتی تھی۔ مجھے اس کے تیور کسی خطرے کی خبر دیتے تھے اور اب میں جلد از جلد وہاں سے رخصت ہو جانا چاہتا تھا مگر ایسے نہیں کہ فرار کا شبہ ہو۔

"میں نے چوہدری صاحب کو فون کیاں تھا۔ وہ بھی آرہا۔ تھے۔" غلام محمد رلا۔

اس وقت تک میں دروازے تک پہنچ گیا تھا۔ ایک بار پلٹ کے میں نے کہا "کل چودھویں کی رات ہوگی۔ چاندنی نا؟"

"چاندنی کو کون روک سکتا ہے جی۔" وہ سرور میں ہنسی کہ اسے یقین تھا کہ وہ مجھ پر اپنی اداؤں کا جادو چلانے میں کامیاب ہوچکی ہے۔ اور عورت کو فتح کے غرور کا نشہ بہت عزیز ہوتا ہے۔

میں اپنی گاڑی میں بیٹھنے تک پُر سکون رہا حالانکہ اندر سے میرا خوف سے بُرا حال تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ ابھی کسی لمحے کوئی گاڑی میرا راستہ روک لے گی اور اس میں سے اُتر کے چوہدری دلاور میرا راستہ روک لے گا۔ تو یہ آپ کی مسخرے پن کی عادت گئی نہیں ابے سکندر صاحب۔ خیر سے اب آپ وہ ہوگئے۔ عبدالودود منظر۔ واہ بھئی واہ۔

گاڑی موڑتے ہی میں نے ایکسیلیٹر دبا دیا "اُف کیسے بال بال بچے۔"

"بال بال بچے یا بال بال میں جکڑے گئے اس کی ناگن جیسی زُلفوں کے۔" رابعہ نے بگڑ کے کہا "دردِ دل تو بہت بڑھ گیا ہوگا۔"

مجھے بے اختیار ہنسی آگئی "کمال ہے۔ میں تو سمجھتا تھا کہ تم عام، جاہل عورتوں جیسی باتیں کرنا جانتی ہی نہیں۔"

"اس قدر اوور ہونے کی کیا ضرورت تھی؟" رابعہ نے خفت سے کہا "ایسی گھٹیا، بازاری ادائیں تھیں اس کی۔"

میں نے کہا "تم حسد سے کباب ہو رہی ہو۔ بے شک وہ عورت کسی کی داشتہ تھی مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ حسین تھی اور اپنے حُسن کی طاقت سے کام لینا جانتی تھی۔"

"تمہارا کام تو تمام کردیتی اگر میں ساتھ نہ ہوتی۔"

"غلام محمد عُرف گولا ٹنڈ والا بھی خدا نے کیا چیز بنائی ہے۔" میں نے کہا "سب کچھ دے دیا۔ خدا نے بس تھوڑی سی عقل نہیں دی۔"

"اب میں کہوں کہ تم حسد سے کباب ہو رہے ہو پھر؟ ذرا دیکھو اس کے پاس کیا نہیں ہے۔ یہ محل اسی نے کھڑا کیا ہے اور چاندنی اسی کے آنگن میں اُتری ہے۔"

"مگر یہ بھی تو دیکھو کہ چاندنی اسے کس طرح لوٹ رہی ہے۔ پیسہ کمانے کے لیے عقل کا ہونا اب شرط نہیں رہا۔ ایسے دھندے بہت ہیں جن میں آدمی راتوں رات بھی لکھ پتی بن جاتا ہے۔ ان کی قسمت ساتھ نہ دے تو وہ سلاخوں کے پیچھے نظر آتے ہیں ورنہ چاندنی کے ساتھ۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ اسے دلاور نے بھی اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ تمہاری زمین اسے بیچ دی، یہ یقین دلا کر کہ کچھ نہیں ہوگا۔ پیسہ اس کا لگا مگر پریشانی ہمارے لیے پیدا ہوگئی۔ چاندنی کا کیا ہے، وہ کل کسی اور کو شکار کرلے گی۔ پیسہ غلام محمد کا ڈوبے گا۔ دعوے ہم دائر کرتے پھریں گے اور دلاور محض تماشا دیکھے گا۔ ہماری پریشانیوں میں اضافہ کرنے کے لیے غلام محمد کو قانونی طور پر گمراہ بھی کرتا رہے گا اور تھپکی بھی دیتا رہے گا کہ چڑھ جا بیٹا سولی، رام بھلی کریں گے۔"

"اگر اس میں چوہدری دلاور بھی ملوث ہے تو شاید یہ اتنا سیدھا سادا، قانونی مسئلہ نہ ہو جتنا تم سمجھ رہے ہو۔" رابعہ بولی۔

"تم نے ٹھیک سوچا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کے ذہن میں کوئی اور خطرناک اسکیم ہو جس کا ابھی اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ منظر سے مشورہ کریں گے۔"

"پہلے اسے فون تو کرو۔ وہ پریشان ہوگا۔"

میں نے کہا "وہ پریشان ہونے والا آدمی نہیں ہے۔"

"یہ مت کہو۔ کیا وہ ہمارے لیے بھی پریشان نہیں ہوگا؟ بس وہ اپنی پریشانی کو ظاہر نہیں ہونے دیتا۔"

میں نے ایک جنرل اسٹور سے اسے فون کیا تو وہ گھر پر نہیں تھا۔ وہ کاجل کو گھر چھوڑ کے پھر ہماری تلاش میں نکلا تھا۔ اس کی بیوی نے اپنی زبان کی قینچی چلانی شروع کی اور دس منٹ بعد آخرکار میں اس سے پتا حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ پتا سمجھاتے ہوئے اس نے ہر سڑک، ہر سڑک کے ہر موڑ، اس کی ہر نشانی اور ہر نشانی کے بارے میں تفصیلی معلومات فراہم کرنا ضروری سمجھا تھا۔

آخری نشانی ایک ٹیلر کی دُکان تھی جس کے بارے میں اس نے کہا۔ بڑی منحوس شکل والا لڑکا مالک ہے اس کا لیکن خود کو سمجھتا ہے دلیپ کمار۔ ہے بھی بڑا آوارہ مزاج۔ ایسے ہی لوگ لیڈیز ٹیلر بنتے ہیں یا پھر چوڑیوں کی دُکان کھول کے بیٹھ جاتے ہیں۔ بے غیرت کہیں کے! اور کپڑے سینا تو اسے خاک نہیں آتا۔ بورڈ پر لگا رکھا ہے "ہالی ووڈ اسپیشل لیڈیز ٹیلر"۔ کیا سی کردیتا ہوگا یہ ان انگریز فلم والیوں کو۔ ان کے پاس پہننے کو ہوتا ہی کیا ہے۔ بے حیا کہیں کی۔ بالشت بھر کپڑے میں تو سوٹ بنالیں۔ مگر بھیا مجبوری یہ ہے کہ قریب میں اور کوئی درزی نہیں۔ اسی لائن میں ساتواں مکان ہے۔ باہر سے رنگ..."

میں نے فوراً کہا "بس میں سمجھ گیا" اور ریسیور رکھ دیا ورنہ وہ مکان کے رنگ، نقشے، ساخت اور حُسن و قبح کے بارے میں بات کرنے لگتی۔ آدھے گھنٹے بعد میں نے مکان تلاش کرلیا۔ ہمارے استقبال کے لیے منظر پہلے سے موجود تھا۔

"آگئے لیلیٰ مجنوں دشت نوردی کرکے؟" اس نے شور مچانا شروع کیا "اب کہو گے راستہ بھول گئے تھے۔ ابے میرے پیچھے چلتے چلتے کیسے بھٹک گئے راستے سے؟ بس تم بھٹکنا چاہتے تھے۔ تمہارا تو باپ بھی بھٹک گیا تھا ورنہ وہ میرے جیسے لائق فائق اور قابلِ فخر بیٹے کا باپ ہوتا۔ بھٹکنا تمہارا خاندانی کام ہے۔ سالے اتنا بھٹک کے آئے ہو۔ ابھی دل نہیں بھرا دھکے کھانے سے۔"

میں نے کہا "تو خود چپ ہوگا یا میں کروں؟"

منظر نے فریادی نظروں سے بیوی کو دیکھا "بیوی! میں نے کچھ کہا ہے ان کو؟ تم اپنے ایمان سے کہو، ان کی جگہ میں ہوتا..."

"تم ہوتے تو لوٹ کے گھر ہی نہ آتے۔" اس کی بیوی نے ہماری حمایت پر کمر کس لی "میں کہتی ہوں، تم نے خیال کیوں نہیں رکھا ان کا۔ تم کدھر دیکھ رہے تھے آخر؟ کسے دیکھ رہے تھے؟"

رابعہ اور میں ہنسنے لگے۔ دوسرے کمرے میں ان کے سارے بچے چیخ پکار میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش میں مصروف تھے۔ سب سے کم عمر صرف گلا پھاڑ کے رو سکتا تھا۔ کسی کمرے میں پوری آواز سے ٹی وی چل رہا تھا۔ ادھر میاں بیوی کے

درمیان جنگ چھڑ گئی تھی۔ گھر میں ایک شورِ محشر برپا تھا۔

میں نے موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے گھر کو ملاحظہ کیا۔ یہ اس کے پُرانے گھر سے واقعی بہت بڑا گھر تھا۔ کاجل اس پُررونق گھر میں آکر خوش ہوگئی تھی۔ وہ اور کلیم' بچوں کے ساتھ ایک ہال جیسے کمرے میں بیٹھے تھے۔ ہال کے فرش پر قالین تھا اور اس میں سارے بچے سوتے تھے' پڑھتے تھے' لڑتے تھے اور وہ سب کچھ کرتے تھے جو بچے کرتے ہیں۔ وہ کاجل کو اپنی اپنی چیزیں دکھا رہے تھے۔ گیم' کتابیں اور کامک۔ کاجل ان کے درمیان بیٹھی سب سے متعارف ہورہی تھی اور غالباً اپنی باتوں کی وجہ سے خاصی مقبول ہوچکی تھی۔ بچے بار بار اس کی کسی بات پر زور سے ہنستے تھے۔

جب میں لوٹ کر اسی کمرے میں آیا تو رابعہ کی فائل منظر کے ہاتھ میں تھی اور وہ اس کی ورق گردانی کر رہا تھا۔

"ان کی تو ایسی تیسی۔ اس گولے ہنڈوالے کو میں نے زمزمہ میں رکھ کے توپ کے گولے کی طرح نہ چلا دیا تو منظر نام نہیں۔ اتنی۔ دھاندلی' ایسا حرامی پن۔ محل بنالیا۔ چاندنی کی اولاد۔"

میں نے کہا "اندھے! تجھے پہلے کچھ نظر نہیں آیا۔ اب بول رہا ہے۔"

"خدا کی قسم' میں ادھر سے نہیں گزرا ورنہ ضرور دیکھتا۔ میں تو جب اس جگہ سے گزرتا تھا تو فاتحہ پڑھ لیتا تھا۔" منظر بولا "کسی مزار کی طرح ہوگئی تھی وہ جگہ میرے لیے۔"

رابعہ ہنسی "میرا مزار بنادیا ابھی سے۔ ابھی تو میں زندہ ہوں۔"

"زندہ؟ ارے کہو' ابھی تو میں جوان ہوں۔ بھئی خدا تمہیں ایسے ہی سدا بہار رکھے۔ آخر یادوں کے مزار بھی تو ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا "منظر صاحب! یہ دلاور نے کوئی نیا کھیل کھیلا ہے ہمارے ساتھ۔"

"تھوڑی دیر اور وہاں رک جاتے تو اسی سے پوچھ لیتے۔ رابعہ نے بتایا ہے کہ اس گنجے نے فون کردیا تھا۔ چہ خوب! ایک جوڑے نے اپنی آمد کا اعلان اخبارات کے ذریعے کردیا۔ دوسرا خود جا پہنچا بتانے کہ ہم آگئے' اب کرلو جو کرنا ہے۔ آخر اتنی جلدی کیا تھی؟"

میں نے کہا "یار' اتنا بڑا کام کر دکھایا ہم نے۔"

"کام تو سولہ آنے پکّا کیا ہے۔ اس میں سب کچھ ہے۔" منظر بولا "رابعہ کی موت کا سرٹیفکیٹ........"

اس کی بیوی جو کھانا لگا رہی تھی' ایک دم چلّائی "اجی کیا واہی تباہی بک رہے ہو۔ مریں رابعہ کے دُشمن۔"

"دیکھ سکندر! تجھے بدُعائیں دے رہی ہے۔ تو خود نمٹ اس سے۔" منظر بولا۔

اس کی بیوی نے آتے جاتے مزید کچھ ارشاد کیا مگر منظر اس فائل کے مطالعے میں غرق رہا۔ اس میں ڈ۔تھ سرٹیفکیٹ کو بنیاد بنا کے وراثت نامہ حاصل کیا گیا تھا۔ ڈ۔تھ سرٹیفکیٹ جعلی تھا یا رابعہ نام کی کسی عورت کی موت کے بعد حاصل کیا گیا تھا۔ ممکن ہے دلاور نے کسی سے مل ملا کے یہ کام کرایا ہو۔ ورثا کو آمادہ ہو کہ وہ رابعہ کی ولدیت بدل کے اصل رابعہ کے مطابق کر... اس کے کسی آدمی نے قبرستان میں خود اندراج کیا۔ ایک... امکان اس کا بھی تھا کہ کسی رابعہ کے باپ کا نام بھی محمد علی... اصل رابعہ کے والد کا نام بھی تھا۔ اس سرٹیفکیٹ کو داخل کر... چاندنی نے حقِ وراثت حاصل کیا اور زمین کی منتقلی وغیرہ... قانونی کام ہماری عدم موجودگی میں کرلیا گیا۔ "اطلاع عام" عنوان سے شائع ہونے والے اشتہارات عام آدمی تو نہیں پڑ... وکیل پڑھتے ہیں۔ ویسے بھی زمین کی کاغذات کی حد تک منتقلی... خفیہ رکھا جاسکتا تھا۔ ہمارے ہوتے اس پر تعمیر ناممکن تھی۔

"اصل فائل کو مَیں رکھوا دیتا ہوں بینک لاکر میں۔ نقل... شدہ نقول اپنے پاس رکھیں گے۔"

میں نے کہا "یار منظر! میرا تو خیال ہے کہ نقل ابھی... جائے اور فائل کو یہاں نہ رکھا جائے۔"

منظر ہنسا "تو سمجھتا ہے ان میں اتنی ہمت ہے کہ میرے گھر... گھُس کے فائل لے جائیں۔ وہ اتنے احمق نہیں ہیں احمق... فائل میں ایسی کون سی دستاویز ہے جو سرکاری ریکارڈ میں نہ... ہوگی؟ صرف اس فائل کی بنیاد پر تو ان کا قبضہ برقرار نہیں... سکتا۔"

میں نے کہا "یہ بھی ٹھیک ہے۔"

رابعہ نے کہا "میں وقار یوسف کو بلا لیتی ہوں۔ اس... ملاقات بھی ہوجائے گی اور فائل آفس میں پہنچ جائے گی۔"

رابعہ نے اپنے آفس کا نمبر ملایا "کون وقار! میں رابعہ بو... رہی ہوں۔ ارے رابعہ قاری اور کون۔" وہ ہنسنے لگی "کیا ہوگیا... تمہیں۔ اتنے بوکھلا کیوں گئے ہو۔ بھئی' میں ہمیشہ کے لیے تو نہیں... تھی۔ لوٹ کر تو آنا ہی تھا ایک دن۔ یا نہیں آنا چاہیے تھا مجھے... ہاں میں بالکل ٹھیک ہوں' بالکل خیریت سے ہوں۔ سنا ہے تم نے... بسالیا ہے۔ بھئی اتنی جلدی کیا تھی۔ ہمارے آنے کا انتظار نہیں... کرسکتے تھے؟ نہیں۔ چلو پھر مبارک ہو۔ منظر بہت تعریف کر... تھے تمہاری۔ تم نے میری عدم موجودگی میں سارا کام سنبھالا... بہت اچھا سنبھالا۔ میں واقعی تمہاری احسان مند ہوں۔ بہت... وفادار دوست تھے اس زمانے میں جنھوں نے واقعی ساتھ دیا... ان میں ایک تم ہو۔ اچھا کیا کر رہے ہو اس وقت؟ آفس بند کر... کا وقت تو ہوگیا۔ تم ایسا کرو' آفس بند کرکے منظر صاحب کے گھر... آجاؤ۔ ہاں میں وہیں ملوں گی۔ تم سے ایک بہت ضروری... ہے۔"

وہ کچھ دیر سنتی رہی اور مسکراتی رہی "اچھا اچھا' پھر تم یوں... کہ پہلے گھر جاؤ' اپنی دُلہن کو ساتھ لو اور منہ دکھائی کے لیے... ساتھ یہاں لے آؤ۔ بھئی باہر کھانے کا وعدہ کیا تھا نا۔ کوئی وعدہ... خلافی کہاں ہوگی' اگر منظر کے گھر میں کھالو گے۔ آخر وکیل ہو... قانونی نکتے پر بیوی کو بھی قائل نہیں کرسکتے؟ ٹھیک ہے ہم انتظار... کرلیں گے کھانے پر۔"

کھانا لگ گیا تھا مگر اب وقار یوسف کا انتظار لازمی تھا۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ آرہا تھا۔

"کہہ رہا تھا' بیوی بہت مارے گی باجی۔ میں نے وعدہ کیا تھا کہ آج ضرور باہر کھانا کھانے چلیں گے۔ اس کے سر کی قسم کھائی تھی۔ روز دیر ہوجاتی تھی واپسی میں۔" رابعہ ہنسنے لگی۔

"بیچارا!" منظر آہ بھر کے بولا "آدمی سے شوہر بن گیا۔ میرا تو خیال ہے نکاح کے وقت دُلہا کے سر پر اتنا بڑا سہرا باندھتے ہیں' اس پر ایک لوح بھی لگادینی چاہیے کہ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔ بہت لوگ عبرت پکڑیں گے۔"

میں نے کہا "عبرت پکڑنے والے پہلی فرصت میں شادی بھی کرلیں گے۔"

منظر کی بیوی اب بچوں کو کھانا کھلانے میں لگ گئی تھی تاکہ ہم بعد میں سکون سے کھانا کھالیں۔ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ منظر کی بیوی نے کہا "لو جی' پتا نہیں کون ہے۔ سکندر کو پوچھ رہا ہے۔"

یہ اعلان بم کے دھماکے سے کم چونکانے والا نہیں تھا۔ ایک لمحے کے لیے ہم سب ساکت بیٹھے ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھتے رہے۔

پھر منظر بولا "یار' یہ انہی میں سے کوئی ہوگا۔ محسن لنگوٹیا یا ہرجاغالب۔ کہیں سے معلوم کرلیا ہوگا میرا نیا نمبر۔"

میں نے ریسیور لے لیا "ہیلو' کون بول رہا ہے؟" میں نے آواز بدل کے کہا۔

ایک اجنبی آواز نے کہا "ہم ہیں جی۔ آپ کے غلام۔"

میں نے کہا "میں سارے غلام آزاد کرچکا ہوں۔ اب صرف کنیزیں رکھتا ہوں۔"

وہ قہقہہ مار کے ہنسا "اب یقین آگیا کہ تم سکندر ہی ہو۔ آواز بدل سکتے ہو' مسخرے پن کی عادت تو نہیں چھوڑ سکتے۔"

مجھ سے غلطی ہوگئی تھی۔ میں نے منظر کو ہاتھ سے اشارہ کیا اور اس نے سمجھتے ہوئے دوسرے کمرے میں جاکے ایکس ٹینشن کا ریسیور اٹھالیا۔ اب وہ بھی ہماری گفتگو سُن سکتا تھا۔ مجھے شک تھا کہ وہ دلاور ہی ہے جو آواز بدل کے بول رہا ہے مگر ابھی تک اس کا ثبوت نہیں ملا تھا۔ دلاور کے بولنے کا اپنا مخصوص انداز تھا۔ وہ مخصوص الفاظ اور جملے استعمال کرتا تھا مگر اس چالاک آدمی نے آواز بدلتے وقت یہ خیال بھی رکھا تھا کہ وہ طرزِ تخاطب سے نہ پہچانا جائے۔

میں نے کہا "کیا تم اپنی پہچان بتاتے ہوئے ڈرتے ہو یا تمہیں اس کی اجازت نہیں ہے؟"

وہ بولا "سکندر! میں محسن بول رہا ہوں۔"

"بکواس کرتے ہو تم۔" میں نے کہا "میں جانتا ہوں تم کون ہو۔"

"تو پھر بتادو میں کون ہوں اور ایک بہت بڑی شرط جیت لو۔"

میں نے کہا "کیسی شرط؟ میں نے کون سی شرط لگانی ہے تم سے۔"

"میں لگا رہا ہوں۔ اگر تم نے بوجھ لیا کہ میں کون ہوں تو تمہاری ایک چیز تمہیں واپس کردی جائے گی جو اس وقت ہمارے قبضے میں ہے۔"

"تم اس زمین کی بات کررہے ہو جس پر ایک احمق نے ایک طوائف کو محل کھڑا کردیا ہے تو یہ سمجھ لو کہ شرط میری طرف سے ہے۔"

"میں تو زمین کی بات نہیں کررہا تھا۔ زمین کا کیا ہے' آج تیری کل میری۔ زمین بھی تو طوائف ہی ہے۔"

میں نے کہا "تمہارے لیے ہوگی۔ ورنہ زمین آدمی کی عزت ہوتی ہے۔ زمین ہی سب کا پیٹ بھرتی ہے' زمین ہی آدمی کی شناخت بنتی ہے اور آخرکار زمین ہی آدمی کو پناہ دیتی ہے۔ ممکن ہے تمہارا پیٹ کوئی طوائف بھرتی ہو' تمہاری شناخت کوئی طوائف ہو اور تمہاری پناہ بھی...."

"ویری گڈ! اچھی تقریر کی تم نے مگر کام کی بات پھر بھی نہیں کی۔ سنو سکندرِ اعظم کی اولاد۔ ہم سے پنگا مت لو۔ ہم تمہیں ایک موقع اور دینا چاہتے ہیں۔ جیو اور جینے دو۔ ورنہ...." اس نے ایک اشتعال انگیز بات کی۔

"میں تمہیں جینے نہیں دوں گا سؤر کے بچے۔ اگر میں نے تمہیں کتے کی موت نہ مارا تو...."

اس نے ایک قہقہہ لگایا "رسّی جل گئی مگر بَل نہیں گیا۔ ہار کے تو لوٹے ہو پھر کیوں ہارنا چاہتے ہو؟"

"ہار جیت کا فیصلہ کرنا ہے تو سامنے آکے کرو۔"

"یہ بھی ہوجائے گا۔ مگر تم اکیلے کب تک لڑو گے؟ کس کس سے لڑو گے؟ تم مجھے نہیں جانتے۔"

"تم دلاور ہو' میں جانتا ہوں۔" میں نے آخرکار وہ بات کہہ دی جو میں کہنا نہیں چاہتا تھا۔

"نہیں سکندر۔ میں تمہارا دُشمن ہوں' دُشمن کا کوئی نام نہیں ہوتا' کوئی چہرہ نہیں ہوتا۔ وہ صرف دُشمن ہوتا ہے۔"

اب مجھے اس کی آواز کچھ جانی پہچانی محسوس ہورہی تھی۔ وہ دلاور نہیں تھا۔

"تمہاری فوج بھی میری قید میں ہے۔"

پہلے میں سمجھا کہ وہ پاکستانی فوج کی بات کررہا ہے مگر وہ مجھ پر طنز نہیں کررہا تھا۔ وہ شاید محسن یا غالب کی بات کررہا تھا۔

"میری فوج؟"

"لیس چیف۔ کے ٹو۔ تمہاری فوج۔" اس نے قہقہہ لگایا۔ اس کے ساتھ ہی لائن کٹ گئی۔ میں فون کا ریسیور ہاتھ میں تھامے بیٹھا رہ گیا۔

منظر نے میری صورت کو غور سے دیکھا "کیا بھوک سے تیرا دم نکلنے والا ہے؟ میں کہتا ہوں بیوی سے کہ فوراً کھانا لگادے ورنہ ایک مہمان تو گیا۔"

میں نے کہا "نہیں یار! یہ بات نہیں۔"

رابعہ نے کہا "کس کا فون تھا؟"

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔" میں نے پریشانی سے کہا "پتا نہیں کون تھا۔ کہتا تھا کہ تمہاری فوج میرے قبضے میں ہے۔"

"اس سے کہتا تھا کہ بھائی ابھی تو شادی بھی نہیں ہوئی۔ فوج ہوگی دس بیس سال بعد۔ اگر اللہ نے اور اس کے بعد گھر والی نے چاہا تو۔ ابھی تو سپہ سالار ہے اور سپہ سالاری ہے۔"

میں نے جھلا کے کہا "کس سے کہتا یہ سب۔ اس نے تو بات ختم کرتے ہی لائن کاٹ دی تھی۔ اکیلا ہی بولتا رہتا۔"

منظر نے سنجیدہ ہو کے کہا "یار! ایسی بات تیرے پھپھڑ۔ چوہدری دلاور کے سوا کوئی نہیں کرسکتا۔ اس سے بڑا حرامی کوئی ہے اس وقت کرۂ ارض پر۔"

میں نے نفی میں سرہلایا "نہیں یار۔ وہ دلاور نہیں ہوسکتا۔ میں تو آواز پہچانتا ہوں اس کی۔"

"نور چشم! اس کی آواز آخری بار کب سُنی تھی تم نے۔ کچھ یاد ہے؟" منظر بولا۔

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"فرق پڑجاتا ہے بیٹے۔ اس تمام عرصے میں جو تم نے پاکستان ست بھارت اور بنگلہ دیش پر لشکر کشی میں گزارا، تمہارے کانوں نے صرف بھیانک آوازیں سُنی ہوں گی۔ گولیاں چلنے کی آوازیں، مشین گن کی تڑتڑ، بموں کے دھماکے۔ سماعت ضرور متاثر ہوئی ہوگی تم سب کی۔"

میں نے کہا "میری سماعت میں کوئی فرق نہیں پڑا۔"

"فرق پڑا ہوگا بیٹے مگر تمہیں احساس نہیں۔ ابھی کچھ دن ایسا ہی ہوگا کہ کسی نے زور سے دروازہ بند کردیا تو چیخ مار کے اچھل پڑو گے کہ بم کا دھماکا ہوا تھا اور وہ جو شاعرانہ زبان میں کہتے ہیں نا۔ ہنسی کی جلترنگ، وہ تمہیں مشین گن کی آواز لگے گی....."

"یار! کیا فضول بک بک لگا رکھی ہے۔ میں جو کہہ رہا ہوں کہ وہ دلاور نہیں تھا۔ وہ آواز بدل سکتا ہے مگر اپنا بات کرنے کا انداز تو نہیں بدل سکتا۔"

منظر نے ایک آہ بھری "تاز و انداز بھی بدل جاتے ہیں پیارے، آپریشن سے جنس بھی بدل جاتی ہے۔ اور دلاور کو کیا سمجھتا ہے تو۔ اتنا بڑا اداکار اور صداکار ہے....."

دروازے کی گھنٹی بجی تو منظر کی بات نامکمل رہ گئی۔ وہ دروازے تک گیا اور واپس آیا تو اس کے ساتھ رابعہ کا پرانا وفادار ماتحت اور ساتھی وکیل وقار یوسف اپنی نئی نویلی، شرمیلی دلہن کے ساتھ تھا۔

"لو بھئی! آج کے مہمانِ خصوصی آگئے" منظر نے اعلان ک

وقار یوسف کا چہرہ رابعہ کو دیکھتے ہی مسرت سے کھل

"رابعہ باجی! مجھے بالکل یقین نہیں آرہا ہے اپنی آنکھوں پر کہ آپ ہیں۔"

"میرا چشمہ لگا کے دیکھو۔ اس سے تو روح بھی نظر آجاتی منظر بولا۔

رابعہ نے کہا "وقار! پہلے اپنی دلہن سے تو ملواؤ۔"

"ملوانا کیا باجی! انجم سب کو جانتی ہے۔ اتنا ذکر ہوتا تھا آ کا" وقار نے جوش سے کہا "آپ سے مراد آپ سب کا۔ کو بخت صاحب کا، محسن اور غالب کا۔"

"ذکر تو ہمارا نہ جانے کہاں کہاں ہوتا تھا۔ اخباروں سے کران اشتہاروں تک جن میں ہمیں مفرور مجرم قرار دیا گیا تھا" نے کہا۔

"مجھے بڑا شوق تھا آپ سب سے ملنے کا۔ یہ تو ہر وقت آ یاد کرتے رہتے تھے۔ پرانی باتیں سُناتے رہتے تھے" وقار کی نے کہا۔

منظر نے کہا "دل کے مایوسی ہوئی ہے تو ڈرو نہیں، ما بتادو۔"

انجم مسکرائی "یہ بالکل ویسے ہی ہیں جیسا میں سمجھتی تھی۔ باقی لوگ کہاں ہیں؟"

"دیکھو دلہن! تمہارے انتظار میں ہم سب فاقے سے تھے۔ پہلے کھانا، پھر باقی باتیں" منظر بولا "ایسا نہ ہو، باتوں باتوں ایک دو بندے لڑھک جائیں۔ صورت دیکھو ان کی، بالکل ہڑتالی لگتے ہیں نا؟"

کھانے کے دوران رابعہ نے کہا "وقار! تمہارے انتخاب داد نہ دینا زیادتی ہوگی۔"

انجم شرمانے لگی۔

وقار یوسف نے آہ بھری "ہر جگہ یہی کہا جاتا ہے۔ میرے انتخاب کی تعریف کرتے ہیں۔ میں تو جیسے تعریف کے ق ہی نہیں رہا۔"

منظر نے اسے تسلی دی "یہ دنیا کی ریت ہے عزیزم۔ شا سے پہلے ہم بھی ہیرو تھے۔ ساری خوبیاں تھیں ہم میں۔ لاکھوں ایک شمار ہوتے تھے۔ جدھر جاتے تھے ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے عقد نے ہم کو نکما کردیا..... ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے۔ اب کھونٹے سے بندھے ہوئے بیل ہیں۔"

"اجی چھوڑو، میرا منہ مت کھلواؤ" منظر کی بیوی چیخ کر

"ورنہ میں سب بتادوں گی، ہاں۔ سب معلوم ہے مجھے، کہ سے جوتے کھاچکے تھے۔ کہاں کہاں دھکے کھا کے آئے تھے ہما گھر۔ جہاں رشتہ لے کر جاتی تھیں اماں، صاف جواب ملتا ہمیں لڑکی کو کنویں میں دھکا نہیں دینا۔ بس ہماری اماں ہی

نہیں۔"

"ہاں۔ جیسے تم سیدھی ہو جلیبی کی طرح" منظر نے خفت مٹانے کے لیے جوابی حملہ کیا "تم نے ہی ہاتھ جوڑے تھے، ناک رگڑی تھی میرے سامنے کہ انکار مت کرنا ورنہ میں زہر کھالوں گی۔ جو آتا تھا رشتہ لے کر، وزن دیکھ کے بھاگ جاتا تھا۔"

منظر کی بیوی کا منہ لال ہوگیا "اتنی موٹی بھی نہیں تھی میں۔ بس صحت اچھی تھی۔ یہ تو تم نے اور تمہارے بچّوں نے زندگی اجیرن کر رکھی ہے میری۔ سوکھ کے کانٹا ہوگئی ہوں۔"

"اور کانٹا بن کے میرے دل میں اُتر گئی ہو۔"

سب کا ہنستے ہنستے برا حال ہوگیا۔ چودہ بچّوں کے ماں باپ خود بچّوں کی طرح لڑ رہے تھے اور ایک دوسرے کے وہ راز فاش کررہے تھے جن پر اب تک پردہ پڑا ہوا تھا۔ وہ ایک دوسرے کے کزن تھے چنانچہ بچپن سے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔

کھانے سے فراغت ہوئی تو میں نے خواتین سے کہا "اب آپ لوگ اپنی زنانہ محفل الگ جمائیں۔ ہم اپنی باتیں کریں گے۔"

"یعنی فضول باتیں نہیں کریں گے" منظر بولا۔

انجم اب خاصی بے تکلف ہوگئی تھی "ہم تو رابعہ باجی سے سب سُنیں گے۔ خواہ رات بھر جاگنا پڑے۔"

ہم ڈرائنگ روم میں جاکے بیٹھ گئے۔ وقار یوسف کو بھی ہمارے سفر اور مہم جوئی کے آغاز سے انجام تک تمام واقعات میں زیادہ دلچسپی تھی مگر میں پہلے اپنی عدم موجودگی کے حالات کی مکمل رپورٹ حاصل کرنا چاہتا تھا تاکہ اس سے موجودہ صورتِ حال کو سمجھنے اور آئندہ کا لائحۂ عمل طے کرنے میں مدد ملے۔

فائل دیکھ کے وقار دم بخود رہ گیا "رابعہ باجی کے پلاٹ پر کسی نے قبضہ کرلیا ہے۔"

"ہاں۔ اور یہ تم دونوں کے لیے شرم کی بات ہے۔ اس جگہ ایک محل تعمیر ہوگیا اور تمہیں خبر نہیں ہوئی۔" میں نے کہا "ایک بدمعاش نے وہاں ہیرا منڈی کی چاندنی کو رابعہ کی بہن بنا کے رکھا ہوا ہے اور تمہیں معلوم نہیں۔"

وقار تو واقعی شرمندہ تھا مگر منظر نے کہا "یار! ایک بار مان لیا نا کہ غلطی ہوگئی۔ وہ بھی اس لیے کہ اُدھر ہمارا جانا نہیں ہوا۔ وہ جگہ ہمارے راستے میں نہیں تھی کہ ہم آتے جاتے دیکھتے۔"

وقار نے سرہلایا "یہی بات ہے۔"

میں نے کہا "بات یہ ہے کہ تم نے پروا نہیں کی..."

منظر بھڑک اُٹھا "اب پروا کے بچے۔ ہم کیا فارغ تھے کہ دن رات تمہاری پراپرٹی کی دیکھ بھال کرتے، روز جا کے دیکھتے۔ اپنے کام کم تھے، تمہارے روگ زیادہ پال رکھے تھے۔ اتنی مشکل سے تمہارے کچھ کیس داخل دفتر کرائے۔ حالانکہ تم لوگ ضمانت پر رہا ہوئے تھے اور کہیں جا نہیں سکتے تھے مگر ہم نے جائز ناجائز طور پر چھوٹے موٹے مقدمات کو ختم کیا۔ قتل کے مقدمات ختم نہیں ہوتے۔ وہ تو جب بھی تم پکڑے گئے اندر ہو جاؤ گے اور مقدمے کا فیصلہ ہونے تک اندر ہی رہو گے۔ اب ضمانت بھی نہیں ہوگی۔ مجھے دن میں اپنے مقدمات سے نمٹنا ہوتا تھا۔ بہت کم کیس لے رہا تھا میں، کیونکہ شام کو رابعہ کے آفس بھی جاتا تھا۔ اکیلا وقار یوسف بے چارہ کیا کرتا۔ اور یہ بھی کچھ نہ کرتا تو رابعہ بی بی کی کمپنی ہی بند ہوجاتی۔ واپس آ کے نئے سرے سے وکالت شروع کرنی پڑتی۔ ہم کو دعائیں دو کہ تمہارے دشمنوں کے عزائم کو کامیاب نہیں ہونے دیا۔ تمہارا ماڈل ٹاؤن والا آبائی گھر محفوظ ہے، رابعہ کی لیگل فرم کا بزنس چل رہا ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ ہم نے وہ جگہ خالی کرالی جس پر چوہدری دلاور نے اپنی اسلحہ سازی کی فیکٹری لگا رکھی تھی۔ میسرز وزیر اینڈ کمپنی، جس میں پہلے زرعی مشینری کے پرزے بنتے تھے، تمہارے ہاتھ سے نکل چکی تھی۔ کس میں ہمت تھی کہ وہ جگہ دلاور اینڈ کمپنی سے چھین سکتا۔ تم جو اصل وارث تھے، قتل کے مقدمات میں مطلوب تھے اور فرار ہوچکے تھے۔ دلاور کی پشت پناہی کررہے تھے ایس ایس پی سراج جیسے وطن فروش لوگ۔ اب دیکھو وہاں اسپتال بن چکا ہے اور وہ بھی وزیر خاں کے نام پر۔ وزیر خاں ٹرسٹ....."

"وزیر خاں کا صرف نام ہے۔ مالک کون ہے اس کا؟" میں نے تلخی سے کہا۔

"مالک کوئی نہیں۔ اس کا انتظام ایک بورڈ چلاتا ہے۔"

"اس بورڈ کا چیئرمین کون ہے؟"

"چیئرمین دلاور ہے لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اس کا ایک ممبر میں ہوں۔ اس کے ممبروں میں تم بھی ہو اور رابعہ بھی ہے۔"

"ہم کیا غائبانہ ممبر ہیں؟"

"ایک سال بعد شاید تم ممبر نہ رہو۔ ابھی تو رابعہ کی نمائندگی کررہا تھا وقار یوسف۔ تمہارا نمائندہ تھا ایک صحافی۔ غالب کا دوست صوفی۔"

"دلاور کو بورڈ آف ٹرسٹی کا چیئرمین کس نے بنایا؟"

"اس معاملے میں ہم نے مصلحت سے کام لیا۔ دو ووٹ اس کے بھی تھے۔ ایک استاد پیڈرو کا..."

"وہ بھی اسپتال کے انتظامی اُمور میں شریک ہے جو وزیر خاں کا قاتل ہے؟" میں نے برہمی سے کہا۔

"ابھی تک اس پر قتل کا الزام بھی نہیں ہے۔ یہ ہم جانتے ہیں کہ وہ قاتل ہے مگر اس کے خلاف کسی نے کہیں رپورٹ درج نہیں کرائی ہے اور وہ قتل کے کسی مقدمے میں مطلوب نہیں ہے۔"

"میں اسے چھوڑوں گا نہیں منظر... وہ حرامزادہ ہے کہاں؟"

"مجھے نہیں معلوم۔" منظر نے کہا "اسے بھی انتظار ہوگا کہ تم

واپس آؤ تو تمہارا قصہ بھی ختم کرے۔ تم اس کے لیے مسلسل خطرہ ہو۔ سر پر لٹکنے والی تلوار کی طرح۔ وہ جانتا ہے کہ تم اسے قتل کیے بنا چین سے نہیں بیٹھ سکتے۔"

"نہیں منظر۔ میں نے اسے بہت پہلے بتادیا تھا کہ اسے میں خود نہیں ماروں گا۔ میں اسے انصاف کے راستے سے تختۂ دار تک پہنچاؤں گا۔ ساری دنیا کے سامنے وزیر خاں کا قاتل ثابت ہونے کے بعد وہ پھانسی کے تختے تک خود اپنے قدموں سے چل کے جائے گا۔ میں اپنے عہد پر قائم ہوں۔ دلاور اس کے تمام جرائم میں برابر کا شریک تھا۔ اس نے میرے والد کے کاروباری شریک کو قتل کرواکے الزام میرے سر تھوپ دیا تھا۔ اب وقت آگیا ہے کہ انصاف ہو' اس طرح کہ دنیا دیکھے۔"

"وہ پہلے صرف دولت مند تھا' اب معزز بھی ہوگیا ہے سکندر۔ وہ کارپوریشن کا ممبر ہے اور آئندہ انتخابات میں صوبائی اسمبلی کا آزاد امیدوار ہوگا" منظر بولا۔

"اسے صرف سزائے موت کا امیدوار ہونا چاہیے۔"

"لوگوں کے سامنے اس کا امیج بہت مختلف ہے۔ وہ ایک بہت غریب پرور اور فیاض آدمی سمجھا جاتا ہے۔ اپنے حلقے میں وہ سب کا ہمدرد اور مددگار مشہور ہے۔ اس کے لیے روپیہ لٹاتا ہے' اس کی تصویریں اخباروں میں آتی ہیں۔ کسی غریب بیوہ کی بیٹی کو جہیز دیتے ہوئے' کسی غریب بستی میں سلائی کی مشینیں اور کمبل تقسیم کرتے ہوئے۔ کوئی حادثے کا شکار ہو کے مرے یا پولیس کے ظلم کا' وہ اس کے گھر ضرور جاتا ہے تعزیت کے لئے اور دن میں ایک بڑے اسپتال کا دورہ ضرور کرتا ہے۔"

میں نے کہا "میں نہیں سننا چاہتا یہ سب کچھ۔ میرے لیے وہ صرف میرے باپ کا قاتل ہے۔ اس نے مجھے میرے حق سے محروم کیا' مجھے دنیا کی نظر میں مجرم بنادیا۔ میں اس کی عزت اور اس کا اثر ورسوخ سب خاک میں ملادوں گا۔" غصے سے میرا چہرہ گرم ہوگیا۔

"ٹھیک ہے' جو تجھے کرنا ہے ضرور کر۔ ہم تیرے ساتھ مرنے کے لیے بھی تیار ہیں مگر تجھے خودکشی کا مشورہ نہیں دے سکتے اور تیرے ساتھ خودکشی نہیں کرسکتے۔ سارے مسائل ٹھنڈے دماغ سے اور عقل سے کام لے کر حل ہوں گے۔ اب تم واپس آگئے ہو تو جلدی کیا ہے۔ تم کو ایک ہوشیار شکاری کی طرح جال پھیلانا ہوگا اور خود بھی پھونک پھونک کے قدم اٹھانا ہوگا ورنہ خود شکار ہوجاؤ گے۔ یہ سب بعد کے مسائل ہیں جن سے ہم سب مل کے نمٹ لیں گے۔"

وقار یوسف نے کہا "منظر صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ پہلے آپ سب کو محسن اور غالب کے بارے معلوم کرنا چاہئے کہ وہ کہاں ہیں؟"

"یعنی گل اور نازو کے بارے میں نہیں؟" منظر بولا "تمہاری انجم تمہیں مل گئی' باقی سب پھریں لنڈورے۔"

وقار مسکرایا "میرا مطلب یہ تھا کہ.... گل اور نازو تو ان ساتھ ہی ملیں گی۔ غالب اور محسن مل جائیں۔"

"اس کے لیے ضروری ہوگا کہ ہم نوشہرہ جائیں" میں نے

"پہلے یہ پتا چل جائے کہ غالب کو اس کا بھائی بن کے کون ا ساتھ لے گیا اور غالب اس کے ساتھ کیسے چلا گیا۔ ممکن انہیں محسن لے گیا ہو۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ محسن اور آخر نوشہرہ کیسے پہنچ گئے؟ ہم نے تو انہیں کراچی آنے والے جہ پر سوار کیا تھا۔ وہ کراچی پہنچ کے اکرام سے کیوں نہیں ملے۔ پشا کی طرف کیوں نکل گئے؟"

"پشاور یا نوشہرہ؟" وقار بولا۔

"اتنی جلدی کوئی بھی لاہور یا پنڈی سے نوشہرہ نہیں پہنچ سکتا پشاور سے نوشہرہ کا فاصلہ اٹھائیس میل ہے۔ وہ مردان یا بنوں بھی پشاور پہنچ سکتے ہیں مگر سوال پھر وہی ہے کہ پشاور' مردان یا بنو میں ان کا کیا کام؟ یا وہ نوشہرہ میں ہی تھے تو کیوں تھے؟ یہ تو سوچا نہیں جاسکتا کہ انہیں پہلے سے معلوم ہوگیا تھا۔"

"کیا معلوم ہوگیا تھا؟"

"یہی کہ غالب اور نازو نوشہرہ پہنچنے والے ہیں۔ خود اکرام پریشان تھا کہ وہ کراچی پہنچ کے اس سے ملے بغیر غائب ہوگئے۔ آ کیوں؟ خود میری عقل ماؤف ہوجاتی ہے یہ سوچتے سوچتے۔ اور ا اس پُراسرار مسئلے کا کوئی حل مل سکتا ہے تو نوشہرہ کے کمبائنڈ ملٹر اسپتال سے۔ وہاں ڈاکٹر بتا سکتے ہیں کہ غالب اور نازو انہیں کہا ملے تھے' کیسے ملے تھے اور انہیں کون اپنے ساتھ لے گیا۔ وہ خو خوشی ساتھ گئے تھے یا مجبوراً۔"

منظر بولا "زبردستی کون لے جاسکتا تھا انہیں؟"

"بعض اوقات جبر بھی برداشت کرنا پڑجاتا ہے۔ دھوکے ا بلیک میلنگ کے سامنے آدمی مجبور ہوجاتا ہے یا جان کا خوف ہ ہے۔ کیا پتا کسی نے نازو کو یرغمال بنالیا اور غالب کچھ نہ کرسکا۔ اس کے برعکس غالب کو کسی نے گن پوائنٹ پر رکھ لیا۔ اس طر کہ کسی کو نظر کچھ نہ آیا مگر نازو کو معلوم ہوگیا اور اس نے..."

"چلو یہ تو نوشہرہ جاکے بھی معلوم ہوسکتا ہے کہ حقیقت ہے۔ خدا کرے کہ ان کو ساتھ لے جانے والے گل اور محسن ہوں' اپنے چودھری صاحب نہ ہوں۔ وہ مل گئے تو ان سے ا طرح پوچھیں گے کہ اس طرح کسی کو بتائے بغیر غائب ہوجانا کیا ضروری تھا۔ حد ہوتی ہے عشق کے حرامی پن کی کوئی۔ کراچی جہاز سے اُترے اور جا پہنچے صوبہ سرحد.... ایسے آوارہ مزاج تو مجنوں بھی نہ تھے۔"

میں نے کہا "یہی تو بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ میں جا ہوں محسن کو۔ بالکل اسی طرح جیسے میں خود کو جانتا ہوں۔ وہ ایک ذمے دارانہ حرکت نہیں کرسکتا تھا' کسی سبب اور مجبوری بغیر...."

"یار! سب کیا ہوگا۔ وہی چکر ہے پُرانا۔ دل اُکتا گیا ہوگا تمہارے ساتھ جھک مار کے۔ وہ لونڈیا لے گئی اپنے ساتھ۔ آخر ہے نا ڈاکو کی بہن۔ چور بھی چوری سے جاتا ہے' ہیرا پھیری سے نہیں جاتا" منظر بولا۔

"میں نہیں مان سکتا کہ گل اسے زبردستی اپنے ساتھ لے گئی۔ اگر ان کا ایسا ارادہ ہوتا تو وہ اکرام کو بتا کے بھی جاسکتے تھے۔ اکرام کیا ان کا راستہ روک سکتا تھا؟ اور میں پھر یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ محسن کا دماغ خراب ہوسکتا ہے مگر اس حد تک نہیں..."

"پھر تو شک کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی کہ مرزا غالب اور ان کی شریکِ وفات جہاں بھی ہیں خیریت سے نہیں ہیں۔"

"شریکِ حیات تو سنا تھا' یہ شریکِ وفات....." وقار بولا۔

"زندگی اور موت کے ساتھی کو اور کیا کہو گے تم؟ شریکِ حیات تو بیوی اور شوہر ہوتے ہیں۔ شریکِ وفات ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں جیسے لیلیٰ مجنوں اور شیریں فرہاد وغیرہ۔ نازو کو دیکھو۔ سفر میں ساتھ رہی' اسپتال میں بھی ساتھ لیٹی رہی۔ غالب کا جنازہ اٹھتا خدانخواستہ تو اس کا بھی اٹھتا۔ غالب اغوا ہوا تو اس نے بھی رضاکارانہ طور پر خود کو اغوا کے لیے پیش کردیا ہوگا کہ تمہارے سنگ میں بھی چلوں گی پیا' جیسے پتنگ پیچھے ڈور۔ خیر سے یہ سب شریکِ وفات ہی ہیں ابھی تک۔ رابعہ اور سکندر' گل اور محسن۔"

میں نے کہا "منظر! یہ بہت سیریس معاملہ ہے۔"

"میں کب نان سیریس ہوں۔ بس یہ ہے کہ میں تمہاری طرح رونی شکل بنا کے اور آواز میں رقت پیدا کرکے بات نہیں کرتا۔ میدان جنگ سے آگئے ہو تو کیا یہاں کے معاملات میں خواہ مخواہ اُلجھنا ضروری تھا؟ اور وہ بھی فوراً۔ ارے بھائی کچھ دن سکون آرام سے گزار لیتے۔ سارے بدھو لوٹ کے گھر آئے تھے' سیدھے گھر جاتے۔ مگر نہیں' ایک جوڑا تو جیسے قسم کھا کے آیا تھا کہ پاکستان پہنچتے ہی سنسنی پھیلانا بے حد ضروری ہے۔ ایسے غائب ہوئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ دوسرے گدھے وہ صحافی اور صحافت کی جان...."

"یار منظر! جان بوجھ کے کسی نے کچھ نہیں کیا۔ جو تقدیر میں لکھا ہو اسے کون بدل سکتا ہے" میں نے کہا۔

"تم کوشش ضرور کرتے ہو تقدیر کے ساتھ پنگا لینے کی۔ اب آپ فرمائیں کہ اس وقت کس نے مشورہ دیا تھا کہ چاندنی بیگم اور گولا ٹنڈ والا کو اپنا دیدار کرائیں؟ وہ تمہارا ماموں دلاور پہنچ جاتا نا تو لے جاتا اپنے ساتھ۔ یہ جو مزے مزے کے کھانے کھائے ہیں ابھی' ان کی جگہ آپ کھاتے جوتے۔ قسمت اچھی تھی کہ بچ کے نکل آئے۔"

میں نے ہنس کے کہا "قسمت اچھی ہونے کا یقین نہ ہوتا تو ہم کچھ بھی نہ کرپاتے۔"

"مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ایفل ٹاور سے کود جاؤ اور کہو کہ قسمت اچھی ہے' کچھ نہیں ہوگا" منظر نے کہا۔

"یار! کوئی مشورہ بھی دے۔ چل ہم بے وقوف ہیں' پاگل اور عاقبت نااندیش ہیں" میں نے بگڑ کے کہا "مگر اب کچھ تو کرنا ہے نا۔"

"یہ رابعہ باجی کے گھر پر قبضے والا معاملہ تو میرے سپرد کردیں" وقار بولا "فائل میں لے جاتا ہوں اور کیس فائل کردیتا ہوں۔"

"رابعہ کا وکالت نامہ ہے تمہارے پاس؟" میں نے کہا۔

وقار مسکرایا "میں بنالوں گا۔ رابعہ باجی کے دستخط کرسکتا ہوں میں۔"

میں نے حیرانی سے کہا "کیا تم یہ بھی کرتے رہے ہو؟ اس کی غیر موجودگی میں اس کے دستخط..."

"میں کم عمر ضرور ہوں' کم عقل نہیں ہوں اتنا۔ عدالتی معاملات میں ایسی جعلسازی کرتا تو ان کا سارا کام کیسے سنبھالتا۔ خود اندر ہوجاتا۔ دستخط دیکھے ہیں میں نے فائلوں میں۔ کاپی کرلوں گا۔ جب تک کوئی چیلنج نہ کرے' اصل اور نقل کا فرق کوئی نہیں دیکھتا۔"

"لیکن برخوردار! رابعہ بقلم خود یہاں موجود ہے۔ تم کون سا اسی وقت کیس فائل کرنے جارہے ہو۔ آدھی رات کے وقت عدالت میں کون ملے گا۔ صبح آرام سے وکالت نامہ سائن کرالینا۔" منظر نے کہا۔

"آپ سمجھے نہیں۔ میں بیک ڈیٹ میں وکالت نامے پر دستخط کروں گا" وقار یوسف بولا "دو سال پرانی کسی فائل سے دیکھ کر۔ تاریخ بھی پُرانی ڈالوں گا۔ اس وقت تو وکالت نامے کا فارم بھی نہیں ہے میرے پاس۔ اس کے علاوہ میں نہیں چاہتا کہ رابعہ باجی کی یہاں موجودگی کا راز فاش ہو۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ انہوں نے بہت پہلے مجھے وکالت نامہ دیا تھا۔ ان کا ارادہ کہیں جانے کا تھا۔ اب مجھے معلوم ہوا ہے کہ ان کے گھر کی زمین پر کسی نے ناجائز قبضہ کرکے مکان بنالیا ہے..."

"اگر تم سے پوچھا گیا کہ یہ فائل کہاں سے آئی تمہارے پاس جس میں ساری اصل دستاویزات ہیں؟" میں نے کہا۔

وقار یوسف مسکرایا "سکندر صاحب! عدالت میں بعض اوقات جھوٹ بھی بولنا پڑتا ہے۔ نظریۂ ضرورت کے تحت۔ میں کوئی جھوٹ گھڑلوں گا کہ گولا ٹنڈ والا خود آیا تھا مجھ سے مشورہ کرنے اور جاتے وقت فائل بھول گیا۔ یا چاندنی آئی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ گولا ٹنڈ والا نے اسے جو محل بنا کے دیا ہے' اس کیس میں وہ پھنس جائے گی۔ اسے کیا کرنا چاہئے۔ اصل فائل کی چوری کا الزام تو مجھ پر کوئی نہیں لگا سکتا۔"

"شاباش برخوردار! ایسے ہی چلتے رہے تو بڑی ترقی کروگے۔ یا پھر کسی دن تمہارا موکل باعزت طور پر بری ہوگا مگر وکیل بے عزت ہوکے اندر ہوجائے گا" منظر نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

"یہ کون سے شریف اور بااصول لوگ ہیں کہ ان کے ساتھ نزاکت برتی جائے" وقار یوسف کندھا سہلا کے بولا۔

"میرا خیال ہے کہ میں صبح نکل جاؤں نوشہرہ کی طرف اور اجل کو بھی ساتھ لے جاؤں" میں نے کہا۔

"صرف کاجل کو!" منظر نے پر تشویش لہجے میں کہا۔

"صرف کاجل کو" میں نے مسکرا کے کہا "کلیم بھی ہوگا ساتھ۔"

"وہ تو بچہ ہے" منظر بولا "رابعہ ہرگز اجازت نہیں دے گی۔"

"اسے اعتماد ہے مجھ پر" میں نے کہا۔

"میں سمجھاؤں گا اسے کہ عورت کا گھر عورت ہی اُجاڑتی ہے اور مرد کی ذات تو ہے ہی ناقابلِ اعتبار۔"

میں نے کہا "یار' میری شادی کو ہوجاتے پندرہ سال اور میرے ہوتے چودہ بچے تو شاید میں بھی سوچتا کہ بھاگ جاؤں۔ ابھی تو میں آؤں گا رابعہ کی خاطر۔"

منظر نے آہ بھری "سچ کہتا ہے تو بھائی۔ شادی سے پہلے آدمی کے جذبات کچھ اور ہوتے ہیں۔ اب ہم جیسے سوچتے ہیں فرار ہونے کی' جن کے ساتھ کوئی تیار ہی نہیں ہوتی بھاگنے کے لئے۔ نہ کاجل' نہ سرے دانی۔"

"کاجل کو ساتھ لے جانے کا مقصد یہ بھی ہے کہ نوشہرہ سے آگے پشاور ہے" میں نے کہا "علاقہ غیر کے پولیٹیکل ایجنٹ سے پاس لے کر ہم کلیم کو اس کے عزیزوں کے حوالے کرنے چلے جائیں گے۔ رابعہ کا ساتھ جانا قطعی غیر ضروری ہے۔ وہ یہاں میری نمائندگی کر سکتی ہے۔"

منظر قہقہہ مار کے ہنسا "بھوتنی کے' آخر وہ ہے کیا چیز؟ پہلے تیری وکیل تھی پھر محبوبہ ہوگئی۔ یہی آفیشل منگیتر بن گئی۔ شریکِ سفر اور شریکِ وفات رہی اور ہوگی بالآخر شریکِ حیات۔ لیکن تیری مائندگی کیا کرے گی وہ؟ یعنی چوہدری صاحب آگئے تو خود پیش ہوجائے گی کہ میرے وہ تو گئے ہوئے ہیں کام سے 'کنیز کی گوشمالی فرمایئے۔ یا پولیس آگئی تجھے پکڑنے تو اپنی گردن پیش کرے گی کہ فی الحال اس میں پھندہ فٹ کردیں۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا "یار' میرا مطلب تھا' یہاں کے معاملات بھی تو ہیں۔ وہ اپنا آفس دیکھے۔ موقع ہے تو گھر جائے۔ اس کے خلاف کوئی کیس نہیں ہے' اسے کس کا ڈر۔ وہ وزیر خاں ہو سپٹل جا سکتی ہے۔"

"کس حیثیت میں؟ اہلیہ ہوتی آپ کی قانونی طور پر تب بھی یہ مشکل ہوتا کہ وہ اسپتال کے معاملات میں دخل اندازی کرے یا اپنا حکم چلائے۔ نہ وہ ہیلتھ سیکریٹری ہے' نہ وزیرِ صحت..."

میں نے کہا "وہ اکرام شیخ سے رابطہ رکھے گی۔ انتظار کرے گی گل اور محسن کا۔ ممکن ہے کسی کا پیغام آجائے میرے نام..."

باہر ایک گاڑی آکے رکی تو منظر کے کان کھڑے ہوئے "کون آگیا آدھی رات کو؟ خدا خیر کرے۔"

میں نے کہا "تیرا کوئی ملاقاتی ہوگا۔"

"سب جانتے ہیں کہ میں دس بجے کے بعد نہیں ملتا۔ یہ ... ملاقاتی ہوگا۔"

"میرا... کون ملنے آسکتا ہے مجھ سے؟"

"ابے جب فون آسکتا ہے تو ملک الموت خود کیوں نہیں آسکتا۔ کیا پتا' آج کل وہ بھی گاڑی لے کر پھرتا ہو۔ فاصلے ... ہوگئے ہیں۔" منظر بولا۔

اچانک وقار یوسف بولا "سکندر صاحب! یہ کہیں وہ نہ ہو ... ٹنڈ والا۔ فائل لینے آیا ہو کسی کے ساتھ۔"

میں ایک دم اٹھا "بالکل ٹھیک سوچا ہے تم نے۔ اب تم ... باہر جا کے۔ اور بہتر ہے کہ اپنی بیوہ کے ساتھ نکل جاؤ۔ جا... ہوئے فائل بھی چھپا کے لے جاؤ۔"

منظر نے کہا "یار! ڈرنے کی کون سی بات ہے۔ کون مائی کا لال سیدھا اندر آسکتا ہے۔ ایمان سے گولی ماردوں خود اپنے ہاتھ ... اور تھانے فون کردوں کہ لاش لے جائیں۔ یہ کسی ایرے غیرے کا گھر نہیں ہے پیارے۔ چوکیدار کسی کو نہیں آنے دے گا۔"

"نہیں۔ میرا نکل جانا ہی بہتر ہے۔ ویسے ہی وقت کافی ہوگیا ہے۔" وقار اٹھا اور اپنی بیوی کو آواز دینے لگا "انجم! فوراً چلو۔"

"اجی ایسی کیا آفت آگئی اچانک؟" انجم نے اندر سے کہا۔

"بے وقوف! جلدی کرو۔ آجاؤ' نہیں تو میں اُٹھانے آتا ہوں۔ باقی باتیں پھر کبھی کرلینا۔" وقار نے بیچ دروازے میں جا کے کہا۔

رابعہ اور منظر کی بیوی نے بھی واجبی سا احتجاج کیا مگر وقار یوسف نے انہیں اشارے سے کچھ سمجھا دیا یا خود انہوں نے وقار یوسف کے لہجے سے کچھ اندازہ کرلیا کہ انجم فوراً اٹھ کھڑی ہوئی اور وقار اسے تقریباً گھسیٹ کر اپنے ساتھ لے گیا۔

باہر منظر سے آدھی رات کے وقت ملاقات کے لیے آنے والے اور چوکیدار کے درمیان بحث چل رہی تھی مگر آوازوں سے کچھ پتا نہیں چلتا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔ منظر کے سارے بچے سو چکے تھے اور گھر میں خاموشی طاری تھی لیکن سارے دروازے اور کھڑکیاں بند ہونے کی وجہ سے باہر کی بات اندر صاف سنائی نہیں دیتی تھی۔

"کون اُلو کا پٹھا ہے آخر؟ کیوں لڑ رہا ہے چوکیدار سے؟" منظر نے اپنی پریشانی کو چھپانے کی ناکام کوشش کی "وہ ہے خر... آدمی۔ گولی ماردے گا اگر کسی نے زبردستی کی۔"

میں نے کہا "تو خود کیوں نہیں دیکھتا باہر جا کے۔"

"خوب! چوکیدار نے کہا ہوگا کہ میں سو رہا ہوں۔ اور میں ... کے چلا جاؤں۔ خیر میں کھڑکی کھول کے دیکھتا ہوں۔"

کھڑکی کا ایک پٹ کھولتے ہی چوکیدار کی آواز کے ساتھ ...

...یوسف کی آواز آئی۔

"دیکھیے آپ اس غریب چوکیدار کو لاوارث سمجھ کے ڈرانے دھمکانے کی کوشش مت کریں۔" وقار یوسف نے برہمی سے کہا "آپ جو بھی ہیں' یہ سمجھ لیں کہ اس وقت ہائی کورٹ کے ایک بہت سینئر وکیل کے گھر میں کھڑے ہیں۔ آپ فوراً تشریف لے جائیں یہاں سے جناب۔"

"آپ جناب کے بچے۔ تو کون ہے؟" کسی نے غرّا کے کہا۔

"میں بھی وکیل ہوں۔ زبان سنبھال کے بات کرو مجھ سے۔ میرا ایک فون کافی ہوگا پولیس کو بلانے کے لیے۔ جیل میں سڑ جاؤ گے' نکل جائے گی ساری بدمعاشی۔" وقار بپھر گیا۔

انجم نے خوفزدہ ہو کے اسے کھینچا "اجی چھوڑیں' آپ مت جھگڑا کریں۔ چوکیدار خود نمٹ لے گا ان سے۔"

وقار یوسف جوان آدمی تھا اور اس ہتک آمیز' بدمعاشی کے غرور والے رویّے پر مشتعل ہوگیا تھا۔ انجم نے بڑی عقلمندی سے کام لیا اور بروقت مداخلت کرکے اس کی آتشِ اشتعال کو عقل اور مصلحت کے تقاضوں سے دبا کے فرو کردیا۔ بات صرف ایک لمحے کی ہوتی ہے' جب آدمی کسی کو ماردیتا ہے یا خود مرجاتا ہے۔ انجم اس لمحے کی راہ میں حائل ہوگئی تھی اور شاید اس کے سامنے آنے سے ہی وقار کو احساس ہوگیا تھا کہ جذبات کی رو میں بہہ کے وہ اپنے مقصد کو بھول رہا تھا۔ اس کا فائل کے ساتھ یہاں سے نکلنا ضروری تھا لیکن اس فائل سے کہیں زیادہ اہم اس عورت کا سہاگ تھا جس کے ساتھ اس نے تمام عمر کا پیمانِ رفاقت کیا تھا اور اسے یہ حق بہرحال حاصل نہیں تھا کہ وہ آغازِ سفر میں ہی انجام کی پروا کیے بغیر اکیلا کسی راہِ پُرخطر کی جانب قدم بڑھائے۔ وہ اپنی کار میں بیٹھا اور زوم سے باہر نکل گیا۔

"یہ معلوم نہیں کون ... ہے۔" منظر نے آگ بگولا ہو کے ایک بھاری بھرکم گالی دی۔ "میں دیکھتا ہوں۔"

میں نے باہر جھانک کے دیکھا "ایک منٹ۔ یہ گاڑی تو اسی کی ہے' چاندنی کی۔ مگر آواز گولا ٹنڈ والا صاحب کی نہیں ہے۔"

"پھر غور سے دیکھ' کہیں وہ پیچھے تو نہیں بیٹھا ہے۔"

"پیچھے ہاں کوئی ہے تو سہی۔ چاندنی ہے یار۔ بالکل وہی ہے' بس لباس بدل کے آئی ہے۔" میں نے کہا۔

"مجھے پہلے ہی سوچ لینا چاہیے تھا کہ وہ یہاں آئے گی۔ تو نے میرا نام جو استعمال کیا تھا۔" منظر نے سر پر ہاتھ مارا "یہ اس کا ڈرائیور کم' باڈی گارڈ کم' سیکریٹری کم خصم ثانی ہوگا۔ آنے دے اس بیبہ کو۔"

رابعہ کا اور اپنی بیوی کا خیال کیے بغیر اس نے ایک اور فحش بات کی۔ وہ ہمارے پیچھے آکھڑی ہوئی تھیں۔ رابعہ کو منظر کی بیوی سے زیادہ پریشان دیکھ کے مجھے حیرانی ہوئی۔

"آپ ٹھہریں جی۔ میں دیکھتی ہوں اسے۔" منظر کی بیوی نے آستین چڑھا کے کہا "طبیعت صاف کردوں گی۔ بھول جائے گا ساری بدمعاشی۔"

"تم کچھ مت کرو خدا کے لیے۔ یا کرنا ہی ہے تو پولیس کو فون کرکے ان سے باتیں کرو۔ جتنی چاہے سُناؤ انہیں۔" منظر بولا "رابعہ! تم بھی اندر جاؤ۔ اور انہیں بھی لے جاؤ اپنے سکندرِ اعظم کو ورنہ میرے گھر میں مار دھاڑ شروع ہوگئی تو سارا محلہ جاگ اُٹھے گا۔ چودہ بچوں کی چیخ و پکار سے۔ میں انہیں ٹالنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

منظر باہر گیا اور چند منٹ کے بعد چاندنی کے ساتھ لوٹا تو اس کے ساتھ کوئی مرد نہیں تھا۔ اسے غالباً چوکیدار نے باہر ہی روک لیا تھا۔ جسے منظر نے چاندنی کے ڈرائیور' سیکریٹری' باڈی گارڈ اور خصم ثانی کے خطاب سے نوازا تھا۔ میں نے چاندنی کے بڑی نزاکت' سبک خرامی' سکون اور اعتماد کے ساتھ اندر آنے کا منظر ساتھ والے کمرے کے دروازے کی اوٹ سے دیکھا۔

منظر کا چہرہ غصّے سے لال بھبھوکا ہو رہا تھا "دیکھیے خاتون! اس وقت یہ نامعقول شخص مارا جاتا میرے چوکیدار کی بندوق کی گولی سے مگر خوش قسمتی سے اس کے آپ ساتھ تھیں۔ میرا ایک فون کافی ہے اس کو اندر کروانے کے لیے۔ صبح اس کی کھال کے جوتے پولیس خود مجھے پیش کرتی۔"

چاندنی صوفے پر بیٹھ گئی "آخر ہم کتنی بار معافی مانگیں۔"

منظر بھی صوفے پر بیٹھ گیا "چلیے پھر معاف کیا۔ مگر آپ جیسی خاتون کو ایسے بدمعاشوں کے ساتھ تو نہیں پھرنا چاہیے۔ اور اگر آپ نے اپنی حفاظت کے لیے رکھا ہے کسی بدمعاش کو تو اسے یہ سمجھا دیں کہ جب وہ شرفاء کے گھر جائے تو شرافت کی وردی پہن لے۔"

"جی ہم سمجھا دیں گے۔ ابھی تو ہم خود کچھ سمجھنے کے لیے آئے ہیں۔" چاندنی نے بالوں کو پیچھے جھٹکا اور ایک گہری سانس لے کر منظر کو نشیلی نظروں سے دیکھا "آپ نے کہا کہ آپ عبدالودود منظر ایڈووکیٹ ہیں؟"

"جی۔ اور بھی سب لوگ یہی کہتے ہیں۔ میری بیوی نہیں کہتی ہے اور بچے ابا کہتے ہیں۔ باقی ساری دنیا مجھے اسی نام سے جانتی ہے۔ ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن سے لے کر چیف جسٹس تک۔"

"ہمارا تو دماغ خراب ہوجائے گا۔" چاندنی نے بڑی نزاکت سے اپنا ہاتھ پیشانی پر رکھا "آپ منظر صاحب ہیں تو پھر وہ کون تھا؟"

"وہ کون؟"

"جس نے آپ کا نام استعمال کیا اور ہمارے گھر آکے بڑی دیدہ دلیری سے بیٹھا رہا۔ اپنی سیکریٹری کے ساتھ۔ اب تو ہمیں شبہ ہے کہ وہ حرافہ بھی اس کی سیکریٹری نہیں ہوگی۔"

دروازے کے قریب میرے ساتھ کھڑی ہوئی رابعہ مسکرائی مگر

منظر کی بیوی نے چاندنی کو ایک سو ایک گالیوں اور کوسنوں سے نوازا جو صرف میں نے سنے کیونکہ اس کے ہونٹ میرے بائیں کان سے صرف دو انچ کے فاصلے پر تھے اور وہ آہستہ بولنے پر مجبور تھی۔ بولے بغیر وہ رہ نہیں سکتی تھی۔

"میں سمجھا نہیں آپ کس کی بات کر رہی ہیں۔ اور کیا یہ ایسی بات نہ تھی جو صبح نہیں کی جا سکتی تھی؟" منظر نے کہا "فرض کیجئے' کوئی اُلو کا پٹھا آپ کے پاس گیا اور آپ سے کہا کہ میں عبدالودود منظر ہوں اور یہ میری سیکریٹری ہے۔ تو اس سے کون سی قیامت آگئی؟ کیا نقصان ہوگیا ایسا کہ آپ ایک بدمعاش کے ساتھ دوڑی چلی آئیں؟ وقت دیکھے بغیر۔"

"نقصان تو ہوا ہے ہمارا اور معلوم نہیں اور کتنا ہوگا لیکن ہم اس لیے چلے آئے کہ شاید آپ کچھ بتا سکیں کہ وہ کون تھا اور ایسا کیوں کیا تھا اس نے۔ وہ ہم سے ایک فائل بھی لے گیا جس میں ہمارے جائداد کے اصلی کاغذات تھے۔ اور کچھ ... خاص اہمیت کی دستاویزات تھیں۔ ان کا غلط استعمال کرکے وہ ہمیں بلیک میل کر سکتا ہے۔"

"دیکھئے' میری صورت پر غور فرمایئے۔ وہ چار سو بیس میں تو نہیں تھا نا؟" منظر بولا۔

"جی قطعی نہیں۔ آپ ہرگز نہیں تھے۔"

"بس تو پھر آپ اپنی اسٹوری جا کے پولیس کو سُنایئے۔ انہیں تفصیل سے بتایئے کہ آپ کے ساتھ کیا واردات ہوگئی ہے۔ میں اب سونا چاہتا ہوں۔" منظر نے خاصی حوصلہ شکن بداخلاقی سے کہا۔

چاندنی کو مایوسی ہوئی کہ اس کے جالی دار' کالے لباس سے چمکتے بدن کی چاندنی اور اس کے عشوہ و غمزہ و ادا کی مستی و شباب کا اندازِ بے حجابی' بار بار ڈھلک کر جسم کے قاتل خطوط کی دعوتِ دید دینے والے آنچل کی شوخی اور کافر بدن کے متلاطم نشیب و فراز کی جادوگری نے کچھ کام نہ کیا اور منظر کے جذبات کی سرد مہری کم نہ ہوئی۔

"ہم ایک بات پوچھیں وکیل صاحب؟"

"جلدی سے پوچھ لیں۔" منظر نے گھڑی کی طرف دیکھا۔

"اب ایسی بھی کیا جلدی۔ آپ اُٹھ ہی گئے ہیں تو تھوڑے سے اخلاق اور آدابِ میزبانی کا خیال رکھنے میں کیا حرج ہے۔ آپ پڑھے لکھے آدمی ہیں' اپنے گھر آنے والوں کے ساتھ ایسے پیش نہیں آتے ہوں گے۔"

"مس چاندنی! میرے گھر آنے والے اپنے ساتھ کسی بدمعاش کو نہیں لاتے۔" منظر بگڑ گیا "آدھی رات کو بھی آتے ہیں تو یوں زبردستی گھر میں نہیں گھُستے۔ آپ عورت ہیں' اس لیے میں نے اندر بٹھا لیا مگر آپ میری مہمان ہرگز نہیں ہیں۔ میں کیوں خیال رکھوں آدابِ میزبانی کا۔ آپ خیال رکھیں کہ مجھے صبح کورٹ بھی جانا ہے۔"

اپنی تذلیل کے احساس سے چاندنی کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ اسے اپنے حسن کی قوتِ تسخیر پر اتنا غرور تھا کہ وہ کسی بھی مرد پر حسن و شباب کا سارا اسلحہ آزما کے ہار جانے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

"آپ ہماری توہین کر رہے ہیں منظر صاحب! بار بار ہمارے شوفر کو بدمعاش کہہ کے۔ ہم آپ سے یہ پوچھنے کا حق رکھتے ہیں آخر کسی نے آپ کا نام ہی کیوں استعمال کیا ہمیں دھوکا دینے کے لیے؟ ہم تو سمجھتے ہیں کہ یہ سازش تھی۔ کہیں آپ بھی اس میں شریک تو نہیں تھے۔ ذرا اپنی ساکھ کا بھی خیال کیجئے۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ وہ اور کوئی نہیں تھا' آپ خود تھے۔"

"شٹ اپ اینڈ گیٹ آؤٹ۔" منظر نے دہاڑ کے کہا "جاؤ' بھونکنا ہے باہر جا کے بھونکو۔ میرے گھر کی حدود سے نکل جاؤ اور سڑک پر چلاؤ۔ پولیس کو مت بلانا۔ پولیس آتی ہی ہوگی۔ تمہیں اندر بُلانے سے پہلے میں نے فون کر دیا تھا۔"

"اچھا جی" چاندنی تلخی سے مسکرائی "پھر تو ہم پولیس کے ساتھ ہی جائیں گے' ایسے نہیں۔ جو کرنا ہے کرلو۔"

اب میرے کان میں بول بول کے چاندنی کی سات پشتوں کو خراب کرنے والی منظر کی بیوی کو فون کرنے کا خیال آیا۔ منظر نے اسے کہا تھا کہ سب پولیس کو بتا دینا۔ وہ فون کرنے دوڑی اور چند سیکنڈ بعد بدحواس واپس آئی۔

"وہ..... فون تو ڈیڈ ہے۔ اب کیا کروں؟ ہائے میرے اللہ کیسی آفت نازل ہوگئی ہے آدھی رات کے وقت۔ یہ چڑیل منحوس شکل والی ڈائن تو دھرنا دے کے بیٹھ گئی ہے۔ ناظم ہوتی تو اسے کھڑکی سے باہر پھینک دیتی۔ سکندر! تم ہی کچھ کرو۔ نکالو اس کو گھر سے۔"

میں نے کہا "بھابی کسی جوان اور خوب صورت عورت کو ہاتھ لگاؤں۔ توبہ توبہ۔ اٹھا کے باہر پھینکنے کا تو سوال ہی نہیں میرے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں۔"

رابعہ نے مجھے گھور کے دیکھا "فون ڈیڈ ہے یا ڈیڈ کر دیا گیا ہے؟"

"ڈیڈ کر دیا گیا ہے؟ فون کا مرڈر" میں نے کہا "اچھا آئیڈیا ہے۔ میری سمجھ میں بھی آتی ہے بات۔ انہوں نے اندر آنے سے پہلے لائن کاٹ دی ہوگی۔ اس کا مطلب یہ بھی لیا جا سکتا ہے کہ مس چاندنی اور ان کے جسم کا رکھوالا خصمِ ثانی اچھی نیت لے کے نہیں آئے تھے۔"

مشتعل مگر بے بس منظر کے لیے چاندنی ایک چیلنج بن گئی تھی۔ ہنگامہ میں بھی نہیں چاہتا تھا لیکن چاندنی کے تیور بتاتے تھے کہ وہ آسانی سے واپس جانے کے لیے نہیں آئی ہے۔

"آپ زبردستی ہمیں نہیں نکال سکتے حضور۔ ہم بڑے

مہمان ہیں۔" چاندنی بولی "بلکہ اب تو آپ ہمیں بھی میزبان مان لیں۔"

"کیا مطلب ہے اس فضول بات کا؟"

"مطلب یہ کہ خاطر تواضع ہم کریں گے آپ کی۔ ایسی کہ آپ یاد رکھیں گے۔" چاندنی نے اسے بڑی بے شرمی سے آنکھ ماری۔

منظر کی پشت میری طرف تھی مگر میرا خیال ہے' اس بے حیائی پر اس کا چہرہ سرخ ہو گیا ہو گا۔ ابھی جواب میں اس نے کچھ کہا نہیں تھا کہ صورتِ حال میں ایک غیر متوقع تبدیلی آئی۔

باہر سے چوکیدار چلانے لگا "سالا رستم کا بچہ' کدھر جاتا ہے۔"

"اوئے ہٹ میرے راستے سے مصیبت۔" کسی نے گالی دے کر کہا۔

اس کے ساتھ ہی چوکیدار بلبلایا۔

منظر نے بپھر کے کہا "یہ کیا..... کیا ہو رہا ہے؟ میرے چوکیدار کو کچھ ہوا تو..... کوئی بچ کے نہیں جائے گا۔ ذرا پولیس آجائے....."

چاندنی مسکرائی "اجی کیا بات کرتے ہیں آپ وکیل صاحب۔ بھلا یہ پولیس والے بھی کسی کے ہوئے ہیں! یہ تو بس پیسے کی طرف دوڑتے ہیں۔ اتنا بھروسہ تو کتے پر بھی نہیں کرنا چاہیے۔ بڑا وفادار مشہور ہے مگر ہے تو جانور نا۔ ہڈی ڈال دو تو چپ۔ پولیس کا انتظار چھوڑ دیں۔"

"ان کا تو باپ بھی آئے گا۔"

"باپ آ کے کیا کرے گا بھلا" چاندنی نے معصوم بن کے کہا "آپ کی جگہ یہاں آپ کے والد صاحب ملتے تو ہم کیا کہتے ان سے۔"

"ساری شوخی بھول جاؤ گی تم چاندنی بیگم۔ تم نے کتنی بڑی حماقت کی ہے۔ یہاں آ کے' سب سمجھا دے گی پولیس۔"

"ہم ویسے ہی سب سمجھتے ہیں جی۔ پولیس کی دھمکی مت دیں سرکار۔ ہمیں تو یہ بھی معلوم ہے کہ وہ کون تھا جس نے ہمارے گھر میں آپ کے نام کا سکہ چلایا۔ وہ سکندر بخت تھا نا۔ اسے کہاں چھپا رکھا ہے آپ نے؟"

"وہ یہاں نہیں ہے۔ تم سے کس نے کہہ دیا؟"

"بس مشکل سے ایک منٹ کا فرق پڑ گیا وکیل صاحب ورنہ اس کی بھی ملاقات ہو جاتی چوہدری صاحب سے۔ اس کے ساتھ جو زنانہ سیکریٹری بن کے آئی تھی' اسے بھی معلوم ہو جاتا....."

"تم شرافت سے جاؤ گی یا جوتے کھا کے؟" منظر چیخ کے بولا۔

"کوشش کر کے دیکھیں۔ ہم بھی یوں جانے کے لیے نہیں آئے ہیں منظر صاحب" وہ منظر کے مقابل کھڑی ہو گئی "ہم جائیں گے تو فائل اپنے ساتھ لے کر۔ آپ دے دیں تو مہربانی ورنہ وہ سکندرِ اعظم سامنے آجائیں جو بزدلوں کی طرح اندر منہ چھپا بیٹھے ہیں۔ ہم نے تو سنا تھا' بڑے طرم خاں ہیں وہ۔"

اب میرے لیے خاموش کھڑا رہنا مشکل ہو گیا۔ میں دروازے سے نکل کر چاندنی کے سامنے جا کھڑا ہوا "آپ نے غلط سنا تھا چاندنی۔ میں بہت شریف اور بزدل آدمی ہوں۔ آپ کی فائل دھوکے سے لایا تھا مگر آپ کی نظروں کے سامنے وہ دونوں میاں بیوی اس فائل کو اپنے ساتھ لے گئے جو آپ کو باہر ملے تھے۔"

"یہ..... یہ جھوٹ ہے۔"

"یہ سچ ہے خاتون۔ لیکن جھوٹ بھی ہوتا تو کیا فرق پڑتا؟ بتاؤ کہ اس فائل کی اہمیت کیا ہے؟ اس میں چند کاغذ کے پرزے ہیں نا اور وہ بھی جعلی۔ اس سے تمہیں کسی قسم کا حقِ ملکیت حاصل نہیں ہو سکتا۔ تمہاری اصل جگہ ہے ہیرا منڈی۔ وہیں لوٹ جاؤ ذلیل ہونے سے پہلے....."

چاندنی نے چیخ کے آواز دی "رستم!"

مشین گن کے ساتھ رستم اندر آگیا۔ وہ چھ فٹ قد کا قوی ہیکل فربہ شخص تھا جس نے اپنے کسرتی بدن کو نمایاں کرنے کے لیے بغیر آستین والی چمڑے کی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ اس پر چمکتے ہوئے بٹن لگے تھے چنانچہ وہ زرہ بکتر میں ملبوس لگتا تھا۔ اس کی چست پتلون میں لانگ بوٹ گھٹنوں تک آگئے تھے اور اس کی کمر پر چھ انچ چوڑی فولادی بکل والی بیلٹ تھی جس پر ایک کھوپڑی بنی ہوئی تھی۔

منظر نے آج تک ہماری جنگ عدالت میں لڑی تھی۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ ہم اس کے گھر میں تھے اور گھر میدانِ جنگ بن گیا تھا۔

منظر نے چیخ کے کہا "کون ہے یہ رستم کی اولاد؟"

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا "اس سے مجھے ملنے دو منظر۔ یہ رستم ہے تو میں اس کا باپ ہوں۔ ابھی معلوم ہو جائے گا اسے کہ بدمعاشی ہم بھی جانتے ہیں۔"

منظر نے غصے سے کہا "یہ حرکت تمہیں بہت مہنگی پڑے گی چاندنی۔ قانون کے سامنے کسی رستم کی بدمعاشی نہیں چلتی۔ اس حرام زادے کو یہ بات سمجھا دو کہ میرے چوکیدار کو کچھ ہوا تو اسے خود پھانسی پر لٹکا دوں گا۔"

"تمہارے چوکیدار کو نیند آگئی ہے۔" رستم مضحکہ اڑانے والے انداز میں بولا "بڑا حرام خور ہے۔ اس کی جگہ تم مجھے رکھ لو۔"

منظر نے چلا کے اپنی بیوی سے کہا "پولیس کو فون کیا تم نے؟"

دروازے کی اوٹ سے نکل آئی "میں..... میں نے..... میں....."

"کیا میں میں لگا رکھی ہے! ابھی تک باتیں سننے میں لگی تھی بکری کی اولاد۔" منظر بگڑ گیا "میں خود بات کرتا ہوں آئی جی سے۔"

"نہ کوئی آئی جی' نہ گئی جی۔" رستم ہنسا۔

"انہوں نے غالباً ٹیلی فون کے تار کاٹ دیے تھے یہاں آنے سے پہلے۔" میں نے منظر کو سمجھایا "فون ڈیڈ تھا۔"

"ساتھ ہی ادھر ڈاکٹر صاحب رہتے ہیں' ساتھ والی کوٹھی میں۔ وہاں نہیں جا سکتی تھی یہ!" منظر بیوی پر چلانے لگا۔

"میں اکیلی جاتی؟" منظر کی بیوی نے منمنا کے کہا۔

"ہائے ہائے زمانہ اتنا خراب ہے۔ جوان جہان لڑکی اکیلی کیسے جاتی آدھی رات کو۔ مرد ذات کی نیت کا کیا بھروسہ۔" رستم بڑی ایکٹنگ کے ساتھ بولا اور قہقہہ مار کے ہنسا۔

منظر کو میں نے کبھی مشتعل نہیں دیکھا تھا۔ وہ ایسا آدمی تھا جو کسی کی بات کا بُرا نہیں مانتا تھا اور زندگی کے سنگین ترین بحران سے ہنس کے گزرنا جانتا تھا۔ ہنسی علاجِ غم ہے۔ وہ اس کی عملی تفسیر تھا۔ وہ روتوں کو ہنسا سکتا تھا مگر یہ صورتِ حال مختلف تھی۔ وہ پاگل ہو کے رستم کی طرف لپکا مگر میں نے اسے زبردستی روک لیا۔

اس کے منہ سے غلیظ گالیوں کا فوارہ سا اُبلا۔ پس منظر میں اس کی بیوی کی زنانہ گالی گلوچ اور طعنوں کوسنوں کا شور اٹھا۔

"بے حیا' فاحشہ' کالا منہ ہو تیرا۔ چاندنی نام رکھ لیا اپنا منحوس شکل والی حرافہ۔ تیرا یہ خصم کتنا بڑا رستم ہے۔ ذرا اس سے کہہ کہ بندوق رکھ کے بات کرے۔ ہڈیوں کا سُرمہ نہ کروے سکندر تو....."

میں نے کہا "بھابی آپ جائیں اندر۔ یہ لاتوں کے بھوت ہیں' باتوں کا اثر نہیں ہوتا ان پر۔"

"ارے میں ابھی بندوبست کرتی ہوں ان کے کفن دفن کا۔ فون نہیں ہے تو کیا' مجھے معلوم ہے آئی جی کا پتا۔ اسے خود جا کے بتاتی ہوں۔ کان سے پکڑ کے نہ لائی تو۔"

رستم پھر ہنسا "یہ تو بتا دو وکیلن کہ جاؤ گی کیسے؟ ہوائی جہاز سے کہ بحری جہاز سے۔ یہیں سے آواز دے کر بلا لو۔ راستے تو سب بند ہیں۔"

تو یہ بات ہے' میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ ہم محصور ہو گئے ہیں۔

"ہٹ میرے سامنے سے حرامی....." منظر کی بیوی نے چلا کے کہا۔

میں نے کہا "منظر! اپنی بیوی کو سمجھا۔ غالباً ان کے آدمی ہر طرف موجود ہیں۔ شور مچانے سے سارا محلہ اکٹھا نہیں ہو گا۔ کوئی نہیں ہے سُننے والا۔ مگر بچے جاگ گئے تو پریشان ہوں گے۔"

منظر نے صورتِ حال کو سمجھ لیا تھا "ٹھیک ہے۔ میں اسے اندر لے جاتا ہوں۔"

میں نے رستم سے کہا "انہیں جانے دو۔ اور ڈرو نہیں' ایسی کوئی بات نہیں ہو گی۔"

"ہو بھی کیسے سکتی ہے۔" وہ سینہ نکال کے بولا۔

چاندنی مسکرائی "گولا ٹنڈ والا شکل یا عقل سے مار کھا سکتا ہے مگر طاقت میں مار نہیں کھاتا۔ اس نے ہمیں ایسے ہی نہیں بھیج دیا ایک رستم کے ساتھ۔ دس رستم باہر ہماری حفاظت کے لیے موجود ہیں۔"

میں اس کے سامنے بیٹھ گیا "مس چاندنی! پہلے میری بات سُن لو اور سمجھنے کی کوشش کرو۔ اس سے پہلے کہ زیادہ خرابی ہو اور تم قانونی مسائل کی دلدل میں پھنس جاؤ۔ تم کو ایک موقع دیا جا سکتا ہے کیونکہ خود تمہارے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ تمہیں دھوکے فریب کی ایک بہت بڑی اور احمقانہ سازش کا آلۂ کار بنا لیا گیا ہے۔ تم ایک خوب صورت عورت ہو مگر عقل سے پیدل ہو۔ تمہیں معلوم نہیں تھا کہ رابعہ زندہ ہے۔"

"رابعہ زندہ ہے..... تم بکتے ہو۔"

میں نے اپنی بات جاری رکھی "ذرا سوچو' دنیا میں ایسا کہیں ہوا ہے یا ہو سکتا ہے۔ رابعہ کی بات چھوڑو' اپنی بات کرو۔ کیا صرف موت کے ایک جھوٹے سرٹیفکیٹ سے کوئی ثابت کر سکتا ہے کہ تم مر چکی ہو۔ تم زندہ ہو تو یہ بات دنیا جانتی ہے۔ تم بھی گمنام بہرحال نہیں ہو۔ رابعہ تو بہت مشہور وکیل ہے۔ نیچے سے اوپر تک ہزاروں لوگ جانتے ہیں اسے۔ اس کی کوئی بہن نہیں تھی۔ اس کی گواہی پولیس کے اعلیٰ افسر تک دے سکتے ہیں۔ ہائی کورٹ کے جج اسے شناخت کر سکتے ہیں۔ تم کیسے اس کی جائداد پر قبضہ جاری رکھ سکتی ہو۔ مجھے بتاؤ۔ فرض کرو' تمہاری جائداد پر ایسے ہی کوئی قابض ہو جاتا۔"

"مگر..... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ہمیں تو بتایا گیا تھا کہ رابعہ... زندہ نہیں" چاندنی کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا اور وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔ "اور خود چوہدری دلاور نے کہا تھا کہ وہ واپس نہیں آسکتی۔"

میں نے کہا "ملو گی رابعہ سے؟"

اس کے ساتھ ہی رابعہ سامنے آگئی "میں رابعہ کی روح نہیں' خود رابعہ ہوں۔"

"کیا..... کیا ثبوت ہے آخر تمہارے پاس؟" چاندنی نے رابعہ پر نظر جما کے کہا۔

میری نظر چاندنی پر تھی اور میں اس کی ذہنی کیفیت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ گولا ٹنڈ والا شاید دلاور کا ایک حقیر سا کارکن تھا جس کو اس نے مروانے کے لیے اسی طرح آگے بڑھا دیا تھا جیسے شطرنج کی بساط پر پیادے کو قربان کیا جاتا ہے۔ اس نے بدمعاشی کے زعم میں ہیرا منڈی کی ایک طوائف کو رابعہ کے گھر کی زمین پر وہ محل بنوا دیا جس کے بارے میں اسے یقین تھا کہ اب اس سے یہ زمین کوئی نہیں چھین سکتا اور اتنی بڑی قیمت ادا کر دینے کے بعد وہ چاندنی کا بھی مالک بن چکا ہے۔ چاندنی کو شاید کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔

"ثبوت بھی مل جائے گا۔ ذرا صبح ہونے دو۔" رابعہ صوفے پر میرے ساتھ ہی بیٹھ گئی "اس وقت بھی فراہم ہو سکتا تھا مگر تمہارے رستم راہ میں حائل ہیں۔"

آہستہ آہستہ چاندنی کا ذہن حقیقت کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہو رہا تھا "ہمیں... ہمیں تو تحفے میں ملی تھی یہ کوٹھی۔"

منظر نے اندر آ کے کہا "ہر کوٹھے والی کی خواہش ہوتی ہے کہ اسے کوئی کوٹھی والا عزت دار عورت بنا دے۔"

میں نے کہا "کس نے گفٹ کی تھی تمہیں یہ کوٹھی؟"

"گولا..... غلام محمد نے۔" چاندنی کی صورت پر اب پریشانی کے آثار واضح تھے۔ "ہم سے شادی کے لیے۔"

"مگر خود کو رابعہ کی بہن تم نے مشہور کیا تھا یا اس کا مشورہ بھی گولا ٹنڈوالا نے دیا تھا؟" میں نے کہا۔

"اسی نے کہا تھا۔" وہ نظر جھکا کے بولی "کہ یہاں پہلے ایک وکیل رہتی تھی۔ تم خود کو اس کی بہن کہہ سکتی ہو۔ وہ تو مر چکی اور دنیا بھی اسے بھول گئی۔ اس طرح تم...."

"رک کیوں گئیں؟" رابعہ نے طنز سے کہا "تم اپنے بدنام ماضی کو اپنی زندگی سے خارج کر دو گی، عزت دار ہو جاؤ گی۔"

اقرارِ جرم چاندنی کی صورت پر لکھا ہوا تھا۔ "ہمارے ساتھ دھوکا ہوا۔ ہم نہیں جانتے غلام محمد نے ایسا کیوں کیا۔"

"وہ خود کتنا بڑا رئیس تھا؟ اتنی بڑی قیمت ادا کر سکتا تھا تمہاری؟" میں نے کہا "تمہیں تو اندازہ ہو گا۔ تمہارا پرانا پرستار ہو گا۔"

"شادی سے پہلے کتنا لٹایا تھا تم پر؟" منظر بولا۔

"بہت۔ اب ہم کیا بتائیں۔ لیکن یہ کوٹھی ہمارے نام کر کے تو اس نے ہمیں حیران کر دیا تھا۔"

"تم نے اس سے کبھی پوچھا کہ وہ کیا کرتا ہے؟ اتنا پیسہ کہاں سے آتا ہے اس کے پاس؟ وہ زمیندار ہے، صنعتکار یا کچھ اور۔" رابعہ نے کہا۔

"انہیں اس سے کیا۔ وہ اسمگلر ہو، ڈاکو ہو۔ انہیں اپنی منہ مانگی قیمت دے کر کوئی بھی اپنا سکتا ہے۔" منظر بولا۔

"اس نے کہا تھا کہ وہ ٹھیکیدار ہے، ہم کیوں شک کرتے۔" چاندنی نے کہا "ہم تو سمجھے تھے کہ شاید ہماری تقدیر بدل گئی ہے۔ ہمیں اپنا گھر مل گیا ہے۔" اس نے ایک سرد آہ بھری "ہر طوائف عورت بننا چاہتی ہے۔"

"غلط کہتی ہو تم۔ وہ صرف امیر عورت بننا چاہتی ہے۔ دولت اور عیش و آرام کی زندگی کون چھوڑتا ہے۔" منظر بولا "جو طوائف اس ماحول سے نکلنا چاہے وہ کسی کلرک سے شادی کیوں نہیں کر لیتی؟ کسی غریب دکاندار یا مزدور کے گھر میں پناہ کیوں نہیں لیتی؟ ہمیشہ جاگیرداروں اور رئیسوں کی کوٹھی میں جا کر... آباد ہونا کیوں قبول کرتی ہے؟"

"وہ بہت مجبور، بے بس ہوتی ہیں۔" چاندنی نے اپنا کمزور سا دفاع کیا۔

"ہوں گی کچھ مجبور مگر سب پر ہر وقت پہرے نہیں ہوتے۔ اصل مجبوری ہے عیش و عشرت کی زندگی، آزادی۔ اسے قربان کر کے شرافت کی سند حاصل کرنے کی خواہش تم نے بھی نہیں کی ہو گی۔"

میں نے کہا "چھوڑو یہ بحث۔ رات بہت ہو گئی ہے چاندنی۔ ساری بات اگر تمہاری سمجھ میں آ گئی ہے اور تمہیں احساس ہو گیا ہے کہ غلطی سے تم اس چکر میں پھنس گئی تھیں تو ابھی وقت ہے۔ گھر جاؤ اور صبح یہاں آ جاؤ۔"

چاندنی نے سوالیہ نظریں اٹھائیں "کس لیے؟"

"میرے ساتھ چل کے بیان دو عدالت میں۔" منظر نے کہا "یا تھانے چل کے رپورٹ لکھوا دو۔ رپورٹ میں بھی لکھوا سکتا ہوں، رابعہ بھی لکھوا سکتی ہے۔ تم اپنے بیان سے تصدیق کر سکتی ہو کہ تمہارے ساتھ غلام محمد عرف گولا ٹنڈوالا نے دھوکا کیا تھا۔"

"یہ... یہ بہت مشکل ہے.... ناممکن" چاندنی نے ہونٹوں پر زبان پھیر کے کہا۔

"تمہارے بچنے کا بس یہی ایک راستہ ہے ورنہ سب کے ساتھ تم بھی جیل کی ہوا کھاتی نظر آؤ گی۔" منظر نے کہا "اگر تم سلطانی گواہ بن جاؤ تو میں یہ سب کچھ بھول جاؤں گا جو اس وقت تم نے یہاں کیا ہے۔ غلط فہمی کو معاف بھی کیا جا سکتا ہے۔ تم عدالت میں سب سچ بتا دو تو..."

وہ اٹھ کھڑی ہوئی "نہیں جی، ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ ہم صرف اتنا کر سکتے ہیں کہ وہ گھر خالی کر دیں اور صبح اپنی دنیا میں لوٹ جائیں۔ آپ کا جو دل چاہے کریں۔ ہم کسی تھانے کچہری اور مقدمے بازی کے چکر میں نہیں پڑ سکتے۔"

میں نے کہا "اس چکر سے بچنا اب تمہارے اختیار کی بات نہیں رہی۔ تم برابر کی شریکِ جرم ہو۔ وعدہ معاف گواہ بن کے اور ہمارے کہنے کے مطابق بیان دینے سے تم کو قانونی تحفظ مل جاتا۔ ورنہ یہ سارے رستم جو تمہارے محافظ بن کے ساتھ آ گئے ہیں گولا ٹنڈوالا اور چوہدری دلاور سب مل کے بھی تمہیں بچا نہیں سکتے۔"

رستم خاموش کھڑا سب کچھ سُن رہا تھا مگر اس کی آنکھوں میں ناپسندیدگی کے جذبات دیکھے جا سکتے تھے۔ وہ اتنا بے وقوف نہیں تھا کہ صورتِ حال پر ہونے والی گفتگو کو نہ سمجھتا مگر اپنی غلطی یا شکست کو تسلیم کرتے ہوئے "سوری" کہہ کے پسپا ہو جانا اس کی شان کے خلاف تھا۔

منظر کی اور میری خواہش ایک تھی۔ ہم چاندنی کو دلاور کے خلاف گواہ کے طور پر استعمال کرنا چاہتے تھے لیکن اس میں اتنی ہمت ہی نہ تھی کہ وہ اپنے شوہر کی زر خرید بیوی ہونے کے خیال سے بغاوت کر سکے۔ وہ گاے ٹنڈوالے سے بھی اتنا ہی ڈرتی تھی جتنا چوہدری دلاور سے۔

ترپ کا آخری پتا چلتے ہوئے میں نے کہا "چاندنی! ہم یہ وعدہ کر سکتے ہیں کہ تمہارے یار رستم کے خلاف ایک بہت سینئر ایڈووکیٹ کے گھر میں زبردستی گھسنے، مار پیٹ کرنے، خوف و ہراس پھیلانے اور اقدامِ قتل جیسے سنگین مقدمات درج نہیں کرائیں گے۔ تم بھی مظلوم اور مجبور ہو اور رستم بھی اس لیے قابلِ معافی ہے کہ یہ حکم کا غلام ہے۔"

رستم نے بگڑ کے کہا "چلو بیگم صاحبہ! بہت ہو گئی۔"

چاندی کا رنگ فق ہو گیا تھا "ہاں..... ہم ایسی باتوں سے ڈرنے والے نہیں ہیں۔ ہم اکیلے نہیں ہیں اور ہم اپنا دفاع کر سکتے ہیں۔ بڑے سے بڑا وکیل ہماری طرف سے عدالت میں پیش ہونے پر تیار ہو گا۔"

وہ باہر چلی گئی تو منظر ایک دم اُٹھا "میں دیکھو تو سہی کتنے رستم کھڑے تھے باہر۔"

میں نے کہا "ذرا خیال سے۔ کہیں انہیں شک نہ ہو کہ تم ان کا پیچھا کر رہے ہو۔"

رابعہ نے بھی کہا "وہ فائرنگ نہ کر دیں۔"

منظر نے کہا "اچھا۔ مگر میں چوکیدار کو تو دیکھ لوں۔ پتا نہیں وہ کس حال میں پڑا ہے۔ زندہ بھی ہے یا نہیں۔"

میں نے کہا "وہ بے ہوش ہو گا۔ یہ لوگ قتل کے ارادے سے نہیں آئے تھے۔ اتنی ہمت تو چوہدری دلاور بھی میں نہیں کہ تیرے گھر میں یوں گھس کے کسی کو مار دے۔ ابھی جو کچھ انہوں نے کیا اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ نہ کوئی گواہ۔"

"ہم سب گواہ ہیں۔"

"ہم سب ایک پارٹی ہیں۔ مدعی بن سکتے ہیں، گواہ نہیں۔" رابعہ نے کہا۔

باہر سے گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ یہ غالباً جیپ تھی۔ اس کے انجن کی مخصوص آواز رات کے سکوت میں واضح ہو گئی تھی۔ میں منتظر رہا کہ کسی اور گاڑی کے روانہ ہونے کی آواز بھی سُننے کو ملے مگر اس ایک گاڑی کی آواز بھی آہستہ آہستہ دور ہو کے معدوم ہو گئی۔

"وہ بلف کر رہے تھے۔" منظر بولا۔

"ہاں۔ چاندنی کے ساتھ ایک ہی رستم تھا، دس رستم نہیں تھے بلکہ تو مجھے بھی تھا مگر اس کی تصدیق کیسے ہوتی۔" میں نے کہا "تمہاری بیوی کہاں ہے؟"

"اسے میں نے ایک جھانپڑ مار کے بچوں کے ساتھ کمرے میں بند کر دیا تھا کہ یہاں بیٹھ کے رو یا سو مگر آواز مت نکالنا حلق سے ورنہ انہی کے حوالے کر دوں گا۔"

میں نے کہا "یہ تو بڑی زیادی کی تو نے۔ جاؤ رابعہ! تم جا کے اسے دیکھو اور بہتر ہے اب سو جاؤ۔ ہم اس وقت کچھ نہیں کر سکتے۔"

"ہم صبح بھی کچھ نہیں کر سکتے۔" منظر بولا "سالے فون بھی کاٹ گئے ہیں۔ میں دیکھتا ہوں لائن کہاں سے ٹوٹی ہے۔"

منظر باہر چلا گیا تو میں نے عقبی حصے کا چکر لگایا مگر مجھے کہیں کسی کی موجودگی کے آثار نہیں نظر آئے۔ اس وقت ہمارے واپس کہیں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور مجھے کاجل کی فکر ہو رہی تھی۔ وہ بچوں کے کمرے میں تھی اور شاید وہیں سو گئی تھی۔ کیا اس نے بھی یہ سب کچھ سُنا ہو گا؟ کہیں منظر کی بیوی نے ساری باتیں اسے بتا دیں تو اس کا ذہنی احساسِ عدم تحفظ پھر بیدار ہو جائے گا۔ وہ خود کو یہاں محفوظ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی اور ہمارے "خاندان" میں کسی حد تک ایڈجسٹ بھی ہو گئی تھی۔ میری خواہش تھی کہ وہ ان سب جھمیلوں سے دور رہے جن کا تعلق اب میرے اور دلاور کے تصفیہ طلب ذاتی معاملات سے تھا۔

میں واپس اندر گیا تو منظر نے چوکیدار کو صوفے پر بٹھا رکھا تھا اور خود ہاتھ باندھے سامنے کھڑا اس کی رُوداد سن رہا تھا۔ اسے انجانے میں کسی نے پیچھے سے دبوچ کر بے بس کر دیا تھا اور باندھ کے ڈال دیا تھا۔ وہ خاصی عمر کا آدمی تھا اور زیادہ تنومند بھی نہیں تھا۔

"بابا! تم نے حملہ آور کو دیکھا تھا؟" منظر نے پوچھا۔

"کہاں دیکھا جی۔ دیکھتے تو گٹے نہ توڑ دیتے۔ مجال تھی کسی کی جو اندر آ جاتا ایسے منہ اٹھا کے۔ بندوق کیا شے ہے، توپ سے بھی ہم ڈرنے والے نہیں ہیں۔" اس نے لیٹے لیٹے کراہتے ہوئے بیان دینا شروع کیا۔

اس کی باتوں پر میں نے رابعہ کو مسکراتے دیکھا۔ وہ منظر کی بیوی کی ساتھ چوکیدار کی تیمارداری کر رہی تھی۔ وہ کافی دیر سردی میں بندھا پڑا رہا تھا اور کچھ خوف سے بھی کانپ رہا تھا۔

"چلو اب دفعہ کرو انہیں۔" منظر بولا "خبیث لوگ تھے، چلے گئے کوئی نقصان کیے بغیر۔ اب کسی سے ذکر مت کرنا اس بات کا۔"

"لو جی، ذکر بھی نہ کریں۔ وکیل صاحب، ان کو تو آپ بند کرا دو ہمیشہ کے لیے۔ صبح شام چھتر کھائیں، حقے کا پانی پلایا جائے حرامیوں کو اور دھونی دی جائے دیسی مرچوں کی...."

"بابا جی! کیا فضول باتیں کرتے ہو۔ کس کو پکڑے گی پولیس؟ سب سے پہلے تو تم سے پوچھا جائے گا کہ حلیہ بتاؤ۔ تم نے دیکھا ہو گا کتنے بندے تھے۔" منظر بگڑ کے بولا "کیسے کپڑے پہن رکھے تھے؟"

اس نے ایک آہ بھری "ہاں جی، پولیس بھی چوروں کو کہاں پکڑتی ہے۔ الٹا زمانہ آ گیا ہے۔ چوکیدار پکڑے جاتے ہیں۔ پہلے چور مارتے ہیں پھر مالک پھر تھانے والے۔ کچھ نہ بولو تو پولیس کہتی ہے بولو۔ بولو تو چور پوچھنے آ جاتے ہیں کہ ہمارا نام لیا تھا......"

جب وہ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا تو رابعہ کو سب سے پہلے ہنسی آئی پھر منظر کی بیوی بھی ہنسنے لگی حالانکہ اس کا موڈ خراب تھا۔

میں نے کہا "یار منظر! یہ کیا نمونہ رکھ لیا ہے تو نے بطورِ

چوکیدار۔ اس کا فائدہ؟ یہ روک سکتا ہے کسی کو اندر آنے سے؟"

"تو مجھے بتا، تالے لگانے کا فائدہ۔ کیا ان سے چور ڈاکو رک جاتے ہیں؟" منظر بولا "جیسے تالے ہوتے ہیں شریفوں کو یہ بتانے کے لیے کہ صاحبِ خانہ گھر میں نہیں ہیں۔ ایسے ہی یہ بھی بیٹھا رہتا ہے۔ آتے جاتے لوگوں کو بتا دیتا ہے کہ میں ہوں یا نہیں۔ بڈھا آدمی دنیا میں اکیلا ہے۔ میں نے جگہ د... ی ہے رہنے کے لیے۔"

میں نے کہا "اسے دیکھ کر تو پرانے وقتوں کے وہ چوکیدار یاد آتے ہیں جو گلیوں میں لالٹین اُٹھائے لاٹھی مارتے پھرتے تھے اور چلّاتے رہتے تھے رات بھر کہ "جاگتے رہو۔"

رابعہ بولی "جو کہ نہایت مضحکہ خیز بات ہے۔ اگر لوگ رات بھر جاگتے رہیں تو پھر چوکیدار کی ضرورت کیوں پڑے۔"

"پرانے چور بھی تو وضع دار ہوتے تھے۔ ان کی آوز پر دبک جاتے تھے یا فرار ہو جاتے تھے۔" منظر نے کہا "اب تو میں دروازے پر ٹینک کھڑا کر دوں تو حملہ کرنے والے ٹینک شکن توپ لے کر آ جائیں گے۔"

"میں نے کہا "کاجل کہاں ہے؟"

"وہ سو رہی تھی۔ اسے کچھ پتا نہیں۔" منظر کی بیوی نے کہا۔

"جاؤ اب تم بھی سو جاؤ، رابعہ بی بی۔ دو بج رہے ہیں رات کے۔ مجھے صبح پھر مغز کھپانے کے لیے جانا ہے۔" منظر نے کہا۔

اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ عام حالات میں کوئی بھی ٹیلی فون کی گھنٹی سُن کے نہیں چونکتا مگر اس وقت ایک ساتھ ہم سب تقریباً اچھل پڑے۔

"یہ مردہ زندہ ہو گیا۔" میں نے کہا۔

منظر نے سوالیہ نظروں سے بیوی کی طرف دیکھا "فون تو ڈیڈ تھا؟"

"رابعہ سے پوچھ لو، مجھے کیا گھور رہے ہو۔" وہ بولی۔

"اچھا دیکھو تو سہی اس وقت کس نے یاد کیا ہے۔ کیا پتا وہی ہوں۔ اطلاع دینا چاہتے ہوں کہ ہم خیریت سے گھر پہنچ گئے۔ فکر نہ کرنا۔" میں نے کہا۔

منظر نے فون اٹھا کے کہا "ہیلو" اور ریسیور پر ہاتھ رکھ کے میری طرف دیکھا "ٹھیک کہا تھا تو نے، تیری کال ہے۔"

"میری کال ہے۔ کون ہے؟" میں نے تذبذب کے ساتھ کہا۔

"تیرے ماموں۔ چوہدری دلاور۔" منظر بولا "بول کیا کہوں؟"

وہ مذاق نہیں کر رہا تھا۔ میں نے ریسیور لے لیا لیکن لائن کٹ چکی تھی۔ "کوئی بھی نہیں۔" میں نے کہا۔

منظر بولا "میں شرط لگا سکتا ہوں کہ وہ چوہدری دلاور تھا۔"

میں سوچ میں پڑ گیا "تجھے چکر دے دیا اس نے۔ اگر میں یہاں نہ ہوتا تو تیرا جواب فوری اور واضح ہوتا۔ تو پوچھتا کہ چوہدری صاحب آپ کا دماغ تو نہیں چل گیا ہے۔ تیرے توقف نے تصدیق کر دی کہ میں موجود ہوں اور یہ، مقصد ہو گا اس کی کال کا۔ اسے معلوم ہو گیا کہ میں یہاں ہوں۔"

منظر نے سر ہلایا "یہ سالا بہت ہی ڈرامے باز ہے۔ تصویر یہاں ویسے ہی ہو جاتی مس چاندنی سے اور اس سالے رستم خاں سے۔"

"وہ تیرا سالا کب سے ہو گیا؟" میں نے کہا۔

منظر نے ایک آہ بھری "کاش ہم اتنے خوش نصیب ہوئے سکندر صاحب۔ اس نے تو بڑی واضح پیشکش کر دی تھی۔ چاندنی اسمِ با مسمّٰی تھی۔"

"پھر کیا بیوی سے ڈر گیا؟" میں نے کہا۔

"نہیں یار، بچّوں سے ڈر گیا۔"

"کیا سب مل کے تجھے مارتے؟" مجھے بے اختیار ہنسی آئی۔

"ابے ان سے جو چاندنی کی اولاد کہلاتے۔ چودہ کیا کم ہیں۔ مزید چودہ کا سوچ کے ہی چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں۔ اس چولہا کے پھاڑے سے ڈر لگتا ہے ورنہ چار تو حاضر اسٹاک میں دستیاب ہو تیں۔"

میں نے کہا "یار! میں ایک چکر باہر کا لگا کے دیکھنا چاہتا ہوں کہ انھوں نے تار کہاں سے کاٹا تھا اور کاٹا تھا تو جاتے وقت انہیں جوڑنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"دیکھ لے جاسوسِ اعظم۔ اس کے بغیر تو شاید نیند بھی نہیں آئے گی تجھے۔" منظر میرے ساتھ چل پڑا۔

ٹیلی فون کی لائن پول سے چھت تک آئی تھی اور تار سیدھا ایک روشن دان سے گھر کے اندر اُتر گیا تھا۔ یہ تار کوئی چھت پر چڑھ کے کاٹ سکتا تھا یا ٹیلی فون کے کھمبے پر۔ چھت پر کسی کا چڑھنا زیادہ مشکل تھا چنانچہ زیادہ امکان یہی تھا کہ کسی نے کھمبے پر چڑھ کے تار کو اس ڈبے سے الگ کر دیا جو اوپر لگا نظر آتا ہے اور پھر وہیں جوڑ کے اس کارروائی کا کوئی ثبوت باقی نہیں چھوڑا۔

واپس اندر آتے ہوئے میں نے کہا "مجھے اس کارروائی کے پیچھے دلاور کا ہاتھ نظر آتا ہے۔"

منظر نے قہقہہ مارا "بھوتنی کے! یہ تو وہی سکھ تھانے دار والی بات ہو گئی جس نے چوری کی واردات میں لمبی چوڑی تفتیش کے بعد اعلان کیا تھا کہ یہ کام کسی چور کا معلوم ہوتا ہے۔"

میں نے خفت سے کہا "میرا مطلب تھا، اس کا ذہن ہی اتنی باریکی میں جاتا ہے۔ اس نے کہا ہو گا کہ خیال رکھنا، وہ کسی عام آدمی کا گھر نہیں ہے۔ بہت بڑا وکیل ہے۔ سب کو اندر کرا دے گا۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے چوکیدار کو مارا نہیں۔ اس کے جسم پر ضرب کا کوئی نشان نہیں ملے گا۔ اسے دوا سے بے ہوش نہیں کیا کہ کہیں میڈیکل رپورٹ میں آ جائے۔ بس ایسے ہی باندھ کے ڈال دیا تھا۔ ٹیلی فون کا تار بھی انھوں نے پول پر سے الگ کیا اور پھر ایسے جوڑ دیا کہ خود ٹیلی فون کے محکمے والوں کو پتا نہ چلے۔ گھر کے اندر بھی انھوں نے باتوں کے سوا کچھ نہیں کیا۔ اور یہ جو فون ابھی آیا تھا۔ اس کا ایک مقصد تو میں نے بتایا۔ دوسرا مقصد اتنی تسلی

رہا ہو گا کہ فون کی لائن پھر جوڑی جا چکی ہے اور مس چاندنی واپس جا چکی ہیں۔"

منظر نے کمرے میں پہنچ کے گھڑی دیکھی "یار، اصولاً تو مجھے سو جانا چاہیے مگر سوتے ہوئے ڈر لگتا ہے کہ کہیں پھر حشر والے دن ہی آنکھ نہ کھلے۔"

"فکر مت کر۔ تیرا ہارٹ فیل نہیں ہو سکتا۔"

"وہ تو میں بھی جانتا ہوں۔ اصل خطرہ تو تیرے دشمنوں سے ہے۔ وہ نہ چھری پھیر جائیں سوتے میں میرے حلق پر۔" منظر بولا۔

"چل تُو سو جا، میں جاگ رہا ہوں۔ مجھے نیند کم آتی ہے اور کچھ رات رات بھر جاگنے کی عادت ہو گئی ہے۔" میں نے کہا "آج ہماری وجہ سے تیرے گھر میں بھی پریشانی کے اسباب پیدا ہوئے۔"

منظر اپنے بیڈ پر لیٹ گیا "ایسا تو اب اکثر ہو گا۔ گھر دیکھ لیا ہے تا انھوں نے اور یہ بھی دیکھ لیا ہے کہ مسٹر اور مسز سکندرِ اعظم یہیں پائے جاتے ہیں۔ جب تو یہاں نہیں تھا تب بھی ہم تو زد پر تھے پیارے۔ اب تیرے آ جانے سے گھر بھی محفوظ نہیں رہا۔ کل سے سب بچوں کی فوجی تربیت شروع کرتا ہوں۔ سالے غلیل تو چلا ہی سکتے ہیں۔ دو چار کو کانا ہی کر دیں۔"

میں نے کہا "تیری نصف بہتر زبان بہت چلاتی ہے۔ اسے ہاتھ چلانا آتا تو کتنا اچھا ہوتا۔"

"یہ نیک کام تو کر۔ رابعہ کو سکھا دے ہاتھ پاؤں چلانا تاکہ تیرا حشر بھی وہی ہو جو اس مرزا غالب ثانی کا نازو کے ہاتھوں ہوتا ہے۔" منظر بولا اور کروٹ بدل کے سو گیا۔

مجھے دو منٹ بعد اس کے خرّاٹے سن کر حیرانی ہوئی۔ میرے لیے نیند کو بلانا روٹھے محبوب کو منانے سے زیادہ مشکل ہوتا تھا۔ آنکھیں بند کرنے کے بعد بھی خیالات کی رَو ماضی سے حال اور مستقبل کے حالات و واقعات، خدشات اور امکانات میں سرگرداں رہتی تھی۔ اچھی کتاب ایسے پریشان کُن خیالات سے نجات دلانے اور ذہن کو پُرسکون کرنے میں معاون ثابت ہوتی تھی مگر یہاں پڑھنے کو کچھ بھی نہیں تھا چنانچہ میں بہت دیر تک جاگتا رہا اور چوہدری دلاور کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس میں کچھ ہماری غلطی تھی، کچھ ستم ظریفیِ حالات اور سلسلۂ اتفاقات کہ اِدھر ہم پاکستان پہنچے، اُدھر دلاور کو خبر ہو گئی۔ غالب نے اپنی آمد کو اخبار سے مشتہر کر دیا اور میں جذباتی ہو کے رابعہ کے پرانے گھر کی جگہ چاندنی کے محل میں پہنچ گیا۔ کسی کی عدم موجودگی میں اس کی زمین، جائداد پر قبضے کے واقعات اتنے عام نہیں۔ اگر میں غور کرتا تو اس غاصبانہ قبضے کے پیچھے دلاور کے سازشی ذہن کی کارستانی دیکھ سکتا تھا مگر مجھے یہ خیال ہی نہیں آیا۔ چالاکی سے کام لے کر میں نے جو فائل حاصل کر لی تھی، وہ اہم ضرور تھی مگر اس کے بغیر بھی رابعہ اپنے حقِ ملکیت کا دعوےٰ دائر کر سکتی تھی اور یہ کہیں بہتر ہوتا اگر وقار یوسف یہ کیس فائل کرتا اور رابعہ کا وکالت نامہ پیش کر کے گولا ٹنڈ والا کو اور چاندنی کو عدالت میں طلب کر لیتا۔ جب چاندنی کو رابعہ آنجہانی کی بہن کے طور پر پیش کیا جاتا تو رابعہ کا زندہ اس جہاں میں خود نمودار ہونا وہ ایٹم بم کا دھماکا ہوتا جو سب کو تباہ کر دیتا۔

معلوم نہیں کب مجھے نیند آئی، مجھے تو ایسا لگا کہ آنکھ لگتے ہی منظر نے مجھے جھنجوڑ کے جگا دیا۔

"لاحول ولا قوۃ کیا آفت آ گئی صبح صبح۔" میں نے آنکھیں مل کے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"میاں سکندر! دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا۔ بھاگو۔" اس نے میرے سامنے ایک اخبار رکھ دیا۔

وہ عدالت جانے کے لیے تیار تھا اور کالا کوٹ پہنے بریف کیس اٹھائے کھڑا تھا۔ یہ اس کا معمول تھا کہ ناشتا کرتے ہوئے اخبار پر نظر ڈالتا تھا۔ جس خبر نے آج اسے بدحواس کر دیا تھا اسے تلاش کرنے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ خبر چھوٹی تھی لیکن صفحۂ اول پر تصویر کے ساتھ لگائی گئی تھی۔

چاندنی کی تصویر پر نظر پڑتے ہی میری نیند رفوچکّر ہو گئی اور ایک جھٹکے سے میرا خوابیدہ ذہن پوری طرح بیدار ہو گیا۔

"یہ... یہ کیا۔ چاندنی کو قتل کر دیا گیا!" میں نے بے یقینی سے کہا۔

منظر کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں "اصل بات یہ ہے کہ جب اسے قتل کیا گیا اس وقت وہ زندہ تھی اور اس وقت آپ رابعہ کے ساتھ اس کے گھر میں تشریف رکھتے تھے۔"

میں نے خبر کو غور سے پڑھنا شروع کیا۔

گڑھی شاہو میں قتل کی لرزہ خیز واردات میں حسین عورت کا سفّاکانہ قتل۔ بازارِ حسن سے تعلق رکھنے والی ایک عورت چاندنی بیگم کو نامعلوم قاتل نے خنجر کے پے در پے وار کر کے ہلاک کر دیا۔ چاندنی بیگم نے کچھ عرصہ قبل ٹھیکیدار غلام محمد سے شادی کی تھی۔ واردات کے وقت وہ گھر پر تنہا تھی۔ اس کے شوہر، مشہور سیاسی و سماجی کارکن چوہدری دلاور کے عشائیے میں شریک تھے۔ انھوں نے واپسی پر رات دس بجے اپنی خواب گاہ میں چاندنی بیگم کی خون میں لت پت لاش دریافت کی اور پولیس کو اطلاع دی۔ ابتدائی تفتیش کے نتیجے میں سامنے آنے والی باتوں سے پتا چلتا ہے کہ یہ واردات رات نو اور دس بجے کے درمیان ہوئی تھی۔ چوکیدار نے تقریباً اسی وقت دو مہمانوں کے آنے اور کچھ دیر بعد خاموشی سے چلے جانے کی تصدیق کی جن میں سے ایک مرد تھا اور دوسری کوئی خوب صورت عورت۔ کار کا نمبر نوٹ کرنا اس نے ضروری نہیں سمجھا تھا مگر اپنے بیان میں چوکیدار نے گاڑی کا رنگ اور ماڈل بتایا ہے۔ اس نے یہ بھی کہا ہے کہ ملاقاتی مرد نے خود کو وکیل ظاہر کیا تھا جس کی وجہ سے چاندنی بیگم نے انھیں اندر بلوا لیا تھا۔ تفتیش کرنے والے ایک افسر نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ قتل کی واردات ایک سے زیادہ افراد کا کام تھا۔ اگر قاتل وہی ملاقاتی تھے

تو یہ فرض کیا جاسکتا ہے کہ مرد نے چاندنی بیگم کو قابو میں رکھا اور اس کا منہ دبایا جب کہ عورت نے خنجر سے چاندنی کا کام تمام کیا۔ یہی وجہ ہوسکتی ہے کہ چوکیدار نے چاندنی بیگم کی چیخ یا مدد کی آواز بھی نہیں سنی اور قاتل ملاقاتی خاموشی سے فرار ہونے میں کامیاب رہے اور چوکیدار نے اندر جاکے چاندنی کی خیریت معلوم کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ غلام محمد کے بیان کے مطابق چاندنی کا قتل کسی رقابت کا نتیجہ نہیں ہوسکتا۔ چاندنی بیگم گزشتہ کئی ماہ سے گھریلو زندگی بسر کررہی تھی۔ اسے بطور ماڈل پیش کرنے کی بات چیت چل رہی تھی۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ کچھ فلمساز اسے پنجابی فلموں میں ڈانسر کا رول قبول کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کررہے تھے۔ ہمارے نمائندے کے مطابق گھر میں کافی نقدی اور زیور موجود تھا مگر غلام محمد نے کسی چیز کی گمشدگی کے شبے کا اظہار نہیں کیا۔ ٹھیکیدار غلام محمد' اکھاڑے کے سابق بے تاج بادشاہ گولا ٹنڈ والا ہیں جو پہلوانی چھوڑ کے صنعتکار چوہدری دلاور کے ساتھ سیاسی و سماجی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کے حصہ لیتے ہیں۔ پولیس تفتیش کررہی ہے۔ مزید سنسنی خیز انکشافات کی توقع ہے۔

اس خبر کو پڑھنے کے بعد میرے لیے صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ کرنا دشوار نہ رہا۔ ہم ایک بہت بڑی سازش کا شکار ہوچکے تھے اور ان حالات میں ہمارا فوراً یہاں سے فرار ہوجانا منظر کو مشکلات سے بچانے کے لیے ازحد ضروری تھا۔

میں نے کہا "منظر! کوئی ہمیں تلاش کرتا ہوا یہاں تو نہیں پہنچا؟"

"ابھی تک تو نہیں پہنچا مگر پولیس کسی بھی وقت آسکتی ہے۔ تم لوگ نکل جاؤ۔" منظر نے کہا "میں نے رابعہ اور کاجل کو اٹھادیا ہے۔"

"اگر ہمارے نکلنے سے پہلے ہی پولیس آگئی تو؟"

"تو ایسے منہ اٹھا کے اندر نہیں آئے گی۔ میں روک سکتا ہوں ان کو دروازے پر۔ خانہ تلاشی کے وارنٹ مانگ سکتا ہوں۔"

"وہ سب اپنے ساتھ لائیں گے۔" میں نے کہا "یہ سب انتظام ولاور نے پہلے سے کرلیا ہوگا۔"

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ بھاگ جاؤ۔ خالی ہاتھ سیدھے وقار یوسف کے گھر چلے جاؤ۔ اس کی گاڑی لو اور لاہور سے نکل کے سیدھے غیر علاقے کا رخ کرو۔ نوشہرہ بالکل نہیں جانا ورنہ پولیس پہلے سے بیٹھی ہوگی وہاں تمہارے انتظار میں۔ الزام آرہا ہے رابعہ پر اور تم پر۔ تم کو ثابت کرنا ہے کہ جب قتل کی یہ واردات ہوئی تو تم یہاں سے سیکڑوں میل دور تھے۔ سمجھے کہ نہیں؟"

"سمجھ گیا۔ دلاور نے میڈیکل رپورٹ میں غلط ٹائم لکھوایا ہے۔ خبر خود اخبارات کو اپنی مرضی کے مطابق فراہم کی ہے۔"

"ہاں بھائی۔ آج کل وہ سیاست میں ہے' اس کی پہنچ دور تک ہے۔" منظر نے بے چینی سے گھڑی دیکھی۔

"تم وقار یوسف کو فون کردیتے۔"

"فون کرنے میں خطرہ ہے۔" وہ بولا "کوئی سن نہ رہا ہو۔ تم لوگ ناشتا بھی وہیں کرلینا۔ وقار یوسف کے گھر میں۔ اور اگر ممکن ہو تو حلیہ بدل کے نکلنا۔ کاجل کو یہاں کوئی نہیں جانتا۔ رابعہ برقعے میں چھپ سکتی ہے۔ تم کچھ کرلینا۔"

"میں مروں گا۔ معاف کرنا یار' تو بڑی مشکل میں پڑگیا ہماری وجہ سے۔" میں نے کہا۔

"اب جاتا ہے یا دھکے دے کر نکالوں بھوتنی کے۔ یہ مت سمجھنا کہ منظر بزدل تھا۔ اب ہم تیرے ساتھ لٹک سکتے ہیں مگر پہلے ان کو لٹکانا ہے سالوں کو جو باز نہیں آرہے ہیں حرامی پن سے۔ پچھلی طرف سے نکل جاؤ تم لوگ۔ کوئی ٹیکسی پکڑلینا۔"

"مگر یار! میری گاڑی چاندنی کے چوکیدار نے دیکھی تھی۔" میں نے کہا۔

"اسے میں ایک میل دور چھوڑ آیا ہوں۔ سارے کاغذات جلا دیے ہیں اور کپڑے سے کچھ صفائی بھی کردی ہے جہاں بھی فنگر پرنٹ ملنے کے امکانات تھے۔" منظر بولا۔

"صبح صبح یہ سب کرلیا تُو نے! رابعہ کو بتایا؟"

"ہاں۔ اپنی گردن تو بچانی ہے نا یار۔" منظر بولا "اب ایسی کی تیسی چوہدری دلاور کی اور پولیس۔ ثابت کرکے دکھائیں کہ تم لوگ کہاں تھے۔ پہلے تو یہ ثابت کریں کہ لاہور میں تھے۔"

"وہ کیبن والا۔ جس سے میں نے بات کی تھی۔ جو رابعہ کے گھر کے سامنے پان سگریٹ بیچتا ہے۔"

"وہ خود کچھ نہیں بولے گا۔ قتل کے کیس میں رضاکارانہ طور پر بیان دے کر کوئی اپنی گردن نہیں پھنساتا۔ ویسے بھی وہ گولا ٹنڈوالا سے ناخوش تھا۔"

"تُو نے اپنی بیوی کو سمجھادیا؟"

"سب سمجھادیا ہے۔ رابعہ اور کاجل کو راستے میں بتادینا' اگر ضروری ہو۔" منظر نے کہا "اور وقار یوسف سے کہنا کہ ابھی انتظار کرے۔ رابعہ کی طرف سے فوراً کیس فائل نہ کرے۔ یہ کام بعد میں بھی ہوسکتا ہے۔ ابھی تو یہ ایک سبب بن جائے گا قتل کا۔ کہ رابعہ اپنے گھر کی زمین پر ایک طوائف کا محل دیکھ کر مشتعل ہوئی اور اس نے تمہاری مدد سے چاندنی کو مار ڈالا۔"

منظر سے باتیں کرتے ہوئے میں نے ہاتھ منہ دھویا اور کپڑے بدلے۔ میرے کان باہر کی آوازوں پر بھی تھے اور اندر سے مجھے کاجل اور رابعہ کی باتیں کرنے کی آواز آرہی تھی۔

"یہ ایک لاکھ کا چیک ہے۔" منظر نے مجھے کاغذ کا ایک پرزہ تھما کے کہا "وقار یوسف سے کہنا' بعد میں کیش کرالے۔ تم اس سے ایک لاکھ لے لینا۔"

صبح آٹھ بجے میں نے رابعہ اور کاجل کے ساتھ کوٹھی کے

پچھے کا چھوٹا سا باغیچہ عبور کیا اور ایک گیٹ سے بیک اسٹریٹ میں آگئے۔ رابعہ خاموش تھی اور کاجل نروس۔ کلیم حیران تھا کہ ہم یوں صبح صبح ناشتا کیے بغیر کہاں روانہ ہورہے ہیں لیکن کاجل نے اسے سمجھادیا کہ ہم تمہارے ساتھ گاؤں جارہے ہیں تو وہ کچھ افسردہ ہوگیا۔

"کیا تم خوش نہیں ہو؟ تم واپس جارہے ہو اپنے گھر۔" کاجل نے کہا۔

"دیدی' تم ہم کو چھوڑ کر آجائے گا؟" وہ بولا۔

"ہاں کلیم یہ تو مجبوری ہے۔" کاجل نے کہا۔

"کیوں؟ تم اُدھر رہو' ہمارے ساتھ۔" کلیم نے کہا "ہمارا گھر میں۔"

"جیسے تم یہاں نہیں رہ سکتے کلیم! ایسے ہی میں وہاں نہیں رہ سکتی۔" کاجل نے اسے سمجھایا۔

"تمہارا تو اِدھر کوئی گھر نہیں ہے۔" کلیم بولا۔

"کیوں نہیں ہے۔ یہ دیکھو کتنے لوگ ہیں یہاں۔ رابعہ باجی اور سکندر بھائی۔ بعد میں سب آجائیں گے۔ چچا غالب اور نازو۔ محسن چچا اور گل۔ یہ لوگ مجھے کہاں جانے دیں گے۔ اگر میں تمہیں واپس لانا چاہوں تو کیا تمہارے گھر والے مانیں گے؟ نہیں مانیں گے نا۔"

رابعہ میرے ساتھ تھی اور کاجل ایک قدم پیچھے۔ ہم کاجل کی باتیں سن رہے تھے اور اس کے لہجے سے اندازہ کررہے تھے کہ وہ خود پر کتنا جبر کرکے اپنے دکھ کو ظاہر نہیں ہونے دے رہی ہے۔ اس عرصے میں کلیم کے ساتھ کاجل کو اتنی زیادہ جذباتی وابستگی ہوگئی تھی کہ کلیم سے زیادہ وہ خود جدائی کے خیال سے اداس تھی۔

"تم نے اخبار دیکھا؟" میں نے رابعہ سے کہا۔

"ہاں۔ منظر نے پہلے مجھے ہی بتایا تھا۔" رابعہ بولی "بہت بڑی حماقت سرزد ہوئی ہم سے کہ چاندنی سے ملنے چلے گئے۔"

"دلاور نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا۔" میں نے کہا۔

وقار یوسف بھی عدالت جانے کے لیے نکل ہی رہا تھا کہ ہمیں اپنے دروازے پر ٹیکسی سے اترتا دیکھ کر حیران ہوگیا۔ اس نے اخبار نہیں دیکھا تھا۔ اندر جانے کے بعد میں نے اسے خبر دکھائی۔

"ہم فوراً نکل آئے وہاں سے۔ ناشتا کیے بغیر۔" میں نے کہا۔

"ناشتا ابھی تیار ہوجاتا ہے۔" وقار یوسف نے کہا اور خبر کی تفصیل پڑھنے لگا۔ اس کی بیوی' رابعہ اور کاجل کو اندر لے گئی۔

"یہ تو سب ایک طے شدہ پروگرام کے تحت ہوا۔" وقار بولا۔

"ہاں۔ اور ہم نے دلاور کو اس پروگرام پر عمل درآمد کا موقع فراہم کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔" میں نے کہا "ہم چاندنی کے گھر سے نکل آئے تھے کہ وہ پہنچا اور اسے معلوم ہوا کہ ہم فائل لے گئے۔ صرف تصدیق کے لیے کہ ہم لاہور میں اور منظر کے گھر ٹھہرے ہیں' اس نے چاندنی کو رستم کے ساتھ بھیجا اور انہیں ہدایت کی کہ وہ اپنی موجودگی کا کوئی ثبوت نہ چھوڑ کر آئیں۔ وہ جاتے جاتے فون تک بحال کرگئے۔ اس کے بعد دلاور نے خود فون کرکے وہاں ہماری موجودگی کی تصدیق کی اور اس کے بعد چاندنی کو قتل کراکے اپنی مرضی کی میڈیکل رپورٹ لے لی۔ اپنی خواہش کے مطابق خبر لگوادی۔ عینی گواہ بعد میں آجائیں گے۔ ٹائمنگ دیکھو کتنی درست رکھی گئی ہے۔ ٹھیک نو بجے ہم چاندنی کے گھر سے نکلے تھے۔ چوکیدار کا بیان ان حالات میں سو فیصد درست ہے اور پولیس کی قیاس آرائی بھی۔ میں تو حیران ہوں کہ وہ صبح ہونے سے پہلے ہی ہماری گرفتاری کے لیے منظر کے گھر چھاپا مارنے کیوں نہیں پہنچ گئے۔"

"خوش قسمتی ہے آپ کی جو بروقت نکل آئے۔"

"اب اگر تمہیں عدالت میں دیر ہورہی ہو تو ہونے دو۔" وہ بولا "نہیں' میرا منشی تاریخ لے لے گا۔ ویسے بھی پہلی پیشی دس بجے تھی۔"

"تمہیں چند اہم اور ضروری کام کرنے ہوں گے۔" میں نے کہا "ورنہ یوں سمجھ لو کہ رابعہ اور میں اس قتل کے الزام میں پکڑے گئے تو ہمیں چھڑانا بھی مشکل ہوگا۔ ہم تو ایسے غائب ہوں گے جیسے لاہور آئے ہی نہیں تھے۔ ہم اپنی کسی اور جگہ موجودگی کے ثبوت اور گواہ پیدا کیے بغیر دلاور کے جال سے نہیں نکل سکتے۔ ہمیں گاڑی چاہیے تمہاری۔"

"میری گاڑی....."

"ہاں۔ ہم اپنی گاڑی میں جاتے تو لاہور سے نکلنے سے پہلے ہی دھر لیے جاتے۔" میں نے کہا "منظر نے ہماری گاڑی کو اپنے گھر سے دور لاوارث چھوڑ دیا ہے۔ ہم دوسری گاڑی خرید لیتے مگر وقت نہیں ہے۔"

"مگر آپ سب لوگ کہاں جائیں گے؟"

"ہم سیدھے پشاور سے آگے علاقہ غیر کی طرف جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔" میں نے کہا "کم سے کم بھی ایک ہفتہ لگ جائے گا۔ ممکن ہے' ہم دو ہفتے بعد پکا بندوبست کرکے واپس آئیں۔"

"کیا پکا بندوبست؟"

"واردات کے وقت اپنی علاقہ غیر یا پشاور میں موجودگی کا ثبوت فراہم کرنے کے لیے کچھ تو کرنا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"گاڑی آپ لے جائیں لیکن راستے میں کسی نے چیک کی تو......"

"کیا چیک کرے گا۔ تم اس کی چوری کی رپورٹ تو نہیں لکھواؤ گے۔ پولیس یا تو ہماری "کورونا" کا نمبر تلاش کرے گی یا منظر کی گاڑی کا نمبر دیکھے گی مگر منظر کی گاڑی تو اسی کے پاس ہوگی۔ تم اپنے لیے دوسری گاڑی کا بندوبست کرسکتے ہو نا؟"

"ہاں۔ کیوں نہیں۔ یہ کار بھی انجم کی ہے اور اسی کے نام پر ہے۔" وہ خفت سے مسکرایا "وہ گھر سے دوسری منگوا لے گی۔ بڑے

باپ کی بیٹی ہے' میرے جیسا معمولی وکیل ایسی گاڑی کہاں خرید سکتا تھا۔"

"وہ..... برا تو نہیں مانے گی؟"

"کون انجم؟" وہ ہنسا "تم اسے اتنا ہی قابلِ اعتماد سمجھ سکتے ہو جتنا تم رابعہ یا نازو کو سمجھتے ہو۔"

میں نے کہا "منظر نے یہ چیک دیا ہے۔ اسے بعد میں کیش کرالینا۔ ابھی تو مجھے ایک لاکھ لا کے دو۔"

"نو پرابلم۔ یہ کام بھی انجم کرے گی۔ ابھی بینک تو کھلے نہیں ہیں۔ وہ گھر سے منگوائے گی۔"

میں نے حیرانی سے کہا "ایک لاکھ کیش؟"

"بہت اونچا ہاتھ مارا ہے میں نے سکندر صاحب۔ اس کا باپ کروڑ پتی ہے۔ پہلے تو روایتی باپ بن کے ہمارے درمیان حائل ہوگیا تھا۔ جب انجم اَڑ گئی تو اس کی اکڑ فوں تمام ہوگئی۔ اسے معلوم تھا کہ ہم کورٹ میں بھی شادی کرلیں گے۔ اکلوتی بیٹی ہے نا' مجبور ہوگیا۔ اب بہت خوش ہے مجھ سے بھی۔ کہتا ہے' انجم کا انتخاب غلط نہیں تھا۔"

میں نے کہا "یہاں بھی ہم سو فیصد محفوظ نہیں ہیں۔ پولیس کو تمہارا خیال آئے نہ آئے' دلاور کو آسکتا ہے۔ منظر کے گھر میں داخل ہونے کے لیے وارنٹ رات کو نکلوائے گئے ہوں گے یا صبح مجسٹریٹ کے گھر سے سائن ہو جائیں گے۔ مگر تمہارے گھر میں داخل ہونے کے لیے انہیں نئے سرے سے کوشش کرنی ہوگی۔ منظر کے گھر میں ہمیں نہ پا کے وہ آرام سے نہیں بیٹھ جائیں گے۔ اپنے چوہدری دلاور صاحب کے شیطانی ذہن کا چرخہ پھر چلنے لگے گا اور وہ سوچے گا کہ ہم اور کہاں جاسکتے ہیں۔ بس علاقہ غیر کی طرف اس کے فرشتوں کا دھیان نہیں جاسکتا۔"

انجم نے اندر سے آواز لگائی "چلیں جی' ناشتا کرلیں پہلے۔ باتیں ہوتی رہیں گی۔"

انجم بلاشبہ بہت اچھی لڑکی تھی۔ جب وقار نے اس سے کہا کہ تم اپنے گھر سے دوسری گاڑی منگوالو تو وہ فون کرنے اٹھی۔

"کون سی گاڑی منگواؤں؟" اس نے سادگی سے کہا۔

"بھئی انہیں جانا ہے پشاور۔"

"پھر جیپ منگوالیتی ہوں۔" وہ بولی۔

"یہ ہماری گاڑی لے جارہے ہیں۔" وقار نے اسے سمجھایا "اور ہاں' ہمارے پاس ان کا چیک ہے۔ نو بجے کیش ہو جائے گا۔ تم پوچھو ایک لاکھ فوراً مل سکتے ہیں قارون کے خزانے سے۔ فقیروں کو اللہ کے نام پر۔"

وہ فون پر بات کرنے لگی اور ہم ناشتے میں مصروف ہوگئے۔

"نام تو ہارون ہے اس کے ابا کا۔ مگر میں قارون کہتا ہوں۔ سب دولت مند دل کے برے نہیں ہوتے۔" وقار بولا "تم ملو گے تو مانو گے۔"

رابعہ نے کہا "ایسے ہی مان لیتے ہیں ہم۔ تمہارا سسر ہے اور وہ بھی کروڑ پتی۔"

میں نے کہا "ہمیں احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ رابعہ تو چھپ جائے گی برقعے میں۔ مجھے کیا کرنا چاہیے حلیہ بدلنے کے لیے؟"

"میک اپ کا سامان اس وقت کہاں ملے گا؟ داڑھی مونچھ میری ہوتی تو میں اتار کے دے دیتا۔" وقار بولا "برقع! برقع کہاں سے ملے گا؟ اے انجم! فون بند مت کرنا۔ وہ جو تمہارے مالی کی بیوی ہے نا' اس کا برقع بھی چاہیے۔"

"کیا؟ مالی کی بیوی کا برقع" انجم نے ریسیور پر ہاتھ رکھ کے کہا۔

"بس برقع چاہیے' کسی کا بھی ہو۔ دو ہوں تو بہتر۔ ایک رابو باجی کے لیے۔ دوسرا سکندر بھائی کے لیے۔ انہوں نے پردہ شروع کردیا ہے۔ ایک دوسرے سے بھی۔" وقار بولا "بابا! میں مذاق نہیں کررہا ہوں۔"

انجم نے گھر سے تو برقع نہیں منگوایا مگر بعد میں نہ جانے کس کو فون کیا اور بولی "ایک برقع تو ابھی آجاتا ہے مگر بھائی سکندر آپ کو بھی....؟"

میں نے کہا "تم بھی کس کی باتوں میں آرہی ہو۔ میں نے حلیہ بدلنے کی خواہش ظاہر کی تھی' جنس بدلنے کی نہیں۔"

"آدھے گھنٹے کے بعد کسی نے کال بیل بجائی تو وقار یونس دروازے تک گیا۔ انجم کے گھر سے کوئی ڈرائیور آیا تھا۔ اس نے ایک لفافہ انجم کے حوالے کیا۔ ظاہر ہے اس میں ایک لاکھ روپے تھے۔ وہ گاڑی کی چابیاں چھوڑ کے واپس جانے لگا تو مجھے ایک خیال آیا۔

میں نے کہا "انجم! حلیہ بدلنے میں کپڑے اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ تمہارے شوفر کی وردی مجھے اچھی لگے گی۔"

وقار یوسف نے بھی سرہلایا "ہاں' آئیڈیا برا نہیں۔ ڈرائیور کی خاکی وردی اور ٹوپی پہن کے دھوپ کا چشمہ لگالو تو تمہیں آسانی سے کوئی شناخت نہیں کرپائے گا۔"

انجم دروازے کی طرف لپکی۔ ڈرائیور ابھی واپسی کے لیے احاطے سے باہر بھی نہیں گیا تھا کہ اسے انجم نے آواز دے کر بلالیا۔ وہ عمر رسیدہ' خاموش طبع اور مظلوم صورت آدمی تھا۔

"تم واپس کیسے جاؤ گے؟" انجم بولی۔

"بس سے چلا جاؤں گا بی بی جی۔" اس نے کہا۔

انجم نے اسے سو کا نوٹ دیا "یہ لو ٹیکسی پکڑ لینا۔"

ڈرائیور نے اس رشوت کو بی بی جی کی فراخدلی سمجھ کے رکھ لیا اور سلام کرکے پھر جانے کے لیے مڑا۔

"سنو! یہ وردی تم نے کہاں سے سلوائی تھی؟" انجم نے چالاکی سے کہا۔

"انارکلی میں انگلش ٹیلرز سے بنتی ہیں سب کی وردیاں۔ میری بھی وہیں سے آئی ہوگی۔"

"وہ دراصل میں نے ایک شخص کو بلوایا ہے شوفر رکھنے کے لیے۔ گاڑی ایک ہے نا' اس لیے تکلیف ہوتی ہے۔ صاحب عدالت چلے جاتے ہیں تو مجھے گھر سے گاڑی منگوانی پڑتی ہے کہیں آنے جانے کے لیے۔ شوفر ہوگا تو صاحب کو عدالت چھوڑ کے گاڑی واپس لے آئے گا اور جب آنے کا وقت ہوگا تو پھر چلا جائے گا۔"

ڈرائیور ہنوز خاموش کھڑا رہا۔ اس کے چہرے پر کسی قسم کے جذبات نہیں تھے۔ بات سننا آدابِ ملازمت میں شامل تھا۔ مالکوں کے فیصلوں پر تبصرہ کرنا اس کے فرائض میں شامل نہیں تھا۔

"تم ایسا کرو' یہ وردی چھوڑ جاؤ۔ دوسری وردی تو ہوگی نا تمہارے پاس۔"

وہ کچھ حیران ہوا "جی بی بی جی!"

"تم ڈریسنگ روم میں جا کے صاحب کی کوئی قمیص پتلون پہن لو۔ باتھ روم کے ساتھ ہی ہے ڈریسنگ روم۔"

اس نے پھر جی بی بی جی کہا اور اندر چلا گیا۔

"بڑا فرمانبردار اور اپنے کام سے کام رکھنے والا آدمی ہے۔" رابعہ نے کہا "کسی حیرانی پریشانی کا اظہار نہیں کیا۔"

انجم بولی "بہت دکھی اور مصیبت زدہ شخص ہے۔ ڈیڈی اس پر بہت اعتبار کرتے ہیں۔ پرانا ہوگیا ہے نا۔ دنیا میں اس کا کوئی نہیں ہے۔ ایک بیٹی تھی' اسے شوہر نے بے وفائی کے الزام میں قتل کردیا اور فرار ہوگیا۔ سنا ہے لندن میں ہے اور وہاں کسی کالی کلوٹی بھینس سے شادی کرلی ہے۔"

"تمہارے ڈیڈی کا تو بہت اثر رسوخ ہوگا۔ انہوں نے کوشش نہیں کی اسے پکڑوانے کی؟" رابعہ بولی۔

"اتنا آسان کام نہیں تھا۔ وہ برطانوی شہری ہوگیا ہے۔ اس کے علاوہ اسے خود کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ کہتا تھا' اب اسے پھانسی بھی ہوگئی تو کیا بیٹی مل جائے گی مجھے۔" انجم نے کہا "ہمارے گھر میں اس کی حیثیت ایک فیملی ممبر سے کم نہیں۔ باہر کے سارے کام کرلیتا ہے۔ لاکھوں لاتا ہے' لے جاتا ہے۔ ایک ایک پیسے کا حساب رکھتا ہے۔ بس ایک عادت عجیب ہے اس کی۔ فطرت سمجھ لو۔ خود کو ڈرائیور ہی سمجھتا ہے۔ وردی ضرور پہنتا ہے حالانکہ ڈیڈی کی طرف سے کوئی پابندی نہیں۔ ساتھ بیٹھ کے کھانا نہیں کھاتا۔ ڈیڈی کو سرکار ہی کہتا ہے۔ میں نے کئی بار منع کیا کہ مجھے بی بی جی مت کہا کرو۔ میں بیٹی ہوں تمہاری۔ مگر بیٹی کے نام پر اس کی آنکھوں میں اداسی اتر آتی ہے۔ زبان سے تو نہیں کہتا کہ بیٹی تو وہی تھی جو خدا نے لے لی۔ اس کی جگہ آپ کیسے لے سکتی ہیں۔ بس مجھے بی بی جی کہنا نہیں چھوڑتا۔"

ڈرائیور شرٹ پتلون کے لباس میں نمودار ہوا "قمیص پتلون مجھے تنگ تھے بی بی جی۔ وردی کہاں رکھوں؟"

"یہاں رکھ دو۔ اور دیکھو' تھوڑا انتظار کرو۔ صاحب خود تمہیں چھوڑ دیں گے۔ اس لباس میں باہر کیسے جاؤ گے؟"

"چلا جاؤں گا بی بی جی۔" اس نے سر جھکا کے کہا اور سلام کرکے چلا گیا۔

میں نے اندر جا کے لباس بدلا اور آئینے میں اپنا جائزہ لیا تو خاصی تبدیلی محسوس ہوئی۔ پی کیپ اور وقار یوسف کے سن گلاسز نے آدھے چہرے کو چھپالیا۔ اگر میں چہرے میں صرف مونچھوں کا اضافہ کرسکتا تو مجھے کوئی غور سے دیکھ کے بھی نہ پہچانتا۔ گردن کے گرد مفلر لپیٹ کے میں باہر آیا تو ایک برقع پوش خاتون کو دیکھ کر ٹھٹکا لیکن وہ رابعہ تھی۔ انجم کی کوئی سہیلی یہ برقع دے گئی تھی جو خاصا جدید فیشن کا اور بہت خوب صورت تھا۔ پھر رابعہ کے سراپا نے اس سیاہ ریشمی ملبوس میں وہ انداز و دلکشی پیدا کی تھی کہ میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ اس نے نقاب سے آدھے چہرے کو چھپالیا تھا۔ صرف اس کے مرمریں ہاتھ اور ستاروں کی طرح روشن غزالی آنکھیں شوخی سے مسکراتی نظر آتی تھیں۔ میرے مقابلے میں اس نے اپنی شخصیت کو زیادہ آسانی سے اور زیادہ خوب صورتی سے چھپالیا تھا۔

کاجل مجھے ڈرائیور کی وردی میں دیکھ کر بھی اتنی ہی محظوظ ہوئی جتنی رابعہ کو برقعے میں دیکھ کر ہوئی تھی۔

وقار یوسف نے کہا "میرا خیال ہے' اب تم دیر مت کرو۔ نو بجنے والے ہیں۔ یہ لو ایک لاکھ روپے پورے۔"

میں نے کہا "چیک ضرور کیش کرالینا۔"

"یہ تم مت سوچو۔" وہ بولا۔ "منظر صاحب کا' آپ کا اور میرا حساب ایک ہی ہے۔"

انجم نے بڑی مستعدی دکھاتے ہوئے گاڑی کی ڈکی میں کمبل رکھ دیے تھے اور ایک سوٹ کیس میں کپڑے۔ وقار یوسف کے کپڑے مجھے بھی تنگ ہوتے۔ خصوصاً پتلون قمیص۔ مگر اس نے مجھے بتایا کہ مردانہ شلوار قمیص کے دو جوڑے میں ضرورت پڑنے پر استعمال کرسکتا ہوں۔ رابعہ اور کاجل کا سائز وہی تھا جو انجم کا۔ ان کے انکار کرنے پر بھی انجم نے اپنے اچھے جوڑے سوٹ کیس میں بھر دیے۔

"کاغذات گاڑی میں ہی ہیں۔" وہ بولی "راستے میں کہیں چیکنگ ہو تو کہہ دینا' میں انجم ہوں' میری گاڑی ہے۔"

وقار یوسف نے کہا "ٹیلی فون پر رابطہ رکھنا۔ جہاں سے بھی موقع ملے اپنی خیریت کی اطلاع دیتے رہنا۔"

میں نے کہا "مجھے ایک بات یاد آگئی۔ منظر نے کہا تھا کہ ابھی رابعہ کے مکان پر ناجائز قبضے کے خلاف کوئی کیس درج کرانے یا عدالت میں دعویٰ دائر کرنے کی ضرورت نہیں۔ بعد میں جب حالات کا اونٹ کسی کروٹ بیٹھے گا تو دیکھیں گے۔"

اس نے سرہلایا "ہاں۔ ابھی تو یہ ایک جواز بنتا ہے' قتل کا۔

سب سے اچھی پالیسی ہے روپوشی اور خاموشی۔ کون سکندر بخت' کیسی رابعہ۔ یہاں نہ کوئی آیا نہ گیا۔ ہمیں کیا معلوم وہ کہاں ہیں۔ زندہ ہیں یا مر گئے چوہدری دلاور نے جال تو اچھا پھیلایا تھا مگر شکار کوئی نہیں ہوگا تو وہ بہت تلملائے گا۔ مگر کر کیا سکتا ہے وہ۔"

"مجھے تو افسوس ہو رہا ہے کہ خدا خدا کرکے لاہور پہنچے تھے۔ اور اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے۔ پھر بھاگنا پڑا۔"

"یہ عارضی ضرورت اور مجبوری ہے۔ چند دن کی بات ہے۔" وقار یوسف بولا۔

ڈرائیونگ میں نے سنبھالی۔ رابعہ میرے ساتھ بیٹھی تھی اور پچھلی سیٹ پر کلیم اللہ کے ساتھ کاجل۔ عین وقت پر خادمہ نے اندر سے آکے اطلاع دی کہ منظر صاحب کا فون ہے۔

"ایک منٹ ٹھہرنا' شاید کوئی بات ہو۔" وقار یوسف اندر لپکتے ہوئے بولا۔

میں نے انجن اسٹارٹ رکھا اور وقار یوسف کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔ وہ دو منٹ میں لوٹ آیا۔

"وہی ہوا نا جس کا ڈر تھا۔ پولیس پہنچ گئی منظر صاحب کے گھر۔" وقار یوسف نے اطلاع دی "خانہ تلاشی کے وارنٹ کے ساتھ۔"

"کسے تلاش کر رہے تھے وہ؟"

"سکندر بخت اور اس کی ساتھی رابعہ کو۔ ایف آئی آر میں چوکیدار کے بیان کو بنیاد بنا کر تم دونوں کے نام مشتبہ افراد میں شامل کیے گئے ہیں۔ ظاہر ہے چوکیدار نے تمہارا ہی حلیہ لکھوایا ہوگا۔"

"کیا پتا تصویر دیکھ کے شناخت بھی کرلیا ہو کہ یہی وہ پُراسرار ملاقاتی ہیں جن کے جانے کے بعد چاندنی مقتول پائی گئی۔" میں نے تلخی سے کہا "پہلے ایس ایس پی سراج تھا چوہدری دلاور کا مشیر و معاون۔ اب کوئی اور ہوگا اس کا آلۂ کار۔ ان کے پاس ہماری تصویروں کی کمی نہیں۔"

رابعہ بولی "اس سے تو صاف اعلانِ جنگ کا پتا چلتا ہے۔ دلاور صُلح صفائی اور مفاہمت کے موڈ میں ہی نہیں۔ وہ نئے کیس بنا رہا ہے تو پرانے کیس بھی ضرور نکلوائے گا۔ ہر فائل پھر کھل جائے گی۔"

میں نے کہا "غالباً یہ دباؤ اس لیے بڑھا رہا ہے وہ کہ ہم خود مصالحت کے لیے ہاتھ بڑھائیں۔ اس نے پہلے ہر طرح کوشش کی تھی کہ خاموشی سے سودا ہوجائے اور ہم اپنے ضمیر کی منہ مانگی قیمت دے کر لندن لوٹ جائیں۔ آج وہ پہلے سے زیادہ طاقتور ہے۔ اس نے اپنے جرائم کا پردہ چاک نہیں ہونے دیا۔ مالی نقصان ضرور اٹھایا مگر خود محفوظ رہا اور قانون کے ہاتھ اس کی گردن تک پہنچنے کے لیے چھوٹے پڑ گئے۔ اب وہ سیاست داں بھی ہے' پہلے صرف شکاری تھا۔"

"کیا سیاست داں شکاری نہیں ہوتے؟" وقار یوسف بولا۔

"کچھ ہوتے ہیں۔ بلکہ اکثر ہوتے ہیں۔ مگر شکاری عموماً سیاست داں نہیں ہوتے۔" میں نے کہا "خیر۔۔۔ ہم بھی دنیا کے ڈھنگ اور زمانے کی چال دیکھ کے چلنے والے لوگ ہیں۔ مقابلہ شکار گاہ میں تھا تو ہم نے ثابت کیا کہ ہم شکار نہیں ہوسکتے۔ سیاست کا میدان ہوگا تو ہم سیاست بھی سیکھ لیں گے۔ وقت خود سکھا دے گا۔"

رابعہ نے کہا "اب چلو بھی۔ کیا ان کے یہاں پہنچنے کا انتظار ہے۔"

"واقعی۔ وہ منہ کی کھا کے ادھر آسکتے ہیں۔" وقار یوسف بولا۔

"راستہ دکھانے والا تو دلاور ہے۔" رابعہ بولی۔

"انجم! ذرا اپنے ابا سے بات کرو۔ کوئی ڈوری ہلائیں۔"

میں نے کہا "کس کس کی ڈوری ہے ان کے ہاتھ میں؟"

"ان کے ہاتھ میں ہے پیسہ اور پیسے کی ڈور سے سب بندھے ہوتے ہیں۔ ایک فون کریں گے اوپر ہوم سیکریٹری کو یا ایڈیشنل چیف سیکریٹری کو تو ادھر کا رخ کرنے والے وردیاں سنبھالتے آجائیں گے معافی مانگنے کہ جی ہم تو حکم کے غلام ہیں۔"

میں نے کلچ چھوڑا "اوکے' خدا حافظ۔ پھر ملیں گے۔"

شاہی قلعے کی بوسیدہ' تاریخی دیواروں کے اور اقبال پارک کے درمیان سڑک سے گزرتے ہوئے کاجل نے مینارِ پاکستان دیکھا اور کلیم اللہ کو اس کے بارے میں بتاتی رہی۔ پھر شاہدرہ کا پل آیا جسے عبور کرتے ہی مقبرہ جہانگیر کے مینارے نظر آنے لگے۔ اس کے بارے میں رابعہ نے کاجل کو بتایا تو وہ ہنسنے لگی۔

"میری تو زندگی یہاں گزری تھی۔" وہ بولی "میری اصل دنیا یہی تھی۔"

رابعہ نے جھینپ کے کہا "میں بھول گئی تھی۔ خیر۔۔۔ تم لوٹ آئیں اس دنیا میں۔"

"لُٹ لٹا کے لوٹ آنا کون سی خوشی کی بات ہے!" وہ تلخی سے بولی۔

کار نے جی ٹی روڈ پر دوڑنا شروع کیا۔ ایک بار پھر ہم واپس راولپنڈی کی طرف رواں تھے جہاں صرف دو دن پہلے ہی ہم نے وطن لوٹ آنے کی ساری خوشی کا تجربہ احساس کی بھرپور شدت کے ساتھ حاصل کیا تھا۔ رابعہ بظاہر باہر کے نظاروں میں گم تھی مگر میرا خیال ہے کہ وہ بھی اپنے خوابِ آرزو کی شکست کے آزار سے دوچار تھی۔ اس نے ایک طویل' صبر آزما اور اعصاب شکن جنگ میں میرا ساتھ دیا تھا جس نے ہم سب کو پشیمانی اور احساسِ زیاں کے سوا کچھ نہیں دیا تھا۔ وہ جنگ ہم نہیں ہارے تھے مگر ہماری امیدوں کو ضرور شکست کا صدمہ اٹھانا پڑا تھا۔ ایسا کیوں ہوا تھا اور کیسے ہوا تھا' یہ سب سوچنے سے بھی کیا حاصل تھا۔ بظاہر یہی لگتا تھا کہ ہم نے ایک بے مقصد جدوجہد میں اپنے خواب تک گنوا دیے تھے۔ جان و مال کے نقصان کا کیا رونا۔ ہم یقین اور اعتماد سے محروم ہوگئے تھے۔ ان گنت دوستی کے رشتے اس سودائے خام کی بھینٹ چڑھ گئے۔ یگانگت اور بھائی چارے کے سب دعوے بے نقاب ہوئے تو جانا کہ خواب تھا جو بھی ہم نے دیکھا' جو بھی سنا افسانہ تھا۔ اخوت اور اتحاد کے رشتوں پر استوار قومیت کے نظریات خود فریبی اور خوش فہمی ثابت ہوئے۔

اور بے سکونی کی پُرعذاب زندگی میں ہر قدم پر موت کے دامِ ہرنگ زمیں سے بچتے بچاتے دستِ اجل کے سائے میں ہر لمحہ سلامتی کے لیے پناہیں تلاش کرتے اور قدم قدم پر تائیدِ ایزدی پر بھروسہ کرتے ہم آخرکار وہیں پہنچ گئے تھے جہاں سے ہم نے آغازِ سفر کیا تھا۔ واپسی کتنی مشکل اور واپسی کی خواہش سراب سے زیادہ دغاباز لگتی تھی۔

ان حالات میں جذباتی مایوسی کا ردِعمل ایک فطری بات تھی۔ ابھی سکون کا سانس بھی نہیں لیا تھا اور مستقبل پر اعتبار کی روشنی دیکھی بھی نہ تھی کہ پھر بے یقینی کی تاریک راہوں نے کھینچ لیا۔

میں نے رابعہ سے کہا "کیا سوچ رہی ہو؟"

اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا "کچھ نہیں۔"

میں نے کہا "مجھے معلوم ہے تم کیا سوچ رہی ہو۔"

"پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو۔"

"صرف یہ جاننے کے لیے کہ میرا اندازہ غلط تو نہیں۔"

اس نے ایک بار میری طرف دیکھا اور بولی "آپ کے اندازے کبھی غلط ہوتے ہیں!؟"

اس بات میں طنز کا جو نشتر چھپا ہوا تھا اور تلخ حقائق کا جتنا زہر بھرا ہوا تھا' اس کی اذیت کو محسوس نہ کرنا میرے بس کی بات نہ تھی مگر میں نے اسے برداشت کرلیا۔ یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ میدانِ جنگ میں لڑنے والی فوج ظفریاب ہو تو فتح مندی کا غرور اور کامیابی کی خوشی سب کے حصے میں آتی ہے۔ ہر سپاہی اپنی قوم کے ہر فرد کو فاتح بنا رہتا ہے۔ اس اعزاز میں سب برابر کے شریک رہتے ہیں اور دشمن کو تباہ کرنے کی خوشی آپس میں بانٹ لیتے ہیں مگر شکست کی ساری ذلت و رسوائی کا عذاب وہ ایک آدمی جھیلتا ہے جو فوج کی کمان کرتا ہے۔ اور خواہ قصور تقدیر کا ہو' حالات کا یا سیاست کے بازیگروں کا' جب وہ ہتھیار ڈالنے کی رسم میں شریک ہوتا ہے اور تاریخ کا حصہ بننے والی کسی شرمناک دستاویز پر دستخط کرتا ہے تو وہ غیروں سے زیادہ اپنوں کی نفرت اور ملامت کا تنہا ہدف رہ جاتا ہے۔ اس کا دکھ' اس کی ذلت اور اس کا عذاب بانٹنے کوئی نہیں آتا اور کوئی خود کو اس کے جرم میں شریک سمجھنا نہیں چاہتا۔

میں نے اپنے آپ سے کہا۔ رابعہ اپنی تمام پیشہ ورانہ قابلیت اور ذہانت کے باوجود جذباتی طور پر وہی کمزور عورت ہے جو تمام حوادث و مصائب کا مقابلہ مرد کے ساتھ اس امید میں کرلیتی ہے کہ آخرکار اسے محبت کے سائبان اور اپنے گھر کی چار دیواری کا تحفظ حاصل ہوگا۔ اگر وہ گھبرا گئی ہے تو اسے صرف دل کے بہلانے کے لیے ایک اچھے خیال اور تھوڑے سے یقین کو بحال کرنے والے حرفِ تسلی کی ضرورت ہے۔

میں نے کہا "دلاور کے معاملے میں میرا اندازہ عموماً بلکہ اکثر غلط ہی ثابت ہوا۔"

"اور یہ احساس تمہیں کب ہوا؟" وہ لڑنے پر آمادہ تھی۔

"ابھی جب تم نے کہا کہ میں کچھ نہیں سوچ رہی تھی۔ اس وقت تم دلاور کے بارے میں ہی سوچ رہی تھیں۔"

"یہ غلط بات ہے۔"

میں نے اپنی بات جاری رکھی "دلاور سے مراد اس کی ذات نہیں۔ ان معاملات سے ہے جو اس کے بارے میں میرے اندازے کی غلطی سے الجھتے رہے ہیں۔ مثال کے طور پر یہی چاندنی والا معاملہ لو۔"

"میں نے تو تم سے کچھ نہیں کہا۔"

"بعض اوقات کچھ کہے بغیر سب کچھ کہا جاسکتا ہے۔ شاید خاموشی کی زبان الفاظ سے زیادہ مؤثر ذریعۂ اظہار بن جاتی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہیں گِلہ کرنا نہیں آتا مگر میں تمہاری ذہنی کیفیت کو سمجھنے میں غلطی نہیں کرسکتا۔ تمہارے جذبات کا عکس میرے دل کے آئینے میں اسی طرح اتر آتا ہے جیسے کیمرے کے بند خول میں فلم پر ہر منظر ساری تفصیلات کے ساتھ اپنا نقش مرتب کردیتا ہے۔" میں نے کہا۔

رابعہ کا چہرہ اور اس کے لب و رخسار پردے میں تھے مگر حیا کا رنگ اس کی آنکھوں میں یوں آیا جیسے تاریک کمرے میں کسی درز سے سورج کی ایک کرن اترتی ہے "مجھے ملال اور مایوسی کا اظہار بھی نہیں کرنا چاہیے۔ کیا میں تم سے جھوٹ بولوں کہ اس طرح بے مراد واپس جانا مجھے بہت اچھا لگا؟ لاہور پہنچنے سے پہلے کچھ اور بات تھی۔ اب تو میں نے اپنے پیچھے لگے ہوئے اندیشوں کے ہر آسیب سے نجات پالی تھی۔ وسوسوں کو دور بھگا دیا تھا اور خوف زدہ کرنے والے ہر خیال سے دامن چھڑا لیا تھا۔ کم سے کم میں نے یہی سمجھا تھا مگر یوں نہ تھا' میں نے فقط چاہا تھا یوں ہوجائے۔"

"تمہیں بہت عرصہ اندھیرے میں گزارنے والے کی طرح ایک دم روشنی کی چکاچوند میں آنے سے گریز کرنا چاہیے۔ سب ایک دم ٹھیک نہیں ہوگا میری جان۔ ویرانوں میں چپکے سے بہار آجانے کا خیال ایک شاعرانہ فتور ہے۔ خزاں کے بعد بہت آہستہ آہستہ سوکھے پتوں پر کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ کیوں کہ ہریالی دھیرے دھیرے اپنا رنگ جماتی ہے اور شاخوں کی ویرانی سمٹتی جاتی ہے۔ پھر شگوفے کھلتے ہیں اور پھولوں کے مسکرانے تک خزاں کے تصور کو فراموش ہونے میں دن یا ہفتے نہیں مہینے لگتے ہیں۔ جیسے گہرے زخم مندمل ہونے میں مسیحائی کے مرہم کو بھی وقت کی ضرورت پڑتی ہے۔"

"زیادہ فلسفہ مت جھاڑو۔" رابعہ نے مسکراتے لہجے میں کہا۔

"بابا یہ حقیقت ہے جسے تم تسلیم نہیں کررہی ہو۔" میں نے کہا "یہ تو معجزہ ہی کہلائے گا کہ شاعر سو کے اٹھے اور کھڑکی کھول کے دیکھے تو پتا چلے کہ ویرانے میں چپکے سے باہر آگئی ہے' راتوں رات۔ ہمارے حالات کو ایسا ہی کوئی معجزہ بالکل ٹھیک کرسکتا ہے۔ ہماری کوشش بہرحال وقت کی محتاج ہے اور تائیدِ ایزدی کی۔ معجزوں کی امید رکھنا مایوسی کو جنم دیتا ہے۔"

"کیا تم خوش ہو؟" رابعہ نے اچانک سوال کردیا "اور مطمئن ہو کہ جو ہوا ٹھیک ہے۔ یہی چاہتے تھے تم؟"

میں نے سٹپٹا کے کہا "نہیں۔ ایسا تو نہیں کہا میں نے۔"

"میں نے بھی کچھ نہیں کہا مگر تم میری خاموشی کو معانی دے رہے ہو۔ چور کی داڑھی میں تنکا۔" وہ بولی۔

میں نے کہا "نہ میری داڑھی ہے اور نہ میں چور ہوں۔ میں اپنی غلطی کو تسلیم کرتا ہوں کہ محتاط نہ رہنے کی وجہ سے ہم نے اپنے لیے تھوڑے سے مسائل کھڑے کرلیے۔ نہ ہم چاندنی کے گھر جاتے' نہ یہ سارا چکر چلتا۔ اپنے حقوقِ ملکیت قانونی طور پر آسانی سے بعد میں بھی حاصل کیے جاسکتے تھے۔ ہمیں کون سی فوری ضرورت تھی اس جگہ کی۔ بس ایک جذباتی حماقت سرزد ہوگئی مجھ سے لیکن اس سے آسمان نہیں گرا۔ میں امید پرست ہوں اور ہر خرابی میں پوشیدہ قدرت کی کسی مصلحت پر یقین رکھتا ہوں۔ چلو اس طرح ہم نے پہلے وہ کام کرلیا جو بعد میں کرنا تھا۔ ہماری عارضی روپوشی سے ایک طرف دلاور کو اپنی ناکامی کا احساس ہوگا......"

"کہیں تم پھر اندازے کی غلطی کا شکار تو نہیں ہورہے ہو؟"

میں نے جھلا کے کہا "بی بی! میں اپنی عقل کے مطابق اندازے قائم کرتا ہوں اور سوچ سمجھ کے ہی قدم اٹھاتا ہوں مگر نہ میں فرشتہ ہوں کہ مجھ سے غلطی ہی نہ ہو اور نہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں کہ مجھے پہلے سے آگے کے حالات کی تصویر نظر آجائے۔ اب میں نے سوچا ہے کہ ہم لاہور سے اپنی غیرموجودگی کے ثبوت فراہم کریں اور کلیم کو بھی اس کے گھر چھوڑ آئیں۔ تم بتاؤ' ہمیں ایسا کرنا چاہیے کہ نہیں۔ جب تک تم نہیں کہو گی میں یہیں کھڑا رہوں گا۔"

میں نے گاڑی سڑک کے کنارے کھڑی کردی اور انجن بند کردیا۔

"یہ کیا بچوں کی طرح لڑائی شروع کردی۔"

"تم مجھے بڑوں کی طرح سوچ کے بتاؤ کہ آگے جانے میں فائدہ ہے یا نقصان۔ نقصان ہے تو ہمیں واپس لاہور چلے جانا چاہیے یا کہیں اور۔"

کاجل نے پریشان ہو کے کہا "سکندر بھائی! آپ چلیں۔"

"نہیں۔ اب فیصلہ تمہاری باجی کریں گی۔" میں نے منہ پھلا کے کہا اور باہر دیکھنے لگا۔

ہم اس وقت وزیر آباد سے گزر چکے تھے۔ جی ٹی روڈ پر دونوں طرف سے ٹریفک رواں دواں تھی اور آتی جاتی بسوں اور گاڑیوں کے مسافر ہم کو واجبی سی دلچسپی سے دیکھتے تھے۔ اس سڑک پر کسی گاڑی کا رک جانا کوئی غیرمعمولی واقعہ نہیں تھا۔ بظاہر ہم پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر لاہور سے فرار ہونے میں کامیاب رہے تھے۔ نہ کسی چیک پوسٹ پر کسی نے ہمیں روکا تھا اور نہ ہم نے کہیں مفرور مجرموں کو تلاش کرنے والوں کی بے مقصد ناکہ بندی کا منظر دیکھا تھا۔

"آنٹی! اب بولیں نا انکل کو۔ چلیں۔" کلیم اللہ نے کہا۔

"تمہارے انکل اپنی مرضی کے مالک ہیں۔ میں نہیں کہوں گی کچھ۔"

"مت کہو' میں بھی بیٹھا ہوں مزے سے۔"

"بیٹھے رہو۔"

کاجل نے اچانک کہا "یہ گاڑی آپ نے دیکھی؟"

میں نے کہا "بہت سی گاڑیاں ہیں سڑک پر۔"

"ایک سفید' لمبی سی گاڑی ابھی گزری ہے۔ وہ سامنے جارہی ہے۔" کاجل نے کہا۔

"جارہی ہے۔ پھر؟"

"اس گاڑی کو میں نے دوبار دیکھا ہے۔" وہ بولی "یہ ہمارے پیچھے تھی' پھر آگے نکل گئی۔"

میں نے سر گھما کے دیکھا "ایسی سفید گاڑیاں بہت ہیں۔ یہ ستر ماڈل کی ڈاج ڈارٹ ہے۔"

"مجھے ماڈل کا نہیں پتا۔"

"پھر کیا نمبر دیکھا تھا؟" رابعہ نے کہا۔

"نہیں۔ نمبر اب دیکھا ہے۔" وہ بولی "پہلے تو اس کو دیکھا تھا جو گاڑی چلا رہا تھا۔ ایک کالا سا حبشی۔ جیسے افریقی ہوتے ہیں۔ موٹی ناک' موٹے ہونٹ' سخت گھونگریالے بال۔"

میں بھول گیا کہ میرے اور رابعہ کے درمیان لڑائی جاری تھی "کانوں میں پیتل کی مُندریاں۔"

کاجل نے کہا "مُندریاں کیا ہوتی ہیں؟ رنگ تھے۔ ایئررنگ۔"

"ہاں بابا۔ بالیاں' مُندریاں' ایئررنگ ایک ہی چیز کے نام ہیں سب۔ وہ استاد پیڈرو تھا۔" میں نے چلّا کے کہا۔

میرے چلّانے سے کاجل کو حیرانی ہوئی "استاد پیڈرو......"

میں نے ایک دم انجن اسٹارٹ کیا "اس حلیے کا دنیا میں ایک حرام زادہ ہے اور اس سے بڑا حرام زادہ بھی کوئی نہیں۔"

رابعہ نے تشویش کا اظہار کیا "کیا وہ ہمارے تعاقب میں ہیں؟"

میں نے اعلان کیا "اب ہم ان کے تعاقب میں ہیں۔"

سفید ڈاج کار زیادہ دور نہیں گئی تھی۔ بیس منٹ بعد میں نے اسے جالیا۔ اس کے اور میرے درمیان فاصلہ کم ہوتے ہوتے اتنا

...یا کہ میں نے اس کا نمبر صاف پڑھا۔

"یہ تو کچھ اور نمبر ہے۔" رابعہ بولی۔

"مگر گاڑی وہی ہے۔" کاجل نے اصرار کیا۔

"کاجل! نمبر بالکل مختلف ہے۔" رابعہ نے کہا "ایک دو ...روں کا بھی فرق ہوتا تو میں مانتی۔"

"رابعہ باجی! میں نے گاڑی کو پیچھے سے بھی دیکھا تھا۔ اس کی ...ے ہاتھ والی لائٹ نہیں ہے۔" کاجل بولی "وہ لیفٹ ہینڈ ...ائیو تھی اور ڈرائیور کی سائڈ پر رگڑ کا لمبا سا نشان ہے۔"

"یہ کیسے نظر آگیا تمہیں؟ میں تو نہیں دیکھ سکتا۔" میں نے ...ہا۔

"جب اس نے اوورٹیک کیا تھا' تو دیکھا تھا میں نے۔ وہ جو ...اڑی چلا رہا تھا استاد پیڈرو' وہ اب ساتھ والی سیٹ پر تھا اور اس ...نے... اس نے...... مجھے......" کاجل کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"کیا کیا تھا اس نے؟" میں نے پلٹ کے دیکھا۔

کاجل نے کلیم اللہ کی طرف دیکھا اور پھر میرے کان کے ...یب منہ لا کے کہا "اس بدمعاش نے آنکھ ماری تھی مجھے۔"

میں نے سر ہلایا اور اپنی کار کو ڈاج سے آگے نکال کرلے گیا۔ ...بے نیازی کا انداز برقرار رکھتے ہوئے میں نے ڈاج کے اندر غور ...ے ہر شخص کی صورت پر غور کیا۔ اس کے شیشے کچھ گہرے رنگ ...کے تھے اور اب بند کردیے گئے تھے مگر استاد پیڈرو کا سایہ بھی ہوتا ...میں رات کے اندھیرے میں شناخت کرسکتا تھا۔ اس گاڑی میں ...ستاد پیڈرو کے حلیے کا کوئی بھی آدمی نہیں تھا۔

بہت آگے نکل جانے کے بعد میں نے کاجل سے کہا "تم نے ...بھی دیکھا ہوگا' استاد پیڈرو جیسی کوئی مکروہ چیز نہیں تھی اس میں۔"

"یہ... یہ تو ٹھیک ہے" کاجل نے بے بسی سے کہا۔

"میں اسے پھر موقع دیتا ہوں کہ ہمیں اوورٹیک کرے۔" ...میں نے ڈاج کو آٹھ دس میل پیچھے چھوڑنے کے بعد کہا "تم دیکھنا جب وہ ہمارے پاس سے گزرے کہ کیا سائڈ میں رگڑ کا نشان بھی ہے۔"

میں نے کار کو سائڈ میں روکا اور اس کا بونٹ کھول کے اندر ...یوں دیکھنے لگا جیسے کوئی خرابی تلاش کررہا ہوں۔ پانچ منٹ میں مجھے ...معلوم ہوگیا کہ ڈاج میرے پاس سے گزر گئی ہے۔ میں نے بونٹ بند ...کیا اور اندر آبیٹھا۔

"سکندر! اس کا نمبر وہی تھا جو کاجل نے بتایا تھا۔" سب سے ...پہلے رابعہ نے کہا "گاڑی وہی تھی' بالکل وہی۔ سائڈ میں اسکریچ ...تھا۔"

"استاد پیڈرو بھی وہی تھا؟" میں نے کہا۔

"ہاں" وہ دونوں ایک ساتھ بولیں۔ جیسے انہیں میرا مذاق ...اڑانے والا لہجہ اچھا نہ لگا ہو۔ ان کے اصرار میں احتجاج بھی شامل ...تھا۔

رابعہ نے کہا "وہ گاڑی چلا رہا تھا۔"

کاجل بولی "باجی نے بالکل ٹھیک دیکھا۔"

میں چکر میں پڑ گیا۔ "کیسی باتیں کررہی ہو تم۔ کبھی آدمی بدل جاتا ہے کبھی نمبر' گاڑی وہی رہتی ہے۔ اچھا یہ بتاؤ اور کون تھا اس کار میں؟"

"صرف ایک آدمی اور ہے۔"

"اس کا حلیہ؟ رابعہ تم نے بھی تو دیکھا ہوگا۔ کہیں وہ استادوں کے استاد اپنے چوہدری دلاور تو نہیں تھے؟ پیڈرو کے پاس...."

"نہیں وہ چوہدری دلاور نہیں تھا۔ اس کا چہرہ مجھے صاف نظر آیا تھا۔ وہ مجھے گھور رہا تھا۔"

"بدمعاش۔ کہیں اس نے تمہیں آنکھ تو نہیں ماری؟"

"تم مذاق سمجھ رہے ہو۔ مجھے گڑبڑ محسوس ہورہی ہے سکندر۔ ہم تو بالکل خالی ہاتھ ہیں۔" رابعہ نے کہا۔

میں نے انجن اسٹارٹ کیا "مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی۔"

"میں بالکل لڑائی کے موڈ میں نہیں ہوں۔ واپس چلو۔"

"اگر وہ استاد پیڈرو ہے تو ایک دم میرا موڈ بن گیا ہے لڑائی کا۔" میں نے کہا "پسپائی اختیار کرنے میں ہتک ہے میرے اسلاف کی۔ ہماری خاندانی تاریخ بزدلی اور میدانِ جنگ سے فرار کے واقعات سے یکسر خالی ہے۔ مجھے آباؤ اجداد کی ارواح کو شرمندہ کرنے پر مجبور مت کرو۔"

"ماننا پڑتا ہے کہ بہت موروثی ہوتا ہے۔ تمہارے پاس بھی وہی عقل ہے جو سو دو سو سال پہلے تمہارے آباؤ اجداد کو ملی تھی۔ ان کی روح واقعی شرمندہ ہوگی کہ آنے والی نسلوں نے کوئی ترقی نہیں کی۔" رابعہ نے جل بھن کے کہا "نظریہ ارتقا کو غلط ثابت کردیا۔"

میں ہنس پڑا "او کے مس رابعہ۔ ایک بار مجھے تصدیق کرلینے دو کہ جو کچھ آپ دونوں نے دیکھا وہ نظر یا عقل کا فتور نہیں تھا۔"

کاجل نے کہا "وہ دیکھیں۔"

میں نے اُدھر دیکھا جدھر کاجل نے اشارہ کیا تھا۔ سفید ڈاج کار ایک روڈ سائڈ ریسٹورنٹ کے سامنے کھڑی تھی اور اس میں کوئی بھی بیٹھا ہوا نہیں تھا۔ میں نے پہلے اسی ریسٹورنٹ میں رک کر چائے پینے کا سوچا اور پھر اس خیال کو دوسرے بہتر خیال سے مسترد کردیا۔ میں اپنی گاڑی کو سیدھا گزار کے دو میل آگے گیا۔ پھر میری نظر نے ایک ایسی جگہ تلاش کرلی جہاں ہم چھپ سکتے تھے۔ اس طرح کہ کسی کو شک بھی نہ ہو۔ اگر کسی کی نظر پڑ جائے تو یہی سمجھے کہ ہم نے لمبے سفر میں آرام کے لیے وقفہ نکالا ہے اور سڑک سے ہٹ کے کچھ کھا پی رہے ہیں۔ ہمیں مخالف سمت سے آنے والے دیکھ سکتے تھے۔ راولپنڈی کی طرف جانے والی گاڑیوں میں صرف ان بسوں کے مسافروں کی نظر ہم پر پڑسکتی تھی جو بائیں

طرف کھڑکی کے ساتھ بیٹھے ہوں۔

رابعہ اور کاجل نے محتاط رہتے ہوئے گھنے درختوں اور جھاڑیوں کے پیچھے تھوڑی سی چہل قدمی کی۔ میں کچھ آگے سڑک کے جتنا قریب جاسکتا تھا گیا اور جیب میں ہاتھ ڈال کے بے نیازی سے آسمان کی طرف دیکھتا رہا مگر میری توجہ جانے والی ٹریفک پر رہی۔ میں قدرے نشیب میں تھا چنانچہ مجھے یقین تھا کہ کار میں آگے بیٹھا ہوا کوئی شخص مجھے نہیں دیکھ سکتا۔

جب سفید ڈاج گزری تو مجھے یوں لگا جیسے اچانک میں نے سورج کی طرف دیکھ لیا ہو۔ پلک جھپکتے میں استاد پیڈرو کا چہرہ فوکس میں آیا اور غائب ہوگیا۔ میں چونکنا بھی بھول گیا تھا اور ہکا بکا کھڑا ہوا تھا۔"

میں ایک دم رابعہ کی طرف دوڑا "رابعہ...!"

رابعہ اچھل پڑی۔ اس نے پلٹ کے کہا "میں تو سمجھی، کچھ ہوگیا تمہیں۔"

"ہوگیا، ہوگیا۔" میں نے کہا "استاد پیڈرو کا دیدار مجھے بھی نصیب ہوگیا۔ میں ایمان لایا تمہاری بصارت و بصیرت پر۔ چلو بیٹھو گاڑی میں۔"

رابعہ نے صاف انکار کردیا "ہم ابھی ٹہل رہے ہیں اور ٹانگیں سیدھی کررہے ہیں جو بیٹھے بیٹھے اکڑ گئی تھیں۔"

"ٹانگوں کے ساتھ اکڑ رہی ہو تم۔ تم سمجھتی ہو کہ ایسے میں رک جاؤں گا اور پیڈرو کے پیچھے نہیں جاؤں گا۔" میں نے کہا "اور تم نہیں جاؤ گی تو....."

"مگر ہم نے ایسا نہیں کہا۔ کیوں کاجل؟"

کاجل نے کہا "ہم چلیں گے۔ ابھی ذرا یہ منظر دیکھو، کتنا خوب صورت ہے اور اس اجلی دھوپ میں......"

میں نے کہا "ٹھیک ہے۔ تم دھوپ میں حسنِ فطرت دیکھو، مزے کرو۔ میں جارہا ہوں۔ شام تک لوٹ آیا تو ٹھیک ورنہ فی امان اللہ۔"

کار میں بیٹھنے کے بعد میں نے اِدھر اُدھر ہاتھ مارا مگر کار کو اسٹارٹ کرنے والی چابیاں غائب تھیں۔ چابیاں میری جیب میں بھی نہیں تھیں۔ اِدھر کاجل اور رابعہ قطعی بے نیازی سے دوسری طرف دیکھ رہی تھیں اور ٹہلتے ہوئے آپس میں باتیں بھی کرتی جارہی تھیں۔ ان کا یہ انداز تغافل خود چغلی کھاتا تھا کہ چابی انہی کے قبضے میں ہے۔

میں نے چلّا کے کہا "چابی کس کے پاس ہے؟ شرافت سے بتادو ورنہ....."

"ورنہ کیا جی؟" رابعہ نے کہا۔

میں نے لات مار کے گاڑی کا دروازہ بند کردیا "مجھے چابی کے بغیر بھی گاڑی کو اسٹارٹ کرنا آتا ہے۔"

"تو کرلو۔ چابی میرے پاس نہیں ہے۔" رابعہ بولی۔

"میرے پاس بھی نہیں ہے۔" کاجل نے سرہلایا۔

"مجھے چابی برآمد کرنا بھی آتا ہے۔" میں نے کہا۔

"اور کیا کچھ آتا ہے آپ کو؟" رابعہ بولی "اللہ نظرِ بد سے بچائے۔ اتنی کم عمر میں سب کچھ سیکھ لیا۔"

میں نے عاجز آکے کہا "رابعہ! خدا کے لیے سمجھنے کی [illegible] کرو۔ استاد پیڈرو کا تعاقب بے حد ضروری ہے۔"

"کیوں؟ آج کے بعد استاد پیڈرو اڑن چھو ہوجائے گا؟ [illegible] الہام ہوا ہے کہ وہ گاڑی میں بائی روڈ یورپ کے راستے [illegible] طرف نکل جائے گا۔" رابعہ ایک دم سیریس ہوگئی "اگر آج [illegible] تعاقب نہ کیا تو کوئی گناہ ہوگا؟ تم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ ہم کس [illegible] مقصد سے نکلے تھے۔ راستے میں چیکنگ سے بچنے کے لیے تم نے وردی پہنی اور میں نے خود کو برقعے میں چھپالیا۔ اب استاد پیڈرو سے بھڑنا چاہتے ہو تاکہ سب کو معلوم ہوجائے۔ کلیم اللہ کو [illegible] پہنچانے کا معاملہ بیچ میں ہی رہ جائے۔ کتوں کے ساتھ بھیڑیے [illegible] پیچھے لگ جائیں گے اور جان بچانی زیادہ مشکل ہوجائے۔"

کاجل نے کہا "رابعہ باجی کا خیال ہے کہ وہ ہمارے تعاقب میں ہیں تو فی الحال ان کو چکر میں ڈال دیا جائے۔ وہ سمجھ نہ پائیں ہم کہاں غائب ہوگئے۔ اس راستے پر وہ زیادہ آگے نہیں جائیں گے۔ آخرکار وہ سمجھ جائیں گے کہ ہم نے انہیں دیکھ لیا اور....."

"جان بچا کے بھاگ گئے۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔ اس سے ناک نہیں کٹتی ہماری۔" رابعہ بولی "خود [illegible] کرنے کے لیے کوئی مسلح دشمن کے سامنے خالی ہاتھ سینہ [illegible] ہوجائے تو اسے بہادری نہیں سمجھا جاسکتا۔ شکاری وہ بھی ہیں [illegible] ہم بھی اور اتنا عرصہ ہوگیا ہے، اب تو ایک دوسرے کے خلاف صف آرائی میں کہ نہ خوش فہمی ہے نہ غلط فہمی۔ وہ جانتے ہیں کہ [illegible] کیا ہیں اور ہمیں معلوم ہے کہ وہ کون ہیں۔"

میں نے کہا "تمہاری باتیں کچھ دل کو لگتی ہیں تو اس کی [illegible] غالباً دل کی خرابی ہے بلکہ خانہ خرابی۔ ذمے دار تم ہو بہرحال۔"

رابعہ نے کہا "پہلے ہم کلیم کو چھوڑ آئیں، اس کے بعد [illegible] تو لاہور ہی آئیں گے نا۔ وہی ہم ہوں گے وہی چوہدری دلاور [illegible] کمپنی، خوب لڑنا۔"

میں نے کہا "ملکی سطح پر تو معاملات ختم ہوئے مگر ذاتی حساب باقی ہے نا۔ میں کیسے معاف کرسکتا ہوں انہیں۔"

"تم معاف کر بھی دو تو وہ کب بخشنے والے ہیں۔ روس [illegible] امریکا میں تو سرد جنگ چلتی ہے۔ تمہارے درمیان عداوت کی جنگ اس وقت تک ختم نہیں ہوگی جب تک ایک فریق ہار [illegible] لے اور اس معاملے میں دونوں کم نہیں۔"

"اگر وہ چاہے تو جنگ ختم ہوسکتی ہے۔ وہ میرے والد [illegible] قاتل کو میرے حوالے کردے، ان کے ساتھ کیے جانے والے سارے مظالم کی تلافی کرے اور میرے غصب کردہ حقوق [illegible] لوٹائے۔"

"مختصر یہ کہ اپنا سب کچھ تمہارے حوالے کرکے خود پھانسی چڑھ جائے۔" رابعہ بولی "کچھ شرائط کے ساتھ اس نے بھی صلح کی پیشکش کی تھی۔"

"وہ تو چاہتا تھا، میں اس کے ہاتھ اپنی عزت بیچ دوں۔ اپنا ضمیر بیچ دوں۔" میں نے برہمی سے کہا "وہ مجھے میرے باپ کے خون کی قیمت دے کر چاہتا تھا کہ میں اس کے ناجائز دھندوں میں شریک ہوجاؤں۔ بھول جاؤں کہ اس نے شرافت، اصول اور ایمانداری کے ساتھ کاروبار میں کامیابی حاصل کرنے والے اپنے دوست اور محسن، میرے والد کے ساتھ کیسی دغابازی کی تھی اور انہیں کتنی بے کسی کی موت مارا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ اگر تمہارے جذبات بدلنے لگے ہیں تو مجھے مفاہمت کا مشورہ مت دو، میرے جذبات آج بھی وہی ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔" رابعہ نے میرا ہاتھ پکڑلیا "لیکن حالات ضرور بدل گئے ہیں۔ تم کو اب پہلے سے زیادہ محتاط رہنا چاہیے۔ صورتِ حال کو سمجھنے کے بعد طے کرنا چاہیے کہ تمہاری حکمتِ عملی کیا ہوگی۔ چوہدری دلاور سیاست داں بن گیا ہے۔ کیا تم سیاست سے کام نہیں لے سکتے؟ تم اسے سیاسی شکست دینے کی صلاحیت نہیں رکھتے؟ کیسے حساب لگاؤ گے کہ اس جنگ میں ہم نے کیا ہارا اور اس نے کیا گنوایا یا فائدے میں کون رہا اور نقصان کس نے اٹھایا۔ یہ جذبات کی ترازو میں تولنے والی چیز نہیں۔ تم اور ہم سب مل کے بیٹھیں گے تو جمع تفریق کرکے دیکھیں گے اور پھر سوچیں گے کہ دوسری بازی کے لیے بساط کیسے بچھائی جائے اور چلنے سے پہلے ہر چال پر غور کریں گے۔ ہم دوسری بازی نہیں ہار سکتے سکندر۔ یہ تم بھی جانتے ہو کہ اس کے بعد سب ختم ہوجائے گا۔ تم کو انتقام کی خواہش میں اتنا اندھا نہیں ہونا چاہیے کہ تم دیکھے بغیر چلتے جاؤ اور اس کنویں میں گرجاؤ جو دشمنوں نے تمہارے لیے کھودا ہے۔ اس میں تو خود انہیں گرنا چاہیے۔"

میں نے محسوس کیا کہ استاد پیڈرو کو دیکھ کر میں واقعی جذباتی ہوگیا تھا۔ میری عقل سے کام لینے کی صلاحیت مفلوج ہو [illegible] لگی تھی کہ رابعہ نے میرا ہاتھ پکڑلیا اور اس کے لمس میں نہ جانے کیا بات تھی کہ میری سوچ کا دھارا بدل گیا۔ میں قائل ہوگیا کہ بدلے ہوئے حالات میں مجھے دوسری بازی کے لیے طاقت سے زیادہ سیاست کے داؤ پیچ آزمانے کا ہنر سیکھنا ہوگا۔ ایک بازی ختم ہوئی اور دلاور کہہ سکتا تھا کہ اس میں ہمارے عزائم کو شکست کا سامنا کرنا پڑا مگر یہ دعوے نہیں کرسکتا تھا کہ ایسا اس کی وجہ سے ہوا۔ اس کے اسباب عالمی سیاست کے ان بڑے شاطروں..... نے پیدا کیے تھے جو بساطِ عالم پر ہم جیسے تیسری دنیا کے چھوٹے ممالک کو [illegible] اتے تھے۔ لیکن ہم دعوے کرسکتے تھے کہ ہم نے چوہدری دلاور کے عزائم پورے نہیں ہونے دیے اور اس وطن

دشمن قبیلے سے تعلق رکھنے والے سب ہی افراد کے کاروبار کو تباہ کردیا۔ کروڑوں کمانے کی امید رکھنے والوں کو کروڑوں کا گھاٹا اٹھانا پڑا۔ عسکری، سیاسی یا نظریاتی محاذ پر کامیابی اور ناکامی کے اسباب اس سے بالکل الگ تھے۔ چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کے مقابلے میں کامیابی ایم آر ایس کی ہوئی تھی۔

اب ایم آر ایس کی کمانڈو تنظیم کو فعال رکھنے کا عملی جواز باقی نہیں رہا تھا۔ رابعہ نے ٹھیک کہا تھا کہ بدلے ہوئے حالات میں ایک موثر سیاسی حکمتِ عملی کے لیے غیر جذباتی سوچ اور شاطر ذہن ہی ہمارا اسلحہ ہونا چاہیے۔ جیسے آتشیں اسلحے کی جنگ میں ہم نے ریوالور سے مشین گن تک اور دستی بم سے ڈائنامائٹ تک سب کچھ استعمال کیا تھا ایسے ہی اب شروع ہونے والی جنگ میں دلاور کا مقابلہ اس کی عیار فطرت، مکروفریب کی ذہانت، باطن کو ظاہر سے مخفی رکھنے کی قدرت، باکمال اداکارانہ صلاحیت اور جوش کے لمحے میں ہوش سے کام لینے کی عادت سے کیا جاسکتا تھا۔

مجھے گم صم دیکھ کے رابعہ ہنسی "کیا ہوا، جا نہیں رہے ہو بغیر چابی کے گاڑی اسٹارٹ کرکے؟"

میں نے کہا "رابعہ! میری عقل پر تالا پڑا ہوا تھا۔ اس کی چابی تمہارے ہاتھ میں تھی۔ اپنا ہاتھ مجھ سے کبھی مت چھڑانا۔"

اس نے ایک دم اپنا ہاتھ چھڑالیا "سڑک پر سے لوگ دیکھ رہے ہوں گے۔ تمہیں تو خیال نہیں..."

کاجل ہنس پڑی "آپ کو بھی اتنی دیر بعد خیال آیا ہے۔ اب تک تو نہ جانے کتنے لوگ اس رومانٹک پوز سے محظوظ ہوکے گزر گئے۔"

"گزر گئے؟" میں نے افسوس سے کہا "کیسے گزر گئے؟ رشک اور حسد کے صدمے سے یا اناللہ وانا الیہ راجعون۔"

"میرا مطلب تھا، بسوں اور کاروں میں سے سب نے ہی یہ سین دیکھا ہوگا تو سمجھے ہوں گے شوٹنگ ہورہی ہے" کاجل بولی "آدھے گھنٹے سے آپ رابعہ کا ہاتھ پکڑے کھڑے تھے۔"

"غلط۔ رابعہ نے پکڑ رکھا تھا میرا ہاتھ۔ میں ایسی جسارت کرسکتا ہوں۔ طبعاً میں تو اتنا شرمیلا ہوں..... یہی ہیں بے شرم۔"

"اچھا اب چلو۔ وہ کافی آگے نکل گئے ہوں گے" رابعہ نے شرم سے لال ہوکے کہا۔

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ ہمیں کچھ دیر رکنا چاہیے۔"

"وہ کیوں؟"

"دیکھو نا، کیسی دھوپ کھلی ہوئی ہے اور کیسے روح پرور مناظر ہیں" میں نے انہی کی بات دہرائی "کیا ضرورت ہے کہیں جانے کی۔ ابھی شام ہوگی، پھر رات کو چاند نکل آئے گا، پھر گیدڑ آجائیں گے۔ صبح تک ہم بھوک، پیاس اور سردی سے اللہ کو پیارے ہوجائیں گے۔ اپنے پیچھے ہم ایک اور محبت کی المناک داستان چھوڑ جائیں گے۔ شیریں فرہاد سے رومیو جولیٹ تک کتنی

کہانیاں ہیں۔ رابعہ سکندر کی کہانی پر بھی سپرہٹ فلم بنے گی۔"

"ابھی تم اکیلے ہو تو یہ حال ہے" رابعہ نے کہا "پٹڑی سے اتر جاتے ہو سیدھا چلتے چلتے اور بولنے لگتے ہو تو کوما' فل اسٹاپ سب بھول جاتے ہو۔ غالب اور محسن ساتھ ہوتے تو نہ جانے کیا ہوتا؟"

میں نے کہا "مذاق کی بات اور تھی' میرے ذہن میں یہاں کچھ دیر رکنے کا خیال اس لیے آیا تھا کہ استاد پیڈرو کی گاڑی بالآخر واپس آئے گی۔ انہیں معلوم ہے کہ ہم انسان ہیں' بھوت نہیں کہ ہوا میں تحلیل ہو جائیں۔ وہ سمجھ جائیں گے کہ انہیں ڈاج دینے کے لئے...."

"ان کی ڈاج کار کو ڈاج کرنے کے لیے" رابعہ بولی۔

"چلو یوں ہی سہی۔ وہ ہمیں تلاش کرتے ہوئے آئیں گے۔ اگر ہم واقعی کہیں چھپ جائیں تو ان کے گزرتے ہی سڑک پر آکے جانبِ منزل' روانگی اختیار کرسکتے ہیں۔ پھر ہم جارہے ہوں گے شمال کی طرف اور ان کا رخ ہوگا جنوب کی جانب۔ ہم جائیں گے گولی کی طرح اور ان کے لیے دوبارہ ہمیں پکڑنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہوگا۔"

"بات تو عقل کی ہے۔ مگر چھپنے کی یہاں کون سی جگہ ہے؟" رابعہ بولی۔

"یہاں نہیں ہے تو آگے پیچھے کہیں ہوگی" میں نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "لاؤ چابی' چل کے دیکھتے ہیں۔"

"میں نے بتایا نا کہ چابی میرے پاس نہیں ہے۔"

میں نے کاجل کی طرف دیکھا "تم تو اچھی بچی ہو۔"

"مگر بھائی سکندر! خدا کی قسم چابی میرے پاس ہوتی تو میں آپ کو پہلے ہی دے دیتی۔"

"پھر کس کے پاس ہے آخر چابی؟" میں نے بھنّا کے کہا۔

"کلیم کے پاس" رابعہ نے معصومیت سے کہا۔ "تم نے اس سے پوچھ لیا ہوتا تو اس وقت ہم یہاں سے بہت دور جاچکے ہوتے۔ اتنا وقت تو برباد نہ ہوتا۔ ہم تو کب سے کہہ رہے تھے چلو۔"

میں نے دل ہی دل میں اسے اُلّو کی پٹھی کہا اور کلیم سے چابی لے کر مسکراتا ہوا گاڑی میں بیٹھ گیا "بجا فرماتی ہیں آپ۔ میں ہی گدھا ہوں۔"

گردوپیش کا بغور جائزہ لینے پر مجھے بائیں جانب ریلوے کی پٹڑی نظر آئی۔ تھوڑا سا کچا ناہموار فاصلہ طے کرنے کے بعد میں نے کار کو پٹڑی کے ساتھ بنے ہوئے راستے پر چلانا شروع کیا۔ اس راستے پر بیل گاڑیاں' گھوڑے اور گدھے چلتے ہوں گے۔ مجھے ایک دیہاتی برات بھی ملی جس میں مشکل سے پچیس تیس آدمی تھے۔ آگے ایک شخص خاصا بڑا ڈھول بجاتا جارہا تھا جو اس کے موٹے پیٹ پر ٹکا ہوا تھا۔ پیچھے دو افراد ریشمی لنگی اور پگڑی پہنے لُڈی اسٹائل میں ڈانس کرتے چل رہے تھے۔ نیم جاں گھوڑے پر بے زار صورت دُلہا سرنگوں بیٹھا اپنی آزاد زندگی کی اختتامی تقریب میں مجبوراً شرکت کرتا محسوس ہوتا تھا۔ خواتین البتہ خوش اور زرق برق' لال نیلے پیلے کپڑوں میں پیدل رواں تھیں ... نے ہمیں راستہ دیتے ہوئے بالکل بُرا نہیں مانا۔

تقریباً دو میل بعد ریلوے کراسنگ آگئی جہاں سڑک اور ... کی پڑی مل کے جدا ہو جاتے تھے' وہیں کچھ فاصلے پر مجھے ریلوے کا ایک متروک اور تباہ شدہ کیبن نظر آیا۔ ممکن ہے پہلے اس میں کوئی لائن مین رہتا ہو' اب اس کی صرف تین دیواریں کھڑی تھیں اور ان پر قائم چھت کسی بھی وقت نیچے آسکتی تھی۔ ... سمت سے کھڑکیاں اور دروازے ہٹالیے گئے تھے تو دیوار ... ہوگئی تھی۔

میں نے گاڑی کو اس "گیراج" کے اندر کھڑا کردیا۔ یہ گاڑی کے ساتھ ظلم تھا۔ کئی اینٹوں پر سے اچھلتی کودتی وہ بادلِ ناخواستہ اس کھنڈر میں داخل ہوئی۔ رابعہ اور کاجل نے خاصی احتجاجی آوازیں نکالیں اور خوف زدہ چیخوں سے مجھے متاثر کرنے کی ناکام کوشش کی۔

"یہ کیا دیوانگی ہے۔ کہاں لا کے کھڑا کردیا ہے گاڑی کو۔" رابعہ نے کہا۔

"مجھے یہ جگہ بہت محفوظ نظر آتی ہے۔ آپ لوگ یہیں بیٹھی رہیں۔"

"خدا کا شکر ہے کہ چھت ہم پر نہیں گری۔" کاجل نے سکون کا سانس لیا۔ "یہ دیواریں دیکھو' پتا نہیں کیسے کھڑی ہیں۔"

میں نے باہر نکلتے ہوئے کہا "مجھے امید ہے کہ میرے واپس آنے تک یہ کھڑی رہیں گی۔"

"اور گر گئیں تو کیا ہوگا؟" رابعہ نے برہمی سے کہا۔

"گاڑی کو میں کھود کے نکال لوں گا۔ ڈینٹ پینٹ بھی کروا لوں گا۔ ورنہ وقار یوسف کی بیوی کہے گی' اچھے دوستوں کو دی گاڑی۔ تباہ کرکے لے آئے۔" میں نے کہا۔

رابعہ نے جل بھن کے کہا "دیکھا' گاڑی کی فکر ہے' ہماری نہیں۔"

"اب ایسا بھی نہیں۔ آپ کی مرمت بھی ہو جائے گی ... زندگی ورنہ فاتحہ چہلم تو ضرور ہوگا۔ ہم ایسے بھی نہیں کہ آپ کو بھول جائیں۔"

میں دانت نکالتا ہوا کراسنگ کے قریب ایک عارضی دیوار کے پیچھے جاکے بیٹھ گیا جو شارٹ کٹ سے انسانوں اور جانوروں کو ریلوے ٹریک پر آنے سے روکنے کے لیے بنائی گئی تھی۔ شاید ... سے آنے والے اندازے کی غلطی کے باعث پوری رفتار ... گزرنے والی ٹرینوں کے سامنے آجاتے ہوں گے۔ اب انہیں ... کے سڑک کی طرف سے آنا پڑتا تھا۔

اس دیوار کے پیچھے سے میں سڑک کی ٹریفک پر نظر رکھ ... مگر مجھے صرف وہی دیکھ سکتے تھے جو لاہور کی جانب سے آ...

میں نے گھڑی دیکھی تو دوپہر ہوچکی تھی۔ پھر دل ہی دل میں دعا مانگی کہ استاد پیڈرو کی گاڑی واپسی میں ہمیں تلاش کرتی ہوئی اس وقفے میں نہ گزری ہو جب ہم کچے راستے پر رواں تھے۔

بعض دعائیں فوراً ہی قبول ہو جاتی ہیں اور اس وقت آدمی سوچتا ہے کاش میں نے زیادہ اچھی اور منافع بخش دعا مانگی ہوتی۔ سفید رنگ کی ڈاج زدم سے ریلوے کراسنگ پار کرگئی۔ میں نے اس کی نمبر پلیٹ کی ایک جھلک دیکھی۔ یہ دوسرا نمبر تھا۔ تھوڑا سا غور کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ایک ہی کار پر آگے پیچھے دو نمبر پلیٹیں لگائی گئی ہیں اور تھوڑے تھوڑے وقفے سے وہ آگے کی پلیٹ پیچھے کرتے ہیں اور پیچھے کی آگے اور جب نمبر پلیٹ بدلتی ہے تو ڈرائیور بھی بدل جاتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب پہلی بار کاجل نے نوٹ کیا تو نمبر کچھ اور تھا اور گاڑی پیڈرو چلا رہا تھا۔ دوسری بار آگے والا نمبر پیچھے کردیا گیا تھا اور پیڈرو جگہ بدل کے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا تھا۔ تیسری بار اس نے اپنی قوت مشاہدہ سے صحیح کام لیا تھا اور اس کی نظر نے دھوکا نہیں کھایا تھا۔ اب گاڑی پھر میرے سامنے سے گزری تو میں نے اسے پیچھے سے دیکھا لیکن نمبر بدل جانے کے باوجود اسے شناخت کرلیا۔

میں ایک دم اپنی گاڑی کی طرف گیا۔ رابعہ اور کاجل کے لیے گاڑی میں بیٹھے رہنے کے سوا چارہ نہ تھا۔ میں تو ڈرائیور کی خاکی وردی میں کہیں بھی بیٹھ جاتا کسی کو شک نہ ہوتا۔ ریلوے کراسنگ سے گزرنے والوں کے لیے بھی میرا وجود اتنا ہی غیر اہم تھا جتنا کسی پھاٹک کھولنے یا بند کرنے والے کا ہوسکتا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس جگہ کوئی اس کام پر مامور نہ تھا۔ گزرنے والوں کو ریلوے کی طرف سے ایک بورڈ لگا کے خبردار کردیا گیا تھا کہ وہ دیکھ بھال کے اپنی ذمے داری پر لائن کو عبور کریں۔ اس کے باوجود کوئی قضا سے گلے ملنا چاہے تو اس کی مرضی۔

"خدا کا شکر ہے تم جلدی آگئے" رابعہ نے کہا "یہ جگہ تو بھوتوں کا ڈیرا ہے۔"

"بھوتنیوں کا ڈیرہ ہے۔ ہمارے جانے کے بعد کھنڈر خالی رہ جائے گا۔" میں نے کار میں بیٹھ کے انجن کو اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی۔

کاجل نے کہا "کیا وہ واپس چلے گئے؟"

"ہاں اب ہم دوڑ لگاتے ہیں پنڈی کی طرف" میں نے دوبارہ چابی گھمائی۔ پنکھا گھوما مگر انجن اسٹارٹ نہیں ہوا۔

"اسے کیا ہوگیا؟" رابعہ گھبرا کے بولی "ابھی تو ٹھیک تھی۔"

میں نے کہا "آسیب کا اثر معلوم ہوتا ہے۔ کسی عامل کو بلانا پڑے شاید۔ ماڈرن جن اگر خوب صورت کاروں پر بھی عاشق ہو جاتے ہوں تو کیا پتا۔"

تین چار بار کوششیں کرنے کے بعد میں نے بونٹ کھولا اور تار چیک کیے۔ کوائل کے تار جھٹکوں سے متاثر نہیں ہوئے تھے۔ البتہ گاڑی کے کاربوریٹر میں پیٹرول زیادہ ہوگیا تھا۔ اب یا تو ہم اس کے خشک ہونے کے انتظار میں وقت گزارتے یا گاڑی کو اسٹارٹ کرنے کے لیے دھکا لگایا جاتا۔ اچانک میری نظر نے کنڈنسر کے نکلے ہوئے تار کو دیکھ لیا لیکن اسے لگانے سے بھی فائدہ نہیں ہوا۔ دو تین بار سیلف گھمانے سے گاڑی مزید "اوور" ہوگئی اور بیٹری کے بیٹھ جانے کا اندیشہ پیدا ہوگیا تو میں نے خواتین سے نیچے تشریف لانے کو کہا۔

"گاڑی کو دھکا لگانا پڑے گا۔" میں نے مسرت سے کہا "میں گاڑی میں بیٹھتا ہوں۔ آپ لوگ ہمت کریں۔"

"گاڑی میں بھی اسٹارٹ کرسکتی ہوں۔" رابعہ نے کہا "اور کاجل بھی کرسکتی ہے یہ کام۔"

کاجل نے کہا "باجی آپ اندر بیٹھ جائیں۔ برقعے کے ساتھ دھکا لگانا مشکل ہوگا۔ اور اچھا بھی نہیں لگے گا۔"

رابعہ بولی "تم اچھی لگو گی ساری کے ساتھ دھکا لگاتی......"

میں نے کہا "آدھا گھنٹا انتظار کریں تو شاید گاڑی خود اسٹارٹ ہو جائے۔ گارنٹی کوئی نہیں۔ بیٹری ذرا کمزور ہو رہی ہے۔"

اسی وقت کلیم اللہ نے کہا "رابعہ آنٹی۔ آپ بیٹھو میں اور سکندر انکل دھکا لگائیں گے۔ کاجل دیدی آپ ہٹ جاؤ۔"

"تارزن تم؟" میں نے کہا "ذرا اس جگہ کو دیکھو۔"

"ہم پہلے اینٹ پتھر ہٹائے گا۔" کلیم اللہ بولا "اور ضرورت پڑے گا تو ادھر سڑک سے کسی کو بلا کے لائے گا۔"

رابعہ اور کاجل نے خوش ہو کے اسے دیکھا "جاؤ شاباش کسی بھی گاڑی والے کو روک لینا۔"

میں نے مایوسی سے کہا "یار یہ تو میں بھی کرسکتا تھا۔ خواہ مخواہ جذباتی ہوگئے ذرا لطف رہتا۔"

ایک کار کے چار مسافروں نے ہماری مدد کی اور گاڑی اس کھنڈر سے نکل کر اسٹارٹ ہوگئی۔ حیران وہ سب تھے کہ ہم نے گاڑی کو اس "گیراج" میں کیسے داخل کیا تھا۔ مگر پوچھا صرف ایک نے کہ بھائی صاحب یہ آخر آپ کا مقصد کیا تھا۔ دوسرے نے اسے ڈانٹ کر خاموش کرادیا کہ فضول سوالات مت کرو۔ دھکا لگاؤ۔"

گاڑی اسٹارٹ ہوگئی تو میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور چند منٹ کے بعد ہم پھر جی ٹی روڈ پر آگئے۔ ہماری مدد کرنے والے کار میں بیٹھ رہے تھے کہ ایک شخص کو کچھ خیال آیا۔

اس نے میرے پاس آکے کہا "بھائی صاحب غالباً آپ کے ہی ساتھی تھے وہ۔ آپ کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔"

میں نے چونک کے کہا "ہمارے ساتھی؟"

"ہاں ایک ڈاج ڈارٹ تھی سفید رنگ کی۔ انہوں نے ہم سے بھی پوچھا تھا آپ کے بارے میں۔"

"کیا پوچھا تھا؟" میں نے کہا۔

"یہی کہ اس نمبر کی گاڑی کہیں دیکھی۔ ایک برقعہ پوش خاتون

رابعہ نے کلیم کو تسلی دی "بس بیٹا پنڈی پہنچ کے کھانا کھائیں گے تھوڑی سی دیر کی بات ہے۔"

"شام تک پشاور پہنچ جانا چاہیے ہمیں۔" میں نے کہا "خدا نے چاہا تو کل ہم کلیم اللہ کے گھر ہوں گے۔"

"آج رات کیوں نہیں؟"

"اس لیے کہ علاقہ غیر میں جانے سے پہلے پولیٹکل ایجنٹ سے پاس حاصل کرنا پڑتا ہے۔" میں نے کہا "اسے مطمئن کرنا پڑتا ہے کہ آپ بلاوجہ وہاں نہیں جارہے ہیں۔ علاقہ غیر ٹورسٹ حضرات کے لیے نہیں ہے۔ پہلے تو باہر کا آدمی ادھر جا ہی نہیں سکتا تھا۔ مگر پاکستان بننے کے بعد حالات کچھ بدل گئے ہیں۔"

ہم چار بجے راولپنڈی سے روانہ ہوئے تو شام ہو رہی تھی۔ سردیوں کے چھوٹے دن تھے۔ پنڈی میں پانچ بجے کے قریب سورج غروب ہوتا تھا۔ سردی ایک دم بڑھ گئی تھی اور جی ٹی روڈ پر شیشے چڑھانے کے بعد مجھے گاڑی کا ہیٹر آن کرنا پڑا۔ راستہ بالکل صاف تھا اور مجھے یقین تھا کہ اب استاد پیڈرو ہم تک نہیں پہنچ سکے گا۔ انہیں ہماری منزل کی خبر کیسے ہوسکتی تھی۔ ہمیں راولپنڈی اور اسلام آباد سے آگے تلاش کرنے کا خیال بھی شاید انہیں نہ آئے۔"

رات آٹھ بجے ہم پشاور پہنچے تو سردی کے باعث سڑکوں پر ویرانی کا سماں تھا۔ یوں بھی لاہور کے مقابلے میں پنڈی کم آباد تھا اور پشاور میں رونق والے علاقے محدود تھے۔ صدر کا علاقہ نسبتاً فیشن ایبل تھا اور وہاں دوسرے علاقوں کی خواتین بے پردہ گھومتی نظر آجاتی تھیں۔ مقامی شرفا اور خواتین کے گھروں میں سخت پردہ رائج تھا اور ان کے گھروں کی عورتیں جن گاڑیوں میں آتی جاتی تھیں ان کے شیشوں پر خصوصی اہتمام کے تحت پردے ڈالے جاتے تھے اور اندر بھی وہ برقعہ پوش رہتی تھیں۔ شہر میں ڈگیری یا قصہ خوانی کے علاقہ میں عورت خال خال نظر آتی تھیں اور وہ بھی پرانی طرز کے ٹلے کے خیمہ نما برقعے میں۔ تقریبات یا اشد ضرورت کے بغیر کم تعلیم یافتہ اور غریب یا متوسط طبقے کی خواتین گھروں سے نکلتی ہی نہیں تھیں اور نکلنا پڑتا تھا تو تانگے میں آگے پیچھے چادر باندھی جاتی تھی۔

کینٹ ایریا بہت وسیع تھا اور ایڈورڈز کالج سے شروع ہوکے بارہ لائن تک جانے والی مال روڈ کے دونوں جانب صدر تک پھیلا ہوا تھا۔ صدر میں جناح اسٹریٹ کی چند گلیاں کراچی کے بوہری بازار یا لاہور کے انار کلی بازار کی طرح تھیں۔ اعلیٰ ترین ہوٹل ڈین تھا جسے آج کل کا فائیو اسٹار ہوٹل سمجھا جا سکتا ہے۔

میں نے رابعہ اور کاجل کے ساتھ ڈین ہوٹل ہی کا انتخاب کیا تھا مگر وہاں پہنچ کے مجھے مایوسی ہوئی۔ وہاں صرف ایک کمرا دستیاب تھا اب ہم چار افراد تھے۔ ہوٹل کے قوانین دو سے زیادہ افراد کو ایک ڈبل بیڈ روم میں ٹھہرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ کلیم اللہ کو بچہ سمجھ کے نظرانداز کیا جاتا تب بھی تین کی جگہ نہ تھی۔ منیجر نے صاف معذرت کرلی اور خصوصی رعایت دینے پر تیار نہ ہوا تو میں نے ایک کمرے میں رابعہ اور کاجل کو چھوڑا۔ کلیم انہی کے ساتھ رہا۔ میں تھوڑی دور واقع گرین ہوٹل میں گیا جہاں شب بسری کے لیے مجھے خاصا آرام دہ کمرا مل گیا۔

وہاں میرے اکیلے قیام کرنے کا ایک اور فائدہ بھی ہوا۔ میں رات کے کھانے کے لیے واپس ڈین ہوٹل گیا تھا اور دس بجے کے قریب واپس آیا تو کاؤنٹر پر ایک باریش پٹھان اور منیجر کے درمیان تکرار چل رہی تھی۔ پٹھان سرخ و سفید رنگ کا جوان آدمی تھا اور حلیے سے معزز لگتا تھا۔ وہ اس بات پر مشتعل تھا کہ اس نے فون پر ریزرویشن کرادی تھی تو پھر اس کا کمرا مجھے کیوں دیا گیا۔

منیجر نے کہا "آپ نے کل فون کیا تھا۔ بلکہ پرسوں شام۔"

"پھر کیا ہوا۔ ہم دو دن کا کرایہ دے گا۔"

"آفریدی صاحب ایسے ہم کمرے خالی نہیں رکھ سکتے۔ کسی کا کیا پتا وہ فون کرنے کے بعد ارادہ بدل دے۔ آپ نے کوئی ادائیگی تو نہیں کی تھی نا۔" منیجر نے کہا "اب یہ مسافر ہوٹل میں آکے ادائیگی کررہا ہے اسے ہم کیسے انکار کریں۔"

"تم لوگ پیسہ کو اہم سمجھتا ہے۔ شریف آدمی کا زبان کا کوئی اہمیت نہیں۔" پٹھان گرم ہوگیا۔

"خان صاحب میں نے آپ کی صرف آواز سنی تھی۔ ذاتی طور پر تو میں آپ کو نہیں جانتا تھا۔ لوگ تو شرارت میں بھی فون کردیتے ہیں۔" منیجر نے شائستگی سے وضاحت کی۔

اب میں نے مداخلت مناسب سمجھتے ہوئے کہا "کیا بات ہے۔ ان کا کمرا مجھے دے دیا گیا ہے۔"

آفریدی نے مجھے دیکھا "آپ کا کوئی غلطی نہیں اس میں۔"

میں نے کہا "غلطی کسی کی بھی نہیں... چلیں چھوڑیں۔"

"یارا ابھی ہم کدھر جائے گا۔"

میں نے کہا "آپ میرے ساتھ آجائیں۔ میرا ڈبل بیڈ میرے لیے کس کام کا ایک رات ہم ساتھ گزار سکتے ہیں۔ میں صبح ہی چلا جاؤں گا۔"

اس کے چہرے پر سکون اور اطمینان کے ساتھ شکر گزاری کے جذبات نظر آنے لگے "آپ نے بڑا خواری سے بچالیا مجھ کو۔ بہت مہربانی۔"

میں نے کہا "آیئے میرے ساتھ۔ ہوٹلوں میں رہائش کی کمی کا بڑا مسئلہ ہے۔ مجھے بھی فیملی کو [illegible] میں چھوڑ کے خود یہاں آنا پڑا۔"

اس کے ہاتھ میں صرف ایک بریف کیس تھا جو چھوٹا سا سوٹ کیس بھی سمجھا جا سکتا تھا۔ کمرے میں پہنچ کے اس نے قمیص کے نیچے سے ریوالور اور میگزین اتار کے میز پر ڈال دیئے اور دوسرے بیڈ پر بیٹھ کے جوتے اتارنے لگا۔ میں نے اتنی دیر میں نائٹ سوٹ

ہیں اور ایک برقعے کے بغیر ایک بچہ ہے اور شوفر۔"

"اور بھی کچھ کہا تھا؟"

"ہاں یہ کہا تھا کہ وہ شوفر ذرا مختلف قسم کا ہے۔ [illegible] لگتا ہے مگر صورت سے شوفر نہیں لگتا۔ ٹھیک ہی کہا تھا اس نے۔ آپ تو خاصے تعلیم یافتہ اور مہذب آدمی لگتے ہیں۔ انگریزی اچھی بولتے ہیں۔"

میں نے کہا "دیکھئے اگر وہ پھر ملیں آپ کو۔ تو ان کو کچھ مت بتایئے گا ہمارے بارے میں۔ لمبی کہانی ہے اور آپ سن کے بھی کیا کریں گے۔ وہ دشمن ہیں ہمارے اور ہم ان سے چھپ کے یہاں کھڑے تھے۔"

اس نے میری بات پر غور کیا اور پھر سمجھنے کے انداز میں سر ہلایا "ٹھیک ہے ہمیں کیا؟" وہ [illegible] سے ہاتھ ملا کے بولا "[illegible] گڈ لک۔"

ان اجنبی ہمدردوں کے انکشاف نے [illegible] اس [illegible] تصدیق کردی تھی کہ استاد پیڈرو باقاعدہ ہمارے تعاقب میں [illegible] مجھے اپنی ایک غلطی کا شدت سے احساس ہو رہا تھا [illegible] انجانے میں ہوگئی تھی۔ میں یہ بھول [illegible] تعاقب میں ایک [illegible] وردی میں ہوں چنانچہ میرا رویہ [illegible] ڈرائیور جیسا ہونا چاہیے۔ میں نے عادتاً انگریزی میں بات [illegible] کردی تھی۔

رابعہ نے کہا "آپ [illegible]"

میں دوسری کار کو مخالف سمت [illegible] روانہ [illegible] دیکھ رہا تھا "اور بھی بہت سے فضول [illegible] میں ایک آزاد ملک کا آزاد شہری ہوں۔ انگریزی [illegible] یا فارسی [illegible] آپ کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔"

کاجل نے کہا "آخر یہ لوگ کہاں [illegible] ہمارے پیچھے [illegible] ہم نے تو بہت احتیاط کی تھی۔"

"یہی میں بھی سوچنے پر مجبور ہوں۔ [illegible] کسی نے ہمیں نہیں دیکھا تھا۔ ہم پچھلی گلی [illegible] وقار یوسف کے [illegible] پہنچے تھے تب بھی ہمارے پیچھے [illegible] تھا۔"

"تم نے دیکھا آپ تھا۔" رابعہ بولی "[illegible] یہ بات نہیں کہہ سکتے۔"

میں نے گاڑی کی رفتار [illegible] ٹھیک کہا تم نے۔ ایسے [illegible] وقار یوسف کے [illegible] پہنچ کے دیکھ لیا تھا۔ [illegible] لیے منظر کے گھر کے پاس چھپ [illegible] ہمارے پیچھے پڑا ہو تو میں نہیں کہہ سکتا۔ وقار یوسف کے [illegible] تک اس کا [illegible] ضروری نہیں تھا جب [illegible] نے اندر [illegible] تو وہ [illegible] ہوں گے۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ [illegible] وقار [illegible] اس کی گاڑی میں چلے تب بھی کوئی دیکھ رہا تھا۔" رابعہ بولی۔

"کوئی سائے کی طرح ہمارے تعاقب میں تھا اور ہمیں معلوم نہیں ہوا۔ انہیں کار کا نمبر تک یاد تھا۔"

"انہوں نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ منظر نے ہماری کار کو اپنے گھر سے دور لے جاکے کھڑا کیا ہے۔" رابعہ بولی۔

"شاید نگرانی وہ ہماری کررہے تھے۔ نگرانی کرنے والے دو ہوں گے تو ممکن ہے ایک منظر کے پیچھے چلا گیا ہو۔ ایک ہوگا تو گاڑی میں صرف منظر کو دیکھ کے رپورٹ آگے دے دی ہوگی اور خود وہیں موجود رہا ہوگا لیکن ہم پر نظر رکھنے کا فائدہ کیا ہوا اگر وہ چاہتے تھے کہ ہمیں چاندنی کے قتل میں ملوث کرلیا جائے اور حراست میں لے لیا جائے تو یہ مقصد بہرحال پورا نہیں ہوا۔"

"ممکن ہے انہیں قانونی مراحل سے گزر کے خانہ تلاشی اور گرفتاری کے احکامات حاصل [illegible] میں دیر لگی ہو۔ عام حالات میں پولیس بھی اتنا [illegible] جب چاہے کہیں سے بھی [illegible] پیڈرو لیل کا۔"

"[illegible] کار بن بھی ہے۔"

"[illegible]" میں نے کہا۔

"[illegible] الیکشن میں بار [illegible] اسی الیکشن کے صدر یا [illegible] انتخاب لڑنے [illegible] رہتا ہے۔ اس کی اہلی بہت [illegible]" رابعہ نے کہا۔

"[illegible] لاہور کے [illegible] شامت آجائے گی [illegible]"

"سوال یہ ہے [illegible] انہوں نے [illegible] ہمارے آگے پیچھے [illegible] کیا کچھ نہیں۔" رابعہ بولی۔

"[illegible] گولی مار دیتے؟"

"[illegible] اس [illegible] مطلب بھی میں نہیں سمجھ [illegible] پڑتی ہے۔ اس طرح تو گویا [illegible] کا احساس [illegible] تعاقب کا [illegible] تھا۔ اتنا تجربہ کار آدمی جو خود بھی [illegible] چوہدری دلاور کے سایہ عاطفت میں [illegible] کی طرح ہوگیا ہے۔ سنجیدگی سے [illegible] ہمارے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہو۔"

"[illegible] وہ [illegible] سنجیدگی سے تعاقب کررہا تھا۔ محض دل لگی کے لیے۔" رابعہ [illegible]

"[illegible] وہ صرف احساس دلانا چاہتا تھا کہ ہمارے جال سے نکل کے تم کہاں جاؤ گے۔ جہاں جاؤ گے ہم پہلے سے موجود ہوں گے۔" میں نے کہا۔

کلیم نے کہا "ڈیڈی مجھے بھوک لگی ہے۔"

"اف بھوک تو مجھے بھی لگی ہے۔ میں تو بالکل بھول گیا تھا کہ میں فاقے سے ہلاک ہونے والا ہوں۔" [illegible] نے کہا۔

پہن لیا۔
"آپ کا نام میں نے رجسٹر میں دیکھا تھا۔" وہ بولا شرافت علی نقوی۔ کراچی سے آئے ہو ادھر کہاں رہتے ہو۔"
میں نے فوراً اکرام شیخ کا پتا بتادیا "میرا بزنس ہے وہاں۔"
اس نے مجھے غور سے دیکھا "کیسا بزنس؟"
"میں نے کہا "کنسٹرکشن کا۔"
اس نے کہا "کراچی میں راج مزدور سے پوچھو۔ وہ بھی ایسا ہی بولتا ہے۔ ہم ٹھیکیدار ہے ادھر سینٹری اور الیکٹرک کا ٹھیکہ لیتا ہے کوٹھی بنگلوں میں۔ تم مکان بناتا ہے یا کارپوریشن کا ٹھیکہ لیتا ہے۔"
خوش اخلاقی کا مظاہرہ مجھے مہنگا پڑ رہا تھا اور میں مجبور تھا کہ اس کے ہر سوال کا جواب دوں۔ یہ میری بدقسمتی تھی کہ میں نے خود کو اسی کاروبار سے وابستہ کرلیا تھا جو آفریدی کی لائن تھی۔ وہ کراچی کے تمام بلڈرز اور بڑے بڑے ٹھیکیداروں کو جانتا تھا اور مجھ سے ان کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ فلاں سے ملے ہو۔ فلاں کے ساتھ کبھی کام کیا ہے۔ فلاں بڑا بے ایمان ہے۔ ریت کی دیواریں کھڑی کرتا جارہا ہے ادھر میرا یہ حال تھا کہ مجھے کراچی کے گلی محلوں اور سڑکوں بازاروں کے نام تک یاد نہیں آرہے تھے۔
بہت جلد میرا پول کھل گیا۔ آفریدی نے تاڑ لیا کہ میں نے اس سے غلط بیانی کی تھی "تم نے یہ ڈرائیور کا وردی کیوں پہنا ہے۔"
میں نے مزید جھوٹ بولا "سفر میں کپڑے تو بس ایسے ہی ہونے چاہئیں۔"
"دیکھو یارا! تم کچھ پریشان ہے۔" اس نے کہا "تمہارا مرضی ہے ہم کو کچھ نہ بتاؤ لیکن تم ہمارا پریشانی دور کیا۔ ہم کو اپنے ساتھ جگہ دیا۔ ابھی یہ قرض ہم پر ہے ہم پٹھان ہے۔ احسان کرنے والا جان مانگے تو دیتا ہے۔ زبان دیتا ہے تو پھر جان دے کر نبھاتا ہے۔"
میں نے کہا "میں جانتا ہوں آفریدی صاحب۔"
"صاحب ... صاحب تو فرنگی ہوتا تھا۔ ہم پاکستانی سب مسلمان بھائی ہے۔" اس نے کہا۔
"معاف کرنا" میں نے کہا "میں نے خواہ مخواہ تم سے جھوٹ بولا۔ تم تو واقعی میری مدد کرسکتے ہو۔ تم یہاں کے رہنے والے ہو؟"
اس نے اقرار میں سرہلایا "صبح جمرود جائے گا ادھر اپنا گھر ہے۔ گاؤں ہے اور قبیلہ ہے سارا۔"
میں نے سوچ کے کہا "مجھے خیبر ایجنسی جانا ہے قبائلی علاقے میں جہاں میں آج تک نہیں گیا۔"
"کام کیا ہے؟" اس نے کہا "ہم کو بولو۔"
میں نے کہا "ایک دوست تھا میرا۔ ادھر مشرقی پاکستان میں وہ بھی پٹھان تھا۔ اس نے مرتے وقت اپنے بیٹے کو میرے حوالے کردیا تھا۔ اور کہا تھا اس کو میرے گھر والوں کے پاس پہنچا دینا۔
کلیم اللہ کی پھوپی زندہ ہے۔"
"اور اس کی ماں کدھر ہے۔"
"وہ بھی مرگئی۔ وہیں ڈھاکا میں۔ اس لڑکے کا باپ کسی ہندو سیٹھ کا چوکیدار تھا۔ اسے بچانے کی کوشش میں خود زخمی ہوگیا تھا۔ ڈاکوؤں کے ہاتھوں۔ سیٹھ نے وفاداری کا کوئی انعام نہیں دیا۔ نوکری سے بھی نکال دیا کہ مجھے معذور آدمی کی ضرورت نہیں۔ فاقہ کشی کی نوبت آگئی تھی۔ میاں بیوی ایک ساتھ مارے گئے۔" میں نے ان کی خودکشی کے ذکر کو عمداً گول کردیا۔
"کیسے لڑائی میں؟"
"ہاں وہاں تو بہت مسلمان مارے گئے تھے۔ کلیم اللہ خوش قسمت تھا کہ ہمارے ساتھ آگیا۔" میں نے کہا۔
اس نے مزید تفصلات کے لیے بہت سے سوالات کیے۔ وہ کب ڈھاکا گیا تھا۔ کیوں گیا تھا۔ ہندو کے پاس ملازمت کیوں اختیار کی تھی۔ خود واپس آنے کی کوشش کیوں نہیں کی تھی۔
ساری بات سن کر وہ کچھ سوچنے لگا اور پھر بولا "یارا شرافت علی۔ ابھی میں ایک بات بولتا ہوں۔ یا تو پھر غلط بولتا ہے یا تیرا یار نے غلط بولا۔ قبائلی علاقے میں جانے سے پہلے سوچو۔"
میں نے کہا "سوچنے کی کون سی بات ہے۔"
"ہے یارا ہے" وہ اصرار کرتے ہوئے بولا "تم کچھ نہیں جانتا ابھی ادھر سے ایک پٹھان محنت مزدوری کے واسطے پنڈی لاہور جاتا ہے کراچی جاتا ہے۔ ڈھاکا نہیں جاتا۔ ایسا کام ادھر بہت ہے۔"
"تمہارے خیال میں اس کے وہاں جانے کا سبب کیا تھا؟"
اس نے کہا "اللہ جانتا ہے لیکن ہمارا اندازہ ہے کہ وہ جان بچا کے گیا۔ کسی دشمن سے۔ ادھر اس نے کسی کو قتل کیا ہوگا اور ڈرتا ہوگا کہ مقتول کا وارث اس کو تلاش کرلے گا۔ اگر باپ کو قتل کیا ہوگا تو بیٹا نہیں چھوڑے گا۔ بھائی ہوگا تو وہ بھی بدلہ لے گا۔ ادھر کوئی کب تک چھپ سکتا ہے۔ دو مہینہ دو سال دس سال۔"
میں نے پریشانی سے کہا "اتنا عرصہ انتظار کرسکتا ہے کوئی۔"
"یارا تم بھول سکتے ہو اپنے بھائی کے قاتل کو۔ یا اپنے باپ کے قاتل کو معاف کرسکتے ہو۔"
اس نے اچانک میری دکھتی رگ پکڑلی تھی۔ مجھ سے وہ سوال پوچھ لیا تھا جس کا میرے پاس ایک ہی جواب تھا۔ ناممکن۔ میں اپنے والد وزیر خاں کے قاتل کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے زندگی کی آخری سانس تک اس کا پیچھا کروں گا۔ دس سال کیا میری باقی عمر اسی انتقام کی پیاس بجھانے کی جدوجہد میں کام آئے تو میں سمجھوں گا کہ میری زندگی بے مقصد جینے کا نام نہیں تھی۔ میری سوچ نے خود مجھے حیران کیا۔ کیا ایسا اس لیے تھا کہ میری رگوں میں بھی پٹھان خون تھا۔ میرا اصل نام کبیر خاں تھا۔ میرے والد وزیر خاں بتاتے تھے کہ ہم یوسف زئی پٹھان ہیں۔
میں نے دیوار کو گھورتے ہوئے کہا "آفریدی میرا نام شرافت علی نقوی نہیں ہے۔ کبیر خاں ہے کبیر خاں ولد وزیر خاں اور میری زندگی کا مقصد اب ان سب کو جہنم رسید کرنا ہے جو میرے والد کے قاتل ہیں۔ وہ بہت طاقتور۔ بااثر اور کینہ پرور لوگ ہیں۔ وہ میرے عزائم کو سمجھتے ہیں چنانچہ وہ چاہتے ہیں کہ میرے انتقام کا نشانہ بننے سے پہلے مجھے ہی ختم کردیں۔ لیکن ایسا نہیں ہوگا۔"
میں نے اسے اپنے ذاتی انتقام سے تعلق رکھنے والے تمام واقعات بتادیے۔ اس کہانی میں ایم آر ایس اور مشرقی پاکستان میں ہمارے کارناموں کا کوئی ذکر نہیں آیا۔ رابعہ اور محسن، غالب یا نازو کا حوالہ نہیں آیا۔ میں نے اسے بتادیا کہ کس طرح چوہدری دلاور نے میرے والد سے سب کچھ چھین لیا تھا اور وہ کس بے کسی کے عالم میں دنیا سے رخصت ہوئے تھے۔ ایک لکھ پتی کا جنازہ اپنے ہی ایک نمک حرام ملازم کے گھر سے اٹھا تھا کیونکہ حالات نے اسے ایک گھریلو ملازم کی حیثیت سے زندگی کے دن پورے کرنے پر مجبور کردیا تھا۔ وہ خیراتی اسپتال سے دوائیں لاتا رہا حالانکہ وہ ایک صنعتکار تھا۔ کوٹھی کا مالک تھا۔ یہ سب کیسے ہوا۔ میں نہیں جانتا۔ میں انگلستان میں تعلیم حاصل کررہا تھا کہ اچانک مجھے ان کی حالت زار کی خبر ایک گمنام شخص کے ذریعے ملی مگر میرے پاکستان پہنچنے سے پہلے ہی وہ اس راز کو سینے میں چھپائے دنیا سے جاچکے تھے۔ ان کا ایک شریک کار شرافت علی مجھے کچھ بتا سکتا تھا مگر وہ بھی قتل کردیا گیا اور اس قتل کا الزام مجھ پر عائد کرکے مجھے تختہ دار تک پہنچانے کا پورا بندوبست کیا گیا مگر خدا نے مجھے بچا لیا اب میں روپوشی کی زندگی گزار رہا ہوں اور موقعے کی تلاش میں ہوں جب میں اپنے والد کے قاتلوں کو اعتراف جرم پر مجبور کرسکوں اور انہیں تختہ دار تک پہنچا دوں۔ وہ میری جان کے درپے ہیں اور یہ کھیل ابھی جاری ہے۔
اس نے بڑی دلچسپی اور ہمدردی کی ساتھ میری کہانی سنی تھی۔ خاموشی کے ایک مختصر وقفے کے بعد اس نے کہا "یارا کبیر خاں کیا تو مرنے سے ڈرتا ہے؟"
میں نے کہا "مسلمان موت سے نہیں ڈرتا۔"
"تو پھر یہ لے ریوالور جا کے انہیں چھلنی کردے۔ بزدل مت بن۔ انہوں نے تیرے باپ کی لاش اور ہڈیاں تک قبر سے نکال لیں۔ اور تو نے ابھی تک کچھ نہیں کیا۔ کیسا بیٹا ہے تو۔ ایک ایک کو مار دے اور سب کو بتادے۔ سب کے سامنے مار انہیں اور ٹھنڈے دل کے ساتھ پھانسی چڑھ جا۔" آفریدی نے کہا۔
میں نے کہا "تمہارے جذبات غلط نہیں ہیں۔ ایسا ہی کرنا چاہیے تھا مجھے۔ لیکن میرے کچھ اور مسائل بھی ہیں۔ میں اکیلا نہیں ہوں۔"
"یہ تو اور اچھی بات ہے۔"
"میرا مطلب تھا کہ کسی کو میری ضرورت ہے۔ اکیلا ہوتا تو میں کب کا یہ حساب چکا دیتا لیکن مجھے اپنا حق بھی حاصل کرنا تھا۔
تم کہہ سکتے ہو کہ تعلیم نے اور دنیا کے جھمیلوں نے مجھے بزدل بنادیا ہے۔ مصلحت کو سمجھنا اور مصالحت کرنا سکھادیا ہے۔ میرے جذبات بھی عقل کے تابع ہیں۔ کاش میں تمہاری طرح سوچ سکتا۔ انجام اور نتائج کی پروا کیے بغیر سب کر گزرتا مگر میں ایسا نہیں کرسکا۔ شاید کر بھی نہیں سکتا۔ میں اپنے دشمنوں سے بچتا پھر رہا ہوں۔ ڈرائیور کی وردی میں نے اسی لیے پہن رکھی تھی کہ میرا تعاقب کرنے والے مجھے نہ پہچان پائیں۔ وہ لاہور سے میرے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ میں نے بڑی مشکل سے ان کو ڈاج دیا۔ میں نے اس بچے کو اس کے وارثوں تک پہنچانے کی ذمے داری بھی قبول کرلی تھی۔"
"وارثوں تک یا قاتلوں تک۔ ابھی تم کو کیا معلوم ہے کبیر خاں کہ وہ اس کو قبول کریں گے یا....."
میں نے کہا "نہیں آفریدی۔ ایسا کوئی نہیں کرسکتا۔ ایک بچے سے کون انتقام لے گا۔"
"آج وہ بچہ ہے کل بڑا ہوجائے گا۔ اگر اس کا باپ جرم کرکے بھاگا ہوگا تو سزا اس کے بیٹے کو ضرور ملے گا۔ اولاد کا ایسا ہی قانون ہے۔"
میں نے پریشان ہوکے کہا "مگر جن کا اس سے خون کا رشتہ ہے....."
اس نے میری بات کاٹ دی "اس کے تربور کب خون کے رشتے سے منکر ہوں گے۔ مگر ان سے خون کے رشتے کا نوعیت بدل جاتا ہے۔ پھر یہ محبت کا نہیں نفرت کا رشتہ بن جاتا ہے۔ اس روایت کو تم نہیں سمجھے گا۔ تربوروں کی روایت۔"
میں نے کہا "میں واقعی یہ سب نہیں جانتا۔ تم نے تو مجھے الجھن میں ڈال دیا ہے۔ کیا واقعی اس کے اپنے اسے مار ڈالیں گے؟"
"ہاں اگر اس کا باپ نے زمین جائداد یا رشتے کے معاملے میں کسی سگے بھائی کا خون بھی کیا ہوگا تو اب اگلی نسل میں اس کا کوئی چچا زاد یا ماموں زاد بھی اس کا جانی دشمن سمجھا جائے گا۔"
"پھر میں کیا کروں۔ میں اسے یہاں اس لیے تو نہیں لایا تھا کہ قاتلوں کے حوالے کردوں۔" میں نے کہا "میں اسے واپس بھی نہیں لے جاسکتا۔ کلیم اللہ اپنے گاؤں جانا چاہتا ہے۔ اپنوں میں رہنا چاہتا ہے۔ اسے نہیں معلوم کہ ایک نسل پہلے کیا ہوا تھا۔"
"میں تمہاری مدد کرسکتا ہوں۔ اس حد تک کہ تم جمرود میں میرے مہمان بن جاؤ۔" آفریدی بولا "اس وقت تک میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا جب تک میرے قبیلے کا ایک ایک فرد تمہاری حفاظت کرتے ہوئے مارا نہ جائے۔ اتنی ہمت کسی میں نہیں ہے۔"
"میں کب تک مہمان رہ سکتا ہوں۔ اور مسئلہ تو کلیم اللہ کا ہے۔" میں نے کہا۔

"ہم اپنا آدمی بھیج کر معلوم کرے گا معاملہ کیا ہے۔" آفریدی بہت صاف اور صحیح اردو بولتا تھا مگر کبھی کبھی اس کی گرامر غلط ہو جاتی تھی۔

میں نے کہا "وہاں جانے کے لیے تو پولیٹیکل ایجنٹ سے پاس بھی لینا پڑے گا۔"

"میرے ساتھ ضروری نہیں۔ میں وہاں کا رہنے والا ہے۔" اس نے کہا "تمہارے ساتھ زنانہ کون ہے۔"

میں نے جھوٹ بولا "میری بیوی اور بہن۔"

"ان کو کیوں لایا تم۔ ہمارا علاقہ میں جائے گا تو ایسا نہیں جائے گا جیسا کراچی میں یا لاہور میں۔ پردہ کرے گا۔"

"وہ پردہ کریں گی میری بیوی تو برقعہ اوڑھتی ہے۔ بہن کے لیے لے لوں گا۔"

"اچھا ابھی سو جاؤ۔ فی امان اللہ شب بخیر۔"

"شب بخیر" میں نے کہا اور لائٹ بجھا کے ..گیا مگر آفریدی کی باتوں نے میرے ذہن میں نئی پریشانیاں پیدا کر دیں تھیں۔ میرا دل نہیں مانتا تھا کہ کلیم کا باپ سرحدی علاقے میں کوئی جرم کر کے سزا سے بچنے کے لیے فرار ہوا ہو گا۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ اپنے بچے کو اپنے حصے کی سزا کاٹنے کے لیے کیوں بھیجتا۔ دوسری طرف آفریدی کی دلیل بھی بے وزن نہ تھی کہ صرف محنت مزدوری کی خاطر کوئی اتنی دور نہیں جاتا۔ سرکاری ملازم کا ٹرانسفر ہو جائے تو اسے جانا پڑتا ہے لیکن کلیم کا باپ معمولی چوکیدار تھا۔ ایسی نوکری تو اسے کہیں بھی مل جاتی۔ ہاں اس کی جان کے دشمن اسے ڈھاکا میں تلاش نہیں کر سکتے تھے۔ پنڈی لاہور یا کراچی تک تو سب ہی کا خیال جاتا ہے مگر مشرقی پاکستان تو دوسرے ملک کی طرح تھا۔ شاید اتنے عرصے بعد کلیم کے باپ نے یہ سمجھا ہو کہ وہ پرانی بات تھی۔ اب کلیم کو معاف کر دیا جائے گا۔ اس نے مجھے بالکل مختلف کہانی سنائی تھی جو اب آفریدی کے دلائل کی روشنی میں غلط لگتی تھی۔

رابعہ اور کاجل دوسرے ہوٹل میں تھیں۔ مجھے خیال آیا کہ میں ابھی جا کے ان کو یہ سب بتاؤں اور ان سے مشورہ کروں کہ کیا ان حالات میں ہمارا کلیم کے ساتھ واپس لوٹ جانا مناسب نہ ہو گا؟ مگر اب رات بہت بیت چکی تھی اور یہاں یہ مشکل کام تھا کہ اتنی سردی میں ہوٹل جا کے میں انہیں جگاؤں۔ وہ پریشان ہونے کے سوا کیا کر سکتی تھیں۔ اس کے علاوہ آفریدی نے ایک اندیشہ ظاہر کیا تھا۔ یہ کوئی یقینی بات نہیں تھی۔

میں سارے معاملات کو خدا کے سپرد کر کے سونے کی کوشش میں مصروف ہو گیا اور رات کے کسی پہر میں آخرکار نیند آ گئی۔ میرے ساتھ ہی دوسرے بیڈ پر آفریدی کروٹ بدلتے ہی سو گیا تھا اور بہت پرسکون تھا۔ اس کے دماغ پر کوئی بوجھ تھا نہ ضمیر پر۔

صبح میری آنکھ قدرے دیر سے کھلی۔ آفریدی اس وقت تک نماز سے بھی فارغ ہو چکا تھا اور غسل سے بھی۔ میں نے قدرے خفت کے ساتھ روم سروس کا بٹن دبا کے اپنے لیے چائے ... اور منہ دھونے چلا گیا۔ پانی گرم تھا مگر مجھے نہانے کا حوصلہ ...

آفریدی نے کہا "خالی چائے کیوں پیتے ہو۔ ناشتا ..."

میں نے معذرت کی "ناشتا میں رابعہ ... اپنی بیوی کے ساتھ ہی کروں گا۔ وہ ہوٹل میں انتظار کر رہی ہوں گی۔"

"کتنی دیر میں واپس آؤ گے۔" وہ بولا "میں تو جلدی ... ہو جاتا۔ تمہاری وجہ سے رکا ہوا ہوں۔"

میں نے کہا "ایک گھنٹے میں۔ اس وقت تک بازار کھل جائیں گے نا؟ مجھے برقعے لینے ہیں۔ میرا لباس تو ٹھیک ہے نا۔"

"اپنے لیے کوئی ٹوپی لے لو۔ قراقلی اچھی لگے گی۔"

میں نے اسے چائے کا کپ دیا اور خود پشاور کی صبح کا نظارہ کرنے کے لیے گیلری میں چلا گیا۔ سڑک ابھی سنسان پڑی تھی۔ بیشتر دکانیں بند تھیں اور سڑک پر سے اکا دکا تانگے گزر رہے تھے یا اسکول جانے والے بچوں کی سواریاں۔ آسمان کچھ ابر آلود تھا اور فضا میں نیلگوں دھند ٹھہری ہوئی تھی۔ سڑک کے کنارے بہت سی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ میری نظر گھوم پھر کے ہوٹل کے مقابل کھڑی ہوئی کاروں پر ٹھہر گئی۔ وہاں دوسری بہت سی کاروں کے درمیان سفید رنگ کی ایک لمبی ڈاج ڈارٹ بھی نظر آ رہی تھی۔ وقار یوسف کی کار کے ساتھ جس نے ہمیں لاہور سے پشاور پہنچایا تھا۔

دوسری منزل کی بلندی سے دھند کے باعث میں کار کا نمبر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس کی ٹیل لائٹس بھی میری نظر سے اوجھل تھیں اور ایک سائڈ پر رگڑ کا نشان بھی۔ کاجل نے صرف نمبر ہی دیکھا ہوتا تو ہم کنفیوژن کا شکار رہتے مگر اس نے دو ایسی نشانیاں نوٹ کی تھیں جو ہر سفید ڈاج پر نہیں ہو سکتی تھیں۔ اس کی ایک نیلی لائٹ ٹوٹی تھی اور دوسری یہ کہ اس کی ایک سائڈ پر گز کا لمبا نشان تھا۔

میں نیچے جا کے تصدیق کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ تعاقب کرنے والوں کا ہم تک پہنچ جانا مشکل ضرور تھا ناممکن نہیں تھا۔ ہمیں معلوم ہو چکا تھا کہ وہ راہ چلتے لوگوں سے بھی ہمارے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔ ایک کار کے چار شریف مسافروں نے ہماری مدد کرنے کے بعد یہ انکشاف کیا تھا کہ ہمارے ساتھی ہمیں تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ غالباً ایسے ہی لوگوں سے پوچھتے ہوئے وہ پشاور آ پہنچے تھے۔ گڑبڑ یہ تھی کہ وقار یوسف کی کار عام کار نہیں تھی۔ بیش قیمت ہونے کے ساتھ ساتھ یہ اسپورٹس ماڈل تھی اور اپنے منفرد کلر کے باعث زیادہ نمایاں ہو جاتی تھی۔ اس کے نچلے حصے پر سبز رنگ تھا اور بالائی حصے پر شوخ سرخ۔ ایسی گاڑی تلاش کرتے ہوئے دیکھنے والوں کی مدد حاصل کرنے سے ان کا مشکل کام بھی آسان ہو گیا ہو گا۔ کسی نے اشارہ دے دیا ہو گا کہ کار پشاور روڈ کی طرف سو کلومیٹر سے زیادہ کی رفتار پر جا رہی تھی۔ پشاور پہنچ جانے کے بعد انہیں یہ کار ڈ-لنز ہوٹل کے باہر نظر آئی ہو گی تو وہ گرین ہوٹل پہنچ گئے تھے۔ انہیں یقیناً معلوم ہو گا کہ گاڑی والے اس ہوٹل میں نہیں اس کے ساتھ ساتھ ...

... نبی کے ساتھ ہم انہی دو ہوٹلوں میں قیام کر سکتے ہیں۔

واپس اندر آ کے میں نے آفریدی سے کہا "یار خان صاحب"

"پھر صاحب بولا تم۔ خان کافی نہیں ہے۔"

میں نے کہا "خان میرے دشمن بھی اسی ہوٹل میں ہیں۔"

اس نے اخبار دیکھتے ہوئے حیرانی سے نظریں اٹھائیں "تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

میں نے کہا "ان کی گاڑی دیکھ کر۔ جو میری گاڑی کے ساتھ ہی لگی کھڑی ہے۔ میں اپنی گاڑی کیسے نکالوں گا۔"

"تمہیں یقین ہے کہ گاڑی انہی کا ہے؟"

"اگر تم نیچے جا کے دیکھ آؤ تو مہربانی۔ دو میں سے ایک نمبر آگے نظر آ جائے گا۔" میں نے کہا۔

"دو نمبر کیا مطلب۔"

"دوسرا نمبر پیچھے کی پلیٹ پر ہو گا۔ وہ کبھی ایک نمبر آگے لگا دیتے تھے کبھی دوسرا۔"

"میں دیکھتا ہوں۔ ان کی شکل صورت بتاؤ۔ نام....."

میں نے کہا "میری طرح انہوں نے بھی غلط نام لکھوایا ہو گا۔"

آفریدی نیچے جا کے پانچ منٹ میں لوٹ آیا اور اس نے تصدیق کی "نمبر تو ٹھیک ہے مگر آگے پیچھے ایک ہی نمبر ہے۔"

میں نے کہا "نمبر پلیٹوں کا دوسرا سیٹ ان کے پاس ہو گا کھڑی ہوئی گاڑی پر آگے پیچھے مختلف نمبر ہوتے تو وہ پکڑے جاتے۔ یہ کام تو انہوں نے راستے میں دھوکا دینے کے لیے کیا تھا۔"

"اب تم کیا کرو گے۔"

میں نے سوچ ... "تم میری مدد کرو۔ نیچے جا کر منیجر یا کلرک سے پوچھو کہ کیا میں پیچھے سے فرار ہو سکتا ہوں۔ ایڈوانس میں نے رات کو ہی جمع کرا دیا تھا۔ رقم ان کی طرف نکلے گی۔"

"مگر تم کیا کرے گا۔"

"کہنا اس سے قاتل کھڑے ہیں باہر۔ اگر وہ چھپ کے نہ گیا تو تمہارے ہوٹل میں گشت و خون ہو گا۔ لاشیں گریں گی۔ پھر پولیس آئے گی اور یہ ہوٹل کی شہرت کے لیے کوئی اچھی بات نہیں۔"

میں نے کہا "مجھے یقین ہے وہ مصیبت سے بچنے کا یہ آسان راستہ ضرور اختیار کریں گے۔"

"میں جا کے بات کرتا ہوں۔"

میں نے کہا "اور ہاں تم اپنا یہ ریوالور دے سکتے ہو مجھے؟ جو بھی قیمت ہے لے لو لیکن یہ تو شاید تمہارے نام پر ہو گا۔ لائسنس والا ہو گا۔"

اس نے مسکرا کے کہا "ادھر کون لائسنس لیتا ہے یار۔ ہم تو اسلحہ بناتا ہے باڑہ میں۔ غیر ملکی اسلحہ کیا چیز ہے اس کے سامنے۔ باہر کا دو ہزار میں ملتا ہے تو ادھر اس سے اچھا دو سو میں ملتا ہے۔ تم لے لو قیمت کا کوئی بات نہیں۔"

"ایسے میں نہیں لوں گا۔"

"یارا مجھے بھی مفت ملا تھا۔ اور بہت ہیں میرے پاس ... گھر چل کے دیکھنا کیسا کیسا شاندار چیز ہے۔ یہ تو ... ہے۔" اس نے ریوالور میری طرف بڑھا دیا "جان کی حفاظت اللہ کرتا ہے یارا۔"

آفریدی ایک بار پھر نیچے گیا اور دس منٹ بعد مسکراتا ہوا لوٹ آیا "جاؤ یارا میں بات کر لیا۔ باہر ایک ویٹر کھڑا ہے وہ تم کو پیچھے سے نکال دے گا۔"

"تھینک یو خان۔" میں نے اس سے پرجوش مصافحہ کیا "تم اب کہاں ملو گے؟"

"تم بولو" وہ مسکرایا "ہم تو آزاد ہے۔"

"ہم ڈ-لنز ہوٹل سے بھی فوراً نکل جائیں گے۔ یہ گاڑی میں اسی جگہ چھوڑ جاؤں گا۔ جب تک گاڑی نظر آتی رہے گی وہ سمجھتے رہیں گے کہ میں ہوٹل میں ہوں۔ اس مہلت سے فائدہ اٹھا کے ہم جمرود کی طرف نکل جائیں تو ان سے پیچھا چھوٹ جائے گا۔"

"پھر تم جمرود کا چیک پوسٹ پر آ جاؤ۔"

"کیسے آ جائیں گاڑی کے بغیر۔"

"ڈ-لنز ہوٹل سے کرائے پر گاڑی لو۔ پورا دن کے واسطے اس کو بولو کوہاٹ جانا ہے۔ پھر پہلے اس کو جمرود لے جاؤ اور بولو کہ ادھر انتظار کرے۔ آگے میں سنبھال لوں گا۔"

میں نے ریوالور کے میگزین کو اپنی خاکی وردی کے نیچے چھپایا اور ریوالور کو جیب میں ڈال کے باہر نکل آیا۔ ویٹر وردی میں نہیں تھا اس نے سردی سے بچنے کے لیے ایک کمبل لپیٹ رکھا تھا۔ یہ کمبل اس نے مجھے دے دیا اور کہا کہ میں منہ سر لپیٹ کے اس کے پیچھے چلوں۔

مختصر کاریڈور سے گزرتے ہوئے میں نے اچانک ایک دروازہ کھلنے کی آواز سنی اور میرا دل دھڑکا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ میرے دشمن ہر آہٹ پر کان لگائے بیٹھے ہوں۔ وہ گرین ہوٹل پہنچ کے اطمینان سے سو نہیں رہے ہوں گے۔ ان کے کان اور نظریں میری آواز اور میرے سائے کے ساتھ تعاقب میں ہوں گے۔

میرے اندیشے کی اس وقت تصدیق ہوئی جب پیچھے سے استاد پیڈرو نے ویٹر کو آواز دی "اوئے ہم نے کب بولا تھا دو چائے کے لیے۔ کیا بات ہے یہ ہوٹل ہے کہ چنڈو خانہ کیا تمہارے منیجر سے کہنا پڑے گا۔"

"ابھی لاتا ہے سر۔" ویٹر نے بات کے عاجزی سے کہا۔

میں سیدھا چلتا گیا۔ نیچے اتر جانے کے بعد بھی مجھے ڈر رہا کہ کہیں پیڈرو چال سے مجھے نہ پہچان جائے اس کا اور میرا بہت پرانی دشمنی کا رشتہ تھا۔ اب ہم ایک دوسرے کی موجودگی کو محسوس کر سکتے تھے۔ خواہ سامنے کوئی نہ ہو۔

ویٹر نے مجھے عقبی حصے میں کھلنے والے ایک دروازے سے باہر نکال دیا تو مجھے کچھ سکون حاصل ہوا۔ وہاں سے ڈ۔لنز ہوٹل کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ میں سڑک کے کنارے پیدل چلتا گیا اور پندرہ منٹ بعد ڈ۔لنز کے گیٹ سے داخل ہوا تو چوکیدار نے مجھے روکا۔

"کیا بات ہے کس سے ملنا ہے۔"

میں نے کمبل ہٹا کے کہا "کیا تم ظالم سماج کے نمائندے ہو۔ جو میاں بیوی کے درمیان آنا چاہتے ہو۔ ہوٹل کی روم نمبر سیون اے میں میری بیوی ہے اور بہن ہے۔"

اس نے "سوری" تو کہا مگر میری خاکی وردی کے باعث کچھ شک میں مبتلا رہا کہ میرے جیسے شخص کی فیملی اتنے اعلیٰ درجے کے ہوٹل میں کیسے مقیم تھی اور اگر تھی تو میں ان کے ساتھ کیوں نہیں تھا۔

رابعہ اور کاجل بڑی بے چینی سے میرا انتظار کر رہی تھیں۔ انہیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ میں نے رات کہاں بسر کی۔

"تم فون کر کے بتا سکتے تھے۔" رابعہ نے خفگی سے کہا۔

"سوری دراصل میں تارے گن رہا تھا۔ تمہارے فراق میں اور آہیں بھر رہا تھا اس لیے یاد نہیں رہا۔" میں نے کہا "ناشتا کر لیا؟"

"تم نے ضرور کر لیا ہوگا۔" رابعہ بولی۔

میں نے افسوس سے سر ہلایا "تم میرے جذبات کا مرڈر کر رہی ہو۔ جلدی سے ناشتا منگوالو۔ ہمیں فرار ہونے کا موقع مل گیا ہے۔ دیر لگائی تو استاد پیڈرو یہاں آ کر ناشتے میں شریک ہو جائے گا۔"

"استاد پیڈرو۔ وہ کہاں ہے۔"

"اسی ہوٹل میں جہاں میں ٹھہرا تھا۔ بالکل میرے ساتھ اسی فلور پر انہیں کمرا مل گیا حالانکہ منیجر نے بتایا تھا کہ ایک ہی کمرا خالی ہے۔ میں اپنی گاڑی وہیں چھوڑ کے آیا ہوں۔ قسمت اچھی تھی کہ ان کی گاڑی پر نظر پڑ گئی۔"

ناشتا کرنے سے پہلے ہی میں نے انہیں آفریدی سے ملاقات کے بارے میں بتا دیا اور اور اس کے ساتھ ہونے والی گفتگو کا خلاصہ بھی سنا دیا۔ کاجل تشویش میں مبتلا ہو گئی۔ کلیم کھڑکی سے باہر ہوٹل کے لان میں کھلے ہوئے پھول دیکھ رہا تھا چنانچہ اس نے کچھ نہیں سنا۔

ناشتا ختم ہوا تو میں نے فون اٹھا کے روم سروس سے بات کی "کوئی کار کرائے پر مل سکتی ہے۔"

"رینٹ اے سروس والوں کو بلایا جا سکتا ہے سر۔ کہاں جائیں گے آپ؟"

"میں نے کہا "پورے دن کے لیے طے کر لیں۔"

کاجل نے میرے قریب آ کے کہا "مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے، باہر چلو۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا "رابعہ تم پیک اپ کرو۔ میں کاجل کے ساتھ آفس تک جا کے چیک آؤٹ کرتا ہوں۔"

رابعہ نے نہایت احمق ہونے کا ثبوت دیا "اس کے لیے
دونوں کا جانا ضروری ہے۔"

"ہاں مجھے ڈر لگتا ہے اکیلے جاتے ہوئے۔" میں نے کہا۔

"مگر میں کیا پیک اپ کروں۔ کیا ہے ہمارے پاس۔"

"اچھا تو کلیم کے ساتھ جا کے باغ کی سیر کرو۔ اب یہ نہ پوچھنا کہ کیوں۔ صبح کی سیر صحت کے لیے اچھی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ مجھے کچھ غیبت کرنی ہے۔" میں نے دانت پیس کے کہا "کاجل کے سامنے تمہاری برائیاں کرنی ہیں۔"

اب رابعہ سمجھ گئی اور کلیم کا ہاتھ پکڑ کے بولی "چلو بھئی ہم جا کے ان دونوں کی برائیاں کریں گے۔"

کلیم کچھ نہیں سمجھا "آنٹی یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ یہ دونوں بہت اچھے ہیں۔"

"ہم دونوں سے اچھے تو نہیں ہیں نا۔" رابعہ نے اسے ڈانٹا۔ وہ خاموشی سے رابعہ کے ساتھ چلا گیا۔

کاجل نے کہا "بھائی سکندر۔ مجھے خوف آ رہا ہے کلیم کو اس کے رشتے داروں کے پاس لے جاتے ہوئے۔"

میں نے کہا "ڈرنے سے کیا ہوگا۔ وہ ہمارے ساتھ ہرگز دھوکا نہیں جائے گا۔ مزید یہ کہ آفریدی نے اپنا خیال ظاہر کیا ہے۔ یہ خیال یہ ہے کہ اگر کلیم اللہ کی جان کو خطرہ لاحق ہوتا تو اس کا باپ کیوں اصرار کرتا کہ وہ واپس جائے۔"

"اگر ایسا ہوا تو۔"

"آفریدی نے کہا ہے کہ ہم اس کے مہمان ہیں۔ وہ ذمے دار ہے ہماری سلامتی کا۔ ہم کلیم کو واپس لے آئیں گے۔" میں نے کہا "چلو اب نہ باتوں کا وقت نہیں ہے۔"

فون کی گھنٹی بجی تو میں نے ریسیور اٹھا لیا "یس!"

"کار آ گئی ہے سر۔ دو سو روپے شام چھ بجے تک چارج کریں گے۔ اس کے بعد پچاس روپے گھنٹا۔"

"ٹھیک ہے ہمارا بل بنا دیں۔ ہم آ رہے ہیں۔"

میں اور کاجل باہر نکلے تو کلیم اور رابعہ لان کی رنگین چھتری کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ رابعہ نے خدا حافظ کہنے کے انداز میں ہاتھ ہلایا جیسے خود اس کا جانے کا کوئی ارادہ نہیں۔ کلیم اسے لگا۔

بل ادا کر کے میں دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ منیجر نے "سر وہ آپ کے ایک مہمان بیٹھے ہیں۔ میرا خیال تھا آپ نے لیا ہوگا۔"

میں نے پلٹ کے دیکھا "میرے مہمان۔"

اسی وقت کاجل نے میرا بازو تھام کے کہا "وہ کار۔ باہر" لیکن میں اپنے مہمان کو دیکھ رہا تھا۔

● ●

آفریدی نے سگریٹ کو مسل کے ایش ٹرے میں بجھایا
"ابا کیا دیکھتا ہے یارا۔ کیا مجھے پہچانا نہیں؟"

میں نے کہا "آفریدی! تم نے تو کہا تھا......"

"ہاں۔ مگر مجھے بعد میں خیال آیا کہ کہیں تم خوار نہ ہو جاؤ۔ نئی جگہ ہے" آفریدی نے ایک بیگ اٹھا کے کندھے پر لٹکا لیا جو اس کے پاس ہی صوفے پر رکھا ہوا تھا۔ "اس لیے میں اپنا جیپ لے کر آگیا۔"

میں نے کہا "کرائے کی گاڑی آ گئی تھی۔"

"خو یارا، دفع کرو۔ ہمارا ساتھ چلو" آفریدی بولا۔

میں نے قدرے تذبذب کے ساتھ کہا "آفریدی! وہی پروگرام ٹھیک تھا۔ ہم سیدھے جمرود چیک پوسٹ پر پہنچ جاتے۔"

"کیسے پہنچ جاتے۔ ابھی تم کو پولیٹیکل ایجنٹ پاس دے گا تو تم سے ہزار سوال کرے گا۔ ہر شخص غیر علاقے میں نہیں جا سکتا۔ پھر تمہارا ساتھ تو زنانہ بھی ہے۔ میں تم سب کے لیے کپڑے بھی لایا ہوں۔"

"مگر ہم گھومنے پھرنے کے لیے تو نہیں جا رہے ہیں۔ ہم بھی کہہ سکتے ہیں، کلیم اللہ بھی بتا سکتا ہے کہ ہمارا مقصد کیا ہے۔"

"ٹھیک ہے یارا، ہم مانتا ہے لیکن وہ مطمئن نہ ہوا تو تم کو انکار کر دے گا یا بولے گا کہ تم جاؤ، زنانہ کو ادھر چھوڑو پھر تم کیا کرے گا۔ جاؤ یہ وردی بدلو، شریف آدمی کی طرح چلو میرے ساتھ۔"

"میں اسے قائل کر لوں گا کہ میری بیوی کا اور بہن کا ساتھ جانا بھی ضروری ہے۔ میں انہیں یہاں کسی کے پاس نہیں چھوڑ سکتا۔ معلوم نہیں واپسی میں دو دن لگ جائیں یا زیادہ۔ اکیلی عورتیں جن کے ساتھ کوئی مرد نہ ہو، کیسے ہوٹل میں رہ سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ کلیم اللہ ہرگز میرے ساتھ نہیں جائے گا اگر ساتھ کاجل نہ گئی۔ پوچھ لو اس سے" میں نے کہا اور کلیم اللہ کو اشارے سے بلا لیا۔

اب کلیم اور آفریدی کے درمیان پشتو میں گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا۔ میں اور کاجل ایک صوفے پر بیٹھے رہے۔ دوسرے صوفے پر کلیم اللہ اور آفریدی کے درمیان قربت کے باوجود اجنبیت کا فاصلہ حائل رہا۔ آفریدی کا رویہ دوستانہ اور مشفقانہ تھا مگر کلیم کے چہرے پر کشیدگی اور ناپسندیدگی کے جذبات میں کمی نہ آئی۔ صاف ظاہر تھا کہ اسے آفریدی کی باتوں سے شدید اختلاف ہے اور وہ اس کی ہر تجویز کو مسترد کر چکا ہے۔ رابعہ تیسری طرف کے صوفے پر خاموش بیٹھی ان مذاکرات کے نتائج کا انتظار کرتی رہی۔

بالآخر آفریدی نے کہا "یہ بھی پٹھان کا بچہ ہے یار! تم ٹھیک بولا تھا۔ یہ میرے ساتھ جانے پر تیار نہیں حالانکہ میں نے اسے بتایا ہے کہ میں اس کے علاقے سے واقف ہوں اور اس کے سب رشتے داروں کو بھی اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"میں نے تم سے کہا تھا...."

"ایک بات اور بتادوں میں تم کو۔ اگر تم اکیلے پولیٹیکل ایجنٹ سے ملنے گئے تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کلیم اللہ کے رشتے داروں کو پشاور بلوالے اور تمہیں ان کے پاس جانے کی اجازت دینے کا مسئلہ ہی ختم کر دے۔ وہ کل تک انہیں طلب کر سکتا ہے اور تم سے کہہ سکتا ہے کہ ہوٹل میں انتظار کرو۔"

میں نے کاجل کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا "اچھا ہوتا اگر ہم خود ہی اسے چھوڑ کر آتے۔ ہم نے اس کے باپ سے وعدہ کیا تھا۔"

"تم پولیٹیکل ایجنٹ کے اختیار کو چیلنج تو نہیں کر سکتے۔ اس نے ایک بار انکار کر دیا تو پھر بحث سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ وہ کہے گا کہ کان کو ہاتھ گھما کر پکڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ آسان طریقہ یہ ہے کہ کلیم اللہ کے عزیز آئیں اور اسے لے جائیں۔ تم پولیٹیکل ایجنٹ کے دفتر میں اس کے سامنے کلیم اللہ کو ان کے حوالے کرو اور واپس جاؤ" آفریدی نے کہا۔

کاجل کا چہرہ اُتر گیا تھا۔ وہ اپنے ہونٹ کاٹ رہی تھی۔ رابعہ کی مایوسی اس کے چہرے پر پڑھی جا سکتی تھی اور خود میں اپنی بے بسی اور جھنجلاہٹ کو چھپانے میں ناکام تھا۔ آفریدی کی بات کو غلط کہہ کے جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا۔ ایسا ہو سکتا تھا بلکہ اب مجھے زیادہ امکانات اسی بات کے لگتے تھے کہ پولیٹیکل ایجنٹ وہی کہے گا جو آفریدی بتا رہا تھا۔ ہمارے بلاوجہ علاقہ غیر میں جا کے خطرہ مول لینے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ اگر مقصد کلیم اللہ کو اس کے خاندان والوں کے سپرد کرنا تھا تو پولیٹیکل ایجنٹ اس کا بہتر اور محفوظ بندوبست کر سکتا تھا جس میں کسی بھی پہلو سے نہ کوئی بات غلط تھی اور نہ قابلِ اعتراض۔

آفریدی نے ہمیں سوچ میں گُم دیکھ کے کہا "ایک بات اور بتادوں۔ وہ خود بھی کلیم اللہ کو اپنی تحویل میں لے سکتا ہے۔"

"تحویل میں کیسے لے سکتا ہے؟" میں نے احتجاج کیا۔

"یارا، وہ اسی علاقے کے قبیلے کا لڑکا ہے۔ تمہارا کیا رشتہ ہے اس سے کہ تم انکار کرو۔ تم تو اس کو یہاں تک لانے کے ذمّے دار ہو، آگے خود پولیٹیکل ایجنٹ بھی پہنچا سکتا ہے۔ سرکاری انتظام کر کے یا کسی ذمّے دار آدمی کے سُپرد کر کے..."

میں نے کہا "آفریدی! تم کچھ نہیں کر سکتے؟"

"میں کیا کروں؟"

"کوئی ایسا چکر چلاؤ کہ ہم بھی غیر علاقے میں کلیم اللہ کے ساتھ جا کے اس کے خاندان والوں سے مل لیں...."

"یارا، اس لیے تو میں یہاں آگیا۔ میں خود تمہارے ساتھ جاؤں گا پولیٹیکل ایجنٹ کے دفتر میں" آفریدی بولا۔

کاجل کا چہرہ پُرامید ہو گیا "کیا وہ آپ کو انکار نہیں کر سکتا خان صاحب؟"

"دیکھو بہن! ابھی یہ ہم کو صاحب بولا تو ہم اس کو منع کیا کہ

صاحب بہادر اِدھر سے چلا گیا۔ ابھی ہم سب مسلمان اور پاکستانی بھائی ہے۔ تم میرے کو خان بھائی بولو۔ تم کاجل ہے نا؟"

میں نے کہا "آفریدی! میں تو باتوں میں بھول ہی گیا تھا۔ تم نے ٹھیک اندازہ کیا۔ یہ کاجل ہے' میری بہن۔"

"اور یہ تمہارا بی بی ہے' رابعہ۔ بہت خوب صورت ہے۔"

رابعہ کا رنگ لال ہو گیا "خان بھائی....."

آفریدی ہنسا "میرا چھوٹا بہن بالکل ایسا ہے مگر وہ تو ایک دم اَن پڑھ ہے۔ تم بہت بڑا وکیل ہے۔ تم کو دیکھ کر ایسا نہیں لگتا۔"

میں نے سرہلایا "بالکل صحیح کہا تم نے۔ شکل سے یہ جاہل بلکہ احمق نظر آتی ہے۔"

رابعہ نے مجھے گھور کے کہا "اور تم...؟"

میں نے اِنکساری سے کہا "برا ماننے کی تو اس میں کوئی بات نہیں ہے بیگم۔ مانا کہ مجھے خدا نے تمہارے جیسی صورت نہیں دی مگر میں کسی کو جاہل یا بے وقوف تو نہیں لگتا۔"

"ہاں۔ تم بڑے افلاطون لگتے ہو۔ ایم اے' پی ایچ ڈی۔ سب تمہارے چہرے پر لکھا ہوا ہے۔"

آفریدی ہنسنے لگا "خو ہمارا یہ مطلب نہیں تھا یارا۔ تم آپس میں کیوں لڑتا ہے۔ ہم عدالت میں وکیل دیکھا' کالا کوٹ اور موٹا چشمہ والا۔ یہ تمہارا بی بی تو کالج کا لڑکی لگتا ہے۔ جو جاہل بولتا ہے اس کو وہ خود جاہل۔"

رابعہ کو مسکراتے دیکھ کر میں نے سر کھجایا "وہ... آپ تو کچھ اور فرما رہے تھے۔ ہمارے ساتھ جانے کی بات کر رہے تھے۔ اس سے کیا فائدہ ہوگا؟"

"فائدہ یہ ہوگا کہ پولیٹکل ایجنٹ تم سے نہیں ہم سے بات کرے گا" آفریدی نے کہا "وہ جانتا ہے ہم کو۔ ہم لے جائے گا تم کو اپنا ذمّے داری پر۔ اپنا مہمان بنا کے۔"

"پھر وہ انکار نہیں کرے گا؟" کاجل نے خوشی سے کہا۔

"وہ ہمارا مہمان کو کیسے روک سکتا ہے۔ ہم دس آدمی لے جائے یا سو آدمی کا برات لے جائے۔"

"یہ بھی نہیں پوچھے گا کہ یہ کون ہیں؟" میں نے کہا۔

آفریدی نے نفی میں سرہلایا "اس کا کیا مجال۔ ہم اپنا ساتھ جس کو مرضی لے جائے۔ ہمارا مہمان بس مہمان ہے۔ وہ کون ہے' کیا کرتا ہے' شریف آدمی ہے کہ قاتل ڈاکو ہے' عورت ہے کہ مرد۔ یہ سب پوچھے گا تو ہمارا بے عزتی کرے گا۔ آفریدی کا بے عزتی کرنے والا ابھی پیدا نہیں ہوا۔"

"بس تو پھر چلو" میں نے کہا "ہم تمہارے ساتھ ہی جیپ میں چلتے ہیں۔"

"اور وہ جو کار [illegible] رابعہ بولی۔

"اسے رخصت [illegible] زیادہ سے زیادہ آج کا کرایہ [illegible] کے بلک کلرک سے

بات کرلو کہ ہمیں آفریدی صاحب خود لینے آگئے ہیں اس لیے اب بے کار ہے ہمارے لیے۔"

رابعہ نے سرہلایا اور کاؤنٹر کی طرف چلی گئی جو لاؤنج سے اِ فاصلے پر تھا کہ نہ کلرک ہماری باتیں سُن سکتا تھا نہ کوئی اور۔ کر بدل کر آنے کے بعد میں نے کہا "خان صاحب..... معاف کر خان بھائی' تم ہوٹل سے اپنی ہی جیپ میں آئے ہو نا؟"

"اور کیا یہ کسی دوسرے کا جیپ ہے۔"

"خود چلا کے لائے ہو؟"

"یارا' کیسی باتیں کرتا ہے۔ ہم کوئی ڈرائیور نہیں رکھتا۔ ہم خود بہت اچھا گاڑی چلاتا ہے۔"

"وہ..... میرا مطلب کچھ اور تھا" میں نے کہا "جب تم ہوٹل سے روانہ ہوئے تھے تو تمہیں یقین ہے کہ کسی نے نہیں دیکھا تھا؟ کوئی تمہارے تعاقب میں تو نہیں آیا تھا؟"

آفریدی نے ایک لمحہ غور کیا "تمہارا وہ دوست؟"

میں نے مسکرا کے کہا "ہاں وہی دوست۔ تم نے ان کی گاڑی دیکھی تھی۔ میری گاڑی کے ساتھ۔"

"وہ اُدھر ہی کھڑا تھا" آفریدی نے میرے اطمینان کے لیے پورے یقین کے ساتھ کہا "ہم دیکھا تھا۔ تم کیوں فکر کرتا ہے یارا۔"

"مجھے اپنی نہیں تمہاری فکر ہے۔ اس سے پہلے بارہا ایسا ہو چکا ہے کہ جس نے ہماری مدد کی' ہمیں مصیبت سے بچایا یا محض انسانی ہمدردی کے نام پر ہمارا ساتھ دیا' ہمارے دشمنوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ ہم ایسے بہت سے مہربان دوستوں کی نیکی کے قرض کا بار اُٹھائے پھر رہے ہیں جنھوں نے ہماری سمت آنے والے اَجل کے تیر کو ہم تک نہیں پہنچنے دیا اور اس کا نشانہ خود بن گئے۔ ہماری موت کو انھوں نے گلے لگا لیا۔"

آفریدی ہنسنے لگا "یارا' تم بہت زیادہ پڑھا لکھا ہے نا' اس لیے یہ بات بولتا ہے۔ تمہارا یقین اُٹھ گیا ہے تقدیر سے۔ تم سمجھتا ہے کہ آدمی موت سے بچ سکتا ہے یا کوئی اسے بچا سکتا ہے۔"

"میں ایسا ہرگز نہیں سمجھتا....."

"پھر یہ کیا مشکل اردو بولتا ہے۔ اَجل کا تیر تمہاری طرف آتا تھا مگر کسی نے بیچ میں آ کے تم کو بچا لیا۔" آفریدی نے میرا تمسخر اُڑانے کے انداز میں کہا "یارا' سیدھا سچا بات ہے کہ تمہارا وقت ابھی نہیں آیا تھا۔ جس کا وقت پورا ہو گیا تھا وہ خود سامنے آ گیا۔ موت بڑا ظالم شکاری ہے۔ اس کا شکار خود اُدھر جاتا ہے جہاں اس کو مرنا ہو۔ ابھی تم سمجھو کہ اللہ نے خاص مہربانی کیا تو آدمی نیکی کر کے مرتا ہے یا کسی کی مدد کرتے ہوئے جان دیتا ہے۔ یہ اس کا خوش نصیبی ہے ورنہ بدبخت لوگ چور یا ڈاکو بن کے مارا جاتا ہے۔ شراب پی پی کے مرجاتا ہے یا لالچ میں زر زمین کی خاطر پھانسی چڑھ جاتا ہے۔"

زندگی اور موت کے بارے میں یہ سیدھا سادا اور سچا نظریہ جو اس سے پہلے نہ کسی نے مجھے یوں سمجھایا تھا نہ خود میں نے سمجھا تھا۔ خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں۔ خداوندا مجھے صاحب جنوں کرتا کہ میں زندگی کے ساتھ موت کے فرق کو بھی دیکھ سکوں اور محسوس کرسکوں۔ ایک آدمی کے تمام عمر کے اعمال اسے اچھا یا برا بناتے ہیں اور یہ فیصلہ بہت آسان ہوتا ہے کہ وہ زندگی میں بخت آور رہا یا بدبخت مگر موت کے بارے میں آفریدی کے نقطۂ نظر نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کردیا۔ مجھے استاد نیڈی یاد آیا جو لاہور کا دس نمبری بدمعاش تھا مگر ایک عمر کی تیرہ بختی کے بعد وہ ہمارے کارواں میں شامل ہوا تو راہِ حق پر پہلے شہید ہونے کا اعزاز اسی کے حصے میں آیا۔ گل کا بھائی ڈاکو شیش ناگ تھا جو مرتے دم تک ڈاکو رہا لیکن زندگی کے آخری لمحے میں وہ ایک نیکی کما گیا' وہ ناگ منی کو ہمارے سپرد کر گیا اور ہم سب نے دیکھا کہ ناگ منی جب گل بانو بنی تو اس کی زندگی کیسے بدل گئی مگر کیا یہ اس کے ڈاکو بھائی شیش ناگ کی موت سے ملنے والی زندگی نہ تھی؟ یہ تو ہم فانی انسان نہیں جانتے کہ دم آخر کے لیے ہمارا نوشتۂ تقدیر کیا ہے۔ اچھے آدمی کی موت بری ہوگی یا بُرے آدمی کا مقدر اچھی موت ہوگی۔

رابعہ لوٹ آئی تھی اور آفریدی اٹھ کھڑا ہوا تھا "ابھی زیادہ غور فکر مت کرو یارا! چلو۔"

میں نے کہا "میں تمہاری بات پر غور کر رہا تھا۔"

"اللہ پر بھروسہ رکھو۔ جب تک زندگی ہے وہ خود تمہاری حفاظت کے اسباب پیدا کرے گا۔ کبھی یہ مت سوچو کہ ہم کو آفریدی نے بچایا یا وہ ہماری خاطر مارا گیا۔ بچاتا بھی خدا ہے اور مارتا بھی وہی ہے۔ اب یہ اس کا مرضی کہ کس کو بچائے اور کس کو مارے۔ کب کہاں اور کیسے۔ یہ ہم کو کیا معلوم۔"

رابعہ نے کہا "آپ کا عقیدہ بہت پختہ اور قابلِ رشک ہے خان بھائی۔ ہم سب تو عقل کے اندیشوں اور وسوسوں کا شکار ہیں۔"

"ابھی تم ادھر ٹھہرو" آفریدی نے اپنا بیگ اُٹھا کے کہا "میں جیپ کو اندر لے آتا ہوں۔ پردے کے لیے۔"

میں نے اس کا مطلب سمجھ لیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ پشاور میں کوئی بھی اس کو جیپ میں دو بے پردہ اور فیشن ایبل خواتین کے ساتھ دیکھے تو شک میں پڑ جائے اور ایک بے غرض کارِ خیر میں شر کا پہلو تلاش کرنے والوں کو افسانہ طرازی کا موقع مل جائے۔

میرا خیال ہے کہ ہماری روانگی کے وقت میں مشکل سے دو تین منٹ کا فرق ہوگا۔ آفریدی کے جاتے ہی ہم بھی اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے کاؤنٹر پر جا کے بل لیا تھا اور ادائیگی کی تھی۔ رابعہ اور کاجل برآمدے میں جا کھڑی ہوئی تھیں جس کی سیڑھیوں کے سامنے آفریدی کو اپنی گاڑی لا کے کھڑی کرنی تھی۔

میں نے باقی رقم پرس میں ڈال کے دروازے کی جانب قدم بڑھایا ہی تھا کہ باہر ایک زبردست دھماکا ہوا۔ اس کی شدت سے بیرونی حصے میں محض اِرتعاش کے باعث کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ کر بکھر گئے اور چند لمحوں کے لیے ہوٹل کے بام و در لرز گئے۔ استقبالیہ کے سامنے انتظار گاہ میں جہاں ہم بیٹھے ہوئے تھے وہاں سینٹر ٹیبل کے گلاس ٹاپ پر رکھا ہوا گلدان نیچے گر گیا مگر قالین کی وجہ سے ٹوٹا نہیں۔ چھت سے آویزاں فانوس جھولنے لگا اور وال لائٹس آف ہو گئیں۔ اس سے ہال میں تاریکی پھیل گئی۔

کاؤنٹر کے پیچھے سے دو افراد ایک ساتھ نکل آئے۔ ان میں سے ایک دوڑتا ہوا میرے قریب سے گزرا تو میں نے کہا "یہ کیا ہوا ہے؟" مگر اس نے میرے سوال کو نظرانداز کردیا اور جواب دینے کے لیے رکنا مناسب نہ سمجھا۔

اتنا تو میں بھی سمجھ گیا تھا کہ یہ دستی بم یا خاص طاقت والے دیسی ساخت کے بم کا دھماکا تھا مگر فوری طور پر میں نے اپنے لیے کوئی خطرہ محسوس نہیں کیا تھا۔ اس کا سبب یہ ذہنی تاثر تھا کہ صوبہ سرحد میں اسلحہ عام ہے اور صدیوں سے ہے۔ وہاں اسلحہ بنتا بھی ہے اور اسمگل ہو کے بھی پہنچتا ہے۔ میرا ذاتی تجربہ کوئی نہیں تھا چنانچہ میں یہ سمجھتا تھا کہ قبائلی روایات کے مطابق نسل در نسل چلنے والی دشمنی اور انتقام کی تاریخ کا عکس شہروں کی معاشرتی زندگی میں بھی عام نظر آتا ہوگا لیکن ظاہر ہے کہ یہ تاثر غلط تھا۔

جب ہوٹل کے اندر سے بھی لوگ نکلے اور منیجر تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا میرے پاس سے گزرا تو مجھے اس کی صورت پر وحشت اور پریشانی کے آثار نظر آئے۔ لائٹس آف ہونے سے بھی اندازہ ہوتا تھا کہ دھماکا ہوٹل ہی میں ہوا تھا۔

باہر ایک ہنگامہ برپا ہو چکا تھا' میں نے منیجر سے کہا "آخر بات کیا ہے' یہ دھماکا کیسا تھا؟"

اس نے آدابِ میزبانی کو فراموش کرتے ہوئے بدتہذیبی اور برہمی سے کہا "یہاں کھڑے رہ کر تو آپ اندازہ ہی کرسکتے ہیں۔ میں باہر دیکھنے جا رہا ہوں' آپ بھی چلیں۔"

میں اس کے ساتھ چلنے لگا "کیا سب اسٹیشن کو نقصان پہنچا ہے؟ لائٹس آف ہو گئی ہیں۔"

اس نے مجھے شرمندہ کرنے والی نظروں سے دیکھا "ہوٹل کا کوئی سب اسٹیشن نہیں ہے لیکن اِدھر ہی ایم ٹی ہے۔ لائٹس تار ٹوٹنے پر بھی بجھ سکتی ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ عین اسی وقت پر بریک ڈاؤن ہو گیا ہو۔ ایسے اتفاق کو ناممکن تو نہیں سمجھا جا سکتا۔"

ایک دروازے سے وہ باہر گیا' دوسرے سے رابعہ اور کاجل اندر آئیں۔ کاجل نے مضبوطی سے کلیم اللہ کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ اس کا اور رابعہ کا چہرہ خوف اور بدحواسی کے جذبات کی عکاسی کر رہا تھا۔

میں نے کہا "کیا بات ہے' لوٹ کے اندر کیوں آ گئی ہو؟"

رابعہ نے کہا "باہر..... کچھ ہوا ہے۔"

"کچھ کا کیا مطلب؟ کسی کا نکاح ہوا ہے یا عقیقہ' کیا خوشی میں یہ گولے داغے جا رہے ہیں۔" میں نے کہا "بابا' یہ بم کا دھماکا ہوا ہے کہیں مگر ہمارے لیے ڈرنے یا پریشان ہونے کی کون سی بات ہے۔ ہم تو عادی ہیں۔"

"سکندر! ہوٹل کے گیٹ پر کچھ ہوا ہے۔ بہت لوگ جمع ہو رہے ہیں" رابعہ بولی۔

"ہونے دو۔ ہم نکل جاتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ تفتیش شروع ہو اور خواہ مخواہ ہم بھی بیان یا گواہی کے چکر میں آجائیں۔" میں نے کہا۔

"نکل کے کہاں جاؤ گے" رابعہ نے جھنجلا کے کہا "دھماکا گیٹ پر ہوا ہے۔"

"دوسرا گیٹ بھی تو ہے" میں نے کہا۔

کاجل نے ہونٹوں پر زبان پھیری "وہ..... آفریدی صاحب بھی تو نہیں آئے۔"

میں نے کہا "اچھا ہوا وہ سامنے نہیں ہے ورنہ صاحب کہنے پر تمہیں جھاڑ پڑتی۔ جب گیٹ بلاک ہے تو وہ کیسے آئے گا اندر۔"

رابعہ اور کاجل میرے ساتھ چلنے لگیں "مجھے ڈر لگ رہا ہے" کاجل نے کلیم اللہ کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔

"کاجل' یہ ہوتا رہتا ہے یہاں۔ اسلحہ یہاں کی ثقافت میں شامل ہے اور اسے مردوں کا زیور سمجھا جاتا ہے۔ قبیلے آپس کی دشمنی میں اسلحے کا بے دریغ استعمال کرتے ہیں اور کسی قبیلے کا ایک فرد مارا جائے تو پھر انتقام کی جنگ چلتی رہتی ہے۔ ایک نسل سے دوسری نسل اور گاؤں سے شہر منتقل ہو جاتی ہے۔ بدلہ لینے والے یورپ امریکا تک پیچھا کرتے ہیں۔ گولی بندوق کی لڑائی میں اب مزہ نہیں رہا۔ جدید ہتھیار آگئے ہیں۔ زمانہ اور ترقی کرے گا تو شاید یہ لوگ راکٹ لانچر اور بمبار طیارے استعمال کریں گے مگر ہمیں کیا۔"

رابعہ کی تشویش کم نہیں ہوئی "کہیں آفریدی....."

میں نے خود اپنے اندیشوں کو جھٹلاتے ہوئے اسے تسلی دی "لاحول ولا قوۃ۔ آفریدی کو ہو سکتا ہے۔ اس نے کسی سے اپنی دشمنی کا ذکر نہیں کیا تھا۔ وہ ایسا خطرہ محسوس کرتا تو یوں بے خوفی سے اکیلا نہ پھرتا۔"

"مگر جو ہمارے دشمن ہیں......"

میں نے کہا "تم خواہ مخواہ فرض کر رہی ہو کہ ہمارے دشمن اس کی جان کے بھی دشمن ہو چکے ہیں۔ اوّل تو انہیں آفریدی کے بارے میں کچھ علم نہیں۔ ہمارا پہلے کبھی آفریدی سے تعلق نہیں رہا اور شاید آئندہ بھی نہیں ہوگا۔ بس یہ ایک وقتی ضرورت ہے جس میں وہ احسان مند ہو کے ہماری مدد کر رہا ہے اور اس معاملے کا چوہدری دلاور کی ذات سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ میں نے اس سے پوچھ لیا تھا۔ جب وہ آیا تھا تو کسی نے بھی اس کا پیچھا نہیں کیا تھا"

میں نے محسوس کیا کہ یہ سب دلائل خود مجھے قائل نہیں کر رہے رابعہ کو کیسے کریں گے۔ جو اندیشے میرے دل میں موجود تھے اپنا وجود تسلیم کرا چکے تھے اور میرا انکار ایک خواہش تھی یا دعا کہ اس عارضی تعلق کی بنا پر آفریدی کی ذات کو گزند نہ پہنچے۔

لیکن دوسرے گیٹ سے باہر آتے ہی عقل کی خود فریبی کھوکھلے دعوے ریت کی دیوار سے زیادہ بے ثبات ہو گئے۔ نظر نے اس آگ اور دھوئیں کے الاؤ کو دیکھ لیا جس کے گرد خوف زدہ' دم بخود اور متجسس تماشائی حلقہ بنائے ہوئے کھڑے تھے۔ یہ سوال زبان سے کر رہے تھے جو باقی سب کی آنکھوں میں پڑھے جا سکتے تھے۔ یہ کیا ہوا' یہ کیوں ہوا' یہ کیسے ہوا؟ وہاں صرف ا[illegible] جیپ تھی' باقی کاریں تھیں۔

خاموش اور حیران تماش بینوں کا یہ حلقہ بہت وسیع تھا۔ لو[illegible] سڑک کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پھیلے ہوئے اور میں تقریباً سو میٹر دور دکانوں کے سامنے فٹ پاتھ پر اور دکا[نوں] کے اندر' اوپر فلیٹوں اور مکانوں کی کھڑکیوں سے' بالکونیوں سے' چھت کی منڈیر سے ان گنت انسانوں کے سر دیکھ سکتا تھا جن کی نظریں بم کے دھماکے سے پُرزہ پُرزہ ہو کے اُڑ جانے والی ا[illegible] اسٹیشن ویگن کے دھڑ دھڑ جلتے ڈھانچے پر جمی ہوئی تھیں پھر اچا[نک] جیسے ساری نظریں گھوم کے مجھ پر مرتکز ہو گئیں۔

میں دہشت زدہ ہو کے رک گیا "رابعہ۔ یہ تو.... آفریدی۔"

رابعہ اور کاجل نے کچھ نہیں کہا۔ شاید رابعہ بھی پہلے جانتی تھی کہ میں کیوں جھوٹ بول رہا ہوں۔ مجھے مزید شرمندہ کر[کے] بھی کچھ حاصل نہ ہوتا۔ آفریدی جو چند منٹ پہلے ایک جیتا[جاگتا] انسان تھا۔ شرافت اور مروت' وضع داری اور خیر خواہی کا وہ [پیکر] تھا جو زندگی کے راستوں پر مختصر ترین رفاقت رکھنے والوں کے [لیے] بھی دوستی کے جذبات کے سوا دل میں کچھ نہ رکھتا تھا' اسے م[یری] ناگہانی خود کھینچ کر وہاں لے آئی تھی جہاں اَجل کے شکاری ہا[تھ] نے اس کی کتابِ حیات میں آخری اندراج کے بعد لکھا۔ "[بے] شک ہم اللہ کے لیے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔" اس کتاب کو یومِ حشر تک کے لیے بند اور محفوظ کر دیا۔

تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا منیجر میرے سامنے آگیا "ہم[نے] پولیس کو بلایا ہے سر۔ بڑے دکھ اور افسوس کی بات ہے۔ [پتا] نہیں کس نے ایسا کیا۔ آپ سے جو صاحب ملنے آئے تھے۔"

"آفریدی صاحب! معاف کرنا میں نے غلطی سے ا[نہیں] صاحب کہہ دیا" میں نے کہا "وہ بہت بُرا مانتا تھا صاحب کہنے پر۔"

منیجر نے مجھے حیرانی سے دیکھا "وہ کیوں سر؟"

"اس لیے کہ وہ صاحب نہیں تھا۔ وہ مسلمان تھا' پاکستانی ایک انسان تھا' پٹھان تھا' دوستوں کا دوست تھا اور دشمن کا دشمن مگر وہ صاحب نہیں تھا" میں نے برہمی سے کہا۔

"آپ خواتین سے کہیں کہ فی الحال اندر ہی تشریف رکھیں"

منیجر بولا "جب تک پولیس نہ آجائے۔"

"کیوں؟ ہم جانا چاہتے ہیں" کاجل نے کہا۔

رابعہ بولی "ہم چیک آؤٹ کر چکے ہیں۔"

"مگر ضابطے کی کارروائی تو ہوگی۔ پولیس کو میں کیا بتا سکتا ہوں" منیجر بولا۔

"میں بھی کیا بتا سکتا ہوں۔ اس کے سوا کہ اس کا نام آفریدی تھا" میں نے کہا "کل سے پہلے میں نے نہ اس کی صورت دیکھی تھی اور نہ وہ مجھے جانتا تھا۔"

"پھر بھی سر! وہ آپ سے ملنے آئے تھے۔ انہوں نے آپ کا نام لیا تھا" منیجر ہاتھ مَل کے بولا "آپ جو کچھ جانتے ہیں وہ بتا دیں اور پھر چلے جائیں۔ دیکھیے نا' یہ تو ایک قانونی مسئلہ ہے۔"

"مگر میرا کوئی تعلق نہیں ہے اس قانونی مسئلے سے۔"

"تعلق میرا کیا ہے سر۔ دیکھیے نا' دھماکا تو باہر ہوا مگر کچھ دیر پہلے یہ شخص اندر ہوٹل میں بیٹھا تھا۔ آپ کے پاس۔ یہ خواتین بھی تو موجود تھیں۔ آپ چلے گئے تو میں کیا وضاحت کروں گا۔ میں بڑی مشکل میں پڑ جاؤں گا۔"

"آپ سے کس نے کہا ہے مشکل میں پڑنے کو۔ دھماکا ہوٹل کے اندر تو نہیں ہوا۔ سڑک پر جو کچھ ہوتا ہے اس کی ذمے داری آپ پر کون عائد کر سکتا ہے۔" میں نے کہا "ایسے تو بہت سے لوگ اندر رہے' اپنے گھروں میں بیٹھے تھے' دکانوں میں موجود تھے۔ ان سے کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ پولیس کو کچھ بتائیں۔"

منیجر نے مجھے بے بسی سے دیکھا "لیکن سر! میں نے تو دیکھا تھا اس کو۔ اندر' ہال میں۔"

"کون جانتا ہے یہ بات؟ اتنے بہت سے لوگوں میں سے ہمارے سوا کون ہے؟" میں نے کہا۔

"چوکیدار نے دیکھا تھا" منیجر سوچ میں پڑ گیا۔

"کیا دیکھا تھا؟"

"اس کو اندر جاتے ہوئے اور باہر آکے جیپ میں بیٹھتے ہوئے۔ اس نے دروازہ بند کیا اور جیسے ہی چابی گھما کے انجن اسٹارٹ کرنا چاہا' دھماکا ہو گیا۔"

"کیا چوکیدار نے اسے ہمارے ساتھ دیکھا تھا؟ اسے معلوم تھا کہ اندر آکے اس نے تم سے ہمارے بارے میں پوچھا تھا؟"

"نہیں۔ یہ تو شاید نہیں معلوم اسے ...." منیجر سوچ میں پڑ گیا۔

"پھر اس سے کہہ دو کہ اپنے بیان کو اتنا ہی محدود رکھے جتنا اس کے علم اور مشاہدے میں ہے۔ وہی بتائے جو اس نے دیکھا تھا۔ تم نے کچھ دیکھا ہی نہیں۔"

"کیا میں جھوٹ بولوں؟ آخر کیوں؟"

"اچھا سچ بول کے دیکھو۔ تم خود بھی مصیبت میں پڑ جاؤ گے۔ ممکن ہے پولیس تمہیں تفتیش کے لیے تھانے لے جائے۔"

"تھانے.... کیوں.... میں نے اگر اس کو اندر آتے' آپ سے باتیں کرتے دیکھا... وہ بھی اس لیے کہ میں ڈیوٹی پر تھا اور کاؤنٹر پر موجود تھا۔ تو یہ بتانے میں میرے لیے پریشانی کی کون سی بات ہے؟ مجھ سے تفتیش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

میں نے کہا "جو کچھ تم نے دیکھا یا سُنا اس کا گواہ ہے کوئی؟"

"گواہ.... لیکن یہ سچ ہے..."

میں نے اس کی بات کاٹ دی "ثبوت اور شہادت کے بغیر کوئی سچ بھی سچ نہیں رہتا۔"

"کیا مطلب؟ آپ انکار کر دیں گے کہ آپ اسے نہیں جانتے تھے؟"

"یس۔ ہم کسی چکر میں پڑنا نہیں چاہتے۔ سچ تو یہ بھی ہے کہ کل رات ہم پہلی بار ملے تھے۔ بالکل اتفاق سے۔ معلوم نہیں صبح صبح یہ مجھ سے ملنے کیوں آگیا۔ اور پھر یہ سب جو اس کے ساتھ ہوا' بے شک بہت افسوس ناک اور قابلِ مذمت ہے لیکن اس کے بارے میں جتنا ہم بتا سکتے ہیں' اتنا ہی تم بھی بتا سکتے ہو۔ اگر تم نے کہا کہ وہ ہم سے باتیں کر رہا تھا تو ہم کہیں گے کہ یہ غلط ہے۔ اس کا تم سے جھگڑا ہو رہا تھا کسی بات پر۔ ہم چیک آؤٹ کرنے کے لیے کاؤنٹر پر کھڑے تھے تو یہ وہاں موجود تھا۔ ہم نے بل لیا اور ادائیگی کی' اتنی دیر میں یہ شخص چلا گیا۔"

خوف اور حیرت سے منیجر کا منہ کھلا رہ گیا "آپ.... اتنا بڑا جھوٹ بولیں گے؟"

"جب تم ہمارے سچ کو نہیں مانتے اور مصر ہو کہ ہم پولیس کی تحقیق و تفتیش کے چکر میں پڑیں تو پھر ٹھیک ہے' ہمارے ساتھ تم بھی شاملِ تفتیش ہو جاؤ۔ تم اپنا بیان دو' ہم اپنا بیان دیں گے۔ دیکھتے ہیں پولیس کس پر اعتبار کرتی ہے۔ میرے پاس بہرحال دو بالغ گواہ ہیں۔ ایک نابالغ..."

منیجر کی شکل رونے والی ہو گئی "دیکھیے سر' میں غریب آدمی ہوں۔ میری ملازمت چلی جائے گی' جیل ہو جائے گی مجھے۔ پولیس بہت مارے گی مجھے۔"

میں نے کہا "اسی لیے تو تمہیں سمجھا رہا ہوں کہ اندر جا کے آرام سے کاؤنٹر پر بیٹھو۔ ہم بھی چلے جاتے ہیں۔ جب پولیس آجائے تو چوکیدار کو اپنا بیان لکھوانے دو۔ تم اس کی تائید کر دو کہ ہاں وہ اندر تو آیا تھا۔ ہال میں کسی کا انتظار کرتا رہا کچھ دیر اور پھر چلا گیا۔ یہ سب لوگ جو دکانوں میں کھڑے ہیں' یہ بھی دھماکا سُن کر نکلے اور تم بھی اُٹھ کے آگئے۔ تمہیں نہیں معلوم یہ جیپ کس کی تھی۔ چوکیدار البتہ جانتا ہے کہ آفریدی اس میں سے اتر کے اندر گیا تھا اور پھر کچھ دیر بعد واپس آگیا تھا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں جاتا ہوں" منیجر نے کہا "آپ لوگ بھی نکل جائیں جلدی سے۔ پولیس آتی ہی ہوگی۔"

"جلدی کس بات کی۔ یہاں اتنے لوگ کھڑے ہیں تو ہم بھی کھڑے ہیں۔ جیسے دوسرے کچھ نہیں جانتے' ایسے ہی ہم بھی کچھ

نہیں جانتے۔ پولیس کو دیکھتے ہی سب کھسک جائیں گے۔ ہم بھی مسٹر منیجر" میں نے کہا۔

میری بات منیجر کی عقل میں آنے لگی تھی۔ اس نے سرہلایا اور جس گیٹ سے ہم نکلے تھے اسی سے اندر چلا گیا۔ مستعدی اور فرض شناسی کی دیرینہ روایات کو برقرار رکھتے ہوئے پولیس ابھی تک جائے واردات پر نہیں پہنچی تھی۔

جیپ کا ڈھانچا کسی حادثے میں مسخ ہوجانے والی لاش کی طرح رہ گیا تھا۔ اس کے آگے والا نصف حصہ غائب ہوکے اِدھر اُدھر چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی صورت میں پھیلا پڑا تھا۔ دھات کے یہ جلتے ہوئے ٹکڑے بہت دور تک دیواروں میں پیوست ہوگئے تھے اور دُکانوں کے شیشے توڑ کے اندر داخل ہوگئے تھے۔ جیپ ایک الگ جگہ کھڑی نہ ہوتی تو آس پاس کھڑی ہوئی دوسری کاروں کو بھی نقصان پہنچتا۔ یہ جگہ بالکل ویران نہ تھی مگر یہاں بازار کا رش بھی نہیں تھا کہ دھماکے سے راہ گیر مارے جاتے اور زخمی ہوتے۔ جتنی دیر منیجر مجھ سے باتیں کرتا رہا میں نے ہر طرف نگاہ رکھی لیکن مجھے کہیں کوئی مجروح نظر نہ آیا اور نہ میں نے کسی کے اسپتال لے جائے جانے کا منظر دیکھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ محدود طاقت کے آتش گیر مادے کا دھماکا تھا جس کا مقصد صرف جیپ میں بیٹھے ہوئے افراد کے وجود کو صفحۂ ہستی سے مٹانا تھا۔

لوگ اس وقت بھی قانون کے محافظوں کی آمد کا انتظار کررہے تھے جب میں نے کاجل اور رابعہ کے ساتھ مخالف سمت میں یوں چلنا شروع کیا کہ ہماری روانگی پر کسی کو فرار کا گمان تک نہ ہو اور یوں لگے جیسے ہم بھی اس سنسنی خیز ڈرامے کے اینٹی کلا ئمکس سے اُکتا کے جارہے ہیں۔ جو ہونا تھا ہوگیا۔ اب کیا ہوگا۔ وردی والے آئیں گے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے اور ڈنڈے ہلاتے ہوئے' چند عینی گواہوں کو پکڑ کے لے جائیں گے جو عزت کی قیمت ادا کریں گے شام تک' تھانے میں ہونے والی بے عزتی کو بُھلا کے خاموشی سے گھر پہنچ جائیں گے اور دل میں عہد کریں گے کہ آئندہ ایسی جگہ سے گزریں گے بھی نہیں جہاں کوئی واردات ہوچکی ہو۔ لاوارث اور بے حیثیت لوگ رات کو بھی مہمانِ سرکار ہوں گے اور ان کی خاطر تواضع بھی خوب ہوگی۔ کُچھ ناکردہ گناہوں کے مجرم گردانے جائیں گے۔ ممکن ہے کوئی اعترافِ جرم بھی کرلے اور اخبار والوں کے سامنے تصویر کھنچوانے اور اپنے کارنامے کی تفصیل سُنانے پر بھی تیار ہوجائے۔ ایسے بہادر لوگ ہمیشہ پولیس کے کام آتے ہیں اور پولیس کا اعتبار قائم کرتے ہیں کہ اس نے ملزموں کو پکڑنے میں دیر نہیں لگائی۔ عموماً یہ خدمت پولیس کے مخبر سرانجام دیتے ہیں اور اس کے عوض انہیں پولیس سے بہت کچھ ملتا ہے۔ بھتا وصول کرنے کا اجازت نامہ' داداگیری کالائسنس' شرفا کی پگڑی اچھالنے کا اختیار۔۔۔ وغیرہ۔

"بھئی آخر ہم کدھر جارہے ہیں؟" رابعہ نے بالآخر خاموشی کے اس بوجھل پن کو ختم کیا جو احساسِ جرم وندامت کی پیداوار تھا۔

"ہم ابھی تو خطرے سے دور جارہے ہیں" میں نے کہا۔

"خطرے سے دور جاسکتے ہیں ہم؟" رابعہ نے تلخ' طنزیہ لہجے میں کہا "اتنی گاڑیاں بدل کے' حلئے بدل کے اور احتیاط کے سب تقاضے پورے کرکے بھی کیا ہوا؟"

"کیا اس سے یہ منطقی نتیجہ اخذ کرنا جائز ہوگا کہ اب ہمیں احتیاط جیسی فضول چیز سے گُریز کرنا چاہیے کیونکہ اس کا کوئی فائدہ نہیں' صرف نقصان ہی نقصان ہے؟" میں نے بھی طنزیہ لہجے میں کہا۔

کاجل نے کہا "سکندر! وہ مسلسل ہمارے تعاقب میں تھے۔ ہر جگہ انہوں نے اپنی موجودگی کا احساس بھی دلایا تھا۔"

"آخر کیوں؟" میں نے کہا "کیا ضرورت تھی پیڈرو کو اپنا دیدار کرانے کی؟ ہمارے آگے پیچھے رہ کے وہ خاموشی سے بھی تو تعاقب جاری رکھ سکتا تھا مگر اس نے اپنی بدمعاشی کا خم ٹھونک کے اظہار کیا۔ اس نے تمہیں چھیڑا اور پھر رابعہ کو۔"

کاجل نے کہا "شاید وہ چاہتا تھا کہ تم اس سے جھگڑا کرو اور اسے روک کے پوچھو کہ وہ کیا چاہتا ہے۔"

"نہیں۔ وہ ہمیں احساس دلانا چاہتا تھا کہ ہم ہروقت اور ہر جگہ ان کی نظر میں ہیں۔ ہم فرار ہوکے کہیں جا ہی نہیں سکتے۔ وہ ہم پر ایک نفسیاتی غلبہ حاصل کرنا چاہتا تھا کہ ہم خود کو بے بس اور کمزور محسوس کرنے لگیں۔ چوہے کا شکار کرنے سے پہلے بلی اس کے ساتھ کھیلتی ہے" میرے خون میں اب آتشِ اشتعال بھڑکنے لگی تھی۔

"کیا اب وہ ہمارا پیچھا چھوڑ دے گا؟" رابعہ نے کہا۔

"میں یہی دیکھنا چاہتا ہوں" میں نے کہا "ان میں سے کوئی بھی اگر جائے واردات پر موجود ہوتا تو ہمیں دیکھ لیتا۔ میں نے ان کو پورا موقع فراہم کیا تھا اس کے لیے۔ ہم سب زندہ سلامت دس منٹ تو ضرور وہاں کھڑے رہے تھے۔ وہ اپنا کام کرکے اور مطمئن ہوکے جاچُکے ہوں گے ورنہ اب تک وہ اپنی ناکامی کو کامیابی میں بدلنے کے لیے دوسری کوشش کرچکے ہوتے۔"

کاجل کا رنگ فق ہوگیا۔ اس نے پلٹ کے دیکھا "گویا تم۔ انہیں یہ موقع دے رہے ہو۔ جانتے بوجھتے ہماری جان سے کھیل رہے ہو؟"

"تم بہت دیر سے شامل ہوئی ہو اس کھیل میں کاجل" میں نے کہا "یہ بازی جان کی بازی ہے۔ اوّل تا آخر۔ اس میں ابھی تک طاقت کا توازن برقرار ہے چنانچہ ہم زندہ ہیں۔ ان کے پاس دولت اور طاقت ہے تو ہمارے پاس عقل وذہانت اور ایک مقصد پُریقین کی قوت جسے ایمان ہی کہا جاسکتا ہے۔ کارزارِ حیات ہو یا میدانِ جنگ' دنیا کی تاریخ شاہد ہے کہ اسلحہ کبھی یقین پر غالب نہیں آیا۔

بالآخر یقین کی جیت ہوتی ہے۔ تم اسلام کے آغاز کی تاریخ سے ویت نام اور بنگلہ دیش تک دیکھ لو۔"

"ابھی تو مجھے پیچھے دیکھتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے" کاجل نے کہا "چلو تم نے آزمالیا ناکہ اب کوئی ہمارا تعاقب نہیں کررہا ہے۔ اب روک لو کسی گاڑی کو' کسی رکشا کو"

رابعہ نے کہا "یہ تو کینٹ اسٹیشن آگیا۔ یہاں سے مل جائے گی سواری۔"

"مشکل سے ایک میل پیدل چل کے یہ حال ہوگیا ہے" میں نے افسوس سے سرہلایا "کلیم اللہ کو دیکھو۔"

"ڈیڈی تھک گیا ہے۔" کلیم اللہ نے کاجل کی حمایت کی۔

"دیکھو بیٹا! یہاں ڈیڈی کوئی نہیں کہتا۔ آپا کہو یا باجی۔ چاہو تو آنٹی بنالو۔" میں نے کہا۔

"باجی ٹھیک ہے کلیم۔ انکل کے ساتھ ہوتی ہے آنٹی تو تم انہیں رابعہ آنٹی کہتے ہونا اور انہیں انکل سکندر" کاجل نے کہا۔

رابعہ نے اسے گھورا "پھر تم مجھے کیوں باجی کہتی ہو؟"

"ہاں۔ تم بھی آنٹی کہا کرو۔ بلکہ ماسی بہتر ہے" میں نے کہا "ماسی میں زیادہ اپنائیت کا اظہار ہوتا ہے جیسے خالہ یا چاچی میں۔"

رابعہ نے کہا "کیا یہاں ٹیکسی نہیں ہوتی؟"

"ٹیکسی میں نے بھی نہیں دیکھی تھی۔ ریلوے اسٹیشن کے باہر مجھے کُچھ پرائیویٹ کاریں نظر آئیں جن کو ڈرائیور محبت سے چمکارہے تھے مگر ان کی متوقع نظریں ہم پر تھیں۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ یہ کرائے کی گاڑیاں تھیں۔ زیادہ بول کے اپنی اپنی خدمت پیش کرنے والے اور خود کو ہمارے حق میں فرشتۂ رحمت ثابت کرنے والے ڈرائیوروں پر میں نے ایک سفید ریش' قناعت پسند بزرگ کو ترجیح دی جو رزق کے لیے اللہ پر توکّل کیے خاموش بیٹھے تھے۔

میں نے کہا "ہمیں دن بھر کے لیے گاڑی چاہیے۔"

"بسم اللہ۔ بسم اللہ" انہوں نے سینے پر ہاتھ رکھ کے کہا "ہم حاضر ہے۔ ہمارا گاڑی حاضر ہے۔"

مایوس ہوجانے والے ایک ڈرائیور نے کہا "گاڑی نہیں چھکڑا بولو چاچا۔"

"ہاں ہاں۔ چھکڑا حاضر ہے۔ اللہ نے چھکڑا دیا ہے' اس کا شکر ہے۔" چاچا نے بُرا مانے بغیر کہا۔

"یہ مسافر بھی چھکڑے کے ہیں" میں نے کہا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ پیچھے والی سیٹ پر رابعہ اور کاجل پہلے ہی فٹ ہوچکی تھیں۔

"ہم ایک سو روپیہ لے گا" چاچا نے قدرے تذبذب کے ساتھ کہا۔

"ٹھیک ہے جناب۔" میں نے کہا "کیں تو پہلے دے دوں؟"

"نہیں۔ ابھی حکم کرو کدھر جائے گا پہلے۔"

[illegible] "ایجنسی کے پولیٹکل ایجنٹ سے ملنا ہے۔"

"وہ ادھر قیوم اسٹیڈیم کے پاس ہے" چاچا نے اپنی گاڑی کو اللہ کا نام لے کر اسٹارٹ کیا۔

گاڑی دیکھنے میں جتنی قدیم اور خستہ حال لگتی تھی' چلنے میں اتنی بُری نہیں تھی۔ جب ڈرائیور نے واپس اسی طرف کا راستہ پکڑا جدھر سے ہم پیدل چل کے آئے تھے تو میں نے کہا "وہاں جانے کے لیے دوسرا راستہ کوئی نہیں ہے؟"

"ہے' لیکن یہ راستہ سیدھا ہے۔ بالکل سیدھا جائے گا تو۔۔۔"

میں نے کہا "آگے راستہ بند ہوگا پھر تم کو واپس آنا پڑے گا۔"

اس نے مجھے حیرانی سے دیکھا۔ "ایسی کیا بات ہے؟"

میں نے کہا "آگے بم کا دھماکا ہوا ہے۔ پولیس نے ناکابندی کررکھی ہے۔ اسی لیے تو ہم اُدھر سے پیدل آئے تھے۔"

وہ اُچھل پڑا "بم کا دھماکا۔۔۔۔ تم دیکھا؟"

میں نے کہا "میں نے دیکھا تو نہیں سُنا تھا۔ تم دھیان سے گاڑی چلاؤ۔ ابھی تم اس معصوم گدھے سے ٹکرا جاتے۔"

اس نے میرے مشورے کو نظرانداز کردیا "کتنا بڑا بم تھا؟"

"میں نے نہیں دیکھا۔"

"تم دھماکا سُنا تھا" اس نے کہا "بہت بڑا تھا۔"

"دھماکا تو اتنا ہی بڑا تھا جتنا ایٹم بم کا دھماکا۔" میں نے کہا۔

"اوہو ہو۔۔۔۔ کتنا لوگ مرگیا؟ یہ ایٹم بم کس نے بنایا تھا۔ خدا خوار کرے" اس نے گاڑی کو ایک سرسبز وشاداب سڑک پر دوڑانا شروع کردیا جو بعد میں مال روڈ ثابت ہوئی "قیامت والا دن سارا لوگ اس کو پکڑے گا۔"

"تم ذرا اسٹیرنگ کو مضبوطی سے پکڑو۔ ابھی فٹ پاتھ پر چڑھ جاتے تو چالان ہوجاتا۔ فٹ پاتھ تو پیدل چلنے والوں کے لیے بنائی گئی ہے۔"

اس نے کہا "کون چلتا ہے فٹ پاتھ پر۔ ابھی دیکھو' سب سڑک پر جاتا ہے۔ او خانہ خراب' داؤسی' فٹ پاتھ پر مرو۔"

آخری الفاظ اس نے ایک راہ گیر کو مخاطب کرتے ہوئے گاڑی سے سر نکال کے بہ آواز بلند کہے تھے۔ جواب میں سڑک کے تقریباً درمیان میں کابلی سے بادل ناخواستہ اپنے وجود کو گھسیٹنے والے شخص نے اسے پنجہ دکھایا جو اشاروں کی زبان میں "لعنت تم پر" کی جگہ استعمال ہوتا ہے۔ ڈرائیور کی دلیل میں مجھے وزن نظر آیا کہ جب راہ گیر سڑک پر چلتے ہوں تو ٹیکسی کو فٹ پاتھ پر چلانا کیسے غلط ہوا۔

میں نے اسے لعنت دکھانے والے کو دندان شکن جواب دینے سے نہ روکا ہوتا تو شاید نوبت مارپیٹ پر آجاتی۔ مجھ سے انتخاب میں غلطی ہوگئی تھی۔ بظاہر خاموش طبع اور قناعت پسند نظر آنے والے چاچا اب خاموش ہونے کا نام نہیں لے رہے تھے اور بے حد جارحانہ موڈ میں تھے۔

موضوع بدلنے کے لیے میں نے کہا "یہ سڑک کہاں جاتی ہے؟"

"سڑک۔ سڑک تو اِدھر ہی رہتا ہے" اس نے یوں کہا جیسے میں نے ایک جاہلانہ سوال کیا تھا "اس پر گاڑی آتا جاتا ہے' آدمی اور جانور چلتا ہے۔ ابھی تم یہ بلڈنگ دیکھا! یہ ایڈورڈ کالج ہے۔ انگریز لوگ بنایا۔ سردار نشتر اِدھر پڑھا اور پرتھوی راج۔ تم جانتا ہے اس کو؟ راج کپور کا باپ۔ آگے الٹا ہاتھ کو جائے گا ارباب روڈ پر' اُدھر پھر وہی صدر والا سڑک آجائے گا۔ اِدھر سیدھے ہاتھ پر قیوم اسٹیڈیم ہے' قیوم خان بنایا۔"

گاڑی کے ساتھ اس کی زبان چل رہی تھی اور وہ بیک وقت بہت سے کام کررہا تھا۔ اس نے گائیڈ کے فرائض سنبھال رکھے تھے۔ وہ پشاور کے تاریخی' سیاسی اور ثقافتی پس منظر پر سیر حاصل تبصرہ کررہا تھا۔ اسے زمانے کی زوال پذیر اخلاقی اقدار اور قربِ قیامت کی نشانیوں کے نمودار ہونے پر بھی خاصی تشویش تھی چنانچہ اس کی توجہ ڈرائیونگ پر بہت کم تھی۔ کم سے کم چار افراد اپنی خوش نصیبی کے باعث اس کی چاند گاڑی کے نیچے آنے سے بچے۔ دوبار میں نے اسے فٹ پاتھ پر چڑھنے سے روک لیا۔ ایک ریڑھی والا عین وقت پر بزدل ثابت ہوا اور ایک طرف ہوگیا ورنہ گرما گرم حلیم کی دیگ ونڈ اسکرین کے راستے ہم پر الٹ کے گرتی۔

صدر سے گزرتے ہوئے اس نے اچانک سوال کردیا "تم غیر علاقہ میں جائے گا؟"

میں نے کہا "اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو۔"

"اعتراض کا پتا چل جائے گا۔" اس نے طنز سے کہا "اُدھر غیرت والا لوگ رہتا ہے۔ ان کا بی بی پردہ کرتا ہے۔ ایسا عورت کو بھی وہ گولی مارے گا اور تم جیسا مرد کو بھی....."

میں نے کہا "مرد کو بھی؟ مرد بھی پردہ کرتے ہیں' برقعے پہن کے پھرتے ہیں؟"

اب رابعہ نے مداخلت کی "چاچا' تم بہت بولتے ہو اور فضول بولتے ہو۔"

"ہم کیا غلط بولا۔ ابھی تم جاکے دیکھو' اِدھر سے تمہارا لاش واپس آئے گا۔" اس نے کہا "یہ کس کا غلطی ہے؟ مرد کا۔ مرد میں غیرت ہو تو عورت کا کیا مجال..."

شاید اس کی حق گوئی اور بے باکی پر میں مشتعل ہو کے کوئی غلط قدم اٹھاتا' احتجاجاً ٹیکسی سے اُتر جاتا یا چلّا کے اسے کہتا "شٹ اپ" اور دھمکی دیتا کہ اس نے اپنی بکواس بند نہ کی تو میں اسے بند کرادوں گا۔ مگر ٹیکسی اچانک رک گئی۔

پولیٹیکل ایجنٹ کے آفس پُر ہجوم دیکھ کر میں پریشان ہوگیا۔ مرد عورت' بوڑھے بچّے لمبی لمبی قطاروں میں کھڑے تھے یا فٹ پاتھ پر دھرنا دیے بیٹھے تھے۔ سب مرد باریش تھے اور ان کے کندھوں پر رائفلیں تھیں۔

رابعہ نے پریشان ہو کے سفید اور سیاہ خیمہ نما برقعوں میں روپوش عورتوں کو دیکھا "کیا یہ سب ملاقاتی ہیں؟"

"اور کیا یہاں سینما کا ٹکٹ لینے کے لیے لائن لگی ہے؟" میں نے کہا۔

کاجل نے کہا "ہمیں بھی لائن میں بیٹھنا پڑے گا۔"

"قطار بندی مہذب اقوام کا شعار ہے" میں نے کہا "آپ اچھی لگیں گی لڑ بھڑ کے آگے جاتی ہوئی۔"

"لیکن سکندر! اب اس طرح.... میرا مطلب ہے پردے کے بغیر تو بڑا مشکل ہے بلکہ ناممکن ہے" رابعہ نے کہا "تم ہو آؤ۔"

صورتِ حال میرے لیے بھی باعثِ تشویش تھی۔ یہ رش میرے لیے خلافِ توقع تھا۔ میرا خیال تھا کہ کوئی عام آفس ہوگا اور میں آسانی سے پولیٹیکل ایجنٹ کے سیکریٹری سے مل کے اور اس سے انگریزی میں کوئی متاثر کن جھوٹ بول کے براہِ راست "صاحب" تک رسائی حاصل کرلوں گا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ پولیٹیکل ایجنٹ سے ملنے والوں کی اتنی لمبی قطاریں ہوں گی جتنی امریکا یا بھارت کا ویزا حاصل کرنے کے خواہش مندوں کی سفارت خانوں کے باہر نظر آتی ہیں۔ بلند فصیل نما چار دیواری کا بھاری فولادی گیٹ بند تھا اور اس کے باہر چوکی پر دو مسلح محافظ ملیشیا کی وردی پہنے کھڑے تھے۔ ان کے پاس انتہائی خطرناک قسم کا خود کار اسلحہ تھا۔

میں نے سوچتے ہوئے کہا "مس رابعہ! تم اپنی بات کرتی ہو یہاں تو مجھے بھی ملاقات کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ یہ لوگ شاید صبح منہ اندھیرے آبیٹھے ہوں گے۔"

"رات تک باری آجائے گی" رابعہ بولی۔

"کیا پولیٹیکل ایجنٹ میرے لیے رات تک بیٹھے گا؟" میں نے کہا۔

"پھر تو یہی ہوسکتا ہے کہ واپس چلیں۔ کل صبح فجر کی نماز سے بھی پہلے تم یہاں آکے بیٹھ جانا۔" رابعہ مسکرائی۔

"میں ترکیب نمبر چار سو بیس آزمانے کی سوچ رہا ہوں۔"

"یعنی رشوت دے کر کام نکالنے کی۔ ان لوگوں کو دیکھ رہے ہو؟" رابعہ بولی "سب کے پاس اسلحہ ہے اور صورت سے بھی یہ کتنے خونخوار نظر آتے ہیں۔ یہ تمہاری خاطر جہنم میں جانے والے لوگ نہیں ہیں سکندر صاحب۔"

"لاحول ولا قوة۔ تم غلط سمجھ رہی ہو۔"

"رشوت دینے والا اور رشوت لینے والا دونوں جہنمی ہیں۔ اس میں غلط سمجھنے والی کون سی بات ہے؟"

"پلیز رابعہ! پریشان مت کرو" میں نے کہا "مجھے اب شدت سے آفریدی کے نہ ہونے کا احساس ہورہا ہے۔ وہ ہوتا تو ہمارے سارے کام ہوجاتے۔"

"کتنی خود غرضی کی بات ہے۔ جب مشکل پڑی تو اس کی یاد آئی ورنہ اس کی موت پر کسی کی آنکھ سے ایک آنسو تک نہیں ٹپکا تھا۔" رابعہ اُداس ہو کے بولی "ہم اپنی جان بچا کے فرار ہوگئے تھے' بالکل نا آشنا بن گئے تھے۔ کون آفریدی' کیسا آفریدی۔"

میں نے برہمی سے کہا "کیسی باتیں کرتی ہو۔ وہاں رُک کے اور آنسو بہا کے ہمیں کیا حاصل ہوتا۔ آفریدی کی نیکی کو اور اس کی وفاداری کو ہم کیسے بھلا سکتے ہیں۔ وہ اچھا آدمی تھا مگر اس کی موت کے ہم ذمّے دار نہیں ہیں۔ خواہ مخواہ احساسِ جرم میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"مگر کیا وہ ہماری وجہ سے نہیں مارا گیا؟"

"نہیں۔ وہ خود یقین رکھتا تھا کہ نہ کوئی کسی کی وجہ سے مارا جاتا ہے اور نہ کسی کی وجہ سے زندہ رہتا ہے۔" میں نے کہا "بات وقت کی ہے۔ جس کا جہاں وقت پورا ہوجاتا ہے' وہ خود وہاں پہنچ جاتا ہے اور تمہیں نہیں معلوم' وہ ایسی ہی موت کو پسند کرتا تھا جو اچھے اور نیک کام کرتے ہوئے اچانک آجائے۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں چوری ڈاکے کی واردات میں پولیس کی گولی کا نشانہ بن کے مرنا نہیں چاہتا' نشے کی حالت میں حادثے کا شکار ہو کے مرنا نہیں چاہتا۔ خدا نے اس کی خواہش پوری کی۔ اسے ایک اچھے مقصد کی خاطر جان دینے کا موقع ملا۔ نہ ہم نے ایسا چاہا تھا' نہ خود اس نے سوچا تھا مگر نوشتۂ تقدیر میں ایسا ہی تھا۔"

کاجل نے پریشان ہو کے کہا "یہ تم لوگ کس بحث میں پڑگئے' کچھ کرو ورنہ واپس چلو۔"

"ترکیب نمبر چار سو بیس کیا تھی؟" رابعہ بولی۔

"کوئی بہت بڑا جھوٹ بولنا پڑے گا۔" میں نے کہا "تمہارا کارڈ ہے کوئی تمہارے پاس؟"

"کارڈ ابھی کہاں چھپوائے ہیں" رابعہ بولی۔

"دیکھو' میں ایسے ہی کام چلانے کی کوشش کرتا ہوں اور پیغام پہنچاتا ہوں کہ لاہور سے رابعہ قاری ایڈووکیٹ ہائی کورٹ' ملنے کے لیے آئی ہیں۔ اور میں بن جاتا ہوں عبدالودود منظر۔"

"تمہارے پاس کیا ثبوت ہے؟"

"کیا تمہیں یہ ثابت کرنے کے لیے کسی ثبوت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ تم رابعہ قاری ہو؟ ایڈووکیٹ لاہور ہائی کورٹ۔ فرض کرو کہیں تم کو ایسی صورتِ حال درپیش ہو' تمہیں شناخت کا مسئلہ ہو۔"

"تو میں ثابت کردوں گی" رابعہ نے سوچ کے کہا "کیونکہ مجھے جھوٹا کوئی ثابت نہیں کرسکے گا۔ میں شک کرنے والے کو چیلنج کرسکتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے میں بھی کردوں گا" میں نے کہا۔

ٹیکسی ڈرائیور گاڑی روکتے ہی اُتر کے کہیں چلا گیا تھا۔ میں نے اسے بعد میں قیوم اسٹیڈیم کی دیوار کی جانب رُخ کیے بیٹھے دیکھا تو سمجھ گیا تھا کہ اسے اتنی دور جانے کی کیا مجبوری لاحق ہوگئی۔ اس کے واپس آنے تک ہم گاڑی میں ہی بیٹھے رہے تھے۔

اس نے حیرانی سے کہا "کیا بات ہے' تم گیا نہیں اندر۔"

میں نے کہا "باہر اتنے لوگ بیٹھے ہیں" میں نے کہا "ہماری باری کیسے آئے گی' ہم تو کسی کو جانتے ہی نہیں۔"

وہ ہنسنے لگا "یارا' تم کو کچھ نہیں معلوم۔ یہ سب تو وظیفہ خور ہے۔ اپنا وظیفہ لینے آتا ہے۔"

میں نے کہا "کیسا وظیفہ؟"

اس نے وضاحت کی کہ انگریز نے اس علاقے پر اپنا تسلط برقرار رکھنے اور آزاد پٹھانوں کو مطیع رکھنے کے لیے جبر و استبداد کے سارے بہیمانہ حربے آزمانے کے ساتھ ساتھ یہ کوشش بھی کی تھی کہ ان لوگوں کے لیے ماہانہ وظیفہ مقرر کردیا جائے جو انگریزی افواج اور حکومت کے خزانوں کو لوٹتے رہتے تھے۔ یہ علاقے میں امن و امان قائم رکھنے کے علاوہ ایک طرح کا خراج تھا جو حاکم اپنی رعایا کو دینے پر مجبور تھا۔ انگریز چلے گئے مگر وظیفہ باقی رہا۔ اس کی رقم میں وقت کے ساتھ برائے نام اضافہ ہوا اور موجودہ دور کی گرانی کو دیکھتے ہوئے یہ وظیفہ مضحکہ خیز حد تک کم لگتا تھا مگر ذرائع معاش کی عدم دستیابی کے باعث نادار افراد اب یہ وظیفہ ہر تین ماہ بعد اسی طرح وصول کرنے آتے رہتے تھے۔

یہ بات جان کے مجھے کچھ اطمینان حاصل ہوا کہ قطاروں میں کھڑے ہوئے مرد و زن ملاقاتی نہیں ہیں اور شاید ہمیں زبانی تعارف پر پولیٹیکل ایجنٹ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوجائے گا۔ پھر ہوا بھی یہی۔ دروازے پر موجود مسلح محافظوں نے ڈرائیور کی زبانی میری بات سُنی اور آہنی دروازے کی ایک کھڑکی سے جھانک کے اندر کچھ کہا۔

ڈرائیور نے مجھے اشارہ کیا "آؤ صاحب!"

میں نے گاڑی کی طرف جاتے ہوئے کہا "کیا اجازت مل گئی؟ تم سے کیا پوچھ رہا تھا وہ محافظ؟"

"پوچھتا تھا کہ تم کون ہو۔ ہم بولا کہ صاحب لوگ کا شوفر ہے اور کون ہے۔ صاحب اور بیگم صاحب بہت بڑا وکیل ہے لاہور ہائی کورٹ کا۔ کام کا ہم کو پتا نہیں۔ کوئی قانونی معاملہ ہوگا۔" اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور سیدھا گیٹ سے گزار کے لے گیا جو ہمارے لیے کھول دیا گیا تھا۔

"قانونی معاملہ تو ہے" میں نے کہا "کیوں مس رابعہ؟"

رابعہ نے کہا "یہ تو سچ ہے۔ جیسے یہ سچ ہے کہ میں رابعہ قاری ہوں اور ایڈووکیٹ ہائی کورٹ بھی ہوں۔ کاجل کے بارے میں کوئی بیان نہیں دیا گیا اور قانونی مسئلہ ہے کلیم۔ اب باقی بچے آپ' تو اللہ آپ کو اس جھوٹ پر معاف کرے۔"

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "تو وہ بھی کہہ رہے ہیں یہ بے ننگ و نام ہے۔"

گاڑی اندر ایک پارکنگ ایریا میں رُک گئی جہاں پہلے سے

ایک فوجی جیپ اور دو کاریں موجود تھیں۔ ضابطے کی کارروائی کرتے ہوئے ملیشیا کے ایک جوان نے گاڑی میں جھانک کر دیکھا' رسمی طور پر ڈکی کھلوائی اور مجھ سے پوچھا "سوٹ کیس میں کیا ہے؟"

"کپڑے' نقد رقم" میں نے کہا "ایک ریوالور میرے پاس ہے۔"

"وہ اِدھر دے جائیں" وہ بولا "واپسی میں لے لیں۔"

مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ سیکیورٹی کے قواعد کے مطابق وہ میری تلاشی بھی لے سکتا ہے چنانچہ رضاکارانہ طور پر اسلحہ پیش کردینا بہتر تھا۔ کسی شخص کے پاس ریوالور یا رائفل کا ہونا اور لائسنس کا نہ ہونا اس علاقے میں ایسا ہی تھا جیسے لاہور میں کسی شخص کی کلائی پر گھڑی ہونا مگر اس کی رسید کا نہ ہونا۔ ہاں تلاشی میں اسلحہ برآمد ہوتا تو ممکن ہے مجھ پر شک کیا جاتا کہ میں اسے چوری چھپے اندر لے جانا چاہتا تھا۔

پولیٹیکل ایجنٹ ایک نوجوان شخص تھا۔ اس نے بڑے تپاک سے ہمارا خیر مقدم کیا۔

"آپ لاہور سے تشریف لائے ہیں؟"

میں نے کہا "جی۔ میں عبدالودود منظر ہوں اور یہ میری وائف رابعہ قاری ہیں۔ یہ بھی لاہور ہائی کورٹ میں ایڈووکیٹ ہیں۔"

وہ خاصا مرعوب نظر آنے لگا "ان کا کوئی مسئلہ ہے؟"

میں نے کہا "جی نہیں۔ یہ میری سسٹر اِن لا ہیں۔ مس کاجل۔ مسئلہ ہے اس بچے کا۔"

"کیا مسئلہ ہے؟"

"یہ غیر علاقے کا رہنے والا ہے۔ اس کا باپ بھی مشرقی پاکستان میں مارا گیا اور ماں بھی۔ اس کو وہ ہمارے حوالے کرگئے تھے کہ جب ہم مغربی پاکستان جائیں تو اسے رشتے داروں کے سُپرد کردیں۔ اس کی ایک پھوپی رہتی ہیں یہاں اور کچھ زمین بھی ہے۔"

"آپ خود جائیں گے؟"

"جی۔ اگر آپ مدد کریں۔"

"دیکھیے جی' میں کچھ نہیں کرسکتا۔ آپ پولیٹیکل ایجنٹ صاحب سے بات کرکے دیکھ لیں۔ اگر وہ اجازت دیتے ہیں...."

میں نے کہا "کیا آپ پولیٹیکل ایجنٹ نہیں ہیں؟"

"میں ان کا سیکریٹری ہوں۔ وہ ذرا مصروف ہیں۔ ایک صوبائی وزیر بیٹھے ہیں۔ آپ تشریف رکھیں۔ میں نے انہیں بتادیا تھا۔ وہ فارغ ہوتے ہی آپ کو بلالیں گے۔"

مجھے غصہ بھی آیا اور خفت بھی محسوس ہوئی۔ میں نے رابعہ کی طرف دیکھا تو وہ ہنسی ضبط کرنے کی کوشش کررہی تھی لیکن غلطی سراسر میری اپنی تھی کہ میں نے سیکریٹری کو پولیٹیکل ایجنٹ فرض کرلیا۔ خود اس نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔ دراصل میں

کمرے کی وسعت اور شان و شوکت سے دھوکا کھاگیا تھا۔ ہم صوفوں پر بیٹھے تھے' وہ بہت شاندار تھے۔ نیچے بیش قیمت قالین اور کھڑکیوں دروازوں پر قیمتی پردے آویزاں تھے۔ سیکریٹری کی میز ایک کونے میں لگی ہوئی تھی۔ باقی حصہ ایک ویٹنگ روم تھا جہاں وی آئی پی قسم کے ملاقاتی اپنی باری کا انتظار کرتے تھے۔

سیکریٹری اپنی کرسی پر جابیٹھا اور فون گھمانے لگا تو رابعہ نے آہستہ سے کہا "اب پہلے پوچھ لینا کہ آپ پولیٹیکل سیکریٹری ہیں۔"

"شناختی کارڈ نہ مانگ لوں۔" میں نے مسکرا کے کہا۔

"آدمی کی پہچان بھی ہونی چاہیے" رابعہ مسکرائی "بھلا اتنی عمر ہوسکتا ہے پولیٹیکل ایجنٹ؟"

"تمہارے خیال میں کیا عمر ہوتی ہے اس کی؟ پہلے کبھی پولیٹیکل ایجنٹ دیکھے ہیں تم نے؟" میں نے بھنّا کے کہا۔

اسی وقت اندر والا دروازہ کھلا اور صوبائی وزیر صاحب برآمد ہوئے۔ انہوں نے ایک شانِ استغنا سے مجھ پر اُچٹتی سی نگاہ ڈالی لیکن کاجل کو خاصی توجہ سے دیکھا اور رابعہ کی طرف دیکھ کے انہوں نے سر بھی خم کیا۔ اس کے پیچھے ایک اور سنجیدہ صورت جوان آدمی تھا جو وزیر صاحب کو دروازے کے باہر ان کی گاڑی تک چھوڑ کے لوٹا تو سیدھا ہماری طرف آیا۔

"تشریف لایئے پلیز" اس نے کہا "آپ کو بڑا انتظار کرنا پڑا۔"

"یہ تو ہوتا ہی ہے پاکستان میں" میں نے ناگواری کے جذبات کا اظہار کیا "بڑا آدمی ہی بڑا انتظار کراتا ہے۔"

"ایک بار پھر میں دھوکا کھاگیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ ہمیں اندر لے جاکے پولیٹیکل ایجنٹ کے سامنے پیش کرے گا اور پولیٹیکل ایجنٹ ہوگا کوئی عمر رسیدہ' بھاری بھرکم' خرانٹ قسم کا شخص لیکن عالی شان کمرے میں وہی نوجوان ایک وسیع و عریض میز کے پیچھے بیٹھا تو مجھے احساس ہوا کہ میں نے اس کی خوش اخلاقی کے جواب میں کتنی بدتہذیبی کا مظاہرہ کیا تھا۔

میں نے پھر رابعہ کی طرف دیکھا تو وہ میری بوکھلاہٹ سے لطف اندوز ہورہی تھی۔ اس کی بات غلط ہوگئی تھی مگر مجھ سے جو غلطی سرزد ہوئی تھی اس کی تلافی بہت مشکل تھی۔

"جی فرمایئے۔ میں کیا خدمت کرسکتا ہوں آپ کی؟" اس نے ایک پیڈ پر نظر ڈال کے کہا "مس رابعہ قاری......"

"مسز رابعہ قاری" میں نے کہا "اور میں ہوں عبدالودود منظر۔ یہ میری وائف ہیں۔ قانونی حلقوں میں ان کا اپنا نام چل رہا ہے لیکن اپنی بات کرنے سے پہلے میں آپ سے معذرت خواہ ہوں اپنے ریمارکس پر' مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آپ جیسا کم عمر شخص بھی پولیٹیکل ایجنٹ ہوسکتا ہے۔"

"اب تو میں ہوگیا" وہ خوش دلی سے ہنسا "تاہم آپ کی غلطی نہیں تھی' اس لیے میں نے بُرا نہیں مانا۔ ... آپ کیوں معذرت

...نے ہیں۔"

اس نے میری بات غور سے سُنی۔ اس دوران ایک چپراسی ہم سب کے سامنے چائے کی پیالی رکھی' بسکٹ کی پلیٹ رکھی اور پھر دبے پاؤں باہر نکل گیا۔ خودکار اسپرنگ کے ذریعے دروازہ آواز کے بغیر بند ہوگیا۔

اس کے بالکل سامنے میں تھا اور میرے ساتھ رابعہ تھی۔ میرے دائیں جانب کاجل اور کلیم اللہ خاموش بیٹھے تھے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جارہا تھا اور ہم اپنے مقصد اور اپنی منزل کے قریب ہوتے جارہے تھے۔ کاجل کی خاموشی میں اُداسی کا رنگ گہرا ہونے لگا تھا۔ وہ بہت کم بولتی تھی اور باتیں کرتی تھی تو کلیم اللہ سے۔ کلیم اللہ خود بھی نادان بچہ نہیں تھا۔ جب کاجل اس سے سوال کرتی تھی کہ کیا تم خوش رہوگے' اجنبی لوگوں اور اجنبی ماحول میں گھبراؤ گے تو نہیں' تمہاری یہ زندگی تو بالکل مختلف ہوگی اور بہت ممکن ہے کہ اگر رشتے داروں نے تم سے اچھا سلوک نہ کیا' تمہیں وہ محبت نہ دی جس کی تم توقع رکھتے ہو تو پھر کیا کروگے؟ زمین جائداد کی خاطر تمہارے ساتھ کسی نے دشمنی کی تو کیا ہوگا؟ تمہیں ہم سب یاد نہیں آئیں گے؟ کبھی تمہارا دل چاہا مجھ سے ملنے کو یا مجھے بُلانے کو تو تم کیا کروگے؟ ایسے سوال بہت تھے جو وہ اکثر کرتی تھی۔

کلیم اللہ سمجھتا تھا کہ اس نے غلط جواب دیا تو کاجل زیادہ دُکھی ہوگی اور اس کے لیے اپنے جذبات پر قابو پانے کا صبر آزما مرحلہ زیادہ دشوار ہوگا چنانچہ وہ سوچ سمجھ کے جواب دیتا تھا۔ اس کے ہر جواب سے کاجل کو مایوسی ہوتی تھی۔ وہ کہتا تھا کہ میں بہت خوش رہوں گا۔ یہاں اجنبی کون ہوگا؟ میری پھوپی آخر میرے والد کی بہن ہے اور میں زمینوں کا مالک بن جاؤں گا تو پھر کس کی مجال ہے کہ میری طرف آنکھ بھی اُٹھا کے دیکھے۔ ہے تو بہت مشکل لیکن جب بھی موقع ملا میں آپ سے ملنے کے لیے ضرور آؤں گا۔ یہاں سے ڈاک تو جاتی نہیں ورنہ میں خط لکھتا اور فون ہوتا تو بات بھی کرلیتا مگر اس کے لیے تو پشاور جانا پڑتا ہے۔ وہ بے حد ذہین تھا اور میں نے محسوس کیا تھا کہ کاجل کی خاطر اس نے اپنے غم پر ایک جھوٹی خوشی کا پردہ ڈال دیا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ بعد میں کاجل کو اس کی جدائی کا صدمہ کم سے کم ہو چنانچہ وہ جذباتی طور پر خود کو لاتعلق اور بے گانہ کرتا جارہا تھا اور اپنے رویّے سے یہ ثابت کرنے پر تُلا ہوا تھا کہ نہ اسے کاجل کی پروا ہے اور نہ ہماری۔ حقیقت اس کے بالکل برعکس تھی مگر کاجل خود جذبات کے اندھے پن کا شکار تھی اور کلیم اللہ کی بے مروتی' لاتعلقی کے اظہار اور اجنبیت آمیز بے گانگی کے رویّے میں چھپے ہوئے جھوٹ کو دیکھنے سے قاصر تھی۔ چنانچہ اس کا دل ٹوٹتا تھا کہ اس نے تو کلیم کو بہت ٹوٹ کے چاہا تھا مگر وہ کتنی جلدی بدل گیا۔ اپنا خون نہیں تھا نا' غیر تو غیر ہی ہوتا ہے۔

کلیم اللہ بڑی بہادری سے کاجل کے بارِ غم کو ہلکا کرنے میں لگا ہوا تھا اور بڑی جوانمردی سے اِس بوجھ کو اپنے دُکھ کے ساتھ اُٹھائے ہوئے اپنے اشکوں کے بند کو خوشی کی مسکراہٹ سے مضبوط کرنے میں کوشاں تھا۔

جتنی دیر میں پولیٹیکل ایجنٹ سے بات کرتا رہا' کاجل خلا میں گھورتی رہی اور ایک میکانکی انداز میں چائے کی پیالی کو اُٹھا کے لبوں تک لے جاتی رہی۔ اگر رابعہ نہ کہتی تو اسے چائے میں چینی ڈالنے کا خیال بھی نہ آتا اور احساس بھی نہ ہوتا کہ وہ پھیکی چائے پی رہی ہے۔ اس کے ساتھ بیٹھا ہوا کلیم اللہ بڑی بے حسی کے ساتھ مسکراتا رہا اور یہ ظاہر کرتا رہا کہ وہ بے حد مسرور ہے۔

میں نے پولیٹیکل ایجنٹ کو ایک قابلِ قبول کہانی سُنائی جس میں کلیم اللہ کے باپ سے ملاقات کا سبب بننے والے اصل حالات کا کوئی حوالہ نہ تھا مگر خود کلیم اللہ کے خاندانی حالات اصل واقعات کے مطابق تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ پولیٹیکل ایجنٹ بعد میں جرح ضرور کرے گا اور خود کلیم اللہ سے بھی تصدیق چاہے گا تو پشتو میں بات کرے گا جو ہماری سمجھ میں نہیں آئے گی لیکن ایک بچے کی زبان نے میری کسی بات کو غلط کردیا تو بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا اور ہماری حیثیت مشکوک ہوجائے گی۔

میں نے اپنے حالات کو بہت مختصر رکھا۔ ہم شادی کے بعد ہنی مون کے لیے مشرقی پاکستان گئے تھے۔ وہاں سے سلہٹ گئے اور ڈھاکا لوٹے تو پہلے مجھے ٹائی فائڈ ہوگیا پھر حالات مخدوش ہوگئے اور ہم وہیں پھنس کے رہ گئے۔ کلیم اللہ کے باپ سے ہماری کوئی شناسائی نہ تھی۔ اس سے ملاقات ایک اتفاق تھی مگر بعد میں اس نے ہمیں پناہ دی۔ باقی سب سچ تھا جو کچھ کلیم اللہ کے گھر میں ہوا تھا۔

پولیٹیکل ایجنٹ نے میری بات سُنتے ہوئے ایک پنسل سے پیڈ پر کچھ لکھنے کا شغل جاری رکھا۔ یہ بہت سے لوگوں کی عادت ہوتی ہے وہ مخاطب کو پوری توجہ دیتے ہیں اور کاغذ پر بے مقصد نقش و نگار یا خطاطی کے نمونے بناتے ہوئے ان کا دھیان پوری طرح ایک ہی طرف رہتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ڈرائیونگ کرتے ہوئے آدمی کے دونوں پاؤں الگ الگ حرکت کرتے ہیں۔ وہ ساتھ بیٹھے ہوئے شخص کی باتیں بھی سنتا ہے۔ اس سے مدلل گفتگو بھی کرتا ہے' اس کے لطائف پر ہنستا بھی ہے مگر بنیادی طور پر اس کی ساری توجہ اپنی ڈرائیونگ پر رہتی ہے۔

میری بات سُننے کے بعد اس نے پیڈ ایک طرف رکھ دیا اور کلیم اللہ سے بات کرنے کے لیے کرسی پر گھوم گیا۔ حسبِ توقع ان کی تمام گفتگو پشتو میں ہوئی اور آدھا گھنٹا جاری رہی۔ درمیان میں اس نے دو اہم فون سُنے اور ایک بار انٹرکام پر ہدایات بھی دیں۔ وہ ایک ذمّے دار اور مصروف آدمی تھا مگر غالباً اس نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ جب تک کسی وی آئی پی کا فون نہ ہو یا خود وی آئی پی ملنے نہ آئے' اسے ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ تجربہ کار سیکریٹری جو اپنے صاحب

کا موڈ اور مزاج سمجھتے ہیں' وہ خود ہی طے کرلیتے ہیں کہ کون وی آئی پی ہے اور کون نہیں ہے۔

بالآخر دوبارہ مجھ سے انگریزی میں مخاطب ہوا "اب بات تو میری سمجھ میں آگئی ہے اور میرا خیال ہے کہ یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ مقصد ہے اس بچے کو وارثوں کے حوالے کرنے کا۔ اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ وارث آئیں اور اسے لے جائیں۔ میرے آفس میں قانونی طریقِ کار کے مطابق یہ کارروائی مکمل ہوسکتی ہے۔ اس سے فائدہ یہ ہوگا کہ بعد میں کلیم اللہ کو تحفظ کی ضمانت حاصل رہے گی۔ خدانخواستہ کسی نے اس کے ساتھ پُرانی دشمنی کا بدلہ چُکانے کی سازش کی یا اسے بچہ سمجھ کے اس کا حق چھینا تو اس معاملے میں پڑنے والے دوسرے لوگ بھی ہوں گے۔ میں قبیلے کے دوسر کردہ افراد کو یہ ذمّے داری سونپ سکتا ہوں اور ان سے عہد لے سکتا ہوں کہ وہ غیر جانبداری کے ساتھ اپنا فرض پورا کریں گے۔"

میں نے مایوسی سے کہا "اس کا مطلب ہے ہم خود ان سے ملنے نہیں جاسکتے؟"

"اوہ نو۔ آپ لوگوں کے غیر علاقے میں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" وہ بولا "یہ لوگ مہمانوں کو خوش آمدید کہتے ہیں مگر کسی اجنبی کو اِس علاقے میں داخل نہیں ہونے دیتے۔ اجنبی کا مطلب ہے وہ شخص جو اِن کی تہذیبی روایات اور ثقافت' ان کے مزاج اور عادت سے ناواقف ہو۔ آپ لوگ خود کو خطرے میں نہ ڈالیں۔"

کاجل نے اچانک کہا "آپ کچھ نہیں کرسکتے ہماری حفاظت کے لیے؟"

وہ اس کی انگریزی پر چونکا "نہیں۔ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ غیر ملکی مہمان آتے ہیں تو پہلے سے قبائلی سرداروں کو مطلع کردیا جاتا ہے اور رسمی طور پر جرگہ منظوری دیتا ہے۔ اس کے باوجود ہم ان کے ساتھ پیرا ملٹری فورس بھیجتے ہیں۔ یہ کوئی ایسا معاملہ نہیں۔"

"تمہارے لیے نہیں ہے' میرے لیے ہے" کاجل نے تیز آواز میں کہا "تم صرف سرکاری قواعد وضوابط کی بات کررہے ہو' یہ نہیں سمجھتے کہ رشتوں کا ایک جذباتی پہلو بھی ہوتا ہے۔ انسانی رشتوں کا۔"

صاف ظاہر تھا کہ وہ مایوسی کے ہسٹریا سے مغلوب ہوچکی تھی۔ میں نے کہا "کاجل! مجھے بات کرنے دو۔"

"بات میں بھی کرسکتی ہوں" کاجل نے میرے لہجے کی سختی سے متاثر ہوئے بغیر کہا "میں اپنا حلیہ' لباس' سب بدل سکتی ہوں سر۔ میں پٹھانوں کے گھر کی عورتوں جیسے کپڑے پہن لوں اور برقع اُوڑھ لوں تو کسی کو کیا اعتراض ہوگا؟ پردہ میرے لیے کوئی انوکھی چیز نہیں۔ آخر میں مسلمان ہوں' میں کلیم کی ماں ہوں' پوچھ لو اس سے!"

وہ ایک دم پھُوٹ پھُوٹ کے رونے لگی۔ ایک لمح... سب کو ایک مجرمانہ احساس کی بوجھل خاموشی نے محصور کر... جس بے رحم شکاری لمحے سے ڈر رہا تھا' وہ اچانک کاجل ... آؤٹ کرگیا تھا۔ اس طرح کہ ہمارے لیے اپنے دفاع ... انتظامات دھرے رہ گئے تھے۔

اس صورتِ حال کو پولیٹکل ایجنٹ نے سنبھالا "... او کے۔ تم جاسکتی ہو۔ میری طرف سے اجازت ہے۔"

کلیم بے اختیار اس سے لپٹ گیا "تم میرے ساتھ ... ویدی۔ ہم نہیں چھوڑے گا تم کو۔ ہم بھی نہیں جائے گا اگر ... جائے گا۔ ہم کیسے رہے گا اُدھر تمہارے بغیر۔"

کاجل کے آنسوؤں نے کلیم کو بھی شکست دے دی ... بڑی جرأت مندی سے خود کو آنے والے جدائی کے لمحے ... آزما ہونے کے لیے تیار کررہا تھا مگر کاجل کو روتا دیکھ کے ... حوصلہ جواب دے گیا۔ اس کے لیے اپنے جھوٹ کو نبھانا ... نہ رہا۔ خوشی کی ساری اداکاری کا اعترافِ جُرم اس کی آ... سے بہنے والے اشکوں کی تحریر میں ڈھل گیا تھا۔

میں اور رابعہ کچھ بھی نہ کرسکے۔ خاموشی سے اپنی شرم اور ندامت کی خلشِ آزار کو برداشت کرنے کے سوا ہم ... کیا سکتے تھے۔ کاجل نے ہم سے قطع تعلق کرلیا تھا اور کلیم ... بننے کا' کہلانے کا اور تسلیم کیے جانے کا اعزاز حاصل کر... لیے ساری دنیا کو چھوڑنا قبول کرلیا تھا۔ اسے کون روک سکتا ...

"پلیز! آپ یہ رونا دھونا بند کریں۔ میں اس کے رشتے دا... کو بلواتا ہوں۔ اگر انہیں کوئی اعتراض نہ ہوا تو آپ جائیں ... آپ کو نہیں روکوں گا۔ لیکن میں آپ کے لیے حفاظتی ... انتظام نہیں کرسکتا جو آپ کو کلیم اللہ کے علاقے میں لے ... کسی پیشگی اطلاع کے بغیر۔ علاقے کا کوئی آدمی ہوتا تو اور بات ... وہ ذمّے داری قبول کرلیتا" پولیٹکل ایجنٹ نے کہا۔

"اس میں تو کچھ وقت لگے گا۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔ دو دن کم سے کم" اس نے کہا "آپ کا قیام ... ہے؟"

"رات ایک ہوٹل میں تھے۔ اب معلوم نہیں وہاں جگ... گی یا نہیں" میں نے کہا۔

"میں ریسٹ ہاؤس میں بندوبست کرسکتا ہوں" گاڑی آپ کو لے جائے گی" اس نے انٹر کام اُٹھاتے ہوئے کہا۔

ہم اس کا شکریہ ادا کرکے اور ہاتھ ملا کے کمرے سے باہر آئے۔ ہمیں احساس تھا کہ جاتے وقت ہم ایک تھے لیکن ساتھ ہونے کے باوجود الگ۔ کاجل اور کلیم کا راستہ بدل ... واپسی صرف میرے لیے اور رابعہ کے لیے تھی۔ کاجل نے ... جانے کا فیصلہ کرلیا تھا اور مشرقی پاکستان سے شروع ہونے ...

رفاقت کا سفر بالآخر پشاور پہنچ کے تمام ہوگیا تھا۔ کاجل ابتدا سے ہمارے ساتھ نہ تھی مگر بہت کم وقت میں اس کے اور ہمارے درمیان ایک خاندان کے افراد جیسا جذباتی تعلق اُستوار ہوگیا تھا۔

ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اگر کوئی گیا تھا تو حالات کی مجبوری کے باعث کچھ دن کے لیے یا کچھ مہینوں کے لیے اور اس کے لوٹ آنے کی اُمید ہمارے ساتھ رہی تھی۔ یا ایسا ہوا تھا کہ استاد ٹیڈی اور شہلا کی طرح کوئی ہماری زندگی سے ہی نہیں دنیا سے بھی چلا گیا تھا ورنہ میں اور محسن' غالب اور نازو' گُل اور اکرام کی طرح کاجل بھی آج تک ایک خاندان میں تھی۔ ہمیشہ ساتھ رہنے کے لیے۔ کسی نے بھی اپنے ارادے اور اپنی مرضی سے اس خاندان کو نہیں چھوڑا تھا۔ کاجل کا یک طرفہ جذباتی فیصلہ میرے لیے اور رابعہ کے لیے صدمے کی بات تھی۔ اس نے کسی کو اعتماد میں نہیں لیا تھا اور اتنا بڑا فیصلہ کرنے سے پہلے مشورہ کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔

باہر آکے میں کرائے کی گاڑی میں بیٹھ گیا اور پیچھے پیچھے چلتا گیا۔ سرکاری جیپ نے نصف گھنٹے کی مسافت کے بعد ہمیں یونیورسٹی کے قریب واقع ایک ریسٹ ہاؤس میں پہنچادیا جہاں ہم سب کے لیے ایک ہی کمرے میں قیام وطعام کی ہدایات موصول ہوچکی تھیں۔ راستے میں ہم نے آپس میں کوئی بات نہیں کی۔ پیچھے والی سیٹ پر کاجل اور رابعہ کے درمیان کلیم اللہ افسردگی' شرمندگی اور بے یقینی کے مِلے جُلے جذبات میں مبتلا گُم صم بیٹھا تھا۔ کاجل ایک کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی تو رابعہ دوسری کھڑکی سے۔ اگلی سیٹ پر میں ان کے چہروں کے تاثرات کا مشاہدہ اس آئینے میں کرسکتا تھا جس میں پیچھے کا سارا منظر نظر آتا تھا۔ واضح طور پر ان کے درمیان کشیدگی کی خلیج حائل تھی۔

ریسٹ ہاؤس اس اعتبار سے بڑی محفوظ جگہ تھی کہ یہاں ہم کسی شکاری کی نگاہ میں نہ تھے اور نہ اس جگہ تک ان کی رسائی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ ہمارے تعاقب میں کوئی بھی پولیٹکل ایجنٹ کے دفتر تک نہیں آیا تھا۔ کینٹ اسٹیشن تک کا فاصلہ پیدل طے کرتے ہوئے بھی میں نے گردوپیش پر نظر رکھی ہوئی تھی اور پھر ایک پرائیویٹ کار میں پولیٹکل ایجنٹ کے آفس آتے ہوئے خاص طور پر اپنے پیچھے آنے والی گاڑیوں کو دیکھتا رہا تھا کہ کوئی ایک سا فاصلہ رکھتے ہوئے ہماری نقل وحرکت کی نگرانی تو نہیں کررہی ہے مگر مجھے ایسی کوئی بات محسوس نہیں ہوئی تھی۔

اس کمرے میں دو بیڈ تھے۔ ایک صوفہ سیٹ بھی بیڈ کے طور پر استعمال کیا جاسکتا تھا ورنہ قالین پر سونے کے لیے بہت جگہ تھی۔

کلیم اللہ نے ایک سوال سے ماحول کے اعصاب شکن سکوت کا خاتمہ کیا "چاچا' ہم ادھر کیوں آگیا؟"

میں نے مسکرا کے کہا "تمہیں بہت جلدی ہے اپنے گھر پہنچنے کی؟"

"ہم کب جائے گا چاچا؟" کلیم نے میرے سوال کو نظرانداز کرکے کہا۔

"بھئی ساری بات تمہارے سامنے ہوئی تھی۔ تمہارے قبیلے کے لوگ آجائیں گے کل پرسوں تک۔ وہی لے جائیں گے تمہیں۔ ہم تو اجنبی ہیں' غیر ہیں تمہارے علاقے میں' اس لیے ہمیں اجازت نہیں ملی" میں نے کہا "ورنہ ہم تو چاہتے تھے کہ تمہارے سب رشتے داروں سے بھی ملیں اور تمہارا گھر بھی دیکھیں۔"

"اپنی دیدی کو تم نے اجازت دلوادی" رابعہ بولی۔

کاجل نظر جھکائے بیڈ پر بیٹھی ایک اضطراری کیفیت میں پاؤں ہلارہی تھی اور ایک انگلی میں پہنی ہوئی انگوٹھی کو گھمارہی تھی "آپ .... خفا تو ہوں گے مجھ ...." اس نے جذبات سے عاری' سپاٹ لہجے میں کہا۔

میں نے ہنس کے کہا "کیسی باتیں کرتی ہو کاجل' ہم بھلا تم سے کیوں خفا ہوں گے۔"

"ہمیں خفا ہونے کا حق بھی حاصل نہیں" رابعہ نے کہا۔

"آپ یقیناً خفا ہیں" کاجل بولی۔

"تمہارے نزدیک ہوگی کوئی وجہ ...."

"وجہ مجھے معلوم ہے۔ میں نے آپ لوگوں سے پوچھے بغیر کلیم کے ساتھ جانے کا فیصلہ جو کرلیا۔"

میں نے کہا "کاجل! ویسے تو تم عاقل وبالغ ہو' تمہیں اپنی زندگی پر پورا اختیار حاصل ہے اور تم بالکل پابند نہیں ہو کہ کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے کسی سے مشورہ لو لیکن میں جو بات محسوس کرتا ہوں وہ ضرور کہوں گا۔ تم نے یہ فیصلہ عُجلت میں اور جذبات کی رو میں بہہ کے کیا ہے۔ آج تک کلیم تمہاری ذمّے داری تھا لیکن اب تم نے اپنی ذمّے داری کا بوجھ کلیم پر ڈال دیا ہے۔ کیا تم یہ بات سمجھتی ہو؟"

"میں کسی پر بار نہیں بنوں گی۔"

"جہاں تم جارہی ہو وہ ڈھاکا' کراچی یا لاہور جیسا شہر نہیں ہے" میں نے کہا "تمہاری ساری زندگی ایک بالکل مختلف دنیا میں گزری ہے۔"

"مجھے معلوم ہے کہ مجھے غیر علاقے میں جدید زندگی کی ساری آسائشوں سے محروم ہوکے گھر کی چار دیواری میں بند رہنا پڑے گا۔ کلیم مجھے بتا چکا ہے کہ وہاں کیا ہوگا اور کیا نہیں ہوگا۔"

"میں سمجھتا ہوں کہ زندگی کی ناکامیوں نے تم سے جینے کی اُمنگ چھین لی ہے تمہاری خواہشات کا گلا گھونٹ دیا ہے' اپنا سب کچھ گنوا دینے کے بعد تم عملاً ترکِ دنیا پر کمربستہ ہو اور وہی طرزِ زندگی تمہیں سکون' طمانیت اور تحفظ کا ضامن نظر آتا ہے جو رہبانیت کے قریب ہے۔ تم تصویر کا دوسرا رُخ نہیں دیکھ رہی ہو" میں نے کہا۔

"کاجل کو تمہارے دلائل اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور نہیں کرسکتے" رابعہ بولی۔

"کاجل اپنا فیصلہ نہ بدلے مگر میرا فرض بنتا ہے کہ میں وہ حقائق بھی اس کے سامنے لاؤں جو اس کی نگاہ سے اوجھل ہیں۔ ایک فرق تو معاشرے کی اخلاقی اقدار کا ہے۔ فرض کرو تم ساری پابندیاں قبول کرلیتی ہو۔ اس کے باوجود مضبوط خاندانی اور قبائلی رشتوں کی شناخت رکھنے والے اس ماحول میں تمہاری حیثیت کیا ہوگی؟ تمہیں اپنے آس پاس ایک بھی شخص ایسا نظر نہیں آئے گا جو اپنا کوئی حوالہ نہ رکھتا ہو۔ جدی پُشتی رشتوں اور حسب نسب کی ضمانت رکھنے والے خاندانی ماحول میں تم خود کو کیسے سب کے لیے قابل قبول بناؤ گی؟"

"کیا میری ضمانت کلیم اللہ نہیں ہوگا؟"

"کس رشتے سے؟" میں نے کہا "کلیم اللہ کیا جانتا ہے تمہارے بارے میں؟ وہ کیا بتائے گا کسی کو کہ تم کون ہو اور کیا ہو؟ اس کے باپ نے تو کلیم کو ہمارے حوالے کیا تھا کہ یہ امانت ہے ان کی ہم ان کے ساتھ خون کا رشتہ رکھتے ہیں۔ تمہارا جذباتی تعلق میرے لیے قابل احترام سہی لیکن خونی رشتوں کے مقابلے میں کچھ نہیں سمجھا جائے گا۔ تم کو اس اجنبی ماحول میں جگہ نہیں ملے گی' اس لیے کہ تم بے حوالہ ہو۔ تم لاکھ کلیم سے جذباتی وابستگی اور محبت کا اظہار کرو کسی رشتے کا دعویٰ نہیں کرسکو گی اور کرو گی تو وہ مسترد ہو جائے گا۔ یہاں تم خود کو کلیم کی ماں کہتی ہو تو لوگ تمہارے جذبات کا احترام کرتے ہوئے تمہارے خلوصِ نیت پر شک نہیں کرتے۔ کلیم کے خاندان کے لوگ تمہیں یہ حق نہیں دیں گے۔ ممکن ہے تم کو دھتکار دیا جائے کہ تو کہاں سے آگئی اس کی ماں بن کے۔ یہ ایک پٹھان کا بیٹا ہے اور اس کی ماں بھی پٹھان تھی۔ تم نے ایک آزاد خیال معاشرے میں جتنی زندگی گزاری ہے' انگریزی اسکولوں اور کالج میں جو تعلیم حاصل کی ہے اور ہندوؤں کی تہذیبی معاشرت سے جو قریبی تعلق رکھتی ہے' وہ سب تمہارا جرم بن جائے گا۔ کلیم کی پھوپی کہے گی کہ یہ میرے سگے بھائی کا بیٹا ہے' کسی بنگالن کا نہیں۔"

"اگر کسی نے ایسا کہا تو میں..." کلیم مشتعل ہوگیا۔

میں نے اس کی بات کاٹ دی "تم کچھ بھی نہیں کرسکو گے بیٹا کلیم کیونکہ اپنے خاندان اور اپنے رشتوں کے حِصار میں تمہاری حیثیت ایک بچے سے زیادہ نہیں ہوگی اور تمہارے بزرگ ہی سب کچھ ہوں گے۔ سب سے پہلے تمہاری پھوپی' پھر خاندان کے بڑے' قبیلے کے بزرگ اور سردار اور پھر جرگہ تمہاری زندگی کا ہر فیصلہ کرے گا۔ اس معاشرے میں فرد کی آزادی کا تصور بالکل مختلف ہے۔ تم کو مجبور کردیا جائے گا کہ تم اپنے خون کے رشتوں کا پاس کرتے ہوئے ان کے ہر فیصلے کے سامنے سر جھکاؤ۔ کل کو تمہاری شادی کسی چچا تایا کی بیٹی سے ہوجائے گی تو تم پر ایک خاندان کی ذمے داری ہوگی اور تم مانو نہ مانو' تمہارا گھر تمہاری بیوی کا ہوگا اور تمہارے بچوں کا ہوگا۔ اس میں شاید کاجل کے لیے کوئی جگہ نہ ہو جو تمہیں اپنے ساتھ لے کر مشرقی پاکستان سے آئی تھی۔ اس سے زیادہ کاجل کا تمہاری زندگی سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔ نہ اس وقت جب تمہارے والدین زندہ تھے..."

"بس کرو..... بس کرو..." کاجل نے چلّا کے کہا اور اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کے رونے لگی۔

کلیم نے بگڑ کے کہا "چاچا! تم ایسا بات مت کرو۔"

میں نے بُرا مانے بغیر کہا "کلیم بیٹا! میں چاہتا ہوں' کاجل آج ہی رو لے۔ آج اس کے رونے میں دکھ کے ساتھ عزت ہے اور راحت ہے۔ بعد میں یہ بے عزت ہو کے روئے گی اور دکھ اُٹھا کے روئے گی۔ اور شاید بے آبرو ہو کے اور مجبور ہو کے پھر اپنی پُرانی دنیا میں لوٹے گی تو زیادہ دل شکستہ اور تنہا محسوس کرے گی۔"

مجھے اپنے الفاظ کے سفاک نشتر سے کاجل کے جذبات کا خون کرتے ہوئے اتنا ہی دکھ تھا جتنا کسی سرجن کو ایک ناسور کو کاٹ کے کسی کو جسم کی معذوری سے اور موت سے بچاتے ہوئے ہوتا ہے۔ کاجل درد سے تڑپ رہی تھی اور تکلیف سے چلّا رہی تھی مگر میں جانتا تھا کہ اس کے مستقبل کو مایوسی اور پچھتاوے کے عذاب سے بچانے کے لیے تلخ حقائق کی یہ گولی اسے نگلنی ہی ہوگی۔

دوپہر کے کھانے کا وقت ہوگیا تھا۔ ریسٹ ہاؤس کے ملازم نے ہمیں اطلاع دی کہ کھانا میز پر لگا دیا گیا ہے۔ بھوک کسی کو بھی نہیں تھی مگر میں نے رابعہ کو اشارہ کیا۔

"بھئی یہ سب تو دنیا کے جھمیلے ہیں' زندگی کے ساتھ رہیں گے مگر زندگی کے لیے کھانا زیادہ ضروری ہے۔"

"بھوک تو مجھے بھی لگی ہے" رابعہ نے اُٹھتے ہوئے کہا "آؤ کاجل۔ تم بھی کچھ کھالو کلیم۔"

"مجھے بھوک نہیں ہے" کاجل نے روتے روتے کہا "آپ کھالیں۔"

"ہم بھی نہیں کھائے گا دیدی کے بغیر" کلیم بولا۔

"تمہاری مرضی۔ ہم زبردستی تو کچھ بھی نہیں کرسکتے۔" میں نے کہا اور انہیں کمرے میں تنہا چھوڑ کے رابعہ کے ساتھ دوسرے کمرے میں کھانے کی میز پر جا بیٹھا۔

"کاجل بہت جذباتی لڑکی ہے" رابعہ نے کہا "کلیم تو خیر بچہ ہے۔"

"کلیم نے اسے زندگی میں پہلی بار بے غرض محبت اور اپنائیت کا وہ احساس دیا جس سے کاجل ہمیشہ محروم رہی تھی۔ اس کا اثر تو ہونا تھا" میں نے کہا۔

"ابھی دو دن ہم یہاں نظربند رہیں گے" رابعہ بولی۔

"اسے فرصت شمار کرو۔ بے فکری اور عافیت کے ایسے دن تو ہم سے روٹھ گئے ہیں" میں نے کہا "یہاں آرام سے رہیں گے' گھومیں پھریں گے' باتیں کریں گے۔ وارسک ڈیم جاسکتے ہیں ہم یا اگر شاپنگ کا موڈ ہو تو لنڈی کوتل۔ گاڑی موجود ہے۔"

رابعہ بولی "مجھے نہیں جانا کہیں بھی۔ پھر کوئی پیچھے لگ جائے گا۔"

"میرا خیال ہے کہ وہ اپنا کام کرکے گئے ہیں۔ اس یقین کے ساتھ کہ انہوں نے ہمیں مرحوم و مغفور کردیا۔"

"کیا واقعی وہ اتنے بے وقوف ہیں کہ مفروضات کو حقائق سمجھ لیں" رابعہ بولی "تمہارا خیال محض خوش فہمی ہے۔"

"نہیں۔ آفریدی کا مارا جانا کسی غلط فہمی کا نتیجہ نہیں تھا۔ تم نے شاید نوٹ کیا ہو کہ وہ عام قسم کی گاڑی نہیں تھی۔ وہ بڑی شاندار اسٹیشن ویگن تھی' لینڈ روور۔ اس سُپر لگژری ماڈل کے شیشے ڈارک تھے اور اندر پردے بھی پڑے ہوئے تھے۔ خان' ارباب اور سردار قسم کے لوگ ایسی ہی گاڑیاں رکھتے ہیں۔ خاص طور پر فیملی کے استعمال کے لیے۔ استاد پیڈرو نے جب گرین ہوٹل کے باہر ہماری گاڑی دیکھی ہوگی تو یقیناً وہ بہت خوش ہوا ہوگا کہ ہم پھر اس کو جُل دے کر غائب ہونے میں ناکام رہے اور اس نے پھر بڑی آسانی سے ہمیں تلاش کرلیا۔ لاہور یا کراچی میں شاید اسے ساری رات تلاش کرتے گزر جاتی۔ یہاں اچھے ہوٹل ہی کتنے ہیں۔ گرین ہوٹل میں اس کو کمرا کیسے ملا' یہ مجھے نہیں معلوم۔ مجھے تو آفریدی والا کمرا دے دیا گیا تھا کیونکہ ریزرویشن کرانے کے بعد وہ پہنچا نہیں تھا۔"

"پیڈرو جیسے لوگوں کے لیے یہ اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہوتا جو کام دھن سے بھی نہ نکلے وہ دھونس اور دھاندلی سے نکال لیتے ہیں۔"

"انہوں نے یہ بھی معلوم کرلیا ہوگا کہ ہم اور آفریدی ایک ہی کمرے میں ٹھہرے ہیں۔ ہم سے مطلب ہم سب۔ یہ اندازہ انہیں کیسے ہوسکتا تھا کہ تم اور کاجل دوسری جگہ ہو۔ بس انہوں نے فرض کرلیا کہ جہاں میں وہیں باقی سب اور اسی مفروضے کی وجہ سے ہم سب کی جان بچ گئی۔ وہ تو ہماری گاڑی پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ اچانک انہیں پتا چلا کہ آفریدی بھی غائب ہے۔ اس کی گاڑی بھی اور ہم بھی۔ شاید انہوں نے آفریدی کی گاڑی کو روانہ ہوتے دیکھ لیا اور یہ سمجھے کہ وہ ہم سب کو اپنے ساتھ لے جارہا ہے' انہیں دھوکا دینے کے لیے ہم نے اپنی گاڑی وہیں چھوڑ دی ہے۔ وہ فوراً آفریدی کی گاڑی کے پیچھے لگ گئے اور جب اس کے ساتھ میں ڈینز ہوٹل پہنچا تو ان پر اپنے اندازے کی غلطی کا راز کھلا۔ تاہم انہوں نے موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ یہ بم وہ ہماری گاڑی میں فٹ کرچکے ہوں گے یا کرتے.... اسے انہوں نے آفریدی کی گاڑی میں نصب کردیا۔ اب اسے پھر تائیدِ ایزدی کہو یا وہی بات کہ جسے خدا رکھے اسے کون چکھے۔ ہمارا وقت آنے سے پہلے کوئی شکاری ہمیں کیسے شکار کرسکتا تھا۔ یہ ہوسکتا تھا کہ ہم سب آفریدی کے ساتھ ہی نکلتے اور اُدھر وہ سوئچ میں چابی گھماتا اُدھر تم... مگر سردار آفریدی سے پہلے آفریدی کو ایک احتیاط کا خیال آگیا اور وہ باہر کھڑی ہوئی گاڑی کو اندر پورچ میں لانے چلاگیا۔ اس کی یہ احتیاط ہی ہمارے لیے زندگی کی ضمانت بن گئی اور خود اس کے لیے موت کا بُلاوا۔"

"کیا انہوں نے ہمارے روانہ ہونے کا انتظار کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا؟"

"بعض اوقات آدمی کامیابی کے نشے یا طاقت کے غرور میں اپنی ناکامی کے امکانات کو نظر انداز کردیتا ہے اور عقل اسے فریب دیتی ہے۔ وہ ننانوے فی صد کو سو فیصد سمجھ لیتا ہے حالانکہ ایک فیصد امکانات ہی کا نام تقدیر ہے۔ وہ مطمئن ہو کے جائے واردات سے فرار ہوگئے اور شاید اب تک چوہدری دلاور کو رپورٹ دے چکے ہوں گے کہ وہ اپنا فرض ادا کر آئے۔ بس ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"وہ کیا ہے؟"

"آخر پیڈرو نے خود کو ہم پر ظاہر کیوں کیا؟ یہ کام وہ خاموشی سے روپوش رہ کے اور سامنے آئے بغیر بھی تو کرسکتا تھا۔ اس نے تو عمداً اپنی موجودگی کا احساس دلایا اور ہمیں بتایا کہ وہ ہمارا تعاقب کررہے ہیں۔ اگر ان کا مقصد ہمیں مارنا ہی ہوتا تو یہ کام وہ راستے میں بڑی آسانی سے کرسکتے تھے۔ وہ کہیں بھی ہماری گاڑی پر دستی بم پھینک کر نکل جاتے یا ہمیں مشین گن کا برسٹ مار کے چھلنی کردیتے۔ ہماری جان لینا تو بہت آسان کام تھا مگر چوہدری دلاور نے ہمیشہ اس سے گریز کیا۔ خود اپنی جان بچانے کے لیے۔ اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ جس دن ہم میں سے کوئی مارا گیا اس دن کے بعد وہ خود کہیں چلا جائے' کچھ بھی کرلے' اپنی جان نہیں بچاسکتا۔"

میز پر کھانے کے لیے بہت کچھ تھا اور سرکاری خرچ پر ہونے والی اس ضیافت میں کفایت کا خیال رکھنے والا سرکار کا خیر خواہ کون ہوسکتا تھا۔ چنانچہ ہر چیز بکثرت اور بہ افراط تھی لیکن ابھی تک نہ میں نے کسی چیز کو چھُوا تھا اور نہ رابعہ نے۔ میرا مقصد کاجل اور کلیم کو اکیلے میں یہ سوچنے کا موقع فراہم کرنا تھا کہ میری تلخ محسوس ہونے والی باتوں میں خیر خواہی کا عنصر کتنا ہے۔

مجھے اس وقت ایک خوش گوار حیرت ہوئی جب کلیم کے ساتھ کاجل نے کمرے میں قدم رکھا۔ کلیم اسے کھینچ کر کھانے کی میز تک لایا تھا۔ کاجل کی آنکھیں اب بھی پُرنم اور سُرخ تھیں مگر وہ کلیم کے اصرار سے مجبور ہوگئی تھی۔ کشیدگی کے اعصابی دباؤ کو کم کرنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ باتوں کا موضوع' لہجہ اور موڈ بدل دیا جائے۔

میں نے کہا "دیکھا۔ میں کیا کہہ رہا تھا۔ کاجل کو لائے گا کلیم اور کاجل اس لیے آئے گی کہ ہم بھوکے نہ بیٹھے رہیں۔"

کاجل نے آہستہ سے کہا "آپ لوگ کھایئے۔"

میں نے کہا "بے وقوف لڑکی بھلا یہ ہوسکتا تھا کہ تمہارے بغیر ہم ایک لقمہ بھی حلق سے اُتارتے۔"

رابعہ نے محبت سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا "آؤ بیٹھو میرے پاس۔ دیکھو کیسی پُر تکلف دعوت کا اہتمام ہے۔"

"لگتا ہے چوہدری دلاور کے باپ کا ولیمہ ہے" میں نے کہا "مگر اس کی تو شادی ہی نہیں ہوئی تھی۔ مثال غلط ہو گئی۔"

رابعہ ہنسی "کسی اور کا ولیمہ سمجھ کے کھا لو۔"

"چلو یہ ٹھیک ہے۔ سمجھ لو میرا ولیمہ" میں نے کہا "اف! پھر غلطی ہو گئی شاید۔ کیوں کاجل؟"

کاجل مسکرانے لگی "رابعہ باجی سے پوچھیں نا۔"

"کلیم بیٹا! تم پوچھ لو۔ تم معصوم بچے ہو نا' تمہاری بات کا بُرا نہیں مانیں گی" میں نے کہا "مجھے تو ڈر لگتا ہے۔"

ذرا سی دیر میں ماحول بدل گیا اور اگرچہ پہلے جیسا نہیں رہا مگر یہ تبدیلی اُمید افزا تھی اور بہتری کی کوشش میں معاون ثابت ہو سکتی تھی۔ کاجل نے تھوڑا بہت کھایا اور پھر ہمارے مشورے کو قبول کرتے ہوئے آرام کے لیے چلی گئی۔

ریسٹ ہاؤس کا دوسرا بیڈ روم بند تھا۔ میں رابعہ کے ساتھ برآمدے میں پڑی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گیا اور اپنے سامنے پھیلے ہوئے سرسبز و شاداب منظر سے اپنے اعصاب کے لیے سکون کشید کرنے لگا۔ گردشِ حالات نے اس نعمت سے مجھے پھر محروم کر دیا تھا اور یہ کسی حد تک میری اپنی عجلت پسندی یا کوتاہ اندیشی تھی کہ میں نے مسلسل جدوجہد اور صعوبت کے طویل سفر اور پُرخطر آزمائشوں کے طویل دور سے خیر و عافیت کے ساتھ لوٹ آنے کے بعد چند دن بھی گوشۂ گمنامی میں آرام سے نہیں گزارے۔ کتنا اچھا ہوتا کہ کسی کو بھی ہماری واپسی کا پتا نہ چلتا۔ ہم دس پندرہ دن یا مہینہ دو مہینہ ذہنی و اعصابی تھکن کو دور کرنے میں گزارتے' خاموشی سے اپنی پُرانی' پُرسکون اور پُرمسرت زندگی کے ایام کی پرانی یادوں کو تازہ کرتے اور جب تازہ دم ہو جاتے تو پھر چوہدری دلاور اینڈ کمپنی سے پرانے قرض مع سود وصول کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہو جاتے مگر نصیب میں قرار نہ تھا' مزاج میں شورش تھی اور فطرت میں حوصلہ آزمائی کا جنوں۔

نتیجہ یہ کہ ہم پھر مفرور اور یہاں روپوش تھے۔ لاہور میں رابعہ کے گھر کی جگہ پر چوہدری غلام محمد یا گولا ٹنڈوالا کے غاصبانہ قبضے سے رابعہ کا حق متاثر نہیں ہوتا تھا اور اس قانونی مسئلے سے آسانی کے ساتھ بھی نمٹا جا سکتا تھا مگر ایک وقتی اور فوری خواہش سے مغلوب ہو کے میں نے رابعہ کے ساتھ وہاں داخل ہونے کی غلطی کی اور اپنے آپ کو مشکل میں ڈالا۔ اب چاندنی بیگم کے قتل کا الزام بھی ہم پر تھا اور اس جُرم کی واقعاتی شہادت سراسر ہمارے خلاف تھی۔ کسی حد تک منظر اور وقار یوسف بھی اعانتِ مجرمانہ کے مرتکب ہو چکے تھے۔ منظر پر الزام آ سکتا تھا کہ اس نے ہمیں پناہ دی اور وقار یوسف نے ہمیں فرار ہونے میں مدد دی۔ اس کی کار گرین ہوٹل پشاور کے سامنے لاوارث کھڑی رہ گئی تھی اور ایک واقعاتی شہادت فراہم کرتی تھی۔

یہ خیال آتے ہی میری تشویش دوچند ہو گئی۔ میں نے کہا "رابعہ! میں نے وقار یوسف سے گاڑی نہ لی ہوتی تو اچھا تھا۔ وہ کیا صفائی پیش کرے گا جب یہ سوال اُٹھے گا کہ آخر وہ گاڑی پنڈی سے پشاور کیسے پہنچ گئی؟ اور کیا شرافت حسین نقوی وہی سکندر بخت نہیں تھا جو فرضی نام سے گرین ہوٹل میں قیام پذیر ہوا تھا؟ آفریدی نام کے ایک شخص کے ساتھ جو بعد میں بم کے دھماکے سے ہلاک ہو گیا۔"

رابعہ نے کہا "کیا وہ گاڑی پولیس نے تحویل میں لے لی ہو گی؟"

"پتا نہیں۔ ہو سکتا ہے ابھی وہیں کھڑی ہو" میں نے کہا۔

"کیا گرین ہوٹل والوں نے تمہیں اِس گاڑی سے اُترتے دیکھا تھا؟ ان کو معلوم تھا کہ وہ تمہاری گاڑی ہے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا "نہیں۔ لیکن استاد پیڈرو اور اس کے ساتھیوں کو یقیناً علم تھا۔"

"کیا انہوں نے ہوٹل والوں سے پوچھا ہو گا؟"

"مجھے کیا معلوم۔ ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ کیا حرج ہے' اگر میں جاؤں اور گاڑی لے آؤں؟"

"تم خود؟"

"ہاں۔ چابیاں میرے پاس ہیں۔ شام تک شاید کوئی نوٹس نہ لے کہ گاڑی کب سے کھڑی ہے۔ دن میں وہاں گاڑیاں آتی جاتی رہتی ہوں گی لیکن آج رات اور کل بھی ایک گاڑی اپنی جگہ موجود رہی تو عین ممکن ہے کہ خود ہوٹل والے پولیس کو مطلع کر دیں۔ لاوارث کھڑی ہوئی گاڑی کو چوری کی سمجھا جا سکتا ہے" میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"دیکھو' یہ خطرہ مول مت لو۔" رابعہ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"خطرہ بعد میں زیادہ ہو گا۔ خود ہمارے خلاف ایک شہادت بن جائے گی وہ گاڑی اور بے چارہ وقار یوسف خواہ مخواہ لپیٹ میں آ جائے گا۔" میں نے کہا "تم فکر مت کرو میں محتاط رہوں گا۔ پانچ چھ میل آنے جانے میں وقت ہی کتنا لگتا ہے۔"

رابعہ نے کہا "تم اِسی گاڑی میں جاؤ گے؟"

"ہاں۔ شام تک کا کرایہ دیں گے تو شام تک استعمال بھی کریں گے۔"

"ایسا کیوں نہیں کرتے' اس ڈرائیور کو چابیاں دے کر بھیج دو۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "اگر وہ پکڑا گیا کسی بھی وجہ سے تو پولیس کو سیدھا یہاں لے آئے گا۔"

"ایک آئیڈیا اور آیا ہے میرے ذہن میں۔ وقار یوسف کو فون کر دو۔ فون ہے یہاں؟"

"فون کر کے کیا کہوں؟"

"اس سے کہو کہ گاڑی کے چوری ہو جانے کی رپورٹ درج کرا دے" رابعہ بولی "اسے ساری بات بھی بتا دو۔ وہ سمجھ دار ہے۔ اس سے کہو کہ منظر سے مشورہ کر کے کسی تھانے میں گزشتہ رات کی یا آج صبح کی تاریخ اور وقت ڈلوا دے۔ اثر و رسوخ اور پیسہ دونوں ہی کام آ سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "خیال اچھا ہے مگر کیا کسی تھانے میں کل رات کے بعد کوئی رپورٹ درج نہیں کی گئی ہو گی؟ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ وقت آگے پیچھے ہو جائے۔"

"یہ چانس کی بات ہے۔ اگر کل رات کا اندراج ممکن نہ ہو تو آج صبح نو دس بجے درج کرائی جانے والی رپورٹ سے بھی اس کی جان بچ سکتی ہے۔ وہ کہہ سکتا ہے کہ مجھے نہیں معلوم رات گاڑی کس وقت چوری ہوئی تھی۔ میں تو جب صبح عدالت جانے کے لیے نکلا تو دیکھا گاڑی گیراج میں نہیں ہے۔"

"یہ بالکل ٹھیک کہا تم نے۔ مگر پہلے یہ دیکھ لیا جائے کہ گاڑی کہاں ہے۔ پولیس کے پاس یا اپنی جگہ۔ وہیں موجود ہے تو اسے لانا بہتر ہو گا۔ رپورٹ وغیرہ کا کوئی جھنجھٹ نہیں ہو گا۔ یہ ٹھیک ہے کہ رپورٹ سے قانونی طور پر وقار یوسف براہِ راست ملوث نہیں ہو گا اور اس پر اعانتِ مجرمانہ کا الزام نہیں آئے گا مگر وہ اس کے باوجود شک سے بالاتر نہیں ہو گا۔ آخر وہ تمہارا ہی ماتحت ہے اور دوست ہے ہمارا۔"

"تم ڈرائیور سے بات تو کر کے دیکھو۔ اسے سو دو سو کا لالچ دو' بتا دو کہ یہ ذرا ہوشیاری کا کام ہے۔"

"کیوں بلاوجہ اس کی نظر میں اپنی حیثیت مشکوک بنائی جائے۔ میں خود اس کام میں کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتا۔ ایک گاڑی سے اُتر کے دوسری تک جانے میں کتنا وقت لگتا ہے۔ چند سیکنڈ کی بات ہو گی۔ کون غور کرے گا میری صورت پر۔"

"اگر یہی بات ہے تو پھر تم بیٹھو' میں جا کے گاڑی لے آتی ہوں۔ برقعے میں مجھے تو کوئی دیکھ بھی نہیں سکتا۔"

"رابعہ! یہاں برقع پوش گاڑیاں چلانے والی کتنی خواتین ہوں گی۔"

"بہت کم ہوں گی تو دو چار ہوں گی۔ ہوں گی ضرور اور وہ عام گھروں کی خواتین نہیں ہوں گی۔ اتنی ہمت کسی میں نہیں ہو گی کہ ان سے سوال کر سکے کہ یہ آپ اپنی گاڑی لے جا رہی ہیں یا کسی اور کی" رابعہ نے کہا۔

"بات تو تمہاری دل کو لگتی ہے مگر....."

"اگر مگر کچھ نہیں۔ میں جا کے ابھی آتی ہوں۔ گاڑی نہ ملی اپنی جگہ پر تو میں کہیں سے فون کر دوں گی۔ تم اُسی وقت لاہور میں وقار یوسف کا نمبر ملا لینا' شام کے وقت وہ آفس میں ہو گا۔ منظر بھی وہیں مل جائے گا۔"

میں نے کہا "میں تمہیں اکیلا نہیں جانے دوں گا۔ ہم دونوں چلتے ہیں۔ میں گاڑی سے نہیں اُتروں گا۔ اگر وقار یوسف کی کار گرین ہوٹل کے سامنے نظر آ گئی تو تم چابی لے جانا اور ہمارے پیچھے پیچھے کچھ دور آنے کے بعد گاڑی روک لینا۔ میں بھی ساتھ آ جاؤں گا۔"

"کوئی ضرورت نہیں راستے میں رُکنے کی' مجھے ڈرائیونگ آتی ہے اور جب تم پیچھے آؤ گے تو میرے لیے ڈر کی بات کوئی نہیں ہو گی" رابعہ بولی۔

کاجل ایک بیڈ پر سو رہی تھی اور کلیم اللہ صوفے پر تھا۔ میں نے ریسٹ ہاؤس کے ملازم کو بلا کے کہا کہ ہم ایک ضروری کام سے صدر تک جا رہے ہیں۔ بیگم صاحبہ جاگ جائیں تو انہیں بتا دینا کہ ہم ایک ڈیڑھ گھنٹے تک لوٹیں گے اور کوئی مہمان آ جائے تو بٹھا لینا۔ مہمان والی بات فقط زیبِ داستاں کے لیے ہی تھی ورنہ یہاں ہم مسافرانِ غریب الدیار کا صورت آشنا بھی کون تھا۔

پرائیویٹ کار ہم نے دن بھر کے لیے لی تھی مگر اس کا استعمال بہت کم کیا تھا۔ کینٹ اسٹیشن سے پولیٹکل ایجنٹ کے آفس تک اور وہاں سے ریسٹ ہاؤس تک دس میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ڈرائیور فارغ بیٹھا تھا۔ وہ باتونی آدمی تھا مگر اس نے ایک حساس موضوع چھیڑ کے ہمیں شرمندہ کرنے کی کوشش کی تھی اور ہم مجبور ہو گئے تھے کہ اس کی زبان کو لگام دیں۔ اس کے بعد سے ہمارے تعلقات دوستانہ نہیں رہے تھے' محض کاروباری ہو گئے تھے۔

ہمیں دیکھتے ہی اس نے پچھلا دروازہ کھول دیا اور خود کپڑے سے ونڈ اسکرین صاف کرنے لگا۔ "ابھی کدھر جائے گا؟"

میں نے کہا "صدر بازار۔"

رابعہ نے کہا "کھانا کھا لیا تھا تم نے؟"

"ہاں جی۔ اور پیسہ بھی دے دیا تھا" وہ بولا۔

"پیسہ!" میں نے کہا "تم سے کھانے کی قیمت مانگی تھی کسی نے؟"

"مانگا نہیں تھا' ہم خود دیا" اس نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

"بابا یہاں سرکاری انتظام ہے۔ یہ کوئی ہوٹل نہیں ہے۔ اس نے پیسے جیب میں ڈال لیے ہوں گے" میں نے کہا۔

"واپس دلوا دیں گے تمہیں' فکر مت کرو۔ بلکہ یہ لو۔ اس سے ہم وصول کر لیں گے۔" رابعہ نے اسے پانچ کا نوٹ دیا جو اس نے مہربانی کا کہہ کر رکھ لیا۔

شام کے وقت صدر کی رونق بڑھ گئی تھی اور گاڑیاں بھی زیادہ نظر آ رہی تھیں۔ میں نے کچھ فیشن ایبل خواتین کو بغیر پردے کے بھی دیکھا۔ جناح اسٹریٹ اور اس سے ملحق تھوڑے سے علاقے میں پشاور کی تہذیبی اور معاشرتی زندگی میں جدید دور کی وہی جھلک محسوس ہوتی تھی جو لاہور کے انارکلی اور کراچی کے بوہری بازار میں دکھائی دیتی تھی۔ دکانیں بڑی چمک دمک والی اور غیر ملکی سامان

سے بھری پڑی تھیں۔

میں نے گاڑی کو گرین ہوٹل سے پہلے ایک جنرل اسٹور پر روکا۔ وہاں سے وقار یوسف کی کار صاف نظر آرہی تھی۔ یہ میرے لیے بڑے اطمینان کی بات تھی کہ ابھی تک کسی نے اس کو نہیں چھیڑا اور قابلِ غور نہیں سمجھا مگر دل میں ایک خلش سی تھی کہ کہیں ہمارے دشمن اس پر نظر نہ رکھے بیٹھے ہوں۔

میرا پہلا خیال یہی تھا کہ آفریدی کی گاڑی کو بم سے اُڑا دینے کا مقصد ہمارا خاتمہ کرنا تھا مگر ماضی کے آئینے میں چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کا کردار اور گزشتہ روز اُستاد پیڈرو کا رویّہ اس خیال کی نفی کرتا تھا۔ زیادہ قرینِ قیاس یہ تھا کہ وہ اپنی موجودگی کا احساس دلا کے وہ ہمیں ایک ذہنی خوف اور اعصابی دباؤ میں رکھنا چاہتے تھے۔ یہ بتانا چاہتے تھے کہ ہم کتنی بھی کوشش کرلیں' ان سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے' بچ کے کہیں نہیں جاسکتے اور ان کے رحم و کرم پر ہیں۔ آفریدی کو مار کے انہوں نے ایک پیغام دیا تھا کہ دیکھو' غور کرو اور سمجھو کہ یہ انجام تمہارا بھی ہوسکتا تھا۔ اس کے بعد غالباً وہ چلے گئے تھے۔ وہ جس مقصد کے لیے بھیجے گئے تھے وہ پورا ہوگیا تھا اور اس کی رپورٹ چوہدری دلاور کو مل گئی ہوگی کہ ہدایات کا خیال رکھتے ہوئے شکار کو مسلسل فرار پر مجبور کیا گیا۔ اسے ہر لحظہ شکارگاہ میں ہر سمت شکاری نظر آتے رہے اور کھیل ختم کرنے سے پہلے ایک شکار کرکے یہ باور بھی کرادیا گیا کہ خطا نہ تیر کی تھی نہ تیرانداز کی' بس ابھی انہیں نشانہ ہی نہیں بنایا گیا تھا۔

لیکن میں اپنی قیاس آرائی کو حساب کے فارمولے سے حاصل ہونے والے یا سائنسی تجربے اور مشاہدے کے نتائج کی طرح حتمی اور سوفیصد درست سمجھ کے مطمئن نہیں ہوسکتا تھا۔ اس امکان کو بہرحال مسترد نہیں کیا جاسکتا تھا کہ ممکن ہے استاد پیڈرو کے لیے وہ آخری سین نہ ہو۔ انہیں آفریدی کے قتل کے بعد بھی ڈراما جاری رکھنا ہوگا تو وہ ہماری واپسی کے منتظر ہوں گے۔

یہی وجہ تھی کہ جب رابعہ گاڑی سے اُتر کے اور مجھ سے چابیاں لے کر چلی گئی تو بالکل سامنے والے جنرل اسٹور سے میں نے اس پر نگاہ رکھی۔ میں نے رابعہ سے کہا تھا کہ وہ براہِ راست گاڑی تک نہ جائے بلکہ پہلے اِدھر اُدھر کی دکانوں میں شاپنگ کے بہانے رُک کے صورتِ حال کا جائزہ لے اور اگر اسے کوئی بھی مشکوک چہرہ دکھائی دے یا اس کی چھٹی حِس کسی خطرے کی خبر دے تو وہ گاڑی کو ہاتھ لگائے بغیر لوٹ آئے۔ اس نے برقع یوں اوڑھ رکھا تھا کہ آنکھوں کے سوا اس کے جسم اور چہرے کا کوئی حصہ نظر نہیں آتا تھا۔

اس دکان میں رُکنے کے لیے کچھ نہ کچھ خریدنا میرے لیے بھی ضروری تھا۔ میں نے ریڈی میڈ شلوار قمیص کی فرمائش کی۔ ان دِنوں پتلون یا سوٹ ہی سرکاری حکام' طبقۂ امرا اور اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کا لباس تھا۔ نجی و سرکاری تقریبات میں پایا ہر جاتے ہوئے شلوار قمیص جو عوامی سوٹ کے نام سے مشہور ہوئ' کوئی نہیں پہنتا تھا بلکہ اسے معیوب اور اس حد تک غیر شریفانہ سمجھا جاتا تھا کہ اعلیٰ درجے کے ہوٹلوں میں ڈنر کے لیے انگریزی لباس ہونا لازی تھا اور دروغ بر گردنِ راوی۔ اسمبلی کے ایک رُکن کو راولپنڈی کے ایک فرسٹ کلاس ریسٹورنٹ میں داخل ہونے سے اس لیے روک دیا گیا تھا کہ وہ شلوار قمیص پہنے ہوئے تھے۔

تاہم پشاور میں ایسا نہیں تھا۔ مجھے میرے سائز کے مطابق شلوار قمیص پیش کردیے گئے۔ شلوار غالباً دس گز کپڑے کی اور بہت بڑے گھیر والی تھی۔ جاپانی سفید کپڑا جو "کے ٹی چار ہزار" کہلاتا تھا' بے حد مقبول تھا اور کوئی وجہ نہ تھی کہ میں اسے پسند نہ کروں مگر میں کپڑے کی طرف کم اور باہر اس گاڑی کی طرف زیادہ دیکھ رہا تھا جو گرین ہوٹل کے سامنے کھڑی تھی۔

سیلز مین میری عدم دلچسپی سے پریشان ہوگیا "سر' کیا کپڑا پسند نہیں آیا؟"

"کپڑا .... نہیں کپڑا تو اچھا ہے" میں نے کہا "بہت اچھا ہے۔"

"کوئی اور رنگ دکھاؤں؟" اس نے کہا۔

رابعہ ایک دُکان سے کوئی پیکٹ ہاتھ میں لیے نکلی' چند سیکنڈ فٹ پاتھ پر کھڑی رہی اور پھر دوسری دُکان میں گھس گئی۔ میری نگاہ جو دو رویہ سڑک کے پار دیکھ رہی تھی پھر کپڑوں پر لوٹ آئی۔

"کیا تم نے کچھ پوچھا تھا؟" میں نے کہا۔

"آپ نے کہا تھا دوسرے رنگ دکھاؤ" سیلز مین بولا۔

"میں نے! سفید رنگ اچھا تھا۔ خیر' میں نے کہا تھا تم سے تو دکھاؤ" میں نے کہا۔

"تین رنگ آپ کے سامنے رکھے ہیں۔"

میں زبردستی مسکرایا "ہاں۔ رکھے تو ہیں۔ بالکل سامنے ہیں۔ نیلا اور یہ کریم کلر.... سب اچھے ہیں۔"

میری نگاہ پھر بھٹک گئی۔ رابعہ دوسری دُکان سے بھی نکل آئی تھی اور آہستہ آہستہ کار کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ کار سے چند قدم کے فاصلے پر تھی جب گرین ہوٹل سے پولیس کی وردی میں تین افراد باہر نکلے۔ ان میں سے ایک وردی سے بھی افسر لگتا تھا اور رویّے سے بھی۔ باقی دو ماتحت ایک فائل اُٹھائے اس سے ایک قدم پیچھے تھے۔ رابعہ نے وقار یوسف کی گاڑی کا دروازہ کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ وہ اس کی طرف بڑھے۔

میں نے گھبرا کے کہا "یہ کیا چکر ہے......"

سیلز مین نے ناگواری سے کہا "یہ تو آپ مجھے بتائیں کہ چکر کیا ہے۔ آپ کو سوٹ پسند ہے کوئی یا آپ صرف وقت گزاری کے لیے دکان میں آئے تھے؟ آپ کی توجہ کہیں اور ہے۔"

میں بے اختیار دروازے کی طرف بڑھا مگر پھر میں نے دیکھا کہ رابعہ کار میں بیٹھ چکی ہے اور پولیس والے اس سے تعرض کیے بغیر کچھ فاصلے پر دوسری گاڑی کی طرف چلے گئے ہیں تو میں لوٹ آیا۔ سیلز مین اب سوٹ واپس پیک کرکے رکھ رہا تھا۔

"کیا بات ہے' سوٹ بیچنا نہیں چاہتے تم؟" میں نے کہا۔

"آپ خریدنا کب چاہتے ہیں؟" اس نے بے رُخی سے کہا۔

"تمہارا کام سوٹ دکھانا ہے" میں نے اس کے غیر کاروباری اندازِ گفتگو پر احتجاج کیا۔

"میں تو دکھا رہا ہوں' آپ کہاں دیکھ رہے ہیں۔"

"یہ تم کس لہجے میں بات کررہے ہو؟"

"کیا غلط کہا ہے میں نے۔ نہ آپ نے کپڑا دیکھا' نہ قیمت پوچھی۔ اگر اچھے ہیں تو بتائیے دے دوں؟ کون سا دوں؟" اس کا لہجہ طنزیہ ہوگیا۔

"تینوں" مجھے غصہ آگیا "لیکن اس سے پہلے کہ میں قیمت ادا کروں' اپنے مالک کو بلاؤ۔ میں شکایت کروں گا کہ اس نے کیسے سیلز مین رکھے ہیں جو شرافت سے بات کرنا نہیں جانتے۔"

"اجی شوق سے شکایت کریں" اس نے تینوں سوٹ میری طرف کھسکا دیے "اور ادائیگی بھی انہی کو کردیں۔ اِسی دروازے کے پیچھے بیٹھے ہیں میرے والد۔ میں سیلز مین نہیں' ان کا بیٹا ہوں۔"

"مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر وہ خود بھی تمہاری جگہ ہوتے تو سیلز مین ہی کہلاتے اور سیلز مین شپ کے کچھ آداب ہیں۔ یہ لُنڈا بازار کی دکان نہیں ہے۔ یہاں عام لوگ نہیں آتے" میں نے برہمی سے کہا "اور جو لوگ یہاں دُگنی قیمت ادا کرتے ہیں وہ خوش اِخلاقی اور شائستگی کی توقع رکھتے ہیں۔"

اس وقت تک رابعہ بھی گاڑی لے کر آگئی تھی۔ اس نے وقار یوسف کی کار کو اسٹور کے عین سامنے پارک کیا اور دروازہ لاک کرکے اندر آگئی۔ اسٹور کے مالک کا بددماغ بیٹا فوراً اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"جی فرمایئے؟"

رابعہ نے دیکھ لیا تھا کہ میں غصے میں ہوں "کیا ہوا؟" اس نے انگریزی میں کہا۔

"ابھی تک تو کچھ نہیں ہوا ڈیئر" میں نے بھی انگریزی میں جواب دیا "بس تین سوٹ خریدے ہیں اس بدتمیز سیلز مین سے۔"

"پھر سُن لو' میں سیلز مین نہیں ہوں' مالک ہوں اس دُکان کا" نوجوان نے سرکشی سے کہا۔

رابعہ بولی "چلو چھوڑو۔ ابھی نوجوان ہے' سمجھ جائے گا۔"

"پہلے میں اس کے باپ کو سمجھادوں ورنہ اس کے سمجھتے سمجھتے تو دُکان پر لوگ آنا چھوڑدیں گے۔"

میری آواز سُن کے بند دروازے کے پیچھے سے ایک بھاری بھرکم' عمر رسیدہ شخص نکلا جس کے سر اور داڑھی کے سب بال سفید تھے۔

"کیا ہوگیا سر! اِدھر آیئے' مجھے بتایئے" اس نے دروازہ کھول کے مجھے اندر بلایا اور اپنے جانشین کو ملامت آمیز نظروں سے گھورا۔

نوجوان شوکیس پر کہنی ٹکا کے ظاہری بے نیازی سے باہر دیکھنے لگا۔ اس نے اندازہ تو کرلیا تھا کہ اس سے غلطی ہوچکی ہے۔ ہم الگ الگ کاروں میں آئے تھے اور رابعہ برقع میں ہونے کے باوجود اپنی گاڑی خود چلا کے لائی تھی۔ اپنے رنگ روپ' قدوقامت' انداز و اطوار اور اندازِ گفتگو سے بھی ہم عام لوگ نہیں لگتے تھے اور خواص پشاور میں بڑا اثر و رسوخ رکھتے ہیں۔

ایک مختصر سے کمرے میں مالک نے ہمیں دو کرسیوں پر بٹھایا اور ہمارے انکار کے باوجود ملازم کو اسپیشل چائے لانے کا آرڈر دیا۔ وہ خود میز کے دوسری طرف بیٹھ گیا۔ وہ حد درجہ منکسرالمزاج اور نرم خُو شخص تھا۔ زندگی کے تجربات نے اسے ہر طرح کی ناخوشگوار صورتِ حال سے نمٹنا اور ہر قسم کے لوگوں سے بات کرنے کا سلیقہ سکھادیا تھا۔ شاید یہی اس کی کاروباری خوش حالی اور ترقی کا راز تھا۔ یہ بات دوسری نسل کے وہ نوجوان نہیں سمجھتے تھے جنہوں نے دولت اپنی محنت سے خون پسینہ ایک کرکے نہیں کمائی تھی بلکہ پیدائشی طور پر دولت مندی انہیں ورثے میں ملی تھی۔

"سر! آپ کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ میں اس نالائق کی طرف سے آپ سے بھی معافی مانگتا ہوں اور بیگم صاحبہ! آپ سے بھی۔"

ظاہر ہے اس کے بعد میرا سب غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا "آپ کو کیا ضرورت ہے معافی مانگنے کی۔ غلطی آپ نے نہیں کی۔"

"نہیں سر.... غلطی ضرور مجھ سے ہوئی ہوگی کہیں نہ کہیں جس کا میں آج خمیازہ بھگت رہا ہوں" اس نے کہا "شاید میں کاروبار میں اتنا مصروف رہا کہ اولاد کی تربیت کے لیے وقت نہ نکال سکا۔ تعلیم تو اسکول سے فیس دے کر مل جاتی ہے لیکن تربیت گھر میں ہوتی ہے اور میں گھر کی طرف سے غافل رہا۔ اخراجات کے لیے جس نے جتنا مانگا دے دیا۔ سب کی جائز ناجائز ضروریات کی تکمیل کرتا رہا اور مطمئن ہوگیا کہ میں نے اپنی ذمے داری پوری کردی۔ ابتدا میں بیس بیس گھنٹے کام کیا تھا میں نے۔ سولہ گھنٹے تو اب بھی کرتا ہوں۔ باقی آٹھ گھنٹوں میں سونا کھانا پینا سب ہی کچھ شامل ہے۔"

میں نے کہا "یہ غلطی بہت سے لوگ کرتے ہیں۔"

"ہاں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ بیوی بچوں کو صرف ضروریاتِ زندگی اور آرام و آسائش کے اخراجات پورے کرنے کے لیے پیسہ دینا ہی کافی ہوتا ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ بیوی بچوں کو توجہ اور نگرانی بھی چاہیے۔ اس مقام تک آنے میں مجھے کئی سال لگے ہیں لیکن میرے بعد شاید اس کاروبار کو چوپٹ ہونے میں چند ماہ بھی نہیں

لگیں گے۔ یہ لوگ اس کاروبار کو ترقی دینا تو دور کی بات ہے' چلانے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتے اور یہ غلطی میری ہے کہ میں نے سیلز مین رکھے' ذمّے داری کا بوجھ اُٹھانے کے لیے اپنے بچّوں کی ٹریننگ نہیں کی۔ احساسِ ذمّے داری ایک دن میں پیدا نہیں ہوتا۔ کامیاب بزنس مین وہی بنتا ہے جو ایک کامیاب سیلز مین رہا ہو لیکن یہ بچّے توہین محسوس کرتے ہیں سیلز مین کہلاتے ہوئے۔"

اس شریف آدمی کے معذرت خواہانہ رویّے اور اعتراف کے بعد گلے شکوے کی گنجائش ہی نہ رہی تھی۔ اگر چائے نہ آگئی ہوتی تو ہم اس سے اجازت لیتے "آپ مجھے یہاں کے رہنے والے تو نہیں لگتے۔"

"میں تقریباً سات سال پہلے پشاور آیا تھا" اس نے چھوٹی سی پیالی میں سبز چائے ڈالتے ہوئے کہا "ڈبگری میں چھوٹی سی دکان تھی پھر قصہ خوانی بازار میں جگہ مل گئی مگر وہ کرائے کی دکان تھی۔ کچھ جھگڑا پڑ گیا تو میں نے یہ جگہ خرید لی۔ اس سے پہلے میں لاہور میں تھا۔ میرا نام آصف علی ہے۔"

باتوں کے دوران میں نے محسوس کیا تھا کہ اس کی نظر گھوم پھر کر میرے چہرے پر جم جاتی تھی' اس کی آنکھیں کچھ سوچنے لگتی تھیں اور یوں لگتا تھا جیسے ذہنی طور پر حاضر ہونے کے باوجود وہ غیر حاضر ہے۔ وہ بات مجھ سے کر رہا تھا مگر اس کا خیال کہیں اور تھا۔

میں نے الائچی کی خوشبو والی چائے پیتے ہوئے کہا "بات صرف اتنی تھی کہ میں سامنے گرین ہوٹل کی طرف دیکھ رہا تھا......"

وہ بولا "گرین ہوٹل.... ہاں' بڑی عجیب واردات ہوئی ہے۔"

"واردات!" میں نے کہا "کیسی واردات آصف علی صاحب؟"

"آپ کو نہیں معلوم۔ پھر آپ کیا دیکھ رہے تھے؟" وہ بولا۔

"میں تو اپنی وائف کو دیکھ رہا تھا۔ ان کی گاڑی نظر آگئی تھی مجھے دوسری طرف" میں نے کہا۔

رابعہ نے کہا "میں بھی تمہاری گاڑی دیکھ کر آگئی۔"

"ہوٹل سے پولیس کو نکلتے بھی دیکھا تھا میں نے۔"

آصف علی نے چائے کی چسکی لی "ہاں۔ تفتیش تو چلتی رہے گی۔"

میں نے واجبی سی دلچسپی ظاہر کی "ہوا کیا تھا؟"

"کچھ نہیں۔ اوپر والے کمرے میں کسی مسافر کا قتل ہوگیا ہے۔ وہ ایک ہفتے سے ٹھہرا ہوا تھا۔ کل کوئی شخص جو شکل وصورت سے ہی بدمعاش لگتا تھا۔ رات کے وقت ہوٹل پہنچا اور اس نے کمرا مانگا۔ کمرا کوئی خالی نہیں تھا چنانچہ منیجر نے معذرت کرلی۔ اس شخص نے ڈبل اور پھر چار گنا کرائے کی آفر کی اور کچھ مشتعل بھی ہوا منیجر کے انکار سے۔ منیجر میرا دوست ہے اور آج میری اس سے بات ہوئی تو اس نے کہا کہ وہ عجیب پاگل آدمی تھا۔

میں نے کہا کہ جناب کمرا ہوتا تو میں انکار ہی کیوں کرتا۔ یہ ہوٹل ہم نے اس لیے تو نہیں کھولا ہے کہ کمرے خالی پڑے رہیں اور مسافر لوٹ جائیں۔ کرایہ تو ہم نے ایک پیسہ زیادہ نہ کبھی لیا ہے' نہ لیں گے۔ آپ فردوسی ہوٹل میں دیکھ لیں۔ اس وقت تو وہ شخص چلا گیا....."

وہ اچانک خاموش ہوگیا اور اس کی نظریں جو خلا میں دیکھتی محسوس ہوتی تھیں پھر میرے چہرے پر ٹھہر گئیں۔ وہ بات بھی ایسے کر رہا تھا جیسے کوئی بہت پُرانا واقعہ سُنا رہا ہو اور تفصیلات دُہراتے ہوئے اسے یادداشت پر بھروسا نہ ہو۔ وہ کچھ سوچنے لگتا تھا اور جملوں کے درمیان وقفہ آجاتا تھا۔ اس کی یہ ذہنی کیفیت رابعہ نے بھی نوٹ کرلی تھی۔

میں نے کہا "کیا بات ہے آصف علی صاحب....؟"

"بات...... ہاں بات میں وہی بتا رہا تھا" وہ چونکا "قتل تو ہوتے رہتے ہیں یہاں۔ دشمنی میں یا طیش میں قتل کردینا کوئی غیر معمولی بات نہیں سمجھی جاتی مگر یہ معاملہ کچھ اور تھا۔ منیجر بے چارہ خواہ مخواہ پھنس گیا ہے۔ وہ پولیس کو کیا بتائے۔ وہ شخص لمبی سی ڈاج کار میں آیا تھا۔"

اب میرے چونکنے کی باری تھی "ڈاج! اس نے اپنا کیا نام بتایا تھا؟"

"کچھ نہیں۔ نام بتانے کی ضرورت ہی کہاں پیش آئی۔ اسے کمرا ملتا تو وہ نام لکھواتا۔" آصف علی نے کہا "وہ تو منیجر کے انکار پر خاصا مشتعل ہو کے چلا گیا تھا۔ بعد میں پھر آیا اور کہنے لگا کہ شرافت علی نقوی نام کا کوئی شخص ٹھہرا ہوا ہے یہاں۔ وہ بھی میرے ساتھ ہی آیا تھا۔ اسے تم نے کمرا دے دیا اور مجھے انکار کر رہے ہو۔ منیجر نے پھر وضاحت کی کہ وہ کمرا تو بک کرایا تھا آفریدی صاحب نے مگر وہ پہنچے نہیں تو نقوی صاحب کو دے دیا گیا۔ اب یہ اتفاق ہے کہ اسی وقت آفریدی صاحب آگئے لیکن انہوں نے آپس میں ڈبل روم شیئر کرنے کا فیصلہ کرلیا۔"

میں نے کہا "اس شخص کا حلیہ تو یاد ہوگا منیجر کو۔"

"ہاں۔ کالا حبشی تھا۔ منہ پر چیچک کے داغ' لمبا چوڑا ڈیل ڈول" آصف علی نے بتایا۔

"کانوں میں پیتل کی مندریاں۔ چھوٹے چھوٹے سخت برش جیسے بال' گھنگھریالے...."

رابعہ نے میز کے نیچے میرا پیر دبایا اور مجھے بولنے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔

"آپ جانتے ہیں اسے؟" آصف علی نے کہا۔

"ہاں۔ مجھے نظر آیا تھا اس حلیے کا ایک شخص۔" وہ لاہور کا نامی گرامی بدمعاش ہے" میں نے کہا "میں اسے یہاں دیکھ کے حیران ہوا تھا۔"

"پھر آپ پولیس کو ضرور بتائیں۔ منیجر سے مل لیں پہلے۔"

مل لوں گا۔ آپ مجھے باقی بات بھی بتادیں" میں نے کہا۔

منیجر نے اُسے دوبارہ انکار کیا تو وہ کہنے لگا کہ میرا ساتھی یہاں ہے۔ میں کہاں جاؤں۔ فردوسی ہوٹل میں بھی جگہ نہیں ہے۔ تم آفریدی کو اس کمرے سے نکالو اور مجھے وہاں جگہ دو۔ پاگل کا بچّہ۔ منیجر کیسے مان لیتا یہ بات۔ اس نے کہا کہ "یہ ناممکن ہے میرے لیے۔ پھر وہ بضد ہوا کہ اچھا ساتھ والے سے بات کرو۔ آفریدی اور نقوی ایک کمرے میں ٹھہر سکتے ہیں تو میں بھی کسی کے ساتھ ایک رات گزار سکتا ہوں۔ منیجر پریشان ہوگیا تھا۔ اس نے کہا میں ساتھ والے کسی کمرے کے مسافر سے خود جاکر نہیں کہہ سکتا کہ آپ کسی اور کو ساتھ رکھ لیں۔ تم خود نمبر ملاؤ اور بات کرلو لیکن میری کوئی ذمّے داری نہیں اور میرا حوالہ بھی مت دینا کہ منیجر نے کہا تھا۔ میں یہاں سے چلا جاتا ہوں۔ وہ ذرا سی دیر کے لیے اپنے کمرے میں گیا اور اس شخص نے فون پر نہ جانے کیا کہا کہ گیارہ نمبر کمرے والا مان گیا۔ چودہ نمبر میں اس کا ساتھی شرافت علی نقوی اور آفریدی مقیم تھے۔ ظاہر ہے اس کے بعد منیجر کیا کرتا۔ اس نے تو اپنی جان چھڑائی تھی لیکن اس شخص نے سو روپے دیے منیجر کو اور کہا کہ آج کے اخراجات میرے۔ منیجر نے سو روپے جیب میں ڈال لیے۔ گیارہ نمبر والا تو ایڈوانس دے چکا تھا ایک ہفتے کا۔ بہت بڑی غلطی کی منیجر نے اس شخص کی بات مان کے۔ اسے چاہیے تھا کہ دوبارہ صاف انکار کرتا اور کسی سے بات بھی نہ کرنے دیتا۔ اسی کا خمیازہ بھگتا بعد میں اس نے۔ گیارہ نمبر والے کا مہمان تو نہ جانے کب چلا گیا۔ رات والے منیجر کی ڈیوٹی صبح آٹھ بجے ختم ہوگئی تھی۔ دوسرا جو اس کی جگہ آیا اسے کچھ معلوم ہی نہ تھا۔ نو بجے ویٹر ناشتا لے کر گیا۔ گیارہ نمبر والا ہر روز اسی وقت ناشتا طلب کرتا تھا۔ ویٹر نے کمرا کھلا دیکھا اور منیجر کو اطلاع دی کہ گیارہ نمبر والا فوت ہوگیا ہے۔ بعد میں پولیس نے قتل کا مقدمہ بنادیا کیونکہ اُسے گلا گھونٹ کے مارا گیا تھا۔"

"کیوں؟" میں نے بے اختیار کہا "میرا مطلب ہے کہ اس اجنبی کو جس نے اسے جگہ دی تھی......"

"آپ تو جانتے ہوں گے اس بدمعاش کا نام۔"

"ہاں۔ استاد پیڈرو کہلاتا ہے وہ" میں نے کہا "کیا استاد پیڈرو اسی کو قتل کرنے آیا تھا؟"

"یہ تو پولیس اسی سے معلوم کرے گی" آصف علی بولا "یہ خاصا پُراسرار معاملہ ہے۔ گیارہ نمبر میں قتل ہونے والے شخص کے پاس خاصی نقد رقم تھی۔ وہ موجود تھی جس کا مطلب یہ ہے کہ قتل اس کی وجہ سے نہیں ہوا تھا بلکہ کوئی اور بات تھی۔ وہ دونوں بھی ایک دوسرے کو جانتے ہوں گے ورنہ ایک اجنبی کو عام حالات میں کوئی اپنے کمرے میں نہیں ٹھہرا سکتا۔"

"وہ شرافت علی نقوی کو بھی جانتا تھا؟"

"ہاں۔ اور اس سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ گیارہ نمبر والا اور شرافت علی نقوی بھی ایک دوسرے کو جانتے ہوں گے۔ یہ نقوی بھی جب ہوٹل میں آیا تو ڈرائیور کی وردی میں تھا مگر ڈرائیور لگتا نہیں تھا۔ یہ خود منیجر نے بتایا مجھے کہ اس نے آفریدی سے بڑی شائستگی سے بات کی تھی۔ وہ دونوں کراچی سے آئے تھے۔ ہے نا پُراسرار معاملہ؟"

میں نے کُریدنے کے لیے کہا "مجھے تو اس میں کوئی خاص پُراسرار بات نظر نہیں آئی۔"

"یہ پُراسرار معاملہ اس لیے زیادہ پُراسرار ہوتا جارہا ہے کہ صبح پہلے تو شرافت علی نقوی گیا۔ وہ ڈرائیور تھا مگر کسی گاڑی میں نہیں آیا تھا۔ کچھ دیر بعد آفریدی اپنی اسٹیشن ویگن میں ڈینز ہوٹل گیا اور وہاں کسی نے اس کی گاڑی میں بم رکھ دیا۔ وہ دھماکے سے ہلاک ہوگیا۔"

میں نے سر ہلایا "واقعی۔ بہت عجیب اسٹوری ہے۔"

"پولیس ان چاروں کے درمیان تعلق تلاش کرنے کی کوشش کر رہی ہے" آصف علی نے کہا "وہ کیا نام بتایا تھا آپ نے۔ استاد پیڈرو۔ اور نقوی کے درمیان کس قسم کا تعلق تھا؟ اور کیا آفریدی کے قتل کا تعلق گیارہ نمبر میں مارے جانے والے شخص سے بھی تھا؟"

میں نے کہا "دنیا میں تو قتل و خونریزی بہت بڑھ گئی ہے۔ اچھا اب ہم چلتے ہیں۔"

"آپ پولیس سے رابطہ کرلیں" اس نے اپنے سامنے رکھے ہوئے فون کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے کہا "کیوں نہ پہلے میں گرین ہوٹل کے منیجر سے مل لوں۔ وہ خود بلالے گا متعلقہ تھانے سے کسی کو۔ جو بھی تفتیش پر مامور ہوگا۔ میں اپنا بیان لکھوادوں گا۔ اور بیان کیا ہے میرا۔ میں صرف اتنا بتاسکتا ہوں کہ استاد پیڈرو کون ہے۔ یہ یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ ہوٹل میں قتل کی واردات کرنے والا بھی وہی تھا۔"

"مگر آپ نے اسے پشاور میں دیکھا تھا۔"

"میرا خیال ہے کہ وہ استاد پیڈرو ہی تھا" میں نے اٹھتے ہوئے کہا "بہت دیر ہوگئی باتوں میں۔ یہ آپ پیسے تو لے لیں۔"

"یہ رہنے دیں" اس نے مجھے بڑی عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "میری طرف سے...."

میں نے کہا "یہ ناممکن ہے۔"

اس نے اصرار کیا "آپ کو جو ذہنی کوفت ہوئی اس کے بدلے..."

میں نے اس کی بات کاٹ دی "وہ معمولی بات تھی۔ آپ نے معذرت کرلی اور بات ختم ہوگئی۔ اب آپ نے قیمت نہ لی تو میں سوٹ نہیں لوں گا۔"

اس نے مجبوراً تین سو روپے رکھ لیے "آپ نے نام نہیں بتایا

مجھے ابھی تک۔ یہاں کے رہنے والے تو نہیں لگتے آپ۔"
میں نے کہا "میرا نام عبدالودود منظر ہے۔ میں اور میری وائف رابعہ لاہور ہائی کورٹ میں پریکٹس کرتے ہیں۔ ایک کام سے خیبر ایجنسی کے علاقے میں جانا تھا۔ پولیٹکل ایجنٹ نے کل تک کے لیے ریسٹ ہاؤس میں جگہ دے دی ہے۔"

"کوئی قانونی معاملہ ہوگا؟"

میں نے کہا "ظاہر ہے' غیر علاقے میں سیر کرنے کون جا سکتا ہے؟"

"کون سے ریسٹ ہاؤس میں ہیں آپ؟"

"یونیورسٹی سے آگے" میں نے کہا۔

وہ ہمیں چھوڑنے باہر تک آیا۔ اس نے اپنے تند مزاج بیٹے کو بھی مجبور کیا کہ وہ ہم سے "سوری" کہے اور ہاتھ ملائے۔

"آپ کی وائف کے پاس اتنی شاندار گاڑی تھی پھر آپ نے یہ کرائے کی کار کیوں لی؟" آصف علی بولا۔

"کرائے کی کار....."

"ہاں۔ یہ گاڑی تو پشاور کی ہے۔ میں جانتا ہوں اس بڈھے کو۔"

میں نے کہا "وہ دراصل...... ہماری گاڑی خراب ہو گئی تھی۔ اسے اب رخصت کر دینا چاہئے بیگم۔ سو روپے دے دو اسے۔"

رابعہ نے تعمیل کی اور ڈرائیور نے سو روپے لے کر پوچھا۔ "کل ہمارا ضرورت ہے تو ہم آجائے؟"

میں نے کہا "نہیں' ہماری گاڑی ٹھیک ہو گئی ہے۔"

ڈرائیور کے جانے کے بعد میں نے بھی آصف علی سے اجازت چاہی "انشاء اللہ پھر ملاقات ہوگی' واپسی پر۔"

وہ بولا "ابھی آپ پولیس کے پاس نہیں جائیں گے؟"

"ابھی تو نہیں۔ کل ہمیں خیبر ایجنسی کے علاقے میں جانا ہے۔ مجھے تو جگہ کا بھی علم نہیں۔ پولیٹکل ایجنٹ نے سب بندوبست کیا ہے اور یہ پولیس کے معاملات ہوتے ہیں کچھ فرصت طلب۔ یہ لوگ ناک کو سیدھا نہیں پکڑتے' اس لیے ہر شریف آدمی گواہی سے بھی ڈرتا ہے۔"

اس نے فقط سرہلایا اور ہماری روانگی کے بعد بھی کچھ دیر وہیں کھڑا رہا۔

رابعہ ایک دم پھٹ پڑی "آخر آپ اتنے عقل مند کیوں واقع ہوئے ہیں؟"

میں نے انکساری سے کہا "سب اللہ کی دین ہے۔ اُس نے آپ کے حصے کی عقل بھی مجھے دے دی اور پھر آپ کو میرے سپرد کر دیا۔"

"خاک دھول۔ میں کہتی ہوں کیا یہ سب ضروری تھا؟ تمہیں کیا ضرورت تھی استاد پیڈرو کا نام لینے کی؟"

"پھر کس کا نام لیتا؟ تمہارا؟" میں نے معصومیت سے کہا۔

"خاموش نہیں بیٹھ سکتے تھے" رابعہ کا غصہ کم نہیں ہوا۔

"وہ تو آدمی نکاح کے وقت بھی نہیں بیٹھ سکتا۔ سب پیچھے پڑ جاتے ہیں کہ بولو' کہو قبول کیا۔"

"سکندر! اس نے ہماری گاڑی کا نمبر نوٹ کر لیا ہوگا۔ وہ شک میں پڑ گیا تھا۔ تم نے یہ بھی بتا دیا کہ ہم کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ اب وہ آجائے گا پولیس کے ساتھ۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ اس نے تمہیں بھی پہچان لیا ہے کہ تم ہی شرافت علی نقوی کے نام سے ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"یہ ایسے ہو سکتا ہے عبدالودود منظر صاحب کہ ہوٹل کا منیجر آصف علی کا دوست ہے۔ اس نے پیڈرو کا حلیہ بتایا تھا تو شرافت علی نقوی کا بھی بتایا ہوگا۔ دیکھا نہیں وہ تمہیں کیسے گھور رہا تھا۔"

"پھر تم کو میری نظر اتارنی چاہیے۔"

"وہ تو پولیس اتارے گی" رابعہ جل کے بولی "جب معلوم ہوگا کہ نہ آپ شرافت علی نقوی ہیں' نہ عبدالودود منظر بلکہ سکندر بخت ہیں۔"

"اور کبیر خاں بھی" میں نے اُسے یاد دلایا۔

"تم سے بات کرنا بھی فضول ہے" اب وہ سچ مچ بُرا مان گئی۔

میں نے کہا "خدا کا شکر ہے۔ تم روٹھے ہم چھوٹے۔ اف۔ شاید الٹی بات کہہ گیا میں۔ کہنا یہ تھا بقول فلمی شاعر۔ تم روٹھی رہو میں مناتا رہوں۔ میں تو سمجھتا تھا تمہیں روٹھنا آتا ہی نہیں۔ محبت میں کوئی مزہ نہیں جب تک روٹھنا منانا نہ ہو۔ نہ جانے کس کا قول ہے کہ بڑا مزہ اُس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر۔ ہفتے میں کم سے کم ایک بار تو ایسا ہونا ہی چاہیے۔"

"سکندر! اگر تم چپ نہ ہوئے تو میں گاڑی مار دوں گی کہیں۔"

"ضرور مار دو۔ گاڑی کون سی میرے باپ کی ہے۔ وقار یوسف کے باپ کی بھی نہیں۔ اس کے سسر کی ہے۔ وہ تو بہت خوش ہوگا کہ چلو کسی نے تو اس کا خانہ خراب کیا۔ ویسے تمہیں کوئی جگہ نظر آرہی ہے ایسی جہاں اس وقت گاڑی مارنے سے نقصان کسی اور کا نہ ہو' کسی کی گاڑی تباہ نہ ہو' کسی گھر کی دیوار نہ ٹوٹے۔ یہ کھمبے بھی سرکاری ہیں اور سرکاری املاک کو نقصان پہنچانا دیسے بھی جرم ہے۔ کہو تو میں اتر کے سامنے کھڑا ہو جاؤں۔ میرا کیا ہے؟ پرایا دھن ہوں۔ لنگڑا لولا یا معذور ہو کے بھی رہوں گا تو تمہارا ہی۔ بس لوگ کہیں گے کہ رب نے کیا خوب بنائی جوڑی پونے دو کی۔"

بالآخر رابعہ کے لیے ضبط کرنا مشکل ہو گیا "سچ بہت ڈھیٹ ہو تم۔"

"سچ!" میں نے خوشی سے بے قابو ہو کے ہاتھ آگے بڑھایا۔

رابعہ چلائی "اے سکندر' ہوش میں رہو۔"

گاڑی تھوڑا سا لہرائی اور درمیان کی گرین۔

جو کچھ رابعہ نے بعد میں کہا وہ ہر عاشق جانباز کو سننا پڑتا ہے۔

شاعر' تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عُقاب۔ یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اُڑانے کے لیے۔ جب ہم ریسٹ ہاؤس پہنچے تو عقاب خاصا اونچا اُڑ رہا تھا۔

کاجل بہت پریشان بیٹھی تھی۔ رات ہوتے ہی ہر طرف سناٹا پھیل گیا تھا اور تاریکی میں ریسٹ ہاؤس کسی ویران' آسیب زدہ گھر کی طرح لگ رہا تھا۔ ملازم نے ہمارے ایک ڈیڑھ گھنٹے میں لوٹ آنے کی اطلاع دی تھی مگر ہم واپس آئے تھے تین گھنٹے بعد اور یہ وقت خوف زدہ کاجل نے کلیم کے ساتھ اپنے کمرے میں بند رہ کے گزارا تھا۔

"کہاں چلے گئے تھے تم لوگ؟ جانا تھا تو ہمیں بھی لے جاتے۔" کاجل نے برہمی سے کہا "ایسا کون سا ضروری کام تھا؟"

میں نے کہا "ہمیں اچانک خیال آیا کہ ہماری گاڑی تو وہیں رہ گئی۔ وقار یوسف کو کیا جواب دیں گے۔ اُس کی بیوی تو بہت مارے گی اسے کہ کیسے لوگوں کو دے دی تھی میرے ابا کی گاڑی۔"

رابعہ نے کہا "ڈرنے کی یہاں کون سی بات تھی؟ یہ سرکاری ریسٹ ہاؤس ہے' کون آسکتا ہے یہاں؟"

میں نے سرہلایا "ہاں۔ کسی کو کیا معلوم کہ ہم یہاں تشریف رکھتے ہیں۔"

"میرا خیال ہے۔ میں نے وہ گاڑی دیکھی تھی۔ وہی سفید رنگ کی ڈاج ڈارٹ۔" کاجل نے کہا۔

اب مجھے سنجیدہ ہونا پڑا "کیسے اندازہ ہوا تمہیں .... میرا مطلب ہے کہ ویسی گاڑیاں تو بہت ہیں۔ تم نے نمبر دیکھا تھا یا کسی کی صورت دیکھ کے شبہ ہوا تھا؟"

کاجل نے نفی میں سرہلایا "وہ گاڑی یہیں پھر رہی تھی۔ میں نے ایک بار نہیں تین بار دیکھا ہے۔ دور سے نمبر میں کیسے دیکھتی؟"

"کیا پتا وہ یونیورسٹی ٹاؤن میں رہنے والے کسی شریف آدمی کی گاڑی ہو اور آس پاس ہی کوٹھی ہو اُس کی۔ تمہیں صورت دیکھنی چاہیے تھی" میں کاجل کی بات سے تشویش میں مبتلا ہو گیا۔

رابعہ نے کچھ سوچ کر کہا "سکندر' کیوں نہ ہم رات بھر کے لیے کہیں شفٹ ہو جائیں۔"

"کہاں شفٹ ہو جائیں؟ ہوٹل سب سے آسان ٹارگٹ ہوتے ہیں جہاں کسی کو آسانی سے تلاش کیا جا سکتا ہے" میں نے کہا۔

"مجھے شک ہے کہ رات کو آصف علی خود آجائے گا یا وہ اپنے دوست' ہوٹل کے منیجر کو سب بتا دے گا اور وہ پولیس کے ساتھ پہنچ جائے گا۔" رابعہ نے کہا۔

"تھوڑے سے اعتماد کی ضرورت ہے" میں نے کہا "پولیس ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ ہم نے یہی کہا ہے نا کہ استاد پیڈرو نظر آیا تھا ہمیں۔ تم کہو کہ میں نے دیکھا تھا۔ اس کا نام پتا' ولدیت سب تمہارا۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اگر تم بیان پر دستخط بھی کر دو تو کیا ہے۔ پیڈرو ہی مشکل میں پڑے گا نا۔ پولیس خود تصدیق کر لے گی کہ تمہارا بیان غلط نہیں تھا۔ وہ تمہیں یہاں تفتیش کے لیے نہیں روک سکتے۔ صرف اس وجہ سے کہ تم نے اتفاق سے پیڈرو کو دیکھ لیا تھا۔ دوسری طرف یہی اتفاق ثابت کرے گا کہ تم پشاور میں تھیں۔"

"اور میرے ساتھ کون تھا؟" رابعہ نے طنز سے کہا۔

"پھول کے ساتھ خوشبو۔ چاند کے ساتھ چکور۔ بھینس کے ساتھ عقل اور اُلّو کے ساتھ اس کی دُم" میں نے کہا "تمہارے ساتھ میں۔"

"میں' یعنی عبدالودود منظر یا شرافت علی نقوی......"

"کچھ نہیں۔ کوئی ثابت نہیں کر سکتا کہ میں نے اپنا نام غلط بتایا تھا۔ میں تو صاف مُکر جاؤں گا کہ میرا کیا کام گرین ہوٹل میں اور میں کیوں پہنوں گا خاکی وردی۔"

رابعہ بولی "سکندر! آصف علی کی نظریں دیکھی تھیں تم نے؟"

"ہاں۔ مجھے کچھ یوں لگا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے یا پوچھنا چاہتا ہے مگر تذبذب کا شکار ہے۔ جیسے وہ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو اور اسے یاد نہ آرہا ہو کہ مجھے کب اور کہاں دیکھا تھا۔"

"کیا یہ خطرے کی بات نہیں؟ خیر سے تمہاری تصویریں چھپتی رہی ہیں اخبارات میں" رابعہ بولی "شیطان کی طرح شہرت رکھتے ہو تم بھی۔ بلکہ اسے پہچاننے والے کم ہیں' تمہیں ہر جگہ پہچان جاتے ہیں لوگ۔"

میری بات ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ باہر ایک گاڑی کا ہارن سنائی دیا پھر گاڑی اندر آگئی۔ میں نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کے دیکھا۔

"وہی گاڑی ہے؟" کاجل نے کانپتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔ شاید کوئی ریسٹ ہاؤس میں آیا ہے۔"

"اِس وقت کون آسکتا ہے؟"

"سرکاری افسران کو وقت کا پابند کون کر سکتا ہے۔ وہ یہاں قیام کے لیے کسی بھی وقت آسکتے ہیں" میں نے کہا "ابھی تو ایک کمرا خالی ہے۔ کوئی فکر کی بات نہیں۔ دوسرا بھی آگیا تو ہم ہوں گے باہر۔"

ریسٹ ہاؤس کا ملازم دروازے پر دستک دے کر اندر آیا۔ "کوئی آصف علی صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں سر۔"

رابعہ نے میری طرف دیکھا۔ بغیر کہے اُس نے کہہ دیا کہ میں نہ کہتی تھی وہ آئے گا۔ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے کہا "اکیلا ہے یا کوئی اور بھی ہے اُس کے ساتھ؟"

"اکیلا ہے سر" ملازم نے جواب دیا "کہتا ہے بیٹھوں گا نہیں۔ ایک منٹ کے لیے آپ باہر آجائیں۔"

میں نے سرہلایا اور اس کے ساتھ باہر چلا گیا۔ گیٹ کے اندر گاڑی کے ساتھ ہی آصف علی ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ اپنے سفید بالوں اور نفاست سے تراشی ہوئی سفید داڑھی کے ساتھ اُس کی

شخصیت بڑی پُروقار لگ رہی تھی۔ اُس کی صحت بھی بہت اچھی تھی۔

"معاف کرنا .... میں پیچھے پیچھے چلا آیا۔ دراصل ایک بات پوچھنا چاہتا تھا میں" اس نے ہاتھ ملا کے کسی تمہید کے بغیر کہا۔ "وہاں اتنی دیر بات ہوئی مگر میں سوچتا رہ گیا۔ تمہارے نام کی وجہ سے ہمت نہیں پڑی میری ورنہ میرا دل گواہی دیتا تھا کہ تم وہی ہو۔"

"وہی کون؟" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"وزیر خاں کے بیٹے..... کبیر خاں" اس نے ایک ہاتھ پیشانی پر رکھا "بالکل وہی ناک نقشہ' وہی چہرہ۔ بہت پرانی بات ہے لیکن .... مجھے یاد ہے .... پندرہ سال بعد تم وہی لگتے ہو۔ تمہیں دیکھتے ہی پہچان جانا چاہیے تھا مجھے۔ شک کی کون سی بات تھی مگر میں سوچتا رہا کہ کہیں تم اس کے ہم شکل تو نہیں ہو۔"

"آصف علی صاحب! آپ کون ہیں؟" میں نے ابتدائی صدمے سے سنبھل جانے کے بعد محتاط لہجے میں کہا۔

"میں ..... بتادوں گا میں بھی کہ میں کون بدبخت ہوں" اس نے ایک گہری سانس لی "پہلے تم کہو کہ میرا یقین بے بنیاد نہیں ہے' اگر تم کوئی اور ہو جس کی صورت ملتی ہے کبیر خاں سے ... تو پھر میں چلتا ہوں .... وزیر خاں کا تو ایک ہی بیٹا باقی بچا تھا اور اُس کا نام عبدالودود منظر نہیں' کبیر خاں تھا وہ کہتا تھا آصف علی' اسے میں پڑھنے کے لیے ولایت بھیجوں گا۔ اور مجھے بعد میں پتا چلا تھا کہ ایسا ہی کیا تھا اُس نے۔"

اب میرے لیے اپنی شناخت کو چھپائے رکھنے کا کوئی جواز باقی نہ رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ مجھے سکندر بخت کی حیثیت سے نہیں جانتا جو ایم آر ایس جیسی تنظیم کے حوالے سے وطن دشمنوں کے لیے شامتِ اعمال کا دوسرا نام ہے۔ ضمیر فروش غداروں کے لیے موت کا پیغام ہے اور قانون شکن عناصر کے لیے حلقہ حلقہ دام ہے۔ شاید اسے نہ سیاست سے دلچسپی تھی اور نہ ہی ان حالات سے جن کی ایک تصویر اخبارات کی شہ سرخیوں میں نظر آتی تھی تو ہر پاکستانی سوچنے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ کیا واقعی ہم عدم استحکام اور بے یقینی کی اس منزل کی جانب رواں دواں ہیں جہاں "اتحاد' تنظیم' یقین محکم" کے اصول محض سیاسی نعرے' کھلے الفاظ اور ہمارے قومی کردار میں منافقت کی تفسیر بن جائیں گے۔"

آصف علی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا "تم کبیر خاں ہی ہو۔ میں سمجھ گیا' تمہاری خاموشی میرے یقین کی تائید کرتی ہے لیکن مجھے پہچان لینے کے بعد تم مجھ سے بات بھی نہیں کرنا چاہتے۔ تم میری صورت دیکھنے کے روادار بھی نہیں ہو۔ تم چاہتے ہو کہ میں دفع ہو جاؤں اور پھر کبھی تمہارے سامنے نہ آؤں۔ میں چلا جاتا ہوں...."

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ آپ میرے بزرگ ہیں اور میرے لیے لائق صد احترام ہیں۔ آپ میرے والد کے پرانے دوست ہوں گے۔ میری بدقسمتی ہے کہ میں آپ کو نہیں جانتا۔ آپ کے نام سے بھی ناآشنا ہوں۔"

اس نے سر جھکا کے دکھی لہجے میں کہا "یہ تمہاری نہیں بیٹا' میری بدقسمتی ہے۔ میں ملعون اور مردود اسی قابل ہوں کہ تم مجھے پہچاننے سے بھی انکار کردو۔ مجھے دھتکار دو' ذلیل کر کے ...."

"آصف صاحب' اندر آئیں .... اور پلیز ایسی باتیں مت کریں کہ میں اپنی نظروں میں رُسوا ہو جاؤں۔ میں اتنا ذلیل نہیں ہوں۔ اگر میں نے آپ کو اپنا نام غلط بتایا تھا تو اس کی بھی وجہ تھی۔" میں نے کہا۔

"دیکھو' میں تم سے اکیلے میں کچھ باتیں کرنا چاہتا تھا۔ سب کے سامنے... میرا مطلب ہے تمہاری بیوی کے سامنے میں وہ سب کچھ نہیں کہہ سکوں گا جو میں کہنا چاہتا ہوں" اس نے بڑی لجاجت سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ ہم ڈرائنگ روم میں بیٹھ جاتے ہیں۔ میں ملازم سے کہتا ہوں وہ کمرا کھول دے۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔ ہم گاڑی میں بیٹھ جاتے ہیں۔" میں سوچ میں پڑ گیا "یہ کچھ اچھا نہیں لگتا۔"

"پھر میرے ساتھ چلو۔ میرے گھر' یہاں سے تو بہت قریب ہے" اس نے کہا "ڈرو نہیں..."

میں نے کہا "آپ سے کیا ڈرنا! آپ میرے والد کے دوست تھے۔"

"نہیں کبیر خاں' میں اس کا دوست نہیں تھا۔ دوست ہوتا تو میرا نام تمہارے لیے اجنبی نہ ہوتا۔ وہ تمہیں میرے بارے میں بھی ضرور بتاتا۔"

میں نے اسے حیرانی سے دیکھا "یہ ٹھیک ہے کہ انہوں نے کبھی کوئی بات مجھ سے نہیں چھپائی' جو باتیں مجھے یاد نہیں تھیں وہ بھی والد ہی بتاتے رہتے تھے۔ ان میں تقسیم ہند سے پہلے کی بہت سی باتیں تھیں۔ میرے بھائی بہن اور رشتے دار' ان کے دوست اور پرانے ساتھی۔ سب ہی کے نام جانتا ہوں میں۔ یہ محض اتفاق ہے۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "اتفاق نہیں ہے کبیر خاں" اس نے عمداً میرا ذکر نہیں کیا ہوگا۔ ایسا ہی آدمی تھا وہ۔ دوستوں کو یاد رکھتا تھا اور دشمنوں کو بھول جاتا تھا۔ نظر انداز کر دیتا تھا یا معاف کردیتا تھا۔ پہلے میں اس کا دوست تھا مگر میں نے اسے دغا دی۔ میں اس کا دشمن ثابت ہوا۔ اس کی پیٹھ میں خنجر گھونپا۔ اس نے کچھ نہیں کیا۔ بس مجھے بھلا دیا۔ میرا نام اپنی زندگی کی کتاب سے کاٹ دیا' خارج کر دیا۔"

میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ان حالات میں میرا ردِعمل کیا ہونا چاہیے۔ میں نے اسے اپنے والد کا دوست سمجھ کے عزت

احترام کے قابل جانا تھا۔ میں ڈرتا بھی تھا اور اس کی باتوں پر اعتبار میں احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہتا تھا اور اب اس اعتراف کے بعد کہ وہ میرے والد کا دشمن تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں اس سے کیسے نفرت کا اظہار کروں اور کیسے اسے حقائق جانے بغیر رسوا کر کے رخصت کر دوں۔ جب کہ وہ اپنے جرم، اپنی شکست اور اپنی ندامت کے ساتھ خود میرے سامنے آگیا تھا۔

میرے لیے یہ بھی مشکل تھا کہ میں اس کی بات نہ سنوں اور اس کو مختصراً اپنا فیصلہ سنا دوں کہ تمہارا جو بھی جرم تھا میرا اُس سے کوئی تعلق نہیں۔ تم جس کے مجرم تھے وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے اس لیے تم جاؤ اور انتظار کرو یومِ حساب کا، جب وہ تمہارے روبرو ہوگا اور عدل مانگے گا۔ میرا تجسس بیدار ہوگیا تھا اور میں اپنے ماضی کے اس باب کو بھی پڑھنا چاہتا تھا جس کے وجود سے میں آج تک بے خبر رہا تھا۔ اس کا جرم جانے بغیر میں یہ وعدہ بھی نہیں کرسکتا تھا کہ اسے معاف کر دوں گا۔

"آصف علی۔" میں نے بالآخر فیصلہ کرلیا "اگر تم اپنے ماضی کی کسی غلطی کا اعتراف کرنے آئے ہو تو پھر بات علیحدگی میں نہیں سب کے سامنے کرو۔ جرم بھی تو سب کے سامنے ہی کیا ہوگا تم نے اور میرے والد کے دوستوں سے اُن کے دشمنوں کی صف میں شامل ہوتے وقت تمہیں بالکل خیال نہیں آیا ہوگا کہ دنیا کیا کہے گی اور کیا سوچے گی۔ اگر تم میرے والد کے دشمن تھے تو میں تمہارے گھر میں قدم رکھنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ یہاں آئے ہو تم اپنی مرضی سے، واپس جانا چاہو تو ابھی چلے جاؤ۔ ابھی تم نے کچھ نہیں بتایا ہے، جو بات آج تک کسی کو معلوم نہ تھی کل بھی معلوم نہ ہوگی تو کیا فرق پڑے گا لیکن تمہیں فرق پڑتا ہے تو اندر آ کے میرے سامنے اور میری بیوی کے سامنے بتاؤ کہ تم نے کیا کیا تھا۔ اگر تمہیں یہ شرط منظور نہیں تو تم جا سکتے ہو۔"

میں پلٹ کے اندر چلا گیا۔ میں نے ریسٹ ہاؤس کے ملازم سے کہا کہ وہ ملاقاتیوں کے بیٹھنے کا کمرا کھولے اور پھر رابعہ کو بتایا کہ اس وقت آصف علی کے آنے کا مقصد کیا تھا۔ میں پھر باہر آیا تو وہ برآمدے میں کھڑا تھا۔ اُس نے میری شرط قبول کرلی تھی اور اب کچھ پُراعتماد نظر آرہا تھا۔ میں اسے اپنے ساتھ لے گیا۔

ملاقاتیوں کا کمرا شاید بند رہتا تھا۔ اس کے صوفے میلے تھے اور میزوں پر گرد کی تہ تھی۔ چار دیواروں پر نصب لائٹس میں سے ایک ٹوٹی ہوئی تھی اور ایک کا بلب فیوز تھا۔ قالین پر دوں اور صوفوں کے ڈارک براؤن رنگ کی وجہ سے دو لائٹس کا اجالا بھی بہت ناکافی محسوس ہوتا تھا۔

آصف علی ایک صوفے پر ٹک گیا۔ دوسرے پر میرے ساتھ رابعہ بیٹھ گئی۔ اُس نے کاجل سے بھی کہا تھا کہ وہ چاہے تو آجائے مگر اسے ڈیپریشن ہو رہا تھا۔ وہ بیزاری اور چڑچڑے پن کا شکار تھی اور کلیم اللہ کے سو جانے کے بعد خود بھی آنکھیں بند کیے پڑی تھی۔ میری باتوں نے اس کے جذباتی حصار کی بنیادیں ہلا دی تھیں اور وہ ایک بار پھر محرومی کا زخم کھا کے اپنے دکھ سے سمجھوتا کرنے میں مصروف تھی اور احساسِ مجبوری کے درد کو صبر کی اسپرین سے دبانے کی کوشش کر رہی تھی۔

آصف علی دونوں ہتھیلیوں کو آپس میں ملتا رہا "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کہاں سے شروع کروں۔"

"اگر اختصار سے کام لینا مشکل ہے آپ کے لیے تو آپ تفصیل سے بتا دیں، ہم پوری رات دے سکتے ہیں آپ کو" میں نے کہا۔

"مشکل اب محسوس ہو رہا ہے، جب میں فیصلہ کرکے تمہارے سامنے آگیا ہوں" وہ بولا "پہلے یہ فیصلہ مشکل لگتا تھا۔ اب الفاظ نہیں مل رہے ہیں۔ وزیر خاں ہوتا تو شاید میرے لیے بہت آسان ہوتا کہ میں اس کے پاؤں پکڑ لوں۔ اپنا جوتا اتار کے اسے دے دوں اور سر جھکا کے کہوں کہ مجھے مارو مگر تم کبیر خاں ہو۔ میرے سامنے تم بچے تھے، آج بھی بچے ہو۔ میرے یہ سفید بال دیکھ رہے ہو نا! میرا کاروبار بھی دیکھا تم نے۔ میری گاڑی کتنی شاندار ہے اور میری کوٹھی دیکھ کے بھی راہ چلتے لوگوں کی آنکھوں میں توصیف و تعریف کے جذبات نظر آتے ہیں لیکن یہ صرف میں دیکھ سکتا ہوں کہ ان سفید بالوں کے باوجود میں روسیاہ ہوں؟ یہ سب شان و شوکت جس کا میں مالک ہوں اور جس پر میری اولاد غرور کرتی ہے۔ میری یہ عزت اور میرا یہ سماجی مرتبہ۔ سب دھوکے، فریب کی لعنتی کمائی ہے۔ میرا اس پر کوئی حق نہیں۔ اس کا احساس مجھے اب ہونے لگا ہے جب زندگی کے راستے کا اختتام نظر آنے لگا ہے اور اس راستے کے آخر میں مجھے اپنی قبر دکھائی دینے لگی ہے۔ اپنی عقل کی عیاری اور اپنی کامیابی کا سارا غرور اب میرا خوف بن گیا ہے کیونکہ انجام قریب ہے اور آصف علی تیموری ایک مشتِ خاک اپنی مٹی کی قیمت جان گیا ہے۔ میں اپنا کتبہ پڑھ سکتا ہوں۔ سب کتبے ایک سے ہوتے ہیں۔ فلاں جو فلاں کا بیٹا تھا، پیدا ہوا اور مرگیا۔ تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات، اللہ اللہ خیر صلا۔ اس نے کیا کیا، کتنے جھوٹ بولے، کتنے دل دکھائے، کتنے کارخانے کھڑے کیے اور مرا تو اُس کا بینک بیلنس کیا تھا۔ اُس کی کتنی کوٹھیاں اور کاریں تھیں اور اس نے کیسے حاصل کی تھیں۔ ذاتی محنت سے یا حرام کی کمائی سے۔ یہ سب کتبے پر نہیں لکھا جاتا مگر ایک کتاب ہے جس میں تمام عمر کا حساب ایک ایک لمحے کے نفع نقصان کی تفصیل کے ساتھ درج ہوتا ہے۔ میں کب سوچتا تھا اس کے بارے میں؟ نامۂ اعمال اور یومِ حشر پر میرا اعتقاد عملاً کیا تھا؟ محض ایک عقیدہ جو ورثے میں ملا تھا۔ میری شکل و صورت عادات و اطوار کی طرح۔ میں نے کبھی عقل کو زحمت نہیں دی تھی کہ عقائد کی حقیقت کو سمجھے۔ اس وقت عقل دنیا کے کاروبار سود و زیاں میں صرف ہو رہی تھی۔ خیر، یہ تو عمر کا فلسفہ ہے جو عمر کے ساتھ ہی سمجھ میں آتا ہے۔ وزیر خاں سے میں اس وقت ملا تھا جب وہ لاہور میں قدم جما چکا تھا۔ میں بھی لُٹ لُٹا کے اکیلا پاکستان پہنچا تھا۔"

میں نے کہا "آپ کے گھر والے۔ والدین یا بیوی بچے؟"

"والدین نے حالات کو دیکھتے ہوئے شادی کر دی تھی۔" آصف علی نے کہا "وہ میری چچا زاد بہن تھی اور اس زمانے کے دستور کے مطابق مجھ سے بچپن میں منسوب کر دی گئی تھی۔ ہم ایک قافلے کے ساتھ پاکستان کے لیے روانہ ہوئے۔ راستے میں دو جگہ قافلے پر حملہ ہوا۔ پہلے حملے میں مردوں نے مقابلہ کیا اور آدھے سے زیادہ کام آئے۔ مرنے والے دوسروں کو اپنی عزت و آبرو کا امین بنا گئے تھے۔ یہ بڑا مشکل کام تھا۔ سب کو اپنی جان کی پڑی ہوئی تھی۔ کسی اور کا بوجھ کون اٹھاتا۔ ماں باپ کے لیے اُن کا بڑھاپا ہی بوجھ تھا۔ وہ راستے کی صعوبتوں کو بھی برداشت کر رہے تھے۔ پہلے حملے میں وہ زر و مال کی حفاظت کرتے ہوئے زخمی ہوگئے تھے۔ علاج میسر نہ آنے کے باعث ہزاروں لوگوں کی طرح راستے میں ہی دم توڑ گئے اور ہم نے انہیں وہیں دفن کر دیا۔ دوسرا حملہ زیادہ منظم تھا اور رات کو اس وقت ہوا تھا جب قافلے والے نڈھال پڑے سو رہے تھے۔ وہ چُن چُن کے جوان عورتوں کو لے گئے۔ مقابلہ کرنے کی کسی میں ہمت ہی نہ تھی۔ جنہوں نے مزاحمت کی، وہ مارے گئے۔"

وہ خاموش ہوگیا اور نظریں فرش پر جما کے اپنے ماضی کے کسی نقش سے نظریں چرانے لگا۔ ندامت کی تحریر اُس کے چہرے پر پڑھی جا سکتی تھی اور اُس کی آنکھوں میں اس بے آبرو لمحے کا عکس اتر آیا تھا جب اُس نے اپنی جان بچانے کے لیے عزت گنوانا منظور کرلیا تھا۔ ایک خود غرض اور بزدل، بے غیرت اور بے ضمیر آدمی بھی موت کی منزل پر پہنچ کے اپنا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا تھا ورنہ اس اعترافِ جرم کی کیا ضرورت تھی۔

"غالباً تم نے اپنی بیوی کو بچانے کے لیے کچھ نہیں کیا ہوگا؟" میں نے بے رحمی سے سوال کیا "تم نے اس عورت کی مدد کی پکار کی ہی نہیں ہوگی جس نے بچپن سے تمہیں اپنا سب کچھ سمجھ رکھا تھا۔ محافظ و مالک، سرتاج اور مجازی خدا۔ اپنی زندگی کو تم نے ایک پلڑے میں رکھا ہوگا اور اپنے عہدِ وفا کو دوسرے پلڑے میں، تو تمہیں وفاداری کے لیے جان سے جانا حماقت محسوس ہوا ہوگا۔ جان ہے تو جہان ہے اور جہان میں، تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی کا معاملہ ہے۔ دوسری عورت اور تیسری یا چوتھی بیوی سب مل جاتی ہیں۔"

اُس نے سردی کے باوجود پیشانی سے پسینہ صاف کیا "تم نے کیسے اندازہ کیا۔ یہ بات تو میں نے وزیر خاں سے بھی چھپائی تھی۔"

"تم جیسا شخص ہی ایسا کرسکتا تھا۔" میں نے کہا "جو کسی کو دوست کہے اور پھر اُس کی پیٹھ میں خنجر بھی گھونپ سکے۔"

اُس نے سر جھکا لیا "ہاں۔ میں ایسا ہی تھا، بزدل اور بے ضمیر۔ مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ میں شادی سے انکار کرسکتا۔ وہ مجھے پسند نہ تھی، یہ بات میں کہہ دیتا تو.... تو شاید اس عورت کے حق میں بہتر ہوتا۔ اسے کوئی اور مرد اپنی شریکِ حیات بنا لیتا جو اتنا باہمت ضرور ہوتا کہ مردانگی کے نام پر داغ نہ آنے دیتا۔ اسے دل و جان سے چاہتا یا نہ چاہتا۔ اغوا ہونے سے ضرور بچا لیتا۔ اغوا عورت کبھی نہیں ہوتی، مرد کی عزت اغوا ہوتی ہے۔"

"بہت دیر میں جاگا تمہارا احساس۔ جب کرنے کو کچھ بھی نہ رہا۔" میں نے کہا۔ "خیر چھوڑو اس قصے کو۔ وزیر خاں کے ساتھ تم نے کیا دھوکا کیا تھا؟"

"اُن دنوں لاہور بھی آج کا لاہور نہیں تھا۔ وہ بھی ایک اُجڑا دیار تھا۔" آصف علی کچھ دیر بعد بولا "لوٹ مار اور آتش زنی کا دور گزر چکا تھا۔ لٹے پٹے مہاجروں کا ریلا مسلسل یلغار کر رہا تھا اور لاہور کے جیالوں نے ان مصیبت زدہ لوگوں کے لیے گھروں کے اور دلوں کے دروازے کھول دیے تھے پھر آہستہ آہستہ زندگی معمول پر آنے لگی۔ لوگ کاروبارِ حیات میں مصروف ہونے لگے اور جو محنت کرسکتے تھے انہوں نے ماضی کو بھلا کے اپنے اور وطن کے بہتر مستقبل کے لیے جدوجہد کا آغاز کر دیا۔ انہی میں وزیر خاں بھی شامل تھا۔ جس نے خاصی محنت سے ایک فونڈری قائم کی تھی۔ اب میں نے یہ سب کچھ بتا دیا ہے تو یہ بھی بتا دوں کہ جب وزیر خاں محنت کر رہا تھا تو میں لوٹ مار میں مصروف تھا۔ میں نے ہندو سکھوں کے مکانوں اور دکانوں کے تالے توڑے اور جو ہاتھ لگا سمیٹ لیا، پھر ایک بار پکڑا گیا اور پولیس نے مجھ سے سب کچھ چھین لیا، سوائے اس کے جو میں نے ایک جگہ گاڑ رکھا تھا۔ میں نے تہیہ کرلیا تھا کہ مر جاؤں گا مگر اس کا پتا نہیں بتاؤں گا۔ حوالات میں وہ روز میری کھال کھینچتے تھے اور میں کچھ اگل دیتا تھا۔ بالآخر میں خون اگلنے لگا تو انہوں نے سمجھ لیا کہ اب اس کے پاس کچھ نہیں رہا۔ وہ مجھے میو اسپتال میں پھینک گئے اور ڈاکٹروں نے مجھے مرنے سے بچا لیا۔ ٹھیک ہونے کے بعد میں نے لوٹ کا باقی مال نکالا اور سوچنے لگا کہ اب اس سے کوئی کاروبار شروع کرنا چاہیے۔ انہی دنوں اتفاق سے میری ملاقات وزیر خاں سے ہوگئی۔ ہم دونوں کی کہانی ایک تھی۔ دونوں کے گھربار، بیوی، بچے سب لٹ گئے تھے۔ تم تو اس زمانے میں اسکول میں پڑھتے تھے۔ میں تمہارے والد کی فونڈری کا مال خریدنے لگا۔ وہ مجھے خاصی رعایت دیتا تھا اور یہ مال بازار میں اچھے منافع پر بک جاتا تھا۔ دو سال تک ہمارا تعلق کاروباری بھی رہا اور دوستانہ بھی۔ میں نے ایک دکان برانڈرتھ روڈ پر لے لی اور وزیر خاں نے فونڈری کے ساتھ لیتھ مشینیں بھی لگا لیں۔ پھر اس کے ایک کاریگر کی بہن سے میری شادی ہوگئی۔ وہ آج بھی میری بیوی

ہے پھر وزیر خاں کو خیال آیا کہ فونڈری کو وسعت دی جاسکتی ہے۔ شاہدرے کی طرف زمین خالی پڑی تھی۔ وہاں زرعی آلات کی چھوٹی سی فیکٹری لگانے سے بہت فائدہ ہوگا۔ اس نے مجھے شراکت کی پیش کش کی۔ میرے پاس جو سرمایہ جمع ہوا تھا وہ بھی وزیر خان کی عنایت تھا۔ ایک طرح سے میں بھی اس کا سول ڈسٹری بیوٹر تھا۔ ہم نے مشترکہ سرمائے سے زمین خریدی تھی مگر میں نے چالاکی سے رجسٹری اپنے نام کروالی۔ مشینری سب وزیر خان کی ہوتی۔

"پھر۔ کیا اس کی نوبت ہی نہیں آئی؟" میں نے اس کی خاموشی سے اکتا کے کہا "تم زمین بیچ کے بھاگ گئے۔"

اُس نے حیرانی سے مجھے دیکھا "یہی کیا تھا میں نے۔ پچیس ہزار کی زمین تھی۔ میں نے پچاس ہزار میں بیچ دی۔ اتفاق سے سستی مل گئی تھی اور اتفاق سے ایک بے وقوف پھانس لیا میں نے جو دُگنی قیمت دینے پر رضامند ہوگیا۔ اس سے میرا ایمان ڈانوا ڈول ہوا۔ پچیس ہزار کو تم آج کے حساب سے دس لاکھ تو سمجھو۔ دس لاکھ کے کسی کو راتوں رات کچھ کیے بغیر بیس لاکھ ملیں تو جس کا ایمان کمزور ہوگا' وہ آج بھی اپنے دوست کی پیٹھ میں خنجر گھونپ دے گا۔ اب تو خیر وقت ہی بدل گیا ہے۔ دس لاکھ کی خاطر شاید بیٹا اپنے باپ کو قتل کردے۔"

میں نے کہا "اگر اپنے باپ کا بیٹا نہیں ہوگا تو یہی کرے گا۔"

اُس کا چہرہ خفت سے زرد پڑگیا "میں بھاگ کے پشاور آگیا۔ ہاں' ایک بات میں نے نہیں بتائی۔ آصف علی میرا اصل نام نہیں تھا۔ وہ حفیظ احمد تھا جو وزیر خاں کے اعتماد کو دھوکا دے کر فرار ہوا تھا۔"

میں نے کہا "کیا تم نے اپنی بیوی کو اعتماد میں لیا تھا؟"

"جب تم نے اپنا نام بدلا تو کیا اسے سچ بتادیا تھا" رابعہ بولی۔

آصف علی نے نفی میں سرہلایا "میں نے اسے یہ بتایا تھا کہ وزیر خاں پکڑا گیا ہے۔ وہ فونڈری کے لیے مغل پورہ ورکشاپ سے چوری ہونے والا خام مال لیتا تھا۔ بجلی کے کھمبے تک اُس کی فونڈری میں گلادیے جاتے تھے۔ چھوٹی موٹی چیزوں کا تو شمار ہی نہیں۔ اگر ہم فرار نہ ہوئے تو ہم بھی پکڑے جائیں گے کیونکہ چوری کے مال ہی کو ہم خریدتے تھے۔ اس کی شکل بدل جانے کے بعد۔"

میرا خون رگوں میں ابلنے لگا "ذلیل شیطان' پہلے چوریاں کرتا رہا پھر ڈاکا ڈالا۔ وزیر خاں کی حلال کمائی لے گیا۔ الٹا اسے بدنام بھی کیا....." میں نے چلا کے کہا۔

رابعہ نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا "سکندر۔ ٹیک اٹ ایزی۔ آج تک تمہیں کچھ معلوم نہیں تھا۔ معلوم ہوجانے سے کوئی فرق نہیں پڑنا چاہیے۔"

"کیوں نہیں پڑنا چاہیے؟ جو کچھ اس نے کیا میرے والد کے ساتھ۔"

"کیا سب کا بدلہ لوگے تم؟ خدا کے انصاف پر کچھ نہیں چھوڑوگے سکندر" رابعہ نے مجھے کسی بچے کی طرح سمجھایا۔

"اس دنیا میں تو وزیر خاں کو دکھ ہی دکھ ملے۔ اس جیسے اور چوہدری واہ اور جیسے شیطان ملے۔ یہ عیش کرتے رہے۔ دنیا کی ہر نعمت ان کو حاصل رہی' کامیاب یہ کہلائے' عزت دار یہ ہوئے۔"

وہ نفی میں سرہلانے لگا "نہیں بیٹا' مکافاتِ عمل دنیا میں بھی ہے۔ اوّل اوّل ایسا ہی لگتا ہے کہ ہم نے جو چاہا حاصل کرلیا۔ جائز ہو وناجائز سے کیا فرق پڑتا ہے۔ لیکن فرق پڑتا ہے۔ میں ضمیر کی خلش اور احساسِ جرم وندامت کی بات نہیں کررہا ہوں۔ وہ ایک الگ آزار ہے۔ میں مادّی دنیا کے نفع ونقصان کی بات کررہا ہوں۔ میں نے اپنی سادہ لوح بیوی کو مطمئن کرلیا۔ میں آصف علی بن گیا۔ چھ مہینے تک ہم روپوش رہے۔ سال بھر میں ہم نے چھ مکان بدلے۔ راولپنڈی میں بھی تین مہینے گزار آئے۔ مجھے ڈر تھا کہ وزیر خاں پولیس کی مدد سے مجھے تلاش کرے گا۔ اس نے رپورٹ ضرور لکھوائی تھی مگر وہ جانتا تھا کہ اس کے پاس اپنے دعوے کی صداقت ثابت کرنے کے لیے کوئی ثبوت نہیں ہے۔ زمین میری تھی' میں نے بیچ دی۔ اُس نے آدھی قیمت مجھے کس کے سامنے ادا کی تھی۔ کوئی رسید تک تو تھی نہیں اُس کے پاس۔ ظاہر ہے پولیس نے بھی کچھ نہیں کیا۔ وزیر خاں بڑا صابر وشاکر اور ہمت والا شخص تھا۔ اس نے یہ صدمہ بھی برداشت کرلیا۔ یہاں میں نے جو کاروبار شروع کیا اس میں برکت ہوئی۔ یہ برکت میری کوشش کا نتیجہ نہیں تھی۔ یہ وزیر خاں کے پیسے کی برکت تھی۔

"درمیان میں کبھی تمہیں خیال نہیں آیا کہ تم قرض سمجھ کے ہی اُس کی رقم لوٹادو" میں نے تلخی سے کہا "تم اس کے سامنے چلے جاتے تو کیا وہ تم کو مار ڈالتا؟"

"شاید وہ ایسا ہی کرتا۔ وہ جتنا شریف اور رحم دل تھا اتنا ہی جلالی بھی تھا اور اسی لیے میں ڈرتا تھا۔ میری کبھی ہمت نہ ہوئی کہ اس کے پاس جاکے اپنے جرم کی معافی مانگ لوں۔ مجھے بعد میں معلوم ہوگیا تھا کہ اس نے کتنی ترقی کی ہے۔ وہ صنعت کار ہوگیا تھا۔ میرے جیسے دس دکاندار کو خرید سکتا تھا وہ۔ میرا پہلا بچہ مُردہ پیدا ہوا تھا اور میری بیوی مرتے مرتے بچی تھی۔ دو سال بعد پھر اس کی نوبت آئی تو خدا نے مجھے ایک بیٹی دی جو سزا تھی میرے اعمال کی۔ اس کی شکل میں میرے گناہوں کی ساری بدصورتی مجسم ہوگئی تھی۔ اس کے اعضاء نامکمل تھے۔ وہ جسمانی طور پر معذور تھی۔ تین سال تک وہ گوشت کے بدوضع لوتھڑے کی طرح پڑی رہتی تھی۔ بڑی مشکل سے اس نے بیٹھنا سیکھا۔ اس کے علاج پر میں نے روپیہ پانی کی طرح بہایا۔ اس کے کئی آپریشن ہوئے۔ دس سال کی عمر میں وہ چلنے لگی لیکن ذہنی طور پر وہ آج بھی کچھ نہیں بس ایک جاندار ہے جسے کھانا پینا آتا ہے۔ ماں باپ کی شامت ہے۔

جہاں ... مجھے ایک طرف اس کو قدرت کی طرف سے ملنے والی اس سزا پر طمانیت محسوس ہورہی تھی وہیں' اُس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو دیکھ کے میرا دل بھی دکھی ہورہا تھا۔ آنسو اس کی سفید داڑھی بھگوتے جارہے تھے مگر اس کو احساس نہیں تھا کہ وہ رو رہا ہے۔ وہ منجمد بیٹھا خلا میں دیکھ رہا تھا۔ اپنی ساری زندگی اس کے سامنے تھی۔ ایک جہد لاحاصل۔ ایک سودائے زیاں۔ عقل کی فریب کاری کا مآل۔ بالآخر ندامتوں کے انگاروں کا برہنہ پا سفر' عذاب ذات کی نار جہنم اور یہ خیال کہ اگلے جہاں میں ایک زنداں ہے جو اس سے بھی بڑا زنداں ہے۔

رابعہ نے کہا "آصف علی صاحب' بہت اچھا ہوتا اگر آپ وزیر خاں مرحوم سے یہ سب کچھ کہتے جو آج سکندر سے کہنا بے کار ہے۔"

"میں نے کوشش کی تھی بیٹا' دیر سے ہی سہی۔ بزدل تو میں ہوں" وہ بولا "کئی برس گزاردیے میں نے سوچنے اور ہمت کرنے میں۔ میری بیوی نے کئی بار پوچھا کہ وزیر خاں کا کچھ پتا چلا۔ وہ جیل بھی گیا ہوگا تو اب تک چھوٹ گیا ہوگا۔ عمر قید کاٹنے والے رہا ہوجاتے ہیں چودہ سال بعد۔ میں نے اسے جھوٹ بول کے ٹال دیا کہ اس کا کوئی سراغ نہیں ملا اور اسے ڈھونڈنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ کہیں ہم نہ پھنس جائیں۔ اس نے تو اپنی سزا کاٹ لی ہوگی۔ ہم اب جیل جائیں گے کیا؟ یہ سن کے میری بیوی خاموش ہوجاتی تھی۔ اس بیٹی کے بعد خدا نے ہمیں تین بار اولاد سے نوازا۔ تینوں لڑکے تھے اور بالکل ٹھیک ٹھاک تھے مگر کوئی بھی نہ جیا۔ وہ دو دو سال کے ہوئے اور کسی وجہ کے بغیر مرگئے۔ بالکل ایک ہی عمر کو پہنچ کے ایک ہی طرح' وہ رات کو سوئے اور صبح نہیں اٹھے۔ ڈاکٹروں نے اپنی اپنی تاویل پیش کی۔ یہ ہوجاتا ہے اور وہ ہوجاتا ہے مگر اصل بات کوئی نہ جان سکا۔ صرف میں جانتا تھا کہ میرے اعمال کی سزا انہیں مل رہی ہے۔ میری بیوی کو اور میرے بچوں کو۔ جو فصل میں نے بوئی تھی وہ کاٹ رہے تھے لیکن سب سے زیادہ عذاب تو میرے لیے ہی تھا۔"

"وہ نوجوان کون تھا؟ تمہاری دکان پر' جسے تم نے اپنا بیٹا کہا تھا؟" میں نے کہا۔

"وہ..... بیٹا نہیں ہے میرا۔ ایک لاوارث لڑکا ہے' اس کے ماں باپ کا بھی کسی کو پتا نہیں۔ چھ سال کا تھا جب میں ایک خیراتی ادارے سے لایا تھا۔ بعد میں میری بیوی نے بھی اسے اپنا لیا۔ جب اپنے بیٹے نہ رہے۔ اس نے اپنی بیٹی کے لیے ایک سہارا تلاش کرلیا۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ..... اپنا سب کچھ ہم بیٹی کے حوالے کردیں۔ قانونی طور پر وہی وارث بھی ہے۔ اور بیٹی کو ہم اس کے سپرد کردیں گے۔ وہ قانونی طور پر اس کا شوہر ہوگا اور وہ اس کی بیوی ہوگی حالانکہ..... حالانکہ' وہ کسی کی بیوی نہیں بن سکتی مگر ہمیں اس کو تحفظ تو فراہم کرنا ہی تھا۔"

میں اور رابعہ دم بخود بیٹھے رہے "یہ بات اس لڑکے کو معلوم ہے؟"

"ہاں' میں نے اسے صاف بتادیا ہے کہ جب تک میں زندہ ہوں یا میری بیوی زندہ ہے' وہ ہماری بیٹی کا شوہر رہے گا اور اس کو حق حاصل ہوگا کہ اس دولت کو جیسے چاہے خرچ کرے۔ کاروبار کو جیسے چاہے چلائے۔ اگر یہ منظور نہیں تو جہاں چاہے چلا جائے۔"

"اور اس نے یہ شرط منظور کرلی؟" رابعہ بولی۔

"ہاں۔ پیسے میں بڑی کشش ہوتی ہے بیٹا۔ اور بڑی منحوس طاقت ہے اس میں۔ کالے جادو کی طرح" وہ بولا "عزت آبرو' شرافت اور انسانیت سب کچھ خریدلیتا ہے آدمی دولت سے۔"

میں نے کہا "اور فرض کرو' اس لڑکے نے ایک قاتل خریدلیا اپنی جان چھڑانے کے لیے..... پھر..."

"ہماری زندگی میں تو یہ ممکن نہیں۔ ہم میں سے ایک بھی نہ رہے تو پھر کچھ بھی ہو۔ ہم اپنے سامنے تو اپنی اولاد پر یہ ظلم نہیں ہونے دیں گے۔ ہم خود اسے نہیں مار سکے تو کوئی اور اسے کیسے مار سکتا ہے ہمارے ہوتے ہوئے۔ جب وہ سال بھر کی تھی' تب سے اب تک نہ جانے کتنی بار سوچا ہے میں نے کہ اس کے لیے اور اپنے لیے عذاب کو ختم کردوں۔ اس کی زندگی بھی کیا ہے' میرے لیے ایک مسلسل سزا۔ انسان کیا وہ جانور سے بھی بدتر زندگی گزار رہی ہے مگر میں اسے قتل نہیں کرسکا..... ناممکن تھا یہ کام میرے لیے۔"

اب وہ باقاعدہ ہچکیوں سے رو رہا تھا اور مجھ سے زیادہ رابعہ کو اُس کی حالت پر رحم آرہا تھا۔

"چلیے آصف صاحب' سب قدرت کے کھیل ہیں۔ صبر سے کام لیں" رابعہ نے اسے تسلی دی۔

میں نے کہا "جو ہونا تھا ہوچکا۔ آدمی کے اختیار کی بات نہیں کہ وہ خدائی میں دخل دے سکے۔"

"تم نے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ میں کیوں آیا تھا؟" آصف علی نے اپنے آنسو ایک رومال سے صاف کیے۔

"آپ اعترافِ جرم کرنے آئے تھے۔ مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں۔ وزیر خاں مرحوم کے اور آپ کے درمیان جو معاملہ ہے اس کا انصاف تو خدا ہی کرے گا" میں نے کہا "میرے والد ہوتے تو میں کہتا کہ آپ کو معاف کردیں۔ آپ کو بہت سزا مل چکی ہے۔ لیکن اب میں کیا کرسکتا ہوں؟"

"تم..... تھوڑا سا میرے احساس جرم کو' میرے بارِ گناہ کو کم کرسکتے ہو" اس نے عاجزی سے کہا۔

"وہ کیسے؟"

"دو سال پہلے میں نے وزیر خاں کو تلاش کیا" وہ بولا "میرے لیے ناممکن ہوگیا تھا اپنے احساسِ گناہ کے ساتھ زندہ رہنا

اور میرے دل میں ایک ڈر بیٹھ گیا تھا کہ جب تک وزیر خاں مجھے معاف نہیں کرے گا میری سزا کا یہ سلسلہ ختم نہیں ہوگا۔ مجھ میں ہمت نہیں تھی اس سے زیادہ عذاب برداشت کرنے کی۔ مجھے خیال آتا تھا کہ .... کسی دن اچانک کوئی حادثہ پیش آجائے گا اور میں لنگڑا لولا یا معذور ہوجاؤں گا۔ اندھا ہوجاؤں گا اور محتاج۔ میری دولت میرے کام نہ آئے گی۔ عین ممکن ہے میں دنیا میں بالکل اکیلا رہ جاؤں۔ بیوی بھی ساتھ چھوڑ جائے اور میں کسی فٹ پاتھ پر بھیک مانگتا مرجاؤں۔ بھیانک خیال ہر وقت پیچھا کرتے تھے اور میں محسوس کرتا تھا کہ یہی حالت رہی تو میں نفسیاتی مریض بن جاؤں گا۔"

"پھر وزیر خاں ملا آپ کو؟" رابعہ بولی۔

"نہیں' میں اُس کی فیکٹری گیا اس سے ملنے۔ وہاں اس کا دوسرا پارٹنر بیٹھا تھا۔ میر شرافت علی۔" آصف علی نے کہا "وہ مجھے نہیں جانتا تھا اور میں اس کو نہیں بتا سکتا تھا کہ میرا وزیر خاں سے ملنا کیوں ضروری ہے۔ میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ یہ ایک ذاتی اور کاروباری معاملہ ہے۔ وہ میرے پیچھے پڑ گیا کہ کاروباری معاملہ ہے تو مجھے بتاؤ۔ میں بھی اس کا پارٹنر ہوں برابر کا۔ جب میں نے صاف کہا کہ وزیر خان کے سوا میں کسی سے بات نہیں کروں گا تو اس نے کہا کہ وہ باہر ہے اور اکثر باہر رہتا ہے۔ میں نے اسے اپنا ٹیلی فون نمبر اور پتا دیا کہ جب وہ آئے تو میری اس سے بات کرادے لیکن دو مہینے گزر گئے اور وزیر خاں نے مجھے فون نہیں کیا۔ میں مایوس ہوگیا۔ شاید اب وہ مجھ سے بات کرنے کا بھی روادار نہیں تھا۔ ہمت کرکے میں نے اسے فون کیا مگر وہاں نہ جانے کون بدتمیز بیٹھا تھا۔ کہنے لگا کہ یہاں کوئی وزیر خاں نہیں ہے میں سمجھا نمبر غلط مل گیا ہوگا۔ دوبارہ فون کیا تو اسی شخص نے کہا کہ مرگیا وزیر خاں۔ میں نے کہا بھائی' یہ کیا کہہ رہے ہو۔ ابھی دو مہینے پہلے میری شرافت علی سے بات ہوئی تھی تو اس نے بتایا تھا کہ وہ باہر گیا ہوا ہے۔ تم کون ہو؟ اس نے کہا میرا نام ہے چوہدری دلاور۔ کیا کام تھا تمہیں وزیر خاں سے؟ میں نے جو پہلے کہا تھا وہی دلاور سے بھی کہہ دیا۔ یہ میرا اور اس کا ذاتی معاملہ ہے۔ مجھے اس کا کچھ قرض ادا کرنا تھا۔ اب وہ انتقال کرچکا ہے تو مجھے اس کے کسی وارث کا پتا بتادو۔ اس کا ایک لڑکا تھا کبیر خاں! اس پر وہ خاموش ہوگیا اور پھر بولا۔ وہ تو یہاں نہیں ہوتا' لندن میں عیش کررہا ہے۔ پھر میں نے تمہارا پتا مانگا تو اس نے کہا' مجھے نہیں معلوم اور فون بند کردیا۔ ایک مہینے بعد میں نے میر شرافت علی کو پوچھا۔ وہ کچھ معقول اور شریف آدمی تھا چوہدری دلاور کے مقابلے میں۔ اس نے کہا کہ وزیر خاں عرصے پر گیا ہوا ہے اس بات نے مجھے چکر میں ڈال دیا۔ میں نے کہا' یہ چوہدری دلاور کون ہے؟ اس نے کہا وہ بھی ایک پارٹنر ہے۔ ایم ڈبلیو ڈی اینڈ کمپنی کا مطلب ہے میر وزیر اینڈ دلاور' ہم تینوں برابر کے حصے دار ہیں۔ میں نے کہا پھر چوہدری دلاور نے کیوں کہا تھا مجھ سے کہ وزیر خان مرگیا؟ اس پر میر شرافت علی نے کسی سے بات کی پھر مجھے جواب دیا' چوہدری دلاور صاحب کہتے ہیں کہ انہوں نے کسی سے بھی اس قسم کی احمقانہ بات نہیں کی۔ اس نے مجھے جھوٹا قرار دے دیا تھا۔ اس سے میں شک میں پڑگیا اور میں نے بعد میں ذاتی طور پر معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی مگر میرا وزیر خاں سے رابطہ نہ ہوسکا۔ مجھے تمہارا پتا بھی نہیں ملا۔ ادھر میری کاروبار مصروفیات ایسی تھیں کہ میں ہر روز لاہور نہیں جاسکتا تھا۔

آصف علی نے بہت پرانے مندمل ہوجانے والے زخموں کو کُرید ڈالا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کہانی کے پیچھے کیسے انسان کو قتل کرکے اس کی لاش کو بے آبرو کرنے والے درندہ صفت شکاری تھے اور انہوں نے کیسے وزیر خاں کے بعد اس کے وارث اور نام لیوا کا نام بھی لوح جہاں سے مٹادینے کی پوری کوشش کی تھی۔

رابعہ نے کہا "اگر وزیر خاں تمہیں مل جاتا آصف علی تو اس سے کیا کہتے؟ صرف معافی مانگتے' الفاظ تو وہ گھاؤ نہیں بھرتے رشتوں کی بے وفائی دیتی ہے جو اپنوں کے پیٹھ میں خنجر گھونپنے ملتے ہیں۔"

"ہاں' میں اس سے بہت زیادہ کرنا چاہتا تھا۔ میں اپنا آدھا کاروبار اُس کے سپرد کردیتا۔ میں اسے برابر کا شریک بنالیتا کیونکہ اس میں آدھا پیسہ بہرحال وزیر خاں کا تھا۔"

اور تم کیا سمجھتے ہو وہ قبول کرلیتا؟" میں نے نفرت سے "اس وقت شاید پچیس ہزار اسکا سارا اندوختہ تھے۔ اب تم دس لاکھ بھی دیتے تو وہ لات پر تھوک کے تمہارے منہ پر کھینچ مارتا۔ خود تم نے اعتراف کیا ہے کہ وہ تم جیسے دس دکانداروں کو خرید سکتا تھا وہ تمہیں کبھی معاف نہ کرتا۔ تمہاری سزا برقرار رکھتا جو تم زندگی آخری سانس تک کاٹتے۔"

"نہیں' وہ ایسا نہیں تھا۔ میں جانتا ہوں' وہ پتھر کا دل نہیں رکھتا تھا۔ وہ دشمنوں کو معاف کرنے کا ظرف اور حوصلہ رکھتا تھا اگر میں اس کے پاؤں پکڑلیتا تو وہ مجھے ٹھوکر نہ مارتا۔ تم بھی اس کے بچے ہو اور تمہیں اس کی صورت دی ہے خدا نے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ سیرت وزیر خاں کی نہ ہو۔"

مجھے بھی اب اس کی حالت پر افسوس ہورہا تھا اور اس بات کا احساس بھی ہو رہا تھا باوجود کہ آصف علی میرے والد کو دھوکا دینے والا پہلا شخص تھا میں اس کے خلاف دل میں وہ عناد نہیں رکھتا تھا جو مجھے چوہدری دلاور' میر شرافت علی یا استاد پیڈرو سے تھی۔ چوہدری دلاور وزیر خاں کے واحد وارث یعنی مجھے بھی ختم کرنے کے درپے تھا اس کو نہ اپنی مجرمانہ غلطی پر ندامت تھی اور نہ اپنے اعمال کی سزا کا خوف۔ اس کو غرور تھا اپنی طاقت پر اور اپنی دولت پر۔ پیڈرو جیسے کرائے کے قاتلوں کی فوج کے ساتھ مجھے نیست و نابود کردینے پر روزِ اول کی طرح کمربستہ تھا۔ اس کے برعکس اس

لیے زندگی کی ایک غلطی تمام عمر کا پچھتاوا بن گئی تھی۔ اس کے بری عادت' اس کی روح کا آزار بن گئی تھی اور اب وہ اپنی غلطی کا کفارہ ادا کرنے کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار تھا۔ وزیر خاں نے کوئی بددعا نہیں دی ہوگی مگر اسے احساس تھا کہ اس کی زندگی کے سارے عذاب اسی ایک غلطی کی سزا ہیں اور عمر کے ساتھ ساتھ یہ بارِ گناہ اتنا بڑھ گیا تھا کہ وہ وزیر خاں کو تلاش کرتے کرتے تھک گیا تھا مگر ہمت نہیں ہارا تھا یہاں تک کہ تقدیر اسے میرے دروازے تک لے آئی تھی۔ اپنے سفید بالوں کی پروا کیے بغیر وہ میرے سامنے رو رہا تھا۔ اپنے جرم کا اعتراف کررہا تھا' اپنی سزا کے خوف میں مبتلا تھا اور مجھ سے بھی معافی چاہتا تھا۔

نہ جانے کیوں مجھے خیال آیا کہ میری جگہ میرے والد ہوتے تو اب تک اس دشمن کو بھی گلے لگا چکے ہوتے جو اپنی انا کا خون کرکے اور اپنے مقام اور مرتبے کی پروا کیے بغیر ایک مجرم کی حیثیت سے ان کے سامنے پیش ہوگیا تھا اور اپنی ساری ذلت و رسوائی کو برداشت کرتے ہوئے ان کے سامنے دست بستہ معافی کا خواستگار تھا۔ "غلطی کس سے نہیں ہوتی کبیر خاں۔" میرے کانوں میں جیسے ان کی پرانی آواز گونجنے لگی "جب اولیاء و انبیاء نے اپنے خطاکار ہونے کا اعتراف کیا اور کبھی خود کو مقام بشریت سے بالاتر نہیں جانا تو ہم کیا ہیں۔ غلطی کے پتلے۔ ہم فرشتے ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتے اور خطا کیا فرشتوں سے نہیں ہوتی۔ آخر ابلیس نے بھی تو سرکشی کا گناہ کیا تھا۔ بس ایک بغاوت نے اسے مردود و ملعون کیا ورنہ وہ معبود تو بڑا رحمان و رحیم ہے اور معاف کرنے والا ہے۔ اسے معاف کردو۔ عفو و درگزر میں بڑائی ہے لیکن اپنی غلطی پر اپنے سے چھوٹوں کے سامنے شرمندہ ہوکے معافی مانگنا بہت بڑی بات ہے' ہر شخص ایسا نہیں کرسکتا۔"

مجھے یاد تھا وہ اپنے ملازموں' ماتحتوں اور ساتھیوں کی غلطیوں کو معاف کرنے کے معاملے میں کتنے فراخ دل تھے۔ چھوٹے ہوتے بہت سے واقعات مجھے یاد تھے جب انہوں نے خیانت اور دھوکا دہی کرنے والوں کو پکڑا مگر اتنا کہہ کے چھوڑ دیا کہ جاؤ... میں نے معاف کیا۔ اللہ بھی تمہیں توفیق دے کہ تم پھر شیطان کے پیچھے نہ چلو' وہ تمہیں پھر نہ بہکائے۔"

"آصف علی صاحب' بتایئے آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟" بالآخر میں نے اپنا دل صاف کرکے کہا۔

"وہی جو میں وزیر خاں سے چاہتا۔ میں اپنا قرض چکانا چاہتا تھا' اصل پر سود کے ساتھ یا میری خطا پر جرمانے کے ساتھ۔ تم اس کے قانونی اور اخلاقی وارث ہو' جو میری غلطی کے باعث اس وقت نہ ہوا۔ وہ آج ہوسکتا ہے۔"

"کیا ہوسکتا ہے؟"

"تم میرے کاروبار میں شریک ہوکے آدھے کے مالک بن جاؤ' جو کچھ میرے پاس ہے۔ اس میں سے ...."

میں نے کہا "یہ ناممکن ہے۔"

"کیوں ناممکن ہے' مجھے تمہاری ضرورت ہے کبیر خاں۔ تم وزیر خاں کی جگہ۔ نہیں لوگے تو اور کون لے گا؟"

"میرے پاس خدا کا دیا بہت ہے اور نہ مجھے کسی چیز کی ضرورت ہے' نہ خواہش۔ آپ کا کاروبار آپ کو مبارک ہو۔ میرے پاس فرصت بھی نہیں ہے۔"

"تم کچھ مت کرو۔ بس مجھے موقع دو کہ میں اپنے قرض سے سبکدوش ہوجاؤں ورنہ میرا مرنا بھی مشکل ہوگا۔ تم شاید اسے ایک بوڑھے کا پاگل پن ہی سمجھو گے مگر نہ جانے کیوں میرے دماغ سے یہ خیال نہیں جاتا کہ میرے کُل سرمائے کا نصف وزیر خاں کا تھا۔ نفع نقصان ہر صورت میں نصف آج بھی اس کا ہونا چاہیے۔"

اچانک مجھے ایک اور خیال آیا "دیکھیے آصف علی صاحب' میرے پاس اس وقت تو تفصیل میں جانے کا وقت نہیں ہے۔ ورنہ میں بھی آپ کو بتاتا کہ وزیر خاں کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ مختصراً یہ سمجھ لیں کہ جب میں لندن میں تھا تو اس کے دونوں پارٹنرز میر شرافت علی اور چوہدری دلاور نے اس سے سب کچھ چھین لیا اور اسے پائی پائی کا محتاج کرکے مار ڈالا۔ یہ سب مجھے لندن میں معلوم نہ ہوسکا۔ پتا نہیں کیوں میرے والد نے بھی سب مجھ سے چھپایا اور جب میں واپس آیا تو ان کا انتقال ہوچکا تھا۔ یہ سب گزشتہ ڈیڑھ دو سال میں ہوا جب آپ نے ان سے ملنے کی کوشش کی تھی اور اُن کے قاتلوں نے آپ کو بھی ٹال دیا تھا۔ بعد میں چوہدری دلاور نے اپنے پارٹنر میر شرافت علی کو بھی مروادیا اور کوشش کی کہ اس کے قتل کے جرم میں مجھے تختۂ دار تک لے جائے لیکن وہ اپنے مقصد میں ابھی تک ناکام رہا ہے۔ میں ابھی تک اپنے والد کے قاتلوں کو کیفرِ کردار تک تو نہیں پہنچا سکا لیکن کسی حد تک اپنا حق حاصل کرنے میں کامیاب رہا ہوں۔ مجھے اپنا آبائی گھر مل گیا ہے اور جہاں ان کی فیکٹری تھی وہاں اب ایک رفاہی شفا خانہ ہے جس میں غریبوں کا مفت علاج ہوتا ہے۔ ان کے نام سے ایک ٹرسٹ قائم کردیا گیا ہے اور ٹرسٹ کی آمدنی سے اسپتال کے اخراجات پورے ہوتے ہیں۔ اگر آپ کچھ کرنا ہی چاہتے ہیں تو قرض مجھے لوٹانے کے بجائے وزیر خاں ویلفیئر ٹرسٹ کو ادا کردیں۔ آپ اپنا قرض براہِ راست وزیر خاں کو چکا سکتے ہیں۔ سود یا جرمانہ ادا کرنے کے بجائے صدقہ جاریہ کا ثواب کما کے آپ سرخ رو ہوسکتے ہیں۔ قدرت نے تو پہلے سے شاید آپ کے لیے ہی انتظام کردیا تھا۔"

"تم .... تم سچ کہہ رہے ہو .... یہ ہوسکتا ہے؟" اس کا چہرہ مسرت سے دمکنے لگا "پہلے کیوں نہیں بتایا تھا تم نے کبیر خاں' اب مجھے لگتا ہے کہ قدرت کی سزا پوری ہوگئی ورنہ مجھے ایسا موقع کہاں ملتا۔ میں ایسا ہی کروں گا۔ اللہ نیتوں کا حال جانتا ہے۔ وہ معاف کرنے والا ہے۔"

میں نے کہا "ابھی اس ٹرسٹ کا انتظام کلی طور پر میرے ہاتھ

میں نہیں ہے۔ فردِ واحد کے ہاتھ میں ہوگا بھی نہیں۔ میرا مطلب یہ تھا کہ میں اس کے بورڈ آف ٹرسٹی کا رکن نہیں ہوں۔"

"پھر کون ہے؟"

"بدقسمتی سے ابھی تک وہی اس کے منتظم بنے بیٹھے ہیں جو وزیر خاں کے قاتل تھے۔ جن کے دامن پر اس کے بے گناہ لہو کے داغ ہیں۔ نگراں کے ساتھ میرا ایک دوست بھی ہے۔ جس کا نام میں نے آپ کے سامنے استعمال کیا تھا اور وہ یہ ہے' رابعہ قاری ایڈووکیٹ ہائی کورٹ۔"

"ماشاءاللہ۔ خدا نے تمہیں...."

میں نے کہا "معاف کیجئے گا' میں نے ایک ضرورت کے تحت بہت سے جھوٹ بولے تھے۔ ایک یہ بھی ہے کہ رابعہ میری بیوی ہے۔ وہ وقت زیادہ دور نہیں ہے جب ایسا ہی ہوگا لیکن ابھی تو یہ میری معاون و مددگار بھی ہے اور محافظ بھی۔ میری وکیل بھی ہے یہ سب سے پہلی۔"

"اچھا اچھا' اللہ وہ دن بھی لائے۔ یہ بتاؤ کہ میں اس ٹرسٹ کے لیے کیا دوں۔ نقد رقم یا جائداد...."

میں نے کہا "جب وقت آئے گا تو میں آپ کو بتادوں گا۔ ابھی میں کسی اور چکر میں پشاور آیا ہوا ہوں۔"

"کوئی پریشانی کی بات ہے تو مجھے بتاؤ۔"

اس سے پہلے کہ میں اُسے اپنی پشاور آمد کا مقصد بتاتا' ملازم نے مطلع کیا کہ کھانا میز پر لگا ہوا ہے۔

میں نے کہا "آیئے۔ اب کھانا کھا کے جایئے۔"

"تم نے تو انکار کردیا تھا!"

"مگر ہم آپ کو انکار نہیں کرنے دیں گے" رابعہ نے کہا۔

میں نے کہا "میں آپ کو کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ شاید آپ میری کچھ مدد کرسکتے ہوں۔"

کھانے کی میز پر آصف علی کا تعارف کاجل سے ہوا اور کلیم اللہ سے۔ میں نے مختصر الفاظ میں اپنے مشرقی پاکستان جانے اور وہاں پیش آنے والے واقعات کا تذکرہ کیا' پھر اپنے لاہور سے اچانک روانہ ہونے کے اسباب بتائے اور پولیٹیکل ایجنٹ سے ملاقات تک پیش آنے والے سارے حالات کی رُوداد سنائی۔ وہ غور سے سنتا رہا۔

"اب میرے مسائل دو ہیں" میں نے کہا "ایک تو مجھے معتبر قسم کے افراد کی گواہی چاہیے' یہ ثبوت چاہیے کہ میں ایک ہفتے سے پشاور میں ہوں۔ اس طرح لاہور سے میری عدم موجودگی ثابت ہوجائے گی' اور ہم پر چاندنی کے قتل کا الزام عائد کرنے والوں کی سازش خود ہی ناکام ہوجائے گی۔"

"یہ ہوجائے گا۔ تم فکر مت کرو۔ اتنا عرصہ گزار چکا ہوں میں پشاور میں اور میرے تعلقات ہر سطح پر ہیں۔ تم کہو تو ڈی آئی جی کی گواہی دلوادوں۔ تمہیں کسی اسپتال میں داخل دکھادوں؟"

"ویری گڈ۔ یہ سب سے بہتر ہوگا۔" میں نے کہا "دوسرا مسئلہ یہ تھا کلیم اللہ کا۔ ہم خود جانا چاہتے تھے اور اس کے رشتے داروں سے مل کے اپنا اطمینان کرلینا چاہتے تھے مگر پولیٹیکل ایجنٹ نے کہا کہ یہ ممکن نہیں۔ اس کے رشتے دار خود آکے اسے لے جائیں گے۔"

"اس میں کیا حرج ہے؟"

"حرج تو کوئی نہیں مگر نہ کلیم اللہ انہیں پہچانتا ہے' نہ ہم انہیں جانتے ہیں' بچّے کا معاملہ ہے۔ ایسا نہ ہو دشمنوں کے ہاتھ پڑجائے۔"

"اس کا کوئی دشمن ہے؟" آصف علی نے کلیم اللہ کو غور سے دیکھا۔

"کیا معلوم! اس کے والد کا دشمن ہوا تو کلیم اللہ کا بھی ہوگا۔ یہ دشمنی تو نسل در نسل چلتی ہے یہاں۔ ورثے میں ملتی ہے" میں نے کہا۔

"یہ تو ہے' خیر.... کل میں کچھ کروں گا" آصف علی بولا۔

"آفریدی زندہ رہتا تو کوئی مسئلہ نہ تھا۔"

"اور بھی لوگ ہیں .... میرے تعلقات غیر علاقے کے سرداروں سے بھی ہیں" آصف علی نے مجھے تسلی دی "وہ خود تمہیں لے جائیں گے۔"

وہ صبح آنے کا وعدہ کرکے رخصت ہوگیا۔ جاتے وقت ایک بالکل مختلف آدمی تھا۔ مطمئن اور مسرور تھا اور قدرت کی اس مہربانی پر شکرگزار جس نے اسے بالآخر اپنے احساسِ جرم وگناہ کے بار سے نجات دلانے کا موقع فراہم کیا۔ جب وہ خود وزیر خاں کی تلاش میں تھا تو اسے ناکامی اور مایوسی کے سوا کچھ نہ ملا تھا۔ شاید اس کے اعمال کی جتنی سزا لکھی گئی تھی وہ پوری نہیں ہوئی تھی یا یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ اس کام کے لیے بھی ایک وقت مقرر تھا چنانچہ اس سے پہلے انسانی کوشش بے سود تھی اور جب یہ وقت آیا تو منزل خود اُس کے سامنے پہنچ گیا۔ وہ جس منزل کی جستجو میں برسوں سے سرگرداں تھا وہ خود چل کے اُس کے پاس آگئی۔

کھانے کے بعد کاجل اور کلیم ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔ میں اور رابعہ سامنے لان میں ٹہلتے رہے اور آصف علی کی باتیں کرتے رہے۔ رابعہ کا بھی خیال یہی تھا کہ ایمان کی آزمائش کے ایک لمحے میں آصف علی کی لغزش پر قدرت کی طرف سے ملنے والی سزا بہت کافی تھی اور اب وہ اپنے سابقہ اعمال کا کفارہ ادا کرنا چاہتا ہے تو اس کی حوصلہ شکنی اور اس کے ارادوں کی راہ میں مزاحمت ہماری غلطی ہوگی۔ اگر کوئی برائی کو چھوڑ کے نیکی کا راستہ اختیار کرنا چاہے تو اُس کا راستہ روکنا بھی کوئی نیکی نہیں ہوسکتی۔

رات بارہ بجے تک کاجل اور کلیم اللہ سونے کے لیے جاچکے لیکن میں پرانے وقتوں کی یادوں کے ساتھ جاگ رہا [illegible] آصف علی میری کتاب ماضی کا ایک ایسا باب تھا جو میں نے [illegible] تک نہیں دیکھا تھا۔ اُس کی باتوں نے مجھے اس بچپن کی طرف [illegible] تھا جس کے دھندلے نقوش میں مجھے اپنا اور وزیر خاں کا چہرہ [illegible] ہی دکھائی دیتا تھا۔ جو اس کا ماضی تھا وہ میرا حال تھا۔ شاید کل [illegible] ماضی ہوگا ایک اور تاریخ کا سفر ہوگا جس میں وزیر خاں اور [illegible] خان کے بعد کوئی قدیر خاں اپنی خاندانی روایات پر اسی عزم [illegible] ار کے ساتھ گامزن نظر آئے گا اور تاریخ کے ہر دَور کی طرح اس مقابل بھی آصف علی جیسے پشت پر وار کرنے والے دوست ہوں اور چوہدری دلاور جیسے دشمن ہوں گے۔ زندگی نام ہے خیر و شر رزم گاہ کا مگر یہاں جیتے وہ ہیں جو خیر سے نمو پاتے ہیں۔ شر سے پانے والے دونوں جہاں ہار دیتے ہیں۔"

آخر شب کا چاند نکلنے تک سردی بڑھ گئی۔ رابعہ سردی سے [illegible] نے لگی۔

"چلو اندر چلتے ہیں۔"

میں نے کہا "کیا نیند آرہی ہے؟"

"نیند تو نہیں آرہی ہے۔ باتیں اندر بھی ہوسکتی ہیں۔"

میں نے کہا "مس رابعہ' یہ خاک ریسٹ ہاؤس ہے۔ یہ نام ہی ہے۔ یہاں نہ آرام ہے نہ گھر جیسی کوئی بات۔"

رابعہ مسکرائی "اچانک آپ کو کیا پریشانی لاحق ہوگئی؟"

"جہاں آدمی کو اپنی مرضی سے چائے کا ایک کپ نہ ملے' کافی [illegible] ور کی بات ہے۔ وہاں پریشان ہونا جائز ہے۔" میں نے کہا۔

رابعہ بولی "ملازم سوگیا ہوگا۔ ورنہ چائے بنادیتا۔ اس غریب [illegible] جگانا تو ظلم ہوگا۔"

"ظلم کہاں نہیں ہورہا ہے خاتون۔ اس کے علاوہ' علامہ اقبال نے تو فرمایا تھا کہ اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگادو۔ ظاہر ہے انہی سے کہا گیا ہوگا جو خود جاگ رہے ہوں گے۔"

"چلو میں دیکھتی ہوں کچن کدھر ہے۔ شاید وہاں نصیب سے کچھ مل جائے" رابعہ بولی۔

ہم دبے پاؤں عقبی برآمدے سے گزرے جہاں ملازم اور چوکیدار رضائی میں لپٹا پڑا تھا۔ کھانے کے کمرے سے گزرتے ہوئے پہلے میں ایک کرسی سے الجھا پھر رابعہ اسٹول سے ٹھوکر کھاکے گرتے گرتے بچی۔ اگر ہم لائٹ جلالیتے تو کچھ بھی نہ ہوتا مگر ایسے اندھیرے میں چوری چھپے قسمت آزمائی کے ایڈونچر میں مزہ آرہا تھا۔

کچن میں پہنچ کے رابعہ نے دروازہ بند کیا "اُف! میری تو ایک ٹانگ بے کار ہوگئی ہے اسٹول لگنے سے۔"

"کوئی بات نہیں' خدا کا شکر ادا کرو کہ اسٹول سر میں نہیں لگا۔" میں نے کہا "میرا بھی پنجہ غالباً پیچھے مڑگیا ہے۔ ایک پاؤں سیدھا ہے دوسرا الٹا۔"

رابعہ ہنسی۔ اُس کے ہاتھ کچن میں مختلف ڈبوں کو اٹھانے اور کھولنے میں مصروف رہے۔ بالآخر اس نے چائے کی پتی اور چینی دریافت کرلی۔ پانی موجود تھا اور دودھ کے بغیر کام چلایا جاسکتا تھا۔ رابعہ نے مٹی کے تیل کا چولہا جلایا اور ایک المونیم کی سیاہ نظر آنے والی کیتلی میں پانی رکھ دیا۔

"آصف علی کے ملنے سے میری آدھی پریشانی دور ہوگئی" میں نے کہا۔

"اس کی بھی آدھی پریشانی ختم ہوگئی۔ بہت عبرت آموز ہے اس کی زندگی" رابعہ نے کہا۔

میں نے کہا "رابعہ' کیا تم سمجھتی ہو آصف علی نے اپنی معذور بیٹی کے مستقبل کے تحفظ کے لیے جو انتظام کیا ہے وہ ٹھیک ہے؟"

رابعہ نے نفی میں سر ہلایا "وہ لڑکا مجھے ٹھیک نہیں لگا تھا۔ اس کی سرکشی کا ابھی سے یہ حال ہے۔ اسے سمجھنا چاہیے کہ وہ زرخرید ہے اور اچھے ہوں یا برے' زرخرید رشتے کبھی بھروسے کے قابل نہیں ہوتے۔ اسے دولت کی ہوس نے اس مجبوری کی زنجیر میں باندھ رکھا ہے۔ جیسے ہی موقع ملے گا وہ زنجیر کاٹ کے فرار ہوجائے گا۔"

"یہ ہوسکتا ہے کہ آصف علی اسے بھاگنے نہ دے۔ وہ سب کچھ اپنی تحویل میں رکھے اور اس لڑکے کو ایک جھوٹے بے بنیاد رشتے کو نباہنے کی منہ مانگی قیمت ادا کرتا رہے" میں نے کہا۔

"مگر آصف علی کے بعد کیا ہوگا؟"

"اُس کی بیوی شاید کاروبار اور مالی معاملات کو اپنے کنٹرول میں نہ رکھ سکے۔" میں نے کہا "وہ لڑکا جو ساری دنیا کے سامنے ان کا داماد ہوگا انہیں بلیک میل کرے گا۔ جب اسے منہ مانگی قیمت ملے گی تو کیا وہ اس بیوی کا وفادار رہوگا جو درحقیقت بیوی بھی نہیں۔ وہ دوسری عورتوں کے پیچھے بھاگے گا۔ ممکن ہے دوسری شادی کرلے۔ ایک معذور بیوی کی موجودگی میں اس کے پاس قانونی اور اخلاقی جواز ہوگا۔"

"اتنی دولت ملنے کی امید ہو تو آدمی کچھ بھی کرسکتا ہے" رابعہ بولی اور ابلتے پانی میں چائے کی پتی ڈالنے لگی۔

"یہ بھی ٹھیک کہا تم نے' آصف علی تو دنیا دیکھ چکا ہے اور تجربہ رکھتا ہے۔ اس کی بیوی کو راستے سے ہٹانا کوئی مشکل نہ ہوگا۔ اس عمر میں غیر طبعی موت کو طبعی موت بنانے میں زیادہ خرچ بھی نہیں ہوتا پھر رہ جائے گی وہ مظلوم و مجبور مخلوق جس کو اپنے آدمی ہونے کا اتنا بھی شعور نہیں جتنا جانور کو اپنے جانور ہونے کا ہوتا ہے۔ اسے آسانی سے کسی پاگل خانے کی دیواروں کے پیچھے پھینک کر بھلایا جاسکتا ہے۔" میں نے کہا۔

رابعہ نے کہا "سکندر، ہم کچھ نہیں کرسکتے اُس کے لیے!"

میں نے کہا "تم نے اس وقت میرے منہ کی بات چھین لی' اس لیے جی چاہتا ہے تمہارا منہ....."

"چائے لیجئے" رابعہ نے پیالی مجھے تھمائی "فی الحال اسی سے گزارا کیجئے۔"

"مجھے وہ شعر یاد آتا ہے۔ چائے کے بارے میں عدم نے کیا خوب فرمایا ہے۔ ایک دوشیزہ کے لبوں کی طرح۔ اس میں گرمی بھی ہے' مٹھاس بھی ہے۔" میں نے کہا۔

جو تیرے سیہ فام بھی ہے" رابعہ ہنسی اور پھر اچانک سیریس ہوگئی "ہم آصف علی کی اس ذہنی و جسمانی طور پر معذور بیٹی کو وزیر خاں اسپتال میں کیوں نہ رکھ لیں۔ وہاں اس کا علاج بھی ہوگا اور دیکھ بھال بھی۔ اسے ساری زندگی وہاں گزارنی پڑے تب بھی خطرہ تو کوئی نہیں ہوگا کہ دولت کی خاطر کوئی اسے قتل کروادے۔"

"بالکل ٹھیک۔ مجھے یقین ہے آصف علی بھی اس انتظام سے خوش ہوگا۔ پہلے ہم اس کی بیٹی کو دیکھ لیں پھر اس سے بات بھی کرلیں گے" میں نے کہا۔

"اس نے ہمیں بڑی مصیبت سے بچالیا۔ اب چوہدری دلاور ثابت کرکے دکھائے کہ ہم چاندنی بیگم سے ملنے گئے تھے" رابعہ بولی۔

ہم چائے کا مگ لے کر کھانے کے کمرے میں آگئے اور لائٹ جلادی مگر ملازم نے کروٹ تک نہ لی۔

"کیا خیال ہے منظر کو بھی جگایا جائے؟" میں نے کہا "کچھ گالیاں کھانے کو جی چاہتا ہے۔"

"ضرور کھاؤ۔" رابعہ ہنسی۔

"اس سے پوچھا جائے کہ چاندنی کے قتل کے کیس کا کیا بنا؟"

"چاندنی کا قتل! کیا زبردست عنوان ہوسکتا ہے کسی کہانی کا یا نظم کا" رابعہ بولی۔

میں نے فون اٹھالیا جو کمرے کے ایک کونے میں رکھا ہوا تھا اور کھانے کی میز پر لے آیا "اسے بتادینا چاہیے کہ ہم نے اپنے دفاع کا بندوبست کرلیا ہے تاکہ وہ ڈٹ جائے مقابلے پر کہ میرے موکل تو یہاں ہیں ہی نہیں' ایک ہفتے پہلے پشاور میں تھے۔ اب پتا نہیں کہاں ہیں۔ باقی سب لوگوں کے بارے میں کوئی اطلاع ہوگی تو وہ بھی مل جائے گی۔"

گھنٹی بہت دیر تک بجتی رہی پھر منظر کی آواز سنائی دی "ابے بھائی' کس کے پیٹ میں درد اٹھا ہے آدھی رات کو" اس نے نیند میں ڈوبے ہوئے بیزار لہجے میں کہا۔

"میری بیوی کے پیٹ میں۔" میں نے رونی آواز میں کہا۔ "اب کیا ہوگا؟"

"ابے یا لڑکا ہوگا یا لڑکی۔ سالے' یہ مجھے جگا کے پوچھنا ضروری تھا۔ میں وکیل ہوں دائی نہیں" منظر نے غالباً میری آواز نہیں پہچانی تھی۔

میں نے کہا "چودہ بجے ہوگئے ہیں۔ اب تو تجھے گائنک وارڈ انچارج بنایا جاسکتا ہے۔ ابھی پندرہ تو نہیں ہوئے نا؟ باز آجا اب بھی..."

"ابے تُو' تیری تو....." اس نے مجھے تین چار ناقابلِ اشاعت گالیاں دیں "یہ تُو مجھ سے پوچھتا ہے... کے۔ خود تو شادی کی ہمت نہیں پڑتی۔ جس نے ابھی کھیت نہیں خریدا وہ کھلیان والے کو کہتا ہے کہ ہل مت چلاؤ۔"

میں نے کہا "شرم کر' تیری بیوی بھی سن رہی ہوگی۔"

"میں تو کہتا ہوں' وہ بھی سن لے جو تیری بیوی نہیں ہے۔"

"بات سن۔ اس چاندنی بیگم والے کیس میں تو بیان داخل کردے کہ میرے موکل تو ایک ہفتے سے پشاور میں ہیں۔ ہم نے گواہی پکی کرلی ہے۔"

وہ گلا پھاڑ کے ہنسا "ابے کیسا چاندنی کا کیس میرے چاند۔ وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ خود ہی ساری دوا کھا گئے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ میرے پڑوس میں سے تیری بھاوج سلام عرض کرتی ہے۔" منظر بولا "کیا کہا کتنی دور ہے۔ ابے دوری کیسی۔ دور ہوں ہمارے دشمن۔"

"اپنی طرف سے بکواس مت کر۔ چاندنی کا کیا ہوا؟"

"سب چوپٹ ہوگیا۔ وہ جو گولا ٹنڈوالا تھا نا۔ چاندنی کا وہ۔ اس سالے نے خودکشی کرلی۔ حرام موت مرگیا۔ حرام زندگی گزارنے کے بعد۔"

میں نے کہا "کیا! خودکشی کرلی..... کیسے.....؟"

"جب تُو آئے گا نا تو تیرے گلے میں ڈالوں گا رسّی کا پھندا۔ اس کا دوسرا سرا باندھوں گا چھت کے پنکھے سے اور نیچے سے اسٹول کو لات مار کے بتاؤں گا کہ ایسے.... سمجھ آجائے گی تجھے۔"

"مگر... خیر چھوڑ.... جو ہوا اچھا ہوا.... یہ بتا اور کسی کی کوئی اطلاع ہے؟"

"ہاں ایک خبر ہے۔ پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔ وہ جو تیرے یار کی گل بانو تھی نا۔ ڈاکو شیش ناگ کی بہن۔ اس کی تصویر چھپی ہے اخبار میں..."

اچانک لائن کٹ گئی۔ میں نے کہا "ہیلو.... ہیلو...!" مگر فون ڈیڈ ہوگیا تھا۔ میں نے پھر نمبر ملانے کی کوشش کی مگر فون کے ریسیور میں ٹون ہی نہیں تھی۔

اسی وقت باہر سے قدموں کی آواز سنائی دی۔ کوئی پرانی روش کے کنکروں پر چلتا ہوا آرہا تھا اور آنے والا ایک نہیں تھا۔

میں بے اختیار دروازے کی طرف بڑھا "اِس وقت کون آیا؟"

رابعہ نے مجھے روک لیا "ایسے مت جاؤ۔"

"پھر کیسے جاؤں؟ سر کے بل۔" میں نے کہا۔

"پتا نہیں کون لوگ ہیں۔" رابعہ بولی۔

"اچھا میں نہیں جاتا۔ پہلے تم پوچھ آؤ کہ بھئی کون ہو۔ نام ولدیت معلوم کرو پھر میں جاؤں گا۔" میں نے اس کی بات مذاق میں ٹال دی۔

مگر وہ ضرورت سے زیادہ خوف زدہ تھی۔ باہر آنے والوں کے قدموں کی آواز رُک گئی تھی۔ معلوم نہیں وہ کیا دیکھ رہے تھے اور کس بات کے منتظر تھے۔ ایک منٹ کے بعد دروازے پر آہستہ سے دستک ہوئی۔

میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ریوالور کو گرفت میں لے لیا اور رابعہ کو بھی اشارے سے سمجھادیا کہ فکر کی بات نہیں۔ میں اپنی حفاظت کے خیال سے غافل نہیں ہوں۔

میں نے دروازہ کھولا تو اپنے سامنے ایک جیسے حلیے اور صورت شکل میں بھی مشابہت رکھنے والے دو افراد کو دیکھا۔ ان دونوں نے بوسکی کی شلواریں' قمیص پر براؤن فوجی جرسی اور سر پر بیری کیپ لگا رکھی تھی۔ ان کی جسامت اور قدوقامت بھی ایک تھی اور مونچھوں کی طوالت بھی۔

"معاف کرنا صاحب۔" ان میں سے ایک نے سلام کے لیے ہاتھ اُٹھا کے کہا "یہ آپ کا گاڑی ہے؟"

میں نے کہا "ابھی تک تو ہے۔"

اسے میری بات میں کوئی مزاح کا پہلو نظر نہ آیا "خو اس کا پیچھے والا لائٹ جلتا ہے۔"

دوسرے نے کہا "بیٹری ایک دم بیٹھ جائے گا صبح تک۔"

اب پہلے نے کہا "خو ہم لائٹ دیکھا' سوچا آپ کو بتادے۔"

دوسرا بولا "غلطی کا مافی۔ ہم چوکیدار ہے۔"

میں نے کہا "خان! تم نے کون سی غلطی کی ہے جو معافی مانگ رہے ہو۔ بہت اچھا کیا جو مجھے بتادیا۔"

"ابھی صاب' بوہت لوگ ناراض ہوتا کہ ہمارا نیند خراب کردیا' بیٹری بیٹھے گا تو ہمارا بیٹھے گا۔" پہلے والے نے کہا۔

دوسرے نے تائید میں سر ہلایا "بوہت لوگ ناراض ہوتا کہ تم کیا چوکیداری کرتا ہے۔ دیکھتا ہے گاڑی کا لائٹ جلتا ہے تو بتاتا کیوں نہیں۔ ابھی صاب ہم اس واسطے ڈرتا ہے۔"

میں نے انہیں دس روپے انعام بھی دینے چاہے مگر انہوں نے لینے سے انکار کردیا۔ باتوں کی آواز سُن کے رابعہ بھی کھڑکی میں آکھڑی ہوئی تھی۔ وہ سلام کرکے چلے گئے تو میں نے ٹیل لائٹ آف کی اور اندر چلا گیا۔ باہر سخت سردی تھی اور ہُو کا عالم طاری تھا اور ایسے میں وہ دو فرض شناس چوکیدار ہی تھے جو سڑکوں پر گشت کررہے تھے۔

"بے چارے!" رابعہ نے کھڑکی بند کردی "فرض ادا کریں تب بھی لوگ خفا' نہ کریں تب بھی خفا۔"

"غلطی اپنی ہو تو کم ظرف ہی دوسروں پر خفا ہوسکتا ہے۔ خاندانی رئیس اور بدمعاش ایسا نہیں کرتے کہ غریب اور کمزور پر بے سبب رعب جھاڑیں۔" میں نے کہا۔

رابعہ مسکرائی "آپ کیا ہیں؟ خاندانی رئیس یا بدمعاش"

"دونوں" میں نے کہا "دولتِ عشق سے دل غنی ہے لیکن نیت اور نظر کی بدمعاشی نہیں جاتی۔"

رابعہ نے شرارت سے کہا "اندر ہو جائیں گے کسی دن۔"

میں نے آہ بھری "اندر تو اس وقت بھی ہیں۔ اگر آپ کی مراد ہے حجلہ عروسی کے اندر تو فرمایئے......"

رابعہ نے جھینپ کے کہا "کمال ہے! ہم نے نہیں دیکھا کہ لائٹس جل رہی ہیں۔"

میں نے کہا "نگاہ سورج کی طرف ہو تو اور مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔"

رابعہ بولی "رات کے وقت سورج نظر آنے لگا ہے۔ خدا خیر کرے۔"

"یہ تمہارے آفتابِ حسن کی تابانی....."

رابعہ نے کہا "شب بخیر' تم آؤٹ ہو رہے ہو۔ نیند کی کمی سے ذہن متاثر ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "ارے بھئی مجھے نیند نہیں آرہی ہے۔ ابھی یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا۔ تم کہاں جارہی ہو؟"

"سونے کے لیے۔ تم شوق سے جاگتے رہو اور آمد ہورہی ہے تو غزل کہو۔ میں صبح سُن لوں گی۔"

میں نے اس کے پیچھے جاتے ہوئے کہا "تم نے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ منظر کیا کہہ رہا تھا گولا ٹنڈوالا اور گل بانو کے بارے میں۔"

"کچھ بھی کہا ہو اس نے' مجھے اس وقت جاننے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ بھی صبح سُن لوں گی۔" اس نے کاجل کے ساتھ بیڈ پر دراز ہو کے کہا "تم بھی سو جاؤ تو اچھا ہے۔"

"احتجاجی بھوک ہڑتال کی طرح تمہاری یہ ادا ایک ظالمانہ رومانٹک مظاہرہ ہے۔" میں آہ بھر کے صوفے پر دراز ہوگیا "تم نے میرے جذبات کا قتلِ عام کردیا ہے۔ اللہ تم سے سمجھے؟"

رابعہ نے ڈانٹ کے کہا "لائٹ بند کردو اور اپنی آواز بھی۔"

میں نے سوئچ آف کردیا "آج خواب میں تم سے سارے بدلے نہ لے لیے تو کہنا۔"

یہ کچھ ماحول کی اجنبیت کا اثر تھا اور کچھ ذہنی انتشار کا کہ میں اندھیرے میں آنکھیں کھولے لیٹا رہا اور سوچتا رہا کہ کیا منظر نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔ میں نے اسے آدھی رات کو نیند سے جگا کر پریشان کیا تھا۔ بدلہ لینے کے لیے اس نے بھی ایسی بات کہہ دی کہ

میں جاگتا رہوں اور پریشان ہوتا رہوں۔ تفصیل بتائے بغیر اس نے لائن کاٹ دی اور ریسیور ایک طرف رکھ کے سوگیا۔ اب سوچتے رہو سکندر اعظم کہ گولا ٹنڈ والا کیسے قتل ہوگیا' اسے کس نے قتل کرایا اور کیوں۔ اور شیش ناگ کی بہن کی تصویر اخبار میں چھپنا چہ معنی دارد۔ منظر نے تو خودکشی کا ذکر کیا تھا مگر گولا ٹنڈ والا کیوں خودکشی کرے گا۔ اسے تو قتل ہی ہونا تھا ایک دن۔ پہلوانی کا اکھاڑہ چھوڑ کے بدمعاشی کا بازار گرم کرنے میں فائدہ تو نظر آتا ہے کہ مٹی دھول کے بجائے چاندنی ملی مگر اس کوچہ بے ننگ و نام میں رسوائیاں بھی ہیں اور موت کو گلے لگانے کی مجبوریاں بھی ... پہلوانی میں تن کا فن ہے' بدمعاشی میں دھن کا تن۔ نہ تن تیرا نہ من۔ آتا ہے دھن جلتا ہے من۔ واہ علامہ صاحب۔ تن من دھن....."

خیالوں میں راہ گم کردہ مسافر کی طرح بھٹکے ہوئے ذہن کو۔ آخرکار نیند کی پناہ ملی۔ میرا خیال ہے سوتے سوتے رات کا آخری پہر ہوگیا تھا۔ دیر تک سوتا رہتا تو شاید نیند کی کمی کچھ پوری ہوجاتی مگر صبح دم آصف علی کا نزول ہوا۔

کاجل نے مجھے ہلا کے کہا "بھائی سکندر! وہ آگئے۔"

میں ہڑبڑا کے اُٹھا "کون آگئے' باجے والے؟"

کاجل ہنس پڑی "کیا خواب میں بارات دیکھ رہے تھے؟"

میں نے جھینپ کر کہا "واقعی۔ مگر عجیب بارات تھی۔ دُلہا کراچی سے گھوڑے پر آرہا تھا سرا باندھے اور پشاور پہنچنے والا تھا۔"

کاجل پھر ہنسی "اچھا جی۔ اور باراتی پیچھے گھوڑے دوڑا رہے ہوں گے۔ باجے والے کیا آگے آگے بھاگ رہے تھے؟ گھوڑوں پر ڈھول تاشے' شہنائی اور بھونپو والے باجے بجاتے۔ میں رابعہ باجی کو جگاتی ہوں۔"

دوسرے کمرے کے باہر سے آصف علی نے آواز لگائی "بھئی اُٹھ جاؤ کبیر میاں۔ ہم تو آگئے تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کے لیے۔"

میں واقعی ایک بے سروپا خواب دیکھ رہا تھا کہ محسن دُلہا بنا چھت پر چڑھا دور دیکھ رہا ہے اور نیچے سے گل بانو چلا چلا کے پوچھ رہی ہے کہ آخر باجے والے ابھی تک کیوں نہیں پہنچے۔ ماہرینِ نفسیات یا خوابوں کی تعبیر بتانے والے عاملوں کے نزدیک اس خواب کی نہ جانے کیا توضیحات ہوں گی۔ میں اپنی بات پر خود مسکراتا ہوا باہر گیا تو سوچ رہا تھا کہ کاجل جب یہ بات رابعہ کو بتائے گی تو میری شامت آجائے گی۔

آصف علی نے کہا "بھئی دیکھو' سورج کہاں آگیا۔"

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا "ابھی یہاں تو نہیں پہنچا ورنہ نظر آتا۔"

آصف علی ہنسا "اس عمر میں ہم بھی یونہی لمبی تان کر سوتے تھے مگر نیند پوری کبھی نہ ہوتی تھی۔"

میں نے معذرت آمیز لہجے میں کہا "دراصل رات بہت دیر تک جاگتے رہے۔"

اس نے پھر میری بات کا مفہوم بدل دیا "ہاں بھائی' ہم بھی جاگتے تھے راتوں کو۔ کیا ہے وہ غزل جو ملکہ پکھراج نے گائی ہے انہیں بھی جگائیں تمام رات..."

میں نے کہا "میں ابھی جگاتا ہوں سب کو۔ کسی کو آپ کے اتنی جلدی آنے کی اُمید نہیں تھی۔"

"ہاں بھئی' ہم ابھی نہ آتے مگر وہ ہماری گھروالی ہے نا' اس نے مجبور کردیا کہ ابھی جاؤ اور انہیں ناشتے کے لیے یہاں لے آؤ۔" آصف علی نے برآمدے میں پڑی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ کے کہا "میں اس وقت نکلتا ہوں صبح کی سیر کے لیے۔ اس نے ڈیوٹی لگادی کہ واپسی میں سب کو ساتھ لیتے آنا۔"

میں نے کہا "آپ نے رات کو ہی بتادیا تھا ہمارے بارے میں۔"

"کیسے نہ بتاتا۔ اور رات میں نے اسے وہ بات بھی بتادی جو اسے آج تک معلوم نہ تھی۔" وہ بولا "میں نے اس کے سامنے اپنے جُرم کا اعتراف کرلیا کبیر خاں' اسے بتادیا کہ میں نے سب جھوٹ بولا تھا۔ میں وزیر خاں کی امانت میں خیانت کرکے فرار ہوا تھا۔ اور بس.... بعد میں جو کچھ ہوا' وہ میرے اعمال کی سزا تھی۔"

"کیا ضرورت تھی انہیں یہ سب کچھ بتانے کی؟"

"ضرورت تھی کبیر خاں۔ جب مجرم پکڑا جائے تو ضروری ہے کہ اس کا چہرہ سب کو دکھایا جائے۔" اس نے کہا "یہ بھی ایک سزا ہوتی ہے مجرم کے لیے۔"

"انہیں یقیناً بہت دُکھ پہنچا ہوگا۔"

"دکھ تو ہوا۔ بہت روئی وہ رات بھر لیکن وہ سمجھتی ہے کہ تمہارا مل جانا رحمتِ خداوندی کی طرف سے بخشش کا اشارہ ہے۔ پھر جب میں نے اسے یہ بتایا کہ ہم وزیر خاں اسپتال کو عطیہ دے کر اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرسکتے ہیں تو اس نے کہا کہ... خیر' تم خود ہی چل کے مل لو اس سے۔ وہ تمہاری راہ دیکھ رہی ہوگی۔"

میں نے کہا "بس ہم تیار ہوجائیں پھر چلتے ہیں۔"

سورج نکلا ہی تھا کہ ہم بھی سوتے جاگتے' ٹھٹھرتے کانپتے سڑک پر آگئے۔ آصف علی کا گھر اس کے کہنے کے مطابق چند قدم کے فاصلے پر تھا مگر ایک کلومیٹر دور ثابت ہوا۔ کاجل اور کلیم خاصے فریش تھے کیونکہ وہ چھ سات گھنٹے سو کے اُٹھے تھے۔ مجھے اور رابعہ کو مشکل سے تین گھنٹے کی نیند نصیب ہوئی تھی۔

رابعہ کو اتفاق سے ٹھوکر لگی تو میں نے کہا "نیند میں چل رہی ہو' سو رہی ہو ابھی تک!"

رابعہ نے کہا "تم کیوں نیند میں بول رہے ہو؟"

میں نے کہا "ایسا نہ ہو سوتے میں نکل جاؤ کسی اور طرف آگے غیر علاقہ شروع ہوجاتا ہے۔"

"کدھر سے شروع ہوتا ہے انکل؟" کلیم نے بڑے اشتیاق کے ساتھ اِدھر اُدھر دیکھا۔

"جہاں سے عقل کی سرحد شروع ہوتی ہے وہاں سے تمہارے انکل کے لیے علاقہ غیر شروع ہوجاتا ہے۔" رابعہ نے کہا "سمجھے بیٹا۔"

"اور بیٹا! غیر علاقے میں کوئی قانون نہیں چلتا۔ کوئی کتنا بھی بڑا وکیل ہو' بے کار ہے۔" میں نے کہا "عورت کو تو وکیل مانتا ہی نہیں کوئی۔ وضع دار لوگ ہیں' سر پر چڑھانے کے قائل نہیں۔ پاؤں کی جوتی بنا کے رکھتے ہیں۔"

رابعہ نے جل بھن کے کہا "یہ جو چمار موچی قسم کے لوگ ہیں نا بیٹا' جو جوتیاں گانٹھتے ہیں اور چمکاتے ہیں' وہی ایسی بات کرتے ہیں' شرفا اور خاندانی لوگ نہیں۔ وہ تو گھر کی عزت سمجھتے ہیں عورت کو جن کی عزت ہوتی ہے۔"

آصف علی ہنسنے لگا "تم چُپ کیوں ہوگئے' بڑا اچھا لگ رہا تھا تمہیں لڑتا دیکھ کے۔"

میں نے کہا "افسوس چچا آصف علی! آپ شرپسند ہیں۔ فتنہ فساد اچھا لگتا ہے آپ کو۔ لڑتا دیکھ کے خوش ہوتے ہیں آپ۔"

"ارے بیٹا! یہ لڑائی کہاں ہے۔ یہ تو چھیڑ چھاڑ ہے محبت کی۔ جیسے بغیر مسالے کے چاٹ اچھی نہیں لگتی نا' ایسے ہی لڑائی نہ ہو تو پیار کا کیا مزہ۔" آصف علی اپنی دُھن میں بولتا گیا "ہم بھی بہت لڑتے تھے' اب بھی لڑتے ہیں' بچّوں کی طرح۔ فضول باتوں پر جھگڑا کرتے ہیں لیکن ایک بات بتادوں تمہیں۔ میں نے دنیا دیکھی ہے۔ بال سفید ہوگئے ہیں میرے۔ میں نے یہی دیکھا ہے کہ جہاں میاں بیوی کا ایک دوسرے سے تعلق ہی نہ ہو' مکمل غیریت ہو ان کے درمیان۔ ایک کو سروکار ہی نہ ہو کہ دوسرا کیا کررہا ہے' وہاں جھگڑا واقعی نہیں ہوتا۔ وہ اپنی اپنی دنیا میں' الگ الگ رہتے ہیں۔ بالکل اجنبی بن کے۔ مگر ایک چھت کے نیچے نظر آتے ہیں تو یہ ایک معاشرتی مجبوری ہوتی ہے۔ ہاں وہ ایک دوسرے کے وجود کو تسلیم کرتے ہوں اور ایک دوسرے پر حق رکھتے ہوں تو پھر سردی گرمی ساتھ ساتھ چلتے ہیں' یہ آدمی کا مزاج ہے۔ اور اختلاف کا اظہار اپنوں سے ہی ہوتا ہے۔ جو میرے لیے غیر ہے وہ میری بلا سے زہر کھائے یا کنویں میں کود جائے۔"

اس کا لیکچر گھر آجانے سے ختم ہوگیا۔ رابعہ کو پہلے تھوڑا سا حیا نے خاموشی اختیار کرنے پر مجبور کیا تھا پھر وہ آصف علی کی باتیں غور سے سُنتی رہی تھی' جیسے یہ سب اس کے لیے انکشاف ہو۔ یہ ایک نیا احساس تھا۔ اس کے لیے اپنی محبت کا ایک نیا پہلو سامنے آیا تھا جو شاید آج تک اس کی نظر سے اوجھل تھا۔ یہ عملی زندگی کی محبت کا وہ انداز تھا جو فلموں اور ناولوں کے مصنوعی جذبات کی یک رُخی' بے جان تصویر سے بالکل مختلف تھا۔

آصف علی کا گھر قدیم اور جدید کا امتزاج تھا۔ اس نے کوٹھی کے سامنے والے حصے کو نئے سرے سے تعمیر کرا کے مغربی طرز تعمیر کو نمایاں کردیا تھا مگر اندر پرانی حویلیوں کا ماحول نظر آتا تھا۔ اونچی چھتوں' محرابی کھڑکیوں اور روشندانوں والے کمروں میں ایرانی اور کشمیری قالین بچھے ہوئے تھے اور ڈرائنگ روم کا ایک حصہ پالش سے چمکتے فرنیچر اور سامان آرائش سے پُر تھا تو دوسرے حصے میں گاؤ تکیوں کے ساتھ فرشی نشست کا اہتمام تھا۔ میں نے اسی حصّے میں فراغت سے پاؤں پھیلا کے بیٹھنا پسند کیا۔

آصف علی کی بیوی تھوڑی دیر بعد اندر آئی۔ اسے دیکھ کر مجھے غیر متوقع ذہنی صدمہ ہوا۔ میرا خیال تھا کہ وہ عمر رسیدہ ضرور ہوگی' ایسے ہی میں نے فرض کر رکھا تھا کہ اس کی صحت بھی آصف علی جیسی ہوگی لیکن اس کے برعکس وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ تھی۔ بالکل ایک چلتی پھرتی لاش۔ وہ آہستہ آہستہ ڈمی کی طرح چلتی آگے آئی تو مجھے دوسرا شاک لگا۔ وہ بینائی سے محروم تھی اور اندازے کی مدد سے آگے بڑھ رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ گھر میں کون سی چیز کہاں رکھی ہے چنانچہ وہ تجربے کو بروئے کار لاتے ہوئے بچتی بچاتی چل رہی تھی۔ آصف علی نے کہا تھا کہ وہ میرے والد کے کارخانے میں کام کرنے والے ایک کاریگر کی بیٹی تھی اور یہ شادی خود وزیر خاں نے کرائی تھی۔ بے رحم وقت اپنی ان گنت نشانیاں' ایسی ہی دکھ دینے والی یادوں اور نوحہ خواں یادگاروں کو پیچھے چھوڑ کر بہت آگے نکل گیا تھا۔

آصف علی نے کہا "خانم' یہ ہے وزیر خاں کا بیٹا۔"

خانم نے ہاتھ آگے بڑھائے "کبیر خاں۔ یہی نام ہے نا تمہارا بیٹا؟ مجھے یاد نہیں تھا' آصف نے بتایا تو یاد آیا۔"

میں نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ اس نے اپنی رعشہ زدہ' کھال مُنڈھی سوکھی انگلیوں سے میرے چہرے کو چھُوا اور محسوس کیا۔

"وزیر خاں بڑا سوہنا جوان تھا۔" اس نے کہا۔

"یہ بالکل وہی ہے نیک بخت۔" آصف علی بولا۔

"بالکل وہی۔ اچھا۔ پھر تو میں دیکھ سکتی ہوں۔"

میرے جذبات بڑے عجیب تھے۔ اگرچہ میں اس شخص کے گھر میں تھا جس نے میرے والد کو بہت بڑا دھوکا دیا تھا۔ اتنا بڑا کہ شاید اس وقت پیٹھ میں گھونپے جانے والے خنجر کے وار کی اذیت نے اسے ہفتوں سوتے جاگتے بے قرار رکھا ہوگا۔ دوست بن کے دغا دینے والا یہ شخص وزیر خاں کے سامنے آجاتا تو شاید وہ اسے جان سے مار ڈالتا۔ میں یقین سے کہہ سکتا تھا کہ زخم کے مندمل ہوجانے کے بعد بھی وزیر خاں کے دل پر اس کا داغ رہ گیا ہوگا۔ پھر اس کو ولاور نے شریکِ کاروبار بن کے کاروبار سے بھی محروم کیا تھا اور اسے نامعلوم حالات کی مجبوری کے حصار میں لا کے آخرکار مار ڈالا تھا۔ اس طرح کہ وہ مدد کے لیے خدا کے سوا کسی کو نہ پکار سکا۔

وزیر خاں کے ساتھ تقدیر نے عجیب بے رحم مذاق کیا تھا کہ اس کو اپنوں کے اعتبار نے مارا۔ آصف علی نے پہلا وار کیا تھا چوہدری دلاور نے دوسرا۔ اصولاً مجھے آصف علی کو بھی دلاور کی طرح صفِ دُشمناں رکھنا لازم تھا مگر اس کو معاف کردینا میری مجبوری بن گیا تھا۔ اگر وہ خود اعتراف نہ کرتا تو مجھے اس کے مجرم ماضی کا کبھی پتا نہ چلتا اور یہ بھی معلوم نہ ہوتا کہ دلاور سے پہلے بھی وزیر خاں کو کسی مارِ آستیں نے ڈسا تھا۔

آصف علی نے از خود اپنا قصور تسلیم کرلیا تھا اور غیر مشروط طور پر خود کو میرے انصاف کے رحم و کرم پر چھوڑتے ہوئے اپنی غلطی، اپنے گناہ یا اپنے جرم کی تلافی کے لیے تاوان یا کفارہ ادا کرنے کی ہر سزا منظور کی تھی لیکن قدرت اسے کہیں زیادہ کڑی سزا دے چکی تھی۔ یہ بات وزیر خاں کو بھی معلوم ہوجاتی تو اس کا دل پتھر نہیں تھا کہ دشمن کو جتلائے عذاب دیکھ کر سکون حاصل کرتا۔ اگر آصف علی آگ میں جل رہا ہوتا تو وہ اسے بچانے کے لئے آگ میں کود پڑتا اور وہ ڈوب رہا ہوتا تو اسے جان پر کھیل کے بچاتا۔ یہ ناممکن تھا کہ وہ اس کے چیخنے چلانے اور مدد کی پکار کے جواب میں بے حسی سے کھڑا تماشا دیکھتا اور قہقہے لگاتا رہتا اور اسے احساس دلاتا رہتا کہ دیکھا آصف علی، قدرت نے میرا انتقام کیسے لیا۔

میں اِسی وزیر خاں کا بیٹا تھا۔ میرے لیے بھی ممکن نہیں تھا کہ اس پر نازل ہونے والے قدرت کے عذاب پر خوشی منا سکتا کہ یہ تو مکافاتِ عمل ہے۔ کوشش کے باوجود میں اس سے اتنی نفرت نہ کرسکا تھا کہ اسے معاف نہ کرتا اور اس پر ترس نہ کھاتا۔ اس کی نابینا بیوی کی حالت دیکھ کے تو میرا دل اتنا ہی دُکھی ہو رہا تھا جتنا برسوں بعد ملنے والے بیٹے کا اپنی ماں کا یہ حال دیکھ کے ہوتا۔ آصف علی تو پھر بھی سزاوار تھا مگر اس عورت نے صرف اس لیے دُکھوں کی فصل کاٹی تھی کہ وہ صرف سُکھ کی ساتھی نہیں تھی۔ شریکِ حیات کی حیثیت سے اس نے اپنے شوہر سے یا تقدیر سے کوئی گلہ نہیں کیا تھا۔ اسے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ اس کا قصور کیا ہے۔

آنسو رابعہ کی آنکھوں میں ہی نہیں میری آنکھوں میں بھی اُتر آئے تھے مگر میں ضبط پر قادر تھا۔

میں نے کہا "خانم! آپ کو یاد ہیں میرے والد؟ یہاں بیٹھ کے مجھے ان کے بارے میں بتائیں۔"

وہ میرے ساتھ بیٹھ گئی "بتاؤں گی، جو مجھے معلوم ہے سب بتاؤں گی۔ پہلے تم بتاؤ، تم یہاں کیسے آگئے؟ کس نے بتایا تھا آخر تمہیں کہ ایک اندھی عورت یہاں تمہارا انتظار کررہی ہے؟"

میں نے کہا "خانم! یہ ملنا بچھڑنا سب قسمت کے کھیل ہیں۔ اسے آپ اتفاق بھی کہہ سکتی ہیں۔"

"تم بالکل وہی ہو، میں نے دیکھ لیا۔ تمہاری آواز بھی تو وزیر خاں کی آواز ہے۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میرے ساتھ وہی بیٹھا بول رہا ہے۔ مجھے آصف نے بتایا ہے کہ تم... اکیلے نہیں ہو۔"

میں نے کہا "جی۔ یہ رابعہ ہے میرے ساتھ۔"

"رابعہ... اچھا... کہاں ہے؟ ادھر بُلاؤ اسے میرے پاس۔"

میں ہٹ گیا اور میری جگہ رابعہ نے لے لی۔ "روئیں مت خانم۔"

"لو، تم خود رو رہی ہو اور مجھے منع کررہی ہو۔" اس نے اپنے ہاتھوں سے رابعہ کے چہرے کو دیکھا "یہ رونے کے دن ہیں بھلا تمہارے۔ خدا نہ رُلائے تمہیں کبھی۔ آنسو پونچھ لو۔ تم خوش قسمت ہو وزیر خاں...."

"یہ کبیر خاں ہے پاگل!" آصف علی نے کہا۔

"پاگل ہو تم۔ میں کیوں پاگل۔ کیا فرق ہے اس میں اور وزیر خاں میں؟ میں تو اسے دیکھ رہی ہوں اور سُن رہی ہوں۔ پھر کیوں نہ کہوں اسے وزیر خاں۔" اس نے رابعہ کے ماتھے کو چوما "بہت خوش قسمت ہو تم۔ بہت خوب صورت ہے تمہاری رابعہ۔ اللہ نے تمہیں ایک دوسرے کے لیے ہی بنایا ہوگا۔ چاند سورج کی طرح نہیں۔ زمین اور سورج کی طرح۔ چاند تو زمین کا ٹکڑا ہے۔ چاند جیسا تو ہوگا تمہارا بیٹا۔"

آصف نے فوراً صورتِ حال کو سنبھال لیا "چل اب یہ سائنسی انکشافات مت کر۔ میں انہیں سوتے سے جگا کے لایا ہوں۔ بھوکے بیٹھے ہیں بچارے۔ باتیں بعد میں کرلینا۔ میں دیکھتا ہوں، ناشتا لگا ہے کہ نہیں۔"

کاجل اُداس اور الگ تھلگ بیٹھی تھی۔ اس ماحول میں وہ اجنبیت کے رشتے کو زیادہ شدت کے ساتھ محسوس کررہی تھی۔

میں نے کہا "خانم! ایک بہن بھی ہے میرے ساتھ۔"

"بہن!" خانم چونکی "تمہاری تو کوئی بہن نہیں تھی۔ تم اکیلے آئے تھے پاکستان۔"

میں نے کہا "ہاں۔ مگر رشتے صرف خون کے ہی نہیں ہوتے، محبت کے بھی ہوتے ہیں۔ میرے سب بہن بھائی تو وہیں رہ گئے تھے لیکن خدا نے یہاں مجھے اکیلا نہیں رکھا۔ موقع ملا تو باقی سب سے بھی ملوادوں گا۔ میرا ایک بھائی ہے محسن، دوسرا غالب اور تیسرا اِکرام شیخ۔ دوسری بہن گل بانو ہے۔"

رابعہ کی جگہ کاجل نے لے لی۔ خانم نے اسے دعائیں دیں تو وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ اس محبت کے مظاہرے نے کاجل کے زخموں کو کُرید ڈالا تھا۔ اسے اپنے ماں باپ یاد آگئے تھے جن سے تعلق کی ساری نشانیاں وہ ان راستوں پر چھوڑ آئی تھی جن پر اسے کبھی لوٹ کے نہیں جانا تھا۔ کاجل نے ہی کلیم اللہ کو خانم کے سامنے پیش کیا اور اس کے بارے میں بتایا کہ ہم اسے عزیزوں کے پاس چھوڑنے جارہے ہیں۔

پھر آصف علی آیا اور ہمیں اپنے ساتھ دوسرے کمرے میں لے گیا جہاں ایک شاندار ہال میں لمبی میز لگی ہوئی تھی۔ اس میز کے گرد بائیس کرسیاں تھیں۔ دس ایک طرف، دس دوسری طرف اور دو آمنے سامنے۔ ظاہر ہے یہ سب خاص طور پر بنوایا ہوا فرنیچر تھا اور بہت بیش قیمت۔ اخروٹ کی لکڑی کی کرسیوں پر کھدائی کے نقش و نگار بہت نفیس تھے اور میں ان کی تعریف کیے بنا نہ رہ سکا۔

"بڑا فنکارانہ ہاتھ تھا اس کا جس نے یہ کام کیا۔"

"ہاں۔ ایک بڈھا تھا۔ خبطی۔" آصف علی بولا "دنیا میں اکیلا رہ گیا تھا۔ بچے پڑھ لکھ کے ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ کوئی دبئی چلا گیا تھا، کوئی کراچی۔ لڑکیاں پرائی ہوگئیں اور بیوی بھی مرگئی۔ اس نے اپنا کام نہیں چھوڑا۔ بیٹے بزنس مین ہوگئے تھے۔ انہوں نے بہت اصرار کیا کہ ہمارے ساتھ چلو مگر وہ نہ مانا کہ گھر بھی چھوڑ دوں، کام بھی چھوڑ دوں؟ حالانکہ وہ گھر کیا تھا۔ ایک کچی کوٹھری تھی اور کام کرنا اس کے لیے بالکل ضروری نہیں تھا مگر اس کو اتا کھویا کچھ اور۔ جیسے ساری عمر ایک پنجرے میں گزارنے والا پنچھی اُڑنا ہی بھول جاتا ہے۔ لاکھ دروازہ کھلا رکھو وہ باہر نہیں آتا۔ ایسے ہی آدمی بھی گھر اور ماحول کا قیدی ہوجاتا ہے۔ یہ قید اس کی مجبوری بن جاتی ہے۔ کام کی عادت بھی مجبوری تھی اس کی۔ جیسے چالیس سال سگریٹ پینے والا سگریٹ پیے بغیر نہیں رہ سکتا بالکل ایسے ہی چالیس سال ایک ہی کام کرتے کرتے اس کے لیے یہ ناممکن تھا کہ کسی دن وہ اپنے اوزار ایک طرف رکھ دے اور کراچی کی کسی کوٹھی کے ائرکنڈیشنڈ کمرے میں بیٹھ کے نوکروں پر حکم چلانے لگے۔"

خانم نے کہا "تم بولتے جارہے ہو۔ بچے ناشتا کررہے ہیں یہ بھی دیکھو۔"

میں نے کہا "سب ناشتا کررہے ہیں، آپ بالکل فکر نہ کریں۔"

ہم سب میز کے ایک کنارے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میز پر کھانے پینے کی اتنی چیزیں تھیں کہ ہم ہر چیز چکھتے تو پیٹ بھر جاتا۔ کمی صرف کافی کی تھی جو میری فرمائش پر فوراً حاضر کردی گئی۔ گھر میں کھانا پکانا ایک ماہر خانساماں کی ذمے داری تھی۔ اس کے علاوہ دو نوکر تھے۔ ایک اندر باہر کے کام کرتا تھا اور دوسرا گاڑی چلانے کے ساتھ باغ کی دیکھ بھال کرتا تھا۔

آصف علی نے اپنی بات جاری رکھی "وہ بڈھا جب ایک کا کام ہاتھ میں لے لیتا تھا تو وہ کام ختم کرنے سے پہلے کسی کا آرڈر نہیں لیتا تھا۔ اس کے قدر دان بہت تھے جو زیادہ سے زیادہ معاوضے ادا کرنے پر تیار رہتے تھے مگر پیسے کی اسے ضرورت ہی کہاں تھی۔ وہ ایک ہی جواب دیتا تھا سب کو۔ ابھی ہاتھ میں کام ہے، یہ ختم ہوجائے تو آنا۔ کل کا وعدہ کیسے کرلوں۔ ایڈوانس کیسے رکھ لوں۔ میں آج رات ہی مرگیا تو کیا ہوگا؟ بائیس مہینے لگا کے اس نے یہ بائیس کرسیاں مکمل کرلی تھیں۔ یعنی ایک مہینے میں ایک کرسی۔ اور معلوم ہے معاوضہ کیا لیا؟ بائیس سو۔ سو روپے ایک کرسی کے۔ بازار میں خریدار ایک کرسی کے ہزار دینے پر بھی تیار ہوں گے مگر بازار کا کام وہ کرتا ہی نہیں تھا اور جن کے گھر میں وہ کوئی چیز بناتا تھا وہ اس کو بازار میں بیچتے نہیں تھے۔"

"اب کہاں ہے وہ؟" میں نے کہا۔

"مرگیا۔ دو سال ہوگئے۔" آصف علی نے کہا۔

"کیسے، بیمار... کے؟"

"نہیں۔ رات کو سویا، صبح نہیں اُٹھا۔ بیماری یا تکلیف اسے کوئی نہیں تھی۔"

"پھر کیا اسے قتل...."

"ارے نہیں کبیر خاں۔ تمہارے دماغ میں یہ باتیں اس لیے آتی ہیں کہ تم کو ایسے ہی حالات کا سامنا رہا۔ جو لوگ ملے وہ بھی ایسے ہی ملے۔ ورنہ عام زندگی میں یہ سب کہاں ہوتا ہے۔ اتنی عمر ہوجائے تو بس آتی جاتی سانس کا شمار رہ جاتا ہے کہ نہ جانے کب سانسوں کا کوٹا پورا ہوجائے۔ موت کے بہانے بہت۔ اس کا دل تھک گیا ہوگا چلتے چلتے۔ کوئی مشین ہے ایسی جو اتنی سال چلتی رہے اور ایک بار بھی بند نہ ہو؟"

رابعہ نے کہا "یہاں فرض کرلیتے ہوں گے لوگ کہ موت طبعی تھی۔"

"جب تک شک کی وجہ نہ ہو، ایسا سمجھنا غلط بھی نہیں۔"

میں نے کہا "پوسٹ مارٹم نہ سہی، کم سے کم ڈاکٹر دیکھ کر بتائے کہ موت کیسے واقع ہوئی۔"

وہ بولا "یہ سب فضول کے جھگڑے ہیں بیٹا۔ گاؤں دیہات میں آج بھی کچھ نہیں ہوتا۔ اور شہروں میں پہلے کب ہوتا تھا؟ یہ تو اب زمین، جائداد کے قضیے اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ حقِ وارثت کا مسئلہ آجاتا ہے۔"

"ذاتی دشمنی یا خاندانی عداوت میں سب سے زیادہ قتل یہاں ہوتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"مگر وہ ایسے نہیں ہوتے۔ یہاں کوئی چُھپ کے وار نہیں کرتا۔ پیٹھ میں گولی مارنے والا بزدل اور کمینہ سمجھا جاتا ہے اور یہ مردانگی کے خلاف ہے۔ اس بڈھے کا تو دشمن بھی کوئی نہیں تھا۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ اس کے سفرِ آخرت میں اپنا کوئی نہیں تھا۔ تین بیٹے تھے، ایک بھی مٹی دینے نہ آیا۔ جو امریکا میں تھا اس کا تو کسی کو پتا ہی معلوم نہیں تھا۔ دوسرا کراچی اور دبئی دونوں جگہ رہتا تھا۔ بہت بڑا اسمگلر تھا۔"

"تھا کیا مطلب؟ اب نہیں ہے؟"

"اب بھی ہوگا۔ جو اس دھندے میں پڑ جائے اور دولت اس پر برسنے لگے، وہ اس کاروبار کو کب چھوڑتا ہے۔" آصف علی نے کہا "وہ تو آگے بڑھتا جاتا ہے، کاروبار کو پھیلاتا رہتا ہے۔ اس کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے اور ایک فرد سے وہ ایک گروہ بن جاتا ہے۔"

"بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔ ایسے گروہ مافیا کہلاتے ہیں۔ کہیں چھوٹے پیمانے پر تو کہیں بین الاقوامی سطح پر مافیا کی طرز پر سیکڑوں مجرموں کے گروہ ہر قسم کے مذموم کاروبار میں مصروف ہیں اور کچھ تو اتنی طاقت پکڑ گئے ہیں کہ ان سے حکومتیں خوف زدہ رہتی ہیں۔"

"حکومتیں ان کی مٹھی میں رہتی ہیں۔" آصف علی نے کہا۔

میں نے کہا "کیا آپ کو اس اسمگلر کا نام معلوم ہے؟"

"ہاں۔ پہلے وہ اکبر خاں تھا پھر ملک اکبر سیٹھ ہوگیا تھا۔ ایک دوبار آیا تھا باپ سے ملنے کے لیے۔ اس کے ٹھاٹ باٹ سے زیادہ اس کے انداز و اطوار میں فرعونیت تھی۔ اس کے ساتھ مسلح محافظ تھے اور اس کی شاندار کالی مرسیڈیز کے آگے پیچھے جیپوں پر سوار تھے۔ ایسا حفاظتی انتظام، یہ کرّوفر کا مظاہرہ اور ایسا تکبر! اللہ کی پناہ۔"

"کیا یہ حیرت کی بات نہیں ہے کہ اس کے باوجود سیٹھ اکبر نے اپنے اس باپ کو بُھلایا نہیں، اس سے رشتہ نہیں ختم کیا اور ساری دنیا کے سامنے اسے اپنا باپ تسلیم کیا؟" میں نے کہا۔

"تم اسے اچھائی کہہ لو مگر میرا خیال ہے اس میں بھی ذاتی پبلسٹی کا پہلو تھا۔ وہ دنیا کو بتانا چاہتا تھا کہ دیکھو میں اس فرش نشیں کا بیٹا آج۔ نعوذ باللہ عرش پر ہوں۔ یہ سب میرا کمال ہے۔ بڑی واہ واہ ہوئی اس کی جب وہ بوڑھے کے پاس یہاں آکے بیٹھا۔ اسی کمرے میں۔ وہ اپنا کام کررہا تھا کہ باہر گاڑیاں آکے رُک گئیں۔ ایک ملازم نے مجھے روتے ہوئے آکے بتایا کہ پتا نہیں کون بدمعاش آیا ہے۔ کہنے لگا وہ بڈھا کاریگر یہاں کام کررہا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کرسیاں بنانے والے بڈھے کی بات کررہا ہوگا۔ میں نے کہا "کررہا ہے لیکن جب تک وہ کام ختم نہیں کرے گا آپ کا آرڈر نہیں لے گا۔" بس جی اس نے ہاتھ ماردیا میرے منہ پر کہ "بھونکنے کی ضرورت نہیں کُتّے۔ اس کو جاکے بولو کہ اکبر خاں آیا ہے۔" پھر میں گیا یہ دیکھنے کے لیے کہ یہ اکبر خاں کیا چیز ہے آخر۔ وہ ببر شیر کی طرح ٹہل رہا تھا ہاتھ پیچھے باندھے اور اس کے وفادار کُتّے ایسے تیار کھڑے تھے کہ اشارہ ملے اور وہ جھپٹ پڑیں۔ میں نے عافیت اسی میں دیکھی کہ اسے عزت کے ساتھ اندر لے آؤں۔ میں نے کہا "اکبر خاں صاحب! یہ گھر میرا ہے۔ تشریف لایئے۔" اس اُلو کے پٹھے نے اکڑفوں میں جواب دیا کہ "مجھے تمہارے گھر سے کچھ نہیں لینا۔ ایسے بہت گھر ہیں میرے۔ مجھے مرعوب مت کرو۔ میرے باپ کو بلاؤ۔ وقت نہیں ہے میرے پاس فضول باتوں کے لیے۔" تب میں نے جان لیا کہ وہ اکبر خاں ہوگا۔ بڈھا کبھی کبھی اس کا ذکر کرتا تھا۔ خیر میں نے بڈھے کو بتادیا اور اس نے مجھ سے کہا کہ اکبر خاں آیا ہے تو میں کیا کروں۔ اُٹھ کے اس کا استقبال کرنے جاؤں۔ میں کام کررہا ہوں۔ بُلالو اسے یہاں۔" خیر..... میں نے یہ اکبر خاں سے کہہ دیا اور اکبر خاں اندر آکے باپ کے پاس بیٹھ گیا۔ اخلاقاً میں نے چائے کے لیے پوچھا تو اس نے انکار کردیا اور مجھ سے بولا کہ تم جاؤ یہاں سے۔" حرام زادہ۔ مجھے میرے گھر میں حکم دے رہا تھا کہ دفع ہوجاؤ۔ میں جھگڑا نہیں چاہتا تھا۔ مجھ میں اتنی ہمت تھی اور نہ اس کی ضرورت تھی۔ کچھ دیر بعد باپ بیٹا دونوں ایک دوسرے پر چلّانے لگے۔ بیٹا کہتا تھا کہ یہ کام کر کے تم میرا نام بدنام کررہے ہو۔ بے عزتی کروا رہے ہو میری اور بڈھا چیخ رہا تھا کہ یہ بات ہے تو جا باپ بدل لے۔ ایسا باپ بنا لے جو تیری عزت بڑھائے۔ آئندہ مجھے صورت مت دکھانا حرامی۔ ماں تجھے یاد کرتی مرگئی تو پیسہ کمانے میں لگا رہا۔ خرید لینا اپنے پیسے سے ماں باپ۔ بہت مل جائیں گے۔ تجھ سے تو تیرا بھائی دلاور اچھا تھا کہ آتا تھا تو ہمیں بے عزت کرنے نہیں آتا تھا۔"

"دلاور!" میں نے چونک کے کہا "کون دلاور؟"

"اکبر خاں سے چھوٹا دلاور خان تھا۔" آصف علی بولا "کہتے ہیں پہلے دونوں بھائی ایک ساتھ تھے پھر دلاور خان نے بھائی سے علیحدگی اختیار کرلی کہ اسمگلنگ اور بدمعاشی کے دھندے میں کب تک ساتھ۔ اصل بات یہ تھی کہ وہ اکبر خاں کا بہت سا مال لے گیا تھا لاکھوں کا۔ یہ سمجھ لو کہ کہانی وہی وزیر خاں اور آصف علی کی تھی، کرداروں کے نام بدل گئے تھے۔ وہ دوست نہیں تھے، سگے بھائی تھے۔ دلاور خان بھی روپوش ہوگیا تھا اور بعد میں اس کا کچھ پتا نہیں چلا۔"

"حیرت ہے کہ اکبر خاں جیسا شخص بھی پتا نہیں چلا سکا۔"

"بابا اس نے باہر ہر جگہ معلوم کیا، جہاں جہاں اس کے کاروباری تعلقات تھے۔ سیکڑوں کارندے تھے اس کے اور ان لوگوں کے جو اکبر خاں جیسے ہی تھے مگر امریکا برطانیہ کناڈا اور جرمنی کے رہنے والے تھے اور ایک دوسرے کے معاون و مددگار تھے۔"

میں نے کہا "آصف صاحب! آپ نے وہ محاورہ سُنا ہے۔ بچہ بغل میں ڈھنڈورا شہر میں۔"

"سُنا تو ہے۔ مگر میری بات سے کیا تعلق ہے اس محاورے کا؟"

میں نے کہا "کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ دلاور خان ملک میں ہی ہو اور اکبر خاں اسے ملک سے باہر تلاش کررہا ہو۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ اتنا لمبا ہاتھ مارنے کے بعد دلاور خاں باہر ہی جائے گا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اکبر خاں کے ہاتھ کتنے لمبے ہیں۔ وہ ملک میں جہاں بھی ہوگا پکڑا جائے گا ایک نہ ایک دن مگر دنیا واقعی بہت بڑی جگہ ہے۔ اکبر خاں کا دھیان ہی نہ گیا ہو اس طرف کہ وہ اسی ملک اور اسی شہر میں عین اس کی ناک کے نیچے ہوسکتا ہے۔"

آصف علی ہنسنے لگا "یہ بھی ہوسکتا ہے، کیوں نہیں ہوسکتا۔ ضروری تو نہیں کہ زیادہ بڑا اور طاقت ور بدمعاش زیادہ ذہین بھی ہو۔ دلاور خان اپنے بھائی کے مقابلے میں کچھ پڑھا لکھا بھی تھا اور ذہین بھی۔"

رابعہ نے کہا "میں ایک دلچسپ واقعہ سناؤں۔ لاہور کا ایک چور تھا جو برسوں پکڑا نہیں گیا تھا۔ ایک تھانے کی حدود میں کچھ کوارٹر تھے۔ کوارٹرز اور تھانے کا احاطہ ایک ہی تھا۔ پچھلی طرف کوارٹروں کی دیوار کے ساتھ رات کے وقت کچھ ریڑھی والے اپنی اپنی ریڑھی کھڑی کردیتے تھے۔ ظاہر ہے کسی کا اپنا آدمی تھا تو کوئی بھتہ دیتا تھا۔ بلا اجازت پولیس والے کسی کو سڑک کے کنارے ریڑھی نہیں لگانے دیتے تو تھانے کی حدود میں کوئی کیسے ریڑھی کھڑی کرسکتا ہے۔ سب کا یہی خیال تھا کہ ریڑھی والے اپنے ہی بندے ہیں۔ ان میں سے ایک دو ریڑھی پر سو بھی جاتے تھے اور صبح ریڑھی لے کر نکل جاتے تھے۔ کھانا بازار سے کھاتے تھے۔ نہانے دھونے کے لیے پولیس لائن کے باتھ روم اور گھر کی جگہ اپنی ریڑھی۔ وہ کباڑی بھی انہی میں شامل ہوگیا۔ رات کو واردات کے لیے نکل جاتا تھا اور واردات کے بعد اپنی ریڑھی پر آکے سو جاتا تھا۔ صبح سب کے ساتھ اُٹھتا تھا اور ریڑھی لے کر نہ جانے کدھر جاتا تھا۔ ساری وارداتیں اس نے پولیس لائن کے آس پاس بنگلوں میں کی تھیں جہاں سے وہ چند منٹ میں اپنے ٹھکانے پر پہنچ جاتا تھا۔ چوری کا مال ریڑھی کے نیچے والے خانے میں چھپاتا تھا اور سو جاتا تھا۔ کئی بار لوگ اس کے پیچھے بھاگے، پولیس اِدھر اُدھر تلاش کرتی رہی مگر یہ خیال کسی کو نہیں آیا کہ چور صاحب تھانے میں مزے سے سو رہے ہیں۔"

ہم سب ہنسنے لگے "اسے تو پولیس میں بھرتی کرلینا چاہیے تھا فوراً۔"

"پھر وہ پکڑا کیسے گیا؟" آصف علی نے پوچھا۔

"پکڑا تو جاتا ہے آدمی کبھی نہ کبھی۔ غلطی سے اس نے پولیس لائن کے ایک کوارٹر میں ہاتھ صاف کردیا۔ ایک ہیڈ کانسٹیبل نے بیوی کے نام پر کسی کا ایک کنال کا پلاٹ رشوت میں لیا۔ کوئی قتل کا کیس تھا جس میں لمبی رشوت چلتی ہے۔ پلاٹ تھا قاتل کے بھائی کی بیوی کا۔ اس نے ہیڈ کانسٹیبل کی بیوی کے نام کردیا۔ بیوی نے شوہر کو پاور آف اٹارنی دی اور ہیڈ کانسٹیبل نے اسے فوراً بیچ دیا۔ رقم وہ اسی روز لے کر آیا تھا۔ اپنا حصہ رکھ کے اسے باقی ایس ایچ او صاحب کی خدمت میں پیش کرنا تھا مگر نہ جانے کیسے چور کو علم ہوگیا۔ غالباً اس نے کھُلی کھڑکی سے میاں بیوی کی باتیں سُن لیں۔ اس کی ریڑھی کھڑکی سے کچھ فاصلے پر کھڑی ہوتی تھی۔ رات کو اس نے مال سمیٹا اور لمبی تان کے سوگیا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے بہت غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ کوئی گھر کا بھیدی ہے۔ بیوی سے یہ اُمید نہ تھی کہ کسی کو بتائے اور کسی کو کچھ معلوم ہی نہ تھا۔ ریڑھی دیکھ کے وہ شک میں پڑگیا اور اگلی رات اس نے بندے کو اُٹھوالیا۔ حوالات میں چھترول تو کسی کی بھی ہوجاتی ہے۔ مان لے تو مجرم اور نہ مانے تو جائے اپنے گھر۔ وہ چور کچھ کم ہمت ہوگا ورنہ صبح تک برداشت کرلیتا تو بچ جاتا۔ اس نے رات بھر میں ہر چوری کا اعتراف کرلیا۔"

ناشتے کے بعد ہم سب پھر ڈرائنگ روم میں جابیٹھے۔ میرے ذہن میں دلاور خان کے نام اور اس کی گمشدگی کے ذکر سے کھدبد ہورہی تھی۔ میں دلاور خان کے بارے میں مزید جاننا چاہتا تھا لیکن آصف علی اب ایک پرانی تصویر لے آیا تھا۔

"دیکھو یہ کون ہے۔" اس نے پہلے رابعہ کو وہ فریم کی ہوئی تصویر دی "اسے پہچانتی ہو؟"

"یہ... سکندر! یہ تم ہو۔" رابعہ نے حیرت سے کہا اور پھر ہنسنے لگی۔

"سکندر کیا اس نے نام بدل لیا ہے؟" آصف علی بولا۔

"جی۔ یہ نام تو بہت پہلے ہی ہوگیا تھا میرا۔ خود والد نے کبیر خاں کہنا چھوڑ دیا تھا۔" میں نے وضاحت کی "اب بہت کم لوگ اصل نام سے واقف ہیں۔"

رابعہ نے تصویر میری طرف بڑھادی "اتنی پرانی تصویر نہ ہوتی تو میں ہرگز نہ مانتی کہ یہ تم نہیں ہو۔"

میں نے تصویر میں وزیر خاں کو دیکھا جو اپنے دوست آصف علی کے ساتھ کھڑا تھا۔ آصف علی نے سہرا تصویر کھنچوانے کے لیے نقاب کی طرح اُلٹ دیا تھا۔ اس کے گلے میں نوٹوں کا ہار تھا اور دونوں دوست ایک جیسی چمکیلی پھولوں والی شیروانی اور عمامے پہنے کھڑے تھے۔ تصویر بلیک اینڈ وائٹ تھی مگر اس کی سیاہی میں سرخی شامل ہوگئی تھی۔ شیروانی کے کپڑے سے صرف اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ وہ بروکیڈ کی قسم کا چمکیلا کپڑا ہوگا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ میں نے اپنے والد کی اس سے زیادہ پُرانی کوئی تصویر نہیں دیکھی تھی اور میرے والد کے دورِ شباب کے آخری عہد کا نقش سوفیصد وہی تھا جو آج میں تھا۔ فرق صرف گزر جانے والے وقت اور گزرتے ہوئے وقت کا تھا۔ جیسے بہتے دریا کا عکس جو آئینے میں دکھائی دے۔ آئینہ بھی وہی رہتا ہے، عکس بھی وہی اور دریا بھی وہی مگر بہتا دھارا بہت آگے نکل جاتا ہے اور ویسا ہی نظر آنے والا پانی وہ پانی نہیں رہتا۔ آصف علی نے ٹھیک کہا تھا۔ میں اپنے والد کا نقشِ ثانی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ خانم جو اس وقت ایک لڑکی تھی اور کہیں دُلہن بنی بیٹھی ہوگی، آج آنکھوں کے بغیر بھی مجھے دیکھ سکتی تھی۔

میں نے کہا "آصف صاحب! تصویریں تو اور بھی ہوں گی آپ کے پاس۔ ان میں دلاور کی کوئی تصویر ہے؟"

"دلاور کی تصویر میرے پاس!" اس نے نفی میں سرہلایا۔

رابعہ نے کہا "آپ کے دماغ میں یہ کیڑا کیوں کلبلا رہا ہے کہ ہر دلاور چوہدری دلاور ہوسکتا ہے؟"

"آپ دلیل سے ثابت کریں کہ نہیں ہوسکتا۔ اگر سو یا ہزار میں ایک کا امکان ہو تب بھی میں اپنا اطمینان کیوں نہ کرلوں، کیا نقصان ہے اس میں آپ کا۔"

"آپ ڈائریکٹری لے کر بیٹھ جائیں اور دلاور نام کے ہر شخص کو فون کرلیں۔ اخبار میں اشتہار دے دیں کہ دلاور نام کا ہر آدمی مجھ سے رابطہ کرے۔ انجمن دلاوران پاکستان بنالیں۔"

آصف ہنسنے لگا "پھر لڑنے لگے۔ دیکھو بھئی! تصویر تو کوئی نہیں۔ ہاں دلاور خان کو میں نے دیکھا تھا۔ جب اس کی ماں زندہ تھی تو وہ سال چھ مہینے میں چکر لگاتا تھا۔ عموماً عید پر۔ ماں سے بڑی محبت تھی اسے۔ ماں کی گود میں سر رکھ کے روتا تھا......"

میں نے کہا "اتنی ہی محبت تھی تو اپنے ساتھ کیوں نہیں لے جاتا تھا؟"

"ایک مجبوری تو شوہر کی تھی۔ دلاور کے باپ کی۔ اسے اکیلا چھوڑ کے وہ کیسے جاتی۔" آصف علی بولا "دوسری بات یہ کہ خود دلاور کہتا تھا ماں سے کہ میں بڑا بدقسمت ہوں۔ نہ تیرے ساتھ رہ سکتا ہوں نہ تجھے اپنے ساتھ رکھ سکتا ہوں۔"

"یہ کہتا تھا وہ؟" رابعہ نے افسوس سے سرہلایا۔

"ہاں۔ پتا نہیں کیا مجبوری تھی اسے۔ بڑا والا اکبر خاں ایسی کوئی بات نہیں کہتا تھا۔ وہ تو کہتا تھا کہ میرے ساتھ کراچی چلو۔ دلاور خان شاید اسے مناسب نہیں سمجھتا تھا کہ والدین کو ان کے کالے کرتوت معلوم ہوں اور اپنے ناجائز دھندوں کی وجہ سے کبھی ان پر مصیبت آئے تو اس عمر میں بوڑھے والدین کی بھی مٹی پلید ہو۔"

میں نے کہا "مجھے ذرا حلیہ بتائیں دلاور کا۔ آپ نے آخری بار کب دیکھا تھا؟"

"آخری بار۔ چار پانچ سال ہوگئے۔ اس کی ماں پہلے مرگئی تھی۔ باپ دو سال اور جیا مگر اس حساب سے تو ڈھائی تین سال ہوئے۔ ہاں اتنی ہی پرانی بات ہوگی۔ آخری عید تھی وہ جو اس نے ماں کے ساتھ کی تھی۔ وہ جب آتا تھا' ماں باپ کے لیے بہت کچھ لاتا تھا لیکن باپ خبطی اور ضدی تھا۔ ایک پیسہ نہیں لیتا تھا اور دھیلے کی چیز بھی گھر میں نہیں رکھتا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ یہ کمائی غلط ہے۔ بعد میں شاید دلاور خاں کو پتا چل گیا تھا کہ ماں مرگئی۔ اس کے جنازے میں وہ شریک نہیں ہوسکا تھا۔ سوئم پر پہنچا۔ سیدھا قبر پر گیا فاتحہ پڑھنے کے لیے۔ کسی ٹھیکیدار سے بات کی اور ماں کی قبر کے آس پاس کی زمین خرید کے وہاں ایک مسجد بنوانے کا ٹھیکا دے گیا۔ بعد میں باپ کو بھی وہیں دفن کیا۔ مسجد کے احاطے میں۔ دلاور آیا تھا درمیان میں دو بار۔ یہ دیکھنے کے لیے مسجد بنی یا نہیں۔ صفوں کے لیے اور دوسرے سامان کے لیے کافی رقم دے گیا۔ لاؤڈ اسپیکر اور کلاک وغیرہ خریدے گئے' امام اور مؤذن کا حجرہ بنا۔ اس کے بعد بھی وہ پیسہ بھیجتا رہا کہ ضرورت مندوں کے کفن دفن کا انتظام مفت کیا جائے۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔"

میں دم بخود بیٹھا ایک اسمگلر اور بدمعاش کی زندگی کا وہ پہلو دیکھ رہا تھا جو ساری دنیا کی نگاہ سے اوجھل تھا۔ آخر یہ سب کیا تھا؟ ایک فطری جذبہ جسے جبلت کہا جاسکتا ہے کہ دلاور خان کو بھی اپنی ماں سے وہی قربت تھی جو کسی بھی جانور کو ایک خاص عمر تک ماں سے رہتی ہے مگر سوشل اینیمل کہلانے والا آدمی جذبات کی دریا زنجیروں میں جکڑا جاتا ہے۔ یہ ایک طاقتور' تمام مادی وسائل رکھنے والے' ساری اخلاقی اقدار کو پاؤں کی ٹھوکر میں رکھنے والے اور قانون کو اپنی مٹھی میں رکھنے والے شخص کی زندگی کا وہ خلا تھا جس کو صرف ماں کی محبت پُر کرسکتی تھی۔ یا ضمیر کے جہنم میں جلنے والے کے لیے روح کی تسکین کا واحد وسیلہ وہ جنت تھی جو ماں کے پیروں کے سوا کہیں نہ تھی۔ کیا اسے احساس تھا کہ اس کے سارے گناہ اسی طرح معاف ہونے کی اُمید ہے کہ وہ ماں کے قدموں کی جنت میں کوئی نیکی کا سرچشمہ جاری کردے جس کے صدقے میں اس کا نامۂ اعمال کچھ متوازن ہوجائے۔ گناہوں کے ساتھ ثواب بھی لکھے جائیں اور میدانِ حشر میں اس کی شفاعت کے لیے ماں کی دعائیں ہوں۔ ان سب کی دعائیں ہوں جو اس مسجد میں مصروفِ عبادت رہے اور ان کی دعائیں ہوں جن کو یہاں سے سفرِ آخرت کے لیے کفن ملا۔

یہ عجب بات تھی کہ دنیا میں خود کو فرعون سمجھنے والا دلاور اندر سے آخرت کے خوف میں مبتلا وہ شخص تھا جو یقین رکھتا تھا کہ خدا بڑا ہی رحمان اور رحیم ہے اور بخشنے والا بھی ہے۔ شاید یہ ناممکن ہے کہ ساری دنیا پر اقتدار اور اختیار کا مالک اور تکبر میں خدائی کا دعوے دار بھی اپنے اس خوف کو دل سے نکالنے میں ناکام رہتا ہو۔

آصف علی اب رابعہ کو اور کاجل کو میرے بچپن کی اور وزیر خاں کے ماضی کی بہت سی ان کہی باتیں بتا رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ میں بھی توجہ سے سُن رہا ہوں جب کہ درحقیقت میں دلاور خان کا تصور کر رہا تھا۔ آخر وہ کون تھا۔ کیا چوہدری دلاور ہی دلاور خان ہوسکتا تھا؟

میں نے موقع پاتے ہی کہا "آصف صاحب! وہ مسجد کہاں ہے جہاں دلاور خان کے والدین دفن ہیں؟"

"اب وہ قبرستان میں داخل ہونے کا راستہ ہے۔"

"اور وہاں پیش امام اور مؤذن وہی ہیں جن کو دلاور خان رقم ارسال کرتا رہتا ہے؟"

"پیش امام اور مؤذن ایک ہی شخص ہے۔"

"اس نے تو دلاور کو کئی بار دیکھا ہوگا۔ مسجد کی تعمیر کرنے والے ٹھیکیدار نے بھی دیکھا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"ٹھیکیدار تو پتا نہیں کہاں گیا۔ سب دبئی جارہے ہیں' وہ بھی نکل گیا ہوگا۔" آصف علی بولا "پیش امام صاحب نابینا ہیں بے چارے۔ حافظ ہیں اور بڑے اچھے قاری۔"

میں نے مایوسی سے کہا "پھر آپ ہی کچھ بتائیں' دلاور خان کے بارے میں۔ میرے پاس اس وقت کوئی تصویر نہیں ہے ورنہ تصدیق ہوجاتی۔"

رابعہ نے مجھے یوں دیکھا جیسے اسے میرے ذہنی توازن پر شک ہو "ابھی تک وہی ایک بات سوچ رہے ہو؟"

"ایک خلش پیدا ہوگئی ہے خواہ مخواہ۔ سمجھ لو دماغ چل گیا ہے میرا۔" میں نے کہا۔

مگر اس کے بعد آصف علی نے سوچ سوچ کے یادداشت کی مدد سے دلاور خان کی صورت شکل' قدو قامت اور انداز و اطوار کا تفصیلی نقشہ بنانا شروع کیا تو خود بخود سب کے ذہن میں ایک ہی تصویر بنتی چلی گئی۔ یہ چوہدری دلاور کی تصویر تھی۔ میں نے ان گنت سوال کیے اور یہ سوال خود بہت سی باتوں کا جواب تھے۔ میں نے دلاور خان کے نامکمل خاکے میں اپنی معلومات کی مدد سے حقائق کے وہ رنگ بھرے جن سے خود ہی چوہدری دلاور کا نقش واضح ہوگیا۔ آصف علی حیران تھا اور مجھے خبطی سمجھنے والی رابعہ شرمسار تھی کہ وہ دشتِ امکاں کا ایک ذرہ جس کو میں نے آفتاب آمد دلیلِ آفتاب کی طرح دلاور ثابت کردیا۔

"دلاور خان ہی چوہدری دلاور ہے؟" آصف علی نے بے یقینی سے کہا۔

"اس میں شک کی ایک فیصد گنجائش نہیں رہی۔" میں نے جوش سے کہا "یقین نہیں آتا تو میرے ساتھ لاہور چلو۔ خود مل کے دیکھو اسے اور پہچانو۔ میں نے کہا تھا نا' اکبر خاں اسے باہر تلاش کرتا رہا لیکن وہ نام بدل کے یہیں موجود رہا۔ اس نے شہر بدل لیا' کاروبار بدل لیا۔"

رابعہ نے کہا "اکبر خاں اب کہاں ہے؟ دلاور کا بھائی۔"

"ہوگا کراچی میں۔ کیا کہا جاسکتا ہے ایسے لوگوں کے بارے میں کہ کس وقت وہ کہاں ہوں گے' کس نام سے ملیں گے اور ملیں گے تو کہاں ملیں گے۔ جیل میں یا کسی گمنام مدفن ہیں۔ ایسے لوگ اپنوں کی گولی کا نشانہ بھی بن سکتے ہیں اور غیروں کی گولی کا بھی' پھانسی بھی چڑھ سکتے ہیں اور غائب بھی ہوسکتے ہیں۔" آصف علی بولا۔

اب نو بجنے والے تھے۔ مجھے ایک بہت اہم بات معلوم ہوئی تھی۔ چوہدری دلاور کا بھائی ایک نامی گرامی اسمگلر تھا۔ اس نے اپنے ہی بھائی سے دغا کی تھی اور خون کا رشتہ رکھنے والا بھائی اس کے خون کا پیاسا تھا۔ اس کی داستانِ ماضی کے یہ حوالے میرے ہاتھ میں آجانے والے ترپ کے اضافی پتے تھے جن کو میں اس کھیل میں کہیں بھی استعمال کرکے چوہدری دلاور کا پتا کاٹ سکتا تھا۔ پہلی بار مجھے معلوم ہوا تھا کہ اس کی ماں کون تھی اور باپ کیا کرتا تھا۔ آج تک اس نے اپنی عمرِ گزشتہ کو رازداری کے ایک آہنی پردے کے پیچھے چھپائے رکھا تھا مگر قسمت نے خود میری رہنمائی کی تھی اور مجھے اس مقام تک پہنچا دیا تھا جہاں سے چوہدری دلاور نے اپنی زندگی کے سفر کا آغاز کیا تھا۔ اب میں اس پوزیشن میں تھا کہ دلاور کے بارے میں سب کچھ جان سکوں۔

رابعہ نے دوسری بات شروع کردی "خانم کی آنکھیں کیا کسی بیماری میں خراب ہوئی تھیں؟"

"نہیں بیٹا۔ اسے بھی میں کیا کہوں۔ اپنی بدقسمتی یا میرے اعمال کی سزا جو اس غریب نے کاٹی۔ مجھے بہت دکھ ہوتا ہے یہ سوچ کے۔ اگر یہ کسی اور کی بیوی ہوتی تو اچھا ہوتا۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو جی.... خدا کی مرضی کے خلاف بول رہے ہو۔ وہ آسمان پر جوڑے بناتا ہے۔ زمین پر کسی کے چاہنے نہ چاہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مجھے تو کوئی گلہ نہیں تقدیر سے۔ بہت خوش ہوں میں۔ میں اس محل میں ایسی شان و شوکت کی زندگی گزار رہی ہوں۔ خدمت کے لیے کسی کی محتاج نہیں۔ نوکر چاکر ہیں۔ ایک نہیں دو دو گاڑیاں ہیں۔ کسی اور کے ساتھ کیا ہوتا یہ کون جانے۔ کیا پتا میں کہیں بھیک مانگ رہی ہوتی' کسی اسپتال میں خون تھوکتی مرجاتی اور میرے پاس دوا دارو کے پیسے تک نہ ہوتے۔ آخر پچاس سال تو دنیا دیکھی میں نے ان آنکھوں سے۔ وہ بھی تو ہوتے ہیں جو پیدا ہی اندھے ہوتے ہیں' ایک دن کا اُجالا بھی ان کے نصیب میں نہیں ہوتا۔"

ایسا صبر و قناعت کا پیکرِ مجسم میں نے کہیں نہ دیکھا تھا۔ اس کا نحیف و ناتواں جسم ایمان اور عقیدے کی وہ ناقابل شکست دیوار تھی جسے آلام و مصائب کے طوفان کبھی متزلزل نہ کرسکے تھے۔ میں نے اس پر رشک کیا کیونکہ میں ان آنکھوں والے اندھوں میں شامل میں تھا جو صرف تیرہ بختی کو دیکھتے ہیں اور خوش بختی کا بہت سا اُجالا پاکے بھی بے یقینی کے راستوں پر بھٹکتے پھرتے ہیں اور شکوہ کرتے ہیں۔

"پانچ سال پہلے تک اس کی نظر ٹھیک تھی۔ پھر اسے پڑھنے میں دشواری ہونے لگی۔" آصف علی نے کہا "کہتی تھی کہ کلامِ پاک کی تلاوت کرتے ہوئے حُروف دُھندلا جاتے ہیں۔"

میں نے کہا "چالیس سال کی عمر کے بعد قریب کی نظر کمزور ہونے لگے تو کوئی غیر معمولی بات نہیں۔"

"میری عمر تو پچپن ہوگئی تھی۔" خانم نے کہا۔

"میرا خیال تھا کہ لیڈی ریڈنگ اسپتال میں کسی امراضِ چشم کے ماہر کو دکھاؤں۔ وہ نظر ٹیسٹ کرکے چشمہ بنادے گا لیکن اس نے کچھ جلدی کی۔ ایک عورت نے کسی پیر کا ذکر کیا کہ ان کی درگاہ سے پیدائشی نابینا بھی بصارت پاکے لوٹتے ہیں۔ ایسے جھوٹے معجزوں کی شہرت ان جعلی پیروں کے ایجنٹ پھیلاتے ہیں اور خاص طور پر عورتوں کے ذریعے۔ ایک دن یہ خود بھی چلی گئی اور وہاں سے کوئی سُرمہ لے آئی۔ پتا نہیں اس میں کیا تھا۔ سُرمہ دینے والے نے کہا تھا کہ لگانے سے تکلیف تو ہوگی مگر فکر مت کرنا' سارے جالے کٹ جائیں گے۔ اس نے بھی بڑی اذیت برداشت کی اور آنکھوں پر پٹی باندھے صبح تک تڑپتی رہی۔ صبح جب آنکھیں دھوئیں تو آرام آیا مگر آنکھوں کی روشنی چلی گئی۔ بعد میں اسپتال

بھی لے گیا میں۔ ٹیکسلا کے مشن اسپتال کے انگریز ڈاکٹروں کو بھی دکھایا مگر انہوں نے صاف کہہ دیا کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ میں اس کے ساتھ پیر کی درگاہ پر بھی گیا مگر وہاں کسی نے اپنے جرم کا اعتراف نہیں کیا۔ یہ دیکھ سکتی تو مجرم کو پہچانتی۔ میں اس کی آنکھیں نکال لیتا۔ ہنگامہ بہت کیا میں نے۔ پولیس نہ ہوتی میرے ساتھ تو وہ لوگ اُلٹا مجھے مارتے۔ پولیس مجھے بچا کے وہاں سے نکال لائی۔ میری چیخ پکار سے جاہل عقیدت مند بھی مشتعل ہو گئے تھے۔"

آصف علی یہ سب بتاتے ہوئے جتنا رنجیدہ تھا اس سے زیادہ شرمندہ تھا۔ وہ اس خیال سے دامن نہیں چھڑا سکتا تھا کہ اپنے' اپنی بیوی کے اور بیٹی کے سارے مصائب و آلام اس کے اعمال کی سزا ہیں۔ ابھی تک اس کی بیٹی سامنے نہیں آئی تھی اور نہ اس کا ذکر آیا تھا۔

میں نے ہمت کر کے کہا "آصف صاحب! اپنی بیٹی سے بھی تو ملوائیں۔"

"ہاں ہاں' کیوں نہیں" آصف علی نے نروس ہو کے کہا "دراصل وہ سو رہی تھی' اب اُٹھ جانا چاہیے اسے۔"

"میں دیکھتی ہوں۔" خانم اُٹھی اور خلا میں راستہ دیکھتی دروازے سے باہر چلی گئی۔

رابعہ نے کہا "نام کیا ہے آپ کی بیٹی کا؟"

"قدرت خانم" آصف علی بولا "اسے دیکھ کر خدا کی قدرت پر ایمان لانا پڑتا ہے۔ اس کا یہ نام تو میں نے بہت سوچ سمجھ کے رکھا تھا مگر میری بیوی کا نام رکھتے وقت اس کے باپ نے یہ نہیں سوچا ہوگا کہ ایک دن وہ بصارت سے محروم ہو جائے گی تو بصیرت رہ جائے گی۔ اس کا نام بصیرت خانم ہے۔ تقدیر نے بصارت چھین لی مگر بصیرت تو اب بھی میرے پاس ہے۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ وہ بصیرت کو نہ چھوڑتا۔ اس اتفاق میں برکت ہے کچھ تو کچھ ان کے خاندان میں عورتوں کے نام ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اس کی ماں تھی صولت خانم' اس کی ماں تھی رحمت خانم۔"

اندر سے خانم کی آواز آئی "آجا... آجا میری بیٹی۔ ہاں ایسے۔ شاباش۔ دیکھ کون آیا ہے آج ہمارے گھر۔ وزیر خاں۔"

ایک عجیب سی ہنسی کی آواز کے ساتھ قدرت دروازے میں نمودار ہوئی۔

جو چیز میرے سامنے کھڑی تھی اسے جسمانی ساخت اور اعضا کی مناسبت سے انسان ہی سمجھا جا سکتا تھا مگر وہ بدہیئتی اور بدصورتی کی بدترین تصویر تھی۔ اس کا قد مشکل سے ساڑھے تین فٹ ہوگا مگر جسم خاصا بھاری اور بے ہنگم تھا۔ اس کے ہاتھ لمبے تھے اور اسی تناسب سے ٹانگیں چھوٹی تھیں۔ چنانچہ ایک نظر میں یوں لگتا تھا جیسے کسی لمبی عورت کا اوپر والا دھڑ ایک پستہ قد عورت کی ٹانگوں پر رکھ دیا گیا ہو۔ اس کا چہرہ بھی پھولا ہوا تھا اور گالوں کا گوشت عجیب طرح سے لٹک گیا تھا چنانچہ اس کی ٹھوڑی ہی نہیں' گردن بھی نظر نہیں آتی تھی۔ اس کی آنکھیں چھوٹی اور گہرے حلقوں میں مدفون تھیں اور ناک قدرے دبی ہوئی اور پھیلی ہوئی لگتی تھی۔ یوں جیسے کسی نے مکا مار کے اس کو بٹھا دیا ہو۔

سب سے عجیب اس کے چہرے کا تاثر تھا۔ وہ کسی جنونی دہشت زدہ اور اذیت میں مبتلا شخص کا چہرہ تھا لیکن اس کے ہونٹ بڑے مصنوعی انداز میں بدنما دانتوں کی نمائش کر رہے تھے اور وہ حلق سے مضحکہ خیز آوازیں نکالتے ہوئے ہنس رہی تھی۔ یہ ایسی ہی آواز تھی جیسے تنگ منہ والی پانی سے پوری بھری ہوئی بوتل کو ایک دم اُلٹ دینے سے پیدا ہوتی ہے۔

جب اس نے قدم بڑھایا تو پہلے ایک پاؤں کو دھپ سے آگے رکھا اور کچھ دیر جیسے اپنا توازن قائم کرتی رہی۔ پھر اس نے دوسرا پاؤں بہت آگے رکھ دیا۔ اور لڑکھڑانے لگی۔ خانم نے اس کو سہارا دیا وہ زور سے ہنسی اور اس کا سارا جسم تھرتھرانے لگا۔ فالتو گوشت اوپر والے دھڑ پر جمع ہو گیا تھا۔ میں نے انسانوں کو فٹ پاتھوں پر ایسی ایسی حالت میں دیکھا تھا کہ ان کا وجود انسانیت کے نام کی تذلیل لگتا تھا۔ وہ جانوروں سے بدتر حالت میں اپنے مکروہ' نامکمل اور شکستہ اعضا کی نمائش کرتے تھے اور دیکھنے والوں کے جذبۂ ترحم کو بیدار کر کے بھیک مانگتے پھرتے تھے۔ بیساکھیوں کے سہارے زمین پر جانوروں کی طرح گھسٹتے ہوئے اور ہاتھوں پیروں سے محروم خالی دھڑ کے ساتھ ریڑھیوں پر پڑے ہوئے آدمیت کی توہین کے یہ قابلِ نفرت نمونے پیشہ ور گداگری کے ٹھیکیداروں کی آمدنی کا وسیلہ تھے جن کو وہ ایسا بناتے تھے اور پھر اسی حالت میں زندہ رکھتے تھے۔

لیکن یہ لڑکی جو میرے سامنے کھڑی تھی' ایک مجسم سوال تھی کہ آخر میں کسی اور کے اعمال کی سزا کیوں بنی؟ دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو اور پھر مجھے بتاؤ کہ یہ کیسا مکافاتِ عمل ہے؟ کس جرم کی پاداش میں اور کس ضابطۂ انصاف کے تحت کسی اور کے گناہوں کو میری پیدائش سے قبل میری سزا بنا دیا گیا اور یہ سزا ہے تو پھر جزا کہاں ہے؟ میری نجات کہاں ہے اور اس قیدِ حیات میں مجھے کب تک یونہی جینا ہے؟

آصف علی اور اس کی بیوی شاید اپنے دکھ جھیلنے کے عادی ہو چکے تھے اور احساسِ اذیت کو برداشت کرتے کرتے اب بے حسی کی منزل تک پہنچ گئے تھے۔ درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا۔ وہ اپنی بیٹی کو دیکھ دیکھ کر نہال ہو رہے تھے' اس کے ساتھ ہنس رہے تھے اور شاید انہیں وہ دنیا کی سب سے خوب صورت لڑکی نظر آ رہی تھی۔ ان کی آنکھوں میں اپنی تخلیق پر ندامت کا کوئی جذبہ نہ تھا۔ سبھی والدین کی طرح وہ اپنی اولاد کو جذبات کی خوب صورتی کے ساتھ دیکھ رہے تھے اور اس پر صرف محبت نچھاور کر رہے تھے۔

وہ آصف علی کوئی اور تھا جس نے میرے سامنے اعتراف کیا تھا کہ اس کے اعمال کی سزا قدرت کا وہ عذاب ہے جو قدرت خانم کی صورت میں نازل ہوا تھا اور جسے وہ خواہش اور کوشش کے باوجود قتل نہیں کر سکا تھا۔ اگر وہ بیٹی کے سامنے ایک باپ کے پُرشفقت' محبت سے معمور دل رکھنے والے انسان کا رول کر رہا تھا تو بلاشبہ یہ اداکاری بہت حقیقی تھی۔ ماں کی بات مختلف ہے' اس کی ممتا میں کہیں کھوٹ نہ تھا۔ اس کا اپنی اولاد پر غرور بے ریا تھا اور اس میں ندامت کا کوئی شائبہ تک نہ تھا۔

قدرت اسی طرح بے ڈھنگے پن سے چلتی آگے آئی۔

میں نے ہاتھ بڑھا کے کہا "آؤ قدرت! میرے پاس آؤ۔"

اس نے خوف زدہ لہجے میں کہا "قد... رت..."

رابعہ نے کہا "تم قدرت ہو نا؟"

اس نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا اور پھر بے سبب مسکرانے لگی "میں...... قدرت.... ہوں"

وہ بھاری' بیٹھی ہوئی آواز میں ایک ایک لفظ بڑی کوشش سے ادا کرتی تھی۔ اس نے میری طرف اور پھر رابعہ کی طرف دیکھا اور کچھ سوچ کے رابعہ کی طرف بڑھ گئی۔

"میرا نام رابعہ ہے۔ آنٹی رابعہ۔"

"آن... ٹی؟" اس کی آنکھوں میں اُلجھن اور ماتھے پر سوچ کی شکنوں کا جال نمودار ہو گیا۔ غالباً وہ اس لفظ کے مفہوم سے ہی ناآشنا تھی۔

"قدرت کس کی بیٹی ہے؟" آصف علی نے جھک کے اسے پیار کیا۔

قدرت نے باپ کے گلے میں ہاتھ ڈال دیا "ابو کی...."

"قدرت میری بیٹی ہے۔" خانم نے کہا۔

وہ زور زور سے سر ہلانے لگی "امی کی بیٹی۔"

"اچھا چلو ناشتا کر لو۔ کیا کھاؤ گی بولو؟" ماں نے کہا۔

"لڈو" اس نے بہت سوچ کے جواب دیا۔

خانم نے ایک نوکر کو آواز دی "جا کے لڈو لے آ۔ فوراً گاڑی لے کر جا۔"

"جی خانم" نوکر نے کہا اور کوئی سوال کیے بغیر یا کسی حیرت کا اظہار کیے بغیر واپس چلا گیا۔

میں نے اور رابعہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا لیکن اپنے ذہن میں پیدا ہونے والے سوال کو آنکھوں میں بھی نہ آنے دیا۔ یہ ماں باپ بڑا مشکل فریضہ سرانجام دے رہے تھے۔ اس اچھے بُرے' جائز ناجائز اور نیک و بد کے شعور سے محروم لڑکی کی ہر خواہش' ہر فرمائش پوری کرنا جیسے ان پر فرض تھا۔ وہ اس کے وسائل بھی رکھتے تھے مگر یہ وسائل کا مسئلہ نہیں تھا۔ بلا چون و چرا تعمیل کا تھا۔ ناشتے میں لڈو کھانے کو مانگنا ایک ایسی خواہش تھی جو شاید تین سال کا بچہ بھی نہ کرتا اور کرتا تو والدین اسے سمجھاتے کہ بیٹا ناشتے میں کون لڈو کھاتا ہے۔ یہ دیکھو ڈبل روٹی' انڈے' جام' مکھن' حلوا پراٹھے' قیمہ' جوس' چائے' کافی' دودھ سب کچھ تو ہے۔ مگر خانم نے فوراً لڈو منگوانے کے لیے ملازم کو گاڑی لے کر دوڑا دیا تھا۔ یہ خیال آنا قدرتی بات تھی کہ وہ کسی ناممکن چیز کی فرمائش کر دیتی۔ مثلاً آم کی یا آئس کریم کی تو اس سردی کے موسم میں یہ چیزیں اس وقت کہاں دستیاب ہوتیں؟

میں نے کہا "آصف صاحب! ہم اب چلتے ہیں۔ آپ نے کہا تھا کہ ہم خود کلیم اللہ کے گھر والوں سے ملنے کے لیے جائیں گے۔"

"ہاں۔ بندوبست ہو جائے گا آج ہی۔" اس نے گھڑی دیکھ کے کہا "پولیٹکل ایجنٹ کا دفتر تو کھُل گیا ہوگا۔ وہ آتا ہے کچھ دیر سے مگر خیر..... چلتے ہیں۔"

میں نے کہا "ہم ریسٹ ہاؤس سے اپنا سامان اُٹھا لیں۔"

"سامان گاڑی میں رکھو اور اِدھر ہی آجاؤ۔ میں چلتا ہوں تمہارے ساتھ۔" اس نے کہا۔

ہم خانم سے اجازت لے کر اُٹھے ہی تھے کہ آصف علی نے کہا "تم سب واپس جا کے کیا کرو گے؟ میں کبیر خاں کے ساتھ جا کے ابھی آتا ہوں۔"

میں نے بھی کہا "ہاں' تم لوگ ٹھہرو۔"

آصف علی نے کہا "خانم! ان کو گھر دکھاؤ اپنا۔"

میں پھر حیران ہوا کہ ایک بصارت سے محروم عورت آنکھوں والوں کو گھر دکھائے گی! لیکن ان کے لیے یہ روز مرّہ کی بات تھی۔

آصف علی نے کہا "کیا خیال ہے' گاڑی لے لوں؟"

میں نے کہا "نہیں۔ پیدل ہی چلتے ہیں۔ دس پندرہ منٹ کا راستہ ہے۔"

وہ میرے ساتھ چل پڑا "تم نے قدرت کو دیکھا؟"

"جی۔ اور میں اسی سلسلے میں کچھ کہنا چاہتا تھا۔" میں نے کہا "ہم نے رات کو اس مسئلے پر غور کیا تو ہمارے ذہن میں بہت سی باتیں آئیں۔ بے شک آپ فیصلہ کرنے میں مختار ہیں' مگر ہم بھی جو محسوس کرتے ہیں' نیک نیتی سے کہنے کا حق رکھتے ہیں۔"

"اس تمہید کی ضرورت نہیں تھی۔ تم کہو۔"

"آصف صاحب! میں آپ کے اس انتظام کو قطعی غیر محفوظ سمجھتا ہوں جو آپ نے قدرت کے مستقبل کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے کیا ہے۔ یہ بہت پُرخطر اور ناقابلِ اعتبار ہے۔" میں نے کہا "میں نے اس نوجوان کو صرف ایک بار دیکھا ہے لیکن اس کی سرکشی کا رویّہ مجھے اچھا نہیں لگا۔ ایک مجبوری کے تحت اس نے آپ کی شرط قبول کر لی ہے لیکن اس کے ذہن میں یہ خیال ضرور ہوگا کہ آپ نے اس کا استحصال کیا۔ وہ غریب تھا اور آپ نے دولت کے بل پر اپنی بیٹی کو زبردستی اس کے سر منڈھ دیا۔ اگر وہ لالچی نہ ہوتا تو ہرگز ایسی ذمّے داری کا بار اُٹھانا منظور نہ کرتا۔ ہر شخص صرف دولت کی خاطر اپنی ساری زندگی عذاب میں نہیں

جھو نکلتا۔ میرے الفاظ ممکن ہے آپ کو بے رحم لگیں کہ میں آپ کی بیٹی کو روگ اور عذاب کہہ رہا ہوں مگر سوچیے ایک صحت مند، نوجوان آدمی کے نقطۂ نظر سے۔ یہ دولت نہ ہوتی تو کیا وہ قدرت کو قبول کرتا؟ یا اتنی دولت نہ ہوتی، لاکھ دو لاکھ ہی ہوتے۔" میں نے نفی میں سرہلایا۔

آصف علی نے ایک آہ بھری "کہتے تم ٹھیک ہو میاں کبیر مگر یہ سب تو میں بھی جانتا ہوں۔"

"جانتے بوجھتے آپ یہ غلطی کررہے تھے؟"

"غلطی!" وہ تلخی سے بولا "اس غلطی کے سوا میرے پاس کیا ہے کرنے کو۔ کون سا راستہ ہے۔ میں اسے کہاں رکھوں، کس کی پناہ میں دوں؟ کسی ذہنی امراض کے اسپتال یا معذور افراد کے ادارے کے سپرد کرتا ہوں تو مجھے معلوم ہے اس کا انجام کیا ہوگا۔"

"ہم نے رات کو یہی سوچا تھا کہ قدرت کے لیے ہم کیا کرسکتے ہیں اور ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ جب آپ وزیر خان ٹرسٹ کے نام اپنی آدھی جائداد کررہے ہیں تو پھر قدرت کو ہمارے سپرد کردیں۔ وہ وزیر خان ٹرسٹ کی نگرانی میں رہے گی۔ اسی طرح جیسے یہاں رہتی ہے۔ اس کا الگ کمرا ہوگا۔ الگ خدمت گار ہوں گے۔ ڈاکٹرز اس کا علاج کریں گے۔ نرسیں ہوں گی۔ اس کے لیے سیرو تفریح آرام و آسائش کا سب بندوبست ہم کریں گے۔ یہ ہمارے گھر میں آنے کی جانے گی۔ ایک نہیں کئی گھر اس کے گھر ہوں گے۔ یہ اسپتال میں بھی مریض کی حیثیت سے نہیں، مالک کی طرح رہے گی۔ یہ ذمے داری ہم ساری عمر کے لیے قبول کرسکتے ہیں۔ آگے آپ کی مرضی۔"

آصف علی چلتے چلتے رک گیا۔ اس کی خوشی دیدنی تھی۔ فرطِ جذبات سے اس کا چہرہ دمک رہا تھا اور جب اس نے میرے شانے پر اپنے دونوں ہاتھ رکھے تو میں نے محسوس کیا کہ وہ کانپ رہا ہے۔

"تم...... ایسا سوچا ہے تم نے میرے لیے، قدرت کے لیے! کیا واقعی تم ایسا کرسکتے ہو؟" اس نے مرتعش آواز میں کہا۔

میں نے کہا "اگر آپ اس تجویز کو قابلِ عمل سمجھتے ہوں اور آپ کو اعتبار ہو ہماری نیت کے خلوص پر تو سب کچھ ہوسکتا ہے۔"

"اس سے اچھا کیا ہوسکتا ہے۔ اس سے بہتر انتظام تو میرے لیے ممکن ہی نہیں تھا۔ میں مجبور تھا، اکیلا تھا۔ کوئی نہیں تھا جس پر میں بھروسہ کرسکوں کہ وہ ساری عمر قدرت کی حفاظت کرسکتا ہے۔ اس ذمے داری کا بوجھ کسی نہ کسی کے سپرد کرنا ضروری تھا کیونکہ میں اور میری بیوی کتنے دن اور جئیں گے؟ کسی غرض کے بغیر کون تھا جو یہ بار اٹھاتا؟ پھر ایک غرض مند مل گیا۔"

میں نے کہا "آئیے چلیں۔ خدا ہمارے ارادوں کو تقویت دے اور ہمیں کامیاب کرے۔ میں نہیں سمجھتا کہ دولت سے آپ نیک نیتی، خلوص اور محبت خرید سکتے ہیں۔ جو بھی آپ کی دولت پر اختیار کے عوض یہ سب پیش کرنے کی بات کرتا ہے وہ تو ایک ریا کار تاجر ہے۔ آپ کے پاس کیا ضمانت ہے کہ وہ قدرت کے ساتھ محبت اور عزت سے پیش آتا رہے گا اور اس کے ساتھ ہمدردی کا رویّہ رکھے گا؟ اس پر میں کوئی الزام نہیں لگا رہا ہوں مگر..."

"میں سمجھتا ہوں، سب جانتا ہوں۔" آصف علی بولا "لیکن ہر جگہ دیکھنے کے بعد اور ہر امکان پر غور کرنے کے بعد مجھے یہی صورت سب سے کم خراب لگی۔ نفسیاتی طریقۂ علاج کے جدید تقاضوں سے ہم آہنگی کا دعوے رکھنے والے پرائیویٹ ادارے محض پیسہ بٹورنے کا ڈھونگ ہیں اور وہاں کسی کو تمام عمر رکھا بھی نہیں جاسکتا۔ وہ سائنٹیفک طریقے سے کھال کھینچنے کے ماہر ہیں۔ سرکاری اداروں کا حال تو عبرتناک ہے۔ وہاں خطرناک پاگل اور عارضی نفسیاتی الجھن میں مبتلا شخص، دونوں کو ایک ہی طرح رکھتے ہیں۔ ان کا کیا علاج ہوتا ہے، کیا کھانے کو ملتا ہے، کیسی رہائش ہے، یہ سب دیکھا ہے میں نے۔ وہ مریض میں اعتماد نہیں، نفرت پیدا کرتے ہیں۔ تشدد کرتے ہیں اس پر۔ مارپیٹ کے لیے بید اور کوڑے استعمال کرتے ہیں۔ الیکٹرک شاک دیتے ہیں۔ ایسے تو جنگلی جانور بھی سیدھا ہو جاتا ہے۔ شیر کو بکری بنایا جاسکتا ہے مگر یہ علاج نہیں ہے۔"

میں نے کہا "وزیر خاں ٹرسٹ اسپتال کوئی ذہنی یا نفسیاتی مریضوں کی علاج گاہ نہیں ہے۔ وہ تو عام امراض کے لیے وقف ہے جہاں نادار مریضوں کو مفت دوا ملتی ہے اور انتہائی ضرورت مندوں کو داخل رہنے کا کوئی خرچ نہیں اٹھانا پڑتا۔ قدرت کی پوزیشن بالکل مختلف ہوگی۔ جب اتنی بڑی آمدنی اس کی وجہ سے ہوگی تو وہ ٹرسٹ کے بورڈ آف ڈائریکٹرز میں شامل ہوگی۔ اس کی رہائش سے آسائش تک سب اس کے شایانِ شان ہوگا اور علاج بھی۔ وہ جب تک زندہ رہے گی اس کی یہ حیثیت برقرار رہے گی۔"

"تم نے میرا مسئلہ حل کردیا۔ میرے لیے مرنا آسان کردیا۔ میں کہاں سے الفاظ لاؤں اپنی ندامت کا اظہار کرنے کے لیے اور شکر گزاری کے جذبات جو میرے دل میں ہیں......"

"ان کی کوئی ضرورت بھی نہیں۔"

"ضرورت میں محسوس کرتا ہوں۔ میں مجرم تھا تمہارے والد کا۔ تمہیں مجھ سے انتقام لینا چاہیے تھا۔ تم نے مجھے معاف ہی نہیں کیا، الٹا مجھے احسان کے قرضے سے زیربار کردیا۔ شاید یہ بھی قدرت کی طرف سے میرے منہ پر طمانچہ ہے۔"

میں نے کہا "ایسا مت سوچیں۔ پرانی بات ختم ہوگئی۔ آپ کو غلطی کا احساس ہوگیا، آپ کی طرف سے میرا دل صاف ہے۔ باقی خدائی باتیں خدا ہی جانے۔ جب میں نے گاڑی آپ کے اسٹور کے سامنے روکی تھی اور اندر قدم رکھا تھا تو یہ مشیتِ ایزدی تھی، میرا فیصلہ نہیں تھا۔ اس وقت یہ ناممکن تھا کہ میں کسی اور دکان میں اپنی مرضی سے جاسکتا۔"

اچانک آصف علی بولا "یہ کیا ہے؟"

میں نے کہا "کہیں آگ لگی ہے۔ دھوئیں سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے۔"

"لوگ بھی جمع ہیں، پولیس اور فائر بریگیڈ کی گاڑیاں بھی ہیں۔" آصف علی نے کہا "ایک منٹ رکو۔"

پہلے میرا بھی خیال تھا کہ واردات ریسٹ ہاؤس کے قریب ہوئی ہے لیکن غور سے دیکھنے پر میرا خیال بدل گیا۔ میں تشویش میں مبتلا ہوگیا۔ "شاید ریسٹ ہاؤس میں کچھ ہوا ہے۔" میں نے کہا۔

"بالکل وہیں کوئی بات ہوئی ہے۔ تم یہاں ٹھہرو۔ میں دیکھ کے آتا ہوں۔"

"نہیں، میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔"

"پاگل مت بنو۔ یہ انہی کی کارروائی ہوسکتی ہے جو کل صبح آفریدی کو ہلاک کرچکے ہیں۔"

میں نے کہا "مگر ایسی بات ہوگی تو وہ اپنا کام کرکے جاچکے ہوں گے۔"

"کیا پتا، وہ لوگوں کی بھیڑ میں موجود ہوں۔"

"میں پہچانتا ہوں انہیں۔"

آصف علی نے کہا "تم کو کیا معلوم اس بار کون آیا ہوگا۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ آفریدی تمہارا ساتھ دے رہا ہے۔"

بات ایک دم میری سمجھ میں آگئی۔ اگر انہیں میرے اور آصف علی کے درمیان نئے تعلق کا پتا چل جاتا تو شاید آصف علی کا انجام بھی آفریدی سے مختلف نہ ہوتا۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہم آفریدی کی گاڑی میں بیٹھے نہیں تھے۔ یا پھر وہی بات تھی کہ شکاری ہمیں مسلسل خوف کے جال میں گرفتار رکھنا چاہتے تھے اور یہ احساس دلانا چاہتے تھے کہ ہم ہر جگہ، ہر وقت ان کی نگاہ میں ہیں اور آفریدی کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ ایک سبق تھا ہمارے لیے۔ ایک اور سبق آصف علی، اس کی نابینا بیوی اور معذور بیٹی کے محل کو ملبے کا ڈھیر بنا کے دیا جاسکتا تھا جس میں ان کی پرزہ پرزہ ہوجانے والی سوختہ لاشیں دفن ہوں۔

آصف علی کے واپس آنے تک میں سڑک سے کچھ ہٹ کے ایک درخت کی چھاؤں میں بینچ پر بیٹھا رہا۔ ادھر سے آنے والے ایک راہ گیر نے میرے خدشات کی تصدیق کردی۔

"بم کا دھماکا ہوا ہے۔" اس نے میرے سوال کے جواب میں بڑی دلچسپی کا مظاہرہ کیا اور میرے ساتھ بیٹھ گیا۔

"یہ کس کا گھر تھا؟" میں نے انجان بن کے پوچھا۔

"یہ گھر نہیں جی، سرکاری افسروں کا ڈاک بنگلا تھا۔ عیاشی کے لیے آتے ہیں اِدھر۔" اس نے رواں ہندکو میں بات کی۔

"اچھا۔ کیا بہت نقصان ہوا ہے؟"

"یہ سب برابر ہوگیا جی۔ دیکھو کیسا دھواں اٹھ رہا ہے۔ بڑی زبردست آگ تھی، اب تو قابو پالیا ہے فائر بریگیڈ والوں نے۔ ملبہ ہوگیا سب۔"

میں نے کہا "کوئی جانی نقصان تو نہیں ہوا۔"

"پتا نہیں جی۔ کوئی کہتا ہے جتنے اندر تھے۔ سب ختم ہوگئے ابھی لاش تو نہیں نکالی کسی کی، پر بچنا بڑا مشکل ہے کسی کا۔ اِدھر ساتھ والی کوٹھی میں میرا یار رہتا ہے۔ میں ادھر خانساماں ہوں۔ ہم دونوں ایبٹ آباد کے ہیں جی۔"

میں نے کہا "مگر تم ہندکو ایسے بولتے ہو جیسے پشاور کے رہنے والے ہو۔"

"وہ تو بندہ سیکھ ہی لیتا ہے جی۔ بارہ سال ہوگئے اِدھر۔ ہم اکٹھے آئے تھے گھر سے بھاگ کے۔ اس کے گھر کا بھی بڑا نقصان ہوا ہے۔ دیواریں جل گئی ہیں، کھڑکیوں کے سارے شیشے ٹوٹ گئے ہیں۔ اس نے مجھے بتایا ہے کہ رات کو چوکیدار نے ایک فیملی کو دیکھا تھا۔ ڈاک بنگلے کا چوکیدار اور ساتھ والی کوٹھی کا چوکیدار رات کو بیٹھ کے گپ لگاتے ہیں۔"

میں نے کہا "کس کی فیملی تھی؟"

"اللہ جانے۔ دو عورتیں تھیں بڑی فیشنی۔ ایک لڑکا تھا کوئی بارہ سال کا اور ایک مرد تھا۔"

"کیا خیال ہے تمہارے دوست کا، اس کارروائی کا مقصد کیا تھا؟"

"مقصد کیا جی۔ کوئی دشمن اپنا وار کرگیا۔"

"چوکیدار کا دشمن؟"

"لو جی، غریب آدمی کا بھلا کون دشمن ہوتا ہے۔ انہی کو مارنا چاہتا ہوگا کوئی جو وہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ایسے ہی آتے ہیں اِدھر سب۔ کوئی کسی عورت کو لے آیا۔ فساد کی جڑ ہے جی عورت۔ بندے کی مت ماردیتی ہے۔ اب جس کی بہن یا بیٹی ہو یا بیوی ہو، اس نے تو کچھ کرنا ہے ناجی۔ عاشقی ماشوقی کوئی کھیل ہے۔"

میں نے اس کی بات نظر انداز کردی "کتنے بجے ہوا دھماکا؟"

"صبح آٹھ بجے۔ ادھر پولیس والے بات کررہے تھے کہ ٹائم بم استعمال ہوا ہے۔ تم مجھ سے کیا پوچھ رہے ہو، جاکے دیکھو۔"

میں نے کہا "میں دور رہتا ہوں ایسی جگہ سے۔ پولیس کا کیا ہے، شک میں کسی کو بھی لے جائے۔ جان چھڑانی مشکل ہوجاتی ہے۔"

"یہ تو سچ ہے۔ یہ جو ادھر جمع ہیں نا، انہی میں سے آٹھ دس کو جاتے وقت ساتھ لے جائیں گے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ کچھ نہ کچھ کارکردگی کا مظاہرہ تو ضروری ہے۔"

"پیدا بھی ایسے ہی ہوتی ہے۔ بم کا کیس تو قتل سے بھی بڑا ہوتا ہے۔ ہزار پانچ سو میں جان نہیں چھوٹے گی۔"

میں نے حیرانی کا اظہار کیا "اچھا!"

"اور کیا۔ پانچ پانچ تو ضرور لیں گے۔ سیانا بندہ فوراً دے کر بھاگ جائے گا۔ بے وقوف پانچ سو چھتر کھا کے دے گا۔ ایک بار جی

میں گواہی میں پکڑا گیا۔ تھانے جا کے پتا چلا کہ میں تو مجرم ہوں۔ ناجائز اسلحہ برآمد ہوا ہے میرے پاس سے۔ لوجی میں نے غلطی کی شور مچا کے۔ میں نے کہا رپورٹ کروں گا سب کی ڈی آئی جی کو۔ ہائی کورٹ میں کیس کروں گا۔ بس جی اس کے بعد ایسا انصاف ہوا میرے ساتھ کہ توبہ۔ دو ہزار پر بات ختم ہو جاتی۔ منت سماجت اور خوشامد' واسطوں میں بائیس سو پر پہنچ گئی۔ حرامی کہتے تھے کہ دو سو چھتر ہم نے فالتو مارے۔ زیادہ محنت کرنی پڑی' وقت ضائع ہوا۔ اس کی قیمت دو۔ اور چھتر بھی مفت تو نہیں آتے۔ بندہ ڈھیٹ ہو تو اسپیشل بنوانا پڑتا ہے۔ مار زیادہ تو پیسے زیادہ۔ اللہ غرق کرے سب کو سمندر میں۔"

"آمین" میں نے کہا "گھر جا کے دو نفل پڑھنا کہ آج بچ گئے گواہی سے۔"

"تم کہاں کام کرتے ہو؟ نئے آئے ہو؟"

میں نے اشارے سے کام چلایا "ادھر آگے آصف علی کے گھر میں۔"

اس نے سرہلایا "پہلے تم کو دیکھا نہیں۔"

میں نے کہا "رات کو جو چوکیدار پھرتے ہیں یہاں' وہ کون ہیں؟"

"چوکیدار پھرتے تو کوئی نہیں۔ ہر کوٹھی کا اپنا چوکیدار ہے۔" اس نے کہا۔

میں سوچ میں پڑ گیا "وہ دو بندے کون ہیں؟ لمبی لمبی مونچھوں والے۔ بندوق اٹھا کے گشت کرتے ہیں یہاں۔"

اس نے نفی میں سرہلایا "پتا نہیں۔ ایسے ہی کوئی گزر رہا ہوگا۔ علاقے میں گشت تو کوئی نہیں کرتا۔"

"تمہیں کیا پتا ہے؟"

"لو ہر بات کی خبر ہے ہمیں۔ اتنا عرصہ ہو گیا ہے۔ تم نئے لگے تو تمہیں فٹ پہچان لیا۔" وہ بولا "چوکیدار کے لیے کوئی انتظام کریں گے تو سب کوٹھیوں والے مل کے ہی کریں گے نا۔ انہیں کیا ضرورت ہے اس کی۔ سب کے اپنے اپنے چوکیدار ہیں۔"

وہ رخصت ہوا ہی چاہتا تھا کہ آصف علی لوٹ آیا۔

"چلو' جلدی سے چلو۔" اس نے مجھے ہاتھ پکڑ کے کھینچا۔

میں نے کہا "آخر ہوا کیا؟"

"بس میاں اللہ نے جان بچالی آج تمہاری ورنہ دشمنوں نے تو کسر نہیں چھوڑی تھی۔ توبہ توبہ!" وہ سخت خائف اور نروس تھا "ریسٹ ہاؤس کا تو نام و نشان مٹ گیا۔ ایک ڈھیر رہ گیا ہے جلی ہوئی چیزوں کا اور ملبے کا۔ اس میں تمہاری گاڑی کا ڈھانچہ بھی شامل ہے۔ میں نے زیادہ تفتیش نہیں کی کہ پتا نہیں کسے شک ہو جائے۔ پولیس اور فائر بریگیڈ والے کسی کو بھی قریب نہیں جانے دے رہے ہیں۔ سادہ کپڑوں میں خفیہ پولیس والے بھی ہیں۔"

"اس کو کہتے ہیں قسمت۔" میں نے کہا "رات کو ہم بہت دیر تک جاگتے رہے تھے۔ رابعہ اور میں تو صبح سوئے ہوئے تھے۔ شاید تین بجے تھے اس وقت۔ آپ نہ آتے تو ہم سوتے ہی رہ جاتے' دھماکا بھی نہ سنتے۔ معلوم ہوتا' دوسری دنیا میں پہنچ چکے ہیں۔"

"کوئی کہہ رہا تھا ٹائم بم تھا۔ ساڑھے سات بجے کا وقت سیٹ کیا گیا تھا۔" آصف علی نے پیچھے مڑ کے دیکھا۔

"ہم نو بجے تک یقیناً سوتے۔" میں نے کہا "آپ ناشتے کے لیے زبردستی کھینچ کر لے گئے ورنہ ہم آپ کو بٹھالیتے تو آپ بھی جاتے ہمارے ساتھ۔"

"بس کبیر میاں! وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے لیکن تم ہو واقعی بہت بے پروا۔"

میں نے کہا "ہمارا کیا قصور تھا اس میں؟"

"بھئی جب تمہیں معلوم ہے کہ تمہاری جان کے دشمن پیچھے لگے ہوئے ہیں تو تمہیں بھی محتاط رہنا چاہیے۔"

"محتاط رہ کے ہم کیا کرتے؟"

"بھئی نظر رکھتے آنے جانے والوں پر۔ آخر کسی نے تو ٹائم بم فٹ کیا ہوگا۔ وہ کون تھا' کب آیا اور کیسے ٹائم بم رکھ گیا اور کہاں؟ ظاہر ہے' سامنے تو نہیں رکھ کر گیا ہوگا۔"

میں نے کہا "ہم کچھ بے فکر ضرور ہو گئے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ آفریدی کو مارنے کے بعد وہ مطمئن ہو کے چلے گئے ہوں گے کہ ساتھ ہی ہمارا بھی کام تمام ہوا۔"

"لیکن ایسا نہیں تھا۔ انہوں نے پتا چلالیا کہ تم بچ گئے تھے۔"

میں نے کہا "اس کا مطلب کیا یہ نہیں کہ وہ پھر معلوم کرلیں گے؟"

اس نے متفکر ہو کے کہا "تفتیش کے نتیجے میں یہ بات تو آہی جائے گی سامنے کہ ہلاک ہونے والوں کی تعداد کیا تھی۔ کوئی یہ بھی کہہ رہا تھا کہ ایک نہیں' دو بم نصب کیے گئے تھے۔"

میں نے کہا "دو کیا' وہ چار بم رکھ جاتے۔ اگر وقت پورا نہیں ہوا ہے تو ہم ایسے ہی بچتے رہیں گے۔"

"تم مطلب نہیں سمجھے میری بات کا۔ اس کام میں وقت تو لگا ہوگا۔" آصف علی بولا "دستی بم کی بات اور ہوتی ہے۔ کوئی بھی پھینک کے نکل جائے۔"

میں نے کہا "مجھے ابھی ابھی ایک بات کا پتا چلا ہے۔ صبح تین بجے دو افراد نے دستک دے کر ہمیں بتایا تھا کہ گاڑی کی ٹیل لائٹس جل رہی ہیں' بیٹری ڈاؤن ہو جائے گی۔ لائٹس واقعی جل رہی تھیں۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور لائٹس آف کر کے اندر چلا گیا۔ انہوں نے بتایا تھا کہ وہ رات کے گشت پر مامور چوکیدار ہیں۔ ان کے کپڑے بھی ایسے ہی تھے۔ چوکیداروں جیسے۔ اسلحہ بھی تھا ان کے پاس۔ اندر کمرے میں لائٹ جلتی دیکھ کے انہوں نے ہمیں مطلع کرنا بہتر سمجھا۔ اب مجھے شک ہوتا ہے کہ یہ انہی کی کارروائی ہوگی۔ اس علاقے میں تو رات کے وقت چوکیدار گشت

کرتے۔ ہر گھر کا اپنا چوکیدار ہے۔"

"یہ تو بالکل ٹھیک ہے۔ یونیورسٹی ٹاؤن میں ابھی بہت کم مکان ہیں' اس لیے سب نے اپنی اپنی حفاظت کا خود بندوبست کر رکھا ہے۔" آصف علی بولا "تم پہچان سکتے ہو انہیں؟ اگر وہ پھر سامنے آئیں۔"

"وہ پھر کیوں سامنے آئیں گے؟" میں نے ہنس کے کہا "سامنے تو ان میں سے کوئی بھی نہیں آتا۔"

"ذہن پر زور دو۔ کیا پہلے کبھی ان کو دیکھا تھا تم نے؟"

"بہت زور دے چکا میں' مجھے کچھ یاد نہیں پڑتا۔ ان کے لیے بالکل اجنبی تھے۔" میں نے کہا "غالباً ان کی خدمات حاصل کی گئی تھیں اور وہ اپنے کام کے ماہر تھے۔"

"ہوشیار لوگ تھے۔" آصف علی بولا "پہلے خیر خواہ بن کے یہ معلوم کیا کہ تم جاگ رہے ہو یا سو رہے ہو اور اندر موجود ہو یا نہیں ہو۔ وہ تمہاری صورتیں دیکھنے کے بعد اطمینان سے اپنا کام کر گئے۔"

"بالکل ٹھیک نتیجہ اخذ کیا آپ نے۔ لائٹس خود انہوں نے ہی جلائی ہوں گی۔" میں نے کہا "حیرت کی بات ہے کہ یہ خیال مجھے اس وقت نہیں آیا کہ ٹیل لائٹس جلتی ہیں تو سامنے کی پارکنگ لائٹس بھی جلتی ہیں اور گاڑی ایسے رُخ پر کھڑی تھی کہ ہم پیچھے کی لائٹس تو خیر نہیں دیکھ سکتے تھے مگر ہیڈ لائٹس کے نیچے پارکنگ لائٹس تو ہمارے سامنے تھیں اور وہ آف تھیں۔"

"کب آف تھیں؟"

"جب میں رابعہ کے ساتھ باہر ٹہل رہا تھا۔ یہ ناممکن ہے کہ رابعہ کی نظر بھی نہ پڑتی اور میں بھی نہ دیکھتا کہ سامنے کی چھوٹی لائٹس آن ہیں۔ پھر کچھ دیر کاجل بھی بیٹھی رہی تھی۔" میں نے کہا۔

"لیکن اس وقت جب چوکیداروں نے بتایا تو آگے پیچھے کی لائٹس جل رہی تھیں؟" آصف علی بولا۔

"ہاں۔ اور اس میں شک کی کوئی گنجائش ہی نہیں کہ لائٹس خود انہوں نے کار کا دروازہ کھول کے جلائی تھیں۔ لاک عام طور پر پرانے ہو جانے کے بعد گھِسی ہوئی ہر چابی سے کھُل جاتے ہیں۔ افسوس! میری عقل میں اس وقت یہ بات نہیں آئی ورنہ میں...."

"ورنہ تم کیا کرتے؟ انہیں پکڑ لیتے؟ کس جرم میں؟ وہ کہتے کہ صاحب ہم نے غلطی کی ہے تو آپ جلنے دیں لائٹس۔"

میں نے کہا "بالکل ٹھیک۔ اس وقت ان کی نیکی اور فرض شناسی کے احساس نے مجھے ایسا متاثر کیا کہ میں تو انعام دے رہا تھا انہیں۔ انکار کر کے انہوں نے مجھے مزید متاثر کیا۔"

"اور ان کے جانے کے بعد تم کتنی دیر تک جاگتے رہے تھے؟"

"ہم فوراً سو گئے تھے۔" میں نے کہا "رابعہ لیٹ گئی تھی کاجل کے ساتھ اور میں صوفے پر تھا۔ مجھے فوراً نیند نہیں آئی تھی مگر رابعہ نے اصرار کر کے لائٹ آف کرادی۔ میں اندھیرے میں کچھ دیر آنکھیں کھولے پڑا رہا۔"

"اور وہ خاموشی سے اپنا کام کرتے رہے۔"

"وہ ان کے لیے بہترین موقع تھا۔" میں نے کہا "کسی کا ڈر نہیں تھا انہیں۔ وقت بھی کافی تھا۔"

رابعہ تو میری صورت دیکھتے ہی سمجھ گئی تھی کہ کوئی بات ہوئی ہے۔ کاجل نے مجھے خالی ہاتھ دیکھ کے پوچھا "سامان نہیں لائے؟"

میں نے کہا "سامان! کیسا سامان؟ کفن باندھے ہوئے چلنے کو یہاں تیار بیٹھے ہیں۔"

کاجل نے کہا "کیسی باتیں کرتے ہو؟"

میں نے کہا "یہی دنیا ہے کاجل۔ آج یہ ہماری نظروں کے سامنے ہے مگر او جھل ہونے میں کتنی دیر لگتی ہے۔ یہ ہو سکتا تھا کہ کل ہم تھے لیکن آج نہ ہوتے اور آنے والے کل کا کیا بھروسہ۔"

رابعہ نے کہا "یہ فلسفہ بولنے کا وقت ہے!"

کاجل نے کہا "سیدھی طرح بتاؤ کیا ہوا ہے۔"

"وہی جو کل صبح ہوا تھا۔ دھماکا۔" میں نے کہا۔

"دھماکا! کہاں؟" رابعہ اور کاجل نے ایک ساتھ کہا۔

"وہیں جہاں کل ہوا تھا۔ گاڑی میں۔"

"کس کی گاڑی میں؟" کاجل بولی۔

"آفریدی کی گاڑی میں؟" رابعہ کے منہ سے نکل گیا۔

میں نے کہا "افسوس! تمہارا آئی کیو گرتا جا رہا ہے۔ حماقت کی روایات کے شاندار ریکارڈ قائم کر رہی ہو تم۔ آفریدی کی گاڑی میں کیا رہا تھا کہ اس میں پھر دھماکا کیا جاتا۔"

رابعہ کا رنگ اڑ گیا "تو کیا وقار یوسف کی گاڑی......"

"مرحومہ کی یاد میں ایک دن کے سرکاری سوگ کا اعلان کیا جاتا ہے۔ آج میں بالکل نہیں مسکراؤں گا۔ تمہاری طرف دیکھ کے بھی نہیں۔" میں نے کہا۔

"بھئی کمال ہے! اتنی غیر سنجیدگی سے بات کر رہے ہو تم جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔" آصف علی نے حیرانی سے کہا۔

میں نے کہا "ہم عادی ہیں آصف صاحب! موت سے آنکھ مچولی کھیلتے زمانہ ہو گیا۔ اب نہ خوف محسوس ہوتا ہے' نہ پریشانی ہوتی ہے۔ دُکھ البتہ ہوتا ہے بے گناہ مارے جانے والوں کا۔ ریسٹ ہاؤس بھی پھر بن جائے گا اور اسے بنانے میں کوئی ٹھیکیدار اور کوئی انجینئر بھی بن جائے گا مگر چوکیدار مفت میں مارا گیا۔ اسے کوئی کچھ نہیں دے گا۔ الزام شاید دے گا کہ اس کی کوتاہی کے سبب ایسا ہوا۔"

کلیم اللہ نے کچھ سمجھا تھا' کچھ نہیں سمجھا تھا "کیا ہوا دیدی؟"

کاجل نے اسے اپنے قریب کرلیا "کچھ نہیں بیٹا۔ تمہاری وجہ سے ہم بھی بچ گئے۔"

مجھے آفریدی کی بات یاد آئی۔ نہ کوئی کسی کی وجہ سے مارا جاتا ہے' نہ کسی کی وجہ سے بچ سکتا ہے۔ زندگی اور موت کے فیصلے تو خدا پہلے ہی کرچکا ہوتا ہے۔ عمل درآمد کا وقت آجائے تو یہ بھی لگتا ہے کہ بے گناہ مارا گیا اور جسے نشانہ بنایا گیا تھا وہ بچ گیا۔

"اب ہمیں یہاں ایک منٹ نہیں رُکنا چاہیے۔" میں نے کہا "ورنہ آصف علی! اگلا نشانہ تمہارا گھر ہوگا۔ ہم وہ ہدف ہیں جس پر چلائے جانے والے تیر سے ہم شکار نہیں ہوتے۔ آپ خود کو بچائیں۔"

"ایسے اناڑی ہیں شکاری..."

میں نے کہا "شکاری تو تقدیر ہے...."

"تقدیر سے بچ کے کوئی کہاں جاسکتا ہے؟" اس نے میری بات کاٹ دی "لیکن احتیاط اور اپنے دفاع سے غافل ہونا غلط ہے۔ ہم چلتے ہیں ایک گاڑی میں۔ میں' تم اور کلیم۔ عورتوں کو دوسری گاڑی میں یہاں سے دور اپنے ایک دوست کے گھر بھیجا جاسکتا ہے۔"

"کیوں؟ کیا ہم ساتھ نہیں جاسکتے؟" کاجل نے کہا۔

"ابھی میں وعدہ نہیں کرسکتا۔ عورتوں کا غیر علاقے میں جانا کچھ مناسب نہیں لگتا۔" آصف علی نے کہا "بہت سخت روایات کے پابند لوگ ہیں۔ عورت کا سایہ تک بے پردہ نظر نہیں آتا وہاں۔"

"ہم پردہ کرسکتے ہیں۔ میرے پاس برقع ہے۔ کاجل کے لیے کوئی بندوبست ہوسکتا ہے۔"

"بالکل ہوسکتا ہے مگر..." آصف علی سوچ میں پڑگیا "تماشا بن جاؤ گی تم لوگ۔ تمہیں سیدھا کسی حویلی کی چار دیواری میں پہنچا دیا جائے گا جہاں تمہارا ہم سے بھی کوئی رابطہ نہیں ہوگا۔ وہاں عورتیں ہوں گی جو تمہاری کوئی بات نہیں سمجھ پائیں گی اور ان کی بولی کا ایک لفظ تمہارے پلے نہیں پڑے گا۔ کوئی مترجم بھی نہیں ہوگا۔"

"بے وقوفوں کی طرح ایک دوسرے کی شکل دیکھتی رہو گی۔ جیسے کہ اس وقت دیکھ رہی ہو۔" میں نے کہا۔

"سارے فیصلے مرد کرتے ہیں۔ باہر ہی باہر کلیم اللہ کا معاملہ طے ہوجائے گا' تمہیں خبر بھی نہ ہوگی۔" آصف علی نے بتایا۔

"میں اس کی پھوپی سے ملنا چاہتی تھی۔" کاجل نے مایوسی سے کہا۔

"ابھی تم جاؤ ڈرائیور کے ساتھ۔" آصف علی نے کہا "اگر بات بن گئی تو ہم آجائیں گے تمہیں لینے کے لیے۔ پولیٹکل ایجنٹ سخت آدمی ہے۔ میں تو جاسکتا ہوں۔ میرے غیر علاقے میں تعلقات ہیں اور اپنے ساتھ میں کسی کو بھی لے جاؤں' عورتوں کو نہیں۔"

"کل بھی وہ انکار کرچکا ہے۔" میں نے کہا "وہ پھر کہے گا کہ جب کلیم اللہ کے عزیز آسکتے ہیں تو آپ لوگ کیوں بضد ہیں۔"

"یہ بات مجھ سے نہیں کہہ سکتا وہ۔ میں ذرا خانم کو سمجھادوں۔ اس سے میں کوئی بات نہیں کروں گا کہ کوئی خطرے کی بات ہے۔ وہ جلدی گھبرا جاتی ہے۔" آصف علی نے معذرت آمیز لہجے میں کہا "میرے دوست کا گھر نا صبر پور میں ہے۔ ہمارے اور خوبانی کے باغات ہیں اس کے۔ کبھی کبھی ہم ادھر بھی چلے جاتے ہیں۔ میں کہوں گا کہ انہیں سیر کرالاؤ۔"

صرف پندرہ منٹ کے بعد وہ سب ایک شاندار گاڑی میں کے روانہ ہوچکی تھیں۔ کاجل پہلے سخت دل گرفتہ اور مایوس تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس کا نروس بریک ڈاؤن ہوجائے۔ یہ خیال اسے ضرور آئے گا کہ شاید کلیم اللہ کو وہ پھر دیکھ سکے لیکن ذہنی طور پر اس نے خود کو تیار کر رکھا تھا۔ گزشتہ کا ہسٹریا ایک جذباتی پریشر والو کھلنے کا نتیجہ تھا۔ یہ پریشر اس کے دل میں نہ جانے کب سے پیدا ہورہا تھا۔ اعصابی دباؤ ختم ہوجانے کے بعد ہماری بات بھی اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔ کار میں بیٹھتے ہوئے اس نے جانتے بوجھتے کلیم کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ اس کا فائدہ ہوا کہ کلیم نے بھی خود کو سنبھال لیا (بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ کاجل روتے روتے بے ہوش ہوگئی تھی) کلیم بہت دیر تک دور جاتی گاڑی کو دیکھتا رہا۔

میں نے کہا "یار! تم بلاوجہ اُداس ہورہے ہو۔ ابھی تھوڑی دیر میں ہم سب چلیں گے۔"

وہ بڑی عجیب نظروں سے مجھے دیکھ کے مسکرایا۔ اس کی نگاہوں کا مفہوم بہت واضح تھا۔ خاموش رہنے کے باوجود اس نے کہہ دیا کہ انکل سکندر' میں اتنا چھوٹا بچہ تو نہیں کہ جھوٹ سے بہل جاؤں۔ میں سب سمجھتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے دیدی مجھے ہمیشہ کے لیے چھوڑ گئی۔ شاید اب ہم کبھی نہ ملیں گے مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہم اس کی اُمید تو رکھیں گے۔

ہم بھی نکلنے ہی والے تھے کہ آصف علی کا منہ بولا بیٹا آگیا۔ مجھے دیکھ کر اس کی صورت پر حیرانی اور ناگواری کے تاثرات نمایاں ہوگئے۔ اس نے ناپسندیدگی کے جذبات کو چھپانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ اس نے بادل ناخواستہ میرے سلام کا جواب دیا۔

آصف علی نے کہا "بھئی یہ عامر ہے' میرا بیٹا۔"

"آپ کا بیٹا؟" میں نے بھی عمداً حیرانی کا اظہار کیا۔

"اسے بیٹا بنالیا ہے میں نے۔" آصف علی نے کہا۔

"آج دُکان نہیں کھولی آپ نے۔" عامر نے مجھے نظرانداز کرتے ہوئے خاصے سخت لہجے میں کہا۔

میں نے کہا "یہاں بھی تم ایک بدتمیز سیلزمین کی طرح بات کررہے ہو حالانکہ یہ گھر ہے اور سامنے کوئی گاہک نہیں' تمہارا باپ ہے۔"

"باپ!" اس نے خاصے تلخ لہجے میں کہا "اگر ہے تو تمہیں کیا پریشانی لاحق ہوگئی۔ ہم تو روز اسی طرح بات کرتے ہیں۔"

"گویا عادی مجرم ہو۔ آصف صاحب نے مروت اور لحاظ میں رکھا ہے تمہیں۔" میں نے کہا۔

آصف علی نے فوراً مداخلت کی "عامر! آج تم دکان کھولو' مجھے ان کے ساتھ کام سے جانا ہے۔"

"کہاں جانا ہے؟" اس نے اکھڑ لہجے میں کہا۔

"ضروری نہیں کہ ہر بات تمہیں بتائی جائے۔" میں نے کہا۔

"میری طرف سے جہنم میں جاؤ۔" وہ بولا۔

اس کی بات مجھے بہت بری لگی۔ میں نے اسے ایک چھوٹا سا سبق سکھانا ضروری سمجھا "تم ساتھ نہیں چلو گے؟" میں نے ایک قدم آگے بڑھ کے اس کی گردن دبوچ لی۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا' میں نے اس کی کلائی کو بل دے کر اسے اپنے سامنے کرلیا اور گھٹنا اس کی کمر پہ یوں لگادیا کہ اس کا سانس رُکنے لگا۔

"چھوڑو مجھے' تمہاری تو...."

"کہو سوری ورنہ تمہیں میرے قدموں میں ناک سے لکیریں کھینچنی پڑیں گی۔" میں نے اسے ایک جھٹکا دیا۔

وہ کراہا "ایسا کوئی مائی کا لال پیدا نہیں ہوا۔"

"ہوچکا ہے بیٹے' بس آج تک تم اس سے ملے نہیں تھے۔" میں نے کہا اور اس کی گدی پر ہاتھ رکھ کے اسے ایک دم جھٹکا دیا۔ وہ گھٹنوں کے بل زمین پر گرا اور اس نے میری گرفت سے آزاد ہونے کی بہت کوشش کی مگر وہ ایک نوعمر' ناتجربہ کار لڑکا تھا۔ میری پیشہ ورانہ مہارت اور تجربے کا کیا مقابلہ کرتا۔ ایک اور جھٹکے نے اسے زمین بوس کردیا اور اس سے پہلے کہ اس کے بچاؤ کے لیے پر آصف علی کچھ کرتا' میں نے اس کی ناک کو زمین پر رگڑ دیا۔

میں نے اسے چھوڑا تو وہ تڑپ کر اُٹھا۔ اس کی ناک رگڑ سے ایسی لال ہوگئی تھی کہ لگتا تھا اس سے خون ٹپکنے والا ہے۔

"آپ کے گھر میں میری تذلیل ہورہی ہے اور آپ خاموش کھڑے دیکھ رہے ہیں!" اس نے چیخ کر آصف علی سے کہا۔

"اس کی ابتدا خود تم نے کی تھی۔" آصف علی نے برہمی سے کہا "تم کو خیال نہیں آیا کہ یہ میرے مہمان ہیں۔ میرے ہی گھر میں تم نے ان کو میرے سامنے بے عزت کیا۔ اب مجھ سے کیا توقع رکھتے ہو؟"

"توقعات آپ کو ہیں مجھ سے' یہ مت بھولیں۔"

"تم بھی اپنی اوقات کو مت بھولو۔ یہ سوچو کہ تم کیا تھے اور آج کیا ہو۔" آصف علی کی مجبوری اور محتاجی اب ختم ہوچکی تھی۔

"میں داماد ہوں اس گھر کا۔ بیٹا بنایا ہے آپ نے مجھے۔"

"لیکن میں تمہارا زرخرید باپ نہیں ہوں۔ اور نہ اس کا یہ مطلب ہے کہ میں نے اپنی عزت کو گروی رکھ دیا ہے۔" آصف علی نے دہاڑ کے کہا "عزت کرو گے نہیں تو عزت پاؤ گے بھی نہیں۔ سمجھے اور نہیں سمجھے تو ابھی وقت ہے۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔ جاؤ دکان کھول کے بیٹھو۔"

اس نے چابیاں عامر کی طرف پھینک دیں۔ عامر کو ابھی تک علم نہیں تھا کہ آصف علی نے مستقبل کے کتنے بڑے فیصلے تبدیل کردیے ہیں۔ کل میرے دُکان میں قدم رکھنے سے پہلے اس کی جو پوزیشن تھی وہ راتوں رات بدل گئی تھی۔

اس نے چابیاں اُٹھالیں اور مجھے خون آشام نظروں سے گھورتے ہوئے بولا "یہ آپ نے اچھا نہیں کیا۔ آپ بھی سمجھ لیں۔ میں بھی سمجھ لوں گا سب سے۔"

اس کے الفاظ میں دھمکی تھی "جا کے اپنی ناک کی فکر کرو' کہیں کٹ ہی نہ جائے۔ ابھی تو کسی نے بھی نہیں دیکھا تھا پھر سب دیکھیں گے۔ آصف علی میرے بزرگ ہیں۔ تم نے پھر ان کے ساتھ غلط لہجے میں بات کی تو پھر نتیجہ وہی نکلے گا جو میرے ساتھ بدتمیزی کا نکلا تھا۔ چلو روانہ ہوجاؤ۔"

میں نے چٹکی بجائی اور اس کی طرف بڑھا تو وہ دروازے کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ دروازے میں رُک کر اس نے دانت پیستے ہوئے زیرِ لب کچھ کہا۔ ظاہر ہے اس نے مجھے دعا نہیں دی تھی' گالیاں دی تھیں مگر میں نے مسکراتے ہوئے اسے ہاتھ سے ایسے اشارہ کیا جیسے لوگ منڈیر پر بیٹھے ہوئے کوے کو یا دروازے پر کھڑے کتے کو بھگانے کے لیے کرتے ہیں۔

"آج تو یہ حد سے بڑھ گیا۔" آصف علی بولا۔

"یہ بات نہیں آصف صاحب! احساس آج ہوا ہے آپ کو ورنہ آپ نے اس کی سرکشی اور گستاخی کو نظرانداز کرنے کا رویہ اختیار نہ کیا ہوتا تو اس کی اتنی جرأت نہیں ہوسکتی تھی۔ ممکن ہے آپ کو میرا جارحانہ انداز برا بھی لگا ہو۔"

"نہیں' بخدا نہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ تم نے اسے بہت صحیح وقت پر دوا کی پہلی خوراک دے دی' جب اس کی خودسری کا مرض میری عزتِ نفس کے لیے خطرہ بن گیا تھا۔ ممکن ہے اب وہ ٹھیک ہوجائے۔"

"ابھی نہ ہوا تو اگلے دو روز میں ہوجائے گا۔ یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔" میں نے کہا۔

"وہ کبیر میاں... بات یہ ہے کہ لاوارث لڑکا ہے۔ یتیم کے ساتھ زیادتی بھی گناہ ہے۔" آصف علی نے کہا "کل تک اس کا دماغ ساتویں آسمان پر تھا۔ اسے اچانک ذلت کے گڑھے میں پھینک دینا میرے لیے ناممکن ہے۔"

"آپ فکر نہ کریں' میری نہ اس سے ذاتی عداوت ہے نہ میں اس کے خلاف کسی قسم کی زیادتی ہونے دوں گا۔ آپ نے اسے بیٹا بنایا ہے تو یہ رشتہ قائم رکھیں مگر عزت آبرو کے ساتھ' مساوی احترام کی بنیادوں پر۔ عزت و احترام کی مساوات ایسے قائم نہیں ہوتی کہ باپ کبھی زیادتی کرجائے اور بیٹے کو تھپڑ ماردے تو جواب میں بیٹا بھی باپ کو مارے۔ نہیں' باپ کا اپنا مقام ہے' بیٹے کا اپنا اور یہ اِدھر سے اُدھر نہیں ہوسکتے۔ بیٹا کبھی باپ کی جگہ نہیں لے

سکتا۔ فرمانبرداری اور اطاعت بیٹے پر ہی فرض ہے' باپ پر نہیں۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو مگر وہ سمجھے تب...."

"میں سمجھادوں گا اسے بڑے آرام سے۔" میں نے کہا۔

"میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ تمہاری طرف سے اس کا دل صاف رہے۔ یہ نہ سمجھے وہ کہ تم نے مجھے ورغلایا اور اس کے خلاف کردیا چنانچہ میں نے اپنی جائداد تمہارے ٹرسٹ کو دے دی اور اسے دامادی کے عہدے سے ہٹادیا۔ میں نے قدرت کے مستقبل کی بہتری دیکھتے ہوئے یہ فیصلہ کیا ہے۔ اس فیصلے سے عامر کا مستقبل متاثر نہیں ہوگا۔ بیٹے کی حیثیت سے اس کے قانونی حقوق برقرار رہیں گے۔ آدھی دولت اور جائداد اگر ٹرسٹ کو ملے گی تو باقی میں اس کا حصہ قدرت کے ساتھ شرع کے مطابق ہوگا۔ دو حصے اس کے' ایک قدرت کا۔"

"میں آپ کی فراخدلی اور انصاف پسندی کی دل سے قدر کرتا ہوں اور آپ کے جذبات کو ٹھیس نہیں لگنے دوں گا۔ میری تو خواہش ہے کہ جب میں واپس جاؤں تو آپ کے اور عامر کے رشتے کی بنیاد زیادہ حقیقت پسندانہ سوچ پر استوار ہو۔ آپ کے درمیان حالات کی خلیج حائل نہ ہو اور آپ مستقبل کے لیے مفاہمت کریں تو ایک دوسرے کا سہارا بننے کی اُمید' خواہش اور کوشش کے ساتھ...."

"اللہ تمہیں جزا دے۔ میرے جیسے محسن کش کو تم نے معاف کیا' یہی بڑا احسان تھا تمہارا۔ پھر تم نے میری زندگی کے دکھ سمیٹ لیے' قدرت کی طرف سے مجھے سکون اور اطمینان دیا ورنہ میری روح مرتے دم بھی چین نہ پاتی۔"

میں نے کہا "آپ جذباتی ہو رہے ہیں۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔"

"وزیر خاں پر اللہ کا خاص کرم تھا۔ اس کو تم جیسا بیٹا دے کے خدا نے سب کچھ دے دیا اور مجھے اتنا کچھ دے کر بھی کچھ نہیں دیا۔ بیٹا نہ سہی' رابعہ جیسی بیٹی ہی دی ہوتی مجھے خدا نے تو میں دنیا میں بھی سُرخرو ہوتا۔ سر اُٹھا کے چلتا۔"

زندگی کے مسلسل آلام و مصائب نے اسے شدید جذباتی' زود رنج' ذکی الحس اور رقیق القلب بنادیا تھا۔ کوئی بات اس کے دل کو لگتی تھی تو آنسو خود اس کی آنکھوں میں اُتر آتے تھے اور اس کا ان آنسوؤں پر اختیار ختم ہوچکا تھا۔

روانگی سے پہلے مجھے خیال آیا کہ میں تازہ ترین واردات سے منظر کو باخبر کردوں مگر گھڑی میں وقت دیکھ کر میں نے اپنا ارادہ ملتوی کردیا۔ منظر اور وقار یوسف دونوں ہی اس وقت کورٹ میں تھے اور دوپہر دو بجے سے پہلے کسی کے گھر میں یا اپنے چیمبر میں ملنے کا امکان نہیں تھا اور بار روم کے نمبر پر ان سے کبھی بات نہیں کی جاسکتی تھی۔ بار میں دو فون تھے اور ان کثرت استعمال کرنے والے۔

وہاں کی لائن ملنا بھی اتنا ہی مشکل تھا جتنا پیڈرو جیسے بدبخت کو نیکی کی توفیق کا ملنا۔ پھر بھی ایک ٹیلی فون نمبر ایسا تھا جہاں سے سب معلومات حاصل ہوسکتی تھیں اور یہاں کی خبریں وہاں دینے میں کوئی حرج نہ تھا بلکہ فائدہ یہ تھا کہ اس طرح منظر کو اور وقار یوسف کو بھی یہ خبر جلد از جلد مل سکتی تھی۔ یہ وقار کے گھر کا نمبر تھا جہاں اس وقت صرف اس کی بیوی انجم باتیں کرنے کے لیے فارغ تھی۔

میں نے اس کا نمبر ملایا تو اس نے چلا کے کہا "ارے کم بخت لائن کٹ گئی تھی تو انتظار کرتی۔ اِدھر سے تو ملا رہی تھی' اُدھر سے میں...."

میں نے زنانہ آواز بنا کے کہا "کم بخت کسے کہہ رہی ہے کم بخت۔ میں کیوں ملاؤں گی تیرا نمبر۔"

وہ سمجھ گئی "یہ کون بدتمیز ہے؟"

میں نے ہنس کے کہا "آپ کا خادم۔ احقر و کمتر معتبر فقیر پُرتقصیر۔"

"کون؟" وہ بوکھلا کے بولی۔

"استاد کبیر خاں طبلہ نواز پٹیالہ والے عرف سکندر اعظم رابعہ قاری والے۔" میں نے کہا۔

"اف بھائی سکندر! آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ ابھی میں کچھ سُنا دیتی پھر۔" اس نے چلاّ کے کہا۔

"سنائیے سنائیے۔ میں ہمہ تن گوش ہوں۔ کیا سنا رہی ہیں اس وقت باگیشوری یا مالکوس تین تال میں۔" میں نے کہا۔

"سکندر بھائی! آخر کہاں ہیں آپ؟ نہ خیر نہ خبر۔"

میں نے کہا "ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی۔ کچھ ہماری خبر نہیں آتی۔"

"کہاں سے بول رہے ہیں؟"

"جہاں سے سب بولتے ہیں۔ منہ کے لاؤڈ اسپیکر سے۔ تم کیا کررہی ہو؟ کس محبت کی لائن کٹ گئی تھی۔ صاحب بہادر کہاں ہیں؟"

"وہ لڑ رہے ہوں گے عدالت میں کیس۔ گھر میں مجھ سے لڑتے ہیں۔ آپ لوگ بھی ساری دنیا سے لڑتے پھر رہے ہیں۔"

"بس ایک تم ہو امن پسند' صلح جو۔" میں نے کہا "فون اس لیے کیا کہ اس وقت تم ہی ایک خبر رساں ایجنسی ہو۔ کل رات منظر سے بات کررہا تھا تو اس کم بخت کی بھی لائن کٹ گئی۔ دوبارہ نہیں ملی۔ تمہیں کچھ معلوم ہے' لاہور میں کیا ہورہا ہے؟"

"لاہور میں؟ ہاں۔ ایک تو چراغاں کا میلہ ہورہا ہے اور آرٹس کونسل میں زبردست نمائش لگی ہے۔ نئی فلم لگی ہے دیدہ مراد کی۔"

میں نے کہا "لاحول ولا قوۃ۔ یہ سب خرافات ہیں بی بی۔ میں جرائم کی رپورٹ چاہتا ہوں۔ سُنا ہے اپنے گولا ٹنڈ والا فوت ہوگئے خیر سے۔"

وہ ہنسی "خود فوت کیا انہوں نے اپنے آپ کو۔"

"مگر کیوں؟ اور کیسے پتا چلا کہ اس نے خودکشی کی؟ اسے مرنا تھا تو ہمیں موقع دیتا۔ ہم قتل کردیتے۔"

انجم ہنستی بہت تھی "یہی وہ کہہ رہے تھے کہ سالا خواہ مخواہ ۔ے لٹک گیا۔ مجھے فون کردیتا' میں جا کے گولی مار دیتا۔ کچھ ۔ے دل کو بھی تسلی ہوتی کہ دشمن کو ختم کردیا اور اس کا بھی کام ۔جاتا۔ کل کو میں بھی کہہ سکتا کہ بڑے بڑے بدمعاشوں کو گولی مار ۔اہوں میں۔"

اب مجھے بھی ہنسی آئی "یہ قتل ہی ہوگا انجم' جسے خودکشی کا ۔ں بنادیا گیا ہے۔"

"کمال ہے! آپ تو بالکل اُنہی کی باتیں دہرا رہے ہیں۔ ۔انکہ گولا صاحب نے اس دنیا کو خیرباد کہنے سے پہلے ایک خط لکھا ۔م خود۔"

"میں نے تو سُنا ہے' وہ انگوٹھا ٹیک تھا۔"

"پولیس نے اسے گولا صاحب کا خط قرار دیا تھا۔ اس میں ۔وں نے صاف لکھا کہ چاندنی کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتے۔"

"حالانکہ یہ غلط ہے۔ آدمی اور پودے دھوپ کے بغیر زندہ ۔ں رہ سکتے۔" میں نے کہا۔

وہ بولی "اور سنیں! اس نے لکھا کہ غصے میں ان سے چاندنی کا ۔ن ہوگیا تھا۔ اس جرم پر وہ خود کو معاف نہیں کرسکتے۔"

"اور اتنا انتظار بھی نہیں کرسکتے کہ ان پر مقدمہ چلے پھر سزا اور پھانسی کی تاریخ مقرر ہو۔ وہ سرکار کو زحمت نہیں دے رہے ۔ے۔ عدالتوں پر پہلے ہی مقدمات کا کافی بوجھ ہے۔ اس لیے گولا ٹنڈ ۔لا اس دنیا سے اپنا بستر خود گول کرتا ہے۔ فقط والسلام......"

انجم کھلکھلا کے ہنسی "ایسی ہی باتیں تھیں۔ خط لکھ کے اس ۔نے کسی اخبار والے کو فون کیا کہ وقت پر آجائے کیونکہ پولیس تو ۔ت پر آئے گی نہیں۔ اطلاع اس نے تھانے کو بھی دی اور پھر ۔ت ہوگیا۔ اخبار والا پہلے پہنچ گیا اور سیدھا اندر گھس گیا۔ اس ۔نے تصویریں وغیرہ بنالیں اس خط کی اور لاش کی اور پھر معصوم ۔ورت بنا کے باہر کھڑا ہوگیا۔ پولیس آئی تو ان کے ساتھ اندر گیا۔ ۔پولیس کے ایک سب انسپکٹر نے اخبار والے کو بہت ڈانٹا کہ وہ ۔اردات سے پہلے کیسے پہنچ گیا۔ کہیں خبر بنانے کے لیے خود اس نے ۔قتل نہیں کیا۔ وہ ایک ڈھیٹ چیز تھا۔ کہنے لگا کہ ایسا ہی ہے تو تم ۔مجھے پھانسی چڑھا دو۔ دوسری خبر بن جائے گی۔"

"کون تھا وہ آخر؟"

"غالب کا کوئی دوست ہے پُرانا۔ اُسی اخبار میں۔ پولیس ۔والے اسے کتے کی دُم کہتے ہیں۔"

"یہ تمہیں کس نے بتایا؟"

"ہوں تو' وکیل کی بیوی ہوں۔ مجھے میرا میاں بتاتا ہے ساری ۔باتیں۔ آدھی وکیل ہوگئی ہوں۔"

"بلکہ نصف بہتر وکیل۔" میں نے کہا "آگے بولو اور کم بولو کیونکہ وقت کم ہے میرے پاس۔ مجھے بھی ایک خبر سُنانی ہے۔"

"اچھی خبر ہے کہ بُری؟"

"بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے تم بتاؤ پولیس نے کیا کیا۔ خودکشی کو قتل کا کیس بنانے کی کوشش کی؟"

"مانتی ہوں آپ کی اُستادی کو۔ انہوں نے چوہدری دلاور کو فون کیا۔ اب یہ مت پوچھنا کیوں؟"

"چلو تم خود ہی بتادو۔"

"ان کا باپ ہے نا وہ' اس لیے" انجم بولی "انسپکٹر کا کہنا تھا کہ انہیں گولا ٹنڈ والا نے نہیں چوہدری دلاور کے ایک ڈرائیور نے اطلاع دی تھی کہ چاندنی کے بعد کسی نے اس کے چاند کو بھی قتل کردیا ہے۔ اس کے سر پر تو پورا چاند ہی تھا۔" انجم ہنسی "اخبار والا سب سُنتا رہا اور جب انہوں نے چوہدری دلاور کے حکم پر خودکشی کے کیس کو قتل کا کیس بنانے کی کوشش کی...."

"تاکہ ہمارا نام اس میں آجائے؟"

"بالکل۔ انہوں نے خط غائب کرکے جیب میں ڈالا اور لاش اُتار کے نیچے رکھ دی تو اخبار والے نے انہیں مطلع کیا کہ وہ خود کو معطل سمجھے۔ چوہدری دلاور کا باپ بھی ان تصویروں کو نہیں جھٹلا سکتا جو وہ پہلے ہی اُتار چکا تھا اور نہ عدالت اس کی گواہی کو غلط قرار دے سکتی ہے۔ سُنا ہے کتے کی دُم کو سیدھا کرنے کی بہت کوشش کی پولیس نے بھی اور چوہدری دلاور نے بھی مگر اس نے خبر فراہم کردی سب کو اور کیمرا بھیج دیا اپنے آفس۔"

"مارا جائے گا کسی دن۔ ایسے لوگ زیادہ نہیں جیتے۔"

"مگر اس نے تمہیں تو بچالیا۔ چاندنی کے قتل کا الزام بھی ختم۔ اب تم اتنے ہی بے گناہ ہو جتنے منظر صاحب"

"منظر نے تو پندرہ گناہ کیے ہیں۔ پہلا شادی کا پھر چودہ بچوں کی پروڈکشن لائن کا۔" میں نے کہا "میرا اس کا کیا مقابلہ۔"

"اچھا اب آپ جلدی سے سُنائیں' کیا خبر ہے؟"

"شربتِ بنفشہ اور [illegible] ہے گھر میں تو قریب رکھ لو۔ ضرورت پڑسکتی ہے تمہیں۔ بُری خبر ہے۔"

"یا اللہ! کیا ہوگیا۔ جلدی بتائیں ورنہ میرا ہارٹ فیل ہوجائے گا۔" وہ گھبرا کے بولی "آپ لوگ خیریت سے ہیں نا؟"

"ہاں ہم تو ٹھیک ہیں مگر وہ...." میں نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔

"وہ کیا؟"

"تمہارے ابا کی گاڑی آج صبح دشمنوں کو پیاری ہوگئی ایک دھماکے میں۔ کچھ بھی نہیں بچا۔"

"اف! آپ نے مجھے اتنا ڈرا دیا تھا۔ بھاڑ میں جائے گاڑی۔ ویسے بھی انشورڈ تھی۔" انجم نے کہا "ذرا تفصیل سے بتائیں۔"

میں نے کہا "اختصارِ وقت کی ضرورت ہے۔"

میں نے کم سے کم الفاظ میں آفریدی کی ہلاکت اور پھر ریسٹ ہاؤس میں ہونے والے دھماکوں کے بارے میں بتادیا۔ درمیان میں اس نے باربار سوال کیے اور نتیجہ یہ کہ دو منٹ میں ختم ہونے والی بات دس منٹ میں پوری ہوئی۔

"اب ہم جارہے ہیں کلیم اللہ کو اس کے گھر چھوڑنے۔"

"رابعہ باجی اور کاجل کے ساتھ؟"

"نہیں۔ وہ کہیں اور گئی ہیں سیر کرنے۔" میں نے کہا "کسی کے گھر۔"

"وہاں فون ہے؟" اس نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

"پوچھ کے بتاتا ہوں۔" میں نے کہا اور آصف علی سے پوچھ کے اسے نمبر بتادیا "یہ ٹھیک ہے۔ اب تم لوگ سارا دن ایک دوسرے کے کان کھاؤ۔ بھلا تو ٹیلی فون والوں کا ہوگا۔ ہاں' ایک بات اور معلوم ہے تو بتادو۔ منظر نے مذاق کیا تھا شاید۔ یہ گل کا کیا قصہ ہے؟"

"آپ کو نہیں معلوم؟"

"معاف کرنا۔ کیا یہ سوال کچھ احمقانہ نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہوتا تو میں تم سے پوچھتا۔"

"یہ گل کون تھی' کسی ڈاکو شیش ناگ کی بہن؟"

"ہاں مگر یہ تو بہت پرانی بات ہے۔" میں نے کہا۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ شیش ناگ اگر سو سال انسانوں میں رہے تو کیا انسانیت سیکھ جائے گا؟" وہ طنز سے بولی۔

"کیا کہنا چاہتی ہو تم؟"

"یہی کہ ناگ منی کو تم سب کی صحبت گل بانو نہ بنا سکی۔ معلوم نہیں کیسے اتنے دن گزارے ہوں گے اس نے۔ آخر کار لوٹ گئی اپنی دنیا میں۔ فطرت سے مجبور ہوگئی۔"

"انجم! سوچ سمجھ کے بات کرو۔ تم نہیں جانتیں اسے۔"

"جو بات ساری دنیا جانتی ہے' وہ آپ نہیں جانتے جناب۔ اخبار والوں کو بھی جھوٹا کہو گے تم سب مل کے۔ اس لیے کہ تم سب کے یقین کو شکست ہوتی ہے حقیقت کو تسلیم کرنے سے....."

"اخبار میں کیا آیا ہے اور کب؟" میں نے ڈرتے دل سے کہا۔

"پرسوں کا اخبار مل جائے تو دیکھ لینا۔ پشاور کے کسی نیوز ایجنٹ یا اخبار کے دفتر سے نہ ملا تو لائبریری سے مل جائے گا۔"

مجھے صدمے سے زیادہ غصہ تھا "ٹھیک ہے' میں دیکھ لوں گا۔ تم وقار یوسف کو اور منظر کو یہ سب بتادینا' خدا حافظ۔"

وہ ہیلو ہیلو کررہی تھی کہ میں نے ریسیور کو دھڑ سے رکھا "دماغ خراب کردیا میرا۔"

"کیا ہوا' ایسی کیا بات ہوگئی؟"

میں نے کہا "لاہور کا ایک اخبار چاہیے مجھے۔ پرسوں کی تاریخ کا۔ کہاں مل سکتا ہے؟"

"صدر کے نیوز ایجنٹ سے مل جائے گا۔ اس کے پاس نہ ہوا تو وہ منگوا دے گا۔" آصف علی نے کہا۔

"بس تو پھر چلیں۔" میں نے کہا اور اپنے ذہن میں اٹھنے والے شکوک کے غبار میں ابھر آنے والے گل بانو کے معصوم چہرے سے نظریں چرانے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔

جب ہم گاڑی میں جارہے تھے تو گل بانو کا چہرہ ونڈ اسکرین پر آگیا۔ میں باہر دیکھنے لگا تو اس کا عکس پیکر خیال کی طرح ساتھ ساتھ پرواز کرنے لگا۔ اس کی آنکھیں سوالی تھیں۔ بھائی سکندر! کیا تم نے یہ بات مان لی۔ تم نے یقین کرلیا۔ فرض کرو' اخبار میں ایسا ہی نظر آیا تو کیا یہ سچ ہوجائے گا؟ کیا سچ وہ نہیں ہے جس کی گواہی تمہارا دل دیتا ہے۔ آخر میں وہی گل بانو ہوں جسے تم نے گل بانو بنایا تھا۔ کیا ایسے عارضی' مٹ جانے والے نقش تھے گل بانو کی شخصیت کے۔ تم سب ایسے اناڑی نقش گر تو نہ تھے۔ پھر انجم کا قہقہہ ایک بازگشت بن گیا۔ شیش ناگ اگر سو سال انسانوں میں رہے تو کیا انسانیت سیکھ جائے گا؟ ڈاکو شیش ناگ کی بہن ناگ منی تھی۔ کل بھی تھی' آج بھی ہے۔ درمیان میں کہیں گل بانو کا روپ دھار لیا تھا اس نے' کینچلی بدلی تھی۔ شیش ناگ سو سال بعد انسان کا روپ دھار لیتا ہے۔ سپیرے جانتے ہیں۔ شاید ناگ منی کو انسان بننا اچھا نہیں لگا تھا۔

"جھوٹ' بکواس۔ سپیرے جاہل ہوتے ہیں' بے وقوف بناتے ہیں۔" میں نے چلا کے کہا۔

آصف علی نے حیرانی سے میری طرف دیکھا "سپیروں کا کیا مسئلہ ہے؟ بڑے فراڈ کرتے ہیں مگر سب نہیں....."

میں نے خفت سے کہا "اس نیوز ایجنٹ کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اخبار کیوں چاہیے۔"

"مجھے معلوم ہوگا تو بتاؤں گا۔ تم نے تو کچھ بھی نہیں بتایا ہے۔" اس نے کار کو صدر کی ایک بغلی سڑک پر موڑ لیا اور ایک کتابوں کی دکان میں گھس گیا۔ اس کے باہر دنیا بھر کے اخبارات و رسائل آویزاں تھے۔

"اس وقت تو نہیں ہے' شام تک دستیاب ہوجائے گا۔" آصف علی نے واپس آکے کار میں بیٹھتے ہوئے کہا "ویسے کیا ہے اس اخبار میں؟"

میں نے کہا "ابھی خود مجھے نہیں معلوم تو آپ کو کیا بتاؤں۔"

"پھر بھی' کیا دیکھنا ہے اس میں؟"

"بعد میں بتاؤں گا تفصیل سے۔" میں نے کہا۔

پولیٹکل ایجنٹ نے مجھے دیکھتے ہی کہا "آپ؟"

میں نے کہا "جی میں۔ زندہ سلامت' جسم اور اپنی روح کے ساتھ۔"

اس نے بے یقینی سے پلکیں جھپکائیں "مجھے اطلاع ملی تھی....."

"اطلاع غلط تھی۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "ہم ریسٹ ہاؤس میں نہیں تھے۔"

"لیکن اس گاڑی کے ڈرائیور نے جو آپ کو چھوڑنے گئی تھی' یہ بتایا تھا کہ آپ سب وہیں ٹھہرے ہیں۔"

اب آصف علی بولا "شام تک یہ سب وہیں تھے پھر ان کو میں اپنے گھر لے گیا۔ یہ میرے ایک محسن اور دوست کے فرزند ہیں۔"

پولیٹکل ایجنٹ نے انٹرکام کا ایک بٹن دبایا "اس الو کے پٹھے ایس پی کو بلاؤ۔ غلط رپورٹ گھر بیٹھ کے سائن کردی۔ یہ تفتیش ہے ان کی۔ میں سب کو معطل کرادوں گا۔ اور دیکھو' میری بات آئی جی صاحب سے کراؤ۔"

میں نئی پریشانی میں مبتلا ہوگیا "کیا رپورٹ میں یہ لکھا ہے کہ ہم سب کی لاشیں برآمد ہوگئی ہیں؟"

اس نے اقرار میں سرہلایا "آخر کیسے ثابت کرے گا وہ کہ وہاں سے پانچ لاشیں نکلی ہیں۔ جلی ہوئی اور ناقابل شناخت حالت میں۔"

"اس کا مطلب ہے ہمیں عدالتی تحقیقات میں خود کو پیش کرنا پڑے گا؟" میں نے کہا۔

"ظاہر ہے۔ آپ لوگوں کو مردہ ظاہر کیا گیا ہے۔ عدالت آپ سب کو دیکھ کر ہی یقین کرے گی تاکہ یہ جھوٹ ہے اور غلط بیانی ہے۔"

میں نے کہا "کیا صرف میرا بیان کافی نہیں؟"

اس نے سوچ کے کہا "ٹھیک ہے۔ آپ بیانِ حلفی داخل کردیں کسی مجسٹریٹ سے تصدیق کرا کے۔ میں نے اس لڑکے کے وارثوں کو مطلع کردیا تھا۔"

"اب ہم خود جارہے ہیں۔" آصف علی نے کہا۔

"خواتین کے ساتھ؟" پولیٹکل ایجنٹ نے کہا "آئی ایم سوری۔ کل بھی میں نے وضاحت کردی تھی....."

"ہم سے مراد ہے ہم تین۔" آصف علی نے کہا "انہیں میں اپنی ذمے داری پر لے جارہا ہوں۔ سردار یوسف خان شنواری کے ڈیرے پر۔"

"ٹھیک ہے آصف صاحب۔ آپ کی بات اور ہے' آپ جاسکتے ہیں۔" پولیٹکل ایجنٹ نے کہا "واپسی پر بیانِ حلفی ضرور دے کر جائیں۔"

میں نے کہا "میں اپنی قانونی ذمے داری کو سمجھتا ہوں۔"

تاریخی درۂ خیبر سے گزرتے ہوئے میرے خیالات کا رخ وقتی طور پر بدل گیا۔ میں لالہ رخ اور ناگ منی کے الجھاؤ سے نکل آیا اور تاریخ کے دھارے میں شامل ہوگیا۔ ادھر سے آریہ آئے۔ سکندر اعظم تسخیرِ عالم کے لیے گزرا۔ محمود غزنوی نے ہندوستان پر حملے کیے۔ پھر مغل آئے اور چار سو سال مسلمانوں کے جاہ و جلال کی حکمرانی رہی۔ سب تاریخ کے صفحات میں نام رہ گئے۔ درۂ خیبر آج بھی وہیں ہے۔ اب نہ کوئی سکندر آتا ہے' نہ محمود غزنوی۔ تورخم بارڈر وہ لائن ہے جو پاکستان کو افغانستان سے جدا کرتی ہے اور علاقہ غیر ہے۔ غیور پٹھانوں کی سرزمین جن کو انگریز کی طاقت کبھی زیر نہ کرسکی کیونکہ ان میں نہ کوئی میر جعفر تھا' نہ صادق جیسا وطن فروش۔ جعفر از بنگال و صادق از دکن۔ ننگ دنیا ننگ دیں ننگ وطن۔ نہ جانے کون ستم ظریف شاعر تھا جس نے اس کو حالاتِ حاضرہ کے مطابق یوں کردیا۔

بھاوے از بنگال و گاندھی از دکن۔ ننگے پاؤں ننگے سر ننگے بدن۔

میں مسکرانے لگا اور آصف علی نے جو میرے موڈ کی خرابی کے باعث خاموش تھا' اطمینان کی سانس لی۔ ایک بار پھر میرا ذہن گل بانو کی طرف پلٹ گیا۔ وہ محسن سمیت کراچی سے غائب ہوگئی تھی۔ اس کو آرام شیخ کے پاس پہنچنا تھا مگر حالات اشارہ کرتے تھے کہ وہ شیش ناگ کے ٹھکانے پر پہنچ گئی جہاں شاید اس کے بچے کھچے ساتھی ملے ہوں گے اور انہوں نے پھر گل بانو کو ناگ منی بن جانے پر مجبور کردیا ہوگا۔ اس نے بھائی کی جگہ گروہ کی قیادت سنبھال لی ہوگی لیکن ایسا فرض کرنے سے میرا دماغ ماؤف ہونے لگتا تھا کیونکہ مجھے گل بانو پر اتنا ہی اعتماد تھا جتنا رابعہ پر۔ اس کی فطرت کی نیکی پر میرا یقین اتنا ہی مکمل ہوچکا تھا جتنا رابعہ پر پہلے سے تھا۔ وہ ایسا نہیں کرسکتی تھی اور وہ اکیلی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ محسن تھا۔ کیا محسن اسے اجازت دے سکتا تھا کہ وہ گل بانو سے دوبارہ ناگ منی بن جائے۔ یہ اتنا ہی بعید از قیاس تھا جتنا محسن کا شیش ناگ بن جانا۔ محسن کی خاطر وہ ناگ منی ہوتی تو گل بانو بن جاتی۔ پھر یہ کیا چکر ہے۔ کوئی شیطانی چکر ہے اس میں۔

تقریباً دو گھنٹے کے سفر میں زیادہ تفصیل کے ساتھ میں نے چوہدری دلاور کے ساتھ اپنے رشتۂ عداوت کی وضاحت کی۔ موجودہ حالات میں کچھ بھی چھپانا بے مقصد ہوتا۔ آصف علی اب ہمارے ساتھ تھا اور ہم نے اس کی پیشکش قبول کرلی تھی۔ وہ وسیع تر بنیادوں پر وزیر خاں ٹرسٹ اسپتال کی انتظامیہ میں شامل تھا۔ میں نے اس سے کچھ بھی نہیں چھپایا اور غیر ضروری تفصیل کو خارج کرتے ہوئے اس کا سب سے تعارف کرادیا تاکہ وہ سمجھ سکے کہ میں گل بانو کے بارے میں کیوں متفکر تھا۔

وہ خاموشی سے سنتا رہا اور ڈرائیونگ کرتا رہا "میں تم سے اتفاق کرسکتا ہوں۔ گل بانو پھر ناگ منی نہیں بن سکتی۔"

"لیکن منظر نے بھی اخبار کی خبر کا حوالہ دیا تھا۔"

"چلو اخبار بھی دیکھ لیں گے۔ یہ سازش بھی تو ہوسکتی ہے کسی کی۔ کوئی جھوٹی خبر لگوا سکتا ہے۔ یا ہوسکتا ہے یہ دوسری ناگ منی ہو جس کا گل بانو سے کوئی تعلق نہ ہو۔"

اس وضاحت نے مجھے تھوڑی دیر کے لیے مطمئن کیا مگر منظر نے تصویر کا بھی ذکر کیا تھا۔

"بھئی ابھی سے پریشان ہو کے کیا ملے گا۔ فرض کرو ایسا ہی ہے پھر؟ کیا کر سکتے ہو تم؟"

"یہ ناممکن ہے۔"

"اچھا ناممکن ہے پھر پریشان کیوں ہو؟" اس نے کہا۔

گاڑی ایک کچے راستے پر دھول اُڑاتی جا رہی تھی۔ دونوں جانب بلند پہاڑ تھے جن پر کہیں کہیں بلند فصیلوں والے گھر بھی نظر آنے لگے تھے۔

"یہ غیر علاقہ ہے؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ ہوشیار رہو۔ کوئی گولی کسی بھی سمت سے آسکتی ہے۔" آصف علی نے کہا۔

"کیا مطلب؟ ہم سے کچھ پوچھے بغیر کہ ہم دوست ہیں یا دشمن' کوئی ہمیں گولی مار دے گا؟" میں نے کہا۔

وہ ہنسنے لگا "یہ تو دشمن کو بھی خبردار کر کے گولی مارنے والے لوگ ہیں۔"

اچانک پہاڑوں میں ایک فائر گونجا۔ گولی کار کے بونٹ سے ٹکرائی تھی۔ آصف علی نے گاڑی فوراً روک لی اور اتر کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ میں نے اس کی تقلید کی اور پہاڑ کی ڈھلوان پر سے اُترنے والے چار افراد کو دیکھا۔ انہوں نے شلوار قمیص پر کوٹ پہن رکھے تھے۔ ان کے سروں پر اونی ٹوپیاں تھیں اور ہاتھوں میں رائفلیں۔ ان میں دو نسبتاً زیادہ عمر کے تھے اور ان کی داڑھیوں کے آدھے بال سفید ہو چکے تھے۔ تیسرے کی داڑھی کالی تھی اور چوتھا ایک نوعمر جوان تھا۔

قریب آ کے انہوں نے ایک آواز میں کہا "السلامُ علیکم۔"

ہم نے ایک آواز ہو کے جواب دیا۔ پھر آصف علی کے اور ان کے درمیان پشتو میں گفتگو شروع ہوئی۔ یہ ابتدائی تفتیش تھی۔ انہوں نے پہاڑ کی کسی چیک پوسٹ سے ایک اجنبی گاڑی کو آتا دیکھ کر فائر کیا تھا۔ یہ وارننگ شاٹ تھا جس کا مقصد ہمیں نقصان پہنچانا ہرگز نہ تھا۔ کچھ دیر بعد وہ ہاتھ ملا کے جدھر سے آئے تھے اُدھر ہی لوٹ گئے۔

"یہ صرف پوچھنے آئے تھے کہ ہم کون ہیں اور کہاں جا رہے ہیں۔"

میں نے کہا "عجیب طریقہ ہے۔ پہلے فائر کر دیا پھر پوچھ رہے ہیں کہ کون ہو۔ گولی ہمیں لگ جاتی تو جواب کون دیتا!"

آصف علی ہنسا "ان کا نشانہ ایسا نہیں ہوتا۔ فائر صرف ہمیں روکنے کے لیے کیا گیا تھا۔"

"اس سے ٹائر برسٹ بھی تو ہو سکتا تھا۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "گولی کا نشانہ بونٹ کو بنایا گیا تھا بلکہ بمپر کو۔ بمپر کے علاوہ گولی کہیں بھی نہیں لگی۔ ایک انچ کا فرق بھی بہت ہے۔ یہ پانچ پیسے کا سکہ ہوا میں اُچھال کے نشانے کی مشق کرتے ہیں اور مہارت کی سند تب ملتی ہے جب دس میں سے ایک بار بھی نشانہ خطا نہ ہو۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو ورنہ یہاں تو میرے قتل کا مقدمہ بھی درج نہیں ہو گا۔" میں نے کہا "اور میں ہوں ذرا دوسری قسم کا پٹھان۔ کاغذی پٹھان۔ میرے خاندان میں کون بدلہ لینے والا ہے۔"

"فکر نہیں کرو۔ اب ہمیں پروانۂ راہداری مل چکا ہے۔ آگے کوئی نہیں روکے گا۔" آصف علی بولا "ہم اس علاقے میں داخل ہو جانے کے بعد اجنبی نہیں رہے۔"

"یہ چار حضرات پاسپورٹ ویزا دیتے ہیں۔ زبانی۔ آگے کوئی پھر پوچھ لے تو؟"

"یہاں آنے کا ایک ہی راستہ ہے۔ اجنبی پہلی چیک پوسٹ پر ہی روک لیے جاتے ہیں اور جب تک کوئی انہیں شناخت کرنے والا نہ ہو وہ آگے نہیں جا سکتے۔"

"تمہیں پہچان لیا تھا انہوں نے۔ مجھے تو خیر کوئی نہیں جانتا۔"

"میں نے بتا دیا کہ مجھے کس کے پاس اور کہاں جانا ہے۔ وہ سارے نام اور حوالے درست تھے۔ تم سے انہیں کوئی غرض نہیں کیونکہ تم میرے ساتھ ہو۔"

"اب کتنی دور جانا ہے؟"

"بس پہنچ گئے سمجھو۔ آدھے گھنٹے میں یوسف خان شنواری کا ڈیرہ آ جائے گا۔" وہ بولا۔

بظاہر ویران نظر آنے والے ان پہاڑوں کے درمیان مختلف قبائل کی بستیاں تھیں۔ میں نے پہاڑوں پر چڑھتے اُترتے لوگوں کو دیکھا جو کندھوں پر بوریاں لادے یا سروں پر لکڑیاں اُٹھائے جا رہے تھے۔ جگہ جگہ مویشی چرانے والے بچے بے فکری سے گھوم رہے تھے۔ یہاں نہ سڑکیں تھیں اور نہ ذرائع آمد و رفت تھے۔ کہیں کہیں زمین ہموار کر کے چھوٹے چھوٹے کھیت کاشت کیے گئے تھے۔ بجلی کا نام شاید یہاں کے لوگوں نے ضرور سُنا ہو مگر بجلی صرف بڑے حصّوں اور شہروں تک محدود تھی۔ یہ لوگ اپنی اہم ضروریاتِ زندگی کے لئے انہی بستیوں کا رُخ کرتے تھے ورنہ مقامی دُکاندار عام ضرورت کی چیزیں رکھتے تھے۔ اسپتال' اسکول' تھانے وغیرہ کا یہاں کوئی تصور نہیں تھا۔ سب سے مشکل مسئلہ پانی کا حصول تھا جو بعض اوقات میلوں دور سے لانا پڑتا تھا اور یہ انتہائی مشقت طلب کام عورتیں سرانجام دیتی تھیں۔ یہاں میں ابتدائی دور کے انسان کی زندگی کی عملی تصویر دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ شہروں کے پُرآسائش ماحول کا پروردہ کلیم اللہ یہاں کیسے رہے گا مگر وہ پٹھان کا بچہ تھا۔ عزم و ہمت کا پیکر۔ جفاکشی' سخت جانی اور مشکل پسندی اس کی گھٹی میں پڑی تھی۔

یوسف خان شنواری کو نہ جانے کیسے پہلے سے خبر مل چکی تھی کہ اس کے مہمان آ رہے ہیں۔ ضرور ان کے درمیان رسل و رسائل کا کوئی ناقابلِ فہم طریقہ رائج تھا جس کی مدد سے پہلی چیک پوسٹ والوں نے یہ اطلاع آگے بھیج دی تھی۔

آصف علی اور یوسف خان دوست تھے۔ وہ بڑی گرمجوشی سے ملے پھر میری باری آئی۔ شنواری قبیلے کے سردار نے کئی بار مجھے خوش آمدید کہا اور پھر استقبالیہ کمیٹی کے ارکان سے ملوایا جو سب اس کے بھائی' چچا' تایا وغیرہ تھے۔ ان سب کے کندھوں پر رائفلیں لٹکی ہوئی تھیں۔ میں اور آصف علی تہی دست تھے جو ہمارے مہمان ہونے کی نشانی تھی۔ آصف علی نے مختصراً کلیم اللہ کا تعارف کرایا۔

ایک دم سب سنجیدہ ہو گئے۔ ان کی نظریں کلیم اللہ پر مرکوز ہو گئیں۔ پھر یوسف خان آگے بڑھا اور اس نے کلیم اللہ کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ اس نے کلیم اللہ سے کچھ پوچھا اور کلیم اللہ نے ہر سوال کا جواب اعتماد سے دیا۔ چند سوالات کے بعد ان کے شکوک رفع ہو گئے کیونکہ وہ سب مسکرانے لگے اور انہوں نے باری باری اسے گلے سے لگا کے چوما۔

پھر یوسف خان کی قیادت میں یہ قافلہ ایک بلند فصیل والی عمارت میں داخل ہوا۔ ہمیں ایک بہت بڑے کمرے میں ٹھہرایا گیا جس کی دیواریں انہی پہاڑوں کے پتھروں کو چُن کے کھڑی کی گئی تھیں اور چھت میں درختوں کے تنے شہتیر کی جگہ استعمال ہوئے تھے۔

یہاں لوگ دو وقت کھانا کھاتے تھے۔ صبح سورج نکلنے کے بعد اور شام کو سورج غروب ہونے کے فوراً بعد لیکن ہمارے لیے کھانے کا خصوصی اہتمام کیا گیا۔

یوسف خان نے کہا "قبیلے کی طرف سے رات کو دعوت ہو گی۔"

میں نے کہا "کیا یہ دعوت نہیں ہے؟"

وہ ہنسنے لگا "ہماری میزبانی کی کچھ روایات ہیں۔ تم شاید ان سے واقف نہیں۔ ابھی گھر میں جو کچھ تھا وہی رکھا ہے۔ تم صرف میرے نہیں' پورے قبیلے کے مہمان ہو۔"

میں نے کہا "آصف صاحب! کیا ہم رات سے پہلے واپس پشاور نہیں جا سکتے۔"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہاں آنا اپنی مرضی سے ہوتا ہے' اب جانا ان کی مرضی سے ہو گا۔" آصف علی بولا۔

یوسف شنواری نے خوش دلی سے کہا "مہمان زیادہ عزیز ہو تو ہم اس کو ہمیشہ کے لیے رکھ لیتے ہیں۔"

"زبردستی؟" میں نے کہا۔

"محبت سے۔ مزار شریف بنا کے۔" وہ بولا اور قہقہہ مار کے ہنسا۔

کلیم اللہ اپنے خاندان کے بزرگوں سے متعارف ہو رہا تھا اور غالباً زنانہ حصے میں خالہ' چچی' پھوپی قسم کی خواتین میں تبرک بن گیا تھا۔ غالباً وہ اس سے ساری باتیں پوچھ رہی ہوں گی جن کا تعلق اس کے والدین سے تھا۔ ممکن ہے اس کی پیدائش سے پہلے کے واقعات سُن رہی ہوں۔ یہاں اس کی حیثیت وہی تھی جو کبھی گاؤں میں ولایت پلٹ نوجوان کی ہوتی تھی۔

رات کو واقعی خالص پٹھانوں کی روایات کے مطابق دعوت کا اہتمام تھا۔ دنبے ذبح کر کے ان کا گوشت چاولوں کے ساتھ کھال میں بھر دیا گیا اور کھال کو سی کر زمین میں دبا دیا گیا۔ پھر اوپر آگ روشن کی گئی اور نہ جانے کیسے پلاؤ کو ٹھیک وقت پر نکال لیا گیا جب چاول بھی گل چکے تھے اور گوشت بھی کچا نہیں رہا تھا۔ اس میں روغن کی جگہ دنبے کی چربی استعمال ہوئی تھی اور مسالے میں صرف نمک تھا مگر اس کا ذائقہ بہت منفرد تھا۔ شرمندگی مجھے اس وقت ہوئی جب میں اپنے میزبانوں کی خواہش کے مطابق ایک سالم دنبہ نہ کھا سکا۔ میری خوراک ان کے نقطۂ نظر سے افسوسناک حد تک کم تھی۔

"یوسف خان! ہم شہری لوگ اتنا ہی کھاتے ہیں۔ کھایا پیا نہیں۔ جو نہیں کھایا وہ معاف کر دو۔" میں نے کہا "کہیں ایسا تو نہیں کہ پورا دنبہ نہ کھا کے میں نے تمہاری روایات کی توہین کی ہو؟"

یوسف خان نے سنجیدہ ہو کے کہا "یہ توہین نہیں تو اور کیا ہے۔ جتنا تمہارے سامنے رکھا گیا تھا وہ تو تمہیں کھانا ہی پڑے گا۔"

"ورنہ..... ورنہ کیا ہو گا؟"

"ورنہ یہ میزبان کی بے عزتی تصور کی جائے گی کہ اس کے مہمان کو کھانا پسند نہیں آیا۔ یہاں کسی کو ذلیل کرنا مقصود ہو تو مہمان ایک نوالہ کھا کے ہاتھ کھینچ لیتا ہے۔" یوسف خان شنواری نے اپنی رائفل کندھے سے اُتاری "تم ایسا نہیں کر سکتے۔"

اس کے ساتھ ہی درجن بھر رائفلیں شانوں سے ہاتھوں میں آ گئیں۔

آصف علی نے مجھے ٹھوکا دیا "کھا دَ یار....."

میں نے کہا "آصف علی! ان سے کہو مجھے ہیضے اور بدہضمی سے مرنا منظور نہیں۔ شہید کر کے مزار شریف بنا لیں میرا۔"

ایک ساتھ کئی قہقہے بلند ہوئے۔ یہ ایک لطیفہ تھا۔ میرے ساتھ مذاق کیا گیا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا مگر میں نے بھی اس کو کامیاب بنانے کے لیے خوف اور دہشت کی بھرپور اداکاری کی۔

یوسف خان شنواری ٹوٹی پھوٹی سے بہتر اردو بول سکتا تھا۔ اس کے مشیر بات آسانی سے سمجھ لیتے تھے مگر اردو میں اپنا مافی الضمیر بیان کرنا انہیں دشوار ہوتا تھا۔ اس کے لیے وہ اپنے سردار کی طرف دیکھتے تھے جو یہاں ایک زبان داں کی حیثیت رکھتا تھا کیونکہ وہ لنگڑی لولی انگریزی پر بھی قادر تھا۔ زبان کو صرف وسیلۂ اظہار سمجھنے والے گرامر کو بہرحال ثانوی حیثیت دیتے ہیں۔

میرا خیال تھا کہ ڈنر کے بعد محفل برخواست ہو جائے گی اور کوئی تصفیہ طلب معاملہ جب ہے ہی نہیں تو کلیم اللہ اپنے

آباواجداد کے جانشینوں میں پہنچ گیا۔ ہم اپنا بارِ امانت اُتار کے سبکدوش ہوئے، فہوا لمطلوب۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔

یوسف خان نے کھانے کے بعد مہمانوں کو قہوہ پیش کیا، یعنی سبز چائے جس میں الائچی اور دارچینی کی خوشبو تھی۔ پھر کچھ نوجوان آگئے جنہوں نے سفید شلوار قمیص پر کالے مخمل کی واسکٹ پہن رکھی تھی۔ واسکٹ پر سنہرے تاروں کا اور شیشوں کا کام تھا۔ انہوں نے ہاتھوں میں بڑی آب و تاب رکھنے والی تلواریں اُٹھا رکھی تھیں جن کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ اصلی ہیں یا نقلی۔ یہ سوال کرکے میں نکو بننا نہیں چاہتا تھا چنانچہ میں خاموشی سے خٹک ڈانس دیکھتا رہا جو رقص اور فن حرب کی متوازن حرکات و سکنات کا خوب صورت امتزاج تھا اور جنگجو پٹھانوں کی صدیوں پرانی تہذیب وثقافت کی بھرپور عکاسی کرتا تھا۔ وہ صرف ایک ڈھول کی لے پر ناچ رہے تھے جس کی آواز کی گونج پہاڑوں میں سنائی دیتی تھی۔ چاروں طرف لگی ہوئی مشعلوں کی روشنی میں تلواریں بجلی کی طرح لہراتی محسوس ہوتی تھیں اور شعلوں کا عکس رقص کرنے والوں کی واسکٹ کے شیشوں میں جھلملاتا تھا۔ ان کے تیزی سے متحرک سائے سمٹتے پھیلتے تھے اور آپس میں گڈمڈ ہوجاتے تھے۔

میں رقص دیکھنے میں اتنا محو تھا کہ مجھے اپنے میزبان کی عدم موجودگی کا پتا ہی نہیں چلا۔ وہ نہ جانے کب اپنے مشیروں کی کابینہ کے ساتھ اٹھ گیا تھا۔ میں نے اچانک دیکھا تو آصف علی کے ساتھ اس کی جگہ خالی تھا۔

"یوسف کہاں گیا؟" میں نے ادھر ادھر دیکھا۔

"اندر جرگہ ہورہا ہے قبیلے کا۔"

"اچانک کیا مسئلہ آگیا؟" میں نے کہا۔

"مسئلہ ہمارے ساتھ ہی آیا تھا۔ کلیم اللہ۔"

"اس کا کیا مسئلہ ہے؟" میں نے کہا۔

"ابھی تو مجھے بھی نہیں معلوم لیکن کوئی خاندانی مسئلہ ہے۔"

میں نے کہا "کیا اس کی پھوپی اسے قبول کرنے پر تیار نہیں؟ یا کوئی زمین کی ملکیت کا جھگڑا ہے؟"

"کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ بعد میں معلوم ہوگا۔"

"بعد میں کب؟" میں پریشان ہوگیا۔

"جب جرگہ کسی فیصلے پر پہنچ جائے گا۔" آصف علی نے مجھ سے نظر ملائے بغیر کہا "تم ڈانس دیکھو۔"

"اب میری کوئی دلچسپی نہیں رہی رقص میں۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ تم کچھ چھپا رہے ہو۔" میں نے کہا۔

اس نے کہا "مجھے کیا ضرورت ہے تم سے کچھ چھپانے کی۔"

"کیا ہم جرگے کی کارروائی میں شریک نہیں ہوسکتے؟"

"نہیں۔ یہ خاندانی معاملہ ہے ان کا۔"

میں نے کہا "ہم بطور گواہ تو پیش ہوسکتے ہیں۔"

"نہیں ضرورت محسوس ہوگی گواہی کی تو ہم سے پوچھ لیں گے۔ اور اس معاملے میں ہم کیا گواہی دیں گے جس کے بارے میں کچھ جانتے ہی نہیں۔"

میں نے کہا "کون سا معاملہ آصف علی! تم جانتے ہو تو مجھے کیوں نہیں بتادیتے؟"

"اچھا بتادوں گا۔ یہاں سب کے بیچ میں بیٹھ کے یہ باتیں کرنا اچھا نہیں لگتا۔ یہ دیکھ رہے ہیں کہ ہم رقص نہیں دیکھ رہے ہیں۔"

"دیکھنے دو۔ اندر چل کے یا الگ کہیں جا کے مجھے بتاؤ کہ معاملہ کیا ہے۔" میں نے کہا۔

اسی وقت رقص ختم ہوگیا اور لوگ اٹھ اٹھ کے ہم سے مصافحہ کرنے لگے اور شب بخیر کہہ کر رخصت ہونے لگے۔ یہاں مہمان کو حقیقی معنوں میں اللہ کی رحمت سمجھ کے وہ عزت دی جاتی ہے کہ سر آنکھوں پر بٹھانے کا محاورہ درست نظر آنے لگتا ہے۔ ایک ایک کرکے سب چلے گئے تو ایک شخص نے ہمیں مطلع کیا کہ ہمارے سونے کا انتظام کردیا گیا ہے۔ آصف علی نے مجھے اشارہ کیا کہ میں اس کے سامنے کوئی بات نہ کروں۔ اس نے بعد میں بتایا کہ وہ سردار کا مخبر تھا۔

میرے اور آصف علی کے لیے ایک ہی کمرے میں دو چارپائیاں ڈال دی گئی تھیں۔ میدانی علاقے کے مقابلے میں یہاں ابھی سردی کی شدت میں کمی نہیں آئی تھی چنانچہ ہمیں اوڑھنے کے لیے کمبل فراہم کیے گئے تھے۔ ان بیش قیمت، غیر ملکی ساخت کے کمبلوں کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔

"ابھی تم نے کیا دیکھا ہے۔ یہاں ہر چیز امپورٹڈ ملتی ہے۔"

"کہاں سے آتی ہے؟"

"افغانستان کے راستے۔ روسی سامان براہ راست آتا ہے۔ امریکی، برطانوی سامان ایران سے افغانستان پہنچتا ہے اور پھر یہاں سے آگے بھی جاتا ہے۔ پشاور اور لنڈی کوتل۔ یہ تجارت مخصوص راستوں پر ہوتی ہے جو انتہائی دشوار گزار ہیں لیکن سیکڑوں میل کی مسافت طے کرکے سامان لانے والوں کو بہت کم منافع ملتا ہے۔ اصل کمائی تو پشاور کے تاجر کرتے ہیں یا لنڈی کوتل والے۔"

میں نے کہا "تم نے خاموش رہنے کا اشارہ کیوں کیا تھا؟"

"جو شخص ہماری خدمت پر مامور ہے بظاہر وہ جاہل ہے۔ اردو نہیں سمجھتا تو انگریزی کیا سمجھے گا لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ شاید وہ پشاور یونیورسٹی کا گریجویٹ ہوگا۔ ایم اے پاس بھی ہوسکتا ہے۔"

میں بھونچکا رہ گیا "اور کام یہ کررہا ہے وہ؟"

"اس کی ظاہری حالت پر مت جاؤ۔ اس کو ملنے والا معاوضہ ڈپٹی کمشنر کی تنخواہ سے چار گنا ہوگا۔" آصف علی بولا "یہاں قبیلوں کے سردار حالات سے باخبر رہنے کے لیے اور آنے جانے والوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے اس قسم کے افراد کی خدمات حاصل کرتے ہیں۔ بعض اوقات وہ گونگے بہرے بنے رہتے ہیں مگر سب سنتے ہیں اور سردار کو بتادیتے ہیں۔"

"جب لوگ انہیں پہچان لیتے ہوں گے تو پھر محتاط ہوجاتے ہوں گے ... ... ہاں۔"

"عام لوگ تو بے ضرر ہوتے ہیں۔ یہ انتظام صرف حریفوں اور خاندانی یا قبیلے کے مشکوک افراد کی سرگرمیوں پر نظر رکھنے کے لیے کیا جاتا ہے یا پھر کسی اجنبی کی آمد پر۔"

"کیا ہم مشکوک ہیں؟"

"میں تو نہیں۔ تم پہلی بار آئے ہو میرے ساتھ اس لیے تم پر نظر رکھی جارہی ہے۔ دو چار مرتبہ آؤ گے تو سب مطمئن ہوجائیں گے یا پھر تمہیں خبردار کرکے روک دیا جائے گا۔"

میں نے گھڑی دیکھی "جرگے میں ایسی کون سی پیچیدہ عدالتی کارروائی جاری ہے، کیا مشکل فیصلہ درپیش ہے؟"

آصف علی نے ایک تھرماس میں سے چینی کی پیالی میں قہوہ اُنڈیل کے مجھے پیش کیا "قہوہ پیو" اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے کہا۔

وہ اُٹھ کے دروازے تک گیا اور ایک دم دروازہ کھول دیا۔ عین دروازے کے قریب کھڑا ہوا سردار کا خاص آدمی جو ہماری ہر بات سُن رہا تھا، ایک دم پیچھے ہٹا۔

"چینی رکھنا بھول گئے تم۔" آصف علی نے اطمینان سے کہا۔

"چینی..... رکھی تھی میں نے۔" پکڑے جانے کی وجہ سے وہ بوکھلا گیا تھا اور آصف علی کی بات کا جواب بھی اس نے اردو میں دے دیا تھا حالانکہ اس سے پہلے وہ ظاہر کرچکا تھا کہ اسے پشتو کے سوا کچھ نہیں آتا۔

چینی خود آصف علی نے چھپائی تھی۔ خادم نے اندر آکے دیکھا اور پھر سر کھجاتا ہوا چینی لینے چلا گیا۔

"مسئلہ یہ ہے" آصف علی نے کہا "کہ کلیم اللہ کا باپ اپنی منگ کو چھوڑ کے۔ منگ سمجھتے ہو؟ وہ لڑکی جس کے ساتھ اس کا خاندانی رشتہ طے تھا۔ ایک اور شخص کی منگ کو لے گیا تھا۔ ظاہر ہے وہ ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے مگر یہاں لومیرج کا کوئی تصور نہیں۔ شادیاں بزرگ طے کرتے ہیں اور وہ قبیلے کی لڑکیاں ہوتی ہیں۔ انہیں چھوڑنا بدترین بدعہدی سمجھا جاتا ہے اور یہ عملاً ناممکن ہے کہ کوئی منگنی توڑ کے قبیلے میں رہ سکے۔ لڑکی والے اس بے عزتی کے بعد مجبور ہوتے ہیں کہ انکار کرنے والے کو مار دیں۔"

"اور انکار لڑکی کرے تو؟"

"تب بھی عموماً لڑکی والے خود ہی اس کا کام تمام کردیتے ہیں۔ طے شدہ رشتے کو ٹھکرانا عزت کو للکارنے کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ کلیم اللہ کے باپ کا دہرا جرم تھا۔ اس نے اپنی منگیتر کو چھوڑا اور وہ ابھی تک کنواری بیٹھی ہے۔"

"ابھی تک... سولہ سال بعد بھی؟"

"وہ مرتے دم تک کسی اور سے شادی نہیں کرسکتی۔ وہ جس کی ہوچکی ہوچکی۔ اب وہ مرگیا ہے تو اس کی موت کی تصدیق کے بعد ممکن ہے قبیلہ اس کو کہیں اور شادی کی اجازت دے دے مگر... سال بعد یہ بہت مشکل ہے کہ کوئی نوجوان اس کو قبول کرے۔ یہ داغ تو اس پر آگیا کہ اس کا ہونے والا شوہر اسے چھوڑ کے چلا گیا تھا۔ وجہ کچھ بھی ہو۔ قصور کسی کا بھی ہو، وہ مسترد شدہ ہے اور اب کسی کی دوسری بیوی ہی بن سکتی ہے۔"

"کیا جرگہ یہی غور کررہا ہے؟"

"ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ غالباً خود یوسف خان شنواری اس سے عقد کرنے پر رضامند ہے۔" آصف علی نے کہا "سولہ سال تک ٹھکرائے جانے کا طعنہ سننے والی بدقسمت لڑکی آخرکار خوش قسمت ثابت ہوئی ہے۔"

"وہ لڑکی جو اب عورت ہوگی، انکار کرسکتی ہے؟"

"کرسکتی ہے، اگر اس سے کوئی پوچھے۔ اقرار تو اس کا باپ کرے گا۔ اور وہ بھی بے وقوف ہوگی تو اس موقعے سے فائدہ نہیں اُٹھائے گی۔ اسے خود سردار قبول کررہا ہے اور کیا چاہیے اسے۔" آصف علی بولا "دوسرا مسئلہ ہے اس شخص کا جس کی منیتر کو کلیم اللہ کا باپ بھگا کے لے گیا تھا۔ سولہ سال سے وہ بے غیرت ہونے کا طعنہ سن رہا تھا اور ابھی تک اس شخص کو قتل نہیں کرسکا تھا جو اس کی عزت کے منہ پر تھوک کے چلا گیا تھا۔ اگر مفرور کہیں مل جاتے تو وہ انہیں قتل کرکے اپنا انتقام لیتا اور ثبوت قبیلے کے سامنے پیش کرتا کہ اس نے اپنی بے عزتی کرنے والوں کو ختم کردیا ہے اور بے غیرتی کے الزام سے بری ہوچکا ہے۔"

"کیا وہ بھی کنوارا بیٹھا ہے ابھی تک؟"

"نہیں۔ مرد تو دو تین یا چار شادیاں کرسکتا ہے۔ اس نے دوسری کرلی تھی لیکن مشرقی پاکستان فرار ہوکے کلیم اللہ کے والدین سزا سے بچے رہے تھے۔ یہ اطلاع اس کے لیے باعث شرمندگی ہے کہ اس کے مجرم اس کے ہاتھوں نہ مارے گئے، وہ انتقام نہ لے سکا۔"

مجھے آفریدی کی بات یاد آئی "چنانچہ اب وہ کلیم اللہ سے انتقام لے گا۔ یہی بات ہے نا؟"

"ہاں یہ قاعدہ ہے یہاں کا۔"

"اچھا قاعدہ ہے۔ ایک بچے سے انتقام لینا کون سی مردانگی ہے جس کا قصور کوئی نہیں۔"

"یہ تمہارا نقطہ نظر ہے۔ ان کا خیال ہے کہ وہ گناہ کی پیداوار ہے۔ بُرائی سے اچھائی جنم نہیں لے سکتی۔ دو زہر ملنے سے تریاق پیدا نہیں ہوسکتا۔ یہ ہے ان کا فلسفہ۔ تمہارا اس سے اتفاق کرنا ضروری نہیں۔ اب یہ غور ہورہا ہوگا کہ کلیم اللہ ابھی تو بچہ ہے۔ کل وہ باپ کے حصے کی سزا کیسے کاٹے گا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اسے معاف کردیا جائے۔ قبیلہ سفارش کرے اور انتقام لینے و

انتہا پسند نہ ہو تو کہے کہ اللہ کے نام پر معاف کیا۔ یا بلکہ کچھ کفارہ ادا کرے۔ جب وہ شادی کے قابل ہوجائے تو اس عورت کے خاندان میں کسی ایسی لڑکی سے شادی کرے جس کو کسی نے مسترد کردیا ہو یا قبیلے کی کسی بھی عورت سے۔ ایک بات اور بتاؤں۔ اگر سردار یوسف خان شنواری نے عقد ثانی کا فیصلہ نہ کیا ہوتا تو عین ممکن تھا بلکہ یقینی تھا کہ کلیم اللہ کو اس عورت سے شادی کرنی پڑتی جس کو اس کے باپ نے چھوڑ دیا تھا۔"

میں بھونچکا رہ گیا "اس عورت سے! اس کی تو بہت عمر ہوگی۔"

"عمر سے کیا ہوتا ہے۔ ہمارے مذہب میں زیادہ عمر کی عورت سے شادی جائز ہے بلکہ سنت ہے۔ یہ ابھی چودہ سال کا ہے' وہ ہوگی تیس بتیس کی۔ یہ اٹھارہ کا ہوگا تو وہ ہوگی چھتیس کی۔ ابھی تو یہ عمر دگنی نظر آتی ہے مگر بعد میں فرق اتنا نہیں رہتا۔ جب وہ ساٹھ سال کا ہوگا تو..."

مجھے اس دلیل نے ذہنی طور پر قائل نہیں کیا تھا مگر بات اس لیے نامکمل رہ گئی کہ ملازم چینی لے آیا تھا۔ آصف علی نے قہوہ پیا اور کمبل لپیٹ کر سوگیا۔ میں بہت دیر تک جاگتا رہا اور اس معاشرے کے عدل و انصاف کے قوانین پر غور کرتا رہا۔ میرا ذہن مختلف ماحول کا پروردہ تھا اور مجھے یہ سب بہت عجیب لگ رہا تھا لیکن اس میں کوئی بات غیر فطری اور غیر منطقی نہیں تھی۔ ہر معاشرہ بیرونی دنیا کی اقدار سے الگ اپنی قدروں پر قائم رہے تو اسے غلط نہیں سمجھا جاسکتا۔

رات کی خاموشی کو اچانک فائرنگ کی آوازوں نے منتشر کردیا۔ میں گھبرا کے اُٹھ بیٹھا۔ آصف علی کی آنکھ بھی کھل گئی۔

میں نے کہا "یہ کیا ہوا۔ قبیلوں میں جنگ چھڑ گئی آدھی رات کو؟"

آصف مسکرایا "یہاں خوشی کا اظہار بھی ایسے ہی ہوتا ہے۔"

"گولیاں چلا کے؟ لاحول ولا قوۃ۔"

"اس میں لاحول پڑھنے کی کون سی بات ہے۔ تم خوشی کے موقعے پر بھی روتے ہو اور غم میں بھی روتے ہو۔" آصف علی بولا اور دروازے تک گیا مگر باہر کوئی نہیں تھا جو کچھ بتا سکتا۔

"تمہارا کیا اندازہ ہے' کون خوشی منا رہا تھا؟" میں نے فائرنگ کا شور تھم جانے کے بعد پوچھا۔

"خوشی سردار بھی منا سکتا ہے۔ عقد ثانی کے اعلان پر۔ کیا معلوم نکاح ہوگیا ہو۔" آصف علی بولا "پھر ہمیں کل دینے تک رکنا پڑے گا۔"

"یہ ناممکن ہے۔"

"سب ممکن ہے کبیر خان۔ یہاں انگریز کا حکم نہیں چلا تھا تو تمہاری کون سنے گا۔ ابھی سو جاؤ آرام سے' صبح معلوم ہوجائے گا سب۔"

وہ پھر سو گیا مگر میں کافی دیر بستر میں کروٹیں بدلتا رہا۔ یہ کچھ ضرورت سے زیادہ کھانے کا نتیجہ بھی تھا۔ مجھے میزبانوں نے بڑی محبت سے اور بہت اصرار کے ساتھ کوٹ کوٹ کے اوپر تک بھرا تھا۔ مجھے خطرہ لاحق ہونے لگا تھا کہ کہیں میری مذاق میں کہی گئی بات سچ ہی نہ ہوجائے اور میں واقعی ہیضے سے یا بدہضمی سے ہلاک ہوجاؤں۔ یہاں نہ حکیم نہ ڈاکٹر۔

لیکن رات بخیریت گزر گئی اور صبح آنکھ کھلتے ہی مجھے آصف علی نے مسکرا کے مبارکباد دی "جرگے نے فیصلہ کردیا۔"

"کیا فیصلہ ہوا؟" میں نے کہا۔

"کلیم اللہ اب اس عورت سے شادی کرے گا۔ لڑکی کے خاندان والوں کا یہی مطالبہ تھا۔ صرف اسی شرط پر اسے معاف بھی کیا جاسکتا تھا۔"

"اس سے تو سردار شادی کرنا چاہتا تھا۔"

"ہاں' مگر خاندان والوں کی مرضی بھی تو ضروری تھی۔ بے عزتی انہی کی ہوئی تھی سولہ سال پہلے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ آج سردار سے عقد ثانی اس بے عزتی کا بدلہ نہیں۔ یہ کفارہ تو کلیم اللہ ادا کرے گا۔"

میں نے اپنا سر پکڑ لیا "اور کلیم اللہ نے مان لیا؟"

"اس کے نہ ماننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ رات اس کا نکاح پڑھا دیا گیا۔ سردار خود گواہ بنا اور وہ شخص جس کی منگیتر کو کلیم اللہ کا باپ لے گیا تھا۔ آج شام ولیمہ ہے۔ کلیم اللہ کی پھوپی کی طرف سے دعوت کا انتظام ہے۔ کلیم اللہ اپنے باپ کی جگہ لے گا خاندان میں۔"

میرا افسوس یا احتجاج کرنا بے سود تھا۔ اس فیصلے کے خلاف کہیں اپیل نہ تھی اور خود کلیم اللہ اس فیصلے سے بہت مطمئن اور مسرور تھا۔ وہ مجھے دن میں ملا تو اس نے یہی کہا کہ اپنے باپ کا قرض اتارنا میرا فرض تھا اور اس طرح دو خاندانوں کی دشمنی بھی ختم ہوگئی ہے۔

میں نے کہا "پھر شادی مبارک ہو۔ رخصتی کب ہوگی؟"

"جب وقت آئے گا۔" اس نے متانت سے جواب دیا۔

میں نے طنز سے کہا "کبھی آنا اپنی بیوی کے ساتھ۔ اب تو آصف علی صاحب کی معرفت رابطہ ممکن ہے۔"

"ہاں۔ مگر ہمارا گھروں کا عورت صرف ملنے کی غرض سے غیروں کے گھر میں نہیں جاتا۔" اس نے کسی بالغ شخص کی طرح کہا۔

میں نے سوچا' اسے کہوں کہ اب ہم غیر ہوگئے ہیں مگر پھر میں نے غور کیا تو مجھے اس کی بات غلط نہیں لگی۔ ہمارے اور اس کے درمیان کوئی ایسا رشتہ نہیں تھا جس کی بنیاد پر ہم کوئی توقع رکھتے محرم اور نامحرم کا فرق بہت واضح ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم اسے بھول جاتے ہیں۔ جیسے ہم بیشتر احکام دین کی پیروی بھولتے جارہے ہیں۔

میں نے کہا "تمہاری دیدی کاجل بہت خوش ہوگی یہ جان کر کہ
نے واپس پہنچتے ہی اپنا گھر بھی بسالیا۔"

"اللہ اس کا گھر بھی بسائے گا۔" وہ بولا۔

اس کی شخصیت میں عجیب انقلاب رونما ہوچکا تھا۔ وہ اچانک ں علاقے' اپنے قبیلے اور خاندان کی ساری روایات کا امین اور سبان بن گیا تھا۔ یہ صدیوں پرانا رشتہ تھا جو اس کے باپ کی ایک باتی غلطی کے باعث صرف سولہ سال منقطع رہا تھا۔ اب وہ لمئن تھا کہ اس نے کفارہ ہی ادا نہیں کیا' وہ اپنی نسلی تہذیب کے مارے میں پھر شامل ہوگیا۔ عجب بات یہ تھی کہ وہ خوش تھا مگر ں خوش نہیں تھا۔ میرے ذہن میں یہ خیال تھا کہ وہ بچہ ہے اور ہ نہیں جانتا کہ اس کا یہ فیصلہ کل خود اس کی زندگی پر خوشگوار زات مرتب کرے گا یا ناخوشگوار۔ کچھ یہ احساس بھی تھا کہ ہم اں اسے خاندان والوں کے حوالے کرنے کے لیے لائے تھے' ی عہد رفتہ کا کفارہ ادا کرنے کے لیے نہیں۔ اور یہ بھی مجھے ب سا لگتا تھا کہ یہ شادی خانہ آبادی نہیں بلکہ اس کے والدین ے اعمال کی سزا ہے جو اس نے ایک فرض شناس اور فرمانبردار یٹے کی حیثیت سے اپنا فرض سمجھ کے قبول کرلی ہے۔

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ کاجل کو میرے ساتھ آنے کی جازت نہیں ملی ورنہ وہ جذباتی عورت نہ جانے کیا کرتی۔ بنگال کا حول زیادہ ہی آزادانہ اختلاط کی اجازت دیتا تھا اور وہاں اس کے پنے گھر کا ماحول بہت مختلف تھا۔ تعلیم اور ذہنی تربیت کے باعث واپنی سوچ کو کلیم اللہ کی سوچ سے ہم آہنگ نہیں کرسکتی تھی۔ وہ ت مایوس ہوتی اور شاید دُکھی بھی۔

چونکہ رخصتی نہیں ہوئی تھی اس لیے ولیمہ بھی نہیں ہوا مگر س رات شادی کی دعوت ہوئی جس میں ایک پُرانا' خاندانی تنازعہ تم ہونے اور نئے رشتے استوار ہونے پر بہت خوشی منائی گئی۔ اس قت میرا ذہن اس عورت کے بارے میں سوچتا رہا جو کسی گھر میں دلہن بنی بیٹھی تھی' جس نے دلہن بننے کے لیے بہت انتظار کیا تھا' بہت اذیت اور ذلت برداشت کی تھی۔ جب اسے کلیم اللہ کے باپ کے لیے مانگا گیا ہوگا تو اس نے ایک صورت کو دل میں بسالیا ہوگا اور اسی دن سے خواب میں خود کو دلہن دیکھنے لگی ہوگی۔ پھر وہ خواب ٹوٹ گیا اور سولہ سال وہ ٹھکرائی ہوئی عورت کے طعنے کی ذلت برداشت کرتی رہی۔ تقدیر کیسی ستم ظریف ہے کہ سولہ سال بعد وہ دلہن بنی بھی تو کس کی۔ اس کے بیٹے کی جو اسے ذلت کے گڑھے میں دھکیل کر پرائی عورت کو اس پر ترجیح دے کر بھاگ گیا تھا۔ کیا وہ خوش ہوگی؟ کیا یہ ممکن ہے کہ اسے سولہ سال پرانی اصل خوشی جذبات کے انہی شوخ رنگوں کے ساتھ ملی ہو جو اس عمر میں سانسوں کو مہکاتے تھے؟ نہیں' وہ عمر گزر گئی۔ جذبات کا آتش کدہ ٹھنڈا ہوا۔ اب یہ شادی کہاں' ایک بندوبست ہے زندگی کی گاڑی کو آخری سانس تک کھینچتے رہنے کے لیے۔

اس رات کی دعوت کے لیے رکنا آصف علی کی مجبوری تھا جس کو نبھانا میرا بھی فرض بن گیا ورنہ اب میرے لیے وہاں پل پل کاٹنا دشوار ہو رہا تھا۔ مجھے رابعہ اور کاجل کی فکر تھی کہ نہ جانے وہ کیا سمجھ رہی ہوں گی اور کیا سوچ رہی ہوں گی۔ مجھے ان کی سلامتی اور تحفظ کے خیال سے بھی پریشانی تھی اور آفریدی کے قتل کے بعد ریسٹ ہاؤس کے دھماکوں نے میرے ذہن میں اس احساس کو پختہ تر کردیا تھا کہ شکاری مسلسل تعاقب میں ہیں اور ہم واقعی آہوئے صیاد دیدہ ہیں۔ خوف سے مسلسل پناہوں کی تلاش میں سرگرداں۔ آخر ایسے ہم کب تک بھاگتے رہیں گے۔ ہمیں آخر کار جنگ کا وہی فلسفہ اپنانا ہوگا کہ جارحیت ہی سب سے بہتر دفاع ہے۔

علی الصبح ہمیں میزبانوں نے واپسی کی اجازت دینا منظور کیا۔ وہ سب ہمارے شکر گزار تھے کہ ہم ان کی امانت کو اتنی حفاظت کے ساتھ پہنچانے آئے' دو خاندانوں کے ملاپ اور عداوتوں کی آگ کو بجھا کے امن کا وسیلہ بنے۔ ہمیں رخصت کرنے کے لیے دونوں طرف کے خاندان کے تمام سرکردہ افراد موجود تھے اور خود کلیم اللہ ایک معزز' ذمے دار فرد کی طرح سب سے آگے تھا۔

واپسی کا سفر مجھے کچھ کم طویل لگا۔ دوپہر سے پہلے ہم پشاور میں تھے۔

"ہم سیدھے ناصر پور چلتے ہیں۔" آصف علی نے کہا۔

میں نے کہا "پہلے اس نیوز ایجنٹ سے ملیں گے۔ وہ پرسوں شام سے اخبار لیے بیٹھا ہوگا۔"

"ٹھیک یاد دلایا تم نے۔" آصف علی بولا اور اپنی گاڑی کو صدر کی جانب موڑ دیا "مگر آج تو چھٹی ہے اتوار کی۔ بازار بند ہوگا۔"

"نیوز ایجنسی تو کھلی ہوگی۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔ کیوں نہیں۔ وہ دراصل مجھے خیال آیا تھا اپنی دکان کا۔ دو دن سے کوئی خبر نہیں لی تھی مگر آج تو بند ہوگی۔"

"یہ لڑکا عامر کہاں رہتا ہے؟"

"کہاں رہتا ہے؟ میرے ساتھ اور کہاں۔" آصف علی بولا "اس کا اپنا کوئی گھر ہے نہ رشتے دار۔"

نیوز ایجنٹ کی دکان تو بند تھی مگر وہ خود باہر اخبارات اور رسائل کے ساتھ موجود تھا "آپ کدھر غائب ہوگئے تھے جناب؟ ہم نے تو اسی دن اخبار پیدا کرلیا تھا۔"

"میں ایک ضروری کام سے گیا ہوا تھا۔" آصف علی نے کہا "اخبار کہاں ہے؟"

"وہ تو گھر بھیج دیا تھا ہم نے جی۔ اسی روز رات کو۔"

"اچھا۔ پھر ہم دیکھ لیں گے۔" آصف علی نے کہا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

میں نے کہا "ہم پہلے گھر جائیں گے۔"

"اخبار اتنا ضروری ہے؟" آصف علی بولا۔

"ہاں۔ لیتے ہوئے نکل جائیں گے۔ کیا پتا وہ سب بھی ناصر پور سے لوٹ آئی ہوں۔" میں نے کہا "دو دن نہ رکی ہوں وہاں۔"

آصف علی نے نفی میں سرہلایا "میں کہہ گیا تھا کہ جب تک میں نہ کہوں واپس نہیں آنا ہے۔ ہو سکتا ہے ہم سیدھے آگے چلے جائیں۔"

"آپ نے بتادیا تھا؟"

"ہاں۔ ایسے کسی اطلاع کے بغیر چلے جاتے تو ابھی رونا دھونا شروع ہو جاتا۔" آصف علی بولا۔

"گویا آپ کو اندازہ تھا پہلے سے کہ کاجل اور رابعہ ہمارے ساتھ نہیں جاسکیں گی؟"

"وہ تو معلوم تھا۔" آصف علی نے کہا "کاجل کے سامنے میں صاف کہتا تو وہ سمجھتی کہ ہم لے جانا نہیں چاہتے۔"

"اس کا نہ جانا ہی بہتر تھا۔" میں نے کہا "کلیم اللہ اپنوں میں پہنچ کے بالکل بدل گیا۔ مجھے غیر کہہ رہا تھا۔ کاجل کو زیادہ صدمہ ہوتا۔ وہ اس پر بہت ممتا نچھاور کرتی تھی۔"

"یہ عارضی رشتے عارضی ہی ہوتے ہیں کبیر خاں۔ خون کے رشتے کا بدل نہیں ہوسکتے۔" آصف علی نے کہا "عامر کو ہی دیکھ لو۔"

"یہ غرض کے رشتے ہیں۔ بے غرض رشتوں کی مضبوطی' خلوص اور اپنائیت دیکھنی ہو تو ہمارے ساتھ رہ کے دیکھ لینا۔ یہ خون کے رشتے تمہیں بے وقعت محسوس ہوں گے۔ یہ حسنِ اتفاق ہے یا قدرت کا حسنِ انتظام کہ اس نے سب اکیلے رہ جانے والوں کو ایک دوسرے سے ملوادیا اور وہ سب ایک خاندان بن گئے۔ محسن کے والدین کا انتقال ہوچکا۔ ایک بہن تھی' وہ شادی ہو کے گئی تو پھر نہ آئی۔ میرے بارے میں آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔ رابعہ کی صرف ماں تھی۔ وہ اس لیے ماری گئی کہ رابعہ میری مدد کررہی تھی اور میرا ساتھ چھوڑنے پر آمادہ نہ تھی۔ غالب کا بھی یہی حال ہے۔ ہاں اکرام شیخ اور نازو سگے بہن بھائی ہیں۔ کاجل اور گل بانو کی کہانی آپ سن چکے ہیں۔ ان کا بھی دنیا میں کوئی نہیں مگر ہم سب ایک دوسرے کے ہوگئے ہیں اور حالات کی سخت آزمائش سے گزرنے کے بعد ان رشتوں میں وہی مضبوطی آگئی ہے جو لوہے کو بھٹی میں تپ کے ملتی ہے۔"

"خدا کرے تم ایسے ہی رہو۔ ان رشتوں کے احترام کو بھی کسی کی نظر نہ لگے۔" آصف علی نے کہا اور گاڑی کو اپنی کوٹھی کے مین گیٹ پر روک کے ہارن دیا۔

چوکیدار نے گیٹ کھولا تو آصف علی نے اسے قریب بلایا "پرسوں رات کو کوئی آیا تھا اخبار دینے کے لیے؟"

"آیا تھا جناب۔ میں نے اندر پہنچادیا تھا۔"

"اندر کون تھا؟ اچھا جاکے وہ اخبار لاؤ۔ جسے بھی دیا تھا اس کو معلوم ہوگا کہ کہاں رکھا ہے۔"

میں نے کہا "یہاں بیٹھ کے انتظار کرنے سے بہتر ہے کہ ہم خود اندر چلیں۔ ہاتھ منہ بھی دھولیں اور کپڑے بھی بدل لیں۔ پرسوں سے یہی پہن رکھے ہیں۔"

"ہاں۔ گئے تو ہم ایک رات کے لیے تھے۔ یہ کسے معلوم تھا کہ دو راتیں گزارنی پڑ جائیں گی۔" وہ اتر کے گاڑی کا دروازہ بند کرتے ہوئے بولا۔

چوکیدار ابھی اندر اخبار تلاش کر ہی رہا تھا کہ ہم بھی پہنچ گئے "کیا بات ہے' ابھی تک تمہیں اخبار نہیں ملا۔"

"وہ جناب' عامر صاحب نے لیا تھا۔" چوکیدار نے کہا۔

"تو کہاں ہے عامر' بلاؤ اسے۔"

"وہ تو نہیں ہیں جناب۔" چوکیدار نے کہا۔

"کہاں گئے ہیں؟ دکان تو بند ہے آج۔" آصف علی نے کہا۔

"کل سب کے ساتھ گئے تھے جناب۔" چوکیدار بولا۔

آصف علی نے حیرانی سے کہا "کون سب؟"

"بیگم صاحب' چھوٹی بی بی اور آپ کے مہمان۔"

"وہ لوٹ آئے تھے ناصر پور سے۔ کیوں؟ میں نے تو منع کیا تھا کہ جب تک میں نہ آؤں' وہیں رہنا ہے۔"

"ہم کو نہیں معلوم جناب۔" چوکیدار نے کہا۔

"اچھا تم جاؤ" آصف علی نے کہا "میں پوچھ لیتا ہوں۔ ذرا کچن میں بولو کہ چائے لے کر آئے۔ فوراً۔"

میں نے کہا "وہ واپس آگئے اور پھر عامر کے ساتھ کہیں چلے گئے۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

آصف علی نے ایک فون نمبر ملایا "ابھی سمجھ میں آجائے گی۔ ہاں ہیلو۔ کون۔ ہاں میں آصف بول رہا ہوں۔ یار' یہ تیری بھابی کو میں نے بھیجا تھا۔ ہاں دو مہمان خواتین کے ساتھ۔ ان سے کہا تھا وہیں رہنا۔ تھا کچھ ایسا ہی مسئلہ۔ میں گیا تھا غیر علاقے کی طرف اور پیچھے کچھ گڑبڑ تھی۔ بعد میں بتاؤں گا۔ کیا۔ اسی دن' کس کے ساتھ۔ عامر کے ساتھ۔ کیوں؟ میرا مطلب ہے عامر کیسے پہنچ گیا ان کو واپس لانے کے لیے۔ نہیں۔ میں نے بتایا نا کہ ان کو میں نے سختی سے تاکید کی تھی۔ میں نے۔ یار' میں ابھی ابھی واپس پہنچا ہوں۔ ابھی گھر میں قدم رکھا ہے۔ میں کیسے بلوا سکتا تھا انہیں۔ غیر علاقے سے فون تو کر نہیں سکتا تھا۔ تمہیں یقین ہے' عامر نے یہی کہا تھا۔ اچھا اچھا میں آتا ہوں۔ بس ابھی ایک گھنٹے میں۔"

اس کے ماتھے پر بے یقینی' برہمی اور پریشانی کے جذبات کا عکس میں دیکھ سکتا تھا اور اس کی یک طرفہ گفتگو سے میں نے پوری بات سمجھ لی تھی۔

"عامر نے کوئی گڑبڑ کی ہے؟" میں نے کہا۔

اس نے قدرے تذبذب کے ساتھ کہا "وہ ایسا کر تو نہیں سکتا۔"

"اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے ایک کم ظرف اور کم بخت آدمی کچھ بھی کرسکتا ہے۔" میں نے کہا "اس کا اچھا تجربہ ہے مجھے۔"

وہ کچھ نہیں بولا اور کچھ سوچتا رہا۔ "مجھے یقین نہیں آتا۔ اس کی اتنی ہمت نہیں ہوسکتی۔ خیر۔۔۔ چلتے ہیں پہلے ناصر پور۔"

"ناصر پور جاکے کیا معلوم ہوگا۔ وہی جو ابھی ٹیلی فون پر آپ معلوم کرچکے ہیں۔ اور کچھ رہ گیا ہے تو پوچھ لیں۔" میں نے کہا "ورنہ اپنے نوکروں سے پتا کریں۔"

آصف علی نے پھر چوکیدار کو بلایا "عامر کب گیا تھا؟ صحیح وقت بتاؤ۔"

"آٹھ بجے رات کو وہ دکان بند کرکے لوٹے تو فیملی ان کے ساتھ تھی۔"

"کیا فیملی دکان پر بیٹھی تھی؟" آصف علی نے بگڑ کر کہا۔

"میں۔۔۔ میں کیا بتاؤں جناب۔ میں نے جو دیکھا وہی بتا رہا ہوں۔ اسی وقت دکان سے لوٹتے ہیں عامر صاحب۔ باقی سب بھی ان کے ساتھ ہی تھے۔ اور میں نے کچھ نہیں پوچھا کسی سے۔ میرا کام بھی نہیں تھا۔"

"اور دوبارہ کب گئے؟"

"تقریباً آدھے گھنٹے بعد۔ ہاں کل شام کوئی آپ سے ملنے آیا تھا۔ میں نے کہا کہ آپ نہیں ہیں تو انہوں نے بیگم صاحب کو پوچھا۔ میں نے کہا کہ وہ ناصر پور گئی ہیں۔"

"تم نے بتادیا انہیں۔ کون تھا وہ؟"

"یہ میں نہیں جانتا جناب۔ پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ لال رنگ کی گاڑی میں آئے تھے۔ ایک شوفر کے ساتھ۔"

"احمق' گدھے۔ کس نے کہا تھا تم سے کہ سارے گھر والوں کے بارے میں بتادو کہ کون کہاں گیا ہوا ہے۔" آصف علی نے چلا کے کہا "اور وہ بھی ایک اجنبی کو جسے تم صورت سے نہیں پہچان سکتے۔ کیا اتنا کہنا کافی نہیں تھا کہ گھر میں کوئی نہیں ہے۔"

"وہ جناب! انہوں نے عامر صاحب کو پوچھا۔ میں نے کہا کہ آتے ہی ہوں گے۔ سب کو جانتے تھے وہ جناب تو میں نے سمجھا کہ ملنے والے ہی ہوں گے۔" چوکیدار نے وضاحت کی "یہ بھی تو پہلی بار آئے تھے۔۔۔۔"

"بکومت" آصف علی نے دہاڑ کے کہا "پھر کیا تم نے انہیں گھر میں بٹھالیا تھا؟"

"جی۔" انہوں نے کہا تھا کہ ہم انتظار کریں گے۔ پھر میں نے ڈرائنگ روم کھلوادیا۔ ان کی گاڑی پورچ میں کھڑی تھی۔ عامر صاحب کو میں نے بتادیا تھا اور اخبار بھی دے دیا تھا۔"

اب تفتیش میں نے اپنے ہاتھ میں لے لی "کتنی دیر بیٹھے رہے تھے وہ لوگ؟ کچھ یاد ہے۔"

"شاید آدھا گھنٹا۔"

"اور کیا وہ ساتھ ہی گئے تھے؟" میں نے کہا۔

"جی۔ آگے پیچھے نکلی تھیں گاڑیاں۔"
"آگے کون سی گاڑی تھی؟" میں نے کہا "مہمانوں کی یا اپنی۔"
"اپنی جناب۔ عامر صاحب چلا رہے تھے۔"
میں نے کہا "چوکیدار! ان سے تمہاری پانچ منٹ تو بات ضرور ہوئی ہوگی۔ تم نے پانچ منٹ میں کیا دیکھا؟ ان صاحب کا چہرہ کیسا تھا؟ بال کیسے تھے؟ کپڑے کیسے تھے کچھ یاد ہے؟"
چوکیدار نے ذہن پر زور دیا "تھوڑا تھوڑا یاد ہے جناب۔"
اس نے جو حلیہ بتایا وہ میرے ذہن میں پہلے سے موجود کسی بھی تصویر سے نہیں ملتا تھا یا پھر سب سے ملتا تھا۔ جب دوسرا نوکر چائے لے کر آیا تو میں نے اس سے بھی یہی سوال کیا کیونکہ اس نے آدھے گھنٹے میں چائے پیش کی تھی۔ وہ دونوں کنفیوژن کا شکار تھے اور ان کے بیان کا فرق مزید کنفیوژن پیدا کرتا تھا۔
"وہ عامر صاحب کے انتظار میں تھے۔ ان کی آپس میں کیا باتیں ہو رہی تھیں؟" میں نے کہا۔
"پتا نہیں جی۔" ملازم بولا "جب میں آیا تو وہ چپ تھے۔"
"اچھا۔ ان کی خاموشی میں تم نے کوئی خاص بات نوٹ کی۔"
"خاص بات..."
"ہاں۔ ایک تو آدمی کوئی پرائیویٹ بات کر رہا ہوتا ہے اور تیسرا شخص کمرے میں آجائے تو وہ خاموش ہو جاتے ہیں۔ یا ایک مجبوری کی خاموشی ہوتی ہے۔ جیسے کوئی بزرگ آکے بیٹھ جائے نوجوانوں میں تو وہ خاموش ہو جاتے ہیں۔ یا کشیدگی ہوتی ہے اس کا سبب۔ کشیدگی سمجھتے ہو؟ نفرت اس کا سبب ہوتی ہے بعض اوقات۔ یا کوئی ناپسند کرتا ہو کسی کو مگر اس کے پاس بیٹھنا پڑے۔ وہ بات بھی نہ کرنا چاہے......"
"یہ... یہ سب میں نے نہیں دیکھا تھا جناب۔ میں تو چائے رکھ کے چلا گیا تھا۔ اس وقت مہمان وہ اخبار دیکھ رہے تھے۔ ایک نے دوسرے کو کچھ بتایا تھا۔"
"کون سا اخبار۔ جو چوکیدار دے کر گیا تھا؟"
"ہاں جی وہی۔ مجھے دیا تھا اس نے اور میں نے سینٹر ٹیبل پر رکھ دیا تھا کہ صاحب آئیں تو دیکھ لیں۔"
میں نے کہا "اچھا۔ ایسی کیا بات تھی اخبار میں؟ وہ پرانا اخبار تھا۔"
لیکن میری تمام تفتیش بے نتیجہ رہی۔ ایک خیال پہلے سے میرے ذہن میں تھا کہ عامر نے کمینگی کا ثبوت دیتے ہوئے اور کسی خطرے کو محسوس کرتے ہوئے مجھ سے اپنی تذلیل کا بدلہ نہ لیا ہو۔ وہ رابعہ اور کاجل کو کہیں بھی لے جا سکتا تھا مگر آصف علی کی بات سمجھ میں آتی تھی کہ وہ اغوا جیسی واردات کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ وہ کوئی مجرم نہیں تھا کہ اتنا بڑا قدم اٹھا سکے۔ اس کا پکڑا جانا یقینی تھا اور اس حماقت کا انجام یہ بھی ہو سکتا تھا کہ سات سال کے لیے جیل جانا پڑے۔ ابھی جائداد سے محرومی کا اندیشہ بھی بے بنیاد تھا کیونکہ اسے آصف علی کے منصوبوں میں کسی تبدیلی کی مصدقہ اطلاع نہیں ملی تھی۔
تاہم میرے اندیشوں میں خوف کا نیا پہلو بہت سے امکانات کی نشاندہی کرنے لگا تھا اور ان میں سب سے قوی امکان یہ لگتا تھا کہ عامر کہیں چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کے مقاصد کی تکمیل کا آلۂ کار تو نہیں بن گیا۔ ایک طرف پیشہ ور اور گھاگ شکاری تھے تو دوسری طرف ایک ناپختہ شعور کا مالک احساس محرومی کا مارا ہوا۔ لالچ اور ہوس کا اسیر نوجوان تھا جو انتقام کی آگ میں بے بسی سے جل رہا تھا۔ کوئی بھی اس کے جذبات سے کھیلنے کے لیے اسے خرید سکتا تھا۔ اسے ایک تیر سے دو شکار کرنے کا گر سمجھا سکتا تھا کہ یہ لو دو لاکھ یا پانچ لاکھ۔ کسی طرح مہمانوں کو اپنے ساتھ باہر لے جاؤ۔ تھوڑی دیر کے لیے کہیں بھی لے جاؤ۔ سیر کرانے کے بہانے۔ یا کھانا کھلانے۔ ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ وہ کون ہیں۔ دور سے دیکھ لیں گے۔ اور اگر اس احمق لڑکے نے جال کو نہیں دیکھا ہوگا تو لالچ اور حسد سے شکار ہو کے خود بھی مارا گیا ہوگا۔ باہر نکلنے کے بعد اسے اندازہ ہوا ہوگا کہ وہ سب جھوٹ تھا۔ دور رہنے کا وعدہ کرنے والے بہت قریب آکے انہیں گن پوائنٹ پر کہیں لے گئے ہوں گے۔ دلاور جیسے لوگوں کے لیے پانچ لاکھ کی کوئی اہمیت نہیں مگر وہ بھی انہیں واپس مل گئے ہوں گے اور انہوں نے آسانی سے عامر کو کہیں بند کر دیا ہوگا یا اس کی گواہی کے خطرے کا سدباب کرنے کے لیے اس کو وہاں بھیج دیا ہوگا جہاں سے کوئی بھی دنیا کی کسی عدالت میں گواہی دینے کے لیے نہیں آسکتا۔
میرا دل کہتا تھا کہ رابعہ اور کاجل کو اغوا کیا گیا ہے لیکن ان کو اغوا کرنے والوں نے عامر کو آلۂ کار بنایا اور اسے دھمکی سے یا دولت سے مجبور کر دیا کہ وہ ان کے مقاصد کی تکمیل میں آسانی پیدا کردے۔ وہ نہ مانتا تب بھی وہ اپنا کام ادھورا چھوڑ کے نہ جاتے۔ وہ عامر کو خاموش کرنے کے لیے اس کے سر پر بندوق کا بٹ مار کے بھی کام چلا سکتے تھے اور وہ اسے گولی بھی مار سکتے تھے۔ ملازم اور چوکیدار مل کے بھی ان کا راستہ نہیں روک سکتے تھے مگر انہوں نے خون خرابے اور شور ہنگامے سے گریز کیا۔ یہ کام خاموشی سے ہو جائے اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو تو بہتر۔ گڑ سے مرنے والے کو زہر کیوں دیا جائے۔ خانم اور اس کی بیٹی تو محض ساتھ ہونے کی وجہ سے ساتھ گئے۔ نہ کوئی ان کا دشمن تھا اور نہ آصف علی کا۔
میں یہ بات آصف علی کو بتاتے ہوئے ڈرتا تھا حالانکہ اس اندیشے کا اظہار میں پہلے بھی کر چکا تھا۔ ہماری مدد کرنے کے جرم میں آفریدی مارا گیا تھا اور وہ بھی مصیبت میں پڑ سکتے تھے۔ اگر خود آصف علی یہ بات سمجھتا تھا تو اس نے بھی مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ بے شک ان حالات کے ذمے دار ہم تھے لیکن ہم خود چل کے اس کے پاس نہیں آئے تھے اور نہ ہم نے اس سے مدد کی درخواست کی تھی۔ وہ خود بہت اصرار کے ساتھ ہمیں اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ یہ ناممکن تھا کہ اتنی جلدی وہ اپنا رویہ بدل لیتا۔ دو دن پہلے وہ میرا اتنا احسان مند تھا کہ اس کے پاس تشکر کے جذبات کا اظہار کرنے کے لیے الفاظ نہیں تھے۔ میں نے اسے معاف کر دیا تھا۔ اسے وہی عزت دی تھی جو میں اپنے والد کے کسی ساتھی کو دیتا اور میں نے اس کی زندگی کے سب سے بڑے دکھ کا بوجھ ہلکا کر دیا تھا۔
"اب کیا کرنا ہے کبیر میاں؟" اس نے اِدھر اُدھر فون کرنے کے بعد ریسیور رکھتے ہوئے مایوسی سے کہا۔
"میری خود سمجھ میں نہیں آتا۔ پولیس کو رپورٹ تو لکھوا ہی دیں۔"
"کیا لکھوائیں رپورٹ میں؟ کیا بتائیں کہ ہمیں کس پر شک ہے اور کسی پر شک نہیں ہے تو ہم نے کیوں فرض کر لیا ہے کہ وہ غائب ہو گئے ہیں۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے کہیں گئے ہوں۔ ایمرجنسی میں۔"
"وہ پیغام چھوڑ کے جا سکتے تھے۔"
"کس کے لیے؟ ہم تو یہاں تھے نہیں مگر تم نے ٹھیک کہا' وہ چوکیدار کو یا ملازم کو بتا سکتے تھے مگر درمیان میں ایک رات ہی تو گزری ہے۔ پولیس کہے گی کہ رات کو آپ خود کہاں تھے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ گئے ہوں تھوڑی دیر کے لیے اور ان کا ارادہ باہر رُکنے کا نہ ہو مگر مجبوراً انہیں رکنا پڑا ہو۔"
"وہ فون کر سکتے تھے۔"
"ہاں مگر دونوں طرف کے امکانات کو ذہن میں رکھو۔ انہیں فون کرنا یاد نہیں رہا یا اس کا موقع نہیں ملا۔ وہاں فون تھا ہی نہیں یا خراب تھا۔ کہیں ان کی گاڑی خراب نہ ہو گئی ہو واپسی میں۔ اور بہرحال حادثے کے امکانات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ پولیس بھی کہے گی کہ اغوا یا گمشدگی کی رپورٹ لکھوانے میں آپ عجلت سے کام لے رہے ہیں۔"
"پھر کیوں نہ ہم اسپتالوں سے معلوم کر لیں۔"
آصف علی نے نیم دلی سے کہا "کر لو لیکن حادثہ پیش آتا تو اطلاع مل جاتی ہمیں۔ یہ فرض کرنا تو محال ہے کہ حادثے میں سب اللہ کو پیارے ہو گئے یا شدید زخمی ہو کے کسی اسپتال میں بے ہوش پڑے ہیں۔"
خدا نہ کرے ایسا ہو مگر اسپتال اور پولیس اسٹیشن کے سوا ہم کہاں سے آغاز کریں؟"
"گاڑی میں شناخت کے کاغذات تھے۔ خانم اور قدرت کے پاس بھی کارڈ ہوں گے۔ ایسی کوئی بات ہوتی تو اب تک فون آجاتا کسی کا۔ پولیس کیا بتائے گی۔ انہیں کوئی تھانے لے جا کے تو بند کرنے سے رہا۔"
میں نے کہا "پھر آپ دور دراز کے جاننے والوں سے بھی پوچھ لیں۔ کیا پتا کسی کے گھر جانا پڑا ہو۔ خوشی کی تقریب کا تو پہلے سے علم

ہوتا ہے مگر موت کی خبر اچانک ملتی ہے۔ ہو سکتا ہے وہ تھوڑی دیر میں آجائیں۔"

آصف علی نے نفی میں سر ہلایا "کبیر میاں! حقیقت جو تم بھی جانتے ہو اور میں بھی سمجھتا ہوں' یہ ہے کہ انہیں کوئی ان کی مرضی کے خلاف لے گیا ہے اور ایسا کرنے والے وہی ہو سکتے ہیں جو ہماری عدم موجودگی میں آئے تھے کسی لال گاڑی میں۔"

"چوکیدار سے پوچھیں' شاید اس نے گاڑی کا نمبر دیکھا ہو۔"

"نمبر تو لکھا ہوا ہو گا اس کے پاس۔" آصف علی نے انٹر کام کا ایک بٹن دبایا۔ انٹر کام دیوار پر نصب تھا۔

"جی" چوکیدار کی آواز اسپیکر سے آئی۔

"تم نے ڈائری میں اس لال گاڑی کا نمبر ضرور لکھا ہو گا۔"

"جی سر۔ پی آر او۔ زیرو سیون ایٹ۔"

"پی آر' ڈبل زیرو سیون ایٹ تو نہیں تھا؟"

"ہو سکتا ہے۔ دوسرا نمبر تھا پی آر آئی۔ ون ڈبل ٹو۔"

"دوسرا نمبر؟ کیا دو گاڑیاں تھیں؟"

"نہیں سر' گاڑی تو ایک تھی۔"

آصف علی بگڑ گیا "کیا گھاس کھا گئے ہو! ہوش میں تھے تم یا نہیں۔ کل کچھ پتا تو نہیں تھا ہمارے جانے کے بعد۔ ایک گاڑی کے دو نمبر ہوتے ہیں۔"

"اس کے تھے سر۔ آگے پیچھے کے نمبر الگ تھے۔ آپ یقین کریں' میں نے دیکھا تھا۔"

"پھر بتایا کیوں نہیں تھا ابھی تک؟"

"مجھے ڈر تھا سر۔ آپ یہی کہیں گے جو ابھی کہا۔" چوکیدار بولا۔

میں نے کہا "دوسرا نمبر بھی مشکوک ہے۔ پی آر۔ ون ون ٹو ٹو بھی ہو سکتا ہے۔ اوّل تو یہ نمبر جعلی لگتے ہیں۔ ایسے نمبر کنفیوژن پیدا کرنے کے لیے لکھے گئے ہوں گے۔"

"مگر ایک کار کے دو نمبر......"

"وہ بھی ممکن ہے۔" میں نے کہا "جب ہم پشاور آرہے تھے تو ایک ڈاج ڈارٹ نے ہمارا تعاقب کیا تھا۔ اس میں آگے پیچھے کے نمبر الگ تھے۔ کبھی وہ پیچھے والے کو آگے لگا دیتے تھے تو کبھی آگے والا پیچھے۔ اور اب مجھے کوئی شک نہیں رہا کہ یہ وہی لوگ تھے۔ مجرم اپنے طریقۂ واردات سے ہی پہچانے جاتے ہیں۔"

"پھر تم ہی کرو جو کرنا ہے۔ میری تو عقل مات ہو رہی ہے پریشانی سے۔" آصف علی صوفے کی پشت پر گر گیا۔

میں نے کہا "گھبرانے سے کچھ نہیں ہو گا۔ وہ خود ہم سے رابطہ قائم کریں گے۔ اغوا کرنے والے ایسا ہی کرتے ہیں۔ ان کے جو بھی مقاصد ہیں سامنے آجائیں گے اور انشاءاللہ آپ کو یا آپ کی فیملی کو کوئی گزند نہیں آئے گی۔ وہ ہمارے دشمن ہیں' آپ کے نہیں۔ جال انہوں نے ہمارے لیے پھینکا تھا۔ خانم' قدرت اور عامر اس میں رابعہ اور کاجل کے ساتھ ہونے کی وجہ سے پھنس گئے۔ انہیں وہ چھوڑ دیں گے۔"

"اور ان دو لڑکیوں کو نہیں چھوڑیں گے؟"

"وہ ان کے اور ہمارے معاملات ہیں۔ ہم نمٹ لیں گے جیسے بھی ہو گا۔" میں نے کہا اور فون اپنی طرف کھینچ لیا۔

آج اتوار کی چھٹی تھی چنانچہ منظر کے گھر پر ملنے کی اُمید تھی۔ گھنٹی کچھ دیر بجتی رہی پھر اس کی اولاد میں سے کسی نے ریسیور اٹھا لیا اور ان کے درمیان لڑائی شروع ہو گئی "میں بات کروں گا' نہیں میں بات کروں گی۔" پھر غالباً طاقتور نے کمزور کو مار بھگایا اور مظلوم نے گلا پھاڑ کے فریاد و فغاں کی "ہیلو" ایک بچے نے کہا۔

میں نے کہا "تمہارا باپ کہاں ہے؟ اس سے بات کرنی ہے۔"

بچے نے چیخ کے کہا "اباجی آپ کا فون ہے۔"

اباجی غسل خانے میں تھے۔ چند منٹ بعد آئے "کیا مصیبت ہے! باتھ روم میں بھی سکون نہیں۔ کون ہے۔ ہیلو۔"

"باتھ روم میں فون لگوا لے۔" میں نے کہا "سکون کے بچے۔"

منظر نے حسبِ عادت سلام دُعا کے طور پر مجھے چند خطابات سے نواز کے کہا "جیسے شیطان نے جنت میں سکون سے نہیں رہنے دیا تھا باوا آدم کو' ایسے ہی تم لوگ مجھے قبر میں بھی نہیں رہنے دو گے سکون سے۔ ابے کیا پدی اور کیا پدی کا شوربہ۔ سالے آدھے سکندرِ اعظم تم' آدھی تمہاری دُم چھلی وکیلن۔ چوتھائی وہ صحافی اور چوتھائی اس کی بلیک بیلٹ حسینہ۔ باقی سب ملا کے ایک۔ یہ ہوئی ڈھائی افراد کی ایم آر ایس۔ دنیا میں فتنہ و فساد پھیلا رکھا ہے۔"

"دیکھ بات سُن۔ وقت کم ہے اور معاملہ سیریس۔"

"ہاں۔ بس میں ہی سیریس نہیں ہوں۔ یا ہوں تو فیملی پلاننگ والوں کے منصوبے خاک میں ملانے کے لیے۔ تم لوگ تو کچھ کرو گے نہیں۔ نامراد دنیا سے بے مراد جاؤ گے۔ ابے بھوتنی کے! میں کہتا ہوں' اب واپس آنے میں کیا ہے۔ کیوں پشاور میں بھٹک رہے ہو دونوں بد روح بن کے' چاندنی کے بعد اس کے خصم کو بھی خلاص کرا دیا میں نے اور کیسا صحیح بیان دلوایا اس سے۔ تم صاف بچ گئے۔"

"یہ تو نے کیا ہے؟"

"اور کیا تیرے باپ نے کیا ہے۔ میرا مطلب تھا اس کی روح نے۔ خیر کیوں نکالا ہے مجھے باتھ روم کی خلوت سے باہر۔ جلدی بول۔ رات کچھ حلوا زیادہ کھا لیا تھا ایک مُلاجی کے گھر۔ آنتیں لاحول ولا پڑھ رہی ہیں۔ یہ سالا ازار بند بھی دغا دے رہا ہے۔"

میں نے کہا "ہم پر یہاں دو قاتلانہ حملے ہوئے۔"

"اچھا۔ مبارک ہو۔" وہ بولا "کوئی کامیاب ہوا؟ اِسی دنیا سے بول رہا ہے نا تو۔"

میں نے کہا "الو کے پٹھے! مجھے اب ڈر ہے کہ رابعہ اور کاجل اغوا ہو گئی ہیں۔"

"مشکل ہے۔ وہ خود فرار ہو گئی ہوں گی۔ ماشاءاللہ بالغ ہیں' اپنی مرضی سے کسی کے ساتھ بھی جا سکتی ہیں۔ تیرے ساتھ کب تک خوار ہوتیں۔ اچھا ہے تیری بھی جان چھوٹی۔ اب میں دیکھتا ہوں کوئی اچھا سا رشتہ تیرے لیے۔ میری سالی ہے۔ بہن جیسی زرخیز ہو گی۔ گھر بھر دے گی۔"

"منظر پلیز یار! میں آ کے ساری بات بتاؤں گا۔ ابھی ایک کام کر۔ وہ اخبار نکال جس میں گل بانو کی تصویر اور کوئی خبر چھپی تھی۔"

"وہ کہاں سے نکالوں۔ میں تو سُرخیاں پڑھ کے چلا جاتا ہوں' بعد میں خیر سے چودہ بچے آپس میں تقسیم کرتے ہیں۔ چھوٹا والا نیوز پرنٹ بڑے شوق سے کھاتا ہے۔ اس سے بڑا کشتی بناتا ہے۔ سب سے بڑا اب اتنا بڑا ہو گیا ہے کہ گلی میں جو لڑکی جھاڑو دینے آتی ہے اُسے کاغذ کی گولیاں مارتا ہے......"

"اف منظر وہ خبر کیا تھی؟ مجھے یہاں اخبار نہیں ملا۔"

"خبر اچھی تھی۔ کم سے کم ایک نے تو فضول کام چھوڑ کے پرانا پیشہ اختیار کر لیا۔ تمہاری وکیلن بھی لوٹ آئیں وکالت کی طرف۔ وہ سالا غالب کی دُم پھر صحافت شروع کر دے حماقت چھوڑ کے....."

میں نے چلّا کے کہا "بکواس کیے جا رہا ہے۔ خبر سُنا مجھے۔ کیا یہ سچ ہے کہ گل بانو پھر ناگ منی بن گئی ہے؟"

"نہیں۔ اخبار نے آخر میں نوٹ لگا دیا تھا کہ آج ساری خبریں جھوٹی شائع کی گئی ہیں۔ اب اتنی بڑی واردات کی اس نے اپنے گروہ کے ساتھ۔ تصویر شائع ہو گئی۔"

"جب واردات ہو رہی تھی تو کیا اخبار کا فوٹو گرافر بھی ساتھ تھا کہ تصویر بنا لی؟" میں نے کہا "منظر' یہ کوئی سازش ہے یا فراڈ۔ واردات کسی اور نے کی' نام گل بانو کا استعمال کیا۔ پرانا نام۔"

"یہ ہو سکتا ہے۔ اس نام کی ایک گُڈول تھی' ساکھ تھی۔" منظر نے مجھ سے اتفاق کیا "اس کا مطلب یہ ہے کہ اب کوئی شیش ناگ بھی دوبارہ پیدا ہو سکتا ہے۔ بہرام ڈاکو اور سلطانہ ڈاکو پھر جنم لے سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "واردات کیا تھی؟"

"کوئی گودام لوٹا تھا۔ پھر انہوں نے اخبار کے دفتر فون کر کے خود ہی اطلاع دی کہ یہ کارنامہ کسی اور سے منسوب نہ کیا جائے۔ میں ناگ منی ہوں اصلی۔ تم کانپ رہے ہو دہشت سے یا میں خود آؤں؟ کوئی سب ایڈیٹر تھا' اس نے مذاق سمجھا۔ تصدیق پر بات دُرست ثابت ہوئی۔"

"چنانچہ اس نے ریکارڈ سے ناگ منی کی پرانی تصویر نکالی اور لگا دی۔ خبر کے ساتھ۔ میں سمجھ گیا۔" میں نے محسوس کیا کہ میرے ذہن سے ایک بوجھ اُتر گیا۔

"مجھے وقار یوسف کی بیوی نے ایک کہانی سنائی تھی۔ گپ لگانے میں اس کا ثانی نہیں۔ جاسوسی ناول پڑھتی ہے' جا... فلمیں دیکھتی ہے۔"

"وہ سب میں نے بتایا تھا اُسے۔ وہ سچ تھا۔"

"اس نے تو کہا تھا کہ تم باڑے سے کوئی توپ خرید کے لا رہے ہو۔ اتنی بڑی کہ ایک گولا چلاؤ گے اور سب خلاص۔ یہ بھی سچ ہے۔ اچھا میں چلا واپس سوئے میخانہ۔ میرا مطلب ہے غسل خانہ۔ دوبارہ کال کر لینا۔"

"اتنا تو بتا جا کہ ان کی کوئی خبر ہے۔"

"خبر یہ ہے کہ کوئی خبر نہیں۔" اس نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔ میں نے چشمِ تصور سے اسے پاجامہ پکڑے باتھ روم کی جانب فرار ہوتے دیکھا اور اس کی حالت پر مسکرائے بنا نہ رہ سکا۔

میرا شک تو دور ہو گیا تھا مگر میں سوچ رہا تھا کہ اخبار مل جاتا تو میں خود خبر پڑھ لیتا اور مجھے اطمینان ہو جاتا کہ یہ گل بانو کے خلاف سازش تھی یا واقعی دوسری ناگ منی کہلانے کے لیے کوئی خاتون شوقیہ ڈاکے ڈالنے لگی ہیں۔ ہر صورت میں نقصان گل بانو کا تھا۔ اگر پولیس' ناگ منی کی پرانی فائلیں پھر کھول دے۔ خیر ان معاملات سے واپس لاہور جا کے نمٹا جا سکتا تھا۔ منظر سے مجھے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ وقار یوسف کی بیوی انجم سے میری جو بات ہوئی تھی وہ اس نے اپنے انداز میں نمک مرچ لگا کے شوہر کو بھی بتا دی تھی اور منظر کو بھی۔ غالب اور نازو ہنوز لاپتا تھے اور ناگ منی والی خبر سے تو یہ اندازہ ہوتا تھا کہ اب اگر محسن بھی ناگ منی کے ساتھ ڈاکو بنا ہو گا تو شاید اس نے اپنا نام ابھی تک سسپنس کے لیے استعمال نہیں کیا ورنہ بہرام ڈاکو اچھا نام تھا۔ محسن کو ایک ڈاکو کے روپ میں دیکھنے کا خیال ہی مضحکہ خیز تھا۔ ایسے موقع ملتا تو وہ فلموں میں بھی لُٹ جانے والے کا کردار قبول کرتا' ڈاکو کبھی نہ بنتا۔

آصف علی میری طرح پُرسکون نہیں رہ سکتا تھا۔ عام آدمی کا ایسے حالات سے سابقہ نہیں پڑتا جن کے ہم عادی تھے۔ کچھ اس کی عمر کا تقاضا بھی تھا چنانچہ اس کی قوتِ برداشت جواب دے رہی تھی۔

"بھئی کبیر میاں! میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آخر تم کیا کر رہے ہو۔ یہ فون پر تم کس سے ہنسی مذاق کر رہے تھے؟ یہ وقت ہے ایسی باتوں کا!"

میں نے کہا "پھر آپ بتائیں میں کیا کروں؟"

"میں بتاؤں! یعنی تم خود کچھ نہیں کرو گے۔ بس ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہو گے اور انتظار کرو گے؟"

"دیکھیے میں نے ابھی اپنے دوست کو بھی نہیں بتایا کہ رابعہ اور کاجل کو واقعی اغوا کر لیا گیا ہے۔ صرف اندیشے کا اظہار کیا تھا۔ وجہ یہ ہے کہ ابھی میں خود یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔

ایسے تو عامر کے خلاف رپورٹ لکھوانا ہی کیا مشکل ہے کہ اس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کے انتقامی کارروائی کی ہے' وجہ بھی بنتی ہے مگر کیا یہ مناسب ہوگا؟ آپ چاہیں گے ایسا؟"

"نہیں۔ یہ تو نہیں چاہتا میں لیکن..."

اس کی بات انٹرکام کے بزر سے ادھوری رہ گئی۔ اس نے ریسیور اُٹھا کے کہا "کیا بات ہے؟"

"سر! پولیس آئی ہے۔" چوکیدار نے کہا۔

"پولیس!" آصف علی گھبرا گیا "کیوں' خیر تو ہے۔ اچھا چھوڑو' میں خود پوچھ لوں گا۔ اندر لے آؤ کسی افسر کو۔ بس ایک آدمی کو' باقی کو باہر روک لو۔"

"جناب! وہ زبردستی اندر گھس گئے تھے......"

اسی وقت اندر سے ملازم نے چلا کے کہا "کہاں جا رہے ہو تم لوگ منہ اٹھا کے؟ ادھر کچن ہے۔ صاحب اُدھر ہیں۔"

کسی نے دروازے کو دھکا دیا پھر ایک پولیس انسپکٹر اندر آگیا۔ اس کے پیچھے تین پولیس والے تھے۔

"یہ کیا تماشا ہے؟" آصف علی نے چراغ پا ہو کے کہا "اس طرح گھر کے اندر داخل ہونے کی جرات کیسے کی تم نے؟"

میں نے بھی کہا "وارنٹ کے بغیر کسی کے گھر میں گھسنا بھی جرم ہے۔"

پولیس والوں نے اپنی بندوقوں کا رخ میری طرف کردیا تھا جیسے میں ان پر فائر کرنے والا ہوں یا فرار ہونے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ ان کی اس حرکت نے مجھے چوکنا کردیا۔ یقیناً دال میں کچھ کالا تھا۔

"وارنٹ ہیں ہمارے پاس۔" انسپکٹر نے ایک کاغذ لہرا کے دکھاتے ہوئے کہا "تم ہو شرافت علی نقوی؟"

میں نے کہا "اگر ہوں تو پھر؟"

"یہ شرافت علی نقوی نہیں ہے۔" آصف علی نے برہمی سے کہا۔

"آپ خاموش رہیں جی۔ پوری اطلاعات ملنے کے بعد چھاپا مارا ہے ہم نے۔ ہمیں معلوم ہے' یہاں یہ کبیر خاں کے نام سے چُھپا ہوا تھا۔"

"چھپا ہوا کیا مطلب! یہ مہمان ہے میرا۔"

"سوری آصف علی صاحب۔ ہم اسے گرفتار کرنے آئے ہیں۔" انسپکٹر نے کہا "بہتر ہے آپ مداخلت نہ کریں ورنہ..."

"ورنہ کیا۔ تم مجھے سرکاری فرائض کی انجام دہی میں رُکاوٹ کا مجرم بنا کے میرے ہاتھوں میں بھی ہتھکڑی ڈال دو گے۔ میں بات کرتا ہوں ڈی آئی جی سے۔" آصف علی نے چلا کے کہا۔

"ضرور کریں۔ میرا نام ہے انسپکٹر نذیر چوہدری۔" اس نے رعونت سے کہا اور پھر سپاہیوں سے مخاطب ہوا۔ "کس بات کا انتظار ہے تمہیں؟"

سپاہی مجھے پکڑنے کے لیے آگے بڑھے۔ ان میں سے ایک نے بیلٹ کے ساتھ ہتھکڑی لگا رکھی تھی۔

میں نے کہا "میرا جرم تو بتا دیں مجھے۔"

"آپ پر ایک قبائلی سردار آفریدی کے قتل میں ملوث ہونے کا الزام ہے۔ اسے گاڑی میں بم رکھ کے ہلاک کیا گیا تھا۔ وہ آپ سے ملنے آیا تھا مگر آپ فوراً جائے واردات سے فرار ہوگئے۔ ہمارے پاس بیانات ہیں چشم دید گواہوں کے۔"

میں سمجھ گیا کہ انکار کی گنجائش نہیں رہی۔ پولیس بعض اوقات حیرت انگیز ذہانت اور مستعدی کا ثبوت دیتے ہوئے گم شدہ سُراغ بھی ڈھونڈ نکالتی ہے۔

"میں بھی بیان دینا چاہتا تھا۔" میں نے ہتھکڑی پہن کے کہا۔

"ضرور دینا۔ ہم بھی بیان لینے کے لیے ہی تھانے لے جا رہے ہیں تمہیں' سہرا باندھنے کے لیے نہیں۔"

"سہرا بعد میں پڑے گا جی گلے میں۔" ایک ہیڈ کانسٹیبل نے ہاتھ سے پھانسی کا پھندا بنا کے سہرے کا مفہوم واضح کیا "چلو دولہا جی۔"

میں نے کہا "ایک منٹ۔ آصف صاحب! اب اغوا کی رپورٹ لکھوانے میں دیر مت کریں۔ یہ رپورٹ آپ لکھوائیں گے۔"

"لو جی۔ ہم پر دن دھاڑے دُلہا کے اغوا کا الزام آرہا ہے۔" حوالدار بولا۔

میں نے اسے گھور کے دیکھا "پولیس میں خواہ مخواہ آگئے تم۔ کامیڈین ہونا چاہئے تھا تمہیں فلموں میں۔"

انسپکٹر نے ناگواری سے کہا "کیا ہونا چاہیے اور کیا نہیں ہونا چاہیے یہ سبق مت پڑھاؤ ہمیں۔ شرافت سے چلو شرافت علی نقوی۔"

میں نے کہا "آصف صاحب! کسی وکیل سے بات کرلیں ورنہ ایک فون نمبر نوٹ کرلیں۔"

اب انسپکٹر نے مجھے دھکا دیا "کس کا نمبر ہے۔ گورنر کا یا وزیر اعظم کا؟ اونچا فنکار ہے بھئی' ذرا تلاشی لو اس کی۔"

حوالدار اُچھل کے میرے سامنے آگیا۔ وہ چھوٹے قد کا گول مٹول سا شخص تھا جسے دیکھ کر جنگلی مینڈک کا خیال آتا تھا جو برسات میں رات کے وقت کبھی کبھی کرخت آواز میں ٹراتے ہیں۔ اس کی آواز بھی ایسی ہی تھی۔

"کھڑا ہو جا" اس نے عادتاً مجھے ایک گالی دے کر کہا۔ کسی بھی شریف آدمی کو وہ ابتدا ہی سے مجرم فرض کرلیتے ہیں اور ملزم ہونے

کی صورت میں حاصل ہونے والی مراعات سے فوراً محروم کردیتے ہیں۔ ان کا بس چلے تو وہ محض الزام پر بھی قتل کے ملزم کو خود پھانسی چڑھا دیں۔

جامہ تلاشی میں آفریدی کا ریوالور برآمد ہوگیا۔ یہ باڑے کا بنا ہوا دیسی ساخت کا ریوالور تھا جسے سب ہی پہچان سکتے تھے۔ اور یہاں کون نہیں جانتا تھا کہ ایسے کھلونے راہ چلتے دس میں سے نو افراد کے پاس ہوتے ہیں مگر میری حیثیت ذرا مختلف ہوگئی تھی۔

"آلۂ قتل برآمد ہوگیا چوہدری صاحب۔ مبارک ہو۔" حوالدار نے بے حد مسّرت سے اعلان کیا۔

انسپکٹر نے کہا "لکھو کہ گرفتاری کے وقت ملزم مسلح تھا۔ اس کے پاس بغیر لائسنس کا اسلحہ تھا۔"

"تم نے مجھ سے پوچھا ہی نہیں کہ لائسنس ہے؟"

انسپکٹر نے میرے ایک تھپڑ مارا "مجھے معلوم ہے۔"

اگر لائسنس ہوتا تو میں اس تھپڑ کا جواب دیتا مگر اب مجھے بلاوجہ بول کے تھپڑ کھانے کا افسوس ہوا۔ میں ان کے ساتھ باہر نکلا اور پولیس کی وین میں دھکیل دیا گیا جو گیٹ سے اندر آکے پورچ میں کار کے پیچھے رُک گئی تھی۔ اگر ہم رُکے بغیر ناصر پور چلے جاتے تو شاید میں ایسے گرفتاری دینے پر مجبور نہ ہوتا لیکن ہونے والی بات ہو کے رہتی ہے۔

پولیس کی گاڑی روانہ ہوئی تو میں نے آصف علی کو ہاتھ ہلایا جو سخت دُکھی اور پریشان اکیلا کھڑا تھا۔ اس کی بیوی اور بیٹی کے اغوا کا مسئلہ حل نہیں ہوا تھا کہ میں نے گرفتار ہو کے اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور اس کے لیے پریشانیوں کا نیا باب کھول دیا۔ شاید وہ سوچنے پر مجبور ہو گا کہ مجھے خوش قسمتی نہیں' اس کی شامت اعمال یہاں لے آئی تھی۔ جسے وہ ایک سزا کا اختتام سمجھ رہا تھا وہ اسی سزا کا تسلسل تھا یا دوسری سزا تھی۔

بظاہر گردش حالات ہمارے لیے بھی بدلی نہیں تھی۔ وقت ضرور بدل گیا تھا اور ہم مسافرت کے پُر مصائب دور سے گزر کے ایک سعی لاحاصل کے بعد اور احساس زیاں کے ساتھ وطن لوٹ آئے تھے مگر یہاں آتے ہی میں زندگی نے دوسرا کھیل شروع کردیا تھا جو زیادہ ظالمانہ تھا۔ زیست سے موت تک ہزار جان لیوا مرحلوں سے گزر کے میں نے رابعہ کے ساتھ اور غالب نے نازو کے ساتھ واپسی اختیار کی تھی اور جب سلامتی کی منزل آگئی تو ہم سب پھر بچھڑ گئے تھے۔

رابعہ اور میں قتل کے الزام سے بچنے کے لیے لاہور سے بھاگے تھے مگر یہاں آکے رابعہ اور کاجل لاپتا ہوگئیں اور میں شرافت علی نقوی بن کے ایک ہمدرد دوست کو قتل کرنے' بلا لائسنس اسلحہ رکھنے اور بہت سے دوسرے جرائم میں ملوث ہوگیا۔ مجھے یقین تھا کہ مجھ پر ٹائم بم جیسا ممنوعہ اور خطرناک اسلحہ رکھنے کا جرم بھی ثابت ہوگا۔ نام بدل کے پولیٹکل ایجنٹ کو دھوکا دینے سے لے کر ریسٹ ہاؤس کو بم سے اُڑانے تک ان گنت مقدمات قائم ہوجانے کے بعد میری ضمانت بھی ممکن نہیں رہے گی اور "دیگر" جرائم کی تفصیلات جاننے کے لیے پولیس مجھ سے جس طرح تفتیش کرے گی' اس کا سوچ کے ہی مجھے ہول آتا تھا۔ نہ یہاں منظر میری مدد کرسکتا تھا نہ وقار یوسف۔ میری وکیلِ صفائی مس رابعہ قاری ایڈووکیٹ ہائی کورٹ لاہور تو خود شریکِ جرم قرار دی جاسکتی تھیں چنانچہ "پ ش" تھیں۔

ایک دم جیسے کائنات کی تمام پُراسرار شیطانی قوتیں مل کے ایم آر ایس کو تہس نہس کردینے پر تل گئی تھیں۔ غالب اور نازو کو بھی کسی نے اغوا کرلیا تھا اور اغوا کرنے والا اتنا دلیر تھا کہ نوشہرہ کے ملٹری اسپتال میں غالب کا بھائی بن کے پہنچا اور انہیں نکال لے گیا۔ ناقابلِ یقین انداز میں محسن اور گل جن کو ہم نے بحفاظت سب سے پہلے ہوائی جہاز سے کراچی بھیجا تھا' اکرام شیخ سے ملے بغیر نہ جانے کس طرف نکل گئے تھے اور اب ہم ایسی ناقابلِ یقین کہانیاں خبروں کی صورت میں سُن رہے تھے کہ گل پھر ناگ منی بن گئی ہے۔ ڈاکوؤں کے گروہ کی سردار۔ اور وہ ڈاکے ڈالنے لگی ہے

اور محسن یقیناً اس کے ساتھ تھا۔ ہم سب جو وطن پہنچ کے امن' سکون اور عافیت کی زندگی گزارنے کا عزم رکھتے تھے' مجرم بن چکے تھے یا مجرموں کے یرغمال تھے۔ قانون کے لمبے ہاتھ ہماری طرف بڑھ رہے تھے اور ہم محصور ہوتے جارہے تھے۔ اگر یہ پُرانے شکاری تھے جو ہمارے لیے جال پھیلانے میں کامیاب ہورہے تھے تو ہم جو ایم آر ایس کی تنظیم کو ختم کرچکے تھے' بڑا کمزور شکار ثابت ہورہے تھے۔

پولیس کی وین میں کسی نامعلوم منزل کی طرف جاتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ ایم آر ایس کو ختم کرنا ہماری جذباتی غلطی کے سوا کچھ نہیں۔

ایم آر ایس یا مائٹ از رائٹ سوسائٹی بھلا کیسے ختم ہوسکتی ہے۔ جس معاشرے میں انصاف اور عدل کے اصولوں پر لاقانونیت اور جبرواستبداد کے علمبردار' دولت مندی کے غرور میں مبتلا فرعون صفت افراد اور اخلاقی قدروں کو پاؤں کی ٹھوکر میں رکھنے والے حکمراں ہوں وہاں جنگل کا قانون ہی چلتا ہے۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔

اور وہاں بیٹھے بیٹھے میں نے ایم آر ایس کو پھر فعال کرنے کے احکامات جاری کردیے۔ فی الحال صرف اپنے لیے۔ باقی لوگ میرے خیال اور تصور سے بھی دور تھے اور ٹیلی پیتھی سے بھی میں اپنا فیصلہ انہیں نہیں سُنا سکتا تھا۔

میں پشاور کے راستوں سے ناواقف تھا لیکن گاڑی کو چلتے ہوئے بیس منٹ ہوگئے تو مجھے خیال آیا کہ آخر اس تھانے کی عملداری کی حد کہاں سے کہاں تک ہے۔ کسی بھی شہر میں ایک تھانے کا علاقہ میلوں تک نہیں پھیلا ہوتا۔

میں نے کہا "تمہارا کیا نام ہے چھوٹے موٹے حوالدار..."
حسب توقع اس نے مجھے گالی نہیں دی اور اس گستاخانہ طرزِ تخاطب پر جھانپڑ سے سُرخرو بھی نہیں کیا "یہی نام ہے میرا" وہ مسکرا کے بولا۔
میں نے کہا "تم دل کے بُرے نہیں لگتے مجھے۔"

وہ مسکراتا رہا "صورت کا بُرا ہوں کیا؟"
"معاف کرنا' تمہاری صورت دیکھ کے مجھے جنگلی مینڈک کا خیال آیا تھا۔ عام مینڈک کے مقابلے میں بس اتنا ہی بڑا ہوتا ہے وہ جتنا گولی کے مقابلے میں گولا۔ ویسے ہی ٹراتے بھی ہو تم۔ کیا یہ خاندانی صفات ہیں؟"

وہ مشتعل نہیں ہوا تو مجھے مزید حیرانی ہوئی۔ دونوں کانسٹیبل مستعد ضرور تھے مگر دانت نکال رہے تھے "ہم اسے کدو شاہ بولتے ہیں۔"

میں نے کہا "کدو شاہ! یہ آخر پشاور کا تھانہ جنگل میں کیوں بنایا گیا ہے؟ پشاور تو غیر علاقہ نہیں ہے کہ یہاں تھانہ قائم کرنا مشکل ہو۔ بہت دور آگئے ہیں ہم۔ اور کتنی دور جانا ہے۔ کون سی جگہ ہے یہ؟"

"یہ جی ٹی روڈ ہے" کدو شاہ نے کہا۔
کچھ دیر بعد شہر کی نئی آبادی شروع ہوگئی جو راولپنڈی کے سیٹلائٹ ٹاؤن یا لاہور کے گلبرگ جیسی تھی۔ اب مجھے تشویش لاحق ہونے لگی۔ آخر یہ لوگ مجھے کس تھانے میں لے جارہے ہیں؟ اور کیا واقعی تھانے لے جارہے ہیں؟ شہر سے باہر تھانے بھی تو ہوتے ہیں۔
وین ایک کوٹھی کے گیٹ پر رُکی تو میرا شک یقین میں بدل گیا کہ مجھے تھانے نہیں لایا گیا۔ گیٹ کھلا اور وین کے گزرتے ہی پھر بند ہوگیا۔
"یہ کیا جگہ ہے؟" میں نے کہا "یہ تھانہ نہیں ہے۔"
"تھانے جائیں آپ کے دشمن دلہا میاں۔" حوالدار کدو شاہ نے خوش دلی سے کہا "تشریف لائیے' یہ بھی آپ ہی کا گھر ہے۔"
میں نے نیچے اُتر کے عالی شان کوٹھی کو دیکھا۔ وین کے اگلے حصے سے اُتر کے آنے والا انسپکٹر بھی اب بالکل مختلف آدمی لگ رہا تھا۔

"سوری مسٹر سکندر بخت! وہ سب ضروری تھا جو رویّہ میں نے آپ کے ساتھ روا رکھا۔" اس نے انگریزی میں کہا۔
"کون ہو تم لوگ؟ تم پولیس مین نہیں ہو؟" میں نے کہا۔
"مجھے ڈر تھا کہ تم فوراً سمجھ جاؤ گے۔ اس کا مطلب ہے میری ایکٹنگ اچھی رہی۔"

میں نے ایک دم لات گھمائی "ایکٹر کی اولاد۔"
وہ بڑی پُھرتی سے پیچھے ہٹ گیا "یہ سب نہ کریں پلیز! میں سوری کہہ چکا ہوں۔ اگر مقابلہ ایسے ہی کرنا ہے تو پھر کریں گے۔ تمہیں اندازہ ہوجائے گا کہ ہم تمہیں اسلحے کی مدد کے بغیر بھی گرفتار کرکے لاسکتے تھے۔"
حوالدار کدو شاہ نے کہا "یہ جو سپاہی تم کو ہتھکڑی لگائے کھڑا ہے' یہ بھی بلیک بیلٹ ہے۔ بس میں کچھ نہیں ہوں کدو شاہ ہوں یا وہ جنگلی مینڈک۔"

اسی وقت پیچھے کا دروازہ کھلا اور برآمدے میں ایک شخص نمودار ہوا۔ میں نے پلٹ کے دیکھا اور حیرت سے میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

● ●

میرے سامنے میرا پرانا حریف سب سے خطرناک شکاری بدترین دشمن چوہدری دلاور موجود تھا۔ اس کی صورت پر وہی دھوکا دینے والی مسکراہٹ تھی جس کا مطلب دوست اور دشمن سب ہی غلط نکالتے تھے۔ جب اس کے دل میں کینہ اور عناد کا زہریلا اژدہا پھنکارتا تھا تو اس کے لبوں پر شہد سے زیادہ میٹھی مسکراہٹ آجاتی تھی۔ اس کے وجود میں نفرت کا جوالامکھی ابلتا تھا ہونٹوں پر محبت کے پھولوں کی خوشبو میں بسی مسکراہٹ جاگ اٹھتی تھی۔ وہ ایک ایسا جادوگر تھا جو اپنے ظاہر میں باطن کا عکس یوں دکھاتا تھا کہ دیکھنے والے کی نظر کو فرق کا احساس ہی نہ ہو۔ اس کے چہرے کا تاثر اور اس کی مسکراہٹ کسی گٹر لائن کے ڈھکنے کی طرح تھی مگر وہ ڈھکنا اٹھائے کہتا تھا کہ دیکھو اندر کیسے خوش رنگ پھول کھلے ہوئے ہیں اور کیسی دل نواز خوشبو ہے۔ تو یہ بھی سچ لگتا تھا ورنہ کون نہیں جانتا کہ گٹر میں غلاظت اور تعفن کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔
اسے اچانک روبرو پاکے میرے ذہن کو جھٹکا لگا تھا مگر یہ جھٹکا ویسا ہی تھا جیسا جنگل میں اپنے سامنے زہریلے ناگ کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے۔ میں حواس کی تمام طاقتوں کے ساتھ مستعد اور محتاط ہوگیا تھا۔
وہ حیل جس میں اب تک چوہدری دلاور کے شامل رہا تھوں نے اپنے مہرے استعمال کیے تھے ایک ایسے نئے موڑ پر آگیا تھا جہاں اس نے خود سامنے آکے کوئی نئی چال چلنے کا فیصلہ کیا تھا۔
وہ آہستہ آہستہ آگے آیا "کیا مجھے پہچاننے کی کوشش کررہے ہو؟ میں اتنا تو نہیں بدلا ہوں اپنے سکندرِ اعظم صاحب۔"
میں نے اپنے لہجے میں نفرت اور حقارت بھر کے کہا "تم چاہو تب بھی بدل نہیں سکتے دلاور۔ سانپ صرف کینچلی بدلتا ہے۔ اس کی فطرت بھی وہی رہتی ہے عادت بھی اور صورت بھی۔"
اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا "چھوڑو جی یہ پُرانیاں گلاں ہوگئیں ہیں جی۔ وقت کو دیکھو کہاں سے کہاں نکل گیا۔"
"میرا اور تمہارا وقت ابھی ختم نہیں ہوا۔ اور جب تک گزرے ہوئے وقت کا حساب برابر نہیں ہوتا میں اپنا ہاتھ آگے بڑھاؤں گا تو صرف تم پر وار کرنے کے لیے..."
وہ ہنسا "او یار زوار از او ور۔ اب وار کی بات بھول جاؤ۔ بہت وار کرلیے تم نے بھی۔ ہیں جی۔ اور ہاتھ کیا آیا تمہارے اس وار میں؟ چلو ملاؤ ہاتھ۔ تم نے گزرے ہوئے وقت کے حساب کی بات کی ہے تو کرلیتے ہیں حساب بھی۔"
میں نے اپنا ہاتھ پیچھے کرلیا "تم جس وار کی بات کررہے تھے دلاور' اس میں تم میرا ساتھ دیتے تو شاید ایک ہموطن ہونے کے ناتے میں کبھی سوچتا کہ اپنا معاملہ روزِ محشر کی عدالتِ انصاف کے سپرد کردوں۔ ذاتی انتقام کے جذبات حاوی ہوں تو خود منصفی کیسے منصف ہوسکتا ہے مگر میرے اور تمہارے درمیان اب صرف ذاتی دشمنی نہیں۔ تم غدار اور وطن دشمن بھی ہو۔ تم نے میرے وطن کو دولخت کرنے والوں کے ہاتھ مضبوط کیے تھے۔ تم ان دشمنوں سے بدتر ہو جو مذہب یا قومیت کی دلیل پر میرے دشمن ہیں۔ مجھے جب بھی موقع ملا میں تمہیں قتل کردوں گا۔ تمہیں بھی اور تمہارے ان حواریوں کو بھی جن کے چہرے بے نقاب ہوچکے ہیں۔"
دلاور کی مسکراہٹ کافور ہوگئی "تم بہت وہ ہو۔ ہیں جی' کیا کہتے ہیں اسے۔ ناعاقبت اندیش؟ اُردو اپنی ایسی ہی ہے عاقبت نااندیش۔ خیر دفع کرو۔ کُتے کی دُم سے بات سمجھ آجائے تو پھر اتنی فارسی بولنے کی کیا ضرورت ہے۔"
"اگر تم بڑے دوراندیش ہو تو موقع سے فائدہ اٹھاؤ دلاور اور اپنے ان حکم کے غلاموں سے کہو کہ مجھے زندہ لوٹ کر نہ جانے دیں۔ میں بالکل خالی ہاتھ اور نہتا ہوں' یہ سب مل کر مجھے شوٹ کرسکتے ہیں اور یہیں گاڑ سکتے ہیں۔ میں بالکل تیار ہوں مرنے کے لیے دلاور۔ کم سے کم ایک دشمن تو کم ہوگا تمہارا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس سے فرق کوئی نہیں پڑے گا۔ تم جانتے ہو' سکندر ایک نام نہیں ہے۔ یہ ایک جذبہ ہے' ایک طاقت ہے' یقین اور اتحاد کی۔ اور ایک تنظیم ہے۔"
"ایم آر ایس؟" اس نے طنز اور تمسخر کے ساتھ کہا۔
"ہاں! ایک ایم آر ایس تم جیسے لوگوں کی ہے جو معاشرے میں لاقونیت' بے ضمیری' ناانصافی اور بدباطنی کے فروغ میں وہی کردار ادا کررہے ہیں جو ابلیس ساری دنیا میں کرتا ہے..."
"اور یہ دوسری ایم آر ایس تم جیسے فرشتوں نے بنائی ہے۔"
دلاور نے بُرا مانے بغیر طنزیہ انداز میں میری بات کاٹ دی "ہم جیسے لوگوں کو نیست و نابود کرنے کے لیے۔ ہیں جی۔ یار یہ نیکی بدی کی جنگ تو ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گی مگر شیطان کے وجود کو ختم کرنے کے لیے فرشتے کبھی مقابلے پر نہیں آئے۔ خدا نے بھی اسے کُھلی چُھٹی دے رکھی ہے۔ بندوں کو سمجھانے کے لیے نبی اور ولی ضرور آتے رہے۔ تم کیا چیز ہو آخر اپنے سکندر صاحب! کبھی غور فرمایا آپ نے؟"
میں نے کہا "میں خدائی فوجدار ہوں۔ تم جانتے ہو۔"
وہ خوش دلی سے ہنسا "اچھا جی ہم مان لیتے ہیں۔ اب اندر چلو۔ میں نے تمہیں نیک نیتی کے ساتھ بلایا ہے۔ کچھ باتیں کرنے کے لیے اور کچھ سمجھنے سمجھانے کے لیے۔"
میں نے کہا "اپنی نیک نیتی کا ثبوت تم نے پہلے ہی دے دیا ہے۔"
مگر میری بات مکمل ہونے سے قبل ہی وہ پلٹ کے اندر چلا گیا تھا اور شاید جاتے جاتے پولیس کی وردی میں ملبوس افراد کو اشاروں کی زبان میں ان کا فرض یاد دلا گیا تھا۔
انسپکٹر غرایا "اب آپ اپنے پاؤں پر چل کے اندر جاؤ گے یا..."

میں نے مسکرا کے کہا "کیا تم مجھے موقع دو گے؟"

"کس بات کا موقع؟" وہ حیران ہو کے بولا۔

"یہی کہ میں اپنے پیروں پر چل کے اندر جاؤں، تمہاری لاش اپنے لئے مجھے اٹھا کے لے جاؤں۔ باری باری تم سب کی۔"

وہ مسکرایا "تمہیں شکایت ہے ہم نے تمہیں کوئی موقع فراہم نہیں کیا اپنی بہادری کے جوہر دکھانے کا۔ یہ موقع ضرور ملے گا تمہیں۔"

چھوٹے گول مٹول حوالدار نے دانتوں کی نمائش کی "مجھ سے لڑو گے ٹارزن؟"

"ٹارزن کا کسی جنگلی مینڈک سے کیا مقابلہ؟" انسپکٹر نے اسے بڑا واضح اشارہ کیا۔

اس سے پہلے کہ میں کوئی مناسب جواب دیتا' حوالدار نے مجھ پر بالکل کسی جنگلی مینڈک کی طرح جست لگائی اور اس کے پاؤں میرے سینے پر دھم سے گُرز کی طرح لگے۔ اس قدوقامت اور جسامت کے ساتھ ایسی پھرتی کا مظاہرہ میرے لیے بعید از قیاس تھا۔ اس کی قوت میں ایک وحشیانہ شدت تھی جس کا اندازہ حوالدار کے مضحکہ خیز اطوار اور مظلوم و مسکین چہرے سے نہیں ہوتا تھا۔

میں ایک دم لڑکھڑا کے پیچھے گرا۔ میرے اٹھنے سے پہلے ہی حوالدار دوبارہ مجھ پر حملہ آور ہوا مگر اب میں بھی خطرے کو محسوس کر لینے والے حیوان کی فطری جبلت کے ساتھ مقابلے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ میں نے اپنی ٹانگیں سمیٹ لیں اور عین اس وقت جب وہ میرے اوپر آیا میں نے ٹانگوں کو جھٹکے سے اوپر اٹھایا۔

میرے دونوں پاؤں اس کے پیٹ پر لگتے تو وہ توپ سے نکلے ہوئے گولے کی طرح اُڑتا ہوا جاتا اور دیوار سے ٹکراتا مگر سیکنڈ کے ہزارویں حصے کا فرق بھی بعض اوقات ساری امیدوں کو خاک میں ملا دیتا ہے۔ شاید اس نے بھی اندازہ کر لیا تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔

اس نے ایک دم سر جھکا کے غوطہ مارا اور میں فضا میں ٹانگ چلا کے رہ گیا۔ میرے پاؤں میں جھٹکا آیا مگر اس کے باوجود میں تیزی سے پلٹ گیا اور حوالدار کو میری ٹانگوں میں گھسنے کا موقع نہ ملا۔ وہ مُنہ کے بل زمین پر گیا۔

کوئی اور ہوتا تو اس صدمے سے فوراً سنبھل نہ پاتا مگر اس نے ریچھ کی طرح غرا کے بلند آواز میں کہا "یا علی مدد" اور ایک سیکنڈ میں پھر کھڑا ہو گیا۔

یہ ایک سیکنڈ کی مہلت بھی میرے لیے بہت تھی۔ میں نے اس کو اپنے مقابل دیکھا تو اس کا چہرہ لہولہان تھا۔ اس کی ناک سے خون کی ایک لکیر بہہ کے ہونٹوں تک آ رہی تھی۔ ہونٹوں کے ایک پھٹے ہوئے کنارے سے خون رِس رہا تھا اور ماتھے کی کھال پھٹ جانے سے پیشانی بھی لہو آلودہ دکھائی دیتی تھی۔

میں نے بائیں پاؤں کی ایڑی پر گھوم کے لات کو ایک دائرے میں حرکت دی۔ یہ ایک انتہائی خطرناک داؤ تھا۔ میری ٹائمنگ بھی تباہ کن تھی اور مجھے یقین تھا کہ جیسے ہی حوالدار کھڑا ہو گا میری ٹانگ اس کے پیٹ پر یوں لگے گی جیسے ہیلی کوپٹر کے تیزی سے گردش کرنے والے پنکھے کا ایک بازو کسی سے ٹکرا جائے چنانچہ مجھے اس وقت سخت حیرت کا سامنا کرنا پڑا جب میں اپنے ہی زور میں دوسری بار گھوم گیا۔

ناقابلِ یقین سُرعت کے ساتھ حوالدار نے خود کو میری لات کی سویپ سے بچالیا تھا۔ کچھ قدرتی فائدہ اسے اپنے قد کی کوتاہی سے بھی حاصل رہا اور وہ مخالف سمت میں نکل گیا۔

میری لات کلاک وائز حرکت میں تھی یعنی میں نے بائیں ایڑی پر دائیں جانب لات گھمائی تھی۔ وہ کلاک وائز آیا یعنی بائیں طرف سے اور دوسرے لمحے اس نے پیشہ ورانہ مشاقی کے ساتھ میری ٹانگ کو نیچے سے پکڑ لیا۔ نتیجہ صاف ظاہر تھا۔ میں نے خود کو فضا میں زمین سے چند فٹ اوپر یوں گھومتا پایا جیسے رسّی کے سرے پر بندھا ہوا پتھر۔

میں اتنا ہلکا پُھلکا بھی نہیں تھا اور نہ وہ جسمانی اعتبار سے مجھ پر برتری رکھتا تھا مگر یہ مارشل آرٹس کے وہ داؤ پیچ ہیں جن میں جسمانی طاقت سے زیادہ تجربہ' مہارت اور حاضر دماغی کام آتی ہے۔ میرا حریف جسے میں نے صورت شکل' قدوقامت اور اطوار کے باعث جنگلی مینڈک کا خطاب دیا تھا' جوڈو ہی نہیں تائی کوانڈو بھی جانتا تھا لیکن وہ مجھے دھوکا دینے میں کامیاب رہا تھا۔ انتہائی احمق اور بے ضرر نظر آنے والا شخص اتنا خطرناک تھا کہ مجھے اپنا انجام صاف نظر آنے لگا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ مختصر' پستہ قامت اور بھاری بدن شخص زیادہ دیر مجھے اوپر اٹھا کے گردش میں نہیں رکھ سکتا۔ اس نے تو میرے وجود کی حرکت پذیری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک جھٹکا دے کر مجھے گھما دیا تھا اور اب یہ بات یقینی تھی کہ توازن بگڑنے سے پہلے وہ مجھے چھوڑ دے گا۔ میں نیوٹن کے دوسرے قانونِ حرکت کے مطابق سیدھا اُڑتا ہوا جاؤں گا اور دیوار سے ٹکرا کے وہیں ڈھیر ہو جاؤں گا۔ فنونِ حرب کی کسی کتاب میں اور کسی نصاب میں ایسا کوئی طریقہ درج نہ تھا جسے یاد کر کے میں اپنے حریف کی گرفت سے بحفاظت نکل سکتا یا اسے مجبور کر سکتا کہ وہ میرے پنجے کو نہ چھوڑے۔

میرے بازو خود بخود پھیل گئے تھے اور میں کسی گلائیڈر کی طرح پرواز کر رہا تھا۔ یہ سب ایک دو سیکنڈ کی بات تھی۔ حسب توقع اس نے میرے پنجے کو اپنی گرفت سے آزاد کیا تو میں دیوار سے متصادم ہونے کے لیے بڑھا۔ اپنی گردن کو ٹوٹنے سے بچانے کی لاشعوری کوشش میں میرے ہاتھ خود بخود سر کے اوپر آ گئے اور میرا سر جھک گیا۔

اسی وقت وہ معجزہ رونما ہوا جس کی امید رکھنے کا خیال بھی

مجھے نہیں آسکتا تھا۔ اچانک مجھے یوں لگا جیسے میں کسی تنے ہوئے رسّے سے ٹکرا گیا ہوں۔ میں دیوار سے ٹکراتا تو یقیناً دو چار پسلیاں ضرور ٹوٹ جاتیں مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔ انسپکٹر نے ہاتھ بڑھا کے مجھے روک لیا تھا۔

میں ایک جھٹکے سے رُکا اور فرش پر گر گیا۔ یہ دوسرا حیران کُن صدمہ تھا جس سے سنبھلنے میں مجھے کچھ وقت لگا۔ جب مجھے یقین آ گیا کہ میں بالکل خیریت سے زندہ سلامت زمین پر اُتر چکا ہوں تو میں نے گردوپیش پر نظر ڈالی۔

مجھے اس صدمے سے دوچار کرنے والا حوالدار کدّو کچھ فاصلے پر کھڑا ہاتھ جھاڑ رہا تھا اور اس کے ساتھی ہنس رہے تھے۔

"ارے واہ رے کدّو" یہ آواز انسپکٹر کی تھی۔

انسپکٹر مجھ پر پیر رکھے اور اپنے ریوالور کا رخ میری طرف کیے کھڑا تھا۔ ریوالور کی نیلگوں جھلک والی سرد سفاک نالی کے اندر کہیں کوئی گولی بے چینی سے منتظر تھی کہ اسے اشارہ ملے تو میرے دل میں اُتر جائے۔

جب فلیش چمکا تو مجھے یاد آیا کہ ایسی ہی چمک میں نے پہلے بھی دو تین بار ضرور دیکھی تھی۔ پھر دلاور کے دہاڑنے کی آواز آئی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" اس نے نصف درجن گالیاں بڑے فراٹے کے ساتھ دیں "کیا کہا تھا تم سے میں نے' ہیں جی؟"

انسپکٹر نے اپنا پاؤں ہٹا لیا اور اپنا ریوالور بھی جیب میں ڈال لیا "سر جی' اس نے ہمیں مجبور کر دیا۔"

"مجبور کر دیا... اور تم مجبور ہو گئے!" دلاور نے حقارت کے ساتھ اس کا مذاق اُڑاتے ہوئے کہا "بڑے افسوس کی بات ہے انسپکٹر کہ تم اتنی آسانی سے مجبور ہو جاتے ہو۔ بڑے کمزور بندے ہو تم تو یار۔"

"آپ میری بات نہیں سمجھ رہے ہیں..." انسپکٹر مشتعل ہونے لگا۔

"اچھا؟ تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میں بے وقوف اور کوڑھ مغز بھی ہوں خیر سے؟" دلاور بولا۔

میں خفت اور شرمساری کے جذبات سے مغلوب کھڑا تھا اور اس حوالدار سے نظریں چُرا رہا تھا جس نے میرے غرور کو خود میری نظر میں عبرت آموز شکست سے دوچار کر دیا تھا۔ میں پولیس والوں سے اچھی طرح واقف تھا اور ماسوا چند ایک کے مجھے اس محکمے میں نیچے سے اوپر تک کاہل' جاہل حرامخور اور بے ضمیر لوگ ہی ملے تھے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ حوالدار کدّو جیسا شخص میرے سارے تصورات کو باطل کر دے گا۔ چھُپے رستم تو مجھے پہلے بھی ملے تھے مگر اس جنگلی مینڈک جیسے حوالدار کدّو کہلانے والے باکمال اور ماہرِ فن شخص کا پولیس کی وردی میں نظر آنا میرے لیے ایک ناقابلِ یقین تجربہ تھا۔ اگرچہ وہ میرا دشمن تھا مگر میں اس کا دل سے اعتراف کرنے پر مجبور ہو گیا کہ فنِ حرب میں اس کی واضح برتری کو تسلیم کروں۔

جب فائر کی آواز آئی اور حوالدار نے اچھل کے سینہ پکڑا اور میں نے اس کی دلخراش چیخ سُنی تو میرا دل ایک لمحے کے لیے دھڑکنا بھول گیا۔ میں نے نیچے گرتے ہوئے حوالدار کی طرف دیکھا اور پھر چوہدری دلاور کی طرف دیکھا جو اپنے ریوالور کی نال کو رومال سے صاف کر رہا تھا۔

"سُور کے بچے؟" میں نے چیخ کے کہا "یہ کیا کر دیا تو نے؟"

دلاور کے لبوں پر ایک سفاک مسکراہٹ آ گئی "مجھے حکم عدولی پسند نہیں۔ خاص طور پر اس وقت جب میرے زر خرید غلام میرے معزز مہمانوں کے ساتھ غلط سلوک کریں۔"

زر خرید غلام' معزز مہمان' غلط سلوک...... میرا دماغ ماؤف ہونے لگا۔ میری نظروں کے سامنے دلاور نے ایک سرکاری اہلکار کو قتل کر دیا تھا۔ سرکاری اہلکار زر خرید بھی ہو سکتے ہیں مگر ایک ایسی خطا پر جو خطا بھی نہیں تھی قتل کی یہ سفاکانہ سزا بہت بڑا جرم تھی۔ قانونی طور پر بھی اور اخلاقی اعتبار سے بھی۔ حوالدار نے اگر تھوڑی سی زیادتی کی تھی تو میرے ساتھ اور میری اشتعال انگیزی پر۔ میرے اور اس کے درمیان خالی ہاتھ ایک بے ضرر سا مقابلہ ہوا تھا جس میں اپنی برتری ثابت کرنے کے سوا حوالدار نے کوئی غلطی نہیں کی تھی۔

اب وہ میرے سامنے ایڑیاں رگڑ رہا تھا اور میں بہت دُکھ کے ساتھ اسے مرتا دیکھ رہا تھا۔ پشیمانی کا یہ احساس میرے ضمیر میں کانٹا بن کے اُتر گیا تھا کہ اس خون کے داغ سے میرا دامن بھی داغدار ہے۔

میں نے چلّا کے انسپکٹر کو گالی دی "بے غیرت' ذلیل کُتے! تم یہ سب کچھ سن کے اور دیکھ کے بھی کچھ نہیں کر رہے ہو۔ لعنت تم پر خدا کی! قتل تمہارے سامنے ہوا ہے۔ قاتل تمہارے سامنے موجود ہے۔ تم نے یہ وردی پہن رکھی ہے جو تمہیں اختیار دیتی ہے کہ اسے پکڑ لو۔ ریوالور بھی ہے تمہارے پاس..."

چوہدری دلاور نے ایک قہقہہ لگایا "اجی چھوڑو پراں۔ اپنے سکندرِ اعظم صاحب! یہ ایسی تقریروں کا وقت نہیں ہے۔ اور یہ تقریر کرنے کی جگہ بھی نہیں ہے۔ وہ کیا فرمایا ہے جی اپنے علامہ صاحب نے۔ اللہ نے آج تک اس ملک کی حالت نہیں بدلی جس کو احساس نہ ہو اپنی حالت خود بدلنے کا۔ تو یہ اپنا ملک ایسا ہی ہے۔ تقریروں سے کچھ ہوتا تو کیا بات تھی۔"

میں ہکا بکا اس شخص کی صورت دیکھ رہا تھا جو اس قتل پر ذرا بھی پشیمانی محسوس نہیں کر رہا تھا۔ جسے ذرا بھی خوف نہیں تھا کہ قانون اس کو گرفت میں لے سکتا ہے۔ میں دُکھ کے ساتھ اس قانون کے رکھوالے کو بھی دیکھ رہا تھا جس نے چند سکّوں کے عوض اپنی وفاداری ہی نہیں خودداری بھی بیچ دی تھی۔ وہ سرکاری اہلکار نہیں رہا تھا۔ دلاور کا کتا ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے ایک ماتحت کے

قتل پر زبانی احتجاج تک نہیں کیا تھا۔ وہ خاموش کھڑا تھا اور دلاور کی فضول باتیں سن رہا تھا۔ اس کی اخلاقی ذلت پر مجھے اتنا ملال اور اشتعال تھا کہ میرے بس میں ہوتا تو مار مار کے اس کی ... کر دیتا۔ اسے سر عام ننگا کرکے ذلیل کرتا اور اس کے گلے میں پٹا ڈال کے مجبور کرتا کہ کتے کی طرح بھونکے اور پھر قانون کے حوالے کردیتا کہ اس کو سزا دے۔

اچانک دلاور کی آواز سن کے میں پھر ہوش میں آگیا۔ اب وہ انسپکٹر سے مخاطب تھا۔

"میں نے تم سے کچھ پوچھا تھا اپنے تھانیدار صاحب۔ ہیں جی۔ آخر کس ...نے افسر بنا دیا تمہیں؟ کنٹرول ذرا بھی نہیں تمہیں کسی ماتحت پر۔ اور اتنے کمزور افسر کا کیا بھروسہ۔ کل کسی کے کہنے پر میرے خلاف کچھ کر بیٹھے۔"

"آپ کیسی بات کرتے ہیں سرجی!"

"سرجی کے بچے! جو میرے مہمانوں کے ساتھ ہوا کیا میرے ساتھ نہیں ہوسکتا۔ میرے حکم کی اگر اتنی ہی اہمیت ہے تمہارے لیے تو پھر کیا فائدہ میرے بکواس کرنے کا۔ تم میں سے کوئی مجھ پر بھی ریوالور نکال سکتا ہے۔"

انسپکٹر نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تھا مگر اچانک اس کے چہرے کا تاثر بدل گیا۔ وہ چلانے لگا "چوہدری صاحب خدا کے لیے ایسا مت کریں۔ مجھے معاف کردیں۔"

میں نے دلاور کی طرف دیکھا اور پھر انجام کی پروا کیے بغیر میں نے اس پر ایک جست لگائی مگر مجھے بہت دیر ہوگئی۔ اتنی ہی سردمہری اور بے نیازی کے ساتھ دلاور نے انسپکٹر کو بھی شوٹ کردیا تھا۔ میں خوف سے اپنی جگہ منجمد ہوگیا۔ کسی نادیدہ قوت نے میرے قدم روک تھے۔ مجھے خبردار کردیا کہ اس شخص کے ریوالور کا رخ میری جانب ہوگیا تو باقی گولیاں میرے سینے میں اتر جائیں گی اور اتنی ہی بے بسی کے ساتھ میں بھی مرجاؤں گا جیسے پولیس کا ایک حوالدار اور ایک انسپکٹر مرگئے تھے۔ کسی بھی قانون کی طاقت دلاور کو گزند نہیں پہنچا سکے گی۔ اس کی طاقت کے مقابلے میں قانون بے بس نہ ہوتا تو اتنی آسانی سے اور اتنے سکون کے ساتھ وہ دو قتل کرکے مسکرا سکتا تھا۔ اچانک مجھ پر بزدلی غالب آگئی۔ مجھے خیال آگیا رابعہ کا اور کابل کا' غالب اور نازو کا۔ ان سب کا جو میرے ساتھی' دوست' عزیز و اقارب اور زندگی کے رفیق و ہم سفر تھے۔ جن کے بغیر میرے لیے اپنی زندگی کا مفہوم کچھ نہ تھا۔ ان سب کا پتا صرف دلاور سے حاصل ہوسکتا تھا۔ میں ان سے پھر مل سکتا تھا مگر اس کے لیے شرط اول یہ تھی کہ میں زندہ رہوں۔

وہ میرے لیے عجیب تبدیلی کا لمحہ تھا۔ جب میں نے زندگی کی چاہت کو محسوس کیا اور یہ چاہا کہ میں اپنی جدوجہد کا رخ زندگی کے راستوں کی طرف رکھوں۔ مرکے تو میں سب کچھ گنوادوں گا۔ وہ خواب جو تشنۂ تعبیر تھے' وہ ارمان جو ادھورے تھے' وہ ارادے جو کل کی امید تھے' اچھے دن جو منتظر تھے کہ فرصت کشاکش غم دوراں سے گر ملے تو وہ حقیقت بن جائیں۔

میری یہ زندگی صرف میری نہیں تھی' اس پر دوسرے بہت سے لوگوں کا حق تھا اور اس زندگی کا ایک مقصد و مصرف بھی تھا۔ یہ کسی شرابی' جواری' ناکارہ و ناکام' غلط رو اور گمراہ شخص کی زندگی نہیں تھی جو معاشرے کے لیے داغ ندامت ہو۔ جو نہ رہے تو خلق کی جان کا عذاب ختم ہو اور کہنے والے کہیں کہ خس کم جہاں پاک۔ نہیں' مجھے تو اس زندگی سے بہت کچھ حاصل کرنا تھا۔ اپنے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی۔ جینے کا حق' انصاف' انسانیت کا احترام اور آدمی کی عزت۔ مجھے اس زندگی کے ہر لمحے سے ایک مشن کی تکمیل کی خاطر بھرپور استفادہ کرنا تھا اور یہ مشن تھا دلاور' پیڈرو اور حاجی عبداللہ جیسے لوگوں کے جرائم کی پردہ دری۔ مجھے اپنی بساط کی حد تک انہیں ہر غلط کام سے روکنا تھا اور ہر غلطی کی سزا دلوانی تھی۔ ان سے اپنے اور دوسروں کے غصب شدہ حقوق حاصل کرنے تھے۔ مجھے اپنے والد کے قاتلوں کو تختۂ دار تک پہنچانا تھا اور وزیر خاں ٹرسٹ اسپتال کا کنٹرول حاصل کرنا تھا۔ مجھے اجڑے گھر بسانے تھے اور بچھڑ جانے والوں کو تلاش کرنا تھا۔

لیکن یہ سب کچھ کرنے کے لیے مجھے طاقت سے زیادہ اپنی عقل پر انحصار کی ضرورت تھی۔ یہ تسلیم کرلینا ضروری تھا کہ بدلے ہوئے حالات میں دلاور کا مقابلہ بندوق کی گولی یا دولت کی طاقت سے نہیں کیا جاسکتا۔ وہ پہلے بھی کمزور حریف نہیں تھا مگر اب تو پہلے سے زیادہ طاقتور ہوگیا تھا۔ اس کے مادی وسائل' اس کا اثر و رسوخ' اس کی قوت خرید' اس کی بدمعاشی کا دائرہ' اس کی دولت کی زنجیر سے بندھے ہوئے شکاری کتے' ان سب کا مقابلہ ہم جذبات کے اندھے پن کے ساتھ نہیں کرسکتے تھے۔ اگر میں سینہ تان کے اس کو للکارتا کہ ہمت ہے تو مجھے گولی مارکے دکھا دلاور۔ تو وہ کہتا اچھا جی اپنے سکندر اعظم آپ کہتے ہو تو پھر ٹھیک ہے۔ اسے بہادری نہیں کہا جاسکتا۔ ایسی عقل کی جذباتی کمزوری ہی آدمی کو ... دیتی ہے۔ مات تو تب ہے کہ آدمی اپنے دشمن کو ذہنی و جذباتی طور پر اتنا زچ کردے کہ وہ خودکشی کرلے۔

میں کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت میں ایک قدم آگے بڑھاتا تو زندگی کی سرحد عبور کرجاتا۔ کسی تذبذب کے بغیر دلاور مجھے شوٹ کردیتا اور میرے جسم میں ہونے والے ایک سوراخ سے میرا خون ہی نہیں میرے مستقبل کے سارے ارادے بھی خاک میں مل جاتے۔ میں کسی گمنام قبر میں جالیٹتا۔ اپنے والد کی طرح۔ دلاور ایسے ہی اپنی دلاوری کے دعووں کے ساتھ زندہ رہتا اور زمین پر غرور و نخوت سے گردن اکڑا کے چلتا۔ ... اور غالب دنیا سے پوچھتے پھرتے کہ کوئی تو بتادو سکندر کہاں گیا جو ہمیں تلاش کرنے نکلا تھا۔ رابعہ خاک بسر راہ گزاروں سے سوال کرتی۔

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مرگیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

یہ وہ ایک راہنما لمحہ تھا جس نے میری زندگی کی راہوں کو روشن کیا۔ اور میں نے یکایک اپنے ذہن کو جذبات کے جالوں سے آزاد ہوتا محسوس کیا۔ میں نے ٹھنڈے دل اور دماغ کے ساتھ دلاور سے مذاکرات اور گفت و شنید کی اہمیت کو تسلیم کیا۔ یہ طے کیا کہ طاقت کے توازن کو نئی بنیادوں پر استوار ہونا ہے۔ اگر دلاور اینڈ کمپنی کے پاس دولت کی طاقت ہے تو دوسری جانب ہم ذہانت کی دولت سے مالا مال ہیں۔ منافقت کا مقابلہ منافقت سے کیا جائے۔ مصلحت اور مصالحت کے ساتھ حالات کے نشیب و فراز پر نظر رکھی جائے اور اپنی حکمت عملی کو دشمن کی طاقت کے کمزور پہلو دیکھ کر مرتب کیا جائے تو بازی پلٹ سکتی ہے۔

حالات بدل چکے تھے۔ وقت کے تقاضے کچھ اور تھے۔ دشمنی کا موسم بدل گیا تھا۔ دوستی اور دشمنی کی قدریں بدل رہی تھیں چنانچہ ضروری تھا کہ ہم بھی اپنے لائحہ عمل پر نظرثانی کریں۔ اگر دلاور نے میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے تو اس کی منافقت کو سمجھتے ہوئے بھی میں اس کا ہاتھ نہ جھٹکوں۔ میں سکندر رہتے ہوئے بھی دلاور کا انداز نظر اختیار کرلوں۔ دشمن کے قلعے میں داخل ہونے کے لیے ضروری ہے کہ قلعے کے اندر کا نقشہ معلوم ہو۔ دلاور کیا سوچتا ہے اور کیا کرتا ہے۔ یہ جاننے کے لیے ضروری ہے کہ میں دلاور کے ذہن تک اسی طرح رسائی حاصل کروں جیسے دشمن کا جاسوس ملک کے اہم رازوں تک رسائی کے لیے ہر ممکن ذہنی و جسمانی صلاحیت کا استعمال کرتا ہے۔

بظاہر میں چار افراد پر مشتمل پولیس پارٹی پر نظر جمائے کھڑا تھا جن میں سے آدھے اپنی وردی کے تمام اختیارات' اپنا ایمان اور ضمیر سب کچھ دلاور کی دولت کے عوض گروی رکھنے کے باوجود جان سے گزر گئے تھے۔ جو باقی بچے وہ ماتحت تھے اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے افسران کی لاشوں کو دیکھ رہے تھے۔ یا پھر دلاور کے ہاتھ میں نظر آنے والے اس فولادی کھلونے کو گھور رہے تھے جس سے برآمد ہونے والی دو تولے کی گولی انہیں بھی چلتے پھرتے انسان سے ایک لاوارث لاش میں تبدیل کرسکتی تھی۔ قدرتی طور پر ان کے ذہن میں یہ سوال ہوگا کہ کیا اب ان کی باری ہے... والی بات یا چوہدری دلاور صاحب جو آج تک ایک فیاض اور سخی ان داتا کے روپ میں دکھائی دیتے تھے اچانک فرشتۂ اجل بن کے ان کی جان لے لیں گے۔ وہ جو ہر خدمت اور ہر سلام پر نوٹ ہی نوٹ پھینکتے تھے زندگی جیسی انمول نعمت کو بے دام چھین لیں گے۔

اس نئی آبادی میں کوٹھیاں ایک دوسرے سے فاصلے پر تھیں اور یوں بھی کہیں سے سنائی دینے والی فائر کی آواز یہاں کسی کو چونکاتی نہیں تھی۔ یہ روز کا معمول تھا۔ اگر کسی نے اپنے دشمن کو ٹھکانے لگادیا تو اچھا کیا۔ اگر کسی نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے ہوائی فائر کیے تو ٹھیک کیا اور محض نشانے بازی کی یا اپنے اسلحے کی کارکردگی کو چیک کیا تب بھی غلط نہیں کیا۔

"آؤ جی اپنے سکندر صاحب" چوہدری دلاور نے بڑے بے تکلف اور دوستانہ انداز میں خوشدلی سے کہا "مرگئے مردود' ان کی فاتحہ نہ درود۔ ان کا غم مت کرو۔ ہیں جی۔ کام کرنے والے بندے تھے کام آگئے۔ جیسے یہ ریوالور کام کی چیز ہے۔ گولیاں تو اس میں خرچ ہوتی ہیں نا جی۔ ایسی کون سی مہنگی چیز ہوتی ہے ان لوگوں کی جان جو خود کو بیچتے پھرتے ہیں۔ اور خرید لیں گے بہت بکاؤ مال ہے بازار میں۔"

میں نے خود پر قابو پاکے بڑی مشکل سے کہا "مگر چوہدری صاحب..."

میرے لہجے کی تبدیلی کو دلاور نے فوراً نوٹ کرلیا "اپنے سکندر صاحب' یہ دو ٹکے میں بکنے والے لوگ ایسے ہی انجام کے مستحق ہوتے ہیں۔ میں نے انہیں بار بار سمجھادیا تھا کہ تم جس بندے کو لینے جارہے ہو وہ کوئی دس نمبریا نہیں ہے اور معمولی آدمی بھی نہیں ہے۔ عزت دار آدمی ہے اور بڑا آدمی ہے۔"

میں نے کہا "میں سمجھا نہیں دلاور۔ آخر کیا مجبوری ہے تمہاری کہ تم میرے منہ پر ایسی باتیں کررہے ہو!"

"سب سمجھ جاؤ گے بادشاہو۔" وہ خوش دلی سے بولا "وقت بڑا ظالم استاد ہے۔ اس نے چوہدری دلاور کو بہت کچھ سمجھادیا ہے۔ سارے کس بل نکال دیے ہیں۔ ہیں جی۔ شاید تم بھی سمجھ لوگے کہ تم نے دلاور کو سمجھنے میں غلطی کی۔ یا بہت دیر کی۔ ورنہ یہ سب کچھ نہ ہوتا...... جو کل تھا وہ آج نہیں ہے۔"

میں نے کہا "سوائے اس کے کہ ہم کل بھی دشمن تھے' آج بھی ہیں۔ اور کل بھی رہیں گے۔ مگر یہ ٹھیک ہے کہ بڑے آدمی چھوٹی چھوٹی باتوں پر دشمنی کو تماشا نہیں بناتے۔ میں نے تمہیں ہمیشہ ایک بڑا اور بہادر دشمن تسلیم کیا ہے۔ مجھے امید ہے تم نے مجھے دھوکے سے ہلاک کرنے کے لیے اغوا نہیں کیا ہوگا۔ ورنہ تم جانتے ہو خو، تمہارا انجام کیا ہوگا۔"

دلاور میری بات پر خوش ہوا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کو میرے خیالات میں تبدیلی اس حد تک نمایاں نظر آئے کہ وہ شک میں مبتلا ہوجائے یا غلط فہمی میں کہ میں ڈر گیا ہوں۔

"چلو اوئے تم دونوں ایسے شکلیں بنا کے مت کھڑے رہو۔" چوہدری دلاور نے اپنی جیب سے سو کے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کے ان کی طرف اچھال دی۔

دس ہزار روپے دو لاشوں کے درمیان گرے۔

"کیا یہ کم ہیں؟ چلو یہ لو۔" اس نے دوسری گڈی بھی پھینک دی "فٹافٹ اپنا کام شروع کردو۔ کام پتا ہے نا؟ ایک تو اپنا منہ بند رکھنا ہے۔ سمجھے؟ تم نے کچھ نہیں دیکھا اور کچھ نہیں سنا۔ کچھ کہا بھی نہیں۔ رات کو پھر ڈیوٹی پر حاضر ہوجانا۔ کوئی بھی تم سے سوال نہیں کرے گا۔ دوسرا کام ہے ان بندوں کو غائب کرنا۔ ان کے پیچھے

کچا کنواں ہے۔ اس میں ڈال کے مٹی بھر دو۔ مٹی بھی ہے اور وہیں سب سامان بھی مل جائے گا۔ زمین برابر کر کے گھر جاؤ یا چاہو تو پہلے نہا دھو لو اِدھر ہی۔"

دوسری گڈی حوالدار کی لاش پر گری تھی۔ میں نے ایک سپاہی کو آگے بڑھ کر دس ہزار کے نوٹ اٹھاتے دیکھا مجھے اس کے چہرے پر عجیب سی غیر انسانی خوشی اور کمینگی نظر آئی۔ پھر دوسرا سپاہی آگے بڑھا اور اس نے جھپٹ کے دس ہزار روپے اٹھائے۔ اپنی خوش نصیبی کا یقین ان کے لیے دُہری مُسرت کا باعث تھا۔ وہ زندہ تھے اور انہیں توقع سے کہیں زیادہ مل گیا تھا۔ شاید یہی رقم ان کے افسران تقسیم کرتے تو تین چوتھائی خود رکھتے اور انہیں ایک چوتھائی ملتا۔ وہ ہوس کے مارے ہوئے کمینہ خصلت اور ضمیر فروش لوگ تھے ورنہ دلاور کے زر خرید کیوں ہوتے۔ انہیں کوئی دُکھ نہ تھا کہ دو انسان جو کچھ دیر پہلے ان کے ساتھ تھے اور انہی جیسے تھے اب مُردہ جسم ہیں جن کا ٹھکانا وہی زمین ہے جو ازل سے اپنی بھوک مٹانے کے لیے لاشوں کو نگلتی جا رہی ہے مگر پھر بھی بھوکی ہے۔

عین اس وقت جب میں پلٹ کے دلاور کے ساتھ اندر جانے والا تھا میری نظر بھٹک گئی۔ میں نے حوالدار کی اور پھر سب انسپکٹر کی لاش کو دیکھا۔ دونوں سپاہی ان کی بغلوں میں ہاتھ دے کر انہیں اٹھا چکے تھے اور گھسیٹ کر لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔

چوہدری دلاور نے میرا ہاتھ پکڑ لیا "آؤ اپنے سکندرِ اعظم صاحب! اندر آؤ میرے ساتھ۔ مجھے خوشی ہے کہ تم نے ہوش سے کام لیا۔ جوش میں بندے کی مت ماری جاتی ہے تو بندہ خود بھی مارا جاتا ہے۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "سچ فرماتے ہیں آپ۔ مرنا تو ایک بار ہی ہوتا ہے سب کو مگر یہ کیڑے مکوڑوں کی زندگی گزارنے والے تو بار بار مرتے ہیں۔ مر مر کے جیتے ہیں اور شاید جیتے ہی مرنے کے لیے ہیں۔"

چوہدری دلاور نے سر کھجایا "اپنے سکندر صاحب! آپ تو پڑھے لکھے بندے ہیں جی۔ ہم ٹھہرے چٹے ان پڑھ۔ اتنا فلسفہ نہیں جانتے۔"

میں نے کہا "دلاور! اس سے پہلے کہ تم کو غلط فہمی کوئی ایسا قدم اٹھانے پر مجبور کرے جس سے ناقابلِ تلافی نقصان ہو جائے۔ میں تمہیں بتا دوں کہ تمہیں مار کے خود مر جانا ہر وقت میرے اختیار میں ہے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اس وقت بھی جب تم خالی ہاتھ میرے ساتھ چل رہے ہو اور تم نے ریوالور بھی جیب میں ڈال لیا ہے، تمہاری جان کی حفاظت کرنے والے پوری طرح چوکس ہیں۔ میں انہیں دیکھ نہیں سکتا مگر وہ ہر سمت سے مجھ پر نظر رکھے ہوئے ہوں گے۔ میں بڑی آسانی سے تمہاری گردن توڑ سکتا ہوں مگر اس کے بعد ہر سمت سے آنے والی گولیاں مجھے بھی چھلنی کر دیں گی۔

ابھی میرا موڈ مرنے کا نہیں ہے اس لیے تم محفوظ ہو مگر مجھے خوف زدہ کرنے کی یا بلیک میل کرنے کی کوشش مت کرنا۔"

وہ خاموشی سے سنتا رہا اور میرے ساتھ چلتے ہوئے زیرِ لب مسکراتا رہا۔ اس کا رویّہ میرے لیے خاصا پُراسرار ہو گیا تھا۔ میری نگاہیں اس عالی شان کوٹھی کی آرائش کو دیکھنے کے بجائے ان لوگوں کو تلاش کر رہی تھیں جو چوہدری دلاور کی حفاظت پر مامور تھے مگر سامنے آئے بغیر اپنا فرض ادا کر رہے تھے۔

اس سے پہلے میری اور چوہدری دلاور کی ملاقات کئی بار ہو چکی تھی اور ہر بار اس کی فطرت کی سفاکی اور عیاری کا کوئی نیا پہلو بے نقاب ہوا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ بہت بڑا اداکار ہے اور اس سے بھی بڑا ہدایت کار ہے۔ اس نے متعدد بار ایسے ڈرامے پیش کیے تھے جو حقیقی زندگی کا منظر لگتے تھے اور چوہدری دلاور کی منفی ذہانت کا ثبوت تھے۔ وہ بے مقصد کچھ نہیں کرتا تھا۔ ابھی جو کچھ میں نے دیکھا تھا وہ بھی چوہدری دلاور کی فطرت اور سوچ کی کامیاب عکاسی کرتا تھا۔ ایک جگہ دلاور مجھ سے جُدا ہو گیا اور دو محافظ میرے ساتھ ہو گئے۔ میں خاموشی سے چلتا رہا۔ گزشتہ چند دن کے واقعات کا ہر نقش میرے ذہن میں تازہ تھا۔ ہمارے مشرقی پاکستان سے لوٹ آنے کے بعد بہت کچھ ہوا تھا جو ناقابلِ فہم تھا۔ محسن اور گُل کراچی ائرپورٹ پر اُتر کے غائب ہو گئے تھے اور اخبار میں خبریں آئی تھیں کہ گُل نے پھر ڈاکوؤں کے اس گروہ میں شمولیت اختیار کر لی ہے جس کا سرغنہ کبھی اس کا بھائی شیش ناگ تھا اور وہ گُل بانو سے دوبارہ ناگ منی بن گئی ہے۔ یہ ناقابلِ یقین تھا مگر سچ نظر آتا تھا۔ غالب کو نازو کے ساتھ ہی سی ایم ایچ سے اغوا کر لیا گیا تھا اور ابھی تک ان کا کہیں بھی سراغ نہیں ملا تھا۔ پیڈرو مسلسل ہمارے تعاقب میں تھا اور اس نے ہمیں ہراساں رکھنے کی پالیسی کے تحت پہلے آفریدی کی گاڑی کو بم سے اُڑا دیا تھا پھر ریسٹ ہاؤس میں دھماکا کیا تھا۔ بظاہر اس کا مقصد ہمیں ختم کرنا تھا مگر درحقیقت ایسا نہیں تھا۔ پیڈرو کو واضح ہدایات تھیں کہ ہمیں نقصان نہ پہنچے اور یہ ہدایات دینے والا چوہدری دلاور کے سوا کون ہو سکتا تھا۔ آخری کارروائی رابعہ اور کاجل کا اغوا تھا جن کے ساتھ آصف علی کے بیوی بچے بھی اٹھائے گئے تھے اور یہ اضافی فائدہ دلاور کو ایک کینہ پرور لالچی اور احسان فراموش شخص کی وجہ سے حاصل ہوا تھا جسے آصف علی نے بیٹا بنا رکھا تھا۔

شاید اب وقت آ گیا تھا کہ چوہدری دلاور کسی ماہر پتے باز کی طرح تُرپ کے سب پتے سمیٹ لینے کے بعد مجھ سے پوچھے کہ اب بولو، بازی جاری رکھو گے یا ہار مان کے پتے پھینک دو گے۔ اس نے مجھے ہر طرف سے محصور کر لیا تھا مگر وہ جانتا تھا کہ جب تک میں ہتھیار نہیں ڈالوں گا اس کی زندگی سکون سے نہیں گزرے گی۔ وہ سمجھتا تھا کہ مجھے خریدا نہیں جا سکتا، خوف زدہ نہیں کیا جا سکتا اور کسی طرح بھی اپنے اصولوں سے منحرف نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ایم آر

...کو نہیں توڑ سکا تھا تو ان رشتوں کو کیسے ختم کر سکتا تھا جو ہم سب کو اپنی جان سے زیادہ عزیز تھے۔ وہ محسن، غالب، رابعہ یا نازو کسی کو بدگمان نہیں کر سکتا تھا اور اپنے مقاصد کے حصول کے لیے استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ ہمارے یقین اور اعتماد کا رشتہ ایک ایسی دیوار تھا جس پر وہ اپنی تمام قوت کے ساتھ ساری عمر ٹکریں مارتا رہتا تو ایک دن خود ختم ہو جاتا مگر دیوار پر خراش تک نہ آتی۔

اب دیکھنا یہ تھا کہ دلاور کے پاس مجھے حیران کرنے کے لیے کیا ہے۔ وہ بدلے ہوئے حالات کے پیشِ نظر کون سی نئی پیشکش کرتا ہے۔ وہ سودا کرنا چاہتا ہے تو کیوں اور کن بنیادوں پر۔ اور اس نے کھیل ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو کیا سوچ کے ایسا کیا ہے۔ میں پہلے کے مقابلے میں زیادہ پُرسکون تھا اور آہستہ آہستہ خود کو آنے والے حالات کے لیے تیار کر چکا تھا۔ مجھے یہ بات بھی بعید از امکان دکھائی نہ دیتی تھی کہ وہ باری باری رابعہ کو، نازو کو، غالب اور کاجل کو، محسن اور گُل کو اور ان سب کو میرے سامنے لائے جو میرا ساتھ دینے کی پاداش میں آج تک آلام و مصائب کا شکار رہے تھے۔ ان سب نے بہت دُکھ جھیلے تھے، تشدد برداشت کیا تھا اور وفاداری کے رشتے کی آبرو پر اپنا سب کچھ قربان کر دیا تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ وہ ان کو میرے سامنے اذیت دے کر ہلاک کرتا جائے۔ میرا حوصلہ آزمانے کے لیے میری برداشت کی طاقت کا امتحان لینے کے لیے۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ میرے اعصاب نے گردشِ حالات کا اثر کس حد تک قبول کیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ لوہا بھٹی میں تپ کے فولاد ہو جاتا ہے مگر گوشت پوست کے انسان کے اعصاب فولادی نہیں ہوتے۔ مسلسل سختیِ ایام، تلخیِ اوقات، پیہم جبر و تشدد، شب و روز کا ذہنی و جسمانی عذاب اور اذیت، انتہائی مضبوط قوتِ ارادی رکھنے والے ناقابلِ شکست انسان کو بھی اندر باہر سے توڑ پھوڑ دیتے ہیں۔ وہ مقابلے کی سکت سے محروم ہو جاتا ہے اور ذہنی ناامیدی سے مغلوب ہو جائے تو آزمائش کے نام سے بھی خوف کھاتا ہے۔

ابھی میں نے حوصلے میں کوئی کمی محسوس نہیں کی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ میں ایک بار پھر اس اعصاب شکن دورِ استبداد سے گزر سکتا ہوں جو لندن سے میری آمد کے ساتھ شروع ہوا تھا اور میرے مشرقی پاکستان سے لوٹ آنے کے بعد بھی اختتام پذیر نہیں ہوا تھا لیکن مجھے کچھ اندازہ ہونے لگا تھا کہ سب کی کیفیت ایک سی نہیں ہے۔ ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ انسان کسی فیکٹری سے بنی ہوئی مشین نہیں ہوتا کہ ایک ہی ڈیزائن اور ماڈل کے ہزاروں لاکھوں نمونوں کی کارکردگی میں سرمو فرق نہ ہو۔ رابعہ نے سب سے پہلے حالات سے مایوسی کا اثر قبول کیا تھا اور مکمل نروس بریک ڈاؤن سے پہلے ہی ہچکچاہٹ میں مبتلا ہو چکی تھی۔ محسن کا نروس بریک ڈاؤن ہو چکا تھا۔ کاجل کے اعصاب آہستہ آہستہ منتشر ہو چکے تھے۔ صرف غالب اور نازو نے ابھی تک ناامیدی کو قبول نہیں کیا تھا۔

جب تک جنگ جاری تھی میں ذہنی طور پر صدمہ جھیلنے کے لیے ہر وقت تیار تھا مگر کیا اب بھی یہ ممکن ہوگا کہ میں وہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھ سکوں جس کا تصور بھی مجھ پر لرزہ طاری کر دیتا تھا؟ کیا میں رابعہ کے ساتھ انسانیت سوز درندگی کے کسی مظاہرے پر خاموش رہ سکوں گا؟ محسن غالب یا نازو کو تشدد سے ہلاک ہوتا دیکھ کے بھی میرے ارادوں کی استقامت باقی رہے گی؟ اگر اس نے ایک ایک کو میرے سامنے تھوڑا تھوڑا کر کے قتل کیا تب بھی میں اپنے اصولوں پر ڈٹا رہوں گا اور ان سب کو گنوا دینے کے بعد بھی اپنے نظریات پر قائم رہوں گا؟ نقصان کچھ بھی ہو، میں دلاور سے کوئی سمجھوتہ نہیں کروں گا اور کسی قیمت پر بھی اپنے ضمیر کا سودا نہیں کروں گا؟

ان سب سوالات کا جواب میرے ذہن میں بہت واضح تھا۔ نہیں، میں آخری انتہا سے بہت پہلے ہی ہار مان لوں گا۔ اگر دلاور مجھ سے اور صرف مجھ سے کہے کہ اپنے سکندرِ اعظم میں تم کو دس سیکنڈ دیتا ہوں مجھ سے میری شرائط پر صلح کر لو ورنہ مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ تو میں بے خوفی سے مسکراتے ہوئے کہہ سکتا ہوں کہ دس سیکنڈ کیوں ضائع کرتے ہو دلاور، پانچ سیکنڈ میں اپنا ریوالور مجھ پر خالی کر دو۔ لیکن خود زندہ رہتے ہوئے اپنے سب دوستوں، ساتھیوں کو پُرعذاب موت سے ہمکنار کرنا میرے لیے ناممکن تھا۔ میں جانتا تھا کہ بلند بانگ دعوے کرنا اور بات ہے، عملاً ان پر پورا اترنا انسان کے بس کی بات نہیں۔ وہ جو کروڑوں میں ایک، صدیوں بعد سُقراط یا حسینؓ ہوتے ہیں وہ میرے جیسے عام انسان نہیں ہوتے۔ انہیں صبر و رضا کے ساتھ ظلم و استبداد کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت کے علاوہ عفو و درگزر کی الہامی صفات عام انسانوں سے ممتاز کرتی ہیں۔ میرا شمار ان میں نہ تھا۔

یہی وجہ تھی کہ جب محافظوں کے ساتھ میں اس کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں پہنچا تو میرے ذہن میں کوئی انتشار نہ تھا۔ میں کسی کنفیوژن کا شکار نہ تھا اور میری قوتِ فیصلہ ہر قسم کی صورتِ حالات سے نمٹنے کے لیے تیار تھی۔ اس ملاقات سے مجھے دوسری جنگِ عظیم میں جاپان کی شکست کے بعد شہنشاہ اور امریکی جنرل کی ملاقات یاد آئی جو ایک بحری جہاز پر ہوئی تھی۔ میں نے اس کی فلم دیکھی تھی۔ فاتح جنرل اپنے مصنوعی غرورِ فتح مندی کے باوجود شہنشاہ کے وقار اور حوصلے کو شکست نہ دے سکا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ جاپانیوں نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ درحقیقت ہارے نہیں تھے۔ آج پھر امریکہ ہی ان کا دستِ نگر ہے۔

کوٹھی میں مکمل خاموشی تھی۔ یہ آسیب زدہ ویرانی کا تاثر میرے احساس کے سناٹے سے پیدا ہوا تھا یا دلاور نے عمداً خوف کی فضا کو مجھ پر مسلط رکھنے کے لیے اس کا اہتمام کیا تھا، یہ طے کرنا مشکل تھا۔ میں نے بے خیالی میں ان سب اشیا کو دیکھا جو وسیع ہال میں دنیا بھر سے لا کے اکٹھی کر دی گئی تھیں۔ نوادرات، آرائشی

ظروف، مصوری کے نمونے، کرسٹل کے فانوس اور لیمپ، قالین اور صوفے جو ہنرمندوں کی دستکاری کا شہکار تھے۔ معلوم نہیں یہ کوٹھی کس کی تھی اور دلاور کے استعمال میں کیوں تھی۔ جب دولت گھر کی باندی ہو تو ساری دنیا خود اپنی ہو جاتی ہے۔ ہر ملک اور ہر شہر میں ہر کوٹھی، اسباب عیش، سامانِ نشاط، آرٹ اور ثقافت کے نمونے۔ مونالیزا کی مسکراہٹ سے خود مونالیزا تک سب انہی کو ملتا ہے جو قوتِ خرید رکھتے ہیں۔

دلاور اچانک اندر آیا اور میرے سامنے پہنچ کے رک گیا "مجھے کچھ ایسا لگتا ہے کہ تم کچھ سیانے ہو گئے ہو۔"

میں نے کہا "ہاں جب تم دولت سمیٹنے میں مصروف تھے تو میں تجربہ حاصل کر رہا تھا جو عقل کی کسوٹی ہے۔"

"دولت کیا عقل کے بغیر ہی حاصل ہو جاتی ہے ؟" وہ ہنسا "بھئی میں تو پہلی بار دیکھ رہا ہوں کہ تم آتش فشاں نہیں بنے ہوئے ہو اور نہ چارلی چیپلن بننے کی کوشش کر رہے ہو۔ ہیں جی۔ بھول گئے ہو ساری مسخری، ورنہ تم اور وہ تمہارا جوڑی دار۔ کیا نام تھا اس کا شیروانی۔ بڑا ہنساتے تھے مل کے۔"

میں نے کہا "ہم نے مل کے رلایا بھی بہت تھا تم کو۔"

"کچھ پتا ہے اس کا، آج کل کہاں ہے، کیا کر رہا ہے۔ ہم نے تو سنا تھا ڈاکے ڈال رہا ہے کسی نئی لڑکی کے ساتھ مل کے۔ وہ پہلے بھی ڈاکو تھی۔ اپنی لائن پر لگا لیا اس نے تمہارے یار کو۔ پہلی بیوی کے مرنے کے بعد پاگل ہو گیا تھا نا، اس کا اثر ہے شاید۔ وہ بھی کون سی شریف زادی تھی۔ کسی کلب میں ڈانسر تھی شاید۔ اور کرسچن تھی، بھائی جواری تھا۔"

میں سمجھ گیا تھا کہ ان باتوں کا مقصد مجھے اشتعال دلانا ہے اور غالباً وہ میرے ظاہری پُرسکون رویے سے کچھ پریشان ہے۔

میں نے کہا "بولتے رہو، میں سن رہا ہوں۔ تمہیں اجازت ہے کہ رابعہ پر تبصرہ کر دیا اس کے کردار پر۔ غالب اور نازو کے بارے میں انکشافات کرو۔ تم جو چاہو کہو۔ یہ تمہارا گھر ہے۔"

اٹھارہ بیس سال کی ایک لڑکی چائے کی ٹرالی کو بڑی نزاکت سے دھکیل کر لائی۔ اس کی صورت، اطوار اور لباس سب اس کے بنگالی ہونے کی چغلی کھاتے تھے۔ اپنے سانولے رنگ کے باوجود وہ بے حد دلکش تھی اور اس کا گدرایا ہوا بدن ہر پہلو سے دعوتِ نظارہ دیتا تھا۔ اس کے کھلے بال کمر سے نیچے تک پہنچے تھے۔

"جیسے تم کاجل کو ترس کھا کے اپنے ساتھ لے آئے ہو۔" دلاور نے طنز سے کہا "ایسے ہی یہ میرے ساتھ آ گئی ہے۔ اچھی چیز ہے نا؟"

میں اس گالی کو پی گیا "بس ایک ہی پیس لائے ہو۔ مال تو بہت تھا وہاں اور تمہارے پاس پیسہ کم نہیں تھا۔"

دلاور کے چہرے پر تاریک سایہ سا آ کے گزر گیا۔ میں نے بات کا جواب بات سے دیا تھا مگر غالباً میری بات میں سچ کی کڑواہٹ شامل ہو گئی تھی۔ دلاور کی بات میں جھوٹ تھا جو مجھے ناگوار نہیں گزرا تھا مگر اچانک اس نے اپنے ردِعمل سے اعتراف کر دیا تھا کہ وہ خانہ جنگی کے حالات سے ایک فائدہ حاصل کرنا نہیں بھولا تھا۔ شاید وہ ایسی بہت سی بھولی بھالی نوجوان لڑکیوں کو تحفظ اور عافیت کا جھانسا دے کر خرید لایا تھا جن کو وہ اپنے ناجائز مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنا سکتا تھا۔ آم کے آم گٹھلیوں کے دام۔ یہاں وہ بے آسرا لڑکیوں کی خانہ آبادی کے کارِخیر سے شہرت بھی پا سکتا تھا اور انہیں اپنی ضرورت کے لیے سکہ رائج الوقت کے طور پر بھی استعمال کر سکتا تھا۔ اس جیسے ضمیر فروش کاغذ کے نوٹ اور عورت کے جسم کو رشوت میں دیتے یا لیتے وقت کسی خلش سے دوچار نہیں ہوتے۔

ذرا سی دیر کے لیے میرے لہو کی حرارت بڑھی اور میں نے سوچا کہ دلاور کی گردن دبوچ لوں اور اس سے پوچھوں کہ دنیا کے سب شیطانی دھندے کیا کم منافع بخش تھے کہ وہ بُردہ فروش بھی بن گیا۔ کیا اسے بالکل خیال نہیں آتا کہ آج نہیں تو کل اس کی بیٹیاں ایسی ہی ہوں گی۔ بے گھر ہونے والی لڑکی کیا بے آبرو ہو جاتی ہے اور وہ بھی اپنے ہم وطن اور ہم مذہب لوگوں کے سامنے جو دولت سے انہیں گھر نہیں دیتے جنسِ بازار بنا دیتے ہیں۔ مگر میں نے خود کو یاد دلایا کہ میرا لائحہ عمل کسی جذباتی ردِعمل کا نتیجہ ہو گا تو میں عقل کے سارے فوائد سے محروم ہو جاؤں گا۔

وہ لڑکی چلی گئی تو میں نے ایک گہری سانس لے کر چائے کا کپ اٹھا لیا "مجھے امید ہے تم نے اس میں زہر نہیں ملایا ہو گا۔"

چوہدری دلاور کے ماتھے کی شکنوں میں کمی آ گئی "اگر تمہیں مارنا ہی میرا مقصد ہوتا اپنے سکندر صاحب، تو اپنے ایمان سے کہو کیا یہ کوئی مشکل کام تھا؟ ہیں جی۔ ایک بندے کے لیے ایک گولی بہت ہوتی ہے اور گولی چلانے والے تو کرائے پر ملتے ہیں۔ لیکن تم کو میں نے ہمیشہ ایک بچہ سمجھا۔ ایک بگڑا ہوا، روٹھا ہوا، سرکش اور باغی بچہ۔ یہ ٹھیک ہے کہ بعض اوقات مجھے غصے میں خیال نہیں رہتا تھا کہ تمہاری اور میری عمر میں بہت فرق ہے۔ تم وزیر خاں کے بیٹے ہو اور میں وزیر خاں کا ساتھی تھا۔ بے شک میں نے اس کے ساتھ جو بھی کیا، غلط تھا۔ اسے تم میرا گناہ یا میرا جرم جو چاہو سمجھو، تمہیں یہ حق حاصل ہے کہ مجھ سے انتقام لو۔ میں نے تمہارے والد کے ساتھ ظلم کیا، تم مجھ پر ظلم کرو۔"

میں نے محسوس کیا کہ ایسی باتوں سے میری قوت برداشت کسی بھی لمحے جواب دے سکتی ہے "کیا تم مطلب کی بات نہیں کر سکتے؟"

"ہاں مطلب کی بات کے لیے ہی یہ اعتراف کر رہا ہوں میں تمہارے سامنے کہ میں مجرم ہوں تمہارا۔ بہت پہلے بھی میں اپنے گناہ کا کفارہ ادا کرنا چاہتا تھا میں سب کچھ کرنے کے لیے تیار تھا، جس سے تمہارے جذبات کی آتش فشانی ختم ہو سکے لیکن تم انتقام کے راستے پر نکل گئے اور معاملات اس حد تک بگڑ گئے کہ تم دشمن بن کے ایک دوسرے کے مقابل آ گئے۔ حالانکہ تمہاری کیا دشمنی۔ میں کچھ ہی کم تھا عمر میں وزیر خاں سے عمر میں بہت بڑا ہوں۔ میں میر شرافت علی اور وزیر ساتھی تھے۔ جیسے تم محسن اور غالب ساتھی ہو۔"

بکواس بند کرو اپنی" میں نے چلا کے کہا "کس منہ سے تم ایسا دلاور۔ تم قاتل ہو میرے باپ کے۔ میر شرافت علی کے۔ آج موازنہ کرتے ہو اپنی ذلالت کا۔ ہماری رفاقت سے۔ ہاتھ اپنے ساتھیوں کے خون سے داغدار ہیں۔ ہم ایک کے لیے جان کا نذرانہ دینا دوستی کا بہت معمولی حق سمجھتے

سنو تحمل سے میری بات سنو اپنے سکندر اعظم صاحب۔" نے ماتھے پر ہاتھ پھیر کے ٹہلتے ہوئے کہا "میں کوئی دعوے نہیں ہوں۔ میں آج ایک سال کے بعد خود کو تمہاری عدالت میں کر رہا ہوں۔"

"بہت خوب عدالت ہے یہ جہاں مجھے سزائے موت پانے مجرم کی طرح لا کے بٹھا دیا گیا ہے۔ میرے چاروں طرف زرخرید قاتل ہیں جن کی بندوق کی نالیوں کا رخ میرے طرف ہے اور یہاں تم کہتے ہو کہ منصف بن کے میں تمہیں۔ اچھا مذاق ہے یہ۔ کیا تم تصور کر سکتے ہو کہ تختہ دار پر ہوئے مجرم سے کوئی جج کہے کہ تم بے گناہ ہو تو یہ پھندا گلے میں ڈال دو۔"

"سکندر میں تم سے پھر بات کروں گا، جب تم سمجھنے کے قابل گے کہ ان حالات میں میرا اعتراف جرم کوئی ڈراما نہیں یک حقیقت تھی۔ صورت حال پر غور کرو گے تو خود ہی سمجھ لو میں کسی طرح بھی مجبور نہیں، مجبور تم ہو۔ تم اکیلے ہو اور بی کے کسی معجزے کی امید بھی تمہارے کام نہیں آ سکتی۔ پنے طریقے آزمانا بھی نہیں چاہتا ورنہ آج نہ سہی ایک ہفتے یا ہینے بعد تم کسی مرنے والے کتے کی طرح اپنے آپ کو گھسیٹ رے قدموں تک لاؤ گے اور میرے جوتوں پر ناک رگڑ کے رحم ے یا روٹی کا ایک ٹکڑا۔ اور کیا پتا رابعہ بھی کتیا کی طرح میرا بوٹ پہلے سے چاٹ رہی ہو۔ اور نہ جانے کتنے کتے اس کے ہیں۔"

میں پھر بھول گیا کہ ابھی کچھ دیر پہلے میں نے پُرسکون رہ کے بات چیت کے ذریعے مسائل کو حل کرنے کا عہد کیا تھا۔ دماغ میں ایک شعلہ سا بھڑکا اور دوسرے لمحے میں نے کسی درندے کی طرح چلاتے ہوئے اس پر حملہ کر دیا۔ یہ ثبوت تھا بات کا کہ میرے اعصاب معمولی سی اشتعال انگیزی کے بھی نہیں ہو سکتے۔ میرا خود اپنے آپ پر کنٹرول نہیں رہا۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے۔ اس سے پہلے کہ میں دلاور تک پہنچتا پیچھے سے رسّی کا پھندا سا بنا کے پھینکا۔ بالکل اسی طرح جیسے امریکن کاؤ بوائے گھوڑے پر بیٹھ کے کسی فرار ہونے والے بچھڑے کو گرفتار کرنے کے لیے پھینکتے ہیں اور رسّی تنتے ہی تو سرکش جانور بے قابو ہو کے گر جاتا ہے۔

رسّی نے مجھے ایک جھٹکے سے روک لیا اور حلقہ میری گردن میں تنگ ہوا تو میں واپس صوفے پر گرا اور میری سانس رک گئی۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا آ گیا لیکن میں نے بے حس ہونے سے پہلے پوری جدوجہد کی اور اپنے ہاتھوں سے رسّی کا پھندا گردن سے نکال دیا۔ سانس آتے ہی میں پھر اٹھا۔ اس بار پیچھے سے میرے سر پر ڈنڈا مارا گیا۔ صوفے کے پیچھے کوئی نہ جانے کب سے موجود تھا لیکن مجھے معلوم نہ تھا۔

دلاور ہاتھ پیچھے باندھے کھڑا رہا تھا اسے معلوم تھا کہ وہ محفوظ ہے اور اس کے محافظ مستعد ہیں۔ سر کی چوٹ نے مجھے ایک دم ناک آؤٹ کر دیا۔ ہوش آنے پر میں نے خود کو دوسرے کمرے میں پایا۔ یہ ایک آرام دہ بیڈ روم تھا جس میں میرے سوا کوئی نہیں تھا۔ میں نے آہستہ آہستہ سر کی بھاری چٹان کو اوپر اٹھایا اور ہاتھ بڑھا کے بیڈ سائڈ پر رکھے ہوئے جگ سے منہ لگا کے پانی پیا۔ اس سے میری طبیعت بحال ہونے میں مدد ملی۔ جگ رکھتے ہوئے مجھے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر اسپرین کی گولیاں نظر آئیں۔ اس "حسن انتظام" پر دل ہی دل میں دلاور کو گالیاں دیتے ہوئے میں نے تین گولیاں نگل لیں اور آدھا جگ خالی کر دیا۔ تھوڑا سا پانی میرے کپڑوں پر اور بستر پر بھی گرا تھا۔ قالین کے خراب ہونے کی پروا کیے بغیر میں نے جگ کے باقی پانی سے منہ پر چھپکے مارے اور پھر آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔

دس منٹ بعد میری طبیعت سردرد میں نمایاں کمی سے مزید بہتر ہوئی تو میں بستر سے اترا۔ کمرے میں دائیں بائیں دو دروازے تھے مگر وہ مقفل تھے۔ تیسرا دروازہ باتھ روم کا تھا۔ میں نے کھڑکی کے پردے ہٹائے تو باہر کا اُجلا منظر میرے سامنے پھیل گیا۔ میں اس کوٹھی کی اوپر والی منزل پر تھا اور لوہے کی جالی سے ایک سرسبز لان کو دیکھ سکتا تھا۔ لان پر قدرت قلابازیاں کھا رہی تھی اور اس سے کچھ فاصلے پر کاجل اداس بیٹھی تھی۔

میں نے چلا کے کہا "کاجل، قدرت...!"

لیکن یہ کھڑکی ایک کاریڈور میں کھلتی تھی... جس میں لمبائی کے رخ چھ سات فٹ چوڑا اور دس فٹ لمبا شیشہ نصب تھا اور میری آواز اس شیشے کی دیوار سے گزر کے لان تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ کاریڈور کی چوڑائی دس فٹ سے زیادہ ہی تھی اور کمرے میں ایسی کوئی چیز نہ تھی جو میں شیشے پر مارتا تو شیشہ ٹوٹ جاتا۔ میں نے گرل کی مضبوطی کا اندازہ کیا۔ اسے اکھاڑنا یا توڑنا ممکن نہیں تھا۔ مجھے خیال آیا کہ میں بیڈ کو توڑ دوں اور اس کی پٹی سے شیشے پر وار کروں مگر ایک تو پٹی صرف چھ فٹ کی تھی اور شیشہ کم سے کم دس فٹ دور تھا۔ پھر گرل کے خانے چھوٹے تھے اور پٹی ان میں ... نہیں

سکتی تھی۔ پیتل کی ایش ٹرے، پیتل کا گلدان بے مصرف تھے۔

میں نے کرسی توڑنے کا فیصلہ کیا اور ... خاص ... کے بغیر ... دیوار ... کر کے اس کے بازو اور ٹانگیں ا... کا ... رہا مگر مجھے اس وقت سخت مایوسی ہوئی جب لکڑی کے یہ ٹکڑے میں نے گرل سے گزار کے شیشے پر مارے تو شیشے کو کچھ بھی نہیں ہوا۔ لکڑی کے ٹکڑے اس سے ٹکرا کے کاریڈور میں گر گئے۔ ظاہر ہے چھ سات فٹ چوڑا اور آٹھ دس فٹ لمبا شیشہ جو دیوار میں نصب تھا کوئی عام شیشہ نہیں تھا۔

میں نے بے بسی سے قدرت کو دیکھا وہ لان پر گول گول گھوم رہی تھی۔ پھر نیچے کسی دروازے سے رابعہ برآمد ہوئی اور اس نے کاجل کو بلالیا۔ میرا چیخنا چلانا بے کار تھا۔ میری آواز ان کے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ میں غور سے ان کی صورتوں کو دیکھتا رہا۔ وہ اُداس اور متفکر ضرور نظر آتی تھیں مگر جسمانی طور پر مستعد اور صحت مند تھیں۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کوٹھی میں وہ آرام سے ہیں اور ان کے ساتھ کسی قسم کا تشدد آمیز سلوک نہیں ہوا۔ تاہم ان کی یہاں موجودگی مجھے خطرات اور تشویش میں مبتلا کررہی تھی۔ ہم سب ایک دوسرے کی کمزوری تھے اور دلاور کو کسی کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کا فن آتا تھا۔

میں کھڑکی سے ہٹنے ہی والا تھا کہ لان پر عامر نمودار ہوا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اپنی مرضی سے وہاں نہیں آیا ہے۔ وہ چند قدم چل کے رُکا اور پھر پلٹ کے دیکھنے لگا۔ شاید کسی نے اسے اور آگے جانے کا اشارہ کیا۔ وہ پھر چند قدم چلا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اس کی صورت پر ناگواری کے ساتھ مجبوری کی تحریر کو میں اتنے فاصلے سے بھی پڑھ سکتا تھا۔

"غور سے دیکھتے رہو اپنے سکندرِ اعظم صاحب۔"

یہ آواز کمرے کے اندر سے سنائی دی تو میں اچھل پڑا مگر میں نے پلٹ کے دیکھا تو بات کرنے والا نظر نہ آیا۔

"یہ بہت سرکش اور باغی لڑکا ہے۔ اور احسان فراموش بھی۔" چوہدری دلاور نہ جانے کہاں تھا مگر اس کی آواز چھت میں نصب اسپیکر سے صاف سنائی دے رہی تھی "اگر یہ تعاون نہ کرتا تو ہم اتنی آسانی سے تمہارے میزبانوں کو یہاں نہیں لاسکتے تھے۔ ... نے ہمیں بتایا کہ رابعہ اور کاجل کہاں ہیں۔"

میں نے کہا "کیا تم میری آواز سن سکتے ہو؟"

"ہاں۔ میں تمہیں دیکھ بھی رہا ہوں خیر سے۔ اور ابھی جب تم کرسی توڑ رہے تھے تو میرا خیال تھا کہ تمہیں منع کردوں۔ پھر میں نے سوچا کہ چلو تم بھی تھوڑا سا غصہ نکال لو۔ ایک کرسی کا کیا ہے۔"

میں نے کہا "یہی لڑکا تمہیں ناصر پور لے گیا تھا؟"

"مجھے نہیں، وہ میرے آدمی تھے۔ اس لڑکے نے ... میں ان کی مدد کی۔" دلاور بولا "اس نے کہا کہ ایک شرط پر میں رابعہ کو بھی لاسکتا ہوں اور کاجل کو بھی۔ اُلو کا پٹھا! اسے معلوم نہیں تھا کہ کوئی شرط لگانے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ اسے پیسے کی ضرورت تھی اور میں نے کہا تھا کہ اسے دے دینا دو چار لاکھ۔ مگر اس کے دماغ میں کچھ اور تھا۔ اس نے کہا کہ مجھے پیسہ نہیں چاہیے۔ اس گھر میں ایک پاگل اور معذور لڑکی رہتی ہے۔ اس کو ٹھکانے لگادو۔"

میرے منہ سے بے اختیار ایک غلیظ گالی نکلی "نمک حرام! آصف علی کی ساری دولت حاصل کرنے کا خواب دیکھ رہا ہوگا کوئی ذمے داری قبول کیے بغیر۔"

"ہاں جی۔ اس نے کہا تھا کہ بعد میں آصف علی اور اس بڑھیا سے وہ خود نمٹ لے گا۔"

"میں خود نمٹ لوں گا اس حرام زادے سے۔"

"کیا تم چاہتے ہو اسے سزا دی جائے؟" دلاور بولا۔

"میں چاہتا ہوں اسے عبرت ناک سزا دی جائے۔" میں نے کہا۔

"اچھا جی پھر دیکھو تماشا، اپنے سکندرِ اعظم صاحب۔"

میں نے پلٹ کے کھڑکی سے جھانکا۔ عامر اب بھی وہیں کھڑا ہوا تھا اور سخت برہم نظر آتا تھا۔ وہ نہ جانے کس سے ہاتھ ہلا کر مخاطب تھا۔ اچانک وہ واپس ہوا اور لان عبور کرکے اسی سمت میں آیا جدھر شاید دروازہ تھا۔ کاجل اور رابعہ بھی ادھر ہی سے آئی تھیں مگر میں عین نیچے کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ دس فٹ کے کاریڈور کی چوڑائی درمیان میں حائل تھی اور میری نظر شیشے سے دکھائی دینے والے منظر تک محدود ہوکے رہ گئی تھی۔

مجھے عامر سے سخت نفرت تھی اور میں واقعی چاہتا تھا کہ اس محسن کش، ننگِ انسانیت شخص کو سزا دے کر درسِ عبرت بنادوں مگر دلاور کی بات نے مجھے پریشان کردیا۔ میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔ آخر دلاور کو مجھ سے یہ سوال کرنے کی ضرورت تھی۔ میں اپنا کام خود بھی کرسکتا تھا۔

اس کا جواب مجھے فوراً ہی مل گیا۔ عامر آگے بڑھتے بڑھتے رک گیا۔ پھر وہ خوف زدہ ہوکے پلٹا اور چند قدم دوڑا۔ لان کے تین طرف قدِ آدم جھاڑیاں کسی سرسبز دیوار کی طرح اِستادہ تھیں۔ اینٹوں کی دیوار ان کے پیچھے مکمل طور پر چھپ گئی تھی۔ چوتھی سمت میں شاید وہ راستہ تھا جس سے کوٹھی کے رہنے والے لان پر آتے جاتے ہوں گے۔ اس راستے سے ایک بھیانک شکل کا کُتا نمودار ہوا۔ وہ بڑی تیزی سے عامر کی طرف لپکا۔

عامر خود کو بچانے کے لیے بھاگا مگر کُتا اس سے زیادہ تیز دوڑ رہا تھا۔ ایک دیوار کے قریب پہنچ کے عامر نے جھاڑیوں پر چڑھنے اور دیوار عبور کرنے کی کوشش کی مگر کُتے نے ایک جست لگائی اور اسے ٹانگ سے پکڑ کر کھینچ لیا۔ عامر کی پنڈلی پر کُتے نے دانت جمادیے تھے اور عامر یقیناً تکلیف میں تھا۔ دہشت زدہ ہونے کے باوجود اس نے کُتے کا مقابلہ کیا۔ نیچے گرتے ہی اس نے تھوتھنی پکڑ کے کُتے کو جھٹکا دیا اور لات مار کے اُس کے خونی دانتوں سے اپنی ٹانگ چھڑالی۔ وہ اٹھ کے پھر بھاگا مگر کُتا اس کے تعاقب میں رہا۔ زخم کے باعث عامر تیز دوڑ ہی نہیں سکتا تھا۔ کُتے نے اسے دوبارہ گرالیا اور اب ان کے درمیان براہِ راست جسمانی برتری کا مقابلہ شروع ہوا۔

میں سانس روکے اس مقابلے کو دیکھتا رہا جس میں ایک فریق انسان تھا اور دوسرا حیوان مگر وہ بقا کی جنگ میں درندے بن گئے تھے۔ عامر نوجوان آدمی تھا لیکن ایک شکاری ... کے مقابلے میں تو کسی شہ زور کا بس نہیں چلتا۔ ... اپنے ... کے ساتھ دانت بھی استعمال کررہا تھا اور عامر صرف ہاتھ۔ کُتے ... بھی گوشت کو اُدھیڑنے اور ٹکڑے کرکے چیرنے پھاڑنے میں تیز تھے۔ نتیجہ یہ کہ عامر لہولہان ہوگیا تھا اور بَلا کی طرح چمٹ جانے والے کُتے کے مقابلے میں آہستہ آہستہ اس کی مزاحمت کم ہوتی جارہی تھی۔

میں دیکھ رہا تھا کہ عامر دہشت زدہ ہونے کے باوجود زندگی کے لیے لڑرہا ہے، مدد کے لیے چیخ رہا ہے مگر اس کی سُننے والے کان بہرے ہوگئے تھے اور جو اس کو بچاسکتے تھے وہ اس خونی تماشے کو بے بسی کے ساتھ دیکھنے پر مجبور تھے۔ میں تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ عبرتناک سزا سے دلاور کی مُراد کیا ہے ورنہ میں اس سے کچھ بھی نہ کہتا۔ ویسے بھی میں نے جو کہا تھا غصے میں کہا تھا۔ میرے ذہن میں سخت ترین سزا جو عامر کو دی جاسکتی تھی یہ تھی کہ اس کی کھال میں بُھس بھردیا جائے۔ محاورے کے مطابق اور اسے پولیس اسٹائل کی مار لگا کے رخصت کردیا جائے۔ آصف علی اس سے لاتعلق ہوجائے۔

پشیمانی اور احساسِ جُرم میرا عذاب بن گئے تھے۔ دلاور نے وہی کیا تھا جو وہ کرنا چاہتا تھا مگر اس کا سارا الزام مجھ پر آگیا تھا۔ زندہ انسان کو بھوکے کُتوں کے سامنے ڈلوانے کی بہیمانہ سزا نہ میں نے سُنی تھی اور نہ بیسویں صدی کے مہذب معاشرے میں ممکن تھی۔ آج کل تو سزائے موت کے لیے پھانسی کا طریقہ بھی ظالمانہ سمجھا جاتا ہے اور الیکٹرک چیئر، گیس چیمبر اور انجکشن سے موت کی نیند سُلانے کا مقصد یہی ہے کہ کم سے کم اذیت کے ساتھ سزائے موت کے فیصلے پر عمل درآمد ہو لیکن یہاں میری نظروں کے سامنے ایک جیتے جاگتے انسان کو ایک کتا اسی طرح شکار کررہا تھا جیسے جنگل میں بھیڑیا کرسکتا ہے۔

اچانک میں نے عامر کو کُتے کے چنگل سے نکلتے دیکھا۔ نہ جانے کیسے اس نے کُتے کی گردن توڑ دی تھی۔ دَم توڑنے والا کُتا پھڑک رہا تھا اور لہولہان زخموں سے چُور عامر اپنے تار تار لباس اور دریدہ بدن کے ساتھ بھاگ رہا تھا۔ یہ بڑا بھیانک نظارہ تھا۔ میں نے دلاور کی ہدایت کاری میں تیار ہونے والی ایک اور دہشت ناک (HORROR) فلم کے رونگٹے کھڑے کرنے والا حقیقی سین دیکھا تھا جس نے میرے رگوں میں خون کو منجمد کردیا تھا۔ یہ ایک خاموش فلم تھی۔ میں نے کُتے کے غرانے اور عامر کی چلانے کی کوئی آواز نہیں سُنی تھی مگر میرے ذہن میں ان آوازوں کی خیالی بازگشت موجود تھی۔

عامر کو جان بچاکے فرار ہوتا دیکھ کے مجھے دلی طمانیت حاصل ہوئی۔ میں زمانۂ قبل از مسیح کا رومن نہیں تھا جو تربیت یافتہ غلاموں (GLADIATORS) کو شیروں سے لڑاتے تھے اور اگر کبھی سیکڑوں میں سے ایک غلام شیر کو ہلاک کرکے آزادی حاصل کرلیتا تھا تو وہ مایوس ہوجاتے کہ کھیل میں مزہ نہیں آیا اور شیر جب غلام کو چیر پھاڑ کے رکھ دیتا تھا تو وہ خوشی کے نعرے بلند کرتے تھے۔ یہی تماشا وہ دو غلاموں کو لڑا کر بھی دیکھتے تھے۔ ایک مارا جاتا تھا، دوسرا قتل کرکے آزادی کا انعام پاتا تھا۔ عامر کی جگہ میرا بدترین دشمن خود دلاور یا میرے باپ کا قاتل پیڈرو ہوتا تو زیادہ سے زیادہ میں انہیں اپنے ہاتھ سے گولی مار سکتا تھا۔ اس سے بڑھ کے سفاکی اور بربریّت کا مظاہرہ میرے لیے ممکن ہی نہ ہوتا۔

لیکن میرے سامنے جو کچھ ہوا، ایک ایسے شکاری کا کھیل تھا جس کے انسانی وجود میں بیک وقت شیطان کی اور خونی درندے کی روح حلول کرگئی تھی۔ عین اس وقت جب عامر زندگی کی امید میں لان کو عبور کرچکا تھا، ایک اور کُتا نمودار ہوا۔ یہ پہلے والے کُتے کی نسل کا تھا مگر زیادہ توانا اور خونخوار نظر آتا تھا۔ مایوسی کی جو کیفیت میں نے عامر کے چہرے پر دیکھی، وہ یاد کرکے آج بھی میرا دل کانپ جاتا ہے۔ جب کُتے نے اس پر جست لگائی تو عامر کو اپنی بھیانک موت کا یقین آچکا تھا۔ اس نے مقابلہ کیا مگر اب معاملہ یک طرفہ تھا۔ عامر کا اتنا خون بہہ چکا تھا کہ اس میں کھڑے رہنے کی توانائی بھی قوتِ ارادی کی محتاج تھی۔ تازہ دم کُتے نے اسے ذرا سی دیر میں چیر پھاڑ کے رکھ دیا۔

میں نے عامر کی موت کا آخری منظر نہیں دیکھا۔ میں کھڑکی سے ہٹ کے پیچھے آگیا اور اپنا سر ہاتھوں میں تھام کے بیٹھ گیا۔ دلاور نے یہ سب کچھ مجھے دہشت زدہ کرنے کے لیے کیا تھا۔ اس نے مجھ پر واضح کردیا تھا کہ زبانی طور پر ہی نہیں، وہ عملاً کسی کو بھی کُتوں کے آگے ڈال سکتا ہے۔ وہ شکاری کُتے اسی مقصد کے لیے پالے گئے تھے۔ شاید انہیں پہلے سے بھوکا رکھا جاتا تھا۔

ایک خوف ناک سناٹے میں دلاور کی آواز گونجی "خیر سے تم ٹھیک تو ہو نا اپنے سکندرِ اعظم صاحب! بندے کا دل ذرا مضبوط ہونا چاہیے ورنہ اسے عبرتناک سزا دینے کی بات نہیں کرنی چاہیے۔"

میں نے کراہ کے کہا "میں سمجھ گیا تمہاری بات دلاور۔ تم جو کہنا چاہتے تھے...!"

"میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ تم نے ہی خواہش ظاہر کی تھی کہ اس لڑکے کو سزا دی جائے۔ ہیں جی۔"

"میں وہ بات بھی سمجھ گیا جو تم نے نہیں کہی۔ تم یہی سلوک میرے ساتھ بھی کرسکتے ہو۔ رابعہ اور کاجل بھی تمہاری قید میں ہیں۔"

وہ ہنسا "ابھی تو سکندر کا پیٹ بھر گیا ہے۔ دو دن کے لیے بہت ہے اس کے کھانے کو۔ افسوس ہے مجھے رابعہ کا۔ لو جی یہ تو میں نے تمہیں بتایا ہی نہیں اپنے سکندر اعظم صاحب کہ رابعہ اور سکندر کی جوڑی میں نے کہاں سے حاصل کی تھی۔ یہ جرمن تیمپرڈا اور وولف ٹیریئر کی مخلوط نسل ہے۔ انتہائی خونی اور وحشی۔ آدم خور تو میں نے بنایا ہے۔ ان کے نام میں نے تمہارے نام پر رکھے تھے۔ اب سکندر کے لیے مجھے دوسری رابعہ کا بندوبست کرنا پڑے گا۔ تمہارا کیا خیال ہے تم ایک رابعہ کی جگہ دوسری کو قبول کرلو گے؟"

درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا۔ جتنی ذہنی اذیت میں جھیل چکا تھا اس کے بعد دلاور کی بکواس کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں اس کی آواز ضرور سن رہا تھا اور اس کی بات بھی سمجھ رہا تھا مگر سوچ کچھ اور رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ میری ایک ایک نقل و حرکت، میری صورت کے تاثرات اور میری ذہنی کیفیت کا ردِ عمل دیکھ رہا ہے۔ اب میری کوشش تھی کہ میں جلد از جلد ذہنی صدمے کی کیفیت پر قابو پالوں۔ صورت حال کا تقاضا بھی یہی تھا اور مجھے سوچنے سمجھنے کے لیے پُرسکون ذہن کی ضرورت تھی۔

میں نے جگ سے گلاس بھر کے پانی پیا تو میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ کیا میرے اعصاب بالکل جواب دے چکے ہیں؟ یا میں اتنا بزدل اور کم ہمت ہوں؟ چوہدری دلاور جیسے شکاری سے مقابلہ ہو تو کیا مجھے بدترین عذاب کے لیے تیار نہیں رہنا چاہیے؟ میں نے سوچا اور اگر میں چوہدری دلاور کا مقابلہ اسی کی حیوانی سطح پر آکے نہیں کرسکتا تو پھر مجھے مقابلہ کرنا بھی نہیں چاہیے۔ آدمی کا مقابلہ کُتے سے ہو تو یوں نہیں ہوتا جیسے عامر نے کیا۔ ایک زہر آلود بوٹی کُتے کا کام تمام کرسکتی ہے۔ بندوق کی ایک گولی شیر کو ٹھنڈا کردیتی ہے۔ طاقت میں آدمی کا مقابلہ آدمی سے تو ممکن ہے اس دلاور سے نہیں جو چیتے سے زیادہ مکار، بھیڑیے سے زیادہ خونی، سانپ بچھو سے زیادہ زہریلا اور تمام ارواحِ خبیثہ سے بڑھ کر خبیث ہو۔

"کس سوچ میں پڑ گئے ہو اپنے سکندر اعظم صاحب! برا مان گئے ہو شاید کہ میں نے کتوں کے نام تمہارے نام پر کیوں رکھے تھے۔ تو بات دراصل یہ ہے..."

میں نے پُرسکون لہجے میں کہا کہ "نہ تمہیں اپنی ماں کا نام معلوم نہ باپ کا۔ ورنہ ان کی یاد میں تم انہی کا نام رکھتے۔ خیر چھوڑو، نام میں کیا رکھا ہے۔ اگر میں خود کو دلاور کہنے لگوں یا تم سکندر بن جاؤ تو اس سے کیا فرق پڑے گا۔"

چوہدری دلاور کی آواز آئی "فرق پڑ بھی سکتا ہے۔ اگر تم نے عامر کی جگہ قدرت کو دیکھا ہوتا۔ تمہارے لیے تو دو نام ہیں، عامر اور قدرت۔ عامر چاہتا تھا کہ قدرت کا وجود حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے۔ تم ایسے ہی جذبات عامر کے لیے رکھتے تھے۔ تمہاری خواہش میں نے پوری کردی۔"

"تم اچھی طرح جانتے ہو کہ تم نے وہی کیا جو تم کرنا چاہتے تھے۔" میں نے کہا "اور اس کے بعد بھی تم مجھ سے پوچھ کے کچھ نہیں کرو گے۔ تم مجھے دھمکی دے رہے ہو تاکہ اگلی باری قدرت کی بھی ہوسکتی ہے۔ تم ایسا کیوں کر رہے ہو دلاور؟"

"میں چاہتا ہوں کہ بات اب ختم ہو جائے۔ تم حالات کو سمجھتے ہوئے کوئی سمجھوتہ کرلو۔ میں نے تم سے معافی مانگی، تمہیں سارے نقصانات کا ہرجانہ ادا کرنے کا وعدہ کیا، تمہاری ہر شکایت دور کرنے پر رضامندی ظاہر کی۔ اور بھی کوئی شرط ہے تو مجھے بتاؤ لیکن اس کے بعد کھیل ختم۔"

میں کچھ دیر سوچنے کی اداکاری کرتا رہا "اچھا تم کہتے ہو تو میں بات کرنے کے لیے تیار ہوں۔ ابھی تک تمہیں اندازہ نہیں کہ میری شرائط کیا ہوں گی اس لیے تم بہت بڑھ بڑھ کے بول رہے ہو۔ میرا حوصلہ تم نے بہت آزمالیا، اب تمہاری باری ہے۔"

"اچھا جی اپنے سکندر اعظم صاحب! میں بھی آپ کو یہ موقع دے کر دیکھتا ہوں۔ کسی کو آزمانا بھی مشکل کام ہے، ہیں جی۔ خیر ابھی حاضر ہوتا ہوں میں۔" دلاور نے کہا۔

لیکن خود آنے کے بجائے اس نے مجھے طلب کرلیا۔ دو افراد نے باہر سے قفل کھولا اور کہا "باہر آجاؤ"

وہ اندر آکے کسی غیر متوقع حملے کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ میرے لیے باہر جاکے بھی انہیں زیر کرنا اور ان کا اسلحہ چھین لینا مشکل نہ تھا مگر میں کوئی رسک لینا نہیں چاہتا تھا۔ میرا اوّلین مقصد اپنی اور ان سب کی رہائی تھا جو دلاور کی قید میں تھے۔ طاقت کے بل پر یہ کام ناممکن تھا چنانچہ میں نے سیاست سے کام لینے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

دلاور اسی کمرے میں تھا اور اس کے لبوں پر وہی پُرفریب مسکراہٹ تھی جو اس کے خیالات اور جذبات کو بڑی خوبی سے چھپا لیتی تھی۔ اگرچہ درمیانی وقفے میں شام بھی ڈھلنے لگی تھی مگر وہاں ہر چیز بالکل ویسی ہی تھی جیسی میں نے آخری بار دیکھی تھی۔ چائے کی ٹرالی بھی موجود تھی اور ایک کپ میں وہ چائے بھی جو میں نے پی نہیں تھی۔ یہ چائے گرم تھی۔ چوہدری دلاور نے جادو کی چھڑی ہلا کے وقت کے ایک لمحے کو وہیں روک دیا تھا جہاں سے گفتگو کا سلسلہ ٹوٹا تھا۔

جب میں بیٹھ گیا اور میرے ساتھ آنے والے خاموشی سے باہر چلے گئے تو دلاور نے اٹھ کر ٹہلتے ہوئے کہا "عرض میں یہ کر رہا تھا اپنے سکندر اعظم صاحب کہ ایک سال بعد پھر میں تمہارے سامنے ہوں۔ تمہارے مجرم کی حیثیت سے۔ تم بتاؤ کہ میرے خلاف کیا الزامات ہیں ــــ جو ہونا تھا وہ تو ہوگیا، اب کیا ہوسکتا ہے۔ اس کا فیصلہ بھی تم خود ہی کرو۔"

"میں کیسے یقین کرلوں کہ تمہاری یہ باتیں نیک نیتی پر مبنی ہیں۔" میں نے کہا۔

"بندے کو آزمانا تو چاہیے۔"

"میں جانتا ہوں دلاور کہ تم نہ احمق ہو نہ کوتاہ اندیش۔ تم تو ایک چال چلنے سے پہلے آگے کی دس جوابی چالوں کا حساب کرلیتے ہو اور ذہین دشمن ہی سب سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ جس کی سادگی میں بھی پُرکاری ہوتی ہے اور سادہ لوحی میں عیاری۔ مگر تم کہتے ہو تو میں مان لیتا ہوں کہ تم واقعی ماضی کی ہر غلطی کا کفارہ ادا کرکے مستقبل کے لیے پُرامن بقائے باہمی کا سمجھوتہ چاہتے ہو۔" میں نے کہا۔

"کیا یہ ہم سب کے حق میں بہتر نہیں ہوگا کہ ہم سمجھوتہ کرلیں اور اپنی توانائی کا بہتر استعمال کریں۔ خواہ وہ کسی بھی سمت میں ہو۔" دلاور بولا۔

"کسی بھی صحیح سمت میں......" میں نے کہا "ماضی کے کھاتے بند کرکے تم آئندہ کے لیے اس سمجھوتے کو غلط کاری کا لائسنس سمجھو گے تو بات نہیں بنے گی۔"

"دیکھو، ہم اپنی اپنی زندگی گزارنے کے لیے کسی دوسرے شخص کے این او سی کے محتاج نہیں ہیں۔" دلاور نے ناگواری سے کہا "نہ میں تمہارے قول و فعل اور اخلاق و کردار کا ذمے دار ہوں اور نہ تم میرے مامے لگتے ہو کہ میرے پیچھے لگے رہو۔ میں غلطی کروں گا تو خود نقصان اُٹھاؤں گا، جرم کروں گا تو پکڑا جاؤں گا۔ گناہ کروں گا تو اللہ میاں کو جواب دوں گا، تم اپنے مستقبل کی فکر کرو۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ بات ان معاملات پر ہوگی جو آج تک اختلاف کا سبب بنے رہے ہیں۔ مثال کے طور پر وزیر خاں کا معاملہ سب سے پہلے۔"

میں نے کہا "چلو ٹھیک ہے۔ میرا پہلا مطالبہ یہ ہے کہ تم وزیر خاں کے قتل کا اعتراف کرلو اور خود کو قانون کے حوالے کردو۔"

"میں پہلے بھی بتاچکا ہوں کہ اسے میں نے قتل نہیں کیا تھا۔ اس کی موت طبعی تھی۔"

"جھوٹ مت بولو۔ تم نے اس کے حالات کو جینے کے لیے ناقابل بنادیا تھا۔ اسے ہر طرف سے محصور کرلیا تھا اور اس انتہا کو پہنچا دیا تھا جہاں موت کے سوا نجات کی صورت باقی نہیں رہی تھی اور وہ جو تمہارا پارٹنر تھا، لاکھوں کا مالک تھا، وہ مفلسی اور کسمپرسی کے عالم میں بیمار پڑا تو اس کے پاس علاج کے لیے پیسہ تک نہ تھا۔ وہ ایک گھریلو ملازم کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ کون تھا آخر اس کا ذمے دار؟" میں چلانے لگا۔

"میر شرافت علی!" دلاور نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"اس کا نام تم اس لیے لے رہے ہو کہ وہ تردید کرنے کے لیے واپس اس دنیا میں نہیں آسکتا۔" میں نے کہا "تم نے اسے بھی قتل کرادیا تھا۔ اس ڈر سے کہ کہیں وہ تمہارے خلاف گواہ نہ بن جائے۔ تمہارا پول نہ کھول دے۔"

"یہ غلط ہے۔ اسے قتل کرنے والا پیڈرو تھا۔"

"پیڈرو کس کے حکم کا غلام تھا؟"

"میں نے اسے کبھی نہیں کہا تھا کہ میر شرافت علی کو راستے سے ہٹادو۔ یہ کام اس نے خود کیا۔"

"اس کی میر شرافت علی سے کیا دشمنی تھی؟"

"کچھ نہیں۔ اسے موقعہ ملا تھا کہ قتل کے جرم میں تم کو پھنسا دے اور اس نے موقعے سے فائدہ اُٹھالیا۔"

"پھر تم نے اس کی پیٹھ ٹھونکی کہ شاباش، ایک تیر سے دو شکار کرلیے۔ سکندر کو قتل کے کیس میں تختۂ دار کی جانب روانہ کردیا اور میر شرافت علی کو عالمِ بالا کی طرف۔ نہ وزیر خاں کا وارث رہا نہ تمہارا کوئی پارٹنر۔ تم بلا شرکت غیرے کاروبار پر قابض ہوگئے۔"

"مگر یہ ٹھیک ہے کہ میں نے خود کچھ نہیں کیا تھا۔ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ وزیر خاں کو راستے سے ہٹادوں۔ یہ خیال تھا خود میر شرافت علی کا۔ بس میں نے اس کی مخالفت نہیں کی تھی۔ پھر وہ جو کچھ کرتا رہا تم مجھے اس کی تائید کا قصوروار سمجھ سکتے ہو لیکن اصل مجرم وہی تھا۔"

"کتنی ڈھٹائی سے تم خود کو بے قصور ثابت کر رہے ہو۔ کیا ایک جرم میں شریک تمام افراد مجرم نہیں ہوتے۔ قتل کا ارادہ کرنے والا، منصوبے بنانے والا، قتل میں شریک، قتل کے جرم میں معاون اور قتل کو چھپانے والا ایک سے مجرم ہوتے ہیں۔ اگر کوئی قتل ہوتے دیکھتا ہے اور خاموش رہتا ہے تو وہ بھی مجرم ہے۔"

"تم قانونی موشگافی کے چکر میں پڑ جاؤ گے تو بات آگے نہیں بڑھے گی۔" دلاور نے برہمی سے کہا "تم کبھی ثابت نہ کرسکو گے کہ قتل کا الزام مجھ پر آتا ہے۔ قانون کی نظر میں تو مجرم تم ہو مگر میں بات کر رہا ہوں ان معاملات کی جو قانون کی آنکھ سے اوجھل ہیں۔ میر شرافت علی اصل مجرم ہے جس کے ذہن میں وزیر خاں کو الگ کردینے کا خیال آیا تھا اور جب وزیر خاں شرافت سے اپنا حصہ لے کر الگ ہونے پر رضامند نہیں ہوا تو میر شرافت علی نے ہی کہا تھا کہ ہمارے پاس دوسرے طریقے بھی ہیں۔ خود اس نے مجھے اُکسایا تھا اور دوسرے طریقے بتائے تھے۔"

"اور تم نے کہا تھا ٹھیک ہے، ایسا ہی کرو۔"

"نہیں۔ میں نے کہا تھا کہ میں کچھ نہیں کروں گا۔ تم خود جو چاہو کرو۔" دلاور بولا "اس نے پیڈرو کی خدمات مانگی تھیں اور میں نے پیڈرو کو میر شرافت علی کے حوالے کردیا تھا۔"

"اچھا اگر سب کچھ میر شرافت علی اور استاد پیڈرو نے ہی کیا تھا تو پیڈرو کو میرے حوالے کردو۔ میں خود اس سے حقیقت اُگلوالوں گا۔"

"پیڈرو سے اب میرا کوئی تعلق نہیں۔ مجھے نہیں معلوم وہ

کہاں ہوگا۔" دلاور نے کہا "میں اسے بہت پہلے نکال چکا ہوں۔"

"جھوٹ بکتے ہو تم۔ وہ مسلسل ہمارا تعاقب کررہا ہے اس نے دو بار ہماری جان لینے کی کوشش کی تھی۔ ایک بار آفریدی مارا گیا' دوسری بار ریسٹ ہاؤس کا چوکیدار۔ کس کے حکم پر کررہا تھا وہ یہ کارروائی؟"

"یقین کرو میرا ان معاملات سے کوئی تعلق نہیں۔"

"تم سے کیسے بات ہوسکتی ہے دلاور۔ تم تو اس سے بھی انکار کروگے کہ رابعہ اور کاجل کے ساتھ آصف علی کے گھر والوں کو اغوا کرانے والے تم نہیں تھے۔" میں نے کہا۔

"نہیں' یہ کام میرا تھا۔ وہ میرے ہی آدمی تھے جو تم سب کو یہاں لائے تھے۔ میں تم سے لاہور میں بات کرلیتا لیکن تم تو لاہور میں ٹھہرے ہی نہیں۔"

"تم چاہتے ہو میں اس بات پر یقین کرلوں کہ پیڈرو تمہاری مرضی کے بغیر ہمارے پیچھے لگا ہوا تھا اور اس نے ہماری جان لینے کی جو ناکام کوشش کی اس کا تمہیں کوئی علم نہیں۔"

"علم تو ہے مگر مجھے نہیں معلوم کہ پیڈرو نے ایسا کیوں کیا۔" دلاور بولا "تم میری قسم پر بھی اعتبار کرنے والے نہیں ہو ورنہ میں حلف اُٹھا سکتا تھا اس بات پر کہ پیڈرو خود میرا ساتھ چھوڑ گیا تھا اور میں نے اسے واپس نہیں بُلایا۔ اسے اندازہ ہوچکا تھا کہ میں بہت جلد اس سے پیچھا چھڑالوں گا۔ ہوسکتا ہے وہ تم سے خطرہ محسوس کرتا ہو کیونکہ تم بھی اسے ہی اپنے والد کا اور میر شرافت علی کا اصل قاتل سمجھتے تھے۔ جب تک اسے میری پشت پناہی حاصل رہی وہ بے خوفی سے سب کچھ کرتا رہا اب اس نے ہمیشہ کے لیے تمہارے خطرے کو ختم کرکے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کا سوچا ہوگا۔"

میں اسے بے یقینی سے دیکھتا رہا "تم واقعی نہیں جانتے کہ پیڈرو کہاں ہے؟"

"وہ ... ہے تو پشاور میں۔ شاید واپس چلا گیا ہو لیکن نہ اسے میں نے بھیجا تھا اور نہ اس نے میری مرضی سے کچھ کیا۔ مجھ سے الگ ہونے کے بعد سے وہ روپوش ہے۔ اسے ڈر ہے کہ میں اس کا قصہ ہی پاک نہ کردوں۔"

"یہ اچانک تمہارے اور پیڈرو کے درمیان اختلافات اتنے سنگین کیوں ہوگئے؟"

"دیکھو سکندر' میرے اور تمہارے درمیان بہت سے اصولی اور نظریاتی اختلافات ہیں۔ تم خود کو شریف زادہ کہتے ہو' میں خود ایسا دعویٰ نہیں کرتا۔ میرے کاروبار کو بھی تم غیر قانونی سمجھتے تھے۔ میرے نزدیک کاروبار صرف کاروبار ہے۔ مجھے اپنی بات ختم کرلینے دو۔ تم مجھے غدار قرار دیتے ہو کیونکہ میں نے وطن دشمنوں کو اسلحہ فراہم کیا لیکن تم سطحی حقیقت کو دیکھ رہے ہو۔ کیا تم جانتے ہو کہ میرے اس کاروبار کو اعلیٰ سرکاری حکام کی سرپرستی حاصل تھی؟ میں ان کا نام نہیں لے سکتا مگر مشرقی پاکستان میں جو کچھ ہوا صرف دلاور کی وجہ سے نہیں ہوا۔ یہاں بڑے بڑے ائرکنڈیشنڈ دفتروں میں بیٹھے ہوئے بیوروکریسی کے نمائندوں نے' منافق ملاؤں اور خودغرض سیاست دانوں نے دلاور سے کہیں بڑھ کے اس سازش میں حصّہ لیا۔ سازشی عناصر کی حوصلہ افزائی کی۔ انہیں وسائل فراہم کیے اور تحفظ کی پوری ضمانت دی۔ تم ایک چوہدری دلاور کی کیا بات کرتے ہو' یہاں جو ملک کے دو حصّوں کے درمیان خلیج کو بڑھا رہے تھے اور انتشار پھیلا رہے تھے۔ خانہ جنگی کے اسباب پیدا کررہے تھے۔ بین الاقوامی سپرپاور کے آلۂ کار بنے ہوئے تھے اور ان سے بھاری رقوم وصول کررہے تھے۔ ان سب کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ ٹھیک ہے' میں نے پیسہ کمایا اور غلط طریقے سے کمایا مگر اس کی راہ مجھے کس نے دکھائی اور کیا تمہیں معلوم ہے اس میں سے کتنا پیسہ انہوں نے وصول کیا۔ جو اصل غدار اور مجرم ہیں نگران کے معصوم چہرے پبلک نے نہیں دیکھے۔ کیا یہاں پہلے سے وطن دشمن نہیں تھے جو ہر سال کروڑوں اربوں کا غبن کرتے تھے۔ ٹھیکوں میں اور بوگس بلوں میں۔ کاغذی منصوبوں میں اور ناقص پلاننگ میں۔ ان کو ہدایات باہر سے ملتی تھیں وہ غلط بجٹ بناتے تھے جو غلط اعدادوشمار اور غلط گوشواروں کا گورکھ دھندا ہوتا تھا۔ غیر ملکی آقاؤں کے یہ زرخرید ایجنٹ کون ہیں' کیا تم جانتے ہو انہیں جو اس ملک کی تاریخ میں نفاق اور انتشار کے ذمّے دار ہیں جنہوں نے کبھی اس ملک میں سیاسی اور معاشی استحکام نہیں آنے دیا۔ جو وزارتوں اور اسمبلیوں کو توڑتے رہے' کبھی مارشل لا کے نام پر فوج کو استعمال کرتے رہے تو کبھی سیاست کے لیے مذہب کو۔ انہوں نے ملک کو پیچھے دھکیلنے والے ہاتھ مضبوط کیے اور اس کو ترقی کی راہ پر کبھی گامزن ہی نہ ہونے دیا تاکہ ہم مقروض رہیں' محتاج رہیں اور خود کفالت کی منزل کبھی نہ پاسکیں۔ تم دلاور کو مار سکتے ہو مگر ان کو جو ملک کے اصل دشمن ہیں تم پہچانتے ہی نہیں۔ ان کا کچھ بگاڑ سکتے ہو تم؟ میں تمہیں بتاتا ہوں سکندر کہ جس دن تم نے ایک بھی چہرہ شناخت کرنے کی غلطی کی اور اسے بے نقاب کرنا چاہا اسی دن تم غائب ہوجاؤ گے۔ چیونٹی کی طرح مارے جاؤ گے کیونکہ وہ ہاتھی ہیں۔ وہ محاورہ مت دُہراتا کہ چیونٹی ہی ہاتھی کی موت کا سبب بنتی ہے۔ یہ خلائی دور ہے جس میں ہاتھی کے پاس جدید ترین آلاتِ سراغرسانی ہوتے ہیں اور چیونٹی حرکت بھی کرے تو اسے معلوم ہوجاتا ہے۔"

وہ بول رہا تھا اور میں اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ یہ دلاور نہیں کوئی اور تھا۔ اس کا لب ولہجہ اندازِ گفتگو اور خیالات سب مختلف تھے۔ وہ ایک پڑھے لکھے آدمی کی طرح روانی سے بول رہا تھا۔ آج تک وہ جاہلوں کی زبان بولتا رہا تھا اور وہ بھی ایک مخصوص اسٹائل میں۔ میرے لیے یہ فرض کرنا مشکل تھا کہ اتنا عرصہ وہ میرے سامنے اداکاری کرتا رہا اور مصنوعی لہجے میں بات کرتا رہا۔

شاید یہ اس کا نیا بہروپ تھا۔ اس نے اپنی شخصیت کو نئے سانچے میں ڈھالا تھا۔ وہ ایک سیاست دان کی طرح مجھ سے مخاطب تھا اور میں آہستہ آہستہ اس تبدیلی کے اسباب کو سمجھنے لگا تھا۔ عملی سیاست میں قدم رکھنے کے بعد چوہدری دلاور کو اپنے ماضی کے کردار کو یکسر بدل دینا ضروری تھا۔ اس نے پیڈرو سے پیچھا چھڑالیا تھا اور اب وہ مجھ سے تمام معاملات پر مصالحت اور مفاہمت کے لیے تیار تھا۔

موقع پاتے ہی میں نے کہا "چوہدری دلاور۔ میں نے سُنا ہے کہ تم نے سیاست میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا ہے۔"

"تم نے ٹھیک سُنا ہے۔ اس ملک کو نئی قیادت کی ضرورت ہے۔" چوہدری دلاور بولا۔

"اور نئی قیادت فراہم کریں گے تم جیسے لوگ جو کل تک اسمگلر تھے' مجرم اور غدار تھے۔ جرائم کی دنیا سے سیاست کی دنیا میں آئے تو تم بڑے شکاری بن جاؤ گے۔ یہی بات ہے نا؟" میں نے تلخی سے کہا۔

چوہدری دلاور کا رنگ ذرا سی دیر کے لیے فق ہوا "تم اپنی رائے قائم کرنے کے لیے آزاد ہو۔ مگر کیا میں نے غلط کہا ہے۔ میں نے اپنے ماضی کی کتاب کو بند کردیا ہے اب نہ میرا کسی استاد پیڈرو سے کوئی تعلق ہے نہ کسی حاجی عبداللہ سے۔"

"اس لیے کہ تم ان کے محتاج نہیں رہے۔ تم نے اتنا کالا دھن اکٹھا کرلیا ہے کہ سیاست کے بازار میں اپنی دُکان کھول سکتے ہو۔ اس بزنس میں لاکھوں کی سرمایہ کاری کروڑوں کی ضامن ہوتی ہے۔ کل کو تم اسمبلی کے ممبر یا وزیر بن کے زیادہ اثرورسوخ کے مالک ہوجاؤ گے۔ قانون سے بالاتر ہوجاؤ گے۔ میرے جیسے لوگ تمہیں سلام کریں گے۔ تمہاری سفارش تلاش کریں گے۔ روٹ پرمٹ کے لیے' امپورٹ لائسنس کے لیے۔ نوکری کے لیے۔"

چوہدری دلاور نے کہا "ہم موضوع سے ہٹ گئے ہیں۔ تم اپنے والد کے قاتل کو کیفرِ کردار تک پہنچانا چاہتے تھے۔ میں استاد پیڈرو کی گرفتاری میں تمہاری مدد کرسکتا ہوں۔ اسے تمہارے حوالے بھی کیا جاسکتا ہے۔"

"لیکن تمہیں تو معلوم ہی نہیں کہ وہ کہاں ہے؟"

"وہ کہیں بھی روپوش ہوجائے۔ چوہدری دلاور کی نظر اسے تلاش کرلے گی۔"

"ٹھیک ہے' استاد پیڈرو کو میرے حوالے کرنا تمہاری ذمّے داری ہے۔ اس کے بعد ہی فیصلہ ہوگا کہ میرے والد کے قتل کی ذمّے داری کس کس پر عائد کی جاسکتی ہے۔"

"دوسرا معاملہ ہے اس جائداد کا جس کے تم وارث تھے۔ تو یہی آفرادین ہے۔" دلاور نے کہا "وہ زمین تمہاری تھی جس پر ابتدا ... بحر وزیر اینڈ کمپنی قائم تھی۔ وہ کمپنی اب نہیں رہی مگر وہاں جو ... والد کے نام پر بنا ہے وہ تمہارا ہے۔ میں بورڈ آف ڈائریکٹرز کا ایک رُکن ہوں۔ اس حیثیت سے میرا نام باقی رہے گا۔ چیئرمین تم ہوجاؤ۔"

"میں یہ شرط نامنظور کرتا ہوں۔ تمہارا اس سے کوئی تعلق نہیں۔"

"ایک دن آئے گا جب تم اس فیصلے پر افسوس کروگے۔ میری ذات سے تمہیں بہت سے فوائد حاصل ہوسکتے ہیں مسٹر سکندر بخت۔"

"میں ان سب فوائد پر لعنت بھیجتا ہوں جو مجھے تمہاری ذات سے حاصل ہوں۔ اپنے چوہدری دلاور صاحب۔"

"تمہارے والد کا گھر اپنی جگہ موجود ہے۔ مجھے معلوم ہے اس میں کتنا عرصہ رابعہ تنہا رہی۔ واقعات کی گواہی کو جُھٹلایا نہیں جاسکتا۔ اس تمام عرصے میں کسی نے رابعہ کی طرف بُری نظر سے بھی نہیں دیکھا۔ تم مانو یا نہ مانو۔ میں خود اس کی حفاظت کے خیال سے غافل نہیں تھا۔"

میں نے تلخی سے کہا "گویا آج تم میرے محسن بھی ہوگئے؟"

"یہ احسان کی بات نہیں۔ خدانخواستہ رابعہ کو کچھ ہوجاتا تو تمہارا شک خود بخود میری طرف انگشت نمائی کرتا۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ کب رعایت دی تھی تم نے رابعہ کو یا نازو کو۔ شہلا کے ساتھ جو کچھ تم نے کیا۔"

"غلط۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ نہ وہ میرے کہنے پر ہوا۔ وہ تمہارے جانے کے بعد کتنا عرصہ یہاں رہی۔ مسٹر اور مسز ضامن رضوی کے ساتھ۔ کسی نے انہیں کچھ کہا؟"

"یہ الزام دوسروں کو مت دو۔ یہ ثابت مت کرو کہ تم کو کچھ معلوم نہیں تھا اور تم بالکل بے گناہ ہو۔" میں نے چلا کے کہا "وہ تمہارے ہی گرگے تھے' تمہارے احکامات کے تابع تھے اور تمہاری مرضی کے بغیر کچھ نہیں کرتے تھے۔ تم سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے تھے۔ تم اور حاجی عبداللہ' ایس پی سراج اور ڈی سوزا۔"

"اچھا اچھا' چلاؤ مت۔ جو بھی ہوا اس کی ذمّے داری اگر میں قبول کرلوں تو تم کیا کروگے۔ زیادہ سے زیادہ تم مجھے قتل کرسکتے ہو۔" دلاور نے میز کو لات ماری "یہ لو شوٹ کردو مجھے۔"

اس نے اپنی جیب سے ریوالور نکال کر میرے سامنے پھینک دیا۔ ریوالور صوفے پر میرے قریب گرا۔

"اُٹھاؤ ریوالور' خالی کردو مجھ پر۔ اگر اس سے تمہارا ہر مسئلہ حل ہوجاتا ہے تو ہمت کرو۔ یہ خالی نہیں ہے۔"

میں نے ریوالور اُٹھالیا "تمہیں شوٹ کرنا واقعی بہت ہی آسان ہوتا۔ اگر میں تمہاری قید میں نہ ہوتا۔ میرے سامنے ڈرامہ مت کرو دلاور۔ صرف حملہ کرنے کی نیت کی تھی میں نے تو تمہارے محافظوں نے میرے گلے میں پھندا ڈال دیا تھا۔ ایک طرف تم اپنی طاقت کا مظاہرہ کرتے ہو۔ یہ بتانے کے لیے کہ اس بدبخت عامر کی طرح تم کسی کو بھی شکاری کتوں کے سامنے ڈال سکتے

ہو۔ ہم سب تمہاری قید میں ہیں۔ تمہیں مار کے کون اپنی جان سلامت لے جاسکتا ہے۔ ہاں میں تمہاری مصالحت کی پیشکش پر اس وقت غور کرسکتا ہوں جب تم اپنی نیک نیتی کا عملی ثبوت دو۔"

"اور کیسے ثبوت دوں آخر؟"

میں نے ریوالور اس کی طرف بڑھایا "سب سے پہلے تو یہ بتاؤ کہ یہاں میرے علاوہ کس کس کو قید کر رکھا ہے تم نے؟"

"یہ قید خانہ نہیں ہے۔ جب تم ان سے ملو تو پوچھ لینا کہ کیا انہیں یہاں کسی قسم کی تکلیف تھی۔ رابعہ اور کاجل کو شاید یہ بھی احساس نہیں ہوگا کہ وہ قید میں ہیں۔ ابھی تک ان کا اور میرا آمنا سامنا نہیں ہوا۔" چوہدری دلاور بولا۔

"وہ اتنی بے وقوف بھی نہیں ہیں کہ اپنے اغوا کو اور اس اسیری کو مذاق سمجھتی ہوں اور یہ فرض کیے بیٹھی ہوں کہ وہ سرکاری مہمان ہیں۔" میں نے کہا "استاد پیڈرو مسلسل ... را اچھا کر رہا تھا اور ہماری جان کا دشمن ہو رہا تھا۔ وہ تمہارا ساتھی ہے۔ ان کے علم میں ہوگا کہ کس طرح عامر نے ان سب سے دغا کی اور انہیں دھوکے سے پیڈرو کے حوالے کردیا۔ تمہاری چنڈال چوکڑی کے سوا یہ حرکت کون کرسکتا تھا دلاور۔ رابعہ کو اچھی طرح معلوم ہوگا کہ اس واردات میں تمہارا ہاتھ ہے اور ایسا صرف نمک حرام عامر کی وجہ سے ممکن ہوا۔"

"عامر کو اس کے کیے کی سزا مل چکی ہے۔"

"کیا یہ سب رابعہ نے نہیں دیکھا ہوگا۔ جو میں نے دیکھا تھا۔ مجھے حیرت ہے کہ تم درندگی کی کس انتہا تک جاسکتے ہو دلاور۔"

"کیا تمہارے خیال میں عامر کے ساتھ زیادتی کی میں نے؟ وہ اچھا آدمی تھا؟" دلاور نے بگڑ کے کہا "سوچو ذرا اس نے کس کی زندگی کو فروخت کیا تھا۔ اس معذور اور بے بس لڑکی کو وہ صرف دولت کی خاطر قتل کرنا چاہتا تھا۔ وہ دولت جس پر اس کا کوئی حق تھا تو اسی معذور لڑکی قدرت کی وجہ سے۔ جس شخص نے اس لاوارث .... کو باپ کی محبت اور شفقت دی۔ اپنا وارث بنایا۔ وہ اسی کے خون کا سودا کر رہا تھا۔ جب مجھے ساری بات معلوم ہوئی تو میں نے اسی وقت فیصلہ کرلیا تھا کہ میں اسے کتے کی موت ماروں گا۔ تم کہہ سکتے ہو کہ میرے اندر بھی ایک حیوان چھپا ہوا ہے۔ کبھی کبھی وہ مجھ پر غالب آجاتا ہے۔ اگر میں عامر کو بخش دیتا تو کل کسی اور بہانے وہ قدرت کی جان لیتا۔ کسی نہ کسی طرح وہ قدرت کو قتل کردیتا۔ یا کرادیتا۔"

"مجھے اس پر اعتراض نہیں کہ تم نے اسے ماردیا۔ مگر تم نے جو طریقہ اختیار کیا..." میں نے نفی میں سرہلایا "تم صرف مجھے دہشت زدہ کرکے مجھ سے اپنی بات منوانا چاہتے تھے۔ تم نے دھمکی بھی دی تھی کہ رابعہ یا قدرت کا یہی انجام ہوسکتا ہے۔"

"اسے نظرانداز کردو۔ وہ محض دھمکی تھی اور اس کا نتیجہ ہے کہ تم میری بات سن رہے ہو اور سمجھ بھی رہے ہو۔ آج نہ سہی اگلی بار جب ہماری ملاقات ہوگی تو بہت سی غلط فہمیاں دور ہوچکی ہوں گی۔ رابعہ کے گھر کی تباہی کا ذمے دار میں تھا تو میں نے اس سے بڑا ایک عالی شان محل بنادیا ہے وہاں۔"

"کس کے لیے؟ ایک طوائف زادی چاندنی کے لیے اور ایک بدمعاش گولا ٹنڈ والا کے لیے؟" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

"وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔" دلاور نے کہا "ایک خاص مقصد کے تحت میں نے انہیں اس خوش فہمی میں رکھا کہ وہ اس محل کے مالک ہیں۔ حالانکہ قانونی طور پر یہ ناممکن تھا۔ تمہیں اور رابعہ کو کسی کے خلاف حقِ ملکیت کا دعویٰ دائر کرنے کی ضرورت نہیں۔ تم جب چاہو اس کا قبضہ لے سکتے ہو۔"

"تمہاری یہ فیاضی مجھے رشوت کی طرح لگتی ہے۔ تم مجھے خریدنا چاہتے ہو دلاور۔ لیکن ایسا ممکن نہیں ہے۔ رابعہ اس زمین پر اپنا گھر خود اپنے پیسے سے بھی بناسکتی تھی۔ اگر تم کچھ کرنا ہی چاہتے ہو تو بس اتنا کرو کہ اس کی ماں اسے واپس لادو جس کو تم نے اسپتال میں قتل کرایا تھا۔" میرا خون کھولنے لگا "مجھے بکاؤ مال مت سمجھو دلاور' میں وہ سب نہیں بھول سکتا جو تم نے میرے ساتھ کیا تھا۔ جو انسانیت سوز تشدد میں نے اور رابعہ نے جھیلا۔ تمہارے اشارے پر پولیس نے میرے ساتھ کیا کیا تھا؟"

"وہ سب باتیں پرانی ہوگئیں۔"

میں نے چیخ کر کہا "تم کہتے ہو میں ان سب باتوں کو بھلادوں؟ یہ بھی بھول جاؤں کہ تم ہی استاد ٹیڈی کے قاتل بھی ہو۔ تمہارا دامن ان گنت انسانوں کے خون سے داغدار ہے۔ آج تم اپنے ماضی کا ہر سیاہ نقش مٹانے کے لیے مجھے قائل کرنا چاہتے ہو کہ جو کچھ بھی ہوا تھا اس کے ذمے دار تم نہیں تھے۔ دوسرے تھے یا تیسرے تھے۔ تم یقین دلانا چاہتے ہو کہ راتوں رات تم بدل گئے ہو۔ انسانی زندگی' انسان کی عزت اور انسانیت کی آبرو کی تجارت کرتے کرتے تم اس ملک کے سیاہ و سفید کے مالک بننا چاہتے ہو۔ سیاست کے میدان میں اُترے ہو تو تمہاری کتاب زندگی کا ہر ورق کیسے سادہ نظر آئے گا جبکہ اس میں تمہارے کالے کرتوتوں کی سیاہی اور بے گناہوں کے خون کی سُرخی کے سوا کچھ نہیں۔"

"اس وقت تم ذہنی طور پر حالات کی تبدیلی کو قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہو۔" دلاور نے اُٹھتے ہوئے کہا "فی الحال اتنا ثبوت دے سکتا ہوں میں اپنی نیک نیتی کا جو تمہیں قائل کرلے کہ وقت کے ساتھ انسان بدل بھی سکتے ہیں۔ نیچے گاڑی تیار ہے تم لوگ میرے مہمان تھے' قیدی نہیں۔ گاڑی میں چابیاں موجود ہیں۔ تم اس میں کہیں بھی جاسکتے ہو۔"

"مثلاً جیل۔ آدھے راستے میں پولیس ہمیں چوری کی کار چلاتے ہوئے پکڑ لے گی۔"

"مجھے اندازہ تھا کہ تم شک کروگے۔" وہ بولا "اس لیے گاڑی آج ہی رابعہ قاری ایڈووکیٹ ہائی کورٹ لاہور کے نام ٹرانسفر کردی گئی ہے۔ تمام قانونی دستاویزات گاڑی میں ہیں۔ اگلی ملاقات میں شاید ہمارے درمیان غلط فہمیاں کم ہوں گی اور ہم بہتر ماحول میں گفتگو کریں گے۔ خدا حافظ۔"

اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھایا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ میں اس سے ہاتھ نہیں ملاؤں گا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ دلاور کے ہر عذرِ بے گناہی کو میں نے مسترد کردیا تھا۔ کل کا شیطان آج فرشتہ ہونے کا دعویٰ کیسے کرسکتا تھا۔ وہ مجبور ہوگیا تھا کہ ہم سے اپنے گناہ بخشوائے ورنہ ہم اس کے سیاسی مستقبل کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہوں گے۔ اس کا دستِ تعاون بڑھانا پہلی سیاسی چال تھی جس کا مقصد اپنے سب سے خطرناک دشمنوں سے ہر قیمت پر صلح کرنا تھا خواہ اس کے لیے اسے اپنی انا کو بھی قربان کرنا پڑے۔

اس کے جانے کے بعد میں جھنجلاہٹ' کنفیوژن اور غصے میں اپنے ہونٹ کاٹتا رہا۔ مجھے ایک فیصد شبہ نہیں تھا کہ میں نے دلاور کو سمجھنے میں غلطی کی ہوگی۔ یہ سب جھوٹ اور مکروفریب کا وہ ڈرامہ تھا جس پر دلاور نے بہت محنت کی تھی۔ صرف ہمیں قائل کرنے کے لیے کہ کل اور آج کے دلاور میں بہت فرق ہے۔ کل وہ ہمارا دشمن تھا مگر آج دوست ہے۔ وہ اپنی غلطی "گناہ' جرم سب کا کفارہ ادا کرنے کو تیار ہے اور ہر قیمت پر ہم سے معافی کا خواستگار ہے۔ بھیڑیے نے اب بھیڑ کی کھال اوڑھنے کا فیصلہ کیا تھا تو وہ چاہتا تھا کہ جو لوگ اس کی حقیقت سے آشنا ہیں وہ اس کے ہمنوا نہ ہوں تو خاموش رہ کے تماشا دیکھنے پر تیار ہوجائیں۔ دل ہی دل میں اسے ہزاروں گالیاں دیتے ہوئے میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اس کے اور میرے درمیان دشمنی کا رشتہ باقی رہے گا۔ ایک ذاتی وجہ کو میں نے آج تک نظرانداز کیا تھا کیونکہ میں وسیع تر بنیادوں پر اس کے خلاف محاذ بناچکا تھا۔ اب میں نے محسوس کیا کہ ایک جنگ ختم ہوجانے سے صورتِ حال نہیں بدلی۔ اب ہم دوسری جنگ میں ایک دوسرے کے حریف ہیں۔ کل وہ غدار تھا اور آج محبِ وطن ہونے کی سند حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس ملک کی جڑیں کھوکھلی کرکے اسے دولخت کرنے والا ٹولہ اس ملک کے عوام کی تقدیر کا مالک بننا چاہتا تھا۔ وطن کے دشمن وطن کے رہنما بننے کی سازش کر رہے تھے۔ ہمیں اس سازش کو ناکام بنانا تھا۔

فوری فیصلے سے کسی مثبت نتیجے کی اُمید نہیں کی جاسکتی تھی۔ میں نے اس معاملے کو مشورے کی مہلت تک ملتوی کردیا۔ وقت خود بتادے گا کہ دلاور کے عزائم کیا ہیں اور اس کے جھوٹ سچ کا پردہ چاک ہوجائے گا۔

کمرے میں میرے سوا کوئی نہیں تھا۔ میں نے صوفے کے پیچھے جھانک کر دیکھا اور پردے ہٹا کے دیکھا مگر دلاو... محافظ بھی پُراسرار طور پر غائب ہوچکے تھے۔

میں ایک دروازے سے باہر آیا تو میرے کانوں نے کاجل کی آواز سُنی۔ وہ رابعہ کو پکار رہی تھی۔

میں نے چلا کے کہا "کاجل کدھر ہو تم۔"

ایک سیکنڈ کی خاموشی کے بعد دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز آئی اور کاجل نے کہا "بھائی سکندر۔"

دوسرے لمحے وہ باہر کھلنے والے دروازے سے میرے سامنے آگئی۔ اس کے پیچھے رابعہ آئی اور وہ بھی مجھے دیکھ کر اتنی ہی حیران ہوئی۔

کاجل نے کہا "آپ یہاں... میرا مطلب ہے کب آئے؟"

میں نے کہا "اصولاً سوال کرنے کا حق مجھے حاصل ہے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ہم نے آپ کو ناصرپور بھیجا تھا۔"

رابعہ نے کہا "اور ہم نے آپ کو بھیجا تھا کلیم اللہ کے ساتھ۔ اسے چھوڑ کے واپس آنے میں دو دن لگ گئے۔ آج تیسرا دن ہے۔"

کاجل بولی "تم آصف علی کے ساتھ گئے تھے تو کل تمہیں اس کے ساتھ واپس آنا چاہیے تھا۔"

"انہیں روک لیا ہوگا کسی نے۔ زور کس پر ہوا۔ کسی پر۔"

رابعہ بولی "کوئی بہت ضروری کام پڑگیا ہوگا۔"

میں نے عاجزی سے سرجھکا کے کہا "شادی سے زیادہ ضروری کام کیا ہوسکتا ہے۔ اس کے بعد ولیمہ بھی ضروری تھا۔ میں کیا کرتا۔"

کاجل ہنسنے لگی "پہلے لوگ ولایت جاتے تھے تو شادی کے بغیر نہیں آتے تھے۔ اب غیر علاقے میں جاتے ہیں شادی کرنے کے لیے۔"

میں نے کہا "یقین کرو اس میں میری مرضی کو قطعی دخل نہیں تھا۔ میں نے آخر وقت تک مزاحمت کی۔ کسی نے میری ایک نہیں سُنی۔ زبردستی شادی کردی۔"

کاجل کی مسکراہٹ پھیکی پڑگئی "مذاق چھوڑیں۔"

میں نے مظلوم اور دُکھی لہجے میں کہا "خدا کی قسم یہ مذاق نہیں ہے کاجل۔ بس سب کچھ اچانک ہوگیا۔ کسی پروگرام کے بغیر۔"

اب رابعہ نے میری طرف یوں دیکھا جیسے پولیس آوارہ گردی میں پکڑے جانے والوں کو دیکھتی ہے کہ کہیں وہ نشے میں تو نہیں۔ اسے معلوم تھا کہ میں قسم کھانے کا عادی نہیں "جھوٹی قسم مذاق میں بھی نہیں کھانی چاہیے۔"

"آخر میں کیسے یقین دلاؤں تمہیں رابعہ۔ مجھے معاف کردو۔ میں مجبور تھا۔" میں نے کہا "نہ میری مرضی تھی اور نہ کسی نے مجھ سے پوچھا۔ وہ تو سب اچانک ہی ہوگیا۔ وہاں ہر فیصلہ جرگہ کرتا ہے اور کسی کی مجال نہیں کہ اختلاف کرے۔"

"سکندر' یہ کیا فضول باتیں کررہے ہو۔" رابعہ کا رنگ اُڑ گیا تھا۔

میں نے مزید مظلومیت کا مظاہرہ کیا "دیکھو رابعہ۔ تم شاید

یقین نہیں کر رہی ہو مگر یہ حقیقت ہے۔"

کاجل نے کہا "آپ کے دماغ پر اثر معلوم ہوتا ہے۔ خواہ مخواہ پریشان کیوں کر رہے ہیں ہمیں۔"

"کاجل مجھے اندازہ تھا کہ تمہیں دکھ ہوگا۔ پریشانی تو بہت معمولی لفظ ہے لیکن تقدیر کے لکھے کو بدلا نہیں جاسکتا۔ تم خود جانتی ہو یہاں سے میں شادی میں شرکت کے لیے نہیں گیا تھا۔ خود آصف علی کے خواب و خیال میں یہ بات نہیں تھی۔" میں نے ایک گہری ٹھنڈی سانس لی "کلیم اللہ بہت خوش اور مطمئن تھا۔ بچّہ ہے نا۔"

رابعہ نے ایک دم میرے سامنے آ کے کہا "سکندر، میں تھپڑ ماردوں گی۔ ایسا بے ہودہ مذاق مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔"

"رابعہ۔ تمہاری قسم یہ مذاق نہیں ہے۔ تم سے زیادہ بھلا کون عزیز ہے مجھے اس دنیا میں پھر بھی یقین نہیں آتا تو آصف علی سے پوچھ لینا۔ یہ مجھے معلوم ہوتا پہلے سے تو میں اُدھر جاتا ہی کیوں۔ مگر قبائل کی رسم و روایت کی بات تھی۔ وہاں فیصلے ہوتے ہیں گن پوائنٹ پر۔ انکار کرے کوئی تو کشت و خون ہوتا ہے۔ میں بھی ایک حد تک مخالفت کر سکتا تھا۔"

رابعہ کی حالت کا تغیّر مجھے مجبور کر رہا تھا کہ میں اس سنگدلانہ مذاق کو ختم کردوں مگر ابھی کلا ٹمکس نہیں آیا تھا۔

کاجل نے دل آزار اور مشتعل لہجے میں کہا "یہ تم نے کیا کیا؟ مجھے یقین نہیں آتا کہ تم ایسا کر سکتے ہو۔ آخر کون ہے وہ؟"

جذباتی اداکاری کا بہترین مظاہرہ کرتے ہوئے میں نے کہا "مجھے نہیں معلوم۔ میں تو اس وقت گم صم بیٹھا رابعہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔"

رابعہ کا نروس بریک ڈاؤن ایک دم ہوگیا "بکتے ہو تم۔ جھوٹ بولتے ہو۔ میں جان سے ماردوں گی تمہیں۔"

"لیکن میرا قصور؟" میں نے سہم کے کہا "میں بتا چکا ہوں کہ یہ شادی میری مرضی سے نہیں ہوئی۔ سب اوپر ہی اوپر مجھ سے پوچھے بغیر طے کرلیا گیا۔ میری سُننے والا کوئی نہیں تھا۔ میں مجبور کردیا گیا۔"

رابعہ کانپنے لگی "سکندر کمینے، دھوکے باز۔ کتنی بے غیرتی سے مجبوری کی بات کر رہے ہو۔ کوئی اور بات ہے، تم جھوٹ بول رہے ہو کہ تم انکار کرتے تو وہ تمہیں گولی ماردیتے۔ مرنے سے ڈرتے تھے تم۔ مجھے دھوکا دینے سے بہتر تھا تم مرجاتے۔ اتنی آسانی سے تم میرے منہ پر مجبوری کی بات کر رہے ہو۔ کتنے ذلیل ہو تم۔"

کاجل نے کہا "رابعہ باجی۔ مرد کی ذات ہی بے وفا ہے۔"

میں نے کہا "تم تو سمجھنے کی کوشش کرو کاجل۔"

"میں سمجھاؤں گی تمہیں اس مجبوری کا مطلب۔" رابعہ نے چیخ کے کہا "تم کیا سمجھتے ہو میں معاف کردوں گی تمہیں۔ میں تمہیں بھی جان سے ماردوں گی اور خود بھی مرجاؤں گی۔ میرے جیتے جی تم کسی اور کے نہیں ہوسکتے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔"

"بھائی سکندر۔ آپ کو ایک لمحے کے لیے خیال نہیں آیا کہ آپ کے لیے رابعہ نے اپنی ساری زندگی داؤ پر لگا رکھی ہے۔"

میں نے احمقوں کی طرح کہا "اچھا؟ خیر ایسا ہے تو میں کرلوں گا ان سے شادی۔ انہوں نے کبھی صاف کہا نہیں۔"

"لعنت بھیجتی ہوں تم پر؟" رابعہ نے ایک دم چہرہ ہاتھوں میں چھپالیا اور بھاگنے کے لیے پلٹی "جاؤ اسی کے ساتھ خوش رہو۔ جس سے نکاح کرنا ایسی مجبوری بن گیا تھا۔"

میں نے ایک دم اس کا ہاتھ پکڑ لیا "میرا نکاح۔ یہ تم کیا کہہ رہی ہو رابعہ؟"

کاجل نے آگ بگولہ ہو کے کہا "تمہارا کیا خیال ہے کہ ایک کے بعد دوسری شادی کرو گے رابعہ سے۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ ایسی گھٹیا باتیں کرتے تمہیں شرم نہیں آتی کاجل۔ کیا میں اتنا ذلیل ہوں کہ محبت کسی سے کروں اور شادی کسی سے۔"

"تم پاگل تو نہیں ہوگئے ہو۔ ابھی کیا کہہ رہے تھے شادی کرکے آیا ہوں۔ ولیمے میں شریک ہونا پڑا۔"

"پاگل تم ہو۔ کیا میں اپنی شادی کی بات کر رہا تھا۔ یہ میں نے کب کہا تھا کہ وہ میری شادی تھی۔"

رابعہ نے بھیگی آنکھوں سے مجھے دیکھا "تم نے نہیں کہا تھا کہ تم مجبور ہوگئے تھے۔ تمہاری کسی نے نہیں سُنی۔"

مجھے ایک دم ہنسی آئی "یہ تو خیر کہا تھا مگر اس سے تم نے یہ نتیجہ کیوں اخذ کیا کہ فیصلہ میری شادی کا تھا۔ اور میں نے اپنی شادی کی مخالفت کی تھی۔"

کاجل نے جل کے کہا "اور کیا آصف علی کی شادی تھی۔"

"شادی کلیم کی تھی" میں نے کہا "اب تم پھر کہو گی میں مذاق کر رہا ہوں یا جھوٹ بول رہا ہوں۔ لیکن میں پہلے بھی سچ بول رہا تھا اور اب بھی سچ عرض کر رہا ہوں لیڈیز۔ اگر کلیم تمہارا بیٹا تھا تو اب تم ساس کے عہدے پر فائز ہوچکی ہو کاجل اور تمہاری بہو وہی ہے جو شاید کلیم کی ماں ہوتی مگر اب اس کی بیوی ہے۔ عمر میں تم سے دُگنی ہے وہ۔"

"تم ہمیں پاگل کردو گے۔" کاجل نے سر پکڑ لیا۔

"انشاء اللہ؟" میں نے کہا "ویسے کیا ہمیں یقین ہے کہ تم پاگل نہیں ہو؟ یہ بات پہلے کسی نے نہیں کہی؟"

رابعہ نے اپنا ہاتھ چھڑالیا "سیدھی طرح بات کرو ورنہ؟"

"ورنہ کیا؟ دھمکی مت دو مجھے۔ میں نے دیکھ لیا ہے کہ تم میں کتنا حوصلہ ہے۔" میں نے کہا "کتنا اعتماد ہے مجھ پر۔ تم نے مجھے نہیں میری محبت کو ذلیل کیا ہے اور احتجاجاً مجھے کم سے کم ایک بار تو شرم سے ڈوب مرنا چاہیے۔ یہاں کوئی انڈر گراؤنڈ ٹینک ہے؟"

"سکندر! تمہیں کسی نے دھوکے سے تو کچھ نہیں پلادیا ہے؟" رابعہ نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"ہاں، تم نے۔" میں نے چلاّ کے کہا "بقول فلمی شاعر ظالم ...ری آنکھوں نے کیا چیز پلادی ہے۔ اب یہ بتاؤ کہ تم یہاں کیسے ...ئیں؟"

رابعہ اب خفّت کا شکار تھی اور آنسو صاف کرتے ہوئے اس ...ں مجھ سے نظر ملانے کی ہمت نہیں تھی۔ مگر وہ مسکرا رہی تھی۔ ...ے خوشی تھی کہ یہ سب مذاق تھا "تم بہت بدمعاش ہو سکندر۔ یہ ...بھی ہم سے پوچھ رہے ہو۔ تمہیں معلوم نہیں تھا کہ ہم یہاں ہوں ...گے؟"

"بی بی، خدا کا نام لو۔ مجھے کیا عالمِ غیب سمجھ رکھا ہے تم نے۔"

"ہاں، وہ تو آپ ایسے ہی گزر رہے تھے ادھر سے کہ ہم سے ملاقات ہوگئی۔" کاجل نے تمسخر اڑایا "آپ کا کیسے تشریف لانا ہوا آخر؟"

میں نے سوچ کے کہا "میں سمجھ گیا، تم کو عامر نے کوئی پیغام دیا ہوگا ہماری طرف سے کہ آپ لوگ یہاں آجائیں۔ وہ خود کہاں ہے؟"

"وہ گیا ہے آصف علی کی بیوی کو گھر چھوڑنے۔" کاجل نے کہا۔

"تم نے... دیکھا تھا اس کو جاتے ہوئے۔"

"دیکھا تو نہیں تھا لیکن وہ کہہ کے گیا تھا کہ میں اماّں کے ساتھ جارہا ہوں۔ آپ لوگ یہاں ٹھہریں، سکندر اور آصف صاحب یہاں پہنچ جائیں گے شام تک۔"

"وہ ناصر پور آیا تھا؟ کیا کہا تھا اس نے؟ اور کون تھا اس کے ساتھ؟"

"آصف علی کے کوئی دوست تھے جو دوسری گاڑی میں ساتھ آئے تھے۔" کاجل نے کہا "عامر نے بتایا کہ یہاں کچھ خطرہ ہے اور آصف علی نے پیغام بھیجا ہے کہ ہم دوسری جگہ شفٹ ہوجائیں پھر ہم اس کے ساتھ آگئے۔ کل کے بعد آج دوبارہ اس وقت نظر آیا تھا وہ جب آصف علی کی بیوی اور بیٹی کو گھر چھوڑنے جارہا تھا۔"

"تم نے پوچھا نہیں کہ ہمیں ساتھ لے جانے میں کیا حرج ہے۔ صاحبِ خانہ سے تمہاری ملاقات ہوئی؟"

کاجل نے نفی میں سرہلایا "سوائے نوکروں کے یہاں کوئی بھی نہیں ہے۔ خاطر مدارات میں کوئی کمی نہیں مگر ملنے کوئی نہیں آیا۔ نہ صاحبِ خانہ، نہ گھر کی کوئی عورت۔ عامر نے کہا تھا کہ سکندر یہیں آئے گا۔ تم کو اس کے ساتھ واپس جانا ہے۔"

میں کچھ دیر سوچتا رہا "اچھا، کیا تم نے کسی نوکر سے پوچھا کہ یہ کوٹھی کس کی ہے، کون رہتا ہے یہاں؟"

"رابعہ باجی نے پوچھا تھا۔ انہوں نے کہا کہ آفریدی صاحب کی کوٹھی ہے۔ وہ آج کل فیملی کے ساتھ لندن میں ہیں۔ معلوم نہیں کیا چکر ہے۔ تم بتاؤ، ابھی کیا بے سروپا باتیں کر رہے تھے؟"

میں نے کہا "میری باتوں کا سرپیر سب ہے۔ چلو میں راستے میں بتاؤں گا۔ ہم فوراً واپس جارہے ہیں۔ تم لوگ چل کے گاڑی میں بیٹھو۔"

"کون سی گاڑی میں؟"

"گاڑی باہر موجود ہے۔ رابعہ کی گاڑی۔" میں نے کہا "جاؤ بابا، ہر بات مذاق نہیں ہوتی۔ دیکھ لینا گاڑی میں جو کاغذات رکھے ہیں ان میں کس کا نام لکھا ہوا ہے۔ میں آتا ہوں۔"

ان کی حالت عجیب تھی۔ میری ہر بات ان کے لیے مُعما بن گئی تھی۔ خود میں بہت سی باتیں سمجھنے سے قاصر تھا۔ اگر میں رابعہ اور کاجل کو دلاور سے ملاقات کا حال بتادیتا تو دہشت سے ان کی جان نکل جاتی۔ صاف ظاہر تھا کہ نہ انہوں نے دلاور کو دیکھا، نہ انہیں شک ہوا کہ کل سے وہ دلاور کی نگرانی میں اور اس کی قید میں ہیں۔ دلاور ان کے سامنے آیا ہی نہیں تھا۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ انہیں عامر کے انجام کی خبر بھی نہ تھی جسے میں نے خود اپنی آنکھوں سے بھوکے شکاری کتوں سے لڑتے اور ایک پُرعذاب موت مرتے دیکھا تھا۔ چند منٹ پہلے کاجل اور قدرت اسی لان پر موجود تھیں جہاں شکاری کُتوں نے عامر کو چیرا پھاڑا تھا۔ کیا انہوں نے کوئی شور نہیں سُنا تھا؟ عامر کی چیخ پکار اور کُتوں کے غرانے دھاڑنے کی آوازیں ان کے کانوں تک بھی نہیں پہنچی تھیں؟

یہ ناممکن نہیں تھا۔ شاید وہ کسی ائر کنڈیشنڈ کمرے میں ہوں گی جو کوٹھی کے آخری حصے میں لان سے بہت دور ہوگا۔ دلاور وہ منظر صرف مجھے دکھانا چاہتا تھا۔

میں نے کوٹھی کا ایک چکر لگایا۔ اس کے اوپر نیچے کے تمام کمروں میں جا کے دکھا مگر دلاور کہیں بھی نہیں تھا۔ مجھے اس کے محافظ اور ملازم بھی دکھائی نہ دیے۔ گھر کے دیگر ملازم عام قسم کے نوکر تھے جو مجھے اس کے سوا کچھ بتانے کو تیار نہ تھے کہ کوٹھی آفریدی صاحب کی تھی اور آفریدی صاحب قالینوں کے بیوپاری تھے جو لندن آتے جاتے رہتے تھے۔ وہ کسی چوہدری دلاور کو نہیں جانتے تھے۔ گھر میں کچھ مہمان ضرور ٹھہرے ہوئے تھے مگر مہمانوں سے کچھ پوچھنا ان کے فرض میں شامل نہیں تھا۔

شک تو مجھے پہلے ہی تھا کہ حقائق کو عمداً چھپایا جارہا ہے اور یہ چوہدری دلاور کے ڈرامے کے کردار ہیں جو اپنا اپنا رول اس کی ہدایات کے مطابق نبھا رہے ہیں۔ میں نے کچن میں دو نوکروں کو سامنے کھڑا کرکے غور سے دیکھا تو میرے شبہات کی تصدیق ہوگئی۔ وہ میری جرح سے کچھ پریشان نظر آرہے تھے۔

باہر نکل کے میں نے عقبی حصے کے لان کا معائنہ کرتے ہوئے پولیس کی دو وردیاں دیکھیں جو دھونے کے بعد خشک ہونے کے لیے ڈال دی گئی تھیں۔ میں نے قریب جا کے ان کا معائنہ کیا۔ ان پر اب بھی کہیں کہیں سرخی موجود تھی۔ دونوں وردیاں ساتھ لے کر

میں پھر اندر گیا۔
"مسٹر خانساماں!" میں نے چھوٹے قد کے گول مٹول شخص کو مخاطب کر کے کہا "کبھی حوالدار کدو سے ملے ہو تم۔ بالکل جنگلی مینڈک کا خیال آتا ہے اسے دیکھ کر؟"
اس کے ہونٹ کانپنے لگے "جی' جی نہیں۔"
"جی اور جی نہیں۔ تم کیا سمجھتے ہو میں نے تمہیں پہچانا نہیں۔ تم دونوں وہی ہو جو کل میرے سامنے مقتول ہو گئے تھے۔"
"آپ کی بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی جناب۔" دوسرا بولا۔
"آنی بھی نہیں چاہیے۔" میں نے کہا "تم صرف چوہدری دلاور کی بات سمجھ سکتے ہو۔ بہت اچھا ڈرامہ پیش کیا تھا تم سب نے مل کے۔ پہلے تو میں بھی دھوکا کھا گیا تھا کہ اس نے تمہیں گولی مار دی ہے اور تم واقعی فوت ہو گئے ہو مگر اس وقت جب تمہارے ماتحت لاشیں گھسیٹ کر لے جا رہے تھے میں نے دیکھ لیا تھا انسپکٹر صاحب کہ تم نے اس سے زیرِ لب کچھ کہا تھا اور پھر آنکھیں بند کر لی تھیں۔ یہ وہی وردیاں ہیں جو کل تم نے زیب تن فرمائی تھیں۔ میک اپ سے تمہارا ناک نقشہ بھی بہت بدل دیا گیا تھا اور آج اس گھر میں تمہیں نوکر کی حیثیت سے کام کرتا دیکھ کے کون کہہ سکتا ہے کہ تم دوسری دنیا سے دوسرا جنم لے کر دوسرا رول کرنے کے لیے واپس آ گئے ہو۔ اس وقت جب دلاور نے تم پر گولی چلائی تھی تو میرا ذہن ماؤف تھا ورنہ میں دیکھ لیتا کہ گولی لگنے کے بعد تم خاصے تڑپے تھے مگر خون کا ایک قطرہ نہیں نکلا تھا۔ مگر میں نے بعد میں دیکھ لیا تھا۔ اس وقت جب تمہاری لاشیں چوہدری دلاور کی حکم پر کنوئیں میں ڈال کے مٹی برابر کرنے کے لیے لے جائی جا رہی تھیں۔"
"یہ سب تم ہمیں کیوں بتا رہے ہو؟" حوالدار نے جارحانہ لہجے میں کہا "دفعہ ہو جاؤ یہاں سے۔"
مجھے اس کے ردِعمل کا اندازہ تھا "میں جا رہا ہوں لیکن تم میری بات چوہدری دلاور کو ضرور بتا دینا۔ ایسے ڈرامے وہ کرتا رہتا ہے۔ یہ ہم جانتے ہیں۔ تم شاید ایک بات نہیں جانتے کہ ہر بار اس کے ریوالور میں نقلی گولیاں نہیں ہوتیں۔ اگلی مرتبہ ہوشیار رہنا۔"
انسپکٹر نے ایک دم مجھ پر گالی دے کر حملہ کیا مگر میں اس کے لیے تیار تھا۔ وہ میری طرف آیا تو میں نے ایک دم دروازہ اپنی طرف کھینچ لیا جس پر میں ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔ وہ لمبائی کے رخ پٹ کی ڈیڑھ انچ موٹی پٹی سے ٹکرایا اور یہ ضرب اتنی شدید تھی کہ بے اختیار اس کی حلق سے ایک چیخ نکلی۔ وہ لڑکھڑایا تو میں نے اس کی گُدی پر ہاتھ مارا اور اس کی گردن کی ہڈی سوکھی ٹہنی کی طرح چیخ کے ٹوٹ گئی۔
اصل خطرہ موٹے حوالدار کی طرف سے تھا جو پیشہ ورانہ تجربے کار فائٹر تھا لیکن میں نے اسے مقابلے کا موقع ہی نہیں دیا اور دروازے کو پورا کھینچ کے باہر سے کنڈی لگا دی۔
وہ مجھے گالیاں دینے لگا اور دروازے کو ٹکریں مارنے لگا لیکن میں نے بھاگ جانے میں عافیت جانی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ دروازہ توڑے گا اور زخمی شیر کی طرح نکلے گا تو اس پر خون سوار ہو گا۔ وہ مجھ پر پیچھے سے فائر بھی کر سکتا تھا۔
میں دوڑتا ہوا باہر آیا اور کار میں بیٹھ گیا۔
"کہاں چلے گئے تھے؟" رابعہ نے شکایتی لہجے میں کہا۔
"میں ذرا عالمِ ارواح تک گیا تھا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ دو مقتولوں کی روحیں وہاں پہنچ گئی ہیں یا نہیں۔" میں نے کار کو اسٹارٹ کرنے کے لیے چابی کی طرف ہاتھ بڑھایا اور روک لیا۔
رابعہ بولی "کسی بات کا ڈھنگ سے بھی جواب دے دیا کرو۔"
"خاتونِ محترم' بندہ بالکل صحیح عرض کر رہا ہے۔ وہاں ایک مقتول کی روح تھی۔ دوسرا مردہ بڑا دھوکے باز نکلا۔ جنگلی مینڈک کی اولاد۔ ابھی تک اسی دنیا میں پھر رہا ہے۔"
"اچھا اب چلیے بھی' انتظار کس کا ہے؟" کاجل نے کہا۔
"میں سوچ رہا ہوں کہ کیوں نہ ہم ایک دوسرے کا کہا سنا معاف کر دیں۔" میں نے کہا "آخری بار ایک دوسرے کو دیکھ لیں کیا پتا چابی گھماتے ہی پتا چلے کہ ہم تو دوسرے جہاں میں ہیں۔"
"تمہارا مطلب ہے گاڑی میں بم نصب ہو سکتا ہے۔"
"یہ سائنسی ترقی کا دور ہے خاتون۔ بم گاڑی میں' جھاڑی میں' داڑھی میں' ساڑھی میں' کہیں بھی نصب ہو سکتا ہے۔" میں نے بونٹ کھول کے کہا "رابعہ ذرا خیال رکھنا گھر کے اندر سے جو چیز بھی برآمد ہو اسے گولی مار دینا۔"
"خالی ہاتھوں سے گولی مار دوں؟"
"اچھا تیرِ نظر سے مار دینا۔" میں نے بونٹ میں جھانک کے تاروں کا بغور جائزہ لیا مگر مجھے کوئی مشکوک کنکشن نظر نہیں آیا۔
میں واپس گاڑی میں بیٹھا ہی تھا کہ حوالدار برآمد ہوا۔ حسبِ توقع اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ میں نے اللہ کا نام لے کر کار کو اسٹارٹ کیا اور کلچ چھوڑ کر ایکسیلریٹر دبا دیا۔ کار کسی پنجرے سے رہائی پانے والے وحشی درندے کی طرح بھاگی۔ میں نے اپنے عقب میں فائر کی آواز سنی۔ گولی شاید کار کی باڈی سے ٹکرائی تھی۔
"اپنا سر نیچے کر لو۔" میں نے چلا کے کہا مگر میرے احکامات موصول کرنے سے پہلے ہی رابعہ اور کاجل کو خطرے کے احساس نے سرنگوں کر دیا تھا اور وہ پچھلی سیٹ پر تقریباً سجدے میں پڑی تھیں۔ دوسرا فائر ہوا تو میں گیٹ پر تھا لیکن گیٹ بند تھا اور اسے کھولنے کے لیے اترنا اپنے قاتل کو آسان ہدف فراہم کرنے کے مترادف ہوتا۔
لوہے کا گیٹ خاصا بڑا اور مضبوط تھا مگر مجھے یقین تھا کہ ایک نئی کار کی بھرپور قوت کے سامنے نہ ٹھہر سکے گا۔ اس سے کار کے اگلے حصے کا بیڑا غرق ہونا تو لازمی تھا۔ امکان یہ بھی تھا کہ گیٹ پلٹ کے گاڑی پر گرے تو پہلے چھت کو اور پھر چھت کے نیچے ہمارے سروں کو چپٹا کر دے مگر یہ رسک لیے بنا چارہ نہ تھا۔
گاڑی ایک دھماکے سے گیٹ کو گرا کے گزری تو میں نے اس کی ہیڈلائٹس کے بکھرنے کا چھناکا بھی سنا۔ یہ بات یقینی تھی کہ سامنے سے بمپر اور جالی بھی سخت مجروح ہوئے ہوں گے مگر ایک مفت میں ملنے والی قیمتی گاڑی کو تباہ کرنے کا یہ پہلا تجربہ خاصا سنسنی خیز ثابت ہو رہا تھا۔
سڑک پر آ کے میں نے بڑی مشکل سے ایک تانگے کو بچایا اور کار گھوڑے کی ناک کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ غالباً گھوڑے کے لیے بھی یہ ایک سنسنی خیز تجربہ تھا مگر تانگے والے کے اعصاب زیادہ کمزور ثابت ہوئے۔ جب وہ ہمیں پشتو میں گالیاں دے کر دل کی بھڑاس نکال سکتا تھا اس وقت وہ سکتے کی کیفیت میں بیٹھا رہا۔
کچھ دور آنے کے بعد شوں شوں کی آواز کے ساتھ میں نے ونڈ اسکرین کے سامنے بادل سے اڑتے دیکھے تو میری نظر ڈائل پر گئی۔ ٹمپریچر میٹر کا کانٹا لال نشان سے بھی آگے پہنچ گیا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ گیٹ سے گزرتے ہوئے ریڈی ایٹر شہید ہو گیا تھا اور اس کا پانی جو انجن کے رگ و پے میں حرکت سے پیدا ہونے والی حرارت کو جذب کر لیتا تھا بہہ چکا تھا۔
میں نے گاڑی کو فوراً روک دیا ورنہ وہ خود رک جاتی۔ سڑک پر آگے پیچھے مکان ضرور نظر آ رہے تھے مگر آبادی کی علامات مفقود تھیں۔
"نیچے تشریف لے آئیے آنرایبل لیڈیز۔" میں نے کہا۔
رابعہ نے سر نکال کے کہا "کیا ہوا؟"
"میرے سلوک سے کار کا دل ٹوٹ گیا۔" میں نے کہا "جیسے دل پورے جسم میں خون پہنچاتا ہے ایسے ہی ریڈی ایٹر پانی..."
"یہ اچانک مار دھاڑ اور ایکشن سے بھرپور فلم کیسے شروع ہو گئی۔" کاجل نے نیچے اتر کے کہا "اندر کیا ہوا تھا؟"
"اندر مجھے حکم ہوا تھا کہ میں کچھ کروں۔ کسی سے پنگا لوں۔ کچھ سکوت اور سکون محسوس ہو رہا تھا زندگی میں۔" میں نے کہا۔
"پھر اب کیا ہو گا۔ ایک تانگہ تک نظر نہیں آ رہا ہے۔"
"ہم دو ٹانگوں پر جائیں گے۔" میں نے خوش دلی سے کہا "میں خود کو ایک درویش کی طرح محسوس کر رہا ہوں۔ نہ جیب میں مال نہ اہل و عیال۔ نہ ہم سواری پر نہ کوئی ہم پر سوار۔ نہ مال و زر نہ گولی کا ڈر۔ یوں ہی چلتے رہے تو بشرطِ زندگی اپنے ڈیرے پر بھی پہنچ جائیں گے۔"
رابعہ نے کہا "سکندر یہ کس کا گھر تھا؟"
میں نے کہا "یہ ظالم اور بے مروت شخص جو ہم پر دن دن گولیاں برسا رہا تھا غالباً چوہدری دلاور کا سالا تھا۔ ممکن ہے دلاور اس کا سالا ہو۔ کل میری اس سے ملاقات بڑی پُرلطف رہی۔"
"دلاور ملا تھا تمہیں کہاں؟"
"اسی گھر میں جہاں آپ مہمان تھیں۔" میں نے کہا "فرلبا ہے اس لیے لمبی بات کرتا ہوں۔ شروع کرتا ہوں وہاں سے جب ہم بچھڑے تھے۔ مس کاجل' یہ داستانِ ہوش رُبا آپ کی خصوصی توجہ کی طالب ہے کیونکہ اس کا سب سے دلچسپ حصہ آپ کے منہ بولے بیٹے کی شادی خانہ آبادی کا حصہ ہے۔"
"جلدی سے بتاؤ۔ یہ کلیم کی شادی کا کیا چکر ہے؟"
"بے چارہ کلیم" میں نے آہ بھر کے کہا "ابھی عمر ہی کیا تھی اس کی لیکن باپ کے اعمال کی سزا اولاد کو ملتی ہے اگر اس کا باپ شادی کر لیتا تو اس پر یہ ظلم کا پہاڑ کیوں ٹوٹتا۔ چونکہ معاملہ ایک خاتون کا ہے اس کو تم ظلم کی پہاڑی کہہ سکتی ہو۔ سنا ہے خاصی بھاری بھرکم ہے۔"
کاجل نے کہا "بھائی سکندر سیدھی طرح بتائیں۔"
میں نے کہا "تم کو خدا عقل دے۔ میں سیدھی بات کر رہا ہوں۔ کلیم کی شادی اسی خاتون سے ہوئی ہے جس سے اس کے باپ کی نسبت طے پائی تھی مگر وہ بزدل تھا یا بہت عقلمند کہ بھاگ گیا۔ پکڑا گیا اس کا بیٹا آخر کار۔ وہی لڑکی اب اس سے باندھ دی گئی جو اس کی ماں کے برابر ہو گی۔"
اس نئی مضافاتی بستی کی سڑکیں رات کو زیادہ ویران نظر آ رہی تھیں۔ ابھی یہاں اسٹریٹ لائٹ نصب نہیں ہوئی تھی۔ سڑکوں پر اندھیرا تھا اور خود سڑکوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ اس میں گڑھے تھے اور پختہ سڑک بنانے کے لیے جو پتھر بچھائے گئے تھے ان پر پیدل چلنا آسان کام نہ تھا۔ کچھ دور جانے کے بعد ایک نیم پختہ سڑک شروع ہوئی تو مجھ سے زیادہ رابعہ اور کاجل نے سکون کا سانس لیا اور خدا کا شکریہ ادا کیا کہ اس راستے پر انہوں نے اونچی ایڑی کے ساتھ چلنے کا امتحان پاس کر لیا' نہ ایڑی جوتے سے الگ ہوئی اور نہ ان کے پاؤں میں موچ آئی۔
میں نے ایک مختصر مگر جامع بیان جاری کیا جس سے کلیم کی شادی کے واقعات اور اس کا معاشرتی پس منظر واضح ہو گیا۔ کاجل کو سخت ملال تھا کہ کلیم پر ظلم ہوا اور کسی حد تک رابعہ بھی اس کی ہم خیال تھی کہ یہ کیا جاہلانہ رسم و رواج ہیں۔ میں نے ان کو یقین دلانے کی پوری کوشش کی کہ خود کلیم نے اس شادی کے خلاف کوئی جذباتی مظاہرہ نہیں کیا تھا بلکہ وہ بے حد مطمئن اور خوش تھا کہ آخر کار اس نے وہ قرض ادا کر دیا جو باپ پر واجب الادا تھا اور سارے جھگڑے خوش اسلوبی سے طے ہو گئے۔
"کمال ہے۔ وہ مطمئن کیسے ہو سکتا ہے ایک ایسی عورت کو بیوی بنا کے جو عمر میں اس سے اٹھارہ سال بڑی ہے۔"
"بیشتر شوہر صبر و قناعت کے پُتلے ہوتے ہیں۔" میں نے کہا "جیسی اللہ نے ان کے مقدر میں لکھ دی اس پر خوش رہتے ہیں۔ یا کم سے کم ایسا ظاہر ضرور کرتے ہیں۔ عورتوں کی طرح ساری عمر روتے پیٹتے نہیں۔"

"عورتیں منافقت نہیں کرتیں نا۔" رابعہ نے کہا۔
"میں نے آج تک وہ عورت نہیں دیکھی جو کہے کہ میں حالات سے بہت خوش اور مطمئن ہوں۔ بے حد خوش قسمت سمجھتی ہوں خود کو کہ میری شادی اس شخص سے ہوئی اور اب مجھے کسی چیز کی خواہش نہیں۔" میں نے کہا "اماں حوّا جنت میں خوش نہیں تھیں۔"
"یہ ایک متعصبانہ بیان ہے۔" رابعہ نے کہا۔
"میری بڑی خواہش تھی کہ میں کلیم کی بیوی کو دیکھ سکتی۔" کاجل نے چلتے چلتے کہا "آخر کلیم نے کیا دیکھا اس میں؟"
"یہ سوال تو کسی بھی مجنوں سے کیا جا سکتا ہے کہ اس نے لیلیٰ میں کیا دیکھا تھا آخر کہ اس کی خاطر صحرا میں بھٹکتا پھرا۔"
"کلیم اس کو جانتا تک نہیں تھا۔" کاجل بولی۔
"اور تم نہیں جانتیں کہ وہ کتنا مجبور تھا۔ اس معاشرے کی روایات کے خلاف آواز اُٹھانا کلیم کے لیے ناممکن تھا۔ اسے وہاں رہنا تھا اور زندہ رہنا تھا۔ بہتر ہے کہ اب اسے بھول جاؤ۔ اس کی زندگی پر تمہیں جو تھوڑا بہت اختیار حاصل تھا وہ اب نہیں رہا۔" میں نے کہا۔

میرے الفاظ میں حقیقت کی بے رحمی تھی جس سے مفر نہیں تھا اور میں چاہتا تھا کہ کاجل اسے تسلیم کرلے۔ یہ بھی ایک معمولی سا جذباتی حادثہ تھا۔ جسے ضرورت سے زیادہ اہمیت دینا لاحاصل تھا۔

رابعہ نے فوراً موضوع بدل دیا "اب ہم کہاں جائیں گے؟"
میں نے کہا "آسان جواب یہ ہے کہ جہاں تقدیر لے جائے۔"
"میرا مطلب تھا کہ ہم آصف علی کے گھر جا سکتے ہیں۔ وہ بہت پریشان ہوگا۔" رابعہ بولی۔
"وہاں جا کے ہم اس کی پریشانی کم نہیں کرسکتے۔ ہو سکتا ہے کہ خود مزید پریشانی میں مبتلا ہو جائیں۔" میں نے کہا "میں دلاور پر بھروسہ نہیں کرسکتا۔ وہ ایک جھوٹا اور فریبی شخص ہے۔ اس نے بیک وقت اپنی طاقت سے مجھ پر دہشت بٹھانے کی کوشش کی اور میری طرف دوستی کا ہاتھ بھی بڑھایا۔ بظاہر وہ جیو اور جینے دو کی پالیسی کا پرچار کررہا تھا مگر ساتھ ہی مجھے دھمکی بھی دے رہا تھا کہ میں تم سب کے ٹکڑے کرکے کتوں کے سامنے ڈال سکتا ہوں۔ اس کے بے قابو ہونے والے کتوں نے مجھے قتل کرنے میں کون سی کسر چھوڑی تھی۔"
رابعہ نے کہا "ہو سکتا ہے حوالدار کدّو بھی تمہیں خوف زدہ ہی کررہا ہو اس کا ارادہ تمہیں شوٹ کرنے کا نہ ہو۔"
"کس کا ارادہ کیا ہے یہ وقت بتائے گا۔ ابھی تو میرا ارادہ ہے کہ آصف علی کو خطرات سے خبردار کردوں۔ یہ بتا دوں کہ عامر بھی دلاور اینڈ کمپنی میں شامل ہو چکا ہے۔ وہ کچھ بھی کرسکتا ہے اس کو فوری طور پر قدرت کی حفاظت کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔"
"وہ کیا کرسکتا ہے؟"
"وہ اپنی بیوی کو اور قدرت کو ہمارے پاس لاہور بھیج سکتا ہے اور اپنا نقد سرمایہ اور کاروبار سمیٹ کر خود بھی لاہور آسکتا ہے۔ یہاں تو ہم اس کی مدد نہیں کرسکتے۔"
"وہ ہماری مدد قبول بھی نہیں کرے گا۔" رابعہ بولی "اسے فکر ہے تو صرف قدرت کی زندگی کی۔ اسے ہمارے حوالے کرنے کے بعد خود بھی بزدلوں کی طرح فرار ہونا شاید پسند نہ کرے۔"
"خیر یہ اس کی مرضی۔ ہم اسے مجبور تو نہیں کرسکتے۔ پیشکش ضرور کرسکتے ہیں اپنے تعاون کی۔" میں نے کہا "باقی سب کا رکھوالا تو وہی ایک اللہ ہے جو ہماری حفاظت کررہا ہے ورنہ ہم کیا اور ہماری اوقات کیا۔"
مجھے پشاور شہر میں چھوڑ دیا جاتا تو شاید میں آصف علی کے گھر پتا پوچھے بغیر نہ پہنچ پاتا۔ یہ تو کوئی نواحی بستی تھی اور میرے لیے رات کے وقت سمت کا تعیّن بھی مشکل ہورہا تھا۔ تین چار میل پیدل چلنے کے بعد آخرکار ہمیں ایک گاڑی کی ہیڈلائٹس نظر آئیں اور اس شریف آدمی نے ہاتھ کا اشارہ دیکھنے سے پہلے ہی گاڑی روک لی۔ دو عورتوں کے ساتھ اس وقت کسی مرد کا سڑک پر نظر آنا یہاں غیر معمولی بات تھی جب سڑکوں پر چور کتے یا پولیس والے ہی پھرتے ہیں جو سب شریف آدمی کے دشمن ہوتے ہیں۔
میں نے اسے گاڑی کے حادثے کی جھوٹی کہانی سُنائی اور اپنی مجبوری بیان کرتے ہوئے درخواست کی کہ وہ ہمیں یونیورسٹی ٹاؤن پہنچا دے۔
وہ کچھ پریشان ہوا "خوچہ یونیورسٹی ٹاؤن۔ وہ تو بہت دور ہے۔"
میں نے کہا "ہاں قریب ہوتا تو ہم پیدل ہی چلے جاتے۔"
"اچھا بیٹھو۔ اللہ مالک ہے۔" اس نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کے کہا "تم شریف آدمی نظر آتا ہے۔"
راستے میں اس نے بتایا کہ اس علاقے میں ہر طرح کے لوگ مل جاتے ہیں۔ بے پردہ عورتوں کے ساتھ رات کو نکلنے والا عام طور پر قابلِ اعتبار اور شریف آدمی نہیں سمجھا جا سکتا۔ ایسے لوگ لفٹ لینے کے بہانے لوٹ بھی لیتے ہیں۔ اس نے صاف تو نہیں کہا مگر اشاروں میں واضح کردیا کہ ایسی خواتین کا کردار بھی مشکوک ہوتا ہے۔
آصف علی کے گھر کے دروازے پر میں نے اپنے محسن کا شکریہ ادا کیا "یہ میرا ہی گھر ہے۔ کبھی آدھی رات کو تمہیں مدد کی ضرورت پڑے خدانخواستہ تو اس گھر کے دروازے تمہارے لیے کھلے ہوں گے۔"

"آپ کا بڑا مہربانی" اس نے ہاتھ ہلا کے کہا۔
آصف علی ہمیں دیکھ کے پہلے حیران اور پھر بے حد خوش ہوا "میری تو زندگی عذاب ہوگئی تھی۔ پولیس کو رپورٹ کی۔ نیچے سے اوپر تک سب کی سفارش تھی۔ دباؤ تھا مگر تمہارا پتا ہی نہیں چل رہا تھا۔ تم نے بھی حد کردی کہیں سے فون کردیتے۔ اطلاع دے دیتے۔"
میں نے کہا "چلیے غلطی معاف کیجیے۔ یہ بتائیے قدرت تو خیریت کے ساتھ گھر پہنچ گئی اور آپ کی وائف؟"
"ہاں وہ تو عامر کو گالیاں دے رہی تھی کہ جھوٹ بول کے ہمیں نہ جانے کہاں لے گیا تھا اور پھر خود غائب ہوگیا۔"
میں نے کہا "خدا کا شکر ادا کیجیے جس نے بروقت عامر کی اصلیت کو عیاں کردیا۔ آپ ایک سانپ کو پال رہے تھے۔"
"میں اس کا سر بھی کچل سکتا ہوں۔" آصف علی نے مشتعل ہو کے کہا اور رابعہ سے مخاطب ہوگیا "جاؤ تم لوگ آرام کرو۔"
"شاید اب اس کی ضرورت نہ پڑے۔" میں نے کہا "وہ ادھر کا رُخ ہی نہیں کرے گا۔"
"کیوں کہاں ہے؟"
"ابھی میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ اس دنیا میں بھی ہے یا نہیں۔" میں نے رابعہ اور کاجل کے جانے کے بعد کہا۔
"کیا مطلب؟"
میں نے اسے مختصراً ساری بات بتائی "دلاور نے پہلے میرے ساتھ ایک ڈرامہ کیا تھا۔ مجھے گرفتار کرکے لے جانے والے پولیس مین نہیں تھے۔ پولیس کی وردی میں اس کے بدمعاش تھے۔ اس نے انہیں شوٹ کردینے کا ڈرامہ کیا۔ ان کی طرف نوٹوں کی گڈیاں پھینک کے مجھ پر ظاہر کیا کہ وہ پولیس کو خرید سکتا ہے اور جسے چاہے قتل کرسکتا ہے۔ قانون اس کے سامنے بے بس ہے۔ بعد میں اس نے مجھے مصالحت کی پیشکش کی جو سب فریب تھا۔ جو قتل ہوگئے تھے انہیں میں نے نوکروں کے روپ میں زندہ دیکھا اور انہوں نے بھی مجھے قتل کرنے کی کوشش کی۔ آپ ابھی دلاور کو نہیں جانتے۔ اس لیے میرا مشورہ ہے کہ اپنی حفاظت کا بندوبست کریں۔ خصوصاً قدرت کا۔"
"میں کیا کرسکتا ہوں قسمت کے لکھے کو تو نہیں مٹا سکتا۔ تم پر بھروسہ کرکے قدرت کو تمہارے حوالے کررہا ہوں۔"
میں نے کہا "آپ کو وہ اخبار ملا؟"
"اخبار تو نہیں ملا۔ مگر ایک فون آیا تھا تمہارے لیے۔ فون کرنے والے نے کہا کہ وہ غالب ہے۔"
میں اُچھل پڑا "غالب؟ کہاں سے بات کررہا تھا وہ؟"
"معلوم نہیں اس نے تمہارے بارے میں پوچھا۔ رابعہ اور کاجل کے متعلق معلوم کیا اور پھر کہا کہ جب وہ واپس آئیں تو منظر کے گھر فون کرلیں۔"
"آپ کو یقین ہے کہ وہ غالب تھا؟"
"بھئی اس نے کہا۔ میں نے مان لیا۔ میں اسے جانتا نہیں اور نہ اس کی آواز پہچانتا ہوں۔"
"اچھا صرف غالب نے بات کی تھی یا نازو نے بھی؟"
"نازو نے تو بات نہیں کی تھی۔" آصف علی نے کہا۔
اچانک باہر سے ایک فائر ہوا۔ غالباً چوکیدار نے اس کا جواب دیا۔ پھر مسلسل فائرنگ شروع ہوگئی۔
آصف علی نے گھبرا کے کہا "یہ کیا ہورہا ہے۔ میں دیکھتا ہوں۔"
اس نے اپنی رائفل اُٹھائی اور باہر لپکا۔ ابھی وہ دروازے میں ہی تھا کہ کسی نے اسے دھکا دیا وہ واپس کمرے میں آگرا۔
"خبردار!" کسی عورت نے زنانہ آواز میں مصنوعی مردانہ بھاری پن پیدا کرکے کہا "ایک ایک کو گولی ماردوں گی میں، جانتے ہو میں کون ہوں؟"
اسے بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ یقیناً ناگ منی تھی۔

میرے سنبھلنے سے پہلے ہی وہ عورت اندر آگئی جو سر سے پیر تک سیاہ بُرقع نما لبادے میں تھی۔ اس نے بڑی خوبی اور مہارت کے ساتھ روپوشی اختیار کی تھی۔ وہ خود تو بُرقعے کے اوپر والی جالی سے باہر کا پورا منظر دیکھ رہی ہوگی لیکن میرے لیے اس کو دیکھنا عملاً ناممکن تھا۔ اس کی صورت یا رنگ وروپ اور عمر کا اندازہ کرنا بھی محال تھا۔

میں صرف یہ دیکھ سکتا تھا کہ وہ نہ پست قامت ہے نہ دراز قد۔ وہ دُبلی پتلی بھی نہیں تھی اور اسے موٹا بھی نہیں سمجھا جاسکتا تھا۔ اگر میں اس کے ہاتھ دیکھ سکتا تو شاید اس کی عمر کا کچھ اندازہ کرتا مگر جن ہاتھوں میں اس نے خود کار مشین گن سنبھال رکھی تھی' وہ کہنیوں تک سفید دستانوں میں چھپے ہوئے تھے۔

بہت نیچے جہاں بُرقع ختم ہوتا تھا' وہاں کلف لگے سفید لٹھے کی شلوار کا بالشت بھر حصہ تھا اور پھر باٹا کے سفید اسپورٹس شوز جو سائز میں اتنے بڑے تھے کہ مردانہ لگتے تھے۔

تاہم اس مشاہدے سے حاصل ہونے والے نتائج کے پیشِ نظر میں اسے پرانی ناگ منی تسلیم نہیں کرسکتا تھا' جواب محسن کی گل بانو تھی۔ گل بانو دراز قد تھی اور دُبلی پتلی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کے پاؤں کتنے نازک اور چھوٹے ہیں۔ اگر وہ اصل سائز سے اتنے بڑے جوتے پہن کے آتی تو ڈھیلے جوتوں میں اس کے پاؤں مضحکہ خیز نظر آتے مگر میرے مقابل کھڑی ہوئی عورت کو یہ جوتے فِٹ تھے۔

جعلی ناگ منی کے پیچھے ایسے ہی حُلیے میں دو ڈاکو بھی اندر آگئے تھے۔ ان کی نیاز مندی کا انداز ہی ان کے ماتحت ہونے کا اعلان کررہا تھا مگر وہ مشین گن کو خطرناک طریقے پر ہماری طرف کیے خالص فلمی پوز میں پاؤں پھیلا کے کھڑے ہوگئے تھے اور اب اپنی سردارنی کی طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ حکم ہو تو ان کے جسم میں اتنے سوراخ کردیے جائیں جتنے چھلنی میں چھید نہیں ہوتے' اور کفایت شعاری مطلوب ہو تو سر میں فقط ایک گولی اتار دی جائے۔ ان کی مردانگی کو برقع پوش ہونا گوارا نہ تھا۔ وہ سر اور منہ پر ڈھاٹے باندھ کے آئے تھے۔ غالباً ڈھاٹے باندھنے کے فن میں وہ نو آموز تھے یا ویسے ہی ڈرتے تھے کہ کہیں فری اسٹائل مارپیٹ کی نوبت آگئی تو ان کا چہرہ بے نقاب ہوجائے گا چنانچہ انھوں نے ڈھاٹوں پر ہر طرف ٹیپ چپکا دیے تھے۔

ان کے جسم پر میلی اور پرانی خاکی رنگ کی وردی تھی۔ یہ کسی چپراسی' ڈرائیور یا چوکیدار سے چھینی ہوئی وردی ہوسکتی تھی جو اُن کے لیے بہرحال نہیں بنائی گئی تھی۔ اگر ایک کا قد کم ہوتا اور دوسرے کا وزن بیس پونڈ بڑھ جاتا تو وردیاں ان کے جسم پر فٹ آتیں۔

وردیاں کثرتِ استعمال سے گِھس چکی تھیں اور ان کے اصل رنگ پر اب دوسرے بہت سے رنگ غالب آگئے تھے جو اُن کی زندگی کے معمولات کی رنگین تصویر پیش کرتے تھے۔ تیل میں ہلدی ملا کے غالباً چوٹوں پر لگائی گئی تھی۔ چوٹیں اس پیشے میں اتنی ہی لازم وملزوم تھیں جتنی مے خواری میں خواری۔ کبھی شامتِ اعمال سے پکڑے گئے تو پہلے پبلک میں ہر شخص ہیرو بن جاتا ہے اور پولیس کے آنے تک گوشمالی کے کارِ خیر میں بڑھ چڑھ کے حصہ لیتا ہے' اس کے بعد مالِ غنیمت کے برآمد اور "انصاف" سے تقسیم ہونے تک پولیس بھی فرض شناسی کا بھرپور مظاہرہ کرتی ہے اور بڑی محنت سے ٹھونک بجا کے اپنا حق وصول کرتی ہے۔ کتھے چونے کے رنگ سے' پان کے دھبے اور قورمے کے رنگ تک ان کے دامن کا ہر داغ' سلسلۂ روز وشب نقش گر حادثات' کی عملی تفسیر تھا۔

خوف اور تحیّر کے چند لمحے گزر گئے اور وہ سسپنس ختم ہوگیا جو گل بانو کو ناگ منی کے روپ میں دیکھ کر پیدا ہوا تھا۔ میں نے آصف علی کی طرف دیکھا۔ دہشت سے اس کے اوسان خطا ہورہے تھے۔

"آصف صاحب' پریشان مت ہوں" میں نے کہا "نقلی پستول کی طرح نقلی ڈاکو سے کیا ڈرنا!"

"تم سمجھتے ہو' میں نقلی ڈاکو ہوں" اس نے پاؤں پٹخ کے برہمی سے کہا۔

"تم نقلی ناگ منی ہو" میں نے کہا "نقل کے لیے بھی عقل چاہیے اور تمہارے پاس عقل ہوتی تو تم یہ نام ہی اختیار نہ کرتیں۔"

"اس نام کی ایک دہشت ہے.... میرے نام کی۔"

"گویا تم اپنے آپ کو ناگ منی تسلیم کرانے پر مُصر ہو۔ چلو ٹھیک ہے' ملکہ الزبتھ دوم کی طرح تم ناگ منی دوم کا لقب اختیار کرسکتی ہو' مجھے کیا! اب اپنے معاونین خصوصی سے بھی متعارف کرادو۔ یہ کیا زیرِ تربیت ہیں' یعنی اپرنٹس ہیں یا پارٹ ٹائم ڈاکو ہیں؟ ایک تو پوسٹ مین لگتا ہے مجھے علاقے کا۔"

یہ گویا اس شخص کے لیے ڈوب مرنے کا مقام تھا جسے میں نے ڈاکو سے ڈاکیہ بنادیا

"بکواس مت کر...."

"یار' میں نے تمہیں اتنی عزت دی کہ پوسٹ مین سمجھا اور تم ہو کہ بُرا مان رہے ہو" میں نے کہا "پوسٹ مین ایمانداری اور محنت سے روزی کماتا ہے۔"

ناگ منی نے کہا "تم مذاق سمجھ رہے ہو۔ یہ گولی بھی مار سکتے ہیں تمہیں۔"

میں نے کہا "مساۃ ناگ منی درجہ دوم۔ معاف کرنا۔ ناگ منی دوم' ابھی تک تم نے کچھ نہیں بتایا کہ آخر تمہاری تشریف آوری کے مقاصد کیا ہیں؟"

"میں چاہتی ہوں کہ تم خاموشی سے میرے ساتھ چلو۔"

"ساتھ چلنے میں تو شاید اعتراض نہ ہو لیکن خاموش رہنا

میرے لیے بہت مشکل ہے۔" میں نے ایک گہری سانس لی "مسلسل پانچ منٹ کی خاموشی سے مجھے اختلاج ہونے لگتا ہے۔ دس منٹ نہ بولوں تو جگر کا فعل بگڑ جاتا ہے۔ پندرہ منٹ بعد....."

"دیکھو سکندر، مجھے سختی پر مجبور مت کرو۔" اس نے جھنجلا کر میری بات کاٹ دی۔ "میں تمہیں زبردستی بھی لے جاسکتی ہوں۔"

"صرف مجھے! باقی لوگوں کا کیا بنے گا؟"

اس نے کہا "تمہیں، رابعہ اور کاجل کو ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔"

"بھئی تم ڈاکو ہو۔ بلکہ ڈاکن ہو" میں نے کہا "ڈاکا ڈالو اور مال غنیمت لے کر جاؤ۔ بندوں کو لے جاکے تم کیا کروگی۔ یہ تو اغوا کا کیس ہوجائے گا تم پر۔"

"ہونے دو، تمہیں کیوں فکر ہے میری؟"

میری باتوں نے آصف علی کے خوف اور پریشانی کو کچھ کم کردیا تھا، میں اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا "تم کھڑی کیوں ہو آخر..... بیٹھو۔"

"وقت نہیں ہے میرے پاس بیٹھنے کا۔ تم میری شرافت سے ناجائز فائدہ اٹھارہے ہو سکندر۔" وہ لہجے کو خطرناک بنا کے بولی۔

"کوئی اور شاید نہ مانے کہ ڈاکو کا شرافت سے کیا تعلق مگر میں تسلیم کرتا ہوں کہ ابھی تک تمہارا رویّہ شریفانہ ہے اور اسی لیے میں نے تم سے بیٹھنے کو کہا تھا کہ جانے سے پہلے کچھ ضروری باتیں ہوجائیں۔ ڈرنے کی کیا بات ہے، تمہارے حکم کے غلام بے حد مستعد ہیں اور خود تمہارے ہاتھ میں بھی آتش فشاں توپ ہے۔"

وہ ایک دم صوفے کے کنارے پر ٹک گئی "میں ڈرتی نہیں ہوں مگر یہ مت سمجھنا کہ تم مجھے باتوں میں لگا کے فائدہ اٹھا سکتے ہو۔ تم کو چلنا ہوگا میرے ساتھ۔"

"اور اگر میں نہ جاؤں تو؟"

"کیا انکار کرنا تمہارے اختیار کی بات ہے؟" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"یعنی زندہ یا مُردہ، ہر حال میں تم ہمیں لے کر ہی جاؤگی؟"

"ایسا ہی سمجھ لو۔"

میں نے کہا "کہاں لے کر جاؤگی؟"

"یہ میں نہیں بتاسکتی۔"

"چلو یہ بتادو کہ ہمیں اغوا کرکے تمہیں کیا ملے گا؟"

"معلوم ہوجائے گا وقت آنے پر" اس نے جھنجلا کے کہا۔

میں نے مظلوم لہجے میں کہا "ابھی معلوم ہوجاتا تو اچھا تھا، میں کچھ کرلیتا۔"

"کیا کرلیتے؟"

"یہی وصیت وغیرہ" میں نے آہ بھر کے کہا "تم کسی ویرانے میں لے جاکے گولی ماردوگی اور پھر کہوگی کہ مرنے کے لیے تیار ہوجاؤ تو کیا فائدہ۔ کسی کو سزائے موت بھی دی جاتی ہے تو اس کی آخری خواہش ضرور پوچھتے ہیں۔"

مجھے یوں لگا جیسے وہ ہنسی ضبط کرنے کی کوشش کررہی ہے "کیا ہوگی تمہاری آخری خواہش ایسی صورت میں؟"

"مس ناگ منی، ویسے تو ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے..... لیکن میں ایک پر اکتفا کروں گا۔ میں دنیا سے چھڑا چھانٹ کنوارا نہیں جانا چاہتا۔ یہاں تو کرائے پر مکان اٹھانے والے بھی پوچھتے تھے کہ شادی شدہ ہوتا! کیا پتا دوسری دنیا میں پھر یہی سوال اٹھ کھڑا ہو۔"

میں اپنے مقصد میں کسی حد تک کامیاب ہونے لگا تھا اور ناگ منی اس حد تک پُرسکون ضرور ہوگئی تھی کہ اس کے ہاتھوں بلا ارادہ فائرنگ سے میری بلاوجہ شہادت کے امکانات نہیں رہے تھے ورنہ جب وہ آئی تھی تو شدید اعصابی دباؤ کے باعث اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اس کے ہاتھوں میں مشین گن لرز رہی تھی اور وہ خود بھی لرزہ براندام تھی۔ یہ ناتجربہ کاری تھی یا اس خیال کی دہشت کہ مقابلہ ایم آر ایس سے ہوگا۔ جو جانتے تھے، وہ مانتے تھے کہ صرف طاقت سے ایم آر ایس کو شکست دینے کی خواہش نے چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کو ناکوں چنے چبوادیے تھے۔

ناگ منی نے کہا "تم ہمارے ساتھ جانے سے پہلے رابعہ سے شادی کرنا چاہتے ہو؟"

ظاہر ہے اس نے یہ سوال سنجیدگی سے نہیں کیا تھا مگر میں نے جواب سنجیدگی سے دیا "میرے چاہنے سے کیا ہوتا ہے جی۔ ایسی صورت میں وہ کب مانے گی۔ دنیا کی کوئی عورت اس شخص کو قبول نہیں کرسکتی... جو تختۂ دار پر کھڑا ہو۔ لیکن تم چاہو تو میری یہ آخری خواہش پوری ہوسکتی ہے۔"

"میں..... یعنی میں رابعہ کو قائل کروں۔ یا زبردستی....."

میں نے نفی میں سرہلایا "تم خود مجھ سے شادی کرلو۔ آصف علی صاحب نکاح پڑھادیں گے۔ تمہارے گواہ یہ کھڑے ہیں۔"

وہ ایک دم کھڑی ہوگئی "تم ایسے ماننے والے نہیں ہو۔ تمہیں یہ غلط فہمی ہے کہ چالاکی سے کام لے کر تم کچھ کرسکتے ہو۔ تم اپنا وقت ضائع کررہے ہو اس امید میں کہ شاید کوئی تمہاری مدد کے لیے آجائے گا یا مجھے باتوں میں لگا کے تم فائدہ اٹھالوگے۔"

اس نے غلط نہیں سمجھا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس مہلت سے رابعہ یا کاجل ضرور فائدہ اٹھالیں گی۔ ان کے پاس زندگی کے حالات کا وہ تجربہ تھا جو کسی بھی پُرخطر صورت حالات سے نمٹنے میں کام آسکتا تھا اور انہیں عقل وہوش کی راہنمائی فراہم کرسکتا تھا مگر اتنی دیر گزر جانے کے بعد بھی نہ رابعہ نے کچھ کیا تھا اور نہ کاجل نے۔ انہیں خبر ہی نہ تھی کہ یہاں اس گھر کے ایک کمرے میں ہم پر کیا بیت رہی ہے۔ وہ کسی دوسرے کمرے میں اتنی بے خبر کیسے رہ سکتی ہیں؟ یہ بات میرے لیے ناقابل فہم تھی۔ کیا انہوں نے باہر ہونے والے فائر کی آواز نہیں سنی تھی اور ان کے کانوں تک چوکیدار کے چلّانے کی آواز نہیں پہنچی تھی؟

"اس گھر میں ایک اندھی عورت ہے، اسے چھوڑ دو" جعلی ناگ منی نے حکم چلاتے ہوئے کہا "ایک معذور پاگل لڑکی بھی ہوگی، اس کو بھی کچھ نہیں کہنا ہے۔ باقی سب کو گاڑی میں ڈال کے لے جاؤ۔"

بظاہر یہ بات اس نے انہی دونوں سے کہی تھی جو اس کے قریب مشین گن کے ٹریگر پر انگلی رکھے اشارے کے منتظر کھڑے تھے لیکن وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلے تو میں سمجھ گیا کہ زیر نقاب کوئی پیغام رسانی کا آلہ ہے یا مائکروفون ہے جس کے ذریعے اس کا رابطہ باہر یا اندر، دوسرے لوگوں سے بھی قائم ہے اور وہ سب اس کے حکم کی اطاعت کے پابند ہیں۔

معلوم نہیں جواب میں کیا کہا گیا تھا۔ جو آواز اسکے کانوں نے سنی ہوگی وہ ہم نے نہیں سنی۔

"بے وقوف ہو تم سب..."

میں نے کہا "محترمہ ناگ منی صاحبہ! مؤدبانہ التماس ہے کہ آپ نے فی الحقیقت ہم سب کو اجتماعی طور پر بالجبر اغوا فرمانے کا تہیّہ کرلیا ہے تو ازراہِ بندہ پروری احکامات صادر فرمائے جائیں کہ سفرِ آخرت میں، دمِ آخر تک ہمارے عہدِ رفاقت پر کاربند رہنے کے عزائم کی راہ میں کوئی مزاحم نہ ہو۔"

"ہم ایک ساتھ جائیں گے" یہ الفاظ رابعہ کے تھے جو اجتماعی مارچ کے انداز میں کاجل کے ساتھ اندر آگئی تھی۔

"میں بھی یہی کہہ رہا تھا۔ سلیس اُردو میں" میں نے دانت نکال کے کہا۔

کاجل نے گویا اس اعلان کی تائید کی "ہم ایک ساتھ جئیں گے اور مریں گے۔"

میں نے سرہلا کے کہا "تت... تت... مریں ہمارے کمینے دشمن۔ تم صرف جینے کی بات کرو۔"

ایک ڈاکو نے مشین گن سے اشارہ کیا "چلو اُدھر لائن میں لگ جاؤ تم بھی۔ خبردار جو کسی نے چالاکی دکھانے کی کوشش کی۔"

میں نے کہا "ڈاکو صاحب! یہ بے چاری کیا چالاکی دکھائیں گی جو برضا ورغبت تمہاری خدمت میں خود حاضر ہوگئی ہیں۔ ان میں اگر عقل ہوتی تو اتنی دیر میں باہر سے کسی کو مدد کے لیے نہ بلاتیں؟"

"یہ باہر جاسکتی تھیں!" ناگ منی نے تمسخر اڑایا "ہمارے آدمی ہر طرف موجود ہیں۔"

"آدمی نہیں، شکاری کُتے کہو" میں نے کہا "جو ایک عورت کے پیچھے دُم ہلانے پر مجبور ہیں۔"

اب دوسرے ڈاکو کی قوت برداشت جواب دے گئی "چپ کر گُتے، بھونکنا بند کر نہیں تو..." اس نے ایک دم مشین گن اٹھا کے چھت کی طرف فائر کیا۔

شاید وہ نشانہ لیتا تو خطا ہوجاتا مگر سمت کا تعین کیے بغیر چلائی جانے والی گولی فانوس کو آویزاں رکھنے والی سنہری زنجیر پر لگی اور زنجیر کے ٹوٹتے ہی شیشے کا بھاری فانوس نیچے آیا۔ اس کے عین نیچے گلاس ٹاپ والی گول سینٹر ٹیبل تھی۔ فائر کی گونج ابھی باقی ہی تھی کہ شیشے بکھرنے کا زبردست چھناکا ہوا اور غیر ارادی طور پر کمرے میں موجود ہر شخص نے ہر طرف اُڑنے والے تیز دھار ٹکڑوں سے اپنا چہرہ اور آنکھیں محفوظ رکھنے کے لیے ہاتھ آگے کیے۔

یہی وہ لمحہ تھا جس کا مجھے انتظار تھا۔ جو کوشش سے نہیں آتا اور کسی کو بتا کے نہیں آتا۔ یہ کھیل تقدیر کھیلتی ہے کہ سب پتے اپنے ہاتھ میں رکھنے والا ایک غلط چال سے بازی ہار جاتا ہے۔

مجھے یہ موقع فراہم کرنے والوں کو اس وقت ہوش آیا جب میں جست لگا کے ناگ منی پر گر چکا تھا اور اسے پیچھے سے دبوچ کے اتنا بے بس کرچکا کہ اس کے جاں نثار محافظ اور اطاعت گزار سب دم بخود کھڑے رہ گئے تھے۔

"اگر تم چاہتے ہو کہ یہ عورت زندہ رہے تو ایسے ہی کھڑے رہو۔ بالکل بُت کی طرح" میں نے پُرسکون لہجے میں کہا "مجھے حرکت کا شک بھی ہوا تو میں اس کی گردن تازہ ککڑی کی طرح توڑ دوں گا۔ شاید تم یہ پہلے سے جانتے ہوگے کہ خالی ہاتھوں سے میں سخت لکڑی کی طرح اکڑی ہوئی گردن بھی توڑ سکتا ہوں۔"

بُت بن جانے والے ایک شخص نے صرف لب ہلائے "کیا تم جانتے ہو کہ اس کے بعد کیا ہوگا؟"

"میرے ساتھ اس سے زیادہ کیا ہوسکتا ہے کہ تم سب اپنی اپنی مشین گنوں کے راؤنڈ مجھ پر چلادو مگر اس کے بعد؟ تم واپس جاکے کیا کہوگے؟ کوئی تو پوچھے گا تم سے کہ غلطی کس نے کی تھی؟"

ناگ منی کی مشین گن نیچے گرگئی تھی۔ وہ خود میری گرفت میں بری طرح تڑپ رہی تھی اور ہر طرف ہاتھ اور لاتیں چلانے کے ساتھ دانتوں سے مجھے کاٹنے کی کوششِ ناکام میں مصروف تھی۔

میں نے اسے دونوں ہاتھوں کے شکنجے میں جکڑ کے پیچھے کھینچ لیا۔ لات مار کے میں نے مشین گن کو بھی کونے میں پہنچادیا اور خود بھی اس عورت کو ڈھال بنا کے کونے میں کھڑا ہوگیا۔ اب کسی بھی سمت سے آنے والی گولی کا پہلا نشانہ وہی بنتی۔

یہ اندازہ تو میں نے فوراً ہی کرلیا تھا کہ میرے بازوؤں کے حلقے میں گرفتار جسم کسی عورت کا نہیں ہوسکتا۔ میرے ہاتھ عورت کے بدن کے لمس کی نرمی، گداز اور نشیب وفراز کی نزاکت ولطافت کو سمجھتے تھے اور محسوس کرسکتے تھے۔ پھر جس طرح اس نے میری گرفت سے نکلنے کے لیے مزاحمت کی وہ کسی بھی عورت کے لیے ممکن نہیں تھا۔

اس کشمکش میں نقاب کا اُتر جانا لازمی تھا۔ نقاب کے نیچے ایک سوفی صد مردانہ چہرہ تھا۔ اس کا رنگ کالا تھا لیکن چہرے پر بڑھی ہوئی شیو کے سخت بالوں میں سفیدی غالب تھی۔ وہ کم سے کم

پچاس سال کا آدمی تھا جس کے سر کے بیشتر بال اُڑ چکے تھے اور باقی بالوں کو مہندی سے رنگ کے اس نے پیچھے کی طرف چُٹیا سی باندھ رکھی تھی۔ اس نے بہت موٹے فریم والی عینک لگا رکھی تھی۔ رابعہ اور کاجل ہکّا بکّا کھڑی تھیں اور آصف علی اتنا حیران تھا کہ وہ رائفل تک اٹھانا بھول گیا تھا جو اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر گئی تھی۔

"تو تم ہو ناگ منی' بلکہ گل بانو" میں نے کہا "کیا چیز ہو آخر تم؟ نہ اِدھر کے نہ اُدھر کے۔"

اب اس نے قطعی بدلی ہوئی مردانہ آواز میں کہا "سکندر بابو' ہم کو چھوڑ دے ورنہ پچھتائے گا' بہت پچھتائے گا۔"

اس کی آواز حیرت انگیز طور پر پاٹ دار اور پُر تحکم ہو گئی تھی۔ میں نے اس کے طبلے جیسے سر پر ہاتھ مارا "اُلو کے پٹھے۔ ایکٹر کی اولاد۔ سیدھی طرح بتا کون ہے تو ورنہ دُھلے ہوئے کپڑے کی طرح نچوڑ دوں گا۔"

اس نے بے خوفی سے قہقہہ مارا "ارے تو نہیں جانتا' کچھ نہیں جانتا نادان کہ ہم کون ہیں۔ ارے ہم قہر ہیں' بلا ہیں۔ ہم سے مت ٹکرا سکندر بابو۔ ہم فولادی چٹان ہیں اور تو مٹی کا پُتلا۔"

اب آصف علی نے رائفل اٹھائی "اس فولادی چٹان کو میں ابھی کنکر بناتا ہوں۔"

وہ ہنستا رہا۔ اس کے قہقہے مصنوعی تھے۔ اسٹیج پر کام کرنے والے ولن کی طرح وہ جھوٹے اعتماد کا سہارا لے کر بے خوفی کی اداکاری میں مصروف تھا اور ہمیں نفسیاتی طور پر کمزور کرنا چاہتا تھا۔ میں اس کی اداکاری سے زیادہ صداکاری کے کمال کا معترف ہو چکا تھا۔ اس نے ناگ منی کا زنانہ رول حد درجہ مہارت کے ساتھ کیا تھا۔ اس کے پاؤں اور جوتے دیکھ کر مجھے یقین آ گیا تھا کہ وہ گل بانو نہیں ہے لیکن یہ شک مجھے بہرحال نہیں ہوا تھا کہ کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگار میں جس کی داڑھی مونچھیں' گنجا سر اور مردانہ خدوخال ہیں۔ مجھے تھوڑا سا تجسس اور اشتیاق تھا کہ میں اس عورت کو دیکھوں جو ناگ منی ہے۔ اس کی آواز اتنی پُرفریب تھی کہ میں اپنے ذہن میں ایک حسین نہ سہی قبول صورت' نوجوان نہ سہی جوان' گوری نہ سہی سانولی عورت کا تصور قائم کر چکا تھا۔ چنانچہ نقاب کشائی کے بعد حیرت اور مایوسی کے ساتھ مجھے خفت کا سامنا بھی ہوا کہ میری عقل جس پر مجھے بڑا ناز تھا' کتنی آسانی سے دھوکا کھا گئی۔

مسکراہٹ رابعہ اور کاجل کے لبوں پر بھی نظر آ رہی تھی اور میری طرح وہ بھی ناگ منی کے اصل روپ کو دیکھ کر شرمندہ و حیران تھیں۔ ہماری ذہنی کیفیت کسی سانپوں پر ریسرچ کرنے والے پروفیسر کی حالت سے مختلف نہ تھی جسے کوئی چالباز سپیرا یقین دلا دے کہ پٹاری میں شیش ناگ ہے مگر وہ پٹاری کھولے تو اس میں سے ربر کا سانپ بھی نہ نکلے۔ ایک چوہا نکلے اور بھاگ جائے۔

آصف علی کی بات پر اس نے کڑک کے کہا "رُک جا بڈھے' وہیں رک جا۔ تو چٹان کو کنکر بنانے کا دعویٰ کرتا ہے۔ کیا ہے تو؟ ریت کی دیوار ہے بڈھے تو۔ چراغِ سحری ہے اور پھونک مار کے بجھانا چاہتا ہے آفتاب کو۔"

اس نے پھر ایک قہقہہ مارا جو کسی طمانچے کی آواز کی طرح تھا۔ رُسوا کن' اشتعال انگیز' ذلت آمیز۔

غصے کی لہر نے مجھے اتنا مغلوب کر لیا تھا کہ شاید میں اس ڈائیلاگ بولنے والے ایکٹر کی آواز ہمیشہ کے لیے بند کر دیتا۔ اس کی گردن کے گرد میرا ایک ہاتھ تھا اور دوسرے سے میں نے اس کا دایاں بازو گھما کے اپنے سامنے اس کی کمر سے لگا رکھا تھا۔ میں اس کی کمر پر گھٹنا مارتا اور گردن کو پیچھے موڑ کے جھٹکا دیتا تو اس کا منکا ٹوٹ جاتا۔

آصف علی نے اسے گالی دی "سُور کے بچے! میں تجھے مار کے ہی مروں گا۔ چھوڑ دو اسے سکندر' ہٹ جاؤ ایک طرف۔ میں اسے گولی مار دیتا ہوں۔ مجھے اس کا حق حاصل ہے۔ یہ میرے گھر میں مجرمانہ عزائم کے ساتھ داخل ہوا۔ اسلحے کے زور پر اس نے مجھے ہراساں کیا' میرے اہلِ خانہ کو یرغمال بنایا۔ میں بلڈ پریشر کا مریض ہوں۔ میرا ہارٹ فیل ہو سکتا تھا۔"

میں نے اسے چھوڑ کے مشین گن اٹھالی "آپ غصے میں نہ آئیں۔ دلاور جیسے لوگوں سے نمٹ چکا ہوں میں' اس کی اوقات ہی کیا ہے۔"

"اوقات!" اس نے پھر قہقہہ بلند کیا "مجھ سے میری اوقات پوچھتا ہے۔ تو نہیں جانتا' بالکل نہیں جانتا کہ تیری اوقات بھی کچھ نہیں ہے۔ تو غبارہ ہے غبارہ۔ اونچا اُڑ رہا ہے ابھی۔ بہت اونچا اُڑ رہا ہے۔"

وہ ایک ایک لفظ کو واضح ڈرامائی تاثر کے ساتھ بھرپور لہجے میں یوں ادا کرتا تھا جیسے وہ اسٹیج سے سامعین کو مخاطب کر رہا ہو یا حجرۂ خاص سے برآمد ہو کے عقیدت مند مریدوں کے اجتماع سے خطاب کر رہا ہو۔

ابتدا میں اس نے اپنی شناخت کو چھپائے رکھنے کے لیے کچھ مزاحمت کی تھی لیکن اس کے بعد وہ پُرسکون ہو گیا تھا۔ نہ وہ اس وقت پریشان ہوا تھا جب آصف علی نے رائفل اٹھائی تھی اور نہ میری گرفت سے آزاد ہونے کے بعد اس کے سکون میں فرق آیا تھا۔ مشین گن کا رخ اپنی طرف دیکھ کے وہ اتنا بھی خوف زدہ نہیں تھا جتنا صورت حال کو پوری طرح اپنے قابو میں دیکھنے کے باوجود آصف علی خائف تھا۔ بے خوفی کا مظاہرہ میں نے بھی کیا تھا لیکن اندر سے میں کتنا پریشان تھا' یہ میں اچھی طرح جانتا تھا۔ خود رابعہ اور کاجل کے رنگ اس بحران سے نکل جانے کے بعد بھی اُڑے ہوئے تھے اور وہ نروس دکھائی دے رہی تھیں لیکن اس شخص کی بات جُدا تھی۔ وہ اندر سے بھی پُرسکون اور پُراعتماد تھا۔

وراسے اپنا راز فاش ہو جانے سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ آغا شر کے اسٹائل میں ڈائیلاگ بول رہا تھا۔ اس کا اندازِ تخاطب' ں کے قہقہے اور اس کی گونج دار آواز سب میں ایک جارحانہ چیلنج تھا۔ ناگ منی کے رول سے اس نے یکلخت اپنی شخصیت کو با۔ خلف اور متضاد کردار میں یوں ڈھال لیا تھا جیسے یہ سب سوئچ دبا۔ کی بات تھی۔ جیسے وہ انسان نہیں ٹی وی ہے۔ بٹن دبایا اور چینل بدل گیا۔ ابھی ایک عورت گا رہی تھی' اچانک وہیں کوئی باریش مولانا درس دینے لگے۔ پھر بٹن دبایا' ڈونالڈ ڈک کی مخصوص ہنسی کے ساتھ کارٹون آ گیا۔ یا وہ ڈبل چال والا پنکھا ہے کہ ایک ڈوری کھینچی تو سیدھا چلنے لگا۔ دوسری کھینچی تو اسٹاپ۔ آدمی کا یوں قالب بدلنا اور ہر بہروپ میں اتنا حقیقی نظر آنا بلاشبہ کمال تھا۔ مجھے اس شخص میں دلچسپی پیدا ہو گئی تھی اور میں زندگی کے ڈرامے میں پہلی بار ہی نمودار ہو کے حیران کر دینے والے اس کردار کے بارے میں زیادہ تفصیل سے جاننا چاہتا تھا کہ وہ کون ہے اور کیا ہے۔ فقط اداکار اور ایک صداکار یا ہدایت کار بھی خود ہی ہے۔ تو ایسے ڈرامے وہ کب سے پیش کر رہا ہے اور کیوں؟

مجھے اونچا اڑنے والا غبارہ قرار دیتے ہوئے اس کی نظریں اوپر چھت کی طرف اٹھ گئی تھیں اور ہاتھ آسمان کی بلندی کو واضح کرنے لگے تھے۔ وہ ایک ایسا کامیاب مداری تھا جسے دیکھنے اور سننے والوں کے ذہن پر ان کی بصارت اور سماعت پر اور عقل و ہوش پر نفسیاتی غلبہ حاصل کرنا آتا تھا۔ غالباً اسی کو عرفِ عام میں نظربندی کہا جاتا ہے کہ تماشا دیکھنے والے وہی دیکھنے اور محسوس کرنے لگتے ہیں جو مداری انہیں بتاتا ہے۔ حقیقت کچھ نہیں ہوتی۔ خصوصی مہارت حاصل کر لی جائے تو یہی ہپناٹزم ہے جس میں عامل اپنے معمول پر صرف ذہنی غلبہ ہی حاصل نہیں کرتا' جسمانی طور پر بھی اسے مطیع کر لیتا ہے۔

ایک لمحے کے لیے میں نے بھی محسوس کیا کہ ہلکا پُھلکا ہو کے میں غبارے کی طرح بلند ہو گیا ہوں اور کھلے آسمان کی وسعت میں پرواز کر رہا ہوں۔ دوسرے لمحے میں اس طلسم سے آزاد ہو گیا۔

میں نے اس کے ایک لات رسید کرنے کی کوشش کی مگر وہ تھوڑا سا دور ہو گیا۔ میرا پاؤں اس کو چھو کے واپس آ گیا "بند کر اپنی بکواس حرام زادے ورنہ......"

"ورنہ کیا... کیا کر لے گا تو... بول... اس اندھی عورت کو مروا دے گا؟" اس نے میری بات کاٹ کے کہا اور پھر اپنی بند مٹھی کو گھورنے لگا "میرے قبضے میں ہے اس کی جان۔ وہ اندھی نہیں دیکھ سکتی مگر جانتی ہے۔ تو دیکھ سکتا ہے مگر جانتا نہیں کہ تو کچھ نہیں کر سکتا۔ بالکل کچھ نہیں کر سکتا۔" ایک بار پھر اس کا منحوس قہقہہ بلند ہوا اور اس نے اپنی لال لال آنکھوں سے مجھے دیکھا۔

میرا دل بیٹھ گیا۔ ابھی تک مجھے خیال ہی نہیں آیا تھا کہ اس گھر میں ہمارے علاوہ بھی دو افراد ہیں۔ آصف علی کی نابینا بیوی اور اس کی ذہنی و جسمانی طور پر معذور بیٹی قدرت خانم۔ وہ اس منظر سے غائب تھیں اور ابھی تک میں نے ان کی آواز بھی نہیں سُنی تھی۔ یہ ناممکن تھا کہ پہلے ہی فائر نے اور پھر چوکیدار کے چلّانے کی آواز نے آصف علی کی بیوی کو متوجہ نہ کیا ہو۔ وہ بصارت سے محرومی کے بعد اپنی سماعت پر زیادہ انحصار کرتی تھی۔ پھر اس نے دوسرے فائر اور فانوس کے گرنے کی آواز کو درخورِ اعتنا کیوں نہیں سمجھا تھا؟ اس کے کان تو دوسرے کمرے میں یا گھر کے کسی بھی حصے میں اجنبی آوازوں پر کھڑے ہو جاتے تھے۔ پھر اس کی غیر حاضری کا کیا مطلب ہے؟ اس نے ابھی تک یہاں آ کے پوچھا کیوں نہیں کہ یہ سب کیا ہے' یہ کیسا شور ہے' یہ کون لوگ ہیں جو اس طرح ہمارے گھر میں داخل ہو گئے ہیں اور دہشت پھیلا رہے ہیں۔

میں نے رابعہ کی طرف دیکھا "رابعہ...."

"مجھے نہیں معلوم" رابعہ نے گویا اعترافِ جرم کر لیا "میں اپنے کمرے میں تھی۔ پھر میں نے دیکھا تو دو آدمی کھڑے تھے وہاں' ایسے ہی۔"

"آدمی..." اس شخص نے نعرہ لگایا جو پہلے ناگ منی کی آواز میں بول رہا تھا اور ابھی تک بُرقعے کا نچلا حصہ پہنے کھڑا تھا "کون ہے آخر آدمی۔ کوئی نہیں جانتا۔ بالکل نہیں جانتا۔ ہم سب بہروپئے ہیں اور ایکٹر ہیں۔ حاکم ہیں اور محکوم ہیں۔ ظالم اور مظلوم۔ قاتل اور مقتول ہیں۔ لیڈر اور ووٹر ہیں۔ مزدور اور شاعر۔ چور' ڈاکو اور مولوی۔ استاد اور طالب علم ہیں۔ آدمی کہاں ہے؟"

تقریر کرتے کرتے اس نے آخری جملہ یوں کہا جیسے اپنے آپ سے سوال کیا ہو۔ وہ بلند آواز میں ہاتھ اٹھا کے بول رہا تھا مگر اچانک اس نے آخری الفاظ سرگوشی میں کہے اور پھر سوچ میں ڈوب گیا۔ اس کا بھی ایک ڈرامائی تاثر تھا۔

میں نے اسے نظرانداز کر دیا اور سوالیہ نظروں سے کاجل کو دیکھا۔

"میں باتھ روم میں تھی۔" اس نے کہا "انہوں نے مجھے بھی یہاں دھکیل دیا۔ پہلے وہ کہہ رہے تھے کہ باہر چل کے گاڑی میں بیٹھو لیکن ہم نے انکار کر دیا تھا۔"

"شاباش' بڑی بہادری کا ثبوت دیا تھا" میں نے طنز سے کہا۔

"اور ہم کیا کرتے؟" رابعہ بولی "ہمیں موقع ہی نہیں ملا۔"

"اور حلق سے آواز نکالنے کا خیال نہیں آیا ہو گا!"

خاکی وردی والے دونوں بے حس و حرکت کھڑے ہوئے تھے اور ان کی نظریں اب اپنے ایکٹر سردار کی طرف تھیں۔

اس شخص نے اچانک کسی کو مخاطب کیے بغیر کہا "ان کو بھی یہاں لے آؤ۔"

پہلے میں نے غور سے دیکھنے کی کوشش کی مگر مجھے کوئی خفیہ مائکروفون نظر نہ آیا۔ اندر کہیں سننے والوں نے اس کا فرمان موصول کر لیا تھا اور جواب میں بھی کچھ کہا تھا جس پر اس نے

سہلا کے کہا تھا "ٹھیک ہے" لیکن پھر میں نے یہ راز دریافت کرلیا۔ اس کی عینک کی کمانی کا جو سرا کانوں کے پیچھے تک پہنچتا تھا اس میں ایک طرف دھاگے جیسا تار تھا جو ایک کان میں داخل ہو رہا تھا۔ یہ غالباً آلۂ سماعت جیسا ریسیور تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ دوسری طرف کی کمانی میں کوئی بہت حساس مائکروفون ہو۔

اس پُراسرار شخص کو سمجھنے کی کوشش میں میرا دماغ چکرا کے رہ گیا تھا۔ وہ بیک وقت مسخرہ بھی لگتا تھا اور فلاسفر بھی۔ وہ روپ بہروپ، آواز و انداز بدل سکتا تھا لیکن باعث تشویش یہ بات تھی کہ وہ ایک گروہ کا سرغنہ تھا جس میں پیشہ ور مجرم شامل تھے۔ ظاہر ہے وہ بہ لحاظِ صلاحیت ان سب سے افضل و برتر تھا۔ اس نے ڈاکا ڈالنے کی کوشش میں ناگ منی کا نام استعمال کیا تھا جس سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ وہ ناگ منی کے ماضی سے بے خبر نہیں۔ اس سے ہمارے تعلق کی نوعیت کے بارے میں بھی وہ یقیناً سب کچھ جانتا ہوگا۔ سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ ہمارے بارے میں تمام معلومات اسے کس نے فراہم کی تھیں؟ بظاہر اس کا ایک ہی جواب تھا کہ ہمارے پرانے دشمنوں نے، مگر اس سے دوسرا سوال پیدا ہوتا تھا کہ کیا وہ ہمیں انہی کے اشارے پر اغوا کرکے ساتھ لے جانا چاہتا تھا؟ یہ بات بالکل ناقابل فہم تھی۔ ہمیں خود دلاور اپنے ساتھ لے جا سکتا تھا لیکن اس نے تو ہمیں "باعزت" طور پر رہا کردیا تھا۔ تاہم دلاور خود ایک سمجھ میں نہ آنے والی چیز تھا۔

آصف علی کی بیوی بدحواس اور دہشت زدہ، چیختی چلاتی اندر آئی "آصف علی، کہاں ہو تم؟ تم ٹھیک تو ہونا!"

"ہاں ہاں۔ بالکل ٹھیک ہوں میں۔"

"یہ ہمارے گھر میں کیا ہو رہا ہے، کون لوگ گھس آئے ہیں، کیا چاہتے ہیں یہ لوگ؟" وہ چلاّ کے بولی۔

میں نے اسے آصف علی کے ساتھ بٹھادیا "آپ یہاں خاموش بیٹھ جائیں۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔"

"فکر کی بات کیسے نہیں۔ انہوں نے مجھے پکڑ کے باندھ دیا تھا۔ میرے منہ میں کپڑا ٹھونس رکھا تھا۔ قدرت کہاں ہے؟" وہ بدستور چلاّتی رہی "خدا غارت کرے انہیں۔ کون ہیں یہ ظالم کمینے....."

آصف علی نے کہا "شور کرنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ قدرت کو ابھی تک تو کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔ تم نے بک بک جاری رکھی تو سب کچھ ہوجائے گا۔"

وہ ڈر گئی۔ "کیا ہوجائے گا؟ دیکھو ان لوگوں سے کہو کہ سب کچھ لے جائیں۔ جو بھی انہیں چاہیے تم خود دے دو۔ لیکن ان سے کہو ہمارے گھر سے چلے جائیں۔ ہم کسی سے کچھ نہیں کہیں گے۔ پولیس کو بھی کچھ نہیں بتائیں گے۔"

میں نے اب اپنے سامنے بڑے قلندرانہ جاہ و جلال اور فاتحانہ عزم کے ساتھ کھڑے ہوئے بہروپیے کو دیکھا "اپنے ساتھیوں سے کہو کہ قدرت کو بھی لے آئیں اور ہتھیار ڈال دیں۔"

اس کی نظریں مجھ پر جم گئی تھیں "تو حکم دیتا ہے مجھے! مجھ پر حکم چلاتا ہے؟ جانتا نہیں، میں کون ہوں۔ بالکل نہیں جانتا تو جاہل، تیری آنکھیں کھلی ہیں مگر تو دیکھ نہیں سکتا اندھے۔"

میں نے کہا "چلو تم خود بتادو اپنے بارے میں کہ تم کون ہو؟"

"میں بادشاہ ہوں" اس نے یوں کہا جیسے یہ بات تو ساری دنیا کو معلوم تھی اور میرا سوال اتنا ہی احمقانہ تھا جیسے میں سورج کے بارے میں پوچھوں کہ یہ کیا چیز ہے۔

"اور آپ کی بادشاہت کہاں قائم ہے؟" میں نے کہا۔

"یہاں۔ اس جگہ۔ تیرے سامنے بھی ہم بادشاہ ہیں لیکن تو نہیں جانتا، بالکل نہیں جانتا۔"

بظاہر یہ اس کا تکیۂ کلام تھا "تو نہیں جانتا۔ بالکل نہیں جانتا۔" مگر مجھے اس میں بھی شک تھا۔ جو شخص دھوکا دینے کے لیے جنس اور آواز تک بدلنے پر قادر ہو، وہ اندازِ کلام بھی بدل سکتا ہے اور ابھی کیا معلوم، یہ بھی اس کی شخصیت کا اصل روپ تھا یا نہیں۔ نقاب اٹھ جانے کے بعد اس کا جو روپ سامنے آیا تھا وہ بھی دھوکا ہو سکتا تھا۔

میں نے کہا "تم اب کیا کرسکتے ہو بادشاہ سلامت؟ تم محصور ہو۔ یہاں سے تم کیسے نکلو گے؟"

اس نے ایک قہقہہ مارا "اپنے آپ سے کر یہ سوال ابوجہل۔ بادشاہ کا راستہ کس نے روکا ہے؟"

"تم سب کی لاشیں ہی جائیں گی یہاں سے۔"

اس نے انگلی لہرائی "نا.... تم سب کی نہیں.... ہم سب کی.... دیکھ ذرا ان بندوقوں کی طرف۔ ان میں جھانک، پڑھ کس گولی پر کس کا نام لکھا ہے اور سمجھ لے کس کو کہاں جانا ہے۔ ہم سب کو ساتھ جانا ہے، جہاں بھی جانا ہے۔ اندر.... باہر.... اوپر۔"

اس نے سر اٹھا کے چھت کو دیکھا اور پھر ہاتھ بلند کرکے انگشتِ شہادت سے آسمان کی طرف اشارہ کرنے لگا۔

یہ بڑی عجیب صورت حال تھی۔ میں اور آصف علی ان پر بندوقیں تانے کھڑے تھے اور وہ ہم پر۔ آصف علی کی بیوی کا ہونا نہ ہونا برابر تھا بلکہ اس کی موجودگی ہمارے دفاع کو کمزور کرتی تھی۔ رابعہ اور کاجل بھی خالی ہاتھ، بے بس تھیں اور ان سے کوئی کارنامہ سرانجام دینے کی توقع رکھنا عبث تھا۔ ہاں ان کی جگہ نازو ہوتی تو میں بہت پُریقین اور پُراعتماد محسوس کرتا اور کسی نہ کسی موقعے سے فائدہ اٹھا کے ہم بساط الٹ دیتے۔ اس وقت بھی جب میں نے بادشاہ سلامت کو دبوچا تھا، میں نے شدت سے نازو کی کمی کو محسوس کیا تھا۔ نازو ساتھ ہوتی تو اسی لمحے باقی دو کو لمبا لٹادیتی اور اس محاذ پر کامیابی کے بعد ہم مشترکہ حکمتِ عملی سے آصف علی کی بیوی اور قدرت کو بھی رہا کرا لیتے لیکن اکیلا میں ہر جگہ نہیں لڑ سکتا

تھا۔

ابھی تک مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اندر گھر کے باقی حصے میں کتنے حملہ آور موجود ہیں اور ان کے کتنے ساتھی باہر ہیں۔

خلافِ توقع وہ قدرت کو بیرونی دروازے کی طرف سے اندر لائے۔ قدرت کا ذہن ایک ننھے بچے کی اوسط ذہانت سے بھی محروم تھا۔ وہ کیسے اندازہ کرسکتی تھی کہ صورت حال کتنی سنگین ہے اور اس گھر میں کس قسم کا خطرناک کھیل جاری ہے۔ وہ تو خطرے کے مفہوم سے ناآشنا تھی اور اس کے لیے اجنبی یا آشنا چہروں پر جذبات کی مہرباں نامہرباں تحریر کو پڑھنا اتنا ہی دشوار اور ناممکن تھا جتنا نظامِ کائنات کے اسرار و رموز کو سمجھنا۔

قدرت کے دائیں بائیں دو تنومند محافظ تھے۔ شناخت کو ناممکن بنانے کے لیے انہوں نے حُلیوں میں یکسانیت کی آڑلی تھی۔ ان کے جسم پر بھی خاکی وردیاں تھیں اور انہوں نے بھی منہ پر ڈھاٹے باندھ رکھے تھے۔

آصف علی کی بیوی دیکھنے سے قاصر تھی مگر اس کی ممتا نے اولاد کی قربت کو محسوس کرلیا "قدرت...." وہ چلاّئی۔

"ام..... ماں" قدرت نے خوش ہوکے کہا اور آگے بڑھی مگر دو مضبوط ہاتھوں نے اسے روک لیا۔

آصف علی نے مضطرب ہوکے کہا "اسے چھوڑ دو۔ اس کے بدلے کچھ بھی لے لو مجھ سے۔"

"ہاں۔ جو بھی ہمارے پاس ہے، سب لے لو" اس کی بیوی ہسٹریا میں مبتلا ہوگئی "روپیہ پیسہ زیور۔ میں ہر چیز دے سکتی ہوں مگر خدا کے لیے اسے چھوڑ دو۔ یہ کچھ نہیں جانتی، کچھ نہیں سمجھتی۔ یہ خدا کی امانت ہے، خدا کی قدرت ہے۔"

بادشاہ ہنسنے لگا "خدا کی قدرت دیکھو سکندر اعظم! اچھی طرح دیکھو اور سمجھو، اس کی قدرت کو اور اپنی مجبوری کو۔"

رابعہ نے کہا "تم اس معصوم پر ظلم کرو گے۔ کچھ تو خدا کا خوف کرو۔"

کاجل نے کہا "اتنے سنگدل مت بنو۔"

بادشاہ ان کی طرف پلٹا "لڑکی! تو نہیں سمجھتی، بالکل نہیں سمجھتی۔ ہم ظلم نہیں کرتے۔ ہم تو بڑے رحم دل ہیں۔ اس کے دشمن ہو تم سب لوگ جو مقابلے پر کمربستہ ہو۔ تمہاری ضد کا نقصان اس کو ہوگا جسے کچھ معلوم نہیں۔ ہم تو بچوں کو ٹافی دیتے ہیں۔ میٹھی میٹھی۔"

قدرت کے ساتھ آنے والے محافظوں میں سے ایک نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک لالی پاپ نکال کے قدرت کو دی جو قدرت نے خوش ہوکے لے لی اور چوسنے لگی۔

"جب یہ ٹافی ختم ہوجائے گی تو ہم اسے دوسری ٹافی دیں گے، میٹھی نیند کی ٹافی۔ پھر جیسے یہ ٹافی ختم ہو رہی ہے آہستہ آہستہ ایسے ہی آہستہ آہستہ قدرت ختم ہوجائے گی.... ہم سب ختم ہوجائیں گے۔"

قدرت کی ماں نے ایک چیخ ماری "قدرت، پھینک دے اسے۔ مت کھا یہ ٹافی۔"

"ٹا...فی.... اچھی...." قدرت مضحکہ خیز انداز میں ہنسنے لگی۔

"سکندر، یہ بڑے سفاک لوگ ہیں" آصف علی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "ان سے بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ انسان مقابلہ کر سکتا ہے انسان کا۔ ہم شیطان سے نہیں جیت سکتے۔"

میں نے اقرار میں سرہلایا "آپ ٹھیک کہتے ہیں۔"

"تمہارے ساتھ میں بھی چلتا ہوں۔"

میں نے مشین گن پھینک دی "نہیں، آپ اس کھیل میں مت شریک ہوں۔ یہ تقدیر یا گردش حالات تھی جس نے مجھے آپ سے ملوادیا ورنہ پوری کوشش کے باوجود آپ تو ناکام ہی رہے تھے۔ مجھے اس کا ہمیشہ افسوس رہے گا کہ تجدیدِ تعلق سے حاصل ہونے والے نیک مقاصد پورے ہوکے بھی پورے نہ ہوئے اور ہماری بدبختی کے تاریک سائے آپ کی زندگی پر بھی پڑے۔"

"ایسا مت کہو سکندر۔ میں ایسا نہیں سمجھتا۔"

"آپ کے اور ہمارے درمیان نہ پہلے کوئی تعلق تھا اور نہ آئندہ ہونا چاہیے" میں نے کہا "ماضی کی سب باتوں کو بھول جائیں۔"

"کیا تم جا رہے ہو؟" آصف علی کی بیوی چلاّئی۔

"ہاں، کتنا اچھا ہوتا اگر ہم پہلے ہی چلے جاتے" رابعہ نے افسوس سے کہا۔

"لیکن قدرت..."

میں نے آصف علی کی بات کاٹ دی "بشرطِ زندگی، ہم اپنا وعدہ پورا کریں گے۔ لیکن خدا کے لیے جب تک ہم خود نہ آئیں، آپ ہم سے ملنے یا ہم سے رابطے کی کوشش بھی نہ کریں۔ قدرت کو اور اس کی ماں کو آپ کی ضرورت ہے، ہماری نہیں۔ اپنی زندگی کی حفاظت کریں اور ان خطرات سے دور رہیں جو ہمارے تعاقب میں ہیں۔"

حقیقت یہ ہے کہ اس صورت حال سے میں بہت مایوس تھا۔ مجھے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ حالات میری توقعات کو دھوکا دے رہے ہیں۔ وہ ایک پوری زندگی تھی جو ہم نے دلاور اینڈ کمپنی میں شامل وطن کے دشمنوں اور غداروں کے خلاف محاذ آرائی کے آلام و مصائب کی نذر کردی۔ دل کے خوش رکھنے کو یہ خیال بھی کافی نہ تھا کہ ہم اس طویل سفر کے تمام مراحل طے کرکے کامران لوٹ آئے جس میں ہر قدم پر سامانِ اجل تھا۔ بس قسمت ساتھ تھی اور بچانے والا ہاتھ مارنے والے ہاتھ سے زبردست تھا کہ اس معرکۂ زیست میں ہم نے جان کی بازی لگائی اور ہارے نہیں۔ لیکن ہم نے اور بہت کچھ گنوایا۔ اپنا یقین اور یہ اعتماد کہ آج بھی جیت راہِ حق پر چلنے والوں کی ہوتی ہے۔ ملک اور قوم کے ساتھ ہم نے

بھی ایک بے مقصد جنگ میں سب کچھ لٹا دیا تھا اور تہی دست لوٹ آئے تھے۔ ہم نے اس احساس سے سمجھوتا کرلیا تھا کہ شکست و فتح مقدر سے ہے۔ مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا۔ وقت گزرے گا تو وہ سب زخم بھی مندمل ہو جائیں گے جو اپنوں کی بے وفائی کا صلہ تھے۔ اغیار تو پھر اغیار ہیں' اپنوں نے سازشوں کے جال پھیلانے اور ہماری قومی یک جہتی کے تصور کو رُسوا کیا تو ان سے کیا گلہ!

مجھے امید تھی کہ شکست کے صدمے سے سنبھل جانے کے بعد رفتہ رفتہ حالات معمول پر آجائیں گے اور ہم زندگی کے لیے حوصلے کو جمع کرکے پھر پُریقین مستقبل کی راہ پر گامزن ہوں گے مگر میری توقعات کا سفر ہنوز ایک سراب کی آرزو ثابت ہو رہا تھا۔ معاملات سلجھنے کے بجائے الجھتے جارہے تھے اور میری ہر کوشش کی ناکامی سے میرے صبر وضبط اور آزمائش کی قوت برداشت کا سرمایہ کم ہو رہا تھا۔ پھر میں اکیلا رہ گیا تھا۔ یہ تقدیر کی عجب ستم ظریفی تھی کہ ہم دیارِ غیر میں اور مسافرت میں تھے تو یکجا تھے اور لوٹ کے گھر آئے تو بچھڑ گئے۔

ہم ایک نیک مقصد لے کر پشاور پہنچے تھے اور وہ مقصد تھا کلیم اللہ کے والدین سے کیے ہوئے وعدے کے مطابق ان کی امانت کو بحفاظت وارثوں تک پہنچانا لیکن اس سفر میں بھی تیرہ بختی نے ساتھ نہ چھوڑا اور یہ سلسلہ ابھی جاری تھا۔ آصف علی نے میرے والد کے ساتھ برائی کی تھی۔ میں نے اسے معاف کرکے احساسِ جرم کے آزار سے نجات دلائی اور اس کی نیک نیتی سے مدد کرنی چاہی تو یہ نیکی بھی ہمارے گلے پڑگئی اور ایک سزا بن گئی۔

ان حالات میں کچھ بھی نہ کرنے اور خود کو حالات کے رحم وکرم پر چھوڑ دینے کے سوا چارہ نہ تھا۔ احساسِ شکست خوردگی نے مجھے اتنا بد دِل ومایوس اور مجبور کردیا کہ میں نے بہتری کے لیے کوشش کو ہی لاحاصل سمجھ لیا اور مزاحمت کا خیال چھوڑ دیا "جو ہوگا دیکھا جائے گا" کے قنوطی فلسفے کو تسلیم کرنے کے بعد میں نے یہی مناسب سمجھا کہ فی الحال بادشاہ سلامت کی بالادستی کو قبول کرلیا جائے۔ یہ سب سوچنا بے سود اور فضول تھا کہ وہ کون ہے' کس کا آلۂ کار ہے اور ہمیں اغوا کرکے کہاں لے جائے گا۔

اپنی زندگی کو داؤ پر لگانا ہمارے لیے ایک ایسا کھیل بن گیا تھا جس میں ہم ہار جیت کی پروا کیے بغیر شریک ہونے کے عادی تھے۔ ہم کسی تذبذب اور خوف کے بغیر جان پر بھی کھیل جاتے لیکن یہاں سوال ایک اور معصوم جان کا تھا جسے ہم نے تحفظ کی ضمانت فراہم کی تھی اور آصف علی سے وعدہ کیا تھا کہ قدرت کا مستقبل ہماری ذمے داری ہوگا۔

"آپ جیت گئے بادشاہ سلامت" میں نے کہا "معاملہ صرف ہماری زندگی کا ہوتا تو ہم مقابلہ کرتے اور فیصلہ یوں نہ ہوتا۔ یہاں سے وہی اپنے پیروں پر چل کے جاتا جسے تقدیر فاتح قرار دیتی۔"

"جب تدبیر کارگر نہیں ہوتی تو تقدیر یاد آجاتی ہے۔" اس نے دونوں ہاتھ پھیلا کے کہا "واہ سکندرِ اعظم واہ! ہم نے تو بہت شہرہ سنا تھا تمہارے ناقابلِ تسخیر ہونے کا۔"

"یہ میدانِ جنگ نہیں' ایک گھر ہے اور گھر گہوارہ ہوتا ہے امن اور سلامتی کا۔ اور یہ گھر بھی ہمارا نہیں۔ ہم یہاں مہمان تھے۔ ہم اس کی تباہی میں شریکِ جرم نہیں ہوسکتے بادشاہ سلامت' اور یہی ہماری مجبوری ہے۔ ورنہ تمہیں شوق ہے تو ہمیں اپنے گھر بلا کے دیکھو۔ نہ ہم تمہاری بیوی کو یرغمال بنائیں گے نہ بیٹی کو۔ یہ وعدہ ہے میرا۔ پھر تم کو اندازہ ہوجائے گا کہ ہمارا راستہ موت بھی نہیں روک سکتی۔"

اچانک قدرت نے لالی پاپ کی ڈنڈی پھینک دی جسے وہ بڑے انہماک سے چوس رہی تھی۔ اس نے پھر ہاتھ پھیلا دیے "ماما! ٹانی ....ما....ما....ٹا....نی۔"

بادشاہ مسکرانے لگا "لڑکی مجھ سے نہیں' اپنے اس ماما سے سوال کر۔"

میں نے کہا "اب اسے چھوڑ دو۔ ہم تمہارے ساتھ ہر جگہ جانے کو تیار ہیں۔"

آصف علی نے کہا "یہ تم کیا کر رہے ہو سکندر؟"

میں نے سپاٹ لہجے میں کہا "آپ قدرت کو اپنے پاس بلائیں اور اس کی ماں کے حوالے کردیں۔"

"نہیں۔" بادشاہ نے بلند آواز میں حکم دیا "یہ ایسے نہیں ہوگا جیسے تم چاہوگے۔ بادشاہ ہم ہیں' حکم ہمارا چلے گا۔"

قدرت ٹانی کے لیے ضد کر رہی تھی اور اس کو قابو میں رکھنے والا' ایک ہاتھ سے اس کا بازو تھامے کھڑا تھا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں زہر آلود لولی پاپ تھی۔ ہم جو بم' بارود' ریوالور اور مشین گن کی گولیوں اور توپ کے گولوں کا مقابلہ کرتے ہوئے خوف زدہ نہیں ہوئے تھے' ایک لولی پاپ سے ڈر گئے۔ وہ چوسنے والی ٹانی جو لکڑی کے ایک تنکے پر لگی رہتی ہے' اس تمام اسلحے سے زیادہ مؤثر ثابت ہوئی تھی جو اس وقت بھی بادشاہ سلامت کی فوج نے اٹھا رکھا تھا۔ پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر۔ معذور اور معصوم قدرت کے ہاتھ اپنے لیے موت مانگ رہے تھے اور یہ ناممکن تھا کہ ہم اس کے ہونٹوں کو قطرہ قطرہ لذت سے بھرپور رنگین' میٹھی اور خوشبودار موت کا رس حلق سے اتارتا دیکھتے رہتے اور اپنے احساس کو ایک دلیل سے دبا دیتے کہ ذہنی اور جسمانی طور پر معذور قدرت کا جینا کیا اور مرنا کیا۔

"آخر کیا ہے تمہارا حکم؟" رابعہ نے برہمی سے کہا۔

اس نے بڑے شاہانہ انداز میں ہاتھ اوپر اٹھایا "سنو' غور سے سنو اور سمجھو۔ باہر تین گاڑیاں کھڑی ہوئی ہیں۔ لڑکیاں پہلے جائیں گی اور درمیان والی گاڑی میں پیچھے والی سیٹ پر بیٹھ جائیں گی۔ اس کے بعد میرے آدمی نکلیں گے۔ وہ آگے پیچھے کی گاڑیوں میں پوزیشن سنبھال لیں گے۔ یہاں رہ جائیں گے ہم دونوں۔"

"یعنی نام کے بادشاہ سلامت اور سکندرِ اعظم" میں نے کہا۔

اس نے دخل در معقولات پر ناگواری سے مجھے دیکھا "اگر تم نے چالاکی سے مجھے دھوکا دینے کی کوشش کی تو بُرا ہوگا۔ بہت بُرا ہوگا۔"

میں نے کہا "میں، خالی ہاتھ ہوں' تم مسلح ہو' پھر بھی ڈرتے ہو۔"

"تم کو بھی ڈرنا چاہیے کیونکہ تم خوش فہم ہو۔ تم نہیں جانتے' بالکل نہیں جانتے کہ خوش فہمی اور غلط فہمی کے بیچ جو فرق ہے وہ تلوار کی دھار ہے۔ اس پر چلنے کی کوشش مت کرنا۔ زندگی اور موت کی سرحد کے درمیان آتی جاتی سانس کا فاصلہ ہے' صرف ایک سانس کی دوری پر دوسری دنیا ہے مگر وہاں سے یہ دنیا بڑی لمبی مسافت ہے۔ قیامت تک طے نہ ہونے والی۔"

میں نے جھلاّ کے کہا "مت بیزار کرو مجھے اپنی اداکاری سے اور آغا حشر کی نقالی سے۔ تم انسانوں کی طرح بات نہیں کرسکتے؟"

اس نے اپنی بات اسی لہجے میں جاری رکھی "تم کیا کرسکتے ہو جو تمہیں نہیں کرنا چاہیے۔ میں بتاتا ہوں۔ تم کو میرے ساتھ زندہ رہنا چاہیے۔ اکیلے نہیں۔ یہاں آنے سے پہلے میں نے اپنی زندگی کی قیمت وصول کرلی تھی۔ منہ مانگی قیمت تو نہیں تھی' مجبوری کی قیمت تھی۔"

"اچھا خریدار کون تھا؟" میں نے دلچسپی سے کہا۔

"خریدار تو بس خریدار ہوتا ہے۔ اس کے نام اور ولدیت' ذات اور مذہب سے کیا فرق پڑتا ہے۔ مجھے مار دو گے تو گھاٹے میں تم رہو گے کیونکہ تم زندگی کو انمول سمجھتے ہو اور تم نے کسی سے اس کی قیمت وصول نہیں کی ہے۔ میری ایک جان کے بدلے تم کتنی جانیں گنوا دو گے۔ شمار کرکے دیکھو۔ ایک اور چھ کا سودا ہے۔ یہ جو میرے ساتھ آئے ہیں' صرف میرے حکم کے تابع ہیں۔ میں نہ رہا تو تم سب بھی نہ رہو گے۔ انہیں یہی ہدایت ہے کہ....."

میں نے کہا "میں سمجھ گیا۔ تمہاری جان کے بدلے یہ ہم سب کی جان لے لیں گے۔ اب چلو جہاں چلنا ہے۔ بہت دیر سے سب کی جان سولی پر اٹکی ہوئی ہے۔ چلو رابعہ' کاجل' جیسا بادشاہ سلامت نے فرمایا ہے ویسا ہی کرو۔"

"اونہہ! صورت دیکھو مسخروں کے بادشاہ کی" رابعہ نے جاتے جاتے حقارت سے کہا "خدا حافظ آصف انکل۔"

"اسے تو کسی پاگل خانے میں ہونا چاہیے' بادشاہ سلامت کا گھوڑا بلکہ گدھا" کاجل نے جاتے ہوئے ہاتھ ہلایا۔

"خدا حافظ بیٹا۔" آصف نے گلوگیر لہجے میں کہا "دیکھو اپنا خیال رکھنا۔ ایسی ویسی کوئی بات نہ ہو۔"

میں نے کہا "آپ پریشان نہ ہوں۔ ایسے مسئلے تو ہماری زندگی میں صبح و شام کا معمول بن گئے ہیں۔"

"موقع ملتے ہی اپنی خیریت کی اطلاع دینا سکندر" آصف علی کی بیوی نے روتے ہوئے کہا "تھوڑا سا سُکھ ملا تھا تمہارے ملنے سے۔ دُکھ زیادہ ہے کہ تمہیں دیکھ نہ سکی۔ پرانے گناہوں کا قرض چُکایا بھی نہیں تھا کہ تمہارے احسان....."

میں نے اس کی بات کاٹ دی "ایسی رسمی باتیں مت کریں۔ افسوس تو ہمیں ہے کہ ہماری وجہ سے آپ لوگوں کی زندگی کا سکون بھی برباد ہوا۔ ایسے سبز قدم ہیں ہمارے۔"

"ایسا مت کہو۔ تمہارے قدم بہت مبارک ہیں" آصف علی بولا "تم نے مجھے احساسِ جرم کی اذیت سے آزاد کیا۔ میرے دل کو وہ سکون عطا کیا جس سے میں محروم تھا۔"

بادشاہ نے پھر بُرقع اوڑھ لیا تھا۔ اندر سے اس نے ایک خود کار پستول نکال کے مجھے اشارہ کیا "روانگی اختیار کی جائے۔"

اس کے ساتھ آنے والے پہلے ہی جاچکے تھے۔ اب صرف قدرت تھی جو اپنی مضحکہ خیز چال چلتی ماں کی طرف آرہی تھی اور بے سبب ہنس رہی تھی اور کچھ بول رہی تھی۔ اس گھر میں جو کچھ ہورہا تھا' وہ اس کے لیے نہ باعث تشویش تھا اور نہ باعث مُسرت۔ زندگی کے حادثات اور واقعات کو سمجھنا اس کو آتا ہی نہ تھا۔

میرے باہر آنے تک کاجل اور رابعہ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ چکی تھیں۔ ان کا موڈ بے حد خراب تھا جو ایک قدرتی بات تھی۔ عین اس وقت جب سارے مسائل سے نمٹ کے ہم واپسی کا سفر اختیار کرنے والے تھے' ایک نئی مصیبت نازل ہوگئی تھی اور کوئی نہیں بتا سکتا تھا کہ اب ہماری منزل کیا ہوگی۔ میرے بیٹھتے ہی گاڑیاں روانہ ہوگئیں۔ کاجل اور رابعہ اپنے خیالوں میں گم تھیں۔ ان سے زیادہ الجھن کا شکار میں تھا جس نے دلاور سے ملاقات کے دوران سمجھ میں نہ آنے والے تجربات کا مشاہدہ کیا تھا۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ مصالحت کی پیش کش میں دلاور کس حد تک مخلص تھا۔ اس نے پیڈرو کے بارے میں جو کچھ کہا تھا وہ کس حد تک درست تھا اور میں نے اپنی آنکھوں سے جو کچھ دیکھا تھا وہ کس حد تک قابلِ یقین تھا۔

دلاور ایک پُر فریب اور عیار مداری تھا اور ایسے تماشے دکھانے کا ماہر تھا جن کی حقیقت کو ظاہر کی آنکھ سے دیکھنے والا نہیں سمجھ پاتا تھا۔ پیڈرو کے ساتھ اپنے اختلافات کا ذکر محض مجھے قائل کرنے کی خاطر بولا جانے والا جھوٹ تھا۔ وہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ اس نے اپنے ماضی کو ہی نہیں' اس دور کے ہر نقش کو مٹانے کے لیے پرانے ساتھیوں کو بھی خیرباد کہہ دیا ہے۔ میدان سیاست میں قدم رکھنے والا شکاری اب پارسائی کا چولا بدلنا چاہتا تھا۔ نیکی' راست بازی' خدا ترسی اور حبُ الوطنی کی صفات کو مشتہر کرنے کے لیے اسے ایک نئی کمپنی کی ضرورت تھی۔ ان کا تعاون درکار تھا جو اس کے نفرت انگیز اور شرم ناک حد تک مجرمانہ ماضی کے ہر رُسوا کن راز سے آشنا تھے اور اس کی منافقت کا پردہ چاک کرسکتے تھے۔ وہ سرتاپا غلاظت میں لتھڑا ہوا تھا اور اس کا دامن ہزاروں بے گناہوں کے لہو سے رنگین تھا مگر وہ دنیا کے سامنے آنے کے لیے صاف ستھرا اور اُجلا' بے داغ اور بے عیب' انسان دوست' وطن پرست اور فرشتہ صفت شخص نظر آنا چاہتا تھا۔

اسے معلوم تھا کہ جب تک ہم جیسے سرپھرے اس کے حریف ہوں گے' اس کی ہر کوشش ناکام ہوگی اور ہم اس کو ایک خون آشام بھیڑیا' ایک درندہ صفت' بے ضمیر اور ریاکار آدمی اور وطن فروش غدار ثابت کرتے رہیں گے اور اس کے ماضی کے ان پہلوؤں کو بھی بے نقاب کرتے رہیں گے جن سے ہمارے سوا کوئی واقف نہ تھا۔

وہ ہمیں لوحِ جہاں سے حرفِ مکرّر کی طرح مٹانے کی کوشش کرکے بھی دیکھ چکا تھا اور یہ تسلیم کرچکا تھا کہ نہ اس کی طاقت ہمارے نفس کو شکست دے سکتی ہے اور نہ اس کی دولت ہمارے ایمان کو خرید سکتی ہے۔ ایم آر ایس کچھ بھی نہیں تھی۔ نہ یہ فوجی تنظیم تھی' نہ گوریلا فورس۔ یہ تو میرے جیسے دیوانوں کا ایک نظریاتی اتحاد تھا جو ہم خیال تھے' ہم نفس تھے اور ہم دم و ہم راز تھے۔ جذبات اور احساسات کی آشفتہ سری کے راستوں پر قدم ملا کے چلنے والے وہ سودائی جو انسانیت کے رشتوں کی آبرو کو اپنی زندگی سے عزیز تر جانتے تھے۔

مجھے وہ وقت یاد تھا جب ہم نے مذاق ہی مذاق میں اپنے دشمنوں کے خلاف اصولی اتحاد کو ایم آر ایس کا نام دے دیا تھا۔ اس وقت ہم تازہ واردانِ ہوائے بساطِ دل' یعنی محسن' رابعہ اور سکندر۔ ایک ایسے معاشرے کے خدائی فوجداروں کے خلاف صف آرا ہوچکے تھے جس میں کوئی قاعدہ قانون' کوئی ضابطۂ اخلاق اور کوئی اصول کسی کے لیے بھی اہم نہیں رہا تھا اور پورا معاشرہ جنگل کے قانون پر عمل پیرا تھا۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ ہم نے لمسے مائٹ از رائٹ سوسائٹی قرار دیا تھا اور جب دلاور اینڈ کمپنی کے شکاری کھُل کر سامنے آئے تو محسن' رابعہ اور سکندر' ایم آر ایس بن گئے۔ پھر حالات کے ساتھ اس حلقۂ احباب میں نئے لوگ شامل ہوتے گئے اور ایم آر ایس نے ایک وطن فروش گروہ کے خلاف بے سروسامانی کے باوجود طویل جنگ لڑی۔ جان کی بازی لگا کے بھی ہم بازی ہار گئے تو ہمیں اس کا دُکھ نہیں تھا۔ اصل کامیابی یہ تھی کہ ایم آر ایس ناقابلِ شکست رہی تھی۔

اور اب دلاور پینترا بدل کے ایم آر ایس کے خلاف نئی جنگ کا آغاز کرنا چاہتا تھا۔ یہ طاقت سے زیادہ ڈپلومیسی کی جنگ تھی مگر اس کا پہلا راؤنڈ اس نے طاقت کے مظاہرے سے شروع کیا تھا۔ اس نے ہمیں اغوا کرایا' قتل کرانے کے لیے پیشہ ور قاتلوں کو ہمارے پیچھے لگایا مگر ہمیں صرف یہ باور کرانے کے لیے کہ ہمارے وجود کو صفحۂ ہستی سے مٹانا تو ہر جگہ' ہر وقت ان کے اختیار کی بات تھی۔ اس نے ہم سب کو قید میں رکھا' ہم پر واضح کیا کہ آج بھی وہ اس قابل ہے کہ جسے چاہے اپنے شکاری کُتوں کے سامنے ڈال دے اور وہ اس کی بوٹیاں نوچ کھائیں۔ وہ قانون اور اس کے محافظوں کی گرفت سے بالا تر ہے لیکن چوہدری دلاور اب دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہے سکندرِ اعظم کی طرف۔ کتنا عظیم ہے وہ کہ اپنی ہر غلطی کو تسلیم کرتا ہے اور اس غلطی کے نتیجے میں ہونے والے تمام نقصانات کی تلافی کے لیے بھی تیار ہے۔

مُدت کے بعد ملنے والی پہلی اچھی خبر یہ تھی کہ غالب نے فون پر ہم سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی تھی اور صاف ظاہر تھا کہ میری پشاور میں آمد اور آصف علی کے گھر میں موجودگی کا پتا اسے منظر سے ہی معلوم ہوسکتا تھا یا پھر رابعہ کے مخلص ماتحت وقار یوسف سے۔ مجھے تصدیق کا موقع ملنے سے پہلے یہ بھان متی کا کنبہ نازل ہوگیا جو اناڑی نہیں تھے' تو شکاری بھی نہیں تھے۔ ابھی تک انہوں نے کچھ بھی نہیں بتایا تھا کہ وہ ہمیں اپنے ساتھ کہاں لے جارہے ہیں اور کیوں؟

جی ٹی روڈ پر تینوں گاڑیاں ایک ہی رفتار سے آگے پیچھے دوڑ رہی تھیں اور ان کے درمیان فاصلہ برقرار تھا۔ ایک نظر دیکھنے والے کو اندازہ نہیں ہوسکتا تھا کہ تینوں گاڑیوں کا آپس میں کوئی تعلق ہے۔ سب سے آگے ایک کھلی جیپ تھی اور اس میں دو ہی افراد تھے۔ ایک ڈرائیونگ کررہا تھا اور دوسرا بظاہر کچھ بھی نہیں کررہا تھا مگر غالباً عقب نما آئینے پر نظر جمائے بیٹھا تھا۔ پیچھے والی گاڑی فاکس ویگن تھی اور اس میں بھی روانگی کے وقت میں نے دو ہی افراد کو دیکھا تھا۔ درمیان میں اوپل ریکارڈ کو چلانے والا وہی تھا جس نے قدرت خانم کو لولی پاپ پیش کی تھی۔ اس کے ساتھ بادشاہ سلامت تشریف فرما تھے لیکن ضرورتاً پھر نقاب پوش ہوگئے تھے۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی میں نے حفاظتی انتظامات دیکھ لیے تھے۔ پیچھے کے دونوں دروازوں کا وجود ہی نہیں تھا۔ یعنی یہ دو دروازوں والی گاڑی تھی۔ پیچھے صرف کھڑکیاں تھیں اور ان کے بھی شیشے نہیں اتارے جاسکتے تھے۔ گہرے رنگ کے شیشوں سے میں باہر کا منظر دیکھ سکتا تھا مگر مجھے معلوم تھا کہ باہر سے کوئی چاہے بھی تو اسے کچھ نظر نہیں آئے گا۔

نوشہرہ سے گزر آنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ میں سیدھا تنا ہوا بیٹھا ہوں اور اعصابی کشیدگی کے باعث میں نے سیٹ کو یوں مضبوطی سے پکڑ رکھا ہے جیسے کوئی دیہاتی پہلی بار ہوائی جہاز میں پرواز کرتے وقت خوف سے سنبھل کر بیٹھتا ہے۔ میرے جبڑے مضبوطی سے بند تھے اور چہرے پر کھنچاؤ کی کیفیت تھی۔ ابھی تک ہم نے آپس میں بھی بات نہیں کی تھی۔ یہ فکر و تردد' خوف اور پریشانی کا اثر تھا مگر ایسے صورت حال کی سنگینی تو کم نہیں ہوسکتی تھی۔ صورت حال سے نمٹنے کے لیے ہماری ذہنی صلاحیت ضرور متاثر ہورہی تھی۔

ایک لمبی گہری سانس لے کر میں نے پیٹھ پیچھے لگادی اور جسم کو

ڈھیلا چھوڑ دیا۔ میں دائیں طرف ڈرائیور کے عین پیچھے تھا۔ میرے ساتھ کاجل تھی اور پھر دوسری کھڑکی سے رابعہ لگی بیٹھی تھی۔

میں نے پُرسکون ہو جانے کے بعد مسکراتے ہوئے کہا "لیڈیز' یہ بڑی غلط بات ہے۔"

رابعہ نے سر گھما کے سوالیہ نظروں سے مجھے گھورا "کیا ہو گیا؟"

"آپ لوگوں کی وجہ سے دنیا کی سب عورتوں پر الزام آرہا ہے" میں نے کہا "دنیا کا سب سے بڑا جھوٹ بھی سچ ثابت ہو رہا ہے کہ ایک جگہ دو عورتیں بیٹھی تھیں اور خاموش تھیں۔"

"میں اس پُرانے گھِسے پٹے لطیفے پر ہنس نہیں سکتی..." رابعہ نے کہا۔

"ایک دوسرے کی روتی شکل دیکھ کے تو ہنس سکتی ہو۔ آئینہ ہوتا تو میں سامنے رکھ دیتا۔"

"بھائی سکندر۔" کاجل ٹھنڈی سانس لے کر بولی "مجھے واقعی رونا آرہا ہے قسمت پر۔"

رابعہ نے کہا "بس قسمت ہی کو رو سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "اچھی تجویز ہے۔ چلیں آپ بسم اللہ کریں۔ رابعہ بی بی' آپ پہلے رونا شروع کریں' باقاعدہ آنسوؤں کے ساتھ اور دہاڑیں مار مار کے' پھر کاجل آپ کا ساتھ دے گی۔ میں غیر جانبداری کے ساتھ فیصلہ کروں گا کہ کس کی پرفارمنس بہتر ہے۔ جس کے رونے سے قسمت بدل جانے کے امکانات زیادہ روشن ہوں گے' اسے ہم اپنی طرف سے بھی جی بھر کے رونے کا موقع دیں گے۔"

آہستہ آہستہ رابعہ کے چہرے کی سختی کم ہوئی۔ پھر کاجل کا چہرہ پُرسکون ہو گیا۔

میں نے کہا "یہ کیا۔ اتنی جلدی ارادہ بدل گیا؟ غور کرو' ہم کتنے دُکھی اور مظلوم ہیں۔ مصیبت کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہیں ہم پر۔ ہم سب سے بچھڑے ہوئے ہیں اور اب اغوا بھی کیے جا رہے ہیں۔ ایسے دردناک حالات میں مسکرانے کا تو خیر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

کاجل مسکرانے لگی "آپ کو بالکل فکر نہیں ہے؟"

"مجھے سخت فکر لاحق ہے آپ دونوں کی طرف سے۔ رنج و غم کی اس المیہ اداکاری سے آپ لوگوں کے چہرے کی خوب صورتی متاثر ہو رہی ہے۔"

رابعہ نے کہا "اس بہروپئے سے پوچھو تو سہی کہ جانا کہاں ہے آخر؟"

میں نے کہا "کیا تم کاجل سے مخاطب ہو؟ مجھے بہروپیا کہا ہے تم نے؟"

کاجل نے کہا "میں ہٹ جاتی ہوں بیچ میں سے۔ آپ لوگ براہِ راست لڑیں۔"

"تمہارا ظالم سماج کی طرح بیچ میں رہنا ضروری ہے" میں نے کہا۔

رابعہ نے بُرا سا منہ بنا کے خود ہی کہا "بادشاہ سلامت! کیا پنڈی جا رہے ہیں؟ کون ہے وہاں' کس کی خدمت میں پیش کر جائے گا ہمیں؟"

اس نے سو فیصد زنانہ آواز اور لہجے میں کہا "اگر میں کہوں کہ صدر صاحب کو بڑا اشتیاق تھا تم سے ملنے کا۔ تو تم مان لو گی؟"

"میں مان لوں گا" میں نے کہا "اور پھر پوچھوں گا کہ آج ایوانِ صدر میں کیا پکا ہے دوپہر کے کھانے کے لیے۔ حالت یہ ہو رہی ہے کہ میں ٹنڈے گوشت بھی کھا سکتا ہوں۔"

اس نے کہا "اٹک کا پُل پار کر کے ہم چائے پئیں گے۔"

"تم لوگ پینا۔ میں اس وقت سے بہت پہلے ہی جاں بحق ہو جاؤں گا بھوک پیاس سے" میں نے کہا۔

"فضول باتیں مت کرو" رابعہ بولی۔

"اٹک کے پُل سے پہلے چائے پینے پر پابندی ہے۔ کسی کے فوت ہونے پر پابندی نہیں ہے" میں نے کہا۔

میری بات کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ نہ جانے اس نے اگلی کار کو کیا سگنل دیا کہ جیپ کی رفتار کم ہوئی اور اس کے ساتھ ہی تینوں گاڑیاں سڑک سے اُتر کے ایک کنارے پر رک گئیں۔

"تمہیں مرنے نہیں دیا جائے گا بشرطیکہ خود تم نے مرنے کی کوشش نہ کی" بادشاہ نے قدرے خوش گوار لہجے میں کہا۔

"تمہاری حسین صورت نہ دیکھی ہوتی تو اس آواز پر میں مر جاتا" میں نے کہا۔

تینوں گاڑیوں کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں رہا تھا۔ تینوں ڈرائیور اب بھی خاکی وردیوں میں تھے مگر انہوں نے ڈھاٹے اتار دیے تھے۔ ان کے بارے میں مجھے کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ آصف علی کے گھر میں بھی موجود تھے۔ چوتھا خود بادشاہ تھا۔ باقی دو کے چہرے دیکھ کے میں شک میں پڑ گیا۔ نہ جانے میں نے انہیں پہلے کب اور کہاں دیکھا تھا۔ بس صورت آشنائی کا مبہم سا احساس تھا جو ایک سوال بن کے ذہن میں موجود رہا۔ وہ صورت سے عام قسم کے شریف اور معزز آدمی لگتے تھے اور بے ضرر بھی...... لیکن ان کے انداز و اطوار میں یا چہرے کے نقوش کی کرختگی میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جو اس خیال کی نفی کرتی تھی۔ شاید یہ صرف میرا خیال تھا اور میرا ذہن سنگین مجرمانہ پس منظر کے ساتھ ان کی شخصیت پر چڑھے ہوئے شرافت کے خول سے دھوکا نہیں کھا تا تھا۔

بادشاہ اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ ڈرائیور نے اُترنا چاہا تو بادشاہ نے اسے بھی روک دیا۔ جیپ میں سے اترنے والے ایک شخص نے بادشاہ کو ایک بیگ تھما دیا اور پھر جیپ میں جا بیٹھا۔

"اس میں سے جو چاہیے وہ لے لو۔" بادشاہ نے بیگ پیچھے

بڑھاتے ہوئے کہا۔

"واہ! یہ عمرو عیار کی زنبیل ہے کیا؟" میں نے کہا "ہر چیز مل سکتی ہے اس میں۔ لاؤ رابعہ' مجھے ایک بھرا ہوا ریوالور نکال دو تاکہ میں پہلے بادشاہ سلامت کا قصہ پاک کروں۔ پھر دو دستی بم دے دینا۔ آگے پیچھے کا راستہ صاف کر کے چلتے ہیں۔"

بادشاہ بولا "تم بہت چہک رہے ہو۔ میں نے ٹھیک ہی سنا تھا کہ تم پیدائشی مسخرے ہو۔"

میں نے رابعہ سے چائے کا مگ لے لیا "پیدائشی طور پر تم کیا ہو؟"

"وہی جو تم دیکھ رہے ہو" اس نے بھی چائے کا مگ پکڑ لیا مگر بسکٹ لینے سے انکار کر دیا۔

"اداکار بہت دیکھے ہیں میں نے لیکن تم غضب کے صداکار ہو" میں نے ندیدوں کی طرح بسکٹ چرتے ہوئے اور چائے کے ساتھ نگلتے ہوئے کہا "تمہارا زنانہ رول بھی بالکل اصلی لگتا ہے اور مردانہ بھی۔ اصل کردار کیا ہے؟ میرا مطلب ہے حقیقی طور پر کیا ہو تم؟ کہیں درمیان میں..."

رابعہ ہنسی تو تھوڑی سی چائے مجھ پر گری "ان کی تو پوری پارٹی ہو گی۔"

میں نے کہا "ہاں۔ تالی بجانے' گانے اور ٹھمکا لگانے والوں کی۔"

بادشاہ نے کسی قسم کے ردِعمل کا مظاہرہ نہیں کیا "میں کسی بات کا بُرا نہیں مانتا۔"

"تمہاری قابلِ رشک صحت اور قابلِ دید جوانی کا یہی راز ہے غالباً" میں نے کہا "ایک بات پوچھوں؟"

"ابھی وقت ہے' پوچھ لو" اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"بادشاہ سلامت تمہارا اصلی نام نہیں ہو سکتا۔ خیر نام سے فرق نہیں پڑتا لیکن خود کو چُھپانے کے لیے تم نے مردوں کی طرح ڈھاٹے باندھنے سے کیوں گریز کیا؟ یہ بُرقع کیوں اچھا لگا تمہیں؟ یہ مردوں کا کام نہیں۔"

اس نے کہا "میں مرد کہاں ہوں۔ اور تم مجھے عورت بھی تسلیم نہیں کرتے تو تمہاری مرضی۔"

وہ پہلے والی زنانہ آواز میں ہی بات کر رہا تھا اور یہ انتہائی کمال کی بات تھی کہ جب وہ مرد کی آواز بناتا تھا تو وہ بھی مصنوعی نہیں لگتی تھی۔ وہ یقیناً ایک پُراسرار شخص تھا۔ اسے میں دلاور کی نئی دریافت قرار دے سکتا تھا۔ وہ مختلف مقاصد کے لیے جوہرِ قابل کی جستجو میں رہتا تھا اور کام کے آدمی کی قدر کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کا ساتھ دینے والے کبھی ساتھ نہیں چھوڑتے تھے۔ اس کی ایک وجہ تو خوف ہو سکتا تھا۔ دلاور سے بغاوت کا خیال ایک بار دل میں لانے والا سو بار اپنے عبرتناک انجام کے بارے میں سوچتا ہو گا۔ دلاور اپنی طاقت کی دہشت بٹھانے کے فن میں ماہر تھا لیکن اس کی دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ دلاور کے ساتھ رہنے والے کو مکمل قانونی تحفظ حاصل ہو جاتا تھا اور مالی مسائل پیدا ہی نہیں ہوتے تھے۔ دلاور کے اثر و رسوخ کے باعث وہ ہر قسم کے غیر قانونی ذرائع اختیار کرتے ہوئے معاشی طور پر خود کفیل رہتے تھے۔ وہ لوٹ مار کریں' ڈاکے ڈالیں' بلیک میلنگ کریں یا اسمگلنگ' ان کی کمائی سے دلاور کو سروکار نہ تھا۔ پکڑے جانے کی صورت میں دلاور کے لمبے ہاتھ انہیں تھانے کچہری اور جیل کاٹنے سے صاف بچا لیتے تھے۔ جب دلاور انہیں کسی مخصوص مقصد کے تحت کوئی خطرناک مشن سونپتا تھا تو صرف ہدایات یا دھمکیاں ہی نہیں دیتا تھا ان کی توقعات سے کہیں زیادہ معاوضہ بھی دیتا تھا۔ ان سب عوامل کے پیشِ نظر مجھے پیڈرو کا دلاور کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنا سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ یہ دلاور ہی تھا جس نے پیڈرو کو استاد پیڈرو بنایا تھا اور اپنے دستِ راست کے طور پر اس کی ہیبت قائم کر کے چھوٹے موٹے غنڈوں' بدمعاشوں کو بالواسطہ طور پر اپنا مطیع و باج گزار بنا لیا تھا۔ استاد پیڈرو اس کا اہل نہ ہوتا تو دلاور اس مقام تک لانے سے پہلے ہی اسے نظر سے گرا دیتا اور جو عیاری و مکاری' بدمعاشی و بدکرداری' بے خوفی اور بے ضمیری میں دلاور کا نقشِ ثانی سمجھا جا سکتا ہو' وہ اتنا احمق نہیں ہو سکتا کہ خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارے اور دلاور کا جانشین بننے کی آرزو میں اس کا تختہ الٹنے کی سوچنے لگے۔ پیڈرو میں ہزار خرابیاں تھیں مگر عقل کے ساتھ وفادار رہنا اس کی وہ خوبی تھی جس سے انکار نا ممکن تھا۔

سڑک پر سے دوسری گاڑیاں گزرتی جا رہی تھیں۔ پنڈی اور پشاور کی طرف سے آنے جانے والی بسوں اور کاروں میں سفر کرنے والے سیکڑوں افراد نے سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی تین گاڑیوں کو دیکھا ہو گا۔ ان سب کے لیے اس نظارے میں حیرانی یا پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی کہ کوئی فیملی پشاور سے پنڈی یا لاہور جاتے ہوئے تازہ دم ہونے کے لیے رکی ہے۔ ہم اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ کسی کو متوجہ کر سکتے یا کوئی ہنگامہ کھڑا کرتے۔

پندرہ منٹ بعد سب کھا پی کے فارغ ہو گئے۔ کھانے کے وقت بسکٹ اور چائے بھی بہت غنیمت محسوس ہوئے اور میں نے ایک ڈبا ختم کرتے ہوئے چائے کے دو کپ حلق میں انڈیلے۔ کاجل اور رابعہ نے اتنی خوش خوراکی کا مظاہرہ نہیں کیا لیکن ان دونوں نے مل کر ایک بسکٹوں کا ڈبا بہرحال خالی کر دیا۔

گاڑی کا ڈرائیور آگے جیپ میں جا بیٹھا تھا اور وہیں اپنے ساتھیوں کے ساتھ کھانے پینے میں مصروف تھا۔ صرف بادشاہ نے چائے کے ایک کپ پر قناعت کی۔

میں نے کہا "تمہیں بھوک نہیں لگتی یا تم بھوک کو کنٹرول کر رہے ہو؟"

وہ سپاٹ لہجے میں بولا "ابھی تم کچھ بھی سمجھ لو۔"

"بعد میں تم سمجھو گے ہم سے" میں نے کہا "ٹھیک ہے بادشاہ

سلامت' یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ..."

اس نے میری بات کاٹ دی "اور وہ وقت اب دور نہیں ہے" اس نے ڈرائیور کو اشارے سے بلایا اور چلنے کا حکم دیا۔

میں نے کہا "تمہاری نقاب پوشی کا معاملہ مجھے بہت پُراسرار لگتا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تم جیل سے بھاگے ہو یا اس علاقے میں تمہاری تصویر ہر تھانے میں آویزاں ہو۔ ایسی صورت تو ہے نہیں تمہاری کہ کسی کی نظر لگ جائے۔"

"میں نے کہا نا کہ وقت آنے پر سب اسرار کھل جائیں گے۔"

"اچھا یہ تو بتادو کہ اس واردات میں تم نے ناگ منی کا نام کیوں استعمال کیا تھا؟" میں نے کہا۔

"اس نام کی ایک دہشت ہے" وہ بولا۔

"دہشت تو سلطانہ ڈاکو اور بہرام ڈاکو کے نام کی زیادہ تھی" میں نے کہا "سلطانہ ڈاکو کی بیٹی' بہرام کی نواسی کہرام ڈاکو۔ ڈاکو تو مرد ہوتے ہیں۔ عورت کے لیے مؤنث کا صیغہ ڈاکن کیسا رہے گا؟"

اچانک میں نے محسوس کیا کہ میرے لیے بولنا کچھ مشکل ہو گیا ہے۔ زبان کا ساتھ الفاظ نہیں دے رہے تھے اور الفاظ کا ساتھ خیالات۔ زبان کچھ سُست روی کا شکار تھی۔ پھر مجھے غنودگی کا احساس ہوا اور میں نے سر کو جھٹکا۔ پیٹ بھر جانے سے تھوڑی سی آسودگی ضرور ملی تھی مگر یہ ذہنی اور اعصابی تھکن اور بے حسی کی کیفیت تھی جو رفتہ رفتہ حواس پر غالب آنے لگی تھی۔

میں نے سر کو تھوڑا سا ہلا کے دائیں جانب دیکھا تو کاجل اور رابعہ ایک دوسرے کے سہارے پر قائم آنکھیں بند کیے سو رہی تھیں۔

"خبیث ..... بادشاہ کی ناجائز او... لاد..." میں نے بڑی مشکل سے غنودگی پر قابو پا کے کہا "کیا تھا.... اس چائے..... میں...؟"

"چائے تو ہم سب نے ایک ہی تھرمس سے پی تھی۔ تم نے ہی مجھے بھی نکال کر دی تھی" میں نے اس کی آواز جیسے دور سے سنی۔

"تو.... تو پھر... بسکٹ... زہر....." میں نے بند ہوتی آنکھوں کے ساتھ اندھیرے اُجالے کو یوں ملتے دیکھا جیسے طوفانی ہوا سے فانوس جھول رہے ہوں اور لالٹینیں جل بجھ رہی ہوں۔ یا روشنی بڑے بڑے گردش کرتے آئینوں سے منعکس ہو کے تاریک سُرنگ میں آنکھ مچولی کھیل رہی ہو۔ میرا سر خود بخود سیٹ پر جا لگا۔ میرے اعصاب شل ہو چکے تھے اور حواس مختل لیکن ابھی میں سوچ سکتا تھا اور اس وقت مجھے صرف یہی خیال تھا کہ ہمیں اغوا کرنے والوں نے بڑی ہوشیاری سے زہر دے دیا تھا۔ زہر چائے میں ہوتا تو وہ بھی متاثر ہوتے۔ انہوں نے شکوک و شبہات کی فضا پیدا ہی نہیں ہونے دی تھی اور ہم اعتماد کے دھوکے میں مارے گئے تھے۔ اطمینان کا پہلو صرف اس احساس میں تھا کہ ان کا مقصد ہمیں ہلاک کرنا نہیں ہو سکتا۔ ہلاک کرنے کے لیے انہیں کسی تردد یا بہانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ صرف ہمیں ہوش سے بے گانہ رکھنا چاہتے تھے تاکہ ہمیں اپنی منزل کے راستے نہ معلوم ہوں۔

اس مقصد میں وہ کامیاب رہے۔ جب میں نے دوبارہ دنیا کو دیکھا تو یہ بالکل مختلف اور بدلی ہوئی دنیا تھی۔ کچھ دیر مجھے یوں لگا جیسے ابھی تک میں حالتِ سفر میں ہوں لیکن سفر ایسے تو نہیں ہوتا جیسے کوئی تیر پر سوار ہو اور تیر ہوا کو چیرتا جا رہا ہو۔ ایک ٹانگ ادھر دوسری اُدھر' بالکل جیسے کارٹون فلموں کی جادوگرنی یا چڑیل لمبے ڈنڈے والی جھاڑو پر اُڑتی نظر آتی ہے۔

جب میں نے سر اٹھانے کی کوشش کی تو میرا توازن بگڑنے لگا۔ میں ایک دم گول گول گھومنے لگا۔ گرداب میں پھنس جانے والے حقیر تنکے کی طرح۔ میں نے اِدھر اُدھر ہاتھ مارے تو کوئی چیز میری گرفت میں آگئی اور گھومتا ہوا کمرا ساکت ہو گیا' بلب کی روشنی ٹھہر گئی اور میری نظر میں وہ منظر فوکس ہونے لگا جس میں میرے لیے ہر چیز اجنبی تھی' سوائے ایک چیز کے۔ اسے چیز کہنا بھی غلط ہوگا کیونکہ وہ ایک چہرہ تھا۔

میرے ہاتھوں نے ایک بیڈ کی سائڈ کو پکڑ رکھا تھا اور میں ایک آرام دہ' صاف ستھرے بستر کی راحت کو محسوس کر سکتا تھا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ اس آراستہ کمرے میں فرنیچر' پردے' قالین اور وال لائٹس ہر چیز نئی ہے اور میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ اس اندازِ آرائش سے بھی میری آنکھیں آشنا نہ تھیں لیکن وہ چہرہ نیا نہیں تھا۔ وہ دنیا کا سب سے زیادہ بدصورت اور قابلِ نفرت چہرہ تھا جسے میں صرف ایک جگہ دیکھنا پسند کرتا۔ تختۂ دار پر پھانسی کے پھندے سے لٹکا ہوا۔ یا لمبی گردن اور باہر نکلی ہوئی زبان کے ساتھ مُردہ خانے میں لاوارث لاشوں کے ساتھ۔ یا قبر کی گہرائی میں کُھلی آنکھوں کے ساتھ۔

میری آنکھیں بند تھیں اور میں سوچ رہا تھا کہ کیا میں نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا تھا۔ خواب میں مجھے اُستاد پیڈرو نظر آیا تھا اور اس کے بعد ہی نفرت انگیز جذبات سے مغلوب ہو کر میں نے اس کی مکروہ لاش کے بارے میں سوچا تھا۔

دوبارہ آنکھیں کھولنے پر وہ مجھے وہیں نظر آیا۔ اب اس کی نگاہیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کے چہرے کی خباثت اور نحوست میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ وہی کالا چمکتا ہوا رنگ۔ موٹے گھنگریالے سخت بال' پھیلی ہوئی ناک' تنگ پیشانی اور کانوں میں وہی سونے کی مُندریاں۔ فرق صرف لباس کا تھا۔ وہ کریم کلر کی شرٹ اور پینٹ میں اور سفیدی مائل بیج کلر کے جوتوں میں تھا۔ کسی تھرڈ ریٹ ذوق کے مالک تھرڈ کلاس شہدے اور بازاری آدمی کے بجائے وہ معزز اور بڑے بدمعاش کے حلیے میں تھا۔

مجھے اپنی طرف متوجہ پا کے وہ مسکرایا "کیا حال ہے شہزادے؟"

"حرام زادے! تو نے اٹھوایا تھا مجھے؟" میں نے کہا۔

"اٹھوانا اور ہوتا ہے' میں نے بلوایا تھا تمہیں۔ اپنے مہمان کے طور پر' پوری عزت کے ساتھ۔"

"لعنت اس عزت پر جو تیرے جیسے شیطان سے ملے اور لعنت مجھ پر اگر میں تیرا مہمان کہلاؤں" میں کوشش کر کے اٹھ بیٹھا "وہ کُتے کا بچہ' بادشاہ سلامت کا نطفۂ ناتحقیق۔ کہاں ہے وہ؟"

"کیوں بگڑ رہے ہو اس پر۔ اگر کوئی زیادتی کی تھی اس نے تمہارے ساتھ' یا کسی اور کے ساتھ بدتمیزی سے پیش آیا تھا تو مجھے بتاؤ' میں اسے یہاں بلا کے تمہارے سامنے اس کی کھال میں بھُس بھر دوں گا۔ اس نے مجھے یہی بتایا ہے کہ کسی نے تم پر انگلی تک نہیں اٹھائی اور تمہارا سفر بھی آرام سے گزرا۔" پیڈرو نے ایک ٹانگ کو دوسری پر رکھتے ہوئے سگریٹ کیس اور لائٹر نکال کے مجھے پیش کیا۔

"میں سگریٹ نہیں پیتا۔" میں نے کہا۔

"چھوڑ دی ہے یا میری پیش کی ہوئی سگریٹ نہیں پیو گے؟" اس نے اپنے لیے سگریٹ سُلگائی۔

"رابعہ اور کاجل کہاں ہیں؟" میں نے کہا۔

"اسی گھر میں ہیں' بالکل محفوظ اور بہت آرام سے۔"

"تمہاری قید میں آرام سے...؟" میں نے تلخی سے کہا۔

"تمہیں یقین کر لینا چاہیے کہ یہ قید نہیں ہے۔" اس نے ایک کش لیا اور دُھواں چھت کی طرف یوں چھوڑا کہ گول رِنگ سے اوپر اٹھ کے پھیلتے گئے۔

"اچھا.. میں یقین کر لوں گا' اگر ہمارا راستہ کوئی نہ روکے۔ میں اب ایک پل نہیں ٹھہر سکتا یہاں.... مہمان تو آزاد ہوتے ہیں' اپنی مرضی سے آنے اور جانے کے لیے۔"

وہ سگریٹ کو دیکھتے ہوئے مسکرانے لگا "ہم اتنے بے مُروّت لوگ نہیں ہیں سکندر صاحب۔ ہماری کچھ روایات ہیں۔ کیا تم نے کبھی ایسا کیا ہے یا کرو گے کہ گھر آئے مہمان کی مرضی پر سب کچھ چھوڑ دو۔ جاتا ہے تو جائے' کھاتا ہے تو کھائے۔ پسند نہیں تو باہر جا کے کھا لے۔ ہم تو بہت اہتمام اور تکلف سے کام لیتے ہیں اور مہمان بھی زبردستی کا برا نہیں مانتے۔"

"صاف کہو نا کہ ہم تمہاری اجازت کے بغیر نہیں جا سکتے۔"

"میزبان سے اجازت لینا تو آداب میں شامل ہے۔ اور ابھی تو تم آئے ہو' تمہاری طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔"

میرا دل چاہتا تھا کہ میں استاد پیڈرو کو نتائج کی پروا کیے بغیر جان سے مار دوں۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ میں اسے دبوچ کے ایک منٹ میں اس کی بھینسے جیسی گردن توڑ سکتا تھا۔ وہ دنیا میں میرا سب سے پہلا اور بدترین دشمن تھا۔ وہ میرے باپ کا قاتل تھا اور اس کے بارے میں مجھے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ اس نے پوسٹ مارٹم سے پہلے وزیر خان کی لاش قبر سے نکال کے کسی نامعلوم مقام

پر گاڑدی تھی۔

یہ احساس میرے جذبات کی آتش فشانی پر تیل چھڑک رہا تھا کہ میں اس شخص کی قید میں ہوں جس کو بدترین اذیت کے ساتھ قتل کرنا میری اوّلین آرزو تھی۔ لیکن میں اپنے جذبات کے طوفان کو ہر طرف سے عقل کی دیواروں میں محصور کرنے پر مجبور تھا۔ ایک مجبوری جسمانی تھی۔ میں خود کو اتنا توانا محسوس نہیں کرتا تھا کہ پیڈرو پر قابو پاسکوں۔ دوسری مجبوری اس یقین کی تھی کہ پیڈرو اکیلا نظر آنے کے باوجود اکیلا نہیں ہوگا۔ میں نے اس کی طرف ایک قدم بڑھایا تو ہر طرف سے اس کی حفاظت پر مامور کتے نکل آئیں گے۔ تیسری مجبوری کاجل اور رابعہ کے تحفظ کا خیال تھا۔ چوتھی مجبوری یہ جاننے کی خواہش تھی کہ استاد پیڈرو نے مجھے کیوں اغوا کرایا تھا۔ اور اب وہ کیوں اپنے بدترین دشمن کو معزز مہمان بنا کے رکھنے پر مُصر تھا۔

میں نے نفرت کے جذبات کو مصلحت کے تقاضوں سے دبانے کی بے عزتی گوارا کرلی "مجھے کافی کی ضرورت ہے۔ ہاٹ اینڈ بلیک اور میں فوراً کاجل اور رابعہ سے ملنا چاہتا ہوں۔"

پیڈرو نے میرے لہجے کی تبدیلی کو پسند کیا "ابھی لو" اس نے شاہانہ انداز میں تالی بجائی۔

اسٹیج ڈرامے کے کردار کی طرح پردہ ہٹا کے ایک غلام نمودار ہوگیا جس کا حلیہ بھی غلامانہ بنایا گیا تھا۔ وہ کسی فرسٹ کلاس ہوٹل کے ویٹر کی وردی میں تھا "یس سر" اس نے سر جھکا کے کہا۔

کسی پرانے رئیس ابنِ رئیس اور خاندانی شخص کی طرح اس نے نخوت سے کہا "صاحب کے لیے کافی لاؤ۔ ہاٹ اینڈ بلیک۔"

"اینڈ نوشوگر؟" ویٹر بولا۔

"اتنا ہی سنو اور سمجھو جتنا کہا جائے" پیڈرو نے غرا کے کہا "چینی کو کس نے منع کیا ہے؟"

"نو شوگر" میں نے صرف پیڈرو کو بے عزت کرنے کے لیے کہا۔

"میرے لیے چائے، جیسی میں پیتا ہوں" پیڈرو نے اسی لہجے میں کہا۔

"یس سر" ویٹر زیرِ لب مسکراہٹ کے ساتھ پلٹ گیا۔

"تمہاری منڈلی میں ایک سے بڑھ کر ایک ایکٹر شامل ہے۔ دلاور کے تھیٹر میں کام کر کے تم بھی ہر رول کرنے لگے ہو۔"

"کیسا رول؟" پیڈرو انجان بن کے بولا۔

"تم کیا تھے پیڈرو! کیا تھی تمہاری اوقات! تم دلاور کے کُتے تھے۔ اس کے ٹکڑوں پر پلنے والے اور اس کے اشارے پر دُم ہلانے والے۔ آج تم میرے سامنے بگ باس کی اداکاری کررہے ہو۔ ایک سیٹ لگا رکھا ہے تم نے مجھے متاثر کرنے کے لیے، یہ بتانے کے لیے کہ تم اب کوئی عام قسم کے غنڈے، بدمعاش نہیں رہے بلکہ ایک گینگ لیڈر ہو، خود مختار ہو۔"

"مجھے معلوم ہے کہ تم ایسی باتوں سے متاثر نہیں ہوتے۔ جو کچھ تم دیکھ رہے ہو یہ حقیقت ہے" پیڈرو بولا "تمہارے سامنے میں کیسے انکار کرسکتا ہوں کہ کل میں کچھ نہیں تھا۔ بلکہ وہی تھا جو تم نے کہا۔ مگر آج کی بات مختلف ہے، تم مانو یا نہ مانو۔"

"سنا میں نے بھی تھا کہ تم نے اپنے آقا کے خلاف بغاوت کردی ہے۔ نمک حرامی تو خیر تمہارے آباواجداد کے حرامی خون میں....."

"دیکھو باپ دادا تک مت جاؤ... انہوں نے کچھ نہیں بگاڑا تھا تمہارا" پیڈرو نے مشتعل ہو کے کہا۔

"اس زمین کو تمہارے غلیظ وجود سے ناپاک کرنے کا الزام ان پر آئے گا۔ ان کی رُسوائی کے ذمّے دار تم نہیں تو اور کون ہے؟"

"خیر چھوڑو یہ باتیں۔ اصل بات یہ ہے کہ میرا دلاور سے کوئی تعلق نہیں رہا، تمہیں یہ کس نے اطلاع دی؟"

"خود تمہارے سابق مالک و آقا نے۔ اور اپنی طرف سے تو اس نے مجھے مرعوب اور متاثر کرنے کے لیے اس سے کہیں بہتر ڈراما اسٹیج کیا تھا جو تم کررہے ہو۔ لیکن اس کا ڈراما فلاپ ہوگیا۔ میرے سامنے اس نے دو پولیس والوں کو گولی ماردی۔ محض اس جرم میں کہ انہوں نے میرے ساتھ نامناسب سلوک کیا تھا۔ لیکن نہ وہ پولیس مین تھے اور نہ ہلاک ہوئے تھے۔ انہیں میں نے زندہ سلامت دیکھا۔ کچن میں کام کرتے ہوئے۔ ان کی وردیاں بھی دیکھ لیں۔ کچا رنگ تھا اس لیے صاف ہوگیا تھا۔ خون کا داغ اتنی آسانی سے نہیں جاتا۔ پھر اس نے میرے کہنے پر حالانکہ وہ بات میرے مُنہ سے غصے میں نکل گئی تھی ورنہ تمہارے سوا میں کسی کے ساتھ ایسا سلوک کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ مگر اس نے میری بات پکڑلی اور ایک شخص کو بھوکے شکاری کُتوں کے سامنے ڈال دیا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ بھی کوئی شعبدہ بازی تھی۔ حقیقت اس کے برعکس ہوگی جو میں نے دیکھا تھا۔ اس نے مجھے میری شرائط پر صلح کی پیش کش کی۔ مجھ سے اپنے سابقہ جرائم کی معافی مانگی۔ ہر نقصان کی تلافی کرنے پر رضامندی ظاہر کی۔ کیا میں یقین کرلیتا اس پر؟"

"وہ جھوٹا اور مکار آدمی ہے۔"

"بہت خوب! یہ تم کہہ رہے ہو پیڈرو!" میں نے حقارت آمیز طنز کے ساتھ کہا "چھاج بولے سو بولے، چھلنی کیا بولے، جس میں نو سو چھید۔ تم اسے جھوٹا اور مکار کہہ رہے ہو... خود تم کیا ہو۔ اس نے بھی مجھے معزز مہمان بنا کے رکھا تھا اور تحفے میں ایک کار دے کر رخصت کیا تھا۔ تم اسی کے چیلے ہو، تم یہ ڈراما کیسے پیش کروگے؟"

"بالآخر تم مان جاؤ گے کہ یہ ڈراما نہیں تھا۔"

"ہاں۔ ابھی ویٹر جب کافی لائے گا اور کافی ٹھنڈی ہوگی تو تم فوراً ریوالور نکال کے اسے شوٹ کردوگے۔ پھر تالی بجاؤ گے۔ دوسرے غلام آئیں گے۔ تم کہو گے، اس گستاخ نافرمان کی لاش لے جاؤ اور گٹر میں ڈال دو۔ اس نے ہمارے معزز مہمان کو ہماری حکم عدولی کرتے ہوئے ٹھنڈی کافی پیش کی تھی۔ دوسرے کمرے میں جاتے ہی مُردہ اٹھ کھڑا ہوگا اور....."

ویٹر کے نمودار ہونے سے میری بات ادھوری رہ گئی۔ اس کے سر پر کلف دار پگڑی تھی۔ نیچے سفید قمیص اور پتلون پر کالی واسکٹ جس کے بٹن پیتل کے تھے۔ اس کی داڑھی بھی تھی لیکن میں نے اس کی صورت پر غور کیا تو کسی دشواری کے بغیر میں نے اسے شناخت کرلیا۔ بدلے ہوئے حُلیے میں وہ وہی ڈرائیور تھا جو ہماری گاڑی چلا رہا تھا۔

میں نے کہا "پیڈرو! آخر کیا حاصل ہے ان سب باتوں سے۔ میں نے یہی بات دلاور سے بھی کہی تھی اور تم سے بھی کہتا ہوں کہ سانپ صرف کینچلی بدلتا ہے، فطرت نہیں۔ میں تمہاری رگ رگ سے واقف ہوں۔ میرے سامنے اگر تم دین دار یا پابندِ شرع باریش مولانا کے روپ میں آجاؤ تب بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ بھیس بدلنے سے خصلت نہیں بدلتی۔"

"میں نے کب کہا ہے کہ میں بدل گیا ہوں۔"

"اور کیا کہہ رہے ہو تم؟ تمہارا رویّہ یہی کہہ رہا ہے کہ تم شرافت کا چولا پہن کے شریف آدمی کہلانا چاہتے ہو۔ معزز آدمی بن گئے ہو۔ یہ ویٹر وہی ہے نا جو گاڑی ڈرائیو کر کے لایا تھا۔ کل اس نے خاکی وردی پہن رکھی تھی، آج سفید وردی پہن لی ہے۔ اس کے باوجود میں نے اسے پہچان لیا۔ اگر تم نے بھی وہی باتیں شروع کردیں جو دلاور کرتا رہا تھا تو میرا جواب پہلے سن لو۔ نہ میں تمہارا معزز مہمان ہوں، نہ میں تم سے ان معاملات پر کسی قسم کا کوئی سمجھوتا کروں گا جو میرے اور تمہارے درمیان تصفیہ طلب ہیں۔ کسی قیمت پر تم اپنے لیے کوئی رعایت حاصل نہیں کرسکتے اور میں نے آج تک کسی دباؤ کو قبول نہیں کیا۔ آئندہ بھی نہیں کروں گا کہ پرانے معاملات کو بھول کے تمہیں معاف کردوں یا رحم و عفو و درگزر سے کام لیتے ہوئے تمہیں ایک موقع دوں کہ تم....."

"تمہاری بھی پرانی عادت گئی نہیں" پیڈرو نے برہمی سے میری بات کاٹ دی "بہت دیر سے میں برداشت کررہا ہوں۔ تمہاری بکواس سن رہا ہوں مگر بواسیر ہے تمہاری زبان کو..... کس... نے کہا ہے کہ میں فرشتہ بن گیا ہوں۔ کون .... دعویٰ کررہا ہے پارسائی کا۔ کس.....نے بات کی ہے بدلنے کی۔؟"

اس نے ایک دم اپنی مادری وفادری زبان میں فصاحت کا مظاہرہ کرتے ہوئے تین مُرصع گالیوں کو جُملوں میں فٹ کیا پھر اس نے پولیس کی ڈکشنری سے نصف درجن منتخب گالیاں دلاور کو دیں۔

"....اس نے جو کہا ہے وہ میں کیوں کہوں گا۔ لعنت اس.... پر جو تم سے معافی مانگے اور تم سے رحم کی درخواست کرے۔ استاد پیڈرو کو توپ میں رکھ کے گولا چلادو پھر بھی وہ ہاتھ نہیں جوڑے گا تمہارے سامنے۔ تم کرتے رہو جو کرنا چاہتے ہو۔ میرے شریفانہ رویّے کا غلط مطلب نکالنے والے تم ہو تو دماغ تمہارا خراب ہے، میرا نہیں" وہ چلاّنے لگا۔

میں اسے حیرانی سے دیکھتا رہا "اور کیا مطلب نکالا جاسکتا ہے اس کا؟ پہلے کبھی تم نے اس لہجے میں بات کی تھی؟ میرا دماغ بالکل ٹھیک کام کررہا ہے پیڈرو۔ تم مجھے اذیّت دے کر ہلاک کرنے یا پُرانے بدلے چُکانے کے لیے اٹھواتے تو مجھے شک نہ ہوتا مگر اس شرافت کے سلوک کا یقیناً کچھ اور مطلب ہے۔"

پیڈرو نے اپنے اشتعال کے بھڑکتے الاؤ پر آتشِ سیال اُنڈیلی۔ اس نے ایک بوتل سے جامِ شراب میں چند گھونٹ ڈالے اور انہیں حلق کے راستے سینے میں لگی ہوئی آگ پر ڈال دیا۔

"سنو مسٹر سکندرِ اعظم!" اس نے ایک لمبی گہری سانس لے کر کہا "یہ بالکل ٹھیک ہے کہ میں نے دلاور کا ساتھ چھوڑدیا ہے۔"

"کیا ساتھ چھوڑنا تمہارے اختیار کی بات تھی؟ تمہارے ان کالے دھندوں کی دلدل میں اُترنے والا ڈوب سکتا ہے۔ باہر نکلنا چاہے تو سہارا دینے والے ہاتھ ہی اسے غرق کردیتے ہیں۔"

"ہاں۔ ایسا ہی ہوتا ہے" پیڈرو بولا۔

"اور دلاور کا ساتھ چھوڑ کے تم نے وہ سب دھندے چھوڑ دیے ہیں چنانچہ دلاور تمہیں ختم کرنے کے درپے ہے اور اس کا مقابلہ کرنے کے لیے..."

پیڈرو نے جام کو دیوار پر دے مارا "تم امتحان لے رہے ہو میری قوتِ برداشت کا۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت نہیں ہے تمیس مارخان۔"

میرا اندازہ پھر غلط ہوگیا "اچھا پھر کیوں بلایا ہے تم نے مجھے؟"

"پرانے دھندے دلاور نے چھوڑ دیے ہیں" پیڈرو کچھ دیر بعد پُرسکون ہونے میں کامیاب ہوگیا "اس لیے کہ اب اسے پیسہ کمانے کے لیے ان دھندوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ وہ اس سے زیادہ گھناؤنے کاروبار میں قدم رکھنے کا فیصلہ کرچکا ہے جس میں سرمایہ کاری بڑی ہے تو نفع بھی زیادہ ہے اور عزت شہرت بونس میں ملتی ہے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ وہ سیاست میں پڑگیا ہے۔"

"اس نے سیاست کا پیشہ اختیار کرلیا ہے' اس لیے کہ وہ کروڑ پتی ہے اور اسے کوئی ضرورت نہیں رہی بدنامی کے ساتھ دولت کمانے کی۔ وہ ملک و قوم کی خدمت کے نام پر عوام کو لوٹے گا' ملک کے خزانے پر ڈاکا ڈالے گا اور اس کے باوجود عزت دار کہلائے گا' وی آئی پی ہوگا۔ اس کی گاڑی پر جھنڈا لہرائے گا اور گھر پر سرکاری گارڈ ہوگی۔"

"اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ عقلمندی سے کام لے رہا ہے' جب آدمی کروڑوں کمالے تو اس کا راستہ کون روک سکتا ہے۔ وہ سب کچھ خرید لیتا ہے۔ ایک گروہ کی قیادت کرنے والا ایک قوم کا لیڈر بن جاتا ہے۔ یہاں تو سیاست کا یہی دستور ہے۔ عام آدمی' شریف آدمی' پڑھا لکھا آدمی' قانون کا احترام کرنے والا آدمی تو کھوٹا سکّہ ہے جو کسی کام کا نہیں۔ نہ وہ لیڈر بن سکتا ہے' نہ ووٹر بنتا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔ اس نے مجھے سب سے پہلے اپنے پروگرام کے بارے میں تفصیل سے بتایا تھا" پیڈرو بولا "اس نے کہا تھا کہ پیڈرو' اب کوئی ضرورت نہیں مجھے قانون کا مجرم کہلانے کی۔ وہ سب کاروبار اب بند' حالات بہت موافق ہیں' میں لیڈر بن سکتا ہوں۔ الیکشن لڑسکتا ہوں اور کامیابی پکی ہے۔ یہ سب پیسے کے کھیل ہیں اور پیسہ بہت اکٹھا کرلیا ہے میں نے۔ اب مجھے عزت اور شہرت کی منزل تک پہنچنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ اس کے بعد تو پانچوں گھی میں اور سر کڑاہی میں۔ ہمیں قوم کو کیا دینا ہے۔ نعرے اور وعدے۔ سب یہی دیتے آئے ہیں۔ مگر اس کے بدلے میں جو کچھ اس ملک میں ہے اور اس قوم کے پاس ہے وہ اپنا بلکہ اپنے باپ کا۔"

"اور تم نے اس سے اختلاف کیا؟"

"میں اس کا ساتھ دے سکتا تھا" پیڈرو بولا "لیکن اس نے خود ہی کہہ دیا کہ اب مجھے تمہاری ضرورت نہیں رہی۔ اس نے مجھے اپنے ماضی کا بدنما داغ قرار دیا۔ یہ کہا کہ نئے کاروبار کے لیے اسے نئے لوگوں کی ضرورت پڑے گی جو نیک نام ہوں' پڑھے لکھے ہوں اور ذہین ہوں۔ میں نے کہا کہ ایسے لوگ تمہارا ساتھ کب دیں گے تو وہ ہنسنے لگا۔ اس نے کہا کہ پیڈرو' تم نے بھی تو میرا ساتھ دیا تھا۔ تم کیا میرے کزن تھے یا بچپن کے دوست تھے۔ میں نے تم کو بازار سے اٹھایا تھا۔ نقد قیمت ادا کی تھی تمہاری۔ تم کیچڑ اور دُھول میں پڑے ہوئے تھے۔ کسی حقیر کانچ کے ٹکڑے کی طرح۔ میں نے تمہیں ہیرے سے زیادہ قیمت کا کردیا۔ تم پڑھے لکھے ذہین لوگوں کو کیا سمجھتے ہو' کیا انہیں نہیں خریدا جاسکتا! بے وقوف' وہی تو زیادہ فروخت ہورہے ہیں ہمارے ملک کے بازار میں۔ بے روزگار تم جیسے لوگ نہیں ہیں' وہی احمق ہیں جو کتابیں چاٹ چاٹ کے ڈگریاں جمع کرتے رہے' علم کے خزانے سمیٹتے رہے اور اب دانشوری کی دال بگھارتے پھرتے ہیں جو کہیں نہیں گلتی۔"

میں نے متفکر ہو کے کہا "یہ بات بھی دلاور نے غلط نہیں کہی تھی۔"

"مجھے اس کی باتوں سے اختلاف نہیں تھا۔ افسوس اس بات کا تھا کہ اس نے ضرورت پوری ہوتے ہی مجھے دودھ میں پڑی ہوئی مکھی کی طرح باہر نکال پھینکا۔ کیا میں اتنا بے مصرف ہوگیا تھا؟ کوئی کام نہیں کرسکتا تھا میں؟ اگر وہ سیاسی لیڈر بننا چاہتا ہے تو کیا اسے بدمعاشوں کی ضرورت نہیں ہوگی؟ ووٹروں کو ڈرانے دھمکانے کے لیے' مخالفین کو پٹوانے اور اٹھوانے کے لیے' ان کے انتخابی جلسے درہم برہم کرنے کے لیے' ان کے پوسٹر اتارنے اور بینر پھاڑنے کے لیے' الیکشن والے دن بیلٹ بکس اٹھانے کے لیے اور کیمپ میں ہنگامہ آرائی کرنے کے لیے۔"

میں نے کہا "اس کے بغیر تو وہ جیت بھی نہیں سکتا۔"

"میں نے یہی کہا تھا کہ کاروبار بدلنے سے تعلق نہیں بدلنا چاہیے مگر وہ نہیں مانا۔ اس نے کہا کہ پیڈرو' مجھے ایک نیا ماضی چاہیے۔ ایسا ماضی جس میں میرے لیے کوئی ندامت نہ ہو' جس پر میں فخر کرسکوں۔"

میں نے کہا "وہ سب کچھ کرلے گا۔ وہ اپنی ولدیت تک بدل لے گا۔ باپ کے باپ کا نام' کام' رُتبہ اور خاندان سب تبدیل کردے گا۔"

"یہ اتنا آسان تو نہیں ہوگا۔"

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات سولھویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں

جاسوسی ڈائجسٹ کا منفرد و مقبول سلسلہ
شکاری
سولہواں حصہ
SMITH & WESSON

مُعاشرے کے اُن ناسُوروں کی رُوداد جو گوشت پوست سے گزر کر اِنسانی ہڈیوں میں اُتر رہے تھے۔ ایک کفن بردوش نوجوان کی کہانی جس کے روز و شب موت کی بستی میں گزر رہے تھے۔ جلتے دن، سلگتی راتیں آس و یاس، خوف و ہراس، شیریں خواب، تلخ حقیقتیں۔

"ناممکن بھی نہیں ہوگا۔ کسے معلوم ہے کہ اس کا باپ لکڑی کا کام کرتا تھا۔ بڑھئی یا ترکھان کہلاتا تھا۔" میں نے کہا "پشاور کے قریب ایک چھوٹے سے گمنام گاؤں کا کاریگر جو مرتے وقت تک اپنی مہارتِ فن سے امیروں کے ڈرائنگ روم کے لیے فرنیچر پر نقش و نگار بناتا رہا اور اس کی ہنرمندی کے یہ شہکار آج بھی رئیسوں کے لیے باعثِ افتخار ہیں۔"

پیڈرو کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا "یہ.... تم جانتے ہو؟"

"ہاں۔ افسوس کہ میں اس سے مل نہیں سکا" میں نے کہا "وہ مر چکا ہے لیکن اس کے ہاتھوں کا کمالِ فن میں نے دیکھا ہے۔ وہ ایسا زبردست فنکار تھا کہ باہر شاید اس کے شہکار موتیوں میں تل کے بکتے لیکن یہاں اسے بمشکل تمام اتنا نصیب ہوتا تھا کہ وہ پیٹ بھر سکے۔ آج بھی یہاں ایسے لوگوں کی کیا اوقات ہے اور کیا عزت ہے؟ وہ ترکھان ہی کہلاتے ہیں، کم ذات اور کم حیثیت ہی سمجھے جاتے ہیں۔ اکبر خان اور دلاور خان نے عملاً تو اپنی ولدیت کو بہت پہلے ترک کر دیا تھا۔"

"دلاور خان...! اپنا چوہدری دلاور؟"

"بالکل، اپنا چوہدری دلاور۔ اکبر خان اس کا بھائی تھا۔ ایک ساتھ ان دونوں نے اپنا آبائی گاؤں اور پیشہ چھوڑا تھا اور ہاتھوں کی محنت سے حق حلال کی روزی کا وسیلہ چھوڑا تھا۔ اس میں انہیں کوئی برکت نظر نہیں آئی ہوگی۔ آباؤ اجداد سب ترکھان کہلاتے ہوں گے۔ عزت تو انہیں خیر کبھی مل بھی نہیں سکتی تھی۔ پیسہ بھی ان کے نصیب میں نہ تھا۔ شاید اس سے بہتر تو وہ طوائف کو سمجھتے ہوں گے جو عزت کی پروا نہیں کرتی مگر کوٹھے پر بیٹھ کے پیسہ تو کما لیتی ہے۔ وہ اپنے نصیب کے لکھے کو بدلنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے تھے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنے ایک مقصد میں وہ کامیاب رہے۔ انہوں نے دولت حاصل کر لی۔ اب دلاور کی اگلی منزل عزت اور شہرت ہی ہو سکتی تھی۔"

پیڈرو نے کہا "کیا تمہیں معلوم ہے کہ اس کا بھائی اکبر خان اب کہاں ہے؟"

میں نے کہا "آج کے بارے میں تو شاید کسی کو نہیں معلوم۔"

"مجھے معلوم ہے" پیڈرو بولا۔

"کیا وہ زندہ ہے؟" میں نے کہا۔

"وہ مجھ سے مل چکا ہے" پیڈرو نے کہا "بلکہ حقیقت یہ ہے کہ میں اس سے بہت پہلے ملا تھا۔ پھر درمیان میں اس سے کوئی رابطہ نہ رہا۔ مجھے دلاور نے ہی بتایا تھا کہ وہ ایک پولیس مقابلے میں مارا گیا۔"

"کہاں مارا گیا؟"

"کہیں باہر۔ کھلے سمندر میں مقابلہ ہوا تھا۔ اس کی لانچ پر دستی بم پھینکا گیا اور وہ ڈوب گئی تھی۔ اس پر جتنے لوگ سوار تھے، سب سمندر میں غرق ہو گئے تھے۔"

"تم نے تصدیق نہیں کی تھی؟"

"مجھے تصدیق کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ دلاور خود اپنے بھائی کے بارے میں بتا رہا تھا کہ وہ مارا گیا تو میں کیوں شک کرتا" پیڈرو ۔۔۔ بولا "اس نے یہ خیال بھی ظاہر کیا تھا کہ شاید یہ پولیس مقابلہ نہیں تھا بلکہ پولیس کی وردی میں ہمارے کاروباری حریف تھے جو ہمیں راستے سے ہٹانا چاہتے تھے۔"

"یہ کب کی بات ہے؟"

"آٹھ دس سال پرانی۔ بھارت پاکستان کی پہلی جنگ سے پہلے کی۔"

"تم اس وقت بھی دلاور کے ساتھ تھے؟"

اس نے رنج سے کہا "یہی تو افسوس ہے مجھے کہ اس کا اور میرا ساتھ بہت پرانا تھا۔ پندرہ سال سے ہم ہر کام مل کے کر رہے تھے۔"

"ڈی سوزا اور حاجی عبداللہ۔ سابق ایس پی سراج؟"

"یہ سب بعد کی پیداوار ہیں۔ ایسے لوگ جو آتے جاتے رہتے ہیں" پیڈرو بولا "جس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے' اس سے سودے کی بات ہو جاتی ہے۔"

"جس شخص نے اپنے باپ کو چھوڑ دیا ' سگے بھائی سے رشتہ توڑ لیا' وہ تمہاری وفاداری کے بدلے ساری عمر کا رشتہ تو نہیں جوڑ سکتا تھا تم سے۔ مجھے یقین ہے اس نے یہی کہا ہوگا۔"

"ہاں۔ اس نے کہا کہ پیڈرو تم نے میرے لیے کام کیا تو مجھ پر کون سا احسان کیا۔ یہ کاروباری تعلق تھا۔ کاروبار میں مال میں نے بھی بنایا اور تم بھی گھاٹے میں نہیں رہے۔ سوچو ذرا کہ اتنے بڑے مواقع تمہیں اور کون فراہم کر سکتا تھا۔ اب مجھے تمہاری ضرورت نہیں رہی تو گلہ کیسا۔ تم جہاں چاہو جاؤ' آئندہ مجھ سے تعلق کی بات بھی منہ سے نہ نکالنا۔ تم جو چاہو کرو لیکن مجھے معلوم ہوا کہ تم میرے نام سے فائدہ اٹھا رہے ہو یا تمہاری وجہ سے میری بدنامی ہو رہی ہے تو پھر ٹھیک نہیں ہوگا۔"

پیڈرو نے ایک بار پھر دلاور کی شان میں ماں بہن کا قصیدہ پڑھا "وہ عزت دار بننا چاہتا تھا تو کیا میں ساری عمر بے عزت رہوں۔ میں بھی کم ذات اور نیچ خاندان کا ہوں۔ میرے باپ دادا کے مقدر میں ذلت لکھ دی گئی تھی اور نوشتۂ تقدیر کو مٹانا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ میرا باپ میراثی تھا اور میرے چچا کے ساتھ گاؤں گاؤں میلوں میں سوانگ بھرتا تھا۔ زمینداروں کی حویلیوں میں شادی بیاہ کے موقعے پر اور عید بقرعید بخشش لینے جاتے تھے۔ گلے میں ڈھول ڈال کے ہاتھوں میں چمڑے کے بڑے بڑے سول جیسے ٹکڑے لے کر وہ ایک دوسرے کو مارتے تھے اور جگت بازی کرتے تھے۔ ہنسی مذاق' پھکڑپن' ٹھٹھول' ایک دوسرے کی تذلیل تاکہ اونچی ذات والے ہنس لیں اور لطف اندوز ہوں۔ وہ نیچے ان کے قدموں میں بیٹھتے تھے۔ جوتے پہن کے پھرنا ان کے لیے ممنوع تھا گاؤں کی حد تک۔ وہ پکّا مکان بنانے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ دنیا کا ہر ذلیل کام انہی سے لیا جاتا تھا جو کمّی کہلاتے ہیں۔ کمینے' کم ذات لوگ۔ اس بیسویں صدی کے مہذب معاشرے میں بھی ان کی حیثیت وہی ہے۔"

وہ بولتے بولتے جیسے تھک گیا یا دُکھی ہو گیا تھا۔ اس نے بوتل سے پھر جام بھرا اور خالی کر دیا۔

"چھوڑو اپنے سکندر اعظم صاحب" اس نے تلخی سے دلاور کے لہجے میں کہا "آدمی واقعی نصیب کے لکھے کو نہیں بدل سکتا۔"

"یہ غلط سوچ ہے۔"

"نہیں۔ ہاتھوں کی لکیریں سب بتا دیتی ہیں۔"

میں نے کہا "عزت' ذلت سب خدا کی طرف سے ہے۔"

"تم کتابی باتیں کرتے ہو۔ شہر کے اسکولوں' کالجوں میں پڑھ کے تم ولایت چلے گئے تھے۔" اس نے تلخی سے کہا "جا کے دیکھو کسی وڈیرے' زمیندار' جاگیردار یا خان ارباب حکمرانی کے علاقے میں۔ ان کی رعیت کو دیکھو اور ان کی حالت کو دیکھو۔ تم سب بھول جاؤ گے انسان کی مساوات کے دعوے اور مذہب کی وہ تعلیمات جن میں کہا گیا ہے کہ اسلام ذات پات کی تفریق سے بالاتر ہے اور کسی کو برتری ہے تو تقوے اور پرہیزگاری سے۔ نہ کہ نام و نسب سے۔"

"تعلیمات تو آج بھی یہی ہیں ' یہ الگ بات ہے کہ ہم نے ہندوؤں کے ساتھ رہ کے انہی کے معاشرے کی سوچ اپنا لی۔"

"مجھے بتائیں کیا شرفا کی کسی شادی میں کسی مسلمان کلمہ گو کو سب معزز مہمانوں کے ساتھ بٹھایا جائے گا؟ اگر وہ سڑکوں پر جھاڑو دیتا ہو یا کچرا صاف کرتا ہو۔ جوتے گانٹھتا ہو یا راج مزدور ہو۔ افسر اور مال دار لوگ کیا' ایک کلرک اس گلاس کو منہ نہیں لگاتا جس سے کوئی جمعدار پانی پی لے' خواہ وہ نہا دھو کے اور پاک صاف ہو کے آیا ہو۔ یہی وہ اپنے بچوں کو سکھاتا ہے کہ خبردار جو اس گندے گلاس میں پانی پیا۔ کوئی دانشور' پروفیسر بھی اپنی بیٹی کی شادی کسی نائی' قصائی یا بیرے سے نہیں کرتا' خواہ وہ حق حلال کی کماتا ہو' تعلیم یافتہ ہو اور شریف ہو۔ کسٹم کے حرام خور کلرک سے کر دیتا ہے۔ آج بھی اونچی ذات کے لوگ ہیں اور نیچی ذات ہے۔ گاؤں کی بات نہیں کر رہا ہوں میں' شہروں کی بات کر رہا ہوں۔ پڑھے لکھے ہی اپنی ذات کا رشتہ تلاش کرتے ہیں۔ یہ کون سا اسلام ہے؟ سیّد' شیخ' قریشی' صدیقی۔ کیا یہ سب برابر نہیں ہوتے؟"

میں حیران تھا کہ پیڈرو یہ کیسی باتیں کر رہا ہے۔ میں اسے ایک جاہل آدمی سمجھتا تھا اور اس کی زبان سے میں نے فحش کلامی اور گندی گالیوں کے سوا کچھ نہیں سنا تھا۔ تاہم یہ بھی حقیقت تھی کہ میری اور اس کی کبھی یوں ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ ہم جب ملے تھے' کسی محاذ پر ملے تھے۔ ایک دوسرے کے دشمن بن کے سامنے آئے تھے۔ دشمنی کے اسباب آج بھی وہی تھے مگر یہ موقع پہلی بار

آیا تھا کہ ہم نفرت اور عناد کے جذبات پر قابو پا کے ایک دوسرے سے مخاطب ہوں۔

"میں مجبور ہوں کہ تم سے اتفاق کروں پیڈرو اور مجھے حیرت ہے کہ یہ باتیں تم کہہ رہے ہو۔ اتنی سمجھ بوجھ تھی تم میں' تو تم دلاور جیسے لوگوں کے راستے پر کیوں چلے؟"

اس نے ایک قہقہہ لگایا "بے وقوف آدمی ہو تم جو ایسا سوال کرتے ہو۔ اور کون سا راستہ رہ جاتا ہے ہم جیسوں کے لیے؟ جو حق ہمیں معاشرہ نہیں دیتا' وہ ہم ڈاکا ڈال کے نہ حاصل کریں تو کیا تمام عمر خیرات میں بے عزتی قبول کرتے رہیں۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ میں دس سال کی عمر میں بھاگ کے شہر آ گیا تھا۔ دس سال کا بچہ گھر سے نکلتے ہوئے بھی ڈرتا ہے مگر میں تو تین سال کی عمر سے ماں کے ساتھ جاتا تھا۔ وہ زمیندار کے گھر میں کام کرتی تھی۔ ہم ان کی اترن پہنتے تھے اور بچا کھچا کھاتے تھے۔ اس وقت مجھے سمجھ نہیں تھی کہ لوگ مجھ پر کیوں ہنستے ہیں۔ وہ سب حاسد لوگ تھے۔ وہ بھی زمیندار کے گھر کی اُترن اور اس کا بچا کھچا کھانا چاہتے تھے کیونکہ محنت کی سوکھی روٹی کے مقابلے میں وہ ایسا کھانا تھا جو انہیں شادیوں میں ہی میسّر آتا تھا یا کسی کے چہلم پر۔ میرا مطلب ہے زمیندار کے گھرانے کی شادیوں اور چہلموں پر۔ خود ان کے ..... گھر کی شادیوں میں گُڑ کے میٹھے چاول ہوتے تھے اور چہلم پر گوشت روٹی کھلانے والا سُرخرو ہوتا تھا کہ اس نے ماں باپ کی بخشش کا سامان کر دیا۔ ہم ہر روز اچھا کھاتے تھے۔ میری ماں ریشم پہنتی تھی اور مجھے جوتے میسّر تھے۔ اُترن ہونے کے باوجود یہ چیزیں قیمتی تھیں۔ ایسی چیزیں کون خرید سکتا تھا اور خرید بھی لیتا تو پہننے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ یہ اعزاز صرف ہمارے گھر کو حاصل ہوا۔ ایک کم ذات میراثی کی بیوی نے صرف اپنے شوہر کو اور اپنے بیٹے کو ان نعمتوں کا حقدار کر دیا کیونکہ' کیونکہ وہ ..... بہت خوب صورت تھی' گوری چٹی اور صحت مند جٹی تھی۔ کسی میراثن کو ایسا نہیں ہونا چاہیے ورنہ وہی ہوتا ہے جو میرے ساتھ ہوا۔ ہر شخص جانتا تھا کہ وہ زمیندار کی اور اس کے بھائیوں کی' اس کے مہمانوں کی خدمت گار ہے۔ ان کا سارا کام وہی کرتی ہے۔ اس میں دن رات کی تخصیص نہیں تھی۔ اسے کسی بھی وقت بُلایا جا سکتا تھا۔ اور اس کی بے عزتی اور بے شرمی کا چلتا پھرتا اشتہار ہم سب تھے۔ میں' میرا باپ' میرے بھائی بہن۔ ہمارے حلیے' ہمارے کپڑے اور ہمارے چہرے۔ حسد کرنے والے صاف کہتے تھے کہ عیش کیوں نہیں کرے گا بھئی تو' آخر بیٹا کس کا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ میری صورت اپنے باپ سے نہیں' زمیندار سے ملتی تھی۔ میں جانتا ہوں کہ موقع ملتا تو وہ خود بھی اپنی بیویوں کو' بہنوں کو اور بیٹیوں کو زمیندار کی خدمت کے لیے وقف کر دیتے مگر وہ بدصورت اور بدوضع تھیں۔ سوکھی سڑی یا موٹی بھینس جیسی۔ لاٹری تو میرے باپ کے نام کھلی تھی۔"

میں دم بخود بیٹھا استاد پیڈرو کی داستانِ حیات کا وہ باب سُن رہا تھا جس کو اپنی زندگی کی کتاب سے پھاڑ کر پھینکنے کے بجائے اس نے سنبھال کے رکھا تھا اور اپنے ماضی کے یہ اوراقِ رُسوائی وہ خود مجھے پیش کر رہا تھا۔

میں نے کہا "تمہارے باپ نے بھی تو گاؤں یا خاندان میں ہی شادی کی ہوگی؟"

"یہی تو ساری خرابی ہوئی۔ وہ خود لمبا تڑنگا خوبرو جوان تھا۔ زبان اس کی خوب چلتی تھی اور میراثی اگر لطیفہ گو' حاضر جواب اور مسخرہ نہ ہو تو بھوکا مرتا ہے۔ وہ باتوں کی کمائی کھاتا تھا۔ سال بھر کے لیے اسے زمیندار نے کسی کام سے شہر بھیجا تھا۔ وہ کام دکھا گیا۔ مال ہضم کر کے روپوش ہو گیا اور تین سال غائب رہا۔ پھر کسی نے اسے دیکھ لیا اور اسے گرفتار کر کے لایا گیا۔ اس نے شادی کر لی تھی اور یہی شادی اس کا معافی نامہ بن گئی ورنہ زمیندار اسے زندہ گاڑنے کا حکم صادر کر چکا تھا۔ عین وقت پر میری ماں روتی پیٹتی زمیندار کے قدموں سے لپٹ گئی۔ اس نے اپنی سونے کی بالیاں' چوڑیاں سب زمیندار کے قدموں میں ڈال دیں اور شوہر کے لیے جاں بخشی کی درخواست کی۔ درخواست کے قبول نہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ زمیندار کی نظر اپنے قدموں میں پڑی ہوئی سونے کی مورت پر جم کے رہ گئی تھی۔ اس نے بالیاں' چوڑیاں واپس کرتے ہوئے اس کا سُہاگ اسے بخشا اور وہ جاں بلب سرتاج کو چارپائی پر ڈال کے گھر لے گئی۔ ہفتہ دس دن بعد میرا باپ مار کو بھول کے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے بعد اسے کام کرنے کی ضرورت بھی پیش نہیں آئی۔ میرا چچا اسے بہت ذلیل کرتا تھا کہ بے غیرتا' چھوڑ دے اس عورت کو یا ڈوب کے مر جا۔ تنگ آ کے میرے باپ نے بات اوپر پہنچائی اور ایک دن زمیندار نے میرے چچا کو ڈھول کی طرح بجا بجا کے پھاڑ دیا۔ چاچی اس پھٹے ڈھول کو گلے میں ڈالے کچھ دن گاؤں میں پھرتی رہی۔ پھر وہ شہر چلے گئے۔ وہاں انہوں نے خاصی کمائی کی۔ خود میں نے ایک بار انہیں دیکھا۔ میرا چچا ایک ریڑھی میں پڑا تھا اور میری چچی اس ریڑھی کو دھکیل رہی تھی۔ بھیک مانگنے کا فن انہوں نے شہر میں ہی سیکھا ہوگا۔

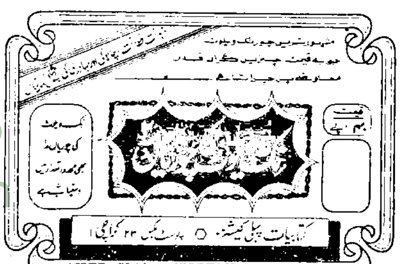

میرے چچا کے ہاتھوں پیروں پر لال پیلے پینٹ تھے اور اس کے ننگے بدن پر مکھیاں بھنک رہی تھیں لیکن اسی مکروہ نظارے پر منہ پھیرلینے والے ان کی طرف نوٹ پھینکتے جا رہے تھے۔ خود میں نے چاچی کو سو کا نوٹ دیا تو وہ حیران ہوئی مگر اس نے مجھے پہچانا نہیں۔ پھر میں نے کہا کہ چاچی' عیش کررہی ہے تو بھی شہر آکے۔ وہ پریشان ہوگئی اور میں گاڑی میں آگے بڑھ گیا۔

"اس کے بعد تم نے ان کے لیے کچھ نہیں کیا؟"

"وہ خود اپنے لیے بہت کچھ کرچکے تھے' مجھے کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی" پیڈرو نے کہا "میرے چچا کے ہاتھ پاؤں کی ہڈیاں اور کچھ پسلیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ گاؤں کے حکیم اور پہلوان انہیں جوڑنے میں تو کامیاب ہوگئے تھے مگر ہڈیوں کو ٹھیک نہ بٹھا سکے۔ نتیجہ یہ کہ میرے چچا کے دونوں پاؤں مخالف سمت میں مڑ گئے۔ ایک پاؤں تھوڑا سا دائیں طرف گھوم گیا' دوسرا بائیں طرف۔ جب وہ چلتا تھا تو اس کے گھٹنے مل جاتے تھے اور پنڈلیاں اُردو کا آٹھ والا ہندسہ بناتی تھیں۔ اس کا ایک ہاتھ ٹھیک تھا لیکن دوسرا سوکھ گیا تھا۔ ظاہر ہے ایسی حالت میں وہ دنیا کا کون سا کام کرسکتا تھا' سوائے بھیک مانگنے کے۔ چاچی کے ساتھ وہ اپنی حالت کو زیادہ قابلِ رحم بنا کے نکلتا تھا۔ اپنے گھر میں وہ نہا دھو کر کپڑے بدل کر آرام سے پھرتا تھا اور کرسی پر بیٹھ کے ٹی وی دیکھتا تھا۔"

"تم ان کے گھر گئے تھے؟"

"ہاں۔ مجھے جانا تو نہیں چاہیے تھا مگر میں تجسس سے مجبور ہوکے چلا گیا کچھ مجھے یہ خیال بھی تھا کہ چاچا کی اس حالت کا ذمے دار میں ہی ہوں۔ میں اسے یہ بھی بتانا چاہتا تھا کہ اس نے جو کیا' بالکل ٹھیک تھا اور بعد میں' میں نے اپنی زندگی کے داغِ رُسوائی کو کس طرح دھویا تھا۔ لیکن وہ تو مجھے دیکھتے ہی بگڑ گیا۔ وہ پاگلوں کی طرح چیخنے لگا کہ نکال اس حرامی پلّے کو میرے گھر سے۔ یہ میرے بھائی کی اولاد نہیں ہے۔ مجھے چاچا کیوں کہتا ہے۔ جاکے زمیندار کے بھائی کو تایا بنالے۔ چاچی نے بھی میری ایک نہیں سُنی۔ میری مالی امداد کی پیش کش کو ٹھکرادیا۔ اس نے اپنے بچوں کو میرے پیچھے لگادیا۔ وہ سات تھے اور سب سے بڑا تو جوان ہی تھا۔ وہ مجھ سے بھوتوں کی طرح چمٹ گئے اور انہوں نے مجھے مار کے اور دھکّے دے کے گھر سے نکال دیا۔ میرا حُلیہ بگاڑ دیا انہوں نے مار مار کے۔"

"اور تم نے مار کھالی؟"

"ہاں۔ اچھی لگی مجھے وہ مار۔ اپنوں کی مار تھی نا۔ مار تو ہم اور ہمارے باپ دادا' سب رزق کے ساتھ کھاتے تھے۔ جو نصیب میں ہو وہی رزق۔ سو پیاز اور سو جوتے ہوں تو وہ بھی ٹھیک۔ لیکن میں پیار کی مار کا ترسا ہوا تھا۔ باپ نے کبھی نہیں مارا۔ کیسے مارتا' زمیندار کی اولاد پر ہاتھ اٹھانے کی ہمت کہاں تھی اس میں۔ یا شاید وہ اتنی نفرت کرتا تھا مجھ سے کہ میرے وجود کو مجبوراً برداشت کرتا تھا۔ میری نیکی بدی کا اور پرورش کا اس کے رشتے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اسی طرح ماں ہمیشہ مجھ پر مہربان رہی۔ مائیں تو مہربان ہی ہوتی ہیں۔ ماواں ٹھنڈیاں چھاواں۔ لیکن وہ صرف میری ماں کہاں تھی۔ وہ تو بہت سے بچّوں کی ماں تھی۔ کچھ پیدا ہی نہیں ہوئے' کچھ پیدا ہوکے مرگئے' کچھ ماردیے گئے۔ جو زندہ بچے وہ بِن باپ کے تھے اور زمیندار کی حویلی میں اس کے بھائیوں' بہنوئیوں' سالوں اور چاچے مامے' ان کی اولادوں اور آنے جانے والوں تک کی صورت میں اپنی صورت تلاش کرتے تھے۔ وہ ماں کیا پیار دیتی مجھے' اس نے مجھے جب مارا اپنے آپ سے نفرت کے باعث مارا۔ وہ مار میرے مقدر میں بھی نہ تھی جو تربیّت' اصلاح اور مستقبل کو سُدھارنے کے لیے ماں باپ اور بڑے بھائی بہنوں سے پڑتی ہے۔ کیا تم اس کا موازنہ پولیس کی مار سے کرسکتے ہو۔ یہی وجہ تھی سکندر صاحب کہ میں نے اپنے چچا کی گالیاں سُن کے خوشی محسوس کی۔ وہ سب میرے کزن تھے۔ چاچے دے پُتّر جنہوں نے مجھے مارا۔ اس لیے کہ میں ایک بُرا آدمی تھا اور ان کے والدین ایسا سمجھتے تھے۔ وہ فقیر تھے مگر ان میں غیرت تھی۔ جو مجھ میں بھی تھی...."

میں نے کہا "یہ انکشاف ہے میرے لیے۔"

"آج رات بہت سے انکشافات ہوں گے تم پر۔"

میں نے کہا "میں ضرور سُنوں گا تمہاری باتیں لیکن پہلے میں کاجل اور رابعہ سے ملوں گا۔"

اس نے پھر تالی بجائی۔ وہی حکم کا غلام حاضر ہوگیا "یس سر؟"

"جاکے دیکھو' مہمان خواتین کیا کررہی ہیں۔ معلوم کرکے آؤ۔"

"یس سر" غلام سر جھکا کے غائب ہوگیا۔

"تمہیں بھوک بھی لگی ہوگی؟"

میں نے کہا "میں اکیلا کھانا نہیں کھاؤں گا۔"

"کھانے میں ابھی کچھ دیر ہے۔ کیوں نہ ایک کپ کافی اور ہوجائے" اس نے کہا "ویسی ہی چلے گی؟"

"ہاٹ اینڈ بلیک مگر کریم اور شوگر کے ساتھ۔"

غلام پھر نمودار ہوا۔ "ڈاکٹر صاحبہ نے کہا ہے کہ مہمان بالکل ٹھیک ہیں مگر سو رہی ہیں۔ انہیں اس وقت اٹھانا مناسب نہیں۔"

"کون ڈاکٹر صاحبہ؟ میں خود بات کروں گا۔ بلکہ میں انہیں دیکھوں گا" میں نے کہا۔

پیڈرو اٹھ کھڑا ہوا "جیسی تمہاری مرضی۔ آؤ میرے ساتھ۔"

رابعہ اور کاجل واقعی سو رہی تھیں۔ ان کے بیڈ روم کے باہر ایک نرس موجود تھی اور ایک خادمہ اسٹول پر بیٹھی تھی جو پیڈرو کو دیکھتے ہی سلام کرکے کھڑی ہوگئی۔

"تم جاؤ اندر" پیڈرو نے وہیں رک کے کہا۔

میں اس شائستگی کے مظاہرے پر حیران ہوا مگر حالات ہر لمحہ ایسی تیزی سے روبہ تغیر تھے کہ میں نے اپنی حیرت کا اظہار نہیں کیا اور دروازہ کھول کے کمرے میں داخل ہوگیا۔ ادھیڑ عمر کی ایک لیڈی ڈاکٹر نے احتجاجی سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

"یہ میری وائف ہیں۔ اور یہ نہیں" میں نے کہا "ان کی طبیعت کیسی ہے؟"

"پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے سر" وہ مرعوب ہوگئی "ان پر تھوڑا سا اثر تھا SEDATIVES کا۔ اگر یہ صبح تک اسی طرح سوتی رہیں گی تو خود بخود ختم ہوجائے گا۔ کسی دوا کے بغیر۔ ویسے میں ان کو انجکشن دوں تو یہ تین منٹ بعد بالکل چاق وچوبند ہوں گی مگر شاید پھر رات بھر جاگتی رہیں گی۔ دوبارہ TRANQUALISER دینا پڑیں گے۔ اس سے کیا فائدہ؟"

"اوکے۔ اوکے۔ ڈاکٹر تم ہو' میں نہیں" میں نے انگریزی میں کہا اور باہر نکل آیا۔ میں باہر نکلا تو پیڈرو غائب تھا۔

"سر اپنے کمرے میں ہیں" نرس نے کہا "کہہ گئے تھے' آپ وہیں آجائیں۔"

شاید پیڈرو کا خیال ہوگا کہ میں بہت دیر رُکوں گا یا اصرار کروں گا کہ رابعہ اور کاجل کو بیدار کیا جائے۔ اگرچہ اس احساس سے مفر نہ تھا کہ میں اپنے بدترین دشمن کی قید میں ہوں اور اپنی مرضی سے جانا چاہوں تو نہیں جاسکتا۔ لیکن ابھی تک کوئی بات میری مرضی کے خلاف نہیں ہوئی تھی اور پیڈرو کے انتظامات بھی ٹھیک تھے۔

وہ مجھے دیکھ کے تھوڑا سا حیران ہوا۔ وہ جامِ شراب ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا۔ "بڑی جلدی آگئے۔"

میں نے کہا "ان کا سوتے رہنا ہی بہتر ہے۔"

پیڈرو نے کہا "کافی پیوگے.....یا..."

میں نے کہا "یا سے میں اس وقت بھی دور رہا جب ولایت میں ہر جگہ اور ہر وقت مفت مل سکتی تھی۔"

وہ مسکرایا "اب میں کون سی قیمت مانگ رہا ہوں۔"

"بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے اس کی۔ تم بھی جانتے ہو" میں نے کافی بناتے ہوئے کہا "اس کے لیے مجھے اپنے ایمان کی قربانی دینی پڑے گی اور اصل قیمت کا حساب بعد میں ہوگا۔"

"ہم تو پیدائشی جہنمی ہیں" اس نے کہا "دنیا میں بھی جہنم اور آخرت میں بھی۔"

"آدمی اپنی جہنم خود بناتا ہے" میں نے کہا "اور پھر اس میں اکیلا ہی نہیں جلتا' وہ سب بھی جلتے ہیں جو اسے اپناتے ہیں۔"

"ٹھیک کہتے ہو تم۔ میں اپنے باپ کے بنائے ہوئے جہنم میں نہ پیدا ہوتا تو شاید استاد پیڈرو نہ ہوتا۔ بدرالدین ہوتا۔"

"یہ تمہارا اصل نام ہے؟"

"ہاں۔ بدرالدین سے میں بدرو بنا پھر اُستاد بدرو ہوا۔ جب فلم آئی بیگم پارا اور شیخ مختار کی۔ 'استاد پیڈرو' تو میں نے خود اپنا نام استاد پیڈرو رکھ لیا۔ اس جہنم میں میری ماں تو اپنی خوشی سے رہی۔ میں سمجھتا ہوں سارا قصور اس کا تھا۔ وہ کیوں گئی تھی میرے باپ کے لیے زندگی کی بھیک مانگنے۔ کیا اسے معلوم نہیں تھا کہ تھانے دار کسی کو رشوت لیے بغیر نہیں چھوڑتا اور وہ تھانے دار تو ان داتا بھی تھا۔"

"تم زیادتی کررہے ہو۔ یہ اسے کیسے معلوم ہوسکتا تھا؟"

"اونہہ! کیا وہ کسی بہت بڑے گھر کی بیٹی تھی' بڑے اونچے طبقے سے آئی تھی؟" پیڈرو نے نفرت کے زہر آلود لہجے میں کہا "ایسی لڑکی میرے مراثی باپ کے ساتھ شادی کرکے اپنا گھر چھوڑ آئی؟"

"تم نہیں جانتے اس کے خاندان کے بارے میں؟"

"کیسے جانتا۔ اس نے کبھی بتایا ہی نہیں۔ اس سے ملنے کبھی کوئی نہیں آیا اور نہ وہ کسی سے ملنے گئی" پیڈرو بولا "بعد میں اس نے کبھی کچھ کہا تو کبھی کچھ۔ وہ کوئی شریف زادی پہلے بھی نہیں تھی۔ ایسی ہی زندگی کی عادی تھی وہ' ورنہ اتنی آسانی سے زمیندار کو منہ مانگی قیمت ادا کرنے پر تیار نہ ہوتی۔"

"مجبوری آدمی سے سب کچھ کراتی ہے" میں نے کہا۔

"ہاں۔ عزت دار عورت ایک مجبوری سے سمجھوتا کرتی ہے تو خودکشی پر مجبور ہوجاتی ہے۔ وہ خودکشی نہ کرتی' شوہر کے ساتھ واپس وہیں چلی جاتی جہاں سے آئی تھی۔ لیکن وہ اپنی مرضی سے وہاں رہی۔ سب کچھ سُن کے اس پر بھی کوئی اثر نہیں ہوا اور میرے باپ کو بھی اسی نے قائل کرلیا ہوگا کہ کیا رکھا ہے عزت غیرت کے چکر میں۔ بھوکے مرنے اور جوتے کھاکے جینے سے یہ بہتر ہے کہ جو بھونکتا ہے اسے بھونکنے دے' اپنے کان بند کرلے اور آنکھیں بھی۔ فراغت نے میرے باپ کو بھی غیرت سے محروم کردیا۔ خوف کا اس میں اتنا دخل نہیں تھا۔ جب میں دس سال کا ہوا تو میرے چاچا کو غیرت مندی کی قیمت ادا کرنی پڑی۔ اس کے گاؤں سے چلے جانے کے بعد لوگوں نے اور تھو تھو کی۔ میری عمر کے لڑکے جو باتیں گھر میں سُنتے تھے' وہ میرے منہ پر کہتے تھے۔ وہ کہتے تھے بدرو! تو حرامی ہے۔ پکا حرامی ہے سولہ آنے۔ حرامی ان میں بھی بہت ہوں گے۔ سولہ آنے نہ سہی' چودہ آنے' بارہ آنے' آٹھ آنے۔ مگر کچھ ہوتے ہیں ایسے راز جو راز نہیں ہوتے مگر سرِعام کھولے بھی نہیں جاتے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ گٹر کے ڈھکن کے نیچے غلاظت بہتی ہے۔ اسے سب چھپاتے ہیں۔ کوئی اسے گلی میں بہتا دیکھے گا تو ناک منہ پر رومال رکھ کے گزرے گا۔ ایسا ہی میرے ساتھ ہوا۔ میرا حرامی ہونا سربستہ راز نہیں رہا۔ بلکہ ہر شخص کی زبان پر آنے والی بات بن گیا۔ پھر آہستہ آہستہ اپنے وجود کی گندگی سے خود مجھے گھن آنے لگی اور میں اپنے آپ سے نفرت میں مبتلا ہوگیا۔ ایک دن میں نے اپنی ماں سے وہ کہہ دیا جو میں نے دوسروں سے سُنا تھا.......... میرا خیال تھا کہ اس بات پر وہ

بھڑک اٹھے گی اور مار مار کے میری چمڑی اُدھیڑ دے گی لیکن وہ تو عادی تھی یہ باتیں سننے کی۔ وہ صرف حیران ہوئی میری زبان سے ایسا سُن کے اور پھر اپنی تیاری میں مشغول ہو گئی "ہاں ہوں... پھر" اس نے کہا۔ میں نے کہا "لوگ مجھے حرامی کہتے ہیں تیری وجہ سے" اس نے کہا "تو بھی کہہ دیا کر انہیں حرامی۔ بڑے آئے حرامی کہنے والے۔ انہیں معلوم ہے ان کا باپ کون تھا۔ ذرا پوچھیں جا کے اپنی اپنی ماؤں سے" لیکن اس کے جواب نے مجھے مطمئن نہیں کیا۔ میں نے کہا "تو کیوں جاتی ہے زمیندار کے گھر؟" اس نے کہا "تم سب کے جہنم بھرنے کے لیے۔ تمہارے پیٹ خالی باتوں سے نہیں بھر سکتے اور تمہارا نکھٹو باپ کچھ نہیں کر سکتا۔" میں نے کہا "کوئی ضرورت نہیں ہے ہمارے لیے کہیں جانے کی۔ ابا بھی کام کرے گا اور میں بھی کام کروں گا" وہ ہنسنے لگی "کیا کام کرے گا تو؟ وہی جو تیرا ابا کرتا تھا' تیرا چاچا کرتا تھا۔ ڈھول بجائے گا' بھانڈ بن کے ناچے گا۔ جوتیاں چٹخائے گا اور کیا بنے گا۔ اس میں بڑی عزت ہے؟" میں نے کہا "میں کچھ بھی کروں مگر میں تجھے گھر سے نہیں جانے دوں گا" اس نے کہا "چل ہٹ حرامی' بڑا آیا مجھے روکنے والا" وہ کپڑے پہن کے میک اپ کر چکی تھی۔ میں اس کے راستے میں کھڑا ہو گیا مگر وہ مجھے دھکا دے کر چلی گئی۔ میں زمین پر گر پڑا۔ مجھ سے کچھ بڑے لڑکے یہ دیکھ کے ہنسنے لگے' فحش اشارے کرنے لگے اور میرا مذاق اُڑانے لگے۔ ذلت کی انتہا نے مجھے پاگل کر دیا۔ میں کپڑوں پر اور ہاتھوں پیروں میں لگی ہوئی مٹی جھاڑے بغیر گھر میں گیا۔ وہاں سے ٹوکا اٹھایا اور اس خیال سے کہ کوئی نہ دیکھے' پچھلی طرف کی کھڑکی سے باہر کود گیا۔ اگر کسی نے مجھے ٹوکے سمیت جاتا دیکھ لیا ہوتا تو مجھ سے پہلے یہ اطلاع زمیندار کی حویلی میں پہنچ جاتی۔ میری ماں حویلی سے گزر کے زمیندار کی بیٹھک میں داخل ہو رہی تھی کہ میں بھی پہنچ گیا۔ کسی نے مجھے نہیں روکا کیونکہ میں حویلی میں آتا جاتا رہتا تھا۔ راستہ طے کرتے ہوئے میرے جوش میں کچھ ہوش کے جذبات غالب آ گئے تھے ورنہ میں ٹوکا لہراتا ہوا اور گالیاں بکتا ہوا داخل ہوتا تو دروازے پر ہی دھر لیا جاتا۔ میں ٹوکے کو چھپا کے لے گیا۔ اتنی بڑی چیز کو چھپانا آسان نہیں ہوتا لیکن میں نے کسی نہ کسی طرح بیٹھک تک فاصلہ طے کر لیا اور بس آگے کچھ تقدیر نے مدد کی۔ میری ماں زمیندار کے ساتھ......... بیٹھی ہوئی تھی مگر ان کا رخ دوسری طرف تھا۔ بید سے بنے ہوئے کاؤچ کی پشت سے ان کے صرف سر نظر آتے تھے............

جب میں نے دروازہ کھولا تو وہ چونک اٹھے..... اور انہوں نے پلٹ کے دیکھا۔ میں نے انہیں اٹھنے کی یا کوئی سوال کرنے کی مہلت ہی نہیں دی۔ مجھے ٹوکا استعمال کرنا آتا تھا۔ چارہ کاٹنے میں اب میں باپ کی مدد کرنے لگا تھا۔ میرا پہلا وار زمیندار پر ہوا۔ اس کا سر درمیان سے دو ٹکڑے ہو گیا اور اس کا خون بھل بھل کر کے نکلا تو اس میں مغز بھی بہہ گیا۔ میری ماں نے چیخ ماری ہی تھی کہ میں نے ٹوکا چلا دیا۔ اس کا سر اس لیے بچ گیا کہ وہ اٹھنے لگی تھی۔ ٹوکا اس کی گردن پر پڑا اور وہ وہیں گر گئی۔ اس کا سر جسم سے الگ نہیں ہوا تھا' بس ایک طرف کی کھال کے ساتھ لٹکا رہ گیا تھا۔ اس کی چیخ نے حویلی میں کھلبلی مچا دی تھی۔ اچانک مجھے اپنے جرم کی سنگینی کا احساس ہوا۔ میں نے دو قتل کیے تھے۔ میں نے اپنی ماں کو مار ڈالا تھا اور میں نے پورے گاؤں کے ان داتا کو' بادشاہ سلامت کو ہلاک کر دیا تھا۔ آلۂ قتل میرے ہاتھ میں تھا اور میں موقعِ واردات پر پکڑا جاتا تو وہیں میری تکا بوٹی ہو جاتی۔ اس وقت ایک دم عقل لوٹ آئی اور میں نے پہلا کام یہ کیا کہ دروازے کو اندر سے کنڈی لگا دی۔ وہ سب دروازہ کوٹتے رہ گئے اور میں کھڑکی کھول کے باہر کود گیا۔ پھر میں بھاگا اور بھاگتا چلا گیا۔ تب سے آج تک میں بھاگ رہا ہوں۔"

"کچھ دیر کی خاموشی کے بعد میں نے کہا "اب کیوں بھاگ رہے ہو؟"

"آدمی کا گھر نہ ہو تو وہ بھاگتا رہتا ہے" پیڈرو بولا۔

"تمہارے منہ سے ایسی فلسفیانہ گفتگو میں پہلی بار سُن رہا ہوں اور عجیب اتفاق یہ ہے کہ مجھ سے چوہدری دلاور نے بھی جس لہجے میں گفتگو کی' وہ میرے لیے اجنبی تھا۔ یہ اچانک دنیا کیسے بدل گئی ہے۔ میری تو عقل حیران ہے کہ وہ سب غلط تھا جو میں نے آج تک دیکھا سُنا محسوس کیا اور سمجھا۔ یا اب جو میرے سامنے آ رہا ہے وہ غلط ہے؟"

"تم آج تک ایک ہی رخ سے حالات کو دیکھتے آئے تھے۔ تصویر کا دوسرا رخ تم نے پہلے کب دیکھا تھا؟"

میں نے کہا "شاید ایسا ہی ہو۔ لیکن تمہارا تو اندازِ بیاں ہی بدل گیا ہے۔ تم پڑھے لکھے لوگوں کی طرح بول رہے ہو۔"

وہ ہنسا "تم مجھے ہمیشہ جاہل سمجھتے رہے؟"

"ظاہر ہے۔ تم جیسے بات کرتے تھے۔"

"وہ بھی ضروری تھا۔ جیسا کام ویسا کلام۔ پولیس بھی اگر آپ جناب کرنے لگے تو ملزم قابو نہ آئیں۔ ان کی مجبوری ہے بدمعاشوں کے ساتھ بدمعاشی کی زبان استعمال کرنا۔"

"یہ غلط دلیل ہے۔ تم اپنی مثال دے سکتے ہو' پولیس کی نہیں۔ وہ تو شریف آدمی کے ساتھ بھی ویسے ہی پیش آتے ہیں جیسے بدمعاش کے ساتھ۔"

"شریف نہیں غریب کہو۔ پیسے والے ان کی زبان خرید لیتے ہیں۔" پیڈرو بولا "عادت رفتہ رفتہ ان کی فطرت بن جاتی ہے جیسے میری فطرت بن گئی تھی۔ چلو پہلے ہم کھانا کھا لیں پھر میں بتاؤں گا کہ گاؤں سے شہر آنے کے بعد میں بدرالدین سے استاد پیڈرو کیسے بنا۔"

میری مجبوری ایک وجہ تھی۔ میں اس کوٹھی کے زنداں میں ایک پل نہ ٹھہرتا مگر میں اپنی مرضی میں مختار نہ تھا۔ پھر کاجل اور

رابعہ سو رہی تھیں اور یہاں ان کو پوری توجہ بھی مل رہی تھی۔ استاد پیڈرو کی باتوں سے متاثر ہو کے اپنی دشمنی کے جذبات کا رخ بدلنا میرے لیے ناممکن تھا۔ پیڈرو کے حالات خواہ کچھ بھی رہے ہوں' میں اس تلخ حقیقت کو نظرانداز نہیں کر سکتا تھا کہ میری زندگی کی ساری بدبختی کے آغاز و انجام میں سب سے بڑا ہاتھ اسی کا تھا۔ اس کی باتیں غور سے اور دلچسپی کے ساتھ سننے کا ایک مقصد اور بھی تھا۔ شاید مصالحت کے چکر میں وہ میرے والد کے قتل اور اس سے پہلے ان کی زندگی کے آخری پُرالم دور کے حالات اور اسباب پر کچھ روشنی ڈال سکے اور مجھے بالآخر معلوم ہو جائے کہ ان کو آرام و آسائش کی زندگی سے محروم کر کے غربت اور ذلت کے انجام تک پہنچانے والا کون تھا۔ اس بھیانک سازش کا تانا بانا کس نے بُنا تھا۔ اس کی تکمیل کس نے کی' قاتل ہاتھ کس کا تھا اور دستِ قاتل میں خنجر تھمانے والا کون تھا۔ میرے والد کے اور میر شرافت علی کے قتل کے بعد مجھے تختۂ دار تک دھکیلنے والے کون لوگ تھے اور انہوں نے اپنے مذموم عزائم کی تکمیل سے کیا فوائد حاصل کیے۔

میں نے کہا "یہ کوٹھی کس کی ہے؟"

"کیا اس سے فرق پڑتا ہے" وہ بولا "اگر میں کہوں کہ میری ہے۔"

میں نے تسلیم کیا "نہیں۔ مگر یہ خادم اور خادمائیں۔ ویٹر...."

"یہ سب عارضی انتظام ہے" وہ بولا "تمہاری دلچسپی کے لیے میں بتا دیتا ہوں کہ کوٹھی اکبر خان کی ہے۔"

میں بھونچکا رہ گیا "وہی اکبر خان؟"

"وہی اکبر خان۔ دلاور خان کا بڑا بھائی جسے وہ مرحوم کر چکا تھا۔"

"وہ زندہ ہے اور پاکستان میں ہے؟"

"آج کل نہیں ہے۔ ویسے آتا جاتا رہتا ہے" پیڈرو بولا۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ زندہ ہے؟"

"خود میں نے معلوم کیا۔ حال ہی میں" وہ بولا "جب ضرورت نہیں تھی تو میں بھی بھول گیا تھا۔ مجھے اس کے پرانے ٹھکانوں کا بھی علم تھا اور پرانے کارندوں کو بھی میں جانتا تھا۔ انٹرنیشنل ڈرگ مافیا میں شامل ہے وہ..."

"کیا اسے خود دلاور نے ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی؟"

"میرا خیال ہے' وہ ایسا نہیں سمجھتا۔ وہ اٹلی کے ایک شخص کو اس واقعے کا ذمّے دار قرار دیتا ہے" پیڈرو بولا "اس سے قبل دونوں بھائیوں کے درمیان کاروباری معاملات پر اختلافِ رائے تھا۔ دلاور میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ مافیا سے مخالفت مول لے سکے۔ اس نے خود ہی اکبر خان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ پیسے کے لین دین پر دونوں بھائیوں میں خاصی گرما گرمی بھی ہوئی تھی مگر اکبر خان وسیع ظرف کا مالک ہے اور بڑا ہے۔ اس نے دلاور کو معاف کر دیا بلکہ اپنا حصہ بخش دیا۔ دلاور جو کچھ ہے اسی کی وجہ سے ہے۔"

"اس نے تم سے پوچھا نہیں کہ اب میرے پاس کیوں آئے ہو؟" میں نے کہا۔

"پوچھا تھا اور میں نے اسے سچ بتا دیا۔ جھوٹ بولنے کا کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ وہ سچ معلوم کر لیتا" پیڈرو بولا "میں نے کہا کہ دلاور خان نے مجھے مایوس کیا ہے۔ اب تم مجھے جگہ دو۔ اس نے وعدہ تو نہیں کیا مگر میرا خیال ہے کہ وہ مجھے مسترد بھی نہیں کرے گا۔"

"تم نے اسے کیوں نہیں بتایا کہ اس پر حملہ کرانے والا خود اس کا چھوٹا بھائی ہے؟"

پیڈرو نے نفی میں سر ہلایا "وہ سمجھتا کہ میں اپنے پرانے باس کا دشمن ہو رہا ہوں اور اختلاف کی وجہ کچھ اور ہے۔ اسے بدنام کرنے کے لیے میں یہ کہانی گھڑ رہا ہوں۔ ایسے لوگوں کو کوئی پسند نہیں کرتا جو ذاتی اختلافات کی بنا پر وفاداریاں بدلتے ہوں۔ اوّل تو اسے حقیقت کا پہلے سے علم ہو گا۔ اس کے وسائل بے پناہ ہیں۔ اگر اس کو یہ بات معلوم ہو گی کہ اس کے خلاف سازش کرنے والا دلاور ہی تھا تو اس نے یہ بات مجھ سے چھپائی۔ اسے میری صاف گوئی پسند آئی ہو گی کہ میں نے دلاور پر کوئی الزام نہیں لگایا' بس یہ کہا کہ وہ فیلڈ سے الگ ہو رہا ہے اور اس نے مجھ سے کہا ہے کہ اپنا بندوبست کر لو' جہاں چاہو۔ فیلڈ میں اعتبار کے قابل کم ہی لوگ ہیں اور باہر کے آدمی پر تو کوئی بھی اعتماد نہیں کرتا' یہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ سُن گُن لینے اور اندر کے بھید معلوم کرنے کے لیے آیا ہو گا۔ خوش قسمتی سے میں اکبر خان کے لیے بھی کام کر چکا تھا اور وہ مجھے جانتا تھا کہ میں کام کا آدمی ہوں۔ وہ اپنے طور پر تصدیق کرے گا کہ میری کہانی میں کتنی افسانہ طرازی تھی اور کتنی حقیقت۔ اس کے بعد وہ مجھے بلا لے گا۔"

"گویا تم تمام عمر اسی دھندے میں گزارنے کا فیصلہ کر چکے ہو؟"

"ہاں۔ جما جمایا کاروبار کوئی نہیں چھوڑتا۔ نہ مجھے کسی اور کام کا تجربہ ہے اور نہ کسی کام میں اتنی آمدنی ہے" پیڈرو نے صاف گوئی سے کہا۔

کھانے کے لیے وہ مجھے دوسرے کمرے میں لے گیا۔ وہاں مجھے دیگر تین افراد بھی نظر آئے جو ہمارے اغوا کرنے والوں میں شامل تھے مگر یہاں ان کی حیثیت ذاتی خدمت گاروں سے زیادہ نہ تھی۔

"یہ تم نے کیسے لوگ جمع کر لیے ہیں؟" میں نے کہا "کیا یہ بھی دلاور کے سابق ساتھی ہیں؟"

"ہاں۔ یہ سب آج کل میرے ساتھ تھے۔ مختلف لوگوں کے ساتھ مختلف کارکن ہوتے ہیں اور وہ کام کی نوعیت کے اعتبار سے ان کا انتخاب بھی خود ہی کرتے ہیں" پیڈرو نے کہا "اگر غلطی سے نقصان ہو جائے تو ذمے داری انتخاب کرنے والے کی۔ وہ نقصان بھی پورا کرے اور غلطی کرنے والے کو خود ہی سزا دے یا معاف

کردے۔"

"لیکن یہ تو مجھے بالکل اناڑی لگتے ہیں۔"

"پہلے سب اناڑی ہوتے ہیں۔ یہ سب وفادار ہیں۔ جتنا کہا جائے اتنا ہی کرتے ہیں۔ نہ زیادہ نہ کم۔ سب اسلحہ استعمال کرنا جانتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ لاوارث ہیں۔ کسی کا گھر ہی نہیں تھا۔ اگر جاتے تھے تو بڑے گھر۔ میں نے ہمیشہ ایسے لوگ تلاش کیے۔ میرے ساتھ ان کے لیے خطرہ کوئی نہیں اور فکر بھی کوئی نہیں۔"

"وہ کارٹون کہاں ہے؟ بادشاہ سلامت..."

"کون بادشاہ سلامت؟" پیڈرو حیران ہو کے بولا۔

"وہی نیم مردانہ' نیم زنانہ۔ ڈبل رول والا؟"

پیڈرو ہنسنے لگا "اس کا یہ نام تو نہیں ہے۔ تم کیوں بادشاہ سلامت کہتے ہو؟"

"اس نے خود ہی کہا تھا کہ ہم بادشاہ سلامت ہیں' کیا وہ پاگل ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ بڑے کام کا آدمی ہے۔ لڑنے بھڑنے میں تو ایسے ہی ہے مگر وہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے کا ماہر ہے۔ مشکل سے مشکل مسئلہ چٹکی بجاتے میں حل کرنا ہو تو اس کے سپرد کیا جاسکتا ہے۔ خصوصاً جاسوسی اور سراغ رسانی سے کوئی خبر لانی ہو' کسی کا کھوج لگانا ہو' کسی بات کی تصدیق کرنی ہو' کسی کو گمراہ کرتا ہو یا جیکب ... وہ عورت بن جائے تو مرد دھوکا کھا جاتے ہیں۔ پاگل' شرابی اور فقیر سب کے رول کرلیتا ہے اور بہت ماہر میک اپ آرٹسٹ ہے۔ پہلے کسی تھیٹر میں کام کرتا تھا۔ وہ گاؤں قصبوں کے میلوں میں ناٹک کرتے تھے لیکن ان کا اصل کام کچھ اور تھا۔ وہ جہاں جاتے تھے' وہاں سے ایک آدھ لڑکی غائب ہوجاتی تھی۔ کچھ ان کے ورغلانے سے تھیٹر کے راستے فلموں میں جانے کا خواب دیکھتی ہوئی خود آجاتی تھیں اور پھر بلیک میل ہو کے واپس جانے کے قابل نہیں رہتی تھیں۔ کچھ انہوں نے دھوکے سے بھی اٹھائیں اور ان میں سے بیشتر تو خاموشی سے ادھر اُدھر ہوگئیں لیکن سب تو بے وقوف اور بزدل نہیں ہوتیں۔ ان کے خلاف مسلسل تین شہروں میں رپورٹیں درج ہوئیں۔ رپورٹ درج کرانے والے اثر و رسوخ رکھتے تھے ورنہ ان بے چاری دیہاتی لڑکیوں کی کون سنتا۔ ایک عورتوں کی تنظیم تھی جس نے سارا کیس تفتیش کرایا۔ دوسرا ایک وکیل تھا اور تیسرا خود ایک خریدار تھا جس نے ایک لڑکی سے شادی کرلی تھی۔ بالآخر یہ لوگ پکڑے گئے اور سب کو لمبی سزائیں ہوئیں۔ آغا اس وقت بھی بھیس بدل کر نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔"

"کون آغا۔ وہی بادشاہ سلامت؟"

"ہاں۔ آغا حشر کا بڑا مداح تھا۔ تھیٹر میں ان کے ڈرامے ہر جگہ بہت مقبول تھے اور فنکار انہی کو کاپی کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس کا اثر آج تک ہماری فلموں میں نظر آتا ہے۔ لوگ آغا حشر کہتے تھے مگر یہ منع کرتا تھا کہ کہاں وہ کہاں میں! میں تو ان کی خاکِ پا بھی نہیں۔ بس آغا کافی ہے۔"

"کیا وہ اسی لیے ہر وقت ہر جگہ بھیس بدل کے پھرتا ہے؟"

"ہاں۔ یہ زیادہ پرانی بات نہیں" پیڈرو نے کہا "پانچ چھ سال پہلے کا اسکینڈل ہے۔ اس کے سب ساتھی' تھیٹر کا مالک اور رائٹر سے ڈائریکٹر تک جیل میں چکی پیس رہے ہیں۔ یہ اس خوف سے پہلے تو روپوش رہا کہ مخبری کرنے والے پکڑوا نہ دیں۔ اسے پہچاننے والے بہت تھے۔ پھر اتفاق سے مجھے مل گیا تب سے میرے ساتھ ہے۔"

میں نے کہا "اسے بلاؤ تو سہی' میں اس کی اصل صورت دیکھوں۔"

بادشاہ سلامت یا آغا بڑے سکون سے آیا۔ میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس کا وہ کالا رنگ اور گنجا سر' چشمہ اور پونی ٹیل سب غائب تھے۔ میرے سامنے پینتیس چالیس سال کا ایک شریف صورت آدمی تھا جس کے بال گھنے تھے اور خاصے اسٹائلش بھی تھے۔ اس کا رنگ گندمی تھا اور جب اس نے اپنی اصل آواز میں گفتگو کی تو میں نے اس کی تیسری آواز سنی۔ میرے سوالوں نے اسے نروس کردیا حالانکہ میں نے سوائے اس کی اداکاری' میک اپ کے کمال اور تھیٹر کے تجربے کے اور کوئی بات نہیں کی تھی مگر وہ سمجھ گیا تھا کہ پیڈرو مجھے سب کچھ بتا چکا ہے۔

اس نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ کرکے اجازت لی اور مجھ سے جان چھڑا کے بھاگ گیا۔

میں نے کہا "اسے سمجھا دینا کہ میں اس کا راز افشا نہیں کروں گا۔"

پیڈرو نے سر ہلایا "اس کی فکر مت کرو۔"

میں نے کہا "تمہاری بات پوری نہیں ہوئی تھی۔ تم اپنے بارے میں بتا رہے تھے کہ بدرالدین سے استاد پیڈرو کیسے بنے تھے؟"

"ہاں۔ دس سال کی عمر میں دُہرا قتل کرکے میں بھاگا تو سیدھا شہر آیا" پیڈرو نے کہا "گیدڑ بدنام ہے کہ شامت آتی ہے تو شہر کا رخ کرتا ہے۔ میری حالت گیدڑ سے بدتر تھی۔ اتنی عقل کہاں تھی مجھ میں کہ پولیس کی' زمیندار کے خاندان کے نمک خواروں کی اور رشتے داروں کی آنکھوں میں دھول جھونک سکتا۔ یہ تو معمولی عقل رکھنے والا بھی اندازہ کرسکتا تھا کہ شہر کے سوا میں کہیں نہیں جاسکتا۔"

"کس شہر کی بات کر رہے ہو تم؟"

"لاہور کی اور کس کی" وہ بولا "آس پاس کے گاؤں میں دس دس کوس تک میں جہاں جاتا' پہچانا جاتا اور اگلے ہی دن واپس پہنچا دیا جاتا۔ اتنے بڑے شہر نے مجھے بچالیا۔ وہ تو مجھے گلی گلی ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ میری تصویریں اخباروں میں چھپ رہی تھیں' دیواروں پر میری تصویر کے پوسٹر تھے۔"

"اس کے باوجود تم پکڑے نہیں گئے تھے؟"

"میں پکڑا گیا تھا" استاد پیڈرو نے کہا۔

"کس نے پکڑا تھا' انہی لوگوں نے؟"

"وہ پکڑ لیتے تو آج میں تمہارے سامنے ہوتا۔ میری تو ہڈیاں بھی قبر میں گل چکی ہوتیں" وہ بولا "مجھے پولیس نے پکڑا تھا۔ میں مسلم پارک میں سو رہا تھا کہ گشتی پولیس کے دو سپاہی مجھے اٹھا کے آوارہ گردی کے الزام میں پکڑ کر لے گئے۔ میں نے ان کے سوالوں کے انٹ شنٹ جواب دیے اور انہوں نے مجھے بہت مارا۔"

"کیا اس تھانے میں تمہاری تصویر نہیں تھی؟"

"تھی لیکن رات کے وقت کسی نے زیادہ غور نہیں کیا۔ ان کے بورڈ پر تو درجنوں افراد کی تصویریں لگی رہتی ہیں۔" پیڈرو بولا "لیکن صبح ایک تھانے دار آیا تو اس نے مجھے پہچان لیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں دُہرے قتل کی واردات کے بعد فرار ہونے والا بدرالدین ہوں؟ تو میں نے اقرار کرلیا۔ اس نے مجھے اپنے پاس بٹھا کے تفصیل پوچھی تو میں نے کہا کہ سب کے سامنے کچھ نہیں بتاؤں گا۔ اس نے باقی سب کو کمرے سے نکال دیا اور پھر میری کہانی سُنی جو میں نے حرف بہ حرف وہی سنائی جو ابھی تم نے سُنی ہے۔ قتل کردینے کے بعد سے اب تک میں نے کسی کے سامنے اعترافِ جرم نہیں کیا تھا اور میرے سینے پر ایک بوجھ تھا۔ ایک یہ احساس تھا کہ میں قاتل ہوں اور دوسرا یہ کہ میں نے اپنی ماں کو قتل کیا ہے۔ زمیندار کے قتل کا مجھے دکھ نہیں تھا۔ میرے لیے اطمینان اور سکون کا احساس صرف اس خیال میں تھا کہ میں نے اصل مجرم کو ٹھکانے لگا دیا تھا۔ لیکن ماں جیسی بھی تھی میری ماں تھی۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ میرا باپ کون تھا؟ اگر باپ وہ زمیندار تھا تو اسے اپنے کیے کی سزا ملی۔ جنم دینے والی تو ایک ہی عورت ہوتی ہے' خواہ ولدیت کے خانے میں کسی کا بھی نام نہ ہو اور پہلے اگر میرا باپ نہیں تھا تو اب ماں بھی نہیں رہی تھی۔ یہی رنج و غم کا بوجھل احساس تھا کہ تھانے دار نے ہمدردی سے میری بات سُنی تو میں بہت رویا۔ روتے روتے میری حالت خراب ہوگئی تو اس نے دو بار مجھے پانی بھی پلایا۔ میری کہانی نے اس کے دل پر اثر کیا۔ میرا خیال ہے دس سال کے ایک بچے کی زبان سے اس اعترافِ حقیقت کے بعد کسی بھی شخص کے دل پر اثر نہ ہو' یہ ناممکن تھا۔ اس نے میری پیٹھ تھپکی کہ "شاباش' غیرت مند جوان۔ تو شیر ہے شیر۔ مردوں والا کام کیا ہے تو نے۔ تیری جگہ میں ہوتا تو ایک بندے کو اور گراتا" میں نے کہا "وہ اس وقت گاؤں میں نہیں تھا ورنہ میں اسے بھی نہ چھوڑتا۔ اپنے باپ کو" تھانے دار بولا "بالکل ٹھیک سمجھا تو' اس بے غیرت کو بھی نہیں چھوڑنا تھا۔" میں نے کہا "نہیں چھوڑوں گا اگر موقع ملا" تھانے دار نے کہا کہ "ابھی درڑوٹ جا کاکا (مطلب یہ کہ چپ کرکے غائب ہوجا) بعد میں نمٹ لینا اس سے۔ ابھی تو

تیرے پیچھے ساری پولیس فورس لگی ہوئی ہے اور پتا نہیں کتنے بندے تجھے گلی گلی دیکھتے پھر رہے ہوں گے۔ تیری قسمت تھی کہ ابھی تک ان کے ہتھے نہیں چڑھا۔" اس کے کہنے کے مطابق میں دڑوٹ گیا۔ اس کا موقع خود تھانے دار نے مجھے فراہم کیا۔ اس نے بعد میں ایس ایچ او سے مشورہ کیا اور یہ معاملہ ایسا تھا کہ مجھے ایس ایچ او کی ہمدردی بھی حاصل ہوگئی۔ سارا تھانہ ہی میرے ساتھ تھا۔ سب میری بہادری اور غیرت مندی کے معترف ہوگئے تھے۔

قانون سے لاعلمی کے باعث میرا خیال تھا کہ مجھے پھانسی ضرور ہوگی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ نابالغ کو سزائے موت نہیں ہوتی اور یہ حالات ایسے ہیں کہ شاید عدالت مجھے سال چھ مہینے کے لیے بچوں کی جیل میں رکھنے کا حکم دے یا صاف بری کردے اور مجھے کسی کی نگرانی میں دے دے۔ ایس ایچ او نے بڑی ہوشیاری سے ایک رپورٹ لکھی جس میں میرا بیان شامل تھا۔ اس میں وقت اور تاریخ کا ہیر پھیر کرتے ہوئے اور حالات کو زیادہ میرے حق میں رکھتے ہوئے میرا بیان تیار کیا گیا۔ ایس ایچ او نے لکھا کہ بدرالدین خود تھانے پہنچا اور اس نے خود کو قانون کے حوالے کرتے ہوئے اپنا بیان رضاکارانہ طور پر دیا اور قتل کی واردات کا اعتراف کیا۔ اس نے بتایا کہ آلۂ قتل کو وہ جائے واردات پر چھوڑ کے فرار ہوگیا تھا۔ میں نے اس کے بیان کو ازبر کرلیا جس میں میرے باپ سے اور زمیندار سے کچھ اور اشتعال انگیز باتیں منسوب کی گئی تھیں۔

بیان پر میرے دستخط لینے کے بعد ایس ایچ او نے محرر سے ایک اور اندراج کرایا۔ میری گرفتاری کا وقت رات بارہ بجے دکھایا گیا تھا۔ دو بجے رات کے اندراج میں لکھا گیا کہ ایک شخص نے جو خود کو مقتول زمیندار کا وارث کہتا تھا، تھانے کے عملے سے مطالبہ کیا کہ قاتل کو اس کے حوالے کردیا جائے اور عملے کے انکار پر اس نے عملے کو دھمکیاں دیں اور فائرنگ کرتا ہوا فرار ہوگیا۔ زمیندار کے جوان بیٹے کا نام اور حلیہ خود میں نے بتایا تھا۔ صبح ساڑھے پانچ بجے تھانے پر مسلح حملے کی رپورٹ لکھی گئی۔ حملہ آور تعداد میں پانچ تھے اور ان کی قیادت زمیندار کا سالا کررہا تھا جسے میں نے شناخت کیا۔ اس کے ساتھ زمیندار کا بھائی تھا اور بہنوئی تھا۔ ان سب کے نام بھی میں نے بتائے۔ ان سب کے خلاف جوابی کارروائی کی گئی اور وہ فرار ہونے پر مجبور ہوگئے۔ ان کے خلاف ضابطۂ فوجداری کی دفعہ ایک سونو، تین سو سات، ایک سو اڑتالیس کا پرچہ کاٹا گیا۔ یہ سب انتظام مجھے بچانے اور ان سب کے ہاتھ پاؤں باندھنے کے لیے تھا جو میرے خلاف انتقامی کارروائی کرسکتے تھے۔

چالان سیشن کورٹ میں پیش ہوا تو مجھے عدالت کی طرف سے سرکاری وکیل پیش کیا گیا مگر میں نے ایک بہت بڑے وکیل کا نام لے کر سب کو حیران کردیا جو فوجداری مقامات میں خصوصی شہرت رکھتا تھا۔ ظاہر ہے اس کی فیس تھانے دار نے ادا کی تھی مگر اسے تمام واقعات بتادیے تھے اور اس وکیل کو قائل کرلیا تھا کہ میں بے قصور ہوں اور یہ قتل اشتعال انگیزی کا نتیجہ تھا۔ مخالف وکیل نے معلوم کرنا چاہا کہ اتنے بڑے وکیل کی فیس میں نے کہاں سے ادا کی تو عدالت نے یہ اعتراض مسترد کردیا اور میرے وکیل نے کہا کہ وہ میرا مقدمہ انسانی ہمدردی کی بنیاد پر مفت لڑرہا ہے۔

بس اس کے بعد حالات میرے حق میں ہوتے چلے گئے۔ میرے مخالفین وہی تھے جن کے نام میں لکھوا چکا تھا۔ ان کے وکیل نے ایڑی چوٹی کا زور لگادیا مگر عدالت خود میرے حالات سے متاثر نظر آتی تھی۔ فیصلہ میرے حق میں ہوگیا اور مجھے صاف بری کردیا گیا۔ البتہ حفاظت اور نگرانی کے لیے مجھے کسی شریف آدمی کی تحویل میں دینے کا مسئلہ اٹھا تو اسی تھانے دار نے ایک نام تجویز کیا، جس کا نام تجویز کیا گیا تھا وہ تھانے دار کا سالا تھا اور شریف آدمی تو خیر نہیں تھا، ایک پرانا نامی گرامی پہلوان تھا جو بدمعاش بنا، ہسٹری شیٹر رہا اور پھر اچانک تائب ہوکے حج کرنے چلا گیا۔ وہ حاجی بن کے آیا تو دنیا نے اس کا بدلا ہوا روپ دیکھا۔ وہ تمام احکاماتِ شرعی کی پابندی کرنے لگا تھا اور اس کا حلیہ بھی ایسا ہی ہوگیا تھا۔ منڈا ہوا سر، ٹخنوں سے اونچی شلوار، ایک بالشت سے زیادہ داڑھی اور ہاتھ میں تسبیح۔ تم جانتے ہو وہ کون شخص تھا؟"

میں چونکا "میں کیسے جان سکتا ہوں۔ ابھی تک تم نے اس کا نام کہاں لیا ہے؟"

پیڈرو مسکرایا "وہ حاجی عبداللہ تھا۔"

میں بھونچکا رہ گیا "وہی حاجی عبداللہ؟"

"بالکل وہی۔ نام کا حاجی ہے وہ اور اس کا ظاہر ایک پردہ ہے اس پُرخباثت باطن کا۔ اس میں اور چوہدری دلاور میں صرف حلیے کا فرق ہے، اندر سے وہ ایک ہیں۔ ان کے سارے دھندے ایک ہیں اور فطرت ایک ہے۔"

"کیا اس تھانے دار کو یہ بات معلوم نہیں تھی؟"

"اس وقت معلوم نہیں تھی۔ وہ نیا نیا حاجی بنا تھا اور اس کی تبدیلیٔ قلب کی شہرت تھی۔ عدالت نے مجھے اس کے سپرد کردیا اور اس نے ابتدا میں مجھے واقعی گھر کا تحفظ اور ماحول فراہم کیا۔ پڑھنے لکھنے کا مجھے پہلے بھی شوق تھا۔ بڑی آسانی سے میں نے تین سال میں ساتویں جماعت تک کا کورس ختم کرلیا۔ حاجی نے کہا کہ اب آٹھویں کو چھوڑو، میٹرک کی تیاری کرو اور اگلے سال ہی میں نے پرائیویٹ امتحان دے کر میٹرک بھی کرلیا۔ اس وقت میری عمر چودہ سال تھی۔"

"کیا تمہیں اندازہ ہوگیا تھا کہ حاجی اندر سے کچھ ہے، باہر سے کچھ؟" میں نے پوچھا "اور اس کے دھندے کیا ہیں؟"

"دھندوں کا تو خیر پتا نہیں تھا" میں نے کہا "وہ گھر میں ایسے کاروبار کی بات ہی نہیں کرتا تھا۔ ہاں ظاہر و باطن کا فرق مجھ پر عیاں ہوگیا تھا اور میں سمجھ چکا تھا کہ حاجی جیسا دنیا کے سامنے خود کو بتاتا ہے ویسا ہرگز نہیں ہے۔"

"اس عرصے میں تمہارے دشمنوں کی طرف سے تمہیں نقصان پہنچانے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی؟"

"وہ گاؤں تھا جہاں ان کی بادشاہت تھی۔ شہر میں ان کی بدمعاشی نہیں چل سکتی تھی۔ انہیں یہ بھی اندازہ ہوگیا تھا کہ تھانیدار میری طرف داری کررہا ہے اور اس نے غالباً سب کو تڑی بھی لگائی کہ بندے دے پُتر بن جاؤ ورنہ سب کو اندر کرادوں گا۔ اتنے کیس بنوادوں گا کہ عمر گزر جائے گی پیشیاں بھگتنے میں، اور سارا خاندان جیل نہ گیا تو مقدمات لڑتے لڑتے دیوالیہ ہوجائے گا۔ حاجی کے گھر میں کسی کا داخل ہونا بھی آسان نہ تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ مرنے والا مرگیا تھا اور وارث اسے بھول کے جائداد اور زمین کی تقسیم کے معاملات میں الجھ گئے تھے۔"

"حاجی عبداللہ نے تمہیں اپنی لائن پر کب ڈالا تھا؟"

"بہت بعد میں۔ اس نے مجھے تعلیم حاصل کرنے کے پورے مواقع فراہم کیے اور میں نے بی اے تک کالج میں تعلیم حاصل کی۔ شاہزادوں کی طرح" استاد پیڈرو بولا "ہاتھ کھول کے خرچ کرنے کا اس نے مجھے شروع سے عادی بنایا تھا۔ میں نے جب جتنا مانگا مجھے ملا۔"

"کیا اس کی اپنی اولاد نہیں تھی؟"

"اس کے دو بیٹے تھے۔ بظاہر اس کا سلوک بالکل الٹا تھا۔ وہ سگے بیٹوں کے ساتھ سوتیلوں جیسا سلوک کرتا تھا۔ ان کو لگا بندھا جیب خرچ ملتا تھا۔ اپنے کام کے علاوہ گھر کی ذمے داریوں میں ماں کا ہاتھ بھی بٹانا پڑتا تھا اور باپ کا بھی۔ ان کے لیے وقت پر سونے اور جاگنے کی پابندی تھی اور ان کے کھیل کود کا بھی وقت مقرر تھا۔ ان کی ماں بہت چیختی چلاتی تھی کہ یہ کیا الٹی گنگا بہہ رہی ہے اس گھر میں۔ جو مالک ہیں وہ قیدیوں جیسی زندگی گزار رہے ہیں اور یہ جو نہ جانے کہاں سے آیا ہے اور کس کا سگا ہے، وہ عیش کررہا ہے۔ حاجی اسے سمجھاتا بھی ہوگا مگر ایسا بھی ہوا کہ اس نے جھانپڑ مار کے بیوی کی زبان بند کردی کہ الّو کی پٹھی، گھر چلا اپنا، زبان مت چلا۔ یہ دنیا کے معاملات ہیں، ان میں ٹانگ مت اڑا اپنی۔ عورت ذات کو خدا نے اتنی ہی عقل دی ہے کہ ایک گھر کو چلانے کے لیے کافی ہو۔ دنیا اور اس کے مسائل بہت بڑے ہیں۔ اس کے لیے ہم مردوں کو بنایا گیا ہے۔ اس کے بیٹے بھی باپ کے اس سلوک سے نالاں تھے اور اس کی تربیت کے سخت اصولوں کے خلاف بغاوت بھی کرتے تھے مگر دبے دبے لہجے میں کیونکہ حاجی عبداللہ ان کے ساتھ انتہائی سختی سے پیش آتا تھا۔ میرے معاملے میں اس نے مجھے مکمل ڈھیل دے رکھی تھی۔ تم سمجھے اس کے حرامی پن کو؟"

"ہاں۔ وہ بیٹوں کی صحیح تربیت کررہا تھا۔ ان کو دنیا اور آخرت دونوں کے لیے عملی زندگی کے اصولوں پر چلنے اور سُرخرو ہونے کا راستہ دکھا رہا تھا اور کامیابی کے ساتھ نیکی اور نیک نامی کی راہ پر گامزن رہنے کا سلیقہ سکھا رہا تھا۔ تمہیں وہ اسی لائن پر چلنے کے لیے تیار کررہا تھا جس پر چل کے تم اس کا قرض مع سود ادا کرسکو۔"

"بالکل ٹھیک سمجھے تم۔ مگر اس وقت میں یہ بات نہیں سمجھ سکا تھا" استاد پیڈرو بولا "کہ وہ بیٹوں کے ساتھ نہیں میرے ساتھ سوتیلوں جیسا سلوک کررہا ہے۔ برائی کی طرف مجھے دھکیل رہا ہے مگر اس خوبی سے کہ مجھے احساس تک نہ ہو اور میں اندھیرے کو روشنی سمجھ کے خود اس کی طرف بھاگتا جاؤں۔ پیسے کی افراط نے مجھے کس طرح بگاڑا، یہ الگ کہانی ہے اور تمہیں سنانے کا فائدہ بھی نہیں۔ تم خود سمجھ دار ہو، اندازہ کرسکتے ہو کہ نوجوانی کا دور ہو، بلا روک ٹوک اور کچھ کیے بغیر پیسہ ملتا ہو تو آدمی کس قسم کی صحبت اختیار کرتا ہے۔ مطلب پرست اور بدخواہ، حاسد اور احساسِ محرومی کے مارے ہوئے خود اسے گھیر لیتے ہیں۔ اس کے گرد ایسے جمع ہوجاتے ہیں جیسے گڑ پر مکھیاں جمع ہوتی ہیں۔ ان دوست نما دشمنوں نے مجھے ہر بُری لت میں مبتلا کیا۔ میں سگریٹ پینے لگا۔ حاجی نے میری حوصلہ افزائی اس انداز میں کی کہ میں اس کی روشن خیالی کی تعریف کرتا رہا۔ اس نے کہا کہ چھپ کے کیوں پیتے ہو، بُرائی سمجھتے ہو تو چھوڑ دو ورنہ میرے سامنے پیو۔ میری طرف سے اجازت ہے۔ رہی عزت تو وہ آدمی دل سے کرتا ہے۔ کسی بزرگ کے سامنے سگریٹ نہ پینے سے عزت افزائی نہیں ہوتی اور سگریٹ پینے سے کسی کی عزت کم نہیں ہوتی۔ سگریٹ سے اگلا قدم چرس کا تھا مگر اس کا نقصان دیکھ کر میں خود ہی تائب ہوگیا۔ کالج میں بی اے تک پہنچنے سے قبل ہی میں جوان ہوگیا تھا اور شراب چکھ چکا تھا۔ عورت کے جسم کی لذت سے آشنا ہوگیا تھا۔ ظاہر ہے اس عیاشی کے لیے تو قارون کا خزانہ بھی کافی نہیں ہوتا۔ حاجی عبداللہ جتنا مجھے دیتا تھا اس سے زیادہ خرچ کرنے کے لیے میں نے خود ہی وسائل تلاش کرلیے۔ سب سے آسان راستہ بلیک میلنگ کا تھا۔

کالج میں ہم نے چار لڑکوں کا ایک گروہ بنالیا تھا۔ ان سب کے حالات مجھ سے مختلف نہ تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ اپنے باپ سے لیتے تھے جن کی حرام کی آمدنی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ ایک کا باپ پولیس انسپکٹر تھا اور دوسرے کا کسٹم انسپکٹر۔ تیسرا یتیم اور لاوارث تھا۔ سوتیلے ماں باپ کے گھر سے نکلا تو چچا ماموں سب کے گھروں میں اس کے ساتھ ایک سا سلوک ہوا اور اس نے گھر سے چوریاں شروع کرکے باہر لوٹ مار شروع کی۔ وہ اور ایک لڑکا رات کو سنسان گلیوں میں راہ گیروں کو لوٹتے تھے، نقلی پستول سے ڈرا کے۔ عورتوں کے پرس چھین لیتے تھے۔ وہ میٹر ریڈر بن کے گھروں میں گھس جاتے تھے اور اکیلی عورت کے زیورات اتروالیتے تھے اور موقع دیکھ کے عزت پر بھی ہاتھ صاف کر آتے تھے۔ جعلی رسیدیں چھاپ کے انہوں نے سیلاب زدگان کے لیے، جنگ کے متاثرین کے لیے، مسجدوں کی تعمیر کے لیے، ہر کام کے لیے چندہ جمع کیا۔ بقرعید پر ایک مشہور سیاسی جماعت کے نام کی رسیدیں جاری کرکے کھالیں اکٹھی کرتے رہے۔ کون سا فراڈ تھا جو انہوں نے

نہیں کیا۔ بس وہ کوئی کام مستقل نہیں کرتے تھے۔ پکڑے جانے سے پہلے کوئی دوسرا چکر چلادیتے تھے اور ان کے چھوٹے موٹے جرائم کی رپورٹ پولیس تک پہنچتی ہی نہیں تھی۔ جس آدمی کے کوئی اُچکا سو دو سو روپے چھین لے‘ وہ تھانے نہیں جاتا یا کسی میٹر ریڈر کے بھیس میں کوئی سونے کی چوڑیاں یا بالیاں اُتروا کے لے جائے تو شوہر بیوی کی بے وقوفی اور جہالت کو برا بھلا کہہ کے صبر کرلیتا ہے۔ بے چارہ شوہر سونے کی بالی کا نقصان تو دیکھ سکتا ہے‘ کسی نے عزت بھی خراب کی تھی‘ یہ اسے کیسے معلوم ہوسکتا ہے‘ جب تک خود بیوی نہ بتائے اور ہر عورت شوہر سے یہ بات کہتے ہوئے ڈرتی ہے‘ خواہ اسے شوہر پر کتنا ہی اعتماد کیوں نہ ہو۔ قصہ مختصر‘ وہ کبھی پکڑے گئے تو سب انسپکٹر نے انہیں چھڑوالیا یا ہم گواہ بن کے پہنچ گئے۔ جب ہم نے ایک گروہ بنالیا تو ہماری سرگرمیوں کا دائرہ بہت وسیع ہوگیا۔ میں ذرا بد صورت تھا‘ اب بھی ہوں لیکن ماردھاڑ میں ہیرو تھا چنانچہ ٹارزن کہلاتا تھا۔ دو واقعی ہیرو تھے اور لڑکیوں کو اپنی صورت اور سیرت سے متاثر کرنے کا فن جانتے تھے۔ جو اُن کے دام میں گرفتار ہوتی تھیں وہ سب کی دولتِ مشترکہ الگ بنتی تھیں اور ہمارا چوتھا ساتھی جو ایک ماہر فوٹو گرافر تھا‘ ان کی بدنامی کے لمحات کا عکس یوں محفوظ کرلیتا تھا کہ سند رہے اور کام آئے۔ ہر لڑکی کو ہم اسی حد تک نچوڑتے تھے جتنی اس کی استطاعت ہو۔ اتنا پریشان نہیں کرتے تھے کہ وہ تنگ آکے خودکشی کرے یا مستقبل کی پروا کیے بغیر ہمارا بیڑہ غرق کرنے پر تُل جائے پھر ہم لڑکی بھی دیکھ بھال کے منتخب کرتے تھے۔ کسی پولیس افسر‘ صحافی یا فوجی افسر‘ وکیل یا جج کے خاندان کے ساتھ اس قسم کی شرارت ہمیں جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچادیتی۔"

"تمہاری سب حرکتوں سے حاجی بے خبر رہا؟"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ مالی جس پودے کی نشوونما میں خصوصی دلچسپی لے رہا ہو‘ اس کے بڑھنے اور پھلنے پھولنے کی رفتار نہ دیکھتا ہو۔ حاجی نے مجھ میں بدی کے جو بیج بوئے تھے ان کے پھوٹنے سے اُگنے اور پھر بڑھ کے پودے کی صورت اختیار کرنے اور تناور درخت بننے تک ہر مرحلے کی اسے پوری رپورٹ ملتی تھی اور وہ میری ترقی سے مطمئن تھا۔ جب میں نے بی اے پاس کرلیا تو اس نے اچانک مجھے اپنے آفس میں طلب کرلیا۔

اس نے کہا "بدرالدین! ماشاءاللہ سے تم نے بی اے بھی پاس کرلیا۔ اب انشاءاللہ سے اپنی ذمے داریاں بھی پوری کروگے۔ الحمدُ للہ سے ہم نے تو جو ذمے داری قبول کی تھی وہ بطریقِ احسن پوری کرنے کے لیے اس معبودِ حقیقی نے ہمیں توفیق بخشی۔ ہمارا قرض تھا ہم نے چُکادیا۔ تمہارا قرض تم چُکاؤ گے۔"

پہلے تو میں سمجھا نہیں تھا کہ وہ کیا بات کررہا ہے مگر پھر اس نے کھل کے کہا کہ "میاں پیسے پیسے کا حساب رکھنا تو ممکن نہیں تھا مگر دیکھ لو تاریخ وار اس میں سب کچھ درج ہے۔ میں ایک بات بتانی بھول گیا۔ وہ جب مجھے رقم دیتا تھا‘ ایک ڈائری میں تاریخ ڈال کے لکھ لیتا تھا اور مجھ سے دستخط ضرور کرواتا تھا۔"

"اور تم کردیتے تھے؟"

"دراصل میں سمجھتا تھا کہ وہ پاگل ہے۔ وہ اسی طرح بیوی سے دوسری ڈائری میں دستخط لیتا تھا اور معلوم ہے دلیل کیا دیتا تھا؟ ایک حدیث سناتا تھا کہ ارشادِ نبویؐ ہے کہ لین دین کے معاملات کو لکھ لیا کرو۔ حرام زادہ‘ کاروبار اور گھر کے معاملات کو ایک کرنے کی کیسی غلط تاویل لاتا تھا۔ بیوی اس کی عادی تھی‘ بیٹے بھی مجبور تھے پھر میں کیوں انکار کرتا۔ انتہا یہ ہے کہ اس نے جب میری فیس ادا کی‘ میرے لیے کتابیں خریدیں یا جوتے کپڑے لیے‘ ان کا بھی اندراج کیا۔ وہ کہتا تھا کہ یہ میں اپنے حساب کتاب کو درست رکھنے کے لیے کرتا ہوں اور آنے والے کل کے لیے۔ زمانہ بڑا خراب جارہا ہے۔ نافرمان اولاد کا کیا بھروسا! کل کو ہمارے سامنے سینہ تان کے کھڑی ہوجائے اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہے کہ ابا میاں‘ پیدا کرنے کے سوا آپ نے ہمارے لیے کیا کیا۔ اور وہ بھی ہم نے تو نہیں کہا تھا۔ سو میاں‘ اس وقت یہ دستاویز ایک آئینہ ہوگی‘ اندازہ کرو وہ کتنا خبیث اور ذلیل آدمی تھا۔ ایسے باپ کہیں دیکھے ہیں تم نے؟ جب اس نے ڈائری میرے سامنے رکھ کے مجھے بتایا کہ تمہارے ذمے اتنے واجب الادا ہیں تو میں بھڑک گیا۔ میں نے لاکھوں کے حساب کو پھاڑ کے ٹکڑے ٹکڑے کردیا۔ وہ داڑھی پر ہاتھ پھیرتا رہا اور سکون سے دیکھتے ہوئے "استغفراللہ استغفراللہ" کرتا رہا۔ میں بہت چیخا چلایا کہ کیا وہ سب قرض تھا اور قرض تھا تو مجھے بتایا کیوں نہیں۔ اس نے کہا کہ میاں! ماشاءاللہ سے تم خود سمجھ دار ہو۔ اس میں بتانے والی تو بات بھی نہیں تھی۔ جو کچھ آدمی غیروں سے لیتا ہے‘ سب قرض ہوتا ہے۔ اولاد کا تو حق بنتا ہے مگر تمہارا حق ثابت نہیں ہوتا الحمدُ للہ سے۔ قرض تو باقی رہے گا‘ خواہ تم حساب کتاب کو دس بار پھاڑ دو یا سو بار جلادو۔ میں نے کب اصل حساب پیش کیا تھا‘ یہ فوٹو اسٹیٹ کاپی تھی۔ مزید نقول درکار ہوں تو بتادینا۔ اور خیر سے یہ بات مت بھولنا کہ جو اتنا لمبا قرض دیتے ہیں وہ سب بے وقوف نہیں ہوتے۔ اپنا قرض وصول کرنا جانتے ہیں ہم۔ اس دن کے بعد وہ اچانک بدل گیا۔ شاید وہ اسی دن کے انتظار میں تھا۔ اس نے مجھ سے تمام جذباتی رشتے منقطع کرلیے جو درحقیقت اپنا کوئی وجود بھی نہیں رکھتے تھے۔ بس مجھے احساس تھا کہ میری پرورش کرنے والا میرے باپ کی جگہ ہے۔ میری خوشی کی خاطر سب کچھ کرتا ہے اور دوسروں کے مقابلے میں بڑھ کر۔ لیکن وہ ایک شکاری تھا جو مجھے اپنے قرض کے جال میں جکڑ رہا تھا۔ اس کی مہربانیاں مکڑی کے جالے کی طرح میرے چاروں طرف وہ جال بُن رہی تھیں جن سے نکلنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ پہلے میں نے سمجھا تھا کہ مجھ سے بڑا شکاری کون ہوسکتا ہے جس کے صبح و شام ہی شکار میں بسر ہورہے ہیں مگر رفتہ رفتہ میری

سمجھ میں آگیا کہ وہ بھی میری بھول تھی اور میں حاجی کے پھیلائے ہوئے جال میں خود الجھ رہا تھا۔ اسے میری ایک ایک حرکت کا علم تھا۔ میری تمام عیاشیوں کا پتا تھا۔ میری سب قانون کی خلاف ورزیوں کا پتا تھا‘ اس کے پاس دن تاریخ کے حساب سے میرا نامۂ اعمال لکھا ہوا تھا اور اس کا دعویٰ تھا کہ وقتِ ضرورت وہ ثبوت‘ گواہ سب فراہم کردے گا۔ اچانک اس نے تمام مہربانیوں سے ہاتھ کھینچ لیا‘ مجھے خرچ دینا بند کردیا اور اس کے جاسوس میرا تعاقب کرنے لگے۔ میں تنگ دستی کا شکار ہوگیا اور وہ دوست میرا ساتھ چھوڑ گئے جو صبح و شام رفاقت کا دم بھرتے تھے۔ حاجی نے انہیں ڈرایا‘ مجھ سے بدظن کردیا یا ان پر میری حقیقت آشکارا کردی کہ میں اس کا بیٹا نہیں ہوں‘ ایک مراثی کی ناجائز اولاد ہوں جس نے اپنی بدچلن ماں کو اس کے آشنا کے ساتھ قابلِ اعتراض حالت میں دیکھ کر دس سال کی عمر میں قتل کردیا تھا۔ نہ جانے کیسے وہ سب لڑکیاں جو مجھے اپنی عزت کا خراج دیتی تھیں‘ باغی ہوگئیں اور میں نے کسی سے رابطہ قائم کیا تو مقررہ مقام پر مجھے مطلوبہ رقم ملنے کے بجائے بے بھاؤ کی پڑیں۔ وہ نامعلوم لوگ میری ہڈی پسلی ایک کرکے اور مجھے دھمکی دے کر چلے گئے کہ دوبارہ میں نے کوئی توقع رکھی تو میرے ساتھ اس سے بری ہوگی اور میں نے بلیک میلنگ کا حربہ آزمایا تو میری لاش کا پتا نہیں چلے گا۔ ایک بار نہیں مسلسل تین مرتبہ ایسا ہوا۔ میرے لیے راستے بند ہوتے جارہے تھے اور میں اکیلا ہر طرف سے محصور ہونے لگا تھا۔ کسی پیشہ ور اور ماہر شکاری کی طرح حاجی عبداللہ فرار ہونے والے شکار کو گھیر کر اپنے جال میں لایا تھا۔ میری شکست اس وقت ہوئی جب اچانک میرے پرانے دشمن نمودار ہوگئے۔ زمیندار کے خون کا بدلہ لینے والوں نے مجھے گھیر لیا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ ابھی تک میں حاجی عبداللہ اور اس پولیس انسپکٹر کی پناہ میں تھا اور ان کی وجہ سے کسی کو جرأت نہیں ہوئی تھی کہ میری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے ورنہ میں کیا اور میری اوقات کیا! زمیندار کے وارث اب خود زمیندار تھے اور انہیں برسوں پرانا انتقام اچانک یاد آگیا تھا۔ دراصل انہیں بھی کہا گیا تھا کہ چلو اب اپنا بدلہ لے لو۔ تمہارا مجرم اکیلا اور بے بس ہے۔ وہ انسپکٹر ڈی ایس پی ہوچکا تھا۔ اس کے حکم پر پرانے قتل کی فائل پھر کھولی گئی اور مُدعی خون کا دعویٰ لے کر آگئے۔ نہ چاہنے کے باوجود ان میں ڈی ایس پی کے حکم سے سرتابی کی مجال نہ تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اب یا تو وہ خود مجھے ٹوکے سے دو ٹکڑے کردیتے‘ میرا کون والی وارث تھا جو میرے خون کا دعویٰ کرتا۔ یہ نہ ہوتا تو وہ اعلیٰ حکام کو یا عدالتِ عالیہ کو درخواستیں دے کر پرانے کیس کو پھر زندہ کرتے اور یہ بھی نہ ہوتا تو ایک ڈی ایس پی میرے سر کسی کا خون بھی تھوپ سکتا تھا۔ کسی بھی قتل میں مجھے ملوث کردیا جاتا اور باقی کام پولیس خود کرتی۔ تمہیں معلوم ہے وہ کون ڈی ایس پی تھا جس نے انسپکٹر کی حیثیت سے مجھے تحفظ فراہم کیا تھا‘ عدالتی کارروائی میں میری مدد کی تھی اور بالآخر مجھے حاجی عبداللہ کے سپرد کردیا تھا۔"

میں نے سوچ کے کہا "کیا وہ بعد میں ایس ایس پی ہوگیا تھا۔ ایس ایس پی سراج؟"

پیڈرو نے بے ساختہ کہا "بالکل ٹھیک۔ سو فیصد صحیح اندازہ کیا تم نے۔ وہ اور حاجی عبداللہ پہلے سے دلاور کے ساتھ تھے۔"

میں نے کہا "یہ اس وقت کی بات ہوگی جب دلاور نے میرے والد کے ساتھ کاروبار میں شرکت اختیار نہیں کی تھی۔ میرے والد پہلے اکیلے تھے پھر میر شرافت علی سے ان کی پارٹنر شپ ہوئی۔ چوہدری دلاور کے شامل ہونے کے بعد میر وزیر اینڈ کمپنی ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلکس بنی تھی۔"

"یہ تقریباً اسی زمانے کی بات ہے۔ اس وقت تو سراج ایس پی تھا اور اسی نے دلاور کو مشورہ دیا تھا کہ وہ شاہدرہ کی ایک فیکٹری میں سرمایہ لگا کے اس پر قبضہ کرنے کی کوشش کرے۔ تمہارے والد کی فیکٹری میں زرعی مشینری کے پُرزے اور آلات بنتے تھے۔ سراج کے ذہن میں سب سے پہلے اسے ایک اسلحہ ساز فیکٹری میں بدلنے کا خیال آیا تھا۔ ساری اسکیم اس نے سوچی تھی اور دلاور کو بتایا تھا کہ مستقبل میں اس سے کیا فائدہ ہوگا۔"

میں نے کہا "سراج مرچکا ہے۔ اب تم اس سے کچھ بھی منسوب کرسکتے ہو۔"

"کیا تم جانتے نہیں کہ ہماری اصل طاقت سراج تھا؟"

"ضرور رہو گا مگر اس کے مرنے سے کیا فرق پڑا؟"

"فرق یہ پڑا کہ دلاور اس کاروبار کو بند کرنے پر مجبور ہوگیا۔ خوفِ خدا کے باعث اس نے فیکٹری کی جگہ خالی نہیں کی تھی۔ اور اپنے دوست کے ساتھ دغا کرنے کی شرمندگی نے اسے وہاں ایک اسپتال قائم کرنے پر مجبور نہیں کیا تھا۔ وزیر خان ٹرسٹ اسپتال کبھی قائم نہ ہوتا اگر ایس ایس پی سراج نہ مارا جاتا۔ وہ ایک رابطہ تھا ہمارے اور اوپر والوں کے درمیان جو ہمارے لیے راستے کھلے رکھتے تھے۔ کوئی عام آدمی یہ کام نہیں کرسکتا تھا کہ بھارت پاکستان کی سرحدوں کو ہمارے لیے کھلوادے۔"

میں اس کی باتوں سے عجب سی بے چینی محسوس کررہا تھا۔ مجھے یہ خیال آرہا تھا کہ قصور وار پیڈرو نہیں تھا‘ دلاور تھا یا حاجی عبداللہ تھا اور ایس ایس پی سراج تھا جو جہنم رسید ہوچکا تھا۔ آج تک میری نظر میں استاد پیڈرو کی حیثیت ایک پیشہ ور مجرم اور قاتل کی تھی اور میں اس کے خون کا اس لیے پیاسا تھا کہ میں اسے اپنے والد کے قاتل کے روپ میں دیکھتا تھا اور اسے تختۂ دار پر پہنچانا میری زندگی کا مشن تھا۔ اچانک اس یقین کی بنیادیں شک کے زلزلے سے ہلنے لگی تھیں۔ پیڈرو اپنی باتوں سے مظلوم کی حیثیت اختیار کررہا تھا۔ وہ ثابت کررہا تھا کہ اس نے جو کچھ بھی کیا اس میں حالات کی مجبوری کا دخل تھا۔ اسے آلۂ کار کے طور پر استعمال کیا

گیا تھا اور اگر وہ ایسا نہ کرتا تو خود بھی مارا جاتا۔

میں نے کہا "میری سمجھ میں نہیں آتا پیڈرو کہ میں کیسے تمہاری باتوں کا یقین کروں۔ چوہدری دلاور کہتا ہے کہ میرے والد کے قاتل تم ہو۔ قتل صرف تم نے کیا تھا۔ تم کہتے ہو اپنی مرضی سے تم نے کچھ نہیں کیا تھا۔ سب کچھ تم سے ایس ایس پی سراج نے کروایا تھا۔ یا حاجی عبداللہ نے۔ میں نے تو تمہیں پہلے دن سے دلاور کے ساتھ دیکھا تھا۔"

"تم نے مجھے بہت بعد میں دیکھا۔ جب حاجی عبداللہ اور سراج نے اپنی اپنی نیک نامی کا بھرم رکھنے کے لیے بندوق دلاور کے کندھے پر رکھ دی تھی۔ ایک کو اپنے حاجی ہونے کی وجہ سے دنیا میں داغِ رُسوائی منظور نہ تھا' دوسرے کو اپنے عہدے کے باعث کسی قسم کا الزام گوارا نہ تھا۔ انہوں نے مجھے دلاور کے سپرد کردیا تھا۔ مجھ سے پہلے ڈی سوزا تقریباً ایسے ہی حالات میں ان کی غلامی قبول کرچکا تھا۔

میں نے کہا "مجھے کبھی احساس نہیں ہوا کہ تم یا ڈی سوزا بے بس ہو اور جو کچھ کرتے ہو مجبوری میں' ڈر یا خوف کے باعث کرتے ہو تم اپنی عقل اور ذہانت کا پورا استعمال کرتے تھے' مجھے ہر ذہنی و جسمانی اذیت دینے کے لیے۔"

"غلام کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ شاہ سے زیادہ شاہ کا وفادار نظر آئے۔"

"میں نہیں مانتا۔ دلاور تم پر الزام عائد کرتا ہے' تم دلاور کو مجرم ٹھہراتے ہو۔ وہ مجھے تاوان ادا کرنے کے لیے تیار ہے۔ مجھ سے مصالحت کی ہر شرط اسے منظور ہے' سوائے ایک شرط کے۔ وہ خود کو قانون کے حوالے کرنا نہیں چاہتا۔ وہ پھر مجھے خریدنے کی کوشش کررہا ہے مگر اس بار مختلف انداز سے۔ تم آج اچانک میرے سامنے صفائی پیش کررہے ہو کہ تم کو سمجھنے میں مجھ سے غلطی ہوئی تھی۔ تم ظالم نہیں' تم تو مظلوم ہو' میں سب سمجھتا ہوں تمہاری عیّاری اور مکّاری کو۔ دلاور اور تمہارے درمیان اختلاف کی وجہ کچھ بھی ہو' ایک بات پر تمہارے درمیان اتفاق ہوگیا ہے کہ سکندر بخت کو اب پیار محبت کے جھوٹ کا جال پھیلا کے' دوستی کا فریب دے کر' معافی تلافی کے وعدوں پر بے وقوف بنا کے زیرِ دام لاتا ہے۔ تم سب وہی پرانے شکاری ہو۔ بس تم بدلے ہوئے حالات میں اپنی حکمت عملی بدل چکے ہو۔ تم دونوں کو میری دشمنی کی بہت بھاری قیمت ادا کرنی پڑی تھی۔ اب تم اس کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ تم دونوں اپنے اپنے مفاد میں یہ چاہتے ہو کہ میں کل کی باتیں بھلادوں..."

"تم سے میں نے کچھ بھی نہیں مانگا ہے ابھی تک" استاد پیڈرو نے میرے خاموش ہوجانے کے بعد کہا۔

میں فرطِ جذبات میں آپے سے باہر ہوگیا تھا۔ مجھ پر دشمنی کے پرانے جذبات غالب آگئے تھے۔ پیڈرو کی باتوں نے وقتی طور پر مجھے اس کا ہم خیال بنادیا تھا اور میں سوچنے لگا تھا کہ شاید مجھ سے پیڈرو کو سمجھنے میں غلطی ہوگئی تھی حالانکہ غلطی یا غلط فہمی کا کوئی سوال نہ تھا۔ ایسے ان گنت واقعات کے زخم میرے سینے میں سُلگ رہے تھے جو پیڈرو کے شیطانی کی کارستانی کا نتیجہ تھے۔ وہ دلاور سے بڑھ کے میرا دشمن تھا اور اس نے ایک اذیت پسند' سفاکانہ اور انتقامی طرزِ عمل اختیار کرتے ہوئے مجھ پر انسانیت سوز مظالم توڑنے کی انتہا کردی تھی۔ اب وہ اس دلیل کی آڑ لے رہا تھا کہ اس کے لیے دلاور اور سراج کو اپنی اعلیٰ کارکردگی سے مطمئن رکھنا ضروری تھا۔

"اگر تمہیں مجھ سے کچھ نہیں چاہیے تو پھر یہاں کیوں بلایا ہے تم نے مجھے؟" میں نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا "صرف اپنی مظلوم و مجبور و محکوم زندگی کی کہانی سنانا تو تمہارا مقصد نہیں تھا۔"

"ہرگز نہیں" وہ بولا "میں تو تمہیں کچھ دینا چاہتا تھا۔"

"تم! تم کیا دوگے مجھے' میرا سب کچھ لینے کے بعد!" میں نے تلخی سے کہا "دلاور نے مجھے بتادیا ہے پیڈرو کہ کس طرح تم نے میرا تعاقب کیا' میری جان لینے کی کوشش کی۔"

"اور تم نے یقین کرلیا اس پر؟"

"میں کیوں یقین نہ کرتا؟ میں نے دیکھا تھا تمہیں' رابعہ نے اور کاجل نے دیکھا تھا۔ تم ایک گاڑی میں مسلسل ہمارے پیچھے لگے ہوئے تھے" میں نے غصے میں میز پر مُکا مارا۔

"یہ ٹھیک ہے..."

"کیا یہ ٹھیک نہیں ہے کہ تم نے ہمیں خوف زدہ کرنے کے لیے اپنی موجودگی کا احساس دلایا؟ تم نے اشارے کیے رابعہ اور کاجل کو؟ اور تم اس ہوٹل میں ٹھہرے تھے جس میں میرا قیام تھا۔ کیا یہ غلط ہے کہ تم نے آفریدی کی جیپ میں بم رکھ کے اسے تباہ کردیا تھا۔ ہم بال بال بچ گئے تھے۔ پھر تم نے ریسٹ ہاؤس کو اُڑا دیا تھا؟"

"تم پھر بال بال بچ گئے تھے" پیڈرو غیر سنجیدہ لہجے میں بولا "تم کو میں اتنا احمق نہیں سمجھتا سکندر۔ غصے نے تمہاری عقل کو مفلوج کردیا ہے۔ جب پیڈرو کسی کو نیست و نابود کرنا چاہے تو وہ بال بال بچتا نہیں۔ پیڈرو کا نشانہ اتنا کچا نہیں ہے کہ جسے وہ شکار کرنا چاہے وہ بچ کے نکل جائے۔"

"کیا یہ غلط ہے کہ راولپنڈی سے پشاور تک تم ہمارے پیچھے لگے رہے تھے اور اس گاڑی کا نمبر بدلتے رہے تھے؟"

"مگر اس سے یہ تو ثابت نہیں ہوتا کہ میں تمہاری جان لینے کے لیے ایسا کررہا تھا۔ میں تو خود تم سے ملنا چاہتا تھا" پیڈرو بولا "لیکن تم نہ جانے کیا سمجھ کے آگے آگے بھاگتے رہے۔ مجھے کوئی موقع نہیں ملا تم سے بات کرنے کا۔"

"یعنی تم انکار کرتے ہو تمام تخریبی کارروائیوں کی ذمّے داری قبول کرنے سے؟"

"بالکل۔ یہ دلاور کا کام تھا۔"

میں نے طنز سے کہا "وہ تم پر الزام لگاتا ہے۔ تم دونوں سمجھتے ہو شاید۔"

"میں جانتا ہوں' تم آسانی سے قائل نہیں ہوسکتے لیکن اب جو باتیں میں تمہیں بتانے والا ہوں' وہ شاید ایک ثبوت ہو۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے دوست کہاں ہیں؟"

"نہیں۔ اور اس کے ذمے دار بھی تم ہو۔ تم یا دلاور۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تمہارا ایک دوسرے سے اختلاف بھی ڈراما ہو۔ محض نورا کشتی ہو۔ دلاور نے ہی یہ اسکیم بنائی ہو کہ تم میرے دشمنوں سے مل جاؤ اور انہیں قائل کرو کہ اب دلاور سے میرا کوئی تعلق نہیں رہا بلکہ ہم تو ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔"

پیڈرو نے دونوں ہاتھ پھیلائے "تمہارے اندیشے غلط نہیں۔ تم جو بھی فرض کررہے ہو ماضی کے تجربات کی بنا پر کررہے ہو۔ خیر وقت آنے پر ہر ثبوت مل جائے گا تمہیں۔ ابھی تو میں تم کو صرف غالب اور نازو کے بارے میں بتا سکتا ہوں۔"

ہم ابھی تک کھانے کی میز پر ایک دوسرے کے مقابل بیٹھے ہوئے تھے اور یہ بڑی عجیب صورت حال تھی جس کا میں تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ کبھی میں پیڈرو جیسے دشمن کے گھر میں' اس کی میز پر' اس کے ساتھ بیٹھ کے اسی کا نمک کھاؤں گا۔

میں جھنجلاہٹ اور بیزاری کا شکار تھا اور کسی قدر نادم اور رنجیدہ تھا کہ میں نے مجبوری کے باوجود پیڈرو کی میزبانی کیوں قبول کی۔ میں اپنی انا کی خاطر اپنی ہٹ پر قائم رہتا' دشمنی کا رشتہ برقرار رکھتا' اس کی ہر پیشکش کو ٹھکرا دیتا' اس کی بات نہ سنتا اور اس کے گھر میں بھوکا مرجاتا مگر اس کے ساتھ کھانے کی میز پر نہ بیٹھتا۔ یہ سب جوش کے جذبات تھے اور قوتِ فیصلہ سے محرومی کا نتیجہ تھے۔ میں یہ طے کرنے سے قاصر تھا کہ دلاور اور پیڈرو مل کے کتنا جھوٹ بول رہے تھے اور کتنا سچ۔ ان پر یقین کرنا غلط تھا' خلافِ مصلحت تھا اور ناممکن تھا۔ مگر دوسری طرف واقعات اور حالات کا رخ دیکھ کے میری عقل چکرا جاتی تھی۔

غالب اور نازو کا نام شاید تُرپ کا پتّا تھا جس کو پیڈرو نے ابھی تک سنبھال رکھا تھا اور بازی کمزور پڑنے لگی تو اس نے یہ پتّا بھی میرے سامنے ڈال دیا اور اس پتّے نے خاطر خواہ طور پر بازی پھر پیڈرو کے حق میں کردی۔ میں وہ سب کچھ بھول گیا جو کہہ رہا تھا یا سوچ رہا تھا اور کہنے والا تھا۔

میری سماعت سے یہ الفاظ یوں ٹکرائے کہ ان کی بازگشت میں نے سنگین خیالوں کے درمیان کیے جانے والے فائر کی طرح بار بار سُنی۔

"تم نے غالب اور نازو کا نام لیا تھا!" میں نے سکتے کی کیفیت سے نکل کے بے یقینی کے ساتھ پیڈرو کو دیکھا۔

"ہاں۔ کیا تمہیں اندازہ تھا کہ وہ کہاں ہوسکتے ہیں؟"

"ہاں۔ انہیں سی ایم ایچ نوشہرہ سے اس کا بھائی بن کے کوئی لے گیا تھا" میں نے مشتعل ہو کے کہا "گران کو اغوا کیا گیا تھا۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اس کا کوئی بھائی نہیں تھا' تم نے قید کر رکھا ہے اسے؟"

"میں نے!" پیڈرو اٹھ کھڑا ہوا "دنیا میں جو کچھ ہورہا ہے پیڈرو نہیں کررہا ہے۔ ساری خرابی کا ایک میں ہی ذمے دار نہیں رہ گیا ہوں۔ آؤ اندر چل کے بات کرتے ہیں۔"

ایک بار پھر ہم اس کمرے میں پہنچ گئے جس کو ڈرائنگ روم ہی کہا جاسکتا ہے۔ دشمن بھی ایک مُدت کے بعد صرف کمزوریوں سے ہی واقف نہیں ہوتے' ایک دوسرے کے مزاج آشنا بھی بن جاتے ہیں۔ پیڈرو کو معلوم تھا کہ میں کافی شوق سے پیتا ہوں' خصوصاً کھانے کے بعد۔ کمرے میں کافی پہلے سے موجود تھی۔

"غالب اور نازو میری قید میں نہ تھے' نہ ہیں" پیڈرو نے میری اضطراری کیفیت کو دیکھتے ہوئے کہا "ان کو اغوا کرانے میں دلاور کا ہاتھ تھا۔ اب تم پھر کہوگے کہ یہ بات میں دشمنی میں کہہ رہا ہوں۔ لو کافی پیو' میں بتاتا ہوں تمہیں۔"

"اگر تم جانتے ہو تو پہلے مجھے ان کے پاس لے چلو' یا وہ اس گھر میں پہلے سے موجود ہیں تو ختم کرو یہ ڈراما اور انہیں بلاؤ۔ وہ ٹھیک تو ہیں نا؟"

"وہ ٹھیک ہی ہوں گے" پیڈرو بولا۔

"کیا مطلب ہوں گے سے' جب تم جانتے ہو..." میں نے بگڑ کے کہا۔

"میں یہ جانتا ہوں کہ وہ کہاں ہیں۔ میں تم کو ان سے ملوانے کے لیے نہیں لے جاسکتا۔ تمہیں ان کا پتا بتا سکتا ہوں۔ آخری اطلاعات تک وہ ٹھیک ٹھاک تھے" پیڈرو بولا۔

میں نے کافی کو چند گھونٹ میں حلق سے اتار لیا "اچھا پھر چلو۔ تم نے وہ بات آخر میں بتائی جو سب سے پہلے بتانی ضروری تھی۔ اپنی لائف اسٹوری سناتے رہے۔ چلو اٹھو..."

اس نے مجھے ہاتھ سے اشارہ کیا "گھبراؤ نہیں۔ اتنی جلدی کی ضرورت نہیں۔ ہم صبح جائیں گے۔"

"میں صبح تک انتظار نہیں کرسکتا" میں نے چلّا کے کہا۔

"اس وقت میں تم کو نہیں لے جاسکتا سکندر..."

"تمہارا تو باپ بھی جائے گا میرے ساتھ" میں نے ایک دم اسے دبوچ لیا اور اس کی گردن قابو میں کرلی۔

اس نے بالکل مزاحمت نہیں کی اور کسی کو مدد کے لیے آواز نہیں دی' تالی بجا کے کسی کو طلب نہیں کیا مگر اس کے بھی نادیدہ محافظ تھے جو سامنے آئے بغیر اس کی حفاظت کرتے تھے۔ دو طرف کے پردے ہٹا کے دو ملازم ریوالور کا رخ میری طرف کیے نمودار ہوئے۔ یہ وہی ویٹر تھے جو اس سے پہلے ڈرائیور کی ڈیوٹی بھی دے چکے تھے۔ تیسری نال مجھے اوپر ایک روشندان سے بھی جھانکتی دکھائی دی۔ اس کا رخ بھی میرے سراپا سینے کی طرف تھا۔ پیڈرو نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں واپس کردیا۔

"آرام سے بیٹھو سکندر' تم کو مہمان کہا ہے میں نے تو تمہارے ساتھ کسی کو زیادتی کی اجازت نہیں دے سکتا" پیڈرو بولا "میں بتاتا ہوں تمہیں' پہلے میری بات سمجھ لو پھر جو چاہو فیصلہ کرنا۔"

میں نے اسے چھوڑ دیا اور پھر اس کے مقابل صوفے پر بیٹھ گیا۔

"میں سُستی یا بزدلی کی وجہ سے صبح تک انتظار کرنے کا نہیں کہہ رہا تھا" وہ بولا "رات کے وقت تمہارے لیے زیادہ مشکلات ہوں گی۔ ایسا نہ ہو کہ ان سے ملنے کے چکر میں تم خود کسی مصیبت میں پڑ جاؤ۔"

"اور دن میں کیا انہیں آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے؟ گارڈ ہٹالی جاتی ہے؟"

"دن میں راستے کی رُکاوٹیں صاف نظر آتی ہیں۔ میں نے ان تک تمہارا پیغام پہنچا دیا ہے۔"

"کیسا پیغام؟" میں نے بے چینی سے کہا۔

"یہی کہ ایک آدھ دن میں تم پہنچنے والے ہو۔ کیا اس نے تم سے بات نہیں کی تھی؟"

"اس نے فون تو کیا تھا لیکن میری اس سے بات نہیں ہو سکی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس نے منظر کے گھر سے فون کیا ہوگا۔"

"نہیں۔ فون تک ان کی رسائی نہیں تھی۔ لیکن میں نے اندر ہی اندر ایسا انتظام کیا کہ ان کو موقع مل گیا۔ ان کی حفاظت کرنے والوں میں سے ایک نے یہ کام کیا مگر دوسرے لوگوں نے ولاور سے شکایت کردی۔ ولاور نے وہاں سے فون کی لائن ہی کٹوادی اور اس نمک حرام کو ٹیلی فون کے کھمبے پر لٹکا دیا۔ بے چارے کو موقع ہی نہ مل سکا وہاں سے نکلنے کا ورنہ وہ میرے پاس آنے والا تھا۔ بڑی اذیت ناک طریقے پر اس کی موت واقع ہوئی۔ ولاور نے کھمبے میں کرنٹ چھوڑ دیا اور وہ جھٹکوں سے تڑپ تڑپ کے روسٹ ہو گیا۔ اس کا جسم کالا پڑ گیا تھا۔"

"مجھے افسوس ہوا یہ سُن کر" میں نے کہا "مگر کیا ٹیلی فون کا کھمبا اس کے گھر میں لگا ہوا تھا؟ کسی نے دیکھا نہیں؟"

"رات کے وقت اسے قتل کیا گیا تھا۔ کپڑے اتار کے اور منہ میں کپڑا ٹھونس کے' اسے سب ملازموں کے سامنے ہلاک کیا گیا۔ ظاہر ہے اب دوسرے زیادہ چوکس ہیں۔"

میں نے متفکر ہو کے کہا "پھر ہم کیسے اندر جائیں گے؟"

"ایک طریقہ تو یہ ہے کہ تم پولیس کے ساتھ چھاپا پڑوا دو۔ تم کہہ سکتے ہو کہ کچھ مجرموں نے ایک صحافی کو' اس کی بیوی کو یہاں قید کرکے یرغمال بنا رکھا ہے۔"

میں نے کہا "مگر میں کس حیثیت میں پولیس اور مجسٹریٹ کو مجبور کر سکتا ہوں کہ وہ اتنا بڑا قدم اٹھائیں؟"

"میرا خیال تھا کہ تم سب کچھ کر سکتے ہو۔"

میں نے سوچتے ہوئے کہا "اندر کتنے محافظ ہوتے ہیں؟ وہ جگہ کہاں ہے؟ اس کا نقشہ سمجھاؤ مجھے اور یہ بتاؤ کہ چھاپا پڑنے کی صورت میں غالب اور نازو کی زندگی کو کسی قسم کا خطرہ تو لاحق نہیں ہوگا؟"

"انہیں کیا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے؟"

"یہ دیکھتے ہوئے کہ اب انہیں قید نہیں رکھا جا سکتا' ان کو گولی ماردی جائے۔"

"کس کے حکم سے؟ ولاور کا حکم ہے کہ انہیں مہمانوں کی طرح عزت سے رکھا جائے۔ اور چھاپا اچانک پڑے تو کسی کو موقع ہی کہاں ملے گا کہ ولاور سے ہدایات لے سکے۔ اندر زیادہ سے زیادہ چند افراد ہوں گے۔ وہ از خود اتنا بڑا فیصلہ نہیں کر سکتے۔ اس کے علاوہ مجرموں کا ایک ذہن ہوتا ہے۔ چوری کی نیّت سے یا ڈاکا ڈالنے کے لیے آنے والا قتل کبھی نہیں کرتا۔ ایک قتل کا ارادہ رکھنے والا دوسرے قتل کا مُرتکب ہونے سے گریز کرتا ہے۔ کسی صحافی کو زندہ قید میں رکھنا خاصا بڑا جرم ہے۔ اسے مار دینا تو ناقابلِ تلافی جرم ہو جائے گا۔ خود ولاور موجود ہوتا تو وہ بھی ایسا حکم نہ دیتا۔ اب صبح تک آرام کرو اور سوچو کہ تم کیا کر سکتے ہو۔ کچھ نہ ہوا تو میں دوسرا مشکل اور خطرناک طریقہ اختیار کروں گا۔"

"وہ کیا ہے؟"

"براہِ راست حملہ' تصادم۔ دو چار اِدھر کے مارے جائیں دو چار اُدھر کے اور کام ہو جائے۔"

میں نے کہا "ہرگز نہیں۔ نہ میں ایسا کر سکتا ہوں' نہ تمہیں کرنے دوں گا۔ ہر آدمی کی جان کی قیمت ہوتی ہے۔"

"لیکن ایک نہیں ہوتی" پیڈرو نے کہا۔

"یہ غلط ہے' اتنے لوگوں کا خون...."

"یہ صحیح ہے کیا دوست کی جان اور دشمن کی جان کی تم وہی قیمت لگاؤ گے؟" پیڈرو نے میری بات کاٹ دی "مجھے معلوم ہے اپنے سکندر صاحب! تم مجھے' ولاور کو اور میرے جیسے دس کو مار سکتے ہو اپنے ہر ساتھی کے لیے۔"

"تم کو میں یقیناً مار سکتا ہوں اور اپنے ہر دشمن کو کسی بھی مقصد پر قربان کرنا قتل نہیں ہوتا۔ لیکن تم میری خاطر اپنے آدمی مروا دو' یہ خون کا قرض میں نہیں لے سکتا۔ اس احسان کو قبول کر لینے کے بعد کیا جواز رہ جائے گا تم سے دشمنی کا؟ تم بھی احسانوں سے خریدنا چاہتے ہو مجھے۔ یہ ناممکن ہے۔"

"بات احسان کی نہیں۔ مگر تم بعد میں سمجھو گے" پیڈرو بولا "ویسے کیا تمہاری جاں بخشی میرا احسان نہیں۔"

"یہ مجبوری ہے تمہاری۔"

وہ طنز سے ہنسا "مجبوری.... کیا مجبوری ہے مجھے؟ تم کو یہ عزت' آرام دینے کے بجائے میں کسی کوٹھری میں ڈال دیتا اور بھوکا پیاسا رکھتا تو تم کیا بگاڑ لیتے میرا؟ اور کیا یہ احسان شمار نہیں ہوگا کہ میں نے تمہیں غالب اور نازو کا پتا دیا۔ میں لے جاؤں گا تمہیں اس جگہ تک جہاں وہ قید ہیں۔ ان کی رہائی میری وجہ سے ہوگی۔ تم خود جھک مارتے رہتے ساری عمر تو تمہیں ان کا پتا نہ ملتا۔"

میں نے محسوس کیا کہ اس کی باتوں کو جھٹلایا نہیں جا سکتا "ایک نہ ایک دن ولاور خود چھوڑتا انہیں۔"

"اس دن جب وہ تم سے اپنی دس باتیں منوا لیتا۔"

"باتیں کیا تم نہیں منواؤ گے؟" میں نے کہا "جو کچھ تم کر رہے ہو نیک نیتی سے' کسی مقصد کے بغیر تو نہیں کر رہے ہو۔"

"جب ماں باپ' اولاد کے لیے دُکھ اپناتے ہیں تو ان کے سامنے بھی ایک مقصد ہوتا ہے کہ بڑھاپے میں اولاد ان کو دُکھی نہ ہونے دے۔" پیڈرو بولا۔

"بہتر ہوگا' اگر تم اپنے مطالبات اور اپنی شرائط مجھے ابھی بتا دو تاکہ میں صبح تک ان پر غور کرلوں اور پھر فیصلہ کروں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔"

"میرا کوئی مطالبہ نہیں' کوئی شرط نہیں۔ میں نے اپنی صفائی پیش کردی' وضاحت کردی کہ تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا اس میں میرا قصور تھا تو کس حد تک۔ تمہیں بتا دیا کہ اب ولاور میرا دشمن ہو رہا ہے۔ ایک بڑے دشمن کے خلاف دو کمزور دشمن مل جائیں تو...."

"یہ ہے نا تمہارا مقصد!" میں نے اس کی بات کاٹ کے کہا۔

"تم انکار کر سکتے ہو" وہ بولا "مگر میں بہت مدد کر سکتا ہوں' تمہارے کام آسکتا ہوں۔ ولاور کے عزائم بہت خطرناک ہیں۔ میں تو ایک عام سا مجرم ہوں۔ ناجائز دھندوں سے پیسہ کمانے والا۔ اسمگلر اور ہر قسم کے غیر قانونی کاروبار سے پیسہ کمانے والا۔ میرے خلاف تو بہت سے ادارے ہیں۔ پولیس' اسپیشل پولیس' خفیہ پولیس' سی آئی اے' ایف آئی اے اور انٹرپول تک۔ ولاور بھی کل تک ساتھ تھا مگر اب وہ اونچی پرواز کرنے کے لیے پر تول رہا ہے۔ تم جسے غدار اور وطن فروش کہتے تھے' وہ اسی قوم کا لیڈر اور اس ملک کے سیاہ و سفید کا مالک بننا چاہتا ہے۔ اس کے خلاف کسی قانون کے تحت کارروائی کرنے والا کوئی ادارہ موجود ہی نہیں۔ اس کا مقابلہ کر سکتے ہو تم؟"

"میں اس کا مقابلہ ضرور کروں گا۔"

"الیکشن میں اس کے خلاف کھڑے ہو کے؟"

"نہیں۔ میں الیکشن والا آدمی نہیں ہوں۔ سیاست سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ میری تو ولاور جیسے لوگوں سے دشمنی ہے اور ان کو بے نقاب کرنا میرا قومی فریضہ ہے۔ ایسے لوگوں کے اصل چہرے پبلک کو دکھانا میرا مقصد تھا اور رہے گا۔"

"تو اس کام میں مجھ سے زیادہ تمہاری مدد کون کر سکتا ہے جو ولاور کے ہر راز سے واقف ہے" پیڈرو بولا "آگے تمہاری مرضی' تم انکار کردو۔ تم میرے خلاف بھی لڑتے رہو اور ولاور کے خلاف بھی مگر سکندر' پہلے بھی تم نے اپنی اور اپنے سب ساتھیوں کی زندگی اجیرن کیے رکھی اور ملا تمہیں کچھ بھی نہیں۔ حُب الوطنی کی سَند تک نہیں ملی تمہیں۔ پبلک میں دو چار لوگ تمہارے کارناموں پر واہ واہ کرنے والے ضرور ہوں گے مگر اس سے زیادہ تو تمہارے مخالفین ہیں۔ پہلے تم مجھ سے اور ولاور سے ایک محاذ پر لڑ رہے تھے' اب دو محاذ کھولو گے۔ اس پہلو سے بھی سارے معاملے کا جائزہ لینا۔ رابعہ اور کاجل سے بھی مشورہ کرلینا۔ میں صبح تمہیں بہرحال غالب اور نازو تک پہنچا دوں گا۔"

وہ مجھے اپنے بیڈ روم میں چھوڑ کے چلا گیا تو میرے دماغ میں خیالوں کا انتشار تھا۔ مخالف اور موافق سوچوں کی یلغار نے میرے وجود میں خانہ جنگی بپا کر رکھی تھی۔ میں جھوٹ کو سچ سے الگ کرکے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جانا تو محاورے کی بات ہے' عام آدمی کیسے جان سکتا ہے کہ دودھ میں کتنا پانی ہے یا پانی میں کتنا دودھ ہے۔ اس کے لیے سائنسی فارمولے اور تجزیہ کرنے کے سائنسی آلات اور لیبارٹری نہ ہوں تو یک جان سو خانے والے پانی اور دودھ کو کس کی نظر الگ الگ دیکھ سکتی ہے۔ میرے ذہن میں بھی ایسا کوئی فارمولا نہ تھا جس سے میں ولاور اور پیڈرو کے بیانات میں سچائی کے عنصر اور جھوٹ کے تناسب کو الگ الگ کرکے دیکھ سکتا۔

حالات نے اچانک پلٹا کھایا تھا۔ کل کے دشمن آج میری خیر خواہی کے دعوے کر رہے تھے اور مجھے اپنی اپنی ضرورت کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ ہر ایک اپنا کیس اپنے حقائق کی بنیادوں پر پیش کر رہا تھا اور میں اتنے کم وقت میں سوچے سمجھے اور پرکھے بغیر فیصلہ نہیں کر سکتا تھا کہ میں کس کو انکار کروں اور کس کی پیش کش قبول کروں۔ میں کسی کا آلۂ کار بننا نہیں چاہتا تھا' کسی کا احسان نہیں لینا چاہتا تھا اور کسی سے وعدہ نہیں کرنا چاہتا تھا کہ اس کے اور میرے درمیان دشمنی کا رشتہ ایک احسان کے بوجھ تلے دب کر ختم ہو جائے گا۔

صرف ایک بات واضح تھی کہ ولاور کے عزائم زیادہ خطرناک تھے اور اس سے مصالحت کا مطلب تھا اپنے عقائد' نظریات اور اصولوں سے روگردانی۔ اس کی ہر پیش کش ایک رشوت تھی کہ مجھ سے جو چاہو لے لو۔ اپنے نقصان کا معاوضہ ایک کی جگہ دس مانگ لو۔ ماضی و حال کے سارے دعوے ایک وعدے پر کیش کرا لو کہ تم میری مخالفت چھوڑ دو گے اور مجھے اپنا' اس ملک اور قوم کا لیڈر مانتے ہوئے میری سیاسی منزل کی راہ میں کانٹے نہیں بچھاؤ گے۔

پیڈرو اس سے بہت کم مانگ رہا تھا۔ وہ واقعی ایک عام مجرم تھا اور اس کے غیر قانونی کاروبار سے نمٹنے کے لیے درجنوں افراد تھے۔ اب یہ ان کی نااہلی' کوتاہی اور حرام خوری تھی کہ سارے قوانین کا فائدہ مجرم اٹھا رہے تھے اور پریشانی عام آدمی کا نصیب تھی۔

دلاور کا معاملہ مختلف تھا۔ اس جیسے لوگ عام آدمی کے مقابلے میں بڑے آدمی تھے، عزت دار کہلاتے تھے، قانون اور دستور کے رکھوالے سمجھے جاتے تھے مگر درحقیقت وہی ساری بدعنوانی کا نقطۂ آغاز تھے، ساری خرابی کی جڑ تھے اور اس معاشرے کو اخلاقی، معاشی اور معاشرتی قدروں کی تباہی کے راستے پر لے جانے کے ذمے دار تھے۔ ان سے نمٹنا نہ آسان تھا اور نہ کسی کا فرضِ منصبی .... یہ کام تھا باکردار اور باضمیر لوگوں کا۔ آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی کی نعرے پر عملاً یقین رکھنے والوں کا گروہ آٹے میں نمک کے برابر بھی نہ تھے اور جو تھے وہ خاموش اور چپ بیٹھے تھے۔ اس خوف سے کہ ان کی جرأتِ اظہار اور طاقتِ گفتار کا خمیازہ ان کے اہل و عیال کو نہ بھگتنا پڑے۔ خود غرضانہ مصلحتوں کے باعث یا کم ہمتی کی بے حسی کے باعث سب سوچتے تھے کہ یار چھوڑو، اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا۔ اس قوم کو خدا اور اس کے رسولوں کے فرمان سُدھار سکے، نہ آئین اور قانون بنانے والے اور نہ مارشل لاء لانے والے، تو ہم کس شمار قطار میں ہیں۔ بس اپنا اُلو سیدھا کرو یعنی سب کو اُلو بناؤ اور خود اُلو کی طرح بیٹھے دیدے گھماتے رہو اور کبھی کبھی آواز بھی نکالتے رہو۔ اپنا وجود ثابت کرنے کے لیے۔

میں صبح تک سو نہ سکا۔ غالب اور نازو کے چہرے جیسے ہر دیوار پر نقش ہوگئے تھے کہ میں جدھر دیکھتا تھا ان کی سوالیہ نگاہیں یہ پوچھتی نظر آتی تھیں، چیف کے ٹو، پھر اب کیا فیصلہ کیا ہے تم نے۔ فیصلہ کرنا بہرحال تمہارا کام ہے اور خواہ دوست بن کے سوچو یا مشن کمانڈر بن کے۔ قوتِ فیصلہ کو بعد از خرابیٔ بسیار بروئے کار لانے کے تمام نقصانات کے ذمے دار تم اور صرف تم ہوگے۔

پیڈرو کو معاف کردینے کا سوال ہی نہ تھا اور ابھی وہ وقت آیا بھی نہیں تھا کہ میں اس سے وزیر خان کے بے گناہ لہو کا حساب لوں۔ فوری مسئلہ غالب اور نازو کی رہائی کے لیے اس کی مدد قبول کرنے یا نہ کرنے کا تھا۔ اس حد تک وہ میری مدد کرچکا تھا کہ اب غالب اور نازو تک رسائی خواب و خیال نہیں رہی تھی۔

رات کے دو بجے میں نے کاجل اور رابعہ سے مشورے کا فیصلہ کیا کیونکہ میں متضاد خیالوں اور ایک دوسرے کو مسترد کرنے والے نتائج کی رسّہ کشی کا شکار تھا اور جیسے ایک رسّے کو ایک طرف سے کھلاڑیوں کی پہلی ٹیم کھینچتی ہے تو دوسری طرف سے زور آزماؤں کی دوسری ٹولی، ایسے ہی میں خیالات کی کھینچ تان میں ادھر سے اُدھر ہونے کے باوجود وہیں تھا۔

رابعہ کو جاگتا دیکھ کے مجھے حیرت نہیں ہوئی۔ اس کا صبح تک سوتا رہنا ممکن تھا، لازمی نہیں تھا۔ دو گھنٹے بعد ہی اس کی نیند اُڑ گئی تھی اور اس نے ڈاکٹر کے مشورے سے گرم دودھ پی لیا تھا۔ اسے بتایا گیا تھا کہ اس گھر میں سکندر صاحب بھی ہیں مگر خواب آور دوا کا اثر باقی ہے چنانچہ انہیں صبح سے پہلے جگانا مناسب نہیں ہوگا۔

یہی بات لیڈی ڈاکٹر نے مجھے سمجھائی تھی اور میں نے مان لی تھی تو رابعہ کیوں نہ مانتی۔ کاجل البتہ سو رہی تھی لیکن بار بار کروٹیں بدل رہی تھی۔

میں نے کہا "کیسی ہے طبیعت؟"

"ٹھیک ہے۔ تم کیسے اٹھ کے آگئے؟" وہ بولی۔

"میں تو پہلے بھی آیا تھا تمہیں دیکھنے۔ لیڈی ڈاکٹر نے جگانے سے منع کردیا تھا چنانچہ واپس لوٹ گیا۔"

"یہ سب ان بسکٹوں کے کھانے سے ہوا تھا۔"

"میں نے تو پورا ڈبا صاف کردیا تھا پھر بھی تم سے پہلے بیدار ہوگیا" میں نے کہا "تمہیں معلوم ہے ہم کہاں ہیں؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "نرس، ڈاکٹر، خادمہ کسی کو کچھ معلوم نہیں۔"

میں نے کہا "ہم استاد پیڈرو کے معزز مہمان ہیں اور صبح انشاءاللہ ... ہم غالب اور نازو سے ملیں گے۔"

اس پر نیم غنودگی کی کیفیت طاری تھی۔ میرے الفاظ کا وہی اثر ہوا جو اس کے سر پر ڈنڈا مارنے کا ہوتا۔ وہ چونک کے اٹھ بیٹھی۔ "کیا کہہ رہے ہو۔ تم ہوش میں ہو نا؟"

"میں نے تمہیں ہوش میں لانے کے لیے یہ بات کہی تھی۔"

وہ مایوس نظر آنے لگی "یعنی جھوٹ بولا تھا؟"

"یہ تو نہیں کہا میں نے، جھوٹ میں نے کبھی بولا ہے تم سے۔ اور تم سے کیا، میں نے تو آج تک جھوٹ کسی سے نہیں بولا۔ ماشاءاللہ سے ...!"

رابعہ ہنسی "اس سے بڑا جھوٹ کیا ہوگا؟"

میں نے کہا "میں تم سے مشورہ کرنے آیا ہوں۔ ہرچند کہ عورت ذات کی عقل کے بارے میں میری رائے اتنی اچھی نہیں ہے۔"

"تو پھر جاؤ، خود فیصلہ کرو" وہ بگڑ گئی۔

"دیکھو نا، مجبوری میں سب جائز ہے۔" میں نے کہا "لوگ گدھے کو باپ بنا لیتے ہیں۔ میں مان لیتا ہوں کہ تم میری طرح عاقل و بالغ ہو۔"

"کوئی ضرورت نہیں۔"

"ضرورت مجھے ہے" میں نے ڈانٹ کر کہا "کان کھول کے سنو لڑکی، میں تم پر ایسے انکشافات کرنے والا ہوں کہ تم سنو گی تو چت سے گر کے بے ہوش ہو جاؤ گی۔ نخلخہ نہیں ہے میرے پاس، اس لیے بے ہوش پھر کبھی ہونا۔"

اس کے بعد میں نے اسے اپنی اور پیڈرو کی گفتگو کا خلاصہ سنایا۔ یہ خلاصہ بھی تلخیص طلب تھا کیونکہ اس میں ایک گھنٹا لگ گیا مگر ایک گھنٹے میں شاید انسٹھ منٹ تو رابعہ کے سوالات کی نذر ہوئے تھے۔

"اب کیا کروگے تم؟" وہ ساری بات سن کے بولی۔

"لاحول ولا قوۃ۔ یہی تو میں تم سے پوچھنے آیا تھا۔ ہونا وہی میں سچ بولوں گا تو بُرا لگے گا۔"

"تم خود کوئی چکر چلاؤ، کسی صحافی سے مدد لو۔ غالب کو بہت لوگ جانتے ہوں گے" رابعہ بولی "کسی اخبار کے کرائم رپورٹر کو ساتھ ملاؤ۔ اس کو بتاؤ کہ غالب کو اغوا کرنے والوں نے فلاں جگہ رکھا ہے مگر یہ بات یقینی نہیں ہے۔"

"پھر وہ کیا کرے گا؟ یقین کی بنیاد پر تو بہت کچھ ہوسکتا ہے۔"

"سب کچھ ہوسکتا ہے سکندر۔ پولیس کو بھلا کون روک سکتا ہے۔ وہ من مانی کرتے ہیں اور قانون کی آڑ تو اس وقت لیتے ہیں جب وہ کچھ نہ کرنا چاہیں" رابعہ نے کہا "کرائم رپورٹر کے لیے ایک سب انسپکٹر اور دو چار سپاہیوں کے ساتھ چھاپا مارنا کوئی مشکل کام نہیں۔"

"مگر مجسٹریٹ اور وارنٹ؟"

"کون پوچھتا ہے وارنٹ کو اور وہ دکھاتے کب ہیں۔ چادر اور چار دیواری کے تقدس کی تو محض اصطلاح ہے۔ بیان بازی کے لیے۔ اور مجسٹریٹ کیا تم نہیں ہوسکتے؟ آج تک کسی نے مجسٹریٹ سے شناختی کارڈ مانگنے کی ہمت کی ہے؟" رابعہ بولی "جیسے پولیس مقابلے بوگس ہوتے ہیں اور بعد میں ثابت نہیں کیے جاسکتے، ایسے ہی پولیس کے چھاپے ہوتے ہیں۔ کون ہوگا دیکھنے والا اور فریاد کرنے والا۔ وہ صاف مُکر بھی سکتے ہیں۔"

میں نے سخت جذباتی ہوکے کہا "رابعہ! تم نے اس وقت پھر مجھے اتنا شرمندہ کردیا ہے ... اتنا کہ ..."

"چلو چلو، فضول بکتے ہو تم۔ تمہاری مرد کی کھوپڑی سے وہ بات نکل ہی نہیں سکتی کہ عورت ذات ناقص العقل ہے۔"

"نہیں۔ میں سچ کہہ رہا ہوں اس وقت۔ میرا دل چاہ رہا ہے کہ بس تمہارا منہ ...." میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

رابعہ نے بگڑ کے کہا "پاگل ہوئے ہو، میں ماروں گی قریب آئے تو۔"

"منہ میٹھا کرادوں مگر افسوس کہ یہاں چینی تک نہیں ہے، مٹھائی کا بھلا کیا ذکر۔ یہ تمہارا منہ کیوں لال ہو رہا ہے آخر؟" میں نے پھر بیٹھتے ہوئے کہا۔

رابعہ خفت سے مسکرائی "منہ .... نہیں تو۔"

"نہیں کیا۔ شلجم جیسا منہ تھا، چقندر ہوگیا" میں نے ڈانٹ کر کہا "کیا سمجھا تھا آخر تم نے۔ میں ایک شریف آدمی ہوں ابھی تک۔ شادی کے بعد نہ رہوں تو اور بات ہے۔ کوئی نہیں رہتا۔"

"اب تم جاؤ۔ دفع ہوجاؤ" رابعہ بولی "ورنہ میں کاجل کو اٹھاتی ہوں۔"

"ارے نہ ہم کاجل سے ڈرتے ہیں نہ سُرمے سے۔ اور دفع ہم ہوتے نہیں، تشریف لے جاتے ہیں، وہ بھی کوئی درخواست کرے تو۔ شرافت سے۔"

"اچھا حضور، آپ کی بڑی عنایت ہوگی، تشریف کا ٹوکرا اٹھائیے اور لے جائیے یہاں سے" رابعہ نے ہاتھ جوڑ کے کہا۔

میں نے دانت نکال کے کہا "اس کے بغیر بھی میں چلا ہی جاتا۔"

صبح میری آنکھ دیر سے کھلی۔ ناشتے کی میز پر ہم سب یکجا ہوئے تو میں رابعہ اور کاجل کو دیکھ کے حیران رہ گیا۔ نہ صرف یہ کہ انہوں نے کپڑے بدلے ہوئے تھے بلکہ نہا دھو کے باقاعدہ سولہ سنگھار بھی کیے تھے۔ سولہ نہ سہی دس بارہ میں کسر نہیں چھوڑی تھی۔ ہمارا میزبان غائب تھا۔ صرف ایک ویٹر باآدب باملاحظہ ہوشیار کھڑا تھا۔ اسے میں نے چلتا کردیا۔

"قسمت میں یہ ذلت بھی لکھی تھی۔" میں نے ناشتے کے لوازمات سے بھری ہوئی میز کو دیکھا۔

"کچھ خدا کا خوف کرو۔ خدا کی نعمتوں کو ذلت کہتے ہو۔"

"نہیں سمجھیں نا، بابا میں حالات کی ذلت کو رو رہا تھا۔ یہ دیکھو کہ ہم کہاں ہیں، کس کا دیا کھا رہے ہیں اور کس کا دیا پہنا ہے تم نے۔"

"اللہ جسے چاہے وسیلہ بنادے" رابعہ نے کہا "اور کیا پتا کل کو تمہارے خیالات ہی بدل جائیں۔"

"کس کے بارے میں؟ پیڈرو کے بارے میں، ناممکن۔"

"ناممکن کچھ نہیں ہوتا۔ آدمی جذبات کی عینک سے برسوں غلط دیکھتا رہتا ہے پھر کسی دن عقل کی خوردبین مل جاتی ہے تو پتا چلتا ہے

کہ ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ۔"

میں نے افسوس سے سہلایا "تمہیں اتنا بھی نہیں معلوم کہ کواکب یعنی ستاروں کو خوردبین سے نہیں دوربین سے دیکھا جاتا ہے۔ خوردبین سے تو جراثیم نظر آتے ہیں۔ تمہاری عقل کے جراثیم شاید اس سے بھی نظر نہ آئیں۔"

کاجل نے کہا "لڑنے کے بجائے کسی سے پوچھو کہ پیڈرو کہاں گیا ہے آخر؟"

"جہنم میں جائے میری بلا سے" میں نے کہا۔

"یعنی وہیں جہاں بالآخر تم جاؤ گے" رابعہ نے کہا۔

"بالکل۔ تمہارے ساتھ۔ ایجاب و قبول کے بعد" میں نے کہا "اور چھوارے بانٹ کر۔"

کاجل ہنسنے لگی "عورت تو گھر کو اپنی جنت سمجھتی ہے۔"

"خیر وہ بالکل ٹھیک سمجھتی ہے۔ تم نے دیکھا ہے کسی فلم میں کسی شوہر کو گا گا کے یہ اعتراف کرتے ہوئے..؟"

اسی وقت پیڈرو نمودار ہوا "مجھے کچھ دیر ہوگئی۔ دراصل تم سے زیادہ رات کو میں اس مسئلے کا حل سوچتا رہا۔"

"ہم نے مسئلے کا حل تلاش کرلیا ہے۔"

"میں تو حل کو اپنے ساتھ لے آیا ہوں" پیڈرو بولا "ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہے۔ ناشتا کرلیا ہے تو آؤ اس سے مل لو۔"

ڈرائنگ روم میں ایک بھالو ٹہل رہا تھا مگر وہ پلٹا تو بالکل انسان کا بچہ ثابت ہوا۔ اس کا قد چھوٹا تھا اور جسم اتنا بھاری کہ وہ بھالو کی طرح چلنے پر مجبور تھا۔ اس کے سر پر الجھے ہوئے بالوں کا ڈھیر تھا۔ ناک پر گول شیشوں والا چشمہ اور غالباً اس نے ایک ہفتے سے شیو نہیں بنائی تھی۔ یا وہ خشخشی داڑھی تھی۔

اس نے لپک کے مجھ سے مصافحہ کیا اور پھر مجھے گلے لگالیا۔ اس کے جسم سے بیک وقت عطرِ حنا، تمباکو، نسوار اور میل کی بُو آرہی تھی۔

"ہم عاجز ہیں۔"

"کس سے؟" میں نے کہا اور دل میں کہا کہ عاجز تو شاید تم سے زمانہ ہوگا۔

"ارے بھئی، ہمارا نام ہے عاجز۔"

پیڈرو نے کہا "انہوں نے پولیس کو بھی اتنا ہی عاجز کر رکھا ہے جتنا مجرموں کو۔ یہ بڑے دھانسو قسم کے کرائم رپورٹر ہیں اور کرائم جہاں بھی ہو وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ اسکول میں، ہاکی کے میدان میں، مینا بازار میں۔ یہ غالب کے بڑے مداح ہیں۔"

میں نے ان سے ہاتھ ملایا "آپ جانتے ہیں غالب کو؟"

"غالب کو بھلا کون نہیں جانتا۔ پورا دیوان پڑھا ہے میں نے۔ واہ واہ۔ کیا شعر لکھا ہے ظالم نے۔ کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالب، شرم تم کو مگر نہیں آتی۔ ابھی تک حج پر گیا کہ نہیں۔ ہر مسلمان کے لیے بڑی شرم کی بات ہے۔"

میں نے اپنا سر پیٹنا چاہا مگر مجبوری تھی۔ اس جاہل شخص کو خدا نے وسیلہ بنادیا تھا تو فائدہ اٹھانا بھی ضروری تھا۔

وہ بدستور غالب کی تعریف میں رطب اللسان تھا "یار، اس نے شراب چھوڑی کہ نہیں۔ ہم نے شعر پڑھا تھا اس کا۔ غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی۔ پیتا ہوں روز ابروشبِ ماہتاب میں۔ یہ بارش کے موسم میں شراب پیتا ہے۔ افسوس، بارش میں تو آدمی پکوڑے کھاتا ہے اور آم کھاتا ہے۔ اور یہ ماہتاب کون ہے؟ اس کے کوٹھے پر جاکے پیتا تھا کبھی کبھی۔"

میں نے کہا "چھوڑیں عاجز صاحب۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ اسے ماہتاب کے کوٹھے پر سے ہی بدمعاشوں نے اٹھالیا اور یہاں قید کر رکھا ہے۔"

"ایسی کی تیسی کردیں گے ہم سب کی۔ اتنے مشہور آدمی کو اغوا کرلیا۔ ہمارا اخبار ہے "خانہ خراب" اس میں ہم خانہ خرابی کے سب واقعات لکھتے ہیں جن سے اس ملک کا خانہ خراب ہو رہا ہے۔ ابھی آپ چلیں میرے ساتھ۔ کسی کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ انسپکٹر اپنا آدمی ہے۔ یوں نکال لے گا آپ کے دوست کو، یوں!" اس نے چٹکی بجائی اور پھر اس چٹکی سے نسوار نکال کے دانتوں میں دبالی۔

مجھے یقین نہ آیا کہ یہ شخص صحافی ہوسکتا ہے مگر ہر جگہ ایسے بہت سے نام نہاد اخبار اور صحافی ہوتے ہیں جن کو سنجیدہ قارئین تو نہیں ملتے مگر وہ بلیک میلنگ سے ہر جگہ اپنا کام ضرور نکال لیتے ہیں۔ ایسے اخبار چیتھڑے بھی کہلاتے ہیں اور زرد صحافت کے علمبردار بھی۔ جو اس پیشے کو بھی بدنام کرتے ہیں اور انہیں بھی جو اس پیشے سے متعلق ہیں۔

میں نے رابعہ اور کاجل کو پیچھے چھوڑا اور عاجز صاحب کے ساتھ پیڈرو کی گاڑی میں روانہ ہوگیا۔ راہنمائی کرنے والا خود پیڈرو تھا مگر عاجز صاحب کو پورا پتا سمجھانے کے بعد وہ راستے میں گاڑی سے اتر گیا۔ غالباً وہ پولیس کے سامنے نہیں جانا چاہتا تھا۔

پولیس کا سب انسپکٹر ایک جیپ میں عاجز صاحب کا منتظر تھا اور خاصا بے زار نظر آتا تھا "خو یار عاجز صاحب، آپ ہم کو بوت عاجز کیا۔ اپی امارا افسر لوگ کو پتا چلا تو۔"

"یار، کیسے پتا چلے گا؟ اور تم کون سا غلط کام کرنے جارہے ہو۔ اغوا شدہ آدمی کو بازیاب کرنا کیا تمہارا کام نہیں ہے؟ علاقہ بھی تمہارا ہے پھر ڈر کیسا؟ بندہ برآمد کرو اور مجرموں کو پکڑلو۔ کل دیکھو، کیسی دھوم مچے گی تمہارے کارنامے کی۔"

"مجرم مسلح ہیں؟" اس نے فکرمندی سے پوچھا۔

"تم ڈرتے ہو؟" عاجز صاحب نے کہا "وہ ایسے مجرم نہیں ہیں جو پولیس سے مقابلہ کریں۔ بس اب چلو، اب دیر مت کرو۔"

نامعلوم راستوں سے گزرتے ہوئے بیس منٹ بعد ہم لوگ ایک بستی کے مضافات میں خالی نظر آنے والے گھر کے سامنے رک گئے۔ میرا دل اس خیال سے دھڑک رہا تھا کہ شاید چند منٹ میں غالب اور نازو سے پھر ملاقات ہوجائے گی۔ میرے دل میں پیڈرو

کے لیے ایک نرم گوشہ پیدا ہونے لگا تھا جو کچھ عرصہ پہلے ایک ناممکن سی بات ہوتی مگر میں اس حقیقت سے روپوشی اختیار نہیں کرسکتا تھا کہ غالب اور نازو کی بازیابی صرف اسی کی وجہ سے، اس کی مدد اور کوشش سے ممکن ہوئی۔

سب انسپکٹر نے موقعِ واردات کا جائزہ لیا اور اپنے دو سپاہیوں کو حکم دیا "تم اُدھر والے مکان سے چھت پر چلے جاؤ۔ تم پیچھے جاؤ، مجرم گلی سے نہ فرار ہوجائیں۔"

دو سپاہی اس کے حکم کے مطابق پیچھے والی گلی میں اور ساتھ والے مکان کی چھت پر پہنچ گئے۔ ساتھ والے مکان میں اکیلی عورت اپنے دو بچوں کے ساتھ کمرے میں چھپ گئی۔ اس کے لیے تو قانون کی راہ میں رکاوٹ ڈالنا اور پولیس سے اپنے گھر میں داخل ہونے کا اختیار نامہ طلب کرنا ہی بہت بڑا جرم تھا۔

اِدھر اُدھر کے بہت سے گھر آباد تھے مگر کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ قریب آکے پولیس سے اس کارروائی کا سبب معلوم کرتا۔ جو یہ حماقت کرتا، اصل مجرم سے پہلے مشتبہ افراد میں شامل ہوجاتا اور دخل در معقولات کی سزا تھانے جاکے پاتا۔

وہ متوسط طبقے کی آبادی تھی اور جس گھر کا پولیس نے محاصرہ کیا تھا، وہ بھی عام قسم کا گھر تھا۔ اس کے دروازے کھڑکیاں بند تھے۔ مکان پر حال ہی میں پلستر مکمل ہوا تھا مگر رنگ نہیں ہوا تھا۔ بظاہر اس میں زندگی کے آثار مفقود تھے لیکن میں جانتا تھا کہ غیر قانونی طور پر کسی کو محبوس رکھنے کے لیے ایسی ہی آبادیاں اور اسی قسم کے گھر بہتر پناہ گاہ ثابت ہوتے ہیں۔

ہر طرف سے مطمئن ہوجانے کے بعد سب انسپکٹر نے دروازے پر دستک دی۔ اس کے دستک دینے کا انداز بھی اتنا کرخت تھا کہ نیا دروازہ بھی ہل گیا۔ اس کے باوجود اندر خاموشی رہی۔ اس نے دوسری بار لات ماری اور چلّا کے کہا "اوئے اندر کون ہے.... باہر نکل.."

اس جملے میں دو الفاظ محکمہ جاتی تھے جو صرف پولیس استعمال کرتی ہے اور ان کا اثر بھی وہی ہوتا ہے جو طلسماتی غار پر علی بابا کے "کھل جا سم سم" کہنے سے ہوا تھا۔ ایک دم دروازہ کھل گیا اور ایک داڑھی والا جوان آدمی معصوم صورت بنائے سامنے آگیا۔

"السلامُ علیکم تھانے دار صاحب، بخیر راغلے۔ حکم....؟" اس نے تھانے دار سے مصافحہ کرنے کی ناکام کوشش کی۔

"اوئے حکم دا پتّر۔ ڈورا ہے... پہلی باری میں دروازہ کیوں نہیں کھولا تھا؟" تھانے دار نے گرج کے کہا۔

"وہ حضرت صاب! ہم ادھر تھی۔ اجابت خانہ شریف میں۔" اس نے مسکینی سے منمنا کے کہا۔

"اجابت کا بچہ۔ چل ہٹ ایک طرف۔ اندر کس کو چھپا رکھا ہے؟" تھانے دار نے اس کی داڑھی پکڑلی اور زور زور سے ہلانے لگا۔

یہ بات غلط تھی مگر اس وقت میں بھونچکا رہ گیا جب داڑھی تھانے دار کے ہاتھ میں آگئی اور میں نے اپنے سامنے ایک کلین شیو شخص کو دیکھا۔ اس نے ایک دم جیب میں ہاتھ ڈالا۔ تھانیدار سے پہلے میں نے اس کی کوشش ناکام بنادی۔ میں نے اس کے بازو پر شانے کے نیچے ہاتھ مارا اور وہ بلبلا کے دُہرا ہوگیا۔

تھانے دار نے اس کی جیب میں سے ریوالور نکال لیا اور اس پر پل پڑا۔ اس وقت تک باقی سپاہی بھی اندر پہنچ چکے تھے۔

میں نے اندر جاتے ہی چیخ کے کہا "غالب! کدھر ہے تو؟"

پولیس والے دھڑ دھڑ کمروں کے دروازے کھول رہے تھے۔

میں نے پھر چلّا کے نازو کو آواز دی۔ "میں سکندر ہوں" لیکن اس آسیب زدہ گھر کی ویرانی اور خاموشی میں کوئی ولدار جواب نہ آیا۔

عاجز صاحب نے کہا "یہاں تو کوئی نہیں ہے جی۔"

سب انسپکٹر نے کہا "مروادیا نا ہمیں عاجز صاحب۔ ابھی چلو۔"

میں نے کہا "ایک منٹ۔ یہ راستہ جو نیچے جارہا ہے، اسے بھی دیکھ لیں۔"

میرے کانوں کو دھوکا ہوا تھا یا شاید سچ مچ میں نے غالب کی آواز سنی تھی۔ پولیس والوں سے پہلے میں دوڑتا ہوا تہ خانے میں جانے والی سیڑھیوں پر اتر گیا۔

آخری سیڑھی کے بعد دروازہ تھا۔ میں نے لات مار کے اسے کھولا اور اپنی جگہ پتھر کا بُت بن گیا۔

نیچے ایک نیم تاریک ہال سا تھا جس کی دیواروں پر گرے سیمنٹ کا رنگ بھی سیاہی مائل محسوس ہوتا تھا مکان حال ہی میں مکمل ہوا تھا یا ہنوز تعمیر کے مراحل میں تھا۔ چنانچہ اس کے بند دروازوں اور دریچوں میں محبوس ہوا میں نمی گیلی ریت اور تازہ لکڑی کی مخصوص بُو تھی۔ فرش پر لکڑی کے ٹکڑے اور بڑھئی کے رندے سے اترنے والے پتلے پتلے چھلکے بکھرے ہوئے تھے۔

دیواروں پر لائٹس کے پوائنٹ ضرور نظر آرہے تھے لیکن فٹنگ ابھی باقی تھی۔ روشنی کا عارضی انتظام ایک بلب ہولڈر لگا کے کیا گیا تھا جو چھت کے وسط میں پنکھے کے لیے مخصوص ہک سے معلق تھا مگر سو واٹ کے اس بلب کی روشنی تہ خانے کی تاریکی کو چیرنے میں یوں ناکام تھی جیسے گہری کُہر آلود دُھندلی صبح کے ماحول میں کار کی ہیڈ لائٹس اُلجھ کے چند گز تک محدود ہو جاتی ہے۔

میری نظروں کو تہ خانے کی ویران دیواروں سے ٹکرا کے مایوسی کے زخموں کے سوا کچھ نہ ملا تھا۔ غالب اور نازو کہیں نہ تھے اور میرے لیے یہ ذہنی صدمہ اس شاک سے کم نہ تھا جو یقینِ کامل کی غیر متوقع شکست سے ہوتا ہے۔ جب آدمی ایک خیال یا ایک تصور کو حقیقت تسلیم کرلیتا ہے' وہ سپاٹ دیوار پر بنی ہوئی تصویر کو دروازہ مان لیتا ہے اور اس میں سے گزرنے کی کوشش کرتا ہے یا یہ سمجھ لیتا ہے کہ بجلی بند ہے اور ننگے تار کو اطمینان اور اعتماد کے ساتھ پکڑ لیتا ہے۔

مجھے بھی یقین تھا کہ دروازہ کھلے گا تو ایک دم غالب روبرو ہوگا اور نازو کا چہرہ نظر آئے گا اور میرے اس یقین میں ایک فیصد بے یقینی بھی شامل نہ تھی۔ انہیں غیر موجود پا کے بھی کچھ دیر تو مجھے یقین نہ آیا کہ حقیقت وہی ہے جو میری نظر میں ہے اور وہ فقط آرزو کا نقشِ خیال تھا جسے میں نے جذبات کے اندھے پن میں حقیقت مان لیا تھا۔ میں نے ہر گوشے کو اور سپاٹ' اندھی دیواروں کی بے حسی میں جکڑی ہوئی ویرانی کو بار بار کھنگالا مگر وہاں کچھ ہوتا تو مجھے نظر آتا۔ کمرے کے فرش پر دو چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ان پر دریاں تھیں اور دریوں پر جو چادر تھی' اس کی ہر شکن وہاں کچھ دیر پہلے کسی کی موجودگی کا اقرار کرتی تھی۔ تکیوں پر چکنائی کا ہلکا سا پھیلا ہوا دھبا خبر دیتا تھا کہ اس پر کسی نے اپنا سر رکھا تھا۔ درمیان میں لگی ہوئی چھوٹی سی میز پر دو خالی مگ رکھے ہوئے تھے اور شیشے کے ایک گلاس میں تھوڑا سا پانی تھا۔

میں نے گلاس اٹھایا اور اس کے کناروں کو دیکھا۔ ان سے غالب یا نازو کے لب مس ہوئے تھے۔ کسی ارادے کے بغیر اور سوچے سمجھے بغیر میں نے وہ چند گھونٹ پی لیے۔ مجھے یوں لگا جیسے اس پانی میں بھی غالب کی خوشبو تھی یا شاید نازو کی۔ ایک گلاب اور دوسرے گلاب کی خوشبو میں فرق کہاں ہوتا ہے۔ ویسے بھی وہ الگ نہیں تھے کہ ان کے وجود کا ایک دوسرے سے الگ کوئی تصور ممکن ہوتا۔

آہستہ آہستہ جُھک کے میں نے بستر کی ایک ایک شکن پر ہاتھ پھیرا اور اس لمس نے خود مجھ سے کہا "کیا تم مجھے نہیں جانتے۔ میں تو دوستی کے لمس کی مہک ہوں اور عہدِ رفاقت کی وہ خوشبو ہوں جس سے تم آشنا ہو۔"

میں نے تکیہ اٹھایا۔ وہ ایک معصوم بچے کی طرح مسکرانے لگا جسے ماں کی آغوش کا محبت بھرا احساس مل گیا ہو۔

رابعہ نے میرا بازو پکڑ کے کہا "سکندر!"

اس کی آواز میں رقت تھی' درد کا مجروح اعتراف تھا اور ناامیدی کے آزار کا نالۂ بے نوا تھا۔

میں نے کہا "رابعہ! وہ یہیں تھے۔ دیکھو وہ کہاں گئے۔ آخر کہاں جا سکتے ہیں وہ؟ ان دیواروں سے کون گزر سکتا ہے؟"

"سچ بولی حضرت صاحب۔ بندہ بشر تو دروازے میں سے گزر سکتا ہے" یہ آواز عاجز صاحب کی تھی "جنات کا معاملہ مختلف ہوتا ہے لیکن ان کو قید کون کر سکتا ہے۔"

رابعہ نے چلّا کے کہا "اس نقلی داڑھی والے کو سب معلوم ہوگا' کہیں وہ نہ نکل جائے۔"

"اجی ہم نے یہ بال دھوپ میں سفید کیے ہیں" اس نے اپنے سر پر خودرو گھاس کی طرح اُگنے والے جھاڑ جھنکاڑ کو مٹھی میں پکڑ لیا "کیا سمجھے؟ ہم تجربے کی بات کرتے ہیں اور تجربہ دھوپ میں جھک مار کے ملتا ہے' گھر میں بیٹھ کے نہیں حضرت صاحب۔ غالب نکل گیا سو نکل گیا' اب ملزم نکل جائے تو ہم خانہ خراب کر دیں پولیس کے سارے محکمے کا۔"

تھانے دار نے سرہلایا "خانہ خراب تو ہو چکا اپنا۔ عاجز صاحب! آپ نے میری پیٹی اتروا دی۔ یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔"

"مگر کیوں نہیں ہے؟ یہی تو سوال ہے انسپکٹر" عاجز صاحب نے اپنی خشخشی داڑھی میں انگلیاں پھیرتے ہوئے فرمایا "وہ کہاں گئے جو یہاں قید میں تھے؟"

"کوئی بھی نہیں تھا یہاں۔ آپ کے کہنے پر چھاپا مارا میں نے کسی اختیار کے بغیر" تھانے دار کی آواز میں رقت آگئی۔

"تمہاری پیٹی اترے گی' ضرور اترے گی" عاجز صاحب نے انگلی اٹھا کے کہا "لیکن اس وقت جب تم نے نالائقی کا مظاہرہ کیا۔ غضب خدا کا! اُردو کا اتنا مشہور شاعر۔ اسے ظالموں نے یہاں قید کر رکھا تھا۔ زمانہ کیا کہے گا..."

"یہ کیا بولتے ہو عاجز صاحب! کیسا غالب' کون غالب؟ مجھے تو کچھ نظر نہیں آتا" تھانے دار بولا۔

"دیکھو' یہ دیکھو..... غور سے ہر چیز کو دیکھو۔ سراغ رسانی کرو تھانے دار! عقل استعمال کرو" عاجز صاحب نے ہاتھ سے ایک ایک چیز کی طرف اشارہ کیا "آخر کوئی تو تھا یہاں۔ وہ کہاں گیا؟ یہ چائے کس نے پی تھی؟ پانی کس کے لیے رکھا ہوا ہے..."

"عاجز صاحب' مکان زیرِ تعمیر ہے۔ رہتے ہوں گے یہاں مزدور....."

"فرض مت کرو' پتا کرو۔ جس کی داڑھی اتاری تھی تم نے' اس کی کھال بھی اتار لو۔ وہ بتائے گا' اس کا باپ بھی بتائے گا۔"

میں صدمے سے سنبھل جانے کے باوجود گُم صُم کھڑا ہوا ان کے مکالمے سُن رہا تھا۔ اگر مجھے شک ہوتا کہ پیڈرو نے جھوٹ بولا تھا اور وہ مجھے بے وقوف بنانے کے لیے یہاں لایا تھا تو میں اس سے نمٹ لیتا مگر مجھے یقین آچکا تھا کہ پیڈرو کا مقصد مجھے دھوکا دینا نہیں تھا۔ اس کی معلومات بھی درست تھیں۔ شاید اس سے کہیں کوئی بھول ہو گئی تھی اور کسی نے قبل از وقت اس کے ارادوں کی خبر آگے پہنچا دی تھی۔ غالب اور نازو کو قید رکھنے والے انہیں بروقت نکال کر کہیں اور لے جانے میں کامیاب ہو چکے تھے اور سانپ نکل جانے کے بعد لکیر ہی کو پیٹا جا سکتا تھا۔ خواہ اس سے کچھ حاصل ہو یا نہ ہو۔ پولیس اور عاجز صاحب یہی کر رہے تھے۔

عاجز صاحب کی بات نے مجھے یاد دلایا کہ ہمیں اتنا مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ ایک ملزم ہمارے قبضے میں تھا اور اس سے یقیناً کچھ نہ کچھ معلوم کیا جا سکتا تھا۔ کوئی کتنا ہی سخت جان کیوں نہ ہو اور قوتِ ارادی کا کیسا ہی مظاہرہ کیوں نہ کرے' جب پولیس والے اسے گنّے کی طرح بیلتے ہیں' بار بار نکالتے ہیں اور پھر نچوڑتے ہیں تو رس کی طرح وہ معلومات اُگلنے لگتا ہے ورنہ پھوک کی طرح رہ جاتا ہے۔ جن تِلوں میں تیل نہ ہو' انہیں بھی پولیس اپنے تشدد کے کولہو میں ڈال کے رگیدتی ہے تو تیل خود بخود باہر آجاتا ہے اور اسی کو یہاں تفتیش کا عمل کہا جاتا ہے جس کے لیے مجسٹریٹ بھی جسمانی ریمانڈ دیتے ہیں۔ ملزم کی جسمانی صحت اور قوتِ برداشت کے مطابق ایک ہفتے کے لیے یا دو ہفتے کے لیے۔ اس سے ہمیشہ دو حیرت انگیز نتائج حاصل ہوتے ہیں۔ یا وہ ملزم ثابت ہو جاتا ہے یا ملزم ثابت نہیں ہوتا۔ دوسری صورت میں کہا سُنا معاف' دل صاف۔ رشوت کا صدقہ نذرانہ دے کر زیرِ تفتیش بُدھو لوٹ کے گھر آتا ہے تو رُسوائی اور مار کے خوف سے آواز نہیں نکالتا اور پولیس کے خلاف بے سبب ایذا رسانی اور ہتکِ عزت کے قانونی مسائل کے بارے میں سوچتے ہوئے بھی ڈرتا ہے کہ یا وقت ضائع ہوگا یا وہ خود۔ جو اقرار کر لیتے ہیں اور مُبیّنہ ملزم کے مرتبے سے بڑھ کے مجرم بن جاتے ہیں' ان کی خوب تشہیر ہوتی ہے اور تاثر یہ دیا جاتا ہے کہ پولیس ہر جرم کا سراغ لگا لیتی ہے حالانکہ پکڑے جانے والوں اور چھاپے میں ہاتھ آنے والوں کی اکثریت مخبروں کو دُعا دیتی ہے جو ملزموں کے درمیان رہتے ہیں اور انہی کے ساتھی نظر آتے ہیں مگر وہ ایک ہاتھ سے مالِ غنیمت وصول کرتے ہیں تو دوسرے ہاتھ سے مخبری کا انعام۔

اوپر سے نقلی داڑھی والے کے چلّانے کی آواز آرہی تھی اور اس سے زیادہ انسپکٹر کے دہاڑنے کی۔ تڑتڑ کی آوازیں واضح طور پر جوتا کاری سے پیدا ہو رہی تھیں۔ تفتیش بذریعہ چھترول کا آغاز ہو چکا تھا۔

عاجز صاحب نے کہا "آؤ جی حضرت صاحب! اب ادھر کیا رہ گیا ہے دیکھنے کو۔ اوپر چل کے تفتیش دیکھتے ہیں۔ یہ تھانے دار دیکھنے میں تو پڑھا لکھا' شریف اور احمق لگتا ہے مگر جملہ صفات معکوس رکھتا ہے۔ غالب صاحب کو یوں برآمد کرے گا یوں" اس نے چٹکی بجائی۔

میں نے کہا "غالب کیا مالِ مسروقہ ہے کہ یوں برآمد ہو جائے گا؟ ایک تھانے کے مال خانے سے کچھ سامان منگوا کے کسی آوارہ گرد کے ساتھ تصویر بنوائی' کرائم رپورٹر کو بیان دیا کہ رنگے ہاتھوں پکڑا جانے والا ملزم فلاں فلاں وارداتوں میں ملوث تھا' اتنی چوریوں اور اتنی ڈکیتیوں کا اعتراف کر چکا ہے۔ یہ خبر اخبار میں' مال واپس مال خانے میں اور آوارہ گرد سرکاری مہمان خانے میں۔"

عاجز صاحب نے گردن ہلائی "کہتے آپ بھی سچ ہو مگر خانہ خراب بھی سچ لکھتا ہے۔ اجی حضرت صاحب! مالِ مسروقہ نہیں غالب تو پھر کیا ہے؟ اتنا بڑا شاعر' ایک قومی اثاثہ' اردو زبان کی آبرو۔ اسے کوئی اغوا کرے اور حبسِ بے جا میں رکھے۔ پھر دوسرا اُچکا کے لے جائے۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔"

میں اس کے ساتھ اوپر گیا "ایسا ہو چکا ہے۔"

"آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا" عاجز صاحب نے کہا "بے چارہ ویسے ہی دل کا مریض تھا۔"

میں نے حیرانی سے کہا "غالب دل کا مریض تھا؟"

"اور کیا۔ ہم نے خود اس کا شعر پڑھا تھا دسویں جماعت میں۔"

"کون سا شعر؟"

"وہی یارا۔ دلِ بدبخت تجھے ہوا کیا ہے۔ آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟" عاجز صاحب نے کہا۔

"بدبخت نہیں' دلِ ناداں......"

"وہی۔ نادان ہی بدبخت ہوتا ہے" عاجز صاحب نے کہا "مگر دیکھو' اس میں صاف انجائنا کا ذکر ہے۔ ہمارا بھی دل میں اِدھر درد ہوتا ہے۔ ایک گولی رکھتا ہے اِدھر زبان پر۔ دلِ بدبخت کا درد غائب۔"

میرا دل چاہتا تھا کہ اپنا سر پیٹ لوں یا عاجز صاحب کو پیٹ ڈالوں۔ اس نے شاید میٹرک تک اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد زندگی میں پھر کبھی کتاب سے یا اہلِ کتاب سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھا تھا چنانچہ غالب کے جو شعر اس نے شرح کے ساتھ رٹ کے یاد کیے تھے' وہ اب بھی حافظے میں محفوظ تھے مگر اسے یہ علم نہ تھا کہ غالب زمانۂ حال کا شاعر تھا یا گزرے وقتوں کا۔ کتاب میں تو سب ہی کے فرمودات تھے۔ میر' غالب اور اقبال سے فیض اور قتیل شفائی تک۔ کون مر گیا ہے اور کون جیتا ہے۔ نہ اس نے

معلوم کیا' نہ کسی نے اسے بتایا۔ اس سے زیادہ تو وہ مجرموں کے بارے میں معلومات رکھتا تھا کہ فلاں ڈاکو مارا گیا اور فلاں مفرور ہے اور زندہ ہے مگر اس نے خود کو مُردہ مشہور کروادیا ہے۔ پولیس کی مدد سے۔

اوپر عجیب تماشا جاری تھا۔ سپاہی ہر طرف سے ملزم کو گھیرے ہوئے تفتیش کے کارِ خیر میں بڑے زور و شور سے حصہ لے رہے تھے۔ زور ان کا تھا' شور ملزم کا۔ ایک کے ہاتھ میں وہ نقلی داڑھی تھی جو ملزم کی بدقسمتی کے باعث تھانے دار کی دراز دستی کی تاب نہ لاتے ہوئے اس کے رخِ پُرنور کو داغِ مفارقت دے گئی تھی۔ ایک سپاہی اسے یوں لہرا رہا تھا جیسے کھیل کے میدان میں فاتح کپتان ٹرافی اٹھاتا ہے۔ باقی سب کانسٹیبل ایک جوتا پہنے کھڑے تھے' دوسرا ان کے ہاتھ میں تھا۔ ان کے افسر کے لیے پاؤں کی جوتی اپنے دستِ مبارک سے اٹھانا شایانِ شان نہ ہوتا' وہ کمر کی بیلٹ کھول کے شمشیر بکف سپہ سالار کی طرح کھڑا تھا۔

"تڑ" اس آواز کے ساتھ ہی ملزم اچھلا اور اس نے ایک ایسی چیخ ماری جو رمضان کے مہینے میں بجائے جانے والے سائرن کی آواز لگتی تھی "اجی ہم مرگئی۔ بالکل مرگئی ابھی.... آہ... ہائے۔ ہم پھر مرگئی۔ کلمہ شریف پڑھتی' درود شریف پڑھتی۔"

ایک کانسٹیبل نے سانس اندر کھینچ کے جوتا سر سے اوپر اٹھالیا تھا۔ اس کا ہاتھ نیچے آگیا۔ اس کی صورت پر تاسف کے ساتھ کچھ بے بسی کی جھنجلاہٹ تھی۔

"سر چپٹا کردو اس خرزاد کا۔ رک کیوں گئے؟"

ایک سپاہی نے دوسرے کی طرف دیکھا "سر! یہ درود شریف پڑھ لے پہلے۔"

تھانے دار نے جھنجلا کے کہا "اوئے یہ حرامی چالاک ہے بہت۔ اس کے بعد تلاوت شروع کردے گا۔"

نقلی داڑھی والے نے بلند آواز میں قرأت شروع کردی۔ چھترول کرنے والے تذبذب میں پڑگئے۔ ان کے نزدیک کسی تلاوت کرنے والے کے سر پر جوتے سے طبلہ بجانا یقیناً گناہ کی بات تھی۔

رابعہ بالکل خاموش اور حد درجہ دل زدہ سی میرے قریب کھڑی تھی "کچھ حاصل نہیں اس سے سکندر۔ یہ سب احمق ہیں اور جاہل۔"

"ہم بہت عقلمند ہیں' ہم کیا کرسکتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"واپس جا کے پیڈرو کو بتاتے ہیں۔"

"اتنی جلدی کیا ہے؟ کچھ پتا نہ چلا تو ظاہر ہے واپس جائیں گے۔ کچھ دیر انتظار کرو' شاید تفتیش کا کوئی مفید نتیجہ نکل آئے۔ میرا دل کہتا ہے کہ اس مکار مولوی کو ضرور علم ہوگا کہ غالب کو کہاں لے جایا گیا ہے" میں نے کہا۔

تھانے دار نے حکم دیا "اس کا والیوم بند کردو۔ نیچے لے جاؤ اسے۔"

نقلی داڑھی والا زیادہ اونچی آواز میں خوب ہل ہل کے تلاوت کرنے لگا۔ اس کا یہ حربہ مؤثر ثابت ہورہا تھا۔ مشکل یہ آپڑی تھی کہ پکے مسلمان سپاہی اس منہ میں کچھ ٹھونسنے پر بھی آمادہ نہ تھے جس سے قرأت کی آواز بلند ہورہی تھی۔ بے شک یہ کلامِ الٰہی کا غلط استعمال تھا اور کوئی مجرم اگر گناہ کا مُرتکب ہو تو قابلِ درگزر نہیں ہوسکتا۔

"سرجی! حکم ہے کہ جب کوئی خدا کا کلام پڑھے تو ادب سے سنو" ایک کانسٹیبل نے کہا "ایسے کب تک بچے گا یہ' ذرا خاموش ہوجائے۔"

"یہ حافظ ہوا تو پورا دن اور پوری رات گزار دے گا۔ تم کیا اس انتظار میں یہاں کھڑے رہوگے؟" تھانے دار نے جھلّا کے کہا۔

عاجز صاحب نے اس کی تائید کی "یہ چالاکی ہر مجرم دکھا سکتا ہے۔ مسجد میں گھس کے نماز پڑھنے لگے یا پھانسی کے تختے پر قرأت شروع کردے تو کیا وہ بچ جائے گا؟"

تھانے دار خود بیلٹ کو استعمال کرنے سے گریز کررہا تھا۔ اسے اندیشہ تھا کہ کج فہم ماتحت اس کی حرکت پر مشتعل ہوکے بغاوت نہ کردیں۔ خود میں منتظر تھا کہ تھانے دار اس مشکل کا کوئی حل نکالے۔

اس نے فوراً حل نکال لیا "اچھا مولوی کو تلاوت کرنے دو۔ بے شک نقلی داڑھی بھی لگادو واپس اس کے چہرے پر۔ اس کے گھر جاؤ اور اٹھا لاؤ جو ہے۔ اس کا باپ یا بھائی۔ گھر تو معلوم ہے نا؟"

سپاہی سے پہلے میں نے کہا "مجھے معلوم ہے' کون جائے گا میرے ساتھ؟"

مجھے اندیشہ تھا کہ احمق کانسٹیبل فوراً لاعلمی کا اعلان کردیں گے اور تھانے دار نے تھوڑی سی ذاتی عقل استعمال کرتے ہوئے جو چال چلی ہے وہ بے کار ہوجائے گی۔

"چلو تم دونوں جاؤ" تھانے دار نے کہا۔

ابھی ہم دروازے تک ہی پہنچے تھے کہ مولوی کا حوصلہ جواب دے گیا "آپ خلقت پر ظلم کرتی' اللہ کا عذاب نازل ہوتی۔ قرآن شریف میں آتی..."

مگر اس سے پہلے کہ وہ آیت کا حوالہ دیتا' تھانے دار نے اس کو تابڑتوڑ بیلٹ مار مار کے لٹادیا۔ وہ ہر مرتبہ "ہم مرگئی' بالکل مرگئی' پھر مرگئی کی گردان کے ساتھ فرش پر اچھلتا اور مچلتا رہا۔ تھانے دار نے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونسا اور گھسیٹ کر اسے نیچے لے گیا۔ عاجز صاحب کی دھمکی میں آکے ایک غلط کام کرنے کے بعد وہ مجبور ہوگیا تھا کہ اس چھاپے سے خاطر خواہ نتائج برآمد کرے۔

"رابعہ نے مجھ سے چمٹ کے کہا "سکندر! یہ...."

"یہ کیا؟" میں نے اس سے بازو چھڑایا "لاتوں کے بھوت کو تم باتوں سے منا سکتی ہو تو کوشش کرکے دیکھ لو۔ میں تھانے دار کو منع کردیتا ہوں۔ اور ہاں' سرِعام ایسی بے تکلفی صرف فلموں میں گوارا کی جاتی ہے بلکہ پسند کی جاتی ہے مگر ہم شوٹنگ پر نہیں آئے ہیں۔ تین فٹ کا شرعی فاصلہ رکھو اپنے اور میرے درمیان۔"

"یہ لوگ غالب کو کہاں لے گئے ہوں گے؟"

"سیزن ہوتا تو شاید مری لے جاتے مگر وہاں سردی ہوگی ابھی۔"

"مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں میں۔"

"مجھے معلوم ہے آپ حماقت کے موڈ میں ہیں۔ آپ ہی بتایئے کہ میں اس سوال کا کیا جواب دوں۔ یہ ساری محنت اور تفتیش اسی سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے ہورہی ہے۔ میں بتا سکتا کہ غالب کو وہ کہاں لے گئے ہوں گے تو پھر ہم سیدھے وہاں نہ چلے جاتے۔"

رابعہ نے جھینپ کر کہا "خواہ مخواہ مت ڈانٹو مجھے۔ تمہارا خیال پوچھ لیا تھا میں نے۔"

"چلو پہلے تم اپنا خیال بتاؤ۔ جب تک خود ملزم صحیح سمت میں راہنمائی نہ کرے' ہم اندازوں کا کھیل کھیلتے ہیں۔ دیکھتے ہیں' کس کا اندازہ درست ثابت ہوتا ہے۔"

"میں سخت ڈیپریشن کا شکار ہوں۔ آج اگر غالب اور نازو نہ ملے تو بہت برا ہوگا۔"

"اس سے زیادہ برا کیا ہوگا۔ پاگلوں جیسی باتیں تم اس وقت بھی کررہی ہو۔" میں نے کہا "آج کی شرط میں کون سی تُک ہے۔ وہ تو جب ملنا ہوگا ملیں گے۔"

رابعہ واقعی نروس بریک ڈاؤن کے قریب تھی۔ اس کا ذہن ماؤف ہورہا تھا اور اتنے شدید جذباتی دباؤ کا نتیجہ نہ ہوتا تو وہ ایسی باتیں بھی نہ کرتی۔ میرے رویّے کا بھی کوئی جواز نہ تھا۔ مجھے سمجھنا چاہیے تھا کہ وہ میرے غیر ہمدردانہ اور کسی حد تک مایوسی اور دل شکنی میں اضافہ کرنے والے رویّے کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ یہ بحث کہ کون زیادہ قوت برداشت رکھتا ہے۔ مرد کہ عورت۔ نفسیات اور میڈیکل سائنس کی ریسرچ کے اعداد و شمار سے کچھ بھی ثابت ہو' میں یہ جانتا تھا کہ میرے مقابلے میں رابعہ میں جذباتی مزاحمت اور طاقتِ برداشت کم ہے۔ اس کا مظاہرہ وہ ایک بار پہلے بھی کرچکی تھی جب ہم سب مشرقی پاکستان کے محاذ پر ایک سے مخالف حالات کے مقابل نبرد آزما تھے مگر وہ حوصلہ ہار گئی تھی اور چپکے سے لاہور لوٹ گئی تھی۔

اچانک اس کی آنکھوں میں اشکوں کی نمی یوں آئی جیسے برسات میں ایک دم کالی گھٹا اٹھے۔ پھر یہ نمی سیلِ اشک میں ڈھل گئی۔ ایسا برسا ٹوٹ کے بادل ڈوب گیا مے خانے بھی۔

"اُف۔ ارے بھئی رابعہ! لاحول ولا قوۃ!" میں نے بگڑ کے کہا "موقع محل دیکھ کے رونا چاہیے۔ کیوں عاجز صاحب؟"

دراصل عاجز صاحب کی موجودگی کے باعث ہی بوکھلاہٹ کا مظاہرہ کرنے کے سوا میں کچھ نہ کرسکا ورنہ ایسا تو پہلے بھی ہوا تھا جب میں نے اسے بازوؤں میں قید کرلیا' تھوڑا سا منایا' چمکارا اور اس کی اشک بار آنکھوں سے بہتے دھاروں کو اپنے لبوں سے بند کردیا۔

عاجز صاحب نے کہا "یار! کچھ کرو۔ وائف صاحب کو چپ کراؤ۔"

میں نے کہا "آپ فرمایئے کیا کروں؟"

"علاج بالمثل" وہ بولے "دورہ اگر شدید ہو.."

"میں سمجھا نہیں" میں نے بے بسی سے کہا۔

"دیکھو' یہ جو ہسٹریا ہے' یہ ردِ عمل ہوتا ہے اور اس کا علاج بھی ردِ عمل ہے۔"

"رابعہ پلیز! آئی ایم سوری...." میں نے عاجز صاحب کے فرمودات کو نظرانداز کرتے ہوئے رابعہ کا ہاتھ پکڑلیا مگر اس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔

عاجز صاحب میری حالت سے لطف اندوز ہورہے تھے "آپ ایک کو نہیں سنبھال سکتے' خیر سے اپنے گھر میں چار ہیں۔ بلحاظِ عمر بھی نمبر ایک سینئر ہے۔ دوئم اور سوئم کی خانہ جنگی کے اسباب چہارم پیدا کرتی ہے۔ وہ خود نہیں لڑتی' انہیں لڑا کے الگ ہوجاتی ہے۔ پھر جناب' نمبر ون ریفری کے فرائض سنبھالتی ہے مگر وہ ناکام رہے تو پھر ہم اپنے ہاتھ کا کمال دکھاتے ہیں۔ ایک جھانپڑ وہی کام کرتا ہے جناب جو عام دوا کے کارگر نہ ہونے کی صورت میں اینٹی بایوٹک....."

اینٹی بایوٹک سے پہلے میں نے بھی وہ نسخۂ شفا استعمال کیا جس میں پیار محبت کا مکسچر اور منت سماجت کی گولیاں تھیں اور علاج کے لیے قربت بے حد ضروری تھی۔

عاجز صاحب نے بغلیں جھانکتے ہوئے فرمایا "خیر.... اپنا اپنا طریقہ ہے... میں ذرا نیچے جا کے دیکھتا ہوں' تفتیش کیسے ہورہی ہے۔"

میں نے انہیں بھاگنے پر مجبور کردیا تھا۔ سسکیاں لے کر روتی ہوئی اور منہ چھپا کے لرزتی ہوئی رابعہ کو میں کب تک دیکھتا رہتا۔ بالآخر میں نے وہی کیا جو مجھے کرنا چاہیے تھا اور یہ بھول گیا کہ ابھی کچھ دیر پہلے میں اسے شرعی فاصلہ برقرار رکھنے کی تاکید کررہا تھا۔

"چھوڑ دو مجھے' پاگل ہوں میں" رابعہ نے مچل کے کہا۔

"بالکل ٹھیک۔ میں بھی تو پاگل ہوں۔ تمہیں کیسے چھوڑ دوں" میں نے اسے منانے کے لیے راست اقدام کیا "پاگل کی گرفت سے خود کو چھڑا سکتی ہو تو چھڑا لو۔"

اس کا جوش و خروش ایک دم سرد پڑگیا "چھوڑو مجھے خدا کے لیے۔ ابھی آجائے گا کوئی۔ بدتمیز... جاہل...... بے شرم۔"

"اور بھی جو کہنا ہے کہہ لو۔ چھوڑوں گا میں اس وقت جب تم مسکرا کے دکھاؤ گی ورنہ جو دیکھتا ہے دیکھتا رہے' مجھے کسی کا ڈر نہیں" میں نے مزید جارحانہ عزائم کا مظاہرہ کیا۔

اس وقت وہاں دیکھنے والا کوئی نہیں تھا اور عاجز صاحب کی فراہم کردہ خلوت کا مختصر وقفہ طویل بحث اور روٹھنے منانے کے لیے سین میں ضائع نہیں کیا جاسکتا تھا۔ روتے روتے مسکرانا تو رابعہ کے بس میں نہ تھا مگر اس کا ہسٹریا اس خوف میں دب گیا کہ نیچے سے کوئی نمودار ہوگیا تو بڑی سبکی ہوگی۔

"ایک منٹ دوں گا میں مسکرانے کے لیے" میں نے اسے چھوڑتے ہوئے کہا۔

اس نے سکون کی گہری سانس لی اور فوراً دوپٹے کے پلّو سے اپنی آنکھیں خشک کرلیں "بلیک میل کرتے ہو' بدمعاشی دکھا کے۔"

میں نے ڈھٹائی سے دانت نکال کے کہا۔ "تم ہی مجبور کرتی ہو کہ ہم شرافت چھوڑ دیں۔ بدمعاشی کے بغیر کہاں مانتی ہے تمہاری قوم۔ ایسی ٹیڑھی ہے ذات عورت کی۔"

"آ گئے نا اوچھے پن پر۔"

"آنسو اور ہسٹریا' یہ جذباتی بلیک میلنگ نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ ہٹلر بھی ہتھیار نہ ڈالے تو کیا کرے" میں نے کہا "جواب نہ ہو کسی بات کا یا زبردستی کچھ منوانا ہو تو....."

میری بات عاجز صاحب کے نمودار ہونے سے نامکمل رہ گئی۔ انہوں نے پہلے مجھے اور پھر رابعہ کو غور سے دیکھا اور غالباً مطمئن ہوگئے کہ ایک کامیاب شوہر کی طرح میں علاج نمبر ایک یعنی پیار سے صورت حال پر قابو پانے میں کامیاب رہا اور علاج نمبر دو یعنی جھانپڑ کی نوبت نہیں آئی۔

ان کے لبوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ تھی "لو جی سب معلوم ہوگیا۔"

میں نے مضطرب لہجے میں کہا "کیا..... غالب کا پتا چل گیا؟"

"کیسے نہ چلتا..... ہم پر لعنت' ہماری صحافت پر لعنت اور اعلیٰ تعلیم پر لعنت' اگر ہم غالب جیسے شاعر کے لیے بھی کچھ نہ کریں۔ ہم تو پولیس کے سارے محکمے کا خانہ خراب کردیتے....."

سیڑھیوں سے ہاتھ جھاڑ کے پیٹی باندھتا ہوا تھانے دار پہلے اوپر آیا۔ اس کے پیچھے ملزم تھا جو اَب صاف مجرم نظر آرہا تھا۔ اس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے' آنکھوں کے گرد نیل تھے۔ ایک آنکھ تو تقریباً بند تھی اور دوسری سے دنیا اسے یقیناً بدلی ہوئی نظر آرہی ہوگی۔ ممکن ہے دن میں تارے نظر آرہے ہوں یا سورج چاند ایک ساتھ چمکتے دکھائی دے رہے ہوں۔ فضا دھندلی ہو یا زمین اُلٹی گھوم رہی ہو۔ جب وہ نیچے گیا تھا تو اس کے حواس خمسہ ضرورت سے زیادہ تیز تھے اور وہ سب کو چکر دے رہا تھا۔ اوپر آیا تو خود چکرا رہا تھا۔ بقول شاعر۔ چھٹے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا۔

وہ ایسے چل رہا تھا جیسے نشے میں ہو۔ یہ نشہ پاپوش تھا اور خمارِ چھترول تھا۔

"چل پدر سوختہ" تھانے دار نے اس کے ایک لات ماری "پڑھ کلمہ شریف اور پھر درود شریف پڑھ کے بتا غالب صاحب کہاں ہیں؟"

اس نے پنکچر ہوجانے والے ٹائر کے ساتھ چلنے والی گاڑی کی طرح بولنا شروع کیا "جناب اٹک کے پل شریف سے آگے نہیں..... نیچے۔ اکوڑہ خٹک شریف سے آگے....."

تھانے دار نے اسے ایک اور لات ماری "آگے پیچھے کی اولاد! جگہ کیا ہے' تو ساتھ جا ان کے..... راستہ بتا....."

وہ چکنے گھڑے کی طرح لڑھک گیا اور پھر چلّانے لگا "اللہ جی ہم مرگئی۔ بالکل مرگئی۔ پھر مرگئی۔ ہم بتاتی۔ آہ..... غالب صاحب فرماتی' کوئی صورت نظر نہیں آتی' آنکھوں کے آگے اندھیرا چھاتی!!"

"آپ جائیں جی اس ولد..... فلاں فلاں کے ساتھ" تھانے دار نے اپنی فادری زبان میں اس کے شجرۂ نسب میں خود کو شامل کرکے کہا "اور عاجز صاحب! آپ اس کا خانہ خراب کردینا کل کے اخبار میں لیکن میرا ذرا خیال کریں۔ بہت بڑا کیس میں نے یوں حل کردیا۔"

"ایسے چٹکی بجا کے تم سارے مجرم کیوں نہیں پکڑ لیتے؟ اور یہ تو ہم نے بتایا اور تم مجبوراً ہمارے ساتھ آگئے۔ خیر ہم خیال رکھیں گے" عاجز صاحب بولے۔

"وہ دراصل..... ابھی کچا تھانے دار ہوں نا جی' اس لیے ڈرتا ہوں قانون کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے۔"

"پکے ہوجاؤ گے تو طوطے کی طرح نظریں پھیر لو گے ہم سے۔ خیر' ہم نے بھی یہ بال دھوپ میں سفید کیے ہیں۔ نمٹ لیں گے بعد میں۔ ابھی تم ایسا کرو' آدھا سیر بکّا چانپ کا گوشت اور کچھ پھل ہمارے گھر میں بھجوا دینا۔ میں ذرا ان کے ساتھ جاؤں گا پوری رپورٹ دینے کے لیے جائے واردات پر میری موجودگی ضروری ہے۔ تمہاری نفری بھی ساتھ جائے گی نا؟ یہ جیپ چھوڑ جاؤ۔"

"جیپ چھوڑ جاؤں! خود کیا پیدل جاؤں؟"

"پیدل چلنے والے ہوتے تو یہ تربوز اتنا بڑا نہ ہوتا۔" عاجز صاحب نے اس کے پیٹ میں انگلی چبھوئی "چالان کرلینا کسی کا۔ وہ خود تمہارا جنازہ ڈھو کر لے جائے گا۔"

اس کے ماتحت دانت نکالنے کی گستاخی پر آمادہ تھے۔ تھانے دار نے ان پر ایک نگاہِ غضب ڈالی۔ "اوئے حرام خورو' ملزم کا خیال رکھنا۔ یہ ایک نمبر کی حرامی چیز ہے اور تم ہو اُلو کے پٹھے۔ آنکھوں میں دھول جھونک کے نہ نکل جائے۔ واپسی میں بیان ہوگا سب کا۔ غالب صاحب کا بھی۔"

"کیوں نہیں' کیوں نہیں" عاجز صاحب چہکے "ذرا تھانے میں استقبال کا اچھا انتظام کرنا۔ خاطر داری میں کمی نہ ہو۔ اُردو کا اتنا

بڑا شاعر پہلی بار تھانے آئے گا۔"

میں نے کہا "پہلی بار کہاں عاجز صاحب! وہ تو اکثر تھانے جاتے تھے۔"

عاجز صاحب نے پہلے اسے مذاق جانا اور نظر انداز کردیا۔ پولیس کے دو سپاہی ملزم کے ساتھ خود کو باندھ کر جیپ میں بیٹھ گئے کہ راستے میں وہ کودنے کی کوشش کرے تو اس کے ساتھ ہی قانون کے محافظ بھی سڑک پر گریں۔ تیسرے نے ڈانواڈول جیپ کی باگ ڈور سنبھالی۔ عاجز صاحب نے کار کی پچھلی سیٹ پر تشریف کو رکھا اور مجھے جیپ کا تعاقب کرنے کی تاکید کی۔ رابعہ آگے میرے ساتھ تھی اور اب ہم جی ٹی روڈ پر راولپنڈی کی جانب رواں تھے۔ ڈرائیونگ رابعہ کررہی تھی۔

عاجز صاحب نے کچھ دیر بعد خاصی تشویش کے ساتھ کہا "وہ آپ جو کہہ رہے تھے غالب صاحب کے بارے میں' وہ مذاق تھا نا؟"

"بالکل نہیں۔ وہ اکثر تھانے جاتے تھے۔"

"اکثر! کس جرم میں؟"

"ایک بار جُوا کھیلتے ہوئے گرفتار ہوئے۔ قرض خواہ پکڑوا دیتے تھے۔ قرض کی پیتے تھے مے" میں نے مذاق میں ایک حقیقت بیان کی۔

"شراب پیتا تھا اُدھار لے کر۔ توبہ توبہ!" عاجز صاحب نے اپنے گالوں پر تھپڑ مارے "جُوا کھیلتا تھا۔ توبہ توبہ۔ اسی لیے تو بیڑا غرق ہورہا ہے نونہالانِ قوم کا۔ میں اس پر کالم لکھوں گا۔ نصاب سے اس کے سب شعر نکال دیے جائیں۔ ایسے بدکردار شاعر کا کلام اسکول کالج کی کتابوں میں بالکل نہیں ہونا چاہیے۔"

میں نے کہا "غالب کی اصلاح کے لیے بھی کچھ کریں آپ۔"

"کیوں نہیں۔ ہم اسے اپنے پیر صاحب کی خدمت میں پیش کریں گے۔ ان کے ہاتھ پر بیعت کرے' ان کی خدمت کرے' انشاءاللہ ٹھیک ہوجائے گا۔ آخر اُردو زبان کا اتنا بڑا شاعر ہے جتنے ڈاکٹر صاحب۔"

میں نے حیرانی سے کہا "کون ڈاکٹر صاحب؟"

"اپنے ڈاکٹر علامہ سر اقبال صاحب سیالکوٹ والے" عاجز صاحب کی معلومات مکمل تھیں "والد صاحب فرماتے تھے' اللہ نے بڑی شفا دی تھی ان کے ہاتھ میں۔"

میں نے کہا "اچھا! آپ کبھی ملے ان سے؟"

انہوں نے ایک آہ بھری "اپنی ایسی قسمت کہاں۔ بس آج غالب سے ملاقات ہوجائے تو ساری عمر فخر کریں گے۔ والد صاحب نے شرفِ ملاقات بخشا تھا۔"

"ڈاکٹر اقبال' شاعرِ مشرق کو؟" رابعہ نے طنز سے کہا۔

"جناب والد صاحب خاص طور پر پشاور سے لاہور گئے تھے۔ خود مجھے بتاتے تھے کہ ان کے ساتھ لاہور والوں نے کیا سلوک کیا" عاجز صاحب نے شکایتی' پُرسوز لہجے میں کہا "وہ اُدھر اسٹیشن پر اترے تو شیو بڑھی ہوئی تھی۔ باہر نکلتے ہی فٹ پاتھ پر بورڈ دیکھا اسلامی ہیئر کٹنگ سیلون کا تو بیٹھ گئے۔ بغیر ٹکٹ کے سفر کیا تھا۔ ٹکٹ چیکر آیا تو وہ گھس گئے بیت الخلا میں۔ چیکر کافر تھا' ہندو۔ اسے معلوم ہوگیا۔ وہ وہیں بیٹھ گیا مگر جناب' والد صاحب بھی باہر نہیں نکلے۔ سُنا ہے لاہور پر اترا تو اپنی شکست کی خفّت کو چھپانے کے لیے کہہ رہا تھا کہ سالے مُسلے کو رات بھر سنڈاس میں بند رکھا۔ خیر کہنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ رات بھر کھڑے رہے تھے اور جاگتے رہے تھے۔ ذرا سی جھپکی آئی ہوگی۔ اتنی دیر میں اس خانہ خراب اسلامی باربر نے سر صاف کردیا۔ ایک دم اُسترا پھیر کے والد صاحب کی برسوں کی محنت خاک میں ملادی۔ انہوں نے تو ڈاکٹر اقبال صاحب کے کہنے پر عمل کیا تھا۔ گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر۔ سر میں خالص مکھن ملتے تھے' پھر روغن آملہ۔ مُربّہ آملہ ناشتے میں نوش کرتے تھے۔ گیسوئے تابدار کی جگہ تابدار سر رہ گیا اور انہیں پتا ہی نہیں چلا۔"

میں نے ہنسی کو بڑی مشکل سے ضبط کر رکھا تھا "پھر کب پتا چلا۔ جب اولے پڑے؟"

"اولے؟" عاجز صاحب نے سوچ کے کہا "نہیں۔ بہت تیز دھوپ پڑ رہی تھی۔ گھنے بال تھے تو کچھ کم لگتی تھی۔ پٹھان کا دماغ تھا۔ ڈائریکٹ مغز گرم ہوا تو والد صاحب جلال میں آگیا۔ چلانے لگا کہ خانہ خراب۔ اب ہم ڈاکٹر اقبال صاحب کو کیسے بتائے گا کہ ہم نے گیسوئے تابدار کو کتنا تابدار کیا تھا۔ غصے میں اسلامی باربر کے مُکا رسید کردیا۔ خاندانی بندوق ساتھ ہوتی تو شاید..... شاید کیا' یقیناً وہیں اس کو فنا کردیتے۔ باربر اُدھر ہی لیٹ گیا۔ خانہ خراب مکر کرتا تھا جیسے فوتیدگی ہوگیا۔ اس کا ایک شاگرد باری کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ وہ پہلوان تھا۔ روز اکھاڑے جانے سے پہلے دو کونڈے دہی کی لسی پیتا تھا اور سر کی شیو کراتا تھا۔ اس نے والد صاحب کو پکڑ لیا اور اُدھر ہی چت کردیا۔ وہ دب گئے گوشت کے پہاڑ کے نیچے۔ ویسے بھی پردیسی مسافر تھے۔ ایک خانہ خراب' شاہی دندان ساز اُدھر بیٹھتا تھا۔ اس نے موقعے سے فائدہ اٹھایا اور والد صاحب کا دو دانت زنبور سے کھینچ لیا۔ خٹاک سے۔"

اب میرے لیے ہنسی کو روکنا محال تھا "وہ کس لیے؟ کیا بقرعید قریب تھی؟"

"بقرعید! آپ کو کیسے معلوم ہوا؟" عاجز صاحب بھونچکے رہ گئے۔

"اس نے کسی بکرے کے لگائے ہوں گے دو دانت۔ ان کی بڑی مانگ ہوتی ہے" میں نے کہا۔

عاجز صاحب نے بُرا نہیں مانا "ابی یارا تم بولو' پردیسی مہمان کے ساتھ ایسا سلوک اچھا بات ہے؟ آپ کے ساتھ کسی نے کوئی غلط بات کیا؟"

میں نے انہیں پشاور میں پیش آنے والے جان لیوا واقعات کے بارے میں بتانے کا سوچا اور پھر ارادہ ملتوی کردیا۔ مجھے ان کی باتوں میں مزہ آرہا تھا اور خود رابعہ بھی بہت لطف لے رہی تھی۔ اس کی ہنسی روکے نہیں رُک رہی تھی۔ ہم وقتی طور پر بھول گئے تھے کہ اس سفر کے اختتام پر کیا ہوگا؟ ہماری تلاش بار آور ہوگی یا ایک بار پھر مایوسی کا سامنا ہوگا؟ غالب اور نازو مل گئے تو کیا ہوگا اور نہ ملے تو کیا ہوگا؟ غالب کی رہائی کے لیے خطرات کی رزم گاہ میں کودنا پڑا تو ناکارہ بندوقوں والے دو نااہل سپاہی کون سی توپ چلائیں گے۔ ایک جاہل' مجہول' نام نہاد صحافی خانہ خراب کرنے کی دھمکی دے کر ہمیں کیسے بچائے گا؟ اور کسی خانہ خرابی کے بغیر غالب اور نازو ہمیں مل گئے تو پھر اس پیر تسمہ پا بن کے عاجز کردینے والے عاجز صاحب سے پیچھا چھڑانے کی کیا صورت ہوگی؟ قانون کے محافظوں سے کیسے جان چھوٹے گی؟ یہ سب سوالات فی الحال پس منظر میں چلے گئے تھے۔

میں نے سنجیدگی اختیار کرکے کہا "آپ کے والد صاحب کے ساتھ واقعی لاہور والوں نے زیادتی کی تھی۔ خیر یہ بتایئے' ڈاکٹر صاحب سے ان کی ملاقات ہوئی یا نہیں؟"

انہوں نے افسوس سے سر ہلایا "کدھر جناب۔ ان کا ایک خدائی فوجدار ملازم تھا۔ اللہ بخش۔ ہر بار اس نے روک دیا کہ ابھی لوگ بیٹھے ہیں۔ وہ ہر روز جاتے' ہر روز یہی ہوتا۔ پھر ایک دن والد صاحب نے کہا کہ میں اپنا کان دکھانا چاہتا ہوں ڈاکٹر صاحب کو۔"

"کان میں کیا ہوا تھا؟"

"وہ..... دراصل پہلوان نے ان کو چت کرنے کے بعد کان بھی کھینچے تھے۔ وہ خانہ خراب تو کان اکھاڑ لیتا مگر پولیس آگئی اور سب کو تھانے لے گئی۔ والد صاحب نے تین یوم تھانہ گڑھی شاہو میں قیام وطعام فرمایا۔ وہاں سے ڈاکٹر اقبال صاحب کا غریب خانہ قریب تھا۔ میرا مطلب ہے دولت خانہ۔ والد صاحب کے ایک کان میں واقعی تکلیف تھا۔ وہ کان تھوڑا باہر بھی نکل آیا تھا۔ انہوں نے بولا کہ کاغذ دو' میں رقعہ لکھ کے دیتا ہوں۔ تمہاری شکایت بھی لکھوں گا کہ میں پشاور سے آیا ہوں اور تم نے دروازے پر روک رکھا ہے۔ بس جناب' اس نے پرچی دیا اور والد صاحب نے اپنا تکلیف بیان کیا اور خدابخش کا بھی بہت شکایت کیا۔ وہ رقعہ اندر لے گیا اور واپس آگیا۔"

ہنستے ہنستے میری آنکھوں میں آنسو آنے لگے تھے "پھر۔ کوئی نسخہ لکھا تھا ڈاکٹر صاحب نے اور اس ملازم کا کیا ہوا؟"

"نسخہ بھی لکھا تھا ایک شعر میں۔ ملازم کی شکایت کے جواب میں یہ لکھا تھا کہ مردناداں پر کلام نرم ونازک بے اثر۔ مطلب یہ کہ اس جاہل کو معاف کردو۔ والد صاحب کے لیے لکھا تھا کہ پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر۔ یہ معلوم نہیں ہوا کہ کون سے پھول کی پتی سے ورنہ ہیرے کا جگر کاٹ کے استعمال کرنے سے ضرور فائدہ ہوتا۔"

رابعہ کا برا حال تھا "بس کرو سکندر۔"

میں نے پیٹ پکڑ کے کہا "عاجز صاحب! ہیرے کا جگر نہیں' کھیرے کا جگر لکھا ہوگا۔ اور پھول ہوگا گوبھی کا۔ آپ کے والد صاحب سمجھ نہیں سکے۔ حکیم الامت تمام سبزیوں کے خواص ضرور جانتے ہوں گے۔ ویسے کیا یہ ان کا اپنا ہینڈ را'ٹنگ تھا۔"

"شاید کمپونڈر کو نسخہ لکھوایا ہوگا" رابعہ بولی۔

عاجز صاحب کچھ آزردہ تھے کہ ہم ان کے والد صاحب کی جہالت پر ہنس رہے ہیں "والد صاحب ہماری طرح اعلیٰ تعلیم یافتہ نہیں تھے مگر بڑے علم دوست تھے۔ ایک دوست تھا محمد عالم' دوسرے کا نام علم الدین۔"

میں نے کہا "آپ نے کہاں تک تعلیم حاصل کی؟"

"جناب' ڈگری اور تعلیم میں بڑا فرق ہے۔ ہم ابھی تک طالب علم ہی سمجھتے ہیں خود کو حالانکہ میٹرک کی ڈگری بہت پہلے لے لی تھی۔"

میں نے کہا "صحافت کا خیال کیسے آگیا آپ کو؟"

"بس ہم نے محسوس کیا کہ ہم میں صلاحیت ہے۔ ملک کا خانہ خراب ہورہا تھا۔ ہم نے قلم اٹھالیا اور کود پڑے میدان میں۔"

میں نے آہستہ سے کہا "کاش آپ مینار پاکستان سے کودے ہوتے۔"

رابعہ زور سے ہنسی لیکن اس نے فوراً میری بات کو دبالیا "اخبار کب جاری کیا آپ نے؟"

"بہت پرانی بات ہے' کئی سال ہوگئے" انہوں نے گول مول جواب دیا "چور ڈاکو' راشی افسر' بدعنوان پولیس والے' بدمعاش اور اسمگلر۔ سب کا خانہ خراب کردیا۔ خانہ خراب کے نام سے ڈرتے ہیں سب۔ عاجز کے قلم سے سب عاجز ہیں۔"

"اشاعت کتنی ہے؟" میں نے کہا۔

"لاکھوں قاری ہیں اس کے" عاجز صاحب نے چالاکی سے جواب دیا "اصل بات اشاعت نہیں ہوتی۔ بہت سے اخبار ہیں جن کو پڑھتا ہی کوئی نہیں یا ان کا اثر نہیں ہوتا۔ ہم خاص خاص لوگوں کو خاص طریقے سے پڑھواتے ہیں۔ عام لوگوں کو عام طریقے سے۔"

"یہ بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی" میں نے کہا۔

"اس کی اعزازی کاپی خاص خاص لوگوں کو مفت پہنچائی جاتی ہے۔ اسمبلی کے ممبرز' ڈپٹی کمشنر' ایس ڈی ایم' پولیس کے اعلیٰ افسران' صوبائی وزرا اور گورنرز' مرکزی حکومت کے ارکان۔ اور

ان کو جن کے بارے میں سُرخیاں ہوتی ہیں۔ جو کاپیاں بچ جاتی ہیں وہ ہم پوسٹر کی طرح سارے شہر میں لگادیتے ہیں۔ نیچے سے اوپر تک سب کو معلوم ہوجاتا ہے۔ بس اسٹاپ' ریلوے اسٹیشن' سینما۔ ہر جگہ لوگ خود دیکھ لیتے ہیں۔ اور مجرم کے ساتھ ہم اس کے خاندان کی تصویر بھی لگادیتے ہیں کہ یہ ہے اس کا باپ' یہ بھائی اور یہ دوست۔ سب سے خبردار۔ بڑی بے عزتی ہوتی ہے ان کی جو ہمارا کہنا نہیں مانتے۔"

میں نے کہا "عاجز صاحب! یہ صحافت ہے یا بلیک میلنگ؟"

عاجز صاحب چراغ پا ہوگئے "کیا بولتے ہیں جناب! یہاں شرافت سے کام چلتا ہے؟ صبح سے شام تک ہر شخص بلیک میل ہوتا ہے اور کرتا ہے۔ میری ماں بلیک میل کرتی ہے مجھے کہ میں نے تجھے پیدا کیا اور پالا۔ میری مان ورنہ میں دودھ نہیں بخشوں گی۔ ایک بیوی کہتی ہے' میکے چلی جاؤں گی' دوسری کہتی ہے خودکشی کرلوں گی' تیسری کا بھائی بدمعاش ہے۔ اس سے ڈراتی ہے مجھے۔ اور میری بات چھوڑو' معاشرے میں کیا ہورہا ہے؟ محبت میں کیا بلیک میلنگ نہیں ہوتی۔ فرہاد کو کتنا بلیک میل کیا شیریں نے۔ ہوتی ہے یا نہیں؟"

میں نے رابعہ کی طرف دیکھا "بہت زیادہ ہوتی ہے۔"

"اور خانہ خراب سیاست میں بلیک میلنگ کے سوا کیا ہے۔ امریکا بولتا ہے یہ مت کرو ورنہ امداد بند' وہ مت کرو ورنہ ہم خانہ خراب کرے گا۔ ابھی بنگلہ دیش کے معاملے میں مجیب نے کتنا بلیک میل کیا۔ ابھی اس تھانے دار کو ڈر نہ ہوتا تو وہ تمہاری مدد کرتا؟ صحافت میں کامیابی کے لیے یہ ضروری ہے۔"

میں نے کہا "چار بیویوں کی حاضر اسٹاک میں موجودگی بھی آپ کی کامیابی کا ثبوت ہے ورنہ لوگ تو ایک بھی افورڈ نہیں کرپاتے۔ یقیناً آپ کا گھر بھی بہت بڑا ہوگا۔ بڑے گھر کی آبادی بھی بڑی ہوگی اور ان کا خرچ بھی بڑا ہوگا۔ ظاہر ہے اس کے لیے بڑی آمدنی چاہیے۔"

"اللہ کے فضل سے دو بسوں کی آمدنی ہے۔ پشاور' پنڈی کا روٹ پکڑ رکھا ہے۔ دو ٹرک ہیں۔ کوئٹہ تک جاتے ہیں اور ہر قسم کا مال لاتے ہیں" عاجز صاحب نے فخر سے کہا۔

"انہیں کوئی بھی نہیں پکڑتا ہوگا" وہ چرس لائیں یا اسمگلنگ کا سامان۔ کسی کی مجال نہیں ہوگی کہ ان سے بھتا لے یا محصول۔ ان کا چالان بھی نہیں ہوتا ہوگا۔ کون پولیس افسر یا کسٹم انسپکٹر اپنی اور خاندان کی تصویریں پوسٹر کی صورت میں دیکھنا چاہے گا۔ آپ نے جو کوٹھی یا حویلی بنائی ہوگی' اس کے ماتھے پر "ہذا من فضل ربی" ضرور لکھا ہوگا۔ آپ خیراتی اداروں کو چندہ بھی دل کھول کے دیتے ہوں گے۔"

"بالکل ٹھیک سمجھے آپ... لیکن..."

"میں ایک حاجی کو جانتا ہوں جو درحقیقت بہت بڑا پاجی ہے۔ نام اس کا عبداللہ ہے مگر یہ بھی غلط ہے۔ وہ شیطان کا چیلا ہے۔ اللہ کا بندہ ہوتا تو اپنی قبر کے لیے جہنم کے انگارے جمع نہ کرتا جس کو وہ بینک بیلنس کہتا ہے۔ اس کی ایک فٹ کی داڑھی ہے۔ تم بھی رکھ لو' پھر اس میں اور تم میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔ وہ پھلوں کا آڑھتی ہے اور تم زرد صحافت کے آڑھتی ہو۔ لعنت خدا کی تم دونوں پر!"

عاجز صاحب کو آگ لگ گئی "کیا بکتے جارہے ہو؟"

"بہت دیر تمہاری بکواس سن لی تھی میں نے۔ اس سے زیادہ برداشت نہیں کرسکتا میں" میں نے اسی سپاٹ لہجے میں کہا اور اپنی نظر سڑک پر کرلی۔

"میں خانہ خراب کروں گا تمہارا۔"

"تمہاری چار بیویوں کے بیوہ ہونے کا خیال نہ ہوتا تو میں تم کو جہنم رسید کرنے کا ثواب ضرور حاصل کرلیتا" میں نے کہا "تم کیا خانہ خراب کروگے میرا جس نے اپنی عاقبت خراب کرنے کے سوا کچھ نہیں کیا۔ تم صحافت کے مقدس پیشے کے نام پر کلنک کا ٹیکہ ہو۔"

"میں بتاؤں گا تمہیں۔" عاجز صاحب نے غصے سے پھنکارتے ہوئے کہا "تم کو پتا چل جائے گا کہ میں کیا ہوں۔"

"تمہیں بھی پتا چل جائے گا بیٹے کہ ہم کیا ہیں۔ اور دنیا کو بھی معلوم ہوجائے گا کہ تم کیا ہو۔ تم ساری دنیا کو بے نقاب کرنے کی دھمکی دے کر اپنا اُلو سیدھا کرتے رہے ہو' اب ہم بے نقاب کریں گے تمہیں۔"

"تم کیا چیز ہو؟" اس نے حقارت سے کہا۔

"ایک نام یاد رکھنا۔ ایم آر ایس۔" میں نے کہا "مائٹ از رائٹ سوسائٹی" تم ان پڑھ ہو اس لیے بتاتا ہوں کہ اس کا مطلب ہے جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے قانون کو ملک کا دستور بنانے والوں کی دشمن جماعت جس میں باضمیر' مخلص اور محبِ وطن' سچے لوگ شامل ہیں۔ کبھی نہ کبھی تمہارا بھی واسطہ اس سوسائٹی سے پڑے گا۔"

"یارا' پھر کیا ہوگا؟ ایسے لوگ آٹے میں نمک کے برابر ہیں اور آج تک انہوں نے کیا تیر مارا ہے؟"

"وقت بدلتے دیر نہیں لگتی عاجز صاحب۔ دل میں قوم کا درد رکھنے والے' حق اور انصاف پر عملاً یقین رکھنے والے اور اصول پرست لوگ اپنی آواز رکھتے ہیں۔ وقتی طور پر اس آواز کو دبانے والے کتنا ہی شور کیوں نہ کریں' نقارے بجائیں یا ڈھول' پاگل کتوں کی طرح بھونکتے رہیں یا پھر بندوق سے دھماکے کریں' ان کی آواز کو ختم نہیں کرسکتے۔ منافق اور دُہرے معیار رکھنے والے ہی اس ملک کے سب سے بڑے دشمن ہیں' جن کا ایمان ہے مفاد پرستی لیکن تم دیکھو کہ اتاترک' چواین لائی' قائداعظم اور مصر کے صدر ناصر جیسے لوگوں نے کیا کیا۔ پہلے ان کی ایک آواز تھی مگر پھر

سب ان کے ہمنوا ہوگئے اور انہوں نے تاریخ کے دھارے کا رُخ بدل دیا' قوموں کی تقدیر بدل دی۔"

"اور اب یہ کام تم کروگے؟ تم تو خود مفرور اور مجرم ہو' دنیا سے مُنہ چُھپاتے پھرتے ہو۔"

"تم جیسے بڑے مجرموں نے ہی ہمیں مجرم بنایا ہے تاکہ تم ہمارے مقابلے میں بے قصور نظر آؤ لیکن ایم آر ایس جھوٹ اور فریب کا یہ پردہ ضرور ہٹائے گی اور تمہارا اصل چہرہ ضرور دکھائے گی۔ بے ایمان تاجر' بدعنوان انتظامیہ' کرپٹ افسر' راشی محکموں کے لٹیرے' عوام کی جان ومال اور آبرو کے دشمن' منافق مُلّا اور تم جیسے جعلی صحافی۔ ان سب کے خلاف ہماری کھلی جنگ ہے۔ تمہیں ہم تمہاری بساط پر تمہاری ہی چالوں سے شکست دیں گے۔ ہم تمہارے ہی جال سے تم کو شکار کریں گے۔"

عاجز کچھ متاثر اور مرعوب نظر آنے لگا تھا۔ "اگر میں تمہیں پکڑوادوں تو یہ سارے دعوے جھوٹے اور بے معنی ہوجائیں گے۔"

"پہلی بات تو یہ کہ اس وقت تم ہمارے قبضے میں ہو' ہم تمہارے قبضے میں نہیں ہیں۔" میں نے کہا "میرے لیے یہ بائیں ہاتھ کا کھیل ہے کہ تمہاری یہ بھینسے جیسی گردن توڑ کے تمہیں چلتی گاڑی سے باہر گرادوں۔ دوسری بات یہ کہ ایم آر ایس صرف میں نہیں' یہ تو ایک جذبہ' ایک یقین اور ایک طاقت ہے جس کی جڑیں اس ملک کے عوام میں اور ان کے خون میں' زمین کے رشتوں میں اور فضاؤں میں' نہ جانے کہاں کہاں تک پھیلی ہوئی ہیں۔ تم نے امربیل تو دیکھی ہوگی۔ وہ کسی درخت سے چمٹ جائے تو پھر نہ اس کی ابتدا کا پتا چلتا ہے نہ انتہا کا۔ تم سمجھ لو کہ ایم آر ایس بدکرداری کے درخت سے چمٹ جانے والی امربیل ہے۔ بدکرداری بہت وسیع لفظ ہے جو ہماری تمام قومی خامیوں اور خرابیوں کا احاطہ کرلیتا ہے۔ یہ درخت سوکھ جائے گا اور اپنی موت آپ مرجائے گا۔ یا اسے گرانا پڑے گا۔ سارے وطن دشمن اور عوام کے دشمن اکٹھے ہوکے خود کو بہت طاقتور محسوس کرنے لگے ہیں مگر میں ایک پتے کی بات بتاتا ہوں تمہیں' اس پر غور کرنا۔ دنیا میں اگر ناقابلِ شکست کوئی چیز ہے تو وہ ایک نظریہ ہے۔ جب گلیلیو نے یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ یہ دنیا ہے جو سورج کے گرد گھومتی ہے تو اس کا سر قلم کردیا گیا مگر کیا اس سے نظریہ ختم ہوا؟ نظریۂ پاکستان کو انگریز اور ہندو اپنی طاقت' عیاری' ذہانت اور سرمائے سے ختم کرسکے؟ ایک کرپٹ معاشرہ بالآخر خودکشی کرلیتا ہے۔"

"تم تو بہت قابل آدمی ہو" عاجز صاحب نے کہا "تم کس چکر میں پڑگئے؟ تم سی ایس ایس کرکے سیاست میں آتے' تجارت کرتے۔"

"سیاست سے تجارت اور ملازمت سے صحافت تک ہر اچھا کام تم جیسے لوگوں کی وجہ سے ایک گالی بن کے رہ گیا ہے۔ تاجر کو چھوڑ دو' اس کا نام تو پہلے سے بدنام ہے مگر سیاست داں' علمأ اور صحافی' یہ تو قوم کی راہنمائی کرتے ہیں' اعتماد کے امانت دار کہلاتے ہیں' نیک وبد اور حق وباطل کا فرق بتاتے ہیں۔ علمأ ہمیشہ ظالم حکمرانوں کے خلاف کلمۂ حق سے جہاد کرتے رہے۔ ظفر علی خاں اور حسرت موہانی جیسے صحافی کاروانِ آزادی میں قائدِ اعظم جیسے مُدبروں کے دستِ راست رہے۔ جب یہی لوگ بے ایمان اور بے کردار ہوجائیں تو پھر قوم کا نہ بھٹکنا ناممکن ہے۔ تمہارا نام بھی ہم نے اسی فہرست میں لکھ لیا ہے۔"

"بہت احسان فراموش ہو تم۔ میں نے کیا برائی کی تمہارے ساتھ کہ تم میرے ہی دشمن بن گئے ہو؟ یہ صلہ ہے نیکی کا؟"

"احسان ہوتا ہے شریف آدمی کا اور نیکی کرنے والے صلے کی تمنا نہیں رکھتے" میں نے کہا "تم نے محض اپنی سنسنی خیز صحافت کی دُکان چمکانے کے لیے ہمارا ساتھ دیا۔ رابعہ! ذرا گاڑی روکنا۔"

رابعہ نے بریک پر پاؤں رکھا "کیا ہوگیا؟"

عاجز صاحب نے کہا "پولیس کی گاڑی آگے نکل جائے گی۔"

میں چند سیکنڈ میں پیچھے جا بیٹھا "اب چلو۔ ذرا رفتار بڑھاؤ۔"

"فکر مت کرو' میں انہیں نظر سے اوجھل نہیں ہونے دوں گی" رابعہ بولی۔

"اب ایک راز کی بات بتاؤ" میں نے بے تکلفی سے عاجز صاحب کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا "استاد پیڈرو سے تمہارا کیا تعلق ہے؟"

اس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا "کوئی تعلق نہیں۔ ویسے شہر کا ہر بدمعاش جانتا ہے مجھے۔"

"کیا تم مدد بھی کرتے ہو ان سب کی؟"

"لاحول ولا قوۃ۔"

"استاد پیڈرو بھی بہت بڑا بدمعاش ہے۔ تم اس کی مدد کے لیے کیسے آمادہ ہوگئے؟ کہ اس کے گھر پہنچ گئے۔"

"مجھے غالب کے بارے میں معلوم ہوا......"

"میں سچ جاننا چاہتا ہوں۔"

"یہی سچ ہے" وہ بضد رہا۔

میں نے کہا "استاد پیڈرو نے تمہیں کیا قیمت ادا کی تھی اپنا اثر ورسوخ استعمال کرنے کی؟"

وہ بری طرح چونکا "تم الزام لگا رہے ہو مجھ پر۔"

"ہاں۔ تم صفائی پیش کرو۔" میں نے کہا "ثابت کرو کہ تم نے اس سے کچھ نہیں لیا تھا۔"

اس کا رنگ اڑ گیا تھا "میں قسم کھا سکتا ہوں......"

"قسم جھوٹے لوگ زیادہ کھاتے ہیں" میں نے کہا "تم بعد میں کہوگے کہ میں نے جان بچانے کے لیے جھوٹی قسم کھالی تو کوئی گناہ نہیں کیا۔ جان خطرے میں ہو تو حرام بھی حلال ہوجاتا ہے لیکن میں استاد پیڈرو کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں اور اب تمہیں بھی جان گیا ہوں۔ وہ مجھے بتادے گا۔"

وہ کچھ دیر خاموش رہا "پانچ ہزار۔"

"کہاں ہیں وہ پانچ ہزار؟ نکالو" میں نے ہاتھ بڑھایا۔

وہ کچھ سمٹ گیا "تم کیوں.... چھیننا چاہتے ہو؟"

"ابھی تو میں مانگ رہا ہوں" میں نے کہا۔

"لیکن کیوں...."

"مجھے ضرورت ہے" میں نے کہا "تمہیں پانچ ہزار سے کیا فرق پڑے گا؟"

وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر آہستہ آہستہ اس کا ہاتھ اپنی جیب میں گیا۔ میں بظاہر بے پروا نظر آنے کے باوجود بہت محتاط تھا چنانچہ اس نے ایک دم ریوالور نکالا تو کسی دشواری کے بغیر میں نے اس کی کلائی پکڑلی۔

"یہ بھی دے دو۔" میں نے اس کی کلائی کو موڑ کے کہا۔

وہ درد کی شدّت سے بلبلایا اور ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا "یہ میں اپنی حفاظت کے لیے ساتھ رکھتا ہوں۔"

"مگر میرے خلاف تم نے جارحیّت کا ارتکاب کیا" میں نے ریوالور اٹھاکے جیب میں ڈال لیا۔

"تم نے مجبور کردیا تھا مجھے۔"

"تم واقعی مجبور ہو۔ لاؤ نقد نکالو کتنا ہے جیب میں؟"

"جیب میں... تو بہت زیادہ ہے" اس کا حلق خشک ہونے لگا۔

"ہمیں بھی بہت زیادہ کی ضرورت ہے اور اپنی ضرورت ہم ایسے ہی پوری کرتے ہیں۔ تم جیسے لوگوں سے خراج وصول کرنا کارِ ثواب ہے۔ تمہاری کون سی حلال کی کمائی ہے جس کے جانے کا دکھ ہورہا ہے۔"

"تم نے سب بکواس کی تھی میرے سامنے کہ تم یہ ہو اور وہ ہو۔ تم صرف ڈاکو ہو' غنڈہ گردی کرتے ہو" وہ چلّانے لگا۔

میں نے کہا "میں بتا چکا ہوں کہ ہم تمہیں تمہاری بساط پر تمہاری ہی چال سے مات دیں گے۔ مالِ حرام بود بجائے حرام رفت۔ یہ محاورہ سنا ہوگا تم نے مگر ہمارے پاس یہ سرمایہ قومی تعمیرِ نو کے مقاصد میں استعمال ہوگا جو تم جیسے لوگوں کی تجوری سے نکلے گا۔ مثلاً ہم ایک اخبار نکالیں گے بہت بڑے پیمانے پر اور اس میں صحافت وہ ہوگی جس کی کسوٹی ہے دیانت داری۔ ہم جہاد کریں گے بددیانتی کے خلاف' بددیانت لوگوں کے پیسے سے۔ ہر میدان میں اپنے حریفوں کا مقابلہ انہی کے سرمائے کی طاقت سے ہوگا۔"

"اخبار نکالنا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔"

"ہاں۔ ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ تم جیسے لوگوں کو جوئے کے اڈے پر ہونا چاہیے یا بدکاری کے اڈے پر" میں نے کہا "اس کے بعد جیل میں اور بالآخر جہنم میں ہونا چاہیے اور انشاء اللہ ہم تمہیں منزلِ مقصود تک پہنچا کے دم لیں گے۔ دلوں میں تفرقہ ڈالنے والے فسادی اور منافق مُلّا کا بھی وہی ٹھکانا ہوگا اور دوغلے' وطن فروش سیاست کاروں کا بھی۔ چائے کی جگہ دال کے چھلکوں کا عرق پلانے والوں سے لے کر نقلی دواؤں سے معصوم بچوں کو موت کی نیند سُلانے والوں تک' سب سے نمٹ لیں گے ہم۔"

"تم شیخ چلی کے خاندان سے ہو؟" وہ بولا۔

"اور تم غالباً ابو جہل کی نسل سے ہو' تمہیں یہ معلوم نہیں کہ اُردو کا وہ عظیم شاعر جسے دنیا مرزا غالب کے نام سے جانتی ہے' سو سال پہلے مرکے زندہ جاوید ہوگیا۔ یہ غالب جو ہمارا دوست ہے' ایک بہت بڑا صحافی ہے۔ حقیقی اور سچا صحافی۔ وہی نکالے گا اخبار جس میں تمہارا بھی خانہ خراب ہوگا۔"

"یارا! مجھے بخش دو۔" وہ منّت سماجت پر اُتر آیا "میں تم سے ہر طرح تعاون کروں گا۔ بے شک تم ہر مہینے پانچ ہزار لے لینا۔"

"ہم تمہارا سب کچھ لے لیں گے مگر رشوت میں نہیں۔ یہ تو پبلک کا مال ہے' پبلک کے کام آئے گا" میں نے کہا "ہم مالِ حرام کو حلال کریں گے جیسے بلیک منی کو وائٹ کیا جاتا ہے یا کافر کو مشرف بہ اسلام کیا جاتا ہے۔ ہمارا پروجیکٹ بہت بڑا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ جس کا حق تھا اسے ملے اور جس نے حق غصب کیا تھا وہ ہرجانا ادا کرے۔ اپنا حساب تم خود لگالو کہ آج تک تم نے کس کس سے سچائی کو زندہ دفن کرنے' سچ کے چہرے کو جھوٹ کی آمیزش سے مسخ کرنے' مظلوم کو انصاف کے حق سے محروم رکھنے' ظالم کو قانون کی گرفت سے بچانے اور بے گناہوں کو پسِ دیوارِ زنداں پہنچانے کا کتنا معاوضہ لیا ہے۔ تمہیں سب یاد ہوگا۔ ممکن ہے تم نے حقائق کو بدلنے میں پولیس کی مدد کی ہو۔ اس سے کوئی قتلِ عمد کا کیس خودکشی کی واردات بن گیا ہو' کسی غریب کی بیٹی کی آبروُ ریزی کے خلاف اٹھنے والی آواز دب گئی ہو' پھانسی کا پھندا ذاتی دشمنی اور عناد کے باعث کسی بے گناہ کے گلے میں پڑا ہو۔"

اس نے کانپتے ہاتھوں سے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کے مجھے تھمادی "یہ لو... سب لے لو... اور بھی جو کچھ میرے پاس ہے' تم لے سکتے ہو مگر میرا خانہ خراب مت کرو۔ میں تمہاری مدد کرسکتا ہوں' بہت کچھ بتا سکتا ہوں جو تم بھی نہیں جانتے اور دنیا بھی نہیں جانتی۔ بہت سے لوگوں کے ظاہر اور باطن کا فرق مجھے معلوم ہے اور وہ بڑے اونچے' عزت دار لوگ ہیں۔ بس مجھے بخش دو۔"

میں نے غور کرتے ہوئے کہا "گویا تم سلطانی گواہ بننا چاہتے ہو؟ تمہارے ساتھ رعایت کے امکان پر غور کیا جاسکتا ہے مگر ابھی میں کوئی وعدہ نہیں کرسکتا' اس کا انحصار حالات پر ہوگا اور مستقبل میں تمہارے رویّے پر۔"

رابعہ نے کہا "یہ سلطانی گواہ بعد میں منحرف نہ ہوجائے۔"

میں نے کہا "یہ جاہل ضرور ہے مگر احمق نہیں ہے۔ استاد پیڈرو سے یہ ایم آر ایس کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کرے گا تو ایسی غلطی نہیں کرے گا۔ یہ رُسوا ہوکے مرنا۔ میرا مطلب ہے خودکشی کرنا پسند نہیں کرے گا۔ کیوں عاجز صاحب؟

جان ہے تو جہان کا عیش ہے۔"

"ٹھیک۔ بالکل ٹھیک کہا آپ نے.... یہ رقم رکھ لیں گن کر۔" وہ ہکلا کے بولا۔

"چار بیویوں کا شوہر بن کے جینے اور چار بیواؤں کا مرحوم شوہر کہلانے میں بڑا فرق ہے۔ اس فرق کو کبھی مت بھولنا" میں نے نوٹ جیب میں ڈال کے کہا "اور آئندہ جھوٹ بھی مت بولنا ہم سے۔ یہ پانچ ہزار نہیں' دس ہزار ہیں جو پیڈرو نے تمہیں دیے تھے۔ تمہارے کتنے بچے ہیں؟"

وہ چونکا "سترہ.... نہیں اٹھارہ۔"

"پھر سوچ لو۔"

"انیس" اس نے انگلیوں پر ٹوٹل کر کے قطعی جواب دیا۔

"انیس بچے یتیم ہو جائیں' یہ ہم بھی نہیں چاہتے۔ تمہارے اس ریوالور میں کتنی گولیاں ہیں؟"

"چھ۔" وہ بڑی مشکل سے بولا۔

"ایک خرچ ہو گی تم پر' پانچ بچ جائیں گی" میں نے ریوالور کی نال پر انگلی پھیر کے کہا "تمہیں معلوم ہے میرا نشانہ کیسا ہے؟ ایک مرتبہ میں اڑتی مرغابی کا شکار کرنا چاہتا تھا جو ڈار میں لیفٹ آوٹ اڑ رہی تھی۔ اچانک رائٹ آوٹ کے انڈا دینے کا ٹائم ہو گیا اور اس نے فلائنگ انڈا دیا۔ جیسے انٹرنیشنل فلائٹ پر ڈلیوری کے کیس ہیں۔ عین اس وقت نیچے میرا ایک پرانا حریف کھڑا ہوا نظر آ گیا جس نے لندن میں تقریر کے دوران مجھ پر انڈا مارا تھا۔ میں نے ارادہ بدل دیا اور بدلہ لینے کا فیصلہ کرتے ہوئے مرغابی کے انڈے کو نشانہ بنایا۔ بالکل صحیح وقت پر جب انڈا میرے حریف کے سر پر تھا' انڈا ٹوٹ کے گرا اور میرے حریف...."

رابعہ نے کہا "آگے والی گاڑی انڈی کیٹر دے رہی ہے۔"

"لے لو" میں نے متانت سے کہا "انکار کرنا بری بات ہے۔"

جیپ بائیں جانب ایک نیم پختہ اور شکستہ سڑک پر مڑ گئی۔ جہانگیرہ اور اکوڑہ خٹک پیچھے رہ گئے تھے۔ اندازہ یہی تھا کہ اب ہماری منزل بھی دور نہیں ہو گی۔ پھر جیپ رک گئی اور ہماری کار اس کے برابر جا کھڑی ہوئی۔

ایک سپاہی نے کہا "سر جی! یہ آگتا ہے میں اگے نئیں جاسکتا۔ وہ تھاں گولی مار دیں گے۔"

"کوئی بات نہیں" میں نے کہا "اس سے آکھو کہ ہم تھاں اس کا بدلہ لے لیں گے۔"

نقلی داڑھی والے نے لرزہ براندام ہو کے ہاتھ جوڑ دیے "حضرت صاحب! آپ نہیں جانتی' یہ بڑا ظالم لوگ ہوتی۔"

میں نے کہا "کون لوگ؟ کہاں ہیں یہ ظالم لوگ؟ مجھے تو یہاں کوئی نظر نہیں آ رہا ہے۔"

اس نے کہا "اس پہاڑی کے پیچھے ایک مزار شریف ہوتی۔"

میں نے غور فرماتے ہوئے کہا "اچھا۔ مزار ہے کسی کا۔ مجاور کون ہے؟"

"وہ مگر مچھ سے زیادہ ظالم ہوتی۔ ریچھ سے زیادہ ظالم ہوتی" اس نے مثالیں دیتے ہوئے کہا "اس کا مرید بدمعاش ہوتی۔"

سامنے سے ایک تانگہ نمودار ہوا جس میں آٹھ دس افراد گھوڑے کی دُم سے تانگے کی دُم تک ہر جگہ سوار تھے۔ ایک شخص لمبے ڈنڈے پر دائیں طرف ٹانگیں لٹکائے بیٹھا تھا تو دوسرا بائیں طرف دوسرے ڈنڈے پر تانگے سے باہر چپکا ہوا تھا اور دونوں پر گھوڑے کی لہراتی دُم کی جھاڑو پھر رہی تھی۔ بالکل پیچھے پائدان پر دو بچے رکھ دیے گئے تھے نگران کے پیر بھی سڑک کو چھو رہے تھے۔ ان کا منہ گھوڑے کی مخالف سمت میں تھا۔

میں سمجھ گیا کہ یہ مزار شریف کے زائرین شریف ہیں جو کسی پیر سے اپنی اپنی دعاؤں کے مستجاب ہونے کی ضمانت لے کر لوٹے ہیں۔ شاید سامنے تو بہو نے بھی اولاد ہی مانگی ہو گی مگر دل میں ساس سے جان چھوٹنے کی خواہش بھی شامل کر دی ہو گی اور ساس نے پوتا طلب کیا ہو گا تو خاموشی سے یہ بھی کہا ہو گا کہ ایسا ممکن نہیں تو پھر اس نامراد بہو کو اٹھا لے تاکہ میں دوسری لاؤں۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" رابعہ نے کہا "دیکھو' پیچھے سے کوئی گاڑی آ رہی ہے۔"

"آنے دو۔ میرا مطلب ہے جانے دو۔ مرادیں مانگنے والے ہوں گے۔" میں نے کہا "عاجز صاحب! ہم بھی چلتے ہیں سوالی بن کے۔ پولیس کو واپس جانے دیں۔"

"ہم تو ملزم کو ساتھ واپس لے کر جائیں گے" ایک کانسٹیبل بولا۔

"اور آپ کو بھی۔ بیان تو سب کا ہو گا" دوسرے نے کہا۔

میں نے کہا "اچھا پھر تم لوگ کہیں انتظار کرو۔ بعد میں آ جانا' یہ ظاہر مت کرنا کہ ہمارے ساتھ تھے بلکہ پیر صاحب سے کہنا کہ اِدھر کسی مفرور مجرم کو تلاش کر رہے ہو جو اٹک جیل سے بھاگا ہے۔ کسی بہانے وہیں موجود رہنا اور اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھنا۔"

عاجز صاحب زیادہ باخبر تھے "یہ نہ ہو کہ بھنگ کے پیالے چڑھانے بیٹھ جاؤ۔ مالِ مفت اور کارِ ثواب سمجھ کے۔"

میں نے کہا "اگر ڈز ڈز گولیاں چلیں تو پہلے دیکھنا کہ کس پر فائر کرتا ہے۔ پرانے بدلے چکانے کے لیے عاجز صاحب کو مت شہید کر دینا۔ تم ملزم کے ساتھ ٹھہرو' ہم چلتے ہیں۔"

رابعہ نے گاڑی بڑھائی "سوال کیا کرو گے؟"

"نیک بخت! اللہ نے سب دیا ہے سوائے اولاد کے۔ سات سال ہو چکے ہیں شادی کو...."

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے!" رابعہ گھبرا کے بولی۔

"لو عاجز صاحب! اس میں کون سی بات ہے ایسی۔ اولاد کی خواہش تو سب کو ہوتی ہے اور آدمی شادی کرتا ہی کیوں ہے؟ اب

آپ خود حساب لگا کے بتائیں۔ سات سال میں چار بیویوں نے سات بار تو آپ کو ضرور باپ بنایا ہو گا۔"

عاجز صاحب نے سوچ کے کہا "آٹھ بار۔"

"اور خیر سے انیس ہیں ابھی۔ شاید ساڑھے انیس ہوں۔ دنیا سے جاتے جاتے نصف سنچری تو بنا جاؤ گے۔ ہم ایک بھی نہ مانگیں پیر صاحب سے۔"

"سکندر! ایسی بے ہودہ بات مت کرنا" رابعہ نروس ہو گئی۔

"تم مت کرنا' میں کر لوں گا" میں نے کہا "عاجز صاحب! کیا نام ہے ان پیر صاحب کا؟ جو زمین کے نیچے ہیں ان کا بھی اور جو اوپر بیٹھے ان کی چھاتی پر مونگ دل رہے ہیں ان کا بھی۔"

"مزار تو ہے پیر کیکر شاہ کا۔ سنا ہے وہ کیکر پر پیدا ہوئے تھے۔ کیکر پر رہے تمام عمر' کیکر کھاتے رہے اور مزار کے سرہانے بھی ایک کیکر ہے" عاجز صاحب نے بتایا "آج گدی نشین ہے ان کا پوتا خلیفہ کیکر۔"

"خلیفہ! کیا وہ نائی بھی ہے۔" میں نے کہا "اور یہ بھی کیکر ہے۔"

"ان کے سب مجاور کیکر کہلاتے ہیں۔ چھوٹا کیکر' بڑا کیکر۔ جسے حلقۂ ارادت میں شامل کر لیا جائے وہ کیکر کہلاتا ہے۔"

"اور ان کے بچے کیا کہلاتے ہیں' کیکر کے کانٹے؟"

کیکر شاہ کا مزار اچانک بہت سے کیکروں کے ایک جھنڈ کے پیچھے سے نمودار ہوا۔ ہر کیکر پر کوئی چھوٹا بڑا نیلا پیلا جھنڈا لہرا رہا تھا.... عین وسط میں کیکر اوّل کا مزار شریف تھا جس کا احاطہ کم سے کم چار ایکڑ پر پھیلا ہوا تھا۔ چار دیواری محرابی دروازوں کی تھی جو محض آرائشی تھے۔ ان میں نہ چوکھٹ تھی اور نہ پٹ تھے۔ وسطی دروازے پر کیکر شاہ اول کا نام معہ نصف درجن القاب و آداب کے آبِ زر سے لکھا گیا تھا۔ ہر دروازے کے ستون سے ٹیک لگائے کوئی کیکر بیٹھا تھا۔ وہ سب ایک سے گہرے سبز لمبے کرتے پہنے ہوئے تھے اور ان کی ٹوپیاں زرد تھیں۔ ان کی ایک جیسی داڑھیاں دیکھ کر مجھے شبہ ہوا کہ وہ نقلی ہیں کیونکہ ان میں سرِ مو فرق نہ تھا۔ ان سب کے سامنے چھوٹے سائز کی دیگ تھی۔ میرا خیال تھا کہ شاید اس میں سے زائرین کو بطور تبرک کچھ دیا جاتا ہو گا مگر معاملہ برعکس نکلا۔ جب کوئی اندر جاتا تھا تو کیکر دیگ کا ڈھکنا اٹھا دیتا تھا جس کا مطلب صاف یہ ہوتا تھا کہ اس میں نذر نیاز ڈالو۔

ایک نظر میں ان کو شمار کرنا تو محال تھا مگر میرے اندازے کے مطابق اس مزار کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے کر بیٹھنے والے کیکر تعداد میں پچاس سے کم نہیں ہو سکتے تھے اور وہ پچاس دیگوں میں مال جمع کر رہے تھے۔ کسی بھی سمت سے آنے والے کے لیے کچھ دیے بغیر اندر جانا اتنا ہی مشکل تھا جتنا بغیر ٹکٹ سینما میں داخل ہونے کی کوشش کرنا۔ ان کی خونخوار صورتیں اور شکی نگاہیں اس بات کی آئینہ دار تھیں کہ وہ خدمت گار یا مرید نہیں' محافظ اور جاسوس قسم کے لوگ ہیں جو آنے جانے والوں پر نظر رکھتے ہیں اور ممکن ہے آپس میں کسی قسم کے خفیہ مواصلاتی رابطے سے ایک دوسرے کو خبردار بھی کر دیتے ہوں۔

احاطے کے باہر پہلے سے ایک ویگن' ایک کھٹارا قسم کی بس' دو پرانی کاریں اور قدرے فاصلے پر چند تانگے موجود تھے۔ ان میں نواح کے دیہات سے عقیدت مند لد کر آئے تھے۔ ان میں سے زیادہ اندر شرف باریابی حاصل کر چکے تھے اور ان کی زبان میں "کیکر کے سائے" میں تھے۔ کچھ ایک چھپر کے نیچے بنے ہوئے تنوری ہوٹل میں ماحضر تناول فرما رہے تھے اور کچھ بس میں اونگھ رہے تھے۔

ہماری گاڑی رکی تو باہر بیٹھے ہوئے ہر کیکر کی نگاہیں سوالیہ انداز میں ہم پر مرکوز ہو گئیں۔ ہم گاؤں دیہات کی اس بدبخت' بدحال اور بداطوار مخلوق سے یکسر مختلف تھے جو اپنے خستہ تن' دریدہ پیرہن اور سختیٔ ایام کی تصویر.... چہروں کے ساتھ ہر روز آتے تھے اور من کی مراد پوری ہو نہ ہو' وقتی سکون اور اعتماد حاصل کر کے لوٹ جاتے تھے۔ خدا کی رضا کے لیے کسی مردہ یا زندہ پیر کی سفارش اور اس سفارش کے لیے نذرانے کی رشوت دینا ان کے عقائد میں شامل تھا لیکن ہم جیسے خوشحال اور تعلیم یافتہ نظر آنے والے شہری ایسے ڈھکوسلوں پر بہت کم یقین رکھتے تھے مگر جب ہر طرف سے مایوس ہو جاتے تھے تو پھر عقل کا سارا فلسفہ بھول کے امید کے ہر ٹھکانے سے رجوع کرتے تھے۔ ظاہر ہے ہم جیسے احمقوں کے ساتھ صحیح رویہ اختیار کیا جائے تو وارے نیارے ہو جاتے تھے۔ جتنا ایک پورا گاؤں نہیں دیتا تھا اتنا شہر کا کوئی ایک حاجت مند دے جاتا تھا۔

میں نے رابعہ سے کہا "اب یہ لال پیلا ہونا چھوڑو۔ اگر تم نے اس ڈرامے میں میرا ساتھ نہیں دیا تو ہم پھنس جائیں گے۔ یہ بہت خطرناک لوگ لگتے ہیں مجھے۔"

رابعہ بولی "ان کا ولاور سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟"

"وہی جو ایک بدمعاش کا دوسرے سے ہوتا ہے۔ کیا پتا یہ بھی دلاور کا کوئی سائڈ بزنس ہو" میں نے کہا "ذرا دوپٹہ اچھی طرح منہ اور سر کے گرد لپیٹ لو اور دکھیاری نظر آنے کی کوشش کرو۔"

وہ مسکرانے لگی "تم تو ابھی سے نقش فریادی بن گئے ہو۔"

"اور کیا گاڑی سے سیٹی بجاتا اتروں۔ پیر صاحب کے حضور پہنچنے تک تھرکتا رہوں اور پھر ایک دم اداس اور غمزدہ ہو جاؤں۔ بابا مجھے اولاد کا دکھ ہے اور تم کو بھی ایک مظلوم بیوی کا رول کرنا ہے جس کو بے وفا اور بے مروّت شوہر اولاد کی خاطر چھوڑنے پر آمادہ ہو اور دوسری کرنے کی سوچ رہا ہو۔"

"سچ بولا انہوں نے۔ یہ سب بدمعاش ہیں۔ ان کے اڈے کو بڑے نامی گرامی لوگوں کی سرپرستی حاصل ہے جن میں پولیس افسران بھی شامل ہیں" عاجز صاحب بولے "یہ ہر قسم کا غلط دھندا

کرنے والوں کے لیے ایک مقدس پردہ ہے جس کی آڑ میں جُوا بھی ہوتا ہے، سٹہ بھی۔ یہاں شراب اسمگل بھی ہوتی ہے اور دیسی شراب کشید کرنے کا بھی کوئی زیرِ زمین کاروبار ہے۔"

میں نے کہا "بردہ فروشی تو پھر لازمی ہوتی ہو گی؟"

"بالکل۔ گاؤں دیہات کی لڑکیاں بھی اٹھائی جاتی ہیں اور شہروں سے بھی ادھر ٹریفک چلتی ہے۔ سنا ہے حجرے عیاشی کے اڈے ہیں۔ حرام کا پیسہ اکٹھا کرنے والے حرام کار تو آتے ہی ہیں، سنا ہے کچھ پردہ نشین بھی ہیں جن کا تعلق معزز گھرانوں سے ہے۔"

میں نے کہا "اس اطلاع کا شکریہ۔ آپ کب سے جانتے ہیں کہ یہاں کیا ہو رہا ہے؟"

"مُدت سے..."

"کیسے جانتے ہیں؟ سُنی سنائی ہے یا..."

"بہت سی شہادتیں ہیں۔ انہوں نے بھی بتایا جو یہاں آتے ہیں اور یہاں اندرونِ خانہ ایک دوسرے کے خلاف سازش کرنے والوں نے بھی اطلاعات دیں۔ واقعاتی شہادت ملتی رہی......"

"اور اس کے باوجود آپ نے کچھ نہیں کیا؟"

"میں کیا کر سکتا تھا؟"

"وہی جو ایک صحافی کو کرنا چاہیے تھا مگر آپ تو خود انہی کے گروہ کے آدمی ہیں۔"

"ان کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ میں تم کو بھی مشورہ دوں گا کہ کسی خوش فہمی کا شکار مت ہونا۔ یہ تمہارے جیسے بہت سے مجاہدین کو یوں غائب کر چکے ہیں جیسے ان کا وجود ہی نہیں تھا۔ میں کچھ کرتا تو آج میرا نام و نشان بھی مٹ چکا ہوتا۔ مجھے معلوم ہوتا کہ یہاں آنا ہو گا تو میں پہلے ہی سب بتا دیتا اور تمہیں بھی روک لیتا۔"

"عاجز صاحب! ہم کسی کے روکے رکنے والی چیز ہی نہیں ہیں، تخت یا تختہ۔ یہ ہمارا نعرہ ہے۔"

رابعہ نے کہا "کیا یہاں لوگ تمہیں پہچانتے نہیں ہوں گے؟ تم تو شیطان کی طرح مشہور ہو۔"

"ضرور پہچانتے ہوں گے" وہ پریشانی سے بولا۔

"پھر تم یہ ظاہر کرو کہ ہمیں یہاں لانے والے تم ہو" میں نے کہا "بس ایک بات کا خاص خیال رکھنا۔ ہم کمانڈوز اسٹائل میں اپنا دفاع بھی کرتے ہیں اور جارحیت ناگزیر ہو تو پھر ادھر یا اُدھر۔ مجھے ذرا بھی شک ہوا تو میں سب سے پہلے خلیفہ کیکر کو یرغمال بنا لوں گا اور تمہیں زد پر رکھوں گا۔ چھ کیکر تو میں اس ریوالور سے گرا سکتا ہوں۔ دو چار خالی ہاتھ بھی۔"

"خدا کے لیے ایسا مت کرنا" عاجز کا رنگ فق ہو گیا۔

"یہاں ہم کچھ نہ کرنے کے لیے نہیں آئے ہیں۔ اگر غالب اور نازو یہاں ہیں تو ہم انہیں ساتھ لے کر جائیں گے۔"

"یہ نازو کون ہے؟"

"نازو ایک قہر ہے، بلا ہے، بجلی ہے" میں نے کہا "ہم کو خدا بچائے اس کے عتاب سے..."

اچانک ایک شخص نے جو وہی سبز پوش زرد ٹوپی والا کیکر تھا کھڑکی سے منہ اندر ڈال کے کہا "زمین پر قدم رکھو۔ کیکر ہو جاؤ۔"

رابعہ اچھل پڑی اور بے اختیار اس نے میرا بازو تھام لیا۔

کیکر نے لاؤڈ اسپیکر کی طرح کہا "پیر کیکر شاہ کے آستانے پر پہنچ کے بھی کار کی چھت کے نیچے ہو۔ کیکر کے سائے میں آ جاؤ، کیکر ہو جاؤ۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ ہمارے پاس کیوں آیا تھا۔ اس نے کار کے مسافروں کو تاڑ لیا تھا اور یہ جاننا چاہتا تھا کہ اتنی دیر سے ہم کیا باتیں کر رہے ہیں۔ یہاں حاضری دینے والے تو جلد از جلد اپنے من کی مُراد بتانے کے لیے بے چین ہوتے تھے۔

"کیکر ہو جاؤ" ان کا نعرۂ مستانہ تھا۔

میں نے کہا "یہ میری گھر والی کچھ ڈر رہی تھی۔ اسے سمجھا رہا تھا کہ پیر کیکر شاہ تو بڑے کرماں والے اور کرم نواز ہیں۔ ہمارے دل کی مراد ضرور پوری کریں گے۔ آؤ اب اندر چلیں۔"

عاجز صاحب نے بھی خشک لبوں پر زبان پھیری "ہاں۔ اتنی دور آخر کس لیے آئے ہیں۔"

رابعہ ادب سے سر مُنہ لپیٹ کر اُتری اور میرے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ میں ایک متفکر شوہر نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ ایک غمزدہ بیوی بن گئی تھی کہ ہماری حسرت ہماری صورتوں سے عیاں تھی یا نہیں تھی۔ یہ ہم نہیں بتا سکتے تھے مگر کوشش ضرور کر رہے تھے کہ ہم مجسم حسرت و یاس کی تصویر ہو جائیں۔

میرا ایک ہاتھ اس جیب میں جانے کے لیے تیار تھا جس میں بھرا ہوا ریوالور موجود تھا۔ میں نے اس کا سیفٹی کیچ بھی ہٹا دیا تھا کہ ضرورت پڑے تو ایک لمحے کی تاخیر نہ ہو۔ یہ ایک قابلِ اعتماد ریوالور تھا۔ درّے کے بنے ہوئے اعلیٰ قسم کے ریوالور ولایتی معیار کے اسلحے سے کسی طرح کم نہیں ہوتے تھے۔ شاید صدیوں کی مہارت اور تجربے کے باعث درّے کے ہُنر مند اسلحہ ساز جدید ترین مشینوں پر فوقیت رکھتے تھے۔

ایک دروازے پر دیگ کا ڈھکنا کھلا۔ میں نے بلا تذبذب اس میں سو سو کے نوٹوں والی دس ہزار کی وہ گڈی ڈال دی جو مجھے عاجز صاحب نے بڑی عاجزی سے پیش کی تھی۔ جب ڈھکن بند ہوا تو مجھے عاجز صاحب کی صورت دیکھ کر تھوڑی سی خوشی ہوئی۔ انہیں امید نہ تھی کہ مالِ مفت کو لٹاتے ہوئے میں ایسی بے رحمی کا مظاہرہ کروں گا۔

"جا، کیکر کی ٹھنڈی چھاؤں میں جا" دیگ پر بیٹھے ہوئے مرید نے گویا مجھے ویزا جاری کر دیا۔

احاطے کے اندر پچاس ساٹھ دیہاتی مرد، عورتیں، بوڑھے، بچّے جمع تھے۔ وہ آسمان کی کھلی چھت کے نیچے خدا کی زمین پر مجرم بنے بیٹھے تھے۔ یہ مظلوم مخلوق رزق بھی خدا سے نہیں، کسی زمینی

داراِن دانا سے مانگتی تھی، نوشتۂ تقدیر کو کسی ڈبا پیر کے اختیار میں سمجھتی تھی اور زندگی سے موت تک ذہنی و جسمانی طور پر محکومی اور مجبوری کے سارے عذاب کئی صدیوں سے اسی طرح جھیل رہی تھی۔ اگر ان کا ایمان ناپختہ اور یقین کامل نہیں تھا یا وہ شرک اور بدعت کے مرتکب ہو رہے تھے تو وہ یہ بات بھی نہیں سمجھتے تھے۔ وہ بڑے خلوص اور اعتقاد کے ساتھ اپنے آباواجداد کے مسلک پر کاربند تھے اور قابلِ رحم حد تک معصوم تھے۔

ہمیں بھی باری کے انتظار میں کسی کیکر کے نیچے بیٹھ جانا چاہیے تھا مگر اندر یہ اطلاع موصول ہو چکی تھی کہ دس ہزار کی پارٹی آئی ہے۔ علامہ اقبال نے قومِ حجاز کے بارے میں صحیح فرمایا تھا کہ آ گیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز تو ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز۔ مگر یہ چودھویں صدی تھی۔ اب محمود اگر کسی سیاسی مصلحت کے تحت نماز پڑھنے جاتا تھا تو اس کے لیے اگلی صف مخصوص تھی۔ وہ عید کی نماز بھی سخت حفاظتی انتظامات کے ساتھ مخصوص مقامات پر ادا کرتا تھا جہاں ٹی وی کے کیمرا مین اسے زمیں بوس ہوتا دکھا سکیں۔ کسی ایاز کی مجال نہ تھی کہ پچھلی صفوں سے اٹھ کے امیرالمومنین سے بغلگیر ہونے کے لیے آگے بڑھے۔ سادہ کپڑوں میں سیکیورٹی والے وی آئی پی یا وی وی آئی پی سے گلے مل لیتے تھے تاکہ خبر دکھائی جا سکے کہ وہ لوگوں میں گھل مل گئے۔

جب دستورِ مملکت یہ ہو تو پھر یہی سب کا معمول بن جاتا ہے خواہ وہ کاروباری ادارہ ہو۔ ایس پی کا آفس یا پیر کا آستانہ۔ کار والا... پیسے والا بڑا آدمی پہلے جائے گا۔ جو اس پر احتجاج کرے گا، مساوات کی بات کرے گا اور حق کی بات کرے گا وہ راندۂ درگاہ ہو گا اور بے فیض رہے گا۔ پچھتائے گا اور دوسروں کے لیے درسِ عبرت بنے گا۔

احاطے کے وسط میں بنے ہوئے حجرۂ خاص کے چاروں طرف سنگِ مرمر کا کٹھہرا سا تھا۔ پھر چند سیڑھیاں چڑھ کے ایک چبوترہ آتا تھا اور وہ دروازہ جس کے اندر پیر کیکر شاہ کے مزار کا مجاور لوگوں کی ہر مُراد پوری کرنے کا ٹھیکیدار بنا بیٹھا تھا۔ یہ ایک بہت بڑا کمرا تھا مگر چبوترے پر سے گزرتے ہوئے مجھے قدموں کی دھمک سے یوں لگا کہ چبوترے کے نیچے بھی کمرے ہوں گے۔ ٹھوس چبوترے پر قدموں کی صدا سنائی بھی نہ دیتی۔ کمرے کے چاروں طرف جالی تھی جس میں نیلی پیلی، لال گلابی، سنہری روپہلی گوٹے کی پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ ان کا رنگ روپ اور آب و تاب دھوپ سے لُٹ چکے تھے اور وہ لوگ نہ جانے کہاں تھے جنہوں نے منّت مانتے وقت یہ گِرہ باندھی تھی۔ ان کی تقدیر کی گِرہ ان کے اپنے ہاتھ ہی کھول سکتے تھے اور کوشش کرنے والوں کو خدا کی تائید و رضا بھی حاصل ہو جاتی ہے مگر یہ سادہ دل بندے...... جائیں تو کہاں جائیں۔ کہ سلطانی بھی عیاری ہے، درویشی بھی عیاری۔ پیر کیکر شاہ کے سبز ٹائلوں والے چمکتے گنبد کے سائے میں بیٹھا ہوا خلیفہ کیکر انہیں کہیں جانے بھی تو نہیں دیتا۔ محور رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے۔ پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے۔ تاکہ یہ نہ خود کو سمجھے نہ خودی سے آشنا ہو۔

دو بڑے کیکر گھنیا، خوشامدانہ انداز میں مجھے، عاجز صاحب اور رابعہ کو خصوصی حضوری میں لے گئے۔ رنگ برنگی ریشمی گوٹا لگی چادروں کے ڈھیر میں دبی ہوئی قبر، عطر و عود کی مہک سے معمور، نیم تاریک فضا اور پُراسرار ماحول میں خلیفہ کیکر ایک تخت پر شاہانہ تمکنت کے ساتھ جلوہ افروز تھا۔ وہ چالیس پچاس سال کا سرخ و سفید اور صحت مند شخص تھا جس نے سبز ریشم کی قبا پر کالے شنیل کی چادر ڈال رکھی تھی۔ اس کے سر پر زرد ریشمی عمامہ تھا اور اس کے ہاتھوں میں روشن، دانوں والی بہت بڑی تسبیح تھی۔ اس میں شاید ایک ہزار دانے ہوں گے۔ ہر دانہ بڑے بیر جتنا تھا اور تاریکی میں فاسفورس یا کسی چمکیلے مُرکب سے خارج ہونے والی مدّھم چمک بھی زیادہ محسوس ہوتی تھی۔ ظاہر ہے عقیدت منداس نورانی حصار کے طلسم میں اسیر ہو کے تھوڑی بہت عقل سے بھی محروم ہو جاتے ہوں گے۔

عاجز صاحب نے جھک کے پیر صاحب کے ہاتھوں کو چوما تو میں بھی نامعقولیت کے اس مظاہرے پر مجبور ہو گیا۔ خلافِ توقع رابعہ نے بھی یہی حرکت کی تو مجھے اچھا نہیں لگا۔ وہ ادب سے سلام کر کے بھی بیٹھ سکتی تھی۔ پھر جب کیکر شاہ نے اس کا ہاتھ زیادہ دیر تھامے رکھا اور اپنی جلالی آنکھیں اس کے چہرے پر مرتکز رکھیں تو مجھے عجیب سی بے کلی محسوس ہوئی۔ کہیں ہوس پرستی کے اس دربار میں رابعہ کو پیش کر کے میں نے غلطی تو نہیں کی تھی؟

اسی وقت خلیفہ نے رابعہ کو آزاد کر دیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ خاصی گھبرائی تھی اور اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔

"بڑے لوگ آئے ہیں۔ اخبار والے آئے ہیں۔ کیا کسی خبر کی تلاش ہے؟" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس کی آواز میں بڑی نرمی اور شائستگی تھی۔ مصنوعی انکساری اور جھوٹی کسرِ نفسی تھی۔ عاجز صاحب پہچان لیے جانے کے بعد کچھ پریشان تھے۔

"ہم تو حضور کی قدم بوسی کے لیے بہت پہلے آ جاتے۔"

"پھر آج کون سی ضرورت لے آئی؟"

"یہ ہمارے عزیز اور دوست ہیں" عاجز صاحب نے خود کو سنبھال کے کہا۔

خلیفہ نے ہاتھ کے اشارے سے کہا "بیٹھو۔ کہو، کیا مسئلہ ہے؟"

میں نے سر جھکا کے کہا "خلیفہ جی، شادی کو سات سال ہو گئے، ہر علاج کرا لیا، ہر جگہ جا کے دیکھ لیا۔"

"اچھا؟" اس نے معنی خیز لہجے میں یوں کہا کہ یہ نہ سوال تھا نہ حیرت کا اظہار اور نہ شک کا "ہم سے کیا چاہتے ہو؟"

"وہی جو کہیں نہ مل سکا۔ آپ دلوں کا حال جانتے ہیں" میں نے کہا۔

"ہم تو تمہیں بھی جانتے ہیں سکندر بخت اور اسے بھی۔ یہ رابعہ ہے نا؟"

میرے دل میں ایک اندیشہ ضرور تھا مگر مجھے یہ توقع ہرگز نہ تھی کہ آغاز ہی اتنا بڑا انکشاف اور سنسنی خیز ہوگا۔ ڈرامے کے پہلے سین کے لیے پردہ اٹھے گا اور ایک دم ڈراپ سین۔"

میرا چونک پڑنا ایک فطری بات تھی اور میں افسوس ناک حد تک اپنے ردِ عمل پر قابو پانے میں ناکام رہا۔ ظاہر ہے اس کے بعد اِدھر اُدھر کی باتوں سے اپنی شناخت پر کسی بھی جھوٹ کا پردہ ڈالنا مزید احمقانہ بات ہوتی۔

میں نے محتاط ہو کے کہا "بہت خوب خلیفہ صاحب! آپ تو واقعی صاحبِ کشف و کرامات ہیں۔ میں پیروں فقیروں کو فراڈ سمجھتا ہوں لیکن آپ نے مجھے قائل کرلیا۔"

خلیفہ کے چہرے پر مسکراہٹ واضح ہوگئی "چھوڑو میاں سکندر بخت! کیا ضرورت ہے یہ جھوٹ کا سکّہ چلانے کی۔ ساری عمر کے خیالات کیا ایک انکشاف کے لمحے میں بدل جاتے ہیں اور پھر یہ کون سا انکشاف تھا' جو بات ہمیں معلوم ہوئی وہ ہم نے تمہیں بتادی۔ بتانے والے کوئی جنّات یا فرشتے نہیں تم جیسے ہی لوگ تھے۔"

"پھر تو آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ میرے یہاں آنے کا کیا مقصد ہے؟" میں نے صاف بات کی۔

"ہاں۔ تم اپنے دوست مرزا غالب کی تلاش میں ہو اور اس کے ساتھ جو لڑکی ہے' نازو' جیٹ فائٹر قسم کی۔"

"بالکل صحیح فرمایا آپ نے۔"

"اس کے لیے پولیس کو ساتھ لانے کی ضرورت نہیں تھی۔ پولیس کیا کرسکتی ہے؟"

"ہاں' وہ بے چارے تو سرکار کی وردی میں ملبوس دد حکم کے غلام ہیں۔ سب سے نچلے درجے کے ملازم جن کی نہ کوئی حیثیت ہے نہ طاقت۔ اور سچ تو یہ ہے کہ میں ان کے بھروسے پر آیا بھی نہیں۔ وہ تو ایک شخص کی حفاظت کے لیے ہم رکاب تھے جو..."

"رک کیوں گئے؟ وہی تمہیں راستہ بتاسکتا تھا" خلیفہ کیکر نے اپنی زبان کی حلاوت اور لہجے کی نرمی میں فرق نہیں آنے دیا۔

"یہ بات نہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ جب عاجز صاحب آپ کے آستانۂ عالیہ کے بارے میں سب کچھ جانتے تھے تو انہوں نے پولیس کو بلاوجہ زحمت دی۔ یہ خود بھی تو ہمیں یہاں لاسکتے تھے۔"

"انہیں اپنی حفاظت کی فکر ہوگی۔ شاید خدا پر اور اپنی قوتِ بازو پر انہیں بھروسہ نہیں" خلیفہ نے عاجز صاحب کی طرف دیکھا اور کسی قدر طنزیہ انداز میں کہا۔

عاجز صاحب نے دائیں بائیں دیکھا "جی۔ خلیفہ صاحب' مجھے تو کوئی... میرا مطلب ہے ڈر کی کون سی بات تھی میرے لئے؟"

"تم نے کئی بار پیغام بھجوایا ہمیں۔ ہم نے جواب دینا مناسب خیال نہیں کیا۔ اس کے بعد ہم منتظر رہے کہ تم ہمارا بھی نام خراب کرو مگر تم نے کچھ بھی نہیں کیا۔"

عاجز صاحب کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ "یہ تو کسی بدخواہ نے شرانگیزی کی ہوگی۔ ہماری کیا مجال جناب عالی صاحب۔ دنیا وعاقبت عزیز ہے ہمیں۔"

"یہ کہو زندگی عزیز ہے" خلیفہ کے چہرے پر ایک فاتحانہ رعونت نظر آنے لگی "ہمارے پاس بھی وقت نہیں ہے دنیا کے بکھیڑوں کے لئے۔ شیر جب جنگل سے گزرتا ہے تو ادھر اُدھر حشرات الارض' کیڑے مکوڑے' گرگٹ اور نیولے' گیدڑ جیسے بزدل اور لومڑی جیسے عیار جانور اس کی راہ میں حائل ہوتے ہیں وہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کے بھی نہیں دیکھتا۔"

آہستہ آہستہ خلیفہ کے اندر کا مغرور' فرعون صفت' نمرود کی طرح خدائی کا دعویدار' شیطان جیسا سرکش وباغی اور خود سر بے مہار انسان نمودار ہو رہا تھا۔

ہمارے استقبال کے لیے خصوصی نائبین کا آنا اور ہمیں وی آئی پی کی طرح خلیفۂ معلیٰ صاحبِ بصیرت ومالکِ بصارت' رہنمائے طریقت و مفسرِ شریعت جناب محترم پیر فیض بخش جہانگیر کیکر سوئم سجادہ نشین آستانۂ عالیہ... وغیرہ وغیرہ۔ کی خدمت میں پیش کیا گیا تو خلوت کا اہتمام کسی مقصد کے تحت کیا گیا تھا۔

میں ابھی حرفِ مُدّعا زبان پر لانے کی تیاری کر رہا تھا کہ وہ دونوں خصوصی معاون پھر اندر آئے اور انہوں نے ایک سبز رومال سے ڈھکی ہوئی ٹرے پیش کی۔ خلیفہ نے سرپوش ہٹا کے دس دس کی گڈی اٹھائی جو ہم نے دیگ میں ڈالی تھی اور میری طرف پھینک دی۔

"اس کی ضرورت شاید تمہیں زیادہ ہو۔"

میں خفّت اور غصے کی کیفیت میں یہ کہتے کہتے رک گیا کہ اگر مال و دولت کی ضرورت سے اتنے ہی بے نیاز ہو تو پھر یہ کھڑاک کیوں پھیلا رکھا ہے۔ مصلحت کا تقاضا تھا کہ بلا سبب اشتعال انگیزی سے حالات کو نہ بگاڑا جائے اور جہاں تک ممکن ہو جارحانہ طرزِ عمل سے گریز کرتے ہوئے دفاعی کھیل کھیلا جائے۔

"میاں عاجز! تم دیکھ رہے ہو سب۔ چاہو تو سب لکھ دو اپنے کثیر الاشاعت' صحافت کے سنگِ میل اور زبانِ اردو کے سب سے بڑے اخبار میں" خلیفہ نے طنز اور تذلیل کے تیر برساتے ہوئے کہا "ہمارا خانہ خراب کردینا۔ اور بھی تم جیسے بہت ہیں جو ہمارے خلاف لکھتے رہے ہیں۔ ہم نے کسی سے تعرض نہیں کیا۔ ہاں ایک وہ راولپنڈی کا مُبصر تھا جسے پشت پناہی حاصل تھی کسی سرکاری ایجنسی کی۔ اس سے ہمیں کچھ شکایت پیدا ہوئی تھی بخدا اس کی گمشدگی میں ہمارا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔"

ھیجا ارشاد۔ آپ کے بدخواہوں نے موقع سے فائدہ اٹھا کے آپ کو بدنام کرنے کے لیے یہ چال چلی ہوگی" میں نے کہا۔

پیر کے انکار میں واضح اقرار جھلکتا تھا اور عاجز صاحب کے لیے کھلی دھمکی بھی کہ حد سے مت بڑھنا ورنہ پتا بھی نہیں چلے گا کہ تمہیں زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ دِرجوابِ آں غزل میں نے جو کچھ کہا اس کا مفہوم بھی واضح تھا کہ آپ جیسے لوگ گناہ کے بعد عذرِ گناہ بدتر از گناہ پیش کرتے آئے ہیں۔ اس نے کسی کی پشت پناہی پر سر اٹھایا تھا یا اس کا قلم خود ہی حق گوئی و بے باکی کی راہِ پُرخار پر چل پڑا تھا اور وہ سچ مچ آدابِ صحافت کی پاسداری کرتے ہوئے دریدہ دہنی کے ساتھ رازِ دورنِ مے خانہ افشا کرنے پر تُل گیا تھا' یہ بتانے کے لیے وہ عدم سے وجود میں نہیں آسکتا تھا مگر خلیفہ کیکر ایک عبرت کی مثال دینے کے لیے موجود تھے۔ شہر کی طرح سیاست کے جنگل میں بھی بادشاہ ہوتے ہیں۔ اخلاق و کردار کی روحانی نشوونما کے ٹھیکے دار اور دوسری دنیا میں نجات اور بخشش کے ضامن بن جانے والے خدائی فوجدار۔ تجارت کی دنیا کے آئل کنگ' کاٹن کنگ' سب ہی حشرات الارض کو اور کمزور مخلوق کو نظرانداز کرنا اپنے آپ کو صاحب ظرف ثابت کرنے کے لیے ضروری سمجھتے ہیں اور اپنی کشادہ دلی کی تشہیر کا ذریعہ بھی مگران کے راستے میں کوئی ناخلف شیر کا بچّہ کھڑا ہونے کی کوشش کرے یا گدھا شیر کی کھال پہن کر غرانے لگے تو اسے ٹھکانے لگانا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔

رابعہ اس صورت حال سے خاصی ہراساں تھی۔ اس سے زیادہ وہ پیر کی گستاخ نگاہی سے پریشان تھی جو نظروں ہی نظروں میں اس کے جسم کے تمام نشیب و فراز سے گزر چکے تھے۔ اس کے بدن کی نرمی اور گرمی اور لمس کی لذت سے پوری طرح لطف اندوز ہوچکے تھے اور اسے اپنی نیّت سے ریپ تک فرماچکے تھے۔ ہوس تو بھری محفل میں سر سے پاؤں تک جبّہ' عمامہ یا سوٹ بوٹ میں ملبوس شخص کو بالکل ننگا کردیتی ہے۔ خواہ اس کی زبان اپنی پاک بازی کے دعوے کرتی رہے۔

میں نے معاملے کو مختصر کرنے کے لیے حرفِ مُدعا زبان پر لانے کا فیصلہ کرلیا "خلیفہ جی..."

"ایسے تو نائیوں کو مخاطب کیا جاتا ہے میاں سکندر۔ بہتر ہے کہ تم ہمارا نام لے کر بات کرو" اس نے ناگواری سے کہا۔

"میں معافی چاہتا ہوں خلیفہ صاحب" میں نے کہا "اب بہتر ہوگا اگر ہم صاف بات کرلیں۔ آپ کا وقت بہت قیمتی ہے۔"

میں نے پھر خود کو کوسا کہ آخر میں طنزیہ اور تلخ گفتگو سے گریز کیوں نہیں کرتا۔ آدمی کو پہلے کوشش ضرور کرلینی چاہیے کہ فتنہ وفساد کے بغیر یعنی پنگا لیے بغیر ہی بات بن جائے۔

"وقت تمہارا بھی قیمتی ہے میاں سکندرِ اعظم۔ بس تم اس کی قدر سمجھو تو بات ہے" خلیفہ کیکر نے کہا۔

"کیا غالب اور نازو یہاں ہیں؟" میں نے کہا۔

اس نے اقرار میں سر ہلایا "وہ ہماری حفاظت میں ہیں' کیکر کے سائے میں ہیں" یہ کہتے ہوئے وہ خود ہی اپنی بات پر مسکرایا۔

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ وہ آپ کے سایۂ عاطفت میں کیسے آگئے' کون چھوڑ گیا انہیں آپ کی تحویل میں؟"

"کیا وہ اپنی مرضی سے نہیں آسکتے؟"

"ناممکن" میں نے کہا "بہ رضا و رغبت' ہوش و حواس میں کسی مجبوری کے بغیر ان کے یہاں آنے کا سوال ہی... انہیں... ہوتا مگر خیر... ب آپ سے درخواست ہے کہ انہیں میرے ... لے کردیا جائے۔"

خلیفہ نے انکار میں سر ہلایا "میاں' کسی کی امانت ہیں وہ۔ ہم اس سے تو پوچھ لیں۔"

"وہ جیتے جاگتے' خود مختار اور آزاد انسان ہیں' کوئی اشرفیوں کا توڑا یا مال تجارت نہیں کہ آپ امانت دار سے پوچھیں۔"

"مگر ہم ایسا ضروری سمجھتے ہیں" اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"آخر وہ کون ہے جو اُن کو لایا تھا؟ چوہدری دلاور' استاد پیڈرو یا..." میں نے برہمی سے کہا مگر پھر رابعہ نے میرا ہاتھ دبا کے مجھے احساس دلایا کہ میں کہاں اور کس کے سامنے ہوں۔ میں خاموش ہوگیا۔

"ہمیں کب تک انتظار کرنا ہوگا خلیفہ صاحب؟" رابعہ نے کہا۔

"زیادہ نہیں" خلیفہ نے نرمی سے کہا "آج تم ہمارے مہمان رہو۔ خدا نے چاہا تو کل صبح ہم تمہیں الوداع کہیں گے۔ تمہارے دوستوں کے ساتھ۔"

ایک دم وہی دونوں خصوصی معاون ہمارے دائیں بائیں آکھڑے ہوئے اور انہوں نے اشارے سے ہمیں اٹھنے کو کہا۔ میں نے عاجز صاحب کی طرف دیکھا اور پھر رابعہ کی طرف۔ ان کی رضا صاف ظاہر تھی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ موقع محل دیکھے بغیر اور صورت حال کو سمجھے بغیر کسی قسم کی مزاحمت کی جائے یا تصادم کی راہ اختیار کی جائے۔ سب کے سامنے پیر صاحب کی تعظیم و تکریم کا ڈراما ناگزیر تھا۔ ہم سب نے ان کے ہاتھ چومے اور مراجعت اختیار کی۔

دستور کے مطابق ہم اُلٹے پاؤں واپس ہوئے۔ ان کی طرف پشت کرنا بے ادبی کے زُمرے میں آتا تھا۔ حجرۂ خاص کے دروازے سے باہر نکلنے تک ہم ریورس گیئر میں گئے جہاں ایک کیکر سب کے ساتھ ہماری جوتیوں کی رکھوالی بھی کر رہا تھا۔ اس کی مونچھیں کلف سے اکڑی ہوئی لگتی تھیں اور کلّوں کے دونوں جانب یوں پھیلی ہوئی تھیں کہ اس کے گول چہرے کو دیکھ کر کلاک کا خیال آتا تھا۔

میں نے جوتے پہنتے ہوئے کہا "تم بھی کیکر ہو' چھوٹے کہ

اس نے بڑے فخر سے بتایا "پیر سائیں کا خاص کرم ہے مجھ پر۔ میں ان کے در کا کتا ہوں۔"

"معاف کرنا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ خلیفہ صاحب چھوٹی چھوٹی باتوں کو اتنی اہمیت دیتے ہیں۔" میں نے کہا "میں نے تو ایسے ہی پوچھا تھا کہ آپ کے مُرید آپ کے حکم پر کیا کرسکتے ہیں۔ انہوں نے کہا سب کچھ۔ میں نے کہا کہ یہ جو باہر جوتیوں کا ٹھیکیدار بیٹھا ہے کیا وہ آپ کے کہنے پر اپنی مونچھیں مُنڈوا دے گا۔ انہوں نے فرمایا کہ میرے کہنے کی ضرورت نہیں، تم میرا نام لے کر اس سے کہو گے تو وہ کہے گا بسرو چشم۔ وہ تو میرے پاس آنے والے عقیدت مندوں کے جوتوں کی خاک کو سُرمہ سمجھتا ہے۔"

"حق ہے" کیکر نے نعرہ لگایا "سدا رہے نام کیکر کا۔ مونچھیں تو کیا، میری جان بھی قربان۔"

رابعہ نے مجھے گھور کے دیکھا۔ عاجز صاحب میرے جھوٹ پر دم بخود رہ گئے، بعد میں مجھے بھی خیال آیا کہ مُرید خود جا کے نہ پوچھے۔ پیر صاحب اس کا صفاچٹ چہرہ دیکھیں گے اور سوال کریں گے کہ کلاک کی سوئیاں کہاں ہیں تو بھانڈا پھوٹ جائے گا۔

میں نے چلتے چلتے کہا "ویسے تم نہ چاہو تو کوئی بات نہیں۔ اچھی لگتی ہیں تمہارے چہرے پر۔"

وہ کچھ نہیں بولا مگر اس کے تیور بتاتے تھے کہ مرشد کی خواہش کے مطابق اپنی تابعداری کا مظاہرہ نہ کیا تو کچھ نہ کیا۔ وہ اپنے آپ کو خوش قسمت تسلیم کرچکا تھا جسے پیر صاحب نے ایک آزمائش کا اہل جانا۔

دونوں بڑے کیکر چبوترے پر کھڑے ہمارا انتظار کر رہے تھے اور مجہول عقیدت مندوں کے ایک اور گروہ کو کیکرِ اعظم کے دربار میں پیشی کے لیے منتخب کر رہے تھے۔ میں نے اس میں چھ جوان عورتوں کو دیکھا۔ ان میں دو غالباً غیر شادی شدہ تھیں۔ وہ واقعی دلکش شباب کی مالک تھیں۔ اس غول میں دو گلہ بان قسم کی خرانٹ بوڑھیاں بھی شامل تھیں اور دو مسکین قسم کے مرد بھی جو بہت کم مرد لگتے تھے۔

میں نے چلتے چلتے کہا "بڑا فائدہ مند پیشہ ہے یہ بھی عاجز صاحب۔ آپ کس چکر میں پڑ گئے۔ کوئی ایسا ہی چکر چلا دیتے پیری فقیری کا۔"

"لاحول ولا قوۃ..... یہ میں کیسے کرسکتا ہوں؟"

میں نے کہا "کر کیوں نہیں سکتے۔ ذرا گھوم پھر کے موقع کی جگہ تلاش کریں۔ آس پاس دس میل کے دائرے میں کوئی پیر نہ ہو تو وہیں پر ڈیرا ڈال دیں۔ ایک قبر، ایک جھونپڑی، رنگین جھنڈا۔ کچھ منفرد قسم کا لباس۔ چونکا دینے والا..... چند اوٹ پٹانگ نعرے اور شعبدے۔"

رابعہ نے مجھے ٹوکا "یہ جگہ نہیں ہے ایسی باتوں کی۔"

میں نے کہا "کتنا زبردست بزنس چل رہا ہے۔ ہر قسم کا مال ہے۔"

"میں دیکھ رہی تھی تمہاری نظر کو" رابعہ بولی "بڑے غور سے ملاحظہ فرما رہے تھے آپ انہیں۔"

"حق ہے" میں نے کہا "تم خود ہی سوچو رابعہ کہ اس پیر کی جگہ میں بیٹھا ہوتا تو ایسے عقیدت مندوں کو مایوس لوٹاتا۔ سبحان اللہ!"

"تو خود بن جاؤ نا پیر" رابعہ جل کے بولی۔

"سوچیں گے۔ پیر کیکر شاہ ہوسکتا ہے تو سائیں ببول کیوں نہیں ہوسکتا اور اندھوں کو اس سے کیا کہ وہ کیکر کے سائے میں جا رہے ہیں یا ببول کے سائے میں۔"

"یہ لوگ ہمیں کہاں لے جا رہے ہیں آخر؟"

عاجز صاحب بولے "ان کا ایک مہمان خانہ بھی ہے۔ وی آئی پی قسم کا۔"

میں نے کہا "کیا پتا کوئی پرائیویٹ ائرپورٹ بھی ہو۔ ابھی جہاز میں بٹھا کے روانہ کردیں اور جہاز ہمیں ٹنڈرا کے خطے میں اتار آئے۔"

دونوں بڑے کیکر ہم سے خاصے فاصلے پر چل رہے تھے اور کچھ ہم بھی آہستہ بول رہے تھے۔ ابھی تک کسی نے نہ ہماری تلاشی لی تھی اور نہ کسی قسم کی نگرانی ضروری سمجھی تھی۔ شاید انہیں یقین تھا کہ اس احاطے سے فرار ہونا ممکن ہی نہیں۔ ہم جس دروازے سے بھی گزریں گے وہاں بیٹھا ہوا کیکر دیگ میں ہاتھ ڈال کے توپ نکالے گا اور دھائیں سے داغ دے گا یا ہم پر دیگ دے مارے گا۔

عقبی حصے کی سیڑھیاں اُتر کے ہم مہمان خانے میں پہنچے۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ چبوترے کے نیچے پختہ کمرے تھے۔ اندر داخل ہوتے ہوئے مجھے ایک لمحے کے لیے داناؤں کا قول یاد آیا، اندر جانے والے کو پہلے باہر نکلنے کا راستہ ضرور دیکھنا چاہیے۔ یہاں آنے جانے کا یہی ایک راستہ تھا۔ یہ دانائی کی بات تو تھی مگر غالب اور نازو کے قریب ہونے کے خیال میں اتنی کشش تھی کہ ہم مجبور تھے۔ میں تصور کرنا چاہتا تھا کہ ان کمروں میں وہ ہم سے کتنے فاصلے پر موجود ہوسکتے ہیں مگر ناکام تھا کیونکہ کیکر کی بات میں کوئی گہری چال نظر آتی تھی۔ امانت دار سے اجازت لینے کا مطلب صرف دلاور کو مطلع کرنا ہو کہ آؤ اور سب کو لے جاؤ۔ حسبِ توقع شکار خود دانہ دیکھ کے جال میں اُتر آیا ہے۔ پیر کیکر خود بھی شکاری تھا اور شاید دلاور بھی اس کی شکار گاہ کو استعمال کرتا تھا۔

عاجز صاحب کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں پیر کیکر شاہ ایک بہت طاقتور چیز نظر آتا تھا اور اس سے ٹکر لینا اس کی پشت پناہی کرنے والے ہر شکاری سے ٹکر لینے کے مترادف تھا۔ ابھی یہ بھی واضح نہیں تھا کہ پیر کیکر نے سب کچھ جانتے ہوئے بھی ہمارا راستہ کیوں نہیں روکا تھا۔ اگر اسے میرا نام اور رابعہ کا نام

معلوم تھا تو یہ بھی علم ہوگا کہ ہمیں اس جگہ پہنچانے والا عاجز نہیں، استاد پیڈرو ہے۔ یہ اسی کی کوشش اور مدد کا نتیجہ تھا کہ ہم پولیس کے ساتھ وہاں چھاپا مارنے پہنچ گئے جہاں غالب اور نازو کو رکھا گیا تھا۔ اب یہ پیڈرو کی ناکامی تھی یا چوہدری دلاور کی پیش بندی کہ اس نے دونوں اسیروں کو پہلے ہی وہاں سے منتقل کردیا تھا۔ اس امکان کو بھی مسترد نہیں کیا جاسکتا تھا کہ چھاپے کی اطلاع کسی نے قبل از وقت دے دی اور چوہدری دلاور کو اتنی مہلت مل گئی کہ قیدی نکال لے۔

ناقابلِ فہم بات یہ تھی کہ جب چوہدری دلاور خود مصالحت چاہتا تھا، مجھے ہر قسم کی رعایت دینے کی پیش کش کرچکا تھا، سارے نقصانات کی تلافی پر تیار تھا، یہاں تک کہ ماضی کی ہر غلطی کا کفارہ معافی کی صورت میں بھی ادا کرنے پر آمادہ تھا تو وہ غالب اور نازو کو قید میں رکھنے پر کیوں مُصر تھا؟ کیا ہم پر دباؤ قائم رکھنے کے لیے؟ وہ اپنے سارے پتے پھینک دیتا تو اگلی چال چلنے کے لیے اس کے پاس کیا رہ جاتا۔

دوسری طرف پیڈرو بھی ایک نئے روپ میں میرے سامنے آیا تھا اور اگرچہ پرانے شکاری بیک وقت ایک دوسرے سے اختلاف کی بنا پر علیحدگی کے اسباب بتا چکے تھے مگر مجھے دونوں ہی ناقابلِ اعتماد لگتے تھے۔ مجھے شک تھا کہ یہ نورا کشتی بھی دلاور کی چال ہوگی ورنہ وہ اتنا احمق نہیں تھا کہ پیڈرو سے مار کھا جائے۔ وہ نہ چاہتا تو پیڈرو کے فرشتے بھی اس جگہ کا سراغ نہیں لگا سکتے تھے جہاں غالب اور نازو کو رکھا گیا تھا۔ پیڈرو تو پولیس کو سیدھا وہاں لے گیا اور وہاں کسی قسم کی مزاحمت کا سامنا بھی نہیں کرنا پڑا۔ نقلی داڑھی والا جوتے کھا کے پیر کیکر شاہ کے آستانے کا پتا بتانے پر تیار ہوگیا۔ چوہدری دلاور کو معلوم ہوگا کہ مولوی میں کتنا دم ہے اور وہ سو پیاز اور سو جوتوں میں سے پچاس جوتے اور پچاس پیاز کھانے کا حوصلہ رکھتا ہے یا پچاس جوتے ہی کافی ہوں گے۔

غالباً چوہدری دلاور اور استاد پیڈرو آپس میں مل کے اس ڈرامے کی ریہرسل کرچکے تھے جس کا ہدایت کار دلاور کے سوا کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔ دلاور نے کہا ہوگا کہ پہلے تم انہیں تھوڑا سا ہراساں کرو، پشاور تک ان کے ساتھ رہو اور ان کو دوڑاؤ۔ پیڈرو نے ایسا ہی کیا تھا۔ اس نے پہلے آفریدی کی گاڑی کو بم سے اڑایا مگر ہمارے بیٹھنے سے پہلے..... پھر ریسٹ ہاؤس کو اڑایا مگر اس وقت جب ہم وہاں نہیں تھے۔ دوسرے سین میں چوہدری دلاور آگیا اور اس نے ہمیں ایک کوٹھی میں منگوا کے دوستانہ باتوں سے ماحول سازگار کیا، صلح صفائی کی پیش کش کرکے ہمارے موڈ کا اندازہ کیا اور ہمیں ایک ڈراؤنا HORROR فلم جیسا ڈراما دکھانے کے بعد نئی کار کا تحفہ دے کر آزاد کردیا۔ تیسرے سین میں پیڈرو نمودار ہوگیا اور اس نے اپنے حالاتِ زندگی سنائے، ہمارے جذبات کا رخ بدلنے کی کوشش کی، پتھر کو موم کرکے اپنی ضرورت کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے اس نے اپنے آپ کو مظلوم کے روپ میں پیش کیا پھر چوہدری دلاور سے اختلاف کی کہانی سنا کے اپنی نیک نیتی یوں ثابت کی کہ سیدھا غالب اور نازو کے پاس لے گیا۔ اس کے لیے وسائل بھی خود اس نے پیدا کیے۔

دلچسپ بات یہ تھی کہ چوہدری دلاور میرے والد وزیر خان کا قاتل استاد پیڈرو کو ثابت کرتا تھا لیکن استاد پیڈرو کی کہانی میں قاتل خود دلاور تھا۔ چوہدری تیار تھا کہ پیڈرو کو ہمارے حوالے کردے گا اور پیڈرو کو دعویٰ تھا کہ وہ چوہدری دلاور کے خلاف ثبوت، شہادت سب فراہم کرسکتا ہے۔ اب یہ پیر کیکر شاہ کا نیا کردار سامنے آگیا تھا۔ اور یہ فیصلہ ہونا باقی تھا کہ اس ڈرامے کی کہانی کون سا نیا رخ لے گی۔

مہمان خانہ واقعی شاندار تھا۔ اس موسم میں پنکھے یا ائرکنڈیشنڈ کی تو ضرورت نہ تھی مگر یہ چیزیں کمرے میں موجود تھیں۔ فرش پر بچھے ہوئے ایرانی قالین اتنے دبیز تھے کہ ان میں پاؤں دھنستے تھے۔ کمرے میں تیسرا بیڈ غالباً ہماری ضرورت پوری کرنے کے لیے لگایا گیا تھا اور خاصے فاصلے پر تھا۔ آرائشی اشیا کی کثرت نے مجھے حیران کردیا۔

"یہ سب تحائف ہیں" رابعہ نے کہا۔

"تحفے دیے جاتے ہیں برابر کے لوگوں کو، دوستوں کو۔ پیروں کو نذرانے پیش کیے جاتے ہیں" میں نے کہا۔

"یہ سب امپورٹڈ چیزیں ہیں" عاجز صاحب بولے۔

"پیر کیکر شاہ کی کرامات کا ڈنکا غالباً چار دانگِ عالم میں بج رہا ہوگا۔ ملکِ افرنگ سے روس اور چین تک۔ بس ہم بدبخت بے فیض رہے تھے آج تک" میں نے افسوس سے کہا "پیر کیکر شاہ کی مُرید میمیں بھی ہوں گی، یہ سوچ کر میرا ارادہ پکا ہوتا جاتا ہے کہ میں سائیں ببول کے منصوبے پر پہلی فرصت میں عمل پیرا ہو جاؤں۔ دو چار سال تو لگیں گے کاروبار جمنے میں اور ساکھ قائم ہونے میں۔ کوئی اچھی سی اشتہاری کمپنی ہو تو ٹھیکہ دے دیا جائے پبلسٹی کا۔"

رابعہ نے کہا "بہت رال ٹپک رہی ہے۔"

میں نے بیڈ پر دراز ہو کے کہا "ہاں یار۔ کیا رکھا ہے اس شوریدہ سری میں۔ نہ دین کے رہے نہ دنیا کے۔ اور کیکر شاہ کو دیکھو، رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی۔ عاجز صاحب، بہتر ہے آپ اللہ کو پیارے ہو جائیں۔"

عاجز صاحب لیٹے لیٹے اٹھ کر بیٹھ گئے "کیا فضول بات ہے!"

میں نے کہا "میں آپ کا مزار شریف بناؤں گا۔ ہر جمعرات کو قوالی اور لنگر، سال کے سال عرس۔ آپ کی چاروں بیوگان کا حصہ آمدنی میں..."

"بیکار باتیں کرنے کے بجائے سوچو کہ یہاں سے کیسے نکلیں گے" عاجز صاحب نے کہا۔

"یہ تو آنے سے پہلے سوچنا تھا" میں نے مصنوعی غصے کا اظہار

کیا "مجھ پر تو لازم آتا ہے کہ آپ کو گولی مار کے آپ کا مزار بنالوں۔ جب آپ کو معلوم تھا کہ یہاں آنا خطرے سے خالی نہیں تو آپ اپنے ساتھ ہمیں کیوں لے آئے؟"

"لاحول ولا قوۃ۔ تم لائے ہو مجھے اپنے ساتھ زبردستی۔ میرا سب کچھ چھین لیا۔ ریوالور بھی پیسہ بھی۔ غالب اور نازو سے تمہیں ملنا تھا۔"

"آہستہ نام لو ریوالور کا ورنہ پہلی گولی تم پر چلانی پڑے گی۔"

رابعہ نے کہا "مجھے یقین نہیں آتا کہ اسی جگہ ہم سے کچھ دور غالب اور نازو موجود ہوسکتے ہیں۔"

میں نے کہا "تو کس نے کہا ہے تم سے یقین کرنے کو؟"

"کیا پتا وہ اس دیوار کے پیچھے ہوں؟" رابعہ بولی۔

"دیوار گرا کے دیکھ لو" میں نے کہا "مجھے تو بھوک لگ رہی ہے اور سخت نقاہت کا عالم ہے۔ پورا غصہ تک نہیں آرہا ہے۔"

رابعہ نے عاجز صاحب سے سوال کیا "میں نے بجلی کے کھمبے تو دیکھے نہیں تھے۔ یہ پنکھے اور اے سی کیسے چلتے ہوں گے؟"

جواب میں نے دیا "پیر صاحب کی روحانی قوت سے جو برقی توانائی اور ایٹمی قوت سے زیادہ ہے۔"

"عاجز صاحب! پیر کیکر شاہ کی کتنی بیویاں ہیں؟"

"پیروں کی ذات عام پابندیوں سے بالاتر ہوتی ہے۔ دس بیس تو ہوں گی اور مس رابعہ! مجھے تو سخت تشویش لاحق ہو رہی ہے۔ وہ حرام زادہ تمہیں کیسی نظروں سے دیکھ رہا تھا.... اور تم تھیں کہ لال ہوئی جارہی تھیں۔"

"اور میں کیا کرتی؟ منہ نوچ لیتی اس کا' آنکھیں نکال لیتی اس کی؟" رابعہ نے خفگی سے کہا۔

"مگر لال ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ اور زیادہ حسین نظر آنے کے لئے؟ مجھے تو فتور نظر آتا ہے اس کی نیت میں۔ کہیں تمہیں داخلِ حرم ہی نہ کرلے۔"

"تم کچھ نہیں کرسکتے؟"

"میں صبر کرسکتا ہوں" میں نے آہ بھر کے کہا "اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ تمہارا نعم البدل عطا کردے گا۔ اس کی رحمت سے مایوسی کفر ہے۔"

ہمیں اس مہمان خانۂ خاص تک لانے والے کیکر کچھ کہے بغیر لوٹ گئے تھے اور اب میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ اسیری ہے یا رہائی ہے۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں گھوم پھر کے مزار شریف کا جائزہ لوں لیکن دروازہ باہر سے بند تھا اور بند نہ ہوتا تب بھی مجھے آزادانہ گھومنے پھرنے کی اجازت نہ ملتی۔ زیرِ زمین عمارت نہ جانے کیسے کیسے رازہائے سربستہ کا خزینہ تھی اور ہر کس و ناکس کو ان سے آگاہی کا مطلب تھا چھوٹے بڑے ہر کیکر کا خاتمہ۔ لوگ جو بے وقوف تھے اور مزید بے وقوف بنے تھے' دھوکے بازوں کے اس ٹولے کو نیست و نابود کردیتے اور خلیفہ کیکر صاحب کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتے۔

ایک دروازہ ملحقہ غسل خانے میں کھلتا تھا۔ باقی تین دروازے ... باہر سے بند تھے۔ دیوار پر لگے ہوئے مختلف بٹن دبانے سے لائٹ جلتی تھی یا پنکھا گھومنے لگتا تھا۔ کوئی بٹن کال بیل کا نہیں تھا۔ میں نے ایک دروازے کو بجا کے اور چلّا کے کہا "کوئی ہے ہماری فریاد سننے والا؟ اللہ کے نام پر بھوکوں کو کھانا کھلانے والا۔"

رابعہ نے کہا "کیا ہوگیا ہے تمہیں! خواہ مخواہ شور مچا رکھا ہے۔"

"خواہ مخواہ؟" میں نے چڑ کے کہا "ایک تو بھوک سے میری آنتیں اناللہ پڑھ رہی ہیں۔ اچھی مہمانی ہے یہ کہ کمرے میں بند کرکے چلے گئے ہیں جیسے آسمان سے من و سلویٰ اترے گا۔ مجھے تو افسوس ہے کہ میں نے ان خبیث کیکروں کے جانے سے پہلے کچھ نہیں کیا۔ اچھا ہوتا اگر میں ایک کو روک لیتا۔"

اسی وقت دروازہ کھلا اور ایک نئی شکل نمودار ہوئی۔ یہ کوئی بڑا موذی قسم کا کیکر تھا۔ انسانوں سے زیادہ اس کا تعلق جنات کے قبیلے سے لگتا تھا۔ وہ ساڑھے چھ سات فٹ لمبا اور تین ساڑھے تین فٹ چوڑا دیوزاد خوفناک حد تک کالا تھا۔ اس کے بازو بلامبالغہ میری رانوں کے برابر تھے۔ لمبے لمبے بالوں اور جھاڑ جھنکاڑ داڑھی میں وہ زمانہ قبل از تاریخ کا وحشی انسان نظر آتا تھا۔ اس کا لباس بھی بہت مختصر تھا۔ ایک انڈرویئر اور بنیان میں اس کا پورا بالوں بھرا جسم عجب کراہیت انگیز منظر پیش کرتا تھا۔ اس نے پاؤں میں لانگ بوٹ پہن رکھے تھے اور ہاتھوں میں فولادی کڑے۔

اس ابنارمل انسان کو زیادہ بھیانک مخلوق بنا کے پیش کرنے کا مقصد اس کے سوا کیا ہوسکتا تھا کہ کمزور انسانوں پر اس کی دہشت بٹھائی جائے۔ ممکن ہے کیکر شاہ کا وارث اسے شاہ جنات بنا کے مُریدوں کو مرعوب کرتا ہو کہ انسان تو انسان' میرے مُرید جنات بھی ہیں جو میرے اشاروں پر چلتے ہیں۔

وہ ایک میز اٹھا کے لایا تھا جو اس نے ہمارے درمیان رکھ دی۔ اس پر میزبانی کے جملہ لوازمات موجود تھے۔ بھُنے ہوئے مرغ اور بٹیر' روسٹ کی ہوئی دنبے کی ٹانگ' قورمہ' بریانی اور پیروں کی مرغوب ترین غذا' حلوہ۔ یہ سب پانچ فٹ لمبی اور تین فٹ چوڑی میز پر سجایا گیا تھا اور اس نے میز کو کسی کھلونے کی طرح اٹھا رکھا تھا۔

میں نے کہا "تم بھی کیکر ہو؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا اور اپنی لال لال آنکھوں سے رابعہ کو گھورنے لگا۔

"نام کیا ہے تمہارا؟ ٹارزن' ہرکولیس' سیمسن؟"

اس نے غرا کے کہا "اور کچھ چاہیے؟"

"ہاں۔ کیا تم میری ہر خواہش پوری کرسکتے ہو چراغ کے جن؟" میں نے کہا "مثلاً کیا تم بتا سکتے ہو کہ نیچے کتنے کمرے ہیں اور ان کمروں میں کیا کچھ ہے؟"

اس نے سپاٹ لہجے میں کہا "خاموشی سے کھانا کھاؤ۔"

میں نے اسے مشتعل کرنے کے لیے کہا "کیا تم مجھے اپنی بیوی سے ملوا سکتے ہو؟ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ تمہارے سائز کی عورت کیسی ہوگی اور آخر کہاں سے ملی تمہیں؟ ضرور آرڈر پر بنوائی ہوگی۔"

"میری کوئی بیوی نہیں" وہ بولا۔

"تم اس خلیفہ کیکر کے غلام ہو" میں نے کہا "نوکر ہو اس کے۔ لعنت تمہارے اس بھاری بھرکم وجود پر۔ کیا فائدہ اس کا جب تم اس کے اشاروں پر کتّے کی طرح دُم ہلانے پر مجبور ہو۔ وہ سب کے سامنے تمہیں گالیاں دیتا ہوگا' مارتا ہوگا۔ کیوں برداشت کرتے ہو یہ ذلت؟ اس کی گردن مروڑ سکتے ہو تم۔ اسے مچھر کی طرح مسل سکتے ہو۔ اس گینڈے جیسے جسم کے باوجود تم چوہے ہو' بزدل ہو اور بے غیرت ہو۔ میں ہوتا تو کیکر شاہ کی داڑھی اکھاڑ کے اس کے ہاتھ پر رکھ دیتا۔"

آہستہ آہستہ اس کا سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگا تھا اور اس کے نتھنے پھڑکنے لگے تھے۔ اس کی لال آنکھیں خونی نظر آنے لگی تھیں اور مجھے اپنے مقصد میں کامیابی کے امکانات روشن نظر آنے لگے تھے۔ اتنی بڑی باڈی کے ساتھ اس کے دماغ میں عقل ایک اوسط آدمی کے برابر بھی نہیں تھی۔

رابعہ نے مجھے کئی بار ٹوکا "ابھی سے چھیڑ خانی مت کرو' انتظار کرو کچھ دیر۔"

عاجز صاحب بھی بولے "کھانا کھالو سکون سے۔"

میں نے کہا "اگر کھانے میں کوئی خواب آور چیز ہوئی پھر؟ ویسے ہی مُرغن غذا پیٹ میں بھر جائے تو آنکھیں بند ہونے لگتی ہیں۔ میں کچھ ہلچل پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ ایسے اسیری میں رہ کے من و سلویٰ بھی ملے تو آخر کب تک۔ ہم یہاں قید کاٹنے نہیں آئے تھے۔ میں فوراً غالب اور نازو سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"لیکن یہ ہمارے اختیار میں تو نہیں ہے۔"

"اختیار اپنے ہاتھ میں ہم خود لیں گے تو بات بنے گی۔"

"ابھی تو تم بھوک بھوک چلّا رہے تھے۔"

"بہانہ تھا کسی کو بلانے کا۔ اب یہ ہاتھی کا بچّہ آیا ہے تو میں اس موقع سے فائدہ ضرور اٹھاؤں گا' تم دیکھتے جاؤ" میں نے کہا۔

ہم بہت آہستہ آہستہ باتیں کررہے تھے تاکہ اس دیوزاد کو ہمارے عزائم کا علم نہ ہو۔ اب میں نے پھر اسے مخاطب کیا۔

"ادھر آؤ کُتّے کے بچّے" میں نے کہا اور ایک بوٹی زمین پر ڈال دی "یہ کھا کے دکھاؤ ہمیں تاکہ پتا چلے' کھانے میں زہر نہیں ہے۔ چلو اِدھر' یہ سب کھاؤ۔"

میں ہر چیز میں سے تھوڑا تھوڑا فرش پر ڈالتا گیا۔ دیوزاد کا غصہ بڑھتا گیا۔ اپنا ریوالور میں نے خاموشی سے رابعہ کو دے دیا۔

"کیا تم بہرے بھی ہو ذلیل پلّے؟" میں نے دہاڑ کے کہا "سنا نہیں' میں کیا کہہ رہا ہوں۔ کس نسل کی کُتیا تھی آخر تمہاری ماں۔"

وہ ریچھ کی طرح غراتا میری طرف آیا۔ میں نے اسے ایک اور گالی دے کر قورمے کا ڈونگا اس پر کھینچ مارا۔ اس کی آنکھوں میں مرچیں بھر گئیں اور وہ بلبلایا تو مجھے یوں لگا جیسے چڑیا گھر کا شیر دہاڑ رہا ہو۔ اس کی دہاڑ میں جنگل کے بادشاہ کی گھن گرج تو نہیں تھی مگر پھر بھی شیر کی آواز تو ہوتی ہے۔

اسے حملے کی دعوت دینے کے لیے میں اس کے سامنے جا کھڑا ہوا اور اس کے ایک لات رسید کی جو اس کی ٹانگوں کے درمیان لگی۔ ایک دم اس کی قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ وہ اپنے بازو اٹھا کے مجھ پر حملہ کرنے آیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ صرف ہوّا ہے جسے دیکھ کے آدمی ڈر جائے۔ اس کے پاس جسمانی طاقت بھی تھی مگر پھرتی نہیں تھی اور وہ کسی بھی فنِ حرب سے ناآشنا تھا۔

بڑی آسانی سے میں نے اس کو بازو پکڑ کے کھینچا اور لات مار کے منہ کے بل گرادیا۔ وہ پھر اٹھا اور پلٹ کے میری طرف آیا۔ میں نے اس کے دوسرے حملے کو یوں ناکام بنایا کہ... اسے سیدھا گزار دیا اور وہ اپنے ہی زور میں سیدھا دیوار سے ٹکرا کے گرا مگر آدمی سخت جان تھا۔ اب وہ کسی وحشی درندے کی طرح غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔ وہ تیسری بار میری طرف آیا تو اس کے ناک اور منہ سے خون جاری تھا۔ عین وقت پر نیچے بیٹھ کے میں نے اسے اوپر سے گزارا اور دوسری طرف کمر کے بل گرادیا۔ اس کا ساڑھے تین چار سو پونڈ سے زیادہ کا بھاری جسم فرش پر بڑی آواز کے ساتھ گرتا تھا اور دھمک سے دیواریں ہل جاتی تھیں۔

اب اس کا حوصلہ جواب دینے لگا تھا مگر میں چاہتا تھا کہ وہ اٹھنے کے قابل نہ رہے۔ عاجز صاحب کی سٹّی گم تھی اور وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے کبھی مجھے دیکھتے تھے تو کبھی اس دیوزاد کو جو ٹارزن نظر آتا تھا مگر مجھ سے بچّے کی طرح پٹ رہا تھا اور بے بس تھا۔ ٹارزن نے مجھ پر چند حملے اور کیے مگر اب اس کی ہمت جواب دے رہی تھی۔ میں نے اسے اتنی بار ادھر سے اُدھر گھما کے پھینکا تھا' اچھالا تھا اور دیوار سے ٹکرایا تھا کہ اس کا دیوہیکل جسم ہر طرف سے چوٹ کھا کے زخمی ہوچکا تھا۔

رابعہ نے میرے کہنے پر دروازہ بند کردیا تھا اور ریوالور نکال لیا تھا۔ اوکھلی میں سر دینے کے بعد ڈرنے کا کوئی سوال نہیں تھا۔ وہ قائل ہوگئی تھی کہ ہم یہاں مہمانی کے نام پر اسیری قبول کرکے خود کو کیکر شاہ کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتے۔ اگر ہم نے کچھ نہ کیا تو صورتِ حالات پر قابو پانا مشکل ہوجائے گا۔ جیسے جیسے وقت گزرے گا' معاملات بگڑتے جائیں گے۔ ہمیں کیکر شاہ نے دوستانہ انداز میں خوش آمدید نہیں کہا تھا۔ اس کے دوستانہ رویّے کے پیچھے دشمنی کا منافق جذبہ تھا جسے وہ چھپانے میں ناکام تھا۔ اس مضبوط قلعے سے نکلنا آسان نہ تھا مگر کیکر شاہ کو ایک بار دروازے

بند کرنے کا موقع مل جاتا تو ہم مر کے ہی اس زنداں سے نکلتے۔ ابھی ہم جال کے اندر تھے مگر کیکر شاہ نے جال کی ڈوریاں نہیں کھینچی تھیں۔ غالب اور نازو یہاں تھے تو ہم خود بھی انہیں تلاش کرسکتے تھے۔ اس امید میں کہ کیکر شاہ خود انہیں ہم سے ملوائے گا ہم اس قید خانے میں تمام عمر انتظار کرتے رہتے۔ کیکر شاہ ہماری حقیقت سے باخبر تھا۔ وہ یہ رسک کیسے لے سکتا تھا کہ ہم اس کے ٹھکانے تک پہنچ کے اس کے سارے شیطانی دھندوں سے واقف ہو جائیں اور اس کو دنیا میں رُسوا کر کے جمے جمائے کاروبار کو چوپٹ کردیں۔ اسے معلوم ہوگا کہ غالب بھی صحافی ہے۔ عاجز صاحب جیسے بھی تھے جواسی پیشے سے تعلق رکھتے تھے اور غالباً پہلے بھی پیر کیکر شاہ کو بلیک میل کرنے کی ناکام کوشش بھی کرچکے تھے۔

کھانا لانے والا دیوزاد حادثاتی طور پر ہلاک ہوگیا۔ وہ کھانے کے ساتھ ایک چھری بھی لایا تھا جو پھل کاٹنے کے لیے تھی۔ اس نے آخری بار چھری اٹھا کے حملہ کیا اور میں نے پہلے کی طرح اسے ٹانگ اڑا کے اور تھوڑا سا اٹھا کے منہ کے بل گرایا تو چھری غلط زاویے پر آگئی۔ اس کا ہاتھ اپنے ہی جسم کے نیچے دب گیا اور چھری اس وزن سے اس کے دل میں پیوست ہوگئی۔

اس نے ایک بھیانک چیخ ماری اور دونوں ہاتھوں سے چُھری کو پکڑ کے کھینچنے لگا۔ اس کوشش میں اس نے اپنا سینہ چاک کرلیا اور شاید دل کو بھی۔ اس کا خون بھل بھل کر کے اُبلنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک منٹ تڑپ کے ساکت ہوگیا۔

عاجز صاحب تھر تھر کانپ رہے تھے اور بے ہوش ہونے کے قریب تھے "یہ..... یہ کیا کردیا..... قتل..."

میں نے رابعہ سے کہا "باہر دیکھو۔ کوئی آرہا ہے۔ تم ایک طرف ہو جاؤ۔ اگر ضروری ہو تو گولی چلانا ورنہ مجھے نمٹنے دینا۔"

ایک ساتھ دو افراد دوڑتے ہوئے آئے۔ یہ وہی کیکر تھے جو ہمیں مہمان خانے میں لائے تھے۔ میں دیوار سے لگ کے کھڑا ہوا تھا۔ ان میں سے ایک میرے پاس سے گزرا تو میں نے ٹانگ اڑادی۔ وہ دھڑام سے منہ کے بل گرا۔ دوسرا اس کے پیچھے تھا وہ میری طرف پلٹا۔ میرا سیدھا ہاتھ حرکت میں آیا اور اس سے پہلے کہ وہ ریوالور سے فائر کرتا میں نے اس کی گردن پر اپنی کھڑی ہتھیلی سے بھرپور وار کیا۔ اس کی گردن جھکولے کے باعث جھٹکا کھا گئی ورنہ ٹوٹ جاتی۔ میں نے دوسرا ہاتھ اس کی کلائی پر مارا اور پلک جھپکے میں اسے اپنی طرف کھینچ کے اس کا سر دیوار سے ٹکرادیا۔ وہ وہیں گر گیا اور میں نے اس کا ریوالور اٹھالیا۔

رابعہ نے منہ کے بل گرنے والے کو اٹھنے ہی نہیں دیا تھا۔ وہ ریوالور کے ساتھ اس کے سر پر جا کھڑی ہوئی تھی اور میں نے اس کی آواز بھی سُنی تھی۔ وہ بتا چکی تھی کہ اگر اس نے سر اٹھایا تو وہ اس میں سوراخ کردے گی۔ وہ دم سادھ کے لیٹ گیا تھا اور لیٹے لیٹے یقیناً اس نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ فرش پر ایک حیوان نما انسان اپنے ہی خون میں لتھڑا پڑا ہے۔ اس نے اپنے ساتھی کو مقابلہ کر کے مرتے دیکھا ہوگا۔ مسلح ہونے کے باوجود وہ ایک منٹ سے کم وقت میں بازی ہار چکے تھے۔

خاموشی سے لڑی جانے والی اس جنگ میں گولی چلانے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ اس کا فائدہ یہ ہوا تھا کہ خانقاہ کے کار پردازوں کو ابھی تک کچھ معلوم نہیں تھا ورنہ وہ اپنی ساری مسلح قوت کے ساتھ حملہ کرتے تو ہمارا حشر نشر کردیتے۔ دو بڑے کیکر بھی اس دیوزاد کی چیخ سُن کر مرنے آگئے تھے۔ ان میں سے ایک نے اپنے سر پر رابعہ جیسی حسین بلائے بے درماں، اس کے ہاتھ میں اصلی طمنچہ اور اس کی سر چھیدنے کی دھمکی سن کر چپ رہنے میں ہی عافیت جانی تھی اور جان بچانے میں کامیاب رہا تھا۔

عاجز صاحب ہر طرف کشتوں کے پشتے لگے دیکھ کر اوسان کھو رہے تھے اور ان کے ہونٹوں سے بے ربط جملوں کے سوا کچھ نہیں نکل رہا تھا۔ "اف۔ یا خدا، یک نہ شد دو شد۔ دو لاشیں۔" انہوں نے سر کو اپنے ہاتھوں میں تھام کے فرمایا "کس مصیبت میں پھنس گیا میں خدایا!"

"میں نے راستے میں پڑے ہوئے شخص کو ٹانگ پکڑ کے کھینچا اور گھسیٹ کر باتھ روم میں لے گیا تو وہ اس منظر کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتے رہے۔ ایک انسان کی لاش کو میں کُتے کی لاش کی طرح کھینچ کے باتھ روم میں ڈال آیا تھا۔ رابعہ اسی طرح لیٹے ہوئے شخص پر ریوالور تانے اور اس کی کمر پر اپنا پیر رکھے کھڑی تھی۔

"عاجز صاحب!" میں نے ڈانٹ کے کہا "ایسے کھڑے کھڑے کیا منہ دیکھ رہے ہیں۔ آپ سے تو ایک عورت اچھی جس نے ایک موذی کو قابو کر رکھا ہے۔"

"میں..... میں کیا کرسکتا ہوں یارا..." انہوں نے ہکلا کے کہا۔

"چلو میرے ساتھ، یہ دوسری لاش اٹھواؤ۔ یہ جنگلی بھینسا بہت بھاری ہے" میں نے کہا۔

وہ بادل ناخواستہ دہشت سے لرزتے آگے بڑھے۔ بڑی احتیاط کے ساتھ ہاتھوں کو خون کے داغ سے بچاتے ہوئے انہوں نے دیوزاد کی ایک ٹانگ پکڑی جو کسی تناور درخت کے تنے جیسی تھی اور زور لگانے لگے۔

میں نے کہا "یہ کیا عاجز صاحب! آپ کی تو شلوار گیلی ہو رہی ہے۔"

ان کا چہرہ خفت سے زرد پڑ گیا۔ ایک اُبکائی کے ساتھ وہ فرش پر بیٹھ گئے اور لمبے لمبے سانس لینے لگے۔ خون دیکھ کر اور اس کی بُو محسوس کر کے ان کے اعصاب جواب دے گئے تھے۔

میں نے کہا "مرد بنیں عاجز صاحب۔ قلم سے لوگوں کی ایسی تیسی کردینا اور دھمکیاں دے کر مال سمیٹنا بہت آسان کام ہے جو بزدل کرتے ہیں۔ آپ نے تو صحافت کو ہی نہیں پٹھانوں کے نام کو بھی رُسوا کردیا ہے۔"

میری باتوں کا ان پر کیا اثر ہوسکتا تھا۔ وہ بیڈ پر جا کے لمبے لیٹ گئے اور غالباً تقویتِ قلب اور سکون کے لیے آیت الکرسی پڑھنے میں مصروف ہوگئے۔ یا جل تُو جلال تُو کا ورد کرنے لگے۔

جب میں دوسری لاش بھی باتھ روم میں ڈال کے آیا تو رابعہ نے واحد زندہ کیکر کو کھڑے ہونے کی اجازت دے دی تھی۔ اس کا منہ دیوار کی طرف تھا اور رابعہ اس کی گدی پر ریوالور رکھے اس کی جیبوں کی تلاشی لے رہی تھی۔ عاجز صاحب نے ایسے مناظر شاید انگریزی فلموں میں دیکھے ہوں تو دیکھے ہوں، کوئی پاکستانی لڑکی حقیقی زندگی میں یہ سب کچھ کرسکتی ہے، اس کا وہ تصور بھی نہیں کرسکتے تھے۔

رابعہ نے تیسرا ریوالور برآمد کیا اور میری طرف اچھال دیا۔ یہ میں نے عاجز صاحب کو پیش کیا "ضرورت پڑنے پر اس کا استعمال کرسکتے ہیں آپ یا ایسے ہی لوگوں پر رعب ڈالنے کے لیے ساتھ لیے پھرتے تھے؟"

"یارا، اب ایسی بات بھی نہیں" عاجز صاحب اٹھ بیٹھے "ہم پٹھان تو اسلحے کو مرد کا زیور کہتے ہیں مگر آدمی کو ایسے نہیں مارتے اور نہ مرنے کے بعد اس کے ساتھ یہ سلوک کرتے ہیں۔ میری طبیعت خون دیکھ کے اور سونگھ کے بگڑ گئی تھی۔"

"سچ بتائیں، آپ نے آج تک کسی پر گولی چلائی ہے؟ میں پاگل کتے، ناکارہ گھوڑے، ہرن یا فاختہ کی بات نہیں کررہا ہوں۔ کسی کو قتل کیا ہے کبھی؟ دشمنی تو شیوہ ہے آپ کی قوم کا۔ کسی دشمن کو مارا ہے کبھی؟"

"کیوں نہیں..." انہوں نے سینہ نکال کے جھوٹ میں سچ کا زور پیدا کرنے کی کوشش کی۔

"تو ان کے جسم سے خون کے بجائے کیا روح افزا نکلا تھا یا کوکا کولا؟" میں نے کہا "عاجز صاحب..."

رابعہ نے کہا "گولی مارو عاجز صاحب کو۔ ادھر آؤ، اس کیکر سے بات کرلی ہے میں نے، یہ تعاون پر تیار ہے۔"

میں نے اس کا چہرہ اپنی طرف موڑ لیا "تم دھوکا دے رہے ہو، جان بچانے کی خاطر جھوٹ بول رہے ہو؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "ایسی بات نہیں۔"

"پھر تم خلیفہ کیکر سے بدعہدی کیوں کررہے ہو؟ اس کے جاں نثار نمک خوار اور وفادار عقیدت مندوں میں تمہاری حیثیت تو دستِ راست کی ہے۔ تم نے اس کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے بہت قربانیاں دی ہوں گی، بڑی محنت کی ہوگی۔"

اس نے سر ہلایا "پہلے ایسا ہی تھا۔"

"اب کیا فرق پڑ گیا ہے؟"

"اس نے میری اکلوتی بہن کو غائب کردیا ہے جس سے اس نے باضابطہ نکاح کیا تھا۔ مجھے معلوم ہے وہ غائب نہیں ہوئی۔ نہ وہ فرار ہوئی ہے۔ اسے خلیفہ نے ختم کرادیا ہے اور کہیں گاڑ دیا ہے۔ وہ ایسی لڑکی نہیں تھی، اگر اسے کہیں جانا ہوتا تو وہ مجھ سے کہتی، مجھ سے مدد مانگتی۔"

"ممکن ہے وہ تم سے ڈرتی ہو کہ تم خلیفہ سے کہہ دو گے۔"

"نہیں۔ یہ بات نہیں تھی" وہ بولا "خلیفہ شادیاں کرتا رہتا ہے اور جو دل سے اُتر جائیں انہیں رخصت کرتا رہتا ہے۔ کسی کو نہیں معلوم کہ ایک وقت میں اس کی بیویوں کی تعداد کیا ہے۔ اس کے حرم میں پرندہ پر نہیں مار سکتا۔ جو عورت ایک بار اس کے جال میں پھنس جائے وہ مر کے ہی نکل سکتی ہے۔ میں نے سمجھایا تھا اپنی بہن کو کہ خلیفہ ہوس کا شکاری ہے اور اس کا کھیل دیکھنا ہے تو میرے ساتھ چل۔ آئے دن عقیدت مندوں کی بہو بیٹیوں کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ تجھے خود اندازہ ہو جائے گا مگر یہی غلطی کی میں نے کہ اسے ساتھ لے گیا۔ میں اسے دوسرے گاؤں بھیج دیتا یا اس کی رخصتی کردیتا۔ وہ سال بھر سے منسوب تھی لیکن میرے ماں باپ ہی جہیز مکمل نہ ہونے کی وجہ سے معاملے کو ٹال رہے تھے۔ خلیفہ میں کوئی خاص بات ہے کہ عورتیں اس کی طرف کھنچی چلی آتی ہیں۔ کوئی وظیفہ ہے یا روحانی قوت ہے جس سے وہ عورتوں کو مطیع کرلیتا ہے۔"

میں نے طنز سے کہا "مرد اس وظیفے یا روحانی قوت سے متاثر نہیں ہوتے؟"

"میں نے یہی دیکھا ہے۔ مرد بھی اسے پیر مانتے ہیں مگر زیادہ تر عورتیں انہیں خلیفہ کے پاس لاتی ہیں۔ میں نے تو بہت تماشے دیکھے ہیں۔ بڑے بڑے عزت دار گھروں کی عورتیں گھر سے بھاگ کے آگئیں پھر ان کے شوہر کبھی پولیس لے کر آئے اور کبھی ملٹری..... مگر لے کر کیا گئے..... لُٹی ہوئی عزت تو انہیں واپس نہیں مل سکتی تھی۔ مجھے معلوم ہے کہ کتنی ہی عورتوں کو غیرت مند شوہروں نے، بھائیوں نے یا چاہنے والوں نے خود مار ڈالا اور فرار ہوگئے۔ میری بہن پیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئی تو لوٹ کر نہیں گئی۔ میں نے تو یہ بھی سُنا تھا کہ پیر انہیں کوئی خاص خوشبو سنگھا کے مست کردیتا ہے۔ اس کے پاس کوئی ایسی جڑی بوٹی ہے۔ وہ انہیں کچھ پلا دیتا ہے جس کے اثر سے... خیر مجھے یہ سب بتاتے ہوئے شرم آتی ہے کہ میری بہن کے ساتھ کیا ہوا۔ جب اس نے مجھے بتایا تو میں نے خلیفہ کو مجبور کردیا کہ وہ اس سے شادی کرے.... مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ وہ مشکل سے چھ ماہ زندہ رہی پھر خلیفہ نے خود پولیس میں رپورٹ لکھوائی کہ وہ کیا کچھ لے کر کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ اس نے ایک تیر سے دو شکار کیے۔ میری بہن کو وہ کہیں گاڑ چکا تھا۔ اس نے ایک باغی مُرید کو بھی مروا دیا جو اس کے کرتوت جان کے باغی ہو رہا تھا۔ میرے بھی ماں باپ نہ ہوتے اور چھوٹے بھائی بہن نہ ہوتے تو میں اس کو مار کے پھانسی چڑھ جاتا لیکن بعد میں خلیفہ کیکر شاہ چہارم گدی نشین ہوتا تو میرے گھر والوں کی شامت آجاتی۔

میں محتاط تھا اور موقع کی تلاش میں تھا۔"

میں نے اس کی بات پر غور کیا تو مجھے اس کہانی میں ایک جھول نظر آیا "تمہاری بہن نے تم سے کیوں نہیں کہا کہ وہ نکلنا چاہتی ہے ؟"

"یہی تو شک کی وجہ ہے۔ میں اسے یوں نکال دیتا کہ خلیفہ کو کانوں کان خبر نہ ہوتی مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ کو پہلے سے اس کے ارادوں کا علم ہوگیا تھا۔ کیا پتا اس پاگل نے غصے میں خلیفہ کے سامنے کچھ بک دیا ہو۔"

میں نے کہا "اب تم ہماری کیا مدد کرسکتے ہو؟"

"میں سب کچھ بتا سکتا ہوں‘ تم پوچھو۔"

"اچھا یہ بتاؤ غالب اور نازو یہاں ہیں یا نہیں؟"

"وہ اسی جگہ ہیں مگر آج رات انہیں نکال دیا جائے گا۔ ان کا سودا ہوگیا ہے۔"

میں بھونچکّا رہ گیا "سودا ہوگیا ہے! کیا مطلب؟"

"کوئی استاد پیڈرو ہے" وہ بولا "اس نے غالب کو اور اس کی بیوی کو چوہدری دلاور کے ہاتھ فروخت کیا تھا۔"

غصے سے میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ "کب اور کتنے میں ہوا تھا یہ سودا؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ چوہدری دلاور لاہور سے آیا تھا اور سودا ہوا تھا خلیفہ کی معرفت۔ سُنا ہے پیڈرو اُن کو نوشہرہ سے پشاور لے گیا تھا اور وہیں چوہدری دلاور کے حوالے کردیا گیا۔"

میں نے غصے میں رابعہ کی موجودگی کا خیال کیے بغیر دلاور کو اور استاد پیڈرو کو فحش گالیاں دیں۔ ان کا میں یہ کردوں گا وہ کردوں گا۔

رابعہ نے میرا غصہ ٹھنڈا کیا "اس کے سامنے چلّانے کا فائدہ۔ یہ پوچھو کہ اب کس سے سودا ہوا ہے"

"کوئی سیٹھ اکبر ہے؟"

میں اچھل پڑا "سیٹھ اکبر! اکبر خان‘ دلاور کا بڑا بھائی؟"

"یہ تو میں نہیں جانتا۔ پہلے چوہدری دلاور نے جو سودا کیا تھا اس میں خلیفہ برابر کا شریک تھا۔ اس پر کچھ گرما گرمی ہوئی تھی۔ دلاور کہتا تھا کہ چھوڑو‘ میں خود نمٹ لوں گا پیڈرو سے۔ خلیفہ نے کہا کہ پیڈرو کے پاس اب کیا ہے۔ مال تو ہمارے پاس ہے اور ہم سے تم نقد سودا کرلو تو اچھا ہے۔ طاقت کے استعمال میں تمہارا نقصان ہوگا‘ یہ تم جانتے ہو۔ دلاور نے بھی کہا کہ خلیفہ‘ ایسی بات نہیں۔ فائدے میں تم بھی نہیں رہوگے۔ میرا نام چوہدری دلاور ہے لیکن میں ٹھنڈے دماغ کا آدمی ہوں ورنہ اپنے ساتھ تم کو بھی لے ڈوبتا۔ اس کے بعد سودا ہوگیا۔ یہ ابھی چند دن پہلے کی بات ہے۔ سیٹھ اکبر تو کل رات آیا تھا۔"

"اسے کس نے بتایا اور اس کو کیا ضرورت پڑگئی غالب اور نازو کی؟" میرا دماغ چکرانے لگا۔

"کیا پتا‘ خود پیڈرو نے کوئی چکر چلایا ہو۔" رابعہ بولی "ادھر سودا کیا اُدھر دلاور کے حریف کو اطلاع دے دی۔"

"خلیفہ کو دلاور کی دھمکی نے بہت مشتعل کیا تھا۔ بعد میں اس نے کہا کہ اچھا بیٹا۔ تیری تو میں .... معاف کرنا .... میرے منہ سے گالی نکل گئی۔ اس نے سیٹھ اکبر کو بُلا کے پوری قیمت وصول کرلی۔"

"اور اب وہ دلاور کو کیا جواب دے گا؟"

"کہہ دے گا وہ بھاگ گئے۔ اب تو اور آسان ہوجائے گا اس کا کام۔ دو لاشیں پڑی ہیں یہاں۔ تم اسے نکال کر لے جاؤ تو چوہدری دلاور کیسے الزام دے گا خلیفہ کو۔"

"او کے۔ سیٹھ اکبر سے ہم بعد میں بات کریں گے۔ تم بتاؤ کہ وہ کہاں ہیں؟" میں نے کہا۔

"میں تمہارے ساتھ نہیں جاسکتا" وہ بولا "تمہیں نقشہ سمجھا سکتا ہوں اور کمروں کی چابیاں دے سکتا ہوں۔ مجھے بھی یہاں لٹا جاؤ اور کمرے کو باہر سے تالا لگادو۔ ادھر کوئی نہیں آئے گا۔ آگے تم خود نقشے کی مدد سے جانا۔ کوئی مشکل نقشہ نہیں ہے۔"

اس نے جیب سے ایک نوٹ بک نکالی اور اس کا ایک صفحہ پھاڑ کے قلم سے زمین دوز کمروں کا نقشہ اور راستہ مجھے سمجھانے لگا۔ پانچ منٹ بعد ہم اسے ناک آؤٹ کرکے باہر نکل آئے لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں اپنے ساتھ کیے جانے والے دھوکے کا اندازہ ہوگیا۔

ہم جس شخص کو اندر لِٹا کے آئے تھے اس نے شور مچادیا۔ وہ لاتوں اور مُکوں سے دروازہ پیٹ رہا تھا اور مدد کے لیے گلا پھاڑ کے چیخ رہا تھا حالانکہ اس نے ہم سے وعدہ کیا تھا کہ وہ کم سے کم آدھ گھنٹا خاموش لیٹا رہے گا۔

"حرام زادہ۔ دھوکے باز۔ مروادیا بھروسے میں" میں نے کہا۔

"بے وقوفی تمہاری ہے کہ دشمن پر بھروسہ کیا" رابعہ بولی۔

"ہاں۔ مجھے اس کو سچ مچ ناک آؤٹ کردینا چاہیے تھا" میں نے رابعہ کا ہاتھ پکڑ کے دوڑ لگائی۔

عاجز صاحب ہانپتے ہوئے ہمارے پیچھے دوڑے "یا اللہ۔ آج خیر نظر نہیں آتی۔ ساری عمر کا حساب کیا آج ہی برابر ہوگا۔"

میں نے پہلے کمرے کے دروازے میں چابی لگائی تو اوپر سے تین چار آدمی نمودار ہوئے۔ میں نے دروازہ کھول کے رابعہ کو اندر کھینچ لیا۔ عاجز صاحب جلدی میں دروازے سے ٹکرائے۔

"کیا کرتے ہو۔ مجھے باہر چھوڑ رہے تھے" انہوں نے فریاد کی۔

میں نے رابعہ سے کہا "تیار رہو جاؤ۔ وہ ادھر ہی آئیں گے۔"

رابعہ نے سرہلایا اور دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑی ہوگئی۔ دوسری طرف میں نے پوزیشن سنبھالی۔ عاجز صاحب ایک پلنگ کے نیچے گھس گئے۔ ان کا خیال تھا کہ اس مورچے سے وہ ہماری حفاظت بھی بہتر طور پر کرسکتے ہیں۔

ایک کے بعد دوسرا اور پھر تیسرا شخص دروازے سے ٹکرا کے اندر آئے۔ شاید ان کا خیال تھا کہ ہم نے دروازہ اندر سے مقفل کرلیا ہوگا۔ پہلا شخص اپنے ہی زور میں دروازے سے گزرا تو میں نے اس کے سر پر ریوالور کا دستہ ماردیا۔ اس کی چیخ نے پیچھے والے کو محتاط کردیا تھا مگر وہ بریک نہ لگاسکا۔ میں نے اسے اندر کھینچ لیا اور رابعہ کی طرف پھینک کر تیسرے کے سامنے آگیا۔

وہ ریوالور نکال کے نشانہ لے رہا تھا۔ میں غوطہ مار گیا اور گولی میرے سر کے اوپر سے گزر گئی۔ دوسرے فائر سے پہلے میں نے اس کو بھی اندر گھسیٹ لیا اور اٹھا کے فرش پر دے مارا۔ اس وقت تک رابعہ کی گولی نے دوسرے شخص کا کام تمام کردیا تھا مگر دو فائروں کی آواز نے نیچے سے اوپر تک کھلبلی مچادی تھی۔

میں نے عاجز صاحب سے کہا "باہر نکلئے ‘ اب کھلی جنگ ہوگی۔"

وہ لرزتے ہوئے باہر آئے "یا اللہ۔ میری ساری خطائیں معاف کر۔ پھر کبھی خطا کروں تو جو چور کی سزا وہ میری۔ بس آج جان بچ جائے۔"

"جان ایسے نہیں بچے گی۔ یہاں کھڑے رہے تو ابھی کوئی اندر آکے گولی ماردے گا" میں نے کہا "آیئے ہمارے ساتھ۔"

ہم درمیانی دروازے سے گزر کے دوسرے کمرے میں داخل ہوئے۔ وہاں دو کیکر سوئے پڑے تھے مگر فائرنگ کی آواز پر اٹھ بیٹھے تھے۔ ہم نے انہیں سنبھلنے کی مہلت ہی نہیں دی۔ دو گولیوں نے انہیں ہمیشہ کی نیند سُلادیا۔

عاجز صاحب چلّائے "آہ۔ دو اور قتل۔"

میں نے کہا "کچھ تو حیا کیجئے۔ ایک عورت دو دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتار چکی ہے۔ آپ کم سے کم ایک گولی ہی چلادیں یا محض لہو لگا کے شہیدوں میں نام لکھوائیں گے۔"

رابعہ نے کہا "باتیں مت کرو۔ آگے چلو۔"

"میری سمجھ میں آنے والے نقشے کے مطابق اگلے کمرے میں غالب اور نازو کو ملنا چاہیے" میں نے کہا۔

"لاؤ مجھے دو چابی" رابعہ نے بے تابی سے کہا۔

"حوصلہ۔ حوصلہ" میں نے اپنے بے قرار دل کو سمجھاتے ہوئے درمیانی دروازے کا قفل کھولا۔

کسی بگولے کی طرح اندر داخل ہو کے میں نے آواز دی "غالب!" لیکن غالب اس کمرے میں ہوتا تو جواب دیتا۔

رابعہ نے خالی کمرے کو دیکھا "یہاں تو نہیں ہیں وہ سکندر۔"

"اس سُور کے بچّے نے دھوکا دیا تھا ہمیں" میں نے کہا "ساری کہانی جھوٹی ہوگی اس کی۔ ہمارے نکلتے ہی اس نے شور مچادیا تھا۔"

اور اس وقت جب غصے اور مایوسی کی انتہا کو پہنچ کے مجھ پر دیوانگی طاری تھی‘ اچانک میرے کانوں نے ایک آواز سُنی۔ ایک ایسی آواز جسے سُننے کے لیے میرے کان ترس گئے تھے۔ میں بُری طرح چونکا۔ کیا یہ فریبِ آرزو تھا؟ میرے کان بج رہے تھے‘ لیکن میرے ساتھ رابعہ بھی حواس باختہ ہوگئی تھی۔

"سکندر! یہ تو... یہ تو غالب کی آواز ہے" وہ چلّائی اور دیوانہ وار اگلے دروازے کی طرف دوڑی۔ "ادھر آؤ‘ ادھر۔"

اس نے دونوں ہاتھوں سے دروازہ کوٹنا شروع کیا "غالب! تم ہونا ادھر۔ بولو‘ نازو! جواب دو۔"

میں نے رابعہ کو کھینچ کے الگ کیا اور دروازے کو لات ماری "میں توڑ دوں گا اسے‘ ہٹ جاؤ..... غالب!"

اب میں نے غالب کی آواز واضح طور پر سنی "سکندر! یہ تم ہو‘ تمہاری آواز ہے؟ رابعہ ہے تمہارے ساتھ؟"

رابعہ چلّائی "ہاں‘ میں رابعہ ہوں‘ ہم تمہیں لے جانے کے لیے آئے ہیں۔"

نازو دوسری طرف سے چلّائی "رابعہ باجی‘ رابعہ باجی۔"

رابعہ تو جیسے پاگل ہورہی تھی۔ شاید دوسری طرف یہی حال نازو کا ہوگا۔ میں نے اسے بڑی مشکل سے کھینچ کر دروازے سے دور کیا ورنہ وہ دروازے سے چمٹی ہوئی تھی اور رو رہی تھی۔ "ہٹو۔ میں اسے گولی سے اُڑاتا ہوں" میں نے کہا اور پھر چلّا کے غالب کو خبردار کیا "سامنے سے ہٹ جا غالب۔ میں تالے پر فائر کررہا ہوں۔"

یقیناً دوسری طرف غالب اور نازو بھی دروازے سے چمٹے کھڑے تھے۔ میں نے غالب کی آواز سُنی۔ وہ نازو کو چمکار رہا تھا۔ "بس جان! بس.... حوصلہ کرو۔ وہ آگئے ہیں‘ تھوڑی سی دیر کی بات اور ہے۔ آؤ ادھر آؤ۔ سامنے سے ہٹ جاؤ۔"

"غالبؔ میں فائر کرنے لگا ہوں۔"

"کرو۔ جلدی کریار۔ ادھر سے کوئی آرہا ہے۔ نازو‘ اُلّو کی پٹھی۔ سُنتی کیوں نہیں۔ ابھی مرے گی سکندر کی گولی سے۔"

میں نے تالے پر گولی چلائی اور تالا ٹوٹ گیا۔ ایک دھماکے کے ساتھ ہی یکلخت وہ فاصلہ اپنا وجود کھو بیٹھا جو صدیوں پر محیط محسوس ہوتا تھا اور جدائی کی وہ خلیج جس کا دوسرا کنارہ ابد کی سرحدوں سے بھی آگے نارسائی کی انتہا پر تھا‘ ایک دم سمٹ گئی۔

پھر میں غالب سے چمٹ گیا اور نازو چیخ مار کے رابعہ سے لپٹ گئی۔ اس وقت میں رو رہا تھا اور غالب رو رہا تھا۔ ایسے میں پہلے کبھی نہ رویا تھا مگر مجھے احساس نہ تھا۔ میں اس کے سر اور بازو اور اس کے جسم کو چھو کر محسوس کررہا تھا اور معلوم نہیں کیا کہہ رہا تھا۔ شاید وہی جو غالب مجھ سے پوچھ رہا تھا "تو ٹھیک ہے نا‘ بالکل ٹھیک ہے نا‘ تجھے کچھ ہوا تو نہیں ؟"

پھر میں نے نازو کو دیکھا جو رابعہ سے لپٹی زار و قطار رو رہی تھی اور میں نے غالب کو چھوڑ کر اسے کھینچ لیا "پاگل! بے وقوف‘ اب کیوں روتی ہے ؟"

اس نے کہا "تم کیوں رو رہے ہو ؟ تم تو مرد ہو‘ سکندرِ اعظم

ہو۔"

میں نے کہا "نہیں ... میں کہاں رو رہا ہوں' ہوش میں آؤ نازو۔"

غالب اب رابعہ کو دلاسا دے رہا تھا "چپ کرو وکیل صاحب۔ وکیل کہیں روتے ہیں' دیکھو بے ہوش مت ہونا۔"

بس وہ ایک بہت مختصر وقفہ تھا جس میں جذبات کا ایٹم بم گرنے سے ہمارے عقل و ہوش بھک سے اُڑ گئے۔ ہم یہ بھی بھول گئے کہ یہ جگہ رونے دھونے اور گلے مل کے محبت کی ساری پیاس بجھانے کی نہیں ہے۔ اب بچھڑے ہوئے ملے ہیں تو چاہتوں کے اظہار کے لیے بعد میں بہت وقت ملے گا۔ یہاں ہر لمحہ ہمارے گرد خطرے کے حصار کو تنگ سے تنگ تر کرتا جارہا ہے۔

جب ایک ساتھ ادھر اُدھر کے تین دروازوں سے بہت سے لوگ مہلک آتشیں اسلحے کے ساتھ اندر گھس آئے تو ہم بے وقوفوں کی طرح آنسو پونچھتے رہ گئے۔ ہمیں ریوالور اٹھانے کی مہلت بھی نہ ملی۔ خود کار مشین گنوں کے مقابلے میں ریوالور ویسے بھی بے کار تھے۔

اندر آنے والے چھ کیکر تھے۔ سبز قباؤں اور زرد ٹوپیوں والے۔ ان میں سے ایک وہی تھا جس نے اپنی دیگ کا ڈھکنا میرے لیے کھولا تھا۔

"ہاتھ نیچے رکھو اور ریوالور وہیں چھوڑ دو جہاں کھڑے ہو۔ پھر ایک قدم پیچھے ہٹ جاؤ" ان میں سے ایک نے کہا۔

میں نے اور رابعہ نے تعمیل کی۔ پھر عاجز صاحب نے بھوں بھوں کرکے رونا شروع کیا "خدا کی قسم میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں نے کسی کو نہیں مارا۔ میں تو خود بہت مجبور تھا۔ پھنس گیا تھا مصیبت میں۔"

ایک کیکر نے آگے بڑھ کے ریوالور اٹھائے۔

"اب اپنے چہرے دیوار کی طرف کرو اور ہاتھ اوپر اٹھالو۔"

میں نے غالب کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ اس کا چہرہ سُتا ہوا لگتا تھا اور شاید ہم سے بچھڑنے کے بعد اس نے شیو بھی نہیں بنائی تھی۔ وہ کچھ دُبلا بھی ہوگیا تھا۔ "یو آر گریٹ۔ چیف کے ٹو۔"

"مرزا غالب کی دُم' تو مُلا کیسے ہوگیا؟" میں نے پلٹتے ہوئے کہا۔

"مُلّا نہیں سکھ۔ میں نے عہد کیا تھا کہ جب تک ہم ملیں گے نہیں' بال نہیں کاٹوں گا۔" غالب بولا اور اپنے ہاتھ اوپر اٹھادیے۔

ایک کیکر میری تلاشی لینے لگا۔ میں نے کہا "تیری حجامت میں کروں گا اپنے ہاتھ سے۔"

غالب ہنسا "کیا اب یہ کام شروع کردیا ہے۔ چل اچھا کیا' جب اولاد ہوگی نا ہماری تو اسے مسلمان بھی خود کرنا۔ بقلم خود نہیں' بہ اُسترہ خود۔"

نازو اب رابعہ کے ساتھ دیوار کی طرف منہ کیے کھڑی تھی "پہلے خود تو مسلمان ہوجاؤ بے شرم کہیں کے۔"

ہم سب ایک دوسرے سے ملنے کی خوشی میں ایسے دیوانے ہورہے تھے کہ خطرے کے وجود کی کوئی اہمیت نہیں رہی تھی۔ اب جو ہو سو ہو۔ ہمہ یاراں دوزخ' ہمہ یاراں بہشت۔ مقابلے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہم سب خلیفہ کیکر کے فیصلے کو نوشتۂ تقدیر کی طرح قبول کرچکے تھے۔

غالب ہنسا "ابے تُو کیا کھاتا ہے۔ سور ہورہا ہے۔ شادی تو نہیں کرلی۔ تر مال ملتا ہو روز کھانے کو۔"

"ابھی کہاں یار۔ ابھی تو دھکے کھارہے ہیں۔" مگر کیا واقعی میرا وزن بڑھ گیا ہے؟"

"بالکل بڑھ گیا ہے' کیوں نازو؟"

"ماشاء اللہ سے صحت اچھی ہورہی ہے۔ رابعہ باجی' آپ بھی بڑے لشکارے مار رہی ہیں" نازو بولی۔

رابعہ نے جھینپ کے کہا "لشکارے کی بچی۔ چلنے لگی زبان تیری بھی۔"

"اوئے بند کرو اپنی بک بک اور چلو" سب پر حکم چلانے والے کیکر نے جھلّا کے کہا۔

میں نے کہا "یار' کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب تیار بیٹھے ہیں۔"

"آج بازار میں پابجولاں چلو" غالب نے کہا "مست و رقصاں چلو۔"

میں نے چلتے ہوئے گانا شروع کیا "چل چل رے نوجوان۔ اونچی تیری شان۔"

اب غالب بھی میرے ساتھ گانے لگا "چل چل رے نوجوان۔ اونچی تیری شان۔"

سارے کیکر یہ سمجھ رہے تھے کہ ہم پاگل ہیں یا نشے میں ہیں۔ ہم ان کے پیچھے چلتے ہوئے مسلسل ہنس رہے تھے اور ایسی حرکتیں کررہے تھے کہ واقعی پاگل نظر آتے تھے۔

"یہ میں اور محسن مل کے گاتے تھے لندن میں" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "یہ ایم آر ایس کا قومی ترانہ ہے۔ گاؤ تم بھی لیڈیز۔ چل چل رے نوجوان۔ اونچی تیری شان۔ اونچی تیری ناک اونچی تیری مونچھ۔ اونچے تیرے کان' چل چل رے نوجوان۔"

جب ہمیں خلیفہ کیکر کے سامنے پیش کیا گیا تب بھی ہم ہنس رہے تھے۔ لیکن اس کے دربار میں پہنچانے کے بعد باقی کیکر چلے گئے تو ہم سب کی وقتی شوخی ختم ہوگئی۔ ایک بار پھر صورت حال کی سنگینی کا احساس ہمارے اعصاب پر سوار ہوگیا۔ خلیفہ کیکر ہمارے غیر سنجیدہ رویے پر سخت حیران تھا۔ اسے یقین ہوگا کہ اتنے کشت وخون کے بعد ہم مجرم کی حیثیت سے سامنے لائے جائیں گے تو ہمارے رنگ فق ہوں گے' سر جھکے ہوئے ہوں گے اور نظر شرمندہ ہوگی۔

اس کے سامنے ایک اور شخص بیٹھا ہوا تھا جس کی شخصیت کا سب سے نمایاں حصہ اس کا سرخ و سفید رنگ اور مہندی سے رنگے ہوئے بال تھے۔ وہ پچاس سال سے زیادہ عمر کا بارُعب شخص تھا۔ اس کی صحت اچھی تھی بلکہ قابلِ رشک تھی۔ اس کی آنکھیں بھوری تھیں اور یوں لگتا تھا جیسے اس نے بالوں سے میچ کرتے ہوئے لینس لگا رکھے ہیں۔ وہ بہترین سلے ہوئے سفاری سوٹ میں تھا اور اس کے پاؤں میں پیٹنٹ لیدر کے انگلش بوٹ تھے۔

"جو کچھ تم نے کیا میاں سکندر! اس پر تم پشیمان بھی نہیں ہو" خلیفہ کیکر نے ہمارے بیٹھ جانے کے بعد دانتوں میں خلال کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ ہم غلطی کرتے ہیں تو پچھتاتے ہیں' شوقیہ نہیں۔"

خلیفہ کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں "اور یہ جو تم نے اتنے بے گناہوں کا خون کردیا۔ یہ ہمارے وفادار لوگ تھے۔ ان کی قدر تم نہیں جانتے۔ ان میں سے ایک کی جان کے بدلے ہم چاہیں تو تم سب کے سر اتار لیں۔"

"ہماری طرف سے اجازت ہے" میں نے اس کی باتوں سے اندازہ کرلیا تھا کہ اس کے ارادے کی راہ میں یقیناً کوئی مجبوری حائل ہے۔

"کیا ضرورت تھی آخر اس کی؟ ہم نے وعدہ کیا تھا کہ جس کی امانت ہے' پہلے اس سے اجازت لے لیں" خلیفہ کیکر دُکھی ہو کے بولا۔

"ہم اور تمہارے جاں نثار۔" میں نے تلخی سے کہا۔

"خاموش ہوجاؤ" خلیفہ نے دہاڑ کے کہا "یہ نہ ہو برداشت کا حوصلہ نہ رہے ہم میں۔ اکبر خان جتنی جلدی ممکن ہو' ان بدبختوں کو ہماری نظروں سے دور لے جاؤ۔ کہیں ہم سودا منسوخ نہ کردیں۔"

"خلیفہ صاحب! میں وعدہ کرچکا ہوں سارے نقصانات کی تلافی کا۔ آپ سے بعد میں بات ہوجائے گی۔ چلیں انہیں معاف کردیں۔" اکبر خان بولا۔

"نہیں۔ یہ نہیں ہوگا اکبر خان میں انہیں کیسے معاف کرسکتا ہوں۔ ایک بار تم انہیں لے جاؤ' اس کے بعد ہم دیکھیں گے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ معافی کا کیا سوال۔ ان کو سزا ضرور ملے گی" اس نے نفرت سے کہا اور اپنا منہ پھیرلیا۔

اکبر خان اٹھ کھڑا ہوا "اچھا تو پھر ہم چلتے ہیں' خدا حافظ۔"

خلیفہ کیکر نے اس کو جواب نہیں دیا۔ وہ بہت غصے میں تھا اور اکبر خان کی مجبوری نہ ہوتی تو یقیناً ہمیں عبرتناک سزا ملتی۔ معلوم نہیں لالچ کی یہ مجبوری کتنی بڑی تھی کہ وہ ہمارے ہاتھوں مارے جانے والوں کے لہو کی قیمت بھی وصول نہ کرسکا۔ بات صرف پیسے کی ہوتی تو وہ اکبر خان کی ادا کی ہوئی قیمت اس کے مُنہ پر مارتا اور کہتا کہ میرے مجرم چھوڑ جاؤ مگر ایسا لگتا تھا کہ وہ عہد شکنی سے بھی ڈرتا ہے۔

تعارف کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی تھی۔ جیسے ہی خلیفہ کیکر نے اس کا نام لیا تھا' میں سمجھ گیا تھا کہ وہ چوہدری دلاور کا بڑا بھائی ہی ہوسکتا تھا جسے دلاور اپنی دانست میں ہلاک کرواچکا تھا مگر وہ زندہ تھا۔ یہ بات دلاور کو بھی معلوم تھی یا نہیں اور اکبر خان ہم سے کیا کام لینا چاہتا تھا' اس کا فیصلہ آنے والے حالات ہی کرسکتے تھے۔ ابھی تو یہ سودا بھی ایک مُعما بن گیا تھا۔ سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔

باہر شاید ہنگامی حالات کا اعلان کردیا گیا تھا اور دفعہ ایک سو چوالیس نافذ کردی گئی تھی کہ مشتاقانِ دید مایوس و بے مراد لوٹ رہے تھے اور اپنی قسمت کو کوستے ہوئے منتشر ہوتے جارہے تھے۔ خانقاہ کے اندر فائرنگ کے بارے میں جتنے منہ تھے اتنی باتیں۔ ہر دروازے پر دیگ کے ساتھ موجود کیکر ایک دوسرے سے اشاروں میں پوچھ رہے تھے کہ معاملہ کیا ہے۔ کیا خلیفہ کیکر سوئم کا تختہ اُلٹ دیا گیا؟ خلیفہ چہارم نے گدّی پر قبضہ کرلیا۔ چھاپا پڑگیا یا کوئی "کیکر گزیدہ" انتقام کے جنون میں مرنے مارنے کے لیے اندر جا پہنچا۔

باہر ایک بالکل نئی چمکتی دمکتی لمبی سی ڈاج ڈارٹ کار کھڑی ہوئی تھی اور باوردی شوفر اپنی ٹوپی بونٹ پر رکھے بڑے پیار سے اس کی صفائی میں مصروف تھا اور ساتھ سگریٹ بھی پیتا جارہا تھا۔ کار کی پالش کو صفائی کی ضرورت نہیں تھی مگر کچھ نہ کرنے سے کچھ کرنے کو بہتر سمجھتے ہوئے وہ اپنا کام کررہا تھا۔ اس طرح وہ مُریدانِ باصفا اور مجاورانِ بے حیا کے ساتھ رابطے کی ضرورت سے بھی بے نیاز تھا۔

اکبر خان کو دیکھتے ہی اس نے بڑی پھرتی سے ٹوپی سر پر رکھی اور دروازے کھول کے کھڑا ہوگیا۔ ایک دروازے سے رابعہ کے بعد میں داخل ہوا تو دوسرے سے نازو کے پیچھے غالب آیا۔ سیٹ خاصی کشادہ تھی مگر چار کے لیے قدرے تنگ ثابت ہوئی۔ اکبر خان آگے بیٹھ گیا تو شوفر نے گاڑی بڑھادی۔

ابھی تک ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ کار کے روانہ ہوتے ہی اکبر خان نے کہا "میرا نام..."

میں نے کہا "اکبر خان ہے۔ آپ چوہدری دلاور کے بڑے بھائی ہیں۔"

وہ ایک دم پلٹا "یہ کون کہتا ہے؟"

"میں کہہ رہا ہوں" میں نے سکون سے جواب دیا "اگر یہ بات غلط ہوتی تو آپ کو شاک نہ لگتا۔ میری غلط معلومات پر حیرانی ہوتی اور آپ تردید کردیتے۔"

"گویا تم مجھے پہلے سے جانتے ہو.... اور کیا جانتے ہو میرے بارے میں؟" اس نے حقیقت کو تسلیم کرلیا۔

"آہستہ آہستہ سب معلوم ہوجائے گا سیٹھ اکبر۔ آپ تو بیوپاری ہیں انسانوں کے" میں نے کہا۔

"میں بزنس مین ہوں۔ تم سے کسی نے غلط کہا کہ میں انسانوں کا بیوپاری ہوں" اس نے برا مانے بغیر کہا اور سگریٹ کا پیکٹ میری طرف بڑھانے کے لیے پلٹا۔

"تھینکس۔ ہم میں سے کوئی اسموکر نہیں" غالب نے کہا۔

"اِن دیٹ کیس" اس نے رواں شائستہ لہجے میں کہا "مجھے امید ہے لیڈیز مائنڈ نہیں کریں گی۔"

وہ ایک مہذب آدمی تھا اور اس کے ایٹی کیٹس ہی نہیں، لہجے سے بھی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کافی وقت بیرونِ ملک یورپ میں گزار چکا ہے۔

رابعہ نے انگریزی میں کہا "آپ اپنا شوق پورا کریں لیکن پھر اے سی بند کر کے کھڑکی کھول دیں۔"

"شیور۔" اس نے کہا اور کھڑکی کا شیشہ اتار دیا "اب میں جاننا چاہتا ہوں کہ آپ میں سے بیرسٹر رابعہ قاری کون ہے؟ غالباً آپ ہی ہیں خاتون؟"

"آپ کا اندازہ غلط نہیں۔"

"پھر یہ دوسری خاتون مس نازو ہوں گی' یہ کچھ عجیب سا نام ہے غالباً نِک نیم (NICK NAME)"

"مس نزاکت شیخ۔ صرف گھر والے مجھے نازو کہتے ہیں۔"

"رائٹ۔ میں خیال رکھوں گا مس نزاکت" وہ بولا "آپ ایک مشہور صحافی ہیں مسٹر غالب۔"

"تھا؟" غالب نے تلخی سے کہا "پرانی بات ہے۔"

وہ ہنسا "اولڈ از گولڈ۔ صحافی تو پیدائشی طور پر صحافی ہوتا ہے اور اس میں ایک خداداد صلاحیت ہوتی ہے جو مرتے دم تک نہیں مرتی۔ جیسے آرٹسٹ ہر حال میں آرٹسٹ رہتا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ معاش کے لیے وہ بس کنڈکٹر بن جائے یا کلرک۔ اس سے فرق نہیں پڑتا۔ تم بہت کام کے آدمی ہو۔"

"تو آپ نے غالب کی صلاحیت کو خریدا ہے۔ میں سمجھ گیا سیٹھ اکبر خان" میں نے کہا۔

"یہ تم کیا بار بار خریدنے کی بات کرتے ہو۔ کیا یہ کافی نہیں کہ میں نے تم کو اس خبیث فراڈ خلیفہ کے چنگل سے نجات دلائی...."

"تھینک یو ویری مچ سر.... بڑی مہربانی کی...."

"مہربانی میری نہیں، تقدیر کی مہربانی تھی تم پر۔ مجھے تو معلوم بھی نہ ہوتا اور تم چوہدری دلاور کے پاس پہنچ جاتے" وہ بولا۔

"اب ہم کہاں جا رہے ہیں بلکہ لے جائے جا رہے ہیں؟" میں نے کہا۔

"میں اپنے گھر لے جا رہا ہوں تمہیں لیکن تم نہ جانا چاہو تو تمہاری مرضی۔ میں تم کو کہیں بھی ڈراپ کر سکتا ہوں۔ تم لاہور جانا چاہو تو شوفر تمہیں چھوڑ آئے گا...."

اچانک مجھے عاجز صاحب کا خیال آیا "رابعہ! وہ عاجز صاحب کہاں رہ گئے۔ میں تو بالکل ہی بھول گیا تھا۔"

رابعہ نے کہا "وہ ہمارے ساتھ کب نکلے تھے۔"

"پھر... وہ وہیں رہ گئے" میں نے تشویش سے کہا۔

"ہاں۔ خلیفہ کیکر نے روک لیا تھا اسے" سیٹھ اکبر نے جواب دیا "ڈونٹ وری... مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔"

"بزنس مین تو اپنی پسند کا مال اٹھاتا ہے مگر مجھے اس کے بارے میں تشویش ہے سیٹھ اکبر" میں نے برہمی سے کہا۔

"بہت دیر میں خیال آیا تمہیں اس کے ساتھ نہ ہونے کا۔"

"میں اپنے دوستوں سے ملنے کی خوشی میں اسے بھول گیا تھا۔ مجھے اپنی کوتاہی کا اعتراف ہے لیکن...."

"فارگیٹ ہم..." اکبر خان بولا "اسے کچھ نہیں ہو گا۔ خلیفہ کیکر جانتا ہے کہ وہ ایک صحافی ہے۔ جیسا بھی ہے اچھا یا برا۔ اور ہم سب کو معلوم ہے کہ وہ کہاں ہے۔ خلیفہ اس سے کوئی ڈیل کرنا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تو اسے بھی لا سکتا تھا مگر خلیفہ نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ خود اسے پشاور پہنچا دے گا۔ میرا گھر اسلام آباد میں ہے۔ میں زیادہ وقت لندن میں رہتا ہوں لیکن پاکستان آتا رہتا ہوں۔ ہم وہاں ایک بزنس پروپوزل کو ڈسکس کریں گے۔ اگر آپ سب نے منظور کیا تو بات آگے ہو گی ورنہ ختم۔"

"بہت بڑا جوا کھیلا ہے تم نے" غالب بولا۔

"فار می' لائف از اے گیمبل" وہ بولا۔ (میرے لیے زندگی ایک جُوا ہے)

"کتنا لگایا تھا داؤ پر؟" میں نے کہا۔

وہ ہنسا۔ "اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ میں پیشہ ور جُواری ہوں۔ لاس ویگاس اور مونٹی کارلو کے جُوئے خانوں میں اس سے کہیں زیادہ ہار جاتا ہوں ایک رات میں۔ یو سی' خلیفہ ایک گھٹیا درجے کا اخلاقی مجرم ہے۔ قانونی طور پر بھی وہ غلط کام کرتا ہے تو بہت گھٹیا۔ صرف پیسے کی خاطر۔ جب آدمی پیسے کو مقصد بنا لیتا ہے تو پھر وہ ذلیل ہوتا ہے۔ پیسہ تو ایک ذریعہ ہے۔ عیش و عشرت کی زندگی کے لیے، عزت اور شہرت کے لیے' خوشی کے لیے' تھرل THRILL کے لیے۔ اور ڈونٹ مائنڈ میں ذرا صاف گو ہوں۔ کچھ لوگوں کے نزدیک ثواب کمانے اور دوسری دنیا کی زندگی میں جنّت کا سودا پکا کرنے کے لیے۔"

"میں تم سے اتفاق کرنے پر مجبور ہوں۔" میں نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے ہم خیال ہیں میں اور تم" وہ بولا "ایسا ہوتا ہے مسٹر سکندر بخت۔ ایک آدمی ساری عمر روکھی سوکھی کھاتا ہے، چیتھڑے پہنتا ہے اور سلمز (SLUMS) میں رہتا ہے۔ جب وہ مر جاتا ہے تو پتا چلتا ہے کہ لکھ پتی تھا۔ اس کے لیے پیسہ ایک مقصد ہوتا ہے۔ وہ جمع کرتا رہتا ہے' جمع کرتا رہتا ہے۔ مرتے دم تک۔ ایک خاص حد تک بزنس مین بھی اس چکر میں پڑتا ہے۔ وہ لکھ پتی ہو تو کروڑ پتی اور کروڑ پتی ہو تو ارب پتی بننا چاہتا ہے۔"

"تم مجھے بتا رہے ہو کہ تم اس چکر سے آگے نکل چکے ہو۔ میں مرعوب ہوا سیٹھ اکبر" میں نے کہا۔

"میرا مقصد مرعوب کرنا نہیں تھا۔ سیدھی سچی بات بتا رہا تھا میں۔ اب میں یہ فکر نہیں کرتا کہ پیسہ کہاں سے آئے گا اور کیسے آئے گا۔ یا ختم ہو گیا تو کیا ہو گا۔ اتنی جگہ انویسٹمنٹ ہے میری کہ خود مجھے یاد نہیں۔ میں اپنے چیف اکاؤنٹنٹ سے پوچھ کے بتا سکتا ہوں۔ میں اپنی بڑائی نہیں کرنا چاہتا۔ سمندر کی مثال لے لو۔ اسے کیا معلوم کہ کہاں کہاں سے ندی نالے اس میں کتنا پانی ڈال رہے ہیں۔ یہ اطمینان کافی ہے میرے لیے کہ مجھے فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ کم سے کم اس جنم میں" وہ ہنسا۔

"ایک اور جنم کی خواہش رکھتے ہو تم؟"

"خواہش سب ہی رکھتے ہیں مگر یقین نہیں رکھتے۔ یہ جو خلیفہ ٹائپ لوگ ہیں نا، ان کو تو یہ جنم بھی نہ جانے کیوں ملا۔ کیا پایا انہوں نے زندگی سے؟ بے اطمینانی' بے سکونی' احساسِ جرم' ڈر' خوف۔ بے شک میں نے بھی اتنی دولت شریفانہ کاروبار سے نہیں کمائی مگر اب میں محفوظ ہوں اور مطمئن۔"

"ضمیر کی خلش سے بھی؟"

"وہ تو بہت جلد مطمئن ہو جاتا ہے۔ شروع میں کچھ دن تنگ کرتا ہے، جیسے کوئی جنگلی جانور شروع میں قید کر کے لایا جاتا ہے تو قابو میں نہیں آتا مگر پھر ٹرینر اسے سُدھا لیتے ہیں، وہ پالتو ہو جاتا ہے" اکبر خان بولا "جیسے آدمی چاہے ویسے ہی مطمئن ہو جاتا ہے اور جو عام لوگوں کے اخلاقی پیمانے کے مطابق غلط ہو اس پر شور مچانا چھوڑ دیتا ہے۔ ویسے یہ الگ بحث ہے کہ اچھا کیا ہے اور برا کیا، غلط کیا ہے اور صحیح کیا۔ ہر آدمی کا اپنا حوالہ ہے۔ FRAME OF REFERENCE جس کے مطابق وہ فیصلے صادر کرتا ہے۔ بعض اوقات بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کے لیے ایک چیز کو غلط سمجھتا ہے مگر خود وہی کرتا ہے تو کسی دوسرے حوالے سے اس کو جائز قرار دے کے مطمئن ہو جاتا ہے۔ یہی ہے ضمیر کو اپنی مرضی پر چلانا جس کو ہم ضمیر کا اطمینان سمجھنے کے عادی ہیں۔"

"سیٹھ اکبر! میری معلومات کے مطابق تم پشاور کے ایک نواحی گاؤں کے رہنے والے تھے۔ تمہارا باپ لکڑی پر نقاشی کے کام کا بہت اعلیٰ فرنیچر بناتا تھا۔ وہ ایک عظیم فنکار اور بڑا آدمی تھا۔"

"اچھا!" اکبر طنز سے بولا "بہت بڑی کوٹھی اور کار ہو گی اس کے پاس، نوکر چاکر ہوں گے اور جب وہ باہر نکلتا ہو گا تو سب ہاتھ سلام کے لیے اٹھ جاتے ہوں گے۔ بڑا آدمی ہے آخر۔"

"بات وہی ہے۔ تمہارے اور میرے حوالے میں فرق ہے۔ تم بڑا آدمی خود کو سمجھتے ہو یا دلاور کو اور خلیفہ کو۔ میرے نزدیک ایک خوددار' کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلانے والا' حلال کی روزی کھا کے قناعت سے زندگی گزار دینے والا فنکار بڑا آدمی ہے۔ اصولوں پر سودا نہ کرنے والا اور...."

وہ ہنسا۔ "تم بیسویں صدی میں اٹھارویں صدی کی روح رکھتے ہو۔ یہ باتیں کتابوں میں اچھی لگتی ہیں۔ یا فلموں میں اسٹیج کے ڈائیلاگ کی طرح بولی جائیں تو اگلی صفوں والے ان سے بہت خوش ہوتے ہیں۔ وہ سب جو امیر نہ بن سکے' امیروں کی زندگی کو جہنم سے بدتر' ان کی کمائی کو حرام اور انہیں دنیا ہی میں رُسوا ہوتا دیکھ کے سکون حاصل کرتے ہیں کہ اللہ کا شکر ہے ہم اچھے ہیں۔"

میں نے اس سے بحث کرنا لاحاصل سمجھا "اچھا چھوڑو ساری باتیں' یہ بتاؤ کہ تمہیں کیا ضرورت پڑ گئی ہماری؟ کس کے خلاف استعمال کرنا چاہتے ہو تم ہمیں؟"

"ایسی جلدی کیا ہے" وہ بولا "ٹیک اِٹ ایزی۔ اس موضوع پر فرصت سے بات کریں گے۔ بس اب کچھ دیر میں ہم گھر پہنچنے والے ہیں۔"

رابعہ اور نازو سر جوڑے باتوں میں مصروف تھیں بلکہ یہ کہنا صحیح ہو گا کہ ایک دوسرے کے کان کھا رہی تھیں۔ ان کی زبانیں قینچی کی طرح چل رہی تھیں اور وہ درمیان میں "ہائے اللہ" "اوئی' اللہ' سچ" جیسے الفاظ کا آزادانہ استعمال کرنے کے علاوہ حیرت اور خوف سے بھرپور چیخوں سے بھی گفتگو کو زنانہ انداز میں پُراثر بنا رہی تھیں۔ انہیں کم سے کم وقت میں ایک دوسرے کو فرقت کے شب و روز کا سارا احوال' غم و الم کی ساری کیفیات اور دورِ جُدائی کے ہر لمحے کا فسانۂ غم سنانے کی جلدی تھی۔ کس پر کیا بیتی، کون کس کو کتنا یاد کر کر کے کتنا آنسو بہاتا رہا۔ آٹھ آٹھ کے سولہ سولہ۔ اور بقول فلمی شاعر۔ کیسے دن بیتے کیسے بیتی رَتیاں۔ یہ سب بڑی افراتفری میں گوش گزار کیا جا رہا تھا۔ اگر وہ نظم و ضبط سے باری باری ایک دوسرے کو حالات کا خلاصہ سنانا چاہتیں تو ان کا کام آسان ہو جاتا مگر ایک تو اس قسم کے حالات میں خواتین جذبات سے اتنی مغلوب ہوتی ہیں کہ عقل تو فوراً خدا حافظ کہہ کے گھاس چرنے چلی جاتی ہے۔ دوسرے خلاصے میں بات کرنا ویسے بھی ان کی عادت اور فطرت کے خلاف ہے۔ نتیجہ یہ کہ دونوں بول رہی تھیں اور شاید سُن بھی رہی تھیں۔

غالب خاموش تھا۔ آپس کی باتیں کرنے کے لیے یہ جگہ اور وقت دونوں ہی نامناسب تھے۔ ورنہ باتیں تو ہمارے پاس بھی بہت تھیں۔ پھر بھی عمومی نوعیت کی باتیں کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

غالب نے سر گاڑی کی نشست سے لگا رکھا تھا اور آنکھیں بند کیے لیٹا ہوا نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔ اس نے میری اور اکبر خان کی گفتگو میں بالکل دلچسپی نہیں لی تھی۔

میں نے کہا "مرزا جی! کوئی خواب دیکھ رہے ہو؟"

غالب آنکھیں کھول کے مسکرایا "خوابوں کے آسرے پہ کٹی ہے تمام عمر۔"

"بے مقصد خواب جن کی تعبیر سراب" میں نے کہا "مگر یار' کیا سب فلسفی اور مؤجد' ریفارمر اور پیغمبر۔ خواب نہیں دیکھتے

تھے؟ ایک اچھی دنیا کے جس میں اچھے انسان ہوں اور صرف اچھائی ہو...... اور انہی کے خوابوں سے دنیا میں سائنس، علم وادب، تہذیب اور انسانیت کے شعور کا تصور پیدا ہوا۔"

"میں کب خوابوں کو برا کہہ رہا ہوں" غالب بولا "یہ بتا باقی سب کہاں ہیں؟"

میں نے کہا "محسن اور گل ابھی تک لاپتا ہیں۔ گل کے بارے میں ایک افواہ اب خبر بن چکی ہے کہ وہ پھر ناگ منی بن گئی ہے۔ میں نے خود اخبار میں پڑھا تھا۔"

"جعلی اخبار ہوگا" غالب نے کہا۔

میں بھونچکا رہ گیا "یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا مرزا جی۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ مجھے یہ خیال نہیں آیا۔ تمہاری ناقص عقل میں فوراً آگیا۔"

"یہ عقل کی نہیں، تجربے کی بات ہے۔ ہم اخبار میں سرخی کیسے بدلتے تھے؟ اندرونِ ملک جانے والے اخبار اور شہر میں تقسیم ہونے والے ایک ہی تاریخ کے اخبار اٹھا کے دیکھو۔ بہت فرق ہوتا ہے خبروں کے صفحات میں اور کسی اخبار کے کسی صفحے پر ایک خبر کی جگہ دوسری خبر لگانا یا سرخی بدلنا روز کی بات ہے۔ آخری کاپی سے ایک قلم ہٹا کے دوسری لگائی اور نئی پلیٹ چڑھادی مشین پر۔"

میں نے سرہلا کے کہا "میں سمجھ گیا، وہ خبر بھی کچھ ایسی ہی ہوگی۔"

"کیا تھا اس خبر میں؟"

"ڈکیتی کی ایک واردات کی خبر تھی۔ ناگ منی کی تصویر کے ساتھ مگر تصویر پرانی تھی۔"

"فائل سے نکالی گئی ہوگی" غالب بولا "تم نے کوشش بھی نہیں کی ان کا پتا چلانے کی؟"

"کہاں کوشش کرتے، کس سے پوچھتے۔ یہ تو ان کا فرض تھا کہ خود ہم سے رابطہ قائم کریں۔ سب کے ٹیلی فون نمبر تھے ان کے پاس اور پتے تھے" میں نے کہا۔

"کیا پتا یار، ان کے لیے رابطہ ممکن بھی تھا کہ نہیں۔ ورنہ اتنے بے وقوف تو نہیں تھے وہ اور نہ ایسے بے مُروّت۔"

"ہاں۔ اسی خیال سے میں بھی دل کو تسلی دیتا ہوں کہ انہیں ضرور کوئی مجبوری درپیش ہوگی۔"

غالب نے کہا "ڈاکوؤں کے کسی گروہ سے معلوم کریں گے۔"

"وہ کیسے؟ ڈاکوؤں کا کیا کوئی دفتر ہوتا ہے تعلقاتِ عامّہ کے لیے یا وہ کوئی پی آر او رکھتے ہیں۔"

غالب مسکرایا "یار، اخبار والوں کو پتا ہوتا ہے سب کا۔"

"اکرام شیخ کراچی میں پھنسا ہوا ہے" میں نے کہا "تمہارا اور محسن کا انتظار کررہا ہے اکیلا۔"

"اور کاجل؟"

"وہ تو باقاعدہ دیوانی ہورہی ہے۔ پہلے اس لڑکے کلیم اللہ پر ساری مامتا لٹاتی رہی۔ اسے ہم غیر علاقے میں اس کے رشتے داروں کے حوالے کرنے گئے تو بہت روئی۔"

"تم اسے چھوڑ آئے؟"

"اور کیا یہاں تم کو لینے آئے تھے" میں نے کہا "ایک مزے کی بات بتاؤں، کلیم اللہ کی شادی ہوگئی، ایمان سے۔"

"کس سے؟ کاجل سے؟" غالب دم بخود رہ گیا۔

"دماغ خراب ہے۔ وہ تو ماں کی طرح تھی اس کے لیے مگر جس سے شادی ہوئی ہے وہ بھی ماں کے برابر ہے" میں نے ہنس کے کہا "اس کا باپ بھاگ گیا تھا شادی کے وقت۔ دستور کے مطابق لڑکی اس کی واپسی کا انتظار کرتی رہی۔ وہ خود تو آیا نہیں، اس کا بیٹا آگیا اور باپ کے گناہ کی سزا اسے ملی۔ قبیلے والوں نے کہا کہ اب اس کو تم اپنے گھر میں بساؤ تو معافی مل سکتی ہے۔"

"حد ہے یار۔ یہ کوئی انصاف ہے۔"

"ہر جگہ انصاف کے معیار الگ ہوتے ہیں اور معاشرہ انہیں جائز قرار دیتا ہے" میں نے کہا "کاجل کچھ دن بہت سوگوار رہی۔ ویسے وہ اپنے بھائی ڈبل ایس آئی کے چکر میں پڑ گئی ہے۔"

"اور اپنے بھائی ڈبل ایس آئی کیا فرماتے ہیں بیچ اس مسئلے کے؟"

"اس کی مجال کہ انکار کرسکے" نازو نے اچانک اپنی باتیں چھوڑ کے کہا۔

"یا میرے خدا! ایک کان ادھر ایک اُدھر۔ تم اپنی باتیں کررہی تھیں یا ہماری سن رہی تھیں؟" غالب بولا "اچھا ہوا خدا نے زبان ایک دی۔"

میں نے اس کی تائید کی "ہاں۔ ورنہ ہماری ہربات میں بھی دخل اندازی جاری رہتی۔"

"اور یہ تم نے کیا بات کی۔ کوئی زبردستی ہے۔ ہمارا بھائی ڈبل ایس آئی اگر نہ چاہے تو تم کیا کرلوگی؟"

"میں اس کا دماغ درست کردوں گی۔"

"پہلے اپنا تو ٹھیک کرلو۔ سارے پیچ ڈھیلے ہیں۔"

نازو نے کہا "جیسا بھی ہے، دماغ تو ہے۔"

"یہ بھی تم کہتی ہو، عام زبان میں اسے بھوسہ کہا جاتا ہے جو عقل سے بڑی چیز کھاتی ہے۔ جس کو موسیقی سے ذرا شغف نہیں ہوتا، اس کے سامنے بین بجاؤ..."

"تو ایسے ہی سرہلاتی رہتی ہے جیسے دوسری خاتون ہلارہی ہیں" میں نے لقمہ دیا۔

گاڑی ایک دم موڑ کاٹ کے گیٹ سے ایک کوٹھی کے احاطے میں داخل ہوگئی۔ اتنے دن بعد غالب اور نازو کی لڑائی دیکھی تو بہت لطف آرہا تھا۔ ان کی عادت نہ بدلی تھی، نہ بدل سکتی تھی۔ مستقل ہوجائے تو عادت بھی فطرتِ ثانیہ بن جاتی ہے مگر اس

لڑائی میں جتنا پیار تھا، اتنا فلموں کے پیار و محبت سے بھرپور مناظر میں بھی محسوس نہیں ہوتا تھا۔ اس میں تصنع نہیں تھا اور بناوٹ نہیں تھی۔ یہ حقیقی زندگی کا جیتا جاگتا عکس تھا جس میں محبت کے بھی ان گنت روپ رنگ تھے۔

شوفر نے پہلے ہمارے لیے دروازہ کھولا۔ وہ اپنے مالک کی طرح ایٹی کیٹس جانتا تھا۔ دلاور کا شوفر ہوتا تو پہلے مالک کے لیے دروازہ کھولتا اور ہم جیسے مہمانوں کے لیے شاید تکلیف ہی نہ کرتا۔

اکبر خان کی کوٹھی بالکل جدید وضع کی اور سرسبز درختوں سے گھری ہوئی تھی۔ یہ درخت نہ جانے کہاں کہاں سے لا کے بڑے سلیقے سے...... لگائے گئے ہوں گے کہ اب کوٹھی کے چاروں طرف بڑے آرائشی انداز میں اپنی بہار دکھارہے تھے۔ مجھے چوہدری دلاور کی لاہور والی کوٹھی اس کے مقابلے میں یوں لگی جیسے کسی باغ کے مقابلے میں پولیس اسٹیشن۔

اکبر خان کا ایک اور ملازم اندر سے نمودار ہوا۔ اب شام ہورہی تھی۔ اکبر خان نے کہا "آپ لوگ اپنے کمروں میں جا کے فریش ہوجائیں پھر چائے پئیں گے۔ جس چیز کی ضرورت ہو کسی کو بھی بتادیں۔"

بظاہر سیٹھ اکبر اونچا آدمی تھا۔ اس کا رہن سہن ٹھاٹ باٹ اور انداز و اطوار سب اس کے بڑا ہونے کی دلالت کرتے تھے۔ اس نے بلا جھجک تسلیم کرلیا تھا کہ یہ دولت اس نے شریفانہ طریقے سے حاصل نہیں کی تھی مگر اب وہ شرفا میں شامل تھا۔ دلاور ابھی اس سے ایک منزل پیچھے تھا۔ وہ دولت کی منزل تک پہنچ گیا تھا۔ اس سے اگلی منزل عزت کی تھی جو آدمی کو ایک اسمگلر اور غیر قانونی کاروبار میں ملوث بدنام آدمی کی سطح سے اٹھا کے اس مقام پر لے آتی ہے جہاں کوئی اس کے ماضی کا حوالہ نہیں دیتا اور اس کے دھندوں کے ناجائز ہونے کے باوجود سرِعام تذکرہ نہیں ہوتا۔ اس کو سوسائٹی کے اعلیٰ طبقے میں وہ مقام حاصل ہوجاتا ہے جہاں اس سے پہلے اسی جیسے موجود ہوتے ہیں مگر وہ اپنے حلقے..... میں ہر ایرے غیرے کو داخل نہیں ہونے دیتے۔ شرافت کی سند اس وقت تک حاصل نہیں ہوتی جب تک پولیس آپ کے پیچھے لگی رہے یا اخبار میں آپ کے کارناموں کا ذکر آتا رہے۔ شرفا اور اُمرا میں آپ اس وقت شمار کیے جاتے ہیں جب پولیس کے اعلیٰ افسر خود بھی آپ کے کاروبار میں شامل ہوجائیں، آپ کے گھر معزز مہمان بن کے آتے ہوں اور آپ کو اپنے گھر کی تقریبات میں مدعو کرتے ہوں۔ شریفانہ طور پر آپ انہیں ماہ بہ ماہ ان کے حصے یا بھتے گھر پہنچاتے ہوں اور آپ کے کسی کالے دھندے کا ذکر اخبار میں کسی حوالے سے نہ آتا ہو۔ پکڑے جاتے ہوں تو چھوٹے موٹے کارندے، جن کو آپ کا نام بھی معلوم نہ ہو اور آپ کسی ڈرائنگ روم میں بیٹھ کے انگلی ہلاتے ہوں تو ان کی رہائی عمل میں آجاتی ہو۔

اتنی عزت خریدنے کے لیے پیسہ پانی کی طرح بہانا پڑتا ہے اور کوئی ایک پورے "مافیا" کو کنٹرول کرتا ہو تو لازمی ہے کہ اس کے پاس ہر سطح کے مجرموں، بدمعاشوں اور ہر قسم کے غیر قانونی کاروبار کرنے والے ماہرین کا منظم گروہ ہو جس میں درجہ بدرجہ اوپر تک بہت سے خفیہ ہاتھ اس کی مدد کرتے ہوں۔ وہ "بگ باس" کی حیثیت سے پسِ پردہ رہتا ہو اور ایک پُراسرار شخصیت ہو جس کی دہشت نچلے درجے کے کارکنوں پر اس حد تک قائم ہو کہ باس کے نام سے ہی ان کا پیشاب خطا ہوتا ہو۔ یہ سب کچھ ایک طے شدہ منصوبے کے تحت بڑی ذہانت سے کیا جاتا ہے اور عام آدمی نہیں کرسکتا۔ غیر معمولی صلاحیت رکھنے والا ایک جینئس اگر زندگی کی راہوں پر مثبت سمت میں قدم بڑھاتا رہے تو کسی بین الاقوامی ادارے کے سربراہ سے لے کر صدر مملکت تک کچھ بھی بن سکتا ہے۔ اس کا انحصار بہت حد تک اس کی خوش نصیبی پر بھی ہے جو حالات کو اس کی ضرورت کے مطابق سازگار کرتی جاتی ہے۔ منفی راہ اختیار کرنے والا، اکبر خان کی طرح کسی مافیا کا، جرائم کی کسی زیرِ زمین، ان دیکھی سلطنت کا سربراہ بن جاتا ہے۔

عزت کی اس منزل کے بعد شہرت کا بھوت سر پر سوار ہوتا ہے تو آدمی سیاست کے میدان میں قدم رکھتا ہے۔ اسمبلی کا رکن، سینیٹ کا ممبر، صوبائی وزیر، گورنر یا وزیراعظم تک بننے کے لیے دولت کے انبار لٹانے پر تیار ہوجاتا ہے۔ سمجھدار آدمی آہستہ آہستہ پبلک میں اپنا امیج بناتا ہے۔ کچھ سمجھ دار، نیک نام اور دور اندیش مشیر رکھ لیتا ہے جو اسے بتاتے ہیں کہ لیڈری کیا ہے اور لیڈر بننے کے لیے اسے کب کیا کرنا چاہیے اور کیسے کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ یہ پبلسٹی کے ماہرین آہستہ آہستہ اخباروں میں بیانات، تصاویر، تقاریب کی رپورٹوں اور تصویروں سے اس کو معاشرے کا خیر خواہ، مخیر اور بے غرض، دولت کو ہاتھ کا میل سمجھنے والا، غریبوں کا ہمدرد اور فرشتہ صفت انسان ثابت کرتے جاتے ہیں، یہاں تک کہ اسے انتخابات میں ایک تہائی ووٹ پروپیگنڈے سے مل جائیں تو باقی ایک تہائی وہ پیسے سے خرید کر منزل مراد تک پہنچ جاتا ہے۔ شادباد منزلِ مراد۔

اکبر خان یہی کررہا تھا۔ اس کا اندازہ مجھے ہوگیا تھا مگر میں نے غالب سے ذکر نہیں کیا تھا۔ چوہدری دلاور جلد بازی سے کام لے رہا تھا۔ وہ عزت کی منزل تک پہنچے بغیر شہرت کے آسمان کو چھونا چاہتا تھا۔ زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ اتنی اونچی جست اسے راس نہیں آئے گی اور آسمان تک پہنچنے کی کوشش میں وہ زمین پر منہ کے بل گرے گا لیکن قبل از وقت یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ آخر وہ بھی اکبر خان کا بھائی تھا اور سیاست میں کوئی بات حتمی نہیں ہوتی۔ پرانے قصے کہانیوں کی بات ہے کہ بادشاہ لاولد مرگیا تھا چنانچہ طے کیا گیا کہ کل صبح سب سے پہلے شہر پناہ میں سورج کی پہلی کرن کے ساتھ مشرق کی طرف سے داخل ہونے والے کو تخت پر

بٹھادیا جائے اور خوش نصیبی نے قرعۂ فال ایک فقیر کے نام نکال دیا جو دیر ہو جانے کے باعث رات بھر شہر کی فصیل کے دروازے پر بھوکا پیاسا پڑا رہا تھا۔ صبح دم شہر میں قدم رکھا تو لوگوں نے پکڑ کے بادشاہ بنادیا۔ امریکی نائب صدر کو آج بھی الیکشن لڑے بغیر دنیا کا سب سے طاقتور عہدہ اسی وقت ملتا ہے جب تقدیر یاور ہو اور صدرِ امریکا اپنی معیاد پوری کیے بغیر اللہ کو پیارا ہو جائے۔

اکبر خان کی وسیع و عریض کوٹھی میں سناٹا تھا۔ رہائش کے لیے ہمیں اوپر والے حصے میں دو کمروں کی انیکسی دی گئی تھی جسے گیسٹ ہاؤس بھی سمجھا جاسکتا تھا۔ اس میں دو بیڈ رومز کے سامنے لاؤنج نما ٹیرس تھا جو دو طرف سے کھلا ہوا تھا اور وہاں پڑے ہوئے بید کے کشن اور آرام کرسیوں پر بیٹھ کے باغ کا دلکش نظارہ بھی نظر آتا تھا اور اسلام آباد کی سرسبزی و شادابی، پس منظر میں سُرمئی پہاڑ اور گہرے نیلے آسمان کی خوب صورتی پر کسی بہت بڑے کینوس پر قدرت کے سب رنگوں سے بنے ہوئے لینڈ اسکیپ کی پینٹنگ کا گمان ہوتا تھا۔ ہوا میں آمدِ بہار کی خوشبو تھی اور درختوں نے شوخ، گہرے رنگ کے چمکیلے پتوں کا نیا لباس زیب تن کرلیا تھا۔

رابعہ اور نازو کی باتیں ختم ہونے والی نہ تھیں۔ وہ سارا راستہ بولتی آئی تھیں اور اب زیادہ فراغت کے ساتھ تفصیلات کی گہرائی میں ڈوب کے ماضی، حال اور مستقبل پر اپنے اپنے نقطۂ نظر سے روشنی ڈال رہی تھیں ورنہ خاموشی تھی۔

میں نے کہا ”یہاں تو اُلو بول رہے ہیں۔“

غالب نے سرہلایا ”دو اُلو۔ مادہ اُلو۔ کیا اُلو کا مؤنث ہوتا ہے؟“

نازو نے پلٹ کے دیکھا ”جی نہیں۔ اُلّو ہمیشہ مذکر ہوتا ہے۔ نر۔“

میں نے کہا ”کبھی ہم اُردو لُغت مرتب کریں گے تو اس میں اُلّی کے لفظ کا اضافہ کردیں گے۔ یا پھر اُلنی۔ جیسے شیر سے شیرنی، بھوت سے بھتنی۔“

”بھتنی یعنی میری ساس“ غالب بولا ”میرے سُسر محترم بھوت ہیں مگر بڑے گاڈوی قسم کے۔ اس تمام عرصے میں انہوں نے کچھ بھی نہیں کیا۔ چاہتے تو سب دشمنوں کو ہوا میں اُلٹا لٹکا دیتے۔“

”غالب! پھر شروع ہوئی تمہاری بد تمیزی“ نازو بگڑ گئی۔

”بھوت کو بھوت کہنے میں کون سی بد تمیزی ہے۔ ہاں گاڈوی کہا ہے میں نے۔ اس کا برا مانے گا تو میرا سُسر، تم کو کیا؟“ غالب نے کہا۔

”اچھا چلو جاؤ دوسرے کمرے میں۔ باتیں کرنے دو ہمیں۔“

”بہت باتیں کرلیں تم نے۔ اب ہماری باری ہے، تم جاؤ۔“

”ہم کیوں جائیں، کیا تم نے ریزرو کرالیا تھا یہ کمرا؟“ نازو نے کہا۔

”جہاں پناہ کے حکم کی تعمیل تم پر فرض ہے“ غالب بولا۔

”بالکل۔ آخر ہم تمہارے مستقبلِ بعید کے خداوندگان مجازی ہیں۔“ میں نے فوراً تائید کی۔

”مانا کہ تم اس قابل نہیں ہو.... مگر خیر، ہم فراخ دل لوگ ہیں اور مجبوری میں صبر شکر سے مرغ قورمہ چھوڑ کے بھنڈی توری بھی زہر مار کرلیتے ہیں“ غالب نے متانت سے کہا۔

”یہ وضاحت فرمادیں کہ آپ نے بھنڈی کسے کہا ہے اور توری کسے؟“ میں نے رابعہ اور نازو کی طرف دیکھا۔

رابعہ اٹھ کھڑی ہوئی ”چلو نازو۔ ان کی زبان کھُل گئی ہے۔ یہ اور بڑھتے جائیں گے، اگر انہیں جواب دیا۔“

”جاؤ جاؤ، نکلو یہاں سے... ورنہ...“ غالب بولا۔

”ورنہ کیا؟“ نازو جاتے جاتے رک گئی ”آگے بولو۔“

”ورنہ ہم نکل جائیں گے یار۔ خفا ہونے کی اس میں کون سی بات ہے“ غالب نے دانت نکال کے شرافت سے کہا۔

تھوڑا سا تخلیہ میسّر آیا تو میں نے کہا ”مولانا، یہ تو میں بعد میں پوچھوں گا کہ آپ نوشہرہ کے ملٹری اسپتال سے اغوا کیسے ہوگئے تھے...“

”مگر میں یہ پہلے بتاؤں گا“ غالب بولا ”لیکن اس سے بھی پہلے اپنی منّت پوری کروں گا۔“

”کون سی منّت؟“

اس نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا ”مولانا غالب سے میں مرزا غالب بننا چاہتا ہوں۔ کیا باتھ روم میں آلاتِ خلافت ہیں۔ آپ شروع کریں اپنا کام خلیفہ سکندر۔“

باتھ روم میں ایک ڈریسنگ کیبنٹ سے قینچی دستیاب ہوئی کنگھا اور برش کمرے میں ہی تھے۔ میں نے کسی تجربہ کار باربر کی طرح غالب کو ایک کرسی پر بٹھایا، اس کی گردن کے گرد ایک میز پوش باندھا اور صفائی شروع کردی۔ بچپن سے اب تک میں نے سیکڑوں بار سر جھکا کے بال کٹواتے ہوئے اس عمل کا اتنی بار مشاہدہ کیا تھا کہ پروفیشنل اسٹائل میں غالب کی داڑھی میں کنگھی پھیر کے قینچی چلانا مجھے بہت آسان کام لگا۔

”آغاز کہاں سے کروں؟“ غالب نے کہا ”جب ہم جہاز سے کودے اور برف میں گرے۔“

میں نے کہا ”اس طرح تو داڑھی کے ساتھ تمہاری ناک بھی کٹ جائے گی، اپنا منہ بند رکھو۔“

”آہ۔“ غالب چلّایا ”یہ ناک نہیں کان ہے۔“

”سوری۔ ذرا ہاتھ بہک گیا مگر فکر کی بات نہیں۔ ابھی تک کان اپنی جگہ پورا موجود ہے۔ روایت یہ ہے کہ باربر قینچی کی طرح زبان بھی چلاتے ہیں اور گاہک مجبوراً خاموشی سے سب سنتے ہیں۔ میں عرض کرتا ہوں کہ آپ لوگوں سے بچھڑ کے ہم پر کیا گزری۔ ہمیں فوجیوں نے پکڑ لیا تھا۔ ہم تلاش میں تھے تم دونوں کی۔ پتا نہیں کدھر نکل گئے تھے لیکن کرنل جعفری گنڈمین دی لاثانین تھا۔

یہ بھی جانتا تھا کہ ہم کون ہیں مگر اس نے کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ دو دن مہمان رکھا اور پھر گلگت پہنچادیا...“

طوالت سے گریز کرتے ہوئے میں نے بعد کے واقعات کا خلاصہ پیش کیا اور پندرہ منٹ بعد جب میں جھاڑ جھنکاڑ داڑھی کو اس حد تک صاف کرچکا تھا کہ غالب کا پرانا چہرہ ... پہچانا جارہا تھا، میری بات بھی ختم ہوگئی۔

”یار، کمال کردیا تو نے تو“ غالب بولا۔

میں نے کہا ”قسمت ساتھ نہ دیتی تو ہم کیا کرتے؟“

”بھائی میں آپ کے کمالِ باربری کی بات کررہا تھا۔ مجھے شک ہورہا ہے کہ لندن میں تم نے پڑھائی خاک نہیں کی، یہی کام کیا ہوگا“ وہ اپنے چہرے پر ہاتھ پھیر کے بولا جس پر ہفتے بھر کی شیو جتنی داڑھی رہ گئی تھی ”محسن ہوگا ڈش واشر۔ یہاں کچھ بھی کہتے رہو، اس کے گواہ تم اور تمہارا گواہ وہ۔“

میں نے کہا ”حکم ہو تو سر کی حجامت بھی کردوں۔ جو اسٹائل بھی پسند ہو۔ کدو اسٹائل ہے اور ریل بریئر کا اسٹائل ہے۔“

اچانک اکبر خان اندر آگیا۔ اس منظر نے تھوڑی دیر کے لیے اسے مبہوت کردیا پھر وہ قہقہہ مار کے ہنسا ”واٹ از دس! تم کہہ دیتے، میں باربر کو بلوادیتا، اتنی جلدی کیا تھی۔“

غالب نے کہا ”میں نے منّت مانی تھی کہ جب تک یہ لوگ نہیں مل جائیں گے، بال نہیں کٹواؤں گا اور سکندر نے قسم کھائی تھی کہ یہ کام خود کرے گا۔ اس مقدس فریضے کی ادائیگی کے لیے باربر کی ضرورت نہیں تھی۔“

”اوکے۔ اوکے۔ اب جلدی سے نہا دھولو۔ میں تو چائے پر تمہارا انتظار کررہا تھا، کچھ ضروری باتیں کرنا تھیں۔“

”ٹھیک ہے۔ ہم آتے ہیں پندرہ بیس منٹ میں“ غالب نے کہا۔

اکبر خان لوٹ گیا تو میں نے کہا ”یار، یہ کیا چاہتا ہے؟“

”یہ ہمیں استعمال کرنا چاہتا ہے۔“

”مگر کیسے، کس کے خلاف؟“ میں نے کہا ”اور اسے کیوں یقین ہے کہ ہم قابل استعمال ہیں؟“

”اچھا۔ رات کو کریں گے فرصت سے باتیں۔ پہلے اس کی سن لیں میں آتا ہوں شیو اور غسل سے فارغ ہوکے۔“ غالب بولا اور باتھ روم میں گھس گیا۔

دوسرے کمرے سے رابعہ کے بولنے کی آواز آرہی تھی۔ اب وہ پشاور میں آصف علی، اس کی معذور بیٹی اور منہ بولے بیٹے کے بارے میں بتارہی تھی اور بہت تفصیل سے بتارہی تھی۔ میں نے بہتر سمجھا کہ انہیں اپنی باتوں میں مصروف رہنے دیا جائے۔ اکبر خان سے میں اور غالب بات کرسکتے تھے اور وہ بعد میں باتھ روم کو فراغت سے استعمال کرسکتی تھیں۔

غالب نہا دھو کے نکلا تو پھر وہی پرانا غالب تھا۔ شیو کرنے اور بال بنانے کے بعد اس کا چہرہ کچھ کمزور لگ رہا تھا مگر فریش بھی ہوگیا تھا۔ اکبر خان نے پہلے سے سب بندوبست کررکھا تھا۔ وارڈ روب میں ہر قسم کے مردانہ و زنانہ کپڑوں کے جوڑے استری کیے ہوئے موجود تھے۔ غالب نے بھی میری طرح کمیض شلوار کا انتخاب کیا اور ابھی ہم تیار ہی ہوئے تھے کہ اکبر خان پھر آگیا۔

رابعہ اور نازو ابھی تک باتیں کرنے سے تھکی نہیں تھیں۔ میں نے کہا کہ اب آپ لوگ بھی باتھ روم استعمال کرلیں تو نازو نے جواب دیا کہ ہم ایسے ہی ٹھیک ہیں۔ ہماری چائے یہیں بھجوادینا۔

اکبر خان ہمیں ٹیرس پر لے گیا جہاں چائے کی ٹرالی کھانے پینے کی بہت سی چیزوں سے لدی کھڑی تھی۔ اس نے ایک اور ملازم کو حکم دیا کہ لیڈیز کے لیے دوسری ٹرالی اندر پہنچادی جائی۔ چائے کے ساتھ کافی بھی تھی اور بہت اعلیٰ تھی۔ دولت کی فراوانی دنیا کی اعلیٰ ترین چیزوں کے حصول کی خواہش کو ممکن کردیتی ہے۔ اکبر خان جیسے لوگ تو فرمائش پر چارٹرڈ پلین سے دنیا کے ہر گوشے سے کوئی بھی چیز فراہم کرسکتے تھے۔

”اس سے پہلے کہ تم کچھ کہو، میں اپنی قیمت جاننا چاہتا ہوں“ غالب نے کہا ”جو تم نے ادا کی ہے۔“

”چھوڑو یہ بات...“

”نہیں۔ ایک زر خرید کو یہ تو معلوم ہونا چاہیے کہ سکّہ رائج الوقت میں اس کی قدر و قیمت کیا ہے“ غالب نے کہا۔

”مسٹر غالب! آدمی کے بدلے پیسہ مانگنے والے کیا آدمی ہوتے ہیں اور تم جیسے لوگ کیا بک سکتے ہیں؟“ اکبر خان بولا ”قیمت تو لی تھی خلیفہ کیکر نے اپنی ذلالت کی۔ کسی باصلاحیت آدمی یا فنکار کا مول کون لگا سکتا ہے۔ محبت اور ممتا کی بھلا کوئی قیمت مقرر کرسکتا ہے؟ میں تو کہتا ہوں کہ وہ عورت جو طوائف کہلاتی ہے، اس کا بھی صرف جسم بکتا ہے۔ وہ خود کہاں بکتی ہے اور اس کے مقابلے میں تم رابعہ قاری جیسی عورت کو رکھو۔ یا اپنے جیسے غیر معمولی صحافی کو رکھو۔ تو یہ سوال ہی بے معنی لگتا ہے۔ مجھے تمہاری خدمات کی ضرورت تھی اور میں نے تمہیں آزاد کرالیا۔ وہ لالچی آدمی ایسے نہ مانتا تو میں دوسرا طریقہ اختیار کرتا۔ کتا اگر ہڈی ڈالنے سے چُپ ہوجائے تو اسے گولی مارنے کی کیا ضرورت ہے۔“

”تم نے یہ کیوں فرض کرلیا کہ میں تمہارا کوئی کام کروں گا؟ مجھے معلوم ہے تمہارے کاروبار کی نوعیت کیا ہے؟“

وہ ہنسا ”یہ تم کیسے جان سکتے ہو، چاہو تو بعد میں کوشش کرکے دیکھ لینا۔ میں ایک شریف اور معزز آدمی ہوں اور میرے سارے کاروبار قانونی اور جائز ہیں۔“

”چوہدری دلاور کی طرح؟“ میں نے کہا۔

”وہ بے وقوف ہے۔ بہت دیر میں عقل آئی ہے اسے“ اکبر خان بولا ”اور ابھی تک میں نے اسے نظرانداز کیے رکھا تو اس کی

وجہ بھی یہی تھی۔ تم جانتے ہو کہ وہ سیاست میں قدم رکھنے کی سوچ رہا ہے۔ انتخابات میں حصہ لینا چاہتا ہے۔"

"اس سے تمہیں خطرہ محسوس ہوتا ہے؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ مجھے کسی سے بھی خطرہ محسوس نہیں ہوتا لیکن میں نہیں چاہتا کہ اس جیسے لوگ عوام کے نمائندے منتخب ہو کے اسمبلی میں جائیں' وزیر بنیں۔"

"کیونکہ تم خود کو اس کے لیے انتہائی موزوں اور ہر اعتبار سے بہترین امیدوار سمجھتے ہو" غالب نے طنز سے کہا۔

"موازنہ تم خود کرلو گے۔ تمہارے اپنے وسائل ہیں۔ جیسے چاہو معلوم کرو۔ جاسوسی اور سراغ رسانی کے لیے ذہانت شرط ہے اور وہ تمہارے پاس ہے۔ میں تمہاری راہ میں کسی کو حائل نہیں ہونے دوں گا۔ میں تو چاہتا ہوں کہ تم چوہدری دلاور جیسے سب لوگوں کو پبلک کے سامنے بے نقاب کرو۔ ان کا سارا کچا چٹھا کھول دو۔ ان کے مجرم ماضی پر پڑے ہوئے سارے پردے ہٹا کے لوگوں کو بتاؤ کہ یہ قوم کے راہنما کہلانے کے لائق نہیں۔ تم قلم کے مجاہد ہو' قلم سے اپنی لڑائی لڑو۔ پہلے کی طرح۔"

غالب اسے نظر جما کے دیکھتا رہا "اکبر خان! تم اچھے شکاری ہو' صحیح جال پھیلایا ہے تم نے۔"

"یہ جال نہیں ہے۔ میں تم کو ایک پیش کش کر رہا ہوں۔ جس دن تمہیں احساس ہو کہ تم نے میری پیش کش قبول کر کے غلطی کی تھی' اس دن تم مجھے صاف بتا دینا۔ میں تمہیں روکوں گا نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم ایک اخبار نکالنے کی تیاری کرو۔ ایک بہت بڑا اخبار۔"

"تمہاری تشہیر کے لیے؟"

"قطعی نہیں۔ اس کی پالیسی تمہاری اپنی ہوگی۔ تم اس کے ایڈیٹر ہی نہیں' مالک بھی رہو گے عملاً۔ نام پبلشر کی حیثیت سے میرا ہوگا' اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ میں تو یہاں رہتا بھی نہیں' نہ مجھے فرصت ہے اپنے کاموں سے کہ اخبار کے بکھیڑے میں پڑوں۔ تمہیں مکمل خود مختاری حاصل ہوگی کہ اسے جیسے چاہو چلاؤ۔ اس میں جو چاہو چھاپو' میرے خلاف بھی کوئی بات ہو تو لکھو۔" وہ ہنسا۔

غالب کی بے یقینی اور تذبذب کی کیفیت اس کی صورت پر پڑھی جاسکتی تھی۔ بے شک ہر بڑے صحافی کی طرح یہ اس کے خواب آرزو کی معراج تھی کہ وہ ایک بڑے اخبار کا خود مختار ایڈیٹر ہو مگر کیا یہ ممکن ہوگا؟ یہی سوال میرے ذہن میں بھی تھا اور اکبر خان کی تمام یقین دہانیوں کے باوجود میں یہ ماننے پر تیار نہ تھا کہ اکبر خان صرف غالب کی خواہش پوری کرنے کے لیے یا ملک اور قوم کے مفاد میں یہ کام کرنا چاہتا ہے۔

میں نے خاموشی کے ایک مختصر وقفے کے بعد کہا "یہ سب تم صرف ایک انتقامی جذبے سے مغلوب ہو کے کر رہے ہو۔"

"مجھے کسی سے انتقام نہیں لینا" وہ بولا۔

"چوہدری دلاور سے بھی نہیں؟"

"چوہدری دلاور نے میرا کیا بگاڑا ہے؟ ہاں تم اس کے دشمن ہو۔ اس کے خلاف ایم آر ایس کی تنظیم بنا کے لڑتے رہے ہو لیکن اس جنگ سے تمہیں نقصان کے سوا کیا حاصل ہوا؟ اگر تمہارا اپنا اخبار ہوگا تو تم یہ جنگ زیادہ مؤثر طور پر لڑ سکو گے۔ مجھے معلوم ہے کہ تم لوگوں کا مشن کیا ہے؟"

"کس نے بتایا ہے تمہیں یہ سب؟"

وہ ہنسا "بابا! میں اسی دنیا میں رہتا ہوں۔ سب سنتا ہوں' دیکھتا ہوں اور پڑھتا ہوں۔ حالات سے پوری طرح باخبر ہوں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "میں یہ نہیں مان سکتا اکبر خان کہ تم نے اپنے بھائی دلاور خان کو معاف کردیا ہوگا۔ تم پٹھان ہو' بدلہ ضرور لیتے ہو۔ اس نے تمہاری جان لینے کی کوشش کی تھی مگر تمہاری خوش قسمتی کہ تم بچ گئے۔ اب تم اس کو آسانی سے مارنے کے بجائے پریشان اور ہراساں کر کے' سیاسی اور معاشی طور پر اس کا مستقبل تباہ کر کے' اس کی زندگی برباد کر کے انتقام لو گے۔ تم اسے اذیت دے کر' دوڑا کے' محصور کر کے مارو گے۔"

وہ مجھے یوں دیکھتا رہا جیسے میری بات سمجھنے سے قاصر ہو' میں کوئی ایسی زبان بول رہا ہوں جس کا وہ ایک لفظ نہیں جانتا یا میں اچانک ہوش کھو بیٹھا ہوں۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو' کس دلاور خان کی بات کر رہے ہو؟ وہ جو میرا بھائی تھا' وہ اب کہاں ہے؟" اس نے بالآخر کہا۔

"وہ چوہدری دلاور ہے اب۔"

"یہ کس نے بتایا ہے تمہیں؟ وہ چوہدری ہے' دلاور خان تو نہیں ہے" اکبر خان نے مجھ پر نظر جما کے کہا۔

"تم جانتے ہو وہی دلاور خان ہے" میں نے کہا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا "نہیں۔ میں نہیں جانتا اور یہ بات تمہیں بھی جان لینی چاہیے کہ چوہدری دلاور سے میرا کوئی رشتہ نہیں ہے۔"

میں نے کہا "تم مانتے ہو کہ تمہارا ایک بھائی تھا۔ دلاور خان۔"

"بالکل تھا۔ ہم ایک ساتھ گھر سے نکلے تھے۔"

"اس کے بعد تمہارے اور اس کے درمیان کاروباری معاملے میں کوئی اختلافِ رائے ہوا۔ یا کسی کے دل میں بے ایمانی آئی۔ تم الگ ہوگئے اور اس نے تمہیں راہ سے ہٹانے کی کوشش کی۔"

"یہاں تک سب ٹھیک ہے۔"

"اس نے کھلے سمندر میں تمہاری لانچ ڈبو دی تھی۔"

"لانچ اس کی ڈوبی تھی' میری نہیں۔ تمہیں کسی نے غلط اطلاع فراہم کی ہوگی" اس نے کہا۔

"اگر وہ دلاور خان نہیں ہے تو سال کے سال میں چکر آ گیا۔ تمہارے والدین کی قبروں پر کیوں حاضری دیتا ہے؟ تم مانتے ہو کہ تمہارا والد ایک ترکھان تھا' فرنیچر بناتا تھا۔ گاؤں سے نکلنے کے بعد تم کبھی لوٹ کر نہیں گئے تھے۔"

"یہ بھی غلط ہے۔ ایک بار میں گیا تھا جب میری ماں کا انتقال ہوا تھا" اس نے کہا۔

"لیکن باپ کی موت پر صرف دلاور خان گیا تھا۔"

"دلاور خان کیسے جاسکتا ہے؟ وہ مر چکا تھا۔"

"گاؤں والوں نے دیکھا تھا اسے۔ اس نے قبرستان میں تمہارے والدین کی قبروں کو پکا کروایا تھا' وہاں مسجد تعمیر کرائی تھی' اس مسجد میں پیش امام مقرر کیا تھا جس کو ماہانہ وظیفہ دیتا تھا اور مسجد کی دیکھ بھال کے اخراجات بھی وہی ادا کرتا تھا۔"

"یہ سب تمہیں کس نے بتایا؟"

"پشاور میں ایک شخص آصف علی نے۔ میں اسی کا مہمان تھا' وہاں میں نے تمہارے والد کے ہاتھ کا بنا ہوا فرنیچر دیکھا تو تعریف کی اور آصف علی نے بتایا کہ وہ ہنر مند کون تھا' اس کے بیٹے کون تھے۔ سب باتیں اسی سے معلوم ہوئی تھیں۔"

"کیا آصف علی نے خود بھی دلاور خان کو دیکھا تھا؟"

"مجھے نہیں معلوم..... دیکھا ہوگا۔"

"اچھا۔ کیا اس نے چوہدری دلاور کو دیکھ کے کہا تھا کہ یہی دلاور خان ہے؟"

میں نے کہا "اس کا اور چوہدری دلاور کا آمنا سامنا نہیں ہوا۔"

"تم نے کوئی تصویر دکھائی تھی اس کی؟"

میں نے کہا "بدقسمتی سے اس کی کوئی تصویر بھی میرے پاس نہیں تھی۔"

اکبر خان نے ایک گہری سانس لی۔ "پھر یہ کوئی غلط فہمی ہے جو وقت آنے پر خود دور ہو جائے گی۔ فی الحال تم میری پیش کش پر غور کرو اور مجھے سوچ کے بتاؤ' سرمایہ کتنا درکار ہوگا' اخبار کہاں سے شائع ہوگا' دفتر کے لیے کہاں اور کتنی جگہ چاہیے؟ اسٹاف تو بعد میں تم خود رکھو گے۔ اس سے پہلے ایک اچھے آفس کے لیے سامان کا بندوبست ہوگا۔ پلاننگ کا سارا کام میں تم پر چھوڑتا ہوں۔ تمہارے پاس اچھی ٹیم ہے۔ بہترین ایڈوائزر ہیں اور قانونی مشیر ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ تم دیانت دار اور مخلص ہو اور تمہاری COMMITMENTS اصولوں کے ساتھ ہیں۔"

میں حیرانی سے اسے دیکھتا رہا۔ "تم نے فرض کرلیا ہے کہ ہم یہ آفر قبول کر چکے ہیں؟"

"کوئی معقول وجہ تو نظر آتی نہیں مجھے..."

غالب جو ابھی تک خاموشی سے خلا میں دیکھتے ہوئے کچھ سوچ رہا تھا' اچانک بولا "سکندر! ہم کریں گے یہ کام۔ اگر واقعی ہمیں اپنی مرضی کے مطابق آزادانہ طور پر کام کرنے کا موقع ملا۔ جس دن ہم نے محسوس کیا کہ ہمیں غلط مقصد یا ذاتی مفاد کی خاطر استعمال کیا جارہا ہے اسی دن ہم اخبار سے الگ ہو جائیں گے۔"

میں نے کہا "غالب! اتنی جلدی میں فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔"

"یہ ایک غیر مشروط پیش کش ہے" اکبر خان بولا۔

"یہی میرے لیے ناقابلِ فہم بات ہے۔ تم ایک بزنس مین ہو' کاروباری نقطۂ نظر سے تمہارے لیے اس کاروبار میں کون سا پہلو منافع بخش ہے؟"

"ہر اخبار بالآخر منافع دیتا ہے۔ یہ تو اس کی کامیابی پر ہے اور کامیابی کے لیے میں تم پر بھروسا کرنے کا رسک ضرور لے رہا ہوں مگر مجھے یقین ہے کہ یہ کوئی رسک نہیں۔ چھ مہینے' سال میں نتائج سامنے آجائیں گے۔ ساری دنیا میں یہ ایک انڈسٹری ہے اور کامیابی کا دارومدار ہے ریڈرشپ پر۔ ریڈرشپ بڑھے گی تو اشتہار خود بخود ملیں گے اور اصل منافع وہی ہوگا۔"

میں نے ابھی تک ذہنی طور پر یہ تسلیم نہیں کیا تھا کہ اکبر خان

جیسا شخص صحافت کے پیشے میں طبع آزمائی صرف اشتہارات سے ہونے والی آمدنی کے لیے کرنا چاہتا ہے اور بطورِ خاص اس نے ایم آرالیس کو اس کے مشن کی تکمیل کے وسائل فراہم کرنے کے لیے ایک اخبار کا طاقتور ہتھیار کسی شرط کے بغیر دینا قبول کرلیا ہے۔ وہ ایسا کہاں قوم کا خیر خواہ اور ملک کا بہی خواہ تھا کہ خدمتِ خلق اور صحافت کی اعلیٰ قدروں کی پاسداری کے لیے لاکھوں کا سرمایہ داؤ پر لگادے۔ صحافی اور بھی تھے، اس نے ہمیں ہی کیوں خریدا؟

اس کی سیدھی سادی، بے غرض پیش کش کے پیچھے یقیناً کوئی سمجھ میں نہ آنے والی بات تھی۔ شاید اس نے دانہ پھینک کے دام پھیلایا تھا۔ صرف یہ دیکھنے کی خاطر کہ ہم کس طرح شکار ہونے کے لیے لپکتے ہیں۔

غالب اس کی چال کو سمجھے بغیر جال میں پھنس گیا تھا۔ اسے تو اپنے خواب کی تعبیریوں مل رہی تھی جیسے لاٹری کا انعام ملتا ہے۔ اس نے اکبر خان کی پیش کش منظور کرلی تھی اور میں مجبور تھا کہ اس کی تائید کروں۔

مزید گفتگو سے پہلے ملازم نے کسی ملاقاتی کی آمد کی اطلاع دی اور وہ معذرت کرکے اٹھ گیا "اب آپ لوگ آرام کریں۔ بھول جائیں ماضی کو اور مستقبل کی پلاننگ میں مصروف ہوجائیں۔ کسی چوہدری دلاور یا استاد پیڈرو سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ اکبر خان اب تمہارے ساتھ ہے۔"

میں نے کہا "جب اکبر خان ہمارے ساتھ نہیں تھا تب بھی ہم کسی اُلّو کے پٹھے سے نہیں ڈرتے تھے۔ ہمارا خدا ہمارے ساتھ تھا اور ہمارا حوصلہ ہمارے ساتھ تھا۔"

"سوری۔ میرا ہرگز یہ مقصد نہیں تھا۔ تم بہت وہ ہو۔ کیا کہتے ہیں حساس کو؟ SENSATIVE اور TOUCHY۔ میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ تم پہلے سے زیادہ مضبوط ہوجاؤ گے۔ ایک اخبار کے مقابلے میں چوہدری دلاور کیا چیز ہے۔ رات کے کھانے پر شاید ملاقات نہ ہوسکے۔ صبح پھر بات ہوگی۔"

میں نے کہا "کیا یہ ضروری ہے کہ معاہدہ ہونے تک ہم یہاں رہیں؟ فرض کرو، ہم انکار کردیتے ہیں؟"

وہ جاتے جاتے رک گیا "آف کورس۔ تم کسی وقت بھی جاسکتے ہو۔ تم مہمان ہو، قیدی نہیں۔ ابھی تو رات ہوگئی ہے ورنہ میں شوفر کے ساتھ گاڑی دے دیتا۔"

جب وہ چلا گیا تو میں نے برہمی سے کہا "مرزا جی! تم کو ایسی کیا جلدی تھی؟ تم جواب دینے کے لیے مہلت لے سکتے تھے۔ صبح تک ہم مشورہ کرلیتے۔"

"یار، تم خواہ مخواہ جذباتی ہو رہے ہو۔ چلو رابعہ اور نازو پر چھوڑ دیتے ہیں فیصلہ۔"

"اب کیا رہ گیا ہے فیصلہ کرنے کو!"

"نہیں فیصلہ کرنے دو کہ میرا فیصلہ درست ہے یا غلط۔ انہوں نے کہا کہ میں نے غلطی کی ہے تو صبح میں اکبر خان کو ... جواب دے دوں گا کہ میرے ساتھی مجھ سے اتفاق نہیں کر... چناں چہ میں مجبور ہوں، یہ بات ختم سمجھی جائے" غالب بولا۔

"اس میں کوئی چال ہوگی مرزا جی۔ اکبر خان جیسا آدمی ... بھی کرے کسی کے ساتھ تو اسے راس نہیں آسکتی جس کے ساتھ نیکی کی جائے۔ وہ لندن میں رہتا ہے۔ ساری عمر اس نے نا... کاروبار سے پیسہ اکٹھا کیا۔ آج بھی وہ تسلیم کرتا ہے کہ اس ... دھندے شریفانہ نہیں مگر اس کے خلاف ثابت کچھ نہیں جاسکتا۔ اور ہم اس کے لیے کام کریں؟ یہ سوچو کہ اس نے خ... ہے ہمیں۔"

"ہم یہ کیوں نہ سوچیں کہ قسمت نے ہمیں ایک موقع فرا... کیا ہے جو ہر کسی کو نہیں ملتا؟ تاریک پہلو کے بجائے ہم روشن پہ... کو کیوں نہ دیکھیں؟ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم سب... مرضی کے بغیر میں کچھ نہیں کروں گا۔ ہم آج بھی وہی ہیں جو ک... تھے۔"

نازو نے دروازے سے سر نکال کے کہا "کل تم بوتل ... دودھ پیتے تھے اور بستر خراب کرتے تھے۔"

غالب نے متانت سے کہا "یہ میں آج بھی کرسکتا ہوں ... آزمائش شرط ہے۔"

میں نے کہا "تم لوگ کب سے ہماری باتیں سن رہی تھیں؟"

"بہت دیر سے۔ ہم نے دخل در معقولات سے گریز کیا" نا... نے رابعہ کے ساتھ ٹیرس پر قدم رنجہ فرمایا۔

وہ نہا دھو کے اور کپڑے بدل کے آئی تھیں۔ باہر ٹیرس پ... اندھیرا پھیل گیا تھا مگر ہم نے لائٹ نہیں جلائی۔ اُفق سے طلو... ہونے والا چاند کا ٹھنڈا اُجالا زیادہ پُرسکون محسوس ہورہا تھا۔ ... تک اسلام آباد کی روشنیاں نظر آرہی تھیں مگر پس منظر کے پ... اور درخت تاریکی کا حصہ بن چکے تھے۔ ابھی تک مجھے یقین نہ... آیا تھا کہ یہ سب بھی کسی خواب کا جال نہیں ہے اور ہم واقع... آزاد ہیں۔ ہم استاد پیڈرو، چوہدری دلاور اور خلیفہ کیکر کے چنگ... سے نکل آئے ہیں اور محفوظ ہیں..... پھر غالب اور نازو کو ا... قریب دیکھ کے میں سوچنے لگتا تھا کہ شاید اکبر خان کو بھی قدرت نے ہی وسیلہ بنا کے بھیجا تھا ورنہ ہم تو مایوسی کے صحرا میں بھٹک ر... تھے۔ ایک بے سود تلاش میں۔

رابعہ نے کہا "مبارک ہو تمہیں، ایڈیٹر ہوگئے؟"

"میرے ابا کہتے تھے کہ گدھا حج کر آئے تب بھی گدھا ہی ر... ہے۔"

غالب نے اسے گھورا "وہ خود بھی تو حاجی تھے۔ کیا حج سے واپس آنے کے بعد بھی انہوں نے اپنی حرکتیں نہیں چھوڑی تھیں؟"

"حرکتوں سے کیا مطلب ہے تمہارا؟" نازو نے برامان کے کہا۔

"حرکت کا مطلب ہے چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا۔ حرکت میں برکت ہے" غالب نے عیاری سے کہا۔

"غالب، میں سب سمجھتی ہوں۔ حج کرنے کے بعد یہ سب کون چھوڑتا ہے چلنا پھرنا کھانا پینا..." نازو نے غصے سے کہا۔

"تو ناراضی کی کون سی بات ہے اس میں۔ سیدھی طرح جواب میں کہہ سکتی ہو تم کہ انہوں نے اپنی حرکتیں نہیں چھوڑی تھیں۔ تم نے ہی اپنے ابا کا قول سنایا تھا گدھے کے بارے میں۔ کوئی گدھا گیا ہوگا ان کے ساتھ حج کرنے۔ واپسی میں انہوں نے جو دیکھا وہ بتادیا..."

"وہ فارسی کی ضرب المثل تھی" نازو جھلّا کے بولی۔

"یعنی تمہارے ابا کا ذاتی تجربہ نہیں تھا؟ خیر" غالب نے بے حد معصومیت سے کہا "مجھے کیا معلوم تھا۔"

رابعہ ہنسنے لگی "اچھا چھوڑو لڑائی۔ یہ بتاؤ اخبار کا نام کیا ہوگا؟"

"روزنامہ بھوت" غالب نے کہا "اس کے اوپر لکھا ہوگا۔ زندگی کے سنسنی خیز انکشافات کا آئینہ دار۔ روزنامہ بھوت یا یہ کہ ... معاشرے کو چمٹ جانے والے لاتوں کے ہر بھوت کا دشمن۔ روزنامہ بھوت۔ نیچے لکھا ہوگا بیاد سُسر صاحب، بھوت آنجہانی۔"

نازو نے بھنّا کے کہا "میں نیچے پھینک دوں گی یہیں سے۔"

"ہوش میں رہ کے بات کرو لڑکی۔ ہم کوئی معمولی آدمی نہیں ہیں۔ سارا کچا چٹھا چھاپ دیں گے تمہارے سارے خاندان کا۔ سب کو پتا چل جائے گا کہ تم بھتنی ہو بلکہ چڑیل ہو۔ آدم خور قسم کی۔"

اتنی برداشت نازو میں کہاں تھی۔ وہ پہلے ہی تاؤ کھا رہی تھی۔ غالب نے جان بوجھ کے اس کو براہِ راست چھیڑا تو وہ بگولے کی طرح اٹھی مگر غالب کو پہلے سے اندازہ تھا کہ اس کی بات کا ردِّ عمل کیا ہوگا۔ اس نے کرسی اُلٹی اور چھلانگ مار کے اندر بھاگ گیا اور دروازہ اندر سے بند کرلیا۔

رابعہ نے نازو کو بٹھالیا "بس بھگا دیا نا اسے۔ اتنا ہی کافی ہے۔ تم خواہ مخواہ چڑتی ہو۔"

"وہ بھوت کیوں کہتا ہے میرے ابا کو؟" نازو بچوں کی طرح بولی۔

میں نے کہا "اس کے کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ وہ بھوت تو نہیں تھے۔"

خود بخود رات کے کھانے پر ان کی صلح ہوگئی۔ ہم اخبار کی باتیں کرتے رہے۔

نازو نے کہا "مجھے کرائم رپورٹر رکھ لینا۔"

"مشکل ہے۔ تم تو مار مار کے سب کو سیدھا کردو گی۔ کرائم ہی نہیں ہوں گے تو رپورٹنگ خاک ہوگی؟"

"جب تک پولیس ہے، جرائم کیسے ختم ہوسکتے ہیں؟" رابعہ نے کہا۔

غالب کے اعصاب پر اخبار سوار ہوگیا تھا۔ وہ بنیادی طور پر صحافی تھا اور اچانک اسے اپنی دنیا میں لوٹنے کا موقع مل گیا تھا۔ وہ ایک زبردست دھماکے کے ساتھ پھر صحافت کے میدان میں کودنے کے خیال سے ہی بہت خوش تھا۔ اس کی ساری گفتگو کا محور یہی یہ تھا کہ اب دیکھنا میں کیا کرتا ہوں۔ ایسی کی تیسی نہ کردی چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کی تو کہنا۔ یہ سمجھو اب ایم آرالیس کے پاس ایٹم بم آگیا ہے۔ اب گل اور محسن کا بھی پتا چل جائے گا۔ اکرام شیخ کو ہم واپس پولیس کے محکمے میں پہنچا کے دم لیں گے۔ وہ ضامن رضوی مرحوم کا جانشین بنے گا۔"

اس کے خیالات کی پرواز شیخ چلی کے منصوبوں جیسی تھی۔ ہم سب اس کا مذاق بھی اڑاتے رہے مگر وہ متاثر نہیں ہوا۔ اس کی بہت سی باتیں میرے دل کو بھی لگی تھیں مگر وہ جو ایک خلش سی تھی وہ باقی رہی کہ آخر اکبر خان کو یہ سب کرنے کی اور ہم سے کرانے کی کیا ضرورت تھی؟

رابعہ اور نازو ایک کمرے میں سوگئیں۔ میں اور غالب دوسرے کمرے میں بہت دیر جاگتے رہے۔ رات کے بارہ بجے میں نے سوچا کہ اب سونا چاہیے مگر نیند ہنوز آنکھوں سے اوجھل تھی۔ غالب نے ایک ملازم کو طلب کیا اور اس سے کافی منگوائی۔ ہم پھر ٹیرس پر آبیٹھے۔ اکبر خان یقیناً گھر سے باہر تھا ورنہ ملنے ضرور آتا۔ آہستہ آہستہ روشنیاں گل ہوگئیں اور گھر کے نوکر چاکر بھی سوگئے۔ سڑکوں پر رات کا سناٹا تھا اور باہر اچھی خاصی سردی تھی۔

شاید ایک بجے کا وقت تھا اور ہم اٹھنے ہی والے تھے کہ سڑک سے گزرنے والی ایک گاڑی نے رخ بدلا اور اس کی ہیڈ لائٹس آف ہوگئیں پھر وہ گاڑی گیٹ سے اندر آگئی۔ یہ لینڈ روور قسم کی جیپ تھی۔ ڈرائیور نے انجن بند کردیا تھا اور گاڑی خاموشی سے پورچ تک آگئی تھی۔

ایک ایک کرکے اس میں سے چھ آدمی اُترے۔ ان سب کے چہرے اوجھل تھے۔ وہ سیاہ کپڑوں میں تھے اور انہوں نے کندھوں پر خودکار قسم کی رائفلیں لٹکا رکھی تھیں۔ وہ بے پاؤں آگے بڑھے۔

○☆○

میں نے کہا "غالب تیرے سسرالی عزیز آگئے برات لے کر۔"

غالب نے سرہلایا "ہاں یار۔ لگتے تو بھوت ہی ہیں۔"

"جا کے فوراً یہ بات نازو کو بتا دے" میں نے سرگوشی میں کہا۔ "یعنی یہ کہوں کہ تمہارے میکے والے آئے ہیں اور یہ بات بھی اسے سوتے سے اُٹھا کے کہوں" غالب نے سرہلایا۔ "تا بھائی۔"

میں نے پھونک پھونک کر آگے قدم بڑھانے والوں پر نظر رکھی جو تاریکی میں سایوں کی طرح متحرک تھے "رابعہ کو بھی اُٹھا دینا۔ ہمارے پاس تین ریوالور ہیں۔ ایک رابعہ کو دے دینا۔ ایک اپنے پاس رکھ لینا۔"

"اور تیسرا؟"

"تیسرا نازو کے حوالے کر دے۔"

"اور آپ کیا ریفری ہوں گے اگر شوٹنگ کا مقابلہ ہوا؟"

"مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی" میں نے کہا "لازم ہے کہ ہم علامہ صاحب کے فرمودات نہ بھولیں۔"

غالب نے آگے جھک کر دیکھا "یہ کچھ قبل از مرگ واویلا نہیں ہے؟"

"بعد از مرگ ہم کیسے واویلا کریں گے؟"

"لیکن سر! کیا پتا یہ اپنے اکبرِ اعظم کے مہمان ہوں جو ہمارا بھی میزبان ہے۔"

میں نے کہا "مہمان ایسے نہیں آتے۔"

غالب تذبذب میں کھڑا رہا "کیا معلوم یہاں ایسے ہی آتے ہوں۔ ہر جگہ کا اور ہر گھر کا دستور الگ ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "یار! کیا میں جاؤں؟ مجھے ان لوگوں کی نیت ٹھیک نہیں لگتی۔ دال میں کچھ کالا ہے۔"

"رات بھی کالی ہے اور دال بھی، تو کالا کیسے نظر آسکتا ہے؟ خیر میں جاتا ہوں اس فتنۂ محشر کو جگانے" غالب بولا "مگر پھر عرض کردوں ایسا نہ ہو دو قسم کے مہمان کسی وجہ کے بغیر ایک دوسرے پر تلوار سونت لیں اور کشتوں کے پشتے لگانے کے بعد....."

اب خود مجھے جانا پڑا کیونکہ آنے والے ویسے بھی گھر میں داخل ہو چکے تھے۔ ہم دوسری منزل پر تھے اور وہ بہت چھپتے چھپاتے، درختوں کی اور جھاڑیوں کی آڑ لیتے نچلی منزل کے صدر دروازے تک پہنچے تھے۔ حیرت مجھے اس بات پر تھی کہ اکبر خان جیسے شخص نے کوٹھی کے دروازے پر کوئی گارڈ نہیں رکھا تھا۔ نہ وہ کسی باڈی گارڈ کو ساتھ لے کر پھرتا تھا۔ خطرہ ہو نہ ہو، درِ خاص پر اِستادہ مسلح پہرے دار، آدمی کے بڑے ہونے کی دلیل ہوتا ہے۔ بہت سے لوگوں کو دشمن بنائے بغیر..... ان کا حق یا مال و جان اور آبرو غصب کیے بغیر بڑا آدمی بننے کا دور بھی شاید اس صدی کے پہلے حصے میں ختم ہوا۔ دوسرے نصف حصے میں بڑا کہلانے کے لیے وہ

سب کرنا شان سمجھا جاتا ہے جو کبھی پُرانی کتابوں گلستاں بوستاں وغیرہ کے حوالوں سے غیر اخلاقی تسلیم کیا جاتا تھا۔

آدھی رات کے وقت اندھیرے میں تاریکی کا لباس پہن کر آنے والے تعداد میں چھ تھے۔ خود اکبر خان کے دھندے تھے مگر اس سے ملاقات کے لیے آنے والے کسی خوف یا ڈر کے بغیر روزِ روشن میں سینہ تانے، سر اُٹھائے آتے ہوں گے۔ زمانہ ہی گزر گیا جب چور ڈاکو چھپتے پھرتے تھے اور شرفا دن میں گلیوں میں سر اُٹھا کے چلتے تھے۔ اب معاملہ اس کے برعکس ہے۔ شرفا چھپتے ہیں اور پھر بھی مجرمانِ بستہ میں شامل ہو جاتے ہیں۔ کسی ذی اقتدار و ذی حشم سے پنگا لیں۔ اور بستہ ب کے مجرم ہا شرافت کی سند رکھتے ہیں۔

کھڑے کرنے والی آواز سُننے کی کوشش کی مگر کان بیٹھے رہے۔ ابھی تک سکوت طاری تھا۔

کیا آنے والوں نے یہاں قدم رنجہ فرمانے سے قبل ہی حفاظتی اقدامات کرلیے تھے۔ یہ بندوبست کرلیا تھا کہ دربان پی کر سو جائے اور ملازم گھوڑے بیچ کے سونے کی اداکاری کرتے رہیں، خواہ ان کو خوف کے مارے ہاتھ روم جانے کی حاجت محسوس ہو یا نمک حرامی کا خیال پسلیوں میں ٹھوکے دے رہا ہو۔ آدمی تو اتنا پُرانا نہیں مگر پُرانے وقتوں کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ تاریخ میں ایک دو بار ہی ایسا ہوا کہ کسی لشکر نے رشوت دے کر فصیلِ شہر کے دروازے کھلوائے۔ جعفر از بنگال و صادق از دکن نے غداری کے لیے رشوت لے کر تاریخ میں اپنا نام کالے حروف میں لکھوا لیا اور ننگِ دنیا، ننگِ دیں، ننگِ وطن کہلائے۔

لیکن پہلے رشوت دے کر عام آدمی سے ناجائز یا اس کے ضمیر کے خلاف کوئی کام نہیں کرایا جاسکتا تھا۔ جدید عہد میں مشینوں نے بہت سی مشکلات کو آسان بنا دیا ہے۔ مثلاً شہروں میں ناکام عاشقوں کے لیے مرگِ ناگہاں کو ٹریفک نے۔ ایسے ہی دھن نے غیر قانونی اور غیر اخلاقی کام کرانا بھی بہت آسان کر دیا ہے۔ نمک کا یا خون کا رشتہ اتنا اہم نہیں رہا جتنا سکۂ رائج الوقت۔

اکبر خان کے ملازموں کا ہوشیار نہ ہونا، مزاحمت نہ کرنا، گھر میں چوروں کی طرح داخل ہونے والوں کے عزائم سے بے خبر رہنا سمجھ میں آنے والی بات نہیں تھی۔ وہ لوگ آپس میں بھی بات نہیں کر رہے تھے اور خاموشی سے تو یوں لگتا تھا جیسے وہ نیچے باجماعت تہجد کی نماز پڑھنے کھڑے ہو گئے ہوں۔

غالب نے میرے کندھے کے قریب سرلا کے میرے کان میں کہا "ابھی تک کچھ نہیں ہوا؟"

عموماً یہ سوال میٹرنٹی ہوم کے باہر کھڑے ہوئے شوہر کرتے ہیں" میں نے کہا "کیا ہونا چاہیے "لڑکا کہ لڑکی؟"

مجھے علم نہیں تھا کہ میرے پیچھے نازو بھی ہے اور اس

"آپ تو خاصے تجربہ کار معلوم ہوتے ہیں" رابعہ ساتھ رابعہ بھی نے کہا۔

میں نے بوکھلا کے پیچھے دیکھا "دیکھو نا، ایسا ہوا نہیں مگر ہو گا تو سہی، میرا مطلب ہے ہر ایک کے ساتھ۔ عقد سے کس کو رستگاری ہے۔"

اسی وقت ایک ہلکا سا کھٹکا سُنائی دیا جیسے کسی نے کمرے کا دروازہ بند کرتے وقت احتیاط سے کام نہیں لیا۔

"یہ لوگ کیا تلاش کر رہے ہیں نیچے؟" نازو بولی۔

"ڈنمارک کا پنیر، نیوزی لینڈ کا مکھن اور باسی روٹی۔" غالب نے کہا "تم جا کے بتا دو نا کہاں رکھی ہے۔"

"تم مرد ہو۔ شرم کرو" نازو نے کہا۔

غالب بولا "شرم عورتوں کو زیادہ آتی ہے۔ میں عورت ہی ٹھیک ہوں۔ آج سے میرا نام غالبا۔ تم مرد بن کے جاؤ۔ ویسے بھی تمہارے ہی گھر والے ہیں۔ سب بھوت لگتے ہیں۔ یہ سکندر نے کہا تھا، میں نے نہیں۔"

میں نے کہا "اچھا اب اپنی منقار بند کرو تم دونوں۔"

نازو نے بُرا مان کے کہا "کیا بند کروں؟"

میں نے کہا "چونچ کو کہتے ہیں منقار۔ مطلب تھا سلیس اردو میں کہ اپنی بکواس بند کرو اور مرزا جی! تم جاؤ رابعہ کے ساتھ نیچے۔"

غالب نیچے چل پڑا۔ میں نے اسے روکا "۔ کیا ہے، جا تو رہا ہوں مرنے کے لیے۔ شاید اپنے سسر کا حوالہ دوں تو جان بچ جائے۔"

"یار! ایک طرف سے تم نیچے اُترنے کا راستہ دیکھو۔ پچھلی طرف سے کوئی صورت پیدا کرو نیچے اترنے کی" میں نے بھنا کے کہا "پھر دائیں بائیں سے الگ الگ گھوم کے جاؤ اور دیکھو نیچے کیا ہو رہا ہے۔"

"اور تم مزے سے یہاں کھڑے گیلری سے مار دھاڑ سے بھرپور فلم دیکھتے رہو گے" غالب بولا "یاران کی ہو گی، دہاڑ ہماری۔"

میں نے کہا "مجھے یقین ہے کہ ہمیں نیچے تلاش کرنے میں ناکام ہو کے وہ اوپر ہی آئیں گے۔ یہاں ہم ان کا استقبال کریں گے لیکن تم جا رہے ہو ناکہ بندی کے لیے۔ ان کو واپس جاتے وقت احساس ہو کہ عقلمندوں نے غلط نہیں کہا تھا۔"

"یہ کہ بکری کی ماں کب تک خیر منائے گی" غالب نے نازو کی طرف دیکھ کر کہا "ایک دن تو بکرا آئے گا مکھڑے پہ سہرا ڈالے۔"

"اُف! یار، تم سمجھتے کیوں نہیں کہ وقت کم ہے۔"

غالب نے رابعہ کا ہاتھ پکڑا اور کہا "چلو جی وکیل صاحب۔ ہم نیچے جا کے کسی اسٹور میں چھپ کے بیٹھ جاتے ہیں۔ وہ اب اوپر آئیں گے۔ نیچے کی تلاشی کا کام تو ختم ہوا۔"

نازو مسکرائی "مگر انہوں نے پوچھا کہ قربانی کا بکرا کہاں ہے تو میں بتا دوں گی۔"

غالب نے آہ بھری "ہاں۔ تمہیں تو بیوی بنے بغیر بیوہ ہونے کا شوق ہے" وہ نیچے جاتے جاتے پھر رک گیا "بھائی سکندر! ایک آخری بات۔"

"پوچھو، جلدی پوچھو۔" میں نے کہا۔

غالب بولا "وہ تم کیا بتا رہے تھے کہ عقل مندوں نے کیا کہا تھا؟"

"یہ کہ آنا اپنی مرضی سے ہوتا ہے اور جانا دوسرے کی مرضی سے۔"

"بالکل ٹھیک۔ میں بھی تمہاری مرضی سے جا رہا ہوں..... مرنے" وہ مجھے اور نازو کو ہنسی ضبط کرتا چھوڑ کے نکل گیا۔

ایک بار پھر نیچے سے دروازے کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی پھر کوئی دہشت زدہ ہو کے چلّایا مگر اس کی آواز دبا دی گئی۔

"اب تو کوئی شک نہیں رہا نا کہ یہ اکبر خان کے ملاقاتی نہیں ہیں؟ وہ گھر پر نہیں ہے، انہیں تو یہ بھی معلوم ہو گا۔"

نازو نے سرہلایا "پھر یہ کس سے ملنے آئے ہیں۔ ہم سے؟"

"ہمارے سوا کون ہے یہاں؟"

"ان کی ملاقات شامتِ اعمال یا فرشتۂ اجل سے بھی تو ہو سکتی ہے۔"

"یہ کون حتمی طور پر بتا سکتا ہے کہ آج کس کی اپائنٹ منٹ ہے فرشتۂ اجل سے" میں نے کہا "چلو اب پیچھے آجاؤ۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ وہ اوپر آنے ہی والے ہوں گے۔"

مجھے یقین تھا کہ اتنی بڑی عمارت کے کسی حصے میں کہیں کوئی ایسی کھڑکی ہو گی یا چھجا ہو گا جس پر قدم جما کے رابعہ اور غالب کے لیے گراؤنڈ فلور تک پہنچنا مشکل نہیں ہو گا۔ شاید انہیں کوئی رسی مل جائے ورنہ چادر پھاڑ کے رسی بنانے اور لٹک کے نیچے اُترنے کا پُرانا طریقہ بھی انہیں آتا ہے۔

میں نازو کے ساتھ راہداری میں کھڑا ہو گیا۔ ہمارے پیچھے آمنے سامنے کے دو کمروں کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ ایک غلطی یا عقلمندی غالب سے یہ سرزد ہوئی تھی کہ وہ انیکسی کی لائٹس جلتی چھوڑ آیا تھا۔ انیکسی یا مہمان خانے میں ہمارا قیام تھا۔ اس حصے کو چھوڑ کے کوٹھی کے اوپر والے حصے میں اندھیرا تھا۔

نازو نے سرگوشی میں کہا "سکندر! یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "یہ شریف لوگ نہیں ہو سکتے۔"

"میرا مطلب تھا کس کے دشمن؟"

"دیکھو یہ اکبر کے دشمن نہیں ہو سکتے۔ چالاک آدمی کے دشمن بھی چالاک ہوتے ہیں۔ بظاہر اپنی حفاظت کے خیال سے بے پروا نظر آنے والا اکبر خان بھی یہ بات جانتا ہو گا کہ اس کے دشمن

کون ہیں‘ ان کی طاقت کیا ہے اور وہ کب حملہ کرسکتے ہیں۔ ایسے ہی دشمنوں کو سب معلوم ہوگا کہ وہ کب کہاں ملتا ہے‘ کس وقت کہاں نہیں ملتا۔ اور اس پر ہاتھ ڈالنا جنگل کے بادشاہ کو زندہ پکڑنے سے کم مشکل اور خطرناک نہیں ہوتا۔ بادشاہ کا کیا پتا‘ کہاں مل جائے۔ غار میں ہو یا خود شکار کی تلاش میں نکلا ہوا ہو۔ یہ آئے ہیں ہمیں سبق سکھانے۔"

"اور ان استادوں کو بھیجنے والا ہیڈ ماسٹر کون ہوسکتا ہے۔"

میں نے کہا "چوہدری دلاور‘ استاد پیڈرو یا خلیفہ کیکر۔ میری چھٹی حس کہتی ہے کہ یہ کیکر ہیں‘ خلیفہ نے انہیں بھیجا ہوگا۔"

نازو بولی "میں سمجھ گئی۔ اس وقت تو اکبر خان کے سامنے وہ کچھ نہیں بگاڑ سکا تمہارا۔ اب بزدلوں کی طرح تم سے اپنے دستِ راست کے قتل کا بدلہ لینا چاہتا ہے۔ کتنے آدمی مارے تھے تم نے؟"

"نازو! اس کے لیے آدمی کیا ہیں؟ کیکر۔ ایک درخت گر گیا تو دوسرا بڑھ جائے گا" میں نے کہا "میری چھٹی حس مزید فرماتی ہے کہ یہ معاملہ مختلف ہے۔ یہ رابعہ کو لے جائیں گے۔"

نازو نے گھبرا کے کہا "کیا کہہ رہے ہو؟ رابعہ باجی....."

میں نے کہا "ہم لے جانے نہیں دیں گے‘ فکر مت کرو۔ دیکھو نا‘ ایک ہی تو رابعہ ہے دنیا میں۔ دوسری ہوتی کہیں تو ہم کہتے کہ لے جاؤ بھئی۔"

"یہ کیسا مذاق ہے! رابعہ نے ان کا کیا بگاڑا ہے؟"

"ان کا نہیں۔ خلیفہ کیکر کے خرمنِ عقل و ہوش کو رابعہ کے حُسن کی تجلی نے خاکستر کردیا تھا۔ یہ مَیں نے دیکھا تھا اس کی آنکھوں میں" میں نے کہا "ممکن ہے رابعہ نے بھی محسوس کیا ہو۔"

نازو آہستہ سے بولی "جب تم نے دیکھ لیا تھا تو رابعہ نے کیسے نہ محسوس کیا ہوگا۔"

"وہ تو اکبر خان پہنچ گیا مال کی ڈلیوری لینے ورنہ رات کو خلیفہ کیکر سوئم آنجہانی ہوجاتے۔ خلیفہ کیکر چہارم کی گدی پر مجھے یا غالب کو بیٹھنا پڑتا۔ ابھی پتا چل جائے گا کہ یہ کیکر ہیں تو....."

میری بات قدموں کی چاپ کے باعث ادھوری رہ گئی۔ میں نے زینے پر ایک گولا سا دیکھا۔ یہ ایک کالے کپڑے میں پھنسا ہوا سر تھا۔ سر کے نیچے کا حصہ رفتہ رفتہ طلوع ہوا۔ آنے والا خود اپنی آوازِ پا سے بھی ڈر رہا تھا یا حددرجہ محتاط تھا۔ اس کے پیچھے دوسرا تاریک سایہ نمودار ہوا۔ قالین کی وجہ سے ان کے چلنے سے کوئی آہٹ پیدا نہیں ہورہی‘ جو آہٹ میں نے سُنی تھی وہ غالباً کسی کے ٹھوکر کھانے یا ہاتھ ادھر ادھر لگ جانے کا نتیجہ تھی۔

میں اور نازو پیچھے ہوگئے اور کھلے دروازوں کی تاریک پناہ میں آنے والوں کا انتظار کرنے لگے۔ نازو کے ساتھ مجھے بہت سپورٹ تھی اور میں چھ مسلح افراد سے ذرا بھی خائف نہیں تھا۔ نہ مجھے نازو کی حفاظت کرنے کی فکر تھی اور نہ اسے ہدایات دینے کی ضرورت۔ مجھے یقین تھا کہ چار میں سے دو کا شکار تو وہ کرسکتی ہے۔ بعض اوقات اس کا اسکور بڑھ جاتا تھا کیونکہ کسی بھی محاذ پر حریف اس کی نسوانیت‘ نزاکت اور معصومیت کے دھوکے میں مجھ سے تو مقابلے کے لیے تیار ہوتا تھا مگر اس کے سامنے بے فکری سے مرنے چلا جاتا تھا اور بے خبری میں خودکشی کرلیتا تھا‘ جب وہ شبنم سمجھ کے شعلے کو چھولیتا تھا۔

ہراول دستے کے دو افراد جن کو پہلے فوت ہونا تھا‘ ایک ہی وقت میں دروازے کے سامنے سے گزرے اور تقریباً ایک ساتھ میں نے اور نازو نے انہیں یوں اندر کھینچ لیا جیسے کچے دھاگے سے بندھے آتے ہیں سرکار چلے۔ میرے قابو میں آنے والا خاصا گرانڈیل تھا مگر میں نے بائیں ہاتھ کو اس کی گردن کے گرد گھما کے شکنجہ بنالیا تھا۔ اس کے لیے سانس لینے کے دونوں راستے بند ہوگئے اور آواز نکالنے کے بھی۔ اس نے لاتیں چلائیں اور ہاتھ گھمائے مگر میں ان حالات میں ایک سیکنڈ بھی ضائع نہیں کرسکتا تھا۔ میں نے گھٹنا اس کی کمر پر رکھا اور دوسرے ہاتھ سے بال پکڑ کے اس کے سر کو پیچھے کی طرف ایک جھٹکا دیا تو آواز ایسے آئی جیسے کسی نے سوکھی ٹہنی توڑی ہو مگر یہ سوکھی ٹہنی نہیں‘ اس کی تروتازہ اور چربی چڑھی ہوئی گردن تھی جس کے اندر سے حرام مغز کی مین لائن اور نرخرہ گزر رہے تھے۔ حرام مغز ریڑھ کی ہڈی کے اندر سے پورے جسم کو کنٹرول کرتا ہے اور عملاً اسی میں آدمی کی جان ہے اور دماغ میں زندگی کے احساس کا وجود ہے جس کو ہم حواسِ خمسہ بھی کہتے ہیں۔ شاہراہ حیات کے منقطع ہوتے ہی جسم بے رُوح ہو کے گرا اور میں نے اسے مرنے کے لیے چھوڑ دیا۔ شاید ایسا ہی نازو نے بھی کیا ہوگا مگر غیر ارادی طور پر ہم سے ایک سی غلطی ہوگئی۔ میں نے اسے تڑپنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا اور اس نے مرتے مرتے لات مار کے ایک میز گرادی۔ وہ میز بھی کیا تھی‘ تین پایوں کا ایک لمبا سا اسٹول تھا جس پر پیتل کا گلدان یا ٹیبل لیمپ رکھا ہوا تھا۔ اندھیرے میں مجھے صاف تو نظر نہیں آیا مگر ان کے گرنے کی آوازیں سُن کے میں دہل گیا۔ مزید غضب یہ ہوا کہ میز گری تو میرے سر پر۔ غنیمت ہے کہ پیتل کا بھاری گلدان یا ٹیبل لیمپ نہیں گرا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا ہی تھا‘ مزید اندھیرا کیا چھاتا۔ مجھے روشن جگنو سے اُڑتے نظر آئے اور اس سے پہلے کہ جگنو غائب ہوتے‘ کسی نے لائٹ جلادی۔

میں نے دیوار کا سہارا لے کر خود کو سنبھالا اور چندھیائی ہوئی نظروں سے اپنے مقابل دو سیاہ پوش دیکھے۔ ان کے ہاتھوں میں ریوالور کی نالی کے اندر بھی مجھے اندھیرا نظر آیا۔

"سیدھا کھڑا ہوجا..." ان میں سے ایک نے غرا کے مجھے گالی دی۔

دوسرا سخت صدمے کی حالت میں تھا "اوئے اس... نے تو کیکر کو شہید کردیا۔"

میں نے زبردستی مسکرا کے کہا "تو میرا اندازہ ٹھیک تھا۔ تم سب کیکر ہو۔"

"ہاں ہم کیکر ہیں" پہلے نے دھمکی اور فخر کے ساتھ کہا۔

"اس کی صرف گردن ٹوٹی ہے۔" میں نے کہا "جوڑ کے پھر کھڑا کرلو۔ کسی کیکر کی پھونک نکل جائے تو خلیفہ جھاڑ پھونک کرلیتا ہوگا۔"

"بھونک مت کتے۔" دوسرے کیکر نے میرے ایک لات مار کے اپنا غم و غصہ ٹھنڈا کیا "حکم نہیں ہے ورنہ تیری بھی پھونک نکال دیتا میں۔"

"حرامی نہیں ہونا‘ والد ماجد کی سب عادتیں آگئی ہیں تم میں۔ وہ بھی ایسے ہی دولتی مارتے ہوں گے" میں نے کپڑے جھاڑ کے کہا۔

میرا مقصد وہی تھا۔ اسے مشتعل کرکے نفسیاتی طور پر کمزور کرنا اور پھر اس کی کمزوری کے کسی لمحے سے فائدہ اُٹھانا مگر اس کا ساتھی یقیناً کم جذباتی تھا۔

"وہ تیری ماں کہاں ہے؟"

میں نے کہا "اللہ انہیں غریقِ رحمت کرے۔ بہت عرصہ ہوا انتقال کو۔ آپ کی والدہ ماجدہ کا کوٹھا وہیں ہے اب بھی؟"

اس نے چیخ کے مجھے بہت سی ناقابلِ اشاعت گالیاں دیں "رابعہ کہاں ہے؟"

میں نے سوچ کے کہا "یہ تو میں نہیں بتا سکتا۔ سوری۔"

"تیرا تو باپ بھی بتائے گا... سوری دے..."

"ہاں۔ وہ شاید بتادیں۔ ان کی قبر کا علم استاد پیڈرو کو ہے" میں نے کہا۔

"مجھے غصہ مت دلا..... میں چھلنی کردوں گا۔"

"تمہیں حکم نہیں ہے اس لیے بس اپنی خیر مناؤ۔ ہم کسی للّو پنجو کا مال نہیں ہیں۔ اکبر خان نے بڑی قیمت ادا کرکے اٹھایا ہے ہمیں۔ اس کا مال ضائع کیا نا تم نے تو وہ سارے کیکروں کو ببول بنادے گا۔" میں نے کہا اور اس بات کی مزید تفصیلات سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ وہ خلیفہ سمیت کس کے ساتھ کیسا شرمناک سلوک کرے گا۔

وہ پھر بھی اشتعال کی حد میں رہا۔ اس نے دوسرے سے کہا "اوئے جا تو دیکھ‘ وہ گشتی یہیں کہیں ہوگی۔"

میں نے کہا "تم کو خلیفہ کیکر کی ہمشیرہ کے بارے میں نازیبا الفاظ استعمال کرنے سے ڈرنا چاہیے۔ وہ جا کے اپنے بھائی کو بتادے گی تو....."

اب اس نے مجھ پر ریوالور مارنے کی کوشش کی۔ غصے سے پاگل ہو کے وہ مجھ پر گولی بھی چلا سکتا تھا مگر اپنی کمزوری کا راز اس نے پہلے ہی افشا کردیا تھا کہ خلیفہ کیکر نے صرف رابعہ کو اُٹھا کر لانے کا حکم دیا تھا‘ باقی سب کو جان سے مارنے کا نہیں۔ شاید خلیفہ کیکر بھی اکبر خان کو برابر کی طاقت تسلیم کرتا تھا اور اس سے بگاڑ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ خدانخواستہ وہ اپنے شیطانی عزائم میں کامیاب ہوجاتے تو اکبر خان کی واپسی سے پہلے ہی رابعہ کو واپس پھینک جاتے اور بعد میں ہمارے لیے خود اسے کتّے کی موت مارنا لازمی ہوجاتا۔ اکبر خان کے سامنے تو وہ مکّار‘ منافق صاف انکار کردیتا کہ اغوا یا آبرو ریزی کے کسی واقعے سے اس کا کسی قسم کا بالواسطہ تعلق بھی تھا؟ کوئی کیکر ایسا کر ہی نہیں سکتا۔

میں جانتا تھا کہ غصے کو برداشت کرنے کی حد ضرور ہوتی ہے۔ کسی کی زیادہ تو کسی کی کم۔ جاہل‘ اجڈ اور بدمعاش جلد مشتعل ہوتا ہے۔ اپنے پیرو مرشد کی ممانعت آڑے نہ آتی تو وہ بہت پہلے ہی مجھے قتل کردیتا مگر میں اسے باتوں سے اس انتہا تک لے آیا جہاں حکم بھی اسے نہ روک سکا۔ اب اس کے پاس حکم عدولی کا بھی جواز تھا۔ میں نے براہِ راست روحانی باپ کو بڑی ذلت آمیز گالی دی تھی اور کوئی بھی عقیدت مند‘ باپ کو گالی برداشت کرسکتا ہے‘ پیر صاحب کو نہیں۔

مجھ پر حملہ کرنے سے قبل وہ اپنے ساتھی کو احکامات جاری کررہا تھا کہ رابعہ کو تلاش کرے اور وہ بھی روانگی کے لیے پلٹ چکا تھا چنانچہ مجھے بڑا اچھا موقع ملا۔ میں نے اس کی کلائی پر ہاتھ ڈال دیا اور ایک دم کلائی موڑ کے اسے پلٹتے ہی جھٹکا دیا تو وہ بلبلا کے خود اپنے زور میں اوپر اُچھلا۔ میں نے اڑنگی مار کے اسے گھمایا اور یوں دیوار پر دے مارا کہ وہ نیچے سے اوپر تک دیوار پر چھپکلی کی طرح چسپاں ہوگیا۔ اس کا سر‘ ناک اور دانت اس تصادم سے اتنے ہی متاثر ہوئے ہوں گے جتنے اس کے گوڈے گٹے۔ وہ الٹا پیچھے آیا تو میں نے پھر اسے ایک ہاتھ پر سنبھال لیا اور ایک پورا چکر دے کر دوسری دیوار پر پھینک دیا۔

"اٹھو کیکر کے نطفے۔ آؤ میں تمہیں رابعہ کا پتا بتاؤں" میں نے کہا اور اس کے خلیفہ کی شان میں ایک اور قصیدہ پڑھا۔ ریوالور تو اس کے ہاتھ سے پہلے ہی چھوٹ گیا تھا‘ اب تو ناک اور منہ سے خون پھوٹ رہا تھا۔ وہ آدھا ایک بیڈ پر اور آدھا نیچے لٹکا ہوا ہانپ رہا تھا اور اُٹھنے کی کوشش کررہا تھا۔

کیکر نمبر دو جو رابعہ کی جستجو میں روانہ ہوا تھا‘ نازو کے ہتھے چڑھ گیا۔ وہ اپنی کمین گاہ سے نکل کے میری مدد کرنے آرہی تھی لیکن روشنی دیکھ کے باہر ہی ٹھہر گئی تھی۔ دوسرا کیکر آگے بڑھا ہی تھا کہ پیچھے سے کیکر نمبر ایک کے ساتھ میری فائٹ شروع ہوگئی اور وہ رکا کہ اپنے ساتھی کے لیے کچھ کرے تو نازو نے اس کو باہر سے ٹکر مار کے آگے کردیا۔

جب مجھے فرصت ملی تو میں نے دیکھا کہ وہ نازو کو پیچھے سے دونوں ہاتھوں کی گرفت میں جکڑ کے خود نازو سے یوں چمٹا ہوا تھا کہ نازو نہ لات چلا سکتی تھی نہ ہاتھ لیکن نازو بہرحال نازو تھی۔ اس

نے ایک دم اس کے بازو پر دانت گاڑ دیے اور غالباً بوٹی اُتار لی۔ اس نے ایک چیخ ماری اور نازو کو گالی دی۔ دوسرے لمحے اس کی گالی بھی چیخ میں بدل گئی۔ نازو نے ایڑی پر گھوم کے اس کی گردن پر لات ماری اور وہ کھڑے کھڑے دھم سے فرش پر گر گیا۔ خود کو بچانے کے لیے اس نے دیکھے بغیر فائر کیے اور یہ اتفاق تھا یا ہماری خوش قسمتی کہ وہ نشانہ لینے میں ناکام رہا تھا۔ اس کی گولیاں چھت اور دیوار کے اوپر والے حصے میں پیوست ہو گئیں مگر فائرنگ کی آواز نے صورتِ حال بدل دی۔

مجھ سے پٹ کر لیٹا ہوا کیکر اسے گالیاں دینے لگا "حرامی دے پتر! کیا کہا تھا خلیفہ نے؟"

وہ کھڑا ہو گیا "اوئے میں کیا کروں؟ زنانی سے مار کھاتا رہوں! ریوالور لائے کیوں تھے ہم؟"

ان کے ریوالور ہم نے ٹھوکر مار کے بیڈ کے نیچے کر دیے تھے "چلو ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے ہو جاؤ" میں نے کہا۔

انہوں نے بادلِ ناخواستہ تعمیل کی۔ اسلحے سے محروم ہوتے ہی ان کی اکڑفوں بھی ختم ہو گئی تھی اور اب وہ سخت گھبراہٹ میں مبتلا تھے۔

"چلو اب ایک دوسرے کو تھپڑ مارو" میں نے کہا "پہلے تم شروع کرو۔ ہر تھپڑ کے ساتھ کہو، کیکر شاہ کی قسم، رابعہ میری بہن ہے۔"

ان کو سخت ذہنی جھٹکا لگا "ہرگز نہیں۔"

میں نے کہا "اچھا پھر میں جا رہا ہوں۔ تمہارے دو ساتھی ابھی اندر ہی ہیں، فائرنگ سُن کے آنے والے ہوں گے شاید۔"

نازو بولی "اگر اس قابل ہوئے۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا "ہاں۔ ہمارے بھی دو بندے ان کی خاطر تواضع کے لیے اسٹور میں تھے۔"

نازو بولی "لگتا ہے دو کیکر انہوں نے بھی گرا دیے۔"

میں نے کہا "میں دیکھتا ہوں جا کے، تم ان سے نمٹ لو۔"

نازو نے کہا "ہاں بھئی شیر جوانو، تم نے سُنا ہمارے خلیفہ جی نے کیا حکم دیا تھا؟ شروع ہو جاؤ۔"

انہوں نے پھر کہا "یہ نہیں ہو سکتا۔"

میں نے کہا "اوئے یہ اچھی بات ہوگی، ایک زنانی مار مار کے تم کو کھوتا بنا دے گی۔ پولیس میں رہی ہے، کھال بھی اُتار کے ہاتھ میں پکڑا دے گی اور مرچیں بھر دے گی۔"

وہ پھر بھی ٹس سے مس نہ ہوئے تو میں کمرے سے نکل گیا۔ مجھے اب یقین آنے لگا تھا کہ رابعہ اور غالب نے باقی دو کو بھی خاموشی سے خلاص کر دیا ہے ورنہ فائرنگ کی آواز پر وہ ضرور لپکتے کہ جنگ تو ادھر ہو رہی ہے۔ حیرت مجھے اس بات پر تھی کہ نہ غالب اور نہ رابعہ نے معلوم کرنے کی کوشش کی تھی کہ گولیاں کیسے چل گئیں اور کس نے چلائیں۔

میں نے زینے میں کھڑے ہو کے آواز دی "غالب!"

اندر کمرے میں ایک کیکر چلّانے لگا "ہائے ہائے میں مر گیا۔"

پھر دوسرے نے کہا "بچا لے کیکر شاہ۔ سدا جیوے کیکر شاہ او مینوں ماف کر ظالما۔"

لیکن ظالم حسینہ یعنی نازو ایسے معاف کرنے والی کہاں تھی۔ وہ ان کی خاطر خواہ تواضع میں مصروف تھی۔ میں نیچے اُتر گیا اور ہال سے گزر کے باہر نکلا۔ غالب اور رابعہ کا کہیں پتا نہ تھا۔ میں نے ایک چکر پیچھے کا لگایا تو مجھے پورچ میں کھڑی ہوئی گاڑی کے پیچھے ایک کیکر ملا جس کا سر تو سلامت تھا مگر وہ مر چکا تھا۔ خون اس کی ناک سے بہہ رہا تھا۔ یہ شاید کسی شدید اندرونی ضرب کا نتیجہ تھا۔

ایک اور کیکر مجھے پچھلی طرف پانی اوپر چڑھانے والی موٹر پر اوندھا پڑا نظر آیا۔ پانی کی موٹر کے تار ٹوٹنے سے کرنٹ اس کے جسم سے گزرا تھا اور وہ تھری فیز موٹر تھی۔ غالباً اسے چار سو چالیس وولٹ نے ہلاک کیا تھا۔ کرب و اذیت سے اس کا جسم اکڑ گیا تھا اور چہرہ مسخ ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھیں بھیانک طریقے پر حلقوں سے باہر آ رہی تھیں اور زبان باہر نکلی ہوئی تھی مگر دانتوں میں دب گئی تھی۔ کہتے ہیں زبان کا حلق سے نکل آنا ایک حیوانی جبلت ہے اور جسم کی آخری خاموش پکار جو وہ مدد کے لیے کرتا ہے۔ ذبح ہونے والے بکرے کی حالت بھی یہی ہوتی ہے اور پھانسی پانے والے انسان کی زبان بھی باہر آ جاتی ہے۔

باہر وہ گاڑی بھی موجود تھی جس میں سارے کیکر بھر کے آئے تھے اور میں نے اس جیپ اور ویگن ٹائپ کی گاڑی کے اندر بھی جھانک لیا تھا۔ اب اس میں کوئی نہیں تھا۔ یہ ان کی بے وقوفی تھی۔ انہیں کم سے کم ایک آدمی کو نیچے ہی چھوڑ کر جانا چاہیے تھا جو گاڑی کی حفاظت کرتا اور خطرہ ہوتا تو سگنل دے سکتا مگر یہ بے چارے سیدھے سادے مرید ٹائپ لوگ بدمعاش ضرور تھے مگر ویسے نہیں جیسے چوہدری دلاور یا اکبر خان جیسے لوگ رکھتے تھے۔ پیر لوگ کے مسائل ان کے حلقۂ اثر تک محدود رہتے ہیں اور کیکر شاہ کا نام بھی کوئی ملکی شہرت کا حامل نہیں تھا۔ وہ تو ایک صوبے کی سطح سے بھی نیچے کا ڈویژنل یا تحصیل کا پیر تھا۔ اس کے ماننے والے دس بیس یا سو پچاس میل کے دائرے میں تھے۔ آگے جہاں کسی دوسرے پیر کی روحانی عملداری کا علاقہ شروع ہوتا تھا، وہاں کیکر شاہ کے معتقدین نہیں ہوں گے۔ یہ بالکل ضلعی انتظامیہ جیسا سلسلہ تھا۔ تھانے کی حد، تحصیل دار کی حکومت، ڈپٹی کمشنر کی سلطنت اور کمشنر کی بادشاہت۔ گورنر وغیرہ تو ہوئے شہنشاہ۔

چنانچہ کیکر شاہ کو سو پچاس میل کے علاقے میں بسنے والے عقیدت مندوں کو راہِ راست پر رکھنے اور ان کے یقین کو تشکیک سے بچائے رکھنے اور ان کے دلوں میں کیکر شاہ کا احترام برقرار رکھنے اور شرپسند یا بدظن ہو کے دوسروں کے ایمان میں خلل ڈالنے والوں کی گوشمالی کے لیے اس قسم کے نمائشی بدمعاش کافی تھے جو حکم پر کسی بدباطن، بدخواہ کو ٹھوک بجا کے اس کے چولیں ڈھیلی کر دیں۔ خلیفہ محترم کی نظرِ کرم کسی پر ہو جاتی تو اس مرید کی چادر اور چار دیواری، عزتِ نفس اور اکڑفوں کا جنازہ نکال سکیں اور بفرضِ محال کوئی بالکل ہی "کافر" ہو جائے تو اس کا اپنا جنازہ بھی۔ لیکن بین الاقوامی سطح پر ہونے والے جرائم سے ناآشنا لوگ تھے اور ان کا کسی "مافیا" یا مافیا کے دشمنوں سے واسطہ نہیں پڑا تھا چنانچہ یہ ڈانگ سوٹے سے مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھنے والے لوگوں کو ریوالور جیسے اسلحے سے دہشت زدہ کر سکتے تھے۔

اکبر خان ذرا بلکہ خاصا اوپر کی سطح کا کسی حد تک بین الاقوامی مجرم تھا۔ حقیقی معنوں میں "مافیا" یا سنڈیکیٹ تو بہت بڑی تنظیم ہوتی ہے اور چوہدری دلاور یا اکبر خان کے ٹولے کا ان سے موازنہ کرنا اتنا ہی غلط ہوتا ہے جتنا ایم آر ایس کا پی ایل او (تنظیم آزادیٔ فلسطین) سے۔ پھر بھی اکبر خان کے پاس ملکی معیار کے جینوئن بدمعاش ہو سکتے تھے جو مشین گن سے دستی بم تک استعمال کر سکتے ہوں اور جن کے لیے ایک قتل کوئی خاص بات نہ ہو مگر وہ بطورِ خاص قتلِ عام کرنے کے بھی اہل ہوں۔

یہی وجہ تھی کہ وہ چھ کیکر جن کو یقین تھا کہ بہ آسانی ایک عورت کو اُٹھا لائیں گے۔ جیسے وہ پرائی بہو بیٹیوں کو اِدھر اُدھر سے لاتے تھے، آسانی سے پٹ گئے اور خلیفہ کیکر سوئم کی ہوس پر قربان ہو گئے۔ عقیدہ ایسی ہی چیز ہے جس میں عقل کو دخل نہیں ہوتا اور جذبات میں آدمی حرام موت بھی مرے تو ثواب سمجھ کے جان دیتا ہے۔

زندہ گرفتار ہونے والوں کے لیے بڑی ذلت تھی۔ ایک صدمہ تو انہیں زنانی سے مار کھانے کا تھا اور زنانی بھی کیسی جو کسی جٹی اور فلمی مٹیار کے مقابلے میں نصف بھی نہ تھی۔ ہاں دیکھنے میں سخت ہوشربا تھی مگر اس کی "ادائیں" اس سے زیادہ ہوش اُڑانے والی تھیں۔

غالب کو آوازیں دیتا میں پورے محل کا چکر لگا کے دوبارہ سامنے آ گیا۔ اب مجھے ان کی طرف سے فکر ہونے لگی تھی۔ کہیں وہ سچ مچ تو اسٹور میں چھپے نہیں بیٹھے مگر وہ مذاق کی بات تھی۔ نہ وہ اتنے بزدل تھے اور نہ ان دو کیکروں کا خاتمہ کوئی اور کر سکتا تھا جن کی لاشیں میں دیکھ چکا تھا۔

میں نے اندر جا کے ایک ایک کمرے کا دروازہ کھولا اور لائٹ جلا کے دیکھا۔ تین مختلف مقامات سے تین بے ہوش نوکر اور کچن میں سے ایک بے سدھ جوڑا دریافت ہوا۔ پولیس انہیں دیکھتی تو قابلِ اعتراض حالت میں قرار دیتی۔ غالباً وہ میاں بیوی تھے میں نے دروازہ بند کر کے لائٹ پھر بُجھا دی۔

تینوں بے ہوش نوکروں اور کچن کے جوڑے کو فوری طور پر میں اکیلا ہوش میں نہیں لا سکتا تھا اور ان کا طبی معائنہ کرنے سے پہلے ہی رابعہ اور غالب کو تلاش کرنا چاہتا تھا۔

میں واپس اوپر پہنچا تو کمرے میں دلچسپ مقابلہ جاری تھا۔ دونوں کیکر صرف انڈرویئر میں ملبوس ایک دوسرے کو تھپڑ مار رہے تھے اور وہی جملہ دُہرا رہے تھے جو میں نے انہیں بتایا تھا۔ ان کے چہرے احساسِ ذلت اور ہاتھ چوٹوں سے لال ہو رہے تھے۔ نازو جنگلی جانوروں کو سُدھانے والے ٹرینر کی طرح ان کے سر پر سوار تھی اور ان کی وحشیانہ سرکشی پہلے ہی ختم کر چکی تھی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟ پٹاخے جیسی آواز نہیں آ رہی ہے" نازو نے ڈانٹ کے کہا "ابھی سے ہاتھ ڈھیلے پڑ رہے ہیں۔"

مجھے دیکھتے ہی وہ دونوں ایک ساتھ فرش پر گرے اور میرے قدموں سے لپٹ کے دہاڑیں مار مار کے رونے لگے "باؤجی! ہمیں ماف کر دو۔ ہماری توبہ۔"

میں نے کہا "اچھا سیدھے کھڑے ہو جاؤ انسان کے بچوں کی طرح۔"

نازو نے کہا "ان کا کیا کرنا ہے؟"

میں نے کہا "انہیں مارو گولی۔"

نازو نے ریوالور اُٹھایا "ابھی لو۔ کہاں مارنی ہے؟ آر پار کرنی ہے یا......"

وہ چلّانے لگے حالانکہ نازو بالکل سیریس نہیں تھی۔

میں نے کہا "دو کیکر باہر گرے پڑے ہیں لیکن ہمارے بول نہیں ہیں۔ نہ مجھے غالب ملا اور نہ رابعہ۔"

غالب نے دوسری طرف کے کمرے سے چلّا کے کہا "ہم بول ہیں، کانٹا بن کے کھٹکتے ہیں تمہاری آنکھوں میں؟ رابعہ! کتنی بے عزتی ہو رہی ہے تمہاری۔ منہ پر یہ شخص تمہیں گلاب کا پھول اور موتیے کی کلی یا رات کی رانی وغیرہ کہتا ہو گا۔"

رابعہ سامنے آ گئی "تمہاری بے عزتی اب ہو گی۔ بتا دوں نازو کو تم کیا کہہ رہے تھے؟"

غالب نے گھبرا کے کہا "کیا غضب کرتی ہو۔ میں نے تو انڈرویئر بھی نہیں پہن رکھا۔"

مجھے پہلے غصہ آیا پھر ہنسی آ گئی "تم یہاں چُھپے بیٹھے تھے؟"

"چُھپنا کیا مطلب" غالب بولا "ہم تو آئے تھے فاتحہ پڑھنے گولی کی آواز پر۔ یہاں دوسرا ڈراما چل رہا تھا، ہم دیکھتے رہے۔"

"اور میں جھک مارتا رہا نیچے" میں نے کہا۔

"بھائی وہی مارو گے نا جو تمہارے نصیب میں ہے۔ یار، یہ بدصورتی کے نمونے ہٹاؤ میری نظروں کے سامنے سے" غالب بولا "تفتیش ہو گئی بہت۔"

میں نے دونوں ملزموں سے باتھ روم میں جا کے کپڑے پہننے کو کہا۔

"اور یہ جو کُشتوں کے پشتے لگا دیے ہیں ہم نے" رابعہ بولی "دو یہاں پڑے ہیں، دو نیچے۔"

میں نے کہا "غالب! انہیں گاڑی میں ڈال اور گاڑی کو کہیں

دور چھوڑ کے آجا۔ جن کو اٹھانا ہوگا اٹھالیں گے۔"

"مگر کیسے؟ گاڑی چھوڑ دوں گا تو خود کیا پیدل آؤں گا؟"

میں نے سوچ کے کہا "پورچ میں ایک کار تو ہے۔ اگر اسٹارٹ ہو جائے تو رابعہ کو ساتھ لے جا۔"

"انجن کو ہاٹ وائر تو کر لیتے ہیں ہم" غالب نے کہا۔

ہاٹ وائر کرنے کا مطلب ہوتا ہے چابی کے بغیر تار ملا کے گاڑی کو اسٹارٹ کرنا۔ میں نے کہا "ٹھیک ہے' تم جاؤ' کوشش کرو۔"

"یہ دو مردے بھی میں ڈھو کے لے جاؤں؟ نوسر' انہیں بلاؤ باتھ روم میں سے۔"

میں نے کہا "نہیں یار۔ انہیں معلوم نہیں ہونا چاہیے کچھ بھی۔ ان سے تو ہم کہیں گے کہ تمہارے دو ساتھی لاشیں لے کر چلے گئے۔"

"اور ان کا کیا کریں گے بعد میں؟"

"انہیں بطور سلطانی گواہ پیش کریں گے۔ پہلے اکبر خان کے سامنے پھر خلیفہ کیکر کے حضور۔"

"میں تو سمجھی تھی' انہیں پیڈرو نے بھیجا ہوگا" نازو بولی۔

"یہی تو خوبی ہے تمہاری کہ تم جو سمجھتی ہو وہ کوئی اور نہیں سمجھتا۔ بلکہ شاید تم خود بھی سمجھتی نہیں ہو' بول پڑتی ہو" غالب نے کہا۔

رابعہ بولی "آج صبح سودا کیا تھا خلیفہ نے۔ شام ہوتے ہی بے ایمانی آگئی اس کے دل میں۔"

"دل میں" غالب نے کہا "ہاں دل میں۔ دل ہی تو بے ایمان ہوتا ہے۔"

"کیا اسے اندازہ نہیں تھا کہ اکبر خان خاموش نہیں بیٹھے گا؟"

"ہم کب خاموش بیٹھنے والے تھے۔"

"وہ ہمیں خاموش کر کے لے جاتے۔" رابعہ بولی۔

غالب نے کہا "اگر ہم خاموش رہتے تو تمہیں لے جاتے۔"

"صرف مجھے کیوں؟"

"بس تم ہی اچھی لگی تھیں خلیفہ کیکر کو۔ کیوں کا کوئی سوال نہیں۔ دل جس پر آجائے وہی لیلیٰ' وہی محبوب و مطلوب۔"

"غالب کے بچے! کیا بولتے جا رہے ہو؟" رابعہ چلائی۔

"میں سچ بولتا جا رہا ہوں۔ تم ہی..."

میں نے کہا "اب چھوڑو یہ بات۔"

"لیکن... کیا یہ ٹھیک ہے؟" رابعہ کا رنگ لال ہو گیا۔

میں نے اقرار میں سر ہلایا "یہ کچھ ایسی ہی نیت لے کر آئے تھے جو اپنے انجام کو پہنچے... اب فکر کیسی۔"

"رابعہ کی فکر میں وزن ہے" غالب بولا "یاد کرو واقعہ کنگ رابرٹ بروس اور مکڑی کا۔ فرض کرلو خلیفہ ہے وہی رابرٹ بروس اور مکڑی ہے رابعہ۔ ٹرائی ٹرائی اگین۔"

"تمہارا مطلب ہے ایک ناکامی کے بعد وہ پھر کوشش کرے گا؟ ناممکن" میں نے کہا۔

"ارے یار! یہ نمرود ہوتے ہیں۔ خدائی کے دعوے رکھنے والے۔ نعوذ باللہ۔ ان کی مجروح انا اتنی آسانی سے شکست تسلیم نہیں کرتی۔ میرا مشورہ مانو تو خواتین کو یہاں سے رخصت کر دو۔"

میں نے کہا "خواتین کو ہی کیوں' ہم سب کیوں نہ رخصت ہو جائیں اسی وقت؟"

غالب بولا "مجھے ابھی اکبر سے معاملات طے کرنے ہیں اور تمہیں بھی..."

میں نے نازو اور رابعہ کی طرف دیکھا "صبح ہونے والی ہے۔ تم لوگ تیار ہو واپس لاہور جانے کے لیے؟"

"لاہور۔ اکیلے؟ ہم دونوں؟" رابعہ نے کہا۔

"ہم دونوں۔ اکیلے" غالب نے اس کی نقل اتاری "اکیلا ایک ہوتا ہے۔ دو مل کے گیارہ ہو جاتے ہیں۔"

نازو نے کہا "ہم جا سکتے ہیں مگر ایک شرط پر۔"

"تمہارے جانے سے پہلے میں ہاں کر دوں؟" غالب شرما کے بولا "اللہ کیسی باتیں کرتی ہیں آپ سب کے سامنے۔"

مجھے اور رابعہ کو بے اختیار ہنسی آگئی۔ نازو کا جھنجلاہٹ سے برا حال ہو گیا "بعد میں مت کہنا مجھے کچھ۔ پہلے خود بلاوجہ بولتے جاتے ہو۔ سوچے سمجھے بغیر" وہ بگڑ گئی۔

غالب نے معصومیت سے کہا "میں تو یہی سمجھا تھا۔ خفا کیوں ہوتی ہو۔"

نازو نے مجھ سے کہا "ہمارے جانے کے بعد آپ لوگ کوئی کارنامہ سرانجام نہیں دیں گے۔ کسی پھڈے میں نہیں پڑیں گے۔"

"ہم کچھ نہیں کرتے۔ بس کچھ ہو جاتا ہے خود بخود" غالب بولا۔

"تمہیں عادت ہے پنگا لینے کی" نازو نے کہا۔

"یہ ہم نے پنگا لیا تھا۔ تمہاری رابعہ باجی کو کیا ضرورت تھی خلیفہ کیکر کے من کو بھانے کی..."

"بدتمیزی مت کرو غالب" رابعہ نے خفگی سے کہا۔

"کیا غلط کہا ہے میں نے... تمہاری وجہ سے یہ سب ہوا۔"

"کیا میں نے جان بوجھ کے کچھ کیا تھا؟" رابعہ روہانسی ہو گئی۔

"میں کب تمہیں قصوروار کہہ رہا ہوں۔ قصور ہے تمہارے اس حسن کا جو پتا نہیں حسن ہے یا نہیں ہے۔ کیوں سکندر' یہ تو دیکھنے والے کی نظر میں ہوتا ہے غالباً۔"

"غالباً کے بچے" میں نے ہاتھ گھما کے اس کی کمر پر مارا "یہ ساتھ سب سے پنگا۔ اتنا ماریں گے ہم سب مل کے۔"

"مارنے کے بعد کہتے ہو ماریں گے" غالب نے کراہتے ہوئے کمر دہری کر کے ہائے ہائے شروع کی "نازو! میری ریڑھ کی ہڈی کے پتا نہیں کتنے مہرے ٹوٹ چکے ہیں۔ میری صوفیہ لارین۔ آج کے بعد میں تمہارا کبڑا عاشق کہلاؤں گا۔ ہنچ بیک آف اسلام آباد' عرف انتھونی کوئن میڈان پاکستان۔"

صورت حال کی سنگینی کے باوجود ہم سب کو اس کی اداکاری پر ہنسی آئی۔ خود نازو ہنسنے پر مجبور ہو گئی۔ اس زمانے میں صوفیہ لارین اور انتھونی کوئن کی شہکار فلم HUNCH BACK OF NOTREDAM کا بہت شہرہ تھا۔ اس میں صوفیہ لارین کا حسن و شباب الگ تہلکہ خیز تھا اور انتھونی کوئن کی لاجواب اداکاری کا کمال الگ۔

صبح کاذب کا اجالا افق پر نمودار ہونے لگا تھا جب مرزا غالب نے پورچ میں کھڑی ہوئی کار کا دروازہ کھولا۔ اس کے لیے گھر میں کوئی چابی دستیاب نہ تھی چنانچہ ایک اسٹیل وائر سے عقدہ کشائی ہوئی۔ بونٹ کھول کے اس نے سیٹ کے تاروں کو ملایا اور اندر سے کاربوریٹر کو ریس دی۔ دو کوششوں کے بعد انجن اسٹارٹ ہو گیا۔

پھر میں اور غالب باری باری دو لاشوں کو اوپر سے اُٹھا کے لائے۔ باقی دو مردے کوٹھی کے احاطے سے اٹھائے اور انہیں اس گاڑی کے پچھلے حصے میں ڈال دیا جس میں وہ بڑے طمطراق اور بدمعاشی کے زعم میں آئے تھے۔ یہ عجیب سی گاڑی مقامی ماہرین کی مشترکہ کوشش سے وجود میں آئی تھی جو انہوں نے کارسازوں کی محنت پر پانی پھیرنے کے لیے کی تھی۔ ولادت کے وقت یہ یقیناً نئے ماڈل کی بہت خوب صورت کار قرار دی گئی ہوگی۔ پرانی ہو جانے کے بعد اسے چھکڑا کہا گیا ہوگا۔ شاید کسی حادثے میں اس کی باڈی ناقابل مرمت ہو گئی تھی یا کسی نے ضرورت کے تحت اختراع کرتے ہوئے کار کے چیسس پر ٹرک بنانا چاہا ہوگا۔ نتیجے میں آدھا تیتر آدھا بٹیر حاصل ہوا تھا۔ سامنے سے یہ کار تھی' پیچھے سے ویگن جیسا ایک بدنما ڈبا جو منی ٹرک کے طور پر ایسے ہی مال کو ادھر سے ادھر لانے لے جانے میں کام آ رہا ہوگا جس کو دنیا کی نظر سے چھپانا ضروری ہو۔

"تم تو جاؤ سیدھی گھر۔" غالب نے ٹرک میں بیٹھ کے کہا "تم کو خدا کی امان میں دیا۔ جب تک میں نہ آؤں' نہار منہ مجھے یاد کرنا اور دن میں تین بار آٹھ آٹھ آنسو بہانا۔ رات کو کھانے کے بعد تارے گننا۔"

"تمہارے تجویز کردہ نسخے پر میں ساری عمر عمل کر سکتی ہوں بشرطیکہ تم کبھی لوٹ کر نہ آؤ" نازو نے ہنس کے گاڑی کو ریورس گیئر میں ڈال دیا۔ رابعہ نے مجھے ہاتھ ہلا کے خدا حافظ کہا۔

"کیسی کٹھور ناری عرف سنگدل حسینہ ہے" غالب شکوہ گیر لہجے میں بولا۔

میں نے اسے تسلی دی "سب اوپرے دل سے کہتی ہے۔ اب تم جاؤ اور اس مصیبت سے چھٹکارا پا کے فوراً آؤ۔ ذرا خیال رکھنا' کوئی دیکھ نہ لے۔"

غالب نے ٹرک کو اسٹارٹ کیا اور پیچھے لے جا کے موڑا پھر سیدھا گیٹ کی طرف گیا۔ میں کھلا گیٹ بند کرنے گیا تو میری نظریں باہر ایک مختصر سے کیبن پر گئیں۔ یقیناً یہ دربان کے لیے بنایا گیا تھا مگر دربان اس میں نہیں تھا۔ میں نے اندر باہر اسے تلاش کیا اور حیران ہو کے یہ سوچتا ہوا لوٹ آیا کہ کیا اکبر خان کا محافظ نمک خوار بھی سازشیوں کے ساتھ مل چکا تھا کہ وہ سیدھے اندر آ گئے یا اسے پہلے ہی ٹھکانے لگا دیا گیا تھا؟

احتیاطاً میں نے صدر دروازے کو بھی اندر سے مقفل کر دیا اور اندر آنے کے سب راستے چیک کیے۔ تمام کھڑکیوں میں گرل تھی اور دروازے پہلے ہی بند تھے۔ جب میں نے خواب غفلت کے مارے نوکروں کو ہوش میں لانے کی کارروائی شروع کی تو کچن میں موجود جوڑے کی آواز آ رہی تھی۔ مرد آہستہ آہستہ کچھ کہہ رہا تھا۔

انہیں بے ہوش کرنے والوں نے سر پر ڈنڈا مارنے کا دیسی طریقہ استعمال نہیں کیا تھا۔ وہ کلوروفارم لے کر آئے تھے جس کی خفیف سی بو اب بھی فضا میں تھی۔ یہ طریقہ ذرا سی بے احتیاطی سے مہلک بھی ثابت ہو سکتا تھا لیکن خاموشی کا ضامن تھا۔ حملہ آور اپنی آمد کو خفیہ رکھنے میں کامیاب ہو جاتے' اگر اتفاق سے میں اور غالب انہیں نہ دیکھتے۔ ہم دونوں کو نیند نہیں آ رہی تھی اس لیے ہم دونوں الو ٹیرس پر تشریف فرما تھے۔

نوکر نمبر ایک پانی کے چھینٹے پڑنے کے انتظار میں ہی تھا کہ فوراً اٹھ بیٹھا اور مجھے پہچاننے کی کوشش کرنے لگا۔

میں نے اسے ہلا کے کہا "کیا ہوا تھا تمہارے ساتھ؟"

اس نے سر کو گھڑے کی طرح ہلاتے ہوئے کہا "جھولے میں آرام سے بیٹھو۔ مجھے بھی گراؤ گے۔"

میں نے اسے زیادہ سختی سے جھنجوڑا تو وہ لیٹ گیا اور چھت کو دیکھنے لگا اور بولا "مجھے متلی ہو رہی ہے۔ کھٹی چیز کھانے کو بھی جی چاہتا ہے۔"

میں نے اس کے گالوں پر طمانچے مارتے ہوئے کہا "ہوش میں آجاؤ۔ تم عورت نہیں مرد ہو۔ نام کیا ہے تمہارا؟"

وہ پٹ پٹ آنکھیں جھپکانے لگا "مراد علی۔ ماں کہتی ہے نامراد۔"

اس کے ہوش و حواس کی مکمل بحالی کے لیے وقت درکار تھا یا اسے چائے کافی پلانے کی ضرورت تھی۔ میں نے اسے اپنے حال پر چھوڑ دینا مناسب سمجھا اور کچن کی طرف چلا گیا۔ میں نے دروازے پر دستک دی تو ایک دم عورت باہر نکلی اور منہ چھپا کے بھاگی۔ ابھی اس کی طاقت اس حد تک بحال نہیں ہوئی تھی کہ وہ ہرنی کی طرح قلانچیں بھرنے لگے۔ وہ لڑکھڑا کے گری۔ اس نے دوپٹے کے میلے پلو سے مجھے دیکھا اور پھر اٹھ کے آہستہ آہستہ چلتی ہوئی دروازے سے

نکل گئی۔

اب میں نے دروازے میں کھڑے ہوئے اس ہیرو کو دیکھا جس کا مدقوق سینہ بنیان سے نکلا ہوا تھا۔ پتلے پتلے کالے ہاتھ بنیان کے سوراخوں کو چھپانے کی ناکام کوشش میں مصروف تھے اور اس کی سوکھی' سیاہ ٹانگیں ڈنڈوں کی طرح نیکر کے غلاف میں سے نکلی ہوئی تھیں اور کانپ رہی تھیں۔ وہ جوان آدمی تھا مگر اس کی جوانی بھی بڑھاپے کی تہمت تھی۔

میں نے کہا "تم کون ہو؟"

"اپن.... اپن روسید روسوئیا۔ کھونا پوکاتا۔"

تھوڑی سی کوشش سے میں نے اس کے جملے کو سمجھ لیا "تم رشید رسوئیا ہو۔ کھانا پکاتے ہو۔ کچھ کھا بھی لیا کرو۔ یہ تمہاری بیوی کو کیا ہوا؟ ایسے کیوں بھاگ گئی؟"

"اپنا بیوی" وہ بوکھلا کے بولا "اچھا.... وہ.... ہاں وہ اپنا بیوی۔ ایک دم سورما تا۔"

میں نے اسے غور سے دیکھ کے کہا "الّو کے پٹھے۔ بکواس کرتا ہے مجھ سے۔ سچ بتا' کس کی بیوی تھی وہ؟ تیری یا کسی اور کی؟"

وہ ایک دم نیچے بیٹھ گیا۔ "شور کار! گولتی ہوا۔ ابھی ایک دم شوچ بولے گا۔ آپ مالک لوگ کو نئیں بولیں گا' نئیں تو وہ اپنا یہ چومڑی کا زوتا بنائے گا اور اپنا شور پر مارے گا۔"

مجھے ہنسی آگئی "تمہاری کالی چمڑی کے جوتے بنا کے تمہارے ہی سر پر مارے گا۔ اتنا ڈرتے ہو تو ایسے کام کیوں کرتے ہو؟ ٹھیک ہے' میں کسی کو بھی کچھ نہیں بتاؤں گا۔ تم یہ بتاؤ' رات کو کیا ہوا تھا؟"

اس کا رنگ اُڑ گیا "ہم کو نئیں مالوم۔ کوئی شالا لوگ اندر آیا' اپنا ناک منہ بند کیا۔ باپ رے' اپن سمجھا مر گیا۔"

اس نے نہ کچھ دیکھا تھا نہ اسے معلوم تھا کہ بعد میں دوسروں پر کیا گزری۔ اسے تو اپنے اسکینڈل کی فکر تھی کہ کس کس نے نہ جانے کیا دیکھا ہوگا۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ کم سے کم میں نے کچھ نہیں دیکھا۔ اسی وقت غالب نے دروازے کی گھنٹی بجائی۔ میں نے رشید سے کہا کہ وہ کافی بنا کے اوپر لے آئے اور خود دروازہ کھولنے گیا۔ ہم اوپر چلے گئے۔ غالب خاصا خوش نظر آرہا تھا۔ اس نے واپس آنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ وہ جوتوں سمیت بستر پر لیٹ گیا۔

میں نے کہا "کہاں چھوڑا وہ مردہ خانہ؟"

غالب ہنسا "ایک احاطے میں' کسی ٹھیکیدار کا یا کنسٹرکشن کمپنی کا ہوگا۔ بہت سی ناکارہ مشینری کے درمیان کھڑا کردیا۔"

"کوئی چوکیدار نہیں تھا؟"

"وہ سب بھاری مشینری تھی جو نہ جانے کب استعمال ہوئی ہوگی۔ شاید اسلام آباد کی تعمیر کے ابتدائی دور میں۔ وہاں سے کوئی کیا لے جائے گا؟ ممکن ہے یہی سوچ کے چوکیدار بھی آرام سے گھر میں سوتا ہو۔"

"لوگ تو اسکریپ بھی نہیں چھوڑتے۔"

"اچھا ہے وہ ٹرک بھی لے جائے کوئی" غالب بولا "واپسی پر ایک بندہ مل گیا' اس نے اسکوٹر پر لفٹ دے دی یہاں تک۔"

"بہت عقل مند ہیں آپ" میں نے کہا "کل اگر اخبار میں خبر آئی تو وہ ضرور سوچے گا کہ وہیں مرزا غالب ملے تھے اور ان کو میں نے اکبر خان کی کوٹھی کے دروازے پر اُتارا تھا۔"

"صرف سوچے گا نا' بولے گا نہیں" غالب نے کہا "کوئی نہیں پڑتا ایسے چکروں میں۔ اس کے علاوہ مجھ پر عقلمند ہونے کا الزام غلط ہے۔ میں کافی آگے آکے اسکوٹر پر سوار ہوا تھا اور اُتر گیا تھا سو گز پیچھے ہی۔"

"اچھا بھئی تم عقل مند نہیں ہو" میں نے کہا۔

"تم کیا مذاکرات کر رہے تھے اس بنگالی سے؟"

"تم جانتے ہو کہ وہ بنگالی ہے؟" میں نے حیرانی سے کہا "اپنا روسید روسوئیا کو زوگار رہا تھا۔ شالا ایک دم بوداس ہے۔"

میں نے اسے ہنستے ہنستے بتایا تھا کہ میں نے گھر میں تین نوکروں کو بے ہوش پڑا پایا تھا اور کچن میں کیا دیکھا تھا۔ "کچا چور تھا' فوراً پکڑا گیا اور فوراً مان گیا کہ وہ کسی اور کی بیوی تھی۔"

"اس کی اپنی کوئی نہیں ہوگی نا۔"

"ہو تب بھی کہتے ہیں کہ اپنا بچہ اور پرائی بیوی تو اچھے ہی لگتے ہیں اور وہ اس کے مقابلے میں بہرحال بہت اچھی تھی" میں نے کہا پھر اچانک مجھے اپنے اپنے دو زیرِ تفتیش حوالاتیوں کا خیال آیا۔ "یار مرزا جی قیدیوں کو چھوڑ دیں یا اکبر خان کے سامنے پیش کریں؟"

"وہی تو گواہی دیں گے ہمارے حق میں۔ خود بتائیں گے خلیفہ کیکر کی بدمعاشی کے بارے میں ورنہ ہمارے پاس کیا ثبوت ہوگا۔"

"ویسے تو اکبر خان ہمیں جھوٹا نہیں کہہ سکتا لیکن مجرم خود اس کے سامنے جرم کا اعتراف کرلیں' یہی بہتر ہے۔" میں نے کہا۔

صبح کا اجالا اب کھڑکیوں کے شیشوں پر دُھند سی بن کے اتر چکا تھا۔ رخصت ہوتے ہوتے موسم سرما اور آمدِ بہار کا اعلان کرتی اسلام آباد کی صبح میں بڑی مفرح خوشبو کی خنکی تھی۔ میں نے کھڑکی کھول دی اور خاموشی سے چہکنے والے پرندوں کی ملی جلی آوازیں سُننے لگا۔

اکبر خان کی لمبی سیاہ کیڈی لاک بڑی خاموشی سے گیٹ میں داخل ہوئی۔ ابھی ہیڈ لائٹس آف کرنے کا وقت نہیں ہوا تھا۔ سڑک پر سے گزرنے والی اِکّا دُکّا گاڑیوں کی روشنی کہیں کہیں درختوں کے پیچھے جھلملاتی نظر آرہی تھی۔ اندھیرا اتنا گہرا بھی نہیں تھا کہ کچھ دکھائی نہ دے مگر مجھے یوں لگا جیسے اکبر خان نے اپنی آمد کو خفیہ رکھنے کے لیے اندر آنے سے پہلے ہیڈ لائٹس بجھا دینا بہتر سمجھا تھا۔ اس کی کار کے انجن کی آواز صرف سرسراہٹ تھی۔ اس سے زیادہ شور تو سرخ بجری بچھے راستے پر ٹائر کر رہے تھے۔

میں نے اوپر سے ہاتھ ہلایا اور غالب سے کہا "اکبر اعظم آگیا چوروں کی طرح۔ پتا نہیں رات بھر کیا کرتا رہا۔"

"جھک مارتا رہا۔ آپ اتنے متفکر کیوں ہیں لوگوں کے بارے میں کہ وہ رات کو کیا کرتے ہیں؟ بھائی! رات کس لیے ہوئی ہے؟" غالب بولا۔

اسی وقت رشید کافی لے کر اندر آیا۔ میں نے کہا "رشید کو معلوم ہوگا۔"

رشید بوکھلا گیا "کیا شاب جی؟"

"رات کس لیے ہوتی ہے' انہیں بتاؤ۔" میں نے کہا۔

اس سے پہلے کہ بدحواس اور شرم سے زمین میں گڑ جانے کا خواہش مند رشید کچھ فرماتا' اکبر خان اندر آگیا۔ اگر وہ مجھے کھڑکی میں کھڑا دیکھ کے حیران ہوا تھا تو اس نے اپنی حیرت کا اظہار نہیں کیا۔

"صبح صبح کافی" وہ بولا "رشید! اور کچھ نہیں ہے کھانے کو؟"

میں نے کہا "ناشتا ہم بعد میں کریں گے۔ ہم تمہاری واپسی کا انتظار کر رہے تھے' اسی لیے جاگ رہے تھے۔"

"کیا رات بھر نہیں سوئے؟" اس نے میری اور غالب کی صورتوں پر غور کرکے کہا "ایسی کیا پریشانی تھی؟"

میں نے چلا کے کہا "اسی لیے بھاگ گئے تھے تم گھر سے؟ تمہیں معلوم تھا کہ یہاں کیا ہوگا۔"

غالب کے لیے بھی میرا یہ رویہ غیر متوقع تھا مگر اس نے میرا ساتھ دیا۔ "ان حالات میں تم پر کیسے اعتبار کیا جاسکتا ہے اکبر خان؟"

اس نے برہمی سے کہا "آخر کچھ بتاؤ مجھے بھی...."

میں نے کہا "ہمیں بتانے کی کیا ضرورت ہے؟ تم خود دیکھ لو اس باتھ روم میں۔"

وہ ایک دم اُٹھا اور باتھ روم تک گیا۔ دروازہ کھولتے ہی اس کا ہاتھ ہینڈل پر جما رہ گیا۔ اس نے پلٹ کے ہمیں دیکھا اور پھر دونوں ملزمان کو باری باری باہر کھینچ لیا۔ وہ رات بھر کے جاگے ہوئے اور تفتیش سے نیم جاں تھے۔ اکبر خان کے دھکے سے وہ ہمارے قریب آگرے۔

"کون ہو تم؟ جلدی بولو' نہیں تو...." اکبر خان دہاڑا۔

میں نے کہا "کیا واقعی تم انہیں نہیں جانتے اکبر خان؟ تمہارے تو خاصے مراسم ہیں خلیفہ کیکر سے۔"

غالب بولا "کاروباری بھی اور ذاتی بھی۔"

"ہاں ہیں مگر میں انہیں نہیں جانتا۔ اب یا تو تم بتادو یا پھر مجھے پوچھ لینے دو۔"

میں نے کہا "یہ کیکر ہیں۔ خلیفہ کیکر کے حکم پر رابعہ کو اغوا کرکے لے جانا چاہتے تھے۔"

"رابعہ کو.... کیوں؟" اکبر خان کا منہ کھلا رہ گیا۔

میں نے کہا "کتنی معصومیت ہے تمہارے سوال میں اکبر خان۔ کیا تم نے کسی کی خوب صورت عورت کو آج تک نہیں اُٹھوایا؟"

"نہیں" مشتعل ہو کے اس نے میز پر مکا مارا "اکبر خان کو کبھی ایسی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ کسی شریف عورت کے ساتھ میں نے زبردستی نہیں کی' جس نے جو قیمت مانگی وہ ادا کی میں نے۔"

"ایسی کوئی نہیں تھی جس نے عزت کی قیمت اپنی جان سے ادا کرنا منظور کرلیا ہو لیکن تمہاری لگائی ہوئی بولی نامنظور کردی ہو؟"

"ہاں۔ ہاں" وہ چلانے لگا "سب ہوتا ہے دنیا میں لیکن وہ بے غیرت شوہر' باپ اور بھائی بھی ہوتے ہیں جو خود قیمت وصول کرتے ہیں۔ اس عورت کی عزت کرتا ہوں میں جو برائے فروخت نہیں ہوتی۔ کسی بھی قیمت پر۔ پھر میرے گھر میں کس نے ہمت کی زبردستی داخل ہو کے میرے مہمانوں کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کی؟ بولو.... کے بچے۔"

اس نے ان دونوں کو مارنا شروع کردیا۔ وہ غصے میں پاگل ہو رہا تھا "اور کون تھا تمہارے ساتھ؟ ہمت کیسے ہوئی تمہاری اکبر خان کے گھر میں گھسنے کی؟ میں تمہارے خلیفہ کیکر کی...."

"یہ غلط کہتا ہے" ان میں سے ایک چلانے لگا۔

پھر دوسرے نے واویلا کیا "یہ بکواس کر رہا ہے' جھوٹ بول رہا ہے۔"

میں ان کی دیدہ دلیری اور دریدہ دہنی پر دم بخود رہ گیا۔ "میں جھوٹ بول رہا ہوں' بکواس کر رہا ہوں۔ اکبر خان! اپنے نوکروں کو بلاؤ۔ ان سے پوچھو۔"

اکبر خان ایک ایک کو آواز دینے لگا۔ سب سے پہلے رشید آیا اور اس نے تھر تھر کانپتے ہوئے بتایا کہ کس طرح وہ کچن میں سو رہا تھا جب اچانک دو آدمی اندر آئے جن کے منہ اور سر پر کالے نقاب تھے اور انہوں نے اس کا منہ دبا کے ناک پر رومال رکھ دیا۔ اس میں کوئی دوا تھی جس کی بو سے وہ بے ہوش ہوگیا۔ اسے نہیں معلوم کہ بعد میں کیا ہوا۔

وہ ملتجی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "اپن کو یہ شاب جول دیا۔"

"میں نے کیا جل دیا ہے تجھے؟" میں نے بگڑ کے کہا۔

"جل۔ پانی شاب" وہ عاجزی سے بولا "جول ڈالا آپ تو اپن کو ہوس آیا۔ ایشا مالک دیکھا آپ کہ نئیں؟ اپن ادھر ایشا موروا کا جیشا لیٹا تھا۔ اکیلا' ایک دم اکیلا۔"

"بالکل۔ تم بالکل اکیلے لیٹے ہوئے تھے۔" میں نے کہا

"مردے کی طرح۔ باقی لوگ کہاں ہیں؟ انہیں بھی بلاؤ۔"

میرے بیان سے اس کی جان میں جان آئی "آتا ہے شاب۔ ان کو سو کر آتا ہے۔ ہم ابھی شائے دیا۔"

"شوگر آتا ہے!" غالب بولا "کیا مطلب' ذیابیطس ہے؟"

"چکر آتا ہے" میں نے کہا "پتا نہیں یہ سین کی جگہ شین اور شین کو سین بولنا کیوں ضروری سمجھتے ہیں۔"

باقی ملازمین حاضر ہوئے تو لرزتے کانپتے ہوئے انہوں نے بھی رشید کے بیان کی تائید کی۔ انہیں سوتے میں بے ہوش کردیا گیا تھا کچھ سنگھا کر۔

"چوکیدار کہاں تھا؟ اسے بلاؤ۔"

میں نے کہا "چوکیدار! میں نے تو کوئی چوکیدار نہیں دیکھا ان کے جانے کے بعد بھی۔ ممکن ہے چوکیدار کو بھی ٹھکانے لگا کے اندر آئے ہوں۔"

"ہوں۔ وہ کتنے آدمی تھے؟"

میں نے کہا "چھ۔ دو پکڑے گئے' چار فرار ہوگئے۔"

ملزمان نے پھر احتجاج کیا "یہ غلط ہے۔ جھوٹ ہے۔"

غصے کی وہ لہر جس نے اکبر خان کو پاگل کردیا تھا' گزر چکی تھی اور اب وہ کافی پیتے ہوئے کچھ سوچ رہا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ کیکر موقعے سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے بیان بدلنا چاہتے ہیں۔ جھوٹ اور سچ دونوں کو اپنے حق میں' اپنی بے گناہی اور ہمارا ظلم و جبر ثابت کرنے کے لیے استعمال کرکے اکبر خان کو ہمارے خلاف کرنا چاہتے ہیں۔

لیکن اکبر خان اب ان کی سُننے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس نے ایک دم ریوالور نکال لیا۔ میں نے جھپٹ کے اس کا ہاتھ نہ پکڑا ہوتا تو وہ ان دونوں کو وہیں شوٹ کردیتا۔ "میرے سامنے بھونکتے ہو کتے۔ میرا نام اکبر خان ہے اکبر خان' خلیفہ کیکر نہیں" اس نے خلیفہ کیکر کی شان میں ایک اور قصیدہ پڑھا۔

"اکبر خان! یہی تو اصل گواہ ہیں ہمارے پاس۔ ان کو مار دیا تو اُلٹے ہم مجرم ہوجائیں گے۔" میں نے کہا۔

اس نے ایک لمبی گہری سانس لی "ٹھیک کہتے ہو تم۔ یہ بتاؤ وہ تو خیریت سے ہیں نا؟"

"رابعہ اور نازو؟" میں نے کہا "وہ تو..... نہیں ہیں۔"

"نہیں ہیں۔ کیا مطلب؟" وہ چونکا "کہیں ... کہیں خدانخواستہ....."

میں نے کہا "نہیں اکبر خان۔ ایسا ہوتا تو ہم تمہیں زندہ ملتے۔ وہ ہماری لاشوں پر سے گزرے بغیر ان کو کیسے لے جاسکتے تھے۔ وہ چلی گئیں۔"

"ان کا جانا ہی بہتر تھا" غالب بولا۔

"کہاں چلی گئیں؟ کیسے؟"

"لاہور چلی گئیں۔ تمہاری دوسری گاڑی میں" غالب بولا

"اس کی چابی نہیں تھی ہمارے پاس۔ میں نے ڈائریکٹ اگنیشن سے اسٹارٹ کرکے دی تھی۔ گاڑی واپس پہنچ جائے گی تمہارے پاس۔"

اس نے ہاتھ کے اشارے سے کہا "دفع کرو گاڑی کو۔ اور چلو تم بھی شکل گم کرو۔ ان خنزیروں کو نیچے بند کرو۔ اگر یہ بھاگ گئے تو میں کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا" وہ نوکروں سے مخاطب ہوکے بولا۔

"اللہ نے بہت خیر کیا۔ اب تم مجھے شروع سے بتاؤ کہ معاملہ کیا ہے۔ خلیفہ کیکر نے ایسی گندی کوشش کیوں کی آخر؟"

میں نے کہا "ہوس میں اندھا ہوکے آدمی ایسا ہی کرتا ہے میں تو اس کی نظر کو تاڑ گیا تھا لیکن مجھے اس سے یہ اُمید نہیں تھی۔"

"میں نمٹ لوں گا اس..... سے" اکبر خان گالی دے کر بولا۔

"نہیں اکبر خان۔ جن کی عزت کا معاملہ ہو' یہ انہی کا حق ہے۔"

"بالکل ٹھیک۔ تم میرے مہمان تھے۔ سوال میری عزت اور غیرت کا ہے۔ لعنت اس پٹھان پر جو مہمان کی حفاظت نہ کرسکے۔ ابھی میں رات بھر جاگا ہوں۔ ایک ضروری کام سے گیا تھا۔ تھوڑی دیر آرام کروں گا پھر ناشتا ایک ساتھ کریں گے۔ تم بھی نہا دھولو۔ تم چاہو تو سیر کرکے آؤ یا اخبار دیکھو۔ شوق ہے تو نیچے گانے والے سنو" وہ اٹھا اور کمرے سے نکل گیا۔

میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا تو سورج طلوع ہورہا تھا۔ سبزے پر شبنم کے قطرے موتیوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے' نئے کھلے ہوئے پھولوں پر اٹکے ہوئے تھے اور بہار کے شگوفوں پر چمک رہے تھے۔ پس منظر میں مری کے پہاڑوں کی سرمئی لکیر واضح ہوگئی تھی۔ میں اور غالب دامن کوہ میں آباد پاکستان کے اس نئے' حسن قدرت سے مالا مال اور انتہائی سرسبز و شاداب شہر کی سڑک پر چہل قدمی کرنے نکل آئے۔

"اب مجھے یقین آنے لگا ہے کہ ہم کسی کی قید میں نہیں ہیں" میں نے سڑک کے کنارے خود رو پودوں کے خوش رنگ پھولوں کو مسرت سے دیکھا۔

"قیدی آزاد کرائے ہیں اکبر خان کی دولت نے" غالب بولا

"اور انہیں سونے کی زنجیر پہنادی ہے۔"

"کس نے کہا ہے تم سے کہ یہ زنجیر پہنو؟"

"یہ خواہشوں اور خوابوں کی زنجیر ہے۔ یہ میرے تمہارے' ہم سب کے خواب ہیں جو اب تعبیر مانگتے ہیں۔" غالب نے کہا۔

"کیا ان خوابوں کو تعبیر بھی اکبر خان جیسے لوگ دیں گے؟" میں نے افسوس سے کہا "اور اس کے بدلے وہ ہم سے کیا لے گا۔"

"یار! ایسا تو ہوتا ہی ہے۔ دنیا کچھ لو اور کچھ دو کے اصول پر

چل رہی ہے۔ یہ بزنس ہے۔ اکبر خان ہمارے مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ بنے گا تو اس کا بھی یقیناً کوئی مقصد ہوگا۔"

"اس کا مقصد میں جانتا ہوں۔ وہ استاد پیڈرو اور چوہدری دلاور جیسے لوگوں کے خلاف ہماری مدد اس لیے کرنا چاہتا ہے کہ اس کے مفادات پر آنچ نہ آئے۔ وہ اپنے لیے ایک حفاظتی فصیل چاہتا ہے اور اخبار کے مالک کی حیثیت سے وہ حکومت کا چوتھا ستون بن جائے گا جسے خود حکومت نہیں گرا سکتی۔ تم جس قسم کی صحافت کرنا چاہتے ہو مرزا جی' اس کی گنجائش اکبر خان کے خیالی منصوبے میں نہیں ہوگی۔ وہ پریس کو خریدنا چاہتا ہے۔"

غالب نے سوچ کے کہا "ایک اخبار تو پریس نہیں ہوتا۔"

"صحافت کے معیار پر ایک ہی ہوتا ہے۔ تم کیا کروگے؟ جس کا کھاؤ گے اسی کے گن گاؤ گے؟" میں نے کہا "ابھی تو اس نے کچھ نہیں کہا بلکہ جو کہا ہے وہ تمہیں بہت اچھا لگا ہے مگر یہ مت بھولو کہ وہ ذرا مختلف قسم کا شکاری ہے۔ جب تم اس کے جال میں پھنس جاؤ گے تو پھر شاید نکل نہیں پاؤ گے۔ آہستہ آہستہ اس کے اغراض و مقاصد کی نوعیت تم پر واضح ہونے لگے گی اور اس وقت تم اختلاف کروگے تو وہ دودھ میں پڑی ہوئی مکھی کی طرح نکال پھینکے گا۔ ایک بہت بڑے اخبار کے لیے وہ کسی بھی ایڈیٹر کو خرید لے گا جو اس کے مفادات کا تحفظ کرے۔ اور اسے اپنے مطلب کا آدمی آسانی سے مل جائے گا۔ ابھی اس کے پاس دولت کی طاقت ہے۔ کل جب وہ ایک بہت بڑے اخبار کا مالک بن چکا ہوگا۔ تمہاری محنت سے۔ تو اس کی طاقت اتنی بڑھ چکی ہوگی کہ تم جیسے اس کی مٹھی میں ہوں گے۔ پھر کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکے گا اس کا۔"

"یہ بالکل ٹھیک کہا تم نے۔ کل ایسا ہی ہو شاید لیکن میں تو آج کی فکر کررہا ہوں" غالب نے کہا "آج ایم آر ایس کو طاقت حاصل ہورہی ہے چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کے خلاف۔ پہلے ان سے نمٹ لیں۔ اس وقت تک یہ کھیل ایسے ہی چلے گا۔ اکبر خان اس خوش فہمی میں رہے گا کہ اس نے ہمیں خرید لیا اور اب ہم اس کی مرضی کے مطابق چلنے کے پابند ہوگئے۔ کل جب وہ کاروبار یا سیاست کی دکان چمکانے کے لیے صحافت کا سہارا لے گا تو ہم اس کے ساتھ ہوں گے۔ مگر ایسا نہیں ہوگا دوست۔ اسے سوچنے دو کہ ایسا ہوگا۔"

"یعنی ہم اسے مطلب براری کے لیے استعمال کریں گے اور جب مطلب نکل جائے گا تو چھوڑ دیں گے؟"

"وہ بھی تو یہی کررہا ہے۔ ہمیں اپنے مطلب کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے" غالب نے کہا "گارنٹی کوئی نہیں۔ وہ کسی وقت بھی ہماری چھٹی کرسکتا ہے اور ہم بھی جب چاہیں اسے خدا حافظ کہہ سکتے ہیں۔ اس میں اعتماد یا اصول کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ جیسے کو تیسا والی بات ہے۔ ہر ایک اپنا اُلّو سیدھا کرنا چاہتا ہے اور اگر ہم معاشرے کو دلاور جیسے لوگوں کے اصل چہرے دکھاتے ہیں یا ان کے عزائم کی اصل حقیقت سے خبردار کرتے ہیں' ان کے مجرمانہ ماضی سے پردہ اُٹھاتے ہیں اور پیڈرو یا حاجی عبداللہ کی بدکرداری کا کچا چٹھا بیان کرتے ہیں تو یہ خدمتِ خلق ہے۔ ہم جان پر کھیل کے اور تمام خطرات مول لے کے ایسا کریں گے مگر اکبر خان خدمتِ خلق نہیں کرنا چاہتا اور اسے کوئی خطرہ نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ وہ تو خود ایک خطرہ ہے اس معاشرے کے لیے' ان نسلوں کے لیے جو اسکولوں اور کالجوں میں پروان چڑھ رہی ہیں اور آنے والے وقت کی امین ہیں۔"

"میں قائل ہونے لگا ہوں تمہاری لفاظی سے۔"

"یہ لفاظی نہیں' حقیقت بیانی کا کمال ہے" غالب نے آداب بجالا کے کہا۔

سامنے سے ایک ہاکر تیز تیز پیڈل مارتا گزرا تو میں نے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ اس کی اتنی رفتار تھی اور بریک اتنے کمزور کہ رکتے رکتے بھی وہ سو گز کے قریب آگے چلا گیا۔ پھر اس نے ہینڈل کو سرکس کے بازی گروں کی طرح ایک پاؤں زمین پر ٹکا کے موڑا اور ہمارے پاس آکے اس نے پھر جوتے سڑک پر گھستے ہوئے بریک لگائے۔

میں نے کہا "ایک اخبار انگریزی کا اور ایک اردو کا۔"

وہ کچھ حیران ہوا "کون سا دوں جناب؟ سنڈے ایڈیشن ہے۔"

"اچھا۔ یہ سنڈے ایڈیشن یہاں اتوار کو شائع ہوتا ہے۔ کمال ہے۔" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "یاد ہے جب ہم لندن میں تھے تو گڈ فرائیڈے بھی ہمیشہ جمعے کو پڑتا تھا۔ خیر ایک اچھی تصویروں والا دے دو۔"

"ایک اچھی خبروں والا" غالب نے میری تائید کی۔

اس نے دو اخبار لپیٹ کر مجھے پکڑائے۔ اب مسئلہ ادائیگی کا آیا۔ میں نے غالب سے اور غالب نے مجھ سے کہا مگر پیسے ہم دونوں ہی لے کر نہیں نکلے تھے۔

اخبار والے لڑکے نے پریشانی سے کہا "جلدی کریں سر۔ مجھے اخبار بھی ڈالنا ہے۔ ذرا دیر ہوجائے تو باتیں سُننی پڑتی ہیں۔"

میں نے کہا "سوری یار۔ کیا یہ ہوسکتا ہے کہ واپسی پر یا کل اِدھر سے گزرتے ہوئے تم پیسے اکبر خان کے گھر سے لے لو؟ ہم وہیں مقیم ہیں۔"

"وہاں تو میں اخبار ڈال چکا ہوں۔" وہ بولا۔

"چلو کوئی بات نہیں۔ ہم آج دوبار پڑھ لیں گے" غالب بولا "ایک بات بتاؤ۔ یہ جو تم پاؤں زمین پر لگا کے جوتے گھستے ہو' بریک لگانے کے لیے' تو کیا بریک ٹھیک کرانے میں زیادہ خرچہ آتا ہے؟ سال میں کتنے جوتے یوں گھس کے ختم کرتے ہو؟"

اب اس کی نظر مجھ پر تھی "سر' آپ یہاں تو نہیں رہتے۔"

"اچھا۔ پھر کہاں رہتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"یہاں رہنے والوں کو میں جانتا ہوں اور آپ کی صورت میں نے دیکھی ضرور ہے کہیں مگر اکبر خان کی کوٹھی میں نہیں۔ اسلام آباد میں بھی نہیں۔ چھوٹا سا شہر ہے یہ تو ابھی" وہ کچھ دیر پہلے کی بات بھول چکا تھا کہ اسے اخبار ڈالنے میں دیر ہو رہی ہے "پھر کہاں دیکھا ہے؟"

"کل تک سوچ لینا۔"

اسے ایک دم یاد آگیا "آپ...... آپ کی تصویر تو اخبار میں شائع ہوتی تھی۔ بالکل ٹھیک۔ میں روز دیکھتا تھا۔ سکندر بخت نام ہے آپ کا۔"

اس کا حافظہ اور مشاہدہ بالکل ٹھیک تھا بلکہ عام لوگوں کے مقابلے میں اس اعتبار سے بہتر تھا کہ سب لوگ باقاعدگی سے اخبار نہیں دیکھتے اور اتنے بہت سے اخبارات نہیں دیکھتے۔ اس کی نظر سے ہر روز کئی اخبار گزرتے ہوں گے۔ اس کا زیادہ باخبر ہونا ایک فطری بات تھی۔

میں نے انجان بن کے کہا "سکندر بخت! وہ کون ہے؟"

اس نے سائیکل کو اسٹینڈ پر کھڑا کیا اور بڑے جوش کے ساتھ مجھ سے مصافحہ کیا "آپ مجھے دھوکا نہیں دے سکتے سر، جو کچھ آپ کرتے رہے، میں باقاعدگی سے پڑھتا تھا۔ مجھے بہت شوق تھا آپ سے ملنے کا۔ بہت عظیم آدمی ہیں آپ۔ سب پاکستانی آپ جیسے ہوتے تو ہم کب کا کشمیر فتح کر چکے ہوتے۔ سارے مسلمان آپ جیسے ہوتے تو اسرائیل کیا چیز ہے، روس امریکا فتح کر لیتے ہم۔"

میں نے کہا "فرض کرو، فتح کر لیتے، اس کے بعد کیا ہوتا؟ ہم ان ممالک کا بھی وہی حشر کرتے جو پاکستان کا کیا۔ بنایا تو ہم نے بڑے جذبے کے ساتھ تھا۔"

اس نے کہا "آپ اکبر خان کے مہمان ہیں؟ عجیب بات ہے!"

"کیا عجیب بات ہے اس میں؟" میں نے کہا۔

"مطلب یہ کہ کہاں اکبر اعظم، کہاں سکندر اعظم۔ ان کے درمیان کوئی دو ہزار سال کا فرق ہے۔" غالب نے کہا۔

"اکبر خان اور طرح کا آدمی ہے۔" وہ بولا "آپ کے اور اس کے درمیان... خیر۔"

میں نے کہا "سنو بیٹے! تم جذباتی ہو بہت۔ سڑک پر اس قسم کی گفتگو نہیں کرنی چاہیے۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔"

"یہاں کوئی دیوار نہیں ہے" غالب نے کہا "فرض کرلو، درختوں کے بھی کان ہوتے ہیں۔"

"اگر تم نے مجھے پہچان لیا ہے تو اس کا اعلان کرنے میں ہمارے لیے خطرہ ہے اور جو کچھ تم اکبر خان کے بارے میں کہہ رہے ہو، اس میں تمہارے لیے خطرہ ہے۔" میں نے کہا "اب سارا دن ڈھول مت پیٹتے رہنا کہ آج میری ملاقات سکندر بخت سے ہوئی اور وہ اکبر خان کی کوٹھی میں ٹھہرا ہوا ہے۔"

"میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں سر۔"

"ہر شخص سمجھتا ہے کہ وہ اتنا بے وقوف نہیں ہے جتنا وہ ہوتا ہے" غالب نے ایک فلسفیانہ نکتہ پیدا کیا "تم یہاں کے حالات پر گہری نظر رکھتے ہو۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ یہ جو کچھ فاصلے پر احاطہ سا نظر آرہا ہے، اس میں یہ بھاری مشینری کب سے پڑی ہے اور کیوں؟"

"وہ" اس نے انگلی سے اشارہ کیا "ایک بلڈنگ کنٹریکٹر تھا جو یہاں سڑکیں اور پل بنا رہا تھا۔ پتا نہیں کہاں چلا گیا۔ کوئی کہتا ہے کروڑوں کا غبن کرکے فرار ہوگیا بیوی بچوں کے ساتھ... لیکن...."

"تم کیا کہتے ہو؟" میں نے اسے غور سے دیکھا۔

"کچھ نہیں جی، میں چلتا ہوں" اس نے سائیکل اٹھائی۔

میں نے سائیکل کے پیڈل پر ہاتھ رکھ دیا "اخبار والے ہو کے حقیقت کو چھپا رہے ہو۔"

"میں کہاں سے اخبار والا ہوگیا جی۔ میں تو اخبار بیچتا ہوں اور اس سے اپنی ٹیوشن فیس ادا کرتا ہوں۔ شام کو ٹیوشن پڑھاتا ہوں تو گھر کا خرچ چلتا ہے۔ ایک معمولی ہاکر ہوں میں۔ شوق بہت تھا رپورٹر بننے کا مگر نصیب میں دھکے کھانے لکھے ہیں۔ بی اے کرلوں گا اس سال تو کلرکی بھی نہیں ملے گی۔"

"رپورٹر بھی تو دھکے ہی کھاتے ہیں" غالب بولا "لیکن ہر کام کے لیے ایک وقت ہوتا ہے۔ تم رپورٹر بنو گے ایک دن بلکہ بہت جلد۔"

"لیکن ابھی تو تم ایک رپورٹ کو گول کر گئے...." میں نے کہا "ہم یہ کیسے فرض کرلیں کہ تم میں ہمت ہے صحافی بننے کی؟ کوئی چانس دیا جا سکتا ہے تم کو بشرطیکہ تم خود کو اس کا اہل ثابت کرو۔ ہم ایک اخبار نکالنے والے ہیں۔"

اس کا چہرہ چمک اٹھا "آپ دلوائیں گے مجھے چانس؟ اچھا جی میں پھر آؤں گا۔ بہت سی باتیں بتاؤں گا۔ ابھی تو مجھے دیر ہو رہی ہے۔"

وہ چلا گیا تو ہم بھی واپس ہوئے۔ اس احاطے میں جہاں غالب نے چار کیکروں کی لاشیں چھوڑی تھیں ابھی تک کوئی ہلچل نہیں تھی۔ فوری طور پر اس کا امکان بھی کم تھا۔ اس جگہ کا والی وارث کوئی نہیں تھا جو رپورٹ کرتا کہ کسی نے ایک ٹرک جیسی گاڑی میرے احاطے میں کھڑی کردی ہے۔ چار مردہ لاشوں کے ساتھ۔ اس کا پتا تو تب چلے گا جب لاشیں سڑنے لگیں گی اور بو پہلے گدھوں اور مردار خوروں کو متوجہ کرے گی پھر ان کے بھائی بند پولیس والوں کو۔

ہمیں گھر سے نکلے ہوئے ایک گھنٹا ہونے والا تھا۔ سورج اب پہاڑیوں کی اوٹ سے جھانکنے لگا تھا اور نباتات سے ایک خوش گوار مہک آمیز خوشبو کے بخارات اٹھنے لگے تھے۔

"آپ کو کیا پریشانی لاحق تھی آخر؟" میں نے کہا "اس احاطے میں پرانی مشینری پڑی ہے یا ہیرے جواہرات؟ صبح سے اب تک اپنے خلاف دوسرا گواہ پیدا کرلیا ہے تم نے ایک گھنٹے میں۔"

"واقعی۔ یہ شرح پیدائش بہت زیادہ ہے۔"

"تم بھول نہیں سکتے اس بات کو۔ بیشتر مجرم اسی طرح پکڑے جاتے ہیں کہ وہ جائے واردات پر دوبارہ جاتے ہیں۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ سب ٹھیک ہے۔"

"ہو بڑا کچھ زیادہ ہی باخبر تھا۔ کیا خیال ہے اس کو لیٹر آف اپائنٹمنٹ دے دوں؟" غالب نے کہا "اس نے مزید سنسنی خیز انکشافات کا وعدہ کیا ہے۔"

میں چلتے چلتے انگریزی اخبار کے پہلے اور آخری صفحے کی سرخیاں دیکھتا جا رہا تھا۔ اچانک میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا اور میرے قدم خود بخود رک گئے۔ پچھلے صفحے پر ایک چھوٹی سی خبر کے ساتھ ایک انچ کی تصویر نظر آرہی تھی۔ یہ خانہ خراب کے مدیر اعلیٰ عاجز صاحب تھے۔

"مرزا جی! افسوس، کسی نے عاجز صاحب کا خانہ خراب کردیا" میں نے خبر پڑھتے ہوئے کہا "ان کی لاش پشاور سی این سی روڈ پر ایک اخبار فروش نے شناخت کی۔"

غالب نے فوراً اردو اخبار کے صفحات پر نظر ڈالی "اس میں تو یہ خبر نہیں ہے۔"

"انگریزی اخبار کے رپورٹر کو پہلے مل گئی ہوگی۔ آخری کاپی پریس میں جانے سے پہلے" میں نے کہا۔

"اسے تو ہم خلیفہ کیکر کے پاس چھوڑ کے آئے تھے۔ لاش پشاور میں ملی ہے۔"

میں نے کہا "لاش کہیں بھی مل سکتی تھی۔ یا کہیں نہ ملتی۔ یہ تو جیتے جاگتے انسان کو لاش بنانے والوں کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ لاش سے کیا کام لینا چاہتے ہیں۔ شاید وہ سب جن کو عاجز نے عاجز کر رکھا تھا، دنیا میں اس جیسے دوسرے سرپھروں کو بتانا چاہتے ہوں گے کہ دوسروں کا خانہ خراب کرنے والے کا بھی ایک دن خانہ خراب ہوتا ہے۔"

غالب نے سہلایا "یا شاید عاجز صاحب کی موت میں ہمارے لیے کوئی وارننگ ہے۔ چوہدری دلاور کی طرف سے۔"

ہمارا میزبان ہماری طویل غیر حاضری سے پریشان تھا "بہت لمبے نکل گئے آپ لوگ۔ بہت دیر سے ناشتا لگا ہوا ہے۔ بھوک سے برا حال تھا میرا۔ یہ کیا، اور اخبار خرید لائے تم۔"

"ہاں بس ایسے ہی اخبار والا سامنے آگیا تھا" میں نے کہا۔

"وہ اخبار دے کے گیا ہوگا یہاں۔"

میں نے انگریزی اخبار کو پلٹ کر اس کے سامنے کردیا "یہ دیکھو اکبر خان۔ کل تک یہ شخص بھی زندہ تھا۔"

اس نے اخبار لے لیا "اوئیں۔ یہ تو وہی ہے جو تمہارے ساتھ آیا تھا۔"

"اسے خلیفہ نے روک لیا تھا" اکبر خان نے سہلایا "چلو جلدی سے ناشتا کرلو پھر ہم چلتے ہیں۔"

"کہاں چلتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"خلیفہ کے پاس۔ وہ بتائے گا کہ یہ سب کیا ہے، کیوں مروایا ہے اس نے تمہارے ساتھی اخبار والے کو اور کیا مقصد تھا میرے گھر پر چڑھائی کرنے کا۔ اسے ایک موقع ضرور دوں گا میں کہ وضاحت کرے۔"

"اور وضاحت نہ کرسکا وہ، اس نے وضاحت سے انکار کردیا یا تم وضاحت سے مطمئن نہ ہوئے پھر؟"

"پھر دیکھیں گے۔ کچھ کریں گے" اس نے مسکرانے کی کوشش کی "چلو ابھی تو ناشتا کرو۔"

میں نے کہا "اس خبر نے میری بھوک ختم کردی ہے۔"

"اتنا جذباتی اور حساس نہیں ہونا چاہیے آدمی کو۔ فکر کرنے سے الگ صحت خراب ہوتی ہے۔ آدمی کھانا پینا بھی چھوڑ دے تو کسی اور کا نہیں اپنا نقصان کرتا ہے۔ پیٹ خالی ہو تو دماغ بھی ٹھیک کام نہیں کرتا۔"

ہم اس کے اصرار سے مجبور ہوگئے۔ ناشتا کرتے ہوئے میں نے کہا "ہم ادھر ادھر کے معاملات میں ملوث نہیں ہوسکتے۔"

"ہماری وہ سختی سے تاکید کرگئی تھیں" غالب نے کسی زن مرید کی طرح منمنا کے کہا۔

"کیا کہہ گئی تھیں؟" اکبر خان مسکرانے لگا۔

"یہی.... کہ کسی سے پنگا مت لینا۔"

میں نے کہا "پہلے تم اچانک پہنچ گئے تھے ورنہ وہ ہمارے ساتھ نہ جانے کیا کرتا۔ اب وہ پوری طرح منتظر ہوگا، پوری تیاری کے ساتھ۔ میرا خیال ہے کہ اس طرح اپنی حفاظت کا بندوبست کیے بغیر ہمارا خلیفہ کے ہاں جانا خطرے سے خالی نہیں۔"

"میں کسی حفاظتی انتظامات کے بغیر کہیں نہیں جاتا۔ اور ایسے تو خلیفہ کے خلاف کچھ بھی نہیں کیا جاسکتا۔ مریدوں کا اور عقیدت مندوں کا اژدہام ہوگا اس وقت۔ ہم صرف بات کرسکتے ہیں، اس کا ردعمل دیکھنے کے بعد سوچیں گے کہ کیا کرنا چاہیے۔ صرف جانا اور آنا ہے۔ دوپہر کا کھانا ہم واپس آکے کھائیں گے۔"

"ہم تین ہوں گے اور وہ خلیفہ کے مجرم اور...."

"اور بھی بہت سے لوگ ہوں گے۔ وہ سامنے نہیں آئیں گے اور ساتھ بھی نہیں جائیں گے" اکبر خان بولا "انہیں روانہ کردیا ہے میں نے۔ وہ اندر باہر، راستے میں اور واپسی پر ہماری حفاظت کے ذمے دار ہیں۔ وہ ہم سے پہلے وہاں پہنچ کے عقیدت مندوں کے ہجوم میں شامل ہوجائیں گے۔"

اکبر خان کی بات نے مجھے مطمئن کردیا۔ رابعہ اور ناز کی تشویش غلط نہیں تھی کہ ہم بعد میں کچھ نہ کچھ ضرور کریں گے لیکن

عاجز صاحب کے قتل کی خبر پڑھ کے میں بھی خلیفہ کیکر سے ملنا چاہتا تھا اور اس پر واضح کرنا چاہتا تھا کہ رابعہ کے اغوا کی کوشش کوئی قابلِ معافی جرم نہیں تھا اور عاجز صاحب کی موت کے بعد اس کے خلاف ایک اور سنگین الزام ہے۔ وہ اپنی بے گناہی ثابت کرے ورنہ سزا کے لیے تیار رہے۔ ایسی دھمکی ہم مناسب حفاظتی انتظامات کے بغیر نہیں دے سکتے تھے اور میری خواہش تھی کہ میں اس کو کسی بلند مرتبہ، واجب الاحترام روحانی شخصیت کے مقام سے نیچے ایک اخلاقی و قانونی مجرم کی سطح پر لا کے ذلیل کروں۔

جب ہم اکبر خان کی سیاہ کیڈلاک میں روانہ ہوئے تو اکبر خان نے مجھے اشاروں سے بہت کچھ سمجھا دیا۔ اس کی کوٹھی کے سامنے سے گزرنے والی سڑک کے اگلے موڑ پر ایک سفید فاکس ویگن کھڑی تھی۔ پچھلے موڑ پر ایک جیپ تھی۔ ہماری گاڑی کے گیٹ سے نکلتے ہی فاکس ویگن بھی چل پڑی اور جیپ بھی حرکت میں آگئی۔

گاڑی کی اگلی سیٹ پر اکبر خان کا باڈی گارڈ خطرناک قسم کی خودکار مشین گن کے ساتھ مستعد بیٹھا تھا۔ اکبر خان نے مجھے بتایا کہ اس کے پاس ممنوعہ بور کے اسلحے کا لائسنس ہے جو اسے خصوصی طور پر گورنر کے حکم پر جاری کیا گیا تھا۔

دونوں قیدیوں کو منہ بند کر کے اور ہاتھ پاؤں باندھ کے لمبی چوڑی گاڑی کی ڈکی میں ڈال دیا گیا تھا۔ پچھلی سیٹ پر میں اور غالب بھی مسلح تھے۔ اسلام آباد سے حسن ابدال اور کیمبل پور تک میں نے کئی بار دیکھا تو سفید فاکس ویگن مجھے آگے اور جیپ پیچھے نظر آتی رہی۔ اٹک کا پل پار کرنے کے بعد میں نے انہیں نہیں دیکھا مگر اکبر خان نے مجھے یقین دلایا کہ وہ ہمارے ساتھ ہی ہیں۔ اٹک کا پل پار کرتے ہوئے مجھے صرف فاکس ویگن کی ایک جھلک نظر آئی لیکن ہم پیر کیکر شاہ کی خانقاہ پر پہنچے تو نہ ہمارے آگے کوئی گاڑی تھی اور نہ پیچھے۔

اکبر خان کی حیثیت وہاں ایک وی آئی پی کی تھی۔ گزشتہ روز کی طرح بیرونی دروازوں پر سادہ لوح عقیدت مندوں کو لوٹنے والے دیگ لیے بیٹھے تھے اور خلیفہ کی روحانیت کا خراج وصول کر رہے تھے۔ مجھے اور غالب کو انہوں نے چونک کے ناگواری سے دیکھا اور ایک دوسرے سے نظروں ہی نظروں میں سوال کیا کہ یہ دونوں وہی نہیں ہیں جو ہمارے بڑے بڑے کیکر گرا کے کل بھی صاف نکل گئے تھے۔ ان کی اتنی جرأت کہ پھر یہاں آگئے۔

لیکن ہم اکبر خان کے ساتھ تھے اور ان سب کو معلوم تھا کہ اکبر خان کا راستہ کوئی نہیں روک سکتا۔ میں نے صحن سے گزرتے ہوئے اس انبوہ پر نظر کی جو اپنی اپنی حسرتوں اور محرومیوں کی تصویر، یاس بنے منتظر تھے کہ خلیفہ کیکر ان کا نذرانہ قبول کر لے اور خصوصی نظرِ کرم سے ان کی تقدیر کی ساری خرابی پلک جھپکتے میں دور ہو جائے۔ یہ ضعیف الاعتقادی صدیوں کا اثاثہ تھی جس نے بالآخر بے یقینی کی صورت اختیار کر لی تھی اور ان کا ان منفی رویوں کے تضادات کا مجموعہ بن کے رہ گیا تھا۔ کاتبِ تقدیر کو قادرِ مطلق مانتے تھے، تسلیم کرتے تھے کہ اس کا لکھا اٹل ہے اور زندگی اور موت کی طرح کامیابی اور ناکامی، خوشی اور مہد سے لحد تک عمر کے ہر لمحے کو کسی کام کے لیے لکھا جا چکا ہے لیکن دوسری طرف یہ بھی سمجھتے تھے کہ ایک شعبدہ باز اور بزعمِ خود پہنچے ہوئے پیر کے اختیار میں ہے کہ وہ کے نوشتۂ تقدیر میں اس کی خواہش کے مطابق ترمیم کر دے جہاں رنج تھا وہاں خوشی لکھ دے، جہاں بیٹی تھی وہاں بیٹا لکھ دے، جہاں موت تھی وہاں زندگی لکھ دے۔ وہ اس بات کی حقیقت پر غور ہی نہیں کرتے تھے کہ دنیا و عقبیٰ میں جو کچھ ہے، آدمی کی کوشش کا ثمر ہے، کسی کی سفارش کا نہیں۔ اکبر خان کی گاڑی الگ ایسی جگہ پر کھڑی تھی جہاں صرف بڑے لوگ ہی اندر تک شاہانہ سواریاں لا سکتے تھے۔ اس کا باڈی گارڈ گن مین کار کے قریب موجود رہا۔ وہ نہ ہوتا تب بھی کوئی ڈکی کے قریب پھٹکنے کی جرأت نہ کرتا۔

لوگوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے میں نے راستے میں ایک طرف مردوں کو اکڑوں بیٹھے دیکھا۔ ان میں بچے، بوڑھے جوان سب ہی شامل تھے۔ ان کے میلے کپڑے، میلے بدن اور کے نیل سے مسخ چہرے سختیِ ایام اور ذہنی و جسمانی ناآسودگی کی تصویر تھے۔ مفلسی کا عذاب ایک دردِ مشترک تھا جو بیشتر لوگوں کے ارادوں اور حوصلوں کو شکست دے چکا تھا اور غالباً ان سب کی خواہشوں اور خوابوں کی تعبیر ایک ہی دعا کا مستجاب ہونا تھا۔ مدفون خزانے کا سراغ، کوئی چھپن کروڑ کی چوتھائی کی لاٹری یا کم کم پرائز بانڈ کا انعام، کوئی پارس پتھر کہ جسے وہ چھوئیں سونا ہو جائے پٹواری کی نوکری مل جائے۔ باقی مرضِ اموات سے شفا مانگتے تھے یہ چاہتے تھے کہ ان کے دشمن سب نیست و نابود ہو جائیں۔

عورتیں دوسری طرف بالکل اسی انداز میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ غالباً یہ اس بارگاہ عالی میں حضوری کے آداب تھے کہ کوئی لے کر اندر نہیں آ سکتا تھا۔ آلتی پالتی مار کے بے فکری سے بیٹھنا منع تھا۔ ایسی بے فکری ہے میاں تو یہاں کیوں آئے ہو، جاؤ کرو۔ ہنسنا مسکرانا ممنوع تھا۔ بدبختو۔ اب بھی اپنی تقدیر پر رونے کے بجائے ہنستے ہو۔ سائل بن کے بیٹھو، محتاج نظر آؤ۔ باادب باملاحظہ، ہوشیار رہو۔ نگاہ نیچے، سر گھٹنوں میں۔

اس طرح بیٹھنا ان عورتوں کے لیے خاص طور پر مشکل تھا آخری ایام میں یہ عرضِ تمنا کرنے آئی تھیں کہ پیر صاحب اس تو نظرِ کرم سے تولد ہونے والے کی جنس بدل ڈالیں۔ آخر کب ایسا نہ ہوگا۔ جب تک ان کا مجازی خدا ناک چوٹی کاٹ کے گھر سے نہیں نکال دے گا کہ حرام زادی، جنے جا رہی ہے بیٹیاں جو ساتھ لاتی ہیں جہیز کی فہرست۔ کل کھیتوں میں کام تیرا باپ کرے

...تو لے جائیں گے جنوائی۔ جن کے بیٹے ہیں... کیسے دبئی اور مکے مدینے سے بوریاں بھر کے ریال بھیج رہے ہیں... بیٹا بہت بڑا ہوتا ہے۔ عورت اپنی مرضی سے بیٹا جننے کا اختیار مانگتی ہے۔ اسے یقین ہے کہ آنے والی سوکن یہ کام اپنی مرضی سے کر سکتی ہوگی جبھی تو گھر والا اس کے چکر میں ہے۔ خدائی انتظام خلگ دتر ہے۔ خداوندا خدائی دردِ سر ہے۔

چنانچہ حضرت علیؓ نے کہا کہ میں نے اپنے رب کو اپنے ارادوں کی شکست سے پہچانا۔

ہماری آمد کی اطلاع یقیناً اندر پہنچ گئی تھی لیکن خلافِ توقع حجرۂ خاص کا دروازہ کھول کے کوئی ہمارے استقبال کے لیے نہیں آیا۔ وہاں کھڑے ہوئے کیکر نے ایک شانِ استغنا سے کہا "حضوری میں حوائج خاص حائل ہیں۔"

میں مسکرائے بنا نہ رہ سکا۔ اکبر خان مجھے دیکھ کر مسکرایا "ہم کچھ دیر انتظار کر سکتے ہیں۔"

بے علم مریدوں اور عقیدت مندوں کے لیے اس بھاری بھرکم جملے کے مفہوم کی پُراسراریت کو سمجھنا مشکل تھا جو ان کی عقل کو چکر دینے کے لیے وضع کیا گیا تھا۔ سیدھی بات یہ تھی کہ وہ طعام فرما رہے ہیں یا باتھ روم میں یا شغلِ جام و مینا میں مصروف ہیں یا بیڈ روم کی خلوت میں۔ گوشت پوست کے بنے ہوئے، دانۂ گندم کھانے والے گنہگار ابنِ آدم کی حاجات میں تخصیص کیا مگر سادہ دل، سادہ لوح اور سادہ فلسفۂ حیات رکھنے والوں کے نزدیک شاید اس مرصع جملے کا مفہوم کچھ اور تھا جو ان کی سمجھ میں خود نہیں آسکتا تھا۔ چنانچہ انہیں سمجھایا گیا تھا کہ ان پر الہامی کیفیت طاری ہے۔ ساعتِ کشف ہے۔ وہ عالمِ ارواح میں ہیں۔ شاہِ جنات کے ساتھ مجاہدے میں مصروف ہیں یا (نعوذ باللہ) پیامبر فرشتوں سے ہمکلام ہیں۔ اصل بات اس وقت یہ تھی کہ ہماری آمد نے خلیفہ کو ہنگامی صورتِ حال سے دوچار کر دیا تھا اور وہ اپنے خاص خاص کیکروں کو الرٹ کر رہا تھا۔

میں نے ایک نظر مردوں، عورتوں کے ہجوم پر ڈالی "کیا یہ سارا دن ایسے ہی اکڑوں بیٹھے رہیں گے؟ مٹی دھول میں اور دھوپ میں۔"

کیکر نے مجھے گھور کے کہا "اور کیا ایرانی قالین بچھوائے جائیں ان کے لیے جس پر یہ استراحت فرمائیں؟ یا صوفے لگوائے جائیں؟"

"خاصا مشکل کام ہے یوں انتظار کرنا..." غالب بولا۔

"حاجت مند کو عرضِ مدعا کے لیے نفس کی آزمائش کے مرحلوں سے تو گزرنا پڑتا ہے۔ حاجت روا خود اس کے پاس چل کے نہیں جاتا" وہ بولا۔

"اچھا جملہ ہے" میں نے کہا "میری لغت میں حاجت روا صرف خدا کی ذات ہو سکتی ہے۔ تم شاید یہ کہہ رہے ہو کہ خلیفہ کیکر تو ان کے گھر جانے سے رہے۔ حضرت عمرؓ تو رات کو گندم کی بوری ڈھو کے ایک بیوہ کے گھر لے گئے تھے جس کے بچے بھوکے تھے۔ وہ خلیفہ تھے مگر رعایا سے خود کو کمتر سمجھتے تھے۔"

اکبر خان نے ناگواری سے مجھے دیکھا "اس سے بحث مت کرو۔"

میں نے کہا "بحث کہاں، میں تاریخ کا ایک حوالہ دے رہا تھا۔"

"میں تاریخ ہی نہیں سمجھتا" کیکر نے غرا کے کہا۔

"یعنی یہ بھی نہیں جانتے کہ آج کیا تاریخ ہے؟" میں نے افسوس سے سرہلا کے کہا "خیر یہ تو بتا سکتے ہو کہ ان عورتوں مردوں کو الگ الگ بٹھانے میں کیا مصلحت ہے؟"

"یہ مصلحت کی بات نہیں، شرع کا حکم ہے۔ عورت اور غیر مرد کا اختلاط جائز نہیں۔"

غالب نے کہا "یہ سب تو بے پردہ ہیں۔ اور دیہات میں مرد عورت کھیتوں میں مل کے کام کرتے ہیں۔ عورتیں برقع پہن کے تو نہیں پھرتیں۔"

"تم کو فضول باتوں سے پرہیز کرنا چاہیے" اکبر خان نے مجھے پھر ٹوکا۔

غالب نے اس کو نظرانداز کر دیا "یہ عورتیں اکیلی تو نہیں آئی ہوں گی۔ باپ یا شوہر۔ کوئی مرد تو آیا ہوگا ان کے ساتھ۔ کیا ان کا اندر ایک ساتھ جانا بھی خلافِ شرع ہے؟"

"اندر صرف ایک جا سکتا ہے۔ حقیقی حاجت مند۔ دل کی بات تخلیے میں ہی ہوتی ہے۔ تم میں سے بھی ایک جائے گا۔"

میں نے تعریفی انداز میں سرہلایا "سبحان اللہ۔ تحلیلِ نفسی کا بھی یہی اصول ہے۔ سائیکاٹرسٹ۔"

اکبر خان کی برہم نظروں کی تو مجھے پروا نہیں تھی مگر میری نظر نے اچانک ہجومِ نامراداں کے پیچھے ایک شناسا چہرہ دیکھ لیا۔ وہ صرف ایک لمحے کے لیے مجھے اندر نظر آیا "یہ یہاں..." میں نے بے اختیار کہا۔

"کون؟" اکبر خان گھوم گیا۔ اس کے ساتھ ہی غالب نے پلٹ کے دیکھا۔

لیکن اس سے پہلے کہ میں اکبر خان کو اخبار فروش لڑکے کی صورت دکھاتا، حوائجِ خاص کا وقفہ ختم ہو گیا اور دروازہ کھولنے والے نے اکبر خان سے کہا "آؤ جناب! خلیفہ صاحب آپ کے منتظر ہیں۔"

ایک بار پھر ہم باری کے اصول سے مستثنیٰ قرار دیے گئے تھے، یعنی پہلے سے بیٹھے ہوئے امیدواروں نے جذبات و تاثرات سے بھی احتجاج نہیں کیا تھا۔ ایسا ہوتا رہتا تھا اور وہ اس کے عادی تھے۔ وہ دور صرف فخر کرنے کے لیے رہ گیا تھا جب عام آدمی، خلیفہ وقت کا دامن سرِعام تھام سکتا تھا۔ یہ خلیفہ کیکر کا زمانہ تھا۔ اب تو

اس وقت کی زبوں حالی پر رونے والا کوئی حالی یا اقبال بھی پیدا ہوجاتا تو نقار خانے میں طوطی کی طرح اس کی صدا کوئی نہ سنتا۔ اجازت نہ ملنے کے باعث غالب کو باہر ہی رکنا پڑگیا۔

خلیفہ کیکر نے خالص تجاہلِ عارفانہ کا مظاہرہ کیا "آؤ بھائی اکبر خان! خیریت تو ہے نا؟"

اکبر خان اس کے سامنے بیٹھ گیا "نہیں۔ خیریت نہیں ہے۔"

خلیفہ نے مجھے بادل ناخواستہ بیٹھنے کو کہا "اس کو پھر ہماری نظروں کے سامنے نہ لاتے تو اچھا تھا۔"

کسی تمیز کے بغیر اکبر خان نے کہا "یہ ایک شکایت لے کر آیا ہے تمہارے پاس۔ میں ساتھ نہ آتا تو اسے کون آنے دیتا تمہارے پاس؟"

"ہم سے شکایت ہے!" خلیفہ نے بے حد تعجب کا اظہار کیا۔

میں نے کہا "بندے کو خدا سے بھی شکایت ہوجاتی ہے۔ علامہ اقبال کا شکوہ..."

اکبر خان نے کہا "بس اپنی بات کرو۔ زیادہ پڑھے لکھے ہونے کا یہی تو نقصان ہے کہ آدمی ہر جگہ کتابی باتیں کرنے لگتا ہے۔"

میں نے کہا "خلیفہ صاحب! آپ کے کیکر میری بیوی کو اٹھالائے ہیں۔"

اکبر خان میری غلط بیانی پر چونکا مگر نہ جانے کیا سوچ کے خاموش ہوگیا۔

"کیا بکتا ہے بدبخت' بدزبان' ہم پر ایسا بے ہودہ الزام۔"

میں نے کہا "ابھی سے گالیاں مت دیں۔ الزام آپ پر نہیں لگایا میں نے۔ آپ کے مرید تھے وہ۔ چھ کیکر تھے جو اکبر خان کے گھر میں آدھی رات کو داخل ہوئے۔ وہ مسلح تھے اور نقاب پوش تھے۔ انہوں نے کلوروفارم سنگھا کے تمام نوکروں کو بے ہوش کیا۔"

اکبر خان بولا "میں رات گھر پر نہیں تھا۔ میرا چوکیدار بھی غائب ہے۔"

"بھئی ایسی وارداتوں سے میرا کیا تعلق؟" خلیفہ نے پھر اپنا نرم' غیر جذباتی لہجہ اختیار کرلیا "بدمعاشی بہت بڑھ گئی ہے ملک میں۔"

میں نے کہا "پوری بات سُن لو میری۔ وہ کسی گاڑی میں آئے تھے۔ اس کا کیا نمبر تھا اور کیا حلیہ' سب معلوم ہے مجھے۔ گھر کے نوکر بھی انہیں پہچان لیں گے اگر وہ سامنے آئے۔"

"وہ سامنے کہاں آئیں گے؟" خلیفہ نے کہا۔

"ان میں سے چار نکلنے میں کامیاب ہوئے تھے" میں نے کہا "اور وہ رابعہ کو بھی بے ہوش کرکے اُٹھالے گئے۔ اسی گاڑی میں مگر دو پکڑے بھی گئے تھے۔ وہ سب کے سامنے لائے جاسکتے ہیں۔"

"تمہارے سامنے بھی" اکبر خان بولا۔

"وہ کیکر نہیں ہوسکتے اکبر خان" خلیفہ نے جلالی لہجے میں کہا "تم جانتے ہو ہمارے مرید کون ہوتے ہیں۔"

"بہت اچھی طرح جانتا ہوں" اکبر خان نے طنزیہ لہجے...

"اسی لیے تو سکندر بخت کو یہاں لایا ہوں ورنہ وہیں اس کی بات ... کے کہتا کہ تم بکواس کرتے ہو' خلیفہ کیکر کے مرید تو فرشتے ... ہیں۔"

"تم حد سے بڑھ رہے ہو۔ کیا ثبوت ہے تمہارے پاس..." خلیفہ نے دہاڑ کے کہا۔ اس کا چہرہ غیظ و غضب میں لال چقندر ... تھا۔

"ثبوت یہاں دیکھو گے یا... تھانے میں؟" اکبر خان بولا۔

"تھانہ۔ تھانے کا نام لیتا ہے ہمارے سامنے۔ دھمکی ... مجھے بدبخت۔ ہم مزہ چکھائیں گے تجھے اس گستاخی کا۔"

اکبر خان نے سکون سے کہا "خلیفہ! شور مچانے سے کچھ ... ہوگا' میں اکیلا نہیں آیا ہوں۔"

"پھر کیا لشکر لایا ہے؟ چڑھائی کی ہے پیر کیکر شاہ کے ... اقدس پر۔ توپ خانہ اور ٹینک ہیں تیرے ساتھ؟"

اس کے چلانے کی آواز سن کے ایک ساتھ بہت سے ... اندر آگئے تھے۔ ان سب کی نگاہوں میں خون اترا ہوا تھا اور ... کے ہاتھ گھیردار شلواروں سے اسلحہ نکالنے کے لیے بے قرار ...

اکبر خان نے انہیں بے نیازی سے دیکھا "خلیفہ! اچھا ... اگر بات آپس میں طے ہوجائے اور جنگ وجدل کی نوبت نہ ... ورنہ واقعی میرا لشکر توپ خانے اور ٹینک کے ساتھ آجائے گا۔"

میں نے اطمینان سے ریوالور نکالا اور کہا "اگر تم نہیں چاہ... کہ کل تمہاری جگہ کیکر چہارم کی دستار بندی ہو اور ... ساتھ تمہارا ابھی سوئم ہو تو اپنے لشکر کو حکم دو کہ پسپا ہوجائے ... تمہاری پیری فقیری کے اس کاروبار پر کوئی اعتراض نہیں تھا ... اب معاملہ ہے میری عزت اور غیرت کا۔ میں رابعہ کو واپس ... بغیر نہیں جاؤں گا۔ تم وہ چاروں مجرم بھی میرے حوالے کرو ... اسے اغوا کرکے لائے تھے۔ پھر یہ معاملہ پولیس کے پاس اور ... میں نہیں جائے گا' انہیں میں خود سزا دے سکتا ہوں۔"

وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مجھے کینہ پرور نظروں ... گھورتا رہا "تو یہ بات ہے۔ اکبر خان' تمہارے کہنے پر ہم نے ... اسے بخش دیا تھا۔"

"آدمی سے غلطی ہوجاتی ہے۔ ایک بھول کے بدلے ... تمام عمر کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا پڑجاتا ہے" میں نے کہا ... اچھی طرح سمجھ لو کہ اس حجرے سے صرف ایک لاش باہر ... جائے گی۔ میری اور تمہاری لاشیں ایک ساتھ اُٹھائی جائیں ... تمہارے کیکر مجھے چھلنی کردیں پھر بھی مرتے مرتے میں تمہارے ... میں دو چار گولیاں اُتار دوں گا۔"

اس نے ہاتھ کے اشارے سے اندر آجانے والوں کو ... کردیا "جاؤ' اس بدبخت کو اس کی شامت یہاں لائی ہے۔ اس ... ہم نمٹ لیں گے۔"

میں نے کہا "تمہاری یہ خوش فہمی بھی دور ہوجانی چاہیے کہ ہم اس حجرے سے نکلنے کے بعد اس احاطے میں محصور ہوجائیں گے۔ تم ایک خونی جنگ کے متحمل نہیں ہوسکتے خلیفہ۔ بہت سے بے گناہ بھی مارے جائیں گے اس میں اور تمہارا جدی پشتی کاروبار ختم ہوجائے گا۔ تم اتنے بڑے پیر نہیں ہو کہ اپنی روحانی طاقت سے قانون کے لمبے ہاتھوں کو روک سکو۔ جو زندہ بچے وہ حوالات میں بند ہوجائیں گے اور پھر پولیس ان سے سب اُگلوالے گی کہ پیری مریدی کی آڑ میں یہاں کیا ہوتا آیا تھا۔ یہ کہانی سب اخبارات میں چھپے گی۔ اور جب تم یا تمہارے کیکر عدالت سے ملنے والی سزا کاٹ رہے ہوں گے تو یہ خانقاہ محکمۂ اوقاف اپنی تحویل میں لے چکا ہوگا۔"

"یہ بہت بڑھ بڑھ کے بول رہا ہے اکبر خان' اسے بتاؤ..."

میں نے کہا "مجھے کچھ جاننے کی خواہش نہیں۔ رابعہ کہاں ہے اور وہ چاروں مجرم کہاں ہیں جو اسے اغوا کرکے لائے تھے تمہارے حکم پر؟"

"میں نے کسی کو ایسا شیطانی کام کرنے کا حکم نہیں دیا۔"

"جھوٹ بکتے ہو تم۔ میں نے تمہاری آنکھوں میں ایک شیطانی شہوانی چمک دیکھی تھی خلیفہ' جب رابعہ تمہارے سامنے آئی تھی۔"

"اگر کسی نے میرا نام لے کر ایسی حرکت کی ہے تو میں خود اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" خلیفہ نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری "لیکن تم کو ثابت کرنا ہوگا کہ وہ میرے مرید تھے۔"

اکبر خان نے کہا "دو قیدی میں اپنے ساتھ لایا ہوں۔ وہ خود تمہارے سامنے اعترافِ جرم کریں گے۔"

"کہاں ہیں وہ؟" خلیفہ کیکر نے کہا۔

"میری گاڑی میں۔ گاڑی کی ڈکی میں۔"

خلیفہ نے تالی بجائی۔ ایک کیکر پردے کے پیچھے سے نکل آیا جس کی موجودگی سے میں قطعی بے خبر تھا۔ خلیفہ میری حیرانی پر مسکرایا "ہم کبھی اکیلے نہیں ہوتے۔ یہ ہمارا نائب ہے۔"

"خلیفہ کیکر چہارم" میں نے کہا "یہ بیٹا ہے تمہارا؟"

"ہاں۔ میں جانشین ہوں اس گدی کا اور محافظ بھی۔" اس نے رواں انگریزی میں کہا "تم خوش قسمت ہو کہ ابھی تک مجھے اشارہ نہیں ملا تھا اس لیے زندہ ہو۔"

"میں یہاں مرنے کے لیے ہی آیا ہوں" میں نے کہا "میرے مرنے سے کوئی خاندانی گدی خالی نہیں ہوگی۔"

خلیفہ کیکر بولا "ہمارے اور تمہارے معاملات آج ختم ہوگئے اکبر خان۔"

"میں بھی یہی چاہتا تھا" اکبر خان بولا "اب اپنے جانشین سے کہو کہ سکندر کے ساتھ جائے اور قیدیوں کو یہاں لے آئے۔"

"یہ کام کوئی بھی کرسکتا ہے" جانشین نے کہا۔

"کیکروں کی اگلی نسل کانونٹ کی تعلیم یافتہ ہوگی" میں نے طنز سے کہا "اور کیوں نہ ہو' اس سے زیادہ منافع بخش کاروبار کیا ہوگا۔"

"میرا باڈی گارڈ شاید کسی کو گاڑی کے قریب نہ جانے دے' اس کے لیے میرا یا سکندر کا ساتھ جانا ضروری ہوگا۔" اکبر خان بولا۔

خلیفہ کیکر نے کہا "ٹھیک ہے۔ یہ جائے گا مگر اسلحہ لے کر کوئی نہیں جائے گا۔ اس معاملے کا فیصلہ ہونے تک کوئی کچھ نہیں کرے گا۔"

میں نے کہا "اپنے ولی عہد کو یہ سمجھادو کہ اسلحہ میری طاقت نہیں ہے۔ باہر اس نے کسی جاں نثار کو اشارہ بھی کیا تو میں ایک ہاتھ مار کے اس کی گردن توڑ دوں گا۔ اس کی گردن تو خاصی نازک ہے۔ مظاہرے کے لیے میں تمہاری گردن۔ اچھا چھوڑو.... یہ دیکھو..."

میں نے خلیفہ کے سامنے رکھی ہوئی اسٹول جیسی میز پر کھڑی ہتھیلی کا تول کے وار کیا۔ میز درمیان سے دو ٹکڑے ہوگئی۔ ایک لمحے کے لیے خلیفہ اور اس کا جانشین پلک جھپکانا بھول گئے۔

میں کھڑا ہوگیا "ادھر آؤ ولی عہد بہادر۔ مردوں کی طرح ہاتھ ملاؤ مجھ سے۔ ڈرو نہیں' تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ ہم اپنا اپنا اسلحہ جیب میں ڈال کر رکھیں گے۔ واپس آنے تک۔"

وہ میری باتوں میں آگیا۔ میرے ساتھ ہی اس نے بھی ریوالور جیب میں ڈالا اور مجھ سے ہاتھ ملا کے بولا "اگر تم یہ سمجھتے ہو..."

میں نے اسے جملہ مکمل کرنے کا موقع نہیں دیا۔ بڑی مہارت اور نزاکت کے ساتھ میں نے اسے اپنی طرف کھینچ کے اُٹھایا اور ہوا میں گھما کے پھر پیروں پر کھڑا کردیا۔ شاید اس کی سمجھ میں بھی نہ آیا ہوگا کہ چند سیکنڈ میں کیا ہوا تھا۔ زمین اس کے پیروں سے نکل گئی تھی یا چھت ٹانگوں میں سے گزر گئی تھی۔ اس نے بدحواسی پر قابو پانے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے پھر اسے ایک کرتب دکھایا اور اس بار اپنے سر کے اوپر سے گزارا اور پھر ایک دم پلٹ کے سنبھال لیا۔ دوبارہ الٹا اور جیسے بازی گر چھڑی کو گھماتا ہے' میں نے اسے گھما کے خلیفہ کے سامنے چھوڑ دیا۔

"یہ کیا بے ہودگی ہے؟" خلیفہ نے برہمی سے کہا۔

میں نے کہا "دیکھ لو اگر اسے کہیں خراش بھی آئی ہو۔ تم چاہتے ہو کہ یہ اسی طرح بخیروعافیت واپس آئے تو اسے نصیحت کردو کہ اچھے بچوں کی طرح رہے۔ باہر کسی کو معلوم نہ ہو کہ ہمارے درمیان کسی مسئلے پر اختلافِ رائے ہے۔"

میں اور خلیفہ کا جانشین ایک ساتھ باہر نکلے' انتظار کا عذاب جھیلنے والوں کے درمیان سے گزرے اور سیاہ کیڈلاک تک گئے۔ اس دوران میری نظر نے اس اخبار فروش لڑکے کو ہر طرف تلاش کیا جو ہمیں صبح ملا تھا اور جسے غالب اپنے اخبار کا رپورٹر بنانا چاہتا

تھا۔ میں اس کی یہاں موجودگی کو محض اتفاق نہیں سمجھ سکتا تھا۔ وہ کسی مقصد کے تحت ہی ہمارے ساتھ یہاں پہنچا تھا۔ کیا وہ بھی اکبر خان کی محافظ فوج کا رکن تھا؟ میں نے سوچا۔ لیکن صبح ہی اس نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ جیسا آدمی اکبر خان کا مہمان کیسے ہو سکتا ہے۔ پھر کیا وہ اکبر خان کے تعاقب میں تھا یا میرا پیچھا کر رہا تھا؟ بالآخر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کا یہاں نظر آنا اتفاق ہی تھا۔ شاید وہ کسی کے ساتھ آیا تھا اور اب جا چکا تھا۔

اکبر خان کا گن مین بہت مستعد کھڑا تھا۔ میرے کہنے پر اس نے ڈکی کا لاک کھولا اور باری باری دونوں قیدیوں کو نکال کے باہر کھڑا کردیا۔ جب وہ ان کے ہاتھ کھول رہا تھا تو میں نے خلیفہ کے ولی عہد سے کہا "ان کو سمجھادو کہ شور نہ کریں، خوا مخواہ تماشا بنے گا۔"

اس نے سرہلایا "سن لی ہے نا پوری بات؟" وہ قیدیوں سے مخاطب ہوا جو اپنے پیروں پر کھڑے رہنے کی کوشش کر رہے تھے۔

کار کی ڈکی میں دست و پا بستہ لیٹے رہنے سے ان کے ہاتھ پاؤں اکڑ گئے تھے اور انہیں حرکت کرنا بھی مشکل ہوگیا تھا۔ عقیدت مندوں کا مجمع حیرت سے آنکھیں پھاڑے یہ منظر دیکھ رہا تھا مگر کسی میں سوال کرنے کی جرأت نہ تھی۔ قیدیوں کو واپس ہانکتے ہوئے میری نظر نے باہر کا جائزہ لیا۔ سفید فاکس ویگن موجود تھی لیکن جیپ کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔ میں نے ان لوگوں کی صورت نہیں دیکھی تھی جو فاکس ویگن میں سوار تھے۔ شاید وہ بھی انہی لوگوں میں شامل ہوگئے تھے جو خلیفہ کیکر کے حضور شرف باریابی کے منتظر بیٹھے تھے۔ غالب بھی نہ جانے کہاں غائب ہوگیا تھا۔

خواتین کے مجمع میں بھی اکثریت دیہاتی عورتوں کی تھی جو گندے اور پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس تھیں۔ جوان عورتوں نے چھینٹ کی شلوار قمیص پہن رکھی تھیں مگر کسی کی جوانی میں مجھے شباب کی وہ رعنائی اور دلکشی نظر نہ آئی جو دوبارہ دعوت نظارہ دے۔ ایک جوان لڑکی ہسٹریا کے دورے میں سر ادھر سے ادھر مار رہی تھی۔ اس کو سنبھالنے والی بوڑھی عورت رو رہی تھی اور آس پاس کی ہمدرد عورتوں کو سمجھا رہی تھی کہ اس کی بیٹی پر بڑا "ڈاڈا جن" آیا ہوا ہے کیونکہ یہ کیکر کے نیچے گیلے بال سلھانے کھڑی ہوگئی تھی۔ میں نے ایک آہ بھری۔ شاید آج رات خلیفہ کیکر اس جن سے لڑکی کا پیچھا چھڑا دے۔ وہ خوب صورت تو نہیں تھی مگر اس کا بدن بہت گدرایا ہوا تھا۔

غربت زدہ غریب عورتوں کے اس ہجوم میں دو سفید برقعہ پوش عورتیں بھی تھیں جو خلاف معمول بات نہیں تھی۔ ابھی اس علاقے میں متمول گھرانوں کی یا تعلیم یافتہ مڈل کلاس کی عورتوں نے پردے کا فیشن نہیں شروع کیا تھا بلکہ اسے ضرورت سمجھ کے اختیار کیا تھا چنانچہ رنگ برنگے، ہر ڈیزائن اور کٹ کے سیاہ یا میرون کلر کے، ریشمی ساٹن اور لیڈی ہملٹن کے برقعوں نے رواج نہیں پایا تھا۔ عورتوں کے مجمع عام میں دو جدید ترین وضع کے برقعے میں تھوڑا سا حیران ہوا۔

ہم مجرم کیکروں کو لے کر روانہ ہوئے تو میں نے ایک نظر کے جانشین پر رکھی اور دوسری سے باہر کا جائزہ لیتا رہا۔ بسوں کی قطار کے پاس بہت سی ریڑھیاں کھڑی تھیں اور مستقل دکانیں بھی تھیں جہاں مزار پر حاضر ہونے والوں کی ضرورت کا سب غیر ضروری سامان بھی ملتا تھا۔ اللہ نے پیر کے طفیل بہت سے لوگوں کے لیے رزق کے وسیلے پیدا کر جو ہار پھول، دم کرانے والوں کے لیے بوتلوں میں پانی یا لیے تیل، نقش والی مٹی کے برتن اور کیکر کی چھال سے ہر چیز کو تبرک بنا کے بیچ رہے تھے۔

انہی کے ساتھ میلے ٹھیلوں میں کھانے پینے کی چیزیں تھیں۔ بہ افراط مرچوں والے آلو چھولے اور بارہ مسالے چاٹ جس کو کھا کے ہم جیسے نازک مزاج شہریوں کے کانوں سیٹیاں بجنے لگتی ہیں اور بیک وقت ناک اور آنکھ سے خارج ہوتی ہے۔ دیسی شکر کا شربت مع حکیموں کے مخرج کی کے اور کنگ سائز جلیب جو شہر کی جلیبی کا مذکر دیہی ایڈیشن اور لنچ میں مجھ جیسے لوگ اس کا پچاس فیصد کھا کے "رج" تھے مگر کھانے والے تو جیسے مقابلے پر آمادہ تھے۔ اندر آتے دس سال کے ایک نورچشم کو اس کے والد ماجد نے جھما کرکے فرمایا "کھوتے دا پتر، جے ادھ سیر جلیب کھان نئیں ترے کولوں تے..."

باقی بات میں نے نہیں سنی کہ جو آدھا سیر جلیبی نہ کھائے ماؤنٹ ایورسٹ سر نہیں کرسکتا یا آبا و اجداد کا نام روشن کرسکتا۔ کچھ ایسی ہی بات ہوگی۔ میری نظر اچانک پھر اس والے لڑکے پر چلی گئی تھی جو غالب کے ساتھ لکڑی کی بینچ گلاس میں خالص دودھ ملائی والی چائے پی رہا تھا۔ اس بار اس نے ہاتھ ہلا کے مجھے وش کیا۔ معلوم نہیں وہ کیا کہنا چاہتا تھا کس چکر میں وہاں موجود تھا۔

ہم حضرات و خواتین کو شرع کے مطابق جدا کرنے والے راستے پر سے گزر رہے تھے کہ ایک سیاہ برقعے والی عورت لجاجت سے کہا "چھوٹے پیر سائیں! ہم بڑی دور سے آئے ہیں"

میرا دل ایک دم گز بھر اچھلا اور سینے میں قلابازیاں شاید معدے میں اتر گیا۔ بڑی مشکل سے میں نے اپنے رد عمل کنٹرول کیا۔ میری صورت دیکھنے والا یقیناً میری جذباتی کیفیت آگاہ ہوجاتا مگر چھوٹے پیر سائیں تو اس چمکیلے نقاب والی کا چہرہ کے چکر میں پڑ گئے تھے جس کے گورے جوان ہاتھ اس کے ٹریلر تھے۔ وہ آواز نازو کی تھی جسے میں ہزاروں آوازوں میں پہچان جاتا۔

جانتے بوجھتے اس نے مجھے وہاں اپنی موجودگی کا احساس

تھا۔ چھوٹے پیر سائیں سے سوال اس نے کچھ اور کیا تھا لیکن اس نے کوڈ میں مجھے پیغام دیا تھا کہ فکر مت کرنا، ہم بھی ہیں میدان میں تمہارے ساتھ۔ یہ پیغام ہی میرا دماغ خراب کرنے کے لیے کافی تھا اور جب صدمے کا اثر کم ہوا تو میرے خون میں ابال آنے لگا۔ میں نے دل ہی دل میں اسے وہ گالیاں دیں جو میں اس کے سامنے بھی دے سکتا تھا، اگر مجھے موقع ملتا۔

چھوٹے پیر سائیں نے کہا "بی بی! غرض مند کو تو آنا ہی پڑتا ہے، دور کیا اور نزدیک کیا۔"

اب دوسری فیشن ایبل برقعے والی خاتون کھڑی ہوگئی جو رابعہ کے سوا کوئی نہیں ہوسکتی تھی۔ "چھوٹے پیر سائیں! آپ کچھ سفارش کردیں، ہمیں واپس بھی جانا ہے۔"

"کردیں گے، کردیں گے۔ آج استحضار نہیں ہے لیکن فکر کی بات نہیں۔ یہاں شب بسری کے لیے بھی انتظام ہے۔"

میں نے دانت پیس کے معنی خیز لہجے میں کہا "انتظام کا واقعی جواب نہیں۔ تمہاری باریابی تو خلوت خانہ خاص تک ہوگی۔"

مجھے معلوم تھا، وہ میرے دل ہی دل میں پیچ و تاب کھانے پر زیرِ نقاب مسکرا رہی ہوں گی اور بہت خوش ہوں گی کہ انہوں نے بڑی چالاکی سے ہمارے پروگرام کا اندازہ کرتے ہوئے راستہ بدل دیا اور لاہور جانے کے بجائے وہاں پہنچ کے ہمیں حیران کردیا جہاں ہمارا پایا جانا ان کے لیے باعث حیرانی نہیں ہوا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ پنگا نہ لینے کی سخت ہدایت کی ہمارے نزدیک اتنی بھی اہمیت نہیں جتنی سرکاری سرکلر کی جس میں نااہلی اور بدعنوانی کے مرتکب افسران کو سخت تادیبی کارروائی کے نتائج سے آگاہ کیا جاتا ہے یا اس سیاسی بیان کی جس میں اکثر واضح کیا جاتا ہے کہ کسی کو عوام کے جذبات سے کھیلنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

ہم ان کی توقعات پر پورے اترے تھے اور پنگا لینے کے عزم مصمم کی راہ میں ان کی سخت تاکید سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ انہوں نے بھی وہی کیا جو ان کو کرنا چاہیے تھا۔ میں نے بعد میں غور کیا تو مجھے ان کا ہمارے پیچھے پیچھے یہاں پہنچ جانا اتنا حیران کن اور اشتعال انگیز نہیں لگا۔ وہ نہ احمق تھیں اور نہ بزدل۔ وہ ہمارے مزاج اور ہماری طبیعت کے تقاضوں سے آشنا تھیں اور عام فہم الفاظ میں ہماری رگ رگ سے واقف تھیں۔ ہم ان سے اپنے خیال کو چھپانے کی کوشش کرتے تو اس میں بھی ناکام رہتے۔ ان کے سامنے ہم نے کیکروں کے ایک حملے کو ناکام بنادیا ہو، ان کے چار سوساؤں کو جہنم رسید کرنے کی مجاہدانہ کوشش میں وہ ہمارے ساتھ برابر کی شریک رہی ہوں، ہم نے دو ملزمان کو تفتیش کے لیے قید کر رکھا ہو تو پھر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ ان کو لاہور روانہ کرنے کے بعد ہم اکبر خان کے آنے کے بعد کچھ نہ کریں۔ بس زیرِ حراست ملزمان کو ان کے حوالے کریں اور خود بھی شرافت سے لاہور کا رخ کریں۔

انہوں نے ہمیں دھوکا دیا تھا۔ وہ مزاحمت کرتیں تو ہم سختی کے ساتھ انہیں اپنی قسم دے کر مجبور کردیتے کہ وہ خطرے سے دور چلی جائیں جو ان کے لیے ناممکن تھا۔ ان وفا کی پتلیوں نے گوارا نہ کیا کہ ہمارا ساتھ ایسے وقت میں چھوڑ دیں اور باہمی مشورے سے طے کیا کہ کریں گے وہی جو ہمیں کرنا ہے مگر انہیں بتائے بغیر۔ اکبر خان کے گھر سے روانگی کے بعد انہیں کامل آزادی حاصل ہوگئی تھی کہ وہ اپنے پروگرام پر عمل کریں۔ اب وہ برقعے میں منہ چھپائے یہاں موجود تھیں جبکہ ہم انہیں لاہور میں تصور کیے مطمئن بیٹھے تھے۔

واپس جاتے ہوئے میں نے سوچا کہ کیا نازو اور رابعہ کے یہاں پہنچ جانے کی خبر غالب کو بھی ہے یا نہیں۔ ایڈیٹر صاحب، اخبار والے لڑکے یعنی اپنے مستقبل کے کرائم رپورٹر کے ساتھ نہ جانے کیا ڈسکس کر رہے تھے۔ اخبار کی پالیسی، اس کا لے آؤٹ یا کچھ اور۔ سائیں کیکر شاہ کی خانقاہ پر کسی بھی وقت چھڑ جانے والی جنگ کی حکمتِ عملی یا عاجز صاحب کی وفات حسرتِ آیات کے اسباب کی تحقیق اور اسے قتل ثابت کرنے کے امکانات؟

ایک بار پھر ہم خلیفہ کیکر شاہ کے حجرۂ خاص میں پہنچے تو صورت حال سخت کشیدہ تھی۔ میرا ذہن بہت سے انکشافات سے پیدا ہونے والے مسائل میں بھی الجھا ہوا تھا اور میری عدم موجودگی میں اکبر خان کے ساتھ خلیفہ کیکر نے جو خصوصی مذاکرات کیے تھے، وہ ناکام ہوگئے تھے۔ اس کا پتا ان کے چہروں سے چلتا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اکبر خان اور خلیفہ کیکر کے درمیان پرانے روابط تھے جو نامعلوم وجوہ کی بنا پر کشیدگی کا شکار تھے۔ عدم اعتماد اور بدنیتی کسی بھی کاروبار میں شریک افراد کی علیحدگی کا سبب بن جاتی ہے۔ اکبر خان کے دھندوں کا بھی میں اندازہ کرسکتا تھا اور پیری فقیری کے پردے میں جاری رہنے والے خلیفہ کیکر کے غیر قانونی کاروبار کا بھی۔ اب شاید اکبر خان کسی پیر کی سرپرستی کا محتاج نہیں رہا تھا اور اسے اندیشہ لاحق تھا کہ خلیفہ کیکر کی حد سے بڑھی ہوئی فرعونیت کا غرور ٹوٹا تو ذلت و رسوائی کے چھینٹے اس کے دامن پر بھی آئیں گے اور خلیفہ کی پیری کا بھانڈا پھوٹا تو خاص حواری کی حیثیت سے اس کی حیثیت بھی متاثر ہوگی۔ اسے ایک بہانے کی ضرورت تھی جو ہم سے تعلق کے بعد خود ہی فراہم ہوگیا تھا۔

میں نے دونوں ملزموں کو آگے دھکیل کر خلیفہ کے قدموں میں گرادیا "یہ ہیں تمہارے کیکر۔ پوچھ لو ان سے کہ یہ کس کے ساتھ آئے تھے اور کیوں آئے تھے؟"

وہ گرتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے اور چلّانے لگے "یہ کیا ہے، کون ہے یہ آدمی؟ ہمیں یہاں کیوں لایا گیا ہے؟"

دوسرے نے بھی واویلا کیا "کیا قصور ہے ہمارا اور یہ کیسی بدمعاشی ہے؟"

میں نے کہا "بند کرو اپنی بکواس اور بتاؤ اپنے خلیفہ کیکر کو کہ

تمہارے باقی چار ساتھی کہاں ہیں؟"

"کون سے چار ساتھی؟" پہلے نے چیخ کر کہا۔

"وہ سور کے بچے جو رات کی تاریکی میں اغوا کرنے آئے تھے۔ منہ پر کالی نقاب ڈال کے۔" میں نے بھی مشتعل ہو کے کہا "تم جیسے کیکر۔"

اب خلیفہ نے مداخلت کی "سکندر میاں! تمہیں کوئی غلط فہمی ہے۔ یہ کیکر نہیں ہیں۔ میں نے کہا تھا نا کہ ہمارے مرید ایسا نہیں کرسکتے۔"

"یہ غلط ہے۔ انہوں نے تسلیم کیا تھا کہ یہ کیکر ہیں۔ آپس میں بات کرتے ہوئے نہیں' بلکہ میرے پوچھنے پر....."

"یہ جھوٹ ہے' الزام ہے ہم پر" ان میں سے ایک نے شور مچایا۔

"ہم اسے نہیں جانتے۔ یہ ہمیں کہاں لایا ہے' کون سی درگاہ شریف ہے یہ" دوسرے نے ادھر ادھر دیکھ کے کہا "پیر صاحب! آپ سمجھایئے اس مرید کو۔ ہمیں جانے دے۔"

غصے سے میرا برا حال ہوگیا "جھوٹے' مکار' تم نہیں جانتے کہ یہ پیکر کیکر شاہ کی خانقاہ ہے۔ یہ خلیفہ کیکر ہیں..."

خلیفہ کیکر نے کہا "زبردستی منوانا چاہتے ہو ان سے؟ ایسا کرو پولیس کی مدد سے اقبالی بیان حاصل کرلو ورنہ مجھے ان کی بات بھی سننے دو۔"

ان کے جھوٹ پر اکبر خان بھی پریشان ہوگیا تھا "ٹھیک ہے۔ تم بھی سُن لو ان کی' یہ کیا کہتے ہیں.... پولیس کے حوالے تو ہم انہیں ضرور کریں گے۔"

"کس جرم میں؟ کیا بگاڑا ہے ہم نے تمہارا؟" ایک دھاڑیں مار مار کر رونے لگا "ہم شریف آدمی ہیں' تمہیں جانتے ہی نہیں۔"

دوسرے نے مظلوم لہجہ بنا کے فریاد کی "سرکار! ہم تو مزدور لوگ ہیں۔ صبح کام پر جانے کے لیے نکلے تھے۔ پیچھے سے ان کی گاڑی آئی اور اس آدمی نے ہمیں پکڑ کے مارنا شروع کردیا۔"

اس نے میری طرف اشارہ کیا تھا۔ اکبر خان مجھے نہ روکتا تو میں اس دیدہ دلیری سے الٹا مجھے مجرم بنانے کی سزا اسے ضرور دیتا۔

"آخر کیوں.... ایسی کیا بات ہوئی تھی؟ کوئی پرانی دشمنی تھی تمہاری اس شخص سے یا تم نے کوئی غلط حرکت کی تھی؟"

"مائی باپ! ہم غریب لوگ کیا دشمنی کریں گے کسی سے۔ غلط حرکت اگر سڑک پر چلنا ہے' مزدوری تلاش کرنا ہے یا آپس میں باتیں کرنا ہے تو بے شک ہم نے غلط حرکت کی ہے۔"

"ہم نے تو ان کی گاڑی کا راستہ تک نہیں روک رکھا تھا۔ ہم کچے میں چل رہے تھے۔ ہم نے انہیں گھور کے بھی دیکھا ہو تو یہ بتائیں۔ کیا غریب آدمی کا سانس لینا بھی غلط حرکت ہے' جینا بھی غلطی ہے..."

"بس اس نے گاڑی روک کے ہمیں بلاوجہ مارنا شروع کردیا؟" اکبر خان نے گرم ہو کے کہا "آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے اتنا بڑا جھوٹ بولتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آئی۔ ذرا ڈر نہیں کہ تم پر یہ چھت نہ گر جائے۔ قسم کھا کے کہہ سکتے ہو کہ تم سچ کہہ رہے ہو؟"

"آپ کہاں اعتبار کریں گے ہماری قسم کا۔ ہائے۔ بڑی طرح مارا ہے جی پیر صاحب۔ اٹھا اٹھا کے پٹخا' کبھی ادھر کبھی ادھر۔"

"اور یہ کسی نے نہیں دیکھا؟" میں نے اسے گالی دی۔

"صبح صبح کون تھا وہاں دیکھنے والا؟ یہ تو پہلوان ہے جی' ہڈیوں کی چٹنی کردے۔ ہم دونوں کی ہڈیاں توڑ دیں اس نے پھر گاڑی میں ڈال دیا باندھ کے اور اب نکالا ہے یہاں آپ کے سامنے لانے کے لیے..."

"میرے سب نوکروں نے دیکھا تھا تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو' تمہاری گاڑی کو...." اکبر خان نے دھاڑ کے کہا۔

"وہ آپ کے نوکر ہیں جی۔ وہی کہیں گے جو آپ کہہ رہے ہو۔ کچھ بھی الزام لگادو ہم پر لیکن ہم بے گناہ ہیں۔"

"پتا نہیں یہ کس جرم کی سزا ملی ہے ہمیں" دھاڑیں مار کے رونے والے نے کہا "پیر سائیں' ہماری مدد کرو خدا کے لیے ان ظالموں سے بچالو۔ آپ کو اللہ رسولؐ کا واسطہ۔ ہمیں پناہ دو۔"

اکبر خان اُٹھ کھڑا ہوا۔ "ٹھیک ہے۔ اب تک ہم نے پولیس کو رپورٹ نہیں کی تھی..."

"یہ کام پہلے کرنے کا تھا" خلیفہ کیکر نے کہا "خیر' اب جاکے پرچہ کٹوادو۔"

"ان کو میں ساتھ لے جاؤں گا۔"

"یہ اب ہماری پناہ میں ہیں۔ خدا اور رسولؐ کے واسطے کو کیسے نظرانداز کردیں؟ جھوٹ سچ کا پتا چل جائے گا تفتیش سے۔ انہیں پولیس کے حوالے کرسکتے ہیں' تمہارے حوالے نہیں کرسکتے۔" خلیفہ کیکر نے کہا۔

"جرم انہوں نے میرے گھر میں کیا تھا۔"

"یہ تم کہتے ہو۔ ہم کیسے مان لیں کہ تم سچے ہو اور یہ جھوٹے ہیں؟ تم نے کہا تھا کہ یہ ہمارے مرید ہیں' کیکر ہیں۔ یہ جھوٹ اور ہم پر الزام تھا۔ ہمیں بدنام کرنے کی کوشش کی تھی تم نے۔ ہمارے خلاف بھی رپورٹ لکھوا دو۔ پولیس اگر کسی رابعہ کو برآمد کرسکتی ہے تو کرے اور ہمیں ہتھکڑی ڈال کے لے جائے" خلیفہ اب شیر کی طرح دھاڑنے لگا تھا۔

خلیفہ کے جانشین نے بھی گرج کے کہا "یہاں تمہاری بدمعاشی نہیں چلے گی اکبر خان۔"

"تم مجھے بدمعاش کہتے ہو۔ میں جانتا ہوں تمہاری حقیقت خلیفہ کیکر کی اولاد۔" اکبر خان بپھر گیا۔

"میں بھی جانتا ہوں تیری اصلیت کو" ولی عہد نے ایک دم ریوالور نکال لیا "میں خون خرابہ نہیں چاہتا۔"

خلیفہ نے کہا "خیریت اسی میں ہے کہ جیسے آئے ہو ویسے ہی خاموشی سے لوٹ جاؤ۔ ان دو مظلوموں کو ساتھ لے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دوبارہ اس کی کوشش بھی مت کرنا اور بھولے سے بھی ادھر مت آنا ورنہ....."

"ورنہ کیا؟" اکبر خان چیخ کے بولا "میں پھر آؤں گا خلیفہ اور اینٹ سے اینٹ بجادوں گا اس دھوکے بازی کے اڈے کی۔"

اس کے جانشین نے فائر کرنے کے لیے ریوالور اُٹھایا ہی تھا کہ میں نے اس کو فلائنگ کک ماری۔ گولی اوپر نکل گئی۔ میں نے زمین پر گرتے ہی اُلٹی قلابازی کھائی۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو اوپر گنبد نما چھت کے ایک موکھے سے آنے والی گولی میرا کام تمام کردیتی۔

سب سے محفوظ جگہ پیر صاحب کی مسند تھی۔ میں اس تخت کے کنارے سے لٹکتی ہوئی چادر اٹھا کے نیچے گھس گیا۔ باہر فائرنگ سے بھگدڑ مچ گئی تھی۔ خلیفہ کیکر نے چیخ کر اپنے سب محافظوں کو طلب کرلیا تھا اور انہیں بڑی افراتفری میں احکامات جاری کررہا تھا۔

"باہر سب کو رخصت کردو۔ کہہ دو ایک دیوانہ اندر گھس گیا ہے۔ راجا صاحب کو فون کرو۔ تھانے سے نفری منگوالو۔ اور دیکھو یہ اکبر خان نہ نکل جائے۔ اسے مارنا نہیں ہے۔ باندھ کے اندر ڈال دو۔"

خلیفہ کے جانشین نے کہا "ابا! وہ نیچے گھس گیا ہے۔"

"نیچے گھس گیا ہے' کیسے! اُلو کے پٹھے تو دیکھ رہا تھا تو اسے گولی کیوں نہیں ماردی؟" خلیفہ نے گھبراہٹ اور پریشانی میں پیری کے مرتبے اور وقار کے تمام ادب آداب بالائے طاق رکھ دیے۔

اکبر خان چلانے لگا "میں ایسی کی تیسی کردوں گا سب کی۔ جانتے ہو مجھے۔"

"چپ کر تیری....." خلیفہ نے چیخ کے کہا "بہت بھونک رہا تھا تو۔ اب تو تیری لاش کے ٹکڑے کتے کھائیں گے۔ تو یہاں سے زندہ جا ہی نہیں سکتا تھا اکبر اعظم کے نطفے۔ لے جا کے پیچھے ڈالو اس.... کو۔ اور دیکھو' باہر کون گیا ہے۔ لوگوں کی چیخ و پکار کیسی ہے۔"

وسیع تخت کے نیچے گھستے ہی کچھ دیر تو میری آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہونے کی کوشش کرتی رہیں پھر میں نے ایک طرف سے تخت پوش کا کونا اُٹھا کے جھانکا تو وہ اکبر خان کو گھسیٹ کر لے جارہے تھے۔ میرے نشانے پر نہ خلیفہ تھا نہ اس کا جانشین۔ سوچے سمجھے بغیر میں نے اکبر خان کو زبردستی لے جانے والوں میں سے ایک کو نشانہ بنالیا۔ وہ چیخ مار کے گرا اور تڑپنے لگا مگر باقی چار تیزی سے بھاگنے لگے۔ اکبر خان ان کے ہاتھ میں جھول رہا تھا۔ غالباً وہ اسے کوئی ضرب لگا کے بے ہوش کرچکے تھے۔ ان کا رخ ایک دروازے کی طرف تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ غائب ہوتے' میں نے ایک اور کیکر گرادیا لیکن باقی اکبر سمیت اس دروازے کے پیچھے روپوش ہونے میں کامیاب رہے۔

حجرۂ خاص کے باہر لوگوں کی چیخ و پکار سے ظاہر ہوتا تھا کہ دید کے امیدوار' نگاہِ کرم کے طلب گار اور خصوصی شفاعت کے خواستگار سب ہی خوف زدہ ہو کے فرار ہورہے ہیں۔ پھر باہر سے پہلا فائر ہوا' اس کے ساتھ ہی دوسرا۔ اس ہنگامہ دارو گیر میں فائرنگ کے دھماکے سن کے اندازہ ہوتا تھا کہ اندر کی جنگ اب باہر کی کھلی جنگ بن چکی ہے اور حریف مقابلے پر صف آرا ہوچکے ہیں۔ ایک طرف خلیفہ کیکر کے وہ تھے جو مرید ہونے کے ساتھ ساتھ بدمعاش تھے' مسلح تھے اور جان پر کھیلنے کے لیے تیار تھے۔ دوسری طرف اکبر خان کے محافظ تھے جو اسی لیے ساتھ آئے تھے کہ اکبر خان کی حفاظت کرتے ہوئے اسے خطرے سے نکال کر لے جائیں۔

اور ان سب کے علاوہ رابعہ' غالب اور نازو تھے۔ اکبر خان کا باڈی گارڈ گن مین تھا اور ایک اخبار فروش لڑکا تھا جس سے یہ توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ ہمارا طرف دار ہوگا۔

تخت پوش کا کنارا اُٹھانے سے روشنی بڑھی تو میں نے اپنے پیچھے فرش کے وسط میں ایک گٹر کے ڈھکن جیسا دو پٹوں والا فولادی دروازہ دیکھا۔ یہ چار فٹ لمبا اور اتنا ہی چوڑا دروازہ بند تھا لیکن مقفل نہیں تھا۔ اس کا ہر پٹ دو فٹ چوڑا اور چار فٹ لمبا تھا۔ اتنا بڑا دروازہ کسی خفیہ تجوری کا نہیں ہوسکتا۔ میں نے سوچا' یہ یقیناً کسی زیرِ زمین تہ خانے کا راستہ ہوگا۔

گھٹنوں کے بل چلتے ہوئے میں وسط تک پہنچا اور ایک پٹ کو اُٹھانے میں کامیاب ہوگیا۔

میرے کانوں میں خلیفہ کی آواز آئی "اس .... کو نکالو نیچے سے۔ چھلنی کردو نیچے ہی اسے۔"

خلیفہ کے جانشین نے کہا "اس کے پاس ریوالور ہے اور یہ بھی معلوم نہیں' وہ کس طرف ہے۔"

دوسرا پٹ اُٹھائے بغیر میں نے نیچے جھانک کر دیکھا۔ میرا اندازہ درست تھا۔ نیچے ایک زینہ موجود تھا۔ سات آٹھ سیڑھیوں کے بعد زینہ گھوم گیا تھا۔ میں لٹک کے نیچے اُترا اور میں نے اوپر والے کھلے پٹ کو پھر کھینچ کے بند کردیا۔ اب مجھے ایک کنڈی بھی نظر آگئی جسے میں نے کھینچ کر دونوں پٹ ملا دیے۔

خلیفہ چلانے لگا "دیکھو وہ... نیچے اُتر گیا۔"

اس کے ہر جملے میں میرے لیے ایک نئی اور فحش گالی تھی لیکن اس سے خلیفہ کیکر کی پریشانی اور بدحواسی بھی ظاہر ہوتی تھی۔ وہ بار بار پوچھ رہا تھا کہ باہر کون گولیاں چلا رہا ہے۔ کسی نے راجا صاحب کو فون کیا ہے کہ نہیں۔ تھانے میں اطلاع دی ہے یا نہیں۔

نہ جانے کس نے چلا کے کہا "فون کٹا ہوا ہے۔"

یہ آوازیں اوپر سے ہی آرہی تھیں لیکن اس طرف سے نہیں

جدھر سے میں اندر اُترا تھا۔ وہ دروازہ بند ہو جانے کے بعد شور کی سمت بدل گئی تھی۔ باہر کی مسلسل فائرنگ اور چیخ وپکار زینے کی طرف سے سُنائی دے رہی تھی۔ میں تیزی سے نیچے اترا اور سیڑھی کے ساتھ ساتھ گھوم گیا۔ اپنے اندازے کے مطابق میں مہمان خانے والے حصے میں تھا اور یہاں ہم گزشتہ روز پچھلی طرف سے آئے تھے۔ نیچے بنے ہوئے کمروں کی چھت کے ساتھ ساتھ روشن دان تھے جو باہر کی طرف کھلتے تھے۔ ان سے روشنی اور ہوا کو تہ خانے تک پہنچنے کا راستہ ملتا تھا۔

میں نے ایک روشن دان پر انگلیاں جما کے اپنے وزن کو اوپر کھینچا اور کہنیوں کے بل اتنا اُٹھ گیا کہ میری آنکھیں باہر کا منظر دیکھ سکیں۔ وہ حصہ ویران پڑا تھا جہاں مرد وزن عقیدت مندوں کا اجتماع تھا۔ اسی جگہ مجھے پیچھے رہ جانے والی جوتیوں اور ٹوپیوں کے درمیان دو سیاہ چمکیلے ریشمی برقعے بھی پڑے نظر آئے۔ یقیناً رابعہ اور نازو اس کھلی جنگ میں شریک ہو چکی تھیں۔ احاطے میں دو کیکروں کی لاشیں پڑی تھیں اور ایک زخمی تڑپ رہا تھا۔ باقی مختلف گوشوں میں پوزیشن سنبھالے بیٹھے تھے اور باہر سے فائرنگ کرنے والوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔ دائیں طرف مجھے اکبر خان کی سیاہ کیڈلاک نظر آئی جو دھڑ دھڑ جل رہی تھی۔ پھر ایک دھماکے سے دروازے کو توڑ کے گراتی سفید فاکس ویگن اندر آگئی۔

میرے ہاتھوں کی طاقت جواب دے گئی تھی۔ میرے پیچھے والے حصے میں بھی بھاگ دوڑ جاری تھی اور غالباً کیکر فورس مجھے تلاش کرتی ہوئی زینے کی طرف آ رہی تھی۔ روشندان تھوڑا سا بڑا ہوتا تو میں خود کو اس میں سے گزار دیتا اور باہر جا گرتا لیکن بنانے والوں نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ ہوا اور روشنی کے سوا آمدورفت کے لیے یہ راستہ کوئی نہ استعمال کر سکے۔

میرے پاس ریوالور میں چار گولیاں تھیں لیکن زینے میں چھپنے کی جگہ نہیں تھی جہاں مورچہ بند ہو کے میں اپنے دشمنوں کا نشانہ لے سکتا اور چار گولیوں سے چار کیکر گرا دیتا۔ میں ایک گولی چلا سکتا تھا۔ زینے سے آنے والا ایک شکاری ختم ہو سکتا تھا مگر اس کے بعد باقی شکاری اپنا تمام اسلحہ مجھ پر صرف کر دیتے۔

اب پیچھے جانا بھی مجھے اتنا ہی مشکل نظر آ رہا تھا جتنا واپسی اختیار کرنا۔ میرے پاس سوچنے کے لیے بھی بہت کم وقت رہ گیا تھا۔ میں زینے کی طرف آنے والوں کی چیخ وپکار سُن سکتا تھا۔ وہ اس یقین کا اظہار کر رہے تھے کہ میں بچ کے نہیں جا سکتا اور مجھے زینے سے اُترتے ہی گولی مارنا بہت آسان ہو گا۔ ان کی مغلظات کا سلسلہ الگ جاری تھا۔

"آگے مت جاؤ" کسی نے چلّا کے کہا "چاروں طرف اپنی اپنی جگہ بنالو' وہ جیسے ہی سامنے آئے۔۔۔

کسی اور نے کہا "بے وقوف کے بچّے! یہ سب کیا اپنے باپ کو سُنا رہا ہے۔"

اب میں نے واپسی کا فیصلہ کیا۔ آگے جانا صریح خودکُ[شی کے] مترادف تھا اور اس راستے سے گزر کے دوبارہ اوپر زینے [تک] پہنچنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔ اوپر والوں کو معلوم تھا کہ [میں] نیچے بھاگ گیا ہوں اور نیچے ہی محصور ہو کے مارا جاؤں گا۔ [شاید] انہیں میری واپسی کی اُمید نہ ہو۔

میں پلٹا ہی تھا کہ ایک خوفناک دھماکے نے تہ خانے [کے] درودیوار ہلا دیے۔ کسی نے روشن دان کے راستے دستی بم [اندر] پھینک دیا تھا۔ یہ اکبر خان کی اسی محافظ فورس کا کارنامہ ہو[گا] جو فاکس ویگن کو ٹینک کی طرح چلاتے ہوئے اندر لے آئے تھے۔ دھویں اور گردوغبار سے میرا دم گھٹنے لگا اور میں واپس [نہیں] بھاگا۔ مجھے یہ خطرہ بھی لاحق ہو رہا تھا کہ میں بھی ان کیکروں [کے] ساتھ اسی تہ خانے میں دفن نہ ہو جاؤں۔ دستی بم کے دھماکے [سے تہ] خانے کا ایک حصہ گر گیا تھا اور ملبے نے وقتی طور پر میرے [پیچھے] آنے والوں کی پیش قدمی کو روک دیا تھا مگر وہ بھی دُھن کے [پکے] تھے۔ چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد میں نے پھر ان کی آواز[یں] سُنیں۔ وہ ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ یہ کس کا حرا[می پن] تھا۔ کسی نے دیکھا اسے۔ وہ اکبر خان کا آدمی تھا یا کوئی اور۔

لیکن کسی نے کچھ بھی نہیں دیکھا تھا۔ دستی بم نے دیوار کا [ایک] حصہ منہدم کر کے باہر سے آنے والوں کے لیے ایک شارٹ [کٹ] بنا دیا تھا مگر وہ سب محفوظ رہے تھے جو مجھے پکڑنا چاہتے تھے۔

کسی نے کہا "سب ٹھیک ہے نا۔ چلو جلدی سے آگے چلو [ورنہ] وہ نکل جائے گا۔"

"شاہ جی! کہاں سے نکل جائے گا؟"

"ادھر سے۔ یہ جو نیا راستہ بن گیا ہے۔"

"ہم بھی تو جا سکتے ہیں ادھر سے باہر شاہ جی۔"

"چلو باہر چلو ورنہ دوسرا بم پھینک دیا کسی نے تو سب [مر جاؤ] گے۔"

"بکو مت۔ بزدل مت بنو' آگے بڑھو۔ اس کا راستہ [تو] ابھی تک وہ زینے میں ہے۔ اوپر سے گیٹ بند کر دیا گیا ہے [وہ] جائے گا کدھر سے۔" شاہ جی نے کہا۔

میرا دل بیٹھ گیا۔ زینے کا راستہ میں نے نیچے سے بند کیا [تھا] انہوں نے اوپر سے بند کر دیا تھا اور اس کا مطلب یہ تھا کہ اب [میں] صرف آگے جا سکتا تھا' پیچھے نہیں۔ اگر میں موقعے سے فائدہ [اٹھاتا] تو دستی بم سے دیوار میں شگاف پڑتے ہی ادھر کا رخ کرتا اور فا[ئر] کرتا ہوا باہر نکل جاتا۔ اس میں میرے بچ جانے کے خا[صے] امکانات تھے لیکن اب اس راستے تک رسائی بھی محال ہو [گئی] تھی۔ شکاری اس سے آگے بڑھ آئے تھے۔

میں نے ریوالور نکالا اور دیوار سے چپک کے کھڑا ہو گیا۔ [عین] میرے سر کے اوپر ایک بلب آویزاں تھا۔ مگر اسے بجھانے کی [کوئی] صورت نظر نہ آئی تھی اس کا سوئچ نہ جانے کہاں تھا۔ میں ا[گر]

ایک گولی ضائع کرتا تو دہرا نقصان ہوتا۔ میرے دشمنوں کو فوراً معلوم ہو جاتا کہ میں کہاں ہوں۔ اچانک مجھے اپنے پیچھے دیوار کے پلاسٹر کی ناہمواری کا احساس ہوا میں نے ناخن گاڑ کے چونے کا ایک خاصا بڑا ٹکڑا الگ کر لیا۔ اسے میں نے تاک کے بلب پر مارا۔ بلب ایک دھماکے سے پھٹا اور اس کی کرچیاں میرے اوپر آئیں' میں فوراً سر نیچے نہ کرتا تو یہ تیز دھار شیشے کے باریک ذرات میری آنکھوں میں گرتے اور پردۂ بصارت کو کاٹ ڈالتے۔

"شاہ جی! ادھر' ابھی بلب توڑا ہے اس نے۔"

"ہاں ہاں۔ میں نے بھی سُنی ہے آواز۔ وہ اندھیرے میں کھڑا ہو گا۔ آگے مت جانا۔ میں ٹارچ منگواتا ہوں۔"

"ٹارچ خود ہی جلانا تاکہ وہ تمہارا نشانہ لے۔"

اس وقت جب میں زندگی سے تقریباً مایوس ہو چکا تھا اور ڈر رہا تھا کہ اوپر والا دروازہ توڑ کے مجھ پر دوسری طرف سے بھی فرار کے راستے بند نہ کر دیے جائیں' اگلے روشندان سے ایک ہاتھ نمودار ہوا اور اس نے دوسرا دستی بم زینے پر پھینک دیا۔ میں ایک دم لیٹ گیا ورنہ میرا بچنا بھی مشکل تھا۔ دستی بم مجھ سے تیس قدم دور زینے کے موڑ پر گرا تھا۔

خوفناک دھماکے کے ساتھ تہ خانے کا ایک اور حصہ مسمار ہو گیا۔ اس میں زینے کا بھی کچھ حصہ شامل تھا۔ میری جان کے طلب گار اس کا براہِ راست نشانہ بنے۔ میں نے ان کی بھیانک چیخوں اور کراہوں کی آواز سنی۔ اس سے مجھے دہری خوشی حاصل ہوئی۔ میں نے دل ہی دل میں کہا "خس کم جہاں پاک" اور آزادی کی منزل کا سراغ دینے والے نئے راستے کی طرف لپکا۔ جہاں پہلے صرف ایک فٹ مربع روشن دان تھا وہاں اچھا خاصا بڑا شگاف نمودار ہو چکا تھا۔ ملبے کے ڈھیر پر قدم جما کے میں نے گردن باہر نکالی اور صورت حال کا نقشہ دیکھا تاکہ عملاً جنگ میں شریک ہونے سے پہلے اپنی سلامتی اور تحفظ کا اطمینان حاصل ہو جائے۔

موکھے میں سے پورا محاذ نظر نہیں آتا تھا۔ میں نے پھر وہی منظر دیکھا جو پہلے بھی ملاحظہ کر چکا تھا۔ کیڈلاک اب بھی شعلوں کی لپیٹ میں تھی۔ اتنی خوب صورت اور پرتعیش کار کے جل کر ضائع ہونے پر مجھے دکھ ہوا حالانکہ وہ میری کار نہیں تھی' اکبر خان کی تھی اور اسے شاید نقصان کی پروا بھی نہ ہو گی کیونکہ عموماً دولت مندوں کی ہر چیز بیمہ شدہ ہوتی ہے۔ ان کی قیمتی کار' ان کی زندگی' ان کا محل' زیورات' بچّوں کا تعلیمی مستقبل' لڑکیوں کی شادی کے اخراجات۔ سب کی ذمے داری انشورنس کمپنی لیتی جاتی ہے چنانچہ وہ اپنے لیے تفکرات پیدا ہونے سے پہلے مسئلے کا حل خرید لیتے ہیں۔ تفکرات کی چکی میں وہ غریب پس جاتا ہے جس کے دن رات' نان جویں' ستر پوشی کے لئے موٹا جھوٹا کپڑا' سر چھپانے کے لیے چھت کا سایہ اور زندگی کی بنیادی ضروریات فراہم کرنے کے لیے کولہو کے بیل کی طرح کام کرنے میں گزر جاتے ہیں' وہ مستقبل کے لیے بے فکری کا پریمیم کہاں سے ادا کرے؟

اس کے باوجود کہ کار انشورڈ تھی اور اکبر خان کی تھی' مجھے اتنا ہی افسوس ہوا جتنا کشمیر جنت نظیر میں چنار کا کوئی خوب صورت درخت گرائے جانے سے ہوتا ہے یا ایک حسین عورت کو مقتول دیکھ کے۔ چنار کے اس درخت یا اس عورت پر میرا کوئی حقِ ملکیت نہ ہونے سے فرق نہیں پڑتا۔ احساسِ حسن تو ایک دولت مشترکہ ہے۔

دو کیکروں کے لاشے اسی طرح اوندھے پڑے تھے اور تیسرا زخمی ابھی تک تڑپ رہا تھا لیکن اندر کی طرف سے جوابی فائرنگ کا سلسلہ بہت حد تک موقوف ہو چکا تھا۔ میں نے سارس کی طرح گردن باہر نکالی تو ایک گولی میرے کان کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ میں نے فوراً سر کو واپس اندر کر لیا۔ کیا نامعقولیت ہے۔ فائر کرنے سے پہلے دیکھ تو لینا چاہیے کہ سر اپنا ہے یا پرایا۔ فائر کرنے والے کی نظر بالکل ٹھیک نہ ہو تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ رابعہ' نازو اور غالب کی نگاہ تو بالکل ٹھیک تھی۔ پھر یہ کون تھا جس نے سکندر اعظم کی کھوپڑی کو نہیں پہچانا؟

دوسرا دستی بم پھینکنے والا بھی دور نہیں ہو سکتا تھا۔ غالباً اس کے سپرد یہی کارِ خیر کیا گیا تھا کہ وہ جہاں بھی روشن دان دیکھے وہاں اللہ کا نام لے کر ایک دستی بم ڈال دے۔ ایم آر ایس کی اتحادی فوج میں اکبر خان کے کمانڈوز شامل تھے اور شاید وہ اخبار فروش لڑکا۔

میں نے منہ اندر رکھتے ہوئے منہ کے سامنے ہاتھ رکھ کے بھونپو سا بنایا اور چلّا کے کہا "غالب' او غالب کے بچّے۔ رابعہ' نازو! ارے کوئی ہے یا سب مر گئے ایک ساتھ۔ ہیلو' میں سکندر ہوں۔"

ایک شخص نے بالکل میرے سامنے منہ لا کے کہا "تم سکندر ہو تو اس کا اعلان یوں چلّا کے کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

میں نے کہا "یہ دستی بم پھینکنے کی حماقت تم نے کی تھی؟"

اس نے مونچھیں ہلا کے کہا "مجھے جو چیز دی گئی تھی وہی پھینک سکتا تھا میں۔ پھول کہاں سے لاتا تمہارے لیے کیکر کے بچّے۔"

میں نے کہا "برگد کے الو' میں کیکر نہیں ہوں۔ میں ہی آیا تھا اکبر خان کے ساتھ۔ تم مجھے پہچانتے نہیں؟"

اس نے کہا "اچھا' معاف کرنا۔ دراصل اس ہنگامے میں میری عینک کے دونوں شیشے گر گئے۔ میری قریب کی نظر کمزور ہے۔"

"تم ذرا دور سے دیکھو۔ میں باہر آتا ہوں۔ مجھے باہر کھینچو۔"

اس نے مجھے باہر کھینچ لیا۔ "اندر کتنے لوگ ہیں اب؟"

میں نے کہا "مجھے نہیں معلوم۔ باہر کی کیا پوزیشن ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم" اس نے کہا "ابھی خطرہ ہے۔"

"مجھ پر گولی کس نے چلائی تھی؟"

"میں نے۔ چھینک آجانے سے نشانہ خطا ہو گیا' سوری۔" وہ پھر چھینک کر بولا۔

مجھے سخت غصہ آیا "اکبر خان کو وہ لوگ اندر لے گئے تھے۔"

"اسے ہم باہر لے آئے ہیں" اس نے کہا "چپ کر کے دیوار کی اوٹ میں میرے ساتھ آؤ' دوسری طرف سے دیکھتے ہیں۔"

"اب تو فائرنگ نہیں ہو رہی ہے۔ کیا سارے کیکر مارے گئے؟" میں نے کہا "بھاگ گئے یا پکڑے گئے؟"

"خاموش رہو۔ جہنم میں گئے کیکر..."

"جہنم میں ہی جانا تھا ان کو۔ پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔ لیکن تم کہاں جا رہے ہو؟" میں نے کہا "وہ دیکھو' سامنے ایک دیگ اور دیگ کے پیچھے کیکر کا سر۔"

میں نے نشانہ لے کر فائر کیا۔ دیگ کے پیچھے چھپا ہوا کیکر چیخ مار کے اُچھلا اور اُلٹ کے دیگ میں یوں گرا کہ اس کا سر نیچے تھا اور ٹانگیں دیگ سے باہر ہوا میں قینچی کی طرح چل رہی تھیں۔

"تمہارا نشانہ اچھا ہے" وہ بولا "نظر بھی ٹھیک ہے لیکن دماغ خراب ہے۔ تم اپنی بیوی اور سالی کو یہاں کیوں لائے تھے؟"

"سائیں کیکر شاہ کے مزار پر کیوں آتے ہیں لوگ؟ میری بیوی کی خواہش تھی کہ ہر بار اس کے دو بچے ہوں۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔"

"ابھی کتنے ہیں؟ ہر سال ایک ہوتا ہے کیا؟"

"ابھی شادی کہاں ہوئی ہے ہماری۔ میرا مطلب ہونے والی بیوی سے تھا" میں نے معذرت آمیز لہجے میں وضاحت کی "سالی سے تو خدا بچائے۔"

"ارے اس نے تو کر دیا تھا مجھے لنگڑا لولا۔ بال بال بچ گیا میں۔ تمہاری سالی کا سالا۔ میرا مطلب ہے اس کے گھر والے نے کہا تھا کہ نازو بیا کیکر نہیں ہے۔ توبہ توبہ" اس نے کان پکڑ کے کہا۔

"اب کہاں ہیں وہ؟" میں نے کہا "اندر یا باہر؟"

"مجھے تو دستی بم دے کر بھیجا گیا تھا کہ تہ خانے کو اُڑا دو۔ ابھی دو بم اور ہیں میرے پاس۔" وہ بولا "تم یہاں ٹھہرو' میں دوسری طرف سے اندر ڈالتا ہوں۔ اس طرف بھی دو روشن دان ہیں۔ خلیفہ کیکر کا بیڈ روم بھی ادھر ہے۔ یعنی کیکر شاہ کے مزار کے نیچے۔"

"تم اس سفید فاکس ویگن میں اندر آئے تھے؟"

"نہیں۔ ہم پچھلی طرف سے جیپ میں آئے تھے۔" وہ بولا "اب تم یہیں بیٹھو' میں آتا ہوں اپنا کام کر کے۔ پھر میں تمہیں لے جاؤں گا۔"

"کہاں لے جاؤ گے؟"

"باہر اور کہاں۔ مجھے واپس جیپ تک جانا ہے۔ تم نہیں جاؤ گے؟"

"پہلے میرے ساتھیوں کا کچھ پتا چلے۔"

اچانک نیچے ایک دھماکا ہوا "یہ کیا تھا؟"

"پتا نہیں۔ تمہارے ہی ساتھی ہوں گے۔"

"دستی بم تو اور کسی کے پاس نہیں تھے۔" وہ بولا اور ا[...] دیوار کا موڑ کاٹ کے غائب ہو گیا۔ خاموشی میں ایک فا[...] میں نے فائر کرنے والے کو ایک لمحے کی تاخیر سے دیکھا مگر [...] اس شخص کی موت بن گیا جو چند سیکنڈ پہلے میرے ساتھ تھا [...] بچ جانے والے دو دستی بم تہ خانے میں پھینکنے گیا تھا۔ اس [...] چلانے والا احاطے کے اندر ایک کیکر کی اوٹ سے نکلا تھا۔

میں نے ایک اور گولی کا استعمال کرتے ہوئے اس کی کھوپڑی میں سوراخ کر دیا۔ میرے لیے کفایت شعاری ضروری تھی۔ میں اندھا دھند فائرنگ کرتا تو خالی ہاتھ رہ جاتا۔ میرے ریوالور میں صرف تین گولیاں رہ گئی تھیں۔

اچانک میرے کانوں نے فاکس ویگن کے اسٹارٹ ہو[نے کی] آواز سنی پھر گرجتی کار میرے سامنے سے گزری۔ اسے [...] چلا رہا تھا۔

"غالب!" میں نے چیخ کے کہا "غالب کے گھوڑے۔"

اس نے میری طرف دیکھا اور چلایا "سکندر! سکندر [...] یہاں چھپا بیٹھا ہے؟" وہ فاکس ویگن کو ایک طرف لے گیا۔

میں اُٹھ کے گاڑی کی طرف دوڑا "رابعہ اور نازو کہاں ہیں؟"

"بصیرت تو پہلے ہی نہیں تھی' بصارت بھی گئی" اس نے [...] آنکھوں کے سامنے ہاتھ ہلا کے کہا۔ پیچھے کی سیٹ پر نازو تھی۔

غالب نے کہا "بے چارہ اندھا ہو گیا" تم ہنس رہی ہو۔"

میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ "اندھا نہیں کانا۔ مجھے نازو نظر آ رہی ہے' رابعہ کہاں ہے؟"

"باہر جیپ میں بیٹھی ہے" نازو بولی "تم کہاں تھے؟"

"میں تہ خانے میں اُتر گیا تھا۔ دو دستی بم پھینکے گئے مجھ پر میں پھر بھی بچ گیا۔" میں نے کہا "وہ کوئی اکبر خان کا آدمی تھا۔ بے چارہ ابھی مجھ سے باتیں کر رہا تھا کچھ دیر پہلے۔ کہہ رہا تھا جیپ تک لے کے چلتا ہوں۔ بس یہ دو دستی بم رہ گئے ہیں' پھینک دوں' اسی چکر میں مارا گیا۔"

"اتنا ضروری تھا انہیں پھینکنا؟" غالب بولا۔

"آرڈر از آرڈر۔ اس نے وہی کیا جو اسے کہا گیا تھا۔ [...] کیکر کی گولی کا نشانہ بن گیا' کیکر کو میں نے مار دیا۔ اس کے [...] اُٹھا لیں؟"

"تم اٹھالو" غالب نے کہا "میرا خیال ہے اب کوئی نہیں بچا۔"

"کیا مطلب؟ سب مارے گئے؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ اوپر تو صرف چار ہلاک ہوئے۔ نیچے کا پتا نہیں [...] اندر تھے اور دستی بم سے کتنے مرے۔"

"مگر یہاں تو بہت کیکر تھے' کیکروں کا جنگل تھا۔"

"سب فرار ہو گئے۔ خلیفہ کیکر سمیت" غالب بولا "تم نے ایک دھماکا سنا تھا؟"

"ہاں۔ نیچے سے آواز آئی تھی۔"

"وہ پچھلی دیوار توڑ کے نکل گئے" غالب بولا "پیچھے کوئی سرنگ ہے۔ اس میں ایک جیپ تیار رہتی تھی۔ بُرا وقت آ جائے تو خلیفہ کیکر سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر نکل جائے۔"

میں نے کہا "تمہیں کیسے معلوم ہوا' کس نے بتایا یہ سب؟"

"وہ اخبار والا یاد ہے جو صبح ملا تھا؟ وہ محرم رازِ درونِ خانہ قسم کی چیز ہے۔ اس کو اندر باہر کا سب نقشہ معلوم ہے۔"

"میں نے دیکھا تھا اسے تمہارے ساتھ۔ یہاں کیا لینے آیا تھا وہ؟"

غالب نے کہا "میں نے بھی پوچھا تھا مگر وہ جواب گول کر گیا۔ کہنے لگا کہ ایسے ہی ایک کام تھا۔ جب ہنگامہ شروع ہوا تو سیدھا میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ جیسا میں کہوں ویسا کریں۔ میں اندر کے راستوں سے واقف ہوں۔ خلیفہ کیکر پیچھے سے فرار ہو جائے گا۔ اس وقت نہ میں نے یقین کیا نہ اکبر خان کی فوج کے کمانڈر انچیف نے اس کی بات مانی۔"

"اب وہ کہاں ہے' فرشتہ غیب؟"

"اکبر خان کے ساتھ نیچے گیا ہے۔ یہ ثابت کرنے کہ جو کچھ اس نے بتایا تھا وہ کس حد تک درست تھا۔ لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ اصل مجرم تو بچ کے نکل گئے" غالب نے کہا "اس نے کہا تھا کہ تم پیچھے جیپ کے پاس آ جانا' ہم اسی راستے سے آئیں گے جدھر سے خلیفہ کیکر فرار ہوا ہے۔"

میں نے ڈانٹ کر کہا "پھر فضول باتیں کر کے وقت کیوں ضائع کر رہے ہو... چلو۔"

غالب نے جیپ کو دروازے کی طرف موڑا۔ ہم اس شخص کے پاس سے گزرے جس نے دستی بم پھینکنے کی ذمے داری پوری کرتے ہوئے جان دے دی تھی۔ یہ تابعداری کی انتہا تھی کہ اس نے اپنی عقل کے دخل کو ضروری نہیں سمجھا اور خود فیصلہ نہیں کیا کہ اب اگر دو دستی بم بچ گئے ہیں اور ان کے استعمال کا جواز باقی نہیں رہا تو وہ اکبر خان کی خدمت میں حاضر ہو کے کہے کہ سرکار! لڑائی تو ختم ہو چکی تھی چنانچہ میں نے یہ دو بم استعمال کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ کیا ضروری ہے اور کیا غیر ضروری' یہ فیصلے آقا اور مالک کرتے ہیں۔ فوج میں ایک دستے کی' بریگیڈ کی یا ڈویژن کی اور فوج کی کمان کرنے والے کرتے ہیں۔ ماتحت سے صرف تعمیل کی توقع کی جاتی ہے۔ میں نے میٹرک میں ایک نظم پڑھی تھی جو سالہا سال سے شامل نصاب تھی۔ چارج آف دی لائٹ بریگیڈ۔ یہ نظم ضبط کے اصولوں پر ایک شہرۂ آفاق اور مستند دستاویزی حوالہ بن چکی ہے۔ اس کا ایک بند مجھے یاد آیا۔

THERE IS NOT TO REASON WAY
THERE IS BUT TO DO AND DIE

اور اس شخص نے یہی کیا تھا۔ کیوں اور کیسے کی بات ہی نہیں۔ حکم ہے مر جانے کا تو مر جاؤ' خواہ حکم صریحاً غلط' بے جواز اور ناجائز ہو۔

میں نے اس کے قریب بیٹھ کے دو غیر استعمال شدہ دستی بم اُٹھاتے ہوئے یوں محسوس کیا جیسے اس کی کھلی آنکھیں مجھے شرمندہ کر رہی ہیں۔ جب وہ مجھ سے ملا تو اجنبی تھا مگر اس نے شناسائی کے بعد چند منٹ میں اجنبیت کے احساس کو ختم کر دیا تھا۔ وہ بہت پُرسکون تھا۔ موت کی کوئی تحریر اس وقت بھی مجھے اس کی صورت پر نظر نہ آئی۔

معاف کرنا دوست۔' میں نے دل ہی دل میں کہا۔ میں چوری نہیں کر رہا ہوں۔ میں اکبر کو بتا دوں گا کہ موت حائل نہ ہوتی تو تم کو ادائے فرض سے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی تھی۔

معلوم نہیں وہ کون تھا۔ میں صرف اتنا جانتا تھا کہ وہ اکبر خان کا ایک کارندہ تھا اور اکبر خان جیسے لوگ اپنی دولت کی قوت خرید میں جاں نثاری کا ایک جذبہ بھی رکھتے ہیں۔ جب کوئی ان کی خاطر جان دے دیتا ہے تو یہ ان کے لیے کوئی جذباتی صدمے کی بات نہیں ہوتی۔ پہلے سے طے شدہ اور متوقع انجام ہوتا ہے۔ آخر اسے معاوضہ بھی تو اسی جاں نثاری کا ملتا تھا۔ جو معاوضہ لے اور جان نہ دے وہ نمک حرام کہلاتا ہے۔ کیا وہ پس از مرگ اسے کوئی تمغۂ جاں نثاری دے گا؟ اس کے اہل و عیال کو وہ سہارا فراہم کرے گا جو شوہر یا باپ کی حیثیت سے وہ تمام عمر اپنا فرض سمجھ کے کرتا؟

جنگ میں یہی ہوتا ہے۔ آدمی کچھ بھی محسوس کیے بغیر دشمنوں کو ہلاک کرتا جاتا ہے۔ خنجر یا سنگین کی نوک سے' گولی سے یا دستی بم سے۔ بعض اوقات وہ توپ کا گولا چلاتا ہے یا ایٹم بم گرا دیتا ہے اور یہ بھی نہیں دیکھتا کہ اس نے کس کو اور کتنوں کو فنا کی نیند سلا دیا۔ اور کبھی وہ اچانک سامنے آ جانے والے دشمن کی صورت تک نہیں دیکھتا اور اسے سنگین گھونپ کے یا چھلنی کر کے آگے بڑھ جاتا ہے مگر پھر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ اپنے ہی دشمن کو اس کی زندگی بخش دیتا ہے یا اس کو مار کے دکھی ہو جاتا ہے اور دکھ کے اس لمحے کی یاد کو کسک بنا کے سینے میں محفوظ کر لیتا ہے۔

یہ بھی ایسا ہی جذباتی کمزوری کا لمحہ تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ دو دستی بم اکبر خان کو واپس کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ شاید وہ ناگواری سے کہے گا۔ کیسے کاہل اور نااہل آدمی پر بھروسہ کر لیا تھا میں نے۔ چار دستی بم پھینکنے میں کتنی دیر لگتی ہے۔ غیر ذمے دار آدمی اس سے پہلے ہی مر گیا۔ میرا تو خیال ہے کہ کہیں چھپا بیٹھا ہو گا۔

غالب نے چلا کے کہا "کیا مردہ اجازت نہیں دے رہا ہے؟"

میں نے کہا "کچھ ایسی ہی بات ہے۔ تم دو منٹ رکو۔"

"اے بھائی۔ اے بھائی! کدھر جا رہا ہے منہ اُٹھا کے؟"

غالب میرے پیچھے دوڑا "پہلے ہی بہت دیر ہو گئی ہے۔"

میں نے کہا "اندھیر زیادہ ہے' دیر کم ہے۔"

بائیں طرف گھومتے ہی مجھے دو تہ خانوں کے روشن دان نظر آگئے۔ میں نے ایک دستی بم کی پن منہ سے کھینچ کے نکالی اور اسے پہلے روشن دان سے اندر پھینک دیا۔ میں دوڑ کر دوسرے روشن دان تک پہنچا ہی تھا کہ دھماکا ہوا اور پیر کیکر کے مزار کا سامنے والا حصہ منہدم ہوگیا۔ گرد اور غبار کا ایک بگولا اُٹھا جس میں غالب ذرا سی دیر کے لیے روپوش ہوا۔ میں نے دوسرا بم پھینکا اور واپس بھاگا اور غالب کا ہاتھ پکڑ کے جیپ کی طرف دوڑ لگائی۔

مزار کی مرکزی عمارت کے نیچے تہ خانے تھے اور جیسا کہ مجھے علم ہوچکا تھا' نیچے صرف مہمان خانہ ہی نہیں تھا' خلیفہ کیکر کا عشرت کدہ بھی تھا۔ دوسرے دھماکے نے وہ بنیاد ہی باقی نہ رہنے دی جس پر حجرۂ خاص قائم تھا۔ اور جب ہم نے جیپ کے پاس پہنچ کے پیچھے دیکھا تو اس ڈبا پیر کے مزار کی عمارت دھویں اور گرد کے مرغولے میں منہدم ہو رہی تھی۔ جیسے بڑا جہاز رفتہ رفتہ ڈوبتا ہے' ایسے ہی عمارت کا مرکزی گنبد والا حصہ گر رہا تھا اور یہ سین ایسا تھا جیسے فلموں میں سلوموشن میں دکھایا جاتا ہے۔ پہلے اس کی دیواریں زمیں بوس ہوئیں پھر گنبد سرنگوں ہوا اور اس کی پرفریب اور گمراہ کن بلندی دراڑوں سے بکھرنے لگی اور اس کی گولائی بے ہنگم ٹکڑوں میں بدل کر گرنے لگی۔ اس پر لہرانے والا گوٹے کی چمک والا تکونا پرچم جو سائیں کیکر شاہ کے دورِ اقتدار کی علامت تھا' خلیفہ کیکر سوم کے عہد میں سرنگوں ہو کے ملبے میں دفن ہوا۔

نازو اور غالب تعریفی اور مبہوت نظروں سے گرد و غبار اور دھویں کے اس طوفانی بگولے کو دیکھ رہے تھے جو کیکر شاہ کے جھوٹ' فریب' ظلم و جور' ناانصافی اور استحصال ہوس اور حرص کے ایوانِ رفعت کو خاک میں ملا چکا تھا۔

"یہ کام باقی رہ گیا تھا یار" میں نے کہا "اب چلو۔"

غالب سرہلا کے فاکس ویگن میں بیٹھ گیا "مس رابعہ جائز طور پر تمہاری مغفرت کی دعا کرچکی ہوں گی اور اس قبل از عقد بیوگی پر آٹھ آٹھ آنسو بہا رہی ہوں گی۔"

نازو نے کہا "نہ تم لوگ ایسے مرنے والے ہو اور نہ کوئی تمہیں رونے والا ہے' خوش فہمی ہے تمہاری۔"

"تم مجھے اتنا غصہ دلاتی ہو کہ...."

"کہ تمہارا جی چاہتا ہے سچ مچ مر جاؤ" نازو بولی۔

"نہیں۔ گولی مار دوں تمہیں اور تمہاری وصیت کے مطابق وعدہ کرلوں کہ آٹھ آٹھ آنسو بہاتا رہوں گا۔ گن کے آٹھ' نہ سات نہ نو" غالب نے کہا۔

"میں کیوں کروں گی ایسی وصیت؟ اچھی طرح معلوم ہے مجھے تم کتنے وفا شعار ہو۔ چہلم کے بعد پوچھو گے' نازو! کون نازو؟"

"یہ سراسر زیادتی ہے" غالب نے احتجاج کیا "چہلم تک انتظار نہیں کرسکتا میں۔"

مجھے نازو کی صورت دیکھ کے ہنسی آگئی "تم بڑی دکھی نظر آرہی ہو جیسے سچ مچ ایسا ہوچکا ہے۔"

درگاہ کے دائیں جانب جہاں سے کیکروں کا گھنا جنگل ... ہوتا تھا' رابعہ جیپ کے بونٹ پر بیٹھی تھی۔ دلاور کا گن ... فاصلے پر کھڑا اس کے حسن سوگوار کا نظارہ کر رہا تھا لیکن ... احساس نہ تھا۔ فاکس ویگن کو دیکھ کے اس نے چھلانگ ... ایک دم اس کا اداس چہرہ کھل اٹھا تھا۔

قریب ہی وہ کار بھی موجود تھی جس میں ہم نے رابعہ ... ساتھ نازو کو لاہور روانہ کیا تھا۔ اس کار میں اکبر خان پچھلی ... سیٹ پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ اس کے نادیدہ محافظ جو ... پُراسرار طور پر ہماری حفاظت کرتے رہے تھے' اب پھر نظر ... آرہے تھے۔

رابعہ واقعی سخت پریشان تھی اور اس کی ذہنی کیفیت کا ... اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ مجھے زندہ و سلامت دیکھ کر ... خود پر کنٹرول نہ رہا۔ یہ یاد نہ رہا کہ یہاں اور لوگ بھی ہیں ... دیکھ رہے ہیں۔ وہ دوڑ کے مجھ سے چمٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ ... رونے لگی۔ اس کے ہاتھ اور اس کی نظریں مجھے ٹٹولتی رہیں ... . تم ٹھیک ہو نا سکندر؟ کچھ ہوا تو نہیں تمہیں؟"

غالب آہ بھر کے بولا "جو ہونا تھا ہوگیا مس رابعہ۔ اب ... سے کیا ہوگا۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔"

رابعہ ایک دم الگ ہوگئی۔ جذبات پر اپنی بے اختیاری ... خیال سے اس کا چہرہ سُرخ پڑ گیا۔

نازو بھی مذاق اڑانے میں غالب کی ہمنوا ہوگئی "آ... ہوگا' یہ بھی بتادو۔"

غالب نے اسے حسرت سے دیکھ کے کہا "یہ تو تم بھی ... بتاسکو گی جب وقت آئے گا۔ بس تصویر دیکھتی رہو گی۔"

"کس کی تصویر' تمہاری.... خدا نہ کرے۔"

"بابا' بڑی خوب صورت فریم کی ہوئی تصویریں ملتی ہیں ... مثول' پیارے پیارے بچوں کی۔ ان کی بات کر رہا تھا میں۔"

"بے غیرت' بے شرم" نازو چلائی "ہوش کی دوا کرو۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا "ہوش کی دوا ہے کوئی تو اس پاگل ... کو بھی دو۔ کیا ہوگیا ہے تمہیں رابعہ؟"

وہ آنسو پونچھ کے اور نظر جھکا کے بولی "کچھ نہیں۔ میں ... تھی کہ کہیں تمہیں کچھ نہ ہوجائے۔ تم نیچے کیوں اُترے ... خانے میں؟"

اکبر خان کار سے اتر آیا "یہ کھیل تو ختم ہوا۔"

میں نے افسوس سے سرہلایا "تمہارے ایک جاں نثار ... واقعی حقِ نمک ادا کردیا۔ اس نے مجھے نکالا ورنہ میں بھی اندر ... دفن ہوجاتا۔ آخری دستی بم پھینکتے ہوئے وہ خود بھی مارا گیا ... نے تو اسے روکا تھا مگر وہ نہیں مانا کہ باس کا حکم ہے۔"

غالب میری صورت دیکھ رہا تھا اور میں اکبر خان کے لبوں پر احساسِ تفاخر کی مسکراہٹ دیکھ رہا تھا۔ اسے ایک وفادار کی جان جانے کا قطعی ملال نہیں تھا۔ فخر تھا اس بات پر کہ اس نے غلط آدمی کا انتخاب نہیں کیا تھا اور اسے اتنا عرصہ جاں نثاری کا جو معاوضہ دیا تھا وہ رائیگاں نہیں گیا۔ یہ جان تو آنی جانی ہے' اس جاں کی تو کوئی بات نہیں۔

میں نے ٹوہ لینے کے لیے کہا "اس کے بیوی بچے تو ہوں گے۔"

اکبر خان نے میری طرف حیرانی سے دیکھا "تم اس کے لیے اتنے جذباتی کیوں ہو رہے ہو؟ یہاں تو بہت لوگ مارے گئے' ان سب کے گھر تھے اور بیوی بچے تھے۔"

میں نے کہا "مگر انہوں نے میری جان نہیں بچائی تھی۔ وہ محسن تھا میرا۔"

"اس کے بیوی بچے اب میری ذمے داری ہیں۔ میں بہادر اور جاں نثار آدمی کی قدر کرتا ہوں۔ میں ایسا نہ کروں تو میرے لیے کسی پر بھروسہ کرنا مشکل ہوجائے۔"

"کتنا دو گے تم انہیں؟" میں نے کہا۔

اس کی صورت پر ناگواری آگئی "جتنا ضروری ہوگا اس سے زیادہ۔ ان کو زندگی میں کبھی تنگی نہیں ہوگی۔ وہ جیسے پہلے رہتے تھے ویسے ہی رہیں گے۔"

"اس آدمی کے بغیر بھی جو شوہر تھا اور بچوں کے لیے باپ بھی۔ اس کا بدل پیسہ ہوسکتا ہے؟"

"ہوسکتا ہے اور ہوتا ہے" اکبر خان نے برہمی سے کہا "ہر عورت مانتی ہے کہ اس کا شوہر کیا کر رہا ہے اور کیوں کر رہا ہے۔ اتنی ہی عزیز ہو اس کی جان تو وہ اس کو ساتھ لے کر کہیں چلی جائے۔ سب بیویوں کو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے شوہر کا ذریعۂ آمدنی کیا ہے۔ اس میں کتنا جائز ہے اور کتنا ناجائز۔ وہی اچھے گھر' اچھے کپڑے' شان اور آن کی خاطر مردوں کو آمادہ کرلیتی ہیں رشوت لینے پر۔ وہ قناعت نہیں کرتیں۔ مقابلے پر آجاتی ہیں ہر معاملے میں...."

"سب عورتوں کو الزام دے کر تم خود کو بے گناہ ثابت کرنا چاہتے ہو۔ خود مرد کیا خواہشات نہیں رکھتے؟" نازو بگڑ کے بولی۔

"سوری۔ میری مراد آپ سے نہیں تھی۔ یو سی ------ EXCEPTIONS ARE ALWAYS THERE مگر ہم عمومی بات کرتے ہیں۔"

میں نے کہا "یہ کون سا موقع ہے عمومی یا خصوصی موضوعات پر بحث کرنے کا؟"

غالب نے کہا "اب کس کا انتظار ہے؟"

"کسی کا نہیں' فوراً نکل جانا چاہیے ہمیں یہاں سے" اکبر خان نے کہا "وہ خبیث الزماں چور دروازے سے نکل بھاگا ہے اپنے حواریوں سمیت۔"

"کیا وہ واپس آئے گا؟"

"واپس کیوں نہیں آئے گا۔ اسے تو ہم نے موقع فراہم کردیا ہے تشہیر کا۔ وہ آس پاس کے گاؤں دیہات میں مریدوں کے جذبات بھڑکائے گا۔ میرے خلاف زہر افشانی کرے گا۔ علاقے کی پولیس اور حکام بالا سے رجوع کرے گا۔ راجا حق نواز اس کے ساتھ ہے۔"

"وہ بار بار کسی راجا کو اطلاع دینے کا کہہ رہا تھا۔"

"راجا حق نواز ایس پی ہے علاقے کا۔ وہ اس کا مرید ہے۔ اس کی بیوی تو سخت عقیدت مند ہے۔ خلیفہ نے ہی اسے اولاد کی نعمت دی۔" وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا "خلیفہ کیکر کی طاقت کم نہیں ہے یہاں۔ وہ اپنی جدی پشتی گدی سے کیسے دستبردار ہوسکتا ہے۔"

"یہ بھی ایک انڈسٹری ہے" میں نے اس سے اتفاق کیا۔

"مجھے افسوس ہے کہ خلیفہ نکل گیا۔ ابھی تو مجھے اس سے عاجز صاحب کے خون کا حساب لینا تھا۔" غالب بولا۔

"چلو یار زندہ صحبت باقی۔ پھر آئیں گے کبھی۔ جب اس کا بزنس جم چکا ہوگا" میں نے کہا۔

"میں آگے جیپ میں چلتا ہوں' تم لوگ پیچھے کار میں آؤ۔ فاکس ویگن چھوڑ دو۔" اکبر خان بولا۔

اب ڈرائیونگ مجھے کرنی پڑی۔ غالب نے مجھ سے پہلے ہی عذر پیش کردیا تھا "دادِ شجاعت دیتے ہوئے میں غازی سے شہید کے مرتبے پر فائز ہوتے ہوتے رہ گیا۔ زخموں سے چور ہوں۔"

میں نے کہا "دیکھنے میں تو پہلے سے زیادہ ہٹے کٹے لگ رہے ہو۔"

"اندرونی چوٹیں ہیں" غالب نے مکاری سے کہا "ویسے بھی اب تو میں اس سیٹ پر بیٹھ گیا تھا تم سے پہلے۔ اب تم مجھے اٹھا کے وہ تو کرو گے جیسی بزمِ ناز میں اپنے مرزا غالب کے ساتھ ہوئی تھی۔"

میں نے کار اسٹارٹ کرکے کہا "بزم ناز چاہیے غیر سے تہی' سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اُٹھا دیا کہ یوں۔"

رابعہ ہنسی تو نازو نے کہا "مجھے بھی مطلب سمجھاؤ تاکہ میں بھی ہنسوں۔"

غالب نے کہا "کیا ہم واپس وہیں جا رہے ہیں' اکبر اعظم کے محل میں؟"

"میں وہاں ایک منٹ نہیں رکنا چاہتی" نازو بولی۔

"ٹھیک ہے۔ ایک گھنٹا رک جائیں گے" غالب بولا۔

"اس سے پوچھیں تو سہی کہ اس نے ہمارے کندھے پر رکھ کے بندوق کیوں چلائی ہے؟" میں نے کہا "اس کو یقیناً خلیفہ کیکر کے ساتھ کسی پُرانی دشمنی کا حساب بے باق کرنا تھا۔ بہانہ اس نے مہمانوں کے ساتھ ہونے والی زیادتی کو بنالیا۔ حالانکہ اسے معلوم

ہو گیا ہے کہ ہم نے جھوٹ بولا تھا خلیفہ کے سامنے۔"

"کیسا جھوٹ بولا تھا؟" رابعہ نے کہا۔

"میں نے کہا تھا کہ تمہارے کیکر۔ خدا نخواستہ میرے منہ میں خاک۔ تمہیں اغوا کر کے لے گئے۔ اکبر خان نے پھر بھی نہیں پوچھا کہ اس جھوٹ کی کیا ضرورت تھی اور یہ جھوٹ ہے تو پھر سچ کیا ہے۔ کیا واقعی چھ آدمی آئے تھے رابعہ کو اٹھانے مگر تم نے چار کو بھاگنے پر مجبور کر دیا اور دو کو پکڑ لیا۔"

غالب بولا "اور جب گاڑی میں چار لاشیں ملیں گی تو اسے پتا چل جائے گا۔"

"تمہیں تو اس نے ایک اخبار کا خود مختار ایڈیٹر بنا کے ہمنوا کر لیا تھا" میں نے کہا "رابعہ کو اغوا کرنے کی ناپاک جسارت پر خلیفہ کیکر کو ایسی عبرتناک سزا دے کے اس نے گویا مجھے ممنون بنا لیا ہے۔ اصل بات کچھ اور ہے۔"

"اصل بات وہ تمہیں نہیں بتائے گا۔ شرط لگا لو" غالب نے کہا "یہی کہتا رہے گا کہ خلیفہ نے میرے گھر میں گھس کے میرے مہمانوں کی عزت پر ہاتھ ڈالا تھا۔ ایک پٹھان کو مہمان کی عزت جان سے زیادہ عزیز ہوتی ہے۔ اصل بات بعد میں معلوم ہو گی۔"

"تم نے میری بات سنی؟" نازو نے کہا "ہم یہاں نہیں ٹھہریں گے۔ سیدھے لاہور چلو۔"

"سیدھے تو نہیں جا سکتے۔ تم جو چاہو کر لو۔" غالب بولا۔

"آخر کیوں نہیں جا سکتے؟"

"اس لیے کہ بہت سے موڑ ہیں راستے میں" غالب نے سادگی سے کہا۔

میں نے کہا "تم سیدھی لاہور کیوں نہیں گئی تھیں؟ ابھی تک ہم نے یہ تو پوچھا ہی نہیں تھا۔"

"ہماری مرضی۔ کیوں نازو" رابعہ ہنسی۔

"بالکل ہماری مرضی۔ تم اپنی مرضی کرتے ہو تو ہم کیوں مانیں تمہاری بات۔ ہم نے کتنا سمجھایا تھا کہ کسی چکر میں مت پڑنا۔"

"یہ تقدیر کے چکر ہیں۔"

"تم نے ہمیں چکر دیا تھا۔ میں نے تو بتا دیا تھا رابعہ باجی کو کہ یہ اتنے سیدھے بھی نہیں ہیں جتنی کتے کی دم ہوتی ہے۔"

"میں نے ایک کتا دیکھا تھا جس کی دم ایک انچ تھی۔ بالکل سیدھی۔ باقی کٹ گئی تھی" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "مجھے خوشی ہے کہ آپ لوگوں نے ہمیں بالکل صحیح سمجھ کے اپنے ناقص العقل ہونے کا ثبوت فراہم کیا۔ ہم واقعی طے کر چکے تھے کہ خلیفہ کیکر کو چھوڑیں گے نہیں۔ اس سے پوچھیں گے ضرور کہ یہ اس کے ایما پر ہوا تھا تو کیوں؟"

"اس سے تو ہماری دور اندیشی ثابت ہوتی ہے" رابعہ نے احتجاج کیا۔

"دور اندیش ہوتیں تو نہ خود جاتیں' نہ ہمیں کہیں جانے دیتیں۔ اپنے ساتھ لے جاتیں" میں نے کہا۔

"واہ! کیا نکتہ پیدا کیا ہے استاد۔ ثابت کر دیا انھیں ناقص العقل" غالب نے خوش ہو کے مجھ سے ہاتھ ملایا۔

"ناشکرے ہو تم لوگ۔ ہم نے بچا لیا..."

"تم نے خاک بچایا" غالب بولا "کون سی توپ چلائی تم نے؟ کوئی کیکر اٹھا کے لے جاتا تو ساری عمر غالب کو یاد کر کے روتیں۔"

"روتی ہے میری جوتی۔ تم میں کون سے لعل لگے ہیں؟" نازو جل کر بولی۔

"میں خود لعل یمنی ہوں' کوہ نور ہیرا ہوں۔ تم ہو میرے پاؤں کی جوتی اور یہ اعزاز ہے تمہارے لیے۔" غالب بولا۔

میں نے فوراً مداخلت کی "مرزا جی! وہ اخبار فروش بڑا پُراسرار کریکٹر ہے۔ میں تو اسے تمہارے ساتھ دیکھ کے حیران تھا۔ وہ کہاں ہے؟"

"معلوم نہیں کس وقت غائب ہو گیا۔"

"وہاں کیا کر رہا تھا وہ؟"

"مجھ سے تو کہہ رہا تھا کہ کسی کے ساتھ آیا ہوں مگر میرا خیال ہے کہ وہ اکبر خان کے محافظوں کے ساتھ تھا۔ معلوم نہیں کیا چکر کر کے ان کے ساتھ ہی یہاں پہنچ گیا تھا۔ ہے پُراسرار۔"

"نام پوچھا تھا اس کا؟"

"اس نے تو کہا تھا کہ میں بیک وقت پیرزادہ بھی ہوں اور شہزادہ بھی۔ کیا مطلب ہو سکتا ہے اس احمقانہ بات کا؟ اس نے خلیفہ کیکر کے بارے میں بڑی تفصیلی معلومات فراہم کیں۔ یہاں کے نقشے سے وہ ایسے واقف تھا جیسے یہاں رہ چکا ہو حالانکہ گھر اس کا جوہڑ میں ہے۔"

"جوہڑ میں؟" نازو بولی۔

"اپنے کان کا میل صاف کراؤ۔ جوہڑ کہا تھا میں نے۔ ہے ایک محلّہ۔ وہاں اپنے ماں باپ کے ساتھ رہتا ہے۔ باپ کا ذہنی توازن کچھ ٹھیک نہیں ہے اور ماں معذور ہے۔"

"کیا معذوری ہے؟" میں نے کہا۔

"دونوں ٹانگیں بیکار ہیں۔"

"پیدائشی طور پر؟"

"نہیں۔ ایک حادثے میں ریڑھ کی ہڈی متاثر ہوئی تھی۔ مہرے ٹوٹ گئے تھے یا سرک گئے تھے۔ اخبار کے معاملے میں دلچسپی تھی اس کی۔ میں نے بتایا کہ برخوردار وہ مذاق کی بات تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ بھی رپورٹر ہو سکتا ہے۔ عجیب بات کی اس نے۔ کہنے لگا میں ایک بہت بڑی اسٹوری لاؤں گا اخبار کے لیے۔ اکبر خان کے بارے میں۔"

"پھر تم نے معذرت کر لی؟"

"ظاہر ہے۔ میں نے کہا کہ سب سے پہلے وہ شاخ کیسے

[...] آشیاں بندی کر رہے ہیں۔ وہ تھوڑا سا مایوس ہوا پھر دیں جس پر [...] کرنے لگا۔ میں نے پھر پوچھا تو اس نے اپنا نام شان تمہاری باتیں [...] بتایا۔ اس کی تصدیق اکبر خان نے کی۔ اس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ یہ اخبار والا لڑکا شان تم سے کیا باتیں کر رہا تھا۔"

"ایسے ہی پوچھا اس نے یا وہ کچھ پریشان ہوا تھا شان کو دیکھ کر؟"

"اگر ہوا تو اس نے مجھ پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ جب ہنگامہ شروع ہوا تو مجھے اس کا خیال نہیں رہا۔ نہ جانے کس وقت غائب ہو گیا۔"

"مارا تو نہیں گیا بے چارہ؟"

"نہیں' میں نے اچھی طرح دیکھ لیا تھا ہر جگہ" غالب نے کہا۔

"اس سے ملنا ضروری ہے۔ اس نے کچھ کام کی باتیں بتانے کا وعدہ کیا تھا۔ یاد ہے نا؟" میں نے غالب کو آنکھ ماری۔

"یہ کیا گڑبڑ اور بدمعاشی ہے۔ رابعہ باجی! یہ لوگ ایک دوسرے کو آنکھیں مار رہے ہیں۔"

"اور کیا ماریں؟ لاتیں' مکے؟" غالب نے کہا۔

"ویسے بھی آنکھ مارنے میں کیا بدمعاشی کا پہلو ہے؟" میں نے کہا "یہ خود دیکھنے والے کی نظر کا قصور ہے۔"

"اور دماغ کا فتور ہے" غالب بولا "حق تلفی ہوئی ہے کسی کی تو میں دس بار اسے سب کے سامنے آنکھ مار سکتا ہوں۔"

"تم کچھ کہہ رہے تھے غالب سے لیکن اس کا مطلب کچھ اور تھا۔" نازو نے کہا۔

"اچھا! تم نے سمجھ لیا۔ ماشاء اللہ بہت سمجھدار ہو" میں نے کہا "دراصل اس اخبار والے نے کہا تھا کہ وہ ہیما مالنی اور زینت امان کے گھر کا پتا دے گا اور ہم بھاگ جائیں گے بمبئی۔ میں اور غالب۔"

"اور پردہ سیمیں پر جلوہ گر ہوں گے انہی کے ساتھ۔"

"کیا بات ہے ہیما مالنی کی" میں نے کہا "ساری اردو شاعری اس پر قربان۔"

"اور جواب نہیں زینت امان کا۔ مصوری کے سارے رنگ اس کے سراپا کا ایک نقش نہیں کھینچ سکتے۔"

"جاؤ جاؤ" نازو بولی "ہمیں کیا' سنا رہے ہو۔ ہم نے پہلے روک رکھا تھا کیا۔"

"تم تو کیا' وہ جو بھوت ہے نا میرا سسر' وہ بھی روکے تو میں اسی دن یوں چھٹی کر دوں اس کی" غالب نے چٹکی بجائی۔

"داماد صاحب' وہ تمہیں لے جائے گا بھوت بنا کے اپنے ساتھ۔"

غالب نے سر ہلایا "ہاں تمہیں زیادہ علم ہو گا والد مرحوم کی عادات و اطوار کا۔ تم بھی تو چمٹ گئی ہو بلا بن کے مجھ سے۔"

"سکندر! دیکھو اب اس نے بھوت کہا ہے میرے ابا کو تمہارے سامنے" نازو نے بگڑ کے کہا۔

"میں نے نہیں' خود تم نے کہا ہے۔"

"کیا میں بلا بن کے چمٹی ہوں تم سے؟" اس نے روہانسی آواز میں کہا۔

"ہاں۔ مگر خوب صورت بلا بن کے" غالب نے فوراً پٹڑی بدل لی "اور کیا فرق ہے۔ مقناطیس لوہے سے چمٹے یا لوہا مقناطیس سے۔ چھری گرے خربوزے پر یا خربوزہ گرے چھری پر۔"

"خربوزے ہو تم واقعی۔ ذرا سی دیر میں لڑھک جاتے ہو۔"

"اور تم وہ چھری ہو جس نے مجھے حلال کر دیا ہے۔ مگر اس کے باوجود۔ آہ زینت امان" غالب بولا "اور واہ زینت امان۔"

ایک بار پھر ہم اکبر خان کے گھر پہنچے تو کھانے کے بعد نازو نے ضد شروع کی "بس اب نکل چلو۔"

رابعہ نے اس کا ساتھ دیا "وہاں سب پریشان ہوں گے۔"

غالب نے کہا "یار! اتنی جلدی کیا ہے۔ منظر کو فون کر لیتے ہیں۔ ذرا اپنے اکبر خان سے مذاکرات کا ایک راؤنڈ اور ہو جائے' اخبار کا معاملہ فائنل ہو جائے۔"

"لاہور سے فون کر لینا" نازو بولی "مجھے لگتا ہے کہ ہم یہاں رکے تو اور کچھ ہو جائے گا۔"

رابعہ نے کہا "اکبر خان کا کیا ہے' لندن بھاگ جائے گا۔ ہم نے خلیفہ کیکر کی خانقاہ کو تباہ کر کے اپنے دشمنوں میں ایک اور خطرناک دشمن کا اضافہ کر لیا ہے۔"

میں نے کہا "یہ تو ٹھیک کہتی ہو تم۔ مجھے بات اس حد تک بڑھ جانے کی اُمید نہیں تھی۔ نہ میں ایسا چاہتا تھا۔"

"یہ سب اکبر خان نے کرایا ہے۔ اس نے عزت کا مسئلہ بنا کے بات کو بڑھا دیا اور ہمیں آگے کر دیا۔ اس کے محافظوں نے فائرنگ شروع کی اور دستی بم پھینکے۔ معاملے کو اتنا بگاڑنے والے وہی تھے مگر نام ہمارا لیا جائے گا۔ میں تو یہ سوچنے پر مجبور ہوں کہ گزشتہ رات جو لوگ آئے تھے یہ بھی اکبر خان کی سازش تھی۔ اسی لیے وہ خود غائب ہو گیا تھا۔"

میں نے کہا "کبھی کبھی تم اتنی عقلمندی کی باتیں کرنے لگتی ہو کہ میں سوچتا ہوں' اپنی رائے پر نظر ثانی کروں۔"

"نہیں' تم سمجھتے رہو ہمیں ناقص العقل" نازو بولی۔

"رائے سکندر بدل رہا ہے' میں اپنی رائے پر قائم رہوں گا۔ جب تک تم بھی کوئی عقل کی بات نہیں کرو گی' خواہ غلطی سے کرو۔"

"تم جیسے کسی احمق کے سامنے عقل کی بات کرنے سے فائدہ؟"

"یار' یہ لڑائی مت شروع کرو۔ ذرا سنجیدگی سے صورت حال پر غور کرو۔ ہمیں واقعی یہاں سے نکل جانا چاہیے" میں نے کہا

"ایک تو استاد پیڈرو کو معلوم ہے کہ ہم یہاں ہیں۔ میں دوبارہ اس شخص کی صورت دیکھنا نہیں چاہتا۔ کیا پتا دلاور کی دشمنی میں اس نے خلیفہ کے ساتھ مل کے یہ سب کیا ہو۔"

"اسے کیا فائدہ ہوگا؟"

"ایک احسان تو اس نے یہ کیا کہ ہمیں آزاد کرادیا۔ دوسرا احسان اکبر خان کی معرفت یہ کیا کہ ہمیں ایک اخبار نکالنے کا منصوبہ پیش کردیا۔ اس پیش کش کو ہم ٹھکرا بھی نہیں سکتے۔ اس نے اکبر خان کی مدد کی' اسے وہ کرائے کے بدمعاش فراہم کیے جو درحقیقت کیکر نہیں تھے۔ وہ خلیفہ کے ... نہیں تھے۔"

غالب بولا "فرض کرو انہوں نے سچ بولا تھا خلیفہ کے سامنے۔ پھر یہ جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی کہ ہم نے انہیں راہ چلتے اُٹھالیا تھا؟"

"اور کیا وہ اعتراف کرتے کہ اکبر خان کے گھر میں گرفتار ہوئے تھے؟ پھر تو انہیں باقی ساتھیوں کے بارے میں بھی سب کچھ بتانا پڑتا۔ جب وہ باتھ روم میں بند تھے تو انہوں نے متوقع حالات کے پیشِ نظر ایک کہانی بنالی تھی اور انہوں نے اتفاق رائے سے خلیفہ کے سامنے ایک ہی بات کی۔ میرا خیال ہے ان کو خود اکبر خان کے محافظوں نے ماردیا ہوگا۔ وہ بھاری معاوضے کے لالچ میں آئے ہوں گے۔ ممکن ہے انہیں ایڈوانس ادائیگی بھی کردی گئی ہو' اس یقین دہانی کے ساتھ کہ ان کا کام بہت آسان ہوگا۔ چھ مسلح افراد کی راہ دو غیر مسلح افراد کیسے روک سکتے ہیں۔ گھر کے اندر انہیں کسی ملازم کی طرف سے مزاحمت کا سامنا نہیں ہوگا مگر افشائے راز سے پہلے ہی ان کو ختم کرنا ضروری تھا۔"

"رائٹ" غالب نے کہا "بات سمجھ میں آتی ہے۔ اسی لیے چوکیدار بھی نہیں تھا۔"

"اکبر خان تو کہتا ہے کہ وہ مارا گیا" رابعہ نے کہا۔

"مارا گیا تو اس کی لاش کہاں ہے؟ اکبر خان کو فکر کیوں نہیں ہے اس کی۔ نہ اس نے کسی سے کہا کہ چوکیدار کو تلاش کریں' نہ رپورٹ لکھوائی اور نہ پولیس کو بتایا" نازو نے کہا "سب کچھ اس نے بہت سوچ بچار کے بعد' ہر تفصیل پر غور کرنے کے بعد پلان کیا ہوگا مگر ایسی ہی کوئی نادانستہ بھول ہر مجرم سے ہو جاتی ہے۔"

غالب بولا "سچ کہتی ہو عزیزہ۔ زندگی میں ایک ایسی ہی بھول مجھ سے بھی ہوئی تھی۔ بھگت رہا ہوں آج تک۔"

"غالب!" میں نے اسے ٹوکا "سنجیدہ بات ہو رہی ہے۔"

"اوہ۔ سوری' میں سنجیدہ کے بجائے رنجیدہ ہوگیا تھا۔ خیر آپ اپنا بیان جاری رکھیں مس نازو۔"

میں نے کہا "اب ذرا شروع سے سلسلۂ حالات اور واقعات پر غور کرو تو کڑیاں آپس میں ملتی نظر آتی ہیں۔ دلاور نے پبلک لائف میں اپنا امیج بنانے کے لیے جو حکمتِ عملی مرتب کی ہے اس کے مطابق یہ اشد ضروری ہے کہ سب سے پہلے وہ پرانے دشمنوں کے خطرے کا سدباب کرے جو اس کے بارے میں سب باتیں جانتے ہیں۔ ایسی باتیں جو کوئی اور نہیں جانتا۔ اس کے یہ ... یعنی ہم بلیک میلر تو ہیں نہیں کہ اس کے ماضی کی ہر خامی' کمزوری' غلطی' گناہ یا جرم کے بارے میں اپنی زبان بند رکھنے کی قیمت طلب کریں۔ ہم قابلِ خرید بھی نہیں ہیں کہ وہ منہ مانگی قیمت دے اور ہمیں اپنا ہمنوا بنالے۔ ایسی صورت میں مصالحت کی پیش کش واحد طریقہ تھا جس کے لیے اس نے ایک منصوبہ بنایا۔

اس نے لاہور سے پشاور تک استاد پیڈرو کو ہمارے پیچھے ... اور اس کے دو مقاصد پورے ہوئے۔ اس نے ہمیں ہراساں ... اور ہمارا سُراغ گم نہیں ہونے دیا۔ پیڈرو نے پشاور میں ہم پر ... قاتلانہ حملوں کا ناٹک کیا۔ یہ احتیاط ملحوظ رکھتے ہوئے کہ ہم ... خراش بھی نہ آئے۔ وہاں بیچ میں آگیا آصف علی۔ آصف علی کا ... اس نے فوراً کاٹ دیا اسے دہشت زدہ کرکے اور ناٹک کا دوسرا ... سین خود چوہدری دلاور نے پیش کیا۔ ہمیں اغوا کرکے آصف علی کے گھر سے اُٹھوالیا گیا' آصف علی کی بیوی اور معذور ... سمیت۔ دلاور نے ہم سے براہِ راست بات کی۔ ہمیں یقین دلایا کہ سارا حرامی پن استاد پیڈرو کا تھا۔ وہی میرے والد وزیر خان کا قاتل تھا اور اسے میرے حوالے کیا جاسکتا ہے بشرطیکہ ہم اس کی مخالفت چھوڑ دیں۔ وہ پبلک لیڈر بننا چاہتا ہے اور اپنے بدنام ماضی کو دفن کرنے کا فیصلہ کرچکا ہے۔ اسے ہماری ہر شرط منظور تھی۔ وہ مستقبل کی نیک نامی کی گارنٹی چاہتا تھا۔ ہمیں اس بات کا یقین دلانے کے بعد کہ اب اس کے اور ہمارے درمیان دشمنی کا مسئلہ ختم اور مصالحت کی کوشش کے آغاز کے طور پر اس نے ہمیں ایک قیمتی کار تحفے میں دے کے عزت کے ساتھ رخصت کیا۔

چوہدری دلاور نے واضح کیا تھا کہ اب وہ استاد پیڈرو جیسے بدنام زمانہ اور بدکردار لوگوں سے تعلق نہیں رکھ سکتا اور نہ پُرانے دھندے جاری رکھنا چاہتا ہے۔ اسے ضرورت بھی نہیں کیونکہ وہ بہت کما چکا ہے اور اب یہ کمائی خدمتِ خلق اور ملک و قوم کی نذر ہے۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف۔ انتخابات میں حصہ لینا تو بس ملک کی محبت اور قوم کے درد کا نتیجہ ہے۔ ہوس جاہ وغیرہ کچھ نہیں۔ اتنا تو دلاور سمجھتا تھا کہ ہم آنکھیں بند کرکے اس کی بات کا یقین کرلینے والے بہرحال نہیں ہیں۔

اب تیسرے سین میں نمودار ہوتا ہے استاد پیڈرو۔ اس نے پوری زندگی کی مظلومیت' تلخئ حالات' نفرت انگیز ماحول سے ملنے والے احساسِ محرومی کو اپنی مجرمانہ زندگی کا سبب بتا کے ہماری ہمدردی سمیٹی۔ یہ بتایا کہ اسے دلاور نے بھی دھوکا دیا۔ پہلے اس نے ہر غلط کام لیا' اب خود قوم کا لیڈر بننا چاہتا ہے تو پاکیزگی کا لبادہ اوڑھ لیا ہے اور اسے دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکا ہے۔ اس نے ہمیں دلاور کے خلاف اشتراک کی پیش کش کی۔ اس نے کہا کہ مجھے بھی جینا ہے اور تمہیں بھی۔ ہمارے خلاف ایک طاقتور دشمن ہے تو کیوں نہ ہم مل کے اس کا مقابلہ کریں۔

پیڈرو نے دلاور کے الزامات کی تردید کردی اور اُلٹا یہ ثابت کیا کہ خود چوہدری دلاور نے وزیر خان کی المناک موت کے حالات پیدا کیے تھے اور اصل مجرم وہی ہے۔ وہ اس کا ثبوت فراہم کرے گا۔ اپنی نیک نیتی ثابت کرنے کے لیے اس نے ہمیں آپس میں ملوادیا۔ بقول اس کے' تم دلاور کی قید میں تھے اور اسے علم تھا کہ ہمیں کہاں رکھا گیا ہے۔

چوہدری دلاور نے طے شدہ پروگرام کے مطابق ہمیں خلیفہ کیکر کی خانقاہ تک پہنچایا۔ اکبر خان ویسے تو انکار کرتا ہے کہ چوہدری دلاور اس کا بھائی نہیں ہے۔ اس کا بھائی دلاور خان تھا اور وہ مارا گیا تھا۔ اب تضاد ملاحظہ ہو۔ اکبر خان کے بارے میں استاد پیڈرو نے بتایا تھا کہ اسے دلاور نے غرق کردیا تھا۔ اکبر خان کہتا ہے کہ غرق ہونے والا دلاور تھا۔ سوال یہ ہے کہ وہ کون سا دلاور تھا؟ چوہدری دلاور یا اس کا بھائی دلاور خان؟ اور وہ دلاور خان تھا تو پھر یہ چوہدری دلاور پشاور کے قریب ایک چھوٹے سے گاؤں کے قبرستان میں والدین کی قبر پر کیوں حاضری دیتا ہے؟ کیوں اس نے وہاں ایک مسجد بنوائی ہے؟ اگر یہ کوئی اور دلاور ہے تو پھر اکبر خان کے گاؤں میں اس کے باپ سے ملنے کیوں گیا تھا اور اس کی موت کے بعد جنازے میں کیوں شریک ہوا تھا؟ جنازے میں یا شاید سوئم میں۔ ظاہر ہے وہ دلاور ہی کا باپ تھا۔ اگر میں تصویر دکھاؤں گا تو آصف علی بھی پہچان جائے گا اور اس گاؤں میں بہت سے لوگ ہوں گے جو دلاور خان کو چوہدری دلاور کی حیثیت سے بھی پہچان لیں گے۔

ساری بات بہت واضح ہے۔ چوہدری دلاور اور اکبر خان دونوں سگے بھائی ہیں جن کا باپ لکڑی کا کام کرنے والا ایک ہنرمند مگر غریب اور گمنام آدمی تھا۔ کسی مشترک مقصد کے تحت وہ آپس کے اختلافات بھلا کے پھر مل گئے ہیں۔ چوہدری دلاور نے اکبر خان کو ٹپ دی ہوگی کہ خلیفہ کیکر کی خانقاہ سے سب بندے اٹھالو' خرید لو۔ براہِ راست قیمت ادا کرکے تو یہ کام کیا نہیں جاسکتا۔ ان پر احسان کرو' ان کے ساتھ کوئی نیکی کرو' انہیں سلیقے سے رشوت دو۔ مثلاً وہ سب پڑھے لکھے' خبطی قسم کے لوگ ہیں۔ ان کو لائن دو اخبار کی۔ اخبار نکالو اور معاشرے سے لڑو۔ انہیں بہت شوق ہے معاشرے کی اور ساری دنیا کی اصلاح کا۔ یہ کہو کہ چوہدری دلاور جیسے لوگوں کے خلاف جہاد میں تم ان کے ساتھ ہو۔ دامے درمے سخنے۔ یعنی جان اور مال کے ساتھ اور اصولی طور پر۔

ہم ٹریپ ہوگئے۔ اکبر خان بہت بڑا اور ذہین شکاری تھا۔ اس کے ساتھ مل گیا دلاور جیسا پرانا شکاری۔ آپس میں مل کے انہوں نے ایک تیر سے دو شکار کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ بعد میں معلوم ہوگا کہ انہیں خلیفہ کیکر کو اپنے راستے سے ہٹانے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی تھی۔ لیکن یہ کام انہوں نے ہمارے ذریعے کیا۔ بندوق ہمارے کندھے پر رکھی۔ پیڈرو نے اناڑی قسم کے بدمعاش فراہم کیے۔ دلاور نے معاوضہ ادا کیا۔ انہوں نے کہا کہ ہم کیکر ہیں اور ہم رابعہ کو اُٹھانے آئے ہیں۔ جیسے میں نے خلیفہ کی آنکھوں میں ہوس کی چمک دیکھ لی تھی' ایسے ہی اکبر خان نے بھی دیکھی ہوگی۔ اس نے جعلی کیکروں کو سمجھایا کہ وہ رابعہ کو اُٹھالیں۔ خود کو کیکر کہیں۔ جیوے کیکر کے نعرے لگائیں اور اس کام کا معاوضہ اتنا بڑا ہوگا کہ وہ تیار ہوگئے۔

اب مجھے یقین ہے کہ اکبر خان اور دلاور نے ان حملہ آوروں کو بھی غلط فہمی میں مروادیا۔ انہیں یقین دلایا کہ مزاحمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن خود انہیں معلوم ہوگا کہ وہ مارے جائیں گے۔ ہم کو جتنی اچھی طرح دلاور جانتا تھا' وہ جعلی کیکر نہیں جانتے تھے۔ انہیں یہ بھی غلط بتایا گیا کہ ہم مسلح نہیں ہوں گے۔ نوکروں سے شاید کہا گیا ہوگا کہ آج رات کوئی زبردستی گھر میں گھس آئے تو شور ہنگامہ مت کرنا۔ وہ حکم کے غلام' ان کی کیا مجال جو پوچھیں کہ آنے والے کون ہوں گے اور کیا کریں گے۔ قاضی کے گھر کے چوہے ہیں نا۔ سیانے تو تھے۔ خاموشی سے لیٹے رہے۔

مارے گئے وہ بے چارے جن کو دولت کی چمک نے اندھا کردیا تھا۔ انہیں بدمعاش ہونے کا زعم بھی ہوگا اور پیسہ بھی بہت مل رہا تھا ایک معمولی سے کام کا۔ یہ تو کام میں ہاتھ ڈالنے کے بعد پتا چلا ہوگا کہ وہ پھنس گئے ہیں۔ چار مارے گئے' دو پکڑے گئے۔ اکبر خان نے ان کو شکوہ شکایت کا موقع ہی نہیں دیا اور نہ ان کی سُنی۔ ان کے ہاتھ پیر باندھ کے اسی طرح مہرِ لب خلیفہ کے سامنے لے جایا گیا۔ وہاں بھی انہوں نے بعد کے خطرات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اکبر خان یا دلاور خان پر کوئی الزام نہیں عائد کیا۔ انہوں نے ہمیں مجرم بنادیا۔ وہ کیکر تھے ہی نہیں تو خود کو کیکر کیسے مانتے۔ خلیفہ کیکر خود اکبر خان کے پھیلائے ہوئے جال میں گرفتار ہوگیا۔ وہ طے کرکے گیا تھا کہ اس کی جعلی خانقاہ کی اینٹ سے اینٹ بجادے گا اور اس کی تیاری پوری تھی۔ اس نے بہانہ بنالیا کہ تم نے رابعہ کو اٹھوانے کے لیے میرے گھر میں اپنے مریدوں کو بھیجا اور میں پٹھان ہوں' مہمان کی عزت پر ہاتھ ڈالنے والے کی ایسی تیسی کرنا میرا فرض ہے۔

اس نے یہ فرض پورا کیا اور اب صورتِ حال یہ ہے کہ ہم ہر طرف سے چوہدری دلاور' استاد پیڈرو اور اکبر خان کے دوستانہ رویئے اور احسانات سے زیرِ بار ہیں۔ تم اخبار کی پیش کش قبول کرچکے ہو۔ خلیفہ کیکر کے سارے مرید بھی ہماری جان کے بدترین دشمن ثابت ہوں گے۔ ایسے لوگ جو روحانی عقیدت رکھتے ہوں' بڑے جنونی ہوتے ہیں اور پیر صاحب کے حکم کے بغیر بھی ان کی خاطر جان دینے کو عین سعادت تصور کرتے ہیں۔ ان میں نہ جانے کتنے ایسے ہوں گے جو ہمیں مار کے "جیوے کیکر" کے نعرے لگاتے

پھانسی چڑھ جانا پسند کریں گے۔ ہمارے لیے ایسے حالات پیدا کردیے گئے ہیں اور آگے بھی پیدا ہوں گے کہ بالآخر ہمارے لیے چوہدری دلاور سے مصالحت ناگزیر ہوگی۔ ہم اکبر خان کا سہارا لیں گے یا استاد پیڈرو سے مل جائیں گے۔ یہ ایک مثلث ہے' ہم اس تکون کے کس کونے پر قدم رکھیں گے یہ فیصلہ ہونے تک کچھ نہیں ہوگا۔ استاد پیڈرو' دلاور اور اکبر خان خاموشی سے نتائج کا انتظار کریں گے۔ ہمیں اگلی چال چلنے سے پہلے بہت سوچنے کی ضرورت ہے۔ طریقِ جنگ دو ہی ہیں۔ کھلی جنگ یا گوریلا جنگ۔ مگر ایک تیسرا طریقہ وہ ہے جس میں جنگ کسی کو نظر نہیں آتی' محسوس بھی نہیں ہوتی لیکن جاری رکھی جاسکتی ہے۔ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے اسی جنگ کا فلسفہ ہے۔"

میں نے کھل کے واقعات اور حالات کا تجزیہ کردیا تھا اور وہ سب کہہ دیا تھا جو میرے دل میں تھا لیکن یہی سب کچھ دوسروں کے دل میں بھی تھا۔ مختلف خیالات اور نظریات' احساسات اور اندیشوں کے غیر مربوط ٹکڑے تھے جن کے بارے میں سب سوچتے تھے۔ بہت سی باتیں ذہن میں آتی ہیں لیکن وہم' شک یا وسوسے' غیر مبہم خیال کا عکس بن کے اور منتشر پرچھائیوں کی طرح۔ ہر ایک کے پاس JIG SAW PUZZLE کا ایک پیس تھا جو آپس میں سیٹ ہو کر ایک مکمل تصویر بناتے ہیں۔ میں نے انہیں جوڑ دیا تھا اور اصل صورتِ حال امکان کی حد تک واضح ہو کے سامنے آگئی تھی۔

اس وقت جب میں اپنا تجزیہ پیش کررہا تھا' غالب بڑی سنجیدگی سے غور و فکر میں ڈوبا ہوا تھا اور ایک ایک لفظ کو اپنے ذہن میں پرکھ رہا تھا' تول رہا تھا اور جانچ رہا تھا۔ اس کے مثبت اور منفی پہلو دیکھ رہا تھا اور اس سے حاصل ہونے والے نتائج کا موازنہ اپنے است... سے کررہا تھا۔ خود نازو بھی پوری طرح متوجہ تھی اور یہی وجہ تھی کہ کسی بھی جگہ غالب اور نازو نے اختلاف رائے نہیں کیا اور اس اختلاف کو بنیاد بنا کے ایک دوسرے سے لڑنا نہیں شروع کیا۔ ان سب سے الگ ردِّعمل رابعہ کا تھا جو محویت کے ساتھ ایک پُرمسرت احساسِ تفاخر کے ساتھ مجھے یوں دیکھ رہی تھی جیسے کوئی اپنے گھر میں آویزاں مصوری کے کسی شہکار پر زبان سے کچھ نہ کہے مگر جذبات سے بتادے کہ یہ تخلیق چغتائی یا زین العابدین کی سہی مگر ہے تو میری۔

ایک انتہائی سنجیدہ ماحول میں انتہائی نازک اور اہم موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے میں نے رازداری کے بنیادی اصولوں کو نظرانداز نہیں کیا تھا۔ میں نے کئی بار کھڑکی کھول کے نیچے جھانکا اور بند دروازے کے باہر کوریڈور میں دیکھا کہ اکبر خان یا اس کا کوئی جاسوس تو ہماری باتیں نہیں سُن رہا ہے۔ اس کمرے میں خفیہ مائیکروفون کی موجودگی کے امکان کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا تھا مگر خصوصی آلات کے بغیر ان کا سُراغ لگانا محال تھا۔ کمرے کی آرائش کے اسباب میں ہمارے سامنے ایسی کوئی چیز نہیں تھی جس پر شک کیا جاسکتا۔ اس کے باوجود ہم سر جوڑے بیٹھے تھے اور ہر کوئی تقریباً سرگوشی میں بول رہا تھا۔

میرے تجزیے سے کسی کو اختلاف نہیں تھا۔

نازو نے تو سب سے پہلے دو ٹوک الفاظ میں کہہ دیا "مجھے تم سے سو فیصد بلکہ ایک سو ایک فیصد اتفاق ہے اور اسی لیے میں کہہ رہی ہوں چلو۔"

رابعہ نے کہا "تم کیا کہتے ہو غالب؟"

"میں اپنی ذاتی عقل رکھتا ہوں اس لیے فوراً اتفاق نہیں کرسکتا مس نازو کی طرح" غالب نے کہا۔

"تم اختلاف کرہی نہیں سکتے" نازو نے کہا۔

"کیوں نہیں کرسکتا۔ زبردستی ہے؟" غالب نے تیوریاں چڑھا کے کہا۔

نازو نے آستین چڑھالی "ہاں ہے۔ تم اختلاف کرکے دکھاؤ اگر ہمت ہے تو۔ کوئی جمہوریت نہیں ہے یہاں۔"

"تمہاری حکومت بھی نہیں ہے۔"

"ہے۔" نازو نے چلّا کے کہا "ایسے نہیں مانوگے تو پہلے میں روٹھ جاؤں گی پھر رونے لگوں گی زار و قطار۔"

"آگئیں نا عورت کے اوچھے ہتھیاروں پر مگر تمہارے آنسوؤں سے میں بلیک میل نہیں ہوسکتا۔ رو کے بھی دیکھ لو۔"

"میں رُلا کے کیوں نہ دیکھ لوں" وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

میرے روکنے سے پہلے اس نے چھلانگ لگائی۔ غالب بیڈ کے نیچے گھس گیا اور شور مچانے لگا "یار' یہ کیا غنڈہ گردی ہورہی ہے سکندر۔ پاگل پن کا دورہ پڑگیا ہے اس بھوت کی بچی کو۔ ایمان سے میرے سسر تو ایسے شریف النفس بھوت ہیں۔ میں آج ہی نوٹس دے دوں گا انہیں کہ مجھے تو معاف کرو۔ شاہ جنات کے لیے باندھ اسے۔"

نازو بیڈ کے نیچے بھی گھس جاتی مگر میں اور رابعہ درمیان میں حائل ہوگئے تھے چنانچہ غالب نیچے سے ہی بولتا رہا۔

"آخر کب تک نہیں نکلوگے باہر؟" نازو نے کہا۔

"نکلوں گا جب تم معافی مانگوگی ہاتھ جوڑ کے' ناک رگڑوگی میرے جوتوں پر۔ ورنہ صورِ اسرافیل پر بھی نہیں نکلوں گا۔" غالب بولا۔

میں نے نازو کو ایک طرف ہٹادیا "چلو اتنا غصہ کافی ہے۔"

رابعہ نے کہا "اس نے تو خود ہی ثابت کردیا کہ تم سے کتنا ڈرتا ہے۔"

"ارے بابا' باؤلے کتے اور بھوت سے تو ہر شریف آدمی ڈرتا ہے" غالب نے نیچے سے نکل کے کہا "نازو تو پکی سہیلی ہے میری اس سے کون ڈرتا ہے۔ ہمارا آپس میں مذاق چلتا ہے۔ کیوں نازو جیسے تم میری سہیلی ہو ایسے ہی میں تمہارا بوائے فرینڈ ہوں' ہوں کہ نہیں؟"

نازو ہنس پڑی "بہت ڈھیٹ ہو تم بھی۔"

"بھی کا مطلب ہے کہ سکندر تو خیر ہے۔"

شام تک تقریباً تین گھنٹے سے ہم اپنے کمرے میں تھے اور یوں لگتا تھا جیسے اتنی بڑی کوٹھی میں بس ہم ہی ہیں' ہمارے سوا کوئی بھی نہیں ہے۔ نہ ہمارے میزبان کا کچھ پتا تھا' نہ کسی نوکر نے آکے جھانکا تھا۔ مجھے اور غالب کو چائے کی سخت طلب محسوس ہورہی تھی۔ رابعہ اور نازو نے ہماری خواہش کی تکمیل سے صاف انکار کردیا۔

"یہ کوئی منظر کا یا یوسف کا گھر نہیں ہے کہ میں اپنا گھر سمجھ کے گھس جاؤں کچن میں اور چائے بنالاؤں۔" نازو نے کہا۔

"مجھے تو ڈر لگتا ہے۔ عجیب آسیب زدہ اور پُراسرار قسم کا ماحول ہے" رابعہ بولی "اتنے بڑے گھر میں رونق کے آثار تک نہیں۔ قبرستان جیسی خاموشی رہتی ہے ہر وقت۔ گھر میں گھر والے نہ ہوں تو وہ مکان ..... نہیں' بھوتوں کا ڈیرہ لگتا ہے۔ آخر اس شخص کا گھر کہاں ہے؟"

"کچھ لوگ گھر کا روگ نہیں پالتے۔ تمہاری مراد بیوی' بچوں والے گھر سے ہے نا؟" غالب نے کہا "خاندان' محلّہ' شہر' وطن' ان کا کسی سے کوئی جذباتی تعلق نہیں ہوتا۔ ساری فکروں سے آزاد رہتے ہیں۔"

"یہ بھی کوئی زندگی ہے" رابعہ نے کہا۔

"اپنا اپنا اندازِ فکر ہے۔ اکبر خان شاید ان سب کی زندگی کو روایتی قیدِ شریعت سمجھتا ہوگا جو اپنی آزادی کو بہ رضا و رغبت اور بقائمی ہوش و حواس صرف ایک عورت اور اس کی پیداوار پر قربان کردیتے ہیں اور تمام فکروں کو ہی خوشی سمجھتے ہیں" میں نے کہا۔

"دیکھو یار' کسی نوکر کو بلانے کے لیے یہاں کوئی کال بیل قسم کی چیز نہیں ہے۔"

نازو بولی "یہ ٹیلی فون ہے یا انٹرکام۔"

میں نے ریسیور اُٹھا کے دیکھا۔ اس میں ٹون نہیں تھی "حد ہوگئی یار۔ یہ انٹرکام ہی تو ہے۔ اب پتا نہیں کون سا نمبر کس کا ہے۔"

غالب نے کہا "ایک نمبر یقیناً اکبر خان کا ہوگا۔ تم نو نمبر سے شروع کرو۔"

میں نے نو کے عدد والے بٹن کو دبایا۔ ہلکی سی موسیقی چند سیکنڈ بجی پھر کسی نے کہا "یس سر!"

میں نے کہا "یہ کون سی جگہ ہے' میرا مطلب ہے تم کون ہو؟"

"آپ حکم کریں سر۔"

"مجھے کچن کا نمبر دو۔ چائے چاہیے اوپر گیسٹ ہاؤس میں۔"

"سات نمبر ہے سر۔ میں کہہ دیتا ہوں۔"

"اکبر خان صاحب کہاں ہیں؟" میں نے کہا۔

"ایک نمبر پر بات کرلیں۔"

"تھینک یو" میں نے کہا اور لائن کاٹ کے ایک نمبر کا بٹن دبایا۔ پھر چند سیکنڈ نرم گھنٹیاں سی بجتی رہیں پھر ایک مترنم' شائستہ اور میٹھی آواز والی لڑکی نے کہا "یس۔؟"

اس نے سر نہیں کہا تھا جس سے صاف واضح تھا کہ جب اسے کوئی کال کرتا تھا تو وہ نچلے یا کم تر درجے کا ملازم ہوتا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ اکبر خان کی پرسنل سیکریٹری یا ویری پرسنل اینڈ ہو سکتی تھی۔

میں نے کہا "یہ اکبر خان کہاں ہے؟"

"تم کون ہو؟" اس نے انگریزی میں پوچھا مگر بہت محتاط لہجے میں۔

"یہ پوچھنے والی تم کون ہو؟" میں نے بھی انگریزی میں خاصی رعونت اور بے نیازی کا انداز پیدا کرکے کہا "اس کی وائف یا مسٹریس؟"

"آپ غالباً گیسٹ ہاؤس سے بول رہے ہیں سر۔ آئی ایم سوری۔" وہ بوکھلا گئی "اکبر خان صاحب باہر گئے ہوئے ہیں۔ رات تک واپس آئیں گے۔"

میں نے ریسیور رکھ دیا "کمال ہے۔ نوکر چاکر سب موجود ہیں۔

ایک بہت ہی سیکرٹ قسم کی سیکریٹری، ٹائپ چیز بھی ہے۔ اس کے باوجود گھر میں الّو بول رہے ہیں۔"
"تین گھنٹے سے ایک ہی کمرے میں" غالب نے کہا۔
"اکبر خان پھر غائب ہے" میں نے کہا "اب پتا نہیں کس چکر میں نکلا ہوگا۔ ویسے تو اس کے سو چکر ہیں۔"
"اس سے پہلے کہ ہم کسی نئے چکر میں پڑیں، کیوں نہ ہم نکل جائیں۔" نازو نے کہا "جب وہ ہمیں بتائے بغیر کہیں جا سکتا ہے تو ہم بھی آزاد ہیں۔"
"رائٹ۔ ہم آزاد ہیں یا نہیں، یہ بھی معلوم ہو جائے گا" میں نے کہا۔
"ہم جا کے پھر آ سکتے ہیں۔ لاہور جا کے فون پر بات کر سکتے ہیں" غالب بولا "اسے بتا سکتے ہیں کہ ہمیں اچانک جانا پڑا۔"
"ہم وضاحت کے پابند نہیں۔ جانا تھا، چلے گئے۔ اکبر خان ہوتا تو اسے بتا جاتے" رابعہ بولی۔
"اس کے آنے سے پہلے نکل چلو" نازو بولی "خاموشی سے۔"
"ڈرنے کی کیا بات ہے۔ ہم چوروں کی طرح کیوں جائیں۔ بتا کے جائیں گے" میں نے کہا "ویسے بتانا بھی ضروری نہیں۔"
"بالکل ضروری نہیں۔ کس کی مجال ہے جو ہم سے پوچھے کہ کہاں جا رہے ہو اور کیوں؟" غالب نے کہا "خود اکبر خان پوچھے تو ہم صاف کہہ سکتے ہیں کہ جہنم میں جا رہے ہیں، ہماری مرضی۔ تم کو کیا پریشانی ہے۔"
نازو ہنسی "مجھے چوہوں کی وہ میٹنگ یاد آ رہی ہے جس میں بلّی کے گلے میں گھنٹی باندھنے کی قرارداد پیش کی گئی تھی۔"
"سکندر! سُنا تم نے، کتنی بے عزتی ہوئی ہے تمہاری۔ تمہارے بہادر اور شیر سے زیادہ دلیر آباو اجداد کی ارواح تڑپ اُٹھی ہوں گی تم کو چوہا کہنے پر" غالب افسوس سے سہلانے لگا۔
میں نے کہا "تڑپ تو تم رہے ہو۔ کیا تم میرے آباو اجداد کی روح ہو؟"
ایک خادم نے دروازے پر ناک کیا اور چائے کی ٹرالی اندر چھوڑ گیا۔ چائے اور کافی کے ساتھ تازہ پھل، ڈرائی فروٹس اور اسنیکس بڑے سلیقے اور وافر مقدار میں سروکیے گئے تھے۔
"یہ ڈرائی فروٹ تو میں جیب میں ڈالوں گا۔ معذرت کے ساتھ۔" غالب نے کہا اور نمکین پستوں کی پلیٹ اُٹھالی۔
"ہش... ندیدے..." نازو نے اسے ڈانٹا "رکھو پلیٹ۔"
غالب نے پلیٹ خالی کر کے رکھ دی "یہ میں راستے میں کھاؤں گا، خبردار جو کسی نے مجھ سے ایک دانہ بھی مانگا۔"
میں نے دوسری پلیٹ اُٹھا کے کاجو کو اپنی جیب میں منتقل کیا "اچھا آئیڈیا ہے۔"
"یہ کیا کر رہے ہو تم لوگ؟" رابعہ بولی۔
غالب بولا "تمہاری ناک کٹوانے کے کام کر رہے ہیں ہم ندیدے لوگ۔"
اسی وقت انٹر کام کا بزر بولا، میں نے ریسیور اُٹھالیا۔ میرا خیال تھا کہ شاید اکبر خان آگیا ہو مگر نمبر چوکیدار نے ملایا تھا "میں گیٹ سے بول رہا ہوں سر۔ چوکیدار۔ وہ لڑکا جو اخبار ڈالتا ہے اِدھر، وہ بولتا ہے کہ آپ نے اخبار کے پیسے نہیں دیے تھے صبح۔"
"ٹھیک بولتا ہے۔ اسے اوپر گیسٹ ہاؤس میں پہنچادو۔"
"یس سر۔"
"اور چوکیدار! تم تو کل قتل ہو گئے تھے نا؟"
"جی! آپ کیا بولا سر...؟"
"کل رات تم کہاں تھے؟" میں نے کہا۔
"ہم کو صاحب چھٹی دیا تھا۔ ہم اپنا بی بی کے پاس گیا تھا اسپتال۔ اپنا نیا بچہ کو دیکھنے کے لیے۔"
"تم صاحب کو بتا کے گئے تھے کہ رات کو لوٹ کر نہیں آؤ گے؟"
"رات کو کیسے آتا سر۔ لارنس پور سے۔"
میں نے ریسیور رکھ دیا "اکبر خان کا چوکیدار کل رات چھٹی لے کر گیا تھا۔ لارنس پور میں اس کی بیوی کے اسپتال میں بچّہ ہوا تھا۔ وہ رات کو لوٹ کے آ ہی نہیں سکتا تھا پھر وہ قتل کیسے ہو سکتا تھا۔ ہے نا سوچنے کی بات؟ شان کو لے کر آ رہا ہے چوکیدار۔"
چائے پیتے ہوئے ہم نے اکبر خان کی سازش کی تفصیلات کا مزید پوسٹ مارٹم کیا۔ چوکیدار کے بیان سے میرے شبہات کی تصدیق ہوگئی تھی۔ اس نے خود ہی راستہ کُھلا چھوڑا تھا لیکن ہمارے سامنے اس نے غلط بیانی سے کام لیا تھا۔
جب دس منٹ تک کوئی اوپر نہیں آیا تو میں نے سات نمبر دبایا۔ یہ کچن کا نمبر تھا "یس سر!"
"گیٹ کا نمبر کیا ہے؟ میں گیسٹ ہاؤس سے بول رہا ہوں۔"
"نمبر آٹھ سر۔"
"تھینک یو" میں نے کہا اور آٹھ نمبر دبایا۔ ہلکی ہلکی آواز میں گھنٹی جیسی میوزک کی آواز آتی رہی۔ ریسیور کسی نے نہیں اُٹھایا۔ میں نے لائن کاٹ کے دوبارہ کوشش کی۔ ابھی ایک منٹ پہلے چوکیدار نے مجھ سے بات کی تھی اور اب کوئی جواب دینے والا نہیں تھا۔
ایک دم میرے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ وہ اخبار فروش لڑکا شان بھی اوپر نہیں آیا تھا۔ دس منٹ اسے اوپر پہنچنے کے لیے بہت کافی تھے۔ دو منٹ میں خود چوکیدار اسے گیسٹ ہاؤس تک چھوڑ کے جا سکتا تھا۔ راستے میں کسی نے چوکیدار کو روک لیا، شان کو۔ سوال یہ تھا کہ کس نے اور کیوں؟
میں ایک دم اُٹھ کھڑا ہوا "چلو، ہم جا رہے ہیں۔ اسی وقت۔"

نازو سب سے پہلے کھڑی ہوگئی "میں تیار ہوں۔"
غالب نے کہا "کیا ہوا؟ شان اوپر کیوں نہیں آیا؟ چوکیدار کہاں ہے؟"
میں نے کہا "یہ گیٹ پر پہنچ کے معلوم ہوگا۔ پہلے بھی معلوم ہو سکتا ہے۔"
میں اور غالب آگے نکلے۔ ہم سے چند قدم پیچھے نازو کے ساتھ رابعہ قدم ملا کے چلنے لگی۔ بظاہر سب مطمئن اور پُراعتماد تھے مگر شان کے اوپر نہ پہنچنے سے میرے دل میں خلش سی پیدا ہوگئی تھی اور یہ خلش دوسروں کے دل میں تھی تو ان کی صورتوں سے بھی عیاں تھی۔
ایک کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے میرے قدم بے اختیار رُک گئے۔ میں نے ایک آواز سُنی جو ہم میں سے کسی کے لیے اجنبی نہیں تھی۔ یہ اکبر خان کی آواز تھی۔ ابھی چند منٹ پہلے ہی مجھے بتایا گیا تھا کہ وہ کہیں گیا ہوا ہے اور اس کے رات سے پہلے لوٹ آنے کا کوئی امکان نہیں ہے مگر وہ گھر میں موجود تھا اور نہ جانے کس سے باتیں کر رہا تھا۔
پھر اس سے زیادہ حیرت مجھے دوسرے شخص کی آواز سُن کے ہوئی کیونکہ یہ دوسرا شخص خود میں تھا جو اکبر خان سے باتیں کر رہا تھا۔ میرے کان خود اپنی آواز سے دھوکا کھانے والے نہیں تھے۔ اور ایک میں ہی کیا، میرے ساتھ یہ آواز رابعہ اور نازو بھی سُن رہی تھیں اور غالب بھی سُن رہا تھا۔
کسی سے کچھ پوچھے بغیر بات سب کی سمجھ میں آچکی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی میں نے جو طویل تقریر کی تھی اور جس میں استاد پیڈرو، چوہدری دلاور اور اکبر خان کی ملی بھگت سے ہونے والی سازش کے ڈرامے کا تفصیلی تجزیہ کیا تھا، اکبر خان اسی کی ریکارڈنگ سُن رہا تھا۔ میری گفتگو کا ایک ایک لفظ بہت واضح تھا۔ مجھے یاد تھا کہ کچھ دیر پہلے میں نے کیا کہا تھا۔ کسی نامعلوم مقام پر پوشیدہ خفیہ آلے نے اس کو ٹیپ ریکارڈر تک پہنچادیا تھا اور اب یہ ساری بات ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو چکی تھی۔ شاید ان سب تک پہنچانے کے لیے جن کے نام میں نے اصل صورتِ حالات کی عکاسی کرتے ہوئے استعمال کیے تھے۔
میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے سب کو دبے پاؤں آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ مجھے یہ احتیاط لاحاصل محسوس ہو رہی تھی۔ میرے دل میں یہ خیال ضرور تھا کہ اتنی رازداری سے ہمیں دھوکا دے کر ہماری گفتگو سُننے والا کیا ہمیں دیکھ نہیں رہا ہوگا۔ خوف کے آثار نازو سے زیادہ رابعہ کی صورت پر عیاں تھے۔
ابھی ہم چند قدم ہی چلے تھے کہ ہلکا سا کھٹکا ہوا اور ایک دروازہ آہستہ سے کھلا۔

○☆○

میں نے ایک شعلہ مجسم کو روبرو دیکھا۔ آتشیں، سرخ پیرہن سے نکلتی اس کے بدن کی گلابی آنچ کسی بھی مرد کے خرمنِ عقل و ہوش کو خاکستر کر سکتی تھی۔ سرسراتے ریشم کی میکسی کے نیچے اس کے موج در موج بدن کے نشیب و فراز کا ہر تلاطم انتہائی ہیجان انگیز تھا۔ سلیولیس یعنی بغیر آستین کی میکسی کا گریبان بھی اتنا کشادہ تھا کہ مدور مرمریں شانوں سے ڈھلکنے پر آمادہ نظر آتا تھا لیکن ڈھلکتا نہیں تھا اور تشنہ دید نگاہوں کی پیاس بڑھادیتا تھا۔ اس کی تراشیدہ سنہری زلفیں ان شانوں پر آ کے شوخی سے پھسلی جاتی تھیں اور تصور میں وہ نرم ریت کے ساحل آتے تھے جن کو صبح دم شفق رنگ سمندر کی آہستہ خرام موجیں چوم رہی ہوں۔ کمر سے نیچے میکسی میں دونوں جانب چاک تھے۔ جب اس نے ایک قدم آگے بڑھایا تو گھٹنوں سے اوپر اس کی ٹانگوں کا اُجلا پن ذرا سی دیر کے لیے جھلکا۔ شاید اس کی عمر چالیس سال ہو مگر اس کے شباب میں تیس سال کی بھرپور عورت کی سرکشی تھی تو حسن میں بیس سال کی لڑکی کی تازگی و شگفتگی۔ وہ ایک ایسی عورت تھی جو ہوش سنبھالتے ہی جان لیتی ہے کہ قدرت نے اسے حسن و شباب کی لامحدود قوتِ تسخیر رکھنے والا اسلحہ کتنی فراخ دلی سے عطا کیا ہے مگر وہ اپنی ذہانت سے عشوہ و غمزہ و ادا کی تربیت حاصل کر لیتی ہے اور اپنی فتوحات کو اپنا حق سمجھتے ہوئے دلوں کو مطیع کرتی جاتی ہے۔ اس یقین کے ساتھ کہ وہ چاہے تو پتھر کے بت بھی اس کے آستانۂ حسن پر سجدہ ریز ہو جائیں۔
مجھے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس سے زیادہ حسین، مکمل اور خطرناک عورت سے میرا کہیں واسطہ نہ پڑا تھا۔ اکبر خان جیسے شخص کی داشتہ ایسی ہی ہو سکتی تھی لیکن صاف ظاہر تھا کہ اس عورت کے لیے اکبر خان بھی ایک سیڑھی ہے۔ اوپر جانے کے لیے۔ اس کے قدم نیچے بہت سی سیڑھیوں کو روند چکے تھے۔ اخلاق و شرافت، عصمت و عفت کی مروجہ اقدار کا اس کے نزدیک کوئی مفہوم اور مقصد نہیں تھا۔ ایسی ہی عورت مارلن منرو تھی جس نے کینیڈی فیملی کے دل جیتنے کے لیے اپنے حسن و شباب کا سارا خزانہ لُٹادیا تھا مگر وہ امریکا کی فرسٹ لیڈی نہ بن سکی تھی۔ تخت کا خواب دیکھنے والوں کو تقدیر دھوکا دے تو ان کا انجام تختے پر ہوتا ہے لیکن جُوا کھیلنے والے ہارنے کی کب سوچتے ہیں؟
میرا اور غالب کا اس حسن کی چکاچوند اور اس کے اندازِ بے حجابی سے متاثر ہونا ایک فطری سی بات تھی۔ دھوپ کتنی ہی اُجلی ہو، ویلڈنگ کا شعلہ پل بھر کے لیے نگاہوں کو ضرور خیرہ کر دیتا ہے لیکن حاسد اور شکی فطرت رکھنے والی عورت کسی سے محبت بھی کرتی ہو تو کسی منطقی وضاحت سے بھی مطمئن نہیں ہوتی۔
میں اور غالب کچھ شاک کی کیفیت میں تھے جسے رابعہ اور نازو نے محویت سمجھ لیا۔ اس وقت تو انہوں نے صرف ماتھے پر ناگواری کے آثار پیدا کر کے اور ہمیں گھور کے خبردار کر دینا کافی سمجھا مگر بعد

میں بہت کچھ کہا جو میں نے اور غالب نے خندہ پیشانی اور فراخ دلی یعنی ڈھٹائی کے ساتھ برداشت بھی کیا۔

"میرا نام روزینہ ہے" دروازے کے فریم میں تصویر حسن بنی ہوئی اکبر خان کی سیکریٹری نے مسکرا کے کہا۔ ہمارے ردِ عمل پر اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا اور کسی حیرانی کا اظہار نہیں کیا۔ یہ سب اس کے لیے متوقع تھا۔

"روزینہ عرف روزی ..... روز..... یعنی گلاب" غالب نے بوکھلا کے کہا۔

میں بھی دُہرے صدمے سے دوچار تھا۔ ایک تو ہم سب چوری چوری فرار ہوتے ہوئے پکڑے گئے تھے۔ پھر پکڑنے والی بھی پولیس نہیں تھی' روزینہ تھی جس کے پاس ہتھکڑی سے زیادہ مؤثر اس کے حسن کا جال تھا۔

میں نے رابعہ سے نظر چُرا کے کہا "مس روزینہ! یہ تعارف کچھ نامکمل ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ ہم چلتے ہیں نیچے" رابعہ نے جل کے کہا "تم ان سے اچھی طرح متعارف ہو کے آجانا۔"

"ہاں۔ اپنا تعارف بھی کرا دینا تفصیل سے" نازو نے لہجے کی تلخی کو جھوٹی مسکراہٹ کی مٹھاس میں دبا دیا "بتا دینا کہ تم ابھی غیر شادی شدہ بھی ہو۔ پھر ان سے بھی پوچھ لینا کہ شادی ہوئی ہے یا نہیں۔ نہیں ہوئی تو کیوں اور کب تک ارادہ ہے۔"

وہ ہنس پڑی "ڈرو نہیں۔ میں ان کو ہتھیانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ ویسے اتنی کمزور تم بھی نہیں نظر آتیں کہ تمہارے قیدی آسانی سے چھوٹ جائیں۔"

"ہم نے کسی کو بند نہیں کر رکھا ہے" نازو چیخ کے بولی "جو کام تم کر سکتی ہو وہ ہمارے بس کا نہیں۔"

رابعہ نے سرہلایا "ہماری فکر مت کرو تم۔"

وہ پھر ہنسی "سب بیویاں اسی طرح خود کو تسلی دیتی رہتی ہیں کہ انہیں کسی سے خطرہ نہیں' وہ اپنے گھر میں بہت محفوظ ہیں کیونکہ ان کے شوہر بڑے وفادار ہیں۔ حقیقت میں جانتی ہوں ایسے شوہروں کی۔"

میں نے سخت لہجے میں کہا "ان فضول باتوں کا مقصد کیا ہے مس روزینہ؟ تمہیں بھی خوش فہمی ہے کہ تم حقیقت جانتی ہو اس لیے کہ تم نے آج تک اکبر خان جیسے لوگوں کا شکار کیا ہے جو خود شکاری ہوتے ہیں۔ ہوس کے شکاری جو دولت کا جال لیے پھرتے ہیں اور تم جیسی عورتیں قید ہو کے بھی خود کو فریب دیتی ہیں کہ انہوں نے حسن کے جال میں ایک اور کاٹھ کا اُلو پکڑ لیا ہے۔"

غالب نے کہا "یار سکندر! کس کو سمجھا رہے ہو یہ فلسفہ۔ کیوں وقت ضائع کر رہے ہو۔"

روزینہ نے شریر نظروں سے رابعہ اور نازو کی طرف دیکھا "بس کچھ غلط وقت پر اور غلط جگہ ملے ہو ورنہ میرے ساتھ تمہیں زندگی کے حسین ترین لمحات ملتے۔"

رابعہ تو خون کے گھونٹ پی کے رہ گئی مگر نازو برداشت نہ کر سکی۔ اس نے نفرت اور حقارت سے کہا "کیسی بے شرم ہے۔"

روزینہ کی ہنسی اسے مزید مشتعل کر سکتی تھی چنانچہ میں نے فوراً صورت حال کو سنبھال لیا۔ "اکبر خان کہاں ہے؟"

اس نے کندھے اچکائے "مجھے کیا معلوم۔ ہوگا کسی دوسری روزینہ کے پاس۔"

"جھوٹ مت بولو۔ وہ اندر ہے" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

"نہ تم میرے غیرت مند شوہر ہو اور نہ میں تمہاری بے وفا بیوی کہ اندر غیر مرد کو چھپا رکھا ہو مگر تم سے کہوں کہ کوئی نہیں ہے' وہم ہے تمہارا۔" اس نے پُرخوف آواز بنا کے کہا اور پھر خود ہی ہنس پڑی "وہ ...... ہوتا میرے ساتھ تو میں دکھا دیتی تم کو۔"

شرم و حیا اس کے لیے کوئی چیز نہیں تھی۔ میں اندازہ کر سکتا تھا کہ اس کی بات کا رابعہ اور نازو پر کیا اثر ہوا ہوگا کیونکہ خود میرے کان گرم ہونے لگے تھے۔

غالب نے کہا "ابھی ہم نے آواز سنی تھی اس کی۔"

"ضرور سنی ہوگی۔ ابھی تو فون آیا تھا اس کا۔ کہہ رہا تھا کہ میں رات کو شاید نہ آؤں۔ نہ آئے' میری بلا سے....."

میں نے کہا "وہ ٹیلی فون کی آواز نہیں تھی۔"

روزینہ گھوم گئی "وہ دیکھو' اس فون کا ریسیور نہیں اٹھانا پڑتا۔ جب کال آتی ہے تو میں ایک بٹن دبا دیتی ہوں اور اسپیکر بولنے لگتا ہے۔"

اس بات نے مجھے قائل نہیں کیا "آدمی کی اصل آواز میں اور کسی ٹیلی فون کے اسپیکر سے سنائی دینے والی آواز میں بہت زیادہ فرق ہوتا ہے۔"

اس نے بازو پھیلا دیے "آؤ' دیکھ لو خود اندر آکے۔ ویسے بھی تم اکبر خان کے معزز مہمان ہو۔ یہاں جو مہمان آتے ہیں وہ سب بڑے معزز ہوتے ہیں۔ میری طرح" وہ تلخی سے ہنسی۔

کسی تذبذب کے بغیر میں اندر چلا گیا۔ وہ دروازے میں سے ہٹنے پر آمادہ نہ تھی اور محض رابعہ کو جلانے کے لیے یہ چاہتی تھی کہ میں اس کے جسم کو دبا کے اپنے لیے راستہ بناؤں مگر میں نے اسے ایک ہاتھ سے دھکیل کر اندر کر دیا۔ وہ لڑکھڑائی اور پھر ہنسی۔ اس کی ہنسی کا اضطراری انداز بتاتا تھا کہ اس پر تھوڑا بہت شراب کا نشہ غالب ہے۔ اکبر کی عدم موجودگی کا یقین کرنے کے علاوہ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ میری آواز کا کیسٹ کس نے ریکارڈ کیا تھا اور کون سُن رہا تھا۔ اگر کسی طرح وہ کیسٹ مجھے مل جاتا تو ہم سب کی پریشانی کا ایک بہت بڑا سبب باقی نہ رہتا۔

میرے پیچھے غالب تھا۔ رابعہ اور نازو نے چند سیکنڈ بعد اندر آنے کا فیصلہ کیا۔ روزینہ کے رویے پر وہ سخت برافروختہ تھیں حالانکہ اس کا کردار سامنے آجانے کے بعد یہ ناراضگی لاحاصل تھی۔

اکبر خان کا بیڈ روم اس کے مزاج اور اس کی خواہشات کی عکاسی کرتا تھا۔ صرف دولت سے عیاشی کے اسباب میں رنگین مزاجی کا انداز ہر شخص پیدا نہیں کر سکتا۔ اندر ہر چیز انتہائی بیش قیمت تھی اور دولت مندی کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ پردوں اور قالینوں سے لے کر ایک طرف سجی ہوئی غیر ملکی شراب کی کچھ خالی اور کچھ بھری ہوئی بوتلیں ہر گوشے میں موجود جیڈ کے لیمپس کی مدھم روشنی کو منعکس کر رہی تھیں۔ ڈریسنگ ٹیبل پر فرانس کی بیش بہا پرفیومز کی خوب صورت شیشیاں اور آرائش حسن کے لوازمات بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ ان میں مجھے کچھ ایسی چیزیں بھی نظر آئیں جو عیش و عشرت کے دلدادہ رئیسوں کے لمحاتِ لطف و انبساط کے لیے بطورِ خاص بنائی جاتی تھیں اور لندن کی مخصوص سیکس شاپس میں دستیاب تھیں مگر یہاں اتنی عام نہ تھیں کہ غالب بھی انہیں دیکھ کے حیران ہوتا۔ رابعہ اور نازو کی تو ان پر نظر ہی نہیں گئی۔ وہ اس جیولری کو دیکھتی رہیں جو "اِمی ٹیشن" بھی ہو سکتی تھی اور اصلی بھی۔ پہچان ہم میں سے کسی کو نہ تھی۔

بیڈ روم کے وسط میں ایک بہت وسیع اور گول بیڈ تھا جس کے بارے میں ایسے ہی مجھے خیال آیا کہ یہ گھومنے والا بیڈ ہوگا۔ ایک روایتی شاہانہ عشرت کدے کی تکمیل میں روشنیاں اور آئینے بہت اہم ہوتے ہیں چنانچہ روزینہ نے اچانک کرسٹل کا فانوس روشن کیا تو اس آئینہ خانے میں چراغاں سا ہو گیا اور ہر سمت میں تاحدِ نگاہ روشنیوں کے ساتھ ہمارے عکس پھیل گئے۔ اس نظر فریب ماحول میں یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہم کسی چھت اور دیواروں والے کمرے میں نہیں بلکہ کسی جگمگاتے شاپنگ سینٹر کے چوک پر کھڑے ہیں لیکن اس کے باوجود مجھے یہاں عجیب سی گھٹن ہو رہی تھی۔

رابعہ اور نازو بھی اتنی نادان نہ تھیں کہ اس اندازِ آرائش کے اغراض و مقاصد کو سمجھ نہ پاتیں۔ یہ دولت کی ہوس خیزی کے کھیل تھے۔ روزینہ ان کی خفت اور گھبراہٹ سے لطف اندوز ہو رہی تھی اور اس نے اپنے لیے ایک نازک سے جام میں کچھ اور شراب ڈال لی تھی۔

"تم سے تو پوچھنا ہی بے کار ہے" وہ بولی "تم اس نعمت سے محروم ہو۔"

"لعنت اس کو نعمت سمجھنے والے پر" نازو بولی۔

رابعہ نے کہا "اور لعنت اس کی عقل پر۔"

میں نے بھنّا کے کہا "لیڈیز! اپنے پند و نصائح کے دفتر بند رکھو۔ تم یہاں تبلیغ و تلقین کے لیے نہیں آئی ہو۔ اتنا کافی ہے کہ تم صراطِ مستقیم پر ہو۔ اس عورت کو جانے دو جہنم میں۔"

"تم جاؤ باہر۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ چوکیدار اس لڑکے کے ساتھ ہمارے کمرے تک جا کے لوٹ جائے" غالب بولا "بلکہ گیٹ تک دیکھ لو۔"

رابعہ اور نازو بھی جیسے اشارے کی منتظر تھیں۔ وہ بُرا مانے بغیر نکل گئیں۔ باہر جا کے یقیناً انہوں نے سکون کا سانس لیا ہوگا۔ بیڈ روم کے ماحول میں وہی گناہگار فحاشی تھی جو کسی طوائف کے کوٹھے پر محسوس بھی کی جا سکتی ہے۔

میں نے روزینہ سے کہا "یہ فانوس اور سب لائٹس بُجھا دو' صرف ایک لائٹ رہنے دو۔"

اس نے تعمیل کی "ایک کی بھی کیا ضرورت ہے؟"

میں نے کہا "روشنیوں میں عکس دھوکا دیتے ہیں۔ اندھیرے میں سیاہ و سفید کی تمیز بھی نہیں رہتی۔"

غالب پردے ہٹا کے دیکھ رہا تھا اور مختلف سمت میں کھلنے والے دروازوں اور کھڑکیوں کو چیک کر رہا تھا۔ سوائے ایک دروازے کے جو باتھ روم میں کھلتا تھا' سب اندر سے بند تھے اور ادھر سے کسی کے باہر نکل جانے کا کوئی امکان نہیں تھا لیکن یہ ہو سکتا تھا کہ اکبر خان کو باہر نکال کے خود روزینہ نے کسی کھڑکی یا دروازے کو بند کیا ہو اور پھر باہر نکلی ہو۔

میں نے ایک ٹیلی فون' ٹی وی اور ریڈیو گرام کے ہر خانے کو دیکھا مگر مجھے کہیں کوئی ٹیپ ریکارڈر نظر نہ آیا۔ وقت کم تھا اور میرے لیے پورے کمرے میں کسی جگہ چھپے ہوئے ٹیپ ریکارڈر کو تلاش کرنا محال تھا۔ ٹیپ ریکارڈر بیڈ کے نیچے بھی ہو سکتا تھا' صوفوں کے اندر بھی اور کسی دیوار کے نظر نہ آنے والے خلا میں بھی۔

"آخر تم لوگ کیا چاہتے ہو؟" روزینہ بیڈ کے کنارے پر ٹک گئی "تم نے اکبر خان کو پوچھا تھا اور وہ کوئی نوٹ بک تو ہے نہیں جسے تم کہیں سے بھی برآمد کر لو۔ تمہیں تلاشی لینے کی اجازت اس لیے نہیں دی تھی میں نے۔"

"فرض کرو" میں نے کہا "ہم یہ کام بلا اجازت کر رہے ہیں۔"

"تم غلط کر رہے ہو" وہ برہمی سے بولی "صرف ایک بٹن دبانے کی دیر ہے۔"

غالب بولا "اور کسی دیوار کے شق ہوتے ہی اکبر خان نکل آئے گا۔"

"تم مہمان ہو اس لیے میں نے ابھی تک سیکیورٹی والوں کو نہیں بلایا ہے۔" وہ جام پھینک کے اٹھی۔

میں نے اسے دھکیل کر پھر بٹھا دیا "میں تمہارے ساتھ سختی کرنا نہیں چاہتا۔ بہتر ہے' ایسے ہی بتا دو کہ وہ ٹیپ کہاں ہے جو اکبر خان سُن رہا تھا؟"

"تم پاگل تو نہیں ہو؟" وہ مشتعل ہو گئی "کیا اکبر خان کوئی چوہا تھا کہ کسی سوراخ سے نکل گیا؟ یہاں سوراخ تو کیا دروازے کے نیچے بھی اتنی جگہ نہیں ہے کہ ایک کاکروچ گزر سکے۔ تم دیکھ چکے ہو

کہ سب دروازے کھڑکیاں اندر سے بند ہیں۔"

میں نے کہا "مس روزینہ 'اکبر خان کی آواز میں نے ہی نہیں' ہم سب نے سُنی تھی اور ہم حلفیہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اس کی اپنی آواز تھی مگر تمہاری بات مان لی جائے کہ وہ ٹیلی فون پر تم سے مخاطب تھا تو کیا وہ ٹیپ تم سُن رہی تھیں جس پر میری آواز ریکارڈ کی گئی تھی؟ کہاں ہے وہ ٹیپ اور ٹیپ ریکارڈر؟ جلدی سے بتادو۔"

"میں... میں کیسے بتاؤں؟ مجھے نہیں معلوم۔"

میں اس کے قریب جا کھڑا ہوا۔ بڑی نرمی سے میں نے اس کا خوب صورت ہاتھ تھاما جو نشے یا خوف کے اثر سے کانپ رہا تھا "تمہاری انگلیوں میں کتنی نزاکت ہے۔ اور یہ انگوٹھی۔ اصل ہیرے کا نگ نظر آتا ہے اس میں۔ میں کانچ کے ٹکڑے اور ہیرے میں کوئی فرق محسوس نہیں کرتا۔ کیا یہ اکبر خان کا تحفہ ہے؟"

اس نے اپنا ہاتھ کھینچا "یہ... منگنی کی انگوٹھی ہے۔"

میں نے سرہلایا "بہت خوب! تم منگنی بھی کرتی ہو۔ کس کس سے ہوچکی ہے تمہاری منگنی... اور کتنی بار...؟"

وہ چلانے لگی "یہ کیا کررہے ہو... مجھے درد ہورہا ہے۔"

میں نے اس کی انگلی کو تھوڑا سا اور دبایا "آج کل تمہارے منگیتر کے عہدے پر کون فائز ہے؟"

"میری انگلی ٹوٹ جائے گی۔"

"ہاں۔ نازک چیزیں آسانی سے ٹوٹ جاتی ہیں۔ دل کو شاعروں نے شیشے کا بنادیا ورنہ دل بڑی مضبوط مشین ہے۔ آسانی سے ٹوٹتا نہیں اور مرمّت بھی ہوجاتا ہے۔ انگلی بھی جُڑ جائے گی۔"

میں نے ایک دم دبایا تو اس کی انگلی کسی کچی پینسل کی طرح ٹوٹ گئی۔

اس نے ایک چیخ ماری اور تڑپ کے اپنا ہاتھ کھینچا مگر میری گرفت سے خود کو نہ چھڑا سکی۔ میں نے اپنا ایک پاؤں اس کے پاؤں پر رکھ دیا تھا۔ وہ اٹھتے ہی پھر گر گئی "ذلیل۔ وحشی۔ درندے...."

میں نے نرمی سے کہا "ٹیپ ریکارڈر کہاں ہے؟"

اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور وہ کرب سے بل کھارہی تھی۔ میں اس کی ٹوٹی ہوئی انگلی کو آہستہ سے ہلاتا تھا تو درد کی شدّت سے اس کا بدن جھٹکا کھاتا تھا۔ غالب اپنے کام میں مصروف تھا اور صوفوں کو اُلٹ چکا تھا" بیڈ کے نیچے جھانک کر دیکھ چکا تھا اور میری کارروائی سے بے نیاز تمام کونوں کی تلاشی لے رہا تھا۔ اس نے انٹر کام کو کھینچ کے نیچے ڈال دیا تھا اور ٹیلی فون کا تار توڑ دیا تھا۔ اس نے وہ دروازہ بھی بند کردیا تھا جس سے ہم اندر آئے تھے اور سب پردے برابر کردیے تھے۔ چنانچہ روزینہ کی چیخوں کے باہر سنائی دینے کا امکان بہت کم تھا۔

تکلیف سے روزینہ کے سارے جسم سے پسینہ پھوٹنے لگا تھا اور گالیاں چھوڑ کے اب وہ منّت سماجت پر اتر آئی تھی "خدا کے لیے.... اُف... آہ... یہ مت کرو' میں مرجاؤں گی۔"

میں نے نفی میں سرہلایا "انگلی ٹوٹنے سے آج تک کوئی نہیں ہوا مس روزینہ۔ ہم تمہیں بے ہوش ہونے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ اگر تم وہ ٹیپ ریکارڈر دے دو تو..."

اس نے سر کو اِدھر اُدھر ہلاتے ہوئے کراہ کے کہا "نہیں.... کرسکتی.... سمجھو خدا کے لیے.... اوف... آہ... مت بنو۔ رحم کرو مجھ پر...."

مجھے خوب اندازہ تھا کہ وہ کتنی تکلیف میں ہے۔ اذیت ہی کم نہیں ہوتی۔ ٹوٹی ہوئی ہڈی کو ہلانے سے ناقابل ہوتا ہے۔ ایک نرم ونازک عورت جس نے سختی جھیلی ہی نہ بے رحمانہ اور پُرتشدد کارروائی کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھی منٹ میں اس کا رنگ سفید پڑگیا تھا۔ جیسے کچے گلابی رنگ کپڑے کو کسی نے بلیچنگ پاؤڈر میں ڈال کے نچوڑ دیا ہو۔ پھر ہوش ہوگئی۔

میں اس کی مجبوری کو سمجھتا تھا اور اندازہ کرسکتا تھا کہ مجھے ریکارڈ کیا ہوا ٹیپ دینے پر تیار نہیں۔ وہ اکبر خان سے وفائی اور غداری کے جرم کا ارتکاب کرتے ہوئے اس صورت' پُرعیش زندگی کے بدصورت' بھیانک انجام سے تھی۔ اکبر خان ان لوگوں میں سے تھا جو ایک ادائے زروجواہر لُٹاتے ہوئے انتہائی فراخ دل نظر آتے ہیں تو کسی کی سزا دیتے ہوئے اتنی ہی سنگدلی کا مظاہرہ بھی کرسکتے ہیں۔ ایک عورت اور دوسری عورت میں کیا فرق ہے۔ روزینہ ایک خوب صورت اور نایاب قسم کی چیز تھی۔ جیسے مصوری کا کوئی شاہکار چوری ہوجائے تو صدمہ ہوتا ہے کہ اب کسی اور کے پاس ہوگا خود ضائع کرنا پڑے تو بس احساسِ زیاں۔ روزینہ استعمال کی تھی' استعمال میں ضائع ہوگئی تو کیا؟

غالب نے کہا "یہ اُلو کی پٹھی زیادہ ہی مزاحمت کررہی ہے کیوں نہ اسے ساتھ لے چلیں؟"

"کیا فائدہ؟"

"اطمینان سے پوچھ لیں گے جو پوچھنا ہے۔"

"مرزا جی! کیا عقل گھاس چرنے گئی ہے؟ جو پوچھنا ہے پوچھنا ہے۔ اس نے بعد میں بتایا کہ ٹیپ فلاں جگہ ہے تو واپس آئیں گے؟" میں نے کہا "اس سے پہلے تو اکبر خان آ کے کام کرجائے گا۔"

غالب نے سر کھجایا "وہ تو شاید اپنا کام کرگیا۔ اب مجھے ہورہی ہے ان بلاؤں کی جو باہر کھڑی منتظر ہیں ہماری۔ وہ نہ جانے کیا سمجھ رہی ہوں گی۔ دروازہ بھی تو بند ہے بڑے مشکوک انداز میں۔"

"سمجھنے دے جو اُن کا جی چاہے۔ وہ ٹیپ حاصل کرنا بہت ضروری ہے ہمارے لیے" میں نے ایک گلاس اٹھا کے روزینہ کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے۔

ہوش میں آتے ہی وہ رونے لگی۔ پہلے آہستہ آہستہ پھر زور زور سے۔ اس کا خوف اب وحشت آمیز ہسٹریا بن رہا تھا۔ اس نے چیخ مارنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے اس پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ تڑپ کے اٹھنے لگی تو میں نے اسے دبالیا۔

"اب تمہارے حلق سے آواز بھی نکلی نا تو میں تمہاری یہ صُراحی دار گردن بھی اسی طرح توڑ دوں گا جیسے انگلی توڑی تھی۔ میں عاشق نہیں ہوں تمہارا اور نہ طلب گار۔ مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوسکتا تمہارے آنسوؤں کا یا تمہاری حالتِ زار کا" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔

غالب میرے ساتھ جھک گیا "ابھی تو کچھ نہیں ہوا ہے تمہارے ساتھ۔ تم نے نہ بتایا کہ ٹیپ کہاں ہے تو پھر بہت کچھ ہوگا جس کا تمہیں کوئی اندازہ نہیں۔ بولو' بتاؤگی... یا..."

روزینہ نے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور سرہلایا۔

میرے بوجھ سے آزاد ہوتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی "وہ مجھے مار ڈالے گا۔ میں مرنا نہیں چاہتی..."

میں نے بڑی نرمی سے کہا "ہم تمہاری مدد کرسکتے ہیں۔"

غالب بولا "اکبر خان کے آنے سے پہلے ہی تم جاسکتی ہو۔ اب تک تم نے بہت کچھ تو وصول کرلیا ہوگا۔ اور بھی جو ملتا ہے یہاں سے وہ سمیٹ لو۔ اگر جان عزیز ہے تو مال کو چھوڑنا ہی پڑے گا۔"

میں نے کہا "تمہیں کیا فرق پڑتا ہے۔ ایک اکبر خان کا مال نہ سہی دوسرے کا سہی۔ تم جیسی عورت کو اکبر خانوں کی کیا کمی۔"

وہ اپنا ہاتھ دبا کے بولی "تم بے وقوف ہو۔ وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ میں کہیں نہیں جاسکتی... کہیں نہیں۔"

"تم ملک سے باہر جاسکتی ہو۔"

اس نے نفی میں سرہلایا "میں نے کہا نا' کہیں نہیں۔ نہ ملک کے اندر نہ باہر۔ اس نے سب سمجھادیا تھا مجھے کہ اس گھر میں آنے کے بعد میرے لیے واپس جانے کے سب دروازے بند ہوگئے ہیں۔ وہ ایسا ہی آدمی ہے۔ جس چیز کو خرید لیتا ہے پھر وہ اس کی ہوجاتی ہے۔ ہمیشہ اسی کی رہتی ہے ورنہ نہیں رہتی۔"

میں نے کہا "تو کیا یہ.... منگنی کی انگوٹھی..."

"منگنی!" اس نے تلخی سے کہا "وہ روز منگنی کرتا ہے اور روز شادی۔ وہ کہتا ہے میں خوش قسمت ہوں کہ میں نے اکبر خان کے دل میں اور اس کے گھر میں جگہ بنالی ورنہ خوب صورت عورتیں دنیا کے بازار میں جوتوں کی طرح بکتی ہیں۔ کسی بھی ملک میں' کسی بھی دکان سے خریدو اور استعمال کرو۔ جب دل بھر جائے کسی کو دے دو یا پھینک دو۔"

میں نے حیرانی سے کہا "تم ساری عمر گزاروگی اس کے ساتھ؟ کیا تمہیں یقین ہے کہ تم سے کبھی اس کا دل نہیں بھرے گا؟"

"کل کا مجھے نہیں معلوم لیکن آج میں اس کو نہیں چھوڑ سکتی۔ یہ عیش وعشرت کی زندگی' مال و دولت۔ سب کچھ میرا ہے۔ اور اکبر خان میرے لیے اچھا ہے۔ جوان مرد ہے اور مجھے خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور کیا چاہیے مجھے؟ بڑی مشکل سے میں نے یہ سب حاصل کیا ہے جو مجھے اور کوئی نہیں دے سکتا تھا۔"

"یعنی تم اس قید خانے میں خوش ہو؟" میں نے نفرت سے کہا۔

"میں قید میں نہیں ہوں۔ میں کہیں بھی آجاسکتی ہوں۔ میرے پاس ایک نہیں دو کاریں ہیں۔ شوفر ہیں' لندن' پیرس' نیویارک کے ٹکٹ میرے پاس پڑے رہتے ہیں۔ میں جو چاہوں کروں یا خریدوں۔ جتنا دل چاہے خرچ کروں۔ شرط صرف یہ ہے کہ جب اکبر خان یہاں آئے تو میں اسے یہاں ملوں اور اس کے سوا کسی سے تعلق نہ رکھوں۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ میری نگرانی ہوتی ہے۔ وہ کہیں بھی ہو' اسے میری مصروفیات کی خبر ملتی رہتی ہے۔ میں اسے ناراض نہیں کرسکتی۔ میں بہت مطمئن ہوں اس زندگی سے۔ خدا کے لیے میری مجبوری کو سمجھو" وہ روتے اور کراہتے ہوئے بولی۔

میں نے متاثر ہوئے بغیر کہا "وہ ٹیپ حاصل کرنا ہماری مجبوری ہے۔"

غالب بولا "تم کہہ سکتی ہو کہ ہم نے تشدد سے وہ ٹیپ حاصل کرلیا تھا۔ ثبوت کے طور پر تم اپنی یہ انگلی دکھاسکتی ہو اور مزید ثبوت چاہو تو...."

اس نے دہشت سے غالب کو دیکھا "دیکھو' بات ٹیپ کی نہیں۔ ٹیپ تو میں دے سکتی ہوں تمہیں لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ پھر وہ مجھ سے پوچھے گا کہ تم نے کیا سنا تھا؟ سب بتانا پڑے گا مجھے۔"

"تم غلط بھی بتاسکتی ہو" غالب نے کہا "کہہ سکتی ہو کہ وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے تھے اور پھر سوگئے تھے۔"

"اِدھر اُدھر کی باتیں؟"

"ہاں۔ ہم تمہیں بتادیں گے کہ اس سے کیا کہا جاسکتا ہے۔"

"کیا تم اسے اتنا بے وقوف سمجھتے ہو؟ جھوٹ بولنا آسان نہیں ہوتا۔ میں تو اچھی ایکٹریس بھی نہیں ہوں۔ وہ فوراً پکڑ لے گا مجھے۔ دیکھو میری انگلی کتنی سوج گئی ہے۔" اس نے ایک ہاتھ سے بوتل اٹھا کے اپنے لیے دوسرے جام میں تھوڑی سی شیمپین ڈالی "تم اتنے سفاک آدمی لگتے نہیں۔"

"ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔" میں نے کہا "اور ہم کوئی خطرہ بھی مول نہیں لے سکتے۔"

"تم ٹیپ لے جاؤگے پھر بھی خطرہ تو باقی رہے گا۔ خطرہ مت چھوڑو۔"

"کیا سنا چاہتی ہو تم؟" میں نے کہا۔

"یہی کہ ٹیپ حاصل کرلینے کے بعد تمہارے لیے بے حد ضروری ہوگا کہ مجھے بھی ختم کردو" اس نے جام اپنے حلق میں انڈیل لیا۔

"ہم بلاوجہ قتل نہیں کرتے۔"

"مجھے معلوم ہے' تم کیا کروگے۔ تم مجھ پر تشدد کروگے۔ عورت پر کوئی بھی مرد سو طرح سے تشدد کرسکتا ہے" اس نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا "کبھی تھانوں میں جاکے دیکھو۔ مرد کے ساتھ وہ سب نہیں ہوسکتا جو عورت کے ساتھ ہوتا ہے۔"

میں نے برہمی سے کہا "تمہیں کیا معلوم۔ سنی سنائی باتیں کررہی ہو یا اس کا بھی تجربہ ہے؟"

اس نے اقرار میں سرہلایا "تجربہ ہوچکا ہے مجھے۔ اور مجھے اپنی قوتِ برداشت کا بھی اندازہ ہے۔"

"ہم پولیس والے نہیں ہیں۔"

"پھر کیا ہوا؟" اس نے کہا "بس وہ جانور بن جاتے ہیں۔ مانا تم وہ سب نہیں کروگے مگر ایک کے بعد دوسری انگلی توڑوگے پھر تیسری۔ دس انگلیاں ہاتھوں کی' دس پیروں کی۔ دوسری انگلی ٹوٹنے سے پہلے ہی میں ٹیپ تمہارے حوالے کردینا بہتر سمجھتی ہوں۔ میں اتنی اذیت نہیں جھیل سکتی۔"

"ٹھیک ہے۔ ٹیپ ہمیں دے دو ایسے ہی" میں نے کہا۔

"وعدہ کرو اس کے بعد تم میرا گلا گھونٹ دوگے۔"

"میں ایسا کوئی وعدہ نہیں کرسکتا۔"

"پھر تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ میں اکبر خان کو سب بتادوں گی۔ میں نے بہت توجہ سے ایک ایک لفظ سنا تھا۔"

غالب نے کہا "اس میں تو بہت رِسک ہے سکندر۔"

"اسی لیے تو میں کہہ رہی ہوں کہ جانے سے پہلے مجھے...."

"لاحول ولا قوۃ۔ تم.... خودکشی کرلو۔ بعد میں جو چاہو کرو" میں نے کہا۔

اس نے مِنّت کے انداز میں کہا "دیکھو' میری مدد کرو۔ میں بہت بزدل عورت ہوں۔ خود اپنی جان نہیں لے سکتی۔ اکبر خان بھی بہت ظالم اور بے رحم آدمی ہے۔ میں اس سے جھوٹ بولوں گی تو وہ بہت اذیت دے کر ہلاک کرے گا مجھے۔ یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ نہ خنجر' نہ پستول' نہ خواب آور گولیاں۔"

وہ مسلسل پی رہی تھی اور اب نشے میں بول رہی تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ سے بوتل چھین کے رکھ دی "اس سے پہلے کہ تم عقل اور ہوش گنوا بیٹھو' ہمیں بتادو کہ ٹیپ ریکارڈر کہاں ہے؟"

اس نے ہچکی لی اور زبردستی ہنسی۔ پھر اس نے بیڈ کی سائڈ پر لگا ہوا کوئی بٹن دبایا۔ میری حیرت زدہ نظروں نے ایک تصویر کے فریم کو کسی تجوری کے پٹ کی طرح کھلتے دیکھا۔ اس کے پیچھے ٹیپ ریکارڈر موجود تھا۔ غالب نے اسے باہر نکال لیا۔

"دیکھ لے یار کہ ٹیپ وہی ہے" میں نے کہا۔

غالب نے ٹیپ ریکارڈر آن کرکے چلایا۔ ٹیپ کو تھوڑا سا وائنڈ کیا اور پھر پلے کا بٹن دبادیا۔ اس کے اسپیکر سے میری آ ابھری۔ غالب نے اسے فوراً آف کردیا اور کیسٹ نکال کے جیب میں ڈال لیا۔

"اب اس عورت کا کیا کریں؟" غالب بولا۔

میں نے کہا "ہم کیا کرسکتے ہیں' اکبر خان کرے جو کرنا ہے۔"

"پھر اتنا وقت ضائع کرنے کی ضرورت بھی کیا تھی؟ یہ ٹیپ چھوڑ جاتے" غالب نے کہا۔

دروازے پر دستک سن کے میں چونکا "یہ کون آگیا؟"

روزینہ نے سر اٹھایا "ڈرو نہیں۔ اکبر خان نہیں ہوسکتا شاید کوئی ملازم ہوگا۔ انٹرکام توڑ کے تم نے غلطی کی تھی۔"

غالب آہستہ آہستہ دروازے کی طرف گیا۔ اس سے پہلے وہ سوال کرتا' باہر سے نازو کی آواز آئی "غالب! تم اندر ہوا تک؟"

غالب نے کہا "نہیں۔ اندر کوئی نہیں ہے۔"

"بکو مت۔ دروازہ کھولو۔"

"ابھی ہم مصروف ہیں' بعد میں آنا۔" غالب بولا "اندھی ہو کیا؟ نظر نہیں آتا؟ باہر لکھا ہوا ہے۔ ڈونوٹ ڈسٹرب۔"

رابعہ ہنسی "یہ کہاں لکھا ہوا ہے؟ مجھے تو نظر نہیں آتا۔"

"اچھا نہیں لکھا ہوا ہے تو خود لکھ لو" غالب بولا۔

"غالب کے بچے!" نازو نے دروازے پر لات ماری۔

"غالب کے بچّے ابھی نہیں ہوئے" غالب نے کہا "جب ہو گے تو سب سے پہلے تمہیں ہی معلوم ہوگا۔"

میں نے کہا "کیوں شامت آئی ہے تمہاری مرزا جی۔ اور یہ کون سا موقع ہے مار کھانے کا۔ کھول دو دروازہ۔"

اس نے دروازہ کھولا اور دوڑ کے میرے ساتھ آکھڑا ہوا۔ رابعہ کو شاید نازو نے سمجھا لیا تھا کہ اپنے غصے کو کنٹرول میں رکھے چنانچہ بگولے کی طرح اندر آنے کے بعد اس نے غالب کو خونخوار نظروں سے گھورا لیکن کچھ کہا نہیں۔ غالب بڑی عاجزی' معصومیت اور ڈھٹائی سے اسے چڑانے کے لیے دانتوں کی نمائش کرتا رہا۔

میری سوالیہ نظروں کے جواب میں رابعہ نے کہا "چوکیدار گیٹ پر ہی موجود ہے لیکن وہ نہیں ہے۔"

میں سمجھ گیا کہ "وہ" سے اس کی مُراد ہے وہ اخبار فروش لڑکا۔

"کیوں' وہ کہاں گیا؟" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "ہم نے چوکیدار سے کہا تھا کہ اسے اندر آنے دے۔"

"اس کا کہنا ہے کہ پہلے وہ اندر آنے پر رضامند ہوگیا تھا پھر میں نہ جانے کیوں اس کا ارادہ بدل گیا۔ وہ کہنے لگا کہ میں پھر آؤں گا اور واپس چلا گیا" رابعہ نے کہا۔

"یہاں کیا ہورہا ہے؟ ابھی تک تعارف کے مرحلے طے ہورہے ہیں" نازو بولی "بات کچھ آگے بڑھی؟"

"تمہارے منہ سے یہ جلی کٹی باتیں ایسی ہی لگتی ہیں جیسے بلبل غصے میں کوّے کی طرح کائیں کائیں کرنے لگے" غالب بولا۔

میں نے جیب سے کیسٹ نکال کے دکھایا "یہ کام تو ہوگیا۔"

"پھر چلو" نازو جھینپ کے بولی۔

میں نے مختصراً ان کو روزینہ کا مسئلہ بتایا "اسے چھوڑتے ہیں تو خرابی۔"

"ساتھ لے جائیں تو اس سے بڑی خرابی۔ یعنی خانہ خرابی" غالب نے کہا "کیوں نہ ہم ٹاس کرلیں۔"

میں نے کہا "یہ فیصلہ ایسا نہیں ہے کہ اسے ہم تقدیر پر چھوڑ دیں۔ ذرا سوچو کہ ہم سب کی گفتگو اکبر خان کے کانوں تک پہنچ گئی تو کیا ہوگا۔ ہمارے سارے منصوبے دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔ اکبر خان کے اعتماد سے محروم ہو کے ہم چوہدری دلاور یا استاد پیڈرو جیسے لوگوں کا کیسے مقابلہ کریں گے؟"

رابعہ نے میری تائید کی۔ "اس وقت اکبر خان کو دشمن بنالینا سب سے بڑی بے وقوفی ہوگی۔ وہ پہلے ہی ہمیں بے وقوف بنا کے پیر کیکر شاہ سے لڑوا چکا ہے۔"

"لڑادے مولے کو شہباز سے' یہ علامہ صاحب نے فرمایا تھا" غالب بولا۔

"ممولا کس کو کہا ہے تم نے؟" نازو بولی "اس سے پہلے یہ بتاؤ کہ ممولا ہوتا کیا ہے؟"

"ممولا.... نیولا اس کا ماموں زاد ہوتا ہے ایک رشتے سے۔" غالب نے سر کھجا کے کہا۔

میں نے کہا "یہ جہالت کی باتوں کا وقت نہیں ہے۔ ممولا چھوٹی سی چڑیا ہوتی ہے۔ تم دونوں سیریس نہیں ہوسکتے تو باہر جاؤ۔"

رابعہ نے کہا "کیا خاتون ہمارے ساتھ جانا پسند کریں گی؟"

روزینہ نے نفی میں سرہلایا "کوئی فائدہ نہیں' یہاں سے بھاگ کر کسی کے ساتھ جانے کا۔"

مجھے جھنجلاہٹ ہونے لگی "فائدہ یہ ہے کہ تم کچھ دن اور جی لوگی۔ کوشش کیے بغیر حوصلہ ہارنے کی کیا ضرورت ہے۔ بھئی یا تو سامنا کرو اکبر خان کا اور اسے یقین دلادو کہ ہم نے ایسی ویسی کوئی بات ہی نہیں کی تھی اور...."

"ایک منٹ" غالب بولا "میرے بہت اعلیٰ دماغ میں ایک بہت اعلیٰ خیال آیا ہے۔ سارا معاملہ ہے کیسٹ کا۔ ہم یہ کیسٹ نہیں چھوڑ سکتے اور روزینہ کو بھی نہیں چھوڑ سکتے کیونکہ کیسٹ اس کے ذہن میں ہے اور اکبر خان کو کیسٹ نہ ملا تو وہ روزینہ کو بجا کے سب سُن لے گا۔ اب فرض کرو کہ ہم کیسٹ بھی چھوڑ جائیں اور روزینہ کو بھی لیکن ہمارا ہرج بھی نہ ہو۔"

"تم جب بولو گے ایسی ہی بے تُکی بات کروگے" نازو نے کہا۔

میں نے نازو کو گھورا "پہلے پوری بات سُن لو۔"

"نہیں۔ پہلے ان کی سُن لو جن کو سرخدا نے دیا تھا صرف خوب صورت بال اُگانے کے لیے۔ اندر کھوپڑی میں اچھی کھاد ہوگی بس۔ گوبر کی کھاد۔" غالب گرم ہوگیا "ڈیڑھ تولہ عقل ہوگی کہیں اس کھاد میں۔"

"ہاں۔ باقی ڈیڑھ من عقل تو تمہارے سر میں کُشتہ بنا کے بھردی گئی ہوگی" نازو جل کے بولی۔

میں نے سر پر ہاتھ مارا "یار! یہ کیا مصیبت ہے آخر؟ تمہیں ذرا احساس نہیں کہ وقت کم ہے۔ ایسا نہ ہو اکبر خان آجائے..."

"آج رات وہ باہر رہے گا" روزینہ نے کہا "وقت بہت ہے۔"

"مس روزینہ! تمہارے پاس کوئی دوسرا کیسٹ ہے؟" غالب بولا۔

اس نے نفی میں سرہلایا "یہاں تو نہیں ہے۔ ہے تو مجھے نہیں معلوم کہ کہاں ہے۔"

"چلو ہم یہی کیسٹ دوبارہ ریکارڈ کرلیتے ہیں۔" غالب نے کہا "ہمیں اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔"

"ہمیں اس کی بالکل ضرورت نہیں" میں نے غالب کی بات سمجھ لی تھی "اسے ہم ضائع کردیتے ہیں؟"

"کیسٹ ضائع کرنے سے کیا فائدہ؟ اسی پر ہم کچھ اور ریکارڈ کرواتے ہیں" غالب نے کہا "اس میں ایک گھنٹا تو لگے گا مگر یہ مسئلے کا بہترین حل ہے۔"

میں قائل ہوگیا۔ "نازو! اب تمہیں فراخ دلی سے کام لیتے ہوئے مان لینا چاہیے کہ تمہاری رائے غلط تھی۔"

"بلکہ تم کو اپنے الفاظ واپس لے کر مجھ سے معافی مانگنی چاہیے۔ نہایت عاجزی کے ساتھ ہاتھ باندھ کے۔"

رابعہ نے فوراً نازو کی حمایت کی "چلو اب تم بھی زیادہ سر پر مت چڑھو۔ جو کرنا ہے فوراً کرلو۔"

میں نے کیسٹ غالب کو پیش کیا "یہ لو۔ اسے واپس ٹیپ ریکارڈر میں لگادو۔ اور مس روزینہ! آپ اسے اپنی جگہ رکھ دیں۔"

"تم بھی کرسکتے ہو یہ کام۔ تصویر اپنی اصلی جگہ آئے گی تو خانہ خود بخود لاک ہوجائے گا۔" روزینہ نے کہا۔

میں نے کیسٹ لگا کے اسے "آن" کیا اور خفیہ خانے میں رکھ کے فریم کو دوبارہ بند کردیا۔ "یہ بھی بتادو کہ تم نے اس کو کیسے کھولا تھا۔ وہ بٹن کہاں ہے؟"

"تم کیا کروگے دیکھ کر؟" روزینہ بولی لیکن اس کی نشاندہی سے پہلے ہی غالب نے وہ بٹن تلاش کرلیا۔ شاید وہ پہلے زیادہ غور سے دیکھ چکا تھا کہ روزینہ کا ہاتھ کہاں گیا تھا۔

میں نے دوبارہ فریم ہٹا کے ٹیپ کو آف کیا اور کیسٹ کو "ریکارڈ" کی پوزیشن پر لانے سے پہلے کہا "اب آپ سب [illegible] خاموشی سے نکل جائیں اور اپنے کمرے میں میرا انتظار کریں [illegible] مس روزینہ کو ساتھ لے کر آتا ہوں۔"

"میں یہیں ٹھیک ہوں" روزینہ نے للچائی نظروں سے [illegible] کی بوتلوں کو دیکھا۔

"احتیاط ضروری ہے مس روزینہ" میں نے کہا "کہیں [illegible] کہ ہمارے جاتے ہی تم اصل کیسٹ نکال کے چھپالو اور کوئی [illegible] کیسٹ لگادو۔"

اس نے زخم خوردہ نظروں سے مجھے دیکھا "تمہیں اعتبار [illegible] ہے مجھ پر؟"

"یہ اعتبار کا کھیل ہی نہیں ہے۔"

وہ افسردگی سے مسکرائی "اچھا۔ مجھے اس بات کی اجازت [illegible] کہ میں اپنے ساتھ کچھ لے چلوں۔ پیاس بجھانے کے لیے تمہارے پاس کیا ہوگا؟"

غالب بولا "ہم سیدھے سادے لوگ پانی سے پیاس بجھا[illegible] ہیں۔"

وہ ہنس پڑی "سیدھے سادے لوگ! احمق' ہر پیاس کیا [illegible] سے بجھتی ہے۔ اور تم پیاس کو بجھاتے نہیں' دباتے ہو۔ اس [illegible] پیاس اور بھڑکتی ہے۔ جیسے آگ جو اندر لگی ہو..."

میں نے اسے ٹوک دیا "فضول باتیں چھوڑو۔ تم ایک گھنٹے [illegible] مر نہیں جاؤگی۔"

وہ خاموشی سے اٹھی اور میرے سامنے کھڑی ہوگئی "کیا [illegible] اس لڑکی سے کم خوب صورت ہوں؟ کیا نام ہے اس کا۔ رابعہ..."

میں نے کہا "رابعہ کے حسن کو تمہاری نظر نہیں دیکھ سکتی۔"

"تم اس سے محبت کرتے ہو نا؟" وہ میرے سہارے پر [illegible] لگی۔

"تم جانتی ہو تو پوچھ کیوں رہی ہو؟"

"کتنی محبت ہے تمہارے پاس اس کے لیے؟"

"میں کیا جواب دوں اس بات کا۔ محبت کو تول کر من [illegible] چھٹانک میں بتانا یا حساب کے کسی قاعدے سے اس کی پیمائش [illegible] تو سائنس کے لیے اتنا ہی ناممکن ہے جتنا خلا کا رقبہ بتانا۔"

"اچھا۔ بہت محبت ہے تمہارے دل میں!" وہ بولی "اکبر [illegible] کی دولت زیادہ ہے یا تمہاری محبت؟"

میں نے جھنجلا کے کہا "میری محبت لامحدود ہے۔ اکبر خان [illegible] دولت کا اس سے کیسے موازنہ کیا جاسکتا ہے؟ یہ دولت ایک [illegible] ہوجانے والی اور ختم ہوجانے والی چیز ہے۔"

"اس کے باوجود اکبر خان بڑی فراخ دلی سے مجھ پر لاکھ[illegible] لُٹا دیتا ہے۔ مجھ سے پہلے بھی نہ جانے کس کس پر لُٹاتا رہا [illegible] اسے یہ خوف نہیں ہے کہ کسی دن یہ دولت ختم ہوجائے گی [illegible]

"پھر... کیا ثابت ہوتا ہے اس سے؟"

"پتا نہیں" وہ بے خیالی میں بولی "کیا تم اس خیال سے نہیں ڈرتے کہ تمہاری محبت کم نہ ہوجائے؟ تمہارا ساتھ نہ چھوڑ دے؟"

"محبت سچی ہو تو ایسا خیال آتا ہی نہیں" میں نے کسی فلمی ہیرو کی طرح ڈائیلاگ بولا۔

"اچھا۔ تو پھر اس میں سے تھوڑی سی محبت مجھے دے دو۔ بس تھوڑی سی" اس نے اچانک میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں "سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم تو سمندر خشک نہیں ہوتا۔"

میں نے اس کے ہاتھ جھٹک دیے "تم پاگل ہوگئی ہو نشے میں۔"

"نہیں۔ میں بقائمی ہوش و حواس ایسا کہہ رہی ہوں۔ ساری زندگی تم رابعہ سے محبت کرتے رہنا بعد میں لیکن آج اس مے خانے سے ایک جام میرے نام کردو.... خیرات کے طور پر۔ اپنی محبت کی اور اپنی زندگی کے حسین مستقبل کی زکوٰۃ سمجھ کے۔"

پہلے میں نے غصے میں اس کو جھانپڑ رسید کرنے کا سوچا لیکن پھر مجھے اس پر رحم آگیا "کیا تم سمجھتی ہو کہ یہ محبت کوئی ایسی چیز ہے جس میں لین دین' نقد اور اُدھار ممکن ہے؟ جو خریدی یا بیچی جاسکتی ہے' کسی کو استعمال کے لیے دی جاسکتی ہے اور وقتِ ضرورت لی جاسکتی ہے؟"

"مجھے .... واقعی نہیں معلوم۔ وہ سب جو مجھ سے محبت کرتے رہے۔ اور جن سے میں نے محبت کا اظہار کیا.... وہ ایسا ہی سمجھتے تھے مگر میں تو دوسری محبت مانگ رہی ہوں تم سے۔"

"بے وقوف عورت! نہ وہ محبت میری ملکیت ہے اور نہ میرے تصرف میں ہے۔ یہ رابعہ کی ایک مقدس امانت ہے اور اس خزانے کی چابیاں بھی میرے پاس نہیں۔ رابعہ کے پاس ہیں۔"

"جھوٹ بولتے ہو تم۔ باتوں سے بے وقوف بناتے ہو مجھے۔ تم متعصب اور تنگ نظر ہو۔ خسیس ہو اور جان بوجھ کے میری تذلیل کررہے ہو۔ کوئی ایسا مرد نہیں جو روزینہ کو ٹھکرا سکے..." اس کی انا میرے انکار سے مجروح ہوچکی تھی۔

"اونٹ جب تک پہاڑ کے دامن سے نہ گزرے' اپنی بلندی پر غرور کرتا رہتا ہے۔ میں ہوں وہ مرد..."

"نامرد ہو تم۔ بزدل ہو.... ڈرتے ہو رابعہ سے" اس نے چلا کے کہا۔

اب میں نے اس کے گال پر اُلٹے ہاتھ سے چانٹا مارا۔ اس کے گلابی رنگ پر انگلیوں کے نیل نمودار ہوگئے "ایک جسم فروش عورت کی ہوس کے جذبات کی تسکین کوئی حیوان ہی کرسکتا ہے۔ اور میں انسان ہوں۔ تم جس خوب صورت جسم پر نازاں ہو اس کے اندر کی روح میں مجھے انسانیت کی بدصورتی کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ میں تم سے صرف نفرت کرسکتا ہوں۔"

وہ ایک ہاتھ گال پر رکھے مجھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی اور ان آنکھوں کی ویرانی میں مجھے احساسِ ذلت سے پیدا ہونے والے انتقامی جذبات کی خوں آشامی نظر آرہی تھی۔ "جب مرد کے پاس دلیل نہ رہے تو وہ ہاتھ اٹھاتا ہے۔"

میں نے تھوڑی سی شرمندگی محسوس کی "آئی ایم سوری۔ تمہاری یہ گالی میں برداشت نہ کرسکا۔"

"تمہارا سچ تو میں نے سن لیا تھا۔" وہ آہستہ سے بولی اور پھر ایک دم باہر نکل گئی۔ میں ٹیپ ریکارڈر آن کرکے گیا۔

"بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے" غالب نے مجھے دیکھ کے دیدے گھماتے ہوئے کہا۔

نازو نے اسے مصنوعی غصے میں ڈانٹا "بھئی ہوگی ایسی کوئی بات جو ہم سب کی موجودگی میں نہیں ہوسکتی تھی۔"

غالب نے گھڑے کی طرح سرہلایا "اور بات کچھ مشکل ہوگی۔ سمجھنے سمجھانے میں دیر لگی۔"

"ویسے اپنے سکندر صاحب ہر بات سمجھ لیتے ہیں اور کسی کا دل توڑنا تو ان کے مسلک میں حرام ہے" نازو شرارت پر آمادہ تھی۔

غالب نے کان میں انگلی ڈال کے ہلائی "خیر جی ہمیں کیا۔ دیر ہویا اندھیر۔ مس رابعہ! ایک لطیفہ سناؤں آپ کو؟ آپ کچھ اداس اور متفکر نظر آرہی ہیں۔"

میں نے ظاہر یہ کیا کہ میں ان کی بکواس کو ایک کان سے سُن کے دوسرے سے اُڑا رہا ہوں لیکن غالب کے قریب جا کے میں نے اسے ایک دم اٹھایا اور دھوبی پٹخا دے کر بیڈ پر دے مارا۔

غالب نے واویلا کیا "آہ... اف .... ارے نازو' بھوت کی بچّی.... تیرا سُہاگ خطرے میں ہے اور تو خاموش ہے۔ تماشا دیکھ رہی ہے۔"

"اور میں کیا کروں؟ تمہاری مغفرت کی دعا۔"

"بے وفا۔ آگے بڑھ کر جان کی بازی لگادے۔ اس پیار کے دشمن کا جھٹکا کردے۔ قربان ہوجا وفا کی راہ میں۔"

"تم خود وفا کی راہ میں قربان کیوں نہیں ہوتے؟ باتیں تو بہت کرتے تھے پیار میں جان دینے کی" نازو نے لہجہ بنا کے کہا۔

غالب ایک دم اٹھ بیٹھا "قسم خدا کی' میں بہت سخت اداریہ لکھوں گا اپنے اخبار میں۔ ایک محبت کے خلاف' ایک دوستی کے خلاف۔"

"اس سے کیا ہوگا؟" رابعہ ہنسی۔

نازو نے کہا "تیسرے دن اخبار بند ہوجائے گا یا مُدیر۔"

میں نے کہا "چلو اب مذاق بہت ہوگیا۔ کچھ کام کی باتیں بھی کرلیں ہم۔ سب سے پہلا مسئلہ ہے اخبار کی پالیسی۔"

غالب نے کہا "سب سے کامیاب پالیسی یہ ہوگی کہ کوئی پالیسی نہ ہو۔"

میں نے کہا "بالکل ٹھیک کہا تم نے۔ کامیاب وہی ہیں جن کا اصول ہے کہ کسی اصول کی بات نہ کی جائے۔ لیکن ہم ایسا نہیں کرسکتے۔"

"اور یہ بات ہم اکبر خان پر واضح بھی کر چکے ہیں" رابعہ بولی۔

روزینہ بے زار اور خاموش بیٹھی نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔ اچانک اس نے سر اٹھا کے میری طرف دیکھا تو میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

"جو باتیں ہم کر رہے ہیں' وہ ریکارڈ ہو رہی ہیں۔ اس میں تمہاری آواز شامل نہیں ہونی چاہیے" میں نے کاغذ کے ایک پُرزے پر لکھا اور اسے پکڑا دیا۔

اس نے مجھ سے پین لے کر لکھا "ایسے میں خاموش نہیں بیٹھ سکتی' مجھے خاموشی کی دوا چاہیے۔"

میں سمجھ گیا کہ خاموشی کی دوا سے اس کی کیا مراد ہے۔ میں نے غالب اور نازو کو اشارہ کیا کہ وہ اپنی باتیں جاری رکھیں اور خود بادل ناخواستہ روزینہ کے لیے شراب کی بوتل لینے چلا گیا۔ واپس آکے میں نے واش بیسن میں ہاتھ اچھی طرح دھوئے۔ اس کے باوجود مجھے یہ احساس رہا کہ میں نے ایک حرام اور ناپاک چیز کو چُھوا تھا۔

غالب اور نازو کو میں نے باتیں کرنے کے لیے کہا تھا چنانچہ وہ لڑ رہے تھے۔ ان کی باتیں شروع بھی لڑائی سے ہوتی تھیں اور ختم بھی لڑائی پر ہوتی تھیں۔

"تم تو خود بھوت ہو" نازو بولی۔

"ہاں میں بھوت ہوں' اسی لیے تو ایک بھوت نے اپنی فرزندی میں قبول کیا ہے مجھے۔" غالب نے چلّا کے کہا۔

"مجھے آتا ہے بھوت اتارنا۔"

"اپنے ابّا سے سیکھا ہوگا تم نے۔"

میں نے کہا "کبھی خود بھی خاموش ہو جایا کرو۔ میں نہ منع کروں تو شاید تم سارا دن لڑتے رہو۔"

رابعہ بولی "ایسے ہی ایک دوسرے کا دماغ کھاتے رہتے ہیں۔"

غالب نے کہا "دماغ یہ کھاتی ہے میرا۔ اس سے کہو۔"

"واہ" نازو چمک کر بولی "تم کچھ نہیں کھاتے۔"

"میں تو بھوسہ کھاتا ہوں۔ جو ملے گا وہی کھاؤں گا نا۔"

میں نے کہا "خاموش ہو جاؤ۔ خدا کے لیے دونوں چپ ہو جاؤ' ایک دوسرے کی طرف دیکھو بھی مت۔"

"ٹھیک ہے۔ میں اِدھر منہ کر لیتا ہوں" غالب نے پیٹھ پھیرلی "سامنے ہے پاؤں کی جوتی جو زیادہ خوب صورت ہے۔"

نازو نے جل بھن کے دوسری طرف منہ کر لیا "مجھے بھی نظر آرہا ہے باتھ روم کا لوٹا۔ بے پیندے کا نہیں ہے۔ بد صورت ہے تو کیا ہوا۔"

رابعہ کو ہنستا دیکھ کے مجھے بھی ہنسی آگئی۔ اب میں رابعہ کے روبرو تھا لیکن نازو اور غالب ہمارے دائیں بائیں دیوار کی طرف منہ کیے بیٹھے تھے اور نادان' ضدی بچوں کی طرح روٹھے ہوئے تھے۔

میں نے کہا "مرزا جی! تم نے اخبار کا کوئی نام سوچا ہے؟"

"سوچا ہے۔ مغلوب لوٹا۔" غالب نے کہا۔

"مظلوم جوتی بھی اچھا نام ہے" نازو بولی۔

رابعہ نے کہا "نام ایسے نہیں رکھا جاتا۔"

"میرا ایسے ہی رکھا گیا تھا۔ دادا جان کا خیال تھا کہ نام سے بڑا فرق پڑتا ہے۔ اسد اللہ غالب ثانی بن کے میں شاعری میں ... پیدا کروں گا کہ لوگ اصل غالب کو بھول جائیں گے۔ آج تک ایک شعر نہیں گھڑ سکا میں۔ اب ایک خاتون ہیں بڑی خونخوار ... مگر نام ہے ان کا نزاکت۔"

"انہیں چھوڑو' یہ سیریس نہیں ہو سکتے" رابعہ بولی "میرا خیال ہے کہ اس اخبار کے لیے دفتر میرے آفس کو بنا لیا جائے۔"

"آئیڈیا تو بُرا نہیں" میں نے کہا۔

"اس سے بہتر اور موزوں جگہ اخبار کے لیے کہاں ملے گی" رابعہ نے مجھے قائل کرنے کے انداز میں کہا "قریب ہی ٹرسٹ کے اخبارات ہیں۔"

"امروز اور پاکستان ٹائمز" میں نے کہا "ٹرسٹ کی تحویل میں آکے کیا سے کیا ہو گئے۔ پروگریسو پیپرز کی ملکیت تھے تو ان کا ... تھا۔ اب ٹرسٹ کا نام ہے مگر ٹرسٹ نہیں۔"

"مرحوم سول اینڈ ملٹری گزٹ بھی آگے سے شائع ہوتا تھا۔ آج تک بلڈنگ کا وہی نام ہے۔" رابعہ بولی "کیسا المیہ ہے کہ ... سال سے زیادہ عرصہ جاری رہنے والا اخبار بند ہو گیا جس کو رڈیارڈ کپلنگ (RUDYARD KUPLING) جیسے ایڈیٹر چلاتے رہے۔"

غالب نے آہ بھری "مجھ پر رقت طاری ہو رہی ہے اس خیال سے کہ ایک دن وہ اخبار بھی بند ہو جائے گا جس کو ہم چلائیں گے بلکہ دوڑائیں گے۔ یوں کہ سارے اخبار پیچھے رہ جائیں گے۔"

میں نے کہا "اس میں میرا کالم روز چھپے گا۔ عنوان ہوگا "جھوٹی باتیں" اور لکھنے والا ہوگا۔ "سچا آدمی" یہ قلمی نام ہوگا۔"

"ونڈر فل۔" رابعہ نے خوش ہو کے کہا "مجھے یقین ہے اسی کی مقبولیت پر اخبار چل جائے گا۔"

غالب نے ایک دم پلٹ کے کہا "اخبار چلتا ہے ایڈیٹر کے نام پر۔ کامریڈ چلتا تھا مولانا محمد علی جوہر کے نام پر۔ زمیندار صرف مولانا ظفر علی خاں کے دم سے تھا۔ پھر چراغ حسن حسرت ... عبدالمجید سالک۔"

میں نے کہا "اچھا یار! ہم مان لیتے ہیں مروّت میں کہ اخبار تمہارے نام پر چلے گا۔"

"سچا آدمی اپنے کالم میں چوہدری دلاور جیسے لوگوں کے بارے میں انکشافات کرے گا تو تہلکہ مچ جائے گا" غالب بولا۔

میں نے کہا "روز ہتکِ عزت کا نوٹس ملے گا یا کوئی دھمکی ملے گی۔"

اب نازو نے پلٹ کے کہا "بدنام جو ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا۔ یہ تو بڑا اچھا ہوگا اگر ہمارے خلاف مقدمات قائم ہو جائیں۔ مفت کی پبلسٹی ملے گی ہمارے دشمنوں کے ذریعے۔"

"رہی سہی کسر عدالت میں پوری ہو جائے گی جب ہماری قانونی مشیر مس رابعہ قاری جرح میں ان کے بخیے اُدھیڑیں گی" غالب خوش ہو کے بولا۔

"مس رابعہ نہیں' مسز رابعہ سکندر۔ لیگل ایڈوائزر۔ یعنی مشیرِ قانونی" نازو نے اسے ٹوکا۔

"اور جرائم کی دنیا کے راز فاش کریں گی ہماری کرائم رپورٹر مسز نزاکت غالب" میں نے فوراً جوابی حملہ کیا "بڑے بڑے مجرم ان کے نام سے تھر تھر کانپتے نظر آئیں گے۔ پولیس والے سر پکڑ کے رو ئیں گے۔"

"سر پکڑ کے نہیں' پیٹ پکڑ کے" غالب بولا "جواُن کی شخصیت کو زیادہ رُسوا کرتا ہے۔ جب بیلٹ اترتی ہے تو اسی پیٹ پر سے۔"

آدھے گھنٹے بعد غالب نے روزینہ کے کمرے میں جا کے ٹیپ ریکارڈر میں کیسٹ کو پلٹ کے لگا یا۔ اکبر خان نے یہ کام روزینہ کے سپرد کیا ہوگا مگر وہ ہمارے کمرے میں بے خبر سو رہی تھی۔ وہ میری طرف سے ٹھکرائے جانے کی ذلت کے احساس کو مٹانے کے لیے مسلسل پیتی رہی تھی۔ اس کی طرف رابعہ کی پیٹھ تھی لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ اس کی نگاہوں میں رابعہ کے لیے نفرت کا کتنا زہر ہے۔ شاید وہ سمجھتی تھی کہ اس کی قوتِ تسخیر اور غرورِ حسن کو محض اس عورت کی وجہ سے شکست ہوئی جو اس کے نزدیک ایک معمولی عورت تھی۔ اس میں مجھ سے نظر ملانے کی ہمت نہ تھی۔ وہ اپنے ہونٹ کاٹتی رہی اور ایک مرحلے پر مجھے یوں لگا جیسے جذبات کا وہ آتش فشاں جو اس کے وجود میں اُبل رہا ہے' اس کی عقل اور ضبط کے حوصلے کو جلا کے خاک کر دے گا۔ میں ہر قسم کے طوفانی ردِّ عمل کے لیے ذہنی طور پر تیار تھا مگر روزینہ کے اندر کی مغرور اور خود پسند عورت نے مزید ذلت اٹھانا منظور نہ کیا۔ اس کی آنکھوں سے جو آنسو ٹپکے ان پر اس کا اختیار نہ تھا۔ کسی نے ان خاموش آنسوؤں کو دیکھا بھی تو سمجھا نہیں اور وہ اپنے آپ سے لڑتے لڑتے تھک گئی تو جہاں بیٹھی تھی وہیں گر کے روتے روتے سو گئی۔ سرہانے میر کے آہستہ بولو!

ایک گھنٹے بعد میں نے باہر جھانک کے دیکھا تو کوٹھی میں اندر اور باہر خاموشی تھی یا رات کا پُراسرار اندھیرا تھا جو ہر جگہ جلنے والی روشنی کو جُل دے کر چوروں کی طرح ہر کونے میں چُھپا بیٹھا تھا۔ رات کے ساڑھے آٹھ بجے تھے اور کوئی ملازم کسی بھی وقت ڈنر کے لیے پوچھنے آسکتا تھا۔ ابھی تک قسمت ساتھ دے رہی تھی۔ آج رات اکبر خان موجود نہیں تھا۔ پھر ہم وہ کیسٹ ضائع کر چکے تھے جو ہمارے سارے راز فاش کر دیتا اور اب اکبر خان کے لیے وہ کیسٹ رہ گیا تھا جس میں نہ ہمارے لیے خطرے کی بات تھی اور نہ اکبر خان کے لیے شک کی۔ بس ایک خیال کی خلش تھی جو صرف میرے دل کو بے قرار کر رہی تھی۔ کیا روزینہ اپنی تذلیل کا بدلہ یوں نہیں لے سکتی کہ اکبر خان کو اصل صورت حالات سے آگاہ کر دے' اسے وہ سب بتادے جو کیسٹ پر سے تو حرفِ غلط کی طرح مٹایا جا چکا تھا مگر اس کے دماغ سے نہیں کھرچا جا سکتا تھا۔ سچ بول کے وہ زیادہ مُعتبر ہو سکتی تھی اور یہ کوئی مشکل کام بھی نہیں تھا۔ اکبر خان کو شک بھی نہ ہوتا کہ وہ کسی انتقامی جذبے سے مغلوب ہو کے سچ بول رہی ہے۔ تذلیل کا داغ نظر نہ آئے مگر اس کی اپنی ذات مظلوم و معصوم نظر آئے۔

غالب نے میرا کندھا ہلا کے کہا "بڑے بھائی! کیا دل نہیں چاہتا یہاں سے جانے کو؟ داغِ مفارقت کے خیال سے دل پریشان ہے؟"

"ہاں۔ پریشانی تو ہے" میں نے چونک کے کہا۔

"آہ رابعہ! تمہارے سکندرِ اعظم عرف ہرجائی بالم نے کیا ٹکا سا جواب دیا ہے تمہیں" غالب آواز میں رقت پیدا کر کے بولا "کیا ہے وہ دردناک فلمی شعر۔ لا کے منجدھار میں مانجھی نے ہمیں چھوڑ دیا۔"

میں نے خِفّت سے رابعہ اور نازو کی طرف دیکھا جو میری محویت کا کچھ اور ہی مطلب نکال رہی تھیں "بکومت۔ پریشانی کا سبب کچھ اور ہے جو میں نے ابھی تک تمہیں نہیں بتایا تھا۔"

"معلوم ہے ہمیں۔ سب کو نظر آرہا ہے۔ اندھے نہیں ہیں ہم سب" غالب نے بولنا شروع کیا "تم بھلا کیوں بتاؤ گے ایسی بات ہمیں لیکن تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔ ماری گئی رابعہ۔"

"مارے جاؤ گے تم میرے ہاتھوں" میں نے بگڑ کے کہا "فضول بولتے جا رہے ہو۔ اصل بات کا پتا ہی نہیں۔"

"اچھا تو تم کچھ بولو...."

نازو نے کہا "آپ بتا دیں اصل بات۔"

"کیا بتاؤں" میں نے سر کھجا کے کہا "شرم آتی ہے۔ مجھے اس بے شرم سے امید نہ تھی ایسی بات کی۔ میرا کوئی قصور بھی نہیں تھا۔"

رابعہ کا رنگ فق ہو گیا "سکندر...."

غالب اور نازو بھی ایک دم سیریس ہو گئے۔ انہیں میرے موڈ سے اندازہ ہونے لگا تھا کہ اب بات مذاق کی نہیں رہی۔

"تم لوگ غلط سمجھ رہے ہو۔" میں نے برہمی سے کہا "... ایسا

سوچ بھی رہے ہو تم تو پھر میرے لیے واقعی شرم کی بات ہے اور یہ بڑے دُکھ کی بات ہے۔ اگر اتنا کمزور اور ناقابلِ اعتبار ہے ہمارے درمیان اعتماد کا رشتہ....."

"مت کرو ایسی دل دُکھانے والی باتیں سکندر" رابعہ نے افسردگی سے کہا "میرے اعتماد کو بلاوجہ الزام مت دو۔"

"نہ تم چور ہو نہ تمہاری داڑھی ہے اور نہ اس میں کوئی تنکا جس کی طرف تمہارا ہاتھ جائے" غالب نے کہا "پھر یہ پریشانی کیسی؟"

میں نے انہیں بتادیا کہ کس طرح روزینہ نے مجھے ورغلانے کی پوری کوشش کی تھی اور کس طرح میں نے اسے ٹھکرادیا تھا۔ اس کے بعد یہ اندیشہ باقی رہتا ہے کہ وہ اپنی ذلت کا انتقام لینے کے لیے اکبر خان کو ہمارے خلاف بھڑکائے۔ یہ بتادے کہ اصل کیسٹ تو ہم نے زبردستی حاصل کرلیا تھا۔ بعد میں جو کچھ ریکارڈ ہوا' سب بکواس ہے۔ اصل بات کو وہ بڑھا چڑھا کے بھی بتا سکتی ہے۔

غالب اور نازو کے ہونٹوں پر بڑی شریر مسکراہٹ تھی جو مجھے مزید خفت میں مبتلا کررہی تھی لیکن رابعہ بھی اپنے بے بنیاد شک اور حسد کے جذبات پر شرمندہ تھی چنانچہ وہ ذہنی طور پر میرے ساتھ ہوگئی تھی۔ اس نے کہا "اسے چھوڑ جانے کی صورت میں یہ خطرہ تو باقی رہے گا۔"

غالب نے سرہلایا "اور اسے ساتھ لے جانے کی صورت میں کیا ہوگا' یہ بھی سوچ لو مس رابعہ قاری اینڈ دکیٹ۔"

میں نے کہا "چلو فیصلہ تم کرو۔ میں تو یہ کام نہیں کرسکتا۔ تم اس کا گلا گھونٹ سکتے ہو تو آگے بڑھو۔ ختم کرو سارا جھگڑا۔"

غالب بے اختیار ایک قدم پیچھے ہوگیا "میں..... تم حکم بھی دو تو میں ایسا نہیں کرسکتا۔ یہ تو قتلِ عمد ہوگا۔"

"تم نازو؟ تم تو بہت بہادر ہو۔" میں نے تلخی سے کہا "ایک ہاتھ مار کے اس کی گردن توڑ دو۔"

نازو نروس ہوگئی "یہ تم کیسی باتیں کررہے ہو؟"

"تم بھی تو بہت بول رہی تھیں۔ باتیں کرنا واقعی آسان ہوتا ہے۔" رابعہ نے فخریہ لہجے میں کہا۔

نازو نے مجروح نظروں سے اسے دیکھا "رابعہ باجی! آپ جانتی ہیں ہم سب مذاق ہی کررہے تھے۔"

"اچھا ختم کرو یہ باتیں۔ اسے ہم ساتھ لے جائیں گے اور بعد میں سوچیں گے اس کے بارے میں" میں نے فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔

لیکن اسی وقت ایک غیر متوقع بات ہوئی۔ کسی نے بند دروازے پر دستک دی۔

"کوئی ملازم ہوگا۔ آپ ڈنر کا کہنے آیا ہوگا" میں نے کہا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ "میں دیکھتا ہوں۔ تم ذرا اس پر کوئی چیز ڈال دو۔ روزینہ پر۔"

میں نے دروازہ تھوڑا سا کھولا تھا کہ شان اسے دھکیل کر اندر آگیا اور پھر بند کرکے کھڑا ہوگیا۔ اس کی صورت پر بدحواسی کے آثار تھے۔

"شان! تم....." میں نے حیران ہو کے کہا "کیا بات ہے؟"

"تم اندر آتے آتے کہاں غائب ہوگئے تھے؟" رابعہ اپنی حیرت کے صدمے سے سنبھل کے بولی۔

"یہ سب میں پھر بتاؤں گا" وہ بولا "میں بڑی مشکل سے پہنچا ہوں یہاں۔ یہ بتانے کے لیے کہ آپ سب لوگ خطرے میں ہیں..."

میں نے اسے تسلی دینے کے انداز میں کہا "آرام سے بیٹھو اور پوری بات بتاؤ۔ واپس کیوں چلے گئے تھے تم؟"

"بیٹھنے کا وقت نہیں ہے" اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کے کہا "جب میں پہلے آیا تھا تو اکبر خان نظر آگیا تھا مجھے۔ وہ دیکھ لیتا مجھے یہاں تو بڑی گڑبڑ ہوجاتی۔"

"وہ جانتا ہے تمہیں۔ تم ہر روز اس کو اخبار دیتے ہو۔"

"ہاں۔ مگر وہ میری اصلیت نہیں جانتا۔"

"تمہاری اصلیت کچھ اور ہے؟" میں نے کہا۔

اس نے اقرار میں سرہلایا "اگر میں آپ سے ملنے آتا تو شاید اسے شک ہوجاتا' اس لیے میں واپس چلا گیا تھا۔"

"تم پُراسرار بننے کی کوشش کررہے ہو نورِ چشم" غالب نے کہا "ایسی کیا بات ہے؟"

"لمبی بات ہے پھر بتاؤں گا آپ کو" اس نے نروس لہجے میں کہا "میں باہر انتظار کررہا تھا کہ اکبر خان چلا جائے یا آپ باہر آجائیں تو میں بات کروں۔ میں دور سے گیٹ کو دیکھ رہا تھا۔"

"اسے تو باہر گئے ہوئے دیر ہوگئی" رابعہ بولی۔

"ہاں۔ اس کی کار نکلی تو میں بھی نکلا۔"

"تم چھپے ہوئے تھے کہیں؟"

"پارک میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایک بینچ پر۔ بینچ کے چاروں طرف گھنی تراشی ہوئی جھاڑیاں ہیں" اس نے وضاحت کی "اکبر خان کی گاڑی کے گزرتے ہی ایک اور گاڑی گیٹ پر آگئی۔ وہ کافی دیر کھڑی تھی اور کافی دیر سے وہیں تھی اس لیے میں نے پہچان لیا۔ اس میں سے کوئی اترا جس کا چہرہ اور جسم چادر میں لپٹے ہوئے تھے وہ چوکیدار کے کیبن میں گیا۔ میرا خیال تھا کہ اکبر خان کا کوئی ملنے والا ہوگا۔ پتا چلے گا کہ وہ ابھی ابھی گیا ہے تو لوٹ جائے گا یا انتظار کرنا چاہے گا تو کار اندر چلی جائے گی مگر کار دس منٹ تک وہیں کھڑی رہی۔ اس کا انجن چلتا رہا۔"

غالب بولا "بہت غور سے نوٹ کرتے ہو تم ساری باتیں۔"

"پورا سراغ رساں ہے یہ تو" رابعہ بولی۔

"وہ.... دراصل ... اس سڑک پر ٹریفک زیادہ نہیں ہے جب آدمی فارغ بیٹھا ہو تو سب دیکھتا رہتا ہے۔ ایک ہی کار نظر آ

تھی مجھے اور اس کا رنگ بھی عجیب سا تھا۔ کچھ ہرا کچھ پیلا۔ لیمن جیسا۔ اس لیے نمایاں تھا۔"

میں نے کہا "کیا فاکس ویگن تھی؟"

"جی .... نہیں جی۔ بڑی گاڑی تھی۔ سامنے سے یوں لگتا تھا جیسے اس کے لمبے لمبے دانت ہوں۔"

"میں سمجھ گیا۔ بیوک تھی پرانی لیکن پھر بھی بہت مہنگی گاڑی ہے اور اتنی عام بھی نہیں ہے" میں نے کہا۔

"اس کا سامنے والا حصہ بہت ٹوٹا پھوٹا تھا۔ دونوں لائٹس بھی نہیں تھیں۔ پیچھے سے ٹھیک تھی۔" شان نے کہا "اور میرا خیال ہے کہ اس گاڑی کو میں نے وہاں دیکھا تھا۔ کیکر شاہ کے مزار پر۔"

میرے کان کھڑے ہو گئے "کیکر شاہ کے مزار پر! تمہیں یقین ہے؟"

"بالکل جناب۔ وہاں جب دھماکے ہو رہے تھے تو اسی وقت یہ گاڑی نہ جانے کہاں سے نکلی تھی اور کچے راستے پر کھیتوں کے بیچ میں چلتی ہوئی غائب ہو گئی تھی۔"

"وہ کیکر کی اولاد اس میں فرار ہو گیا تھا۔ کسی خفیہ راستے سے نکل گیا تھا" میں نے کہا۔

غالب بولا "اب یہاں کیا لینے آیا تھا وہ؟"

"تم شان کو بھی تو کچھ بتانے دو۔ بیچ میں اپنی جرح شروع کر دیتے ہو" نازو نے کہا۔

شان نے پھر بات شروع کی "وقت ضرور نوٹ کیا تھا میں نے' اس لیے کہ کار نہ آگے گئی تھی نہ پیچھے۔ اور اس کے پیچھے سائیلنسر سے ہلکا سا دُھواں خارج ہو رہا تھا۔ اس سے اندازہ کیا میں نے کہ انجن چل رہا ہے۔ دس منٹ بعد جو شخص منہ سر چادر میں لپیٹ کر اندر گیا تھا اسے وردی والے چوکیدار نے کندھے پر اٹھا کے گاڑی میں ڈال دیا۔"

"کیا مطلب؟ مار کے ڈال دیا؟"

"یہ تو مجھے نہیں معلوم کہ وہ زندہ تھا یا صرف بے ہوش تھا لیکن وہ اس چادر میں لپٹا ہوا تھا جو پہلے اس نے اوڑھ رکھی تھی۔" شان نے کہا "چوکیدار نے اسے ڈکی میں ڈالا۔ ڈکی ایک اور شخص نے کھولی تھی۔ پھر گاڑی واپس چلی گئی۔ جدھر سے آئی تھی۔ وہ آدمی زندہ ہوتا تو اسے ڈکی میں کیوں ڈالا جاتا؟"

"تمہارا کیا خیال ہے' اسے چوکیدار نے قتل کر دیا ہو گا؟"

"میں وہیں رک کے بہت دیر تک سوچتا رہا کہ یہ معاملہ کیا تھا۔ چوکیدار نے اسے کیوں قتل کیا۔ اور اتنی آسانی سے کون قتل ہوتا ہے؟ میرا مطلب ہے لڑائی ہوتی ہے' مقابلہ ہوتا ہے۔ گولی کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا مگر میں نے گولی چلنے کی آواز نہیں سنی۔"

میں نے کہا "ایک چیز ہوتی ہے سائیلنسر۔ اگر وہ ریوالور کی نال پر لگا دیا جائے تو فائر کی آواز دب جاتی ہے۔"

"بھاجی! خیر کچھ ہوا ضرور تھا۔ اگر خنجر سے قتل ہوتا تو اس چادر پر خون بھی نظر آتا۔ چھوٹا سا کیبن ہے' اس میں چوکیدار کی کو گلا گھونٹ کر کیسے مار سکتا تھا۔ چوکیدار خود کون سا ٹارزن ہے۔ پھر آخر کوئی وہاں مرنے کے لیے کیوں آیا تھا؟ اور جو اسے لایا تھا وہ خود کون تھا؟ کیا وہ خود یہ کام نہیں کر سکتا تھا؟ یہ تو ایسے ہی ہوا جیسے کوئی مرغی ذبح کرانے کے لیے قصائی کے پاس لے جائے۔ مگر اس میں ایک اور عجیب بات تھی کہ کسی نے اکبر خان کے جانے کا انتظار کیا۔"

"اس میں کیا عجیب بات ہے؟" میں نے بات سمجھ لینے کے باوجود اسے غور سے دیکھا۔

"دیکھیں ناجی' کیا چوکیدار نے کہا تھا کہ اچھا اپنے شکار کو شام کے وقت لے آنا۔ اتنے بجے سیٹھ باہر جائے گا۔ اس وقت میں تمہارا کام کر دوں گا۔ یعنی اس بندے کا کام تمام کر دوں گا۔ چوکیدار کو میں جانتا ہوں۔ وہ بہادر ہے' وفادار ہے مگر پیشہ ور قاتل نہیں ہے۔ نیک دل شخص ہے۔ دو سال سے میں صبح اسے ہی اخبارات کا بنڈل پکڑاتا ہوں۔ ہمیشہ دعا دی اس نے مجھے کہ بیٹا محنت کرتے رہو۔ اللہ ضرور کامیاب کرے گا تمہیں۔ ایک دن بڑے آدمی بنو گے مگر اکبر خان جیسے نہیں۔"

"یہ کہتا تھا تم سے اکبر خان کا چوکیدار؟"

"ہاں۔ چوکیدار پرانا تھا' سب جانتا ہو گا" شان بولا "کافی دیر سوچنے کے بعد جب اندھیرا ہو گیا تو میں نے کہا بیٹا شان' یہ معاملہ کچھ اور ہے اور یہ تمہاری شان کے خلاف ہو گا اگر تم اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھنے کے بعد آنکھیں بند کر کے سو گئے۔ بس جی میں نے کہا اب جو ہوتا ہے ہو۔ میں گیٹ تک پہنچا اور سیدھا اندر جانے لگا۔ اسی وقت چوکیدار نے کرخت لہجے میں کہا "اوئے چھوکرا! کدھر جاتا ہے اندر۔ تیرے باپ کا گھر ہے کیا؟ گالی بھی دی اس نے مجھے۔"

میں بھونچکا رہ گیا "تمہارا مطلب ہے .... وہ چوکیدار نہیں تھا؟"

"نہیں جناب۔ اس کی آواز سنتے ہی میرا تو ہارٹ فیل ہونے لگا تھا مگر میں نے ہمت سے کام لیتے ہوئے خود کو سنبھال لیا اور کہا "تم نئے چوکیدار ہو شاید۔ میں ملازم ہوں اس گھر کا اور رات کے وقت آتا ہوں اور صبح جاتا ہوں" اس نے کہا "اچھا پھر دفع ہو۔ کھڑا کیوں ہے؟" بس میں دل ہی دل میں دعائیں پڑھتا آگے بڑھا اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے میری جان بچا لی۔ میری عاجزی اور مظلومیت دیکھ کے اسے شک نہیں ہوا ورنہ جس نے چوکیدار کو قتل کر دیا تھا وہ مجھے بھی مار کے وہیں ڈال دیتا۔"

"گویا تم سمجھ گئے تھے...."

"میں بالکل سمجھ گیا تھا جناب کہ چادر میں چوکیدار کی لاش تھی اور چوکیدار کی وردی میں اس کا قاتل کھڑا ہوا تھا۔ اس نے کیبن میں داخل ہوتے ہی چوکیدار کو گولی مار دی ہو گی۔ فائر کی آواز میں نے نہیں سُنی۔ سائیلنسر والا ریوالور استعمال کیا ہو گا اس نے۔ دس منٹ میں اس نے چوکیدار کے کپڑے پہنے اور اتنی دیر گاڑی گیٹ کے سامنے کھڑی رہی۔ پھر اس میں چوکیدار کی لاش ڈال دی گئی اور گاڑی چلی گئی۔"

"اور تم نے اندر آ کے کیا کیا؟"

"میں اندر آ کے پورچ میں چھپ گیا۔ ایک ایسی جگہ جہاں سے میں کسی کو نظر نہ آؤں مگر میں گیٹ پر نظر رکھ سکوں۔ مجھے یقین تھا کہ ابھی اور بہت کچھ ہو گا۔ چوکیدار کی جگہ اپنا آدمی کھڑا کرنے والے ضرور لوٹ کر آئیں گے۔ آج رات کیکر شاہ کے مُرید انتقامی کارروائی کریں گے اور اکبر خان کے ساتھ آپ لوگوں کو بھی سزا دیں گے۔"

"بہتر ہوتا' اگر تم فوراً ہمیں بتا دیتے یا گھر کے ملازموں کو خبردار کر دیتے" غالب نے کہا۔

"کیسے بتا دیتا جناب؟ میرے لیے تو اندر داخل ہونا بھی مسئلہ بن گیا تھا۔ وہ لوگ چاروں طرف موجود ہیں" شان نے کہا "کوٹھی کے اندر بھی۔ وہ ٹیلی فون کے تار کاٹ رہے تھے اور آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ بجلی کا خیال رکھنا۔ شاید وہ مین سوئچ بند کریں گے۔"

رابعہ اور نازو پریشان ضرور نظر آتی تھیں مگر خوف زدہ نہیں تھیں۔ میں صورتِ حال کی سنگینی کو سمجھ رہا تھا اور شاید غالب کو بھی محصور ہو جانے کا یقین آ گیا تھا۔

"کیا باہر بھی کیکر موجود ہیں؟" غالب نے پوچھا۔

"پتا نہیں۔ ضرور ہوں گے۔" شان نے کہا "کچھ کریں جناب..."

"کر رہے ہیں یار۔ فکر کر رہے ہیں اور غور بھی کر رہے ہیں" غالب نے کہا۔

صورت حال ایک بار پھر ویسی ہی نظر آ رہی تھی جیسی پہلی بار تھی جب خلیفہ کیکر کے غلاموں نے اپنے آقا کی خواہش پر رابعہ اور نازو کو اغوا کر کے لے جانے کی ناکام کوشش کی تھی۔ شاید آج وہ زیادہ منظم طریقے پر منصوبہ بندی کر کے آئے تھے اور زیادہ قوت کے ساتھ۔ انہیں بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ مقابلے پر کمزور حریف نہیں ہے۔

حیرت اور غصہ مجھے اس بات پر تھا کہ اکبر خان جیسے شخص نے کیکر شاہ کی خانقاہ کو نیست و نابود کرنے کے بعد جوابی کارروائی کے خلاف اپنے دفاعی انتظامات پر قطعی توجہ نہیں دی تھی۔ اس کے دروازے پر وہی ایک پرانا چوکیدار تھا جو اب مارا جا چکا تھا۔ وہ اگر چاہتا تو ایک نہیں' دس مسلح افراد کو ہر طرف مشین گنوں کے ساتھ بٹھا رکھتا لیکن ایک بار پھر وہ ہمیں گھر میں چھوڑ کے خاموشی سے نکل گیا تھا۔

اکبر خان سے ہم بعد میں بھی نمٹ سکتے تھے۔ فوری مسئلہ یہاں سے نکلنے کا تھا جو شان کے بیان کی روشنی میں ناممکن کام لگتا تھا مگر اندر بے دست و پا ہو کے بیٹھے رہنے اور مقابلہ کیے بغیر کیکروں کے انتقام کا نشانہ بننا بھی کوئی عقل مندی نہ تھی۔ کیکر یقیناً بہت مشتعل ہوں گے۔ پہلی شکست کی ذلت کو وہ پی گئے تھے کیونکہ اس میں خلیفہ کیکر شاہ کی ہوس پرستی کو دخل تھا مگر خانقاہ کی تباہی ان سب کے لئے جذباتی سانحہ تھا جو کیکر شاہ کے عقیدت مند تھے اور اسے اپنا دُنیاوی و دینوی روحانی پیرو مرشد تسلیم کرتے تھے۔ درگاہ کے مجاور ان سادہ لوح مُریدوں کے جذبات سے کھیلتے ہوئے انہیں یقین کی اس منزل تک لا سکتے تھے جہاں وہ ہمارے قتل کو فرض عین جانیں اور تختۂ دار کو براہِ راست جنت میں داخلے کا ذریعہ سمجھتے ہوئے پھانسی چڑھ جائیں۔

ہمارے پاس اپنے دفاع میں استعمال کرنے کے لئے کچھ بھی نہیں تھا۔ اس گھر میں ہر قسم کے اسلحے کی موجودگی بعید از امکان نہ تھی مگر اس تک رسائی مشکل ہی نہیں ناممکن تھی جب تک کوئی محرمِ راز اس کی نشاندہی نہ کر دے۔

یہ خیال آتے ہی میری نظر روزینہ پر گئی۔ میں نے غالب کی طرف دیکھا "شاید اسے معلوم ہو کہ گھر میں اسلحہ ہے تو کہاں ہے۔"

غالب نے کہا "اسے جگا کے پوچھ لیتے ہیں۔"

یہ کام رابعہ کے سپرد کیا گیا۔ نشے کا کچھ اثر باقی تھا مگر روزینہ بے ہوش نہیں تھی۔ تھوڑا سا جھنجوڑنے اور ہلانے سے وہ جاگ گئی۔ رابعہ نے اس پر پانی کے چھینٹے مارے۔

"روزینہ! اٹھو' آنکھیں کھول کے دیکھو۔"

"کیا.... کیا دیکھوں... کچھ نہیں دیکھنا مجھے۔ وہی خواب اچھا تھا جو میں دیکھ رہی تھی" وہ کسمسائی اور کروٹ لے کر پھر سو گئی۔

رابعہ نے پھر اس پر پانی ڈالا "روزینہ! دیکھو باہر ڈاکو آئے ہیں۔ انہوں نے چوکیدار کو بھی قتل کر دیا ہے۔ اٹھو ورنہ وہ اندر آ کے ہمیں بھی مار ڈالیں گے۔ چلو اٹھ کے بیٹھو۔"

"اچھا ہے ماردیں سب کو... مجھے بھی...." اس نے بیٹھنے کے بعد بھی جھومتے ہوئے کہا "ان سے کہو پہلے اکبر خان کو میرے سامنے گولی مار دیں۔ پھر... پھر تم کو... تم بھی بہت ظالم ہو اکبر خان کی طرح۔ اس نے مجھے باندھ رکھا ہے۔ سونے کی زنجیر سے۔ اور تم نے.... تم نے سکندر کو باندھ رکھا ہے زُلفوں... زُلفوں کی زنجیر سے.... تمہارے بال سنہرے ہیں۔ یہ بھی سونے کی زنجیر ہے۔"

اب نازو نے خاصی طاقت سے روزینہ کے گالوں پر طمانچے مارے "اٹھتی ہو یا میں تم کو اٹھا کے نیچے پھینک دوں۔"

"پھینک دو' پھینک دو لیکن مارتی کیوں ہو؟" وہ نشے میں ڈوبی ہوئی آواز میں بولتی رہی۔

میں نے کہا "روزینہ! خدا کے لئے عقل سے کام لو۔"

"عقل!" اس نے ہاتھ ہلایا "کہاں ملتی ہے عقل؟ مجھے [illegible]

تھوڑی سی۔ شراب میں ملا کے پی لوں۔"

"ہم خطرے میں ہیں روزینہ۔ ہمیں اسلحہ چاہئے ان ڈاکوؤں سے مقابلے کے لئے۔" میں نے کہا "کیا تمہیں معلوم ہے اکبر خان اسلحہ کہاں رکھتا ہے؟"

وہ ہنسی "وہ اُلو کا پٹھا ہے۔ سمجھتا ہے مجھے کچھ معلوم نہیں۔ سب جانتی ہوں میں۔ نیچے تہ خانے میں اسٹور ہے.... اس میں سب کچھ ہے۔ جا کے دیکھ لو۔ دھوکا دینے کے لئے اس نے اوپر... کاٹھ کباڑ ڈال رکھا ہے مگر وہ سب ہٹا کے دیکھو۔ سب ہے وہاں۔ ٹینک اور توپیں نہیں ہیں.... مگر مال بہت ہے... ٹینک اور توپیں تم بازار سے خرید لینا۔ بازار میں تو سب کچھ ملتا ہے۔ روزینہ بھی ملتی ہے' رابعہ بھی' بس ایک سکندر نہیں ملتا۔ الیگزینڈر دی گریٹ۔ آئی لو یو۔ آؤ... میرے ساتھ۔"

رابعہ نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ کچھ دیر ہاتھ پھیلائے مجھے دیکھتی رہی اور پھر آہستہ آہستہ پیچھے گر گئی۔ اس کی باتوں کا رابعہ نے بُرا نہیں مانا تھا مگر ناپسندیدگی کے وہ جذبات اس کی صورت سے عیاں تھے جو کسی بھی محبت کرنے والی عورت کی دلی کیفیت کے ترجمان ہوتے ہیں۔ جب کوئی اس سے زیادہ حسین عورت اس کے محبوب کو اس سے چھیننے کی خواہش کا اظہار کرتی ہے اور اس کی محبت کو بدنام کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ وہ ایک فاحشہ تھی اور شراب نے اس کے حواس معطل کر رکھے تھے مگر نشے میں جو کچھ وہ کہہ رہی تھی' غلط نہیں تھا۔ نشے میں عقل کی سنسرشپ باقی نہیں رہتی اور آدمی نتائج و عواقب کی پروا کیے بغیر وہ سب کچھ بک دیتا ہے جو اس کے دل میں ہو۔ ہوش میں مصلحت کے تقاضے اور اندیشۂ سود و زیاں کا احساس زبان پکڑ لیتا ہے۔

"یہ تو بہت آسان ہو گیا" غالب نے غیر سنجیدہ لہجے میں کہا "اس محل میں ایک تہ خانہ ہے۔ تہ خانے میں ایک اسٹور۔ اسٹور میں کباڑ اور اس کے نیچے گوہرِ مقصود۔ جاؤ اور یوں نکال لو۔ چٹکی بجاتے میں۔ پھر لگا دو کشتوں کے پشتے۔"

میں نے کہا "کام مشکل ہے' ناممکن نہیں۔"

نازو نے کہا "ہم سب نکل جاتے ہیں تہ خانے کا راستہ تلاش کرنے کے لئے۔ یا نوکروں سے پوچھ لیتے ہیں۔"

"اور وہ پوچھیں کہ تہ خانے سے کیا دلچسپی ہے آپ کو تو یہ بھی بتا دینا کہ ہم اسلحہ تلاش کر رہے ہیں اس گھر کو میدانِ جنگ بنانے کے لئے۔ اس کارِ خیر میں ہماری مدد کرو۔" غالب بولا۔

"یہ بات تو انٹرکام پر بھی پوچھی جا سکتی ہے۔"

"پوچھو۔ پوچھ کے دیکھو" غالب نے کہا "وہ ہرگز نہیں بتائیں گے۔"

"نہیں بتائیں گے تو خود بھی مارے جائیں گے۔ ہم ان کو اور اس گھر کو بچانے کے لئے جان کی بازی لگا رہے ہیں" رابعہ نے کہا اور انٹرکام کا ریسیور اٹھا لیا۔

"سب سے آسان کام ہے فرار ہونا۔ جان بھی بچ جا... اور آدمی کو شکست کی شرمندگی بھی نہیں اٹھانی پڑتی" غالب... "کیوں نہ ہم بھی میدان چھوڑ کے بھاگ جائیں۔ واک اوور... دیں دشمنوں کو کہ میاں لڑتی ہے ہماری جوتی۔ گیا ہے سانپ نکل... اب لکیر پیٹا کر۔"

"انٹرکام تو کام نہیں کر رہا ہے" رابعہ مایوسی سے بولی۔

"میرا دماغ بھی کام نہیں کر رہا ہے" غالب بولا۔

میں نے کہا "یہ دماغ کا مسئلہ ہی نہیں رہا۔ اب تو بس نکلو یہاں سے اور دیکھو اسلحہ کہاں ہے۔ یہ جو تھوڑی سی مہلت ملی ہے اس سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔"

"میں پھر کہتا ہوں بزدل بنو بزدل۔ بھاگ جاؤ اپنی جان بچا کے۔ مقابلے میں نقصان ہے۔"

میں نے بھنّا کے کہا "کیسے بھاگ جائیں؟ کوئی راستہ ہے یہاں سے نکلنے کا؟ ہر طرف تو شکاری بیٹھے ہیں گھات میں۔ تم جاؤ نازو... ساتھ۔"

"کہاں جاؤں؟"

"جہنم میں" نازو بگڑ کے بولی۔

"اور اس وقت کہاں ہوں میں؟ خیر۔ تمہاری خواہش ہے... تو پھر چلو۔ ویسے جنت میں جاتے تو وہاں خوش رہتے۔" غالب... کہا۔"

نازو نے اسے دھکیلا "نکلو باہر۔"

"ہاں آگے مجھے رکھو۔ ٹھائیں سے گولی آ کے میرے دل... لگے۔ تم تو چاہتی ہو بیوہ ہونا" غالب بڑبڑاتا ہوا آگے ہو گیا... زمانہ آ گیا ہے۔ بیوی بننے سے پہلے بیوہ ہونے کا سوچتی... لڑکیاں۔"

"ہم نچلی منزل پر دائیں طرف دیکھیں گے' تم بائیں طرف... دیکھنا" میں نے نازو کو ہدایت دی "اگر کوئی نوکر مزاحمت کرے... اس سے نمٹ لینا۔ کسی رعایت کے بغیر۔"

نازو رک گئی "جو تہ خانے کا راستہ دریافت کرے وہ فو... دوسرے کو بتا دے۔ بلاوجہ کوئی نہ بھٹکتا پھرے۔"

میں نے ان کے نکل جانے کے بعد پانچ منٹ انتظار کیا اور... رابعہ کے ساتھ باہر نکلا۔ ٹیرس میں اندھیرا تھا۔ کسی... باہر کی لائٹ جلائی ہی نہیں تھی یا غالب جاتے ہوئے بجھا گیا تھا... کمروں کے سامنے جالی کے کٹہرے کی آڑ لیتے اور ایک... محراب کے ستون کی اوٹ سے نکل کر دوسرے کے پیچھے پناہ... زینے تک پہنچے۔ اس وسیع گھر میں اوپر ہی کم سے کم آٹھ کمرے... لیکن سب تاریک اور مقفل تھے۔ اکبر خان اتنے بڑے گھر... ملازموں کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ خود بتا چکا تھا کہ اس کا زیادہ وقت... باہر گزرتا ہے۔ اسے اتنے بڑے گھر کی ضرورت ہی نہیں تھی...

کے مظاہرے سے زیادہ یہ اس کی پُراسرار کاروباری شانِ امارت کی ضرورت تھا۔ شاید یہاں اس کا گودام ہو۔ ان کمروں معمولیات کی ضرورت تھا... میں سب اسمگل کیا ہوا یا اسمگل کیا جانے والا سامان رکھا جاتا ہو یا ان کمروں میں اس کے وہ مہمان ٹھہرتے ہوں جو اکیلے نہیں آتے۔ ان کے ساتھ ذاتی محافظ اور ملازم' مے خانہ' شباب و شراب اور ساقی گری کے لئے عالمی بازارِ حسن سے منتخب سوغات بھی ہوتی ہے۔

نیچے کی منزل پر قدم رکھتے ہی میرا سامنا ایک ملازم سے ہو گیا۔

"میں آپ ہی کے پاس آ رہا تھا سر! ڈنر کا کہنے کے لئے" اس نے کہا۔

"چلو ہم خود آ گئے" میں نے خوش دلی سے کہا۔

"سوری سر۔ کھانے میں کچھ دیر ہو گئی۔"

"کوئی بات نہیں۔ ابھی ہمارا موڈ بھی نہیں تھا۔ یہ بتاؤ اکبر خان صاحب آئے ہیں یا نہیں؟ ہم نے انہیں جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اب ان کی گاڑی بھی نہیں ہے باہر۔"

"جہاں تک مجھے معلوم ہے سر' وہ آج رات نہیں آئیں گے۔"

"اچھا۔ یہ بتاؤ تم نے کوٹھی میں یا اس کے آس پاس کوئی ایسی ویسی بات دیکھی؟ میرا مطلب ہے کوئی مشتبہ شخص نظر آیا یا کوئی آواز سنی۔"

"کیسی آواز سر؟"

"اچھا چھوڑو۔ اس گھر میں ایک تہ خانہ ہے۔"

اس نے جواب دینے سے پہلے سوچا "تہ خانہ.... ہے تو سہی' آپ کیوں پوچھ رہے ہیں سر؟"

"ہم وہ تہ خانہ دیکھنا چاہتے ہیں۔" میں نے کہا "اکبر خان نے کہا تھا کہ وہ کچھ مصوری کے نمونے پیرس سے لایا تھا جو ابھی تہ خانے میں ہی رکھے ہوئے ہیں اور ... کے پاس مختلف ممالک کے جمع کیے ہوئے دلچسپ نوادرات ہیں۔ سووینیئر سمجھتے ہو نا تم؟"

مجھے بڑی خوشی ہوئی جب ملازم نے تائید میں سر ہلایا اور بولا "آیئے میرے ساتھ۔"

میں نے بہت نفاست اور ذہانت سے جھوٹ بولا تھا اور وہ ملازم کچھ پڑھا لکھا' مہذب اور فرمانبردار تھا۔ اسے تہ خانے میں میری دلچسپی کی وجہ معقول لگی۔ اگر میں اس سے کہتا کہ تم کون ہوتے ہو مجھ سے سوال کرنے والے یا کہتا کہ میں ایسے ہی تہ خانہ دیکھنا چاہتا ہوں تو شاید وہ شک میں پڑ جاتا اور مجھے ٹالنے کی کوشش کرتا اور میں زبردستی پر مجبور ہو جاتا۔

مختلف کمروں سے گزار کے وہ مجھے پچھلے حصے میں لے گیا جہاں سرونٹ کوارٹرز تھے۔ کوٹھی اور سرونٹ کوارٹرز کے بیچ میں ایک باغ حائل تھا۔ آقا اور غلام کی مساوات محض ہمارے شاندار ماضی کی قابلِ فخر روایت بن کے تاریخ کے صفحات میں زندہ تھی۔ حضرت عمرؓ اور غلام باری باری ایک ہی اونٹ پر سفر کرتے تھے۔ ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز۔ اب آقا کو یہ بھی گوارا نہیں کہ غلام کو اس کے محل کا سایۂ دیوار بھی ملے۔ سرونٹ کوارٹرز دور بنائے جاتے ہیں اور بات افورڈ کرنے کی نہیں۔ عمداً امتیاز برتنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ انہیں زندگی کی بنیادی سہولیات روٹی کپڑے اور مکان تک محدود کر دیا جاتا ہے۔ نہ اس سے زیادہ کی خواہش کرو' نہ مانگو۔

سرونٹ کوارٹر تک آنے جانے کے لئے ایک لمبا برآمدہ سا تھا جس پر سیمنٹ شیٹ کی چھت ڈال دی گئی تھی تاکہ آتے جاتے دھوپ اور بارش سے تحفظ حاصل رہے۔ ملازموں کو نہیں' ان چیزوں کو جو مالکان کی ملکیت ہوتی ہیں مگر نوکر لاتے لے جاتے ہیں۔

اس کاریڈور جیسے راستے پر دائیں جانب ایک کمرا بنا ہوا تھا جو بظاہر واٹر سپلائی کا پمپنگ اسٹیشن نظر آتا تھا۔ عموماً پائیں باغ میں ٹیوب ویل اسی طرح بنائے جاتے ہیں لیکن اس میں داخل ہونے کے بعد میرا خیال غلط ثابت ہوا۔ یہ موٹر ورکشاپ تھی جہاں پرانے ٹائر پڑے ہوئے تھے' آئل کے ڈبّے تھے اور کاروں سے لے کر گھر کے تمام حصوں میں چھوٹی موٹی مرمت اور دیکھ بھال میں کام آنے والے اوزار تھے جن کی ضرورت کسی الیکٹریشن' پلمبر یا کارپینٹر کو پڑ سکتی تھی۔ یہاں ایک بہت پرانا فریج بھی پڑا ہوا تھا جسے شاید ملازمین نے کباڑی کو دینے کے بجائے مرمت کر کے اپنے استعمال کے لئے رکھ لیا تھا۔

ہمارے ساتھ آنے والے ملازم نے ایک دروازے سے داخل ہو کے سامنے والے دوسرے دروازے کو کھولا تو میں اپنے سامنے چار فٹ کے فاصلے پر ایک اور دیوار دیکھ کے حیران ہو گیا۔ باہر سے کوئی اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ اس کمرے کی ڈبل دیوار کے بیچ میں کوئی زینہ بھی ہو گا۔

"لائٹ کا سوئچ پیچھے ملے گا سر۔ دروازے کے پاس" ملازم نے مجھے راستہ دکھانے کے بعد کہا۔

"تم ساتھ نہیں آؤ گے؟"

"نہیں سر۔ مجھے کام ہے" وہ بولا "اور سر' شکایت کرنے والے تو موقع تلاش کرتے ہیں۔ آج تک کسی نے تہ خانہ دیکھنے کی فرمائش نہیں کی تھی۔ آپ معزز مہمان ہیں لیکن شریف لوگ لگتے ہیں اس لئے میں آپ کو لے آیا۔ پلیز! کسی کو یہ نہ بتائیں۔"

رابعہ نے کہا "پھر کیا کہیں؟ فرض کرو کوئی آ جائے تو؟"

"آپ تو کچھ بھی کہہ سکتے ہیں۔ گھومتے پھرتے ادھر آ گئے تھے آپ۔ دروازے مقفل نہیں تھے' آپ اندر چلے گئے یہ دیکھنے کے لئے کہ یہاں کیا ہے۔ رائٹ سر۔" وہ پیچھے پلٹ کر باہر نکل گیا۔

رابعہ نے کہا "یہ کچھ پُراسرار بندہ نہیں تھا؟"

"ہم سب کسی نہ کسی پہلو سے پُراسرار ہوتے ہیں" میں نے

کہا۔

"دیکھا جائے تو اس نے نمک حرامی کی" رابعہ بولی "ایک ایسا کام کیا جس کے بارے میں اسے یقین تھا کہ مالک اس سے ناراض ہوگا۔"

میں نے اندھیرے میں سیڑھیاں اترتے ہوئے کہا۔ "دیکھا جائے تو تمہاری بات بھی ٹھیک ہے۔"

"کہیں وہ اوپر جا کے دروازے لاک نہ کردے۔"

"وہ اتنا احمق بھی نہیں تھا۔ اسے معلوم ہے کہ ہم اندر سے دروازے کو توڑ سکتے ہیں' کاٹ سکتے ہیں' سارے اوزار ہیں اندر۔۔۔"

ایک چیخ کے ساتھ رابعہ مجھ پر گری۔ خود کو منہ کے بل گرنے سے بچانے کے لئے میں نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے اور دیوار کو گرفت میں لینے کی ناکام کوشش میں میرا ہاتھ بجلی کے سوئچ پر پڑ گیا۔ جب میں ایک سیڑھی پھسل کے دروازے سے گلے ملا تو رابعہ تقریباً میری پشت پر سوار تھی۔ دروازہ کھلا ہوتا تو میں اندر جا کے گرتا۔ میری ناک چپٹی ہوجاتی یا سامنے والے دانت بس دکھانے کے رہ جاتے۔ رابعہ بہرحال محفوظ رہتی۔

رابعہ نے شرمندگی سے کہا "وہ۔۔۔۔ پیر پھسل گیا میرا۔"

"بڑی خوشی کی بات ہے" میں نے کہا۔

"جان بوجھ کے تو نہیں گری تھی میں پھر طنز کیوں کررہے ہو؟"

میں نے کہا "لاحول ولا قوۃ۔ میں تو ایک حقیقت کا اعتراف کررہا ہوں کہ تمہارا پیر آخری سیڑھی پر پھسلا۔ پہلی سیڑھی پر پھسل جاتا تو ہم جیک اینڈ جل کی طرح نیچے جاتے گھل مل کے۔ خیر مزہ تو اب بھی آیا۔"

وہ تھوڑا سا شرمائی اور مسکرائی تو میں نے دروازہ کھول کے اسے اندر کھینچ لیا اور اپنی بانہوں میں بھرلیا۔

"بدتمیز۔ موقعے سے فائدہ اٹھا رہے ہو۔" اس نے خود کو چھڑانے کی آدھی ادھوری کوشش کی۔

میں نے اسے چوم کے چھوڑ دیا "کون فائدہ نہیں اٹھاتا موقعے سے عزیزہ۔ اب اپنی مثال لو۔ پیر پھسلنے کا تو بہانہ تھا۔"

اس نے احتجاج کیا مگر اس کا مطلب بھی اس بات سے زیادہ مختلف نہیں تھا جو میں نے کہی تھی۔

میں دروازے کی کنڈی لگا کے پلٹا تو مجھے اپنے مقابل ایک وسیع ہال نظر آیا۔ اس میں ٹینس کورٹ تھا اور ایک طرف کچھ ورزش میں کام آنے والی مشینیں نصب تھیں۔ یہ انڈر گراؤنڈ ہال یقیناً ائرکنڈیشنڈ ہوگا مگر اس وقت اندر خاصا حبس اور گھٹن تھی۔ فولڈ ہوجانے والی ٹیبل ٹینس کی میز شاید کبھی استعمال نہیں ہوئی تھی۔ یہ اکبر خان کا جمنازیم تھا جہاں وہ خود کو فٹ رکھنے کے لئے ایکسرسائز کرتا ہوگا اور ممکن ہے ٹینس بھی کھیلتا ہو۔ ظاہر ہے ایسی جگہ مقفل نہیں رہتی۔

"بس یہی ہے اسٹور؟" رابعہ نے مایوسی سے کہا۔

"یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ جو ہے سامنے ہے۔"

"وہ کتیا بھونک رہی ہوگی ایسے ہی۔ تم نے یقین کرلیا۔"

میں ہنس پڑا "مزہ نہیں آیا۔ ذرا کھل کے گالیاں دو' اپنی زنانہ لغت نکالو' یعنی ابھی تک غصہ آرہا ہے تمہیں۔ اب دیر سے جل بھن رہی تھیں اندر ہی اندر۔ کمال ہے بھئی۔"

"غصہ آنے کی تو بات ہے۔ کوئی شریف عورت کرسکتی ہے ایسی باتیں؟" رابعہ جھینپ کر بولی۔

"بابا تو اس نے کب دعویٰ کیا ہے شرافت کا۔ وہ جیسی اس نے ویسی ہی بات کی۔ بھول جاؤ اسے۔ کل کوئی شرابی بدچلن آدمی تم پر مرمٹے اور میرے سامنے تم سے اظہار کردے تو میں اسے کوئی اہمیت نہیں دوں گا۔ اس کا کیا قصور ایک تو تمہارا یہ حسن پھر شراب کا نشہ۔ وہ آدمی جذبات کو کیا کنٹرول کرے جس نے عقل کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا ہو۔ دیوانہ سچ کہتا ہے' منافق ہوتے ہیں ذی ہوش۔"

"تمہارا فلسفہ میری سمجھ میں نہیں آتا" رابعہ بولی اور اچانک چلائی "اے سکندر! یہ دیکھو' اس ٹیبل ٹینس کی میز کے پیچھے۔"

"کیا ہے؟" میں نے سیدھی کھڑی ہوئی میز کو دیکھا۔

"دروازہ" رابعہ نے کہا "یہ میز ہٹاؤ سامنے سے۔"

میں نے میز کو دیوار کے ساتھ کھسکا کے کہا "کھل جا سم سم۔"

رابعہ نے اس چھوٹے سے دروازے کو کھولا جس میں ایک وقت میں ایک ہی آدمی گزر سکتا تھا۔ یہ ایک اسٹور روم تھا جس کی چوڑائی تو صرف چھ فٹ تھی مگر لمبائی کے رخ یہ ہال کی چوڑائی کے برابر تھا۔ یعنی کم سے کم تیس فٹ۔

اندر ایک سوئچ کو دبانے سے ٹیوب لائٹ جل گئی۔ میں نے اسٹور کے آخری حصے میں وہ سب کاٹھ کباڑ دیکھا جس کا ذکر رابعہ نے کیا تھا۔ پرانے قالین' ٹوٹی ہوئی کرسیاں میزیں' ایک ٹوٹی خوردہ سائیکل' پانی کی دو خراب موٹریں۔ ہر چیز پر مٹی دھول کی تہہ تھی۔ میں ایک ایک کرکے ان چیزوں کو اٹھا کے دیکھتا گیا۔ میرا خیال تھا کہ اگر وہاں کوئی چیز چھپائی جاسکتی تھی تو صرف قالینوں میں یا ان کے نیچے اور میرا یہ خیال بالکل ٹھیک تھا۔ ایک گھسا ہوا قالین مجھے ضرورت سے زیادہ وزنی محسوس ہوا۔ میں نے اڑنے والی گرد کی پروا کیے بغیر اس کو کھول دیا۔

اس میں سے پلاسٹک کے دو بیگ نکلے۔ ایک بیگ میں مشین گنوں کے اجزا تھے جن کو آپس میں جوڑ کے استعمال کیا جاسکتا تھا اور یہ کام دو منٹ میں ہوجاتا تھا۔ یہ سوئیڈن کی بنی انتہائی بیش قیمت اور خطرناک مشین گنیں اکبر خان جیسے لوگ ہی باہر سے اسمگل کرکے لاسکتے تھے۔ پاکستان میں غیرملکی سامان کی مارکیٹ سے پستول اور ریوالور تو شاید مل جاتے مگر اس چیز کا حصول بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

مشین گن کے راؤنڈ دوسرے بیگ میں تھے۔ اسی بیگ میں سے اٹلی کے بنے ہوئے بتیس بور کے دو بہترین ریوالور بھی نکلے اور گولیوں سے بھرا ہوا ایک ڈبا بھی برآمد ہوا۔

"ریوالور ہیں اصل کام کی چیز" میں نے باری باری دونوں ریوالور لوڈ کیے۔

"کیوں؟ یہ مشین گن۔۔۔"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "مشین گن میں بیلٹ چلتی ہے اور اس کے لئے کہیں مورچہ قائم کرنا پڑتا ہے۔ اس کا "ریکائل" اتنا ہوتا ہے کہ اسے سنبھالنا مشکل ہوجاتا ہے۔ چلتے پھرتے' دوڑتے بھاگتے اس کا استعمال نہیں کیا جاسکتا۔"

"پھر کیا انہیں چھوڑ دیں؟"

"ابھی ان کا بوجھ اٹھانا بے سود ہے۔ بعد میں لے جائیں گے اگر ضروری ہوا۔ کام کی چیز تو یہ ہے۔ پتا نہیں اکبر خان نے یوں چھپا کے کیوں رکھا تھا یہ سب کچھ۔ وہ ڈرنے والا آدمی تو ہے نہیں۔ اسلحہ بھی اس کے لئے کوئی ایسی چیز نہیں۔ یہ لو۔۔۔۔ تم پکڑو یہ ریوالور۔"

رابعہ نے کہا "اس دوسرے قالین کو بھی دیکھو۔"

میں نے کہا "اچھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ پہلے غالب اور نازو سے مل لیں پھر سب یہاں آکے اطمینان سے۔۔۔"

میری بات پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ باہر ایک فائر ہوا اور کسی نے بڑی دلخراش چیخ ماری۔ رابعہ ڈر کے میرے پیچھے آگئی۔

"یہ۔۔۔۔ یہ کیا ہوا سکندر؟"

"اسے انگریزی میں فائر کہتے ہیں۔ فائر ہوا ہے" میں نے کہا "تم تو ایسے خوف زدہ ہو جیسے پہلی بار یہ آواز سُنی ہے۔ ابھی چل کے دیکھ لیتے ہیں۔"

چند سیکنڈ کے وقفے سے دوسرا فائر ہوا پھر تو جیسے جنگ سی چھڑ گئی۔ تہ خانے میں یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہمارے اوپر نیچے' دائیں بائیں ہر سمت گولیاں چل رہی ہیں۔ سمجھ میں نہ آنے والی بات یہ تھی کہ فائرنگ اگر کیکر شاہ کے چیلے کررہے ہیں تو ان کے مقابلے پر کون ہے۔

"اب شاید اس کی ضرورت پڑے۔" میں نے پلاسٹک بیگ میں سے ایک مشین گن نکالی اور سابقہ تجربے کی بنیاد پر اس کے مختلف حصوں کو کھٹا کھٹ ایک دوسرے میں پھنسا کے فٹ کردیا۔

اچانک لائٹ آف ہوگئی۔ رابعہ مجھ سے لپٹ گئی۔ وہ خوف سے کانپ رہی تھی۔

"کیا ہوگیا ہے تمہیں؟" میں نے خود کو چھڑاتے ہوئے درشت لہجے میں کہا۔ "ریوالور سنبھال کے آگے چلو۔"

"مجھے۔۔۔۔ کچھ نظر نہیں آرہا ہے۔"

"نظر مجھے بھی نہیں آرہا ہے مگر مجھے اندازہ ہے کہ دروازہ کہاں تھا۔ تم بھی اندازے سے چلو۔"

"تم ساتھ آؤ نا۔" وہ منمنا کے بولی۔

"میں تمہارا ہاتھ پکڑ کے چلوں؟ بے وقوف! مجھے مشین گن اور اس کا میگزین اٹھانا ہے۔" میں نے خفگی سے کہا۔ "اپنا راستہ خود بناؤ اور باہر نکل کر میرا انتظار کرو۔ ذرا دھیان سے جانا۔ خیال رکھنا کہ راستے میں بہت سی چیزیں پڑی ہیں۔ ہال میں پہنچ جاؤ گی تو پھر باہر کے دروازے تک راستہ صاف ملے گا۔ میں بھی آرہا ہوں۔ تم چلو۔"

میں نے اندھیرے میں وہ شاپنگ بیگ اٹھایا جس میں مشین گن کے راؤنڈ تھے۔ یہ بہت بھاری بیگ تھا اور اسے اٹھا کے اسٹور کے گیٹ تک پہنچتے ہوئے میں دو بار گرا۔ ہر بار رابعہ کی آواز مجھے بہت قریب سے سنائی دی۔ "سکندر! کیا ہوا؟"

دوسری بار میں نے بھنا کر کہا۔ "تمہارا سر ہوا۔ تم ابھی تک اندر ہی ہو۔"

باہر نکلنے کے بعد میں نے پھر اسے دیکھا تو وہ اندھیرے میں بُت بنی کھڑی تھی۔ "سکندر' مجھے غالب اور نازو کا خیال پریشان کررہا ہے۔"

میں نے کہا۔ "پریشانی سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ تم اندر جاؤ۔ وہ خود تمہیں تلاش کرلیں گے۔"

"تم کہاں جارہے ہو؟"

"میں چھت پر جارہا ہوں۔ جلدی کرو' اپنے دوپٹے سے یہ بیگ میری کمر پر باندھ دو۔ ذرا نیچے کرکے مضبوطی سے باندھو تاکہ سلپ نہ کرے۔" میں نے کہا اور مشین گن کو کندھے پر لٹکا لیا۔ اس کا شولڈر اسٹریپ اچھا تھا۔ بیگ کو میں نے کندھے کے اوپر سے پکڑ رکھا تھا۔ اس کا وزن دس پندرہ سیر تو ہوگا۔

"تم کیسے جاؤ گے چھت پر؟"

میں نے کہا۔ "ڈرین پائپ سے۔ تم فکر مت کرو۔ بہت پریکٹس ہے مجھے۔ ایک بار چھت پر پہنچ کے مورچہ قائم کرلیا میں نے تو سب کو بھون کے رکھ دوں گا۔"

"سکندر! کیا یہ لوگ آپس میں لڑ رہے ہیں؟"

"کیا فضول بات ہے۔" میں نے پائپ کو ہلا کے دیکھا۔

"پھر مقابلہ کن کے درمیان ہے؟ کیا یہ اکبر شاہ کے محافظ اور ملازم ہیں جو کیکر شاہ کے مُریدوں کی فائرنگ کا جواب دے رہے ہیں؟" رابعہ نے کہا۔

میں نے جوتے اتار کے قدم جمائے اور پائپ پر چڑھنے لگا۔ کام میری توقع سے کہیں زیادہ مشکل ثابت ہوا۔ میں نے غلط کہا تھا رابعہ سے کہ مجھے بہت پریکٹس ہے۔ حقیقت یہ تھی کہ آخری بار میں تین سال پہلے ایسے ہی ایک پائپ کے راستے لندن میں ایک فلیٹ میں گھس گیا تھا۔ فلیٹ پہلی منزل پر تھا اور اس کی کھڑکی میرے لیے ہی کھلی ہوئی تھی۔

تین سال بعد اس پائپ پر چڑھتے ہوئے مجھے اس وقت کی یاد آئی جب میں اور محسن ایسی ہی مُہماتِ عشق سر کرتے تھے اور اپنا اپنا حساب ڈائری میں لکھتے جاتے تھے۔ محبوبہ کا نام، پتا، ٹیلی فون نمبر، باپ کا نام، عشق کب شروع ہوا اور کب ختم ہوا۔ اس عشق سے کیا حاصل ہوا۔ نقد رقم الگ، رومال، ٹائیاں اور دیگر تحائف الگ۔ یہ عشق ہم ایک مشن کے تحت کرتے تھے اور ہمارا مقصد تھا انگریزوں سے دو سو سالہ دورِ حکومت اور ان کے نسلی تعصب کا انتقام لینا۔ وہ جو ہمارے انتقام کا نشانہ بنتی تھیں، کوئی شریف زادیاں نہیں ہوتی تھیں مگر حسب نسب کے اعتبار سے اس طبقے سے تعلق رکھتی تھیں جن کے دماغ سے ابھی تک دورِ حکومت کی فرعونیت اور نسلی احساسِ برتری کا فتور نہیں گیا تھا۔

اوپر پہنچتے پہنچتے میری حالت غیر ہوگئی۔ تصور میں وہ زمانہ تھا جب عشق کا جادو سرچڑھ کے بولتا تھا تو ہم پرواز کرنے لگتے تھے اور حال کی حقیقت یہ تھی کہ میری پیٹھ پر پندرہ سیر وزن کا اسلحہ تھا اور میری جان ہی نہیں، عزت بھی داؤ پر لگی ہوئی تھی۔ ہر لمحہ مجھے یہ ڈر تھا کہ میرے ہاتھ سے پائپ چھوٹ جائے تو میں پٹ سے نیچے جا گروں گا اور ساری عمر وھیل چیئر پر نہ پھرا تب بھی رابعہ کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ اونہہ! کہتے تھے بڑی پریکٹس ہے مجھے۔

اللہ نے میری آبرو رکھی اور میں بالآخر چھت کی منڈیر تھام کے خود کو اوپر کھینچنے میں کامیاب رہا۔ اوپر سے میں نے یوں ہاتھ ہلایا جیسے ماؤنٹ ایورسٹ پر کھڑا ہوں لیکن بالکل تازہ دم ہوں۔ اگر مجھے اوپر سے "ہیلو" کہنا پڑتا تو میرے دھونکنی کی طرح چلتے ہوئے سینے سے صرف ہوا نکلتی۔ میرے ہاتھوں پیروں کا دَم بالکل ہی نکل چکا تھا۔

رابعہ اندر چلی گئی تو چند منٹ میں نے اپنی حالت پر قابو پانے میں صَرف کیے اور اس دوران فائرنگ کی آوازیں سننے کے علاوہ شرم سے پانی پانی بھی ہوتا رہا۔ پہاڑ خاک سر کروں گا میں اور آسمان کے تارے خاک توڑ کے لاؤں گا رابعہ کے لیے۔ اتنی سی چڑھائی میں کیا حال ہوگیا ہے میرا۔ یہ سب ایکسر سائز اور جاگنگ وغیرہ سے لاتعلق ہونے کا نتیجہ تھا۔ میں تین کلومیٹر جاگنگ کرتا ہوا جاتا تھا اور برٹش نیوی کے ایک افسر کی بیوی کو ہر صبح تازہ پھول پیش کرکے دوڑتا ہوا واپس آتا تھا۔ ایسا تین مہینے تک ہوتا رہا۔ تیسرے مہینے کے آخر میں اس نے مجھے اندر بلالیا۔ "ویل یو کالا آدمی۔ بہت ڈھیٹ ہو تم یا تم واقعی مجھ سے اتنی محبت کرتے ہو؟" اور جواب میں نے یہ دیا تھا کہ "ڈارلنگ، تم خود اندازہ کرلو۔ میں اڑ سکتا تو تین مہینے میں چاند تک پہنچ جاتا۔ خیر اب زمین پر ہی چاند مل گیا ہے تو میں گیارہ سو کلومیٹر کی دوڑ جیت گیا ہوں۔" اس زمانے میں جھوٹ بولنے کی بھی بہت پریکٹس تھی مجھے۔

یہ سب غیر متعلقہ باتیں اس وقت یاد کرنے کی کوئی تُک نہیں تھی مگر ساری بات ایک ڈرین پائپ سے شروع ہوئی تھی اور خیالات کی قلم خود بخود چل پڑی تھی۔ مشین گن کو چھت کے ا[ور] چمنی [پر] ...نٹ کرتے ہوئے میں نے گردوپیش کا جائزہ لیا۔ تمام لائٹ[یں] آف تھیں اور اندھیرے میں یہ اندازہ کرنا محال تھا کہ اندر باہر [کتنے] قاتل ہیں، کتنے مقتول اور کس کی جنگ کس سے چل رہی ہے۔

ایک افسوس ناک بات یہ تھی کہ ابھی تک پولیس جائے واردات تک نہیں پہنچی تھی۔ سنسان آبادی میں عام لوگ تو خیر کھڑکیاں دروازے بند کیے اپنے گھروں میں دبک گئے تھے اور جل تو جلال تو کا ورد کرنے میں حق بجانب تھے مگر اتنی فائرنگ کا پولیس نے بھی نوٹس نہیں لیا تھا۔ پولیس والے بے وقوف نہیں ہوتے کہ اس قسم کی معرکہ آرائی میں اپنی پرانی لاٹھیاں اور زنگ خوردہ تاریخی بندوقیں لے کر کود پڑیں۔ وہ ایسی صورت حال کو سمجھتے ہیں اور کوئی خطرہ نہ ہو تو مال کی کشش خود انہیں کھینچ لیتی ہے ورنہ وہ بعد میں پہنچتے ہیں اور جو بھی احمقوں کی طرح منہ کھولے تماشا دیکھنے رک گیا ہو، اس کو باندھ لاتے ہیں۔ مجرم نہ سہی، ملزم تو کوئی بھی ہوسکتا ہے۔

جنگ کے دو فریق تھے۔ تیسرے فریق کے طور پر ابھی ہم یعنی ایم آر ایس کے مجاہدین جنگ میں شامل نہیں ہوئے تھے۔ ایک فریق تھے کیکر۔ کیکر شاہ کے مُرید لیکن دوسری طرف کون تھا جو باہر ہی سے کیکروں کی بیخ کنی کر رہا تھا۔

چھت پر میری پناہ گاہ ایک چمنی تھی یا ایک واٹر ٹینک تھا جو نسبتاً بلندی پر اور پچھلے حصے میں واقع تھا۔ چمنی سامنے کی طرف اور غالباً نچلی منزل پر ڈرائنگ روم کے آتش دان کا حصہ تھی۔ اس کے پیچھے سے میں نے اسٹریٹ لائٹس کے برائے نام اُجالے میں میدانِ کارزار کا نقشہ دیکھنے کی کوشش کی لیکن گھنے درختوں کے سیاہ ہیولوں اور کوٹھیوں کو منقسم کرنے والی دیوار اور ویران باغ کے سوا مجھے کچھ نظر نہ آیا۔ اس علاقے میں پڑوسی اور ہمسائیگی کے تصورات محض نظریاتی تھے۔ ایک کوٹھی کا دوسری کوٹھی سے نہ کوئی جذباتی رشتہ تھا اور نہ معاشرتی، نہ ان کی دیواریں ملتی تھیں اور نہ ان دیواروں میں مقید رہنے والے انسانوں کے دل۔ دونوں جانب بند کھڑکیوں کے پیچھے میں روشنی دیکھ سکتا تھا۔ یہ ناممکن تھا کہ فائرنگ کی آوازیں انہوں نے نہ سُنی ہوں مگر عام رویّہ یہ تھا کہ پرائے معاملات میں اور خصوصاً قانونی چکروں میں لاتعلقی اور لاعلمی کا اظہار آدمی کو پریشانیوں سے محفوظ رکھتا ہے۔ کسی بچّے نے کہا بھی ہوگا کہ "ڈیڈی، فائرنگ ہو رہی ہے پڑوس میں" تو عقلمند ڈیڈی نے فرمایا ہوگا۔ "بے وقوف اپنا کام کرو۔ کوئی فلم چل رہی ہوگی ان کے گھر میں۔ مار دھاڑ سے بھرپور۔ کل یا کبھی کوئی پوچھے تو یہی کہنا ہے اور بس۔"

فائرنگ اب ختم ہوگئی تھی۔ میں نے پھر مطمئن ہو کر چمنی کے پیچھے سے سر نکالا ہی تھا کہ باہر سے ایک تیز سرچ لائٹ کی روشنی نے اندھیرے کو کھنگالنا شروع کیا۔ روشنی اس کوٹھی کے احاطے کی

شنی دیوار پر پڑی۔ اس سے دیوار کی بلندی اور اوپر درختوں تک ہر چیز واضح ہوگئی۔ یہ روشنی کسی جیپ کے اوپر نصب تھی جس کا میں ہیولا سا دیکھ سکتا تھا اور اگر چاہتا تو اسے نشانہ بھی بنا سکتا تھا مگر میں نے انتظار کیا۔

روشنی آہستہ آہستہ آگے بڑھی۔ اچانک ایک درخت پر فائر ہوا۔ جوابی فائر کے ساتھ ہی کسی نے کرب ناک چیخ ماری "جئے کیکر۔" اور پھر ایک کیکر بھد سے زمین پر گرا۔ خیرہ کُن روشنی نے کیکر کو اندھا کردیا ہوگا۔ چنانچہ وہ صحیح نشانہ لینے میں ناکام رہا تھا مگر خود نشانہ بن گیا تھا۔

اس سے ایک بات تو ثابت ہوگئی کہ باہر سے فائرنگ کرنے والا ہمارا دشمن نہیں بلکہ مددگار ہے جو کیکروں کا خاتمہ کر رہا ہے۔ کیکروں کے بارے میں شان کی اطلاع درست تھی کہ انہوں نے کوٹھی کو ہر طرف سے محصور کرلیا ہے۔ اب سوال یہ تھا کہ ان کو نیست و نابود کرنے والا کون تھا؟ اسے کس نے اطلاع دی تھی اور وہ ٹھیک وقت پر کیکروں کو جامِ شہادت پلانے کے لیے آگیا تھا۔

میری عقل تو یہی کہتی تھی کہ کیکروں کو صاف کرنے والے اکبر خان کے محافظ تھے جن کو کوٹھی کے ملازموں نے سب حالات سے آگاہ کردیا تھا مگر اس سوال اور سوال کے جواب میں بھی بہت سے پہلو ناقابلِ فہم تھے جن پر غور کرنے کی مجھے فرصت نہ تھی۔

روشنی کا دائرہ سا مسلسل آگے سفر کر رہا تھا۔ ابھی روشنی کچھ دور تھی کہ ایک درخت پر سے میں نے کسی کو اندر کودتا دیکھا۔ وہ ایک شاخ سے بندر کی طرح لٹک رہا تھا اور زمین اس کے قدموں سے دو تین فٹ نیچے تھی۔ میں نے اطمینان سے نشانہ لے کر فائر کیا اور وہ ڈال سے ٹپکے ہوئے پھل کی طرح نیچے گرا۔ اس نے بھی بزعمِ خود شہادت پالی تھی۔ گولی لگتے ہی اس نے "جئے کیکر" کا نعرہ بلند کیا اور پھر ایک کیاری میں پھولوں کے تختوں پر تڑپنے لگا۔ اس کا خون پی کر پروان چڑھنے والے پودوں پر بہار میں زیادہ شوخ رنگ کے پھول کھلیں گے۔

میرے فائر نے جنگ میں تیسرے فریق کی موجودگی کا اعلان کردیا تھا جو پہلے سے لڑنے والوں کے لیے حیران کُن بات تھی۔ سرچ لائٹ ایک دم گُل ہوگئی۔ شاید انہیں خطرہ لاحق ہوگیا تھا کہ میں اس بلندی سے سرچ لائٹ کو نشانہ بنالوں گا لیکن یہ میری خوش فہمی تھی۔ وہ سرچ لائٹ کو صحیح سمت میں یعنی مجھ پر فوکس کر رہے تھے۔ جب وہ چُندھیا دینے والی روشنی مجھ پر پڑی تو ایک لمحے کے لیے میں اندھا ہوگیا۔ اس لائٹ کے پیچھے دیکھنے کی کوشش کرنا خودکشی کے مترادف تھا۔ میں فوراً غوطہ مار کے چمنی کے پیچھے چھپ گیا۔ ایک گولی سیٹی بجاتی اور شاید میرے کان کو چھوتی گزر گئی لیکن یہ گولی اس طرف سے نہیں آئی تھی جدھر سے مجھ پر سرچ لائٹ پڑ رہی تھی۔ یہ پیچھے سے آئی تھی۔ گولی چلانے والا اناڑی تھا یا اس نے جلدی میں فائر کیا ورنہ تیز روشنی میں چھ فٹ کا ٹارگٹ بہت آسان تھا۔

سرچ لائٹ بند ہوئی تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا ورنہ مجھے انتخاب کرنا مشکل ہوجاتا کہ سامنے والی گولی کا نشانہ بنوں یا پیچھے والی کا۔ نادیدہ دشمن دونوں طرف تھے اور یقیناً بہت خوش بھی ہوں گے کہ بے وقوف آدمی مرنے کے لیے چھت پر چڑھ گیا۔

مجھے اپنے تین ساتھیوں پر غصہ آنے لگا جو نیچے چھپے ہوئے تھے اور کچھ بھی نہیں کر رہے تھے۔ شاید کسی کھڑکی کے پیچھے سے ایک دلچسپ مقابلہ دیکھ رہے تھے کیونکہ اس میں وہ شامل نہ تھے۔ کون کس کو مارنا چاہتا ہے اور کیوں۔ انہیں اس سے کیا۔ ان کے لیے دونوں ہی دو شکاری تھے جو ایک شکار کی خاطر آپس میں لڑ رہے تھے۔ رابعہ نے انہیں بتایا ہوگا کہ سکندر تو مشین گن سمیت اوپر چھت پر چڑھ گیا ہے تو انہوں نے کہا ہوگا کہ واہ۔ اوپر سے تو بہترین نظارہ ہوگا۔ انہیں کیا معلوم کہ اوپر میں بہترین نشانہ ثابت ہو رہا ہوں۔

میں نے دل ہی دل میں محلے والوں اور پولیس والوں کو ایک جیسی گالیاں دیں جو اندھے، بہرے اور گونگے ہوگئے تھے۔ جس ملک کے عوام اتنے بے حس، خود غرض اور قانون سے اتنے بیزار ہوں اور قانون کے محافظ اتنے بزدل اور کام چور ہوں، وہاں جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا قانون نہیں چلے گا تو اور کیا ہوگا۔ یہ پورا معاشرہ مائٹ از رائٹ پر یقین رکھنے پر مجبور ہے۔ ایم آر ایس ہے۔

میں منتظر تھا کہ پیچھے سے کوئی مجھ پر کوئی دوسرا فائر کرے مگر فائر کرنے والا غالباً سرچ لائٹ کا انتظار کر رہا تھا کہ سرچ لائٹ ہی میرا سب سے بڑا مسئلہ تھی۔ میرے خیال میں وہ اکبر خان کے آدمی تھے جو کیکروں کی یلغار کا مقابلہ کر رہے تھے اور سرچ لائٹ انہیں تلاش کرنے کے لیے ضروری تھی۔ میری طرف تو اس کا رُخ غلطی سے ہوگیا تھا۔ شاید مجھے دیکھتے ہی انہوں نے لائٹ بند کردی تھی۔

ایک منٹ تک کچھ بھی نہیں ہوا پھر باہر سے کسی نے چلّا کے کہا۔ "سکندر، نیچے اتر آؤ لنگور کے بچے۔ خیریت چاہتے ہو تو۔"

اس بے تکلفی نے مجھے سخت جز بز کیا۔ "زبان سنبھال کے بات کرو سُور کے بچے۔ میں اکبر خان سے شکایت کروں گا تمہاری۔"

"ایسی کی تیسی اکبر خان کی۔ تم آتے ہو نیچے یا ہم اوپر آکے پکڑیں تم کو۔"

میں نے چیخ کے کہا۔ "مشین گن سے بھون کے رکھ دوں گا سب کو۔"

"اوئے ہم بھی ٹینک لے کر آئیں گے چھت پر۔" اسی بدتمیز شخص نے چلّا کے کہا۔

میں شک میں پڑگیا۔ مجھ سے اس لہجے میں بات کرنے والا اکبر خان کا کوئی ملازم نہیں ہوسکتا تھا۔ پھر وہ کون تھا؟ شاید وہ مشین گن والی بات کو مذاق سمجھ رہا تھا۔ وہ بڑے اکھڑ لہجے میں بول رہا تھا

اور اس کی آواز لاؤڈ اسپیکر جیسی تھی۔ میں نے اسے سبق سکھانے کا فیصلہ کیا اور اندازے سے رُخ متعین کرتے ہوئے مشین گن کو سرچ لائٹ کی طرف کیا۔ ایک سیکنڈ اور گزر جاتا تو میں پورا راؤنڈ چلادیتا اور اس سے جو نقصان ہوتا اس کی تلافی میں تمام عمر نہ کر پاتا۔

ایک دم کوٹھی میں لائٹ آگئی۔ گیٹ لائٹ سے پورچ تک اور کمروں کے اندر تک اجالا ہوگیا۔ میں فوراً چمنی کے پیچھے ہوگیا۔ اندر باہر کا پورا منظر اپنی ساری ہولناکی کے ساتھ میرے سامنے آگیا تھا۔ دو کیکر ٹائپ مُردے گیٹ کے اندر ڈرائیو دے پر اوندھے پڑے تھے۔ ایک لان کے وسط میں یوں چت لیٹا ہوا تھا جیسے تارے گن رہا ہو۔ بیرونی فصیل کے ساتھ ایک تو وہی تھا جسے میں نے شکار کیا تھا' دوسرا چند سیکنڈ قبل ہلاک ہوا تھا۔ ایک کیکر کو میں نے فصیل پر نیچے دروں پیچھے بروں دیکھا۔ اس کی ٹانگیں دیوار کے باہر نکلی ہوئی تھیں اور دھڑ اندر تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ جیسے اندر کی زمین کو چھونے کی کوشش میں تھے۔

سڑک پر میں نے ایک مائکرو بس دیکھی جو ریورس گیئر میں گیٹ سے اندر آرہی تھی۔ سرچ لائٹ شاید اسی کی چھت پر نصب تھی مگر اب نظر نہیں آرہی تھی۔ میں اس کے اندر ڈرائیور کو بھی نہیں دیکھ سکتا تھا اور نہ اندر موجود دیگر افراد کو۔

چھت پر میں نے خود کو قطعی احمق محسوس کیا۔ میں سخت کنفیوژن میں مبتلا تھا۔ نہ یہ پولیس والے تھے اور نہ اکبر خان کے محافظ اور ملازم۔ تو پھر یہ کون لوگ تھے جو کیکروں سے کھلی جنگ لڑ رہے تھے۔ جو مجھے جانتے اور پہچانتے تھے اور اب بڑی بے خوفی سے اندر آرہے تھے۔ میرے لیے ان پر فائر کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔ وہ جو بھی تھے میری جان کے دشمن نہیں تھے ورنہ وہ مجھے اتنی مہلت نہ دیتے۔

دائیں اور بائیں طرف کی دیواروں پر سے دو افراد کود کر اندر آئے۔ ان کے جسم پر سرتاپا سیاہ لباس تھے۔ سیاہ جوتے' سیاہ چُست پتلون پر سیاہ بنیان اور سر پر سیاہ جُراب کی نقاب۔ نائیلون کی جُراب کو کھینچ کر گردن تک لانے کے بعد اس میں آنکھوں کی جگہ دو سوراخ کرلئے گئے تھے۔ چُست لباس کی وجہ سے ہی میں نے یہ دیکھ لیا کہ دیوار پر سے کودنے والوں میں ایک عورت بھی شامل ہے۔

"اے!" میں نے اوپر ہی سے کہا۔ "کون ہو تم لوگ آخر؟"

ایک سیاہ پوش نے سر اٹھایا۔ "تمہارے باپ۔ ابھی اوپر آکے بتاتا ہوں تمہیں۔" یہ وہی اکھڑ لہجے والا تھا۔

اب میں نے نیچے آکر ان سے بات کرنے کا فیصلہ کیا کیونکہ جارحانہ لہجے کے باوجود ان کے عزائم خطرناک نہیں لگتے تھے اور میرے پاس اپنی حفاظت کے لیے مشین گن تھی جس پر میں انحصار کرسکتا تھا۔ اچانک پیچھے سرونٹ کوارٹر کی طرف ہڑبونگ مچی۔ دو سیاہ پوش ایک کیکر کے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ کیکر کے پاس شاید ا نہیں تھا یا وہ اپنے ریوالور کی آخری گولی بھی خرچ کرچکا تھا اور ا گالیوں سے کام چلا رہا تھا جس کا جواب تعاقب کرنے وا گالیوں سے دے رہے تھے۔ غالباً یہ وہی کیکر تھا جس نے عقب مجھ پر گولی چلائی تھی اور وہی اس کی آخری گولی تھی۔ ظاہر ہے چھپ کر فرار کے موقعے کا انتظار کرنے کے سوا کچھ نہیں کر تھا۔ اب فاتح فوج نے اسے تلاش کرلیا تھا اور بد قسمت کیکر غازی بنا تھا نہ شہید ہوا تھا بلکہ جنگی قیدی بن گیا تھا۔

پائپ سے پھسل کر نیچے اترتے ہوئے میں نے دوبارہ گن کو کندھے پر لٹکایا لیکن پندرہ سیر گولیوں کے وزن کو رابو دوپٹے سے کمر کے گرد باندھنے کے بجائے میں نے یوں نیچے چھ جیسے کوئی ڈول کو رسّی باندھ کے کنویں میں لٹکائے۔ جنگی قیدی چلّانے کی آواز سے میں نے اندازہ کرلیا کہ اس کے ساتھ "جی کنونشن" کی قرارداد کے مطابق سلوک نہیں ہورہا ہے بلکہ پا تھانوں کی زندہ روایات کے مطابق اس کی چھینٹی لگائی جارہی ہے۔

ابھی میں آدھے راستے میں تھا کہ میں نے رابعہ کے چلانے آواز سُنی۔ "چھوڑو... چھوڑ دو مجھے... ذلیل... کمینے... خبردار تو نے ہاتھ لگایا مجھے۔" پھر وہ اچانک خاموش ہوگئی۔ میری حرکت قلب ایک لمحے کے لیے بند ہوئی اور میں چھ سات فٹ کی بلند سے چھلانگ مار کے اُترا۔

ایک بار پھر رابعہ کی آواز آئی۔ "سکندر..." پھر جیسے کسی اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

میں نے چیخ کے کہا۔ "رابعہ' میں آرہا ہوں۔"

لیکن ہیروئن کی پکار پر لبیک کہنے والے ہیرو کو اپنی بہادر دکھانے کا موقع ہی نہ ملا۔ جیسے ہی میں ایک دروازے سے طوفا کی طرح اندر داخل ہوا' میں نے دو سیاہ پوشوں کو دیکھا جو غالب ا نازو کو کندھوں پر اٹھا کے لے جارہے تھے۔ رابعہ فرش پر بے سُ پڑی ہوئی تھی۔

غصے میں پاگل ہوجانے کے باوجود میں نے گولی چلانے کی وقوفی نہیں کی۔ غالب اور نازو کے بارے میں یقین سے کہنا مشکل تھا کہ وہ مرچکے ہیں یا صرف بے ہوش ہیں۔ میں فائر کرتا تو ممکن تھا کہ گولی انہیں لگ جاتی اور ان کو بے ہوشی میں قتل کر کا الزام مجھ پر آجاتا۔

وہ دوسرے کمرے میں غائب ہورہے تھے کہ میں نے مش گن اٹھا کے اور چیخ کے کہا۔ "خبردار... رک جاؤ ورنہ..."

اس سے زیادہ کہنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ پیچھے سے کسی مجھ پر وار کیا اور میں نے روشنی کو اندھیرے میں بدلتے محسوس اس اندھیرے میں جگنو سے جھلملائے اور میں نے انہیں پکڑ کوشش کی مگر جگنو بھی غائب ہوگئے اور مجھے یوں لگا جیسے میں بلا بلندی سے خلا میں اتر رہا ہوں۔

جب مجھے پھر ہوش آیا تو میں نے آنکھیں کھول کر گرد و پیش پر ایک نظر ڈالی اور پھر آنکھیں بند کرلیں۔ میرے سر میں شدید درد تھا مگر میں سوچ رہا تھا کہ آخر میں کہاں ہوں۔ اپنی قبر میں؟ آج تک نہ کہیں پڑھا نہ سُنا کہ قبر میں مُردے کو لٹو کی طرح گھمایا بھی جاتا ہے۔ دیواریں یقیناً گردش میں تھیں اور قبر میں روشنی کا کیا سوال۔ میں نے تو ایک لالٹین دیکھی تھی۔ ایک نہیں دو۔ ایک داہنی طرف کی دیوار پر' دوسری بائیں طرف۔ میں چارپائی پر ہوں اور آج تک کسی مُردے کو چارپائی سمیت دفن نہیں کیا گیا۔

ایک بار پھر آنکھیں کھول کے میں نے زیادہ غور سے اس اجنبی دنیا کو دیکھا جس سے پہلے کبھی میرا واسطہ نہیں پڑا تھا۔ اس خالی کمرے کی بوسیدہ دیواریں رنگ و روغن سے بے نیاز تھیں اور لالٹینوں کی مدھم' زرد روشنی میں ماحول بھی آسیب زدہ لگتا تھا۔ میں چھت پر رینگنے والی ایک چھپکلی کو فوکس کررہا تھا جب دوسری طرف آہٹ سی ہوئی۔

میں نے سر گھما کے دیکھا اور پھر ایک دم اٹھ بیٹھا۔ ایک پرانی کرسی پر مجھے ایک جیتا جاگتا کارٹون نظر آیا۔ وہ کرسی میں پھنسا ہوا گول مٹول شخص تھا جو اُب مجھے اپنی اُلو جیسی گول گول آنکھوں سے گھور رہا تھا۔ اس کا سر بالوں سے بے نیاز تھا۔ ماتھے سے پسینہ صاف کرتے ہوئے وہ بار بار گہری ٹھنڈی سانسیں لے رہا تھا جس سے اس کا پیٹ پھولتا تھا تو کرسی کی حدود سے باہر نکل آتا تھا۔

"تم کون ہو؟" میں نے کہا۔

"میں کون ہوں؟" اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ "میں شامت کا مارا ہوں۔ بے چارہ ہوں' گھسیارا ہوں۔ میں گردش میں ہوں' آسمان کا تارا ہوں۔ آوارہ ہوں۔ آج تک میں خود کو ڈاکٹر سمجھتا تھا۔ دنیا بھی مانتی تھی۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ "پھر آج کیا ہوا؟"

"آج... آج یہ ہوا ہیرو کہ دو ڈاکو میرے کلینک پہنچے۔ جب میں چھٹی کرکے گھر جانے والا تھا۔ وہ مجھے یہاں لے آئے اور اب میں تمہارے ساتھ یہاں قید ہوں۔ میری بیوی نے اپنے میکے والوں کو یہ اطلاع دے دی ہوگی کہ بالآخر میں بھاگ گیا اسی نرس کے ساتھ جسے میں نے گزشتہ ہفتے ملازم رکھا تھا۔ بتاؤ میں کیا کروں؟" اس پر رقت طاری تھی۔

میں نے اسے مخلصانہ مشورہ دیا۔ "جب تمہاری یہاں سے رہائی ہو تو پہلا کام یہی کرنا۔ اسی نرس کے ساتھ بھاگ جانا۔"

"تم مذاق کررہے ہو۔ میری جان پر بنی ہوئی ہے۔ اس کا باپ اور میرے سالے۔ وہ مجھے گولے کے ساتھ توپ میں ڈالیں گے اور پھر توپ چلادیں گے۔" اس کی آواز میں بھی رقت آگئی۔

میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "معاف کرنا۔ تم نے مذاق کیا تو میں نے بھی مذاق میں مشورہ دے دیا۔"

"میں نے کون سا مذاق کیا تھا آپ کے ساتھ؟"

"تم نے کہا تھا کہ تمہیں ڈاکو اٹھا لائے تھے۔"

"یعنی آپ کو ابھی تک یقین نہیں آرہا میری بات پر؟" اس نے افسوس سے سر ہلایا۔ "ہوش میں آتے ہی تم فلمی ہیرو کی طرح پوچھتے کہ میں کہاں ہوں تو میں کہتا کہ یہ ڈاکوؤں کا ڈیرا ہے۔ ڈاکو تمہیں بھی اٹھا کے لائے ہیں اور تمہارے ساتھ پتا نہیں کس کس کو۔"

اب میرے حواس پوری طرح بیدار ہوچکے تھے۔ "تم نے دیکھا ہے کسی ڈاکو کو... میرا مطلب ہے تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ ڈاکو ہیں؟"

"لاحول ولا۔ خود انہوں نے بتایا تھا مجھے۔"

"اور تم نے مان لیا؟"

"نہ مانتا تو وہ وہیں مار دیتے مجھے۔ کسی دوسرے ڈاکٹر کو لے آتے۔ اور نہ ماننے والی بات بھی نہیں تھی۔ وہ صورت شکل سے اور بات چیت سے علما یا حافظ جی نہیں لگتے تھے۔"

میری تشویش بڑھتی جارہی تھی۔ "یہ کب کی بات ہے؟"

"بات تو ہے گزشتہ رات کی جس کی صبح اب ہونے والی ہے۔ چھ گھنٹے ہوگئے مجھے یہاں آئے ہوئے۔" وہ بولتا تھا تو لگتا تھا کہ رو رہا ہے اور یہ ایک فطری صلاحیت تھی۔ "میں نے انجکشن لگا دیا' دوا دے دی۔ بتا دیا کہ بے ہوشی عارضی ہے' معمولی چوٹ ہے۔ خطرے کی کوئی بات نہیں رہی۔ اب جانے دو مجھے مگر ڈاکو تو میاں ڈاکو ہی ہوتا ہے۔ وہ سنتے ہیں کسی کی۔"

میں نے کہا۔ "اور کون ہے میرے ساتھ؟"

"کیا چیز ہو تم بھی؟ یہ مجھ سے پوچھ رہے ہو۔"

"ڈاکٹر صاحب! مجھے تو انہوں نے سر پر گُرز مار کے لٹا دیا تھا۔ مجھے کیا معلوم کہ اور کون کون پکڑا گیا تھا؟"

وہ رازدارانہ لہجے میں بولا۔ "دیکھو' ان کو معلوم نہ ہو کہ میں نے کچھ بتایا تھا تمہیں۔ بیوی تو شاید بخش دے' یہ نہیں بخشنے والے۔ چار آدمی اٹھائے ہوئے تھے انہوں نے کہیں سے۔ دو عورتیں اور دو مرد۔ تم اور ایک عورت تو شرافت سے یہاں تک آگئے مگر ایک عورت اور ایک مرد راستے میں غائب ہوگئے۔"

"کیا مطلب؟ گر گئے کہیں یا کھو گئے؟ وہ بھوت تو نہیں تھے کہ غائب ہوجاتے۔" میں نے کہا۔

"بھئی واللہ اعلم۔ میں نے تو سنا تھا۔ ان کا جو سردار ہے نا' وہ بہت گرج برس رہا تھا کہ تم سب اُلّو کے پٹھے ہو۔ میں نے بتا دیا تھا' سمجھا دیا تھا۔ شرم نہیں آتی' خود کو مرد کہتے ہو۔ ایک لڑکی کو نہیں سنبھال سکے۔ تمہاری ٹھکائی لگا کے نکل گئی وہ اور ساتھ اسے بھی لے گئی۔"

میں ساری بات سمجھ چکا تھا مگر ڈاکٹر کی زبان سے تصدیق چاہتا تھا۔ "یہاں ایک خاتون کو لایا گیا تھا میرے ساتھ۔ وہ کہاں ہیں؟"

"دوسرے کمرے میں۔"

"اس ساتھ والے کمرے میں؟" میں نے پلنگ پر سے چھلانگ لگائی۔

ڈاکٹر میرے پیچھے پیچھے لپکا۔ "یار! کیوں مرواتے ہو۔ دوسرے کمرے کا مطلب ساتھ والا کمرا نہیں ہے۔ ابھی تمہیں اجازت نہیں ہے اٹھنے کی۔"

میں مایوس ہو کے پھر بیڈ پر بیٹھ گیا۔ "کسی کی اجازت نہیں چاہیے مجھے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"دیکھو' ابھی وہ آئے گی تو اسے بتا دینا یہ بات تاکہ میری بھی جان چھوٹے۔"

"کون آئے گی؟" میں نے کہا۔

"وہی۔ ڈاکو ناگ منی جس کا یہ ڈیرا ہے۔"

یہ الفاظ بم کے دھماکے تھے جو میری سماعت پر گرے۔ میں کچھ دیر دم بخود بیٹھا ڈاکٹر کو گھورتا رہا۔ "یہ...... ناگ منی کا ڈیرا ہے؟ تم نے دیکھا ہے اسے؟ تم ملے ہو ڈاکو ناگ منی سے؟"

"اتنے بدحواس کیوں ہو گئے؟ تمہاری ملاقات بھی ہو جائے گی۔ وہ بڑی عجیب چیز ہے میاں۔ بس خدا کی قدرت ہے اور کیا کہوں۔ نہ صورت سے ڈاکو لگتی ہے' نہ بات چیت سے اور نہ اطوار سے مگر سچ مچ کے ڈاکو اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ اس کے دائیں بائیں محافظ بن کے رہتے ہیں۔ مجھے تو یقین نہیں آتا کہ یہ حقیقت ہے یا کوئی بھیانک خواب۔ فلموں میں دیکھا تھا ایسا کہ ڈاکوؤں کی سردار کوئی حسینہ ہے۔ ناچ گانا بھی جانتی ہے اور پیار بھی کرتی ہے کسی شہزادہ گلفام سے۔ اب یقین کرنا پڑتا ہے کہ فلموں میں جو اتفاقات نظر آتے ہیں وہ سب بے بنیاد نہیں ہوتے۔ کچھ حقیقت بھی ہوتے ہیں۔

میں حیرت کے جذبات کی اس انتہا پر تھا جہاں حیرت بے معنی ہو جاتی ہے۔ وہ ڈاکو ناگ منی اور اس کے ساتھی تھے جنہوں نے کیکر شاہ کے مُریدوں کا مقابلہ کیا تھا اور ان کے حملے کو ناکام بنا دیا تھا۔ وہ ہماری اپنی گل بانو تھی جو سچ مچ ڈاکو ناگ منی کے روپ میں نمودار ہوئی تھی اور ہمیں اکبر خان کے گھر سے نکال لائی تھی۔ آخر وہ عین وقت پر وہاں کیسے پہنچ گئی تھی؟ کس نے بتایا تھا اسے کہ ہم اکبر خان کے مہمان ہیں اور محصور ہو گئے ہیں اور اگر وہ گل بانو ہی تھی تو کیا وہ اکھڑ لہجے میں مجھ سے بات کرنے والا محسن تھا؟ انداز تو وہی تھا اس کی بے تکلفی کا مگر آواز؟ شاید وہ آواز بنا کے بول رہا تھا۔ ڈاکٹر کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ نازو راستے میں ہی انہیں جُل دے کر فرار ہو گئی اور جاتے جاتے اپنے ساتھ غالب کو بھی لے گئی۔ یہ سوچ کر میں مسکرائے بنا نہ رہ سکا۔ نازو آخر نازو ہے۔ اس نے مکر کیا ہو گا۔ یہ دیکھ لیا ہو گا کہ مقابلہ بے سود ہے تو اس نے غالب کو بھی سمجھا دیا ہو گا کہ مکر کیے پڑے رہنا اور جب میں اشارہ دوں تو بس میرے ساتھ ہی چھلانگ مار دینا یا ایسا کوئی ڈراما کیا ہو گا اس نے راستے میں کہ اغوا کر کے لانے والے احمقوں کی طرح منہ دیکھتے رہ گئے اور جنہوں نے اس کی راہ میں حائل ہونے کی کوشش کی وہ مارے گئے۔ نازو نے ان کو اپنی جگہ لٹا دیا ہو گا۔

"ایسی کیا بات ہے میاں کہ مسکرا رہے ہو؟ بڑے خوش نظر ہو۔" ڈاکٹر نے طنز سے کہا۔

میں نے کہا۔ "خوشی کی بات تو ہے۔ ہر ایک کے نصیب میں کہاں کہ گل بانو..... میرا مطلب ہے ناگ منی اسے اغوا کرے۔ کیا کہا ہے کسی شاعر نے کہ وصالِ یار فقط آرزو کی بات نہیں ہے۔"

صدمے سے ڈاکٹر کا برا حال ہو گیا۔ "یہ خواہش تھی تمہاری؟"

"ڈاکٹر صاحب' خواہش کا کیا ہے۔ ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے۔ فرض کریں میری خواہش ہو کہ مجھے صدر امریکا اپنے پوتے کی رسم عقیقہ میں مدعو کرے۔ تو کیا یہ خواہش پوری ہو سکتی ہے؟ کبھی نہیں۔ ابھی تو پوتا ہی نہیں ہے اس کا۔ ہو گا تو عقیقہ نہیں ہو گا اس کا اور بفرضِ محال ہوتا تو وہ مجھے کیوں بلاتا؟ کیا میں ماموں ہوں اس کے پوتے کا؟"

ڈاکٹر کو یقین ہونے لگا تھا کہ سر کی چوٹ کا اثر اب ظاہر ہونے لگا ہے کہ اچھی بھلی باتیں کرتے کرتے میں پاگل ہو گیا ہوں۔ میں اسے کیا بتاتا کہ اس وقت میرے دلی جذبات کیا ہیں۔ ایک طرف مجھے خوشی تھی گل بانو اور محسن سے ملاقات کی تو دوسری طرف میرا دل ایک صدمے سے بھی دوچار تھا۔ اب تک میں نے ہر خبر کو افواہ جانا تھا مگر اب تصدیق ہو گئی تھی کہ ڈاکو شیش ناگ کی بہن ناگ منی جسے ہم نے بڑے خلوص' بڑی اپنائیت اور محنت سے گل بانو بنایا تھا' وہ پھر اپنے اصل کی جانب لوٹ گئی ہے۔ وہ پھر ڈاکوؤں کے گروہ کی سردار ہے اور میں نے اس کے بارے میں جتنی باتیں سنی تھیں وہ غلط نہیں تھیں۔

آخر اس نے ایسا کیوں کیا؟ کیا مجبوری تھی جس نے گل بانو کو دوبارہ ناگ منی بنا دیا؟ اگر ابتدا میں ایسا ہوتا تو مجھے نہ حیرت ہوتی اور نہ دکھ ہوتا۔ شریفانہ زندگی کے طور طریقے' ادب و آداب اور ڈسپلن کی پابندی انہیں کہاں راس آتی ہے جو بے راہ روی کی زندگی کے عادی ہوں۔ چور' ڈاکو' غنڈے یا بدمعاش۔ بازاری عورت کے لیے بیوی بن کے شوہر کی اطاعت کرنا اور گھر کی چار دیواری میں قید رہنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

افسوس کی بات یہ تھی کہ گل بانو نے خود بھی ناگ منی کے ماضی سے پیچھا چھڑانے کی کوشش میں ہم سے بھرپور تعاون کیا تھا۔ ناگ منی اس کے گم گشتہ ماضی کی بھولی بسری یاد بن چکی تھی اور کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اچانک وہ پرانی ناگ منی پھر زندہ ہو جائے گی اور گل بانو کا وجود خیالوں میں خواب اور سراب کی طرح رہ جائے گا۔ یہ ناممکن لگتا تھا مگر حقیقت اس سے کہیں زیادہ سنگین اور بھیانک تھی۔ صرف گل بانو ہی نے ناگ منی کا راستہ اختیار نہیں کیا تھا' وہ اپنے ساتھ میرے اس دوست محسن کو بھی

لے گئی تھی جو روزِ اوّل سے میری زندگی میں شامل تھا اور میرے وجود کا ایک حصہ تھا۔ میرا اپنا وجود کرۂ ارض کی طرح تھا جس میں زمین آسمان' سمندر اور پہاڑ' آبادیاں اور ویرانے سب ہی شامل ہوں۔ میں ماضی' حال اور مستقبل میں بٹا ہوا تھا۔ ماضی میں میرے والدین' بھائی بہن اور بہت سے لوگ شامل تھے جو اَب صرف یادوں میں رہ گئے تھے مگر محسن نے ماضی سے حال تک میرا ساتھ دیا تھا۔ رابعہ بھی میرے سفرِ حیات میں بہت دیر سے شریک ہوئی تھی اور اب میں مستقبل کا تصور کرتا تھا تو رابعہ کو شریکِ حیات سمجھتا تھا۔ بالکل اسی طرح محسن کو بھی میں نے اپنے مستقبل میں ساتھ دیکھا تھا۔ غالب اور نازو بھی میرے ساتھ تھے اور میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ان میں سے کوئی اچانک اپنی راہ الگ کر لے گا لیکن محسن نے ایسا ہی کیا تھا' وہ گل بانو کو روکنے کے بجائے خود اس کے ساتھ نکل گیا تھا۔

ڈاکٹر میری صورت کو بڑے غور سے ملاحظہ کر رہا تھا جس پر حیرت' خوشی' دکھ اور پچھتاوے کے سارے جذبات کا عکس باری باری جھلک دکھا رہا تھا۔ ظاہر ہے میری جذباتی کیفیت کا یہ اتار چڑھاؤ اور میرے ناقابلِ فہم رویّے کی تبدیلی سے وہ پریشانی کا شکار تھا۔ میں اسے کیا بتاتا کہ میری اور اس کی یہاں موجودگی کے پیچھے وہ کہانی ہے جو میں اسے سمجھانا چاہوں تو وہ سن کے پاگل ہو جائے۔

اب میرے دل میں رابعہ سے' محسن سے اور گل بانو سے ملنے کی خواہش جاگ اٹھی تھی اور ہر لمحہ شدید سے شدید تر ہوتی جا رہی تھی۔

میں نے اچانک چلّا کے کہا "ڈاکٹر' اوئے مینوں وس او ناگ منی کتھے اے۔ اونوں آکھ میرے سامنے آوے۔ میں اُوے ٹوٹے کر دیاں گا۔ جے او ناگ منی اے تے میں وی شیش ناگ آں......"

ڈاکٹر اچھل پڑا۔ "یہ..... یہ کیا ہو گیا ہے تمہیں اچانک؟؟"

میں نے دہاڑ کے کہا۔ "اوئے توں نئیں جاندا مینوں۔ میں تیرے وی ٹوٹے کر دیاں گا لوٹے..... ہا آ آ... کتھے جے میرا گنڈاسا۔"

میری ہنگامہ آرائی کا مقصد کسی کو متوجہ کرنا تھا اور میں اس مقصد میں کامیاب رہا۔ باہر سے کسی نے دروازے کا قفل کھولا اور ایک دم گل اندر آ گئی۔ اس کے پیچھے صورت اور حلئے سے ڈاکو نظر آنے والا اور ایک شخص تھا جس نے اپنی اسٹین گن کا رخ میری طرف کر لیا تھا۔

ناگ منی عام استعمال کے کپڑوں میں تھی اور اس میں ذرّہ برابر بھی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ جب پہلی بار وہ مجھے ناگ منی کے روپ میں ملی تھی تو اس کا حلیہ بالکل مختلف تھا۔ ہمارے ساتھ رہنے سے وہ گل بانو بنی تو اس نے اپنا حُلیہ بھی بدل لیا' انداز و اطوار بھی بدل ڈالے تھے۔ اس وقت بھی میرے سامنے وہی گل بانو تھی اور میرا ذہن اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے گریزاں تھا کہ وہ ناگ منی ہے۔

چند سیکنڈ ہم ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے خاموش کھڑے رہے۔ گل بانو کے ساتھ آنے والا محافظ اور میرے ساتھ کھڑا ہوا ڈاکٹر منتظر رہے کہ ہم کوئی بات کریں۔

بالآخر گل نے اپنے ساتھ آنے والے کو حکم دیا۔ "تم جاؤ' اس ڈاکٹر کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤ۔"

"خدا کے لیے اب تو مجھے جانے دو۔" ڈاکٹر نے فریاد کی۔ "شادی کے بعد آج تک کبھی میں پوری رات گھر سے باہر نہیں رہا۔ میری بیوی بڑی ظالم ہے۔"

"اگر اس کی ضرورت نہ ہو تو اسے واپس چھوڑ آؤ۔" گل نے کہا۔

"اب میری کیا ضرورت ہے ڈاکو صاحب۔ دیکھ لیں آپ کا بندہ ٹھیک ٹھاک کھڑا ہے آپ کے سامنے..... میری بیوی..."

ڈاکو نے اسے باہر کھینچ لیا۔ "بیوی سے اتنا ڈرتا ہے۔ شرم کر۔"

دروازہ بند ہو گیا تو میں نے کہا۔ "کس نام سے مخاطب کروں میں آپ کو؟ گل بانو کہوں یا ناگ منی؟"

گل ایک دم آگے آئی اور میرے گلے لگ کے رونے لگی۔

"مجھے معلوم تھا' آپ بہت ناراض ہوں گے۔ آپ سب کو میرے نام سے نفرت ہو گی مگر سکندر بھائی! میں وہی گل ہوں۔ خدا کی قسم۔"

میں نے اسے ایک جھٹکے سے دور کر دیا۔ "جھوٹی قسم کھا کے مزید گناہگار کیوں ہوتی ہو۔ جو حقیقت ہے' میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔"

"نہیں بھائی سکندر' ابھی آپ کو کچھ بھی نہیں معلوم مگر میں سب بتا دوں گی کہ میں نے ایسا کیوں کیا تھا۔"

"مجھے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ نالی کا کیڑا نالی ہی میں خوش رہتا ہے۔" میں نے برہمی سے کہا۔

"ابھی آپ غصے میں ہیں جو چاہیں کہیں۔ میں بہت پہلے آپ کی غلط فہمی دور کر دیتی مگر آپ لوگ تو پاکستان آ کے بھی انہی چکروں میں پڑے ہوئے ہیں۔" گل نے کہا۔

"ہاں' ہم وہی ہیں۔ ہماری مصروفیات اور معمولات سب وہی ہیں اور ایسا ہی تم نے بھی کیا ہے۔ تم اپنی پرانی دنیا میں واپس چلی گئی ہو جس سے ہمارا نہ پہلے کوئی تعلق تھا اور نہ آئندہ کبھی ہو گا۔"

گل سر جھکائے مجرموں کی طرح کھڑی رہی۔ "میں نے اور محسن نے آپ لوگوں کو بہت تلاش کیا۔ بالآخر کل آپ کا پتا چلا اور خدا کا شکر ہے کہ ہم بروقت پہنچ گئے۔ میں نے رابعہ باجی کو سب بتا دیا ہے۔"

"رابعہ..... کہاں ہے رابعہ؟" میں نے کہا۔

"محسن سے باتیں کررہی ہے۔" گل نے مسکرانے کی کوشش کی۔

رابعہ اور محسن کے نام پر میرے جذبات کی آگ سرد پڑنے لگی۔ یوں بھی نہ جانے کیوں گل کو دیکھتے ہی میرے دل میں کچھ ہونے لگا تھا۔ مجھے اس پر اتنا غصہ تھا کہ میرا خیال تھا میں اس کو برا بھلا کہوں گا' اسے گالیاں دوں گا' اسے صاف بتادوں گا کہ ہم سب اس سے نفرت کرتے ہیں اور اب اس کے اور ہمارے درمیان کوئی رشتہ ہے تو دشمنی کا۔ کسی ڈاکوؤں کے گروہ سے ہمارا کیا تعلق۔ اب ایک طرف ہم ہیں اور دوسری طرف چوہدری ولاور ہے' ناگ منی ہے اور وہ سب قانون شکن' ملک دشمن عناصر ہیں جن کے خلاف ایم آر ایس کی کھلی جنگ ہے۔

لیکن گل بانو سامنے آئی اور اس نے میرے سینے سے لگ کر رونا شروع کیا تو میں اپنی ساری نفرت اور غصہ بھول گیا۔ مجھے وہ پہلے جیسی معصوم اور پرانی گل بانو لگی۔ میں نے غصے میں جو بھی کہا وہ مجھے غصے کی ایکٹنگ لگا۔ میں سوچنے لگا کہ میں گل بانو کو صفائی اور وضاحت کا موقع دیے بغیر اس سے نفرت کیسے کرسکتا ہوں۔

گل نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ "آیئے میرے ساتھ۔ محسن کی بات تو مانیں گے آپ؟ وہ تو آپ سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔ اس سے پوچھ لیں کہ ہم نے جو بھی کیا ضرورت اور مجبوری کے تحت کیا۔"

"ضرورت اور مجبوری!" میں نے تلخی سے کہا۔ "میں بھی سخت ضرورت محسوس کررہا ہوں اس حرامزادے کو جوتے مار مار کر گنجا کرنے کی اور مجبوری میری یہ ہے کہ میں اسے گولی نہیں مار سکتا۔"

گل نے کہا۔ "اب وہ ٹھیک ہے اور اس کو ڈپریشن کے دورے بھی کم پڑتے ہیں۔ آپ تو جانتے ہیں کہ پہلے اس کا حال کیا تھا۔ کتنا عرصہ وہ شاک کی کیفیت میں رہا تھا۔ بہت کم امید تھی کہ وہ شہلا کی اور اپنے بیٹے کی موت کا ذہنی صدمہ بھول پائے۔"

ایک دم میرا دل اپنے دوست کے لیے محبت اور ہمدردی کے جذبات سے بھر گیا۔ وہ سارا دکھ اور اذیت میرے احساس کا حصہ بن گئے جو محسن نے برداشت کیے تھے۔ صرف اس لیے کہ وہ میرا دوست تھا اور اس کو میرا ساتھ دینے کی اتنی بڑی سزا ملی تھی جو خود مجھے نہیں ملی تھی۔ گل کی بات نے یادوں کا دریچہ کھول دیا اور میں نے گزرے ہوئے وقت کے بہت سے بے رحم لمحات کی وہ تصویر دیکھ لی جس کے نقش محسن کے ہر زخمِ دل میں آج بھی تازہ ہوں گے اور اگر گل کی محبت کا اعجازِ مسیحائی نہ ہوتا تو ناسور بن چکے ہوتے۔ یہ گل ہی تھی جس نے محسن کے دل میں جینے کی اُمنگ کو مرنے نہیں دیا تھا اور ایک موہوم امید کے سہارے پر اپنے نخلِ محبت کے لیے اس کے دل کی بنجر زمین سے نمو کی بھیک مانگتی رہی تھی اور خواہشوں کی خزاں سے ارمانوں کی بہار کشید کرنے کی دیوانہ وار کوشش سے کبھی دستبردار نہیں ہوئی۔ آج یہ اس کی قربانیوں اور اس کی محبت کا کرشمہ تھا کہ محسن ایک بار پھر اپنے ماضی کے پُرآزار زنداں سے رہائی پا کے ہم سب کے ساتھ امیدوں کے سفر میں پورے جوش اور ولولے کے ساتھ شریک تھا۔

"جب تک ہم یہاں نہیں آئے تھے۔" گل نے کچھ دیر بعد کہنا شروع کیا۔ "محسن کی حالت بظاہر ٹھیک ہوگئی تھی مگر واپس آنے کے بعد ہم جب کراچی کے ایئرپورٹ سے نکلے تو اس کی حالت میں پھر جنون کے آثار پیدا ہوگئے۔ اس نے لاہور جانے سے صاف انکار کردیا۔ اس نے کہا کہ تم سب کے لیے لاہور وہی پرانا لاہور ہوگا مگر میرے لیے وہاں اب کیا ہے۔ ہر جگہ' ہر طرف یادوں کا ایک قبرستان ہے۔ کیا میں اس قبرستان میں کسی بدروح کی طرح بھٹکتا رہوں۔ میں اس کی بات سمجھ گئی۔ وہ پرانے ماحول میں واپس جاتے ہوئے ڈرتا تھا اور یہ تو میرے اختیار میں نہیں تھا کہ اس ماحول سے پرانی یادوں کو الگ کردوں۔ گھر میں ایک کمرا بدلا جاسکتا ہے مگر میں یا تم لاہور کو کیسے بدل سکتے تھے۔ ان گلیوں اور سڑکوں' گھروں اور بازاروں' دُکانوں اور ہوٹلوں کو دیکھ دیکھ کر محسن پھر پاگل ہوجاتا جہاں شہلا اس کے ساتھ تھی۔"

میں نے کہا۔ "تم نے بہت اچھا کیا گل۔"

"مجھے امید تھی کہ تم سب آجاؤ گے تو شاید محسن کو سنبھال لو گے اور ممکن ہے ہم مل کے کوشش کریں تو محسن میں حقیقت کو سمجھنے اور اسے تسلیم کرنے کا حوصلہ بحال ہوجائے لیکن اس کی وحشت میں جنون کے آثار پیدا ہونے لگے تھے۔ اس نے اکرام شیخ سے ملنے سے بھی انکار کردیا۔ اب میں کیا بتاؤں آپ کو۔ میں تو بکھر گئی تھی۔ وہ میرے کنٹرول سے بھی باہر ہوجاتا' اگر میں اس کا کہا نہ مانتی۔ اس نے کہا کہ گل مجھے تنہا چھوڑ دو۔ تم جاؤ سکندرِ اعظم کے ساتھ' مرزا غالب کے ساتھ اور نازو کے ساتھ۔ میں کسی کے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ میں نے اپنا سب کچھ تو لٹا دیا اور کچھ نہیں ہے میرے پاس کسی کو دینے کے لیے۔ میں اسے ایک ہوٹل میں لے گئی اور بڑی مشکل سے اسے یقین دلانے میں کامیاب ہوئی کہ میں بھی لاہور نہیں جانا چاہتی اور کسی سے کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتی۔ ایک دن تو وہ کمرے سے باہر ہی نہیں نکلا' نہ اس نے مجھے باہر جانے دیا۔ وہ خوف کے آسیب کا شکار تھا۔ کہتا تھا' باہر جاؤ گی تو دلاور اٹھا کے لے جائے گا تمہیں۔ استاد پیڈرو مل جائے گا۔ بس یہاں بیٹھو میرے پاس۔ مجھ سے باتیں کرو۔ وہ بولتا رہا اور میں سنتی رہی۔"

"کیا باتیں کرتا رہا وہ تم سے؟"

"پرانی باتیں۔ جب تم لندن میں تھے تو کیا کرتے تھے' کہاں رہتے تھے۔ حیرت کی بات ہے کہ اس نے شہلا کی کوئی بات نہیں کی اور نہ اپنے بچے کی۔ نہ اس وقت کی جو اس نے لاہور میں گزارا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اپنی زندگی سے اس نے ایک پُرعذاب یادوں سے معمور وقت کا ٹکڑا کاٹ کے الگ کردیا ہے۔ وہ صرف

کی باتیں کویا، رکھنا چاہتا تھا۔ مجھے وہ لندن کے بارے میں بتاتا رہا اچھا ہے۔ بہت خوب صورت شہر ہے' وہاں کوئی کسی کا دشمن نہیں ہوتا۔ اس کے کچھ حصے تو ایسے ہیں کہ لگتا ہے ہم پاکستان میں ہیں۔ بس ہم وہیں رہیں گے۔ کسی کو معلوم نہیں ہوگا کہ ہم کہاں ہیں۔ ہم ایسٹ اینڈ پر چھوٹا سا ریسٹورنٹ کھول لیں گے۔ میں اور تم مل کے اسے چلائیں گے اور دیکھنا ایک دن وہ ترقی کر کے مشرقی بلکہ پاکستانی کھانوں کے لیے لندن اور پورے انگلستان میں مشہور ہوگا۔ ابھی تو میں کاؤنٹر پر بیٹھوں گا اور تم سروس کرنا۔ وہاں یہ کوئی معیوب بات نہیں ہے۔ بہت سے میاں بیوی مل کے کاروبار چلاتے ہیں۔ بچے بھی شریک ہوتے ہیں۔ پاکستانی لباس میں تم جیسی ویٹرس ہوگی تو دیکھنا گاہک ٹوٹ پڑیں گے۔ میں سب سنتی رہی اور اس کی حوصلہ افزائی کے لیے تائید بھی کرتی رہی۔ میں نے یہ بالکل نہیں پوچھا کہ ہم لندن جائیں گے کیسے؟ نہ پاسپورٹ ہے نہ رقم۔ کاروبار کیا خالی ہاتھوں سے اور جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھ کر کیا جاسکتا ہے۔ وہ خواب کو حقیقت کے روپ میں دیکھنا چاہتا تھا اور میں نے اس کھیل میں محسن کا پورا ساتھ دیا۔ ایک پورا دن ہم ہوٹل کے کمرے میں بند رہے۔ بڑی مشکل سے میں نے اسے قائل کیا کہ روم سروس سے کھانا اور چائے وغیرہ منگوانے میں کوئی خطرے کی بات نہیں۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں کوئی ویٹر ہمیں پہچان کے چوہدری دلاور یا استاد پیڈرو کو نہ بتادے۔ ہمارے دشمن بہت ہیں۔ 'گل' تم نے دیکھا ہوگا کہ لوگ ہر جگہ ہمیں پہچان جاتے تھے۔' محسن مجھے قائل کرنے کے لیے کہتا تھا۔ 'ہم تو راتوں رات چپکے سے یہاں سے نکل جائیں گے۔' بڑی مشکل سے مجھے ایک ویٹر سے بات کرنے کا موقع ملا۔ اس وقت محسن باتھ روم میں تھا۔ میں نے ویٹر کی منت ساجت کی اور اسے بتایا کہ صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے مگر وہ ڈاکٹر کے پاس جانے کے لیے تیار نہیں۔ تم کسی ڈاکٹر کو بھیج دو۔ اسے سمجھا دینا کہ نفسیاتی مسئلہ ہے۔ وہ خود کو ڈاکٹر نہ کہے ورنہ صاحب کا بھروسہ نہیں۔ ویٹر کچھ سمجھا' کچھ نہیں سمجھا مگر اس نے قریب ہی کسی ڈاکٹر سے بات کی۔ وہ سمجھ دار آدمی تھا۔ اس نے ڈاکٹروں والا سفید گاؤن پہنا اور چائے کی ٹرے لے کر آگیا۔ کہنے لگا کہ میں تو ویٹر ہوں۔ وہ چائے میں کوئی خواب آور دوا ملا کے لایا تھا شاید۔ محسن نے چائے پی اور پندرہ بیس منٹ بعد باتیں کرتے کرتے سوگیا۔ رات سے وہ مسلسل جاگ رہا تھا اور اسے اٹھارہ گھنٹے ہوگئے تھے باتیں کرتے ہوئے۔ یہ بات بھی میں نے ویٹر کو بتا دی تھی۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ڈاکٹر دوبارہ آیا اور اس نے مجھ سے بات کی۔ میں نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ اس نے مجھے تسلی دی اور کہا کہ آپ بالکل فکر نہ کریں۔ یہ اثر عارضی ہے۔ ویسے تو علاج میں ایک مہینہ بھی لگ سکتا ہے لیکن ایک جُوا بھی کھیلا جا سکتا ہے۔ اس میں کامیابی اور ناکامی کے امکانات برابر ہیں۔ اگر آپ میں ہمت ہے تو میں آپ کو بتاتا ہوں کہ آپ کو کیا کرنا ہوگا؟ میں نے کہا کہ ایک مہینے تک علاج کرانا میرے بس کی بات نہیں۔ میں اکیلی ہوں۔ نہ میرے پاس پیسہ ہے اور نہ وقت۔ ہاں میں جُوا کھیل سکتی ہوں۔ آپ بتائیں مجھے کیا کرنا ہوگا۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ آپ اس ہوٹل سے کسی دوسرے ہوٹل میں شفٹ کر جائیں۔ میں ان کو نیند کے انجکشن لگا دوں گا۔ یہ کم سے کم چھ گھنٹے تک بے ہوشی کی نیند سوئیں گے۔ چھ گھنٹے میں آپ سب کچھ کرلیں۔ ہوٹل بالکل مختلف ہو۔ اس کے کمرے کا ماحول بالکل مختلف ہو۔ آپ اپنے کپڑے بدل لیں اور ان کا لباس تبدیل کردیں۔ جب ان کی آنکھ کھلے گی تو آپ کا اصل کام شروع ہوگا۔ یہ حیران ہوں گے۔ آپ سے پوچھیں گے کہ ہم کہاں آگئے۔ آپ انہیں یقین دلائیں گی کہ ہم شروع سے یہیں ہیں۔ یہ پرانی باتیں دُہرائیں گے جو یہ آپ سے کر چکے ہیں۔ آپ صاف انکار کردیں کہ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ آپ کے کپڑے اور اپنے کپڑے دیکھ کے اور ہوٹل کے کمرے کا بدلا ہوا ماحول دیکھ کر یہ شک میں مبتلا ہوجائیں گے کہ انہوں نے کوئی خواب دیکھا تھا۔ آپ اس شک کو یقین میں بدل دیں کہ یہ خواب ہی تھا۔ سب کچھ آپ کی پُراعتماد اداکاری پر منحصر ہے۔ اگر انہوں نے آپ کی بات مان لی تو غالب امکان یہ ہے کہ آپ جیت جائیں گی اور ان کا اپنی ذات پر اعتماد باقی نہیں رہے گا۔ یہ آپ پر انحصار کریں گے۔ اس وقت آپ جو بھی کہیں گی یہ مانیں گے لیکن آپ نے یہ موقع گنوا دیا اور انہیں شک ہوگیا کہ آپ جھوٹ بول رہی ہیں تو آپ جُوا ہار جائیں گی۔ بس سکندر بھائی! اس کے بعد میں نے کہا کہ اب ادھر یا ادھر۔ میں نے وہی کیا جو ڈاکٹر نے کہا تھا۔ جب محسن جاگا تو پریشان ہوگیا۔ کہنے لگا کہ تم نے کمرا بدل لیا ہے یا ہوٹل؟ میں پہلے سے تیار تھی۔ میں نے کہا کہ کیسی باتیں کررہے ہو۔ کل سے ہم اسی ہوٹل میں ہیں۔ اس نے اپنے کپڑے دیکھے پھر میرے۔ کہنے لگا کہ یہ ہم نے کب خریدے تھے۔ میں نے کہا کہ کل شام کو بازار گئے تھے تو خود تم نے پسند کیے تھے۔ وہ چکرا گیا اور سب پوچھتا رہا۔ کیا میں نے یہ نہیں کہا تھا' وہ نہیں کہا تھا۔ میں برابر اسے جھٹلاتی رہی کہ کیا ہوگیا ہے تمہیں۔ ہم تو اتنے تھکے ہوئے تھے کہ بس سوتے رہے تھے۔ شام کو نکلے تھے تو کھانا باہر ہی کھا کے لوٹے تھے اور واپس آکے پھر سوگئے تھے۔ اس نے پوچھا کہ کھانا کہاں کھایا تھا۔ میں نے ایک ریسٹورنٹ کا نام لیا۔ وہ کہنے لگا۔ "گل! یہ مجھے کیا ہوگیا ہے۔ مجھے تو کچھ بھی یاد نہیں۔ کیا میری یادداشت چلی گئی ہے؟" میں نے ہنس کے کہا کہ یادداشت نہ رہتی تو تمہیں میرا نام کیسے یاد رہتا؟ سکون آور دواؤں سے اور مسلسل سونے سے یہ فائدہ ہوا تھا کہ اس کے اعصاب پر خوف کا اثر باقی نہیں رہا تھا۔ اس کا ذہن دوسری الجھن میں گرفتار ہوگیا تھا۔ قصہ مختصر میں نے جُوا کھیلا اور جیت گئی۔ محسن کا خوف دور ہوگیا لیکن وہ کسی "بچے" کی طرح قوتِ فیصلہ سے محروم ہوگیا۔ میری ہر بات پر وہ کہتا تھا کہ گل' تم کہتی ہو تو میں مان لیتا ہوں۔ بہت سی ایسی باتیں

بھی ہوئیں جو میں بتا نہیں سکتی۔ محسن بتائے گا آپ کو۔"

میں نے اسے شرم سے لال ہوتے دیکھا اور کہا۔ "ممکن ہے اسے وہ باتیں یاد ہی نہ ہوں۔ کیا اس نے....."

"نہیں سکندر بھائی۔ وہ خوف زدہ تھے یا عدم اعتماد کا شکار تھے مگر پاگل نہیں ہوئے تھے۔ انہوں نے..... پوچھا مجھ سے..... کہ گل' میری اور تمہاری شادی تو نہیں ہوئی ہے نا؟" میں نے کہا کہ۔ "آپ کا کیا خیال ہے؟" محسن نے کہا کہ "یہاں ہوٹل کے رجسٹر میں تو یہی لکھا گیا ہوگا کہ ہم میاں بیوی ہیں لیکن مجھے معلوم ہے' یہ غلط ہے۔" میں نے کہا۔ "غلط ہے تو مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں؟" محسن نے کہا "گل' تم کو مجھ سے ڈر نہیں لگتا؟" میں نے کہا "تم کیسی باتیں کرتے ہو" محسن نے کہا "بہت رسک لیا تم نے میری خاطر گل۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا....." میں نے کہا "میں جانتی ہو آپ کو۔ آپ خود میری حفاظت کر سکتے ہیں" محسن کہنے لگا "گل! اتنا بھروسہ نہیں کرنا چاہیے کسی پر بھی۔ ہر مرد کے اندر ایک انسان ہوتا ہے اور ایک حیوان۔" میں نے کہا "آپ کے اندر کا انسان ہی تو میرا محافظ ہے جس نے اس حیوان کو قید کر رکھا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ وہ حیوان میرا کچھ بگاڑ سکے" میری باتوں کا بڑا عجیب اثر ہوا۔ محسن رونے لگا' کہنے لگا "گل! میں بہت بُرا آدمی ہوں۔ میں نے بہت پریشان کیا تھا تمہیں لیکن تم نے مجھے مرنے نہیں دیا۔ میں ضرور مرجاتا شہلا کی موت کے بعد مگر تم نے اپنی زندگی مجھے دے دی۔ اپنا سب کچھ داؤ پر لگادیا اور مجھے بچالیا۔ تم نے مجھے چھوڑا تو پھر کوئی مجھے بچانے نہیں آئے گا۔" میں نے کہا "میں آپ کو کیسے چھوڑ سکتی ہوں؟" محسن نے کہا "جیسے شہلا نے چھوڑ دیا تھا۔ تمہارا کیا بھروسہ۔ وعدہ کرو کہ مجھے اکیلا نہیں چھوڑو گی۔ ہمیشہ میرے ساتھ رہو گی۔ اب تم ہی میرا سب کچھ ہو۔ میری زندگی' میرا احساس' میری آنکھیں' میرے ہاتھ' میری طاقت' سب تم ہو" میں نے وعدہ کیا اور اس کے بعد ایک بڑی خوش گوار تبدیلی آئی۔ محسن کہنے لگا کہ اب ہم لاہور میں اپنا گھر بنائیں گے۔ ایک گھر سکندر کا اور رابعہ کا ہوگا' ایک غالب کا اور نازو کا۔ کوئی چوہدری دلاور اور کوئی استاد پیڈرو ہے تو ہوا کرے۔ ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ پھر دو دن سکون سے گزر گئے۔ جانتے بوجھتے میں نے اکرام شیخ کی بات نہیں کی اور نہ تمہارا ذکر کیا لیکن میں نے لاہور فون کرکے وکیل صاحب سے بات کی تھی اور انہیں بتادیا تھا کہ میں کراچی میں ہوں۔"

"یہ بھی بتادیا تھا کہ ہوٹل میں کیا کر رہی ہو؟"

"ہاں۔ سب بتادیا تھا اور منظر صاحب نے کہا کہ شاباش لڑکی۔ ڈٹی رہو مقابلے پر جب تک وہ انسان کا بچہ نہ بن جائے۔ آپ تو ان کی عادت جانتے ہیں۔ کہنے لگے..... اتنا کیا ہے تو ایک کام اور کرو۔"

میں نے کہا "ایسی کیا بات کہہ دی تھی اس نے؟ خاموش کیوں ہو؟"

گل نے شرما کے کہا "منہ پھٹ آدمی ہیں وہ۔ کہنے لگے اسے پکڑ کے لے جاؤ کسی قاضی کے پاس اور دو بول پڑھوا لو' وغیرہ سب مل جاتے ہیں بی بی۔ بس کسی طرح وہ قید شریعت میں آجائے پھر ساری عمر تمہارا غلام۔ بندر کی طرح نچانا سامنے ڈگڈگی تمہارے ہاتھ میں رہے گی ہمیشہ۔ اور بھی بہت سی فضول باتیں کی تھیں۔ میں کیا بتاؤں۔"

میں نے ہنس کے کہا "مجھے معلوم ہے اس نے اور کیا کہا ہوگا۔ کہا ہوگا کہ شادی کے بعد ہر سال ایک بیڑی پہناتی جانا۔"

گل نے کہا "بھائی سکندر! آپ تو مت کریں نا ایسی باتیں۔"

اس وقت شرم سے منہ چھپا کے ہنستی ہوئی وہ مجھے اتنی اچھی لگی کہ میں یہ بھول گیا کہ اس وقت میرے سامنے گل بانو نہیں ناگ منی ہے اور یہ ڈاکوؤں کا ڈیرا ہے جہاں کچھ دیر پہلے جذبات کی نوعیت بالکل مختلف تھی۔

"یہ سب تو واقعی قابلِ تعریف ہے۔ تم نے وہ کام کیا جو شاید کوئی بھی نہیں کر سکتا تھا۔" میں نے کہا "لیکن اس کے بعد یہ حماقت' اپنی پرانی زندگی کی طرف لوٹ جانے کا فیصلہ چہ معنی دارد؟"

"وہ بھی بتاتی ہوں۔ آپ ایک حادثہ سمجھ لیں اسے۔ میرے ذہن میں یہ خیال آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا" گل نے کہا "تیسرے دن میں نے ڈرتے ڈرتے محسن سے کہا کہ ہمیں سکندر اور غالب کا بھی پتا کرنا چاہیے۔ اس کی ذہنی کیفیت بڑی عجیب تھی بھائی سکندر۔ وہ سوچ میں پڑ گیا' کہنے لگا کہ "وہ کہاں ہیں؟" میں نے کہا کہ "کیا تمہیں کچھ یاد نہیں ہے؟ ہم انہیں پیچھے چھوڑ آئے تھے" محسن بولا کہ "اچھا' تم کہتی ہو تو مان لیتا ہوں۔ اب وہ کہاں ملیں گے؟" میں نے کہا "انہوں نے ہم سے کہا تھا کہ اکرام شیخ سے مل لینا ورنہ لاہور چلے جانا۔ کیا پتا وہ پہنچ چکے ہوں اور اکرام شیخ کے گھر میں منتظر ہوں۔" محسن نے کہا "اکرام شیخ کہاں رہتا ہے؟" میں نے کہا "مجھے تو نہیں معلوم۔" اس نے کہا "مجھے بھی نہیں معلوم۔ چلو ہم لاہور چلتے ہیں۔ وہاں سب مل جائیں گے" میں نے اس کی بات مان لی اور ہم چار دن بعد لاہور جانے کے لیے ٹرین میں بیٹھ گئے۔ میں نے روانہ ہونے سے پہلے منظر کو بتانے کی کوشش کی تھی مگر ان کا نمبر ہی نہیں ملا۔ ملتان سے ذرا آگے ٹرین کا کوئی حادثہ ہوا تھا۔ کوئی مال گاڑی پٹری سے اتر گئی تھی۔ اس سے ٹریفک رک گئی اور معلوم ہوا کہ صبح سے پہلے لائن کلیئر نہیں ہوگی۔ اس وقت رات کے سات بجے تھے۔ بہت سے مسافروں کی طرح میں نے بھی سوچا کہ چار پانچ گھنٹے کا سفر ہی تو رہ گیا ہے۔ دس بارہ گھنٹے ٹرین میں بیٹھ کے انتظار کرنے کی کیا ضرورت ہے' اتر کے سڑک تک جاتے ہیں اور بس پکڑ لیتے ہیں۔ جن کے پاس سامان کم تھا اور جوان تھے' وہ ٹرین سے اتر کے روانہ بھی ہو چکے تھے۔ ہمارے پاس ایک سوٹ کیس ہی تھا جو محسن نے اٹھالیا اور ہم نے ٹرین چھوڑ دی۔ ٹرین سے جی ٹی روڈ دور نہیں لگتی تھی۔ میں گاڑیوں کی لائٹس کو متحرک دیکھ رہی تھی مگر جب پیدل چلنا پڑا تو کوئی دو میل کا فاصلہ تھا اور وہ بھی کچا اور ناہموار۔ ہم شاید رات دس بجے مین روڈ پر پہنچے مگر اس وقت تک ہم سے پہلے بہت مسافر ملتان کی طرف آنے والی بسوں پر سوار ہو چکے تھے اور پھر بھی کافی سڑک کے کنارے کھڑے تھے۔ رات گیارہ بجے بالآخر ہمیں بھی ایک بس میں جگہ مل گئی۔ ویسے تو ملتان سے روانہ ہونے والی ہر بس میں تھوڑے بہت مسافر ہی جاتے تھے مگر بعد میں خبر ملتان پہنچی تو ایک کمپنی نے اسپیشل سروس چلادی۔ خالی بسیں سب کو سمیٹ کر لے گئیں۔ ہم جس بس میں تھے وہ تو آدھی خالی رہی۔ دو گھنٹے بعد اوکاڑہ سے پہلے ہی جنگل میں ڈاکوؤں نے بس کو روک لیا۔ وہ مسافر لگتے تھے مگر بس میں سوار ہوتے ہی انہوں نے ریوالور نکال لیے۔ ایک نے مسافروں کو سامنے سے کور کیا اور دوسرے نے پیچھے سے۔ تیسرے نے ڈرائیور کو مجبور کردیا کہ بس کو ایک ویران سائیڈ روڈ پر موڑ لے۔ بس کنڈکٹر نے مزاحمت کی تو اسے ڈاکوؤں نے ریوالور کا بٹ مار کے بس کے اندر ہی لٹادیا۔ مین روڈ سے ایک ڈیڑھ میل کے فاصلے پر انہوں نے باری باری سب مسافروں کو اتارا اور ایک ایک کی تلاشی لی۔ ان کا سامان کھول کے دیکھا۔ عورتوں کے زیور اتروائے۔ اس وقت تک میں نے کسی کی شکل غور سے نہیں دیکھی تھی کیونکہ انہوں نے ڈھاٹے باندھ رکھے تھے۔ جنگل میں جب انہوں نے ڈھاٹے اتارے تو مجھے وہ وقت یاد آرہا تھا جب میں اپنے بھائی شیش ناگ کے ساتھ مل کر ڈاکے ڈالتی تھی۔ ہم نے کبھی کسی بس کے نہتے مسافروں کو نہیں لوٹا تھا۔ ہمارا نشانہ وہ ہوتے تھے جن کے پاس حرام کا پیسہ جمع ہو جاتا تھا اور جو غریبوں کا خون چوس کے رئیس بن جاتے تھے۔ ہم وہ پیسہ غریبوں میں تقسیم نہیں کرتے تھے مگر ایک بات ضرور تھی۔ ہمارے لوٹنے سے انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا جو ہم سے بڑے لٹیرے تھے۔ نہ وہ غریب ہوتے تھے اور نہ ان کے گھر میں فاقہ کشی کی نوبت آتی تھی۔ نہ کسی کی بیٹی جہیز لٹ جانے کے بعد گھر بیٹھتی تھی اور نہ کوئی مالی مشکلات میں مبتلا ہو کے خودکشی کرتا تھا۔ ان کی زمینیں' کارخانے' جائدادیں اور بینک بیلنس سلامت رہتے تھے۔ اس بس کے مسافروں کی حالت دیکھ کے مجھے بہت افسوس ہو رہا تھا اور سچی بات یہ ہے بھائی سکندر کہ ایک تو آپ کو بہت یاد کیا میں نے اور ایک نازو کو۔ خود محسن بار بار کہتا رہا کہ اس وقت پستول ہوتا تو میں تینوں کو شوٹ کر دیتا اور ان کی لاشیں یہیں گاڑ کے ہم بس کو لاہور لے جاتے۔ خیر جب میری باری آئی تو میں نے محسن سے کہا کہ خاموشی سے سب ان کے حوالے کر دینا۔ خواہ مخواہ کچھ بولنے کی ضرورت بھی نہیں۔ یہ سمجھنے والے لوگ نہیں ہیں اور نہ شرمندہ ہونے والے۔ ہم نے اپنا سوٹ کیس ان کے حوالے کر دیا اور انہوں نے وہ ساری رقم نکال لی جو ہم اسپتال سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ وہ ہر مسافر کو لوٹنے کے بعد بس میں بھیج دیتے تھے جہاں ان کا ایک ساتھی موجود تھا۔ دوسرا نیچے کھڑے ہوئے مسافروں پر ریوالور تانے کھڑا تھا اور تیسرا مال جمع کرنے میں مصروف تھا۔ میں نے اسے دیکھا تو اس کی صورت مجھے دیکھی ہوئی لگی۔ میں نے ذہن پر زور دیا اور ایک دم مجھے اس کا نام بھی یاد آگیا۔ میں نے کہا "تم خلیفہ گوجر ہو نا' تم شیش ناگ کے ساتھی تھے' کمینے نامُراد۔" وہ اتنے زور سے اچھلا جیسے اسے چار سو بیس وولٹ کا کرنٹ لگ گیا ہو۔ اس نے غور سے مجھے دیکھا اور ہکلا کے بولا "کون..... تم کون ہو؟" ریوالور اس کے ہاتھ میں کانپنے لگا تھا۔ میں نے پلٹ کے دوسرے کو دیکھا اور کہا "ادھر آتو ذرا میرے سامنے۔ میں دیکھوں تیری شکل بھی سُور کا۔" اب میں کیا بتاؤں کہ گھبراہٹ سے ان کی حالت کتنی غیر تھی۔ یہ میری بہت بڑی غلطی تھی کہ میں نے ایک کو پہچانتے ہی فرض کرلیا کہ باقی بھی اسی گروہ کے لوگ ہوں گے جس کا سردار کبھی میرا بھائی تھا اور اس وقت خود میری حیثیت گروہ کے سردار سے کم نہیں تھی۔ بس میرا پارہ چڑھ گیا کہ جو کل تک میرے سامنے سر اٹھا کے بات نہیں کرتے تھے وہ آج مجھے لُوٹ رہے ہیں۔ اس کا اثر الٹا بھی ہو سکتا تھا۔ وہ گھبراہٹ اور پریشانی میں مجھے گولی بھی مار سکتے تھے۔ ڈاکو تو ڈاکو ہی ہوتے ہیں۔ وہ کسی رشتے کا لحاظ نہیں کرتے اور اب تو رشتہ بھی پرانا ہو گیا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ خلیفہ گوجر بعد میں کسی اور ڈاکو کا ساتھی بن گیا ہو۔ خیر اس وقت تو اللہ نے بچایا۔ اتنی ہمت آگئی تھی مجھ میں کہ میں خلیفہ گوجر کو چھوڑ کے دوسرے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اسے بھی میں نے پہچان لیا "کُتّے۔ کمینے۔ تو لال دین پوپٹ ہے نا؟ شیش ناگ کی ٹانگیں دباتا تھا' چلمیں بھرتا تھا اس کی" محسن مجھے روکتا ہی رہ گیا کہ "یہ تم کیا کر رہی ہو' تم تو مجھے منع کر رہی تھیں کہ ان کے منہ مت لگنا" مگر میں نے کہا "تم خاموش رہو جی۔ میں ان نمک حراموں کو جانتی ہوں جو کل تک میرے تلوے چاٹتے تھے۔" لال دین پوپٹ نے مجھے فوراً پہچان لیا "آپ..... باجی! باجی آپ۔" اس کے منہ سے بدحواسی میں اور کچھ نہ نکلا۔ میں نے ایک ہاتھ مار کے اس کا ریوالور نیچے کر دیا "باجی کے بچے..... آگے بول' نام یاد ہے میرا یا وہ بھی بھول گیا ہے۔ چلا مجھ پر گولی اگر ہمت ہے تو" بس اس کے بعد تو نقشہ ہی بدل گیا۔ خلیفہ گوجر اور لال دین پوپٹ دونوں ہی معافیاں مانگنے لگے اور پرانے واسطے دینے لگے۔ ان کا تیسرا ساتھی نیا تھا۔ اس صورتِ حال پر وہ ناخوش تھا۔ اس نے ایک ایسی بات کہہ دی کہ خلیفہ اور پوپٹ دونوں ہی اس پر چڑھ دوڑے۔ میں نہ روکتی تو شاید وہ اسے ختم کر دیتے۔"

میں نے حیرانی سے کہا "اتنی مُروت اور وضع داری ہوتی ہے ان ڈاکوؤں میں بھی۔"

"سب کا تو میں نہیں کہہ سکتی لیکن میرے بھائی شیش ناگ کا

گروہ اس کا خاندان تھا۔ اس میں وہ باپ کی جگہ تھا۔ مجھے وہی عزت و احترام حاصل تھا جو ماں کو ملتا ہے۔ وہ سب شیش ناگ کے بیٹے تھے اور وہ ان کا خیال بھی بیٹوں کی طرح رکھتا تھا۔ یہ اسی کے سلوک اور تربیت کا نتیجہ تھا کہ خلیفہ اور پوپٹ میرے سامنے ہاتھ باندھ کے کھڑے ہو گئے۔ بالکل اسی طرح جیسے پہلے ہوتے تھے۔ مسافر اس صورت حال پر خوش بھی تھے اور حیران بھی۔ یہ سب کے لیے انتہائی ناقابلِ یقین بات تھی کہ ان کے ساتھ سفر کرنے والی ایک لڑکی نے جو صورت سے بھی شریف اور معزز نظر آتی تھی، ڈاکوؤں سے ہتھیار رکھوا لیے اور پھر سب کا مال واپس کروا دیا۔ سب مسافر بس میں سوار ہو گئے تو بس پھر لاہور کے لیے روانہ ہوئی۔ میں نے مسافروں سے کہا کہ "اب آپ لوگوں کو سب کچھ واپس مل گیا ہے۔ کسی نے لاہور جا کے پولیس کو رپورٹ کرنے کی کوشش کی یا اس معاملے کو اخبار والوں تک پہنچایا تو پھر نتائج کا ذمے دار وہ خود ہو گا۔ یہ ڈاکو نہ اسے چھوڑیں گے، نہ اس کے خاندان والوں کو۔" ظاہر ہے اس کے بعد کسی کے دل میں یہ خیال تھا تو اس نے فوراً توبہ کر لی۔ تقریباً ایک گھنٹے کا سفر طے کرنے کے بعد خلیفہ اور پوپٹ نے اترنے کے لیے بس رُکوائی تو میں بھی ان کے ساتھ ہی اتر گئی۔ مجھے معلوم تھا کہ اب یہاں سے ان کا ٹھکانا قریب ہے۔ لاہور پہنچ کے کوئی پولیس چوکی پر یا بھرے بازار میں شور مچا دیتا کہ بس میں ڈاکو ہیں تو مشکل ہو جاتی۔ سب کے ساتھ ہم بھی پکڑے جاتے اور ڈاکو آسانی سے قابو میں نہیں آتے۔ خلیفہ اور پوپٹ تو خود کو اور مجھے بچانے کے لیے سارا اسلحہ پھونک دیتے اور آخری وقت تک مقابلہ کرتے۔ بلاوجہ کشت و خون سے بچنے کے لئے میں وہاں اتر گئی۔ ان کا اصرار بھی تھا کہ ڈیرے پر چلو۔ بس روانہ ہو گئی تو ہم کچے راستے پر واپس گئے۔ ایک جگہ درختوں کے پیچھے ان کی جیپ کھڑی ہوئی تھی۔ صبح کا اجالا پھوٹ رہا تھا جب میں پھر وہاں پہنچی جو میرا گھر تھا۔ میرے ذہن میں گھر کا سب سے پہلا تصور اسی جگہ کا ہے جہاں میں اپنے بھائی کے ساتھ رہتی تھی۔ گروہ کے دیگر ارکان بھی مجھے دیکھ کے بہت حیران ہوئے۔ وہاں حالات زیادہ تبدیل نہیں ہوئے تھے مگر میں بہت بدل گئی تھی۔ وہ سب مجھے یوں دیکھتے رہے جیسے میں آسمان سے اتری ہوئی مخلوق ہوں۔"

"انہوں نے محسن کے بارے میں نہیں پوچھا؟"

"پوچھا تھا۔" گل تھوڑا سا شرمائی۔

"پھر کیا بتایا تم نے؟"

"وہی جو مجھے بتانا چاہیے تھا۔ ان سب کے لیے یہ انتہائی حیرت اور خوشی کی بات تھی کہ میں شریفانہ اور باعزت زندگی گزار رہی ہوں۔ گروہ کے دو پرانے ارکان مارے جا چکے تھے۔ ان کی جگہ دو نئے بندے آ گئے تھے۔ وہ سب آٹھ آدمی تھے اور آج کل ان کا سردار طافو من موجی تھا۔ اس کا نام تو لطیف تھا مگر سب طافو کہتے تھے۔ من موجی اس لیے کہ وہ شوقین مزاج آدمی تھا۔ گاتا بہت اچھا تھا اور چمٹا بھی بہت اچھا بجاتا تھا۔ بہت موڈ میں ہوتا تو ناچنے بھی لگتا تھا۔ کبھی ہم لمبا ہاتھ مار کے آتے تھے تو رات کو جشن ہوتا تھا۔ بکرا بھونا جاتا تھا اور شراب تو سب ہی پیتے تھے میرے سوا۔ طافو من موجی رات کو سب کے بیچ میں چمٹا لے کر ماہیئے کے بول سناتا تھا اور رقص کرتا تھا۔ ایک خود فراموشی کی کیفیت میں۔ یوں کوئی اس سے لاکھ کہے کہ طافو یار رہنے دے، وہ انکار کر دیتا تھا۔ اس کا موڈ بنتا تھا چودھویں کی رات کو جب چاند نکلتا تھا۔ ایک بڑی عجیب بات یہ تھی کہ جب وہ مست ہو کر گاتا تھا اور ناچتا تھا تو اس کے آنسو بہنے لگتے تھے۔ اپنے آنسوؤں کا راز اس نے کبھی کسی کو نہیں بتایا لیکن کوئی راز ضرور تھی۔ طافو من موجی نے گروہ کی قیادت سنبھال لی۔ وہ بڑا نڈر اور سفاک بھی تھا اور میرا بھائی شیش ناگ اسے کنٹرول میں رکھتا تھا اور سمجھاتا بھی تھا کہ 'پتر لطیف' بندے کو بندہ سمجھنا چاہیے۔ ہاں وہ دیوار بن جائے تو اسے بے شک گرا دو مگر راستہ دے تو چھوڑ دو۔ تو من موجی بھی ہے اور جلاد بھی ہے اور یہ اچھی بات نہیں ہے۔" عام خیال یہی تھا کہ وہ سردار بنے گا تو سخت گیر اور ظالم ہو گا۔ بلاوجہ خون بہائے گا مگر مجھے پتا چلا کہ من موجی تو شیش ناگ کی موت کے بعد بالکل بدل گیا ہے۔ ایک اس نے گانا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ چاندنی راتوں میں اکیلا چپ چاپ اور اداس بیٹھا رہتا تھا۔ کوئی گانے کی فرمائش کرے تو گالیاں دیتا۔ لیکن اس کی جلاد صفت، خون آشام فطرت بھی بدل گئی تھی۔ وہ دوسروں کو سفاکی اور بے رحمی سے روکتا تھا اور وہی کہتا تھا جو استاد نے اسے ہمیشہ کہا تھا۔ بندے کو بندہ سمجھو۔ میں کیا بتاؤں وہ سب کس طرح میرے گرد جمع ہو گئے تھے۔ وہ دن تو جشن کی سی کیفیت میں رہی اور ہماری اتنی خاطر تواضع ہوئی کہ محسن بھی حیران ہو گیا۔ کہتا تھا "گل! یہ کیسے ڈاکو ہیں؟ ان کو دیکھ کر تو میرا بھی دل چاہتا ہے کہ ڈاکو بن جاؤں۔" ایک رات وہ لاہور سے ناچنے والیوں کو لائے تھے۔ اور معلوم ہے یہ سب کیوں ہوا تھا؟ یہ میرے واپس ملنے کی خوشی کا جشن نہیں تھا۔ جشن تھا میری شادی کا۔ ان کا کہنا تھا کہ استاد شیش ناگ ہوتا تو کیا شادی ایسے ہی ہو جاتی۔ دور دور سے مہمان آتے تحفے لے کر۔ ہم تو بس اپنا دل خوش کر رہے ہیں۔"

میں نے کہا "یہ مہمان کون ہوتے؟"

"مہمان بھی ڈاکو ہوتے۔ گرد و نواح کے۔" گل بانو ہنسی۔ "محسن تو باقاعدہ جیجا جی بن گئے تھے اور ان کی طافو من موجی سے دوستی ہو گئی تھی۔ تعارف تو میں کرا ہی چکی تھی کہ کون کیا ہے۔ محسن نے پہلے دن ہی رات کو فرمائش کر دی کہ استاد من موجی دیکھو آج چودھویں کی رات ہے۔ کوئی گانا سناؤ۔ سنا ہے تم گاتے بہت اچھا ہو اور ڈانس بھی کرتے ہو" میرا دل دھک سے رہ گیا۔ باقی سب بھی ایک دم خاموش ہو گئے۔ سب ڈرتے تھے کہ اب محسن کی مٹی پلید ہو گی۔ طافو کچھ دیر محسن کو گھورتا رہا پھر آہستہ آہستہ اس کے چہرے پر سختی کم ہونے لگی۔ اس نے پوپٹ کی طرف دیکھا اور بولا "پتر پوپٹ! تجھے معلوم ہے نا میرا چمٹا کہاں رکھا ہے" اور پوپٹ خوش ہو کے دوڑا "ابھی لایا استاد جی" اس رات پھر ہم سب نے پرانے طافو من موجی کو دیکھا۔ اسی طرح گانے کے بول سناتے ہوئے، چمٹا بجاتے ہوئے، رقص کرتے ہوئے اور روتے ہوئے اس نے میرا مان رکھ لیا تھا۔ جب وہ تھک گیا تو اس نے چمٹا محسن کو تھما دیا۔ "اب یہ ساتھ لے جانا اور پھر کبھی نہ کہنا مجھ سے گانے کے لیے۔ آج تو یہ مُردہ تیرے کہنے پر زندہ ہو گیا تھا" طافو من موجی عمر میں میرے بھائی سے بھی بڑا تھا اور گروہ کے باقی سب ارکان کی طرح مجھے باجی نہیں کہتا تھا۔"

"تمہاری باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ تمہارا اپنے قبیلے میں جو استقبال ہوا اور جس طرح انہوں نے تمہاری خانہ آبادی کا جشن کیا اس کے بعد تمہارے اندر یہ تبدیلی آئی" میں نے کہا۔

"کیسی تبدیلی؟"

"جس نے تمہیں ہم سے دور کر دیا اور تم نے اپنے ماضی سے رشتے توڑ کے یہاں رک جانے کا فیصلہ کیا۔"

گل نے نفی میں سر ہلایا "ایسی کوئی بات نہیں۔ میں اپنی خوشی سے یہاں نہیں رکی ہوئی ہوں۔ ایک مجبوری ہے۔"

"جذباتی مجبوری...؟"

"نہیں۔ میرے سب جذباتی رشتے آپ لوگوں کے ساتھ ہیں۔ میرا خیال تھا کہ تین دن بعد مجھے جانے کی اجازت مل جائے گی اور اپنی روایت کے مطابق یہ تحفے تحائف دے کر مجھے رخصت کر دیں گے لیکن تیسرے دن ایک اور بات ہوئی۔ مجھے ڈر تھا کہ یہ بات ہو گی۔ جب تک شیش ناگ زندہ تھا، اس کے گروہ میں وہی اتحاد تھا جو ایم آر ایس میں ہے۔ بس مقصد کا فرق کا ضرور ہے۔ ایم آر ایس مثبت قوت ہے اور یہ ڈاکو نہ شریف تھے اور نہ کوئی اچھا کام کرتے تھے۔ وہ سب مجرم تھے مگر ان کے درمیان برادرانہ رواداری تھی۔ میرا بھائی شیش ناگ ہر بار مالِ غنیمت تقسیم کرتا تو سب کے حصے برابر رکھتا تھا۔ سردار کی حیثیت سے وہ زیادہ لے سکتا تھا مگر اس نے کبھی نہیں لیا تھا۔ گروہ میں دو افراد شادی شدہ تھے۔ ان میں سے ایک مارا گیا تو اس کا حصہ باقاعدگی سے اس کے خاندان کو ملتا رہا۔ دراصل یہ ایک معاہدہ تھا جو انہوں نے آپس میں پہلے سے کر رکھا تھا۔ ہر ڈاکو اپنے حصے کے مالِ غنیمت کا ایک چوتھائی شیش ناگ کے حوالے کر دیتا تھا اور یہ مال سب کی امانت کے طور پر جمع ہوتا جا رہا تھا۔ ظاہر ہے ایک چوتھائی حصہ بہت ہوتا ہے مگر وہ سب اپنے مستقبل یا اپنے خاندان کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے یہ قربانی دیتے تھے۔ یہ ایک طرح کی انشورنس تھی یا پنشن اسکیم تھی جس کی بنیاد سرکاری قواعد و ضوابط پر نہیں، باہمی اعتماد پر تھی اور یہ سلسلہ بڑی کامیابی سے چل رہا تھا۔ ایک ڈاکو معذور ہو گیا تھا تو اسی جمع شدہ مال میں سے اس کو شہر میں دُکان خرید کر دی گئی تھی اور اب سنا ہے، وہ بہت بڑا بزنس مین بن گیا ہے۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ شیش ناگ یہ مال کہاں رکھتا ہے۔ مالِ غنیمت میں سونا چاندی بھی ہوتا تھا۔ ظاہر ہے اسے محفوظ رکھنا مشکل کام تھا چنانچہ اسے بیچ کر رقم حاصل کی جاتی تھی اور یہ لاکھوں کی رقم برابر بڑھتی جا رہی تھی۔ خود مجھے معلوم نہیں تھا کہ بھائی نے رقم کسی بینک میں جمع کر رکھی ہے یا کہیں دفن کر رکھی ہے۔ اب طافو من موجی کہتا ہے کہ حالات بہت خراب ہیں۔ اس علاقے میں مسلسل وارداتوں کے باعث پولیس پر پبلک اور پریس کا بہت دباؤ ہے اور پولیس والوں کا کہنا ہے کہ ہم اپنی سرگرمیاں کسی اور علاقے میں جاری رکھیں۔ یہاں ان کی نوکری کا سوال ہے۔ بڑے افسر بدل گئے ہیں اور نئے افسر خاص طور پر اسی مقصد کے لئے بھیجے گئے ہیں کہ ڈاکوؤں کے کسی گروہ کو باقی نہ رہنے دیں۔ وہ ایماندار اور فرض شناس مشہور ہیں اور یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ انہیں لامحدود اختیارات دیے گئے ہیں یعنی وہ چاہیں تو قانونی چکروں میں نہ پڑیں۔ پولیس مقابلے میں جسے چاہیں ختم کر دیں اور جسے چاہیں پکڑ کے لنگڑا لُولا یا اندھا کر دیں تاکہ پھر وہ ڈاکو کبھی نہ بن سکے۔ اس کے بعد قانونی کارروائی ہوتی رہے گی۔ ان باتوں سے ڈاکوؤں میں بڑا خوف و ہراس پھیلا ہوا ہے اور بہت عرصے بعد انہوں نے ایک بس کو لوٹنے کی کوشش کی تھی تو اسے بھی میں نے ناکام بنا دیا۔ اب ڈاکو چاہتے ہیں کہ گروہ کے ارکان ایک دوسرے کو خدا حافظ کہیں اور منتشر ہو جائیں۔ جیل جانے یا حرام موت مرنے سے بہتر ہے کہ یہ دھندا چھوڑ دیں اور جس کا جو دل چاہے کرے۔ دل چاہے تو ڈاکے ڈالے یا کسی دوسرے گروہ میں شامل ہو جائے مگر ایک بار الگ ہو جانے کے بعد ان کا آپس میں کوئی رابطہ نہیں ہو گا۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ ایک کو پولیس پکڑے تو باقی سب لوگوں کے بارے میں کچھ نہ اگلوا سکے۔ طافو من موجی نے مجھ سے کہا کہ وہ سب رقم جو شیش ناگ کے پاس تھی، دس پندرہ لاکھ کے درمیان ہونی چاہیے۔ اس کی موت کے بعد کسی کو اس میں سے کچھ نہیں ملا۔ برابر تقسیم کی جائے تو ہر ایک کو دو دو لاکھ مل جائیں گے۔ کچھ اور بھی جمع کر لیا ہے سب نے۔ امید ہے جو عقل سے کام لے گا اس کو پریشانی نہیں ہو گی۔" میں نے کہا کہ میں تو اپنا حصہ چھوڑتی ہوں۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں رہی۔ اس نے کہا کہ تمہاری مرضی مگر وہ رقم ہے کہاں؟" میں نے کہا "یہ تو مجھے نہیں معلوم" طافو نے میری بات کا یقین نہیں کیا۔ اس نے کہا "تم شیش ناگ کی بہن تھیں۔ گروہ میں اس کے بعد تمہاری حیثیت تھی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تمہیں پتا نہ ہو۔" اس مسئلے پر طافو سے میری متعدد بار گفتگو ہوئی۔ میں نے اسے سمجھایا کہ رقم کسی بینک میں ہو گی تو اسے حاصل کرنا بہت مشکل ہو گا۔ بینک والے قانونی وارثوں کے علاوہ کسی کو حقدار تسلیم نہیں کرتے اور اس کے لیے وراثت کا سرٹیفکیٹ عدالت

دیتی ہے۔" طافو نے کہا کہ ہر صورت میں یہ تمہاری ذمے داری ہے۔ تم شیش ناگ کی حقیقی بہن ہو' اس کی واحد وارث ہو۔ عدالت میں جانا ہے تو جاؤ۔ خود کو حقدار ثابت کرو اور پھر ہمارا حق ہمیں ادا کرو۔" میں نے کہا کہ تم پاگل ہوگئے ہو کیا؟ عدالت میں ثبوت گواہ پیش کرنے پڑتے ہیں۔ میں کس بنیاد پر اس رقم کا دعویٰ کروں کہ میرے ڈاکو بھائی کی جمع پونجی میرے حوالے کی جائے۔ میں تو خود گرفتار کرلی جاؤں گی۔" طافو نے کہا کہ شیش ناگ بے وقوف نہیں تھا کہ رقم بینک میں رکھتا۔ اسے معلوم ہوگا کہ کسی دن اچانک کوئی گولی اس کے نام کی آگئی تو بینک کا سارا کھاتا دھرا رہ جائے گا۔ کوئی اور چیک نہیں کاٹ سکے گا اور نہ رقم حاصل کرسکے گا۔ اس نے وہ نقد رقم کہیں محفوظ مقام پر جمع کی تھی۔ اس مدفون خزانے کے بارے میں وہ خود جانتا تھا لیکن اس نے تمہیں بھی ضرور بتایا ہوگا تاکہ اچانک اسے کچھ ہوجائے تو دوسروں کی امانت کو کچھ نہ ہو۔" میں نے ہر طرح سے اس کو یقین دلایا مگر وہ نہیں مانتا اور میں بتاچکی ہوں کہ وہ بڑا سفاک آدمی ہے۔ اب وہ مجھے کھلی دھمکی دے رہا ہے کہ ایسے کام نہیں چلے گا گل بانو۔ تم تو بن گئی ہو شریف زادی مگر ہمیں بھی تو جینے کا حق ہے۔ ہم بھی شریفانہ زندگی گزارنے پر مجبور ہوگئے ہیں تو تم چاہتی ہو کہ ہمارا حق بھی نہ ملے اور ہم پولیس مقابلوں میں مارے جائیں۔" اب صورتِ حال یہ ہے کہ میں اور محسن یہاں قید ہیں۔ طافو من موجی نے مجھے ایک ہفتے کی مہلت دی تھی۔ اس کے بعد کیا ہوگا' اس کا اندازہ تم خود کرسکتی ہو" اس نے مجھے بتادیا تھا۔"

میں گل بانو کی بات سمجھ چکا تھا اور اس کی مجبوری کا عذراب میرے لیے باعثِ تشویش ہورہا تھا "اگر یہ بات تھی تو تم نے ہمیں پیغام کیوں نہیں بھیجا؟ ہم کسی طرح بھی چودہ پندرہ لاکھ کی رقم فراہم کردیتے۔"

"مجھے اس کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔"

"تم منظر کو فون کرسکتی تھیں" میں نے کہا "خود اس سے مل کے اسے ساری بات بتاسکتی تھیں۔"

"میں نے طافو سے کہا تھا کہ مجھے وکیل سے بات کرنے دو۔ اگر رقم کسی بینک میں ہے تو کس بینک میں ہے اور کیسے حاصل کی جاسکتی ہے۔ یہ مسئلہ کسی وکیل کی مدد کے بغیر حل نہیں ہوگا لیکن وکیل کے نام سے طافو ڈرتا ہے۔ اسے ویسے بھی یقین ہے کہ رقم بینک میں نہیں ہوسکتی۔ وہ پیسہ کہیں موجود ہے اور اس جگہ کی نشاندہی میں ہی کرسکتی ہوں۔ بہت چالاکی سے کام لیتے ہوئے میں نے طافو سے کہا کہ تمہیں پیسہ چاہیے تو پیسہ مل جائے گا' خواہ کہیں سے بھی ملے۔ میرے شوہر کے بڑے بھائی صنعت کار ہیں لیکن بھائیوں کے تعلقات کشیدہ ہیں۔ یہ ہوسکتا ہے کہ وہ محسن کے کسی دوست کو بلوادیں جو یہ رقم فراہم کردے۔ میں نے اور محسن نے مل کے یہ ... ائی اور چوہدری دلاور کے ... پھر ایک دن استاد پیڈرو کو اغوا کرلیا گیا۔ میرا پروگرام تھا کہ چوہدری دلاور سے استاد پیڈرو کی رہائی کا معاوضہ پندرہ لاکھ طلب کیا ہے مگر استاد پیڈرو نے کچھ اور ہی کہانی سنائی۔ اس نے بتایا کہ اس اور چوہدری دلاور کے درمیان شدید قسم کے اختلافات ہیں ... ایک ... نہیں دے گا۔ ممکن ہے ایک لاکھ دے اور کہے کہ ... کو مار کے کہیں دفن کردو تو میری طرف سے انعام۔ استاد پیڈرو ہی تمہارے بارے میں اطلاع فراہم کی کہ تم آج کل کہاں ہو۔ محسن کے ساتھ یہ ڈاکو اکبر خان کے گھر کا محاصرہ کرچکے تھے ... وہاں کیکر شاہ کے مرید حملہ آور ہوئے۔ باقی تم جانتے ہو۔"

"وہ.....وہ محسن ہی تھا نا؟"

گل مسکرائی "ہاں۔ اس نے مجھے بتایا ہے کہ تمہاری ... کیا بات ہوئی تھی۔"

"غالب اور نازو کیسے فرار ہوگئے؟"

"انہیں محسن نے موقع فراہم کیا تھا۔ اس نے کہا کہ ... کچرے کو اٹھالائے ہو۔ ان کو دفع کرو۔ ڈاکوؤں نے انہیں راستے میں ہی اتار دیا۔ وہ لاہور پہنچ چکے ہوں گے۔"

"کیا محسن نے انہیں کچھ بتایا تھا؟"

"محسن نے ایک رقعہ انہیں تھمادیا تھا۔ اس میں مختصراً ... لکھ دیا تھا اور مجھے امید ہے اب باقی معاملات کو غالب اور منظر کے سنبھال لیں گے" گل نے کہا "وہ قانونی کارروائی کریں گے ... پیسہ فراہم کریں گے....."

"ہمیں کیوں اٹھوایا تھا تم نے؟"

"مقصد یہ نہیں تھا کہ تمہیں اٹھایا جائے۔ محسن تم سے ... اور تمہیں سارے حالات بتادیتا لیکن اکبر خان کی کوٹھی میں ... ہونے سے پہلے ہی کیکروں سے واسطہ پڑگیا۔ طافو کو ہم نے کہا تھا کہ ہمارے دوست سکندر تمہارا مسئلہ حل کردیں گے۔"

"مسئلہ حل کرنے کے لیے غالب اور نازو بھی ساتھ ہوتے تو اچھا تھا" میں نے کہا "خیر۔ ایک سے دو بھلے۔ ہم چاروں ... نمٹ لیں گے من موجی سے بھی۔"

"وہ بہت خطرناک آدمی ہے۔"

"ہم کیا کم خطرناک ہیں" میں نے کہا "ہر آدمی کی فطرت کے دونوں پہلو ہوتے ہیں۔ وہ من موجی بھی ہوتا ہے اور ... بھی۔ طافو من موجی کی اچھائی تم نے دیکھ لی' اب دوسرا پہلو سامنے آیا ہے تو ہم بھی سامنے آئے ہیں۔"

ایک دھماکے سے دروازہ کھلا اور دروازے پر ... والا اندر آگیا "اچھا ہوا جو تم سامنے آگئے۔" میں نے ... ہے ناگ منی۔ مجھے تو پہلے ہی شک تھا کہ تم نے نام بدلا ... تمہاری فطرت بھی بدل گئی ہوگی....."

اس خونخوار شخص کے ہاتھ میں وہی مشین ... تھی جو ... خان کی کوٹھی کی چھت پر لیے بیٹھا تھا۔

اس کے عقب میں استاد پیڈرو کا مکروہ چہرہ تھا اور اس ... وہی پرانی پُرخباثت مسکراہٹ تھی۔

طافو من موجی چالیس سال کا یا اس سے بھی زیادہ عمر کا ہوگا مگر سختی حالات نے اس کی صورت کے نقوش سے نرمی چھین لی تھی اور اس کے جسم کو پتھر کی طرح سخت کردیا تھا۔ شاید اس من موجی کو بھی پتھر کی طرح کردیا تھا جو ماہیے کے بولوں میں رچے بسے ہوئے معصوم محبت کے گداز سے بھرپور گیت گاتا تھا تو خود اپنی ہی آواز کے سوز میں ڈوب جاتا تھا اور جذبات کی لے پر رقص کرتے ہوئے اس کی روح کا تمام کرب آنکھوں سے اشک بن کر بہہ نکلتا تھا۔ یہ کرب کیا تھا' اس کی حقیقت کو کبھی کوئی نہ جان سکا تھا۔ ڈاکوؤں کے ایک گروہ کی قیادت سنبھالنے کے بعد اس نے کوشش کی تھی کہ طافو کے اندر خوابیدہ من موجی کو قتل کردے لیکن من موجی بڑا سخت جان ثابت ہوا تھا۔ وہ زندہ رہا تھا اور نادانستگی میں محسن نے اسے پکارا تھا تو وہ اپنے مدفن سے اُٹھ کے باہر آگیا تھا۔ مجھے یقین ہے اور یہ میرا ایمان ہے کہ دنیا کے بدترین مجرم کے وجود میں بھی ایک معصوم فرشتہ اور ایک محبت سے بھرپور دل رکھنے والا من موجی ہر حال میں زندہ رہتا ہے۔ وہ دب جاتا ہے' چھُپ جاتا ہے یا مغلوب ہوجاتا ہے مگر مرتا کبھی نہیں۔

طافو ایک پیشہ ور ڈاکو تھا اور مشہور تھا کہ وہ سفاک اور بے رحم ہے۔ شاید خون آشامی اور درندگی اس کی فطرت کے بنیادی عوامل نہیں تھے مگر بعد میں دنیا کے تجربات اور حوادث نے اس کی شخصیت کو یوں مسخ کرکے قابلِ نفرت بنادیا تھا۔ جیسے غلاظت کے چھینٹے کسی تصویر کے ہر رنگ پر غالب آکے حُسن کو بدصورتی کے احساس میں بدل دیں۔ نہ کسی کو ضرورت تھی اور نہ یہ فرصت کہ حالات کی گرد کے نیچے دب جانے والے' زندگی کے اصل رنگوں کی خوب صورتی کو دیکھے کیونکہ طافو اب صرف ایک ڈاکو تھا۔

میں اور گل اپنی باتوں میں اتنے محو ہوگئے تھے کہ ہمیں نہ وقت کے گزرنے کا احساس رہا تھا نہ یہ خیال کہ کوئی چھپ کے ہماری باتیں سُن رہا ہوگا۔ دروازہ بھی پوری طرح بند نہیں تھا۔ طافو نہ جانے کب سے باہر کان لگائے کھڑا تھا مگر ہمیں معلوم نہ تھا۔ باہر اجالا دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ سورج طلوع ہوئے ایک گھنٹا تو ہوگیا ہے۔

طافو سخت مشتعل نظر آتا تھا۔ اس کے چہرے کی لکیریں گہری ہوگئی تھیں اور وہ اپنی لال آنکھوں سے مجھے پلک جھپکائے بغیر گھور رہا تھا۔ اس کے برعکس پیڈرو خوش اور مطمئن نظر آتا تھا۔ اس نے جب مجھے غالب سے ملوایا تھا تو اس جنگ میں پہلی اخلاقی فتح حاصل کی تھی پھر اپنی مظلوم اور حالات کی گردش سے پامال ہوجانے والی زندگی کی کہانی سُنا کے اس نے مزید اخلاقی ہمدردی حاصل کرلی تھی اور اسے اپنا بدترین دشمن سمجھنے کے باوجود میں مجبور ہوگیا تھا کہ اسے شک کا فائدہ دیتے ہوئے اسی طرح چھوڑ دیا جائے کہ جیسے عدالت کسی قتل کے مجرم کو ضمانت پر رہا کرتی ہے۔

گل نے اسے ہمارا پتا معلوم کرنے کے لیے اٹھوایا تھا اور اس نے ہمارے بارے میں صحیح اطلاع فراہم کرکے گُل کی حمایت بھی حاصل کرلی تھی۔ اخلاقی طور پر ہمارے دیرینہ جذبۂ عداوت کے خلاف جنگ میں یہ اس کی تیسری فتح تھی اور اس حقیقت کو تسلیم کیے بنا چارہ نہ تھا کہ ایم آر ایس کی منتشر ہوجانے والی قوت کو پھر سے یکجا کرنے والا وہی شکاری تھا جس کے خلاف ایم آر ایس نے روزِ اوّل سے اعلان جہاد کر رکھا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے شرکی تمام قوتوں کے خلاف انبیاء و اولیاء سے آج تک نیکی کے تمام علمبرداروں نے اپنی جنگ کو ایک مقدس فریضہ سمجھتے ہوئے مسلسل جاری رکھا۔

یہ قدرت کی ایک اور ستم ظریفی تھی کہ جس شکاری کو ہم نے مادی وسائل میں برتری کے باوجود ہر محاذ پر شکست کی ذلت سے دوچار کیا تھا' وہی آج احسانات اور خیرسگالی کے جذبات سے ہمارے خلاف مسلسل اخلاقی فتوحات حاصل کررہا تھا۔ ماضی کے حقائق کتنے ہی تلخ سہی اور یادوں کے مندمل ہوجانے والے زخموں کے نشان کتنے ہی بدنما سہی۔ بظاہر حالات خود ہمارے لیے حوصلہ شکن تھے اور پیڈرو کے خلاف عداوت و انتقام کے جذبات کو اسی شدت کے ساتھ زندہ رکھنا مشکل سے مشکل تر ہوتا جارہا تھا۔ پہلے اس نے مجھے اور رابعہ کو خاصی مشکلات پر قابو پاکے اور بظاہر خطرات مول لے کر ملوایا تھا۔ ایسے وقت میں جب ہم اپنی کوشش میں ناکام ہوکے ملاقات کی اُمید کو تقدیر کے رحم و کرم پر چھوڑ چکے تھے' اس نے ہمیں گل اور محسن تک پہنچانے میں بھی بھرپور معاونت کی تھی اور یہ ماننا پڑتا تھا کہ اس کی مدد کے بغیر یہ ملاقات بھی اس وقت تک ممکن نہ ہوتی جب تک تقدیر اس کے لیے سازگار حالات فراہم نہ کرتی۔ ایسی صورت میں یہ سوچنا بھی عجیب لگتا تھا کہ ہم سب مل کے پھر اس شخص کے خلاف متحد ہوجائیں اور اس کو عبرتناک سزائے موت دینا اپنے لیے مقصدِ حیات بنائیں جس نے ہم سب بچھڑے ہوئے ریگستانِ حیات کو اپنی کوشش سے یکجا کیا تھا۔ اس کے پس پردہ عوامل کچھ بھی ہوں' ممکن ہے اس طرح وہ اپنی مجرمانہ غلطیوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتا ہو۔ ممکن ہے وہ سزا کے ناقابلِ تنسیخ فیصلے میں رعایت کی اُمید رکھتا ہو' ممکن ہے وہ ہمارے جذبات کا رخ ایک مشترکہ دشمن چوہدری دلاور کی طرف موڑنا چاہتا ہو اور یہ بھی اب بعید از امکان نہیں رہا تھا کہ وہ ہماری بنیادی غلط فہمی رفع کرنا چاہتا ہو کہ وزیر خان کا قاتل وہ کبھی نہ تھا مگر اصل قاتلوں نے واقعاتی شہادت کو موڑ کے اس پر قاتل کا لیبل لگادیا تھا۔ وجہ کچھ بھی ہو' قانون کی نظر میں وہ مجرم بھی رعایت کا مستحق ہوجاتا ہے جو اعتراف کرنے کے بعد قانون کی معاونت کرے اور صلے میں اس کی سزا معاف ہوجائے۔ موجودہ حالات اور درپیش حقائق کو دیکھتے ہوئے رابعہ' نازو یا گُل' غالب اور محسن میں سے کوئی بھی مجھ سے اتفاق نہ کرتا کہ استاد پیڈرو اپنے تمام جرائم کی سنگینی کے باوجود کسی رعایت کا استحقاق نہیں رکھتا۔ اس کا مقصد

کچھ بھی ہو' کیا اس نے ہمیں اس لیے آپس میں ملوایا تھا کہ ہم ایک فائرنگ اسکواڈ بن کے اسے ہدف پر رکھ لیں اور کیا ہم ایسا کرسکتے ہیں؟

اس وقت میرے سامنے وہی شخص تھا جس کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ میرے والد وزیر خان کو ایک پُر اذیت' پُر عذاب موت دینے والا وہی تھا۔ یہی نہیں' پس از مرگ اپنے ابدی مدفن سے محروم کرکے ان کی ہڈیوں کو کسی گمنام گڑھے میں دبانے کا گھناؤنا جرم بھی اسی سے منسوب تھا۔ آج تک میری دلی آرزو تھی کہ میں اس سے بدترین انتقام لوں اور اسے ایک عبرتناک موت کے رسوا کُن انجام تک پہنچا دوں لیکن اب میرے یقین کی ٹھوس چٹان میں شک کی دراڑیں پڑ رہی تھیں۔ میں خود سے یہ سوال کرنے لگا تھا کہ کیا میرے یقین کو بنیاد فراہم کرنے والے حقائق وہی تھے' ویسے ہی تھے جیسے کسی ثبوت کی عدم موجودگی میں مجھے نظر آئے تھے اور محسوس ہوئے تھے یا شاید اب میرے جذبات کی نوعیت بدلنے لگی تھی۔ میں یہ بھی سوچنے لگا تھا کہ انتقام لینے والا زیادہ بہادر ہوتا ہے یا عفو و درگزر سے کام لینے والا اور فیصلے کو عرصۂ محشر کی عدالت انصاف پر چھوڑ دینے والا؟

پیڈرو کی مسکراہٹ سے بھی کچھ پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ ہماری بے بسی پر مسکرا رہا ہے یا اپنی کامیابی پر۔ گُل نے اسے ایک مجرم کی حیثیت سے طلب کیا تھا اور شاید اس کا خیال ہوگا کہ وہ پیڈرو سے تشدد کے ذریعے معلومات حاصل کرے گی مگر خلافِ توقع پیڈرو نے اسے بتایا کہ وہ اب دشمن نہیں' دوست ہے۔ اس نے سکندر' غالب' رابعہ اور نازو کو ہزار خطرات مول لے کر ملوایا اور وہ گُل اور محسن کو بھی وہاں پہنچا سکتا ہے جہاں ان کے باقی چار یار انہی کی طرح منتظر ہیں کہ دستِ قدرت راہ نما ہو تو بچھڑے ہوئے پھر مل جائیں۔ اچھا ہوا جو گُل نے خود پیڈرو کو بلوا لیا ورنہ سب ایک دوسرے کو ڈھونڈتے رہ جاتے۔ پھر اس نے گُل اور محسن کو ملاقات کی راہ میں حائل سب دشواریوں سے آگاہ کیا ہوگا اور ان کا اعتماد حاصل کرنے کے بعد حصول مقصد میں ہر قدم پر ان کی راہنمائی کی ہوگی۔ محسن اور گُل اس کے کتنے ممنون ہوں گے۔

گُل اچانک طافو کے آجانے سے تھوڑی سی نروس ہوگئی تھی۔ پھر شاید اسے خیال آیا کہ یہاں اس کی حیثیت کیا ہے۔ وہ نہ مجرم تھی اور نہ قیدی۔ وہ اس قبیلے کے سردار کی بہن تھی اور قبیلہ اس کے لیے آج بھی وہی جذبات رکھتا تھا جو پہلے۔

اس نے طافو کی بات میں چھپی ہوئی دھمکی کو نظر انداز کردیا۔ "یہ کوئی اچھی حرکت نہیں کہ تم نے طافو... چھپ کے باتیں سُننا......"

"ہم اچھے لوگ نہیں ہیں ناگ منی۔" طافو نے اس کی بات کاٹ دی۔ "ہم آج بھی بُرے ہیں کل کی طرح۔ بس تم اچھی بن گئی ہو ان اچھے لوگوں میں رہ کے۔"

میں آگے بڑھا۔ "مجھے یقین ہے کہ تم ہی طافو من موجی ہو۔"

اس نے ایک قدم پیچھے ہٹا لیا۔ "سب تو بتا دیا ہے تمہیں ناگ منی نے' شک کی اب کون سی بات رہ گئی ہے؟"

میں نے کہا۔ "پھر بھی ہم ملے تو نہیں تھے۔ تم نے میری صورت دیکھی ہوگی۔ میں نے تو پہلی بار دیکھا ہے تمہیں۔"

گُل نے کہا۔ "آخر اس طرح بندوق لے کر اندر آنے کا کیا مطلب ہے طافو؟ تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے کیا؟"

"ہاں۔ ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے۔" طافو نے بڑا کر کہا۔

"اور تمہارا خیال ہے کہ وہ حد آگئی ہے؟" میں نے کہا۔

"تم مت بولو بیچ میں۔" طافو نے بندوق کا رخ میری طرف کردیا۔

میں مطمئن اور پُرسکون کھڑا رہا۔ "ورنہ تم گولی مار دو گے مجھے......؟"

گُل نے نفرت سے کہا۔ "بڑی اچھی روایت قائم کر رہے ہو طافو! نمک حرامی کی۔ شیش ناگ جسے تم اپنا باپ کہتے تھے۔"

"شیش ناگ مرچکا ہے۔"

"اور اس کے بعد تم شیش ناگ کے جانشین بنے ہو اس لیے کہ اس کے سارے خاندان کو ختم کردو۔ کیا میں' تم اور ... سب ایک خاندان نہیں سمجھتے تھے خود کو؟ آج وہ سب رشتے بے معنی ہوگئے ہیں تمہارے لیے؟ تمہارے جذبات بدل گئے ہیں" ناگ منی پھنکارتے ہوئے بولی۔

"سب کچھ بدل گیا ہے ناگ منی۔ بھول جا پُرانی باتیں۔ سارے رشتے ضرورت کے رشتے تھے۔ آج تیری ضرورت بدل گئی ہے مگر ہماری ضرورت وہی ہے۔ ہم کیا کریں؟" طافو نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

میں نے کہا۔ "تم صرف اپنی بات کررہے ہو یا سب کے ترجمان بن کر آئے ہو؟"

گُل نے نفرت سے کہا۔ "باقی سب آج بھی میرے اشارے پر تمہاری تکا بوٹی کردیں گے طافو۔"

طافو حقارت سے مسکرایا۔ "باقی سب تیرے سگے نہیں ناگ منی۔ نہ پہلے تھے۔ کُتّے کو ہڈی نہ ملے تو وہ بھی مالک کی ... لے۔ وہ پیسہ ہی تھا جس نے شیش ناگ کے خاندان کو مجبور زنجیر میں باندھ رکھا تھا اور کچھ نہیں... اور وہ کوئی خیرات نہیں تھا کسی کو۔ خود کما کے ان کے پیٹ نہیں بھرتا تھا۔ یہ سب طاقت تھے۔ اپنی اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کے جاتے تھے اور ڈال کے جو مال لاتے تھے وہ ان کا حق تھا' زورِ بازو کی کمائی۔ اسی میں سے ہم سب نے تھوڑا تھوڑا شیش ناگ کے پاس رکھا تھا۔ وہ سردار تھا' ہم اعتماد کرتے تھے اس پر۔ ہمیں یقین تھا کہ بُرا وقت آیا یا ضرورت پڑی تو ہمارا جمع کیا ہوا مال ہمیں مل جائے گا۔ تو دھوکا دے رہی ہے ہم سب کے اعتماد کو۔ کیا بُرائی کی تھی آخر ہم نے شیش ناگ کے ساتھ یا تیرے ساتھ؟ بول' کیوں ہمارا حق غصب کرنا چاہتی ہے تو؟"

"ہمیں کیسے بتاؤں کہ وہ سب میرے پاس نہیں۔"

"مجھے کچھ مت بتا۔ میں سب کو جمع کرلیتا ہوں۔ انہیں بتا کے دیکھ۔ کیا وہ مانیں گے تیری بات؟" طافو نے کہا۔ "کبھی نہیں۔ ان کا پتہ ہنگام کرے گی تو وہ سب رشتے بھول جائیں گے ناگ منی۔ یہ سب جنھوں نے تجھے اور تیرے گھر والے کو اتنی عزت دی' اتنی خاطر مدارات کی۔ یہی تیری جان کے دشمن ہو جائیں گے۔ اسی لیے میں سمجھا رہا ہوں تجھے کہ بات بگڑنے سے پہلے اپنی جان اور اپنا سہاگ بچا کے چلی جا یہاں سے۔"

"کیا خطرہ ہے میری جان کو؟ کس کی ہمت ہے کہ میرے سہاگ کو اُجاڑے؟" گُل نے چیخ کے کہا۔ "بلا لے سب کو طافو۔ میں چاہتی ہوں' آج یہ فیصلہ بھی ہو جائے۔"

"وہ تیرا ساتھ نہیں دیں گے ناگ منی۔ آزما لے۔"

"ہاں میں آزمانا چاہتی ہوں۔ یہ دیکھنا چاہتی ہوں کہ وہ انسان ہیں یا کُتّے۔"

طافو نے افسوس سے سر ہلایا۔ "ڈاکو ہیں وہ ناگ منی۔ تو شریف زادی بن گئی ہے مگر ان کی زندگی تو وہی ہے۔ کُتّے کی زندگی۔ وہ اس مالک کے وفادار رہتے ہیں جو انہیں کھانے کو دے۔ اسی کے پیچھے دُم ہلاتے ہیں جو مالک ہو' اسی سے ڈرتے ہیں جو طاقتور ہو۔"

پیڈرو ابھی تک پیچھے کھڑا ہوا تھا اور بظاہر اس کا رویہ قطعی بے نیازی کا تھا۔ وہ اس صورتِ حال سے لاتعلق نظر آتا تھا اور یہ واضح کرنا چاہتا تھا کہ تم جانو' تمہارا کام۔ نہ میں کسی کا دوست نہ دشمن۔ ویسے جس کا جو دل چاہے سمجھے۔

اچانک اس نے پیچھے سے طافو کی بندوق پر ہاتھ ڈال دیا۔ "چھوڑو یار! کس بحث میں پڑ گئے۔"

طافو کی بندوق کا رخ نیچے ہوگیا۔ "تمہاری تو......"

پیڈرو نے گالی کو نظر انداز کردیا۔ "کوئی بہت بڑی بات نہیں ہے۔ دس پندرہ لاکھ کا معاملہ ہے نا۔"

"تم دو گے یا تمہارا باپ دے گا...؟" طافو بگڑ کر بولا۔

"کوئی بھی دے سکتا ہے۔ باپ' چچا' تایا۔ اس کے لیے بندوق یا گولی کی زبان میں بات کرنا ضروری نہیں۔" پیڈرو مشتعل ہوئے بغیر بولا۔ "میں نے بتایا تھا تمہیں کہ سیٹھ سکندر کوئی معمولی آدمی نہیں ہیں۔ تم جتنے کہو گے مل جائیں گے مگر ایسے نہیں۔"

پیڈرو کی حرکت نے پھر مجھے ششدر کردیا تھا۔ "ہاں' ایسے تم کو کچھ نہیں ملے گا طافو۔ سوائے عبرت ناک سزا کے۔ تم یہ سمجھ لو کہ میں پُرانے شیش ناگ کا نیا روپ ہوں۔ مجھ سے بغاوت کی ہمت ہے جس میں وہ مقابلہ کرکے دیکھ لے۔ ایسے کھلونوں سے ڈرنے والا نہیں ہوں میں طافو۔"

طافو خفت سے مسکرایا۔ "جب تک اس کھلونے کا رخ تمہاری طرف تھا' تمہاری آواز بھی نہیں نکل تھی۔ اب اچانک تم بہادر بن گئے ہو۔"

یہ ایک چیلنج تھا مگر میں غصے کو پی گیا۔ "وقت آنے پر اس کا فیصلہ بھی ہو جائے گا طافو۔ تم اس اسلحے کے ساتھ آجانا' میں خالی ہاتھ تم سے لڑوں گا مگر اس شرط پر کہ ہارنے والا رعایت نہیں مانگے گا اور نہ معافی۔"

"مجھے منظور ہے۔" اس نے طنزیہ' تلخ لہجے میں کہا۔ "کل معلوم ہو جائے گا کہ تم شیش ناگ کا نیا روپ ہو یا اس کی کینچلی بدل لینے والی بہن کے کمزور سہارے پر اکڑنے والے کینچوے۔ طافو من موجی کی طاقت کا بھی غلط اندازہ کیا تو نے ناگ منی اور اس کی شرافت کا بھی۔"

وہ ایک دم ہنسا اور دروازے سے نکل گیا۔ اس کی بات ایک ایسی گالی تھی جسے برداشت کرنا آسان نہیں تھا۔ میں اس کے پیچھے لپکا ہی تھا کہ گُل نے میرا بازو پکڑ لیا۔

"چھوڑو... جانے دو اسے بھائی سکندر۔"

استاد پیڈرو معنی خیز انداز میں مسکرا رہا تھا۔ "ویسے بھی وہ ہاتھ آنے والا نہیں ہے۔ زخمی سانپ بِل میں گھُس گیا ہے۔"

"میں اسے بھی باہر نکال سکتا ہوں۔" میں نے گُل سے بازو چھڑایا اور باہر نکل کے دیکھا مگر طافو کہیں نہ تھا۔

میں ایک برآمدے میں کھڑا تھا جو انگریزی کے حرف ایل کی شکل میں دائیں جانب بھی پھیلا ہوا تھا۔ ہر بازو میں دو ہی کمرے نظر آرہے تھے اور اس کی ساخت بڑے ڈاک بنگلوں جیسی تھی۔ دیواروں کی خستہ حالی کہتی تھی کہ عمارت کا ذاتی وارث اور دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں رہا۔ شاید کسی نئے ریسٹ ہاؤس کی تعمیر کے بعد رفتہ رفتہ پُرانے ڈاک بنگلے کو بھوت بنگلا مشہور کردیا ہوگا۔ ناجائز قابضین عموماً پرانے مجرم ہوتے ہیں جو اپنی لاقانونیت کی سلطنت میں کہیں اپنا دارالخلافہ بھی رکھتے ہیں۔ کوئی ایسا ٹھکانہ جہاں عام آدمی کا گزر نہ ہو اور جسے وہ پناہ گاہ کے طور پر استعمال کرسکیں' گودام بنالیں یا سب کے رہنے اور آرام کرنے کی جگہ۔ اب یہاں شیش ناگ ڈاکو کے گروہ کا ڈیرا تھا اور گُل کی بات سے اندازہ ہوتا تھا کہ ایک مدت سے انہوں نے اپنا ٹھکانہ نہیں بدلا تھا۔

اونچی پختہ چھت والے کمروں کے سامنے نیچی کھپریل کی چھت کا برآمدہ تھا اور اس کو سہارا دینے والے لکڑی کے سال خوردہ شہتیر بے رنگ ہوچکے تھے مگر ان کی مضبوطی میں فرق نہیں آیا تھا۔ برآمدے کی دیوار کے ساتھ ساتھ پرانی اینٹوں کی سیڑھیاں نیچے اُترتی تھیں۔ چار کمروں پر مشتمل ڈاک بنگلے کی عمارت کے گرد پہلے اینٹوں کی چار دیواری ہوگی جو اب آثارِ قدیمہ کی طرح ختم ہو رہی تھی۔ شاید ضرورت مند اس کی اینٹوں کو اکھاڑ کرلے جارہے تھے

اور یہ عمل ہنوز جاری تھا۔ پھاٹک کی جگہ ایک خلا رہ گیا تھا لیکن اس کی نشاندہی وہ ستون کرتے تھے جن پر پہلے گیٹ نصب ہوں گے۔ احاطے کے وسط میں اگر باغ یا لان تھا تو اب صرف اس کا تصور کیا جا سکتا تھا۔ لان میں خشک گھاس اور خودرو پودوں کی بہتات تھی اور ان پر گھنے درخت سایہ فگن تھے۔ ان درختوں نے کافی حد تک ڈاک بنگلے کی عمارت کو چھپا لیا تھا۔

گل نے میرے پیچھے آ کے کہا۔ "وہ باہر نکل گیا ہوگا۔"

میں نے گرد و پیش پر نظر ڈالی۔ "یہ کیا جگہ ہے گل؟ میرا مطلب ہے ہم کہاں ہیں اس وقت؟"

"لاہور یہاں سے چالیس میل ہے۔" گل نے کہا۔ "یہ محکمۂ انہار کا پرانا ڈاک بنگلا ہے۔ قریب ترین گاؤں بھی یہاں سے ایک میل دور تھا۔"

"تھا... یعنی اب نہیں ہے؟"

"نہیں۔ اس گاؤں کے لوگ خوف سے گھر چھوڑ گئے تھے۔"

"خوف کس کا تھا؟ شیش ناگ کا؟"

گل مسکرائی۔ "نہیں۔ ڈاک بنگلے میں بھوت تھے جو رات کو جنگل میں گھومتے تھے' گاؤں میں پہنچ جاتے تھے۔"

میں نے سرہلایا۔ "وہ بھوت رات کے وقت اکیلے مسافروں کو ڈراتے ہوں گے' دن میں اکا دکا نظر آنے والی جوان عورت کو اٹھا لیتے ہوں گے' بھیڑ بکریاں غائب کر دیتے ہوں گے۔ مجھے پہلے ہی اندازہ تھا کہ تمہارے بھائی نے یہ ٹھکانہ کیسے حاصل کیا ہوگا۔ اب یہاں کتنے لوگ ہیں؟"

گل نے کہا۔ "سب پرانے لوگ ہیں مگر اس وقت کوئی بھی موجود نہیں۔"

"کیا دن میں جاتے ہیں یہ لوگ واردات کرنے؟"

"نہیں۔ دن میں چھاپے پڑنے کا ڈر ہوتا ہے۔ آج یہ لوگ زیادہ ڈرے ہوئے ہیں۔ غالب اور نازو کے فرار ہو جانے کی وجہ سے۔" گل نے کہا۔ "نہ جانے انہیں کس نے بتا دیا کہ ان میں ایک اخبار والا تھا۔"

پیڈرو نے اطمینان سے کہا۔ "یہ میں نے بتایا تھا اور یہ بھی کہ غالب کے ساتھ جو لڑکی تھی' وہ دوسرے اخبار کی رپورٹر تھی۔"

"کیوں؟" گل نے تیوری چڑھا کے کہا۔ "اس جھوٹ کی کیا ضرورت تھی؟"

"یہ آدھا تو سچ ہے۔ مجھ سے بھی تم نے کہا تھا کہ جھوٹ مت بولنا۔" پیڈرو مسکرانے لگا۔ "مگر تمہاری دھمکیوں سے ڈر کے سچ نہیں بولا تھا میں نے۔ دھمکی طافو من موجی نے بھی دی تھی کہ جھوٹ بولا تو تمہیں مار کے اسی جنگل میں گاڑ دیں گے۔ مجھے کیا ضرورت تھی جھوٹ بولنے کی اور مرنے کی۔"

میں نے کہا۔ "میرے بارے میں بھی سچ بک دیا تم نے....."

"سچ بولا جاتا ہے' جھوٹ بکا جاتا ہے۔" پیڈرو بولا۔

"تمہارے بارے میں اگر یہ کہا میں نے کہ تم سیٹھ ہو تو کیا غلط اور تمہاری.... میرا مطلب ہے مس رابعہ کے بارے میں بتایا ہائی کورٹ کی بہت بڑی وکیل ہیں تو یہ بھی برا نہیں کیا۔ ڈرے ہوئے ہیں یہ لوگ۔"

"یہ ڈرنے والے لوگ نہیں ہیں استاد پیڈرو۔" گل نے ... سے کہا۔

"پھر روپوش کیوں ہو گئے ہیں جنگل میں؟"

گل نے کہا۔ "اپنی حفاظت کے خیال سے لیکن اس کا مطلب یہ مت سمجھنا کہ انہوں نے تمہارے لیے فرار کے راستے کھلے چھوڑ دیئے ہیں۔"

"قید میں ہم سب ہیں۔ اور میں نے بھی جو کچھ کہا اس کا مقصد اپنا دفاع تھا۔ پیڈرو بولا "میں انہیں بتانا چاہتا تھا کہ ہم بے یار و مددگار لاوارث لوگ نہیں ہیں۔ ہماری کوئی حیثیت ہے اور....."

"اچھا اچھا۔ فی الحال اپنی حیثیت کو میری حیثیت سے الگ رکھو۔" میں نے کہا۔ "تمہاری حیثیت کو میں جانتا ہوں۔"

"تم ابھی تک بدگمانی میں مبتلا ہو سکندر۔ حالانکہ میں گل کی مدد نہ کرتا تو ان لوگوں کا تم تک پہنچنا دشوار ہو جاتا بلکہ ناممکن۔ اور اگر یہ پہنچ بھی جاتے تو تمہیں کیکروں کے نرغے سے بحفاظت نکال لانا کسی اور کے بس کی بات نہیں تھی۔ پوچھ لو گل سے۔ اس آپریشن ڈنائٹ کی کمان کون کر رہا تھا؟ محسن یا میں..."

گل نے سرہلایا۔ "یہ تو ٹھیک ہے بھائی سکندر...."

"اور یہ بھی بتا دو اپنے بھائی سکندر کو کہ میری مدد کے بغیر غالب اور نازو کا فرار ہونا بھی مشکل تھا۔"

نہ جانے کیوں یہ سب مجھے اچھا نہیں لگا۔ پیڈرو کے سامنے اس کے احسانات کا بار اٹھانا' اس کی مدد پر شکر گزار ہونا اور اس کے لیے دوستانہ جذبات کا اظہار۔ حقائق کو تسلیم کر لینے کے باوجود میرا دل اس خیال سے مفاہمت نہیں کرتا تھا کہ میرے باپ کا قاتل میرا دوست بھی ہو سکتا ہے۔ اگر آج اپنے قول و فعل سے وہ اپنے ماضی کی بداعمالی کے داغ ندامت کو مٹا دینا چاہتا تھا تو اس کی غرض کے پیچھے بھی نیکی اور خیر سگالی کے جذبات نہیں ہو سکتے تھے۔ ان کی فطرت کو سمجھنے کے باوجود اگر کوئی سانپ یا بچھو کے دوستی کے دعوے کو تسلیم کرے تو یہ اس کی سادہ لوحی نہیں سمجھی جائے گی' نادانی ہوگی۔

میں نے کہا "گل! کیا محسن اور رابعہ ابھی تک سو رہے ہیں؟ میں فوراً ملنا چاہتا ہوں۔"

"پہلے کس سے ملو گے؟" گل مسکرائی۔

"محسن سے" میں نے قطعی لہجے میں کہا۔

"رابعہ سے کیوں نہیں؟ تمہیں تو بہت تشویش تھی۔"

"لیکن اب نہیں رہی۔ مجھے معلوم ہے وہ ٹھیک ہو گی۔ سونے دو۔" میں نے کہا "مجھے تو حیرت ہے محسن پر کہ اسے مجھ سے

ملاقات کی جلدی نہیں۔"

"وہ تو رات بھر جاگتا ہی رہا تھا۔ ڈاکٹر نے اور پھر میں نے سمجھایا کہ صبح ہونے سے پہلے نہ کسی کو جگانا بہتر ہے اور نہ کسی کی خاطر جاگنا تو وہ بڑی مشکل سے گیا تھا۔"

"مگر تم نے تو کہا تھا کہ رابعہ اور محسن باتیں کر رہے ہیں؟"

"معاف کرنا بھائی سکندر۔ تھوڑا بہت جھوٹ تو بولنا ہی پڑتا ہے بچوں کو بہلانے کے لیے اور بیماروں کو مطمئن کرنے کے لیے" گل ہنسی۔

"لڑکی! نہ میں بچہ ہوں اور نہ بیمار۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم بہت باتیں بنانے لگی ہو۔ چلو اب سیدھی طرح" میں نے کہا۔

"کیا میرا ساتھ جانا ضروری ہے؟" وہ بولی "یہ سامنے کمرا ہے' خود چلے جاؤ۔"

"یہ... یہ کمرا" میں نے حیرانی سے کہا "واقعی۔ مجھے پہلے ہی دیکھ لینا چاہیے تھا۔ خواہ مخواہ انتظار کرتا رہا کہ تم مجھے لے کر جاؤ گی۔"

جب میں نے اس کمرے کی طرف قدم بڑھائے تو میرے دل کی اضطرابی کیفیت اپنی انتہا پر تھی۔ بہت دیر سے میں خود کو ذہنی طور پر اس وقت کے لیے تیار کر رہا تھا جب ایک مدت کے بعد محسن پھر میرے سامنے آئے گا۔ اس ملاقات میں ڈرامائی عنصر باقی نہیں رہا تھا۔ وہ مجھے پہلے ہی دیکھ چکا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ میرے اور اس کے درمیان حائل فاصلے ختم ہو چکے ہیں۔ اس کے باوجود میں نے اندر قدم رکھا تو ایک دم آتش شوق بھڑک اٹھی۔

میں نے دروازے پر دستک دی مگر دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے اندر داخل ہوتے ہی چلّا کے کہا "ابے محسن خاں شیروانی کے بچے..... اچکن کی اولاد.... اٹھ تیری تو..."

میرا خیال تھا کہ میرے ایک دھماکے سے اندر داخل ہونے پر محسن ہڑبڑا کے اٹھے گا' چند سیکنڈ احمقوں کی طرح میری صورت دیکھتا رہے گا اور پھر جواب میں مجھے پرانی سکہ بند گالیوں سے نواز کے مجھ سے چمٹ جائے گا۔ ہم ایک دوسرے سے گلے ملتے ہوئے ٹکر ماریں گے اور روئیں گے۔ بچھڑے ہوئے دوست تو ایسے ہی ملتے ہیں۔

لیکن جو کچھ ہوا وہ میری توقعات کے اتنا خلاف تھا کہ چند سیکنڈ کے لیے میں مفلوج اور حواس باختہ کھڑا رہ گیا۔ اندر ایک عورت دیوار پر لگے ہوئے آئینے میں اپنی صورت دیکھ کے لپ اسٹک لگا رہی تھی یا سرمہ۔ اس نے دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا اور آئینہ ایسے زاویے پر تھا کہ میں اس کا چہرہ بھی نہ دیکھ سکا۔ اس کے رنگین' ریشمی کپڑے دیکھتے ہی میں رک گیا تھا مگر اس نے ایک ایسی چیخ ماری جس نے میرے اوسان خطا کر دیئے۔

میں نے ہکلا کے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن میرے حلق سے بے معنی آوازوں کے سوا کچھ نہ نکلا۔ ایک اجنبی عورت کے کمرے میں یوں دیوانہ وار گالیاں بکتے ہوئے داخل ہونے کا شاک اتنا شدید تھا کہ مجھے پسینہ آ گیا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ ایسا کیوں ہوا۔ شاید اس وقفے میں جب گل مجھ سے باتیں کر رہی تھی یا طافو اور پیڈرو بھی وہاں تھے' محسن اٹھ کے رابعہ کی طرف چلا گیا تھا یا کہیں اور۔ اس کمرے میں موجود عورت طافو کی بیوی تو ہو نہیں سکتی تھی مگر کسی دوسرے ڈاکو کی گھر والی ہو سکتی تھی۔ غلطی گل سے ہوئی تھی اور مجھ سے بھی ..... میں نے زبان کی لکنت پر قابو پا کے کہا "میں... معاف کرنا بہن' میں سمجھا تھا .... وہ دراصل... گل نے مجھے بتایا تھا۔"

دوپٹے سے منہ چھپا لینے والی عورت نے چلّانا شروع کر دیا "مجھے کیا بتا رہا ہے بے شرم... بے غیرت ... اندھے بیل۔ پاگل شرابی کی طرح گالیاں بکتا چلا آ رہا ہے اندر۔ کسی کی ماں بہن کی عزت کا خیال نہیں تجھے' تیرے اپنے گھر میں نہیں ہے کوئی نامراد..."

میں پلٹ کے بھاگنے ہی والا تھا کہ میرے ذہن کو ایک اور جھٹکا لگا۔ میں پلٹا اور اس عورت کو دیکھنے لگا جو بڑے فراٹے سے مجھے کوس رہی تھی۔ زنانہ لغت سے منتخب گالیوں کے ساتھ۔ یہ خیال تو مجھے پہلے بھی آیا تھا کہ عورت غیر معمولی طور پر صحت مند اور قد آور ہے۔ اب اس کی آواز نے مجھے متوجہ کیا تھا۔ یہ مصنوعی آواز تھی اور عورت کی آواز بنا کے چلانے والا مرد محسن کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا تھا۔

جب میں فرار ہوتے ہوتے رکا اور پھر پلٹا تو وہ میری طرف دیکھ رہا تھا اور بلاشبہ بہت ضبط سے کام لے رہا تھا۔ میری گھبراہٹ اور بدحواسی سے پوری طرح لطف اندوز ہوتے وقت اس کے لیے اپنی ہنسی پر قابو پانا یقیناً ایک مشکل کام تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ بھانڈا پھوٹ چکا ہے تو اسے اپنے دفاع کی فکر لاحق ہو گئی۔

میں آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھا "گولی مارو ماں بہن کو میری جان۔ ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے..."

محسن جان بچا کے بھاگا "ابے سکندر اعظم کے سالے.... دیکھ تیرا تو پجامہ بھی گیلا ہو رہا ہے" ہنستے ہنستے اس کی حالت غیر ہونے لگی تھی "ذرا اپنی حالت دیکھ..."

میں اس کے پیچھے لپکا "ابھی بتاتا ہوں تجھے میں..."

وہ مجھ سے بچنے کے لیے پلنگ کے نیچے گھس گیا اور چلّانے لگا "ہائے ہائے' کوئی بچاؤ مجھے اس موئے مردوئے سے۔ پرائی بہو بیٹی کی عزت خطرے میں ہے۔"

میں اس کے تعاقب میں رہا اور پلنگ کے نیچے اس کو پکڑنے کی کوشش کی "پرائی کیوں... تمہاری عزت میری عزت۔"

وہ شور مچاتا دوسری طرف نکل گیا "ارے رابعہ! گل!"

رابعہ اور گل اس ڈرامے کے آخری سین کے لیے پہلے سے تیار تھیں اور ان سب نے مل کر ریہرسل بھی کر لی تھی۔ وہ ایک

ساتھ اندر آئیں محسن ان کے پیچھے چلا گیا اور انہوں نے مجھے دھکیل دیا۔ ان کا برا حال تھا آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور ہنسی رو کے نہیں رکتی تھی۔

میں سخت خفت کا شکار تھا۔ رابعہ اور گُل کی ہنسی مجھے مزید شرمندہ کررہی تھی۔ ان کے پیچھے اپنے مضحکہ خیز حلئے میں کھڑا ہوا محسن بھی پیٹ پکڑ کے ہنس رہا تھا۔ پھر میں اس صورتِ حال پر کیسے نہ ہنستا۔

"بہت بدمعاش ہو تم سب" میں نے کہا۔

محسن مجھ سے لپٹ گیا "ہم بدمعاش ہیں۔ سُنا تم نے رابعہ۔ ایمان سے کیا حال ہوا تھا بھائی کا اندر آتے ہی۔ کون رابعہ اور کیسی محبت..... سب بھول گئے۔"

میں نے ہنستے ہوئے اسے دو مُکّے مارے "الو کے پٹھے۔ گُل اجازت دے مجھے تو میں ابھی نکاح پڑھوالوں تجھ سے۔"

گُل آنسو پونچھ کے پھر ہنسنے لگی "مجھے کیا۔ رابعہ باجی سے پوچھو۔"

رابعہ کو پھر ہنسی کا دورہ پڑا "خدا کے لیے اب بس کرو یہ بے ہودگی۔ میں تو پہلے ہی کہہ رہی تھی کہ ایسا مت کرو' تماشا بن جائے گا۔"

گُل نے کہا "کوئی نہیں ہے یہاں ہمارے سوا۔"

میں نے کہا "مگر بیڈ رو... وہ کہاں گیا؟"

"اسے میں نے طافو کے پاس بھیجا ہے" گُل نے کہا۔

میں نے اطمینان کا سانس لیا "بڑی نامعقولیت کا ثبوت دیا تم نے۔ وہ دیکھ لیتا پھر؟"

رابعہ بولی "اس کے علاوہ بھی تو لوگ تھے۔"

گُل نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا "منع تو میں نے بھی کیا تھا مگر یہ کہاں ماننے والے ہیں۔"

"یہ آئیڈیا کس کا تھا؟" میں نے کہا۔

"آئیڈیا بھی میرا تھا اور کیا لاجواب آئیڈیا تھا۔ قسم خدا کی پہچان ہوگئی آج کہ محبت کیا ہوتی ہے اور ہوس کیا۔ میں کہتا ہوں' اب بھی وقت ہے رابعہ! سنبھل جاؤ۔ یہ جو تمہارا چاہنے والا بنتا ہے نا' ایسا فریفتہ ہوا تھا مجھ پر کہ....."

میں نے کہا "محسن تو کیوں مار کھانا چاہتا ہے مجھ سے۔ چل جا اپنا حلیہ ٹھیک کر سؤر کے بچّے۔ ابھی آجائے گا کوئی۔"

چند منٹ میں وہ لباس بدل کے آگیا اور سارا ہنگامہ ختم ہوا تو سب کو ناشتے کا خیال آیا "کیا ملے گا یہاں تیری سسرال میں محسن؟" میں نے کہا "ڈاکوؤں کے داماد۔"

محسن نے غیر موجود مونچھوں پر تاؤ دیا۔ "ابے منہ سے بول۔ جو کہے گا وہ حاضر کردیں گے۔ بڑا خوش قسمت ہے تو۔"

"خاک خوش قسمتی ہے یہ۔ ایک کا سسر بھوت ہے' ایک کے سسرالی عزیز ہیں ڈاکو۔"

"ابے یہی تو خوش قسمتی ہے تیری۔ کیسے ملتے ہیں ایسے رشتے کہ جو چاہو وہ فراہم کردیں۔ سوری کہنا تو جانتے ہی نہیں" محسن کہتا "ساری دنیا میں جہاں کوئی چیز ہوگی وہاں سے لے آئیں گے ہمارے سالے۔"

"ناشتے میں کیا کھاؤ گے بھائی سکندر؟" گُل مسکرائی۔

"پوچھ تو ایسے رہی ہو جیسے جنگل میں سینڈوچ' آملیٹ کافی چیز آرڈر پر مل جاتی ہے۔"

"یار' کہا ہے نا تجھ سے کہ مانگ کیا مانگتا ہے۔ کہے گا تو شتر مرغ کے انڈے کا آملیٹ آجائے گا۔ بس ذرا افریقہ تک جانے میں کچھ دیر لگے گی۔ یہ سمجھ لے کہ تو لاہور کے شیزان میں بیٹھ کے آرڈر دے رہا ہے اور یہ ہے ویٹریس۔" اس نے گُل کی طرف اشارہ کیا "اب بول۔"

"یہ بات ہے" میں نے کہا "تو ویٹریس' ہم امریکن بریک فاسٹ لیں گے' ملے گا؟"

"وائی ناٹ سر" گُل نے مؤدبانہ لہجے میں سر جھکا کے کہا اور رابعہ کے ساتھ ہنستی ہوئی باہر چلی گئی۔

"کیا واقعی..... یہاں انتظام ہے؟" میں نے کہا۔

"ابے ہم ہیں تو پھر کیا غم ہے۔ ہم نے پہلے ہی سب کچھ منگوالیا تھا۔ لاہور ہے کتنی دور۔ یہ لوگ لادیتے ہیں" محسن نے کہا "پہلے دن تو میں نے گزارا کیا تھا انہی چیزوں پر جو یہ کھاتے تھے ناشتے میں پراٹھے اور مکھن۔ مرغی بھنی ہوئی لنچ میں تو رات کو روسٹ۔ چائے بھی وہی تھی دیسی اسٹائل کی۔ دودھ میں پتی ڈال کے اُبال لیتے تھے پھر گل نے خود ہی میری مرضی کے مطابق انتظام کردیے۔ ڈاکوؤں کے ڈیرے پر قیام کا پہلا تجربہ بُرا نہیں رہا۔ دل کے اچھے ہیں یہ لوگ۔"

"پھر کیوں نہ ہم بھی انہی جیسے ہوجائیں؟ دل کے ہم بھی اچھے ہیں۔" میں نے کہا "اچھی گزرے گی ہماری بھی۔ جیسے تمہاری گزری۔"

"میرا یہ مطلب بہرحال نہیں تھا۔"

"پھر کیوں ڈیرا ڈال رکھا تھا یہاں؟" میں نے کہا۔

محسن بولا "مجبوری تھی یار۔ گل نے بتایا نہیں تجھے؟"

"مجبوری کے گھوڑے۔ تیرا دماغ درست ہوا یا نہیں؟ تو نے بہت پریشان کیا گل کو اور تیری وجہ سے ہی وہ یہاں آکے پھنس گئی" میں نے کہا۔

محسن کی صورت پر دکھ اور شرمندگی کے آثار نظر آنے لگے "یہ تو ٹھیک کہا تو نے۔ گل میرے ساتھ بُری پھنسی۔ یہ اسی کی ہمت تھی اپنے سکندر صاحب کہ آج میں ٹھیک ہوں اور ہماری ملاقات پاگل خانے میں نہیں ہورہی ہے۔ گل نے مجھے پاگل نہیں ہونے دیا حالانکہ میں نے اپنی سی پوری کوشش کی تھی۔ وہ مجھے واپس زندگی کی طرف کھینچ لائی۔ کہنے کو بڑی کمزور اور نازک ہوتی ہے عورت لیکن کون مقابلہ کرسکتا ہے اس کے عزم اور حوصلے کا۔ میں تو شرمندہ ہوتا ہوں جب اپنی محبت کا موازنہ گل کی محبت سے کرتا ہوں۔ احساسِ کمتری ہوتا ہے مجھے۔ میری محبت شاید ایسی کسی آزمائش کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ ایسی قربانی میں نہیں دے سکتا تھا سکندر جو گل نے دی۔ اتنا ظرف نہیں تھا میرا۔ یہ ماننا پڑتا ہے مجھے اور دیکھا جائے تو یہی ہے اصل محبت جس میں طلب کی اہمیت ہی نہیں تھی۔ بس اپنا سب کچھ ہار دینے' وار دینے کی تمنا تھی۔"

میں نے پُرانی یادوں میں گم ہوکے کہا "ہاں۔ تو بالکل ٹھیک کہتا ہے محسن۔ گُل نے اس لیے نہیں چاہا تھا تجھے کہ بالآخر تجھے پائے۔ یہ تو بس قسمت کے کھیل ہیں۔"

"تو ڈرتا ہے شہلا کا ذکر کرتے ہوئے؟" محسن نے کہا "اب ایسی کوئی بات نہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ اس وقت میں نے گل کو ٹھکرا دیا تھا' اس کی محبت کے بدلے میں نفرت دی تھی کیونکہ میں شہلا کے ہوتے کسی اور کی طرف دیکھنا بھی گناہ سمجھتا تھا' کسی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ لیکن گل کو دیکھ' وہ کبھی مایوس اور بددل نہیں ہوئی۔ یک طرفہ محبت کے پاگل پن میں مبتلا رہی اور کسی کے سمجھانے کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔"

"ہاں۔ ہم بہت سمجھاتے تھے اسے کہ محسن کا خیال دل سے نکال دو مگر وہ ایک ہی بات کہتی تھی کہ میں نے کچھ مانگا تو نہیں ہے محسن سے لیکن اس سے محبت نہ کرنا میرے اختیار کی بات نہیں۔ عجیب لڑکی ہے یہ گل۔ بھئی میں اور غالب تو انکار نہیں کرسکتے اس حقیقت سے کہ ہماری محبت کی منزل بالآخر وہی ہے۔ شادی خانہ آبادی۔ یہ ہجر کے صحرا کا بے سمت سفر نہیں ہے۔ ہم میں سے کوئی بھی گل کی طرح محبت نہیں کرسکتا۔"

"مجھے یقین ہے کہ آج بھی شہلا زندہ ہوتی تو گل کو فرق نہ پڑتا۔ وہ اسی طرح خاموشی سے میری محبت کے آزار میں مبتلا رہتی اور مجھے عذاب میں مبتلا رکھتی۔"

"عذاب کیسا؟"

"یار' یہ جاننا کہ آپ کسی کو محبت کے جواب میں نفرت دے رہے ہیں اور مجبور ہیں' کچھ کر بھی نہیں سکتے۔ نفرت کرنا بھی تو مشکل ہوجاتا ہے۔ اب مجھے شرم آتی ہے یہ کہتے ہوئے کہ خدا نے سب کی مشکل آسان کی ورنہ زندگی کیسے گزرتی؟ ایسے کب تک گزرتی' شہلا مرگئی تو اس کے لیے بھی عذاب ختم ہوا۔ سوائے انتظار کا دکھ جھیلنے اور مسلسل ہجر کے صدمے اُٹھانے کے اس نے کیا پایا تھا زندگی سے' زندہ رہتی تو مزید دکھ اٹھاتی۔ شاید گل بھی اس کے لیے آزار ہوجاتی۔ میں کتنا بے بس ہوتا۔ گل کو قتل بھی تو نہیں کرسکتا تھا۔ نہ گل مایوس ہوکے خودکشی کا سوچتی تھی۔ تم سب مل کے بھی اس مسئلے کو حل نہیں کرسکتے تھے جو خدا نے یوں حل کردیا کہ کوئی بھی کسی کو الزام نہیں دے سکتا۔ بڑی صابر عورت تھی شہلا بھی مگر یہ گل تو اس سے بھی کئی ہاتھ آگے ہے۔ نہ پہلے کبھی اس نے شہلا سے حسد کیا تھا اور نہ اب ایسی کوئی بات ہے۔ کبھی مجھے ایسا لگتا ہے کہ شہلا کے مرنے کا غم مجھ سے زیادہ اسے ہوا۔ وہ دل ہی نہیں اس کا جو کسی سے حسد یا نفرت کرے۔"

"چل یار' جو ہوا اچھا ہوا۔" میں نے کہا "وقت گزر گیا اور یادیں چھوڑ گیا۔ اب ان کے سہارے زندگی تو نہیں گزاری جاسکتی۔"

"لیکن ان یادوں کو زندگی سے خارج بھی تو نہیں کیا جاسکتا۔"

"ہاں۔ البم رکھے رہتے ہیں گھر میں۔ کبھی فرصت ملتی ہے تو سب ہی دیکھ لیتے ہیں ورنہ عکس جو دماغوں میں رہیں' وہ محو ہوجاتے ہیں۔ تصویر میں منجمد لمحے پھر بھی زندہ رہتے ہیں۔ آدمی کا دل چاہتا ہے تو اپنے ماضی میں گھوم آتا ہے لیکن اپنے مستقبل کی جانب سفر تو جاری رکھتا ہے۔"

"سفر جاری ہے دوست" محسن آہ بھر کے بولا اور کچھ دیر خاموشی سے خلا میں گھورتا رہا۔

گل نے رابعہ کی مدد سے خود ہی ناشتا تیار کیا تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنے حسن انتظام سے اس نے جنگل میں منگل منانے کو محاورہ سچ کر دکھایا تھا۔ ناشتے میں کارن فلیک' انڈے' مکھن اور ڈبل روٹی کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا اور چائے کے ساتھ کافی بھی تھی۔ گل نے بتایا کہ انڈے' مکھن تو گردونواح میں ہی دستیاب ہیں' باقی چیزوں میں سے صرف ایک کے لیے کوئی ہر روز شہر جاتا ہے اور وہ ہے ڈبل روٹی۔ نہ ان لوگوں کے پاس پیسے کی کمی ہے اور نہ وسائل کی۔ ایک جیپ تو ہر وقت تیار کھڑی رہتی ہے' دوسری آمدورفت کے لیے استعمال ہوتی ہے۔

"پہلی جیپ آمدورفت میں استعمال نہیں ہوتی تو پھر تیار کیوں کھڑی رہتی ہے؟" رابعہ نے پوچھا۔

"ان کا ایک مسئلہ جو سر پر ہر وقت لٹکنے والی تلوار کی طرح ہے' چھاپے کا ڈر ہے" گل نے کہا "کیا پتا کب کوئی مخبری کردے۔ ویسے تو مخبر بھی پولیس کے اپنے ہی آدمی ہوتے ہیں۔"

"اور پولیس ان کی اپنی ہے" محسن بولا "وہ چھاپا مارنے سے پہلے بتادیتے ہیں کہ خبردار' ہوشیار ہم آرہے ہیں۔"

"پھر ڈرنے کی وجہ؟"

"بعض اوقات پولیس پر اوپر والوں کا دباؤ ہوتا ہے۔ اچانک کچھ نہیں ہوتا۔ کبھی آئی جی یا ایس پی بدلتا ہے تو پہلے سے معلوم ہوتا ہے کہ نیا حاکم مزاج کا کیسا ہے۔ پولیس خود بتادیتی ہے کہ ابھی ذرا ہاتھ روک لو۔ یہ بندہ ذرا مختلف ہے اور اسے کچھ دن تو فرض شناسی کا ڈراما کرنا ہی ہے تاکہ اخباروں میں بیانات چھپ جائیں اور پبلک وقتی طور پر دہائی دینا بند کردے۔ کچھ پکڑ دھکڑ لازمی ہوجاتی ہے۔ کرائم رپورٹرز کی مدد سے سُرخیاں لگوادی جاتی ہیں کہ اتنے چور پکڑے گئے۔ تصاویر مع برآمد شدہ سامان مسروقہ ملاحظہ ہوں۔ اتنے ڈاکو پکڑے گئے۔ منہ پر نقاب کے ساتھ ان کی

تصاویر۔ ان سے ملنے والا اسلحہ' چند پُرانی ڈکیتیوں کا حوالہ کہ یہ فلاں فلاں واردات میں ملوث تھے۔ گرفتاری دینے والے اور تصاویر بنوانے والے پُرانے پاپی ہوتے ہیں جو پولیس کے کام آتے ہیں۔ مال ہمیشہ مال خانے سے آتا ہے۔ جس علاقے کی خبر اور تصویر بنوانی مقصود ہو' وہاں فراہم کردیا جاتا ہے۔ کچھ دن بعد لوگ مطمئن ہوجاتے ہیں کہ واقعی سب ٹھیک ہورہا ہے۔ پھر نیا افسر بھی پُرانے ڈھب پر آجاتا ہے۔ دنیا کے سب کام پہلے کی طرح ہونے لگتے ہیں۔

"تمہارا مطلب ہے اصلی چھاپا کبھی نہیں پڑتا ہے؟"

"پڑتا ہے۔ جب کبھی غلطی سے ڈاکو کسی وزیر یا مشیر' اعلیٰ سرکاری افسر وغیرہ کے کسی عزیز کو لوٹ لیتے ہیں۔ افسر کو پیٹی اُترنے کا' لائن حاضر ہونے کا یا تنزلی کا خطرہ لاحق ہوجاتا ہے اور اس سے زیادہ خبر شائع ہونے کی رسوائی کا تو پھر وہ کچھ کارکردگی دکھاتا ہے۔ اسے علم تو ہوتا ہے کہ واردات کہاں ہوئی تھی اور اس علاقے میں کون کون سے گروہ ہیں۔ وہ ایک گروہ کو گھیر لاتا ہے۔ اگر وہی مجرم ہوں تو مالِ غنیمت کی پائی پائی واپس۔ انہیں پابہ زنجیر متعلقہ افسر کے سامنے پیش کیا جاتا ہے اور اس کے لٹنے والے عزیز کو تھانے میں مجرموں کے پٹنے کا منظر دکھانے کے لیے مدعو کیا جاتا ہے۔ مقدمہ بھی درج ہوتا ہے اور چھترول بھی اصلی ہوتی ہے مگر یہ چند دن کی بات ہوتی ہے۔ بعد میں کون پوچھتا ہے کہ پکڑے جانے والوں کا کیا انجام ہوا' انہیں کس عدالت میں پیش کیا گیا اور کیا سزا ہوئی۔ سب کو سو کام ہوتے ہیں۔ جسے مال واپس مل جاتا ہے وہ مطمئن ہوکے بیٹھ جاتا ہے کہ مجرم پکڑے گئے۔ اگر غلطی سے غلط گروہ پکڑلیا جائے تو وہ خود بتادیتے ہیں کہ واردات فلاں نے کی تھی چنانچہ انہیں چھوڑ کر فلاں کو لے آتے ہیں۔"

میں نے تعریفی نظروں سے اسے دیکھا "گُل! تمہاری معلومات ہمارے علم میں اضافہ کررہی ہیں۔ یہ بتاؤ کبھی یہاں چھاپا پڑا؟"

"کیوں نہیں پڑا۔"

"تمہاری موجودگی میں؟ میرا مطلب ہے تم کو بھی گرفتار ہونے کی سعادت نصیب ہوئی؟"

گُل مسکرائی "شیش ناگ ایک بااصول ڈاکو تھا۔ پولیس کو اور اس کے مخبروں کو کبھی ناخوش نہیں کرتا تھا۔"

غالب بولا "جدید اصطلاح میں اس کی پی آر اچھی تھی۔"

"ہاں۔ اس کے باوجود دوبار چھاپا پڑا۔ سب گرفتار ہوئے اور تھانے میں بھی رہے۔ وہاں ان کے ساتھ وہ سب ہوا جو دوسروں کے ساتھ ہوتا ہے۔ دو سال میں ایک بار سب کو حاضری لگوانی پڑجاتی ہے تھانے میں۔ باری باری۔ پولیس کا کہنا ہے کہ آخر ہم نے وردی پہنی ہے اور تنخواہ لیتے ہیں اس بات کی تو پھر کچھ کرکے دکھانا ضروری ہے۔ آپس میں مل جل کے ایک دوسرے کا کام چلاتے ہیں۔ میں اس لیے نہیں پکڑی گئی کہ چھاپے سے پہلے ہی بھائی مجھے روپوش کردیتا تھا۔ مجھے ایک گاؤں کے چوہدری کی حویلی میں جگہ مل جاتی تھی۔ چوہدری میرا حقیقی چچا تھا۔"

میں بھونچکا رہ گیا "حقیقی چچا......"

محسن نے کہا "تم نے آج تک بتایا نہیں تھا کہ تمہارا کوئی ہے......"

"اب اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ وہ پہلے بھی نام کا چچا تھا۔"

"وہ بھی ڈاکو تھا؟" محسن نے پوچھا۔

"پہلے تھا پھر حج کرکے آیا تو اس کی کایا کلپ ہوگئی۔ بالشت بھر کی سفید داڑھی رکھ لی۔ گنجے سر پہ ٹوپی اوڑھ کے' اونچے پائنچوں والی شلوار پہن کے اور ہاتھ میں تسبیح لے کر دنیا بھر کو روزے نماز کی تلقین کرتا پھرتا تھا۔ ایک دن میرے بھائی سے الجھ گیا اور اسے لیکچر دینے لگا کہ تم جہنمی ہو اور شیطان ہو۔ اس نے کہا کہ چچا! جو کل تک تم تھے وہی میں آج ہوں۔ جب تمہاری عمر کو پہنچوں گا تو حج کرنے جاؤں گا اور واپسی پر یہی ڈراما شروع کردوں گا جو تم کررہے ہو۔ مال تو بہت جمع ہوجائے گا اس وقت تک۔ باقی عمر ثواب کمانے میں لگادوں گا۔ بس ایک بات کا خیال رکھنا۔ اگر کبھی میرے ساتھ دغا کی تم نے یا ناگ منی کو کچھ ہوا تو تمہاری خیر نہیں۔ میں تو چلا جاؤں گا جیل لیکن تم سے نمٹنے والے بہت ہوں گے انہیں تاکید کردی ہے میں نے کہ تمہاری داڑھی مونڈ کے ہاتھ پر رکھ دیں اور منہ پر کالک مل کے اور تمہارے کپڑے اتار کے تمہیں مال روڈ پر چھوڑ دیں۔ تصویریں اُتارنے کے بعد۔ اور یوں میں محفوظ رہی۔ چاچا کو عزت اور دولت دونوں سے پیار تھا۔"

ہم سب گُل کی بات پر ہنسنے لگے تھے۔

میں نے کہا "گُل! تمہاری بات سے تو ثابت ہوتا ہے کہ پولیس میں نہ کوئی ایماندار ہے نہ فرض شناس۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ بُرے لوگ کہاں نہیں ہوتے۔ کچھ محکمے ایسے بھی ہیں جہاں ان کا تناسب زیادہ ہے۔"

"پولیس میں اچھے' ایماندار اور فرض شناس لوگ آج تک تم نے کتنے دیکھے ہیں؟" محسن بولا۔

"ایک تو اپنے انکل ضامن رضوی مرحوم تھے۔ ایک اپنا یار ڈبل ایس آئی سب انسپکٹر سیّد اکرام شیخ تھا۔"

"ایک اللہ کو پیارے ہوئے' دوسرے ٹیکسی چلارہے ہیں کراچی میں۔ ایماندار آدمی کو وہاں رہنا مشکل کردیا جاتا ہے۔"

"پھر بھی ضامن رضوی جیسے لوگ ڈٹے رہتے ہیں۔ انہوں نے ملازمت پوری کی اور نیکی بھی کمائی۔ ان کے بدترین دشمن بھی اعتراف کرتے ہیں ان کی مثالی فرض شناسی کا اور اصول پرستی کا۔"

"صلہ کیا ملا ان کو اس کا؟ ایک گھر تو بنا نہیں سکے اور واقعی پولیس کے اعلیٰ افسر بھی تنخواہ میں گزارا کریں تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوجائے۔ ضامن رضوی کی تعریف کرنے والوں نے ان کے بیوی بچوں کے لیے کیا کیا؟ کون ان کے کام آیا؟ ان کی بیوہ جو اسکول چلارہی تھی' وہ بھی ختم ہوگیا۔ ضامن رضوی پُرانے وقتوں کے آدمی تھے۔ ان کا انجام دیکھ کے دس نئے افسروں نے ایمانداری اور فرض شناسی سے توبہ کی ہوگی۔ حکومت نے ایک تمغۂ خدمت تک نہیں دیا۔ نہ انعام میں زمین ملی۔ پھر پولیس ڈاکوؤں اور چوروں سے نہ ملے تو کیا کرے۔ ویسے بھی اس معاشرے میں چور ڈاکو زیادہ ہیں اور وہ سب آپس میں ملے ہوئے ہیں۔ نیچے سے اوپر تک۔"

میں نے گھڑی دیکھی۔ "یہ وقت ان باتوں کا نہیں۔"

"ایسی باتوں کے لیے وقت کب آئے گا؟" محسن نے میز پر مُکا مار کے کہا۔

"ہم بتادیں گے تمہیں" میں نے کہا "ابھی تو یہاں سے نکلنے کی فکر کرو۔"

"استاد پیڈرو گیا تھا مذاکرات کے لیے" گُل نے کہا۔

"اسے ہماری طرف سے بات کرنے کا اختیار دینا غلط ہے۔ ہم خود بات کرسکتے تھے۔" میں نے احتجاج کیا۔

محسن بولا "بدمعاشوں سے بدمعاش ہی بات کریں تو اچھا ہے۔"

"تم سمجھتے کیوں نہیں۔ آہستہ آہستہ وہ ہمارے درمیان جگہ بنارہا ہے' ہماری صفوں میں گھُس رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس نے ٹھیکا لے لیا ہے ہمارے سب مسائل حل کرنے کا۔ یہ اس کی چالبازی ہے۔"

"میں مانتا ہوں مگر......"

"مگر کیا؟ میرے لیے اس شخص کا وجود ہی باعثِ آزار ہے۔ میں بہت ضبط سے کام لیتا ہوں مگر پھر بھی اسے دیکھ کر میرا خون کھولنے لگتا ہے۔ مجھے وہ سب یاد آجاتا ہے جو اس نے ہمارے ساتھ کیا تھا۔ اب اس کی ڈپلومیسی بدل گئی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ہم پُرانی باتیں بھلادیں اور اسے معاف کرکے اپنے ساتھ شامل کرلیں۔"

"یہ ناممکن ہے" محسن بولا۔

"اسے معاف کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا" گُل نے کہا۔

میں نے کہا "دیکھو گُل! قبل ازوقت فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ حالات اب پہلے جیسے نہیں رہے۔ پیڈرو کہتا ہے کہ میرے والد کو چوہدری دلاور نے قتل کیا تھا اور اسے پھنسادیا تھا ورنہ اسے ہم سے کوئی پرخاش نہیں۔ یہ ثابت کرنے کے لیے اس نے ہماری مدد بھی کی ہے۔ ہم سب اس کی کوشش کے نتیجے میں ایک دوسرے سے ملے مگر مجھے اس کوشش کے پیچھے بھی چوہدری دلاور کا ہاتھ نظر آتا ہے۔"

"وہ کیسے؟" محسن بولا۔

"چوہدری دلاور اب گُل کے چاچا کی طرح نیک نامی کمانے کے چکر میں ہے۔ وہ سیاست میں قومی لیڈر بن کے سامنے آنا چاہتا ہے اور اس کے لیے وہ اپنے ماضی کے ہر نقش کو مٹانا چاہتا ہے۔ پبلک کو تو کچھ معلوم نہیں اور پبلک ہوتی ہے ریوڑ کی طرح۔ جدھر ہانک دو چل پڑتی ہے۔ ان کا حافظہ بھی کمزور ہوتا ہے۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ کل کسی نے ان سے جو وعدے کیے تھے وہ کیوں پورے نہیں ہوئے۔ بعد میں آنے والا زیادہ بُرا ثابت ہوتا ہے تو وہ مردہ باد مردہ باد چلّانے لگتے ہیں۔ پہلے والے کے کہنے پر اور پھر زندہ باد کے نعرے لگا کے پرانے حاکم کو واپس لے آتے ہیں۔ ان کا بھلا نہ مردہ باد سے ہوتا ہے نہ زندہ باد کے نعروں سے مگر یہ سیاست کا کھیل ایسے ہی چل رہا ہے۔ اب تم خود سوچو کہ چوہدری دلاور اگر کل کو اسمبلی کے انتخابات میں جیت گیا تو وہ وزیر بھی ہوجائے گا۔ اس کے بعد کون روکے گا اس کا راستہ؟ وہ ایوانِ صدر تک جاسکتا ہے۔"

"ہم اس کا راستہ روکیں گے" محسن نے سینے پر ہاتھ مارا۔

"رائٹ۔ یہ بات وہ بھی جانتا ہے" میں نے کہا "اور وہ چاہتا ہے کہ جب وہ ایک دیانت دار' خداترس' نیک دل' شریف اور ایماندار و محبِ وطن پاکستانی شہری کے روپ میں سامنے آئے تو کوئی اس کے چہرے سے نقاب اُتارنے والا نہ ہو۔ جب وہ تقریروں میں روشن مستقبل کے خوابوں کا ذکر کرے تو کوئی اسے تاریک ماضی کا حوالہ نہ دے۔ وہ تو اپنے لیے ایک قابلِ فخر ماضی بھی خریدنا چاہتا ہے۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ وہ پیدائشی طور پر فرشتہ سیرت ہے اور ایک قابلِ تقلید لیڈر کی جملہ صفات اس کی ذات میں روزِ اوّل سے موجود ہیں چنانچہ اسکول میں' کالج میں اور اس کے بعد خدمتِ خلق کے سوا اس نے کچھ نہیں کیا۔ کتنے یتیموں کے سر پر ہاتھ رکھا' کتنی بیواؤں کی بیٹیوں کے لیے رخصتی کا انتظام کیا' غریبوں' ناداروں کی کتنی مدد کی' اس کے گواہ بہت مل جائیں گے..... یتیم اور مسکین خود اس کی خداترسی کے عینی گواہ ہوں گے۔ باقی کام اس کا پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ کرے گا۔ بس خطرے کی گھنٹی بجانے والے ہم ہیں جو نہ زر سے مانتے ہیں نہ زور سے۔ اب اس نے اپنی حکمتِ عملی بدل ڈالی ہے۔ ایک تو اس نے پیڈرو کو الگ کردیا ہے۔ وہ خود بھی کہتا ہے اور پیڈرو بھی۔ بظاہر ان کے درمیان عداوت پیدا ہوگئی ہے مگر میرا خیال ہے کہ یہ نورا کشتی ہے۔ اس نے پیڈرو کو اپنا خاص آدمی سمجھتے ہوئے یہ مشن سونپا ہے کہ وہ ہمیں رام کرے' ہماری صفوں میں گھُس کے انتشار پھیلائے' ہمارے خیالات اور نظریات کو بدل دے۔ اور اگر یہ نہ ہو تو پھر ہمارے درمیان رہ کے چوہدری دلاور کو ہمارے عزائم سے باخبر رکھے۔ ہمیں جدا کرنے کا ڈراما چوہدری دلاور نے کیا' ملوانے کا ڈراما پیڈرو نے اور ظاہر ہے' ہمارے جذبات کی نوعیت اب پہلے جیسی نہیں رہی۔ پھر ایک شک بھی پیدا کردیا ہے اس نے ہمارے دل میں کہ آج تک ہم غلط فہمی کی بنا پر اس سے دشمنی کرتے رہے۔ بظاہر وہ چوہدری

دلاور کی مخالفت کررہا ہے مگر یہ ہماری موافقت حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ چوہدری دلاور کا ایک بھائی بھی تھا؟"

"ہاں۔ پیڈرو نے بتایا ہے۔"

"اس نے غالب کو خرید لیا ہے۔ ایک اخبار کی پیش کش کرکے اور غالب نے ایڈیٹر بننے کے شوق میں اسے قبول بھی کرلیا ہے۔"

"صحافت اس کا شوق بھی ہے اور اس کی کمزوری بھی لیکن یہ کتنا زیادتی ہوگی کہ غالب بک گیا ہے۔" رابعہ نے کہا۔

"یہ چکر ایسے ہی چلائے جاتے ہیں رابعہ۔ پہلے آفر دی جاتی ہے۔ اگر آپ ایک بدکردار' بے ضمیر اور زر پرست آدمی کے لیے کوئی کام کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں تو گویا آدھی بازی اس نے جیت لی۔ اگر آپ صاف انکار کرنے کے بجائے ہمدردانہ غور کرنے کا وعدہ کرلیتے ہیں تب بھی وہ سمجھ لیتا ہے کہ پنچھی نے دانہ دیکھ لیا ہے' اب وہ دام میں بھی آجائے گا اور ایسے شکاری بڑے تجربے کار' جہاں دیدہ اور مردم شناس ہوتے ہیں' جو ہم جیسے خردماغوں کا شکار کرتے ہیں۔ چوہدری دلاور اور اکبر خان ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ غالب کو اصولی طور پر رضامند کرکے انہوں نے بڑی خوشی منائی ہوگی کہ کام آسان ہوگیا۔ اس کے بعد جو بھی ہوگا' آہستہ آہستہ ہوگا۔ عزت' شہرت اور دولت کے جال میں غالب خود گرفتار ہوتا جائے گا اور اسے اصل مقاصد سے دور کرنے والے ڈوریاں کھینچتے رہیں گے۔ غالب ایک بہت نیک نام' حق گوئی و بے باکی کے ترجمان اخبار کی حیثیت سے صحافتی و حکومتی حلقوں میں اور پبلک میں اخبار کی پوزیشن مستحکم کردے گا تو اسے دودھ کی مکھی کی طرح نکال باہر پھینکا جائے گا۔ نیا ایڈیٹر پرانی ساکھ اور بہت بڑی اشاعت رکھنے والے اخبار میں چوہدری دلاور کی تعریف و توصیف کرے گا تو اسے سچ ہی تسلیم کیا جائے گا۔ کوئی کہے گا کہ یہ اخبار جھوٹا ہے' زر خرید ہے اور رائے عامہ کو گمراہ کرتا ہے تو اسے پاگل' شرپسند اور دشمن کا ایجنٹ قرار دیا جائے گا۔ اتنا بڑا اخبار بھلا غلط لکھ سکتا ہے۔ اس کی گُڈوِل پوری طرح چوہدری دلاور کی پبلسٹی میں کام آئے گی۔"

محسن بولا "اگر تم ایسا سمجھتے ہو......"

"میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کررہا ہوں" میں نے کہا۔

"یار! میں نے تو ایڈیٹری قبول نہیں کی' مجھے کیوں سمجھا رہے ہو؟ اسے سمجھاتے نا۔ غالب کے دُم چھلے کو۔"

"یعنی نازو کو" گُل نے مذاق میں بات بدلنے کی کوشش کی۔

"وہ دُم چھلی ہے" محسن بولا۔

رابعہ نے کہا "تم ابھی سے اتنے سیریس کیوں ہو رہے ہو؟ ابھی تو کچھ بھی نہیں ہوا۔"

"یعنی سب کچھ ہو جانے کا انتظار کروں میں؟ پھر سیریس ہونے میں کوئی حرج نہیں" میں نے جھنجلا کر کہا۔

"میرا مطلب تھا کہ ہم غالب کو سمجھائیں گے۔ ابھی اس نے صرف تجویز سے اتفاق کیا ہے' نہ اخبار نکالا ہے' نہ وہ سب ہوا ہے جس کا تمہیں اندیشہ ہے کہ ہوگا۔ ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے" محسن نے کہا۔

"پہلی بات تو یہ کہ یہاں بیٹھ کے ہم کچھ نہیں کرسکتے۔ دوسری بات جو اصل بات تھی" میں نے کہا "پیڈرو کو فوراً چلتا کرو۔"

گل نے کہا "اکیلے پیڈرو کو وہ کہاں جانے دیں گے۔ جائے گا وہ ہم سب کے ساتھ۔ پھر ظاہر ہے' ہمارے راستے الگ ہوں گے۔"

میں نے کہا "آخر تم خود کیوں ڈرتی ہو بات کرتے ہوئے؟ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ طافو کہاں ہوگا؟"

"معلوم تو ہے۔ وہ سب اسی جنگل میں آس پاس چھپے بیٹھے ہیں۔ میں نے پیڈرو سے کہا تھا کہ طافو کو بلا لائے' بات ہم خود کرلیں گے" گل نے کہا "اصل بات تو ان کا مطالبہ پورا کرنے کی ہے۔"

"ان کا مطالبہ پورا کردیا جائے گا" میں نے کہا "وہ جتنی رقم مانگتے ہیں انہیں مل جائے گی۔"

"کیسے مل جائے گی؟" محسن بولا۔

"بس مل جائے گی" میں نے چڑ کے کہا "کسی نہ کسی ذریعے سے۔ ظاہر ہے ہماری جیب میں تو ہے نہیں۔"

رابعہ نے کہا "منظر سے کہیں گے یا یوسف سے۔"

"کیسے کہیں گے؟ یہاں فون تو ہے نہیں" میں نے کہا۔

گُل مسکرائی "سب کچھ ہے بھائی سکندر۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔"

اچانک مجھے کچھ یاد آیا "رابعہ! وہ لڑکا کہاں ہے؟ شان۔"

رابعہ کا رنگ ایک دم اُڑ گیا "شان......"

"ہاں۔ وہ اخبار فروش لڑکا" میں نے کہا۔

"تمہیں نہیں معلوم؟" رابعہ نے افسردگی سے کہا۔

"کیا خدانخواستہ......"

"ہاں۔ وہ مارا گیا غالباً' اسے گولی لگی تھی سینے پر۔ میں نے اسے گرتے بھی دیکھا تھا۔" رابعہ نے کہا "وہ خاصا زخمی تھا۔"

"خدا کرے وہ بچ گیا ہو" میں نے افسوس سے کہا۔

"کیکر شاہ کے مریدوں سے بچ گیا تو اکبر خان مار دے گا۔ اگر زندہ رہا تو وہ خود آجائے گا۔" رابعہ نے کہا "مجھے تو اس بے چاری کا بھی خیال آرہا ہے۔"

میں نے کہا "اس جیسی عورتوں کو تم بے چاری کہہ رہی ہو؟"

"مجبور تو وہ بھی تھی۔ سب کچھ حاصل تھا اسے سوائے اپنی زندگی پر اختیار کے۔" رابعہ نے کہا "تم بھی کیا کم ہو اکبر خان سے۔"

"کیا! تم میرا مقابلہ اکبر خان سے کررہی ہو" میں نے بگڑ کے

کہا۔

"وہ اکبرِ اعظم تھا تو تم سکندرِ اعظم ہو۔ ایسی سنگدلی کا مظاہرہ کیا۔ کہ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ دل توڑ دیا تم نے اس کا" رابعہ شرارت پر آمادہ تھی۔

"بھئی یہ کیا قصہ ہے؟" محسن چونکا "کون تھی وہ......؟"

رابعہ نے خوب نمک مرچ لگا کے سب بتایا لیکن میں مشتعل نہیں ہوا اور شرمندہ بھی نہیں ہوا۔ میرا دھیان ادھر تھا ہی نہیں۔ میں دیکھ رہا تھا کہ صبح سے دوپہر ہونے کو آگئی ہے لیکن ابھی تک معاملات وہیں رُکے ہوئے ہیں۔ ہم سب یوں گپ شپ میں مگن تھے جیسے یہ ڈاکوؤں کا ڈیرہ نہیں' اپنے گھر کا ڈرائنگ روم ہو۔ محسن اور گل کے مل جانے کے بعد دورِ مفارقت کے آلام اور اندیشے تو ختم ہوگئے تھے اور یہ بات بھی باعثِ اطمینان تھی کہ غالب اور نازو بحفاظت نکلنے میں کامیاب رہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ سب فکر فردا اور غم دوش سے آزاد ہوگئے۔ ان ڈاکوؤں کے چنگل سے رہائی کا مسئلہ صرف پیسے سے حل ہوسکتا تھا اور مجھے یقین تھا کہ منظر کہیں نہ کہیں سے رقم اکٹھی کرلے گا۔ رابعہ کی فرم کو وہی چلا رہا تھا' وزیر خاں ٹرسٹ اس کی نگرانی میں چل رہا تھا۔ اس کے اپنے بھی تھوڑے بہت وسائل تھے۔ وہ یوسف سے بھی کہہ سکتا تھا جس کا سسر کوئی بڑی توپ قسم کی چیز تھا۔ اور ان سب کے بعد پشاور میں آصف علی تھا۔ پندرہ لاکھ میرے لیے اس اعتبار سے بڑی رقم نہیں تھی کہ اب چوہدری دلاور بھی مجھ سے میری شرائط پر صلح کے لیے تیار تھا۔ رابعہ کو اس کی کوٹھی کا قبضہ مل گیا تھا اور مجھے اپنے آبائی گھر کا۔ چوہدری دلاور میرے والد وزیر خاں کے کارخانے کی جگہ قائم ہونے والے وزیر خاں ٹرسٹ اسپتال کا انتظام و انصرام میرے حوالے کرنے پر راضی تھا اور میرے اب تک ہونے والے نقصانات کی تلافی پر بھی آمادہ تھا۔ کسی اصولی مسئلے پر مفاہمت کیے بغیر اپنے دشمن سے پُرانے قرض کا حساب لینا جائز تھا۔

جب دوپہر ہوگئی تو باقی سب کو بھی تشویش لاحق ہونے لگی۔ محسن نے کہا "دال میں کچھ کالا ہے مس گل بانو۔"

"اور اتنا ہی کالا ہے جتنا خود پیڈرو یا اس کا اعمال نامہ۔" میں نے کہا "اس کے اور طافو کے درمیان کیا مسئلہ کشمیر پر مذاکرات چل رہے ہیں کہ ختم ہونے میں نہیں آتے۔"

"میں نے تو بس طافو کے لیے پیغام دیا تھا کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ وہ سب کے ساتھ آجائے اور بات کرے۔" گُل نے کہا۔

"وہ سب کے ساتھ شاید نہ آئے" محسن نے کہا۔

"اکیلا آجائے۔ آئے تو سہی۔ یہ کیا کہ پیڈرو کو بھی بٹھا لیا انہوں نے" میں نے کہا۔

"کیا پتا لٹکا دیا ہو" محسن نے کہا "قبر میں......"

"کس نے کسے لٹکا دیا ہو؟ طافو نے پیڈرو کو یا پیڈرو نے طافو کو؟ دونوں میں سے کوئی بھی کم نہیں ہے" رابعہ نے کہا۔

میں نے کہا "مذاق چھوڑو۔ گُل! میرے ساتھ چلو تم۔"

"میں چلوں۔"

"ہاں۔ تمہیں تو اندازہ ہے نا کہ وہ کہاں ملیں گے۔ ہم خود انہیں تلاش کرکے لاتے ہیں۔ دیکھتے ہیں معاملہ کیا ہے۔ ایسی کیا بات ہوگئی ہے کہ وہ سامنے آنے سے ہی ڈرتے ہیں۔ انہیں تم پر تو اعتماد ہونا چاہیے۔" میں نے کہا۔

رابعہ نے کہا "تم اتنے بڑے جنگل میں انہیں کہاں تلاش کروگے اور کیسے؟"

میں نے کہا "گُل نے بتایا تھا کہ ایک جیپ یہاں ہر وقت تیار رہتی ہے۔"

گل نے اقرار میں سر ہلایا "جیپ تو ہے۔"

"چابیاں نہیں ہیں" میں نے کہا "کوئی بات نہیں' میں چابی کے بغیر بھی اسٹارٹ کرلوں گا۔"

رابعہ نے کہا "ایسے ہی مت جاؤ۔ میرا مطلب ہے خالی ہاتھ۔"

"پھر کیا توپ لے کر جاؤں اور توپ ہے کہاں جو لے جاؤں۔ ویسے بھی میں صلح صفائی کی بات کرنے جارہا ہوں۔" میں نے کہا۔

گل اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے ساتھ میں ڈاک بنگلے کے پیچھے گیا۔ وہاں سے ایک راستہ درختوں کے بیچ میں سے نشیب کی جانب جاتا نظر آرہا تھا۔ گل میرے ساتھ چلتی گئی اور چند منٹ بعد میں نے پلٹ کے دیکھا تو پرانے ڈاک بنگلے کی عمارت درختوں میں چھپ گئی تھی۔

میں نے کہا "گل! تمہیں تو معلوم ہوگا' یہ لوگ اپنا مالِ غنیمت کہاں رکھتے ہیں؟"

گل نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا "آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

میں نے ہنس کے کہا "ڈرو نہیں۔ میرا کوئی ارادہ نہیں ہے اس پر قبضہ کرنے ..."

گُل نے کہا' "... کرنا بھائی سکندر! میں اس سوال کا جواب نہیں دوں گی۔ میں جھوٹ نہیں بول سکتی آپ سے اور سچ بول کے اپنا اعتماد گنوانا نہیں چاہتی۔"

میں نے کہا "اسلحہ بھی بہت ہوگا ان کے پاس۔"

"ڈاکو ہیں آخر۔ اسلحہ ان کی ضرورت ہے۔"

میں نے کہا "اسلحے کی ضرورت ہمیں بھی ہے۔"

گُل نے کہا "میں بات کروں گی طافو سے۔"

"ہم قیمت بھی ادا کرسکتے ہیں۔"

"اگر اسے اعتراض نہ ہوا تو وہ بلا معاوضہ دے گا۔ قیمت کیسے مانگ سکتا ہے وہ مجھ سے" گل نے کچھ غرور سے کہا۔

"تمہیں ابھی تک خوش فہمی ہے کہ تم ان کی سردار ہو؟"

"میرا حکم کوئی نہیں ٹال سکتا۔ آزما کے دیکھ لو" وہ بولی۔

"پھر تم کہو ان سے کہ وہ خود کو قانون کے حوالے کردیں" میں نے غیر سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"میں ایسا کوئی حکم نہیں دوں گی جو ان کے مفاد کے خلاف ہو یا جس سے ان کو نقصان ہو۔ اسی لیے وہ اعتماد کرتے ہیں مجھ پر۔ ان کے لیے میں آج بھی ناگ منی ہوں۔ وہ کسی گل بانو کی اطاعت نہیں کریں گے۔ یہ محض ایک اتفاق تھا جس نے مجھے پھر ان کے درمیان پہنچادیا تھا۔ اس کے بعد تو یہ خود بھی ایک دوسرے سے نہیں ملیں گے۔ میں واقعی چاہتی ہوں کہ ان کی مدد کروں۔ جتنا عرصہ میں یہاں رہی' ان کو قائل کرتی رہی کہ وہ یہ پیشہ چھوڑ دیں۔"

"اور تمہارا کیا خیال ہے' تمہاری نصیحت نے ان کے دل پر اتنا اثر کیا کہ وہ مان گئے؟"

"نہیں۔ وہ پہلے ہی یہ سوچ رہے تھے۔ حالات بہت بدل گئے ہیں اور وہ محسوس کرتے ہیں کہ آہستہ آہستہ ان کے لیے مواقع محدود ہوتے جارہے ہیں۔ تعلیم نے رائے عامہ کو متاثر کیا ہے' رائے عامہ کا اثر اخبارات پر ہے اور اخبارات پہلے سے زیادہ کھل کر پولیس کے خلاف لکھنے لگے ہیں اور انتظامیہ کی بدعنوانی پر تنقید نے قانون کے محافظوں کو صورتِ حال کی نزاکت کا احساس دلادیا ہے۔ وقت اور بدلے گا اور پھر عوام میں شعور بھی پیدا ہوگا کہ وہ لاقانونیت کے سیلاب کو دیوار بن کے روکنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ یہ سب میں نے بھی اچھی طرح سمجھایا انہیں اور ان کے سامنے ایک پُرسکون' شریفانہ زندگی' ایک گھر' بیوی بچوں کے دم قدم سے ملنے والی خوشی اور طمانیت کا نقشہ کھینچا۔ خواب تو یہ لوگ بھی ہمیشہ دیکھتے ہیں ایک ایسی زندگی کے جس میں کوئی خوف اور ڈر نہ ہو' پکڑے جانے کا اور جیل کی ذلت اور صعوبت کا' کسی پولیس مقابلے میں مارے جانے کا یا تختۂ دار کا۔ خواب کون نہیں دیکھتا مگر یہ سمجھتے ہیں کہ کسی خواب کی تعبیر ان کی دسترس میں نہیں۔ میں نے اور محسن نے یہاں رہ کے اور کیا کام کیا۔ یہی کہ انہیں بے یقینی سے نکالا' انہیں بتایا کہ وہ اپنے ماضی سے رشتے توڑ کے پھر دنیا میں جاسکتے ہیں' عزت حاصل کرسکتے ہیں اور سکون کے ساتھ آرام کی زندگی بھی بسر کرسکتے ہیں۔ ان کے سامنے راستے نہیں تھے یا انہیں نظر نہیں آتے تھے۔ ہم نے انہیں یہ راستے دکھائے۔ کون کیا کرسکتا ہے' کہاں جاسکتا ہے۔ ایک نئی زندگی کی طرف پہلا قدم اُٹھانا ہی سب سے کٹھن مرحلہ ہوتا ہے' اس کے بعد تو آدمی خود آگے بڑھتا جاتا ہے..... یہ ہے وہ جیپ۔"

میں گل کی باتوں میں اتنا منہمک ہوگیا تھا کہ مسافت کا پتا ہی نہیں چلا۔ اس لڑکی نے جو دیکھنے میں سیدھی سادی اور کم عقل لگتی تھی' نازو کی تیزی طرّاری اور رابعہ قاری ایڈووکیٹ ہائی کورٹ کی عقل وذہانت پر کئی طرح سے برتری حاصل کرلی تھی۔ اس کی شخصیت کا ہر پہلو اتنا بھرپور' جاندار اور عمیق تھا کہ حیرت ہوتی تھی۔ وہ ناگ منی تھی تب بھی اس کے حوصلے کو اس کی ذہ... اور قوتِ عمل کی حمایت حاصل تھی۔ جب اس نے ... تب بھی اس کی فطرت کی یہی نمایاں صفات سامنے آئیں ... واپس زندگی کی طرف لانے کے بعد آج ایک بار پھر وہ ناگ... دوسرے روپ میں غیر معمولی اعتماد کا مظاہرہ کررہی تھی اور ... جدوجہد نے ڈاکوؤں کے ایک گروہ کو صراطِ مستقیم پر ... اُٹھانے کے لیے سوچنے پر مجبور کردیا تھا اور وہ بہت بڑا ... ان بھٹکے ہوئے لوگوں کو اس گھر تک پہنچادے گی جو ان ... خوابوں کی تعبیر تھا۔ نیکی کرنے کے مواقع بھی وسائل کا ... کرتے۔ چھوٹی بڑی نیکیاں سب کے راستے میں کنکروں کی ... طرح بکھری پڑی رہتی ہیں۔ جو نیت اور ارادہ کرلے وہ ... اُٹھالے۔ گل نے تو بہت بڑا کام کرنے کا سوچا تھا۔ وہ ایک ... اپنی جگہ سے سرکانا چاہتی تھی۔

جیپ وہی پرانا ملٹری ماڈل تھی جس کی صورت شکل کو ... دیکھتا۔ مضبوطی میں جیسی وہ بیس سال پہلے تھی ویسی ہی آج ... شاید اگلے بیس سال میں بھی کوئی فرق نہیں پڑسکتا تھا۔ ... پر اور زمانۂ امن میں' ریگستانوں میں اور جنگلوں میں ... راستوں پر اور دلدلی علاقوں میں اپنی افادیت ثابت کرچکی تھی ... ور سپاہی اسے کہیں بھی قابلِ اعتماد ساتھی کے طور پر لے جا... وقت ایسا بدلا تھا کہ وہی سواری اب ڈاکو بھی استعمال کر... اور اسمگلر بھی۔

گل کی بات پر یقین کرتے ہوئے کہ اس کو وقتِ ضرورت کے لیے بالکل فٹ اور ریڈی رکھا جاتا تھا' میں نے اس ... اُٹھاکے سیلف کے تار الگ کیے اور سوئچ کو ایک پیچ کر... گھماکے آن کیا۔ یہ نہ ہوتا تو میں اس کے بھی تار جوڑتا۔ ایک بار غرانے کے انداز میں گھوما اور بند ہوگیا۔ دوسری بار کرنے سے پہلے میں نے گل سے کہا "اندر بیٹھ کے ایکسیلیٹر ... جب میں کہوں۔"

گل ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی "یس باس۔"

میں نے پھر تار ملا کے کہا "چلو ایکسیلیٹر ... دو۔"

انجن پھر گھوما اور ایک جھٹکے سے اسٹارٹ ہوگیا۔ اس ... ہی بتاتی تھی کہ ٹیوننگ بالکل ٹھیک ہے۔ میں گل کے ساتھ ... "اب بتاؤ پہلے کس طرف۔"

گل نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ "وہ ہے پہاڑی۔ آ... پر ایک درخت نظر آرہا ہے سب سے الگ؟"

"بالکل صاف نظر آرہا ہے۔"

"اسے فرض کریں بارہ کا ہندسہ۔ اپنے دونوں بازو ... دایاں ہاتھ چھوٹی سوئی' بایاں ہاتھ بڑی سوئی۔ دائیں طر... شروع کریں تو پانچ بج کے دس منٹ۔ بائیں جانب ... پچاس منٹ والی پوزیشن پر چلیں۔"

میں نے کہا "کس کی پوزیشن؟ چھوٹی سوئی کی یا بڑی سوئی کی؟"

گل نے کہا "بڑی سوئی سے ہی منٹ کی سمت معلوم ہوسکتی ..."

میں نے کلاک وائز گھومنے کا فیصلہ کیا۔ "شروع کہاں سے کرنا ہے؟"

"اسی درخت سے۔ وہاں پہنچنے کا راستہ میں بتاتی ہوں۔"

وہ جنگل کے راستوں سے اس طرح واقف تھی جیسے شہر کا لڑکا اپنے محلے کی گلیوں سے ہوتا ہے۔ گل راہنمائی نہ کرتی تو نہ جانے کتنی جگہ مجھے راستہ بند ملتا یا جیپ کہیں اور نکل جاتی۔ وہ پہاڑی قریب جانے پر مٹی کا ٹیلہ ثابت ہوئی۔ گل نے جس درخت کی طرف اشارہ کیا تھا وہ انگریزی حرف وائی یا غلیل کی شکل کا تھا۔ اوپر جاکے اس کا تنا بڑی صفائی سے دو حصوں میں بٹ گیا تھا۔

اب جیپ کو ایک دائرے میں سفر کرنا تھا اور مجھے یہ فرض کرنا تھا کہ یہ دائرہ نہیں' ایک بہت بڑی گھڑی کا ڈائل ہے جس پر نظر نہ آنے والے ہندسے لکھے ہوئے ہیں۔ باقی سب مجھے چشمِ تصور سے دیکھنا تھا کہ بارہ کے بعد ایک کا ہندسہ کہاں ہوگا اور دو کا اس سے کتنے فاصلے پر۔ یہ تقریباً ایک فرلانگ نصف قطر کا ڈائل بنتا تھا۔ دسویں جماعت میں پڑھا ہوا گولڈن حساب' گولڈن الجبرا اور گولڈن جیومیٹری تو میں امتحان دیتے ہی بھول گیا تھا۔ اب عام زندگی میں جمع تفریق اور ضرب تقسیم کے علاوہ کبھی جیومیٹری کی ضرورت پڑتی تھی تو کسی کمرے کی لمبائی چوڑائی ناپنے کے لیے یا کسی دیوار کا رقبہ معلوم کرنے کے لیے۔ روپے' آنے پائی اور سیر' چھٹانک' تولہ' ماشہ ختم ہوچکے تھے۔ روز مرّہ کے لین دین کی رقم گننے کے سوا کبھی اکاؤنٹس سے بھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ یہ کون کم بخت یاد رکھ سکتا تھا کہ نصف قطر ایک فرلانگ کا ہو تو دائرے کا محیط کتنا ہوگا اور اس کو بارہ سے تقسیم کیا جائے تو ہر ہندسہ کتنا فاصلہ طے کرنے کے بعد آئے گا۔

میری زیادہ توجہ ڈرائیونگ پر تھی اور کان گُل کی آواز پر لگے ہوئے تھے۔ ادھر سے موڑو' ادھر چلو' اس درخت کے پیچھے نالہ ہے' ادھر گڑھا ہے' بائیں طرف پول ہے' دائیں جانب خاصا بڑا چٹان جیسا پتھر ہے۔

میں نے کہا "کیا اب تک سب ویسا ہی ہوگا؟"

وہ ہنسی "کیوں نہیں ہوگا۔ یہاں کون سا ترقیاتی کام ہورہا ہے۔ مجھے تو ایک درخت بھی کم نہیں لگا۔"

"تو بھی تم نے گن رکھے تھے" میں نے کہا "تم کو تو ہونا چاہیے تھا محکمۂ جنگلات میں۔"

"یہ ایک کا ہندسہ سمجھ لو" اس نے ایک جھونپڑے کی طرف اشارہ کیا "یہاں ایک فقیر کا ڈیرا تھا۔ لوگ خواہ مخواہ اس کے مرید ہوگئے۔ بالآخر وہ ایک مریدنی کے ساتھ بھاگ گیا۔"

"ثم المطلب۔ مطلب یہ کہ مطلوب بھی یہی تھا۔ اچھا پیشہ ہے یہ بھی۔ جب کرنے کو کچھ نہ رہا تو یہی کریں گے۔"

جیپ چلتی گئی۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا مگر راستہ ایسا تھا کہ لگتا تھا' میں "پیرس۔ ڈیکار" ریلی میں شریک ہوں جو دنیا کی مشکل ترین کاروں کی ریس ہے اور اس کا راستہ بحرِ ظلمات کے علاوہ ہر جگہ سے گزرتا ہے۔

ہر جگہ جہاں کسی بندے کا وجود فرض کیا جاسکتا تھا' گل نے رک کے کچھ دیکھا تھا اور پھر دو انگلیاں منہ میں ڈال کے سیٹی بجائی تھی۔ پہلی بار تو میں دنگ رہ گیا تھا کیونکہ میں نے کبھی لڑکیوں کو یوں سیٹی بجاتے نہیں دیکھا تھا۔ خود میں اس فن سے نابلد تھا۔ ابّا مرحوم کا خیال تھا کہ یہ سب کام شہدے لفنگے کرتے ہیں۔ مثلاً گولیاں کھیلنا' پتنگ بازی' بٹیر بازی' لٹو گھمانا اور ایسے سیٹی بجانا..... اگلے وقتوں کے تھے وہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو!

گیارہ بج کے پچیس منٹ کی پوزیشن پر اچانک طافو جیپ کے سامنے آگیا۔ میں یوں چونکا جیسے آدمی نہیں' میری راہ میں کوئی آدم خور شیر آگیا ہو۔ یہ جگہ ڈاک بنگلے سے بھی ایک فرلانگ دور تھوڑا سا بائیں ہاتھ کی جانب تھی جہاں ہم نصف دائرے کا سفر طے کرکے پہنچے تھے۔ طافو کی رائفل اس کے کندھے پر تھی۔

میں نے کہا "من موجی صاحب! بالآخر ہم نے آپ کو تلاش کرلیا۔"

لیکن من موجی کی نظر گُل پر رہی "یہ جیپ اس لیے نہیں تھی۔"

میں نے کہا "ضرورت پڑنے پر حرام بھی حلال ہوجاتا ہے اور اس کا استعمال تو حرام کے زمرے میں بھی نہیں آتا۔ یہ بتاؤ کہ تم آئے کیوں نہیں؟ ہم صبح سے انتظار کررہے تھے۔"

اس نے میرے سوال کو نظرانداز کردیا۔ "جیپ اسٹارٹ کیسے ہوئی؟"

"مجھ سے پوچھو نا یار۔" میں نے کہا "میں سب کچھ کرسکتا ہوں۔ بغیر چابی کے بھی گاڑی چلاسکتا ہوں اور بغیر پہیوں کے بھی۔"

گُل نے کہا "گاڑی میں بیٹھو۔ تمہارا دماغ خراب ہورہا ہے شاید۔ کیا تم مجھ پر بھی اعتبار نہیں کرتے۔"

"یہ کون کہتا ہے؟"

"پھر میں نے بلایا تھا تو آئے کیوں نہیں تھے؟" گل کا لہجہ واقعی ڈاکوؤں کی سردار جیسا ہوگیا تھا۔

"مجھے کوئی بلانے کے لیے نہیں آیا۔"

"میں نے پیڈرو کو بھیجا تھا" گل نے کہا "تین گھنٹے ہوگئے۔"

طافو نے نفی میں سرہلایا "وہ مجھے نہیں ملا۔ میں نے اسے نہیں دیکھا۔ وہ چکمہ دے کر نکل گیا ہوگا۔"

"چلو جانے دو اسے۔ اگر وہ چلا گیا ہے تو ہماری بلا سے۔ تم بیٹھو" گل نے کہا۔

"کہیں.... وہ پولیس کو نہ لے آئے۔ وہ آدمی ایسا ہی تھا۔ اس نے کہا تھا......" طافو سوچ میں پڑ گیا۔

"کیا کہا تھا؟"

"اس نے کہا تھا کہ طافو بیٹا اب تمہاری خیر نہیں۔ یہ جو تمہاری ناگ منی کے ساتھی ہیں' یہ سب بڑے خطرناک لوگ ہیں۔ وہ جو فرار ہو گئے' انہیں بھی جان بوجھ کے موقع دیا گیا تھا۔ ایک اخباری نمائندہ تھا' دوسری رپورٹر تھی اور.... اس کے بارے میں بتایا تھا کہ یہ کمانڈو ہے۔ جو اس کی ساتھی ہے وہ کوئی بہت بڑی وکیل ہے۔ یہ سچ ہے؟"

"سچ ہے پھر؟ تم کو میرے ساتھیوں سے کیا؟"

"دیکھ ناگ منی! ہم نے تو شیش ناگ کی بہن سمجھ کے اعتبار کیا تھا تجھ پر اور تجھے مہمان بنا کے رکھا تھا مگر تو نے جھوٹ بولا تھا ہم سے کہ تو نے شادی کر لی ہے.... وہ تیرا گھر والا تو نہیں تھا۔"

"طافو! میں تو وہی ہوں...."

"نہیں ناگ منی۔ تو اب گُل بانو ہے اور تیری نیت ٹھیک نہیں لگتی مجھے۔ تو ہم سب کو پکڑوانا چاہتی ہے۔" طافو بولا "پیڈرو نے کہا تھا کہ ذرا بچ کے رہنا' یہ سب خدائی فوج دار ہیں۔ ساری دنیا کو ٹھیک کرنے کا ٹھیکا لے رکھا ہے انہوں نے۔ تمہیں پتا بھی نہیں چلے گا اور سب اندر نظر آؤ گے۔ کہہ دے کہ یہ بھی جھوٹ ہے۔"

"یہ جھوٹ ہے۔ جھوٹ ہے سب طافو۔ میں یہاں کسی کو پکڑوانے کے لیے نہیں آئی تھی۔ مجھے تو تم لوگ یہاں لائے تھے۔"

"لیکن باقی سب لوگوں کو تو نے بلوایا تھا۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ وہ کون لوگ ہیں۔"

"وہ میرے ساتھی ہیں اور ان کی ذمّے دار میں ہوں۔ میں نے وعدہ کیا ہے کہ تم کو کچھ نہیں ہو گا تو یہ ان سب کا وعدہ ہے۔"

میں نے کہا "پیڈرو حرامی پن کر گیا ہے جاتے جاتے۔ گُل ٹھیک کہتی ہے۔ ہم تمہیں گرفتار کرانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ تم بلاوجہ محاصرہ کیے بیٹھے ہو۔ ہمارے ساتھ چلو۔ ہم تمہاری مدد کرنا چاہتے ہیں۔ جتنی رقم کو تم اپنا حق سمجھتے ہو وہ تمہیں مل جائے گی۔ وہ قرض شیش ناگ کا ہے تو اسے ناگ منی چکائے گی مگر ناگ منی اب میری بہن گُل بانو ہے' اس کا قرض میرا قرض ہے۔"

"ناگ منی! کیا یہ ٹھیک کہہ رہا ہے؟"

گُل نے کہا "تم کو اعتبار کر لینا چاہیے طافو۔"

"قسم کھا اپنے بھائی کے خون کی۔ کہ اس میں کوئی دھوکا' فریب نہیں ہے۔"

"میں قسم کھاتی ہوں شیش ناگ کے خون کی جو میرے لیے باپ کی جگہ تھا" گُل نے چلّا کے کہا "اس میں کوئی دھوکا نہیں۔ دھوکا تو تم نے کیا تھا میرے ساتھ کہ مہمان رکھا اور پھر قیدی بنا لیا۔

کہاں سے لا کے دیتی میں وہ رقم تم کو جس کے بارے میں مجھے معلوم ہی نہیں تھا۔ یہ شیش ناگ نہیں' سکندر ہے۔ میرا یار یہ بھی' جو مردوں کی طرح قول دے کر نبھانا جانتا ہے۔ تمہاری طرح اعتماد کا فریب نہیں دیتا۔ تم کیا چیز ہو طافو' تمہاری اوقات بھی کچھ نہیں۔ ایک منٹ میں تم جیسے چار ہوں تو اس کے سامنے چت ہو جائیں لیکن ابھی تک اس نے تمہیں کچھ نہیں کہا تو میری وجہ سے...."

"لیکن اب بھی انکار کیا تم نے تو میں تمہیں ایسے ... گا" میں نے اس کی شلوار کے نیفے کو پکڑ کے جھٹکے سے اوپر اٹھایا دائیں ہاتھ سے گھما کے احتیاط کے ساتھ جیپ کی سیٹ پر ڈال دیا۔ اس کی رائفل پہلے ہی نیچے گر گئی تھی۔

طافو چند سیکنڈ ہکّا بکّا بیٹھا رہا اور سوچتا رہا کہ چند سیکنڈ میں کیا ہوا تھا۔ آسمان گھوم کے اس کی ٹانگوں میں سے نکل گیا تھا۔

لیکن میرے سامنے آتے وقت وہ بھی اپنی حفاظت کے خیال سے غافل نہیں تھا۔ اس کے ساتھی وہیں چھپے بیٹھے تھے۔ پلک جھپکنے میں تین طرف سے تین آدمی بندوق کا رخ میرے طرف کیے نمودار ہو گئے۔

میں نے ہتھیار ڈالنے کے انداز میں ہاتھ اوپر اٹھائے "پورا لشکر ہے مقابلے پر اور وہ بھی مسلح۔ مروا دیا تم نے گُل" میں نے کہا جیسے مجھے اپنی حماقت پر ندامت ہے۔

وہ میرے قریب آ گئے "اس کے لیے کیا حکم ہے سردار؟" ان میں سے ایک نے رائفل سیدھی کر کے کہا "مار دوں یا ... موت؟"

"پاگل ہوا ہے..." طافو نے اسے گالی دی "گولی مت چلانا ورنہ اس کی چیختی آواز سُن لے گی تو سیدھی ادھر لے آئے گی پولیس کو۔"

"طافو! پاگل تم ہو رہے ہو۔ کہاں ہے پولیس؟"

"مت چکر دے ہمیں ناگ منی" طافو نے کہا "میں نے انتظام نہ کیا ہوتا تو تیرا بھائی مجھے ویسے ہی پکڑ کے لے جاتا۔ اسے کیوں لے کر آئی تھی یہاں آخر؟ مار کے لمبا ڈال دو اسے۔"

یہ آخری بات طافو نے اپنے ساتھیوں سے کہی تھی۔ وہ تین طرف سے مجھ پر پل پڑے۔ ان کا ارادہ مجھے بندوقوں کے بٹ سے مار مار کے لمبا ڈالنے کا تھا۔ وہ سخت جان اور مضبوط جوان مرد تھے جن کا مقابلہ عام آدمی نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے انہیں جان بوجھ کر قریب آنے کا موقع دیا تھا۔ پہلے شخص نے مجھ پر حملہ کیا اِدھر میں نے گھوم کے اس کو لات ماری اور وہ اپنے ہی زور میں جیپ کی باڈی پر جا گرا۔ میرے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی نے سوپ نے دوسرے کو سنبھلنے کا موقع ہی نہ دیا۔ ... شانے پر پڑی اور وہ درد سے بلبلایا۔ تیسرے کو البتہ موقع مل گیا اور اس نے مجھ پر رائفل کا بٹ مارا۔ میں نے خود کو بچانے کی کوشش کی پھر بھی بٹ بازو سے رگڑ کھاتا گزرا۔ پھر میں نے اسے گھٹنا مار کے نیچے جھکایا اور پلٹ کے اوپر اُچھال دیا۔ وہ جیپ کے اوپر سے گزرا اور دوسری طرف چت گرا۔ اتنی دیر میں پہلا اُٹھ کھڑا ہوا تھا اور طافو بھی صورتِ حال کی سنگینی دیکھتے ہوئے نیچے اُتر کے رائفل اٹھا رہا تھا۔ میں نے اس کو جو ٹھوکر ماری وہ اس کی ٹھوڑی پر لگی اور وہ ہاتھ اوپر اٹھا کے پیچھے جیپ کے پہیے پر گرا۔ پہلے شخص کی کوشش اب یہ تھی کہ رائفل لوڈ کر لے مگر میں نے اسے بونٹ پر سے کھینچ لیا اور تیسرے شخص پر دے مارا۔ تیسرا شخص مرکھنے بیل کی طرح مجھے ٹکر مارنے آ رہا تھا۔ ان کے آپس کے تصادم کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا۔ اس کے سر ٹکرائے اور وہ کراہ کے ایک ساتھ نیچے گرے۔ گُل نے میری خاصی مدد کی اور فوراً ان کی رائفلوں پر قبضہ کر لیا۔ طافو ابھی اٹھ ہی رہا تھا کہ جیپ کے دوسری طرف گرنے والے نے رائفل سنبھال لی۔

"خبردار! میں گولی مار دوں گا" اس نے چیخ کے کہا۔

میں نے جھپٹ کے طافو کو اپنے سامنے کر لیا "مارو۔ تمہارا نشانہ بھی آزما لیں۔ معلوم ہے نا دل کہاں ہوتا ہے۔"

طافو... بے بسی سے پھنکار رہا تھا اور میری گرفت میں مچل رہا تھا مگر میں نے اسے پیچھے سے آرم لاک لگا دیا تھا۔ وہ اب گالیاں بک رہا تھا "تو نے جھوٹی قسم کھائی تھی بے غیرت۔ دھوکے باز۔ شیش ناگ کے خون کو رسوا کیا تو نے۔"

گُل آگے آئی۔ اس نے طافو کے منہ پر تھپڑ مارا "مجھے اپنے وعدے کا خیال نہ ہوتا تو میں چار لاشیں چھوڑ کے جاتی۔ لیکن میں اب بھی کہتی ہوں کہ سیدھی طرح ہمارے ساتھ چل۔"

طافو نے اسے لات ماری "دفع ہو یہاں سے کنجری۔"

اب میں نے پیچھے سے سر کو گرز کی طرح استعمال کیا اور اس کے سر کے پچھلے حصے پر ضرب لگائی۔ "جان سے مار ڈالوں گا اگر تو نے گالی دی گُل کو۔ میرے ہاتھ پاؤں گُل کے وعدہ نے باندھ دیے ہیں طافو ورنہ تیری تو لاش کے ٹکڑے کر دیتا میں۔ چیر کے ڈال دیتا تجھے۔"

مجھ پر فائر کرنے کی دھمکی دینے والا بھی حواس باختہ ہو گیا تھا اور اس کے ہاتھ میں رائفل کانپ رہی تھی۔ اچانک گُل نے پلٹ کے ایک رائفل کو اس کے ہاتھ پر ڈنڈے کی طرح مارا۔ میں نے طافو کو پیچھے سے اُٹھایا اور اوپر سے اچھال کے اس کی طرف پھینکا۔ ابھی وہ دوسری طرف گرا بھی نہ تھا کہ میں پھر پہنچ گیا۔

گُل نے رائفل کا رخ طافو کی طرف کر لیا "بس طافو! بہت ہو گئی۔ اب میں گولی مار دوں گی۔ جس نے بھی سکندر پر ہاتھ اُٹھایا' اس کی لاش گرے گی۔"

طافو جہاں تھا وہیں کھڑا رہ گیا "گُل.... تو جا... ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دے" اس نے بڑی مشکل سے ہانپتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ تم ہمارے ساتھ چلو گے" گُل نے کہا "باقی سب کو بھی سمجھا دو کہ آدھے گھنٹے میں ڈیرے پر پہنچ جائیں۔"

"ہمیں کچھ نہیں چاہیے..... تو چلی جا سب کے ساتھ۔"

"اب میں قرض چکائے بنا نہیں جا سکتی۔ جیسا میرا پہلا بھائی تھا ویسا ہی یہ بھائی ہے۔ جان بچانے کے لیے اس نے جھوٹا وعدہ نہیں کیا تھا۔ یہ میرے وعدے کا پاس رکھنے کے لیے اپنی جان بھی دے سکتا ہے۔ پندرہ لاکھ تو کیا چیز ہیں طافو" گل نے یوں کہا کہ فخر سے میرا سر بلند ہو گیا۔

میں نے نرمی سے کہا "طافو من موجی! یہ سب کچھ نہ ہوتا اگر تم اعتبار کرتے۔ خیر' اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ چلو ہم سب مل کے بیٹھیں گے اور بات کریں گے مردوں کی طرح۔ اس وقت جو ہوا اسے بھول جاؤ۔ سمجھو ہم کل کی طرح آج بھی مہمان ہیں اور تم میزبان ہو۔"

طافو کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے سر ہلایا اور اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا "میں ڈیرے پر جا رہا ہوں۔ تم سب بھی پہنچو۔ ان کو ہوش میں لانے کے بعد آ جانا ورنہ ایسے ہی اٹھا لانا۔"

"یہ ہوش میں ہیں" میں نے زمین پر پڑے ہوئے دونوں افراد کی طرف دیکھا جو اب کُلبلا رہے تھے۔

جیپ کا انجن چل رہا تھا۔ میں نے ڈرائیونگ سنبھالی۔ طافو پیچھے والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس کی رائفل سے میگزین نکال کے گل نے واپس کر دی تھی۔ جیپ کے روانہ ہوتے ہی میں نے عقب نما آئینے میں دیکھا تو طافو کا ہاتھ آہستہ آہستہ سیٹ کے نیچے بڑھ رہا تھا۔

میں نے کہا "طافو! کیسے مرد ہو تم۔ شرم آنی چاہیے تمہیں کہ تم خود کو ڈاکو کہتے ہو لیکن بزدل ہو کسی اٹھائی گیرے کی طرح۔"

اس کا ہاتھ رُک گیا۔ گل نے پلٹ کے دیکھا تو وہ پھر سیدھا ہو کے بیٹھ گیا۔ "تم پھر کچھ کرنا چاہتے تھے طافو؟"

"غالباً سیٹ کے نیچے کوئی ریوالور ہو گا۔" میں نے کہا "فرار کے وقت خالی جیپ ہی تو کام نہیں آتی' اسلحے کی ضرورت بھی پڑتی ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ اس میں پولیس کی پوری بٹالین سے مقابلے کے لیے کافی اسلحہ ہو گا۔ دو چار ریوالور ہوں گے۔ شاید دستی بم بھی ہوں۔ میں نے تلاشی نہیں لی ورنہ سب برآمد کر لیتا۔"

چند منٹ میں جیپ ڈیرے کی شکستہ دیوار سے گزر کے احاطے میں داخل ہوئی تو رابعہ اور محسن پہلے سے برآمدے میں کھڑے تھے۔ انہوں نے جیپ کے انجن کی آواز سُن لی تھی۔ میں نے جیپ بالکل ان کے سامنے روکی۔

"اب یہ ہمارے مہمان ہیں" میں نے طافو کی طرف اشارہ کیا اور جیپ سے اُتر گیا "بڑی مشکل سے منا کے واپس لائے ہیں۔ یہ روٹھ گئے تھے ہم سے بلاوجہ۔"

"پیڈرو کہاں ہے؟" محسن بولا "اسے ساتھ نہیں لائے؟"

"حسبِ توقع اس نے اپنی فطرت کی کمینگی کا مظاہرہ کیا۔ وہ

نکل گیا اور جاتے جاتے ہمارے خلاف بدگمانی اور نفرت کا زہر پھیلا گیا۔"

محسن نے طافو کو غور سے دیکھا۔ "لگتا ہے انہیں منا کے لانے کے لیے بھی تمہیں خاصی کوشش کرنی پڑی۔"

گل نے دوستانہ لہجے میں کہا "چلو طافو! اندر آؤ۔ غلط فہمی دوستوں میں بھی ہو جاتی ہے۔"

میں نے کہا "نیت صاف ہو تو دل بھی صاف ہو جاتے ہیں۔"

طافو کے ساتھی آدھے گھنٹے سے پہلے ہی وہاں جمع ہو گئے۔ وہ سب کچھ پریشان' خوف زدہ اور ناراض لگتے تھے۔ ان میں سے تین کے ساتھ میں نے جو سلوک کیا تھا وہ ان کی حالت سے ظاہر تھا۔ باقی سب اس پر خفا تھے اور ان کی نظروں میں ناگ منی کے خلاف احتجاجی جذبات کی جھلک محسوس کی جا سکتی تھی۔

تھوڑا سا وقت ان سب کے لیے دوستانہ فضا پیدا کرنے اور ان کا اعتماد بحال کرنے میں لگا۔ ہم سب کی کوشش سے بالآخر انہیں یقین آ گیا کہ استاد پیڈرو نے بکواس کی تھی۔ ہم شریف اور پُر امن شہری ہیں۔ بے شک چوروں' ڈاکوؤں اور ملک دشمن عناصر سے رعایت کرنا ہمارا شیوہ نہیں لیکن یہاں مسئلہ ذرا مختلف ہے۔ ناگ منی اگرچہ اپنے بھائی کا قرض ادا کرنے کی پابند نہیں مگر اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شیش ناگ کے پاس ان کی کمائی کا جو اندوختہ محفوظ تھا وہ ایک امانت تھی۔ یقیناً شیش ناگ نے غلطی کی تھی کہ مرتے وقت اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا اور یہ سب کمائی غیر قانونی ہونے کے باوجود خون پسینے کی کمائی تھی۔

میں نے کہا "نہ کسی نے ناگ منی کو براہِ راست کچھ دیا تھا اور نہ ناگ منی نے کبھی یہ کہا تھا کہ وہ کوئی ذمّے داری قبول کر رہی ہے۔ اس پر کسی کا قرض نہیں ہے لیکن اس تعلق کی بنا پر جو تمہارے اور اس کے درمیان رہا تھا' اپنے بھائی کی روح کو قرض کے بوجھ سے نجات دلانے کے لیے اور اس مہمان نوازی کا شکریہ ادا کرنے کے لیے جو اس کے دوبارہ محسن کے ساتھ یہاں آنے پر ہوئی' گل بانو نے اخلاقی طور پر سب کو ان کی جمع کردہ رقم کے برابر دینے کی ذمّے داری قبول کر لی ہے۔ آج میں اس کے بھائی کی جگہ ہوں۔ جس کا دعویٰ ہے میرے سامنے پیش کرے' میں سب کی پائی پائی ادا کردوں گا۔"

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد طافو نے کہا "حساب تو کسی کے پاس بھی لکھا ہوا نہیں ہے۔"

میں نے کہا "تمہیں یاد ہو گا کہ تم نے شیش ناگ کو کتنی رقم دی تھی۔ جو کسی کے پاس امانت رکھواتا ہے وہ اس کا زبانی حساب ضرور رکھتا ہے۔"

طافو نے اقرار میں سر ہلایا "میرے چار لاکھ تھے۔"

"پورے چار لاکھ؟" میں نے کہا۔

"پورے چار لاکھ۔ میں رقم اوپر نیچے نہیں رکھتا تھا ... سے یاد رہے۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ تم بولو" میں نے دوسرے کو اشارہ کیا۔

"میرے سوا تین لاکھ تھے" خلیفہ نے کہا۔

"میرے ڈھائی لاکھ۔" پوپٹ بولا۔

"میں جب دیتا تھا' پچیس ہزار دیتا تھا۔ تیرہ بار دیے تھے۔"

"میں نے دس بار" پوپٹ نے تائید میں سر ہلایا۔

"میں دو لاکھ دے چکا تھا۔" چوتھے شخص نے کہا۔

وہ سب باری باری اپنا حساب بتاتے گئے۔ سب سے ... دینے والا ساتواں شخص تھا جس نے صرف ایک لاکھ مانگے ... خیال ٹھیک تھا۔ کسی نے آنکھیں بند کر کے شیش ناگ کو ... کتاب کے معاملے میں آزاد نہیں چھوڑ دیا تھا۔ اعتبار اپنی ... زبانی ان سب کو اپنی اپنی جمع پونجی کا علم تھا۔ مجموعی رقم پندرہ ... پچاس ہزار ہو چکی تھی۔

ابھی ایک شخص باقی تھا اور یہ وہی شخص تھا جس کی حا... سب کے مقابلے میں خراب نظر آتی تھی۔ وہ گھٹنوں میں سر ... بیٹھا تھا اور کراہ رہا تھا۔

"تم کیوں خاموش بیٹھے ہو؟" میں نے کہا۔

"اور کیا کروں۔ میں نے بھی ایک لاکھ جمع کرائے تھے ... بعد میں لے لیے تھے" اس نے ندامت سے سر جھکا لیا۔

"کیوں لے لیے تھے؟" طافو نے برہمی سے کہا۔

"میری مرضی.... اور دینے والے کی مرضی" وہ بھی کر...

"مجھے ضرورت تھی۔"

"ایسی کیا ضرورت تھی جس کا ہمیں بھی پتا نہیں چلا؟"

وہ تھوڑے سے تذبذب کے بعد بولا "میں نے شادی ... تھی۔"

سب ہنس پڑے۔ طافو نے کہا "اوئے شادی کی تھی تو کون ... جرم کیا تھا۔ چھپانے کی کیا بات تھی۔"

خلیفہ نے کہا "کب کی تھی شادی؟"

"شیش ناگ کی موت سے ایک مہینہ پہلے" وہ بولا۔

"اتنی دھوم دھام سے شادی کی تھی نواب کے بچے ... لاکھ اُڑا دیے" طافو نے کہا۔

اس نے آہستہ سے کہا "شادی پر تو کوئی خرچہ نہیں ہوا تھا۔"

پوپٹ بولا "پھر؟ ولایت سے منگوائی تھی کوئی میم؟ زیور ... کر کے۔"

وہ سب پھر ہنسے "اب حق مہر اس نے پہلے رکھوا لیا ہو گا ... ہے شرع تو یہی ہے۔"

"یہ کون سا مولوی ہے سالا" طافو بولا "کون مرد ہے جو ... پہلے دیتا ہو۔ بولتا کیوں نہیں' کیا بات تھی؟"

"وہ.... استاد! معاملہ ہی ایسا تھا" مجرم نے اپنے سامنے ...

طرف معذرت طلب نظروں سے دیکھا "اس نے ایک قتل کر دیا تھا بلکہ دو بندے مارے تھے۔"

"بھئی شاباش ہے۔ کون شیرنی تھی وہ؟" طافو بولا۔

"کس کو مارا تھا.... اب تو بتا دے...." خلیفہ نے گالی بکی۔

طافو نے اسے گھورا "خلیفہ' لگام دے زبان کو۔ تیری بہن بیٹی ہے سامنے۔"

"معاف کرنا استاد۔ بُری عادت پڑ گئی ہے" خلیفہ شرمندہ ہو گیا۔

ناگ منی نے فخریہ انداز میں میری طرف دیکھا۔ "جب میں ان کے ساتھ ہوتی تھی تو کسی کی مجال نہ تھی کہ گالی بکے۔ شیش ناگ منہ توڑ دیتا تھا گندی گالی دینے والے کا۔ ہاں تو یہ کیا قصہ ہے تمہاری شادی کا؟ اب تو مجھے بھی شوق ہو گیا ہے۔"

اس کے لبوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی اور آنکھوں میں ایک خواب آفریں روشنی کی کرن جھلملانے لگی "اسی علاقے کی لڑکی ہے اس لیے میں چپ تھا۔ گاؤں کا نام میں نہیں بتاؤں گا' تم خود ہی سمجھ جاؤ گے۔ بڑا مشہور کیس ہے۔ ایک تانگے والے کی بیٹی تھی نوراں۔"

پوپٹ کی آنکھیں چمکنے لگیں "اس کے باپ کا نام...."

طافو نے سختی سے کہا "منہ بند رکھ اپنا کُتّے۔"

صاف ظاہر تھا کہ نام سُنتے ہی انہوں نے سب کچھ جان لیا تھا مگر وہ تفصیلات کا راز ہمارے سامنے افشا کرنا نہیں چاہتے تھے۔ غالباً اس لیے کہ ہمارے درمیان رابعہ ایڈووکیٹ ہائی کورٹ بھی موجود تھی اور یہ قانونی معاملہ تھا۔

"اس کو چودھری کا بڑا لڑکا اُٹھا کے لے گیا تھا۔ وہ اس پر شروع سے بُری نظر رکھتے تھے۔ تم نے تو سنا ہو گا۔ میں نے دیکھا اسے تو حیران رہ گیا۔ بالکل اپنی نیلو جیسی ہے۔"

"اپنی نیلو...." خلیفہ نے تمسخر اُڑایا "بھوتنی کے.... وہ ایسی کب سے ہو گئی.... اپنی نیلو!"

"نیلو کوئی شے نہیں اس کے مقابلے میں یار۔ یہ چودھری اور اس کے سارے حرامی بیٹے سب سور ہیں۔ انہوں نے نوراں کو دو مہینے رکھا۔ اندر ہی اندر اسے سب نے خراب کیا۔ اس کا باپ فریاد لے کر تھانے گیا تو تھانے دار نے اسے ڈک دیا۔ اس کا تانگہ گھوڑا سب غائب ہو گیا۔ جہاں اس کا مکان تھا وہاں چودھری نے ٹیوب ویل لگوا دیا۔ نوراں کا باپ دو مہینے اندر رہا۔ پھر نوراں نے ایک رات باپ بیٹا دونوں کو مار دیا۔ ذبح کر دیا انہیں سوتے میں۔ چھری ہاتھ آ گئی تھی اس کے۔ اس نے باری باری ان کے گلے پر پھیر دی۔ بڑی چودھرائن اس کی ہمدرد تھی۔ وہ ان کے پاس گئی' انہیں یہ نہیں بتایا کہ تمہارے شوہر اور بیٹے دونوں کا خون کر دیا ہے تم نے۔ ان سے کہا کہ آج موقع ملا ہے' مجھے نکال دو باہر۔ چودھرائن نے اسے باہر نکال دیا اور وہ سیدھی چلی گئی شہر۔ وہاں کوئی وکیل ہے۔ اس کے پاس گاؤں کا ہی ایک لڑکا کام کرتا تھا جو کبھی نوراں کا بڑا عاشق تھا مگر نوراں کی بات سُن کے اس کا عشق تو ہو گیا ختم لیکن اس نے نوراں کو وکیل صاحب کے سامنے پیش کر دیا۔ وکیل نے ساری بات سُنی اور اس کا کیس لے لیا۔ مقدمہ درج کرا کے اسے پولیس کے حوالے کر دیا۔ پھر یہ خبر سارے اخباروں میں چھپی۔ نوراں نے اعترافِ جرم کر لیا تھا۔ وکیل کا ڈر تھا اس لیے تھانے میں تفتیش کوئی نہیں ہوئی۔ اسے جیل بھیج دیا گیا اور چالان بھی پیش ہو گیا۔ جیل میں ہی اس کے بچّہ ہوا۔"

"تیرا بچّہ....؟" پوپٹ نے بے اختیار سوال کیا اور پھر شرمندہ ہو گیا۔

"نہیں یار۔ چھوٹے بڑے کسی چودھری کا ہو گا۔ میں تو اس وقت تک نوراں سے ملا بھی نہیں تھا۔ وکیل کے پاس جو گاؤں کا آدمی کام کرتا تھا اس سے میری جان پہچان تھی پہلے سے۔ اس نے مجھ سے ذکر کیا تو میں نے کہا کہ اب کیا ہو گا؟ اس نے کہا کہ سزا تو ہو گی مگر زیادہ نہیں۔ ہو سکتا ہے جج بالکل معاف کر دے۔ مجبوری میں' غصے میں یا نشے میں قتل ہو جائے تو رعایت ملتی ہے۔ وکیل نے اس کی ضمانت کے لیے درخواست دی۔ جج نے ایک لاکھ کی ضمانت منظور کر لی۔ ایک لاکھ وہ کہاں سے لاتی اور اس کے لیے ایک لاکھ کی ضمانت دینے والا شہر میں کون تھا؟"

"وہ وکیل ضمانت دے سکتا تھا؟" پوپٹ پھر بولا۔

"وکیل خود ملزموں کی ضمانت دینے لگیں تو خود اندر ہو جائیں۔ تو چپ کر کے نہیں بیٹھ سکتا" طافو نے اسے ڈانٹا۔

"پھر یار' میں نے سوچا کہ چلو ایک لاکھ اور جمع ہو جائیں گے۔ اس وقت تک میرے دل میں شادی کا کوئی خیال نہیں تھا۔ میں نے تو بس ایسے ہی سوچا تھا کہ مفت کا مال ہے' کسی مصیبت زدہ کے کام آ جائے تو اپنا کیا ہے۔ جیسے زندگی گزر رہی ہے گزر جائے گی۔ جب وہ جیل سے چھوٹی تو پھر سوال پیدا ہوا کہ اس کی زندگی کیسے گزرے گی اور کس کے ساتھ۔ وکیل نے کہا کہ بھئی میرے گھر میں تو ویسے ہی جگہ نہیں ہے اور میری بیوی بڑی بدذات ہے۔ اس وقت ایک دم میں نے فیصلہ کر لیا شادی کا اور بس.... میری شادی ہو گئی تو وکیل نے کہا کہ اب بھاگ جاؤ۔ ضمانت ضبط ہو جانے دو۔ دوبارہ کسی کے سامنے مت آنا اور اسے گھر میں رکھنا چھپا کے۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ مجبوری تھی ورنہ تمہیں ضرور بتاتا لیکن میں ڈرتا تھا کہ بات پھیل جائے گی۔ میرے ایک لاکھ حرام جائیں گے۔ پولیس پھر گرفتار کر لے گی اسے اور شاید لمبی جیل ہو جائے گی...."

طافو نے سب سے پہلے اس کی پیٹھ پر دھپ ماری "شاباش ہے بھئی شاباش ہے تجھے۔ جوان مردوں والا کام کیا ہے تو نے۔"

"خاک مردوں والا کام کیا" خلیفہ نے نیچے تھوک دیا "تھوکا ہوا چاٹ لیا۔ چودھریوں کے حرامی...."

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے طافو نے ایک جست لگا کے

اس کی گردن دبوچ لی۔ وہ اتنے غصے میں تھا کہ دوسرے مداخلت نہ کرتے تو شاید وہ خلیفہ کا گلا گھونٹ کے جان سے مار دیتا۔

"تجھے اپنا پتا ہے کُتّے۔ تیری ماں نے جنا تھا تجھے۔ کبھی اس سے پوچھ کے دیکھنا اپنے باپ کے بارے میں" طافو جو کچھ دیر پہلے خلیفہ کو گالی دینے پر ٹوک چکا تھا' اب اتنا مشتعل تھا کہ اسے فری اسٹائل گالیاں بک رہا تھا۔

"بڑا دل جگرا چاہیے اس کے لیے۔ تیرے جیسے نامرد یہ کام نہیں کرسکتے تھے خلیفہ۔ نوراں ہم سب کی بھابی ہے۔ اس کے خلاف تونے ایک لفظ بھی اپنی گندی زبان سے نکالا تو یہ سب تیرا خون پی جائیں گے۔"

پوپٹ نے سرہلایا "بعد میں بھی اپنی زبان بند رکھنا خلیفہ! ورنہ ہم سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔"

خلیفہ کو اتنے شدید ردِّعمل کی توقع نہ تھی۔ وہ پٹے ہوئے کُتے کی طرح دُم دبا کے بیٹھ گیا۔ باقی سب نے آپس میں مشورہ کیا اور پھر اعلان کردیا کہ وہ اپنے اپنے حصے میں سے ایک لاکھ پورے کریں گے۔

میں نے کہا "تمہارا یہ جذبہ قابلِ قدر ہے لیکن اب ایک بات اور بتاؤ کہ آئندہ کے لیے تم سب نے کیا سوچا ہے؟"

"ابھی کچھ پتا نہیں۔ اس دھندے کو چھوڑنا تو سب چاہتے ہیں مگر کسی کو اور کوئی کام نہیں آتا" طافو نے کہا۔

"میں تو لاہور میں تانگا چلاؤں گا" نوراں کے شوہر نے کہا۔

"اسے پکڑا جائے گا۔"

"چھوڑ یار۔ ایک تانگے والے پر کون شک کرسکتا ہے کہ اس نے ایک لاکھ کی نقد ضمانت جمع کرائی تھی۔ نام بھی بدل لوں گا اپنا۔"

میں نے کہا "تم سب بھی بہت کچھ کرسکتے ہو۔ ہم جانے سے پہلے تم کو اپنا پتا بتا کے جائیں گے۔ وہاں اور بھی بہت لوگ ہیں جو تمہاری مدد کرسکتے ہیں۔ کسی نہ کسی کاروبار میں فٹ کردیں گے۔ ابھی تو ہماری بات کراؤ لاہور۔"

"لاہور میں کس سے؟" طافو نے کہا۔

میں نے کہا "میں دو فون نمبر دیتا ہوں۔ کل تک رقم آجائے گی۔"

"رقم کہاں آئے گی؟"

"جہاں تم کہو گے" میں نے کہا۔

"رقم کے ساتھ پولیس تو نہیں آئے گی؟"

"تم کو اعتبار کرنا چاہیے۔ ابھی تو ہم سب تمہاری قید میں ہیں" میں نے کہا۔ "ہم کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتے۔"

"تمہیں مار کے ہمیں کیا ملے گا؟ ہم خود بھی مارے جائیں گے بعد میں" طافو نے کہا۔

"پندرہ لاکھ کے لیے ہم میں سے کوئی مرنا نہیں چاہے گا۔ کسی کی زندگی کی قیمت صرف چار لاکھ نہیں ہے طافو۔ اور تم لاکھ دے کر بھی ہم کنگال نہیں ہوں گے۔ ہم یہ رقم [illegible] دے رہے ہیں' تم سے ڈر کے نہیں۔ ایک تو گل بانو کے [illegible] پاس ہے لیکن دوسری وجہ یہ ہے کہ ہم تمہاری مدد کرنا چاہتے [illegible] گل کی طرح ہم بھی چاہتے ہیں کہ تم یہ دھندا چھوڑ دو۔ [illegible] پاس اتنا ہے کہ سوچ سمجھ کے استعمال کرو تو اچھا خاصا کاروبار [illegible] ہو اور زندگی عیش و آرام سے گزار سکتے ہو۔ آج تم [illegible] کرتے ہو مگر تمہیں صرف عیش کا موقع ملتا ہے' آرام کا [illegible] سکون سے محروم ہو اور مسلسل خوف کے سائے میں زندگی [illegible] رہے ہو۔ تم ارادہ کرلو تو تم بھی شادی کرکے اپنے اپنے گھر [illegible] ہو۔ جیسے نوراں کے شوہر نے تانگا چلانے کا فیصلہ کرلیا ہے [illegible] کوئی فیصلہ کرسکتے ہو اپنے لیے۔ تم تانگا نہ چلاؤ' ٹیکسی چلاؤ [illegible] چلاؤ' منڈی سے مال اُٹھاؤ اور شہر میں لاکے بیچو۔ مکان بناؤ [illegible] دو۔ بے شک یہ سب تجربے کے کام ہیں مگر تجربہ بھی آجاتا ہے [illegible] میں ایک نہیں سیکڑوں کاروبار ہیں اور جیسا کہ میں نے پہلے [illegible] وہاں ہم سب تمہاری مدد کرنے والے ہیں۔ جب تم مدد کے [illegible] ہمارے پاس آؤ گے تو تمہیں اندازہ ہوگا کہ تم اکیلے نہیں ہو۔"

طافو اٹھ کھڑا ہوا "چلو میرے ساتھ۔ میں تمہاری فون پہلے [illegible] کرا دیتا ہوں۔"

"کہاں جانا ہوگا؟" میں نے کہا "میرا مطلب ہے..."

"کیا اعتبار کی بات کرتے کرتے تم خود بے اعتباری کا [illegible] ہوگئے؟" طافو نے طنز سے کہا "ڈرنا تو مجھے چاہیے تم سے۔"

میں اس کے ساتھ جیپ میں بیٹھ گیا۔ جیپ آدھے گھنٹے [illegible] ایک کچے راستے پر چلتی رہی جس پر آنے جانے والی بیل گاڑیوں [illegible] اور تانگوں کے پہیوں نے متوازی لکیروں کا جال سا پھیلا رکھا [illegible] جیپ گزرتی تھی تو پیچھے گرد کا غبار رہ جاتا تھا۔ ہمیں راستے [illegible] ایک بیل گاڑی ملی جس کو مشکل سے دس سال کا بچہ چلا رہا [illegible] بیل آٹومیٹک لگتے تھے کیونکہ ڈرائیور تو گنا چوسنے میں مصروف [illegible] اور وہ اپنی مرضی سے چل رہے تھے۔ اس کے بعد تین تانگوں [illegible] مشتمل بارات ملی۔ آگے والا یکہ تھا جس میں آرکسٹرا تھا۔ [illegible] شخص ڈھول کو بڑے انتقامی جذبے کے ساتھ پیٹ رہا تھا' [illegible] نفیری والا مشک جیسے پیٹ کو دھونکنی کی طرح استعمال کرنے [illegible] "ویرے میرا گھوڑی چڑھیا" کی دُھن کو مسخ کرکے بجا رہا تھا [illegible] شخص متحرک یکے میں ڈانس کرنا چاہتا تھا مگر جھٹکوں کی وجہ [illegible] باربار نفیری والے پر گرتا تھا۔ غالباً اسے ڈھول والے نے [illegible] تھا کہ اسے نہ بجانے لگے۔ دوسرے تانگے میں نوٹوں کے ہار [illegible] دولہا اپنے یاروں میں پھنسا ہوا تھا۔ اس کے بالوں کا تیل بہ [illegible] ماتھے پر اور آنکھوں کا سرمہ ناک کی سرحد تک پہنچ گیا تھا مگر وہ [illegible] پگڑی کے شملے سے بھی صاف نہیں کرسکتا تھا۔ آخری تانگے [illegible] دولہا کے لواحقین تھے جو یوں چلا چلا کے باتیں کررہے تھے کہ [illegible]

ہوئے نظر آتے تھے۔

جب کسی گاؤں کے مضافات میں واقع تھانے کی عمارت کے باہر نصرتی تو میں حیران ہوا۔ ایک کمرے اور احاطے پر مشتمل اس عمارت پر تھانے کا مخصوص سرکاری رنگ دور سے بھی اپنی دہشت پھیلاتا محسوس ہوتا تھا۔

طافو نے اندر کھڑے ہوئے کالے شخص سے کہا "ملک صاحب ہیں؟"

اس نے طافو کو غور سے دیکھا اور سرہلایا۔ پھر اشارے سے میری طرف دیکھ کے سوال کیا کہ یہ اپنے ساتھ کسے پکڑلائے ہو اور طافو نے نظروں ہی نظروں میں اسے بتادیا کہ فکر مت کرو' اپنا ہی بندہ ہے۔ مجرموں کے ساتھ پولیس کے تعاون کی ایسی عملی مثال میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

طافو نے چق اُٹھا کے کہا "سلاما لیکم ملک صاحب" اور پھر مجھ سے مخاطب ہوا "آؤ جی اپنے سکندر صاحب۔"

میں اندر داخل ہوا تو مجھے ویران کمرے کی خستہ حال میز کے پیچھے ایک مثالی تھانے دار نظر آیا۔ مثالی یوں کہ اس کا چہرہ سختی اور بے رحمی کے جذبات کی عکاسی کرتا تھا۔ اس کا پیٹ کرسی کی حدود سے باہر اور اوپر تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کی مونچھیں "رعب دار" تھیں اور آنکھوں میں خون کی سُرخی۔ نہ اس نے طافو کے سلام کا جواب دینے کی زحمت گوارا کی اور نہ مجھ سے ہاتھ ملانے کی۔ چونکہ میں تھانے داروں کی عادات واطوار کو سمجھتا تھا اس لیے میں نے بھی نہ سلام کیا تھا اور نہ مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا تھا۔ ابھی طافو کرسی پر بیٹھنے کے لیے اشارے کا منتظر ہی تھا کہ میں بیٹھ گیا۔

"مجھے ایک ٹیلی فون کال کرنی ہے۔"

تھانے دار نے مجھے گھورا "پہلے بتاؤ تو سہی کہ تم ہو کون؟ اے سی ہو کہ ڈی سی؟ بات کرتے ہوئے تو بڑا کرنٹ مارتے ہو۔"

طافو نے خوشامدانہ لہجے میں کہا "ملک صاحب' اپنے سکندر صاحب بہت بڑے صنعت کار ہیں لاہور کے۔ ان کی وائف وکیل ہیں لاہور ہائی کورٹ میں۔"

تھانے دار سیدھا ہوکے بیٹھ گیا "اچھا جی۔ خیر سے اِدھر کیسے آنا ہوگیا؟ لطیف صاحب کے مہمان ہو؟"

اس نے مہمان کا لفظ طنزیہ انداز میں استعمال کیا تھا۔

"یہی سمجھ لو" میں نے کہا "فون کہاں ہے؟"

"فون تو خراب ہے" اس نے ناک میں انگلی گھماتے ہوئے کہا۔

اب طافو اسے اشارہ کرکے باہر لے گیا "ذرا ایک منٹ میری عرض سُن لیں جناب۔"

جب وہ واپس آئے تو تھانے دار کا موڈ پھر بدل چکا تھا۔ اس نے میز کی دراز میں سے فون نکالا اور میرے سامنے رکھ دیا۔ میں نے اسے شرمندہ کرنا غیر ضروری سمجھتے ہوئے منظر کا نمبر ملایا۔ شام کے چار بجنے والے تھے۔ مجھے اُمید تھی کہ وہ اس وقت رابعہ کے آفس میں ہوگا۔ فاصلہ کم تھا اس لیے کال فوراً مل گئی۔

"کون بول رہا ہے؟ یوسف......"

"جی۔ آپ کون...؟"

"یوسف! میں سکندر ہوں۔ منظر صاحب ہیں؟"

یوسف نے شور مچادیا "سکندر صاحب! کہاں ہیں آپ؟ کہاں سے بات کررہے ہیں؟ منظر صاحب' منظر صاحب! سکندر صاحب کا فون ہے۔ رابعہ باجی کہاں ہیں سکندر صاحب؟ آپ ٹھیک ہیں نا؟"

میرے جواب دینے سے پہلے ریسیور منظر نے چھین لیا "ابے سکندر کے گھوڑے۔ خچر کے سالے۔" منظر نے حسبِ عادت سلام دعا کا آغاز کیا۔

درجواب آں غزل میں نے بھی بہت کچھ کہا جس کو سُن کے تھانے دار کا موڈ خراب ہوگیا مگر اس سودے میں اپنے مالی مفاد کے پیشِ نظر اس نے صبروضبط سے کام لیا۔

"منظر! وہ غالب پہنچا کہ نہیں؟"

"پہنچ گیا یار۔ جاتا کہاں سالا۔ جیلر کی بچّی اسے کہیں جانے دیتی ہے۔ انہیں دیکھ کے تو وہ شعر یاد آتا ہے۔ قید میں ہے بلبل صیاد مسکرائے۔ بلبل سمجھ لے غالب کو۔ ہے نا اُلٹا معاملہ۔ تو اپنی سنا' کب آرہا ہے اپنی مغویہ کے ساتھ؟" وہ گلا پھاڑ کے ہنسا۔

"بکواس بند کر۔ دیکھ میری بات سُن۔"

"ابے پہلے میری سُن۔ خوش خبری ہے تیرے لیے۔ آج ہی پندرہ ہوئے ہیں۔"

میں نے بے خیالی میں کہا "پندرہ کیا؟"

"ابے تیرے بھانجے۔ یار' بڑا خوش قسمت ہے تو۔ پندرہ کا ماموں ہوگیا تو میری کوشش سے" وہ قہقہہ مار کے بولا "جب تیرا آخری وقت آئے گا تو کوئی دوسو بھانجے بھتیجے مگرمچھ کے آنسو بہا رہے ہوں گے چاروں طرف۔ آخر ان کی اولادیں بھی تو ہوں گی۔ نازو اور گل کی۔ مقابلہ ہوگا بڑا سخت۔"

"مقابلے کے بچّے! اپنی بیوی پر رحم....."

"یار! گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں شاید اُنہتّر کی تعداد ہے۔ ابھی تو ایک چوتھائی بھی نہیں ہوئے۔ ابے محبت اس کو کہتے ہیں...."

"دیکھ یار منظر' میں اس وقت لمبی بات نہیں کرسکتا۔ میں ایک پولیس اسٹیشن سے فون کررہا ہوں۔"

وہ چلّانے لگا "پھر پکڑا گیا۔ ابے بھوتنی کے' کیوں دشمن ہو رہا ہے تو میرے چھوٹے سے خاندان کا۔ تو چاہتا ہے سب فاقے کریں' گلی گلی بھیک مانگیں۔ 'یتیموں کی فریاد سُن لیجیے' گاتے پھریں...."

"لاحول ولا قوۃ۔ کیسی باتیں کررہا ہے تو۔"

"ابے جب میرا کام صرف تیرے مقدمات کی پیروی رہ جائے گا اور تیری وہ کبھی نہ ہونے والی جورو تیرے پیچھے لگی رہے گی تو میں

کہاں سے کماؤں گا۔ تو فیس دیتا ہے کیا مجھے جو روز اندر ہو جاتا ہے کسی کیس میں۔ اب کیا پنگا لیا ہے' کس کے ساتھ لیا ہے اور کیوں...؟"

میں نے کہا "پنگا کوئی نہیں لیا۔ دراصل اس علاقے میں یہی ایک ٹیلی فون دستیاب تھا۔" میں نے کہا "میری بات سُن کے شور مت کرنا۔ مجھے کچھ رقم چاہیے۔ فوراً۔"

"کتنی؟ میری جیب میں تو اس وقت ساڑھے دس روپے پڑے ہیں۔ ڈال دوں اِدھر سے ریسیور میں۔ تو اُدھر سے نکال لے فوراً کے بچّے۔ اس وقت بینک' ڈاک خانے سب بند ہیں۔"

میں نے کہا "کل دوپہر تک رقم کا بندوبست ہو جانا چاہیے۔ بہت زیادہ رقم نہیں ہے۔ سولہ لاکھ..."

حسبِ توقع اُدھر سے منظر نے غل مچایا "آہ... ارے یار یوسف! افسوس... سکندر پاگل ہو گیا۔ رابعہ' تمہاری باجی اور تمہاری باس رخصت ہو کے پاگل خانے جائے گی۔ شاید غلط سُنا میں نے۔ بیٹا سکندر' یہ بتاؤ کیا کہا تھا تم نے؟ سولہ روپے مانگے تھے نا۔"

"سولہ لاکھ... ایک لاکھ میں ہوتے ہیں سو ہزار۔"

"یوسف... نخلخہ..." منظر چلّایا "جلدی سے مجھے نخلخہ سُنگھا دو ورنہ میں گیا۔ سکندر نے سولہ لاکھ روپے مانگے ہیں فوراً۔ اف ابھی تک میں بے ہوش نہیں ہوا۔ کل تک سب کو بیچ دوں گا۔ ایک لاکھ میں ایک بچّہ۔ یہ ہوئے پندرہ لاکھ۔ بیوی کے کون دے گا مجھے ایک لاکھ؟ مفت میں بھی کوئی نہیں لے گا۔ یوسف! تمہاری بیوی۔"

میں نے ہنس کے کہا "دیکھ بلاوجہ شور مت مچا۔ چھ تیرے پاس ہوں۔ کچھ ٹرسٹ کی رقم ہوگی۔"

"تو مجھے غبن کا مشورہ دے رہا ہے؟"

"ٹرسٹ بھی تو ہمارا ہے۔ عارضی ضرورت کے لیے اس میں سے قرض لیا جا سکتا ہے" میں نے کہا "اس سے بھی پورا نہ ہو تو پشاور فون کرنا۔ آصف علی کو... وہ پورا کر دے گا۔"

"وہ سب میں کر لوں گا مگر یار' مجھے بتا کہ اتنی بڑی رقم کی پولیس اسٹیشن پر کیا ضرورت پڑ گئی؟ کیا خرید لیا ہے پولیس اسٹیشن' ایس ایچ او اور حوالات میں بند قیدیوں سمیت۔"

"تیری ملاقات ابھی تک غالب سے نہیں ہوئی؟"

"نہیں۔ مگر یوسف نے بتایا تھا کچھ۔ عجیب سی اسٹوری تھی کہ تم سب کو ڈاکو اُٹھا کے لے گئے تھے۔ پاگل ہوں گے سالے۔ اُٹھا کے بھی کیا چیزیں لے گئے۔ راستے میں دو عدد فالتو سمجھ کے پھینک دیے۔ اس نے نام بتایا ہوگا مرزا غالب اور ڈاکو ڈر گئے ہوں گے کہ ابھی مشکل شعر کہنا شروع کر دے گا۔ اور نازو تو ہے چھلاوہ۔ مجھے تو یہ گپ لگتی ہے۔"

"انہوں نے کیا بتایا تھا تجھے؟"

"مجھے کہاں بتایا یار' وہ گئے سیدھے اخبار کے دفتر۔"

میں چونکا "اخبار کے دفتر! کیوں؟"

"بال کٹوانے" منظر بولا "ابے مُلّا کی دوڑ مسجد تک... سالا کہاں جائے گا۔ غالب نے کوئی دھماکا کیا ہے۔"

"کیا مطلب؟ خبر دے دی ہے؟ کیا دماغ خراب ہے اس کا..."

"وہ تو خیر سے تم سب کا ہے۔"

میں نے کہا "منظر! اسے روکو۔ یہ خبر روکنی ہے۔ اسے جیسے بھی ہو' یہ خبر نکلوا دے۔ ابھی تو کاپی بھی نہیں جوڑی ہوگی۔"

منظر نے کہا "اچھا کوشش کرتا ہوں مگر بات کیا ہے؟... ایک منٹ... یہ یوسف کچھ کہہ رہا ہے۔ لو خود بات کرو۔"

یوسف نے کہا "سکندر صاحب! غالب اور نازو سیدھے میرے گھر پہنچے تھے۔ وہاں بیٹھ کے غالب نے کوئی خبر بنائی۔ اس میں یہی ہے کہ لاہور کے نواح میں شیش ناگ کا پُرانا گروہ سرگرم ہے اور وہ ڈکیتی کی وارداتوں کے ساتھ اغوا برائے تاوان میں ملوث ہیں۔ اس نے آئی جی پولیس مغربی پاکستان اور گورنر سے خصوصی اپیل کی ہے۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ تمہارے ساتھ رابعہ کے علاوہ اسی گروہ نے محسن اور گُل کو بھی پکڑ رکھا ہے۔"

"یہ غلط ہے۔ غلط بتایا ہے اسے جس نے بھی بتایا ہے" میں نے کہا "اب تم کسی طرح بھی غالب سے رابطہ قائم کرو اور اسے سمجھاؤ کہ یہ خبر چھپ گئی تو بہت بُرا ہوگا۔ ہم سب کل شام تک لاہور پہنچ سکتے ہیں مگر اس خبر کی اشاعت کے بعد شاید یہ ناممکن ہو جائے۔"

"میں ابھی جاتا ہوں' دیکھتا ہوں وہ کہاں ہے" یوسف پریشان ہو کے کہا "نازو تو گھر پر ہی تھی۔ میری بیوی کے ساتھ جانے والی تھی۔"

"کہاں جانے والی تھی؟"

"میرا خیال ہے... میرے سسر کے پاس۔ آپ کو شاید معلوم نہیں' وہ بڑی توپ چیز ہے۔"

"مجھے معلوم ہے یوسف مگر ہمیں اس وقت کوئی توپ چلانے کی ضرورت نہیں۔ سارا نقصان ہمارا ہوگا۔ فوراً فون کروا کے غالب کو ایک شوہر کی طرح اور اسے روک دو۔ حکم دو کہ تمہارے آنے تک گھر سے قدم باہر نہ نکالے اور نہ اپنے ابّا سے کوئی بات کرے۔ نازو کو بتا دینا کہ یہ سکندر نے کہا ہے۔"

"ٹھیک ہے... جیسا آپ نے کہا ویسا ہی ہوگا" یوسف نے ریسیور پھر منظر کو تھما دیا۔

"یار سکندر! تو پھر سوچ لے۔ سولہ لاکھ دے کر رہائی کا سودا کیا ہے تو نے..."

"یار' یہ کس الو کے پٹھے نے کہا ہے کہ سولہ لاکھ تاوان دینے ہیں" میں نے برہمی سے کہا "نہ ہم قید میں ہیں اور نہ کوئی رکھ سکتا ہے ہمیں قید میں۔ ہم جب چاہیں باہر آ سکتے ہیں۔"

"تو آجاؤ نا یار۔ سولہ لاکھ بہت ہوتے ہیں۔" منظر نے روتی آواز میں کہا "ایمان سے میرا بلڈ پریشر بڑھ رہا ہے۔ اختلاج تک ہونے لگا ہے مجھے۔ اگر میں فوت ہو جاؤں تو بُرا مت ماننا۔"

"رقم ارسال کر کے فوت ہو جا۔ میری طرف سے اجازت ہے۔ کل تک یہ کام کرنا ہے' جیسے بھی ہو۔"

"ہو جائے گا یار' ہو جائے گا۔ اب تو نے کہا ہے تو میری کیا مجال کہ انکار کروں" وہ لہجہ بدل کے بولا "سولہ لاکھ کیا' سولہ کروڑ نثار تجھ پر مگر یارے بدحواس گھر آجا۔ اپنی اس نورِ چشم سے کہہ کہ وکالت کرے اور تو دل کھول کے کیس کر' اس کی پریکٹس چلا۔ ورنہ تو میری جگہ آجا اور میں کرتا ہوں بدمعاشی' مار پیٹ اور وہ سب جو تم کر رہے ہو۔"

"منظر! کل ہم آجائیں گے' اگر رقم مل گئی۔ شام پانچ بجے۔"

"پھر بھی کہتا ہے کہ یہ تاوان نہیں ہے۔"

"تاوان نہیں ہے یار۔ میں آ کے بتاؤں گا۔ بھلا کوئی پولیس اسٹیشن میں بیٹھ کے تاوان کی رقم منگواتا ہے؟ یہ ایک نیک مقصد کے لیے ہے۔"

منظر بولا "ابے مجھے مت چکر دے۔ یہ سب دھندے اور کہاں ہوتے ہیں؟ کوئی مسجد میں بیٹھ کے منگواتا ہے سولہ لاکھ اور وہ بھی ڈاکوؤں کی فلاح و بہبود کے لیے۔ نیک کام اور تھانے میں! اچھا بتا' رقم کیسے پہنچائی جائے؟ کس قسم کے نوٹ ہوں کتنے پُرانے' بینک ڈرافٹ یا پے آرڈر چلے گا؟"

"مجھے نقد رقم چاہیے۔ ایک منٹ ہولڈ کر۔" میں نے کہا اور طافو کی طرف دیکھا۔ "رقم کہاں وصول کی جائے گی؟"

تھانے دار نے بے نیازی سے کہا "جہاں آپ بیٹھے مزے کی باتیں کر رہے ہو۔ دل کھول کے گپ لگاؤ جی۔ بل تو مجھے دینا ہے۔"

میں نے کہا "اس تھانے کا اتا پتا بتاؤ۔"

اس نے بلا جھجک سب بتا دیا اور میں نے منظر کو سمجھا دیا۔ ریسیور رکھنے کے بعد میں نے طافو سے کہا "تم نے ساری گفتگو سُن کے اندازہ تو کر لیا ہوگا کہ صورتِ حال خراب ہوتے ہوتے رہ گئی۔ اور تھوڑی دیر ہو جاتی تو قابو سے باہر ہو جاتی۔"

طافو متفکر نظر آ رہا تھا "گویا پیڈرو نے غلط نہیں کہا تھا۔ وہ اخبار والا ہی تھا۔"

"ہاں۔ مگر میں نے سب رُکوا دیا ہے۔ اخبار چھپتا ہے رات کو' ابھی تو شام بھی نہیں ہوئی۔"

تھانے دار نے طافو کی طرف دیکھا "کبھی کمان سے نکلا ہوا تیر واپس نہیں آتا۔"

میں نے کہا "جس بات کا پتا نہ ہو اس کے بارے میں بولنا بھی نہیں چاہیے۔ غلط مثال دی تم نے۔ صحیح مثال میں دیتا ہوں۔ تم جب کسی کو تفتیش کے لیے لاتے ہو تو کیا قانون کے مطابق فوراً ایف آئی آر درج کرتے ہو اور اسے چوبیس گھنٹے کے اندر مجسٹریٹ کے سامنے پیش کر دیتے ہو؟ نہیں۔ تم اس نکتے کو بنیاد بنا کے سودا کرتے ہو کہ ابھی وقت ہے' پرچا نہیں کاٹا میں نے... تو ایسا ہی معاملہ یہ ہے۔ ابھی معاملہ ہمارے ہاتھ میں ہے۔"

تھانے دار کا موڈ خراب ہو گیا "تم طافو کے ساتھ نہ ہوتے تو میں سمجھاتا تمہیں کہ میں ذرا مختلف قسم کا تھانے دار ہوں۔"

"میری بھی مجبوری یہ ہے کہ بیچ میں کوئی اور ہے جس کے دعوے کا پاس ہے مجھے ورنہ تم اپنا حصہ وصول کرتے وقت پکڑے جاتے تھانے دار صاحب' رنگے ہاتھوں۔ خبر نہیں' تصویر شائع ہوتی تمہاری۔ میں کل اکیلا آؤں گا یہاں۔ شام پانچ بجے۔"

"ٹھیک ہے۔ پانچ بجے حوالات خالی ملے گی۔"

میں نے ہنس کے کہا "ایک وکیل آئے گا رقم لے کر۔ اور یہ مت بھولو کہ طافو سے نہیں' اپنا حصہ تم کو مجھ سے وصول کرنا ہے۔ ذرا ہوشیار رہنا۔"

"میں بند کر دوں گا تمہیں۔ اسی وقت..."

"کس جرم میں؟ میرا ایک دوست مجھے سولہ لاکھ دینے آ رہا ہے۔ رقم میں تھانے کے باہر کسی دوست سے وصول کر سکتا ہوں اور رقم وصول کیے بغیر اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کے بھی جا سکتا ہوں۔"

اس نے پھیکی ہنسی کے ساتھ کہا "سر جی! آپ تو مذاق کا بُرا مان گئے۔"

"۔۔۔ مجھے آج ہی معلوم ہوا کہ پولیس والے بھی مذاق کرسکتے ہیں۔ پہلے تو صرف تفتیش کرتے تھے۔" میں نے طنز آمیز تمسخر کے ساتھ کہا "یا پھر شاید وہ تفتیش ہی مذاق ہوتی تھی۔ مذاق مذاق میں بندے کی کھال میں بھُس بھر دیا، اسے ننگا کرکے اُلٹا لٹکادیا اور مذاق ہی مذاق میں چھتّر مار مار کے کسی ناکردہ گناہ کا اعتراف کرالیا۔"

تھانے دار کا غصے سے بُرا حال ہوگیا۔ "یہ سب تم جیسے پڑھے لکھے لوگوں کا اور کیا کہتے ہیں انہیں... دانشور۔ دانشوروں کا اور اخبار والوں کا قصور ہے کہ انہوں نے ہمیں ایسا بنادیا ہے۔ جیسے ہم انسان ہی نہیں، سب شیطان ہیں۔ بیڑہ غرق ہو ان اخبار والوں کا۔ ہم جو کچھ کرتے ہیں اسے اسٹوری کہتے ہیں۔ اچھائی کسی کھاتے میں نہیں، بُرائی ایک انچ کی ہو تو اسے ایک میل کی بنادیتے ہیں۔ میرا بس چلے نا تو میں سارے اخبار بند کرادوں۔ سب اخبار والوں کو سڑک کوٹنے پر لگادوں۔ خبریں سُننے کے لیے ریڈیو ہے، ٹی وی ہے اور ہم ہیں۔ جو پوچھنا ہے ہم سے پوچھ لو۔"

میں نے ہنس کے کہا "خدا بھی گنجے کو ناخن نہیں دیتا۔"

وہ گنجا بھی تھا۔ اس کا علم مجھے اچانک اس وقت ہوا جب ٹوپی اٹھا کے اس نے اپنے سرِ پُر شبنم کو ہوا دی۔ چنانچہ اس نے مزید بُرا مانا اور میز پر مُکا مار کے وہ ارشاداتِ عالیہ کا نیا باب شروع کرنے ہی والا تھا کہ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ بداخلاقی میرے مزاج میں نہیں مگر اخلاق میں کسی بردہ فروش، غدارِ وطن یا دشمنِ انسانیت کے ساتھ شرافت سے پیش نہیں آسکتا۔ میں نے تھانے دار کے آگے بڑھے ہوئے ہاتھ کو عمداً نظرانداز کیا اور مصافحہ کیے بغیر باہر آگیا۔

طانو نے شاید ایک منٹ میں تھانے دار سے معاملہ پکا کیا۔ اسے اینڈ میں "تعاون" کا یقین دلایا اور میری بدتمیزی کی معافی مانگی۔ جب وہ باہر آیا تو اس کی صورت ناگواری کے جذبات کی بدصورت تصویر بنی ہوئی تھی۔

"تم نہیں جانتے اس... تھانے دار کو۔۔۔" عادت کے مطابق اس نے جملے میں ایک گالی کو یوں شامل کیا جیسے کچھ لوگ کھانے میں اچار یا سلاد کو رکھتے ہیں۔

میں نے اس کی بات کاٹ دی "میں ہر تھانے دار کو جانتا ہوں۔ وہ صرف تھانے دار ہوتا ہے اور کچھ نہیں۔ باقی سب اسے تم جیسے لوگ بناتے ہیں۔ وہ پیدائشی طور پر ہڈ حرام، راشی اور سفاک نہیں ہوتا۔ وہ تو پولیس فورس میں شامل ہوتے وقت بھی عام آدمی ہوتا ہے مگر پھر اس کا واسطہ پڑتا ہے تم جیسے لوگوں سے جو اسے خراب کردیتے ہیں۔ مجرموں سے اور قانون شکن عناصر سے۔ خوشامدی اور مطلب پرست، بدکردار اور بے ضمیر لوگ اسے آہستہ آہستہ فرض شناسی کا دوسرا مفہوم سمجھادیتے ہیں۔ اسے احساس دلادیتے ہیں کہ وہ جس قانون کی محافظت کا دعوے دار ہے وہ تو محض ایک کاغذی کتاب کی بے معنی تحریر ہے۔ اصل اختیار کا مالک تو وہ خود ہے جو قانون کو توڑ بھی سکتا ہے، خرید بھی سکتا ہے، مفلوج اور مسخ بھی کرسکتا ہے۔"

میرا سچ طانو کو بھی برا لگ رہا تھا اور اس کے لیے میری آفرین اور نکتہ سنجی محض بکواس تھی چنانچہ کان تو اس نے بند کرلیے تھے، میری زبان بند کرنے کے لیے اس نے اپنا گاڑی کے پانی بنانا شروع کیا اور ایک درخت کے تنے کو سیراب کرنے لگا۔ مجھے بھی احساس ہوا کہ میں بھینس کے آگے بین بجا رہا ہوں۔ پرانے لوگوں نے تجربے کی بنا پر ہر موقعے کے لیے ضرب الامثال کی اچھی خاصی لُغت بنادی ہے۔ اب کوئی استعمال نہ سمجھے کرکے دیکھ لے۔ بھینس اور بین کے مفہوم کی دوسری ضرب المثل۔ اندھے کے آگے روئے اپنی آنکھیں کھوئے۔ ظاہر ہے اسے لطیف پیرائے میں منظوم کردیا۔ مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر۔

واپسی پر میں نے رابعہ اور گل کو مبارک باد پیش کی۔ MISSION IMPOSSIBLE کی کامیابی یقینی ہوگئی تو کچھ ایسا ہی اعلان طانو نے بھی کیا ہوگا کہ چلو بھئی گولڈن ہینڈ شیک کرو، اپنا اپنا حصہ لو اور اپنی اپنی راہ لو۔ کمپنی بند۔ ظاہر ہے دونوں کے جذبات کی نوعیت میں قطبین کا فرق تھا۔ ہم خوش تھے کہ اب دن کی بات ہے پھر وہی لاہور ہوگا، وہی اس کی دلدار فضا۔ یادوں کے حسین لمحوں سے آراستہ اور مستقبل کے خوابوں کی روشنی سے منوّر۔ یارانِ خوش خصال و خوبانِ خوش ادا کی عنایات سے شب و روز اور وہی پرانی بزم آرائی سے رزم آرائی تک سارے مرحلے ہوں گے اور ہم ہوں گے۔ ہمیں بیک وقت ہنسانے اور یرغمال بنائے رکھنے والے ڈاکو افسردہ تھے کہ برسوں کی رفاقت کا سفر بالآخر تمام ہوا اور اب اس چوک سے ہر راہ الگ ہوجائے گی۔ بُرے تھے وہ سارے جہاں کے لیے لیکن ایک دوسرے کے لیے اچھے تھے۔ دُکھ سُکھ میں ساتھ دینے والے، عہدِ وفا کو، اعتماد کو اور آپس کے اتحاد کو کسی مقدس عقیدے کی طرح ماننے والے اور اس پر قائم رہنے والے۔ شاید انہیں بہت کچھ یاد آتا ہوگا۔ کون کیا تھا اور کیا بن گیا۔ زندگی کے کون سے پُرپیچ راستوں پر بھٹکتا ہوا کب اس گھر تک پہنچا تھا جو شیش ناگ کا ڈیرا تھا اور اپنے اس گھر کو بھول گیا تھا جہاں اس کو خون کے رشتوں نے دیا تھا۔ شیش ناگ مرچکا تھا۔ اور بھی نہ جانے کتنے تھے جو پُرخطر زندگی کی تاریک راہوں میں مارے گئے تھے۔ کس کی لاش کو کفن بھی نہ ملا، صرف رُسوائی کی تشہیر ملی۔ کسے خود انہوں نے گمنام مٹی کے لیے نشانِ بے نشان مدفن میں دبادیا اور بھول گئے۔ آج وہ جو محض سلسلۂ اتفاقات کے سبب قانون کے شکنجے سے ناگہاں سے یا تختۂ دار سے محفوظ رہے تھے، خود مجبور ہوگئے کہ اجنبی زندگی کے ناآشنا راستوں پر تنہا ہوجائیں۔

رفتہ رفتہ ان کی اُداسی کا ردِ عمل بھی اس کیفیت میں ڈھل گیا جسے حالات کے جبر سے مفاہمت کا نام بھی دیا جاسکتا تھا۔ انہوں نے شہر سے پہلے اپنی عمرِ رفتہ کو الوداع کہنے کے لیے آخری محفل برپا ہونے کا اہتمام کیا۔ طانو کے ہرکارے شہر گئے اور ہیرا منڈی سے وہ ہیرے خرید لائے جن کے حسن و شباب اور غمزہ و ادا کی آب و تاب نے تماش بینوں کے دل اور بینک اکاؤنٹ لوٹ لیے تھے۔ انہوں نے زیادہ قیمت ادا کی اور ایک رات کے لیے جنگل میں منگل منا کے دکھادیا۔

میرے لیے یہ بہت انوکھا اور کسی حد تک دلچسپ تجربہ ہی تھا مگر آنکھوں کے لیے جو تماشا تھا وہ احساس کے لیے درسِ عبرت تھا۔ ایک طرف وہ دولت تھی جو ان ڈاکوؤں نے طاقت اور دہشت سے چھینی تھی اور یہ سوچے سمجھے بغیر کہ مالِ غنیمت کسی کی ساری عمر کا اندوختہ ہے یا کسی کے مستقبل کی روشنی۔ اس سے کسی کو آپریشن فیس دے کر نئی زندگی ملنے والی تھی، یہ کسی کی لیے خوش مستقبل کی ضمانت تھی اور کاروبار یا ملازمت کے حصول کا مال آخری سہارا تھی یا کسی بیٹی کے لیے باپ کے گھر سے رخصت ہو کے اپنا گھر آباد کرنے کی امید تھی۔ دوسری طرف وہ عورتیں تھیں جن کے جسم کی خوب صورتی.... شباب کی شوخی اور دلربائی کی ہر ادا برائے فروخت تھی اور ہر رات پھر سجا سنوار کے نئے خریداروں کے سامنے پیش کردی جاتی تھی۔ ایک کم ظرف وہ کمینے دل ہوتے ہیں جو کسی مجبور بیوہ سے بھی اس لیے شادی نہیں کرتے کہ چیزوں کی طرح انہیں سیکنڈ ہینڈ عورت قبول نہیں ہوتی۔ دوسرے بے ظرف وہ ذلیل ہوتے ہیں جو طوائف کو بھی عورت سمجھ کے قبول کرلیتے ہیں۔

ڈاکوؤں نے رات بھر شراب پی اور خوب غل غپاڑہ کیا۔ گل اور رابعہ تو اس محفل میں شریک ہی نہیں ہوئی تھیں اور ان کی دلی خواہش تو یقیناً یہ ہوگی کہ ہم بھی اس لہو و لعب سے دور، ان کے ساتھ رہیں مگر میں نے محسن کو اور محسن نے مجھے سپورٹ کیا کہ ہم صرف عبرت پکڑنے کے لیے بحیثیت مُبصر شریک ہوں گے۔ مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو۔ تازہ ہوتی تو غالب کی ایک نہ چلتی اور صاف نوٹس دیتی کہ ٹانگیں توڑ کے ڈال دوں گی چارپائی پر لیکن رابعہ اور گل نسبتاً صلح پسند اور صابر و شاکر قسم کی خواتین تھیں جن کو یہ اعتماد بھی تھا کہ ہم واقعی برائی کو دیکھ کر برائی سے بچنے کا حوصلہ اور صلاحیت رکھتے ہیں۔

لیکن ہوا بعد میں یہ کہ میں اور محسن قطعی غیر جانبدار مُبصر نہیں رہے اور عبرت پکڑنے کی بات بالکل بھول گئے۔ ایک مرحلہ ایسا بھی آیا جب مس بجلی گجرات والی اور موتی جان نے ایک مشہور فلمی گیت کی لے پر تیز رقص شروع کیا تو جملہ حاضرین کے ساتھ ہم بھی تالیوں سے تال دینے لگے۔ اس کے بعد محسن نے دو انگلیاں منہ میں ڈال کے سیٹی بجائی اور میں نے نعرہ لگا کے کہا "موتی جان واقعی ایک گوہرِ یکتا تھی مگر اس کوچے میں جہاں اصلی بھی پتھر کے مول بکتے ہیں۔ مس بجلی میں واقعی شرارے بھرے ہوئے تھے اور ان کا رقص سچ مچ کا رقصِ شرر ثابت ہوا۔ پہلے شراب کے نشے میں پوپٹ ان کے ساتھ ناچنے لگا۔ اسے ناچنا نہیں آتا تھا اور نشے کے باعث ویسے بھی اسے اپنی حرکات و سکنات پر قابو نہیں تھا۔ اس کا ڈانس دیکھ کر حاضرین کی آنکھوں میں ہنستے ہنستے آنسو آگئے۔ خود مس بجلی، موتی جان اور ان کا سارا طائفہ ہنسی میں شریک تھا اور سب بہت خوش تھے۔ ایک تو ڈاکو بے حد "شریف" ثابت ہوئے تھے اور کسی نے وعدہ خلافی کرتے ہوئے دست درازی نہیں کی تھی۔ پھر انہیں دل کھول کر داد دی تھی۔ شاعر کے لیے واہ واہ داد ہوتی ہے تو طوائف کے لیے وہ نوٹ جو اس پر نچھاور ہوتے ہیں۔

ایک بار محسن نے سیٹی بجاتے ہوئے میری طرف دیکھا اور بولا "کیا بات ہے خان صاحب! مال نہیں ہے گرہ میں۔ مُفت کا تماشا دیکھنے آگئے ہو۔"

میں نے سر کھجا کے کہا "مال ان پر لُٹانے کے لیے نہیں ہے۔"

محسن نے جیب میں سے پانچ پانچ کے نوٹ نکال کے اور مجھ پر وار کے پھینکنے شروع کیے تو ڈاکو بہت محظوظ ہوئے۔ انہیں قطعی امید نہ تھی کہ ہم جیسے "شرفا" بھی اس تماشے میں اس حد تک شریک ہوسکتے ہیں۔ ساری بات وقت اور ماحول کی تھی۔ وہاں ہم کمرے میں منہ لپیٹ کر سو ہی نہیں سکتے تھے اور آنکھیں یا کان بند کرنا بھی محال تھا۔ رابعہ اور گل کا مسئلہ مختلف تھا۔ وہ شرم و حیا کی پُتلیاں اس محفل سے دور رہنے پر مجبور تھیں۔ محسن کے بعد میں نے بھی مالِ مُفت کو لُٹانے میں حرج نہ سمجھا لیکن بہت جلد ہماری جیبیں خالی ہوگئیں۔ ڈاکوؤں کی طرف سے دولت کی بارش صبح تک جاری رہی۔

مس بجلی اور موتی جان نے آخری آئٹم پیش کیا تو فرطِ جذبات میں محسن ان کے ساتھ رقص کرنے پر آمادہ تھا مگر میں نے اسے شرمندہ کیا۔

"کیوں اپنے آباو اجداد کی ارواح کو رُسوا کرتے ہو شیروانی صاحب۔"

"کبیر خاں صاحب! ہمیں کم رُسوا کیا آباو اجداد نے۔ اچھی بھلی سلطنت گنوادی۔" محسن بیٹھ گیا "اور کیا پتا جوانی میں وہ کیا کرتے رہے تھے۔ بحرِ ظلمات میں گھوڑے دوڑانے کے علاوہ۔"

میں نے کہا "وہ لہو و لعب سے کوسوں دور تھے۔ سلطنت آنی جانی چیز ہے۔ شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر۔ یہی ان کا شیوہ تھا۔"

"اچھا؟ پھر تو ہم انہی کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں۔ شمشیر و سناں سے پہلے یہ سب کرتے تو غلط ہوتا۔ بعد میں تو گویا اجازت ہے۔"

"اجازت کے بچے! اپنی اوقات مت بھول۔ میں سب بتادوں

گا گُل کو کہ آپ کیا گُل کھلا رہے تھے۔"

"میں بھی لفظ بہ لفظ رابعہ کو آپ کی خرمستی کا حال سنا دوں گا۔"

بعد میں ایک معاہدے کے تحت ہم نے گل اور رابعہ کے سامنے ایک ہی بیان دیا کہ سوائے عبرت پکڑنے کے ہم نے رات بھر کچھ نہیں کیا اور جو کچھ ہوتا رہا اس پر سوبار' ہزار بار لعنت۔ سب قربِ قیامت کی نشانیاں ہیں۔ ایکٹر ہم دونوں اچھے تھے یا رابعہ اور گل عام عورتوں کی طرح سب جان کے بھی انجان بنی رہنے والی فراخ دل مخلوق تھیں کہ انہوں نے ہماری معصومیت کا بھرم رکھا اور یہ بھی انکشاف نہیں کیا کہ وہ چھپ کر سب دیکھتی رہی تھیں۔ یہ بات رابعہ نے بہت عرصے بعد بتائی جب میں اسے بھول بھی چکا تھا۔

صبح کے آثار نمودار ہوئے تو محفل برخواست ہوئی۔ طافو نے کہا "چلو بھئی اٹھاؤ اپنا تان طنبورہ۔ اذان کا وقت ہے۔"

ناچنے گانے والیوں نے یا ان کے لواحقین نے زیادہ حیرانی کا اظہار نہیں کیا۔ شاید ایسا بھی ہوتا ہوگا۔ رات بھر شراب وشباب کے نشے میں ڈوبے رہنے والے صبح سربہ سجود ہو کے خدا سے کہتے ہوں گے کہ اس بندے کے یہ گناہ معاف کر۔ تو بڑا غفور الرحیم ہے۔ اگلی رات یا اگلی محفل تک وہ توبہ بھی بھول جاتے ہوں گے اور اپنا وعدہ بھی۔

ڈانسرز' تھکے ہارے سازندے اور ان کے ملازم آرام کرنے چلے گئے تو رنگِ محفل بدل گیا۔ سب اچانک خاموش اور سنجیدہ ہوگئے۔ اس جنگل میں آوازِ اذاں کہیں سے بھی نہیں آرہی تھی مگر ایک اندر کی آواز تھی جس سے کہیں مفر نہ تھا۔ جو ہم بھی ایسے ہی سُنتے تھے جیسے ڈاکو من موجی نے سُنی۔ کھلے احاطے میں وہ سب حلقہ بنائے منتظر تھے کہ طافو اٹھے تو باقی سب بھی اٹھیں۔

محسن نے مجھے کہنی مار کے آنکھ سے اشارہ کیا مگر میں تجسس میں مبتلا ہوگیا تھا اور یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اینٹی کلائمکس کیسے آتا ہے۔ نیند سے سب کی آنکھیں بوجھل تھیں۔ شراب کے نشے نے' ہیجان انگیز رقص نے اور طوائفوں کے فحش' معنی خیز اشاروں نے سب کے جذبات میں آگ سی لگادی تھی۔ وہ سب آتش فشاں کی طرح اندر ہی اندر پک رہے تھے۔

طافو نے اچانک کہا "پوپٹ پُتّر! میرا سنگی کتھے ہے؟"

پوپٹ لپک کے اٹھا "ابھی لایا استاد جی۔"

وہ واپس لوٹ کے آیا اور اس نے ساز طافو کو تھمادیا۔ طافو کچھ دیر اس پر پیار سے ہاتھ پھیرتا رہا پھر اس نے آہستہ سے ساز کے تاروں کو چھیڑا اور کھنکار کے گلا صاف کیا۔

"لو بھئی بجنو! دن چڑھنے والا ہے۔ کل کے دن کا بھروسہ نہیں" اس نے کسی کی طرف دیکھے بغیر کہا "ادھر کس نے پھر ملنا ہے۔ ملیں گے حشر والے دن تو اپنی اپنی پڑی ہوگی۔ سوہنا رب تم سب کو جہاں رکھے خوش رکھے اور اپنی امان میں رکھے ... ے اس کی بجنو کہ ہم ابھی جیتے ہیں۔ کسی کی گولی نہیں ... ہم جیل کے باہر ہیں لیکن بندے کو اشارہ سمجھنا چاہیے ... مہلت دی تھی' ساری زندگی کا لائسنس نہیں دیا تھا ... جوان تھا شیش ناگ۔ اس کی مہلت ختم ہوگئی ناگ منی ... سے فائدہ اٹھالیا۔ تم نے دیکھا' اب وہ ناگ منی نہیں ... ہے۔ سوہنے رب نے کیسا اس کی زندگی کو بدلا۔ جس ... سمجھ لی نا' وہ تو بندہ بن جائے گا اور جو بدبخت نہیں سمجھ ... پھر رب راکھا۔ کتنے عرصے بعد ناگ منی پھر آئی اور تم ... سیدھا راستہ دکھادیا۔ یہ بھی بتادیا کہ اس پر چل کے وہ ... سکتی ہے تو ہم سب بھی چل سکتے ہیں۔ کیا زور تھا میرا ... دیکھو' گل بانو نے سب کو حق دلوادیا۔ سوہنا رب اس کو ... دے جو بھی وہ مانگے۔ لو بھئی بجنو! میں کوئی مولوی نہیں ... کروں۔ طافو تو بڑا گنہگار بندہ ہے۔ تم بے شک طافو ... لیکن من موجی کو یاد رکھنا۔ آج من موجی کو آخری بار ... طرح دیکھ لو کہ وہ کیسا حرامی تھا..."

وہ شراب کے نشے سے اور جذبات سے مغلوب تھا ... باتیں بے ربط تھیں اور وہ بڑی مشکل سے اپنا مافی الضمیر ... تھا۔ وہ کوئی مقرر تھا نہ واعظ' نہ سیاسی لیڈر اور نہ دانش ... زبان میں اس نے وہی کہا جو اس کے دل میں تھا۔ جو دل ... خوب صورت الفاظ کا' فصاحت وبلاغت کا اور حسنِ بیان کا ... نہ تھا۔ دل کی بات تھی' دلوں میں اُتر گئی۔

طافو من موجی کے بجن ساتھی' ہم پیشہ' ہمراز ... ماتحت۔ دُکھ سُکھ' موت اور زندگی کی ہر گھڑی میں اس ... رہنے والے' اس کا حکم ماننے والے اور اس کے ... خاندان کی طرح رہنے والے' سب شراب کے لُٹے ... بوجھل دل ودماغ کے ساتھ خاموش بیٹھے اس کی باتوں کو ... سن رہے تھے جیسے روحانی مُریدانِ باصفا اپنے پیر طریقت ... فرمودات کو ایک پُرتقدس انہماک کے ساتھ سنتے ہیں ... تھے' بد اطوار تھے' قانون کے مجرم تھے اور ملعون ومردود ... انسان بھی تھے اور اپنی بنیادی حسیات سے محروم نہیں ہو ...

میں نے اور محسن نے دیکھا کہ خلیفہ رو رہا ہے اور ... آنسو بہنے لگے ہیں۔ ایک عمر کی رفاقت کے بعد دائمی جدائی ... آتا ہے۔ کبھی کسی ائرپورٹ پر' کبھی ایسے جنگل میں اور ... پر۔ راستوں کا ہمیشہ کے لیے الگ ہونا اور موت ایک ... کے تجربے کے دو روپ ہیں۔

من موجی نے اپنی آواز اٹھائی اور صبح کے سکوت ... صرف میں نے ہی نہیں سُنی' جنگل کے ہر درخت نے ... سادھے کھڑا تھا۔ پرانے ڈاک بنگلے کے در ودیوار نے ... فضا نے سُنی جو برسوں سے ان ڈاکوؤں کے ہر لمحے کی ...

... کہ نئی آوازیں ہوں گی اور نئی صورتیں مگر تم یہ چہرے پھر نہ دیکھو گے اور ایسی آواز کوئی نہ ہوگی۔

طافو نے پنجابی کے جو ماہیے اور بول گائے ان کا اُردو ترجمہ کچھ یوں ہوگا۔

پتّے سب گر جائیں گے
اس بار خزاں میں ہم
کیا جانے کدھر جائیں گے

اس کی پُرسوز آواز چند سیکنڈ کے لیے خاموش ہوئی اور پھر ابھری۔

نئے پھول بھی کھل جائیں گے
آئے گی بہار مگر....
ہم گھر نہیں آئیں گے

صبح کا افق سے جھانکتا اُجالا' جنگل کا سمٹتا دُھندلکا' فضا اور ہوا ... سب گوش بر آواز تھے۔

کچھ اور نہیں کہنا
جب عید کا دن آئے
گلے یادوں سے مل لینا

آنسو اب من موجی کے رخساروں پر لکیریں بنانے لگے تھے اور اس کی درد بھری آواز کا جادو ہر آنکھ کو نم کر رہا تھا۔

کیا لطف ہے جینے میں
ہم تم سے جدا ہوتے ہیں
ساون کے مہینے میں

وہ ایک بے خودی کی کیفیت میں اٹھا اور آہستہ آہستہ ہم سب کے درمیان رقص کرنے لگا۔ اس کی آواز میں دل کا سارا درد جاگ اٹھا۔

مٹی کا نہیں ہے ٹھکانا
ورنہ تم سے کہتے ہم
دو پھول چڑھا جانا

ان سیدھے سادے بولوں میں جذبات کا خلوص تھا اور سچائی ... زندگی کے سات رنگ تھے جو موسیقی کے سات سُروں سے ... نظر آتے تھے جیسے منشور سے گزرنے والی سورج کی کرن کی ... کے سارے رنگ۔ یہ کوئی بہت بلند پایہ' ادبی حیثیت کی ... شاعری نہیں تھی۔ اس میں صوفیانہ کلام کے الہامی اسرار و رموز بھی نہیں تھے۔ یہ ہم جیسے ملنے بچھڑنے' پیدا ہو کے زندگی کے ... ساتھ چلنے اور مر کے دل میں یاد کی طرح رہنے والے ... انسانوں کی ازلی وابدی کہانی تھی۔ مجھے نہیں معلوم' وہ کب تک ... رقص کرتا رہا اور روتا رہا کیونکہ خود میں اس کے ساتھ ... رو رہا تھا۔ میرے ساتھ محسن رو رہا تھا اور طافو من موجی کے سنگی بجن ... رو رہے تھے۔ صبح کی ہوا' سورج کی پہلی کرن' قطرۂ شبنم' سب ... رو رہے تھے۔ کوئی نہیں بتا سکتا کہ کیا ہوتا ہے جب گیت کا ایک بول' ایک نغمۂ ساز' ایک یاد کی خلش یا ایک خیال کا نقش طافو من موجی جیسے ڈاکو اور میرے جیسے شخص کے جذبات پر ایک ہی طرح اثر کرتا ہے اور ایک دردِ مشترک کا احساس اشکوں میں ڈھل جاتا ہے۔ آنسو تو ایک جیسے ہوتے ہیں۔

اچانک نغمۂ ساز خاموش ہوگیا' رقص تھم گیا۔ کائنات جیسے منجمد ہو کے خلا میں ٹھہر گئی۔ میں نے مشرق کے روشن افق کو دیکھا۔ 'کل کا سورج کون کہاں دیکھے گا؟' میں نے ایک ایک ڈاکو کی صورت کو دیکھ کے سوچا۔ وہ سب خاموش اور ساکت بیٹھے تھے' ان سب کے آنسو تھم گئے تھے۔ من موجی اپنے ساز کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے محسن کے اشارے پر پیچھے دیکھا۔ رابعہ اور گل برآمدے کے ستون سے لگی کھڑی تھیں۔

"اچھا بھئی بجنو! دن چڑھ گیا" من موجی نے لہجہ بدل کے اور مسکرا کے کہا "چلو جا کے سو جاؤ۔ رات تک تیاری کرلو چلنے کی۔"

پوپٹ نے آنسو پونچھ کے کہا "استاد جی...."

"ہاں پتّر۔ سوہنا رب جو کرتا ہے اچھا کرتا ہے" طافو نے اس کے دل کی بات کو الفاظ میں ادا ہونے سے پہلے سمجھ لیا "اس کی یہی مرضی ہے۔"

خلیفہ نے کہا "کہا سنا معاف کرنا یارو۔"

من موجی ہنس پڑا "معافی دے گھوڑے۔ کس بات کی معافی؟ آخر کیا کیا ہے تو نے؟ اوئے کسی نے بھی کسی سے معافی نہیں مانگنی۔ بجن یار تھے ہم سارے۔ کسی نے کسی کے ساتھ برائی کی ہوتی تو وہ بجن کہاں ہوتا۔ دشمن ہوتا۔"

پھر اس نے ایک عجیب حرکت کی۔ اس نے اپنے ساز کو گھٹنے پر مار کے اس کے دو ٹکڑے کردیے "پوپٹ پُتّر! اس لاش کو دفنا دینا تمہیں مگر مجھے مت بتانا۔ سمجھ آگئی ہے نا میری بات؟ یہ بھی اپنا سنگی تھا۔"

اس نے ساز کے دونوں ٹکڑے نیچے پھینکے اور پلٹ کے تیز تیز قدم چلتا برآمدے سے گزرتا ہوا اپنے کمرے میں غائب ہوگیا۔ پوپٹ نے ساز کے ٹکڑوں کو اتنے احترام اور عقیدت سے اٹھایا جیسے وہ سچ مچ کسی لاش کے اعضا ہوں۔ اس نے انہیں چوما اور آنکھوں سے لگایا۔

محسن نے مجھے ٹہوکا دیا "چل یار۔ تماشا ختم ہوگیا۔"

میں نے ایک آہ بھری "ہاں یار۔ عجب تماشا تھا۔ پہلے نہ دیکھا' نہ سُنا۔"

مس بجلی اور موتی جان کا خیال بھی پرانے خواب کی طرح رہ گیا تھا۔ وہ وقت بہت پیچھے رہ گیا تھا جب میں اور محسن ان کے رقصِ شرربار میں سب کے ساتھ پروانوں کی طرح جل رہے تھے۔ خوشی کے جذبات کا تاثر کتنا وقتی اور سطحی ہوتا ہے' دردِ روح میں کتنی گہرائی تک اترتا ہے' یہ تجربہ کسی ثبوت کا محتاج نہیں تھا۔ جب میں اور محسن دل گرفتہ لوٹے تو ڈاکو منتشر ہو رہے تھے۔ پوپٹ

اپنے استاد کی ہدایت کے مطابق من موجی کے سنگی کی تدفین کے لیے جنگل کی طرف کہیں نکل گیا تھا۔

رابعہ اور گل کی آنکھیں بھی اب خشک تھیں مگر صاف لگتا تھا کہ وہ بھی روتی رہی ہیں۔ بائیں جانب کسی کمرے میں مس بجلی گجرات والی اور موتی جان سوئی پڑی تھیں۔ جذبات میں جو آگ انہوں نے اپنے حسن و شباب کی جلوہ نمائی سے لگائی تھی' وہ صبح ہونے سے پہلے ہی ان آنسوؤں نے بجھادی تھی جو من موجی کی آواز کے درد کا ثمر تھے۔ شہر کی وہ پیشہ ور ڈانسرز ہار گئی تھیں جن کو اپنی آواز کے جادو پر اور اعضا کی شاعری پر غرور تھا کہ وہ چاہیں تو محفل کو دیوانہ کردیں' پتھر کو موم کردیں اور برف کے صحرا میں آگ کا دیا روشن کردیں۔ طافو جیت گیا تھا۔

رابعہ نے کہا "بڑا درد ہے اس کی آواز میں۔"

محسن نے کہا "ان کے دل ابھی تک درد شناس ہیں' پتھر نہیں ہوئے۔"

"شاید دل کبھی پتھر نہیں ہوسکتے۔" گل نے کہا "یہ احساس مجھے پہلے بھی ہوتا تھا۔ یہ لوگ ذرا بھی نہیں بدلے' میں کتنا بدل گئی ہوں۔"

"کیا تمہیں افسوس ہو رہا ہے؟" محسن نے کہا۔

"مجھے بدلنے والے تم ہو۔ کیا تمہیں افسوس ہے کہ تم نے ایسا کیوں کیا تھا؟" گل نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر کہا۔

محسن نے نفی میں سرہلایا "مجھے تو غرور ہے تم پر گل۔ افسوس کیسا۔"

"پھر مجھ سے کیوں پوچھتے ہو؟"

"اچھا بابا' معاف کرو۔ غلطی ہوگئی۔ آئندہ نہیں پوچھوں گا۔" محسن نے ہاتھ جوڑ کے کہا۔

رابعہ نے مسکرا کے کہا "تم لوگ تو رات بھر جاگتے رہے۔"

محسن نے چور نظروں سے مجھے دیکھا "وہ۔ ہاں' بس بیٹھ گئے تو بیٹھ گئے۔ محفل سے اٹھنا ذرا معیوب لگتا تھا۔"

"پھر جب محفل ایسی ہو" میں نے اعترافِ جرم کے انداز میں کہا "تم بھی تو دور سے نظارہ کررہی تھیں۔ بلکہ نگرانی۔"

رابعہ نے نفی میں سرہلایا "ہم طافو کی آواز پر جاگے تھے۔ وہ سب بے ہودگی ہم نے نہیں دیکھی۔"

"اچھا! جب آپ نے کچھ دیکھا ہی نہیں تو یہ فیصلہ کیسے کرلیا کہ وہ بے ہودگی تھی؟"

"آوازیں جو آرہی تھیں تالیوں اور سیٹیوں کی۔"

"ہاں۔ کچھ زیادہ ہی جذباتی ہوگئے تھے یہ لوگ۔" میں نے محسن کی طرف تائید طلب نظروں سے دیکھا۔

"اور آپ لوگ تو جیسے بڑی شرافت سے سر اور نظریں جھکائے بیٹھے تھے؟" رابعہ نے طنز سے کہا "بس میرا منہ مت کھلواؤ۔ دیکھا تھا ایک بار باہر آکے ہم نے۔ کیوں گل' کیا کررہے تھے یہ لوگ؟"

گل ہنسی "چلیں چھوڑیں رابعہ باجی۔ معاف کرو بے چاروں کو۔"

"بے چارے! کون بے چارے؟" محسن نے "شرفا پر تہمت لگاتے ہوئے آپ کو کچھ شرم آنی چاہیے رابعہ۔"

"شرم تمہیں آنی چاہیے" گل بگڑ گئی۔

"اچھا شام کو دیکھیں گے آتی ہے یا نہیں۔ ابھی تو ... ہے" محسن نے منہ پھاڑ کر ڈھٹائی سے کہا۔

دوپہر تک میں بھی بے خبر پڑا رہا اور گزشتہ شب کی ... ہوئی تو آنکھ خود بخود کھل گئی۔ کمرے میں میرے سوا کوئی ... تھا۔ محسن مجھ سے پہلے ہی بیدار ہوچکا تھا اور مجھے باہر ... ہنسنے کی آواز آرہی تھی۔ موضوعِ سخن مس بجلی گجرات والی ... موتی جان تھیں۔ محسن پریشان کرنے کے لیے گل کے سامنے ... افشانی کررہا تھا کہ سبحان اللہ۔ مس بجلی فتنۂ محشر تھی تو ... قیامت۔ کیا رقص تھا اور کیا رقاصہ تھی۔ کیا نزاکتِ ... اک شعلہ جوالہ تھا یا برقِ طور تھی...

رابعہ اسے شرمندہ کرنے کی بے سود کوشش کررہی تھی ... گل محض خفا ہورہی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ محسن کا ... اسے جلانے کے سوا کچھ نہیں' وہ جلی کٹی باتیں سنارہی تھی ... ہی تھیں تو چلے جاتے انہی کے ساتھ۔ مجھے کیا پروا ہے۔ ... وہ گل تھی' نازو نہیں ورنہ محسن کی ایسی جرأت نہ ہوتی۔ ... دیکھتی تھی کہ غالب کے دماغ کی رو کچھ زیادہ ہی بہک رہی ہے ... اپنی خفگی کا عملی اظہار یوں کرتی تھی کہ غالب کا دماغ ... راست پر آجاتا تھا۔

خیال تو میرا بھی یہی تھا کہ اپنی "بے راہروی" کو ... پردے میں چھپانے کی حکمتِ عملی ہی سب سے بہتر اظہار ... کی صورت ہوگی۔ اس سے پہلے کہ رابعہ ہماری شوقینی اور ... مزاجی پر مزید طعنہ زنی کرے اور زنانہ حسد کا فطری ردِعمل ... میں بھی محسن کی طرح ڈھیٹ ہوجاؤں۔ جارحیت ہی کو حالت ... میں بہترین دفاع سمجھا جاتا ہے۔ مگر اب مجھے اس کی ... محسوس نہیں ہوتی تھی۔ محسن یہ فریضہ بطریقِ احسن انجام ... تھا اور میں یہی ڈراما پھر کرتا تو فلاپ ہوجاتا۔

پلنگ سے اتر کے میں دبے پاؤں دروازے تک گیا۔ ... میری طرف پیٹھ کیے برآمدے کے کنارے پاؤں لٹکائے ... رابعہ کے پیچھے جا کے میں نے چلا کے کہا "بھوک لگی ہے مجھے" ... گل نے باقاعدہ سینے پر ہاتھ رکھ کے چیخ ماری اور "ہائے" ... کہا۔ رابعہ اچھل پڑی اور اس نے ایک دم پلٹ کے اور ... نکال کے مجھے گھورا۔

"یہ کیا حرکت ہے؟"

"میرا تو دل اتنے زور سے دھڑک رہا ہے" گل نے کہا۔

محسن پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ "دل کا تو کام ہی دھڑکنا ہے۔ بندے کو بھوک لگی ہے تو وہ شور بھی نہ مچائے۔"

میں نے اس حمایت پر محسن کا شکریہ ادا کیا "سچ فرمایا ہے آپ نے۔"

"میں بندے کی بات کررہا تھا۔ آپ گھوڑے کی طرح ہنہناتے ہیں تو جائیے' گھاس کھائیے" اس نے سامنے احاطے میں لہلاتی ہوئی لمبی لمبی گھاس کی طرف اشارہ کیا "آپ کی عقل تو رات ہی گھاس چرنے چلی گئی تھی۔ اسے بھی ساتھ لے آیئے گا۔ کہیں زیادہ چرنے سے بدہضمی نہ ہوجائے۔"

میں رابعہ کے ساتھ بیٹھ گیا "رابعہ! مجھے معاف کردو۔"

رابعہ حیران ہوئی "اب خیال آیا ہے؟"

"میں رات بھر سوچتا رہا۔"

"کیا سوچتے رہے؟" رابعہ نے دل ہی دل میں خوش ہوکے کہا۔ اس کو یقین تھا کہ میں اسی کے بارے میں سوچنے کی بات کروں گا اور معافی بھی میں اپنے اس بے ہودہ طرزِ عمل کی مانگ رہا ہوں جو میں نے سرِ محفل اختیار کیا تھا۔

"یہی... کہ میں موتی جان کے ساتھ بھاگ جاؤں۔"

رابعہ کا موڈ محسن کے قہقہے سے اور خراب ہوگیا "سوچتے کیوں رہ گئے؟ کوشش کرتے۔"

"بس تمہارا خیال آگیا۔ تمہیں تو کوئی رونے والا بھی نہیں رہے گا۔"

رابعہ نے اٹھنے کی کوشش کی "بہت ہیں مجھے رونے والے۔ تم جاؤ۔"

میں نے اس کی کلائی پکڑلی "تم اجازت دے رہی ہو' خوشی سے؟"

"ہاں میں خوشی سے کہہ رہی ہوں۔" اس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔

"میری بھی ایک شرط ہے۔ تم بعد میں چوہدری دلاور سے..."

"سکندر! میں ماربیٹھوں گی" رابعہ کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا "ایسی بے ہودگی مجھ سے مذاق میں بھی برداشت نہیں ہوتی۔"

محسن نے ہنستے ہوئے کہا "جب معلوم ہے کہ یہ مذاق ہے تو لال مرچ کیوں ہورہی ہو؟"

گل نے بھی کہا "باجی! آپ تو مجھے سمجھا رہی تھیں۔"

میں نے اسے پھر بیٹھنے پر مجبور کردیا "دوسروں کو سمجھانا تو بہت آسان لگتا ہے' خود سمجھنا بہت مشکل کام ہے۔ کیوں جی؟"

رابعہ کا غصہ کچھ کم ہوا "مت بات کرو مجھ سے۔"

میں نے کہا "میں منانے کا ایک ہی طریقہ جانتا ہوں۔ معلوم ہے نا؟"

محسن نے انجان بن کے کہا "وہ کون سا طریقہ ہے یار؟"

"ڈی اے ڈی آر۔ برخوردار" میں نے کہا۔

"بزرگوار! ذرا وضاحت فرمایئے" محسن بولا۔

(DIRECT ACTION FOR DESIRED RESPONSE)

میں نے کہا "یعنی مطلوبہ ردِعمل کے لیے راست اقدام۔"

"استادِ محترم! اس کا عملی مظاہرہ ہو تو سمجھ میں آئے۔"

میں نے سر گھما کے رابعہ کی طرف دیکھا "یہاں... سب کے سامنے..."

رابعہ ایک دم نیچے کود گئی۔ غصے کے ساتھ اب حیا سے بھی اس کے چہرے پر کچھ اور لالی آگئی تھی۔ گل بھی سمجھ گئی تھی کہ ڈی اے ڈی آر کیا بلا ہے۔ اس نے رابعہ کا ساتھ دیا اور وہ پاؤں پٹختی اندر چلی گئیں۔ میں نے محسن سے ہاتھ ملایا اور ہم انہیں چڑانے کے لیے مسخروں کی طرح حلق سے مضحکہ خیز آوازیں نکال کے ہنستے رہے۔

"ڈی اے ڈی آر۔ یہ کیا تھیوری ہے بائی داوے؟"

میں نے کہا "سکھ کی اولاد! ہنسنے کے بعد پوچھتا ہے لطیفہ کیا تھا۔ ابے اس کا مطلب تو صاف ہے۔ لڑکی روٹھ جائے تو پکڑ کے چومو اور اس کا سارا غصہ پی جاؤ۔ ایسے جیسے سپیرا زہر چوس لیتا ہے۔"

"میرا بھی یہی خیال تھا" محسن بولا "اندر چلیں؟"

"یہاں اتنا سناٹا کیوں ہے؟"

"وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے۔"

"کیا مطلب؟"

"مس بجلی اور موتی جان صبح دم رخصت ہوئیں۔ ڈاکو نہ جانے کدھر نکل گئے ہیں۔ شاید الوداعی ملاقاتیں کررہے ہوں گے۔"

"کس سے؟ دوسرے ڈاکوؤں سے؟"

"ہاں۔ ان سے بھی" محسن بولا "ممکن ہے کوئی سابقہ تجربے کی بنا پر کہیں متبادل جگہ تلاش کررہا ہو۔ کہ فدوی اتنا عرصہ شیش ناگ اینڈ کمپنی میں سینئر ڈاکو کے فرائض منصبی سرانجام دے چکا ہے۔ فدوی نے اس عرصے میں چار افراد کو تین گولیوں سے قتل کیا' دو کو خنجر گھونپا۔ سترہ بار پولیس مقابلے میں ہلاک ہوا۔ ایک سو سترہ وارداتوں میں سترہ لاکھ نقد اور سترہ سو تولہ خالص سونا تیزابی کے زیورات لوٹے مگر نہ کہیں پولیس پکڑ سکی نہ انکم ٹیکس والے۔ گزارش ہے کہ فدوی کو اپنے زیرِ سایہ خدمتِ خلق کا موقع فراہم کیا جائے۔ ناچیز عرض گزار طافو عرف من موجی۔"

میں نے کہا "مجھے نہیں لگتا کہ ان میں سے کوئی پھر یہ کام کرے۔"

"بھائی' جب چور کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ ہیرا پھیری سے نہیں جاتا تو ڈاکو کیسے تائب ہوکے رزقِ حلال پر اکتفا کرسکتا

ہے؟"

میں نے کہا "اوروں کا پتا نہیں مگر طافو من موجی کے بارے میں مجھے یقین ہے اور پوپٹ کے بارے میں بھی۔"

"چلو جی ہمیں کیا۔ کوئی چور بنے یا سادھو۔ ہم تو شام کو خالی ہاتھ جھاڑ کے روانہ ہو جائیں گے اور خدا کا شکر ادا کریں گے جس نے بچھڑے ہوؤں کو ملایا اور بھٹکے ہوؤں کو گھر کا راستہ دکھایا۔"

میں نے کہا "مجھے شام کو سولہ لاکھ بھی وصول کرنے ہیں۔"

محسن بولا "اکیلے مت جانا سکندرِ اعظم۔"

"پھر کیا تمہیں ساتھ لے جاؤں مسٹر ٹارزن؟"

"کیا خیال ہے' رقم کون لے کر آئے گا؟ پولیس یا اینٹی کرپشن والے ہم رکاب ہوں گے؟" محسن نے کہا۔

"میں منظر سے ایسی عظیم الشان حماقت کی توقع نہیں رکھتا۔ ایسا ہوا تو ہم سب بھی مارے جائیں گے۔"

"بھی کا کیا مطلب ہے؟"

"ڈاکو اور پولیس والے تو خیر مریں گے۔ مقابلہ ضرور ہو گا۔ ڈاکو اس جنگل کے چپے چپے سے واقف ہیں اور تھانے داران سے ملا ہوا ہے۔ وہ ہر طرف سے تھانے کے گرد مورچہ بند بیٹھے ہوں گے۔ ان کے ہدف پر۔ سولہ لاکھ کی خاطر یہ خونریزی قانون نافذ کرنے والوں کے نقطۂ نظر سے تو جائز سمجھی جائے گی مگر یار! کیا ہم پولیس مقابلے میں ڈاکوؤں کے ساتھ مارے جائیں؟ شہادت تو خیر نصیب میں نہ تھی' حرام موت کیوں قبول کریں۔"

"خدا کرے' خبر نہ چھپی ہو اور یوسف کا وہ توپ سُسر کوئی گولہ نہ چلائے۔" محسن بولا۔

"میرے ذہن میں ایک ترکیب ہے" میں نے کہا "میری چھٹی حس کہتی ہے کہ میرا کھل کے سامنے جانا خطرے سے خالی نہیں۔"

محسن نے مجھ سے ہاتھ ملایا "یہی تو میری ساتویں حس بھی کہہ رہی تھی۔ ترکیب کیا ہے؟"

"پیٹ خالی ہے۔ دماغ سے ہر بات نکل کے معدے میں چلی جاتی ہے۔ ناشتے کے بعد بتاؤں گا۔" میں نے کہا "بلڈ پریشر کی طرح عقل کا بھی پریشر ہوتا ہے جو اس وقت صفر کے قریب ہے۔ پیٹ بھرے گا تو عقل کا پریشر نارمل پر آجائے گا' پھر بات ہو گی۔"

خواتین نے' جو در حقیقت تین نہیں' دو تھیں' ٹھنڈے ناشتے کو گرم کر لیا تھا اور قابلِ استعمال بنا کے اپنے سگھڑ ہونے کا ثبوت دیا تھا ورنہ ٹھنڈی چائے پی کے تو تعلقات اتنے کشیدہ ہو جاتے کہ ڈی اے ڈی آر کا طریقہ بھی ناقابلِ عمل اور غیر موثر ہو جاتا۔

پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق ہمارے تشریف لاتے ہی رابعہ نے گل کو مخاطب کیا "میں نے تو پہلے بھی کہا تھا نازو سے کہ مجھے سکھا دو۔"

گل نے سہلایا "جوڈو کراٹے سیکھے بغیر کام نہیں چلے گا۔"

"لاتوں کے بھوت واقعی باتوں سے نہیں مانتے" رابعہ بولی۔

میں نے محسن کو مخاطب کیا "یہ غالب کے سُسر کی بات کر رہی ہیں۔ کیا تجھے معلوم ہے کہ وہ بھوت ہے؟"

"یعنی یہ غالب کے سُسر کو لاتیں ماریں گی۔ توبہ توبہ! یہ شریف زادیوں کے لچھن ہیں" محسن نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

"اور وہ سب جو تم رات مس بجلی اور موتی جان کو دیکھ دیکھ کے کر رہے تھے' وہ شریف زادوں کے لچھن تھے؟" گل ہنسنے لگی۔

میں نے کہا "گل بانو! تم کب سے جاگ رہی ہو؟ تم کب سوئی تھیں؟"

"صبح تو ہو گئی تھی جب ہنگامہ ختم ہوا تھا۔ اس کے بعد کیا سونا۔ ہم جنگل میں پھرتے رہے۔ بڑا مزہ آیا" رابعہ بولی۔

"بڑا مزہ آیا۔" محسن نے اس کی نقل اتاری "مل جاتا کوئی شیر یا چیتا تو بریک فاسٹ میں اسے بھی بڑا مزہ آتا۔ ایسی لذیذ اور حسین لڑکیاں روز کہاں ملتی ہوں گی۔"

میں نے آہ بھر کے کہا "افسوس محسن! ہماری بد قسمتی ہے کہ اس جنگل میں نہ شیر ہیں نہ چیتے۔"

محسن بولا "ڈاکو تو ہوں گے اور بھی۔"

"ہاں۔ اِدھر اُدھر کے کچھ لوگ آج آئے تھے۔ تجربہ کار لوگوں کی اسامی ہمیشہ خالی رہتی ہے" گل نے کہا "آفر تو پہلے بھی آتی رہی تھیں مگر گیا کوئی نہیں۔"

"آج کیا ہوا؟"

"طافو نے تو صاف انکار کر دیا۔ باقی کے بارے میں کہا کہ انہی سے پوچھ لو' میری طرف سے کسی پر کوئی بندش نہیں۔"

"یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"مجھے طافو نے بتایا تھا۔ وہ خاصا رنجیدہ تھا۔ بہت شرمندہ بھی تھا کہ اس نے میرے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ دراصل اسے امید نہیں تھی کہ ہم اتنی شرافت کا ثبوت دیں گے اور تم میرا مان رکھنے کے لیے سولہ لاکھ اتنی آسانی سے پھینک دو گے۔ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ ناگ منی' میرا کوئی ارادہ نہیں تھا تیرے ساتھ زیادتی یا زبردستی کرنے کا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ تو جھوٹ نہیں بول رہی ہے اور تجھے واقعی معلوم نہیں کہ تیرے بھائی نے وہ رقم کہاں رکھی تھی لیکن مجھے دوسروں نے مجبور کر دیا کہ جیسے بھی ہو' رقم واپس دلواؤ۔ وہ سب کہتے تھے کہ ہم سے پیشہ چھوڑنے کی بات بھی کرتے ہو اور یہ بھی چاہتے ہو کہ ہم خالی ہاتھ جائیں۔ کیا کریں گے ہم دنیا میں؟ ڈاکے نہیں ڈالیں گے تو کیا بھیک مانگیں گے؟ پیٹ بھرنے کے لیے کچھ تو کرنا ہی پڑے گا اور کچھ کرنے کے لیے پیسہ چاہیے۔ طافو کو اب یہ خیال پریشان کر رہا ہے کہ وہ پیسہ لے کر بھی پرانے دھندے نہیں چھوڑیں گے اور کسی دوسرے گروہ میں شامل ہو جائیں گے یا کہیں اور جا کے اپنا گروہ بنا لیں گے۔ وہ خلیفہ کو سردار بنانے کی باتیں بھی کر رہے تھے۔ ایک گروہ شریف ڈاکو کا بھی ہے یہاں۔ اس کا نام شریف ہے۔"

میں نے کہا "اگر یہ بات ہے تو پھر ہمیں بھی ... پڑے گا۔"

"کیا سوچنا پڑے گا؟" محسن بولا "زبان دے کے پھر جاؤ گے؟"

"زبان ہم نے دی تھی اس یقین دہانی پر کہ یہ پیسہ لے کر وہ شریفانہ زندگی بسر کریں گے۔ انہوں نے عہد کیا تھا۔"

محسن نے کہا "ایک ڈاکو کے عہد کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔"

"تو پھر ہمیں بھی ان کے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہیے جس کے وہ مستحق ہیں۔ ہم ان کی مدد کرنا چاہتے تھے۔ گل بانو کے سامنے انہوں نے عہد کیا تھا کہ وہ ڈاکو کا پیشہ چھوڑ دیں گے۔ انہیں اپنے عہد کا پاس نہیں تو ہم کیوں کریں۔ ایک ڈاکو کو شریف آدمی بنانے کی قیمت تو ادا کی جا سکتی ہے' کسی ڈاکو کو نذرانہ پیش نہیں کیا جا سکتا۔"

"جذباتی معاملات سے قطع نظر ڈاکو صرف ڈاکو ہوتے ہیں اور ان کے لیے جان سے زیادہ مال کی اہمیت ہوتی ہے۔ اس قسم کے حالات میں وہ طافو کے خلاف بغاوت بھی کر سکتے ہیں۔ انہیں پیسہ مل جائے تو شاید وہ کسی سے کچھ نہ کہیں۔ پیسہ نہ ملا تو وہ طافو کو قصوروار ٹھہرائیں گے کہ تم نے ہمارے ساتھ غداری کی' تم نے ہماری باتیں اُن کے آگے پہنچا دیں اور ہمیں سولہ لاکھ سے محروم کیا۔ وہ طافو کو جان سے بھی مار دیں گے اور عین ممکن ہے' گل کے لیے بھی پریشانی کے اسباب پیدا کریں۔"

میں نے کہا "تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہمیں ذرا ڈپلومیسی سے کام لینا ہو گا۔ گل! تمہیں معلوم ہے' وہ لوگ کہاں گئے ہیں؟"

"اپنا اپنا اسباب سمیٹ کر کہیں لے گئے ہیں۔ یہاں اب ان کا کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ میں نے گھوم پھر کے دیکھ لیا ہے۔ سارے کمرے خالی پڑے ہیں۔"

میں نے کہا "اچھا۔ اس کا مطلب ہے وہ روپوش ہو گئے ہیں۔ انہیں خطرہ ہے کہ پولیس چھاپا نہ مار دے۔ اصلی چھاپا۔"

"ہاں۔ غالب کی وجہ سے وہ کچھ ڈرے ہوئے تھے" گل نے کہا۔

"اس خبیث تھانے دار نے انہیں مشورہ دیا ہو گا کہ کسی کے بھروسے میں مت رہنا۔ یہ اخبار والے بڑے چالاک اور خطرناک لوگ ہوتے ہیں" محسن بولا۔

میں نے کہا "اس نے کل ٹیلی فون پر میری باتیں سن کے اندازہ لگایا ہو گا کہ معاملہ گڑ بڑ ہے۔ خیر' شام کو دیکھیں گے' وہ اپنا حصہ کیسے وصول کرنے آتے ہیں۔ وہ یقیناً ہم پر نظر رکھیں گے اور شہر سے آنے والے راستے پر بھی کہ رقم لانے والے کون ہیں اور کتنے ہیں۔"

"تمہاری عقل کا پریشر نارمل ہو گیا ہے غالباً۔ اب تم بتا سکتے ہو کہ تمہاری اسکیم کیا تھی؟"

میں نے سہلایا "اس کے لیے مجھے کم سے کم دو گھوڑے درکار ہوں گے۔ اصلی اور جاندار۔"

"گھوڑے!" محسن بولا "گرد و نواح میں حشرات الارض تو بہت ہیں مگر مجھے سب سے بڑا چوپایہ ایک کتا نظر آیا تھا۔"

گل نے کہا "گھوڑے تو کسی گاؤں سے ہی مل سکتے ہیں۔"

"اور قریب ترین گاؤں یہاں سے کتنی دور ہو گا؟"

"چار پانچ میل۔ ادھر۔" گل نے اشارے سے بتایا "یہ بھی یقین نہیں کہ وہاں گھوڑے ہوں اس وقت اور وہ تمہیں مل جائیں۔"

"ہم گھوڑے خرید سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"اور پھر بیچ کے سو سکتے ہیں" محسن بولا۔

"کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے" میں اٹھ کھڑا ہوا "چل محسن! ہم ذرا گھوم پھر کے آتے ہیں گھوڑوں کی منڈی تک۔"

"وہ..... جیسا کہ آپ جانتے ہوں گے' ناچیز کی جیب تو خالی ہے اور آپ بھی ماشاء اللہ سب کچھ لٹا چکے تھے کل رات۔ سوائے اپنی جوانی کے" محسن بولا "گھوڑے خریدنے کے لیے کیا ہے آپ کے پاس؟"

میں نے کہا "یار! تو اپنی سُسرال میں ہے' بیوی سے کہہ۔"

محسن نے مظلوم صورت بنا کے گل کو دیکھا "بیوی! میری عزت کا سوال ہے۔ ڈوب مرنے کا مقام ہو گا اگر۔۔۔"

گل کا چہرہ گلابی ہو گیا "فضول باتیں مت کریں۔ میرے پاس چار پانچ ہزار پڑے ہیں' وہ لے جائیں۔"

"چار پانچ ہزار لے کر ہم کوئی فضول بات نہیں کریں گے۔ وعدہ۔" میں نے کہا "بلکہ کوئی بھی بات نہیں کریں گے۔"

رابعہ نے کہا "تمہیں یقین ہے کہ تم اس جنگل سے نکل کے کہیں جا سکو گے؟ وہ محاصرہ کیے بیٹھے ہوں گے ہر طرف۔"

میں نے کہا "آخر ہم تمہیں کس لیے چھوڑ کے جا رہے ہیں؟ یہ ضمانت کافی ہے ہماری طرف سے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم واپس نہ آئیں؟"

"اور بالفرض ہم نہ آئیں' گھوڑے کو ایڑ لگائیں اور نکل جائیں ملک پرستان کی طرف۔ یعنی بمبئی کی طرف جہاں زینت امان اور ہیما مالنی ہمارے لیے چشم براہ ہیں۔ تو برا مت ماننا" محسن نے کہا۔

میں نے سہلایا "نیک بیبیوں کی طرح ہماری سلامتی اور خیر و عافیت سے واپسی کے لیے دعا کرنا۔ فی امان اللہ۔"

جنگل سے ہم یوں گزرے جیسے ہمارا مقصد تفریح کے سوا کچھ نہیں۔ ہم بے فکری سے درختوں کے پرندوں کو اور گرد و پیش کی ہر چیز کو ایسے دیکھتے جا رہے تھے جیسے شہر کے باسی پہلی بار جنگل میں پکنک... منانے جاتے ہیں تو مظاہرِ قدرت کو حیرانی اور تجسس سے دیکھتے ہیں۔ کبھی میں محسن سے کہتا تھا "وہ دیکھ یار' کبوتر" اور محسن کہتا تھا "کبوتر نہیں' یہ فاختہ ہے۔ بے شک پوچھ لو اس سے۔"

ایک جگہ محسن نے کہا "یہ انگور کا درخت ہے۔"

"بے وقوف! انگور کی بیل ہوتی ہے اور انگور یہاں نہیں ہوتے" میں نے کہا "یہ مونگ پھلی کا درخت ہے۔"

شہر کے ماحول میں پلنے والے بچے ایسی باتیں کریں تو گاؤں میں رہنے والے ہنستے ہیں اور پھر ترس کھا کے کہتے ہیں۔ ان بے چاروں کو کیا پتا۔ یہ تو ریڑھی پر ہی دیکھتے ہیں انگور اور مونگ پھلی۔

ہمارا اصل مقصد اردگرد کے ماحول کا کسی جاسوس کی نظر سے جائزہ لینا تھا کہ کوئی چھپ کر ہمیں دیکھ رہا ہے یا ہمارے تعاقب میں ہے تو معلوم ہو جائے۔ اچانک ادھر اُدھر دوڑ کر جانا بظاہر ایک معصوم اور بے ضرر سی حرکت تھی مگر ایسے ہی ہم معمولی سی نقل و حرکت کو بھی نوٹ کر سکتے تھے۔ تقریباً ایک میل دور آجانے کے بعد محسن نے اس یقین کا اظہار کیا کہ سب ٹھیک ہے۔

گل نے ہمیں راستہ سمجھانے کے لیے چند نشانیاں بھی بتائی تھیں۔ کسی دشواری کے بغیر ہم نے انہیں تلاش کر لیا اور گھومتے پھرتے دو گھنٹے میں اس گاؤں تک جا پہنچے جس کی آبادی مشکل سے ایک ہزار نفوس ہوگی۔ یہ گاؤں مایوس کُن حد تک چھوٹا تھا اور یہاں سے دو گھوڑوں کا ملنا مشکل نظر آتا تھا۔ ابھی ہم گاؤں کی حدود میں داخل بھی نہیں ہوئے تھے کہ پیچھے سے ایک تانگے کی شکل نظر آئی جو کچے راستے پر رینگتا ہوا آرہا تھا۔

"مبارک ہو۔ ایک ہارس پاور کا ایک گھوڑا رضائے الٰہی یا قضائے الٰہی سے خود ادھر آرہا ہے" محسن نے مجھ سے ہاتھ ملا کے کہا۔

میں نے کہا "کیا مطلب؟ اس سے گھوڑا لے کر تانگا اس کے پاس چھوڑ دیں گے کہ اسے خود لے جاؤ۔"

"تھوڑی دیر کے لیے وہ خود کو گھوڑا فرض کرلے تو فائدے میں رہے گا۔"

"اور اس نے کہا کہ میں چلتا ہوں گھوڑے پر، تم تانگہ لے جاؤ، تم تھوڑی دیر کے لیے خود کو گھوڑا فرض کر سکتے ہو گدھے۔"

تانگا قریب آیا تو محسن پنجابی میں مخاطب ہوا "پہلوان! یہ گھوڑا بیچو گے؟"

جھاڑو کے تیلے جیسے لمبے پتلے نوجوان نے محسن کو یوں دیکھا جیسے زندگی میں پہلی بار کوئی مستند احمق دیکھا ہو "مسخری کرتے ہو۔"

میں نے اسے روک لیا "وہ دراصل...... ہم دو گھوڑے خریدنا چاہتے تھے۔"

"یار، مجھے کیا، پورا اصطبل خرید لو۔ میرا راستہ مت کھوٹا کرو۔"

"کہاں سے خرید لیں؟ تمہیں کچھ معلوم ہے، گھوڑے کہاں سے مل سکتے ہیں؟"

محسن نے کہا "بالکل اصلی۔ ایسا نہیں جیسا تمہارا۔"

اس نے خاصا برا مانا "یہ بھی نقلی نہیں ہے۔ اس کے ساتھ دوڑ لگا کے دیکھو گے؟ چل پُتر" اس نے گھوڑے کو سگنل دیا۔

میں نے کہا "ایک منٹ۔ آس پاس کسی گاؤں میں کوئی گھوڑا بیچنا چاہے تو ہم اچھی قیمت دے سکتے ہیں۔ تمہیں بھی سو روپے دیں گے۔"

وہ سوچ میں پڑ گیا "سو روپے.... اچھا۔ سنا ہے ملک صاحب کے دو گھوڑے چوری ہو گئے ہیں مگر کرموں بڑا حرامی ہے۔ ... ہزار کے دے گا۔"

میں سمجھ گیا کہ کرموں صاحب خود چور ہیں یا چوری کا مال خرید کے منافع پر بیچتے ہیں۔ دوسرا دھندا گاؤں میں مشکل سے ہی چھپتا ہے۔ زیادہ امکان یہی تھا کہ چور سے براہِ راست سودا ہوگا۔

میں نے کہا "ہم خرید لیں گے۔"

وہ کچھ حیران ہوا "تمہیں پکڑے جانے کا کوئی ڈر نہیں؟"

"جب کرموں کو ڈر نہیں تو ہم کیا کرموں سے بھی گئے گزرے ہیں پہلوان؟" محسن بولا اور تانگے کی اگلی نشست پر براجمان ہو گیا۔

مجبوراً مجھے ایک ڈھلوان سطح پر بیٹھنا پڑا۔ تانگا واپس اسی راستے پر روانہ ہوا جس پر چل کے آیا تھا۔ ہر گڑھے کے جھٹکے میں چند انچ نیچے سرک جاتا تھا اور بڑی مشکل سے خود کو سجدہ ریز ہونے سے بچاتا تھا۔ گھوڑے کے بارے میں بھی محسن نے مبالغے سے کام لیا تھا۔ وہ آدھے ہارس پاور کا تھا۔

"بائی داوے، کیا یہ گھوڑے کرموں صاحب نے جیب میں چھپا رکھے ہیں؟" محسن بولا۔

"ابھی تک کسی کو معلوم نہیں؟" میں نے کہا۔

"مگر مجھے معلوم ہے۔ پوچھو وہ کیسے؟" تیلے پہلوان نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"کیسے؟" محسن نے کہا۔

پہلوان نے اس کے کان میں سرگوشی کی "کرموں میرا سُسر ہے۔"

جب مجھے یقین آگیا کہ وہ مذاق نہیں کر رہا ہے تو اس مضحکہ خیز صورت حال پر مجھے بے اختیار ہنسی آئی "اور تم اتنی بے خوفی سے سودا کر رہے ہو؟ تمہیں ڈر نہیں کہ ہم پکڑے گئے یا ہم نے ملک صاحب کو بتا دیا۔"

تیلا پہلوان کانپنے لگا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ ہنس رہا تھا "مجھے نہ معلوم ہے کہ تم گھوڑے لے کر بھاگ جاؤ گے، یہاں رکو گے نہیں۔ تم یہاں کے رہنے والے نہیں ہو۔ تمہیں کیا پتا ملک صاحب کا؟"

میں اس کی ذہانت پر دم بخود رہ گیا "یہ اندازہ کیسے لگایا تم نے کہ ہم گھوڑے پر بیٹھ کے فرار ہو جائیں گے؟"

اس نے مجھے آنکھ ماری "تم مجھے جیل سے بھاگے ہوئے لگتے ہو۔"

میں اور محسن کچھ دیر صدمے سے سکتے میں بیٹھے رہے۔ پہلی بار کسی نے ہماری صورت دیکھ کے اتنا غلط اور شرم ناک اندازہ قائم کیا تھا مگر ہم نے تیلے پہلوان کے خیال کی تردید نہیں کی۔

"بالکل ٹھیک سمجھے تم۔" میں نے کچھ دیر بعد کہا "ہم رات کے وقت گھوڑوں کو کھلا چھوڑ دیں گے اور گاڑی پکڑ لیں گے۔"

"کون سی؟ لاہور والی کہ کراچی والی؟"

"یہ ہم نہیں بتا سکتے" محسن نے کہا "تم بھی کسی کو کچھ مت بتانا۔ گھوڑے بھی ملک صاحب کو کچھ نہیں بتا سکتے۔"

کرموں صاحب ایک وقت میں ایک سے مخاطب ہوتے تھے اور ایک آنکھ سے ایک ہی کو دیکھ سکتے تھے۔ مجھے اس میں بھی شک تھا کہ وہ تیلے پہلوان کا سُسر ہو سکتا ہے۔ وہ کسی آلو کی بوری کی طرح تھا۔ جب وہ تانگے میں میرے ساتھ بیٹھا تو یہ خطرہ لاحق ہو گیا کہ گھوڑا فضا میں معلق ہو جائے گا۔ تیلے پہلوان نے مجھے آگے شفٹ کیا اور تانگا پھر چلا تو مجھے گھوڑے کی مظلوم آنکھوں میں اپنے لیے لعن طعن نظر آئی کہ سکندر تم بھی...

مالِ غنیمت ایک کھنڈر عمارت میں گھاس کھا رہا تھا۔ کرموں صاحب نے انکشاف کیا کہ ادھر کوئی نہیں آتا۔ یہ ایک جن کا ڈیرا ہے۔

تیلے پہلوان نے مجھے ایک طرف لے جا کے کہا "پیسے مجھے دے دو۔"

میں نے کہا "تمہیں کیوں، تمہارے سُسر محترم..."

"بُڈھا حرامی ہے۔ ابھی شہر چلا جائے گا اور اُڑا دے گا۔ گھر میں ایک پیسہ بھی نہیں دے گا۔"

"تم بھی اسی کے داماد ہو۔ اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم ایسا نہیں کرو گے؟" میں نے کہا "کہیں ایسا تو نہیں کہ تم ہمیں ٹھگ رہے ہو؟ ایک ہزار اپنی جیب میں ڈال لو۔"

محسن نے مجھے آواز دی "موجی، ہزار میں بات پکّی۔ یار! کرموں صاحب کو ہزار دے دو۔ گن کر پورے ایک ہزار۔"

میں نے تیلے پہلوان کو گھورا۔ وہ غصے اور خفت کے علاوہ پشیمانی کے جذبات کا شکار تھا کہ قیمت اس نے پہلے ہی کیوں وصول نہیں کی تھی۔ عین وقت پر سارا کام خراب ہو گیا۔

میں نے ہزار کرموں کو دیے اور ایک سو کا نوٹ تیلے پہلوان کو پیش کیا "گن لو پہلوان! پورے سو ہیں۔ دیکھ لو اچھی طرح۔"

اس نے جل بھُن کے کہا "ایک نوٹ کو کیا سو بار گنوں؟ خیر میں کرموں سے وصول کرلوں گا آدھے ورنہ..."

"ورنہ کے بچے! ہم سے بدمعاشی کرتے ہو" میں نے کہا "معلوم ہے ہم تین قتل کر کے جیل گئے تھے۔ چوتھا قتل تمہارا ہوگا۔"

محسن نے بھی غرا کے کہا "آج تو فرصت نہیں ہے لیکن ہم پھر کسی دن آکے تمہیں فوت کر دیں گے۔ خبردار! جو اپنے سُسر کو لوٹا۔"

کرموں نے شور مچایا "سُسر! کون سُسر، کس کا سُسر؟ خدا نہ کرے جو میں اس سُور کے بچے کا سُسر بنوں۔ میری بیٹی ہوتی کوئی تو کسی اندھے کنویں میں دھکیل دیتا۔"

ہم نے دونوں پر لعنت بھیجی اور گھوڑوں پر آزمائشی سواری کی۔ محسن کے حصے میں خاصا مہذب اور تابعدار قسم کا گھوڑا آیا تھا۔ میرے گھوڑے نے پہلے مجھے دھوبی پٹخا دینے کے لیے تھوڑی سی اچھل پھاند کی مگر میں نے شہسواری کے کورس میں گھوڑوں کی نفسیات پر بھی تحقیق کی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہمارے تعلقات ساس بہو جیسے ہو گئے جو ایک دوسرے کو برداشت کرتی ہوں۔ گھوڑا احتجاجی انداز میں چلنے لگا۔

میں نے کہا "میاں شیروانی! تم بالکل دُلہا لگتے ہو۔ اگر تمہارے مُکھڑے پر سہرا ہوتا، آگے باجو بینڈ ہوتا اور پیچھے باراتی ہوتے......"

"پہلے ہم مفرور مجرم لگ رہے تھے، اب چور بھی لگ رہے ہیں۔ نکل چلو جلدی سے، کہیں ملک صاحب کے بندے نہ آجائیں۔"

میں نے کہا "ایسی کی تیسی ملک صاحب کی۔ گھوڑے ہمارے ہیں۔ ہم ان پر کیس کر دیں گے۔ وہ چاہیں تو ہم سے دو ہزار میں سودا کر لیں۔"

"اب جانا کہاں ہے۔ تھانے؟"

"بالکل ٹھیک۔ شام ہونے والی ہے" میں نے کہا "منظر اگر سولہ لاکھ لے کر آیا نہیں ہوگا تو آنے والا ہوگا۔ ایک مسئلہ اور ہے۔"

"گھوڑے تو مل گئے، اب کیا ہاتھی چاہیے؟"

میں نے کہا "مجھے ڈاکوؤں جیسا ملبوس چاہیے۔ عام قسم کی شلوار قمیص، منہ پر.... باندھنے کے لیے ڈھاٹا۔ کام پگڑی سے بھی چل جائے گا۔"

"جب ہم ڈاکوؤں کے درمیان تھے تو تمہیں خیال نہیں آیا۔"

میں نے کہا "میں کسی کو کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا۔ انہیں شک ہو جاتا کہ میری نیت ٹھیک نہیں۔"

محسن نے ایک طرف اشارہ کیا "ادھر دیکھو۔ کوئی کسان ہے شاید۔ ہل بیل کے ساتھ لوٹ کے گھر جا رہا ہے۔"

"اس سے بات کر کے دیکھتے ہیں۔" میں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور چند منٹ میں حیران پریشان دیہاتی کو جا لیا جو واقعی سر سے پیروں تک مٹی دھول میں اٹا ہوا تھا۔ محسن نے اس کا راستہ روک لیا۔

میں نے کہا "ہمیں یہ کپڑے اتار دو۔"

وہ ہاتھ جوڑ کے گھگھیانے لگا "کپڑے اتار دوں؟ گھر کیا ننگا جاؤں؟"

میں نے غرا کے کہا "بکو مت۔ ہم اپنے کپڑے دیں گے تمہیں۔"

محسن نے کہا "اور پانچ سو روپے بھی دیں گے زبان بند رکھنے کے۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ ہم ڈاکو ہیں۔"

"سمجھ گیا" اس نے بڑی مشکل سے کہا "میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔ تم میرے بیل تو نہیں چھینو گے؟"

مجھے اس پر ترس آیا "نہیں بابا۔ بیل تمہیں مبارک ہوں۔ ہم کسی کے رزق کا وسیلہ نہیں چھینتے۔"

پتلون قمیص پہن کے وہ خوش نہیں تھا۔ شاید اسے خیال تھا کہ وہ دیکھنے والوں کو اس تبدیلی کی کون سی قابلِ قبول وجہ بتائے گا کہ وہ ہل چلانے گیا تھا تو دیہی لباس میں تھا اور لوٹا ہے تو بابو بن کے لیکن پانچ سو روپے اس کے لیے اتنی بڑی دولت تھی کہ وہ ایک کی جگہ دس جھوٹ بول سکتا تھا۔

میں نے محسن کو گھوڑوں کے ساتھ تھانے سے کچھ فاصلے پر درختوں کے پیچھے ایک محفوظ مقام دیکھ کر انتظار کرنے کو کہا اور خود منہ پر ڈھاٹا لپیٹ کر آگے بڑھا۔ سامنے کے بجائے میں نے عقبی حصے کا رخ کیا اور ایک کھلی کھڑکی کے نیچے جا پہنچا جو میرے اندازے کے مطابق تھانے دار کے کمرے کی کھڑکی تھی۔ ابھی چند سیکنڈ ہی گزرے تھے کہ میرے کانوں نے ایک جانی پہچانی آواز سنی اور میں وہیں منجمد ہوگیا "کوئی بھی نہیں آیا ابھی تک تو"

انتہائی حیرت کے صدمے سے سنبھل جانے کے بعد میں نے اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی بے سود کوشش کی کہ آخر اکبر خان یہاں کیسے آپہنچا۔ رقم لے کر یا تو خود عبدالودود منظر آسکتا تھا یا رابعہ کا معاون وکیل اور سب سے مخلص دوست وقار یوسف۔ اکبر خان کے سوال سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ میرا انتظار کر رہا ہے۔

تھانے دار کے جواب نے صورت حال اور واضح کردی "وہ جناب! کیا نام بتایا تھا آپ نے؟ اکبر خان صاحب..... یہ معاملات ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ٹھیک وقت پر تو نہ دفتر کا بابو آتا ہے، نہ مہمان خصوصی۔ ڈاکو تو پھر ڈاکو ہیں۔ ٹائم پر آجائیں تو پکڑے جانے کا ڈر ہوتا ہے۔ ابھی وہ دیکھ رہے ہوں گے کہ آگے پیچھے اور کون ساتھ آیا ہے۔ اس راستے پر کھڑے ہوں گے جدھر سے آپ آئے تھے۔ صبح سے نگرانی شروع کردی ہوگی، رات تک کریں گے۔"

"آخر کتنی دیر انتظار کرنا پڑے گا مجھے؟ تم تو ان معاملات میں خاصے تجربے کار لگتے ہو۔"

"چوبیس گھنٹے واسطہ چوروں اور ڈاکوؤں سے ہے۔ آپ جیسے شریف اور معزز لوگ تو ادھر آتے نہیں۔ آتے ہیں تو بس ایسے ہی جیسے آپ کو آنا پڑا۔ جلدی کیا ہے، تسلی سے بیٹھیں۔ چائے اور بنواتا ہوں آپ کے لئے۔"

"نو۔ تھینک یو۔"

"سرجی، پی لیں چائے۔ پتا نہیں دو گھنٹے اور لگ جائیں، یا دو گھنٹے بعد پیغام آجائے کہ فلاں جگہ آجاؤ۔ وہاں سے کہیں اور جائیں۔"

"یہ تو بڑی غلط بات ہے۔"

تھانے دار ہنسا "لو جی، صحیح بات کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ایسے معاملات میں۔ لینے والے ڈاکو ہیں، دینے والے آپ جیسے لوگ۔ اور سودا ہے بندوں کا۔ یہ کوئی بزنس ڈیل نہیں ہے جی کہ کسی بہت بڑے ہوٹل میں بزنس مین کرتے ہیں، بوفے لنچ پر۔"

"مگر میں ساری رات خوار نہیں ہوسکتا" اکبر خان جھنجلا کے بولا۔

"کس نے کہا ہے جی خوار ہونے کو۔ بھروسا ہے تو رقم میرے پاس چھوڑ کے تسلی سے گھر جاؤ۔"

"بھروسا اور تم پر!" اکبر خان نے تلخی سے کہا "سولہ روپے نہیں چھوڑ سکتا میں تمہارے پاس۔ سولہ لاکھ کی تو بات ہی مت کرو۔"

"اچھا مت کریں بھروسا ہم پر لیکن ایک بات بتائیں۔ فرض کریں ابھی یہاں ڈاکو آجائیں۔ ایک تو یہی طافو من موجی ہے [illegible] اس کا حریف بھی ہے۔ ایک شریف ڈاکو۔"

"ڈاکو اور شریف!"

"نام شریف ہے حرامی کا" تھانے دار بولا "اس کی بڑی [illegible] ہے طافو سے۔ سنا ہے اس کے بندے توڑ رہا ہے۔"

"تم یہ سب مجھے کیوں سنا رہے ہو؟ شریف ڈاکو ہو یا بدمعاش مجھے کسی کا ڈر نہیں۔ میں اپنی حفاظت کرسکتا ہوں۔ عقل نہ [illegible] ہوتی خدا نے تو میں بھی تمہاری طرح کسی گاؤں کے تھانے میں [illegible] مارتا، شہر میں اتنا بڑا بزنس نہ ہوتا میرا۔ سولہ لاکھ جیب میں ڈال کے نکلنے سے پہلے میں نے پکا انتظام کرلیا تھا کہ ڈاکو تو شاید دھوکا نہ [illegible] لیکن تم ڈاکوؤں کے کندھے پر رکھ کے بندوق چلا سکتے ہو۔"

"کیا مطلب ہے جی اس فضول بات کا؟"

"مطلب صاف ہے اور تم سمجھ گئے ہو۔ تم مجھے لوٹ سکتے اور الزام کسی کو بھی دے سکتے ہو۔ شریف ڈاکو تم بھی ہو" اکبر خان نے کہا۔

یہ سب باتیں سنتے ہوئے میرا ذہن صورتِ حالات کا [illegible] کرنے میں مصروف تھا اور مجھے اچانک احساس ہوا تھا کہ دستِ غیب نے ہماری مدد کے لیے کیا خوب بندوبست کیا ہے۔ اپنی [illegible] سے تو میں نے بس یہ انتظام کیا تھا کہ جیسے بھی ہو، اپنے وسائل بروئے کار لاتے ہوئے سولہ لاکھ ان ڈاکوؤں کی نذر کردوں [illegible] میں نقصان صرف میرا نہیں تھا۔ نقصان رابعہ کا بھی تھا، وزیر [illegible] ٹرسٹ کے زیرِ انتظام چلنے والے اسپتال کا بھی تھا اور ان [illegible] مددگار دوستوں کا بھی جو کسی نہ کسی طرح سولہ لاکھ کی رقم [illegible] کرکے ہم سب کو ڈاکوؤں کے چنگل سے چھڑانے کے اخلاقی [illegible] پابند تھے اور اس قرض کی ادائیگی کو تقاضائے دوستی کا حق [illegible] کرتے تھے۔

اکبر خان وہاں کیسے پہنچا تھا، یہ بعد میں معلوم کیا جاسکتا تھا۔ خوشی کی بات یہ تھی کہ وہ سولہ لاکھ لے کر آیا تھا اور یہ رقم ڈاکوؤں کو ادا کرکے میں خود بھی نقصان سے بچ سکتا تھا اور دوستوں کے بارِ احسان سے بھی۔ ایک معزز ڈاکو کی جیب سے مال دوسرے ڈاکو کے پاس پہنچ جانے سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ مالِ حرام بود بجائے حرام رفت۔ میری اسکیم اچانک دُہرے فائدے کی حامل ہوگئی تھی۔ ایک طرف میں طافو اینڈ کمپنی کو وعدے کے مطابق ادائیگی کرکے ثابت کرسکتا تھا کہ شریف آدمی تو ڈاکو کے ساتھ بھی شرافت کے اصول نہیں چھوڑتا۔ دوسری طرف میں اکبر خان جیسے بدمعاش کا احسان قبول کرنے سے انکار کرسکتا تھا۔

خاموشی کا مختصر وقفہ آتے ہی میں نے بجلی کی طرح کمرے کے اندر جست لگائی۔ یہ اندازہ میں پہلے ہی کرچکا تھا کہ میری طرف تھانے دار کی پشت ہوگی اور مجھے اکبر خان کی نظر پہلے دیکھے گی۔ اس کے سنبھلنے سے پہلے ہی میں کنٹرول سنبھال لوں گا۔ اکبر خان نے کھڑکی میں سایہ سا دیکھا ہوگا۔ پلک جھپکتے میں وہ سایہ ایک حقیقت بن کے سامنے آگیا تھا۔

میں نے چادر کے نیچے ہاتھ چھپا کے ایک انگلی کو یوں بڑھا رکھا تھا کہ دیکھنے والے کو وہ پستول کی نال نظر آتی تھی۔

"خبردار! کوئی ہلا اپنی جگہ سے تو اس کی لاش پھڑکتی نظر آئے گی فرش پر" میں نے مصنوعی آواز بنا کے خوف ناک لہجے میں کہا۔

اکبر خان کا جیب کی طرف بڑھنے والا ہاتھ رک گیا۔ اس کی نظر میری انگلی یعنی ریوالور کی نال پر جم کے رہ گئی تھی۔ تھانے دار کا حال زیادہ ابتر تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں اور وہ پلک جھپکائے بغیر مجھے دیکھ رہا تھا۔ شاید یہ اندازہ کرنے کے لیے کہ میں کون ہوں۔

یہ سوال پہلے اکبر خان نے کیا "کون ہو تم؟"

میں نے دہاڑ کے کہا "یہ اپنی ماں سے پوچھنا۔ دوسرا سوال کیا پوچھے گا تو مجھے معلوم ہے۔ میں کیا چاہتا ہوں۔"

اکبر خان نے غیر ارادی طور پر اثبات میں سر ہلا دیا۔

میں نے کہا "پیسہ۔ میں سولہ لاکھ روپے لینے آیا ہوں، کسی کی جان لینے نہیں لیکن سولہ لاکھ بچانے کے لیے کوئی جان دینا چاہے تو اس کی مرضی۔ میری تو ایک گولی خرچ ہوگی۔ سولہ لاکھ میں پھر بھی لے جاؤں گا۔"

اکبر خان کا سارا غم و غصہ تھانے دار کی طرف منتقل ہوگیا "یہ تمہارا حرامی پن ہے نا؟ ایسے ڈرامے بہت دیکھے ہیں میں نے۔"

تھانے دار نے خشک لبوں پر زبان پھیری "بہت دیکھے ہیں تو پھر یہ بھی دیکھ لو۔ میں انکار کروں گا کہ اس میں میرا ہاتھ نہیں تو تم مانو گے نہیں۔ نہ مانو، کچھ کرسکتے ہو تو کرو۔"

میں نے تھانے دار کے لات ماری۔ لات اس کے شانے پر لگی اور وہ کرسی سمیت گر گیا۔ میں نے اسے مشتعل ہو کے ریوالور نکالتے دیکھا اور دوسری ٹھوکر اس کے ہاتھ پر ماری۔ وہ بلبلایا اور ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل کے میز کی سطح سے ٹکرایا۔

"اٹھ تیری....." میں نے اُجڈ لہجے میں اسے گالی دے کر اس کی پسلیوں میں کک لگائی "کھڑا ہوجا سیدھا الف کی طرح۔ ہاتھ اوپر۔ خبردار جو بکواس کی۔ منہ دیوار کی طرف۔"

تھانے دار کو ایک لات اور دو ٹھوکریں کھا کے بخوبی اندازہ ہوگیا تھا کہ ریوالور کے بغیر بھی حریف اس کے مقابلے میں زیادہ جاندار ہے، اس نے تعمیل کی۔ میں نے پورا خیال رکھا تھا کہ میرا ہاتھ چادر سے باہر نہ آنے اور میری انگلی کی دہشت ریوالور کی نال کی طرح قائم رہے۔ جب مجھے اصلی ریوالور اٹھانے کا موقع ملا تو میں نے دیر نہیں لگائی۔ فلمی ولن کی طرح ایک قہقہہ لگا کے میں نے کہا "بس اوئے تھانے دارا! اتنی تھوڑی عقل ہے تیرے سر میں؟ اکڑ فوں ساری دو منٹ میں ختم ہوگئی۔ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں تھا لیکن اب ہے۔ جس کی جوتی اسی کا سر۔ تیرے ریوالور کی گولی تیری پھونک نکال دے گی۔"

اس نے بڑی مشکل سے کہا "تم طافو کے ساتھی ہو؟"

میں نے طافو کو ایک غلیظ گالی دی "میں شریف ڈاکو کا سنگی ہوں۔ اس نے ہی بھیجا ہے مجھے کہ جا کے تھانے سے سولہ لاکھ لے آؤ۔"

"تمہیں ضرور طافو کے کسی غدار نے بتایا ہوگا۔"

"اس..... کا نام مت لے باربار۔ اس نے ڈاکوؤں کے نام کو بدنام کردیا۔ بزدل، نامرد، اپنے ساتھ دوسروں کو بھی مروا دیا۔ خود الگ ہونا تھا تو سردار کیوں بنا تھا؟ اس کے بندے اور کہاں جائیں گے۔ ایک ہی شیر باقی رہ گیا ہے جنگل میں... شریف ڈاکو۔"

اکبر خان ابھی تک خاموش تھا۔ اس نے کہا "شریف ڈاکو خود کیوں نہیں آیا؟ تم کو مرنے کے لیے بھیج دیا۔"

"ایسا کون مائی کا لال ہے جو یہ دعوے کرتا ہے؟"

"میرے ذاتی محافظ گاڑی میں موجود ہیں" اکبر خان بولا۔

"کون سی گاڑی؟" میں نے حقارت سے کہا۔

"گاڑی یہاں نہیں ہے۔ تمہیں نظر نہیں آئے گی لیکن محافظ سب سُن رہے ہوں گے" اکبر خان مسکرایا "وہ آتے ہی ہوں۔"

اب مجھے خطرے کے وجود کا احساس ہونے لگا۔ اکبر خان سے کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ بلف کھیل رہا ہو لیکن یہ بھی ہوسکتا تھا کہ اس کی جیب میں کوئی موبائل فون ہو یا واکی ٹاکی قسم کی چیز ہو۔ وہ تھانے دار کو بھی بتا چکا تھا کہ سولہ لاکھ کی رقم کے لیے اس نے حفاظتی انتظام میں کمی نہیں چھوڑی تھی۔

"یہاں تو مجھے اکیلے ہی آنا تھا۔" اکبر خان اپنی بات کا خاطر خواہ اثر دیکھ کے بولا "مگر میں اتنا احمق بہرحال نہیں ہوں کہ ڈاکوؤں کو تھانے میں ادائیگی کرنے جاؤں تو کسی کو ساتھ نہ لے

جاؤں۔"

اب تھانے دار کا بھی حوصلہ بڑھا "تھانے کے باہر بھی ایک کانسٹیبل ہے۔ دو بندے گشت پر ہیں۔ وہ بھی آنے والے ہیں۔"

میں نے سوچ کے کہا "یہ سب کتنے آدمی ہوگئے؟ چار۔ تمہیں ملا کے۔ کوئی بات نہیں۔ چھ گولیاں ہوں گی ریوالور میں۔ پہلے اسے بلالو جو باہر کھڑا ہے۔ تم اسے حکم دے سکتے ہو کہ تم پر قربان ہوجائے۔ تم افسر ہو۔"

اپنی بات ختم ہونے سے پہلے ہی میں نے ریوالور کا بٹ اس کے سر پر مارا۔ اس کے حلق سے "اوق" کی آواز نکلی اور اس کا بھاری بھرکم وجود لڑکھڑا کے فرش پر ڈھیر ہوگیا۔

"تم کیا چاہتے ہو سیٹھ؟" میں نے خونخوار نظروں سے اکبر خان کو گھور کے کہا "میں نے آتے ہی بتادیا تھا کہ میں جان کسی کی نہیں لینا چاہتا۔"

"مجھے مار کے تم بھی نہیں بچو گے۔"

"مجھے معلوم ہے لیکن ایک سیٹھ کے مقابلے میں ایک ڈاکو کی زندگی کی کیا حیثیت ہے۔ ڈاکو تو روز مارے جاتے ہیں۔ پولیس والوں سے ہماری پرانی دشمنی ہے۔ تم سے نہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ رقم بریف کیس میں ہے" اس نے سرہلایا۔

"ایسے نہیں سیٹھ۔ بریف کیس کھول کے دکھاؤ۔"

"کیا تمہیں اعتبار نہیں؟"

"نہیں۔ بریف کیس میں بم بھی ہوسکتا ہے۔ جو کھولے وہ ایک دھماکے میں نیچے سے اوپر پہنچ جائے" میں نے کہا "اللہ میاں کے پاس۔"

"بہت چالاک آدمی ہو تم" اکبر خان بولا اور اس نے نمبر ملا کے بریف کیس کھول دیا۔

اگر میں یہ احتیاط نہ کرتا تو وہی ہوتا جس کا مجھے ڈر تھا۔ وہ مجھے غلط کبھی نیشن بتادیتا اور شاید اس سے کوئی سرکٹ پورا ہوجاتا۔ اس کے ساتھ ہی میری زندگی کا سفر بھی۔ یہ سائنس فکشن کی بات نہیں۔ اس قسم کے "بوبی ٹریپ" اکبر خان جیسے لوگ ہی استعمال کرتے ہیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ایسی کوئی بات نہ ہو اور میرا خوف میرا وہم بن گیا ہو۔

"رقم پوری ہے" اکبر خان نے بریف کیس میری طرف سرکادیا۔

"اب اپنے بندوں سے کہو کہ جہاں ہیں وہیں رہیں۔ ادھر تشریف لارہے ہیں تو واپس چلے جائیں" میں نے کہا "اس طرح تم محفوظ رہوگے ورنہ میرا راستہ تو تمہارا باپ بھی نہیں روک سکتا۔ میں تم کو ڈھال بناکے ساتھ لے جاؤں گا اور شریف ڈاکو کے حوالے کردوں گا۔ آگے اس کی مرضی کہ تمہیں زندہ گاڑے یا تمہاری لاش کا تحفہ بھیج دے۔"

وہ میری باتوں سے ڈر گیا۔ اس نے جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا

اور رک گیا "میں ریوالور نہیں نکال رہا ہوں۔"

"میری طرف سے اجازت ہے۔ گولی تو پہلے میں ہی چلاؤں گا اور میرا نشانہ ایسا ہے کہ سوراخ بالکل تمہاری پیشانی کے بیچ میں ہوگا۔ ایک سوت کا فرق نہیں ہوگا۔"

اس نے جیب سے دو انچ چوڑا اور چار پانچ انچ لمبا ایف ایم واکی ٹاکی نکالا۔ اس میں سے ایریل باہر کھینچا اور ریسیور والے حصے کو کان سے لگالیا۔ میں نے اپنا کان اس کے کان سے ملادیا۔

"ہیلو۔"

"یس باس۔" کسی نے بڑی مستعدی سے کہا "کیا حکم ہے؟"

"کوئی حکم نہیں۔ کہاں ہو تم؟"

"وہیں باس۔" ٹیلی فون کے مقابلے میں اس ریسیور کی آواز اتنی زیادہ تھی کہ مجھے بھی صاف سنائی دے رہی تھی۔

"او کے۔ وہیں ٹھہرو اور انتظار کرو" اکبر خان نے کہا اور ایریل کو پھر اندر کردیا۔

"یہ کھلونا مجھے دے دو" میں نے کہا "پہلے تم نے جھوٹ بولا تھا کہ تمہارے ساتھی ساری گفتگو سن رہے ہیں۔"

"اس میں جھوٹ کیا ہے؟"

میں نے اس کے گال پر اُلٹے ہاتھ کا طمانچہ مارا "یہ آف نہ ہو اور اس کا ایریل جب تک باہر نہ کھینچا جائے اس کی آواز کمرے سے باہر نہیں جاسکتی۔"

اس نے واکی ٹاکی مجھے تھمادیا "یہ تمہارے لیے بے کار ہے۔"

میں نے اسے جیب میں ڈال کے کہا "اس تھانے دار کو اٹھا کے حوالات میں پہنچادو۔ اس کے ہاتھ باندھو مضبوطی سے اور اس کے منہ میں کپڑا ٹھونسو۔"

"رسّی کہاں ہے؟" اکبر خان مجبوراً اٹھا۔

"حوالات میں ہوگی۔ یہاں ہتھکڑی کا کام رسّی سے لیا جاتا ہے۔"

اکبر خان بڑی مشکل سے تھانے دار کو گھسیٹ کر حوالات میں لے گیا۔ وہاں رسّی موجود تھی۔ جب وہ تھانے دار کو باندھ کے فارغ ہوا تو میں نے اسے ایک کپڑا دیا جو شاید گرد جھاڑنے کے کام آتا ہوگا۔ میری نظر باہر کی طرف تھی۔ گشت پر جانے والے سپاہی کسی وقت بھی آسکتے تھے۔ تھانے دار نے تاکید کے ساتھ انہیں کہیں بھیجا ہوگا تاکہ وہ سولہ لاکھ میں سے اپنا حصہ وصول کرے تو دیکھنے والا کوئی نہ ہو۔ گیٹ پر موجود کانسٹیبل بھی اپنی جگہ چھوڑ کر اندر نہیں آسکتا تھا لیکن یہ مہلت محدود تھی۔ آدھا گھنٹا گزر چکا تھا اور اگلے آدھے گھنٹے میں مجھے بہت کچھ کرنا تھا۔

اکبر خان سیدھا ہوا ہی تھا کہ میں نے اس کے سر پر بھی پستول کے ضرب لگائی۔ اس نے گرنے سے پہلے میری طرف دیکھا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں غصے کے بجائے حیرانی نظر آئی۔ شاید اسے

مجھے وعدہ خلافی کی امید نہیں تھی۔ میں نے اسی رسّی کے باقی حصے کو اکبر خان کے ہاتھ پاؤں باندھنے میں استعمال کیا اور جھاڑن کے بچے ہوئے ٹکڑے سے اس کا منہ بند کردیا۔

خالی حوالات کے فولادی گیٹ پر تالا لٹک رہا تھا اور اس کی چابی معلوم نہیں کہاں تھی۔ یہ کھٹکے والا تالا تھا۔ دروازہ بند کرکے میں نے تالا لگایا اور پھر کھڑکی کے راستے باہر نکل گیا۔ بریف کیس کو میں نے چادر کے نیچے چھپالیا تھا۔

محسن میرے انتظار میں باربار گھڑی دیکھ رہا تھا "کیا ہوا، اتنی دیر کیوں لگی؟"

میں نے بریف کیس اسے پکڑادیا "یہ لے جا ڈاک بنگلے۔ اس میں پورے سولہ لاکھ ہیں۔"

"کون لایا ہے؟ منظر یا یوسف؟"

میں نے کہا "اکبر خان۔"

محسن نے مجھے بے یقینی سے دیکھا "اکبر خان!"

"ہاں۔ بعد میں ساری بات بتاؤں گا۔ یہ رقم گل کے حوالے کردینا۔ اس سے کہنا کہ طافو کو دے دے یا سب لوگوں میں تقسیم کردے۔ میرا انتظار مت کرنا۔ تم لوگ فوراً نکل جانا، دو گھوڑے ہیں۔"

"اور تم؟"

"میں بعد میں آجاؤں گا۔ منظر کے گھر پہنچ جاؤں گا۔" میں نے کہا۔

"لیکن کب؟" محسن پریشان ہوگیا۔

"آج ہی رات تک" میں نے کہا "اب تو جا۔ ایک گھوڑے پر سواری کر، دوسرے کی رکاب تھام لے۔"

"یار! یہ کیا چکر ہے؟ ہم ایسے نہیں جاسکتے۔"

"یار محسن! تجھے یقین کرنا چاہیے" میں نے کہا "فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ جانے سے پہلے اپنے کپڑے دے جا مجھے۔"

"یار! تو کیا کررہا ہے آخر؟" محسن جھنجلا گیا۔

"ابھی مت پوچھ۔ یہ پتلون قمیص اور جوتے مجھے دے۔ میرے کپڑے پہن اور بھاگ جا۔" میں نے کہا "دو گھوڑوں پر تم تینوں آسانی سے نکل جاؤگے۔ گل سے کہنا، محفوظ راستہ اختیار کرے۔ سڑک کی طرف سے جاؤگے تو راستے میں اکبر خان کے آدمی کھڑے ہیں۔ چل اپنا منہ دوسری طرف کر..... ہاتھ پیچھے کرکے مجھے کپڑے پکڑا۔"

میں نے اپنا منہ دوسری طرف کرلیا اور چند منٹ میں میرا لباس محسن کے جسم پر اور محسن کا میرے بدن پر آگیا تو ہم نے پلٹ کر ایک دوسرے کو دیکھا اور ہنسے۔ پھر محسن گھوڑے پر سوار ہوا اور اس نے دوسرے گھوڑے کی لگام اسے تھمادی۔ دوسرا گھوڑا تابعدار قسم کا تھا۔ وہ سر جھکا کے ساتھ چل پڑا۔ وہ سرکش گھوڑا جس نے مجھے پٹخنے کی کوشش کی تھی، محسن کے معاملے میں نہ جانے

کیوں سب سرکشی بھول گیا۔

محسن نے مجھے فخر سے دیکھا "دیکھا، ساری ہیکڑی بھول گیا سالا۔"

میں نے مایوسی سے کہا "یہ پچھلے جنم میں تیرا ماما ہوگا۔"

جب محسن ڈاک بنگلے کی طرف جانے والے راستے پر غائب ہوگیا تو میں نے ہاتھ سے بال سنوارے، اپنا حلیہ ٹھیک کیا اور پکی سڑک کی طرف سے سیٹی بجاتا تھانے کی جانب روانہ ہوگیا۔ اس بار میں گیٹ کی طرف سے گیا تھا چنانچہ سنتری نے بہت دور سے ہی مجھے دیکھ لیا تھا۔

اگر میں سیدھا گزرنے کی کوشش کرتا تو شاید وہ مجھے روکتا مگر میں نے بڑے دوستانہ طریقے پر اس سے ہاتھ ملایا "کیا حال ہے سنتری بادشاہ، اپنے انچارج صاحب ہیں؟"

"ہیں..... پر کوئی مہمان بیٹھا ہے۔"

"اچھا تم جاکے انہیں بتادو کہ سکندر صاحب آئے ہیں۔ انہیں ملنا ہوگا تو بلالیں گے ورنہ میں پھر آجاؤں گا۔" میں نے کہا۔

سنتری میری شرافت سے متاثر ہوا۔ "دراصل انہوں نے منع کررکھا ہے کہ اندر کوئی بھی نہ آئے میری اجازت کے بغیر۔ میں ابھی پوچھ کے آتا ہوں۔"

حسب توقع ایک منٹ بعد اس نے اندر سے شور مچایا۔ اس کے شور کو غل غپاڑہ کہا جاسکتا تھا کیونکہ بیک وقت وہ اپنے "سر" کو پکار رہا تھا اور ان سے پوچھ رہا تھا کہ آپ کو کیا ہوگیا، یہ جانتے ہوئے بھی کہ "سر" اپنے مضروب سر کے باعث اتنا غفیل ہیں، شراب کے نشے میں دُھت نہیں پڑے ہیں۔ پھر وہ مدد کے لیے پکار رہا تھا حالانکہ میرے سوا مدد کی پکار سننے والا بھی کوئی نہیں تھا۔

اخلاقاً میرا اندر بھاگ کر جانا اور صورت حال پر بے حد تشویش کا اظہار کرنا بھی ضروری تھا۔ میں نے کہا "ارے یہ کیا، انہیں کس نے بند کردیا حوالات میں؟ اوہو ہو۔ ان کے تو ہاتھ بھی بندھے ہوئے ہیں اور ان کے منہ میں بھی کچھ ہے۔ کیا یہ کپڑا کھا رہے ہیں؟"

"نہیں جی۔ منہ بند کرنے کے لیے کپڑا ٹھونسا ہے کسی نے..."

اس نے نادانستگی میں مجھے گالی دی جس کا میں نے برا نہیں مانا "یہ بے ہوش ہیں۔"

"اچھا اچھا" میں نے سرہلایا "بے ہوش بھی ہیں۔ یہ تو بڑی بری بات ہے۔ مگر کیوں بے ہوش ہیں؟ کمزوری ہے یا دل کا دورہ پڑا ہے؟"

"یار! تم بڑے ہی بے وقوف ہو۔" کانسٹیبل جھلّا کے بولا "اتنا بھی نہیں سمجھتے، کسی نے ان کو مار کے اندر ڈال دیا ہے۔"

"اچھا!" میں نے احمقوں کی طرح اسے دیکھا "مگر کس نے؟"

"میں کیا بتاؤں؟"

میں نے کہا "کیوں؟ تم باہر کھڑے تھے۔ کوئی تو اندر گیا ہوگا۔"

"اندر تو بس یہ مہمان گئے تھے" وہ پریشان ہو کے بولا۔
"تو پھر کیا انہوں نے ایک دوسرے کو ناک آؤٹ کر دیا اور ایک دوسرے کو باندھ کے..."

کانسٹیبل نے مجھے خونی نظروں سے دیکھا۔ "اوئے پاگل دے پتر! کیا بک بک لگا رکھی ہے۔ نہ کچھ کرتا ہے، نہ کرنے دیتا ہے؟"

میں نے کہا "تم تالا کھولو تو میں کچھ کروں۔ باہر سے کیا ہو سکتا ہے۔"

"تالا کیسے کھولوں؟" وہ بدحواس ہو گیا تھا۔

"چابی سے۔" میں نے معصومیت سے کہا۔

"چابی کہاں سے لاؤں؟ چابی تو.... خیر، میں تالا توڑتا ہوں" اس نے بندوق اٹھا کے اس کا کندا مارنے کی تیاری کی۔

"سوچ لو۔ سرکاری تالا ہے" میں نے کہا۔

اس نے مجھے گھور کے تالے پر وار کیا اور بندوق ایک طرف پھینک کے "سر" کے پاس بیٹھ گیا۔ میں نے اکبر خان کے ہاتھ پیر کھولے اور کانسٹیبل نے اپنے افسرِ اعلیٰ کے۔ ہم انہیں گھسیٹ کر باہر لائے اور کمرے میں لے گئے۔ کمرے میں دو چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ کانسٹیبل نے مجھ سے کہا کہ میں "سر" کو اٹھا کے چارپائی پر لٹانے میں اس کی مدد کروں۔ اس نے تھانے دار کو بغلوں میں ہاتھ دے کر اٹھایا، میں نے ٹانگیں پکڑ کے لیکن ایک مرتبہ میں نے جان بوجھ کے ٹانگیں چھوڑ دیں۔ تھانے دار کا آدھا دھڑ فرش پر گرا۔ میں نے "سوری" کہہ کے اسے پھر اٹھایا اور چارپائی پر ڈال دیا۔ پھر اکبر خان کی باری آئی۔ کانسٹیبل پانی لے کر آیا اور ہم نے ان کے منہ پر چھینٹے مارے۔ موقع پاتے ہی میں نے اکبر خان کا واکی ٹاکی پھر اس کی جیب میں ڈال دیا۔ چند منٹ کے بعد جب وہ ہوش میں آنے لگے تھے تو گشتی پارٹی بھی پہنچ گئی۔ تھانے کے اندر ہونے والی اس واردات نے خاصی سنسنی پھیلا دی تھی۔

گشتی پارٹی میں ایک ہیڈ کانسٹیبل تھا۔ اس نے سنتری کو ڈانٹنا شروع کیا "اندھے، کھوتے، تم نے نہیں دیکھا کسی کو اندر جاتے ہوئے تو پھر کیا یہ کام جن کر گئے؟"

"قسم خدا کی، میں نے کسی کو اندر جاتے نہیں دیکھا۔ نہ باہر آتے" کانسٹیبل نے اپنی بے گناہی ثابت کی "ان صاحب سے پوچھ لو۔ جب یہ آئے تو میں ڈیوٹی پر تھا۔"

میں نے اقرار میں سر ہلایا "اس وقت تو یہ موجود تھا۔ اس سے پہلے کا میں نہیں بتا سکتا۔"

"اس سے پہلے بھی میں یہیں موجود تھا۔ سر جی نے کہا تھا کہ کسی کو اندر مت آنے دینا۔"

سر جی بالآخر ہوش میں آ گئے اور کچھ دیر آنکھیں گول گول گھمانے کے بعد اٹھ بیٹھے۔ ان کا سراب بھی ڈانواڈول تھا۔ ظاہر ہے وہ غصے میں آتش فشاں بنا ہوا تھا۔ ان کے سب ماتحتوں کے سامنے ان کی سخت بے عزتی "خراب" ہوئی تھی۔ انہوں نے تھانے دار صاحب کو حوالات میں بند دیکھا تھا اور وہ بھی ناگفتہ بہ حالت میں۔ اس وقت تک اکبر خان بھی ہوش میں آ گیا تھا۔

تھانے دار نے ایک ماتحت کو چائے بنانے کے لیے کہا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ "میں اس.... کو نہیں چھوڑوں گا" اس نے سر دبا کے کہا اور پھر مزید اعلانات کیے کہ وہ شریف ڈاکو اور اس کے اہلِ خانہ کے ساتھ کیا کچھ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

اکبر خان نے پہلے پانی پیا اور پھر سگریٹ کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا تو واکی ٹاکی اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ وہ کچھ دیر اسے حیرت سے دیکھتا رہا، پھر اس کا ایریل کھینچ لیا "ہیلو۔" اس نے دہاڑ کے کہا "جتنی جلدی ممکن ہو یہاں آ جاؤ۔" اور جواب کا انتظار کیے بغیر اسے بند کر دیا۔

اب میں نے کہا "یہ کیا قصہ ہے... اکبر خان.... تم یہاں؟"

"تھانے دار صاحب بتائیں گے تمہیں سب۔ میں تو رقم لے کر آیا تھا تمہیں دینے کے لئے۔ ایک اکیلا ڈاکو کھڑکی کے راستے آیا اور لوٹ کر لے گیا" اس نے پولیس کی شان میں، تھانے دار کی بہادری کی شان میں اور پورے محکمے کی فرض شناسی کی شان میں ایک قصیدہ پڑھا۔

میں نے بے حد حیران ہو کے کہا "صرف ایک ڈاکو!"

"صرف ایک آدمی۔ خالی ہاتھ آیا تھا وہ۔ بعد میں تھانے دار سے ہی ریوالور چھینا اس نے" اکبر خان نے بتانا شروع کیا۔

تھانے دار نے دہاڑ کے کہا "اوئے کدھر مر گئے ہو سب؟ پرچا کاٹو شریف ڈاکو کے خلاف۔ سولہ لاکھ کی ڈکیتی، اقدامِ قتل، سرکاری فرائض میں مداخلت، اغوا، سب لکھ دو۔"

"مت کرو یہ ڈراما میرے سامنے تھانے دار" اکبر خان نے گرج کے کہا "مجھے اندیشہ تھا کہ یہاں یہ بھی ہو سکتا ہے لیکن تھانے دار، اکبر خان الو کا پٹھا نہیں ہے کہ تمہاری چالاکی نہ سمجھے۔ تم احمق ہو۔ میں نے تمہیں جیل کی سلاخوں کے پیچھے نہ پہنچایا تو اپنے باپ کی نہیں کسی کتے کی اولاد سمجھوں گا خود کو۔ میں آئی جی کو خود سب بتاؤں گا۔"

تھانے دار کی حالت غیر ہو گئی "یہ.... آپ کیا فرماتے ہو جی، میں تو رپورٹ لکھ رہا ہوں۔ شریف ڈاکو کے سارے گروہ کو..."

"شریف ڈاکو!" اکبر خان نے طنز سے کہا "کون شریف ڈاکو تھانے دار؟ وہ تمہارا آدمی تھا۔ تم نے اسے سب بتا دیا تھا کہ ..."

"یہ جھوٹ ہے" تھانے دار دہاڑ کے بولا "مجھ پر الزام ہے"

"میں ایک ایک پیسہ وصول کر لوں گا تم سے" اکبر خان اٹھ کھڑا ہوا "میری بہت بے عزتی ہوئی ہے۔"

"میری بے عزتی نہیں ہوئی؟" تھانے دار گرجا۔

"تمہاری عزت ہوتی ہے؟" اکبر خان نے تلخ لہجے میں نفرت سے کہا۔

باہر ایک گاڑی آ کے رکی اور ایک ساتھ چار مسلح افراد اندر آ گئے۔ وہ اکبر خان کے باڈی گارڈ تھے۔ "میں جا رہا ہوں تھانے دار۔ کل تک کی مہلت ہے تمہارے پاس۔"

تھانے دار نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ سر پکڑے بیٹھا خلا میں گھور رہا تھا۔ ڈاکا ڈالنے والا اس کے خیال میں شریف ڈاکو ہی تھا مگر اکبر خان یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھا۔ وہ کسی طرح بھی اکبر خان کو یقین نہیں دلا سکتا تھا کہ اس نے کوئی ڈراما نہیں کیا تھا اور اس سے یہ وعدہ بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ کل تک ساری رقم ڈاکوؤں سے وصول کر لے گا۔

میں نے کہا "اکبر خان! تم نے مجھے بتایا نہیں کہ رقم لے کر تم کیوں آئے تھے؟ میں نے تو منظر سے کہا تھا، تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"مجھے غالب نے بتایا تھا" اکبر خان بولا "تمہارے باقی ساتھی کہاں ہیں؟"

"وہ کہاں ہو سکتے ہیں اکبر خان، غالب نے یہ نہیں بتایا تھا؟"

"تم کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں کل تک رقم کا پھر انتظام کر لوں گا مگر اس تھانے دار نے جو حرامی پن کیا ہے...."

میں نے اس کی بات کاٹ دی "تھینک یو اکبر خان۔ میں تمہارا احسان مند ہونا نہیں چاہتا۔ اچھا ہوا کہ وہ رقم شریف ڈاکو لے گیا۔ وہ نہ لے جاتا پھر بھی میں قبول نہ کرتا۔ تمہیں میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے میرے وسائل کافی ہیں۔ یہ میں غالب سے بعد میں پوچھوں گا کہ اس نے تم سے مدد کے لیے کیوں کہا؟"

"اس نے مدد کے لیے تو نہیں کہا تھا مگر میں خود آ گیا تھا۔ کیا فرق پڑتا ہے اس سے؟"

"بہت فرق پڑتا ہے اکبر خان۔ دوبارہ کوئی انتظام مت کرنا۔ غالب کی غلطی سے تمہارا نقصان ہوا، اس کا مجھے افسوس ہے۔"

اکبر خان نے آہستہ سے سر ہلایا اور نہ جانے کیا سوچ کے خاموشی سے باہر چلا گیا۔

"بہت خوب تھانے دار صاحب!" میں نے موقع پاتے ہی کہا "میں نے کچھ دیکھا تو نہیں لیکن جو کچھ مجھے معلوم ہوا ہے اس کے بعد پولیس پر سے میرا رہا سہا اعتبار بھی اٹھ گیا ہے۔"

"کیا ہو گا تمہارا اعتبار اٹھ جانے سے؟ پولیس کا محکمہ ٹوٹ جائے گا؟" اس نے چراغ پا ہو کے کہا "یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا۔"

"میری وجہ سے!" میں نے کہا "تھانے دار! مجھ سے پنگا مت لو، اکبر خان کے بعد مجھے دشمن مت بناؤ۔ تم نہیں جانتے کہ میں کون ہوں اور کیا کر سکتا ہوں۔ ابھی تو میں جا رہا ہوں۔"

"جاؤ، دفع ہو جاؤ۔ کہہ دو اس.... طافو سے کہ نہیں ہیں سولہ لاکھ۔ تم سب کو لائن میں کھڑا کر کے گولی مار دے۔ مجھ پر بڑا احسان ہو گا" تھانے دار چیخ کے بولا۔

صدمے، احساسِ ذلت اور غصے میں وہ پاگل ہو رہا تھا۔ میں اطمینان سے باہر نکلا۔ مجھے یقین تھا کہ اب تک گل، محسن اور رابعہ شہر روانہ ہو چکے ہوں گے ورنہ رات تک ضرور پہنچ جائیں گے۔ ان کے لیے اب کوئی خطرے کی بات نہیں تھی۔ خطرہ طافو اینڈ کمپنی کے لیے بھی نہیں تھا۔ انہیں سولہ لاکھ مل گئے تھے مگر ڈکیتی ان کے حریف شریف ڈاکو کے کھاتے میں لکھی گئی تھی۔

اکبر خان گاڑی میں سوار ہو چکا تھا کہ میں نے اسے ہاتھ دے کر روک لیا "اگر تم شہر جا رہے ہو تو..."

"کیوں نہیں۔ بیٹھو" اس نے میرے لیے دروازہ کھولا۔

اسی وقت دوسری گاڑی میرے قریب آ رکی۔

"ادھر کہاں جا رہے ہو سرکار؟ ہم بھی تو تمہیں ہی لے جانے کے لیے آئے ہیں۔" کار سے اترنے والوں نے مجھے دونوں جانب سے گھیر لیا۔

'یک نہ شد دو شد' میں نے اپنے آپ سے کہا۔ شاید یہ کہنا زیادہ مناسب تھا کہ آگے کھائی تو پیچھے کنواں۔ فیصلہ مجھے کرنا تھا کہ مجھے کس میں کودنا چاہیے۔

گاڑی بہت بیش قیمت تھی مگر جو لوگ اس میں سے اُترے تھے وہ حلیئے سے بدمعاش کم اور جوکر زیادہ لگتے تھے۔ وہ ایک ہی قدو قامت کے جوان آدمی تھے اور شرٹ پتلون پہنے ہوئے تھے مگر کپڑے ان کے اپنے نہیں لگتے تھے۔ ایک جوڑا کسی لمبے آدمی کا تھا تو دوسرا پستہ قد اور موٹے آدمی کا مگر انہوں نے تقسیم ایسے کی تھی کہ لمبی پتلون والے نے چوڑی شرٹ پہن رکھی تھی جو چھوٹی بھی تھی اور تنگ لمبی بشرٹ کے ساتھ پتلون ڈھیلی تھی مگر ٹخنوں تک پہنچ کر ختم ہو جاتی تھی۔ انہوں نے شام کے دُھندلکے میں بھی سیاہ چشمے لگا رکھے تھے اور اپنی اداکاری سے وہ فلمی ولن بننے کی کوشش کر رہے تھے۔

اس ہیئت کذائی کے باوجود میں نے غالب کو پہچان لیا لیکن رابعہ کے سب سے ہونہار اور قابلِ اعتماد معاون وقار یوسف ایڈووکیٹ کو پہلی بار بدلے ہوئے روپ میں دیکھ کر نہ شناخت کر سکا۔ غالب اپنی آواز سے سلطان راہی کی کاپی کر رہا تھا اور وقار یوسف مصطفیٰ قریشی کی۔

لیکن یہ سب کچھ میں نے بعد میں دیکھا۔ میرا پہلا ردِ عمل یہ تھا کہ وہ بھی سیٹھ اکبر کے محافظ ہیں۔ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر میں اس کی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا اور میں نے پیچھے سے سیٹھ اکبر کی گردن میں ہاتھ ڈال دیا تھا۔ سیٹھ اکبر اگلی سیٹ پر انتہائی بے بس تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ اپنی ٹانگیں چلا سکتا تھا۔ اس کے ساتھ بیٹھا ہوا ڈرائیور اور باڈی گارڈ مسلح ہونے کے باوجود اسے میری گرفت سے نہیں چھڑا سکتا تھا۔ اگر وہ اس کی کوشش بھی کرتا تو سیٹھ اکبر کی گردن کی سلامتی خطرے میں پڑ جاتی۔ وہ تجربے کار اور سمجھ دار آدمی تھا چنانچہ اس نے صورت حال کو مداخلت سے زیادہ خطرناک اور جان لیوا بنانے سے گریز کیا۔

سیٹھ اکبر کی سانس رُکنے لگی تھی اور اس کی آنکھیں حلقوں سے اُبلنے پر آمادہ تھیں۔ اس نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ "یہ...... کیا...... ہے۔"

میں نے کہا۔ "یہ وہی کنواں ہے جس میں کنواں کھودنے والا خود گر پڑتا ہے۔ تمہاری زندگی کا خاتمہ انہی کی وجہ سے ہو جائے گا جن کو تم نے زندگی کی حفاظت کے لیے رکھا تھا۔ خصوصی اور خفیہ انتظام کے طور پر۔"

اس نے نفی میں گردن ہلانے کی کوشش کی۔ "تم...... غلط......"

اس کے ڈرائیور نے سیٹھ اکبر کی مدد کی۔ "صاب بولتا ہے کہ آپ نے غلط سمجھا۔"

"ہز ماسٹرز وائس [His Master's Voice] کے کُتّے تم اپنا بھونکنا بند رکھو اور سیدھا سامنے دیکھو۔ اگر موت کا فرشتہ اِدھر آتا دکھائی دے تو اپنے صاب کو بتا دینا۔"

"اوئے چھڈ دے بندہ ساڈا۔" یہ غالب کی آواز تھی جو مجھے للکار رہی تھی۔

"ایہہ گل سمجھ لے چنگی طرح کہ اسی بڑے ظالم لوک ہیگے آں۔" وقار یوسف نے سرہلایا۔

سیٹھ اکبر کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ میں نے اپنی گرفت تھوڑا سا ڈھیلا کیا تو اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا "سکندر! یقین کرو یہ میرے آدمی نہیں ہیں۔"

میں نے کہا "پھر یہ تمہیں کیوں لے جانا چاہتے ہیں؟ یہ تم کو اپنا بندہ کیوں کہتے ہیں؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ یہ کوئی چال ہے میرے دشمنوں کی۔" سیٹھ اکبر نے کہا۔ "تم انہی سے پوچھو کہ انہیں کس نے بھیجا ہے۔"

"او جی سیٹھ صاحب... کی پئے کہندے او۔ اسی جانثار آں پرانے۔" غالب نے لہجے میں حیرانی کے جذبات شامل کیے۔

"تواڈے حکم دے غلام آں جناب عالی۔" وقار یوسف بولا۔

میں نے سیٹھ اکبر کی گردن پھر دبالی۔ "اب کیا فرماتے ہیں آپ؟ اب بھی اصرار ہے تمہیں کہ یہ تمہارے چمچے نہیں ہیں۔ یہ اپنی زبان سے تمہارے منہ پر خود کو جاں نثار اور حکم کے غلام کہہ رہے ہیں۔"

"ایک...... ایک منٹ...... چھوڑو مجھے......" سیٹھ اکبر نے کہا۔ "میں پوچھتا ہوں ان حرامزادوں سے۔ یہ مجھے مروانا چاہتے ہیں۔"

تھانیدار کی حالت سب سے عجیب تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس کی مانے اور کس کی نہ مانے، کس کی حمایت میں بولے اور کس کو سمجھائے۔

ڈرائیور نے پھر کہا۔ "سر یہ کوئی دھوکے باز ہیں۔ ان کا ہم سے کوئی تعلق نہیں۔"

میں نے کہا۔ "بڑے لوگوں کے چکر بھی بڑے ہوتے ہیں سر۔ آپ خود پوچھ کے مجھے مطلع فرمائیں کہ یہ دھوکے باز کون ہیں، کیا چاہتے ہیں اور بلا معاوضہ آپ کی خاطر کیوں اپنی جان کو خطرے میں ڈال رہے ہیں۔"

ڈرائیور نے ہمت سے کام لیا۔ "اوئے تمہاری...... کون ہو تم...... کیوں پنگا لے رہے ہو بلا وجہ۔ چلو دفع ہو جاؤ یہاں سے۔"

غالب نے پریشانی سے وقار یوسف کی طرف دیکھا۔ "اوئے لالے...... ایہہ کی ہو ریا مہ اے۔ مینوں تے سمجھ نہیں آئی۔"

"بس جی دساں بھائیا جی۔ جے ساڈی لوڑ نہیں سی تے فیر آکھیا کیوں سی۔" (اگر ہماری ضرورت نہیں تھی تو ہم سے کہا کیوں تھا۔)

سیٹھ اکبر پھٹ پڑا۔ "بکواس بند کرو...... کس...... نے کہا تھا تم سے، میں نے؟"

غالب نے سرہلایا۔ "آہو جی۔ آپ نے ہی تو یہ گڈی دی تھی۔"

"یہ گاڑی میری نہیں ہے۔ سکندر۔ تم اس کا نمبر نوٹ کر کے مجھے بتاؤ۔" سیٹھ اکبر نے بڑی مشکل سے کہا۔

میں نے کہا۔ "تم اپنے ڈرائیور سے کہہ سکتے ہو کہ وہ باہر نکلے بغیر اپنا سر گھما کے نمبر دیکھے۔"

"او بادشاہو' نمبر اسی دس دینے آں۔ ایل ای...... تھری فور تھری فائیو۔" غالب نے کہا۔

"تھری فور، تھری فائیو" ڈرائیور نے حیرانی سے دُہرایا "یہ نمبر تو سیٹھ صاحب کی گاڑی کا ہے۔"

"ٹھیک ہے مگر گاڑی سیٹھ صاحب کی نہیں ہے۔" میں نے طنز سے کہا "یہ گاڑی تو خود پکار پکار کے کہتی ہے کہ میں کسی معمولی آدمی کی ملکیت نہیں ہوں۔ ایسی گاڑی سیٹھ اکبر جیسے لوگ ہی رکھ سکتے ہیں۔"

"تے سرجی تسی نے پنج پنج ہزار سانوں کا دے لئی دِتّے سن؟" (آپ نے پانچ پانچ ہزار کس لیے دیے تھے؟)

"یہ کوئی سازش ہے۔ حرامی پن ہے" سیٹھ اکبر غصے میں آتش فشاں بن گیا "گاڑی میری نہیں ہے۔ انہوں نے میری گاڑی کی نمبر پلیٹ لگا رکھی ہے۔ تم دیکھ سکتے ہو۔"

"میں نہیں دیکھ سکتا۔ انہی سے پوچھو۔"

غالب نے کہا "بادشاہو' تواڈی گڈی دا نمبر ہے۔ ایل ای۔ زیرو فور زیرو فور۔ کیوں بھئی لالے؟"

"سچ آکھدے ہو بھائیا جی" وقار یوسف نے سرہلایا۔

"بکواس! جھوٹ" سیٹھ اکبر چیخا "یہ میری گاڑی کا نمبر کیسے ہو سکتا ہے۔ تھانے دار تم دیکھو۔"

تھانے دار نے گاڑی کے پیچھے جا کر دیکھا اور بولا "نمبر تو یہی ہے سیٹھ صاحب۔ آپ کی گاڑی کا۔ زیرو فور زیرو فور۔"

"اور دوسری گاڑی کا؟"

"وہ بھی۔ تھری فور تھری فائیو" تھانے دار نے کہا۔

سیٹھ اکبر خاموش ہو گیا۔ اس تمام صورت حال کو وہ خود نہیں سمجھا تو کسی اور کو کیا سمجھاتا۔

"اب کیا فرماتے ہیں آپ بیچ اس مسئلے کے؟" میں نے کہا "کیا یہ تمہارے اشارے پر نہیں آئے تھے؟ یہ سازش تم نے نہیں کی تھی کہ بعد میں یہ ایک دم پہنچ جائیں، کیا پتا وہاں صورت حال کیا ہو جائے۔ یہ گاڑی تمہاری ہے اور تم نے ان مسخروں کی خدمات پانچ پانچ ہزار روپے......"

اکبر خان نے سرہلایا "میں ابھی کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں، میرا سچ ہی میرا جھوٹ بن گیا ہے۔"

میں نے دہاڑ کے کہا "اکبر خان! بہت ہو گئی' اب ان کو حکم دو کہ خاموشی سے لوٹ جائیں۔ ہمارا وقت نہ ضائع کریں۔"

غصے اور بے بسی میں اکبر خان نے چلّا کے کہا "اچھا تمہاری تسلی، تم سچے اور میں جھوٹا۔ اب جاؤ' دفع ہو جاؤ...... میں نے بلایا تھا تمہیں" اب میں ہی کہہ رہا ہوں کہ جان چھوڑو میری۔ میں معلوم کرلوں گا بعد میں کہ میرے ساتھ یہ حرامی پن کس نے کیا تھا، کس نے بھیجا تھا تمہیں..."

"لو جی" ہور کون...... تُسی آپ ای۔"

"چل چھڈ پراں لالے...... سانوں کی" غالب نے وقار یوسف کا بازو پکڑ کے کھینچا "اسی لگے جانے آں...... پاگل کُتّے نے تے نئیں سی وڈیا سانوں۔" (ہمارا کیا ہے' چلے جاتے ہیں' ہمیں پاگل کتّے نے تو نہیں کاٹا تھا)

غالب نے جاتے جاتے کہا "گڈی کتھے چھڈیے؟" (گاڑی کہاں چھوڑیں؟)

جواب میں اکبر خان نے انہیں نصف درجن گالیوں سے نوازا۔ غالب نے وقار یوسف کی طرف دیکھا اور سر کے پاس انگلی گھما کے واضح کیا کہ سیٹھ کا مغز پھر گیا ہے۔ وقار یوسف نے اقرار میں سرہلانے کے علاوہ ہاتھ کے اشارے سے جام اٹھا کے غٹاغٹ پینے کا منظر پیش کیا کہ سیٹھ نے بہت پی لی ہے۔ پھر وہ دونوں کار میں بیٹھ کے جدھر سے آئے تھے اُدھر ہی لوٹ گئے۔ ان کی سمجھ بوجھ اور دلچسپ اداکاری سے میرا دل باغ باغ ہو گیا۔

"اب بولو' وہ تمہارے آدمی نہ ہوتے تو تمہارے حکم پر جاتے؟" میں نے اکبر خان کو چھوڑ دیا اور گاڑی سے اتر گیا۔

اکبر خان نے ایک گہری سانس لی۔ "تمہیں مجھ پر اعتبار کرنا چاہیے سکندر۔ اب تک میں نے پوری کوشش کی ہے تمہارے ساتھ مخلص رہنے کی۔ میں نے تم سے پورا تعاون کیا ہے اور تمہیں شکایت کا کوئی موقع نہیں دیا۔"

"میں سمجھتا ہوں کہ تمہاری عنایات بے سبب نہیں۔ ایسے ہی ڈرامے وہ تمہارا بھائی چوہدری دلاور بھی کرتا رہتا ہے جن کا مطلب آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا" میں نے کہا "مگر اب میں اس کے ذہن کو پڑھ لیتا ہوں۔ کسی حد تک سمجھ لیتا ہوں کہ ظاہر کے پردے میں نہاں کیا ہے؟"

"تم سے خدا سمجھے اور خدا تمہیں سمجھائے" سیٹھ اکبر خان نے میری بات پر بے بسی سے ہاتھ پھیلائے "میں سولہ لاکھ لٹا کے بھی تم کو یہ یقین نہیں دلا سکا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

"اکبر خان! ایک بات ابھی' اسی وقت سمجھ لو۔ نہ میں نے تم سے یہ سولہ لاکھ مانگے تھے' نہ یہ میرے کسی کام آئے۔ اگر یہ مجھ تک پہنچ جاتے تو یقیناً تمہارا احسان ہوتا مگر میرے ہاتھوں میں آنے سے پہلے ہی یہ رقم شریف ڈاکو لے گیا۔ مجھے تو اس میں بھی شک ہے کہ وہ شریف ڈاکو تھا یا تمہارا ہی کوئی ساتھی۔ مگر میرا مسئلہ وہیں ہے۔ شاید تمہاری مداخلت کے باعث پہلے سے زیادہ اُلجھ گیا ہے۔ اس معاملے میں تم ٹانگ نہ اڑاتے تو اچھا تھا۔"

"میں تو مدد کرنا چاہتا تھا۔ ہمیشہ کی طرح۔"

"لیکن نتیجہ کیا نکلا اس کا؟ اب مجھے نہیں معلوم کہ تمہاری

اس حرکت کے بعد محسن اور گُل کے لیے کیا مشکلات پیدا ہوں گی۔ یہ شریف لوگوں کے شریفانہ' قانونی مسائل نہیں ہیں جن میں عیاری اور چالاکی سے کام لینے والے کا کام ہوجاتا ہے۔ یہ چوروں ڈاکوؤں کی بات ہے جو زبان پر اعتبار کرتے ہیں۔ مردوں سے مردوں کی طرح نمٹنا جانتے ہیں اور زبان دے کر دغا کرنے والے کو کبھی معاف نہیں کرتے۔"

"یہ سب تم مجھے سمجھا رہے ہو؟" اکبر خان جھلا کے بولا۔

"پھر کیا کروں۔ تم نے ایسی نادانی کا ثبوت دیا ہے کہ ہم سب کی زندگی کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ کیا ضرورت تھی تمہیں بیچ میں کودنے کی' باڈی گارڈ ساتھ لے کر آنے کی۔ تمہارا کیا خیال ہے یہاں ڈاکو لمبی تان کے سوتے رہتے ہیں۔ کسی غار میں یا زیرِ زمین ٹھکانے پر۔ اس جنگل میں پتا بھی ہلے تو انہیں خبر ہوجاتی ہے اکبر خان۔ کوئی نہیں جان سکتا کہ کہاں سے کہاں تک ان کی آنکھیں ہر طرف دیکھتی ہیں۔"

اکبر خان سخت پریشانی اور پشیمانی میں مبتلا تھا "مجھ سے تو غالب نے کہا تھا کہ... کچھ مسئلہ درپیش ہے.... سولہ لاکھ کا۔ کہیں سے ہو نہیں پا رہے تھے.... میں نے کہا کہ ایسی کوئی بات نہیں.... قرض سمجھ کے لے لو۔ جب ہوں دے دینا..."

"تمہیں کچھ کرنا ہی تھا اکبر خان تو یوں نہ کرتے۔ کیا غالب پر اعتماد نہیں تھا تمہیں؟ شاید تم نے سوچا ہوگا کہ غالب جھوٹ بول کے تم کو ٹھگنا چاہتا ہے۔"

"نہیں.... ایسی کوئی بات نہیں۔"

"اور کیا بات تھی؟ تم خود اس لیے آئے تھے اکبر خان کہ تم خود کو بہت چالاک سمجھتے ہو۔ تم تصدیق کرنا چاہتے تھے کہ ڈاکوؤں کی اس کہانی میں حقیقت کتنی ہے۔ ورنہ تم سولہ لاکھ غالب کو بھی دے سکتے تھے۔"

وہ جھینپا ہوا اور لاجواب نظر آنے لگا "اس نے مجھے شریف ڈاکو کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔"

"کیسے بتاتا اور کیا بتاتا۔ یہ تو مجھے بھی یہاں رہ کے معلوم ہوا۔ غالب اور نازو تو فرار ہوگئے تھے۔ اور ابھی کتنے دوسرے ڈاکو اس جنگل میں سرگرم عمل ہیں' کون جانے۔ مجھے افسوس ہے کہ تمہاری نیکی ہمارے حق میں برائی بن گئی اور تم اپنی حماقت سے لُٹ گئے۔ اب تو میں اس پوزیشن میں بھی نہیں ہوں کہ تمہارے نقصان کی تلافی کرسکوں۔"

اس نے ناگواری سے کہا "گولی مارو نقصان کو۔"

"سولہ لاکھ کوئی اہمیت نہیں رکھتے تمہارے لیے تو ٹھیک ہے۔"

"اکبر خان کو لُوٹنا آسان نہیں ہے" اس نے تھانے دار کی طرف دیکھا "میں پورے ضلعے کی پولیس کو شریف ڈاکو کی گرفتاری پر لگادوں گا۔ ڈی آئی جی سے کہوں گا کہ خصوصی ٹیم تشکیل دی جائے۔ ایک لاکھ کا انعام میری طرف سے اس کی زندہ یا مردہ گرفتاری پر۔"

میں نے ہنس کے کہا "سرکار تو پہلے ہی پانچ لاکھ لگا چکی ہے شریف ڈاکو کے سر کی قیمت۔ ایک لاکھ..."

"میں دس لاکھ لگادوں گا" اکبر خان مشتعل ہوگیا۔

"اچھا جو تمہارا جی چاہے کرو مگر اس وقت تم جاؤ۔ میرا مشورہ ہے کہ فوراً اعلیٰ افسران سے رجوع کرو۔ تمہارا اثر و رسوخ ہے۔"

تھانے دار کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں "وہ میری تو شامت آجائے گی۔"

"کیوں؟ تمہارا کیا قصور ہے اس میں؟"

"وہ جی.... افسرانِ اعلیٰ کہاں سنتے ہیں کوئی بات۔ وہ تو کہتے ہیں کہ جس کے علاقے میں واردات ہو وہی تھانہ انچارج ذمے دار۔ اخبار والوں کے سامنے اپنی کارکردگی دکھانے کے لیے انہیں ہوا کرنا پڑتا ہے۔ بے چارے انچارج تھانہ کو قربانی کا بکرا بنانے سے ان کی انتظامی صلاحیت پر الزام نہیں آتا۔ اب آپ دیکھیں نا میں اکیلا ہر وقت ہر ڈاکو کے ساتھ لگا رہوں..."

میں نے کہا "تھانے دار! فضول باتیں مت کرو۔ حقیقت ہے' میں جانتا ہوں۔ کیا تم چاہتے ہو کہ میں سب کو کل شام مذاکرات کی تفصیل بتاؤں جو میرے' تمہارے اور طافو کے درمیان ہوئے تھے۔"

چند سیکنڈ کے لیے تو مجھے یوں لگا جیسے تھانے دار پر ہارٹ اٹیک ہوگیا ہے "آپ.... کیسی باتیں کرتے ہیں جی..."

اکبر خان نے اسے حقارت سے دیکھا "مجھے کیا سمجھتے ہو؟ میں کوئی دودھ پیتا بچّہ ہوں؟ جانتا نہیں کہ ڈاکو تمہارے ساتھی ہیں اور تم ڈاکوؤں کے۔ شریف ڈاکو رہ سکتا ہے اس جنگل میں تمہارے ساتھ حصہ بٹائے بغیر۔ سولہ لاکھ میں سے تمہارا حصہ کتنا ہوگا بولو...."

"آپ کسی ثبوت کے بغیر الزام لگا رہے ہیں مجھ پر۔"

"ثبوت کے بچّے۔ جب تمہاری پیٹی اترے گی اور تم معطل ہوکے جاؤگے یہاں سے تب پتا چلے گا تمہیں۔"

ایک دم تھانے دار کا رویّہ بدل گیا "کیا پتا چلے گا جی۔ یہ لیں میری پیٹی۔ اپنے ساتھ لے جائیں اور پیش کردیں آئی جی صاحب کو۔"

اس نے پیٹی اتار کے اکبر خان کی طرف پھینک دی۔

"بہت کروگے تم تو مجھے ملازمت سے برطرف کراؤ گے کرادو۔ اب ایسی کوئی ضرورت بھی نہیں رہی مجھے اس نوکری کی۔ اتنا ہے میرے پاس کہ اس گاؤں میں رہنے کے بجائے ٹھاٹ سے کراچی میں کوٹھی بنا کے رہوں۔ لاہور والی کوٹھی کا کرایہ ہی بہت ہے ویسے تو۔ اور معلوم ہے اس میں کون رہتا ہے؟ ایک ایم این اے"

"چوری اور سینہ زوری؟" اکبر خان چراغ پا ہوگیا "میں تمہیں اندر کرادوں گا۔ ایک ایک پیسہ وصول کرسکتا ہوں میں' جو تم نے ایسے اکٹھا کیا ہے۔"

"اور آپ نے کیسے اکٹھا کیا ہے جی؟ یہ بھی بتادیں" وہ تلخ لہجے میں بولا "جو کچھ تم جیسے لوگوں کے پاس ہے' وہ کیا حلال کی کمائی ہے؟ چھوڑیں سرجی یہ باتیں۔ آپ بھی حصہ دیتے ہیں اوپر اور ہم بھی۔ اوپر والوں کی ترٹی مت دیں۔ آپ صرف ایک گاؤں کے تھانے دار کے سامنے بول سکتے ہیں۔ شہر کا تھانے دار تو ڈک دیتا آپ کو اور رات بھر میں سارا بخار اتار دیتا۔ صبح بے شک آپ ضمانت کرالیتے یا اسے معطل کرادیتے۔ ہفتہ بھر سیدھے چلنا مشکل ہوجاتا۔ ولایتی کموڈ استعمال کرنا پڑتا۔ اور باتھ روم جاتے تو سارے مُحلّے کو پتا چلتا..."

احساسِ ذلت سے اکبر خان کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ تھانے دار کو گولی مار دیتا اور اپنے حکم کے غلاموں سے کہتا کہ اس کی لاش کے ٹکڑے کرکے کُتّوں کو کھلادو مگر یہاں وہ برداشت کرنے پر مجبور تھا۔ ہر کمزور جانور ایک حد تک ڈرتا ہے مگر اس کی جان پر بن جائے تو چوہا بھی بلی کے مقابلے پر آجاتا ہے اور بلی شیر بن جاتی ہے۔

تھانے دار کا سچ ایک جوابی طمانچہ تھا۔ وہ مجبور ہوگیا تھا کہ اس کو مسلسل طمانچے مار کے ذلیل کرنے والے "سچے آدمی" کے منہ پر زیادہ بڑے سچ کا ایک ہی طمانچہ مار کے اس کا منہ بند کردے۔ بڑا چور اور ڈاکو ایک بہت کم حیثیت چور کو دھمکی دے رہا تھا کہ وہ اس کا بھانڈا پھوڑ دے گا۔ چھاج بولے سو بولے چھلنی کیا بولے جس میں نو سو چھید۔

اکبر خان نے ڈرائیور کو چلنے کا حکم دیا۔

تھانے دار نے سچ کی مار سے بھاگنے والے پر ایک اور وار کیا "اکبر خان! ہمت ہو تو ڈی آئی جی سے ہی پوچھ لینا کہ ضلع کے چور ڈاکو اور بدمعاش جو بھتا دیتے ہیں وہ اسے کون پہنچاتا ہے اور کتنا ہوتا ہے ہر ماہ۔"

جب گاڑی زوم سے نکل گئی تو میں نے تھانے دار سے ہاتھ ملایا "تم نے سچ بول کے ثابت کردیا کہ کچھ پولیس والے بہادر بھی ہوتے ہیں۔"

"اور کیا جی... اس نے تو.... سمجھ لیا تھا" اس نے ایک اِسم مفعول کو بطور گالی استعمال کیا "خود کیا تھے کل تک.... آج ہم پر چڑھتے ہیں راشن لے کر۔"

میں نے کہا "کہتے تو ٹھیک ہو تم لیکن ایک فارسی کی ضرب المثل ہے کہ نزلہ برعضو ضعیف مطلب یہ کہ مرتا کمزور ہی ہے۔ مجرم تم بھی ہو' اکبر بھی اور ڈی آئی جی بھی' تو مارے صرف تم جاؤگے' یہ بات لکھ لو۔"

"مجھے معلوم ہے جی۔ لعنت اس نوکری پر جس میں صرف پیسہ ملا' عزت نہیں ملی۔ اس سے جان چھوٹے گی تو ہم بھی شہر کے رئیسوں اور سیٹھوں میں شامل ہوجائیں گے۔ معزز بن کے رہیں گے۔"

"تم نے دیکھا' میرے ساتھ کیا حرامی پن کرنا چاہتا تھا وہ؟ اپنے بندے لایا تھا۔ گاڑی اس کی اپنی تھی۔ کیسے انکار کر رہا تھا۔"

"آپ فکر مت کریں جی۔ میں نے سب دیکھا اور سنا۔"

"تم بھی فکر مت کرو۔ یعنی گواہ میں بھی ہوں۔"

"سرجی! آپ کے تو دوست ہیں اخبار والے" وہ ایک دم خوشامد پر اُتر آیا "اخبار والوں کے سامنے کون ٹھہر سکتا ہے۔"

"مگر اخبار والے اس معاملے میں کیا کرسکتے ہیں۔ وہ نہ چور کا ساتھ دے سکتے ہیں نہ تم جیسے کوتوال کا" میں نے کہا "ہم تو آج چلے جائیں گے۔ میرا مشورہ مانو تو تم بھی اب یہ علاقہ چھوڑ دو یا یہ نوکری۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ طافو کے بعد شریف ڈاکو تمہیں کوئی نقصان پہنچائے۔"

اس نے سرہلایا "طافو میں لحاظ تھا۔ شریف ڈاکو حرامی تو اپنے باپ کا بھی نہیں۔ خیر' خیال رکھنا سر ہم غریبوں کا۔"

میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔ "تم غریب ہو تو پھر خدا سب کو غریب کرے۔ سُنا ہے اس علاقے کے کسی زمیندار کے دو قیمتی گھوڑے چوری ہوگئے ہیں۔"

"آپ کو معلوم ہے۔ ملک صاحب بہت پریشان تھے۔"

میں نے کہا "طافو کل تمہیں بتادے گا کہ گھوڑے کہاں ہیں۔ ہوسکتا ہے' مسروقہ گھوڑوں کو برآمد کرنے پر ملک صاحب خوش ہوجائیں اور تمہارا کام بن جائے۔ کچھ اثر و رسوخ ان کا بھی ہوگا۔"

وہ بے حد مسرور نظر آنے لگا "ملک صاحب بڑی اونچی چیز ہیں جی۔ آپ نے تو دل خوش کردیا میرا۔ اب دیکھتا ہوں اکبر خان کیا بگاڑتا ہے میرا۔ وہ گھوڑے اس وقت کہاں ہیں؟"

میں نے کہا "ہمارے پاس ہیں مگر ابھی ہمیں ان کی ضرورت ہے۔ تم نے جلدی کی اور تعاقب کا سوچا تو تمہیں فائدے کے بجائے نقصان ہوجائے گا۔"

"میری توبہ جی" تھانے دار بولا "کہا سنا معاف۔"

دل ہی دل میں اپنے ڈبل ایکشن پلان کی کامیابی پر خوش ہوتا میں اس طرف چل پڑا جہاں ایک گھوڑا جو ملک صاحب کے اصطبل کی ناز برداریوں کا عادی تھا' اندھیرے جنگل میں لاوارث کھڑا تھا۔ میں تھانے دار کی طرف سے محتاط تھا لیکن وہ اندر جا کے بیٹھ گیا تھا اور شاید اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ رہا تھا جو بیک وقت مخدوش بھی تھا اور خوش آئند بھی۔ اس نے اکبر خان سے پنگا لیا تھا۔ اس کے نتیجے میں عین ممکن تھا کہ اسے یہ نوکری چھوڑنی پڑتی جو لاکھ رُسوائی' ذلت اور غلامی ہو مگر سونے کی کان بھی تھی

جس سے ابھی مزید سونا نکالا جاسکتا تھا لیکن دوسری طرف فکرِ معاش کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ ملازمت ایک عادت ہوتی ہے تو بزنس ایک چیلنج ہوتا ہے۔

گھوڑے نے اپنے ساتھ کیے جانے والے عامیانہ سلوک پر کچھ برہمی کا اظہار کیا مگر میں نے اسے رام کرلیا۔ مانا کہ تم وی آئی پی گھوڑے ہو دوست مگر ہمیں بھی دیکھو' ہم بھی تو اس جنگل میں تمہارے ساتھ خوار ہو رہے ہیں۔

میں ڈاک بنگلے پہنچا تو خلافِ توقع وہاں تاریکی تھی اور سناٹا تھا۔ میں نے گھوڑے کو احاطے کے اندر باندھا اور دوسرے گھوڑے کی تلاش میں اِدھراُدھر دیکھا۔ گھوڑا آخری حصے میں لمبی لمبی گھاس کے درمیان سائے کی طرح نظر آرہا تھا۔

میں نے برآمدے سے گزر کے پہلے کمرے کا دروازہ کھولا اور محسن کو آواز دی۔ میری جیب میں نہ ماچس تھی کہ میں موم بتی ہی تلاش کرسکتا اور نہ ٹارچ تھی۔ چند سیکنڈ اندھیرے میں گھورنے کے بعد میری آنکھیں کمرے کی ویرانی سے مانوس ہوگئیں۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔

ایک نامعلوم خطرے کے احساس نے مجھے چوکنا کردیا۔ جو کچھ تھانے میں ہوا تھا اس کے بعد غیر متوقع کوئی بات نہ تھی۔ اکبر خان اور اس کے ساتھی مجھ سے پہلے روانہ ہوئے تھے لیکن یہ بات بعید از قیاس لگتی تھی کہ وہ محسن اور گل کے علاوہ طافو کے پورے گروہ سے ٹکر لیں۔ طافو اپنے سب ساتھیوں کے ساتھ آس پاس ہی موجود ہوگا اور محسن کے سولہ لاکھ سمیت پہنچ جانے کے بعد وہ اپنا اپنا حصہ وصول کرنے آئے ہوں گے۔

اس کے باوجود امکانات لامحدود تھے۔ کہیں طافو نے یا اس کے کسی ساتھی نے راہ میں ہی تو محسن کو.... نہیں' میں نے اس دہشت زدہ کرنے والے خیال کو مسترد کردیا۔ وہ گل کے ساتھ اتنا بڑا دھوکا نہیں کرسکتا مگر ڈاکو تو ڈاکو ہی ہوتے ہیں اور سولہ لاکھ کی رقم بھی معمولی نہیں سمجھی جاسکتی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اکبر خان نے جتنے آدمی اپنی حفاظت کے لیے پیچھے چھوڑے تھے ان سے چار گنا ڈاک بنگلے کی طرف بھیج دیے ہوں کہ وہاں جو ملے اسے پکڑلاؤ اور کیا پتا اس نے پولیس کو مطلع کردیا ہو کہ آج فلاں جگہ پر سودا ہونے والا ہے۔ بہت مال ملے گا۔

میں نے ڈرتے ڈرتے دوسرے کمرے میں جھانکا اور محسن کو آواز دی.... پھر گل کو پکارا مگر خاموشی کا بوجھل پن ختم نہ ہوا۔ اندر ہی اندر خوف اب میرے دل میں اپنے عفریتی پنجے گاڑنے لگا تھا۔ میں نے بڑی چالاکی سے اکبر خان کو لوٹ لیا تھا مگر ہاتھی سے گنّے چھیننا آسان نہیں ہوتا۔ وہ ایسا اناڑی شکاری نہیں کہ سولہ لاکھ لے کر جنگل میں ڈاکوؤں سے معاملہ کرنے جائے اور اپنی حفاظت کے خیال سے غافل ہو۔

باری باری میں نے ہر کمرے میں دیکھ لیا مگر ہر جگہ وہی آسیب زدہ ویرانی اور دلدوز سناٹا تھا۔ خوف زدہ کرنے والے خیالات اب زیادہ شدت کے ساتھ میرے ذہن پر یلغار کرنے لگے تھے اور پُر امید' مثبت سوچ کی صلاحیت میں کمی کے ساتھ حوصلہ شکن امکانات کو اپنے اعصاب پر غالب آتے محسوس کررہا تھا۔ میں نروس تھا اور اندر کی بہت سی چور آوازوں کا شور مجھے ڈسٹرب کر رہا تھا۔ یہ آوازیں میری کوتاہیوں اور غلطیوں کے امکانات' میرے اندازوں کی خوش فہمی کے نقصانات اور میرے حد سے بڑھے ہوئے خود اعتمادی کے جذبات پر خندہ زن تھیں۔

میں نے تقریباً دوڑتے ہوئے اس برآمدے کے دو چکر لگائے اور ہر بار خالی کمروں میں اپنی آواز کی کھوکھلی بازگشت سُنی۔ خوف سے پاگل کردینے والے احساس کا ریلا میرے حوصلے کو یوں بہائے جانا چاہتا تھا جیسے سیلاب خس وخاشاک کو لے جاتا ہے مگر میں اپنے آپ سے ڈر رہا تھا۔ میں ایک بار پھر سب سے بچھڑ جانے کے تصور سے بھی بچنا چاہتا تھا۔ یہ سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا کہ ہم سب کے دشمن اپنی کسی مکروہ سازش میں کامیاب ہوگئے ہیں اور.... اب میں ہوں اور ماتم یک شہرِ آرزو۔ میں زندگی کے پُرعذاب راستوں پر اپنے پچھتاوے سمیٹنے کے لیے اور یادِ رفتگاں کے سایوں کا تعاقب کرنے کے لیے اکیلا رہ گیا ہوں۔

میں نے سنسان احاطے میں آکے طافو کو آوازیں دیں۔ خلیل اور پوپٹ کو پکارا۔ میرے وجود میں ایک زلزلہ آیا ہوا تھا' ایک ہلا دینے والی کن قوت کے ساتھ خوف کا عفریت مجھے جھنجوڑ رہا تھا اور تقدیر اپنی تمام ستم ظریفی کے ساتھ مجھ پر قہقہے لگارہی تھی۔ سُنو سکندرِ اعظم. کہاں تمہاری ذہانت کو مات ہوئی۔ تمہاری کون سی چالاکی تمہاری شکست کا سبب بنی۔ تم نے کیا کیا جو تمہیں نہیں کرنا چاہیے تھا اور کیا نہیں کیا جو کرنا تھا۔ خوش قسمتی کے ساتھ پرواز کے افق لامحدود ہوں مگر آدمی کی قوتِ تسخیر تو تقدیر کے تابع ہے اور تم اتفاقات کی موافقت پر انحصار کرنے لگے تھے۔

میری خود اعتمادی میں دراڑ پڑنے لگی تو مجھے ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آنے لگا۔ وہ اندھیرا جس میں ہر طرف میرے مجرم شکاری چھپے ہوئے تھے اور مجھے محصور کرچکے تھے۔ اوہ میرے خدا! کیا اس جہدِ مسلسل کا حاصل یہی تھا۔ یہ انجام تھا ایک پُرامید جدوجہد کا جو صرف اچھے مستقبل کے لیے تھی۔ اپنے لیے اور رابعہ کے لیے۔ غالب اور نازو کے لیے۔ گل اور محسن کے لیے اور ان سب کے لیے جو ایم آر ایس کو انسان کے اندر کی نیکی اور آدمیت' عدل کی طاقت اور پُرامن بقائے باہمی کی علامت سمجھتے تھے اور اس پر یقین رکھتے تھے۔

میں نے محسوس کیا کہ اگر اسی طرح میں منفی خیالوں کے سامنے جُھکتا رہا تو میرا وجود شکست سے پہلے ہی شکست کا شکار ہوجائے گا۔ خوف مجھے اتنا کمزور کردے گا کہ میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی ہار جاؤں گا۔ محض ناامیدی کے تصورات سے دامن جھڑانا بے حد ضروری ہے۔ میں تاریک سُرنگ کے دوسرے دہانے پر روشنی کیوں نہیں دیکھتا۔ کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ محسن اور گل میرا انتظار کرتے کرتے.... مگر نہیں' وہ مجھے چھوڑ کے کیسے جاسکتے ہیں۔ انہیں معلوم تھا کہ میں کہاں ہوں اور محسن سے میں نے یہی کہا تھا کہ میں ابھی آتا ہوں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ غالب اور وقار یوسف وہاں سے تو گاڑی میں واپس شہر کی طرف روانہ ہوئے مگر پھر اِدھر آگئے انہوں نے محسن اور گل کو بتادیا ہو گا کہ سکندر تو اکبر خان کی گاڑی میں بیٹھ چکا تھا اور وہ واپس لاہور جارہا تھا۔ ظاہر ہے اس کے بعد گل اور محسن اس کار میں روانہ ہوگئے جو بطورِ خاص ہمیں واپس لانے کے لیے بھیجی گئی تھی۔ وقار یوسف کے سُسر کے بارے میں سب ہی جانتے تھے کہ وہ حکومت میں بڑی توپ چیز ہے۔ اس کا عہدہ میں نے کبھی نہیں پوچھا تھا مگر مجھے معلوم تھا کہ اس کے پاس "ہذا من فضلِ ربی" کا کرشماتی طلسم ہے۔ دولت کی خیرہ کن ریل پیل ہے۔ عظیم الشان کوٹھیوں اور کاروں کی افراط ہے اور ظاہر ہے یہ سب کسی انتہائی اثر ورسوخ والے اور لامحدود اختیارات والے عہدے کا کمال ہے۔

اچانک میں نے خود کو تاریک سرنگ کے باہر پایا جہاں صرف امید کی روشنی تھی اور میں اپنے آپ سے شرمندہ ہوا کہ ذرا سی آزمائش کا مرحلہ آیا تو میرا حوصلہ اور اعتماد کتنا ناقابلِ اعتبار ثابت ہوا جس پر مجھے ناز تھا۔ اتنی ہی دیر میں کیا کچھ نہیں سوچا میں نے جو مجھے پاگل کرنے کے لیے کافی تھا حالانکہ بات کچھ بھی نہیں تھی۔

میں نے سامنے کی حقیقت کو کیوں نہیں دیکھا اور دور اُفتادہ ناممکنات کے آسیب سے خوف زدہ ہوگیا۔ آخر کیوں؟ کیا یہ بے سکونی کے مسلسل آزار کا نتیجہ ہے کہ میرے اعصاب کے تار ٹوٹنے لگے ہیں اور میں ذہنی طور پر قنوطی اور یاسیت زدہ (PASSIMIST) بننے لگا ہوں۔

میں نیا حوصلہ پاکے اٹھ کھڑا ہوا۔ صورت حال کی تصویر میرے سامنے بالکل واضح ہوگئی تھی۔ میں نے منظر سے کہا تھا کہ وہ کسی بھی طرح سولہ لاکھ کا بندوبست کرے اور اس نے غالب سے ذکر کردیا۔ غالب نے کہا ہوگا کہ ٹھہرو پہلے مجھے بھی کوشش کرنے دو۔ اگر میں کچھ نہ کرسکا تو پھر ہم سولہ لاکھ کا بندوبست مل کر کریں گے۔ تھوڑا بہت اندوختہ منظر کا بھی ہوگا۔ وزیر خاں ٹرسٹ سے رقم نکلوائی جاسکتی تھی اور ایمرجنسی میں وقار یوسف کی بیوی اپنے ڈیڈی سے کہہ سکتی تھی کہ وہ سرکاری اختیارات والی جادو کی چھڑی گھمائیں اور سولہ لاکھ حاضر کردیں۔ ایک وسیلہ پشاور میں قدرت خانم کے والدین کا بھی تھا جو اپنی سب جمع پونجی وزیر خاں ٹرسٹ اسپتال کے نام کرنے کا وعدہ کرچکے تھے لیکن غالب نے ایک "ضرورت مند" کو پکڑا۔

یہ ضرورت مند اکبر خان تھا جسے ہر قیمت پر غالب کی صحافت اور ایم آر ایس کی حمایت کی ضرورت تھی۔ ابھی تک اس کے

مقاصد واضح ... نہیں تھے مگر حقائق ایک ہی سمت میں اشارہ کرتے تھے کہ چوہدری دلاور سامنے آئے بغیر ہم سے مفاہمت چاہتا تھا۔ اس نے استاد پیڈ رو کو ہمارے پیچھے لگادیا تھا کہ وہ کسی طرح بھی ہماری نظر میں اپنی پوزیشن کلیئر کرے۔ ہماری حمایت حاصل کرنے کے لیے سب سے پہلے تو ہم سب کو جو ایک دوسرے سے بچھڑے ہوئے تھے اس طرح ملوائے کہ یہ سب اس کی کوشش کا نتیجہ نظر آئے اور ہم یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوں کہ اس نے جان جوکھوں میں ڈال کے یہ کارنامہ سرانجام دیا ہے تاکہ ہم اس کی نیّت کے خلوص کو تسلیم کرلیں۔ یہ چوہدری دلاور کے طویل ڈرامے کا پہلا ایکٹ تھا جس میں سب کچھ اس کی مرضی اور ہدایات کے مطابق ہوا۔ دوسرے ایکٹ میں اکبر خان نمودار ہوا اور اس نے چوہدری دلاور کے اشارے پر ہمیں احسانات کے بارِ گراں سے خریدنے کی کوشش کی۔

غالب نے موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اکبر خان کو موقع دیا کہ کرنا چاہتے ہو تو یہ احسان کردو اور اکبر خان نے سولہ لاکھ داؤ پر لگادیے۔ اس نے کہا ہوگا کہ اب تم فکر مت کرو، میں جاؤں گا اور انہیں لے آؤں گا۔ غالب اور وقار یوسف نے بھیس بدل کے اس کا تعاقب کیا۔ شاید وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ اکبر خان اپنا وعدہ پورا کرتا ہے یا نہیں۔ وہ سولہ لاکھ ادا کرے گا یا طاقت اور بدمعاشی سے ہمیں چھین کرلانے کی کوشش کرے گا۔ عین ممکن تھا کہ غالب اور وقار یوسف اپنے طور پر سولہ لاکھ لے کر چلے ہوں۔ عمداً انہوں نے ایسی گاڑی استعمال نہیں کی تھی جو پہچانی جائے۔ گاڑی کا انتظام وقار یوسف کی بیوی نے کردیا ہوگا۔ نمبروں کی ہیرا پھیری غالب کا آئیڈیا تھا اور بلاشبہ اس نے اکبر خان کو کنفیوز کردیا تھا۔

اگر صورت حال خطرناک ہوتی اور ڈاکو وعدہ خلافی کے جرم کی سزا کے طور پر ہماری رہائی سے انکار کردیتے یا ہماری قیدِ حیات سے رہائی پر تل جاتے تو غالب فوراً ریفری بن کے بیچ میں کود پڑتا اور کہتا کہ سوری، یہ غلط آدمی تھا جس نے غلط کام کیا۔ ہم فاؤل نہیں کھیلتے۔ یہ لو سولہ لاکھ اور لاؤ ہمارے بندے۔ لیکن انہوں نے دیکھا کہ اکبر خان سولہ لاکھ دے چکا ہے تو پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق انہوں نے دوسرا ڈراما شروع کردیا۔ یہ شرارت غالب کے سوا کوئی نہیں کرسکتا تھا۔ اکبر خان تو اسے پہچان ہی نہیں پایا مگر وہ جاتے جاتے اکبر خان کی مٹی پلید کرگئے اور اس کی نیکی کے رنگ میں بھنگ ڈال گئے۔

ابھی غالب اور وقار یوسف کو علم نہیں تھا کہ میں نے اکبر خان کے ساتھ کیا ہاتھ کھیلا ہے۔ اس عیار اور شاطر آدمی نے ہمیں شکار کرنے کے لیے دولت کا جال پھیلایا تھا لیکن وہ ناکامی کے دُہرے صدمے سے دوچار ہوکے گیا۔ اس نے شکار بھی گنوایا اور جال بھی۔ اس کا احسان اُلٹا اس کے حق میں ندامت اور ملامت کا سبب بن گیا۔ مجھے اس خیال سے خوشی ہونے لگی کہ باقی سب اکبر خان کے شریف ڈاکو کے ہاتھوں لُٹنے کا الم ناک واقعہ سن کر خوش ہوں گے۔ نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم۔ سولہ لاکھ گئے کے ساتھ ہی عزت بھی گئی اور حاصل کچھ نہ ہوا۔ ہم نے کی کمائی کا اندوختہ بچالیا اور ڈاکوؤں کے مالِ غنیمت کا نقصان خان جیسے ڈاکو کے مالِ حرام سے پورا کردیا مگر خود پر نہ دیا نہ احسان کا بار۔ بدنام ہوا شریف ڈاکو جس کے فرشتوں کو اس کے نام پر ہونے والی واردات کی خبر نہ ہوئی اور سولہ جانے کہاں سے آئے اور کہاں گئے۔ قیاس آرائیوں اور کا سلسلہ چلتا رہے گا۔

فوری طور پر میرے سامنے لاہور شہر پہنچنے کا مسئلہ تھا۔ معلومات کے مطابق چالیس میل کی مسافت تھی۔ اگر اندازے سے منہ اٹھا کے چل پڑتا تو کسی نہ کسی سڑک تک جاتا۔ کوئی آبادی مل جاتی تو صبح تک قیام کرتا اور صبح تانگے بس یا ٹرین سے لاہور پہنچنا آسان ہوجاتا مگر میں جلد از جلد کے درمیان پہنچنے کے لیے بے چین تھا اور ایک رات محض خاطر انتظار میں نہیں گزارنا چاہتا تھا۔ سفر کا آسان اور موثر میری دسترس میں تھا۔ میں گھوڑے پر یہ فاصلہ ڈیڑھ دو گھنٹے آسانی طے کرسکتا تھا۔ لاہور تو لاہور سے بیس میل پہلے ہی ہوجاتا تھا چنانچہ جنگل کے ویران راستے کا سفر پندرہ بیس میل زیادہ نہ تھا۔ اس کے بعد بس، ویگن، رکشا یا ٹیکسی مل جانے کی تھی۔

میں نے تھانے دار سے وعدہ کیا تھا کہ اسے صبح گھوڑے "برآمد" کرکے ملک صاحب کے سامنے سُرخرو ہونے موقع فراہم کروں گا لیکن اب ضرورت اور حالات کا تقاضا تھا میں اپنا پروگرام بدل دوں۔ میں نے کلائی کی گھڑی دیکھی تو رات کے آٹھ بجے تھے۔ دس بجے تک میں لاہور پہنچ سکتا تھا۔

میں نے گھوڑے کو کھولا اور پیار سے تھپکی دی۔ چل لاہور کی سیر کرائیں۔ ملک صاحب کی غلامی سے تیری جان میں نے گھوڑے پر سوار ہوکے دل ہی دل میں کہا مگر گھوڑا شاید کی بات سمجھنے کی چھٹی حس رکھتا تھا۔ اس نے مجھے پُرملال نظروں سے دیکھا اور نہ جانے کیسے میں وہ بات سمجھ گیا جو گھوڑا زبان سے کہہ سکتا تو ضرور کہتا...... کہ یہ جسے تم غلامی سے کہہ رہے ہو، یہ بدترین غلامی کی، بدقسمت زندگی ہوگی سکندر صاحب۔ آپ تو مجھے کہیں بھی چھوڑ کے چل دیں گے کہ آگے مرضی مگر میری مرضی خاک ہوگی۔ جس نے پکڑا وہ کسی تانگے والے کو بیچ ڈالے گا اور ملک صاحب کے اصطبل کی نازو نعم والی زندگی کے بعد باقی عمر تانگے میں سواریاں ڈھوتے جائے گی۔

گھوڑے کے جذبات اپنی جگہ مگر میں بھی مجبور تھا اور لاہور کی جانب مارچ نہیں کرسکتا تھا۔ آہستہ آہستہ میں نے

اندازے سے سمت کا تعین کیا اور گھوڑے کو اندھیرے میں آگے بڑھایا۔ گھڑ سواری کے بھی انداز جُدا ہیں۔ ریس کورس میں نمبر ون آنے والا گھوڑا اور جو کی میدانِ جنگ کے لیے، پولو کھیلنے کے لیے یا دشت و دریا سے گزرنے کے لیے بالکل بے کار ثابت ہوں گے۔ میں بھی ریس کے گھوڑے پر سوار تھا۔ جنگل کے اونچے نیچے تاریک راستوں پر سفر کا تجربہ نہ مجھے تھا اور نہ گھوڑے کو۔ کئی جگہ گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور مجھے احتجاجاً گرانے کی کوشش بھی کی مگر میں اس سے بھوت کی طرح چمٹا رہا۔

آدھے گھنٹے بعد میں نے مشکل سے ایک میل کا فاصلہ طے کیا تھا اور میں اس خیال سے پریشان تھا کہ اس رفتار سے تو میں صبح تک بھی لاہور نہ پہنچ پاؤں گا۔ پہنچا بھی تو دونوں کی حالت قابلِ رحم ہوگی۔ گھوڑا مجھے گالیاں دے رہا ہوگا اور میں گھوڑے کو۔ اس سے یقیناً بہتر ہوگا کہ میں گھوڑے کی جاں بخشی کردوں اور خود زیادہ آسانی کے ساتھ سیٹی بجاتا ہوا پیدل چل پڑوں۔

معلوم نہیں گھوڑے کی دعا قبول ہوئی یا میری، اچانک میں نے تھانے کی طرف سے کسی کو اپنی جانب دوڑ کر آتے دیکھا۔ ایک فرلانگ دور سے وہ مجھے چلّا چلّا کے آوازیں دے رہا تھا۔ یہ طافو تھا اور اسے دیکھ کے مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ میں چھلانگ مار کے گھوڑے سے اترا اور خود بھی طافو کی طرف دوڑنے لگا۔

طافو نے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ کہا "آپ... آپ کدھر چلے گئے تھے جی؟ حد کردی!"

میں نے بمشکل تمام کہا "حد میں نے کردی یا تم نے۔ میں ڈاک بنگلے کی جانب گیا تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ کہاں گئے سب آخر؟"

"وہ سب۔ ایک گاڑی آئی تھی... سب کو لے گئی... سب چلے گئے۔"

میں نے غصے سے کہا "اور مجھے چھوڑ گئے؟"

طافو نے کہا "انہوں نے بتایا تھا.... کہ آپ کسی سیٹھ اکبر خان کی گاڑی میں لاہور چلے گئے ہو۔"

میرا اندازہ درست ثابت ہوا تھا مگر پھر بھی مجھے سب پر غصہ آرہا تھا، انہیں میرا انتظار ضرور کرنا چاہیے تھا۔ یہ ضرور سوچنا چاہیے تھا کہ ان سب کو وہاں چھوڑ کے میں اکیلا اکبر خان کے ساتھ کیسے لاہور جاسکتا ہوں۔ میں تو مجبوراً گاڑی میں بیٹھا تھا اور ممکن ہوتا تو میں اکبر خان کو بھی ڈاک بنگلے ہی لاتا۔ غالب اور وقار یوسف نے خواہ مخواہ فرض کرلیا کہ میں اکبر خان کے ساتھ لاہور روانہ ہوگیا۔ باقی سب کے لیے ان کے بیان پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔

"وہ تم کو ڈاک بنگلے میں چھوڑ گئے تھے؟"

"ہاں۔ بہت دیر انتظار کیا میں نے۔ پھر میں نے سوچا کہ تھانے دار سے پوچھوں۔ اس نے بتایا کہ اکبر خان کے ساتھ کیا ہوا؟" وہ ہنس پڑا۔

میں نے کہا "تمہیں اپنا اپنا حصہ مل گیا؟"

"مل گیا جی۔" اس نے بوجھل لہجے میں کہا اور ایک آہ بھری۔

"اب کس بات کا دکھ ہے؟"

"بس جی! میں نہیں چاہتا تھا یہ سب.... کچھ بھی نہیں چاہتا تھا میں مگر میں مجبور ہوگیا۔ باقی سب لحاظ بھول گئے تھے۔ وہ بھی مجبور تھے۔ مجبوری آدمی سے سب کچھ کرا سکتی ہے۔ میں نے سوچا، کہیں وہ میرے بھی دشمن نہ ہوجائیں، گل کو نقصان نہ پہنچائیں۔ اس لیے میں نے سب کی طرف سے وہ بات کی جو میں کرنا نہیں چاہتا تھا۔"

"چلو چھوڑو۔ جو ہونا تھا ہوگیا" میں نے کہا۔

"اسی بات کا تو دکھ ہے جی۔ جو نہیں ہونا چاہیے تھا وہ ہوگیا۔ اب آپ جارہے ہیں تو میری طرف سے یہ بات ناگ منی.... میرا مطلب ہے گل بانو کو بتادینا۔ ہم تو بس ناگ منی کو جانتے تھے۔" وہ بے حد افسردہ اور جذباتی نظر آرہا تھا اور سر جھکائے کھڑا تھا۔ "وقت کے ساتھ سب کچھ بدل جاتا ہے۔ بدل جاتا ہے ناجی؟"

میں نے کہا "کیا تمہیں شک ہے؟"

اس نے نفی میں سرہلایا "شیش ناگ کے مرنے سے سب بدل گیا۔ یہی سب تھے جو اس لڑکی ناگ منی کی طرف نظر اٹھا کے دیکھتے ہوئے ڈرتے تھے۔ میلی نظر سے دیکھنا تو دور کی بات ہے۔ سب جانتے تھے کہ شیش ناگ کے دل میں ان کے لیے باپ جیسی شفقت کم نہیں ہے۔ وہ بڑی سے بڑی غلطی معاف کرسکتا تھا مگر نیّت کا کھوٹ برداشت نہیں کرتا تھا۔ ناگ منی بڑی لاڈلی تھی اس کی۔ بہن سے زیادہ بیٹی تھی اس کے لیے اور..." وہ ذرا سی دیر کے لیے رکا "ایک بار کسی کے منہ سے اس نے کچھ سن لیا تھا۔ اس نے ناگ منی کے بارے میں کوئی گندی بات کی تھی۔ سب کے سامنے شیش ناگ نے اسے چیر پھاڑ کے رکھ دیا۔ اس کی انتڑیاں نکال دیں اور اسے اوپر سے نیچے تک اُدھیڑ دیا۔ حالانکہ وہ پرانا آدمی تھا، بہت سرچڑھا ہوا تھا۔ شاید اسی لیے اتنی ہمت ہوگئی تھی اس کی۔ بعد میں کس کی مجال تھی جو ناگ منی کے بارے میں پیٹھ پیچھے بھی بات کرتا..... لیکن شیش ناگ مرگیا۔ تربیّت تو اس نے بہن کی ایسے کی تھی جیسے وہ گروہ کی سردار ہوگی مگر شیش ناگ کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی یہی کرتا جو اس نے کیا تھا۔ عورت کیسی بھی دلیر اور نڈر ہو، عورت ہی ہوتی ہے، جوان اور خوب صورت عورت شریفوں کی بستی میں آج بھی اکیلی نہیں رہ سکتی تو ان ڈاکوؤں کے ساتھ کیسے رہ سکتی تھی۔ اچھا کیا اس نے جو ناگ منی کو تمہارے حوالے کرگیا تھا لیکن وہی ناگ منی جب گل بانو بنی تو کیا ہوا۔ جو اس کے سامنے نظر نہیں اٹھاتے تھے وہی اس کا راستہ روک کے کھڑے ہوگئے تھے۔ لحاظ مُروّت سب بھول گئے تھے..... اور سینہ تان کے اس کے سامنے آگئے تھے۔"

"اتنی خاطر مدارات کیوں کی تھی پہلے؟" میں نے طنز سے کہا۔
"وہ ایک رسم کی بات تھی" طافو بولا "انہوں نے کہا کہ ہم نے کوئی کمی نہیں کی۔ اپنا فرض ادا کردیا' اب ہمیں ہمارا حق ملنا چاہیے۔ میرے سمجھانے کا بھی ان پر اثر نہیں ہوا۔ انہیں اپنا قرض بھی یاد تھا جو انہوں نے شیش ناگ کو دیا تھا۔ ایک امانت کے طور پر...... اور انہیں یہ بھی معلوم ہوگیا تھا کہ گل بانو یہ قرض چکا سکتی ہے۔"
میں نے کہا "گل کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس کے بھائی نے دوسروں کا پیسہ کہاں رکھا تھا؟"
"ہو سکتا ہے کہ معلوم نہ ہو۔ ہو سکتا ہے..."
"اب تمہیں مان لینا چاہیے۔ جو تم چاہتے تھے تمہیں مل گیا' خواہ کہیں سے بھی ملا۔" میں نے برہمی سے کہا۔
"اسی بات کا تو دکھ ہے مجھے۔ ان سب نے زبردستی کی۔ وہ جو تمہارے ساتھ تھا نا ایک کالا سا۔ گھونگریالے بالوں والا۔ جس نے کانوں میں مُندیاں پہن رکھی تھیں سونے کی۔"
"استاد پیڈرو۔ شیطان کی حرامی اولاد۔"
"اس نے ان کے کان میں یہ بات ڈال دی تھی کہ موقع اچھا ہے۔ گل بانو اتفاق سے پھر یہاں آکے پھنس گئی ہے۔ تم نے اسے چھوڑ دیا ایسے ہی تو ساری عمر پچھتاؤ گے۔ وہ پھر نہیں آنے والی۔ جو وصول کرنا ہے ابھی وصول کرلو۔ اس کے ساتھ جو لوگ ہیں سب موٹی اسامی ہیں۔ سولہ لاکھ کیا' تیس لاکھ بھی دے سکتے ہیں۔ ذرا صحیح طریقے سے دباؤ ڈالو۔ آسانی سے کچھ نہیں ملتا دنیا میں۔"
میں نے سینے میں دہکتی ہوئی نفرت کی آگ کو الاؤ کی طرح بھڑکتے محسوس کیا۔ میں نے اسے ایک سے ایک غلیظ گالی دی "یہ سب اس کی کارستانی تھی' مجھے پہلے ہی سمجھ لینا چاہیے تھا۔ خیر' اس سازش کو بھی میں نے اس کی فردِ جرم میں لکھ لیا ہے۔ اس کے خون کا ہر قطرہ میرے انتقام کا مقروض ہے طافو۔"
"آپ مجھے بھی بُرا آدمی سمجھتے ہوگے۔ بُرا تو میں ہوں۔ ڈاکو نیک کب ہوتے ہیں" وہ بولا "مگر یہ گھر کی بات تھی۔ بنی یا بہن کے ساتھ تو کوئی بھی بدمعاشی نہیں کرتا...... لیکن وقت بدل گیا ہے جی۔ شرم اٹھ گئی ہے رشتوں کی۔ میں یہ بتانے نہیں آیا کہ میں سب سے الگ تھا اور میں نے کوئی احسان کیا تھا۔ نہیں جی' میں مجبور تھا۔ میں کچھ نہ کرتا تو معاملات قابو سے باہر ہوجاتے۔ میں نے سب کو پٹا ڈال کے رکھا اور انہیں یقین دلایا کہ انہیں ان کا حق مل جائے گا لیکن وہ ایسی کوئی بات نہ کریں کہ آخری وقت میں برسوں کے ساتھ کا بھرم بھی نہ رہے۔ دوستی کے رشتے دشمنی میں بدل جائیں اور کل تک جینے مرنے کے ساتھی ایک دوسرے کا خون بہانے پر اتر آئیں۔ خلیفہ اور پوپٹ بھی میرے ساتھ تھے نا جی۔ ہم نے کہا کہ کسی نے ناگ منی کو گل بانو سمجھ کے لوٹنے کی کوشش کی تو خون خرابا ہوگا۔ ہم ماردیں گے اور مرجائیں گے۔ بار وہ خوشی سے جو دے نہ لے لو۔ اگر وہ دباؤ میں کچھ کرسکتی ہے تو یہ کام مجھے دو۔ شرافت کا دامن ہاتھ سے چھوڑنے والا خود ذمے دار ہوگا۔
میں نے کہا "تم میرے سامنے کیا ثابت کرنا چاہتے ہو؟"
"کچھ نہیں۔ کچھ نہیں جی" وہ بولا "گل نے تو کسی سے کچھ نہیں کہا۔ کسی کو بھی شرمندہ نہیں کیا۔ اس نے سولہ لاکھ پھینک دیے جیسے کوئی بھوکے کے سامنے روٹی پھینکے۔ اس نے ایک کو اس کا حصہ خود دیا اور کہا کہ خدا کا شکر ہے جس نے اپنے بھائی کا قرض ادا کرنے کے قابل کیا۔ یہ کاغذ کے ٹکڑے سدا ساتھ نہیں دیتے۔ رشتے تمام عمر کے ہوتے ہیں مگر راستے بدل جائیں تو نظریں بھی بدل جاتی ہیں، رشتے بھی نہیں رہتے۔ اپنا اپنا حق لے کر بڑے ذلیل ہوئے۔ خود اپنی نظر میں۔ میں دیکھ رہا تھا جی۔ مگر ان میں ہمت نہ تھی کہ گل بانو سے' گل کی ناک سے...... معافی مانگ لیتے۔"
میں نے کہا "معافی مانگنا بڑی بہادری کا کام ہوتا ہے' اس میں اپنی انا کو پہلے مارنا پڑتا ہے۔"
"کیسے جی؟ خیر' آپ پڑھے لکھے بندے ہو۔"
میں نے کہا "اپنے غرور کو۔"
اس نے سر ہلایا "دوسروں کو میں کیا الزام دوں' میں خود بھی اس سے نہ کہہ سکا کہ ناگ منی' میں بڑا کمینہ ہوں۔ مجھے معاف کردے۔ وہ کہاں سنتی میری۔ کیسے معاف کرتی مجھے۔ اپنی اصلیت جو ظاہر کردی تھی میں نے لیکن اب آپ مہربانی کرو۔ آپ میری طرف سے اس کو بتانا کہ طافو من موجی بڑا مجبور تھا مگر وہ کمینہ نہیں تھا۔ اس نے دوسروں کی مجبوری کو اپنی مجبوری بنالیا تھا کہ گل بانو کو کچھ نہ ہو۔ اس کا گھر آباد رہے۔ اللہ اس کے گھر کو خوشیوں سے بھرا رکھے۔ اسے ممتا کی دولت کے سارے خزانے دے دے۔ وہ سب بھی جو میرے نصیب میں نہ تھے۔"
میں نے نرمی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا "تم رو رہے ہو طافو من موجی۔"
"من موجی؟ من موجی مرگیا۔ دفن کردیا اسے میں نے آخری بار۔ جیسے ناگ منی مرگئی' ایسے ہی من موجی بھی مرگیا۔ اس کا ساز اور سنگیت مرگیا۔"
میں نے کہا "غلط سمجھے ہو تم۔ طافو مر سکتا ہے مگر من موجی نہیں مر سکتا ہے۔ ساز اور سنگیت امر ہیں' تمہارے اندر زندہ ہیں اور رہیں گے۔ آدمی اپنے وجود کی برائی سے لڑ سکتا ہے اور اسے ختم بھی کرسکتا ہے مگر اچھائی کو نہیں۔"
"پتا نہیں جی۔ اب تو لگتا ہے زندگی ضائع ہوگئی۔ کیا فائدہ ہوا اس سے مجھے یا کسی اور کو۔ جب ہوش سنبھالا تو اس کو دکھ دیا' اُس کو دکھ دیا۔ سکھ خود کبھی نہیں دیکھا تھا نا۔ دوسروں کو بھی سکھی نہ دیکھ سکا۔ آج سوچتا ہوں سب کے سکھ چھین کے کیا مجھے سکھ ملا؟ نہیں۔ میں اور دکھی ہوتا گیا۔ اپنے بیگانے ہوگئے۔ دوست کوئی نہ رہا۔ سب کی خاطر مگر دشمنی اللہ واسطے رکھی۔ ڈاکو کا دوست کون ہوتا ہے جی۔ ہونا بھی نہیں چاہیے۔ پیسہ مال و دولت سب یہیں رہ جانا ہے۔ ...ش کو نہ کفن ملا نہ قبر کی مٹی ملی۔ بس بچی کھچی ... نہیں بھری۔ اپنے ساتھ بھی یہی ہوگا۔ من دکھی ہونے کا ... ڈپریشن کا شکار ہو۔"
میں ... نظریں اٹھائیں "یہ بیماری ہوتی ہے کوئی؟"
اس نے ... میں نے سوچ کے کہا "ہاں۔ بیماری ہی ہوتی ہے۔"
"صرف ڈاکوؤں کو' ہم جیسوں کو ہوتی ہے؟"
میں نے مسکرا کے کہا "نہیں بھئی۔ شریف لوگوں کو بھی ... ہوجاتی ہے۔"
"کیوں ہوجاتی ہے' کوئی دوا ہے اس کی؟"
میں نے کہا "جب آدمی حالات سے سمجھوتا نہ کرسکے اور یہ سمجھنے لگے کہ حالات پر اس کا اختیار نہیں رہا تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ حالانکہ حالات تو آدمی خود پیدا کرتا ہے۔ وہ خود حالات کے سانچے میں ڈھل جائے تو حالات سے لڑنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی ورنہ تقدیر سے شکوہ رہتا ہے۔ اس کی دوا بھی یہی ہے کہ خود پر اور خدا پر بھروسہ کرو۔ پیچھے مت دیکھو۔ آگے نظر رکھو اور پچھتانے میں وقت ضائع کرنے کے بجائے وہ کرو جو تم کرنا چاہتے تھے لیکن نہ کرسکے۔"
وہ خاموش کھڑا رہا جیسے میری بات کو سمجھنے اور ذہن میں بٹھانے کی کوشش کررہا ہو۔ "عجیب لگتی ہیں آپ کی باتیں مگر غلط نہیں۔"
میں نے کہا "بعد میں سوچنا غور کرنا اور سمجھنے کی کوشش کرنا اپنے آپ کو...... اور کوئی فیصلہ کرلو تو میرے پاس آجانا۔"
"فیصلہ! کیسا فیصلہ جی؟"
"یہی کہ تم کون ہو۔ طافو یا من موجی" میں نے کہا۔
"اچھا جی۔ چلیں آپ کو چھوڑ آؤں۔"
"کہاں؟ میں چلا جاؤں گا من موجی۔" میں نے عمداً اس کو طافو نہیں کہا۔
"آپ غلط راستے پر جارہے ہو جی۔ ادھر سے آگے کسی ہے۔ رسائی نالا ہے" وہ بولا "اندھیرے میں جنگل کے راستے میں آنکھوں پر پٹی باندھ کے بھی دیکھ سکتا ہوں۔"
وہ اچھل کے گھوڑے پر بیٹھ گیا اور پھر اس نے ہاتھ بڑھا کے مجھے بھی کھینچ لیا۔ میں اس کے پیچھے جم کے بیٹھ گیا۔
"یہاں کہیں قریب سے لاہور جانے والی سڑک گزرتی ہوگی' شاید کوئی بس مل جائے ملتان کی طرف سے آنے والی۔"
"آپ فکر ہی مت کرو جی۔ آپ کو لاری اڈے پہنچاتا ہوں" اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی "ہو سکتا ہے اُدھر سے کوئی ٹیکسی بھی مل جائے۔"
گھوڑا اب خاصی رفتار سے دوڑ رہا تھا۔ 'شاید جانور بھی انسان کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہیں' میں نے سوچا' یہی گھوڑا مجھے شرافت سے سیدھے راستے پر نہیں لے جارہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اسے بھی راستہ سجھائی نہیں دے رہا' اب کیسے نظر آرہا ہے راستہ؟'
تھکن کے جسمانی احساس کو میں نے ابھی تک دبا رکھا تھا۔ گھوڑے کی سواری میں نے عرصہ دراز سے نہیں لی تھی۔ اس وقت یہ سفر میری قوت برداشت کی آزمائش بن گیا۔ رات کے ساتھ ہی جنگل میں خنکی بھی بڑھ گئی تھی اور ٹھنڈی ہوا میرے چہرے کو سُن کرنے لگی تھی۔ جھٹکوں سے میرے جسم کا جوڑ جوڑ ہل گیا۔ بھوک کا مجھے پہلے خیال نہ تھا' اب لاری اڈے کا تصور کرتے ہی میرے ذہن میں بہت کچھ آیا۔ چٹپٹے کھانے جن کی پوری فہرست ہر ویٹر ایک سانس میں پڑھ دیتا ہے۔ کسی کے پلے کچھ پڑے نہ پڑے۔ تندور سے نکلنے والی گرما گرم روٹی کی سوندھی مہک۔ ابلتی چائے کی خوشبو۔
ایک گھنٹے بعد مجھے طافو نے ایک روڈ سائڈ ریسٹورنٹ کے سامنے اتارا جہاں ملتان کی طرف سے آنے والی چند بسیں پہلے سے موجود تھیں اور ان کے مسافر رات کا کھانا کھارہے تھے۔ یہ ہر بس کے ڈرائیور یعنی استادِ محترم کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ مسافروں کو کس قیمت پر کہاں لنچ یا ڈنر تناول فرمانے پر مجبور کردیں۔ ہوٹل والے اس تعاون کے بدلے انہیں اور کلینر صاحب کو سب کچھ بلا معاوضہ پیش کرتے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ ان کے اخراجات سارا دن آنے والے مسافر ادا کرتے ہیں۔
اگر طافو اس وقت مجھے نہ اتارتا تو شاید میں خود ہی گر پڑتا' میری ٹانگوں میں دم نہیں رہا تھا اور میری کمر کے سارے مُہرے ہل گئے تھے۔ میں نے گھوڑے کو دیکھا تو وہ بھی خاصا برہم تھا کہ ریس کے عالی نسب گھوڑے کو ایک ڈاکو نے خچر سمجھ کے استعمال کیا اور ٹریک کے بجائے جنگل میں بندہ لاد کے دوڑایا۔
میں نے کہا "شکریہ من موجی صاحب۔ ایک عنایت اور کرو" میں نے ایک چارپائی پر گر کے کہا "مجھے کچھ پیسے دے جاؤ۔"
اس نے گھیر والی شلوار کے اندر سے ایک تھیلی برآمد کی "آپ نے میرا ایک کام کرنا ہے جی۔"
میں نے کہا "یہ کیا ہے؟"
"یہ آپ گل بانو کو دے دینا" اس نے کہا اور گھوڑے پر چڑھ گیا۔
میں نے تھیلی پکڑلی تھی "بات تو سنو۔"
"اللہ بیلی" اس نے ہاتھ ہلا کے گھوڑے کو موڑا اور سرپٹ بھگاتا ہوا اسی راستے پر غائب ہوگیا جدھر سے ہم آئے تھے۔
مجھے اندازہ تو ہوگیا تھا کہ تھیلی میں کیا ہو سکتا ہے مگر میں نے تصدیق کے لیے اس کو کھولا۔ اس میں وہی چار لاکھ کی رقم تھی جو

طافو کا حصہ بنتی تھی اور جو اس نے گل سے قرض خواہ کی طرح طلب کی تھی۔ بعد میں اس کی سوچ میں کیا انقلاب آیا اور کیوں آیا' کیسے ایک ڈاکو کے جذبات کا رخ بدلا اور احساسِ ندامت نے اسے کیسے ملامت کی۔ کیا اس کو عمرِ رفتہ کے رائگاں جانے کے احساس نے پشیمانی میں مبتلا کیا اور کیسے وہ میرا راستہ روک کے اس کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوا۔ یہ کوئی بھی سمجھ سکتا ہے جو وارداتِ قلبی کا شعور اور ادراک رکھتا ہو۔ یہ کوئی انہونی بات نہیں تھی۔ ہزاروں بے راہرو اور صراطِ مستقیم سے بھٹکے لوگ زندگی کے کسی اچانک آجانے والے موڑ پر اس انقلاب آفریں لمحے سے دوچار ہوئے اور اگلے لمحے میں ان کی زندگی کا رخ بدل گیا۔ وہ اپنے ماضی سے یوں کٹ گئے جیسے وہ کسی اور کی زندگی تھی اور جب خدا نے یہ توفیق دی تو پھر ان کا راہبر و رہنما ان کا ضمیر ہوا اور ان کی منزل حضوری ٹھہری۔

کچھ لوگ مجھے حیرت اور دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ ایک پُراسرار شہسوار مجھے وہاں چھوڑ کے لوٹ گیا تھا اور میں یوں ہکا بکا بیٹھا تھا جیسے مریخ سے آنے والی اُڑن طشتری مجھے ابھی ابھی زمین پر اتار کے کائنات کی بیکراں وسعت میں گم ہوگئی ہے اور میں اس دنیا میں تنہا اور اجنبی مخلوق ہوں۔

اس نے مجھے موقع ہی نہیں دیا تھا کہ میں چار لاکھ روپے اسے واپس کرسکتا۔ شاید اسے بھی اندازہ تھا کہ میں بحث کروں گا اور اسے قائل کرنے کی کوشش کروں گا کہ یہ رقم اب اسی کی ہے اور اسے رکھنی چاہیے۔ یہ رقم میری بھی نہیں تھی اور گل کی بھی نہیں تھی۔ یہ اکبر خان کا پیسہ تھا جو گھوم پھر کے میرے پاس پہنچ گیا تھا۔

ایک ویٹر جن کی طرح نمودار ہوا "بولو جناب!"

میں نے کہا "میں کیا بولوں۔ کچھ تم ہی بولو۔"

"کیا کھاؤ گے؟" وہ بڑی عجلت میں تھا۔

میں نے کہا "جی تو چاہتا ہے سارا ہوٹل کھا جاؤں۔ جو تمہیں اچھا لگے لے آؤ مگر میرے فاقے سے ہلاک ہونے سے پہلے آجانا۔"

اس نے مجھے مشتبہ نظروں سے دیکھا۔ حُلیے سے وہ شاہِ جنات کا ٹھکرایا ہوا کزن ہی لگتا تھا۔ مجھ سے مغزماری کو فضول سمجھتے ہوئے وہ سر ہلا کے لوٹ گیا اور کچھ دیر بعد اشتہا انگیز لوازمات کے ساتھ اس جن کی طرح پھر نمودار ہوا جس کو الٰہ دین نے چراغ رگڑ کے طلب کیا تھا اور پہلی فرمائش یہ کی تھی کہ میرے لیے اور والدہ کے لیے مزے مزے کے کھانے لاؤ۔

ابھی میں کھانے سے پورا انصاف بھی نہیں کرپایا تھا کہ ایک ٹیکسی چند مسافروں کو اتارنے آگئی۔ اس سے پہلے کہ ٹیکسی پر کوئی اور قابض ہوتا یا وہ خالی لوٹ جاتی میں نے اسے آواز دے کر روک لیا۔ سو کا ایک نوٹ پلنگ پر پھینک کے میں ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ جب ٹیکسی روانہ ہوئی تو شاہِ جنات کا ٹھکرایا ہوا کزن مشکوک نظروں سے سو کے نوٹ کا معائنہ کررہا تھا۔ کسی جعلی نوٹ کی شنا... ماہر کی حیثیت سے۔ پانچ سات روپے کے بل پر سو کا نوٹ... والوں کی صورت اور حلیہ کیا میرے جیسا ہوتا ہے؟

اچانک میں نے خود کو بہت محفوظ اور پُرسکون محسوس... بالآخر میں بھی اس دلدل سے نکل آیا تھا جس میں... باعث محسن اور گل نے قدم رکھ دیا تھا۔ کلیم کو اس... تک پہنچانے کی ذمے داری ایک کٹھن آزمائش تھی اور... شکرگزار تھا کہ اس نے مجھے اس امتحان میں سُرخ... رابعہ کی وفا اور غالب کے ساتھ رابعہ کی رفاقت پر ناز... خلوص اور اعتماد کے ہر امتحان میں میرے ساتھ میرا... میری طاقت بن کے رہے۔ بالکل اسی طرح جیسے منظر... یوسف جیسے دوست جو بظاہر ہمارے ساتھ نہ تھے لیکن ان کا... ہر وقت ہمیں میسر تھا۔

قدرت اپنی جلوہ نمائی کے کتنے حیران کن انداز رکھتی... ایک امانت سے سبکدوش ہونے کی نیت نہ کرتے تو پشاور... والد کے ایک پرانے نمک خوار' نمک حرام سے کیسے... اپنے ضمیر پر احساسِ جرم و گناہ کا بارِ ملامت لیے پھر رہا... متلاشی تھا کسی موقعے کا جب وہ اپنی تقصیر پر خدا کے بعد... سے معافی مانگ لے جس کی نیکی کا بدلہ اس نے پیٹھ میں خنجر... کے دیا تھا۔ اعتقاد نہ رکھنے والے اسے اتفاق کہہ کے... کرسکتے ہیں مگر قدرت کے نظامِ انصاف کے توازن کی سچائی... کی بے آواز لاٹھی کے وجود سے انکار ناممکن ہے۔ مکافات... دستور اس کائنات میں ہر جگہ کارفرما ہے اور اسیر زمان و... لیے اس سے نہ یہاں مفر ہے نہ وہاں۔ قدرت خانم معصوم... تھی اور دیکھنے والے اس پر ترس کھاتے تھے لیکن ان میں... سمجھ سکتا تھا کہ وہ کس کے اعمال کی سزا بھگت رہی ہے اور... سزا پانے والا مجرم کون ہے۔ خدا نے مجھے بھی توفیق دی کہ... ودرگزر اور عدل و احسان کے ساتھ اپنے والد کا ایک قرض... کرسکوں اور ثابت کردوں کہ میں اسی سمندر کی ایک لہر... باراں کی ایک پھوار اور اسی خاک کا ایک ذرّہ ہوں۔... باپ کا بیٹا' اسی کی طرح بے ریا' کینے سے پاک دل رکھنے... عمل کی نیکی پر یقین رکھنے والا۔

سفر وسیلۂ ظفر۔ اس پرانی کہاوت کی صداقت لوٹ کر... تک ثابت ہوگئی تھی۔ زندگی تو ایک مسلسل معرکۂ سود و زیاں... لیکن وقت کا ہر لمحہ اپنے دامن میں ایک تجربہ رکھتا ہے... تجربات کا حاصل وہ عمر ہے جسے کچھ لوگ ماہ و سال کے حساب... شمار کرتے ہیں۔ علامہ اقبال نے کہا تھا۔ تو اسے پیمانۂ امروز... سے نہ ناپ' اور غالب نے کہا تھا کہ۔ گردشِ رنگِ چمن... وسال عندلیب۔ کچھ لوگ سو سال جی کے بھی کچھ نہیں... ذہنی طور پر عقل اور تجربے کی اس منزل تک نہیں پہنچ... جیسے بعض وقت کی چوتھائی مسافت طے کرکے یا کوئی صاحب... نصف عمر گزار کے پہنچ جاتا ہے۔

اس سفر میں سندباد لوٹا تو اس کے پاس نئے افسانے تھے اور عجائبات کے قصے تھے۔ اس نے دیکھا تھا کہ مہذب و متمدن دنیا کے پہاڑوں کی سنگلاخ وسعتوں میں' قبائلی علاقے کے غیرت اور باحمیت لوگ آج بھی اجداد کی روایات کے امین ہیں۔ سندباد نے دوستوں کے ساتھ دشمنوں کے ان گنت چہرے دیکھے تھے جو شیطان کی طرح شکلیں بدل بدل کے سامنے آتے تھے۔ کبھی اشارہ پذیر دوست بن کے نمودار ہوتا تھا اور اپنی مظلومیت کا ڈھنگ رچاتا تھا... پھر اکبر خان طاقت اور فرعونیت کے بھرپور اظہار کے ساتھ دوستی کی نقاب ڈال کے سامنے آتا تھا۔ خلیفہ کیگر جیسے مکر و فریب کے بندے' خدا کے سادہ دل بندوں کے پیر و مرشد اور نجات دہندہ دکھائی دیتے تھے۔ اس سے بہتر طافو جیسے ڈاکو تھے جو اپنے مکروہ عزائم پر نیکی اور روحانیت کی نقاب نہیں ڈالتے تھے۔

میں نے اس سفر میں وہ ڈاکو بھی دیکھے تھے جو منافقت سے کام لیے بغیر شرمندگی کے ساتھ خود کو ڈاکو تسلیم کرتے تھے اور وہ ڈاکو بھی جو کسی شرم کے بغیر اپنے معزز ہونے پر نازاں تھے۔ حالات واقعات کے اس گورکھ دھندے میں ابھی تک اصل کہانی وہی تھی۔ پسِ پردہ وہی چہرے تھے اور وہی ان کے عزائم۔ جیسے بچوں کی ذہانت آزمانے کے لیے ایک ہی تصویر کو کبھی رنگوں میں گم کردیا جائے' کبھی لکیروں میں اور کبھی نقطوں میں' اور گہری قوتِ مشاہدہ رکھنے والا اسے پھر بھی شناخت کرلے۔ سارے رنگوں' ساری لکیروں اور سارے نقطوں کے درمیان لیکن سب سے الگ۔

زندگی کے ساتھ آزمائش کے مرحلے تھے اور زندگی کا ساتھ ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ نیا جال لانے والے پرانے شکاری بھی تھے اور ہم بھی جو اس شکارگاہ میں بیک وقت شکار بھی تھے اور شکاری بھی۔ آج بھی چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کے لیے ایم آر ایس کا وجود ختم نہیں ہوا تھا۔ یہ چیلنج اسے بار بار نئے سرے سے جارحیت پر اکساتا تھا پھر موافقت پر مجبور کردیتا تھا۔ اس چیلنج سے نمٹے بغیر اس کے لیے کامیابی کا تصور ادھورا تھا۔ وہ ناکامی اور ہزیمت کے خوف سے دامن نہیں چھڑا سکتا تھا اور اس کے لیے مقاصد کا حصول سراب تک رسائی سے زیادہ اعصاب شکن ہوگیا تھا۔ اس کے ساتھ اب ڈی سوزا نہیں تھا یا ایس ایس پی سراج نہیں تھا تو ہمارے ساتھ استاد ٹیڈی نہیں تھا اور شہلا نہیں تھی۔

چوہدری دلاور نے جو سب سے خطرناک مہرہ آگے بڑھایا تھا وہ اکبر خان تھا جو ڈبل گیم کھیل رہا تھا۔ ڈبل گیم کھیلنے کی کوشش تو استاد پیڈرو نے بھی کی تھی مگر وہ اپنے ماضی پر پردہ ڈالنے میں ناکام تھا اور وہ سونے کا بن کے بھی آجاتا تو ہم اس کو پیتل کے بھاؤ قبول نہ کرسکتے تھے۔ اکبر خان کا معاملہ مختلف تھا۔ اس کی شخصیت ابھی تک پُراسرار تھی اور اس نے خود کو ناقابلِ فہم بنا رکھا تھا۔

ٹیکسی میں بیٹھ کے میں اپنے خیالات میں ایسا محو ہوا کہ میرے لیے وقت رک گیا۔ میں بھول گیا کہ ٹیکسی کے چاروں پہیے تیزی سے گھوم رہے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے زمین کا سورج کے گرد طواف جاری ہے۔ میرے ساکت وجود کے نیچے سے سڑک اسی طرح نکلتی جارہی ہے جیسے مسلسل رواں وقت کے تیزی سے گزرتے ہوئے لمحے میرے احساس کی گرفت میں آئے بغیر نکل رہے ہوں۔

اچانک میں نے خود کو لاہور میں پایا۔ وہی اپنائیت کے احساس کی خوشبو سے معمور فضا تھی جس نے مجھے جھنجوڑ کے ہوشیار کیا۔ میرے شہر کے گلی کوچے آباد تھے۔ روشنیاں مسکراہی تھیں اور نیون سائن جل بُجھ کے مجھے خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ ہر گزرنے والے سائن بورڈ کی عبارت پکارتی تھی۔ جی آیاں نوں۔ بخیر راغلے۔ الفاظ تو محض جذبات کی علامت ہیں۔ ایک دم میری ساری تھکن اور پژمُردگی کی دھند غائب ہوگئی اور میری خوشی ایک بھرپور دن کے اُجالے کی طرح غالب آگئی۔

میں نے کہا "کہاں چلے جارہے ہو بادشاہو۔ پوچھ تو لو کہ مجھے کہاں جانا ہے؟"

"کیا آپ سوگئے تھے جی؟"

میں نے کہا "اگر کوئی سوجائے تب بھی تمہیں دیکھ لینا چاہیے کہ کہیں وہ مر تو نہیں گیا۔"

"اللہ معاف کرے" اس نے بے اختیار کہا "میں تو چلتا جارہا تھا کہ جہاں آپ کہو گے گاڑی موڑ لوں گا۔ جہاں بولو گے' رک جاوں گا۔"

میں نے کہا "اس نہر کے مال والے موڑ سے صدر کی طرف جانا ہے۔ بازار سے سیدھا راستہ پکڑلو۔ راستوں سے تو واقف ہونا؟"

وہ ہنسا "ہوجی' ہم تو اِدھر ہی پیدا ہوئے' اُدھر ہی مریں گے۔"

میں نے کہا "اچھا؟ کیا حال ہے لہور کا؟"

اس نے مجھے پلٹ کے دیکھا "لہور لہور ہے جی۔ آپ کہیں باہر سے آئے ہو؟"

میں نے کہا "پتا نہیں میں اندر تھا کہ باہر۔ آدمی اندر ہو تب بھی باہر کا کیا پتا چلتا ہے اور باہر ہو...."

اس نے مجھے یوں دیکھا جیسے فیصلہ کرنا چاہتا ہو کہ میں جیل سے چھوٹا ہوں یا پیچھے بیٹھ کے پیتا رہا ہوں "کس کے گھر جانا ہے جی؟"

میں نے ہنس کے کہا "کیا تم مجھے عبدالودود منظر کے گھر پہنچا دوگے؟ اگر میں صرف نام بتادوں۔ بہت بڑا وکیل ہے ہائی کورٹ کا۔ بہت موٹا ہے اور بہت حرامی ہے۔ پندرہ بچے ہیں سالے کے۔ باز نہیں آتا۔"

ٹیکسی ڈرائیور کا شبہ قوی تر ہوگیا کہ میں نشے میں ہوں "آپ گھر کا راستہ تو پہچانتے ہو نا جی؟" اس نے کچھ گھبرا کے کہا۔

میں نے کہا "فکر مت کرو، میں نشے میں نہیں ہوں۔ میں بھی اسی زندہ دل شہر کا پروردہ ہوں۔ بہت دن بعد لوٹا ہوں تو کچھ ترنگ میں ہوں۔"

"کہاں گئے ہوئے تھے جی؟"

میں نے کہا "یہ ایک بہت لمبی کہانی ہے۔ کیا کرو گے سن کر۔ تمہیں تو ہر روز ہی ملتی ہوں گی ایسی کہانیاں۔ ہر آدمی مسافر ہے اور ایک کہانی ہے لواب گاڑی کو موڑ لو دائیں طرف اور سیدھے ہاتھ پر تیسرے کھمبے کے سامنے روک لو۔"

میں نے ڈرائیور کو سو کا ایک نوٹ پیش کیا "کھمبے کی روشنی میں پرکھ لو، یہ جعلی نہیں ہے۔ اور یہ لو دوسرا، یہ بھی اصلی ہے۔"

اس نے سرہلایا اور نوٹ جیب میں رکھ کے باقی رقم واپس کرنے لگا لیکن میں اتنی دیر میں گیٹ پر پہنچ چکا تھا۔ ڈرائیور کو جب یقین آگیا کہ میں واقعی نوّے روپے واپس لینے کے موڈ میں نہیں ہوں تو اس نے ہاتھ ہلایا اور گاڑی کو یوٹرن کاٹ کے واپس لے گیا۔ مالِ مفت دلِ بے رحم۔ اکبر خان کی دولت سے میں تھوڑی سی خوشی ایک ویٹر کو دے چکا تھا جو شاہ جنات کا کزن تھا اور اب اس ڈرائیور کو ٹپ دیتے ہوئے بھی میں نے نو دو گیارہ ہونے کی طرح حاتم طائی کی قبر پر لات ماری تھی لیکن میں خوش تھا اور دوسروں کو خوش دیکھ کے مزید خوش ہونا چاہتا تھا۔

میں کال بیل کو انگلی سے دبا کے کھڑا ہو گیا تھا۔ گھنٹی کچھ دیر بجتی رہی پھر خاموش ہو گئی۔ غالباً گھنٹی کا کوائل جل گیا تھا۔ اس قسم کی گھنٹی کے بٹن کو ایک بار دبا کے نہ چھوڑا جائے تو یہی ہوتا ہے مگر جو یہ بات یا تمیز نہیں جانتے وہ ایسا ہی کرتے ہیں۔ میری بدتمیزی کا مقصد عبدالودود منظر سے گالیاں سننا تھا۔

وہ اندر سے چلاتا ہوا برآمد ہوا۔ "او یار کون آیا ہے بھائی۔ قیامت آئی ہے ساتھ کیا؟! انگلی پھنس گئی ہے بٹن میں؟"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور جب منظر نے گیٹ کھولا تو میں چیخ مار کے اس سے لپٹ گیا "اوئے گیدڑ سنگھا۔ کی حال ہے تیرا کھوتے دے پتر۔"

منظر کمبل میں لپٹا ہوا تھا، پہلے تو جواب میں اس نے بھی کہا "اوئے..... اوئے ہٹ۔ کون ہے بھوت کے بچے۔ ابے جان چھوڑ میری۔"

پھر اس نے میری آواز پہچان لی اور اس نے کمبل پھینک کے مجھے مکا مارنے کی کوشش کی "گیدڑ سنگھ کی اولاد۔"

میں اندر بھاگا "ارے بچو! مجھے بچاؤ، تمہارا باپ پاگل ہو گیا۔ قتل کرنا چاہتا ہے تمہارے چاچا کو۔"

اندر سے منظر کی بیوی پریشان ہو کے نکلی۔ اس کے چار چھ بچے ماں کے پیچھے نمودار ہوئے۔ اس وقت منظر کمبل اٹھا رہا تھا۔

میں نے کہا "بھابی جی سلام۔"

اس نے مسکرا کر کہا "حد کرتے ہیں آپ بھی سکندر بھائی۔ مجھے دہلا دیا۔ ایمان سے دل ایسے دھڑک رہا ہے۔"

میں نے کہا "ارے بھابی جان! ابھی تک آپ کا دل ... ہے۔ اس ریچھ کے ساتھ رہ کے بھی؟"

منظر نے کہا "اندر چل بھوتنی کے۔ میری بیوی کو میرے خلاف مت کر۔"

میں نے اندر جا کر ادھر اُدھر دیکھا "بھابی، وہ کہاں ہے؟"

منظر کی بیوی نے تعجب سے کہا "کون بھیا؟"

"پندرھواں۔ جو سولہویں سے پہلے آیا ہے اور چودہویں کے بعد۔ قسم خدا کی، مجھے تو بڑی خوشی ہوئی کہ کسی نے تو ہمت کی، فیملی پلاننگ والوں کی ایسی تیسی کرنے کی۔ اللہ اور برکت دے، اللہ کرے زورِ شباب اور زیادہ۔"

منظر کی بیوی کا چہرہ سرخ ہو گیا "اتنے دن بعد آئے ہیں ... آتے ہی..."

منظر نے کہا "تم جاؤ۔ اس کی اوجھڑی خالی ہے نا اس لیے اول فول بک رہا ہے۔ میں کرتا ہوں اس کا دماغ درست۔"

اس کے سارے بچے ہکا بکا کھڑے مجھے دیکھ رہے تھے اور ہجوم میں دو فٹ سے چار فٹ تک کے ملے جلے بچے تھے، شاباش! قطار بناؤ۔ ہاتھ ملاؤ اپنے چاچا سے اور عیدی لیتے جاؤ۔ چلو بیٹا تم آؤ، یہ لو۔"

پہلے بچے نے سو کا نوٹ پکڑ کے خوشی سے چھلانگ ماری اور غائب ہو گیا۔ اس کے بعد ہڑبونگ مچ گئی۔ جب میدان صاف ہوا تو میں جوتوں سمیت چارپائی پر لیٹ گیا۔

منظر نے مجھے پُرملامت نظروں سے دیکھا "بچوں کو جعلی نوٹ دیے ہیں۔"

میں نے کہا "اگر بچوں کی ولدیت جعلی نہیں ہے تو نوٹ بھی اصلی ہیں۔"

"پھر کیا حرام کا مال ہے؟"

"مالِ غنیمت ہے جو حلال ہوتا ہے۔" میں نے کہا "کیا تو جانتا ہے کہ یہاں میں تجھے قتل کرنے آیا تھا۔ بچے سامنے آگئے تو میرے جذبات بدل گئے۔ ان کی یتیمی کے خیال سے ارادہ بدل دیا۔"

وہ ہنسنے لگا "ابے کیا ملے گا مجھے قتل کر کے۔ الٹا تیری بیوہ کے شوہر کو قتل کر۔ بیوہ سے شادی کا ثواب بھی لے اور میم۔"

میں نے کہا "قتل کی وجہ زیادہ اہم ہے۔ تو نے میری ہدایات پر حرف بہ حرف عمل کیوں نہیں کیا ناخلف؟ سولہ لاکھ میں نے ... سے منگوائے تھے، تو نے اپنے والدِ ثانی کو بھیج دیا۔"

اس نے کہا "یہ سب اس جورو کے غلام کا حرامی پن تھا، محض نام کا غالب ہے ورنہ ہے مغلوب۔ اس نے کہا کہ صاحب، رام رام جپنا، پرایا مال اپنا۔ اکبر خان کیا ڈاکو نہیں؟ ڈاکو کا مال ہی جائے ڈاکوؤں کے پاس تو اچھا ہے۔ بعد میں پریشان ہونے لگا کہ کہیں اکبر خان کوئی ہاتھ نہ کر جائے۔ اس کے سولہ لاکھ تو اسے کچھ نہیں ہو گا مگر ہمارے سکندرِ اعظم کی فوج کو شکست نہ ہو جائے اس پورس کے ہاتھی سے۔"

"اس کے بعد وہ خود آیا۔"

"اکیلا کہاں، وقار یوسف بھی تو ساتھ تھا۔"

میں نے کہا "اس کا ساتھ آنا حیرت کی بات تھی۔"

"وہ تو میں نے روک لیا اس بلائے بے درماں کو جسے نازو کہتے ہیں، وہ کمر بستہ تھی غالب کے ساتھ جانے پر۔ غالب نے مجھ سے کہا کہ یار وہاں میں صورتِ حال کو سنبھالوں گا کہ اس بھوت کی بیوی کا ایک تو معاملہ ہے ڈاکوؤں کا۔" منظر نے کہا "یہ اندر کرائے کی نانی جا کے۔ میں نے چائے میں خواب آور گولی ملا کے دے دی۔ وہ سو گئی تو غالب بھاگ گیا وقار یوسف کے ساتھ۔"

"غالب زندہ ہے یا واپس پہنچتے ہی مارا گیا نازو کے ہاتھوں؟"

منظر ہنسا۔ "نازو کو شک ہوتا تو وہ مجھے بھی معاف نہ کرتی مگر غالب نے تو آتے ہی اس کو بہت ڈانٹا ڈپٹا کہ کیا ضرورت تھی بعد میں بھی اٹھنے کی۔ میں تو سمجھا تھا ہمیشہ کی نیند سو گئیں۔ وہ بڑی پریشان اور شرمندہ تھی کہ آخر عین وقت پر اسے نیند کیسے آگئی۔ وہ اٹھ گئی تھی غالب کے جانے کے چند گھنٹے بعد۔"

"یہ نیند کی گولی دینے کا خیال کسے آیا تھا؟"

"سچی بات تو یہ ہے کہ آئیڈیا غالب کا تھا مگر عمل میں نے کیا" منظر قہقہہ مار کے ہنسا۔

میں نے کہا "میرا خیال تھا کہ سب یہاں ہوں گے۔"

"وہ گاڑی وقار یوسف کے گھر سے گئی تھی۔ سب لوگ سیدھے وہیں چلے گئے۔ میرے پاس فون آیا تھا کچھ دیر پہلے محسن کا۔ تیری طرف سے کچھ تشویش تھی۔ اس نے سب بتایا مجھے نے... میری اولاد سمجھی میں پاگل ہو گیا ہوں۔ اتنی ہنسی آئی مجھے۔ یار یہ آج کل کی اولاد اتنی جلدی باپ کو پاگل کیوں سمجھنے لگی ہے؟"

میں نے آہ بھر کے کہا "سب قُربِ قیامت کی نشانیاں ہیں۔ پہلے جوان بیٹے بوڑھے باپ کو پاگل سمجھتے تھے، اب وہ وقت آنے والا ہے منظر کہ پیدا ہوتے ہی تیرا اگلا بیٹا سوال کرے گا کہ پاگل خانے، کیا پہلے پندرہ کم تھے تجھے کہ مجھے پیدا کیا۔"

منظر کی بیوی اسی وقت کھانا لے کر آئی "بچے تو اللہ کی رحمت ہوتے ہیں بھیا۔ اب تم خود کو دیکھو۔ پھر رہے ہو شترِ بے مہار بنے۔ گھر بسا لیتے تو آج ماشاء اللہ سے تمہارے بھی ہوتے۔ بچے ہوں تو کا دل چاہتا ہے رونق چھوڑ کے باہر جانے کو اور جو صبح کے گئے شام کو لوٹتے ہیں تو بچے کیسے چمٹتے ہیں باپ سے..." اس کی زبان کی قینچی چل پڑی تھی۔

میں نے کہا "یورپ میں بچوں کی ماں چمٹتی ہے بھابی۔"

اس نے برا مان کے کہا "وہ تو ہوتی ہیں بے حیا۔"

میں نے کہا "چھوڑیں بھابی، یہ اپنی مشرقی بیویاں کیا خاک محبت کرتی ہیں، دور سے منمنا کے کہا سلاما لیکم جی اور پھر گھس گئیں کچن میں۔ سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم۔ میمیں ہوتی ہیں پیار کا بپھرا ہوا سمندر۔ ایسے موج کی طرح اٹھتی ہیں اور ساحل سے ٹکراتی ہیں۔ وہ کیا شعر ہے غالب کا۔ آ سینے نال لگ جا ٹھاہ کر کے۔"

منظر کی بیوی دم بخود رہ گئی۔ ایسی بے شرمی کی باتیں میں نے اس کے سامنے کبھی نہیں کی تھیں "تمہارا تو دماغ چل گیا ہے بھیا لندن میں رہ کے۔ یہ سب رابعہ کو پتا چلا تو..."

میں نے کہا "کون رابعہ؟ کیسی رابعہ؟ ہم تو واپس جا رہے ہیں لندن اور وہیں رہیں گے۔ روز بیاہ کریں گے میموں سے۔ یہ دیسی بیویاں ویسے ہی دماغ خراب کر دیتی ہیں، ان کا بس چلے تو سال میں چار بار بچے دیں۔"

وہ سخت خفا ہو کے رخصت ہو گئی تو میں نے کہا "یار، اس کے بغیر چارہ نہیں تھا۔ وہ بولتی رہتی تو ہم خاک بولتے۔ آخر تو اس کی زبان پر تالا ڈال کے کیوں نہیں رکھتا ہے؟"

منظر نے آہ بھری "کس کس چیز پر تالا ڈالے آدمی۔ خیر تو کھانا کھا اور یا تو سو جا یا دفع ہو جا۔"

"کھانا تو میں نے کھا لیا تھا۔ چائے کافی اب ملنے سے رہی، اس لیے چلتے ہیں وقار یوسف کی طرف۔"

"میں نہیں اس وقت کہیں جانے والا۔ تو گاڑی لے جا۔"

"گاڑی کے گھوڑے، مجھے راستہ معلوم ہوتا تو میں ٹیکسی میں سیدھا اُدھر نہ چلا جاتا۔ تیرے اس چڑیا گھر کے پندرھویں مہمان کو دیکھنے کیوں آتا۔ اس کی صورت کس سے ملتی ہے؟"

اس نے افسوس سے سرہلایا "وحید مراد سے۔ میری بیوی اس پر عاشق ہے۔"

"بیشتر بیویاں اس پر عاشق ہیں دوست۔ کیا ہو سکتا ہے صبر کے سوا" میں نے کہا "چل تو سو جا۔ مجھے راستہ سمجھا دے اور اپنی گاڑی دے دے۔"

"میں فون کر دوں انہیں؟"

"نہیں۔ تھوڑا سا سرپرائز ٹھیک رہے گا۔"

منظر نے کرولا مارک ون لے لی تھی جو بالکل نیا ماڈل تھا اور اسے چلا کے میں نے یوں محسوس کیا جیسے میں ہوائی جہاز میں پرواز کر رہا ہوں۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ منظر کی پریکٹس خوب چل رہی ہے ورنہ وہ ایسی قیمتی اور صبا رفتار گاڑی کہاں سے لیتا۔

رات کے وقت مال روڈ سنسان تھی۔ بیشتر دکانیں بند ہو رہی تھیں، کافی ہاؤس کھلا ہوا تھا لیکن وہاں اکیلے بیٹھ کے کافی پینے میں کوئی لطف نہ آتا چنانچہ میں گولی کی طرح زمزمہ تک سیدھا گیا اور پھر بائیں ہاتھ کو مڑ گیا۔ آگے سڑک زیادہ ویران تھی۔ میں ماڈل ٹاؤن تک رُکے بغیر چلتا گیا۔ پھر میں نے منظر کے بتائے ہوئے پتے کی نشانیوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے راستہ طے کیا اور پون گھنٹے بعد میں

وقار یوسف کے نئے گھر کے سامنے تھا۔ وہاں وہ گاڑی بھی موجود تھی جس میں محسن اور گل واپس پہنچے تھے۔ اب اس پر ایک سرکاری نمبر نظر آرہا تھا۔

خلافِ توقع اندر خاموشی تھی۔ میں نے گھنٹی بجائی تو اندر سے ایک ملازم برآمد ہوا۔

میں نے کہا "گھر کے لوگ کہاں ہیں؟"

اس نے مجھے غور سے دیکھا "آپ سکندر صاحب ہیں ناجی؟"

میں نے کہا "یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔"

"وہ لوگ اُدھر ہیں۔ نئی کوٹھی میں" اس نے کہا۔

میں نے کہا "یہ کوٹھی بھی نئی ہے۔"

"گلبرگ والی کوٹھی سر" ملازم نے کہا۔

"مگر مجھے ابھی ابھی وکیل صاحب نے بتایا ہے یہ پتا کہ وقار صاحب اور ان کے مہمان یہاں ہوں گے۔" میں نے برہمی سے کہا۔

"یہیں تھے جناب، ابھی تھوڑی دیر پہلے گئے ہیں۔ کہہ گئے تھے کہ آپ وہاں آجائیں" نوکر ڈر گیا۔

"یہ پتا میں نے بڑی مشکل سے تلاش کیا تھا۔ جانے سے پہلے منظر کو بتا جاتے تو میں سیدھا ادھر جاتا۔ خیر، تم بتاؤ یہ گلبرگ والی کوٹھی کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

نوکر نے کہا "ایک منٹ جناب" اور اندر چلا گیا۔ وہ ایک منٹ سے بھی پہلے لوٹا تو اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا جس پر پتا بھی تھا اور نقشہ بھی۔ میں نے اسے جیب میں رکھ کے گاڑی پھر اسٹارٹ کی۔

"تمہیں معلوم ہے، آخر ان کے ایک دم انتقال کی وجہ کیا تھی؟"

"ہیں جی!" نوکر بھونچکا رہ گیا۔

میں نے کہا "میرا مطلب تھا اچانک کیوں چلے گئے وہ؟"

"نہیں جی.... وہ کسی کا فون آیا تھا... اس کے بعد پروگرام بن گیا۔"

میں نے اس کی بات پر غور کیا اور سرہلا کے چل پڑا۔ اسے نقل مکانی بربنائے ضرورت نہیں سمجھا جاسکتا تھا۔ ایک نئی کوٹھی سے دوسری کوٹھی میں جانا کوئی شوقیہ حماقت بھی نہیں ہوسکتی تھی۔ یہ غالباً فرار تھا اور شاید فون پر کسی نے کوئی ایسی بات کہی تھی کہ انہیں یہاں سے نکل جانے میں عافیت نظر آئی۔ خیر، قبل از وقت مفروضات قائم کرنے سے کیا فائدہ۔

میں نے گاڑی کو موڑا ہی تھا کہ اندھیرے میں سے تین افراد سرتاپا کفن جیسا سفید لباس پہنے سڑک پر آگئے۔ ان میں سے ایک سڑک کے وسط میں تھا، باقی دو کناروں پر ایک موٹا رسہ پکڑے کھڑے تھے۔ اس رسّے کو انہوں نے بڑی پھرتی سے دو کھمبوں پر لپیٹ دیا، ایک کھمبا ٹیلی فون کا تھا اور دوسرا اس کے مقابل بجلی کا۔

ہیڈ لائٹس میں مجھے اندازہ ہوا کہ انہوں نے بیچ بیچ سر پر کفن باندھ رکھا تھا۔ درمیان والے کے ہاتھ میں کلہاڑی تھی جس کا پھل چمک رہا تھا۔ باقی دو سریے اٹھا چکے تھے جو پہلے شاید زمین پر پڑے ہوئے تھے۔

وہ میری چھٹی حس تھی یا قدرت کی طرف سے عطا کردہ دفاع کرنے کی صلاحیت کا غیر معمولی کرشمہ کہ میرے ذہن میں یہ خیال وحی کی طرح نازل ہوا۔ یوں شوقِ شہادت میں سر پر کفن باندھ کے مرنے مارنے والے صرف کیکر ہی ہوسکتے تھے۔ جنون ہی انسان کی جدوجہد کو اس مقام تک لے آتا ہے جہاں عقل تو محوِ تماشائے لبِ بام رہ جاتی ہے اور عشق بے خطر آتشِ نمرود میں کود پڑتا ہے۔ وہ کیکر تھے اور کیکر شاہ کی خدمت بے برکات میں اپنی روحانی عقیدت کا اظہار اپنی جان دے کر اور میری جان لے کر کرنا چاہتے تھے۔ کیونکہ میں کیکر شاہ کی بے حُرمتی کا مُرتکب ہوا تھا اور واجب القتل تھا۔

ایسے اندھے جذبات رکھنے والے اول تو ذہنی طور پر ہی کمزور ہوتے ہیں پھر کیکر شاہ جیسے عیاروں کی شعبدہ بازی اور ساحری ان کی عقل پر ایسا پردہ ڈالتی ہے کہ وہ خود کچھ نہیں سوچتے۔ وہ ہپناٹائز ہوجانے والے کی طرح ایک معمول بن جاتے ہیں اور نتائج کی پروا کیے بغیر عامل کے احکامات بجالانے کو ہی ایمان جان لیتے ہیں۔

شاید انہیں علم تھا کہ میری سواری آنے والی ہے اور ماڈل ٹاؤن سے ڈائریکٹ عدم آباد پہنچانے کے لیے ان کی تیاری مکمل تھی۔ میں ایک کوشش کرسکتا تھا کہ رفتار بڑھا کے اس رسّے کو توڑتا ہوا نکل جاؤں مگر عین سڑک کے درمیان ایک کفن پوش کلہاڑی لیے حملے کا پوز بنائے کھڑا تھا۔ اسے گرانا بھی ضروری تھا لیکن آثار بتاتے تھے کہ وہ گاڑی پر چھلانگ مارے گا اور بونٹ کے اوپر آکے کلہاڑی سے وار کرے گا۔

کسی تیز رفتار گاڑی پر یوں مخالف سمت سے دوڑ کر چڑھنے والے کا ونڈ اسکرین سے ٹکرا کے سلامت رہنا اتفاق کی بات تھی۔ اس کی ہڈیاں بھی ٹوٹ سکتی تھیں اور ونڈ اسکرین بھی ٹوٹ سکتا تھا۔ وہ بچ جاتا تو اس کی کلہاڑی کی ضرب براہِ راست مجھ پر پڑتی اور مجھے بیک وقت تین خطرات کا سامنا ہوتا۔ میں ونڈ اسکرین کے شیشے کے ذرّات سے زخمی یا اندھا ہوجاتا، کار بے قابو ہوجاتی یا کلہاڑی کا پھل میرے سر گردن یا جسم سے گزر جاتا۔

انسانی ذہن عام حالات میں بھی کمپیوٹر کی طرح فیصلے کرنے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتا ہے۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ مصروف شاہراہ پر ڈرائیونگ میں آدمی ایک منٹ میں چھوٹے بڑے دو سو فیصلے کرتا ہے۔ ہنگامی صورت میں یہ صلاحیت کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔

وہ ایک سیکنڈ کی مہلت تھی جس میں سارے خطرات کو دیکھ کے میں نے ایک لائحۂ عمل مُرتّب کیا اور جان بچانے کے لیے

میں نے سینٹر فارورڈ کو ڈاج دیا اور ایک دم گاڑی بائیں جانب موڑ دیا۔ دائیں طرف بجلی کا کھمبا سڑک سے کچھ دور تھا، ٹیلی فون کا کھمبا نسبتاً قریب تھا اور میں نے رسّی کو چھوٹے طرف سے راستہ بناتے ہوئے ایک کیکر پر چڑھائی کی۔ بیچ والا یعنی سینٹر فارورڈ کلہاڑی بلند کیے "جئے کیکر" کا نعرہ لگا چکا تھا۔ میرے ڈاج کرنے کے بعد جب اس نے جست لگائی تو وہ ہوا میں بلند ہوا اور بونٹ پر لینڈ کرنے کے بجائے دائیں طرف سڑک پر گرا۔ بائیں طرف والے کیکر کے ہاتھ میں بھی سریا تھا مگر پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق رائٹ آؤٹ اور لیفٹ آؤٹ کو بعد میں حملہ کرنا تھا۔

اس وقت مجھے اپنی جان بچانے کی اتنی فکر نہیں تھی جتنی منظر کی بالکل نئی گاڑی کا خانہ خراب ہونے سے بچانے کی حالانکہ جان کے مقابلے میں اس نقصان کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ انشورنس کمپنی گاڑی کا نقصان پورا کردیتی۔ میری تو انشورنس بھی نہیں تھی مگر میرے دل میں ایک خیال تھا کہ میں نے عقل سے کام لیا اور پُرسکون رہا تو یہ تین کیکر میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ بندوق کی گولی کا مقابلہ میں یقیناً نہیں کرسکتا تھا مگر یہ دست بدست لڑائی تھی اور کیکروں کے ہتھیار بھی وہ تھے جو شاید زمانۂ قبلِ مسیح میں بطور آلاتِ حرب استعمال ہوتے ہوں گے۔

گاڑی کا رخ بدلا تو لیفٹ آؤٹ بدحواس ہو کے بھاگا۔ ان کے ذہن میں مقابلے کا ایک ہی نقشہ تھا کہ میں رسّے کی وجہ سے رکنے پر مجبور ہوجاؤں گا، مرکزی رہنما ہائی جمپ لگا کے بونٹ پر کودیں گے اور شیشے کی دیوار پر ایسا وار کریں گے کہ میں خاک و خون میں لوٹتا نظر آؤں گا۔ نقشہ یوں بدلا کہ پہلے تو سپہ سالار سڑک پر بھد سے منہ کے بل گرے اور گاڑی نے تیزی سے دوڑتے ہوئے چیتے کی طرح ایک دم سمت بدل لی۔

میں نے پاؤں کا سارا زور ڈال کے بریک لگائے تو گاڑی کچے راستے پر گھوم گئی۔ گاڑی کے ٹھہرنے سے پہلے میں نے دروازہ کھول لیا تھا۔ میں نے باہر چھلانگ لگائی تو لیفٹ آؤٹ سریا لے کر مجھ پر حملہ آور ہوا۔ میں نے اسے وار کرنے کی مہلت دی اور آخری لمحے میں جھوک دے کر اس کے پیٹ میں گھس گیا۔ رائٹ آؤٹ "جئے کیکر" کا نعرہ لگاتا اس کے پیچھے چلا آرہا تھا۔ اس نے جو کلہاڑی میرے سر پر مارنے کے لیے اٹھائی تھی وہ پہلے حملہ آور کی گردن پر لگی۔ ظاہر ہے اس سے وہ شہید ہوئے۔

پہلے حملے کی ناکامی سے زیادہ سینٹر فارورڈ کو سڑک پر سجدہ ریز ہونے کا صدمہ تھا۔ جوش میں اس نے چھلانگ بھی اونچی لگائی تھی۔ وہ بونٹ پر گرتا تو بات کیا کچھ ہوتی۔ مزید تین فٹ نیچے پختہ سڑک پر گرنے سے اس کے گوڈے گِٹے متاثر ہوئے اور غالباً کلہاڑی کے پھل سے بھی اس کو نقصان پہنچا۔ وہ دوبارہ شوقِ شہادت میں اٹھا تو اس کے جذبات اور ولولے میں خاصی کمی واقع

ہوچکی تھی۔ اس کے ساتھی کو بھی اپنی غلطی کا صدمہ تھا۔ اس کی مجاہدانہ ضرب سے اپنا ہی ایک ساتھی اللہ کو پیارا ہوگیا تھا..... پھر بھی اس نے اور کلہاڑی والے نے اپنی صف بندی کی اور مجھ پر ایک ساتھ لپکے۔

کلہاڑی والے نے "جئے کیکر" کا نعرہ مار کے کلہاڑی گھمائی۔ میری گردن کو تن سے جدا کردینے کے عزمِ صمیم کے ساتھ۔ وہ تربیت یافتہ لوگ نہیں تھے۔ لڑنا تو ہر جانور جانتا ہے۔ وہ حملہ بھی کرسکتا ہے اور اپنی صلاحیت کے مطابق دفاع بھی۔ یہ گاؤں کے سوہنا شاید خاندانی اور برادری کے فسادات میں دادِ شجاعت دیتے ہوں گے مگر انہیں کیا معلوم تھا کہ مقابلہ کسی عام شہری بابو سے نہیں (جو فلموں میں گاؤں کی گوری سے عشق کے بعد بے وفائی کرکے شہر بھاگ جانے کے سوا کچھ نہیں کرسکتا)

میں نے پہلے سریا بردار شخص کو شہید ہونے کا موقع دیا۔ وہ سریا گھما کے آگے بڑھا تو میں ایک دم لیٹ گیا اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ سریا ہوا میں گھوما تو زور میں وہ بھی تھوڑا سا گھوما۔ کلہاڑی والا اس کے ساتھ ہی تھا۔ وہ بال بال بچا مگر مجھ سے ٹھوکر کھا کے پھر زمین پر منہ کے بل گرگیا۔ اب میں نے سریے والے کو ٹانگ پکڑ کے کھینچ لیا، اس کا سر زمین پر لگا ہی تھا کہ میں نے اسے اٹھا لیا اور ایک چکر دیا۔ کلہاڑی والا پھر اٹھا ہی تھا کہ دائرے میں گردش کرتا ہوا کیکر اس سے ٹکرایا اور ایک گالی بک کے وہ تیسری بار چت ہوا۔ میں نے دوسرے راؤنڈ میں کیکر کی ٹانگ چھوڑ دی۔ وہ کسی دُم دار ستارے کی طرح سیدھا گیا اور ٹن سے اس کا سر ٹیلی فون کے کھمبے پر لگا۔ کھمبا متاثر نہیں ہوا، وہ وہیں گر گیا۔

دو تہائی فوج ختم ہوجانے کے بعد سپہ سالار میدان میں تنہا رہ گیا تھا مگر پسپائی اس کا مقصد کبھی نہ تھا۔ مجھے قتل کرنے کی سعادت یا شہادت۔ یہی اس کی دلی تمنا تھی چنانچہ وہ تیسری بار فرشِ خاک سے اٹھا اور کلہاڑی اٹھا کے میرے سامنے آیا۔ اس کی کلہاڑی کا پھل اتنا تیز تھا اور اس کی سفاک چمک اتنی خوں آشام تھی کہ میں ذرا بھی غلطی کرتا تو دو ٹکڑے ہوجاتا۔ میں نے سریا اٹھا لیا اور لاٹھی کی طرح گھمایا۔ کلہاڑی اس سے ٹکرائی۔ مجھے اندازہ نہیں ہوا کہ اس وار کے پیچھے کتنی قوت تھی۔ میرا ہاتھ جھنجھنا گیا اور سریا میری گرفت سے نکل گیا۔ تاہم ایک قاتلانہ حملے سے بچ جانے کے بعد مجھے مہلت مل گئی تھی۔ میں جست لگا کے کار کے پاس پہنچ گیا۔ میرا ہاتھ کار کے دروازے پر تھا۔ میرا حریف کسی وحشی درندے کی طرح بڑھا۔ اس نے پھر کلہاڑی گھمانے کے لیے ہاتھ اٹھایا تھا کہ میں نے کار کا دروازہ پوری قوت سے کھول کے ڈھال کی طرح استعمال کیا۔ دروازہ دھڑ سے اس کے سینے پر لگا۔ نیوٹن کے قانونِ حرکت کے پہلے کُلیے کے مطابق اس کا نچلا دھڑ رک گیا مگر اوپر کے حصے کا سفر سیکنڈ کے ہزارویں یا اس سے بھی کم حصے تک جاری رہا۔ چلتی بس سے کودنے والا جب سڑک پر منہ کے بل گرتا

ہے تو اسی کُلیے کی صداقت کو ثابت کرتا ہے یا اچانک بریک لگانے سے سر آگے جاکے ڈیش بورڈ سے ٹکراتا ہے تب بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔

کلہاڑی والے کی گردن دروازے کے اوپر سے میرے سامنے آئی۔ یہ بڑا شدید جھٹکا تھا جو اس کے نرخرے نے تو برداشت کرلیا مگر پچھلے حصے میں گردن کے نازک مُہروں کا توازن بگڑ گیا۔ اس کے حلق سے ایسی ہی آواز نکلی جیسی بکرے کے منہ سے قصاب کی چھری کے نیچے نکلتی ہے...... پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ مجھے سب سے پہلے قتل کرکے جنت میں پہنچنے کی خواہش رکھنے والا اپنے مقصدِ خودکشی میں کامیاب رہا تھا۔ افسوس کہ دنیا سے سفر کرگیا کیکر۔ آنکھیں تو کھلی رہ گئیں پر مرگیا کیکر۔

شاید اس معرکہ آرائی کا احوال پڑھنے میں آپ نے جتنا وقت صرف کیا اس سے کم وقت میں یہ کیکرانہ جنگ ختم ہوچکی تھی۔ کفن وہ پہلے سے باندھ کے آئے تھے۔ میں نے تدفین کا فریضہ لواحقین پر چھوڑا اور فوراً گاڑی میں بیٹھ گیا کیونکہ دوسری طرف سے میں نے کسی گاڑی کی ہیڈلائٹس کو قریب آتا دیکھ لیا تھا۔

دوسری گاڑی رستے کے قریب آکر رک گئی۔ اس میں کوئی فیملی تھی جو آدھی رات کے بعد کسی تقریب سے واپس آرہے تھے۔ زیورات سے لدی پھندی اور بجی بنی خواتین نے دہشت سے چیخ کا کورس بلند کیا مگر مرد کچھ حوصلہ مند ثابت ہوا۔ شاید اس نے دیکھ لیا تھا کہ رستہ گیر لمبے لیٹے ہوئے ہیں اور حرکت بھی نہیں کررہے ہیں۔ وہ سفید کفن میں لاشوں کی طرح نظر آرہے تھے۔ سڑک کے کنارے میری کار کی ہیڈلائٹس بھی جل رہی تھیں اور انجن بھی بند نہیں تھا۔

میں نے نیچے اُتر کے دوسری گاڑی والے کو ہاتھ ہلایا لیکن اپنی جگہ کھڑا رہا۔ ممکن ہے خواتین نے اسے روکا ہو مگر وہ اترنے پر مجبور تھا اور میرے رویّے سے بھی یہ ظاہر ہوتا تھا کہ میں خود اس منظر پر حیران، پریشان اور حواس باختہ ہوں۔ مرد سوٹ میں تھا اور میرے مقابلے میں بہت معزز نظر آتا تھا حالانکہ گاڑی میری زیادہ قیمتی تھی۔

اس نے عادتاً انگریزی میں سوال کیا "یہ کیا ہے آخر؟"

میں نے کہا "میں بھی اسی سوال کا جواب تلاش کرنے اُترا تھا۔"

"پھر؟"

"پھر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ میرا کام نہیں۔ یہ کام پولیس کا ہے۔"

"یعنی ہمیں کچھ نہیں کرنا چاہیے۔"

"کرنا چاہیے۔ ہمیں فوراً بھاگ جانا چاہیے" میں نے کہا "شریف آدمی یہی کرتا ہے اور اس واقعے کو ایسے بھول جانا چاہیے جیسے ہم نے کچھ بھی نہیں دیکھا۔"

"رائٹ" اس نے مجھ سے اتفاق کیا اور ایک منٹ بعد کے کھمبے کی طرف سے گاڑی نکال کرلے گیا اور میں ٹیکسی کی طرف سے۔ تینوں کیکران کرام وہیں لیٹے رہے، میں یقین سے کہہ سکتا تھا کہ ان میں سے کتنے شہید ہوئے اور کتنے مرے لیکن مجھے یقین تھا کہ یہ انجام نہیں، آغاز ہے اور نہ جانے کتنے کیکر مجھے جہنم رسید کرنے کے مشن پر بھیجے جائیں گے۔ جب میں کچھ پُرسکون ہوا تو میری سمجھ میں یہ بات بھی آگئی کہ دوستوں نے ایک نئی کوٹھی سے دوسری نئی کوٹھی میں ہجرت فرمائی تھی۔ غالباً فون پر ان کو جو پیغام ملا تھا اس کا تعلق طور پر انہی کیکروں کے مذموم عزائم سے ہوگا۔

منظر کے گھر سے روانہ ہوتے وقت میں بہت خوش گوار موڈ میں تھا اور میرے تصور میں مدت کے بعد محفلِ یاراں کی دلدار شب تھی۔ کچھ کہنے اور اس سے زیادہ سننے کی رات، کے شکوے اور پُرخلوص گالیوں کے لطف کی رات۔ بچھڑنے کے خوشی میں جاگنے کی اور پھر نہ بچھڑنے کی دعاؤں میں گزرنے والی رات۔ رفاقتوں پر ناز اور تجدیدِ عہدِ وفا کی رات۔ میں کسی کے دامِ اجل کے بارے میں سوچ بھی نہیں رہا تھا اور کسی کے لیے تیار نہ تھا۔ میرا دل سکون، اطمینان اور مسرت سے تھا اور خطرہ میرے احساس کی سرحد سے پرے تھا۔

پھر یہ سب کچھ ہوگیا اور ختم بھی ہوگیا۔ اب میں اس طرح تھا جیسے بھوک اور فاقہ کشی کے بعد خوانِ نعمت کی دکھا کے حقے کا پانی پلادیا جائے۔ اس کی بھوک کیا وہ خود ہے۔ میں مرا تو نہیں تھا مگر میرے دل سے چشمہ سنگ کی طرح والی خوشی مرگئی تھی اور جوش و خروش کا وہ جذبہ مرگیا تھا شریر بچے کی طرح مضطرب تھا۔

اس حملے میں میرا کچھ بھی نہیں گیا تھا۔ سوائے میرے کے۔ میں ایک غیر متوقع قاتلانہ حملے میں بچ گیا تھا اور جو اندھے کیکر ایک جعلساز پیر کی عقیدت میں میری جان لینے آئے تھے وہ تاریک راہوں میں مارے گئے تھے۔ اس حادثے نے مجھے ڈیپریشن میں مبتلا کردیا تھا اور میں سوچنے لگا تھا کہ کیا میری زندگی میرے ساتھ رابعہ کی زندگی ایسے ہی بسر ہوگی؟ آہوئے صیاد کی طرح ہم ہروقت، ہر جگہ ایک مسلسل خوف کے سائے میں اپنی زندگی کی حفاظت کے لیے چوکس اور کمربستہ رہیں گے کا کوئی لمحہ نہ ہوگا جب ہم صرف ایک دوسرے کے بارے میں سوچیں، ہماری آنکھیں صرف ایک دوسرے کو دیکھیں کان صرف ایک دوسرے کی آوازیں سنیں۔ باقی سب بے وجود ہوجائے۔ خدشات اور خطرات، وسوسے اور اندیشے یہ سوال ہی بے حقیقت ہوجائے کہ ہم شکار ہیں یا شکاری اور کے اس لمحے میں ہم زندگی کی سرحد پر کھڑے ہیں یا موت کی کبھی ایسا ہوگا!

رات ایک بجے میں نے وقار یوسف کا نیا گھر تلاش کیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ کیکروں سے مقابلہ کرتے ہوئے مجھے صرف ایک شخص نے دیکھا تھا جو شومئی قسمت سے معہ اہل و عیال آگیا تھا۔ اس سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ قانون کے رکھوالے آجاتے تو بالکل مختلف ہوتا۔ اس وقت میں وقار یوسف کے دروازے کے بجائے کسی متعلقہ تھانے میں بیٹھا ہوتا۔

وہ سب بے چینی سے میرے منتظر تھے اور اندر پہنچ جانے کے بعد مجھ پر دقتی قنوطیت کا جو دورہ پڑا تھا، اس کے اثرات زائل ہوگئے۔

بیک وقت ان سب نے بولنا شروع کیا "کب سے انتظار کررہے ہیں ہم تمہارا" محسن بولا۔

"آخر اتنی دیر سے کہاں تھے تم؟" غالب نے مجھے ڈانٹا۔

"ہم سب کو تشویش لاحق ہورہی تھی" نازو بولی اور گل نے سرہلایا۔

صرف رابعہ نے زبان سے کچھ نہیں کہا مگر اس کی آنکھوں میں شکوہ شکایت اور صورت پر احتجاجی جذبات صاف پڑھے جاسکتے تھے۔

میں نے کہا "مس رابعہ! آپ بھی کچھ عرض کریں تو میں سب کو ایک ہی دندان شکن جواب دینے کے لیے کچھ فرماؤں۔"

رابعہ نے کہا "کیا غلط کہہ رہے ہیں سب لوگ؟"

"سب لوگ اُلّو کے پٹھے ہیں۔" میں نے کہا "یہ مُذکر کا صیغہ ہے چنانچہ خواتین خود اپنے لیے متبادل لفظ تلاش کرلیں۔ خوار کردیا مجھے، شرم تم کو مگر نہیں آتی۔ اُلٹا مجھی کو ڈانٹ رہے ہو۔ دو گھنٹے سے تو میں لاہور میں سرگرداں ہوں۔"

اب سب نے مجھے ڈانٹا "آتے ہی شروع ہوگئی آوارہ گردی۔ رابعہ! تم ذرا سختی سے پوچھو کہ یہ سیدھے گھر کیوں نہیں آئے۔"

غالب نے بھی سرہلایا "اس منہ زور گھوڑے کی لگام تمہارے ہاتھ میں دی ہے خدا نے۔"

وقار کی بیوی میری واحد ہمدرد ثابت ہوئی "یہ کیا فضول باتیں شروع کردی ہیں۔ خواہ مخواہ پیچھے پڑگئے ہو ایک آدمی کے۔"

"کون آدمی؟ یہ تو سکندرِ اعظم ہے۔" محسن بولا۔

"ہمارا چیف کک تو" غالب نے کہا۔

"سکندر بھائی، آپ بیٹھیں، جوتے اتاریں" وقار یوسف نے بھی ساتھ دیا "غسل وغیرہ کرنا ہے تو....."

میں نے ایک کشن چیئر پر گر کے کہا "تم سب کو معلوم ہونا چاہیے کہ صرف قسمت نے میرا ساتھ دیا ورنہ ابھی آخری غسل ہورہا ہوتا میرا۔"

رابعہ نے اور گل نے ایک ساتھ کہا "کیسی باتیں شروع کردیں تم نے۔"

میں نے کہا "میں بکواس نہیں فرمارہا ہوں۔ تم تو ایک نئی کوٹھی سے دوسری نئی کوٹھی میں پہنچ گئے۔ میں پہنچ جاتا اس دنیا سے دوسری دنیا میں۔"

اب غالب اور محسن نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا "خدا نخواستہ یہ حرکت منظر کی تھی؟ کیا وہ قتل کرنا چاہتا تھا تمہیں؟"

غالب نے کہا "تم اس کی گاڑی لے کر بھاگے کیوں تھے؟"

اب نازو نے کہا "غالب! بس بھی کرو۔"

گل نے کہا "سکندر بھائی! آخر ہوا کیا؟"

میں جوتے اتار کے قالین پر دراز ہوگیا "کیا زبردست قصرِ عالی شان ہے بھئی۔"

وقار یوسف کی بیوی نے خوش ہو کے کہا "ڈیڈی نے اپنے رہنے کے لیے بنوائی ہے۔"

نئی کوٹھی کا وسیع ڈرائنگ روم اتنا ہی پُرشوکت اور شاندار تھا جتنا ایک کاٹن کنگ یا آئل کنگ کی کوٹھی کا ہوسکتا تھا مگر اس کا مالک اس مملکتِ خداداد، جمہوریۂ اسلامیہ پاکستان پر حکومت کرنے والی بیوروکریسی کا ایک کنگ تھا جو اس ملک کی سیاست پر، تجارت پر، ملک کے عوام کی قسمت پر، ان کے حال اور مستقبل پر حاوی اور مسلط تھے۔ جو بظاہر تمام فیصلے ملک و ملت کے مفاد میں کرنے کا ڈھول پیٹتے تھے یا پٹواتے تھے مگر درحقیقت وہ صرف اپنے مفادات کے لیے اس ملک کے وسائل کو ایک بے رحمانہ خودغرضی کے ساتھ استعمال کرتے تھے۔ اس ملک کے وسائل سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ انگریز کے دورِ حکومت کے پروردہ اور انہی کی استحصالی ذہنیت کے مالک لوگ تھے جن کے لیے آزادی پروانۂ حاکمیت ثابت ہوئی تھی۔ گورے صاحب کے جانشین کالے صاحب کے آجانے سے عوام کو کچھ خوش آئند خواب اور کچھ دلکش نعرے ہی ملے تھے جن کے سہارے وہ آج تک علامہ اقبال کے فرمودے پر عقیدت مندی سے عمل پیرا تھے۔ پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ۔ ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ۔ یہ فلسفۂ حیات بھی نئے حاکموں کا عطا کردہ تھا۔

میں نے قالین پر لیٹ کر چھت سے آویزاں فانوسوں کو دیکھا جو کرسٹل کے تھے اور چیکوسلواکیہ سے برآمد کئے گئے ہوں گے۔ ایران کا شانی قالین، ڈیکوریشن پیس، صوفے، پردے سب امپورٹڈ تھے۔ باہر کے تعلیم یافتہ اور مغربی تہذیب کے نمائندہ و علمبردار اعلیٰ افسران دیسی چیزوں کا استعمال اپنے اسٹیٹس کے خلاف اور باعثِ شرم سمجھتے تھے۔ ملک و قوم کے مفادات کے بدلے وہ سب کچھ حاصل کررہے تھے۔ وقار کی بیوی کا خیال تھا کہ میں اس کے ڈیڈی کی نئی کوٹھی کو تعریفی نظروں سے دیکھ رہا ہوں چنانچہ وہ مجھے تفصیل سے بتانے پر آمادہ تھی کہ کون سی چیز کہاں کی ہے اور کتنی مالیت کی ہے۔ میرے خیالات اس کے برعکس تھے، اگر وہ جان لیتی کہ میں اس کے "توپ" ڈیڈی کے بارے میں کیا سوچ رہا ہوں تو یقیناً اس کی بڑی دل شکنی ہوتی۔

بالآخر وقار نے اسے ڈانٹا "ارے بابا بس کرو۔ یہ ٹھیک ہے کہ تمہارے ڈیڈی بہت بڑے افسر ہیں وزارتِ خارجہ و داخلہ کے۔ اس محل کے آگے بکنگھم پیلس ہیچ ہے مگر یہ کون سا موقع ہے۔"

"سکندر نے پوچھا تھا تو میں بتا رہی تھی" وہ خفا ہو کے بولی۔

"پھر بتا دینا۔ زندگی پڑی ہے" وقار نے کہا "جا کے اپنے ملازموں سے کہو چائے کافی کا بندوبست کریں۔"

"ابھی ملازم کوئی نہیں ہے یہاں۔ میں لاتی ہوں" وہ واک آؤٹ کر گئی۔

میں نے کہا "تمہارے فادر اِن لاء کے پاس پہلے رہنے کے لیے جگہ نہیں تھی۔ کتنے افسوس کا مقام ہے۔"

وقار یوسف میرے طنز کو سمجھ گیا "سرکاری کوٹھی میں رہتے تھے نا۔ ایک کوٹھی بنائی تھی وہ کسی سفارت خانے کو کرائے پر اٹھا رکھی ہے اور جتنا کرایہ وہ دیتے ہیں یہاں کون دے گا۔ یہاں وہ ریٹائرمنٹ کے بعد رہیں گے ورنہ اسے بھی کسی سفیر یا کونسلیٹ کو دے کر خود سدھار جائیں گے امریکا۔"

میں نے کہا "وہ کوٹھی بھی نئی تھی جہاں تم اب رہتے ہو۔"

"وہ خود میں نے بنوائی ہے۔ اپنی کمائی سے" وقار یوسف بولا۔

"آدھی رات کو وہاں سے فرار ہونے کا مقصد کیا تھا آخر؟ وہ کس کا فون تھا اور کس نے کیا تھا جس کے بعد تم سب نے انتقال فرمایا؟"

"پہلے تو کسی نے وقار کی ساس کو فون کیا کہ بیگم صاحبہ آپ کی نئی کوٹھی میں کچھ لوگ گھسے ہیں۔ مشتبہ قسم کے۔ کوٹھی ابھی بن کے مکمل ہوئی ہے اور پوری طرح فرنش نہیں ہوئی۔"

"یہ فرنشنگ پوری نہیں ہے؟ سبحان اللہ!" میں نے کہا۔

"اندر کی ڈیکوریشن اور بہت سا فضول کام باقی ہے۔ ابھی یہاں رہنے کے لیے کوئی نہیں آیا۔ ایک چوکیدار ہے وہ گھوڑے بیچ کے سوتا ہے کیونکہ ابھی چوری کا اندیشہ نہیں۔ فرنیچر فریج اے سی وغیرہ کوئی نہیں چراتا۔ بیگم صاحبہ نے اسے فون کیا تو گھنٹی بجتی رہی۔ پھر انہوں نے بیٹی کو حکم دیا کہ میں جا کے دیکھوں اور میری بیوی نے حکم پاس کر دیا میری طرف۔"

"یہ ٹھہرا زن مرید۔" محسن بولا "غالب کی طرح۔"

"قسمت والے ہوتے ہیں زن مرید" غالب نے کہا "تاریخ میں ان کا نام سنہرے حرفوں سے لکھا جاتا ہے۔ تاج محل بنانے والا شاہجہاں بھی زن مرید تھا۔"

"بادشاہ تو زن مرید ہو کے بھی بادشاہ ہی رہتا ہے۔ تم ہو حکم کے غلام یعنی جوکر۔"

میں نے کہا "آخر تمہاری ساس صاحبہ نے تمہارے سُسر صاحب کو کیوں نہیں بھیجا؟"

"کیسی باتیں کرتے ہو۔ وہ اتنے بڑے آدمی ہیں۔" محسن بولا "اتنے چھوٹے کام چھوٹے آدمی کرتے ہیں۔"

غالب نے تائید کی "اتنے قیمتی مجازی خدا کو ضائع ... رسک کون لیتا ہے۔ اس عمر میں پھر کہاں ملے گا۔ ... ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔"

وقار مسکرایا "دراصل وہ بیمار ہیں۔"

"اوں ہوں۔ صاحبِ فراش ہیں۔ بیمار ہوتے ہیں غریب ... اس سے بڑے علیل ہوتے ہیں، سب سے بڑے صاحبِ فراش ..."

میں نے کہا "وہ کسی نوکر کو بھیج دیتے۔ یا کسی پولیس ... فون کر دیتے۔"

"کیا ضرورت تھی انہیں پریشان ہونے کی جب میرے ... فرماں بردار داماد موجود ہو۔" وقار بولا۔

"بس اتنی سی بات پر تم سب جلوس لے کر چل پڑے؟"

"نہیں۔ میں نے تو ٹھکولی دی تھی ساس صاحبہ کو کہ آپ فکر نہ کریں، میں ابھی جا کے دیکھتا ہوں۔ میں نے تھانے فون کر دیا تھا کہ ذرا چیک کر کے مجھے بتاؤ اور سُسر محترم کا حوالہ بھی ... تھا کہ کوٹھی ان کی ہے۔ وہ تو سر کے بل جاتا اور نہ جاتا تو نوکری ... جاتا۔ ٹرانسفر بہرحال ہو جاتا۔ لیکن بعد میں ایک فون ... میرے گھر کیا کہ کیا سکندر پہنچ گیا۔ میں نے ریسیور محسن کو ... دیا۔"

محسن نے کہا "پہلے تو میں سمجھا کہ ایسے ہی کسی نے شرارت کی ہو گی مگر میں نے بات کی تو اس نے کہا کہ محسن بول رہے ہو۔ اب میں چونکا۔ میں نے کہا کہ تم کون ہو؟" اس نے کہا کہ "ہمدرد" میں نے کہا "ہمدرد دوا خانے، تمہارا کوئی نام اور ... ہے؟" اس نے کہا "میری بات کو مذاق مت سمجھو، تم لوگ خطرے میں ہو" میں نے کہا "غلط۔ ہم گھر میں ہیں" وہ کہنے لگا "وقار یوسف کے گھر میں ہو نا۔ غالب بھی وہیں ہے اور باقی سب کو تم ابھی لے آئے ہو۔ محسن اور گل کو، نازو اور رابعہ کو۔" اس نے گاڑی کا نمبر بھی بتا دیا اور یہ بھی کہ سکندر تمہارے ساتھ نہیں آیا ہے۔ میں نے کہا "آخر تم ہو کون؟" اس نے پھر وہی کہا کہ "تمہارا ہمدرد" میں نے کہا کہ ہمدرد صاحب، خطرہ کیا ہے اور کس سے ہے؟ اس نے کہا "خطرہ تمہیں ہے، تم سب کو۔ تمہارے دشمن کون ہیں؟ جانتے ہو" میں نے کہا "او کے۔ پھر کیا کرنا چاہیے ہمیں؟ ... کریں یا دشمنوں پر کالا جادو؟" وہ کہنے لگا "میرا مشورہ ہے کہ رات کے لیے یہاں سے چلے جاؤ۔ کہیں بھی چلے جاؤ۔"

میں نے کہا "اس وقت تمہیں یہ خیال نہیں آیا کہ ... کی ساس صاحبہ کو فون کرنے والا ابھی یہی شخص تو نہیں تھا؟"

"خیال آیا تھا مگر اس نے کہا تھا کہ کہیں بھی چلے جاؤ ... بندہ ہوتا تو ہمیں نئی کوٹھی میں رات گزارنے کا مشورہ دیتا۔"

"اسے اندازہ ہو گا کہ تم وہیں جاؤ گے۔"

"ہم کہیں نہ جاتے۔ اور جاتے تو رابعہ کا گھر تھا جو اب ... بیگم کی ملکیت نہیں رہا۔ منظر نے اس کا قبضہ حاصل کر لیا ہے۔"

... تمی بہت تھے مگر یہ تو بڑی بے وقوفی کی بات ہوتی اگر ... گھر چھوڑ کے نکل جاتے" محسن نے کہا "... ایک ٹیلی فون کال پر ... نے فون بند کر دیا تو خواتین نروس ہو گئیں۔ وقار کی ... تو خیر ہے ہی ڈرپوک۔ شوہر تک سے ڈرتی ہے۔"

وقار کی بیوی اسی وقت ٹرالی کو دھکیلتی اندر آئی تھی "لال بیگ اور چھپکلی سے ضرور ڈرتی ہوں میں مگر یہ کوئی ڈرنے والی چیز ہے؟"

غالب نے کہا "لعنت تم پر یار وقار یوسف۔ ایک لال بیگ اور چھپکلی سے بھی گئے گزرے ہو تم۔"

وقار یوسف نے کہا "اس کا مطلب ہے کہ میں کوئی ڈراؤنی چیز نہیں ہوں۔ بہت پیاری چیز ہوں۔ پیار کرنے کے قابل، کیوں ڈارلنگ؟"

ڈارلنگ مسکرانے پر مجبور ہو گئی "خود آئینہ دیکھ لو۔ مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔"

محسن نے کہا "جناب، یہ دوسری چیزیں بھی کون سی بہادر ہیں۔ رابعہ کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ گل کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ نازو پر غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔"

"جھوٹ کم بولو" گل نے کہا۔

"او کے۔ میری بات میں پچاس فیصد جھوٹ سمجھ لو لیکن ڈر رہی تھیں تم سب یا نہیں؟" محسن نے کہا۔

"ڈرنے کی تو بات تھی۔ جو ایک ایک کا نام لے کر بات کر رہا تھا اس کی بات کو مذاق سمجھ کے نہیں ٹالا جا سکتا تھا" رابعہ نے کہا۔

"یہ سب ہجرت کی تحریک پیش کر چکی تھیں لیکن ہم نے مسترد کر دی کہ ایسی کی تیسی ہمدرد صاحب کی۔ نمٹ لیں گے خطرے سے ... خطرہ تو ہماری جیب میں رہتا ہے۔ یہاں رہیں تو کیا اور یہاں سے چلے جائیں تو کیا۔ اتنی دیر میں تھانے سے فون آ گیا کہ سر وہاں سے چار بندے پکڑے ہیں۔ چوکیدار کہتا ہے کہ اسے نہیں معلوم کون ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے چوکیدار کو رات گزارنے کے لیے سو روپے دیے تھے۔ انہیں صبح کی ٹرین سے کراچی جانا تھا اور کسی ہوٹل میں جگہ نہیں ملی تھی۔ چوکیدار خود انہیں لایا تھا اور شاید وہ ہر رات دو چار مسافر ٹھہرا لیتا ہے وہاں۔ میں نے کہا کہ انہیں روک کے رکھو اور اچھی طرح تفتیش کرو آج رات۔ صبح میں آ کے پوچھ لوں گا۔ وہ سچ مچ مسافر ہوں تو انہیں جانے دینا مگر چوکیدار کو مت چھوڑنا۔

"ظاہر ہے ہم سب کو تمہارا انتظار تھا اور ایک گمنام ٹیلی فون کال نے سب کو تھوڑا بہت پریشان تو کیا تھا۔ پندرہ منٹ بعد دوسرا فون آ گیا۔ انہی ہمدرد صاحب کا۔ کہنے لگا کہ تم لوگ بیٹھے ہو ابھی تک۔ میری بات کو مذاق سمجھ رہے ہو نا" میں نے کہا "ہم سکندر کا انتظار کر رہے ہیں۔" اس نے کہا "کسی کو چھوڑ جاؤ گھر پر یا پیغام چھوڑ دو۔ سکندر آ جائے گا وہاں جہاں تم جاؤ گے۔ ابھی وقت ہے، بعد میں پھنس جاؤ گے" میں نے کہا "یار کیا سسپنس پھیلا رکھا ہے۔ سیدھی طرح نام بتاؤ اپنا اور پوری بات کرو کہ خطرہ کیا ہے" اس نے کہا "تم نے کیکر شاہ کی خانقاہ کو تباہ کر کے اچھا نہیں کیا تھا۔ اس کے مُرید بہت مشتعل ہیں اور آج رات کوئی کارروائی کریں گے۔ انہیں تو نہیں معلوم کہ سکندر تمہارے ساتھ نہیں آیا۔ وہ بچ جائے گا اور تم لوگ مارے جاؤ گے" میں بھی اب پریشانی میں مبتلا ہو گیا تھا۔ میں نے کہا "بعد میں سکندر یہاں آیا تو کیا ہو گا" اس نے کہا "کہ وہ جائے گا منظر کے گھر۔ اور وہاں سے ادھر آیا تو میں اسے راستے میں ہی روک کے بتا دوں گا کہ وہ رات منظر کے گھر گزارے۔"

"بس اس کے بعد تم بھاگ گئے؟" میں نے کہا۔

"نہیں یار۔ اتنے جلد باز اور بزدل نہیں ہیں ہم لوگ" محسن بولا "میں نے مشورہ کرنے کے بعد منظر کے گھر فون کیا اور وہاں سے مسٹر ہمدرد کے دعووں کی تصدیق ہو گئی۔ منظر نے بتایا کہ تم وہاں پہنچے تھے مگر زیادہ دیر رُکے نہیں اور وقار یوسف کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ ظاہر ہے منظر تمہیں کوئی پیغام نہیں دے سکتا تھا چنانچہ میں نے اپنے خادم کو اس کوٹھی کا نیا نقشہ بتا کے دیا اور سمجھا دیا کہ جب سکندر صاحب آئیں تو انہیں بتا دینا۔"

"تم لوگ تھوڑا سا انتظار نہیں کر سکتے تھے؟ منظر کے گھر سے روانہ ہو جانے کے بعد مجھے کتنی دیر لگتی؟"

غالب بولا "مگر ہم پہلے آ گئے اور تم بعد میں تو اس سے کیا فرق پڑا؟"

"فرق تو بہت پڑا" میں نے کہا "بعض اوقات ایک غلطی بھی تائیدِ ایزدی کا اشارہ بن جاتی ہے۔ سب ساتھ ہوتے تو نہ جانے کیا ہوتا۔ اب تو جو ہوا میں نے اکیلا ہونے کے باعث بھگت لیا۔"

محسن کا چہرہ سوالیہ نشان بن گیا "کیا ہوا؟"

میں مسکرایا "وہی جو مسٹر ہمدرد نے کہا تھا۔ تین کفن پوش کیکر دنیا سے میرا بستر گول کرنے آ گئے تھے۔"

"کیکر! کیکر شاہ کے مرید؟" غالب نے کہا۔

"ہاں یار۔ کیکر کے درخت تو میرے دشمن ہیں نہیں۔ وہ مسلح تھے مگر ان کا اسلحہ خاصا قدیم تھا۔ پتھر کے زمانے کے بعد تاریخ میں لوہے کا زمانہ آیا تھا۔ اسی عہد کی کلہاڑی اور سریے لے کر وہ حملہ آور ہوئے تھے۔"

میں نے ان کو اختصار کے ساتھ کیکروں کے حملے کی روداد سنا دی۔ سب خاموشی سے چائے پیتے ہوئے میری بات سنتے رہے۔ رابعہ، نازو اور گل ایک صوفے پر ساتھ ساتھ بیٹھی تھیں۔ ان کے مقابل وقار یوسف کی بیوی تھی اور باقی یعنی ہم سب حضرات قالین پر کشن سر کے نیچے دبائے صوفوں کا سہارا لیے پاؤں پھیلا کے بیٹھے تھے۔ وقار یوسف نے فین ہیٹر چلا دیا تھا جس سے ٹھنڈک کا

احساس ایک راحت بخش حرارت میں ڈھل گیا تھا۔
"گویا مسٹر ہمدرد کو واقعی ہم سے ہمدردی تھی" محسن بولا۔
"میں اس سے اتفاق نہیں کرتا" غالب نے کہا "ہمدرد ... تو سامنے آتا۔ اسے ڈر کس کا تھا؟"
"میں سمجھتا ہوں کہ مسٹر ہمدرد نے صحیح وقت پر مجھے تنہا کردیا" میں نے کہا "اس سازش کا مقصد ہی یہ تھا۔ وہ تعداد میں صرف تین تھے اور تھے بھی احمق! وہ چاہتے ہوں گے کہ اکیلے میں مجھے گھیر لیں۔ سب سے مقابلہ کرنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔"
"اس کا تو مطلب یہ ہوا کہ کسی نے انہیں جانتے بوجھتے مروایا۔ یہ جو مسٹر ہمدرد تھے' ان کو یہ بات معلوم تھی تو کیا یہ معلوم نہیں تھا کہ ایک کلہاڑی اور دو سریے اٹھا کے تین سرپھرے مُرید تمہارے راستے میں آجائیں گے تو تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ غالب امکان اسی بات کا تھا کہ وہ مارے جائیں گے اور ایسا ہی ہوا" غالب نے کہا "مقصد تمہیں قتل کرنا ہوتا تو ان کے ہاتھ میں ریوالور بھی دیے جاسکتے تھے۔"
اس دلیل نے مجھے قائل کرلیا "بات دل کو لگتی ہے مگر اس کے لیے باقی سب کے ہونے یا نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا؟"
غالب نے کہا "ہر احمق ایک حد تک احمق ہوتا ہے۔ ان کو یقین دلایا گیا ہوگا کہ تمہارا مقابلہ ایک ایسے شخص سے ہوگا جو اکیلا ہی نہیں' خالی ہاتھ بھی ہوگا۔ تمہارے پاس کلہاڑی ہوگی۔ سر پھاڑ دینا اس کا۔ سریے مار کے ہڈیاں توڑ دینا۔ اس کے علاوہ مسٹر ہمدرد یہ نہیں چاہتے ہوں گے کہ کیکر بلا مقابلہ زندہ پکڑ لیے جائیں۔"
میں نے کہا "مقابلہ تو لازمی تھا۔ وہ سر سے کفن باندھ کے آئے تھے۔"
"اس کے باوجود ہم سب ہوتے تو انہیں گھیر لیتے اور شاید انہیں جامِ شہادت نوش نہ کرنے دیتے۔ وہ گرفتار ہوجاتے تو بہت کچھ بک دیتے۔ شوقِ شہادت اور چیز ہے۔ تفتیش کا حوصلہ ہر ایک نہیں رکھتا۔ تمہارے مقابلے پر انہوں نے دل کھول کے دادِ شجاعت دی اور جہنم رسید ہوئے" غالب بولا۔
"بزعمِ خود شہید ہوئے۔" محسن بولا "ان کے مرنے سے کسی کو کیا فائدہ ہوا؟"
"معلوم ہوجائے گا" میں نے کہا "ابھی تک دو باتیں سامنے آئی ہیں۔ ایک تو مسٹر ہمدرد کو ایک ایک لمحے کی خبر تھی اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب سائے کی طرح کوئی ہمارے پیچھے لگا رہے اور ہماری نقل و حرکت کی مسلسل نگرانی کی جارہی ہو۔ دوسری بات یہ کہ کسی شکاری نے ہمارے استقبال کے لیے یہ اہتمام پہلے سے کیا تھا۔ تین کیکروں کو میرے ہاتھوں مروانا ایک سازش بھی ہوسکتی ہے جس کے نتائج بالآخر سامنے آئیں گے۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ مقصد مجھے مارنا نہیں تھا۔ مجھے تین افراد کے قتل میں ملوث کرنا تھا۔ ظاہر ہے اس وقت میں نے اِدھر اُدھر کچھ نہیں دیکھا لیکن میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ کہیں چھپ کر مسٹر ہمدرد یا کوئی ... جنگ کو فلم بند کررہے ہوں گے۔"
محسن متفکر نظر آنے لگا "آتے ہی تم تہرے قتل کی ... میں ملوث ہوگئے۔"
غالب نے کہا "یہ اپنے دفاع کی کوشش تھی۔ قاتلانہ ... انہوں نے کیا تھا۔"
"میرے چاند! یہ ہے قانونی نکتہ اور دلائل کا مرحلہ ... عدالت میں۔ اس سے پہلے ضابطے کی کارروائی تو ہوگی ... تعین بعد میں ہوگا۔ ابھی تو یہی نظر آئے گا کہ سکندر اعظم ... باری تینوں کو ٹھکانے لگادیا۔ تین قتل کردیے۔ قتل تو قتل ہے ... یہ عدالت کا کام ہے کہ وہ مجموعی صورت حال میں فیصلہ ... دے۔ سکندر کو باعزت بری کردے کیونکہ مجرم قاتلانہ حملہ ... والے تھے۔ اس نے صرف خود کو بچایا۔ عدالت کا فیصلہ ایک ... میں نہیں ہوجائے گا۔ اس میں طریقِ کار وہی ہوگا۔ گرفتاری ... ضمانت' بیان اور پیشی۔ گواہی اور جرح۔ تب تک سکندر لازم ... گا۔"
"اور حالات ایسے ہیں کہ ہوتے ہیں اہلِ ہوس مدعی ... منصف بھی۔ کوئی جج کسی بھی وجہ سے فیصلہ میرے خلاف دے ... ہے۔ وہ مجھے رعایت دینے کا پابند نہیں ہے اور اگر کوئی رائے ... کرتا ہے تو میں اسے صرف اپیل میں غلط کہہ سکتا ہوں۔ جج ... ہوتا ہے' اس کی اپنی سمجھ بوجھ ہے اور اس کے جذبات ہیں ... تعصب سے بھی کام لے سکتا ہے اور اسے دھن' دھونس یا دھاندلی ... سے مجبور بھی کیا جاسکتا ہے کہ مجھے سخت سزا دے۔ سزائے موت ... ناممکن ہے مگر تین سال سے سات سال تک قید کی سزا دے ... اسے کون روک سکتا ہے۔ اگر میری اپیل منظور ہوجاتی ہے تو ... تب بھی اس کی ذات پر کوئی حرف نہیں آتا لیکن اپیل کا فیصلہ ... ہونے میں لگ جائیں گے کئی سال۔ کیا سمجھے؟"
"سمجھا یہ کہ اگر تمہارے خلاف سابقہ مقدمات ختم ہو ... ہیں تو تمہیں نئے معاملات میں اُلجھا دیا جائے۔" محسن بولا "بات ... ہے پشاور جاتے وقت تم پر چاندنی بیگم کے قتل کا الزام نہ ... ٹھیک ہے کہ بعد میں گولو پہلوان کی خودکشی سے بات ختم ہو ... اس واردات کی بازگشت ابھی ختم ہی نہیں ہوئی تھی کہ ایک ... واقعہ پیش آگیا۔ تم نے تین بندے ماردیے۔ وجہ پر کون غور ... ہے۔ لوگ کہیں گے یار یہ سکندر بخت کے منہ کو خون لگ گیا ... واپس آتے ہی قتل و خونریزی شروع کردی۔"
"اچھا صبح بات کریں گے" وقار یوسف جماہی لے کر ...
"مجھے نیند میں پوری بات سمجھ میں ہی نہیں آرہی ہے۔"
غالب نے بھی کہا "زنانہ خانے میں کیسی خاموشی ہے؟"
محسن ہنسا "ہم اپنی باتوں میں مگن تھے۔"
"کیا ان کے پاس باتوں کا اسٹاک ختم ہوگیا تھا؟" میں ...
"یہ تمہارے آنے سے پہلے ہی کافی زبان چلاچکی تھیں۔ تھکی ہوئی تھیں اس لیے بیٹھے بیٹھے سو گئیں۔"
"سونے کا کیا انتظام ہے؟" محسن بولا۔
"جس کے جہاں سینگ سمائیں" غالب نے کہا۔
"تمہارے سینگ تو غائب ہوچکے ہیں۔ محاورہ مشہور ہے۔"
"صبح میں اپنی بیوی سے شکایت کروں گا کہ تمہارے مجازی خدا کو منہ پر گدھا کہا گیا ہے۔" غالب نے مظلوم لہجے میں کہا۔
"بیوی سے کہوں گا" محسن نے اس کا مذاق اُڑایا "میرے سامنے تم اس کو بیوی کہہ دو تو مانوں کہ واقعی مجازی خدا ہو۔"
"اور پھر کیا ہوں میں؟"
"ابھی تم خود کو مجازی گدھا کہہ سکتے ہو زیادہ سے زیادہ" محسن نے کہا۔
خواتین صوفوں پر آڑی ترچھی سوگئی تھیں۔ ہم نے انہیں کھینچ کے قالین پر ڈالا اور ان کے سر کے نیچے کشن لگادیے۔ پھر ہم دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ کوٹھی میں تین وسیع بیڈ روم تھے۔ ابھی صرف کارپٹ لگایا گیا تھا' بیڈ نہیں تھے۔ وقار نے ائرکنڈیشنر کا ہیٹر آن کردیا ورنہ سردی میں ہم رات بھر سکڑتے رہتے۔
وقار یوسف اور غالب تو لیٹتے ہی خراٹے لینے لگے لیکن میرا ذہن تازہ واردات میں اُلجھا رہا۔ ایک مُدت سے میں رات بھر سکون کی نیند سونا بھول چکا تھا۔ زندگی کے صبح و شام کا توازن بگڑ گیا تھا اور معمولات یکسر تھے ہی نہیں۔ وہ دن خواب و خیال ہوگئے تھے جب سونے جاگنے اور کھانے پینے کے اوقات میں پابندی کا خیال رہتا تھا اور بے اعتدالی ہوتی تھی تو تفریح کے سبب۔ تفریح کی کوئی حد نہ تھی اور سب کچھ تفریح ہی تھا۔ جینا کوئی مجبوری نہیں تھی یا خوف اور اندیشوں کے سائے میں وقت کے گزرنے کا احساس نہیں تھا۔ جینا ایک ایڈونچر تھا یا ایک پُرانبساط تجربہ تھا۔ زندگی کے محدود مقاصد میں خوشی کی جستجو' سنسنی خیز تصورات اور حسین خواب شامل تھے۔ محور و مرکزِ حیات عشق تھا۔ خوب صورتی سے عشق' صبح کی شفق سے شبِ ماہتاب تک وقت کے سارے منظر خوب صورت تھے۔ کائنات کے سارے رنگ' سارے گیت خوب صورت تھے۔ عنوانِ حیات اول و آخر عشق تھا۔ لندن کی سیمابی رنگت اور برفاب سے جسم رکھنے والی لڑکیوں سے عشق کچھ اور تھا۔ فوزیہ کا عشق کسی نو آموزِ مے کش کا نشہ تھا اور پھر رابعہ کا عشق تھا۔
"دنیا جیسے اور تھی اور میں اسی میں اپنا وجود گُم کرچکا تھا۔ آج وہ سب خوابِ آرزو کی طرح بے حقیقت تھا۔ رابعہ میرے قریب ہوکے بھی نارسائی کی حد تک دور تھی۔ میں آنے والے دن پر یقین سے محروم تھا اور ایک مسلسل گریز پا اندازِ زندگی کو میں اپنا مقدر تسلیم کرنے پر مجبور تھا۔ کب تک ... آخر کب تک یہ شکار اور شکاری کا تماشائے مرگ و زیست جس کی نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم۔ تمام عمر ایسے تو نہیں گزاری جاسکتی۔ مجھے کچھ کرنا ہوگا۔ اپنا یقین' اپنا اعتماد اور اپنی زندگی پر اپنا اختیار حاصل کرنا بے حد ضروری ہے۔ اس کے بغیر رابعہ کو حاصل کرنے سے کیا حاصل؟
پھر کیا میں پسپائی اختیار کرلوں باعزت طور پر؟ نہ کوئی جیتا نہ ہارا۔ میچ ڈرا۔ چوہدری دلاور اینڈ کمپنی بمقابلہ ایم آر ایس۔ دلاور خود یہی چاہتا ہے۔ بس اس میں "باعزت" کچھ بھی نہیں ہے۔ ظاہر کچھ نہ ہو مگر ہار جیت ہر باعزت سمجھوتے کے پس منظر میں صاف نظر آتی ہے۔ ٹاس بھی کریں تو سکہ اُلٹا گرتا ہے یا سیدھا۔ ٹاس ڈرا نہیں ہوتا۔ مفاہمت سے بہتر تو یہ ہوگا کہ میں سب کے مفادات کا سودا کرلوں۔ چوہدری دلاور کے سامنے اپنے مطالبات رکھ دوں جس میں سب کا فائدہ ہو۔ چوہدری دلاور ہر مطالبہ منظور کرلے گا۔ اس کے لیے میدان خالی ہوجائے گا۔ ہم فکرِ جہاں سے چھوٹ جائیں گے۔
میں نے محسوس کیا کہ شاید میرا دماغ چل گیا ہے۔ اس حد تک منفی سوچ سے یہی ظاہر ہوتا تھا۔ صرف میں ہی نہیں' غالب یا محسن میں سے بھی کوئی ایسا سوچے تو اس کے بارے میں باقی سب کی رائے کیا ہوگی؟ شکست کا خوف کوئی بات نہیں۔ شکست میں کوئی ذلت نہیں۔ آدمی بزدل اور کم ہمت بھی ہوجاتا ہے لیکن خودغرضانہ مفادات کی خاطر مفاہمت کی سوچنا تو بے غیرتی ہے۔ دلاور اینڈ کمپنی کے لیے میدان خالی چھوڑ دینا تو بددیانتی ہے۔ اپنے آپ سے بھی اور اپنے ساتھیوں سے بھی بے وفائی ہے۔ غدار کا ساتھ دینا بھی غداری ہے تو کیا اس کے جرم کو نظرانداز کرتے ہوئے یہ سوچنا کہ "مجھے کیا" یہ غداری نہیں ہے؟
مجھے اپنے آپ سے شرم آئی اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے انسانوں کو دوسرے انسانوں کے دل کا حال جاننے اور ان کے خیالات پڑھنے کی صلاحیت نہیں دی ورنہ ابھی میں خود اپنے ساتھیوں کی نظر میں کتنا رسوا ہوتا۔ رابعہ کی نظر سے گر جاتا۔ محسن اور غالب کہتے لعنت ہو تم پر سکندر۔ ہم شرمندہ ہیں تمہاری دوستی کے نام سے۔
میں کروٹیں بدلتا رہا۔ یہ ضرور کوئی ذہنی بیماری ہے۔ ذہنی مریض وہ بھی تو ہوتے ہیں جو اپنے ہاتھوں اپنی زندگی کا خاتمہ کرنے کی سوچتے ہیں۔ کوئی وجہ ہو یا نہ ہو۔ اعصابی دباؤ اور پریشانی میں کبھی آدمی خود کو مار ڈالتا ہے تو کبھی دوسرے کو مگر وہ صحت مند جسم رکھنے والا بیمار آدمی معذور ہوتا ہے۔ شیطان اس کے ذہن کو مطیع کرلیتا ہے اور اسے تخریب کے منفی خیالات کا اسیر بنادیتا ہے۔ کیا ایسا ہی میرے ساتھ ہورہا ہے؟ غالباً مجھے کسی سائیکاٹرسٹ سے مشورہ کرنا چاہیے جو میرا دماغ درست کردے۔ یا شاید مجھے سکون اور آرام کی ضرورت ہے جس سے میرا یقین اور اعتماد بحال ہوسکے۔
"کیا نیند نہیں آرہی ہے؟" محسن نے سرگوشی میں کہا۔

میں ڈر گیا "تو... جاگ رہا ہے؟"

"ہاں۔ یہ لے و یلیم" محسن نے کہا۔

"تیرے پاس..."

"میں عادی ہوگیا ہوں ان کا" وہ بولا "پہلے گل نے علاج کے طور پر سکون آور دوائیں استعمال کرائی تھیں۔ ڈاکٹر کے مشورے سے۔ پھر میں خود کھانے لگا۔ گل سے چھپ کر۔ گل نے کئی بار پکڑا اور دوا ضبط کرلی مگر پھر خود ہی دی۔ میری حالت بگڑنے لگتی تھی۔"

میں نے کہا "مگر یہ خطرناک چیز ہے۔"

"میرے لیے نہیں رہی۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ حد سے نہ بڑھوں مگر میرا جسم اتنا عادی ہوگیا ہے کہ پوری شیشی کھا کے بھی مروں گا نہیں۔ مجھے معلوم ہے" محسن نے کہا۔

میں نے شیشی اس سے چھین لی "کتنی گولیاں ہیں اس میں؟"

"چار۔ و یلیم فائیو کی چار گولیوں سے کچھ نہیں ہوتا۔ اس سے زیادہ گل چھوڑتی ہی نہیں" وہ بولا "چاروں کھالے۔"

"میرا دماغ خراب ہو رہا ہے محسن۔"

"سب کا ہو رہا ہے" محسن بولا "عورتیں فائدے میں ہیں۔ اپنا علاج ہسٹریا سے کرلیتی ہیں۔ تجھ پر اس واقعے کا زیادہ اثر ہے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ اچھا ہوتا اگر ہم صبح بات کرتے۔ نیند زیادہ ضروری تھی۔"

محسن اٹھ کے باتھ روم تک گیا اور میرے لیے ایک گلاس میں پانی لایا۔ "ڈاکوؤں کی قید میں مجھے بہت ٹینشن تھی۔ گل میرے مقابلے میں ایزی تھی۔ زیادہ پُراعتماد تھی۔ لوگ اس کے جانے پہچانے تھے اور ماحول بھی نا آشنا نہیں تھا۔"

میں نے محسن کے اصرار پر ڈرتے ڈرتے چاروں گولیاں نگل لیں "ایسا نہ ہو میں بے ہوش ہو جاؤں۔"

"نہیں یار۔ تجھے ذرا ہیوی ڈوز کی ضرورت ہے" اس نے مجھ سے گلاس لے لیا "صبح میں فوزیہ کے پاس جا رہا ہوں۔"

"فوزیہ کے پاس! کیوں؟"

"کیوں! یار وہ بہن ہے میری" محسن بولا "اس کا گھر بھی تو میرا گھر ہے۔ میرا خیال ہے مجھے وہیں سکون ملے گا۔ اس کا شوہر سیالکوٹ میں پروفیسر ہے۔"

"گل بھی جائے گی؟"

"ہاں۔ اور اس سے شادی کر رہا ہوں میں" محسن بولا۔

"اچانک؟"

"مجبوری ہے میری۔ میں اس کے ساتھ ایسے نہیں رہ سکتا۔ تمہاری بات اور ہے" محسن نے اعتراف کے انداز میں کہا "میں نے شہلا سے شادی نہ کی ہوتی تو میں بھی انتظار کرلیتا۔ تو سمجھ رہا ہے نا؟"

"سمجھ رہا ہوں شیروانی صاحب۔"

"دیکھ یار! آدمی کو اپنے آپ سے ڈرنا چاہیے۔ کیا فائدہ کمزوری کے کسی لمحے میں مجھ سے وہ گناہ سرزد ہو جائے جس پر بعد میں ہمیشہ گل کے سامنے شرمندہ رہوں۔ کسی اور کو معلوم ہو یا نہ ہو۔"

میں نے کہا "تو گل کو کیوں نہیں بھیج دیتا فوزیہ کے پاس؟"

"گل نہیں جائے گی۔"

"پھر تم بھاڑ میں جاؤ۔ مجھے نیند آرہی ہے۔"

"فوزیہ سب کرلے گی۔ کسی تقریب یا ہنگامے کی گنجائش نہیں۔ ضرورت بھی کیا ہے؟ بے شک گل کے ارمان ہوں گے ہر لڑکی کی طرح کہ سب کچھ ہو..."

وہ نہ جانے کب تک بولتا رہا ہوگا۔ اس کی آواز آہستہ آہستہ دور ہوتی گئی۔ آدھے ادھورے الفاظ بے معنی ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ بے ہوشی کی نیند نے مجھے دنیا ومافیہا سے بے خبر کردیا۔

میں سو کے اٹھا تو دوپہر ہو رہی تھی۔ یہ نہ جانے کتنے دنوں کی ذہنی و جسمانی درماندگی تھی کہ مجھے گرد و پیش کی خبر نہ رہی، اس بے خبری اور بے فکری کی نیند کے پیچھے اس پُرتحفظ ماحول کا بھی دخل تھا جس میں میرے اعصاب پر کوئی دباؤ نہ تھا اور احساس کو تمام اندیشوں سے فراغت میسّر تھی۔

میرے اٹھنے تک وقار یوسف اپنی بیوی کے ساتھ جا چکا تھا۔ اسے اپنے گھر سے کورٹ جانا تھا۔ وہ جاتے وقت کہہ گئے تھے کہ ہر اس گھر سے کہیں نہ جائیں۔ محسن نے اپنے ارادے سے باقی لوگوں کو بھی باخبر کردیا تھا۔ آنکھ کھلتے ہی میرے کانوں میں گل اور محسن کی آواز آئی۔

گل کہہ رہی تھی "تم نے مشورہ بھی نہیں کیا مجھ سے۔"

"یہ فیصلہ ایک الہامی کیفیت کا نتیجہ تھا۔" محسن نے کہا "ابھی غیب سے مجھے اشارہ ملا..."

"جھوٹ مت بولو۔ تم نے پہلے سے سوچ رکھا تھا۔"

محسن بولا "سوچ تو سب نے رکھا ہے لیکن باقی سب گفتار کے غازی ہیں۔ میں کردار کا غازی ہوں۔ میرے قول اور فعل میں نہ فرق ہے نہ تضاد۔"

"پھر بھی مجھے کیوں نہیں بتایا؟"

"اب زیادہ بنو نہیں۔ کیا تمہیں معلوم نہیں تھا۔" محسن نے اسے ڈانٹنا شروع کیا "ایک تو تم لڑکیوں میں بڑی بُری عادت ہوتی ہے اداکاری کرنے کی۔ سب جانتی ہیں مگر انجان بن کے آدمی کو الو بناتی ہیں۔"

"کیا مطلب ہے... کیا معلوم تھا مجھے؟"

"یہی کہ میں صرف تم سے شادی کرسکتا ہوں یا پھر الزبتھ ٹیلر سے۔ اس کا نمبر پہلے تھا مگر خیر۔"

"میں فوزیہ کے پاس جانے کے فیصلے کی بات کر رہی تھی۔"

"اچھا۔ میں سمجھا تمہیں شکایت ہے کہ تمہیں بتائے بغیر میں نے تم کو منکوحہ کے عہدے پر فائز کرنے کا اعلان کردیا ہے اس پر خفا ہو تم۔ وہاں تو مجھے جانا ہی تھا ورنہ وہ کہتی کہ مجھے تو بتا دیتے اس کلموہی کو لانے سے پہلے۔ میں تمہارے لیے چاند سی بھابی لاتی جو تمہارے لائق ہوتی۔"

"میں... میں کلموہی ہوں۔ تمہارے لائق نہیں ہوں؟" گل مشتعل ہوگئی۔

"اُفوہ! بُرا ماننے کی کون سی بات ہے۔ میں تو ایک نند کے جذبات کی ترجمانی کر رہا تھا۔" محسن نے کہا "وہ اسی قسم کے خیالات رکھتی ہیں بھابی کے بارے میں۔ جب خود زمانے کی خاک چھان کے لاتی ہیں نا... چندے کا آفتاب اور چندے کا ماہتاب قسم کی۔ تب بھی ایسا ہی کہتی ہیں بعد میں۔"

گل نے کہا "چندے کا نہیں 'چندے آفتاب۔"

"محاورے بدل گئے ہیں اب۔ تمہیں کیا معلوم۔ پہلے لوگ کہتے تھے 'پُل بنا' چاہ بنا' مسجد و تالاب بنا۔ اب مسجد بھی چندے سے بنتی ہے..."

گل ہنسی "فرض کرو میری نند نے مجھے فیل کردیا۔"

"اس کی مجال ہے" محسن بولا "میری چھوٹی بہن ہے۔ ایک جھانپڑ مار کے منوالوں گا کہ یہ مثالی بھابی ہے۔ ایک راز کی بات بتاؤں۔ تمہارے کان میں؟"

"کیا... بدتمیز' چلو پیچھے ہٹو۔"

"سب کو بتا دو گی نا" محسن بولا "خیر بتا دینا۔ سب کو پہلے ہی معلوم ہے۔ یہ اپنا چیف کے ٹو ہے نا' اس کی شادی پہلے فوزیہ سے ہونے والی تھی۔ سالا میرا سالا ہوتا۔"

میں نے چلّا کے کہا "اُلٹی کھوپڑی کے' تو سالا ہوتا میرا۔"

محسن دروازے میں نمودار ہوا "تم نے اس شخص کی اخلاقی گراوٹ دیکھی گل۔ یہ مکر کیے پڑا تھا اور ہماری پرائیویٹ باتیں سن رہا تھا۔"

میں نے کہا "میں دیکھ بھی رہا تھا۔ جب ایک بات کہی تھی تم نے گل کے کان میں۔ تمہارے کان کیوں سرخ ہو رہے ہیں گل؟"

گل دروازے کے پیچھے نظر آرہی تھی۔ وہ فوراً غائب ہوگئی۔

میں نے کہا "یہ دوسرے کمرے میں کیا کھٹ پٹ ہو رہی ہے؟"

محسن نے کہا "مزار شریف بن رہا ہے آپ کا۔ جب آدمی اتنی دیر تک سوتا رہے تو گمان یہی ہوتا ہے کہ وہ اللہ کو پیارا ہوا۔"

رابعہ نے اندر آ کے کہا "محسن! بری بات ہی کیوں نکلتی ہے تمہارے منہ سے؟"

"ابھی تو تمہیں صرف سکندر کی باتیں لگتی ہیں۔ کچھ دن بعد ہم سب زہر لگنے لگیں گے" محسن نے احتجاج کیا "ہر بیوی کو دشمنی ہوتی ہے شوہر کے دوستوں سے۔"

رابعہ مسکرانے لگی "پھر تو گل کو بھی دشمنی ہوگی سکندر سے۔"

"سکندر سے تو میری بھی دشمنی ہے" محسن بولا "صوفیہ لورین پر پہلے میں عاشق ہوا تھا۔ تاس یہ جیت گیا تھا۔"

میں نے کہا "مرزا مغلوب اور مسز غالب کہاں ہیں؟ ان کے لڑنے کی آواز نہیں آرہی ہے؟"

رابعہ ہنسی "وہ تو کب کے لڑ کے فارغ ہوئے۔ اب روٹھے پھر رہے ہیں ادھر سے اُدھر۔ تم اب ناشتا کرو گے یا لنچ؟"

"میں برنچ کروں گا۔"

رابعہ کے کچھ کہنے سے پہلے ہی ایک شخص اندر آگیا۔ وہ چھ فٹ قد کا عمر رسیدہ مگر صحت مند اور وجیہہ شخص تھا۔ اس نے بہترین سوٹ پہن رکھا تھا اور موٹے سیاہ فریم کی عینک لگا رکھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں امپورٹڈ لیدر کا بریف کیس تھا۔

اس کے یوں اندر آنے سے ہم سب ایک لمحے کے لیے خاموش ہوگئے۔ بات صرف اس کے اعتماد کی نہیں تھی، اس کی شخصیت بھی اتنی باوقار اور بارعب تھی کہ کوئی اس کو ناک کیے بغیر اندر آنے پر کچھ کہنے کی ہمت بھی نہ کرتا۔

اس نے ایک نظر مجھے' رابعہ کو اور محسن کو دیکھا "میں زیڈیو نقوی ہوں۔ آئی ہوپ کہ مجھے مزید تعارف کی ضرورت نہیں۔"

اندازہ شاید ہم سب کرچکے تھے کہ وہ صاحب خانہ اور وقار کا شہرہ آفاق 'توپ سُسر' ہے۔

محسن نے فوراً اسے ایک کرسی پیش کی۔ "تشریف رکھیے نقوی صاحب!"

"تم سکندر بخت ہو؟" اس نے بریف کیس نیچے رکھ کے کہا۔

"میں سکندر بخت ہوں" میں نے اب بستر میں بیٹھے رہنا خلافِ اخلاق جانا "یہ میرے دوست محسن خان شیروانی ہیں حالانکہ شیروانی ان کے خاندان میں کسی نے نہیں پہنی۔"

وہ میرے مذاق سے محظوظ نہیں ہوا "اور یہ لڑکی...؟"

"یہ رابعہ ہے۔ رابعہ قاری۔"

"ایڈووکیٹ ہائی کورٹ" اس نے بڑے طنزیہ لہجے میں رابعہ کو گھور کے کہا "میں بہت مایوس ہوا۔"

میں نے خوش دلی سے کہا "ہم کبھی مایوس نہیں ہوتے۔ آپ سے غائبانہ تعارف تھا' آج مل کے خوشی ہوئی۔"

نقوی صاحب نے مجھے ڈانٹنا شروع کیا "بہت بولتے ہو تم۔ بلاوجہ بولنے والے کو میں احمق سمجھتا ہوں۔"

میں نے آہستہ سے کہا "ذرّہ نوازی ہے آپ کی۔"

وہ مزید خفا ہوا "لک ہیئر مائی بوائے۔ میں بڑا روایتی قسم کا اور وضع دار آدمی ہوں۔ اپنے سے چھوٹوں کو بے تکلفی کی اجازت بالکل نہیں دیتا۔ تم وقار کے برابر ہو اس لیے مجھ سے بات کرتے ہوئے محتاط رہو۔ جوکر بننے کی کوشش مت کرو۔ آئی ہوپ کہ تم سمجھ گئے۔"

اس کے بعد تو جیسے سب کی شامت آگئی۔ توپ کا رخ پہلے میری طرف تھا۔ "تم نے یہ کیا' وہ کیا' مجھے سب معلوم ہے۔ رضوی کو بہت پریشان کیا تھا تم نے (ان کی مراد مرحوم ایس ایس پی ضامن رضوی صاحب سے تھی) وہ واحد دوست تھا میرا۔ مجھے بتاتا رہتا تھا کہ تم رابن ہڈ سکندرِ اعظم اور رستم زماں بنے پھرتے ہو۔ میں نے تو کہا تھا کہ تم کیسے پولیس افسر ہو۔ سب کو بند کردو جیل میں۔ وہاں سر منڈوادو ان کے۔ یہ داڑھی رکھیں' قرآن حفظ کریں اور پانچ سال بعد انہیں محکمۂ اوقاف کی کسی مسجد میں امام بنادو۔ سب ٹھیک ہوجائے گا..... لیکن وہ شریف آدمی تھا۔ اس نے کھلی چھٹی دی تمہیں اور قانون کے چکر میں پڑا رہا۔ میں قانون وانون کی پروا نہیں کرتا۔"

دوسرا نمبر رابعہ کا تھا "تم ایڈووکیٹ ہو۔ شیم آن یو۔ تم نے ایک آؤٹ لا کی حیثیت سے شہرت پائی۔ سوچو ذرا' تم کیا کرتی رہیں' کس کا ساتھ دیا تم نے۔ تم کو قانون کا ساتھ دینا تھا۔ تم نے اپنی گڈ ول داؤ پر لگادی اور دنیا فتح کرنے نکل کھڑی ہوئیں سکندرِ اعظم کے ساتھ۔ فتح کرلی دنیا؟"

وہ واقعی توپ قسم کی چیز تھا۔ توپ سے دنادن گولا باری ہو رہی تھی اور کسی میں ہمت نہ تھی کہ مقابلے پر ٹھہر سکے۔ رابعہ نے بھی میری طرح سمجھ لیا تھا کہ اپنا دفاع بھی فضول ہے۔ توپ خانہ اس وقت خاموش ہوگا جب اسلحہ نہیں بچے گا۔ رابعہ کے بعد غالب کی شامت آگئی۔ "تم شاعر ہو' صورت تو انتہائی غیر شاعرانہ ہے۔"

غالب نے ہمت کرکے کہا "اس لیے کہ میں شاعر نہیں صحافی ہوں۔"

"صحافی! مائی فٹ" انہوں نے پٹڑی بدل لی "کس قسم کے صحافی۔ بلیک میلنگ سے اور یلو جرنلزم سے شرفا کی پگڑیاں اچھالنے والے۔ فلم اسٹارز کے اسکینڈل بنانے والے۔ رائی کا پہاڑ بنانے والے..... اور تم کہاں چھپی کھڑی ہو لڑکی۔ ذرا سامنے آؤ میرے۔"

نازو مسکین صورت بنائے سامنے آگئی۔

"سبحان اللہ! کیا قدوقامت ہے۔ وزن کرنا ہو تو سُنار کی ترازو چاہیے مگر بنی ہوئی ہو ایٹم بم۔ دنیا میں تباہی پھیلا رکھی ہے۔ بلیک بیلٹ لڑکی تو بغیر لائسنس کے ریوالور کی طرح ہوتی ہے۔ تمہارے خاندان میں کسی نے رکھا ہے بغیر لائسنس کے ریوالور۔ تم کشتوں کے پشتے لگاتی پھر رہی ہو۔ مردوں سے ہاتھا پائی کرتی ہو۔ کیا خیال ہے' پروپوزل دے دوں کہ تمہیں اکیلے کشمیر کو فتح کرنے کے لیے بھیج دیا جائے۔"

سب کا اتنی بے عزتی کے باوجود ہنسی ضبط کرنا محال ہو رہا تھا مگر ہنسنے کا مطلب ہوتا ناقابل معافی ڈھٹائی اور گستاخی۔ ایک تو گل کو محسن نے سامنے نہیں آنے دیا' دوسرے شاید وہ گل کے پس منظر سے ناواقف تھے۔ سب سے کم قصوروار بھی محسن ثابت ہوا۔ نتیجہ یہ کہ وہ دونوں اس طوفانِ بلاخیز کی غضب ناک موجوں کے تھپیڑوں سے بچ گئے۔

ان کی آتش فشانی کے دوران ہی مجھے ان کے ... مزاج اور حاکمانہ رویے کا اندازہ ہوگیا تھا اور یہ بھی ... کہ وہ ہم سب سے اور ہمارے کارناموں سے ... اس کے باوجود انہوں نے ہمیں اپنے قصر عالیشان سے ... جیل ارسال کرنے کے احکامات جاری نہیں کیے تھے اور ... "گیٹ آؤٹ" بھی نہیں کہا تھا تو اس کا مطلب صاف ... مرحوم انکل رضوی کی طرح وہ بھی ہمیں "برداشت" کر ... فرق صرف یہ تھا کہ طبعاً رضوی صاحب نرم خو اور بردبار تھے ... نقوی صاحب گرجنے والی توپ تھے۔ رضوی صاحب کے مزاج ... تحمل تھا اور نقوی صاحب مجسم جلال تھے۔ انکل رضوی ... تھے تو نقوی صاحب آتش گیر۔

قدر مشترک صرف ایک تھی کہ ہم ان کی نظر میں "... گستاخ اور بگڑے ہوئے بچے" تھے اور اپنے بچوں کا ... نہیں ہوتا۔ ان کی پرورش میں تادیب کا انداز سب جدا رکھتے ... مگر مقصد سب کا نیک ہوتا ہے۔ اپنے اپنے طور پر سب چاہتے ... کہ بچے "سُدھر" جائیں اور جیسے سب شریفوں کی اولاد اپنے آباواجداد کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے سکھ چین کی بنسی بجاتی ہے' دودھوں نہاتی اور پوتوں پھلتی ہے' ایسے ہی ہم بھی ہوں۔ لوگ دیکھیں تو اش اش کریں اور ماں باپ کا نام اسٹریٹ لیمپ کی طرح روشن ہو۔

افسوس ناک بات یہ تھی کہ ہم کسی کی توقعات پر کبھی پورے نہیں اترے تھے اور ہم نے روایات سے انحراف کرتے ہوئے بیسویں صدی کے "اینگری ینگ مین" (ANGRY YOUNG MAN) کی طرح بزرگوں کی اقدار کو بھی پامال کردیا تھا۔ بزرگوں کی بے بسی یہی تھی کہ وہ ہمارے کردار میں یا افعال میں کوئی اخلاقی سقم تلاش کرنے سے قاصر تھے اور حقائق کی بنیاد پر یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ جو کچھ ہم نے کیا وہ غلط تھا۔ اس سے تو یہ ثابت ہوتا کہ جو ہمارے حریف کر رہے تھے وہ صحیح تھا۔ منافقت پر استوار معاشرے کی اخلاقی' مذہبی اور سیاسی قدریں تو اس نسل کے لیے باعث شرمساری تھیں جو خود کو کاروانِ آزادی کا سالار' نظریۂ پاکستان کا امین و محافظ اور ایک نئے وطن کا معمار کہتے تھے۔ سانحۂ مشرقی پاکستان نے ان کے سارے دعوؤں کی قلعی کھول دی تھی۔ فصل انہوں نے بوئی تھی جو ہم کاٹ رہے تھے۔ اس کے باوجود ہمارا یہ سوال کرنا گستاخی تھا کہ بزرگو' آپ نے کیا بویا تھا؟ بوئے تھے ببول کے تو سیب کہاں سے آئیں؟

ہم سب کی سعادت مندانہ خاموشی ان کو پسند آئی۔ انہوں نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد نازو کو مخاطب کیا "اے لڑکی! کیا نام ہے تمہارا؟ نازو۔ چائے لاؤ ہمارے لیے۔"

نازو نے سر جھکا کے کہا "جی۔"

"جی کیا۔ چائے بنانی آتی بھی ہے۔ پانی میں پتے ڈال دینے سے چائے نہیں بنتی۔ مار دھاڑ کرنا اور چیز ہے۔"

نازو نے پھر کہا "جی" اور باہر نکل گئی۔

دروازے کے پیچھے سے گل نے محسن کو اشارہ کرکے بلایا اور اس نے پیٹ پکڑ کے اٹھتے ہوئے کہا "میں ابھی حاضر ہوا۔"

انہوں نے فقط سہلایا اور مجھ سے کہا "کل کیا ہوا تھا رات کو؟"

میں نے اپنی سرگزشت انتہائی جانبداری کے ساتھ سنائی۔ اس طرح کہ خود کو صرف مظلوم ثابت کرسکوں اور یہ ظاہر ہو کہ میں خاموشی سے پٹتا رہا۔ وہ مجھے مارتے رہے اور پھر اتفاق سے فوت ہوگئے کیونکہ ان کا وقت پورا ہوچکا تھا۔

"صبح مجھے کس نے فون کیا تھا؟"

"انہی میں سے؟" میں نے نہایت احمقانہ بات کی۔

"پھر بہک گئے۔ وہ کیا جہنم سے فون کریں گے!" نقوی صاحب نے کہا "اور کوئی تھا۔ کہنے لگا کہ نقوی صاحب' آپ عزت دار آدمی ہیں۔ ذرا خیال رکھیے' آپ کی نئی کوٹھی میں کون لوگ موجود ہیں۔"

"پھر آپ نے کیا کہا؟"

میں نے کہا "یو باسٹرڈ۔ تم وہی ہونا' رات بھی تم نے فون کیا تھا کہ میری کوٹھی میں مشکوک افراد گھس گئے ہیں۔ کوئی بھی نہیں تھا وہاں۔ آخر کون ہو تم' کیا چاہتے ہو؟ وہاں اس وقت میری بیٹی ہے اور داماد ہے۔"

میں نے کہا "بالکل ٹھیک کہا تھا آپ نے۔"

"غلط کہا تھا میں نے۔" انہوں نے مجھے ڈانٹا "وقار کے ساتھ تم سب بھی تھے۔ اور اس نے ٹھیک کہا تھا کہ ان میں ایک شخص ایسا بھی ہے جو تین قتل کرکے وہاں پہنچا ہے۔"

میں نے کہا "تین..... قتل۔ وہ دیکھیے جناب....."

"میں کیا خاک دیکھوں۔ تم دیکھو کہ ابھی تک تم کو عقل نہیں آئی ہے۔ اپنے لیے ہر روز نئی مشکلات پیدا کرلیتے ہو۔"

میں نے کہا "کیا میں نے انہیں مدعو کیا تھا کہ میں حاضر ہوں' فلاں وقت مجھے قتل کرنے کی کوشش فرمائیے۔ اس میں بھی میرا قصور نظر آتا ہے آپ کو؟ یہ تو بڑی زیادتی ہے۔"

انہوں نے خلافِ توقع برا نہیں مانا "وجہ کچھ بھی ہو' آخر یہ سب تمہارے ساتھ ہی کیوں ہوتا ہے؟ صرف اس لیے کہ تم نے مصیبت سے جان چھڑانے کے بجائے انہیں پیچھے لگا رکھا ہے۔ پاگل کتا آدمی کے پیچھے پڑ جائے تو اسے پتھر مارے۔ بھگانا ٹھیک مگر اس کے ساتھ گھر تک دوڑ لگانا غلط۔ وہ تو پھر جائے گا تمہارے دروازے پر کہ جب نکلو تمہیں کاٹ لے۔"

میں نے کہا "معاف کیجیے ایسا کتا پاگل قرار نہیں دیا جاسکتا۔ وہ تو انتہائی چالاک....."

"دیکھو میاں سکندرِ اعظم! ختم کرو یہ سب چکر۔ جان چھڑاؤ اپنی پرانے جھگڑوں سے۔" انہوں نے میری بات کاٹ دی "کون لوگ ہیں اور کتنے لوگ ہیں آخر جن کے ساتھ تمہاری دشمنی کا سلسلہ چل رہا ہے؟ اور کب تک چلے گا؟ میں جاننا چاہتا ہوں کہ میری مدد سے یہ مسائل کیسے سمیٹے جاسکتے ہیں؟ ہر مسئلے کا ایک حل ہوتا ہے۔"

"میں آپ سے اتفاق نہیں کرسکتا۔ سوری۔"

وہ چونکے "واٹ نان سنس۔"

میں نے کہا "انسان کی شیطان سے ازلی وابدی دشمنی ہے۔ اس مسئلے کا آپ کیا حل نکالیں گے؟ شیطان کو اندر کرادیں گے؟"

وہ جزبز ہوکے بولے "احمقانہ بات مت کرو۔ میں انسانوں کی دنیا کے مسائل کی بات کر رہا تھا جو انسان ہی پیدا کرتے ہیں۔"

میں نے کہا "اوکے۔ مسئلہ کشمیر کیوں حل نہیں ہوتا؟"

"دیکھو' میں بتا چکا ہوں کہ فضول بات نہ میں کرتا ہوں اور نہ برداشت کرسکتا ہوں۔ میں نے صبح وقار سے بات کی تھی اور اس نے کچھ بھی نہیں بتایا۔ اس نے کہا کہ آپ براہِ راست سکندر سے بات کرلیں۔ جس شخص نے مجھے فون کیا تھا اس نے مجھے دھمکی دی کہ وہ ثبوت اور شہادت فراہم کرسکتا ہے کہ ایک شخص سکندر بخت پہلے آپ کی بیٹی کے گھر گیا۔ اس کے پاس ایک وکیل عبدالودود منظر کی گاڑی تھی اور وہ شاید نشے میں تھا۔ اس کے قابو سے باہر ہوکے گاڑی سڑک سے نیچے اتر گئی۔ تین افراد نے اس کی مدد کرنے کی کوشش کی تو اس نے تینوں کو مار مار کے ادھ موا کردیا اور پھر گاڑی لے کر فرار ہوگیا۔ جاتے وقت اس نے تینوں کے کپڑے بھی اتار لیے تھے تاکہ شناخت باقی نہ رہے۔"

"یہ جھوٹ ہے' بکواس ہے" میں نے کہا۔

"شٹ اپ۔ پہلے میری بات سنو" نقوی صاحب نے برہمی سے کہا "تمہارے انکار کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ جو کچھ اس شخص نے کہا تھا میں وہی بتا رہا ہوں۔ وہ تینوں آدمی سردی میں وہاں پڑے رہے تھے اور اتنے زخمی تھے کہ انہیں فوراً اسپتال لے جایا جاتا تو بچایا جاسکتا تھا مگر رات بھر سردی میں اکڑ کے وہ مرگئے' ان کی لاشیں پولیس کے قبضے میں ہیں۔"

میں نے کہا "پلیز نقوی صاحب! بہت سن لی میں نے آپ کی۔ جس نے بھی آپ کو فون کیا تھا اس کا نام تھا مسٹر ہمدرد۔ رائٹ!"

"ہاں۔ یہی کہا تھا اس نے۔"

"اس مسٹر ہمدرد نے آپ کو جو بھی بتایا' سب غلط ہے۔ میں بتاتا ہوں آپ کو صحیح بات۔"

نازو ایک ٹرے میں چائے اور کھانے پینے کی چیزیں رکھ کے

لائی۔

"میں صرف چائے پیوں گا۔" نقوی صاحب نے کپ لے لیا۔

"میں نے ابھی ناشتا نہیں کیا تھا" میں نے ٹرے اپنے سامنے رکھ لی "میں یہ سب کھاؤں گا۔"

انہوں نے مجھے پُرملامت نظروں سے دیکھا "یہ سب؟ ینگ مین تم کو اپنی صحت سے دشمنی ہے؟ اتنا کولسٹرول؟"

"وہ کیکر تھے۔ کیکر شاہ کے مرید" میں نے ندیدوں کی طرح لوازمات کو صاف کرتے ہوئے کہا "آپ کو معلوم ہے؟"

"معلوم ہے' معلوم ہے" انہوں نے بے زاری سے کہا "تم نہیں جانتے' وہ کتنا بڑا کیس بن گیا ہے۔ اخبارات میں اس کو کتنا اچھالا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پاکستان میں روحانیت کا اس سے بڑا مرکز کہیں نہیں تھا جسے صیہونی سازش کے تحت تباہ کرا دیا گیا....."

"پھر تو حقیقت بھی آپ کے علم میں ہوگی کہ کیکر شاہ کے مزار پر کیا ہوتا تھا؟"

"ایک کیکر شاہ کیا' س جیسے پتا نہیں کتنے فراڈ ہیں۔ معصوم اور جاہل لوگوں کو لوٹنے والے پیروں کے اڈے ہیں مگر ہم کسی ثبوت کے بغیر کوئی کارروائی نہیں کرتے۔ اور پھر یہ مسئلہ ہوتا ہے جذبات کا۔ حکومت کو کیا ضرورت ہے کہ اہم مسائل کو چھوڑ کر ان ڈبا پیروں کے چکر میں پڑے۔ لاکھوں پاگل قسم کے FANATICS شورش برپا کردیں گے' جہنم میں جائیں سب۔"

میں نے کہا "مجھ پر حملہ کرنے والے کیکر تھے۔ ان کا خیال ہے کہ کیکر شاہ کے مزار کو تباہ کرنے والا میں ہوں۔ کیا اخبارات میں یہ بھی شائع ہوا ہے؟"

"آف کورس۔ انہوں نے تو ایک ہنگامہ کھڑا کردیا تھا۔ آئی جی سے اور حکومت سے مطالبہ کرنے کے لیے اس علاقے میں احتجاج کا پورا ڈراما چل رہا تھا کہ تمہیں گرفتار کرکے عبرت ناک سزا دی جائے۔"

"صرف مجھے؟ اکبر خان کا کسی نے نام نہیں لیا؟"

"کون اکبر خان؟ وہ اسمگلر!"

"جی۔ سب کچھ اسی نے تو کیا تھا۔ میرے کندھے پر رکھ کے بندوق چلائی تھی اس نے۔ خلیفہ کیکر اور وہ بزنس پارٹنر تھے۔ کسی بات پر اختلاف ہوا ہوگا۔ اکبر خان نے اپنی طاقت کا مظاہرہ کیا۔ کیکر شاہ کی درگاہ کو تباہ کرا دیا۔ میرا خیال ہے' اس کا اصل مقصد کچھ اور تھا۔ وہ اپنا اڈا ختم کرنا چاہتا ہوگا۔ خلیفہ کیکر کے ساتھ کسی قسم کے غیر قانونی دھندے میں ملوث ہونے کے تمام ثبوت مٹانا چاہتا ہوگا۔ بعد میں خلیفہ کیکر نے بھی مجھے قربانی کا بکرا بنا لیا۔ اکبر خان کا نام لینے کی ہمت نہیں پڑی۔"

"وہ رپورٹ میں نے دیکھی ہے۔ ایک خفیہ ایجنسی نے ساری انفارمیشن دے دی تھی" نقوی صاحب نے کہا "خلیفہ کے خلاف ٹھوس ثبوت مل گئے ہیں اور اسے بہت جلد گرفتار کرلیا جائے گا..... لیکن اکبر خان کے خلاف کچھ نہیں ہے۔"

"ہو بھی نہیں سکتا تھا" میں نے تلخی سے کہا "اکبر خان کی طاقت آپ کی خفیہ ایجنسی کے اختیارات سے زیادہ ہوگی۔ وہ معزز آدمی ہے اور ملک کا قانون اس پر کیسے ہاتھ ڈال سکتا ہے۔"

"ایسے تو بہت لوگ ہیں" نقوی صاحب نے بے بسی سے کہا "لیکن میں نے سوچا تھا کہ تم کو ٹارگٹ نہیں بننے دوں گا۔ وقار نے مجھے بتایا تھا کہ تم کو بہت سے معاملات میں بلاوجہ ملوث کیا جارہا ہے۔ میں نے کہا کہ بلاوجہ کوئی تمہیں کیوں ملوث نہیں کرتا۔ اس شہر میں لاکھوں لوگ رہتے ہیں۔ ان کو INVOLVE کیوں نہیں کیا جاتا؟ ظاہر ہے تم بھی ایک وجہ ہو۔ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔"

پھر وقار نے کچھ بتایا آپ کو..... آپ نے یقین کیا؟"

"میرے یقین کی بات نہیں۔ میں بلیک میل ہوگیا۔"

"آپ جیسے لوگ بھی بلیک میل ہوجاتے ہیں!" میں نے طنزا کہا۔

"ہاں۔ تم تو خیر ابھی بچے ہو۔ ان باتوں کو سمجھے بغیر مذاق اڑانا تمہارے لیے بہت آسان ہے۔ بیوی کبھی مجھ سے کوئی ناجائز بات نہیں منوا سکی۔ میں نے اپنے کام میں اسے کبھی دخل نہیں دینے دیا اور اس کے کام میں مداخلت نہیں کی۔ بیٹا ہوتا تو میں اسے عاق کردیتا' گھر سے نکال دیتا اگر وہ مجھے بلیک میل کرتا مگر معاملہ تھا بیٹی کا۔ جب تم باپ بنو گے اور تمہاری ایک ہی بیٹی ہوگی۔ تو شاید تم سمجھ سکو گے۔"

"میں یقین دلا سکتا ہوں آپ کو جناب کہ بیٹی نے آپ کو بلیک میل نہیں کیا ہوگا۔ اس نے آپ کو مجبور کیا ہوگا کہ آپ حقیقت کو تسلیم کرلیں۔ اس نے سچ بولا ہوگا۔ آپ کے لیے وہ سچ شاید جھوٹ ہوگا۔"

"چھوڑو یہ بات۔ میں چاہتا تھا کہ تمہارے مسائل ختم کرادوں۔ جو بھی تمہارا دشمن ہے اسے تمہارے سامنے بٹھا کے سمجھاؤں کہ معاملات تمہاری مرضی کے مطابق طے کرلے ورنہ پھر میں اس سے نمٹ لوں گا اپنے طور پر۔ حکومت کی طاقت سے کوئی ٹکر نہیں لے سکتا" نقوی صاحب نے چٹکی بجاکے کہا "یہ چوہدری دلاور I CAN FINISH HIM LIKE THAT (میں اسے یوں ختم کرسکتا ہوں)

"نقوی صاحب! بعض اوقات ساحل سے طوفان کی شدت کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا۔"

"تمہارا مطلب ہے مجھے خوش فہمی ہے۔" نقوی صاحب بگڑے "یہ بات نہیں سکندرِ اعظم۔ کچھ کام مشکل ہوتے ہیں' ہم مشکل میں ڈال دیتے ہیں..... اور یہاں مسئلہ ایسا ہی ہے کہ تم نے رضوی صاحب کو بھی مشکل میں ڈال دیا تھا۔ اب وہی صورت حال مجھے درپیش ہے۔ کوئی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ میں ان کیکروں کا ایک ایک کانٹا چن چن کر ختم کرا سکتا تھا۔ چوہدری دلاور اگر پتھر کی دیوار ہے تو میں اسے جھکا سکتا تھا' گرا سکتا تھا لیکن اب میں کیا کروں! ادھر بیٹی ہے کہ پاپا' آپ نے کچھ نہ کیا تو میں کچھ کر بیٹھوں گی۔ بے وقوف لڑکی۔ کچھ سننے کو تیار نہیں۔ بتاؤ اس سب کی موجودگی میں پاپا کیا کرے!"

انہوں نے میرے سامنے ایک لفافہ ڈال دیا۔ میں نے اس میں سے آٹھ تصویریں نکالیں۔ یہ تصویریں انفراریڈ کیمرے سے اتاری گئی تھیں یعنی اس کیمرے سے جو اندھیرے میں دیکھ سکتا ہے۔ تصویریں اتارنے والا فنکار تھا۔ ایک تصویر میں میری گاڑی سڑک چھوڑ کے نیچے ٹیلی فون کے پول کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس میں وہ رسّہ نظر نہیں آتا تھا جو سڑک پر میری گاڑی روکنے کے لیے باندھا گیا تھا۔ دوسری تصویر میں مجھے بڑے جارحانہ انداز میں گاڑی سے نکلتے دکھایا گیا تھا۔ تین تصویروں میں مجھے دیوانوں کی طرح سریے کی مدد سے وار کرتا دکھایا تھا مگر میں جس پر حملہ کررہا تھا اس کی صرف پشت نظر آتی تھی اور یہ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ شخص سر سے کفن باندھے ہوئے ہے۔ ایک تصویر میں کوئی شخص لاش کے کپڑے اتار رہا تھا۔ وہ میں نہیں تھا مگر یہ ثابت کرنا بھی اتنا ہی مشکل تھا کہ میں نہیں ہوں۔ آخری تصویر میں تین لاشیں سڑک پر پڑی تھیں۔ رسّہ غائب تھا اور میری کار پس منظر میں غائب ہو رہی تھی۔

"ویری گڈ۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ شوٹنگ بہت ہوشیاری سے کی گئی اور فوٹوگرافر یقیناً اپنے فن کا ماہر تھا" میں نے کہا "ان سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ میں نے واقعی ان تینوں کو مارا اور پھر کپڑے اتار کے سڑک پر ڈال دیا۔"

"اور کیا ثابت نہیں ہوتا" نقوی صاحب نے ایک سگار کوٹ کی اوپر والی جیب سے نکالا جس کو میں پین سمجھ رہا تھا۔

"یہ فوٹوگرافر ایک انفراریڈ کیمرے کے ساتھ جائے واردات پر کیسے موجود تھا؟" میں نے کہا اور تصویریں غالب کو دے دیں۔

نقوی صاحب نے پین جیسے کور کو توڑ کے اندر سے سگار نکالا "وہ انہی کے ساتھ تھا۔"

"اور میں نے اسے بخش دیا تاکہ وہ پورے واقعے کی منظر کشی کرسکے؟" میں نے تلخی سے کہا۔

"فرض کرو' وہ فرار ہو کے چھپنے میں کامیاب ہوگیا تھا؟" نقوی صاحب نے سگار کا کونا کاٹنا شروع کیا۔

"وہ یقیناً کوئی مشہور فوٹوگرافر ہوگا۔ ہر فوٹوگرافر کے پاس اندھیرے میں تصویریں اتارنے والا کیمرہ نہیں ہوتا۔" میں نے کہا "وہ یقیناً بتا سکتا ہے کہ باقی تین کون تھے جو میرے ہاتھوں مارے گئے؟"

"بتا دے گا اگر ضرورت پڑی۔"

"کیوں نہیں بتائے گا۔ ظاہر ہے وہ اس کے دوست' شناسا ہوں گے ورنہ وہ ان کے ساتھ کیوں تھا۔ آدھی رات کے وقت اسے کسی آوازِ غیب نے تو نہیں کہا تھا کہ فلاں مقام پر ایک ماردھاڑ سے بھرپور واقعہ پیش آنے والا ہے۔ تم آدھی رات کے وقت وہاں پہنچ جاؤ تو بڑی نایاب تصاویر اتار سکتے ہو۔ ان تصاویر کی مدد سے خاصی دولت بھی کما سکتے ہو۔"

"سکندر! وہ کون تھا' وہاں کیا کررہا تھا اور کیسے پہنچا تھا' یہ سب معلوم ہونے یا معلوم نہ ہونے سے فرق نہیں پڑتا۔" نقوی صاحب نے سگار کو جلانے کا عمل شروع کیا "فرق پڑتا ہے تمہیں۔ تمہارے خلاف یہ ثبوت کافی ہے۔ اس کے علاوہ مجھے فون کرنے والے نے ایک اور بات بتائی تھی۔ اس سارے واقعے کا ایک چشم دید گواہ بھی ہے۔"

"وہ کون ہے؟" میں نے کہا۔

"وہ اپنی فیملی کے ساتھ گزرا تھا وہاں سے۔ ایک ایس ڈی او ہے۔ اس نے فیملی ساتھ ہونے کی وجہ سے اس وقت کچھ نہیں کیا تھا۔ خاموشی سے چلا گیا تھا۔ مجھے فون کرنے والے نے کہا کہ نقوی صاحب' فلاں ایس ڈی او سے بھی بات کرلیں۔"

"پھر آپ نے فون کیا؟"

"ہاں۔ اور اس نے تصدیق کی۔ لفظ بہ لفظ وہی بتایا جس کی تصویروں سے گواہی ملتی ہے۔ اس نے گاڑی کا نمبر بھی بتایا اور تمہارا حُلیہ بھی۔ میں نے اسے بلالیا اور اسے یہ تصویریں دکھائیں۔ اس نے تمہیں شناخت بھی کرلیا تھا۔"

"ابھی تک آپ نے یہ نہیں بتایا کہ فون تو کسی نے صبح کیا تھا' تصویریں آپ کو کس نے فراہم کی تھیں اور کب؟"

"اس نے کہا تھا کہ تصویریں لیٹر بکس سے نکال لیں۔ یہ شاید نو بج کر دس منٹ کی بات ہے۔ سوا نو بجے میں نے لفافہ خود نکالا۔ ایس ڈی او بہت پریشان تھا کہ وہ تصویریں میرے پاس کیسے آئیں۔ میں نے اسے سمجھایا کہ یہ بلیک میلنگ کا مسئلہ ہے۔ تم خاموش ہی رہو تو بہتر ہے۔"

"اور آپ کو یقین ہے کہ وہ آپ کی بات مانے گا۔ ان کی بات نہیں مانے گا جنہوں نے یہ جال پھیلایا تھا اور اسے بطورِ خاص چشم دید گواہ بنا کے بھیجا تھا۔"

"ایسی کوئی بات نہیں' وہ اپنی فیملی کے ساتھ ایک شادی سے لوٹ رہا تھا۔"

"گویا چشم دید گواہ کی سہولت کے مطابق سب ہوگیا۔"

"یہ کیسی بے وقوفی کی بات ہے۔ کیا کسی کو اندازہ ہوسکتا تھا کہ تم وہاں کتنے بجے پہنچو گے؟ اور شادی سے اس کی واپسی کتنے بجے ہوگی کہ چند منٹ کا بھی فرق نہ ہو تاکہ وہ سب دیکھ سکے۔"

"پھر فون کرنے والے نے اسے کیسے دریافت کرلیا؟ آدھی رات کے وقت وہ وہاں سے گزرا جب اسے کوئی بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ میرے سوا یا اس فوٹوگرافر کے سوا جس نے بقول آپ کے جان بچائی اور میری قل آف ایکشن تصاویر بنالیں۔ کیا اس نے گواہ کی کوئی تصویر نہیں بنائی تھی؟ ایس ڈی او تو پتا نہیں کتنے محکموں میں ہوتے ہیں۔ پی ڈبلیو ڈی میں، ٹیلی فون کے محکمے میں۔ اس کے علاوہ اور بھی پتا نہیں کہاں کہاں.... انہوں نے صبح تک کیسے پتا چلالیا کہ وہ کس محکمے کا ایس ڈی او تھا؟ اس سے تصدیق بھی کرلی کہ وہ عینی گواہ ہے اور یہ یقین دہانی بھی حاصل کرلی کہ وقتِ ضرورت سب بتادے گا۔ اس کا فون نمبر راتوں رات انہوں نے کیسے حاصل کرلیا جو اُن کے کہنے کے مطابق اتفاقیہ وہاں سے گزر رہا تھا اور ایک شادی سے لوٹ رہا تھا؟ اتنی جلدی آپ معلوم کرسکتے ہیں کہ کل رات بارہ بج کر دس منٹ پر جب فلاں جگہ ایک واردات ہوئی تھی تو وہاں سے کار میں کون گزرا تھا؟"

نقوی صاحب سوچ میں پڑگئے۔ "یہ تو ہے سوچنے کی بات۔"

"صیاد بعض اوقات خود اپنے جال میں گرفتار ہوجاتا ہے۔" میں نے کہا "آپ اسی ایس ڈی او کو پھر بلائیں۔ اس کا بیان ریکارڈ کریں۔ اس طرح کہ اسے معلوم نہ ہو۔ یہ بندوبست میں کرلوں گا۔ جب وہ ساری بات بتا چکے تو اس سے کہیں کہ اب سچ سچ بتادو، کتنے پیسے ملے ہیں یہ بیان دینے کے اور کس نے دیے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ کسی ایس ڈی او جیسے معمولی سرکاری افسر سے سچ تو اگلوا ہی سکتے ہیں۔"

"لیس۔ یہ میں کرسکتا ہوں۔ اور کروں گا۔ میں تمہاری ذہانت کی داد نہ دوں تو یقیناً زیادتی ہوگی۔"

"تھینک یو سر۔ اس کے علاوہ... مجھے یقین ہے کہ مسٹر ہمدرد آپ کو پھر فون کریں گے۔ اپنے فون کو آبزرویشن پر رکھوائیں تاکہ یہ پتا چلے کہ کسی نے کہاں سے فون کیا تھا۔ زیادہ امید تو یہی ہے کہ گمنام کال کسی پبلک کال آفس سے کی گئی ہوگی۔ پھر بھی آپ یہ چانس لیں۔ اس کا پیغام ریکارڈ کریں۔ میں آواز سن کے شاید بتا سکوں۔ مسٹر ہمدرد بڑی ہوشیاری سے قدم بڑھا رہے ہیں۔ مرحلہ وار۔ پہلے انہوں نے مجھے ٹریپ کیا۔ میں ان کے بچھائے ہوئے جال میں پھنس گیا۔ میری یہ تصاویر اتارلی گئیں۔ آپ کی بیٹی کے گھر فون کرنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ انہیں وہاں سے رخصت کردیا جائے۔ سب کو، اور جب ان کے گھر سے چند قدم کے فاصلے پر یہ واردات ہو تو میری مدد کے لیے کوئی نہ آسکے۔ آپ کے داماد کا نیا گھر اتنی آباد جگہ نہیں ہے ابھی۔ پھر یہ کہ میرا وہاں جانا تو طے تھا۔"

وہ اٹھ کھڑے ہوئے "اوکے۔ آج شام کسی وقت میں پھر بلاتا ہوں اسی ایس ڈی او کو۔ یا کل صبح۔"

"کہاں بلائیں گے آپ.... یہاں؟"

"یہاں بلایا جاسکتا ہے اسے لیکن میرا آفس محفوظ جگہ ہے۔ اگر وہ عینی گواہ کسی کا خاص آدمی تھا تو معلوم ہو جائے گا.... فی الحال تم اپنی سرگرمیاں محدود کردو۔ اس گھر سے باہر نکلنے کی ضرورت نہیں۔"

"آپ میری نظربندی کے احکامات جاری کررہے ہیں؟" میں نے کہا۔

"یہی سمجھ لو۔ تم بہت خطرے میں ہو۔ پہلے مجھے اتنی مہلت دو کہ میں اپنے طور پر تھوڑی سی تفتیش کرالوں۔ خلیفہ کیکر کا معاملہ اخبارات کی حد تک دب گیا ہے۔ ایک انکوائری کمیشن بنایا گیا ہے، خصوصی تحقیقاتی ٹیم تشکیل دی گئی ہے اور یہ سب حربے ہوتے ہیں کسی معاملے کو سرد خانے میں ڈالنے کے۔ ہم خلیفہ کی نگرانی کررہے ہیں اور اسے ایک پیغام دیا گیا ہے کہ وہ "تعاون" کرے بصورتِ دیگر ہماری تفتیش کے نتیجے میں معلوم ہوگا کہ وہاں زیرِ زمین اسلحہ خانہ تھا جس میں شارٹ سرکٹ ہونے سے آگ لگ گئی اور خلیفہ کیا بتائے گا کہ کیکر شاہ کے مزار کے زیریں حصے میں یہ اسلحہ کس مقصد کے لیے جمع کیا گیا تھا۔ وہ بھی ادھر اُدھر ہاتھ پاؤں مار رہا ہے مگر اس کی رسائی ضلعے کی سطح پر اعلیٰ افسران تک ہے، چند صوبائی افسران بھی ہیں۔ اسے ہم گھیرلیں گے۔ یا تو وہ تردید کرے گا کہ یہ حادثہ تھا اور بدخواہوں نے اس سے غلط بیان منسوب کردیا۔ وہ اپنے کیکروں کو صبر سے کام لینے کی ہدایت دے گا ورنہ انکوائری ہوگی۔ اس نے پھر وہیں ڈیرا جمالیا ہے۔ میرا خیال ہے وہ تعاون کرے گا۔ آج میں معلوم کراتا ہوں کہ مرنے والے کیکر تھے یا نہیں؟"

"وہ کیکر تھے سر۔ اور انہیں بھی بے وقوف بنا کے مرنے کے لیے بھیجا گیا ہوگا۔ خلیفہ کے کچھ خصوصی معاون ہیں۔ وہ ان کی شناخت میں مددگار ثابت ہوسکتے ہیں۔"

نقوی صاحب نے سر ہلایا "ایک وعدہ معاف گواہ بنالیا ہے ہم نے اور اس نے خاصے انکشافات کیے ہیں۔"

"میں بہت تقویت محسوس کررہا ہوں۔ آپ بارسوخ آدمی ہیں۔ میں کسی تعلق کی بنا پر آپ سے کوئی خصوصی رعایت نہیں مانگتا مگر پلیز آپ سچ کو ضرور تسلیم کریں۔ میں آپ سے جھوٹ بول سکتا ہوں اور نہ باقی لوگ۔ ہم بھی تو اصول پرستی کے چکر میں ذلیل و خوار پھر رہے ہیں۔"

"میری بات سنی تم نے۔ جب تک میں نہ کہوں، یہاں سے مت نکلو۔ کل تک میں بہرحال رابطہ قائم کروں گا۔" انہوں نے دسویں بار سگار جلایا "ایک بات اور ہے۔ ان لاشوں کا پوسٹ مارٹم ہوگا۔ اگر تمہاری ان سے دست بدست جنگ ہوئی تھی تو میڈیکو لیگل رپورٹ میں بہت کچھ ہوگا جو تمہارے خلاف استعمال ہوسکے۔ ان کے ناخنوں میں تمہارے بال یا کھال کے ریشے اور فنگر پرنٹس، اور بہت سے لیبارٹری ٹیسٹ ہیں تمہارے اور ان کے درمیان تصادم کو ثابت کرنے کے لیے۔ اب میں چلتا ہوں۔ ذرا شرافت سے رہو تم لوگ۔ اوکے.... اور لڑکی... چائے بنا سکتی ہو تم اچھی چائے تھی۔"

نازو نے مسکراہٹ کو دبا کے کہا "تھینک یو انکل۔"

"ڈونٹ مائنڈ۔ میں ذرا اپ سیٹ تھا۔ کچھ زیادہ ہی کہہ دیا تم سب سے" انہوں نے پہلی بار مسکرانے کی کوشش کی۔

"آپ اس سے بھی زیادہ کہہ سکتے ہیں انکل۔" غالب نے کہا "آپ بڑے ہیں اور ہم بچے۔"

میں نے کہا "اور آپ فخر کرسکتے ہیں اپنی بیٹی پر۔ وہ بلیک میل نہیں کررہی ہے آپ کو۔ وہ جانتی ہے اس لیے...."

میری بات سُنے بغیر انہوں نے سر ہلایا اور باہر نکل گئے۔ میں نے کھڑکی سے جھانک کے دیکھا۔ ایک عالی شان لمبی سیاہ گاڑی دھوپ میں لشکارے مار رہی تھی اور ایک سفید وردی والا شوفر اس کے قریب بالکل اٹن شن کھڑا ہوا تھا۔

غالب نے ایک گہری سانس لی "اُف... رسیدہ بود بلائے۔"

میں نے کہا "ولے بخیر گزشت۔ کیا چیز ہے وقار یوسف کا سُسر بھی۔ پتا نہیں ان کی آپس میں کیسے بنتی ہوگی۔"

"آدمی دل کا برا نہیں۔ ذرا گورا شاہی مزاج ہے اور حاکمیت کا غرور ہے۔ وقار یوسف تو بیوی کو ڈھال بنا کے رکھتا ہے۔ اسے کس بات کا ڈر" غالب نے کہا۔

نازو بولی "میں تو واقعی رعب میں آگئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ بات کی تو چانٹا ماردیں گے۔"

"جی جی کے سوا آواز نہیں نکل رہی تھی حلق سے" غالب بولا۔

دروازے کی اوٹ سے محسن نے جھانکا "توپ خانہ گیا؟"

میں نے ہنس کے کہا "تم تو صاف بچ گئے۔"

"شریف آدمی ہوں۔ ریکارڈ بالکل صاف ہے میرا" محسن بولا "واللہ لطف آگیا۔ کیا باری باری شامت آئی تم سب کی۔"

گل اندر آکے ہنسنے لگی "میں تو باہر تھی ورنہ میری باری بھی آتی۔"

"میں بھی اسی لیے بھاگ گیا کہ ان کا کیا بھروسہ، سامنے رہتا تو کچھ سننی پڑے گی" محسن ہنسا "میں نے تو بڑی مشکل سے ہنسی کو ضبط کیا۔ ذرا سوچو کیا مشورہ دیا تھا موصوف نے انکل رضوی کو۔"

غالب نے قہقہہ مارا "محکمۂ اوقاف کی مسجد میں امام۔"

نازو بھی ہنسنے لگی "کیا جھاڑ لگائی رابعہ باجی کو۔ آؤٹ لا کہہ دیا۔"

محسن بولا "اور اس کے بارے میں تو خیر بالکل ٹھیک رائے دی کہ ساری صحافت دھری کی دھری رہ گئی۔"

غالب نے جھینپ کے کہا "مجھے تو مزہ آیا۔ جب نازو کو ڈانٹ پڑی۔ بغیر لائسنس کا ریوالور۔ مردوں سے ہاتھا پائی کرتی ہو۔ کشمیر فتح کرنے بھیج دیں۔"

نازو نے کہا "اس کے سامنے بولتے نا۔ اس وقت تو گھگھی بندھ گئی تھی.... آخر سکندر نے بات تو کی۔"

میں نے کہا "چلو اچھا ہوا کوئی تو بولا۔ میں بھی خاموش رہتا تو سارا معاملہ چوپٹ ہوجاتا۔ میں نے قائل کرلیا ہے اسے کہ ہم سازش کا شکار ہوئے ہیں اور بہت بڑا سہارا حاصل ہوگیا ہے ہمیں۔"

"کیا یہ شخص واقعی دلاور کو یوں ختم کرسکتا ہے؟" محسن نے چٹکی بجائی۔

"کیا پتا۔ اس نے دلاور کا نام ہی سنا ہے، ابھی اسے چوہدری دلاور اینڈ کمپنی سے براہِ راست واسطہ نہیں پڑا۔" میں نے کہا "وہ کیکر شاہ کیس ختم کرادے، یہی بہت ہے۔"

محسن بولا "برادرانِ اسلام! میں تو آج جارہا ہوں جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں۔"

رابعہ نے کہا "تمہارے حق میں یہی بہتر ہے۔"

"مجھے امید ہے کہ جب ہم واپس آئیں گے تو آپ سب لوگ زندہ سلامت اور ایسے ہی لاوارث پھر رہے ہوں گے۔" محسن بولا۔

غالب نے کہا "اس کو دوستی کہتے ہیں! شرم آنی چاہیے تم کو۔ ہم ہیں دربدر اور تم کو خانہ آبادی کی سوجھ رہی ہے۔"

"سب نصیب کے کھیل ہیں اور اعمال کی بات ہے" گل کے کھسکتے ہی محسن نے دانت نکال کے کہا "تمہیں کوئی گھاس نہ ڈالے تو میں کیا کرسکتا ہوں۔"

"میں گدھا نہیں ہوں کہ مجھے گھاس ڈالے کوئی۔ نہ میں گھاس کھاتا ہوں۔"

"تم مار کھاتے ہو۔ اس سے بہتر تھا، تم گدھے ہوتے اور گھاس کھاتے" محسن بولا "تمہارے نصیب میں ذلت ہے دوست۔"

رابعہ نے کہا "سچ محسن! تم ایسے خاموشی سے، ہماری شرکت کے بغیر شادی کرلوگے؟"

محسن بولا "میری طرف سے دعوتِ عام ہے، آجاؤ اپنا اپنا کھانا لے کر اور میرے باراتی کہلانے کا اعزاز مفت میں حاصل کرو۔"

"مجھے تو نظربند کردیا گیا ہے ورنہ میں چلتا" میں نے کہا "اور ابھی معاملات ایسے ہیں کہ میں رسک نہیں لے سکتا۔"

غالب نے کہا "مجھے بھی اخبار کا معاملہ سیٹ کرنا تھا۔ شام کو اکبر خان سے میٹنگ ہے۔ اگلے چند دن بے حد مصروفیت کے ہوں گے۔ وِش یو گڈ لک۔"

رابعہ نے بھی کہا "خدا کرے فوزیہ ٹھیک ہوجائے۔"

میں نے چونک کے کہا "فوزیہ کو کیا ہوا ہے؟"

رابعہ نے حیرانی سے مجھے دیکھا "تمہیں نہیں بتایا محسن نے؟"
محسن نے شرمندگی سے کہا "وہ دراصل مجھے بھی منظر نے بتایا تھا کہ اس کے شوہر کا پیغام ملا تھا۔ مہینہ بھر پہلے۔"
"اس کا شوہر غالباً لیکچرر ہے۔"
"ہاں۔ اس نے کہا تھا کہ فوزیہ مجھے دیکھنا چاہتی ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ مرنے سے پہلے ایک بار میں اس سے ملوں" محسن بولا "یا تو اس کے شوہر نے بات چھپائی اور یہ کہا کہ ایسی کوئی خاص بیماری نہیں یا واقعی فوزیہ نے ایک جذباتی بات کی۔ جیسی کہ عورتیں عام طور پر کرتی ہیں۔"
رابعہ بولی "پھر تم نے معلوم کرلیا ہوتا۔"
"کہاں سے معلوم کرتا اور کیسے؟" محسن نے کہا "پیغام مجھے واپس لاہور پہنچنے کے بعد ملا تھا۔"
"یعنی کل؟" میں نے کہا۔
اس نے اقرار میں سرہلایا "میں نے سوچا کہ فون کرنے سے بہتر ہے میں خود چلا جاؤں۔ گل نے کہا کہ میں بھی چلوں گی۔"
"اس کے بعد تم نے شادی کا فیصلہ کرلیا۔"
"یار، میں بڑی عجیب سی کیفیت کا شکار ہوں۔" محسن بولا "یہ خبر ملنے کے بعد میرے دل کو سکون حاصل نہیں رہا۔ چھٹی حس کہوں اسے یا کچھ اور۔ مجھے ایک ڈر ہے، تشویش لاحق ہے کہ بات اس سے کہیں زیادہ سیریس ہوگی جتنی فوزیہ کے شوہر نے بتائی۔ بیماری میں اس نے پہلے تو کبھی فون نہیں کیا۔ بیماری اگر معمولی ہوتی تو منظر کو فون کرکے میرا پتا پوچھنے اور میرا پیغام دینے کی ضرورت نہ ہوتی.... اور پھر میں فوزیہ کو جانتا ہوں وہ ایسی عورت نہیں جو ذرا سی بات پر گھبرا جائے۔ فوزیہ کے شوہر نے بیماری کی نوعیت چھپا کے زیادہ شکوک پیدا کردیے ہیں۔ وہ کہہ سکتا تھا کہ یرقان ہے' ٹائیفائڈ ہے یا ٹی بی ہے۔ یہ سب واقعی امراض ہیں اور ان میں پیچیدگی مسائل پیدا کرسکتی ہے لیکن یہ قابلِ علاج ہیں۔ میں رات بھر سوچتا رہا۔ کہیں اسے گردے کی تکلیف تو نہیں' ہارٹ پرابلم تو نہیں۔ لیور ایبسس تو نہیں۔ یہ بھی خطرناک بیماریاں ہیں۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ مجھے کینسر کا بھی خیال آیا۔ میری ماں کا اسی بیماری میں انتقال ہوا تھا۔ کینسر موروثی نہیں ہوتا۔ سب سے بہتر ہے کہ میں جاکے دیکھ لوں۔"
"تم کو اتنی دیر بھی نہیں کرنی چاہیے تھی" رابعہ نے کہا۔
میں نے اس کی تائید کی "تم صبح ہی نکل جاتے تو اب تک پہنچ گئے ہوتے۔ خیر اب جاؤ۔"
"جاتا ہوں۔ مجھے کون سی تیاری کرنی ہے" محسن نے کہا۔
میں نے کہا "رابعہ جہاں میں سویا تھا' وہیں تکیے کے پاس ایک بیگ رکھا ہے اس میں پیسے ہیں۔"
"مجھے پیسے نہیں چاہئیں" محسن بولا۔
میں نے کہا "خرچ نہ ہوں تو واپس لے آنا مگر خالی ہاتھ مت جاؤ۔ کیا پتا کہاں ضرورت پڑجائے۔ کیا بہن کے شوہر سے مانگوگے؟"
غالب نے کہا "آخر شادی کا خرچ بھی ہوگا۔"
محسن بولا "یار، تم لوگ یہ مت سمجھنا کہ مجھے ... تھی۔ ابھی یہ کوئی قطعی فیصلہ بھی نہیں ہے لیکن رہ رہ کے ایک خیال آتا ہے کہ خدانخواستہ ایسی ویسی صورت حال ہوئی تو فوزیہ سے اس کی زندگی میں صرف ملوں گا ہی نہیں۔ اس سے پہلے جب میری شادی شہلا سے ہوئی تو اسے اطلاع دینے تک کی نوبت نہیں آئی تھی۔ شہلا کے بیٹا ہوا پھر خدا نے انہیں اپنے پاس بلالیا۔ فوزیہ کو کچھ بھی نہیں معلوم۔ نالائق ہے نا میری۔ ایک ... ہے اسے میں نے بھلائے رکھا۔ کبھی اس کی خوشی کے لیے ... کیا۔ شاید اس طرح وہ خوش ہوجائے۔"
اس نے آنکھوں سے بہہ نکلنے والے آنسو آستین سے صاف کرلیے۔ اچانک وہ بے حد دکھی اور رنجیدہ ہوگیا تھا۔ ہم سب محسن کے غم اور ملال' احساسِ پشیمانی اور دکھ کو اس کے ساتھ جھیل رہے تھے اور سب سے زیادہ میں خود کو مجرم محسوس کرتا تھا جس نے فوزیہ کو اپنی محبت کا یقین دلایا اور پھر اسے یوں بھلا دیا جیسے وہ سب نقشِ خیال تھا یا فریبِ آرزو کی بات تھی۔ فوزیہ اور محسن کو میں نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے ساتھ دیکھا تھا اور شاید یہ رفاقت کے قرب کا نتیجہ تھا اور جوانی کے جذبات کی پہلی یلغار تھی جس میں سب سے قریب فوزیہ کو پاکے میں اس سے محبت کرنے لگا تھا۔ ایک حقیقت ہے کہ میں نے محبت کی تھی، مجھے اس سے محبت ہوئی نہیں تھی۔ جیسے رابعہ سے ہوگئی تھی۔ بچپن سے جوانی تک طویل جدائی کے دور میں مجھے اس کا احساس کبھی نہیں ہوا تھا مگر برسوں بعد وہ ملی تو نوشتۂ تقدیر ہوکے رہا۔ نہ اس میں میری کوشش کا دخل تھا نہ خواہش کا۔ اس کے لیے ایک وقت مقرر تھا اور دستِ قدرت نے جس کے تصرف و اختیار میں گردشِ حالات و کائنات ہے، اس مقررہ لمحے میں مختلف سمتوں سے لاکے مجھے اور رابعہ کو یکجا کردیا اور اسی لمحے کا فیصلہ اٹل ہوا۔
کسی رسمی اعلان کے بغیر بھی یہ تسلیم کرلیا گیا تھا کہ میرا اور فوزیہ کا ساتھ تمام عمر کا ہوگا چنانچہ میرے انکار کا سب سے زیادہ شدید جذباتی صدمہ تو خود فوزیہ نے اٹھایا مگر اس کے والدین کو بھی افسوس اور مایوسی ہوئی۔ میں اور محسن پیدائش کے وقت سے دوست تھے مگر اس سے پہلے ہمارے والدین دوست تھے۔ میں نے منافقت سے کام لیے بغیر محسن کو بتادیا کہ میں کیوں مجبور ہوں اور محسن نے میری بات اس لیے سمجھ لی کہ وہ مجھے سمجھتا تھا۔ مرتے وقت محسن کی ماں نے بھی مجھے معاف کردیا تھا۔ محسن کے والد شیروانی صاحب نے تو اس موضوع پر مجھ سے کبھی بات بھی نہیں کی تھی مگر مجھے یقین تھا کہ میرے والد.... مرحوم وزیر خاں زندہ ہوتے تو شاید مجھے معاف نہ کرتے۔

آج بھی میں خود کو مجرم محسوس کررہا تھا کیونکہ وہ حالات میرے ہی پیدا کردہ تھے جن کی وجہ سے محسن کو شادی کے بعد بہن سے ملنے کی فرصت نہ ملی۔ ماں کے بعد محبت کا بے غرض اور پُر تقدس رشتہ صرف بہن کا ہوسکتا ہے لیکن محسن نے اس رشتے کو یاد نہیں رکھا تھا اور آج احساسِ گناہ اس کے لیے پُر اذیت خلش بن گیا تھا۔
رابعہ نے بیگ مجھے تھمادیا۔ میں نے محسن کو گلے لگا کے کہا "ابھی سے رو کے بدشگونی مت کر۔ خوشی خوشی جا۔ خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہوگا۔"
وہ زبردستی مسکرایا "ہاں۔ میں بلاوجہ ڈر رہا ہوں۔"
رابعہ نے کہا "فوزیہ کا خیال رکھنا۔ ہماری وجہ سے اس کو چھوڑ کے مت آنا۔ جب تک وہ اجازت نہ دے اپنی خوشی سے وہیں رہنا۔"
غالب نے کہا "ہاں۔ اس کی صحت کی بحالی تک ضرور رک جانا۔"
نازو نے بھی تائید میں سرہلایا "ہماری بالکل فکر مت کرنا۔ یہاں ایسا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوگا۔"
"اگر ضروری ہو تو ہمیں بھی بلالینا۔ ہم آجائیں گے دنیا کے سارے کام چھوڑ کے" میں نے کہا۔
محسن کا چہرہ روشن ہوگیا "تم لوگ آؤ گے؟ واقعی آجاؤ گے؟"
رابعہ نے کہا "بھئی کیوں نہیں آئیں گے۔"
غالب بولا "غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں۔"
میں نے بیگ اس کے سامنے رکھ دیا "اس میں تقریباً چار لاکھ ہیں اور یہ مالِ غنیمت ہے' حلال ہے۔"
"اتنے میں کیا کروں گا؟"
"اچھا آدھے لے جاؤ۔" رابعہ نے کہا۔
"نہیں۔ میں ایک لاکھ لے جاتا ہوں۔" محسن نے کہا۔
ہم سب انہیں رخصت کرنے نہیں جاسکتے تھے۔ مجھے نقوی صاحب نے سختی سے باہر نہ جانے کی تاکید کی تھی۔ غالب کو اکبر خان سے ملنا تھا۔ میں نے رابعہ اور نازو کو بھی ساتھ کردیا۔
"بس کے چکر میں مت پڑو۔ پرائیویٹ کار لے لو کرائے پر" میں نے محسن سے گلے مل کے کہا۔
منظر خواہ مخواہ جذباتی ہوگیا تھا۔ گل نے باقاعدہ آنسو بہانے شروع کیے تو میں نے اسے ڈانٹا۔ "یہ کیا ڈرامے بازی ہے۔ دل میں تو لڈو پھوٹ رہے ہوں گے۔"
وہ اور زیادہ رونے لگی "سکندر بھائی! دعا کریں۔"
رابعہ نے اسے پیار کیا "بے وقوف۔ تجھے محسن کا خیال رکھنا ہوگا جیسے پہلے رکھا تھا۔"
میں نے کہا "ہم سب تم پر بھروسہ کرتے ہیں گل۔ محسن کو تمہارے سپرد کررہے ہیں۔"
نازو بھی رورہی تھی "ہوسکے تو.... واپسی میں فوزیہ کو لے آنا اپنے ساتھ۔"
غالب نے اسے گھورا "خوشی ہو یا غم' تم بے وقوفی کی بات ضرور کروگی۔"
نازو نے کہا "تمہارا دماغ خراب ہے؟"
"دماغ تمہارا خراب ہے۔ یہاں آکے فوزیہ کیا کرے گی۔ گھربار شوہر اور بچوں کو چھوڑ کے ہمارے ساتھ خوار ہو؟"
میں نے بڑی مشکل سے آنسوؤں کو روک رکھا تھا۔ وہ سب چلے گئے تو میں کمرا بند کرکے بستر پر لیٹ گیا اور نہ جانے کب سے رکا ہوا سیلِ اشک ضبط کے سارے بند توڑ کے بہہ نکلا۔ اچانک میری عمرِ گزشتہ کی کتاب کا ہر ورق زندہ ہوگیا اور یادوں کے دریچے سے میں نے گزرے ہوئے وقت کے ہر نقش کو زندہ دیکھا۔ فوزیہ ایک چھوٹی سی بچی تھی۔ گلے میں بستہ لٹکا کے میرے ساتھ اسکول جاتی تھی۔ پھر وہ لوگ کہیں چلے گئے۔ سرکاری ملازمت میں ہمارے والدین خانہ بدوشی کی زندگی گزارنے کے عادی تھے۔ میں نے اسے پھر دیکھا تو وہ ہائی اسکول کی طالبہ تھی۔ حیرت انگیز طور پر بڑی ہوگئی تھی۔ اس کا تیسرا روپ کالج جانے والی لڑکی کا تھا۔ حسن و رعنائی اور آغازِ شباب کی دلکش تصویر۔ ایک بار پھر ہم سب اکٹھے ہوئے۔ میں نے کسی طرح فوزیہ پر اپنائیت کا دعویٰ رکھتے ہوئے اسے اپنی محبت کا یقین دلایا۔ وہ سیدھی سادی لڑکی شاید پہلے سے ہی مجھے اپنا سمجھتی تھی۔ اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ میں اور محسن انگلینڈ.... چلے گئے اور وہاں ہم نے جو گل کھلائے وہ ہماری داستانِ حیات کا سب سے سنسنی خیز باب تھا جس پر اس وقت ہم فخر کرتے تھے مگر اب ان کارناموں کو یاد کرکے صرف شرمندگی ملتی تھی۔
تقریباً ایک گھنٹے بعد رابعہ لوٹی تو میں اسی طرح تکیے پر سر رکھے چھت کو گھور رہا تھا جیسے وہ سنیما اسکرین ہو۔ اس پر گزرے ہوئے وقت کی فلم چل رہی تھی۔ فوزیہ دلہن بن گئی تھی۔ میں نے وہ رات ایسے بسر کی تھی جیسے صبح پھانسی پانے والا مجرم جیل میں آخری رات گزارتا ہے۔ اس کے بعد سب کچھ ختم ہوگیا تھا۔ محسن کے والدین تقریباً ایک ساتھ دنیا سے رخصت ہوگئے تھے۔ میری طرح محسن بھی تنہا ہوگیا تھا۔
رابعہ نے میرے قریب آکے میری پیشانی پر ہاتھ رکھا تو میں چونکا۔
"تم... اتنی جلدی آگئیں؟" میں نے اٹھنے کی اور آنسوؤں کو پی کر مسکرانے کی ناکام کوشش کی۔
رابعہ بولی "لیٹے رہو۔ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگتی۔"
میں نے کہا "میں ٹھیک ہوں۔"
"تمہارا ماتھا جل رہا ہے۔ میں کسی سے منگواتی ہوں اسپرین۔"
وہ چند منٹ کے لیے باہر گئی اور پھر لوٹ آئی۔
"رابعہ! میں اپنے آپ کو مجرم محسوس کرتا ہوں۔" میں نے

رابعہ کا ہاتھ پکڑ کے اپنے گال کے نیچے رکھ لیا "بتاؤ میں کیا کروں؟"

اس نے دوسرے ہاتھ سے میرے پریشان بال سنوارے "کیا واقعی یہ تمہارا قصور تھا؟ مجھے بتاؤ کیسے؟ حالات کیا ہم اپنی مرضی سے بناتے ہیں؟"

میں نے کہا "ہم حالات کے ذمّے دار تو ہوتے ہیں؟"

"تقدیر کچھ نہیں ہوتی؟ مجھے بھی یقین تھا کہ میں شادی کا فیصلہ کرکے کوئی غلطی نہیں کررہی ہوں۔ غلطی اس کی تھی جو شادی کے قابل ہی نہیں تھا مگر اس نے آخری وقت تک مجھے بھی دھوکے میں رکھا۔ میری تباہی میں میرا کیا قصور تھا؟ میری رُسوائی کے حالات کیا میرے پیدا کردہ تھے؟ پھر تم کیوں دُکھی ہو کہ اکیلے تم ساری خرابی کے ذمّے دار تھے۔ میرا تم سے ملنا...."

"میں اسے خرابی کب سمجھتا ہوں۔ تم سے ملنا میرے نصیب میں تھا اور ہم ایک دوسرے کے لیے ہی بنے تھے۔" میں نے کہا "یہ سب ناگزیر تھا۔ جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا تھا۔ یا میرے ساتھ ہوا تھا۔"

"پھر ماضی کو اپنی غلطی کی سزا بنانے سے فائدہ۔ چلو ہم داتا صاحبؒ کے مزار پر چلتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ خدا فوزیہ کو صحت اور خوشی دے جو اسے اب تک میسّر تھی۔"

میں نے کہا "ہاں۔ ویسے تو وہ خوش و خرّم زندگی گزار رہی تھی۔"

"ہم سب کے لیے دعا کریں گے۔ اپنے لیے بھی..."

میں نے کہا "لیکن ہم باہر نہیں جاسکتے.... مجھے..."

کوٹھی میں کام کرنے والا ایک کارپینٹر اسپرین دینے کے لیے آیا۔ "بیگم صاحب! میرے کو چھٹی دیں، آج جلدی جانا ہے۔"

رابعہ بوکھلا گئی مگر میں نے صورتِ حال کو سنبھال لیا "ہاں بھئی ضرور جاؤ۔ پوچھنے کی کیا بات ہے؟"

"وہ.... بڑے صاحب ناراض ہوتے ہیں جی۔ آج اور کوئی بھی نہیں ہے یہاں۔ چوکیدار کو نکال دیا تھا انہوں نے۔ مجھے گھر والی کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا تھا۔"

"کتنے بے بس اور مجبور ہوتے ہیں یہ لوگ!" رابعہ نے تاسّف سے کہا۔

اسپرین کھانے کے بعد میں دس منٹ آنکھیں بند کیے لیٹا رہا۔ رابعہ اتنی دیر میں چائے بنا کے لے آئی۔ میں اب بہت بہتر محسوس کررہا تھا۔ چائے پینے کے بعد ہم نے گھوم پھر کے کوٹھی کو دیکھا۔ اس میں اب کچن کی فٹنگ کا کام ہورہا تھا اور باتھ رومز میں ٹائل لگ رہے تھے۔ چار کنال کے رقبے پر بنی ہوئی کوٹھی بلاشبہ ایک محل تھی جس کی ایک ایک چیز کو دیکھ کر اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ نقوی صاحب نے اپنے اختیارات کو کس حد تک کیش کروایا ہوگا۔ اگر وہ صرف اپنی تنخواہ میں گزارا کرتے تو ریٹائرمنٹ تک شاید مشکل سے دس مرلے کا سیدھا سادا مکان بنا پاتے۔ کوٹھی کا ایک فانوس ہی ان کی پوری مہینے کی تنخواہ سے زیادہ قیمت کا تھا۔

کچن میں کھانے پینے کا سامان ہماری ضروریات کے مطابق فراہم کردیا گیا تھا ورنہ کوٹھی ابھی اسباب سے خالی تھی۔ کوٹھی میں کام کرنے والے اپنے کام کے کپڑے وہیں چھوڑ گئے تھے اور جاتے وقت وہی صاف ستھرے کپڑے پہن گئے تھے جو وہ صبح پہن کر آئے تھے۔ نیلی زین کی ایک ڈانگری رنگ کرنے والے کی تھی۔ اس پر پینٹ کے داغ کپڑے کے رنگ سے زیادہ نمایاں تھے۔ میں نے اسے اتار کے دیکھا تو رابعہ میرا مقصد سمجھ گئی۔

"یہ پہنوگے؟ اتنی میلی؟"

میں نے کہا "تھوڑی دیر کسی محنت کش مزدور کی وردی پہن لینے سے کوئی فوت نہیں ہوتا۔ اتنا بھی نازک نہیں ہوں میں۔ چلو تم باہر نکلو۔"

رابعہ کچن سے نکل گئی تو میں نے وہ ڈانگری چڑھالی۔ ڈانگری عرفِ عام میں اس قمیص پتلون کو کہتے ہیں جو ایک ساتھ سی دیے جاتے ہیں اور نیچے سے اوپر کی جانب پہن کے آدمی کوئی بھی کام آسانی سے کرسکتا ہے۔ مجھے ایک پرانی پشاوری چپل بھی مل گئی۔

رابعہ بہت ہنسی "اس حُلیے میں چلوگے میرے ساتھ۔"

"تمہیں شرم آتی ہے تو نہیں جاتا" میں نے کہا۔

"یہ مطلب نہیں تھا میرا" وہ معافی مانگنے کے انداز میں بولی "شرم کی بات یہ ہے کہ میرا لباس بہت اچھا ہے۔ تمہارے مقابلے میں۔"

"تم خود بھی تو بہت اچھی ہو میرے مقابلے میں" میں نے کہا "چلو۔"

ہم نے سامنے والے دروازے بند کیے اور پچھلی طرف سے باہر آگئے۔ اچانک رابعہ نے کہا۔

"بعد میں وقار یوسف آیا تو پریشان ہوگا۔ میں اسے فون کرکے آتی ہوں۔" وہ پھر اندر چلی گئی۔

وہ چند منٹ بعد آئی تو میں نے کہا "غالب یا نازو بھی تو آسکتے ہیں؟"

رابعہ نے کہا "غالب اور نازو اکبر خان سے کاروباری معاملات طے کرنے گئے ہیں۔ دیر لگے گی۔"

"گویا اخبار نکالنے کی تیاری ہے۔"

"غالب بہت سیریس ہے۔ جگہ دیکھ لی ہے اس نے اور اکبر خان کے ساتھ کاروباری اور غیر کاروباری امور پر معاہدہ بھی ہوگیا ہے۔"

"غیر کاروباری امور کیا ہیں؟" میں نے کہا۔

"اخبار کی پالیسی، مُدیرِ اعلیٰ صاحب کے اختیارات اکبر خان کے حقوق۔" رابعہ نے کہا "وہ صرف کاروبار چلانا چاہتا ہے اخبار بھی کاروبار ہے۔"

"لیکن غالب کے لیے اخبار پہلے اخبار ہے پھر کاروبار۔ یہی ذہنی ان کے درمیان اختلاف کا سبب بنے گا۔"

ہم نے تھوڑا سا فاصلہ پیدل طے کیا۔ رابعہ کو شدت سے احساس ہورہا تھا کہ اس کے ساتھ میں بالکل نوکر لگ رہا ہوں۔ اس علاقے کی بیگمات کا یوں اپنے کسی ملازم کے ساتھ نظر آنا کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ جب پیچھے سے ایک خالی تانگا آیا تو یہ مسئلہ حل ہوا۔

تانگے کی سواری ایک صبر آزما کام تھا مگر رابعہ کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ کے میں نے اس تجربے میں وہی لطف اور سنسنی خیز مسرت محسوس کی جو آغازِ عشق میں کالج سے بھاگنے والے نوجوانی کے جذبات سے متعارف ہونے والے لڑکا اور لڑکی محسوس کرتے ہیں۔ رابعہ بھی خوش تھی اور ہم پرانی باتوں پر ہنس رہے تھے۔ یہ مجھے بڑا عجیب لگا کیونکہ ابھی کچھ دیر پہلے میں پرانی باتوں کو یاد کرکے آنسو بہا رہا تھا۔

مغرب سے کچھ پہلے ہم داتا دربار والی گلی میں داخل ہوگئے۔ میں نے دونوں جانب پھیلی ہوئی دُکانوں میں سے ایک پھولوں کی چادر منتخب کی اور ایک رابعہ نے۔ ہم الگ الگ راستوں سے اندر گئے۔ اس مرکزِ تجلّیات پر اس وقت بھی ہم جیسے ہزاروں عقیدت مند محوِ دعا تھے۔ میں نے چادر چڑھانے کے بعد آنکھیں بند کرکے انتہائی خشوع و خضوع کے ساتھ دعا کی۔ 'میرے خدا! مجھے دنیا کی کوئی دولت نہیں چاہیے۔ مجھے شہرت نہیں چاہیے۔ بس مجھے سکون اور خوشی دے اور انہیں جن کے دم سے مجھے سکون اور خوشی ملتی ہے۔'

میں باہر آیا تو خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کررہا تھا۔ یہی لگتا تھا جیسے میرے آدھے مسائل کا بوجھ ختم ہوگیا ہے۔ رابعہ بھی سنجیدہ اور اداس صورت بنائے برآمد ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں ابھی تک اشکوں کی نمی تھی۔ ہمارے باہر آنے تک رات کا اندھیرا پھیل گیا تھا اور میرے لیے روزِ روشن کے اُجالے کا ذرا باقی نہیں رہا تھا۔

ہم نے آہستہ آہستہ پیدل چلتے ہوئے ایک مینار والی مسجد تک کا فاصلہ طے کیا۔ وہاں ایک جگہ میری نظر ان اخباروں پر چلی گئی جو فٹ پاتھ پر پھیلے ہوئے تھے۔ وہ ایک اخبار کا شام کے وقت شائع ہونے والا ضمیمہ تھا جو عام طور پر اپنی گمراہ کن سنسنی پھیلانے والی سرخیوں کے باعث زرد صحافت کے علمبردار سمجھے جاتے ہیں...... مگر یہ سرخی غلط نہیں ہوسکتی تھی "پوسٹ مارٹم سے پہلے ہی لاشوں کی چوری" اس کی ذیلی سُرخی تھی "مُردہ خانے سے تین لاشوں کو زبردستی لے جانے والے پیشہ ور مجرم تھے۔"

میں نے دو اخبار خرید لیے جن میں ایک ہی خبر کو مختلف انداز میں زیادہ سے زیادہ چٹپٹا بناکے پیش کیا گیا تھا۔ دونوں اخبارات سے حاصل ہونے والی معلومات کا خلاصہ یہ تھا کہ گزشتہ رات ایک پولیس پارٹی نے جی ٹی روڈ پر شاہدرہ اور کالا شاہ کاکو کے درمیان کھڑی ہوئی لاوارث گاڑی سے تین لاشیں قبضے میں لی تھیں اور انہیں پوسٹ مارٹم کے لیے رکھوادیا گیا تھا۔ پولیس کے ذرائع کے مطابق ان تینوں کا تعلق مجرموں کے ایک بین الاقوامی گروہ سے تھا۔ دوپہر سے قبل ایک جیپ میں آنے والے دو افراد نے ریوالور دکھا کے مُردہ خانے کے نگراں کو باتھ روم میں بند کیا اور اسپتال کی ایمبولینس میں لاشیں ڈال کے فرار ہوگئے۔ ایمبولینس بعد میں شالامار لنک روڈ پر کھڑی پائی گئی مگر اس میں لاشیں نہیں تھیں۔ پولیس کے اعلیٰ حکام نے فوری تفتیش کا حکم دے دیا ہے۔ سنسنی خیز انکشافات کی توقع ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

رابعہ نے اور میں نے الگ الگ اخبار پڑھا اور پھر آپس میں بدل لیا۔

"نقوی صاحب نے جادو کی چھڑی گھمادی۔" رابعہ مسکرائی۔

"شاید۔ یہ اتنا آسان کام نہیں تھا" میں نے کہا "تاہم میں اس امکان کو مسترد نہیں کرتا کہ خود خلیفہ کیکر کے حکم پر لاشوں کو شناخت سے پہلے ہٹا دیا گیا۔"

"پولیس نے تو کہانی ہی بدل دی ہے" رابعہ بولی۔

"ان کے لیے یہ کون سی نئی بات ہے" میں نے کہا۔

"بلاوجہ تو وہ کچھ نہیں کرتے۔ کسی کے ساتھ نیکی بھی نہیں" رابعہ بولی "یا لالچ ہوتا ہے یا دباؤ۔ اب مسٹر ہمدرد کیا کریں گے؟"

"مسٹر ہمدرد کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔ ان کی محنت اکارت گئی۔ نہ ان تصویروں کی اہمیت رہی نہ اس چشم دید گواہ کی۔ کہاں ماڈل ٹاؤن کا وہ علاقہ اور کہاں کالا شاہ کاکو۔"

رابعہ نے کہا "لاوارث گاڑیاں بہت ہوتی ہیں ان کے پاس اور احمد کی پگڑی محمود کے سر والا محاورہ تو پرانا ہوگیا۔ اب وہ احمد کے گلے کا پھندا محمود کے گلے میں ڈالتے ہیں۔ تمہارے خیال میں یہ مسٹر ہمدرد کون ہیں؟"

"معلوم ہوجائے گا۔ نقوی صاحب کو وہ پھر فون کرے گا۔ اس کی آواز کا ٹیپ سُن کے میں یقین کے ساتھ کہہ سکوں گا کہ وہ چوہدری دلاور ہے، اس کا بھائی اکبر خان یا کوئی اور..."

"وہ آواز بدل کے فون کرتا ہوگا" رابعہ نے کہا۔

"آواز بدل سکتی ہے، انداز کہیں نہ کہیں چغلی کھاتا ہے۔"

رابعہ نے کہا "وہ اب کوئی نئی چال چلے گا۔"

"لعنت بھیجو اس کے ذکر پر۔ خدا کا شکر ہے کہ ابھی تک ہم محفوظ ہیں اور بظاہر شکاری پھر ناکام ہوگئے ہیں جنھوں نے بڑی ہوشیاری سے یہ جال بچھایا تھا۔ دیکھو انارکلی میں کتنی رونق ہے۔ گول گپّے کھاؤ گی؟"

"کیا؟" رابعہ ہنسی "میرا موڈ تو دہی بھلے کھانے کا ہے بانو بازار سے۔"

"کمال ہے! میرا بھی یہی موڈ تھا بانو" میں نے کہا "اس وقت

میرا موڈ اچانک اتنا رومانٹک ہوگیا ہے کہ میں چاہتا ہوں' تمہارا ہاتھ پکڑلوں۔"

"خبردار! ہر جگہ بدتمیزی اچھی نہیں ہوتی۔"

"بدتمیزی کیا ہے اس میں۔ وہ دیکھو سامنے کیسے مزے سے جارہے ہیں محبت کے متوالے۔" میں نے کہا۔

"ان کی تو نئی نئی شادی ہوئی ہے" رابعہ بولی "دُلہا دُلہن ہیں۔"

"یہی تو مسئلہ ہے" میں نے آہ بھر کے کہا "تم تو دُلہن لگتی ہو لیکن میں دُلہا نہیں چولہا لگتا ہوں۔ خیر' جہاں بدتمیزی اچھی لگے بتادینا مجھے۔"

"سکندر! چلو اپنے گھر چلیں" رابعہ نے اچانک کہا۔

"اپنے گھر؟" میں نے کہا "کہاں ہے اپنا گھر؟ میکے کی بات کررہی ہو یا سُسرال کی؟"

"میکے کی" رابعہ شرما کے ہنسی "میں اپنے گھر کو دیکھنا چاہتی ہوں۔"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "چاندنی بیگم کی اور گولو پہلوان کی روح سے ملاقات نہ ہوجائے۔"

"منظر نے بتایا تھا کہ وہ قبضہ حاصل کرچکا ہے۔"

"قبضے کی بات نہیں۔ ہم اندر کیسے جائیں گے؟ کھڑکیاں بند ہوں گی' دروازے مقفل ہوں گے۔" میں نے کہا۔

"اگر اپنے گھر کی چابیاں کھو جائیں تو آدمی کیا کرتا ہے؟" رابعہ نے کہا "وہ تالا توڑے تو جرم نہیں کرتا۔ چلو پلیز!"

اس "پلیز" کے بعد میرے اعتراضات اور دلائل بے معنی ہوگئے۔ میں نے کہا "اچھا بھئی' دہی بھلے تو نوش فرمالیں آپ۔ اس کے بعد آپ کا یہ خادم بلکہ نوکر چائے پینا چاہتا ہے۔"

"خادم صاحب' اس حلیے میں آپ نہ شیزان میں قدم رنجہ فرماسکتے ہیں اور نہ گارڈینیا میں۔"

"اچھا۔ پھر پاک ٹی ہاؤس کے باہر ہی کافی پی لیں گے۔ کبھی تم نے پی ہے وہ کافی؟ ایک بندہ بناتا ہے۔"

"سکندر! میں پہلے ہی بہت تھک گئی ہوں۔ کہاں سے پیدل آرہے ہیں ہم" رابعہ بولی "اب وہاں تک مارچ کرنا پڑے گا۔"

"میں بانو بازار جاسکتا ہوں تمہاری خاطر تو تم کو میرے ساتھ پاک ٹی ہاؤس جانا پڑے گا" میں نے اسے ڈانٹا "پیدل چلنا صحت کے لیے مفید ہے' تم ویسے ہی موٹی ہورہی ہو۔"

"واقعی۔ میں بھی محسوس کررہی ہوں۔"

"بعد میں تم بھی ایسی ہی ہوجاؤ گی' یہ جو ڈرم ٹائپ چیزیں اسمارٹ قسم کے مردوں کے ساتھ لڑھک رہی ہیں۔"

رابعہ ہنسی "کیوں بددعا دیتے ہو۔ مجھے ویسے ہی ڈر لگتا ہے۔"

میں نے کہا "فکر مت کرو۔ میں ایک چھٹانک وزن نہیں بڑھنے دوں گا' تم میرے ساتھ جاگنگ کروگی۔"

ہم بانو بازار سے نکل کے مال روڈ تک گئے اور پھر الٹے ہاتھ کی طرف فٹ پاتھ پر چلنے لگے۔ ہمارے چاروں طرف زندگی اپنی پوری گہما گہمی کے ساتھ رواں دواں تھی۔ خوب صورت کاریں اپنی تیز روشنیاں چمکاتی زنا زن گزر رہی تھیں اور ان میں بیٹھے ہوئے خوش حال اور بے فکرے مرد عورتیں اور بچے شاید ہم سے زیادہ خوش تھے کیونکہ ان کا گزارا ہوا کل اور آنے والا کل بھی ایسا ہی تھا جب کہ ہم وقت سے مستعار ایک خوشی کے وقفے کو بھی ڈرڈر کے استعمال کررہے تھے' اس احساس کے ساتھ کہ لمحہ بہ لمحہ مُسرت کی مہلت تمام ہورہی ہے اور اس کے بعد ہمیں پھر تفکرات کے اسی زنداں میں لوٹ کر جانا ہے جسے ہم نے خود اپنے لیے بنایا اب اسے گرا کے رہائی حاصل کرنا ہمارے اختیار کی بات نہیں۔

کافی پینے کے بعد ہم کسی خالی رکشا' ٹیکسی کے انتظار میں کھڑے رہے۔ بہت سے ہنستے کھیلتے بچوں کے ساتھ مرد عورتیں ہمارے قریب سے گزرے۔ ان کی آسودہ حال' پُرسکون اور پُراطمینان زندگی میرے لیے باعثِ رشک تھی۔ خوب صورت ساڑیوں پر شال اوڑھے حسین عورتیں بہترین سوٹ میں ملبوس مردوں کے ساتھ شاپنگ کررہی تھیں۔ جگمگاتی دکانوں سے کپڑے' زیورات' میک اپ کا سامان اور بچوں کے کھلونے خرید رہی تھیں۔ ہماری طرف کوئی متوجہ نہ تھا مگر ہم انہیں دیکھ رہے تھے۔ ان کی زندگی ہماری دسترس میں ہوکے بھی ہمارے لیے شجرِ ممنوعہ ہوگئی تھی۔ ہم چھپ کے رہنے پر مجبور تھے۔ ابھی تک ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے۔ اتنی قربت کے باوجود بہت دور تھے۔

رابعہ نے ایک رکشا روک لیا۔ میں نے اسے گھر کی سمت جانے کا کہا "اداس کیوں ہوگئیں اچانک؟" میں نے رابعہ سے کہا۔

"کچھ نہیں۔ اداسی تو ہوتی ہے خوشی کے بعد۔"

میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا "مجھے معلوم ہے تم کیوں اداس ہو اور کیا سوچ رہی ہو؟"

"میں نے دیکھا ہے' نادان اور معصوم بچے خوب صورت کھلونوں کی دُکان میں جاکے کیسے مسحور ہوجاتے ہیں" رابعہ بولی "وہ ہر کھلونا لینا چاہتے ہیں۔ اور سمجھ دار ماں باپ انہیں جھوٹ سے بہلاتے ہیں کہ بیٹا' چلو ابھی یہ لے لو' وہ کل لے لیں گے' پھر لیں گے' آج نہیں۔"

میں نے کہا "میں بھی اسی بچے کی طرح محسوس کررہا ہوں۔"

"کھلونوں کی دُکان میں نہیں جانا چاہیے بچوں کو۔" رابعہ بولی "جیسے ہمیں خوابوں کی دُکان کے شوکیس میں جھانک کر بھی نہیں دیکھنا چاہیے۔"

"رابعہ! ایک نہ ایک دن ..." میں نے کہا اور خاموش ہوگیا۔

"مجھے معلوم ہے سکندر" رابعہ میری طرف دیکھ کے مسکرائی۔ میں نے کہا "مسکرانے سے کام نہیں چلے گا۔ ہنسو ورنہ میں

گُدگُدی ..."

رابعہ گھبرائی "پاگل ہوئے ہو" اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں رکشا والے کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے رکشا والے کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا "بھائی تم برا تو نہیں مانو گے؟"

رکشا والا حیران ہوکے بولا "کس بات کا جی؟"

میں نے کہا "یہ میری گھر والی کچھ ناراض ہے۔ اس کے گُدگُدی کرکے ہنسالوں۔"

وہ ہنس پڑا "تو جی۔ میں خود یہی کرتا ہوں۔ جب گھر والی کا موڈ بگڑ جاتا ہے تو پھر اسے ہنسانا مشکل ہوتا ہے گُدگُدی کیے بغیر۔ اس میں بھلا برا ماننے والی کون سی بات ہے۔"

میں رابعہ کا صرف چہرہ دیکھ سکتا تھا۔ اندھیرے میں یقیناً اس کا رنگ غصے اور شرم سے لال پڑگیا ہوگا "تم نے بے ہودگی کی نا... تو..."

"تو کیا؟" میں نے دیدہ دلیری سے کہا۔

"میں دھکا دے دوں گی تمہیں یا خود چھلانگ ماردوں گی۔ چلتے رکشا سے۔"

میں نے سوچ کے کہا "یہ تو بڑا مسئلہ ہوگیا۔ کہیں تمہاری یا میری ٹانگ ٹوٹ گئی تو زندگی کی گاڑی ڈیڑھ پہیئے پر کیسے چلے گی؟"

رکشا والا یقیناً دلچسپی سے ہماری گفتگو پر کان لگائے بیٹھا تھا۔ اس نے شرارت سے کہا "چلو جی رکشا روک لیتا ہوں۔"

"وہ کس لیے بھائی؟" میں نے کہا۔

"ٹانگ تڑوانے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ منالو بھرجائی کو پھر چلتے ہیں۔"

"بکومت"! رابعہ نے برہمی سے کہا "شرافت سے چلتے رہو۔"

لیکن رکشا والا اب مجھ سے بے تکلف ہوچکا تھا "شادی سے پہلے ایسی ہی کوئی بات تھی جناب۔ میری گھر والی نے کوٹھے پر سے چھلانگ ماردی۔ ایک ٹانگ کڑچ ہوگئی۔"

میں نے ہنس کے کہا "یعنی سچ مچ تمہاری زندگی کی گاڑی چل رہی ہے ڈیڑھ پہیئے پر؟"

"اوہ نہیں جی۔ اپنی گاڑی تو خیر سے ٹھیک چل رہی ہے۔ ٹانگ ٹوٹی تھی میرے سُسر کی۔ وہ نیچے کھڑا تھا نا۔ دھی رانی اس کے اوپر بم کے گولے کی طرح گری۔ اب تو خیر دُگنا ہوگیا ہے لیکن اس وقت بھی پکا سوا من وزن تھا۔"

میں تو خیر دل کھول کے ہنسا مگر رابعہ بھی ہنسی کو ضبط نہ کرسکی۔ مزنگ شاہو کے چوک پر کراؤن سینما کی طرف موڑ کاٹتے ہی رکشا رک گیا۔ میں اسے پیسے دینے لگا تو وہ بولا "پھر کیسی رہی جی ہماری بات؟"

میں نے کہا "کیا مطلب؟"

"ہم نے ہنسادیا بھرجائی کو۔ جو کام آپ نہیں کرسکے' ہم نے کردیا۔"

میں حیران رہ گیا "وہ سب جھوٹ تھا!"

"اور کیا جی۔ میری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی" اس نے رکشا اسٹارٹ کرکے موڑا "سلاما لیکم۔"

"بدمعاش" رابعہ نے مسکرا کے زیرِ لب کہا۔

جدید طرز کی اس شاندار کوٹھی کے سامنے جہاں پہلے رابعہ کے والدین کی بنائی ہوئی پرانی کوٹھی تھی' پان والے کا کھوکھا آباد تھا اور کراؤن سینما میں فلم کا انٹرول ہوا تھا۔ ڈیڑھ گھنٹا ہال کے اندھیرے میں فلم کی دلچسپی نے سگریٹ کی طلب کو دبا رکھا تھا مگر اب جیسے پندرہ منٹ کے لیے قیدی رہا ہوئے تھے اور چائے' سگریٹ کے رسیا کینٹین پر یلغار کرچکے تھے۔ عین گیٹ کے سامنے ریڑھی پر بن کباب سے مالٹے اور مونگ پھلی تک ہر چیز یوں فروخت ہورہی تھی جیسے کرفیو کے وقفے میں گلی سڑی سبزی سے باسی گوشت تک سب کچھ ہاتھوں ہاتھ بِک جاتا ہے۔

اِنٹرول ختم ہونے کی گھنٹی بجی تو ایک دم ہجوم چھٹ گیا اور مجھے پان سگریٹ والے سے شرفِ ملاقات حاصل ہوا۔ اسی نے مجھے چند دن پہلے گولو پہلوان اور چاندنی بیگم کے بارے میں تفصیلی معلومات فراہم کی تھیں۔ اس نے مجھے پہچان لیا اور میرے ساتھ رابعہ کو دیکھ کے چونکا۔ میں نے اس سے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اس نے اپنے ہاتھ صاف کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ آج میں نے ڈانگری پہن رکھی تھی اور میں حُلیے سے کارپینٹر یا پلمبر نظر آتا تھا۔ معزز نظر آنے والی رابعہ کے ساتھ میری حیثیت کا فرق زیادہ نمایاں محسوس ہوتا تھا۔

اس نے کہا "تم وہی ہو نا؟"

میں نے اپنی کتھے چونے سے لال ہوجانے والی انگلیوں کو دیکھا "میں وہی ہوں مومن ... تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔"

"یاد کیسے نہیں۔ اور تم مومن ہو تو کیا ہم کافر ہیں؟"

میں نے ردّی اخبار کے ایک ٹکڑے سے ہاتھ صاف کیے۔ "صورت سے ہم سب ہی مومن لگتے ہیں بھیّا پان والے۔ اندر کا حال اللہ جانتا ہے۔ سنا ہے بعد میں یہاں بہت گڑبڑ ہوئی تھی" میں نے کوٹھی کی طرف اشارہ کیا "گولو پہلوان نے اپنی چاندنی بیگم کو قتل کرنے کے بعد خودکشی کرلی تھی۔"

اس نے کہا "یہ تو سارا شہر جانتا ہے۔ اور جب تمہیں معلوم ہے تو مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو؟"

میں نے کہا "آخر بات کیا ہوئی تھی؟ کیوں قتل کردیا تھا گولو نے اسے؟ چاندنی تو واقعی چاندنی تھی۔ اور یہ گولو نے واقعی خودکشی کی تھی یا اسے بھی کسی نے ...؟"

اس نے میری بات کاٹ دی "جاؤ یار۔ میرے متھے مت لگو۔ مجھے کیا معلوم..."

میں نے کہا "پہلے تو سب معلوم تھا۔ تم نے ہی بتایا تھا۔"

"بڑی غلطی کی تھی میں نے۔" وہ ہاتھ جوڑ کے بولا "تم سی آئی ڈی کے بندے ہو۔ تم نے پولیس کو بتادیا اور انہوں نے مجھے بھی شاملِ تفتیش کرلیا۔ ابھی تک اسٹول پر گدی رکھ کے بیٹھتا ہوں۔"

میں نے کہا "لاحول ولا قوۃ۔ تم الزام لگا رہے ہو مجھ پر بلکہ مجھے گالی دے رہے ہو۔ میں سی آئی ڈی کا نہیں اللہ کا بندہ ہوں۔ ان خاتون کو پہچانتے ہو؟"

وہ تذبذب میں پڑ گیا "نہیں..."

میں نے کہا "یہ اس جگہ کی اصل مالک ہیں۔ رابعہ قاری' ہائی کورٹ کی وکیل ہیں۔"

"اور تم کیا لگتے ہو ان کے؟"

میں نے کہا "یہ انہی سے پوچھ لو۔"

رابعہ نے صورتِ حال کو سنبھالنے کے لیے کہا "یہ بھی وکیل ہیں۔ میرے ساتھ۔"

میں نے مسکرا کے کہا "میرے اس حلیے پر مت جاؤ۔ بس کچھ ایسی مجبوری تھی کہ میں سامنے نہیں آسکتا تھا۔ کچھ دشمن میرے پیچھے لگے ہوئے تھے۔"

اس نے کہا "کیسے دشمن؟"

میں نے کہا "جیسے دشمن ہوتے ہیں۔ تمہارے دشمن بھی تو ہیں جو تم کو اس جگہ سے ہٹا کے خود یہاں بیٹھنا چاہتے ہیں۔"

"یہ تو ہے" اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "آخر میں اُٹھ کے کہاں جاؤں۔ برسوں سے یہاں بیٹھا روزی کما رہا ہوں تو سب کو تکلیف ہے۔ جیسے میں کوئی حرام کا دھندا کرتا ہوں۔ جو کرتے ہیں انہیں کوئی نہیں پوچھتا۔"

میں نے کہا "سینما کا مالک سیٹھ تمہاری حمایت نہیں کرتا تھا؟"

وہ مجھے گھور کے بولا "پہلے کرتا تھا۔ جب سے پولیس تفتیش کے لیے تھانے لے گئی ہے' وہ بھی بدل گیا ہے۔ کہتا ہے کہ شریف سمجھ کے میں تمہارا ساتھ دیتا تھا۔ تم تو نرے حرامی ہو۔ اب میں اسے کیسے یقین دلاؤں کہ مجھے تو پولیس نے شریف ہونے کے جرم میں بدمعاش بنادیا ہے۔ وہ "ہسٹری شیٹر" بھی کردیں گے مجھے لیکن میں نے بھی پکا ارادہ کرلیا ہے کہ جگہ چھوڑ دوں گا مگر وہ سب نہیں کروں گا جو پولیس والے چاہتے ہیں۔"

میں نے کہا "کیا چاہتے ہیں وہ ہمیں بتاؤ۔ شاید ہم تمہاری مدد کردیں۔"

اس نے پُرامید لہجے میں رابعہ کی طرف دیکھا "وہ چاہتے ہیں کہ میں مخبر بن جاؤں۔ کوکین والا پان بیچوں۔ مارفیا رکھوں اور یہاں جو شوقین آتے ہیں' ان کا سپلائر بن جاؤں۔ سپلائر سمجھتے ہو جی آپ؟... دلاّ.... اللہ معاف کرے' جس دن میں کسی کنجری کا یار بنوں اور دلاّ گیری کے نوٹ پکڑوں۔ مجھے تھانے میں روز جوتے کھانا منظور ہے مگر میں اپنے بچوں کو نجس رزق نہیں کھلا سکتا۔ رزق دینے والا وہ ہے۔" اس نے سر اٹھا کے آسمان کی طرف دیکھا۔

"تم بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ حوصلہ ہونا چاہیے آدمی میں۔ بندہ ایک دروازہ بند کرتا ہے تو خدا رزق کے دس دروازے کھولتا ہے لیکن کوئی تم کو غیر قانونی طور پر پریشان کرتا ہے تو ہمیں بتاؤ۔"

"کیا بتاؤں جی۔ پریشان کرنے والے تو روز آجاتے ہیں۔ باپ کی دُکان سمجھ کے سگریٹ اٹھا لیتے ہیں' پان کھاتے ہیں۔ آج ابھی تک کوئی نہیں آیا لیکن آتا ہی ہوگا..."

اس نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ ابھی اس کی بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ ایک کار بڑی تیز رفتاری سے آئی۔ ڈرائیور نے ایک دم بریک لگائے تو اس کے ٹائر جام ہوگئے اور سڑک پر ان کی رگڑ سے پیدا ہونے والی آواز نے سب کو متوجہ کرلیا۔ کار کی اگلی سیٹ پر لمبے لمبے بالوں والا ایک موٹا تازہ نوجوان بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ والا نسبتاً زیادہ عمر کا تھا اور اس نے اونی کھیس کو بغل کے نیچے سے گزار کے کندھے پر ڈال رکھا تھا۔ پان والے نے مجھے آنکھ مار کے کھسک جانے کا اشارہ کیا۔

میں فوراً وہاں سے یوں ہٹ گیا جیسے کسی عام گاہک کی طرح میں پان سگریٹ لینے کے لیے رُکا ہوا تھا۔ رابعہ کے ساتھ میں چند قدم کے فاصلے پر جا کے ٹھہر گیا جہاں سے میں ان کی گفتگو سُن سکوں۔

رابعہ نے خفگی سے کہا "یہ کیا ہو رہا ہے' تم کس چکر میں پڑ گئے؟"

میں نے اسے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے خاموش کیا "اُدھر مت دیکھو۔ ہم رکشا کا انتظار کررہے ہیں۔"

کار سے صرف کھیس والا اترا تھا۔ ویسے تو ان دونوں نے خاصی کوشش سے اپنی صورت پر بدمعاشی کی خباثت اور غنڈہ گردی کی صفات کو نمایاں کیا تھا لیکن کھیس والا اطوار سے خود کو چنگیز خان اور ہلاکو خان بھی ثابت کررہا تھا اور فلمی انداز میں بڑے بدمعاش یعنی دادا کا رول کررہا تھا۔

اس نے سلام کی جگہ ایک چٹان سے بڑی گالی لڑھکا کے کہا "لگتا ہے اثر نہیں ہوا تجھ پر ہماری بات کا..."

پان والے نے کن انکھیوں سے میری طرف دیکھا اور آہستہ سے کہا "پہلوان جی! میں نے تھوڑی سی مہلت مانگی تھی۔"

اس نے پان والے کی گردن دبوچ لی "مہلت کے گھونٹ

بہت مہلت دے چکے ہیں ہم۔ تو کیا چاہتا ہے، ہم یہ سب اٹھا کے سڑک پر پھینک دیں؟"

وہ ہر جملے میں حسب ضرورت مکروہ گالیاں بھی استعمال کر رہا تھا۔ چنانچہ میرا خون کھول رہا تھا مگر میری لگام رابعہ نے تھام رکھی تھی۔ اس نے مجھے مظلوم کی حمایت میں کلمۂ حق کہنے سے باز رکھا۔

رابعہ نے کہا "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اندر جانے کے بجائے تم پان والے سے ملنے کیوں آ گئے؟"

میں نے کہا "یہ خالہ کی طرف سے میرا چچا زاد بھائی ہے اور چچا کی طرف سے خالہ زاد..."

"فضول باتیں چھوڑو۔"

میں نے کہا "رابعہ بی بی! یہ پان والا مجھے جانتا اور پہچانتا ہے۔ اس کو سمجھانا ضروری ہے کہ تم ہی اس کوٹھی کی جائز وارث ہو۔ یہ ثابت کیے بغیر ہم کوٹھی میں دیوار پھاند کے داخل نہیں ہو سکتے۔ گیٹ پر اتنا بڑا تالا پڑا ہوا ہے اور اس کی چابی نہ تمہارے پاس ہے نہ میرے پاس۔"

رابعہ نے کہا "مگر اس کے لیے پرائے پھڈے میں ٹانگ اڑانا ضروری نہیں۔"

میں نے کہا "ضروری کچھ نہیں ہوتا۔ مثلاً میرا تم پر فریفتہ ہونا ضروری نہیں تھا اور فریفتہ ہو جانے کے بعد یہ عہد کرنا ضروری نہیں تھا کہ میں بقائمی ہوش و حواس خود کو تمام عمر کے لیے تمہاری غلامی میں دینا چاہتا ہوں۔"

اچانک کھیس والے نے پان والے کو باہر گھسیٹ لیا۔ پان والا چلّانے لگا۔ پھر کار میں بیٹھا ہوا لمبے بالوں والا بدمعاش بھی اُتر آیا تو میں نے اپنی آستین کو رابعہ کی گرفت سے چھڑا لیا اور آگے پہنچ گیا۔ عین میدانِ جنگ میں جہاں کھیس والے نے پان والے کو مارنا شروع کر دیا تھا۔ کچھ لوگ صورت حال کو سمجھتے ہوئے انجان بن گئے تھے۔ بیچ بچاؤ کرنے والے بھی میرے بعد ہی آئے۔

میں نے کہا "پہلوان جی! خیر ہو آپ کی جوانی کی اور جان کی۔ لیکن اس غریب کو مار کے گناہگار کیوں ہوتے ہو۔"

اس نے مجھے گھور کے دیکھا "چل دفع ہو اِدھر سے۔ تو ماما ہے اس کا؟"

میں نے اس کی کلائی تھام لی "نہیں۔ یہ ماما ہے میرا۔"

غالباً میری گرفت اور میرے اندازِ تخاطب سے ہی اس نے سمجھ لیا تھا کہ میں دخل اندازی سے مار کھائے بغیر باز نہیں آؤں گا۔

دوسرے نوجوان نے مجھے گالی دی "تیری اور تیرے مامے کی..."

میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کھیس والے کی کلائی کو جھٹکا دیا اور اپنے دوسرے ہاتھ سے اس کی گردن پر کان کے ذرا نیچے کھڑی ہتھیلی کا وار کیا۔ وہ گرنے لگا تو میں نے اسے سنبھال کے گاڑی میں ڈال دیا جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور انجن چل رہا تھا۔

"تمہارے حق میں بہتر ہے کہ اسے لے کر چلے جاؤ۔" میں نے لمبے بالوں والے نوجوان کو مخاطب کر کے ہاتھ جھاڑے "پولیس آ گئی تو مشکل میں تم پڑو گے۔"

نوجوان کے قدم تو کھیس والے کا انجام دیکھتے ہی رک گئے تھے۔ میرے لہجے کی دھمکی نے اسے مزید محتاط کر دیا "یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔"

"شٹ اپ۔ میں اس سے بھی بُرا کروں گا تمہارے ساتھ۔ میرے مُطلبے پر مت جاؤ۔" میں نے دہاڑ کے کہا "میں تم جیسے بدمعاشوں کو ایک موقع دیتا ہوں۔ جو موقعے سے فائدہ نہ اٹھائیں وہ فٹ پاتھ پر بھیک مانگتے نظر آتے ہیں یا کبھی نظر نہیں آتے۔ وہ سامنے ہے میرا گھر۔ ہمت ہے تو پھر آ جانا۔"

وہ بہت کم ہمت آدمی تھا۔ اس نے بے یقینی سے عالی شان کوٹھی کی طرف دیکھا اور ایک دم گاڑی میں بیٹھ گیا۔ دوسرے لمحے گاڑی اسی تیزی سے روانہ ہو گئی جس تیزی سے آئی تھی۔ ہکا بکا کھڑے ہوئے چند افراد نے اس منظر کو خاصی دلچسپی سے دیکھا تھا۔ ان میں سے ایک نے قہقہہ لگا کے ایک ناقابلِ اشاعت بات بھی کی۔

میں نے پان والے کے کندھے پر دوستانہ انداز میں ہاتھ رکھا "ڈرو نہیں۔ یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

پان والا سخت نروس تھا "آپ کی بات اور ہے۔ میرے جیسے آدمی کے لیے ان کی دشمنی..."

میں نے کہا "دشمنی کس بات پر ہو گی؟ یہ جگہ چاہیے انہیں۔ جگہ انہیں دے دو۔"

"اور خود بھوکا مروں؟" وہ تلخی سے بولا۔

میں نے سکندرانہ شان سے کہا "جگہ ہم دیں گے تمہیں۔ سڑک کے ادھر نہ سہی اُدھر سہی۔ اس کوٹھی کے باہر یا اندر۔"

بلا ارادہ اس وقت میری نظر کوٹھی کی طرف گئی۔ میں بھول گیا کہ اس پان والے سے میں کیا کہہ رہا تھا۔ میری نگاہ اس کار پر جم کے رہ گئی تھی جو رابعہ کی کوٹھی کے گیٹ پر آ کے رک گئی تھی۔ میں اس گاڑی کو نہیں پہچانتا تھا مگر اس شخص کو جانتا تھا جو گاڑی ڈرائیو کر کے لایا تھا اور اسے بھی جو آگے بیٹھا ہوا تھا۔ یہ چوہدری دلاور تھا۔ گاڑی پیڈرو چلا رہا تھا۔

میں نے پان والے کو چھوڑ دیا اور سڑک عبور کرنے کے لیے آگے بڑھا۔ اس وقت پیڈرو گیٹ کا تالا کھول رہا تھا۔

میں نے رابعہ کی آواز پر اس کی طرف دیکھا بھی نہیں جو مجھے واپس بلا رہی تھی۔

میرا ردِ عمل فطری تھا۔ دو پرانے دشمنوں کو ایک ساتھ دیکھتے ہی ہوش پر جوش کے جذبات غالب آ گئے تھے۔ پیڈرو نے خود کو بے قصور اور مجبور ثابت کرنے کے لیے بہت جھوٹ بولے تھے۔ اس نے اپنے ماضی کے پُرستم حالات کا ایسا دردناک نقشہ کھینچا تھا کہ میں اس کی مظلومیت کو تسلیم کرنے لگا تھا اور قائل ہو رہا تھا کہ اس نے نہ صرف میری حمایت حاصل کرنے کے لیے چوہدری دلاور سے اپنے اختلافات کی کہانی نہیں سنائی تھی بلکہ عملاً ہماری مدد کر کے اس کا ثبوت بھی فراہم کیا تھا کہ اب وہ ہمارا نہیں چوہدری دلاور کا دشمن ہے لیکن اس پُرفریب ڈرامے بازی کا راز فاش ہو گیا تھا۔ میرے سامنے وہ پہلے کی طرح چوہدری دلاور کے ساتھ تھا اور حسبِ عادت ایک وفادار کتے کی طرح اس کے اشاروں پر دم ہلا رہا تھا۔

رابعہ نے چلّا کے کہا۔ "رک جاؤ سکندر۔ ٹھہرو۔"

میں نے پلٹ کے بھی نہیں دیکھا اور ایک جست میں سڑک عبور کرنے کی کوشش کی۔ اچانک دائیں جانب سے آنے والی ایک گاڑی کے ڈرائیور نے مجھے بچانے کے لیے پوری قوت سے بریک لگائے۔ گاڑی کے جام ہو جانے والے پہیے سڑک پر رگڑ کی لکیر بناتے اور احتجاجاً چلّاتے ہوئے آگے بڑھے۔ یہ ناممکن تھا کہ گاڑی کا بھاری بھرکم وجود حرکت کی ساری توانائی سے محروم ہو کے عین اسی جگہ رک جاتا جہاں ڈرائیور نے بریک پیڈل دبایا تھا۔

میں نے تو ایک دم گاڑی کی چندھیا دینے والی روشنی کو چند فٹ کے فاصلے پر دیکھا۔ کسی شکار پر جست لگانے والے خون آشام بھیڑیے کی چمکیلی آنکھوں کی طرح۔ خوف نے مجھے یوں مفلوج کر دیا کہ مجھے سڑک کا دوسرا کنارا زندگی کی دوسری سرحد سے بھی زیادہ دور نظر آیا۔ میں نے رابعہ کی چیخ بھی سنی۔ شاید اس کی آنکھوں نے مجھ سے پہلے میری بے بسی کو دیکھ لیا تھا اور آنے والے لمحے کی تصویر کو بھی۔ جب میرا شکستہ اور کچلا ہوا خون آلود جسم سڑک پر دیکھنے والی آنکھوں کے لیے نظارۂ عبرت فراہم کرے گا۔ ان سب پر انسان کی ہستی ناپائیدار کی حقیقت عیاں ہو گئی تھی جو دیکھ رہے تھے کہ میں نے اپنے جسم کی طاقت اور پھرتی پر اعتماد کرتے ہوئے یہ نہیں دیکھا تھا کہ دوسری طرف سے ایک بے جان مگر متحرک فولادی مشین کہیں زیادہ طاقت اور تیز رفتاری کے ساتھ مجھے کچلنے کے لیے بڑھتی آ رہی ہے۔

ساری بات ایک لمحے کی تھی جو ناگزیر ہوتا تو میں بھی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ کوئی فانی انسان (لاکھ دارا اور سکندر ہو گئے) اس لمحے کی گرفت سے نہ بچے جو یکلخت بے خبری میں آ لیتا ہے اور اس سے اگلا لمحہ حادثے کا شکار ہو جانے والے کے لیے اتنا ہی بے وجود ہوتا ہے جتنا کسی سڑک کے کنارے پڑے ہوئے پتھر کے لیے۔

لیکن وہ لمحہ میرے لیے ابھی نہیں آیا تھا چنانچہ میں اسے جُل دے کر نکل گیا (یا میں نے ایسا ہی سمجھا) میں ایک دم اُچھلا اور بڑی آواز کے ساتھ گاڑی کے بونٹ پر گرا۔ گاڑی رک گئی اور ڈرائیور بڑے اشتعال کے عالم میں باہر نکلا۔ اگر میں اس کی گاڑی کے نیچے آ جاتا تو یقیناً اس کے لیے بھی پریشان کن قانونی مسائل پیدا ہو جاتے۔ غلطی سو فی صد میری تھی مگر اس کی کون سنتا۔ پبلک اسے موردِ الزام ٹھہراتی اور پولیس اسے گرفتار کر کے اس کی کار ضبط کر لیتی، اس کا ڈرائیونگ لائسنس رکھ لیتی اور ان قانونی معاملات کے رُسوا کُن مراحل سے گزر کے اپنی بے گناہی ثابت کرنے تک اس کے ہزاروں خرچ ہو جاتے۔ ایک ذہنی اذیت کی سزا الگ ہوتی اور نہ جانے کب تک حادثے کے منظر کا تصور اس کے لیے سوہانِ روح ہوتا۔

وہ ایک گالی دے کر کار سے اترا تھا۔ "اندھے ہو کے سڑک پر دوڑتے ہو....." خوف اور غصے سے اس کی آواز بھی کانپ رہی تھی۔

میں نے اپنی صفائی میں کچھ کہنا بے سود جانا۔ "سوری سر" میں نے کہا اور بونٹ پر سے چھلانگ مار کے اتر گیا۔ میری نظر گیٹ پر تھی، ان سب پر نہیں جو وہاں کسی ہنگامے کے منتظر تھے۔ میں نے رابعہ کی طرف بھی پلٹ کے نہیں دیکھا جو سب سے پہلے دیوانہ وار چلّاتی ہوئی آئی تھی۔

میری نظر دلاور پر تھی اور پیڈرو پر تھی جو رابعہ کی چیخ سے اور پھر لوگوں کے چلّانے سے میری طرف دیکھنے پر مجبور ہوئے تھے۔ اتنا تو ان کی آنکھوں نے بھی دیکھ لیا ہو گا کہ ایک بندہ کسی گاڑی کے نیچے آتے آتے رہ گیا۔ اس نے بڑی حاضر دماغی اور پھرتی سے کام لیتے ہوئے بونٹ پر کود کے اپنی جان بچالی اور وہ بندہ ڈانگری پہنے ہوئے تھا۔

لیکن یہ سمجھنے میں انہیں کچھ دیر لگی کہ ڈانگری سمیت بونٹ پر کود کے جان بچانے والا سکندر بخت تھا اور چیخ مارنے والی عورت رابعہ قاری ایڈووکیٹ ہائی کورٹ تھی۔ یہ احساس چوہدری دلاور سے پہلے استاد پیڈرو کو ہوا۔ وہ اس وقت گیٹ کھول کے اندر داخل ہو چکا تھا، جب اس نے مجھے دوبارہ اپنی طرف دیکھتے دیکھا۔

چوہدری دلاور کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ "تم...." اس نے بڑی مشکل سے کہا۔

میں طوفانی بگولے کی طرح اس کے پاس سے گزر گیا۔ پیڈرو کے لیے واپسی ممکن نہ تھی۔ وہ آگے بھاگا اور اس نے گیٹ کو اندر سے بند بھی کر دیا۔ میں اپنی رفتار میں لوہے کے گیٹ سے ٹکرا گیا۔

"سکندر!" چوہدری دلاور نے کہا۔ "میری بات سنو۔"

میں نے اسے جواب میں ایک فحش گالی دی اور گیٹ پر چڑھ گیا۔ "تیری بھی سنوں گا....."

اندر اندھیرا تھا۔ میں نے پیڈرو کو کسی سائے کی طرح پورچ میں غائب ہوتا دیکھا۔ کوٹھی کے دروازے بند تھے اور پیڈرو کے

پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ اپنی چابی لگا کے کھول سکتا۔ اس نے یقیناً میرے جارحانہ عزائم کو بھانپ لیا تھا اور اسے اپنی جان بچانے کی فکر لاحق ہو گئی تھی۔

وہ دائیں جانب آٹھ فٹ اونچی دیوار اور کوٹھی کے درمیان کی تنگ گلی میں بھاگا۔ یہ تقریباً چار فٹ چوڑا راستہ تھا مگر اس میں دیوار کے ساتھ ساتھ گملوں کی قطار تھی چنانچہ خالی جگہ تین فٹ ہی رہ گئی تھی۔ وہ مجھ سے تقریباً بیس گز آگے تھا اور یہ فاصلہ برقرار تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ آگے کہیں نہ کہیں اس کے لیے راستہ مسدود ہو جائے گا۔

اس وقت مجھے بالکل خیال نہیں آیا کہ ایسے بالکل پیچھے رہ کے پیڈرو کا تعاقب کرنا خودکشی کے مترادف ہے۔ وہ کسی بھی جگہ ریوالور نکال کر مجھ پر فائر کر سکتا تھا۔ تین فٹ کی گلی میں بیس گز کے فاصلے سے اس کا نشانہ خطا ہو جانے کا کوئی امکان نہ تھا مگر نہ جانے کیوں اس نے ایسا نہیں کیا۔

اس نے دوڑتے ہوئے اچانک لات مار کے ایک گملا لڑھکا دیا۔ گملا اوپر سے چوڑا تھا اور نیچے سے اس کا پیندا بہت چھوٹا تھا۔ گملا مٹی اور پودے کے ساتھ گرتے ہی ٹوٹ گیا اور اس کے ساتھ ہی میری راہ میں رکاوٹ بن گیا۔ میں اتنا تیز دوڑ رہا تھا کہ بروقت اپنی رفتار پر قابو پانے میں ناکام رہا اور گملے سے ٹھوکر کھا کے سیدھا منہ کے بل گیا۔ اگر میں گملے سے بچ جاتا تو اس میں اُگے ہوئے ڈیڑھ دو فٹ اونچے اور گملے کی چوڑائی سے باہر تک پھیلے ہوئے کیکٹس سے بہرحال نہیں بچ سکتا تھا۔

میں نے اپنا منہ اور سر تو بچائے لیکن فرش پر گرنے سے میرے گھٹنے اور میری کہنی بری طرح چھل گئے۔ میرے ایک گھٹنے میں خاصی چوٹ آئی جو پہلے فرش سے ٹکرایا تھا۔ کانٹے دار شاخوں والے کیکٹس نے رہی سہی کسر پوری کر دی، اس کے سخت کانٹوں نے میرے ہاتھوں پر کہنیوں تک خراشیں ڈال دیں اور میرے کپڑے کئی جگہ سے پھٹ گئے۔ اس وقت پیڈرو بائیں طرف گھوم کے غائب ہو گیا تھا۔ مجھے دوبارہ اٹھنے میں دیر نہیں لگی مگر ایک گھٹنے کی تکلیف کے باعث میں کچھ دیر لنگڑا کے دوڑا۔ میرے کانوں نے خاموشی میں ایک شیشہ ٹوٹنے کی آواز سنی۔ درد کو برداشت کرتے ہوئے میں بائیں طرف پہنچا تو مجھے ایک کھڑکی کھلی ہوئی دکھائی دی۔

پیڈرو اس کھڑکی کا شیشہ توڑ کر اندر چلا گیا تھا۔ اگر وہ عقلمندی سے کام لیتا تو اندر کودتے ہی عین کھڑکی کے نیچے بیٹھ جاتا اور جب میں کھڑکی کے راستے اندر قدم رنجہ فرماتا تو وہ آسانی سے میرے سر پر ریوالور کا بٹ مار کے مجھے لٹا دیتا یا مجھے ہینڈز اپ کرا لیتا مگر وہ ایک کھلے دروازے سے گزر کے دوسرے کمرے میں چلا گیا تھا۔

میں کھڑکی کے راستے سے اندر اترا تو میرے کانوں نے ساتھ والے کمرے سے پیڈرو کی آواز سنی۔

"سکندر! وہیں رک جاؤ ورنہ...." اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

میں رک گیا۔ "ورنہ کیا....؟"

"میں.... گولی۔ گولی مار دوں گا۔"

میں نے اپنی سانس کو قابو میں کیا۔ "اب تک کیوں نہیں ماری تھی؟"

"میں موقع دے رہا تھا تمہیں۔"

"کیسا موقع؟"

"میں تمہیں مارنا نہیں چاہتا تھا سکندر۔" اس نے کہا۔ "تم پاگل ہو رہے تھے۔ میں رک جاتا تو تم مجھے مار ڈالتے۔"

"میں اب بھی تمہیں چھوڑوں گا نہیں۔" میں نے کہا۔

"دیکھو سکندر! پہلے میری بات سن لو۔" اس نے کہا۔

"باتیں بہت سن لیں میں نے۔" میں نے کہا۔

اس وقت تک میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہو گئی تھیں، میری پھولی ہوئی سانس قابو میں آ گئی تھی اور میرا دماغ آہستہ آہستہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت حاصل کر رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ استاد پیڈرو خوفزدہ ہے۔ مجھے موقع دینے کی بات بھی دھوکا تھی۔ اس وقت وہ مسلح نہیں تھا ورنہ گملا گرا کے میرا راستہ روکنے کے بجائے وہ فائر کر کے مجھے لنگڑا لولا بھی کر سکتا تھا۔ اب غالباً وہ دوسرے کمرے میں محصور ہو چکا تھا۔ اگلے کمرے سے نکل کے جان بچانے کے لیے فرار کا نیا راستہ تلاش کرنا ممکن نہیں رہا تھا ورنہ اسے رُکنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں بھاگتا جاتا، سیڑھیوں سے اوپر چڑھ جاتا، کسی کھڑکی کو کھول کے پھر باہر نکل جاتا یا چھت پر پہنچ کے دیکھتا کہ اب وہ کس طرف سے پھر نیچے گلی میں اتر سکتا ہے اور کیسے۔ غالباً دوسرے کمرے میں جہاں اس کی پیش قدمی رک گئی تھی، دروازے مقفل تھے اور کوئی کھڑکی نہیں تھی۔

میں نے ایک سوئچ بورڈ کی طرف دیکھا جو میری دسترس میں تھا اور ایک ایک کر کے سب سوئچ آن کر دیے مگر نہ کوئی لائٹ جلی اور نہ چھت سے معلق پنکھے نے حرکت کی۔ باہر سے مین سوئچ آف معلوم ہوتا تھا۔ اس تمام عرصے میں میری نظر ایک لمحے کے لیے بھی درمیانی راستے سے نہیں ہٹی۔

پیڈرو نے یقیناً وہ آوازیں سُنی ہوں گی جو سوئچ آن کرنے سے پیدا ہوئی تھیں اور اس نے یہ بھی سمجھ لیا ہو گا کہ اس کی دھمکی رائیگاں گئی۔ میں خوفزدہ نہیں ہوا تھا۔ میں زیادہ پُرسکون انداز میں آگے بڑھنے کی تیاری کر رہا تھا۔

یہ ایک بیڈ روم تھا۔ اس میں اپنے مطلب کی مجھے ایک ہی چیز نظر آئی۔ یہ کونے میں رکھا ہوا پیتل کا پیڈسٹل لیمپ تھا جس کا ڈنڈے جیسا حصہ منقش تھا۔ کوئی آہٹ پیدا کیے بغیر میں اُلٹے پاؤں پیچھے ہٹا اور میں نے پیڈسٹل لیمپ کا تار کھینچ کے الگ کر دیا۔ اس کا شیڈ بہت بڑا تھا اور شیڈ سمیت اس کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرنا مشکل ہو جاتا۔ میں نے بلب ہٹا کے پیتل کے گول رِنگ کو کھولا۔ یہ

کارروائی مشکل سے ایک منٹ میں مکمل ہو گئی اور کاغذ کے شیڈ کو ایک طرف رکھتے ہی میں نے پیڈسٹل لیمپ اٹھا لیا۔

خاموشی کا ہر لمحہ یقیناً پیڈرو کے اعصاب پر اثر انداز ہو رہا تھا اور وہ بھی اندازے لگانے میں مصروف ہو گا کہ میں کیا کرنے والا ہوں۔ پرانے تعلق کی بنا پر اتنا تو اسے معلوم تھا کہ دھمکی سے ڈر کے پسپا ہو جانا میرا شیوہ نہیں۔ وہ جانتا تھا کہ میں خالی ہاتھ سے بھی ہتھیار کا کام لے سکتا ہوں اور اس جیسے مسلح ہوں تو میرا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

پھر اس کی آواز آئی۔ "سکندر! کیا تم میری بات سنو گے؟"

میں نے کہا۔ "نہیں۔"

اس نے کہا۔ "پاگل مت بنو۔"

میں نے کہا۔ "مجھے اپنا پاگل پن اچھا لگتا ہے لیکن تم مجھے نہیں بنا سکتے۔"

"میں نے تمہیں سب بتا دیا تھا۔" اس نے مجبور لہجے میں کہا۔

"ابھی بہت سی باتیں باقی ہیں۔ جو میں پوچھوں گا اور تم بتاؤ گے۔ اب میں تمہیں ایک موقع دے رہا ہوں۔ خود کو میرے حوالے کر دو۔"

اس نے تیز لہجے میں کہا۔ "کیا ہو آخر تم؟ پولیس یا مجسٹریٹ۔ میری گرفتاری کے لیے آئے ہو اور میں کیا مفرور مجرم ہوں؟"

میں ایک ایک قدم آگے بڑھتا گیا۔ "یہ مجھ سے مت پوچھو...."

"چوہدری دلاور موجود ہے باہر۔"

میں نے کہا۔ "ایک دن وہ بھی غیر موجود ہو جائیں گے اور پھر قیامت تک اپنی لحد میں موجود رہیں گے۔"

"اگر تم نے.... کچھ کیا تو...."

"تو اپنے چوہدری صاحب پیدل فوج، توپخانہ اور ٹینک کے ساتھ حملہ کر دیں گے اور مجھے شکستِ فاش دے کر تمہیں یوں نکال لے جائیں گے جیسے بارات کے ساتھ آنے والا دُلہا اپنی دُلہن کو لے جاتا ہے۔ میکے والے روتے پیٹتے رہ جاتے ہیں۔" میں نے ہنس کے کہا۔ "سوال یہ ہے کہ اتنی دیر کیوں کر دی انہوں نے؟ ابھی تک وہ تمہاری مدد کے لیے کیوں نہیں پہنچے؟"

اس سوال کے بعد میرے ذہن میں یہ خیال بھی آیا کہ آخر رابعہ نے اتنی دیر کیوں کی؟ وہ تو میرے پیچھے لپکی تھی۔ جتنی احمقانہ حرکت کے ساتھ میں نے گاڑی کے نیچے سے گزرنے کی کوشش کی تھی اتنی ہی عاقلانہ مستعدی کے ساتھ میں گاڑی پر سے کود کے فرار ہو گیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ میں دیوانہ وار کیوں بھاگا تھا اور کس کے پیچھے بھاگا تھا۔ بلاشبہ لوگ ابھی تک وہاں ہکا بکا کھڑے سوچ رہے ہوں گے کہ یوں غائب ہونے والا بھوت تھا یا چھلاوہ تھا۔ اور یہ کارروائی ناظرین کرام کو قائل کرنے میں مصروف ہو گا کہ وہ ایک پاگل تھا لیکن رابعہ سب کی رائے سننے کے لیے وہاں نہیں

رک سکتی۔ ممکن ہے اتنی دیر میں گاڑی والا تو خدا کا شکر ادا کر کے جا چکا ہو کہ اللہ نے بڑی مصیبت سے بچایا اور ناظرین بھی نہ رہے ہوں۔ رابعہ کو اگلے چند سیکنڈ میں میرے پیچھے پیچھے گیٹ تک اور پھر اندر پہنچ جانا چاہیے تھا۔ میرے تعاقب میں وہ عین ساتھ بھی رہ سکتی تھی۔ اسے روکنے والا کون تھا۔ سوائے چوہدری دلاور کے۔ وہ گیٹ پر موجود تھا۔ اس نے رابعہ کو روکا ہو گا مگر اس کے روکنے سے رابعہ رُکے گی؟ یہ تو بعید از قیاس ہے کہ چوہدری دلاور اس عشق کے طوفان کو ظالم سماج بن کے روک سکے۔ وہ کہے کہ "بس رابعہ! اندر وہ دونوں آپس میں نمٹ لیں گے۔ آیئے ہم یہاں گیٹ پر رک کے باتیں کرتے ہیں۔ موسم کتنا اچھا ہے آج...."

اس نتیجے پر پہنچتے ہی میرے دماغ میں ایک اندیشے نے جنم لیا مگر مجھے اس اندیشے پر غور کرنے کی مہلت نہیں ملی۔ دروازے کی اوٹ سے پیڈرو نے ایک دم سامنے آ کے مجھ پر حملہ کیا۔ اندھیرے میں صرف ایک سایہ سا میری جانب آیا۔ اس کے ہاتھ ہوا میں لہرائے اور کوئی چیز میرے شانے سے رگڑ کھاتی ہوئی گزر گئی۔ پیڈرو کے ہاتھ میں بھی کوئی ایسا ہی ہتھیار تھا جیسا میرے پاس تھا۔ اس نے اندھیرے میں حملہ کیا تھا اور وہ گھبراہٹ کا بھی شکار تھا۔ عام حالات میں اس کا نشانہ میرا سر ہوتا اور وہ چیز میرے سر پر لگتی تو شاید میں ہوش میں آنے کے بعد بھی اتنی ہی بے سروپا گفتگو فرماتا جتنی بعض اوقات سرکاری حکام اور وزرا حقائق کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

میں نے جوابی حملہ پیڈسٹل اٹھا کے کیا مگر اس کا نچلا حصہ میری توقع سے زیادہ بھاری ثابت ہوا۔ میں نے اسے گُرز کی طرح گھمایا اور کسی دشواری کے بغیر پیڈرو نے جھک کے خود کو بچا لیا۔ گُرز کھڑکی پر لگا اور اس کے سارے شیشے ایک چھناکے سے بکھر گئے۔

مجھے معلوم تھا کہ اب پیڈرو کی باری ہے اور وہ مجھے پھر سنبھلنے کی مہلت نہیں دے گا۔ اس نے رسّی میں کوئی بھاری چیز باندھ رکھی تھی۔ بعد میں یہ جان کے مجھے بڑی ہنسی آئی تھی کہ وہ تانبے کا ایک لوٹا تھا جو باتھ روم میں استعمال ہوتا تھا۔ پیڈرو نے ایک چادر پھاڑ کے رسّی بنائی تھی اور لوٹے کے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈال کے خاصا مؤثر ہتھیار ایجاد کر لیا تھا۔ مجھ سے پانچ چھ فٹ دور رہتے ہوئے اس نے پھر لوٹا گھمایا اور مجھے کود کے پیچھے ہٹنا پڑا۔

پیڈرو کا وار خالی گیا اور لوٹا ایک ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے پر لگا۔ میں نے پیڈسٹل پر لعنت بھیجی اور پیڈرو پر جست لگا دی۔ لوٹا بڑی ٹیڑھی چیز ہوتا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اس کی ٹونٹی کہیں پھنس گئی ہو۔ پیڈرو اپنے ہاتھ میں رسّی کو جھٹکتا رہ گیا اور میں اس کے اوپر جا گرا۔

وہ آسانی سے مغلوب ہونے والا شخص نہیں تھا۔ ایک بار تو اس نے مجھے ہاتھوں اور پیروں کی مدد سے اچھال دیا اور پہلے میں

قالین پر گرا پھر ڈریسنگ ٹیبل کا اسٹول مجھ پر گرا اور میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو آئینے کی کرچیوں سے میرے ہاتھ زخمی ہو گئے۔

پیڈرو اٹھ کے کھڑکی کی طرف دوڑا تھا کہ میں نے اس کھلاڑی کی طرح ڈائیو ماری جو باؤنڈری سے چند انچ کے فاصلے پر گیند کو روک لیتا ہے۔ میں پیڈرو کی ٹانگ پکڑنا چاہتا تھا۔ میرے ہاتھ میں صرف اس کا جوتا آیا لیکن نتائج میری توقعات کے مطابق نکلے۔ پیڈرو بھد سے منہ کے بل گرا اور اس نے ہاتھ فرش پر جما کے چھپکلی کی طرح آگے بڑھنے کی کوشش کی تو اس کے ہاتھ بھی کھڑکی کے شیشوں سے زخمی ہو گئے۔

میں نے اس کا پاؤں پکڑ کے ایک جھٹکا دیا اور وہ تھوڑا سا پیچھے سرک آیا۔ میں اس کی کمر پر سوار ہو گیا اور میرے ہاتھ اس کی گردن پر جم گئے۔ میں نے اس کا ایک ہاتھ موڑ کر کمر پر رکھ لیا۔

"بس استاد، بہت ہو گیا مذاق۔" میں نے کہا۔ "لاؤ اب وہ ریوالور مجھے دے دو جس سے تم مجھے شوٹ کرتے۔ اسی سے میں تمہارے جسم میں ایک سوراخ اور کر دوں۔ باقی تو قدرت نے کیے ہیں۔"

وہ چلانے لگا۔ "تم میرا بازو تو چھوڑو۔ ہڈی ٹوٹ جائے گی۔"

"صرف ہاتھ؟" میں نے حیرانی سے کہا۔ "تمام انسانوں کے جسم میں شاید دو سو بیالیس ہڈیاں ہوتی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہارے جسم میں چار سو چوراسی ہوں۔ کم سے کم چار سو بیس تو ہوں۔ آخر تم استاد ہو۔"

اس نے مزاحمت ترک کر دی تھی۔ "میں اپنی ہار مانتا ہوں سکندر۔ میرے پاس کوئی ریوالور نہیں ہے۔ تم تلاشی لے کر دیکھ سکتے ہو۔"

میں نے اسے کھڑا ہونے کا موقع دیا۔ "اگر فوراً جہنم رسید ہونا نہیں چاہتے تو سیدھے ہو جاؤ کتے کی دم کی طرح اور منہ دیوار کی طرف کر لو۔"

پیڈرو نے تعمیل کی۔ "تمہیں غلط فہمی....."

میں نے اس کے ایک لات ماری۔ "تمہارے بارے میں غلط فہمی صرف تمہارے باپ کو ہوئی ہو گی جو تمہیں اپنی اولاد سمجھتا تھا۔ میرے سامنے بھی کبھی ایسا مت کہنا۔"

وہ دیوار سے ٹکرایا۔ اس کی ناک اور دانت یقیناً تصادم سے خاصے متاثر ہوئے تھے۔ وہ بڑی مشکل سے بولا۔ "یہ سب جو تم کر رہے ہو، اس سے کیا ملے گا تمہیں، تمہیں پھر میری مدد کی ضرورت ہو گی۔"

میں نے اسے دوسری بار لات مار کے دیوار پر منطبق کیا۔ "تمہارے مقابلے میں شیطان ہو تو میں اس کی مدد قبول کرنے کو ترجیح دوں گا۔"

وہ نیچے گرا اور آہستہ آہستہ کھڑا ہوا۔ "کل بھی تمہاری مدد کرنے والا میں ہی تھا۔ میں نے ہی بتایا تھا تمہیں کہ غالب اور نازو کہاں ہیں۔ میں نے جان پر کھیل کے تمہاری مدد کی تھی۔ تم بھول گئے...."

میں نے کہا۔ "آج کی بات کرو۔ اچانک تمہارے اور چوہدری دلاور کے سب اختلافات کیسے ختم ہو گئے؟ تم تو ایک دوسرے کے جانی دشمن ہو گئے تھے۔"

اس نے کہا۔ "ہمارے درمیان دوستی اور دشمنی کے رشتے ضرورت کے مطابق بدلتے رہتے ہیں۔ تم فکر کرو رابعہ کی۔"

میں نے کہا۔ "رابعہ کو کیا ہوا ہے؟"

وہ عجیب طریقے سے ہنسا۔ "وہ تمہارے ساتھ تھی۔"

"وہ میرے ساتھ ہے اور رہے گی....." میں نے اس کے بال پکڑ لیے۔

"کہاں ہے؟ مجھے تو نظر نہیں آئی۔" وہ اذیت کے باوجود ہنسا۔ میں نے اس کا سر دیوار پر دے مارا۔ "اب کیا خیال ہے؟"

پیڈرو لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ "بہت پہلے.... چوہدری دلاور اور رابعہ.... ایک ساتھ.... ایک ہی جگہ....."

میرا اندیشہ ایک دم حقیقت کا بھیانک روپ دھار کے یوں ڈرانے لگا جیسے سنسان جنگل میں تاریک رات کے مسافر کے وہم بھوتوں اور چڑیلوں کی شکل میں سامنے آکے ڈراتے ہیں۔ میں اس کے سر کو پھر دیوار پر مارنے ہی والا تھا کہ ایک [illegible] روشنیوں سے جگمگا اٹھا۔

"چوہدری دلاور بھی اندر نہیں آیا۔ رابعہ بھی اندر نہیں آئی۔" استاد پیڈرو مسکرایا۔ "کہاں چلے گئے دونوں؟ ذرا معلوم کرو۔"

میرے جسم میں دوڑنے والے خون کا درجۂ حرارت بڑھنے لگا۔ ایک اندر کی آواز چلا چلا کے مجھے الزام دینے لگی۔ "ایک نمبر کے گدھے اور احمق ہو تم مسٹر سکندر اعظم عرف چیف کے.... اس خیال کو تم نے کیوں اہمیت نہیں دی تھی؟ اب انکار نہ کیا ہوگا کیونکہ ہونی کو انہونی کوئی نہیں کر سکتا۔ صرف تمہارے جذباتی جنون کے باعث ایسا ہوا۔ تمہاری بہادری، حاضر دماغی، مستعدی سب خوش فہمی ہے تمہاری۔ حقیقت یہ ہے کہ سوچے سمجھے بغیر تم نے نفرت کے پہاڑ پر چڑھ کے انتقام کے اندھے کنویں میں چھلانگ مار دی۔ تم نے ایک کم خطرناک دشمن کا تعاقب اسی طرح کیا جیسے بلی کسی چوہے کے تعاقب میں دوڑے اور سیدھا پاگل کتے سے ٹکرا جائے۔ تم نے دانہ دیکھا مگر دام نہیں دیکھا۔ دام میں گرفتار ہو گئی رابعہ۔ اسے لے گئے اپنے چوہدری دلاور صاحب۔ اب تم لے جاؤ استاد پیڈرو کو۔"

میں نے چلا کے کہا۔ "یہ غلط ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔"

دروازے میں پان والا نمودار ہوا۔ "کیا نہیں ہو سکتا جی؟"

میں نے پیڈرو کو چھوڑ دیا اور پان والے کی طرف دیکھا۔ "تم کب اندر آئے؟"

"جیسے آپ آئے جی۔ کھڑکی سے۔" وہ بولا۔

"یہ لائٹس تم نے جلائی تھیں؟"

"ہاں جی۔ مین سوئچ آف تھا۔"

میں نے کہا۔ "باہر کیا ہو رہا ہے؟"

"کچھ نہیں جی۔" وہ میری بات سمجھے بغیر بولا۔ "سب خیر ہے، اللہ نے بہت بچایا آپ کو اور آپ نے بھی کمال کر دیا۔ بالکل ہیروؤں کی طرح چلتی گاڑی پر جمپ ماری اور یوں نکل گئے۔ ہوا کی طرح۔"

میں نے اس کی بات کو نظر انداز کر دیا۔ "باہر اب کون ہے؟"

"کوئی نہیں جی۔ سب چلے گئے۔ اللہ نے بڑی خیر کی۔ وہ گاڑی والا بھی فوراً بھاگ گیا۔"

میں نے بے خیالی میں کہا۔ "گیٹ پر ایک کار کھڑی ہوئی تھی۔"

"گیٹ پر.... گاڑی تو تھی۔ اب نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔ "اور.... ایک شخص تھا۔ چوہدری دلاور؟"

"کون جی.... میں تو نہیں جانتا کسی چوہدری دلاور کو۔"

"اچھا.... وہ خاتون.... جو میرے ساتھ تھیں۔ اس کوٹھی کی مالک؟" میں نے کوشش کی کہ اپنی کمزوری کا اظہار لہجے سے نہ ہونے دوں۔

"وہ.... وہ ادھر ہی آئی تھیں۔ پر.... اب تو باہر کوئی نہیں ہے جی۔" پان والا سوچ کے بولا۔ "وہ شاید گاڑی میں چلی گئیں۔"

میں نے پیڈرو کو نظر جما کے دیکھا۔ "اگر رابعہ کو کچھ ہوا....."

"تو تم میری کھال اُتروا کے جوتے بنواؤ گے اور.... کسے مارو گے؟ میری قبر پر یا دلاور کو؟" پیڈرو نے میری بات کاٹ دی۔ "ہم تو پیدا ہی اس لیے ہوئے تھے کہ زندگی بھر کتوں کی طرح لوگوں کے ٹکڑے چاٹیں اور جوتے کھائیں۔ جیتے جی بھی ذلیل ہوں اور مر کے بھی رسوا ہوں مگر چوہدری دلاور کا تم آج تک کچھ نہیں بگاڑ سکے۔"

میں نے اس کے منہ پر ایک مکا مارا۔ "میں اسے بھی زندہ گاڑ دوں گا پیڈرو۔ اب تک قسمت اسے بچاتی رہی لیکن....."

"لیکن کیا؟" پیڈرو نے آستین سے وہ خون صاف کیا جو بہہ کر ہونٹوں کے کنارے تک آگیا تھا۔ "آج تمہیں اچانک آوازِ غیب نے بتایا ہے کہ اب قسمت اس کا ساتھ نہیں دے گی۔"

میں نے مکے مار مار کر اس کے چہرے کا حلیہ بگاڑ دیا۔ "دلاور کے کتے، تیرے بھونکنے سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" اس کے بعد میں نے اسے اندر کے ایک باتھ روم میں بند کر دیا اور لوٹ آیا۔

پان والا گھبرا گیا تھا۔ "جناب.... یہ کیا ہے جی؟"

میں نے کہا۔ "یہ اسی بدمعاش کا ساتھی ہے جو رابعہ کو اغوا کر کے لے گئے ہیں۔ تم نے تو دیکھا ہوگا؟"

"بدمعاش... اغوا.... یا میرے خدا!" پان والے نے فریاد کرنے والے انداز میں کہا۔ "یہ کس مصیبت میں پھنس گیا میں؟ بھائی، میں نے کچھ نہیں دیکھا، خدا کی قسم۔ میں چلتا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "ایک منٹ، میری بات سن لو۔"

وہ رک گیا۔ "بات کیا سنوں جی۔ یہاں تو کسی کے ساتھ بھلائی کرنا بھی برائی ہے۔ مجھے کیا معلوم تھا یہ چکر کچھ اور ہے۔ میں کسی کی گواہی میں نہیں پڑ سکتا جی۔"

میں نے اسے تسلی دی۔ "ڈرو نہیں، میں تمہارا نام کسی کے سامنے نہیں لوں گا اور نہ تمہیں گواہی کے لیے بلاؤں گا۔ تم مجھے بتاؤ....."

"دیکھو جی، میں ہوں غریب بال بچوں والا آدمی۔ مجھے تو معاف ہی رکھو۔ ایک طرف وہ بدمعاش ہیں جو میرا پان کا کھوکھا ہٹانے پر تلے ہوئے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "میں نے وعدہ کیا ہے کہ تمہیں کھوکے کے لیے یہاں جگہ مل جائے گی۔"

"وہ پتا نہیں کب ملے گی جناب۔ ابھی تو صرف وعدہ ہے۔ ان بدمعاشوں سے جھگڑا کر کے آپ نے میرے لیے اور مصیبت کھڑی کر دی ہے۔ اب وہ مجھے نہیں چھوڑیں گے۔" وہ تقریباً رونے پر آگیا۔

میں نے کہا۔ "وہ تمہیں ویسے بھی نہ چھوڑتے۔ بہتر ہے کہ تم وہ جگہ خود ہی چھوڑ دو۔ آج ہی اپنا سامان اٹھالو۔"

وہ مجھے احمقوں کی طرح دیکھنے لگا۔ "کیا بات کرتے ہو جی! وہی تو ایک رزق کا وسیلہ ہے۔"

"رزق کے وسیلے خدا فراہم کرتا ہے۔ کوئی انسان نہ کسی کا رزق بند کر سکتا ہے اور نہ خدا کی مصلحت کو سمجھ سکتا ہے۔ کیا پتا اس میں بھی تمہارے لیے بہتری کا سبب ہو" میں نے ناصحانہ انداز میں کہا۔

وہ کنفیوز ہو گیا "میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا جی۔"

میں نے کہا "اچھا دیکھو، وقت کم ہے۔ پھر بات کریں گے تم سے" میں نے گھڑی دیکھی "ابھی یہ بتاؤ کہ باہر کیا ہوا تھا، میرے آنے کے بعد؟"

"باہر... کچھ نہیں۔ وہ گاڑی والا پہلے تو چلاتا رہا، بک بک کرتا رہا کہ.... خیر جی چھوڑیں اس کی بات۔ وہ تو دو منٹ بعد ہی گاڑی لے کر بھاگ گیا تھا۔ کسی نے اسے کہہ دیا تھا کہ مجمع دیکھ کے پولیس نہ آجائے۔ اس کے جاتے ہی لوگ بھی ادھر ادھر ہو گئے۔ میں وہیں کھڑا وکیل صاحب کو دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے پہلے تو آپ کو روکنے کی کوشش کی تھی۔ آپ کا نام لے کر چیخ بھی ماری تھی۔ آپ گاڑی پر کود کے نکل گئے تو ان کی حالت خراب ہو گئی تھی۔ وہ گرنے لگی تھیں مگر میں نے سنبھال لیا اور اندر اسٹول پر بٹھا دیا، پانی پلایا اور تسلی دی کہ اللہ نے خیر کی، کچھ بھی نہیں ہوا۔ آپ

پریشان مت ہوں۔ ان کو، یعنی آپ کو خراش بھی نہیں آئی ہوگی۔"

میں نے کہا "اب ذرا ذہن پر زور دے کر بتاؤ۔ کیا اس وقت بھی گیٹ کے سامنے گاڑی موجود تھی؟"

"ہاں جی۔ گاڑی وہیں تھی۔ وکیل صاحب اسی کی طرف دیکھ رہی تھیں اور ان کی حالت بڑی ویسی ہو رہی تھی۔ کیا بتاؤں میں کیسی ہو رہی تھی۔ لگتا تھا ان کو دل کا دورہ پڑ گیا ہے۔ میں تو گھبرا گیا تھا جناب۔"

"اچھا۔ گاڑی کے اندر ایک شخص بیٹھا ہوا تھا؟"

اس نے سوچ کے کہا "ہاں جی، مگر بعد میں وہ بھی اتر کے اندر آ گیا تھا۔"

میں نے کہا "وہ اندر تو نہیں آیا تھا۔"

"بس جناب! میں نے جو دیکھا تھا، بتا دیا" پان والے نے پریشانی سے کہا "مجھے کیا معلوم، گیٹ سے اندر داخل ہو کے وہ کہاں گیا؟"

میں نے کہا "آگے بولو۔"

"اس کے بعد جناب، وکیل صاحب نے میرا شکریہ ادا کیا اور مجھ سے کہا کہ میں بھی اندر جا رہی ہوں، تو میں نے کہا کہ ضرور جاؤ جناب۔ آپ کا اپنا گھر ہے لیکن یہ صاحب کو اچانک کیا ہو گیا تھا؟ ایسے کیوں بھاگے تھے وہ؟ اللہ نے بال بال بچایا۔ میری بات پر بیگم صاحب نے کہا کہ ذرا نظر رکھنا کوٹھی پر۔ کوئی ایسی ویسی بات نظر آئے تو پولیس کو بتا دینا۔ میں نے کان پکڑ کے کہا وکیل صاحب، میرے باپ کی سو بار توبہ۔ میں پولیس کو دور ہی سے سلام کرتا ہوں۔ اس پر وکیل صاحب نے ایک نمبر لکھ کے دیا مجھے کہ اچھا اس نمبر پر فون کر دینا۔"

"وہ فون نمبر ہے تمہارے پاس؟" میں نے کہا۔

پان والے نے اقرار میں سرہلایا "کاغذ کی پرچی پر لکھا تھا۔"

وہ پرچی نکال کر مجھے نمبر بتانے ہی والا تھا کہ میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا "مجھے معلوم ہے کہ وہ کس کا نمبر تھا۔ اسے سنبھال کے رکھو، بعد میں تمہارے کام آئے گا۔"

"وہ بھی کسی وکیل کا نمبر تھا جی۔"

میں نے کہا "ہاں یار، مجھے معلوم ہے۔ مجھے نام بھی معلوم ہے۔ تم آگے بولو، اس کے بعد وکیل صاحب اندر آئی تھیں؟"

اس نے اقرار میں سرہلایا "انہوں نے آرام سے سڑک پار کی اور اندر چلی گئیں۔"

میں نے کہا "ذرا سوچ کے بتاؤ، اس وقت بھی گاڑی وہاں تھی؟"

"گاڑی تھی جناب، بالکل وہیں تھی۔"

"اور وہ شخص جو اندر بیٹھا ہوا تھا؟"

"میں نے بتایا تھا کہ وکیل صاحب سے پہلے ہی وہ اندر چلا گیا تھا" پان والے نے کہا "شاید پانچ منٹ پہلے۔"

میں نے سرہلایا "تم نے وکیل صاحب کو گیٹ سے گزر کر اندر جاتے دیکھا تھا؟"

"آپ تو پولیس والوں کی طرح جرح کرتے ہو جی۔ دیکھا نہیں تھا؟" پان والا بولا "پھر پانچ یا دس منٹ بعد میں نے دیکھا، گاڑی والا ڈرائیور کی جگہ بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کی تو میری نظر گئی ادھر۔ اس سے پہلے میں تھوڑی دیر کے لیے مصروف ہو گیا تھا۔ میں نے لائٹ آف کی اور کھوکھا بند کر دیا۔ اس وقت میں نے دیکھا تو اگلی سیٹ پر وکیل صاحب بیٹھی تھیں۔"

"بیٹھی تھیں، کیسے بیٹھی تھیں؟"

"کیسے.... جیسے سب بیٹھتے ہیں" وہ میرے سوال پر بوکھلا گیا۔

میں نے کہا "میرا مطلب ہے، بالکل سیدھی۔ وہ ہوش میں تھیں یا بے ہوش، کیا انہوں نے تمہاری طرف دیکھا تھا؟"

وہ سوچ میں پڑ گیا "میری طرف تو نہیں دیکھا تھا.... یہ معلوم نہیں کہ وہ.... ہوش میں ہی ہوں گی جی۔ بے ہوش آدمی سیدھا کیسے بیٹھ سکتا ہے سیٹ پر۔"

"بالکل ٹھیک خیال ہے تمہارا" میں نے کہا "کیا پچھلی سیٹ پر بھی کوئی تھا؟"

"میں نے دیکھا نہیں جناب۔ سچی بات ہے کہ پیچھے نظر ہی نہیں گئی تھی میری۔ اس کے بعد گاڑی چلی گئی۔"

"تم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ پیچھے، میرا مطلب ہے وکیل صاحب کے پیچھے کوئی ریوالور لیے بیٹھا تھا یا نہیں؟"

پان والے نے نفی میں سرہلایا "میں نے نہیں دیکھا جی۔"

میں نے کہا "وکیل صاحب بالکل سیدھا دیکھ رہی تھیں، اپنے سامنے؟"

"لگتا تو ایسا ہی تھا۔"

میں نے کہا "بے ہوش آدمی کو بھی چند منٹ کے لیے بیلٹ سے لگا کے، سیدھا بٹھایا جا سکتا ہے۔ کیا تم نے یہ نہیں دیکھا تھا کہ وکیل صاحب باہر کب آئی تھیں اور کیسے آئی تھیں؟ خود چل کے.... یا کوئی انہیں اٹھا کے لایا تھا؟"

اس نے پھر نفی میں سرہلایا "میں نے بتایا نا جناب، سامنے سے تو میں نے کھوکھا پہلے ہی بند کر دیا تھا۔ ان بدمعاشوں کے جانے کے پیچھے کا حصہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے وکیل صاحب کو پیچھے ہی بٹھایا تھا۔ سامنے فٹ پاتھ پر تو لوگ جمع ہو جاتے۔ ان کا تماشا بن جاتا۔ جب وہ چلی گئیں تو میں نے سوچا کہ اب کھوکھا بند کر کے نکل جاؤں۔ اس میں پانچ دس منٹ لگے تھے۔ دوبارہ میں نے گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز پر کوٹھی کی طرف دیکھا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اب سب لوگ چلے گئے ہو مگر گیٹ کا تالا کھلا ہوا تھا۔ میں بہت دیر تک دیکھتا رہا کہ اندر کوئی ہوگا تو باہر بھی آئے گا۔ اندر اندھیرا تھا۔ اس سے مجھے شک ہوا کہ کہیں کوئی معاملہ گڑبڑ نہ ہو۔ میں یہ دیکھنے تاکہ اندر کون ہے اور کیا کر رہا ہے۔ مجھے پچھلی طرف سے آوازیں سنائی دیں۔ ایک آواز آپ کی تھی۔ مجھے ایسا لگا کہ اندر جھگڑا ہو رہا ہے۔ میں نے پیچھے سے آ کے دیکھا تو کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ باقی سب دروازے بند تھے۔ میں نے باہر کی لائٹ جلانے کی کوشش کی تھی پر مجھے مین سوئچ نظر آ گیا۔ اسے آن کرتے ہی اندر بھی لائٹ جل گئی اور میں کھڑکی کے راستے چپکے سے اندر آ گیا۔"

میں نے اس کی بات پوری توجہ سے سننے کی کوشش کی تھی لیکن میرا ذہن بار بار رابعہ کے اغوا کے خیال سے ڈسٹرب ہو رہا تھا۔ یہ کام اتنا آسان نہیں تھا لیکن پان والے کے بیان پر شبے کی گنجائش بھی نہ تھی جس نے خود رابعہ کو دلاور کی گاڑی میں جاتا دیکھا تھا۔ غلط فہمی کا امکان بھی اس لیے نہیں تھا کہ جب پیڈرو اور دلاور آئے تھے تو ان کے ساتھ کوئی عورت نہیں تھی چنانچہ دلاور کے ساتھ بیٹھنے والی عورت رابعہ کے سوا کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ بھی بعید از قیاس تھا کہ وہ خود اس کی کار میں جا بیٹھی ہو۔ ظاہر ہے اس کو زبردستی لے جایا گیا تھا یا مجبور کر دیا گیا تھا۔

رابعہ کو اغوا کرنا آسان نہیں تھا۔ وہ کچھ نہ کچھ مزاحمت ضرور کرتی اور زبردستی کے جواب میں شور ضرور مچاتی۔ یہ الگ بات ہے کہ اسے موقع ہی نہ ملا ہو۔ اسے دلاور نے اچانک وار کر کے قابو میں کر لیا ہوگا۔ دلاور گیٹ کے اندر تھا مگر کوٹھی کے اندر نہیں تھا۔ اسے یقین ہوگا کہ رابعہ میرے پیچھے ضرور آئے گی اور غالباً رابعہ نے اس کی توقعات کے عین مطابق احتیاط سے کام نہیں لیا۔ اس نے گیٹ سے سیدھا گزر کے اندر آنے کی کوشش کی ہوگی اور گیٹ کے پیچھے چھپے ہوئے دلاور نے پیچھے سے اس کے سر پر ریوالور وغیرہ مار کے اسے ناک آؤٹ کر دیا ہوگا۔ اسے گرنے سے پہلے سنبھال کے وہ گاڑی تک گھسیٹ کر لے گیا ہوگا۔ گیٹ سے گاڑی تک مشکل سے پانچ چھ فٹ کا فاصلہ تھا اور گاڑی کے پیچھے ہونے والی اس کارروائی کو رات کے اندھیرے میں دیکھنے والا کون تھا۔ دلاور نے باہر آنے سے پہلے اطمینان کر لیا ہوگا کہ فٹ پاتھ پر کوئی نہیں ہے۔ بفرضِ محال دور سے کسی نے کچھ دیکھا ہوگا تو اس کی سمجھ میں کوئی بات آنے سے پہلے گاڑی روانہ ہو چکی تھی۔

رابعہ کوئی عام عورت نہیں تھی۔ وہ ایک مشہور وکیل تھی۔ اس کو اغوا کر کے کہیں قید رکھنا چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کے لیے سنگین مشکلات پیدا کر سکتا تھا اور اس سے دلاور کی نیک نامی کمانے کی ناتمام خواہش خاک میں مل سکتی تھی۔ یہ بات یقینی تھی کہ شہر میں اس واردات کا صرف چرچا ہی نہیں ہوگا، ہر جگہ طوفان اٹھ کھڑا ہوگا۔ سب سے پہلے تو ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن اٹھ کھڑی ہوگی پھر وکلا کی دیگر تنظیموں کے ساتھ ملک بھر کے وکلا بھی احتجاج کریں گے۔ پریس ان کا ہمنوا ہوگا اور پبلک کے ساتھ ساتھ سیاسی لیڈر بھی اپنی دکان چمکانے کے لیے حکومت کے خلاف مظاہروں کا سلسلہ شروع کر دیں گے۔ پولیس پر چوہدری دلاور کو گرفتار کرنے کے لیے اتنا دباؤ ہوگا کہ اس کا روپوش رہنا بھی ناممکن ہو جائے گا۔

اس نے ابھی ابھی اپنے سیاسی کیریئر کا آغاز کیا تھا۔ وہ اتنی بڑی بدنامی مول لینے کی حماقت نہیں کر سکتا۔ صرف یہی ایک احساس میرے لیے باعثِ اطمینان تھا لیکن دوسری طرف میں سمجھتا تھا کہ عام عورت نہ ہونے کے باوجود رابعہ ایک عورت ہے جس کی عزت و آبرو کا آبگینہ حباب سے زیادہ نازک ہوتا ہے۔ مرد ایک ہفتہ یا ایک مہینہ بھی دشمنوں کی قید میں کاٹ آئے تو اس کی نیک نامی پر حرف نہیں آتا۔ عورت دوستوں کے ساتھ ایک گھنٹا بند کمرے میں گزار آئے تو اس کے ماتھے پر سب کو کلنک کا ٹیکا نظر آنے لگتا ہے۔ دشمن تو دشمن ہی ہوتا ہے۔ وہ رابعہ کو انگلی بھی نہ لگائے لیکن اپنے لبوں پر ایک معنی خیز فاتحانہ مسکراہٹ سجا لے تو رابعہ کی کوئی دلیل اس کی پاک دامنی کو کھویا ہوا اعتبار عطا نہیں کر سکتی۔

میں قبل از مرگ واویلا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میرے ذہن میں خوف کے ساتھ ایک احساس تحفظ کا بھی تھا۔ چوہدری دلاور مجرم تھا اور اس کے جرائم کی فہرست کی کوئی انتہا نہ تھی۔ وہ اسمگلر تھا، غدار تھا، اس کے نزدیک دولت کا حصول ہی مقصدِ حیات تھا جس کی خاطر وہ کچھ بھی کر سکتا تھا اور اس کے مقابلے میں وہ انسانیت کو محض ایک بے معنی لفظ سمجھتا تھا مگر وہ بے وقوف نہیں تھا۔ اسے اپنے قول و فعل کی اچھائی برائی پر کسی سے رائے لینے کی ضرورت نہیں تھی مگر وہ نفع نقصان کو ملحوظ رکھے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاتا تھا۔ وہ رابعہ کے اغوا کے جرم میں ملوث ہونے کی حماقت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ پہلے بھی شیطان تھا مگر اب اس کی تمام کوششوں کا مقصد خود کو فرشتہ ثابت کرنا تھا اور رابعہ جیسی عورت کے اغوا کا جرم اتنا سنگین تھا کہ اس کا نام بھی اس واردات میں آتا تو اس کا سیاسی مستقبل شروع ہونے سے پہلے ہی تباہ ہو جاتا۔

چوہدری دلاور اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے والا آدمی نہیں تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ جواب میں ایم آر ایس اس کا خانہ خراب کر دے گی۔ ہم میں سے کوئی بھی اس اغوا پر قانون کے مطابق کارروائی کے نتائج کا انتظار کرتے ہوئے خاموش بیٹھنے والا نہیں تھا۔ ایم آر ایس کو قانون کی مجبوری کا بھی اتنا ہی احساس تھا جتنا قانون کے رکھوالوں کی غیر ذمے دارانہ روش کا اور فرض شناسی کے معاملے میں عدم دلچسپی کا۔ ایم آر ایس ایسے تمام معاملات کو اپنے انداز میں طے کرنے کی اہل تھی جو قانونی مسائل کی بھول بھلیوں میں اور سرخ فیتے کی کارروائی میں برسوں الجھے رہنے کے بعد سرد خانے کی نذر ہو جاتے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ چوہدری دلاور موجودہ حالات میں ایم آر ایس سے براہِ راست تصادم نہیں چاہے گا۔

مجھے رابعہ پر بھی بھروسہ تھا کہ وہ اپنا دفاع کر سکتی ہے اور دلاور کی عقل کو راہِ راست پر لا سکتی ہے۔ جذبات کی رو میں بہہ کے یا اشتعال کی کیفیت میں ایک غلط قدم اٹھانے والے چوہدری دلاور کو

سمجھا سکتی ہے کہ اس نے اپنے مستقبل کے لیے کتنے سنگین خطرات کو دعوت دی ہے۔ اس نے مصالحت اور مفاہمت کی جتنی کوشش کی تھی اس کے پیش نظر مجھے دلاور سے ایسی بے وقوفی کی توقع نہیں تھی۔ مجھے یہ خیال بھی آرہا تھا کہ کہیں رابعہ اپنی مرضی سے اس کے ساتھ نہ گئی ہو۔ دلاور نے اسے کہا ہو کہ وہ کوٹھی کے معاملات پر اس سے بات کرنا چاہتا ہے۔ رابعہ کو یقین دلادیا ہو کہ سکندر کو کچھ نہیں ہوگا۔ پیڈرو خود اسے گھر پہنچادے گا۔ پیڈرو مسلح نہیں ہے۔ وہ سکندر کا کیا بگاڑ سکتا ہے۔ شاید وہ رابعہ کو قائل کرنے میں کامیاب ہوگیا ہو کہ درمیان میں اس کی کوٹھی پر چاندنی بیگم اور گولا پہلوان کے قبضے میں اس کا ہاتھ نہیں تھا اور وہ رابعہ کو بتا سکتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا تھا اور کیسے ہوا تھا۔

اس کے باوجود رابعہ کا مجھے کچھ بتائے بغیر چوہدری دلاور کے ساتھ چلے جانا میرے لیے ناقابل فہم تھا۔ حقیقت کچھ بھی تھی اور وجہ جو بھی ہو، میں اب مزید تاخیر کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ میں اس خیال سے مطمئن نہیں ہوسکتا تھا کہ استاد پیڈرو میرے قبضے میں ہے اس لیے رابعہ محفوظ رہے گی۔ چوہدری دلاور جیسے لوگوں کے لیے استاد پیڈرو جیسے کرائے کے بدمعاش بہت تھے مگر میرے لیے اس زندگی، اس جہان، ارض و سما کی وسعت اور اس کائنات میں رابعہ صرف ایک ہی تھی اور اس سے ایک لمحے کی جدائی کا تاوان کوئی استاد پیڈرو جان دے کر بھی ادا نہیں کرسکتا تھا۔

پان والا میری صورت کے تغیرات کا بغور جائزہ لے رہا تھا اور غالباً پریشانی کی اس دلدل سے نکل جانے کی دعا مانگ رہا تھا جس میں اس نے شامتِ اعمال کے باعث قدم رکھ دیا تھا۔ اس کی نگاہ بار بار اس باتھ روم کی طرف جاتی تھی جہاں میں نے استاد پیڈرو کو خاصی بُری حالت میں ڈال دیا تھا۔

بالآخر اس نے کہا "میں... چلتا ہوں جی۔ گھر پر میری بیوی بچے پریشان ہوں گے۔ گیارہ بجے تک پہنچ جاتا ہوں میں.... آج...."

میں نے کہا "تم جاؤ۔ اور میرا مشورہ مانو تو ابھی چند دن گھر میں رہو۔"

"گھر میں رہوں...؟"

"ہاں۔ کھوکھے کی طرف آؤ گے تو.... میرا مطلب ہے کہ تمہارے وہ دشمن کچھ کرسکتے ہیں جو چاہتے تھے کہ تم اپنا کھوکھا خالی کردو۔ ان سے مقابلہ تمہارے بس کی بات نہیں۔ قانون تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکتا۔"

"مگر آپ نے تو کہا تھا..؟"

میں نے کہا "ہم تمہارا کوئی نہ کوئی بندوبست ضرور کریں گے۔ کوئی اور جگہ مل جائے گی تمہیں۔ جو اس سے بہتر ہوگی۔ گھر تمہارا اپنا ہے؟"

اس نے مُردہ آواز میں کہا "کرائے کا ہے جی۔"

میں نے کہا "اگر ہوسکے تو گھر بھی بدل لو۔ تم کچھ ایسے معاملات میں اُلجھ گئے ہو... کہ تمہیں اپنی حفاظت کرنی ہوگی۔ اس سے کچھ کہنے کی اور کوئی بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ کل اس پر فون کرلینا..."

میں فون کی بات کرہی رہا تھا کہ اندر کہیں ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اگر یہ رابعہ کا پرانا گھر ہوتا تو میں اندازہ کرلیتا کہ گھنٹی بیڈ روم میں بج رہی ہے یا ڈرائنگ روم میں لیکن وہ گھر بم کے ایک دھماکے سے بہت پہلے ختم ہوچکا تھا اور اب اس عمارت کا نقشہ میرے ذہن میں رہ گیا تھا یا رابعہ کے تصور میں۔ اسی زمین پر تعمیر ہونے والی یہ نئی کوٹھی میرے لیے اجنبی تھی۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اب اس کا فون نمبر کیا ہے۔ ایک مُدت سے کوٹھی ویران پڑی تھی۔ اس کے آخری مکین چاندنی بیگم اور گولا پہلوان زیرِ مدفن خاک سو رہے تھے۔ پھر اس وقت یہ نمبر کس نے ملایا؟ فون کرنے والا کس سے بات کرنا چاہتا تھا؟

میں نے ساتھ والے کمرے میں جاکے سنا تو گھنٹی بجنے کی آواز کہیں اوپر سے آرہی تھی اور مجھے یہ بھی اندازہ نہ تھا کہ زینہ اب کہاں ہے۔ اندر کے سب کمروں کا آپس میں براہِ راست یا کاریڈور سے رابطہ تھا۔ میں دوسرے کمرے سے کاریڈور میں آیا ہی تھا کہ مجھے زینہ نظر آگیا۔ چکر کھاکے جانے والا یہ زینہ ڈرائنگ روم میں لاؤنج کے آخری حصے میں تھا۔

فون کرنے والا خاصا مستقل مزاج معلوم ہوتا تھا کہ ابھی تک اس نے لائن ڈس کنیکٹ نہیں کی تھی ورنہ عام طور پر آٹھ دس گھنٹیاں بجنے پر بھی ریسیور نہ اٹھایا جائے تو لوگ یہ فرض کرلیتے ہیں کہ کوئی موجود نہیں اور ریسیور رکھ دیتے ہیں۔

میرے اوپر پہنچنے تک فون کو مسلسل بجتے ہوئے ڈیڑھ دو منٹ ہوچکے تھے مگر جیسے ہی میں نے اوپر والے ٹیرس نما لاؤنج کے کونے میں رکھے ہوئے فون کا ریسیور اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا، گھنٹی خاموش ہوگئی۔ میرا ہاتھ رک گیا۔ یہ بڑی عجیب بات تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی شخص مجھے پریشان کرنا چاہتا تھا اور کہیں سے چھپ کے سب کچھ دیکھ رہا تھا کہ جیسے ہی میں ریسیور اٹھانے لگوں، وہ فون بند کردے۔ میں چند سیکنڈ خفت، کوفت اور تذبذب کے جذبات سے مغلوب منتظر رہا کہ گھنٹی پھر بجے لیکن فون تو جیسے ڈیڈ ہوگیا تھا لیکن ایسا نہیں تھا۔ میں نے ریسیور اٹھاکے دیکھا تو ٹون آرہی تھی۔

میں ریسیور کو کریڈل پر رکھ کے پلٹا ہی تھا کہ گھنٹی پھر بجی اور اس بار میں نے لپک کے ریسیور اٹھالیا۔ کسی مرد نے تصدیق کے لیے مجھ سے نمبر پوچھا۔

میں نے کہا "مجھے نہیں معلوم۔ تم نے کہاں فون کیا ہے؟"

"میں نے یہی نمبر ملایا تھا" وہ بولا۔

"بھائی، بات کس سے کرنی ہے؟ یہاں تو کوئی بھی نہیں رہتا۔"

"پھر تم کون ہو؟" اس نے نیم سنجیدہ لہجے میں پوچھا "بھوت! کوئی تم سے ہی بات کرنا چاہتا ہے۔"

غلط نمبر مل جانے کے بعد کچھ لوگ بے سبب تفریح بھی لیتے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ یہ بھی کوئی ایسا ہی فارغ شخص ہے یا پھر ٹیلی فون پر جو رات کو اِدھر اُدھر کی کال ملانے کے لیے بدنام ہیں۔ کوئی دلکش آواز سنائی دے جائے تو دل لگی کرتے ہیں اور.... بقول راوی... سنا ہے ایسے ہی اندھیرے میں ان کا تیر جا لگتا ہے تو رشتے بھی استوار ہوجاتے ہیں۔ کبھی جذباتی کبھی کاروباری۔ پیاسے کو کنواں مل جاتا ہے اور کنویں کا کیا سب کی پیاس بجھادیتا ہے۔ لوگ آتے ہیں، ڈول ڈالتے ہیں اور پانی پی کے اپنی راہ لیتے ہیں۔ کنواں وہیں رہتا ہے۔

اچانک رابعہ کی آواز سن کے میں یوں اچھل پڑا جیسے کسی بھوت نے سچ مچ سامنے آکے میرے کان میں فائر کردیا ہو۔

"رابعہ...." میں چلایا۔

"ہاں۔ سکندر..."

"تم کہاں ہو رابعہ؟" میں نے چیخ کے کہا "کہاں سے بول رہی ہو؟ یہ اچانک مجھے چھوڑ کے تم کہاں چلی گئی تھیں؟ جانا تھا تو مجھے بتا کے جاتیں۔ میں کس قدر پریشان تھا۔ تم کو اندازہ ہے؟"

"مجھے اندازہ ہے۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا "اینڈ آئی ایم سوری۔"

"سوری! مائی فٹ۔ یہ ایسا طریقہ سکھادیا ہے انگریزوں نے ہمیں... جو زیادتی چاہے کرو اور پھر کہہ دو سوری..."

"سنو سکندر! پہلے میری بات سن لو۔"

"پہلے بتاؤ تم ہو کہاں؟"

"یہ میں.... پھر بتاؤں گی...."

اس کے تذبذب نے میرے کان کھڑے کردیے "ایسی کیا بات ہے رابعہ، ابھی بتانے میں کیا ہے؟ کہیں تم اس حرامزادے کی تحویل میں تو نہیں ہو؟"

اس نے پھر غیر معمولی وقفے سے کہا "یہ تم فرض کررہے ہو۔"

"کیا فرض کررہا ہوں؟" میں نے چلّا کے کہا "رابعہ، تم کو چوہدری دلاور کی گاڑی میں بیٹھ کر جاتے ہوئے ساری دنیا نے دیکھا تھا۔ ساری دنیا کے ساتھ میں بھی دیکھ رہا تھا۔ تم اگلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ تمہیں اغوا کرکے لے گیا ہے نا؟"

رابعہ نے اسی سپاٹ لہجے میں کہا "نہیں، یہ غلط ہے۔"

"یہ بالکل صحیح ہے، تم جھوٹ بول رہی ہو کسی کے ڈر سے۔ کوئی اور بھی موجود ہے وہاں جو یہ ساری باتیں سن رہا ہے۔ ہے نا خراب بات؟ خیر، سننے دو انہیں، میں بھی انہیں بتادینا چاہتا ہوں..." میں نے دیوانہ وار چلّاتے ہوئے کہا۔

"کیوں بلاوجہ ہنگامہ کررہے ہو! میں کسی کے ساتھ نہیں گئی۔ نہ مجھے دلاور نے اغوا کیا تھا اور نہ میں اس کے ساتھ گاڑی میں گئی تھی۔ غلط فہمی ہوئی ہوگی تمہیں۔"

"غلط فہمی!" میں نے یوں چیخ کے کہا جیسے یہ لفظ گالی ہو۔

"پریشان ہونے کی بات نہیں، میں خیریت سے ہوں..."

وہ بات جس کا مجھے ڈر تھا، رابعہ کے اندازِ گفتگو اور اس کے محتاط لہجے سے سچ ثابت ہورہی تھی۔ اسے یقیناً اغوا کیا گیا تھا اور اس وقت جو کچھ رابعہ کہہ رہی تھی، اپنی مرضی سے نہیں کہہ رہی تھی۔ کسی مجبوری کے باعث وہ ایسا کہہ رہی تھی۔ میں اس مجبوری کا صحیح اندازہ نہیں کرسکتا تھا مگر اتنا یقین کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ اس کی اپنی ذات کو خطرہ لاحق ہوتا تو وہ جھوٹ نہ بولتی۔ اس جھوٹ سے میرا یا ہم میں سے کسی کا فائدہ وابستہ تھا۔

میں نے کہا "رابعہ! کیا خود تمہیں یقین ہے کہ میں تمہاری بات پر اعتبار کرلوں گا؟ کیا اس طرح میں تمہیں چھوڑ کے جاسکتا ہوں؟"

"میں کل بات کروں گی..."

"سنو رابعہ! فون بند مت کرنا" میں نے چلّا کے کہا "دیکھو، میری بات کرادو چوہدری دلاور سے۔"

"چوہدری دلاور تو یہاں نہیں ہے۔"

"پھر کون ہے؟ اس کا کوئی حکم کا غلام؟ اسے ایک پیغام دے دو.... تم کچھ مت کہو، مجھے معلوم ہے وہ سب سن رہے ہوں گے۔ خود چوہدری دلاور سُور کا بچہ سب سن رہا ہوگا۔ میں اسے بتانا چاہتا ہوں کہ پیڈرو میرے پاس ہے اور کل تک اس نے تمہیں نہ چھوڑا یا اس نے تمہارے ساتھ کوئی زیادتی کی تو میں اس.... کے سارے خاندان کی.... ہیلو، رابعہ! ہیلو۔"

میں نے سخت مشتعل ہوکے چوہدری دلاور کو بڑی فحش گالیاں دی تھیں لیکن جیسے ہی مجھے احساس ہوا کہ رابعہ ایسی گالیاں میرے منہ سے سن کے بھی چپ ہے، مجھے شک ہوگیا کہ لائن کٹ چکی ہے۔ میں نے زور زور سے کریڈل کو دبایا اور ہیلو ہیلو کہتا رہا مگر ریسیور سے مسلسل ڈائل ٹون آرہی تھی۔ رابعہ کی لائن کاٹ دی گئی تھی۔

میں کچھ دیر صدمے کو برداشت کرنے کی کوشش میں سُن کھڑا رہا۔ ابھی تک مجھے یقین نہیں آیا تھا کہ وہ رابعہ مجھ سے چھن گئی ہے جو کچھ دیر پہلے میرے ساتھ انارکلی میں تھی۔ ہم داتا صاحب کے دربار میں حاضری دے کے نکلے تھے تو ہم نے انارکلی میں دہی بھلے کھائے تھے اور پھر کافی پی تھی۔ اپنا گھر دیکھنے کی خواہش خود رابعہ نے ظاہر کی تھی حالانکہ اس گھر کی زمین کے سوا یہاں اس کا کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ باقی سب یادیں تھیں۔ ان یادوں کے مزار تک باقی نہ رہے تھے۔ نہ وہ کمرا کہیں تھا جس میں کبھی رابعہ کا بیڈ روم تھا، نہ وہ جس میں اس کی بیمار ماں لیٹی رہتی تھی۔ اس پرانے گھر کا فرنیچر، سازوسامان، پردے، قالین، رابعہ کے استعمال کی چیزیں، اس کی کتابیں، باہر کا مختصر باغیچہ، ہر چیز خوابِ فردا کا نقش ہوگئی تھی۔ یہ ایک جذباتی حماقت تھی، ایک بچکانہ خواہش اور

ایک بے سبب دیوانگی۔ بہ الفاظِ دیگر شامتِ اعمال۔ غلطی میری تھی کہ میں نے اس کی بات مانی۔

مجھے اچانک کمزوری سی محسوس ہونے لگی تھی۔ میرا وجود ایک زلزلے کی زد میں تھا اور ایک طرف جذبات کا سیلِ بلاخیز تھا تو دوسری طرف عقل کے اندیشہ ہائے دور و دراز کا طوفان۔ یہ کیا ہوا؟ یہ کیوں ہوا اور اب کیا ہوگا؟ ایک نہیں سیکڑوں سوال تھے جو کیڑوں کی طرح کلبلا رہے تھے اور مجھے کاٹ رہے تھے۔ رابعہ نے اپنے لہجے اور انداز کی بے بسی سے مجھ پر واضح کردیا تھا کہ وہ کتنی مجبور ہے۔ دوسری طرف اس کے الفاظ حقائق کی تردید کررہے تھے۔ اچانک میرے لیے سب کچھ بے مقصد ہوگیا تھا۔ اپنی زندگی' اپنا مقصدِ حیات' اپنی جدوجہد اور اپنا آئیڈیلزم۔ اصول پرستی' شرافت اور انسانیت' اخلاقی اقدار اور قانون کا احترام کرنے والی خیالی دنیا کسی دیوانے کا خواب تھی اور میں پاگل تھا کہ اس خواب کی تعبیر کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔

اچانک اس ویرانے میں ایک بازگشت ابھری۔ "یہ سب بے کار ہے۔" پھر دوسری آواز آئی "یہ دنیا ایسے ہی رہے گی۔"

تیسری آواز نے کہا "اس میں چوہدری دلاور ہی حاکم رہیں گے۔" پھر چوتھی آواز گونجی "وہ معتبر ہوں گے اور معزز...."

"وہ صاحبِ اقتدار ہوں گے...."

"وہ انصاف کریں گے اور نظامِ انصاف بھی انہی کا ہوگا۔"

"ایم آر ایس کے چیف کے ٹُو' دنیا کی تسخیر کا خواب دیکھنے والے پاگل سکندرِ اعظم! تم کو ہر چوہدری دلاور کے سامنے سر جھکانا ہوگا۔ اس کی اطاعت کرنی ہوگی۔"

"ورنہ تمہارا وجود صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹادیا جائے گا۔"

"تمہاری جدوجہد لاحاصل ہے۔"

"تمہاری خواہشات فریبِ خیال ہیں۔"

"جو کچھ تم کررہے ہو' سب بے کار ہے۔"

پھر ایک ساتھ سب آوازوں نے کورس شروع کیا۔ سب بے کار ہے' سب بے کار.... اب بھی مان لو اپنی ہار.... سب بے کار ہے' سب بے کار.... مان لو اب بھی اپنی ہار۔ پھر وہ مجھ پر قہقہے لگانے لگے۔ ہاہاہا....

ان آوازوں کے شور سے میرا سر پھٹنے لگا۔ وہ بدروحیں تھیں، شیاطین تھے اور خیالوں کے عفریت تھے جو ایک ہجوم کی شکل میں میرے چاروں طرف رقصاں تھے اور اپنی بھیانک' مکروہ شکلوں سے مجھے ڈرا رہے تھے۔ میں جیسے کسی پرانے قبرستان میں تنہا بیٹھا تھا اور اندھیری رات میں قبروں سے نکل نکل کے ان گنت اندیشوں کے کھڑکھڑاتے ڈھانچے اپنے استخوانی پنجے بجاتے میری طرف بڑھ رہے تھے۔

ایک بار پھر گھنٹی بجی تو میں چونکا اور فون کو یوں دیکھنے لگا جیسے وہ کوئی بھیانک تباہ کن چیز ہے جسے ہاتھ لگاتے ہی سب نیست و نابود ہوجائے گا۔ نہ میرا احساس رہے گا اور نہ میں رہوں گا۔ صرف جمود ہوگا اور سناٹا اور سرد منجمد کردینے والا اندھیرا ہوگا۔

گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔ پُرآسیب آوازوں کا شور تحلیل ہوکے اس خاموشی کا حصہ بن گیا تھا جو شور سے زیادہ اعصاب شکن تھی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے ہاتھ بڑھایا اور ریسیور اٹھالیا۔

"رابعہ!" میں نے کہا "تم نے اچھا کیا کہ پھر فون کرلیا۔"

"ابے رابعہ کے گھوڑے! میں تیرا مجازی باپ بول رہا ہوں۔" میں نے منظر کی آواز سُنی "بھوتنی کے' یہ کیا ڈراما ہورہا ہے اس وقت؟"

میں نے گہری سانس لے کر کہا "منظر! تجھے کس نے بتایا کہ میں یہاں ہوں؟"

"کیا بتاؤں دوست" وہ آہ بھر کے بولا "میرے غریب خانے کو ایم آر ایس نے ٹیلی فون ایکس چینج سمجھ لیا ہے۔ کبھی ادھر سے کال آتی ہے' کبھی اُدھر سے۔ مجھے فون کیا تھا رابعہ نے۔ لگتا تھا دوسری دنیا سے بول رہی ہے۔"

"کیا کہہ رہی تھی؟"

منظر نے کہا "میری سمجھ میں تو کچھ آیا نہیں۔ اس نے یہ نمبر دیا اور کہا کہ سکندر سے بات کرو' میری تو عقل چکرا گئی۔ میں نے کہا کہ بی بی' کیا تمہاری آپس میں بات چیت بند ہے؟ تم خود بھی تو فون کرسکتی تھیں۔ اس نے کہا میں نے ابھی بات کی تھی' وہ بہت پریشان ہے اور غصے میں پاگل ہورہا ہے۔ میری بات سننے اور سمجھنے کے لیے تیار نہیں' میں نے کہا' یہ کیا پہیلی ہے میری سہیلی۔ جب وہ تمہارے اشارۂ ابرو کا غلام اور تمہاری محبت کا اسیر تمہاری بات نہیں کہہ رہا ہے تو میری خاک سُنے گا۔ اور ایسی کیا غلط حرکت فرمائی تم نے کہ وہ غصے میں بھوت بنا ہوا ہے؟ اس نے کہا کہ بھائی منظر' آپ صرف یہ سمجھادیں کہ وہ کچھ بھی نہ کرے۔ میں بالکل خیریت سے ہوں اور پریشانی کی واقعی کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ محترمہ رابعہ' میں احمق ضرور ہوں مگر اتنا نہیں جتنا سکندر۔ میرے بچ کا برا مت ماننا' تمہاری بات میں اقرار ہے تمہاری پریشانی کا اور تمہارے خیریت سے نہ ہونے کا' آخر تم کہاں ہو اور وہ کہاں ہے؟ رابعہ نے کہا کہ آپ بھی میری بات سمجھ لیں۔ میں آپ کو' میرا مطلب ہے آپ میں سے کسی کو ہر روز فون کروں گی لیکن شرط یہ ہے کہ کسی کا فون ٹیپ نہ ہو' آبزرویشن پر نہ رکھا جائے۔ اگر کسی نے ایسا کیا تو مجھے معلوم ہوجائے گا اور پھر رابطہ مشکل ہوجائے گا۔ بس یار' میں تو ہکا بکا کھڑا اس پُراسرار معمے کو سمجھنے کی فضول کوشش کرتا رہ گیا اور لائن کٹ گئی۔ اب آپ فرمائیں یہ ماجرا کیا ہے؟ کوئی نیا کھیل شروع کیا ہے تو برادر' میرے پندرہ بچوں کی پندرہ ہزار قسم' مجھے اس میں مت شامل کرو۔"

میں نے کہا "منظر' یہ بہت سیریس معاملہ ہے۔"

اس نے روتی آواز میں کہا "تمہارا کون سا معاملہ سیریس نہیں ہوتا بھائی؟ ایک وہ کبیر داس تھے۔ دیکھ کبیرا رویا والے۔ وہ بھی بابا کبھی ہنسے نہیں تھے۔ ایک تم کبیر خاں ہو' غلطی سے بھی کوئی ایسا کام نہیں کرتے جس میں مصیبت نہ ہو۔ جھیلنے کو رہ گیا ہوں میں بدبخت۔"

میں نے کہا "یار' فون پر نہیں بتا سکتا ساری بات۔ تم آسکتے ہو اس وقت؟"

"میاں مجنوں! تم ہو ابھی صرف ایک عاشق۔ شوہر نہیں بنے ہو۔ چھڑے چھانٹ عرف لنڈورے خاں" منظر بولا "تمہارا کیا ہے' رات فٹ پاتھ پر گزارو' گھر میں یا حوالات میں.... لیکن میں ہوں بیاہا شادی شدہ۔ میرے جیسے کسی بھی قیدی کو اس وقت بستر سے نکلنا ایسا ہی گناہ ہے اور مشکل ہے جیسا مُردے کو سوال جواب کے وقت قبر سے نکالنا۔"

"یار' فضول باتیں مت کرو" میں نے برہمی سے کہا "مجھے نہیں معلوم کہ غالب اور نازو اس وقت کہاں ہوں گے۔ وہ اخبار کے چکر میں آفس گئے تھے۔ کیا پتا ابھی تک وہیں بیٹھے ہوں۔ میرے پاس ان کے آفس کا فون نمبر بھی نہیں ہے۔"

"فون نمبر میں بتادیتا ہوں۔"

"مجھے مت بتا' انہیں فون کردے اور کہہ دے کہ وہ رابعہ کے پرانے گھر پہنچ جائیں۔ فوراً سارے کام چھوڑ کر اور جتنی جلدی ممکن ہو۔"

"یار' کچھ تو بتادے کہ یہ کیا فون بازی ہورہی ہے اور کیوں ہورہی ہے؟ رابعہ نے تجھے فون کیا پھر مجھے' میں نے تجھے فون کیا اور اب غالب کو فون کرکے کہوں کہ وہ تجھے فون کرے۔ میری تو نیند اڑگئی ہے اور پریشانی میں بھوک سے بُرا حال ہوگیا ہے۔ اب میں سو بھی نہیں سکتا۔ میرا ازدواجی مستقبل سخت خطرے میں ہے۔ تمہارے اعمالِ خبیثہ کے باعث اور حالات یہی رہے تو میرے پندرہ نابچے رہ جائیں گے یا سولہواں ہوگا تو میرا نہیں ہوگا۔"

پس منظر میں اس کی بیوی نے اسے ڈانٹا "بے شرمی کی بھی حد ہوتی ہے۔"

"تمہاری بھابی صاحبہ پوچھ رہی ہیں کہ آخر بے شرمی کی کوئی حد ہے تم لوگوں کی؟ بھئی' سکندر کہہ رہا ہے کہ وہ حد ابھی نہیں آئی" یہ آخری بات منظر نے اپنی بیوی سے کہی تھی۔ "اچھا پیارے' میں آتا ہوں بادلِ ناخواستہ۔ میرے پہنچنے تک بقیدِ حیات رہنا۔ میں غالب کو فون کرکے آؤں گا۔"

میں نے ریسیور رکھ دیا۔ اب میرا اعتماد کسی حد تک بحال ہونے لگا تھا۔ رابعہ یقیناً کہیں قید تھی جہاں اسے صرف اتنی سہولت حاصل تھی کہ وہ ہم سے فون پر بات کرے لیکن یہ اجازت مشروط کردی گئی تھی۔ ہم یہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کریں گے کہ کس فون سے بات کرتی ہے اور خود یا پولیس کی مدد سے کال کو ٹیپ بھی نہیں کریں گے۔ بصورتِ دیگر رابطے کا یہ وسیلہ بھی باقی نہیں رہے گا۔ یہ بات رابعہ کو اچھی طرح سمجھادی گئی تھی کہ اسے ہم سے کیا کہنا ہے اور کیا نہیں کہنا ہے۔ وہ مجبور تھی کہ ہم سب کے مفاد میں ان کی بات مانے جو اسے کسی نامعلوم مقام پر ہم سب کی دسترس سے دور پہنچا چکے تھے۔

غالباً چوہدری دلاور کے ذہن میں رابعہ کے اغوا کا کوئی منصوبہ نہیں تھا مگر میں نے اچانک سامنے آکے پیڈرو کو گرفتار کرلیا تو چوہدری دلاور کے لیے رابعہ کو اپنے ساتھ لے جانے کے سوا چارہ نہ رہا۔ وہ خود وہاں ٹھہرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا اور اگر رابعہ خود چل کے اس کے پاس نہ جاتی تو وہ اکیلا ہی خاموشی سے کھسک لیتا۔ رابعہ کو دیکھ کے اس نے اچانک یہ بازی جیتنے کے لیے ٹرمپ کارڈ اپنے ہاتھ میں رکھنے کا فیصلہ کیا۔ میرا آدمی واپس کردو' رابعہ کو لے جاؤ۔ اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوگی تو رابعہ بھی خیریت سے رہے گی۔

لیکن رابعہ کے فون سے اندازہ ہوتا تھا کہ بات اتنی آسان اور مختصر نہیں ہوگی۔ دلاور کے عزائم کچھ اور تھے۔ وہ معاملے کو لمبا کرنا چاہتا تھا اور وہ اس پوزیشن میں بھی تھا کہ سودا اپنی شرائط پر کرے۔ اسے پیڈرو کی نہ اتنی فکر تھی اور نہ ضرورت' جتنی مجھے رابعہ کی۔ خود اس کی ذات پر براہ راست الزام نہیں آتا تھا۔ وہ معتبر گواہوں کی مدد سے ثابت کرسکتا تھا کہ جس وقت رابعہ کا اغوا (مُبیّنہ طور پر) ہوا' اس وقت وہ جائے وقوعہ سے بہت دور کسی کارِ خیر میں مصروف تھا۔ نہ جانے کتنے معززینِ شہر عدالت میں حلفیہ بیان دینے پر تیار ہوں گے کہ عین اس وقت جناب چوہدری دلاور صاحب ان کے گھر میں دیگر معززین کے ساتھ ایک محفلِ سماع سے لطف اندوز ہورہے تھے یا فلاں فلاں کی محفل میں سماجی بہبود کے ایک پروگرام کی تفصیلات طے کررہے تھے جس کو چوہدری صاحب کی سرپرستی حاصل ہے' اور ان "معززین" میں ایسے ایسے لوگ ہوں گے جن کی گواہی کو ہر عدالت تسلیم کرے گی۔

میں آہستہ آہستہ نیچے آیا۔ میرے دل پر پچھتاوے کا بوجھ تھا۔ مجھے شدت سے احساس تھا کہ رابعہ نے اس طرف آنے کی جذباتی خواہش کا اظہار کرکے اتنی بڑی غلطی نہیں کی تھی جتنی میں نے استاد پیڈرو اور دلاور کو دیکھ کے کی تھی۔ میں جذبات کو کنٹرول میں رکھتا تو دیوانہ وار بھاگنے کے بجائے پُرسکون رہتے ہوئے خاموشی سے سب دیکھتا رہتا اور اطمینان سے اندر جاکے پیڈرو کے ساتھ دلاور سے بھی نمٹ لیتا۔ ساری خرابی میرے اندھا دُھند بھاگنے سے ہوئی۔ میں تو خیر مرنے سے بچ گیا مگر میری حرکت نے ان دونوں کو متوجہ کرلیا۔ انہوں نے رابعہ کو بھی دیکھ لیا اور بدحواسی میں رابعہ میرے پیچھے لپکی تو چوہدری دلاور کو موقع مل گیا کہ خود بھی نکل جائے اور اپنے ساتھ میری شکست کے اسباب بھی لے جائے۔

میں نے اس ایک لمحے کی دیوانگی کو کوسا جب میں ہوش کے بجائے جوش کے جذبات سے مغلوب ہوگیا تھا لیکن اب میرے پچھتانے سے کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

پان والا موقع ملتے ہی فرار ہوگیا تھا۔ باتھ روم کا دروازہ باہر سے اسی طرح بند تھا جیسے میں نے چھوڑا تھا۔ اندر پیڈرو ٹائلوں کے فرش پر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی حالت پہلے سے بہتر نظر آتی تھی۔ اس نے واش بیسن سے منہ دھولیا تھا مگر اس کی آنکھوں کے نیچے نیل نظر آرہے تھے۔ اس کی ناک سوج گئی تھی اور ایک ہونٹ کا کنارا پھٹا ہوا نظر آرہا تھا۔ اس سے خون اب بھی رِس رہا تھا۔

میں نے باتھ روم کا دروازہ اپنے پیچھے بند کیا "پیڈرو! تم یہاں کیوں آئے تھے؟"

اس نے قمیص کی آستین سے ہونٹ صاف کیے "مجھے دلاور نے ساتھ چلنے کے لیے کہا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ یہاں کیا لینے آیا تھا۔"

"دلاور آج کل کہاں رہتا ہے؟"

"وہ اپنے ٹھکانے بدلتا رہتا ہے" پیڈرو نے کہا۔

"کہاں کہاں ہیں یہ ٹھکانے؟"

"میں بھی سارے ٹھکانوں سے واقف نہیں۔"

میں نے اس کی ٹھوڑی پر کِک ماری "اس کے بیوی بچے کہاں رہتے ہیں؟ اس کا گھر تو وہی کہلائے گا..."

"بیوی بچوں کو اس نے بہت پہلے باہر بھیج دیا تھا۔" پیڈرو نے بڑی مشکل سے جواب دیا۔

"باہر کہاں؟"

"لندن" پیڈرو نے خون تھوک دیا۔

"عارضی طور پر؟"

اس نے واش بیسن کا نل کھول کے ٹھنڈے پانی سے کُلّی کی "نہیں۔ بچے وہیں پڑھتے ہیں۔ اس نے کوئی مکان بھی خرید لیا ہے وہاں۔"

"کس کے نام سے؟"

"اپنے نام سے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ اس کے پاس برطانیہ کی شہریت بھی ہے" پیڈرو نے کہا "اس نے سرمایہ کاری کی بنیاد پر اور برطانوی شہریت کو بنیاد بنا کے کینیڈا میں رہائش کی اجازت لے رکھی ہے اور وہ کینیڈا کا شہری بن گیا تو امریکا بھی چلا جائے گا۔"

"تم نے کہا تھا کہ وہ سیاست میں حصہ لینا چاہتا ہے" میں نے کہا "یہ اسی کی پیش بندی ہے؟"

پیڈرو نے اقرار میں سرہلایا "سیاست دانوں پر بُرا وقت آتے دیر نہیں لگتی۔ وہ پناہ گاہیں پہلے بنا لیتے ہیں۔"

میں نے اسے گردن دبوچ کے اٹھایا "تم بہت کچھ بتاتے رہے ہو مجھے مگر وہ سب جھوٹ تھا۔ تم نے اور اکبر خان نے دلاور کے اشارے پر خود کو ہمارا بہی خواہ ثابت کرنے کے لیے بہت سے ڈرامے کیے تھے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا تھا جب میں قائل ہونے لگا تھا کہ تم واقعی مظلوم اور ہمدردی کے مستحق ہو۔ تم نے اور اکبر خان نے ہماری جتنی مدد کی تھی، وہ ایک پُرفریب کوشش تھی۔"

پیڈرو نے پھٹی پھٹی آواز نکالی "تم کچھ بھی سمجھ سکتے ہو۔"

میں نے اسے پیچھے کی دیوار پر دے مارا اور ایک گھٹنے سے دبا کے اس کے بال پکڑ لیے "اب تم سچ بولو گے۔ ساری زندگی جھوٹ بولنے کے بعد یہ تمہارے لیے بہت مشکل ہوگا مگر ہم تمہاری مشکل آسان کردیں گے۔"

اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "نہ جانے کب سے تم مجھے قتل کرنا چاہتے ہو۔ اس وقت تمہیں روکنے والا کون ہے۔ کردو میرا کام تمام۔"

میں نے اس کی گردن پر ہاتھ جما کے دیوار پر دباؤ ڈالا۔ اس کا سانس رکنے لگا اور اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر نکلنے لگیں۔ اس نے میری گرفت سے نجات پانے کے لیے ہاتھ پاؤں چلائے مگر میری گرفت سخت سے سخت تر ہوگئی۔ پہلی بار مجھے اس کی دہشت زدہ آنکھوں میں موت کی دہشت نظر آئی۔ شاید میں اسے مار ڈالتا۔ مجھ پر ایک جنونی کیفیت غالب تھی اور پیڈرو کی قابلِ رحم حالت دیکھ کے میرے دل کو عجیب سفاک خوشی حاصل ہو رہی تھی۔

اچانک کسی نے لات مار کے دروازہ کھولا "یہ کیا ہو رہا ہے؟ چھوڑو اسے" کسی نے مجھے چلّا کے حکم دیا۔

میں نے پیڈرو کو چھوڑ دیا اور پلٹ کے دیکھا تو مجھے پولیس کی وردی میں ایک سب انسپکٹر نظر آیا جس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ اس نے ریوالور کے اشارے سے مجھے باہر آنے کا حکم دیا۔

"کون ہو تم؟ کیوں قید کر رکھا تھا تم نے اس شخص کو؟" سب انسپکٹر نے غرا کے کہا "اپنے ہاتھ اوپر اٹھالو۔"

سب انسپکٹر کے ساتھ چار ماتحت تھے۔ ان میں ایک حوالدار تھا اور باقی تین کانسٹیبل۔ مجھے ان کے کمرے کی کھڑکی سے اندر آنے کا بالکل پتا نہیں چلا تھا اور میں عین ارتکابِ جرم کی حالت میں، پیڈرو کو قتل کرتے ہوئے گرفتار ہوا تھا۔

میں نے سب انسپکٹر کے حکم کی تعمیل کی "تم اندر کیسے آئے؟"

سب انسپکٹر نے میرے منہ پر تھپڑ مارا "مجھ سے سوال کرتا ہے... تو بتا پہلے... کہ تو یہاں کیا کر رہا تھا؟ یہ تیرے باپ کی کوٹھی ہے...؟"

اس ایک جملے میں سب انسپکٹر نے مجھے چار گالیاں دی تھیں لیکن میں سب برداشت کرنے پر مجبور تھا "یہ کوٹھی رابعہ قاری ایڈووکیٹ کی ہے۔"

"اچھا۔ وہ کنجری... تیری ماما تھی وہ" سب انسپکٹر کے اشارے پر حوالدار کے ساتھ تینوں کانسٹیبل مجھ پر پل پڑے۔

میں نے اپنے دفاع کی کوشش کی اور حوالدار کو دبوچ کے پیچھے سے گرا لیا "یہ سب نہیں ہوگا انسپکٹر۔ میں کوئی چور ڈاکو نہیں ہوں۔"

سب انسپکٹر کے ریوالور کا رخ میری طرف رہا۔ "سب معلوم ہوجائے گا... ہم نے تو اس کنجری کے قتل کا کیس داخلِ دفتر کردیا تھا۔ اس کے یار پہلوان کو بھی تو نے ہی مارا ہوگا۔"

میں نے کہا "اس کوٹھی کی مالک چاندنی بیگم نہیں تھی۔ یہ رابعہ قاری ایڈووکیٹ ہائی کورٹ کی کوٹھی ہے۔ میں اسی کے ساتھ یہاں آیا تھا۔ اسے اغوا کرلیا گیا ہے۔"

سب انسپکٹر نے میری بات سُنے بغیر کہا "ہتھکڑی ڈالو اسے۔ میری شکل کیا دیکھ رہے ہو؟ بروقت پہنچ گئے ہم ورنہ ایک اور لاش ملتی یہاں۔"

پیڈرو نے کہا "آپ نے خود دیکھ لیا... بس ایک منٹ کی دیر ہوجاتی تو میری لاش ملتی یہاں۔"

"ایک منٹ" میں نے تحقیر سے کہا "کاش یہ لوگ صرف چند سیکنڈ اور نہ آتے۔"

سب انسپکٹر نے پھر اپنے ماتحتوں کو حکم دیا "سنا نہیں میں نے کیا کہا تھا۔ دو پیچھے سے پکڑلو پہلے۔"

میں مزید پیچھے ہٹ کے دیوار سے لگ گیا۔ حوالدار کی گردن میرے ایک بازو کی گرفت میں تھی "میں خود رضا کارانہ طور پر گرفتاری دے دوں گا لیکن ابھی نہیں۔ تمہیں تھوڑا سا انتظار کرنا پڑے گا۔ میرے دوست عبدالودود منظر کو آنے دو۔ وہ بھی وکیل ہے۔ وہ آنے ہی والا ہے۔"

"دیکھو، تم پڑھے لکھے بندے لگتے ہو۔ تم پر ابھی اقدامِ قتل کا الزام ہے۔ اغوا اور حبسِ بے جا کا کیس بھی بن سکتا ہے اور ناجائز طور پر اندر داخل ہونے کا بھی۔" سب انسپکٹر نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی "تمہیں گرفتار کرنا ضروری ہے، ابھی وکیل کا کوئی کام نہیں۔"

ایک کانسٹیبل نے مجھے گالی دے کر کہا "بکواس کرتا ہے جی۔ اسے کیا پہلے سے معلوم تھا کہ اس نے وکیل بلالیا۔"

میں نے کہا "ہاں۔ میں پہلے سے وکیل کو سب بتا چکا تھا۔ یہاں سے اس کے ساتھی نے رابعہ قاری ایڈووکیٹ کو اغوا کیا تھا جس کی یہ کوٹھی ہے۔ یہ شخص استاد پیڈرو ہے اور اس کا ساتھی چوہدری دلاور تھا جو رابعہ قاری ایڈووکیٹ کو گاڑی میں ڈال کے فرار ہوگیا۔"

"اچھا جو کہنا ہے تھانے چل کے کہنا۔ سب معلوم ہوجائے گا کہ جھوٹ کیا ہے اور سچ کیا" سب انسپکٹر نے کہا "شرافت کے ساتھ چلوگے تو فائدے میں رہوگے۔"

میں نے طنز سے کہا "تھانے جا کے بھی فائدہ ہوتا ہے! یہ آج پتا معلوم ہوا۔ سب انسپکٹر، تم نے زبردستی کی تو میں اس حوالدار کی گردن توڑ دوں گا۔ گولی چلا سکتے ہو تو چلاؤ۔ میں جانتا ہوں تمہیں کس نے بھیجا ہے یہاں۔"

سب انسپکٹر کے ماتحت اس کے احکامات کی تعمیل سے قاصر تھے اور میری دھمکی نے اس کی پوزیشن خراب کردی تھی۔ میری گرفت میں تڑپنے والے حوالدار کی کیفیت اس... کالے بکرے سے مختلف نہ تھی جسے قصائی نے شہ رگ پر خنجر رکھ کے کسی کا صدقہ اتارنے کے لیے زمین پر لٹا رکھا ہو۔ ایک طرف قانون کو مجرموں پر اپنی بالادستی کا ثبوت فراہم کرنا تھا تو دوسری طرف ایک مجرم نے اسے اپنی جان بچانے کے لئے ڈھال بنالیا تھا۔ اگر سب انسپکٹر فیصلہ کرلیتا کہ ادائے فرض پر ایک حوالدار کی جان قربان کی جاسکتی ہے تو وہ فائر کرسکتا تھا۔ حوالدار بے چارہ بعد میں کیا پاتا؟ ایک تعریفی سند، شہادت کا رُتبہ یا زیادہ سے زیادہ جان کا معاوضہ دس ہزار روپے، یہ بھی اس کے لواحقین کو ملتے، اسے نہیں۔ دوسری طرف میں بھی اس سے رعایت کرنے والا نہیں تھا اور خواہ اسے مار کے مجھے کچھ حاصل نہ ہوتا مگر میرے عزائم بہت واضح تھے۔

سب انسپکٹر بھی غصے میں تھا۔ "تم تو پیشہ ور قاتل لگتے ہو مجھے۔"

میں نے کہا "تم مجھے کچھ بھی بنا سکتے ہو۔ قتل میں نے آج تک ایک بھی نہیں کیا مگر تم مجھے ایک سو ایک افراد کے درندہ صفت قاتل کے روپ میں پبلک کے سامنے پیش کرنے کا ہُنر جانتے ہو اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ صرف اس وردی کو پہننے کی تنخواہ کا مسئلہ نہیں ہے، تمہیں نمک حلال کرنا ہے اس معاوضے کا جو کسی نے تمہیں ادا کردیا ہے یا ادا کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ کون ہے وہ انسپکٹر اور..."

"شٹ اپ" سب انسپکٹر نے دہاڑ کے کہا "میں نے رنگے ہاتھوں پکڑا ہے تمہیں اور میں اپنا فرض ادا کر رہا ہوں۔"

"بہت خوب! یہ بھی بتادو کہ تمہیں اس ویران اور غیر آباد پڑے ہوئے گھر میں ہونے والی اس واردات کے بارے میں اطلاع دینے والا کون تھا؟ کسی گمنام کال پر تو تم حرکت میں نہیں آتے، خواہ سوال کسی معصوم کی جان کا ہو۔ ہاں حرکت میں برکت ہو تو دوڑے چلے آتے ہو۔"

میرا مقصد اسے باتوں میں لگا کے مہلت حاصل کرنا تھا اور اتنا وقت گزارنا تھا کہ منظر یہاں پہنچ جائے یا غالب اور نازو میں سے کوئی آجائے۔ میں اس مقصد میں کامیاب رہا۔ باہر کوئی گاڑی رُکی اور اس کا دروازہ بند ہونے کی آواز آئی۔ گاڑی کوٹھی کے اندر آگئی تھی اور میرا خیال تھا کہ آواز منظر کی کورونا کے دروازے کی ہے۔ میں نے اسی وقت حوالدار کو آزاد کردیا۔

چند منٹ بعد منظر کا چہرہ کھڑکی کے فریم میں نظر آیا "ویری گڈ۔ یہاں تو شوٹنگ ہو رہی ہے کسی فلم کی۔ مگر کیمرا کہاں ہے؟"

"شوٹنگ ریوالور سے بھی ہوتی ہے" میں نے کہا "اندر تشریف لائیے وکیل صاحب!"

"میں شریف آدمی ہوں" منظر بولا "دروازے سے ہی گھر میں داخل ہوتا ہوں۔ ویسے بھی کھڑکی چھوٹی ہے۔"

سب انسپکٹر نے اسے گھورا "ہمارے پاس دروازے کی چابی نہیں ہے۔"

"پھر آپ اندر کیسے پہنچے تھانے دار جی؟" منظر بولا "لیکن اس سوال کا جواب دینے سے پہلے آپ خود کو تھانے دار ثابت کریں۔"

"کیا مطلب؟ تمہیں نظر نہیں آتا۔"

"میری قریب کی نظر کمزور ہے" منظر بولا "ویسے بھی جناب عالی! ہں کو اب کچھ نظر آتے ہیں کچھ۔ معاف کرنا میں شعر پڑھ گیا غلطی سے۔ تم خاک سمجھے ہوگے۔ مطلب یہ تھا کہ اس بھیس میں کہیں علی بابا اور چالیس چور والا ڈراما تو نہیں ہورہا ہے۔ کوئی شناخت تو کراؤ اپنی۔"

"تم کو کس نے اختیار دیا ہے کہ تم مجھ سے شناختی کارڈ مانگو؟"

"یہ حق قانون ہر شہری کو بہت پہلے دے چکا ہے۔ میں تو اسی قانون کی کمائی کھاتا ہوں جس پر تم اپنی حاکمیت قائم کرتے ہو۔ اگر تم اپنی شناخت کرانے میں ناکام رہے تو میں فرض کرلوں گا کہ تم جعلی لوگ ہو اور اس وردی کی کوئی حیثیت نہیں۔ یہ تمہارا دوسرا جرم ہوگا بلکہ تیسرا۔"

"پہلا دوسرا بھی بتادیں وکیل صاحب" اس نے طنز سے کہا۔

"یار، تم کسی اختیار کے بغیر میری مؤکلہ کے گھر میں داخل ہوئے اور وہ بھی غلط راستے سے۔ وارنٹ ہے تمہارے پاس؟" منظر بولا "اس کے علاوہ تم نے میرے دوسرے مؤکل پر ریوالور تان رکھا ہے۔ میں نہ آتا تو تم اسے گولی مار دیتے۔"

تھانے دار نے مجبوراً اپنا شناختی کارڈ نکالا "تمہاری دور کی نظر تو ٹھیک ہے نا دیکھ لو۔"

منظر نے یوں سرہلایا جیسے واقعی اس نے سب کچھ دیکھ لیا ہے "اب وارنٹ بھی دکھادو۔ میرے مؤکل پر کیا الزام ہے، یہ بھی بتادو۔"

"تھانے چل کے دیکھ لینا۔" سب انسپکٹر نے ناگواری سے کہا اور سپاہیوں کو پھر حکم دیا "چلو پکڑلو اس کو۔ آرام سے۔"

سپاہیوں نے اشارہ سمجھ لیا اور مجھے ہتھکڑی لگانے کے لیے آگے بڑھے "ہاتھ آگے کرو" ایک کانسٹیبل بولا۔

میں نے ہاتھ آگے بڑھائے اور پھر ایک دم ہتھکڑی چھین کے کھڑکی سے باہر پھینک دی۔ منظر نے بڑی مشکل سے خود کو بچایا ورنہ وہ زخمی ہوجاتا۔

مجھے امید تھی کہ سب انسپکٹر میری جارحانہ کارروائی کے جواب میں ضرور کچھ کرے گا۔ اس نے مجھے خبردار کرنے کے لیے فائر کیا۔ وہ براہِ راست میرا نشانہ نہیں لے سکتا تھا مگر احتیاط کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے میں جھک گیا تھا۔ گولی میرے سر کے اوپر سے گزر گئی۔ بالکل ٹھیک وقت پر ایک شعلہ سا لپکا۔ یہ کیمرے کے فلیش کی لائٹ تھی۔ منظر نے اس وقت تصویر اتارلی تھی جب انسپکٹر مجھ پر فائر کررہا تھا اور میں خود کو بچارہا تھا۔

اب انسپکٹر کی قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ اس نے منظر کو نصف درجن غلیظ گالیوں سے نوازا "تم کیا سمجھتے ہو اس طرح خود کو بچالوگے؟"

منظر نے عیاری سے کہا "میری فکر چھوڑو۔ تم خود کو کیسے بچاؤگے؟ میں تو یہ گفتگو بھی ریکارڈ کررہا ہوں۔"

سب انسپکٹر کچھ پریشان نظر آنے لگا، اس نے منظر کو بڑی دھمکیاں دی تھیں اور بہت کچھ کہا تھا جو اسے نہیں کہنا چاہیے تھا۔ تاہم مجھے یوں لگتا تھا جیسے منظر پولیس کے ساتھ ڈراما کررہا ہے۔ مجھے نہ اس کے ہاتھ میں کیمرا نظر آیا تھا اور نہ وہ کہیں ریکارڈر لے کر جاتا تھا۔ پولیس کے عملے کے دیگر ارکان مجھے قہر آلود نظروں سے گھور رہے تھے مگر وہ میرے ساتھ روایتی مہمان نوازی کا سلوک کرتے ہوئے ڈر رہے تھے کہ کہیں منظر اس پُرتشدد منظر کی تصویریں نہ اتارلے۔

"تھانے دار جی! اب خیر سے جیسے اندر گئے تھے ویسے ہی باہر آجاؤ۔ یہاں کب تک کھڑے رہوگے؟" منظر مسکرایا "باقی باتیں تھانے چل کر کریں گے۔ میں اپنے مؤکل کی نیک چلنی کی ضمانت دیتا ہوں۔ وہ تمہارے ساتھ تعاون کرے گا۔"

سب انسپکٹر نے میری طرف تائید طلب نظروں سے دیکھا تو میں نے سرہلایا۔ دو کانسٹیبل پہلے باہر کودے اور دوبارہ فلیش چمکا۔ اب میرے لیے شبہے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ منظر اکیلا نہیں ہے۔ اس کے ساتھ غالب اور نازو میں سے کوئی آیا تھا اور وہ صورت حال کو اپنے مطلب کے مطابق پیش کرنے کے لیے واقعاتی شہادت جمع کرنے میں مصروف تھے۔

"یہ کون فوٹوگرافی کررہا ہے؟" سب انسپکٹر نے دہاڑ کے کہا۔

منظر نے کہا "اخبار والے بھی آگئے ہیں۔ اتفاق سے۔"

"اتفاق سے! یا تم لائے ہو انہیں؟"

"آخر آپ بھی تو اتفاق سے ہی آئے تھے تھانے دار صاحب یا کسی نے آپ کو بھیجا تھا؟" منظر نے کہا۔

تھانے دار نے اس سوال کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔ اس نے پہلے پیڈرو کو باہر جاکے دیکھنے کا حکم دیا کہ کیا واقعی اخبار والے موجود ہیں پھر وہ خود کھڑکی سے باہر آیا۔ فلیش کی روشنی دوبارہ نظر آئی پھر پیچھے رہ جانے والے کانسٹیبلوں کے اشارے پر میں آگے بڑھا اور کھلی کھڑکی سے کود گیا۔

"اب تصویر کیوں نہیں بنائی؟" سب انسپکٹر نے مشتعل ہوکے کہا۔

"میں تمہاری مرضی کا پابند نہیں ہوں" میں نے غالب کی آواز سنی "یہاں آنے سے پہلے میں اپنے ایڈیٹر کو بتاکے آیا تھا کہ وہ ڈی ایس پی سے بات کرلے۔"

"جھوٹ بکتے ہو تم! ڈی ایس پی کو کیا معلوم؟"

"رائٹ۔" غالب نے اس کی بات پکڑلی "ڈی ایس پی کو واقعی معلوم نہیں تھا لیکن اب پتا چل گیا ہوگا۔"

اب صورت حال بالکل بدل چکی تھی۔ تھانے دار کے لیے نئی پریشانی اس وقت پیدا ہوئی جب کانسٹیبل وہ ہتھکڑی تلاش کرنے میں ناکام رہے، جو میں نے کھڑکی کے راستے باہر پھینک دی تھی۔

"آخر کہاں گئی ہتھکڑی؟" تھانے دار نے چلّا کے منظر سے پوچھا۔

"مجھے کیا معلوم۔ میں تو تمہارے سامنے ہی موجود ہوں۔ چاہو تو تلاشی بھی لے لو۔ ہتھکڑی میری جیب میں تو ہو نہیں سکتی۔"

غالب نے کہا "ہوسکتا ہے ہتھکڑی کو بلی کھا گئی ہو۔ ابھی میں نے ایک بلی کو چلّاتے دیکھا تھا۔"

منظر نے اس سے اتفاق کیا "اس کے پیٹ میں درد ہوگا۔"

سب انسپکٹر غصے میں پاگل ہوگیا۔ اس نے اپنے ماتحتوں کو گالیاں دیں "تم سب نکمّے حرام خور ہو۔ سب کی پیٹی نہ اُتروادی صبح تو کہنا۔"

"سرجی ہمارا کیا قصور ہے؟" ایک کانسٹیبل نے کہا۔

پھر دوسرا چلّایا "ہماری گاڑی کے ٹائر۔ سب کی پھوک نکل گئی ہے سر۔"

سب انسپکٹر نے منظر کی کار کے پیچھے کھڑی ہوئی جیپ کو بے یقینی سے دیکھا۔ اس کے چاروں ٹائر فلیٹ تھے۔ غالب نے اس کی بھی تصویر بنالی۔

"جیسی روح ویسے فرشتے۔ پولیس کی گاڑیاں تک حرام خور ہو گئی ہیں" غالب نے کہا "ناکارہ محکمہ، ناکارہ لوگ، ناکارہ گاڑیاں۔"

اب منظر بولا "یہ مخبر ہے تمہارا؟"

سب انسپکٹر نے کہا "اگر ہم نہ آتے تو اس شخص کا قتل ہوجاتا۔"

"اور میں نہ آتا تو میرے مؤکل کا قتل ہوجاتا۔ میں تو جانتا ہوں کہ یہ کوٹھی میرے ایک مؤکل کی ہے اور میرا دوسرا مؤکل یہاں مس رابعہ قاری کی ہدایات کے مطابق اور اس کی اجازت سے موجود تھا۔ یہ بندہ آخر کون ہے جو تمہارے بیان کے مطابق یہاں قتل ہونا چاہتا تھا؟ اس کا نام کیا ہے؟ تم نے اس سے معلوم کیا کہ یہ یہاں کیا کررہا تھا؟"

سب انسپکٹر نے صورت حال کی نزاکت کو بھانپ لیا۔ اس نے کانسٹیبلوں کو حکم دیا کہ رائفلیں نیچے کرلیں "ہم تھانے چل کے بات کرتے ہیں وکیل صاحب!"

"کیا تھانے جانا بے حد ضروری ہے؟" غالب نے سوال کیا "چلو اس سے پوچھ لیتے ہیں جو مقتول تو نہ ہوسکا مگر مُدّعی ہوسکتا ہے۔"

مُدّعی یعنی استاد پیڈرو ہماری چالاکی کو سمجھ رہا تھا اور صورتِ حال کو بدلتا دیکھ رہا تھا۔ یا تو پولیس کا سب انسپکٹر واقعی اسے نہیں جانتا تھا اور اسے غالباً "اوپر" سے حکم ملا تھا کہ فلاں جگہ فوراً چھاپا مارو..... ہمارا ایک بندہ پکڑلیا گیا ہے۔ بندے کو اور پکڑنے والوں کو تھانے لے آؤ۔ اوپر والے ہر قسم کے احکامات زبانی صادر کرتے رہتے ہیں اور نیچے والے ان کے آسرے پر بے خوفی سے اپنے اختیارات کا جائز ناجائز استعمال کرتے ہیں۔ سب انسپکٹر بھی نہ خانہ تلاشی کا وارنٹ لایا تھا نہ میری گرفتاری کا۔ چوہدری دلاور نے رابعہ کو اپنے ساتھ لے جانے کے بعد اوپر والوں سے رابطہ کیا ہوگا اور انہوں نے احکامات آگے ارسال کئے ہوں گے۔ اس کارروائی میں تھوڑی بہت دیر تو لگتی ہے۔ شاید چوہدری دلاور نے مجھے وہیں روکنے کے لیے رابعہ کو استعمال کیا اور اسے موقع فراہم کیا کہ وہ مجھ سے فون پر بات کرے۔ دلاور نے ایک تیر سے دو شکار کیے۔ ایک طرف مجھے رابعہ کی زبانی کچھ بھی نہ کرنے کا پیغام پہنچایا اور دوسری طرف مجھے پولیس کے آنے تک روکے رکھا۔ ممکن ہے دلاور کو پیڈرو کی طرف سے فکر لاحق ہو کہ وہ میرے ہاتھوں مارا نہ جائے۔ ایسی صورت میں قاتل اور مقتول کو پولیس جائے واردات سے لاسکتی تھی۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ انسپکٹر نے عمداً استاد پیڈرو کو پہچاننے سے گریز کیا ہو۔

حیرت مجھے اس بات پر تھی کہ رابعہ نے منظر کو کیسے فون کیا۔ غالباً رابعہ نے دلاور سے جھوٹ بولا کہ سکندر تو وہاں سے اپنے دوست کو سب کچھ بتاچکا ہے اور یہ ضروری ہے کہ عبدالودود منظر کو بھی یہی سمجھایا جائے کہ وہ قانونی کارروائی نہ کرے۔ فکر اور پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ دلاور نے اس سے اتفاق کرنے کی غلطی کی اور انتہائی ذہانت سے کام لیتے ہوئے رابعہ نے الفاظ کا سہارا نہیں لیا۔ اس نے اپنے رویّے اور لہجے سے بتادیا کہ دال میں کچھ کالا ہے اور منظر بہرحال سفارش کے سہاروں سے اتنا بڑا وکیل نہیں بنا تھا۔ اس نے بھی سمجھ لیا کہ معاملہ کچھ گڑبڑ ہے۔ اس نے مجھ سے رابطہ کیا تو صورت حال کی سنگینی واضح ہوگئی اور اس نے غالب کو ایس او ایس (SOS) دے دیا۔

پیڈرو پولیس کو دیکھ کر بہت خوش ہوا تھا لیکن اس کے بعد بازی پلٹ گئی اور اب وہ بھی اتنا ہی پریشان تھا جتنا سب انسپکٹر۔

"دیکھیں جناب وکیل صاحب" سب انسپکٹر نے کہا "اس اخباری نمائندے کو آپ ہی لائے ہیں اپنے ساتھ۔"

غالب نے کہا "میں کسی کے ساتھ نہیں آیا۔ ہم اخبار والے ویسے ہی بہت باخبر لوگ ہوتے ہیں۔ ہمیں سب معلوم ہوتا ہے کہ کیا کیا ہورہا ہے اور کیا ہونے والا ہے؟"

"خیر سے کس اخبار کے نمائندے ہو آپ جی؟" سب انسپکٹر بولا۔

"میں ہر اخبار کا نمائندہ ہوں۔"

سب انسپکٹر نے کہا "ایسا تو کبھی نہیں سنا۔"

غالب نے کہا "تمہارے اور ہمارے درمیان تعاون ہو تو یہ شہر ہی نہیں، یہ ملک سچ مچ پاکستان بن جائے جہاں مجرموں کو معاشرے میں سر چھپانے کی جگہ نہ ملے۔ مجرموں کا سراغ ہم بھی لگاتے ہیں اور تم بھی یہی کام کرتے ہو مگر فرق یہ ہے کہ ہم ان کی نشاندہی کرتے ہیں سزا دلوانے کے لیے مگر تم ان کی سرپرستی شروع کردیتے ہو یا ان سے 'مک مکا' کرلیتے ہو۔ تمہارے اور ہمارے درمیان فرق مقصد کا ہے اور اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ تم جاہل کاہل اور کوڑھ مغز ہو۔ ہم اعلیٰ تعلیم یافتہ ذہین اور...."

"بس جی بس.... ہم نے بہت صحافی دیکھے ہیں۔"

"پولیس میں بھی سب بے ایمان، کام چور اور رشوت خور نہیں ہوتے۔" غالب نے اعتراف کیا۔

"میں نے پوچھا تھا کہ تم کس اخبار کے کرائم رپورٹر ہو، نام کیا ہے تمہارا؟ میں نے تمہیں پہلے کبھی دیکھا نہیں" سب انسپکٹر نے کہا۔

"میرا نام ہے غالب اور میں بہت جلد شائع ہونے والے بہت بڑے اخبار کا نیوز ایڈیٹر ہوں۔" غالب نے کہا۔

"یعنی ابھی وہ اخبار نکلا ہی نہیں؟" سب انسپکٹر بولا۔

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہم خبریں اور تصویریں پول (POOL) کرتے ہیں۔ کچھ نمائندے اور فوٹوگرافر شہر کے ایک حصے کی خبریں لاتے ہیں تو کچھ دوسرے حصے کی۔ بعد میں ہم آپس میں خبروں اور تصویروں کا تبادلہ کرلیتے ہیں۔ جو خبر میں نے حاصل کی ہے وہ کل سارے اخبارات میں تصویروں کے ساتھ شائع ہوسکتی ہے اور میں نہ چاہوں تو...." غالب نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

سب انسپکٹر نے اس کا مطلب سمجھ لیا "وکیل صاحب! دیکھو جی، ہم تو بس حکم کے بندے ہیں۔ اوپر سے جیسے آرڈر آئے تھے ہم نے ویسا ہی کیا۔ ہماری کسی کے ساتھ ذاتی دشمنی تو ہے نہیں۔ نوکری کا معاملہ ہے، افسروں کی بات ماننی پڑتی ہے۔ آپ ہماری مجبوری کا خیال کرو۔"

منظر نے سرہلایا "تمہیں آرڈر کس نے دیا تھا؟"

"مجھے تو جناب، ڈی ایس پی نے بولا تھا مگر سنا ہے، انہیں ایس ایس پی نے فون کیا تھا۔"

"کون ایس ایس پی؟" غالب بولا۔

"آپ سے تو بات کرتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔"

"نہیں۔ تم بولو، ہم آف دی ریکارڈ کچھ شائع نہیں کرتے۔ یعنی جو بات ہمیں اعتماد میں لے کر بتائی جائے" غالب نے کہا "یہ ہمارا اصول ہے۔"

"نیا ایس ایس پی ہے زمان خان لودھی۔ سفارشی ہے اور خاص آدمی ہے ایڈیشنل چیف سیکریٹری کا۔ آپ تو جانتے ہوگے کہ ایڈیشنل چیف سیکریٹری کون ہے اور کس کا بندہ ہے؟" سب انسپکٹر بولا۔

"پھر اب تم کیا چاہتے ہو؟" غالب نے بے حد مُربیانہ لہجے میں کہا۔

"افسرانِ بالا کے حکم کی تعمیل بہت ضروری ہے۔ ملزم کو... میرا مطلب ہے اس بندے کو تھانے پہنچا کے میری ذمے داری ختم ہوجائے گی۔ آپ ذرا مہربانی کرو۔"

غالب نے نفی میں سرہلایا "حکم کی تعمیل میں تم یہاں آگئے اب تم واپس جاکے کہہ سکتے ہو کہ وہاں کوئی بھی نہیں ملا۔ تم پر کوئی الزام نہیں آئے گا۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے؟"

"تم نے ایسا نہ کیا تو مشکل میں پڑجاؤگے۔ ابھی اخبار کی آخری کاپی نہیں گئی ہوگی۔ صبح ایک خبر اور ایک تصویر ہر اخبار میں ہوگی جو تمہارا مستقبل تاریک کردے گی۔ اعلیٰ افسران تمہارے خلاف ضابطے کی کارروائی کرنے پر مجبور ہوں گے اور زمان خان لودھی کو تم جانتے ہی ہو۔ وہ نااہلی کے اس مظاہرے پر تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔"

چاروں کانسٹیبل ایک نیم دائرے میں ہم سے کچھ فاصلے پر کھڑے ہوئے تھے لیکن ان کی رائفلوں کا رخ ہماری طرف تھا۔ استاد پیڈرو بظاہر بے نیازی سے اور پُرسکون کھڑا ہوا تھا مگر مجھے اندازہ تھا کہ اندر سے اس کے دل کی کیا حالت ہوگی۔ اس کی تقدیر کا فیصلہ ان مذاکرات کی کامیابی یا ناکامی پر منحصر تھا جو سب انسپکٹر، مرزا غالب اور منظر ایڈووکیٹ کے درمیان ہورہے تھے۔ میری حیثیت ویسے تو ملزم کی تھی مگر اس الزام سے زیادہ مجھے اپنی جذباتی حماقت کے نتائج کی فکر تھی، رابعہ کا خیال تھا اور یہ احساس تھا کہ غالب اور نازو کے علاوہ منظر بھی مجھے کتنا شرمندہ کرے گا چنانچہ میں بوجھل دل کے ساتھ خاموش کھڑا تھا اور مایوسی کے ردِعمل کا شکار تھا۔

"آپ کی مرضی جناب" سب انسپکٹر نے کہا اور ریوالور نکال لیا "ملزم تو ہم ہر قیمت پر تھانے لے جائیں گے۔ امید ہے آپ سرکاری فرائض میں مداخلت نہیں کروگے؟"

غالب نے کہا "ہم صحافی ہیں، بدمعاش نہیں۔ تم غیر قانونی کام کروگے تو خود بھگتوگے۔"

منظر نے کہا "میں تمہارے جرائم کا عینی گواہ ہوں۔ ثبوت شہادت سب میرے پاس ہیں۔"

"ٹھیک ہے جی۔ آپ کیا کروگے؟ چھٹی اُتروادوگے، معطل کرواؤگے۔ یہ سب تو ویسے بھی ہوگا اگر ہم نے ملزم کو پیش نہ کیا اور خالی ہاتھ گئے۔ اپنے بندے سے کہہ دو کہ مقابلہ نہ کرے اور فرار ہونے کی کوشش بھی نہ کرے ورنہ میں رعایت نہیں کروں گا...."

منظر اور غالب نے میری طرف دیکھا "ہم اس کی ضمانت دیتے ہیں کہ ہمارا آدمی مزاحمت نہیں کرے گا۔"

"چلو اوئے، تم گاڑی کے ٹائر کھولو۔ باری باری! ایک اسپیئر [illegible] گاؤ اور دوسرا ہوا بھروانے کے لیے ساتھ لے جاؤ۔ دو ٹائر آجائیں [illegible] انہیں فٹ کرکے باقی دو لے جاؤ۔ دو بندے یہاں رہیں گے، دو [illegible] گاڑی کو ٹھیک کریں گے۔ سمجھ آگئی میری بات؟" سب انسپکٹر نے کہا۔

منظر اس وقت بہت سنجیدہ بلکہ کسی حد تک رنجیدہ تھا۔ اس کی [illegible] کوشش ناکام ہوگئی تھی "میں چلتا ہوں، صبح میں سارے کیس فائل کروں گا پولیس کے خلاف۔"

میں نے کہا "یار منظر...."

اس نے مجھے روک دیا "کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے ابھی۔ [illegible] تمہاری کوئی غلطی ہے اور نہ تم نے کوئی جرم کیا ہے۔ تمہارے ساتھ تھانے میں قانون کے مطابق سلوک ہوگا۔ میں ابھی بات کرتا ہوں زمان خان سے۔"

وہ گاڑی میں بیٹھ کے چلا گیا۔ غالب اس وقت تک موجود رہا جب تک پولیس مجھے لے کر روانہ نہیں ہوگئی۔ اس نے ہر تصویر بنائی۔ ایک میں پولیس والے ٹائر بدل رہے تھے، دوسری میں ٹائر لڑھکاتے ہوئے گیٹ کے باہر لے جارہے تھے۔

چلتے چلتے اس نے مجھ سے کہا "ان سب کی ڈفلی نہ بجادی میں نے تو غالب نام نہیں۔"

میں نے کہا "مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ایک معمولی سی غلطی کا اتنا بڑا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔"

"بابا آدم کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ ایک معمولی سی غلطی پر جنت سے نکلنا پڑے گا۔" غالب بولا "غلطی کوئی جان بوجھ کے نہیں کرتا۔ بس غلطی ہوجاتی ہے۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"پریشان ہوں میں رابعہ کی طرف سے۔"

"ارے یار، یہ سب تو چلتا ہی رہتا ہے۔ رابعہ کو کچھ نہیں ہوگا۔ اللہ نے چاہا تو کل سب ٹھیک ہوجائے گا۔ اوکے۔ خدا حافظ۔"

"خدا حافظ" میں نے اپنی مایوسی کو چھپاتے ہوئے بشاشت سے کہا۔

اچانک میں ایم آر ایس کے چیف کے بجائے ایک ملزم ہوگیا تھا اور مجھے پولیس گرفتار کرچکی تھی۔ اب نہ مقابلے کی گنجائش تھی اور نہ فرار کے امکانات تھے۔ ایسی کوشش کا انجام چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کی خواہشات کے عین مطابق ہوتا۔ میں پولیس کی گولیوں کا نشانہ بن جاتا۔

غالب نے ایک نظر پیڈرو پر ڈالی۔ "قربانی کے بکرے! کہہ دینا اپنے چوہدری صاحب سے کہ حالات ضرور بدل گئے ہیں، ہم نہیں بدلے ہیں اور نہ ہی بدلیں گے۔ وہ جتنے روپ چاہیں بدلیں، ایم آر ایس ان کا اصلی روپ پہچانتی ہے اور ایم آر ایس ہر محاذ پر ان کے مقابل ہوگی۔"

استاد پیڈرو نے کچھ نہیں کہا۔ جب اسے سب انسپکٹر نے جیپ میں سوار ہونے کا اشارہ کیا تو وہ آگے بیٹھ گیا۔ دو پولیس والے میرے دائیں طرف رہے اور دو بائیں طرف۔ جیپ تھانے کی طرف چل پڑی۔

میری ذہنی کیفیت بہت عجیب تھی۔ پولیس سے میرا پہلا سابقہ ایک بھولی بسری بات ہوگئی تھی جب پاکستان پہنچتے ہی مجھ سے میرا باپ اور میرا حقِ وراثت چھین لینے والے قاتلوں اور مجرموں کے ٹولے نے پولیس کی ملی بھگت سے مجھے تختۂ دار تک پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اس کے بعد میں سازشی عناصر کا مقابلہ کرنے کے لیے اکیلا میدان میں کود پڑا تھا پھر قانونی مدد کے لیے عبدالودود منظر کے ساتھ رابعہ نے میرا ساتھ دیا تھا اور آہستہ آہستہ وہ جذبہ جو خلوص اور دوستی کی بنیادوں پر استوار تھا، ایک بہت بڑی طاقت بن گیا تھا جس نے ضمیر فروشوں اور غداروطن دشمنوں کے لامحدود وسائل کی پروا نہ کرتے ہوئے ہر محاذ پر ان کا بھرپور مقابلہ کیا تھا۔

مجھے اپنی طویل جدوجہد کا ہر مرحلہ یاد آرہا تھا۔ کہاں کہاں ہم نے موت سے پنجہ آزمائی کی تھی اور کیسے کیسے جان لیوا خطرات کا مقابلہ کرتے ہوئے ہم نے بڑے بڑے فرعونیت کے دعوے داروں کے غرور کو خاک میں ملایا تھا۔ ہم نے جو حکمتِ عملی یا فلاسفی ایجاد اور اختیار کی تھی وہ بعض اوقات قانون کے دائرے کی حدود سے تجاوز بھی کرجاتی تھی مگر صرف وہاں جہاں قانون شکن عناصر قانون کے طریقۂ کار کی مجبوری سے فائدہ اٹھاکے انصاف کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کرتے تھے۔ قانون کی بے بسی یہ تھی کہ ثبوت اور شہادت نہ ہو تو مجرم کو مجرم قرار نہیں دیا جاسکتا مگر ہم بے بس نہیں تھے۔ ہم جیسے کو تیسا کے قائل تھے۔ انگریزی محاورے کے مطابق جس کا بھی ہم سے معاملہ ہوا ہم نے اسی کے سکوں میں ادائیگی کی۔ جس کا کوئی اصول یا ضمیر نہ ہو، اس کے ساتھ کیسی شرافت اور کیسی اصول پرستی! جو قانون کو بے آبرو کرنے پر کمربستہ ہو اس سے قانون کی بات کیا کرنی؟ یہی وجہ تھی کہ متعدد بار خود ہم نے چشم دید گواہ کی حیثیت سے یا اپنے یقین کی بنیاد پر مجرموں کے خلاف اپنے نظامِ انصاف کے مطابق کارروائی کی اور انہیں سزا بھی دی جو دولت یا اثر ورسوخ کی بنا پر کتابی قانون کی گرفت سے صاف نکل جاتے تھے یا وکیلوں کی اور پولیس کی مدد سے معاملات کی نوعیت بدل کے اور حالات وواقعات کی شہادت مسخ کرکے انصاف کرنے والوں کی بے بسی کا مذاق اُڑاتے تھے۔

ہم نے ایم آر ایس کے نام پر بہت بڑے بڑے کارنامے سرانجام دیے تھے مگر خالص نظریاتی قانون کی روشنی میں ہمارے اعمال کو پرکھا جاتا تو ہم نے بہت جرم کیے تھے جن پر ہمیں سزا اس لیے نہیں ہوئی کہ ہم نے مجرموں سے نمٹتے ہوئے کوئی ثبوت یا شہادت باقی نہیں چھوڑی تھی جسے کوئی ہمارے خلاف استعمال کرسکتا۔

یہ بڑی عجیب بات تھی کہ مغربی پاکستان سے بھارت کے راستے مشرقی پاکستان تک ہم نہ جانے کہاں کہاں اور کس کس کے خلاف معرکہ آرا رہے تھے۔ قید و بند کی صعوبت، ظلم اور تشدد جھیل چکے تھے۔ گولیوں کی بوچھار اور بموں کے دھماکوں سے بچ کر نکل آئے تھے لیکن کبھی یوں گرفتار نہ ہوئے تھے جیسے آج میں ایک ناکردہ گناہ کی پاداش میں پکڑا گیا تھا۔ رابعہ کو اغوا کرکے اپنے ساتھ لے جانے والا وہی شخص تھا جس نے اس کے گھر کو بم سے اڑا دیا تھا، اسپتال میں اس کی ماں کو مروا دیا تھا۔ اس نے میرے باپ وزیر خان سے اس کا سب کچھ چھین لیا تھا اور اسے غربت و بے کسی کی موت مار ڈالا تھا۔ اس نے ان گنت قتل کروائے تھے مگر وہ آج بھی آزاد تھا۔ قانون ایک بار بھی اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکا تھا اور وہ معزز شمار ہوتا تھا جبکہ میں بستہ ب کے مجرم کی طرح پولیس کی معیت میں تھانے جا رہا تھا۔ نثار میں تری گلیوں پہ اے وطن کہ جہاں.... سنگ و خشت مقید ہیں اور سگ آزاد۔

تھانے میں گاڑی سے اترتے ہوئے مجھے یوں لگا جیسے یہ اختتام نہیں، ایک نئی جنگ کا آغاز ہے۔ پہلی جنگ میں نے وطن کے لیے لڑی تھی مگر میرے جیسے محب وطن مجاہد اور مخلص، سچے پاکستانی یہ جنگ اس لیے ہار گئے تھے کہ ان کے مقابل بین الاقوامی سپر پاورز تھیں جو سی آئی اے، کے جی بی، موساد یا را کے نام پر تیسری دنیا کے ممالک کی داخلی سیاست میں اپنی بدمعاشی کا سکہ چلاتے تھے اور ان محکوم و مجبور و حقیر عوام کی قسمتوں کے فیصلے واشنگٹن، ماسکو یا دہلی میں بیٹھ کے کرتے تھے جن کے نصیب میں پہلے ہی مفلسی، تہی دامنی، جہالت اور انتشار کے سوا کچھ نہ تھا۔

اب میں نے نصف پاکستان کو اپنی قیادت کی سیاسی غلطیوں کا خمیازہ، اعمال کی سزا یا نوشتۂ تقدیر سمجھ کے پورا پاکستان تسلیم کرلیا تھا، تب بھی ہم جیسے احمقوں کے لیے کہیں اماں نہ تھی جو انسان کے بنیادی حقوق، جمہوریت کی بالادستی، اسلام کے نام پر قائم ہونے والے ملک میں اسلامی نظامِ حیات اور نظامِ انصاف، قانون کے مطابق عدل اور انسانیت کے احترام کی پاسداری چاہتے تھے۔ سیاست میں، معیشت میں اور معاشرے میں چوہدری دلاور جیسے حاکموں کے سامنے سر جھکانا ہمیں منظور نہ تھا چنانچہ ہمارا وجود ان حکمرانوں کو خطرے کا سگنل محسوس ہوتا تھا جو انگریز سے آزادی کی جنگ لڑنے والے، عقیدے کے راسخ اور دل کے سچے پاکستانی عوام کی اکثریت کو اپنے غلاموں کی طرح رکھنا چاہتے تھے اور ان پر یوں حکومت کرنا چاہتے تھے کہ کوئی انہیں مذہب، اخلاق اور قانون کی حدود کا پابند کرنے والا نہ ہو اور وہ کروڑوں انسانوں کی قربانی کے اس ثمر کو مالِ غنیمت کی طرح اڑانا چاہیں تو کوئی انہیں روکنے کی ہمت نہ کرسکے۔ وہ اس ملک پر یوں غاصبانہ قبضہ کرنا چاہتے تھے جیسے علی بابا کے خزانے کو چالیس چور لوٹنے آگئے تھے۔ چالیس چوروں نے یہاں بھی اپنے شیطانی عزائم کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک ناپاک اتحاد کرلیا تھا مگر جیسے علی بابا نے مرجینا کے ساتھ مل کر چالیس چوروں کا خانہ خراب کردیا تھا ایسے ہی ہم جیسے لاکھوں جاں نثار تھے جو ایم آر ایس کے نام سے آشنا ہوئے بغیر اس کے مقاصد سے متفق تھے اور اس جہاد میں ہمارے ساتھ شریک تھے جو ہم نے ملک دشمنوں کے خلاف شروع کر رکھا تھا۔ جو پاکستان کو دل سے اسلامی فلاحی جمہوریت بنانے کے آرزومند تھے۔ یہاں قرآن و سنّت کے مطابق طرزِ معاشرت اور حکومت مانگتے تھے اور یقین رکھتے تھے کہ ان کا وطن ایک دن وہ جنت بن جائے گا جس کا خواب علامہ اقبالؒ نے قائدِ اعظمؒ اور جنگِ آزادی کے لاکھوں شہیدوں نے دیکھا تھا۔

تھانے کی عمارت وہی تھی جو ہر جگہ اپنی پُراسرار فضا کی دہشت، سفاکی و بربریت کے پُرعذاب سسکتے ماحول کی علامت اور قانون کے نام پر لاقانونیت کا پرچار کرتی نظر آتی ہے۔ یہ مظلوموں کی پناہ گاہ نہیں سمجھی جاتی اور اسے فریادی کی دادرسی کا مرکز نہیں تسلیم کیا جاتا۔ شریف آدمی ظلم اور نقصان برداشت کرلیتا ہے مگر تھانے جاتے ہوئے ڈرتا ہے۔ قتل، اغوا اور آبروریزی کے عینی گواہ سچ بولنے کے لیے تھانے جانے کی ہمت نہیں کرتے اور برائی کی طرف سے آنکھیں، کان اور لب بند کرکے کسی نہ کسی حیلے سے ضمیر کو بھی مطمئن کرلیتے ہیں۔ عام تاثر یہ ہے کہ یہاں مجرم وی آئی پی سمجھے جاتے ہیں کیونکہ وہ اپنی آمدنی میں تھانے والوں کو برابر کا شریک کرتے ہیں لیکن جس کا کوئی والی وارث نہ ہو اسے مجرم بنا کے پسِ دیوارِ زنداں یا تختۂ دار تک پہنچانا ایک معمول کی بات ہے۔

منظر کے اور غالب کے آجانے سے میری پوزیشن کچھ محفوظ ہوسکتی تھی۔ مجھے ہتھکڑی پہنانے کے لیے ایک کمرے میں لے جایا گیا جہاں محرر اور ڈیوٹی افسر کے سامنے لکڑی کی بینچوں پر کچھ سہمے ہوئے مدعی اور مدعا علیہ بیٹھے تھے لیکن ان میں تفریق کرنا مشکل تھا۔ اعتماد سے وہ بھی محروم تھا جو سچ بول رہا تھا۔ یہ تو مرضی ہے سرکار کی کہ جسے چاہے کسی بھی جرم میں شاملِ تفتیش کرلے اور چوری کی رپورٹ لکھوانے کے لیے آنے والا منشیات کی پُڑیا برآمد ہونے کے جرم میں بغرضِ چھترکاری ڈرائنگ روم کی جانب بھیج دیا جائے۔ چور جناب محرر سے ہاتھ ملا کے نصف کا نذرانہ پیش کرے اور گھر جا کے چین سے سوئے۔

اچانک دو پولیس والے ایک نوجوان پر جھپٹے جو ضرورت سے زیادہ انگریزی بول رہا تھا اور فرمودۂ اقبال پر عمل پیرا تھا۔ آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی۔ پولیس والوں نے اسے لاتوں اور مکوں سے مار مار کے فرش پر گرا دیا اور زبان سے فصاحت و بلاغت کے دریا بہاتے ہوئے اسے ٹھڈے مارنے لگے۔ وہ ان کے پیروں میں لوٹ رہا تھا اور چلا رہا تھا۔ بینچ پر بیٹھے ہوئے عوام کا دہشت سے برا حال تھا۔ صرف ایک بوڑھا رو رو کے ہاتھ جوڑ رہا تھا۔

"چھوڑ دیں سرکار۔ نادان ہے مائی باپ۔ اسے مت ماریں۔ میں سمجھا دوں گا اسے۔ اللہ کے لیے، رسولؐ کے لیے۔"

اللہ کے لیے... رسولؐ کے لیے... شاید سب سے زیادہ واسطے خدا رسولؐ کے ہی دیے جاتے ہیں مگر اس سے تفتیش کرنے والوں پر اثر نہیں ہوتا اور ہر تھانے میں، ہر رات کی صبح ہونے تک انسانوں پر وہ انسانیت سوز ظلم ہوتا ہے جس کی فلم بنا کے دکھائی جائے تو لوگ نازی مظالم پر مبنی فلمیں بھول جائیں۔

میں انچارج کے کمرے کی چق ہٹا کے اندر داخل ہوا تو سب انسپکٹر پہلے ہی اسے پوری رپورٹ دے چکا تھا۔ روایتی توندار جرے کے بے رحمانہ نقوش والا انچارج کچھ متفکر نظر آتا تھا۔ دو کانسٹیبل میری ہتھکڑی کے ساتھ دونوں طرف موجود تھے۔ ان کی وجہ سے میں بھی کھڑا رہنے پر مجبور تھا۔ یوں بھی میں ملزم تھا اور میرا کرسی پر بیٹھنا وہ گستاخی سمجھا جاتا جس کی پاداش میں مجھ پر فوری عتاب نازل ہوسکتا تھا۔

استاد پیڈرو بڑے اطمینان سے ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا لیکن اس نے مجھ سے نظر نہیں ملائی۔ ایس ایچ او کچھ دیر مجھے بے حسی سے دیکھتا رہا پھر اس نے قریب آکے میرا معائنہ کیا۔ اس نے میرے بال پکڑ کے میرا سر دائیں بائیں گھمایا اور چھوڑ دیا۔

"تم سکندر بخت ہو۔ سکندر بخت ولد وزیر خان؟"

میں نے اقرار میں سر ہلایا "یس۔"

"اس شخص کو جانتے ہو تم؟" اس نے پیڈرو کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں۔ یہ استاد پیڈرو ہے۔ اس کے ماں باپ کا تو پتا نہیں مگر یہ چوہدری دلاور کا کتا ہے" میں نے کہا۔

"چوہدری دلاور کون ہے؟" ایس ایچ او نے بے زاری سے کہا۔

"ہر وہ شخص جو اس ملک کا دشمن ہے، انسانیت کا دشمن ہے، جو چور ڈاکو اور قاتل ہے مگر معاشرے کو دکھانے کے لیے ایک معزز چہرہ رکھتا ہے۔"

اس نے سر ہلایا "یہ ایم آر ایس کیا بلا ہے؟"

"یہ عذابِ الٰہی ہے ہر چوہدری دلاور کے لیے" میں نے کہا "خدا نے ہر فرعون کے لیے ایک موسیٰ پیدا کیا ہے..."

"تم نے اسے قتل کرنے کی کوشش کی تھی... کیوں؟"

میں نے کہا "میں اس جیسے ہر شخص کو قتل کرسکتا تو ضرور کرتا۔"

اس نے کچھ سوچ کے سر ہلایا "میں بات کرتا ہوں ایس ایس پی صاحب سے۔ اسے ذرا ٹھنڈا ڈالو۔ یہ بھونکتا بہت ہے۔"

"جنگلی کتا ہے ناجی۔ صبح تک پالتو کتے کی طرح پاؤں میں لوٹنے لگے گا۔ دُم ہلائے گا۔" سب انسپکٹر نے کہا اور پولیس والوں کو اشارہ کیا کہ مجھے لے جائیں۔

یہ دوسرا موقع تھا جب دیارِ غیر سے وطن لوٹ کے مجھے حوالات کی سلاخوں کے پیچھے عام اخلاقی مجرموں کے ساتھ بند کردیا گیا تھا۔ پہلی بار میں حصولِ تعلیم کا سلسلہ منقطع کرکے انگلستان سے لوٹا تھا اور اس بار میں بزعم خود وطن کے دشمنوں سے نبرد آزما رہنے کے بعد انہیں ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا کے واپس آیا تھا۔ کیا مجھے توقع تھی کہ میری شاندار خدمات کے صلے میں حکومت مجھے تمغۂ خدمت عطا کرے گی اور عوام میرے شاندار کارناموں پر مجھے یوں خراجِ تحسین پیش کریں گے کہ پھولوں سے لاد دیں گے اور میں جدھر جاؤں گا ٹھٹھ کے ٹھٹھ میرے استقبال کے لیے موجود ہوں گے؟ مجھے ہر شہر میں استقبالیہ دیا جائے گا اور میرا اپنے سپاس نامے میں میرے کارناموں کا ذکر یوں کرے گا جیسے میں جنگِ عظیم کے ہیرو فیلڈ مارشل منٹگمری سے بھی بڑا ہیرو ہوں۔ ہر شہر میں میرے نام سے سڑکوں، پارکوں اور قومی یادگاروں کو منسوب کیا جائے گا۔ ایم آر ایس کی شجاعت اور حب الوطنی کی داستانوں پر فلمیں بنائی جائیں گی، کتابیں لکھی جائیں گی۔ جی نہیں، ایسی خوش فہمی تو شاید اس سے پہلے ستمبر ۶۵ء کی جنگ کے ہیروز کو بھی نہیں ہوگی۔

اوّل تو عزت یا شہرت کی خاطر کوئی بہادری کا بڑا کارنامہ سرانجام نہیں دیتا پھر وہ قومیں ہی اور ہوتی ہیں جو اپنے ہیروز کو سر آنکھوں پر بٹھاتی ہیں۔ انہیں عزت ہی نہیں، بے حساب شہرت اور دولت بھی ملتی ہے۔ میں اتنا بڑا ہیرو بھی نہیں تھا اور نہ ایم آر ایس کے دوسرے ساتھیوں نے کبھی اس انداز میں سوچا تھا کہ کبھی یہ ملک ان کی خدمات کا صلہ بھی دے گا۔ تقسیم ہند کا پورا المیہ میرے سامنے تھا۔ اس کو کسی شاعر نے فقط ایک مصرعے میں یوں سمو دیا ہے کہ اس پر لمبے چوڑے حوالے اور تاریخی مقالے لکھنے والے بھی حقیقت کو اتنی سادگی کے ساتھ اتنے بھرپور انداز میں پیش نہیں کرسکتے۔ ـ منزل انہیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے۔ اس کا سا مصرع بھی قابلِ غور تھا، نیرنگیٔ سیاستِ دوراں تو دیکھیے۔ اس ملک کی تخلیق میں خلوص کی دولت کے ساتھ تن من دھن قربان کردینے والے وہ تمام قافلۂ سالار تو رخصت ہوئے۔ بعض کس مپرسی کے عالم میں اور بے سروسامانی کا شکوہ زبان پر لائے بغیر گمنامی کی موت مر گئے۔ محلاتی سیاست کے سازشی عناصر جن کی باگ ڈور غیر ملکی آقاؤں کے ہاتھ میں تھی، اپنے مکروہ عزائم کے چہروں پر شرافت کی نقاب ڈال کے سامنے آگئے۔ ان کے منہ میں جھوٹ کی زبان تھی اور ان کے دلوں میں منافقت تھی۔ وہ لٹیرے تھے جو راہنما ہوئے اور عالمی سیاست کے شاطروں نے انہیں اپنے مقاصد کی تکمیل کا آلۂ کار بنا لیا۔ وہ جنہوں نے کبھی صدقِ دل سے پاکستان کے وجود کو اور دو قومی نظریے کو قبول نہیں کیا تھا، اس ملک کے عوام کو مضبوط، خوش حال اور متحد کیسے دیکھ سکتے تھے۔

میں انہی خیالوں میں محو تھا کہ سب انسپکٹر (جس کا نام اس کی شرٹ کی پاکٹ پر جلیل لکھا ہوا تھا) حوالات کے باہر نمودار ہوا۔

"تم تو بڑی نامی گرامی چیز ہو یار" وہ بولا "ابھی ایس ایس پی صاحب خود تشریف لا رہے ہیں تمہاری سب پرانی فائلوں کے ساتھ۔"

میں نے مایوسی کو ظاہر نہیں ہونے دیا "میرا کوئی ریکارڈ نہیں ہے۔"

"جھوٹ سچ سب پتا چل جائے گا صبح تک" اس نے دھمکی کے انداز میں کہا۔

وہ سب مجھے دہشت زدہ کرنے کے حربے تھے۔ یہ ایک تلخ حقیقت تھی کہ قانون کے مطابق ہر مجرم کو چوبیس گھنٹے کے اندر مجسٹریٹ کے سامنے پیش کرکے اس کا جسمانی ریمانڈ حاصل کرنا ضروری تھا اور پُرتشدد کارروائی کے خلاف بھی قوانین موجود تھے مگر پولیس چوبیس گھنٹے میں ہی اپنی طاقت کا لوہا منوالیتی تھی۔ ان کے پاس وسائل تھے اور ٹریننگ تھی۔ تشدد ایک سائنس کی حیثیت اختیار کرگیا تھا۔ وہ نہ آدمی کے جسم پر نشان چھوڑتے تھے اور نہ اسے مرنے دیتے تھے مگر عذاب کی اس انتہا پر پہنچا سکتے تھے جہاں مرجانے کو وہ باعثِ نجات و رحمت سمجھنے لگتا تھا اور چوبیس گھنٹے تو کتاب میں لکھے ہوئے تھے، پولیس ہفتہ دس دن یہاں تک کہ مہینوں کسی کا سراغ بھی نہیں دیتی تھی کہ وہ ان کی تحویل میں ہے۔ بہت عالم فاضل اور اثر و رسوخ رکھنے والے عدالتوں میں جھک مار کے بھی انہیں برآمد کرنے میں ناکام رہتے تھے۔ افشائے راز سے پہلے ہی ان کی لاش علاقے کے تھانے کی حدود سے سیکڑوں میل دور مل جاتی تھی۔

یہ سب جانتے ہوئے بھی مجھے اپنی فکر نہیں تھی۔ مجھے اپنی قوت برداشت پر بھروسا تھا اور اپنے ساتھیوں کی مدد پر۔ وہ قانونی طور پر بھی بہت کچھ کرسکتے تھے اور میرے تحفظ کو یقینی بنانے کے لیے جوابی کارروائی کے طور پر کسی بھی شکاری کو شکار کرسکتے تھے۔ زیادہ پریشانی مجھے رابعہ کی طرف سے لاحق تھی جس کے بارے میں یقین سے کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا تھا۔ دشمن سے نیکی کی توقع رکھنے والا احمق ہوتا ہے اور دلاور جیسے دشمن سے واسطہ ہو تو شرافت، انسانیت اور ضمیر کے بارے میں سوچنا بھی غلط تھا۔ رابعہ کی یقین دہانی بے معنی تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ اسے میری کمزور رگ سمجھ کے اٹھالیا گیا ہے۔ مصالحت کی ہر کوشش میں ناکامی کے بعد چوہدری دلاور اینڈ کمپنی نے پھر پرانے طریقے آزمانے کا فیصلہ کرلیا تھا تاکہ مجھے ان کے بارے میں کوئی خوش فہمی پیدا ہوگئی ہے تو رفع ہوجائے۔

رات کے بارہ بجے تھے اور تھانے کے عقبی حصے میں معمول کے مطابق تفتیش کا عمل پورے زور و شور سے جاری تھا۔ ملزم دیوانہ وار چیخ رہے تھے، تشدد کرنے والوں سے رحم کی بھیک مانگ رہے تھے اور ان کے دل کو موم کرنے کے لیے دنیا بھر کے واسطے دے رہے تھے۔ ان کی دلدوز چیخوں سے میرے اعصاب بھی متاثر ہورہے تھے اور لامحالہ مجھے یہ خیال بھی آرہا تھا کہ نہ جانے کب میری باری بھی آجائے۔ ابھی تک کچھ نہیں ہوا تھا مگر میں اندازہ کرسکتا تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ کسی دستِ غیب نے میرے سب پرانے کیس کھولنے کا اشارہ کردیا تھا اور یہ سب کیس ایسے تھے کہ سال چھ مہینے میں قانون کے سارے تقاضے پورے کرتے ہوئے مجھے سزائے موت سنائی جاسکتی تھی یا رعایت کرتے ہوئے عمر قید۔

بارہ بجے اچانک ہڑبونگ مچی اور تھانے میں ہر شخص الرٹ ہوگیا۔ تفتیش کا شور بھی تھم گیا اور تھانے کا ہر اہلکار انتہائی مستعد ہوگیا پھر تین حوالاتی لائے گئے اور انہیں مُردہ کتوں کی طرح اندر پھینک دیا گیا۔ ان میں سے ایک کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ تھوڑی دیر کا مہمان ہے۔ اس کے منہ اور ناک سے خون نکل رہا تھا اور وہ جانکنی کی کیفیت میں فرش پر ہاتھ پاؤں مار رہا تھا اور سر کو اِدھر اُدھر جھٹک رہا تھا۔ وہ دُبلا پتلا، سیاہ رو نوجوان تھا جس کی صورت پر سختیٔ حالات نے مفلسی رقم کردی تھی۔ باقی دو بھی آڑے ترچھے پڑے ہوئے تھے، لمبے لمبے سانس لے رہے تھے اور کراہ رہے تھے۔ ان میں سے ایک حلق سے ذبح ہونے والے بکرے جیسی آواز نکال کے چلّا رہا تھا "ہائے ربّا، ہائے میں مرگیا۔ اوئے ظالمو..."

ایک سنتری نے جو حوالات کے باہر اطمینان سے بندوق لیے کھڑا تھا، کہا "چپ کر... ابھی تو پہلی رات ہے پُتّر۔ ابھی سے کون مرنے دے گا تجھے۔ ایس ایس پی صاحب آئے ہیں۔ شور کرے گا تو زمین میں زندہ گاڑ دیں گے..."

ایس ایس پی کے آتے ہی مجھے طلب کرلیا گیا۔ وہ ایس ایچ او کے کمرے میں اسی کی کرسی پر بڑے کرّوفر کے ساتھ براجمان تھا۔ ایس ایچ او اس کے مقابل ہاتھ پیچھے باندھے کھڑا تھا۔ ایس ایس پی کے ساتھ والی کرسی پر دوسرا انسپکٹر کے رینک کا افسر بیٹھا تھا جو شاید اس کا پی اے تھا اور صورت سے ذہین لگتا تھا۔ وہ جسمانی طور پر بھی فٹ تھا۔

ایس ایس پی زمان خان لودھی کی شخصیت کا تاثر بالکل مختلف تھا۔ وہ صورت سے تعلیم یافتہ اور مہذب نظر آتا تھا۔ اس کے چہرے کے نقوش میں شائستگی کی نرمی تھی اور وہ بلاشبہ خوبرو تھا۔ جب اس نے کیپ کو میز پر رکھا تو میں نے اس کے گھنے چمکیلے کالے بال دیکھے۔ اس کے حکم پر میرے ہاتھ کھول دیے گئے۔ مجھے ہتھکڑیاں لگا کے لانے والے محافظ کمرے سے باہر چلے گئے۔

اس نے اشارے سے مجھے بیٹھنے کو کہا "مسٹر سکندر بخت" اس نے انگریزی میں کہا "جیسا کہ تم جانتے ہو۔ تمہارے خلاف ایس ایس پی سراج صاحب کے زمانے میں بہت سے مقدمات درج کیے گئے تھے۔ ان میں سے کچھ انتہائی سنگین تھے اور کچھ مختلف عدالتوں میں زیرِ سماعت تھے۔ قتل کے ایک کیس میں تمہاری ضمانت بھی منظور کرلی گئی تھی لیکن اس کے بعد تم روپوش ہوگئے اور تمہارے بارے میں تحقیقات کرنے والی ہر ایجنسی نے رپورٹ دی کہ تم ملک دشمن سرگرمیوں میں اور دہشت گردی کی کارروائیوں میں ملوث ہو۔"

میں نے کہا "غالباً ایسی ہی رپورٹیں آپ کو ایک ہمسایہ دشمن ملک کے تفتیشی اداروں نے بھی دی ہوں گی۔"

اس نے سرہلایا "یس۔ تم بھارت سے بنگلہ دیش چلے گئے تھے اور تم نے ایک گروہ بنالیا تھا جس کے تم سرغنہ تھے۔"

میں نے تلخی سے کہا "مشرقی پاکستان کے باغیوں سے اور بیرونی حملہ آوروں سے لڑنا اگر دہشت گردی میں شمار ہوتا ہے تو پھر ہماری فوج بھی..."

"فوج کے بارے میں بات کرتے ہوئے تمہیں محتاط رہنا چاہیے ورنہ تمہارا کیس خراب ہوجائے گا۔"

"میرا کیس اچھا کب ہے؟" میں نے کہا "اگر حب الوطنی جرم ہے تو وہ سب بھی مجرم ہیں جنہوں نے مشرقی پاکستان میں بھارتی فوج کی جارحیت کا مقابلہ کیا۔"

"بات کو گھمانے پھرانے کی کوشش سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ تم پر یہ کیس مجرمانہ نوعیت کے ہیں جو پہلے سے چل رہے تھے۔ اس کا پورا ریکارڈ اب میری تحویل میں دے دیا گیا ہے۔ ابھی مجھے ان کا سرسری طور پر مطالعہ کرنے کا موقع ملا ہے لیکن چند باتیں واضح طور پر سامنے آگئی ہیں۔ ایک یہ کہ تمہارے خلاف مرحوم ایس ایس پی سراج نے غیر قانونی اور مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث ہونے پر جب بھی کارروائی کی تمہیں ایس ایس پی ضامن رضوی نے بچالیا۔"

"یہ غلط ہے۔ میں اس فرشتہ سیرت شخص پر الزام کے خلاف سخت احتجاج کرتا ہوں جس نے پولیس کے محکمے میں رہ کے اصول پرستی اور فرض شناسی کی وہ مثال قائم کی تھی..."

"مجھے معلوم ہے کہ وہ ایک ایماندار اور ذہین افسر تھے مگر تمہارے معاملے میں وہ رشتے داری کے ہاتھوں مجبور تھے۔"

"وہ میرے رشتے دار نہیں تھے۔"

ایس ایس پی کا موڈ خراب ہوگیا "میں نے تم کو بحث کرنے کے لیے نہیں بُلایا ہے اور میں ساری رات بکواس نہیں کرسکتا۔ یہ ہیں تمہارے خلاف وہ کیس جو درج کیے جاچکے ہیں۔"

ایس ایس پی کے پی اے نے ایک فائل کھول کے میرے سابقہ جرائم کی تفصیلات پر مبنی رپورٹ نکالی اور ترتیب وار ہر کیس کا خلاصہ پڑھنے لگا۔ ایک کانسٹیبل ٹرے میں چائے لے کر حاضر ہوا۔ خلافِ توقع ایک کپ میرے سامنے بھی رکھا گیا۔ اپنے خلاف مقدمات کی اس فہرست کے مندرجات کو سُنتے ہوئے میں نے کسی قسم کے احتجاجی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔ پہلی وجہ تو یہ تھی کہ کاغذی حقائق کی رو سے زیرِ سماعت اور زیرِ تفتیش مقدمات کے وجود سے انکار ممکن نہیں تھا۔ دوسری یہ کہ مقدمات قائم کرنا بہرحال پولیس کا کام تھا اور بے گناہی کو صرف عدالت میں ثابت کیا جاسکتا تھا۔ تیسری وجہ نقطۂ نظر کا فرق تھا۔ میں پوری نیک نیتی اور ایمانداری سے حلفیہ کہہ سکتا تھا کہ نہ میری نیت کبھی ارتکاب جرم کی تھی، نہ میں مجرمانہ ذہن رکھتا تھا اور نہ اس جرم کو جرم سمجھا جاسکتا ہے جس کا مقصد اجتماعی فلاح ہو یا ذاتی تحفظ ہو۔

اس کی مثال یوں دی جاسکتی ہے کہ اشتعال انگیزی کے نتیجے میں ہونے والے قتل یا حملہ آوروں سے خود کو بچاتے ہوئے غیر ارادی قتل پر عدالت معروضی حالات کو درپیش رکھتی ہے اور بعض اوقات اس جرم کو سزا کے قابل ہی نہیں سمجھتی۔ نشے کی حالت میں یا پاگل پن کی کیفیت میں ارتکاب جرم کرنے والا بھی بچ جاتا ہے کیونکہ وہ بقائمی ہوش و حواس جرم نہیں کرتا۔ ایک قبائلی معاشرے میں شادی سے پہلے کوئی لڑکی کسی لڑکے سے ملے تو یہ جرم ہے اور جو انہیں ملتا دیکھے وہ قتل کردے تو یہ ایک قابلِ تحسین کام سمجھا جائے گا جس سے معاشرے کی اجتماعی فلاح وابستہ ہے۔ شہر کے مہذب اور متمدن سمجھے جانے والے معاشرے میں یہ نقطۂ نظر قابلِ قبول نہیں ہوگا۔

میرے تمام جرائم قانون کی نظر میں جرائم تھے اور صرف عدالت ہی میری نیت اور میرے جذبات پر غور کرتے ہوئے مجھے رعایت دے سکتی تھی۔ پولیس نے چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کی ایما پر بھی کیس بنائے تھے اور سابق ایس ایس پی سراج نے اس کارِ خیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ پیا جسے چاہے وہی سہاگن۔ اعلیٰ افسران کی مرضی ہو تو ماتحت بڑی مستعدی دکھاتے ہیں اور جسے چاہیں کسی بھی جرم میں ملوث کرکے چالان کے سارے لوازمات بھی رضاکارانہ طور پر خود ہی فراہم کرلیتے ہیں۔ جس کا دنیا میں خدا کے سوا کوئی نہ ہو اس کے کھاتے میں کوئی لاش ڈالی جاسکتی ہے۔ آلۂ قتل تو ہر وقت دستیاب رہتے ہیں۔ وجہ قتل پرانی دشمنی، لین دین کا جھگڑا، ناجائز تعلقات کچھ بھی بنالی جاتی ہے اور گواہ... ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔

ایس ایس پی نے میز پر بید کی چھڑی مار کے مجھے متوجہ کیا "تم نے سُن لیا سب؟"

میں نے کہا "سچ تو یہ ہے کہ کچھ سُنا کچھ نہیں سُنا۔ میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔"

"میں ذاتی طور پر تم سے کوئی عناد نہیں رکھتا مگر تمہیں بے سبب رعایت بھی نہیں دوں گا۔ تم متعدد مقدمات میں سماعت کے لیے پیش نہیں ہوئے چنانچہ تمہاری ضمانت منسوخ ہوگئی ہے۔ تم ایک مفرور مجرم قرار دیے جاچکے ہو۔ دیگر مقدمات بہت جلد عدالت میں پیش کیے جائیں گے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارے وکیل بہت زبردست ہیں۔"

ایس ایچ او نے کہا "ایک تو سرو ہی تھا۔ جس نے گرفتاری کے وقت مداخلت کی تھی۔"

میں نے کہا "عبدالودود منظر۔ وہ خود بتائے گا کہ اس نے کس حد تک مداخلت کی تھی۔ میں اس الزام کی تردید نہیں کروں گا۔"

"وہ بہت سینئر ایڈووکیٹ ہیں" ایس ایس پی نے کہا۔

"ان کی ایک وکیل مس رابعہ قاری بھی ہیں سر جو نامعلوم وجوہ کی بنا پر اپنی پریکٹس چھوڑ کے ان کے ساتھ چلی گئی تھیں۔ وہ بھارت اور بنگلہ دیش میں بھی ان کے ساتھ تھیں۔"

میں نے کہا "ان پر اعانتِ مجرمانہ کا کیس بنتا ہے۔"

ایس ایس پی نے میرے طنز کو نظرانداز کردیا "تم نے کسی قانونی جواز اور اجازت کے بغیر سرحد عبور کی تھی۔ انڈین گورنمنٹ نے اس پر باقاعدہ احتجاج کیا تھا کہ پاکستان کے تخریب کار بھارت میں گڑبڑ پھیلا رہے ہیں۔ تخریب کاروں کی فہرست میں تمہارا نام بھی تھا اور رابعہ قاری ایڈووکیٹ کا بھی۔ وزارتِ خارجہ نے یہ فہرست وزارتِ داخلہ کو ارسال کی تھی۔"

ایس ایس پی کے پی اے نے ایک اور فائل کھول کے ایک کاغذ نکالا "یہ اس کی نقل ہے۔"

میں نے نقل کو دیکھے بغیر پرزہ پرزہ کردیا "اس فہرست میں کیا چوہدری دلاور کا نام ہے یا ایس ایس پی سراج، نواب خسرو جمشید اور ڈی سلوا کے نام ہیں۔ اس شخص استاد پیڈرو کا نام ہے؟ انہوں نے بھی بھارت میں بہت کچھ کیا تھا اور ان سب اسمگلرز اور غیر قانونی طور پر اسلحے کی خرید و فروخت کرنے والے بھارتی ایجنٹوں کے نام ہیں جن کے ساتھ ان کے مستقل کاروباری مراسم ہیں؟ کیا پولیس، تحقیقاتی ادارے، ہماری وزارتِ خارجہ و داخلہ کو نہیں معلوم کہ یہ لوگ کس قسم کے گھناؤنے کاروبار میں ملوث تھے۔ انہوں نے کتنا اسلحہ مشرقی پاکستان کے علیحدگی پسندوں کے ہاتھ فروخت کیا اور اس سے کتنی دولت کمائی۔ جب یہ بات ہم جانتے ہیں تو وہ لوگ ضرور جانتے ہوں گے ایس ایس پی صاحب جن کے ہاتھوں میں اس ملک کی سیاست کی باگ ڈور ہے۔ جو اس ملک کی معیشت کو کنٹرول کرتے ہیں اور نظم و نسق چلاتے ہیں۔ ان میں سے کس کس نے کتنا کتنا کمیشن لیا..."

ایس ایس پی نے میز پر مُکّا مارا۔ "بند کرو یہ بکواس۔ یہ عدالت نہیں ہے، تھانہ ہے۔ یہاں صرف تفتیش ہوتی ہے۔ اس جرم کی جس کی رپورٹ درج ہو۔ ایف آئی آر ہو۔"

"میں لکھوانا چاہتا ہوں رپورٹ۔ آپ لکھیں گے؟" میں نے کہا۔

"تم اگر یہ کہو کہ صدر کینیڈی کے قتل میں مادام نورجہاں، پنڈت نہرو اور پاپائے روم ملوث تھے تو میں تمہیں پاگل خانے بھیج دوں گا۔ ان کے خلاف ایف آئی آر کاٹوں گا تو خود بھی وہیں پہنچ جاؤں گا۔ ثبوت لاؤ اور گواہی لاؤ پھر تم جس کے خلاف کہو میں رپورٹ لکھنے کو تیار ہوں۔ نام تم کسی کا بھی لے سکتے ہو مگر میں ریکارڈ دیکھ کے بات کر رہا ہوں۔"

میں نے کہا "ابھی کچھ دیر پہلے چوہدری دلاور نے رابعہ قاری ایڈووکیٹ کو اغوا کیا، اس کے چشم دید گواہ ہیں۔"

"نام بتاؤ اس چشم دید گواہ کا" ایس ایچ او بولا۔

میں نے کہا "ایک پان سگریٹ بیچنے والا جس کا کھوکھا عین رابعہ قاری کی کوٹھی کے سامنے ہے۔"

"ہم اسے بُلالیں گے" ایس ایچ او نے ایک کاغذ کے پرزے پر کچھ لکھ کے ایک کانسٹیبل کو دیا "رپورٹ بھی لکھیں گے انشاء اللہ۔"

"میں رپورٹ لکھوانا چاہتا ہوں پولیس کے خلاف جو رابعہ کی کوٹھی میں کسی قانونی اختیار کے بغیر داخل ہوئی تھی۔ اس کوٹھی پر چوہدری دلاور نے ناجائز قبضہ کر رکھا تھا۔ پہلے اس نے یہ کوٹھی تباہ کرادی تھی پھر اس زمین پر اس نے کوٹھی بنا کے یہاں ایک طوائف چاندنی بیگم کو رکھا۔ ابھی کچھ دن پہلے ہی اس کا قتل ہوا تھا۔"

ایس ایس پی نے کہا "صبح تک سوچ لو کہ تمہیں کس کس کے خلاف کیا رپورٹ لکھوانی ہے اور کیا تمہارے پاس ثبوت کے طور پر پیش کرنے کے لیے کچھ ہے؟ کوئی گواہ ہے۔ تم جن کا نام لے رہے ہو انہیں عدالت میں مجرم ثابت کرسکو گے۔ میرا ان سب معاملات سے کوئی تعلق نہیں۔ مجھے تو صرف تمہارے کیس دیے گئے ہیں۔ تم اپنی ذمے داری پر جو چاہو کرو۔ مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ تمہارے ساتھ کچھ بڑے نامی گرامی صحافی بھی ہیں لیکن ایک بات اچھی طرح سمجھ لو مسٹر سکندر بخت۔ تمہارے یہ وکیل اور صحافی دوست انصاف کے عمل کو نہیں روک سکتے۔ وہ پولیس کے خلاف جو چاہیں لکھیں۔ اس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ممکن ہے نچلی سطح پر دو چار لوگ معطل ہوجائیں یا کسی ایس ایچ او کا ٹرانسفر ہوجائے۔ پولیس کا محکمہ اور اس کے اختیارات وہی رہیں گے اور پولیس کی تحویل میں رہتے ہوئے سارا نقصان تمہیں ہوگا۔ تمہارے صحافی دوستوں کی ہنگامہ آرائی کا خمیازہ تم بھگتو گے۔"

وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور اس کے ساتھ ہی ماتحت عملہ بھی حرکت میں آگیا۔ باہر کھڑے ہوئے کانسٹیبل فوراً ہتھکڑیاں لے کر اندر آگئے اور انہوں نے مجھے پھر حوالات میں پہنچادیا۔ میں اتنا دل شکستہ اور مایوس تھا کہ میں گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گیا اور حالات کی اس تبدیلی پر غور کرنے لگا جو کسی طرح بھی غیر متوقع نہیں تھی۔ ایس ایس پی نے غلط نہیں کہا تھا کہ تمام صحافی اور وکیل مل کے بھی پولیس کے محکمے کو ختم کرنا تو درکنار بدل بھی نہیں سکتے۔ کوئی ملک گیر تحریک، احتجاجی جلوس، مظاہرے اور بیانات، رائے عامہ یا پریس سب مقدمات کی نوعیت نہیں بدل سکتے اور کسی عدالت کو مجبور نہیں کرسکتے کہ وہ مجرم کو قانون کے مطابق سزا نہ دے۔ مجرم کو مجرم ثابت کرنا یا بے گناہ بنا کے پیش کرنا انہی کے اختیار میں ہے جو ثبوت اور شہادت لاسکتے ہیں۔ بنا سکتے ہیں یا مٹا سکتے ہیں۔ وہ اصل

...اہوں کو دھمکی سے اغوا کرا کے یا مروا کے عدالت تک رسائی ...مل نہ کرنے دیں تو ان کی مرضی اور وہ جھوٹے گواہ لے آئیں ...ٹ پر ہاتھ رکھ کے عینی شاہد بن جائیں تو یہ بھی ان کے اختیار ...ور پیشہ ور گواہ اور ضامن ہمیشہ پولیس کو دستیاب رہتے ہیں۔

...اس میں کوئی شک نہیں کہ سارے مقدمات میرے ہی خلاف ...بنائے ہوئے تھے۔ ہم نے کبھی چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کے کسی فرد کے خلاف کبھی رپورٹ نہیں لکھوائی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ...ڈی سلوا، خسرو جمشید اور ایس ایس پی سراج جو اب اس دنیا میں ...نہیں تھے، خود کچھ نہیں کرتے تھے اور جو کچھ وہ کرتے تھے اس کا ...کوئی ثبوت باقی نہیں چھوڑتے تھے۔ چوہدری دلاور نے میرے والد کی ساری جائداد پر قبضہ کرلیا تھا مگر اس سے پہلے کہ میں یہ معاملہ عدالت تک لے جاتا، خود میں ان کے پارٹنر میر شرافت علی کے قتل میں ملوث کردیا گیا تھا۔ اس نے رابعہ کی ماں کو اسپتال میں قتل کروایا تو اصل شکاری غائب ہوگئے تھے۔ رابعہ کی ماں کی تدفین کے ...وقت ان کے گھر میں بم کا دھماکا ہوا تھا تو وہاں کوئی شکاری نہیں تھا۔ ...شکار ہم سب ہوئے تھے مگر ہم اپنے خلاف انتقامی کارروائی کرنے والے کسی شکاری کو کبھی زیرِ دام نہیں لاسکے تھے۔ ایک انتہا کو پہنچ کے ہم نے معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیے تھے اور ان سے خود نمٹنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اس فیصلے کے نتیجے میں ایم آر ایس وجود میں آئی تھی۔

لیکن آج قانونی صورتِ حال یہ تھی کہ سارے انسانیت سوز جرائم کرنے والے باعزت طور پر آزاد تھے اور حوالات کی سلاخوں کے پیچھے صرف میں تھا جس کے خلاف نہ ثبوت کی کمی تھی، نہ شہادت کی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بہترین وکیل بھی مجھے باعزت طور پر رہا نہیں کراسکتے تھے اور غالب جیسے صحافی اس سسٹم کو بدل نہیں سکتے تھے۔

بہت پہلے سمجھانے والوں نے مجھے سمجھایا تھا کہ اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا اور میں نے اس خیال کو جذبات کی رو میں مسترد کردیا تھا مگر آج میں حوالات میں یوں پڑا تھا جیسے اکیلا چنا ٹھنڈے بھاڑ کی دیواروں میں پڑا ہو۔

منظر سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں خود میں یہ کہنے میں حق بجانب تھا کہ میرے خلاف مقدمات عدم پیروی کی بنا پر خارج ہوگئے ہیں یا سرد خانے میں پہنچ گئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر سال سیکڑوں مقدمات محض اس وجہ سے ختم ہوجاتے ہیں کہ مدعی اور مدعا علیہ یا گواہ حاضر نہیں ہوتے۔ وکیل سرکار کو پیروی سے دلچسپی نہیں رہتی یا اس پر دباؤ نہیں رہتا۔ عدالت کے باہر ہی مک مکا ہوجاتا ہے۔ گواہ منحرف ہوجاتے ہیں یا ...ن تعمیل ہونے کی نوبت نہیں آتی۔ عدالت زیادہ سے زیادہ اخبار ...میں اشتہار دے کے دوسرے مقدمات میں مصروف ہوجاتی ہے۔ ہر عدالت میں زیرِ تصفیہ مقدمات کی تعداد اتنی بڑھ چکی ہے کہ شاید انہیں جلد نمٹانا کسی بھی جج کے لیے ممکن نہیں خواہ وہ دن کے چوبیس گھنٹے عدالت لگائے۔ کیس کو دبانے میں پولیس کے ساتھ وکیل بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں اور وکیل بھی اپنی مرضی سے کچھ نہیں کرتے۔ بعض اوقات خود مدعی ہاتھ جوڑتا ہے کہ خدا کے لیے میری جان چھڑاؤ۔ آئندہ کوئی میرے باپ کو بھی قتل کردے تو میں کیس نہیں کروں گا۔ اتنا وقت صرف کرنا بھی ہوگا تو اس کے لیے دعائے مغفرت میں کروں گا۔

میرے کیس بھی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پُرانے ہوگئے تھے اور فائلیں دوسرے مقدمات کی فائلوں کے انبار تلے دب چکی تھیں۔ مجھے مفرور قرار دیا جاچکا تھا اور سرکاری وکیل کی طرف سے عدم پیروی کی بنا پر ان معاملات کے ازسرنو اُٹھائے جانے کا کوئی امکان نہ تھا لیکن چوہدری دلاور کی طرف سے مصالحت اور مفاہمت کی ہر کوشش میں ناکامی کے بعد یہ کیس بطورِ خاص نکالے گئے تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ دیوانی مقدمات ایک خاص مدت گزر جانے کے بعد دائر تک نہیں کیے جاسکتے اور فریقین حاضر نہ ہوں تو خارج بھی ہوجاتے ہیں مگر فوجداری مقدمات میں ایک فریق تو خود ریاست ہوتی ہے اور تاوقتیکہ حکومت خود ان مقدمات کو واپس نہ لے یہ کبھی ختم نہیں ہوسکتے۔

چوہدری دلاور نے مجھے مہلت دی تھی۔ اس نے مجھے استاد پیڈرو کے ذریعے اور پھر اکبر خان کی معرفت ہر پیش کش کی تھی۔ بالواسطہ طور پر مجھے رشوت بھی پہنچائی گئی تھی اور میرے تمام نقصانات کی تلافی کے ساتھ وہ میرے وقت اور میری ذہنی اذیت کی قیمت بھی ادا کرنے پر تیار تھا مگر میں نے غرض کے تحت بڑھائے جانے والے دوستی کے ہاتھ کو جھٹک دیا تھا۔ میں نے اپنے ضمیر کی آواز کے مطابق فیصلہ کیا تھا اور میرے ساتھ سب کی ایک ہی رائے تھی کہ حالات خواہ کیسے بھی ہوں جو سجدہ خدا کو روا ہے وہ شیطان کو صرف کافر ہی کرسکتا ہے۔ شیطان کیسا ہی پارسا بن کے کیوں نہ آئے اس پر لعنت۔

شیطان مشتعل ہو کے ہمارے خلاف پھر سرگرمِ عمل ہوگیا تھا۔ چوہدری دلاور کے لیے اپنے سیاسی کیریئر کے آغاز سے پہلے یہ ازحد ضروری تھا کہ وہ اپنے بدنام ماضی کی مجرم پرچھائیوں سے نجات حاصل کرے۔ یہ اس وقت تک ممکن نہیں تھا جب تک وہ اپنے پُرانے دشمنوں کے دلوں سے ہر قیمت پر دشمنی کے جذبات کو ختم کردے۔ جب یہ ممکن نہ ہوا تو اس نے پھر دشمنوں کو ختم کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس نے ایک طرف کیکر شاہ کے خطرناک حد تک جنونی مریدوں کو ہمارے پیچھے لگادیا تھا۔ کیکر شاہ کے مزار کو اکبر خان نے کاروباری رقابت کے باعث تباہ کرادیا تھا مگر اس کا الزام ہم پر آگیا تھا۔ یہ بھی شاید چوہدری دلاور جیسے عیار شکاری کا منصوبہ تھا۔ ہم اس کے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس گئے اور اب مجھے یقین تھا کہ پاگل عقیدت مندوں کے مجروح ہونے والے جذبات کی آگ

ہمارا خون ہی بجھائے گا۔ وہ اسے ایک کارِثواب اور مقدس فریضہ سمجھتے ہوئے موقعے کی تلاش میں رہیں گے کہ ہمیں جہنم رسید کردیں۔ اس کوشش میں خود شہید ہوکے جنت میں داخل ہونا ان کے نزدیک گھاٹے کا سودا نہیں تھا۔

اب چوہدری دلاور نے قانون کو ہمارے پیچھے لگادیا تھا اور یہ دوسری قسم کے دشمن بھی جان لیے بنا ٹلنے والے نہ تھے۔ خود چوہدری دلاور کو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ کیکر شاہ کے مریدوں کو بھڑکا سکتا تھا اور ان کی ہمہ وقت رہنمائی کرسکتا تھا۔ وہ ہمارے خلاف تمام مقدمات کو از سرِ نو تازہ کرچکا تھا اور غالب امکان یہ تھا کہ کچھ اور مقدمات بھی پُرانی فہرست میں شامل کیے جائیں گے جن میں کیکر شاہ کے مزار پر قتل و غارت گری اور آتش زنی کا جرم سب سے سنگین ہوگا۔ جب اس جرم کی تفصیلات منظرِ عام پر آئیں گی تو گواہ خود سامنے آئیں گے اور ہمارے جرم کی تشہیر ہماری جان کے دشمنوں کو دور دور سے کھینچ لائے گی۔

غالب اور نازو کے بارے میں سمجھا جاسکتا تھا کہ وہ چوہدری دلاور کی شرانگیزی سے کسی حد تک محفوظ رہیں گے۔ رابعہ پر ایک سینئر ایڈووکیٹ کی حیثیت سے ہاتھ ڈالنا آسان نہ تھا چنانچہ اسے ایک عورت کی حیثیت سے اغوا کرلیا گیا تھا۔ اپنے تمام مددگاروں اور دوستوں کی حمایت کے باوجود چوہدری دلاور کا سب سے آسان شکار میں تھا۔ میرے بعد گل بانو کا نمبر تھا جس کو بہ آسانی سابق ڈاکو ثابت کیا جاسکتا تھا۔ اسے ناگ منی کی حیثیت سے پہچاننے والے بھی بہت ہوں گے اور پولیس کے ڈاکوؤں سے خصوصی مراسم ہمیشہ رہے تھے۔ اپنے بھائی شیش ناگ کے گروہ کی ساری مجرمانہ سرگرمیوں میں ناگ منی برابر کی ملوث رہی تھی اور اس کے مجرم ماضی کے بارے میں پولیس سے زیادہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ قانون یہ کیسے تسلیم کرسکتا تھا کہ وہ تائب ہوکے گل بانو بن گئی ہے۔ پولیس کا مؤقف تو یہی ہوگا کہ اس نے بھیس بدل کے روپوش ہونے کے لیے شرافت کا لبادہ اوڑھا ہے اور تائب ہونے سے وہ جرائم بھی ختم تو نہیں ہوتے جن کی سزا باقی ہو۔ تیسرا نمبر محسن کا ہوتا جو میرا سب سے پُرانا دوست تھا اور روزِ اول سے میرے تمام معاملات میں برابر کا شریک۔

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ محسن اور گل یہاں نہیں ہیں اور وقتی طور پر پولیس کی دسترس سے دور ہیں۔ انہیں سمجھایا جاسکتا ہے کہ فی الحال وہ اس شہر کی جانب رُخ بھی نہ کریں۔ سیالکوٹ میں فوزیہ کا گھرانہ کی بہترین پناہ گاہ تھا اور صورتِ حال کے بہتر ہونے تک ان کے سامنے نہ آنا ہی بہتر تھا ورنہ محسن کی ازدواجی زندگی کا دوسرا دور بھی ایک داستانِ عبرت بن جائے گا۔

مجھے آج پُرانا وقت یاد آرہا تھا۔ پُرانے لوگ یاد آرہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے ایک دائرے میں سفر کرکے میں پھر وہیں پہنچ گیا ہوں جہاں سے سب کے ساتھ ایک ایڈونچر کا آغاز کیا تھا۔ ایک عظیم مقصد کے لیے جہاد کا سلسلہ وقت کی طویل مسافت تھی جس پر ہم نے تائیدِ ایزدی، اپنے عزم اور حوصلے کے ساتھ حادثات اور خطرات کا مقابلہ کرتے ہوئے مغربی پاکستان سے مشرقی پاکستان تک سفر کیا تھا۔ ہر قدم پر مرگِ ناگہانی کا خوف حائل تھا مگر ہم بڑھتے گئے تھے اور ہم سے کہیں زیادہ طاقتور دشمن ہمارا بال بیکا نہیں کرسکا تھا۔

لیکن وہ سفر کامیابیوں کے تمام غرور اور ناکامیوں کی ساری تلخی کے ساتھ تمام ہوا تو سب کچھ وہی تھا۔ جب میں انگلستان سے لوٹا تھا تو میرا واسطہ جس قسم کے حالات سے پڑا تھا وہ بدلے نہیں تھے میں وہی لاوارث سکندر بخت تھا جس کے باپ کو اس کی سب دولت چھین کر حقیر کردینے والے قاتل آج بھی آزاد تھے اور اتنے طاقتور تھے کہ قانون ان پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا تھا۔ نہ میرا گھر میرا تھا، نہ وزیر خان کا وہ کارخانہ مجھے ملا تھا جس کی جگہ اب اسپتال قائم کردیا گیا۔ اس اسپتال پر وزیر خان کا نام لکھا ہوا تھا مگر اس کا سنگِ بنیاد رکھنے والے بھی اس کے قاتل تھے۔ وزیر خان کی قبر سے نکالی جانے والی ہڈیاں آج بھی کسی گمنام مدفن میں میرا انتظار کررہی تھیں۔

میں سخت ڈیپریشن کا شکار تھا۔ اب تو رابعہ بھی مجھ سے دور تھی اور مجھے اس کی قانونی مدد سے زیادہ جذباتی سہارے کی ضرورت تھی۔ حوالات میں میرے ساتھ تین مجرم پڑے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک مرچکا تھا۔ پولیس نے اس پر تفتیش کے جو طریقے آزمائے تھے وہ ان کی تاب نہ لاسکا تھا مگر پھر بھی یہ قتل نہیں تھا۔ اس کے خون کا دعویٰ کرنے والا اسے قتل ثابت نہیں کرسکتا تھا۔ پولیس اسے لاوارث لاش قرار دے کر کسی فلاحی تنظیم کے حوالے کرسکتی تھی کہ دفنادے یا میڈیکل کے طلبا کو بیچ سکتی تھی۔ اسے کسی شاہراہ پر ٹرک کے سامنے ڈال کر حادثاتی موت کا شکار قرار دیا جاسکتا تھا۔ لواحقین بے رسوخ لوگ ہوں تو لاش ان کے سپرد کرنا بھی مشکل نہ تھا۔ بندے نے حوالات میں اپنے ازار بند کا پھندا بنا کے خودکشی کرلی۔ کرائم رپورٹر اور میڈیکو لیگل افسر کی مدد سے بیان بھی جاری کیا جاسکتا تھا کہ متوفی دمے کا یا ٹی بی کا مریض تھا یا ہارٹ فیل ہونے سے مرگیا۔ بفرضِ محال معاملہ اخبارات تک پہنچ جائے تو رسمی قسم کی عدالتی تحقیقات کا ڈراما بھی چلتا ہے۔

میرے خیالات کی رو اس وقت ٹوٹی جب ایک نئے ملزم کو حوالات کے اندر پھینکا گیا۔ میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یہ وہی پان والا تھا جس کو میں نے چشم دید گواہ کے طور پر طلب کرنے کی حماقت کی تھی۔

اس نے مجھے دیکھا تو جیسے اس پر بجلی سی گر پڑی۔ "آپ یہاں.... اوہ.... میں سمجھ گیا۔ مجھے بھی آپ نے مروایا ہے۔"

میں نے اسے جھوٹی تسلی دی "تم کو ڈرنے کی کیا ضرورت تم نے کوئی جرم نہیں کیا ہے، صبح ہونے دو۔"

"صبح کیا ہوگا جی۔ ان کی جگہ فرشتے آجائیں گے" وہ تلخی سے بولا۔

"میرے دوست اور وکیل آجائیں گے، ہماری ضمانت ہوجائے گی۔"

"آپ نے تو کچھ کیا ہوگا۔ مجھے کیوں پکڑا ہے انہوں نے۔ میری ضمانت کس لیے جی؟" وہ رونے پر آگیا "کون دے گا میری ضمانت؟"

اس سے پہلے کہ میں اسے کچھ سمجھاتا، حوالات کا دروازہ پھر کُھلا اور دو سپاہی اسے گھسیٹ کر لے گئے۔ ایس ایچ او صاحب نے اسے طلب کیا تھا۔

میں نے چلاّ کے کہا "تم اتنا ہی بتانا جتنا تم نے دیکھا تھا۔"

وہ شور مچاتا رہا "میں نے کچھ نہیں دیکھا جی۔"

پولیس والوں نے اسے وہیں مارنا شروع کردیا تھا۔ کچھ دیر بعد میں اس کے چیخنے کی وحشت ناک آوازیں سُن رہا تھا اور میرے اعصاب جواب دینے لگے تھے "ایس ایچ او صاحب۔ ظالمو، چھوڑ دو۔ ایک لاش تو پڑی ہے یہاں" میں نے حوالات کی سلاخوں والے دروازے کو ہلاکے کہا "کیا اسے بھی مار ڈالوگے۔ اس نے کیا جرم کیا ہے آخر۔ میں تم پر قتل کا کیس کردوں گا۔"

میری ہنگامہ آرائی کا نتیجہ یہ نکلا کہ دو پولیس مین مجھے بھی حوالات سے نکال کر عقبی حصے میں لے گئے۔ اگر میں چاہتا تو ہتھکڑی ہونے کے باوجود انہیں مار مار کے وہیں لٹا سکتا تھا مگر مجھے معلوم تھا کہ اس طرح میرا کیس اور خراب ہوجائے گا۔ اس تھانے سے فرار ہونے کی کوشش کو کسی کانسٹیبل کی رائفل سے نکلنے والی ایک گولی ناکام کرسکتی تھی۔

وہ کمرۂ تفتیش تھا جہاں مجھے پولیس والوں نے فرش پر بٹھادیا۔ میرے سامنے جو منظر تھا اس نے رگوں میں میرے لہو کو منجمد کردیا تھا۔ میں خود بہت پہلے تفتیش کا نشانہ بنا تھا مگر ایک تماشائی کی حیثیت سے سفاکی اور بربریت کا یہ مظاہرہ دیکھنا بہت سخت سزا تھی۔ پان والے کو چھت سے یوں اُلٹا لٹکا دیا گیا تھا کہ اس کا ایک پاؤں رسی سے ایک کُنڈے میں بندھا ہوا تھا اور دوسرا پاؤں چھ فٹ دور دوسرے کُنڈے میں۔ اس کے برہنہ جسم پر دو پولیس والے چھتر کاری کررہے تھے۔ یہ جوتے کے سول جیسا چمڑے کا ڈیڑھ فٹ لمبا اور آٹھ انچ چوڑا ٹکڑا تھا۔ ہر ضرب کے ساتھ چمڑے کی آواز پٹاخے کی طرح آتی تھی۔ پان والا تڑپ کر چلاتا تھا اور اُچھلتا تھا تو پھر جھٹکے سے نیچے آتا تھا۔ اس کی کھال جگہ جگہ سے پھٹ رہی تھی۔ جب اس کی تمام منت سماجت رائیگاں گئی تو اس نے نیم دیوانگی کی کیفیت میں مجھے گالیاں دینی شروع کیں۔ پھر وہ پولیس والوں کو گالیاں دینے لگا مگر پولیس کے جلاد کسی مشین کی طرح اپنا کام کررہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اندھے بہرے ہوگئے ہوں۔ ان کے ہاتھ احساس سے محروم اور روبوٹ کی طرح چل رہے تھے۔ دیگر دو کانسٹیبل جو اس وقت وردی میں نہیں تھے دونوں کُنڈوں میں سے گزرنے والی رسی کو تھوڑا تھوڑا کھینچتے جارہے تھے جس سے اُلٹے لٹکے ہوئے شخص کی ٹانگوں کے درمیان فاصلہ بڑھتا جارہا تھا۔ ظاہر ہے وہ ٹانگوں کو زیادہ سے زیادہ چار فٹ تک پھیلا سکتا تھا۔ جب کہ کُنڈے آٹھ فٹ دور تھے۔ نظروں آتا تھا جیسے وہ ملزم کی ٹانگیں چیر کے اسے دو حصوں میں لٹکا ہوا چھوڑ دیں گے۔

درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہوجانا۔ اس کی عملی تفسیر میں نے اس وقت دیکھی جب چند منٹ کے لیے چھتر مارنے والے دم لینے کے لیے رُکے اور ایک منحوس صورت شخص نے بھدے مگ میں سے ملزم کے زخمی بدن پر نمک والا پانی ڈالنا شروع کیا۔ وہ مچھلی کی طرح تڑپا مگر اس کی ٹانگیں اب اتنی کس گئی تھیں کہ وہ اپنے جسم کا صرف زیریں حصہ ہلا سکتا تھا۔ اس نے ہوا میں ہاتھ چلا کے بھیانک چیخیں مارتے ہوئے سر کو جھٹکا اور بالآخر یہ اذیت اس کی قوتِ برداشت سے بڑھ گئی۔ وہ بے حس ہوکے جھول گیا۔ اس کے ہاتھ نیچے لٹک گئے اور اس کی باچھوں سے رال ٹپکنے لگی۔

میں یہ سب دیکھنے پر مجبور تھا۔ اگر میں آنکھیں بند کرلیتا۔ تب بھی جسمانی عذاب سے چلاّنے والے شخص کی دل کو چیرنے والی آوازیں میرے کانوں میں آتیں اور میرے تصور میں یہ ننگِ انسانیت منظر رہتا۔ اس کے خاموش ہوتے ہی ایس ایچ او صاحب تشریف لے آئے۔

"ہاں بھئی، سکندر بخت۔ تمہارے گواہ نے کیا بتایا؟"

میں نے کہا "تم اسے میرے جرم کی سزا کیوں دے رہے ہو۔ اسے معاف کردو، میں نے غلطی کی تھی اس کا نام لے کر گواہ بنایا تھا۔"

"غلطی اور گناہ کے ذمے دار ہم نہیں ہیں۔ ہم جرم کو دیکھتے ہیں۔" ایس ایچ او بولا "اب دیکھونا۔ اتنی سینئر ایڈووکیٹ ہیں یہ

تماری مس رابعہ قاری ایڈووکیٹ۔ تمہارا کیا رشتہ ہے ان سے؟"
"جو ایک انسان کا دوسرے انسان سے ہو سکتا ہے۔"
"ایک عورت کا ایک مرد سے" وہ بولا "کتنا عرصہ ساتھ رہے ہو تم؟"

میں نے کہا "تم کو شرم آنی چاہیے۔"

اس نے میرے منہ پر چانٹا مارا "شرم تجھے نہیں آئی دلّے۔ شادی کی نہیں اور اسے ساتھ لیے پھرتے تھے۔ کس کس کی بیوی تھی وہ؟"

اس کے بعد وہ رابعہ کے بارے میں بکواس کرنے لگا اور اس نے مجھے مشتعل کرنے کے لیے اتنی غلاظت اُگلی کی میرا دماغ بدبو سے بھر گیا مگر میں نے اسے یوں نظرانداز کیا جیسے لوگ گلی میں بھونکنے والے کتّے کو نظرانداز کرتے ہیں۔ اس نے نازو کے بارے میں بھی بہت کچھ کہا مگر میں نہیں چاہتا تھا کہ میرا حشر بھی وہی ہو جو پان والے کا ہو رہا تھا۔ بے لباس ہو جانے کے بعد آدمی خود اپنی نظر سے گر جاتا ہے اور اس کی عزتِ نفس باقی نہیں رہتی پھر جب اسے تھانے کے آسیب زدہ ماحول میں کسی جانور کی طرح اُلٹا لٹکا کے مارا جائے تو وہ سمجھتا ہے کہ انسان ہونے سے گلی کا کتا ہونا بہتر ہے۔

زخموں پر نمک چھڑکنے والا ایک بالٹی کے ساتھ اندر آیا اور ذبح کیے ہوئے اور کھال اُترے ہوئے بکرے کی طرح لٹکنے والے ملزم پر پانی انڈیلنے لگا۔ جیسے قصائی گوشت کو دھونے کے لیے ڈالتے ہیں، کچھ دیر بعد بے ہوش شخص کراہنے لگا اور ہوش میں آگیا۔

ایس ایچ او کے حکم پر اسے اُتار لیا گیا۔ وہ زمین پر لوٹنے لگا اور دہائی دینے لگا "میں نے کچھ نہیں دیکھا۔ تھانے دار صاحب' مجھے معاف کردو۔ تمہیں اللہ کا واسطہ۔ اس کے رسول کا واسطہ... میں مرجاؤں گا' میرے بیوی بچّے ہیں۔"

ایس ایچ او نے اسے ٹھوکر مار کے دور پھینک دیا "جھوٹ بول کے جان بچانا چاہتا ہے.... ابھی تیری گواہی کچی ہے۔"

اب اسے نہایت شرم ناک پوز میں ایک میز پر لٹا دیا گیا۔

"ہاں۔ کیا دیکھا تھا تونے.... بول۔"

گالی گلوچ کی زبان تو وہ عادتاً بولتے تھے لیکن میں نے دیکھا کہ اس وقت وہ جسمانی تشدّد سے بھی لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ ان کو قطعی احساس نہ تھا کہ یہ اذیت برداشت کرنے والا بھی انہی جیسا انسان ہے۔ یہ بڑی عجیب بات تھی۔ عام آدمی کسی اور کے جسم پر مشقِ ستم دیکھ تڑپ اُٹھتا ہے اور اس کے درد کو دل میں محسوس کرتا ہے۔ شاید تھانوں میں ہر روز تفتیش کرنے والوں کا احساس مرجاتا ہے یا پھر وہ ذہنی مریض ہوتے ہیں جو ایک انتقامی جذبے کے تحت انسان کو مارتے ہیں اور اتنی بے رحمی سے کہ وہ بعض اوقات مرجاتا ہے مگر وہ پُرسکون رہتے ہیں اور اتنی ہی بے حسی کے ساتھ دوسرے کو تختۂ مشق بناتے وقت بالکل نہیں سوچتے کہ یہ سب ان کے ساتھ ہو تو کیا ہو گا؟

پان والے کے ساتھ اگلے ایک گھنٹے میں جو شرمناک ظلم ہوا اس کو نہ یہاں بیان کیا جا سکتا ہے نہ یہ بیان قابلِ اشاعت ہو گا۔ نہ میرے قلم میں طاقت ہے کہ اس بربریت کی تصویر کھینچ سکے اور نہ پڑھنے والے شریف انسانوں کو ذہنی اذیت میں مبتلا کرنا میرا مقصد ہے۔ ایک گھنٹے تک ایس ایچ او نے اپنی نگرانی میں "تفتیش" کی۔ میری منت سماجت کو اس نے سُنا ہی نہیں اور بالآخر حکم دیا کہ میرے منہ میں کپڑا ٹھونس کے مجھے کھمبے سے باندھ دیا جائے۔ کھمبا نہیں عمارت کا ستون تھا۔ جس کے ساتھ میرا وجود بھی پتھر ہو گیا۔ میں نے موت جیسی پُر آسیب تنہائی کو محسوس کیا۔ یہاں میں اتنا کمزور اور بے بس اور حقیر تھا کہ میرے دوست احباب' صحافی اور وکیل' انصاف اور قانون کی بالادستی پر یقین رکھنے والے' ملک کی اعلیٰ ترین عدالت' اقوام متحدہ' بین الاقوامی عدالتِ انصاف اور ساری دنیا مجھے ایسی ہی عبرت ناک موت سے نہیں بچا سکتے تھے جیسی ایک بے قصور پان سگریٹ بیچنے والے کا مقدر ہوئی۔ اس کا کوئی قصور نہیں تھا سوائے اس کے کہ وہ معاشرے کے سب سے مظلوم اور محکوم طبقے کا فرد تھا۔ وہ کسی بھی وزیر' سفیر' رکنِ اسمبلی' ڈی آئی جی یا مجسٹریٹ کا رشتے دار تو کیا واقف کار تک نہیں تھا۔ اگر وہ ایڈیشنل چیف سیکریٹری کے کُتّے کو ٹہلانے والا ہوتا یا چیف سیکریٹری کے شوفر کا سالا بھی ہوتا تو کسی کی ہمت نہ ہوتی کہ اسے ہاتھ بھی لگا سکے۔

میں سمجھ رہا تھا کہ مجھے اس بے گناہ کی عبرت ناک موت کا منظر آخری ہچکی تک دکھانے کا مقصد صرف مجھے دہشت زدہ کرنا تھا اور یہ سمجھانا تھا کہ میرے ساتھ بھی یہ سب ہو سکتا ہے اور میرے ساتھ ہی کیا' رابعہ بھی ان کے قبضے میں ہے۔ جہاں وہ غریب پان والا لٹکا ہوا تھا وہیں رابعہ مجھے دیکھنے کے لیے ضرور آسکتی ہے۔

میری عقل ماؤف ہو چکی تھی۔ یہ گزشتہ رات کی بات تھی کہ میں اور رابعہ خوشی کے ایک ٹکڑے سے بچّوں کی طرح خوش تھے جو ہمیں وقت نے مستعار دیا تھا اور یہ نہیں جانتے تھے کہ آنے والا وقت کتنا بے رحم ہے جو ہم سے سب کچھ چھین لے گا۔ ہمارا اعتبار' ہمارا یقین اور احساسِ تحفظ' رفاقت کی خوشی اور زندگی کی ساری رعنائی سے معمور خوشی کے سب رنگ۔ ہم محبت کے ساحل کے نرم ریت پر موجوں کی گدگدی کو محسوس کر رہے تھے اور اس بے رحم اور سفاک لمحے سے بے خبر تھے جو کسی خونی مگرمچھ کی طرح چپکے چپکے آگے بڑھ رہا تھا۔

میرے ضمیر پر بھی بوجھ تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ ایک غریب پان والے کی بیوی کا سہاگ اُجڑنے کا ذمّے دار میں ہوں۔ میں نے اس کے بچّوں کو یتیم کیا ہے۔ میں نے اس کی مدد کرکے اس پر ظلم کیا تھا۔ جب مجھے ایس ایچ او صاحب کے کمرے میں پیش کیا گیا تو وہاں میں نے ایک جھلک ان دونوں کی دیکھی جو کار میں بیٹھ کے پان والے کا کھوکھا اُجاڑنے آئے تھے مگر میری مداخلت کے باعث فرار ہونے پر مجبور ہو گئے تھے۔

میں نے اعتماد سے محروم لہجے میں کہا "ایس ایچ او صاحب! یہ دونوں کون تھے؟"

"اپنے ہی بندے ہیں جی" اس نے بے نیازی سے کہا اور پھر سب انسپکٹر کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"گاڑی ہے کوئی' بندے کو لے جانے کے لیے۔"

"گاڑی پکڑ لیتے ہیں جی" اس نے کہا۔

"اسے کون لایا تھا گھر سے؟"

"حوالدار رحیم بخش جناب۔ سادہ کپڑوں میں گیا تھا۔"

"کسی نے دیکھا تو نہیں تھا؟" ایس ایچ او بولا۔

"نہیں سر جی۔ یہ کھانے کے بعد گلی کے نکڑ پر حلوائی کی دُکان پر جاتا تھا اور وہاں آدھی رات تک گپ لگاتا تھا۔ واپسی میں ہم نے گاڑی میں ڈال لیا تھا' گلی میں بالکل اندھیرا تھا۔"

"گاڑی کس کی تھی؟"

"اپنی ہی تھی۔ کوئی فکر خطرے والی بات نہیں سر جی۔ ہم کچا کام نہیں کرتے۔" سب انسپکٹر بولا۔

"اچھا جاؤ پھر اسے چھوڑ آؤ کہیں۔ ذرا ہوشیاری سے۔ کہیں ان کے صحافی دوست وہاں بھی نہ پہنچ جائیں تصویریں بنانے کے لیے" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"جی ٹی روڈ پر ڈال دیں جی؟"

"او نہیں یار۔ وہ اپنا یار ہے۔ اُدھر ملتان روڈ کی طرف پھینکو تاکہ وخت پڑے اس.... کو۔"

یہ سب کچھ میں نے دیکھا' سُنا اور برداشت کیا جس کا گواہ کوئی نہیں تھا۔ سوائے میرے' جس کی گواہی کی حیثیت کوئی نہ تھی۔ مجھے اپنی بزدلی پر شرم آئی مگر میری بہادری یہاں بے مصرف تھی۔ میں جو سکندرِ اعظم کہلاتا تھا اور چیف کے تو تھا زنجیر سے بندھا ہوا قانون کی گرفت میں تھا اور خود کو باز کے شکاری پنجے میں قید حقیر چڑیا سے بھی زیادہ بے بس اور کمزور محسوس کر رہا تھا۔ میں ساری شوخی اور ظرافت بھول گیا تھا۔ اپنی اعلیٰ تعلیم اور اپنا حسب نسب' اپنے اعلیٰ وارفع نظریات۔ اپنی جمالیاتی حِس' انسانی اخلاقی اقدار پر اپنا یقین' اپنے رشتے اور ان رشتوں کے ناقابلِ شکست ہونے کے دعوے۔ سب بھول گیا تھا۔ اس لمحے کو کوسنے سے کچھ حاصل نہ تھا جب میں نے رابعہ کی بات مان کے اس کی کوٹھی تک جانے کے لیے رکشا روکا تھا۔ میری خوش قسمتی کا کوٹا ختم ہو گیا تھا۔

میں کچھ بھی نہ کرتا تب بھی شاید ایسا ہی ہوتا یا بدتر ہوتا۔ غالب نے ایسے ہی وقت میں کہا ہوگا کہ ۔ ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے۔ رات کے دو بج کر چالیس منٹ پر میں نے اس شخص کے بے جان جسم کو جاتے دیکھا جس سے میری دوستی یا دشمنی تو کیا' جان پہچان تک نہ تھی۔ جس کا نام تک مجھے معلوم نہ تھا۔ محض اس جرم میں اسے درسِ عبرت بنادیا گیا تھا کہ اس نے نادانستگی میں وہ دیکھ لیا تھا جو اسے نہیں دیکھنا چاہیے تھا اور وہ سن لیا تھا جو اس کے کانوں کے لیے نہیں تھا۔ سبق مجھے پڑھایا گیا تھا کہ دیکھو' ریاستی تشدد کیا ہوتا ہے اور لاقانونیت کی طاقت کے سامنے سر نہ جھکانے کا انجام کیا ہو سکتا ہے۔ سچ وہ ہے' قانون وہ ہے اور لازم وہ ہے جو طاقتور اور حکمران کا فرمانِ امروز ہے۔ باقی سب جو کتابوں میں اور صحیفوں میں لکھا ہے اور کسی فلسفی یا مفکر کا فرمایا ہوا ہے' جو سیمپوزیم اور سیمیناروں میں بولا اور پڑھا جاتا ہے یا اقوالِ زریں میں شمار ہوتا ہے' سب ڈراما ہے۔ زندگی کی اصل حقیقت سے اس کا کیا تعلق۔ بھوک اور مفلسی' جبرواستبداد' استحصال اور حیوانِ ناطق کی سطح پر جینے کی مجبوری کا سیاست اور ادب' آرٹ اور نظریاتی علم' تہذیب کی دانشوری اور آئیڈیلزم سے کیا تعلق؟

ایک بار پھر مجھے حوالات میں پہنچادیا گیا۔ تشدد سے ہلاک ہونے والے پہلے ملزم کی لاش ابھی تک وہیں پڑی ہوئی تھی اور باقی دو اپنی جسمانی اذیت کے باوجود سو رہے تھے۔ نیند اور بے ہوشی انسان کی جسمانی قوت برداشت کو بحال کرتی ہے۔ شاید اسی لیے کہا جاتا ہے کہ نیند سولی پر بھی آجاتی ہے۔ صرف میری آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔ میں اچانک بدل جانے والے حالات کا تجزیہ کرنے کی کوششِ ناکام میں مصروف تھا۔ میرے ذہن میں انتشار تھا اور میں خیالات کو ایک جگہ مرتکز کرنا چاہتا تھا مگر سوچ کے دھارے کبھی ایک سمت میں بہنے لگتے تھے' کبھی دوسری سمت میں۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس وقت رابعہ کہاں ہوگی اور اس پر کیا بیت رہی ہوگی؟ وہ کیا سوچ رہی ہوگی اور کیا محسوس کررہی ہوگی؟ میں غالب اور نازو کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کیا وہ کچھ کرسکیں گے؟ منظر کچھ کرپائے گا؟

صبح کے چار بجے سے کچھ پہلے کا وقت تھا جب اچانک دروازۂ زنداں کھلا اور میں نے اپنے مقابل ایک نیا چہرہ دیکھا۔ وہ ایک اسمارٹ اور خوش پوش' نوجوان آدمی تھا "مسٹر سکندر بخت!" اس نے مجھ سے ہاتھ ملاکے کہا "میرے ساتھ آیئے۔"

میں نے کہا "تم کون ہو؟"

اس نے کہا "میرا نام رفیق ہے۔ رفیق کے معنی ہوتے ہیں دوست۔"

"میرے کسی دوست کا نام رفیق نہیں" میں نے حوالات سے باہر آتے ہوئے کہا۔

وہ مسکرایا "چلیں اب یہ نام بھی شامل کرلیں اس فہرست میں۔"

"کس نے بھیجا ہے تمہیں؟" میں نے کہا۔

اس نے میری بات کا جواب گول کردیا "مجھے افسوس ہے کہ آپ کو یہ پریشانی اٹھانی پڑی۔ مجھے کچھ دیر ہوگئی رسمی قسم کی کارروائیوں میں۔"

"کیا مطلب! تم میری رہائی کے احکامات لے کر آئے ہو گورنر کی طرف سے؟" میں نے کہا۔

خلافِ توقع تھانے کے عملے نے نہ میرا راستہ روکا' نہ میری طرف نظر اٹھاکے دیکھا۔ وہ ایسی بے نیازی برت رہے تھے جیسے میں کسی کام سے تھانے آیا تھا اور واپس جارہا ہوں تو ان کی بلا سے۔ باہر ایک سفید فاکس ویگن کھڑی ہوئی تھی "بیٹھیے پلیز۔"

میں نے کہا "مسٹر رفیق! جب تک مجھے یہ معلوم نہیں ہوگا کہ اب مجھے کہاں لے جایا جارہا ہے اور کیوں' میں گاڑی میں نہیں بیٹھوں گا۔"

"ویسے تو آپ آزاد ہیں" اس نے کہا "آپ کہیں بھی جاسکتے ہیں لیکن میرے ساتھ جانے میں آپ کا فائدہ ہے۔"

"کس قسم کا فائدہ؟"

"اہم سوال آپ کے مستقبل کا ہے۔ آپ کو اس کی فکر نہیں ہے؟ اور آپ کے مستقبل سے میری مراد ہے ان سب کا مستقبل جن سے آپ کا کوئی رشتہ ہے۔" اس نے خاصے محتاط انداز میں گول مول بات کی "آپ کو مجھ سے کوئی خطرہ محسوس نہیں کرنا چاہیے۔ میرے پاس کسی قسم کا اسلحہ نہیں ہے۔ آپ تلاشی لے سکتے ہیں۔ اور میں بلیک بیلٹ تو کیا' جوڈو کے نام کے سوا کچھ نہیں جانتا" وہ ہنسا۔

میں اس کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ "او کے مسٹر رفیق۔ چلو' آسمان سے گر کے کھجور میں اٹکنا بھی مجھے منظور ہوگا۔"

"ہوسکتا ہے اس فیصلے کے بعد آپ بحفاظت زمین پر اُتر جائیں۔ کھجور میں اٹکے بغیر۔ مگر سیف لینڈنگ کے لیے پیراشوٹ ضروری ہوتا ہے۔ اور جب آدمی ہوا میں معلق ہو' یعنی نہ اس کے پیر زمین پر ہوں' نہ وہ زمین کی کشش کا مقابلہ کرسکتا ہو۔ تو اس کا رفیق پیراشوٹ ہوتا ہے۔"

"مسٹر رفیق! تم بہت چالاک اور عیار آدمی ہو۔ باتوں میں چکر دینے کے ماہر" میں نے کہا "تم نہیں بتاؤ گے کہ تمہیں کس نے بااختیار بناکے بھیجا تھا اور تم مجھے کہاں لے جارہے ہو۔"

"یہ سسپنس بہت جلد ختم ہونے والا ہے۔ تم خود سب جان لوگے" وہ بولا۔

گاڑی ہوٹل ایمبیسڈر سے سیدھی گزر چکی تھی۔ مال روڈ پر آتے ہی رفیق نے موڑ کاٹا اور ہم اس پتلی سی سڑک پر آگئے جس پر اعلیٰ حکام کی سرکاری رہائش گاہ تھی اور میں نے سنا تھا کہ یہاں سیکریٹری کے سطح کے بادشاہ لوگ رہتے ہیں۔ گاڑی انہی میں سے ایک کے گیٹ پر رک گئی۔ دروازے پر کھڑے ہوئے سنتری نے کار میں جھانک کر دیکھا اور مطمئن ہوکے انٹرکام پر اندر بات کی۔ چند منٹ میں دروازے کا خودکار قفل کھلا اور ہم آہنی پھاٹک سے اندر کی قوس نما ڈرائیو وے پر آگئے جو سیدھی پورچ تک جاتی تھی مگر پورچ میں پہلے سے دو کاریں موجود تھیں جن میں سے ایک پر مجھے جھنڈا ابھی نظر آرہا تھا۔

فاکس ویگن بائیں جانب دو چھوٹی گاڑیوں کے ساتھ ٹھہر گئی اور رفیق نے بڑے دوستانہ انداز میں مجھے مخاطب کیا۔ "لیجیے ہم پہنچ گئے۔ اب تو یقین آجانا چاہیے آپ کو کہ آپ آسمان سے گر کے کھجور میں نہیں اٹکے ہیں بلکہ آپ آسمان سے گرے ہیں تب بھی آپ کو پھر اٹھاکے آسمان پر پہنچایا جاسکتا ہے۔ میری مُراد ہرگز دوسری دنیا سے نہیں ہے۔ ادھر سے آیئے میرے ساتھ۔"

ہم صبح کے چار بجے اس کوٹھی کے عقبی حصے سے اندر گئے جس کا وجود حاکمیت کے اختیارات اور غرور کا آئینہ دار تھا۔ اس کی ظاہری شان وشوکت اگرچہ حسنِ تعمیر کا شاہکار نہیں تھی' نہ مکینوں کی دولت مندی کا اشتہار لیکن اس کی فضا میں دبدبہ تھا اور اس کے درودیوار زبانِ خاموشی میں پکارتے تھے کہ باادب' باملاحظہ' ہوشیار۔

رفیق اس اہم سرکاری عمارت میں اجنبی نہیں تھا۔ جس طرح اسے دربان نے محض ایک نگاہ ڈال کے داخلے کا اجازت نامہ عطا کردیا تھا' وہی اس کے معتبر ہونے کی سند تھا۔ وہ جتنے اعتماد کے ساتھ مجھے اندر لے گیا اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ وہ محرمِ رازِ درونِ خانہ بھی ہے۔ اس نے مجھے ایک کمرے میں بٹھاکے ساری لائٹس آن کردیں۔ یہ ڈرائنگ روم نہیں تھا بلکہ لائبریری جیسی جگہ تھی جہاں خصوصی ملاقاتوں کے لیے دیوار کے ساتھ ساتھ دو صوفے لگادیئے گئے تھے۔ وہ سب امور جو دفتر میں یا ڈرائنگ روم میں زیرِ بحث نہیں لائے جاسکتے تھے' اس لائبریری کے تخلیئے میں کسی مداخلت کے بغیر زیادہ رازداری کے ساتھ طے کیے جاسکتے تھے۔

میرے دائیں جانب دیوار کے ساتھ وسیع ٹیبل لگی ہوئی تھی جس پر ایک ٹیلی فون اور دو ٹیبل لیمپ رکھے ہوئے تھے۔ بالکل سامنے بہت بیش قیمت رائٹنگ سیٹ تھا اور درمیان میں ایک جھنڈا سنگِ مرمر کے چھوٹے سے مینارِ پاکستان پر نصب تھا۔ لازمی طور پر یہ کسی وزیرِ باتدبیر کی اقامت گاہ تھی۔ دیواروں پر شفاف شیشوں کی الماریوں میں سرکاری ونیم سرکاری مطبوعات مجلّد صورت میں مقفل تھیں۔

میں یہ طے کرنے سے قاصر تھا کہ وزیرِ موصوف کا ان تمام معاملات میں کیا کردار ہوگا۔ وہ مجھے نفسیاتی طور پر مزید دہشت زدہ کریں گے یا کوئی مصالحتی فارمولا پیش کریں گے جو بیک وقت میرے لیے اور چوہدری دلاور کے لیے قابلِ قبول ہو۔ صاف ظاہر تھا کہ اس ملاقات کے لیے یہ جگہ کسی غیرجانبدار فریق کی تجویز کردہ نہیں تھی۔ خود چوہدری دلاور کی خواہش پر مجھے یہاں بلایا گیا تھا بلکہ منگوایا گیا تھا جس سے وزیرِ موصوف اور چوہدری دلاور کے درمیان پہلے سے موجود روابط کا اظہار ہوتا تھا۔

میں حکومت کے ہر وزیر کو پہچاننا تو درکنار' اس کے نام اور محکمے سے بھی واقف نہ تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ میں عرصہ دراز سے باہر تھا اور ویسے بھی مجھے ملک کا سیاسی نظم ونسق چلانے والوں کے کوائف سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں یہ نہیں دیکھتا تھا کہ ملک کی باگ ڈور کس کے ہاتھ میں ہے' یہ دیکھتا تھا کہ ملک ٹھیک چل رہا ہے یا نہیں اور اندرونی وبیرونی طور پر حالات بہتری کی جانب رواں ہیں یا روبہ تنزل ہیں۔

یہ بھی ضروری نہیں تھا کہ جھنڈے سے یہ کسی وزیر ہی کی سرکاری کوٹھی ہو۔ بہت سے نچلے درجے کے سربراہانِ محکمہ' سیکریٹری کی سطح کے لوگ' یہاں تک کہ ڈپٹی کمشنر بھی گاڑیوں پر جھنڈا لہراتے پھرتے تھے جو خلافِ ضابطہ ضرور تھا مگر ضابطے ان کے مزاج اور ان کی مرضی کے تابع رہتے تھے' وہ ضابطوں کے پابند نہیں تھے۔ گاڑی پر جھنڈا لہرانا اپنے اقتدار اور اختیار کے اعلان کے مترادف تھا اور دوریادشاہت کے نقیب کا کام کرتا تھا جو شاہی سواری کی آمد سے پہلے ہٹو۔۔۔ بچو۔۔۔ ہوشیار۔۔۔ خبردار۔۔۔ باادب' باملاحظہ کی صدا لگانے پر مامور تھے۔ خاص سواری آرہی ہے۔ عام آدمی اپنی جان خود بچائے اور اس راہگذر سے دور رہے۔

مجھے وہاں بیٹھے بیس منٹ ہوچکے تھے۔ ایک کلاک کی مترنم آواز نے پانچ گھنٹے بجائے اور اس کے ساتھ ہی چوہدری دلاور نے ایک پردے کو ہٹاکے کمرے میں قدم رکھا۔ میں نے حیرت کے کسی ردِعمل کا اظہار نہیں ہونے دیا اور اسے یوں دیکھتا رہا جیسے میں اسی کا انتظار کررہا تھا۔

چوہدری دلاور کو معلوم تھا کہ میں اس سے ہاتھ نہیں ملاؤں گا۔ اس نے کوشش بھی نہیں کی اور میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"تم پوچھوگے نہیں کہ تمہیں یہاں کیوں لایا گیا ہے؟" اس نے کہا۔

میں نے کہا "نہیں۔ پولیس اسٹیشن پہنچاکے مجھے دہشت زدہ کیا گیا تھا' یہاں مجھے مرعوب کیا جائے گا۔"

وہ مسکرایا "ہمارا تو خیال یہ تھا اپنے سکندر صاحب" کہ نہ تم دہشت زدہ ہوتے ہو نہ مرعوب۔"

"کم ظرف لوگ اس کی کوشش تو کرتے ہیں" میں نے تلخی سے کہا۔

"اویار اپنے سکندر صاحب! ہم کوئی عام آدمی ہیں؛ میں اور تم۔ ہیں جی!" اس نے پاؤں سینٹر ٹیبل پر پھیلادیئے "اگر دشمنی ضروری ہے تو بندے کو خیال کرنا چاہیے اپنے لیول کا۔ ہیں جی' ہم کوئی شہدے لفنگے تو ہیں نہیں کہ دو چار سو کی خاطر ایک دوسرے

سے لڑیں۔ کبھی بس میں' کبھی گلی محلے میں۔ کپڑے پھاڑیں اور ایک دوسرے کے گھر میں گھس جائیں۔ نہ ہم وہ ہیں... کیا نام ہے اس کا' گینگ لیڈر... بدمعاشوں کے گروہ کے لیڈر...... ہیں جی۔"

"بہت جلد تم ثابت کردو گے کہ ہم ایک ہی ذہنیت اور ایک ہی سطح کے لوگ ہیں چنانچہ ہمارے درمیان کوئی لڑائی نہیں۔"

وہ مسکرایا "لڑائی! اویار' لڑائی تو بڑی گھٹیا بات ہے۔ ہیں جی' لوگ لڑتے ہیں زمین کے پیچھے۔"

میں نے کہا "میرے اور تمہارے درمیان اسی زمین کا مسئلہ ہے جسے میں مادرِ وطن سمجھتا ہوں مگر جس کے ساتھ تم پیشہ ور طوائف جیسا سلوک کرنا چاہتے ہو۔"

"اپنے سکندر صاحب! طعنہ بڑا مارتے ہو آپ۔ پڑھے لکھے ہوتا۔ ہم اپنی سیدھی سادی زبان بولتے ہیں" ولاور نے کہا "ہمارے درمیان لڑائی نہیں' اختلاف ہے کچھ باتوں پر لیکن وہ... کیا نام ہے اس کا... مسئلہ... مسئلہ اتنا سنگین نہیں ہے یار۔"

میں نے کہا "چوہدری ولاور! تم جب مجھے 'یار' کہہ کے مخاطب کرتے ہو تو مجھے لگتا ہے کہ یہ لفظ ایک گالی ہے۔ خدا نہ کرے کہ میں تمہارا یار کہلاؤں۔"

"اچھا جی مسٹر سکندر بخت! صبح صبح کا وقت ہے' اچھی بات سے دن کا آغاز کرتے ہیں۔ دشمنی یا اختلاف۔ جو بھی تم کہو۔ کوئی اچھی بات تو نہیں۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ پرانی باتوں کو بھول کے ہم نئی زندگی کا آغاز کرتے ہیں۔ ہیں جی' نیک نیتی کے ساتھ۔"

میں نے کہا "ہاں۔ نیک نیتی کا پہلا ثبوت تم نے رابعہ کو اغوا کرکے فراہم کردیا ہے۔"

ایک ملازم چائے کی ٹرالی لے کر آیا اور خاموشی سے لوٹ گیا۔

"چائے تو پیو گے نا؟" اس نے درخواست کے انداز میں کہا۔

"اصلاً میں بھی پٹھان ہوں۔ ہم دشمن کے گھر میں کھانے پینے کو حرام سمجھتے ہیں" میں نے کہا۔

"یہ میرا گھر نہیں ہے۔ مجھے بھی بلوایا گیا ہے یہاں تمہاری طرح۔"

"آخر کیوں؟"

"صلح صفائی کے لیے' اختلافات ختم کرنے کے لیے۔"

"وہ کون ہے جو ثالث بن کے چاہتا ہے کہ ہم اختلافات ختم کردیں؟ کیا دلچسپی ہے اسے ہمارے معاملات سے اور کیوں؟ اور وہ اتنا ہی بااختیار ہے تو سامنے آئے۔"

"یہ اختیار اس نے مجھے دیا ہے" ولاور نے چائے کی پیالی میری طرف بڑھائی۔

میں نے ہاتھ مار کے چائے گرادی "صاف کیوں نہیں کہتے کہ وہ تمہارا آدمی ہے' تمہیں اس کی پشت پناہی حاصل ہے۔ تم اس کا نام کیوں نہیں بتاتے؟"

ولاور نے اس دھبے کو دیکھا جو قالین پر چائے گرنے سے نمودار ہوگیا تھا مگر اس نے کپ اٹھانے کی کوشش نہیں کی "اپنے سکندر صاحب! حالات بہت بدل گئے ہیں۔ کچھ اندازہ تو کرلیا ہوگا تم نے۔ اپنی زندگی کی قدر کرو۔ ہیں جی' بہت کچھ گنوادیا ہے تم نے مگر ابھی بہت کچھ ہے تمہارے پاس۔ سب سے بڑی چیز ہے زندگی ساری زندگی تمہارے سامنے ہے۔ بڑی لمبی ہے یہ سڑک۔ اس پر چلتے جاؤ جہاں تک ہمت ہو۔ خدا نے تمہیں عقل دی ہے اور حوصلہ دیا ہے۔ پہلے مجھے بولنے دو' میری پوری بات سن لو' اس کے بعد جو چاہو کہنا۔ میں سنوں گا۔ ہیں جی' دنیا میں تمہارے دوست بھی بہت ہیں اور ابھی تک یاری نبھا رہے ہیں وہ لیکن ذرا سوچو' کب تک کوئی ساتھ دے سکتا ہے کسی کا؟ ہر ایک کی اپنی زندگی... ہوتی ہے۔ اس کا ایک حصہ تو دیا جاسکتا ہے' پوری زندگی نہیں۔ ابھی تک تم نے کچھ بھی نہیں گنوایا ہے' سوائے تھوڑے سے وقت کے۔ جو تمہارا تھا وہ سب تمہیں مل سکتا ہے۔"

"بشرطیکہ میں تم سے تعاون کروں؟"

"میں نے کہا تھا کہ پہلے میری بات ختم ہو جائے پھر بولنا۔ اپنے سکندر صاحب' بُرے وقت میں سایہ بھی آدمی کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ یہ صرف وہ نہیں ہے' کیا نام ہے اس کا... ضرب المثل۔ یہ حقیقت ہے۔ تم چاہو تو تمہیں سب واپس مل سکتا ہے۔ تمہارا گھر' تمہارے والد کی جائداد' وہ جگہ جہاں اب اسپتال قائم ہے' ان کا پرانا کاروبار۔ تمہارے سارے مالی نقصانات کی تلافی ہوسکتی ہے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "تمہاری شرائط پر مجھے کچھ نہیں چاہیے' میں تم سے خیرات میں کچھ بھی نہیں لوں گا۔ میں تم سے اپنا حق چھین لوں گا۔"

وہ ہنسا "اپنے سکندر صاحب! فلمی ڈائیلاگ پردۂ اسکرین پر اچھے لگتے ہیں۔ وہ ہے نا اپنا۔ کیا نام ہے اس کا' محمد علی... خوب گرجتا ہے عدالت میں جج پر' ایسے کسی عدالت میں کوئی ملزم بول سکتا ہے؟ حقیقت تو یہ ہے کہ تم کچھ نہیں کرسکتے۔ تمہاری ایک پوزیشن پہلے بھی نہیں تھی اور اب تو بالکل نہیں ہے۔ میرا مطلب قانونی پوزیشن سے ہے۔"

"مجھے معلوم ہے ولاور کہ میرے خلاف تمام پرانے مقدمات کس کے اشارے پر از سرِ نو شروع کیے گئے ہیں۔ غالباً یہی ہے وہ خفیہ ہاتھ جو تمہاری پشت پناہی کررہا ہے۔" میں نے مینارِ پاکستان کے ماڈل پر لگے ہوئے جھنڈے کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ جھنڈا حکومت' اقتدار اور اختیار کی علامت ہے۔"

"غلط۔ یہ ایک جذبے کی علامت ہے' ایک مقصد اور ایک منزل کی علامت ہے جو برِصغیر کے مسلمانوں نے طویل جدوجہد اور لامحدود قربانیوں کے بعد حاصل کی تھی۔ یہ میری سربلندی کی علامت ہے کہ میں ایک پاکستانی ہوں اور یہ میرا جھنڈا ہے۔"

"ایک تو اپنے سکندر صاحب! زیادہ پڑھنا بھی بندے کو وہ بنادیتا ہے' کیا کہتے ہیں اسے؟ خواب پرست اور آئیڈیلسٹ۔ اویار' جو تم کہتے ہو وہ ہونا چاہیے مگر ہے نہیں" چوہدری ولاور نے کہا "جذبات کی زبان مت بولو' عقل سے بات کرو۔ یہ جھنڈا تمہارا ہے تو کسی دن نکلو گاڑی پر لگا کے' اپنی کوٹھی پر لہرا کے دکھاؤ۔ خاص دنوں میں نہیں' عام دنوں میں۔ بابا' یہ حاکم لوگ لگاتے ہیں جو حکومت کا اختیار رکھتے ہیں۔ ہم جیسوں کی دشمنی میں اور حکومت سے پنگا لینے میں بڑا فرق ہے۔"

"گویا رابعہ کو بھی حکومت نے اغوا کیا ہے... تم نے نہیں؟"

"اغوا کس نے کیا ہے رابعہ کو اپنے سکندر صاحب!" اس نے پُرمسرت انداز میں کہا "غلط فہمی..."

"غلط فہمی!" میں نے برہمی سے کہا "پھر وہی غلط فہمی۔ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں صرف مجھے غلط فہمی ہوتی ہے۔ ساری دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے اسے میں ہی غلط سمجھتا ہوں۔ ورنہ وہ بالکل ٹھیک ہوتا ہے۔ آخر میں کیا ہوں؟ احمق یا فاترالعقل..."

وہ سنجیدہ اور خاموش بیٹھا مسکراتا رہا۔ "اب میری سمجھ شریف میں تو دوسرا کوئی لفظ آتا نہیں۔ آخر میں اسے کیا کہوں؟ اغوا کیا ہوتا ہے؟ کسی کو اس کی مرضی کے خلاف زبردستی لے جانا۔ ہیں جی' جب کوئی اپنی مرضی سے کہیں جائے اور وہ عاقل وبالغ بھی ہو..."

"بند کرو یہ فضول بکواس...." میں نے چیخ کے کہا "تم سمجھتے ہو کہ تمہارے جرم کا گواہ کوئی نہیں رہا تو تمہارا کوئی جرم بھی نہیں رہا۔ ایک گواہ تو وہ غریب پان والا تھا۔ یقین رکھو ولاور' اس کے مظلوم بیوی بچوں کی آہ ضرور لگے گی تمہیں۔ تمہارا بھی ایک گھر ہے۔ جب تم دوسروں کے گھر کو آگ لگاؤ گے تو کبھی کوئی دیوانہ تمہارا گھر بھی پھونک دے گا۔"

اس نے ایک لمبی گہری سانس لی "یار' دنیا میں جو بھی ہو رہا ہے' ولاور کی مرضی سے نہیں ہو رہا ہے۔ اس پان والے کا اس معاملے سے کیا تعلق۔ اس نے شرافت سے کھوکھا چھوڑنے سے انکار کردیا تھا اور وہ بڑے ڈاڈے لوگ تھے۔ پھر بھی میں کہتا ہوں کہ یہ بُرا ہوا۔ اسے مارنے کی ضرورت نہیں تھی۔ غریب بندہ تھا' دس بیس ہزار لے کر جگہ چھوڑ دیتا۔"

"تمہیں کس نے بتایا کہ پان والے کا کھوکھا ہٹانے والے کون لوگ تھے؟"

"یہ اپنا رفیق بڑے کام کا بندہ ہے۔ سارے شہر کی خبریں اس کے پاس ہوتی ہیں" چوہدری ولاور نے کہا "میں نے کہا ہے اس سے کہ صبح اس کے گھر دس ہزار دے آئے' میرا نام لیے بغیر۔"

"سبحان اللہ! ایک ہاتھ سے دنیا میں شر پھیلا رہے ہو اور دوسرے ہاتھ سے جنت کا سودا بھی ہو رہا ہے۔ بہت خوب چوہدری ولاور! کیا بات ہے تمہاری سخاوت اور بندہ پروری کی....."

"تم سے تو کچھ چھپا ہوا نہیں ہے۔ دنیا داری کی یہی رسم ہوگئی ہے اور سیاست میں تو یہی نسخہ ہے کامیابی کا۔ ہیں جی۔"

"ہاں جی۔ ادھر ایک عورت کو اغوا کیا' ادھر ایک تصویر شائع کرادی کسی غریب بیوہ کی' سلائی مشین دیتے ہوئے۔"

"پھر وہی اغوا! اویار' وہ اپنی مرضی سے گئی تھی میرے ساتھ۔ تم یہ بات سمجھنا کیوں نہیں چاہتے۔"

"اس لیے کہ میں ہی کیا' کوئی بھی ہوش مند آدمی یہ تسلیم نہیں کرے گا اور نہ رابعہ جیسی صحیح الدماغ عورت تمہارے ساتھ جاسکتی ہے۔"

"وہ تم سے زیادہ سمجھ دار ہے' تم سے زیادہ ٹھنڈا دماغ ہے اس کا" چوہدری ولاور بولا "تم بھی آرام سے بات کرلیتے تو کوئی مسئلہ پیدا نہ ہوتا۔ تم پہلے پوچھتے تو سہی کہ میں وہاں کیا لینے آیا تھا۔ رابعہ نے پوچھا اور میں نے کہا کہ چلو کہیں بیٹھ کے بات کرتے ہیں' اپنے سکندر کو بھی تم مجھ سے بہتر طریقے پر سمجھا سکتی ہو' وہ کوئی دیہاتی' جاہل عورت یا دودھ پیتی بچی نہیں ہے۔ اس نے میری بات مان لی۔ اسے تم پر جتنا اعتماد ہے اتنا ہی اپنے آپ پر ہے.... ہیں جی۔"

میں اسے بے یقینی سے دیکھتا رہا "کہاں لے گئے تھے تم اسے؟"

"ہم انڈس ہوٹل کے نیچے گلیکسی ریسٹورنٹ میں بیٹھ گئے تھے۔ اس نے وہیں سے فون کیا تھا تمہیں... ہیں جی۔"

"میں نہیں مان سکتا۔" میں نے کہا "کہیں جانے سے پہلے وہ مجھے ضرور بتادیتی۔ ایسے خاموشی سے تمہارے ساتھ نہ چل پڑتی۔"

"تم مان لوگے اپنے سکندر صاحب' جب تمہاری بات رابعہ سے ہوگی" چوہدری ولاور بولا۔

"اس نے یہ کیوں نہیں بتایا تھا کہ وہ گلیکسی ریسٹورنٹ میں بیٹھی ہے؟" میں نے کہا۔

"تمہارے ڈر سے۔ اس کا خیال تھا کہ تم بھی پہنچ جاؤ گے وہاں۔ ہیں جی' اور پھر بات خاک ہوگی۔ بات ذرا دھیان سے سننے والی تھی... اور لمبی بات تھی' وہ سمجھ سکتی تھی' تم نہیں سمجھتے۔ اس نے تمہارے یار اس وکیل کو بھی فون کیا تھا۔ کیا نام ہے اس کا... بڑا مشکل سا... عبدالودود منظر کو کہ پولیس کے چکر میں مت پڑنا۔"

"پولیس خود میرے چکر میں پڑگئی۔ ہے نا کمال کی بات؟"

"وہ سب تو ہونا تھا۔ ہیں جی۔ پولیس تو لاہور آتے ہی تمہارا استقبال کرتی مگر تم نکل گئے پشاور کی طرف۔ انہوں نے انتظار بہتر سمجھا ورنہ وہ جاتے تمہارے پیچھے تو بڑی لمبی قانونی کارروائی ضروری ہوتی۔ ہیں جی' اسپیشل ٹیم بنانی پڑتی اور اسے خصوصی اختیارات دینے پڑتے۔ لوٹ کے تو آنا ہی تھا تمہیں۔"

"تمہیں پولیس کے معاملات کی سب خبر رہتی ہے کہ وہ کیا کر رہے ہیں اور کیا کرنے والے ہیں؟" میں نے طنز سے کہا۔

"خبر رکھنی پڑتی ہے جی اپنے سکندر صاحب۔ آپ کے ساتھ تو معاملہ ہی کچھ ایسا ہے۔" اس نے عیاری سے کہا۔

رابعہ کی طرف سے میری تشویش کسی حد تک کم ہوگئی تھی مگر دل میں ایک خلش باقی تھی۔ "دلاور! تم نے کبھی سچ بولا ہے؟"

وہ ہنسا "او یار جی! بغیر ضرورت کے کون جھوٹ بولتا ہے' میں بھی بولتا ہوں لیکن اس وقت جو بھی تمہیں بتا رہا ہوں' سچ ہے۔"

"یعنی رابعہ اپنی مرضی سے تمہارے ساتھ گئی تھی؟"

"ہاں۔ اس کی تصدیق نہ ہو تو کہنا کہ دلاور اپنے باپ کا نہیں" اس نے کہا "ابھی تو بیوی بھی نہیں ہے وہ تمہاری کہ تم سے اجازت لیے بغیر کہیں نہ جائے۔ ہیں جی' وکیل ہے آخر' ایک شادی پہلے بھی کر چکی ہے خیر سے.... تجربہ کار تو تم سے زیادہ ہی ہوئی نا۔"

میں نے اپنے چہرے کو غصے سے سرخ اور گرم ہوتا محسوس کیا "اس وقت وہ کہاں ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ ہو سکتا ہے کہ تمہارے دوستوں کے پاس چلی گئی ہو۔ یا اپنے گھر میں ہو۔ پتا چل جائے گا۔"

"کب پتا چلے گا؟ ابھی بات کرنا چاہتا ہوں میں اس سے۔" میں نے چلّا کے کہا۔

"کیا وہ بات کرے گی تم سے؟" وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

"تمہارا دماغ خراب ہے؟" میں نے کہا۔

"ہوگا لیکن قسمت خراب نہیں ہے میری۔ ہیں جی' میں چاہتا ہوں کہ تم آج فیصلہ کرلو۔"

"کس بات کا فیصلہ؟"

"یہی کہ تمہیں کیا کرنا ہے" وہ اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ "میں نے پوری کوشش کی کہ تم کسی طرح مان جاؤ۔ تمہارا سب کچھ تمہارے حوالے کرنے کے علاوہ بھی میں نے بہت کچھ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ ہرجانہ' جرمانہ' تاوان۔ کچھ بھی کہہ لو۔ میں نے تمہارے والد کے قاتل کو تمہارے حوالے کرنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ تم نے میری ہر پیش کش مسترد کردی۔ میں نے ہمیشہ اپنے مقصد کو اہم سمجھا' انسانوں کو نہیں' اسی لیے میں پیڈرو جیسے پرانے وفادار کو بھی قربان کرنے کے لیے تیار تھا۔ یہ میرا نہیں' ساری دنیا کی سیاست کا اصول ہے۔ اس میں افراد اہمیت نہیں رکھتے۔ مفادات کی جنگ میں جیت ہی سب کچھ ہے۔ بڑے بڑے سیاسی لیڈر بھی شطرنج کے پیادے ہیں۔ مثال لیاقت علی خان کی دیکھ لو یا کینیڈی کی۔ کتنے محبوب لیڈر تھے وہ لیکن ان کو کتنی آسانی سے سیاسی منظر سے نکال دیا گیا۔ تم تو بہت لائق فائق بندے ہو۔ ساری دنیا کی کیا صرف پاکستان کی تاریخ اٹھا کے دیکھ لو۔"

"اب تم اس تاریخ کے صفحات میں اپنا نام لکھوانا چاہتے ہو؟"

"شہیدوں کے ساتھ نہیں۔ مجھے اصول پرستی اور شرافت کی سیاست کرنے کا کوئی شوق نہیں۔ ہیں جی' سچ پوچھو تو سیاست کا کوئی تعلق ہی نہیں ہوتا شرافت اور اصول پرستی سے۔ مغل تاریخ کو دیکھ لو یا اس سے پہلے کی۔ کبھی غلام نے آقا کو خنجر گھونپا اور تخت سنبھال لیا' کبھی بیٹے نے باپ کو جیل میں ڈالا اور بھائیوں کو مروا کے حکومت حاصل کی۔ ہیں جی' پھر انگریز آگئے اور انہوں نے غلام ملک پر کیسے حکومت کی۔ اب ہماری باری ہے تو ہم شرافت اور اصول پرستی' جمہوری حقوق اور اسلامی مساوات کے منشور پر عمل کریں؟ کیسے جی؟"

میں حیرانی سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ باہر سورج طلوع ہوچکا تھا اور میں گزشتہ شب کے تلخ تجربات اور شب بیداری کے باعث بہت تھک گیا تھا۔ میرا ذہن اس خیال سے بھی ماؤف ہو رہا تھا کہ رابعہ نے میری رائے کو نظرانداز کردیا تھا' مجھ سے مشورہ کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا اور مجھے اتنی اہمیت بھی نہیں دی تھی کہ دلاور کے ساتھ جانے سے پہلے بتا جاتی۔ یہ سرکشی نہیں تھی' اپنی خودمختاری کا اعلان نہیں تھا۔ خود پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کی حماقت تھی۔ کیا واقعی وہ بھی سمجھتی ہے کہ میں عقل سے کام نہیں لے سکتا' جذبات کی رو میں بہہ کے میں ٹھنڈے دماغ سے سوچنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ شاید پیڈرو کو دیکھ کر میں نے جس ردِعمل کا مظاہرہ کیا تھا اس کے بعد وہ ایسا سمجھنے میں حق بجانب تھی لیکن اسے بعد میں تو میری خبر لینی چاہیے تھی۔ غالب اور نازو نے اسے بتادیا ہوگا کہ مجھے پولیس گرفتار کرچکی ہے۔ اس نے تھانے آنے کی یا کال کرنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی؟

"میں بات مختصر کرتا ہوں اپنے سکندر صاحب' آج کا پورا دن ہے تمہارے پاس" چوہدری دلاور نے کہا "میں کوئی رسک نہیں لے سکتا۔ ہیں جی' میں نے سیاست میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا ہے اور مجھے اگلے الیکشن میں کامیاب ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ ہیں جی' اس کے لیے مجھے فرصت چاہیے۔ وقت کم ہے' میں یہ وقت اور اپنی ساری توانائی تم جیسے پاگل خانوں کا دماغ درست کرنے میں صرف نہیں کرسکتا۔ تمہارے سامنے دو ہی راستے تھے۔ ایک تم نے پہلے چھوڑ دیا۔ وہ فائدے کا سودا تھا جس میں تم بھی عزت آبرو سے سکھ چین کی زندگی گزار سکتے تھے۔ ہیں جی' اور مجھ سے تعاون کرتے نہ کرتے' بس اپنی زبان بند رکھتے اور خاموشی سے اپنا کام کرتے' اپنا اسپتال چلاتے' بزنس چلاتے اور گھر چلاتے لیکن تم تو تھے ایم آر ایس کے سربراہ' تم نے تو میرے خلاف اعلانِ جہاد کردیا تھا۔ جیو اور جینے دو کا فلسفہ تمہاری سمجھ میں نہیں آیا۔ مجبوراً مجھے یہ دوسرا راستہ اختیار کرنا پڑا۔ تم کو اچھی طرح اندازہ ہوگیا ہوگا کہ میں بازی نہیں ہار سکتا کیونکہ سارے پتے میرے ہیں اور میرے ہاتھ میں ہیں۔ تمہاری حیثیت کیا ہے' یہ ایس ایس پی زمان خان لودھی نے تم کو بہت اچھی طرح سمجھا دی ہوگی۔"

میں مجبور تھا کہ اپنے اشتعال کے جذبات کو قابو میں رکھوں۔ میرا ذہن چوہدری دلاور کی باتوں سے ماؤف ہو رہا تھا۔ میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے' غلط ہے لیکن اس سے اتفاق کرنا بھی میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ اس میں کوئی شک کی بات نہیں تھی کہ حالات بدل چکے تھے اور میرے لیے موافق بہرحال نہ تھے لیکن مجھے سوچنے کی مہلت درکار تھی اور مجھے مشورہ کرنا تھا۔ اپنے ساتھیوں سے' اپنے آپ سے۔

"وہ وقت گزر گیا جب تم نے چُھپ چُھپ کے میرے خلاف مجرمانہ کارروائیاں جاری رکھیں۔ ہیں جی' اور اللہ معاف کرے انہیں' ایس ایس پی ضامن رضوی تمہیں بچاتے رہے" چوہدری دلاور نے کمرے میں ٹہلتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی "اب تم کو یوں ختم کیا جاسکتا ہے... یوں..."

اس نے چُٹکی بجائی اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

"پھر تمہیں تامل کیوں ہے' ڈر کس کا ہے؟ لحاظ کی بات تو تم سمجھتے بھی نہیں ہو" میں نے کہا۔

"بالکل ٹھیک سمجھے تم۔ ہیں جی' صرف ڈر ہے مجھے' لحاظ کوئی نہیں' مجھے معلوم ہے کہ تم آرام سے نہیں بیٹھو گے۔ تمہارے کیس چلیں گے تو تمہارے وکیل بھی پوری کوشش کریں گے مجھے خوار کرنے کی۔ تم بھی بیان دو گے اور مجھے عدالت میں کھینچو گے۔ تمہاری زبان تو میں پکڑنے سے رہا۔ ہیں جی' میں تو تم کو پکڑ سکتا ہوں' تمہارے ساتھ حوالات کے اندر یا جیل میں کون ہوگا مگر وہاں تم کو عقل سکھانے والے ضرور ہوں گے۔ اول تو عقل آجائے گی تم کو ورنہ دو تین سال تک تم نے مقابلہ کیا اور پاگل خانے نہ پہنچے تو پھر پھانسی کے تختے پر پہنچو گے۔ یہ تم مجھ سے آج لکھوا لو کہ آج کی تاریخ سے تین سال کے اندر اگر رابعہ تمہاری قبر پر پھول نہ چڑھا رہی ہو... خیر... یہ سب میں نہیں چاہتا۔ تم میرا سیاسی کیریئر خراب کرنے کی کوشش کرسکتے ہو۔ اس سے کہیں زیادہ خرابی تمہارے لیے اور تمہارے لواحقین کے لیے پیدا ہوگی۔ دیکھو نا' ایک محسن کی بہن بھی ہے۔ ابھی تک اسے کسی نے نہیں چھیڑا۔ مزے سے سیالکوٹ میں وقت گزار رہی ہے۔ اس کا شوہر پروفیسر ہے اور ایک بچہ بھی ہے ان کا۔"

"میں ان دھمکیوں سے ڈرنے والا نہیں ہوں دلاور!"

"دھمکی نہیں بابا' یہ عقل کی بات ہے۔ خود بھی آرام سے رہو' ہمیں بھی رہنے دو۔ دوسروں کی زندگی بھی حرام مت کرو" چوہدری دلاور بولا "سب کے گھر آباد رہیں' اس میں سب کا فائدہ ہے ورنہ سب کی تباہی۔ ابھی فیصلے کا وقت ہے۔ تم میرا راستہ مت روکو' میں تمہارا راستہ صاف کرا دیتا ہوں' بتاؤں کیسے' ہیں جی؟"

اس نے پردہ ہٹا کے آواز دی "رفیق! ادئے وہ سب اِدھر لا کے رکھ۔ تھانے والوں کی سوغات۔"

"یہ ہے تمہارا مستقبل" چوہدری دلاور نے کہا "تمہارے خلاف ہر کیس کی اصل فائل۔ اس میں ہر کیس کی پوری تفتیش کی رپورٹ ہے اور وہ سب کچھ ہے جس کی بنیاد پر تمہیں عدالت سے سزا ہوگی۔ کسی کیس میں چھ مہینے' تو کسی میں چھ سال۔ عمر قید' اور ہاں.... ایک کیس میں سزائے موت بھی ہوگی۔ لازمی.... تم اپیل کرنے جاؤ ہائی کورٹ تک اور سپریم کورٹ تک مگر تمہارا بچنا مشکل ہے۔ بے شک اپنے وکیل منظر صاحب سے پوچھ لینا یا رابعہ سے۔"

"میں رابعہ سے بات کرنا چاہتا ہوں" میں نے کہا۔

"کرلینا۔ یہ کوئی حوالات نہیں ہے۔ ہیں جی' تم جانا چاہتے ہو تو جاسکتے ہو مگر جاؤ گے کہاں؟" چوہدری دلاور بولا "آج رات یا کل کسی بھی وقت تمہیں لے جانے والے پھر لے جائیں گے۔"

رفیق نے کہا "سر! یہ اخبارات..."

"کیا ہے اخبارات میں۔ ابھی تک کیوں کھڑا ہے تو برخوردار...؟"

"وہ جی' یہی بتانے کے لیے..." رفیق نے کہا "بہت سی خبریں اور تصویریں ہیں۔"

"اچھا میں دیکھ لوں گا" چوہدری دلاور نے کہا اور ایک اخبار اٹھا لیا۔ "واہ جی واہ۔ بڑی اچھی تصویریں آئی ہیں۔ پولیس والے کھڑکی سے کود کے باہر نکل رہے ہیں... اور یہ" وہ ہنسا "گاڑی کی پھونک نکل گئی ہے۔ لو تم بھی دیکھو۔"

میں نے اخبار لے لیا "اس میں سب وہی تصویریں تھیں جو گزشتہ شب غالب نے اتاری تھیں۔"

"خبر بڑے مزے کی لگائی ہے تمہارے یار نے" دلاور بولا اور خبر پڑھنے لگا۔

"گزشتہ رات پولیس نے رابعہ قاری ایڈووکیٹ ہائی کورٹ کے گھر کا تالا توڑ کے وارنٹ کے بغیر تلاشی لی۔ مُبیّنہ طور پر اس کوٹھی میں جو پہلے چاندنی بیگم نامی... طوائف اور گولو پہلوان کی رہائش گاہ تھی' بہت عرصے سے خالی پڑی تھی۔ چاندنی بیگم کے قتل اور گولو پہلوان کی خودکشی کے بعد یہاں پولیس کی نگرانی میں جوئے کا اڈا چل رہا تھا۔ واضح رہے کہ رابعہ قاری ایڈووکیٹ کا یہ بنگلا کچھ عرصہ پہلے بم کے ایک دھماکے میں تباہ کردیا گیا تھا جس کے بعد ان کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس جگہ پر ناجائز قبضہ کرلیا گیا تھا اور کہا جاتا ہے کہ چاندنی بیگم کو شہر کے ایک مشہور بزنس مین نے نیا بنگلا بنوادیا تھا لیکن رابعہ قاری کی واپسی کے بعد قانونی مسائل کے خوف سے چاندنی بیگم کو قتل کردیا گیا جو خود کو اس کا مالک سمجھتی تھی اور اس قتل کو گولو پہلوان سے منسوب کردیا گیا جو درحقیقت چاندنی بیگم کا محافظ اور دلال تھا مگر خود کو اس کا شوہر بتاتا تھا۔ گولو پہلوان نے پُراسرار حالات میں خودکشی کرلی اور اس کے بعد یہ بنگلا کسی قانونی عذرداری کے بغیر رابعہ قاری کی ملکیت تسلیم کرلیا گیا تھا لیکن بوجوہ انہوں نے اس میں رہائش اختیار نہیں

کی تھی۔ پولیس کو یہاں جوئے کے اڈے کی موجودگی سے آگاہ کرنے والے مشہور بیرسٹر عبدالودود منظر نے گزشتہ شب اخبار والوں کی موجودگی میں بنگلے میں پولیس کو جُواریوں سے بھتّا وصول کرتے دیکھا' تاہم یہ پولیس والے جُواریوں کو بھگانے کے بعد خود بھی کھڑکی کے راستے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ چند چشم دید گواہوں نے بتایا کہ پولیس کی ایک گاڑی بہت عرصے سے بنگلے کے اندر موجود تھی جسے گزشتہ رات وہاں سے ہٹالیا گیا۔ بیرسٹر عبدالودود منظر اپنی مؤکلہ رابعہ قاری ایڈووکیٹ کی جانب سے پولیس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کا ارادہ رکھتے ہیں۔"

چوہدری دلاور نے دوسرا اخبار اٹھالیا۔ خبر سب میں ایک ہی تھی مگر غالب نے جو تصویریں اتاری تھیں وہ مختلف اخبارات میں الگ الگ شائع ہوئی تھیں۔ ایک میں پولیس والا کھڑکی سے باہر کود رہا تھا تو دوسری میں سب انسپکٹر۔ تیسری تصویر میں وہ گاڑی کے فلیٹ ہو جانے والے ٹائر کھول رہے تھے اور چوتھی میں لگاتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

"واہ جی واہ! کیا اسٹوری دی ہے اپنے مرزا غالب صاحب نے۔ سنا ہے وہ بھی کوئی اخبار نکال رہے ہیں۔ ہماری تو پھر خیر نہیں۔ ہیں جی اپنے سکندر صاحب!"

خلافِ توقع مجھے اخبار میں رابعہ کے اغوا کیے جانے کی کوئی خبر نہیں ملی۔ شاید اس نے غالب کو فون کر کے وضاحت کردی ہوگی کہ وہ اپنی مرضی سے دلاور کے ساتھ ایک اہم مسئلے پر بات کرنے گئی تھی۔ مجھے اس کی حرکت سے دُکھ بھی ہوا تھا اور اس پر غصہ بھی آیا تھا۔

"اب وقت تو ناشتے کا ہے اپنے سکندر صاحب لیکن تم نے تو قسم کھا رکھی ہے کہ حرام نہیں کھاؤ گے" وہ قہقہہ مار کے ہنسا "دشمن کے گھر میں اس کے ہاتھ سے یا اس کے ساتھ بیٹھ کے کھانا حرام ہی ہوا نا جی۔ خیر آپ کی مرضی.... یہ فائلیں آپ دیکھ لیں۔"

"میں نے دیکھ لی ہیں" میں نے کہا۔

"تو پھر سوچ لیں کل تک۔ یہ فائلیں میں تمہارے حوالے کرسکتا ہوں۔ اس گارنٹی کے ساتھ کہ پھر کوئی کسی کیس کا نام بھی لے تو جو چور کی سزا وہ میری۔ نام لے بھی کیسے' اس کا ڈُپلی کیٹ ریکارڈ تو ہے نہیں۔ رہے ثبوت اور گواہ۔ تو اپنے سکندر صاحب' ان کی کیا حیثیت ہے۔ جب چاہا خرید لیا' بدل دیا' ختم کردیا۔ سب بِکنے والی چیزیں ہیں۔ ہم پُرامن بقائے باہمی کا سمجھوتا کرلیں گے تو یہ سارے معاملے خود بخود ہی ختم ہو جائیں گے۔ تم بزنس کرنا چاہو بزنس کرنا۔ اللہ نے چاہا تو ہم سے فائدہ ہی پہنچے گا تمہیں.... اور باہر جانا ہے تو باہر جاؤ۔ سیاست ہمارا کام ہے' ہمیں کرنے دو۔"

اس نے پھر رفیق کو بلایا اور اسے تاکید کی کہ جہاں بھی میں چاہوں مجھے چھوڑ آئے۔ اس کی سفید فاکس ویگن میں روانہ ہوتے وقت میری ذہنی کیفیت بالکل بدلی ہوئی تھی۔ میرا تمام جذباتی جوش اور ولولہ سرد پڑنے لگا تھا اور زندگی کے تلخ حقائق کی تصویر دیکھ کے میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ کیا واقعی جدوجہد بے سود ہے؟ یہ معاشرہ' اس کی قدریں' قانون اور انصاف کے معیار' مذہبی اور اخلاقی اقدار سے بیگانگی سے پیدا ہونے والی منفی سوچ' داخلی سیاسی انتشار کے نتیجے میں ملنے والی عدم تحفظ اور بے یقینی کی کیفیت۔ ان سب مخالف عناصر کے ہوتے حالات کو صحیح نہج پر لانے کی کوشش کیسے بار آور ہو سکتی ہے؟ جب لاقانونیت ہی سب سے مؤثر قانون بن جائے اور خاندانی شرافت کے بجائے لوگ اپنی بدمعاشی اور طاقت پر ناز کرنے لگیں' ہر برائی کو ناگزیر سمجھتے ہوئے قبول کرلیں' ذاتی مفاد کی خودغرضانہ جنگ میں رشتوں کے احترام کو بھول جائیں' محبِ وطن پر غدار کا لیبل لگادیا جائے اور چور ہو جائے کوتوال تو کوئی کیا کرسکتا ہے؟ ایک جنگ ہم نے اس لیے ہار دی کہ ہمارے مقابل سُپرپاورز تھیں مگر اس سیاسی یا فوجی شکست کے ذمے دار خود ہم بھی تھے۔ ہم نے نفرتوں کے بیج بوئے' سیاسی اختلافات کو ہوا دے کر دشمنی میں ڈھالا۔ اس کا تجزیہ آنے والے وقت کا مؤرخ کرے گا مگر اب اس باقی ماندہ پاکستان میں جو کچھ ہو رہا ہے' اس کا ذمّے دار کون ہے؟ یہاں تو ہم کسی دشمنی کے خلاف برسرِپیکار نہیں۔ یہاں تو ایک زوال پذیر معاشرے کا سیاسی' اخلاقی اور مذہبی ڈھانچہ ہے جس کو ہم سب مل کے برباد کررہے ہیں۔ بُرائیوں کی بیخ کنی کرنے کے بجائے ان کی جڑیں مضبوط کرنے والے عوامل کی حوصلہ افزائی کررہے ہیں۔ ہم خود اپنے مستقبل کی بنیادوں کو کھوکھلا کررہے ہیں اور اپنے پاؤں پر خود ہی کلہاڑی مار رہے ہیں۔ ہم نے منافقت کو مصلحت کوشی کا نام دے دیا ہے اور برائی کو برائی کہنا بھی چھوڑ دیا ہے۔

جب گاڑی رکی تو رفیق نے کہا "خدا حافظ سر۔"

میں نے سرہلایا "رفیق! نہ جانے کیوں تم جیسے شخص کو دلاور کے ساتھ دیکھ کر مجھے افسوس ہوتا ہے۔ خیر' خدا حافظ۔"

رفیق نے مجھے یوسف کے گھر کے سامنے اتارا تھا۔ میرے اندر داخل ہوتے ہی ہڑبونگ مچ گئی۔ یوسف کی بیوی نے چیخ ماری "سکندر!" یوسف ایک موزا پہنتا ہوا دوڑا۔ ایک کمرے سے غالب آنکھیں ملتا برآمد ہوا اور دوسرے سے نازو کا پریشان حال چہرہ۔

"لعنت ہے تم پر! تم سو رہے تھے بے غم ہو کے؟"

غالب نے شرمندگی سے کہا "میں ابھی تو آیا تھا' دو گھنٹے پہلے مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ تم خیریت سے ہو۔"

"یہ معلوم تھا کہ میں کہاں ہوں؟" میں نے متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔

"تمہیں ایک سفید فاکس ویگن لے گئی تھی جسے چوہدری دلاور کا سیکریٹری رفیق چلا رہا تھا۔" غالب نے کہا "ایک رپورٹر نے تھانے سے کنفرم کیا تھا۔"

"پھر تو تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا...."

"ہاں۔ اس پان والے کے ساتھ جو کچھ ہوا' افسوس ناک ہے۔"

"صرف افسوس ناک! اسے تشدد سے ہلاک کردیا پولیس نے اور اس کی لاوارث لاش ملتان روڈ پر پھینک دی۔"

"یہ ہوتا ہے تھانوں میں یار۔ یوسف اس کیس کو اٹھائے گا اور ہم بھی۔ تم بتاؤ...."

"تم وہاں گئے کیوں تھے؟" نازو ایک دم پھٹ پڑی "اور گئے تھے تو دخل در معقولات کی کیا ضرورت تھی۔ مجھے رابعہ نے بتادیا ہے کہ تم پر دورہ پڑ گیا تھا۔"

"رابعہ کہاں ہے؟" میں نے کہا "مجھے بھی بہت کچھ پوچھنا ہے اس سے۔ مجھے بتائے بغیر وہ کیسے دلاور کے ساتھ چلی گئی تھی؟"

"اسے کچھ مت کہو۔ وہ مجبور تھی۔ اسے چوہدری دلاور زبردستی اپنے ساتھ لے گیا تھا" نازو نے کہا۔

"زبردستی! اس حرام زادے نے جھوٹ بولا مجھ سے...."

"چوہدری دلاور نے اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی۔ اس نے رابعہ کو دو ٹوک الفاظ میں بتادیا کہ اس کے عزائم کیا ہیں۔ وہ کیا کرسکتا ہے اور کیا کرنا چاہتا ہے۔"

"کیا رابعہ واپس نہیں آئی تھی؟"

"نہیں۔ اس نے فون کیا تھا منظر کے گھر سے اور اس نے ہمیں بتادیا تھا کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ چوہدری دلاور نے جو کچھ اسے بتایا تھا' وہ سکندر کو بھی سمجھائے گا۔ تم چوہدری دلاور کے ساتھ تھے۔ اس کے گھر میں؟" غالب بولا۔

میں نے سرہلایا "میں اسی کے ساتھ تھا لیکن اس کے گھر میں نہیں تھا۔ وہ گھر کسی وزیر کا ہے غالباً۔"

"کس وزیر کا؟" نازو بولی۔

"میں نے نام اور نمبر نہیں دیکھا۔ وہاں تو سب ایک جیسی کوٹھیاں ہیں۔"

"رابعہ باجی نے تمہاری سب فائلیں دیکھی تھیں اور وہ بہت مایوس تھیں" یوسف نے کہا "ہم سب رات بھر جاگتے رہے۔ میں نے بھی رابعہ باجی سے بات کی تھی اور پھر منظر صاحب سے۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا "میرا خیال ہے کہ مجھے وہیں جا کے رابعہ سے بات کرلینی چاہیے۔"

"ناشتا تو کرلو" یوسف کی بیوی نے شور مچایا۔

"وہیں کرلوں گا" میں نے کہا۔

"ایک خبر اور بھی ہے تمہارے لیے" غالب نے افسردگی سے کہا "اکبر خان نے اخبار نکالنے کا ارادہ بدل دیا ہے۔"

"کیا مطلب!"

"مطلب صاف ظاہر ہے۔ میں پھر بے روزگار ہوں۔ وہ قلم میرے ہاتھ سے چھین لیا گیا ہے جو میری طاقت تھا۔" غالب نے کہا۔ "شاعر کے لیے اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔ تو بھیّا اور بھی دھندے ہیں دنیا میں صحافت کے سوا۔ میں اور تم مل کے پولٹری فارم کھولیں گے یا دودھ دہی کی دُکان۔ نازو دہی بھلے کی ریڑھی کے حق میں ہے۔ چڑیا گھر کے دروازے پر اچھی سیل ہوگی۔" غالب نے تلخی سے کہا۔

نازو کی شوخی بھی رخصت ہو چکی تھی "ان کا ایسا ہی موڈ ہو رہا ہے رات سے۔ حالانکہ مایوسی کی کوئی بات نہیں۔ دوسرے اخبار بھی ہیں اور ہم خود بھی اخبار نکال سکتے ہیں۔"

"بے وقوف لڑکی! اخبار نکالنے کو تم نے کیا سمجھ رکھا ہے' دہی میں سے مکھن نکالنا...."

"اوکے۔ یہ سب ہم اس وقت سوچیں گے جب مل کے بیٹھیں گے۔ تم رابعہ کو فون کردو۔ منظر کورٹ جاتے ہوئے اسے اُدھر چھوڑ جائے۔"

نازو اور غالب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا "شاید وہ نہ آئے۔ معلوم نہیں اس کے ارادے کیا ہیں۔ وہ کسی سے بات کرنا نہیں چاہتی۔ تم جا کے بات کرو اس سے۔"

میرے لیے یہ بات ناقابلِ یقین تھی "وہ تم سے بات نہیں کرنا چاہتی؟"

"ہاں۔ منظر نے یہی کہا تھا" نازو نے اداس لہجے میں کہا "ہم سے ایسا کون سا قصور ہوا ہے آخر؟"

"تم بھی جانے سے پہلے فون کرلو" غالب نے دبے دبے الفاظ میں کہا "رابعہ کا رویّہ بالکل ناقابلِ فہم ہے۔"

"میں دماغ درست کردوں گا اس کا" میں نے فون اٹھا کے منظر کا نمبر ملانا شروع کیا۔

ریسیور منظر کی بیوی نے اٹھایا "رابعہ تو چلی گئی۔"

"چلی گئی.... کہاں؟" میں نے برہمی سے کہا۔

"کورٹ۔ منظر کے ساتھ۔ کہہ گئی تھی کہ واپسی میں اپنے آفس جائے گی" وہ بولی "آخر یہ معاملہ کیا ہے بھیّا۔ کچھ تیور ٹھیک نہیں لگ رہے مجھے اس کے۔ مجھ سے تو کوئی بات نہیں کی اس نے مگر مجھے پتا چلا ہے کہ اس نے اپنا کام پھر شروع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ خیر کام کرنا تو بری بات نہیں۔ اچھا ہے سب خود سنبھالے' ان پر تھا سارا بوجھ۔ لیکن بھیّا یہ الگ رہنے والی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ دنیا کیا کہے گی۔ اتنی بڑی کوٹھی میں رہ سکتی ہے بھلا جوان عورت۔ وکیل ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

میں بھونچکا رہ گیا "وہ... اپنی کوٹھی میں رہے گی؟"

"ہاں بھیّا۔ ابھی تو شاید دو چار دن یہاں گزارے گی۔ کوٹھی میں سامان نہیں ہے نا۔ سب سامان لے گی پھر جائے گی' تم سے ناراض ہے کیا؟ ایسی کیا بات ہو گئی ہے آخر؟ مجھے بھی تو پتا چلے" حسبِ عادت اس کی زبان کی قینچی چل پڑی تھی اور رُکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

"مجھے کچھ معلوم ہو گا تو ضرور بتاؤں گا" میں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

غالب اور نازو میری گفتگو سن کے سب سمجھ چکے تھے۔ "یہ سب کیا ہے آخر؟ رابعہ کا دماغ کیوں اتنا خراب ہو رہا ہے؟" نازو نے کہا۔

"اس سے کورٹ میں ملنا تو مناسب نہیں۔ دفتر میں ملاقات ہو گی دوپہر دو بجے کے بعد" میں نے مسکراتے ہوئے اپنے تفکرات اور اندیشوں کو چھپانے کی بے سود کوشش کی "فی الحال تو مجھے ناشتا کر کے سو جانا چاہیے۔"

یوسف کے کورٹ چلے جانے کے بعد میں بستر پر لیٹا کھلی آنکھوں سے چھت کو گھورتا رہا اور وقت کا ایک ایک لمحہ شمار کرتا رہا۔ میرے خوابوں کے فلک بوس محل زلزلے کی زد میں تھے۔ میرے خیالوں میں بگولے رقص کر رہے تھے۔ اب مجھے یوں لگتا تھا جیسے اس ایک رات میں میرا سب کچھ لٹ گیا ہے۔ مایوسی کے اندھیرے ہر طرف سے مجھے گھیر لیتے تھے تو میں امید کی کسی روشنی کے لیے بھاگتا تھا۔ کبھی ایک طرف تو کبھی دوسری طرف۔ میں خود کو یقین دلانا چاہتا تھا کہ رابعہ بدلی نہیں ہے، صرف روٹھی ہے۔ میں اسے منا سکتا ہوں، سمجھا سکتا ہوں، اس کی مان سکتا ہوں اور ہم سب مل کے اس بحران کا کوئی حل تلاش کر سکتے ہیں۔ ابھی ہماری قوت منتشر نہیں ہوئی ہے۔ ہمارے درمیان خلوص کے رشتے پہلے جیسے مضبوط ہیں اور ہم آج بھی ایم آر ایس کے پرچم تلے ایک متحدہ قوت ہیں۔

میں دوپہر تک کروٹیں بدلتا رہا اور گزشتہ رات کے واقعات بار بار میرے تصور کو جھنجوڑتے رہے۔ میں چوہدری ولاور سے ہونے والی گفتگو کے ایک ایک لفظ پر غور کرتا رہا اور باعزت طور پر ان مسائل سے نبرد آزما رہنے کے امکانات تلاش کرتا رہا۔ دو بار میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا تو مجھے یوں لگا جیسے کچھ لوگ میری نگرانی پر مامور ہیں پھر میں ہر آدھے گھنٹے بعد جھانکتا رہا اور میرے شبہات کی تصدیق ہو گئی مگر میں نے یوسف کی بیوی کو کچھ نہیں بتایا جو مجھے دو بار چائے پلانے کے علاوہ بہت تسلی بھی دے چکی تھی کہ اس کے پاپا سب کی ایسی تیسی کر دیں گے۔ وہ بڑی توپ چیز ہیں۔

مجھے کسی توپ کی نہیں رابعہ کی ضرورت تھی۔ میں اس سے بات کرنا چاہتا تھا کہ یہ سب کیا ہے؟ میں یہ کیا سن رہا ہوں اور ایسا کیوں ہے؟ اس سے بات کیے بغیر میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا تھا۔ دو بجے میں نے یوسف کی بیوی کے بے حد اصرار پر کھانا زہر مار کیا اور اس کی گاڑی لے کر روانہ ہو گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ رابعہ کا پرانا آفس اب بھی وہیں ہے۔

مجھے کونے پر "رینکن اینڈ کمپنی" کے سامنے گاڑی کھڑی کرنے کی جگہ مل گئی۔ وہاں سے اوپر رابعہ کے آفس جانے والا زینہ چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ میں اپنے جذبات کو کنٹرول میں رکھنے کی کوشش کرتا ہوا انتہائی پُرسکون انداز میں اوپر گیا تو خلافِ توقع اس کے آفس کے باہر مسلح محافظ کو دیکھ کر حیران ہوا۔ میں اندر جانے لگا تو اس نے میرا راستہ روک لیا۔

"کدھر جاتا ہے؟"

میں نے کہا "تم مجھے نہیں جانتے؟ میرا نام سکندر بخت ہے۔ رابعہ سے ملنا ہے مجھے؟"

"کیا کام ہے، کوئی کیس ہے؟"

میں نے اسے دھکا دے کر ایک طرف کیا اور اندر داخل ہو گیا۔ کالے کوٹ میں ایک وکیل نے میرا استقبال کیا۔ "سر پلیز!" لیکن میں اسے بھی ایک طرف ہٹا کے سیدھا رابعہ کے کمرے کی طرف بڑھا۔ ماتحت وکیل اور چوکیدار میرے پیچھے لپکے اور میرے ساتھ ہی رابعہ کے کمرے میں داخل ہوئے۔

رابعہ گھومنے والی کرسی پر ساکت بیٹھی تھی۔ اسے میری آمد کا علم ہو چکا تھا اور وہ پہلے سے طے کر چکی تھی کہ اسے کیا کرنا ہے۔

"تم کو اس طرح یہاں نہیں آنا چاہیے تھا" رابعہ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"تم میری بے عزتی کر رہی ہو رابعہ۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ یہ کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ؟" میں نے برہمی سے کہا "میں تم سے بات کرنے آیا ہوں اور بات کیے بغیر نہیں جاؤں گا۔"

رابعہ نے چوکیدار کی طرف دیکھا۔ "تمہیں باہر کس لیے کھڑا کیا گیا تھا؟"

"وہ جی بیگم صاب! ہم اس کو بولا..."

"میں نے بھی روکا تھا میڈم" وکیل نے گھبراہٹ میں کہا۔

"تم لوگ جاؤ" میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا "مجھے کچھ پرائیویٹ باتیں کرنی ہیں رابعہ سے۔"

"مسٹر سکندر بخت! یہ میرا آفس ہے، گھر نہیں" رابعہ نے اجنبی لہجے میں کہا۔

مجھے اپنے کانوں پر یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ معلوم نہیں کیسے اس وقت میں نے اپنے اشتعال کے تباہ کن سیلِ بے عناں کو روک لیا۔ وہ میری چھٹی حس تھی یا صورت حالات کو سمجھنے کی صلاحیت جس نے مجھے احساس دلا دیا کہ معاملات حد سے زیادہ بگڑ بھی سکتے ہیں۔ اگر میں نے ہنگامہ کیا تو اس سے رابعہ کی پوزیشن بھی خراب ہو گی اور میری بھی۔ مجھے یوں لگا جیسے رابعہ چوکیدار کو اشارہ کر دے گی کہ مجھے دھکے دے کر نکال دیا جائے۔ میں اس جیسے دس چوکیداروں کی ایسی تیسی کر سکتا تھا مگر یہ رابعہ کا آفس میں پہلا دن تھا اور اس کی گُڈ وِل کو تباہ کر کے مزید خرابی کے اسباب پیدا کرنا کوئی عقلمندی نہ ہوتی۔ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ کہیں وہ فون کر کے پولیس کو طلب نہ کر لے۔ اس خیال کا میرے ذہن میں آنا ہی مجھے بہت عجیب لگا۔ رابعہ بھلا ایسا کیسے کر سکتی ہے؟

میں نے اپنے چہرے کے تاثرات پر قابو پا کے کہا "او کے

میں جا رہا ہوں۔ آفس میں واقعی کام کی بات کرنی چاہیے۔ رات کو گھر پر تفصیل سے بات ہو گی۔"

رابعہ نے کچھ نہیں کہا۔ اس نے اقرار میں سر ہلایا نہ انکار میں۔ وہ جذبات سے عاری سپاٹ چہرہ لیے بیٹھی رہی۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ خود پر جبر کر رہی ہے اور اس کے لیے میرے ساتھ بے اعتنائی کا یہ مظاہرہ کتنا دشوار ہو گا۔ اس کے باوجود ایک سوال میرے ذہن میں کانٹے کی طرح چبھ رہا تھا۔ آخر رابعہ نے یہ رویّہ کیوں اختیار کیا؟ کیا ضرورت تھی اسے میرے ساتھ یہ توہین آمیز برتاؤ کرنے کی؟ میں پہلے بھی تو اس کے آفس میں آتا رہا ہوں۔

میں نیچے اترا اور اپنی گاڑی کی طرف چلنے لگا۔ میرے وجود میں چھپا ہوا آتش فشاں پھٹنے کے قریب تھا۔ میرا ذہن ماؤف ہو رہا تھا اور مجھے ڈر تھا کہ اس کیفیت میں گاڑی چلاتے ہوئے کہیں مجھ سے حادثہ نہ ہو جائے۔ اچانک میں نے انہی لوگوں کو دیکھا جو میری نگرانی پر مامور تھے۔ وہ صورت اور حلیے سے خفیہ پولیس کے آدمی نظر آتے تھے لیکن بالکل نمایاں تھے۔

میں اپنی گاڑی کی طرف بڑھا ہی تھا کہ کسی نے مجھے آواز دی اور میں نے پلٹ کے دیکھا تو رفیق کا مسکراتا ہوا چہرہ میرے سامنے آگیا۔

"تم۔ تم بھی پیچھا کر رہے ہو میرا؟ یو باسٹرڈ!"

وہ بوکھلا کے پیچھے ہٹ گیا "سر! یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ! یہ ٹھیک ہے کہ میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا۔"

"تم میرا انتظار کر رہے تھے؟ کیوں.... کس نے بتایا تمہیں کہ میں اس وقت یہاں ملوں گا؟" میں دہاڑ کے بولا۔

"میں نے.... فون کر کے معلوم کیا تھا۔"

"کیوں؟ اس حرام زادے تمہارے باس نے تو مجھے مہلت دی تھی..."

"آپ غلط سمجھے سر۔ انہوں نے نہیں بھیجا تھا۔ کیا آپ ایک منٹ کے لیے ادھر تشریف لائیں گے؟"

میں نے اُدھر دیکھا جہاں سیاہ رنگ کے سیاہ شیشوں والی مرسیڈیز کھڑی تھی۔ "آئی ایم سوری رفیق! تم نے غلط سمجھا مجھے۔ تم جیسے دس مل کے بھی مجھے اغوا نہیں کر سکتے۔ ہمت ہے تو مقابلے پر آ کے دیکھ لو۔"

رفیق نے افسوس سے سر ہلایا "میں بھلا کیسے مقابلہ کر سکتا ہوں آپ کا اور اغوا کا خیال کیسے آیا آپ کو؟"

میں نے کہا "تم گدھا سمجھتے ہو مجھے۔ میں صبح سے دیکھ رہا ہوں کہ یہ منکر نکیر میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔"

"لعنت بھیج دیں ان پر۔ ان کا تو کام ہے افسروں کے حکم کی تعمیل کرنا۔ میں انہیں منع کر دوں گا۔"

"تم!" میں نے حقارت سے کہا "تم افسر ہو ان کے؟ تمہاری بات مانیں گے یہ لوگ؟ ناؤ گیٹ لاسٹ۔"

"پلیز سر!" رفیق نے جلدی سے کہا "ایک خاتون آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔ آپ کا فائدہ ہے..."

"فائدہ! مائی فُٹ۔ تم میرے فائدے کی بات آخر کیوں کرتے ہو؟ میں تو تمہیں اپنا دشمن سمجھتا ہوں۔" میں بھڑک اٹھا۔

"آپ جو چاہے سمجھیں۔ ایک منٹ کے لیے کسی معزز خاتون سے ملنے میں کوئی نقصان بھی نہیں ہو گا۔"

اسی وقت کھڑکی کا شیشہ خاموشی سے نیچے سرکا اور ایک ہاتھ باہر آیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ہاتھ بہت خوب صورت تھا۔ گلابی اور سنہرا، نرم و نازک اور بے حد متناسب۔ حسنِ تخلیق کا لاجواب نمونہ۔ کوئی مجھے ہوس پرستی کا الزام نہیں دے سکتا۔ میں حسن پرستی میں بھی اخلاقی حدود سے تجاوز کا قائل نہیں مگر اس وقت میں اس ہاتھ کے اشارے کو نظر انداز نہیں کر سکا۔ صرف اپنی اُلجھن رفع کرنے کے لیے کہ آخر مجھ سے ملاقات کی خواہش مند وہ معزز خاتون کون ہے اور کیا چاہتی ہے؟ میں نے اس سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں یہ بھی ثابت کرنا چاہتا تھا کہ میں ڈرتا نہیں۔

میرے قریب پہنچتے ہی گاڑی کا شیشہ پورا نیچے اتر گیا اور میں نے خاتون ڈرائیور کا چہرہ دیکھا۔ اگر میں یہ کہوں کہ اس پہلی جھلک نے مجھ پر جادو کر دیا یا میرے حواس معطل کر دیے۔ وہ برقِ طور تھی جس نے مجھے خاکستر کر دیا یا بجلی تھی جو میرے دل پر گری تو یہ شاعرانہ بات ہو گی۔ حقیقت یہ ہے کہ میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ پچیس سال کی تھی مگر یہ ہو سکتا تھا کہ اس کی اصل عمر دس سال زیادہ ہو یا پانچ سال کم۔ اس کے چہرے کی جلد میں صبحِ بہار کے اوّلیں شگوفوں کی تازگی تھی اور وہ رنگت تھی کہ لگتا تھا اس میں گلاب، مرمر اور شہد کو ملانے والے فنکار ہاتھ تخلیقِ حسن میں رنگوں کے تناسب کو سمجھتے تھے۔ اس کے بال تراشیدہ تھے اور اس کے شانوں پر سیاہ ریشم کی طرح بکھر رہے تھے، پھسل رہے تھے اور جھول رہے تھے۔ اس کی آنکھیں بھی اتنی ہی کالی تھیں اور اتنی حیران کہ دیکھنے والا مجسم حیرت ہو جائے۔

اس نے میری محویت کو بھی تاڑ لیا اور اپنے حسن کی قوتِ تسخیر کا بھی بخوبی اندازہ کر لیا۔ یہ صفت عورت کی فطرت میں چھٹی حس کی طرح کام کرتی ہیں۔ وہ دیکھے بغیر ہی دیکھ لیتی ہے کہ اسے کون دیکھ رہا ہے، کب سے دیکھ رہا ہے اور کیوں دیکھ رہا ہے؟ وہ پوچھے بغیر پوچھ لیتی ہے کہ پوچھنے والا پوچھے بغیر کیا پوچھ رہا ہے اور پھر جواب دیے بغیر جواب بھی دے سکتی ہے۔

اس نے کہا "سکندر بخت صاحب! مجھے آپ سے ایک کام تھا۔"

میں چونکا اور مجھے اپنی نامعقولیت کا احساس ہوا۔ "جی.... مجھ سے.... مگر میں تو آپ کو نہیں جانتا... کیا ہم پہلے ملے ہیں؟"

"جی ہاں۔" اس نے ایک ادائے ناز سے بالوں کو پیچھے کیا۔

"کہاں.... اور کب؟"

"ابھی دو منٹ پہلے.... یہاں" وہ شوخی سے مسکرائی۔

میں سنبھل گیا۔ اس عورت کے عزائم خطرناک معلوم ہوتے تھے۔ "آپ مجھے کیسے جانتی ہیں؟"

"آپ کو بھلا کون نہیں جانتا" وہ مسکراتی رہی "نیچے سے اوپر تک۔ بیچ میں کہیں پولیس بھی آتی ہے۔"

میں نے کہا "بیچ میں رفیق کی موجودگی مجھے شکوک میں مبتلا کرتی ہے۔"

"رفیق میرا خاص آدمی ہے جسے میں نے چوہدری دلاور کے پیچھے سائے کی طرح لگادیا ہے" وہ ہنسی۔

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ نے ایسا کیوں کیا؟"

"آپ اس سے زیادہ بھی پوچھ سکتے ہیں لیکن یہاں کھڑے کھڑے نہیں۔ ادھر آکے بیٹھیے میرے ساتھ" اس نے تحکمانہ ادائے دلبری سے کہا۔

"معاف کیجئے' میں اپنی گاڑی میں ہوں۔ ویسے بھی کسی جان پہچان کے بغیر میں کسی کے ساتھ جاتے ہوئے ڈرتا ہوں۔"

"ابھی تو تعارف بھی یک طرفہ ہے۔ میں آپ کو جانتی ہوں لیکن آپ مجھے نہیں جانتے۔ جان پہچان تو ملاقات کے بعد ہی ہوتی ہے سر۔ رہی بات خطرے کی' تو سکندرِ اعظم کا ایک عورت سے ڈرنا میری سمجھ میں نہیں آتا۔"

"عورت سے بڑی طاقت تو جوہری طاقت بھی نہیں اور پھر کیا معلوم آپ کس مقصد کے تحت' کس کی طرف سے آئی ہیں یا بھیجی گئی ہیں۔ آپ نے مجھے ابھی تک کام کی نوعیت نہیں بتائی۔"

"میں سب بتادوں گی۔ یقین کیجئے میں آپ کو اغوا کرکے نہیں لے جاؤں گی۔ ہم "لارڈز" میں بیٹھ کے چائے بھی پی سکتے ہیں' بیٹھیے پلیز!"

میں نے نفی میں سرہلایا "میرے پاس اپنی گاڑی ہے۔"

اس نے میری گاڑی کی طرف دیکھا "اس کے تو سارے ٹائر فلیٹ ہیں۔"

میں اس کی چالاکی پر حیران رہ گیا "گویا پکا انتظام آپ نے پہلے ہی کرلیا تھا۔ مس...."

"غزالہ۔ میں چوہدری دلاور کی بہن ہوں" اس نے کہا۔

اس کے یہ الفاظ میری سماعت سے بم کا دھماکا بن کے ٹکرائے۔ میں نے اسے نظر جما کے دیکھا "بہن.... چوہدری دلاور کی بہن!"

"جی.... اب آپ تشریف رکھیں تو میں کچھ اور فرماؤں۔ ایسے ہکا بکا کھڑے رہیں گے سڑک پر؟" وہ بولی۔

میں نے کہا "کیا ثبوت ہے.... کہ یہ سچ ہے؟"

"میں ثبوت بھی فراہم کردوں گی سکندر صاحب۔ اتنا بڑا جھوٹ کون بول سکتا ہے آپ سے" اس نے کہا "میں اس کی سگی بہن نہیں ہوں"

"دیکھئے میں کسی چکر میں نہیں پڑنا چاہتا۔ رفیق آپ کا آدمی ہے مگر وہ سیکریٹری ہے چوہدری دلاور کا۔ میں چوہدری دلاور کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ اتنا بے وقوف نہیں ہے کہ اسے کوئی دھوکا دے سکے۔ آپ کہتی ہیں کہ رفیق آپ کا خاص آدمی ہے۔ وہ بیک وقت آپ کے ساتھ بھی ہے اور دلاور کے ساتھ بھی۔ یہ میری سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے مس غزالہ' مجھے یہ چوہدری دلاور کا نیا ڈراما لگتا ہے۔"

"سکندر صاحب! میرا خیال تھا کہ ہم ایک دوسرے کے کام آسکتے ہیں" اس نے مایوسی سے کہا "آپ کو اتنا بزدل نہیں سمجھتی تھی میں۔ آپ چاہیں تو تلاشی لے کر دیکھ سکتے ہیں کہ میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے اور نہ میری کار کی ڈکی میں کوئی آدمی چھپا ہوا ہے۔"

"آئی ایم سوری مس غزالہ۔ آج اچانک ساری دنیا میرے پیچھے لگ گئی ہے۔ دو خفیہ پولیس کے احمق ہیں جن کے لیے خود کو خفیہ رکھنا ہی سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ رفیق نہ جانے کیسے یہاں آگیا اور اب آپ مُصر ہیں کہ میں آپ کے ساتھ چلوں۔"

"مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے سکندر صاحب اور یقین کیجئے میں آپ کی بھی مدد کرسکتی ہوں۔ چوہدری دلاور میرا بھائی ضرور ہے ایک رشتے سے لیکن یہ خون کا رشتہ درحقیقت دشمنی سے بدتر ہے۔ بھائی بہن سے زیادہ مقدس کوئی رشتہ ہے تو ماں بیٹے کا۔ لیکن....."

اچانک میں نے اس عورت کے بارے میں جاننے کا فیصلہ کرلیا۔ اگر وہ بھی شکاری بن کے آئی تھی یا کسی شکاری نے اس کے حسن کو دام بنایا تھا تو میرے لیے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ میں محتاط ہوگیا تھا اور اب اس معاملے کی حقیقت کو سمجھنا ضروری تھا۔ میرا تجسس بیدار ہوچکا تھا اور موجودہ صورت حالات میں ایک موہوم سی امید کا سہارا ابھی آزمانے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

"آپ کی گاڑی رفیق لے آئے گا" وہ بولی "اس میں تو کچھ وقت لگے گا۔ ہوا بھری جائے گی سب ٹائرز میں۔"

"آپ انتظار کرسکتی ہیں؟"

"لیکن آپ اعتماد نہیں کرسکتے؟" اس نے طنز سے کہا "اپنے آپ پر بھی۔"

میں نے کہا "اوکے۔ مس غزالہ! چلیے۔"

جب میں گھوم کے اس کی گاڑی میں بیٹھنے کے لیے دوسری طرف پہنچا تو میری نگاہ بلا ارادہ اوپر چلی گئی۔ اپنے آفس کے باہر گیلری میں رابعہ نہ جانے کب سے کھڑی تھی۔ اس کی نظریں مجھ پر تھیں اور مجھے ایسا لگا جیسے وہ رو رہی ہے.... میں نے چاہا کہ دروازہ کھول کے اتر جاؤں مگر اس وقت تک مرسیڈیز آگے بڑھ چکی تھی۔

میرے ذہن میں بے یقینی' خوف اور انتشار کی آندھی چل رہی تھی جس میں میرا وجود کسی تنکے کی طرح بھٹک رہا تھا۔ بے رحم خیالوں کی دھول نے مجھے اندھا کردیا تھا اور میرے گرد مایوسی کا دل شکن اندھیرا محیط تھا۔ میں اس بچّے کی طرح محسوس کررہا تھا جو اجنبی شہر کی بھیڑ میں کھوجائے اور سہم کر کسی بھی اجنبی کی انگلی پکڑلے' یہ سوچے اور جانے بغیر کہ وہ اجنبی اسے دوبارہ زندگی کے گم کردہ رشتوں کی منزل تک پہنچائے گا یا اس جنگل میں چھوڑ آئے گا جہاں سے جرم اور گناہ کے تاریک راستوں کا سفر شروع ہوتا ہے۔

چوہدری دلاور کی دھمکی نے اور رابعہ کی بے رحمی نے میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو اس حد تک مفلوج کردیا تھا کہ میں آسانی سے رفیق کی دوستانہ سازش اور غزالہ کی سحر آفریں شخصیت' دردِ آشنائی کے دعوے اور تعاون کی پیش کش کے خلاف مزاحمت نہ کرسکا۔ شاید یہ ایک منفی ردِّعمل تھا۔ اس شخص کی طرح جو غصے کے ساتھ بے بسی اور فرسٹریشن کے ساتھ مایوسی کا شکار ہوکے اپنے تفکرات کو جامِ شراب یا کسی بھی نشے کی کیفیت میں بھول کے سکون اور تقویت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ فرار کسی مسئلے کا حل نہیں ہے' جھوٹے' کمزور سہاروں پر انحصار کی عادت بالآخر آدمی کو اعتماد سے محروم کردیتی ہے۔

غزالہ کی ہپناٹائز کردینے والی نرم آواز میرے کانوں تک یوں آئی جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم۔ جیسے نیند کی ترسی ہوئی بوجھل آنکھوں پر ماما کے رس میں ڈوبی ہوئی لوری کے سُر اُتریں۔ سوکھی کھیتی پر برکھارُت کا سندیسہ لانے والی پھوار گرے۔

"آخر اتنے پریشان کیوں بیٹھے ہو۔ ٹیک اٹ ایزی۔"

میں نے چونک کر اسے دیکھا "یہ اچھا نہیں کیا تم نے.... میرا مطلب ہے میں نے...."

وہ مسکرائی اور اس نے آہستہ سے میرے شانے پر ایک ہاتھ رکھا۔ اس کے غیر معمولی لمبے' گھنے کالے بال اس کی پشت پر ایک ریشمی ڈھیر کی طرح پھیلے ہوئے تھے اور ہوا کے ساتھ اپنی خوشبو اُڑا رہے تھے۔ اس کی ٹھوڑی سے گردن کے زیریں حصے تک ایک قوس سی بنتی تھی۔ اجلی' بے داغ اور نرم و نازک جلد پر پھسلنے والی نظر بے اختیار بلاؤز کے چاک گریبان تک پہنچ کے تشنہ رہ جاتی تھی۔

خشک لبوں پر زبان پھیر کے میں نے ایک لمبی سانس لی اور خود کو سیٹ کی پشت پر گرادیا۔ ابھی تک میں سیٹ کے کنارے پر یوں بیٹھا تھا جیسے موقع پاتے ہی دروازہ کھول کے باہر کود جاؤں گا۔ میں واقعی بہت TENSE تھا اور بالکل نامعلوم طور پر احساسِ جرم کی ندامت میں مبتلا ہونے لگا تھا۔ حالانکہ اس کی وجہ کوئی نہیں تھی۔ بس مجھے احساس تھا کہ اچانک سب کچھ غلط ہونے لگا ہے اور ہربار کسی غلطی کا سلسلہ تقدیر کی ستم ظریفی سے شروع ہوتا ہے تو میری تدبیر کی کوتاہ اندیشی سے منسوب ہوجاتا ہے۔ چوہدری دلاور اور پیڈرو کا رابعہ کے گھر کے دروازے پر آجانا کوئی واقعہ بھی نہ تھا مگر تقدیر نے عین اسی وقت مجھے اور رابعہ کو وہاں پہنچا کے اسے ایک ناخوش گوار اتفاق بنادیا اور میرے جذباتی ردِّعمل نے رہی سہی کسر پوری کرکے اسے بدبختی میں بدل دیا۔ اسی طرح رابعہ کا مجھ سے یا میرے کسی غلط فیصلے سے اختلاف کرتے ہوئے خفا ہوجانا بھی کوئی واقعہ نہیں تھا۔ ایسا تو محبت میں ہوتا ہے اور چاہنے والے روٹھنے والوں کو منالیتے ہیں۔ میں اس کے آفس نہ جاتا تو کچھ نہ ہوتا۔ منظر کے گھر میں اسے سمجھا کے' اس سے لڑ کے' ہنسا کے یا رُلا کے' جھانپڑ رسید کرکے یا چوم کے منانا کیا مشکل تھا مگر تقدیر نے پھر ایک سازش کا جال پھیلایا اور میں اس دامِ ہم رنگِ زمیں کو دیکھے بغیر غزالہ کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔

غصہ مجھے اپنے آپ پر آرہا تھا۔ مجھ پر لازم تھا کہ میں رفیق کو لات مار کے چلتا کرتا اور غزالہ سے دوٹوک لہجے میں کہہ دیتا کہ تم واقعی دلاور کی سوتیلی بہن ہو اور مجھ سے کوئی بات کرنا چاہتی ہو تو منظر کے گھر آجاؤ۔ اس طرح میرا تعاقب کرنے اور میری گاڑی کے سارے ٹائروں کی ہوا نکال کے مجھے اپنے ساتھ کار میں لے جانے کی یہ کوشش انتہائی احمقانہ اور گھٹیا تھی مگر میں غزالہ کی توقعات سے بڑھ کر احمق ثابت ہوا۔ میں نے اس سے یا اس کی باتوں سے متاثر ہوکے ایک چیلنج قبول کرلیا۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ میں ڈرتا نہیں۔ ثابت مگر یہ ہوا کہ میری حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی ہی میری کمزوری ہے۔

واقعات کا تانا بانا میرے گرد ایک ناقابلِ فہم جالا بُن رہا تھا۔ صورتِ حالات ایک زاویے سے کچھ اور نظر آتی تھی تو دوسرے پہلو سے کچھ اور۔ کسی معمے کی طرح جس میں دائیں سے بائیں الفاظ کا مفہوم کچھ اور بنتا ہو' اوپر سے نیچے کچھ اور۔ پیڈرو نے پشاور تک ہمارا تعاقب کیا اور وہاں بظاہر ایک دشمن کی طرح ہمارے خلاف بھرپور جارحیت کا مظاہرہ کیا۔ اس کے بعد وہ ہمدرد اور مددگار بن کے سامنے آیا اور اس نے اپنی زندگی کا فسانۂ عبرت سُنا کے ہماری جذباتی ہمدردی حاصل کی۔ پھر ہمیں یقین دلایا کہ چوہدری دلاور اپنے مستقبل کو نیک نامی کی سند بنانے کے لیے اس جیسے وفاداروں کو بھی بدنما داغ کی طرح مٹادینا چاہتا ہے۔ اس نے خود کو مظلوم اور بے گناہ ثابت کرتے ہوئے عملاً ہماری مدد کی اور ہم سب بچھڑے ہوئے دوستوں کو ملا کے اپنی نیک نیتی کا ثبوت فراہم کیا مگر یہ سب جھوٹ تھا' فریب تھا اور چوہدری دلاور کا ڈراما تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے اکبر خان کا پُراسرار کردار۔ اس نے بھی ہمیں احسان سے خریدنے کی کوشش کی اور خود کو چوہدری دلاور کا بھائی ثابت کرنے کے بعد اپنے درمیان دشمنی کے پُرانے اسباب بھی بتادیے۔ شاید یہ بھی جھوٹ تھا۔ اکبر خان نے ہماری یوں مدد

کی تھی کہ ہم پہلے سے زیادہ مشکلات اور مصائب میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اب پیر کیگر شاہ کے سیکڑوں جنونی مرید ہمارے خون کے پیاسے تھے اور ہمارے یہ دشمن سب سے زیادہ خطرناک تھے جو ہمیں فی سبیل اللہ، محض ثواب اور رتبۂ شہادت حاصل کرنے کے لیے جہنم رسید کرنا چاہتے تھے۔ ایک طرف چوہدری دلاور اینڈ کمپنی، دوسری طرف قانون کے نام پر لاقانونیت کی طاقت کا مظاہرہ کرنے والے، تیسری طرف خوں آشام، دیوانے کیگر۔ سامنے اور دائیں بائیں سارے راستے مسدود تھے، اب ہم صرف پیچھے ہٹ سکتے تھے۔ وہ بھی ایک حد تک۔ جہاں تک یہ دفاعی مراجعت ممکن ہو۔ انگریزی محاورے کے مطابق ہم اس پوزیشن میں تھے کہ پیچھے دیوار تھی۔

چوہدری دلاور کی بہن کا اپنے ہوشربا حسن اور شعلہ فشاں شباب کی بھرپور قوت کے ساتھ نمودار ہونا اس ڈرامے کا نیا موڑ تھا۔ درحقیقت یہ ایک ہی ڈراما تھا جس کا مصنف اور ہدایت کار سامنے آئے بغیر ہر نئے سین میں نئے کردار پیش کرتا رہتا تھا اور حالات کے مطابق کہانی کو آگے بڑھاتا تھا۔ پہلے کبھی نہ میں نے سوچا تھا اور نہ اس کی ضرورت محسوس کی تھی کہ میں چوہدری دلاور کے بھائیوں، بہنوں یا چاچوں ماموں کے بارے میں معلومات حاصل کروں۔ ان کا میرے معاملات سے کوئی تعلق نہیں تھا اور نہ مجھے چوہدری دلاور کے خاندانی مسائل سے دلچسپی تھی۔ اکبر خان نے بھی خود ہی ہم سے رابطہ کیا تھا اور اب غزالہ نام کی یہ عورت اس کی سوتیلی بہن ہونے کا دعویٰ لے کر آئی تھی تو میں سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ ایسے کتنے کردار ہوں گے جو چوہدری دلاور کے حوالے سے مکروفریب کا نیا تماشا دکھائیں گے۔

وہ چند منٹ کا فاصلہ تھا جس میں میرے خیالات کا انتشار واضح ہو کے میرے سامنے آیا اور میں نے محسوس کیا کہ مجھے محتاط ہو کے ٹھنڈے دل ودماغ کے ساتھ عقل سے کام لینے کی جتنی ضرورت آج تھی، اتنی پہلے کبھی نہ تھی۔ ایک عرصے تک میں نے حالات سے لڑتے ہوئے اور اپنی خوش قسمتی پر انحصار کرتے ہوئے، دوستوں کی مدد اور تائیدِ ایزدی سے کامیابی کے راستوں پر سفر کیا تھا مگر اب حالات مجھے شکست دینے لگے تھے تو یہ سمجھنا غلط تھا کہ تقدیر نے آنکھیں پھیر لی ہیں، دوست دوست نہیں رہے یا میں تائیدِ ایزدی سے محروم ہو گیا ہوں۔ میں عام انسانی کمزوری کا شکار ہو گیا تھا۔ مسلسل کامیابی اسے خوش فہم بنا دیتی ہے اور خوداعتمادی کی انتہا پر پہنچ کے مغرور بھی۔ وہیں سے غرور کا سر نیچا ہونے لگتا ہے اور قدرت خود انسان کو یہ سبق سکھاتی ہے کہ سب کچھ اس کے ارادے یا اختیار سے نہیں ہوتا۔

چند منٹ کے بعد گاڑی رک گئی۔ میں ائرکنڈیشنڈ کار سے باہر نکلا تو مجھے موسم ہی نہیں، فضا بھی کچھ بدلی بدلی سی لگی۔ تبدیلی میرے اندر آئی تھی، باہر اس کا عکس میری آنکھیں دیکھ سکتی ری دنیا کے لیے سب کچھ وہی تھا اور ویسا ہی تھا۔ دل

اُداس ہو تو بہاروں کے رنگ پھیکے لگتے ہیں اور خوشبو میں افسردگی اُتر آتی ہے۔ زمین و آسمان ویران لگتے ہیں اور ماحول سوگوار۔ خوشی احساس میں شامل ہو تو کائنات رقص میں نظر آتی ہے۔ فضا گنگناتی ہے اور دنیا اچانک بہت خوب صورت ہو جاتی ہے۔

غزالہ نے گلابی سلک کی ساری کے سرکش آنچل کو سمیٹا اور بائیں ہاتھ سے سنبھال لیا۔ اس کا مختصر بلاؤز کسی ماہر فن درزی نے سیا تھا کہ جسم پر کہیں ایک شکن تک نہ تھی۔ جہاں بلاؤز نہیں تھا، وہاں اس کی کسی ہوئی کمر کا بانکپن دعوتِ دید دیتا تھا اور نگاہوں کو خیرہ کرتا تھا۔ حسین عورت کا اصل سرمایہ تو عطیۂ قدرت ہوتا ہے مگر وہ بلند عزائم رکھتی ہو تو اس سرمائے میں حسبِ خواہش اضافہ کر سکتی ہے۔ عشوہ و غمزہ و ادا سے، خوش لباسی سے، رنگِ پیرہن سے، خوش اطواری اور خوش ذوقی سے وہ اپنے سرمایۂ حسن وشباب کی قوتِ خرید کو لامحدود بھی کر لیتی ہے۔ غزالہ ایسی ہی عورت تھی۔

"لارڈز" کے ایک نیم تاریک اور پرسکون گوشے میں بیٹھ کے اس نے کہا "سکندر! آخر بات کیا ہے، تم کیوں نروس ہو؟"

میں نے کہا "نروس.... غلط خیال ہے تمہارا۔"

"پھر ایسے کیوں دیکھ رہے ہو مجھے؟ تم مجھے نروس کر رہے ہو۔"

میں نے خفت سے کہا "میں بہت اپ سیٹ ہوں۔"

"میں نے تمہارے بارے میں بہت کچھ سُن رکھا تھا۔"

"کیا سُن رکھا تھا؟"

"یہی کہ تم.... بہت سی باتیں ہیں لیکن ایک بات یہ تھی کہ تم پریشانی میں بھی ہنسنا اور ہنسانا جانتے ہو۔" اس نے کہا۔

میں نے سنبھل کے کہا "اچھا.... کس نے بتائی تھی یہ بات؟"

"جس نے بتائی تھی، غلط تو نہیں بتائی تھی۔ تم نے بدترین حالات کا مقابلہ کیا۔ سخت ترین آزمائشوں سے گزرے۔ تمہارے دشمن کون تھے اور دوست کون تھے، سب معلوم ہے مجھے اور یہ بھی کہ دشمن تمہارے بارے میں کیا کہتے ہیں اور دوست کیا رائے رکھتے ہیں۔"

میں نے اسے حیرانی سے دیکھا "مجھے بھی بتاؤ مس غزالہ۔"

"ایسے انجان مت بنو۔ مجھے مایوسی ہو رہی ہے تمہارے رویّے سے۔"

میں نے سپاٹ لہجے میں کہا "آخر کیا توقعات رکھتی ہیں آپ مجھ سے خاتون! میں آپ کو ہنساؤں، لطیفے سناؤں؟"

"نہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ تم نارمل ہو جاؤ۔ مجھ سے پوچھو کہ میں کون ہوں، کب سے تمہارے پیچھے لگی ہوئی تھی اور ایسے بھونڈے طریقے سے تمہیں اپنے ساتھ یہاں لے کر کیوں آئی ہوں۔"

میں نے کہا "تمہیں احساس ہے کہ یہ بھونڈا طریقہ تھا؟"

"کیا یہ شریفانہ طریقہ تھا؟" وہ بولی "کیا فرق ہے آخر مجھ میں

اور ایک بازاری عورت کے انداز واطوار میں۔ میرا حلیہ' میرا لباس اور میری ادائیں دیکھ کے کوئی بھی مرد یہ رائے قائم کرسکتا ہے۔"

"برا نہ مانو تو ایک بات کہوں؟"

"کہو" اس نے ویٹر کو کافی لانے کا آرڈر دینے کے بعد کہا۔

"تمہارے پاس وہ سب کچھ ہے جو دنیا کے کسی بھی مرد کو تمہارے اشارۂ ابرو کا غلام بنا سکتا ہے۔"

"میں اسے تعریف سمجھوں یا تذلیل۔"

میں نے جلدی سے کہا "تذلیل کا خیال کیوں آیا تمہیں؟"

"آئینہ دیکھوگے تو اس سوال کا جواب اپنی آنکھوں میں دیکھ لوگے" اس نے اُداسی سے کہا "مجھے احساس ہے کہ میں نے اس طرح تم کو اپنے ساتھ لا کے اچھا نہیں کیا۔ تمہاری آنکھوں میں نفرت ہے میرے لیے۔ تم سارا راستہ یوں بیٹھے رہے جیسے چلتی گاڑی سے چھلانگ ماردوگے۔ میں اسے تمہارا خوف نہیں سمجھ سکتی۔ تم مجھ پر اعتبار کرنا نہیں چاہتے۔ یہ سمجھتے ہو کہ میں تمہارے ساتھ کوئی مکروفریب کرنا چاہتی ہوں۔ میں ایک جھوٹی اور مکّار عورت ہوں اور تمہیں دھوکا دے کر کسی مصیبت میں ڈالنا چاہتی ہوں۔ مجھے کسی نے تمہیں نقصان پہنچانے کے لیے بھیجا ہے۔"

وہ میز پر آگے جھک کر سرگوشی میں بات کررہی تھی اور بہت رنجیدہ نظر آتی تھی۔ اس کا لہجہ بہت پرسکون تھا اور اس کی آنکھیں بات کرتے ہوئے خلا میں دیکھتی محسوس ہوتی تھیں۔ ٹیبل کے دوسری طرف سے بھی مجھ پر وہ خوشبو حملہ کررہی تھی جس نے گاڑی میں مجھے بے چین رکھا تھا۔ جب اس نے آنکھوں میں آنے والے آنسوؤں کو ساری کے پلو سے صاف کیا تو مجھے اپنے رویّے پر افسوس ہوا۔

میں نے کہا "مس غزالہ! ہسٹریا کے لیے یہ جگہ انتہائی نامناسب ہے۔ آئی ایم سوری۔"

"مجھے کچھ نہیں ہوگا" وہ زبردستی مسکرائی "آپ بتائیں' کیا میں نے غلط سمجھا؟"

میں نے اعتراف کیا "اگر سچ سننے کا حوصلہ ہے تو میں یہی کہوں گا کہ آپ نے ٹھیک سمجھا۔"

"یعنی یہ کہ میں بڑی غلط قسم کی عورت ہوں' آپ سے ملاقات کا مقصد آپ کے خلاف سازش ہے؟"

"دراصل حالات ایسے ہیں میرے.... کہ میں کسی پر بھی بھروسا نہیں کرسکتا۔"

"خصوصاً چوہدری دلاور کی بہن پر۔"

"ابھی میں نے آپ کو اس کی بہن تسلیم نہیں کیا۔ آپ خود کو الزبتھ ٹیلر کی بہن بھی کہہ سکتی ہیں۔ اس سے مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"مجھے فرق پڑتا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم مجھ پر اعتبار کرو۔ میں واقعی چوہدری دلاور کی سوتیلی بہن ہوں" اس نے کہا "لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہمارے درمیان کوئی محبت کا رشتہ ہے۔ میں اس کی بدترین دشمن ہوں۔"

میں ہنس پڑا "خاتون! مجھے اس کہانی سے بھی قطعی کوئی دلچسپی نہیں کیونکہ ایسی ہی ایک کہانی مجھے اکبر خان سنا چکا ہے۔ اگر چوہدری دلاور تمہارا سوتیلا بھائی ہے تو اکبر خان بھی ہوگا۔"

اس کے چہرے کا رنگ بدلا "سکندر! پلیز۔ اتنی جلدی کوئی فیصلہ مت کرو۔ میں تمہارے لیے بہت کچھ کرسکتی ہوں۔"

"مگر میں تمہارے لیے کچھ نہیں کروں گا۔ بہتر ہے کہ اس موضوع کو ختم کردو" میں نے کہا۔

"آخر پوری بات سُننے میں کیا حرج ہے؟"

"اکبر خان کی باتیں بھی ایسی ہی تھیں۔ وہ میری مدد کرنا چاہتا تھا کیونکہ اسے چوہدری دلاور سے انتقام لینا تھا۔ بکواس کرتا تھا۔ اس نے مجھے بے وقوف بنایا تھا۔ پیسہ اس کے پاس بھی بہت تھا مگر وہ مجھے خرید نہیں سکا تو اس نے مجھے مصیبت میں ڈال دیا۔ پہلے ہی کم مسائل نہیں تھے میرے لیے۔ اب تم آگئی ہو۔" میں نے برہمی سے کہا۔

"پلیز ذرا آہستہ بولو۔ اکبر خان نے تمہیں دھوکا دیا تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں بھی دھوکا دوں گی۔ ایک ملاقات میں تمہیں قائل کرنا بہت مشکل ہے مگر ایک نہ ایک دن تمہیں یقین آجائے گا کہ...."

"شاید وہ دن کبھی نہ آئے۔"

"وہ دن بہت جلد آئے گا" وہ کسی ضدی لڑکی کی طرح بولی۔

"آنے والے دن کی بات چھوڑو مس غزالہ! آج کے دن کی حقیقت بھی کتنی ناقابلِ اعتبار ہے۔ میں یہ تسلیم کرلیتا ہوں کہ تمہارا نام غزالہ ہے۔ یہ بھی مان سکتا ہوں کہ وہ عالی شان مرسیڈیز تمہاری ہے جس میں تم مجھے اپنے ساتھ بٹھا کے لائی ہو۔ تمہارا یہ لاثانی پیکرِ حسن وشباب بھی ایک ناقابلِ تردید سچائی ہے جس پر شک کرنے والا کافر لیکن اس کے بعد جو کچھ ہے وہ بقول مرزا غالب۔ عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے۔"

"نہیں۔ تم نے تعصب میں عقل کے سب دروازے پہلے ہی بند کرلیے ہیں اور اب اس حقیقت کے سوا تمہارے لیے دنیا میں کوئی حقیقت باقی نہیں رہی کہ میری ہر بات جھوٹ ہوگی اور میں چوہدری دلاور کی بہن ہوں اس لیے تمہاری دشمن ہوں۔" اس کا چہرہ غصے میں گلابی ہوگیا۔

"اخلاقاً میں تمہاری ہر بات سُن سکتا ہوں۔" میں نے کہا "مگر مجھ سے یہ توقع مت رکھنا کہ میں اسے سچ بھی مان لوں گا۔ شاید میں صورت سے احمق لگتا ہوں مگر تمہیں دعویٰ ہے کہ تم مجھے جانتی ہو تو یہ بھی تمہارے علم میں ہونا چاہیے کہ میں بے وقوف نہیں ہوں۔ میں کیسے تسلیم کرلوں کہ چوہدری دلاور کی بہن یہاں "لارڈز" ریسٹورنٹ میں میرے ساتھ بیٹھ کے کافی پی رہی ہو اور محترم بھائی صاحب کو علم نہ ہو؟ جو میرے پل پل کی خبر رکھتے ہیں اور مجھ پر ان کی ایسی نظرِ کرم ہے کہ وہ خود ساتھ نہ ہوں تو ان کے فرشتے میرے ساتھ سائے کی طرح رہتے ہیں۔"

وہ روہانسی ہوگئی "تم ٹھیک کہتے ہو۔ شاید ایسا ہی ہوگا۔"

"شاید نہیں خاتون! اس وقت بھی جب آپ نے اس ناچیز کو یاد کیا اور شرفِ ملاقات بخشنے کے لیے ایک فلمی' ڈرامائی صورتِ حال پیدا کی۔ تو وہ سب دیکھ رہے تھے۔ دو افراد صبح سے میرے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ اب تک وہ اپنے آقائے ولی نعمت کو رپورٹ دے چکے ہوں گے کہ سر' سب بالکل ٹھیک جارہا ہے۔ بالکل آپ کی مرضی کے مطابق۔ شکار جال میں پھنس چکا ہے اور...."

"ول یو پلیز شٹ اپ...." غزالہ نے اتنی بلند آواز میں کہا کہ اِدھر اُدھر کی میزوں پر بیٹھے ہوئے چند افراد نے سر گھما کے دیکھا۔

"اوکے۔ میں اپنی بکواس بند کرتا ہوں۔ اب آپ جو فرمانا چاہیں فرمائیں۔ میری آنکھیں بھی کھلی ہوئی ہیں اور کان بھی کھلے ہوئے ہیں۔ رہا دل کا دروازہ تو وہ پہلے سے بند ہے اور مقفل ہے۔ اس کی چابی کسی اور کے پاس ہے ورنہ میں آپ کو خوش آمدید کہتا۔" میں نے تلخی سے کہا "عقل آزاد ہے۔ اسے نہ میں پابند کرسکتا ہوں کہ کیا مانے اور کیا نہ مانے' کس کی سُنے اور کس کی نہ سُنے۔ عقل کی عدالت میں جذبات کی سفارش نہیں چلتی۔ اس کے سارے فیصلے میرٹ پر ہوتے ہیں۔"

"چلو اچھا کیا تم نے یہ وضاحت کردی۔ اب مجھے ذہنی تعصب پر مبنی مخالف جذبات کی رخنہ اندازی کا اندیشہ تو نہیں رہا۔"

"چشمِ بددور۔ یہ اندازِ بیاں اپنے چوہدری دلاور صاحب کی جہالت آمیز گفتگو سے کتنا مختلف ہے۔ ہیں جی۔" میں نے اس کی نقل اُتاری۔

"وہ جاہل ضرور ہے مگر کتابی علم پر ناز کرنے والے بہت سے افلاطون اس کی ذہانت کا پاسنگ بھی نہیں۔"

"رائٹ۔ دشمن ہونے کے باوجود میں یہ مانتا ہوں۔ شاید موروثی نوعیت کی شیطانی ذہانت ہے یہ۔"

"مسٹر سکندر اعظم! میرے یا آپ کے پاس پوری رات نہیں ہے کہ ہم یہاں بیٹھ کے بے مقصد باتیں کرتے رہیں اور کسی نتیجے پر پہنچے بغیر اٹھ جائیں۔ تم مجھے چوہدری دلاور کے حوالے سے ذلیل کرتے رہو' میری ہر بات کا مذاق اُڑاتے رہو اور میری ہر دلیل کو نفرت اور کدورت کی بنا پر رد کرتے رہو۔ تم نے ابھی کہا تھا کہ تم میری بات سُنوگے" وہ ایک دم بگڑ گئی۔

"میں سُن رہا ہوں خاتون۔ اور بھی بہت سے لوگ سُن رہے ہیں۔"

"نہیں۔ تمہارا یہ تحقیر آمیز' پُرتمسخر انداز مجھے بالکل پسند نہیں۔ تم میں اتنی اخلاقی جرأت تو ہونی چاہیے کہ لگی لپٹی رکھے بغیر صاف کہہ سکو کہ میں کوئی بات نہیں سُنوں گا۔ ایسی ہی بات تھی تو میرے ساتھ کیوں آئے تھے؟"

"تم صاف سُننا چاہتی ہو تو سُنو مس غزالہ۔ میں نے تمہارے ساتھ آکے واقعی غلطی کی تھی۔ معلوم نہیں کیوں میں نے تمہارے کہنے پر گاڑی میں بیٹھنا منظور کرلیا تھا۔ شاید اس لیے کہ میں اس وقت بہت پریشان تھا اور میری قوتِ فیصلہ باقی نہیں رہی تھی۔ تمہاری بات میں کیا سنوں اور کیوں سنوں؟ جب کہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ تمہارے منہ میں تو زبان بھی اپنی نہیں۔ جو کچھ بھی تم کررہی ہو یا کہہ رہی ہو' ایک ایسے ڈرامے کا سین ہے جس کا اسکرپٹ چوہدری دلاور نے لکھا ہوگا۔ تم نے اس کی خوب ریہرسل کی ہوگی' یہاں تک کہ خود دلاور بھی مطمئن ہوگا کہ اب تمہاری اداکاری میں سوفیصد حقیقت نظر آنے لگی ہے۔ تم ایک کٹھ پتلی ہو اور مجھ سے توقع رکھتی ہو کہ میں.... خیر چھوڑو...."

خلافِ توقع وہ مشتعل نہیں ہوئی۔ ذہنی طور پر وہ پہلے سے میرے ردِعمل کے لیے تیار تھی۔ وہ خاموشی سے کافی پیتی رہی اور مجھے جذبات سے عاری چہرے کے ساتھ دیکھتی رہی۔

"بس یا اور کچھ؟" اس نے میرے خاموش ہوجانے کے بعد کہا۔

میں نے کہا "نہیں۔ عقلمند کو اشارہ کافی ہوتا ہے۔ میں نے تو وضاحت سے سب کچھ کہہ دیا۔ خیر سے تم جتنی حسین ہو' اتنی ہی ذہین بھی نظر آتی ہو لیکن ذہین نظر آنے اور ذہین ہونے میں خاصا فرق ہے۔ حسین نظر آنے اور حسین ہونے میں اتنا فرق نہیں ہوتا۔"

"چلو تمہاری مردانہ انا کی تسکین کے لیے میں مان لیتی ہوں کہ میں ذہین تو بالکل بھی نہیں ہوں۔ ناقص العقل عورت ذات ہوں نا۔ آپ حسین مانتے ہیں تو یہ بھی ذرہ نوازی ہے آپ کی۔" اس

نے طنزیہ لہجے میں کہا "یہ بات عام لوگ اکثر کہتے رہتے ہیں مجھ سے لیکن وہ سب اہلِ نظر نہیں ہوتے۔ بیشتر بوالہوس ہوتے ہیں۔ اور شکاری مردِ ہر عورت سے تعلق کی کوشش ایسے ہی کرتے ہیں۔ اس کے حسن کی تعریف و توصیف میں شاعرانہ انداز اختیار کرنا تو حرفِ آغاز ہوتا ہے' اس سے اگلا مرحلہ یہ ثابت کرنے کا ہوتا ہے کہ وہ خود دوسروں سے مختلف ہیں اور پھر۔۔۔"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "خاصا تجربہ ہے آپ کا لیکن میں ایسا شکاری نہیں ہوں۔ پہلے تھا.... اب نہیں رہا۔ اب میں شکاریوں کا شکاری ہوں۔ آپ سمجھتی ہیں بگ گیم کو۔ خطرناک' آدم خور شیر مارنے والے چڑی مار نہیں ہوتے۔ جب تم واپس جاؤ تو... اپنے چوہدری صاحب یعنی اپنے نام نہاد بھائی صاحب کی خدمت میں میرا سلام عرض کرنا اور کہنا کہ میں اس لطیفے سے محظوظ ہوا مگر یہ کھیل پُرانا ہوگیا ہے۔ کوئی نئی چال چلیں۔"

"تمہاری کافی ٹھنڈی ہوگئی ہے۔" وہ بے نیازی سے بولی "غصہ ابھی ٹھنڈا نہیں ہوا۔ تم گرم کافی منگواؤ۔ اچھا میں منگواتی ہوں۔"

"تھینک یو۔"

"اب تھوڑا سا وقت مجھے دو۔ میری بات مداخلت کے بغیر سنو۔ جیسے میں نے تمہاری بکواس سنی۔"

"یہ بکواس نہیں تھی۔"

"میرے لیے تھی" اس نے ویٹر کو اشارہ کیا اور اسے کافی کا آرڈر دے کر پھر بات شروع کردی۔ "جناب سکندر اعظم صاحب! آپ کی ساری فتوحات کا احوال میں نے سنا' پڑھا اور تسلیم کیا۔ ظاہر ہے' بالواسطہ حاصل ہونے والی معلومات سو فیصد خالص نہیں ہوتیں۔ سچ زیادہ سے زیادہ نوے فیصد سچ ہوتا ہے اور جھوٹ میں بھی دس فیصد سچ آجاتا ہے۔ اس کے باوجود حقیقت کا عمومی تاثر بے بنیاد نہیں ہوتا۔ تم نے بڑے کارہائے نمایاں سرانجام دیے اور جس طرح اپنے دشمنوں کے عزائم کو ناکام کیا' وہ قابلِ تعریف ہے۔ تمہارے پاس وسائل صرف عزم اور یقین کے تھے اور تمہاری قوت تھی تمہارا اعتماد۔ تمہارے دست و بازو تھے تمہارے دوست اور بلاشبہ تمہیں حالات کی موافقت حاصل رہی۔ تم نے تاریخ پڑھی ہے؟"

"کس کی تاریخ؟"

"اپنی تاریخ۔ وہ تاریخ جس کو تم اپنے تہذیبی شعور کا قصہ سمجھتے ہو" اس نے ایک فلسفیانہ جواب دے کر مجھے حیران کردیا "سکندر اعظم کو جانتے ہو نا؟ وہ ساری دنیا کی تسخیر کے لیے نکلا اور مسلسل فتوحات نے اسے یقین بلکہ غرور میں مبتلا کردیا کہ جو وہ چاہتا ہے' کرسکتا ہے لیکن اس نے غالباً ایک ضرب المثل نہیں سنی تھی۔ تدبیر کند بندہ' تقدیر زند خندہ۔"

میں نے سرہلایا "وہ فارسی نہیں جانتا تھا۔"

"ہر زبان میں یہ بات کہی اور سمجھی جاسکتی ہے" وہ بولی "کہتے ہیں اسے ایک مچھر نے شکست دی۔ اسے مچھر کے کاٹنے سے ملیریا ہوا اور تمت بالخیر۔ سکندر جب گیا دنیا سے دونوں ہاتھ خالی تھے۔"

"شاعری سے تمہارے ذوق۔۔"

"گولی مارو ذوق اور سودا کو" وہ بولی "نپولین کی مثال لو۔ اسے بھی ناقابلِ شکست سمجھا جاتا تھا۔ ہٹلر کو برف نے پسپا کیا۔ برف تو خفیف سی حرارت سے پگھل جانے والی چیز ہے۔ توپ خانے' ٹینک اور بم جس کا راستہ نہ روک سکے' اسے آسمان سے برسنے والی برف کی پھوار نے روک دیا۔ تم کو معلوم ہوگا کہ ہاتھیوں کے لشکر کو ابابیلوں نے کنکر برسا کے تباہ کردیا تھا۔"

"اتنی مثالیں کافی ہیں۔ میں نے عبرت پکڑی۔ اب آگے کہو۔"

"میرا خیال تھا کہ آپ سمجھ جائیں گے" وہ بولی "کہنے کا مقصد یہ تھا کہ سکندر اعظم' نپولین یا ہٹلر کو ان کی اس خوش فہمی نے مروایا تھا کہ وہ اپنے آپ کو ناقابلِ تسخیر سمجھنے لگے تھے۔ حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی غالباً غرور بن جاتی ہے۔ جب آدمی سمجھنے لگتا ہے کہ بس میں ہی میں ہوں۔ ہم چو من دیگرے نیست۔ اور کوئی ہم سا ہو تو سامنے آئے۔ خدا نے تو ہر فرعون کے لیے ایک موسیٰ پیدا کیا ہے۔"

"آپ نے مجھے فرعون کہا ہے یا خود کو موسیٰ؟"

"میں نے کچھ نہیں کہا۔ یہ سب مجھ سے بہت پہلے لوگ کہہ چکے ہیں" وہ بولی "اصل نکتہ سمجھنے کا یہ ہے سکندر صاحب! کہ انسان کو اس وقت سے بچنا چاہیے جب اس کے دماغ میں یہ خناس سما جائے کہ صرف میری سوچ ٹھیک ہے' میری عقل ارفع و اعلیٰ ہے' میں غلط فیصلے نہیں کرسکتا اور میں حالات کا مقابلہ کرسکتا ہوں کیونکہ میرا خدا ہے میرے ساتھ۔ بالکل ٹھیک کہ خدا آپ کے ساتھ ہے مگر کیا خدا صرف آپ کے ساتھ ہے اور وہ بھی غیر مشروط طور پر؟ آپ غلطی نہیں کرسکتے۔ پھر آپ انسان تو نہ ہوئے۔ بندہ تو خطا کا پتلا سمجھا جاتا ہے۔"

"مس غزالہ! براہِ کرم مجھے میری غلطی سے آگاہ فرمایئے۔"

"غلطی آپ سے ایک ہوئی ہو تو بتاؤں۔ کیا آپ کو نہیں معلوم کہ اس وقت آپ کے گرد مخالف حالات کا گھیرا تنگ ہوتا جارہا ہے؟ آپ کا خیال تھا کہ یہاں آکے سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

"مجھے اس میں کوئی شک نہیں۔"

"جب آپ نے چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کے خلاف ہتھیار اُٹھائے تھے تو کیا آپ کے دل میں کوئی شک تھا؟ آپ کو یقین تھا کہ آپ حق پر ہیں۔ حق کی ہمیشہ جیت ہوتی ہے اور آپ اپنا حق ضرور حاصل کرنے میں کامیاب ہوں گے۔ آپ کے ساتھ انصاف ہوگا اور ناانصافی کے مرتکب کیفرِ کردار کو پہنچ جائیں گے۔ سچ کا بول بالا اور جھوٹے کا منہ کالا ہوگا۔ جیسے ہر فلم کا انجام ہوتا ہے کہ ولن ذلیل و خوار ہوتا ہے۔ ہیرو ہزار مشکلات و مصائب کا مردانہ وار

مقابلہ کرکے اور بدخواہوں کی ایسی تیسی کرکے کامیاب ہوتا ہے اور ہیروئن کا ہاتھ تھام کر آخر میں دوگانا گاتا ہے۔ تماشائی خوش خوش گھر کی راہ لیتے ہیں کہ پیسے وصول ہوئے۔ مگر فلم دیکھنے والے فینٹسی FANTASY کی خود فریبی کا شکار ہوتے ہیں۔ زندگی میں کوئی فینٹسی نہیں ہوتی۔"

میں مجبور تھا کہ اس بے حد حسین نظر آنے والی لڑکی کو انتہائی ذہین اور غیر معمولی عقل و شعور کی مالک سمجھتے ہوئے اس کی باتوں کو سنجیدگی سے سنوں۔ میرا یہ عقیدہ غلط ہورہا تھا کہ ایک انتہائی خوب صورت چہرے کے ساتھ عورت کے سر میں واجبی سی عقل ہوتی ہے جو سلیقے سے زندگی گزارنے کے لیے کافی ہو یا محبت کرنے کے لیے۔ اس لڑکی نے آہستہ آہستہ مجھے متاثر کرنا شروع کردیا تھا۔ اس کے خیالات کی گہرائی' قوتِ مشاہدہ کی وسعت اور علم کے ساتھ عقل کی آمیزش نے ثابت کردیا تھا کہ میں روایتی طور پر اس کے مقابلے میں اپنی ذہنی برتری کا دعویٰ کرکے اسے ناقص العقل ثابت نہیں کرسکتا۔ وہ میرا تمسخر اُڑا رہی تھی۔ اس نے مجھے خوش فہم' مغرور' خود فریبی کا شکار' غیر عملی اور ناکام انسان' سب کچھ کہہ دیا تھا۔ ابتدا میں میرے رویّے نے اس کو نروس کردیا تھا مگر اب وہ اعتماد کے ساتھ اپنے قدم جما کے جارحانہ انداز میں اپنی حیثیت تسلیم کروانے کے لیے لڑرہی تھی۔ یہ ایک خطرناک بات تھی۔

میں نے کہا "آپ کیا ثابت کرنے والی ہیں خاتون؟"

"جو ثابت نہیں تھا وہ پہلے ہی ثابت ہوچکا ہے" وہ بولی "کبھی آپ نے نفسیات دانوں کے برین ٹیسٹ دیکھے ہیں؟ کچھ سوالات ہوتے ہیں جن کے جواب سے ایک نتیجہ نکالا جاسکتا ہے۔ آپ کتنے سوشل ہیں؟ آپ کا آئی کیو کیسا ہے یعنی آپ کتنے ذہین ہیں؟ کیا آپ میں قوتِ برداشت ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ ایسے ہی رجحان طبع کے ٹیسٹ ہوتے ہیں۔ APTITUDE TEST جن سے پتا چل جاتا ہے کہ کوئی بچہ یا بڑا کیا کرسکتا ہے اور کیا نہیں کرسکتا۔ ان سے آدمی کے لاشعور کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اندر کا آدمی سامنے آجاتا ہے۔"

"آپ مجھے کوئی ٹیسٹ دینے والی ہیں؟" میں نے غیر سنجیدہ لہجے میں کہا مگر حقیقت یہ ہے کہ میں اندر سے اتنا پُراعتماد نہیں تھا "پہلے مجھے یہ بتادیں کہ آخر آپ کیا چیز ہیں؟ میرا مطلب ہے۔۔"

"میں ماہرِ نفسیات یا سائیکاٹرسٹ وغیرہ نہیں ہوں۔ میں ایک عام ڈاکٹر ہوں۔ ایم ڈی' جسے آپ ایم بی بی ایس کے برابر سمجھ لیں۔"

"یہ ڈگری تو باہر کی ہے۔"

"جی۔ میں نے لندن میں تعلیم حاصل کی تھی۔ اس کے بعد میں نے اسپیشلائز کیا نیورولوجی میں۔ میں نیوروفزیشن ہوں۔"

"اس کے باوجود آپ کو اصرار ہے کہ آپ ماہرِ نفسیات نہیں؟"

"میں ذہنی اور اعصابی امراض کی ڈاکٹر ہوں۔ دواؤں سے علاج کرتی ہوں۔ تحلیلِ نفسی میرا شعبہ نہیں۔"

"یعنی آپ مجھے ایک ذہنی مریض کی حیثیت سے دیکھ رہی ہیں اور مجھے یقین دلانا چاہتی ہیں۔۔۔"

"پلیز سکندر صاحب! ڈونٹ بی پرسنل" اس نے التجا آمیز لہجے میں کہا "میں صرف اپنی پوزیشن کلیئر کرنا چاہتی ہوں۔ آپ کو یقین دلانے کا مرحلہ بعد میں آئے گا کہ نہ میں چوہدری دلاور کی کٹھ پتلی ہوں اور نہ میں اس کی کسی سازش کا حصہ ہوں۔ آپ مردم گزیدہ ہیں۔ بہت دھوکے کھاچکے ہیں اور آپ کی جگہ میں ہوتی تو شاید میرے لیے بھی یہی شکل ہوتی۔ چوہدری دلاور صرف نام کے رشتے سے میرا سوتیلا بھائی ہے۔ یہ بات میں آپ سے چھپا بھی سکتی تھی' اجنبی بن کے مل سکتی تھی آپ سے۔"

"پھر آپ نے ایسا کیوں نہیں کیا؟"

"اس سے مجھے وہ فائدہ نہ ہوتا جو میں حاصل کرنا چاہتی ہوں" وہ سوچ کے بولی۔

"یعنی آپ مجھے اپنے کسی فائدے کے لیے استعمال کرنا چاہتی ہیں؟"

"فائدہ صرف میرا نہیں ہے۔ آپ کا بھی ہے۔"

"میرے فائدے کی فکر کرنے والے بہت ہیں خاتون۔ آپ

مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں اور خود بھی چوہدری دلاور سے بگاڑ مت مول لیں۔ سوتیلا سہی مگر وہ بھائی تو ہے آپ کا۔ اگر کوئی خاندانی جھگڑا ہے تو آپس میں طے کرلیں۔ مجھ سے توقع مت رکھیں۔ مجھے تو اس خیال سے وحشت اور دہشت ہورہی ہے کہ میں نے آپ کے ساتھ آکے بڑی عاقبت نااندیشی کا ثبوت دیا تھا۔ اور اتنی دیر سے ہم یہاں بیٹھے ہیں..... میرا تو خیر وہ کیا بگاڑے گا۔ آپ کا کیا بنے گا جب آپ لوٹ کے گھر جائیں گی۔ کیا وضاحت پیش کریں گی' اگر واقعی آپ اپنی مرضی سے آئی تھیں؟"

"وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا سکندر۔ اسے کیا معلوم۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ رفیق اس کا آدمی ہے۔ اس کے علاوہ دو آدمی صبح سے میرے پیچھے لگا رکھے تھے اس نے۔"

وہ مسکرائی "رفیق کی بات تو میں نے بتادی۔ وہ چوہدری دلاور کے ساتھ ہے مگر اس کا آدمی نہیں ہے۔"

"چوہدری دلاور کسی شخص کو جانے بغیر اپنے قریب آنے کا موقع نہیں دیتا۔"

"تم نے رفیق کو کہاں دیکھا تھا؟"

"سب سے پہلے حوالات میں۔ وہ مجھے رہا کرا کے لے گیا تھا۔"

"کہاں لے گیا تھا؟"

"وہ غالباً کسی وزیر یا سیکریٹری قسم کے بیوروکریٹ کی رہائش گاہ تھی۔"

"رائٹ۔ وہ چوہدری دلاور کا گھر نہیں تھا۔ یہ تو مانتے ہو نا تم؟ بعد میں یہ بھی معلوم ہوجائے گا تمہیں کہ خود چوہدری دلاور کو وہاں بُلایا گیا تھا اور وہ مجبور تھا وہاں آنے پر۔ یہ الگ کہانی ہے۔"

"تم پُراسرار بننے کی کوشش کررہی ہو۔"

"پھر میں کیا کروں؟ جب تم میری کوئی بات ماننے کے لیے تیار ہی نہیں۔"

میں نے کہا "تمہیں معلوم ہے' وہ کس کی رہائش گاہ تھی؟"

"ہاں۔ وزارتِ داخلہ کے ایڈیشنل سیکریٹری زیڈ یو نقوی کی۔ وہ غالباً ہوم سیکریٹری ہوجائیں گے۔"

میں بھونچکا رہ گیا "مسٹر نقوی۔ وہ تو بڑی توپ چیز ہیں۔"

وہ ہنسی "ہر ایڈیشنل سیکریٹری توپ چیز ہوتا ہے اور ہوم سیکریٹری تو زمزمہ ہوتا ہے۔"

"مگر وہ..... زیڈ یو نقوی صاحب تو..... سسر ہیں اس کے۔ وقار یوسف کے۔"

"ہوں گے۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"مگر وہ..... ان کے گھر میں..... میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔"

"آجائے گا آہستہ آہستہ۔ رفیق انہی کا پی اے ہے۔ اسے بھی تم چھوٹی موٹی توپ ہی سمجھو" غزالہ نے کہا۔

"مس غزالہ! پلیز' میرا دماغ خراب ہوجائے گا۔ اس راز پر سے پردہ ہٹادیں کہ مجھے وہاں لے جانے کا مقصد کیا تھا اور چوہدری دلاور وہاں آنے پر کیوں مجبور تھا؟ اس کے علاوہ رفیق آپ کا آدمی ہے تو کیسے؟"

"سکندر صاحب' یہ دنیا جلیبی کی طرح سیدھی نظر آتی ہے لیکن بیوروکریسی اور سیاست کے کھیل اس سے بھی زیادہ پُرپیچ ہیں۔"

"ڈاکٹر صاحب! آپ نے باہر تعلیم حاصل کی' باہر سے ڈگری لی اور وہ بھی نیورولوجی کی' کوئی پولیٹیکل سائنس میں ڈاکٹریٹ نہیں کی۔ پھر آپ نے ان چکروں کو کیسے سمجھ لیا جو اس ملک میں رہنے والے میرے جیسے پاکستانی کی سمجھ میں نہیں آتے؟"

"یہ سب آج ہی نہیں بتاسکتی۔ تم کو جلدی ہے؟"

"خیر مجھے اتنی جلدی بھی نہیں ہے" میں نے کہا۔

"تم نے کہا تھا کہ ہم ساری رات نہیں بیٹھے رہ سکتے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ "لارڈز" رات بھر نہیں کُھلا رہتا" میں نے سر کھجا کے کہا "تم مختصریات کرو تو چار گھنٹے میں اپنی پوری تاریخ جغرافیہ بتاسکتی ہو۔"

وہ مسکرائی "ابھی کچھ بنیادی باتیں غور طلب ہیں۔ پہلی تو یہ کہ آپ کس حد تک میری بات پر اعتبار کرسکتے ہیں۔ دوسری یہ کہ بدگمانی اور تعصب کے جذبات سے بالاتر ہوکے ایک ناقص العقل عورت کے مشورے کو قبول کرنے پر آمادہ ہیں یا نہیں۔ تیسری..."

اس کا ہاتھ میز پر تھا۔ غیر ارادی طور پر میں نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا "دیٹ از آل مس غزالہ۔ پہلے میں چند سوالات کروں گا۔"

اس نے اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا "پہلے آپ میرا ہاتھ چھوڑ دیں۔"

میں نے خفت زدہ ہوکے اپنا ہاتھ اُٹھالیا "سوری۔"

وہ مسکرائی "میں نے بُرا نہیں مانا۔ لندن میں رہی ہوں اس لیے عادی ہوں۔"

میں نے کہا "آپ چوہدری دلاور کی سوتیلی بہن ہیں۔ کیسے؟"

"سمپل۔ چوہدری دلاور کے باپ نے میری ماں سے شادی کی تھی۔"

"کہاں شادی کی تھی؟"

"لندن میں۔ میری ماں انگریز تھی۔"

"آئی سی۔ اسی لیے تمہاری آنکھیں نیلی ہیں اور بال سنہری مائل مگر جہاں تک مجھے معلوم ہے' چوہدری دلاور کا اور اکبر کا باپ پشاور کے قریب ایک گاؤں کا رہنے والا تھا۔ وہ فرنیچر بناتا تھا اور ہاتھ سے کندہ کاری میں ماہر تھا۔ وہ وہیں غربت کی زندگی گزار کے مرگیا تھا۔"

"تم ملے ہو اس سے؟"

"نہیں۔ مگر لوگ جانتے ہیں یہ بات۔"

وہ سوچ میں پڑگئی "اس میں کوئی شک نہیں کہ لندن میں بھی اس کا فرنیچر بہت مقبول تھا۔ جو باتیں مجھے میری ماں نے بتائی تھیں' وہ مجھے یاد ہیں۔ اس کا نام بہادر خان تھا لیکن وہ خان بہادر لکھتا تھا۔ خان بہادر ایک خطاب بھی ہوتا تھا۔ خان بہادر فرنیشر کا اوریجنل اسٹائل قدامت پرست انگریز امرا منہ مانگی قیمت پر خرید لیتے تھے۔ خصوصاً وہ جو برطانوی ہندوستان میں حاکم تھے یا حکمران رہے تھے۔ اس کے بعد اچانک وہ غائب ہوگیا اور میری ماں کو بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اپنا بزنس گڈول کے ساتھ کسی ہندو کو فروخت کرگیا تھا مگر اس میں کوئی قانونی سقم نکل آیا۔ نتیجہ یہ کہ وہ ہماری ملکیت ہوگیا۔"

"تمہاری ماں نے اس کا پتا چلانے کی کوشش کی تھی؟"

اس نے نفی میں سرہلایا "اس نے تو خدا کا شکر ادا کیا ہوگا کہ ایک کالے انڈین سے جان چھوٹی۔ وہ کالا تو خیر نہیں تھا۔ میری ماں کہتی تھی کہ اس کا رنگ روپ بالکل انگریزوں جیسا تھا اور سوٹ بن کے وہ انگریز بھی لگتا تھا۔ پول اس وقت کھلتا تھا جب وہ ولایت میں دیسی انگریزی کی ٹانگ توڑتا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے انڈیا میں انگریز اردو کی۔ یہ تھوڑی بہت انگریزی بھی اس نے برطانیہ میں رہ کے سیکھی تھی۔ جب وہ وہاں آیا تھا تو بالکل کورا تھا۔"

"وہ برطانیہ پہنچا کیسے؟"

"اس کا بیان تو یہ تھا کہ اپنے ایک انگریز افسر کی جان بچائی تھی جسے قبائلی مار ڈالتے۔ احسان کا بدلہ چکانے کے لیے انگریز اسے اپنے ہمراہ لے آیا اور برطانیہ میں آباد ہونے کے بعد بھی اس کی مدد جاری رکھی۔ بہادر خان فرنیشر کے کاروبار کو طبقۂ خواص میں اسی نے متعارف کرایا تھا۔ باقی سب اس کی محنت اور اللہ کی دین۔ میری ماں کا خیال تھا کہ وہ انڈیا سے فرار ہوکے برطانیہ آیا تھا کیونکہ وہ بہت ڈرا ہوا رہتا تھا اور شروع میں ایسے بہت سے مواقع آئے جب وہ گھر میں چھپا رہا۔ اس نے کئی بار رہائش بدلی اور اپنے ہم وطنوں سے ہمیشہ دور رہا۔ میری ماں اس بزنس کو نہیں چلاسکتی تھی چنانچہ سودا پھر اسی ہندو سے ہوا اور برطانوی نژاد شہری کی حیثیت سے میری ماں نے اپنے قانونی اختیارات استعمال کرتے ہوئے ایک لیگل فرم کے ذریعے اصل سے زیادہ قیمت وصول کرلی۔"

"اصل سے زیادہ کیسے؟"

"کچھ ایسا مسئلہ تھا کہ میرے باپ کے علاوہ اس ہندو خریدار پر اصل مالیت کو چھپانے کا اور انڈر ہینڈ ڈیل UNDER"

"HAND DEAL" کا الزام آسکتا تھا۔ جب میری ماں بہت دولت مند ہوگئی تو اس نے ایک اعلیٰ خاندانی لارڈ سے شادی کی جس کی شرافت' انسانیت' وضع داری اور شفقت کو میں کبھی نہیں بھول سکتی۔ مجھے یہ بتانا یاد نہیں رہا کہ میری ماں بہت حسین تھی اور جب میں جوان ہوچکی تھی تو لوگ اسے میری بڑی بہن سمجھتے تھے۔ اس لارڈ نے میری پرورش اور تعلیم کا اعلیٰ انتظام کیا اور مجھے بہترین انگلش سوسائٹی کے ادب و آداب سیکھنے کا پورا موقع ملا۔ جب میں میڈیکل کی طالبہ تھی تو میرے کلاس فیلو چند پاکستانی تھے اور ان میں ایک پٹھان تھا۔ میری کہانی سُن کے اور میری درخواست پر اس نے وعدہ کیا کہ وہ بہادر خان یا خان بہادر کا سراغ لگانے کی کوشش کرے گا۔ اسے صرف اتنا معلوم ہوا کہ بہادر خان اپنی ایک بیوی اور دو بیٹوں کو چھوڑ کے فرار ہوگیا تھا۔ غالباً اس نے بے وفائی کے الزام میں اور بدچلنی کے شک میں بیوی کو قتل کردیا تھا لیکن یہ الزام غلط تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ وہ کسی بدکردار عورت کے چکر میں پڑگیا تھا اور اپنی بیوی سے جان چھڑانا چاہتا تھا۔ بیوی کے بھائی اور خاندان والے اس کے خون کے پیاسے ہوگئے تو اسے جان بچاکے نکلنا پڑا۔ وہ اس طوائف کے پاس پہنچا تو اس نے بھی بہادر خان کو پناہ دینے سے انکار کردیا۔ وہ اسے پناہ دیتی تو خود بھی ماری جاتی۔ پشاور میں اور پورے سرحد میں آج بھی کوئی بازارِ حسن نہیں ہے۔ کچھ لوگ چوری چھپے یہ دھندا کرتے تھے اور رئیسوں کے عشرت کدے آباد کرنے والی یہ عورتیں بھی باہر سے آتی تھیں۔ بہادر خان اس عورت کے انکار سے مشتعل ہوگیا۔ اس نے ایک رات قیام کرنے کی اجازت حاصل کی مگر اسی رات اپنی بے وفا محبوبہ کا کام تمام کرکے نکل گیا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے ہم وطنوں سے اور خصوصاً اپنی قوم کے لوگوں کی شکل دیکھ کے ڈرتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اسے تلاش کرتے پھر رہے ہوں گے۔"

"سب کچھ تو معلوم ہے تمہیں۔"

"ہاں۔ مگر یہ بہادر خان کی بات ہے۔ میرے باپ کا نام خان بہادر تھا۔ تم کہتے ہو کہ وہ اپنے آبائی گاؤں میں فرنیچر بناتا تھا۔ اس سے تو ثابت ہوتا ہے کہ بہادر خان کوئی اور تھا۔ وہ اپنے علاقے میں واپس جاتا تو قتل نہ ہوجاتا؟ ایک نظریہ میں نے یہ قائم کیا تھا کہ خان بہادر بلاوجہ جمے جمائے کاروبار کو اور بیوی بچّوں کو چھوڑ کے فرار نہیں ہوا تھا۔ شاید کسی نے اسے پہچان لیا تھا۔ اس کے قاتل اسے تلاش کرتے ہوئے لندن میں اس کے گھر یا کاروبار کا سراغ لگاچکے تھے اور اسے یہ بات معلوم ہوگئی تھی۔ بیوی بچّوں کو واپس ہندوستان اور قبائلی علاقے میں لے جانا ناممکن تھا۔ وہ اپنی جان بچاکے نکل گیا اور شاید مارا گیا۔ برطانیہ سے نکلنے سے پہلے ہی یا واپس وطن پہنچ کے۔"

"لیکن وہ شخص جو خود کو اکبر خان اور دلاور کا باپ کہتا تھا......"

"اکبر خان اور دلاور بہت چھوٹے تھے۔ ان کی پرورش کی ذمّے داری خاندان میں کسی نے لے لی ہوگی" وہ بولی "مجھے میرے پٹھان کلاس فیلو نے بتایا کہ سرحد اور پنجاب کے بعض علاقوں میں بڑے یا چھوٹے بھائی کی بیوہ کا کسی بھائی سے نکاح کردیا جاتا ہے تاکہ گھر کی عزت گھر میں ہی رہے۔ ایک اور سبب زمین بن جاتی ہے۔ ایک بھائی کی بیوہ سے دوسرا بھائی اس لیے بھی شادی کرلیتا ہے کہ زمین کا بٹوارا نہ ہوا۔ یہ ہوسکتا ہے کہ اکبر خان اور چوہدری دلاور کی پرورش کرنے والا ان کا حقیقی باپ نہ ہو' ان کا چچا یا تایا ہو۔"

میں نے کہا "ایسا ہوسکتا ہے۔ اور اب مجھے یہ خیال بھی آیا ہے کہ کہیں اکبر خان اور چوہدری دلاور بھی سوتیلے بھائی نہ ہوں۔ ان کی ماں ایک ہی ہو مگر باپ الگ الگ ہوں۔ چوہدری دلاور چھوٹا ہے۔ وہ بعد میں پیدا ہوا ہو۔ خیر..... اس کی تصدیق ہوجائے گی۔ یہ بتاؤ کہ تم اتنی اچھی اردو کیسے بول لیتی ہو؟ تمہاری ساری زندگی تو برطانیہ میں گزری اور تمہاری ماں بھی انگریز تھی۔"

"ہاں۔ لیکن ہم لندن کے اس علاقے میں رہتے تھے جہاں زیادہ تعداد پاکستانی اور بھارتی باشندوں کی تھی۔ میں نے پاکستانی ہائی کمیشن کے اسکول میں ابتدائی تعلیم حاصل کی جہاں سب کلاس فیلو پاکستانی بچّے تھے۔ میرا باپ مجھے انگریز بچّوں سے دور رکھنا چاہتا تھا تاکہ میں ان کے تعصب کا نشانہ نہ بنوں۔ کسی انگریز عورت کا کسی غلام ملک کے کارپینٹر سے شادی کرلینا اس معاشرے میں ناقابلِ معافی جرم تھا۔ پاکستانی بچّوں میں میری حیثیت ممتاز رہی کیونکہ میرا باپ برطانوی شہری اور ایک بزنس مین تھا اور میری ماں کوئی معمولی عورت نہیں تھی۔ اس کا خاندان بھی معزز شمار ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ..... میرا رنگ روپ بالکل انگریز بچّوں جیسا تھا۔"

"یقیناً ہوگا' آج بھی ہے۔" میں نے تسلیم کیا۔

وہ تھوڑا سا شرمائی "ان بچّوں میں رہ کے میں نے اردو بھی اور روانی سے بولنے بھی لگی۔ خان بہادر کا کہنا تھا کہ تم پاکستانی ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم پاکستانی رہو۔ ایک دن ڈاکٹر بنو اور واپس پاکستان جاؤ۔ وہاں ڈاکٹرز نہیں ہیں۔ لوگوں کو علاج کرنے والا کوئی نہیں ملتا۔ وہ مجھے بہت کچھ بتاتا تھا پاکستان کے بارے میں۔ مجھے بڑی حیرانی ہوتی تھی یہ جان کر کہ بیشتر علاقوں میں میلوں تک ڈاکٹر اور اسپتال نہیں ہوتے۔ لوگ بیماروں کو چارپائیوں پر ڈال کے پہاڑوں کے دشوار گزار راستوں پر پیدل چلتے ہوئے پچاس پچاس میل دور کسی قصبے یا شہر لے جاتے ہیں اور اگر وہاں پہنچنے تک مریض زندہ رہے تو اس کا علاج کراتے ہیں۔ وہاں مرجائے یا راستے میں دم توڑ دے تو جنازہ واپس لے آتے ہیں۔ یہاں آکے دیکھا تو....." اس نے ایک جھرجھری لی۔

میں نے کہا "تم یہاں کب آئی تھیں؟"

"زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔" اس نے گول مول جواب دیا۔

"تمہاری ماں کہاں ہے؟"

"شی از ڈیڈ" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا "اسے قتل کردیا گیا تھا۔ میرا دوسرا باپ انسان نہیں فرشتہ تھا۔ اس میں تعصب نام کو نہیں تھا۔ وہ بہت پڑھا لکھا' فلسفی قسم کا آدمی تھا جو انسانیت کی اعلیٰ اقدار پر یقین رکھتا تھا۔ پورا اولڈ مین۔ جب میری ماں اس کی طرف ملتفت ہوئی اور اسے بتایا کہ کس طرح وہ دنیا میں اکیلی رہ گئی ہے اور ایک انڈین سے شادی کرنے کے جرم میں اسے خاندان کے رشتوں سے بھی محروم ہونا پڑا ہے۔ تو اور جذباتی ہوگیا۔ اس کی عمر ستر سال تھی اور میری ماں کی اس سے نصف۔ بلکہ نصف سے بھی کم۔ شادی کے وقت وہ تیس سال کی تھی۔ مجھے شرم آتی ہے یہ سب بتاتے ہوئے مگر وہ کوئی اچھی عورت نہیں تھی۔ معلوم نہیں اس نے زندگی میں جو کچھ کیا کیوں کیا۔ پہلی بات تو یہ کہ اسے خان بہادر سے شادی کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس معاشرے کی روایات کو جانتے ہوئے بھی اس نے یہ غلطی کی تو اس کی یقیناً کوئی بہت بڑی جذباتی وجہ ہوگی جسے محبت کی دیوانگی کہا جاسکتا ہے۔"

"کیا محبت دیوانگی ہوتی ہے؟" میں نے کہا۔

"پتا نہیں۔ محبت تو صرف محبت ہوسکتی ہے۔ دیوانگی صرف دیوانگی ہوتی ہے۔ میں اپنی بات کررہی ہوں۔ اگر مجھے کسی سے محبت ہوگی تو اس کے پیچھے میری پسند ہوگی اور پسند کی بنیاد ہوگی عقل پر' طویل تعلق کے تجربے پر' منطقی وجوہات پر' مشاہدے پر اور حقائق پر۔ میں کسی کی سوچ۔ شخصیت' فطرت اور مزاج سے مکمل آگاہی کے بغیر اسے کیسے پسند کرسکتی ہوں اور پسند کرنا بھی مرحلہ وار عمل ہے۔ میں تمہیں پسند کرتی ہوں دوستی کے لیے۔ تم مخلص ہو یا بظاہر نیک ہو۔ میں ایک پروفیسر کو پسند کرتی ہوں کیونکہ میں اس کی علمیت سے متاثر ہوں۔ ایک ڈاکٹر کی مشنری اسپرٹ کو پسند کرتی ہوں۔ کسی ایکٹر کو پسند کرتی ہوں تو کسی اسپورٹس مین کو مگر میں ان سب سے شادی تو نہیں کرسکتی۔ کسی کی محض ایک خوبی دیکھ کے اپنی ساری زندگی اس کی تحویل میں دے دوں' یہ کیسے ممکن ہے۔ شوہر کا انتخاب تو بہت سوچ سمجھ کے اور چھان پھٹک کے کرنا پڑتا ہے۔"

"یعنی اب تک تم سب کو چھان پھٹک رہی ہو۔ فائنل میں کوئی نہیں پہنچا۔"

وہ ہنسی "ایسا ہی سمجھ لو۔ کچھ کوارٹر فائنل میں آگئے' کچھ سیمی فائنل میں۔"

"میں تمہاری دلیل سے انکار نہیں کرسکتا مگر یہ فلسفۂ حیات بہت عجیب ہے" میں نے کہا۔

"میری ماں نے جذباتی دیوانگی میں زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ کیا۔ بہت جلد اسے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا مگر اس وقت کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ خان بہادر نے اسے دو باتیں اچھی طرح سمجھادی تھیں۔ ایک یہ کہ اس معاشرے کی روایات کچھ بھی ہوں' کبھی اس نے غیر مرد سے دوستی کی بات بھی کی تو وہ اسے قتل کردے گا۔ طلاق کا تو خیر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ قانون کی مدد سے وہ الگ ہوسکتی ہے مگر الگ ہوکے زندہ نہیں رہ سکتی۔ دوسری بات یہ کہ اس کی اولاد ہمیشہ مسلمان رہے گی' پاکستانی ہوگی اور انہیں وہ انگریز بنانے کی کوشش نہ کرے۔ میری ماں مجبور تھی اور ہمیشہ یہ سمجھتی رہی کہ وہ بلیک میل ہورہی ہے۔ ایک ردِعمل کے طور پر اس نے مجھے بھی وہ محبت نہیں دی جو ایک ماں اپنی بیٹی کو دے سکتی ہے۔ میرے باپ کے فرار ہوجانے کے بعد اس نے دوسری غلطی ایک بوڑھے سے شادی کرکے کی۔ وہ معاشرے میں پھر معزز ہونا چاہتی تھی اور بلاشبہ اس لارڈ کے ساتھ اسے سوشل اسٹیٹس مل گیا مگر میں اس کے ماضی کی پشیمانی کا داغ بن کے موجود رہی۔ لارڈ اس کی ذہنی کیفیت کو سمجھتا تھا اور اسے سمجھاتا بھی رہتا تھا کہ غلطی اس نے کی تھی تو سزا مجھے نہیں ملنی چاہیے مگر میری ماں کے لیے مجھ سے نفرت نہ کرنا ممکن نہ ہوا۔ محبت کی کمی کو میرے دوسرے باپ نے پورا نہ کیا ہوتا تو شاید میں نارمل نہ رہتی۔ بگڑ جاتی' بے راہروی کا شکار ہوجاتی یا شخصیت کے عدم توازن کا۔ اس نے مجھے سنبھالا اور میری ذہنی تربیت کی۔ میں سمجھتی ہوں کہ بہت کم باپ اپنی بیٹی کو اتنی توجہ دیتے ہوں گے۔ یہ اُلٹا معاملہ تھا۔ حقیقی ماں کا رویّہ بالکل سوتیلی ماں جیسا تھا اور سوتیلا باپ مجھے حقیقی باپ سے زیادہ چاہتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ یہ میرے لیے ایک آزمائش ہے۔ میں کسی کوتاہی کا متحمل نہیں ہوسکتا اور اس ذمّے داری کو پورا کیے بغیر میں مروں گا بھی نہیں۔ گڈ اولڈ مین' اس نے جو کہا وہ کرد کھایا۔ زندگی ویسے تو اتنی میلوڈراماٹک نہیں ہوتی مگر میرا تجربہ ایسا ہی رہا۔ اچانک پاپ کو کینسر ہوگیا۔ میں اپنے دوسرے والد یعنی لارڈ کو پاپ کہتی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ ڈیئر' اپنے اصل کی طرف لوٹ جاؤ۔ تمہاری ماں کا ORIGIN یہی ہے۔ قانونی طور پر تم بھی برطانوی شہری ہو مگر اندر سے تم پاکستانی ہو۔ تم یہاں ہمیشہ اجنبی اور اکیلا محسوس کروگی کیونکہ تمہارے رشتے بہت کمزور ہیں۔ اور عین ممکن ہے کہ خود تمہاری ماں تمہیں اپنا ماننے سے انکار کردے' وہ تمہیں DISOWN کردے۔ یہ میرے اصل باپ بہادر خان کی خواہش بھی تھی اور میری بھی۔ یہ عجیب بات ہے کہ اس ماحول میں پرورش پانے کے باوجود میں خود کو ویسا ہی پاکستانی سمجھتی تھی جیسا تعلیم کے لیے آنے والے دوسرے طلبا یا عارضی طور پر قیام کرنے والوں کے بچّے۔ پھر میرے ذہن میں ہر وقت ایک خیال تھا جو اکثر میرے تصور میں اور خواب میں نظر آتا تھا کہ برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں کی ویرانی میں کچھ لوگ ایک چارپائی پر کسی بیمار کو ڈالے نشیب کی جانب کچے راستے پر کسی قصبے کی سمت رواں ہیں مگر انہیں ابھی تک معلوم نہیں کہ جسے وہ علاج کے لیے لے جارہے ہیں وہ ایک لاش ہے۔ جب وہ دم لینے کے لیے کہیں چارپائی کو نیچے رکھیں گے تو شاید انہیں یہ بات معلوم ہوگی اور وہ بادلِ ناخواستہ اور مجبوراً واپسی کا

سفر شروع کریں گے۔ تھکے ہوئے' موسم اور سفر کی سختی سے نیم جاں' غم زدہ اور اپنی سعئ لاحاصل پر پشیماں۔ عجیب اتفاق یہ ہوا کہ انہی دنوں میں نے اسپین کی ایک فلم دیکھی جو خانہ جنگی سے متعلق تھی۔ اس میں گوریلا فورس کے کمانڈو اپنے ایک ساتھی کو اسی طرح اُٹھا کے لے جا رہے تھے جسے گولی لگ گئی تھی۔ وہ کسی قصبے کے ڈاکٹر تک پہنچنا چاہتے تھے۔ راستے میں ان کا مقابلہ مخالف فوجی دستے سے ہو جاتا ہے اور وہ زخمی ساتھی کو وہیں پھینک کر پناہ کی تلاش میں بھاگتے ہیں مگر سب مارے جاتے ہیں۔ مجروح گوریلا کمانڈو وہیں پڑا رہ جاتا ہے اور اس پر برف گرتی رہتی ہے' یہاں تک کہ وہ بھی برف کی تہ کے نیچے غائب ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھیوں کی لاشیں بھی برف میں چھپ جاتی ہیں۔ پھر ایک ڈاکٹر گھوڑے پر بیگ کے ساتھ نمودار ہوتا ہے جسے دو دن پہلے بُلایا گیا تھا مگر وہ کسی وجہ سے پہنچ نہیں سکا تھا۔ وہ وہاں سے سیدھا گزر جاتا ہے اور برف پر گھوڑے کے سموں کے نشان باقی رہ جاتے ہیں۔ اس فلم نے مجھے اندر سے ہلا دیا۔ میں نے سوچا کہ کیا اب بھی میرے ملک میں ایسا ہی ہوتا ہوگا؟"

میں نے ایک آہ بھری "ڈاکٹر غزالہ' یہاں اکثر ایسا ہوتا ہے۔ گاؤں تو گاؤں' شہروں میں مریض اسپتال کی سیڑھیوں پر دم توڑ دیتے ہیں کیونکہ وہ عام آدمی ہوتے ہیں۔"

"لارڈ مر گیا تو میں نے اپنی ماں سے کہا کہ مجھے واپس جانا ہے۔ میری ڈاکٹری کی تعلیم اور INTERN کی حیثیت سے ہاؤس جاب کا پیریڈ پورا ہو چکا تھا۔ میری ماں نے پوچھا کہ وہاں کس کے پاس جاؤ گی' کہاں رہو گی؟ میں نے کہا کہ میرا وطن پھر میرا وطن ہے' میں کہیں بھی رہ سکتی ہوں۔ نہ جانے کیوں میری ماں کو پھر میرے باپ کا خیال آ گیا اور اس نے ہائی کمیشن سے رابطہ کیا۔ ایک مہینے بعد اسے اطلاع ملی کہ کچھ مفید معلومات حاصل ہوئی ہیں اور بہت جلد اس کے سابق شوہر خان بہادر کی فیملی کا ایک شخص لندن میں اس سے رابطہ کرے گا۔ پھر پتا چلا کہ خان بہادر تو نہیں مگر بہادر خان کا بیٹا دلاور خان لندن میں ہے۔ میں کراموبل اسپتال میں تھی اور ویک اینڈ پر ماں سے ملنے آئی تھی۔ معاف کرنا' یہ بتانا مجھے یاد نہیں رہا کہ میری ماں نے تیسری شادی ایک نیگرو سے کرلی تھی جسے ڈر تھا کہ حکومت اسے واپس کینیا بھیج دے گی۔ شہریت حاصل کرنے کے لیے اس بائیس سال کے جوان آدمی نے دُگنی عمر کی عورت سے شادی کرلی۔ وہ ایک مجرمانہ ذہنیت رکھنے والا شخص تھا اور میں اس سے سخت نفرت کرتی تھی۔ اس شریف النفس لارڈ کے بعد اس کا وجود ایسا ہی تھا جیسے انتہائی بلندی کے بعد پستی کی انتہا۔ پہاڑوں کی خالص قدرتی برف کی بے داغ سفیدی سے گٹر کی متعفن تاریک فضا کا سفر۔ اس کی آنکھوں میں ایک وحشیانہ ہوس دیکھ کے مجھے ڈر لگتا تھا۔ اور ایک دن اس نے ذلالت کی انتہا کردی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ بے بی' مجھ سے شادی کرلو۔ میں اس منحوس بڑھیا سے تمہاری بھی جان چھڑا دیتا ہوں۔ میں پولیس کو رپورٹ کردیتی مگر مسئلہ تھا گواہی کا۔ اس نے بے شرمی سے کہا کہ تمہارے الزام پر یقین کون کرے گا۔ خیر' ایک سنیچر کی صبح مجھے اطلاع ملی کہ میری ماں کا قتل ہو گیا ہے اور پولیس نے اس کے شوہر کو گرفتار کرلیا ہے۔ اس نے میرے سامنے قسم کھا کے کہا کہ اس چڑیل کو قتل کرنے والا وہ نہیں مگر نہ پولیس نے اس کی مانی اور نہ میں نے۔ تفتیش کے دوران معلوم ہوا کہ میری ماں کو قتل کرنے والا کوئی ایشین تھا جس نے اپنا نام دلاور خان بتایا تھا۔ وہ کالا حبشی اسی گھر کے ایک کمرے میں اپنی کسی گرل فرینڈ کے ساتھ موجود تھا مگر اس کی بیوی یعنی میری ماں کو علم نہیں تھا۔ انہوں نے سب کچھ چھپ کے سُنا اور دیکھا۔ گرل فرینڈ ایک ہپی لڑکی تھی جو اپنا گھر چھوڑ کے مشترکہ خاندانی نظام کے تحت اپنے جیسے دوسرے نوجوانوں کے ساتھ رہتی تھی۔ تین لڑکیاں تھیں اور چار لڑکے۔ قتل دیکھ کے اس پر ہسٹریا کا دورہ پڑ گیا اور وہ چیخنے لگی۔ میری ماں کا تیسرا شوہر تو کھڑکی سے کود کر بھاگ گیا۔ دلاور خان سمجھا کہ وہ لڑکی میری ماں کی بیٹی ہے یعنی میں ہوں۔ اس نے وہیں لڑکی کو بھی ختم کیا اور اس طرف سے مطمئن ہو گیا کہ اس نے نہ اپنے باپ کی سابق بیوی کو چھوڑا نہ اس کی بیٹی کو جو رشتے میں اس کی سوتیلی بہن ہونے کا دعویٰ کر سکتی تھی۔ یوں میں بچ گئی اور میری جگہ ایک اور لڑکی قتل ہو گئی۔ جب وہ نیگرو پکڑا گیا تو اس نے ساری بات بتائی مگر اس کی بات پر کسی نے یقین نہیں کیا اور حالات کچھ ایسے تھے کہ واقعات کی ساری شہادت اس کے خلاف گئی۔ میں تو خاموشی سے واپس کراموبل اسپتال چلی گئی اور ایک ہفتے بعد اپنے برٹش پاسپورٹ پر پاکستان آ گئی۔"

"یہ کب کی بات ہے؟"

"تقریباً چھ سال پہلے کی" وہ بولی۔

"اور چوہدری دلاور کو ابھی تک معلوم نہیں؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "اسے کیسے معلوم ہو سکتا ہے؟"

"تم چوہدری دلاور کو کس حد تک جانتی ہو' یہ تو معلوم ہو گیا مجھے ... میرا خیال ہے کہ اسے تمہارے بارے میں تم سے زیادہ علم ہوگا۔ کسی دن.... بلکہ اب تو بہت جلد تمہیں تجربہ بھی ہو جائے گا کہ وہ جانتے بوجھتے انجان بنا ہوا تھا۔ وہ تمہیں یہ بتا دے گا کہ تمہارا پاسپورٹ نمبر کیا ہے' تم کس فلائٹ سے پاکستان آئی تھیں' تمہارا ٹکٹ نمبر کیا تھا اور سیٹ نمبر کیا۔ تم نے ائرپورٹ سے کس ٹیکسی میں سفر کیا' اس ٹیکسی کا نمبر اور ڈرائیور' اس ہوٹل کا نام جہاں تم نے قیام کیا اور تمہارے کمرے کا نمبر۔ سب اطلاعات ملتی رہی ہوں گی اسے۔ آج کے دن تک۔"

وہ مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتی رہی "تم نے اسے سپر ہیومن سمجھ لیا ہے۔ آخر کیوں؟ نعوذ باللہ وہ خدا تو نہیں ہے اور کیا میں یا تم ذہنی و جسمانی اعتبار سے کرۂ ارض کی ناکارہ ترین مخلوق ہیں؟"

"یہ تو میں نے نہیں کہا۔"

"جو کچھ تم نے کہا اس سے اور کوئی نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا سکندر صاحب۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ چالاک' عیار' ذہین' سفاک اور بے رحم' وسائل رکھنے والا اور دولت کی قوتِ خرید کا مالک ہے لیکن تم نے مبالغہ آرائی سے اس کو ایف بی آئی یا اسکاٹ لینڈ یارڈ بنا دیا ہے۔"

میں نے اس کے پُراعتماد' تمسخر آمیز انداز کے سامنے خود کو تھوڑا سا احمق محسوس کیا "میرا مطلب صرف یہ تھا کہ تمہارا اس سے واسطہ نہیں پڑا۔ تم اسے صرف اپنی ماں کے قاتل کی حیثیت سے جانتی ہو۔"

"جی نہیں حضور۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ بعد میں کیا ہوا تھا۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ جسے وہ غلطی سے اپنی سوتیلی بہن سمجھ کے ٹھکانے لگا آیا تھا' وہ تو ایک لاوارث قسم کی لڑکی تھی۔ اس نے تفتیش کے نتائج پر نظر رکھی ہوگی۔ ہر قاتل خواہ وہ کتنا ہی ہوشیار اور اثر و رسوخ رکھنے والا ہو' قتل کے بعد مطمئن ہو کے نہیں بیٹھ جاتا اور کسی واردات کو ایسے نہیں بھول جاتا جیسے قتل کسی اور نے کیا ہو۔ اس نے صرف خبر پڑھی ہو۔ نہیں۔ وہ دیکھتا ہے کہ بعد میں کیا ہوا' پولیس کیا کر رہی ہے اور تفتیش کس رُخ پر ہو رہی ہے۔ چوہدری دلاور شاید پہلی فلائٹ سے واپس پاکستان پہنچ گیا ہو مگر اس نے کسی لندن کے اخبار میں قتل کی تفصیلات ضرور دیکھی ہوں گی اور جب اسے معلوم ہوا ہوگا کہ اس قتل کا ایک چشم دید گواہ پکڑ لیا گیا ہے تو وہ فکرمند بھی ہوا ہوگا۔"

"پھر اس نے معلوم کیا ہوگا کہ خان بہادر کی اصل بیٹی جو ڈاکٹر تھی' کہاں ہے۔ کسی ڈاکٹر کا پتا چلانا کیا مشکل ہے۔ کراموبل اسپتال والوں سے پتا چل گیا ہوگا کہ اس کا نام غزالہ خان ہے اور وہ پاکستان جا چکی ہے۔ چوہدری دلاور کی جگہ میں ہوتا تو باقی معلومات آسانی سے حاصل کر لیتا۔ ہائی کمیشن' ائرلائن' ٹریولنگ ایجنسی اور امیگریشن والے سب بتا سکتے ہیں۔"

"ویسے تو میں خود بھی ماشاء اللہ کم ذہین نہیں ہوں اور خطرہ ہو تو اوسط صلاحیت کا مالک بھی غیر معمولی صفات کا مظاہرہ کرتا ہے لیکن میرا ایک بہت عقلمند اور دور اندیش مشیر تھا۔ ایک پاکستانی' سے ونڈر فل مین۔"

"وہ صرف مشیر تھا؟"

"گی۔ پتا نہیں تم مردوں کی کھوپڑی میں ہر وقت یہ خیال کیوں کلبلاتا رہتا ہے کہ جب کوئی لڑکی کسی مرد کا ذکر اچھے الفاظ میں کرے تو اس کے پیچھے کچھ اور ہوتا ہے۔ فوراً دال میں کالا نظر آنے لگتا ہے۔ عجیب نفسیاتی مسئلہ ہے۔ صرف کالا تلاش کرتے ہیں' دال کی طرف دیکھتے ہی نہیں۔"

میں نے کہا "ہم مسلمان ہیں۔ دال کی طرف کیوں دیکھیں؟"

"وہ ایک عمر رسیدہ شخص تھا۔ عمر میں میرے باپ کے برابر۔ پہلے وہیں سفارت خانے میں تھا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وہیں سیٹل ہو گیا۔ اس کی بیوی بھی انگریز تھی۔ وہ میرا سب سے اچھا دوست اور ہمدرد تھا اور وہ گھر مجھے اپنے گھر سے زیادہ محفوظ اور پُرسکون لگتا تھا۔ میں اکثر وہاں رک جاتی تھی۔ ایسا ہوتا ہے دنیا میں سکندر صاحب' جن کی پیاس ہر طرف پھیلا ہوا سمندر نہیں بجھاتا' ان پر سمندر سے اُٹھنے والا بادل برس جاتا ہے۔ ماں باپ اور بھائی بہن کی محبت تو مجھے نہیں ملی مگر محبت ضرور ملی اور سب سے ملی۔ وہ دونوں بے اولاد تھے اور بے اولاد ہی رہے مگر ان کے درمیان محبت روزِ اوّل کی طرح رخشندہ رہی۔ انہیں کسی کمی کا احساس کبھی نہیں ہوا۔ فرض کرلو اس کا نام تھا شیخ۔ شیخ صاحب نے میری قومیت کے شعور کو بڑی جِلا بخشی اور مجھے ہمیشہ احساس دلایا کہ تم پاکستانی ہو اور تمہیں اپنے باپ کی خواہش کے مطابق پاکستان جا کے اپنا فرض ادا کرنا چاہیے۔ برطانیہ میں تو ساری دنیا سے ڈاکٹر آ جاتے ہیں اور خود ہمارے پاکستانی ڈاکٹر اتنے خود غرض ہو گئے ہیں کہ ذاتی عیش و آرام کی خاطر اِدھر اُدھر نکل جاتے ہیں۔ مڈل ایسٹ' امریکا' کینیڈا' برطانیہ۔ تم اس کے برعکس کرکے یہ ثابت کرو گی کہ ڈاکٹر کیا ہوتا ہے۔ وہ اپنی ضرورت کو نہیں دیکھتا۔ اپنے معاشرے' اپنے ملک اور ساری انسانیت کے مفاد کو دیکھتا ہے۔ بس اسی نے میری راہنمائی کی۔ جب میری ماں کا قتل ہو گیا تو اس نے معاملات کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ وہ میری طرف سے سخت متفکر ہو گیا کیونکہ میرے سارے حالات اس کے سامنے تھے۔ اور یہ بالکل درست ہے کہ اس کی مدد کے بغیر شاید میں اپنے دفاع میں ناکام رہتی۔ زندگی اور موت تو خدا کے ہاتھ میں ہے مگر اس نے شیخ کو وسیلہ بنا دیا۔ وہ کسی زمانے میں سفارت خانے کا افسر تھا اور لوگ اس کی بہت عزت کرتے تھے۔ وہ آدمی ہی ایسا تھا۔ میری خاطر اس نے کوئی چکر چلایا۔ نتیجہ یہ کہ میں نے کراچی تک کسی اور کے پاسپورٹ پر فرضی نام سے سفر کیا۔ پاسپورٹ پر تصویر میری تھی مگر باقی سب غلط تھا۔ اب کچھ آیا سمجھ شریف میں؟"

"آ گیا۔ پاسپورٹ کس کا تھا؟"

"اندرا گاندھی کا۔ آپ کو اعتراض؟"

"قطعی نہیں۔ صورت بھی بہت ملتی ہے آپ کی ان سے۔ تصویر بدلنے سے کوئی فرق نہیں پڑا ہوگا" میں نے دانت نکال کے کہا۔

"اصل بات یہ ہے کہ یہاں میرا کیا نام ہے اور کیا کام ہے اور میری رہائش کہاں ہے؟" وہ بولی "نام میں نے بتا دیا۔ کام ابھی تک کچھ نہیں کیا۔ سوچ رہی ہوں کہ کیا کروں۔"

"آپ کچھ بھی نہ کریں تب بھی آپ کا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے۔"

"ایک عقلمندی کی بات کی آپ نے بالآخر" وہ بولی "میرے کچھ نہ کرنے میں ہی میرا بھلا ہے۔ اگر میں کسی اسپتال میں ڈاکٹر بن

جاؤں اور لوگوں کا علاج کرنے لگوں تو پھر چھپ کے نہیں رہ سکتی۔"

"چھپ کے رہنے میں آپ کو کسی کی نظر لگنے کا بھی احتمال نہیں" میں نے کہا۔

اس نے مجھے گھورا "سب کی نظر لگے مگر چوہدری دلاور کی نظر نہ لگے۔ فرض کریں اس نے معلوم کرلیا کہ اپنی سوتیلی ماں کے ساتھ اس نے جسے قتل کیا تھا وہ اس کی سوتیلی بہن نہیں تھی......"

"دخل در معقولات پر معذرت۔ خان بہادر یا بہادر خان نے ولایت میں جس میم سے شادی کی تھی۔ کیا وہ مسلمان تھی یا ہوگئی تھی؟"

"ظاہر ہے۔ خان بہادر تو کرسچن نہیں ہوا تھا۔"

"اور نکاح بطریقِ شریعت ہوا تھا؟"

"بالکل۔ نکاح نامہ میرے پاس موجود ہے۔ جس مولوی نے نکاح پڑھایا تھا وہ بھی زندہ ہے اور شادی کے گواہ بھی ہیں۔ اس کے علاوہ میری ماں نے نکاح نامے کی رجسٹریشن کرالی تھی۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ ایک مسلمان کا کیا بھروسا۔ کل کو مجھے چھوڑ کے دوسری کرلے۔"

"حالانکہ دوسری وہ خود تھی۔"

"مگر اسے معلوم نہیں تھا۔ برطانوی قانون کے تحت وہ یکطرفہ طور پر نہ طلاق دے سکتا تھا اور نہ دوسری شادی کرسکتا تھا۔ اس نے ایک غلط حلف نامہ بھی داخل کیا تھا کہ وہ پہلے سے شادی شدہ نہیں ہے۔ یہ سب دستاویزات میرے پاس ہیں۔ میں اس کی جائز قانونی وارث ہوں۔ ایک مکان کے علاوہ تقریباً ایک لاکھ پاؤنڈ..."

"غالباً آپ ہزار کہنا چاہتی تھیں۔"

"میں سو ہزار کہنا چاہتی تھی‘ ایک لاکھ کہہ گئی۔ سوری" اس نے طنز آمیز شوخی سے کہا۔

میں نے منہ گول کر کے سیٹی بجائی "خاصی قیمتی چیز ہیں آپ۔ اغوا کرنے کے قابل۔"

"چوہدری صاحب مجھے اس سے بھی زیادہ سمجھتے ہیں۔ قتل کرنے کے قابل۔" وہ مسکرائی "اگر انہیں معلوم ہوا ہوگا۔ اگر کی کیا بات ہے‘ انہیں یقیناً علم ہوگا کہ اصل شکار تو ہاتھ سے نکل گیا۔ اب وہ اِدھراُدھر سے پوچھتے پھر رہے ہوں گے کہ میری پیاری بہن کہاں ہے۔ کوئی بتاؤ تاکہ میں اسے دنیا سے رخصت کرکے سرخ رو ہوجاؤں اور میرے لیے کوئی خطرہ نہ رہے۔ ابھی تک میں زندہ ہوں‘ اس کا مطلب یہی نکالا جاسکتا ہے کہ انہیں کامیابی نہیں ہوئی۔"

"اگر میں یہ سب سچ مان لوں۔"

"مت مانو۔ مجبور کس نے کیا ہے؟" وہ برہمی سے بولی۔

"اچھا فی الحال میں اخلاقاً مان لیتا ہوں۔ رسی کا کاٹا ہوا ہوں نا‘ سانپ کے سائے سے بھی ڈرتا ہوں۔ پہلے تصدیق کرلیتا ہوں کہ سانپ ہی ہے۔ پھر لاٹھی تلاش کرتا ہوں اور ترکیب سوچتا ہوں جس سے لاٹھی ٹوٹ جائے مگر سانپ نہ مرے۔"

وہ ہنسی "پہلی بار تم اپنے اصلی رنگ میں نظر آئے ہو۔"

"میرا اصلی رنگ! پہلے کیا میں جامنی‘ کاسنی نظر آرہا تھا؟ خیر یہ بتاؤ کہ بہن بھائیوں کے درمیان اس دشمنی کی کوئی معقول وجہ ہے؟ بھئی غلطی اگر کی تھی تو تم دونوں کے مشترکہ والد نے۔"

"اس صورتِ حال پر یوں غور فرمایئے کہ اگر میں دلاور کو قتل کرادوں..... میں خود تو پوسٹ مارٹم تک نہیں کرسکتی۔ تو مجھے صرف سزائے موت ملے گی۔ دلاور کے والی وارث ہیں‘ میرا کوئی نہیں چنانچہ دلاور کی جائیداد اور دولت کے ساتھ میرا سب کچھ بھی بالآخر انہی کا ہوجائے گا۔ اگر میں زندہ رہوں تو دلاور کے لیے مستقل خطرہ کہ میں اسے پکڑوا نہ دوں۔ وہ تو مجھے اور میری ماں کو اس لیے قتل کرنا چاہتا تھا کہ لندن کا مکان اسے مل جائے اور ایک لاکھ پاؤنڈ بھی۔ آخر اپنے باپ کا وہی تو ایک وارث ہے۔ کتنا فائدہ ہوگا اسے کہ لندن میں ایک مستقل ٹھکانا مل جائے اور اتنی بڑی رقم جس کے سود کی ماہانہ آمدنی ہی اخراجات کی کفالت کرسکتی ہے۔ مجھے لوحِ جہاں سے حرفِ مکرر کی طرح مٹانا بے حد ضروری ہے اور یہ کام وہ ضرور کرے گا۔"

"تمہیں کوئی ایسا ثبوت ملا کہ وہ تم کو تلاش کررہا ہے؟"

"ایک ثبوت تو میری ماں اور ایک لاوارث لڑکی کی قبر کی صورت میں موجود ہے" وہ بولی "حال ہی میں مجھے معلوم ہوا تھا کہ کچھ لوگ شیخ کے گھر گئے تھے اور اس سے میرے متعلق پوچھتے رہے تھے۔ انہوں نے خود کو اسکاٹ لینڈیارڈ کا نمائندہ ظاہر کیا تھا اور کہا تھا کہ کرامویل اسپتال کی ایک لیڈی ڈاکٹر کا کیس ہے جو اچانک غائب ہوگئی ہے۔ شیخ کو معلوم تھا کہ نہ میں غائب ہوئی ہوں اور نہ اسپتال والے اس قسم کی رپورٹ کرسکتے ہیں۔ اس نے بڑی اچھی اداکاری کی اور بہت افسوس کرتا رہا کہ خدا کرے وہ لڑکی خیریت سے ہو۔ وہ آتی رہتی تھی۔ بڑی پیاری لڑکی تھی۔"

"اتنا سچ ضرور بولا انہوں نے؟"

"ان کے جاتے ہی شیخ صاحب نے اسکاٹ لینڈیارڈ سے رابطہ کیا تو ثابت ہوگیا کہ وہ جعلی لوگ تھے" غزالہ نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ وہ خطرے میں ہیں۔"

"خطرے سے بچ کے وہ کہاں جاسکتے ہیں۔ ان کا دنیا میں کوئی ٹھکانا ہی نہیں۔"

"دوسری دنیا میں ہوسکتا ہے۔" میں نے کہا "وہی لوگ دوبارہ جائیں گے تو شیخ صاحب سے حقیقت اگلوالیں گے۔ ان کا سب سے بڑا قصور یہ ہے کہ وہ پہلے سفارت خانے میں تھے۔ سفارت خانے والے جسے چاہیں‘ کسی بھی نام سے کسی بھی سمت میں روانہ کرسکتے ہیں۔ ایک ریٹائرڈ آدمی کتنا دباؤ برداشت کرسکتا ہے؟ کیا مسٹر شیخ کو بھی معلوم ہے کہ تم نے کس نام سے اور کس راستے سے سفر کیا ہے؟"

"نہیں۔ یہ تو شیخ صاحب بھی نہیں جانتے" وہ افسردگی سے بولی "میں اپنے اصل پاسپورٹ پر لندن سے پیرس گئی اور ان دو شہروں کے درمیان آنا جانا اتنا ہی آسان ہے جتنا لاہور سے اسلام آباد آنا جانا۔ چیک پوسٹ پر صرف پاسپورٹ کی جھلک دیکھتے ہیں اور بس۔ میں کرائے کی گاڑی لے کر گئی تھی جو میں نے پیرس میں رینٹ اے کار والوں کے پاس جمع کرادی اور وہ بھی کسی اور کو بھیج کے۔ پھر میں نے اصلی پاسپورٹ چھپالیا اور دوسرے پاسپورٹ پر ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ وہیں سے فرینکفرٹ گئی۔ فرینکفرٹ میں پھر برٹش پاسپورٹ استعمال کیا اور ٹرین سے ویانا اور ترکی پہنچی۔ استنبول سے جعلی پاسپورٹ پر کراچی پہنچی۔"

"ایک منٹ۔ تمہارے سفرنامے میں گڑبڑ ہے۔" میں نے کہا "کہیں تم نے ایک پاسپورٹ استعمال کیا تو کہیں دوسرا۔ ویزا اسٹیمپ ایک پر لگی ہوگی‘ دوسرا استعمال کرتے وقت کسی نے اعتراض نہیں کیا کہ آپ یہاں کیسے موجود ہیں۔ اس پر تو اسٹیمپ ہی نہیں ہے۔"

"ان ملکوں میں ویزا اسٹیمپ ایئرپورٹ پر اترنے کے بعد لگائی جاتی ہے اور بہت سے یورپی ملک کے درمیان ویزا ہی نہیں ہے۔ ایک جگہ ایسا ہوا کہ امیگریشن سے گزر جانے کے بعد میں نے ایک پاسپورٹ بیگ میں ڈال لیا اور واپس گئی کچھ دیر بعد کہ آپ لوگ کیا کرتے ہیں‘ پاسپورٹ دیکھا اور مہر نہیں لگائی۔ مجھے ہوٹل سے واپس آنا پڑا۔ انہوں نے کہا کہ سوری میڈم‘ رش میں ایسا ہوگیا۔ اب اپنے چوہدری دلاور صاحب مجھے تلاش کرکے دکھائیں۔ میں وہیں پہنچی اور غائب ہوگئی۔ کرائے کی گاڑی جو میں نے لندن سے لی تھی‘ پیرس میں کسی اور نے جمع کرادی۔"

"ایسا تو جاسوس ہی کرسکتے ہیں۔ میری مراد سراغ رساں سے نہیں ہے۔ میں SPY ایجنٹوں کی بات کررہا تھا لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ تم نے نیکی کرنے والے کو دریا میں ڈال دیا۔ محاورہ تو یہ ہے کہ نیکی کر دریا میں ڈال۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ شیخ صاحب مارے گئے۔ وہ سچ بھی بولیں گے تو جھوٹ ثابت ہوگا اور..."

"یہ بدمعاشی اور لاقانونیت وہاں نہیں چلتی۔ چوہدری دلاور کیا چیز ہے۔ بڑے بڑے مافیا کے ایجنٹ ان کا بال بیکا نہیں کرسکتے جن کو قانون کا تحفظ حاصل ہوجائے۔"

"غزالہ تمہارا اصلی نام ہے؟"

وہ کچھ دیر تذبذب میں رہی "نہیں‘ یہ میرا نقلی نام ہے اور یہی وجہ ہے کہ ابھی میں نہ پریکٹس شروع کرسکتی ہوں اور نہ ملازمت۔"

"یہ نہیں بتاؤگی کہ لندن میں تمہارا کیا نام تھا؟"

"شیلا خان۔ شہلا تھا جو لکھتے وقت شیلا ہوگیا۔ اسپتال میں مجھے ڈاکٹر شیلی کہا جاتا تھا۔ اصل نام صرف ریکارڈ میں ہوگا۔"

"اب پورا نام کیا ہے؟"

"غزالہ سہگل۔" وہ بولی "پاسپورٹ پر یہی تھا۔"

"سہگل۔ تمہیں معلوم ہے......"

"مجھے معلوم ہے کہ یہ بہت بڑی فیملی کا نام ہے لیکن اس سے میں بھی معتبر ہوگئی ہوں" وہ بولی "اصل مسئلہ ہے میری ڈگریوں کا جن پر نام بدلا نہیں جاسکتا۔ تم کسی جعلساز کو جانتے ہو؟"

"جعلساز کو؟ لاحول ولا قوۃ۔"

"یار! یہاں سب کچھ ہوتا ہے۔ جعلی نوٹ تک چھپتے ہیں۔ کوئی میری اصل ڈگری میں صرف نام بدل دے۔ ذرا مہارت اور صفائی سے۔ تم تو ماہر ہو چہرے‘ نام اور مقام بدلنے کے۔"

"خاتون! آپ کو میرے بارے میں کیا معلوم ہے۔ اور جو کچھ معلوم ہے وہ کیسے معلوم ہوا ہے؟" میں نے جزبز ہوکے کہا۔

"تمہارے نام سے تعارف لندن میں ہی ہوگیا تھا۔ شیخ صاحب نے کچھ بتایا تھا۔ پھر پتا چلا کہ تمہارے اور چوہدری دلاور کے درمیان جنگ چھڑی ہوئی ہے تو خود مجھے دلچسپی ہوگئی اور میں نے تمہاری سرگرمیوں پر نظر رکھی۔ اخبارات دیکھتی رہی اور لوگوں سے سنتی رہی۔ کراچی میں ہفتہ بھر ایک ہوٹل میں قیام کرتی تھی پھر دوسرے ہوٹل میں چلی جاتی تھی۔ تین ہفتے بعد میں لاہور آگئی۔ یہاں دو تین ہوٹل بدلے۔ کبھی ایک پاسپورٹ‘ کبھی دوسرا۔ یہاں برٹش پاسپورٹ تو بڑی مقدس کتاب ہے۔ ہوٹل والے ایک جھلک دیکھتے ہی ریشہ خطمی ہوجاتے ہیں۔ میں نے دو ہفتے اسلام آباد میں گزارے‘ ایک ہفتہ پشاور میں رہی پھر واپس کراچی چلی گئی۔ آج کل لاہور میں اور اس وقت تمہارے سامنے ہوں۔ فلیٹیز میں ٹھہری ہوئی ہوں۔ اس تمام عرصے میں میرا زیادہ وقت چوہدری دلاور کے بارے میں معلومات حاصل کرتے اور تمہارے مشن کی تفصیلات جمع کرتے گزرا ہے۔ یوں سمجھ لو کہ تفریح ایک مقصد تھا‘ اپنے ملک کو دیکھنا دوسرا مقصد اور ریسرچ تیسرا مقصد۔"

"رائٹ۔ میں مانتا ہوں کہ بالآخر تم نے مجھے قائل کرلیا ہے۔"

"واقعی۔ یار‘ پھر ملاؤ ہاتھ" وہ خوش ہوکے بولی اور اس نے اپنا ہاتھ بڑی بے تکلفی سے میرے ہاتھ میں دے دیا "چلو اب اس خوشی میں کہیں اور چل کے ڈنر کرتے ہیں۔ میں تمہاری دعوت قبول کرتی ہوں۔"

میرا موڈ بالکل بدل چکا تھا۔ میں اعصابی اور ذہنی کشیدگی کے دباؤ سے نکل آیا تھا اور غزالہ کے خلاف شک اور بے یقینی کے اندیشوں سے بھی۔ میرا تجسس اچانک بیدار ہوگیا تھا اور میں یہ چاہتا تھا کہ غزالہ سے باقی سوالوں کے جواب بھی حاصل کرلوں جو ہنوز میرے ذہن میں کلبلا رہے تھے۔ ابھی میرے لیے سب سے

بڑی اُلجھن رفیق کا بیک وقت دلاور سے اور غزالہ سے تعلق تھا اور دوسرا اہم سوال یہ تھا کہ غزالہ آخر زیڈیو نقوی صاحب کے گھر کیسے پہنچی؟ نقوی صاحب تو واقعی بڑی توپ چیز تھے۔ انہوں نے مجھے اور دلاور کو کیسے اپنے گھر میں اکٹھا کیا۔ رفیق ان کا پی اے تھا اور غزالہ اسے اپنا خاص آدمی کہتی تھی جسے اس نے چوہدری دلاور کے پیچھے لگا رکھا تھا۔ میرے خلاف مقدمات کی فائلیں رفیق لایا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ فائلیں نقوی صاحب کے پاس تھیں۔ وزارتِ داخلہ کے ایڈیشنل سیکریٹری کے پاس ہر فائل پہنچ سکتی ہے۔ لیکن انہوں نے یہ فائلیں دلاور کو کیوں دکھائیں؟ اور وہ اتنی بڑی چیز ہیں تو پھر ایک معمولی ایس ایس پی نے مجھے کیسے گرفتار کر کے حوالات میں بند کر دیا؟

"کس سوچ میں پڑ گئے؟" غزالہ نے کہا۔

"میں... اپنی گاڑی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔" میں نے کہا۔

"گاڑی آ گئی ہو گی" وہ بولی "باہر چل کے دیکھو۔"

میں نے بل ادا کیا اور باہر آیا تو واقعی میری گاڑی بہت سی دوسری گاڑیوں کے درمیان اور غزالہ کی مرسیڈیز کے ساتھ موجود تھی۔

"اس کی چابی...." میں نے رفیق کی تلاش میں اِدھر اُدھر دیکھا۔

"یار‘ چابی تو تمہارے ہی پاس ہو گی؟" غزالہ ہنسی۔

میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ چابی میرے ہاتھ میں آ گئی۔ "یہ گاڑی یہاں کیسے آ گئی؟" میں نے اس کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا "مس غزالہ! مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں کسی شیطانی چکر میں پڑ گیا ہوں۔"

"پھر وہی بے اعتمادی" وہ میرے ساتھ بیٹھ گئی۔

"تم.... تمہاری گاڑی۔" میں نے کہا "وہ کیسے آئے گی؟"

"صاف کیوں نہیں کہتے کہ مجھے ساتھ بٹھاتے ہوئے ڈر رہے ہو"

میں نے سٹپٹا کے کہا "ڈر کس کا؟" میں نے دوسرا دروازہ کھول دیا۔

"رابعہ کا بھی نہیں؟" وہ آنچل سنبھال کر میرے ساتھ بیٹھ گئی۔

میں ہنسا "نہیں۔ آدمی جس سے محبت کرتا ہے اس سے ڈرتا نہیں۔ ڈرتا وہی ہے جو بے وفائی کا مرتکب ہو سکتا ہو۔ یا پھر جس سے وہ محبت کرے وہ شکی مزاج ہو۔"

"ہر عورت شکی مزاج ہوتی ہے اور حاسد۔"

"رابعہ نہیں ہے" میں نے یقین کے ساتھ کہا "وہ مجھ سے اختلاف کر سکتی ہے‘ مجھ سے لڑ سکتی ہے‘ روٹھ سکتی ہے مگر مجھ پر شک نہیں کر سکتی۔ کیا تمہیں یہ سن کے مایوسی ہوئی؟"

"ہاں۔ میرا خیال تھا کہ تم عاقل و بالغ ہو" وہ مسکرائی۔

"میں ایک ماہرِ نفسیات ڈاکٹر کی رائے کا احترام کرتے ہوئے خاموش احتجاج کرتا ہوں۔" میں نے کہا "اب کہاں چلیں؟"

"یار‘ دعوت تم نے دی ہے" وہ بولی۔

اس نے آپ سے تم اور تم سے یار پر آنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ غالباً دیارِ مغرب میں پرورش پا کے اس کا مزاج ایسا ہو گیا تھا بلکہ اس نظر سے دیکھا جاتا تو اس نے مغربی تہذیب کے اثرات کو بہت کم قبول کیا تھا۔ اس کے اطوار سو فیصد نہ سہی‘ نوے فیصد مشرقی تھے۔ اس کے باوجود میرا محتاط رہنا ضروری تھا۔ پہلی بار ملی کے عام لڑکی نہ اتنی باتیں کرتی ہے‘ نہ یوں بے تکلف ہو کے کسی اجنبی کے ساتھ آزادانہ گھومتی ہے اور نہ اسے اپنی داستانِ حیات کا ہر ورق کھول کے دکھاتی ہے۔ غزالہ کا مسئلہ قدرے مختلف تھا۔ غائبانہ طور پر وہ میرے بارے میں بہت پہلے سے سب کچھ جانتی تھی اور جو نہیں جانتی تھی وہ معلوم کر چکی تھی۔ اس کے نہ ماں باپ تھے‘ نہ سرپرست جو روک ٹوک کرتے اور وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی۔

مجھے یہ خیال بھی تھا کہ غالب اور نازو میرا انتظار کر رہے ہوں گے اور شاید منظر کے گھر میں رابعہ بھی میری منتظر ہو۔ اس کا شام کا رویّہ میرے لیے الجھن پیدا کر رہا تھا مگر آہستہ آہستہ میں سمجھنے لگا تھا کہ اس کے خفا ہونے کی وجہ کیا تھی۔ میں اپنی ہر غلطی پر اڑ جانے والا آدمی نہیں تھا۔ غلطی مجھ سے بارہا ہوئی اور کبھی مجھے غالب نے ٹوکا تو کبھی محسن نے۔ نازو‘ گل اور رابعہ۔ میرے لیے سب محترم تھے اور ان کے مشورے کو نظرانداز کرنا میرے لیے ممکن ہی نہیں تھا۔ ہم الگ الگ قالب رکھتے ہوئے بھی ایک جان تھے۔ ہماری عادات‘ ہمارے مزاج اور خیالات میں اتنی ہم آہنگی نہ ہوتی تو ہم اتنا عرصہ ساتھ نہ رہ پاتے۔ عیش اور خوشی کا ساتھی تو ہر ابن الوقت ہوتا ہے۔ آزمائش اور ابتلا میں حقِ رفاقت ادا کرنے والے صرف دوست ہو سکتے ہیں اور مجھے ناز تھا کہ جس دنیا میں لوگ ایک دوست نہ ہونے کی شکایت کرتے عمر گزار دیتے ہیں۔ (مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ۔ از سجاد حیدر یلدرم) وہاں میرے اتنے دوست ہیں۔

افسوس مجھے اس سبکی کا تھا جو میں نے رابعہ کے آفس میں اس کے ماتحتوں کے سامنے اُٹھائی۔ میرا وہاں جانا غلط سہی‘ رابعہ پر بھی لازم تھا کہ وہ معقولیت کے ساتھ یہ بات مجھے سمجھا دیتی کہ میں مصروف ہوں۔ اس کے چپراسی‘ چوکیدار اور ملازم نے جس طرح مجھے روکا اور میرے ساتھ جو ہتک آمیز سلوک روا رکھا‘ اس پر رابعہ کو انہیں روکنا چاہیے تھا بلکہ ڈانٹنا چاہیے تھا۔ اس نے تو ان کی حمایت کی جیسے میں واقعی کوئی جاہل اجنبی ہوں۔

اب میری جھنجلاہٹ اور خفت کے جذبات نغمے میں ڈھل رہے تھے اور غزالہ سے باتیں کر کے میں نسبتاً پرسکون ہو گیا تھا۔ ذہن کو سکون یوں بھی ملتا ہے کہ آدمی اپنے خیالات اور مصروفیات کی نئی جہت تلاش کرے۔ فلمی فارمولے کے مطابق تو دل شکستہ ہیرو شراب کا سہارا لیتا ہے یا کسی کوٹھے کی سیڑھیاں چڑھ جاتا ہے جہاں رقص و سرور اور شراب و شباب کی محفل آراستہ ہو۔ میں غزالہ کی باتوں میں اُلجھ گیا تھا اور اس وقت صورتِ حال یہ تھی کہ میں اس کے ساتھ "کلارڈز" میں دو گھنٹے باتوں میں گزار کے اسے اپنے ساتھ ڈنر کے لیے لے جا رہا تھا۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ غزالہ کی باتوں نے مجھے قائل کر لیا تھا مگر اس کی داستانِ حیات کو جھوٹا افسانہ بھی قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ یہ داستان اپنے چوہدری دلاور صاحب کے ذہن کی اختراع بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ جوڑ توڑ کا ماہر اور سازشی ذہانت میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا لیکن وہ افسانہ نویس‘ ناول نگار یا ڈراموں کا مصنف نہیں بن سکتا تھا۔ نگارانہ تخلیق کا اس کی ذہانت سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ غزالہ کی باتوں میں سچ خود بول رہا تھا اور اب تک اس نے جو کچھ بتایا تھا وہ تصدیق طلب نہیں لگتا تھا مگر میں اس کی تصدیق کر سکتا تھا۔ میری اور محسن کی زندگی کے چار ہنگامہ پرور سال لندن کی کوچہ گردی میں بسر ہوئے تھے اور میں چند منٹ کی جرح کے بعد ثابت کر سکتا تھا کہ لندن میں رہ کے تعلیم حاصل کرنے کا دعویٰ کس حد تک درست ہے۔ ایسے بہت ہیں جو لندن شہر کا نقشہ دیکھ کر اور اخبارات سامنے رکھ کر لندن کا سفرنامہ لکھ سکتے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو چند دن یا چند ہفتوں کے لیے لندن میں قیام کر کے دنیا کو بتاتے پھرتے ہیں کہ ان کی تو عمر وہیں گزری اور وہ لندن تو جاتے ہی رہتے ہیں۔

رابعہ کے لیے میں نے یہ سزا طے کی تھی کہ وہ انتظار کرے‘ اس اُمید میں بیٹھی رہے کہ میں آؤں گا اور اس سے پوچھوں گا کہ آخر یہ عتاب مجھ پر کس خطا کے بدلے نازل ہوا تھا۔ میں اسے مناؤں گا اور اس سے معافی مانگوں گا۔ غلطی میری ضرور تھی مگر اس نے میری دلآزاری کی اور میری بے عزتی کی۔ یہ غلطی نہیں‘ جرم ہے۔ وہ خود آئے اور مجھے سمجھائے کہ اس نے ایسا کیوں کیا تھا۔ اپنے رویّے پر شرمندہ ہو ورنہ یہ مسئلہ مجلس شوریٰ عرف فیڈرل چوکڑی کے سامنے رکھا جائے گا اور پھر جو فیصلہ پنچ کریں وہ ٹھیک۔

رابعہ کی طرف سے مطمئن ہو جانے کے بعد مجھے وقار یوسف کی فکر لاحق ہو گئی۔ بیوی نے اسے بتایا ہو گا کہ سکندر بھائی تو گاڑی لے کر کہیں گئے تھے مگر جاتے وقت کچھ بتا کے نہیں گئے تھے۔ اب انہیں ضرور تشویش ہو رہی ہو گی کہ بندہ گیا تو کدھر گیا۔ میرے سارے ٹھکانے وہ بھی جانتے تھے۔ رابعہ کے آفس سے تصدیق ہو گئی ہو گی کہ میں وہاں پہنچا تھا اور بقول علامہ صاحب۔ آ کے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے۔ رابعہ نے یہ بھی بتا دیا ہو گا کہ صاحب بہادر تو کسی سنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں والی حسینہ کی سیاہ مرسیڈیز میں بیٹھ کے روانہ ہو گئے تھے اور نہ جانے کون یوسف کی گاڑی کے پہیوں میں ہوا بھروا کے لا رہا تھا اور باری باری گاڑی میں لگا رہا تھا۔ پھر وہ گاڑی بھی لے گیا تھا۔ کہاں؟ یہ کسی کو معلوم نہیں ہو گا۔ ایک امکان کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا کہ رابعہ نے رفیق کا تعاقب کیا ہو یا کسی کو اس کے پیچھے بھیجا ہو کہ وقار یوسف کی گاڑی میں وہ کہاں جاتا ہے اور اسے رپورٹ مل گئی ہو کہ میں "کلارڈز" میں تشریف فرما ہوں۔

ایک جگہ گاڑی روک کے میں نے کہا "اجازت ہو تو میں ایک فون کر لوں؟ میرے لواحقین پریشان ہوں گے کہ میں کس دنیا میں ہوں۔"

غزالہ ہنسی "بتا دو کہ ابھی تک تو خیریت سے ہوں اور اپنی مرضی سے راضی خوشی اغوا ہو کے بقائمی ہوش و حواس ایک جھوٹی اور بے وقوف لڑکی کے ساتھ ڈنر کرنے جا رہا ہوں۔"

"یعنی حسین و جمیل نہ کہوں؟ بہت چالاک ہو تم بھی" میں نے اُترتے ہوئے کہا "جانتی ہو نا کہ میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔"

وہ پوسٹ آفس کے باہر میری گاڑی میں بیٹھی رہی اور میں نے اندر ایک وحشت زدہ ماحول میں بیٹھے ہوئے آدم بیزار شخص سے فون کرنے کی اجازت طلب کی۔ وہ خود فون پر کسی سے گفتگو میں مصروف تھا۔ اسے میری مداخلت گراں گزری۔

"بہت ضروری ہے فون کرنا؟" اس نے تیوری پر بل ڈال کے کہا۔

"نہیں۔ مگر میں آئین میں دیے گئے بنیادی حقوق کے تحت فون ضرور کروں گا۔" میں نے کہا۔

"اچھا صبر کرو۔ میں ضروری بات کر رہا ہوں۔"

"مجھے صبر کرنا نہیں آتا اور میرا بات کرنا زیادہ ضروری ہے۔"

"او بھائی! میری جان پر بنی ہوئی ہے۔"

"میری جان خطرے میں ہے۔ میرے قاتل گولیاں برساتے میرے تعاقب میں آ رہے ہیں۔ میں پولیس کو اطلاع دے کر فرار نہ ہوا تو وہ یہاں آ جائیں گے اور میرے ساتھ تمہارا بھی انتقالِ بے ملال ہو جائے گا۔"

بادل ناخواستہ اس نے ریسیور میرے حوالے کیا۔ اسے شک ہو گیا تھا کہ میں ٹیڑھی چیز ہوں۔

میں نے منظر کا نمبر ملانے کا سوچا اور پھر ارادہ بدل کے یوسف کے گھر فون کیا۔ ریسیور اس کی بیوی نے اٹھایا۔

"سکندر بھائی! حد کرتے ہیں آپ بھی۔ سب پریشان ہیں۔"

"اللہ نے ان کے مقدر میں پریشانی لکھی ہے تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں" میں نے کہا۔

"آخر آپ کہاں ہیں صبح سے؟"

پھر ریسیور غالب نے چھین لیا "تم شترِ بے مہار کی طرح کہاں پھر رہے ہو؟"

"اونٹ ہے صحرا میں اور بیرونِ صحرا کچھ نہیں۔" میں نے کہا

"مقامِ شکر ہے کہ میری مہار کسی کے ہاتھ میں نہیں۔"

"یار' کہاں سے بول رہے ہو؟" غالب جھنجلا کے بولا۔

"جہاں سے سب بولتے ہیں۔ اپنے منہ سے۔ فون صرف اس لیے کیا تھا کہ یہ ناچیز بدھو کچھ دیر بعد لوٹ کر گھر آئے گا۔ پریشان ہونا چاہو تو تمہاری مرضی" میں نے کہا۔

"تم رابعہ کے آفس گئے تھے؟"

"کوئی اور بات کرو" میں نے کہا "اس وقت میں کسی کے ساتھ ڈنر پر جارہا ہوں۔"

"زمان خان کے ساتھ سرکاری مہمان خانے؟"

"میرے ساتھ نیلی آنکھوں اور سنہرے بالوں والی ایک طرح دار حسینہ ہے۔ گلابی ساری اور۔۔"

"وکالی مرسیڈیز میں۔ دو گھنٹے سے تم اس کے ساتھ "لارڈز" میں گھسے ہوئے تھے۔ ہم وہیں سے تم کو لے آتے۔ سرکاری اعزاز کے ساتھ۔ پھر ٹھیک رہتا۔ کون ہے یہ لڑکی؟"

"ایک ڈاکٹر' نیورو فزیشن۔ میں شدید اعصابی اور ذہنی دباؤ کا شکار رہا ہوں۔ کچھ دن اس کے زیرِ علاج رہوں گا۔ رابعہ کو ضرور بتادینا اور تم بھی آیت الکرسی پڑھ کے میز پر سو جانا۔" میں نے کہا۔

"یار' بکواس مت کرو۔ ہم تمہارے ساتھ منظر کے گھر جانا چاہتے تھے۔ رابعہ اور تم دونوں پاگل ہو گئے ہو۔"

"ہم پہلے بھی پاگل تھے۔ آپ نے اس لیے نہیں پہچانا کہ پاگل کو صرف پاگل پہچان سکتا ہے۔ ولی را ولی شناسا۔ واپس آکے تم پر حیرت انگیز انکشافات کروں گا۔" میں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

باہر آتے ہی میرے ذہن کو ایک جھٹکا لگا۔ میں نے آنکھیں مل کے دیکھا مگر گاڑی غائب تھی۔ میں نے دائیں بائیں نگاہ ڈالی لیکن گاڑی ہوتی تو نظر آتی۔ میں نے اترتے ہوئے چابی گاڑی میں لگی چھوڑ دی تھی اور یہ میرے لیے ایک اور سبق تھا کہ اعتبار میں دھوکا بھی ہوجاتا ہے۔ گاڑی یوسف کی تھی اور پریشان کن بات یہ تھی کہ چوری کی رپورٹ لکھوانا بہت مشکل کام تھا۔ اس کے لئے مجھے غزالہ کے بارے میں بتانا پڑتا اور ظاہر ہے وہ سب ایف آئی آر میں نہیں لکھا جاسکتا تھا جو اس نے مجھے بتایا تھا۔

میں اپنے آپ سے خفا پیدل روانہ ہوا ہی تھا کہ گاڑی زدم سے میرے پاس آکے رک گئی۔

غزالہ نے دروازہ کھول کے کہا "تشریف رکھئے۔ گاڑی کے ہوتے ہوئے بھی آپ جوتیاں چٹخا رہے ہیں۔"

میں نے بھنا کے کہا "یہ کیا بیہودہ مذاق تھا؟"

"مقصد صرف یہ سمجھانا تھا کہ آپ کو احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ میرے جیسی کوئی دوسری لڑکی آپ کو لوٹ لے گی۔ طبعاً آپ حسن پرست اور خاصے دل پھینک لگتے ہیں۔"

"فضول باتیں مت کرو۔ میں ایسے الزامات مذاق میں بھی برداشت نہیں کرتا" میں نے برہمی سے کہا "اگر تمہارے دل میں بھی یہ خیال ہے کہ تم نے مجھے پھنسالیا ہے اور اپنے حسن و شباب سے میری عقل خبط کردی ہے تو ابھی وقت ہے' فوراً اس خیال کو دل سے نکال دو۔"

"ڈنر سے پہلے غصہ بھوک کو نقصان پہنچاتا ہے۔ تمہارا بلڈ پریشر کتنا رہتا ہے' کبھی چیک کیا تم نے؟ اور کولسٹرول کیا ہے؟ میرا مشورہ ہے کہ سال میں ایک بار سب ٹیسٹ کرالینے چاہئیں تاکہ اچانک کچھ نہ ہو۔ باہر سے آدمی ٹھیک ٹھاک لگتا ہے' اندر خرابی بڑھتی جاتی ہے۔ HDL کے علاوہ اپنے ٹوٹل LIPIDS اور LDL ......اور ہاں TRI-GLYCIRIDE بھی۔۔۔"

"وِل یو پلیز شٹ اپ!" میں نے چلّا کے کہا "میرا سب کچھ ٹھیک ہے۔ دماغ خراب ہے۔ اچانک مرجاؤں تو پوسٹ مارٹم رپورٹ میں بھی چیر پھاڑ کئے بغیر ہی لکھ دینا۔"

"اچھا اچھا' جیسی تمہاری مرضی۔ میں تمہیں کچھ دوائیں دوں گی۔"

"سنکھیا' نیلا تھوتھا اور سائنائڈ تو میں باقاعدگی سے کھاتا ہوں تینوں وقت۔" میں سمجھ گیا کہ وہ مجھے چڑا کے خوش ہو رہی ہے۔

"مچھلی۔ او مائی گاڈ۔ کیسی خوب صورت مچھلی لٹک رہی ہے۔ میں نے کب سے مچھلی نہیں کھائی" وہ بولی اور گاڑی کو عین مزنگ کی اس دُکان کے سامنے روک دیا جہاں لوگ بڑے شوق سے مچھلی کھانے آتے تھے۔

"مجھے الرجی ہے مچھلی سے" میں نے کہا "میں چینی کھانا کھاؤں گا اور چونکہ ڈنر میری طرف سے ہے اس لیے تم کو بھی کھانا پڑے گا۔"

"مجھے چینی کھانوں سے الرجی ہے۔ میں یہاں مچھلی کھاتی ہوں۔ پھر ہم چائنیز چلے جائیں گے۔ تم کھالینا کیکڑے اور مینڈک کا سوپ۔۔۔"

مجھے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ "اس جگہ کو دیکھو' یہ کوئی شریفانہ ماحول ہے؟"

"یار' ہم شریف ہیں' اتنا کافی ہے۔ ہم پر یہ ماحول اثرانداز نہیں ہوگا" اس نے فیصلہ کردیا۔

"کہیں سکون سے بیٹھ کے باتیں کرتے۔"

"میں بہت پُرسکون ہوں۔ تمہیں سکون اور دواؤں کی ضرورت ہے اور اس سے زیادہ ضرورت ہے ماحول کو بدلنے کی۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ تمہارا نروس سسٹم شدید دباؤ سے متاثر ہوا ہے۔ تم TENSE رہتے ہو۔"

میں نے ایک گہری سانس لی اور آرام سے بیٹھ گیا۔ "میں تم سے اختلاف نہیں کروں گا ڈاکٹر غزالہ لیکن مجھے ایک بات بتاؤ۔ آدمی اپنے ماحول کو کیسے بدل سکتا ہے؟"

"بدل سکتا ہے" اس نے کہا "لو یار' مچھلی کھاؤ۔ کیا خوشبو ہے"

میں نے مچھلی کی پلیٹ سنبھال لی "مجھے تم سے کچھ پوچھنا تھا۔"

"ضرور پوچھو۔ میں جواب نہیں دوں گی۔ میں خاموشی سے کھانے کی عادی ہوں۔ تمہیں بھی میرا یہی مشورہ ہے کہ کھانے کو انجوائے کرو' زہرمار مت کرو۔ پیٹ بھرنے کے لیے مت کھاؤ' مزہ لینے کے لیے کھاؤ۔"

مجھے اس کے جواب نے مشتعل نہیں کیا' اُلٹا میں نے محسوس کیا کہ وہ غلط نہیں کہہ رہی ہے۔ اس نے میری باتوں سے یا میرے رویّے سے میرے ذہنی مسائل کی بالکل صحیح تشخیص کرلی تھی اور اعصابی دباؤ کی TENSION کو بھی سمجھ لیا تھا۔ وہ ایک ماہر ڈاکٹر ہونے کا ثبوت دے رہی تھی۔

کھانے کے دوران اس نے نہ میری طرف دیکھا اور نہ ان لوگوں کی طرف جو اسے دیدے پھاڑ پھاڑ کے گھور رہے تھے۔ اس جیسی لڑکی بلاشبہ کہیں بھی جنسی محرومی کے مارے ہوئے جاہل مردوں کے ہوش اُڑا سکتی تھی۔ جب ہم وہاں سے رخصت ہوئے تو میں نے خاصا پُرسکون محسوس کیا۔

"بہت غلط جگہ کا انتخاب کیا تھا تم نے۔ مجھے سخت طیش آرہا تھا ان سب پر جو تمہیں گھور رہے تھے" میں نے کہا۔

"یار' کسی کے گھورنے سے میرا کیا جاتا ہے۔ کسی کا دل خوش ہوتا ہے مجھے دیکھ کر تو اس میں کیا برائی ہے" وہ ہنسی "بھئی' مصور اپنی تصویر کی نمائش کرتا ہے داد پانے کے لیے۔ سنگر گاتا ہے۔۔۔"

"چنانچہ تم اپنے حسن کی نمائش کرتی ہو۔ واٹ نان سنس۔"

"میں نمائش نہیں کرتی۔ لوگوں کو قابلِ رحم سمجھتے ہوئے معاف کردیتی ہوں۔ کیا تم نے دعوتوں میں نہیں دیکھا' بھوکے لوگ کیسے دیکھتے ہیں کھانے والوں کو۔ پلاؤ زردے' قورمے کی دیگوں کو اور چکن تکّوں کو۔ غریب بچے کیسے دیکھتے ہیں شوکیس میں سجے ہوئے رنگ برنگے کیکس کو اور ٹافیوں کو۔ کیا تم انہیں گناہ گار اور مجرم سمجھو گے؟"

"یہ عجیب منطق ہے؟"

"تم نے ساحر لدھیانوی کی نظم پڑھی ہے۔ اونچے ہوٹل کے درِ خاص پر ایستادہ ہیں۔ اجنبی دیس کے مضبوط گرانڈیل جواں۔ نظم تو لمبی ہے مگر اس میں کیا ہے۔ کہ بھوکے لوگ منتظر ہیں کہ بوٹ کی نوک سے پھینکے کوئی۔ کوئی ہڈی یا بوٹی' روٹی کا ٹکڑا۔ بڑی تلخی ہے اس کی "تلخیاں" میں ہم اس لیے فرسٹریشن کا شکار رہتے ہیں کہ ہم بے حس اور خود غرض بننے پر مجبور ہیں۔ ہمیں ایک احساسِ جرم پریشان کرتا ہے کہ جس ملک میں ایک وقت کی روٹی کے لیے انسان اپنی عزتِ نفس بیچتا ہو وہاں ہم کاروں میں گھومنے والے کتنی شان سے چرغے اُڑاتے پھرتے ہیں۔"

"خدا کے لیے یہ فلسفہ اور اپنے لیکچر بند کرو' پتا نہیں تم کیا چیز ہو؟" میں نے جھلّا کے کہا۔

"دیکھو تم پھر TENSION میں مبتلا ہو گئے۔ او کے۔ ہم چلتے ہیں' کہیں پُرسکون سی جگہ۔ دیکھ کے آئس کریم کھاتے ہیں۔ ایک جگہ ہے میری نظر میں۔ اتفاق سے دیکھ لی تھی ورنہ مجھے اس شہر کا کچھ پتا نہیں۔ مال سے انارکلی تک آجاسکتی ہوں ورنہ راستہ بھول جاتی ہوں۔ پھر کسی سے پوچھنا پڑتا ہے کہ میرا گھر کہاں ہے۔" وہ ہنسی۔

"تم بہت زیادہ بولتی ہو" میں نے کہا "غنیمت یہ ہے کہ غلط نہیں بولتیں اور جاہل نہیں ہو۔ صرف میڈیکل کی ڈگری لے کر یا ایم ایس سی اور ایم اے' پی ایچ ڈی کر کے بھی اکثر لوگ جہالت سے نہیں نکل پاتے۔ شاعری کے علاوہ تمہارے کیا شوق ہیں؟"

"یار' میں پڑھتی ہوں۔ جاسوسی ناول اور ڈراؤنے قصے۔ پرانی فلمیں بہت دیکھتی ہوں اور گانے بہت سنتی ہوں۔ کرکٹ میچ ہو تو سب کچھ چھوڑ دیتی ہوں۔ کلینک بھی بند کردوں اگر میرا بس چلے تو۔ ٹیسٹ میچ کبھی نہیں چھوڑا۔"

"بڑا غیر ڈاکٹرانہ رویّہ ہے۔"

"ہاں' ہے تو سہی" وہ بولی "یار' میں نے کبھی کسی چیز کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔ زندگی میں سیریس ہونے سے کچھ ملتا نہیں۔ سوائے دُکھوں کے۔ وہ کیا شعر ہے......"

"اے شمع تیری عمرِ حقیقی ہے ایک سال۔ رو کر گزار یا اسے ہنس کر گزار دے۔"

وہ بہت خوش ہوئی "یار' کمال کردیا تم نے تو۔ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں یہ شعر پڑھوں گی؟ خوب یاد آیا تمہیں۔"

"اس کے علاوہ کون سا شعر موزوں ہوتا" میں نے کہا۔

آئس کریم کی دُکان ایرمال پر گلوب سینما کے قریب تھی اور ایک سائڈ روڈ کے بنگلے میں کسی نے اپنے لان پر پلاسٹک کی رنگین میز کرسیاں ڈال دی تھیں۔ سرسبز لان کے چاروں طرف رنگین پھولوں کے حاشئے تھے۔ بہار کے آغاز کی رنگینیٔ لطافت اور خوشبو اس وقت خوابیدہ محسوس ہو رہی تھی۔ نفاست سی تراشی ہوئی جھاڑیوں میں چھپے ہوئے قمقمے بالکل جگنو لگتے تھے اور انہی سے ہر طرف نرم اجالا پھیل گیا تھا۔ تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر بیٹھے ہوئے لوگ سایوں کی طرح نظر آتے تھے اور اس قدرتی ماحول میں آسمان کی چھت کے نیچے اور کھلی ہوا میں سبزے پر بیٹھ کے بھی پرائیویسی یا خلوت برقرار رہتی تھی۔ انہی جھاڑیوں میں کہیں چھوٹے چھوٹے اسپیکر پوشیدہ تھے جو بڑی نرمی سے بیتھوون کی پانچویں سم فنی کے سُر بکھیر رہے تھے۔ مجھے افسوس ہوا کہ ایسی رومان پرور فضا آج تک میری نگاہوں سے اوجھل رہی تھی اور میں کبھی رابعہ کے ساتھ یہاں نہیں آیا تھا۔ لیکن رابعہ کے ساتھ مجھے لاہور میں سکون سے رہنا نصیب ہی کہاں ہوا تھا۔ کبھی دوڑ بھاگ اور افراتفری کی زندگی میں فرصت کے چند لمحے چُرا کے ہم ان بچوں کی طرح خوش ہولیتے تھے جو اسکول سے بھاگ کے میلے میں چلے

جائیں لیکن تفریح کرتے ہوئے بھی ڈرتے رہیں کہ کوئی انہیں دیکھ نہ لے۔

"ہم تو جناب نیچے تشریف رکھیں گے۔ واہ' کیا خوشبو ہے گھاس کی" وہ آلتی پالتی مار کے بیٹھ گئی۔

آخری گوشے میں ایک فیملی جس میں دو بچے بھی تھے' اسی طرح کرسیاں چھوڑ کے گھاس پر بیٹھی ہوئی تھی۔ بچے گھاس میں قلا بازیاں لگا رہے تھے۔

میں نے کہا "اگر اسی طرح سوتے میں کوئی تم پر بیٹھ جائے تو تمہیں کیسا لگے گا؟"

"کون بیٹھ جائے۔ مکھی' مچھر... شیر یا اونٹ؟"

میں نے کہا "آدمی باذوق ہے جس نے یہ جگہ بنائی۔"

"میں دو کپ کھاؤں گی۔ ایک ونیلا' ایک ٹوٹی فروٹی۔ تم جو چاہو کھاؤ' میرے سر کے علاوہ۔"

"ظاہر ہے میں یہاں تمہارے ساتھ ڈیٹ پر نہیں آیا ہوں۔ مجھے تم سے چار بنیادی نوعیت کے سوال پوچھنے ہیں۔"

"پہلے آئس کریم تو لے آؤ۔ سیلف سروس ہے یہاں۔"

میں نے اسے حیرانی سے دیکھا "یہ بھی معلوم ہے تمہیں؟"

"یار' تمہیں کوئی ویٹر نظر آرہا ہے۔ اور وہ دیکھو! ایک شریف آدمی خود لے کر جا رہا ہے آئس کریم کے کپ۔ تم چاہو تو اسے ویٹر کہہ کے آواز دو اور دیکھ لو کیا ہوتا ہے۔" وہ ہنسی۔

"تم ہنستی بھی بہت ہو۔"

"کہتے ہیں کہ جو اندر سے بہت دُکھی ہوتے ہیں وہ باہر اپنی شخصیت پر ہنسی کی نقاب ڈال لیتے ہیں" وہ بولی۔

"تم کو کیا دُکھ ہے؟"

"کوئی نہیں۔ یہ نظریہ غلط ہے۔" وہ بولی۔

میں آئس کریم کے تین کپ لا کے پھر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ یہ سب مجھے بہت عجیب لگ رہا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں اسی لڑکی کے بارے میں بڑے معاندانہ خیالات رکھتا تھا جو چوہدری دلاور کی سوتیلی بہن تھی۔ اس نے جس طرح مجھے ٹریپ کیا تھا اس سے میں بہت مشتعل تھا اور میں اس کی کوئی بات ماننے کے لیے تیار نہ تھا۔ میں نے انتہائی بدتہذیبی سے کام لیتے ہوئے اسے جھوٹا' فریبی' مکار' کٹھ پتلی اور پتا نہیں کیا کچھ کہا تھا مگر داد دینی پڑتی ہے اس کے حوصلے کی کہ وہ گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوئی اور بڑی ہوشیاری سے اس نے مجھے یوں قابو کر لیا جیسے شیر کو سدھانے والا کسی نووارد جنگلی شیر کو قابو کرتا ہے۔ اب میں اس کے ساتھ بیٹھا ہوا بہت پُرسکون محسوس کر رہا تھا اور اس نے میرا اعتماد ہی حاصل نہیں کر لیا تھا' بڑی جلدی بے تکلف دوستی کے وہ مراحل طے کر لیے تھے جو رابعہ نے مہینوں میں نہیں کیے تھے۔ رابعہ میں ایک باوقار سنجیدگی اور متانت تھی۔ غزالہ کی فطرت میں شوخی تھی اور لاابالی پن تھا حالانکہ ذہانت اور تعلیمی سطح پر وہ کسی طرح بھی رابعہ سے کم نہ تھی۔ فرق تھا تو عمر کا۔ رابعہ ایک شادی کے تلخ تجربے سے گزر چکی تھی اور اس نے پیشہ ورانہ مصروفیات کے علاوہ کسی چیز میں دلچسپی نہیں لی تھی۔ وہ دنیا میں تنہا تھی اور اس نے زندگی کی خوشیوں کو خود پر حرام کر رکھا تھا۔ مجھ سے ملنے کے بعد اس کی زندگی کا انداز بدلا تھا لیکن اس کی شخصیت کا پُرتلاطم ٹھہراؤ کسی سمندر جیسا ہی رہا تھا۔ غزالہ اس کے برعکس وہ پُرشور' تیز رو پہاڑی ندی تھی جو ہر موڑ پر کائنات کے حسن کو ساتھ لے کر چلتی ہو۔ اس نے غلط نہیں کہا تھا کہ اوپر سے ہروقت خوش اور ہنستے رہنے والے لوگ اپنے اندر کے آنسوؤں کو چھپاتے ہیں۔ غزالہ کی زندگی کی کہانی میں دُکھ ہی دُکھ تھے مگر اسے قدرت نے دفاعی کھیل کھیلنے کی صلاحیت عطا کی تھی۔ وہ مصلحت اور مصالحت کے ساتھ اپنا دامن بچا کے چلتی رہی اور اس نے اپنے لیے زندگی کی جو منزل متعین کر لی تھی وہ حاصل کرنے کی لگن میں ہنستے کھیلتے آگے بڑھتی گئی۔ رشتے اس کے لیے پہلے ہی بے معنی ہو گئے تھے مگر اس کا رشتوں پر اعتماد باقی رہا۔ اس کے مقابلے میں رابعہ نے ایک جارحانہ مگر قنوطی اندازِ فکر کو اپنا لیا اور اسے ہی تقدیر سمجھ لیا۔

مجھے تعجب بھی ہوا اور ندامت بھی ہوئی کہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔ مجھے رابعہ اور غزالہ میں مطابقت اور مخالفت کے پہلو تلاش کرنے اور ان کا مقابلہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں یہاں گپ لگانے' دل بہلانے یا آئس کریم کھانے کے لیے تو نہیں آیا تھا مگر عجیب بات یہ تھی کہ میں بالکل بے فکری سے گھاس پر بیٹھا آئس کریم کھا رہا تھا اور غزالہ کو بچوں کی طرح آئس کریم کھاتا ہوا دیکھ رہا تھا۔

"غزالہ! اس وقت تم کہاں ہو؟"

"کمال ہے۔ جہاں تم ہو یار۔ کون سی جگہ ہے یہ؟" وہ بولی۔

"لاحول ولا قوۃ۔ میرا مطلب تھا کہ تمہارا قیام کہاں ہے؟"

"ہوٹل میں۔ ہوٹل کی زندگی بڑی پُرلطف ہوتی ہے۔ کسی بات کی فکر نہیں۔ فون اٹھایا اور آرڈر دے دیا۔"

"تم زیڈیو نقوی صاحب کے گھر میں نہیں ہو؟"

"اب مجھے لاحول پڑھنی چاہیے۔"

"پھر تم رفیق کو کیسے جانتی ہو؟ تم نے اسے اپنا خاص آدمی قرار دیا تھا۔"

"بس یار۔ پیٹ بھر گیا" اس نے دوسرا کپ آدھا کھا کے رکھ دیا "کچھ مزہ بھی مختلف ہے آج۔ چلو چلیں۔"

"کہاں چلیں؟ تم میری بات کا جواب دینے سے گریز کر رہی ہو" میں نے اس کی کلائی پکڑ کے اسے بٹھا لیا۔

"مجھے دیر ہو رہی ہے۔"

"تمہیں پوچھنے والا کون ہے۔ ممی ڈیڈی ناراض ہوں گے۔ یہ بہانہ نہیں چلے گا۔" میں نے کہا "میں تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔"

"اچھا۔ پوچھو کیا پوچھنا ہے؟" اس نے ناگواری سے کہا۔

میں نے کہا "لندن میں خان بہادر کا قیام کہاں تھا؟ اس کی ...کان کہاں تھی اور وہ شیخ صاحب کہاں رہتے ہیں؟"

"پتے پوچھ رہے ہو نا.... لکھو" اس نے فرفر بولنا شروع کیا۔ اس سڑک سے ادھر۔ وہاں سے دائیں طرف۔ بس نمبر' گلی نمبر' مکان نمبر' انڈر گراؤنڈ ریلوے کا اسٹاپ۔ اس نے سب کچھ صحیح بتایا۔ میں نے اس سے اور بھی سوال کیے جن کا تعلق لندن کے ان واقعات سے تھا جو اس عرصے میں پیش آئے تھے اور مجھے یہ جان کے حیرت ہوئی کہ غزالہ نے تقریباً اسی زمانے میں نیورولوجی کی ڈگری لی تھی جب میں اور محسن بھی وہاں تھے۔

"باقی باتیں پھر" وہ اٹھ کھڑی ہوئی "جو کچھ میں نے بتایا ہے اس کی تصدیق کر لو پہلے.... پھر اور بھی باتیں ہوں گی۔"

میں نے کہا "چلو میں تمہیں ہوٹل چھوڑ دوں۔"

"نو تھینکس۔ میں چلی جاؤں گی۔"

"کیسے؟ اکیلی لڑکی کا یہاں سے فلیشیز تک ٹیکسی میں جانا ٹھیک نہیں۔" میں نے کہا۔

اس نے ہینڈ بیگ میں ہاتھ ڈالا "اس کی موجودگی میں مجھے کچھ نہیں ہو سکتا۔"

میں اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا خوب صورت کولٹ آٹومیٹک ریوالور دیکھ کے حیران رہ گیا۔ "اس کا لائسنس ہے تمہارے پاس؟"

"عزت یا جان بچانے کے لیے لائسنس کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ گاڑی ہے میرے پاس۔" وہ بولی۔

میں اس کے ساتھ باہر آیا تو سیاہ مرسیڈیز گیٹ سے کچھ فاصلے پر موجود تھی۔ "تمہاری گاڑی ہمارے تعاقب میں تھی؟"

"تھی تو کیا یہ غلط تھا.... میں اپنی حفاظت کے خیال سے کبھی غافل نہیں ہوتی" وہ بولی۔

"کیا تمہیں مجھ سے خطرہ تھا؟ مس غزالہ! تم خواہ مخواہ گیم کھیل رہی ہو میرے ساتھ" میں نے کہا "کیا ضرورت ہے اتنا پُراسرار بننے کی؟"

"کل میں خود رابطہ کروں گی تم سے۔" وہ گاڑی کی طرف بڑھی "آج رات یقیناً تم میرے بارے میں سوچتے رہو گے۔ تمہاری تسلی کے لیے ایک بات بتا دوں۔ تمہارے تعاقب میں نہ پولیس کے آدمی تھے اور نہ چوہدری دلاور کے۔ انہیں میری ہدایت پر رفیق نے تمہارے پیچھے لگایا تھا تاکہ مجھے معلوم رہے کہ تم سے کب اور کہاں ملاقات کرنا مناسب رہے گا۔"

میں نے اس کی گاڑی کے دروازے میں ٹانگ اڑا دی "یہ رفیق آخر تمہارا کیا لگتا ہے؟ کیوں وہ ڈبل ایجنٹ کا رول کر رہا ہے؟ چوہدری دلاور بھی اسے اپنا خاص آدمی کہتا ہے۔ کیا ملے گا اسے اپنی زندگی کو یوں داؤ پر لگا کے؟ یہ پاکستان ہے خاتون' ولایت نہیں۔"

"اچھا کیا تم نے بتا دیا۔ اب اپنی ٹانگ ہٹاؤ ورنہ......"

"ورنہ کیا؟ مس غزالہ! میں تمہارے ساتھ بیٹھ جاؤں گا۔ مجھے بتاؤ کہ رفیق نے تمہارے لیے یہ انتظامات کیسے کیے؟ گاڑی کس کی ہے؟ وہ پُراسرار ڈرائیور کون ہے جو کبھی غائب ہو جاتا ہے اور کبھی پھر گاڑی لے کر آ جاتا ہے؟ اور تعاقب کرنے والوں کی خدمات رفیق کو کہاں سے حاصل ہو گئیں؟ یہاں تو نہ پرائیویٹ سراغ رساں ہوتے ہیں اور نہ...."

اس نے چلا کے کہا "سب ہوتا ہے سب جگہ۔ اب تم ایسے نہ مانے تو میں شور مچا دوں گی۔ وہ دیکھو' سامنے چوک میں پولیس والا کھڑا ہوا ہے۔"

"ایسی کی تیسی پولیس کی۔ تم مچاؤ شور..."

وہ ایک دم چیخنے لگی "بدمعاش۔ کیا سمجھتے ہو تم خود کو۔ ہٹ جاؤ میرے راستے سے۔ پولیس.... پولیس!"

میں بوکھلا کے ایک دم پیچھے ہٹ گیا "پاگل مت بنو۔"

اس نے دروازہ بند کیا اور گاڑی ایک دم آگے بڑھ گئی۔ میرے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ وہ لڑکی مذاق میں اس حد تک بڑھ سکتی ہے اور اپنی دھمکی کو عملی جامہ بھی پہنا سکتی ہے۔ پولیس مین زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ بڑی تیزی سے میری طرف آیا۔ خفت' احساسِ ذلت اور غصے سے میں ہونٹ کاٹ رہا تھا اور سیاہ مرسیڈیز کی لائٹ کو رات کے اندھیرے میں دور' غائب ہوتا دیکھ رہا تھا۔

پولیس مین نے عادتاً بداخلاقی سے کہا "یہ کیا بدمعاشی ہو رہی تھی؟ کون تھی وہ عورت' کیوں چلا رہی تھی؟"

میں نے معصومیت سے کہا "کون سی عورت؟"

"وہ جو اس کالے رنگ کی گاڑی میں تھی۔ وہ پولیس کو آواز دے رہی تھی۔"

میں ہنس پڑا "جاؤ میاں اپنا کام کرو۔ اس کی گاڑی میں ریڈیو لگا ہوا تھا اور ڈراما نشر ہو رہا تھا۔"

"کیسا ڈراما...." وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا "تم کون ہو؟"

میں نے کہا "میں وقار یوسف ہوں۔ وکیل.... یہ میری گاڑی ہے۔ ابھی ابھی ہم یہاں سے نکلے تھے۔ تم چاہو تو چل کے پوچھ لو۔ وہ عورت میری مؤکل تھی۔ مؤکل سمجھتے ہو؟ میں اس کا مقدمہ لڑ رہا ہوں۔ اس نے اپنے شوہر کو قتل کر دیا تھا۔ وہ اسے فلمیں دیکھنے سے منع کرتا تھا۔ تمہارے ایس پی زمان صاحب کو پورا کیس معلوم ہے۔ کہو تو تھانے چل کے ان سے بات کرا دوں۔"

پولیس مین پریشان ہو گیا تھا "نہیں سر جی۔ وہ بس میں نے غلط سمجھا۔ ریڈیو پر ڈراما ہو رہا تھا۔ آپ نے تو بڑی عجیب بات بتائی وکیل صاحب۔ کیسا زمانہ آ گیا ہے۔ شوہر کو اتنی سی بات پر قتل کر دیا۔" اس نے کانوں کو ہاتھ لگایا اور واپس چوک پر جا کھڑا ہوا۔

میں اپنی کار میں بیٹھا اور واپس روانہ ہوگیا۔ غزالہ نے وقتی طور پر اپنی باتوں سے میرا اعتماد حاصل کرلیا تھا مگر چلتے چلتے اس نے پھر ایسی حرکت کی کہ میرا اعتبار ختم ہوگیا۔ وقت ہوتا تو میں فلیٹیز ہوٹل جاتا اور تصدیق کرتا کہ وہاں ڈاکٹر غزالہ سہگل یا شیلا خان نام کی خاتون کس کمرے میں قیام پذیر ہیں۔

رات کے گیارہ بجے میں وقار یوسف کے گھر پہنچا تو وہاں صورت حال خاصی ہنگامی تھی۔ انہیں معلوم ہوچکا تھا کہ میں رابعہ کے آفس گیا تھا لیکن رابعہ نے مجھ سے بات نہیں کی۔ اُلٹا مجھے بے عزت کرکے رخصت کردیا۔ اس کے بعد میں کسی اجنبی عورت کی سیاہ مرسیڈیز میں بیٹھ کے کہیں چلا گیا جو نیچے میرا انتظار کررہی تھی۔ رابعہ نے یوسف کی گاڑی ایک نامعلوم شخص کو لے جاتے دیکھا تو خود منظر کی گاڑی میں اس کا پیچھا کیا۔ منظر چند منٹ بعد ہی آگیا تھا۔ اس نے سیاہ مرسیڈیز کو لارڈز کے سامنے دیکھا اور واپس چلی گئی۔ منظر بہت مشتعل تھا اور بہت کچھ کرنا چاہتا تھا لیکن رابعہ نے اسے کچھ نہیں کرنے دیا۔ میرے پہنچنے سے پہلے ہی غالب کو منظر سے تمام تفصیلات حاصل ہوچکی تھیں اور وہاں سب بے چینی سے میری واپسی کے انتظار میں تھے۔

وقار یوسف تو میرا لحاظ کرنے پر مجبور تھا۔ اس نے صرف اتنا کہا کہ "مجھے تو اپنی گاڑی کی فکر ہوگئی تھی۔"

اس کی بیوی نے اسے ڈانٹا "گاڑی کہاں جاسکتی تھی؟"

نازو نے کہا "ہم تمہارے لیے پریشان تھے۔ کس کے ساتھ چلے گئے تھے آخر تم اور کہاں؟"

میں نے کہا "آپ لوگ باری باری اپنا غصہ اتارلیں۔ ایک ساتھ سب بولیں گے تو میرے لیے سب کو جواب دینا مشکل ہوجائے گا۔"

خلاف توقع غالب سنجیدہ تھا "مجھے حیرت ہے کہ تم پر کوئی اثر نہیں۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔"

میں اس کے سامنے بیٹھ گیا "کیا ہوا ہے آخر؟"

"تمہاری رابعہ کے ساتھ لڑائی ہوئی تھی؟" نازو نے کہا۔

"اسے لڑائی تو نہیں کہا جاسکتا۔ میں اس سے ملنے گیا تھا اور صرف یہی پوچھنا چاہتا تھا کہ گزشتہ رات وہ مجھے چھوڑ کے دلاور کے ساتھ کیوں چلی گئی تھی اور جانے کو وہ جہاں چاہے جائے' عاقل وبالغ اور خود مختار ہے لیکن بعد میں اس نے کسی سے بات کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا۔ منظر کے گھر چلی گئی اور وہاں سے کورٹ۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ اس نے ٹھیک کیا تھا؟ نازو! تم کو تعجب نہیں ہوا تھا؟ مرزا غالب! آپ کو حیرانی نہیں تھی؟ مجھے تو غصہ آرہا تھا لیکن میں اس کے آفس میں کوئی ہنگامہ کرنے نہیں گیا تھا۔ اتنی عقل تو ہے مجھ میں کہ کہاں کیسے بات کی جاتی ہے۔ تمہیں معلوم ہے اس نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا؟" میرا غصہ بھڑک اٹھا تھا۔

غالب نے سرہلایا "یوسف نے بتایا مجھے تو.... مجھے بھی یقین نہیں آیا۔ رابعہ کو کیا ہوگیا ہے؟"

"دماغ خراب ہوگیا ہے اس کا۔ اس نے مجھے بے عزت کرکے رخصت کردیا۔ کوئی بات کئے بغیر۔ کہنے لگی کہ میں آفس میں صرف کام کی بات کرتی ہوں۔ اُلو کی پٹھی۔ جیسے میں پہلی بار اس کے آفس گیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس آفس میں...."

غالب نے کہا "نازو! اس کے سر پر ٹھنڈا پانی ڈالو۔"

"نہیں۔ میرے حلق میں گرم چائے ڈالو" میں نے ایک گہری سانس لی۔

وقار یوسف نے بیوی کو اشارہ کیا مگر وہ اس سے پہلے ہی چائے لانے کے لیے روانہ ہوچکی تھی "سکندر صاحب! آج تو میرے ساتھ بھی بُری ہوئی۔ میں اس آفس میں سب سے سینئر ہوں۔ اور آپ جانتے ہیں کہ رابعہ باجی کی عدم موجودگی میں یہ آفس میں نے کیسے چلایا تھا۔ یقین کریں مجھے ہر وقت خطرہ رہتا تھا کہ کہیں ہاتھیوں کی لڑائی میں یہ ناچیز' مینڈک کی طرح نہ پس جائے۔ پھر میں دوستی میں احسان جتانا ذلالت سمجھتا ہوں۔ ہم سب دوست ہیں اور یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ مجھے اپنا سمجھتے ہیں اور مجھ پر اعتماد کرتے ہیں۔"

"رابعہ باجی نے آج اسے بُری طرح جھاڑا۔ بلکہ "ٹُل شٹ" کیا" غالب نے اس کے سر پر دستِ شفقت پھیرا "بہت اداس اور غمزدہ ہے بے چارہ۔"

"بات ہی ایسی ہے غالب۔ ایسی غیریت کے ساتھ انہوں نے کہا کہ مسٹر یوسف' یہ مت بھولو کہ تم میرے ماتحت ہو اور یہ دفتر میرا ہے۔ اپنے کام سے کام رکھو۔ میرے ذاتی معاملات میں دخل مت دو۔ سمجھے؟ میں تو صدمے سے سُن کھڑا رہ گیا۔ مگر انہوں نے کہا۔ اب جاؤ' میری صورت کیا دیکھ رہے ہو۔" میں نے سخت بے عزتی محسوس کی۔ میں باہر آکے بیٹھا تو مجھے سخت تشویش ہوگئی کہ آخر رابعہ باجی کو کیا ہوگیا ہے۔ ان کی طبیعت یقیناً ٹھیک نہیں تھی لیکن میری ہمت نہ پڑی کہ میں ڈاکٹر کو بلاؤں۔ ان کا تو نروس بریک ڈاؤن ہوگیا ہے۔ سکندر کے بعد میری شامت آئی تھی۔ پھر منظر صاحب سے بخ بخ ہوئی۔ وہ بھلا دبنے والے کہاں ہیں۔ انہوں نے تو صاف کہا کہ بی بی' ہوش میں رہو ورنہ میں ہاتھ ماردوں گا۔ اس کے بعد وہ روتی رہیں اور انہوں نے منظر صاحب سے کہا کہ مجھے اپنی گاڑی دو۔ میں گھر جاؤں گی۔ منظر صاحب نے مجھے حکم دیا کہ رابعہ کو گھر چھوڑ آؤ لیکن رابعہ باجی نے خود ہی انکار کردیا کہ مجھے کسی ڈرائیور یا محافظ کی ضرورت نہیں ہے۔ تم گاڑی نہیں دوگے تو میں ٹیکسی سے چلی جاؤں گی۔"

"ایک منٹ" میں نے کہا "کیا درمیان میں رابعہ باجی اٹھ کے باہر گئی تھیں؟"

"میرے سامنے تو صرف ایک بار گئی تھیں۔"

"تم نے اسے برآمدے میں دیکھا تھا۔ وہ رو رہی تھی؟"

یوسف نے نفی میں سرہلایا "جب آپ آئے تھے تو میں وہاں نہیں تھا۔ ایک کام سے گیا ہوا تھا لیکن میری عدم موجودگی میں جو کچھ ہوا اس کی رپورٹ مل گئی تھی مجھے۔ چوکیدار اور وہ دوسرا ...یں بھی پریشان تھے۔"

"خیر۔ پھر منظر نے گاڑی دی؟"

"ہاں۔ انہوں نے کہا کہ بی بی' مجھے تمہاری فکر نہیں' اپنی ...ڑی کی فکر ہے۔ ذرا ہوش میں رہ کے چلانا" یوسف بولا "انہوں ...نے کوئی جواب نہیں دیا اور چابی لے کر نیچے اُتر گئیں مگر پندرہ بیس ...ٹ میں واپس آگئیں۔"

"کیا تم نے نیچے اپنی گاڑی دیکھی تھی؟"

"نہیں۔ میری نظر ہی نہیں پڑی ورنہ میں اس کو ضرور پکڑلیتا ...نے ٹائروں کی ہوا نکالی تھی۔"

"اس کا نام رفیق ہے۔"

"منظر صاحب نے آفس بند کردیا اور سب کی چھٹی کردی کیونکہ رابعہ ...اسٹریا میں مبتلا تھیں۔ وہ زاروقطار رو رہی تھیں اور.... آپ ..."

"مجھے گالیاں دے رہی تھیں؟" میں نے تلخی سے کہا۔

"گالیاں تو نہیں۔ منظر سے کہہ رہی تھیں کہ.... اس مخص کی ...ں نے اپنی زندگی برباد کرلی' سب کچھ گنوادیا' ماں باپ' گھربار' ...ت شہرت۔ اور اسے احساس ہی نہیں۔ پھر انہوں نے بتایا کہ ...ہ کس کے ساتھ ہیں اور کہاں بیٹھے ہیں۔ منظر صاحب کا تو پارہ ...ھ گیا۔ چلانے لگے کہ روتی کیوں ہو احمق' جو تا بھی تمہارا ہوگا... ...سالا حرامی ہے تو ہم حرامیوں کے باپ ہیں۔ اس جیسے پندرہ پیدا ...کر چکے ہیں۔ وہ رابعہ باجی پر بھی بہت گرجے برسے کہ بی بی تم بھی کم ...نہیں ہو۔ عشق لڑالیا' سارے زمانے میں جھک ماری۔ نقصان ...اٹھایا' ذلت برداشت کی۔ نہیں کی تو بس شادی۔ جو کام سب سے ...ضروری تھا وہ آج تک نہیں کیا۔ یہ سب اسی کا نتیجہ ہے۔ خیر آنے ...دو اس اُلو کے پٹھے کو آج۔ رات بارہ بجے سے پہلے تمہارا نکاح گن ...پوائنٹ پر ہوگا۔ ہمت ہے تو میرے سامنے انکار کرکے دیکھے۔ ...اس کو توپ دم کردوں گا۔"

سنجیدہ موضوع ہونے کے باوجود یوسف کی بات نے مجھے بھی ...مسکرانے پر مجبور کردیا تھا "پھر رابعہ نے کہا کہ اچھا جی' جیسی آپ کی مرضی۔"

وقار یوسف نے نفی میں سرہلایا "رابعہ باجی نے کہا کہ منظر' تم کو میری قسم۔ اس سے کچھ مت کہنا۔ مجھے نہیں کرنی شادی کسی سے بھی۔ اس کے بعد منظر صاحب اسے گھر لے گئے تھے۔"

وقار یوسف کی سلیقہ شعار بیوی چائے اور کچھ خشک میوے ...ٹرے میں رکھ کے لے آئی "مجھے تو لگتا ہے رابعہ باجی کو کچھ ہوگیا ہے۔"

"مجھ کو تو لگتا ہے کہ اسے عشق ہوگیا ہے" یوسف بولا "میری طرح...."

"میں چائے سر پر ڈال دوں گی" وہ آنکھیں نکال کے بولی "رابعہ باجی پر کسی نے کچھ کردیا ہے۔"

"میں نے تو کچھ نہیں کیا۔ مجھ پر کیوں خفا ہورہی ہو۔"

غالب کی اور نازو کی شگفتگی غائب ہوچکی تھی۔ وہ اداس اور خاموش بڑے عجیب لگ رہے تھے۔

میں نے کہا "تم لوگ بلاوجہ پریشان ہو۔ ایسا ہوتا ہے یار۔ تین دن میں دماغ ٹھکانے آجائے گا۔"

نازو نے خفگی سے کہا "وہ ہم سے بات بھی نہیں کررہی ہے۔"

"نہ کرے۔ تم مجھ سے بات کرو۔ غالب سے لڑو" میں نے کہا۔

غالب نے سرہلایا "یار سکندر! تو اس معاملے کو سیریس نہیں سمجھ رہا ہے۔ میں اس کی ناراضگی سے ڈر رہا ہوں۔ اس مرتبہ کچھ اور بات ہے۔"

"بقول شاعر۔ یوں تو پہلے بھی ہوئے ان سے کئی بار جُدا۔ لیکن اب کے نظر آتے ہیں کچھ آثار جُدا۔"

"کوئی بات ہے تو آپ کو معلوم ہوگی" یوسف کی بیوی نے کہا۔

"میں آپ سب کو یقین دلاتا ہوں حضرات وخواتین کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے" میں نے چائے کا مگ اٹھا کے کہا۔

"ایک نیلی آنکھوں اور سنہرے بالوں والی بات ہے۔"

"بلیک مرسیڈیز کی بات ہے" نازو نے اس کی حمایت کی "کون تھی آخر وہ؟"

"میں نے ایک نیا عشق شروع کیا ہے لیڈیز۔ رابعہ سے عشق رہے گا لیکن عشق میں ورائٹی بھی تو ضروری ہے" میں نے کہا۔

یوسف کی بیوی اور نازو نے مجھے خوں آشام نظروں سے گھورا "دو پر کیوں اکتفا کرتے ہو؟ چار کرلو۔"

"کرلیں گے یہ بھی۔ ہم چاروں صوبوں کو مساوی نمائندگی دے سکتے ہیں یا ہر برِّاعظم سے ایک منتخب کرسکتے ہیں لیکن اس وقت ہم مزید بکواس نہیں فرماسکتے۔ کل بات کریں گے۔" میں نے منہ پھاڑ کے جماہی لی۔

"منظر دس بار فون کرچکا ہے" غالب نے کہا۔

"گیارھویں بار کرے تو اسے میری طرف سے گیارہ گالیاں دینا۔ ایسی کہ اس کا دل خوش ہوجائے" میں نے کہا "شب بخیر۔"

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت میں غزالہ کے بارے میں اور اس کی پُراسرار شخصیت کے بارے میں بحث کا آغاز کردیتا تو پنیڈورا بکس کھل جاتا اور ساری رات سوالوں میں گزر جاتی۔ میرا جواب کسی کو مطمئن نہ کرتا اور ہر شخص اپنے اندیشوں کا اظہار کرتا۔ میں آج کے دن کی ذہنی کوفت سے اتنا پریشان تھا کہ میری اوّلین خواہش پُرسکون نیند کی تھی۔ میں نے لیٹنے کے بعد بھی سوچنے سے

گریز کیا اور پریشان کرنے والے خیالات سے پیچھا چھڑا کے سونے میں کامیاب بھی ہوگیا۔

رابعہ کے بارے میں سب کو یقین تھا کہ اس کی مجھ سے لڑائی ہوئی ہے اور میں ہی اس کے جنون آمیز رویّے کا ذمے دار ہوں۔ میرے غیر سنجیدہ رویّے نے انہیں تھوڑا سا مطمئن کردیا کہ کوئی بات ہوئی ہے تو وہ سیریس نہیں ہے۔ چند دن میں سب ٹھیک ہوجائے گا۔ ایسی لڑائیاں سب کی سب سے ہوتی رہی تھیں۔ کبھی غالب کی گل سے، کبھی نازو کی غالب سے اور میری رابعہ سے۔ روٹھنا منانا تو پیار کے انداز اور آداب محبت کے نصاب میں شامل تھا۔ کوئی یہ سوچ ہی نہیں سکتا تھا کہ میں رابعہ کو اذیت پہنچانے کے لیے غزالہ کے ساتھ گیا تھا اور اس طرح میں رابعہ سے اس کے اہانت آمیز سلوک کا انتقام لینا چاہتا تھا۔ رابعہ کی زیادتی کا اعتراف سب نے کیا تھا لیکن سب کو یقین تھا کہ دو چار دن میں وہ معافی مانگ لے گی یا میں اسے منالوں گا۔ غزالہ کے بارے میں تجسس سب کو تھا لیکن میرے رویّے سے سب نے سمجھ لیا کہ یہ کوئی اہم مسئلہ نہیں ورنہ میں خود ہی ساری بات بتا دیتا۔

صبح میری آنکھ خلاف معمول جلدی کھل گئی۔ مجھے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر دیکھنے سے باہر اندھیرا نظر آیا۔ گھڑی میں اس وقت ساڑھے پانچ بجے تھے۔ نہ جانے کیسے مجھے رابعہ کے بجائے غزالہ کا خیال آیا اور مجھے گزشتہ شب کی ساری باتیں یاد آئیں۔ میں دبے پاؤں کچن تک گیا اور کوئی آواز کیے بغیر میں نے چولھا جلا کے اپنے لیے کافی بنائی۔

واپس اپنے کمرے میں آکے میں نے پہلے رابعہ کو فون کرنے کا سوچا پھر مجھے خیال آیا کہ میں تو اس سے خفا ہوں اور جب تک وہ خود اپنے رویّے پر پشیمان نہ ہو، میں اس سے بات نہیں کروں گا۔ میں نے ڈرائنگ روم میں جاکے فون اٹھایا اور انکوائری سے فلیٹیز ہوٹل کا نمبر مانگا۔ دروازہ بند کرکے میں نے فلیٹیز کا نمبر ملایا۔

"فلیٹیز سر۔ واٹ کین آئی ڈو فار یو۔"

میں نے کہا "ہوٹل میں ڈاکٹر غزالہ سہگل مقیم ہیں۔"

"غزالہ سہگل..... نو سر۔" کلرک نے چند سیکنڈ بعد کہا۔

"یہ کیسے ہوسکتا ہے" میں نے کہا "انہوں نے مجھے بتایا تھا۔"

"آئی ایم سوری سر۔"

"اچھا مس شیلا خان...؟" میں نے جلدی سے کہا۔

"جی..... وہ ہیں لیکن اس وقت..."

میں نے کہا "کوئی بات نہیں... ان سے کہو سکندر بخت صاحب کوئی بہت ضروری بات کریں گے۔"

"سوری سر۔ ان کی ہدایات ہیں کہ کسی کو کمرے کا نمبر نہ بتایا جائے، کسی ملاقاتی کو اجازت نہ دی جائے اور کوئی فون کال نہ ملائی جائے۔"

"لیکن... میری بات..."

"سوری سر۔ انہوں نے کہا تھا کہ گورنر کا فون بھی ہو تو نہیں" اس نے ریسیور رکھ دیا۔

میں نے دل ہی دل میں اسے گالی دی لیکن یہ خفت مٹانے کی فضول سی کوشش تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ فلیٹیز کوئی عام ہوٹل نہیں ہے اور وہاں خواص ہی قیام کرتے ہیں۔ ہوٹل کی انتظامیہ بھی مجبور ہے۔ میں اگر غزالہ کی مرضی کے بغیر اس سے ملنے کی کوشش کروں تو ہوٹل کی سیکیورٹی مجھے باہر پھینکنے سے بھی دریغ نہیں کرے گی۔

میں نے ریسیور رکھا ہی تھا کہ غالب خاموشی سے اندر آگیا "تو یہ حال ہوگیا ایک رات میں۔ ساری اکڑ فوں نکل گئی۔"

"اکڑ اپنی جگہ ہے اور فوں اپنی جگہ" میں نے کہا۔

"کیا رابعہ نے پھر انکار کردیا بات کرنے سے؟ صبح صبح بے عزتی ہوگئی اللہ کے حکم سے" غالب بولا۔

میں نے کہا "مرزا جی! اپنے چوہدری دلاور صاحب کا ایک بھائی تھا۔ تھا کیا' ہے۔ اب ایک بہن بھی پیدا ہوگئی ہے۔"

"مبارک باد دینی چاہیے چوہدری صاحب کو۔ نومولود کا نام کیا ہے خیر سے؟ زچہ بچہ خیریت سے ہیں نا؟" غالب نے کہا "یہ کافی کہاں سے آئی؟"

"کافی تو برازیل سے آئی تھی۔ یہ مشروب میں نے بقلم خود تیار کیا ہے۔ آپ شوق فرمانا چاہیں تو کچن ادھر ہے۔" میں نے کہا۔

"آپ ایثار سے کام لیں تو آدھی مجھے دے سکتے ہیں۔" وہ بولا۔

میں نے خالی مگ اسے پکڑا دیا "لے عیش کر۔ تیرے نصیب میں یہی ہے۔ بچا کھچا مانگ کے کھانا۔"

وہ کافی بنا کے لوٹا اور میرے سامنے بیٹھ گیا "یہ اپنے چوہدری دلاور کی بہن وہی ہے' نیلے بال' سنہری آنکھیں۔"

"بالکل وہی ہے" میں نے اسے سب بتادیا۔ وہ غور سے سنتا رہا۔

"معاملات اُلجھتے جارہے ہیں۔" غالب نے صورت حال کو سمجھنے کے بعد کہا "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ چوہدری دلاور کی بہن کہاں سے آٹپکی اور وہ بھی ایسے وقت میں جب ہم پہلے ہی حالات کے گرداب سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ اس سے صاف کہہ دینا تھا کہ بی بی' خدا کے لیے ہمیں تو معاف ہی رکھو۔ اپنی دشمنی کے معاملات اپنے بھیا سے طے کرلو' نہ ہمیں تمہاری مدد چاہیے' نہ ہم تمہاری مدد کرنے کی پوزیشن میں ہیں۔"

"یہی کہا تھا میں نے لیکن اس نے مجھے قائل کرلیا کہ اس سے تعاون میں فائدہ ہی ہوگا۔"

"کیسا فائدہ..... مالی فائدہ" غالب نے کہا "ایک لاکھ پاؤنڈ کا۔"

"یہ پہلو بھی قابل غور ہے۔" میں نے کہا "میرا ذہن اس طرف نہیں گیا تھا۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس کا خاص آدمی رفیق ہمارے لیے کیا کرسکتا ہے۔ رفیق پی اے ہے زیڈیو نقوی صاحب کا۔ رات کو میں یوسف کی بیوی کے سامنے یہ ذکر نہیں چھیڑ سکتا تھا۔"

"نقوی صاحب بڑی توپ چیز ہیں" غالب نے تنزیہ اور پُرتمسخر لہجے میں کہا "مجھے تو وہ بھنگیوں کی توپ لگتے ہیں جو محض نمائش کی چیز رہ گئی ہے۔"

"یار' میرے سارے مقدمات کی فائلیں اس کے پاس ہیں۔"

"اچھا! وہ چاہے تو مقدمات ختم کرا سکتا ہے۔"

میں نے نفی میں سرہلایا "قانون میں تو شاید اس کی گنجائش نہیں۔ لیکن ہیرا پھیری کی گنجائش کہاں نہیں ہوتی۔ فرض کرو وہ فائلیں غائب کردے۔ فائلوں میں سے بنیادی اہمیت کی حامل دستاویزات نکال دے جن سے مقدمے میں جان ہی نہ رہے۔ استغاثہ کا کیس کھوکھلا ہوجائے اور آخر میں شک کا فائدہ مجھے ملے۔"

"یار' نقوی صاحب چاہیں تو پولیس کو صرف اشارہ کردیں۔ پولیس والے ہر کیس دفن کرسکتے ہیں۔ گواہوں کو غائب کرنے یا منحرف کرا دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔" غالب نے کہا۔

"میں اسی لیے غزالہ سے پھر ملوں گا۔ اگر رفیق اس کا خاص آدمی ہے تو غزالہ اسے ہم سے ملوائے۔ ہم خود پوچھیں گے کہ نقوی صاحب کے دولت خانے پر دلاور کی اور میری ملاقات کرانے کا مقصد کیا تھا اور وہ فائلیں اب بھی وہیں ہیں تو کیا انہیں غائب کیا جاسکتا ہے؟"

غالب نے چٹکی بجائی "اگر وہ ڈرتا ہے تو ہمیں موقع فراہم کردے۔"

"ہم وہ فائلیں چوری کرائیں گے۔ ابھی تو یقیناً ہم دباؤ میں ہیں۔ وہ کیس پھر شروع ہوگئے تو مجھے روپوش ہونا پڑے گا۔" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "اگر فائلیں چوری ہوگئیں تو الزام نقوی صاحب پر آئے گا۔"

"یہ مت بھولو کہ وہ بڑی توپ چیز ہیں۔ بڑا افسر ہمیشہ بچ جاتا ہے' الزام آتا ہے نیچے والے پر۔ ممکن ہے رفیق معطل ہوجائے یا کسی عدالت کا کوئی اہلکار لیکن یہ بہت ضروری ہے مرزا جی۔"

غالب نے افسوس سے سرہلایا "مجھے ایسا لگتا ہے کہ چوہدری دلاور نے خطرے کو بھانپ لیا اور اکبر خان کو منع کردیا کہ وہ اخبار نکالنے کی حماقت نہ کرے۔ ایم آر ایس کے ہاتھ میں ایسا خطرناک ہتھیار دینا خودکشی ہوگی۔"

"تم نے کوئی اور فنانسر تلاش نہیں کیا؟"

"میں کوشش کررہا ہوں کہ چوہدری دلاور کے ایک سیاسی حریف سے رابطہ ہوجائے۔ مشکل یہ ہے کہ وہ پرانا سیاست داں ہونے کی وجہ سے بااصول اور وضعدار ہے۔ جمہوریت کی بقا کے لیے سیاست میں شرافت کا قائل ہے اور منفی ہتھکنڈے استعمال کرنا غلط سمجھتا ہے۔ پھر یہ کہ اس کے پاس محدود وسائل ہیں۔ اس کا اثاثہ ہے اس کی قربانیاں جو اس نے پاکستان کے لیے دیں۔ وہ خدمت جو اس نے مسلم لیگ کے جھنڈے تلے سرانجام دیں۔ اس کی جدوجہد اور ایک والہانہ عقیدت جو وہ قائداعظم کے لیے رکھتا ہے۔"

"اب کون پوچھتا ہے ایسے لوگوں کو۔ سیاست میں پیسہ چلتا ہے۔ دھن' دھاندلی اور دھونس نے اتحاد' تنظیم اور یقین کی جگہ لے لی ہے" میں نے آہ بھر کے کہا "خیر اللہ مُسبب الاسباب ہے۔"

"یار' یہ لڑکی غزالہ.... سہگل..." غالب کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"ڈاکٹر شیلا خان" میں نے اس کی تصحیح کی "آگے بولو۔"

"اگر وہ سچ مچ ہمارے ساتھ ہوجائے تو اخبار کے لیے سرمایہ بھی فراہم کرسکتی ہے" غالب نے خواب زدہ لہجے میں کہا "ایک لاکھ پاؤنڈ۔"

"شاہین کے بچے' اتنی پست کیوں ہوتی جارہی ہے تیری پرواز؟" میں نے کہا "تو حلوائی کی دُکان پر نانا جی کی فاتحہ کے بارے میں کیوں سوچتا ہے۔ ہم کیا مرگئے ہیں یار۔"

وہ شرمندہ ہوگیا "میں نے امکان کی بات کی تھی۔"

"مرزا جی! جوئندہ' پابندہ۔ فارسی میں کہتے ہیں کہ جو تلاش کرتا ہے وہ پالیتا ہے اور عربی میں کہتے ہیں کہ انسان کوشش کرے تو اسے سب مل جاتا ہے۔ آخر کتنا سرمایہ چاہیے ایک اخبار جاری کرنے کے لیے؟"

"جتنا ایک انڈسٹری لگانے کے لیے درکار ہوتا ہے۔ انڈسٹری چھوٹی ہو تب بھی لاکھوں کا کھیل ہے۔ بلکہ جُوا ہے۔ اخبار چلے نہ چلے' اس کی گارنٹی کون دے سکتا ہے؟" وہ بولا۔

"گارنٹی میں دے سکتا ہوں کہ جس اخبار کا ایڈیٹر انچیف ہو مرزا غالب اور پرنٹر' پبلشر ہوں ایم آر ایس۔ وہ سب کا دھڑن تختہ کرسکتا ہے۔" میں نے کہا "اب رہی سرمائے کی بات تو پیارے' اپنا ایک گھر ہے جس کا میں بلاشرکتِ غیرے مالک ہوں۔"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا" غالب نے کہا "کتنی خواہش اور کوشش سے تو نے اپنے والد کی ایک نشانی پھر حاصل کی ہے۔ تو اسے بیچنے کی بات کررہا ہے؟"

"پیارے' یہ اینٹ پتھروں کے گھر کیا انسانوں سے زیادہ اہم ہوتے ہیں" میں نے کہا "یہ تو مظہر ہوتے ہیں انسانی خواہشات کے اور خواہشات کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ جھگی یا جھونپڑی سے لوگ کوٹھیوں میں پہنچ جاتے ہیں تو محلوں کے خواب دیکھنے لگتے ہیں۔ کچھ صرف خواب دیکھتے ہیں۔ کچھ تعبیر بھی تلاش کرلیتے ہیں۔"

"یہ گھر بھی تیرے والد کے خوابوں کی تعبیر تھا۔"

"ان کے خوابوں کی تعبیر یہ ملک تھا اور میں تھا' میرا مستقبل

تھا" میں نے کہا "میں اس خواب پر قناعت نہیں کرسکتا جو میرے والد نے دیکھا تھا۔ میں بہت آگے ہوں۔ میں اپنی خواہشات کی پرواز کو محدود کرلوں گا تو وقت کے حصار کا قیدی بن جاؤں گا۔ مجھے اپنے ماضی کے مزاروں کا مجاور بننا منظور نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے بعد اگلی نسل ستاروں پر کمند ڈالے۔ مجھ میں اتنی ہمت ہے مرزا جی کہ میں اس گھر کو بیچ دوں اور پھر خرید لوں۔ اس جیسے دس محل بنالوں۔ ہر محل بالآخر آثار قدیمہ بن جاتا ہے ویسے بھی۔"

"میں افسوس کے ساتھ اس تجویز کو مسترد کرتا ہوں لیکن اس بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ وسائل تلاش کئے جاسکتے ہیں۔ میں نے نازو سے بات کی تھی۔"

"غالب! ایک نہ ایک دن میرا حق مجھے ملے گا۔ میں چوہدری دلاور سے ایک ایک پیسہ وصول کرلوں گا جو اس نے وزیر خان سے چھینا تھا لیکن اس سے پہلے بھی ہم مل کے سرمایہ فراہم کرسکتے ہیں۔ رابعہ، منظر، وقار یوسف، ہمیں اُدھار دے سکتے ہیں، اُدھار دلوا سکتے ہیں۔ کسی بینک سے لون منظور کروانا نقوی صاحب کے لیے کیا مشکل ہے۔ ہم پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کی طرح کمپنی بنا کے پبلک کو شیئرز فروخت کرسکتے ہیں۔ ہمارے اثاثے تو کم نہیں۔ میرا گھر ہے، رابعہ اور منظر کا گھر ہے۔ کیا یہ ضمانت کافی نہیں؟"

غالب کا چہرہ پُرامید ہوگیا "یو آر ویری رائٹ۔ اس طرح تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ چلو رابعہ سے بات کرتے ہیں۔"

"ہرگز نہیں۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ اپنے طرزِ عمل پر ندامت کا اظہار کرے گی تو بات بنے گی۔"

"ورنہ کیا ہوگا؟ کب تک روٹھے رہو گے تم لوگ؟"

"جب تک خدا ہمیں عقل نہیں دیتا اور کسی ایک کا دماغ درست نہیں ہوجاتا۔ زیادہ امید یہی ہے کہ یہ ناچیز گھٹنے ٹیک دے گا لیکن ابھی نہیں یار، ایسے تو دماغ خراب ہوجاتا ہے لڑکیوں کا۔"

"بکواس مت کر۔ ابھی وقت ہے۔ سب سو رہے ہیں۔ رابعہ بھی سو رہی ہوگی۔ ہم جا کے جگاتے ہیں" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "دو چار دن ٹھہر جا یار۔"

"کل وہ شفٹ ہوجائے گی اپنے اس محل میں جو چوہدری دلاور نے چاندنی بیگم کو بنوا کے دیا تھا۔ دلاور نے غیر مشروط طور پر اس کا قبضہ دے دیا ہے۔"

"وہاں وہ کیسے رہے گی اکیلی...."

"چل کے اس سے پوچھ لیتے ہیں۔ منظر کی موجودگی میں بات کرنے سے فائدہ یہ ہوگا کہ نہ آپ کے لیے ناک کا مسئلہ ہوگا نہ رابعہ کے لیے۔ منظر تم دونوں کی ناک پکڑ کے لکیریں نکلوا سکتا ہے۔"

"یہ تو ہے" میں نے کہا۔

اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ غالب نے ریسیور اٹھایا اور پھر مجھے تھما دیا "آپ سے بات کرنا چاہتا ہے کوئی۔"

میں نے ریسیور لے لیا "ہیلو!"

غزالہ کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز نے کہا "ہیلو یار۔ تم نے فون کیا تھا؟"

"جی۔ لیکن آپ کا نادر شاہی فرمان تھا...."

وہ ہنس پڑی "سوری یار۔ مجبوری ہے۔ میں زیادہ سے زیادہ گمنام اور روپوش رہنا چاہتی ہوں۔ مجھے پیغام مل گیا تھا تمہارا۔"

"تمہیں صبح صبح اٹھنے کی عادت ہے؟"

"ابھی میں اٹھی کہاں ہوں۔ بیڈ ٹی پیئوں گی پھر اخبار دیکھوں گی۔"

"سب رئیسانہ چونچلے ہیں۔"

"جلدی اٹھ کے کیا کروں۔ وہاں تو اسپتال پہنچنا ہوتا تھا اور فاصلہ بھی کافی تھا۔ یہاں بے کاری ہے اور پھر پاکستان آ کے وقت کی بہت گڑبڑ ہوگئی تھی۔ پانچ گھنٹے کا فرق بڑی مشکل سے ایڈجسٹ ہوا ہے۔"

"میرا نمبر کہاں سے ملا تمہیں؟"

وہ ہنسنے لگی "کیا تمہارا بھی کوئی نمبر ہے۔ یہ تو وقار یوسف کے گھر کا فون نمبر ہے۔ پہلے میں نے منظر ایڈووکیٹ کے گھر فون کیا تھا۔ میرے پاس سارے نمبر ہیں یار۔"

"منظر سے کیا بات ہوئی؟"

"کچھ نہیں۔ فون رابعہ نے اٹھایا تھا۔"

"پھر.... تم نے کیا کہا؟"

"میں نے کہا کہ یار ناراض مت ہونا۔ کل میں تمہارے سکندر کو ورغلا کے لے گئی تھی لیکن بُری نیّت سے نہیں۔ میرا اس پر غاصبانہ قبضہ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا اور نہ ہے۔ ویسے تمہارا بوائے فرینڈ ہے دل پھینک قسم کا۔"

"اُف۔ یہ سب بک دیا تم نے! تم تو پاگل ہو" میں نے چلّا کر کہا۔

"کیوں، بلاوجہ کوئی غلط فہمی پیدا ہوجاتی تمہارے درمیان۔ میں نے اپنی صفائی پیش کردی۔" وہ بگڑ کے بولی "اور اسے بھی ایک بات سمجھادی تاکہ وہ بھی محتاط رہے۔ تم دونوں کے حق میں اچھا کیا میں نے۔"

"خاک اچھا کیا۔ کیا ضرورت تھی تمہیں فون کرنے کی آخر؟ اور فون کیا تھا مجھ سے بات کرنے کے لیے تو.... خیر اور کیا بات ہوئی؟" میں نے دانت پیس کے کہا "رابعہ نے کیا کہا؟"

"کچھ نہیں۔ بس یہ پوچھ لیا تھا کہ سکندر کو کب سے جانتی ہو، کیا کام تھا اس سے، کہاں گئے تھے تم لوگ۔ میں نے بتادیا کہ ملاقات آج پہلی بار ہوئی تھی اور کام کیا... کچھ پرائیویٹ باتیں کرنی تھیں۔ ہم لارڈز میں بیٹھے رہے پھر سکندر نے مجھے ڈنر پر مدعو کیا۔ یار، میں اسے آئس کریم کھلانے لے گئی۔ بڑا اچھا وقت گزرا۔ ہی از اے ونڈر فل مین۔ تم بہت لکی ہو۔"

"بیڑا غرق کردیا میرا۔ خدا تم سے سمجھے۔"

"یار، کوئی غلط بات تو نہیں کی میں نے۔ کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ تم بلاوجہ بگڑ رہے ہو۔ وہ کہنے لگی کہ سکندر تو یہاں نہیں آیا۔ میں نے پھر وضاحت کردی کہ دیکھو، غلط مت سمجھنا۔ وہ میرے ساتھ نہیں رہا رات بھر۔ گیارہ بجے میں نے اسے چھوڑ دیا تھا۔ وہ اپنی گاڑی میں چلا گیا تھا اور میں گئی تو اس کے ساتھ تھی لیکن پھر میری گاڑی آگئی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ یہ تو بڑی رومانٹک جگہ ہے۔ میں کبھی رابعہ کے ساتھ یہاں نہیں آیا جہاں ہم نے آئس کریم کھائی تھی۔"

"اُلّو کی پٹھی....." میں نے دھڑ سے ریسیور رکھ دیا "اتنا بولتی ہے، اوپر سے دعویٰ ہے کہ میں نے کیا غلط کیا، کون سا جھوٹ بولا۔ سچ بولے بغیر کیا کھانا ہضم نہیں ہو رہا تھا۔"

غالب ہنسنے لگا "آخر ہے نا چوہدری دلاور کی بہن۔ خانہ خرابی کے اسباب تو پیدا کرے گی۔"

گھنٹی پھر بجی "یار، آئی ایم سوری۔ رئیلی سوری۔ تم نہ جانے کیا سمجھ رہے ہو۔"

میں نے کہا "میں سب سمجھ رہا ہوں۔"

"نہیں۔ تم بہت غصے میں ہو۔ پلیز مجھے معاف کردو ورنہ میں رونے لگی تو یہاں کوئی چپ کرانے والا بھی نہیں ہے۔" غزالہ نے پھر کہنا شروع کیا "کل ایک بات بتانا بھول گئی تھی میں۔ آج میں لندن جا رہی ہوں۔"

"واپس تو نہیں آؤ گی نا؟"

وہ ہنسی "یہاں کی مٹی میرے نصیب میں ہوگی تو خود کھینچ لے گی۔ میں بھی نہیں چاہتی کہ چوہدری دلاور مجھے لندن میں قتل کرے۔"

"یہاں بھی تم شہید نہیں کہلاؤ گی۔"

"دراصل مجھے وہاں اپنے معاملات نمٹانے ہیں۔ میں نے اپنے اٹارنی سے فون پر بات کی تھی۔ اس نے بتایا کہ مکان کا سودا بھی ہوگیا ہے اور میرے واپس آتے ہی فائنل ہوجائے گا۔ اپنی رقم یہاں منتقل کرنا ہوگی۔ اس کے لیے بھی شیخ صاحب نے کوئی چکر چلایا ہے۔ ڈائریکٹ ٹرانسفر تو ممکن نہیں تھا۔ کمیشن کی بنیاد پر کسی سے بات ہوئی ہے۔ کچھ لوگ کرنسی کو اِدھر سے اُدھر کرتے ہیں۔ پاؤنڈ یہاں مہنگا بک جاتا ہے۔ سرکاری شرح سے زیادہ ہی یہاں نقد مل جائیں گے۔ میرا خیال ہے کہ تین چار دن تو لگ ہی جائیں گے۔ آج کیا دن ہے؟"

"اتوار۔ کب تک واپسی ہوگی؟"

"یار، اگلے اتوار کو ملاقات ہوگی۔ اگر اس سے پہلے نہ ہوئی۔ وہ جو کل مچھلی کھائی تھی نا، اس سے الرجی ہوگئی ہے غالباً۔ یا شاید میں زیادہ کھا گئی تھی۔ خیر شام تک ٹھیک ہوجاؤں گی۔ فلائٹ تو رات کی ہے۔ تم ابھی تک غصے میں ہو؟"

"نہیں۔ اس وقت غصہ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ جب تم واپس آؤ گی تو بتاؤں گا۔"

"یار، تم ذرا ذرا سی بات پر TENSE کیوں ہوجاتے ہو؟ ایزی رہا کرو۔ غم کو ایک قہقہے میں اُڑا دو۔ غصے کو حرام کیوں قرار دیا گیا ہے؟ یہ شراب کی طرح آدمی کی عقل کو..."

"شروع ہوگیا تمہارا لیکچر....." میں نے بھنا کے کہا۔

"تمہیں کچھ TRANQUALISERS لینے چاہئیں۔ یا پھر تبدیلی کے لیے کہیں جانا چاہیے ورنہ تمہاری اعصابی کشیدگی تمہارے ذہن پر ہی نہیں، جسم پر بھی اثرانداز ہوگی۔ یار، تم ایسا کیوں نہیں کرتے.... میرے ساتھ چلو۔"

"کیا! تمہارے ساتھ لندن چلوں؟"

"ہاں۔ کیا حرج ہے۔ ایک ہفتے ہی کی تو بات ہے۔"

"ڈاکٹر غزالہ! کیا آپ کو معلوم نہیں کہ مجھے برطانوی حکومت نے ناپسندیدہ قرار دے کر ڈی پورٹ کیا تھا؟" میں نے کہا۔

"یار، پھر کیا ہوا۔ تم پیرس میں رک سکتے ہو۔ بلکہ انگلش چینل کے اِدھر میں، اُدھر تم۔ میں دن بھر اپنا کام نمٹاؤں، تم پیرس کی سیر کرو۔ شام کو میں آجاؤں گی۔"

"سوری۔ میں یہ نہیں کرسکتا۔"

"دیکھو، مجھے ایک پارٹنر سے زیادہ ایک محافظ کی ضرورت ہے۔ تمہیں کون سی تیاری کرنی ہے۔ پاسپورٹ تو ہے نا تمہارے پاس۔ ویزا لگوانا میری ذمے داری۔"

"میں نے کہا نا کہ یہ ناممکن ہے۔"

"یار، تمہاری خاطر میں روانگی دو دن کے لیے ملتوی بھی کرسکتی ہوں۔ اِٹ وِل بی گڈ فار یو۔ آئی کین بیٹ۔" (میں شرط لگا سکتی ہوں کہ تمہیں فائدہ ہوگا)

میں نے عاجز آ کے کہا "سنو مس غزالہ......"

"ڈونٹ کال می غزالہ۔ یہ تو فرضی نام ہے یار" اس نے مجھے ٹوک دیا "میں شیلا خان ہوں۔ تم شیلی کہہ سکتے ہو۔"

"اوکے شیلی۔ اب میری عرض بھی سن لو۔ میں رفیق سے ملنا چاہتا ہوں، آج ہی۔"

"تو ملو یار۔ کس نے منع کیا ہے۔ مجھ سے اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے" وہ بولی۔

"یہ کیا بری عادت ہے تمہیں یار یار کہنے کی؟"

"اس میں کیا برائی ہے؟ تم واقعی ایک قنوطی، تنگ نظر اور ایڈیٹ ہو۔ معاف کرنا، مجھے منافقت نہیں آتی۔ میرا خیال ہے کہ تم ایسے تھے نہیں لیکن تم کو حالات نے آدمی سے گھن چکر بنادیا ہے۔ کیا تم شروع سے ایسے ہی تھے؟ لکیر کے فقیر۔ ہر وقت ذہنی انتشار کا شکار رہنے والے اور مُردہ دل۔"

مجھے اس کی بات نے سوچنے پر مجبور کردیا۔ کیا واقعی میں ایسا ہوگیا ہوں؟ شیلی جھوٹ کیوں بولے گی۔ اس نے جو محسوس کیا وہ

کہہ دیا۔ جب میں اور محسن لندن میں تھے تو شوخی اور زندہ دلی میں مشہور تھے۔ ایڈونچر کی خاطر معاشقے لڑاتے پھرتے تھے اور زندگی فضا میں اُڑنے والا رنگین غبارہ تھی' کسی ڈور سے بندھی ہوئی پتنگ نہیں۔ اب محسن میرے ساتھ نہیں تھا' رابعہ مجھ سے خفا تھی اور میں عہد کرچکا تھا کہ چند دن اس سے نہیں ملوں گا۔ اس نے مجھے شیلی کے ساتھ جاتے دیکھ لیا تھا اور خود شیلی نے رہی سہی کسر یہ بتا کے پوری کردی تھی کہ ہم کہاں گئے تھے اور کیا کررہے تھے۔ رابعہ کے لیے سب سے مناسب سزا یہی ہے۔ اس نے مجھے ذہنی اذیت میں مبتلا کیا' میں بھی اسے ایک شاک تو دے سکتا ہوں۔

اچانک میں نے فیصلہ کرلیا "اچھا شیلی' فرض کرو میں تمہارے ساتھ جانا چاہوں؟"

اس نے ایک چیخ ماری اور لبوں سے ایک آواز پیدا کی جو واضح طور پر بوسے کی آواز تھی مگر میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میرے سامنے بیٹھے ہوئے غالب نے کچھ نہیں سنا "اوہ یو آر سچ اے ڈارلنگ۔ مجھے پتا تھا' تم مان جاؤ گے۔"

میں نے کہا "جانے سے پہلے تم میری ملاقات رفیق سے کراؤگی؟"

"کیوں نہیں۔ تم بولو اسے کہاں بلاؤں۔ اور کس وقت؟"

"شیلی! میں اس سے تمہاری موجودگی میں بات کروں گا' تمہارے کمرے میں۔ اور میرے ساتھ ایک دوست بھی آئے گا' غالب۔"

"یار' میرے کمرے میں کیوں؟"

"بس میں یہی چاہتا ہوں۔ تم اپنی ہر بات منوا رہی ہو' ایک بات میری مانو ورنہ چھوڑو۔"

"لیکن اس میں تُک کیا ہے۔ بلاوجہ خطرہ مول لینے میں۔ ملاقات باہر کہیں بھی ہوسکتی ہے۔"

"اسے تم میری شرط سمجھ لو ساتھ جانے کے لیے۔"

"اچھا۔ اگر یہ بات ہے تو آجاؤ۔ شام تین اور چار بجے کے درمیان کسی بھی وقت۔ غالب سے میں بھی ملنا چاہتی ہوں۔ لیکن معلوم ہے اس کے بعد کیا ہوگا۔ یار' مجھے یہ ہوٹل چھوڑنا پڑے گا" اس نے آہ بھر کے کہا اور فون بند کردیا۔

غالب ابھی تک برداشت سے کام لے رہا تھا۔ باہر وہ نکل آیا تھا اور اندر کی آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ یوسف کی بیوی اٹھ گئی ہے۔

"سکندر! یہ کیا ہورہا ہے؟" غالب نے سنجیدگی سے کہا۔

"کیا ہورہا ہے' اور کہاں...."

"یہ بہت خطرناک کھیل ہے۔ تو اس کے ساتھ کیوں جارہا ہے؟ مجھے بہت خطرناک لگتی ہے یہ لڑکی۔ تو اس کے چکر میں تو نہیں پڑ گیا؟"

میں نے کہا "میں ایک جھانپڑ رسید کروں گا تو آپ کی عقل ٹھکانے پر آجائے گی۔ میرے اس کے ساتھ جانے کا ایک مقصد ہے۔"

"مجھے اس مقصد پر اعتراض ہے۔ اس سے زیادہ خرابی ہوگی۔"

"پہلے یہ تو پوچھ لیں آپ کہ مقصد کیا ہے؟" میں نے کہا "نمبر ایک :۔ مجھے اپنے ذاتی تعلقات سے کام لیتے ہوئے ڈاکٹر شیلا خان کے بارے میں معلوم کرنا ہے۔"

"اب کون سے ذاتی تعلقات رہ گئے ہیں وہاں؟"

"وہ سب لڑکیاں مجھے مرتے دم تک بھول نہیں سکتیں جن کے نزدیک میں ان کا واحد عاشق صادق تھا۔ جیسا نہ پہلے پیدا ہوا نہ پھر ہوگا۔ میں اور محسن بیک وقت تین تین کو اس یقین میں مبتلا کرنے کی بے مثل صلاحیت رکھتے تھے اور۔ آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ" میں نے آہِ سرد بھر کے کہا "ایک لارڈ تھے جن کی بیٹی...."

"وہ اب کسی کی بیوی اور پتا نہیں کتنے بچوں کی ماں ہوگی۔"

"پھر کیا ہوا۔ کیا آپ نے پڑھا نہیں' بزرگ کیا فرما گئے ہیں اور انہی کے تجربات کا نچوڑ ملتا ہے کتابوں میں۔ کہ عورت اپنا پہلا عشق کبھی نہیں بھولتی۔ خیر یہ تو مذاق کی بات تھی۔ میں لندن نہیں جاسکتا مگر کچھ ایسے دوست ہیں جن کو پیرس بُلا کے ڈاکٹر شیلا خان کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کرسکتا ہوں۔ دوسرا خیال بھی نیک ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ برطانیہ میں لاکھوں پاکستانی ہیں اور انڈین ہیں۔ شیلی کا گھر بڑی اچھی جگہ ہے... اگر اخبار وہاں سے نکالا جائے...."

"کون نکالے گا؟ آپ کا داخلہ تو ممنوع ہے۔"

"تمہارا تو نہیں ہے۔ لندن کا اخبار دباؤ سے آزاد ہوگا اور وہاں نہ سنسر شپ ہوگی نہ اپنے چوہدری صاحب کی بدمعاشی چلے گی۔"

غالب نے نفی میں سر ہلایا "میں سمجھتا ہوں اس سے یہاں پر رائے عامہ متاثر نہیں ہوسکتی۔ اخبار لاہور سے نکلنا چاہیے جہاں دلاور کا ووٹ بینک ہے' اس کے ووٹر ہیں۔ خیر ایک ہفتے کی کوئی بات نہیں لیکن خیر سے بُدھو ایک ہفتے میں گھر لوٹ آئیں۔ پتا نہیں تم اور محسن ولایت سے کیسے خالی ہاتھ آگئے۔ ورنہ پہلے تو قاعدہ تھا کہ جو جاتا تھا ایک میم ضرور لاتا تھا۔"

اب یوسف بھی اٹھ گیا تھا اور نازو بھی اندر اس کی بیوی سے ناشتے کے موضوع پر تبادلہ خیالات کررہی تھی۔

میں نے غالب کو اشارہ کیا "یار' خاموشی سے نکل چلتے ہیں' کسی کو بتایا تو شور مچ جائے گا کہ ناشتا کرکے جاؤ۔"

"ناشتا ہم وہیں کریں گے۔ منظر کے گھر...!" غالب نے کہا۔

یوسف کی گاڑی کی چابی ابھی تک میرے ہی پاس تھی۔ میں اور غالب ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کے پورچ میں برآمد ہوئے اور گاڑی لے کر فرار ہوگئے۔ صبح کے سات بجے تھے اور مجھے یقین

تھا کہ ساڑھے آٹھ نو بجے سے پہلے منظر بھی کورٹ نہیں جائے گا۔

منظر کی گاڑی گیٹ سے اندر جانے والے راستے پر آگے تھی۔ میں نے دوسری گاڑی اس کے بالکل پیچھے لگادی اور چابی باہر ایک گملے میں رکھ دی۔ "اب نکال کے دکھائے اپنی گاڑی" میں نے کہا۔

منظر نے گاڑی کی آواز سن لی تھی۔ وہ سلیپنگ سوٹ میں زلیے سے سر رگڑتا ہوا باہر آیا۔ "ابے تم! دونوں ایک ساتھ" وہ چلّایا "خدا خیر کرے۔ صبح صبح دو منحوس چہرے دیکھ لیے۔"

"دو کیوں' تین ہوئے نا یار۔ شیو بھی تو کی ہوگی تو نے آئینہ دیکھ کر" میں نے کہا۔

"تیری تو میں گول بوٹی بناتا ہوں ابھی۔ ذرا اندر آ بھوتنی کے۔ قیمہ بنائے گی رابعہ۔" منظر تولیہ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا "قسم خدا کی' میں نے اسے کبھی اتنے جلال میں نہیں دیکھا۔ تو یہ تولیہ ڈال لے سر پر۔"

"یہ کیا دافع بلیات تولیہ ہے' بلائیں دور رہتی ہیں؟"

"ابے بلیات کے بچے' اپنے سر کو بچا" منظر مجھے گھور کے بولا "اس کا کیا پتا' بیلن مارے یا چمٹا۔ دل کے بعد سر کی چوٹ بُری ہوتی ہے۔ میں کل سے اسے بھڑکا رہا ہوں تیرے خلاف۔ عین ممکن ہے چھری گھونپ دے تجھے۔"

"یار' یہ تو بڑی کمینگی ہے" میں نے دانت نکال کے کہا۔

"نہیں بیٹے۔ اب یہی علاج ہے تیرا۔" منظر بولا "تو سُدھرنے والا نہیں ہے۔ تیرا باپ ہوتا تو تجھے مرغا بنا کے اتنے جوتے مارتا کہ تو جہاں تشریف رکھتا تیرے دل سے ہائے نکلتی۔"

رابعہ نے اگر میری آواز سنی تھی تو عمداً اپنے اندازِ تغافل سے مجھ پر واضح کردیا تھا کہ جنگ جاری ہے۔ منظر کی بیوی نے سر نکال کے جھانکا۔

"ارے بھیّا تم! کب آئے' اور یہاں کیوں کھڑے ہو۔ حد کرتے ہو تم بھی۔ کل سو بار فون کیا ہوگا تمہیں۔"

"ایک سو ایک بار" منظر نے کہا "ہمیشہ گنتی غلط کرتی ہو۔ رات کو بھی پورے پندرہ بجے تھے' تم نے چودہ گنے۔"

"تو' سنو ان کی بات۔ اب ان میں سے ایک نیچے گھس کے سوگیا تو کیا اس میں میرا قصور ہے۔ انہیں تو فکر ہوتی نہیں۔ یہ کیا جانیں ماتا کو۔ میرا دل تو بھیّا دھک سے رہ گیا۔ کونا کونا چھان مارا' پاس پڑوس میں پتا کیا پھر مسجد سے اعلان کروایا' تھانے فون کیا۔ رو رو کے بُرا حال ہوگیا میرا۔ دل میں ایسے ایسے خیال آرہے تھے بھیّا' زمانہ خراب ہے...."

حسبِ عادت اس کی زبان کی قینچی چل پڑی تھی۔ وہ بھول گئی تھی کہ ہم برآمدے میں کھڑے ہیں اور اندر ناشتا میز پر لگا ہوا ہے۔ مجھے اور غالب کو بہت ہنسی آئی۔ بچّہ بغل میں اور ڈھنڈورا شہر میں۔ یہ اس کی صحیح مثال تھی۔

بالآخر منظر نے کہا "نیک بخت' خلاصہ سنادے۔ ایک بچہ کھو گیا تھا' بیڈ کے نیچے سے مل گیا۔ انسان کا بچہ ہوتا تو اوپر ملتا نا۔ اب چلو اندر۔ ان عورتوں کو ماتا کا ڈھول بجانے کا شوق ہے یار۔ ورنہ کیا باپ کو پتا نہیں ہوتی۔ اور آنسو بہانے کی تو بڑی پریکٹس ہوتی ہے۔ میں نے بہت سمجھایا کہ بھئی ایک نہیں تو نہ سہی۔ پھر ہوجائیں گے پندرہ' رونے کی کیا بات ہے۔ ابھی تو میں جوان ہوں۔"

اس کی بیوی چلّانے لگی "شرم تو نہیں آتی۔"

"شرم کیسی۔ بڑے فخر کی بات ہے یہ تو۔ ان سالوں کو دیکھنا۔ اس کے آدھے بھی کرلیں نا مل کے تو قسم خدا کی' مان لوں گا کہ یہ بھی مرد ہیں۔"

میں اور غالب بے تحاشا ہنس رہے تھے اور منظر کی بیوی چلّا رہی تھی کہ رابعہ اندر آگئی۔ عام حالات میں وہ بہت پہلے ہی آجاتی۔ یا وہ ہنستی ہوئی آتی اور سب کے قہقہوں میں شامل ہوجاتی مگر جانتے بوجھتے وہ اپنے چہرے پر سنجیدگی مسلط کرکے آئی۔ اس کا فطری ردِعمل یہ ہوا کہ ہم سب بھی ایک دم خاموش ہوگئے اور اچھے خاصے بے تکلف ماحول میں کشیدگی یوں پھیل گئی جیسے بجلی کا سوئچ آف کرتے ہی اندھیرا پھیل جاتا ہے۔

"کیا حال ہے سکندر؟" رابعہ نے مصنوعی لہجے میں کہا "اتنے میزلیس کیوں نظر آرہے ہو؟ بیٹھو۔"

میں نے بھی باچھیں چیر کے کہا "نہیں۔ میں تو بہت خوش ہوں۔"

وہ غالب سے مخاطب ہوگئی "نازو بھی آئی ہے ساتھ؟"

"یہ بیٹھی تو ہے تمہارے ساتھ" غالب بولا "بھوت کی بچی ہے' غائب ہوجاتی ہے۔ تم بھی غائب ہو۔ کل یہ غائب ہوگئے تھے۔"

"پہلے ناشتا کرلو سب خاموشی سے" منظر کی بیوی نے ایک ساتھ سب کو ڈانٹا "اسکول جانے والے بچوں کو اتنی مشکل سے ناشتا کرایا ہے۔ پانچ ابھی سو رہے ہیں۔ اٹھ گئے تو میرا ناشتا کرنا مشکل ہوجائے گا۔"

منظر نے بڑی برق رفتاری سے خوش خوراکی کا مظاہرہ شروع کردیا تھا۔ "میں تو کہتا ہوں بیوی' ان کو بھی گود لے لو تم۔ بیس ہوجائیں گے۔ اپنے ہی بچے ہیں یہ بھی۔ ذرا بگڑ گئے ہیں۔ تم ٹھیک کرسکتی ہو انہیں۔ تم نے تو مجھے ٹھیک کردیا۔ کُتے کی دُم کو۔"

اس کی بیوی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا اور ثابت کردیا کہ وہ منظر سے بڑی وکیل ہے۔ منظر ہائی کورٹ میں ولائل دے سکتا تھا۔ گھر میں بیوی کی زبان مشین گن کی طرح چلتی تھی اور وہ ناکارہ بندوق کی طرح ٹھائیں ٹھائیں فش کرتا رہ جاتا تھا۔ ان کی باتوں سے بھی کشیدگی ختم نہیں ہوئی۔ رابعہ مجھ سے نظر چُراتی رہی اور میں سوچتا رہا کہ کیا یہ خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ ہے۔ میرا تو

خیال تھا کہ کل سے اب تک اس کا موڈ بدل گیا ہوگا۔ خود غالب اس صورت حال سے پریشان نظر آتا تھا۔

ناشتا ختم کرتے ہی میں نے رابعہ سے کہا "میں تم سے بات کرنے کے لیے آیا ہوں۔ تمہارا موڈ کیوں خراب ہے آخر؟"

"وہم ہے تمہارا" وہ بولی "اس وقت تو کورٹ جانا ہے مجھے۔"

میں نے اس کا ہاتھ پکڑلیا اور اسے گھسیٹ کر ڈرائنگ روم میں لے گیا "بھاڑ میں گئی کورٹ۔ یہ دفتر نہیں ہے تمہارا جہاں سے تم نے مجھے بے عزت کرکے نکال دیا تھا اور میں خاموشی سے چلا گیا تھا۔"

"میں نے دیکھا تھا" وہ تلخی سے بولی "ہاتھ چھوڑو میرا اور آرام سے بیٹھ جاؤ۔ ایسے بات نہیں ہوسکتی۔"

غالب اور منظر بھی پریشان ہوکے ہمارے پیچھے آگئے تھے۔

"ہاں ہاں۔ بات ویسے ہی ہوگی جیسے ہوتی ہے۔" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "آخر تم چاہتی کیا ہو؟"

"آج تک میرے چاہنے سے کچھ نہیں ہوا۔ میں تمہیں کیا بتاؤں کہ میں کیا چاہتی ہوں۔" رابعہ نے سپاٹ لہجے میں کہا "جو تم چاہتے ہو کرو۔"

"کیا مطلب لوں میں اس بات کا؟ تم نے میرا ساتھ چھوڑ دیا ہے؟" میں نے برہمی سے کہا۔

"ہاں۔ صاف سننا چاہتے ہو تو سن لو۔ میں نے بہت کوشش کی تھی تمہارا ساتھ دینے کی۔ کوئی سوال کیے بغیر، کوئی جواز مانگے بغیر۔ بالکل غیر مشروط طور پر۔ اپنا سب کچھ تمہارے حوالے کردیا تھا اور تم سے کچھ بھی نہیں مانگا تھا۔ سوائے ایک وعدے کے۔ یہ وعدہ کہ آنے والا کل میرا ہوگا۔ مگر یہ خود فریبی تھی میری۔ تمہاری زندگی میں ایک دن..... آنے والا ایک دن بھی میرا نہیں ہے شاید۔"

"تم بہت زیادتی کررہی ہو۔"

"میں زیادتی کررہی ہوں!" وہ طنز سے بولی "میں زیادتی برداشت کرتی رہی ہوں اب تک مگر میری قوت برداشت جواب دے گئی ہے۔ تم سمجھ لو کہ میں کمزور تھی، بزدل تھی، بے وقوف تھی یا بے وفا تھی۔"

"دیکھو رابعہ! خواہ مخواہ بات کو مت بڑھاؤ۔"

غالب نے کہا "بہتر ہے ابھی کوئی بات نہ کی جائے۔"

میں نے کہا "نہیں۔ ایسے حقیقت سے نظریں چُرا کے کیا ہوگا۔ میں ہر الزام سننے کے لیے تیار ہوں۔"

"میں تمہیں کوئی الزام نہیں دے رہی ہوں۔ تم خود مختار ہو، اپنی مرضی کے مالک ہو، مردِ میدان ہو۔ میں ناقص العقل عورت ذات ہوں۔ تم مجاہد ہو گفتار کے ہی نہیں، کردار کے غازی بھی ہو۔ تم سُپرمین ہو۔ سب سے برتر ہو۔ سب وہی کرتے ہیں جو تم چاہتے ہو کیونکہ تم ایم آر ایس کے چیف ہو۔"

"لعنت بھیجو ایم آر ایس پر۔ اس سے رشتوں کا کیا تعلق؟"

"رشتے اب تمہارے لیے ثانوی حیثیت اختیار کرچکے ہیں سکندر۔ تمہارے مقاصد اوّلیت رکھتے ہیں اور میں تسلیم کرتی ہوں کہ یہ مقاصد بہت بلند ہیں۔ مجھے تمہاری نیک نیتی اور خلوص پر شک نہیں۔ تم عزم اور حوصلے کے پیکر ہو۔ ساری عمر کسی نہ کسی سے لڑتے رہوگے۔ میں ایک بار پہلے بھی پسپائی اختیار کرچکی تھی مگر پھر میں نے سوچا کہ کہیں میری وجہ سے تم ہمت نہ ہار دو۔ اور خود کو الزام سے بچانے کے لیے میں پھر شریکِ سفر ہوگئی۔"

"پھر آج اچانک ایسی کون سی غلطی ہوگئی ہے مجھ سے؟"

"کوئی ایک غلطی ہو تو بتاؤں۔ میرے خیال میں تو تمہاری ساری زندگی اب ایک غلطی کا تسلسل ہے۔ تم زندگی سے مفاہمت کبھی نہیں کروگے۔ تم نے شکست کو انا کا مسئلہ بنالیا ہے حالانکہ زندگی عبارت ہے کامیابی اور ناکامی کے دو رنگوں سے۔ جیو اور جینے دو کا فلسفہ آدمی کو صرف جُھکانا ہی نہیں سکھاتا، جُھکنا بھی سکھاتا ہے...."

میں اور غالب دم بخود بیٹھے رابعہ کے ہسٹریا زدہ لہجے میں اپنی فردِ جرم سن رہے تھے۔ بدلا کچھ بھی نہیں تھا سوائے رابعہ کی نظر کے۔ چنانچہ وہی جو کل قابلِ تعریف تھا، آج قابلِ تعزیر بن گیا تھا۔ شاید منظر کو معلوم تھا کہ رابعہ کیا کہے گی۔ رابعہ پہلے ہی اسے اپنے نقطۂ نظر سے آگاہ کرچکی ہوگی کہ وہ خاموش بیٹھا رہا جو اس کی فطرت کے خلاف تھا اور پھر کورٹ جانے کا عذر پیش کرکے اٹھ گیا۔ منظر کی بیوی نے بھی بحث ضرور سنی ہوگی مگر اس نے اندر آکے نہیں جھانکا۔ اسے منظر نے منع کردیا ہوگا کہ تم نے دخل دیا تو شاید بات اور بگڑ جائے گی۔

منظر نے کہا "ابے یہ چھکڑا ہٹادے راستے سے۔ پتا نہیں کہاں کہاں سے لے آتے ہیں لوگ ایسی چیزیں۔"

غالب کو صرف بہانے کی تلاش تھی۔ وہ فوراً اٹھ گیا "میں ذرا گاڑی ہٹادوں۔"

میں نے اس کے جاتے ہی رابعہ کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کی "دیکھو رابعہ! بحث سے کچھ حاصل نہیں۔"

اس نے اپنا ہاتھ چھڑالیا "میں خود بحث میں نہیں پڑنا چاہتی تھی۔"

"میں سارے الزامات قبول کرنے کو تیار ہوں۔ تم مجھے ایک موقع دو۔"

"موقع دینے کی بات مت کرو۔ مواقع بہت آئے تھے لیکن تم نے گنوادیے" وہ تند لہجے میں بولی "تم اپنی انا پسند خود غرضی اور خود فریبی کے جال سے نہیں نکل سکے ورنہ حالات بالکل مختلف ہوتے۔ آج معاملات تمہارے اختیار سے باہر ہوچکے ہیں۔ اب تم کچھ نہیں کرسکتے سکندر۔ تم ساری دنیا کو فتح نہیں کرسکتے۔"

میرا غصہ ایک دم بھڑک اٹھا "میں نے کب دعویٰ کیا تھا سکندرِ اعظم بننے کا۔ میں نے اپنا حق حاصل کرنے کے لیے ہاتھ

نیں پھیلایا تو کیا یہ میری غلطی تھی؟"

"دیکھو، طیش میں آنے کی ضرورت نہیں۔ تم میں حوصلہ ہے حقائق کا سامنا کرنے کا تو بات کرو ورنہ چھوڑو۔ تم اپنی دنیا میں خوش، میں اپنی دنیا میں" رابعہ نے بے رُخی سے کہا۔

"تمہارے بغیر میری دنیا اور میرے بغیر تمہاری دنیا نامکمل ہے۔"

"مجبوری میں نامکمل زندگی بھی قبول کرنی پڑتی ہے۔ اپاہج ہوکے بھی تو جیتے ہیں لوگ اور ہوش و حواس سے محروم ہوکے جانوروں کی طرح پاگل خانے کے پنجرے میں بھی۔ میرے اور تمہارے نصیب میں یہی تھا۔"

"ایسا مت کہو پلیز! ایسا نہیں ہے۔"

"ایسا ہے سکندر۔ حقیقت کو تسلیم کرلو" رابعہ نے کہا "یہ تمہاری اپنی زندگی ہے، کسی اور کی نہیں ہے جسے تم ضائع کررہے ہو۔"

"کیسے؟ ذرا مجھے سمجھاؤ۔" میں نے پُرسکون ہونے کے لیے پانی کا ایک گلاس پی لیا اور آرام سے بیٹھ گیا۔

"میں تم سے سوال کروں گی۔ فرض کرو کہ تم عدالت میں ہو اور تمہیں میرے ہر سوال کا جواب ہاں یا نہیں میں دینا ہے۔ میں کسی آزمائش میں نہیں ڈالوں گی تمہیں۔ ہر سوال کا ایک واضح جواب ہوگا۔"

"اوکے۔ میں مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا ہوجاتا ہوں۔" میں اپنی جگہ سے اٹھ کے صوفے کے پیچھے چلا گیا۔

"میں نے بہت غور کیا اور چونکہ تمہاری زندگی کی کتاب کا کوئی ورق ایسا نہیں تھا جو میں نے نہ پڑھا ہو، اس لیے میں نے اس وقت سے تمہارے حالات میں تمہاری ذمے داری کو دیکھا جب تم اس قابل تھے کہ ذمے داری کو سمجھتے تھے اور نبھا بھی سکتے تھے۔ مثلاً جب تم اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ گئے تو تمہارے والد بوڑھے اور تنہا تھے۔ تمہارے ماسوا ان کا کوئی نہیں تھا۔"

"ہاں۔ یہ ٹھیک ہے۔"

"کیا اس وقت تمہارا تعلیم کے لیے بیرونِ ملک جانا ضروری تھا؟ اور کیا یہ تعلیم یہاں مکمل نہیں کی جاسکتی تھی؟"

"نہیں۔ لیکن میں مجبور تھا۔"

"تم نے اپنے والد کو دلائل سے قائل کرنے کی کوشش کی تھی؟"

"ہاں۔ مگر وہ مانے نہیں۔"

"اگر تم انکار کردیتے تو کیا اس نافرمانی پر وہ تمہیں عاق کردیتے؟"

"نہیں... لیکن..."

اس نے مجھے آگے بولنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ "ولایت میں رہتے ہوئے تم نے اپنے والد کا اتنا خیال نہیں رکھا جتنا رکھنا چاہیے تھا۔"

"ہاں.... میں اپنی کوتاہی کو تسلیم کرتا ہوں۔"

"تم نے تعلیم بھی مکمل نہیں کی۔ تمہارا زیادہ وقت غیر نصابی سرگرمیوں میں صرف ہوا۔ محسن کے ساتھ... تم ایک غیر ذمے دار بیٹے ثابت ہوئے اور تم اپنے والد کی توقعات پر بھی پورے نہیں اُترے۔ رائٹ؟"

"رائٹ" میں نے کہا۔

"تمہیں مجرمانہ سرگرمیوں کی بنا پر ڈی پورٹ کیا گیا۔ تم خود نہیں آئے، نکالے گئے؟"

"ہاں۔ مگر وہ سازش تھی۔"

"میں اسباب پر بحث نہیں کررہی ہوں۔ حقائق کی نفی کرو یا انہیں مانو۔" رابعہ نے کہا "واپس آنے کے بعد تم نے اندازہ کرلیا کہ تمہارے والد کو چوہدری دلاور اینڈ کمپنی نے تمام اثاثوں سے محروم کیا اور پھر مروادیا؟"

"ہاں۔ مجھے ثبوت مل گیا تھا۔"

"پھر تم یہ ثبوت لے کر عدالت میں کیوں نہیں گئے؟ تم نے مقدمات کیوں دائر نہیں کیے؟ ایف آئی آر کیوں نہیں کٹوائی؟"

"مجھے معلوم تھا کہ اس سے کچھ نہیں ہوگا۔"

"چنانچہ تم نے قانون اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ کیا تمہارا یہ فیصلہ ٹھیک تھا؟"

"نہیں.... مگر..."

"اگر مگر چھوڑو۔ تم اپنے حقِ وراثت کا مقدمہ بھی دائر کرسکتے تھے۔ منظر جیسے دوست اور قابل وکیل کی موجودگی میں تم دلاور سے پائی پائی وصول کرلیتے۔ بے شک اس میں کافی وقت صرف ہوتا لیکن اپنے ہاتھ میں قانون لے کر تم نے کیا پالیا؟ کیا تمہیں تمہارا حق مل گیا؟"

میں نے جھنجلا کے کہا "نہیں۔"

"تم نے معلوم کرلیا تھا کہ میرا شرافت علی کا قاتل کون ہے اور تمہارے والد کا قاتل استاد پیڈرو ہے۔ کیا تم ان کا کچھ بگاڑ سکے؟"

"نہیں.... لیکن..."

"تمہارے والد کی لاش پوسٹ مارٹم سے قبل ہی کھود کے نکال لی گئی۔ کیا تمہیں یہ معلوم ہوا کہ اب ان کی ہڈیاں کہاں مدفون ہیں؟"

میں نے محسوس کیا کہ میرا چہرہ تپ رہا ہے اور میں نے وحشت کی کیفیت میں صوفے کو یوں دبوچ رکھا ہے جیسے وہ دلاور کی گردن ہو اور میں اسے گلا گھونٹ کے جان سے مار دینا چاہتا ہوں۔

"نہیں۔ نہیں۔ نہیں" میں نے چیخ کے کہا۔

"ابھی سے حوصلہ جواب دے گیا سکندر؟"

"تم حالات کو نظرانداز کررہی ہو۔" میں نے غصے میں

پھنکارتے ہوئے کہا۔

"میں صرف نتائج کی بات کر رہی ہوں۔ ریاضی کے دقیق مسائل حل کرنے میں بڑا وقت لگتا ہے اور بہت محنت ہوتی ہے مگر اس کا جواب ایک ہی ہوتا ہے' خواہ طریقہ کوئی بھی اختیار کیا جائے۔ حل کمپیوٹر سے نکالا جائے یا کاغذ پنسل سے۔"

میں تھک کے صوفے پر بیٹھ گیا۔ "رابعہ! خدا کے لیے بس کرو۔"

"نہیں۔ فیصلہ آج ہو جانا چاہیے۔ مجھے بتاؤ کہ تم نے چوہدری دلاور کے خلاف اعلانِ جنگ کیا تھا۔ کیا اسے شکست ہوئی؟"

"نہیں۔"

"تم نے غداروں اور علیحدگی پسندوں کی سازش کے خلاف جہاد کیا۔ کیا اس سے کچھ حاصل ہوا؟ تم اس ملک کو ٹوٹنے سے بچا سکے؟"

"نہیں" میں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام کے کہا "میں مانتا ہوں..."

"تمہارے سارے فیصلے غلط تھے سکندر۔ تم ایک خیالی' غیر حقیقی دنیا کے آئیڈیلسٹ تھے۔ اگر تم حقیقت شناس ہوتے تو اپنے ساتھ دوسروں کی زندگی کو ایک لاحاصل جوئے میں داؤ پر نہ لگاتے۔ تم کو چوہدری دلاور نے ابتدا ہی میں بڑی معقول پیش کش کی تھی۔"

"تم.... تم یہ کہہ رہی ہو....؟"

"تم اس کے پارٹنر نہ بنتے.... جتنا وہ تمہیں نقصانات کی تلافی کے طور پر دے رہا تھا وہ لے کر کہیں بھی سیٹل ہو جاتے۔ اس نے واپس برطانیہ بھیجنے کی آفر بھی دی تھی۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ میں اپنے باپ کے قاتل کو معاف کر دیتا' اس کے ہاتھ اپنا ضمیر بیچ دیتا' اپنے والد کے خون کی قیمت وصول کر لیتا؟"

"بعد میں بھی کیا ملا تمہیں؟ تم اس سے نہ بدلہ لے سکے' نہ اپنا حق۔ اُلٹا تم نے اپنے ساتھ اپنے مخلص دوستوں کے مستقبل کو بھی ایک بے مقصد جنگ میں جھونک دیا۔"

"اسے تم ایک بے مقصد جنگ کہتی ہو!" میں نے لات مار کے میز اُلٹ دی۔

"ہاں۔ اس میں اپنی ماں گنوا دی میں نے۔ اپنا گھر گنوا دیا۔ اپنا کیریئر گنوا دیا۔ محسن کو دیکھو' نازو کو دیکھو۔ ان سب کے پاس کیا رہا؟ محسن کی بیوی بچے اس جنگ کی بھینٹ چڑھ گئے جو صرف تمہاری جنگ تھی۔"

"مجھے معلوم نہیں تھا کہ تمہاری سوچ اس حد تک پست ہو جائے گی۔"

"حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا سکندر۔ چھوڑو اسے جو ہو گیا' آج کی بات کرو۔ یہ دیکھو کہ تم کہاں کھڑے ہو۔ ایک بار پھر تم نے چوہدری دلاور کی مصالحت کی پیش کش کو مسترد کر دیا ہے حالانکہ وہ سب کچھ کرنے کے لیے تیار تھا۔ اس نے تم سے معافی مانگی' خود کو مجرم تسلیم کیا' استاد پیڈرو کو تمہارے حوالے کرنے کا وعدہ کیا' تمہارا حق تمہیں لوٹانے کے علاوہ اس ذہنی و جسمانی اذیت کا تاوان ادا کرنے کا وعدہ کیا جو تم نے برداشت کی لیکن تم نے اس کے خلاف محاذ آرائی ختم نہیں کی۔"

"یہ سب میں کروں گا بھی نہیں رابعہ۔"

"نہ کرو۔ تمہارے خلاف تمام پرانے مقدمات پھر کھل جائیں گے۔ اس دن جب تم میری پروا کیے بغیر استاد پیڈرو کے پیچھے بھاگ کھڑے ہوئے تھے تو مجھے چوہدری دلاور نے روک لیا تھا۔ اس نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ میں اس کی بات سنوں اور میں نے اسی وقت طے کر لیا تھا کہ بس اب بہت ہو چکی' میں اس سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتی۔ میں اس کے ساتھ چلی گئی اور اس نے مجھے سب سمجھا دیا کہ اس کے کیا عزائم ہیں اور وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔"

"لعنت بھیجو اس پر۔ مجھے بتاؤ تم کیا چاہتی ہو؟"

رابعہ نے کہا "میں یہ چاہتی ہوں کہ تم اپنی زندگی گزارو۔ اپنے لیے اور اپنی مرضی سے۔ اپنی خوشی کے لیے اور اپنے مستقبل کی خوشحالی کے لیے۔ اپنے دوستوں کے لیے اور چاہنے والوں کے لیے۔ تمہارا گھر تمہیں واپس مل گیا ہے اور میرا گھر دلاور نے میرے حوالے کر دیا ہے۔ وزیر خان مرحوم کی ساری دولت اور جائداد جس پر تمہارا حق تھا' تمہیں کسی قانونی یا غیر قانونی جھگڑے کے بغیر مل جائے گی۔ علاوہ جرمانے یا تاوان کے۔ تم وزیر خان ٹرسٹ ہسپتال چلاؤ۔ سرمایہ فراہم ہو جائے تو اپنا بزنس کرو۔ میں اپنی پریکٹس کروں۔ غالب چاہے تو اپنا ایک اخبار نکالے یا صحافت میں نام پیدا کرے لیکن چوہدری دلاور سے دشمنی کی خاطر نہیں۔ سیاست بڑا بدنام پیشہ ہے اور چوہدری دلاور جیسے لوگوں کو راس آتا ہے۔ تم اس کی جتنی مخالفت چاہو کرو' وہ نہیں ہوگا تو اس جیسا کوئی دوسرا ہوگا۔ تم جیسے چوہدری دلاور کی راہ میں حائل ہوں گے تو حشرات الارض کی طرح روندے جائیں گے۔ سیاست کی غلاظت کو سیاست دانوں کے لیے چھوڑ دو۔ ہم سب اپنی صاف ستھری' خوب صورت اور خوشیوں سے معمور زندگی ان سارے تفکرات اور مسائل سے بے نیاز رہ کے گزار سکتے ہیں۔ چوہدری دلاور کا وعدہ ہے کہ تمہارے خلاف سارے مقدمات داخلِ دفتر ہو جائیں گے اور کل اگر وہ اقتدار کی کرسی پر بیٹھے گا تو کسی کے خلاف انتقامی کارروائی نہیں کرے گا۔ ہمارے تعاون کا بدلہ ضرور ادا کرے گا۔"

میں نے کہا "بس۔ یہی کہنا تھا تمہیں یا کچھ باقی ہے؟"

"نہیں۔ اور مجھے کچھ نہیں کہنا۔ فیصلہ اب تمہارے اختیار میں ہے۔"

میں نے سوچ سوچ کے کہنا شروع کیا "یہ بہت اچھا ہوا مس رابعہ قاری ایڈووکیٹ! کہ تم نے مجھے ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا کر کے میری فردِ جرم سنا دی۔ بلکہ عائد کر دی۔ اس سے میری غلط فہمی دور ہو گئی۔ میں یہ سمجھ رہا تھا کہ تم صرف روٹھی ہو۔ جیسے محبت کرنے والے روٹھ جاتے ہیں۔ لیکن مجھ پر انکشاف یہ ہوا کہ تمہارے نظریات اور خیالات یکسر بدل گئے ہیں۔ یہ انقلاب اچانک نہیں آیا۔ یقیناً تمہارے وجود میں شکست و ریخت کا عمل بہت پہلے سے جاری تھا لیکن تم امیدوں کے سہارے پر عہدِ رفاقت نبھا رہی تھیں۔ اچانک کچھ نہیں ہوتا۔ بظاہر تندرست نظر آنے والا اچانک حرکتِ قلب بند ہونے سے مر جاتا ہے۔ خود اسے یا دیکھنے والوں کو اندازہ نہیں ہوتا کہ اندر اس کے دل کی حالت کیا ہے۔ بلڈ پریشر کو خاموش قاتل SILENT KILLER کہا جاتا ہے۔ کولسٹرول کی زیادتی اور ذیابیطس کی موجودگی کا بھی پتا نہیں چلتا۔ یہی تمہارے ساتھ ہوا۔ آج میں ایک نئی رابعہ کو دیکھ رہا ہوں جس کے پاس مجھے غلط ثابت کرنے کے لیے ہر دلیل ہے۔ مجھے مسترد کرنے کے لیے ہر جواز ہے۔ میرے نظریات اور خیالات سے اختلاف کی وجہ ہے اور میرے اعمال کو میری فردِ جرم بنانے کی خواہش ہے۔ اس خواہش کی تکمیل کے لیے یہ نئی رابعہ میرے جذباتی استحصال پر یقین رکھتی ہے۔ اس کے پاس اعتماد ہے کہ سکندر کی سب سے بڑی کمزوری اس کی محبت ہے۔ اس کی محبت کو بلیک میل کیا جا سکتا ہے اور اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی ہر بات منوائی جا سکتی ہے۔ آج تک میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ آزمائش کی ایسی گھڑی میں میرا فیصلہ کیا ہوگا اور میں واقعی نہیں جانتا کہ بالآخر میں کیا کروں گا۔ وہی جو تم چاہتی ہو یا وہ جو میں چاہتا ہوں۔ لیکن میں ایک بات کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔ اس دنیا میں انسانوں کے دو گروہ ہمیشہ برسرِ پیکار رہے ہیں۔ بے شک غالب وہی نظر آتے ہیں جنھوں نے سقراط کو زہر کا پیالہ دیا' عیسیٰؑ کو مصلوب کیا اور حسینؓ کو کربلا میں شہید کیا۔ لیکن شکست بالآخر انہی کی ہوئی۔ دورِ حاضر کی تاریخ اٹھا کے دیکھ لو' پاکستان کی تاریخ پڑھ لو۔ تمہیں مثالیں بہت نظر آئیں گی لیکن ایک تیسرا گروہ سب سے بڑا ہے جو نہ تاریخ کے صفحات میں نظر آتا ہے اور نہ عہدِ حاضر میں اس کا وجود محسوس ہوتا ہے۔ یہ لوگ سب سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں جو ظلم برداشت کرتے ہیں مگر اس کے خلاف فریاد نہیں کرتے۔ ناانصافی کو محسوس کرتے ہیں مگر آواز نہیں اٹھاتے۔ برائی دیکھتے ہیں' اسے برائی سمجھتے ہیں مگر برائی نہیں کہتے۔ یہ خود غرض اور مفاد پرست لوگ ہی ساری خرابی کی بنیاد بنتے ہیں کیونکہ وہ اکثریت میں ہیں اور اگر وہ متحد ہوں اور ان میں غلط کو غلط کہنے کی ہمت ہو تو کس کی مجال کہ ظلم کرے' ناانصافی کرے یا استحصال کرے۔ مگر ہوتا یہ ہے کہ چند افراد بزورِ بازو' دولت کی طاقت سے یا شیطانی قوت کی مدد سے خاندان' معاشرے' ملک اور پھر اس دنیا میں ظلم اور ناانصافی' گناہ اور جرم' بدی اور بے ضمیری کے بیج بوتے ہیں اور چند سرپھرے ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اکثریت خاموش تماشائی بنی رہتی ہے کہ جو ہوگا دیکھا جائے گا' ہمیں کیا۔ ہم کیوں پڑیں اس چکر میں۔ ہم نے کوئی ٹھیکا لیا ہے دنیا کے اخلاق و کردار کا۔ میاں جس قوم کو انبیاء اور اولیا' مقدس صحیفے' قانون کی کتابیں اور مارشل لاء کے ڈنڈے نہ ٹھیک کر سکے' اسے ہم راہِ راست پر لا سکتے ہیں؟ یہ بے بسی کا اعتراف' بے چارگی کا شکوہ اور شکست خوردہ ذہنیت کی پست ہمتی کی دیمک ہے جو قوموں کو زوال کی طرف لے جاتی ہے۔ میری بدقسمتی ہے کہ تم مجھے اس تیسرے گروہ میں شامل دیکھنا چاہتی ہو۔ آئی ایم سوری رابعہ۔ یہ ناممکن ہے کہ چوہدری دلاور جیسا شخص اس ملک کا لیڈر بنے جس کے لیڈروں میں قائدِ اعظم' قائدِ ملت' سردار نشتر اور مولوی تمیزالدین جیسے لوگ تھے۔ اس قوم کی قیادت کا قبلہ درست رکھنے کی ذمے داری مجھ پر بھی اتنی ہی عائد ہوتی ہے جتنی تم پر۔ اور میں جانتے بوجھتے اس فرض سے پہلو تہی نہیں کر سکتا۔ یہ ناممکن ہے کہ میں اپنے ضمیر کو دھوکا دوں اور مطمئن رہوں۔ میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ تمہاری بات مان کے میں "راہِ راست" پر آجاؤں' اپنے کام سے کام رکھوں' پیسے کو مقصدِ حیات بنا لوں۔ ہم شادی کر لیں اور ٹھاٹ سے رہیں۔ چوہدری دلاور وزیر ہو جائے تو ہم اس کے حضور سلامی پیش کرنے جایا کریں۔ مرزا غالب اخبار میں ان کی قصیدہ خوانی کرے اور سرکاری اشتہارات لیتا رہے۔"

اچانک میں نے محسوس کیا کہ رابعہ میری بات سن ہی نہیں رہی ہے۔ میں اپنی دُھن میں بولتا جا رہا ہوں مگر اس نے جیسے اپنے کان بند کر لیے ہیں اور ذہن کی سوچ کے سامنے بے حسی کی دیوار کھڑی کر دی ہے۔

میرے خاموش ہوتے ہی اس نے کہا "سکندر! بحث سے کچھ نہیں ہوگا۔ بدلے ہوئے حالات کو دیکھو اور سمجھو۔ ہم نے بہت وقت گنوا دیا ہے۔ کیا تم ساری زندگی گنوا دینا چاہتے ہو؟"

"یہ تو نقطۂ نظر کا فرق ہے۔ جسے تم گنوانا کہتی ہو اسے میں کمانا سمجھتا ہوں۔ کس نے ایک ہزار ایک مستحق کو دیے تو اس نے سکہ رائج الوقت میں واقعی گنوایا مگر اس نے بہت کچھ کمایا۔ ثواب' نیکی' سکونِ قلب..."

"یہ فلسفہ ہے اور میں ایک وکیل ہوں۔ وکیل سے بھی پہلے میں ایک عورت ہوں۔ میری فطرت کے تقاضے کچھ اور ہیں جن کو تم مسلسل نظر انداز کر رہے ہو۔ دیکھو گل اور محسن کو' انہوں نے کتنا صحیح فیصلہ کیا۔ آخر وہ کب تک تمہارا ساتھ دیتے؟ غالب اور نازو بھی ایک دن یہ سمجھ لیں گے کہ زندگی سے سمجھوتا کرنا ہی پڑتا ہے۔"

"میں سمجھ گیا ہوں رابعہ۔ ہم اس دوراہے پر آگئے ہیں جہاں ایک طرف تمہاری زندگی کے مقاصد ہیں اور دوسری طرف میرے

اصول...“

وہ ایک دم التجا پر آگئی ”سکندر! پلیز‘ اتنی عجلت میں فیصلہ مت کرو۔“

”فیصلہ تمہیں کرنا ہے رابعہ‘ مجھے نہیں۔ میں آج بھی وہی ہوں جو کل تھا۔ بدلی تم ہو“ میں نے کہا۔

”دیکھو‘ غالب اور نازو سے بھی مشورہ کرلو۔ ہم سب مل کے بیٹھتے ہیں اور سوچتے ہیں۔“

”تم نے پہلے ہی واضح کردیا تھا کہ تم بہت غوروخوض فرما چکی ہو۔ اور سوچ سمجھ کے ہی تم نے میرے خلاف ایک کیس بنا رکھا تھا۔ اس میں مُدّعی بھی تم ہو اور منصف بھی تم۔ جو تم چاہتی ہو وہ میرے لیے ممکن نہیں۔“

”سب کچھ ہوسکتا ہے سکندر۔“ اس کے آنسوؤں کا وہ ریلا جسے وہ بہت دیر سے روکے ہوئے تھی‘ ایک دم بہہ نکلا۔

”رابعہ! مجھے تمہاری خوشی کی راہ میں اپنے مسائل کے ساتھ حائل ہوکے کچھ نہیں ملے گا۔ بہتر یہی ہے کہ تم اپنی زندگی گزارو اور خوش رہو۔ مجھے میری مرضی سے جینے دو۔ ہم اچھے دوست بن کے رہیں گے اور کبھی حالات پھر موافق ہوئے تو اپنی زندگی کے بارے میں بھی سوچیں گے۔“

”وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا سکندر۔“

”مجھے معلوم ہے۔ اور مجھے افسوس ہے کہ میں تمہاری توقعات پر پورا نہ اتر سکا حالانکہ تم نے میری خاطر بہت دکھ جھیلے‘ بہت قربانیاں دیں۔ لیکن اس کے بدلے میں اپنی ساری جدوجہد کو قربان نہیں کرسکتا‘ اپنے اصول اور آئیڈیل قربان نہیں کرسکتا۔“

”تم نے مجھ سے بھی وعدے کیے تھے“ وہ روتے ہوئے بولی۔

”وہ وعدے تھے۔ امیدوں اور خواہشوں کے خواب تھے۔ سرِتسلیم خم کرنے کے غیر مشروط عہد نامے نہیں تھے۔ آج تم کہتی ہو کہ خود کو دلاور کے ہاتھ اس کی قیمت پر فروخت کردو میرے لیے‘ تو تمہارے لیے یہ سکندر کی محبت کی توہین نہیں ہے۔ اگر کبھی تم یہ کہنے لگو کہ دلاور کے بزنس پارٹنر بن جاؤ تو کیا تمہاری محبت میں مجبور ہوکے میں یہ بات مان لوں گا؟“

”میرا دماغ خراب نہیں ہے کہ ایسی بات میرے ذہن میں بھی آئے“ رابعہ چیخ کے بولی ”میں تو صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم کچھ نہ کرو۔ چوہدری دلاور پر لعنت بھیج کے سارے معاملات سے لاتعلق ہوجاؤ۔ وہ کچھ بھی کرے۔ غلط کام کرے گا تو وہ خمیازہ بھگتے گا۔ جُرم کرے گا تو پکڑنے والا قانون ہے۔ گناہ کرے گا تو خدا اس کے نامۂ اعمال میں لکھے گا۔“

”رابعہ! حقوق العباد کو ترک کرنے کا مطلب سمجھتی ہو؟“ میں نے افسوس سے کہا ”یہ خود غرضی نہیں‘ کمینگی ہے۔ وہ شخص انسان کہلانے کے قابل نہیں جو دوسروں کے حقوق کو تسلیم نہ کرے۔ ایک آدمی اپنے خاندان کی پروا نہیں کرتا۔ دوسرا کہتا ہے پڑوسی اور محلے والے جائیں بھاڑ میں۔ تیسرا کہتا ہے کہ ملک میں جو ہوتا ہے‘ ہوا کرے‘ مجھے کیا۔ چوتھا کہتا ہے‘ کیسی انسانیت‘ کہاں کی انسانیت۔ لعنت سب پر۔ مجھے بتاؤ ہم کس کلاس میں ہیں؟ میرے اور تمہارے جیسے تعلیم یافتہ‘ مہذب‘ حساس اور باضمیر شخص کو ایسا ہونا چاہیے؟“

”آدمی کو خدائی فوجدار بھی نہیں ہونا چاہیے۔ سارے جہاں کے ساتھ اپنی فکر بھی کرنی چاہیے۔ کیا خود کو نظرانداز کردینا اور اپنی ذات کی نفی جائز ہے؟ اپنی زندگی کی کوئی قدر‘ قیمت‘ کوئی اہمیت اور کوئی ضرورت نہیں؟ میں کب کہتی ہوں کہ سوسائٹی یا ملک و قوم کے لیے کچھ مت کرو۔ لیکن اپنے لیے اور اپنے خاندان کے لیے تم کیا کررہے ہو؟“

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی ”تم نہیں سمجھو گی رابعہ۔ یہ سب میں ایک بہتر مستقبل کے لیے کررہا تھا۔ میرے اور تمہارے لیے۔“

اس نے نفی میں سرہلایا ”تم اپنا مستقبل تباہ کررہے ہو۔ خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماررہے ہو۔ مجھے بتاؤ‘ کتنے مقدمات ہیں تمہارے خلاف؟ کتنے مقدمات میں تمہاری ضمانت منسوخ ہوچکی ہے؟ تمہارے خلاف ناقابلِ ضمانت وارنٹ ہیں اور تم مفرور قرار دیے جاچکے ہو۔ بہت جلد تم پکڑلیے جاؤ گے اور پھر تمہاری باقی زندگی جیل میں گزر جائے گی۔ تمہاری جذباتی سرکشی‘ باغیانہ خیالات اور انقلابی طبیعت جیل کی سلاخوں کے پیچھے دم توڑدے گی۔ تم نہیں جانتے کہ جیل کے اندر کیا ہوتا ہے۔ آدمی کی حیثیت ایک جانور سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اس کا باہر کے قانون‘ مہذب دنیا اور بنیادی آئینی حقوق اور انسانی حقوق کے عالمی منشور سے کوئی تعلق باقی نہیں رہتا۔ اس کے ساتھ کتے سے بدتر سلوک ہوتا ہے اور اس کی دُم تک سیدھی کردی جاتی ہے۔ اسے بھوکا ماردیا جاتا ہے۔ ذہنی اذیت سے مریض بناکے پاگل خانے بھیج دیا جاتا ہے‘ یہاں تک کہ مار بھی دیا جاتا ہے۔ باہر والے آزاد ہوتے ہیں اور طاقتور ہوں تو کچھ بھی کراسکتے ہیں۔“

”مجھے معلوم ہے۔ ایسی باتوں سے میں خوف زدہ ہونے والا نہیں ہوں۔“ میں نے کہا ”میں مرجاؤں گا مگر چوہدری دلاور سے زندگی کی بھیک نہیں مانگوں گا اور رحم کی درخواست نہیں کروں گا۔ یہ اتنا آسان بھی نہیں ہے۔ چوہدری دلاور جانتا ہے کہ میں اکیلا اور لاوارث نہیں ہوں۔ میں اس کی زندگی کی ضمانت ہوں۔ مجھے کچھ ہوا تو وہ بھی مارا جائے گا۔ اسی طاقت کے توازن کی وجہ سے وہ مجھے آج تک مار نہیں سکا۔ وہ کبھی مذاکرات کرتا ہے‘ کبھی مجھے خریدنے کی کوشش کرتا ہے اور کبھی میری کمزوری سے فائدہ اٹھانے کی۔ مجھے یقین ہے کہ اس نے تمہیں یہ سب کچھ کرنے پر مجبور کیا ہوگا۔ اس نے تمہیں دہشت زدہ کردیا ہے۔“

”یہ غلط ہے“ رابعہ چلّائی۔

”تمہاری سوچ اور فطرت میں یہ انقلاب ایسے ہی نہیں آگیا۔ ...مرد اس نے تمہیں کوئی ڈوز دی ہے۔ میں سفلی علم‘ جادو ٹونے پر تو ...ین رکھتا نہیں اور نہ یہ سمجھتا کہ تم پر کسی نے کچھ کردیا ہے۔“

”مجھے نہ کچھ ہوا ہے نہ ہوگا سکندر۔ تم دیکھو کہ جو تمہیں مل ...تا ہے تم اسے بھی ٹھکرا رہے ہو۔ مجھے‘ ایک پُرسکون زندگی کو‘ ...شحال مستقبل کو‘ وزیر خان ٹرسٹ اسپتال کو...“

”جو میرے نصیب میں ہے وہ مجھے مل جائے گا۔ اس کے لیے ...جدوجہد کروں گا اور اپنا حق حاصل کرکے رہوں گا۔“

”تم اب سیاست میں پڑنا چاہتے ہو؟“

”میں چوہدری دلاور کو سیاست سے باہر رکھنا چاہتا ہوں۔ ...رے باپ کا قاتل میرا لیڈر بنے‘ غدارِ وطن کو مُحبِ وطن کی سند ...لے‘ چور ڈاکو اس ملک کے حکمران ہوں‘ یہ میں نہیں ہونے دوں ...ا۔“

”تم مزید مشکلات میں گرفتار ہوجاؤ گے۔ تمہارے خلاف اور ...ندمات بن جائیں گے۔“

”میں ڈرنے والا نہیں ہوں رابعہ۔ چوہدری دلاور بھی جانتا ...ہے کہ وہ مجھے آسانی سے اپنی راہ سے نہیں ہٹاسکتا ورنہ وہ اتنا تردّد ...یوں کرتا۔ اس کا کیریئر بھی داؤ پر لگا ہوا ہے۔ میں‘ محسن اور گل ...لب‘ نازو اور رابعہ..... معاف کرنا‘ تمہارا نام میں نے روانی میں ...لے لیا۔ تم شاید اب ہمارے ساتھ نہیں ہو مگر ہم سب چوہدری ...اور کے بارے میں جو کچھ جانتے ہیں وہ اس کی راتوں کی نیند حرام ...کرنے کے لیے کافی ہے۔ وہ کس کس کو مروائے گا‘ کس کس کی ...زبان پر تالے ڈالے گا۔ اس کا ماضی ہی اس کے مستقبل کا سب ...سے بڑا آسیب ہے۔“

”جذباتی مت بنو سکندر۔ اپنی قانونی پوزیشن کو دیکھو۔“

”یہ کام تمہارا تھا۔ تم سے پہلے منظر کا تھا“ میں نے کہا۔

”پرانی باتوں کو بھول جاؤ۔“

”اوکے۔ تمہاری حد تک میں یہ بھول جاتا ہوں کہ تم میری ...وکیل تھیں۔ میں وہ وکالت نامہ بھی منسوخ کردوں گا۔ منظر میری ...پیروی کرسکتا ہے۔“

”تم غصے میں ہو۔ غلط مطلب نکال رہے ہو میری بات کا۔“

میں اٹھ کھڑا ہوا ”جیسا کہ تم نے کہا‘ ہم اچھے دوست رہیں ...گے مگر میں کبھی تمہارے آفس میں تم سے ملنے نہیں آؤں گا۔“

”میں اپنے پرانے گھر میں شفٹ ہورہی ہوں۔“

”پرانا گھر!“ میں نے تلخی سے کہا ”پرانا کیا ہے وہاں؟ صرف وہ ...زمین پرانی ہے جو اس عمارت کے نیچے ہے۔ بالواسطہ طور پر چوہدری ...دلاور کا یہ تحفہ تمہیں مبارک ہو۔ اس نے یہ محل چاندنی بیگم کو ...لواکے دیا تھا۔ پھر تمہیں بخش دیا۔ سارے نقصانات کی تلافی ...ہوگئی۔ تمہارے سارے شکوے گلے دور ہوگئے۔ لاکھوں کی مالیت ...کا محل بطور فیس وصول کرلینے کے بعد چوہدری دلاور کی وکالت کرنا تمہارا اخلاقی فرض ہے۔“

”سکندر! نکل جاؤ۔“ رابعہ نے چیخ کے کہا ”کمینے‘ ذلیل انسان۔ کیا کہنا چاہتے ہو تم۔ میں دلاور کی داشتہ ہوں‘ طوائف ہوں چاندنی بیگم کی طرح...“

اس نے دیوانگی کی کیفیت میں مجھ پر چیزیں پھینکنی شروع کردی تھیں۔ چائے کے کپ‘ چائے دانی‘ ایش ٹرے۔ وہ بری طرح چیخ رہی تھی اور سوچے سمجھے بغیر جو منہ میں آرہا تھا بک رہی تھی۔ نشانہ خطا ہوجانے سے بہت سی چیزیں کھڑکیوں پر لگیں اور ان کے شیشے بکھر گئے۔ میں جان بچاکے نکل سکتا تھا مگر مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ اس جنونی کیفیت میں خود کو زخمی نہ کرلے یا دیوار سے ٹکراکے سر نہ پھوڑے۔

منظر کی بیوی دروازے سے لگی سب سن رہی تھی۔ وہ ایک دم اندر آگئی۔ اس نے رابعہ کو پکڑلیا ”تم جاؤ بھیّا۔ یہ تو دیوانی ہوگئی ہے۔ رابعہ‘ اے رابعہ‘ ہوش میں آ‘ یہ کیا پاگل پن ہے۔ یا خدا... میں کیا کروں۔ ارے تم تو جاؤ یہاں سے۔ تمہیں دیکھ کے اور باؤلی ہورہی ہے یہ تو۔“

میں نے جاتے جاتے دیکھا کہ منظر کی بیوی رابعہ سے چمٹ گئی تھی۔ اندر سے تین بچے روتے دھوتے نمودار ہوگئے تھے۔ باہر سے غالب نے میرا ہاتھ پکڑ کے کھینچ لیا۔ وہ منظر کے ساتھ باہر گیا تھا تو پھر لوٹ کے اندر نہیں آیا تھا۔ وہ اور منظر باہر ہی نہ جانے کیا باتیں کرتے رہے تھے کیونکہ میں نے کافی دیر بعد منظر کی گاڑی کے روانہ ہونے کی آواز سنی تھی۔

غالب نے اندر جاکے منظر کی بیوی کی مدد کی ورنہ رابعہ اس کے قابو میں آنے والی نہیں تھی۔ غالب نے اس کا بالکل ٹھیک علاج کیا۔ وہ غالب کی طرف لپکی تھی مگر غالب نے اس کے گھماکے ایک تھپڑ رسید کیا جو اس کے گال پر پڑا اور وہ ایک جھٹکے سے پیچھے جاگری۔

”میں سکندر نہیں ہوں“ غالب نے دہاڑ کے کہا ”دماغ درست کردوں گا۔“

منظر کی بیوی ڈرگئی تھی مگر غالب نے اسے آنکھ کے اشارے سے سمجھادیا کہ یہ علاج بالمثل ہے اور ناگزیر ہے۔

”تم سب ذلیل ہو۔ تمہارا وہ دوست بھی مجھے الزام دیتا ہے۔ کہتا ہے میں بک گئی ہوں۔“ رابعہ چلّانے لگی اور پھر غالب کے سامنے کھڑی ہوگئی۔

غالب نے اس کے دوسرا جھانپڑ رسید کیا ”بکواس بند کرداپنی‘ خبردار جو تم نے سکندر کو کچھ کہا۔“

رابعہ صوفے پر گری اور روتے روتے بے ہوش ہوگئی۔ اس کے بعد ہم نے فون کرکے ڈاکٹر کو طلب کیا اور ڈاکٹر نے اسے سکون آور انجکشن دے کر ہمیں تاکید کردی کہ رابعہ پر نظر رکھیں۔

”جب یہ سو کر اٹھیں گی تو ایک نیچرل ری ایکشن ہوگا۔ شدید

قسم کا ڈیپریشن" ڈاکٹر نے کہا "ایسی کیفیت میں یہ خودکشی کی کوشش بھی کر سکتی ہیں۔"

منظر کی بیوی نے سینے پر ہاتھ رکھ کے کہا "ہائے اللہ' ڈاکٹر صاحب! آپ کوئی ایسی دوا دیں نا۔ کہ خودکشی کا خیال بھی نہ آئے۔"

"دوا تو دے دی ہے مگر دیکھیے' نفسیاتی مسائل کا حل ایک گولی یا ایک انجکشن نہیں ہے۔" ڈاکٹر نے کہا "ان کا اعتماد بحال ہونا چاہیے۔ زندگی پر اور اپنے رشتوں پر۔ اپنے آپ پر۔ انہیں احساس دلائیں کہ آپ سب کو ان کی ضرورت ہے اور اگر کوئی مسئلہ ہے تو وہ ان کی خواہش کے مطابق حل ہو جائے گا۔"

میں نے غالب کی طرف دیکھا اور سرہلایا "اس کے لیے جھوٹ بولنا پڑے گا۔"

"تو بھائی بولو۔ ایک جان بچانے کے لیے ایک جھوٹ نہیں بول سکتے! اور نہ جانے کتنے جھوٹ بولتے ہوگے اپنے فائدے کے لیے۔" بوڑھا ڈاکٹر برہم ہو گیا۔

غالب نے کہا "آپ فکر نہ کریں۔ یہ وقتی ردِ عمل تھا۔"

"میں جانتا ہوں اس لڑکی کو۔ تم سے زیادہ" وہ بولا "یہ وکیل تھی اور بہت نامور وکیل تھی۔ اس کا باپ میرا دوست تھا۔ مجھے معلوم ہے' اُس کی زندگی کیسی گزری تھی اور اس کے مسائل کیا ہیں۔"

میں نے اسے ایک دم پہچان لیا۔ "آپ..... شملہ پہاڑی کے پاس رہتے ہیں؟"

"یس۔ میں نے تو تمہیں دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔ اب میں یہاں شفٹ ہو گیا ہوں" وہ بولا "صبح یہاں کلینک میں بیٹھتا ہوں' شام کو پرانے کلینک میں۔ میں پھر آؤں گا چھ گھنٹے بعد۔ ضرورت ہوگی تو اسے ایک انجکشن اور دے دوں گا ڈرپ میں۔ گلوکوز کی ضرورت پڑے گی بہرحال۔ بارہ چودہ گھنٹے تک کچھ کھا نہیں سکتی۔"

ڈاکٹر کے جانے کے بعد میں نے کہا "غالب! میں جاتا ہوں اور نازو کو یہاں لے آتا ہوں۔"

غالب نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا "ایسی کوئی تشویش کی بات نہیں یار۔ تو خود کو سنبھال۔"

میں نے کہا "مجھے کیا ہوا ہے؟"

"لگتا تو ایسا ہے کہ ایک انجکشن کی ضرورت تجھے بھی ہے۔" غالب نے کہا۔

"میں گاڑی چھوڑ کے جا رہا ہوں' کہیں بعد میں ضرورت نہ پڑے۔"

"رابعہ نیند میں اٹھ کے تو کہے گی نہیں کہ مجھے شالیمار لے چلو یا جہانگیر کے مقبرے سے چھو لے لا دو۔" غالب نے کہا "تجھے واپس آنے کے بعد پھر جانا ہے۔"

"کہاں جانا ہے؟"

اس نے مجھے آنکھ ماری "فلیٹیز ہوٹل۔"

میں نے سرہلایا اور باہر نکل گیا۔ اس وقت میری ذہنی کیفیت بڑی عجیب تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میرے ذہن میں خلا ہے۔ میرا ماضی' حال اور مستقبل۔ سب سراب ہو گئے تھے۔ وہ ایک زلزلہ تھا جس نے میری دنیا کو یوں تہس نہس کر دیا تھا کہ کچھ بھی قابلِ شناخت نہیں رہا تھا۔ میں یادوں اور خیالوں کے کھنڈر میں تہی دست و آبلہ پا پھر رہا تھا اور اپنے خوابوں کی کرچیاں چن رہا تھا۔ میرا دل ایک اُجڑا ہوا نگر تھا جس میں حسرتوں کے مدفن پر رونے والا بھی کوئی نہ رہا تھا۔ میرے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں اور اسی کالی آندھی میں شجرِ محبت کے تن سے نوچے ہوئے مجروح پتے اُڑ رہے تھے' فریاد کناں تھے اور بے حسی کی دیواروں سے سر ٹکرا رہے تھے۔

نازو نے مجھے دیکھا تو گھبرا گئی "کیا بات ہے؟"

میں نے اسے یوں دیکھا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہوں "کیا ہوا ہے مجھے؟ تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟"

وقار یوسف کی بیوی نے بھی زبان چلانی شروع کی "سکندر بھائی! آپ تو کاٹنے کو دوڑ رہے ہیں بلاوجہ۔ ٹھیک ہی تو پوچھا ہے بے چاری نے۔ ذرا اپنی صورت دیکھیں آئینے میں۔"

میں نے کہا "آپ کو بلاوجہ بولنے کی عادت ہے۔ نازو! تم چلو میرے ساتھ۔"

"کہاں چلوں؟"

"جہنم میں" میں نے کہا "بھگا کے لے جانا چاہتا ہوں میں اپنے ساتھ۔"

نازو نے تاڑ لیا کہ کوئی بات ضرور ہوئی ہے "چلو۔"

یوسف کی بیوی پکارتی رہ گئی۔ "ارے اس وقت کہاں جا رہے ہیں' کھانا تیار ہے۔ کھانا تو کھا لیں۔ یا وحشت' انہوں نے کہا کہ چلو اور وہ چل پڑیں' اللہ خیر کرے۔"

میں نے سارے راستے نازو کو کچھ نہیں بتایا۔ مجھے اپنی توجہ سڑک پر رکھنے میں دشواری پیش آ رہی تھی۔ ڈرائیونگ کرتے ہوئے میں ذہنی طور پر غیر حاضر ہو رہا تھا اور مجھے حادثے کا ڈر تھا۔ نازو نے شاید میری صورت سے میری ذہنی کیفیت کا اندازہ کر لیا تھا اور وہ بھی کچھ ڈری ہوئی بیٹھی تھی۔

میں نے اسے منظر کے گھر کے دروازے پر اتارا اور خود گاڑی لے کر نکل گیا۔ ابھی ایک بجا تھا اور میرے پاس غزالہ عرف شیلی سے ملنے کے لیے دو گھنٹے تھے۔ میں نے یہ دو گھنٹے واقعی دیوانوں کی طرح گزارے۔ فرق صرف صحرا نوردی اور شہر کی خاک چھاننے کا تھا۔ میں کسی وجہ کے بغیر بہت سے پرانے مقامات پر گیا۔ میں نے اپنے گھر کو دیکھا جس کو وزیر خان مرحوم نے بڑے ارمانوں سے بنایا تھا مگر اسے موت بھی آئی تھی تو پرائی چھت کے نیچے۔ پھر میں نے اسے دوبارہ حاصل کیا اور اسے رابعہ نے اپنے خوابوں سے سجایا۔

میں ضامن رضوی صاحب کے پرانے گھر کی طرف گیا جہاں اب نہ جانے کون رہتا تھا۔ میں نے غالب کا کھنڈر ہو جانے والا گھر دیکھا اور نازو کے مکان کو جو اَب کسی اور کی ملکیت تھا۔

میں نے ہر راستے سے پوچھا۔ تم نے رابعہ کو دیکھا ہوگا۔ راستے کے ہر شجر کی گواہی لی۔ تم تو جانتے ہو وہ مجھ سے محبت کرتی تھی۔ شہر کی ہوا سے پوچھا' کوچہ و بازار سے سوال کیا' بہار کے شگوفوں سے اور چاہت کے راز داں گوشوں سے دریافت کیا۔ وہ سب جیسے اجنبی ہو گئے تھے۔ وہ سب اپنی ویران آنکھوں سے میرے دل کی ویرانی کو دیکھتے تھے۔ غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی' دِوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری۔

تین بجے سے بہت پہلے ہی میں فلیٹیز میں جا گھسا۔ "مجھے ڈاکٹر شیلا خان سے ملنا ہے" میں نے انگریزی میں کہا "کون سا کمرا ہے اس کا؟"

"سوری سر۔ ہم....."

میں نے چلا کے کہا "مجھے معلوم ہے کہ اس نے تمہیں منع کر رکھا ہے لیکن اسے کچھ ہو گیا تو ذمے داری بھی تم ہی پر آئے گی۔ میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ وہ بلاوجہ چھپ کے نہیں رہتی۔"

کلرک گھبرا گیا۔ "آپ..... ایک منٹ ٹھہریں۔ میں منیجر کو بلاتا ہوں۔"

منیجر نسبتاً معقول اور پُرسکون تھا۔ "کیا آپ بتا سکتے ہیں......"

"نو۔ میں کچھ نہیں بتا سکتا۔ خطرہ اس کے لیے ہے مگر مشکل تمہارے لیے ہی ہوگی۔ بے شک تم معاملہ دبا دو گے اور..."

"اوکے۔ اوکے۔ آپ تشریف رکھیں۔ میں انہیں بلاتا ہوں۔ اپنا نام بتانا پسند کریں گے آپ؟"

"سکندر۔" میں نے کہا اور اس بورڈ پر شیلا خان کا نام تلاش کرنے کی بے سود کوشش کی جس کے خانوں میں مہمانوں کے کارڈ لگا دیے جاتے ہیں۔ پھر میں ویٹنگ لاؤنج میں ٹہلتا رہا اور ایک صوفے سے اٹھ کر دوسرے صوفے پر بیٹھتا رہا۔ میری حرکات و سکنات' اضطراب اور بے سکونی کو دیکھ کر کوئی بھی اندازہ کر سکتا تھا کہ میں اگر پاگل نہیں ہوں تو نارمل بھی نہیں ہوں۔

دس منٹ گزر گئے۔ کلرک اپنے کام میں مصروف تھا مگر کبھی کبھی نظر اٹھا کے مجھے دیکھ لیتا تھا۔ منیجر واپس اپنے کمرے میں لوٹ گیا تھا مگر اس نے عقلمندی کی تھی کہ سیکیورٹی کو الرٹ کر گیا تھا۔ میری نگاہ ہر دس پندرہ سیکنڈ کے بعد گھڑی پر جاتی تھی لیکن اب میں نے خود کو سمجھا لیا تھا کہ مجھے ضبط سے کام لینا چاہیے۔ اتنا کافی ہے کہ شیلا خان موجود ہے اور ہوٹل کی انتظامیہ نے اسے بلوا لیا ہے۔ ہنگامہ آرائی کا نتیجہ اُلٹا بھی نکل سکتا ہے۔ یا تو وہ پولیس کو بلا لیں گے یا ان کی اپنی سیکیورٹی والے مجھے اٹھا کے باہر پھینک دیں گے۔

شیلی اس وقت پرس جھلاتی ہوئی نمودار ہوئی جب میرے صبر کا پیمانہ چھلکنے ہی والا تھا "ارے تم۔ یار' حد کر دی تم نے۔ کہاں سے آ رہے ہو؟"

"جہنم سے" میں نے کہا۔

وہ ہنس پڑی "ہاں صورت سے ایسا ہی لگ رہا ہے۔ میرا خیال ہے' بھاگ کر آئے ہو۔"

"تم تو ایسے قلعہ بند ہو کے بیٹھی ہو۔ ابھی فساد ہو جاتا یہاں۔"

"یار' وہ مجبوری ہے۔ تم تو جانتے ہو۔" اس نے بڑی لجاجت سے کہا "میں نے گاڑی منگوائی ہے۔ بیٹھو' ایک کپ چائے پیو۔"

"مجھے کچھ اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ گاڑی ہے میرے پاس' باہر کھڑی ہے۔"

"اسے باہر ہی کھڑا رہنے دو" وہ بولی "کھانا کھا لیا ہے؟"

"میرا دل چاہتا ہے زہر کھا لوں۔"

"اوکے۔ میں کافی اور سینڈوچ منگواتی ہوں۔ تم زہر ہی سمجھ کے کھا لینا یار۔ پتا ہے آج میں نے بھی لنچ نہیں کیا۔ ہفتے میں ایک بار میں لنچ گول کر دیتی ہوں' ایک بار ڈنر۔ تمہاری خاطر اپنا اصول توڑ رہی ہوں۔"

"میری خاطر کچھ مت کرو۔" میں نے برہمی سے کہا "کسی کو ضرورت نہیں میرے لیے کچھ کرنے کی۔"

"بڑے گرما گرم نکلے ہو جہنم کے شعلوں سے۔ پہلے کچھ ٹھنڈا پی لو۔ تمہارے تو دل سے ہی نہیں' دماغ سے بھی دُھواں اُٹھ رہا ہے۔" اس نے بڑی بے تکلفی سے میری کمر میں ہاتھ ڈالا اور مجھے اپنے ساتھ کھینچ کر ایک ٹیبل تک لے گئی۔

"کم آن یار۔ مجھے بتاؤ تو سہی کچھ۔ آخر کیا ہوا ہے؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے تھوڑا سا پانی پی کے کہا "سگریٹ ملے گی یہاں؟"

"صرف سگریٹ۔ پینے کی کوئی اور چیز مانگو یار۔ وہ بھی مل جائے گی۔" وہ ہنسی اور اس نے ایک چُغد صورت ویٹر کو اشارہ کیا "پہلے سگریٹ' پھر کافی اور دو کلب سینڈوچ۔ جتنی جلدی لاؤ گے اتنا ہی زیادہ انعام ملے گا۔ لے آئے؟ اُف... تم تو ابھی کھڑے ہو یہیں۔"

چُغد صورت ویٹر نے دانت نکالے اور بھاگ گیا۔

"تم سگریٹ پیتے ہو۔ بہت اچھا کرتے ہو۔" وہ بولی "کل کیا توبہ کر لی تھی؟"

"توبہ توڑ دی ہے میں نے۔"

"تمام لوگ یہی کرتے ہیں۔ اور ظاہر ہے تم خاص تو ہو نہیں۔ مٹی کے پُتلے ہو' خطا کے پُتلے ہو" وہ بولی "یار' ہے تو بری چیز مگر مجھے وہ مرد اچھے لگتے ہیں جو اسٹائل سے سگریٹ پیتے ہوں۔ راجر مور

کی طرح۔"

"تم نے رفیق کو بلوایا ہے؟" میں نے اپنا سر تھام کے کہا۔

"وہی آرہا ہے گاڑی لے کر۔ تمہارے سر میں درد ہے؟"

"ہاں۔ اچھا ہوتا میں اسپرین بھی منگوالیتا۔"

اس نے ہینڈ بیگ کی ایک زپ کھولی "یہ لو' آخر ڈاکٹر ہوں میں۔ دواخانہ ساتھ لے کر پھرتی ہوں۔"

جب میں نے سگریٹ سُلگائی تو ایک لمحے کے لیے میرے ہاتھ کانپے اور جھجک نے میرے احساس کا دامن تھاما مگر میں نے کہا "وعدہ۔ کیسا وعدہ۔ لعنت وعدہ کرنے والے پر۔ کسی کو وعدے کا پاس نہیں تو مجھے کیوں ہو۔" پھر ایک انتقامی جذبے کے تحت میں نے سگریٹ جلالی اور اس کے پہلے کش نے میرے وجود میں انقلاب برپا کردیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے دُھوئیں کے ساتھ ساتھ میں نے اندر جمع ہوجانے والے غبار کو بھی خارج کردیا ہے۔

اس نے کہا "یار' تم کسی سے لڑکے آئے ہو؟ میری طرف دیکھ ہی نہیں رہے ہو۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ اس نے ڈارک میرون سلک کی قمیص کے ساتھ زرد شلوار پہن رکھی تھی اور اس کا دوپٹا بھی شلوار کے رنگ کا تھا۔ گہرے میرون رنگ کی قمیص سلیو لیس تھی چنانچہ اس کے بدن کا مرمر اپنی تمام تابناکی کے ساتھ عیاں تھا۔ اس کی گردن کے نیچے جیسے برف کا میدان سا تھا جس کی سفیدی میں شفق کا سنہرا پن جھلملا رہا ہو۔ گردن کی نزاکت کے ساتھ کانوں میں جھولنے والے آویزے ایک طلسماتی اثر رکھتے تھے۔ نیلی آنکھیں اور سنہرے بال اس منظر کو مزید رنگین بناتے تھے

"تم بلاشبہ قیامت خیز لگ رہی ہو۔" میں نے کہا۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا یار کہ میری تعریف کرو۔" وہ مسکرائی "کوئی بات کرو' کچھ کہو کہ ہوا کیا ہے۔ کسی نے مارا ہے؟ یہ کیا ہے کہ تم آدمی نہیں' خدائی مخلوق لگ رہے ہو۔ کسی نے قرض دینے سے انکار کیا ہے؟ یا قرض مانگا ہے؟"

ویٹر نے سگریٹ اور منقش مونو گرام والا سنہرا لائٹر ایک ٹرے میں پیش کیا "ابھی دو منٹ میں کافی لاتا ہوں میڈم۔"

"رابعہ کا دماغ خراب ہوگیا ہے شیلی۔ تم نیورولوجی کی ماہر ہو' اسے دیکھو" میں نے کہا۔

"پھر وہی غلطی کررہے ہو تم۔ میں اعصابی امراض کی ڈاکٹر ہوں۔"

"یار' اس کا نروس بریک ڈاؤن ہوگیا ہے۔ اسے ڈاکٹر نے انجکشن دے کر سُلا دیا تھا" میں نے چڑ کے کہا "میرا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ سچ مچ پاگل ہوگئی ہے۔ اسے تم ٹھیک کرسکتی ہو۔"

"او کے۔ میں رابعہ کو ٹھیک کردوں گی۔ پہلے تم تو ٹھیک ہوجاؤ۔ یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے۔ ڈھنگ کے کپڑے نہیں ہیں تمہارے پاس۔ شیو کب سے نہیں کی۔ اب تم بالکل مجنوں لگ رہے ہو یار۔"

"فکر مت کرو' تم ذرا بھی لیلیٰ نہیں لگ رہی ہو۔ تمہاری رُسوائی نہیں ہوگی" میں نے کہا۔

باہر سے چوکیدار نے ایک چابی لاکے اسے پیش کی "لو گاڑی تو آگئی یار مگر رفیق کیوں نہیں آیا۔ خیر' پہلے پیٹ پوجا۔"

"میرا بالکل دل نہیں چاہتا..."

"یار' کھانا معدے میں جاتا ہے' دل میں نہیں۔ کھالو ورنہ میں زبردستی کروں گی" وہ بولی "مجھے بہت تجربہ ہے ایسے مریضوں کو کھانا کھلانے کا جو..."

"میں مریض نہیں ہوں تمہارا۔" میں نے بادل ناخواستہ ایک سینڈوچ اٹھالیا۔

ہم باہر نکلے تو وہی سیاہ مرسیڈیز پارکنگ ایریا میں موجود تھی۔ شیلی نے ادھر اُدھر دیکھا اور پھر کہا "رفیق کیوں نہیں آیا آخر؟"

اس نے گاڑی کھولی اور میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا "تمہارا کیسے رابطہ رہتا ہے اس سے؟"

اس نے گاڑی کو ریورس کیا "جیسے تم سے رہتا ہے۔ یار' آدمی اسی دنیا میں ہو تو رابطہ کیا مشکل ہے۔ میں نے تو سنا ہے' لوگ دوسری دنیا سے روحوں کو بُلا لیتے ہیں۔ اُف' خدا سمجھے ان ریڑھے والوں سے۔ ایسی ریس لگاتے ہیں آپس میں کہ کچھ نہیں دیکھتے۔ سمجھتے ہیں کہ سڑک تو سنسان پڑی ہے۔ ابھی گاڑی لگ جاتی تو اُلٹا مجھ سے لڑتے کہ ریڑھے کا ستیاناس کردیا" وہ ہنس پڑی۔

"تمہیں دیکھ کر اور تمہاری باتیں سن کے کون یقین کرسکتا ہے کہ تم نے لندن میں زندگی گزاری ہے۔" میں نے کہا۔

"یار' میں پاکستان آتی رہی ہوں۔ کبھی دو مہینے قیام کیا' کبھی دو ہفتے۔ اور جب میں آتی تھی تو خوب آوارہ گردی کرتی تھی۔ اکیلی پھرتی تھی گلی کوچوں میں' سڑکوں پر اور بازاروں میں۔"

میں نے کہا "ایک منٹ۔ یہ آواز کیسی ہے؟"

اس نے غور کیا "ڈکی میں کوئی چیز ہے۔ ٹائر ہوگا۔"

میں نے کہا "ٹائر ایسے ہی تو نہیں رکھا جاتا۔ ٹائٹ کرکے رکھا جاتا ہے نٹ بولٹ کے ساتھ" میں نے کہا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو یار۔ کل تو یہ آواز نہیں تھی۔"

میں نے کہا "یہ تو..... ایسا لگتا ہے جیسے کوئی لاتیں مار رہا ہے۔"

اس نے گاڑی ایک کنارے پر روک دی "تم دیکھو یار۔"

میں نے چابی سے ڈکی کھولی اور ایک لمحے کے لیے مجھے خوف کی سرد لہر نے مفلوج کردیا۔ اس میں ایک شخص تڑپ رہا تھا۔ اس کا جسم لہولہان تھا مگر اس کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے اور منہ میں کپڑا ٹھونس دیا گیا تھا۔ وہ چند سانسوں کا مہمان نظر آتا تھا!

وہ رفیق تھا۔ اس کی دونوں کلائیاں کٹی ہوئی تھیں اور رگوں سے بہنے والا خون ڈکّی میں بچھے ہوئے سرخ کارپٹ کے رنگ کو زیادہ گہرا کرنے کے بعد اِدھر اُدھر بہنے لگا تھا۔ اس خون کے چھینٹوں نے ڈکی کو اوپر سے اور سائڈ سے لہو رنگ کردیا تھا۔

رفیق کی آنکھیں بند ہورہی تھیں۔ میں نے اس کے منہ میں ٹھونسا ہوا کپڑا نکالا تو میرے ہاتھ خون میں بھر گئے۔ "رفیق....." میں نے چلاّ کے کہا۔

آگے سے شیلی نے سر نکال کے مجھے دیکھا "سکندر! کیا ہوا؟"

"شیلی! کسی نے رفیق کو مار کے گاڑی میں ڈال دیا ہے۔ وہ مرنے والا ہے" میں نے چلاّ کے کہا۔

شیلی دروازہ کھول کے باہر آئی۔ اس نے ڈکی میں جھانکا اور پھر میرے خون آلود ہاتھوں کو دیکھا "ہم اسے اسپتال لے چلتے ہیں۔"

میں نے نفی میں سرہلایا "اتنا وقت نہیں ہے۔"

شیلی نے مجھے دھکیلا "یار! خدا کے لیے ایسے مت کھڑے رہو۔ بند کرو ڈکی۔"

میں نے کہا "شیلی! وہ مر رہا ہے۔"

"ہم اسے مرنے سے نہیں بچاسکتے۔" شیلی نے پُرخوف نظروں سے ادھر اُدھر دیکھا۔ "چلو بیٹھو' گاڑی میں چلاؤں گی۔ دیکھو' اپنے ہاتھوں کا خیال رکھنا۔ داغ کپڑوں پر نہ لگ جائیں۔"

"یہ تم کیا کررہی ہو.....؟" میں نے احتجاج کیا۔

"یار' کچھ تو عقل سے کام لو۔ ابھی راہ چلتے کوئی رک گیا یا کسی نے دیکھ لیا تو تم پھنس جاؤ گے۔" شیلی نے گاڑی اسٹارٹ کی "کیا جواب دوگے تم کسی کو۔ اپنے ساتھ میرا بھی بیڑا غرق کراؤ گے۔"

"آخر تم جا کہاں رہی ہو؟"

"جہاں اس سے بات کی جاسکے اور کوئی دیکھنے والا نہ ہو" اس نے گاڑی کی رفتار بڑھا کے ادھر اُدھر نگاہ ڈالی۔

سڑک پر گاڑیاں مسلسل آجارہی تھیں۔ موٹر سائیکلیں گزر رہی تھیں۔ بسیں اور تانگے چل رہے تھے۔ یہ میری قسمت تھی کہ عین اس وقت جب میں ڈکی کھولے کھڑا تھا' میرے قریب سے کوئی بس نہیں گزری ورنہ نسبتاً بلند کھڑکی سے جھانکنے والا کوئی بھی مسافر ڈکی کے اندر رفیق کو اور اس خون کو دیکھ سکتا تھا جس میں میرے ہاتھ رنگے ہوئے تھے۔ قریب سے گزرنے والا کوئی راہ گیر بھی رک جاتا تو رفیق کے عالمِ نزع میں تڑپنے کا منظر دیکھ لیتا اور وہ آوازیں سن لیتا جو خراخراہٹ کی صورت میں اس کے حلق سے برآمد ہورہی تھیں۔

"شیلی' خدا کے لیے گاڑی روکو کہیں۔"

"مجھے نروس مت کرو۔ میں جگہ دیکھ رہی ہوں۔"

"جگہ کی فکر مت کرو۔ سڑک کے آخری کنارے پر اس دیوار کے ساتھ روک لو۔ وہ مرجائے گا شیلی تو ہمیں کچھ معلوم نہیں ہوگا۔"

"یار' تم جذباتی ہورہے ہو۔ کسی نے ہمیں پھنسانے کی کوشش کی ہے۔ پھانسی چڑھ جائیں گے ہم دونوں" اس کی حالت خوف سے غیر ہورہی تھی اور مجھے ڈر تھا کہ اتنی رفتار کے ساتھ وہ کسی کو ٹکر مار کے نئی مصیبت نہ کھڑی کردے۔

میں نے اپنے ہاتھوں کو جسم سے دور کرلیا تھا۔ ہوا سے خون میری ہتھیلیوں اور انگلیوں پر خشک ہونے لگا تھا۔

شیلی نے اچانک ایک جگہ گاڑی کو تھوڑا سا دائیں طرف گھمایا اور پھر بریک لگا کے ریورس گیئر میں ڈال دیا۔ گاڑی تیزی سے پیچھے گئی اور کسی اسکول کی چار دیواری سے جا لگی جہاں ضرورت مندوں نے مجبوری میں اخراجِ آب کرتے ہوئے اس عبارت کو بھی نظرانداز کردیا تھا جس میں رائے عامّہ کو متوجہ کرنے کے لیے لکھا گیا تھا "دیکھو کتا پیشاب کررہا ہے" دوسری جگہ "یہاں پیشاب کرنا سخت منع ہے" کی عبارت پر فلمی پوسٹر آگئے تھے۔

شیلی تیزی سے اتری "جاؤ' اب دیکھو اسے۔ میں بونٹ کھول کے انجن کو دیکھتی ہوں۔"

"انجن کو کیا ہوا؟"

"یار' بُدھو ہو تم بھی۔ کوئی دیکھے گا تو سمجھے گا کہ گاڑی میں خرابی ہوگئی ہے۔ متوجہ ہوگا تو میری طرف..."

میں اس وقت تک پیچھے پہنچ چکا تھا۔ میں نے ڈکی کھولی تو خود دیوار سے لگ گیا۔ رفیق اب ساکت تھا اور اس کی آنکھیں بند تھیں۔ میں نے پہلے اس کی نبض دیکھنے کا ارادہ کیا تھا مگر میرے ہاتھ آگے بڑھ کر رک گئے۔ اس کی کلائیاں عین نبض کے مقام پر کسی تیز دھار خنجر یا بلیڈ سے کاٹ دی گئی تھیں اور ان میں سے باقی ماندہ خون اب بھی رِس رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ رفیق کے ساتھ یہ سفاک قاتلانہ واردات تقریباً اسی وقت ہوئی تھی جب وہ گاڑی لے کر آیا تھا۔ شاید قاتل اس کے پیچھے تھے یا اس کے ساتھ تھے کہ انہوں نے رفیق کو باندھ کے ڈکی میں ڈالا اور اس کی کلائیاں کاٹ کے چابی اندر بھجواتے ہی فرار ہوگئے۔

میں نے اسے آواز دی "رفیق... رفیق' میری طرف دیکھو۔"

مجھے لگتا تھا کہ میری یہ حرکت دیوانگی کے سوا کچھ نہیں۔ بھلا آواز دینے سے کہیں مُردے بھی آنکھیں کھولتے ہیں لیکن اچانک رفیق کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی اور اس نے مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں موت کے ویران سائے اتر چکے تھے اور بظاہر یہ زندگی کی آخری رمق تھی جس کو بروئے کار لاتے ہوئے اس نے میری آواز سُنی اور اس آواز کی طرف دیکھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ عالمِ نزع میں جب موت کا اندھیرا غالب آرہا ہو تو آدمی کے حواس کس حد تک اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ اگر عکس آنکھ کے پردے پر بنتا ہے تو بصری نظام کا پیغام دماغ کے اس حصے تک پہنچتا ہے یا نہیں جہاں عکس محفوظ رہتے ہیں۔ شعور' لاشعور اور تحت الشعور کے خانوں میں یادوں کا لامحدود ذخیرہ موجود ہوتا ہے۔ کیا اس وقت یہ ممکن

ہوتا ہے کہ واقعات' مقامات اور صورتوں کے نقوش کی لائبریری سے آدمی ایک آواز کے مانوس حوالے سے رشتے کو شناخت کرسکے ؟

میں نے رفیق کے اوپر جھکنے کے لیے اپنا آدھا دھڑ ڈکی میں ڈال دیا۔ "میری آواز سن رہے ہو تم رفیق! میں سکندر بخت ہوں۔"

مجھے یوں لگا جیسے اس نے خفیف سی جنبش سے مجھے اثبات میں جواب دیا ہو۔ اس کے لب ہلے اور اس نے قوت ارادی سے کام لیتے ہوئے زندگی کے آخری لمحات میں کچھ کہنے کی کوشش کی جو اس کے نقطہ' نظر سے اہم تھا۔ اس کے ہونٹ بھی بالکل سفید ہو رہے تھے اور چہرہ بے جان ہوچکا تھا۔

"رفیق! یہ کس نے کیا' چوہدری دلاور نے؟... بولو۔"

"بھا..... جا..... "اس کے حلق کی غراہٹ میں یہی دو لفظ میری سمجھ میں آئے۔

"بھائی جان... کون بھائی جان؟" میں نے کہا "دلاور کا بھائی؟"

"جا... جا..... یا..... یا..... جا..... کے" اس نے سر اٹھانے کی بے سود کوشش کی اور پھر ایک انگلی اٹھائی۔

اس کے ساتھ ہی سانسوں کا وہ کوٹا ختم ہوگیا جو قدرت کی طرف سے اسے دنیاوی زندگی گزارنے کے لیے عطا کیا گیا تھا۔ خالق کائنات یوں اپنے قادرِ مطلق ہونے کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ کسے صرف ماں کے پیٹ میں سانس عطا ہوں گے' کون اس عالمِ آب و گل میں چند سانس لینے کے بعد پھر اسی کی طرف لوٹ جائے گا جس نے اسے مٹی سے پیدا کیا اور پھر مٹی میں شامل کردیا۔ ہے کوئی اعجازِ مسیحائی کا دعوے دار جو گوشت کے ایک لوتھڑے کو دنیا میں جینے کے لیے سو سال دے سکے' یا جہاں مرگِ ناگہاں آئے' وہاں زیادہ نہیں صرف سو سانسوں کی مہلت بڑھا سکے؟

میرے دل میں ایک شیشہ سا ٹوٹ کے بکھر گیا تھا اور کرچیاں کانٹوں کی طرح میری روح میں اتر گئی تھیں۔ رفیق کی کھلی آنکھیں مجھے الزام دیتی محسوس ہوتی تھیں کہ... بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے۔ کاش ہم پہلے سے باہر موجود ہوتے اور کلب سینڈوچ کھانے اور کافی ختم کرنے میں چند منٹ بھی نہ گنواتے۔ شیلی کی احتیاط بجا لیکن ایک منٹ پہلے شاید رفیق میرے سوال کا جواب دے سکتا تھا۔ وہ بات کہہ سکتا تھا جو مبہم الفاظ بن کے اس کے لبوں پر ادھوری رہ گئی۔

میں نے اس کی آنکھیں بند کرتے ہوئے ان بے معنی الفاظ پر غور کیا اور نامکمل لفظوں کے آگے پیچھے دوسرے حروف شامل کرکے کوئی مطلب اخذ کرنے کی کوشش کی مگر با... جا... بھا... یا با اور جا سے کچھ پتا نہیں چلتا تھا۔ آخر وہ کیا بتانا چاہتا تھا؟ اس کے اشارے کا مقصد کیا تھا جب اس نے ایک انگلی اوپر اٹھائی تھی۔

میں نے سر اٹھا کے اوپر دیکھا تو ڈکی کے اندر والے حصے پر خون کے چھینٹوں کے درمیان مجھے ایک خونی تحریر نظر آئی۔ یہ ٹیڑھے میڑھے الفاظ تھے جو کچھ پھیل گئے تھے اور صاف پڑھے بھی نہیں جاتے تھے لیکن اچانک میرا تجسس بیدار ہوگیا تھا۔ رفیق بے بس تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ مرنے والا ہے۔ اس کے لبوں پر دستِ قاتل نے مہر لگادی تھی مگر اس نے ہار نہیں مانی کہ خونِ دل میں ڈبوئی ہیں انگلیاں ہم نے۔ اب یہ لہو سراغ دے گا قاتلوں کا۔ رفیق نے اپنی انگلیوں تک بہہ آنے والے خون کی سرخی کو استعمال کرتے ہوئے ڈکی کے اندر تین حروف لکھے۔ اس وقت شاید اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ اس کے پاس وقت ہوتا تو جگہ اتنی نہ تھی کہ وہ پورا نام لکھ سکتا۔ ڈکی کی اندرونی سیاہ سطح پر مشکل سے تین حروف لکھے جاسکتے تھے۔

ایک حرف کو آڑا پڑھا جاتا تو وہ این تھا۔ دوسری طرف سے وہ زیڈ بھی ہوسکتا تھا۔ دوسرا حرف جو ڈکی کے اندرونی حصے میں دستیاب جگہ پر لکھا گیا تھا' وہ واضح طور پر انگریزی کا یو تھا لیکن تیسری جگہ رفیق نے پھر زیڈ یا این لکھا تھا۔ وہ اٹھ کے بیٹھ نہیں سکتا تھا۔ اس کے ہاتھوں سے خون اُبل رہا تھا اور گاڑی کی ڈکی میں اندھیرا تھا۔ اسے جھٹکے لگ رہے تھے اور اس کے لیے ہاتھ اوپر اٹھا کے تین حروف لکھنا بھی سخت ترین مرحلہ تھا مگر اس نے کوشش کی اور کامیاب رہا۔

میں نے ڈکی بند کی ہی تھی کہ صورت سے رشوت خور اور خبیث نظر آنے والے ایک ٹریفک سارجنٹ نے اپنی موٹر سائیکل عین کار کے سامنے روکی۔ شیلی کار کے انجن میں کچھ نہیں کررہی تھی۔ وہ بار بار مجھ سے کچھ پوچھ رہی تھی مگر میں نے اس کی آواز سننے کے باوجود اسے جواب نہیں دیا تھا۔ میری ساری کوشش اور توجہ رفیق سے چند حروف اُگلوانے کے لیے تھی جن سے اس قتل کے یا قاتل کے بارے میں کوئی مفید بات معلوم ہوسکے۔

پولیس کو دیکھ کر شیلی گھبرا گئی۔ اس نے ایک دم بونٹ بند کردیا۔

"یہ گاڑی آپ کی ہے؟" سارجنٹ نے کہا۔

"نہیں.... ہاں... میرا مطلب ہے نہیں۔"

وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا "اتنا گھبرا کیوں گئی ہو جناب؟ ایک ساتھ ہاں بھی اور نہیں بھی۔"

شیلی نے خود کو سنبھالا "وہ دراصل... میں مالک نہیں ہوں اس گاڑی کی۔ یہ کرائے کی گاڑی ہے.... لیکن استعمال تو میں کررہی ہوں۔"

"اچھا جی! کاغذات ہیں آپ کے پاس؟"

"کاغذات!.... پتا نہیں" شیلی نے بے بسی سے مجھے دیکھا۔

"پتا نہیں کیا... معاملہ کچھ مشکوک ہے۔" اس نے یہ آخری بات اپنے آپ سے لیکن شیلی کو سنانے کے لیے کی تھی۔

میں اپنے ہاتھ صاف کرنا چاہتا تھا مگر مجھے معلوم تھا کہ رومال سے خون کو صاف نہیں کیا جاسکتا۔ اتفاق سے ڈکی میں "ہنڈرڈ آکٹین" پیٹرول کا بند ڈبا رکھا ہوا تھا۔ میں نے اسے کھول کر پیٹرول سے ہاتھ صاف کیے۔ اگر میں گاڑی کے پچھلے حصے میں' دیوار کے ساتھ نہ ہوتا تو سارجنٹ یقیناً دیکھ لیتا کہ میرے ہاتھوں کو صاف کرنے والے پیٹرول میں سرخی شامل ہے۔ میں نے یہ ظاہر کیا کہ گاڑی میں کام کرتے ہوئے میرے ہاتھوں پر کالک یا تیل کے داغ لگ گئے تھے جن کو اسی طرح صاف کیا جاسکتا ہے۔ پیٹرول کی بو میں خون کی مہک بھی دب گئی تھی۔

اپنے ہاتھوں کو چھپاتے ہوئے میں دوسری طرف گیا اور اندر سے گاڑی صاف کرنے کا کپڑا لے کر اپنے ہاتھ کہنیوں تک صاف کیے۔ میرے اندازِ بے نیازی سے ظاہر ہوتا تھا کہ میں شیلی کی طرف سے مطمئن ہوں اور یہ سمجھتا ہوں کہ وہ ٹریفک سارجنٹ سے نمٹ لے گی۔

شیلی نے کہا "دیکھو آفیسر! گاڑی لے کر آتا ہے ڈرائیور۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ کاغذات ہیں یا نہیں۔ ظاہر ہے جو کمپنی گاڑی بھیجتی ہے وہ ایسے ہی تو نہیں بھیج دیتی ہوگی۔ میں نے نہ کبھی ڈرائیور سے پوچھا' نہ کاغذات دیکھے۔"

"خیر' اب دیکھ لیں۔ کیا یہ ڈرائیور ہے گاڑی کا؟"

میرے جواب دینے سے پہلے شیلی نے کہا "یار' یہ میرے شوہر ہیں۔ کمال کرتے ہو۔"

سارجنٹ اس کے "یار" کہنے پر چونکا "گاڑی کون چلارہا تھا؟"

"میں چلارہی تھی اور کون چلارہا تھا" شیلی اب جارحانہ موڈ میں تھی "تم بولو مسئلہ کیا ہے؟ کوئی جرم کیا ہے میں نے؟"

"جرم نہیں کیا تو کیا میں نے آپ کو گپ شپ کے لیے روکا ہے جی!"

"یار' میں یہاں پہلے سے رُکی ہوئی تھی۔ تم بعد میں آئے ہو۔"

"آخر تم کیا چیز ہو؟ تمہیں پتا ہے یار کیا ہوتا ہے؟" سارجنٹ چڑ گیا "ایسے یاریاں لگاتی پھرتی ہو۔"

شیلی چراغ پا ہوگئی۔ "زبان سنبھال کے بات کرو میرے ساتھ۔ میں ڈاکٹر شیلا خان ہوں اور میں برٹش نیشنل ہوں۔ ابھی برطانوی سفیر کو مطلع کردوں گی تو وزارت خارجہ تک بات پہنچ جائے گی۔"

اب سارجنٹ کی حالت دیکھ کے مجھے ہنسی آئی "سرجی' کیوں ہر ایک کے متھے لگتے ہو۔ یہ تو دیکھ لو کہ گاڑی مرسیڈیز ہے۔ تمہارے آئی جی صاحب کے پاس بھی ہوگی تو رشوت سے خریدی ہوگی۔"

"تم نے.... تمہاری وائف نے ون وے کی خلاف ورزی کی تھی۔"

"کب کی تھی... اور کہاں؟"

"پچھلے چوک سے پہلے۔"

"تم وہاں کھڑے تھے تو وہیں کیوں نہیں روکا تھا؟"

"مجھے رپورٹ ملی تھی۔ ڈیوٹی پر موجود کانسٹیبل سے۔ اس نے گاڑی کا نمبر نوٹ کرلیا تھا اور یہ بھی بتایا تھا کہ انہوں نے رفتار کی حد سے زیادہ تیز ڈرائیونگ کی۔"

"چھوڑو یار۔ ایک کانسٹیبل کی بات پر اعتبار کرتے ہو" شیلی نے پھر اسے یار کہہ دیا "ہم تو اُدھر سے گزرے ہی نہیں۔ اُدھر سے آئے ہیں۔ کیا تم اسے جھوٹ ثابت کرسکتے ہو؟"

اچانک مجھے خیال آیا کہ جس لڑکی نے تمام عمر لندن میں گزاری ہو' وہ فرنچ بھی جانتی ہوگی۔ زیادہ نہ سہی تھوڑی بہت ضرور سمجھ لیتی ہوگی۔ میں نے اس سے پوچھا "تمہیں فرنچ آتی ہے؟"

"کیوں نہیں!" اس نے حیرت کے ردِعمل کو چھپالیا "میں تمہیں فرنچ سکھا سکتی ہوں۔"

"تو پھر اس سے مت اُلجھو۔ اسے صرف سو کا ایک نوٹ دے دو جس کے لیے یہ کھڑا ہے اور خواہ مخواہ کے قانونی مسائل پیدا کررہا ہے۔"

"میرے پاس ٹریولر چیک ہیں اتفاق سے۔ کیا میں اسے فلیٹیز کا پتا دے دوں؟ بعد میں آکے لے جائے۔ جی چاہتا ہے اس کا پیٹ پھاڑ دوں۔"

میں نے ہنس کے کہا "سرکاری پیٹ ہے۔ عوام کے خرچے پر پلا بڑھا ہے۔ میں دے دیتا ہوں جرمانہ۔"

سارجنٹ کی حالت اب واقعی غیر ہوگئی تھی۔ اس نے فلیٹیز ہوٹل کا نام بھی سن لیا تھا اور ہماری فرنچ اس کے خاک پلے نہیں پڑی تھی۔

میں نے اپنی جیب میں سے سو کا ایک نوٹ نکالا "لو جناب مال' اب تو کوئی جرم نہیں کیا نا ہم نے؟ اب جاؤ' اللہ حافظ۔"

اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور نوٹ لے لیا "ڈاکٹر صاحب تو ایسے ہی ناراض ہو رہی ہیں۔ آخر ہمارا بھی فرض بنتا ہے کوئی۔"

"فرض نہیں۔ ایک نقطہ بڑھا دو۔ قرض... پبلک تمہاری مقروض رہتی ہے۔ ہر وقت اور ہر جگہ۔ اور قرض وصول کرنے کے لیے تمہیں وردی پہن کے خوار ہونا پڑتا ہے۔ بڑی سخت ڈیوٹی ہے تمہاری" میں نے کہا۔

اچانک اس نے کہا "یہ داغ کیسا ہے؟"

میں نے کہنی کے پاس خون کی سرخی کو دیکھا۔ اس وقت میں ذرا بھی گھبرا جاتا تو اس کے دل میں شکوک پیدا ہوتے "یہ خون ہے۔"

"خون.... کس کا؟"

"ابھی کٹ لگ گیا تھا" میں نے جیب سے رومال نکال کے بڑے اعتماد کے ساتھ اس سرخی کو صاف کیا۔
"کٹ تو مجھے نظر نہیں آرہا ہے۔"
"پھر کیا نظر آرہا ہے؟" میں نے برہمی سے کہا "سو سے زیادہ کے چکر میں پڑو گے تو مشکل میں پڑو گے۔ میری بیوی پاکستان میں نہیں رہی لیکن میں یہیں کی پیداوار ہوں۔ یقین نہیں تو زمان خان سے پوچھ لینا۔ اور کچھ ضرورت ہو تو ان سے میرا نام لے کر مانگ لینا۔"

وہ فوراً روانہ ہونے کے لیے موٹر سائیکل کو کک مارنے لگا
"ایک بات پوچھوں سر جی؟ ناراض مت ہونا۔"
"یار، پوچھو جلدی سے اور سامنے سے گاڑی ہٹاؤ" شیلی نے بے زاری سے کہا۔
"ڈاکٹر صاحب کو جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی کہ آپ اُدھر سے آئے ہی نہیں ہو؟" اس نے شیلی کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرانے کی کوشش کی۔
میں نے کہا "کیا تم ثابت کرسکتے ہو کہ ہم اُدھر سے آئے تھے؟"

اس نے روانہ ہوتے ہوئے کہا "ثابت تو آپ بھی نہیں کرسکتے سر جی کہ آپ کے بازو پر کوئی کٹ تھا اور خون آپ کا ہی ہے۔"
جب وہ چلا گیا تو مجھے یوں لگا جیسے فرشتۂ اجل میرے دروازے پر دستک دے کر لوٹ گیا ہو۔ معلوم نہیں کیوں اس نے اپنے شکوک کی تصدیق نہیں کی۔ عام حالات میں کسی وجہ کے بغیر ہی پولیس والے اپنے اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے جسے چاہتے ہیں "مشکوک" بنادیتے ہیں۔ ایسا اکثر ہوتا ہے کہ رات گئے اخبارات کی آخری کاپی پریس میں بھیج کر گھر لوٹنے والے صحافی اور بعض اوقات سنیما کا آخری شو دیکھ کر آنے والے انہیں مشکوک حالت میں پھرتے نظر آجاتے ہیں یا محسوس ہوتے ہیں۔ بس اسٹاپ پر کھڑا ہوا کلرک، کام کے انتظار میں سرراہ بیٹھا ہوا راج مزدور، نائٹ کالج میں پڑھانے والا پروفیسر۔ مشکوک کسی کو بھی قرار دیا جاسکتا ہے اور پھر اس الزام سے عزت و آبرو کے ساتھ بچنے کا جرمانہ ہر شخص اپنی استطاعت کے مطابق ادا کرتا ہے۔ میرا ذاتی تجربہ یہ تھا کہ ان کے چنگل سے بچ نکلنے کا ہنر صرف صحافی جانتے ہیں جن کی رسائی افسران بالا اور حکومت کے اعلیٰ حکام تک ہوتی ہے اور جو خبر چھاپ کے رائی کا پہاڑ بھی بنادیتے ہیں۔
ہم واضح طور پر انسپکٹر کے شک کی زد میں آچکے تھے لیکن وہ شیلی کی برطانوی شہریت سے ڈر گیا اور فریج نے ہمارے "غیر ملکی" ہونے کا ثبوت فراہم کردیا۔ بیک وقت پاکستانی اور برطانوی شہریت رکھنے والے عام لوگ نہیں ہوتے اور شیلی نے تو باقاعدہ دھمکی بھی دے دی تھی کہ وہ برطانوی ہائی کمشنر سے شکایت کرے گی۔ میں نے برطانوی شہری ہونے کا کوئی دعویٰ نہیں کیا تھا مگر شیلی نے علی الاعلان مجھے اپنا شوہر تسلیم کرلیا تو پھر یہ ازخود ثابت ہوگیا کہ میں بھی عام آدمی نہیں۔ مرسیڈیز، فلیٹیز کا حوالہ، برطانوی شہریت اور ڈاکٹر شیلی کے نام کا مجموعی اثر یہ ہوا کہ انسپکٹر نے ہم سے پنگا لے کر اپنی نوکری کو خطرے میں ڈالنے سے گریز کیا اور سو روپے غنیمت جان کے رخصت ہوگیا۔
لیکن وہ میرے لیے پریشانی کے بہت سے اسباب چھوڑ گیا تھا۔ گاڑی چلتے ہی میں نے کہا "شیلی! رفیق مرگیا۔"
"میں بہت نروس ہوں یار۔۔۔"
"خدا کے لیے ہر ایک کو یار کہنا چھوڑ دو" میں نے کہا "یہ امریکا یا برطانیہ نہیں کہ جسے چاہا بڈی یا پال کہہ دیا۔ خصوصاً عورتیں۔۔۔"
"آئی ڈیم کیئر۔ تمہارے اس منافق معاشرے پر سو بار لعنت بھیجتی ہوں میں" شیلی کا موڈ بے حد خراب تھا۔ مرد "یار" کہے تو اس کا مطلب ہے دوست اور عورت کہے تو یاری کا مطلب ناجائز تعلقات۔ یہ مطلب نکالنے والے بھی تم مرد۔۔۔ میں پوچھتی ہوں۔۔۔"

"اچھا بحث مت کرو۔" میں نے بگڑ کے کہا "یہ وقت ہے اس معاشرے کی اخلاقی اقدار پر نکتہ چینی کا۔ تمہاری کار کی ڈکی میں ایک لاش پڑی ہوئی ہے اور وہ لاش کسی اجنبی کی نہیں، اس شخص کی ہے جسے تم اپنا خاص آدمی کہتی تھیں۔ تمہیں افسوس نہیں ہے اس کی موت کا؟"
"افسوس ہے تو کیا میں جاہل عورتوں کی طرح چلّا چلّا کے رونے لگوں، سینہ کوبی کروں؟ یار، وہ میری وجہ سے مارا گیا۔ مجھ سے زیادہ رنج کسے ہوسکتا ہے" شیلی نے افسردگی سے کہا۔
"جس نے اسے قتل کیا وہ تمہیں بھی قتل کرسکتا ہے۔ یہ اس کی طرف سے پیغام ہے، دھمکی ہے" میں نے کہا۔
"اسی لیے تو میں نروس ہوں۔ کسی کو معلوم ہوگیا تھا کہ وہ مجھ سے ملتا ہے۔۔۔"
"معلوم تو ہونا ہی تھا۔ تم کیا سمجھتی ہو، دنیا اندھی ہے یا بے وقوف ہے؟" میں نے کہا۔
"تم ملنا چاہتے تھے اس سے۔ میرے کمرے میں؟" وہ تلخی سے بولی۔
"وہ کچھ بتانے کی کوشش کرتا رہا۔" میں نے پیچھے مڑ کے دیکھا "کوئی ہمارا پیچھا تو نہیں کررہا ہے؟"
"یار، مجھے کیا معلوم؟" وہ بولی۔
"اچھا مجھے ڈرائیونگ کرنے دو" میں نے کہا "گاڑی روکو اور میری جگہ آجاؤ۔"
اس نے ایسا ہی کیا "فرض کرو کوئی تعاقب میں ہوا تو تمہیں کیسے معلوم ہوگا؟"

میں نے کہا "تم دیکھتی رہو۔ اس مصیبت سے چھٹکارا تو حاصل کرنا ہی پڑے گا کسی نہ کسی طرح۔"
میں نے مرسیڈیز کو لاہور کی جانی پہچانی سڑکوں پر دوڑانا شروع کیا۔ اگلے آدھے گھنٹے میں اپرمال، آرائے بازار اور ایئرپورٹ سے ابھی آتے ہوئے میں نے اندازہ کرلیا کہ اب کوئی بھی ہمارے تعاقب میں نہیں ہوسکتا۔ میں نے رفیق کے آخری الفاظ بھی شیلی کو بتائے تھے جو اس نے مجھ سے کہے تھے اور جو اپنے خون سے لکھے تھے۔ شیلی نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی مگر وہ ان الفاظ میں کوئی ربط تلاش نہ کرسکی۔
"این یو این۔ یا زیڈ یو این" شیلی نے ایک ڈائری میں لکھ کے اِدھر اُدھر سے دیکھا "این یو زیڈ۔ زیڈ یو زیڈ۔"
ایک دم میرے ذہن میں حروف نیون سائن کی طرح جگمگائے اور پھر مسلسل جلنے بجھنے لگے۔ "زیڈ یو این۔ دیٹ از رائٹ۔ رفیق نقوی کا تو پی اے تھا۔ زیڈ یو نقوی صاحب کا۔"
شیلی نے ماتھے پر ہاتھ مارا "حد ہوگئی یار۔ یہ تو سامنے کی بات ہے۔"
"یہی تو انسانی ذہن کا مسئلہ ہے۔ وہ الجھن اور پیچیدگی میں پڑجاتا ہے۔ چراغ تلے اندھیرا نظر نہیں آتا اور وہ ہر طرف روشنی ڈھونڈتا رہتا ہے۔"
"مگر اسے نقوی صاحب کا نام لکھنے سے کیا فائدہ ہوا؟"
میں نے کہا "اسے کیا فائدہ ہوتا۔ وہ تو مرتے مرتے کچھ بتا گیا ہے۔ اب سمجھنا ہمیں چاہیے۔"
"یار، مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ میں واپس کیسے جاؤں گی؟ وہاں تو میں بالکل اکیلی ہوں۔" شیلی نے کہا۔
"تم نے مزید عقلمندی یہ کی تھی کہ فلیٹیز کا نام بھی لیا تھا۔ اس انسپکٹر کے سامنے۔"
"میں نے۔۔۔ مجھے یاد نہیں" وہ بے خیالی میں بولی۔
"تم نے کہا تھا کہ اسے فلیٹیز بلا کے پیسے دوں گی لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جنہوں نے رفیق کو عین فلیٹیز کے دروازے پر قتل کیا انہیں معلوم ہے کہ تم اسی ہوٹل میں ہو۔"
"ہوٹل کے دروازے پر۔۔۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟" وہ بولی۔
"ممکن ہے چند منٹ پہلے قتل کیا ہو۔"
"لیکن کس لیے؟ یار، یہ کوئی آسان کام تو نہیں تھا نا۔ میرا مطلب ہے، ایک آدمی کی کلائی کاٹنا۔۔۔ اسے باندھنا۔۔۔"
میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ کچھ لوگ اس کے ساتھ ہی آئے تھے۔ وہ کم سے کم دو ہوں گے۔ انہوں نے رفیق کو پہلے ہی باندھ کے اور اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کے ڈکی میں ڈال دیا ہوگا۔ ہوٹل کے باہر گاڑی پارک کرکے انہوں نے صرف یہ کیا کہ ڈکی کھولی اور کسی خنجر سے اس کی کلائیاں کاٹ دیں۔ شاید ایک نے یہ کام کیا اور دوسرے نے چابی اندر پہنچادی۔ راستے میں تو رفیق کو باندھ کے ڈالنا مشکل تھا۔ وہ گھر سے ہی ساتھ روانہ ہوئے ہوں گے اور ظاہر ہے، وہ ایسے لوگ تھے جن پر اعتماد کیا جاسکتا تھا۔"
"اوہ سکندر! اب میرا کیا ہوگا؟ میں وہاں کیسے واپس جاؤں گی؟ میرا تو سامان بھی ہوٹل میں پڑا ہوا ہے۔"
"یہ بعد میں سوچیں گے" میں نے کہا۔
اس نے تائید میں سرہلایا "ہاں۔ پہلے اس سے تو جان چھڑالیں۔ کیا تم پولیس اسٹیشن جارہے ہو؟"
"پولیس اسٹیشن! تمہارا دماغ خراب ہے کیا؟"
"پھر۔۔۔ لاش کو کہاں چھوڑو گے؟ رفیق کے گھر کا بھی پتا نہیں مجھے" شیلی نے کہا "اپنے بھائی کے ساتھ رہتا تھا۔ بھابی سے بالکل نہیں بنتی تھی۔"
"بیوی بچے تھے؟"
"نہیں یار۔ ابھی شادی نہیں کی تھی بے چارے نے" شیلی نے کہا۔
"اچھا ماں باپ، بھائی بہن۔۔۔؟"
اس نے نفی میں سرہلایا "میرا خیال ہے کہ کوئی نہیں۔"
"چلو یہ بھی اچھا ہی ہے۔ مرنے والا تو مرجاتا ہے، دکھ جھیلنے کے لیے رہ جاتے ہیں لواحقین۔ بھائی کی بیوی تو خدا کا شکر ادا کرے گی کہ جان چھوٹی۔ پھر بھائی بھی صبر کرلے گا" میں نے کہا "میرا کام کچھ آسان ہوگیا ہے۔"
"کیا مطلب؟"
"مطلب بھی معلوم ہوجائے گا۔ یہ بتاؤ، تم نے رفیق کو ٹیلی فون کرکے بلوایا تھا؟" میں نے کہا۔
"اور کیسے بلواتی یار۔ خود جاتی؟"
"کہاں فون کیا تھا؟" میں نے کہا۔
"نقوی صاحب کے گھر" شیلی نے کہا "یہ تم کدھر جارہے ہو؟"
"اپنے گھر۔ خاموش بیٹھی دیکھتی رہو۔ اب جو کچھ میں کروں گا اپنی ذمے داری پر کروں گا" میں نے کہا "تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ اس وقت تم کتنی بڑی مصیبت میں گرفتار ہوسکتی تھیں۔"
اس نے مجھے شکر گزار نظروں سے دیکھا "تھینک یو یار!"
"اب اپنے دماغ سے نکال دو یہ خیال کہ تمہارے بھیّا کو تمہارے پاکستان میں موجود ہونے کا علم نہیں تھا۔ اسے تو تمہارے کمرے کا نمبر بھی معلوم ہوگا ڈاکٹر شیلا خان عرف غزالہ سہگل۔"
"تم کیوں مجھے دہشت زدہ کررہے ہو؟"
"میں تمہیں حقائق سے باخبر کررہا ہوں۔ دہشت زدہ ہونے سے کچھ نہیں ہوگا ڈیئر شیلی۔ جب جب جو جو ہونا ہے تب تب سو سو ہوتا ہے۔ یہ بڑا عظیم مقولہ ہے۔"
"کس کا؟"
"کسی کا بھی ہو۔ مطلب یہ ہے کہ وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا

ہوتا ہے اور خدا کو کیا منظور ہوتا ہے' یہ کوئی جان نہیں سکتا چنانچہ فکر مندیا پریشان ہونے کا کوئی فائدہ نہیں" میں نے کہا "جہاں میں تمہیں لے جارہا ہوں وہ میرا آبائی گھر تھا۔ بلکہ ہے مگر میں وہاں نہیں رہتا۔"

"پھر اب کون رہتا ہے وہاں یار؟"

"یادیں" میں نے کہا "ممکن ہے تمہیں وہ گھر آسیب زدہ لگے۔ یادیں خوش گوار نہ ہوں تو آسیب بن جاتی ہیں۔"

"وہاں کیا کام ہے؟"

"آج میں اور تم وہیں رہیں گے۔ تمہیں ڈر تو نہیں لگے گا نا؟"

اس نے مجھے بے یقینی سے دیکھا "یار' ڈر کس سے۔۔۔ تم سے؟"

"اس لاش سے۔۔۔ رفیق کی لاش بھی تو ہوگی" میں نے کہا۔

"معلوم نہیں تم کیا کرنا چاہتے ہو۔ رات بھر ہم اس لاش کے ساتھ بیٹھ کے کیا کریں گے؟"

میں نے کہا "مجھے ذرا سوچنے دو۔ رنگے ہاتھوں پکڑے جانے سے تو بچ گئے ہیں لیکن اب اس لاش کا ڈسپوزل باقی ہے۔ کیا یہ کار واقعی کرائے کی ہے؟"

"ہاں۔ ابھی ایسے ہی کام چلا رہی تھی میں۔ سیٹل ہو جاتی تو شاید کوئی گاڑی خرید بھی لیتی۔"

"جس رینٹ اے کار سروس سے تم نے گاڑی منگوائی تھی' وہ تمہیں جانتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"نہیں یار۔ میں نے تو رفیق سے کہا تھا۔ رفیق سے انتظام کرایا تھا۔ نام پتا اس کا تھا' ضمانت اسی کی تھی۔"

"جو بھی گاڑی لے کر آتا تھا' وہ تمہیں جانتا تو ہوگا؟"

"نہیں۔ رفیق کہہ دیتا تھا کہ گاڑی ہوٹل پہنچادو۔ کوئی ڈرائیور چابی ریسپشن پر چھوڑ جاتا تھا۔"

ایک عرصے بعد میں پھر ماڈل ٹاؤن میں تھا جہاں کے سب راستے میرے جانے پہچانے تھے۔ گھنے' پرانے درختوں کے نیچے خستہ حال سڑکوں پر شام کے سائے اترنے لگے تھے۔ پرانی وضع کی کوٹھیوں کے سبزہ زاروں میں نئی بہاروں کا شوخ رنگ نمایاں ہورہا تھا۔ جھاڑیوں اور پودوں نے پتوں کا لباس پہن لیا تھا لیکن مجموعی طور پر گردوپیش کے ماحول میں کوئی نمایاں تبدیلی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ کہیں کسی کوٹھی پر نیا رنگ ہوا تھا یا کسی نے سامنے کے حصے کو بدل کے جدید طرز تعمیر کا تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔

مرحوم نواب خسرو جمشید کا جلا ہوا محل اسی طرح ویران اور غیر آباد پڑا تھا۔ اس کے ایک گوشے میں ان کے جدِ امجد کی قبروں پر سنگِ مرمر کی بارہ دری کے سائے میں ایک ملنگ ٹائپ فقیر سویا پڑا تھا۔ کسی دن وہ اس قبر پر گوٹے والی لال ریشمی چادر ڈال دے گا۔ اس کے سرہانے اگربتیاں جلادے گا اور چاروں طرف رنگین جھالریں لٹکا کے چھت پر کوئی جھنڈا لگادے گا۔ زیادہ چالاک اور پروفیشنل ہوگا تو کتبہ بدل ڈالے گا اسی میں نام کے آگے پیچھے القاب و آداب کا اضافہ کرکے ساتویں نواب کی قبر کو کسی فرضی پیر کے آستانے میں بدل کے خود گدی نشین ہو جائے گا۔ دو چار سال بعد یہ جگہ مرجع خلائق بھی بن جائے گی۔

میرے اپنے گھر کا پھاٹک بند تھا۔ میں نے کار سے اتر کے اسے خاصی مشکل سے کھولا مگر اس بات کا خاص خیال رکھا کہ گاڑی کے گزر جانے کے بعد پھاٹک پھر پہلے کی طرح بند نظر آئے۔ نیم پختہ سڑک سے پھاٹک تک کچے راستے پر ٹائروں کے نشانات بن گئے تھے۔ میں نے گاڑی صاف کرنے والا کپڑا زمین پر مار کے ان نشانات کو مٹادیا۔ آگے پختہ فرش تھا جس پر باریک گرد جمع تھی۔ گاڑی اس پر سے گزرتی تو ٹائروں کے نقش دو متوازن لکیروں پر ضرور نظر آتے۔ یہ سراغ مٹانے کا ایک مشکل طریقہ یہ ہو سکتا تھا کہ میں بعد میں ڈنڈے والا برش لے کر پورے راستے کو صاف کر ڈالوں لیکن میں نے ایک آسان طریقہ سوچ لیا۔

میں نے گاڑی کی ڈکی میں سے کپڑے کا کوَر نکالا۔ رفیق کی لاش اس کوَر کے اوپر ہوتی تو کپڑا خون سے تر ہوتا مگر اسے لپیٹ کر بنڈل کی طرح ایک کونے میں ٹھونس دیا گیا تھا۔ میں نے کوَر کو پچھلے بمپر کے ساتھ ایسے باندھا کہ جب گاڑی چلے تو فرش پر پھیلا ہوا کوَر خود ہی مٹی صاف کرتا جائے۔

شیلی یہ سب دیکھ رہی تھی اور عادتاً اس نے مجھ سے بہت سے سوالات بھی کئے تھے مگر میں نے اسے ایک جواب دے کر خاموش کردیا تھا کہ "بعد میں بتاؤں گا۔ ابھی چپ چاپ دیکھتی رہو۔"

میری ترکیب کامیاب رہی۔ اب کوئی بھی سراغ دیکھ کر اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ گیٹ سے کوئی گاڑی اندر گئی ہوگی۔ پرانے خالی گیراج کا گیٹ کھول کے میں نے شیلی کو اشارہ کیا کہ وہ گاڑی اندر لے جائے۔ گیٹ کھولنے کے لیے مجھے اس کی کنڈی میں لگا ہوا زنگ خوردہ تالا توڑنا پڑا تھا اور اب اس تالے کو پھر بند کرنے کے لیے چابی میرے پاس نہیں تھی۔

گیراج میں اندھیرا ہوگیا تھا۔ میں نے سوئچ آن کیا تو لائٹ جل گئی۔ گیراج کا پچھلا راستہ اندر سے مقفل تھا اور اس کی چابیاں وہیں دیوار پر لٹکی ہوئی تھیں۔ میں نے اسے تائید ایزدی سمجھتے ہوئے قفل کھولا اور شیلی کے ساتھ اسٹور سے گزر کے کچن میں پہنچ گیا۔

"اب تم یہاں ٹھہرو" میں نے کہا۔

"کیوں؟ یار تم کہاں جارہے ہو مجھے چھوڑ کے؟"

میں نے اسے تسلی دی "کہیں نہیں جارہا ہوں۔ ذرا یہ تالا باہر سے گیراج میں لگادوں۔ ڈرو مت۔ یہاں بھوت نہیں رہتے۔"

"آج آگئے ہیں رہنے کے لیے" شیلی نے گرد سے اَٹے ہوئے کچن کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

میں کچن کی کھڑکی سے باہر گیا اور گیراج کی کنڈی لگا کے پھوہڑ تالا ڈال دیا جو عرفِ عام میں علی گڑھ کا تالا کہلاتا تھا۔ اس پر بھی زنگ کی افراط تھی اور میں نے پوری کوشش کی کہ یہ زنگ اصل حالت میں موجود رہے۔ لان کے آخری حصے میں اور گیراج کے سامنے بہت سے تختے' ایک سیڑھی' ایک پرانا ڈرم اور زنگ سے سڑ ہو جانے والے سریے کے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے انہیں احتیاط سے اٹھایا اور گیراج کے سامنے ڈھیر کردیا۔ سیڑھی میں دروازے کے سامنے یوں کھڑی کردی جیسے پہلے کبھی گیراج کی چھت کی صفائی کے لیے رکھی گئی تھی۔ تختوں کے بعد ڈرم رکھتے ہوئے میں نے اسے زور سے لڑھکادیا۔ ڈرم کے اندر سے خشک چونے کے ڈلے باہر گرے اور ڈرم کی چادر پر سے سیاہ پپڑیاں فرش پر پھیل گئیں۔ سریے کے ٹکڑوں کو میں نے تختوں پر آڑا ترچھا ڈال دیا۔ پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ میں نے اپنی کارکردگی کا جائزہ لیا اور مطمئن ہوگیا۔ یوں لگتا تھا کہ یہ سب کاٹھ کباڑ برسوں سے پڑا ہوا ہے۔ یہ خیال کسی کے ذہن میں آہی نہیں سکتا تھا کہ راستہ صاف کئے بغیر کوئی گاڑی اندر جاسکتی ہے۔

سامنے والے حصے میں پورچ کے نیچے برآمدے میں کھلنے والے دروازے سے نچلی منزل کی کھڑکیوں تک سب شیشوں پر گرد کی تہ خود اپنی کس مپرسی کی داستان کہتی تھی۔ اوپری منزل کی حالت بھی مختلف نہ تھی۔ منڈیروں پر اور چھجوں پر خس و خاشاک جھول رہے تھے اور آشیاں بنانے والے پرندوں کو یقیناً یہ اطمینان حاصل ہوگا کہ وہ صفائی پسندی کے نام پر آشیانے اُجاڑنے والوں کی چیرہ دستی سے محفوظ ہیں۔

لان میں گھاس سوکھ گئی تھی یا بے ہنگم طریقے پر بڑھ گئی تھی۔ پھولوں کے تختے ویران تھے اور اُجڑے ہوئے چمن کے شجر سوال کرتے محسوس ہوتے تھے کہ نگری نگری پھرنے والے لوٹ کے کب گھر آؤ گے' کب لاؤ گے اپنی بہاریں' کب تک پھول کھلاؤ گے۔ اُداس بام و در پوچھتے تھے کہ سنگ و خشت کی دیواروں میں مقید خوابوں کو تعبیر کب ملے گی۔ عہد رفتہ کی یادوں کے اس مدفن کو وزیر خاں کے وارث کب اپنائیں گے۔ تم نے اسے پھر خرید تو لیا ہے سکندر اور شاید اس سے تمہارے احساس ملکیت کی خلش مٹ گئی ہو لیکن جو مکان آباد نہ ہو وہ گھر نہیں ہوتا۔

میرے پاس نہ کوئی جواب تھا' نہ وعدہ اور نہ حرفِ تسلی۔ رابعہ کے رویّے کی تبدیلی نے میرے لیے احساس جرم کی پشیمانی بڑھادی تھی اور امیدوں' حسرتوں اور خواہشوں کے گلاب بن کھلے مرجھانے لگے تھے۔ وہ وقت ابھی میرے تصور کی دسترس میں بھی نہ تھا جب میں بالآخر غم دو جہاں سے فراغت پاکے اس رنگوں سے دمکتے' روشنیوں سے جگمگاتے اور خوشیوں سے مہکتے گھر کے گوشے گوشے میں اپنی شریک زندگی سے پورے اعتماد' خلوص اور یقین کے ساتھ کہہ سکوں کہ میرا یہ گھر اب تمہارا ہے۔ مجھ سمیت اور ان بے بہا یادوں کے خزینے سمیت جن سے میری زندگی عبارت تھی اور ان سب توقعات اور نیک خواہشات سمیت جن کے ساتھ میرے باپ وزیر خاں نے یہ امانت مجھے سونپی تھی۔

میں لوٹ کے اندر گیا تو شیلی کچن کا دروازہ تھوڑا سا کھول کے اندر جھانک رہی تھی۔ میں نے اپنے پیچھے دھڑ سے دروازہ بند کیا تو وہ چیخ مار کے اچھل پڑی۔

"یار' ابھی میرا ہارٹ فیل ہو جاتا" اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔

"ایسے اندر کیا دیکھ رہی ہو۔ چلو تمہیں اندر سے دکھاؤں۔ یہ گھر میرے والد نے بنایا تھا" میں نے اس کا ہاتھ پکڑلیا "میرا بچپن اسی گھر میں گزرا۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ میں لندن چلا گیا اور میرے والد سے یہ گھر چھین لیا گیا۔ انہوں نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔ معلوم نہیں کیوں۔ اپنا سب کچھ ہار دیا مگر مجھے خبر بھی نہ ہونے دی۔ پھر ان کو یہاں قتل کردیا گیا اور مجھے ابھی تک ان کے قاتلوں کی تلاش ہے۔ بڑی مشکل سے میں نے یہ گھر بہت زیادہ قیمت ادا کرکے پھر حاصل کیا تھا۔ اس امید میں کہ ایک نہ ایک دن یہ پھر آباد ہوگا لیکن معلوم نہیں وہ دن میرے مستقبل میں کہاں ہے۔ کتنی دور ہے؟"

شیلی بڑی دلچسپی سے پرانے گھر کی ہر چیز کو دیکھتی جارہی تھی "یہ فرنیچر اور پردے' قالین' یہ اتنے پرانے تو نہیں لگتے۔ مٹی بہت پڑی ہوئی ہے۔"

"ہاں۔ یہ سب رابعہ نے خریدے تھے۔ اس نے گھر کو پوری طرح فرنش کیا تھا۔ بڑے شوق سے۔"

"اس کا ذوق بھی برا نہیں۔"

"برا کچھ بھی نہیں۔ سوائے میرے نصیب کے" میں نے ٹھنڈی سانس لی۔

شیلی ہنس پڑی "نصیب کو کیوں الزام دیتے ہو یار۔"

"اس لیے کہ اور کسی کو الزام دیا نہیں جاسکتا۔ قصور شاید صرف میرا ہے۔ میرا دماغ خراب تھا۔"

"تھا۔۔۔ یعنی اب نہیں ہے؟" وہ مشکوک لہجے میں بولی۔

میں نے مسکرا کے کہا "شاید تم میرا دماغ درست کردو گی۔"

اس نے نفی میں سرہلایا "الٹا تم مجھے پاگل کردوگے۔ ابھی سے میرے اعصاب جواب دینے لگے ہیں یار۔ خاک اعصابی امراض کی ماہر ہوں میں۔"

میں نے کہا "تمہیں کیسی لگی یہ جگہ؟"

اس نے فلسفیانہ موڈ میں کہا "جگہ نہ کوئی اچھی ہوتی ہے' نہ بری۔ رہنے والے کھنڈر میں خوش رہتے ہیں ورنہ محل میں رہ کے بھی روتے ہیں۔ زندگی ایک رویّہ ہے یار۔ ایک ATTITUDE اس کے مثبت یا منفی ہونے پر ہی سب کچھ منحصر ہے۔ ویسے میں یہاں خوش رہ سکتی ہوں کیونکہ اس میں ایک CHARM ہے۔ بڑا

رومانٹک قسم کا جس کا تعلق روایات سے اور گزرے ہوئے وقت کی اچھی یادوں سے ہوتا ہے۔ بس ضرورت ہے اس جگہ کو اوور ہال کرنے کی۔ اس کی ظاہری صورت نہ بدلی جائے لیکن کلر اسکیم ایک دم نئی ہو۔ اور یہ سامان۔ اس میں کوئی قباحت نہیں۔ ڈرائی کلیننگ اور نئی پالش وغیرہ کی ضرورت ہوگی۔ ڈیکوریشن بھی اس کی۔۔۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر شیلی! آپ سے انٹیریئر ڈیکوریشن پر مشورہ نہیں مانگا تھا میں نے۔ نہ یہ آپ کا کام ہے۔"

وہ کچھ شرمندہ ہوئی "سوری یار۔ میں بس ایسے ہی سوچنے لگی تھی۔ بہ آوازِ بلند سوچ رہی تھی۔ خیر یہ بتاؤ کہ یہاں کیوں آئے ہیں ہم؟"

"اس لیے کہ ہم اور کہیں نہیں جاسکتے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ آج رات تم فلیٹیز میں واپس جاتیں تو صبح تک پتا نہیں کیا ہوجاتا۔"

"کیا ہوجاتا؟ ابھی تک تو کچھ ہوا نہیں تھا۔"

"ابھی تک تم مجھ سے نہیں ملی تھیں۔ اگر دلاور کو تمہارے بارے میں یہ معلوم تھا کہ تم پاکستان میں ہو تو وہ تم پر نظر رکھے یہ دیکھ رہا تھا کہ تم کیا کرتی ہو۔ مجھ پر تو اس کی نظر بہت پہلے سے ہے۔ اب اس نے اپنا پیغام بالکل لگی لپٹی رکھے بغیر پہنچادیا ہے کہ مجھے چکر دینے کی کوشش کی تو تمہارا انجام بھی رفیق سے مختلف نہیں ہوگا۔"

"ہوٹل میں وہ کیا کرسکتا تھا آخر۔۔؟" وہ سوچنے لگی۔

"ڈاکٹر صاحب! یہ پاکستان ہے اور چوہدری دلاور کے ذہن کو تم کبھی سمجھنے کا دعویٰ نہیں کرسکوگی۔ وہ کچھ بھی کرسکتا ہے۔ ویسے تو زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن اب تمہیں بہت محتاط رہنا ہوگا۔ تمہارا مجھ سے ملنا تمہارے بھائی کو سخت ناگوار گزرا ہے۔ میری مانو تو واپس لندن چلی جاؤ اور وہیں سکون سے رہو۔"

اس نے نفی میں سرہلادیا "میں اپنے ارادے اتنی جلدی نہیں بدلتی یار۔ دلاور سے نہ میرا کوئی رشتہ ہے۔۔۔۔۔"

"رشتہ تو ہے۔"

"میں نہیں تسلیم کرتی ایسے رشتوں کو۔ مجھے اس سے کوئی دشمنی بھی نہیں مگر وہ سمجھتا ہے کہ مجھ سے میری دولت ہتھیالے گا یا مجھے ختم کرادے گا تو یہ اتنا آسان نہیں ہوگا اس کے لیے۔ میں اپنی حفاظت خود کرنا جانتی ہوں۔ اور اب تو یہ ذمے داری بھی تم نے قبول کرلی ہے۔"

"میں نے۔۔۔۔ نہیں ڈاکٹر شیلی۔ یہ کہنا ابھی قبل از وقت ہے۔"

"پھر یہاں کیوں لائے ہو مجھے یار؟ جانے دیتے واپس اپنے ہوٹل" اس نے خفگی سے کہا۔

"تمہارے ساتھ مجھے اپنی بھی فکر تھی۔ روپوش رہنے کے لیے مجھے اس سے بہتر کوئی جگہ نہیں سوجھی" میں نے کہا۔

"لیکن یہاں ہم کب تک روپوش رہ سکتے ہیں؟"

"بس آج کی رات خیریت سے گزر جائے" میں نے کہا "ایک تو مجھے ان کا ردِ عمل دیکھنا تھا۔ پھر تم سے کچھ پوچھنا تھا اور اس لاش کا بندوبست کرنا تھا۔ میں کوئی رسک نہیں لے سکتا تھا۔"

"کیا میں پھر ہوٹل نہیں جاسکتی؟"

"کم سے کم آج نہیں۔ کیا ہے تمہارا ہوٹل میں؟ پاسپورٹ وغیرہ؟ نقد رقم۔۔؟"

اس نے نفی میں سرہلایا "ایک سوٹ کیس ہے کپڑوں کا۔ نقد رقم تو میں رکھتی نہیں۔ ٹریولرز چیک ہیں امریکن ایکسپریس کے۔ پاسپورٹ بھی میں ساتھ ہی رکھتی ہوں۔"

میں نے کہا "یہاں سونے کا مسئلہ کوئی نہیں لیکن تھوڑی دیر میں رات ہوجائے گی۔ ہم کھانے کے لیے کچھ بھی نہیں لائے۔"

"کچن میں کچھ نہیں ہوگا؟"

میں نے نفی میں سرہلایا "اگر ہوا تو چائے یا کافی کا سامان ہوگا۔ میں پیچھے سے نکل جاتا ہوں۔"

"مجھے اکیلا چھوڑ کے جاؤ گے۔۔۔ نہیں یار۔"

میں نے کہا "تمہیں کچھ نہیں ہوگا دس منٹ میں۔ دروازے بند کرکے بیٹھ جاؤ۔ ویسے تو بہت بہادر بن رہی تھیں کہ مجھے اپنی حفاظت کرنا آتی ہے اور ریوالور بھی دکھایا تھا ایک۔ کہاں ہے وہ ریوالور؟"

اس نے بیگ میں ہاتھ ڈالا "یہ۔۔۔ لیکن آج تک میں نے کسی کو بھی قتل نہیں کیا۔"

"فوری طور پر کسی کو قتل کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔" میں نے کہا "تم اتنی دیر میں کچن کا سروے کرو اور دیکھو کہ ہم چائے یا کافی بنا کے پی سکتے ہیں یا رات ایسے ہی گزرے گی۔ پانی پی پی کر۔"

میں کچن کے راستے باہر گیا اور دس منٹ بعد بسکٹ کے ڈبے' سموسے اور کیک لے کر لوٹا تو کچن کافی کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔

"یار' یہاں تو سب کچھ ہے۔ سوائے دودھ کے۔" شیلی نے بتایا "الیکٹرک کیٹل مل گئی۔ برتن تو سب نئے ہیں۔ پورے پورے سیٹ بھرے پڑے ہیں۔"

میں نے افسردگی سے کہا "رابعہ کے خریدے ہوئے ہوں گے۔"

"باتھ روم میں تولیہ اور صابن ہے۔ تم چاہو تو منہ دھولو یا نہالو۔"

میں نے کہا "نہیں۔ ابھی ضرورت نہیں۔ کافی مجھے بلیک ہی دے دو۔ تمہارے لیے میں یہ دودھ لے آیا تھا۔ کنڈنس ملک۔"

"اچھا کیا۔ مگر مجھے تو عادت ہے بلیک کافی پینے کی۔ چینی کے بغیر۔ تمہارے لیے چینی ہے۔"

میں نے کھانے پینے کا سامان شیلف میں رکھ دیا۔ "شیلی! تم کو اندھیرے میں ڈر تو نہیں لگے گا؟"

"لائٹ ہے نا یار۔"

"کچھ دیر بعد میں ہر لائٹ آف کردوں گا۔" میں نے کہا "جو کھانا ہے کھالو۔ کیتلی میں ڈھیر ساری کافی بنالو۔ اندھیرے میں ہی پلگ لگاکر گرم کرتے رہیں گے۔"

اس کی صورت ایک سوالیہ نشان بن گئی "لیکن کیوں؟"

میں نے کہا "مجھے یقین ہے کہ تمہیں اور مجھے تلاش کرنے والے بالآخر یہاں بھی آئیں گے۔ ہم ان کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ ہم اندھیرے میں دم سادھے بیٹھے رہیں گے اور باقی کام بعد میں کریں گے۔ جب وہ مایوس ہو کے لوٹ جائیں گے۔"

"باقی کام۔۔۔؟"

"ایک تو ہر بات تمہیں سمجھانی پڑتی ہے اور تم سوال بہت کرتی ہو۔ جو ہوگا تمہارے سامنے ہوگا۔" میں نے کہا "چلو یہ سب سامان اٹھاؤ۔ ہم اندر چلتے ہیں۔ بیڈ روم میں۔"

"بیڈ روم میں۔۔۔۔" اس نے بڑی مشکل سے کہا۔

"ڈرو نہیں۔ ہم صرف باتیں کریں گے۔ یہ پاکستان ہے میڈم اور یہاں ہم رشتوں کا لحاظ رکھنے کے عادی ہیں۔ ہم عورت کی عزت کی اہمیت کو سمجھتے ہیں اور جب کسی پر اس کی حفاظت کا فرض عائد ہوجائے تو وہ جان دے کر بھی اپنا فرض نبھا سکتا ہے لیکن نہ کسی کے اعتماد کو دھوکا دے سکتا ہے اور نہ اپنے آپ کو۔ خصوصاً وہ جس کا نام سکندر بخت ہو۔"

"یار' میرا خیال ہے کہ ہر لڑکی اپنی عزت کی حفاظت کرسکتی ہے۔ خصوصاً وہ جس کا نام شیلی ہو' رابعہ ہو یا کچھ اور لیکن وہ سکندر بخت کو جانتی ہو۔" اس نے کہا "چلو میں کافی کی الیکٹرک کیٹل اور مگ لاتی ہوں۔ تم اٹھاؤ یہ کھانے پینے کا سامان۔"

بیڈ روم اوپر تھا۔ پہلے یہ میرے والد کا کمرا تھا۔ بعد میں اسے میں نے پسند کرلیا۔ وہ کچھ ضعیفی کے باعث بھی اوپر کی منزل کے مقابلے میں نیچے رہنے کو ترجیح دینے لگے تھے۔ اور انہیں صبح چھت پر کھلی ہوا ملتی تھی مگر انہیں نماز باجماعت کے لیے بار بار نیچے اترنا پڑتا تھا۔ جب رابعہ نے اسے نئے سرے سے آراستہ کیا تو اسے بڑی نفاست سے بیڈ روم بنادیا اور کچھ عرصہ وہ اس میں رہی۔

آج اس کمرے کو دیکھ کر ناصر کاظمی کا شعر یاد آتا تھا۔ ہمارے گھر کی دیواروں پر ناصر۔ اداسی بال کھولے سو رہی ہے۔ اس کمرے میں سبزے کے رنگ کا دبیز قالین تھا۔ دیواروں پر آف وائٹ پینٹ تھا اور گولڈن شیڈ دینے والے ہلکے گلابی رنگ کے پردے تھے۔ ایک مقابل کے کونے میں ٹی وی رکھا ہوا تھا اور اس سے کچھ فاصلے پر چار فولڈنگ ایزی چیئرز رکھی ہوئی تھیں۔ دوسری طرف بیڈ سیٹ کے ساتھ کی وکٹورین وارڈ روب اور ڈریسنگ ٹیبل تھی۔ پرانے اسٹائل کے مکانوں کی طرح اس کی وائرنگ بھی اوپن تھی لیکن رابعہ نے اسے کنسیل کرادیا تھا۔ اب چاروں دیواروں پر ڈبل وال لائٹس تھیں اور درمیان میں اسی ڈیزائن کے فانوس۔

بیڈ کی ایک سائیڈ ٹیبل پر لیمپ تھا اور دوسری جانب ٹیلی فون۔ مجھے اس آلے کو دیکھ کر حیرانی ہوئی۔ یہ حیرانی اور بڑھ گئی جب میں نے غیر ارادی طور پر ریسیور اٹھاکے کان سے لگایا۔ اس میں ٹون آرہی تھی۔ نہ جانے کیسے اب تک فون بند نہیں کیا گیا تھا۔ میری عدم موجودگی میں بجلی اور ٹیلی فون کے سارے بل لیٹر بکس میں جمع ہوتے رہے ہوں گے۔ ادائیگی کرنے والا یہاں کون تھا۔ اس کے باوجود بجلی اور ٹیلی فون لائن منقطع ہونے سے بچ گئی تھی۔ شاید اس لیے کہ استعمال نہ ہونے کے باعث بل کی رقم بہت تھوڑی ہوگی۔ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ رابعہ نے بلوں کی ادائیگی کی ذمے داری بھی وقار یوسف کو سونپ دی تھی جو مہینے میں ایک بار کسی کو بھیج کے لیٹر باکس میں سے بل منگوالیتا تھا۔ فون کا تو صرف لائن رینٹ آرہا تھا مگر بجلی والے اوسط کی بنیاد پر رقم وصول کررہے تھے۔

شیلی کافی پیتے ہوئے کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس نے میرے والد کی اور میری تصویریں دیکھیں جو ٹی وی پر رکھی ہوئی تھیں اور انہیں اپنے دوپٹے کے پلو سے صاف کرکے پھر وہیں رکھ دیا۔

میں نے کافی کے ساتھ کھانے کا سلسلہ جاری رکھا "تمہیں

میرے بارے میں کیا معلوم ہے اور کس نے بتایا؟"

"میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ مجھے سب کچھ معلوم ہے۔ اور معلوم کرنے والے وسائل تلاش کر لیتے ہیں۔ یہ ایک ریسرچ ورک تھا۔ سب سے زیادہ مدد شیخ صاحب نے کی۔ ان کے علاوہ اخبارات تھے۔ پھر بھی مجھے کوئی دعویٰ نہیں کہ میں سب کچھ جانتی ہوں۔"

"ابھی تک تم نے رفیق کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔"

"یار، میرا خیال ہے کہ پہلے میں یہ گرد جھاڑ دوں۔ ہم ان کرسیوں پر بیٹھ کے باتیں کر سکتے ہیں" اس نے کہا "بیڈ کی چادر اور تکیوں پر بھی اتنی ہی مٹی ہو گی"

"چھوڑو بیڈ کی چادر کو۔ ابھی اتنی مٹی اُڑے گی۔ سب کمرے میں بھر جائے گی۔ سانس لینا بھی مشکل ہو جائے گا" میں نے کہا۔

"میں باہر ٹیرس پر جا کے جھاڑ دیتی ہوں۔ تم لائٹس آف کردو۔" شیلی نے کہا "ویسے وارڈ روب میں کپڑے ہیں۔ زنانہ بھی اور مردانہ بھی۔"

میں نے لائٹ آف کرنے سے پہلے وارڈ روب میں دیکھا تو اس میں کپڑے استری کئے ہوئے اور ترتیب کے ساتھ ہینگر میں لٹکے ہوئے تھے۔ مجھے رابعہ کے خیال نے ملول کر دیا۔ اس گھر میں اپنی تنہائی کے لمحوں کو اس نے اپنی حسرتوں اور خواہشوں سے سجاتے گزارا تھا۔ کسی بچی کی طرح جو اکیلے میں اپنی گڑیا سے کھیلتی ہو۔

اس سے باتیں کرتی ہو۔ اس کے لیے کپڑے بناتی ہو اور گھر سجاتی ہو۔ اس گھر میں ضرورت کی چیزیں فراہم کرتی ہو اور اس کی شادی رچاتی ہو۔ رابعہ نے بھی اس گھر میں اپنے خوابوں کو حقیقت کا روپ دے کر آباد کر لیا تھا۔ گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی۔ یہ ویسا ہی گھر تھا جیسا وہ میرے ساتھ مل کے بناتی۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ میں نے اسے مایوس کیا۔ مرد اس وقت بھی بے رحم ہوتے ہیں جب لڑکے ہوتے ہیں۔ وہ گڑیوں کے گھر اُجاڑ دیتے ہیں اور معصوم بچیوں کے جذبات کی پروا کئے بغیر ان کی گڑیوں کو خراب کر دیتے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ ہر گڑیا در حقیقت اسی معصوم لڑکی میں چھپی ہوئی عورت ہوتی ہے۔

کیا میں نے رابعہ پر ظلم کیا تھا؟ یا اس نے مجھے یہ فریب دیا تھا کہ وہ بڑی حقیقت پسند ہے۔ جب کہ وہ خواب پرست تھی۔ ہر لڑکی ویسے تو خواب پرست ہوتی ہے مگر وہ ساری عمر تو خوابوں کے پیچھے دوڑتے نہیں گزار سکتی۔ رابعہ کی زندگی میں آنے والا پہلا مرد میرے سے مرد ہی نہیں تھا اور یہ دھوکا اسے تقدیر نے دیا تھا۔ پھر اچانک دل شکستگی اور مایوسی کے اس گرداب سے میں نے اسے زندگی کے پُرامید ساحل کی جانب کھینچ لیا۔ اس نے میرے عزائم کی شدت کا ساتھ اپنے جذبات کی بھرپور توانائی کے ساتھ دیا مگر آہستہ آہستہ اس پر یہ حقیقت عیاں ہونے لگی کہ وہ میرے پیچھے بھاگ رہی ہے اور میں اپنے مقاصد کے پیچھے سرگرداں ہوں۔ ان مقاصد جو اس کے نزدیک لاحاصل اور مبہم تھے۔ غیر یقینی مستقبل کے لامحدود افق تک۔ حدِ امکاں سے آگے۔ اس کے خیال کی اور تصور کی انتہا سے بھی دور میری کوئی منزل تھی۔ اور رابعہ نے محسوس کیا کہ زندگی نے دوسری بار اسے فریب دیا ہے۔ اسے اس صدمے نے توڑ پھوڑ دیا کہ وہ میری منزل نہیں تھی اور یہ اس کے اختیار میں بھی نہ تھا کہ وہ میری منزل بن جائے۔ میرے مقاصد کی انتہا سے آگے پہنچ جائے یا میرے عزائم کے سفر کو اپنی ذات تک محدود کردے۔

شیلی میرے قریب آکے بیٹھ گئی "رابعہ کے بارے میں سوچ رہے تھے؟"

میں چونکا "تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"یار، تمہاری جگہ میں ہوتی نا، تو میرے خیالات بھی مختلف نہ ہوتے۔ اس ماحول میں تم اور کسے یاد کر سکتے ہو؟"

"اس کی بات مت کرنا شیلی۔ میں اس کے خیال سے بھی گریزپا ہوں۔" میں نے کہا "حالانکہ یہ ناممکن ہے۔"

"شیلی فون کر کے اس کی خیریت تو معلوم کر لو۔"

"وہ سو رہی ہو گی۔ ٹھیک ہو گی" میں نے کہا "ٹی وی چلا دوں؟"

"نہیں یار۔ اندھیرا اچھا لگتا ہے" وہ بولی۔

میں نے سگریٹ جلائی "میں شراب نہیں پی سکتا۔ غم غلط کرنے کے لیے وہ چیز پی رہا ہوں جو میں نے خود پر حرام کر لی تھی۔"

"اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہو؟"

"شاید۔" میں نے کہا "کبھی کبھی اچھا لگتا ہے اپنے آپ سے جھوٹ بولنا۔ کل تک میں اس منظر کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ایسے تم اور میں یہاں بیٹھے ہوں گے۔ اندھیرے میں چوروں کی طرح چھپے ہوئے۔ اس بیڈ روم میں۔ اور بلیک کافی پی کے رات گزاریں گے۔"

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات سترھویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں

جاسوسی ڈائجسٹ کا منفرد و مقبول سلسلہ
شکاری
سترہواں حصہ

شکاری

نئی سوچ نیا رنگ نیا لہجہ نیا آہنگ
احمد اقبال کے شہ بار و شبنم فشاں قلم سے

معاشرے کے اُن ناسوروں کی رُوداد جو گوشت و پوست سے گزر کر انسانی ہڈیوں میں اُتر رہے تھے۔ ایک کفن بردوش نوجوان کی کہانی جس کے شب و روز موت کی بستی میں گزر رہے تھے۔ جلتے دن، سُلگتی راتیں، آس و یاس، خوف و ہراس، تلخ حقائق، شیریں خواب

"تمہیں کیوں یقین ہے کہ وہ آئیں گے؟"

"پتا نہیں۔ میری چھٹی حس غلط نہیں کہتی۔ دس بجے رات تک انہیں معلوم ہو جائے گا کہ ہم ان کے پھیلائے ہوئے جال سے نکل گئے۔ ہر شکاری کے لیے ناکامی ایک چیلنج بن جاتی ہے۔"

میں نے کہا "افسوس یہ ہے کہ رفیق قربانی کا بکرا بنا۔ خود میں نے کبھی شیر کا شکار دیکھا تک نہیں مگر جم کاربٹ کی کتابوں میں قصے بہت پڑھے ہیں۔ شکاری کوئی بکرا یا بچھیا جنگل میں باندھ دیتے ہیں اور مچان پر بیٹھ کے انتظار کرتے ہیں۔ شیر گارا کر کے چلا جاتا ہے۔"

"گارا کیا؟"

"بکرے یا بچھیا کو مار کے چلا جاتا ہے۔ اسے گارا کرنا کہتے ہیں۔ اسے کھانے کے لیے وہ پھر آتا ہے۔ اس وقت وہ خود مارا جاتا ہے۔ خیر چھوڑو' یہ باتیں تو بڑی دل دُکھانے والی ہیں۔ رفیق کے بارے میں بتاؤ کہ تم اسے کیسے جانتی تھیں اور زیڈیو نقوی صاحب کے پی اے سے تمہارا رابطہ کیسے ہو گیا تھا؟"

"جیسے تم سے ہو گیا...."

"تم ٹال رہی ہو۔ تم نے کہا تھا کہ رفیق میرا خاص آدمی ہے۔ اس کا چودھری دلاور سے بھی تعلق تھا۔ یہ مُعما میری سمجھ میں نہیں آتا" میں نے کہا۔

"میں نے تم سے ایک شیخ صاحب کا ذکر کیا تھا جن کا اصل نام کچھ اور تھا" وہ بولی "انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ پاکستان جا کے رفیق سے ملنا۔ وہ تمہارے سارے مسائل حل کر سکتا ہے۔ انہوں نے رفیق کے نام ایک خط بھی دیا تھا۔ رفیق غالباً زیڈیو نقوی صاحب کی بہن کا بیٹا ہے۔ اس بہن نے تقسیم ہند سے پہلے کسی ہندو سے محبت کی شادی کر لی تھی۔ اس کے نتیجے میں نقوی صاحب نے اس سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ حالانکہ وہ ان کی ایک ہی بہن تھی اور وہ خود بھی اس بہن کے ایک بھائی تھے۔ نقوی صاحب پاکستان آ گئے اور وہ بہن وہیں رہ گئی لیکن پاکستان بننے کے بعد حالات نے ایسا رُخ اختیار کیا کہ محبت پر مذہبی جنون غالب آ گیا۔ انتہا پسند ہندوؤں کے دباؤ میں شوہر نے بیوی کو گھر سے نکال دیا اور خود پاک وصاف ہو کے پھر اپنی براہمن برادری میں شامل ہو گیا۔ وہ دولت مند اور والدین کا اکلوتا تھا۔ اس کے ماں باپ ہر قیمت پر اپنا بیٹا واپس چاہتے تھے اور اس کی شادی اپنے جیسے عزت داروں میں کرنا چاہتے تھے۔ پیسہ ہو تو آدمی کی ساری غلطیاں' کوتاہیاں' گناہ اور جرم معاف ہو جاتے ہیں۔ لیکن نقوی صاحب کی بہن سخت مشکلات میں گھر گئی۔ ایک طرف اس کا کوئی گھر اور خاندان نہیں رہا تھا' وہ محبت نہیں رہی تھی جس کو اس نے تمام عمر کا سہارا سمجھ لیا تھا اور نفرت کرنے والوں کے درمیان اپنے پاپ کی گٹھڑی اٹھائے پھرنے پر مجبور تھی۔ کیسی عجیب بات ہے یار۔ وہی بچہ ماں باپ کے گھر میں جنم لیتا ہے تو محبت کا ثمر کہلاتا ہے اور خوشیوں سے گھر بھر دیتا ہے اور کوئی بے ضمیر اور ذلیل آدمی اپنی جان چھڑانے کے لیے جھوٹ بول دے کہ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں تو وہی بچہ

بارِ گناہ اور ناجائز ہوجاتا ہے۔ ماں کی بات تو وہی رہتی ہے لیکن اولاد اس کے لیے داغ رُسوائی بن جاتی ہے۔ خیر اس لڑکی نے ہمت سے کام لیا اور دہلی پہنچ گئی۔ یہ واقعہ تھا بریند کا۔ اس نے سنا تھا کہ دہلی سے ہجرت کرنے والے مسلمانوں کو لے کر اسپیشل گاڑیاں پاکستان جارہی ہیں۔ وہ لڑکی غصے میں گھر سے نکل آئی تھی ورنہ عقل سے کام لیتی تو اپنے اونچی ذات والے' عزت دار اور رئیس زادے شوہر سے قطع تعلق کی قیمت اچھی خاصی وصول کرسکتی تھی۔ وہ سودا کرتی کہ اچھا یار میں تمہاری جان چھوڑتی ہوں۔ اس بچے کی پرورش کے لیے اور میری زندگی گزارنے کے لیے مناسب بندوبست کردو۔"

میں نے کہا "جذبات غالب ہوں تو عقل سے کون کام لے سکتا ہے۔"

"ہاں' کچھ ایسی ہی بات ہے یار۔ وہ راضی خوشی دیتے۔ اس کو پاکستان بھجوادیتے بائی ائر۔" شیلی نے کہا "وہ دہلی میں نظام الدین اولیاؒ کے مزار پر بہت عرصہ پڑی رہی کیونکہ اسے کسی اسپیشل ٹرین میں جگہ دلوانے والا کوئی نہیں تھا۔ نہ پیسہ تھا نہ اثر ورسوخ۔ اس نے کچھ زیور پہن رکھا تھا۔ بالآخر وہ اس کے کام آہی گیا اور وہ ایک ٹرین میں بیٹھ کے لاہور پہنچ گئی۔ وہ اپنے بھائی کو تلاش کرنا چاہتی تھی جس کے بارے میں اسے معلوم ہوا تھا کہ وہ پاکستان پہنچ چکا ہے مگر یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ یوں ہی بھٹکتی ہوئی ایک دن وہ شیخ صاحب کے بنگلے میں داخل ہوئی۔ شیخ صاحب ریلوے میں افسر تھے۔ وہ صبح آفس جانے کے لیے نکلے تو انہیں برآمدے میں وہ عورت پڑی نظر آئی جس نے گزشتہ رات ہی ایک بچے کو جنم دیا تھا۔ انہوں نے فوراً ڈاکٹر کو بلوایا اور عورت کو گھر کے اندر شفٹ کردیا لیکن اس کا وقت پورا ہوچکا تھا۔ مرنے سے پہلے اس نے شیخ صاحب کو ساری بات بتادی اور نقوی صاحب کے بارے میں بھی سب کہہ دیا۔ شیخ صاحب سمجھ دار آدمی تھے اور کسی قانونی معاملے میں ملوث ہونا نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے پولیس کو اطلاع دی اور ایک مجسٹریٹ کی موجودگی میں نقوی صاحب کی بہن کا پورا بیان ریکارڈ کروالیا۔ اس نے اپنے دستخط بھی کیے اور انگوٹھے کا نشان بھی لگایا۔ اس بیان کی ایک تصدیق شدہ نقل شیخ صاحب کے پاس آج بھی موجود ہے۔ میں بتاچکی ہوں کہ وہ بے اولاد تھے۔ انہوں نے بچے کی پرورش کی اور اس کا نام رفیق شیخ رکھا۔ ساتھ ہی وہ نقوی صاحب کو بھی تلاش کرتے رہے اور بالآخر ان کا سراغ لگانے میں کامیاب ہوگئے مگر اس وقت تک نقوی صاحب بہت ترقی کرچکے تھے اور ان کا مستقبل تو شاندار تھا ہی۔ وہ اپنا ایک شاندار ماضی بھی بناچکے تھے۔ اپنی خاندانی تاریخ اور شجرۂ نسب کو اپنی حیثیت کے مطابق کرنے کے بعد انہوں نے بوگس کلیم داخل کیے تھے اور لاکھوں کی متروکہ جائداد اپنے نام الاٹ کرالی تھی۔ نقوی صاحب نے پہلے تو رفیق کو اپنا بھانجا تسلیم کرنے سے یکسر انکار کیا۔ اسی بنیاد پر کہ ان کی کوئی بہن نہیں تھی۔ پھر یہ مانا کہ بہن تو تھی مگر ایک ہندو سے شادی کے بعد وہ ان کے لیے مرچکی تھی....

شیخ صاحب نے انہیں یاد دلایا کہ ان کی بہن ہندو نہیں ہوئی تھی' وہ لڑکا مسلمان ہوگیا تھا جس نے اس سے شادی کی تھی مگر بعد میں اس کے خیالات بدل گئے۔ اس پر ذات برادری کا دباؤ بھی بڑھا اور اسے یہ خیال بھی پریشان کرنے لگا کہ وہ ایک لڑکی کے چکر میں ساری دولت اور جائداد سے محرومی قبول کررہا ہے۔ لڑکی جیسی بھی تھی' غیر مذہب کی تھی اور اب محبت کا بھوت اترا تھا تو اسے باپ دادا کے دھرم سے ایک ناری کے لیے ہٹنا مہا پاپ لگنے لگا تھا۔ شادی سو فیصد جائز تھی اور رفیق ہر طرح سے ان کا بھانجا تھا۔ شیخ صاحب کی معلومات پر نقوی صاحب کو شک ہوا اور شیخ صاحب نے بالآخر تُرپ کا آخری پتا ان کے سامنے پھینک دیا۔ ان کی بہن کا پورا بیان جس کی تصدیق ایک مجسٹریٹ نے کی تھی کہ یہ مرتے وقت دیا گیا تھا۔ اس کی صداقت کو قانون تسلیم کرتا تھا۔ نقوی صاحب کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ اس بیان کے سامنے آجانے سے ان کا ماضی غلط ہوجاتا تھا اور ظاہر ہے' مستقبل مخدوش ہوجاتا تھا۔ انہوں نے شیخ صاحب سے وعدہ کیا کہ وہ رفیق کی ہر ممکن طریقے سے مدد کریں گے۔ اسے اپنے گھر میں رکھیں گے اور اس کی حفاظت بھی کریں گے۔ ہر طرح سے مطمئن ہوجانے کے بعد شیخ صاحب نے رفیق کو یہاں بھیج دیا اور نقوی صاحب نے اس سے اپنا تعلق پوشیدہ رکھتے ہوئے اسے ملازمت دلوائی پھر ترقی دلوائی اور بالآخر اپنے پی اے کے طور پر ساتھ رکھ لیا۔ جب مجھے شیخ صاحب نے رفیق کے نام خط دیا تھا تو یہ سب بتادیا تھا اور مجھ سے کہا تھا کہ میں اپنے پتے سوچ سمجھ کے استعمال کروں۔ رفیق میرے لیے سب کچھ کرسکتا ہے۔ اس لیے کہ وہ جس شخص کا پی اے ہے' وہ سب کچھ کرسکتا ہے اور رفیق سب کچھ کرواسکتا ہے۔ جب رفیق مجھ سے ملا تو میں نے اسے اپنے بارے میں صرف یہ بتایا کہ میں لندن سے آئی ہوں۔ وہاں میں ڈاکٹر تھی اور اب میرا ارادہ پاکستان میں پریکٹس کرنے کا ہے یا پھر کسی اچھے اسپتال میں جاب کرنے کا۔ اس نے کہا کہ وہ میری ہر طرح سے مدد کرے گا۔ پھر میں نے کہا کہ ویسے تو میرا دشمن کوئی نہیں لیکن میں ایک شخص کے بارے میں جاننا چاہتی ہوں کہ آج کل وہ کہاں ہے اور کیا کرتا ہے؟ میں نے چوہدری دلاور کا نام لیا تو وہ حیران ہوا کہ آپ کا اس سے کیا تعلق؟ میں نے کہا کہ میرا تعلق سکندر بخت سے بہت قریبی رہا ہے لیکن میں نے سنا ہے کہ چوہدری دلاور کی سکندر سے جانی دشمنی ہے۔ میں سکندر بخت سے ضرور ملوں گی اور اکثر ملوں گی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ میرے پیچھے پڑجائے۔ رفیق ہنسنے لگا کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ چوہدری دلاور آپ کو کچھ نہیں کہے گا۔ میں نے کہا کہ اچھا یہ ساری باتیں ہمارے درمیان رہنی چاہئیں۔"

میں نے کہا "اس کے بعد رفیق نے میری اور چوہدری دلاور کی ملاقات کی راہ ہموار کی تھی۔ تمہارے کہنے پر۔"

"میرے کہنے پر! نہیں یار۔ میں نے تو اس سے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔ اور میں کر بھی کیسے سکتی تھی۔ ایسے تو میں براہِ راست ملوث ہوجاتی۔"

"پھر یہ کیا چکر تھا؟" میں نے کلائی کی گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے کہا "اتنی دیر سے ہم باتیں کررہے ہیں اور ابھی صرف نو بجے ہیں۔"

"باتیں کہاں کررہے تھے۔ میں بول رہی تھی اور تم سن رہے تھے۔ ایک بات پوچھوں سکندر؟"

"نہیں۔ دو باتیں پوچھو" میں نے کہا۔

"کیا تم رفیق کو یہاں دفن کرنے کے لیے لائے ہو؟"

"خیال تو یہی تھا پہلے...."

"اب بدل گیا ہے؟"

"ہاں۔ سوچ رہا ہوں کہ یہ معاملہ نقوی صاحب کے سپرد کروں۔ وہ اس سے بہتر طور پر نمٹ لیں گے۔"

"شاید اسی لیے رفیق نے نقوی صاحب کا نام لکھا تھا۔"

"مگر وہ بھا.... جا اور جا.... چا...."

"اگر لفظ مکمل کیے جائیں۔ فرض کرو یہ معما حل کرنا ہو تو بھا اور جا کے [illegible] لگایا جاسکتا ہے۔"

"میں نے بھائی جان سمجھا تھا۔"

"بھاگ جاؤ۔ اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

میں اچھل پڑا "رائٹ۔ ویری رائٹ۔ یہی مطلب تھا اس کا۔ تم نے تو کمال کردیا یار۔"

"اب تو تم بھی بری عادت کا شکار ہوگئے" اس نے طنز سے کہا۔

میں نے کہا "صحبت کا اثر تو ہوتا ہے نا۔ ویسے میں تمہاری دلیل سے قائل ہوگیا تھا کہ یار کہنے میں کوئی برائی نہیں۔ برائی آدمی کے دماغ میں ہوتی ہے جو اس کا برا مطلب نکالتا ہے۔ اگر رفیق کی آدھی بات کا مطلب یہ تھا تو باقی آدھی بات بھی سمجھ میں آتی ہے۔ جان بچا کے۔ وہ پورا لفظ نہیں بول پارہا تھا۔ جا کا مطلب جان.... با.... چا کا مطلب بچا کے.... بھاگ جاؤ اپنی جان بچا کے۔ یہی چاہتا تھا وہ۔"

"اس کا مطلب سمجھے بغیر بھی ہم نے ایسا ہی کیا...."

"لیکن بات اس سے زیادہ ہوگی۔ ہم اس وقت خطرے میں تھے تو اس وقت بھی ہوں گے۔ یا تو ہم گاڑی وہیں چھوڑ دیتے۔ گاڑی ہی ہمارے لیے جال تھی جسے ہم ساتھ لیے پھر رہے ہیں۔ یقیناً کوئی یہ رپورٹ دے چکا ہوگا کہ شکار جال میں پھنس گیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ شکاری کیا کرتے ہیں۔"

"یار ایک دوسرے کی شکل تو دیکھ نہیں سکتے۔ اور کیا دیکھیں گے۔ اندھیرے میں بیٹھے رہیں گے رات بھر۔ کافی پیتے رہیں گے اور جاگتے رہیں گے۔ اُلوؤں کے جوڑے کی طرح جو ویرانے میں...."

اس کی بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ میں نے روشنی کی ایک چمک سی دیکھی اور پھر ایک آواز سنی۔ کوئی گاڑی گھوم کے گیٹ تک آئی تھی اور اس کی ہیڈ لائٹس شیشوں پر پڑی تھیں۔ رات کی خاموشی میں جیپ کے انجن کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

میں نے ایک پردے کا کونا ہٹا کے باہر جھانکا۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں دو سائے گیٹ کھول رہے تھے۔ جیپ سیدھی اندر آئی اور اس کا انجن خاموش ہوگیا۔ ڈرائیور اور اس کے ساتھ والی سیٹ پر سے دو افراد کود کے باہر آئے۔ گیٹ کھولنے والے بھی بڑی بے خوفی سے قدم بڑھا رہے تھے اور میں ان سب کے ایک جیسے حلیوں سے اندازہ کرسکتا تھا کہ ان موت کے فرشتوں کو کس نے بھیجا ہوگا۔ وہ سب گہرے رنگ کی قمیص اور پتلون پہنے ہوئے تھے اور بے حد چوکس تھے۔ اگر پتا بھی ہلتا تو وہ جیب سے ریوالور نکالنے میں دیر نہ لگاتے۔

مجھے بالکل پتا نہیں چلا کہ عین میرے پیچھے شیلی مجھ سے تقریباً چمٹ کے کھڑی ہوئی ہے۔ جب اس کا جسم خوف سے کانپنے لگا تو مجھے جنبش ہوئی۔

"ڈاکٹر صاحب! اتنا کمزور دل ہے آپ کا تو کوئی گولی ساتھ لائی تھی اعصاب کو تقویت پہنچانے والی۔" میں نے کہا۔

"سکندر! یار فرض کرو' یہ اندر آگئے...."

میں نے اطمینان سے کہا "فرض کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ اندر ہی آئیں گے۔"

"پھر تم کیا کروگے؟"

"میں انہیں کہوں گا السلام علیکم۔ پھر ان سے مصافحہ کرکے بیوی بچوں کی خیریت معلوم کروں گا۔ ابھی دیکھو یہ کیا کرتے ہیں۔"

حسب توقع انہوں نے ٹارچ کی روشنی میں گیٹ سے گیراج تک آنے والے راستے کو دیکھا۔ میں دوسری کھڑکی کے پاس چلا گیا اور اس کا ایک ٹوٹا ہوا شیشہ دیکھ کے مجھے خوشی ہوئی۔ میں نے ایک کان شیشے سے باہر رکھتے ہوئے ان کی گفتگو سننے کی کوشش کی۔

"یہاں کوئی گاڑی نہیں آئی" ایک نے کہا۔

"اوئے گاڑی کیسے نہیں آئی؟"

"کیا اُڑ کے آئی ہوگی۔ مٹی میں کوئی نشان نظر آرہے ہیں ٹائروں کے؟"

"میاں جی۔" تیسرے نے کہا "یہ راستہ کچھ ضرورت سے زیادہ صاف نہیں ہے؟"

چوتھا بولا "ہاں۔ کسی نے جھاڑو دی ہے اس پر۔"

"جھاڑو کیا تیرے باپ نے دی ہوگی؟"

"اوئے باپ تک مت جا...."

"بکواس بند کرو اپنی۔ گیراج کو دیکھو۔" پہلے شخص نے کہا

"گاڑی اندر جاتی تو پہلے سامان ہٹانا پڑتا۔"

"گاڑی پیچھے بھی ہو سکتی ہے۔"

"پیچھے کوئی جگہ نہیں ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ آس پاس کے علاقے میں کسی سڑک پر کھڑی ہو۔ یا کسی دوسری کوٹھی میں۔"

"باس! وہ کہیں اور بھی تو جا سکتے ہیں۔"

"پاگل کے بچے! ہم یہاں ایسے ہی نہیں آئے ہیں۔ ایک ایک لفظ سنا تھا ہم نے۔ سارے راستے انہوں نے کیا باتیں کی تھیں۔"

"گاڑی میں خفیہ مائیکروفون تھا؟ واہ استاد۔"

"اب چلو اندر۔ ایک آدمی یہاں ٹھہرے' ایک باہر گیٹ پر جائے۔ دو پیچھے سے اندر داخل ہوں گے۔ اپنے اپنے واکی ٹاکی آن رکھنا۔ کوئی بھی ایسی ویسی آواز سُنے تو وہ دیر نہ کرے۔"

اس انکشاف نے کہ کار میں خفیہ مائیکروفون لگا ہوا تھا اور اس کی مدد سے انہوں نے ہماری ساری باتیں سن لی تھیں' میرے پیروں کے نیچے سے زمین کھینچ لی تھی۔

میں نے شیلی کو پیچھے کھینچ لیا۔ "بڑی غلطی ہو گئی ہم سے۔"

"صرف ایک غلطی..... جو کوئی بات نہیں۔"

"تم مذاق سمجھ رہی ہو۔" میں نے اسے گھورا "وہ لوگ اندر آ رہے ہیں۔ اٹھاؤ یہ سب کھانے کا سامان۔ کافی کے مگ اور کیتلی۔ اچھا ہوا کہ تم نے صرف کرُسیاں صاف کی تھیں' بیڈ کی چادر' تکیے نہیں بدلے تھے ورنہ وہ تو فوراً تاڑ جاتے کہ کسی نے صفائی کی ہے۔"

اس نے گھبرا کے کہا "یہ کرُسیاں جن پر ہم بیٹھے تھے یار۔"

میں نے دونوں کرُسیوں کو فولڈ کر کے دیوار کے سہارے کھڑا کر دیا "چلو دو کرُسیوں پر تو گرد ہے۔"

"اتنی گرد میں فرش پر ہمارے قدموں کے نشانات بھی صاف نظر آئیں گے۔"

میں نے چند سیکنڈ سوچا "اب نشانات مٹانے کے لیے تو وقت نہیں ہے۔ تمہارے پاس کوئی سِکّہ ہے۔"

"سِکّہ..... کیسا سِکّہ؟"

"کوئی بھی ہو۔ دس پیسے کا' چار آنے یا آٹھ آنے کا۔"

"کیا کرو گے؟ کیا ٹاس کرنا ہے؟" اس نے اپنے ہینڈ بیگ میں ہاتھ ڈالا اور مجھے ایک سِکّہ تھما دیا۔

"اب تم چلو بیڈ کے نیچے۔ سانس روک کے لیٹ جاؤ" میں نے بیڈ کے سرہانے والی لائٹ کا بلب نکال لیا۔

بلب کے اوپر سِکّہ رکھ کے میں نے اسے پھر اپنی جگہ ہولڈر میں فٹ کر دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ دروازے کے ساتھ والے بورڈ پر پہلا سوئچ اسی لائٹ کا ہے۔ جو بھی اندر آئے گا وہ لائٹ جلانے کے لیے پہلا سوئچ آن کرے گا اور اس کے ساتھ ہی فیوز اڑ جائے گا۔ اگر کسی نے فیوز دوبارہ لگانے کی زحمت کی تو اس سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ جب تک سِکّہ بلب کے اوپر موجود ہے تار شارٹ رہیں گے اور فیوز اُڑتا رہے گا۔ ان کے لیے فیوز اُڑنے کا سبب تلاش کرنا آسان کام نہیں تھا۔ اول تو ان کی عقل میں یہ بات آ ہی نہیں سکتی تھی کہ فیوز کیوں اُڑ رہا ہے۔ اسے وہ پرانے تاروں کی خرابی ہی سمجھتے اور بفرضِ محال کسی کے ذہن میں یہ خیال آتا تو پورے گھر کے بلب نکال کے فیوز اُڑانے والے سِکّے کو تلاش کرتے انہیں صبح ہو جاتی۔

ڈبل بیڈ کے اوپر پڑے ہوئے کور کو اٹھا کے میں دوسری طرف سے اندر لیٹ گیا۔ وہاں لیٹنا مجھے بہت عجیب لگا۔ یہ ایک پُرتکلف بیڈ روم تھا اور یہ بیڈ روم اس گھر کا حصہ تھا جس کا میں مالک تھا مگر یہاں میں ایسے چھپ کر لیٹا ہوا تھا جیسے میں چور ہوں۔ چور روندتا تے ہوئے اوپر آ رہے تھے۔ میں نچلی منزل پر ان کے باتیں کرنے کی' گالیاں بکنے کی اور دروازے دھڑ دھڑ مارنے کی آوازیں سن رہا تھا۔

میرے بہت قریب ایک اجنبی لڑکی لیٹی ہوئی تھی جس کے قرب کی خوشبو اس محدود سی جگہ میں بھر گئی تھی۔ وہ کوئی بہت اعلیٰ قسم کی پرفیوم استعمال کرتی ہو گی لیکن اس وقت یہ دلنواز مہک بھی مجھے ڈرا رہی تھی۔ غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا۔ یہ خوشبو پکار کے نہ کہے کہ وہ گل کہاں کھلا ہے جس نے اس ویران اندھیرے کو مہکا دیا ہے۔ شیلی گرد اور دُھول کے بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ وہ لڑکی جو پیشے کے اعتبار سے بہت ماہر ڈاکٹر تھی' لندن کے ماحول کی پروردہ تھی اور فلیٹیز جیسے ہوٹل میں قیام پذیر تھی' میری طرح مجبور تھی اور خوف زدہ تھی۔ اسے نہ اپنے کپڑوں کا خیال تھا' نہ بالوں کا۔ نہ یہ احساس تھا کہ اس وقت فرش خاک پر لیٹی ہوئی وہ لندن میں ایک لاکھ پونڈ کا بینک بیلنس' ذاتی مکان اور گاڑی رکھنے والی ڈاکٹر شیلا خان نہیں بلکہ کوئی بے آسرا' بے گھر اور بے امان فقیر ہے۔ اس شہر میں آسمان کی کھلی چھت کے نیچے ایسے ہی خدا کی زمین پر پاؤں پسارے نہ جانے کتنے مفلس ہوں گے مگر وہ ہم سے یوں بہتر تھے کہ انہیں جان کے خوف سے تحفظ حاصل تھا اور ان کی آنکھوں کو نیند میسّر تھی۔

میں نے تاریکی میں آہستہ سے ہاتھ بڑھایا اور شیلی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس کا ہاتھ برف کی طرح ٹھنڈا ہو رہا تھا۔

"یار' مجھے ایسے لگتا ہے کہ میں مر چکی ہوں اور یہ میری قبر ہے۔ لوگ مجھے دفنا کے جا چکے ہیں اور اب اندھیرا ہے۔"

میں نے کہا "اگر تم مر چکی ہو تو خاموش رہو۔ مُردے بولتے نہیں۔"

اس نے اپنی بات سرگوشی میں جاری رکھی "بس اب کچھ دیر میں یہاں منکر نکیر آئیں گے اور مجھ سے سوال کریں گے کہ تم کون ہو۔"

"یہ خوشبو بہت اچھی ہے۔ لیکن مس شیلی! اگر ہم پکڑے گئے تو اسی خوشبو سے پکڑے جائیں گے۔"

"میں کیا کروں یار۔ عادت ہے مجھے تو..... اور تم اسے بری عادت بھی نہیں کہہ سکتے۔"

"شش۔" میں نے آہستہ سے کہا "وہ لوگ اوپر آ گئے ہیں۔"

"اچھا... یار ' انہوں نے پکڑ لیا ہمیں تو کیا بالکل مار ڈالیں گے؟" اس نے میرے اور قریب آ کے بالکل میرے کان میں کہا۔

"مجھے ضرور مار ڈالیں گے" میں نے دانت پیس کے کہا۔

"مجھے کیوں نہیں؟"

"اس لیے کہ تم لڑکی ہو' خوب صورت ہو' ایک ترچھی نظر اور ایک قاتل ادا سے سب کو ڈھیر کر دو گی۔"

باہر سے کسی نے گالی دے کر کہا "اوئے..... یہاں تو بھوت بھی نہیں ہیں۔"

"بھونک مت کُتّے۔ وہ کہیں بھی ہو سکتے ہیں۔"

"وہ کہاں ہوں گے؟ سب جگہ تو دیکھ لیا۔"

پھر دھڑ سے لات مار کے کسی نے دروازہ کھولا۔ باہر سے تھوڑی سی روشنی اندر آئی۔ اب تک وہ ہر کمرے میں لائٹ جلا کے دیکھتے آئے تھے۔ میں منتظر رہا کہ وہ اس کمرے کی روشنی کے سوئچ کی طرف ہاتھ بڑھائیں۔

"اوئے پاگل دے پُتّر' ان کی گاڑی....."

"پھر وہی بکواس! گاڑی نہ ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ خود بھی یہاں نہیں ہو سکتے۔"

"اچھا استاد۔ گرمی کیوں دکھاتے ہو۔ سارے گھر کی خاک تو چھان لی۔"

"ملا کچھ نہیں۔ کوئی سراغ نہیں" پہلے نے کہا۔

دوسرا بولا "ہاں یار۔ جہاں آدمی ہوتا ہے' کوئی نشانی تو چھوڑتا ہے۔"

"پھر کافی کی خوشبو کیوں تھی کچن میں؟" اس شخص نے دہاڑ کے کہا جو غالباً اس شکاری ٹولے کا استاد تھا۔

"میری تو ناک خراب ہے" ایک نے کہا۔

دوسرا بولا "میں نے کبھی کافی پی ہی نہیں۔"

استاد نے کہا "وہ یہاں آئے ضرور تھے۔ الماریوں میں دیکھو۔ باتھ روم میں جھانک کے دیکھو۔ بے وقوفوں کی طرح کھڑے مت رہو۔"

خلافِ امید اس نے لائٹ آن نہیں کی تھی۔ شاید باہر سے آنے والا اجالا انہیں کافی محسوس ہوا تھا۔

"استاد جی! ذرا لائٹ تو جلاؤ پھر پتا چلے کچھ۔"

جب لائٹ آن ہوتے ہی ایک دم تاریکی چھا گئی تو مجھے تھوڑی سی ڈھارس بندھی ورنہ یہ اندیشہ پیدا ہونے لگا تھا کہ ذرا سا بھی سراغ ملا تو استاد بیڈ کے نیچے جھانکنے سے بھی دریغ نہیں کریں گے اور روشنی میں گرد پر انسانی قدموں کے تازہ نشانات واضح نظر آ سکتے تھے۔

"اوئے ایہہ کی ہویا...؟"

"تیری بے بے دا سر۔ اندھیر ہو گیا اور کیا ہوا۔ فیوز اُڑ گیا۔"

"کیسے اُڑ گیا؟"

"جیسے نورجہاں کے ہاتھ سے کبوتر اُڑ گیا تھا۔ یوں۔ مجھ سے کیا پوچھتا ہے کھوتے۔ استاد سے پوچھ" جواب دینے والا ہنسا۔

"چلو نکلو یہاں سے۔" استاد نے حکم دیا "یہاں کوئی نہیں ہے۔"

"استاد جی! فیوز ٹھیک کروں؟"

"دفع کر۔ یہ لائٹ خراب تھی۔" استاد نے ناگواری سے کہا۔ "سب جگہ دیکھ لیا ہم نے۔"

"کوئی کونا نہیں چھوڑا۔"

"واپسی میں پانی کا ٹینک دیکھ لینا۔ نیچے والا بھی اور اوپر والا بھی۔"

استاد واقعی استاد تھا۔ "کیا پتا وہ وہاں چھپے ہوں۔"

"پانی کے اوپر یا نیچے؟ انسان کے بچے ہیں یا مچھلی کے؟"

"اُلو کے پٹھے۔ یہ بہت پرانا طریقہ ہے۔ جس بات کا پتا نہ ہو اس پر بولنا بھی نہیں چاہیے۔" استاد نے جاتے جاتے کہا "مجرم ڈھکن کھول کے اندر اتر جاتے ہیں۔ کوئی ڈھکن کھول کر جھانکے تو پانی میں غوطہ مار جاتے ہیں ورنہ سر اوپر رکھتے ہیں۔ خود میں نے ایک بار پولیس کو ایسے ہی دھوکا دیا تھا۔"

آہستہ آہستہ ان کی آوازیں دور ہو گئیں۔ وہ جاتے وقت دروازہ بند کر کے نہیں گئے تھے۔ میں نے ان کے زینے سے اترتے قدموں کی چاپ بھی رات کے سناٹے میں صاف سُنی اور کھسک کے بیڈ کے نیچے سے نکل آیا۔ شیلی نے بھی ادھر سے ہی سرک کے خود کو باہر کیا اور مجھ سے ٹکرائی۔

"یار' رک کیوں گئے؟" وہ ہنسی۔

میں نے ایک دم اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا "ڈاکٹر صاحب! دماغ کیا پڑھائی میں خرچ کر دیا سارا یا لندن چھوڑ آئی ہو۔"

"تمہارے ہاتھ تو بالکل گنواروں جیسے ہیں" اس نے آہستہ سے کہا "ایسے دباتے ہیں کسی لڑکی کا منہ۔"

"مجھے کسی بے وقوف لڑکی کا منہ دبانے کا پہلے کبھی تجربہ نہیں ہوا ڈاکٹر شیلی۔" میں نے خفگی سے کہا۔

میرے اندیشے ابھی تمام نہیں ہوئے تھے۔ استاد نسبتاً ذہین تھا اور اگر کمرے میں روشنی زیادہ ہوتی تو وہ یقیناً گرد پر ہمارے قدموں کے نشانات بھی دیکھ لیتا اور قریب آتا تو شاید کافی کی مہک کو بھی سونگھ لیتا۔ باقی احمقوں کے مقابلے میں استاد کے حواسِ خمسہ تیز تھے۔ اب بھی مجھے ڈر تھا کہ وہ گیراج میں گھسنے کی کوشش نہ کرے۔

شیلی کا ہاتھ تھام کے میں نے دبے پاؤں اندھیرے میں قدم بڑھایا۔ اس گھر میں میرا بچپن گزرا تھا اور یہاں میں آنکھ بند کر کے

کسی بھی کمرے کے کسی بھی کونے یا دروازے تک پہنچ سکتا تھا۔ ہمارے تعاقب میں آنے والوں نے ایک فاش غلطی کی تھی۔ ان کی جگہ میں ہوتا تو خاموشی سے آتا اور ہر کمرے میں ایسے داخل ہوتا کہ کسی کو پتا نہ چلتا مگر وہ مسلسل بول رہے تھے۔ ان کی قسمت ان کا ساتھ دے رہی تھی اور میں خون خرابہ کرکے اپنے مسائل میں اضافہ نہیں چاہتا تھا ورنہ ان کے آنے کی خبر مجھے پہلے ہی مل گئی تھی اور میں باری باری ان سب کو ایک منٹ سے کم وقت میں لمبا لٹا سکتا تھا۔ میں مسائل کے چیستاں میں اتنا الجھ چکا تھا کہ اب میری خواہشات کی لگام عقل کے ہاتھ میں تھی۔ میرے جذبات پر جوش سے زیادہ ہوش کا غلبہ تھا اور میں جارحانہ عزائم پر دفاعی حکمتِ عملی کو ترجیح دے رہا تھا۔

شیلی کے ساتھ میں ایک ایک زینہ سنبھل کے اتر رہا تھا اور اس کا ایک ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا اور دوسرا ریلنگ پر۔ مجھے دوسری طرف سے دیوار کا سہارا لینے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ سب زینوں پر قالین تھا۔ ان کی چوڑائی اور اونچائی برابر تھی مگر برا ہو اونچی ایڑی کا۔ اچانک شیلی کا توازن بگڑ گیا اور میں نے اسے نہ کھینچا ہوتا تو وہ منہ کے بل گرتی اور لڑھکتی ہوئی نیچے جاتی۔ ظاہر ہے وہ چیخ بھی مارتی اور یہ کوئی ناز نخرے والی چیخ نہ ہوتی جو عموماً خواتین بڑی الائچی کو کاکروچ سمجھ کے بھی مار دیتی ہیں۔ یہ دلخراش ' فلک شگاف ' قیامت خیز قسم کی چیخ اس ویران حویلی کے گوشے گوشے میں پہنچتی اور وہ شکاری کتے جو مایوس لوٹ رہے تھے ' فوراً پلٹ آتے۔ نتیجے میں مارا ماری ہوتی اور ایک ہائی ہیل کم سے کم چار افراد کی جان لے لیتی۔

شیلی نے ضبط سے کام لے کر مجھے حیران کردیا۔ اس نے حلق سے "ہائے اللہ" یا "اوئی اماں" جیسی آواز تک نہیں نکالی۔

"یو اوکے؟" میں نے اسے سنبھالنے کے بعد کہا۔

"ہاں یار۔ یہ پاؤں کچھ مڑ گیا ہے" اس کی آواز سے صاف تکلیف کا احساس ہو رہا تھا "موچ آگئی ہے شاید۔"

"اچھا بیٹھ جاؤ یہاں" میں نے اسے زینے کے درمیان میں بٹھادیا۔

"یہ اونچی ایڑی..."

میں نے کہا "تم عورتوں کے فیشن کا تعلق عقل سے بھی ہوتا ہے یا نہیں۔ اچھا بھلا قد ہے تمہارا۔ ساڑھے چار فٹ کی تو ہو نہیں کہ چار انچ کی ہیل ضروری ہو۔"

"یار ' تمہیں کمپلکس ہوگیا ہے کہ میرا قد بڑھ گیا۔" وہ کراہ کے بولی۔

"ایک فٹ اونچی ایڑی ہو تو شاید تم میرے برابر آجاؤ۔" میں نے کہا "تم چل سکتی ہو یا نہیں؟"

"تم بیساکھی بن جاؤ تو چل لوں گی۔ ورنہ یار ' میرا وزن ہی کتنا ہے۔ ایک سو اٹھارہ پونڈ" وہ ہنسی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

باہر گاڑی کا انجن غرایا اور پھر ہیڈ لائٹس نے اس گھر کے اندھیرے کو ذرا سی دیر کے لیے اجال دیا۔ مجھے ایک انجانی سی خوشی کے احساس نے سرشار کردیا۔ میری تھوڑی سی پیش بندی ' احتیاط اور چالاکی نے اس شکاری ٹولے کے عزائم کو خاک میں ملا دیا تھا ان کی آنکھوں میں دھول جھونک دی تھی اور ان کی عقل کو گمراہ کردیا تھا۔ یا پھر اسے بھی میں اپنی زندگی کے ان گنت مواقعوں میں سے ایک شمار کرسکتا تھا جب بچانے والے ہاتھ نے زبردست ہونے کا ثبوت دیا اور مارنے والے ہاتھ کو روک لیا۔

میں نے خوشی سے نعرہ لگایا "یو... ہو... وہ مارا پاپڑ والے کو۔"

شیلی ہنسی "کسے مارا؟ کون پاپڑ والا؟"

میں نے اسے ہاتھ پکڑ کے گھمادیا "اب چلو واپس۔ دشمن گئے۔ میدان صاف ہے۔"

اس نے چیخ ماری "اف۔ یار ' میرا پاؤں۔"

میں نے اسے گرنے سے پہلے ہی اٹھالیا "سوری۔ میں بھول گیا تھا کہ تم لنگڑی دلی اور معذور ہو۔"

اس کا وزن مجھے ایک سو اٹھارہ پونڈ بھی نہیں لگا لیکن یہ بڑا عجیب لگا کہ جس لڑکی سے میں کچھ دیر پہلے لارڈز ریسٹورنٹ میں سیدھے منہ بات کرنے کا روادار بھی نہ تھا ' اب وہ میری آغوش میں تھی اور حالات نے ایسی کروٹ لی تھی کہ ذہنی طور پر بھی وہ میرے بہت قریب آگئی تھی۔ اسے جذباتی قربت کا نام دینا غلط ہوگا۔ یہ صرف مجبوری تھی جس نے مجھے اور اسے یکجا کردیا تھا اور اس ویران گھر کی رات میں اعتماد کے رشتے سے باندھ دیا تھا۔ اسے واپس بیڈ روم کی طرف لے جاتے ہوئے میں نے سوچا کہ اگر یہ سب رابعہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لے یا میں اسے بتاؤں تو وہ کیا سمجھے گی؟ میری فطرت ' میری عادت اور میری محبت کو اچھی طرح سمجھنے ' جاننے اور ماننے کے باوجود یہ ناممکن ہوگا کہ وہ شک ' حسد اور رقابت کے جذبات کا شکار نہ ہو۔ اور ایک رابعہ پر ہی کیا منحصر۔ شاید نازو اور گل کو بھی یقین نہ آئے کہ شیلی نے میرے قریب آنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ بظاہر معصوم اور بے ضرر محسوس ہونے والے اتفاقات کو حالات کی سازش کا نام دے کر خود کو الزام سے بچانا مشکل ہوگا۔ ممکن ہے محسن یا غالب مجھ پر اعتبار کرلیں مگر عورت ہونے کے ناتے نازو اور گل کا متفقہ فیصلہ جذباتی ہوگا اور وہ مجھے شک کا فائدہ بھی نہیں دیں گی۔ رابعہ کے طرزِ عمل کے بعد میں نے جان بوجھ کے شیلی کو ملتفت ہونے کا بہانہ فراہم کیا۔ یہ ایک گھٹیا انتقامی جذبہ تھا جس سے مجبور ہوکے میں اسے یہاں لایا ورنہ کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ میں غالب کو ' منظر یا وقار یوسف کو فون کرکے ساری صورت حال بتادیتا اور پھر سب مل کے اس مشکل کا کوئی آسان حل تلاش کرلیتے۔

اچانک مجھے اپنے طرزِ عمل پر ندامت کی خلش پریشان کرنے لگی۔ ان حالات میں کہ یہاں فون بھی ہے ' میں نے ابھی تک کسی کو کیوں اطلاع نہیں دی کہ میں کس مصیبت میں ہوں اور کہاں ہوں۔ باقی سب لوگ دہری پریشانی سے دوچار ہوں گے۔ ایک طرف انہیں رابعہ کی فکر ہوگی جو اپنے ہی جذبات کے آتش فشاں میں خاکستر ہو رہی تھی۔ دوسری طرف میری گمشدگی انہیں تشویش میں مبتلا کرے گی کہ مایوسی اور دل شکستگی کی کیفیت میں سکندر بخت پر کیا گزری کہ وہ لوٹ کے نہیں آیا۔ میری فطرت سے سب ہی واقف تھے کہ میں شدید ترین ڈیپریشن کی حالت میں بھی خود کشی نہیں کروں گا۔ فلمی ہیرو کی طرح میرا اس رات کی تنہائی میں راوی کے کنارے بیٹھنا اور چاند کو تکتے ہوئے کوئی دردناک گیت گانا۔ (مثلاً۔ پریت لگا کے میں نے یہ پھل پایا۔ سُدھ بُدھ کھوئی چین گنوایا) مشکل تھا۔

شیلی کو گرد آلود بیڈ پر لٹا کے میں نے فیصلہ کیا کہ میرا اس طرح رات بھر یہاں روپوش رہنا میرے مسائل میں اضافہ تو کرسکتا ہے ' مسئلے کو حل نہیں کرے گا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ میں منظر یا غالب سے فون پر رابطہ کروں ورنہ میرا کوئی عذر بھی قابلِ قبول نہیں سمجھا جائے گا کہ جب شکاری ٹولہ واپس چلا گیا تھا اور فون بھی ٹھیک تھا تو آپ اس بیڈ روم میں شیلی کے ساتھ صبح تک صرف باتیں تو نہیں کرتے رہے ہوں گے اور پھر ایسی کون سی باتیں تھیں کہ آپ کو ہم بھی یاد نہ آئے۔

میں نے کہا "ڈاکٹر شیلی! تم ذرا آرام کرو۔"

"آرام خاک کروں۔ اس بیڈ پر تو اتنی دھول ہے۔"

میں نے طنز سے کہا "کہ تمہارا میک اپ خراب ہو رہا ہے ' کپڑوں پر داغ لگ گئے ہیں۔ بھول گئیں ابھی کچھ دیر پہلے بیڈ کے نیچے کس حال میں پڑی تھیں۔"

"وہ مجبوری تھی یار..."

"اچھا تو تم چادر جھاڑو ' میں آتا ہوں فیوز چیک کرکے۔ تمہیں ڈر نہیں لگنا چاہیے۔"

"یار ' جب آدمی اپنے آپ سے نہ ڈرتا ہو تو پھر صرف خونخوار جانوروں سے ڈرتا ہے۔ مثلاً لال بیگ ' مکڑی ' چھپکلی وغیرہ سے۔ بھیڑیے یا شیر وغیرہ تو یہاں آ نہیں سکتے۔ جن بھوت پر میرا اعتقاد نہیں" وہ بولی "بس تم آجانا۔"

"اس فضول بات کا کیا مطلب ہے آخر؟ میں فرار ہو رہا ہوں فیوز لگانے کے بہانے...؟" میں بگڑ گیا۔

وہ ہنسی "یار ' کیوں اتنے TENSE ہو رہے ہو۔ ٹیک اٹ ایزی۔ کیا مجھے معلوم نہیں کہ تم ہی میرے محافظ بنے ہو اور اپنی مرضی سے۔ تم مجھے یہاں چھوڑ کے کیسے جاسکتے ہو؟ میں مذاق کر رہی تھی۔"

میں نے دل ہی دل میں اسے گالی دی۔ ٹینشن کی اولاد۔ بات بات پر کہتی ہے ' ٹینس کیوں ہو رہے ہو۔ ٹیک اٹ ایزی۔ بابا یہ کوئی فلم کا سین ہے یا ڈراما چل رہا ہے کہ میں سکون سے بیٹھا دیکھتا رہوں۔ میں نے زینے سے نیچے جاتے ہوئے سوچا۔ اپنا یہ حال ہے کہ پاؤں مڑ گیا تو ہائے میں مرگئی۔ اپنا سایہ دیکھا تو چیخ ماردی۔ فلم میں دردناک منظر دیکھا اور رونا شروع کردیا۔ ہسٹریا کا تماشا کرکے اندر کا سارا غبار نکال دیا۔ مرد بے چارے چپ رہتے ہیں۔ خاموشی سے برداشت کرتے ہیں تو کہتی ہیں کہ ٹینس کیوں ہو رہے ہو۔ گوشت پوست کا بنا ہوا آدمی TENSE بھی نہ ہو۔

میں نے ماچس کی تیلی جلا کے فیوز دیکھا۔ دور اندیشی کا ثبوت دیتے ہوئے فیوز وائر بھی وہیں رکھ دیا گیا تھا۔ اسکریو ڈرائیور بہرحال نہیں تھا۔ کہ میں پرانا ' جلا ہوا تار ہٹا کے نیا تار ٹائٹ کرتا۔ میں نے فیوز کے دونوں کناروں کو تار سے باندھا اور کٹ آؤٹ لگادیا۔ ایک شعلہ سا چمکا اور فیوز پھر اڑ گیا۔ میں نے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔ اسے کہتے ہیں اپنی جوتی اپنا سر۔ جن کو اندھیرے میں رکھنے کے لیے بلب کے نیچے سکہ لگایا تھا ' وہ تو چلے گئے فیوز لگائے بغیر اور سکہ ہٹائے بغیر فیوز لگانے کی حماقت کا اعزاز میرے حصے میں آیا۔ لائٹ پل بھر کے لیے چمکی تھی۔ شیلی اگر عقلمندی سے کام لیتی تو سمجھ جاتی کہ پھر فیوز اڑ گیا اور خود ہی بلب ہٹادیتی مگر ایک تو اس کے پنجے میں موچ تھی۔ وہ بیڈ کے سرہانے پر چڑھ کے بلب اتارتی تو اس کے دوسرے پنجے میں بھی موچ آجاتی یا کمر میں بل پڑ جاتا۔

مجھے خود اوپر جا کے بلب نکالنا پڑا پھر واپس آکے دوسری بار فیوز لگاتے ہی اوپر نیچے کے سب کمرے روشن ہوگئے۔ یہ لائٹس جلانے والے وہی تھے جو عقل سے پیدل نہ ہوتے تو ہماری موجودگی کا سراغ لگا سکتے تھے مگر عام آدمی ایسا باریک بیں ' سراغ رساں نہیں ہوتا جیسا کہ شرلاک ہومز تھا ورنہ گیٹ کے باہر ہی نشانات دیکھ کے ٹائر کا سائز ' گاڑی کا میک اور ماڈل ' رفتار اور رنگ سے لے کر چلانے والے یا والی کی عمر اور عادات تک جان لیتا۔

اجالے میں شیلی کو دیکھ کر مجھے ہنسی آگئی "تم بالکل بھتنی لگ رہی ہو۔"

وہ مسکرائی "ہاں یار۔ آئینہ دیکھا تھا میں نے۔ سب مٹی ہو رہی ہے۔ بالوں میں ' کپڑوں میں۔ چادر جھاڑی تھی نا۔"

میں نے کہا "چاہو تو نہا کے دوسرے کپڑے پہن لو۔"

وہ بولی "یہی میں بھی سوچ رہی تھی۔"

اس کے پاؤں میں موچ نہیں آئی تھی۔ مڑ جانے سے کوئی رگ پٹھا متاثر ہوا تھا مگر وہ چل سکتی تھی۔ اس نے اپنے لیے وارڈ روب میں سے کپڑے منتخب کئے اور غسل خانے میں بند ہوگئی تو میں نے فون اٹھایا۔ ابھی میں نے دو ہی نمبر ڈائل کئے تھے کہ کھڑکی پر ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی پڑی اور میں ریسیور رکھ کے دوڑا۔ باہر پھر کوئی گاڑی آئی تھی اور مجھے یقین تھا کہ آنے والے نے اوپر کی منزل کے بیڈ روم کی روشنی ضرور دیکھ لی ہوگی۔ اب اسے گل کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

میں نے پردہ ہٹا کے دیکھا تو ایک لمحے کے لیے مجھے یوں لگا جیسے

میری آنکھیں غلط دیکھ رہی ہیں اور میرے اندیشے ہی میرے حواس کو دھوکا دینے لگے ہیں۔ کار کی لائٹ بند ہوتے ہی دو سائے سے اترے تھے اور وہ گیٹ کھول کے اندر آگئے تھے۔ دور سے آنے والی اسٹریٹ لائٹ کی مدھم روشنی نہ ہوتی تو تب بھی میں انھیں چال سے پہچان سکتا تھا۔ ان میں سے ایک غالب تھا اور غالب کے ساتھ رابعہ تھی۔ مجھے زمین آسمان گھومتے محسوس ہوئے۔ میرے دل میں چھپ کر بیٹھنے والا شک کا کالا ناگ ایک دم پھن پھیلا کے سامنے آگیا اور جھومنے لگا۔ کچھ دیر پہلے میں جس خیال سے خائف تھا وُہ حقیقت کا روپ دھار چکا تھا اور اب اس رُسوا کن' دل شکن اور حوصلہ شکن صورت حال سے مجھے اکیلے ہی نمٹنا تھا۔ میں نے خدا سے مدد کی دعا کی کہ وہ مجھے کسی جذباتی طوفان سے دوچار نہ کرے جس میں اس بندۂ پُر تقصیر کا بیڑا غرق ہو جائے مگر ہر دعا قبول نہیں ہوتی اور ایسی سب دعائیں تو یقیناً مسترد ہو جاتی ہوں گی جب کوئی اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے سے پہلے کہے کہ 'اللہ میاں' میرے قدم نہ لڑکھڑائیں یا پاؤں کٹ جائیں تب بھی میں منہ کے بل نہ گروں'

ستم بالائے ستم شیلی نے باتھ میں سیٹی بجانی شروع کردی۔ باتھ روم سنگر میں بھی تھا اور ان بہت سے لوگوں سے بہتر تھا جن کی آواز سن کے پھٹے ڈھول کی آواز بھی بیٹھ جائے یا خوشی سے ہنہنانے والے گدھے پر رِقت طاری ہو جائے۔ شیلی غالباً اس سے بھی برا گاتی ہوگی کہ اس نے سیٹی پر اکتفا کی۔ بس وہ دُھن انتہائی تباہ کُن ثابت ہوئی جو وہ نہ جانے کیسے سنا رہی تھی۔ غسل خانے کے نل کو یا ٹائل والی دیواروں کو۔ تمی ہو محبوب میرے' میں کیوں نہ تمھیں پیار کروں۔

میں نے دروازہ بجا کے کہا "اے شیلی! یہ کیا بے ہودگی ہے۔"

اس نے سیٹی روک کے اور تنک کے جواب دیا "کیا ہے یار۔"

"لڑکیاں.... شریف لڑکیاں سیٹی نہیں بجاتیں۔ اور یہ.... بہت فضول گانا ہے" میں نے کان آہٹ پر رکھے۔

"مجھے پسند ہے۔ تم کو میرے جذبات کا خیال رکھنا چاہیے۔ کیا سیٹی بجانے سے میں لڑکی نہیں رہی... یا شریف لڑکی نہیں رہی؟"

بحث یا زبردستی سے اسے قائل کرنے کے لیے وقت نہیں تھا اور اب تو اس نے یہی گانا بہ آواز بلند خود گانا شروع کردیا تھا۔ میں نے آنے والی مصیبت سے بچنے کے لیے آیت الکرسی پڑھنے کی کوشش کی تو وہ بھی مجھے یاد نہ آئی حالانکہ بچپن سے آج تک میں اس دعا کو ہر رات سونے سے پہلے اسی طرح عادتاً پڑھ لیتا تھا جیسے صبح اٹھتے ہی کلمہ پڑھتا تھا۔ میری ماں نے مجھے بتایا تھا کہ زندگی کے ہر دن کا آغاز اور اختتام ایسے ہی ہونا چاہیے اور میں یہ بات کبھی نہیں بھولا تھا۔

جب میں نے راہداری میں قدموں کی چاپ اور غالب کی آواز سنی تو میرا دل ڈوبنے لگا۔ پھر میں نے خود کو سمجھایا کہ جب میں بے گناہ اور حق پر ہوں تو مجھے بے باک بھی ہونا چاہیے کیونکہ سانچ کو آنچ نہیں۔ بس ایک تو مجھے مشتعل ہونے سے گریز کرنا چاہیے ورنہ عقل متاثر ہوگی اور میں حقائق کو معصومیت کے پُراعتماد انداز میں پیش نہ کرسکا تو ثابت ہوگا کہ سچ کڑوا ہوتا ہے اور چور کی داڑھی میں تنکا ہوتا ہے۔

غالب نے عین دروازے پر آکے کہا "دال میں کچھ کالا ہے۔"

میں نے اس خیال سے کہ وہ جیمز بانڈ کی طرح دروازہ توڑ کے اور ہاتھ میں ریوالور اٹھا کے داخل نہ ہو' کنڈی کھول دی تھی مگر اس نے ایسا ہی کیا۔ نتیجہ یہ کہ وہ اپنے ہی زور میں سیدھا گزرا اور دھڑام سے فرش پر گرا۔ اس کے پیچھے کھڑی ہوئی رابعہ اندر آئی اور پھر یوں منجمد ہوگئی جیسے اس کے سامنے میں نہیں' خلائی مخلوق کا تصوراتی نمونہ ہو۔ کبھی ہم ان کو کبھی ان کے گھر کو دیکھتے ہیں۔

غالب شرمندگی اور غصے میں کپڑے جھاڑے بغیر اٹھ کھڑا ہوا "تم...."

میں نے مسکرا کے کہا "میرے گھر میں آخر اور کون ہوسکتا تھا۔"

باتھ روم میں سے آواز آئی "تم ہی... ہی... ہی... ہو... ہو..." وہ غالباً سردی سے کانپ رہی تھی۔

غالب نے دروازے کو اور پھر مجھے دیکھا "یہ کون ہی ہی اور ہو ہو کر رہا ہے؟"

"کر رہی ہے۔" میں نے کہا "یہ شیلی ہے۔ ڈاکٹر شیلا خان۔"

رابعہ کی نظر دروازے پر جم گئی تھی۔ اس کا چہرہ فق ہو رہا تھا۔

باتھ روم میں سے شیلی نے چلّا کے کہا "کیا ہوا یار؟ یہ دھماکا کیسا ہوا تھا؟ باتیں کس سے کر رہے ہو' اپنے آپ سے؟"

میں نے جھینپ کے کہا "رابعہ اور غالب آئے ہیں۔ جب یہ آتے ہیں تو دھماکا ضرور ہوتا ہے۔"

اس کا ریاض ختم ہوگیا "واٹ اے سرپرائز۔"

غالب نے سپاٹ لہجے میں کہا "تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

سوال کا باقی حصہ اس نے نہیں بولا مگر میں نے سن لیا کہ اس لڑکی کے ساتھ؟ "میں ابھی بتاتا ہوں۔ تم پہلے اطمینان سے بیٹھ جاؤ۔"

رابعہ نے کہا "مجھے کوئی ضرورت نہیں...."

"دیکھو رابعہ! مجھے یہ شک ضرور تھا کہ تم شک کروگی مگر یقین نہیں تھا کہ...."

وہ ایک دم پلٹی "غالب! میں جا رہی ہوں۔"

"رابعہ! پلیز' ڈونٹ بی سلی" میں اس کی طرف لپکا "یہاں تک آکے ایسے مت جاؤ۔ میری بات تو سن لو۔"

"شٹ اپ۔ مجھے معلوم نہیں تھا.... کہ تم...." رِقت اور جذبات کی شدت سے اس کی آواز گھٹ گئی۔

"تم غلط سمجھ رہی ہو۔ توہین کر رہی ہو میرے جذبات کی۔ میں اتنا ذلیل ہوں.... رابعہ...."

"تم اس سے کہیں زیادہ ذلیل ہو.... جتنا میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔" رابعہ کے لہجے میں نفرت کا زہر بول رہا تھا "ذلیل مجھے کیا میرے نصیب نے اور غالب نے.... یہاں لا کے...." وہ پھر دروازے کی طرف بڑھی۔

میں نے اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا مگر وہ جاتے جاتے دروازے کو دھڑ سے مار گئی تھی۔ میں بند دروازے سے ٹکرا کے رک گیا۔

چوٹ کی پروا کیے بغیر میں نے دروازہ کھولا۔ میرے کان رابعہ کے قدموں کی آواز سن رہے تھے۔ وہ تیزی سے دوڑتی ہوئی زینے کی طرف جا رہی تھی۔ سینڈل کی سخت ایڑی فرش پر گونج پیدا کر رہی تھی اور سکوت میں یہ آواز گولیوں کی طرح تھی جو میرے دل پر چل رہی تھیں۔

میں نے چلّا کے کہا "رابعہ...."

اسی وقت غالب نے پیچھے سے میرا ہاتھ پکڑ لیا "کوئی فائدہ نہیں۔ وہ نہیں رکے گی اور نہ تمھاری بات سنے گی۔"

غالب کے لہجے نے مجھے مشتعل کردیا اور میں بھول گیا کہ ابھی چند منٹ پہلے میں نے اپنے آپ سے پُرسکون رہنے کا عہد کیا تھا "تمہارا بھی دماغ خراب ہو رہا ہے۔"

غالب نے سپاٹ لہجے میں کہا "اور کیا کہہ سکتے ہو تم؟ ہم سب کا دماغ خراب ہوگیا تھا۔ پاگل ہم تھے۔ دیوانے تھے۔ ایک تم سیانے تھے..."

"بکواس بند کرو غالب...." میں نے دہاڑ کے کہا۔

"میں بڑی مشکل سے اسے یہاں لایا تھا... اسے میرے دلائل نے قائل نہیں کیا تھا۔ نازو اور منظر اسے سمجھانے میں ناکام رہے تھے لیکن اپنے جذبات کے سامنے وہ نہ ٹھہر سکی۔ اسے معلوم ہوا کہ تم لاپتا ہو تو اس نے جو مصنوعی غصے' بیزاری اور لاتعلقی کی نقاب ڈال رکھی تھی' وہ خود اتر گئی۔ یہ اصل.... وہی پرانی رابعہ تھی جو کل بھی تمھارے لیے پاگل تھی اور آج بھی ہے۔ ہمیشہ رہے گی۔ کوئی کسر نہیں چھوڑی تم نے اسے پاگل خانے پہنچانے میں سکندر...."

گیلے بال بکھرائے' شانے پر تولیہ پھیلائے اور رابعہ کے کپڑے پہن کے باتھ روم سے برآمد ہونے والی شیلی کسی مجرم کی طرح سر جھکائے کھڑی سب سن رہی تھی۔ حالات وواقعات کی شہادت نے اس پر بھی وہی فردِ جرم عائد کردی تھی جس میں اس کے ساتھ مجھے برابر کا شریک قرار دیا جا چکا تھا۔ میرے پاس ایسی کوئی دلیل نہ تھی جس سے میں اپنے سچ کو سچ ثابت کرسکتا۔ کون کہتا ہے کہ جیت ہمیشہ سچ کی ہوتی ہے۔ یہاں ایک بے بنیاد الزام کے کوہِ گراں نے سچ کے وجود کو کچل کے مسخ کردیا تھا اور زمین میں دفن کردیا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے ہاتھی کا پاؤں چیونٹی پر ہو تو چیونٹی کی آواز بے وجود ہو جاتی ہے اور انسدادِ بے رحمی والوں سے لے کر خود اس کے قریب پھرنے والی کوئی چیونٹی بھی اس کی پُکار نہیں سنتی۔

میرا دماغ اچانک گھوم گیا۔ جب عقل ناکام ہو تو جنوں کام آتا ہے۔ احساس ذلت اور قوت برداشت کی انتہا کو پہنچ کے میں مجبور ہوگیا کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دوں اور یہ پتھر بھی مجھے پتھر مارنے والے ہاتھوں سے چھین لوں۔ الزام ہوتا تو میں سر جھکاتا کہ مجھے سنگسار کردو مگر بے گناہی کے جرم میں سزا قبول کرنا میرا مسلک نہیں تھا۔

میں نے ایک دم غالب کو اٹھا کے بیڈ پر پھینک دیا اور ایک دم چھلانگ مار کے اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا "میں تجھے جان سے ماردوں گا غالب۔ تو میرا دوست ہے' اس کے باوجود میں تجھے اجازت نہیں دے سکتا کہ تو مجھے ایسی گالی دے...."

شیلی نے چیخ ماری "سکندر! آر یو میڈ۔ یو سلی فول..." (ARE YOU MAD? YOU SILLY FOOL?) چھوڑو اسے۔"

غالب میری آنکھوں میں وحشت کے آثار دیکھ کے ساری مزاحمت بھول گیا تھا۔ اس شخص کی طرح جو کسی خوں آشام آدم خور شیر کے پنجے میں ہو۔ وہ مفلوج پڑا مجھے یوں دیکھ رہا تھا جیسے پہلے کبھی اس نے نہ دیکھا تھا۔ پھر شیلی نے پیچھے سے میرے سر پر کوئی چیز ماری اور ایک دم میرے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے۔ میرے جسم کی ساری توانائی پریشر کُکر کے سیفٹی والو سے خارج ہونے والی بھاپ کی طرح نکل گئی اور میں چکرا کے اسی بیڈ پر گر گیا۔ شیلی نے ایک نیورو فزیشن سے زیادہ ایک ماہرِ نفسیات ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے میرے پاگل پن کے دورے کا بالکل صحیح علاج کیا تھا۔ جسمانی طور پر تو کوئی بھی مجھے زیر نہیں کرسکتا تھا۔

چند سیکنڈ کے لیے میری نظروں کے سامنے اندھیرا آیا پھر میں نے بجھ جانے والے فانوس کی روشنی کو آہستہ آہستہ بڑھتا دیکھا۔ غالب اب میرے قریب کھڑا مجھے تشویش سے دیکھ رہا تھا۔

شیلی مجھ پر جھکی ہوئی میرے گالوں کو اپنے ہاتھوں سے تھپک رہی تھی اور مجھ پر بیک وقت گرم اور ٹھنڈے پانی کے قطرے برس رہے تھے۔ ٹھنڈے پانی کی بوندیں اس کے بکھرے ہوئے گیلے بالوں سے ٹپک رہی تھیں اور گرم قطرے اس کی آنکھوں سے۔

"آئی ایم سوری یار۔ سکندر.... پلیز مجھے معاف کردو۔ تمھیں زیادہ چوٹ آگئی۔ بائی گاڈ میں ایسا نہیں چاہتی تھی۔ میں تو یار' تمھیں کنٹرول کرنا چاہتی تھی۔.. لو یہ پانی پی لو.... آر یو اوکے؟"

میں اٹھ بیٹھا "میں ٹھیک ہوں۔ غالب' یار کیا میں پاگل ہوگیا ہوں؟ میں کیا کر رہا تھا آخر.... رابعہ...."

"رابعہ چلی گئی" غالب نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا "چلی گئی... اور تو نے اسے جانے

دیا؟"

"اس وقت.... رابعہ کا جانا ہی مناسب تھا" غالب نے عجیب سی نظروں سے شیلی کو دیکھا "لیکن اس کی فکر مت کر۔ کہاں جائے گی وہ یار۔ قید حیات و بند غم۔ اصل میں دونوں ایک ہیں۔"

"غالب! وہ جذباتی لڑکی...."

غالب نے نفی میں سرہلا دیا "نہیں۔ وہ پاگل ہو جائے صدمے سے تب بھی خودکشی نہیں کرے گی۔ تجھے اس دنیا میں چھوڑ کے وہ دوسری دنیا میں پہنچ جائے' یہ اسے ہرگز منظور نہیں ہوگا۔ اگر اسے مرنا ہو گا نا.... تو وہ پہلے یہاں آئے گی۔ تجھے گولی مارنے۔ اور جب اسے تیرے مرنے کا یقین آجائے گا تو وہ مرتے وقت بہت خوش ہوگی۔ نہ اسے زندگی میں کوئی تجھ سے جدا کر سکتا ہے' نہ موت...."

مجھے نہیں معلوم کہ غالب نے یہ سب کچھ عمداً شیلی کو یہ بتانے کے لیے کہا تھا کہ وہ کبھی مجھے رابعہ سے نہیں چھین سکتی۔ نہ اپنی دولت' نہ اپنے حسن و شباب کی ساحری سے' نہ اپنی سادگی و پُرکاری کے ناز و انداز سے۔ نہ اس بے تکلف' دوستانہ جارحیت سے جو دیارِ مغرب کے ماحول کی عطا کردہ تھی اور جس کی مدد سے وہ رابعہ کی محبت پر غاصبانہ قبضے کو بھی آدابِ عشق میں شامل سمجھتی تھی۔ اور اسے عار نہ تھی کہ یہ دل بری کا انداز کسی طرح معیوب یا خلافِ اخلاق ہے۔ غالب شاید یہ سمجھتا تھا کہ لندن میں پرورش اور تعلیم پانے والی لڑکی تو ایسا ہی سوچتی ہوگی کہ کیا ہوا اگر اس نے کسی کے بوائے فرینڈ پر قبضہ کر لیا۔ وہ کوئی دوسرا تلاش کرلے گی۔ ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔

میں نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ غلط فہمی پر مبنی غالب کے رویے کا شیلی نے کیا اثر قبول کیا تھا اور اس کا ردِعمل کیا تھا۔ میں سخت ذہنی اذیت میں مبتلا ہونے کے باوجود کوشش کر رہا تھا کہ کسی طرح غالب کو اپنے دکھ درد کا ہم راز اور شریک کرلوں۔ ایک دوست کی حیثیت سے یہ اس کا فرض اور میرا حق تھا۔

میں نے کہا "غالب! رابعہ کا مسئلہ نہیں۔"

غالب نے نظر اٹھا کے شیلی کو دیکھا "پھر کس کا مسئلہ ہے؟"

میں نے کہا "ایک لاش کا جو اس وقت بھی گیراج میں موجود ہے۔"

"گیراج میں...؟ کس کی لاش؟" غالب چونکا۔

"رفیق کی۔ اور یہ لاش ہے شیلی کی گاڑی کی ڈکی میں۔"

"گیراج تو بند ہے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ سامنے سے ایسا ہی نظر آتا ہے لیکن ابھی میں تجھے دکھا بھی دیتا ہوں اور بتا بھی دیتا ہوں کہ میں اور شیلی یہاں کیوں چھپے ہوئے تھے۔"

شیلی نے آہستہ سے کہا "میں خود اپنی نظر سے گر گئی ہوں۔ مجھے وہم تھا یار کہ جن کو تم دوست کہتے ہو.... اور سمجھتے ہو.... وہ تم پر اعتماد نہیں کرتے' اعتبار نہیں کرتے۔ کیسی دوستی ہے یہ آخر...."

غالب نے دفاعی انداز میں کہا "میں یہ کیسے بھول سکتا ہوں کہ تم اپنے چوہدری دلاور کی بہن ہونے کا دعویٰ بھی رکھتی ہو۔ ایسا ہی ایک دعوے دار اکبر خان تھا جسے ہم خوب بھگت چکے ہیں۔"

"تمہاری بات کو میں کیسے غلط کہوں۔ وقت کی کسوٹی میرے ہاتھ میں نہیں جس پر دوستی اور دشمنی یا محبت اور ہوس کو پرکھا جاسکتا ہے۔ اور تو کوئی ایسا آلہ یا مشین ابھی تک ایجاد نہیں ہوئی جس سے جذبات کی تشخیص ممکن ہو۔ اور فرق کو DIAGONISE کیا جاسکے... تم مجھے نفرت سے قتل کرنا چاہتے ہو...."

میں نے شیلی سے کہا "ہم اتنے بے رحم لوگ نہیں ہیں جتنے اس وقت تمہیں نظر آرہے ہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم اپنا حلیہ ٹھیک کرو ڈاکٹر شیلی۔ اس وقت تم خود بہت TENSE ہو۔"

وہ تلخی سے مسکرائی "بہت کہتی تھی میں یار۔ کہ ٹیک اٹ ایزی۔"

"ہاں۔ ٹیک اٹ ایزی۔ میں آتا ہوں غالب کو جائے واردات دکھا کے" میں نے کہا۔

"کیا واردات بھی یہاں ہوئی تھی..؟"

"نہیں۔ میری مراد تھی وہ جگہ جہاں واردات موجود ہے" میں اب ابتدائی صدمے سے خاصا سنبھل گیا تھا لیکن میرا سابقہ اعتماد بحال نہیں ہوا تھا۔

غالب بھی افسردہ اور پریشان تھا "خدا سمجھے تم سے سکندر۔ پتا نہیں تم کیا کرتے پھر رہے ہو اور کیوں...؟"

میں نے برہمی سے کہا "تم سمجھنا نہیں چاہتے تو جاؤ۔ میں خود اپنے معاملات سے نمٹ لوں گا۔"

"بکواس مت فرماؤ۔ چلو۔" اس نے مجھے کھینچ کے دروازے کی جانب دھکیلا۔

رفیق کی لاش ڈکی میں پڑے پڑے اکڑ گئی تھی۔ اس کا خون جم کے سیاہی مائل ہونے لگا تھا اور اس کی بو کا بھبکا ڈکی کھولتے ہی میرے حواس پر حملہ آور ہوا تو مجھے متلی سی محسوس ہوئی۔

میں نے لائٹ آن کر دی تھی۔ اس کی روشنی ڈکی کے اندر براہ راست نہیں پہنچ رہی تھی مگر منعکس ہونے والا اجالا کم نہ تھا۔ غالب نے ایک نظر رفیق پر ڈالی اور پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے ڈکی بند کرنے سے پہلے اسے وہ حروف دکھائے جو رفیق نے اپنے لہو سے لکھے تھے۔

دس منٹ سے بھی کم وقت میں اس نئی افتاد کی ساری روداد غالب تک پہنچ گئی تھی۔ اب وہ مجھ سے زیادہ متوحش اور پریشان نظر آنے لگا تھا۔ وہ بار بار افسوس یا ملامت کے اظہار میں سر ہلاتا تھا جیسے اسے مجھ سے ایسی حماقت کی توقع نہیں تھی "حد کر دی تم نے" اس نے کئی بار کہا۔

"یہ کیا حد کر دی' حد کر دی کی رٹ لگا رکھی ہے۔ اور میں کیا کرتا؟" میں نے بالآخر چڑ کے کہا "اس لاش سمیت تمہاری خدمت میں حاضر ہو جاتا؟"

"ہاں۔ ہمارے پاس آجاتے۔ کچھ نہ کرتے اور اس الو کی پٹھی سے کہتے کہ گاڑی لے کر سیدھی پولیس اسٹیشن چلی جاؤ" غالب نے کہا۔

"کیا تمہیں اندازہ نہیں کہ پولیس کا رویہ کیسا ہوتا...؟"

"بھاڑ میں جائے پولیس کا رویہ۔ تمہیں اتنی ہمدردی کیوں ہے شیلی سے؟" غالب نے کہا "اور پولیس اسٹیشن نہ سہی' وہ نقوی صاحب کے گھر جا کے سب بتا سکتی تھی۔ وہ سب سنبھال لیتے۔ وقار یوسف کی بیوی ہمارے ساتھ ہے۔ وہ اپنے باپ سے سب کچھ منوا سکتی تھی۔"

"اس کا وقت بھی آئے گا۔ میرے سارے مقدمات کی فائلیں اس وقت نقوی صاحب کی تحویل میں ہیں" میں نے کہا۔

"آخر کیوں؟ کیوں منگوائی ہیں اس نے یہ فائلیں؟"

"ایڈیشنل ہوم سیکریٹری کو تم کیا سمجھتے ہو؟"

"بظاہر تو وہ چوہدری دلاور کا مددگار ہے۔ اس نے دلاور کو اپنے گھر بلا کے موقع فراہم کیا کہ وہ تمہیں بلیک میل کرے۔ انہی فائلوں کی مدد سے۔ اور دلاور نے تم پر دباؤ ڈالا...."

"میری معلومات کے مطابق اس نے دلاور پر بھی دباؤ ڈالا تھا۔ اور عین ممکن ہے کہ اس نے تمام مقدمات کی فائلیں نظرثانی کے لیے منگوائی ہوں۔ اس نے دلاور کو موقع فراہم کیا ہو کہ خود معاملات طے کرا دو ورنہ میں کیس واپس لینے کے احکامات جاری کرتا ہوں۔"

"یہی تو سوال ہے۔ دلاور کو یہ موقع کیوں دیا اس نے؟ کیا تعلق ہے اس کا دلاور سے کہ اس نے احکامات جاری کرنے سے پہلے دلاور کو بلایا؟ وہ تمہارا ہمدرد ہوتا' تمہیں شک کا فائدہ دینا چاہتا تو کر دیتا آرڈر۔ اسے کون چیلنج کرتا۔ ایڈووکیٹ جنرل یا ڈپٹی ایڈووکیٹ جنرل کی طرف سے عدالت میں مقدمات واپس لینے کی درخواست پیش کر دی جاتی.... وہ ضرور دلاور کو کوئی فائدہ پہنچانا چاہتا تھا۔"

"یا اس سے فائدہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔" میں نے کہا "جو بات ہوگی سامنے آجائے گی۔ دیکھتے ہیں وہ بیٹی کی بات کس حد تک مانتا ہے اور بیٹی کیا کر سکتی ہے۔ فی الحال ایک بات کی وضاحت کر دوں میں۔ مجھے یہ ڈاکٹر شیلی کسی سازش میں شریک نہیں لگتی۔ تم مجھ سے اختلاف کرنے کا حق رکھتے ہو لیکن میرا دل گواہی دیتا ہے...."

"تمہارا دل...!" غالب نے طنز سے کہا "تمہارے پاس ہے؟ وہ تو غالباً تم رابعہ کو دے چکے تھے۔"

"بکواس سے کیا فائدہ۔ میں اپنی بات پر قائم ہوں۔ شیلی نے جو کچھ بتایا ہے' اس کی تصدیق ہو جائے گی۔ غلط ثابت ہو تو کہنا کہ سکندر بخت تمہاری عقل کی طرح تمہارا دل بھی ناقابلِ اعتبار فی الحال میں اس سے لاتعلق نہیں ہو سکتا۔ وہ مدد کی مستحق ہے اور میں اسے چوہدری دلاور کا آسان شکار نہیں ہونے دوں گا۔"

"خواہ اس کوشش میں خود شکار ہو جاؤ؟"

"تمہاری مُراد شیلی سے ہے تو وہ مجھے شکار کرنے نہیں آئی تھی۔ اس کے یہاں آنے کا مقصد کچھ اور تھا۔"

"پہلا مقصد کچھ اور تھا۔ ثانوی مقاصد کچھ بھی ہو سکتے ہیں۔"

"تم اسے بلاوجہ نزاعی مسئلہ بنا رہے ہو۔ اگر بعد میں اسے کچھ ہو گیا تو میں نہ تمہیں معاف کروں گا اور نہ خود کو۔"

"چلو چھوڑو۔ یہ بحث لاحاصل اور قبل از وقت ہے۔ میں رابعہ کے حق میں اپنے جذبات سے مغلوب ہوں۔" غالب بولا "ابھی تو تم فون اٹھا کے بات کرو زیڈ یو نقوی صاحب سے۔ ان سے کہو کہ ہم ملنے آرہے ہیں۔"

"کیوں نہ یہ بات شیلی کرے؟"

"شیلی بات کرلے۔ یہ مزید بہتر ہے" غالب نے کہا "ہم گاڑی لے کر ان کے گھر پہنچ جاتے ہیں اور ان سے صاف بات کر لیتے ہیں۔"

"کیا صاف بات..؟"

"یہی کہ ہم رفیق کے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں۔"

میں نے کہا "یہ تو بلیک میلنگ ہوگی۔"

"جینے کا حق مانگنے کے لیے سب جائز ہے۔ وہ فائلیں ہمارے حوالے کر دیں" غالب نے کہا۔

"یہ مشکل... بلکہ ناممکن ہے۔ عدالتی ریکارڈ ہے۔"

"اول تو نقوی صاحب جیسے لوگ کوئی کنکر پتھر نہیں جسے کوئی ٹھوکر مار سکے۔ وہ بہت بڑی چٹان بلکہ ایک پہاڑ ہیں۔ ان سے ٹکرانے والا خود پاش پاش ہو جائے گا۔ پھر یہ کہ وہ قانون کو بنانے' بگاڑنے' معطل کرنے اور بدلنے کا حق جانتے ہوں گے۔ ہر بڑے بیوروکریٹ کی طرح۔ وہ ایک ڈکیتی کی رپورٹ لکھوا کے عدالتی ریکارڈ کے بارے میں پرانی بات کو سچ ثابت کر سکتے ہیں کہ.... آں دفتر را گاؤ خورد... گاؤ را قصاب برد قصاب ہم کرو۔ یعنی فائل کو گائے کھا گئی' گائے کو قصائی لے گیا اور اب تو قصائی بھی فوت ہو چکا۔ لیکن ایک ڈائریکٹ طریقہ بھی ہے۔ وہ ہمارے سامنے ہر کیس فائل پر احکامات صادر فرما دیں۔"

"اور نہ فرمائیں تو....؟" میں نے کہا۔

"تو ہم پولیس اور اخبار والوں کی موجودگی میں رفیق کی لاش کہیں سے برآمد کراتے ہیں۔ چوہدری دلاور کے گودام سے یا پائیں باغ سے... اور پھر تفصیلات جاری کرتے ہیں شیخ صاحب کے حوالے سے...."

ہم پھر پچھلی طرف سے نکلے اور کچن سے گزر کے اوپر پہنچے تو

شیلی گُم صُم بیڈ پر بیٹھی تھی۔ شاید وہ اپنی بے سبب تذلیل کے احساس پر آزردہ اور دل شکستہ تھی۔ اسے نہ صفائی پیش کرنے کا موقع ملا تھا اور احتجاج کی اس میں ہمت نہ تھی۔ ملامت اور ندامت کے جذبات کی یورش میں اس کی قوت فیصلہ کا متاثر ہونا فطری بات تھی۔ اس کا تصور کچھ بھی نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ اس نے مجھ سے مدد مانگی تھی اور میری مدد کا فیصلہ کیا تھا۔ یہی ایک فیصلہ تھا جو اس نے خود اپنی عقل سے سوچ سمجھ کے کیا تھا۔ باقی فیصلے تقدیر کے تھے۔ مثلاً یہ کہ وہ چوہدری دلاور کے باپ کی بیٹی تھی۔ خود کو وہ اس کی سوتیلی بہن کہلوانا بھی پسند نہیں کرتی تھی۔ اس کی حد سے بڑھی ہوئی بے تکلفی کی عادت اس کی خود اعتمادی کی مظہر تھی۔ لندن میں پرورش پا کے ڈاکٹر بننے والی کسی لڑکی کے لیے یہ کوئی معیوب بات ہی نہ تھی مگر یہاں معیار مختلف تھے۔ دُہرے معیار تھے اور ان میں لچک نہ تھی ورنہ انصاف سے دیکھا جاتا تو تمام عمر مغربی تہذیب اور مادر پدر آزاد معاشرے میں گزارنے کے باوجود اس کی مشرقیت برقرار تھی۔ وہ بہترین اُردو بولتی تھی، پاکستانی لباس پہنتی تھی، بے تکلفی کے باوجود فاصلے برقرار رکھتی تھی اور اس کی نسوانیت کا تقدس کسی حصار کی طرح اس کی شخصیت کو گناہ گار نظروں سے تحفظ فراہم کرتا تھا۔

میں نے کہا "ڈاکٹر شیلی! واٹ از دی میٹر۔ ...

IS THE MATTER

اس نے مجروح نظریں اٹھائیں DONT YOU KNOW ۔ کیا تمہیں واقعی نہیں معلوم؟"

میں نے کہا "چھوڑو یار۔ تم جیسی لڑکی کو ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں سے رنجیدہ نہیں ہونا چاہیے۔"

"کیوں یار؟ صرف اس لیے کہ میں لندن سے آئی ہوں۔ چوہدری دلاور کا باپ میری بدقسمتی کے باعث میرا بھی باپ تھا۔ میں اس معاشرے کے دوغلے معیاروں کی گھٹن میں پل کے بڑی نہیں ہوئی۔ مجھ پر کوئی بھی الزام عائد کیا جا سکتا ہے۔ ہر شخص سے میرا تعلق نہیں مگر تم جیسے پڑھے لکھے، روشن خیال اور باضمیر کہلانے والے بھی مجھے بے حیا اور آبرو باختہ سمجھنے لگیں...."

"فار گاڈ سیک شیلی! کیا کہہ رہی ہو تم...."

"وہ جو تمہاری نظریں کہہ رہی تھیں یار۔ یہ میرے نہیں تمہارے جذبات ہیں مسٹر غالب۔" اس نے تلخی سے کہا "تم صحافی ہو۔ تمہارا ذہن تو مختلف ہونا چاہیے۔ تمہاری OUT LOOK میں وسعت اور فراخ دلی ہونی چاہیے یار۔ یہ زرد صحافت YELLOW JOURNALISM کا گھٹیا پن نہیں۔"

غالب سخت شرمسار تھا "دیکھو، میں تمہارے الزامات کی نفی نہیں کروں گا اور اپنی صفائی پیش نہیں کروں گا۔ کیچڑ میں جتنے پتھر پھینکے جائیں اتنے ہی چھینٹے اچھلتے ہیں۔ میں تم سے معافی مانگ سکتا ہوں۔ میری سوچ غلط تھی۔ یار I WAS WRONG ۔ کیا یہ کافی ہے؟"

شیلی مسکرانے لگی "تم بھی اب میری زبان بولنے لگے ہو۔ اوکے۔ کہا سُنا معاف۔ ہاتھ ملاؤ۔"

غالب نے اس سے ہاتھ ملایا "NO HARD FEELINGS اب دل میں رنجش نہیں رہنی چاہیے۔"

میں نے کہا "شیلی! وقت کم ہے۔ تم یہ ریسیور اٹھاؤ اور بات کرو توپ.... میرا مطلب ہے اپنے زیڈیو نقوی صاحب سے۔"

"یہ توپ کا لفظ بیچ میں کہاں سے آ گیا تھا؟" شیلی نے ریسیور اٹھاتے ہوئے کہا۔

"وہ.... دراصل۔ ان کے بارے میں یہ کہا جاتا تھا کہ وہ بڑی توپ چیز ہیں۔ جیسے انگریزی میں کہتے ہیں کہ " HE IS A BIG GUN

"ان سے کیا کہوں؟"

"کہو کہ میں بڑی مشکل میں ہوں۔ اسی وقت تشریف لانا چاہتی ہوں کیونکہ دنیا میں آپ ہی میرے مشکل کشا ہیں۔" میں نے کہا "میرا یا غالب کا حوالہ بالکل مت دینا۔ یہ بھی مت بتانا کہ کہاں سے بول رہی ہو اور مشکل کیا ہے۔ بس یہ کہنا کہ میں آ کے بتاتی ہوں۔ وہ بہت ٹالیں گے کہ لڑکی کیا دماغ خراب ہے تمہارا۔ آدھی رات کے وقت کیا قیامت آ رہی ہے۔ صبح آنا۔ مگر تم ایک مت سننا۔"

شیلی نے سرہلایا "میں سمجھ گئی مگر کیا ہم...."

"ہاں۔ ہم رفیق کو ان کے سپرد کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ یہ ایک ماموں کا فرض ہے کہ وہ بھانجے کی آخری رسوم کی ذمے داری قبول کرے اور اس کی تجہیز و تکفین...."

میری بات نامکمل رہ گئی کیونکہ شیلی نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کر دیا تھا۔ "ہیلو.... سر میں شیلی ہوں۔ ڈاکٹر شیلا خان۔ سوری سر.... معاملہ ہی کچھ ایسا تھا کہ میں نے آپ کی نیند ڈسٹرب کی۔ یہ زندگی اور موت کا مسئلہ ہے میرے لیے۔ میں نہیں بتا سکتی سر۔ نو سر۔ فون پر کچھ نہیں کہہ سکتی۔ سخت خطرہ لاحق ہے مجھے۔ نہیں سر.... پولیس کا نام بھی مت لیں۔ سوری.... میرا مطلب تھا کہ مجھے نہیں لینا چاہیے۔ ناممکن سر.... میں.... میں آنا چاہتی ہوں۔ ابھی، ابھی، آپ کے پاس.... نو سر۔ صبح؟ صبح تک مجھے زندگی کا اعتبار نہیں۔ میں نکل رہی ہوں سر۔ اپنے گارڈ سے کہہ دیں۔ میں کچھ نہیں جانتی سر۔ آپ کے دروازے پر میرا خون ہو جائے گا تو لاش پڑی رہے گی صبح تک وہیں۔ میں کہیں اور نہیں جا سکتی۔ مرنے کے لیے بھی نہیں...." اس نے ایک دم ریسیور رکھ دیا۔

"گڈ۔ ویری گڈ۔ تمہاری پرفارمنس اچھی رہی۔"

"اب چلو۔" غالب نے چٹکی بجائی۔

"یار، میں بھی حلیہ ٹھیک کر لوں۔ بھوت بنا ہوا ہوں۔"

"تازہ ہوتی تو میں کہتا کہ کوئی میرا شُسر نہیں بن سکتا" غالب نے کہا "یہ حُلیہ بالکل ٹھیک ہے۔ ایک پریشان حال، بدبخت اور معیبت کے مارے کا گیٹ اپ ایسا ہی ہونا چاہیے۔"

"یار، وہ نقوی صاحب اس پر بھی خفا ہوں گے... خیر۔ جہاں سیر وہاں سوا سیر۔" میں نے کہا۔

میں نے لائٹس آف کرتے ہوئے اس خواب گاہ کو دیکھا جس کے در و دیوار مجھے خفا خفا سے لگتے تھے۔ میری لاتعلقی اور عدم توجہی پر شکوہ کناں تھے۔ اس بیٹے کی طرح جسے والدین سے گِلہ ہو کہ اپنی مصروفیت میں وہ اس کو شفقت دینا بھولے ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ دیواروں کے کان تو ہوتے ہیں مگر ان کا دل کس نے دیکھا ہے۔ یہ تو احساس کی بات ہے کہ گھر کی دیواریں، بام و در کس طرح اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ جب صاحب خانہ کی میت اٹھتی ہے تو کیسے وہ سب کے ساتھ آنسو بہاتے ہیں اور جب گھر میں خوشی کے شادیانے بجتے ہیں تو وہ کیسے مسکراتے رہتے ہیں۔ کچھ خواب میرے تھے جن میں اس گھر کے در و دیوار شامل تھے۔ شاید ایسے ہی خواب یہ گھر بھی دیکھتا تھا اور اسے بھی تعبیر کا انتظار تھا جو طویل ہوتا جا رہا تھا۔

نیچے جاتے ہوئے میں نے ایک دیوار پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔ میں آؤں گا۔ بہت جلد، پھر نہ جانے کے لیے۔

نیچے غالب نے گیراج کے دروازے کا راستہ صاف کرنے کے لیے سامنے پڑا ہوا کاٹھ کباڑ ہٹانا شروع کر دیا تھا۔ شیلی اس کام میں غالب کا ہاتھ بٹانے پر مُصر تھی۔

"ڈاکٹر شیلی! یہ تمہارے کرنے کا کام نہیں۔"

"کیوں؟ کیا میں معذور ہوں؟" اس نے کہا۔

"یہ کام عورتوں کا نہیں ہے یار" میں نے کہا۔

"تم مرد بڑے خود غرض، متعصب اور سازشی ہو یار۔ تم نے ہمیں ناکارہ بنانے کے لیے صنفِ نازک کا خطاب دیا۔ زبان سے ضرور کہتے ہو کہ عورتوں کو مرد کے شانہ بشانہ کام کرنے کا حق حاصل ہے مگر اس کے لیے مواقع فراہم نہیں کرتے۔" شیلی نے اپنا کام جاری رکھا "بھئی میں کیا کر سکتی ہوں اور کیا نہیں، اس کا فیصلہ مجھے کرنے دو۔"

اس وقت تک میں نے غالب کے ساتھ مل کے راستہ صاف کر دیا تھا "اوکے ڈاکٹر صاحب۔ ہم مرد سخت شرمندہ ہیں۔ اب کیا آپ ڈرائیونگ سے بھی شوق فرمائیں گی؟"

"آف کورس۔ ڈرائیونگ میں کروں گی۔ بس تم راستہ بتاتے جانا" اس نے چابی کے لیے ہاتھ پھیلایا۔

"سوری۔ میں دونوں کام خود کر سکتا ہوں اس لیے کہ میں آپ کے مقابلے میں زیادہ COMPETANT ہوں" میں نے کہا مگر شیلی نے نہیں مانا۔

چند منٹ بعد ہم اس جگہ سے رخصت ہوئے تو سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا کہ ہمارے آنے سے پہلے تھا۔ گزرے ہوئے وقت کا کوئی سراغ تھا تو صرف ہمارے ذہن میں۔ یادوں کی صورت میں۔

کاتبِ وقت نے عمرِ گزشتہ کی کتاب میں چند سطریں اور لکھ دی تھیں۔ وقت اور مقام کے ساتھ زندگی کے ایک تجربے کا احوال۔

سڑکیں سنسان تھیں اور ہمارا راستہ روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ شیلی اچھی ڈرائیور تھی اور گاڑی اتنی اچھی تھی کہ اس کی خواہش کی پوری طرح اطاعت کرتی تھی۔ اس کے ہاتھوں اور پیروں کو زیادہ زحمت نہیں اٹھانی پڑ رہی تھی۔ ماڈل ٹاؤن کی خستہ اور خراب سڑکوں پر بھی اس کے جمپ ہر زیادتی برداشت کر رہے تھے۔ میں اور غالب سمٹ کر آگے ہی فٹ ہو گئے تھے۔

اچانک غالب نے کہا "تو پھر پینے لگا ہے؟"

میں سمجھ گیا "ہاں۔ اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی۔ اس آگ کو آگ ہی بجھا سکتی ہے۔"

غالب بولا "شراب سمجھ کے پی رہے ہو سگریٹ، تو حرام ہے۔"

"میں روح افزا سمجھ کے پی رہا ہوں" میں نے شیلی کو مزید ہدایات جاری کرتے ہوئے کہا "یہ گلی...."

"یار، اب مجھے معلوم ہے۔ وہ سامنے والا مکان ہے نا؟" شیلی نے کہا۔

"مکان! افسوس لڑکی۔ تم ایسی توپ چیز کے قصرِ عالی شان کو صرف مکان کہہ رہی ہو۔ نقوی صاحب کے سامنے ایسی گستاخی کرو گی تو مار کھاؤ گی۔" میں نے کہا۔

شیلی نے گاڑی کو گیٹ پر روکا ہی تھا کہ سائڈ کی کھڑکی سے گارڈ نے جھانک کے دیکھا۔ اس نے شیلی سے نام پوچھا اور پھر انٹرکام پر نقوی صاحب کو گاڑی کا نمبر بھی بتایا۔ ایک منٹ بعد اس نے ہمارے بارے میں پوچھا "صاحب بولتے ہیں کہ مس شیلی کے ساتھ کون ہے؟"

میں نے کہا "ان کو بولو کہ سکندر بخت اور غالب۔"

گارڈ نے یہ اطلاع اندر پہنچائی اور پھر سرہلانے لگا "صاحب بولتے ہیں کہ صرف مس شیلی اندر جا سکتی ہیں۔"

اب شیلی نے چلا کے کہا "یار ٹو ہیل وِد یور صاحب۔ گیٹ کھولتے ہو یا میں دروازہ توڑتی ہوئی گاڑی اندر لے جاؤں۔ کرتے رہنا فائرنگ۔"

گھبراہٹ میں چوکیدار نے فوراً یہ دھمکی اندر پہنچائی اور پھر "یس سر۔ یس سر" کہتے ہوئے گیٹ کھول دیا۔ شیلی نے گاڑی کو غصے میں زیادہ ہی تیز دوڑایا اور پھر ایک دم بریک لگائے۔ رُکتے رُکتے بھی گاڑی پورچ میں موجود سرکاری کار سے ٹکرا گئی۔ اس وقت تک نقوی صاحب نائٹ گاؤن میں باہر آ چکے تھے اور ہاتھ جیبوں میں ڈالے کھڑے تھے۔ نیچے اترنے سے پہلے ہی میں نے ناگواری کے آثار شکنوں کی صورت میں دیکھ لیے تھے جو اُن کے ماتھے پر بہت نمایاں تھیں۔

انہوں نے میرے اور غالب کے مؤدبانہ سلام کا جواب بڑی

نخوت سے سرہلا کے دیا۔ مصافحے کے لیے ہاتھ جیب سے نکالنا ان کی شان کے خلاف تھا۔

شیلی نے کہا "معاف کیجئے گا' آپ کی گاڑی..."

"گولی مارو گاڑی کو۔" نقوی صاحب نے کہا "ڈاکٹر شیلی! اب میں سمجھ گیا کہ زندگی اور موت کے مسئلے سے تمہارا کیا مطلب تھا۔"

"نو سر۔ آپ کا غلط خیال ہے کہ آپ سمجھ گئے ہیں۔" شیلی نے صاف گوئی سے کام لیا "ابھی آپ کو کچھ نہیں معلوم۔"

نقوی صاحب بگڑ گئے۔ "ان دونوں کو تمہارے ساتھ دیکھنے کے بعد میں تمہارے رویّے کو سمجھ گیا ہوں لڑکی۔ اور کون ہو سکتا ہے تمہارے پیچھے شامت اعمال کے سوا۔ میں سب جانتا ہوں۔"

لیکن شیلی ایسے خاموش ہونے والی نہیں تھی "میں پھر کہوں گی سر کہ آپ فرض کر رہے ہیں۔ مسئلے کا ان دونوں سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ یہ میرا مسئلہ ہے اور مجھ سے زیادہ آپ کا لیکن یہاں کھڑے کھڑے تو سب باتیں نہیں ہونی چاہئیں۔"

وہ کچھ کہے بغیر پلٹ گئے۔ آگے شیلی اور اس کے پیچھے ہم مجرموں کی طرح سر جھکائے ڈرائنگ روم میں پہنچے۔ اتنے صاف ستھرے اور سجے سجائے ڈرائنگ روم میں مجھے اپنا وجود کسی خارش زدہ کتے کی طرح محسوس ہوا جو کسی اسپتال کے وارڈ میں گھس گیا ہو۔ میرے کپڑوں پر' بالوں میں اور ہاتھوں پیروں پر وہ سب دھول تھی جو میں نے اپنے گھر کے فرش سے حاصل کی تھی۔ یہ مٹی مجھے عزیز ہو سکتی تھی' نقوی صاحب کے لیے یہ انتہائی ناقابل برداشت تھی۔

توپ کا رخ اب میری طرف ہو گیا۔ "مسٹر سکندر! مجھے یقین ہے کہ شیلی کے ساتھ تم بلاوجہ نہیں آئے ہو۔ میں بداخلاق ضرور ہوں لیکن تم جیسے بدتمیزوں کے ساتھ۔ تم کو شاید نہ آتی ہو مگر مجھے شرم آرہی ہے تمہارا یہ حلیہ دیکھ کر۔"

میں نے کہا "معاف کیجئے گا سر۔ میں کسی بوفے ڈنر پارٹی سے نہیں آیا ہوں۔ اور آپ پریشان ہیں اس خیال سے کہ صوفے اور قالین گندے ہو جائیں گے۔"

"شٹ اپ۔ میں صرف تمہیں احساس دلانا چاہتا تھا کہ کسی مجبوری کی وجہ سے میں نے تمہیں اندر نہیں بلایا۔ نہ میں دھمکی سے ڈرا تھا اور نہ میری اجازت کے بغیر تم اس ڈرائنگ روم میں قدم رکھ سکتے تھے۔ یہ صوفے اور قالین میں روز بدل سکتا ہوں... سمجھے۔"

"جی سمجھ گیا۔" میں نے اطمینان سے ایک صوفے پر بیٹھ کے کہا "میں آپ کا احترام کرتا ہوں۔ اس لیے کہ آپ بزرگ ہیں اور ہم جیسے نامعقول بچوں کے لیے بھی دل میں ایک نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ کسی ایڈیشنل ہوم سیکریٹری کا عہدہ مجھے متاثر نہیں کرتا۔"

وہ شیلی کی طرف متوجہ ہو گئے "تم کو جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں تھی کہ تمہارے ساتھ کوئی نہیں ہے۔"

"وہ ایسا ہے کہ تھوڑا بہت جھوٹ ضرورت کے مطابق ہم سب ہی بولتے ہیں یار...." شیلی روانی میں کہہ گئی۔

حسب توقع نقوی صاحب اچھل پڑے "یار! یو کال می یار! تمہاری اتنی جرأت لڑکی۔ ذرا اپنی عمر دیکھو۔ میرے بچپن کے دوست مجھے یار نہیں کہتے۔ حد ہوتی ہے بے ہودگی کی...."

"سوری سر۔ ویری سوری۔ بس ایک بری عادت ہے مجھے۔" شیلی نے ہکلا کے کہا "اب یہ غلطی نہیں ہو گی۔ میں انکل کہوں گی آپ کو۔ غالباً آپ کا بی پی بہت ہائی ہے۔ دوا کون سی لیتے ہیں آپ؟ ALDOMAT ؟ اور نمک کون سا استعمال کرتے ہیں؟ پوٹاشیم کلورائڈ۔ عام نمک تو نہیں...."

نقوی صاحب صوفے پر بیٹھ گئے۔ "میں بھول گیا تھا کہ تم ڈاکٹر ہو۔"

ڈاکٹر شیلی نے نقوی صاحب کی کمزوری دریافت کر لی تھی اور اچانک ان کی ہمدردی حاصل کرنے کا یہ نسخہ کامیاب رہا تھا۔ نقوی صاحب نے چند منٹ اس سے اپنے بلڈ پریشر' ڈاکٹروں کی نااہلی' دواؤں کی بے اثری اور اپنے پرائے سب کے غصہ دلانے والے رویّے کا گلہ کیا جن کی وجہ سے انہیں کم خوابی اور ڈیپریشن تک ہو جاتا ہے۔ انہوں نے اپنی بے احتیاطی' تفکرات مول لینے کی عادت' حصول زر کی ہوس اور اس کے لیے دن رات کی تگ و دو کا ذکر کرنے سے گریز کیا۔ ہم انتظار کرتے رہے کہ وہ ہماری موجودگی کا بھی نوٹس لیں۔

دس منٹ بعد انہوں نے قدرے مربیانہ لہجے میں کہا "بھئی میں تو اس وقت کچھ نہیں پیتا۔ تم لوگ کافی پی لو۔"

وہ پوچھنے کے عادی نہیں تھے۔ حکم دینے کے عادی تھے۔

"اب بتاؤ کیا قیامت آرہی تھی آدھی رات کو؟"

شیلی نے کہا "آپ ذرا پرسکون رہیں انکل۔ یہ بات کچھ ایسی ہے کہ آپ کو ڈسٹرب کر سکتی ہے۔ میں نے وضاحت تو کر دی تھی کہ مسئلہ میرا بھی ہے اور آپ کا بھی۔"

"او کے۔ او کے۔ اتنی تمہید کافی ہے" وہ جھنجلا کر بولے "آگے بولو۔"

"انکل! آپ کا پی اے ہے رفیق" شیلی نے کہا "اس کے بارے میں کچھ معلوم ہے آپ کو' وہ کہاں ہو گا؟"

"وہ.... ہو گا اپنے گھر میں۔ سو رہا ہو گا۔ ویسے تو لڑکا ٹھیک ہے لیکن اسے پولیس نے پکڑ لیا ہو کسی الزام میں تو مجھے صدمہ نہیں ہو گا۔ زمانہ ہی ایسا ہے...."

اب میں نے کہا "آپ کے پی اے کو بھلا پولیس کسی جھوٹے الزام میں پکڑ سکتی ہے۔ معاملہ اس سے کہیں زیادہ سیریس ہے۔"

اب وہ متفکر ہوئے "کیا قتل کر دیا ہے اس نے کسی کو؟ رقیب کے

ہاتھوں پکڑا گیا ہے؟ دشمن تو کوئی رقیب ہی ہو گا۔ اس عمر میں سب پاگل ہوتے ہیں۔ ایک ہی لڑکی کے لیے مرنے مارنے پر اتر آتے ہیں۔"

میں نے کہا "معاملہ اس کے برعکس ہے سر۔"

"کیا مطلب؟ صاف کیوں نہیں کہتے۔ میں یہ چکر والی بات بالکل پسند نہیں کرتا" نقوی صاحب بگڑ گئے۔

"اسے کسی نے قتل کر دیا ہے سر۔" میں نے کہا اور اپنے الفاظ کا ردِ عمل دیکھنے لگا۔

نقوی صاحب چونکے اور مجھے گھورنے لگے۔ آہستہ آہستہ میرے الفاظ کا مفہوم ان پر عیاں ہو تا گیا۔ ان کے ماتھے کی شکنوں کا جال گہرا ہو گیا "رفیق کو قتل کر دیا ہے۔ کس نے.... کیوں؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا "ان دونوں سوالوں کا جواب غالباً آپ کی پولیس بھی نہیں دے سکتی۔ نہ آج نہ کل۔ کچھ جواب ایسے ہی ہوتے ہیں جو گول کر دیے جاتے ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"کیا میں اس ملک کی سیاسی تاریخ کے قتل گنواؤں؟ رفیق کا قتل سیاسی تو خیر نہیں مگر اسی نوعیت کا ہے۔"

"یہ سب تم کیسے جانتے ہو؟" انہوں نے اچانک دہاڑ کے کہا۔

"آپ بیٹھ جائیں انکل۔ کون سی گولی کھاتے ہیں آپ...."

"گولی مارو گولی کو۔" نقوی صاحب نے گاؤن کی جیب میں سے ایک شیشی نکال کے ایک گولی منہ میں رکھ کے پانی کا ایک گھونٹ لیا۔ گلاس کو ٹرے میں رکھ کے وہ پھر بیٹھ گئے اور انہوں نے شیلی کو ہاتھ سے اشارہ کیا کہ کافی بنائے۔

چند منٹ کی خاموشی کے بعد نقوی صاحب نے ایک گہری سانس لی "کہاں ہے رفیق؟ میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"دیکھ لیجئے گا۔ جلدی کیا ہے۔" میں نے کہا۔

"میں اس کے قاتل کے سارے خاندان کو پھانسی کے تختے تک پہنچا دوں گا۔" انہوں نے شعلہ فشاں لہجے میں کہا۔

"بہت مشکل ہے سر۔ اگر میں آپ کو بتا دوں کہ اس قتل کے پیچھے کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے تب بھی۔ تفتیش تک آپ کے اختیار میں نہیں۔"

نقوی صاحب گرجے "تم جانتے ہو میں کون ہوں؟"

"میں تو یہ بھی جانتا ہوں کہ رفیق صرف آپ کا پی اے نہیں تھا۔ وہ آپ کا بھانجا تھا۔" میں نے ہمت کر کے توپ کے سامنے گولہ داغ دیا۔

ایک لمحے کے لیے مجھے یوں لگا جیسے ان کا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔ ان کا چہرہ کھنچ گیا اور آنکھوں کے نیچے کے عضلات پھڑکنے لگے۔ ان کی نظر مجھ پر ٹھہر گئی اور ان کے ہاتھوں نے صوفے کے کشن کو یوں جکڑ لیا جیسے وہ کسی کا گلا گھونٹ رہے ہوں۔

شیلی نے فوراً صورت حال کو سنبھالا "انکل! میں نے کہا تھا...."

نقوی صاحب کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی "یہ.... تم کیسے جانتے ہو؟"

میں نے کہا "مجھے ڈاکٹر شیلی یعنی شیلا خان نے بتایا ہے اور ان کو بتایا تھا شیخ صاحب نے۔"

"کون شیخ صاحب؟"

شیلی نے کہا "ان کا اصل نام کچھ اور ہے۔ آپ چاہتے ہیں میں ان کا نام لوں؟ ویسے آپ سمجھ گئے ہوں گے انکل کہ اس راز سے کون واقف تھا؟"

ان کا چہرہ آہستہ آہستہ سپاٹ ہو تا گیا۔ انہوں نے گاؤن کی جیب میں سے ایک اور گولی نکالی "پانی دو مجھے۔ اور دس منٹ کی مہلت تاکہ میں اس صورت حال کو سمجھنے کے قابل ہو جاؤں۔"

دس منٹ بعد وہ پھر پرسکون ہو گئے تو میں نے کہا "سہولت کی خاطر ہم اصل نام کی جگہ شیخ صاحب کا نام استعمال کریں گے۔ یہ شیخ صاحب آج بھی لندن میں ہیں اور....."

"دی بلیک میلر۔ دی باسٹرڈ...." نقوی صاحب زیرِ لب دانت پیس کر بولے "وہ کیا چاہتا ہے مجھ سے؟"

میں نے کہا "آپ جاننا چاہتے تھے کہ رفیق کے قتل کے پیچھے کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ فرض کیجئے میں کہوں کہ اسے مروانے والا چوہدری دلاور ہے تو کیا کریں گے آپ؟ تختۂ دار تک پہنچا دیں گے اسے؟"

"تمہارے کہنے پر؟" انہوں نے حقارت اور تلخی سے کہا۔

"میں نے نشاندہی کی ہے۔ آپ تفتیش کرانے کا اختیار رکھتے ہیں۔ آپ کو ثبوت بھی مل جائے گا۔ لیکن سر.... آپ کچھ نہیں کریں گے۔"

"ڈونٹ سے دیٹ اگین۔ " DONT SAY THAT AGAIN

میں نے اپنی بات جاری رکھی "آپ اس لیے کچھ نہیں کریں گے کہ ایک تو چوہدری دلاور معمولی آدمی نہیں' بڑا بزنس مین ہے۔ آپ کو یقیناً معلوم ہو گا کہ اس کے ذرائع آمدنی کیا رہے ہیں۔ آج کل وہ کیا کرتا ہے جو اسے نہیں کرنا چاہیے۔ مثلاً وہ اسمگلنگ کرتا ہے اور ایسے ہی دیگر غیر قانونی کاروبار۔ امورِ داخلہ کے ماتحت دس قسم کے محکمے ہیں۔ پولیس' ایف آئی اے' سی آئی اے' اسپیشل پولیس' انٹیلی جنس بیورو' کوسٹ گارڈ' بارڈر پولیس۔ ان سب سے آپ کو مکمل معلومات حاصل ہوتی ہیں۔"

"کم ٹو دی پوائنٹ۔ کیا کہنا چاہتے ہو تم؟"

میں نے کہا "دلاور بہت کچھ نہیں کرتا جو اسے کرنا چاہیے۔ مثلاً اسے پورا انکم ٹیکس دینا چاہیے۔ ملک کا پیسہ ملک میں رکھنا چاہیے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس ملک میں کوئی ایک چوہدری دلاور نہیں۔ سیکڑوں ہزاروں سے بھی زیادہ تعداد ہے ایسے لوگوں کی لیکن میں

چوہدری دلاور کا ذکر کر رہا ہوں۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ اس سے آپ کا یقیناً کوئی تعلق ہے۔ کاروباری یا..."

"بکواس بند کرو۔"

"میں سُنی سُنائی بات نہیں کہتا نقوی صاحب۔ میں چشم دید گواہ ہوں۔ میں نے اسی گھر میں چوہدری دلاور سے ملاقات کی تھی۔ کیوں موجود تھا وہ یہاں؟ اس کے پاس میرے تمام مقدمات کی فائلیں کیسے پہنچ گئی تھیں؟"

"یہ جھوٹ ہے" نقوی صاحب نے کمزور لہجے میں کہا۔

"لیکن آپ مانتے ہیں کہ میرا جھوٹ ہی سب سے بڑا سچ ہے۔ ورنہ یہ کیسے ممکن ہوا کہ چوہدری دلاور نے رفیق سے کہا کہ وہ فائلیں لاؤ اور آپ کے پی اے نے اسے تمام فائلیں پیش کر دیں۔ عدالتی ریکارڈ آپ کے گھر میں کیسے آیا؟ رفیق خود تو اتنے اختیارات نہیں رکھتا تھا اور نہ چوہدری دلاور۔ ہاں عدالتی عملے پر اور محکمۂ داخلہ کے حکام پر آپ کا حکم چلتا ہے۔ یہ فائلیں آپ نے منگوائی تھیں اور شاید اس وقت بھی آپ کے پاس ہوں گی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ فائلیں میرے دشمن کے ہاتھ میں دینے والا کون تھا؟ اور میرے جانی دشمن کی مدد کرنے کا مقصد کیا تھا؟ یہاں، اسی کمرے میں اس نے مجھے بلیک میل کیا۔ انہی فائلوں کی مدد سے مجھے دھمکی دی کہ میرے خلاف سارے کیس پھر کھول دیے جائیں گے لیکن میں اس کے سامنے ہتھیار ڈال دوں تو سب ختم۔ کیا وہ اتنا بہ اختیار ہے نقوی صاحب؟ کیسے دعویٰ کر رہا تھا وہ اتنا بڑا؟ یہ بات آپ کہہ سکتے تھے۔ آپ کے باس ہوم سیکریٹری کہہ سکتے تھے۔ آپ کا ماتحت کوئی ڈپٹی سیکریٹری، کوئی انسپکٹر جنرل پولیس کہہ سکتا تھا۔

چوہدری دلاور کیا چیز ہے آخر؟ آپ کہیں گے کچھ نہیں لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ کتنا بڑا شکاری ہے۔ آپ بھی ڈرتے ہیں اس سے۔ آج تک آپ کے اختیار اور اس کی دولت کے درمیان ایک توازن تھا جس کی بنیاد پر آپ نے اور اس نے ایک انجمن مفادِ باہمی بنا رکھی تھی۔ ایسی کوئی نہ کوئی انجمن ہر جگہ ہے۔ ہر بیوروکریٹ، بدعنوان سیاست داں، نام نہاد قانون کے محافظ، پبلک سرونٹ، بزنس مین، صنعت کار، ٹھیکے دار۔ ہر سطح پر ایسے لوگ ہیں جو اپنے مفاد کے سودے کرتے ہیں۔ میں زیادہ تفصیل میں نہیں جا سکتا۔ آپ سے بھی چوہدری دلاور نے کوئی سودا کیا ہوگا؟"

"تم غلط سمجھ رہے ہو۔ میں تمہارے مقدمات کی فائلوں پر نظرِ ثانی کر رہا تھا۔ میں تمہیں شک کا فائدہ پہنچا کے تمہاری مشکلات آسان کرنا چاہتا تھا۔"

"آخر کیوں؟"

"صرف اپنی پاگل بیٹی کی وجہ سے جس نے ایک کنگال وکیل سے شادی کی۔ میری مرضی کے خلاف" نقوی صاحب نے شکست خوردہ لہجے میں کہا "سب ماؤں کو بلیک میل کرتے ہیں ان کے بیٹے۔ پیدائش کے وقت سے مرتے دم تک۔ اور میرے جیسے باپ بھی بلیک میل ہوتے ہیں تو صرف بیٹی سے....."

"میں قدر کرتا ہوں آپ کے اعتراف کی لیکن معاملے کا دوسرا پہلو بھی ہے میری نظر میں۔" میں نے کہا "آپ نے اپنی مجبوری کو بھی کیش کرا لیا۔"

"کیا ثبوت ہے تمہارے پاس؟"

"ثبوت! کیا اس حقیقت کو ثبوت کی ضرورت ہوتی ہے جو سب پر عیاں ہو جائے۔ مثلاً شیخ صاحب کی گواہی کے بعد کسی کو ثبوت کی ضرورت نہیں ہوگی کہ رفیق آپ کا بھانجا تھا اور آپ کی خاندانی تاریخ کا ایک سیاہ باب سب کے سامنے آجائے گا۔"

"تم... مجھے بلیک میل کرنے آئے ہو؟" نقوی صاحب چلّانے لگے۔

"آہستہ نقوی صاحب! آہستہ۔ ابھی صرف ہم سُن رہے ہیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ باہر کا کوئی بھی آدمی کچھ سُنے" میں نے کہا "جسے آپ بلیک میلنگ کہہ رہے ہیں، وہ میرے نزدیک سودا ہے۔ سودا آپ نے بھی کیا تھا چوہدری دلاور سے۔ اگر میرا مفروضہ غلط ہو تو تردید کر دیں۔ آپ نے اسے بُلا کے کہا کہ دیکھو، میں مجبور ہوں۔ مجھے سکندر کے خلاف کیس کمزور بنانے ہیں یا ختم کرنے ہیں۔ اس کام کو تھوڑا سا مؤخر کیا جا سکتا ہے مگر ٹالا نہیں جا سکتا۔ درمیانی مُدت میں تم کوئی فائدہ اٹھانا چاہو تو سکندر سے بات کر لو۔ دیکھو شاید وہ مان جائے تمہاری بات۔ اور دونوں کا مسئلہ حل ہو جائے۔ ممکن ہے چوہدری دلاور نے کہا ہو کہ نقوی صاحب، فائلیں میرے گھر پہنچا دو پھر میں بلاتا ہوں اسے۔ لیکن اتنا بڑا خطرہ آپ نہیں مول لے سکتے تھے۔ آپ نے کہا کہ فائلیں میرے پاس ہیں۔ کسی دن میری عدم موجودگی میں آجاؤ، رفیق سے فائلیں منگوالو اور میرے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کے بات کر لو۔ یہ رعایت کیوں دی آپ نے چوہدری دلاور کو؟ کیوں بتایا اسے کہ آپ میرے خلاف کیس ختم کر رہے ہیں؟ ظاہر ہے ہر بات کی کوئی وجہ ہوتی ہے۔ اور گستاخی معاف، آپ جیسے یا دلاور جیسے لوگ بلا معاوضہ نیکی بھی نہیں کرتے۔ چلئے میرے معاملے میں آپ مجبور تھے۔ چوہدری دلاور کے ساتھ مجبوری کا کوئی سلسلہ نہیں تھا۔ اس سے تو آپ نے قیمت وصول کی ہوگی اس احسان کی۔"

"خدا گواہ ہے، میں نے اس سے ایک پیسہ نہیں لیا تھا اس معاملے میں۔" نقوی صاحب نے کہا۔

"یعنی اور بھی معاملات تھے اس کے ساتھ۔ خیر.... یہ میرا دردِ سر نہیں ہے.... اگر آج آپ نے اس سے نقد قیمت نہیں لی تو اس کی ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ آپ آنے والے وقت کے لیے پیش بندی کر رہے ہیں۔ کل تک دلاور ایک اسمگلر تھا، بدمعاش تھا یا غدار تھا۔ لیکن اب وقت پر اس کی دولت کی گرفت ہے اور اسے یقیناً آپ جیسے بیوروکریٹس کی تائید و حمایت حاصل ہے۔ چور تو چاہے گا کہ دوسرا چور بھائی ہی کوتوال بنے تو اپنے وارے نیارے ہوں۔ آپ کی ریٹائرمنٹ کے دن قریب ہیں۔ آپ غروب ہونے والا سورج ہیں۔ وہ چڑھتا سورج ہے جس کے سب پجاری ہوں گے۔ آپ ان پجاریوں کی صف میں پہلے سے شامل ہو گئے ہیں تاکہ وقت بدلے تو وقت کی نظر نہ بدلے۔ حاکم کل بھی مہربان تھا، حاکم کل بھی مہربان رہے۔ اب آپ پر ساری بات واضح ہو چکی ہوگی کہ میرا الزام بے سبب نہیں تھا۔ رفیق کو قتل کروانے والا چوہدری دلاور ہے مگر نہ اس کے خلاف ثبوت ہے نہ گواہ۔ نہ آپ اس کے خلاف تفتیش کرا سکتے ہیں اور نہ جرم ثابت ہونے پر اسے سزا ہو سکتی ہے۔"

"تمہیں کیوں یقین ہے کہ چوہدری دلاور ہی رفیق کا قاتل ہوگا؟ وہ تمہارا دشمن تھا، رفیق کا دشمن کیسے ہو گیا؟"

میں نے کہا "یہ بہت لمبی بات ہے اور بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کا نہ جاننا ہی آپ کے حق میں بہتر ہے۔ ان کا تعلق چوہدری دلاور سے ہے۔ اگر اسے معلوم ہو گیا کہ آپ اس کے بارے میں وہ سب جانتے ہیں جو ہم جانتے ہیں تو وہ آپ کا نام بھی ہمارے نام کے ساتھ دشمنوں میں لکھ لے گا۔ ہم ہرگز یہ نہیں چاہتے کہ ہماری وجہ سے آپ کی شہرت اور نیک نامی کو، جان و مال کو یا مستقبل کو کسی قسم کا خطرہ لاحق ہو۔ ہم تو آپ کو اپنا غائبانہ محافظ سمجھتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ آپ بھی محفوظ رہیں۔"

نقوی صاحب کمر کے پیچھے ہاتھ باندھے کمرے میں ٹہلتے رہے۔ ان کی صورت سے ظاہر تھا کہ وہ صورت حال کو سمجھتے ہوئے کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں اور اپنی پوزیشن کا مثبت اور منفی پہلو سے جائزہ لے رہے ہیں۔ دو گھنٹے بعد صبح ہونے والی تھی لیکن ہمارے لیے یہ مہلت کافی تھی۔ میں نقوی صاحب پر دباؤ ڈال چکا تھا لیکن عجلت میں ان سے بھی حماقت سرزد ہو سکتی تھی۔ میں نے کافی کا تیسرا کپ ختم کیا۔ شیلی نے حیرت انگیز طور پر خاموشی اختیار کیے رکھی اور ایک فیشن میگزین کی ورق گردانی کرتی رہی۔ غالب صوفے کی پشت سے سر لگائے چھت کو دیکھتا رہا۔

بالآخر نقوی صاحب نے کہا "واٹ ڈو یو وانٹ فرام می؟ (مجھ سے تم کیا چاہتے ہو؟)"

میں نے کہا "پہلی بات تو یہ کہ جو کارِ خیر آپ کر رہے ہیں، یعنی میرے خلاف مقدمات واپس لینے کا۔ وہ جاری رکھیں۔"

"اس میں وقت لگے گا۔"

"مجھے کوئی جلدی نہیں۔ ایک ایک کر کے تمام مقدمات کو واپس لیں یا کوئی ایسی ترکیب کریں کہ شک کا یقینی فائدہ مجھے حاصل ہو۔ میری ضمانت ہو جائے اور بالآخر باعزت رہائی۔"

"اس وقت تم کون سی قید میں ہو؟"

"ابھی میں ایک مفرور مجرم ہوں۔ میری پوزیشن اس حد تک بہتر ہو جائے کہ میں خود کو عدالت میں پیش کر کے ضمانت حاصل کر سکوں۔ تو یہ رہائی ہی ہوگی۔ تفکرات سے اور اندیشوں سے" میں نے کہا۔

"یہ کام چھ مہینے یا سال میں ہوگا۔"

"ہونے دیں۔" میں نے کہا "لیکن اس عرصے میں میرے خلاف نئے مقدمات کھڑے نہ ہوں۔"

"اس کی ضمانت میں کیسے دے سکتا ہوں۔ کل کو تم قتل کر دو...."

"میں قتل کروں گا تو دو صورتیں ہیں.... یا تو میں رنگے ہاتھوں پکڑا جاؤں گا اور جائے واردات پر چشم دید گواہ بہت ہوں گے۔ حالات اور واقعات کی شہادت میرے خلاف ہوگی اور ثبوت واضح ہوں گے۔ اگر میں پکڑا نہ گیا تو میں خود فون کر کے یا پیغام بھیج کے بتا دوں گا کہ قتل میں نے کیا تھا تو کیوں۔ اور نہیں کیا ہوگا تو بتا دوں گا کہ مجھے بلاوجہ ملوث کیا جا رہا ہے اور ملوث کون کر رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ مجھ پر جھوٹے مقدمات نہ بنائے جائیں۔"

انہوں نے سر ہلایا اور گویا منظوری دی کہ چلو ایسا ہی ہوگا۔ "آگے بولو۔"

میں نے کہا "آپ کو خدا ہوم سیکریٹری بنائے۔ جب میری ضمانت کی درخواست پیش کی جائے تو سرکاری وکیل اس کی مخالفت نہ کرے۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں چاہتا۔ میں اپنی حفاظت خود کر سکتا ہوں اور اپنے دشمنوں سے بھی نمٹ سکتا ہوں۔"

"تمہیں بھی میرا مشورہ ہے کہ جینا سیکھو۔ مر کے، مار کے نہیں۔ جیو اور جینے دو کے اصول پر۔ دشمن مت بڑھاؤ۔ بی ڈپلومیٹک BE DIPLOMATIC۔ میرے اختیارات کی حدود بھی سیاسی ہیں۔ اگر اوپر سے دباؤ ہوگا تو وہ نیچے منتقل ہوگا۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ کچھ عرصے کے لیے تم روپوش ہو جاؤ؟"

ایک دم شیلی نے رسالہ رکھ دیا "یار، میں بھی ان سے یہی کہہ رہی ہوں۔"

"اسٹاپ دس یار لڑکی!" نقوی صاحب برہمی سے بولے۔

"سوری... ویری سوری سر" شیلی بوکھلا گئی "میرا مطلب تھا انکل کہ یہ میرے ساتھ لندن چلے جائیں مگر مسئلہ یہ ہے کہ ان کو وہاں سے ڈی پورٹ کیا گیا تھا۔ یعنی بے آبرو کر کے رخصت کیا گیا تھا۔ اگر نیا پاسپورٹ مل جائے..... تو...."

شیلی کے نامکمل جملے کو غالب نے پورا کیا "تمہارا مطلب ہے، نئے نام سے نا؟ یہ تو بہت چھوٹے چھوٹے مسائل ہیں انکل کے لیے۔"

"بلکہ کوئی مسئلہ ہی نہیں ہیں۔ عام آدمی دو چار پاسپورٹ رکھتا ہے اپنے پاس" میں نے کہا۔

نقوی صاحب کی خاموشی کو میں نے ان کی رضامندی پر محمول کیا۔ "اب رہ گئی بات بے چارے رفیق کی.... تو جیسے ماموں چاہیں۔"

"چاہیں! کیا مطلب؟" نقوی صاحب چونکے۔

"مطلب یہ کہ اس کی تدفین پوسٹ مارٹم کے بغیر کرائیں یا پوسٹ مارٹم رپورٹ لیں۔ کیس پولیس کو دیں یا نہ دیں" میں نے کہا "تفتیش..."

"تم نے یہ نہیں بتایا ابھی تک کہ اس کا قتل کہاں ہوا اور کیسے؟"

میں نے کہا "یہ تو ہمیں بھی نہیں معلوم۔"

"کیا تم نے اسے قتل ہوتے دیکھا تھا؟"

میں نے شیلی کی طرف دیکھ کر سرہلایا "نہیں۔ قتل ہوتا دیکھتے تو قاتل کو بھی دیکھتے۔ لیکن اس کا انتقال ہمارے سامنے ہوا۔ اس وقت ہم کچھ بھی نہیں کرسکتے تھے۔ بس وہ چند منٹ میں مرگیا۔ کچھ بتائے بغیر۔"

"لیکن مرتے مرتے وہ اپنے خون سے آپ کا نام لکھ گیا تھا" شیلی نے کہا۔

"میرا نام۔ واٹ نان سنس.... کہاں لکھا تھا؟" نقوی صاحب اب کچھ نروس ہونے لگے تھے۔

"گاڑی کی ڈکی کے اندر" میں نے کہا "نام کیا.... ایک اشارہ تھا۔ زیڈ۔ یو... این۔"

"اس وقت کہاں ہے رفیق کی لاش؟" نقوی صاحب نے مجھے گھورا۔

"اسی گاڑی میں" میں نے عمداً ایک ہی مرتبہ میں پوری بات بتانے سے گریز کیا "کرائے کی مرسیڈیز تھی جو اس وقت باہر کھڑی ہے۔"

"آپ کی پورچ میں" غالب نے کہا۔

نقوی صاحب بے اختیار اٹھے "واٹ؟ یو ایڈیٹس! تم.... اتنی دیر سے یہاں بیٹھے بکواس کررہے ہو۔ جیسے اس بات کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ او مائی گاڈ۔ ایک لاش میرے گھر کے اندر گاڑی کی ڈکی میں۔ میرا ہارٹ فیل ہوجائے گا۔ مجھے بتاؤ تم سیریس ہو؟ یو جوکرز۔"

میں نے کہا "اس قسم کا بے ہودہ مذاق ہم نہیں کرتے۔"

غالب نے کہا "ہم نے تو آتے ہی رفیق کی بات کی تھی۔ آپ نے کب پوچھا کہ اس کی لاش کہاں ہے' قتل کب ہوا' کیسے ہوا۔"

"آپ تو بس قاتل کا نام پوچھتے رہے تھے جو ہمیں بھی معلوم نہیں تھا" میں نے کہا۔

"شٹ اپ۔ شٹ اپ" نقوی صاحب چلّانے لگے "تم سب بدمعاشوں کا ایک ٹولہ ہو۔ بلیک میلرز۔ قاتل اور ڈاکو۔ میں تم سب کو اندر کرادوں گا۔ رفیق کو تم نے ہی مارا ہوگا... لاش بھی تم لائے ہو۔"

ان کی یہ کیفیت بڑی جنونی تھی۔ وہ بری طرح کانپ رہے تھے اور اس اندیشے کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا تھا کہ اچانک وہ فلمی اسٹائل میں سینے پر ہاتھ رکھیں' نیچے جھک کر کلمہ پڑھیں اور اللہ کو پیارے ہوجائیں۔ شیلی نے فوراً اپنی خدمات پیش کرتے ہوئے انہیں تسلی دی۔

"انکل! پلیز' آپ بیٹھئے۔ لیجئے پانی" اس نے نقوی صاحب کو بٹھا کے گلاس ان کے لبوں سے لگادیا۔

نقوی صاحب نے تیسری گولی حلق سے اتاری۔ وہ لمبے لمبے سانس لے رہے تھے اور انہیں پسینہ آگیا تھا مگر شیلی کے اطمینان سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ کیفیت تشویشناک نہیں ہے۔ وہ بڑے غور سے ان کا جائزہ لے رہی تھی۔ مجھے حیرت تھی کہ ابھی تک اندر سے ان کی آواز پر کوئی اٹھ کے نہیں آیا تھا۔ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ ان کی ایک معذور بیوی تھی جو بیڈ سے اٹھ بھی نہیں سکتی تھی اور اکلوتی بیٹی ان کی مرضی کے خلاف شادی کرکے گھر سے نکل گئی تھی۔ ان کا بیٹا کوئی نہیں تھا چنانچہ انہوں نے سوچا ہوگا کہ اپنی دولت' مرتبے اور اثرورسوخ سے کوئی اچھا سا' فرمانبردار گھر داماد خرید لیں گے جو عمر کے آخری حصے میں ان کی خدمت کرے گا لیکن اس خواب کی تعبیر انہیں نہ مل سکی۔ اب صرف نوکر تھے جو معاوضہ لے کر خدمت کرتے تھے۔ آدھی رات کے بعد نقوی صاحب کی آواز سن کے دوڑنا ان کے فرائض میں شامل نہ تھا۔

"مجھے..... مجھے بتاؤ... دو منٹ میں" نقوی صاحب نے نقاہت سے کہا "مجھے کچھ کرنا ہے.... ایسا نہ ہو میں مرجاؤں.... یا تمہیں گولی ماردوں۔"

میں نے کہا "نقوی صاحب! ابھی آپ کو ہوم سیکریٹری بنا ہے۔ آپ نے تو بہت بڑے بڑے چیلنج پہلے بھی قبول کئے ہوں گے اور آج بھی اصل اختیارات کس کے پاس ہیں۔ یہی دو چار لوگ۔ چیف سیکریٹری' ہوم سیکریٹری' یا فنانس سیکریٹری۔ وزیر سب چار دن کے آتے جاتے رہتے ہیں۔"

شیلی نے کہا "انکل' یہ گاڑی میں نے منگوائی تھی۔ رفیق کی معرفت۔ وہ نہ جانے کہاں سے روز یہ کار بھجوادیتا تھا۔ ادائیگی بھی وہی کرتا تھا۔ آج جب گاڑی آئی تو ڈرائیور نے چابی اندر بھجوادی۔ یہ ذرا خلافِ معمول تھا۔ ہر روز ڈرائیور خود حاضر ہوکے سلام کرتا تھا۔ میں ٹھہری ہوئی ہوں...."

"ایمبیسڈر ہوٹل میں" میں نے اس کی بات کے بیچ میں کہا۔

"وہ مجھے معلوم ہے یار۔" شیلی نے مجھے ٹوکنے پر ٹوکا۔

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ نقوی صاحب جیسے کائیاں شخص کو شک نہیں ہوا۔ شیلی نے بڑی خوبی سے بات بنائی تھی۔

"لیکن اب.... ان حالات میں میرا وہاں قیام مناسب نہیں انکل۔"

"بالکل۔ تم کو صبح ہونے سے پہلے چیک آؤٹ کرجانا چاہیے۔" میں نے تائید کی "ہم تمہیں کسی محفوظ مقام پر شفٹ کردیں گے۔"

"میری طرف سے تم جہنم میں جاؤ۔ تم سب" نقوی صاحب نے انگلش میں کہا "وہ جگہ سب سے محفوظ ہے تمہارے لیے۔ اور دنیا کے لیے بھی جو تمہاری ان مجرمانہ قسم کی سرگرمیوں سے محفوظ ہوجائے گی۔"

"مجرمانہ قسم کی۔ تھینک یو سر کہ آپ نے مجرمانہ نہیں کہا۔"

اندر کہیں کال بیل بجنے لگی۔ "یہ کون بدتمیز ہے؟" انہوں نے دیوار پر نصب انٹر کام اٹھا کے دو نمبر بٹن دبایا "یہ کیا ہے چوکیدار؟ کیوں ڈسٹرب کررہے ہو؟ بے وقوف' تمہیں اندر آکے بات کرنی چاہیے۔ چوکیدار! بولتے کیوں نہیں۔ کیا...؟ پولیس۔ تم اندر آچکے ہو۔ کیسے؟ کسی نے روکا نہیں تمہیں۔ اور تمہاری ہمت کیسے ہوئی؟ کون ہو تم آخر؟ ایس ایچ او۔ علاقہ ایس ایچ او۔ کیا بات ہے؟ خیر جو بھی بات ہے' پہلے تو تم باہر جاؤ۔ گیٹ سے باہر۔ ورنہ میں بلا اجازت اندر داخل ہونے پر تمہیں برخواست کرادوں گا۔ ہاں ہاں سن لیا ہے میں نے۔ میرے دروازے سے دور کھڑے رہو۔ خبردار جو گاڑی بھی سامنے نظر آئی مجھے۔ میں ابھی آتا ہوں تھوڑی دیر میں۔ شٹ اپ۔ آسمان نہیں گرے گا چند منٹ میں۔ بیڈروم سے میں نائٹ سوٹ میں باہر نہیں آسکتا۔ یو فول۔"

انہوں نے غصے سے زیادہ پریشانی کی کیفیت میں انٹر کام رکھا "دِس از دی اینڈ آف ایوری تھنگ THIS IS THE END OF EVERY THING - ہو گیا سارا معاملہ چوپٹ) وہ آگئے ہیں علاقہ ایس ایچ او صاحب اور انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ میرے گھر کے اندر ایک گاڑی موجود ہے اور اس میں ایک لاش ہے۔ بتاؤ مجھے' میں کیا کروں؟ میں پاگل ہوجاؤں گا۔ بائی گاڈ! میں کسی کو شوٹ کردوں گا۔ تمہیں یا اپنے آپ کو۔"

ڈاکٹر شیلی نے پھر مسیحائی کے فرائض پورے کئے "سر! آپ کو اس CRISIS سے نمٹنا ہے۔ ٹھنڈے دل اور دماغ کے ساتھ۔"

میں نے کہا "ایک معمولی ایس ایچ او سے آپ کو ڈرنے کی کیا ضرورت ہے... بلکہ.... میرا تو خیال ہے کہ یہ فرشتۂ غیب ہے۔"

"ایس ایچ او... فرشتہ.... مائی فٹ۔ شیطان کہتے تو میں مان لیتا جو ایسے ہی نازل ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "سر! آپ سب کچھ اس کے سپرد کردیں۔ اپنا وردِ سرمت بنائیں کسی بات کو۔ ایس ایچ او جیسے لوگ اس قسم کے معاملات سے نمٹنا جانتے ہیں۔"

"کیا تمہارا مطلب ہے.... میں... زیڈ یو نقوی۔ ایڈیشنل ہوم سیکریٹری۔ ایک معمولی ایس ایچ او کے سامنے مجرم بن کے اس سے کہوں کہ میں مشکل میں پھنس گیا ہوں۔ مجھے بچالے..." نقوی صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔

"آپ چاہیں تو ایس ایس پی یا ڈی آئی جی سے بات کرلیں مگر میرا مشورہ ہے کہ بات کو اتنا اوپر لے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ چھوٹے افسر ہی اصل کام کرتے ہیں اور ڈی آئی جی بھی بالآخر اسی سے کہے گا۔ یا وہ ایس ایس پی سے کہے۔ وہ ایس پی ہے تھرو پروپر چینل THROUGH PROPER CHANNEL بات ہوگی تو بلاوجہ کئی لوگ ملوث ہوں گے اور آپ کو ایک نہیں' چار چھ منہ بند کرنے پڑیں گے۔ یہ چھوٹا سا منہ ہے' اس کے لیے یہ بڑی بات ہے کہ ایڈیشنل ہوم سیکریٹری خود اس سے کوئی کام کہے۔ اشارے میں انعام کی بات کریں۔ وہ خوشی خوشی دم ہلاتا جائے گا اور سر کے بل واپس آکے کہے گا کہ سر' آپ فکر ہی نہ کریں۔ سب ٹھیک کرالیا ہے میں نے۔"

"انعام! میں اس سے انعام کا وعدہ کروں.... ناممکن۔"

"نقوی صاحب! ان کے لیے انعام کیا ہوتا ہے۔ بس ایک پروموشن۔ کندھے پر ایک پھول ہے تو دو کرادیں۔ دو ہیں تو تین۔ یا اس کی مرضی کے تھانے میں پوسٹنگ کرادیں۔ اور اس میں آپ کا کیا جاتا ہے۔ کل پرسوں' دو چار دن یا ہفتے بھر بعد ایس ایس پی کے آرڈر سے انعام اسے مل جائے گا تو ساری عمر اس کی زبان آپ کی غلامی کا اقرار کرتی رہے گی۔ آپ کے خلاف تو بھونکنے کی ہمت وہ کر نہیں سکتا۔ اشارے میں بھی آپ یہ واضح کرسکتے ہیں کہ اس نے اچھی کارکردگی کا مظاہرہ نہ کیا تو.... اور بس۔"

"آئی تھنک' یہی ٹھیک ہے۔ مگر میں اس سے کیا کہوں؟ میری عقل تو بالکل کام نہیں کررہی ہے۔"

"آپ کہیں کہ مجھے کیا معلوم یہ گاڑی کون چھوڑ گیا ہے۔ تم نے ہی جگا کے یہ انکشاف کیا ہے ابھی ابھی۔"

غالب نے کہا "وہ... چوکیدار کی کیا بات تھی؟"

"وہ غائب ہے۔ گیا ہوگا نماز پڑھنے۔" انہوں نے چوکیدار کو ایک گالی سے نوازا "میں اسے برطرف کردوں گا۔ ایسے وقت میں چور ڈاکو اندر آجائیں جب وہ خدا کے سامنے سرجھکائے پڑا ہوا۔ تو بس ہوچکا کام۔ کوئی میرا کام تمام کرجائے گا۔ میں صاف کہہ دوں گا آج کہ یا نوکری کرلو یا نمازیں پڑھ لو گھر بیٹھ کے۔ پیسہ کمالو یا ثواب۔ یہ حرام خوری ہے صاف...."

مجھے نقوی صاحب کی فرعونیت پر افسوس ہوا مگر اس سوچ کا کوئی علاج نہیں تھا۔ یہ ان فرنگی آقاؤں کی ذہنیت کا عکس تھی جو ہندوستان کے مسلمانوں کی مذہب پرستی' عقائد اور دینی شعائر کے دشمن تھے اور جاتے جاتے وقت یہ نمرود کی خدائی کا انداز اپنے تربیت کردہ آئی سی ایس افسران کو سکھا گئے تھے۔ اس کے بعد سے یہی نظریاتی تضاد ان حکمرانوں کے طبقے کی سوچ میں رچ بس گیا تھا جو مجبوراً زبان سے خود کو پبلک سرونٹ کہتے تھے مگر عملاً پبلک سے اسی طرح پیش آتے تھے جیسے آج بھی مملکتِ خداداد پاکستان میں دورِ غلامی ہے اور اسلامی مساوات فقط سیاسی بیانوں اور تقریروں کی اصطلاح رہ گئی تھی۔ اُلٹا یہ احساس عوام کے ذہنوں میں بیدار ہونے لگا تھا کہ فرنگی سامراج کے دور میں حاکم و محکوم میں اتنے فاصلے حائل نہیں تھے اور وہ غلامی آج کی جمہوریت سے زیادہ جمہوری تھی۔

نقوی صاحب کے باہر جاتے ہی غالب نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا "یہ کس کی حرکت ہو سکتی ہے؟"

میں نے معصومیت سے کہا "معاف کرنا یار۔ میں نے غلطی سے پولیس کو فون کر کے سب بتا دیا تھا۔ بے وقوف شخص! اس سوال کی ضرورت نہیں تھی۔"

شیلی کا رنگ فق ہونے لگا تھا "تم لوگ سیریس نہیں ہو؟"

غالب نے کہا "میں تو سیریس تھا بلکہ ہوں۔"

"میں کون سا دانت نکال رہا ہوں" میں نے اٹھ کے ایک پردہ ہٹاتے ہوئے باہر جھانکا۔

غالب میرے دائیں جانب آگیا اور شیلی نے جگہ نہ پا کے صوفے کے اوپر چڑھتے ہوئے میرے کندھے پر کہنی ٹکا دی۔ میں نے شانے پر نوکیلی ہڈی کا دباؤ مجبوراً برداشت کیا۔ باہر عجیب منظر تھا۔ کھلے گیٹ کے سامنے نقوی صاحب گاؤن کی جیب میں ہاتھ ڈالے کھڑے تھے اور کسی مجسٹریٹ ٹائپ شخص سے بحث کر رہے تھے۔ ایس ایچ او وردی میں پیچھے مظلوم و مسکین شکل بنائے کھڑا ہوا تھا۔ نقوی صاحب کے سامنے کھڑے ہوئے شخص کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا۔

"غالب! یار میں نے اچانک اپنی چھٹی حس کی آواز سن لی ہے۔ یہ وارنٹ ہیں خانہ تلاشی کے۔"

غالب نے سرہلایا "ٹھیک فرماتے ہو تم۔ ایسے کون جرأت کر سکتا تھا ایڈیشنل ہوم سیکریٹری کے گھر پر چھاپا مارنے کی۔"

"پکا کام کیا جس نے بھی کیا۔"

میں نے کہا "شکاری بڑے گھاگ اور تجربہ کار ہیں۔ کوئی یقیناً پیچھے لگا ہوا تھا۔"

"یار' یہاں سے بھاگنے کی کرو ورنہ پکڑے ہم ہی جائیں گے۔ نقوی صاحب کا کچھ بھروسہ نہیں۔"

"مگر کیسے یار....." شیلی نے گھبرا کے کہا "وہ جانے دیں گے؟"

میں نے کہا "تم ذرا مسکرا کے کہنا۔ ایکس کیوز می۔ ذرا سامنے سے ہٹ جایئے۔ مجھے باہر جانا ہے۔ اُف' پیچھے ہٹو شیلی' میرے ناتواں کندھے اس سے زیادہ بارِ نزاکت نہیں اٹھا سکتے۔"

غالب نے کہا "سکندر! بس اب وہی پرانی چالیں۔ تخت یا تختہ۔ پیچھے سے نکلنے کا راستہ بناتے ہیں۔"

سوچے سمجھے بغیر میں نے شیلی کا ہاتھ پکڑا "چلو۔"

شیلی کو سوال کرنے کا موقع دیے بغیر میں ایک دروازے سے اندر گھس گیا۔ غالب مجھ سے آگے تھا۔ یہ کھانے کا کمرا تھا۔ اس سے اگلے ایک دروازے سے جھانک کے وہ دوسری طرف گیا پھر اس نے مجھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ ہم اچانک کچن میں پہنچ گئے۔ وہاں فرش پر دو افراد لمبی تانے سو رہے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ایک سونے کی اداکاری میں مصروف تھا تاکہ اسے کسی کام کے لیے پکارا جائے تو وہ نظر انداز کر دے۔ اب وہ ہڑبڑا کے اٹھا۔ اس نے انڈرویئر' بنیان میں اپنے سوکھے' کالے جسم کی نمائش کرتے ہوئے زور سے کہا "کون ہے... کون ہے؟"

میں نے اسے جواب دینا مناسب نہ سمجھا اور ایک ہاتھ مار کے پھر لٹا دیا مگر وہ دوسرے پر گرا جو اس کی آواز پر بیدار پہلے ہی ہو چکا تھا۔ دوسرا کچھ فربہ بدن تھا اور اس صحت کا راز وہ دودھ' مکھن' انڈے' گوشت ہو سکتے تھے جو عموماً خانساماں قسم کے ملازم فراخ دلی سے چُرا کے کھاتے ہیں۔ اس نے ہکلا کے یہ کہنے کی ناکام کوشش کی کہ اس کی جاں بخشی کی جائے مگر میں یہ رعایت دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ میرا ہاتھ پڑنے سے قبل ہی وہ لیٹنے کے لیے تیار تھا۔

ہم کچن کے دوسرے گیٹ سے باہر نکلے تو آٹھ دس فٹ کا کورٹ یارڈ سامنے تھا اور پھر ایک دیوار۔ یہ ساتھ والے بنگلے کے گیراج یا سرونٹ کوارٹر کی دیوار لگتی تھی۔ میں نے شیلی کو دائیں طرف گھسیٹا۔ اونچی ہیل والی سینڈل میں وہ کئی بار گرتے گرتے بچی۔ متعدد بار اس نے ہائے اور اوئی قسم کی آوازوں کے بعد اعلان بھی کیا کہ "میں مری۔" مگر میں متاثر نہیں ہوا۔

ساتھ والے بنگلے کو جُدا کرنے والی دیوار چھ سات فٹ اونچی تھی مگر اس پر نوکیلے شیشے جُڑے ہوئے تھے۔ خالی ہاتھوں سے اس پر چڑھنے کا انجام یہ ہوتا کہ ڈاکٹر شیلی کی نیورولوجی میرے کام نہ آتی۔ مجھے کسی جراح کے زیرِ علاج رہنا پڑتا۔ تاہم اس وقت میرا ذہن پوری طرح فعال تھا اور اپنی نارمل سے زیادہ کارکردگی کا مظاہرہ کر رہا تھا جو حالات کے پیشِ نظر فطری بات تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ دیر کی صورت میں شاید ہم نقوی صاحب کے گھر میں ہی گرفتار کر لیے جائیں اور فرار ہوتے ہوئے پکڑا جانا ہمارے خلاف جرم کی ایک دلیل بن جائے۔ سرچ وارنٹ کی موجودگی میں نقوی صاحب قانون کا راستہ نہیں روک سکتے تھے۔ ان کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ انسپکٹر جنرل پولیس یا کسی اور سے رجوع کر سکتے.... وہ تو بے خبری میں اچانک مجسٹریٹ آگیا تھا ورنہ نقوی صاحب کے کانوں میں بھنک بھی پڑ جاتی تو وہ پہلے سے بندوبست کر لیتے۔ صبح وہ مجسٹریٹ اور ایس ایچ او دونوں کو معطل کرا دیں یا ٹرانسفر مگر اس وقت وہ مجبور تھے اور ان سے کچھ بعید نہ تھا کہ اپنی پوزیشن کو بچانے کے لیے وہ ہماری حمایت سے ہاتھ کھینچ لیں اور مزاحمت کر کے عزت کو داؤ پر لگانے سے بہتر سمجھیں کہ ہمیں پولیس کے حوالے کر دیں۔

میں نے غالب کو آواز دی "ادھر مرغا بن جاؤ۔"

میری بات سمجھتے ہوئے اس نے فوراً رکوع میں جا کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ لیے "بس اتنا خیال رکھنا کہ جب اوپر پہنچ جاؤ تو ہمیں بھی کھینچ لینا۔"

"بھیا! دنیا میں بڑی نفسا نفسی ہے۔ اوپر جا کے دیکھیں گے..."

میں نے اس کی کمر پر چڑھ کے اوپر دیکھا۔

"اُف۔ آج مرزا غالب کی روح کو کتنی تکلیف ہو رہی ہوگی۔ غالب پر ایک گدھا جوتوں سمیت چڑھ گیا ہے۔ اُف.... یار' اب مجھے سیدھا کون کرے گا۔ میں تو مستقل جھک گیا۔"

میں اوپر دیوار کی طرف ہاتھ بڑھا کے اچھلا تھا اور چھت کے کنارے کو پکڑ لیا تھا۔ جھٹکا غالب کی کمر میں آیا تھا لیکن میری پہلی کوشش ناکام رہتی تو میں اس کی کمر پر گرتا۔ پھر ہم دونوں گرتے مگر میرے ہاتھ سرونٹ کوارٹر کی چھت کے کنارے پر جم گئے تھے۔ میں نے خود کو اوپر کھینچا اور چھت پر پہنچ گیا۔ اوپر سے میں نے گیٹ کی طرف دیکھا تو مجھے اندازہ ہوا کہ نقوی صاحب تلاشی کے لیے آنے والوں کو روکنے میں ناکام رہے تھے۔ پولیس کی گاڑی وہیں موجود تھی۔ ایک کانسٹیبل بڑے جارحانہ انداز میں بندوق تھامے گیٹ پر کھڑا تھا۔ جیسے شاہِ جنات بھی نکلنے کی کوشش کریں تو وہ گولی مار دے۔ باقی لوگ اندر پہنچ چکے تھے اور غالباً گاڑی میں لاش کا معائنہ کر رہے تھے یا کمروں میں مجرموں کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ وہ کسی وقت بھی کچن کی طرف سے نمودار ہو سکتے تھے۔

غالب نے شیلی کو اوپر اٹھانے کی کوشش کی مگر وہ خود بہت ڈھیلی ثابت ہوئی۔ اگر وہ جسم کو لکڑی کی طرح سخت کر لیتی تو غالب اسے میرے ہاتھوں تک پہنچا سکتا تھا۔ میں چھت پر اُلٹا لیٹا ہوا تھا اور میرے ہاتھ نیچے دو فٹ تک لٹکے ہوئے تھے۔ شیلی ہاتھ اوپر اٹھاتی تو دو فٹ اوپر میرے ہاتھوں میں اپنے ہاتھ دے دیتی مگر وہ گھبرائی ہوئی تھی۔ غالب نے اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں پیوست کر کے ایک جھولا سا بنا لیا اور شیلی سے کہا کہ وہ چڑھ جائے۔ پھر اس نے دیوار کے ساتھ ساتھ شیلی کو اوپر اٹھایا اور بڑی صفائی سے ہاتھوں کو سر تک لے گیا۔ اس نے کسی ویٹ لفٹر کی طرح شیلی کو اٹھایا اور پھر انگڑائی کے انداز میں ہاتھ سر سے اوپر تک اٹھا کے اسے میری دسترس تک پہنچانے میں کامیاب رہا۔ شیلی نے ہاتھ اوپر کیے تو میں نے اسے ایک جھٹکے سے کھینچ لیا۔ اب مسئلہ غالب کے اوپر آنے کا تھا۔

گھر کے اندر مجھے ہنگامہ آرائی کے آثار سنائی دے رہے تھے۔ خانہ تلاشی کے لیے آنے والے قانون کے تقاضے ضرور پورے کر رہے تھے۔ غالب نے تھوڑا سا پیچھے جا کے دوڑتے ہوئے ایک پاؤں سامنے کی دیوار پر رکھا۔ اس کا پاؤں تقریباً تین فٹ کی بلندی پر پڑا۔ اپنی پوری قوت کے ساتھ غالب اوپر اچھلا اور میں نے اس کے اوپر اٹھے ہوئے ہاتھوں کو گرفت میں لینے کی کوشش کی۔ اگر میری کوشش ناکام رہتی تو غالب دھڑام سے فرش پر گرتا۔ جب اس کا ایک ہاتھ میرے ہاتھ میں آیا تو میرے جسم کو ایک جھٹکا لگا۔ میری ہدایات کے مطابق شیلی نے ٹخنے سے اوپر میرے پاؤں کو دونوں ہاتھوں میں جکڑ رکھا تھا اور وہ اپنا سارا زور پیچھے کی طرف لگا رہی تھی۔

جھٹکا لگتے ہی میں نے کہا "شیلی! چھوڑنا نہیں مجھے ورنہ میں سر کے بل نیچے جاؤں گا۔"

"نہیں یار۔ تم گئے تو میں بھی جاؤں گی۔ مگر چھوڑوں گی نہیں تمہارا پیچھا" اس نے ایک ذو معنی جملہ ہانپتے ہوئے بولا۔

شیلی نے مجھے پیچھے سے نہ پکڑ رکھا ہوتا تو میں یقیناً غالب کے ساتھ ہی نیچے جاتا۔ وہ کوئی شہ زور نہیں تھی مگر مجھے بھی معمولی سے سہارے کی ضرورت تھی۔ میرا جسم کسی چھپکلی کی طرح چھت سے چمٹا ہوا تھا۔ غالب کا ہاتھ پکڑتے ہی میں نے سکون کا سانس لیا اور اسے اوپر کھینچنے کے لیے پیچھے ہٹا۔ غالب نے دیوار پر چلنے کے انداز میں دوسرا قدم آگے بڑھایا اور میں نے اسے ایک جھٹکے سے اوپر کھینچ لیا۔ میرے پیچھے ہٹنے میں لات شیلی کو لگی اور وہ چھت پر ہی لڑھک گئی مگر اس نے اتنی عقلمندی سے کام لیا کہ چیخ نہیں ماری۔

میں نے ہانپتے ہوئے کہا "سوری۔ تمہیں چوٹ تو نہیں آئی؟"

"وار دل پر کیا تھا تم نے" وہ بولی "چوٹ اوپر سے کہاں نظر آئے گی یار۔"

غالب نے کہا "ایسے ہی موقعے کے لیے یہ شعر ہے کہ۔ جگر کی چوٹ اوپر سے کہیں معلوم ہوتی ہے۔ جگر کی چوٹ اوپر سے نہیں معلوم ہوتی ہے۔"

میں نے چھت کے پیچھے جھانک کر دیکھا۔ "پتا نہیں یہ کس توپ کا گھر ہے اور اس گھر میں چوروں کی طرح کودنے کی کیا سزا ہے؟"

"کودنے کی سزا زیادہ سے زیادہ ٹانگ ٹوٹنا ہو سکتی ہے۔ پکڑے جانے کی سزا چھ ماہ کی جیل" غالب نے کہا "یا دونوں۔"

خرابی بعض اوقات خوبیٔ تقدیر سے اچھائی بن جاتی ہے۔ یہی اس وقت ہمارے ساتھ ہوا۔ ہم چھت پر ہی تھے کہ نقوی صاحب کے کچن کا دروازہ کھلا اور ایک ساتھ بہت سے لوگ اندر آگئے۔ ہم سب فوراً چھت پر سیدھے لیٹ گئے۔ مجھے یقین تھا کہ نیچے سے کسی کو بھی اوپر ہماری موجودگی کا احساس نہیں ہو سکتا لیکن میں ذہنی طور پر اس کے لیے بھی تیار تھا کہ کوئی پولیس والا اوپر آجائے تو اس سے نمٹ لوں۔ جب فرار کے راستے ہی مسدود ہوں تو آدمی مرنے مارنے کے سوا کیا کر سکتا ہے۔

میں ایک شخص کو یا زیادہ سے زیادہ دو کو مار سکتا تھا مگر اس کے بعد جب ثابت ہو جاتا کہ مجرم اوپر تشریف فرما ہیں تو مجسٹریٹ شہر کی ساری پولیس فورس کو تمام دستیاب وسائل کے ساتھ طلب کر لیتا اور وہ کسی بھی دشواری کے بغیر ہمیں نیچے اتر کے خود کو قانون کے حوالے کرنے پر مجبور کر دیتے یا اوپر دستی بم پھینک دیتے۔ خبر یہ آتی کہ مجرم مقابلہ کرتے ہوئے ہلاک ہوئے۔

لیکن اس کی نوبت نہیں آئی۔ میں نے مجسٹریٹ کی آواز سنی "وہ اس طرف سے فرار ہوئے ہیں غالباً۔"

"پھر انتظار کیوں کرتے ہو؟ چڑھ کے تم بھی اُدھر اُتر جاؤ اگر ہمت ہے" نقوی صاحب نے دہاڑ کے کہا "ادھر چیف سیکریٹری

رہتے ہیں۔"

مجسٹریٹ نے معذرت کے انداز میں کہا "سر! آپ سے پھر معذرت' میں مجبور تھا۔ اوپر سے آرڈر ملے تھے مجھے۔ ایک رسمی قانونی کارروائی ضروری تھی۔"

"شٹ اپ۔ رسمی کارروائی کے لیے تمہارا یہاں آنا ضروری نہیں تھا۔ تم مجھ سے فون پر پوچھ سکتے تھے اور رپورٹ دے سکتے تھے۔ یہ ایس ایچ او خاموشی سے آکے اپنی کارروائی مکمل کر سکتا تھا۔"

"آئی ایم سوری سر۔"

"افسوس تمہیں صبح ہوگا۔ چند گھنٹے بعد کہ تم نے میری بات کا یقین نہیں کیا۔ تم نے میرے گھر میں گھس کے مجھے ہراساں کیا۔ تم میری بیمار بیوی کے بیڈ روم میں گئے۔ کوئی ملا تمہیں؟" نقوی صاحب آتش فشاں بنے ہوئے تھے۔

"سر' ہم نوکر لوگ ہیں..... ہماری مجبوری کا خیال کریں" یہ ایس ایچ او کی آواز تھی "ورنہ ایسی گستاخی کرتے ہم؟"

"بکو مت۔ تمہیں کسی نے شہ دی تھی ورنہ تم ایسی جرأت نہ کرتے کہ میری بات کا یقین نہ کرو۔ جب میں نے بتا دیا کہ مجھے نہیں معلوم یہ گاڑی کس کی ہے اور رفیق کی لاش یہاں کون چھوڑ گیا ہے۔ تو کیا یہ کافی نہیں تھا؟ وہ میرا پی اے تھا۔ اس کے قتل کی تفتیش ہوگی اور میں قاتلوں کو معاف نہیں کروں گا۔ تم کو بھی معافی مانگنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اتنی بے عزتی میں نے زندگی میں کبھی برداشت نہیں کی۔" نقوی صاحب گرجتے رہے "ورنہ مجھے بتاؤ کہ کس نے جھوٹ بکا تھا' کس نے اطلاع دی تھی تمہیں۔ وارنٹ کس نے نکلوائے؟"

"سوری سر۔ یہ ہم نہیں بتا سکتے۔"

"تو پھر گیٹ آؤٹ۔ ایک منٹ میں دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ مسٹر مجسٹریٹ' تم تو خود کو برطرف سمجھو۔ اور ایس ایچ او' تم میری طرف سے ایف آئی آر لکھو۔ تمہارے بارے میں سوچوں گا میں۔ تم واقعی مجبور تھے۔"

"سر جی' بڑا احسان ہوگا آپ کا۔ میں تو غریب' مسکین سا بندہ ہوں۔ حکام کا غلام۔"

وہ سب جدھر سے آئے تھے' ادھر ہی چلے گئے تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ شاید اتنی دیر سے میں سانس روکے لیٹا ہوا تھا۔ شیلی اور غالب کی حالت بھی ایسی ہی تھی۔

"اُف۔ بال بال بچے" میں نے کہا "اِدھر چیف سیکریٹری صاحب کا بنگلا نہ ہوتا تو مارے جاتے۔"

غالب نے کہا "ہاں۔ وارنٹ صرف اس گھر کا تھا۔ وہ اس سے آگے ایک قدم نہیں بڑھا سکتے تھے۔ خدا کا شکر ہے' نقوی صاحب اپنے بیان پر قائم رہے۔"

"لیکن کیا واقعی وہ ایف آئی آر لکھوائیں گے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا "یہ ایسے ہی دھمکی تھی۔ اندر جا کے مجسٹریٹ ان کے پاؤں پکڑ لے گا اور ایس ایچ او قدموں میں سر رکھ دے گا۔ وہ معاملات کو اپنی مرضی کے مطابق طے کرا لیں گے۔ مجسٹریٹ کی جاں بخشی کرکے اور اسے اس گستاخی پر معاف کرکے۔ ایس ایچ او تو ہے ہی حکم کا غلام۔"

"دیکھو یار' کیا فرعونیت ہے افسر شاہی کی۔ ایک مجسٹریٹ بہرحال ایک عدالتی افسر ہوتا ہے۔ کتنا بے عزت کیا نقوی صاحب نے اسے۔ اختیارات ہیں اس کے پاس توہین عدالت کے مگر وہ استعمال کیسے کرے۔ سرکاری ملازم ہے' کوئی ہائی کورٹ کا جج نہیں ہے۔"

"پس عدلیہ کو انتظامیہ سے جدا ہونا چاہیے۔" میں نے کہا "اب سوچو ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ یہ صبح کاذب کا اجالا ہے۔"

"اس کے بعد صبح صادق ہوگی۔ پھر صبح۔ اور چیف سیکریٹری صاحب اگر لان پر ٹہلنے نکلے۔ اپنے کتے کے ساتھ۔ تو سرونٹ کوارٹر کی چھت پر ہم تینوں کو دیکھ کے بہت خوش ہوں گے۔ سمجھیں گے' آسمان سے فرشتے اترے ہیں۔ مہمان رحمت کا فرشتہ ہوتا ہے۔"

شیلی نے کہا "یار' مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ ذرا دیکھو' میں کہاں بیٹھی ہوں' کس حال میں۔ ڈاکٹر شیلا خان نیورولوجسٹ..... مائی فٹ۔"

میں نے کہا "او کے۔ اب ہم ادھر سے اتریں گے اور گیٹ کے اوپر سے باہر نکل جائیں گے۔ دعا کرو ہمارے پیچھے کتے نہ لگ جائیں۔ اندر کوئی خفیہ سسٹم کا الارم نہ ہو اور گارڈ سو رہا ہو۔"

وہ بولی "اتنی دعائیں ایک ساتھ قبول نہیں ہوں گی۔"

"چلو ایک ایک مانگ لیتے ہیں۔" غالب نے کہا۔

چیف سیکریٹری صاحب کے گھر میں اترے بنا چارا بھی نہ تھا۔ نقوی صاحب کے گھر میں ابھی پولیس اور مجسٹریٹ دونوں موجود تھے۔ اگر ہم ان کی واپسی کا انتظار کرتے تو سورج نکل آتا اور اس سے پہلے ہی سرونٹ کوارٹر میں رہنے والے ہمیں دیکھ لیتے۔ ملازمین سے تو نمٹا جا سکتا تھا مگر گارڈ کا مسلح ہونا یقینی تھا۔

میں نے چھت کے کنارے سے جھانک کے نیچے دیکھا اور پھر کنارے کو پکڑ کے لٹک گیا۔ میرے پیر اب بھی فرش سے چار فٹ کے قریب اوپر تھے۔ میں پکے فرش پر گرتا تو آواز سے کوئی ملازم ضرور جاگ اٹھتا۔ ویسے بھی ملازم جلدی اٹھتے ہیں اور ان کے جاگنے کا وقت ہو گیا تھا۔ میں نے غالب کی مدد حاصل کی اور اس نے نیچے لٹک کر میرے ہاتھ پکڑے۔ اب اس کی ایک ٹانگ شیلی نے کھینچی اور غالب نے آہستہ آہستہ آگے جھک کر مجھے فرش پر اتار دیا۔ یہ اندیشہ ہمہ وقت میرے ذہن میں رہا کہ شیلی نے غالب کی ٹانگ چھوڑ دی تو میں نیچے اور غالب میرے اوپر گرے گا یا شیلی ساتھ ہی آگئی تو ہم ایک زنجیر کی طرح ٹپک جائیں گے۔

زمین پر قدم جماتے ہی مجھے کچھ اطمینان ہوا۔ پہلے غالب نے شیلی کو لٹکایا اور وہ میرے کندھے پر اتری تو میں نے اس کی مختصری کمر کو پکڑ کے اسے نیچے رکھ دیا۔ اتنی احتیاط سے جیسے وہ شیشے کی گڑیا ہو۔ پھر مرزا غالب میرے کندھوں پر وارد ہوئے اور پیر تسمہ پا کی طرح ٹانگیں میری گردن پر لٹکا کے بولے "چلو۔"

میں نے رکوع میں جا کے اسے نیچے گرانے کی کوشش کی مگر گرنے نہیں دیا۔ گیٹ مجھے سامنے نظر آ رہا تھا۔

میں نے کہا "ڈاکٹر شیلی! ایک ایکٹ کا چھوٹا سا ڈراما ہے' کر سکتی ہو؟"

"یار' اسکرپٹ بتاؤ۔"

میں نے کہا "اطمینان سے ٹہلتی ہوئی گیٹ تک جاؤ۔ گارڈ بالکل شک نہیں کر سکتا کہ تم چوروں کی طرح دوسری طرف سے دیوار پھاند کے آئی ہو۔ وہ سمجھے گا' تم چیف سیکریٹری صاحب کے گھر میں سے ہو۔ کوئی مہمان یا کوئی فرینڈ فار ون نائٹ۔ پتا نہیں وہ کیسے آدمی ہیں مگر عموماً ایسے لوگوں کے مہمان ایسے ہی ہوتے ہیں جو اندھیرے میں آتے ہیں اور اندھیرے میں ہی رخصت ہو جاتے ہیں۔"

"تمہیں شرم نہیں آتی یار" شیلی نے خفگی سے کہا۔

"یار' یہ شرم کی بات تو ہے مگر مجبوری میں شرم کو چھوڑ دینا چاہیے۔ تم کو سمجھنا چاہیے کہ نظریہ ضرورت کے تحت سب جائز ہوتا ہے۔ جھوٹ بھی۔ کم آن' بی اے گڈ گرل۔"

"یہ کیوں نہیں کہتے کہ بی اے بیڈ گرل۔ (BE A BAD GIRL)"

اس نے کہا "گارڈ نہ مانا تو....."

"مانے گا ڈیئر شیلی۔ تم منوا سکتی ہو۔ اس سے کہو' دروازہ کھول دے۔ تمہیں جانا ہے باہر۔ جب تم باہر نکلو گی تو وہ پھر گیٹ لاک کرے گا۔ اس سے پہلے ہی ہم اسے لٹا دیں گے آرام سے۔"

"مار ڈالو گے اسے بلاوجہ.....؟"

"لاحول ولا قوۃ۔ لٹانے کا مطلب ہے لٹانا۔ ایک دو گھنٹے چپ لیٹا رہے گا۔ اس سے پہلے ہی کوئی دیکھ لے گا۔ ڈاکٹر کو بلا لے گا۔ پولیس خود آجائے گی شاید مگر اس وقت تک ہم محفوظ ہوں گے۔ وہ خاک بتائے گا ہمارے بارے میں؟"

شیلی نے گیٹ کی طرف چلنا شروع کیا۔ گارڈ اپنے کیبن میں تھا۔ شیلی نے گیٹ پر پہنچ کے اسے متوجہ کیا تو حسب توقع اس نے کوئی سوال کیے بغیر دروازہ کھول دیا۔ میں اور غالب اتنی دیر میں دیوار کے ساتھ ساتھ تاریکی میں چلتے ہوئے بہت قریب پہنچ گئے تھے۔ گارڈ کی ہماری طرف پشت تھی۔

چند قدم کے فاصلے سے میں نے چیتے کی طرح حملہ کیا اور گارڈ پلٹا ہی تھا کہ میں نے اسے دبوچ لیا۔ میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھا اور اسے واپس کیبن میں پہنچا دیا۔ ایک منٹ بعد غالب کے ساتھ میں باہر نکلا اور میں نے گیٹ کو ایسے برابر کر دیا کہ وہ بند ہی نظر آئے۔

اب سکون سے چلتے ہوئے ہم بنگلوں کے درمیان سے گزرے۔ ایک اخبار والے اور ایک دودھ والے نے سائیکل پر گزرتے ہوئے صرف شیلی کو دیکھا۔ ظاہر ہے وہی ایک دیکھنے کی چیز تھی۔ ہماری اشکال پر پھٹکار برس رہی تھی اور ہمارے "بوتھے" ویسے بھی فضول تھے۔

مال روڈ تک کا فاصلہ چند منٹ کا تھا۔ مجھے جو پہلی کار اپنی طرف آتی نظر آئی' میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکا مگر وہ نہیں رکی۔ پھر شیلی نے کوشش کی اور ہم ایک درخت کے پیچھے چھپ گئے۔ یہ ناممکن تھا کہ صبح دم کوئی اکیلی حسینہ کسی ویران سڑک پر کسی مرد کو روکے اور وہ نہ رکے۔ مرد بوڑھا ہو یا متقی' اس سے فرق نہیں پڑتا۔ شیلی کے اشارے پر جو کار رکی اسے ایک درمیانی عمر کا عیاش نظر آنے والا شخص چلا رہا تھا۔ اس نے بہت مسکرا کے شیلی کے لیے دروازہ کھولا ہی تھا کہ ہم دونوں جانب سے نازل ہوئے اور اس کے احتجاج کرنے سے پہلے پچھلی سیٹ پر قابض ہو گئے۔ شیلی نے اپنا زنانہ ماڈل کا ریوالور میرے حوالے کر دیا تھا۔ وہ پہلے ہی دہشت زدہ ہو گیا تھا۔ ریوالور دیکھ کے اس کی آواز بھی بند ہو گئی۔

اس نے بڑی مشکل سے کہا "کیا..... کیا چاہتے ہو؟"

میں نے آہ بھر کے کہا "ساری دنیا کا بھلا لیکن ایک ہمارے چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔"

"یہ..... یہ بھلائی ہے؟"

"ہاں۔ ہماری جگہ کوئی اور ہوتا تو اب تک تمہاری لاش پیچھے چھوڑ کے بہت دور جا چکا ہوتا۔" میں نے کہا "ہم نے تو صرف لفٹ لی ہے۔ ہم تمہاری کار بھی چھین لیں گے مگر واپس کر دیں گے۔ بالکل اسی حالت میں آج ہی۔ اب چلو۔"

اس نے کار کو آگے بڑھایا "کار..... کیا کرو گے تم؟ کہیں ڈاکا ڈالو گے؟ پولیس تو مجھے پکڑ لے گی۔"

میں نے اسے تسلی دی "پولیس کو کچھ معلوم ہوگا تو پکڑے گی۔ اب تم ایسا کرو کہ اچھے بچوں کی طرح گاڑی روک کے نیچے اُتر جاؤ۔"

وہ چلایا "کیا..... نیچے اُتر جاؤں۔ مگر کیوں؟"

"اس لیے کہ ہم تمہیں اپنے ساتھ رکھنا نہیں چاہتے۔ تم ساتھ رہو گے تو سب دیکھو گے۔"

"نہیں..... خدا کی قسم' کسی کو نہیں بتاؤں گا۔"

"گڈ۔ ہم بھی نہیں بتائیں گے۔" غالب نے کہا "اس میں نہ تمہارا نقصان ہوگا نہ ہمارا۔"

میں نے کہا "ٹھیک ایک گھنٹے بعد ہم تمہیں فون کرکے بتا دیں گے کہ گاڑی کہاں کھڑی ہے۔ چابیاں اندر گلوز کمپارٹمنٹ میں ہوں گی۔ گاڑی روکو۔"

اس نے بادل ناخواستہ بریک لگائے "میں یہ رسک نہیں لے سکتا۔ مجھے پولیس کو رپورٹ کرنی پڑے گی۔"

غالب نے کہا "ضرور کرو۔ اس سے ہمارا کچھ نہیں بگڑے گا۔ تم پولیس کے چکر میں پڑو گے تو کار مشکل سے واپس ملے گی۔ نذر نیاز پیش کرنے کے علاوہ خاصی منت سماجت کے بعد۔"

"اور عین ممکن ہے کہ اصل حالت میں نہ ملے۔ ٹائر نئے ہوں تو ایک گھنٹے میں پُرانے ہو جائیں۔ کسی چھوٹے تھانے دار کی بڑی کار میں فٹ ہو جائیں' کیا پتا ریڈیو ٹیپ اور بیٹری کے پسند آجائیں۔"

غالب نے کہا "ایک گھنٹا انتظار کرنے میں کوئی نقصان نہیں۔ اس کے بعد جو چاہو کرو۔ فون نمبر بتادو اپنا۔"

شاید بات اس کی سمجھ میں آگئی "اچھا۔ ایک گھنٹا انتظار کرتا ہوں میں۔۔۔ لیکن یہ تو بتادو کہ اس ایک گھنٹے میں تم کیا کرو گے؟ یہ میرا کارڈ ہے۔"

"ہم کوئی واردات نہیں کریں گے۔ یہ ہمارا وعدہ ہے" غالب نے اس کی جگہ بیٹھ کے گاڑی آگے بڑھادی۔

شیلی نے یہ سب کارروائی بڑی ناگواری سے برداشت کی تھی "یہ تو جرم ہے یار' کار چھیننا۔"

میں نے کہا "مجبوری آدمی سے بہت کچھ کراتی ہے۔"

شیلی نے پیچھے دیکھا "بے چارہ۔ کیسے پیدل آرہا ہے۔ کیا گاڑی چھینے بغیر کام نہیں چلتا تھا؟ یار اس سے درخواست کرتے۔"

"بعد میں وہ نشاندہی کرتا کہ انہیں میں نے یہاں ڈراپ کیا تھا اور تفتیش کا چکر شروع ہو جاتا۔ ڈاکٹر مس شیلا خان عرف غزالہ سہگل! تم اپنے خوب صورت لب بند رکھو یا لبِ لعلیں سے صرف مسکرا کے بجلی گرانے کا کام لو تو بہتر ہے۔"

"صاف کیوں نہیں کہتے یار کہ شٹ اپ۔"

"او کے۔ شٹ اپ۔ ہم باہر انتظار کرتے ہیں' تم ہوٹل سے اپنا سامان اٹھاؤ اور چیک آؤٹ کرو" میں نے کہا "ورنہ رینٹ اے کار والے اور پریشان کرنے والے یا قتل کرنے والے سیدھے یہاں پہنچ جائیں گے۔"

"اور ٹیڑھے راستے سے ہم کہاں جائیں گے؟" غالب نے کہا "جہاں خاتون محفوظ رہیں جملہ آفاتِ ارضی سے۔۔۔۔"

میں نے کہا "چراغ تلے۔ جہاں اندھیرا ہوتا ہے۔"

"کیا مطلب؟ یہ کسی بجلی کے کھمبے کے نیچے کھڑی رہیں گی۔"

میں نے کہا "ہم نے نقوی صاحب سے جھوٹ بولا تھا کہ یہ ایمبی سیڈر ہوٹل میں قیام پذیر ہیں۔ انہوں نے سچ مانا اور یہاں سے نکل کے ہم وہیں جائیں گے۔ نقوی صاحب وہاں پہنچے تو معلوم کریں گے کہ اس نام کی خاتون یہاں مقیم ہیں تو ظاہر ہے جواب نفی میں ملے گا۔ بعد میں پولیس تفتیش کرے گی تو نقوی صاحب بتائیں گے کہ وہ ایمبی سیڈر ہوٹل میں بھی نہیں ہیں۔ انہوں نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔ لیکن ہم وہیں ہوں گے۔ ہم سے میری مراد ہے ڈاکٹر شیلا خان جو کسی اور نام سے رجسٹریشن کرائیں گی۔"

اس کے بعد شیلی نے بھی کوئی سوال نہیں کیا۔ ہم فلیٹیز پہنچے تو سورج طلوع ہو گیا تھا۔ ہم نے کار کو بہت سی دوسری کاروں کے درمیان پارک کیا اور شیلی کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔ الگ کھڑی ہوئی گاڑی زیادہ نمایاں ہوتی اور بہت سے لوگ ہماری صورت بھی ملاحظہ کرتے۔

"کیا تم واقعی لندن چلے جاؤ گے؟" غالب نے کہا۔

"یہی بہتر ہے۔"

"شیلی کے ساتھ بہتر نہیں ہے۔ رابعہ پہلے ہی بدگمان ہے' وہ تم سے نفرت کرنے لگے گی۔"

"کیا تم اسے سمجھا نہیں سکتے؟" میں نے کہا۔

"محبت کے پاگل پن میں عقل کے دلائل سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔"

"اس وقت ہر صورت میں میرا روپوش ہو جانا ہی میرے مسائل کا حل ہے۔ جب تک نقوی صاحب اپنا وعدہ نہیں نبھاتے' میرے خلاف مقدمات ختم نہیں ہوتے یا کمزور نہیں پڑتے' میں سامنے کیسے رہ سکتا ہوں۔"

"روپوشی کے لیے لندن جانا ضروری ہے؟"

"پھر کہاں جاؤں؟ ہمالیہ کی ترائی میں جہاں آدم خور شیر رہتے ہیں یا افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں یا پھر برفانی خطے میں۔ بلاوجہ نیل کے ساحل سے لے کے تابہ خاکِ کاشغر پھروں۔ اس کے باوجود کیا تم رابعہ کو یقین دلادو گے کہ میں شیلی کے ساتھ لندن میں نہیں ہوں؟ یا جہاں بھی ہوں' وہ میرے ساتھ نہیں ہے اور میں اس کے ساتھ نہیں ہوں؟ آخر وہ بھی تو غائب ہو گئی' بدگمانی پہلے سے ہے۔"

"تمہیں یقین ہے کہ نقوی صاحب اپنے وعدے پر قائم رہیں گے؟"

"اس کا اندازہ ہو گیا ہے۔ انہوں نے پولیس سے وہی کہا جو ہم چاہتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کا جھوٹ چلا نہیں مگر انہوں نے اپنے جھوٹ کو تسلیم ہی نہیں کیا اور یہ نہیں مانا کہ مجرمان سکندر بخت' غالب اور ڈاکٹر شیلی ان کے گھر میں تھے۔ اگر رفیق کے قتل کی تفتیش نہیں ہوئی اور خبر عام نہیں ہوئی تو سمجھ لو کہ نقوی صاحب نے معاملے کو دبادیا۔ ایس ایچ او پر تو انہوں نے واضح کردیا تھا کہ وہ اسے قصوروار نہیں سمجھتے۔ مجسٹریٹ کو بھی وہ بخش ہی دیں گے اور وہ رپورٹ دے گا کہ کہیں کچھ نہیں۔ نہ کوئی قتل ہوا' نہ کوئی گاڑی ملی۔ نقوی صاحب کے گھر میں سب سکون سے سو رہے تھے۔ گارڈ ڈیوٹی پر موجود تھا۔ اندر پرندہ پر نہیں مار سکتا تھا۔ تاہم اس کارروائی سے ہمیں ایک اضافی فائدہ ہوگا۔ نقوی صاحب اپنی بے عزتی پر برافروختہ ہیں۔ وہ معلوم کریں گے کہ ان کے گھر چھاپا

پڑوانے کا بندوبست کس نے کیا تھا اور اتنی رازداری سے ان کے خلاف سازش کس نے کی تھی۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ کوئی ایس پی یا مجسٹریٹ فون پر ان سے دریافت کرلیتا کہ سر ہم نے کچھ ایسا سنا ہے۔ خدانخواستہ آپ کے گھر میں کوئی سیاہ مرسیڈیز تو نہیں کھڑی ہوئی ہے جس میں ایک لاش ہے اور نقوی صاحب کہہ دیتے کہ واٹ نان سنس۔ کیا تم نشے میں ہو؟ یہاں صرف میری گاڑی کھڑی ہے۔ بات ختم ہو جاتی حکمران کے کسی برابر کے حریف نے انہیں ذلیل کرنے کی کوشش کی اور قربانی کا بکرا مجسٹریٹ کو بنالیا۔ اب نقوی صاحب سازش کرنے والوں کو معاف نہیں کریں گے۔ ایک ایک کا پتا چلالیں گے اور میرا خیال ہے کہ ابتدا ہوگی چوہدری دلاور کے نام سے۔"

"آپ کے منہ میں گھی شکر۔ کاش ایسا ہو۔"

"ایسا ہوگا۔ نقوی صاحب خاموش کیسے بیٹھ سکتے ہیں۔ اتنی بڑی توپ ہیں وہ۔ توپ کا رخ جس کی طرف ہو گیا وہ مارا گیا۔"

"میں پھر وہیں آتا ہوں۔ شیلی کے ساتھ لندن مت جاؤ۔ تم یہاں بھی روپوش رہ سکتے ہو۔" غالب نے کہا "رابعہ کی بدگمانی دور ہو جائے گی کہ شیلی تو گئی۔ وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دُکان اپنی بڑھا گئے لیکن اپنا بیمار یہیں ہے۔ تم کبھی کبھار اس کے حضور میں حاضری لگوانے جاسکتے ہو۔"

"دیکھ یار' بات تیری سولہ آنے درست مگر میں عورت ذات کے جذبات کی انتہا سے ڈرتا ہوں۔ انتہائی محبت کرنے والی اگر اچانک نفرت کرنے لگے۔ خواہ نفرت کی وجہ کوئی نہ ہو۔ تو اس میں بھی انتہا ہوگی۔ کہیں وہ خود نہ پکڑوادے مجھے۔ عورت کی نفسیات میں ایک کجی یہ ہے کہ وہ کسی کو حاصل نہ کرسکے تو پھر یہ بھی برداشت نہیں کرتی کہ کوئی اور اس کے محبوب کا ہو جائے۔ تم میرے نہیں تو کسی کے بھی نہیں۔ بس اللہ کو پیارے ہو جاؤ۔ اس فارمولے سے ڈر لگتا ہے۔"

"رابعہ پاگل نہیں ہے۔"

"فی زمانہ وہ ہم سب سے زیادہ پاگل ہے۔ تم دیکھو اس کا رویّہ اور ردِّعمل۔ اسے سمجھاؤ' قائل کرو کہ سکندر سے بڑا سچا عاشق تو نہ مجنوں تھا نہ فرہاد۔ اس کی برین واشنگ کرتے رہو' یہاں تک کہ بدگمانی اور نفرت کا سارا زہر دُھل جائے۔ پھر مجھے مطلع کرنا۔ میں سیدھا کھڑے پہ سہرا ڈالے' گھوڑے پر سوار' قاضی کو پیچھے بٹھا کے بگٹٹ دوڑتا ہوا آجاؤں گا۔ تم اور محسن گواہ بن کے موجود رہنا۔ چٹ منگنی کے بغیر پٹ بیاہ' فانفٹ روانگی برائے ہنی مون اور کھٹاکھٹ بچے۔ دو دو تین تین۔ پانچ سات سال میں منظر کو شکستِ فاش۔ ایک بہت بڑا چیلنج یہ بھی ہے دوست۔"

غالب نے ہنستے ہوئے کہا "محسن کہتا ہے' لندن میں تمہارے پندرہ بچے موجود ہیں۔ بیوی ایک بھی نہیں۔"

"بکواس کرتا ہے وہ۔ سولہ کا حساب تو میرے پاس ہے۔

دراصل یہ اینگلو انڈین نسل انگریز اپنے دورِ حکومت میں چھوڑ گئے تھے۔ ہم جوابی انتقامی کارروائی میں مصروف تھے۔ بڑے بڑے لارڈز اور عالی نسب' مغرور اور متعصب انگریزوں سے بدلہ لینا ایک قومی فریضہ تھا۔ ہماری اس تحریک میں انڈین اور پاکستانی بڑے جوش و خروش سے حصہ لیتے تھے۔"

"تحریک ہی ایسی تھی۔ تحریکِ حرامی پن۔ تم کو شرم نہیں آتی؟"

"اب آتی ہے یار۔ بس جوانی دیوانی کا قصور تھا۔"

شیلی کو دیکھ کے میں نے ہاتھ ہلایا اور وہ سیدھی کار کی طرف آئی۔ رات بھر جاگنے سے اور خوف کے باعث اس کا بُرا حال تھا۔ غالب نے آگے جاکے اس کا سوٹ کیس لے لیا جو ہوٹل کا ایک پورٹر لا رہا تھا۔ وہ بخشش لے کر واپس ہو گیا۔ میں بھی نہیں چاہتا تھا کہ وہ ہماری مسروقہ کار دیکھے۔

ایمبی سیڈر ہوٹل پر میں شیلی کے ساتھ اتر گیا۔ "اب تم گاڑی کہیں چھوڑ کے اس بے چارے کو فون کردو۔ پھر ٹیکسی لے کر سیدھے گھر جاؤ اور میرے جملہ لواحقین کو تسلی دو کہ صبح کا بھولا شام کو گھر آنے کا وعدہ کرچکا ہے۔"

غالب نے کہا "تم شرفا کے اس ہوٹل میں قیام فرماؤ گے۔ اس حلیے میں؟"

"حلیہ بدل کے کوئی شریف آدمی نہیں ہو جاتا۔ میں خود اپنی شرافت کی سند ہوں" میں نے کہا۔

کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے بے حد شائستہ اور صاف ستھرے کپڑوں والے کلرک نے ہم دونوں کو دیکھ کے سر کھجایا مگر خاموشی سے رجسٹر سامنے کردیا۔ میں نے اپنا اور شیلا کا نام "مسٹر اینڈ مسز رستم جی ٹمن والا" لکھا اور پتا کراچی کا۔ ظاہر ہے شیلی کو نہ کچھ معلوم ہوا' نہ اسے اعتراض ہو سکتا تھا۔

میں نے بے حد غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہا "یہ ملک اب جنگل ہوتا جارہا ہے۔ میرا خیال ہے اب یہاں نہیں رہنا چاہیے۔"

کلرک نے رجسٹر پر ایک نظر ڈال کے کہا "کس قسم کا روم پسند کریں گے آپ؟"

میں نے فرنچ میں شیلی سے کہا "دیکھو میں نے خود کو اور تمہیں میاں بیوی لکھا ہے۔ ظاہر ہے ہم لوگ الگ الگ کمروں میں نہیں رہ سکتے۔ دوسری بات یہ کہ میری جیب میں تو پھوٹی کوڑی نہیں ہے۔ اسے ایڈوانس دے دو۔ ایک ہزار کے قریب۔"

"میرے پاس ٹریولر چیک ہیں۔"

"امریکن ایکسپریس کے چیک چلتے ہیں" میں نے کہا اور کلرک سے مخاطب ہو گیا "ہمارے پاس نقد رقم نہیں ہے۔ فی الحال' امریکن ایکسپریس ٹریولر چیک ہیں۔"

"نو پرابلم سر۔" کلرک ہماری فرنچ سے سخت متاثر ہوا تھا اور

میرا گردوغبار سے اٹا ہوا لباس اور مضحکہ خیز حلیہ اس کے لیے غیر اہم ہوگیا تھا۔

"ہم آئے تھے شکار کے لیے۔ خود شکار ہوگئے۔ بدمعاشوں نے ہماری گاڑی بھی چھین لی۔" میں نے خفگی سے کہا "بڑی مشکل سے یہ ایک سوٹ کیس دیا جس میں کپڑے تھے۔ ٹریولر چیک ان کے لیے بے کار تھے اس لیے بچ گئے۔"

"آئی ایم سوری سر۔ کیا آپ نے رپورٹ کی پولیس کو؟"

"ہاں۔ کی ہے مگر اس سے کیا ہوگا؟" میں نے مایوس لہجے میں کہا "ہم نے رات کو دس میل پیدل سفر کیا جنگل میں پھر لفٹ لے کر یہاں پہنچے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں نو وزیٹر' نو فون کالز۔ "NO VISITORS- NO PHONE CALLS"

شیلی نے کہا "کمرا پچھلی طرف اور پرسکون ہو۔ اوپر' جہاں سے شہر نظر آئے مشرق کی طرف۔"

کلرک مزید متاثر ہوا اور اس نے ایک پورٹر کو بلا کے ہمارے ساتھ کردیا جس نے شیلی کا سوٹ کیس اور بیگ اٹھالیا۔ جب وہ ٹپ اور ناشتے کا آرڈر لے کر چلا گیا تو میں نے بیڈ پر گر کے کہا "اف۔ میں بہت تھک گیا ہوں۔ بھوک اور نیند سے میرا برا حال ہے۔"

"تم تو عادی ہو" شیلی صوفے پر بیٹھ گئی "یہ میرے لیے تو بہت اعصاب شکن تجربہ تھا۔"

ناشتا کرتے ہی میں پڑ کے سویا تو شام کی خبر لی۔ آنکھ کھلی تو کمرے میں لائٹس آن تھیں۔ شیلی مشرق کے رخ کھلنے والی کھڑکی سے شہر کا نظارہ کررہی تھی۔ میں نے پیچھے سے جا کے "ہیلو" کہا تو وہ اچھل پڑی۔

"تم نے تو ڈرا دیا مجھے یار' دیکھو میرا دل کیسے دھڑک رہا ہے۔" اس نے میرا ہاتھ پکڑ کے کہا۔

میں نے ہاتھ اس کے دل پر رکھنے کے بجائے نرمی سے چھڑا لیا "دل کا تو کام ہی دھڑکنا ہے ڈاکٹر شیلی۔ تم سوئی نہیں؟"

"ابھی اٹھی تھی کچھ دیر پہلے یار۔ سوچا چائے پی لوں۔ پھر سوچا تمہیں اٹھادوں۔ پھر سوچا کہ انتظار کروں" وہ ہنس پڑی۔

"مسٹر رستم جی ٹین والا! تم نے تو نہادھو کے کپڑے بدل لیے تھے۔ میں ابھی تک بھوت بنا ہوا ہوں۔ اس طرح میرا باہر جانا بھی ممکن نہیں۔ تم ایسا کرو کہ غالب کو فون کرو" میں نے کہا "اچھا چھوڑو۔ ایسا نہ ہو' اس کے پیچھے پیچھے کوئی یہاں بھی پہنچ جائے۔"

"میں بازار سے کپڑے لے آتی ہوں" اس نے مجھے نظروں سے ناپ کے میرے سائز کا اندازہ کیا۔

"یہاں ہوٹل سے کار لو۔ ان کے اپنے آدمی قابل اعتبار ہوتے ہیں۔ انارکلی میں یا مال پر بہت سی دکانیں ہیں۔ کسی بھی بڑے اسٹور میں چلی جاؤ۔ وہ ٹریولر چیک لے لیں گے۔"

"یار' مجھے شیخ صاحب کو کال بھی کرنی ہے۔۔۔ لندن۔"

"وہ کیوں؟"

"انہیں بتادوں کہ اب میں یہاں ہوں۔ وہ پریشان نہ ہوں۔"

"انہیں بتادینا کہ آئندہ تم خود انہیں فون کروگی۔ وہ زحمت نہ کریں۔ انہیں سمجھادینا کہ رفیق لاپتا ہے اور ان حالات میں تم خود کو غیر محفوظ محسوس کرتی ہو اس لیے ایک ہی ہوٹل میں زیادہ عرصہ قیام کرنا ممکن نہیں۔"

"یار' تمہارے بارے میں۔۔۔ کیا کہوں؟"

"کچھ نہیں۔ کسی کے بارے میں کوئی بات نہ کرنا۔ جیسے ابھی تک نہ تم کسی سے ملی ہو' نہ کوئی ایسی بات ہوئی ہے جس کا ذکر کیا جائے۔ ہاں یہ کہہ دینا کہ تمہارا ارادہ واپس لندن آنے کا ہے۔"

"یار' وہ پوچھیں گے نہیں کہ کیوں؟"

"کہہ دینا کہ رفیق کے لاپتا ہوجانے کے بعد تم کو شبہ ہے کہ کچھ لوگ تمہارا تعاقب کرتے ہیں۔ اسی لیے تم نے ہوٹل بدل لیا ہے اور شاید پھر بدلو۔ زیادہ خطرہ محسوس ہوا تو تم یہاں نہیں رہوگی۔۔۔ رائٹ؟"

"رائٹ۔ اگر تم کہتے ہو" وہ مسکرائی۔

میں نے فون اٹھا کے روم سروس کو کافی کے لیے کہا اور شیلی کے ساتھ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ میں نے اسے اندازے سے بتایا کہ ادھر پہلے ضامن رضوی کا گھر تھا۔ ماڈل ٹاؤن کا وہ گھر کہاں ہے جہاں ہم گزشتہ رات تھے۔ شاہی مسجد کے مینار نظر آرہے تھے۔ مقبرۂ جہانگیر کے بھی تین مینار دیکھے جاسکتے تھے۔

"یہ ایک عجیب بات ہے۔ جہانگیر کے مقبرے کے کسی بھی مینار پر چڑھ کے دیکھو' بادشاہی مسجد کے تین مینار نظر آئیں گے اور بادشاہی مسجد کے ہر مینار سے مقبرے کے تین۔"

"واقعی؟ تم نے دیکھا ہے یار؟" شیلی نے بے حد حیرانی سے کہا۔

"نہیں۔ ہر مینار پر چڑھنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ ویسے بھی میں نے جب بھی دیکھا' ایک ہی مینار پر جانے والا راستہ کھلا دیکھا۔ باقی تین بند تھے۔"

"اور اس مینار سے۔۔۔"

"وہاں سے تو تین ہی نظر آئے مجھے۔ یہ بات بہت مشہور ہے۔ ایسا کوئی شخص آج تک ملا نہیں جو کہے کہ میں نے یہ تجربہ کیا ہے۔ مقبرۂ جہانگیر کے چاروں اور بادشاہی مسجد کے چاروں میناروں پر چڑھ کے۔ ہوسکتا ہے یہ روایت ہو۔"

"کیا روایات غلط ہوتی ہیں یار؟"

"روایات۔۔۔ بس روایات ہوتی ہیں۔ یہ بھی سنا تھا کہ قلعۂ لاہور سے شالیمار باغ تک زیر زمین راستے ہیں۔ بیشتر لوگ اس پر یقین رکھتے ہیں مگر یہ غلط ہے۔"

"یار! تم میرے ساتھ ایک اچھے ٹورسٹ گائیڈ بن کے چلو۔ میں سب دیکھنا چاہتی ہوں۔ پاکستان ایک اجنبی وطن ہے میرے لیے۔ اس کا گوشہ گوشہ مجھے بلاتا ہے۔"

"شامتِ اعمال آپ کو بلاتی ہے میڈم۔ گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کا رخ کرتا ہے" میں نے کہا۔

"تم مجھے گیدڑ کہہ رہے ہو۔ میں بزدل نہیں ہوں یار۔"

"تم یہاں ٹورسٹ نہیں ہو۔ اپنے مقصد کو مت بھولو اور یہ بھی کہ نہ میں ٹورسٹ گائیڈ ہوں۔ نہ یہ ساتھ مستقل ہے۔ حالات کی مجبوری نے ہمیں ایسے ہی یکجا کردیا ہے جیسے بارش سے پناہ لینے کے لیے دو اجنبی ایک ہی درخت کے نیچے کھڑے ہوں۔"

اس کا چہرہ ایک دم بجھ گیا "ہم اچھے دوست بھی نہیں ہوسکتے؟"

"ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں تو تمہیں جانتا تک نہیں۔ جو تم نے کہا وہ میں نے FASE VALUE پر مان لیا۔ تصدیق کیے بغیر۔ میں نے زندگی میں بہت فریب کھائے ہیں اس لیے انسانیت پر اعتماد کے باوجود انسانوں پر اعتبار مشکل سے کرتا ہوں۔ مجھے خوشی ہوگی' اگر وہ سب سچ ہوا جو تم نے مجھے اپنے بارے میں بتایا ہے۔"

"اور جھوٹ ہوا تو۔۔۔؟" وہ خلا میں دیکھنے لگی۔

"تو میں رعایت دیے بغیر تمہیں جان سے بھی مار سکتا ہوں۔"

"تم۔۔۔ بڑے بے رحم ہو یار۔" اس نے دکھی لہجے میں کہا۔

"میں کیا کروں۔ دنیا بڑی بے رحم ہے۔"

دروازے پر دستک ہوئی اور میں نے دروازہ کھولا تو ویٹر نے اندر آکے کافی رکھی۔ واپس جانے سے پہلے اس نے ایک نظر شیلی کو اور پھر مجھے دیکھا۔ اس ایک لمحے میں مجھے اس کی آنکھوں میں الجھن اور تذبذب کی جھلک نظر آئی۔ میں نے اسے غور سے دیکھا مگر وہ پلٹ چکا تھا۔ میں شیلی پر اپنے شک کا اظہار کرکے اسے خوف زدہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔

"ویٹر!" میں نے کہا۔

وہ رک گیا اور واپس آیا "یس سر۔"

"میڈم کو شاپنگ کے لیے جانا ہے۔ یہاں رینٹ اے کار سروس ہے؟"

"ہے سر۔ آپ منیجر کو بتادیں" اس نے پلک جھپکائے بغیر مجھے دیکھا۔

میں نے یاد کرنے کی کوشش کہ مگر مجھے اس کے چہرے یا آواز میں شناسائی کی رمق تک محسوس نہ ہوئی "اوکے۔ تم جاؤ۔"

شیلی کے جاتے ہی میں نے دوبارہ کافی منگوائی لیکن اس بار کافی لانے والا ویٹر دوسرا تھا۔

میں نے کہا "ابھی کچھ دیر پہلے کافی کون لایا تھا؟"

"مجھے نہیں معلوم سر۔ اس روم سروس کے لیے تو میں ہوں۔"

میں نے کہا "کیا کوئی اور نہیں آسکتا؟ فرض کرو تم نہ ملو۔ مصروف ہو۔"

"یہ دس کمرے میرے ہیں سر۔ اس فلور پر۔ میں کہاں جاسکتا ہوں۔ چند منٹ تو لگ جاتے ہیں۔ اور کسی کو آنے کی اجازت نہیں ہوتی۔۔۔"

میں نے کہا "اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ یہاں تمہاری ڈیوٹی ہے؟"

وہ گھبرا گیا "آپ منیجر کو فون کرسکتے ہیں سر۔ یہ میرا نمبر ہے۔ میرا نام ہے مراد خان۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے' تم جاؤ۔"

اس کے باہر نکلتے ہی میں نے چند منٹ توقف کیا پھر دروازہ کھول کے راہداری میں دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے ریسیور اٹھا کے آپریٹر سے کہا کہ منیجر سے بات کرائے۔

"میں رستم جی ٹین والا بول رہا ہوں۔ ابھی کچھ دیر پہلے چیک ان کیا ہے میں نے۔" میں نے انگریزی میں کہا۔

"یس سر۔ اینڈ واٹ کین آئی ڈو فار یو۔ (میرے لیے کوئی خدمت؟)"

"اس کمرے میں ویٹر کون ہے؟ روم سروس کے لیے۔"

"کیا بات ہے سر؟ کوئی شکایت؟"

"کچھ نہیں۔ اس کا نام۔۔۔ نمبر اور حلیہ۔۔۔"

"نام ہے شاہ دین۔ نمبر ٹوسیون۔ لمبا' قدرے [illegible]۔ ایبٹ آباد کی طرف کا رہنے والا ہے۔"

میں نے ریسیور رکھ دیا اور کافی کو گھورنے لگا۔ یہ کافی لانے والا ویٹر پستہ قد' فربہی مائل اور گورا تھا۔ اس کا نمبر بھی غلط تھا۔ وہ اٹھائیس نمبر تھا۔ اچانک تحفظ اور سکون کا احساس ختم ہوگیا تھا۔ مجھے شک نہیں' یقین تھا کہ کافی میں زہر ہوگا یا خواب آور دوا ہوگی مگر ایسا کوئی طریقہ نہیں تھا کہ میں اس کافی کا تجزیہ کسی لیبارٹری سے کراسکتا یا یہ کافی کسی اور کو پلا کے اپنے شکوک رفع کرسکتا۔ جرائم کی کہانیوں میں تو عموماً کتے بلی کو زہر آلود چیز کھلا کے ماردیا جاتا ہے اور ہیرو صاف بچ جاتا ہے مگر یہاں کتے بلی ہوتے تب بھی کافی شاید نہ پیتے۔ میں کسی اور کو مثلاً خود منیجر کو دعوت دیتا تو غیر ارادی قتل کا مرتکب ٹھہرتا اور لمبے چکر میں پڑجاتا۔ صورتِ حال کی سنگینی واضح ہوکے سامنے آنے لگی تھی۔ شیلی کے یا میرے تعاقب میں کوئی ویٹر بن کے اندر پہنچ چکا تھا۔ شاید اب اس کا سراغ لگانا مشکل ہوجائے۔ وہ اپنا کام کرکے نکل جائے گا اور جس نے بھی اسے بھیجا تھا اسے رپورٹ دے گا کہ وہ ناکام نہیں رہا۔

اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے فون کی طرف یوں دیکھا جیسے اس خطرناک آلے سے سوائے اس شخص کے کسی کی آواز نہیں نکلے گی جس کا خیال میرے ذہن میں خطرے کا احساس پیدا کررہا تھا۔ میں نے واضح ہدایت دی تھی کہ مجھے کوئی بھی فون کرے' میرا نمبر نہ ملایا جائے۔ میں نے اس خیال سے ریسیور اٹھالیا کہ شاید میرا خوف بے بنیاد ہو اور منیجر مجھ سے مزید وضاحت چاہتا ہو کہ۔۔۔

کے بارے میں کیوں پوچھ رہا تھا۔

آپریٹر نے کہا "سوری سر۔ آپ کی ہدایات مجھے معلوم ہیں لیکن فون مسز رستم کا ہے۔"

"او کے۔ میں بات کروں گا۔"

شیلی نے کہا "رستم! میں نے لندن کال کی تھی۔"

"پھر...؟ پریشانی کی کیا بات ہے...؟"

"یار وہ..." شیلی نے باقی بات فرنچ میں کی "اس پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا۔ اس کی بیوی مرگئی۔ وہ اسپتال میں ہے۔ کوما میں۔ بالکل بے ہوش...."

اسی وقت میری نظر دروازے کی طرف گئی۔ کسی نے ایک لفافہ نیچے سے سرکادیا تھا۔

شیلی کو جواب دیے بغیر میں نے ریسیور کو آہستہ سے نیچے رکھا اور دبے پاؤں دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے اونچی آواز میں بولتا رہا جس سے یہ ظاہر ہو کہ میں نے لفافہ نہیں دیکھا اور میں بدستور کسی سے فون پر گفتگو میں مصروف ہوں۔

اگرچہ مجھے بہت کم امید تھی کہ لفافے کو ایسے پُراسرار انداز میں کھسکانے والا دروازے پر کھڑا ملے گا مگر ایک مبہم سا خیال تھا کہ شاید وہ اپنا کام کرکے راہداری میں کہیں جاتا دکھائی دے تو میں اسے تاڑلوں۔ اس قسم کے دھندے عموماً روم سروس کے وہ ویٹر کرسکتے ہیں جن کو معقول معاوضہ مل جائے لیکن پکڑے جانے کا خطرہ بالکل نہ ہو۔ وہ خود سامنے نہیں آتے اور انہیں یہ فکر بھی نہیں ہوتی کہ لفافے میں بم ہوگا۔ لفافوں میں صرف پیغام ہوتے ہیں۔ محبت کے یا نفرت کے۔ کوئی کسی سے کچھ کہنا چاہتا ہو مگر روبرو کہنے کی ہمت نہ رکھتا ہو یا کوئی فون پر اس کی رودادِ محبت سُنے بغیر ہی ریسیور رکھ دیتا ہو تو پھر آخری طریقہ کسی گمنام نامہ بر کے ذریعے فسانۂ دل بقلم خود تحریر کرکے ارسال کرنے کا رہ جاتا ہے۔ یا ایسا وہ کرتا ہے جو کسی کو بلیک میل کرنا چاہتا ہو یا دھمکی دینا چاہتا ہو۔

اچھے برے سب ہوٹلوں کے ویٹر۔ ہوتا ہے شب و روز تماشا میرے آگے۔ کی تفسیر ہوتے ہیں۔ ہر وقت' ہر قسم کے مسافر آتے جاتے رہتے ہیں۔ وہ کیا کرتے ہیں' کیا نہیں کرتے' کیا کہتے ہیں اور کیا کہلواتے ہیں' اس کا خاموش مشاہدہ ویٹر اپنی کھلی آنکھوں سے اور کُھلے کانوں سے کرتے ہیں مگر وہ قطعی بے ضرر' معصوم اور لاتعلق نظر آتے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ کوئی انہیں بالکل اہمیت نہیں دیتا اور ایسا نہیں سوچتا کہ وہ دوست کے نامہ بر ہوسکتے ہیں تو دشمن کے زرخرید کیوں نہیں ہوسکتے۔

دائیں طرف کاریڈور کے آخر میں کوئی ویٹر ہاتھ پر چائے کی ٹرے لیے جارہا تھا۔ بائیں طرف کوئی بھی نہیں تھا۔ مجھے تھوڑی سی مایوسی ہوئی۔ چند سیکنڈ میں ویٹر اتنی دور نہیں پہنچ سکتا تھا' جب تک کہ وہ لفافہ نیچے سے اندر ڈالتے ہی دوڑنے نہ لگا تا۔ چائے کے برتنوں کی ٹرے کے ساتھ یہ مشکل کام تھا اور اس کے بعد وہ اتنے سکون سے چل بھی نہیں سکتا تھا۔

میں نے اسے سیٹی بجا کے متوجہ کیا اور انگلی کے اشارے سے اپنی طرف بلایا۔ وہ اطمینان سے مُڑا اور میرے قریب آکے بولا "لیس سر؟"

میں نے کہا "یہ چائے کس نے منگوائی تھی؟"

اس نے حیران ہوئے بغیر اشارے سے کہا "چار سو تیس میں سر۔"

"اچھا.... دراصل میں نے کچھ دیر پہلے ایسے ہی کسی ویٹر سے کہا تھا کہ مجھے کافی چاہیے.... ابھی تک کوئی لے کر نہیں آیا۔"

"آپ روم سروس کو فون کردیتے سر...."

"وہ.... اس وقت فون پتا نہیں کیوں کام نہیں کررہا تھا۔ خیر.... تم جاؤ" میں نے کہا اور اندر آکے دروازہ بند کرلیا۔

تقریباً دس سیکنڈ کے بعد میں نے پھر باہر آکے دیکھا تو ویٹر اسی بے نیازی کے انداز میں جارہا تھا۔ اس کی خود اعتمادی کا یہ سکون مجھے مصنوعی نہیں لگا۔ اگر وہ مجرم ہوتا تو اس کی صورت چغلی کھاتی۔ وہ مجھے دیکھ کے نروس ہوتا اور بعد میں پیچھے پلٹ کے ضرور دیکھتا کہ میں اسے دیکھ رہا ہوں یا نہیں۔ وہ عام ویٹر تھا' کوئی پیشہ ور مجرم یا اداکار نہیں تھا۔ میری بات میں بھی ایسی کوئی بات نہیں تھی جس سے وہ مجھے مشکوک سمجھتا۔

اب میں نے سامنے والے دو کمروں کے دروازوں کو دیکھا۔ یہ ہوسکتا تھا کہ اندر کسی جھری یا تالے کے سوراخ سے کوئی میری پریشانی کا نظارہ کررہا ہو اور لطف لے رہا ہو۔ اپنی چالاکی پر اور میری سراغ رساں بننے کی ناکام کوشش پر۔ لفافہ ارسال کرنے والا دائیں اور بائیں جانب کے کسی کمرے میں بھی ہوسکتا تھا۔ ان کے بارے میں معلومات بعد میں حاصل کی جاسکتی تھیں۔

میں نے دروازہ بند کرکے پھر ریسیور میں کہا "شیلی!"

لیکن دوسری طرف سے شیلی کی آواز سنائی نہ دی۔ وہ یقیناً پریشان ہوئی ہوگی کہ باتیں کرتے کرتے میں کہاں غائب ہوگیا۔ لائن کٹی بھی نہیں تھی اور میں نے اسے ہولڈ کرنے کے لیے بھی نہیں کہا تھا۔ ممکن ہے وہ کچھ دیر ہیلو' ہیلو کرتی رہی ہو اور اس نے دوبارہ نمبر ملایا ہو لیکن ریسیور تو دور رکھا ہوا تھا' لائن کیسے مل سکتی تھی۔

میں نے مایوسی سے ریسیور کریڈل پر رکھا۔ میں نے تو اس سے یہ بھی نہیں پوچھا تھا کہ وہ کہاں سے بات کررہی ہے۔ کسی پبلک کال آفس سے یا کسی دُکان سے۔

گھنٹی پھر بجی تو میں نے کسی تمہید کے بغیر کہا "شیلی!"

جواب میں کوئی انتہائی بے ہودہ طریقے پر ہنسا "شیلی نہیں۔ کہو شیلی میری جان۔ کہاں ہو تم۔ تمہارے بغیر میں یہاں تڑپ رہا ہوں۔"

"شٹ اپ۔ کون ہو تم؟" میں نے کہا۔

"نام' ولدیت' پتا۔ سب بتاؤں پیارے" اس نے میرا تمسخر اُڑانے کے انداز میں کہا "صرف نام سے کیا ہوگا۔ بات کروگے شیلی سے۔"

ایک لمحے کے لیے میرا ذہن خوف سے مفلوج سا ہوگیا۔ کیا کسی نے شیلی کو اغوا کرلیا ہے مگر یہ کیسے ممکن ہے۔ ابھی چند منٹ پہلے تو وہ مجھ سے بات کررہی تھی اور اس کی کسی بات سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ کسی کی قید میں ہے یا جبر کے تحت بات کررہی ہے۔ لیکن کچھ ہونے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ چند سیکنڈ پہلے بستہ لے کر گھر سے نکلنے والا اور حصول علم کی طلب میں مکتب کی جانب قدم بڑھانے والا بچّہ اچانک کسی تیز رفتار بس یا ٹرک کے نیچے آکے دوسری دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ مستقبل کا معمار پلک جھپکتے میں داستانِ ماضی ہوجاتا ہے۔ آنکھوں میں خواب بسائے شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ کسی کے نام سے تحفہ وصول کرنے والی لڑکی کو پارسل بم کے دھماکے پر حیران یا دُکھی ہونے کی مہلت تک نہیں ملتی۔ ہنی مون کے لیے مری یا نتھیا گلی جانے والے نئے شادی شدہ جوڑے کے ہونٹوں پر محبت کے غرور سے معمور مسکراہٹ اور آنکھوں میں بسے ہوئے جنت کے نظارے بس کے کھڈ میں گرتے ہی جہنم کے شعلوں میں خاکستر ہوجاتے ہیں۔

کیا پتا اس آخری جملے کے بعد جو شیلی نے مجھے مخاطب کرکے کہا تھا' کسی نے...

"بڑا دھکا لگا ہے دل کو پیارے۔ گُنگ ہوگئی زبان...." اس شخص نے مجھے اپنے لہجے کی حقارت آمیز کاٹ سے چونکادیا۔

صاف ظاہر تھا کہ وہ آواز بنا کے بول رہا ہے۔ ریڈیو ڈرامے کے کردار کی طرح جسے صرف آواز سے اپنی بدباطنی کا اظہار کرنا ہو۔ وہ اپنے طرزِ تخاطب سے میرے دل میں نفرت اور اشتعال کے جذبات پیدا کرنے میں کامیاب تھا۔

"میں نے پوچھا تھا کہ تم کون ہو؟" میں نے سنبھل کے سخت لہجے میں کہا۔

"یہ بھی جان لوگے کسی دن۔ اور ہم کیا کہیں' جب تم جانتے بوجھتے انجان بن رہے ہو۔ سچ کہو' کیا تم جانتے نہیں ہمیں پیارے..."

"پیارے کی اولاد۔ شیلی سے کیا تعلق ہے تمہارا؟"

"شیلی سے... تمہارا کیا تعلق ہے پیارے؟" وہ پھر ہنسا "تم کہوگے کہ کچھ نہیں۔ تو ہم بھی کہیں گے کہ کچھ نہیں۔ بس اچھی چیز ہے۔ ولایتی مال ہے۔"

میں نے دہاڑ کے کہا "بکواس بند کرو اپنی۔ کیا تم نے شیلی کو اغوا کرلیا ہے؟"

"اغوا! اجی توبہ توبہ۔ ایسا کام ہم نہیں کرتے پیارے۔ ہم تو بس کچے دھاگے سے باندھ دیتے ہیں اور پھر چلے آتے ہیں سرکار بندھے۔ کیا سمجھے؟" اس نے مکروہ طریقے پر ہنس کے کہا۔

میں سوچ رہا تھا کہ یہ لہجہ اور یہ آواز بنا کے والا کون ہوسکتا ہے مگر میرے ذہن میں کوئی صورت واضح نہیں ہوتی تھی۔ میرے تصور میں ایک بدصورت اور بدکردار چہرہ تھا جس کے قرب سے تعفن اور کراہیت کا احساس جاگتا ہو۔

"تم جھوٹ بکتے ہو۔" میں نے ہمت سے کام لیتے ہوئے اندھیرے میں تیر چلادیا "شیلی تمہارے پاس کیسے ہوسکتی ہے؟"

"کل رات تو وہ تمہارے پاس تھی پیارے۔ کیا ہم نے کوئی اعتراض کیا تھا؟ وہ کیا ہے کہ... آج تم کل ہماری باری ہے... کیا سمجھے؟"

میں نے محسوس کرلیا تھا کہ وہ شخص مجھے مشتعل کرکے لطف اندوز ہورہا ہے اور یہ میری بے وقوفی ہے کہ میں اس کے بھونکنے سے مشتعل ہورہا ہوں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ چیخ چلّا کے یا جواب میں گالیاں دے کے میں اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔ ابھی تو اس کا جھوٹ سچ بھی ثابت نہیں ہوا۔

"آخر تم کیا چاہتے ہو؟" میں نے قدرے پُرسکون لہجے میں کہا۔

"چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسد۔" اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "اب اتفاق دیکھو پیارے کہ یہی اپنا نام بھی ہے۔ اسد۔ کیا سمجھے؟"

"سب سمجھ گیا۔ تم جو بھی ہو' بہت اچھے صداکار ہو۔ میں تمہیں نہیں پہچان سکا" میں نے کہا "دوستوں کی بات الگ ہے' کسی باذوق دشمن سے پہلی بار واسطہ پڑا ہے۔ چلو میری بات کراؤ شیلی سے۔"

"رات بھر کیا باتیں کرنے کی فرصت ہی نہیں ملی تھی کہ اتنے بے تاب ہو پیارے۔" وہ ہنسا "اجی' اس کی باتوں میں گلوں کی خوشبو۔ اور کیوں نہ ہو' اس رنگ' روپ اور جوانی کی خوشبو ہی تو دیوانہ کرتی ہے آدمی کو۔ ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے...."

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ تم نے دل لگی کی ہے میرے ساتھ۔ شیلی نے ابھی فون کیا تھا مجھے۔"

"یہ بھی سچ ہے۔ ایسا ہوتا ہے پیارے کہ شکار خود کھنچا چلا آتا ہے جال کی طرف۔ کیا سمجھے؟ ہم نے بھی کہا کہ چلو فون کے بہانے ہی سہی۔ وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے۔ کیا سمجھے۔ ہم نے تو سمجھادیا کہ حضور آئے اپنی مرضی سے' اب جانا ہماری مرضی سے..."

میں اپنی بات پر اڑا رہا "یہ سب کچھ مجھے شیلی بھی بتاسکتی ہے پیارے۔ اگر تم جھوٹ نہیں بول رہے ہو تو فون اسے دو۔ ابھی سب معلوم ہوجائے گا۔"

"ایسا لگتا ہے کہ ابھی تک تم نے ہمارے پیغام کو قابلِ توجہ

نہیں سمجھایا شاید تم کو معلوم ہی نہیں پیارے کہ...“

میں نے اپنے ہاتھ کے لفافے کو دیکھا ”یہ خط تم نے بھیجا ہے... کیوں؟“

اس نے پھر آہ بھری ”خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو۔ ارے پیارے ہم تو عاشق ہیں...“

اب میرا شک تقویت پکڑنے لگا تھا کہ اس کی باتیں محض باتیں ہیں اور فی الحقیقت وہ شیلی کا نام مجھے مشتعل یا خوف زدہ کرنے کے لیے استعمال کررہا ہے۔

میں نے پھر پانسہ پھینکا ”خط دیکھ لیا ہے میں نے۔“

”پھر کیا سوچا ہے پیارے۔ یہ بھی تو فرماؤ۔“

”سوچ کے فرماؤں گا۔“ میں نے کہا ”پہلے تم فرماؤ کہ شیلی سے بات کرانے میں تامل کیا ہے؟“

”تامل کیسا... لیکن پہلے اپنی باتیں تو ہوجائیں...“

”فضول باتوں کے لیے وقت نہیں ہے میرے پاس“ میں نے کہا اور ریسیور نیچے رکھ دیا۔

میں نے ایک جُوا کھیلا تھا۔ میں نے یہ ظاہر کیا تھا کہ نہ میں اس کی باتوں سے خوف زدہ ہوا ہوں‘ نہ میں نے اس کی بکواس پر اعتبار کیا ہے۔ میں نے اس کے خط کو قطعی اہمیت نہیں دی اور میں بلیک میل ہونے پر بھی تیار نہیں۔ مجھے یقین تھا کہ وہ میرے رویے سے دل برداشتہ نہیں ہوگا لیکن دوبارہ فون کرے گا تو فضول باتوں میں وقت گنوانے سے گریز کرے گا۔

اگر میں چاہتا تو ریسیور نیچے رکھ سکتا تھا یا آپریٹر سے پوچھ سکتا تھا کہ میری واضح ہدایات کے باوجود ایک غیر متعلقہ شخص کی فون کال مجھے کیوں دی گئی؟ شیلی کی بات اور تھی... اس نے آپریٹر کو بتادیا تھا کہ وہ کون ہے اور آپریٹر نے اس کے باوجود مجھ سے پوچھا تھا۔

گھنٹی پھر بجی مگر اب آپریٹر نے کہا ”سر! کوئی مسٹر اسد ہیں۔“

میں نے کہا ”ابھی تم نے اس کی کال ملائی تھی۔ کیوں؟“

”سوری سر۔ میں سمجھا تھا‘ آپ کی مسز کی کال شاید ڈس کنکٹ ہوگئی تھی۔“

”تم نے میری مسز کی اور مسٹر اسد کی آوازوں میں فرق کو محسوس ضرور کیا ہوگا۔“ میں نے خفگی سے کہا۔

”وہ... سر... پہلے بھی مسٹر اسد نے بات کی تھی اور کہا تھا کہ آپ کی وائف بات کرنا چاہتی ہیں... ایسا ہوتا ہے سر۔ پبلک کال آفس سے پہلے کوئی مرد ہی بات کرتا ہے۔ کنفرم کرتا ہے پہلے...“

”اوکے‘ اوکے۔ لائن دو۔“ میں نے بیزاری سے کہا۔

اسد کی آواز دوبارہ سنائی دی ”بڑا انتظار کراتے ہو پیارے۔“

میں نے کہا ”میں تمہیں دس سیکنڈ دوں گا۔ یا تو میری بات کراؤ شیلی سے ورنہ میں تمہاری ایک نہیں سُنوں گا۔ ابھی تک میں نے صرف آپریٹر کو تاکید کی تھی مگر اب یہ انتظام کرنا پڑے گا کہ میرے نام کوئی کال آئے تو اس کا نمبر ٹریس ہوجائے۔“

وہ ہنسا ”یہ پاکستان ہے پیارے۔ یہاں اس قسم کے انتظام میں بڑی دیر لگتی ہے۔ ٹیلی فون کے محکمے والے ایسے کہاں کہ تم کہو اور وہ مان لیں۔“

میں نے کہا ”یہ بندوبست کریں گے ہوٹل والے۔ انہیں مستعدی پیدا کرنے کے طریقے آتے ہیں۔ تم یہ بات نہیں جانتے تو جان لو کہ ہر اچھے ہوٹل کو اپنی نیک نامی عزیز ہوتی ہے اور اس کی حفاظت کی قیمت وہ سب کو ادا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بارے میں کبھی کوئی غلط خبر نہیں بنتی۔ ورنہ ہوٹلوں میں کیا نہیں ہوتا۔ لیکن مہمانوں کو پریشانی نہ ہو‘ یہ بات وہ ہر قیمت پر یقینی بناتے ہیں۔“

مجھے اچانک احساس ہوا کہ میں اپنے آپ سے باتیں کررہا ہوں۔ جو کچھ میں ریسیور میں بول رہا تھا وہ صرف میرے کان سُن رہے تھے۔ دوسری طرف نہ جانے کب ریسیور رکھا جاچکا تھا۔

میں نے ایک بار ”ہیلو“ کہا پھر سخت کوفت اور جھنجلاہٹ کے ساتھ ریسیور رکھنے پر مجبور ہوگیا۔ مجھے پھر اپنی غلطی کا احساس ہونے لگا تھا کہ اس شخص کو باتوں میں لگا کے اس سے کچھ اُگلوانے کے بجائے اسے دھمکی دے کر میں نے عقلمند ہونے کا ثبوت نہیں دیا تھا۔ میں پہلی بار ریسیور رکھنے کے بعد آپریٹر سے کہہ سکتا تھا کہ اب جو بھی کال آئے اسے ٹریس کرنے کا فوری بندوبست کیا جائے اور ہوٹل کے کسی دوسرے فون سے ایکس چینج کا نمبر ملا کے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی جائے کہ اسد کہاں سے بات کررہا ہے۔

کچھ ہوٹل والے کال کا بل تو مہمان کے کھاتے میں ڈالتے ہیں لیکن ان کے اور ٹیلی فون کے محکمے کے آپریٹرز کے درمیان مفادِ باہمی کا معاہدہ ہوتا ہے چنانچہ ہوٹل کی فون کالز کا بل محدود رہتا ہے۔ ایسی صورت میں یہ ناممکن نہیں تھا کہ میں اسد کو باتوں میں اُلجھالیتا اور ہوٹل والے اپنے خصوصی ذرائع استعمال کرتے ہوئے اس کا نمبر معلوم کرلیتے۔

اسد نام کا یہ شخص دوست بہرحال نہیں تھا لیکن دشمن تھا تو دلاور اینڈ کمپنی کے شکاری ٹولے میں نیا شامل ہوا تھا یا اسے ہم پر نگرانی سونپی گئی تھی۔ وہ ہوٹل کے اندر بھی ہوسکتا تھا جہاں خاموشی سے ہماری نقل و حرکت پر نظر رکھتے ہوئے اپنا کام بھی جاری رکھ سکتا تھا اور ”اضافی خدمات“ کا معاوضہ بھی وصول کرسکتا تھا۔ اپنی طرف سے میں نے احتیاط کے تمام تقاضے پورے کیے تھے مگر کوئی مسلسل ہمارے تعاقب میں تھا اور یہ جانتا تھا کہ گزشتہ شب شیلی میرے ساتھ تھی۔

انتہا یہ کہ اسے کچھ دیر پہلے دروازے کے نیچے سے کمرے میں پہنچائے جانے والے خط کے بارے میں بھی معلوم ہوچکا تھا۔ اگر وہ ہوٹل کے باہر کہیں تھا تو چند منٹ میں یہ اطلاع اسے کوئی اندر کا

آدمی ہی پہنچا سکتا تھا۔

پریشانی اور فکر کے ساتھ میری فرسٹریشن میں اضافہ ہوگیا تھا۔ شیلی سے بات نامکمل رہ گئی تھی۔ اس نے میرے اچانک خاموش ہوجانے کا نہ جانے کیا مطلب لیا ہوگا اور بفرضِ محال اس کے فوراً بعد اسد اچانک اسے اغوا کرنے پہنچا ہوگا تو شیلی نے مجھے ضرور پکارا ہوگا۔ اسے جسمانی طور پر مغلوب کرنے کے لیے اور اس کی آواز کو دبانے کے لیے انہوں نے کلوروفارم میں بھیگا ہوا رومال استعمال کیا ہوگا یا شاید بے خبری میں پیچھے سے اس کے سر پر وار کرکے اسے بے ہوش کردیا ہوگا۔ میرے تصور میں نہ اسد کا چہرہ تھا اور نہ کسی حملہ آور کا۔ میں صرف شیلی کو دیکھ رہا تھا جس کا چہرہ لاش کی طرح سفید ہوگیا تھا اور وہ بے جان ہوکے اغوا کرنے والوں کے بے رحم ہاتھوں میں جھول رہی تھی۔

اسد نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا لیکن مجھے وہ سب کچھ بتادیا تھا جو ضروری تھا۔ مجھے خبردار کرنے کے لیے‘ میری حوصلہ شکنی کے لیے اور مجھے یہ سمجھانے کے لیے کہ میں لاکھ اپنی ذہانت اور ہوشیاری پر بھروسہ کرتے ہوئے کہیں بھی چلا جاؤں‘ ان کی دسترس سے دور نہیں جاسکتا۔

میرے ذہنی انتشار کا یہ عالم تھا کہ ابھی تک میں نے اس خط کو کھول کے نہیں دیکھا تھا جو تازہ خرابی کا نقطۂ آغاز تھا۔ میں ریسیور رکھنے کے بعد ایک ہاتھ ریسیور پر رکھے بیٹھا تھا اور خلا میں دیکھتے ہوئے اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا۔ یہ اعصابی کشیدگی کے نتیجے میں ہونے والی ایک اضطراری حرکت تھی۔ میں نے خود کو اچانک تنہا اور بے سہارا محسوس کیا۔ ایسے وقت میں غالب اور محسن‘ رابعہ اور نازو کے ساتھ ہونے سے کتنی تقویت حاصل رہتی تھی۔ وہ صرف حوصلہ اور تسلی ہی نہیں دیتے تھے‘ میری پریشانی کو بانٹ لیتے تھے اور پھر ہم سب مل کے سوچتے تھے کہ ان حالات سے مقابلے کے لیے کیا لائحۂ عمل اختیار کیا جائے۔ میں کبیر خاں یعنی سکندر بخت عرف سکندرِ اعظم‘ چیف کے ٹُو‘ مشن کمانڈر ایم آر ایس۔ جو کچھ بھی تھا انہی کے دَم سے تھا جو ایک متحدہ قوت تھے‘ ایک جذبے کی طاقت تھے‘ خلوص اور محبت کی علامت تھے۔ ان کے بغیر میں کچھ نہیں تھا۔ موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں!

دروازے پر دستک ہوئی تو میں بری طرح چونکا۔ پھر شیلی اندر آگئی اور اس نے اپنے پیچھے دروازہ بند کردیا۔ میں فالج زدہ شخص کی طرح ساکت بیٹھا اسے پلک جھپکائے بغیر دیکھتا رہا۔ میری آنکھیں ابھی تک ایک حقیقت کو خواب کی طرح دیکھ رہی تھیں۔ یہ بے یقینی نتیجہ تھی غیر متوقع صدمے کے بعد ملنے والی لامحدود خوشی کے احساس کی اور پُرمسرت حیرت کی اس انتہا کی جو آدمی کو پاگل کردے۔ جب کوئی خبر اچانک بے بنیاد ثابت ہوتی ہے کہ کسی کے مرگِ ناگہاں‘ کسی پر عائد ہونے والے الزامِ بے وفائی‘ یا کسی ناقابلِ تلافی نقصان کی اطلاع غلط تھی۔

شیلی نے دونوں ہاتھوں میں بنڈل اٹھا رکھے تھے جو اس نے بیڈ پر پھینک دیے ”کیا بات ہے یار! تم پاگل ہوگئے ہو؟ ایسے کیا دیکھ رہے ہو مجھے؟ کیا بجلی کا کرنٹ لگا ہے؟ مجھے تو ہارٹ اٹیک کے آثار لگتے ہیں۔“

میں نے چونک کر مسکرانے کی کوشش کی ”اس سے بھی زیادہ...“

وہ دھم سے صوفے پر گر گئی۔ ”کیا اس سے بھی زیادہ؟ تم نے تو مجھے پریشان کردیا یار۔“

”میں نے...؟“

”اور کیا میں نے۔ حد ہوتی ہے کسی بات کی یار“ وہ برہمی سے بولی ”بڑی مشکل سے ایک فون ملا تھا ایسا جہاں میری بات سننے والا کوئی نہیں تھا۔ ہر جگہ تو لوگ کھڑے ہوتے ہیں باری کے انتظار میں۔ وہ دُکان دار بھی مہذب تھا۔ خود ہی دور جا کھڑا ہوا تھا۔ اور تم نے پوری بات نہیں سُنی۔ کیا ہوگیا تھا تمہیں بات کرتے کرتے؟“

”ہارٹ اٹیک...“ میں نے اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے کہا۔

”میں تو پریشان ہوگئی تھی یار۔ بے وقوفوں کی طرح ہیلو ہیلو کرتی رہی۔ پھر نمبر ملایا۔ کم سے کم دس بار۔ آخر یہ کیا حرکت تھی یار؟ ریسیور رکھ کے اچانک کہاں غائب ہوگئے تھے؟“

”وہ... دراصل... پرانی عادت ہے غائب ہوجانے کی۔ ہم خاندانی قسم کے بھوت ہیں۔“

اس نے فریج سے بوتل نکال کے منہ سے لگائی ”میں سخت احتجاج کرتی ہوں۔ یہ بدتہذیبی ہے بلکہ بے عزتی کی ہے تم نے میری یار۔ بات کیے بغیر ریسیور رکھ دیا ایک طرف۔ کیا میں بے وقت کی راگنی گارہی تھی یا بور کررہی تھی تمہیں اپنی باتوں سے؟“

”جب تمہارے دل کا سارا غبار نکل جائے تو بتادینا۔ اس وقت تک میں صرف مسکراتا رہوں گا“ میں نے کہا۔

”کیوں؟“ وہ چراغ پا ہوکے بولی ”بتا نہیں سکتے مجھے کہ ایسی کیا آفت آگئی تھی؟“

میں نے کہا ”تم یقین نہیں کروگی۔“

”یار کیوں یقین کروں گی میں۔ جیسا میں چھوڑ کے گئی تھی ویسے ہی ہٹے کٹے بیٹھے ہو۔ مجھے تو ڈر تھا کہ تمہیں کچھ ہوگیا ہے۔“

”ہارٹ اٹیک...؟“

”سچ بتاؤں۔ بڑے بُرے بُرے خیال آرہے تھے دل میں۔ کہیں اچانک تمہیں کسی نے ناک آؤٹ تو نہیں کردیا۔ پیچھے سے سر پر ڈنڈا مار کے یا کلوروفارم سُنگھا کے۔ کسی نے خنجر تو نہیں گھونپ دیا۔ سائلنسر والے پستول سے گولی تو نہیں ماردی۔ ہارٹ اٹیک کا خیال بھی آیا تھا۔ کہ کھڑے کھڑے پٹ سے گرے اور

بس۔ دی اینڈ۔"

میں نے کہا "تم کیسی لڑکی ہو۔ ایسی باتیں کرتی ہو میرے منہ پر۔"

"یار پھر کیا کروں۔ جھوٹ بولوں؟"

"لڑکیاں تو بری بات منہ سے نکالتے ہوئے ڈرتی ہیں۔ کوئی اور کرے تو کہتی ہیں۔ ہائے اللہ... دشمنوں کے منہ میں خاک۔"

"میں اللہ وسائی بنت اللہ رکھا نہیں ہوں اور نہ مجھے کیا کیس ہے کوئی۔ بجائے شرمندہ ہونے اور معافی مانگنے کے الٹا تم مجھے الزام دے رہے ہو یار۔ تم کو ذرا احساس نہیں کہ پریشانی اور بدحواسی میں میرا کیا حال تھا۔ میں سب کچھ چھوڑ کے بھاگی۔ راستے بھر ڈرائیور کو کہتی رہی کہ جلدی کرو۔ تیز چلو۔ خوف سے میرا ہارٹ فیل بھی ہو سکتا تھا۔ کتنی TENSE ہوں میں۔ یہاں تم آرام سے بیٹھے مسکرا رہے ہو..."

میں نے اس کا ہاتھ تھام کے کہا "ول یو پلیز شٹ اپ ڈیئر شیلی تا کہ میں بھی بول سکوں؟"

"یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے' کس کا خط ہے؟" برا مانے بغیر اس نے ایک ہاتھ سے اپنی زلفوں کو پیچھے ہٹایا۔

"ساری خرابی کا ذمے دار یہی لفافہ ہے" میں نے کہا اور لفافے کو کھولا۔

شیلی اٹھ کر میرے قریب آئی اور جھک کر اس کاغذ کو دیکھنے لگی جو میں نے ابھی کھولا ہی تھا۔ اس کے سارے بال پھسل کر چہرے پر آ گئے تھے اور اس کا چہرہ مجھ سے چند انچ کے فاصلے پر تھا۔ اس کے وجود سے پھوٹنے والی سنسنی خیز مہک میرے حواس پر حملہ آور ہوئی۔ میرے لیے یہ بھی ناممکن ہو گیا تھا کہ میں اپنی نظر کو زلف و رخسار سے نیچے اور سایۂ زلف کے دامن میں نہاں حسن کی جلوہ گاہ تک پھسل جانے سے روک لوں۔

میں نے گھبرا کے اسے پیچھے دھکیلا "بھئی ایسی کیا بے تابی ہے۔ تم کیا مجھ سے بھی پہلے دیکھو گی۔"

اس نے کاغذ میرے ہاتھ سے اچک لیا اور سیدھی ہو گئی۔

"ہاں۔ رابعہ کا خط ہے نا..."

اچانک اس کی آواز بند ہو گئی اور اس کی نظر ٹھہر گئی۔ میں نے اس کے تیزی سے بدلتے ہوئے رنگ کو دیکھا اور کاغذ اس کے ہاتھوں سے لے لیا۔ اس پر کسی نے اخبار سے ایک تصویر کاٹ کے چپکا دی تھی۔ اصل تصویر جنوبی افریقہ کی سفید فام اقلیت کی نسل پرست حکومت کے ظلم و بربریت کا منہ بولتا ثبوت تھی جو سیاہ فام اکثریت کو انسانیت سوز قوانین کی مدد سے عبرت ناک سزائیں دے کر شیطانی انصاف کا بول بالا کر رہی تھی۔ یہ سب قوانین متعصبانہ اور یکطرفہ تھے۔ مثلاً سفید فام مرد کے لیے کسی نیگرو عورت کی آبروریزی محض "غلطی" تھی۔ اس کے برعکس سیاہ فام کے خلاف کسی گوری عورت کا صرف الزام ہی اسے پھانسی دینے کے لیے کافی سمجھا جاتا تھا۔ پھانسی سرعام دی جاتی تھی۔ یہ تصویر ایسے ہی کسی "مجرم" کی تھی جس کی لاش رسی کے پھندے میں لٹکی ہوئی جھول رہی تھی۔

مجھے خط بھیجنے والے نے اس تصویر کا اصل چہرہ ہٹا کے اس کی جگہ میرا چہرہ لگا دیا تھا۔ یہ کام بڑے بے ڈھنگے پن سے کیا گیا تھا۔ رسی سے جھولنے والے سیاہ فام کے جسم کے مقابلے میں میرا چہرہ بہت بڑا تھا۔ اس تصویر کی دوبارہ بلیک اینڈ وائٹ تصویر بنائی گئی تھی مگر نتیجہ پھر بھی مضحکہ خیز ہی رہا تھا۔ میں نے کبھی کسی پھانسی پانے والے کی تصویر تک نہیں دیکھی مگر میں نے پڑھا اور سنا ہے کہ اس کی آنکھیں حلقوں سے ابل آتی ہیں' زبان باہر لٹک جاتی ہے اور گردن لمبی ہو جاتی ہے۔ شاید مرنے والے کی صورت بھی اتنی ہی بھیانک ہو گی مگر میرے چہرے پر موت کا کوئی تاثر نہیں تھا۔ میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی اور میری آنکھیں میری طرح زندہ تھیں۔ تاہم کہنے والے نے تصویر کی زبان میں سب کہہ دیا تھا اور دکھا دیا تھا۔

"وہائی گاڈ!" شیلی نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "یہ ... کیا بیہودگی ... حد ہے آخر اس کا؟"

میں ابتدائی ذہنی صدمے سے سنبھل چکا تھا۔ خود کو پھانسی کے پھندے سے معلق دیکھنا یقیناً ایک دہشت زدہ کرنے والا تجربہ تھا مگر میں نے شیلی کے سامنے کسی کمزوری کا مظاہرہ نہیں کیا۔ یوں بھی اس تصویر میں اور تحریری طور پر الفاظ میں دی جانے والی قتل کی دھمکی میں کوئی فرق نہیں تھا۔ فرق صرف اثر یا IMPACT کا تھا۔ مجھے ایک جملہ لکھا ہوا ملتا کہ "تمہیں جان سے مار دیا جائے گا" تو میں اسے فوراً پھاڑ کے پھینک دیتا اور بھول جاتا۔ یہی بات کوئی مجھ سے فون پر کہتا کہ سکندر اب تمہیں پھانسی سے کوئی نہیں بچا سکتا تو اثر یقیناً زیادہ ہوتا اور میں کچھ عرصہ تصور میں وہی آواز سنتا رہتا لیکن سب سے زیادہ اثر تصویر کا ہوا تھا۔ فارسی کی پرانی کہاوت ہے۔ شنیدہ کہ بود مانند دیدہ۔ یعنی سنا ہوا دیکھے ہوئے کے برابر کیسے ہو سکتا ہے؟

"ڈاکٹر شیلی! اپنے بیگ میں سے دو چار سکون آور گولیاں نکال کے کھاؤ" میں نے مسکرا کے کہا "ایک تصویر نے اتنا نروس کر دیا ہے تمہیں۔"

اس نے کہا "یہ تصویر مذاق نہیں ہے یار؟"

"ہاں۔ یہ ایک خواہش کا عکس ہے۔" میں نے کہا "اور ہر شخص کے دل میں خواہشات اس کی ذہنیت کے مطابق ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے میرا ہر دشمن یہی خواہش رکھتا ہے اور خود میں بھی کیا ان کا بھلا چاہتا ہوں۔ نہیں۔ میں بھی انہیں کتے کی موت مارنا چاہتا ہوں مگر نہ میرے چاہنے سے کچھ ہو گا' نہ میرے دشمنوں کے خواہش کرنے سے۔ یہ تو تقدیر کے مسائل ہیں جن پر خدا کا اختیار کامل ہے۔"

"تمہیں دھمکی دی ہے کسی نے؟" وہ غصے سے بولی۔

"پھانسی تو نہیں دی۔ پھر گھبرانے کی کون سی بات ہے؟ اس وقت جب میں تم سے فون پر بات کر رہا تھا تو کسی نے یہ لفافہ دروازے کے نیچے سے اندر سرکایا تھا اور ایک سیکنڈ ضائع کیے بغیر میں ریسیور رکھ کے دوڑا تھا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ شاید باہر کوئی ہو۔ مگر بہت دور صرف ایک ویٹر جا رہا تھا اور مجھے یقین ہے کہ یہ حرکت اس کی نہیں تھی۔"

وہ ہکا بکا بیٹھی سب سنتی رہی۔ میں نے اسے اسد نام کے کسی شخص کی ٹیلی فون کال کے بارے میں تفصیل سے بتایا "یہ تھی میرے بات کرتے کرتے غائب ہو جانے کی اصل وجہ... یہی وجہ تھی کہ تم ... نہیں ملی۔"

"یہ تو بڑی گڑبڑ ہے یار۔" شیلی متفکر ہو گئی "کون ہے جو سائے کی طرح ہمارے پیچھے لگا ہوا ہے؟"

"اگر تم یہ بتا دو تو میری طرف سے منہ مانگا انعام۔"

"دیکھو میں بتا دوں گی۔ بعد میں مکر مت جانا" وہ مسکرائی "انعام... گے؟"

میں نے سینے پر ہاتھ رکھا "جان مانگ لے ... جانے ... سکندر بخت نہیں' بندر بخت کہنا۔ قول مردانہ..."

"تمہاری جان لے کر کیا کروں گی میں یار۔ ہاتھ ملاؤ' جو مانگوں گی دو گے نا؟"

میں نے ہاتھ ملا کے کہا "منظور۔ تم بتاؤ کون ہے وہ مگر نام بتانا پڑے گا۔"

"چوہدری دلاور۔" اس نے کہا "ثابت کرو کہ یہ غلط ہے۔"

میں نے سر کھجا کے کہا "غلط تو نہیں ہے....."

"اگر غلط نہیں ہے تو پھر صحیح ہے" اس نے فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا "یار تم شرط ہار گئے۔"

"اوکے۔ چالاک لڑکی۔" میں نے کہا "مانگو کیا مانگتی ہو۔"

اس کی نظر میرے ہاتھ پر جم گئی "لاؤ یار' یہ انگوٹھی مجھے دے دو۔"

میری مسکراہٹ کافور ہو گئی "یہ انگوٹھی...؟"

"کیا بہت قیمتی ہے؟" اس نے طنز سے کہا "بہت زیادہ مانگ لیا میں نے؟"

میں نے محسوس کیا کہ جو بات میں نے مذاق میں کہی تھی وہ ایک سنگین غلطی بن گئی ہے "بات قیمت کی نہیں۔"

"پھر کیا بات ہے؟ بیک آؤٹ کرو گے؟ اتنی جلدی۔"

"نہیں.... دراصل یہ انگوٹھی رابعہ کی ہے۔ تم کچھ اور مانگ لو۔"

"یار' رابعہ کی ہو یا فوزیہ کی' مجھے یہی چاہیے ورنہ چھوڑو۔ پھر کبھی قول دے کر پھرنے کی یا اپنے مرد ہونے کی بات مت کرنا۔"

غصے سے میرے کان گرم ہو گئے "یہ جو کچھ تم کر رہی ہو ڈاکٹر شیلا خان! یہ غلط ہے' بد اخلاقی ہے' غلط فہمی ہے تمہاری۔"

"چلو یار کمینگی ہے میری۔ میں مانتی ہوں۔ مگر تم اتنے خوف زدہ کیوں ہو اپنے آپ سے؟ کیا رابعہ کی دی ہوئی انگوٹھی مجھے دے دو گے تو رابعہ کی محبت ختم ہو جائے گی؟ اس انگوٹھی میں ہی ہے ساری محبت؟ جیسے جادوگر کی جان ہوتی تھی کسی طوطے میں یا جن کی طاقت تھی الٰہ دین کے چراغ میں۔"

میں نے بڑی مشکل سے غصے کو ضبط کیا "شیلی! خدا کے لیے سمجھنے کی کوشش کرو۔ رابعہ پہلے ہی بدگمان ہو گئی تھی۔"

"محبت میں بدگمانی نہیں ہوتی مگر بدگمانی کے بغیر محبت بھی نہیں ہوتی ہے یار۔ پہلے کبھی آزمایا تھا تم نے رابعہ کو؟ نہیں آزمایا تھا نا؟ تم کو اعتماد نہیں تھا۔"

"یہ غلط ہے۔"

"یار' سونے کو دس بار کسوٹی پر دیکھو۔ خالص ہو گا تو ہر بار سونا ہی ثابت ہو گا۔ ڈرتا وہ ہے جسے شک ہو کہ ملاوٹ ہو گی تو پتا چل جائے گا۔ حالات کی آزمائش نے کیا ثابت کیا آخر؟ یہی نا کہ وہ تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی۔"

"پلیز شٹ اپ۔"

"سچ کو سنو یار۔ جھوٹ ہے تو میرے منہ پر تھپڑ مارو۔ پہلے بڑے دعوے ہوتے ہیں دکھ سکھ میں ساتھ دینے کے' ساتھ مرنے جینے کے۔ وقت آنے پر سب کھوکھلے ڈھونگ ثابت ہوتے ہیں" شیلی نے کسی سفاک مسیحا کی طرح نشتر زنی جاری رکھی "ایک بے بنیاد فضول بات پر وہ بدگمان ہو گئی۔ اس نے تم پر شک کیا' اپنے اعتبار کو رسوا کیا۔ یار یہ محبت ہے؟ مائی فٹ! اس نے تم سے پوچھنا تک تو گوارا نہیں کیا' تمہاری وضاحت نہیں سنی۔ آخر کیوں؟ کیا جرم کیا تھا تم نے؟ اول تو تم نے کوئی جرم کیا ہی نہیں تھا۔ یہ تم بھی جانتے ہو یار اور مجھے بھی معلوم ہے۔ مگر وہ کیوں مجھے گالی دے گئی چلو یار میں طوائف بھی سہی مگر تم نے جرم کیا تھا تب بھی کیا وہ تمہیں معاف نہیں کر سکتی تھی؟ اتنی گنجائش بھی نہیں ہے اس کے دل میں یار؟"

"بند کرو اپنی بکواس۔ تم کیا جانو محبت کو۔"

"میں جانتی ہوں سر! محبت کیا ہوتی ہے۔ محبت اور ملکیت میں جو فرق ہوتا ہے' وہ میں سمجھتی ہوں۔ وہ تمہیں OWN کرنا چاہتی ہے۔ جیسے یہ محبت نہیں غلامی ہے۔ کبھی تم نے یہ زنجیر توڑنے کی خواہش بھی کی تو تمہارا یہ جرم ناقابل معافی ہو گا؟ ایسی ہوتی ہے محبت تو لعنت اس محبت پر۔"

میرا سارا وجود شیلی کے خلاف نفرت کی آگ میں دہک رہا تھا اور اس کی تپش مجھے اندر سے جھلسا رہی تھی۔ میرے منہ سے نکلنے والی ایک بے ضرر سی بات وہ چنگاری بن گئی تھی جس نے یہ آگ بھڑکائی تھی۔ اب وہ اس آگ کو ہوا دے رہی تھی اور میرے لیے یہ اذیت ناقابل برداشت ہو گئی تھی۔

میں نے اس کے منہ پر تھپڑ مارا "اس کے آگے کچھ مت کہنا۔"

وہ لڑکھڑا کے پیچھے ہٹی "ایک تھپڑ مار کے تم کیا سمجھتے ہو یار' سچ بدل جائے گا؟ یا تم خود کو سچا ثابت کرلو گے؟ سچ میں بتاتی ہوں۔ اگر مجھے محبت ہو کسی سے تو میں اسے اپنی ملکیت نہیں سمجھوں گی۔ وہ غلام نہیں ہوگا میرا۔ میں اس سے یہ توقع نہیں رکھوں گی کہ ہر قیمت پر صرف میری خوشی کا اور میرے جذبات کا خیال رکھے اور اپنے آپ کو' اپنی ہستی کو مٹا دے۔ نہیں۔ مجھے اس کی خوشی عزیز تر ہوگی' اس کے جذبات کا پاس ہوگا۔ بائی گاڈ' وہ جسے چاہے گا وہ بھی میرا محبوب ہوگا۔ وہ جس سے چاہے شادی کرلے' جس سے چاہے جسمانی تعلق قائم کرے۔ مجھے کیا یار' میں اس سے محبت کرتی ہوں تو بس کرتی رہوں گی۔ کسی شرط اور پابندی کے بغیر' کسی ڈر کے بغیر۔ مگر تم تو غلام ہو محبت کی زنجیر میں جکڑے ہوئے" وہ ہنسنے لگی۔ اس کی ہنسی میں ہسٹریا تھا۔ درحقیقت یہ آنسو تھے جو آنکھ سے نہیں ٹپک سکتے تھے تو ہنسی بن کے نکل رہے تھے۔ جیسے بوائلر میں پانی اُبلتا ہے تو بھاپ بن کے نکلتا ہے۔

میں نے کہا "اسٹاپ اِٹ ڈاکٹر شیلی۔ تم اپنی بے بسی پر کیوں رو رہی ہو؟ اپنے ساتھ یہ ظلم مت کرو۔ آنسوؤں کو بہنے دو۔ انہیں زبردستی ہنسی کی چٹان کے نیچے مت دباؤ ورنہ تم پاگل ہو جاؤ گی۔"

وہ بیڈ کے کنارے پر ٹک گئی "آئی ایم آل رائٹ یار۔ تم تو مجھ سے بھی زیادہ بے بس ہو۔ میں اپنے آپ پر ہنس بھی سکتی ہوں اور آنسو بھی بہا سکتی ہوں لیکن تم مرد ہو' رونا تمہاری شان کے خلاف ہے' تمہاری انا کی شکست ہے اور اپنے آپ پر ہنسنے کا تم میں حوصلہ نہیں۔"

"تم یہ سب کتابی باتیں بھول جاؤ گی شیلی۔ محبت اور محبت کا فلسفہ دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔ جو کچھ تم نے کہا وہ عقل کی بات تھی۔ محبت جذبات کا کھیل ہے۔"

"کھیل...؟ واقعی محبت کو کھیل سمجھ کے کھیلتے ہیں لوگ یار۔ جیسے ایکٹر سنیما کے اسکرین پر محبت کی اداکاری کرتے ہیں۔ ان کے جذبات بھی کتنے حقیقی نظر آتے ہیں۔"

"کیا مطلب ہے آخر تمہارا؟ میں یا رابعہ اداکاری کر رہے تھے؟ مجھے اب غصہ نہیں' ترس آتا ہے تم پر کیونکہ تم نے کسی سے محبت نہیں کی۔ نیورولوجی سے تم ذہن اور اعصاب کے مسائل کو سمجھ سکتی ہو' محبت کو نہیں۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟ تم اس کے سوا میرے بارے میں کیا جانتے ہو جو خود میں نے تمہیں بتایا ہے؟" اس نے میرا تمسخر اڑاتے ہوئے کہا "تمہارے نزدیک تو محبت ایک جذبہ نہیں یار' ایک فارمولا ہے خوش گوار ازدواجی زندگی کا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ پہل مجنوں کرے اور لیلیٰ کے سامنے دوزانو ہو کے اور سینے پر ہاتھ رکھ کے کہے کہ میں تم پر مرتا ہوں لیلیٰ' تم نہ ملیں تو میں مر جاؤں گا۔ لیلیٰ کا ملنا شرطِ اول ہے یار۔ محبت کی تان شادی پر آکے ٹوٹتی ہے۔ ایک پیارے سے گھر کے خواب پر آکے محبت کا ڈراپ سین ہو جاتا ہے۔ ہر فلم کی طرح۔ شادی کے بعد مایوسی کا اینٹی کلائمکس آتا ہے جب جذبات کی حدّت اور شدّت ختم ہو جاتی ہے اور شوہر کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یار اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔ محبوبہ جب بیوی بنتی ہے تو عام عورت ہو جاتی ہے۔"

اس سے بحث لاحاصل تھی اور خفّت کے ساتھ اب مجھے یہ احساس بھی ہو رہا تھا کہ اس نے مجھے غلط وقت پر غلط مسئلے میں اُلجھالیا ہے۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی جذبات کے فوری ردِّعمل سے مغلوب ہو گیا تھا اور اسے جھانپڑ مار کے میں نے گویا تسلیم کرلیا تھا کہ میرے پاس کوئی دلیل نہیں تھی۔ اصولاً مجھے نہ دلیل دینے کی ضرورت تھی اور نہ بحث میں پڑنے کی۔

میں نے کہا "شیلی! پلیز کوئی اور بات کرو۔ آئی ایم رئیلی سوری۔ میں نے تم پر ہاتھ اٹھایا۔ مجھے معاف کردو۔"

"معافی کی کون سی بات ہے یار۔ یہ تو ساری دنیا کے مردوں کا رویّہ ہے۔ مرد کی آخری دلیل یہی ہوتی ہے۔ یورپ' امریکا کے مہذب معاشرے میں بھی عورت صنفِ نازک ہے اور مرد طاقتور۔ وہاں بھی وہ ایسا ہی کرتے ہیں کہ پہلے عورت کو چُپ کرا دیتے ہیں پھر سوری کہہ کے بات ختم کر دیتے ہیں۔"

"خدا کے لیے میرا دماغ خراب مت کرو۔ خاموش ہو جاؤ۔"

"میں خاموش ہو جاؤں گی مگر بات جو تم نے کہی تھی۔ قولِ مرداں والی۔ وہ تو باقی رہے گی یار" وہ آہستہ سے اٹھی اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

میں ایک بار پھر مشتعل ہو گیا۔ وہ مسلسل میری' میری محبت کی' میری مردانگی کی اور میرے جذبات کی تذلیل کر رہی تھی "او کے۔ احمق اور ضدی لڑکی۔ یہ لو" میں نے غصے میں اپنی انگلی سے انگوٹھی کو کھینچ کے اتارا اور اس کی طرف پھینک دیا "پہن لو اسے اپنی انگلی میں۔ اگر یہی کفارہ ہے میری غلطی کا تو ٹھیک ہے۔ جی چاہے تو نمائش کرو اس کی۔ ساری دنیا کو بتا دو کہ یہ انگوٹھی مجھے سکندر نے دی ہے۔ مگر کیا فرق پڑے گا اس خود فریبی سے؟"

اس نے انگوٹھی کی طرف نگاہ اٹھا کے نہیں دیکھا جو دیوار سے ٹکرا کے قالین پر گر گئی تھی۔ "ماشاء اللہ سکندر صاحب! آپ پڑھے لکھے اور مہذب نظر آتے ہیں اور سمجھے جاتے ہیں۔ ولایت پلٹ ہیں۔ ادب آداب اور ماڈرن سوسائٹی کے ایٹی کیٹس کو سمجھتے تو ہوں گے۔ بُرا مت مانیے گا میرے سوال کا۔ کیا رابعہ نے ایسے ہی دی تھی یہ انگوٹھی آپ کو؟"

"رابعہ کو بیچ میں مت لاؤ۔ اٹھالو انگوٹھی۔"

"وہ پڑی ہے آپ کی انگوٹھی۔ آپ کی چیز ہے' آپ چاہیں تو اسے باہر بھی پھینک سکتے ہیں" وہ پھر باہر دیکھنے لگی "میں گری پڑی چیزیں نہیں اٹھاتی۔"

اب میرے لیے اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ میں انگوٹھی اٹھا کے اس کی خدمت میں پیش کروں۔ اس کی ضد نے مجھے شکست کی شرمندگی کو برداشت کرنے پر مجبور کردیا تھا۔ وہ رابعہ سے یکسر مختلف' خود سری کی حد تک خود دار' انا پرست اور بے باک لڑکی تھی۔

"یہ لیجیے خاتون" میں نے انگوٹھی کو ہتھیلی پر رکھ کے کہا "قبول فرمایئے' ایک حماقت کا تاوان۔"

وہ مسکرائی "شرط ہارنے والے کو ظرف کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔"

"اب اگر آپ کی خواہش ہو تو میں انگوٹھی آپ کو رسمی تکلفات اور ماڈرن ایٹی کیٹس کا بہترین مظاہرہ کرتے ہوئے پہنا بھی دوں؟"

"نو۔ تھینک یو یار۔ بس شرط پوری ہو گئی" اس نے انگوٹھی اٹھا کے میری طرف بڑھا دی YOU MAY KEEP IT "یو مے کیپ اِٹ۔ پہن لو اسے۔ کم آن' اتنا جذباتی نہیں ہونا چاہیے۔ انگوٹھی اتاری اور پھر پہن لی تو کوئی آسمان نہیں ٹوٹتا۔ سمجھ لو کہ ایک دوستانہ مذاق تھا۔"

لیکن میرے لیے اب یہ دوستانہ مذاق نہیں رہا تھا۔ شیلی نے بڑی چالاکی سے اور بڑی معصومیت سے رابعہ کی محبت کا اور میرے جذبات کا پوسٹ مارٹم کردیا تھا اور اس تصویر پر جو میری اور رابعہ کی محبت کا حسین شاہکار تھی' ایک بدہیئت سیاہ کراس لگا دیا تھا۔ میرے جذبات کے سارے رنگ جو اپنی دلفریبی کے انداز جُدا رکھتے تھے یُوں خلط ملط ہو گئے تھے جیسے سورج کی روشنی کے سات رنگ مل کے سفید ہو جاتے ہیں اور سفید کوئی رنگ نہیں ہوتا۔

اب میرے لیے یہ ناممکن تھا کہ میں اس انگوٹھی کو دوبارہ پہن کے بھول جاؤں کہ یہ رابعہ کی نشانی نہیں' شیلی کی دین ہے۔ یہ شیلی کی عنایت تھی کہ جو انگوٹھی وہ مجھ سے لے چکی تھی اور جس کی ملکیت پر اس کا اخلاقی حق بھی میں نے تسلیم کرلیا تھا' وہ اب اس کو پھر میری انگلی میں دیکھنا چاہتی تھی۔ لو' یہ اب میری طرف سے قبول کرو۔

میں نے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا "سوری ڈاکٹر شیلی۔ دیٹ واز نو جوک۔ THAT WAS NO JOKE جو چیز تمہاری ہو چکی' اسے میں جذباتی خیرات کے طور پر قبول نہیں کرسکتا۔"

اس نے کامل بے نیازی سے انگوٹھی اپنی انگلی میں پہن لی "تمہاری مرضی یار' تمہاری چھوٹی انگلی مساوی ہے میری درمیانی انگلی کے۔ تم نے اپنے کپڑے دیکھے۔ دیکھتا کیا' بس بدل ڈالو یہ خاکروبوں والا لباس۔"

میرا موڈ بہت خراب ہو گیا تھا اور میرا دل چاہتا تھا کہ میں اسی وقت شیلی سے لڑ کے چلا جاؤں۔ اس سے صاف کہہ دوں کہ اپنے معاملات کو میرے مسائل سے الگ رکھو۔ چوہدری دلاور کی سوتیلی بہن' تم جانو اور تمہارا سوتیلا بھائی جانے۔ میں تمہارا وبال نہیں پال سکتا۔

مشکل یہ تھی کہ میں نے دلدل میں قدم رکھ دیا تھا اور اس سے نکلنا میرے اختیار میں نہیں رہا تھا۔ اسی ہوٹل کے اندر کسی نے ویٹر کے روپ میں آکے مجھے یا شیلی کو زہر دینے کی کوشش کی تھی۔ کسی ثبوت کے بغیر بھی میں خاصے وثوق سے کہہ سکتا تھا کہ اس کافی میں زہر ملایا گیا ہوگا جو اس وقت بھی میز پر رکھی ہوئی تھی اور ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ مگر روم سروس سے کوئی ابھی تک خالی برتن اٹھانے نہیں آیا تھا۔ ایک گمنام شخص نے فون کرکے مجھے بتا دیا تھا کہ میری روپوشی کا ڈراما فلاپ ہو چکا ہے اور شاید اسی نے مجھے میرے مستقبل کی تصویر دکھا دی تھی کہ تم پر رفیق کے قتل کا جرم ثابت ہے اور پھانسی تمہارا مقدر ہو گئی ہے۔ اب بچ کے دکھاؤ۔

ان حالات میں میرا یہاں سے فرار ہونا بھی انتہائی خطرناک تھا جتنا یہاں قیام کرنا۔ اگر کوئی شخص یہ جانتا تھا کہ نقوی صاحب کے گھر سے بھاگ کے میں یہاں آگیا ہوں تو وہ شخص یہ بات پولیس کو یا میرے کسی دشمن کو بھی بتا سکتا تھا۔ ابھی تک اس نے ایسا نہیں کیا تھا تو کیوں؟ یہ ایک الگ سوال تھا مگر میں محسوس کرتا تھا کہ پولیس کسی بھی وقت اچانک دستک دے کر اندر آسکتی ہے۔ نقوی صاحب کا کیا بھروسہ کہ بعد میں وہ اپنا بیان بدل دیں۔ اپنے مؤقف سے دستبردار ہونے پر مجبور کردیے جائیں۔ انہوں نے تسلیم کیا تھا کہ وہ سیاسی دباؤ کا مقابلہ نہیں کرسکتے اور انہیں ہوم سیکریٹری کے عہدے تک پہنچنے کے لیے اوپر والوں کی خوشنودی بہرحال درکار ہوگی۔ قبل از وقت ریٹائرمنٹ وہ میری خاطر کیوں قبول کریں گے۔

میں بیڈ پر سیدھا لیٹا چھت کو گھور رہا تھا اور میرا ایک ہاتھ پیشانی پر تھا۔ مجھے فیصلہ کرنے سے پہلے سوچنے کے لیے سکون اور مہلت کی ضرورت تھی لیکن ہوٹل کے اسی کمرے میں شیلی کے ساتھ یہ ناممکن سی بات لگتی تھی۔ میں نے غالب کو فون کرکے بلانے کا سوچا اور پھر یہ ارادہ بھی ترک کردیا۔ اگر کوئی کہیں پہلے سے سب دیکھ رہا تھا تو وہ غالب کو بھی دیکھے گا۔ غالب آئے گا تو نازو بھی ساتھ ہوگی۔ مجھے تو اب یہ شک ہو چلا تھا کہ اس کمرے میں کہیں کوئی خفیہ آلہ ہے یا کوئی مائیکرو فون نصب ہے۔ حالانکہ یہ بعید از قیاس بات تھی۔ ہم کسی پروگرام کے بغیر ہی اور اچانک یہاں پہنچے تھے۔ پھر نہ جانے کیسے کوئی یہاں بھی پہنچ گیا تھا۔

شیلی نے میرے قریب بیٹھ کے میرا ہاتھ پیشانی پر سے ہٹایا "تم بہت غصے میں ہو یار۔"

"نہیں۔ میں بہت پریشان ہوں۔"
"سر میں درد ہے کیا؟" وہ بولی "طبیعت تو ٹھیک ہے؟"
"ہر وقت ڈاکٹر مت بنی رہا کرو۔" میں نے چڑ کے کہا "شیلی! ہمیں کسی طرح یہاں سے نکل جانا چاہیے مگر سمجھ میں نہیں آتا کیسے نکلیں؟"
"تمہیں یہاں سے نہیں یار' اس ملک سے نکل جانا چاہیے۔ یہاں تم کہیں بھی چھپ کے نہیں رہ سکتے۔ تمہارے دشمن ہر طرف موجود ہیں اور تمہارے لیے خطرات بڑھتے جارہے ہیں۔ میری مانو اور میرے ساتھ چلو۔"
"کیسے چلوں؟ ٹکٹ لے کر ہوائی جہاز میں بیٹھ جاؤں؟" میں نے جھنجھلا کے کہا "اتنا آسان ہے فرار ہونا یا ملک سے نکلنا۔"
"یار' نقوی صاحب نے وعدہ کیا تھا۔"
"ان ... پر اتنا اعتبار ہے تمہیں؟" میں نے کہا "... پاسپورٹ اتنی آسانی سے تو نہیں بنتا اور جعلی پاسپورٹ پر بھی تصویر تو ... ہی ہوگی' نام' ولدیت بدلنے سے صورت تو نہیں بدل ..."
"... تو کیا صورت بدلی نہیں جا سکتی؟"
میں اٹھ بیٹھا "صورت بدلی جا سکتی ہے۔ بارہا بدلی ہے میں نے۔"
"تو پھر پرابلم کیا ہے یار؟" اس نے خوشی سے میرے کندھے پر ہاتھ مارا۔
میں نے کہا "یہاں ہم کسی عارضی ضرورت کے لیے صورت بدلتے تھے اور واسطہ رہتا تھا یہاں کے مجرموں سے یا یہاں کی پولیس سے۔ مجرم زیادہ سیانے ہیں' وہ دھوکا کھا جاتے تھے تو پولیس کی ... کیا کرتے مگر پاسپورٹ کے لیے صورت کو میک اپ سے بدلنا مشکل ہے۔"
"یار کیا مشکل ہے اور کیوں مشکل ہے؟ اگر داڑھی مونچھیں..."
"اس لیے کہ امیگریشن والے یہاں بھی عقاب کی نظر رکھتے ہیں۔ ان کی چھٹی حس شکاری کی طرح تیز ہو جاتی ہے۔ فوراً تاڑ لیتے ہیں کہ یہ بندہ جعلی ہے یا پاسپورٹ جعلی ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹ کے کہا۔
"تمہارا پاسپورٹ جعلی نہیں ہوگا۔"
"لیکن حلیہ تو جعلی ہوگا۔ کسی کو شک ہوا اور اس نے داڑھی پکڑ کے ہلائی تو مولانا اسلام الدین کے خول سے برآمد ہوگا سکندر بخت ..."
"... مجال ہے کہ ایسی گستاخی کرے..."
... نے کہا "یہاں دھوکے کے کام میں بھی دھوکا ہو جاتا ہے۔ ... ایجنٹ ہیں جو لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔ فی سبیل اللہ نہیں' اچھی خاصی دولت بٹور کے۔ انہیں نام' ولدیت' حلیہ' سب ... کے جعلی پاسپورٹ پر امریکا' کینیڈا پہنچانے کا سارا بندوبست کردیتے ہیں۔ ویزا تک لگ جاتا ہے۔ مگر وہی لوگ ائرپورٹ پر اپنے کسی آدمی کو مطلع کردیتے ہیں۔ ہر بدمعاش ایجنٹ کا اپنا بندہ ہوتا ہے جو آخری وقت میں خیر سے سدھارنے والے کو اسی وقت پکڑ لیتا ہے جب وہ سمجھتا ہے کہ سارے مرحلے طے ہوگئے۔ اللہ کا شکر ہے۔ وہ سامنے جہاز کھڑا ہے۔ اس میں بیٹھے تو امریکا۔ وہیں تقدیر کی کمند ٹوٹتی ہے۔ اب ذہنی طور پر خود کو دبئی یا امریکا میں محسوس کرنے والے کے لیے یہ بڑا جان لیوا صدمہ ہوتا ہے۔ یا تو وہ جیل جائے یا راستہ روکنے والے کا مطالبہ پورا کرے۔ ظاہر ہے وہ عزیز و اقارب جو اسے چھوڑنے آتے ہیں' جیب خالی کراتا ہے اور کہیں نہ کہیں سے چندے کی صورت میں مطلوبہ رقم فراہم کرکے جانے والے کو ہوائی جہاز تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ اس آمدنی کا نصف وہی مخبر لے جاتا ہے جو ہانکا کرنے والوں کی طرح شکار کو شکاری تک پہنچاتا ہے۔ میرے کیس میں ایسا ہوا تو کچھ لے دے کر بات نہیں بنے گی کیونکہ میں عام آدمی نہیں ہوں۔ ایک مجرم ہوں اور مجھے فرار میں مدد دینے والا خود بھی مشکل میں پڑ سکتا ہے۔"
"یار تم حلیہ مستقل طور پر بھی بدل سکتے ہو۔"
"وہ کیسے؟ داڑھی بڑھا لوں اور مونچھیں رکھ لوں۔ اس کے لیے کئی ماہ کی محنت چاہیے۔ مہینے نہ سہی' چند ہفتے..."
"نو۔ ابھی تم ایک اسٹینڈرڈ حلیہ بناؤ یار۔ میرا مطلب ہے ایسا جو بعد میں اصلی ہو جائے۔ مثلاً تم فرنچ کٹ داڑھی رکھ لو اور جب تک اصل داڑھی تیار نہ ہو' اسی رنگ کی نقلی سے کام چلاؤ۔ کیا سمجھے؟ مونچھیں بھی نیچرل اور واجبی سی۔ ہیر اسٹائل بدلنا کوئی مسئلہ نہیں یار۔ کوئی بھی اچھا ہیر ڈریسر تمہارے اچھے بھلے بالوں کا ستیاناس کر سکتا ہے۔ مثلاً سیدھے شریفانہ بالوں کو تم آئن اسٹائن جیسے الجھے ہوئے بے ترتیب بنا لو یا گھونگریالے۔ ان کا کلر براؤن کرلو۔ تم براؤن کنٹیکٹ لینز بھی پہن سکتے ہو یا چشمہ بھی لگا سکتے ہو۔"
"مگر میری نظر کمزور نہیں ہے۔"
"نہ ہو۔ تم دن میں سن گلاس اور رات کو زیرو پاور کے لینز والا چشمہ لگا کے خود کو زیادہ معمر' جینئس یا خبطی' مذہبی اسکالر یا مبلغ ظاہر کرسکتے ہو اور جب تک چاہو اسی حلیے میں رہ سکتے ہو یار۔ کون پہچانے گا تمہیں جب تم واپس آؤ گے۔"
"میں نے ابھی طے نہیں کیا کہ میں تمہارے ساتھ جارہا ہوں' میں یہاں بھی روپوش رہ سکتا ہوں۔"
"تم نہیں رہ سکتے یار۔ تمہاری اپنی فطرت میں نہیں ہے نچلا بیٹھنا۔ آفت تمہیں ڈھونڈتی ہے اور شامت اعمال کو تم آواز دیتے ہو۔ اس کے علاوہ یہ ہے بھی مشکل اس ماحول میں اور ان حالات

میں۔ تم نے بکھیڑے بہت پھیلا رکھے ہیں اور تمہارے جذباتی مسائل بھی ہیں۔ مائنڈ یو۔ میں رابعہ کی بات نہیں کررہی ہوں۔ تمہارے دوست اور ساتھی ہیں۔ دشمن کے ساتھ بھی نفرت کے جذبات کا رشتہ تو ہوتا ہے اور یہ جذبہ زیادہ خرابی پیدا کرتا ہے۔ تمہاری نجات ان سب معاملات سے مکمل قطع تعلق میں ہے۔ کچھ دن کے لیے سب سے دور چلے جاؤ' سب کو بھول جاؤ۔ اتنی دور کہ تم چاہو یا کوئی اور چاہے تب بھی تمہیں مسائل کی دنیا میں نہ گھسیٹ سکے۔"
"فرض کرو میں کسی دور افتادہ گاؤں کے یا کسی خانقاہ کے حجرے میں جا پہنچوں۔ کسی انڈر گراؤنڈ کمرے میں دو مہینے گزاروں جس کا کسی کو بھی علم نہ ہو۔"
"یار' خود کو عذاب میں ڈالنے سے فائدہ۔ جو کام آسانی سے ہو جائے' اسے اتنے مشکل طریقے سے کرنے کی ضرورت کیا ہے اور پھر اس میں سو فیصد ضمانت نہیں ہے۔ اس بات کی کہ تم خود پریشان ہو کے یا کوئی بات سن کے دوبارہ میدان عمل میں نہیں کودو گے یا اکتاہٹ اور بیزاری سے تنگ آکے چلہ نہیں توڑ دو گے۔ رسک ہمیشہ رہے گا اور میں چاہتی ہوں کہ فی الحال تم اس دنیا سے ہی نکل جاؤ جس میں جینا تمہارے لیے روز بروز مشکل سے مشکل تر ہوتا جارہا ہے۔"
"تم مجھے دوسری دنیا میں بھیج رہی ہو؟ ابھی سے؟"
"یار' تم تیسری دنیا کے رہنے والے ہو۔ تمہیں دوسری دنیا میں لے جانا ہی تمہاری صحت اور سلامتی کی ضمانت ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ کچھ عرصے کے لیے تم خود بھی بھول جاؤ کہ تم سکندر بخت تھے۔ اس وقت تک جب تک یہ دنیا سکندر بخت کو نہ بھول جائے۔"
"یہ ناممکن ہے۔ چند مہینے کیا' چند سال بعد بھی۔"
"یار' ممکن ہے۔ سو فیصد ممکن ہے۔" اس نے زور دے کر کہا "واٹ از ان اے نیم (نام میں کیا رکھا ہے) تم سکندر بخت سے پہلے کبیر خاں تھے۔ درمیان میں تم نے اپنا لیبل کئی بار بدلا۔ کیا فرق پڑا اس سے؟ نئی پیکنگ ہوگی تو کیا فرق پڑے گا؟ تم دھوتی باندھ لو یا شیروانی پہن لو' رہو گے وہی جو ہو۔ ساری دنیا کے لیے یہ جاننا ضروری نہیں کہ اصلیت کیا تھی۔ تمہیں معلوم ہے اور میرے علاوہ گنے چنے چند افراد کو معلوم ہے کہ مسٹر نور دین جو چار خانے کی لنگی یا ریشمی لاچے پر کھدر کا کرتا پہنتے ہیں اور قراقلی ٹوپی لگاتے ہیں۔ یا مولوی نعمت اللہ کی ریش دراز' جناح کیپ اور شیروانی میں وہی سکندر بخت ہے۔ اس گیٹ اپ میں تم جب تک چاہو رہ سکتے ہو۔ سب کے درمیان رہ کے بھی سکندر بخت سب کی نگاہ سے اوجھل ہو۔ IS THAT IMPOSSIBLE (کیا یہ ناممکن ہے) نہیں یار۔ یہ تو بہت آسان ہے اور بہت پریکٹیکل۔ تم انجوائے کرسکتے ہو ایک نئی شخصیت کے نئے تجربات کو' ایک نئی لائف کے ایڈونچر کو جس کا ماضی روپوش ہو اور مستقبل محفوظ۔ ایک دیوار کھڑی کردو گزرے ہوئے وقت اور آنے والے وقت کے درمیان جس کے پار کوئی تمہیں نہ دیکھ سکے۔ وہ دیوار تک نظر نہ آئے کسی کو۔ بس تمہیں معلوم ہو کہ دیوار کے ادھر تمہارا ماضی ہے اور وہ سب ہے جو سکندر بخت کے نام سے منسوب ہے۔ دیوار کے دوسری طرف بھی تم ہو مگر ایک محفوظ مستقبل کے ساتھ۔ تمہارے تعاقب میں لگے ہوئے شکاری بھی اس دیوار کو عبور کرکے تم تک کبھی نہیں پہنچ سکتے' تمہاری بو تک نہیں پا سکتے۔ تم سمجھ رہے ہو نا میری بات کو یار؟"
میں اسے پلک جھپکائے بغیر حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی اسکیم کو یکسر احمقانہ اور ناقابل عمل سمجھ کے مسترد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جو کچھ اس نے کہا تھا وہ قابل غور تھا۔ جیسے FANTASY پر مبنی کسی فلم کا خیال جسے ایک کامیاب فلم بنا کے پیش کیا جا سکتا ہو یا ایک ABSTRACT خیال جس کو مصور رنگ دے کر تصویر کے قالب میں ڈھال سکتا ہو اور شاعر الفاظ کا پیراہن دے کر طویل نظم لکھ سکتا ہو۔ شکوہ اور جواب شکوہ کی طرح۔ یا نظریہ اضافت کی طرح جس کو بنیاد بنا کے ہیروشیما پر ایٹم بم گرایا جا سکتا ہو۔
"کیا سوچ رہے ہو یار؟ میں نے کوئی بہت احمقانہ بات کی ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ تمہارے لیے یہ بہت بڑا چیلنج ہے۔ تمہاری صلاحیت اور تمہارے حوصلے سے زیادہ..."
میں نے اٹھ کے کمرے میں ٹہلتے ہوئے کہا "معلوم نہیں تمہارے دماغ میں یہ خیال کیسے آیا۔ میں نے کبھی ایسا نہیں سوچا تھا۔"
"ہر خیال ہر شخص کی کھوپڑی میں نہیں آسکتا۔ قطعی طور پر یہ ایک حقیقت ہے" اس نے گویا اعلان کیا۔
"ہاں۔ کسی اور نے بھی ایسا نہیں سوچا کبھی۔"
"یار' میں نے سوچا تو کیا غلط سوچا؟ بس یہ بتا دو مجھے۔"
"نہیں۔ غلط کہنا تو مشکل ہے لیکن آسان سمجھنا اس سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ مجھے مشورہ کرنا ہوگا اور سوچنا پڑے گا۔ جو تم نے کہا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے مس شیلی کہ میں سکندر بخت کو اس کے ماضی کے ساتھ دفن کردوں۔ کم سے کم وہ دنیا کے لیے مر جائے اور اس کی جگہ آجائے ایک اجنبی۔ وہ اچانک اس دنیا میں وارد ہو جائے اور اپنی جگہ بنا لے۔ اس کا ماضی کوئی نہ ہو۔ یا ایک پراسرار' مبہم سا حوالہ ہو جس سے وہ معتبر ہو جائے' مشکوک نہ رہے۔ لیکن اس کی تصدیق اور تردید کوئی نہ کرسکے.... رائٹ؟"
"رائٹ۔ یہی ہے وہ گریٹ آئیڈیا" شیلی نے مسرت سے کہا۔
"میں کسی جادوگر کی طرح تم کو اڑن چھو کرکے ساتھ لے جاتی ہوں۔ یار' لندن میں تمہاری شخصیت کو نیا قالب دینے میں کچھ

وقت ضرور لگے گا لیکن اس کے بعد جب تم واپس آؤ گے تو تمہارے سر پر ہوگی سلیمانی ٹوپی' تم چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کے ہر شکاری کو دیکھ سکو گے مگر وہ اندھوں کی طرح ادھر سے اُدھر دوڑتے رہیں گے اور سکندر بخت کی تلاش میں پاگل ہو جائیں گے مگر سکندر بخت انہیں نہیں ملے گا۔"

شیلی کی تجویز نے میرے ذہن کی تاریک سُرنگ کے دہانے پر روشنی پھیلادی تھی اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ اس کے لیے سوچ سمجھ کے پلاننگ کی ضرورت پڑے گی اور دوستوں کے تعاون کی۔ یہ چال کبھی چوہدری دلاور کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔ وہ خود کوئی ایسی چال اس لیے نہیں چل سکتا کہ اسے چوہدری دلاور کے نام پر سیاست کی دُکان چلانی ہے۔ چوہدری دلاور کے قانونی اور غیر قانونی کاروبار پر اس نام کی چھاپ ہے۔ اس کے لیے اپنا نام بدلنا ممکن ہی نہیں۔ وہ جس عورت کا شوہر ہے اس کے بچوں کا باپ چوہدری دلاور ہے۔ وہ غائب نہیں ہو سکتا۔ میرے لیے یہ کوئی مسئلہ نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ قانونی طور پر میں نہ کسی کاروبار کا مالک ہوں' نہ کسی کا شوہر' نہ کسی کا باپ۔ مجھے کسی سے اپنے نام پر ووٹ نہیں مانگنے ہیں' پوسٹر اور بینر نہیں بنانے ہیں۔ مجھے کسی کے حلقۂ انتخاب میں اس نام کی شناخت کا مسئلہ نہیں۔ صرف ایک ہی مسئلہ ہو سکتا ہے میرے لیے اور وہ ہے مرحوم وزیر خاں کے حقِ وراثت کا۔ تو اس کا میں نے پہلے ہی انتظام کر رکھا ہے۔ میرے وکیل اور تمام معاملات کے لیے جنرل پاور آف اٹارنی رکھنے والا محسن ہے اور وہ سب اٹارنی کے اختیارات منظر کو بھی دے سکتا ہے' رابعہ کو بھی اور غالب کو بھی۔ قانونی طور پر کسی لاپتا ہو جانے والے شخص کو سات سال کا عرصہ گزرے بغیر مردہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ فیصلہ بھی کسی درخواست پر کوئی عدالت مجاز ہی صادر کر سکتی ہے۔ ساتویں سال کے آخری دن میں اچانک نمودار ہو جاؤں تو بہ حیثیت سکندر بخت میرے تمام شہری اور قانونی حقوق بحال۔ سات سال تک بقول ڈاکٹر شیلی' میں سلیمانی ٹوپی پہن کے سب کے بیچ میں رہوں مگر کسی کو نظر نہ آؤں۔ شکاری میرے تعاقب میں آسمان سے زمین تک اور پاتال تک چھان ماریں۔ بحرِ ظلمات میں گھوڑے دوڑائیں یا خلا میں تلاش کریں۔ سکندر بخت سب کچھ دیکھتا رہے' سنتا رہے اور وہ کرتا رہے جو سکندر بخت ہی کر سکتا ہے۔ لیکن دیکھنے والوں کو سکندر بخت دکھائی نہ دے۔ چند آنکھوں کے سوا اسے کوئی نہ پہچانے۔

آہستہ آہستہ مجھ پر اس خیال کی افادیت عیاں ہوتی جارہی تھی اور میں نے اصولی طور پر اس کے عملی پہلو پر غور کرنا شروع کر دیا تھا لیکن یہ ایسا فیصلہ نہیں تھا جو میں تنہا کر سکتا۔ اس کے لیے مجھے مشورے اور سوچ بچار کی ضرورت تھی۔ اصل فیصلہ نام اور شخصیت بدل کے نیا جنم لینے کا نہیں تھا۔ مشکل فیصلہ انتخاب کا تھا کہ اگر میں اس دنیا میں کسی اور نام' چہرے اور حُلیئے کے ساتھ نمودار ہوتا ہوں تو یہ راز کی بات کس کس کو معلوم ہونی چاہیے۔ ایک طویل عرصے تک کس میں رازداری کے امتحان میں پورا اترنے کا حوصلہ ہوگا۔ یہ کوئی آسان کام نہیں ہوگا کہ کوئی اپنی ہی دنیا میں اجنبی بن کے زندگی گزار سکے۔ یہ کوئی عام زندگی بھی نہیں ہوگی۔ اس کے مرحلے اور مسئلے سب وہی ہوں گے جو آج ہیں۔ مجھے سب سے اسی طرح نمٹنا ہوگا جیسے آج نمٹتا ہوں۔ اس نئی زندگی میں یہ خوف دامن گیر نہیں ہوگا کہ میں پکڑا گیا تو مجھے سیدھا تختۂ دار پر پہنچادیا جائے گا لیکن افشائے راز کا خوف بہرحال ہر قدم پر لاحق ہوگا۔ مجھے ہی نہیں' مجھے جاننے پہچاننے والوں کو بھی بہت زیادہ احتیاط لازم ہوگی۔

شیلی بیڈ پر نیم دراز مجھے غور سے دیکھ رہی تھی اور یہ بات یقیناً اس کے لیے باعثِ طمانیت اور مُسرت ہوگی کہ وہ مجھے پٹڑی سے اتارنے اور کانٹا بدل کے دوسرے ٹریک پر لانے میں کامیاب ہو گئی ہے۔ اس اسکیم کی مُوجد و خالق کی حیثیت سے وہ اپنا کردار بھی اتنا ہی لازم وملزوم سمجھ رہی ہوگی جیسے روشنی کے ساتھ سائے کا ساتھ مگر میرے ذہن میں ایسا نہیں تھا۔ یہ میرے مسائل کا حل اور مستقبل کی حکمتِ عملی میں مددگار ثابت ہونے والا فیصلہ ہو سکتا تھا مگر اس میں ڈاکٹر شیلی کے ہونے نہ ہونے سے فرق نہیں پڑتا تھا۔ شاید اس کا نہ ہونا ہی میرے حق میں زیادہ سودمند ہوتا مگر اسے اسکیم سے خارج کرنا عملاً اتنا ہی ناممکن تھا جتنا کسی مشینی نظام کو متحرک رکھنے والے کسی پُرزے کو الگ کرنا۔ کسی گھر کا نقشہ ایک باتھ روم کے بغیر بھی مکمل نہیں ہوتا' خواہ باتھ روم کے مسائل کتنے ہی ناپسندیدہ کیوں نہ ہوں۔

"اُف یار۔ اب بس بھی کرو۔ کیا سیارے کی طرح ایک ہی مدار میں گھوم رہے ہو۔" شیلی کے صبر کا حوصلہ بالآخر جواب دے گیا "خواہ مخواہ خالی دماغ پر... میرا مطلب ہے' خالی پیٹ والے دماغ پر اتنا زور ڈال رہے ہو۔"

میں نے اس کے سامنے بیٹھ کے کہا "اچھا کیا جو مجھے یاد دلا دیا کہ کھانا بھی ضروری ہے۔"

"تم چاہو تو چلتے رہو یار۔ پٹ سے گر وگے جب ٹانگوں میں جان نہیں رہے گی اور پوسٹ مارٹم رپورٹ میں لکھا جائے گا کہ فاقے سے ہلاکت ہوئی۔"

"تم بڑی ہولناک باتیں اتنی آسانی سے کر لیتی ہو۔ یہ سب نتیجہ ہے کاکروچ اور مینڈک سے لے کر انسانی لاشوں تک سب کو کاٹنے کا۔"

"میڈیکل سائنس کے اصول جذبات کے تابع نہیں ہوتے۔"

میں نے کہا "اگر ہم نے یہاں کھانا منگوایا تو ہماری پوسٹ مارٹم رپورٹ میں لکھا جائے گا۔ زہر خورانی سے ہلاکت ہوئی۔ لیٹ اس گو آؤٹ سم ویئر LET'S GO OUT SOME WHERE (چلو کہیں باہر چلیں)

"کھانا کیا چاہیے' ایک آئیڈیا..." وہ ایک دم کھڑی ہو گئی۔

میں نے اپنے حُلیئے پر نگاہ ڈالی "یہ لباسِ فاخرہ تو بدل لوں۔"

وہ میرے لیے دو شرٹس پتلونیں اور جوتے لائی تھی جو حیرت انگیز طور پر عین میرے سائز کے ثابت ہوئے۔ میں نے دس منٹ میں غسل کیا اور باہر نکلا تو بالکل بدلا ہوا شخص تھا۔ میری نظر شیلی پر پڑی تو ایک لمحے کے لیے میں پلک جھپکانا بھول گیا۔ اس نے وہ گلابی ساری بدل لی تھی جو گزشتہ چوبیں گھنٹے سے اس کے جسم پر تھی۔ اب اس نے ہلکے سبز رنگ پر ننھے ننھے شوخ زرد رنگ کے پھولوں والا شلوار قمیص سوٹ پہن لیا تھا جسے دیکھ کر بسنت رُت اور سرسوں کے پھولوں کی بہار یاد آتی تھی۔ اس کے سنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں کے ساتھ یہ رنگ اور بھی نکھر آیا تھا۔

مگر اس سے پہلے کہ میں اخلاقاً اس کے حسن کو خراجِ تحسین پیش کرتا' اس نے خوش ہو کے کہا "گریٹ۔ یو آر لکنگ ہینڈسم۔" YOU ARE LOOKING HANDSOME (بہت اچھے لگ رہے ہو تم)

یہ مغربی تہذیب کے ماحول کی پرورش کا نتیجہ تھا کہ اس نے شرمائے بغیر وہ بات کہہ دی جو مجھ سے کبھی رابعہ نے نہیں کہی تھی۔ حیا اور جھجک ہمارے ماحول میں بہت سی پابندیاں عائد کر دیتی ہے۔ خصوصاً عورت پر جو اپنے جذبات کا اظہار تک نہیں کر سکتی' خواہ یہ جذبات کتنے ہی حقیقی اور معصوم کیوں نہ ہوں۔ میں نے بھی جب شیلی سے کہا کہ وہ بے حد حسین لگ رہی ہے تو اس نے ایک فطری خوشی کے ساتھ "تھینک یو" کہا۔ یورپی اقوام کی کچھ عادات یقیناً اچھی ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ تنقید سے گُریز کرتے ہیں۔ خصوصاً دل آزار تنقید سے۔ وہاں کوئی کہے کہ "یار یہ کیا پہن لیا" تو سخت بداخلاقی کی بات ہوگی۔ لوگ ایک دوسرے کے گھر جاتے ہیں تو گھر کی آرائش کی یا باغ کی تعریف لازمی ہے۔ اسی طرح نئے لباس میں کسی کی تعریف نہ کرنا بدتہذیب ہونے کا ثبوت دینے کے مترادف ہے۔

"تمہارا چوائس میرے لیے بھی بہت اچھا ہے" میں نے کہا۔

"رئیلی۔ تمہیں پسند آیا میرا انتخاب؟"

"تم تو جیسے مجھ سے پوچھ کے گئی تھیں۔ سائز' رنگ' ڈیزائن سب پرفیکٹ۔ کیسے اندازہ کر لیا تھا تم نے؟" میں نے جوتے پہنتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر انسانی جسم کی رگ رگ سے واقف ہوتے ہیں یار۔ ایک نظر میں سب دیکھ لیتے ہیں۔" وہ مسکرا کے بولی "اب چلو۔ مجھے تو ڈر ہے' کھانا کہیں نہیں ملے گا۔ یہ کوئی وقت ہے۔"

"ادھر سب چلتا ہے ڈاکٹر شیلی۔ ہر وقت ہر چیز ملتی ہے۔ رات کے دو بجے ریلوے اسٹیشن سے لے کر گوال منڈی تک سب کچھ ملتا ہے۔ تکے کباب' لسّی' برف اور برفی' پوری چھولے' پراٹھے اور کٹا کٹ۔"

"اُف۔ سب ہائی کولسٹرول۔ بلڈ پریشر اور ذیابیطس اور جگر کی خرابی کے اسباب۔"

میں نے کمرے کو لاک کرتے ہوئے کہا "پنجاب کے جیالوں کی صحت دیکھو ڈاکٹر صاحب۔ ان کے رنگ روپ' قد کاٹھ کو دیکھو۔ انہیں اکھاڑوں میں اور کھیل کے میدانوں میں دیکھو۔ ملک کی دفاعی قوت میں دیکھو۔"

"بعد میں دیکھوں گی یار۔ ابھی اتنا وقت نہیں ہے اور میں کھانا چاہتی ہوں چائنیز۔ خواہ اس کے لیے مجھے چین جانا پڑے۔" وہ ہنسی۔

"افسوس ناک بات یہ ہے کہ میری جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں۔ دیکھنے میں تمہارے ساتھ چلتے ہوئے میں ڈپٹی کمشنر کا سالا لگتا ہوں۔"

"میں نے ٹریولر چیک کیش کرا لیے تھے۔ تقریباً چالیس ہزار کے۔ کچھ تم رکھ لو۔"

"ابھی رہنے دو۔" میں نے کہا "غالب کے پاس میرے پیسے پڑے ہیں۔"

نیچے اترتے ہوئے میں نے ہر طرف نگاہ رکھی۔ اگر کوئی ہمارے ساتھ ہی کسی کمرے سے برآمد ہوتا تو میں محتاط ہو جاتا۔ چوتھی منزل سے لفٹ میں سوار ہو کے میں تیسری منزل پر اتر گیا اور شیلی کے ساتھ ایک طرف کھڑا رہا لیکن نہ کوئی زینے سے اتر کے آیا اور نہ لفٹ اوپر گئی۔

ہال میں ایک میز پر چار افراد بیٹھے تھے' دوسری پر ایک مرد اور عورت۔ میں نے چابیاں کاؤنٹر پر دیں اور باہر نکلا تو ایک شخص فوراً آگے آیا۔ "کار سر؟" وہ ڈرائیوروں جیسی وردی میں تھا۔

شیلی نے کہا "نہیں۔ تھینک یو" اور پھر مجھ سے فرنچ میں بات کی "یہ وہی ہے جس کے ساتھ میں شاپنگ کے لیے گئی تھی۔"

ڈرائیور کی آواز سے مجھے ایسا لگا تھا جیسے میں نے پہلے بھی یہ آواز سنی ہے۔ شیلی کی بات نے میرے شک کو ہوا دی "کیا اس نے پریشان کیا تھا؟"

"نہیں.... پریشان تو نہیں کیا تھا۔ پتا نہیں بار بار کہاں غائب ہو جاتا تھا۔ دوبار میں شاپ سے نکلی تو کار موجود مگر ڈرائیور ندارد۔"

"اچھا... پھر فوراً ہی آجاتا ہوگا؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ معلوم نہیں کہاں چھپ کے کھڑا ہو جاتا تھا۔"

میں نے کہا "ہم اسی کے ساتھ چلیں گے۔"

ڈرائیور کچھ نہیں سمجھا تھا اور اس نے اپنے تاثرات کو چہرے سے بھی عیاں نہیں ہونے دیا تھا۔ میں سب سمجھ گیا تھا۔ میں نے اسی کی آواز فون پر سنی تھی۔ وہ یقیناً لہجہ بدل کے بول رہا تھا مگر

اس کی آواز کی PITCH وہی تھی۔ "پچ" کا متبادل اردو لفظ کوئی نہیں۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ آواز پتلی تھی یا بھاری تھی۔ یا یہ کہ درمیانی تھی۔ سن بلوغت کے ساتھ ہی لڑکوں کی آواز کی پچ بدل جاتی ہے اور تبدیلی کے دوران سب کو ان کی آواز مضحکہ خیز لگتی ہے۔

ڈرائیور کے غائب ہونے کی بات سن کے ساری صورت حال مجھ پر واضح ہو گئی تھی۔ وہی تھا جس کو سب معلوم تھا اور کسی نے اسے بھاری معاوضے پر ہماری نقل و حرکت کی نگرانی کے علاوہ یہ ذمے داری بھی سونپ دی تھی کہ وہ ہر خبر آگے پہنچائے۔ شاید دولت کی قوت خرید نے اسے جائز کے ساتھ ہر ناجائز کام پر بھی مجبور کر دیا تھا۔ شاید اسی نے کسی ویٹر سے مل کے ذرا سی دیر کے لیے اپنی وردی بدلی تھی اور ہمارے کمرے میں کافی پہنچانے کے بعد واپس کر دی تھی۔ ڈرائیور سے ویٹر اور ویٹر سے ڈرائیور بن جانے کے بعد اس کے لیے خطرے کی کوئی بات نہیں رہی تھی۔ اس نے خود اپنی کار شبلی کے سامنے اکھڑی کی ہوئی اور شاید کرایہ بھی کم بتایا ہوگا کہ ہوٹل کی انتظامیہ نے اسے بلا لیا۔ قصور نہ انتظامیہ کا تھا، نہ رینٹ اے کار سروس چلانے والوں کا۔ انہیں کیسے معلوم ہو سکتا ہے کہ عام حالات میں ایمانداری اور شرافت سے ڈرائیونگ کرنے والا شخص کتنی قیمت وصول کر کے خلاف قانون کام کرنے پر تیار ہو جائے گا۔ یہ بات تو خریدار جانتے ہیں کہ ناقابل فروخت کوئی نہیں ہوتا۔

یہ سات آٹھ سال پہلے کی اوپل ایکارڈ کار تھی۔ اس کو کسی نے بڑے پیار سے سنبھال کے رکھا تھا اور کرائے کی کار کے طور پر استعمال ہونے کے باوجود یہ بہت سی اپنی ہم عمر پرائیویٹ کاروں سے زیادہ خوب صورت اور آرام دہ تھی۔ اس کا نمبر میں نے پہلے ہی ذہن نشین کر لیا تھا۔

"تم اس شہر سے تو واقف ہو نا؟" میں نے گاڑی میں بیٹھنے کے بعد کہا "کب سے کر رہے ہو یہ کام؟"

"دس سال ہو گئے سر" اس نے جواب دیا اور میں نے پھر اس کی آواز پر غور کیا تو شک کی گنجائش نہ رہی۔

شبلی پیچھے میرے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ کچھ حیران تھی کہ میں نے اس کے انکار کو اہمیت کیوں نہیں دی تھی اور وہی گاڑی کیوں لے لی تھی مگر اس نے وجہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی "تمہیں تو معلوم ہوگا کہ اس وقت چائنیز ریسٹورنٹ کہاں کھلے ہوں گے؟"

شبلی نے سوال مجھ سے کیا تھا مگر جواب ڈرائیور نے دیا "یس میڈم، میں آپ کو لے چلتا ہوں۔ گلبرگ میں رات بارہ ایک بجے تک ریسٹورنٹ کھلے رہتے ہیں۔ ابھی تو گیارہ بجے ہیں۔"

اس نے گاڑی کو بائیں طرف موڑ لیا تھا اور یہ سڑک نسبتاً غیر آباد نظر آتی تھی۔ "نام کیا ہے تمہارا.... ڈرائیور؟"

اس نے پیچھے دیکھے بغیر کہا "فضل دین سر۔"

شبلی چونکی۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ہتھیلی پر انگلی سے لکھا "افضل... خان" جو مجھے یہ بتانے کے لیے کافی تھا کہ یہی ڈرائیور اسے اپنا نام افضل خان بتا چکا تھا اور غالباً یہ بات بھول گیا تھا۔

اچانک میں نے فون پر گفتگو کرنے والے کا لہجہ بنا لیا "آدمی تو ہوشیار ہو۔ کچھ پڑھے لکھے بھی ہو پیارے۔"

اس نے اپنے ردعمل کو ظاہر نہیں ہونے دیا مگر میں نے اسٹیئرنگ وھیل پر اس کی گرفت سے اندازہ کر لیا کہ تیر کس حد تک نشانے پر لگا ہے۔ گاڑی ذرا سی دائیں بائیں ہو کے پھر سیدھی دوڑنے لگی تھی "یس... یس سر... میٹرک کیا تھا۔ کالج جانے کا شوق تھا۔ حالات نے مجبور کر دیا۔"

"مجبوری بڑی بری چیز ہے پیارے۔ آدمی کو اپنا ضمیر اور ایمان بھی بیچنا پڑے تو وہ پیسے کی خاطر بیچ دیتا ہے۔ وہ کام کر سکتا ہے جو وہ نہیں کرنا چاہتا۔ کیا سمجھے؟ ایک حد ہوتی ہے ہر شخص کی جہاں تک وہ مزاحمت کرتا ہے۔ ضرورت اور پریشانی میں دس ہزار بھی دس لاکھ لگتے ہیں اور جب کوئی یقین دلا دے کہ پیارے مت ڈرو کچھ نہیں ہوگا۔ یہ رکھو ایک لاکھ۔ کام بھی مشکل نہ لگتا ہو تو بندہ کہتا ہے کہ اب تخت یا تختہ۔ ادھر پیسہ دینے والے حوصلہ دیتے ہیں کہ چڑھ جا بیٹا سولی پر، رام بھلی کریں گے۔ تو پھر فضل دین ہو یا افضل خان، ڈرائیور ہو یا ویٹر۔"

اس نے بمشکل تمام کہا "میں... مطلب نہیں سمجھا سر؟"

"سمجھ لو گے پیارے۔ یہ بتاؤ تمہیں کچھ شعر و شاعری سے بھی شوق ہے؟" میں نے کہا "یا ایکٹر بننے کا۔ مجھے ایسا لگتا ہے پیارے کہ تمہاری آواز میں نے کسی ریڈیو ڈرامے میں سنی ہے۔ [illegible] بدلا ہوا تھا۔"

اس نے ایک دم گاڑی روک لی "کیا کہنا چاہتے ہو؟" وہ پلٹ کے بولا تو اس کا لہجہ ہی نہیں، چہرہ بھی خطرناک ہو گیا تھا۔

میں نے اس کی گردن کو پیچھے سے پکڑنے میں دیر نہیں کی۔ وہ جوان اور طاقتور آدمی تھا مگر اسے میری پروفیشنل گرفت کا اندازہ نہیں تھا۔ اس نے اوپر نیچے ہاتھ چلائے اور مجھے پکڑنے کی کوشش کے ساتھ ہی اپنی گردن چھڑانے کے لیے زور لگایا۔

میں نے کہا "بے کار ہے پیارے۔ کیوں اپنی گردن تڑواتے ہو۔"

اس کا پاؤں کلچ پر سے ہٹ گیا۔ گاڑی نے ایک جھٹکا لیا اور اس کا انجن بند ہو گیا۔ شبلی خلاف توقع پریشان نہیں ہوئی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا، نیچے اتر کے وہ آگے گئی اور اس نے اگنیشن آف کر کے گاڑی کی چابیاں نکال لیں۔ میں نے اس کی [illegible]

اور جانے باقی کا اعتراف کیا۔ ڈرائیور نے اس وقت تک مزاحمت چھوڑ دی تھی۔

"اب بولو۔ تم فضل دین ہو یا افضل خان؟ جھوٹ نہیں چلے گا۔ میں تمہارے کاغذات بھی دیکھوں گا" میں نے کہا "یہاں کوئی تمہاری مدد کرنے نہیں آئے گا۔ وہ بھی نہیں جنہوں نے تمہیں ایک پیشہ ور قاتل بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ ایک بار تم اس راستے پر چل پڑتے تو وہ تمہیں بلیک میل کرتے یا تم خود لالچ میں جرم کی راہ اختیار کرتے۔ دس سال ڈرائیونگ کر کے تم نے اتنا نہیں کمایا ہوگا جتنا ایک دن کی کارگزاری پر ملا۔ بولو کتنا پیسہ لیا تھا؟"

آخری جملے کے ساتھ ہی میں نے ایک جھٹکا دیا تھا۔ وہ اگلی سیٹ پر الٹا پڑا ہوا تھا اور اس کا سر سیٹ پر ایسے دبا ہوا تھا کہ وہ صرف میرے پیروں کو دیکھ سکتا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ پہلے میری کمر کے گرد تھے اور وہ مجھے دبانے کے لیے زور بھی لگا رہا تھا مگر اس کا سانس رکنے لگا تو ہاتھ خود بخود نیچے لٹک گئے اور وہ ٹانگیں چلانے لگا۔ اس کے پاؤں ڈیش بورڈ سے ٹکرانے لگے۔

"میں... میں بتاتا ہوں۔"

شبلی نے کہا "دیکھو یہ مر نہ جائے کہیں۔"

میں نے کہا "مر جائے۔ مجھے کیا۔ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ کیوں پیارے۔"

میری گرفت ڈھیلی پڑی تو اس نے لمبی سانس لی "تم انہیں.... نہیں جانتے...."

میں نے نیچے سے گھٹنا اوپر اٹھا کے اس کی ناک پر مارا "تم مجھے نہیں جانتے۔"

وہ بلبلایا "انہوں نے دھمکی دی تھی...."

"دھمکی میں بھی دے رہا ہوں۔" میں نے کہا "تم نے مجھے سب کچھ اسی وقت نہ بتایا تو تمہاری لاش یہاں صبح تک پڑی رہے گی۔ آسان کام ہو تو معاوضہ کوئی زیادہ نہیں دیتا۔ اور جو پیسہ دیتے ہیں وہ تمہاری جان کی بازی لگاتے ہیں کیونکہ خود انہیں اپنی جان زیادہ عزیز ہوتی ہے۔ مجھے مجبور مت کرو کہ میں سچ تمہارے حلق سے یوں اگلواؤں کہ تم بعد میں جھوٹ بولنے کے قابل ہی نہ رہو۔"

"میں.... بتاتا ہوں" اس نے کراہتے ہوئے کہا "مجھے چھوڑو...."

اب شبلی نے پھر میری مدد کی۔ اس نے اپنے بیگ سے زنانہ ماڈل کا ریوالور نکال کے اس کی کنپٹی پر رکھ دیا۔ "یار، اس سے تمہارے سر میں چھوٹا سا سوراخ ہوگا۔ نہ کوئی فائر کی آواز سنے گا، نہ تمہارے مرنے کا کسی کو علم ہوگا۔ آرام سے پیچھے چلے جاؤ۔ گاڑی میں چلاؤں گی۔"

وہ سخت دہشت زدہ ہو گیا تھا۔ اس نے شبلی کے حکم کی تعمیل کی اور اگلی دونوں سیٹوں کے درمیان سے گزر کے میرے ساتھ آ بیٹھا۔ شبلی نے باہر رہتے ہوئے کھڑکی میں سے ریوالور کا رخ اس کی طرف رکھا۔ میں خود بھی اس سے نمٹ سکتا تھا لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ اس کا حوصلہ جواب دے چکا ہے۔ وہ پیشہ ور مجرم نہیں تھا۔ شاید اس نے زندگی میں پہلی بار بڑے معاوضے کے لالچ میں بڑا جرم کرنے کی کوشش کی تھی۔ چھوٹے موٹے جرائم تو ہم سب ہی کرتے ہیں، خواہ وہ ٹریفک کے قوانین کی خلاف ورزی کی صورت میں ہوں یا انکم ٹیکس کے غلط گوشواروں کی صورت میں۔

شبلی نے گاڑی کو اسٹارٹ کیا اور آہستہ آہستہ چلانے لگی "یار مجھے راستہ بتاتے رہنا۔"

"ابھی ناک کی سیدھ میں چلو۔ آگے سے دائیں جانب" میں نے کہا اور اس شخص کی طرف متوجہ ہو گیا جو اب پھس پھس کر کے رو رہا تھا اور ناک سے نکلنے والے خون کو آستین سے صاف کرتا جا رہا تھا "بولو پیارے۔"

"میں اسے نہیں جانتا..... اس نے اپنا نام نہیں بتایا تھا۔"

"اس کا حلیہ بتاؤ۔ نام ہم بتا دیں گے۔"

"وہ.... کالا سا..... بلکہ حبشی ٹائپ تھا۔ جیسے اپنے بلوچستان کی طرف بھی ہوتے ہیں۔"

"مکرانی ٹائپ۔" میں نے کہا "موٹے ہونٹ، پکوڑا ناک اور چھوٹے سخت اور سیاہ گھونگھریالے بال؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا "آپ.... جانتے ہیں...؟"

"ایک کان میں پیتل کی مندری" میں نے کہا "کب آیا تھا وہ تمہارے پاس؟"

"آج دوپہر۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس نے آپ کے بارے میں کس سے پوچھا تھا" وہ بولا "اور کس نے اسے میرے پاس بھیجا تھا۔ میں ادھر کھڑا ہوا تھا جب اس نے گاڑی میں بیٹھ کے بولا کہ چلو۔ میں چل پڑا تو اس نے بھی یہ پوچھا کہ نام کیا ہے، کب سے گاڑی چلا رہے ہو، اس ہوٹل میں رینٹ اے کار سروس کے ساتھ مہینے میں کتنا کما لیتے ہو۔ میں نے بتایا کہ گاڑی میری اپنی ہے اور مہینے کے دو تین ہزار بچ جاتے ہیں مگر اب شاید گاڑی بیچنی پڑے گی۔ مکان بیچ کے گاڑی لی تھی۔ ہر مہینے کچھ بچاتا رہا۔ وہ سب ماں کی بیماری اور ایک آپریشن میں لگ گیا۔ ماں پھر بھی مر گئی۔ اب ایک بہن کی شادی کرنی ہے۔ ماں نے رشتہ کیا تھا اور مرتے وقت کہا تھا کہ تاریخ مت بڑھانا۔ ایسا نہ ہو کہ یہ منگنی بھی ٹوٹ جائے۔ پہلی بار مجبوری تھی۔ لڑکا دبئی چلا گیا تھا اور وہاں اسے جیل ہو گئی تھی۔ یہ دوسرا رشتہ قسمت سے آ گیا تھا۔ لالچی لوگ تھے۔ تیاری کے لیے ہم پہلے بھی کافی وقت لے چکے تھے۔ لالچی اس لڑکے کی ماں تھی۔ اس نے خود بتا دیا تھا کہ میں مجبور ہوں اور دیر کی تو ماں میں اور رشتہ کر دے گی۔"

"یہ سب خود تم نے بتایا یا وہ پہلے سے جانتا تھا؟"

اس نے کہا "میں نے بتایا جی۔ وہ بڑا ہمدرد نظر آتا تھا۔ آدمی دُکھی ہو تو دل کی بات کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ماں کو مرے ہوئے ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ آج گیارھواں دن ہے۔ اس کے چہلم سے پہلے رخصتی ہوگی۔ ظاہر ہے اس کے لیے گاڑی ہی بیچی جاسکتی ہے۔ پھر میں اکیلا رہ جاؤں گا۔ زندگی گزارنے کے لیے کچھ بھی کروں گا۔"

میں نے کہا "اس نے معلوم کرلیا ہوگا کہ تم زیادہ مجبور ہو۔ تمہیں آسانی سے خریدا جاسکتا ہے۔"

اس نے کہا "فضل دین۔ یہی اصل نام ہے میرا سر۔ آپ میرا ڈرائیونگ لائسنس دیکھ لیں" وہ بولا "اس نے کہا کہ گاڑی مت بیچو۔ ایک کام ہے میرا۔ اگر ہمت ہے تو یہ لو پچاس ہزار ایڈوانس۔ آدھی رقم بعد میں۔ اس نے تو سر' ایک دم نوٹوں کی گڈی میرے سامنے ڈال دی۔ بس میں کیا بتاؤں' اتنی بڑی رقم دیکھتے ہی مجھے کیا ہوگیا تھا۔ ایک لاکھ میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھے تھے۔ اندازہ تو میں نے کرلیا تھا کہ کام مشکل اور خطرناک ہوگا ورنہ وہ خود کرلیتا۔ میں نے کہا کہ قتل کے سوا میں سب کچھ کرسکتا ہوں۔ پکڑا گیا تو جیل ہوگی نا۔ ہو جائے۔ میں چھ سات سال اندر کاٹ لوں گا لیکن میں پھانسی قبول نہیں کرسکتا۔ اس نے مجھے یقین دلایا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ اس ہوٹل میں مسٹر اور مسز رستم جی بٹن والا ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ان پر نظر رکھنی ہوگی اور مجھے رپورٹ دینی ہوگی۔ میں سامنے نہیں آؤں گا مگر تم پر نظر رکھوں گا اور جب ضرورت پڑے گی' ہدایات دینے آجاؤں گا۔ دوپہر کے بعد اس نے کہا کہ فضل دین' کسی ویٹر کو اپنے ساتھ ملا دیا خود ویٹر بن کے اندر جاؤ۔ وہ کافی ضرور منگوائیں گے شام کو۔ تمہیں کافی میں یہ دوا ملانی ہوگی۔ یہ زہر نہیں ہے' نیند کی دوا ہے۔ میں ڈر گیا' میں نے کہا کہ کیا ثبوت ہے۔ ایسا نہ ہو کہ مجھ پر ایک ساتھ دُہرے قتل کا الزام آجائے۔ بہن کی شادی کے لیے میں زندگی کے پانچ چھ سال تو قربان کرسکتا ہوں' یہ میری زندگی کی قیمت نہیں ہوسکتی۔ اس نے مجھے ایک ڈاکٹر کا نسخہ دیا کہ لو خود جا کے کسی کیمسٹ سے معلوم کرلو اور یہ دوا خرید لو۔ بس اس کے بعد میں کچھ مطمئن ہوگیا۔"

میں نے کہا "تم نے خود وہ دوا کافی میں ملائی تھی؟"

اس نے اقرار میں سرہلایا "پہلے میں نے سوچا تھا کہ کسی ویٹر کو ساتھ ملالوں لیکن اس میں خطرہ تھا۔ ویٹر شکایت کردیتا تو پولیس مجھے پکڑلیتی۔ عین وقت پر میں بہن کی رخصتی کے معاملے کو بگاڑ دیتا تو ساری عمر یہ خیال رہتا کہ اس کی زندگی کو میں نے تباہ کیا۔ پھر شاید کبھی اس کی رخصتی نہ ہوتی۔ اس سے تو بہتر یہی تھا کہ میں گاڑی بیچ کے بڑے بھائی کا فرض ادا کروں اور میرے ضمیر پر بوجھ کوئی نہ ہو۔ اگر کوئی ویٹر مان بھی جاتا تو آدھی رقم ضرور مانگتا۔ شاید زیادہ کیونکہ اصل کام تو اسے ہی کرنا تھا۔ اور پچاس ہزار بھی نہ ملیں تو ایسے کام میں ہاتھ ڈالنے سے کیا فائدہ۔"

"یعنی ایک لاکھ میں تمہارے نزدیک وہ کام جائز ہوتا جو پچاس ہزار میں بُرا تھا؟" میں نے طنز سے کہا۔

"آپ جو مرضی سمجھ لیں جی۔ بندہ کنویں میں جانتے بوجھتے گرتا ہے تو دیکھ لیتا ہے کہ کنواں کتنا گہرا ہے۔ اس میں پانی ہے' کچھ یا پتھر روڑے ہیں۔ اس کے ہاتھ پاؤں ہی ٹوٹیں گے یا لاش ہی باہر آئے گی۔"

"پھر تم نے یہ کام کیسے کیا؟"

"میں اندر آتا جاتا رہتا ہوں۔ سب مجھے جانتے ہیں۔ یہی سمجھتے ہیں کہ کسی مسافر سے کوئی بات کرنی ہوگی یا کسی نے مجھے بلایا ہوگا۔ مجھے معلوم تھا کہ لانڈری کدھر ہے اور اسٹور کہاں ہے۔ میں نے وردی حاصل کرلی اور وہیں اسٹور میں بدل لی۔ اس پر جو نمبر تھا وہ پرانا تھا۔ شاید کبھی کسی ویٹر کو ملا ہوگا۔ اس نمبر کے ساتھ کچن میں جانا خطرناک ثابت ہوسکتا تھا۔ ویٹر سب ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں۔ میں نے نمبر ہٹادیا اور پھر روم سروس کے قریب ہی ٹرے لے کر دروازے کے پیچھے کھڑا ہوگیا۔ جب کوئی ویٹر گزرتا تھا تو میں منہ دوسری طرف کرلیتا تھا۔ بالآخر فون پر بٹلر نے آپ کے کمرے کا آرڈر سُنا۔ بٹلر نے آرڈر آگے پاس کیا اور میں نے دیکھا کہ ایک ویٹر ٹرے میں پیالیاں' چینی' وغیرہ رکھ رہا ہے۔ میرا خوف سے بُرا حال تھا۔ میرے جسم پر پسینہ بہہ رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ کام مجھ سے نہیں ہوگا۔ کوئی مجھے پہچان جائے گا اور کچھ کرنے سے پہلے ہی میں پکڑا گیا تو کیا بتاؤں گا کہ میں نے یہ وردی کیوں پہنی ہے۔ لیکن ایک لاکھ کا لالچ مجھے قدم پیچھے نہیں ہٹانے دیتا تھا۔ اب جو ہو سو ہو۔ میں نے سوچا اور جب آپ کے کمرے میں کافی لے جانے والا ویٹر کچن سے نکلا تو میں اس سے پہلے ہی اوپر پہنچ چکا تھا۔ اتفاق سے مجھے ایک بند دروازے کے باہر خالی برتن رکھے ہوئے نظر آگئے۔ میں وہ برتن لے کر چل پڑا۔ میں نے ٹرے میں سو کا ایک نوٹ ڈال دیا۔ لفٹ نیچے پہنچی اور دروازہ کھلا تو اوپر آپ کے کمرے میں کافی لے جانے والا ویٹر تیار کھڑا تھا۔ میں نے اسے سوچنے کا موقع دیے بغیر اپنی ٹرے اسے پکڑادی اور اس کی ٹرے اٹھالی۔ میں نے کہا کہ یہ برتن تو لے جا' کافی میں پہنچا دیتا ہوں۔ اس نے پوچھا کہ پتا بھی ہے کس کا آرڈر ہے؟ تو میں نے سرہلادیا۔ اس کی نظر سو کے نوٹ پر گئی تو وہ خاموش ہوگیا اور اتنی دیر میں لفٹ کا دروازہ بھی بند ہوگیا۔"

"اسے شک نہیں ہوا تھا؟"

"ہوا ہوگا تو اس نے اظہار نہیں کیا۔ وہ سمجھا ہوگا کہ کسی نے مجھے سو روپے ٹپ دی تھی جو میں اس کے لیے چھوڑ رہا ہوں۔ شاید کوئی خاص بات ہے کہ میں اس کی جگہ کافی لے جانا چاہتا ہوں۔

ایسا ہوتا ہے بعض اوقات۔ مستقل قسم کے مہمان مخصوص ویٹرز کے ساتھ رابطہ رکھتے ہیں جو اُن کے خاص کام کرتے ہیں اور ان کے رازدار ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک لینڈلارڈز ہیں ملتان کے۔ وہ ہمیشہ میری گاڑی لیتے ہیں۔ ہر مہینے ایک رات کے لیے قیام کرتے ہیں۔ ہوٹل کے اندر بھی خاص بندہ ہے۔ کمرا انہیں کوئی بھی ملے' وہ اسی ویٹر کو طلب کرتے ہیں۔ وہ کہیں فون کرتا ہے اور پھر ان کی مہمان کو لانے کے لیے مجھے بھیجتا ہے۔ صبح میں اس مہمان کو واپس چھوڑ آتا ہوں۔ دوپہر سے پہلے وہ خود بھی ملتان چلے جاتے ہیں اور مجھے دو طرفہ کرایہ دیتے ہیں۔ ملتان سے وہ اسی ویٹر کو فون کرتے ہیں کہ گاڑی بھیج دو اور وہ مجھے بتا دیتا ہے کہ ملک صاحب کو لے آؤ۔"

"میں سمجھ گیا' آگے بولو۔"

"بس جی۔ میں نے کافی میں وہ دوا ملائی جو میں نے پیس کے سُرمہ کرلی تھی۔ کافی آپ کے کمرے میں پہنچائی اور بھاگ لیا۔ آپ کو شک ہوگیا تھا؟"

"ہاں۔ تم گھبرائے ہوئے تھے۔ میں نے دوبارہ کافی منگوائی تھی تو دوسرا ویٹر آیا تھا۔ اس نے صاف انکار کردیا تھا کہ اس کی جگہ کوئی اور کافی لے آیا تھا" میں نے کہا۔

"وہ سمجھ گیا ہوگا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ وہ کیسے مان لیتا کہ سو روپے دیکھ کر اس نے ٹرے کسی اور کو دے دی تھی۔ میں نے آپ کے کمرے میں آنے سے پہلے نمبر لگالیا تھا۔ اس سے بھی گڑبڑ ہوئی تھی۔ میں تو واپسی میں سیدھا اسٹور ہی گیا۔"

"کیا اسٹور ہر وقت کھلا رہتا ہے؟"

"وہ لانڈری کا اسٹور ہے جی۔ وہاں میلے کپڑے بھرے رہتے ہیں۔ ہر روز صبح بیڈ شیٹ وغیرہ بدل جاتی ہیں۔ اس کے بعد لانڈری والا سب سمیٹ کرلے جاتا ہے۔ ویٹر بھی وردی بدلتے ہیں تو پہلی وردی وہیں ڈال دیتے ہیں۔ بلاوجہ دن میں وہاں کون جاتا ہے۔ میں نے فائف بیرے کی وردی اتار کے اپنی ڈرائیور کی وردی پہنی اور ہوٹل سے نکل آیا۔ مجھے اس کام میں ایک گھنٹا بھی نہیں لگا ہوگا مگر میرا یہ حال تھا کہ دروازے پر گیٹ کیپر نے مجھ سے پوچھا کہ کیا بات ہے فضل دین۔ بڑا بیمار لگ رہا ہے تو۔ طبیعت تو ٹھیک ہے۔ اور میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوا اپنی گاڑی میں جا کے لیٹ گیا۔ میں نے اپنا کام کردیا تھا۔ اب میں باقی پچاس ہزار کے بارے میں سوچ رہا تھا اور ایک لاکھ کے خیال سے مجھے نشہ ہونے لگا تھا۔ یہ ایک لاکھ میں نے جان ہتھیلی پر رکھ کے کمائے تھے۔"

"ہماری جان کی بازی لگا کے۔ تم نے یہ پوچھنا بھی ضروری نہیں سمجھا تھا کہ ہمیں خواب آور دوا دینے کا مقصد کیا ہے؟"

"پوچھا تھا۔ اس شخص نے کہا کہ تم اپنا کام کرو۔ تفتیش مت کرو۔ ہم اپنا کام کریں گے اور تمہیں کچھ نہیں بتائیں گے۔ ابھی میں آکے لیٹا ہی تھا کہ وہ آگیا۔ اس نے پوچھا کہ کام ہوگیا اور میں نے اقرار میں سرہلادیا۔ اس نے باقی پچاس ہزار مجھے دے کے کہا کہ کیا خیال ہے' ایک لاکھ اور کماؤ گے؟ میں نے ہاتھ جوڑے کہ مجھے معاف کرو۔ وہ ہنسنے لگا کہ مشکل کام تو تم نے کرلیا' اب آسان کام کے ایک لاکھ مل رہے ہیں تو انکار کررہے ہو۔ خیر یہ کام کوئی اور بھی کرسکتا ہے۔ بس جی' مجھ پر دوبارہ لالچ غالب آگیا۔ میں نے کہا کہ اب کیا کام ہے۔ اس نے کہا کہ تم یہاں موجود رہو۔ ہوسکتا ہے' تمہیں ہمارے ساتھ جانا پڑے۔ پھر وہ غائب ہوگیا اور میں گاڑی میں لیٹا ایک لاکھ کے تصور میں آسمان پر اُڑتا رہا۔ اب میں بہن کو بڑی دھوم دھام سے رخصت کروں گا اور اسے اتنا جہیز دوں گا کہ ساری عمر کوئی اسے کچھ نہ کہہ سکے۔ وہ لڑکا لالچی نہیں تھا۔ اس کی ماں کا منہ بند کرنا ضروری تھا۔ مزید ایک لاکھ کی امید ہوئی تو میں اپنی شادی اور اپنا گھر بنانے کے بارے میں سوچنے لگا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ آدھی رقم سے کوئی پانچ مرلے کا مکان خرید لوں گا' باقی محفوظ رکھوں گا۔ گاڑی میرے پاس ہوگی تو نہ آمدنی کا مسئلہ ہوگا نہ رہائش کا۔ باقی زندگی چین سے گزر جائے گی۔ شام کو میڈم کو گاڑی کی ضرورت پڑی تو میں ہی انہیں انارکلی بازار لے گیا تھا۔ وہ نہ جانے کہاں سے سب کچھ دیکھتا رہتا تھا۔ میری تو مت ماری گئی تھی اتنی دولت دیکھ کر جناب۔ اندھا ہوگیا تھا میں کہ مجھے کوئی خطرہ نظر نہیں آیا۔ میں نے اس پر یقین کرلیا کہ خطرہ کوئی نہیں۔ حالانکہ ایسے دھندے میں خطرے کے سوا ہوتا کیا ہے اور جہاں کوئی لاکھوں لٹا رہا ہو اتنی بے دردی سے' وہاں خطرہ بھی بہت بڑا ہوگا' یہ میں نے نہیں سوچا یا سوچا تو اہمیت نہیں دی۔ انارکلی میں میڈم ایک اسٹور میں گئیں تو وہ میرے پاس آگیا۔ وہ ہمارے پیچھے لگا ہوا تھا۔ اس نے مجھے کہا کہ فضل دین' تمہیں ایک فون کرنا ہے۔ مسٹر رستم جی بٹن والا کو۔ وہ ہوٹل میں اکیلا ہوگا۔ میں نے پوچھا کہ کیا کہنا ہے تو اس نے کہا کہ ڈائیلاگ میں سمجھادوں گا۔ تم اپنی اصل آواز کو اور لہجے کو بدل سکتے ہو؟ میں نے کہا کہ ہاں۔ تھوڑا بہت لیکن تم یہ سب کیا کررہے ہو اور کیوں؟ اس نے پھر وہی جواب دیا کہ کام کرو' سوال مت کرو۔ نہیں کرسکتے تو انکار کردو۔ لو جناب' اس وقت پھر میرے سامنے پچاس ہزار آگئے۔ میری تو آنکھیں چُندھیا جاتی تھیں' عقل پر پردہ پڑ جاتا تھا اور میں سارے سوال بھول جاتا تھا۔"

شیلی نے کہا "یار' میرا بھوک سے دم نکل جائے گا۔ تمہاری باتیں ختم نہیں ہوں گی۔"

میں نے کہا "تم ڈاکٹر ہو' یہ جانتی ہوگی کہ بنا کھائے پیے آدمی کتنے دن جی سکتا ہے۔ غیر ضروری باتیں فرنچ میں کرو۔"

"کیا میں صبح تک اسی سڑک پر ادھر سے اُدھر آتی جاتی رہوں؟" اس نے فرنچ میں کہا "معلوم ہے یہ کون سا چکر ہے؟"

"یہ تقدیر کا چکر ہے" میں نے کسی فلسفی کی طرح جواب دیا۔

"یار یہ چوتھا چکر ہے۔ بارہ بجنے والے ہیں اور میرا خیال ہے کہ ہمارے پیچھے کوئی لگا ہوا ہے۔"

"کیا؟ آر یو شیور؟" (تمہیں یقین ہے؟)

"تقریباً۔ ویسے تم خود بھی تصدیق کر سکتے ہو۔ ایک گاڑی لائٹ جلائے بغیر تقریباً ایک فرلانگ پیچھے چل رہی ہے۔ اس میں چار آدمی ہیں۔"

"تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟" میں نے پلٹ کے پیچھے دیکھا لیکن مجھے دور تک کوئی گاڑی نظر نہیں آئی۔

"اب کیا کروں یار؟ یہ بتاؤ"

"وہ شاید ہماری واپسی کے منتظر ہیں" میں نے کہا "تم زیادہ سے زیادہ کتنی رفتار سے گاڑی دوڑا سکتی ہو؟ سابقہ ریکارڈ کیا ہے؟"

"وہ لندن کا ریکارڈ تھا۔ یہ لاہور کی سڑکیں ہیں۔ یہاں وہ ریکارڈ توڑنے کی کوشش کی تو ریکارڈ کے سوا ہر چیز ٹوٹ جائے گی۔ اس گاڑی کے اور میرے تمہارے پارٹس..."

"چلو پھر جتنی رفتار سے بھی ممکن ہو اس خطرے کو پیچھے چھوڑ سکتی ہو۔ سیدھی سڑک پکڑو۔ ان کو کنفیوز کردو تاکہ انہیں پتا نہ چلے۔" میں نے پلٹ کے دوبارہ سڑک پر نگاہ دوڑائی۔ "غالباً یہ آخری پھیرا ہوتا۔ اللہ نے تمہیں بروقت عقل دی اور تم نے مجھے بتا دیا۔"

میرا خیال تھا کہ وہ شکار اور شکاری کی خطرناک دوڑ کے مقابلے سے گھبرائے گی مگر اس نے بڑی خوش دلی سے جواب دیا بات چونکہ ایسی ہو گئی کہ سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے۔ اور گاڑی جو طاقت میں طوفان سے کم نہ تھی، زخم خوردہ درندے کی طرح دم اٹھا کے بھاگی۔

میں نے چلا کے کہا "شاباش۔ میری طرف سے اجازت ہے۔ جہاں چاہو مڑ جاؤ، جہاں دل چاہے کوئی بھی کھمبا یا پیڑ گرا دو بس کے پیچھے یا ٹرک کے اوپر سے گزر جاؤ۔ دریا، سمندر، پہاڑ۔"

گاڑی اسی نوے میل کی رفتار پر پوری طرح اس کے کنٹرول میں تھی۔ آدھی رات کے وقت سڑکیں خالی تھیں اور سوائے ایک دو چوراہوں کے جہاں بغیر ہیڈ لائٹ کی گاڑی سے دوسرے کار والوں نے فوراً اپنی گاڑی کو بچالیا، کہیں حادثے کے امکانات پیدا نہیں ہوئے۔ رات کے وقت سڑک پر گشت کرنے والی پولیس کی ایک وین بھی بال بال بچی۔ انہوں نے اس تیز رفتاری کا نوٹس لیتے ہوئے سیٹی بھی بجائی مگر تعاقب کی غالباً کوشش بھی نہیں کی۔ انہیں اپنی طرح اپنی گاڑی کی مستعدی اور کارکردگی کے معیار کا علم ہوگا۔ جیسی روح ویسے فرشتے۔ کاہل پولیس تو مردار گاڑی۔

فضل دین سخت خوف زدہ تھا اور بار بار پیچھے دیکھ رہا تھا۔ خود میری بھی ... تھیں۔ تقریباً پانچ منٹ بعد مجھے یقین ... ہ

ہمارے پیچھے کوئی نہیں ہے تو میں نے شبلی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا "گڈ۔ تم کوئی بھی ریس جیت سکتی ہو۔ اب آرام سے چلو۔"

اس نے فرنچ میں کہا "یار، ایسے ہی میرے ذہن میں ایک خیال آیا ہے۔ کہیں اس گاڑی میں خفیہ مائکروفون نہ لگا ہوا ہو۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ "کمال کردیا تم نے تو۔ ایسا شاندار خیال کیسے آیا آخر تمہیں؟ تم تو واقعی ذہین بھی ہو۔"

وہ خوش ہو کے بولی "جاسوسی اور ایکشن فلموں میں ایسا ہوتا ہے نا یار۔ میں بہت فلمیں دیکھتی ہوں۔"

"کبھی بری عادت کا بھی فائدہ ہو جاتا ہے۔ اب دیکھو اس گاڑی میں جو ریڈیو ہے، وہ آن کردو۔"

"اس سے کیا ہوگا؟" اس نے ریڈیو کھول دیا۔

"شور میں ہماری گفتگو کوئی نہیں سنے گا" میں نے کہا۔

"مگر وہ شور کا پیچھا کرتے ہوئے آجائیں گے۔ اگر وہ اس گاڑی میں سگنل وصول کر رہے ہیں تو..."

میں نے ندامت سے سر ہلایا "کاش میں نے فلموں سے ہی کچھ سیکھا ہوتا۔"

شبلی نے کہا "یار، یہ کار ریڈیو کا ایریل۔ تم نے دیکھا، یہ باہر کتنا اوپر نکلا ہوا ہے۔ حالانکہ ریڈیو بند تھا۔"

"سگنل اسی سے نشر ہو رہا ہوگا۔" میں نے چلا کے کہا "اسے بند کردو۔"

شبلی نے دائیں ہاتھ کو باہر نکال کے ایریل کو اندر کھینچا تو ریڈیو میں شور آنے لگا۔ پاکستان کے ریڈیو اسٹیشن اپنے پروگرام ختم کر چکے تھے۔ ریڈیو پر شاید بی بی سی سے موسیقی نشر ہو رہی تھی جو شور میں دب گئی۔

میں نے کہا "یہ ٹھیک ہے۔ ایک ہاتھ سے گاڑی چلاؤ، دائیں ہاتھ سے ایریل کو پکڑے رہو۔ پھر یہ کام نہیں کرے گا۔"

غالباً شبلی بھی میری بات سمجھ گئی۔ اس نے ریڈیو کا والیوم کم کردیا مگر اسے آن رکھا اور ایریل کو نہیں چھوڑا۔ کار کے ریڈیو کا ایریل اس کی باڈی کو نہیں چھوتا کیونکہ بیرونی کا ... پول کار کی باڈی سے جوڑا جاتا ہے اور پینٹ کے نیچے دھات کی سطح ایک آلے کا کام کرتی ہے۔ ایریل کو شبلی نے پکڑا تو وہ ارتھ ہو گیا۔

میں نے کہا "اب مواصلاتی رابطہ تو نہیں رہا لیکن رسک لینے کی ضرورت نہیں۔ تم سیدھی چلتی جاؤ اور جیسے ہی کوئی مناسب جگہ نظر آئے، گاڑی کو سائڈ میں کہیں روک لو۔"

مناسب جگہ فوراً ہی آگئی۔ سڑک کے کنارے ایک بہت بڑا سائن بورڈ لگا ہوا تھا۔ اور اس کے بالکل سامنے ایک ... کھڑی ہوئی تھی۔ بس شاید خراب تھی۔ جب شبلی نے ... بورڈ کے پیچھے روکا تو میں نے دیکھا کہ بس کی شافٹ نکلی ہوئی ...

سائن بورڈ کے نیچے جہاں اسے سہارا دینے والے تین فولادی ستون تھے، جھاڑیوں کی باڑھ تھی۔

شبلی نے کہا "بڑا مزہ آرہا ہے یار اس ایڈونچر میں۔ لگتا ہے، میں شوٹنگ کرا رہی ہوں۔"

"شوٹنگ بھی ہو سکتی ہے۔ اصلی" میں نے کہا "اپنا ریوالور مجھے دے دو۔ تم سڑک پر نظر رکھو۔ انجن بند مت کرنا اور ایریل کو مت چھوڑنا۔"

ہم اندھیرے میں خاموش بیٹھے رہے۔ رات کے سکوت میں انجن کے آہستہ چلنے کی آواز بھی ہمیں زیادہ محسوس ہو رہی تھی حالانکہ باہر کھڑا ہوا کوئی شخص سنتا تو اسے ہوا کی سرسراہٹ سنائی دیتی۔

شبلی نے سرگوشی میں کہا "اگر پولیس آجائے یار اور پوچھے کہ کون ہو تم لوگ، کیوں چھپے ہوئے ہو یہاں تو کیا جواب ہوگا؟"

میں نے اس کے کان میں کہا "سو کا ایک نوٹ۔"

"وہ ادھر دیکھو" شبلی نے کہا "یار، یہ وہی گاڑی ہے۔"

سفید رنگ کی ایک بل مین کار لائٹس آف کئے بہت آہستہ آہستہ سڑک پر ہمارے سامنے سے گزر رہی تھی۔ "تمہیں یقین ہے؟"

"سو فیصد" شبلی نے کہا "یہ لوگ کنفیوز ہو گئے ہیں یار۔"

میں نے کہا "انہیں جانے دو۔ اب تم پیچھے آجاؤ۔ گاڑی میں چلاؤں گا۔"

اس نے نیچے اترتے ہوئے بھی ایریل کو نہیں چھوڑا۔ پھر جب میں اس کی جگہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور میں نے ایریل کو پکڑ لیا تو وہ پیچھے چلی گئی۔ فضل دین کی طرف سے اب مجھے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا تھا۔ وہ پٹے ہوئے کتے کی طرح دم دبائے بیٹھا تھا اور سخت خوف زدہ تھا۔ اگر اسے تھوڑی بہت امید تھی کہ اسے نیلا ہاکو دینے والے اس کو بچانے آجائیں گے تو اب یہ آس بھی دم توڑ گئی تھی۔ اسے شاید یہ اندازہ بھی ہو گیا تھا کہ وہ کسی لمبے چکر میں پھنس گیا ہے۔ اور جیسے دو ہاتھیوں کی لڑائی میں مینڈک پس جاتے ہیں، دو خطرناک قسم کے مجرموں کی محاذ آرائی میں وہ مارا جائے گا۔ معاوضہ وصول کرتے ہوئے اس نے یہ نہیں سوچا ہوگا کہ شامت اعمال اسے مخالف گروہ کے چنگل میں پھنسا دے گی۔ ان کا کام تمام ہو جاتا تو اس کی جان چھوٹ جاتی مگر ہم بچ گئے تھے اور ... دشمنوں کا آلہ کار بننے کے جرم میں وہ ہم سے کسی رعایت کی توقع نہیں کر سکتا تھا۔

اس نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ میں خالی ہاتھوں سے اس کی ہڈی پسلی ایک کر سکتا ہوں تو شبلی واقعی اس کے سر میں سوراخ کر سکتی ہے۔ ہم کسی غیر ملکی زبان میں بات کرتے تھے اور ہمارے دشمن بھی کم حیثیت والے، عام قسم کے بدمعاش نہیں تھے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ ہم بین الاقوامی سطح کے دہشت گرد یا مجرم ہیں۔

ایک ... اس ... ڈرائیور ان حالات میں خود کو ... ہم سے پوچھ ... نے سے ... یہ ... کر سکتا تھا۔

میں نے گاڑی کو واپس سڑک پر لا کے یوٹرن دیا اور ہم جدھر سے آئے تھے پھر ادھر ہی روانہ ہوئے۔ اگر اس وقت بھی ہم کوشش کرتے تو آدھے گھنٹے میں گلبرگ مارکیٹ پہنچ سکتے تھے اور شبلی کی چائنیز کھانے کی خواہش پوری ہو سکتی تھی مگر ثابت یہ ہوا کہ ہر خواہش محض ارادے سے پوری نہیں ہوتی۔ وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔

پہلی غلطی میں نے یہ کی کہ ہیڈ لائٹس کو آن نہیں کیا حالانکہ مخالف سمت میں سفر کرتے ہوئے دشمنوں سے سامنا ہونے کا کوئی امکان نہ تھا۔ اپنے ذہن میں محفوظ نقشے کے مطابق میں نے ایک شارٹ کٹ لیا۔ وہاں موڑ پر کسی نے کار غلط پارک کی تھی مگر تیز رفتاری سے موڑ کاٹتے ہوئے میں پوری کوشش کے باوجود اپنی گاڑی کو نہ بچا سکا۔ میری گاڑی کا اگلا دایاں کونا اس کار کے پچھلے بائیں کونے سے ٹکرایا تو بڑا خوفناک ... ہوا۔ کھڑی ہوئی کار کی ٹیل لائٹ کے پرخچے اڑ گئے اور ... کی ہیڈ لائٹ کا شیشہ بکھرنے کی آواز الگ آئی۔

مجھے یقین تھا کہ گاڑی کی رائٹ ... ہوئی ہوگی مگر اس وقت رکنے کی گنجائش نہ تھی۔ جس ... تھی وہ اچھل کر تھوڑا سا آگے ہو چکی تھی۔ مجھے گاڑی ... کا راستہ مل گیا تھا۔ اندر شور مچ گیا ... ہوٹل کے ایک چوکیدار شور مچانے لگا تھا لیکن میں نے اس کی آواز کو سنا ہی نہیں۔ اس مختصر سی گلی سے نکل ... جاتی تو روشنی صرف بائیں جانب ہوتی اور مجھے دائیں طرف کا ... ہوٹل بالکل نظر نہیں آیا۔

گاڑی مین ہول میں گری اور زبردست جھٹکا کھا کے نکلی تو اس کی رفتار کم ہو گئی تھی۔ پھر دوسرا پہیہ ... میں گیا اور قسمت اچھی تھی کہ نکل گیا لیکن اب گاڑی لنگڑا کے دوڑ رہی تھی۔

"تم تو یار کمال کی ڈرائیونگ کرتے ہو" شبلی نے کہا۔

میں نے کہا "یہ رکاوٹیں والی ... تمہارے بس کی نہیں تھی اسی لیے میں نے گاڑی لے لی تھی۔"

شبلی نے کہا "... سے اس کے ٹائر کٹ گئے ہیں شاید ماسسپنشن تباہ ہوا ہے۔"

میں نے کہا "ابھی چل رہی ہے۔ فضل دین! شاید ہمیں یہ گاڑی کہیں چھوڑنی پڑے۔"

وہ مردہ آواز میں بولا "کوئی بات نہیں ... میں ... چلا جاؤں گا۔ صبح اٹھوالوں گا گاڑی۔ جو نقصان ہونا ہے وہ تو ہو گا۔"

میں نے کہا "خرچے کی بات نہیں، خطرے کی بات ... سے پہلے کہ تم گاڑی اٹھواؤ، دشمن تمہیں اٹھوالیں ...

دشمن اب تمہارے بھی دوست نہیں رہے۔"

"نصیب کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے سر۔"

میں نے کہا "وہ رقم کہاں ہے جو انہوں نے دی تھی؟"

وہ رونے پر اتر آیا "مجھ غریب کو مت لوٹیں جناب..."

میں نے چلّا کے کہا "غریب کے بچے! میں پیچھے ہوتا تو تمہارے جھانپڑ مارتا اس بات پر۔ شیلی! اس کے ایک علامتی چپت لگاؤ۔ اسے سمجھاؤ کہ ہم ڈاکو یا چور اُچکے نہیں' بہت شریف لوگ ہیں۔"

"وہ تو اسے اندازہ ہوچکا ہے۔ بلکہ تجربہ۔ سمجھانے کی کوئی ضرورت نہیں یار" شیلی نے کہا۔

"فضل دین! وہ تمہاری جان بھی لے سکتے ہیں۔ مال واپس لینے کے بعد کیونکہ تم نے ان کا سارا کھیل بگاڑ دیا۔"

"میں نے جی؟" وہ فریادی لہجے میں بولا۔

"ہاں تم نے۔ غلطی تمہاری تھی یا نہیں' یہ کوئی نہیں دیکھے گا۔ الزام تم پر آئے گا کہ تم نے عقل سے کام نہیں لیا اور تم بزدل ثابت ہوئے۔ اب تمہارے بچنے کی ایک ہی صورت ہے۔ ہم تمہیں مار کے باہر پھینک دیتے ہیں۔"

"کیا... مجھے مار کے؟" وہ چلّانے لگا۔

"مارنے کا مطلب جان سے مارنا نہیں تھا۔ سوری' ہم تمہیں ناک آؤٹ کرکے سڑک پر گرادیتے ہیں اور تمہاری گاڑی لے کر بھاگ جاتے ہیں۔ کوئی صبح ہونے سے پہلے تمہیں اٹھالے گا۔ اسے بتادینا کہ مسٹر اور مسز رستم جی بٹن والا نے تمہاری گاڑی لی تھی لیکن راستے میں ان کی نیت خراب ہوگئی۔ وہ تمہیں مار کے باہر پھینک گئے اور گاڑی لے گئے۔ ہوسکے تو تھانے جاکے رپورٹ لکھوادینا۔ خواہ رپورٹ لکھوانے کے لیے رشوت دینی پڑے۔ پھر ہوٹل پہنچ جانا روتے پیٹتے۔ جب وہ لوگ تم سے رابطہ کریں تو خوب شور کرنا کہ مجھے مروادیا۔ پیسہ دے کر غلط کام کرایا۔ مجھ سے کہا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ وہ تو بڑے خطرناک لوگ تھے۔ مجھے قتل کردیتے۔ اچھا ہوا گاڑی ہی لے گئے۔ گاڑی کے ساتھ پیسہ بھی گیا لیکن خدا کا شکر ہے جان بچ گئی۔ بس اسی قسم کے ڈائیلاگ ذرا روتے پیٹتے بولنا اور کہنا کہ اب بتائیں کیا کروں۔ میری تو گاڑی بھی گئی اور حاصل کچھ نہیں ہوا۔ ان کے گلے پڑجانا کہ میرا نقصان پورا کرو۔ عین ممکن ہے' تم ان سے کچھ اینٹھنے میں کامیاب ہوجاؤ لیکن اصل بات یہ ہے کہ تمہاری جان صرف اسی طرح بچ سکتی ہے۔ انہیں یقین دلاؤ کہ تم نے ہمیں کچھ بھی نہیں بتایا حالانکہ رستم جی بٹن والا نے تمہیں رُستمِ ہند کی طرح مارا۔ وہ تو جوڈو کراٹے سب جانتا ہے اور اس کے ساتھ جو لڑکی تھی' وہ بار بار گولی ماردیتی تھی۔ میرا مطلب ہے' یہ کہتا کہ گولی مارنے کی دھمکی دیتی تھی۔ میری بات سن رہے ہو نا غور سے؟"

"سن رہا ہوں جناب!"

"اگر تم نے ایسا نہ کیا اور انہیں شک ہوا کہ تم نے ہمارا مقابلہ کیے بغیر سب بتادیا ہے تو تمہاری خیر نہیں۔ تم ان سے وفاداری اور جاں نثاری کا مظاہرہ کرنے کا انعام اور معاوضہ مانگ سکتے ہو' رحم کی بھیک نہیں۔ انہیں یقین دلانا بے حد ضروری ہے کہ تم نے ہم سے تعاون نہیں کیا تھا اسی لیے تمہارا حشر برا ہوا۔"

"وہ پوچھ سکتے ہیں کہ انہوں نے تمہیں قتل کیوں نہیں کیا" شیلی نے نکتہ اٹھایا۔

"گڈ پوائنٹ۔ فضل دین! عقل سے کام لوگے تو تمہارے ڈیڑھ لاکھ بھی محفوظ رہیں گے۔ ممکن ہے نقصان کی تلافی کے طور پر مزید پچاس ہزار مل جائیں۔ انہیں بتانا کہ رُستمِ ہند کا ارادہ یہی تو تھا کہ تمہیں جان سے مادیا جائے مگر تم نے اپنی بہن کی رخصتی کے لیے زندگی کی بھیک مانگی۔ خدا رسولؐ کے واسطے دیے تو مسز رستم جی بٹن والا کے دل پر اثر ہوا اور اس نے سفارش کی کہ چلو اس کی جان بخشی کردو ورنہ بہن گھر بیٹھی رہ جائے گی۔ اور اس طرح تمہارے قتل کا فیصلہ بدل گیا۔ ایسی باتیں عورتوں کو جذباتی بلکہ اشکبار کردیتی ہیں۔" میں نے کہا "اور ہم چین پہنچ گئے۔ اب وقفہ برائے چینی طعام۔ اس کے بعد ماریں گے فضل دین کو۔"

"بھوکے پیٹ تو مجرم کو بھی پھانسی نہیں دیتے" شیلی نے کہا "مگر اب میں کیا کروں یار؟ میری تو بھوک ہی مرگئی ہے۔"

فضل دین نے کہا "میں کچھ نہیں کھاسکتا جی۔ میرا تو دل ڈوب رہا ہے۔"

"دل کو تیرنا سکھاؤ" میں نے کہا اور گاڑی کو ایک چائنیز ریسٹورنٹ کے سامنے کھڑی ہوئی بہت سی گاڑیوں کی قطار میں شامل کردیا۔

"یار' ہم اندر نہیں جائیں گے؟" شیلی نے کہا۔

"جا بھی نہیں سکتے" میں نے کہا "یہیں منگوالیتے ہیں جو ملے۔"

ہارن غالباً شہید ہوچکا تھا یا صدمے سے گُنگ تھا۔ میں نے ایک بیرے کو خالص لاہوری اسٹائل میں بلایا "پہلوان جی! ساڈے ول وی پھیرا پاؤ۔"

پہلوان جی نے اس خطاب کو طنز سمجھا۔ وہ بانس جیسا پتلا لمبا اور صورت سے فاقہ زدہ لگتا تھا۔ میرے ہاتھ میں مینو کارڈ تھماکے اس نے گردن کو ہر سوال پر دائیں بائیں ہلانا شروع کردیا۔ مجھے شک ہوا کہ شاید کسی معذوری کے باعث وہ سر کو اوپر نیچے نہیں کرسکتا۔

شیلی نے کارڈ مجھ سے چھین کے اسے تھمادیا "اب تم جو چاہو لے آؤ یار۔ میرا مطلب ہے جو بھی بچا ہے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ ایسا نہ ہو' تم مزید آدھا گھنٹا نفی میں سر ہلاتے رہو اور ادھر ریسٹورنٹ بند ہوجائے۔"

اس نے پھر بڑی حقارت سے گاڑی کے اگلے حصے پر نظر ڈالی تو میں نے مجبوراً نیچے اتر کے دیکھا۔ گاڑی کا دایاں جبڑا ٹوٹ گیا تھا اور بہت سی شاندار کاروں کے بیچ میں وہ یوں لگ رہی تھی جیسے مقابلۂ حسن کی حسیناؤں کے درمیان جج نظر آتا ہے۔ ہمارے استعمال میں آنے سے پہلے یہ گاڑی بھی شاندار تھی۔

میں نے فضل دین کو تھوڑا سا اور بریف کیا۔ اس نے انکشاف کیا کہ ساری رقم اسی گاڑی میں موجود ہے۔

"اسی گاڑی میں! عجیب بے وقوف آدمی ہو تم۔"

"اور کہاں لے جاتا سر؟" وہ بولا "بینک میں جمع کراتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ وہ پوچھ نہ بیٹھیں کہ کہاں سے آیا اتنا پیسہ؟"

شیلی نے اسے ڈانٹا "بینک والے یہ کیسے پوچھ سکتے ہیں۔ قانونی طور پر وہ ایسا سوال کرنے کا اختیار نہیں رکھتے۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر شیلی! قانون کی بات کرتے وقت یہ مت بھولا کرو کہ تم لندن میں نہیں ہو۔ فضل دین ٹھیک کہتا ہے۔ یہ غریب آدمی ہے اس لیے سچ بھی بولے تو جھوٹ بولنے کے جرم میں پکڑا جاسکتا ہے۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ گزشتہ روز کی ڈکیتی میں وہ شریک تھا۔"

"کون سی ڈکیتی میں؟"

"کسی بھی ڈکیتی میں۔ یہ تو الزام عائد کرنے والوں کی مرضی ہے کہ جس پر جو الزام چاہیں عائد کردیں۔ اگر وہ اپنا دفاع نہ کرسکتا ہو۔" میں نے کہا "فضل دین! وہ رقم کہاں چھپائی ہے' نکال کے ہمیں دے دو۔"

وہ مجھے پاگلوں کی طرح دیکھنے لگا "آپ کو... نہیں جی۔"

میں نے کہا "بابا کچھ سمجھنے کی کوشش کرو۔ اول تو وہی چھین سکتے ہیں تم سے جنہوں نے دی تھی۔ ورنہ پولیس نکال لے گی۔ گاڑی جب ملے گی تو پولیس کی تحویل میں جائے گی اور تھانے میں کھڑی رہے گی۔"

"یا مولا! کس مصیبت میں پڑگیا ہوں۔ مجھے معاف کردے" فضل دین رونے لگا۔ "بڑی غلطی ہوئی مجھ سے رب جی۔"

میں نے کہا "رونے دھونے سے کچھ نہیں ہوگا۔ ہمت سے کام لو۔ جیسے پہلے ہمت سے کام لیا تھا تو ہمیں زہر تک دے دیا تھا۔"

ایک کے اوپر ایک ٹرے اٹھائے بیرا ہماری طرف آیا تو شیلی نے کہا "چپ کرجاؤ یار۔ اللہ کی یہی مرضی تھی۔"

میں نے بھی کہا "موت سے کس کو رستگاری ہے۔ اللہ تمہاری خالہ کی مغفرت کرے اور خالو کو نعم البدل عطا کرے۔ لو کیکڑے کھاؤ۔"

ویٹر نے روتے ہوئے فضل دین کو پُر تعزیت نظروں سے دیکھا اور شاید حیران ہوا کہ اس زمانے میں بھی خالہ کی موت پر رونے والے ہیں۔ میری بھوک بھی فوت ہوچکی تھی مگر کھانوں کی خوشبو سے پھر زندہ ہوگئی۔ جو کچھ میں نے کھایا' وہ زندگی میں پہلے نہیں کھایا تھا اور شاید دوبارہ کبھی نہیں کھاؤں گا مگر اس وقت پسند ناپسند کا سوال نہیں تھا۔ میں نے دل میں خدا سے دعا مانگی کہ وہ سب حلال ہو جو میں نے کھایا۔ شیلی کے انہماک کو دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ وہ کیکڑے (CRAB) کا سوپ' کھمبیاں MUSHROOM اور بانس BAMBOO SHOOTS پر مشتمل ڈنر بہت لطف لے کر کھا رہی تھی۔ اس نے کھانے کے ذائقے کی تعریف بھی کی۔ اس کے جذبات کا پاس کرتے ہوئے میں نے یہ نہیں کہا کہ بقائمی ہوش و حواس کوئی بھی ایسا نہیں کہہ سکتا۔

فضل دین بالآخر قائل ہوگیا تھا کہ ہم اس کے قاتل اور ڈاکو وغیرہ نہیں ہیں۔ اس نے ڈکی میں کاٹھ کباڑ کے ساتھ اور اسپیئر وھیل کے نیچے پڑی ہوئی نوٹوں کی گڈیاں نکال کے یوں حسرت بھری نظر کے ساتھ میرے حوالے کردیں جیسے کوئی اپنی محبوبہ کو دوست کے حوالے کرتا ہے کہ یار تم ہی اسے ڈنر پر لے جاؤ۔ میں تو صاحبِ فراش ہوں۔

میں نے اسے تسلی دی کہ ہم اس کے ساتھ فراڈ نہیں کریں گے۔ اسے منظر ایڈووکیٹ کا ٹیلی فون نمبر ازبر کرایا اور بار بار پوچھا۔ پتا سمجھایا اور کہا کہ وہاں رقم بینک سے زیادہ محفوظ ہوگی اور اگر وہ چاہے تو قانونی طور پر ہر قسم کی مدد بھی حاصل کرسکتا ہے۔ اسے پولیس سے گاڑی چھڑانے کے لیے یا جان چھڑانے کے لیے کسی وکیل کی ضرورت بہرحال پڑے گی۔

شیلی نے کہا "یار' وہاں ایک نہیں' دو وکیل ملیں گے۔ ایک ہی گھر میں۔"

میں نے کہا "ایک وکیل' اس کی بیوی اور پندرہ بچے۔ اور ایک وکیلن۔ خاتون وکیل۔"

"ان کے کتنے بچے ہیں؟" فضل دین نے بلاوجہ سوال کیا۔

"ان کی نظر میں... سب بچے ہیں۔ نادان ہیں" میں نے کہا "ویسے ابھی ان کی شادی نہیں ہوئی۔"

پہلوان جی دوبارہ برتن سمیٹنے اور بل کے نام پر ہماری کھال کھینچنے آئے۔ فضل دین نے کچھ چکھا تک نہیں تھا مگر شیلی کو اس کی قیمت دینی پڑی۔ غصے میں شیلی نے اسے ٹپ نہیں دی اور جو کچھ اس نے زیرِ لب کہا اسے بھی نظر انداز کردیا۔ "یہ تو لُوٹتے ہیں۔ میری بھوک پھر مرگئی یار۔"

میں نے کہا "چلو تم بچ گئیں۔ کسی کو تو مرنا ہی تھا۔ کھانے سے بھوک مرگئی۔ نہ کھاتے تو تم مرجاتیں اپنے وعدے اور اعلان کے مطابق۔"

گاڑی کی باگ ڈور اب شیلی کے ہاتھ میں تھی کیونکہ بھاگ دوڑ میں اس نے مجھ پر اپنی برتری ثابت کردی تھی۔ میں دانتوں میں شوقیہ خلال کرتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ مناسب جگہ نظر آتے ہی

اچانک فضل دین کو ہاتھ مار دوں۔ وہ بڑا سہما ہوا بیٹھا تھا اور مجھے ایسے دیکھ رہا تھا جیسے بکرا عید کی نماز پڑھ کے آنے والوں کو دیکھتا ہے۔ اگر میں اسے بتا تا کہ تیار ہو جاؤ' میں تمہیں مارتا ہوں۔ ون ٹو تھری۔ تو تھری کہنے سے پہلے ہی وہ چلانے لگتا یا بے ہوش ہو کے گر جاتا۔

وہ گاڑی جسے ہم ڈاج کر چکے تھے' اچانک ایک سائڈ سے نمودار ہوئی۔ وہ شاید ڈنر کے وقفے میں بڑی مستعدی سے ہمیں تلاش کرتے پھر رہے تھے اور رات کے وقت خالی سڑک پر دو گاڑیوں کا بچھڑنا اور پھر مل جانا کوئی فلمی اتفاق نہیں سمجھا جا سکتا۔

فضل دین کی گاڑی کے جبڑے ہی نہیں ٹوٹے تھے' چال میں بھی فرق آگیا تھا اور اب وہ آہوئے صیاد دیدہ کی طرح نہیں دوڑ سکتی تھی۔ اس کی ایک آنکھ بھی ضائع ہو چکی تھی۔ شبلی کے اڑنگا دینے پر وہ بھینس کی طرح بھاگی جس کے تعاقب میں کانجی ہاؤس والے ہوں۔ دوسری گاڑی جب بالکل ہمارے پیچھے آگئی تو شبلی نے ایک دم یوٹرن لیا اور میں نے ہاتھ باہر نکال کے ٹائر کا نشانہ لیا۔

بائیس بور کے ریوالور کی آواز بھی رات کے سناٹے میں توپ کے گولے کی طرح گونجی مگر اس سے زیادہ شاندار آواز وہ تھی جو ٹائر برسٹ ہونے کے بعد گاڑی کے ایک کھمبے سے ٹکرانے اور پھر ایک دیوار میں گھس جانے سے پیدا ہوئی۔ میں نے پلٹ کے دیکھا تو ٹیلی فون کا کھمبا سڑک پر پڑا تھا اور کار کا اگلا حصہ ایک بنگلے کی دیوار کے اندر پہنچا ہوا تھا۔

تعاقب کرنے والوں کو یہ امید نہیں تھی کہ میں گولی چلاؤں گا۔ وہ خود بھی فائرنگ سے گریز کر رہے تھے۔ اس سے سارے علاقے میں ہنگامہ ہو جاتا اور کہیں نہ کہیں سے پولیس بھی نمودار ہو جاتی۔ گاڑی ہمارے ساتھ ہی مڑی تھی مگر بے قابو ہو گئی تھی اور اس سے پہلے کہ کوئی کچھ کرتا' حادثے کا شکار ہو گئی تھی۔

"گریٹ۔ رئیلی گریٹ یار" شبلی نے چلا کے کہا۔

میرے پاس جواب دینے کا وقت نہیں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ہمارے پیچھے آنے والی کار میں جتنے بھی لوگ تھے' شدید زخمی ہوئے ہوں گے۔ معجزے کی بات اور ہے۔ اس قسم کے حادثے میں ڈرائیور اور اس کے ساتھ بیٹھا ہوا کوئی شخص مشکل سے ہی بچتا ہے۔ جواب میں کسی نے گولی نہیں چلائی تھی اور دھماکا ہونے کے بعد گاڑی بھی دیوار کے ملبے میں پھنس کے رک گئی تھی۔ میرے لیے اپنے پروگرام پر عمل کرنے کا یہ بہترین موقع تھا۔ میں نے دہشت سے نیم جاں فضل دین کے ایک ہاتھ مارا اور اسے دروازہ کھول کے باہر گرا دیا۔ شبلی نے گاڑی کی رفتار کچھ کم کی تھی مگر اس کی رفتار پہلے بھی زیادہ نہیں تھی۔

فضل دین گرا تو کچھ دور سڑک پر پھسلتا گیا۔ "خدا کرے اس کی ایک آدھ ہڈی ٹوٹے۔" میں نے کہا "ہاتھ پاؤں کی۔"

شبلی نے کہا "ایسے پھینک دیا اسے۔ بددعا اللہ ... رہے ہو۔"

"بے وقوف! دعا کر رہا ہوں کہ اس کے سر میں چوٹ نہ آئے۔ ریڑھ کی ہڈی محفوظ رہے" میں نے کہا "گاڑی یہیں روک لو۔"

شبلی نے بریک لگائے تو گاڑی فٹ پاتھ پر چڑھ گئی۔ اس کی وھیل الائنمنٹ بھی خراب ہو چکی تھی۔ سامنے ایک کٹا گرا جو پودوں کی حفاظت کے لیے لگایا جاتا ہے اور جب نہ ہو تو نظر آتا ہے۔ پھر اسے لوگ اکھاڑ کے لے جاتے ہیں۔ فقیر اور آوارہ گرد انہیں کباڑ کے ڈبوں کی طرح ذریعہ آمدنی بناتے ہیں۔ یہ بھی مشہور ہے کہ بل پاس ہوتے ہی ٹھیکے دار انہیں اکھڑوا لیتا ہے تاکہ اگلی بار کے ٹھیکے میں کام آئیں۔ واشتہ آید بکار۔

شبلی نے ایک چیخ ضرور ماری تھی مگر اسے تقاضائے فطرت نسوانی قرار دیا جا سکتا ہے۔ وہ خود بالکل ٹھیک تھی۔ میں نے اسے ہاتھ پکڑ کے کھینچا اور سڑک سے دور لے گیا۔ اونچی ایڑی کے ساتھ اس نے خاصی تیز رفتاری کا مظاہرہ کیا۔ پھر اچانک رک گئی "ایک منٹ۔"

"کیا ہوا؟" میں نے پریشانی سے کہا اور اسے کھینچا۔

"وہ..... ایک جوتا نکل گیا پاؤں سے" اس نے دوسرے پیر کو جھٹک کے کہا۔

دوسرا جوتا تھوڑا سا فضا میں بلند ہوا اور میں پھرتی نہ دکھاتا تو وہ میرے سر یا منہ پر لگتا۔ جائے حادثہ پر بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے جو سب آس پاس کے بنگلوں سے برآمد ہوئے تھے۔ ان میں اکثریت نوکروں اور چوکیداروں کی ہو گی۔ وہ ہاتھ ہلا ہلا کے دوسری کار کی جانب اشارہ کر رہے تھے جو فٹ پاتھ پر بھی تھی اور سڑک پر بھی۔

سوچے سمجھے بغیر ہم ایک ایسی کوٹھی میں گھس گئے جہاں نہ چوکیدار تھا' نہ کتا اور کوٹھی والے بھی سکون سے سوئے ہوئے تھے۔ شبلی اب ننگے پاؤں تھی اور میرے ہاتھ میں ایک پوٹلی تھی۔ اس پوٹلی میں ڈیڑھ لاکھ روپے تھے۔ سو سو کے نوٹوں کی پندرہ گڈیاں۔ پورچ میں ایک کار کھڑی تھی اور ایک ہی لائٹ جل رہی تھی۔ میں دائیں جانب پتلی سی گلی میں داخل ہو گیا۔ یہ گلی عقبی حصے میں ختم ہوئی جہاں دو تخت بچھے ہوئے تھے۔ کپڑے سوکھ رہے تھے اور ایک ڈربے میں مرغیاں بند تھیں۔ تخت کے قریب بچوں اور بڑوں کے جوتے بکھرے ہوئے تھے۔ شبلی نے فوراً ان میں سے دو سلیپر منتخب کر لیے۔ ایک اسے بڑا تھا اور ایک چھوٹا کیونکہ ایک زنانہ تھا دوسرا مردانہ۔ شاید ایسی ہی ایک جوڑی تخت کے نیچے ہو گی مگر اسے نکالنے کے لیے وقت نہیں تھا۔

میں تخت پر اور پھر ڈربے پر چڑھا تو مرغیاں کڑکڑانے لگیں۔ ان کی نیند ڈسٹرب ہو گئی تھی۔ مرغے نے مداخلت کا زیادہ برا منایا تھا۔ شبلی نے مرغے کی طرح گردن نکال کے درمیانی دیوار کے دوسری طرف جھانکا اور پھر دیوار پر چڑھ گیا۔ شبلی ذرا بھی نروس نہیں تھی۔ اس کے لیے تو یہ سب ایڈونچر تھا۔ ایکشن۔ ہم پکڑے جاتے تو ری ایکشن مختلف ہوتا۔

میں نے شبلی کو اوپر کھینچا تو وہ اسپرنگ کی طرح اچھل کے اوپر آگئی۔ نتیجہ یہ کہ میں دوسری طرف لڑھک گیا۔ جب میں کھڑا ہوا تو وہ دیوار پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھی تھی اور بیک وقت دو گھروں میں تھی۔ میں نے اس کی ٹانگ کھینچی تو وہ میرے اوپر آ گری۔

"یہ کس کا گھر ہے؟"

"میرے ہم زلف کی خوشدامن کا" میں نے جھلا کے کہا "خاموش رہو۔"

"اچھا یہ بتاؤ کہ ہم زلف اور خوش دامن سے تمہارا کیا رشتہ ہے۔ نام تو خیر عجیب سے ہیں یار۔"

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے پھر دائیں جانب والی گلی میں چلنا شروع کیا۔ ہر کوٹھی میں یہ گلی کھڑکیوں کے لئے رکھی جاتی تھی اور فلش لائن کے لیے۔ ایک کوٹھی کا عقبی حصہ دوسری کوٹھی کے عقبی حصے سے ملتا تھا اور ایسے ہی میرے دائیں ہاتھ پر ساتھ والی کوٹھی کی گلی تھی۔ اس کوٹھی میں بھی لوگ سو رہے تھے اور دروازے بند تھے مگر میں احتیاطاً دیوار سے لگ کے چل رہا تھا۔ ہمارے سر پر دوسری منزل کے چھجے کا سایہ تھا۔ اچانک اوپر کوئی کھڑکی کھلی۔ میں اور شبلی دبک کے کھڑے ہو گئے۔ اوپر سے کسی نے کھنکار کے بلغم تھوکا "آخ..... تھو....." کھڑکی پھر بند ہو گئی۔

اگر اس کوٹھی میں کتا ہوتا تو اب تک الارم کی طرح بج رہا ہوتا یا ہمیں کاٹ چکا ہوتا۔ میں نے دل ہی دل میں دعا مانگی کہ یہاں کوئی چوکیدار نہ ہو۔ یہ نسبتاً چھوٹی کوٹھیاں تھیں۔ آدھے کینال یا کچھ زیادہ پر عمارت۔ تھوڑا سا خالی حصہ ملا کے رقبہ شاید ایک کینال ہو گا۔ پورچ میں یہاں ایک کار کے ساتھ موٹر سائیکل بھی تھی۔ پھر گیٹ کے قریب مجھے ایک سائیکل نظر آگئی۔ میں نے شبلی سے کہا کہ وہ دروازہ کھولے لیکن ذرا احتیاط کے ساتھ۔ اس نے پہلے تو لوہے کا کنڈا ہٹاتے ہوئے آواز کی پھر گیٹ چرچرایا۔ میں سائیکل اٹھا کے روانہ ہوا ہی تھا کہ اوپر والی کھڑکی پھر کھل گئی اور آخ تھو کرنے والا چلانے لگا۔ "اوئے کون ہے۔ سامنے آ چور ہے تو....."

میں نے کہا "کوئی نہیں بابا جی۔ سو جاؤ۔" اور شبلی کو سائیکل پر آگے بٹھا کے روانہ ہو گیا۔ برسوں بعد سائیکل چلاتے ہوئے مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے پہیے گول نہیں ہیں یا ہینڈل ٹیڑھا ہے۔ شبلی بے تحاشا ہنس رہی تھی اور میری ڈانٹ ڈپٹ کا اس پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔

"یہ تم سائیکل چلا رہے ہو یار کہ ہل چلا رہے ہو؟"

میں نے کہا "تمہارے ہنسنے کی وجہ سے توازن بگڑ رہا ہے۔ گر و گی تو ساری ہنسی نکل جائے گی۔ سائیکل سب ایسے ہی چلاتے ہیں۔ دو پہیے اور ہوتے اس میں تو اچھا تھا۔ خیر' کافی پریکٹس ہے مجھے۔ پہلے تین پہیوں والی چلاتا تھا پھر دو..... آئندہ کبھی..... موقع ملا..... تو ایک پہیے والی۔ کسی سرکس میں۔ ڈاکٹر شبلی' تم کو اپنا وزن کم کرنا چاہیے۔"

شبلی پھر ہنسی "تم دمے کے مریض لگ رہے ہو۔ ارے وہ بڈھا آ رہا ہے پیچھے دوڑتا ہوا۔"

"اچھا!" میں نے ایک دم پیڈل مارے اور پیچھے دیکھنے کی کوشش کی۔ سائیکل صراط مستقیم سے بھٹک کے سڑک کے کنارے لگی ہوئی جھاڑیوں میں گھس گئی۔ گرنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ شبلی نے جھوٹ بولا تھا مگر میں آرام سے لیٹا آسمان کو دیکھتا رہا اور اپنی پھولی ہوئی سانس پر قابو پانے کی کوشش میں مصروف رہا۔ میرا اسٹیمنا افسوس ناک حد تک کم ہو چکا تھا۔

شبلی جھاڑیوں میں الجھ گئی تھی اور بہت خفا تھی "تمہیں تو گرانا تک نہیں آتا یار۔ میرے کپڑے دیکھو' ہاتھ دیکھو۔"

واقعی اس کے ہاتھوں پر خراشیں تھیں اور کپڑے جگہ جگہ سے پھٹ گئے تھے "تمہیں شکایت نہیں' خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے مس شبلی۔ اتفاقات مسلسل ہمارے ساتھ رہے۔ میرا نشانہ خطا نہیں گیا اور گاڑی ان کی تباہ ہوئی۔ پھر ہم آسانی سے فرار ہو گئے اور تم نے گاڑی فٹ پاتھ پر ہی چڑھائی' کسی دیوار پر نہیں۔ آگے غور فرماؤ۔ ہم آسانی سے ایک گھر میں گھسے اور پھر دوسرے سے گزر آئے۔ کسی نے ہمیں نہیں پکڑا۔ حد یہ ہے کہ تمہیں تو چپل تک مل گئے ورنہ تمہیں ننگے پاؤں میرا ساتھ دینا پڑتا تو تمہارے پیروں میں چھالے پڑ جاتے۔ یہ سائیکل بھی شاید کسی نے ہمارے لیے ہی ایجاد کی تھی مگر آج ہمارے کام آئی۔ مزید یہ کہ وہ بے خواب بوڑھا ہمارے پیچھے نہیں دوڑا اور جب اس نے آخ تھو کیا تھا تو تھوک تمہارے منہ پر نہیں گرا تھا۔ اسے علم ہو گا غالباً کہ چاند پر تھوکا تو اپنے ہی منہ پر آ جائے گا۔"

"تھینک یو کہ تم نے مجھے چاند کہا۔ اب اٹھو' معلوم ہے کیا وقت ہے؟"

میں نے اٹھتے ہوئے کہا "وقت دعا ہے۔ اور امت پہ تیری آ کے عجب وقت پڑا ہے۔ ابھی تک اس علاقے میں مجھے چوکیدار بھی نظر نہیں آیا جو رات کو سائیکل پر سیٹیاں بجاتے پھرتے ہیں۔"

"کیا یہاں کے چور سیٹیوں سے ڈر جاتے ہیں یار؟"

میں نے کہا "نہیں۔ وہ چوروں کو خبردار کرتے ہیں کہ ہم یہاں ہیں' تم وہاں اپنی کارروائی جاری رکھو جہاں بھی ہو۔"

"پھر یہاں سب چور رہتے ہوں گے یا سب کوتوال" شبلی نے کہا۔

ہم نے سائیکل وہیں چھوڑ دی۔ آدھی رات کے بعد سائیکل پر ایک مرد اور ایک عورت کا ڈبل سواری کرنا شکوک پیدا کر سکتا تھا

اور جو ہمیں دیکھتے' وہ ہمارا حلیہ نہ بھولتے۔ پیدل چلنے میں کسی سے لفٹ ملنے کا امکان تھا مگر یہ عجیب سنسان علاقہ تھا جہاں سڑکوں اور گلیوں میں مکمل سناٹا تھا۔ غور کرنے پر مجھے اس کا محل وقوع سمجھ میں آیا۔ ہم دماغی امراض کے شفا خانے' عرفِ عام میں پاگل خانے کے پیچھے کی آبادی میں تھے۔

حادثے کی جگہ بہت دور رہ گئی تھی۔ شاید اب تک پولیس آگئی ہوگی۔ کسی نے فون ضرور کیا ہوگا۔ مارا گیا وہ شخص جس کی دیوار توڑ کے ایک گاڑی اندر آگئی۔ اب پولیس تفتیش کرے گی۔ ایک ٹائر گولی لگنے سے برسٹ ہوا تھا۔ ممکن ہے' ایک دو حادثے میں مرگئے ہوں۔ باقی زخمی ہوں گے تو اسپتال لے جائے جائیں گے اور پولیس انہیں اپنی تحویل میں رکھے گی۔ ان کا بیان لے گی اور ان سے رشوت لے گی۔ فضل دین کو میں نے صحیح وقت پر اپنا بیان سمجھا دیا تھا۔ اس طرح وہ بچ جائے گا وہ کیا بتا تاکہ اس نے کس پر گولی چلائی تھی اور کیوں چلائی تھی۔ آلۂ قتل کہاں ہے اور مال کہاں ہے؟

"تم کو معلوم ہے' میں کیا سوچ رہا تھا؟" میں نے چلتے چلتے کہا۔

"ہاں' تم اس حادثے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔"

میں نے حیرانی سے کہا "یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"اس لیے کہ میں بھی یہی سوچ رہی تھی یار" وہ بولی "تمہارا کیا خیال ہے' وہ سب مارے گئے ہوں گے؟"

"یہ خیال کی بات نہیں ہے' زندگی اور موت کا فلسفہ ہے۔ وہی مرے ہوں گے جن کا وقت پورا ہوگیا ہوگا" میں نے کہا "مارنا تو وہ مجھے اور تمہیں چاہتے تھے مگر بقول شاعر۔ آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں۔ اور موت تو دور کی بات ہے' آنے والے لمحے کا کچھ پتا نہیں۔ آج ہوٹل سے نکلتے وقت کیا میں تصور کر سکتا تھا کہ ٹھیک دو گھنٹے بعد میں تمہیں سائیکل پر آگے بٹھا کے یہاں سے گزروں گا اور میرے ایک ہاتھ میں ڈیڑھ لاکھ نقد ہوں گے۔ تمہارے پاؤں میں چوری کے جوتے..."

"اسی کا نام ایڈونچر ہے۔ میں نے کب سوچا تھا کہ آج ہی اتنا زبردست ایکشن ہوگا۔ بڑا مزہ آیا یار۔"

"مزہ آتا جب وہ پکڑ لیتے یا پہلے تمہاری لنگڑی کار پر گولی چلادیتے" میں نے کہا "اب آگے کی سوچو' صبح ہونے سے پہلے ہی پولیس نہ پہنچ جائے مسز رستم جی بٹن والا۔ ہمیں اسی وقت وہاں سے چیک آؤٹ کرنا ہوگا۔"

"اس وقت؟" اس نے پریشانی سے خود کو دیکھا "زبردستی ہمیں کوئی روک تو نہیں سکتا یار مگر شک ہوگا.... فرض کرو' ہم نہ جائیں واپس۔"

"تمہارا سامان بھی تو ہے۔"

"بس کپڑے ہیں یا میک اپ کا سامان۔ پرفیوم وغیرہ۔ پاسپورٹ اور ضروری کاغذات' نقد رقم اور ٹریولر چیک تو میں بیگ میں رکھتی ہوں یار اور بیگ میرے کندھے پر ہے۔"

میں نے کہا "ویری گڈ۔ گویا ہم آزاد ہیں کہیں بھی جانے کے لیے۔ ہوٹل جانے میں رسک تھا۔ کوئی پوچھتا کہ یہ حال کیسے ہوا؟ کیا بتاتے۔ لوگ سمجھتے..... خیر جانے دو' بری بات ہے۔"

"کیا سمجھتے لوگ؟ ایسی کی تیسی لوگوں کی۔ مجھے بتاؤ۔"

"یہی کہ شاید میں نے دست درازی کی ہوگی۔ اور تمہارا بھی کیا بھروسہ' کسی کے ورغلانے میں آکے میرے خلاف بیان دینے پر راضی ہو جاتیں۔"

"شٹ اپ۔ تم ایسا سمجھتے ہو مجھے؟"

میں نے کہا "میں تمہیں سمجھتا ہی کہاں ہوں۔ بلکہ عقل مند کہتے ہیں کہ جو عورت کو سمجھنے کا دعویٰ کرے' وہ سب سے بڑا احمق۔ تم نے رابعہ کا رویّہ دیکھا تھا؟ اب ہم جارہے ہیں غالب اور نازو کی طرف۔ تم نازو کا رویّہ بھی دیکھنا۔ مجھے دعویٰ ہے کہ میں اسے سمجھتا ہوں اور وہ مجھے جانتی ہے۔"

رات کے دو بجے ہم جیل روڈ پر پہنچے جہاں سے اِکا دُکا گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ ان میں ٹیکسی کوئی نہیں تھی اور پہلی دو گاڑیاں میرے اشارے کو نظرانداز کرکے گزر گئیں۔ ایک میں عورتیں' بچے کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ دوسری خود ایک عورت چلا رہی تھی اور لفٹ دینے کا رسک نہیں لے سکتی تھی۔ تیسری گاڑی میں ایک خوبصورت مہذب جوڑا تھا۔ وہ نئے شادی شدہ تھے یا پھر ہم جیسے آوارہ گرد۔ انہوں نے ہمیں پیچھے بٹھالیا۔ حسبِ توقع عورت نے ہماری حالتِ زار کے بارے میں تجسس کا مظاہرہ کیا۔ میں نے اسے ایک دل گداز کہانی سنائی کہ ہم گھر سے ریلوے اسٹیشن جانے کے لیے نکلے تھے مگر راستے میں ٹیکسی کا حادثہ ہوگیا۔ دراصل ڈرائیور کی نظر کمزور تھی اور وہ چشمہ گھر بھول آیا تھا۔ وہ چشمہ لینے گھر جارہا تھا کہ ہم نے روک لیا۔ کوئی ایک فرلانگ کے بعد نہ جانے کہاں سے سڑک کے بیچ میں بھینس آگئی مگر وہ کتا سمجھا۔ اس نے سائڈ سے نکالنے کی کوشش کی اور بھینس نے مشتعل ہوکے ٹکر ماردی۔ اس کا ریڈی ایٹر.... اس کی گاڑی کا ریڈی ایٹر اور چشمہ ٹوٹ گیا۔ گاڑی کا نہیں' اس کا..."

عورت بولی "مگر تم نے ابھی کہا تھا کہ وہ چشمہ بھول آیا تھا۔"

"ہاں۔ اس کی دور کی نظر بھی کمزور تھی اور قریب کی بھی۔ الگ الگ چشمے تھے۔ وہ دور دیکھنے والا چشمہ بھولا تھا۔ قریب دیکھنے والا چشمہ گاڑی میں موجود تھا۔ وہ لگالیا تھا اس نے..."

مرد نے اسٹیشن کے قریب گاڑی روک کے مجھے قہر آلود نظروں سے گھورا۔ اس پر یقیناً میری کہانی کا خاطر خواہ اثر نہیں ہوا تھا۔ جب کہ عورت تقریباً آبدیدہ تھی۔ مرد غالباً سنگدل اسی لیے مشہور ہیں۔ میں نے بھی اس کا شکریہ ادا نہیں کیا کیونکہ اس نے میری بات کا یقین نہیں کیا تھا۔ یہ اخلاقی فریضہ شیلی نے سرانجام دیا مگر بات نہیں بنی۔ عورت نے شیلی کے اترنے کے بعد روشنی میں دیکھا تو اسے ایک بڑی اور ایک چھوٹی چپل نظر آگئی۔ ایک مردانہ' ایک زنانہ۔ ظاہر ہے کہ گھر سے ریلوے اسٹیشن جانے کے لیے روانہ ہوتے وقت کوئی عورت ایسی غلطی نہیں کرتی اور ٹکر بھینس سے ہو یا کتے سے' حادثے کے نتیجے میں چپل نہیں بدلتی۔

جب ہم وہاں سے ٹیکسی لے کر روانہ ہوئے تو میں نے کہا "ڈاکٹر شیلی' انہوں نے یقین نہیں کیا ہم پر۔ کتنے افسوس کی بات ہے۔ دنیا سے اعتبار اٹھ گیا ہے۔"

"ہاں یار۔ کیسے گھور رہی تھی وہ عورت۔"

"آخر ہماری کیا غلطی تھی؟ بس ہم جھوٹ نہیں بول سکتے۔ پریکٹس جو نہیں ہے" میں نے کہا "اور تم نے اگر غلطی سے ایک مردانہ اور ایک زنانہ سلیپر پہن لیا تو کیا ہوا؟ ہر شخص کو اس آزاد ملک کے آزاد شہری کی حیثیت سے یہ آزادی ہے..."

حسبِ توقع زیادہ بڑی مصیبت ہماری منتظر تھی۔ میں نے ٹیکسی والے کو ایک گلی پیچھے ہی رخصت کردیا تھا۔ میں نے وقار یوسف کے گھر کی کال بیل بجائی تو غالب برآمد ہوا۔

"آیئے' تشریف لایئے۔ بالکل صحیح وقت پر آئے آپ۔" اس نے دروازہ کھول کے کہا "میں کہہ رہا تھا نازو سے کہ سکندر نے ڈھائی بجے کا وقت دیا ہے تو ڈھائی بجے ہی آئے گا۔"

نازو نے دروازے کے پیچھے سے سر نکالا "وہی ہیں' میں نے کہا تھا کہ آدھی رات کے بعد بھلا کون آسکتا ہے۔ خیر سے بُدھو گھر کو آئے۔"

میں نے بوٹلی اسے تھما کے کہا "لڑکی! یہ ہم پر ذاتی حملہ ہے اور بڑا رکیک قسم کا۔ ہم بُدھو نہیں ہیں اور نہ یہ گھر ہے ہمارا۔"

نازو نے بڑی چبھتی ہوئی نظروں سے میرا اور پھر شیلی کا جائزہ لیا "بالکل صحیح فرمایا آپ نے۔ یہ تو ہوٹل ہے۔ آپ نے عزت بخشی ہمیں۔ فرمایئے کس قسم کا کمرا چاہیے؟"

غالب نے کہا "اور آپ بُدھو نہیں۔ ماشاء اللہ اتنے سیانے ہیں۔ خیر سے کوئی معرکہ سر کرکے لوٹے ہیں..."

اس طنزیہ گفتگو سے شیلی کی پوزیشن زیادہ خراب ہو رہی تھی لیکن میں نے اسے پہلے ہی خبردار کردیا تھا کہ اس کا استقبال کرنے والوں کا رویّہ اچھا نہیں ہوگا۔ اس کی ظاہری حالت بھی ایسی تھی کہ۔ تری صبح کہہ رہی ہے تری رات کا فسانہ۔ مگر سمجھنے والے غلط سمجھ رہے تھے اور وہ بلاوجہ مجرم محسوس کررہی تھی۔

میں نے کہا "مرزا جی! ہم اس وقت جھانپڑ مار کے تمہارا دماغ درست کرنے کے موڈ میں نہیں ہیں۔ صبح دم دنگا فساد شرفا کا شیوہ نہیں۔ بعد میں تمہیں دنداں شکن جواب دیں گے یا تمہارے دانت کھٹے کریں گے۔"

غالب نے کہا "اتفاق سے ہم اس کے برعکس سوچ رہے ہیں۔"

میں نے کہا "یار' میں نے ڈاکٹر شیلی سے کہا تھا کہ تم بڑے بااخلاق لوگ ہو اور صورت بُری سہی' دل کے بُرے نہیں ہو۔ کچھ تو میرے جھوٹ کا خیال کرو۔ یہ بہت تھکی ہوئی ہیں' انہیں اندر لے جاؤ۔"

غالب نے نازو کو ڈانٹا "اتنی دیر سے میں اور کیا کہہ رہا ہوں مگر اس لڑکی میں نہ عقل ہے نہ تمیز۔ بس زبان چلا سکتی ہے۔"

نازو نے آنکھیں نکال کے کہا "ہاتھ بھی چلا سکتی ہوں میں لیکن خیال ہے ڈاکٹر شیلی کا۔"

شیلی نے کہا "نہیں.... تم جو کرنا ہے کرو۔ میری کوئی بات نہیں یار۔"

نازو ہنس پڑی "آپ آجائیں میرے ساتھ۔ سکندر' یہ کیا تھمادیا تھا مجھے؟"

میں نے کہا "نہ یہ باپ کی گٹھڑی ہے' نہ باپ کا مال۔ کسی کی امانت ہے۔ ایک پیسہ بھی کم ہوا تو یوم حشر ستر دینے پڑیں گے۔"

"نیّت میں فتور ہے تمہاری" غالب نے کہا۔

"اور تمہاری عقل میں بھی فتور ہے' نظر میں فتور ہے" نازو نے پلٹ کے کہا۔

"ظاہر ہے۔ فتور نہ ہوتا تو تمہارے ساتھ کیوں جھک مارتا۔ میرا سُسر بھوت کیوں ہوتا۔"

"دیکھو' پھر تم نے مجھے بھوت کی بچّی کہا۔"

"یار سکندر! دیکھ خواہ مخواہ گلے پڑ رہی ہے۔ میں نے ایسی کوئی بات کی ہے؟ اور ویسے بھی یہ کون سی پری ہے۔"

"چلو صبح فیصلہ کریں گے" میں نے غالب کو ڈرائنگ روم کی طرف کھینچ لیا۔ "یہ بتاؤ اتنی دیر سے ہم سب لڑ رہے ہیں۔ یوسف اور اس کی بیوی اپنی خواب گاہ سے نہیں نکلے۔"

غالب لائٹ جلا کے میرے سامنے بیٹھ گیا "وہ خواب گاہ میں نہیں ہیں۔"

میں نے جوتے اتار کے ٹانگیں صوفے پر پھیلادیں۔ نیا جوتا ایک انگلی پر کاٹ رہا تھا۔ "وہ کہاں ہیں پھر؟"

غالب نے جواب سے گریز کیا "تم دونوں کہاں سے آرہے ہو؟"

میں نے کہا "لمبی کہانی ہے۔ فل آف ایکشن۔ تمہیں سنانے کے بعد زبردستی بھی کرنی پڑے گی منوانے کے لیے۔ اس وقت میں سونا چاہتا ہوں۔ شب بخیر۔"

غالب نے کہا "وقار اور اس کی بیوی گئے ہوئے ہیں۔ نقوی صاحب کے گھر۔ ہم ابھی کچھ دیر پہلے ہی آئے ہیں اسپتال سے۔"

"اسپتال سے؟ نقوی صاحب اسپتال میں ہیں؟" میں اٹھ بیٹھا۔

"آئی سی یو میں" غالب نے کہا "ان کی حالت غیر یقینی ہے۔ وہ ابھی تک کوما سے باہر نہیں آئے۔"

میں نے کہا "کیا ہوا تھا انہیں۔ ہارٹ اٹیک؟"

"نا... نے نفی میں سر ہلایا "فوڈ پوائزننگ۔ ڈاکٹروں نے زہر تو معدہ... صاف کردیا ہے مگر اثرات خون میں سرایت کرچکے ہیں... سارا خون بدلا گیا ہے لیکن جسم نے پوری طرح قبول نہیں کیا۔ مسلسل ANTI- REJECTION دوائیں دی جارہی ہیں۔ پھر بھی گردوں کا فنکشن نارمل نہیں ہے۔"

میں دم بخود بیٹھا رہا "کھانے میں زہر کس نے دیا؟"

"ابھی کچھ پتا نہیں۔ ڈاکٹروں نے کسی کو بھی کچھ بتانے سے صاف انکار کردیا ہے۔" غالب نے کہا "ہوسکتا ہے' صبح انہیں لندن روانہ کردیا جائے۔ اگر وہ صبح تک زندہ رہے۔"

"اتنی سیریس بات ہے؟"

"پولیس نے سارے ملازمین و... گرفتار کرلیا ہے۔ بہت اونچی سطح پر تحقیقات جاری ہیں" غالب نے کہا۔

"یہ تو سخت تشویش کی بات ہے۔ یہ کب ہوا' میرا مطلب ہے زہر دینے کا واقعہ.....؟"

"انہیں شام چھ بجے داخل کیا گیا ہے۔ رپورٹ ایک ملازم نے کی تھی" غالب نے کہا "غالباً انہیں کافی میں زہر دیا گیا ہوگا۔ وہ شام کو اپنی اسٹڈی میں کافی پیتے تھے۔ وہیں بے ہوش پڑے ملے تھے۔ ملازم اتفاق سے اندر چلا گیا تھا۔ یہ بتانے کے لیے کہ اسلام آباد سے فون آیا ہے۔ ظاہر ہے کوئی اہم فون ہوگا ورنہ انہیں کوئی ڈسٹرب نہیں کرسکتا تھا۔"

"مگر....." میں نے کہا "یہ کام تو ان کے پی اے کا تھا..."

"پی اے..." غالب نے تلخی سے کہا "ان کا پی اے تھا رفیق۔ تم جانتے تو ہوگے' وہ غائب ہے۔"

میں نے سکون کا سانس لیا "کسی کو نہیں معلوم' وہ کہاں ہے؟"

"نہیں۔ پولیس کو اسی پر شک ہے" غالب بولا "خدا کا شکر ادا کرو یار کہ وقار کو ابھی کچھ معلوم نہیں۔ نہ اس کی بیوی کو۔"

"معلوم تو مجھے بھی نہیں تھا۔ میں سارا دن ہوٹل سے نہیں نکلا تھا۔"

"اس مصیبت کو یہاں کیوں ساتھ لے آئے' وہ بتادے گی نازو کو۔ اور نازو کی حد تک ٹھیک ہے۔ اگر وقار کی بیوی کو معلوم ہوا کہ رفیق کا ڈاکٹر شبلی سے خصوصی تعلق تھا اور اس نے درمیان میں کیا پارٹ ادا کیا تھا تو بہت گڑبڑ ہوجائے گی۔"

"میں اسے منع کردوں گا" میں نے کمرے میں چکر لگاتے ہوئے کہا "مگر یار! نقوی صاحب نے اگر رفیق والے معاملے سے نمٹ لیا تھا..... تو پھر یہ کیسے ہوا؟"

"ظاہر ہے یہ اس کے بعد ہوا۔ اور اسی وجہ سے ہوا کہ نقوی صاحب تمہاری مدد کرنے پر مجبور ہوگئے تھے۔ اس لیے نہیں کہ انہیں تم سے ہمدردی تھی بلکہ اس لیے کہ ان کی اکلوتی بیٹی یعنی وقار یوسف کی بیوی نے مجبور کردیا تھا لیکن تمہارے جو دشمن یہ نہیں چاہتے تھے' ان کو اس مجبوری کا احساس نہیں تھا۔ وہ ہر قیمت پر انہیں استعمال کرنا چاہتے تھے۔ اپنے ٹرمپ کارڈ کے طور پر۔ نقوی صاحب نہیں مانے تو انہوں نے اوپر سے بندوبست کیا۔ ان کے گھر پر چھاپا مارا گیا۔ پوری قانونی کارروائی خاموشی سے عمل میں لائی گئی اور اگر تم..."

"یہ کیا تم تم کی تکرار لگا رکھی ہے۔ ہم کیوں نہیں کہتے؟ کیا تم میرے ساتھ نہیں تھے؟"

"اگر ہم بروقت فرار ہونے میں ناکام رہتے اور پکڑے جاتے تو نقوی صاحب معطل ہوجاتے۔ ان کے خلاف امانت مجرمانہ کا کیس بن جاتا اور ان کا چوبیس سالہ سول سروس کا بے داغ ریکارڈ اتنا خراب ہوجاتا کہ وہ ہوم سیکریٹری بننا تو دور کی بات ہے' پنشن اور سروس کی ساری مراعات سے محروم ہوکے جیل کی ہوا کھاتے۔ ہم نہیں ملے تو پانسہ پلٹ گیا۔ نقوی صاحب نے رفیق کے قتل کا معاملہ دبادیا کیونکہ اس معاملے کا تعلق اوپر سے نہیں تھا۔ ایس ڈی ایم اور ایس ایچ او نے اپنی نوکری بچانے کے لیے ان سے تعاون کیا اور معلوم نہیں اس وقت رفیق کی لاش کہاں ہے۔ لاوارث قرار دے کر کسی سرد خانے میں رکھوادی گئی ہے' میڈیکل کالجوں کو لاشیں فراہم کرنے والے کسی ٹھیکے دار کو بیچ دی گئی ہے یا کسی ویرانے میں گڑھا کھود کے گاڑ دی گئی ہے۔"

"یہ تو نقوی صاحب کی کامیابی تھی۔"

"لیکن یہ ناکامی بن گئی کسی بہت بڑے شکاری کی جس نے ایک بڑی مچھلی کے لیے بڑا جال ڈالا تھا" غالب نے کہا "بڑی مچھلی اس سے صاف بچ کے نکل گئی۔ اب خطرہ یہ تھا کہ بڑی مچھلی جال ڈالنے والوں کا خانہ خراب کردے گی۔ نقوی صاحب یقیناً اپنے گھر پر چھاپے سے بہت مشتعل ہوں گے اور انہوں نے معلوم کرلیا ہوگا کہ اس سازش کے پیچھے اصل ہاتھ کس کا ہے؟"

"مرزا جی! اصل ہاتھ کس کا تھا؟" میں نے سوچ کے کہا۔

"ظاہر ہے چوہدری دلاور کا۔ ہمارے خلاف کیس ختم ہوجاتے تو اس کی ساری منصوبہ بندی دھری رہ جاتی۔ اسے یہی خطرہ لاحق ہوگا کہ نقوی صاحب ہوم سیکریٹری بن گئے تو اس کا سیاسی مستقبل تاریک ہوجائے گا۔ ایک طرف ہم اس کے مخالف' دوسری طرف بیورو کریسی۔ ہم تو خیر نہ تین میں نہ تیرہ میں لیکن بیورو کریسی کی پشت پناہی کے بغیر سیاست کا چلنا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا پٹرول کے بغیر کار کا چلنا۔"

"اس ملک میں؟" میں نے کہا۔

"ہاں اس ملک میں" غالب نے مجھ سے اتفاق کیا "بیورو کریسی کے ہاتھ میں ہر حکومت کی نکیل رہتی ہے اور جو حکومت شامت اعمال کو دعوت دے وہ بیورو کریسی کو نکیل ڈالنے کی کوشش کرتی ہے اور اس کا تختہ اُلٹ دیا جاتا ہے۔ چوہدری دلاور چڑھتا سورج ہے۔ دولت کی کنجی اس کے ہاتھ میں ہے چنانچہ سیاست کا دروازہ اس نے کھول لیا ہے۔ اب آنے والے وقت کو پہچاننے والے بیورو کریسی کے دوراندیش جونیئرز' جو کل سینئر ہوں گے۔ اپنی طاقت بڑھانے کے لیے چوہدری دلاور کو طاقت ور دیکھنا چاہتے ہیں۔ جیسے کچھ سمجھ دار لوگ سال بھر پہلے ہی بکرے کا بچہ لے کر پالتے ہیں اور خوب کھلا پلا کے اسے تگڑا بناتے ہیں۔ آخر کس لیے بکرے کی صحت اور فلاح و بہبود کی خاطر نہیں۔ اپنے فائدے کے لیے۔ بقرعید پر ایک شاندار بکرا قربان کرنے کا اعزاز تو انہی کو حاصل ہوگا۔ یا جیسے بل فائٹ کے لیے بیل پالے جاتے ہیں اور سدھائے جاتے ہیں۔ آخر میں مرتا تو بیل ہی ہے اور نیک نامی بل فائٹر کے حصے میں آتی ہے۔ تو بیورو کریسی بھی سیاست میں بکرے پالتی ہے اور ان کی قربانی دیتی رہتی ہے یا انہیں لڑاتی رہتی ہے۔ نقوی صاحب کو آؤٹ کرکے ہوم سیکریٹری کے عہدے پر اس شخص کو لایا جائے جو غالب کا طرف دار نہ ہو' سکندر کے کیس ختم نہ کرے بلکہ ان میں مزید اضافہ کرے اور چوہدری دلاور کی پشت پناہی کرے۔ نقوی صاحب کو ذلت و رسوائی کے ساتھ رخصت کرنے کا منصوبہ ناکام ہوگیا اور ڈر پیدا ہوگیا کہ وہ سازشی عناصر کو رخصت کردیں گے۔ تو اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ انہیں دنیا سے ہی رخصت کردیا جائے۔ ابھی یہ کہنا تو مشکل ہے کہ کامیاب کون ہوگا؟"

"کیا نقوی صاحب کے بچنے کی امید بالکل نہیں ہے؟"

"یار' اس قسم کے کیس میں حقیقت کبھی سامنے نہیں آتی۔ لیاقت علی خان کی شہادت کا مسئلہ آج بھی ایک معما ہے جو کبھی حل نہیں ہوگا۔ اس کے بارے میں کیا کچھ نہیں کہا گیا۔ قیاس آرائیوں کی انتہا کوئی نہیں۔ یہ بھی کہا جاتا رہا کہ انہیں اسپتال میں بچانے کی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ حسین شہید سہروردی کے بارے میں ایک خیال یہ بھی ہے کہ انہیں بیروت کے ہوٹل میں زہر دے کر مارا گیا۔ یہ سب بین الاقوامی سیاست کے خدائی فوجدار کراتے تھے اور کراتے ہیں۔ اب کیا معلوم وہ نقوی صاحب کے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔ ممکن ہے انہیں ہارٹ اٹیک ہی ہوا ہو لیکن کیس زہر خورانی کا بنادیا گیا ہو۔ یا معاملہ اتنا سنگین نہ ہو جتنا ظاہر کیا جارہا ہے۔ سیاسی خداؤں نے نقوی صاحب کے حق میں فیصلہ دیا تو وہ بچ جائیں گے۔ ان کے مخالفین غالب رہے تو کہا جائے گا کہ ڈاکٹروں کی بہترین کوشش کے باوجود وہ جانبر نہ ہوسکے۔ جن کے ہاتھ لمبے ہوں' وہ آئی سی یو کے اندر بھی من مانی کرسکتے ہیں یا کراسکتے ہیں۔ یہ پہرا اور داخلے پر پابندی تو ہم جیسوں کے لیے ہے یا اخبار والوں کے لیے جو ہمیشہ سچ کی کرید میں رہتے ہیں۔"

خاموشی کے ایک مختصر وقفے کے بعد میں نے کہا "نقوی صاحب کے گھر میں جو کچھ بھی ہوا تھا' وہ کس کس کو معلوم ہے؟"

"ظاہر ہے آپ کے علاوہ آپ کی ڈاکٹر شبلی ہیں..."

"اور آپ کی نازو ہیں" میں نے کہا "اس کے علاوہ......"

"نازو بعض اوقات حیرت انگیز ذہانت کا مظاہرہ کرتی ہے" غالب نے کہا "یہ اسی کا مشورہ تھا کہ میں خاموش رہوں۔ سارے معاملے سے یوں لاعلمی کا انداز اختیار کروں جیسے تمہارے ساتھ میں تھا ہی نہیں۔"

"ایسا چاہنے کی وجہ؟"

"وہ نہیں چاہتی تھی کہ وقار یوسف کی بیوی کو باپ کی طرف سے پریشانی ہو۔ اس نے تو ہماری ہر موقعے پر نیک نیتی سے مدد کی ہے اور اس نے ضد کرکے باپ سے یہ بات بھی منوالی تھی کہ تمہیں قانونی الجھنوں کی دلدل سے نکالا جائے۔ اسے کیا اندازہ تھا کہ باپ کے لیے اتنی پریشانیاں پیدا ہوں گی۔ اس کی نیک نیتی میں شک نہیں لیکن وہ سمجھتی کہ اس کے باپ کی اس رسوائی اور مصیبت کے ذمے دار ہم ہی ہیں۔ بس نازو کے کہنے پر میں نے خاموشی اختیار کی۔ نہ وقار یوسف کو کچھ بتایا نہ رابعہ اور منظر کو..... اگر نقوی صاحب خود بیٹی سے بات کرتے اور کہتے کہ تمہاری ضد کی وجہ سے مجھے یہ دن دیکھنا پڑا' تمہارے دوستوں اور مہمانوں کی حرکتوں کا خمیازہ میں نے بھگتا اور مجسٹریٹ کے ساتھ چھاپا مارا گیا میرے گھر پر' خانہ تلاشی ہوئی۔ اتنی بے عزتی کا میں تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ لیکن انہوں نے بھی کسی سے کچھ نہیں کہا۔

میں نے کہا "چلو یہ اچھا ہی ہوا۔ اب وقار یوسف کی بیوی کو اپنے ابا پر قاتلانہ حملے کے سیاسی پس منظر کا علم نہیں ہوگا۔ وہ رفیق ہی پر شک کرتی رہے گی جو غائب ہے یا پھر نوکروں پر۔ میری تمہاری اور ڈاکٹر شبلی کی پوزیشن خراب نہیں ہوگی۔"

"ڈاکٹر شبلی کی پوزیشن پہلے ہی سے خراب ہے اور خراب رہے گی۔ خواتین کا متفقہ فیصلہ ہے کہ اس کو تم نے جان بوجھ کے لفٹ دی اور شبلی نے غلط فہمیاں پیدا کرکے صورت حال سے فائدہ اٹھایا۔"

"یہ غلط ہے۔ رابعہ کے طرز عمل کو بھی دیکھو۔"

"ایک غلطی کا جواب دوسری غلطی نہیں ہوتی۔ رابعہ کو سمجھایا جاسکتا تھا۔ وہ خود بھی سمجھ لیتی کہ اس کا غیر جمہوری رویہ نہیں چلے گا۔ اسے اپنی ذاتی خواہشات اور تمہارے عزائم کے درمیان کوئی سمجھوتے کی راہ نکالنی پڑے گی" غالب نے کہا "شبلی نے اس کے امکانات کو معدوم کردیا ہے۔"

"میں سمجھتا ہوں' اب میرے معاملات میں بہتری کی امید کوئی نہیں رہی" میں نے مایوسی سے کہا "میرے لیے قانونی مسائل سنگین سے سنگین تر ہوتے جائیں گے۔ میں چوہدری دلاور کی شرائط پر اس سے صلح نہیں کرسکتا اور وہ مجھے برداشت نہیں کرسکتا۔"

"پھر؟ کیا سوچا ہے آپ نے؟"

"وہی جو میں پہلے بھی بتاچکا ہوں' مجھے روپوش ہوجانا چاہیے۔"

"یعنی شبلی کے ساتھ لندن چلا جانا چاہیے؟" غالب طنز سے

بولا۔

"وقتی طور پر مگر اس کے بعد میری روپوشی ختم نہیں ہوگی۔ میں ہمیشہ کے لیے غائب" میں نے کہا "نہ ہوگا بانس' یعنی یہ خاکسار اور نہ بجے گی بانسری' یعنی یہ مصیبت ختم۔ ایک فلمی شعر کے مطابق۔ ہمارے دم سے ہے ہر غم' نہ ہم ہوں گے نہ غم ہوگا۔"

"خودکشی کا ارادہ ہے تو سبحان اللہ۔ نیک کام میں دیر کیسی۔ فرمایئے کیا حاضر کروں۔ سنکھیا' خنجر آب دار' طمنچہ..."

میں نے کہا "کیا شیلی واقعی سو گئی ہے؟"

غالب اندر گیا اور واپس آ کے تصدیق کی کہ شیلی اور نازو واقعی سو رہی ہیں۔ اسے تازہ ترین واقعات اور میری پلاننگ سے آگاہ کرنا بھی ضروری تھا۔ تھکن کے باعث نیند کی خواہش بھی شدید تھی۔ غالب نے نقوی صاحب کے گھر فون کیا۔ وقار یوسف کی بیوی کا اسپتال سے براہِ راست رابطہ تھا۔ اس نے بتایا کہ صورتِ حال جوں کی توں ہے اور ڈاکٹر ابھی ان کی حالت کو خطرے سے باہر قرار نہیں دیتے۔ اگلے چوبیس گھنٹے اہم ہیں۔ میں نے بھی وقار یوسف کی بیوی سے بات کی اور اسے تسلی دی کہ وہ فکر نہ کرے۔ انہیں بہترین طبی سہولیات حاصل ہیں اور آج کل تو میڈیکل سائنس کی جدید ترین تحقیق سے پاکستان میں بھی ان امراض کا علاج ممکن ہے جو پہلے ناقابلِ علاج تھے۔ یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔

ظاہر ہے میں نے کسی یقین کے بغیر جھوٹ بولا مگر سچ نہ مجھے معلوم تھا اور نہ مجھ میں بولنے کی ہمت تھی۔ یہ ایک رسمی' اخلاقی فریضہ تھا جو میں نے ادا کیا۔ ایسے وقت میں آدمی جذباتی سہاروں پر انحصار کرتا ہے۔ ہمدردی اور غمگساری کے الفاظ اسے کھوکھلے محسوس نہیں ہوتے۔ وہ یقین کرنا چاہتا ہے چنانچہ مان لیتا ہے کہ واقعی...

اس نے مجھ سے بھی پوچھا کہ سکندر بھائی' آپ کہاں تھے؟ ہم سب آپ کو مطلع کرنا چاہتے تھے۔ میں نے ٹال دیا کہ میں اپنے مسائل میں اُلجھا ہوا تھا لیکن فی الحال تم میری فکر مت کرو۔ اپنا خیال رکھو۔ جاگنے سے کیا فائدہ۔ سو جاؤ۔ اللہ سب ٹھیک کرے گا۔

اس نے کہا "وقار بھی یہی کہتے ہیں مگر میں کیا کروں۔ نیند نہیں آتی۔ میں تو وہیں آئی سی یو کے باہر بیٹھی رہتی۔ یہ مجھے گھر لے آئے۔"

"بالکل ٹھیک کیا وقار نے۔ تمہیں سکون کی ضرورت ہے۔ کوئی گولی کھا لو اور سو جاؤ۔ ہم صبح معلوم کریں گے خیریت' شب بخیر۔"

کچن میں اسٹول پر بیٹھ کے میں نے غالب کو ان واقعات کی رپورٹ دی جن سے وہ بے خبر تھا۔ پہلے میرا خیال تھا کہ سنسر کی قینچی بھی چلاؤں اور سین کاٹ دوں جو اسے قابلِ اعتراض لگیں گے لیکن ڈر یہ تھا کہ بعد میں شیلی کسی نہ کسی بات پر کوئی حوالہ دے گی تو میرا جرم سنگین تر ہو جائے گا کہ میرے دل میں چور تھا چنانچہ میں نے بات کو گول کیا تھا۔ کافی بناتے ہوئے غالب خاموشی سے سب سنتا رہا پھر ہم ڈائننگ روم میں چلے گئے اور وہاں سے کرسیاں اٹھا کے پورچ میں جا بیٹھے۔

"کیا ان حالات میں تمہاری اسکیم پر نظرِ ثانی کی ضرورت نہیں؟" غالب نے غور و خوض کے بعد کہا "وہاں یعنی ولایت شریف میں تمہارے جو مہربان اور قدردان تھے۔ کوئی شیخ صاحب اور یہاں نقوی صاحب' ایک ساتھ ایک جیسی حالت میں ہیں۔ کوئی تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔"

میں نے کہا "میں کسی کی مدد پر اتنا انحصار نہیں کر رہا تھا۔"

"لیکن یہاں تمہیں ایک آسرا تو تھا کہ نقوی صاحب تمہیں کسی اور نام کے ساتھ پاسپورٹ بنوا دیں گے۔"

"یہ کام کراچی میں کوئی بھی ایجنٹ کر سکتا ہے۔ وہاں اکرام شیخ ٹیکسی چلا رہا ہے۔ اسے سب معلوم ہوگا۔"

"اکرام شیخ کے نام پر یاد آیا" غالب بولا "وہ ڈبل ایس آئی شیخ۔ سابق سب انسپکٹر سید اکرام شیخ۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔"

میں نے کہا "کیا ہوا اسے؟"

"پہلے تو وہی نامُراد مرض ہوا تھا جس کا کوئی علاج' نہ دوا۔ مرضِ عشق۔ بالآخر کاجل کو پیارا ہوا" غالب نے آہ بھری "آثار ایسے ہی تھے بھائی۔"

میں نے سر ہلایا "چلو اس کی ناؤ بھی کنارے لگی۔"

"پتا نہیں یار' بیڑا پار ہوا کہ غرق ہوا۔ وہ تو گیا ہمیشہ کے لیے۔"

"اب بھی ٹیکسی چلا رہا ہے؟"

"اور کیا' بحری جہاز چلانے لگے گا اتنے کم عرصے میں۔ کہتا ہے بہت خوش ہوں" غالب بولا "فون آیا تھا منظر کے گھر۔ اتفاق سے میں اور نازو وہیں تھے۔ رابعہ تو ظاہر ہے پہلے سے تھی۔ نازو بھی بہت خوش ہوئی۔ میں نے تعزیت کی اور دلاسا دیا کہ چل جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب تو بس بچے ہوں گے یا جھگڑے ہوں گے۔ نازو بہت خفا ہوئی۔"

میں نے کہا "عشق کا دوسرا رُخ ان خواب پرست لڑکیوں کو اچھا نہیں لگتا۔ وہ لاہور کیوں نہیں آجاتا؟"

"میں نے بھی پوچھا تھا۔ کہنے لگا کہ تم ادھر آجاؤ۔ ڈوبنا ہے تو آگ کے دریا میں کیا' سمندر میں ڈوب کے دیکھو۔ کاجل کوئی مکان کرائے پر لے کر اسکول چلا رہی ہے۔ تمہارے اور میرے بارے میں بہت متفکر تھی کہ آخر ہم بھی اس کے نقشِ قدم پر کیوں چلنے کی کوشش نہیں کرتے۔ لومڑی' اپنی دُم کٹ گئی تو سب کو مشورہ دے رہی ہے کہ دُم کٹوا لو۔ یہ بھی کہا تھا میں نے۔"

"گویا اکرام شیخ ہو گیا کراچی والا... پکا...؟"

"ہاں۔ وہ شاید پاسپورٹ بنوا دے گا مگر اس کے باوجود یہ کام خطرناک ہے۔" غالب نے کہا "لندن کی پولیس کا حافظہ اتنا کمزور نہیں ہو سکتا۔"

"حافظے کی کیا بات ہے۔ اگر میری صورت کسی سکندر بخت سے ملتی ہو تو اس کو قدرت کا حسین اتفاق کہا جا سکتا ہے۔"

"اس حسنِ اتفاق پر تم اندر بھی جا سکتے ہو۔"

"کیوں؟ پاسپورٹ جعلی تو نہیں ہوگا۔ حکومتِ پاکستان کی ضمانت پر جاری ہوگا" میں نے کہا "اس کے علاوہ ڈاکٹر شیلی کی شہریت دُہری ہے۔ پاکستانی بھی اور برطانوی بھی۔"

"آئی سی... تم اس کے نام نہاد شوہر کی حیثیت سے جاؤ گے۔ ظاہر ہے اس کے بغیر ویزا نہیں ملے گا۔" غالب نے خفگی سے کہا "یہ بھی سوچا ہے کہ رابعہ پر کیا بیتے گی؟"

"یار' تم سب یکطرفہ طور پر اس کی حمایت کرتے ہو۔ اسے کسی نے کہا کہ وہ بھی قصوروار ہے۔ اس نے مجھ سے بات کیے بغیر' لڑے بغیر' نوٹس دیے بغیر اپنا رویّہ ایک دم کیوں بدلا؟ وہ پہلے بھی اسی طرح مجھے اکیلا چھوڑ کے بھاگ آئی تھی۔ کتنے حیلے بہانے کیے تھے اس نے۔ صاف اور سیدھی بات یہ تھی کہ اس میں حوصلہ نہیں تھا میرے ساتھ حالات کی سختی جھیلنے کا۔"

"یہ آپ بکواس مت فرمائیں۔ اس نے جتنی قربانی دی تمہارے لیے..."

"یار' کیا میں نے کہا تھا کہ قربانی دو۔ اسے تو محبت کا دعویٰ تھا۔ محبت میں قربانی تم نے نہیں دی' نازو نے نہیں دی۔ محسن کو دیکھو' سب سے زیادہ مصیبت اس نے جھیلی۔ اس کے بیوی بچے..."

"وہ ٹھیک ہے مگر سب کی ہمت کو ایک ہی ترازو سے تولنا بھی غلط ہے۔" غالب نے کہا "رابعہ نے تمہارا بہت ساتھ دیا۔ اپنا کیریئر تباہ کر لیا۔"

"غلط۔ اس کی کمپنی اپنی جگہ ہے۔ اس کے کاروبار کو سنبھالنے والا منظر بھی تھا اور وقار یوسف بھی۔ وہ واپس آ کے اپنے آفس میں جا بیٹھی ہے۔ اس کی جو کوٹھی تباہ ہو گئی تھی' چوہدری دلاور نے اس کی جگہ محل بنا دیا ہے۔ مجھے کیا ملا؟ میں تو بدستور انہی مسائل سے دوچار ہوں۔ میرے خلاف مقدمات اپنی جگہ قائم ہیں۔ حالات ہمیشہ ایسے نہیں رہیں گے..."

"ہم نے سمجھایا تھا اسے...."

"کیا فائدہ ہوا؟ کیا اس نے اپنی غلطی تسلیم کی؟ وہ تو مجھے قصوروار سمجھتی ہے کہ میں نے چوہدری دلاور کے ساتھ پنگا ہی کیوں لیا۔ شروع سے میں اس کی نظر میں غلطی پر غلطی کرتا آیا تھا۔ مجھے والد کو چھوڑ کے لندن نہیں جانا چاہیے تھا' دلاور سے جھگڑا مول نہیں لینا چاہیے تھا۔ یہ نہیں کرنا چاہیے تھا' وہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اب اس کا نظریہ ہے کہ میں یہ سارے معاملات راتوں رات سمیٹ لوں۔ اور اس کا طریقہ صرف یہ ہے کہ میں چوہدری دلاور کی پیش کش قبول کر لوں۔ وہ صلح کرنا چاہتا ہے تو صلح کر لوں' معافی مانگتا ہے تو معاف کر دوں۔ نقصانات کی تلافی کرتا ہے تو کہوں کہ تھینک یو۔ آج کے بعد ہم دوست ہیں۔ میں اپنے باپ کے قاتل کو معاف کر دوں اور جو ہوا سو ہوا کہہ کے سب بھول جاؤں۔ اپنی جائداد کا قبضہ لوں اور اپنا کام کروں۔ یہ کیوں نہیں سمجھتی وہ کہ میں بے وقوف یا کوتاہ اندیش نہیں ہوں۔ بہت بڑی قیمت لگائی تھی چوہدری دلاور نے میری۔ اس نے مجھے قابلِ خرید سمجھ لیا تھا۔ بہت آسان تھا میرے لیے اس کا پارٹنر بن جانا اور اس کے کاروبار میں شریک ہو کے لاکھوں کے کروڑ بنانا مگر سکندر اور دلاور میں جو فرق ہے' وہ ہے' اور رہے گا۔ پھر آج میں کیسے اس کی اطاعت قبول کر لوں؟ کیسے اس غدار اور ضمیر فروش سے ہاتھ ملاؤں؟ کیسے پیڈرو کو معاف کروں؟ یہ سب کرنا ہوتا تو میں اتنا نقصان کیوں اٹھاتا؟ سو پیاز کھا کے سو جوتے کھانا مجھے منظور نہیں مرزا غالب۔ رابعہ کوئی ناسمجھ بچی تو نہیں ہے۔ کیا اتنے عرصے میں میرے ساتھ رہ کے اس نے اندازہ نہیں کر لیا تھا کہ میں کس مٹی کا بنا ہوا ہوں؟ اسے معلوم نہیں تھا کہ میرا ساتھ دینے کے نتائج کیا ہوں گے؟ اسے پتا نہیں تھا کہ حالات کا رخ کس سمت میں ہے؟ پھر وہ آج کیوں توقع رکھتی ہے مجھ سے کہ میں حالات کے ساتھ بدل جاؤں؟ اپنے نظریات' خیالات سب کو اپنے مفادات کے سانچے میں ڈھال لوں۔ وہ وکیل ہے' اچھی طرح جانتی ہے کہ ان مقدمات سے جان چھڑانا اتنا آسان نہیں ہوتا۔"

"یہ سب وہ سمجھتی ہے مگر اس کا خیال ہے کہ تم حالات میں بہتری کے لیے نہیں' ابتری کے لیے کوشش کر رہے ہو۔"

"بڑی فضول بات ہے یہ۔ مجھے کیا پاگل سمجھتی ہے وہ؟" میں نے سخت برہمی سے کہا "مجھے شوق ہے گڑھے میں گرنے کا یا آگ میں کودنے کا؟ یہ ٹھیک ہے کہ کہیں مجھ سے غلطی بھی ہوئی۔ آخر انسان ہوں میں۔ لیکن یہ حالات میری غلطی کی پیداوار نہیں ہیں۔ میرے گرد شکاری اپنا حصار پہلے ہی قائم کر چکے تھے۔ اب وہ حلقہ تنگ سے تنگ تر نہیں کریں گے تو میں ہار کیسے مانوں گا؟ وہ تو اپنی فرعونیت کے زعم میں' نعوذ باللہ خدا بنے بیٹھے ہیں۔ رابعہ چاہتی ہے کہ میں ان کی بندگی قبول کر لوں۔ آخر کیوں؟ وہ مجھے ذلیل کرنا چاہتی ہے خود اپنی نظر میں' دنیا کی نظر میں۔ اتنا بزدل اور کم ہمت نہ میں تھا اور نہ اس خوف سے بن سکتا ہوں کہ میرا دشمن قوی سے قوی تر ہوتا جا رہا ہے۔ شیطان بہت قوی ہے مگر میں کبھی مصلحت یا مصالحت کے فارمولے سے اسے رحمان مانوں تو میں کافر۔ پھر دلاور سے کیوں شکست کی ذلت اٹھاؤں! رابعہ ساتھ نہیں دے سکتی' نہ دے۔ اپنی وکالت کرے۔ انتظار نہیں کر سکتی نہ کرے۔ مجھے ابھی نہ فرصت ہے نہ حالات کی اجازت مگر وہ مجھے بزدلی اور ضمیر فروشی کی ترغیب تو نہ دے۔"

غالب کی خاموشی یہ ظاہر کرتی تھی کہ اسے میرے خیالات سے اختلاف نہیں۔

"وہ اپنے گھر میں شفٹ ہوگئی ہے۔"

"بڑی خوشی کی بات ہے" میں نے تلخی سے کہا "ہاؤس وارمنگ HOUSE WARMING (نئے گھر کی خوشی) کی دعوت کب ہو رہی ہے۔ پرانا گھر تو میں نے دیکھا تھا۔ دلاور نے مع سود تمام قرض بے باق کردیا۔"

غالب نے موضوع بدلنے کے لیے کہا "یہ سکندر بخت کی جگہ کسی اور کو لانے کی اسکیم ویسے تو مجھے ٹھیک لگتی ہے۔"

"خرابی کیا ہو سکتی ہے؟"

"خرابی بھی تیرے ساتھ ہے بھائی۔ اور مجھے لگتا ہے کہ ساتھ ہی رہے گی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ رابعہ کا سکندر ہمیشہ کے لیے کھو جائے۔"

"سکندر کبھی نہیں بدلے گا' اس کا نام اور حلیہ کچھ بھی ہو۔ ہاں رابعہ اس کی واپسی کا انتظار نہ کر سکے تو اور بات ہے۔"

"کہتے ہیں آنکھ او جھل پہاڑ او جھل۔ شیلی سامنے ہوگی تو رابعہ خود بخود تصور سے بھی غائب ہو جائے گی۔"

"میرے دل میں ایسی کوئی بات نہیں۔ تمہیں اعتماد ہونا چاہیے مجھ پر۔ آخر تم دوست ہو میرے۔"

"دوست ہیں اسی لیے تو فکر مند ہیں ورنہ ہم کہتے کہ بھاڑ میں جائیں آپ بھی مع رابعہ اور ڈاکٹر شیلی کے۔ سکندر! آدمی کو آزمائش سے بچنا چاہیے۔ یہ دعویٰ نہیں کرنا چاہیے کہ وہ بے خطا ہے۔ میری آنکھیں جب دور تک دیکھتی ہیں تو منظر بدلا بدلا لگتا ہے۔"

"قصور تیری آنکھوں کا ہے۔ دور کی نظر کا چشمہ ٹھیک نہیں ہے۔"

"نہیں دوست۔ شیلی کوئی عام لڑکی نہیں۔ وہ حسین ہے' ذہین ہے' مخلص ہے تمہارے ساتھ۔ دولت مند ہے' اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے۔ تمہیں اس گرداب سے بحفاظت نکال کے لے جا رہی ہے۔ کون جانے اس کے دل میں کیا ہے اور تمہارے جذبات کل کیا ہوں گے؟"

میں نے افسوس سے سرہلایا "یار غالب! شیلی بھی ایک ضرورت مند ہے۔ اسے حالات نے ہماری طرف دھکیل دیا ہے تو اس کے حسن' اس کی دولت یا تعلیم کا کیا قصور۔ وہ چاہتی ہے کہ ہم اس کی مدد کریں اور وہ ہماری مدد کرے۔ تو کیا ہمیں اس کو دھتکار دینا چاہیے؟ مشترک مقصد ہونے کے باوجود انکار کر دینا چاہیے؟ اس کی نیت پر شک کو بنیاد مت بناؤ۔ دیکھو اور سمجھو کہ وہ لڑکی بری نہیں ہے۔ وہ ہمارا ساتھ دینا چاہتی ہے۔ جیسے کاجل نے دیا' شہلا نے دیا' نازو دے رہی ہے۔ اس سے بلاوجہ نفرت مت کرو۔ وہ ہم سب کے لیے بہت کچھ کر سکتی ہے اور ہم اس کے لیے بہت کچھ

نے کی پوزیشن میں ہیں۔ ضرورت صرف اعتماد کی ہے۔"

غالب نے کہا "یار سچ بتاؤں' رابعہ کی جگہ میں ہوتا تو میرا اعتماد بھی قائم نہ رہتا۔ عورت بڑی حساس اور حاسد ہوتی ہے محبت میں اور کوئی شک نہیں لیتی۔ الزام دے سکتی ہے۔"

"قطع نظر اس سے کہ کل شیلی کی جگہ رابعہ ہوگی یا رابعہ کی جگہ شیلی۔"

"ظاہر ہے ایک ہوگی۔ ایک نیام میں ایک ہی تلوار ہو سکتی ہے ورنہ عاشقی کی بات مت کرو۔ دو سے نہیں' چار سے نکاح پڑھوالو۔ ایک دل میں تو ایک ہی محبت رہتی ہے۔ ایک گھر میں چار سوکنوں کو ٹھونس دو اور...."

"غالب! میں بہت اپ سیٹ ہوں۔ مجھے مشورہ چاہیے' ہمدردی اور دوستی چاہیے۔ رابعہ کی طرح بے رحم مت بنو" میں نے سر تھام کے کہا "مجھے بتاؤ کہ میں کیا کروں؟ حالات تو تمہارے سامنے ہیں۔ میں نے فوری فیصلہ نہ کیا تو انجام وہی ہوگا جس کی نوید مجھے شکاری دے چکے ہیں۔"

میں نے وہ تصویر غالب کو دے دی جو مجھے ہوٹل میں پہنچائی گئی تھی۔ اس نے روشنی کے رُخ کر کے اسے دیکھا "یہ کس کا حرامی پن ہے؟"

"یہ دھمکی ہے' مذاق نہیں ہے غالب۔"

"میں سمجھتا ہوں۔"

"لیکن پھر بھی اعتماد نہیں ہے مجھ پر؟ تو بھی سمجھ رہا ہے کہ میں شیلی کے ساتھ فرار ہو رہا ہوں اور لوٹ کے نہیں آؤں گا؟ یہ پیپر میرج PAPER MARRIAGE میں ضرورت کے تحت نہیں' تم سب کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے کروں گا...."

"نہیں یار۔ میری طرف سے اِن او کی۔ مجھے بھروسہ ہے تیرے وعدے پر" غالب نے کہا "اللہ تجھے اس آزمائش میں سرخ رو کرے اور کل ہم پشیماں نہ ہوں اور تو شرمسار نہ ہو۔ لیکن عورتوں کے جذبات کی نوعیت کچھ اور ہے۔ نازو یا گل میں سے کوئی کسی دلیل پر تیری حمایت نہیں کر سکتی۔ ان کی جذباتی ہمدردیاں یک طرفہ طور پر کسی دلیل یا جواز کے بغیر رابعہ کے ساتھ ہوں گی۔"

"مجھے معلوم ہے لیکن تم اور محسن انہیں سمجھا سکتے ہو۔"

"میں نے کہا نا کہ یہ عقل کا مسئلہ نہیں ان کے لیے۔ ہم خاک سمجھائیں گے۔ تو محسن سے بات کر کے دیکھ لے۔ وہ مان جائے گا' گل نہیں مانے گی۔"

"وقت خود منوالے گا سچائی کو۔"

اندر ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی' غالب اٹھا "خدا خیر کرے۔ جب گھنٹی بجتی ہے تو مجھے ریسیور اٹھاتے ہوئے خوف آتا ہے۔ تو سو جا دو چار گھنٹے کے لیے۔"

میں نے کہا "پانچ بجے ہیں۔ کوشش کرتا ہوں' نیند آجائے۔"

فون وقار یوسف کا تھا۔ وہ مجھ سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن میں نے غالب کو اشارے سے سمجھا دیا کہ ٹال دے۔ اس سے ...کہ سکندر تو سویا پڑا ہے۔ رات کو ڈاکٹر شیلی کے ساتھ آیا تھا۔ دونوں بہت تھکے ہوئے تھے۔ کچھ بتائے بغیر ہی سو گئے تھے۔

"بات کیوں نہیں کی اس سے؟" غالب نے ریسیور رکھ کے کہا۔

"دیکھ یار! یہ جو باتیں تیرے اور میرے درمیان ہوئی ہیں' ان کا علم سب کو نہیں ہونا چاہیے۔ بے شک وقار یوسف قابل اعتبار ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ یہ بات کم سے کم لوگوں کو معلوم ہو۔ میں اس معاملے میں ایک متعصب مرد ہونے کا الزام قبول کر سکتا ہوں لیکن رسک نہیں لے سکتا۔ میں سمجھتا ہوں' عورتیں راز کو راز رکھنے کی اہل نہیں ہوتیں۔"

"کیا مطلب؟ نازو کو یا رابعہ کو بھی نہیں بتاتا ہے؟"

"چاہتا تو میں یہی تھا مگر یہ ناممکن ہے اور ویسے بھی رابعہ یا نازو اور گل کی آزمائش ہو چکی ہے۔ جب میں لندن سے واپس آؤں تو گنے چنے افراد کے سوا کسی کو معلوم نہیں ہونا چاہیے۔ ابھی نازو کو بتانے میں کوئی حرج نہیں مگر میرے سامنے بات مت کرنا۔ وہ مجھ سے لڑے گی۔"

"بعد میں مجھ سے لڑے گی۔"

"تم تو لڑتے رہتے ہو یار۔ اچھا موضوع ہوگا یہ بھی" میں نے کہا۔

"نہیں یار۔ اس سے آپ بالکل صاف بات کریں۔ دونوں۔ رابعہ اور منظر کو بھی بتا دیں' انہیں اعتماد میں لینا ضروری ہے۔ آج چھٹی ہے۔"

"کس بات کی؟"

"اتوار ہے یار۔" غالب نے کہا۔

"مجھے نہ دن یاد' نہ مہینہ' نہ تاریخ" میں نے کہا۔

"ابھی چلتے ہیں منظر کی طرف۔ ناشتے کے بعد۔ ان سے ڈسکس کرلیں گے پورا پلان۔ وہیں سے محسن کو فون کرلینا۔"

"گل سمیت ہو گئے چھ افراد۔ میں اور شیلی آٹھ" میں نے کہا "نواں کوئی نہیں ہوگا جس کے کانوں میں بھنک بھی پڑے۔ غلطی سے بھی کسی کے منہ سے کوئی بات نکل گئی تو میرا سارا پلان فیل اور بیڑہ غرق۔ یہ بہت خطرناک کھیل ہوگا جس میں انتہائی احتیاط کے سارے تقاضے ہم سب کو پورے کرنے ہوں گے ورنہ راز فاش ہو جائے گا۔ میں نے اسی لیے وقار یوسف سے بات نہیں کی تھی کہ وہ زیادہ کریدتا۔ زیادہ تفصیلات میں اسے بھی بتانا نہیں چاہتا۔ میں شیلی کو بھی منع کر دوں گا۔"

"یہ ڈاکٹر شیلی ابھی میری سمجھ میں نہیں آئی۔ یا تو یہ انتہائی احمق ہے یا بہت چالاک۔ احمق سے میری مراد تھی' سادہ لوح۔"

"اس کی پرورش ذرا مختلف ماحول میں ہوئی ہے اس لیے لگی لپٹی نہیں رکھتی۔ کچھ بے باک لگتی ہے اور جوش زیادہ ہے۔ جذباتی بھی ہے مگر بعض اوقات اپنی شخصیت کا بالکل متضاد تاثر دیتی ہے۔ جب اچانک ڈاکٹر شیلا خان بن جاتی ہے۔ ابھی ایک ... ہوئی لیکن میں کہوں گا تو وہ اخبار نکالنے پر بھی تیار ہو جائے گی۔"

"ہاں بھائی' تمہاری نہیں مانے گی تو اور کس کی مانے گی۔"

"یہ بات نہیں کہ برائی سیدھی بات اس سے منوائی جا سکتی ہے۔ لندن سے ڈ...یشن لے کر اخبار شائع کرنے کا آئیڈیا کیسا ہے؟"

"آئیڈیا کوئی چیز نہیں۔ اصل چیز ہے حالات کی ...۔ قابل عمل کیا ہے اور کیا نہیں ہے' اس کا فیصلہ وقت کرے گا۔" غالب نے کہا "تجربہ کیے بغیر نہ آئیڈیا غلط ثابت ہوتا ہے' نہ صحیح سمجھا جا سکتا ہے۔"

چار گھنٹے بے سدھ سونے کے بعد میں جاگا تو گھر میں وہی سکوت تھا۔ وقار یوسف کی عدم موجودگی میں گھر کچھ سنسان لگتا تھا اور اس تاثر کو ہم چار مہمانوں کا وجود ختم نہیں کرتا تھا۔ وقار یوسف کی بیوی بہت تیز طرار ... ہر وقت مہمان نوازی پر مستعد رہتی تھی اور سب کی خدمت پر کمربستہ۔ وہ عادات' مزاج اور فطرت میں ...تقوی صاحب کے برعکس تھی۔ ممکن ہے اس میں اپنی ماں کی صفات کا عکس ہو جو نہ جانے کب سے مفلوج پڑی تھی۔ اس میں غرور یا بدخوئی نام کو نہ تھی۔ اتنے بڑے باپ کی اکلوتی بیٹی اپنے شوہر کے گھر میں سارے کام خود کرتی تھی۔ صبح سے شام تک مصروف رہنا اور ہنستے کھیلتے سب کے کام کر دینا اسے اچھا لگتا تھا۔ ہم وقت بے وقت چائے کی فرمائش کر بیٹھتے تھے یا کافی مانگ لیتے تھے۔ اکثر تو وہ خود ہی سمجھ لیتی تھی کہ اب ہمارا موڈ کیا ہے۔ اس کے نہ ہونے سے گھر کی چہل پہل مفقود تھی۔ باپ موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ میں تصور کرتا تھا تو مجھے اس کا چہرہ افسردہ اور دکھی اور اس کی آنکھوں میں آنسو نظر آتے تھے۔ اسی سے گھر کے سکوت میں اداسی کا عنصر شامل ہو گیا تھا۔

میں نے اس بیڈ روم میں جھانک کر دیکھا جہاں نازو نے شیلی کو اپنے ساتھ سلا لیا تھا۔ اب وہاں شیلی تکیے کو دبوچے اوندھی پڑی تھی۔ باہر سے نازو کے چلانے اور غالب کے ہنسنے کی آواز سن کے میں برآمدے کی طرف گیا۔ وہاں غالب اسی کرسی پر بیٹھا تھا۔ میری جگہ نازو نے لے لی تھی۔

میں نے کہا "السلام علیکم حضرت اور خاتون۔ دیکھیے میں آپ کے لڑائی جھگڑے میں دخل نہیں دوں گا۔ پلیز اپنا کام کیجیے۔"

غالب ہنسنے لگا "جھوٹ غالباً عورتوں کے لیے ایجاد کرنا پڑا ہوگا۔ کسی میرے جیسے مجبور مرد کو۔"

"اسی لیے تو مرد جھوٹے ہوتے ہیں۔" نازو نے کہا "جھوٹے اور دغا باز۔"

"کیا کریں ہم' جب تم میں سچ سننے کا حوصلہ ہی نہیں۔ پچاس سال کی عورت بھی پانچ دس سال کی رعایت نہیں' فقطی پر...

ڈسکاؤنٹ مانگتی ہے عمر میں۔ تمیں سے اوپر کی وہ کبھی ہوتی ہی نہیں۔ اب ہم سب سچ بولیں کہ خاتون یہ بال کیا دھوپ میں سفید ہو گئے جن کو آپ نے کالا کولا ہیئر کلر سے جوان کیا ہے؟" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "تم بھی زیادتی کر رہے ہو یار۔ نازو ابھی پچاس کی کہاں ہوئی ہے۔ کالا کولا ہیئر کلر ایسے ہی آزمایا ہوگا اس نے۔"

نازو نے مجھے گھورا "تم مت بولو سکندر۔"

غالب نے سرہلایا "کیوں نہ بولے۔ تم نے مجھے جھوٹا کہا تھا' اسے دغاباز۔"

میں نے کہا "کوئی بات نہیں یار۔ ہم بھی کتنا جھوٹ بولتے ہیں ان کے سامنے۔ دل پر پتھر رکھ کے ان کے حسن کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتے ہیں۔"

"کسی چڑیل کو حور کرنا بڑے دل گردے کا کام ہے" غالب نے مجھ سے اتفاق کیا۔

نازو چلانے لگی "کیا میں چڑیل ہوں؟ ہمت ہے تو صاف کہو۔"

"نہیں۔ چڑیل کی نسل الگ ہے۔ بھوت جن کے قبیلے سے میرے سُسر محترم کا تعلق ہے۔ اتنے بھیانک نہیں ہوتے" غالب نے اسے غور سے دیکھ کے کہا۔

نازو اس کی طرف لپکی "سکندر کو دیکھ کے اترا رہے ہو۔"

غالب فوراً میرے پیچھے آگیا "دیکھا' سچ برداشت نہیں ہوتا۔ میں نے غلط نہیں کہا تھا۔ سارا دن اُلو بناتا رہوں اور قصیدے پڑھتا رہوں تمہارے حسن کے تو سنتی رہو گی۔"

"اچھا۔ تو اُلو بناتے ہو تم مجھے؟" وہ میرے پیچھے آئی تو غالب دوسری طرف چلا گیا۔

"توبہ توبہ۔ بندے کی کیا مجال کہ خدا کے کام میں دخل دے۔ ویسے بھی اُلو کے پٹھے کی مؤنث ہوتی ہے' اُلو کی نہیں۔"

میں نے نازو کو روک لیا۔ اسی وقت میری نظر شیلی پر گئی جو نہ جانے کب دروازے کے پیچھے آکھڑی ہوئی تھی۔ اس نے ابھی تک وہی پھٹے ہوئے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اس کے بال بھی بکھرے ہوئے تھے اور ہاتھوں کی خراشوں پر خون کی لکیریں جم گئی تھیں۔

نازو نے کہا "آجاؤ بھئی۔ چھپ کے کیا دیکھ رہی ہو؟"

شیلی باہر آگئی "وہ یار..... میرا حلیہ ذرا خراب تھا۔ رات میں اتنی تھکی ہوئی تھی۔ کوئی بات بھی نہیں ہوئی۔"

غالب نے کہا "نازو ڈیئر! ڈاکٹر شیلی کو باتھ روم دکھاؤ' کپڑے دو بدلنے کے لیے' ناشتا بناؤ ہم سب کے لیے۔ آخر اتنی پھوہڑ کیوں ہو تم۔ لڑکیوں کو صبح صبح یہ ونگا فساد زیب دیتا ہے؟"

نازو نے اسے خوں آشام نظروں سے گھورا مگر بولی نہیں۔ وہ شیلی کو لے گئی تو غالب نے مجھے اخباروں کی طرف متوجہ کیا جو وہاں ڈھیر کی صورت میں پڑے ہوئے تھے۔ ایک ایک کرکے میں نے سب کی سُرخیاں دیکھ لیں مگر کسی میں نہ رفیق کے قتل کی خبر تھی اور نہ ڈپٹی ہوم سیکریٹری کے گھر پر چھاپا پڑنے کی۔ ایک مختصر خبر نقوی صاحب کے صاحبِ فراش ہونے کی مخصوص اخباری زبانوں میں دی گئی تھی کہ ہارٹ اٹیک کے بعد وزارتِ داخلہ کے ایک اعلیٰ افسر کو اسپتال میں داخل کردیا گیا ہے جہاں ڈاکٹران کی جان بچانے کی پوری کوشش کررہے ہیں۔

اچانک مجھے ایک خیال آیا میں نے کہا "غالب! نقوی صاحب کے گھر میں صرف بیٹی داماد ہوں گے۔"

"نوکر چاکر بھی ہوں گے۔" غالب بولا۔

میں نے کہا "وہ فائلیں..... میرے مقدمات کی فائلیں بھی تو شاید وہیں ہیں۔"

"کیا پتا نقوی صاحب نے واپس کردی ہوں۔"

"چانس تو لیا جاسکتا ہے" میں نے کہا "اگر آج رات ہم بھی وہیں ہوں تو کسی کو پتا نہیں چلے گا۔"

غالب سوچ میں پڑگیا "نقوی صاحب کی نوکری خطرے میں پڑجائے گی۔"

"ابھی تو ان کی زندگی خطرے میں ہے۔ اللہ انہیں شفا دے۔ پھر وہ ضرور کچھ کریں گے لیکن بفرضِ محال..... خدا نخواستہ....."

غالب نے سرہلایا "اگر انہیں زبردستی ہٹا کے کسی کے لیے راستہ صاف کیا گیا ہے تو آنے والا ہمارا نہیں' ہمارے دشمنوں کا ساتھی ہوگا۔ نقوی صاحب پر بیٹی کا دباؤ نہ ہوتا تو وہ بھی نقد سودا کرتے۔ اللہ انہیں معاف کرے' اپنے اختیارات کو کیش کرانے کے معاملے میں وہ بہت بدنام تھے۔ یہ کوٹھیاں' گاڑیاں ایسے ہی تو نہیں بن گئی تھیں۔ چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کی دولت کے سامنے بیٹی دیوار بن گئی تھی ورنہ پیسے کی تو اہمیت ہی نہیں تھی۔ وہ بلینک چیک بھی دے سکتے تھے۔"

"یار! یہ کام بہت ضروری ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ آج رات کوشش کرتے ہیں لیکن ایک شرط ہے" غالب نے کہا "اگر نقوی صاحب صحت یاب ہو کے لوٹ آئے تو ہم یہ فائلیں واپس وہیں رکھوا دیں گے یا رکھ دیں گے۔"

"فائلیں ان کے جانشین کے ہاتھ نہیں لگنی چاہئیں" میں نے کہا۔

"کیوں نہ ہم وقار یوسف سے کہہ دیں..... وہ اس گھر کے بارے میں ہم سے بہتر جانتا ہے اور زیادہ اعتماد کے ساتھ..."

میں نے کہا "نہیں۔ وہ ایک پیشہ ور وکیل ہے۔ اسے غیر قانونی کام میں ملوث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ میرے کیس منظر یا رابعہ کے پاس ہیں اور وقار یوسف دونوں کا معاون ہے۔ ایسے اگر مقدمات کا فیصلہ ہمارے حق میں ہوگا تب بھی وہ ضمیر کا مجرم بن جائے گا۔ اسے احساس ہوگا کہ اس نے اپنے پیشے کی حُرمت کو برقرار نہیں رکھا۔"

ناشتے کی میز پر میں نازو اور شیلی کو دیکھ کے حیران ہوا۔ شیلی نے نازو کے کپڑے پہنے تھے اور اسے فٹ آئے تھے کیونکہ وہ بھی نازو کی طرح نازک اور دُبلی پتلی تھی۔ ان کے درمیان دوستی کے مراحل بڑی تیزی سے طے ہوئے تھے اور وہ آپس میں اتنی بے تکلف ہو چکی تھیں جیسے برسوں کا یارانہ ہو۔ ان دونوں کی فطرت میں خاصی مماثلت تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ ایک ڈاکٹر تھی تو دوسری جوڑ توڑ کی ماہر۔ شیلی تو خیر عادت کے مطابق سب ہی کو یار کہتی تھی مگر نازو بھی اسے یار کہہ رہی تھی اور ناشتا بنا کے لگاتے ہوئے ان کی زبانیں ایک ساتھ چل رہی تھیں۔ یہ کمال غالباً خواتین ہی کو حاصل ہوتا ہے کہ وہ بیک وقت بولتی بھی ہیں اور ایک دوسرے کی سن بھی لیتی ہیں۔

غالب نے آہ بھر کے شعر پڑھا "بن گیا رقیب آخر تھا جو راز داں اپنا۔"

میں نے آہ بھری "جن پہ تکیہ تھا وہی پتّے ہوا دینے لگے۔"

نازو اسے بتا رہی تھی کہ نقوی صاحب کون ہیں اور "توپ چیز" کیا ہوتی ہے۔ ان کی بیٹی سے ہمارا کیا تعلق ہے اور ان کو زہر دینے والا کون ہوسکتا ہے۔

میں نے میز کے نیچے سے شیلی کو ٹانگ مار کے متوجہ کرنے کی کوشش کی مگر پاؤں غلطی سے نازو کے لگا۔

اس نے غالب کو گھورا "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"جو بھی ہو رہا ہے اچھا نہیں ہو رہا ہے" غالب نے کہا۔

"اپنے پیروں کو قابو میں رکھو۔"

"تم اپنی زبان کو قابو میں رکھو" غالب نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

موقعے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے فرنچ کا سہارا لیا اور شیلی کو مخاطب کرکے کہا "کل رات کی کوئی بات مت بتانا۔"

نازو مجھ پر خفا ہونے لگی "کیا کہا ہے تم نے؟ ایسی کون سی خفیہ بات تھی؟ پہلے تم اور محسن فائدہ اٹھاتے تھے۔"

غالب نے کہا "ہاں۔ اب یہ ڈاکٹر شیلی آگئی ہیں۔ نازو! کیوں نہ ہم بھی فرنچ سیکھ لیں؟"

میں نے کہا "میں صرف یہ بتا رہا تھا کہ صبح' دوپہر' شام تین وقت لڑنا ڈاکٹر نے نسخے میں لکھا تھا۔"

نازو نے شیلی کی طرف دیکھا "یہی کہا تھا سکندر نے؟"

شیلی نے نفی میں سرہلایا تو میرا دل ڈوبنے لگا۔ اُلو کی پٹھی۔ سمجھتی کیوں نہیں کہ میں فرنچ استعمال کرنے پر مجبور تھا۔

شیلی نے کہا "اس نے کہا تھا کہ یہ لڑتے نہیں' محبت کرتے ہیں یار۔"

میں نے سکون کا سانس لیا اور شکر گزار نظروں سے شیلی کو دیکھا۔ اس نے بڑی خوب صورتی سے میری بات کا بھرم رکھ لیا تھا۔ اس بات سے نازو کی ساری خفگی اچانک شوخ ہنسی میں ڈھل گئی تھی۔

"سکندر! کیا میں اسپتال جاسکتی ہوں؟" شیلی نے کچھ دیر بعد اچانک کہا "یار میں نقوی صاحب کو دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"تم... مگر کیوں... اور یہ ہے بھی بہت مشکل" میں نے کہا۔

"ہاں۔ انتہائی نگہداشت کے شعبے میں ہر ایک کو جانے کی اجازت نہیں ہوتی" غالب نے میری تائید کی۔

"میں ہر ایک نہیں ہوں' ڈاکٹر ہوں۔" شیلی نے کہا "اور میں عام ڈاکٹر بھی نہیں ہوں۔ مجھے کون روک سکتا ہے یار۔"

"بے وقوفی کی بات مت کرو۔ جو ڈاکٹر ان کے علاج پر مامور ہیں' وہی اندر جاسکتے ہیں۔ وہ تمہیں دخل در معقولات کی اجازت نہیں دیں گے۔"

"میں ڈاکٹرز سے بات کرلوں گی۔" وہ اڑ گئی "وہ مجھے نہیں ٹال سکتے۔ میں بتا دوں گی کہ میں لندن سے کوالیفائڈ ہوں اور نیورولوجسٹ ہوں یار۔"

"یہ نیورولوجی کا کیس نہیں ہے۔"

"نہ ہو۔ وہ مجھے کیس اسٹڈی کرنے سے منع نہیں کریں گے یار۔ زہر عموماً دماغ کو اور اعصابی نظام کو مفلوج کرتے ہیں۔"

غالب نے کہا "یار سکندر! کیا حرج ہے اگر ڈاکٹر شیلی کو وہاں پہنچا دیا جائے۔ شاید کوئی ایسی بات معلوم ہوجائے......"

میں نے کہا "غالب! کوئی مصیبت نہ کھڑی ہوجائے۔"

شیلی نے کہا "یار! میں چیک کروں گی کہ رپورٹس صحیح ہیں یا نہیں اور علاج رپورٹس کے مطابق ہو رہا ہے یا نہیں؟"

"تم کون ہوتی ہو یہ چیک کرنے والی؟"

غالب نے کہا "فرض کردیار' یہ نقوی صاحب کی بہن بن کے پہنچ جائیں۔"

"بہن بن کے۔ ناممکن؟"

"ہاں۔ یہ کہہ سکتی ہیں کہ میں تو بھائی کی بیماری کا سن کے لندن سے آئی ہوں۔ ان کا پاسپورٹ اس کا ثبوت ہوگا۔ یہ لندن کے کسی اسپتال میں تھیں۔ اس کے حوالے بھی کام آئیں گے اور ان کا ایک طرح سے قانونی حق بھی بن جائے گا اور اخلاقی بھی۔"

"یار' خدا کے لیے سوچو' وہاں اور لوگ بھی ہوں گے جو ہمارے اور ان کے مشترکہ دشمن ہیں" میں نے کہا۔

"یار' مجھے کوئی نہیں پہچانتا۔ بس کوئی مجھے سیدھا آئی سی یو تک لے جائے۔ اس سے پہلے کہ کسی کو کچھ پتا چلے' میں ڈاکٹروں سے بات کرکے اور نقوی صاحب کو دیکھ کے نکل آؤں گی۔"

نازو نے کہا "انہیں وقار یوسف کی بیوی لے جاسکتی ہے اپنے ساتھ۔"

میری مخالفت رائیگاں گئی۔ شیلی کو غالب کے ساتھ اب نازو کی حمایت بھی حاصل ہوگئی تھی۔ غالب نے اسی وقت فون کیا اور وقار یوسف کو بتا دیا کہ ہم ان کی طرف آرہے ہیں۔ وقار یوسف کی

کار یں دیں موجود تھی اور شاید ہمارے استعمال کے لیے ہی چھوڑی گئی تھی۔ نقوی صاحب کے گھر میں اس سے کئی گنا قیمتی دو کاریں تھیں۔ ان کاروں میں شان و شوکت کے ساتھ سر پر غرور اٹھا کے بیٹھنے والا اسپتال کے بیڈ پر کوما میں پڑا ہوا تھا۔

نازو پر شبلی نے نہ جانے کیا منتر پھونکا تھا کہ اس کے جذبات کا رخ ہی بدل گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ رابعہ کی حمایت میں وہ غالب سے بڑھ کر شبلی کی مخالفت کرے گی لیکن وہ تو بالکل ایک جان دو قالب ہو رہی تھیں۔ وقار یوسف نے شبلی کا استقبال قدرے سرد مہری سے کیا اور اس کی بیوی نے بے رخی سے مگر پھر دیکھتے ہی دیکھتے شبلی نے اسے بھی ہمنوا بنا لیا۔

وقار یوسف کی بیوی نے حیرانی سے کہا "تم دیکھو گی پاپا کو؟"

نازو نے کہا "ارے یہ بڑی توپ ڈاکٹر ہیں۔ ولایت کی ڈگری ہے۔"

وقار یوسف کی بیوی کا چہرہ پر امید ہو گیا "اچھا.... یہ تو بڑا اچھا ہوا کہ تم آ گئیں۔ تم کچھ کر سکتی ہو؟"

میں نے کہا "جو کچھ ڈاکٹر کر رہے ہیں پہلے ہی..."

نازو نے میری بات کاٹ دی "ہمیں تو معلوم نہیں نا کہ وہ کیا کر رہے ہیں اور وہ بتاتے کبھی نہیں۔"

"مجھے اطمینان ہو جائے گا۔ ڈاکٹر شبلی! چلو میرے ساتھ۔ میں لے کر چلتی ہوں تمہیں" وقار یوسف کی بیوی نے بے چینی سے کہا۔

وقار یوسف نے اسے ٹوکا "بھئی ایسے نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر تو بہت ہیں لیکن جس کا کیس ہو' علاج اسی کا چلتا ہے۔"

"یار' میں علاج میں دخل نہیں دوں گی۔ میں تو بس دیکھوں گی کہ کیا حالت ہے ان کی؟"

نازو نے کہا "تجویز یہ ہے کہ انہیں نقوی صاحب کی بہن بنا دیا جائے۔ کہا جائے کہ یہ بیماری کا حال معلوم ہوتے ہی لندن سے آئی ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ بڑی وزنی دلیل ہو گی۔"

اب وقار یوسف بھی مجبور ہو گیا۔ "اوکے۔ میں تمہیں لے چلتا ہوں۔ تمہارے پاس تو کچھ نہیں ہے ڈاکٹر شبلی۔ اسٹیتھسکوپ وغیرہ جس سے تم ڈاکٹر نظر آؤ۔"

وہ ہنس پڑی "کیسی باتیں کرتے ہو یار۔ ڈگری دیکھیں گے وہ میری تو میں ڈگری دکھا دوں گی۔ پاسپورٹ ہے میرا۔ اور جو کچھ ہے' وہ تو یہاں ہے" اس نے اپنے سر پر انگلی رکھی "دو منٹ میں معلوم ہو جاتا ہے کہ کون کتنا بڑا ڈاکٹر ہے۔"

وقار یوسف شرمندہ ہو گیا۔ میں نے اور غالب نے عمداً ان کے ساتھ جانے پر اصرار نہیں کیا۔ وقار یوسف جانتا تھا کہ خطرہ تو شبلی کے لیے بھی ہے مگر نسبتاً کم۔ آئی سی یو کے ڈاکٹر یقیناً اسے چوہدری دلاور کی بہن کی حیثیت سے شناخت نہیں کر سکتے تھے اور نہ اسپتال کے اندر ان کی بدمعاشی چل سکتی تھی۔ میں نے وقار یوسف کو سمجھا دیا کہ وہ اپنی بیوی کو اور ڈاکٹر شبلی کو عین آئی سی یو کے سامنے ڈراپ کرے اور انہیں وہیں سے سیدھا گھر لے آئے۔

شبلی نے مجھے تسلی دی "فکر مت کرو۔ میں جانتی ہوں کہ اس میں کتنا رسک ہے لیکن میں انہیں چکر دے سکتی ہوں یار۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم تمہاری بحفاظت واپسی کے لیے دعا کریں گے" میں نے کہا۔

اس گھر میں اب میں اور غالب ہی رہ گئے تھے۔ اگر میرے مقدمات کی فائلیں اسی گھر میں کہیں موجود تھیں تو ہم آسانی سے تلاش کر سکتے تھے۔ ہمارے پاس وقت بھی کم نہیں تھا اور نہ کوئی ہمیں روکنے والا تھا۔ گھر کے ملازم اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ نقوی صاحب کی بیمار اور مفلوج بیوی کا وجود نہ ہونے کے برابر تھا اور اس وقت میاں بیوی کی ایک ہی کیفیت تھی۔ وہ اس دنیا میں تھے' اس دنیا کو دیکھ سکتے تھے' اس دنیا کی آوازوں کو سن سکتے تھے اور وہ سب محسوس کر سکتے تھے جو ان کے گرد و پیش کا حصہ تھا لیکن وہ زندہ انسانوں کی جدوجہد حیات اور تگ و دو میں شامل نہیں تھے۔

گھر کے اندر ملازمین کی تعداد چار تھی۔ ان میں سے ایک تو پرانے' عمر رسیدہ خانساماں اور اس کی بیوی تھے جو اولاد کے ہوتے ہوئے بھی بے اولاد تھے۔ نہ جانے یہ ان کے اعمال کی سزا تھی یا ان کی آزمائش کہ اولاد نے انہیں تمام عمر کے حق خدمت کا معاوضہ بڑھاپے میں سکھ پہنچا کے ادا نہیں کیا تھا۔ ان کے علاوہ ایک مالی تھا اور ایک شوفر جو سرکاری طور پر مہیا کیے گئے تھے چنانچہ گھر کے باہر ہی رہتے تھے اور باہر کے سرونٹ کوارٹر میں رہتے تھے۔

غالب کی سوچ بھی میرے خیالات کا عکس تھی "یہ اچھا موقع ہے" میں نے سرہلایا "آغاز کہاں سے کریں؟"

"فائلیں کچن میں تو ہوں گی نہیں۔ نقوی صاحب کی اسٹڈی میں ہی ان کا آفس بھی ہو گا جہاں وہ آفس کا کام بھی کر لیتے ہوں گے۔"

میں نے اور غالب نے اطمینان سے گھر کے اندر کا جائزہ لینا شروع کیا۔ گھر میں تین بیڈ روم تھے۔ پہلا شاید ... نقوی صاحب اور ان کی بیگم کے زیر استعمال ہو گا۔ اب ازدواجی تعلقات محض وضع داری کی زنجیر گرانبار تھی جو صرف رشتہ حیات کے منقطع ہونے سے ٹوٹ سکتی تھی۔ وہ جو زندگی کی گاڑی کے دو پہیے تھے' اب ایک مجبوری کے بوجھ کو گھسیٹ کر اس مقام تک لے آئے تھے جہاں ایک کو دوسرے کی طرف دیکھنے کی نہ فرصت تھی نہ ضرورت اور اب تو ان کے درمیان فاصلے اتنے بڑھ چکے تھے کہ وہ ایک دوسرے کے وجود سے بھی بے نیاز و بے خبر تھے۔ بیوی کے ساتھ خادمہ رہتی تھی جو رات کو بھی انہیں مقررہ وقت پر پانی پلا دیتی تھی یا دوا دے دیتی تھی۔ نقوی صاحب کے زیر استعمال دوسرا بیڈ روم ... روم تھا جہاں وہ اپنی تنہائی کی الگ دنیا بسائے صرف ہوم سیکریٹری بننے کے لیے جی رہے تھے ورنہ شاید ان کی زندگی کی ہر خواہش پوری ہو چکی تھی۔ تیسرا بیڈ روم بند تھا۔ یہ شاید پہلے وقار یوسف کی بیوی کے لیے مخصوص ہو گا۔

سامنے پورچ میں ڈرائنگ روم کا ایک دروازہ کھلتا تھا اور اس وسیع ڈرائنگ روم کے پچھلے حصے میں ایک پردے کے پیچھے باتھ روم تھا تو دوسرے کے پیچھے ان کا آفس یا مطالعے کا کمرا تھا۔ مہمان باہر سے ہی ڈرائنگ روم میں لائے جاتے تھے اور نقوی صاحب پردہ ہٹا کے اپنے آفس سے طلوع ہوتے تھے۔

آفس بارہ بائی چودہ فٹ کا کمرا تھا جس کے دائیں ہاتھ پر برمائیک کی میز تھی اور اس کے پیچھے لیدر سیٹ والی کرسی۔ میز پر دونوں جانب لیمپ تھے اور عین اوپر شیڈ والی ڈبل ٹیوب لائٹس تھیں۔ میز کے تین طرف شیشے کی سلائڈنگ ڈور والی کتابوں کی الماریاں کتابوں سے بھری ہوئی تھیں اور انہیں دیکھ کے نقوی صاحب کے مطالعے کی وسعت کا اندازہ ہوتا تھا۔ وہ سب ہسٹری اور پولیٹیکل فلاسفی پر جدید اور قدیم اسکالرز کی ریسرچ تھی۔ ہم جیسے شعر و شاعری یا ناول افسانے کا ادبی ذوق رکھنے والوں کے لیے وہ بہت ثقیل اور غیر دلچسپ کتابیں تھیں۔

ان کی کرسی کے عین سامنے یعنی چوتھی دیوار کے ساتھ ایک صوفہ سیٹ ان ملاقاتیوں کے لئے تھا جو دفتر کے بعد دفتری امور اور مسائل لے کر حاضر ہوتے تھے۔ سرکار کے قواعد و ضوابط کے مطابق ہونے والے کام تو دفتری اوقات میں بھی ... جا سکتے تھے مگر ... معاملہ قواعد و ضوابط میں لچک پیدا کرنے اور خصوصی صوابدیدی اختیارات کے تحت رعایت دینے کا ہو' وہاں دفتری فضا سازگار نہیں رہتی۔ آپس کی بات ایسے ہی گوشۂ خلوت میں بگڑنے نہیں پاتی اور کچھ لو اور کچھ دو کے اصول پر بن جاتی ہے۔

میل کے اوپر چند فائلیں دفتر کی تھیں۔ سماجی بہبود کے ایک ادارے کی خفیہ سرگرمیوں کے بارے میں خفیہ پولیس کی رپورٹ۔ ایک قبائلی علاقے میں امن و امان کی صورت حال کے بارے میں ڈی سی کی تجاویز۔ پولیس کے چند نیک نام افسران کی پوسٹنگ' وغیرہ وغیرہ۔ میں نے چند صفحات کے نوٹ پڑھ کے فائلوں کے مندرجات کا اندازہ کر لیا۔

غالب نے دائیں طرف کی درازوں کو دیکھا۔ ان میں نوٹ بکس' ڈائریاں اور "سمری شیٹس" SUMMARY SHEETS تھیں جو ادھر ادھر سے موصول ہوئی تھیں۔ بائیں طرف الماری جیسے خانے میں تالا تھا۔ غالب نے ایک کاغذ کاٹنے والے نوکدار چاقو کی مدد سے تالا کھولنے کی ناکام کوشش کی۔ کنڈی توڑنے کی کوشش میں نازک سے چاقو کا دستہ ٹوٹ گیا۔

آفس میں چھینی ہتھوڑی یا لوہے کی سلاخ جیسی کوئی چیز نہیں تھی۔ پیپر ویٹ واحد بھاری چیز تھی جس سے شاید کسی کے سر میں گومڑ تو پیدا کیا جا سکتا تھا مگر وہ تالا نہیں توڑا جا سکتا تھا۔ غالب نے اس مسئلے کو بزور شمشیر حل کیا۔ وہ ڈرائنگ روم میں گیا اور ایک تلوار لے آیا۔ کراس کی شکل میں یہ خنجر نما پیتل کی تلواریں ایک دیوار کی آرائش کا حصہ تھیں۔ تلوار سے شاید آج تک کسی چور نے بھی تالا نہیں توڑا ہو گا۔ یہ تاریخی کارنامہ غالب نے سرانجام دیا۔

اس خانے میں نیچے سے اوپر تک فائلیں بھری ہوئی تھیں۔ مجھے شک تھا کہ آفس میں سے سنائی دینے والی آوازیں کہیں خادمہ کو یا اس کے خانساماں شوہر کو متوجہ نہ کر لیں۔ وہ ہمیں روک تو نہیں سکتے تھے لیکن نقوی صاحب کے آفس میں ہماری سرگرمی انہیں شک میں مبتلا کر دیتی جہاں ان کے ہوتے پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا بلکہ چیونٹی تک ٹانگ نہیں رکھ سکتی تھی۔

میں نے دروازے کو بند کر کے اندر سے چٹخنی لگا دی۔ اب میں نے اور غالب نے آمنے سامنے بیٹھ کے ایک ایک فائل کا یوں مطالعہ شروع کیا جیسے ان پر ہمیں احکامات صادر فرمانے ہیں۔ یہ ٹاپ سیکرٹ فائلیں تھیں جن پر لال رنگ کے کراس اور اسٹار نمایاں تھے۔ یہ سب انتہائی حساس نوعیت کے ایسے معاملات تھے جن کے بارے میں عام طور پر سرکاری موقف یہ رہتا ہے کہ ان کا تعلق براہ راست قومی سلامتی سے ہے اور خدانخواستہ انشائے راز ہوا تو اسی دن ملک اور قوم کا نام و نشان مٹ جائے گا۔ بات اگر رائی کے برابر ہو تو بیورو کریسی اسے پہاڑ بنا کے پیش کر... طولی رکھتی ہے۔ کون شرپسند ہے' کون تخریب کار یا علیحدگی... دشمن کے ہاتھوں میں کھیل رہا ہے اور کون سرکار... اقتدار کی کرسی کے لیے خطرہ ہے۔ یہ ساری رپورٹس ایسے ہی افراد اور اداروں یا جماعتوں کے بارے میں تھیں۔ اور ظاہر ہے غلط تھیں لیکن مستند تھا ان کا فرمایا ہوا۔

"یہ معلومات اخبار والوں کو مل جائیں تو ہو جائے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی" غالب نے کہا۔

"دودھ کہاں... صرف پانی ہو گا ڈوب مرنے کے لیے" میں نے کہا۔

"حد ہے غلط بینی' غلط فہمی اور غلط بیانی کی" غالب بولا "ملک خطرے میں ہے' اسلام خطرے میں ہے۔ امن و امان خطرے میں ہے' اصل خطرہ نظر آتا نہیں یا کسی کو دیکھنے نہیں دیتے۔ بے بنیاد خطرات کا طومار ہے۔"

میں نے فائلیں سمیٹ کے کہا "ان میں تو اس ناچیز کے سوا ہر اہم سیاسی شخصیت کے بارے میں کچھ نہ کچھ فرمایا گیا ہے۔"

"یہ شکر کا مقام ہے کہ سانحہ مشرقی پاکستان کے ذمے داروں میں آپ کا اور میرا یا ایم آر ایس کا نام ابھی تک نہیں آیا" غالب نے کہا۔

"نقوی صاحب نہ رہے تو آ جائے گا۔ ہمارے ... نے

اپنے مہرے کو آگے بڑھادیا تو ثابت کردیا جائے گا کہ ایم آر ایس کو یہودی لابی' کے جی بی یا را کی امداد و حمایت حاصل تھی۔" میں نے کہا "اب کیا کریں؟"

غالب نے ساری فائلوں کو پھر اسی ترتیب سے دراز میں رکھ دیا جیسے وہ پہلے رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے مجھے بھی تاکید کی کہ جس چیز کو ہاتھ لگاؤ اسے بعد میں کپڑے سے ضرور صاف کرتے جاؤ۔

"ہم احتیاط نہیں کرتے۔ ہر جگہ فنگر پرنٹ چھوڑدیتے ہیں۔ اس امید میں کہ یہاں کون دیکھتا ہے لیکن بعض معاملات میں دیکھنے والوں کو سب نظر آجاتا ہے۔ جو ہے وہ بھی' جو نہ ہو وہ بھی" غالب نے کہا۔

"یہ میرے سوال کا جواب نہیں تھا" میں نے کہا۔

"ان الماریوں میں تو بڑی دہشت زدہ کردینے والی کتابیں ہیں۔ فائلوں کا کوئی خانہ نظر نہیں آتا۔ خفیہ خانے کے امکان کو میں مسترد نہیں کرتا مگر اسے تلاش کرنا صرف شرلاک ہومز کے لیے ممکن ہے۔"

"تم کہو تو اسے بلوالیں۔ میرا مطلب ہے' اس کی روح آجائے ہماری رہنمائی کے لیے۔"

"ہم اب رخ کرتے ہیں نقوی صاحب کے بیڈ روم کا۔ دوسری جگہ وہی ہوسکتی ہے۔ بلحاظِ اہمیت" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "اگر میں نقوی صاحب کی جگہ ہوتا تو ایسی خفیہ فائل باتھ روم کے فلش ٹینک کو خالی کرکے اندر رکھتا۔"

"یہاں تو ساری فائلیں ایسی ہیں۔ اور نقوی صاحب نے کبھی خطرہ محسوس نہیں کیا ہوگا کہ کوئی فائل چوری بھی ہوسکتی ہے ورنہ گھر میں اسٹرانگ روم بنوانا کیا مشکل تھا۔"

نقوی صاحب کا بیڈ روم بھی مقفل تھا مگر ڈور لاک کھولنے میں غالب کی مہارت نے یہاں کوئی مشکل پیدا نہیں ہونے دی۔ اندر داخل ہونے کے بعد ہمیں اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ یہ ان کی بیٹی کا بیڈ روم تھا اور ایک باپ کے لیے اس کے بچپن کی یادوں کا میوزیم۔ نقوی صاحب نے اس کی ہر چیز کو بڑی احتیاط اور قرینے سے کمرے میں جمع کردیا تھا۔ دیواریں اس کی تصاویر کے فریم سے چھپ گئی تھیں۔ پہلی تصویر وہ تھی جس میں نقوی صاحب کی بیگم کسی اسپتال کے بیڈ پر دراز تھیں اور ساتھ چھوٹے سے پیڈ پر نوزائیدہ بیٹی آنکھیں بند کئے پڑی تھی۔ نقوی صاحب اس کے اوپر جھکے ہوئے حیرت' مسرت اور فخر کے جذبات سے معمور مسکراہٹ کے ساتھ اپنی تخلیق کے شہکار کو دیکھ رہے تھے۔ ان کی بیوی جو اس زمانے میں حیرت انگیز طور پر حسین تھیں' آنکھیں بند کئے مسکرا رہی تھیں۔

بعد کی تصویریں زمانۂ شیر خواری سے اسکول اور کالج کے ہر دور کی عکاسی کرتی تھیں۔ اس کی ہر سالگرہ کی رنگین تصویر الگ فریم میں تھی اور چند فریم ایسے تھے جن میں آٹھ آٹھ دس دس تصاویر تھیں۔ وادیٔ کاغان اور سوات کے پس منظر میں۔ کالج کے اندر اور کانووکیشن کے موقعے کی۔ فینسی ڈریس شو میں۔ یہ سب ایک ہی جذبے کے عکس تھے۔ یہ اولاد سے محبت کا نور تھا جس کی کرنوں کے ہزار رنگ تھے اور ایک باپ کے بیٹی سے پیار کا وہ گلستاں تھا جس میں ہر پھول کی خوشبو جُدا تھی۔

چاروں دیواروں کے ساتھ فرش پر شوکیس ان کھلونوں سے بھرے ہوئے تھے جن سے نقوی صاحب کی بیٹی کھیلتی رہی تھی۔ درجنوں گڑیوں سے لے کر ہر قسم کے چابی والے جانوروں تک۔ کاریں' ہوائی جہاز اور ہیلی کوپٹر۔ ریل گاڑیاں اور کشتیاں۔ اون کے بنے ہوئے بھالو اور خرگوش۔ وہ کپڑے جو نقوی صاحب کی بیٹی نے چار سال کی عمر سے جوان ہونے تک پہنے۔ ان کا ایک ایک یادگار نمونہ وہاں موجود تھا۔ اس کے اسکول کی یونیفارم۔ کالج میں جیتے ہوئے کپ۔ ٹیبل ٹینس کے ریکٹ۔ اس کی کتابیں اور قلم۔ کیا تھا جو وہاں نہیں تھا۔ اس کا بستر ویسے ہی بچھا ہوا تھا جیسے وہ چھوڑ گئی تھی۔ انتہا یہ تھی کہ ایک شوکیس میں مختلف اقسام کی دودھ پلانے والی بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔

ان سب چیزوں سے دو باتیں ثابت ہوتی تھیں۔ ایک یہ کہ نقوی صاحب ہر چیز کو سنبھال کے رکھنے کے عادی تھے اور دوسری یہ کہ وہ بیٹی کو پاگل پن کی حد تک چاہتے تھے۔ یقین نہیں آتا تھا کہ نقوی صاحب جیسا روکھا' آدم بیزار اور متکبر شخص کسی سے اتنا پیار بھی کرسکتا ہے۔ مگر یہ حقیقت تھی کہ بیٹی ان کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔ ایسی ہی بیٹی انہیں مجبور کرسکتی تھی کہ وہ قانون اور غیر قانونی کسی بھی فیصلے کو اس کی خواہش پر بدل دیں۔

میری طرح غالب بھی دم بخود کھڑا تھا اور کچھ رنجیدہ بھی۔ اس بیٹی نے نقوی صاحب کی توقعات پر پورا نہ اتر کے انہیں شدید جذباتی صدمے سے دوچار کیا تھا۔ وقار یوسف ہر لحاظ سے بہترین انسان اور مثالی شوہر تھا مگر اس کا کیا علاج کہ وہ نقوی صاحب کے معیار STATUS پر پورا نہیں اترتا تھا۔ معلوم نہیں انہوں نے بیٹی کے لیے کیا سوچا ہوگا۔ نیلے گھوڑے پر سوار ہوکے چاند نگر کے شہزادے تو اب نہیں آتے مگر انہیں فارن سروس میں کوالیفائی کرنے والا' کسی مغربی ملک کے سفارت خانے میں فرسٹ سیکریٹری کے عہدے پر فائز۔ کوئی ڈپٹی کمشنر۔ کسی ملٹی نیشنل کمپنی کا بزنس ایگزیکٹیو۔ ملک کے امیر ترین بائیس خاندانوں کا کوئی باہر کا تعلیم یافتہ خوبرو نوجوان۔ سب انہیں مل سکتے تھے مگر بیٹی نے پسند کسے کیا؟ ایک معمولی وکیل کو جس کا سارا اثاثہ تھا اس کی شرافت اور محبت۔ مائی فٹ۔ یہ دو کوڑی کے لوگ اپنے احساس کمتری کو کیسے چھپاتے ہیں۔ ملمع چڑھانے سے کیا پیتل کبھی سونا ہوسکتا ہے۔

غالب نے کہا "آؤ یار' چلیں..."

میں نے ایک آہ بھری۔ "اب میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو۔ بے چارے کوے میں پڑے ہوئے زیڈ یو نقوی ایڈیشنل

ہوم سیکریٹری..."

غالب نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا "تقدیر آدمی کو کیسے تماشائے عبرت بنادیتی ہے۔ اپنی ساری دولت اور طاقت کے باوجود اسے پیار نہیں ملتا۔ پیار کے سمندر سے شبنم تک نہیں ملتی۔"

نقوی صاحب کے بیڈ روم کا نقشہ بالکل مختلف تھا۔ ہم نے الماریوں میں جھانکا مگر ان میں سوٹ ہی سوٹ لٹکے ہوئے تھے۔ ڈریسنگ ٹیبل کی درازوں میں بنیان اور موزے بھرے ہوئے تھے۔ کتابیں یہاں بھی تھیں لیکن وہ نہیں جو اسٹڈی کی شیشے والی الماریوں میں قید تھیں۔ یہاں عام قسم کے سستے جاسوسی ناول تھے۔ ابنِ صفی اور اکرم الہ آبادی کے علاوہ نسیم حجازی کے اور ایم اسلم کے ناول تھے۔

غالب نے افسوس سے سر ہلایا "کیسی نقاب دار شخصیت تھی نقوی صاحب کی۔ ہیں کو اکب کچھ' نظر آتے ہیں کچھ۔ کی عملی تفسیر۔ وہ اندر سے کھوکھلے تھے۔ اسٹڈی میں مرعوب کرنے والی کتابیں تھیں جن سے لوگوں پر ان کی علمیت کا رعب پڑے۔ شاید زندگی میں کبھی انہوں نے کوئی کتاب کھول کے نہیں دیکھی ہوگی۔"

غالب نے اچانک کہا "یار' تم برا نہ مانو تو ایک بات کہوں؟ بہت دیر سے میرے دل میں کانٹے کی طرح کھٹک رہی ہے۔"

"نازو کے سامنے سچ بولنے سے ڈرتے تھے۔ اب میرے سامنے بھی تکلف..."

"تکلف کی نہیں' تکلیف کی بات ہے۔ تمہارے جذبات نے کچھ کہنے نہ دیا تھا مگر اب کہنا ضروری ہوگیا ہے۔ یہ لڑکی' ڈاکٹر شیلا خان یا غزالہ سہگل۔ مجھے اس کے ڈاکٹر ہونے میں شک ہے۔"

"تمہیں تو ہر بات میں شک ہے۔"

"ہاں ہے۔ مجھے شک ہے کہ وہ کچھ بھی نہیں۔ نہ وہ دلاور کی سوتیلی بہن ہے' نہ ہماری ہمدرد۔ اس کی شخصیت کچھ مصنوعی ہے۔ میں کیا بتاؤں..."

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ جو حقیقت ہوگی سامنے آجائے گی" میں نے کہا "میری آنکھیں' میرے کان سب کھلے ہیں اور میری عقل پر جذبات کا پردہ بھی نہیں پڑا ہے۔ میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم نہیں ہوا۔ میں معلوم کرلوں گا۔"

"کیسے معلوم کروگے؟ اس کے ساتھ جاکے..... فرض کرو..."

"فرض بہت کچھ کیا جاسکتا ہے۔ ابھی تک ثابت کچھ نہیں ہوا۔"

غالب نے کہا "رات کار کے حادثے میں کوئی مرا یا زخمی ہوا تھا؟"

"میں کیا بتاؤں؟"

"شیلی کے بیان کے مطابق تعاقب کرنے والا استاد پیڈرو تھا اور اس کے ساتھ تین افراد تھے" غالب نے کہا "یہی بات ہے نا؟"

"ہاں۔ اس کا بیان کردہ حُلیہ سو فیصد استاد پیڈرو کا نقشہ تھا۔"

"مگر استاد پیڈرو کو میں نے اور نازو نے کہیں اور دیکھا تھا۔ عین اسی وقت جب وہ گاڑی میں تمہارا تعاقب کررہا تھا" غالب نے کہا۔

"تمہیں دھوکا ہوا ہوگا۔"

"مجھے بھی اور نازو کو بھی؟ صرف تم نے جو اندازہ کیا' وہ درست تھا' ہم نے جو دیکھا وہ بھی غلط۔ تم نے جو نہیں دیکھا' وہ صحیح" غالب نے برہمی سے کہا۔

"اچھا یار! فرض کرلو کہ وہ کوئی اور تھا۔ میں نے غلط سمجھا تھا کہ ہمارا پیچھا استاد پیڈرو کررہا ہے" میں نے کہا۔

"سکندر صاحب! اکبر خان کو ہم نے چوہدری دلاور کا بھائی مان لیا تھا۔ کیا فرق ہے اکبر خان کی کہانی میں اور ڈاکٹر شیلی کی کہانی میں؟ واقعات اور کردار الگ ہیں مگر مقصد میں کوئی فرق نہیں۔ اکبر خان نے بھی ہماری حمایت حاصل کرکے ہمیں نقصان پہنچایا تھا۔ شیلی نے بھی تمہاری ہمدردی حاصل کرلی ہے۔ یہ وہی چال ہوسکتا ہے سکندر۔ پہلے ایک مرد تھا' یہ ایک خوب صورت اور خطرناک عورت ہے۔ زیادہ ذہین اور زیادہ عیار۔"

میں نے کہا "مرزا غالب! کیا نقصان ہوا ہے ابھی تک شیلی کی ذات سے؟ میں دن رات اس کے ساتھ ہوں۔ ایسی کوئی بات ہوتی تو..."

اچانک ڈرائنگ روم میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے غالب کو باہر کھینچ لیا اور دروازہ بند کردیا۔ ریسیور غالباً خادمہ نے اٹھالیا تھا۔

"صاحب جی! آپ سے بی بی بات کریں گی" اس نے بڑی بدحواسی میں کہا "پتا نہیں کیا ہوگیا۔ رب خیر کرے۔"

میں نے کہا "روتی کیوں ہو۔ دعا کرو۔"

خادمہ نے زار و قطار رونا شروع کردیا "میں اب کیا دعا کروں..."

غالب ڈرائنگ روم میں چلّا رہا تھا "یہ کیا کہہ رہی ہو تم۔ وقار کہاں ہے۔ پولیس..... اچھا اچھا.... دیکھو خدا کے لیے حوصلے سے کام لو۔ منظر.... ہاں میں رابعہ کو بھی بتادیتا ہوں۔"

وہ دیوانوں کی طرح دروازے میں نمودار ہوا "دیکھا تم نے..." وہ چیخ کے بولا "تمہاری اس ڈاکٹر شیلی نے کیا کیا؟"

غالب کی صورت دیکھ کے میں ڈر گیا "کیا.... کیا ہوا؟"

"اس نے.... نقوی صاحب.... انہیں ماردیا.... اور خود بھی مرگئی..." غالب کے منہ سے مغلظات اُبلنے لگیں "اور یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا۔ تمہاری وجہ سے سکندر۔"

اس نے پاگلوں کی طرح میری گردن دبوچ لی اور مجھے زور زور سے جھٹکے دینے لگا۔ میں نے بوڑھی خادمہ کی طرف دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں نہ جانے کہاں سے ایک چھُری آگئی تھی اور وہ دیوانہ وار میری طرف بڑھ رہی تھی۔

غالب بھی کم مشتعل نہ تھا مگر اس نے خادمہ کے اور میرے درمیان حائل ہونے میں دیر نہیں لگائی۔ اس نے خادمہ کے ہاتھ سے چھری چھین لی اور اسے دھکیل کر کمرے سے نکال دیا مگر میں اپنی جگہ منجمد کھڑا رہا۔

یہ اطلاع اتنی پر وحشت، الم انگیز اور کربناک تھی کہ میرا پہلا فطری ردِ عمل بے یقینی کا تھا۔ میرے ذہن نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ غیر متوقع صدمے کی شدت میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ کسی محفل میں آپ کے ساتھ بیٹھ کے کسی لطیفے پر قہقہے لگانے والا اچانک خاموش ہو جائے اور اچانک آپ کو پتا چلے کہ وہ تو حرکتِ قلب بند ہو جانے سے مر چکا ہے تو آپ کے لئے اس حقیقت کو تسلیم کرنا اتنا ہی ناممکن ہوگا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اوہ نو۔ یہ نہیں ہو سکتا!

غالب نے سپاٹ نظروں سے مجھے دیکھا اور وہیں منجمد کھڑا رہا۔

"میں نے کہا۔ "غالب... یہ جھوٹ ہوگا۔ اس میں ضرور کوئی دھوکا ہے۔ میں کیسے مان لوں... یہ ہو سکتا ہے یار کہ کسی نے ہمیں ڈرانے کے لئے فون کیا ہو.... بے وقوف بنایا ہو۔ کیا تم یقین سے کہہ سکتے ہو کہ آواز اُسی کی تھی؟ وقار یوسف کی بیوی کی؟ ویسے بھی آج یکم اپریل ہے نا۔ اپریل فول...."

"آج مارچ کی اکتیس تاریخ ہے سکندر صاحب۔ اور تمہیں شک ہے کہ میرے کانوں نے غلط سُنا تھا یا میں نے وقار یوسف کی بیوی کی آواز نہیں پہچانی تھی۔ تو یہ رکھا ہے تمہارے سامنے ٹیلی فون۔ اسپتال کا نمبر لو اور کسی سے پوچھ لو۔ اگر تمہارے یقین نہ کرنے سے حقیقت بدل جائے تو کتنا اچھا ہو۔" اس کے لہجے میں زہر آلود خنجر کی کاٹ تھی۔

"سوری۔" میں نے محسوس کیا کہ شاید میرے لئے کھڑا رہنا بھی ممکن نہیں۔ "میں چاہتا تھا یار کہ یہ بات جھوٹ ثابت ہو جائے مگر یہ تو بہت بھیانک سچ ہے۔ میرے اعتبار کی شکست ہے..... میں کیا کروں۔"

غالب اس آزمائش کی گھڑی میں میرے ساتھ تھا۔ یہ میری خوش نصیبی تھی کہ وہ میری ذہنی کیفیت کو سمجھ رہا تھا اور ایک دوست کی حیثیت سے اس نے میرا حوصلہ بحال رکھنے اور مجھے ڈپریشن سے بچانے کے لئے اپنا سارا خلوص صرف کر دیا۔ نقوی صاحب کی موت طبعی تھی یا قتل۔ اس کے پس پردہ ذاتی دشمنی وجہ تھی یا سیاسی عوامل کار فرما تھے۔ یہ سب فوری توجہ طلب مسائل نہیں تھے۔ غالب کے لئے زیادہ اہم میری سلامتی تھی۔

"ہمیں فوراً یہاں سے نکل جانا چاہئے۔" غالب نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے باہر کھینچا۔ "ابھی کسی کو کچھ معلوم نہیں۔"

میں نے واجبی سی مزاحمت کی۔ "ایسے ہی بھاگ جائیں۔ کسی کو تو بتا کے چلو...."

غالب نے جھنجلا کے کہا۔ "اس وقت کون ہے یہاں؟ کسے بتائیں گے آپ اور کیا بتائیں گے۔ پولیس یہاں کسی وقت بھی پہنچ سکتی ہے۔"

غالب نے ٹھیک ہی سوچا تھا۔ نقوی صاحب کوئی عام آدمی نہیں تھے جس کا قتل بھی ہو جائے تو پولیس مقدمہ تک درج کرنے سے گریز کرتی ہے۔ خصوصاً اس وقت جب قانون کے ہاتھ لمبے ہوں اور ان کی رسائی اربابِ اختیار تک ہو۔ بے رسوخ اور بے نوا آدمی کا قتل اگر خودکشی نہ ثابت کیا جا سکے تو پھر اسے ہی پکڑ لیا جاتا ہے جس کے گلے میں پھندا فٹ آ جائے۔ قتل کو گھریلو ناچاقی یا خاندانی دشمنی کا شاخسانہ قرار دے کر انہی لواحقین اور پسماندگان کو سب سے پہلے شک ہی میں دھر لیا جاتا ہے جن کے لئے دنیا بھی بے دلی سے صبرِ جمیل کی دعا کرتی ہے۔

نقوی صاحب کا معاملہ مختلف تھا۔ وہ خاص آدمی تھے اور اسی محکمے کے بڑے توپ افسر تھے جو خود جرم و سزا کے معاملات کا براہ راست ذمے دار ہوتا ہے۔ ان کا قتل بھی عام قتل نہیں تھا۔ طے شدہ طور پر ان کے قاتل بھی عام قاتل نہیں ہو سکتے تھے۔ ترپ کے پتے کو بڑا ترپ کا پتا ہی کاٹتا ہے۔

میرے مقدمات کی فائلیں یہاں نہیں تھیں انہیں واپس متعلقہ عدالتی ریکارڈ میں پہنچا دیا گیا تھا یا پھر نقوی صاحب نے ان کو بحفاظت رکھنے کے لئے کسی ایسی جگہ کا انتخاب کیا تھا جہاں کسی کی آسانی سے رسائی ممکن نہ رہے۔ اگر وقت ملتا تو ہم خفیہ خانوں، الماریوں اور درازوں کو تلاش کرتے لیکن خطرے کی گھنٹی کسی ٹائم بم کے کلاک کی طرح مسلسل خبردار کر رہی تھی کہ گزرتے ہوئے ہر لمحے کے ساتھ ہماری گرفتاری کے امکانات بڑھتے جا رہے ہیں۔

میں نے غالب کے ساتھ باہر آتے ہوئے اس کمرے میں سے اپنی موجودگی کے سب آثار مٹا دیے اور ڈور لاک کو اندر سے دبا کر دروازہ بند کر دیا۔ اب کمرا مقفل ہو چکا تھا اور اسے صرف چابی کی مدد سے کھولا جا سکتا تھا۔

برآمدے میں پہنچ کر میں نے گیٹ کی طرف دیکھا۔ "حیرانی کی بات ہے یار کہ گیٹ پر کسی کا پہرا نہیں۔ کل تو تھا۔"

غالب نے سر ہلایا۔ "اصولاً تو یہاں پولیس کو بھی موجود ہونا چاہئے۔ سادہ کپڑوں میں انہیں آنے جانے والوں پر نظر رکھنی چاہئے۔"

گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے میں نے ادھر اُدھر دیکھا۔ "مجھے تو کوئی بھی نظر نہیں آ رہا ہے۔"

"بس اسے تائیدِ ایزدی سمجھتے ہوئے نکل چلو۔" غالب نے کہا۔

"میں نے کہا۔ "مرزا جی۔ کیا نقوی صاحب جیسے توپ افسر کے معاملے میں پولیس اتنی بڑی کوتاہی کی مرتکب ہو سکتی ہے۔ یہ سب مجھے سوچی سمجھی سازش لگتی ہے۔ میں نے تو سنا تھا کہ انہوں

نے گھر کے نوکروں کو گرفتار کر لیا تھا۔"

"پولیس کو شبہ تھا کہ زہر گھر کے ہی کسی فرد نے دیا ہوگا۔"

"پھر کوئی پکڑا کیوں نہیں گیا اور پکڑا گیا تھا تو اتنی جلدی آزاد کیسے ہوا؟" میں نے کہا۔

غالب سوچ میں پڑ گیا۔ "ممکن ہے نقوی صاحب کی بہن نے گھر کے نوکروں کو بچا لیا ہو کہ یہ تو پُرانے نمک خوار ہیں۔ اس کے علاوہ قتل کی ایک وجہ ہوتی ہے۔"

"بعض اوقات قتل کرنے والا اپنی مجبوری کو وجہ بنا لیتا ہے۔ سب سے بڑی مجبوری ہوتی ہے غربت۔ عام حالات میں غریب آدمی خوفِ خدا، ضمیر یا ایمان کے خیال سے گناہ اور جرم کی ترغیب کو قبول نہیں کرتا۔ چوری، ڈاکے یا قتل کا راستہ اختیار کر کے مالی مسائل حل کرنے اور معیارِ زندگی بہتر بنانے کے بارے میں نہیں سوچتا۔"

"سوچتا تو شاید ہوگا مگر سزا کے خوف سے مغلوب ہو کے لاحول پڑھتا ہوگا اور ایسے گمراہ کن شیطانی خیالات سے پیچھا چھڑاتا ہوگا۔"

میں نے کہا۔ "ہاں۔ اسے دل بہلانے کے لئے صبر و قناعت کا فلسفہ دے دیا گیا ہے اور یہ یقین دلا دیا گیا ہے کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ نوشتۂ تقدیر کا نظریہ بھی اسی کے لیے ہے۔ لیکن جب اس کی ماں کی زندگی محض دوا علاج کی استطاعت نہ ہونے کے باعث خطرے میں پڑتی ہے یا اس کا بچہ دودھ جیسی بنیادی ضرورت پوری نہ ہونے سے قریب المرگ ہوتا ہے تو غریب آدمی سب کچھ بھول جاتا ہے۔ اس کی مزاحمت بالکل ختم ہو جاتی ہے اور پھر وہ پیسہ حاصل کرنے کے لئے سب کچھ کرتا ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے گھر کے کسی نوکر کی ایسی ہی مجبوری کو خرید لیا گیا اور نقوی صاحب کو زہر اسی نے دیا تھا؟"

"اور کون کر سکتا تھا یہ کام۔ نقوی صاحب کی مفلوج بیوی؟ ان کی بیٹی؟"

"داماد کو شک سے مبرا قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بیوی کی جائیداد اور دولت کسے ملتی ہے؟ وقار یوسف بہت شریف اور خوددار شخص ہے لیکن اس سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ دولت مند نہیں ہے۔"

"وہ غریب بھی نہیں ہے اور بیوی اس کی خاطر باپ کا گھر چھوڑ آئی تھی۔ آج بھی اس کے شوہر پر کوئی انگلی اٹھائے تو وہ اپنے حقِ وراثت سے دستبرداری کا اعلان کر سکتی ہے۔ وقار یوسف کی پوزیشن بہت محفوظ ہے۔ میری مراد تھی ان نچلے درجے کے ملازموں سے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ ابھی تک پولیس نے عمداً تفتیش نہیں کی۔ شاید انہیں اوپر سے روک دیا گیا ہوگا۔ ورنہ یہ معلوم کرنا کیا مشکل تھا کہ کافی کس نے بنائی۔ کس نے جا کے دی۔ درمیان میں کون آیا، کون گیا۔ ظاہر ہے فرشتوں نے تو کافی میں زہر

نہیں ملا دیا تھا۔ گھر کے ملازمین میں سے دو پُرانے نمک خواروں کو خارج کر دیا جائے تو نئے عارضی ملازمین میں سے کسی پر شک کیا جا سکتا ہے۔ کس کے حالات ایسے تھے کہ معاوضے کے لالچ میں وہ یہ رکیک حرکت کر سکتا تھا۔ مجھے تو کہیں بھی تفتیش ہوتی دکھائی نہیں دیتی۔"

غالب نے کہا۔ "لیکن اب تفتیش ہوگی سکندر اور اس کے نتیجے میں جو حقائق سامنے آئیں گے وہ اس جرم میں پھر تمہاری شرکت اور معاونت ثابت کریں گے۔"

"صرف اس لئے کہ ڈاکٹر شیلی میرے ساتھ تھی۔"

"قاتل کا ساتھی کیا شریکِ جرم نہیں سمجھا جاتا؟ اور اب شیلی خود بھی زندہ نہیں تو تمہارے سوا کون پکڑا جائے گا؟"

"میں بھلا نقوی صاحب کے قتل کی سازش میں کیسے شریک ہو سکتا ہوں۔ زبردستی کی بات الگ ہے؟" میں نے برہمی سے کہا۔

"زبردستی کیسی۔ اس کی معقول وجہ بنتی ہے۔ تم چاہتے تھے کہ وہ تمہارے خلاف قانونی مقدمات ختم کرا دیں۔ وہ اس کے لئے تیار نہیں تھے اور اُلٹا تم پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ چوہدری دلاور سے صلح کرو۔ اس کی شرائط پر۔ تم خود ایک ایسی عورت کے ساتھ پھر رہے تھے جس کے بارے میں وثوق سے کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کون تھی۔ اس نے خود کو چوہدری دلاور کی سوتیلی بہن کہا۔ دلاور سے عداوت کا سبب بتانے کے لئے تمہیں ایک ایسی کہانی سنائی جو بہت زیادہ قابلِ یقین لگتی تھی کیوں کہ اس میں سارے حوالے معتبر تھے مگر کیا ابھی تک کسی حوالے کی تصدیق کی تم نے؟"

میں نے کہا۔ "تصدیق ہو جائے گی۔"

"کب ہو جائے گی؟" غالب نے بگڑ کر کہا۔ "اور اب کیا ہوگا، تصدیق سے بھی۔ میں شرط لگا سکتا ہوں سکندر کہ اس نے جو کچھ بتایا تھا وہ سب جھوٹ تھا۔ آج تک دلاور نے جتنی چالیں چلی ہیں۔ یہ ان میں سب سے زیادہ خطرناک چال تھی۔ اس نے پہلے اکبر خان کو بڑی ہوشیاری سے آگے بڑھایا تھا۔ اکبر خان پر اعتبار کر کے ہم نے یہ نقصان اٹھایا کہ پاگل قسم کے جاہل اور خطرناک مذہبی جنون میں مبتلا کیکروں کو اپنا جانی دشمن بنا لیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ پیر کیکر شاہ کے مرید اپنے مرشد کے حکم کو نعوذ باللہ خدا کے حکم سے بڑھ کر سمجھتے ہیں اور مشرک ہیں مگر حقیقت کون سمجھتا ہے۔ اکبر خان نے اپنی دولت کا جال بھی پھیلایا تھا مگر ہم بچ گئے۔ اکبر خان خود ہی پیچھے ہٹ گیا۔"

میں نے اعتراف کیا۔ "وہ بہت عیار اور چالاک آدمی تھا۔ اس کی کہانی بھی ایسی تھی کہ کہیں جھول محسوس نہیں ہوتا تھا۔"

"اور اب دلاور نے ایک ذہین اور حسین عورت کو استعمال کیا جس نے تمہاری ہی نہیں ہم سب کی عقل پر اعتبار کا ایسا پردہ ڈالا کہ کسی کی نظر نہ دیکھ سکی۔ مجھے بتاؤ کیا ثبوت ہے تمہارے پاس کہ اس کا نام وہی تھا جو اس نے بتایا تھا۔ تم نے نیپئر ہوٹل کے

رجسٹر میں اندراج دیکھا تھا؟"

میں نے نفی میں سرہلایا۔ "نہیں۔ یہ مشکل تھا۔"

"کبھی تم نے اس کا پاسپورٹ دیکھا تھا؟"

"نہیں۔"

"کبھی رفیق سے پوچھا تھا کہ وہ اس عورت کے بارے میں کیا جانتا ہے؟"

"نہیں۔ موقع ہی نہیں ملا....."

"ان سے معلوم کیا تھا جو کرائے کی گاڑی بھیجتے تھے؟"

"نہیں۔" میں نے خود کو پرلے درجے کا احمق محسوس کیا۔

"ایک آخری بات۔ کیا شیلی نے تمہارے سامنے لندن کے شیخ صاحب سے بات کی تھی؟"

"نہیں۔ اس نے باہر جا کے فون کیا تھا۔"

"تمہارے پاس فون نمبر یا پتا ہے شیخ صاحب کا؟ ہم ابھی معلوم کر لیتے ہیں۔"

میں نے افسوس سے سرہلایا۔ "ان کا تو نہیں لیکن جس اسپتال میں وہ کام کرتی تھی....."

"وہ سب جھوٹ ہوگا دوست۔ مجھ سے لکھوا لو۔ اس اسپتال میں غزالہ سیگل یا شیلی خان نام کی کوئی ڈاکٹر نہیں ہوگی۔ نہ کبھی رہی ہوگی۔ نہ تمہیں کوئی شیخ صاحب ملیں گے۔ یہ ایک دلچسپ کہانی تھی جو یقیناً بڑی محنت سے تخلیق کی گئی تھی۔ اس میں کمال تھا۔ دلاور کی ہدایت کاری کا جس نے واقعات کو انتہائی حقیقت پسندانہ تفصیلات کے ساتھ شامل کیا تھا۔ تم خود سوچو کہ کیا لندن کے کسی اسپتال میں کام کرنے والی نیورو فزیشن کسی انتقام کے اس فلمی چکر میں پڑ سکتی ہے؟ وہ صاحبِ جائیداد تھی۔ بقول اس کے سوا لاکھ پونڈ کا ترکہ تھا اس کا اور وہ خود چلی آئی یہاں اپنی ماں کے قاتل کو قتل کرنے کے لئے۔ پھر یہاں آ کے اس نے تمہارے ساتھ اشتراک کے منصوبے پر عمل کیا۔ اس نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ۔ میرا مطلب ہے حسن و شباب کی خوبصورتی سے تمہیں اعتماد میں لے لیا۔ تم نے مزاحمت ضرور کی لیکن اس کے بعد رابعہ کی معمولی سی بدگمانی نے تمہیں اس سے بدظن کر دیا اور شیلی نے غلط فہمی کو ہوا دے کر پورا فائدہ اُٹھایا۔ سوچو تم اس کے ساتھ کہاں نہیں گئے۔ تم نے کیا نہیں کیا۔ اسی شہر میں کتنے گواہ پیدا کر لئے تم نے۔ ہوٹل میں 'رینٹ اے کار' والے۔ وہ پولیس انسپکٹر جو شیلی کی دھمکی سے ڈر کے چلا گیا تھا۔ اس وقت تم رفیق کی لاش ڈکی میں ڈالے پھر رہے تھے۔ تم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ لاش وہیں چھوڑ کے جانے والے دلاور اینڈ کمپنی کے لوگ نہیں تھے اور یہ بات شیلی کو معلوم نہیں تھی؟ اس نے پوری طرح تمہیں اس جرم میں ملوث کر لیا۔"

میں نے اپنے دفاع کی کمزور سی کوشش کی۔ "یار وہ ہمارے تعاقب میں آئے تھے۔ ہم نے گاڑی گیراج میں چھپا دی تھی ورنہ....."

"سکندر میں نہیں مان سکتا کہ کسی کو گیراج میں کھڑی ہوئی گاڑی نظر نہ آئے۔ وہ شکاری کیا جو سارا جنگل چھان مارے اور اسے گھانس پھونس میں کھڑا ہوا ہاتھی نظر نہ آئے۔ انہوں نے ڈرامہ کیا تھا تلاش کا ورنہ تم چیونٹی بن کے بل میں گھس جاتے تب بھی وہ تمہارا سراغ لگا کے تمہیں برآمد کر لیتے۔ یہ بھی ڈرامہ تھا اور جو گزشتہ رات ہوا وہ بھی۔ کسی استاد پیڈرو نے تمہارا پیچھا کیا ہوتا تو تم اتنی آسانی سے بچ کے نہ نکل آتے۔"

"یہ تو معلوم ہو جائے گا۔ اگر وہ زخمی حالت میں ملا۔"

"ہاں۔ بالکل معلوم ہو جائے گا؟" غالب نے پورے یقین کے ساتھ کہا۔

ہم اس وقت تک مال روڈ کا کچھ حصہ پیدل طے کر چکے تھے۔ میرا ذہن خالی تھا۔ تصور کے پردے پر بہت سی پرچھائیاں تھیں۔ یہ سب شیلی کے ساتھ گزرے ہوئے وقت کی متحرک تصویریں تھیں۔ وہ شب بڑی دغا باز تھی جس نے مجھے اور شیلی کو رفاقت کا فریب دیا تھا۔ وہ میرے گھر میں میرے ساتھ تھی۔ نقوی صاحب کے گھر میں ساتھ تھی۔ وقار یوسف کے گھر میں ساتھ تھی۔ اگر وہ ڈرامہ تھا تو تعاقب کے اس کھیل میں بھی وہ میرے ساتھ تھی۔ جب میں جان بچا کے فرار ہوا۔ جب میں نے چوروں کی طرح دیواریں پھاندیں اور کسی کی سائیکل چرا کے میں نے اسے آگے بٹھایا تو خطرے کے اس کھیل میں بھی وہ میرے ساتھ تھی لیکن یہ ٹھیک ہے کہ وہ خوفزدہ نہیں تھی۔ شاید اسے معلوم تھا کہ یہ تو نا ٹک ہے۔ خطرے کا الارم ہے مگر خطرہ نہیں تھا۔ نہ ہے۔ وہ اسے ایڈونچر' ایکشن فلم کی طرح انجوائے کر رہی تھی۔ شامتِ اعمال کے بھی کتنے حسین روپ ہوتے ہیں۔ پُرکشش اور جان لیوا۔ موت کیسے کیسے بہروپ اختیار کرتی ہے۔ شاید سب سے خطرناک روپ میں وہ ایک عورت بن جاتی ہے۔ ادائے حسن اور معصومیت' نازو ادا کی سادگی و پرکاری اور شباب کی بے ضرر نظر آنے والی غارت گر قوت کے ساتھ اور ایک فطری جبلت کے ساتھ مرد ہی اس کا آسان شکار ہوتا ہے۔ تاریخ ایسی عورتوں کے کارناموں کے ذکر سے بھری پڑی ہے جنہوں نے اپنے حسن و شباب کی تابکاری سے زیادہ تباہی کی کیوں کہ قدرت نے انہیں چہرہ اور جسم ہی نہیں قابلِ رشک عقل و ذہانت بھی بخش دی تھی۔

میں یہ تصور کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ آخر شیلی نے کیسے نقوی صاحب تک رسائی حاصل کی ہوگی۔ آئی سی یو (I.C.U) میں پہنچ کے اس نے کیسے نقوی صاحب کو ہلاک کیا ہوگا۔ انتہائی نگہداشت کے یونٹ میں ہر وقت ڈاکٹر موجود ہوتے ہیں اور نرسیں سب دیکھتی رہتی ہیں۔ مریض کے سرہانے مانیٹر لگے ہوتے ہیں جو ہر سانس کی خبر دیتے ہیں۔ نبض کی' دل کی اور دورانِ خون کی کیفیت کو مسلسل ظاہر کرتے رہتے ہیں۔ آکسیجن کے ماسک اور اسٹینڈ میں اُلٹی لٹکی ہوئی خون یا گلوکوز کی تھیلیاں براہِ راست رگوں سے منسلک نظر آتی ہیں۔ انہی میں دوا بھی شامل کی جا سکتی ہے اور زہر بھی ڈالا جا سکتا ہے لیکن یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اسپتال کا عملہ غافل نہ ہو یا عمداً چشم پوشی نہ کرے جو بعید از امکان تھا۔

پھر کیا نقوی صاحب کو راستے سے ہٹانے والوں نے یہ بندوبست بھی کر لیا تھا کہ پہلی کوشش کی ناکامی کی صورت میں دوسری کوشش کو کامیاب کرانے کی ذمّے داری کس کی ہوگی۔ کیا شیلی کے پاس پہلے سے کوئی قاتل زہر موجود تھا یا زہر اسے اسپتال میں فراہم کیا گیا تھا؟ اگر وہ کامیاب ہو گئی تھی تو پھر اسے جان دینے کی کیا ضرورت تھی؟ ناکامی کی سزا کا خوف اسے خودکشی پر مجبور کر سکتا تھا مگر کامیابی کے بعد شیلی نے ایسا کیوں کیا؟ میں چلتے چلتے سوچتا گیا۔

شاید یہ خودکشی نہیں تھی۔ شیلی کو بھی قتل کیا گیا ہوگا۔ اس کے سپرد جو کام کئے گئے تھے وہ پورے ہو گئے تھے۔ اسے جو معاوضہ ادا کیا گیا ہوگا وہ یقیناً بہت بڑا ہوگا مگر اس کی ایک قسط واجب الادا ہوگی۔ اس بقیہ معاوضے کا نام موت تھا اور یہ بات شاید شیلی کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگی کہ وہ اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ سفاک اور عیار ہیں جو اس کی ذہانت اور اس کے حسن و شباب کے اسلحے کو استعمال کرنے کے لئے دولت کے انبار اُٹھا لائے ہیں۔ آلۂ قتل کتنا ہی قیمتی اور خوبصورت کیوں نہ ہو جب اس کے استعمال کا مقصد حاصل ہو جاتا ہے تو پھر اسے غائب کر دیا جاتا ہے۔

میرا تصور ناکام تھا۔ میں ہنستی' کھیلتی خوبصورت معصوم اور پُراعتماد شیلی کو ایک قاتل اور پھر مقتول کی حیثیت سے دیکھنے میں ناکام تھا۔ یہ تسلیم کرنے میں ناکام تھا کہ وہ دلاور اینڈ کمپنی کی آلۂ کار تھی اور اس نے جو کچھ مجھے بتایا تھا وہ جھوٹ کے سوا کچھ نہیں تھا۔ کچھ جھوٹ حقیقت کے کتنے قریب ہوتے ہیں اور کچھ سچ بالکل کھوکھلے۔

میں حالات اور واقعات کے اسباب کا اور نتائج کا تجزیہ کرنے میں ناکام تھا اور یہ سمجھنے میں ناکام تھا کہ آخر شیلی کے وجود اور عدم کے پیچھے اصل مقاصد کا تعین کس نے کیا تھا۔ کیا اسے تقدیر کا نام دیا جائے گا؟ اگر مجھے ہدف بنا کر شیلی کو تیر کی طرح چلانے والے شکاری تھے تو ان کے ہاتھوں میں کمان کس نے دی تھی۔ اگر نقوی صاحب پہلی کوشش میں ہی اللہ کو پیارے ہو جاتے تو شیلی کیا کرتی؟ اگر اس نے رفیق کے قتل میں مجھے ملوث کر دیا تھا۔ اگر غالب کے لگائے ہوئے سارے الزامات ٹھیک تھے تو پھر میں کیوں بچ گیا تھا اور شیلی کیوں ماری گئی تھی؟

ان گنت تصدیق طلب جھوٹ اور سچ کے انبار' مفروضات اور قیاس آرائیوں کے سلسلے چھوڑ کے شیلی مر گئی تھی۔ کسی شہاب کی طرح وہ میری زندگی کے افق پر نمودار ہوئی۔ پل بھر کے لئے اس نے اپنی خیرہ کن روشنی کی لکیر بنائی اور پھر خاکستر ہو کے تاریکی میں شامل ہو گئی۔ ہر شہابِ ثاقب کو انسان اپنے خیالات کے آئینے میں دیکھتا ہے۔ کچھ اسے منحوس قرار دیتے ہیں اور اس کے نحس اثرات سے ڈرتے ہیں۔ کچھ اس کے برعکس کہتے ہیں کہ جب تارا ٹوٹتا ہے تو اسے دیکھتے ہی مانگی جانے والی دعا قبول ہوتی ہے۔ علامہ صاحب نے خوب فرمایا تھا۔

ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا
وہ خود فراخیٔ افلاک میں ہے خوار و زبوں

کسی سیارے سے ٹوٹ کے الگ ہونے والے ٹکڑے کی طرح جو زمین کی اجنبی فضا میں داخل ہوتے ہی جل جائے۔ شیلی بھی نہ جانے کہاں سے آئی تھی اور کیوں آئی تھی۔ وہ شیلی تھی یا نہیں تھی۔ یہ سارے سوال اور ان کے سب جواب بے معنی ہو چکے تھے۔ آج کی حقیقت سامنے تھی کہ اس کا نام میرے لئے ایک الزام ہو گیا تھا۔ ایک طرف رابعہ کی پر ملامت' پر تہمت نظر کا سامنا تھا کہ اس پتھر کی خاطر تم نے میرے شیشۂ دل کو بدگمانی سے غبار آلود کیا تھا؟ دوسری جانب وقار یوسف کی بیوی کی آنکھوں کے آنسو سوال کرتے تھے؟ کیوں لے کر آئے تھے تم اپنے ساتھ ایک قاتل کو جس نے میرے گھر سے میرے ساتھ جا کے میرے ہی باپ کی جان لی۔

میں غالب کے ساتھ ایسے چل رہا تھا جیسے کوئی خلا میں چلتا ہے۔ مجھے گرد و پیش کی خبر ہی نہ تھی۔ اچانک میں نے خود کو انڈس ہوٹل کے "گلیکسی ریسٹورنٹ" میں پایا۔ میرے چاروں طرف عام لوگ تھے۔ زندگی کے دکھ ان کے ساتھ بھی تھے مگر ان کا روگ نہیں بنے تھے۔

میں نے کہا۔ "غالب۔ یہ ہم کہاں آ گئے؟"

غالب نے کہا۔ "تم کہاں جانا چاہتے تھے؟"

"شاید میں واپس جانا چاہتا تھا۔" میں نے کہا۔ "اب یہ ممکن نہیں رہا۔"

"دیکھو یار سکندر۔ میں تمہارا دوست ہوں یا نہیں ہوں؟"

غالب بولا۔ "فرض کر یہ سوال میں نے سب کی طرف سے کیا ہے۔"

"نہیں۔ تم سب دوست نہیں۔ میرے اپنے ہو۔ میرے دست و بازو' میرے وجود کا حصہ ہو۔" میں نے کہا۔ "یہ کون کہتا ہے کہ میرے ہاتھ میرے دوست ہیں یا میری آنکھیں اور میرے حواسِ خمسہ میرے دوست ہیں۔ یہ تو بس میرے اپنے ہیں۔ جن کے بغیر میں تصور ہی نہیں کر سکتا کہ میں کیا ہوں۔"

"شاید ایسا ہی تھا یہ رشتہ۔ ہم تمہارے دست و بازو تھے لیکن ہم پر تمہارا اختیار تھا۔" غالب نے کہا۔ "ہم وہی کر سکتے تھے جو تم چاہتے تھے۔"

میں نے احتجاج کیا۔ "غلط مطلب مت نکالو میری بات کا۔"

"میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں سکندر۔ ایک وقت تھا جب

ضرورت کے تحت اور ایک مقصد کی خاطر ہم نے رضاکارانہ طور پر تمہیں فیصلے کرنے کا اختیار دیا تھا۔"

"اس وقت بھی میں ہر معاملے میں مشورہ کرتا تھا۔"

لیکن آخری فیصلہ بہرحال تمہارا ہوتا تھا اور ڈسپلن کی خاطر ہم اس سے اختلاف کو غلط سمجھتے تھے۔ ایک ٹیم کے مورال اور اسپرٹ کا اس کے عزائم' مقاصد اور نتائج سے بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے۔ یہ اسی اتفاق اور اتحاد کا کرشمہ تھا کہ محدود وسائل کے ساتھ ہم نے اپنے سے کئی گنا طاقتور دشمن کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ یہی ہماری کامیابی تھی۔ اس جدوجہد کے سیاسی انجام سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔" غالب نے ایک لمحے توقف کیا اور پھر اپنی بات کا اثر دیکھتے ہوئے بات جاری رکھی۔ "آج صورت حال قطعی مختلف ہے۔ جنگ میں ملکی قانون کی خلاف ورزی کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ آپ دشمن کے جتنے آدمی چاہیں مار دیں۔ ان میں بے گناہ ہی ہوں گے لیکن آپ کے خلاف ضابطۂ فوجداری کی کسی دفع کے تحت قتل عمد' غیر ارادی قتل یا نیت قتل کا کوئی مقدمہ نہیں بنتا۔ نا دشمن کی ملکیت کو تباہ کرنے پر دیوانی مقدمہ درج ہوتا ہے۔ دشمن تو دشمن' اپنی زمین پر محاذ جنگ ہو تو اپنے ہی گھر' کھیت کھلیان برباد ہوتے ہیں اور بمباری سے اپنے شہری بھی مارے جاتے ہیں۔ زمانۂ امن کی بات کچھ اور ہے۔"

"کیا میں یہ بات نہیں سمجھتا؟"

"سمجھتے ہو تو اس پر عمل کیوں نہیں کرتے۔" غالب نے تیز لہجے میں کہا۔ "جب تم پاکستان میں نہیں تھے تو اس ملک کے قانون کی دسترس سے باہر تھے۔ قانون آج بھی وہی ہے اور تمہارے خلاف الزامات کی فہرست طویل سے طویل ہو چکی ہے۔ اوّل تو قانون میں ایسی کوئی گنجائش نہیں کہ تمہارے شاندار مجاہدانہ کارناموں' تمہارے حب الوطنی اور جذبۂ قومیت کے عظیم مظاہرے پر تمہارے خلاف مجرمانہ الزامات ختم کر دیے جائیں۔ دوسرے یہ کہ ایسی گنجائش ہوتی تب بھی ہم یہ کیسے ثابت کرتے کہ ہم نے کیا کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔ وطن کے دشمنوں اور غداروں کی سازش کو کب کہاں اور کیسے ناکام بنایا۔ گواہ' ثبوت اور شہادت کے بغیر کوئی دعویٰ سند نہیں رکھتا۔"

"میں نے کب کہا تھا کہ مجھے ایک عظیم مجاہد تسلیم کریں۔ مجھے کسی اعزاز نے بے نوازیں۔"

"جب دشمن کا سامنا ہو تو ملک کا ہر شہری مجاہد بن جاتا ہے اور وہ کسی بھی حیثیت میں جہاد کرے تو وہ اپنا قومی فریضہ انجام دیتا ہے۔ ہم پر محب وطن ہونا ایک فرض ہے اور وطن کی خاطر جان دینا بھی اس فرض کا حصہ ہے۔ ہر پاکستانی سن پینسٹھ کی جنگ میں فوج کے ساتھ لڑ رہا تھا اور اس جنگ میں بھی صورت حال مختلف نہ تھی۔ جہاد میں وہ بوڑھا بھی شریک ہوتا ہے جو بستر مرگ پر معذوری کی حالت میں دل سے دعا کرتا ہے اور وہ بچہ بھی جو بلیک آؤٹ کے وقت لائٹ کا سوئچ آف کرتا ہے۔"

"مجھے اس لیکچر کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے برہمی سے کہا۔

"سکندر..... یہ لیکچر نہیں..... میری کوشش ہے کہ تم بدلے ہوئے حالات میں اپنے طرز عمل کو بدل دو۔" غالب نے میرے ہاتھ پر تھپکی دی۔ "جنگ ختم ہو گئی مگر ہمارے آپس کے تعلقات کی نوعیت جو پہلے تھی وہ آج بھی ہے۔ ہم آج بھی ایم آر ایس کے رکن ہیں اور جذباتی طور پر ایک دوسرے سے اسی طرح وابستہ ہیں جیسے ایک جسم کے اعضا۔ جسم کے وجود کا انحصار تمام اعضا کی مضبوط کارکردگی پر ہے۔ آدمی کا ایک ہاتھ پیچ کو کس رہا ہو اور دوسرا کھولنے لگے۔ ایک ہاتھ وزن اٹھائے لیکن دوسرا ساتھ نہ دے۔ ایک ہاتھ مشرق کی طرف بڑھے اور دوسرا مغرب کی جانب کیا یہ ہو سکتا ہے؟"

"تم سمجھتے ہو میں ایسا ہی کر رہا ہوں؟"

"صرف میں نہیں' ہم سب سمجھتے ہیں کہ تم اپنی مرضی سے من مانی کرتے رہے ہو اور تم نے ابھی تک بدلے ہوئے حالات کے مطابق نئی حکمت عملی اپنانے کے لئے کسی سے اشتراک نہیں کیا ہے۔ خدا کے لئے سمجھو سکندر۔ رابعہ نے بھی غلط نہیں کہا تھا۔ یہی بات وہ بھی سمجھانا چاہتی تھی لیکن تم نے....."

"جو رویہ اس نے میرے ساتھ اختیار کیا۔ کیا وہ ٹھیک تھا؟" میں بھڑک اٹھا۔ "اس نے میری جتنی بے عزتی کی تھی۔ اس کا کوئی جواز تھا!"

"سنو! آرام سے سنو۔" غالب نے ادھر ادھر دیکھا۔ "چلانے کی ضرورت نہیں۔ یہاں دوسرے لوگ بھی بیٹھے ہوئے ہیں۔ اگر محسن ہوتا تو یہ ناخوشگوار فریضہ وہ ادا کرتا۔ یا ہم ہی کرتے' ویسے تو اکرام شیخ' نازو' رابعہ اور گل کا بھی تم پر اتنا ہی حق ہے مگر میں یہ مناسب نہیں سمجھتا کہ تم کسی ٹریبونل یا فل بینچ کے سامنے الزامات کا سامنا کرو۔ میرے اور تمہارے درمیان براہ راست گفتگو یقیناً بہتر ہے۔ تم بھی دل کھول کے کہو۔ میں بھی لگی لپٹی نہیں رکھوں گا۔ اختلافات کا مطلب مت یہ نکالو کہ ہماری دوستی کے جذبات بدل گئے ہیں۔ اختلافات کا مقصد ہے مشترکہ مسائل کا صحیح حل تلاش کرنا خواہ مسائل تمہارے ہوں یا میرے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑنا چاہئے۔ ہم ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کے بعد مشورے سے بگڑے کام سنوار سکتے ہیں اور مزید خرابی کے امکانات ختم کر سکتے ہیں۔ مجھے صاف نظر آ رہا ہے کہ اب معاملات کو التوا میں رکھنے کا کوئی جواز نہیں رہا۔ کیوں کہ وقت کی عطا کردہ مہلت ختم ہو رہی ہے۔ اس بار تم پکڑے گئے تو دنیا کی کوئی طاقت تمہیں نہیں چھڑا سکے گی۔ ہم سب اتنے بے بس اور مجبور ہو جائیں گے کہ ہم تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکیں گے۔ تمہارے خلاف تمام سابقہ الزامات ختم نہیں ہوئے تھے۔ جو شخص اسے ختم کرا سکتا تھا

اسے ختم کرا دیا گیا ہے اور ختم کرانے والے وہی شکاری ہیں جو ہم سب کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ یہ کام انہوں نے ایسے کیا ہے کہ نقوی صاحب کا قتل بھی تمہارے فرد جرم میں شامل ہو جائے اور معاف کرنا' جتنا ذہین و فطین ہونے کا ثبوت یہ شکاری دے رہے ہیں۔ اتنا ہی تم اپنے آپ کو آسان شکار ثابت کر رہے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تم گرفتار ہو گئے تو تمہاری ضمانت پر رہائی بھی ناممکن ہو گی۔ تم پہلے ہی مفرور مجرم قرار دیے جا چکے ہو اور تمہاری زندہ یا مردہ گرفتاری پر انعام بھی ہے۔ یہ معاملہ اب تک دبا ہوا تھا لیکن اب پورے زور و شور سے اٹھایا جائے گا۔ تمہاری وجہ سے ہم سب کی پوزیشن غیر محفوظ ہو گئی ہے جو تمہارے دوست ہیں۔"

مجھے اس بات سے دلی رنج ہوا۔ "ایسا ہے تو مجھ سے لاتعلقی کا اعلان کر دو۔ چھوڑ دو مجھے۔"

"بے وقوفی کی بات مت کرو۔" غالب نے کہا۔ "اس اعلان سے کون سا فرق پڑ جائے گا۔ ایک مجرم اور قاتل کے ساتھی اور مددگار تو یہی کہتے ہیں کہ انہوں نے کسی جرم میں ساتھ نہیں دیا۔ ڈاکوؤں کے کسی گروہ میں شامل ہو کے وارداتیں کرنے والا کسی دن اخبار میں یہ اعلان شائع کرا دے کہ اب اس کا اس گروہ سے کوئی تعلق نہیں رہا تو اس کے ماضی کے جرائم ختم نہیں ہو جاتے۔ قانون میں تو یہ کوئی چیز نہیں۔ یہ صرف خدا قبول کر سکتا ہے بشرطیکہ کوئی سچے دل سے تائب ہو۔ کوئی مجرم عدالت میں حلف اٹھا کر کہے کہ آئندہ کے لئے میری توبہ تو عدالت یہ نہیں کہہ سکتی کہ جاؤ معاف کیا۔ اب شرافت سے رہنا۔ آئندہ کی آئندہ دیکھی جائے گی۔ پہلے جو کیا تھا اس کا حساب پہلے ہوگا۔ ساری دنیا کے قانون میں ایسا ہی ہے۔"

"پھر کیا سوچا ہے تم سب نے؟ میرے ساتھ جیل جاؤ گے؟" میں نے طنز سے کہا۔ "یا تمہیں بچانے کے لئے میں اپنی گرفتاری پیش کر دوں؟"

"قانونی مسائل پر قانونی ماہر کی رائے مستند سمجھی جا سکتی ہے۔ حسن اتفاق سے ہمیں بیک وقت دو ماہرین کی خدمات حاصل ہیں۔ مس رابعہ قادری ایڈووکیٹ ہائی کورٹ اور عبدالودود منظر ہائی کورٹ و سپریم کورٹ۔ بات ان کی موجودگی میں ہوگی۔ اس وقت تک نقوی صاحب کے قتل کی رپورٹ بھی مل جائے گی اور صورت حال واضح ہو جائے گی۔ رابعہ اور منظر کی پوزیشن محفوظ ہے۔ پولیس ان پر ہاتھ نہیں ڈال سکتی۔ محسن اور گل یہاں ہوتے تو ضرور پکڑے جاتے۔ میں نے انہیں بتا دیا ہے کہ وہ ادھر کا رخ بھی نہ کریں بلکہ بہتر ہوگا کہ فوزیہ کا گھر بھی چھوڑ دیں۔ اس سے کوئی رابطہ نہ رکھیں۔"

"ان سے کب بات ہوئی تھی؟"

"کل۔ نقوی صاحب کی موت سے پہلے ہی مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ حالات کس سمت میں جا رہے ہیں۔" غالب نے کہا۔

"تمہاری اپنی پوزیشن کیا ہے؟"

"زیادہ اچھی نہیں ہے لیکن میں نے اپنا بندوبست کر لیا ہے۔ مجھے کراچی کے ایک بہت بڑے روزنامے کا بیورو چیف بننے کی پیشکش ہوئی تھی۔ میں اسے قبول کر رہا ہوں۔ لاہور آفس کے بیورو چیف کی حیثیت سے میری تقرری اس وقت بڑی کارآمد ثابت ہو گی۔"

"اور نازو....."

"اسے میں نے کرائم رپورٹر لگا دیا ہے اسی اخبار میں جہاں کبھی یہ کام میں کیا کرتا تھا۔" غالب نے کہا۔ "ایڈیٹر بہت دبنگ اور کھرا آدمی ہے۔"

"تم خود اسی اخبار میں کیوں نہیں گئے؟"

"یار! چلا تو جاتا ایڈیٹر انکار بھی نہ کرتا مگر وہ مشکل میں پڑ جاتا۔ میں نے اسے آزمائش میں ڈالنا مناسب نہیں سمجھا۔ یہی کیا کم ہے کہ میری بات مانتے ہوئے اس نے اتنی اہم ذمے داری نازو کو سونپ دی حالانکہ اس کا صحافت میں کوئی تجربہ نہیں۔ میں نے اسے بتا دیا تھا کہ نازو بہترین کرائم رپورٹر بن سکتی ہے۔ اس میں ہمت ہے' ذہانت ہے اور وہ اپنی حفاظت آپ کرنا جانتی ہے۔ رہی بات تجربے کی تو کچھ دیر اسے بطور اپرنٹس کسی کے ساتھ منسلک کر دیا جائے۔ وہ کرائم رپورٹر یا کورٹ رپورٹر کے ہمراہ ہر جگہ جائے اور رپورٹنگ دیکھے' میں نے اسے یقین دلایا ہے کہ زیادہ سے زیادہ ایک مہینے بعد نازو کو کسی کی مدد یا رہنمائی کی ضرورت نہیں رہے گی۔"

"اخبار میں پہلے کون کرائم رپورٹر تھا؟"

"وہ بنیادی طور پر کامرس کا آدمی تھا۔ کامرس رپورٹر بن کر زیادہ خوش ہوگا۔" غالب نے انگلیوں کے اشارے سے مال بنانے کا حوالہ دیا۔

"چلو یہ اچھا کیا تم نے۔ مگر گرفتاری سے کیسے بچو گے تم؟"

"اوّل تو پولیس سنجیدگی سے کوشش نہیں کرے گی۔ وہ ایسے بندے پر ہاتھ نہیں ڈالتے جو بعد میں ان پر ہاتھ ڈالے اور مجھے پکڑنے کے بعد پریشانی اٹھا کے چھوڑنا پڑے۔ صحافی چھوٹا ہو یا بڑا۔ صحافی برادری کا اتحاد اس کی سب سے بڑی طاقت ہوتا ہے۔ پشاور سے کراچی تک سارے اخبار والے ایک آواز ہو کر چلانے لگتے ہیں کہ حکومت آزاد صحافت کا گلا گھونٹ رہی ہے۔ آزادی اظہار کا قتل عام کر رہی ہے۔ خدانخواستہ پولیس نے کسی اوپر والے کے دباؤ میں یہ سوچا کہ ہمیں شامل تفتیش کیا جائے تو اس کی خبر بھی ہمیں پہلے مل جائے گی۔ پولیس خود اطلاع کر دے گی کہ جناب اپنا بندوبست کر لو۔ ہماری نوکری کا خیال کرتے ہوئے۔ ہم فوراً ضمانت قبل از گرفتاری کی درخواست داغ دیں گے اور ضمانت ہو جائے گی۔ سب سے اہم نکتہ جو تمہاری عقل شریف کو قبول کر لینا چاہئے یہ ہے کہ جب تک ہم تمہارے ساتھی ہیں ہم تمہاری مدد نہیں کر سکتے۔"

"یہ کیا بات ہوئی' مدد کیا غیر کرتے ہیں؟"

"ہاں۔ قانونی معاملات میں ایسا ہی ہوتا ہے...... پہلے تو ہم عملاً ثابت کریں گے کہ ہمارا سکندر بخت کے جرائم سے کوئی تعلق نہ تھا اور نہ ہے۔ دوستی ایک الگ چیز ہے۔ ہم نہ مجرم کے ساتھ رہتے ہیں نہ اسے چھپا کر انصاف کی راہ میں رخنہ اندازی کرتے ہیں اور نہ حقائق چھپا کر مجرمانہ حوصلہ افزائی۔ اس اظہارِ لاتعلقی کے بعد ہم تمہارے لئے جو بھی کریں گے حصولِ انصاف کے نام پر کریں گے۔ ایک ساتھ وکیل برادری اور صحافی برادری انصاف کے خلاف تحریک شروع کر دے گی اور نعرہ ایک ہی ہوگا۔ سکندر بخت کو سیاسی عداوت اور ذاتی انتقام سے بچایا جائے۔"

میری اعصابی کشیدگی اب بہت کم ہو گئی تھی۔ "اور یہ تحریک چلائے گا کون؟"

"ظاہر ہے ہم اور ہمارے ہم نوا دوست۔ بیشتر صحافی اور وکیل جانتے ہیں کہ تمہارے خلاف سب کارروائی چوہدری دلاور' سابق ایس ایس پی سراج اور سابقہ حکومت کے چند کرپٹ بیوروکریٹ نے شروع کی تھی۔ ہم اسباب و عوامل کی تشہیر کریں گے اور دلاور اپنے سیاسی پلیٹ فارم یا اپنی دولت کی طاقت سے ہماری آواز کو دبانے میں ناکام رہے گا۔ اسے تو اپنی فکر پڑ جائے گی کہ سکندر کی دشمنی غالب سے دشمنی بن گئی ہے اور غالب سے دشمنی صحافت سے جنگ۔ سیاست کے میدان کا شہسوار صحافت کو نظرانداز کرے تو اپنے زور میں چلتے ہی منہ کے بل گرتا ہے۔ وکیل ناانصافی کے راستے کی دیوار بنتے ہیں تو صحافی سیاست میں بدعنوانی کا سدِباب کرتے ہیں۔ ان دو طاقتوں کی عدم موجودگی میں انارکی پھیل جاتی ہے۔ لاقانونیت اور بدمعاشی حاوی آ جاتی ہے۔ آئی بات سمجھ میں!"

"بالکل آ گئی.... آگے بولو۔" میں نے ہنس کے کہا۔

"آگے آتی ہے اصل بات جس کی یہ تمہید تھی۔" غالب نے کہا۔ "رابعہ نے تمہارے ساتھ جو رویّہ اختیار کیا تھا اس کا مقصد بھی یہی تھا۔ دنیا کے سامنے تم سے لاتعلقی کا اظہار۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ "کیا یہ سچ ہے؟"

"نہیں' یہ سچ کا باپ ہے۔" غالب بولا۔ "سب کے سامنے اس نے تمہیں اپنے آفس سے بے عزت کر کے نکالا تھا تو اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ سب دیکھ لیں اور سُن لیں۔ جب وہ دلاور کے ساتھ گئی تھی تو اس نے کسی حد تک دلاور کو قائل کر لیا تھا کہ وہ تمہیں سمجھائے گی۔ کوشش کرے گی کہ تم بدلے ہوئے حالات کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے "جیو اور جینے دو" کی پالیسی اپناؤ۔ اس نے بڑی ہوشیاری سے کام لیا تھا اور کہا تھا کہ میں وعدہ نہیں کر سکتی۔ سکندر خود سر اور ضدی آدمی ہے۔ ہو سکتا ہے میری مان لے۔ آج نہ سہی کل پرسوں۔ ایک ہفتے یا ایک مہینے بعد اور چوہدری دلاور اس کی باتوں میں آ گیا' اس نے رابعہ سے کہا کہ صرف تم ہی یہ کام کر سکتی ہو۔ یہ جھگڑا ختم کراؤ خود بھی آرام سے رہو اور مجھے بھی موقع دو کہ میں اپنی ہر زیادتی سے ہونے والے تمام نقصانات کی تلافی کر دوں۔ اس نے رابعہ پر زور دیا کہ وہ اپنی محبت کا دباؤ ڈال سکتی ہے اور سکندر کی سب سے بڑی کمزوری بن کے اسے کمزور کر سکتی ہے۔"

"یہ رابعہ سے کہا تھا اس نے؟"

"ہاں.... بات یہی تھی۔ الفاظ گول مول تھے۔ رابعہ نے بھی انجان بنتے ہوئے پھر کہا کہ چوہدری صاحب! میں بھی تنگ آ گئی ہوں اس شب و روز کی بے مقصد بھاگ دوڑ اور معرکہ آرائی سے لیکن سکندر کے بارے میں یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ وہ کیا کرے گا۔ اس کا کچھ بھروسا نہیں کہ وہ مجھے بھی چھوڑ دے۔ رابعہ ایسا نہ کہتی تو دلاور نرا کائیاں آدمی ہے۔ تاڑ جاتا کہ رابعہ اسے بے وقوف بنانے پر آمادہ ہے' اگر وہ صاف کہتی کہ اپنے چوہدری صاحب تسی تے فکراں نہ کرو۔ تیر کی طرح سیدھا کر دوں گی میں سکندر کو۔ وہ میرے قابو میں ہے۔ میری مرضی کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔ ایک دفعہ دھمکی دوں گی قطع تعلق کی تو ساری اکڑ فوں بھول جائے گا۔ رابعہ نے ایسا نہیں کہا۔ اس نے بڑے تذبذب اور بے یقینی کے ساتھ صرف کوشش کرنے کی بات کی اور نتائج کے بارے میں مایوسی کا زیادہ اظہار کیا۔ اس سے دلاور کی اُمید بندھی کہ رابعہ واقعی کچھ کرنا چاہتی ہے۔ اس کے بعد وہ تم سے ایسے پیش آئی تھی۔ وہ اس کے پلان کا حصہ تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کی بے رخی۔ تمہاری خفگی اور تعلقات میں کشیدگی کا چرچا ہو تو بات دلاور تک پہنچ جائے۔"

میں نے سخت ندامت محسوس کی۔ "میری عقل پر پتھر کیوں پڑ گئے تھے!"

"عاشقوں کے نصیب پتھر ہی ہوتے ہیں مسٹر مجنوں۔ سر اٹھایا تھا کہ سنگ یاد آیا۔" غالب نے کہا۔ "پتھر لیلیٰ کے دیوانے پر پڑیں یا اس کی عقل پر....."

"کیا تم لوگ بھی ایسا ہی ڈرامہ کرو گے۔"

"ضرورت پڑی تو کر لیں گے۔" غالب نے کہا۔ "ابھی تو پہلا مسئلہ تمہیں غائب کرنے کا ہے۔ سب پرانے ٹھکانے خطرے کی جگہ ہیں۔ پولیس ایک دم مستعد ہو کے چھاپے مارے گی تو انہی گھروں پر جہاں تم مل سکتے ہو۔ منظر کا گھر سرِفہرست ہے مگر وہاں مجسٹریٹ خانہ تلاشی کی قانونی کارروائی کرے گا اور منظر اس کے ساتھ پورا تعاون کرے گا۔ نقوی صاحب کے داماد کا گھر اور ان کی نئی زیرِ تعمیر کوٹھی بھی غیر محفوظ ہو گی۔ وقار یوسف کی معقولیت میں شک نہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ یہ سب فریم اپ ہے یعنی تمہیں پھانسنے کی سازش لیکن وہ دُہری مشکل میں ہے۔ ایک دولت مند سسر کے غریب اور ناپسندیدہ داماد کی حیثیت سے اس نے اپنی خودی کو یقیناً بلند رکھا تھا مگر پولیس یہ سب کہاں دیکھتی ہے۔ انہیں تو غرض ہے سیدھا کسی کے گلے میں پھندا ڈالنے سے' اتنے دولت مند سسر کے کسی اکلوتے داماد کی دلی خواہش نہیں ہوتی کہ بزرگوار فوراً اللہ کو پیارے ہوں تو اپنے وارے نیارے ہوں۔ وہ پولیس سے تعاون کرے گا ورنہ خود ہی شریکِ جرم سمجھا جائے گا۔ دوسرا مسئلہ ہے اس کی بیوی کا جو بے حد جذباتی ہو گی۔ آہستہ آہستہ وہ اپنے شوہر اور باپ کے درمیان خلیج کو پاٹنے میں کامیاب ہو چکی تھی اور نقوی صاحب نے بالآخر داماد کو وہ حیثیت دے دی تھی جس کا وہ مستحق تھا۔ خود وقار یوسف نے بھی اپنے رویے میں لچک پیدا کر لی تھی۔ اس عرصے پر وہ بیوی کے جذبات کو عقل کی دلیل سے کیسے مسترد کر سکتا ہے۔ عورتوں کا تو یہ بین الاقوامی مسئلہ ہے کہ جذبات غالب ہوں تو عقل اتنی دور گھاس چرنے نکل جاتی ہے کہ اسے واپس ہی نہیں لایا جا سکتا۔ اسے قائل کرنے میں دیر لگے گی کہ تم نے کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ ابھی تو اس کے نزدیک یہ بھی تمہاری غلطی ہو گی کہ تم نے شبلی پر اعتبار کیا تھا حالانکہ اس کے مخالف تھے۔ اس غلطی کو وہ کیسے نظرانداز کر سکتی ہے۔ جس کے نتیجے میں اس کے ابا جان کی جان گئی۔ فی الحال وقار یوسف اور اس کی بیوی کا نام بھی اپنے ہمدرد یا دوستوں کی فہرست میں سے خارج کر دو۔ میں اس بات کو بھی خارج از امکان نہیں سمجھتا کہ فوزیہ اور اس کے شوہر سے بھی پوچھ گچھ ہو۔ بھائی کے لئے بہن کا گھر ہی ایک ٹھکانا ہوتا ہے۔ ابھی کچھ عرصہ تمہاری تلاش بڑے زور و شور سے جاری رہے گی اور ہر جگہ سادہ کپڑوں میں خفیہ پولیس اور سی آئی ڈی کے لوگ ہماری نگرانی کریں گے۔ ان کا یہی طریقہ ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ مفرور مجرم کبھی نہ کبھی کسی رشتے دار دوست شناسا کے گھر ضرور پہنچتا ہے خواہ آدھی رات کو آئے یا حلیہ بدل کے آئے۔ اس وقت تک ہم سب بھی چپ رہیں گے۔"

"اور میں کہاں رہوں گا؟"

"انڈر گراؤنڈ۔ زیرِ زمین۔" غالب نے کہا۔ "لندن میں تو ریلوے لائن تھی انڈر گراؤنڈ۔ یہاں سیوریج لائن ہے۔"

"کیا مطلب۔ میں گٹر میں رہوں گا۔ اس سے بہتر نہ ہو گا کہ میں کسی مدفن میں رہوں۔" میں نے کہا۔ "زندہ گاڑ دیں مجھے آپ سب مل کے۔"

غالب ہنسنے لگا۔ "ایک تیسری جگہ بھی ہے میرے ذہن میں۔ اسے تہ خانہ کہتے تھے۔ آج کل بیس منٹ (BASEMENT) کہتے ہیں۔ شاہی قلعے میں ایک تہ خانہ ہے لیکن وہاں رہنے سے گٹر میں رہنا کم عذاب دہ ہو گا۔ تہ خانے بڑی پُراسراریت رکھتے ہیں۔ انہی میں زنداں بھی ہوتے تھے اور ان ہی میں عشرت کدے بھی۔"

میں نے کہا۔ "آج بھی ایسا ہی ہے۔"

"اب زیرِ زمین بہت کچھ ہوتا ہے۔ تجربہ گاہیں۔ عقوبت گاہیں۔ گودام بلکہ میں نے سُنا ہے کہ پورے پورے شہر زمین کے نیچے آباد ہیں۔ جہاں ایٹم بم بنتے ہیں۔ ہزاروں افراد کام کرتے ہیں۔ یا رہتے ہیں مگر اوپر ویران صحرا یا جنگل نظر آتا ہے۔ آپ کو ایسی ہی جگہ رہنا پڑے گا۔ جہاں سے آپ کو باہر آنے کی قطعی اجازت نہیں ہو گی۔ عملاً آپ قیدی ہوں گے۔"

"ایسی جگہ کہاں ہے؟" میں نے مسکرا کے کہا۔

"ایک جگہ ہے لیکن میں ابھی بتا نہیں سکتا۔" غالب نے گھڑی دیکھی۔ "میرا خیال ہے اگر ہمارے تعاقب میں کوئی ہوتا تو اب تک معلوم ہو جاتا۔ میں شیشوں سے مسلسل باہر دیکھتا رہا ہوں۔ پولیس بہت تیزی سے حرکت میں آئے گی مگر اس کے باوجود قانونی کارروائی میں دو تین گھنٹے صرف ہو جائیں گے۔ میں جا کے صورتِ حال کا جائزہ لوں گا اور پھر رات کو آؤں گا۔"

"مجھے کیسے معلوم ہو گا؟"

"میں تمہیں فون کروں گا۔ تم کسی کو فون نہیں کرو گے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ہم سب کے فون ٹیپ کرنے کے احکامات صادر ہو جائیں۔ تفتیش کا صرف ڈرامہ نہیں ہو گا۔ سچ مچ تفتیش ہو گی۔ اس بار چوہدری دلاور نے تمہیں تو پکا شکار کر لیا ہے۔ اگر تمہاری کال ٹریس کر کے پولیس یہاں آ گئی تو پھر تم فرار بھی نہیں ہو سکتے۔ یہاں کافی اندھیرا ہے اور کوئی تمہاری طرف متوجہ بھی نہیں ہے۔ کل صبح تک خطرے کی کوئی بات نہیں۔"

"کل صبح کیا ہو گا؟"

"یار کچھ تو عقل کو حاضر رکھو۔ کل صبح کے اخبارات میں نقوی صاحب کے قتل کی خبر اور ان کے قاتل کی تصویر شائع ہو گی۔ اخبار یہاں بھی آئے گا تو کیا ویٹر یا منیجر نہیں دیکھیں گے۔ کل صبح کے بعد تمہارا کسی بھی ہوٹل میں قیام ناممکن ہو جائے گا۔ اگلے چند روز میں چوہدری دلاور پوری کوشش کرے گا کہ تمہاری تصویر والے پوسٹر لاہور کے ہر گلی کوچے میں بازاروں میں اور تفریحی مقامات پر لگ جائیں تاکہ تم یہ چہرہ لے کر کہیں بھی نہ جا سکو۔"

"میں تو لندن جا رہا تھا۔" میں نے آہ بھر کے کہا۔

"تم سیدھے جیل اور وہاں سے تختۂ دار کی طرف جا رہے تھے۔ بالکل اس شعر کی تفسیر بن کے۔ جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے۔ اب سب سے اہم مسئلہ تمہاری حفاظت کا ہے اور یہ اتنا بڑا مسئلہ ہے کہ میں اکیلا اس سے نہیں نمٹ سکتا۔" غالب اُٹھ کھڑا ہوا۔

"سوال اگر چہرہ بدلنے کا ہو تو......"

غالب نے میری بات کاٹ دی۔ "میک اپ سے کام نہیں چلے گا۔ میک اپ عارضی ضرورت کے لئے ہوتا ہے اور تمہارا مسئلہ مستقل ہے۔ جب مل کے بیٹھیں گے تو سوچیں گے کہ کیا حل نکالا جائے؟"

ہم نے وہیں بیٹھے بیٹھے کافی پی تھی اور پھر کھانا منگوا لیا تھا۔ مجھے بھوک بالکل بھی نہیں تھی۔ میرا ذہن بدستور اُلجھنوں کا شکار

تھا۔ غالب نے بڑی عقل مندی کی تھی کہ مجھے اس گوشہ عافیت میں لے آیا تھا۔ اپنی باتوں سے اس نے میرا کھویا ہوا اعتماد بحال کردیا تھا اور میرے خیالات کا انتشار بھی کافی حد تک کم ہو گیا تھا۔

ہوٹل میں کمرا حاصل کرنا مشکل نہ تھا لیکن میں نے استقبالیہ پر بیٹھے ہوئے شخص سے سامنا کرنے سے گریز کیا۔ یہ کام غالب نے کیا۔ ہمارے ساتھ سامان نہیں تھا مگر ہم بہت دیر سے ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے اور بظاہر عام لوگوں کی طرح پُرسکون بھی نظر آتے تھے۔ صورت سے بھی شریف اور مہذب لگتے تھے۔ غالب نے مزید وضاحت کردی تھی کہ ہم ایک کاروباری معاملہ طے کرنے کے لئے کراچی سے صرف دن بھر کے لیے لاہور آئے تھے اور شاید پی آئی اے کی نائٹ کوچ سے واپس چلے جائیں گے یا پھر علی الصبح' چوبیس گھنٹے کا کرایہ پیشگی ادا کرنے کے بعد غالب نے مجھے اشارہ کیا اور ہم ایک ساتھ اوپر چلے گئے۔

"اب تم یہاں لمبی تان کر سو جاؤ۔" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "مجھے تو اکیلے پن کے خیال سے وحشت ہو رہی ہے۔ نیند کہاں آئے گی ایسی پریشانی میں۔"

"کوئی دوا لا دوں؟"

"نہیں یار' ایسے کب تک سکون ملے گا۔ بے سکونی کی عادت ہو جائے تو اچھا ہے۔" میں نے کہا۔

غالب نے جانے سے پہلے ایک کام یہ کیا کہ اپنے کپڑے مجھے دے دیئے اور خود میرے کپڑے پہن لیے۔ ہماری جسمانی ساخت میں بہت زیادہ فرق نہ تھا۔ قدو قامت کے اعتبار سے غالب کچھ کم تھا۔ میرے کپڑے اس کو معمولی سے ڈھیلے رہے مگر ایسے نہیں تھے کہ وہ مضحکہ خیز نظر آتا۔ اس کے کپڑے مجھے ٹائٹ فٹ رہے لیکن بہت سے لوگ عین جسمانی پیمائش کے مطابق کپڑے پہننا پسند کرتے ہیں خواہ اس میں جسم بے آرام رہے۔

غالب نے مجھے بتا دیا تھا کہ وہ ریسٹورنٹ سے گزر کر جائے گا تو دور کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے شخص کی طرف اس کی پشت ہوگی اور وہ دیکھے گا تو یہی سمجھے گا کہ جس نے کمرا بک کراتے وقت رجسٹر میں دستخط کیے تھے وہ تو اوپر ہی ہے۔ یہ اس کا ساتھی ہے جو باہر گیا ہے۔ غالب ایسا نہ کرتا تو اسے کمرے کی چابیاں استقبالیہ کو دینی پڑتیں یا وضاحت کرنی پڑتی کہ کمرا کھلا ہوا ہے اور گیسٹ اوپر ہے۔

کمرے میں تازہ اخبارات بھی تھے اور ایک کونے میں ٹی وی بھی لگا ہوا تھا مگر اس وقت خاموش تھا۔ میں نے بستر پر دراز ہو کر اخبارات دیکھنے شروع کئے کچھ دیر بعد ہی مجھے احساس ہو گیا کہ میری نظریں سطور پر ہیں لیکن سوچ میں شیلی کے بارے میں رہا ہوں۔

غالب کے تمام دلائل اور ناقابل تردید حقائق کے باوجود میرے دل کے کسی گوشے میں یہ خیال اب بھی راکھ میں دبی ہوئی چنگاری کی طرح موجود تھا کہ ڈاکٹر شیلی کی داستان میں حرف

اوّل سے آخر تک سارا جھوٹ نہیں ہوگا۔ کہیں نہ کہیں اس میں تھوڑا بہت سچ بھی شامل ہوگا۔ سو فیصد جھوٹ میں اتنا حقیقی رنگ کیسے آسکتا ہے۔

غالب نے کہا تھا کہ حقیقت ضرور معلوم ہو جائے گی۔ میرے پاس لندن کے اس اسپتال کا فون نمبر تھا جہاں ڈاکٹر شہلا خان اگر نیورو فزیشن تھی۔ یہی اس کا واحد حوالہ تھا جس کی تصدیق ٹیلی فون سے کی جا سکتی تھی۔ کچھ سوچ کر میں نے فون کا ریسیور اٹھا لیا۔

آپریٹر کی آواز سنتے ہی میں نے کہا "ایک ٹرنک کال لندن کے لئے پلیز" اس نے روم نمبر کے بعد میرے نام کی تصدیق کی اور کہا "میں کوشش کرتی ہوں سر"

آدھے گھنٹے تک میں سوچتا رہا کہ کہیں میری یہ بھی غلطی نہیں بن جائے گی۔ غالب نے مجھ سے کہا تھا کہ تم کسی سے بات نہیں کرو گے مگر اس کی مراد یہاں کے ان نمبروں سے تھی جو آبزرویشن پر رکھے جا سکتے تھے۔ لندن کے اس اسپتال کی کال کو کون چلا سکتا تھا جو ایک بوگس نام سے کی گئی تھی۔

انتظار کا وقت میں نے بے چینی سے ٹہلتے ہوئے' اخبار کے صفحے پلٹتے اور کھڑکی سے باہر جھانکتے یا جماہیاں لیتے ہوئے گزارا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے میں ایک قیدی ہوں جس کا باہر کی دنیا سے رابطہ منقطع ہو گیا ہے۔ میں اکیلا تھا اور لاپتا تھا۔

چند سوالات تھے جو میرے ذہن میں گردش کر رہے تھے اور سامنے آجاتے تھے۔ اس ہاتھی یا گھوڑے کی طرح جو چکر والے جھولے میں سواری کے لئے لٹکایا جاتا ہے۔ ایک جگہ کھڑے ہوئے شخص کے سامنے ایک ہی ترتیب سے وہ لکڑی کے جانور گزرتے جاتے ہیں۔ نیلا گھوڑا' لال ہاتھی' پیلا گھوڑا' ہرا ہاتھی۔ اس وقت اسپتال میں کیا سین ہوگا؟ نقوی صاحب کی لاش ایمبولنس میں رکھی جا چکی ہوگی یا گھر پہنچ گئی ہوگی' شیلی کی لاش مردہ خانے میں پڑی ہوگی؟ اس کے چہرے کا تاثر کیا ہوگا؟ وقار یوسف کی بیوی کی حالت کیا ہوگی؟

اچانک فون کی گھنٹی بجنے لگی اور آپریٹر نے کہا "آپ کی کال مل گئی ہے سر' ہولڈ کریں سر۔"

میں دو منٹ تک ریسیور کان سے لگائے بیٹھا رہا۔ اس دوران دوبارہ آپریٹر نے مجھے ہولڈ آن کرنے کو کہا۔

آخر کار کسی نے کہا "گڈ مورننگ سر! البرٹ ہوسپٹل۔" بات کرنے والی کی آواز میں آپریٹر کے لہجے کی مخصوص نرمی خوش مزاجی اور شائستگی تھی۔

میں نے جانتے بوجھتے فرنچ میں پوچھا "کیا میں نیورولوجی کے شعبے میں کسی سے بات کر سکتا ہوں؟"

حسب توقع مجھے روکھے لہجے میں جواب ملا "نیورو فزیشن کیس یا نیورو سرجن کا؟"

میں نے کہا "نیورو فزیشن پلیز! اگر کوئی انڈین ڈاکٹر ہو یا پاکستانی تو پہلے اس سے میری بات کرا دیں۔"

اس نے کہا "آپ انڈین ہیں تو انگریزی میں بات کیوں نہیں کرتے؟"

میں جانتا تھا کہ انگریز بھی فرنچ کو اتنا ہی ناپسند کرتے ہیں جتنا فرانسیسی انگلش کو۔ "اس لئے کہ میں انگریزی کو ان غاصب آقاؤں کی زبان سمجھتا ہوں جنہوں نے ڈیڑھ سو سال ہندوستان کو غلامی میں رکھا تھا کیا یہ وضاحت کافی ہے۔ ویسے یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔"

اس نے مزید کچھ کہے بغیر کہیں لائن ملا دی۔ کسی نے خالص دیسی پنجابی لہجے میں کہا "گڈ مارننگ جی! ڈاکٹر چرن سنگھ۔"

میں نے پنجابی شروع کردی۔ تاکہ آپریٹر کچھ نہ سمجھے "سردار چرن سنگھ جی۔ میں یہاں لاہور سے بول رہا ہوں۔"

"آہو جی۔ بولو بولو۔ اپنا لاہور تے فیر لاہور ہے۔ حکم کرو۔" چرن سنگھ نے خوش ہو کے کہا "کیسی سوہنی زبان ہے اپنی بھی۔ یہاں تو انگریزی بول بول کے زبان ٹیڑھی ہو گئی ہے۔"

میں نے کہا "سردار جی! آپ کب سے ہیں یہاں؟"

انہوں نے ایک آہ بھری۔ "بس جی اب تو ایسا لگتا ہے کہ پیدا ہوئے تھے اپنے لور میں۔ پھر ٹر گئے دلی اور اب مریں گے ولایت میں۔"

میں نے کہا "یہاں بھارتی پاکستانی ڈاکٹر تو کم ہی ہوں گے۔ مجھے معلوم کرنا تھا ایک لڑکی شیلا خان کے بارے میں۔"

"شیلا خان۔ وہ تو ٹر گئی ہے جی ایتھوں۔ ہاں' وہ ڈاکڑی سی۔"

"آپ کا مطلب ہے' یہاں۔ اس اسپتال میں اس نام کی ڈاکٹر تھی۔" میں نے صدمے سے سنبھل کر کہا۔

"آہو جی۔ تھی اسی لئے تو آپ پوچھ رہے ہو۔ نا ہوتی تو کیوں پوچھتے جی۔ اور میں کیا بتاتا۔"

"آپ کو معلوم ہے وہ لندن میں کہاں رہتی تھی۔ اس کے گھر کا فون نمبر چاہئے مجھے....."

"وہ تو مجھے نہیں معلوم لیکن ایک بندہ ہے ادھر۔ اس کی بڑی یاری تھی شیلا خان سے۔ وہ کیا کہتے ہیں اسے۔ پیار و محبت۔ شادی بھی ہو گئی تھی۔ پھر گل مک گئی....."

"یعنی طلاق ہو گئی؟"

"آہو جی۔ یہاں تو ایسے ہی ہوتا ہے۔ آج ملے۔ کل شادی۔ پرسوں طلاق۔" سردار جی بولے۔ "چوتھے دن بیوی ملنے آتی ہے کسی کو کہ ان سے ملو۔ یہ ہیں میرے دوسرے شوہر اور پہلا بے غیرت ہنس ہنس کے ہاتھ ملاتا ہے اور کہتا ہے جی کہ بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ کر لو گل....."

میں نے کہا۔ "سردار جی۔ اسی سے ملوا دیں۔ لمبی بات نہیں کر سکتا میں۔ ٹرنک کال بڑی مہنگی پڑتی ہے۔"

"اچھا اچھا۔ ابھی دیکھتا ہوں بندہ ہے کہ نہیں۔" سردار جی نے کہا اور شاید آپریٹر سے کہا کہ لائن ٹرانسفر کردے۔

اب کسی مرد نے کہا۔ "ہیلو۔ ڈاکٹر ماجد علی شمسی۔"

میں نے کہا "ماجد صاحب۔ میں رضا خان بول رہا ہوں لاہور سے۔"

"فرمایئے۔ کیا خدمت کر سکتا ہوں آپ کی۔" وہ اردو میں بات کر رہا تھا اور مہذب آدمی تھا۔

"بات ہے آپ کی سابقہ بیوی شیلا کی۔"

"میں اس کے بارے میں کوئی بات کرنا نہیں چاہتا۔ پلیز؟"

میں نے کہا۔ "بات کا غلط مطلب لیا آپ نے۔ مجھے صرف اس کے گھر کا فون نمبر چاہئے۔"

"وہ تو چلی گئی پاکستان۔ گھر بند ہے۔" اس نے مختصرا کہا۔

"اچھا یہاں کوئی شیخ صاحب تھے۔"

"تھے کیا مطلب۔ ہیں۔"

"وہ اس اسپتال میں داخل ہیں۔" میں نے کہا۔

"یہ کس نے بتایا تمہیں۔ مجھے تو نہیں معلوم۔ ٹھہرو میں پوچھ لوں۔" ماجد علی شمسی نے کہا۔

میں نے کہا۔ "اگر وہ نہ ہوں تو پلیز مجھے ان کا فون نمبر چاہئے۔ میں ان سے خود بات کر لوں گا۔ مجھے اطلاع ملی تھی کہ وہ کوما میں ہیں۔"

"کسی نے بے ہودہ مذاق کیا ہے آپ کے ساتھ۔ وہ شیلی.... میرا مطلب ہے ڈاکٹر شیلا خان کے مشیر خاص تھے۔ اس نے شیلی کو گمراہ کیا ورنہ وہ بری لڑکی نہیں تھی۔ خیر۔ یہ سب آپ کو بتانے کا کیا فائدہ۔ آپ ان کا نمبر لکھ لیں۔" ماجد علی نے کہا۔

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور ریسیور رکھ دیا۔ ڈاکٹر شیلی کے بارے میں غالب کا دعویٰ جزوی طور پر غلط ہو گیا تھا۔ اس نام کی لڑکی اسپتال میں تھی اور ڈاکٹر ہی نہیں نیورو فزیشن بھی تھی۔ شیخ صاحب کا وجود بھی تھا اور یوں شیلی کا جھوٹ آدھے سے زیادہ سچ ثابت ہو گیا تھا۔ جھوٹ یہ تھا کہ وہ شادی اور طلاق کے مراحل سے گزر چکی تھی اور اس شادی کے بعد خانہ بربادی میں شیخ صاحب نے کوئی غلط کردار ادا کیا تھا۔ ماجد علی نے تسلیم کیا تھا کہ شیلی اچھی لڑکی تھی جسے شیخ صاحب نے خراب کیا تھا۔

اس انکشاف سے میری الجھن اور بڑھ گئی۔ اگر مجھے اسپتال سے کورا جواب ملتا کہ سوری! اس نام کی کوئی بھی ڈاکٹر نہیں رہی تو مجھے اطمینان ہو جاتا اور میں مان لیتا کہ وہ کوئی دھوکے باز عورت تھی جسے دلاور نے پٹی پڑھا کے میرے پاس بھیجا تھا۔

اپنی الجھن رفع کرنے کے لئے میں نے اگلا قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا اور شیخ صاحب کو فون کیا۔ اس بار کال ملنے میں آدھا گھنٹا بھی نہیں لگا۔ کسی بھاری آواز والے مرد نے ریسیور اٹھا کے کہا۔ "شیخ اسپیکنگ۔"

میں نے کہا۔ "شیخ صاحب! السلام و علیکم۔ بڑی خوشی ہوئی اس وقت آپ کی خیریت دریافت کر کے۔"

"میاں بھائی۔ کون ہو تم پہلے یہ تو بتاؤ۔"

"میں ایک دوست ہوں شیلا خان کا۔ ڈاکٹر رضا.... نہ جانے کس نے اسے بتا دیا تھا کہ خدانخواستہ آپ اسپتال میں داخل ہیں اور کومے میں ہیں وہ بہت پریشان تھی۔"

"لاحول ولا قوۃ پریشان تھی تو بات کرتی مجھ سے۔ وہ خود کہاں ہے؟ لاہور سے صرف ایک بار فون کیا ہے اس نے مجھے۔ اتنی مصروف ہو گئی ہے وہ؟"

میں نے کہا۔ "وہ کچھ.... قانونی مسائل میں اُلجھ گئی تھی۔"

"یہ تو ہونا ہی تھا۔ میں نے تو منع کیا تھا کہ لعنت بھیجو اس پر وہ کوئی اچھا آدمی نہیں ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے...."

میں نے اندھیرے میں تیر چلایا۔ "کون.... چوہدری دلاور۔"

"ہاں، وہی اور کون۔ اسی نے بلایا تھا شیلی کو۔"

میں نے پھر جُوا کھیلا۔ "دیکھئے۔ سگا نہ سہی۔ سوتیلا بھائی تو تھا۔"

"میاں! سگے سوتیلے کی بات نہیں۔ اتنا عرصہ وہ کہاں تھا۔ آج تک اسے سوتیلی بہن یاد نہیں آئی۔ اب اچانک محبت جوش مارنے لگی۔ خون کا رشتہ یاد آ گیا۔"

"بڑی غلطی کی تھی اس نے آپ کا مشورہ نہ مان کے۔ اب مشکل میں پڑ گئی ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ واقعی بہت غلط آدمی ہے۔ وہ ضرور استعمال کرنا چاہتا ہو گا شیلی کو۔ کس غلط مقصد کی خاطر۔"

"آخر ہوا کیا ہے؟ کچھ بتاؤ۔"

"یہ ذرا لمبی بات ہو جائے گی۔ وہ خود آپ کو فون پر بتا دے گی۔ مجھے تو آپ کی خیریت دریافت کرنی تھی اور یہ پوچھنا تھا کہ چوہدری دلاور نے اسے کیوں بلایا تھا یہاں۔"

"میاں جو ہم جانتے ہیں وہ تو صرف اتنا ہی ہے کہ لاہور میں کسی ٹرسٹ کا اسپتال ہے۔"

"وزیر خان ٹرسٹ۔" میں نے کہا۔

"شاید یہی نام تھا۔ دلاور چاہتا تھا کہ شیلی اس کا انتظام سنبھال لے۔ سب کچھ اس کے ہاتھ میں ہو گا۔ بس وہ لالچ میں آ گئی۔ کچھ پاکستان جانے کا شوق تھا۔ ایک اسپتال کی منتظم اعلیٰ بننے کی آفر اس کے لئے بہت پُرکشش ثابت ہوئی۔ چوہدری دلاور نے یہ بھی کہا کہ رہنے کی جگہ کار کوٹھی سب کچھ ملے گی۔ ویسے اپنا گھر بھی ہے۔ معاوضہ کوئی مسئلہ نہیں، تمہیں تمام امور میں مکمل خود مختاری حاصل ہو گی.... مجھے کھٹکی تھی یہ بات کہ کیا وہاں اسپتال کا نظم و نسق سنبھالنے والا کوئی نہیں تھا کہ شیلی کو بلایا گیا۔ جسے کوئی تجربہ بھی نہیں انتظامی امور کا۔ آخر اس سے پہلے اسپتال کون چلا رہا تھا۔ اس کے علاوہ میاں۔ ٹرسٹ میں تو ہوتا ہے بورڈ آف ڈائریکٹرز، اس کا ایک چیئرمین بھی ہوتا ہے۔ شیلی کیسے منتظم اعلیٰ ہو گی اور عام طور پر ٹرسٹ کے اسپتالوں میں رضاکارانہ خدمات ہوا[illegible] ہے۔ ایسی کوٹھی کار کی شاہانہ مراعات تو اپنے ملک میں بڑے بڑے ڈاکٹروں کو حاصل نہیں ٹرسٹ کہاں سے دے گا منہ مانگا معاوضہ۔"

"آپ کا اندازہ بالکل ٹھیک تھا۔ دلاور نے اسے دھوکا دے کر بلایا اور مصیبت میں پھنسا دیا۔"

"میاں! میں دل کا مریض ہوں۔ شیلی مجھے بہت عزیز تھی۔ مجھے زیادہ مت دہلاؤ، کس مصیبت کا ذکر کر رہے ہو تم....؟"

میں نے کہا۔ "مجھے تو پیغام ملا تھا اس کا کہ شیخ صاحب کی خیریت دریافت کر لو اور انہیں بتا دو کہ سب ٹھیک ہے مگر سب ٹھیک نہیں ہے وہ بہت پریشان لگتی تھی۔ مجھے بھی تفصیل سے کچھ نہیں بتایا اس نے۔ کوئی بہت سنگین قانونی معاملہ ہے۔ بس آپ دعا کریں اس کے لئے یا چوہدری دلاور سے معلوم کریں۔"

"میرے پاس تو اس کا فون نمبر نہیں ہے۔ ہیلو....."

لیکن میں ریسیور رکھ چکا تھا۔ غیر ضروری تفصیلات میں جانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ جو بات میں معلوم کرنا چاہتا تھا وہ بات مجھے معلوم ہو گئی تھی۔

شیلی نے مجھ سے سو فی صد جھوٹ نہیں بولا تھا۔ اس کا چوہدری دلاور سے وہی رشتہ تھا جو اس نے مجھے بتایا تھا۔ وہ لندن میں نیورو فزیشن بھی رہی تھی۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ اپنی ماں کے متعلق بھی اس نے جو کچھ بتایا ہو گا سچ ہی بتایا ہو گا کہ اسے قتل کرنے والا دلاور تھا۔ شاید وہ سمجھتی تھی کہ اس کی کہانی پر آسانی سے اعتبار نہیں کیا جائے گا اور ہم اس کے بیان کردہ کوائف کی تصدیق ضرور کریں گے۔

اس حد تک غالب کا قیاس غلط تھا کہ شبلی نے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا تھا وہ سب کچھ بے بنیاد اور بے حقیقت تھا۔ غالب کو یقین تھا کہ نہ اس کا نام شیلی ہو گا اور نہ وہ دلاور کی بہن ہو گی اور نہ وہ لندن کی ڈاکٹر۔ اس نے کسی شیخ صاحب کے وجود کو بھی تسلیم نہیں کیا تھا۔ یہ سب چوہدری دلاور کی گھڑی ہوئی کہانی تھی۔

غالب کے یقین کے غلط ثابت ہونے سے مجھے کوئی خوشی حاصل نہیں ہوئی تھی بلکہ اس سے میرا اعتماد بحال ہو گیا تھا۔ خرابی شیلی کی نیت اور اس کے مقاصد میں تھی۔ جس کا میں اندازہ نہیں کر سکا تھا۔ خود شیلی نے اپنے بارے میں جو بتایا تھا وہ مجھے بھی حقیقت لگا تھا۔ میرا موقف یہ تھا کہ چوہدری دلاور اچھا ڈرامہ کرنے والا ضرور ہے مگر اس کے پاس کسی کہانی کار کا تخلیقی ذہن نہیں ہے اور وہ خیال آرائی کی بنیاد پر شیلی کو ایک ایسی داستان حیات کی پوری کتاب مرتب کر کے نہیں دے سکتا تھا جس میں جزئیات اور تفصیلات کے ساتھ زندگی بالکل جیتی جاگتی حقیقت محسوس ہو۔

مجھے یہ بھی ناممکن لگتا تھا کہ شیلی جیسی کوئی لڑکی دلاور کا پڑھایا ہوا سبق یوں رٹ لے اور ایسی بے مثل اداکاری کے ساتھ سنائے

کہ اس کے ماضی کا ہر ورق آپ بیتی محسوس ہو جگ بیتی نہ لگے۔ اس کی گزری ہوئی زندگی کے ماہ و سال اس آئینے میں اپنا عکس خود اپنی سچائی کا ثبوت بن کر پیش کرتے تھے۔ فلم کتنی بھی حقیقت سے قریب کیوں نہ ہو اس میں دیکھنے والی آنکھ کوئی نہ کوئی خامی پکڑ لیتی ہے۔ اسٹیج کے پرانے ایکٹر جو آغا حشر کے ایک ہی ڈرامے کے ڈائیلاگ مسلسل ایک ہی شو میں مہینوں دُہراتے رہتے تھے اور سین کے مطابق اداکاری میں ماہر ہو جاتے تھے وہ بھی بعض اوقات بھول چوک کا شکار ہو جاتے تھے اور نادانستہ طور پر ان کی اداکاری میں جھول آ جاتا تھا۔

شیلی نے کوئی غلطی نہیں کی تھی کیوں کہ اس نے کوئی غلط بیانی نہیں کی تھی۔ اس نے مجھے وہی بتایا تھا جو وہ اپنے بارے میں خود جانتی تھی۔ انسانوں کو سمجھنے اور ان کے کردار کو پرکھنے میں میرے مشاہدے اور تجربے کی کسوٹی نے مجھے دھوکا نہیں دیا تھا۔ فتور اس کی نیت کا تھا جو میں نہ دیکھ سکا اور یہ ناممکن ہے کہ کوئی کسی کے ذہن کو پڑھ کے بتا سکے کہ وہ کیا کرنے والا ہے۔

تازہ معلومات کی روشنی میں جو تصویر ابھر کر سامنے آئی تھی وہ افسوس کے جذبات اُبھارتی تھی۔ نفرت کے قابل شیلی نہیں تھی انسانی فطرت میں شامل ہوس کے جذبات تھے۔ شیلی کو خدا نے کیا نہیں دیا تھا۔ حسنِ بے مثال، اعلیٰ تعلیم، ذہانت، دولت اور عزت.... لیکن دلاور نے اس کے سامنے زیادہ پُرکشش جال پھیلا دیا۔ دلاور کے پاس کوئی آلہ نہیں تھا لیکن ایک شیطانی صلاحیت ضرور تھی جس سے وہ انسانوں کی کمزوری اور ان کی قوتِ مزاحمت کی پیمائش کر لیتا تھا پھر کسی تجربہ کار شکاری کی طرح ڈور ڈالتا تھا۔ جتنی بڑی مچھلی اتنی بڑی ڈور اور اتنا ہی پُرکشش نوالہ۔

سہ پہر ڈھلتے ہی مال روڈ پر گاڑیوں کی آمد بڑھ گئی تھی اور ایک رونق سے معمور شام بڑی تمکنت کے ساتھ اترنے لگی تھی۔ میں اس ماحول کا حصہ ہو کر بھی سب سے الگ تھا اور میری تنہائی کی رفاقت صرف انہی خیالات تک محدود تھی۔ شاید اب تک وہ سب کچھ ہو چکا ہو گا جو ہونا ہے۔ نقوی صاحب کا جسدِ خاکی۔ جو بڑی توپ چیز تھے۔ عام انسانوں کی طرح کورے لٹھے کے کفن میں قبر کی تنگی میں سمانے کے لئے تیار ہو گا اور سفرِ آخرت پر روانہ کرنے والے وہی ہوں گے جو ان کے اقتدار کو سلام کرتے تھے اور سرکاری پروٹوکول یا رسم دنیا نبھانے کے لئے ثواب کی خاطر یا اپنے انجام کے خیال سے وہاں پہنچے ہوں گے۔ ان میں وہ بھی ہوں گے جن کے لئے یہ غم کا نہیں شادمانی کا موقع ہو گا اور وہ نظروں ہی نظروں میں ایک دوسرے کو اپنی کامیابی پر مبارکباد بھی دے رہے ہوں گے کہ دیکھا! وہ کام کیا ہم نے جو رستم سے نہ ہو گا۔ بڑی توپ چیز بنا پھرتا تھا۔ ہم نے دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکا۔ سانپ مر گیا اور لاٹھی اپنے ہاتھ میں ہے۔ کل کوئی دوسرا سانپ پھن پھیلا کر سامنے آیا تو اس کا سر بھی کچل دیں گے۔ انشاء اللہ۔

پھر مجھے شیلی کا خیال آیا۔ اس کا لاوارث جسم کہاں ہو گا؟ کیا اب چوہدری دلاور اس سے خون کا رشتہ نباہے گا؟ اسے اپنی بہن تسلیم کرتے ہوئے اسے دنیا سے ایسے ہی رخصت کرے گا۔ جیسے ہم سب اپنے پیاروں کو کرتے ہیں؟ نہیں۔ وہ شیلی نہیں ایک آلۂ قتل تھی۔ دلاور قتل کرنے کے بعد اسے پھینک چکا تھا۔ ضائع کر چکا تھا۔ وہ تو اسے پہچانے گا بھی نہیں۔ ڈاکٹر شیلا خان؟ کون شیلا خان۔ نیورولوجسٹ؟ نہیں۔ میں نے تو یہ نام بھی نہیں سنا۔

شاید اسی چوہدری دلاور نے لندن میں شیلی سے رابطہ کیا ہوا تھا تو اس کا انداز بالکل مختلف ہو گا۔ مکاری اور عیاری اس کی بدذات کے دو نمایاں اوصاف تھے۔ شیلی کے سامنے وہ بالکل مختلف آدمی بن کے بیٹھا ہو گا۔ اس نے کہا ہو گا کہ شیلی۔ دیکھو میں تمہارا بڑا بھائی ہوں۔ تم لاکھ انکار کرو مگر خون کے رشتے کی حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ میں اپنی کوتاہی کو تسلیم کرتا ہوں کہ آج تک تمہاری خبر لینے نہیں آیا تھا۔ مجھے یہ بھی اعتراف ہے کہ تمہاری ماں کو میں نے قتل کیا لیکن وہ میری مجبوری تھی۔ تم کو بھی معلوم تو ہو گا کہ وہ کس قماش کی عورت تھی۔ اس عورت کو میں اپنی ماں نہیں تسلیم کر سکتا تھا مگر تمہیں اپنے باپ کی اولاد مانتا ہوں۔ میرا باپ مجبور تھا ورنہ تمہیں چھوڑ کے نہ جاتا۔ یہ تمہاری ماں تھی جس نے اسے جان بچا کے بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا۔ بالآخر اس نے اپنے شوہر کی ساری دولت ہتھیا لی اور اس شخص سے شادی کر لی جس سے اس کے دیرینہ مراسم تھے۔

حالات کیا تھے کیا نہیں تھے۔ یہ چوہدری دلاور کو بھی علم نہیں ہو گا یا اس نے کوشش کر کے معلوم کر لیا ہو گا۔ کسی انگریز عورت کا جو اپنی غلطی سے ایک انڈین کارپینٹر سے شادی کر بیٹھی تھی۔ اس معاشرے میں آزادی کے لئے کوشش کرنا بعید از امکان نہ تھا۔ یہ عین ممکن تھا کہ اس عورت نے ایک دیسی شوہر سے نجات حاصل کرنے کی کوشش میں کسی سے مدد لی ہو۔ سچ مچ ایسے حالات پیدا کر دیے ہوں کہ کالا آدمی بھاگ جائے۔ بعد میں سب کچھ اسی کو ملا تھا اور شاید دلاور نے معلوم کر لیا تھا کہ اس نے اپنے دیسی شوہر سے چھٹکارا حاصل کرنے کے بعد کس قسم کی زندگی گزاری تھی۔ شیلی کو دیکھ کے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی ماں بھی حسین ہو گی اور ایک ایسے معاشرے میں جہاں عورت پوری طرح خود مختار ہو۔ کسی حسین اور دولت مند بیوہ کا تنہا رہنا ممکن نہیں تھا۔ یہ روایات صرف مشرق سے منسوب ہیں جہاں آج بھی وفا شعار اور شوہر پرست بیویاں جوانی میں بیوہ ہو جاتی ہیں تو سفرِ حیات کے آخری لمحے تک صرف یادوں کو ساتھ رکھتی ہیں اور اپنی عفت و شرافت کا سرمایہ بحفاظت میدان حشر میں پیش کرنے کے لئے ساتھ لے جاتی ہیں تاکہ وہاں ان کے عزت مند مجازی خداؤں کا سر نیچا نہ ہو۔

اگر میرے مفروضات غلط نہیں تھے تو یہ سمجھا جا سکتا تھا کہ چوہدری دلاور کے پھیلائے ہوئے جال میں شیلی آسانی سے پھنس

گئی ہو گی۔ اس نے کہا ہو گا کہ چلو بھول جاؤ اس بدکردار عورت کو اور چلو میرے ساتھ۔ میں تمہارا بڑا بھائی بن کے تم سے معافی مانگنے آیا ہوں۔ تمہارے در پر سوالی بن کے پہنچا ہوں۔ مجھے مایوس مت لوٹاؤ۔ ایسے ڈائیلاگ تو وہ جذباتی اداکاری کے ساتھ کسی تیاری کے بغیر بول سکتا تھا۔ اس نے تنہائی کی بات بھی کی ہو گی کہ یہاں اب کون ہے تمہارا۔ واپس وطن چلو۔ یہی تمہارے اور میرے والد کی خواہش تھی۔ یہاں تم ملازم ہو۔ وہاں اسپتال تمہارا ہو گا۔ تم مالک کہلاؤ گی اور تم جیسے وہاں کئی ملازم ہوں گے۔ وہ ایک خیراتی شفا خانہ ہے لیکن تمہیں کسی چیز کی کمی نہ ہو گی۔

شیلی کو واقعی کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ اچانک قدرت کی طرف سے فیاضی کا مظاہرہ ہوا تھا۔ اس کا بڑا بھائی اسے اپنانے پہنچ گیا تھا۔ وہ رشتوں سے محروم نہ تھی اور حقیقی رشتوں کی منزل خود اس کے سامنے آگئی تھی۔ وہ اپنے باپ کی خواہش کے مطابق پاکستان جا کے غریبوں اور ضرورت مندوں کی خدمت کرنا چاہتی تھی اور ایک خیراتی اسپتال کی صورت میں اسے اپنی خواہشات کی تکمیل کے سارے اسباب میسر آرہے تھے۔ اسے خود مختاری حاصل ہو رہی تھی اور زیادہ سے زیادہ نیک نامی عزت اور ثواب کمانے کا موقع مل رہا تھا۔ پیسہ اس کے پاس پہلے بھی کم نہ تھا اور وہ خود بھی کما سکتی تھی۔ پاکستان میں اس جیسی نیورو فزیشن شاید ایک بھی نہیں تھی۔

لاہور پہنچنے تک شیلی مطمئن ہو گی کہ اس کی زندگی کا یہ نیا دور اس کی خواہشات کی بھرپور تکمیل ثابت ہو گا۔ وہ کسی سکندر بخت کے نام سے بھی واقف نہ ہو گی۔ یہاں پہنچنے کے بعد بھائی نے اسے بتایا ہو گا کہ ویسے تو سب ٹھیک ہے لیکن میرا تمہارا مشترکہ دشمن سکندر بخت ہے جو اس راستے کا معمولی کانٹا ہے اور اسے ہٹایا جا سکتا ہے۔ اس نے اپنے طور پر شیلی کو وزیر خاں کے بارے میں کچھ بتایا ہو گا کہ اسپتال اس کے نام پر کیوں ہے اور میں اس کی ملکیت کا دعوے دار ہوں۔

دلاور منفی پروپیگنڈے کا ماہر تھا۔ اس نے شیلی کے دماغ میں میرے خلاف زہر بھر دیا ہو گا اور کشتیاں جلا کے وطن آنے والی شیلی کی سوچ کو اس موڑ تک لے آیا ہو گا جہاں وہ بھائی کے نیک مقاصد کی آلۂ کار بننے پر بھی تیار ہو گئی۔ شاید دلاور نے خود اسے لندن سے فرار ہونے پر مجبور کیا ہو گا اور جب وہ غیر قانونی طور پر پاکستان پہنچی ہو گی تو دلاور نے اس کا پرتپاک استقبال کرنے کے بعد آہستہ آہستہ اس کے گرد سازش کا جال پھیلا دیا ہو گا۔ بالکل انجانے میں شیلی غلطیاں کرتی گئی جو اس کا جرم بن گئیں اور دلاور کے لئے اسے بلیک میل کرنا آسان سے آسان تر ہو تا گیا۔ ایک وقت وہ آیا کہ شیلی نے سکندر بخت کو شکار کرنے کے لئے اپنے شکاری بھائی کے ساتھ مل کے جال بچھانا منظور کر لیا۔

یہ سب میری قیاس آرائیاں تھیں۔ اصل حالات کچھ بھی

...ہوں۔ یہ ثابت ہو چکا تھا کہ شیلی نے کسی مجبوری کے تحت دلاور کا ساتھ دیا تھا۔ وہ ایسی لڑکی بہرحال نہیں تھی جو کسی غرض یا مفاد کی خاطر اس مجرمانہ کھیل میں شریک ہوتی جس کا انجام رسوائی بھی ہو سکتا تھا اور موت بھی۔ اس کے سابق شوہر نے تسلیم کیا تھا کہ وہ بری لڑکی نہیں تھی اور میں نے اس کی چند روزہ رفاقت میں یہی نتیجہ اخذ کیا تھا کہ ناگزیر مجبوری ہی اسے دلاور کا آلۂ کار بننے پر مجبور کر سکتی تھی۔ وہ خود نہ میری دشمن تھی نہ کسی کی بدخواہ۔ اس کے سابق شوہر نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ لندن میں اس کی خانہ بربادی کے ذمے دار یہی شیخ صاحب تھے جن کو وہ باپ کی جگہ سمجھتی تھی۔ پاکستان میں اسے ذلت کی موت مارنے والا وہ شخص تھا جسے شاید اس نے اپنا بھائی سمجھنے کی غلطی کی تھی۔

بد طینت اور بد باطن شخص کا انجام عبرتناک ہو تو کسی کو دکھ نہیں ہوتا۔ سینما ہال میں ولن کے المناک انجام پر تالیاں بجتی ہیں لیکن شیلی جیسی لڑکی کے یوں مارے جانے کا مجھے واقعی ملال تھا۔ اسے دلاور نے قتل کیا تھا۔ کسی کی آنکھوں پر جھوٹ کی پٹی باندھ کے اسے تباہی کے راستے پر دھکیل دینا اور کیا سمجھا جائے گا۔ راستہ جس کا اختتام موت کے تاریک اور اندھے کنوئیں میں ہو۔ دلاور نے اس کے دماغ میں نفرت کا زہر بھرا پھر اس کے ہاتھوں میں ... تھما کے کہا کہ جاؤ۔ اپنی خوشیوں کے اور خوابوں کی تعبیر کے ... دشمن کا کام تمام کر دو۔ یہ کام تم ہی کر سکتی ہو اور تمہیں یہ کرنا ہو گا۔ اس نے منفی انداز میں شیلی پر غلبہ حاصل کیا۔ جیسے ... عامل اپنے معمول پر حاصل کر لیتا ہے۔ اسے ہر طرف سے بلیک میل کیا اور محصور کر لیا پھر اس کے سامنے صرف ایک ہی راستہ رہ گیا اور شاید وہ مجبور ہو گئی کہ دلاور کے پلان کے مطابق چلے۔

اب وہ مر چکی تھی۔ اس کی موت کا دکھ تھا تو صرف مجھے۔ اس لئے کہ میں نے اسے قریب سے دیکھا تھا اور سمجھا تھا۔ صرف مجھے یقین تھا کہ وہ لڑکی بری نہیں تھی۔ وہ برائی کی دلدل میں اتر گئی اور اسی برائی نے اسے نگل لیا۔ غالب 'ناز و یا' رابطہ میں سے کسی ... میرے خیالات سے اتفاق نہیں کر سکتا تھا۔ ان کے نزدیک وہ ... بری تھی اور برائی پر اعتبار کرنا برا تھا۔

میں ایمانداری سے دل کو ٹٹولتا تھا تو مجھے شیلی کے خلاف نفرت کا کوئی جذبہ محسوس نہ ہوتا تھا۔ بے شک اس نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا اور اپنے بارے میں غلط بیانی کی تھی لیکن جس طرح اس نے میرا ساتھ دیا تھا اسے دیکھتے ہوئے میرا ذہن اسے مجرم تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ اگر وہ مجبور تھی اور دلاور کی آلۂ کار ... شاید وہ اس مجبوری کی دلدل سے نکلنا بھی چاہتی تھی لیکن وہ ... کی پوری سازش کا بھانڈا پھوڑتے ہوئے ڈرتی تھی۔ اس نے دلاور کے منصوبے کے مطابق میرا اعتماد حاصل کر لیا تھا۔ اگلے مرحلے میں شاید وہ اپنی مجبوری بھی بتا دیتی۔ یہ اعتراف کر لیتی کہ جو جھوٹ ... نے کہا یا کیا وہ دلاور کی سازش کا حصہ تھا اور وہ خود ایک سازش ...

شکار نہ ہوتی تو یہ سب نہ کرتی۔

مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ دلاور نے شیلی کی نیت کے فتور کو بھی تاڑ لیا تھا۔ اس کے شکاری کتے مسلسل شیلی کے تعاقب میں رہے تھے۔ اس کی نقل و حرکت پر نظر رکھتے تھے اور پل پل کی خبر دلاور کو پہنچاتے تھے۔ شاید دلاور کو شک ہو گیا تھا کہ شیلی جو شکار کرنے گئی تھی خود شکار ہو گئی ہے اور سکندر بخت کا جادو اس پر چل چکا ہے۔ وہ منحرف ہو کے دشمن کے کیمپ میں شامل ہو سکتی ہے۔ یہ خیال بھی اس کے لئے پریشان کن ہو گا۔

شیلی کی بغاوت اور سرکشی ناقابل معافی جرم تھا۔ دلاور اتنا بڑا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا کہ اس کی سوتیلی بہن اس کے دشمنوں سے مل جائے اور اس کی آلۂ کار بننے کے بجائے اس کے مخالفوں کی طاقت ہو جائے۔ ان حالات میں شیلی کی خودکشی کا راز بھی سمجھ میں آتا تھا۔ یہ خودکشی نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ صریحاً قتل تھا۔ نقوی صاحب کو مارنے والے بھی اس کے آدمی تھے اور پھر شیلی پر اس قتل کا الزام تھوپ کے اس کی جان لینے والے بھی وہی تھے۔

مسئلہ اور اس کا حل۔ نقوی صاحب کو مار دو۔ الزام شیلی پر ... اور پھر شیلی کو مار دو اور اس کو خودکشی کا کیس بنا دو۔ کیسی بہن اور کیسا خون کا رشتہ! اتنی خود غرضانہ سفاکی' بے غیرتی اور بد ضمیری کا مظاہرہ صرف چوہدری دلاور ہی کر سکتا تھا جس کی نظر میں مقاصد کتنے ہی مذموم کیوں نہ ہوں۔ رشتوں سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں خواہ وہ کتنے ہی مقدس کیوں نہ ہوں۔ رشتے توڑے جا سکتے ہیں۔ مقاصد نہیں چھوڑے جا سکتے۔ آفرین۔ ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند۔ (بڑا مردوں والا کام کیا تو نے!)

رفتہ رفتہ شام کے سائے تاریک ہونے لگے اور مال روڈ کی چہل پہل میں روشنی کی جگ مگ بھی شامل ہو گئی۔ اوپر سے یہ رنگ و نور کا ایک سیل رواں لگتا تھا۔ مرکری بلبوں کی دودھیا نیلی روشنی کی قطاریں۔ نیون سائن کے نارنجی اور جامنی رنگ۔ جلتی بجھتی روشنی کی تحریریں۔ بے آواز کاروں کی ہیڈ لائٹس اور شوکیسوں کو رنگین بنانے والی اسپاٹ لائٹس۔

میں بہت دیر سے ایک ہی جگہ ایک ہی پوز میں کھڑا ہوا تھا اور باہر دیکھنے کے باوجود کچھ بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ میری نظر کہیں اور تھی۔ خیال کہیں اور' بند کمرے میں اندھیرا در آیا تھا اور مجھے خبر نہ ہوئی تھی۔ میں نے گھڑی دیکھی تو سوا سات بجے تھے۔

لائٹ جلا کے میں نے فون اٹھایا اور کافی کا آرڈر دیا۔ میرا جسم تو کیا میرا دماغ بھی تھکن سے بے حال تھا۔ ایک منحوس دن کی جگہ پر آسیب رات نے لے لی تھی۔ قید تنہائی میں میرے لئے انتظار کا عذاب تمام نہیں ہوا تھا۔ شعور کے پس منظر میں ایک خاموش فلم کے مختلف مناظر بھی جیسے شہر خموشاں کی پرہول تاریکی میں منجمد ہو گئے تھے۔ نقوی صاحب کی دنیا سے رخصتی مکمل ہو چکی تھی اور میں

لاتعداد قبروں کے درمیان ایک تازہ گیلی مٹی کے ڈھیر کا تصور کر سکتا تھا جس پر پھول بھی تازہ تھے۔ صبح تک ان کی خوشبو اور رنگت بھی ساتھ چھوڑ جائے گی اور عناصر کی ترتیب ختم ہو گی تو زندگی کے اجزا کا انتشار شروع ہو گا۔

ماٹی کہے کمہار سے تو کیوں گوندھے موہے
اک دن ایسا آئے گا میں گوندھوں گی توہے

ہاں ایک لاش بے گور و کفن رہ جائے گی جس کا وارث سامنے نہیں آئے گا۔ کیا اس سے فرق پڑتا ہے؟ جسم زیر زمین ڈی کمپوز ہو جائے یا سرکاری مردہ خانے میں سڑ جائے۔ تقسیم ہو جائے اور تفتیش یا تحقیق میں صرف ہو کے کوڑے کی نذر کر دیا جائے۔

ویٹر دستک دے کر کافی اندر لایا تو میں نے اسے اسپرین لانے کو کہا۔ میرے سر کا درد شدید اعصابی دباؤ کا نتیجہ تھا۔ اب ویٹر کو اسپرین باہر سے لانی تھی۔ اس کی واپسی سے پہلے میں نے غسل کیا تو مجھے خاصا سکون ملا۔ کافی اب بھی گرم تھی۔ اسپرین نے مزید فائدہ پہنچایا اور میں کافی پی کے لیٹا تو مجھے بہت آرام ملا۔ میں نے ٹی وی آن کیا اور پھر بند کر دیا۔ اس پر کوئی مزاحیہ پروگرام چل رہا تھا۔ اسٹیج شو میں شریک خوش پوش اور خوش باش لوگ ہنس رہے تھے۔ مجھے یوں لگا۔ جیسے وہ سب بے حس اور خود غرض لوگ ہیں جن کو ذرا بھی خیال نہیں کہ رات کتنی سوگوار ہے اور نوحۂ غم میں نغمۂ شادمانی کتنی اذیت دیتا ہے۔ یہ ایک مضحکہ خیز اور احمقانہ خیال تھا۔ دنیا میں ہر روز' ہر لمحہ نہ جانے کتنے گھروں پر اجل شب خون مارتی ہے مگر وقت کا یہ کارواں تو ایسے ہی رواں رہتا ہے۔

ساڑھے آٹھ بجے فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ہمت کر کے ریسیور اٹھا لیا اور آواز بدل کے کہا۔ "ہیلو۔"

غالب نے کہا۔ "سکندر۔ کیا سو رہے تھے؟"

میں نے کہا "نہیں سو رہا تھا۔ کوئی خاص خبر؟"

"نہیں! نقوی صاحب کی تدفین ہو گئی۔"

"پوسٹ مارٹم ہوا تھا۔"

"ہاں' لیکن تفصیلات اخبار والوں کو جاری نہیں کی گئیں۔ اندر کی ایک اطلاع کے مطابق ڈاکٹر شیلی کے معاملے کو دبا دیا گیا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ نقوی صاحب کی موت میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں۔ انہیں زہر خورانی کے کیس میں اسپتال لایا گیا تھا تو وہ بے ہوش تھے اور کوما میں ہی انتقال کر گئے۔ ڈاکٹر اپنی پوری کوشش کے باوجود ان کی جان نہیں بچا سکے۔" غالب نے کہا۔

"اور۔ وہ جو' ان کی بیٹی نے کہا تھا۔"

"وہ ٹھیک تھا۔ مگر جیسے ہی پولیس کے اعلیٰ افسران پہنچے۔ انہوں نے تمام معاملات اپنے ہاتھ میں لے لئے اور پابندی عائد کر دی کہ ذاتی حیثیت میں کوئی بھی بیان جاری نہیں کیا جائے گا۔

اسپتال کی انتظامیہ نے پولیس اور اوپر والوں کی مرضی کے مطابق بلٹین جاری کیا اس میں نقوی صاحب کی موت کا سبب حرکت قلب کا بند ہو جانا بتایا گیا ہے۔"

"یعنی... طبعی موت؟"

"نہیں۔ طبعی موت تو نہیں۔ دل کے مریض تھے وہ۔ ان کا بلڈ پریشر بھی بہت ہائی رہتا تھا۔" غالب نے کہا۔ "ان کی خوراک میں شامل کئے جانے والے زہر سے الرجک ری ایکشن ہوا اور ASTHAMA جیسی کنڈیشن میں دل نے کام کرنا چھوڑ دیا جسے ڈاکٹرز CARDIC ARREST کہتے ہیں۔"

"کیا یہ پوسٹ مارٹم رپورٹ ہے؟"

"یہ پوسٹ مارٹم رپورٹ ہی بتا رہا ہوں لیکن غیر مصدقہ۔"

"ڈاکٹر شیلی کے خلاف قتل کا کوئی کیس نہیں؟"

"نہیں۔ اس کیس سے اسپتال کی بدنامی ہوتی تھی۔ پریس اور پبلک کو کیا بتایا جاتا کہ اتنی نگرانی کے باوجود یہ کیسے ہوا؟"

"کیسے ہوا تھا؟"

"ہونے والی بات تھی اسے کون روک سکتا تھا۔" غالب نے کہا۔ "میں فون پر سب نہیں بتا سکتا۔"

"کہاں سے بات کر رہے ہو؟"

"ایک اخبار کے دفتر سے۔ یہیں سے وہ ساری باتیں معلوم ہوئی ہیں جو پیچ ہیں نگران کی خبر نہیں بنے گی۔" غالب نے کہا۔ "تم باہر مت نکلنا۔ پولیس ایک دم الرٹ ہو گئی ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے میں اس کمرے میں قید رہوں گا؟"

"نہیں۔ صبح ہونے سے پہلے تمہیں دوسرے قید خانے میں منتقل کر دیا جائے گا جہاں تم امتناعی قوانین کے تحت تا حکم ثانی رہو گے۔" غالب ہنسا۔

فون بند ہو گیا اور میں سوچتا رہ گیا کہ اس سے شیلی کے بارے میں بات کروں یا نہیں۔ میں اس سے یہ تو پوچھ سکتا تھا کہ شیلی کی لاش کس کی تحویل میں ہے اور اس کو رسمِ دنیا کے مطابق کون سپرد خاک کرے گا۔ دلاور کی غیر انسانی بے حسی میرے لئے باعث اشتعال تھی۔ اہمیت تو اس کے لئے کسی زندگی کی نہیں تھی مگر ڈاکٹر شیلی سے اس کا کوئی تعلق ضرور تھا۔ اسی تعلق کو بنیاد بنا کے اس نے شیلی کو استعمال کیا تھا اور اب وہ مر چکی تھی تو اس سے یوں بے تعلق ہو گیا تھا کہ اسے دو گز کفن اور دو گز زمین دینے کا روادار نہ تھا۔

کیا پولیس نے اس کے بیگ سے برآمد ہونے والے پاسپورٹ اور امریکن ایکسپریس کے ٹریولرز چیک نہیں دیکھے ہوں گے؟ اگر دیکھے ہوں گے تو کیا ان سے معلوم نہیں ہو جائے گا کہ شیلی کون تھی۔ یہ تو بہت آسان تھا کہ پولیس لندن سے تمام معلومات حاصل کر لے۔ ایک فون کر کے میں نے اسپتال سے بہت کچھ معلوم کر لیا تھا اور اب باقی باتیں شیخ صاحب نے بتا دی تھیں۔

شیخ صاحب کا خیال آتے ہی مجھے افسوس ہوا۔ شیلی نے ان کے بارے میں عمداً غلط بیانی سے کام لیا تھا کہ وہ اسپتال میں پڑے ہوئے ہیں۔ ان کی بیوی قاتلانہ حملے میں ماری گئی اور وہ کوما میں ہیں۔ ظاہر ہے اس نے یہ جھوٹ اس لئے بولا تھا کہ نہ میں شیخ صاحب سے رابطہ کروں نہ کوئی اور ان سے بات کرے۔ وہ ظاہر کرنا چاہتی تھی کہ شکاری اس کے ہی نہیں شیخ صاحب کی جان کے بھی دشمن ہو رہے ہیں جب کہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ عین ممکن ہے کہ باہر جا کے وہ دلاور سے ملی ہو اور اس نے شیلی کو یہ پٹی پڑھائی ہو۔ وہ میرا اعتماد حاصل کر چکی تھی۔ یہ رپورٹ دلاور کے لئے حوصلہ افزا ہو گی۔ اس نے شیلی کو مزید ہدایات دی ہوں گی کہ آگے اسے کیا کرنا ہو گا۔ اس نے شیلی کو زہر بھی فراہم کیا ہو گا جو اسے اسپتال پہنچ کے نقوی صاحب کو دینا تھا اور اسپتال کے آئی سی یو وارڈ میں رسائی کا طریقہ بھی سمجھا دیا ہو گا۔

مشکل یہ تھی کہ بیکاری میرے لئے ذہنی پریشانی کے اسباب پیدا کر رہی تھی اور حقائق سے بے خبری نے مجھے قیاس آرائی میں اُلجھا دیا تھا۔ میں صرف فرض کر سکتا تھا کہ ایسا ہوا ہو گا یا یوں ہوا ہو گا۔ تصدیق کے بغیر یہ خام خیالی تھی اور میں وسوسوں کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے پر مجبور تھا۔ یقین کا راستہ نہ جانے کہاں تھا۔

میں بیڈ کے کنارے پر بیٹھا ہوا دانتوں سے اپنے ناخن کاٹ رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ یہ غالب نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے ابھی چند منٹ پہلے کسی اخبار کے دفتر سے بات کی تھی اور کسی کو میری یہاں موجودگی کا علم ہی نہ تھا پھر مجھے خیال آیا کہ ابھی میں نے کافی منگوائی تھی اس کے برتن میز پر رکھے ہوئے ہیں۔ یہ ویٹر ہو گا جو خالی برتن اٹھانے کے لئے آیا ہو گا۔

دروازہ کھولنے پر مجھ پر جیسے بجلی گری۔ میں جہاں جس پوزیشن میں کھڑا تھا اسی حالت میں پتھر کے مجسمے کی طرح منجمد ہو گیا۔ میرے سامنے رابعہ کھڑی تھی۔ وہی تصویرِ رعنائی، وہی اندازِ محبوبی۔ وہی فسوں ساز میں وہی انکار کی ادا۔ لبوں کے تبسم میں وہی اقرارِ وفا۔

اس نے آہستہ سے کہا۔ "کیا میں واپس چلی جاؤں؟"

میں چونکا۔ ابھی تک میں دروازے میں اس کا راستہ روکے کھڑا تھا۔ "کیا ایسے ہی جانے کے لئے آئی تھیں؟" میں نے ہاتھ پکڑ کے اسے اندر کھینچ لیا اور دروازہ بند کر دیا۔

اس نے نہ جانے کہاں سے وہی ساری نکال لی تھی جس کے شوخ نیلے رنگ اور زرد پھولوں سے میری یادوں کے سفر کا آغاز ہوا تھا۔ جب وہ پہلی بار جیل میں مجھ سے ملنے آئی تھی تو اس ساری میں تھی اور مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے اس بند تاریک کمرے کی دیواروں پر تاروں بھرا روشن آسمان پھیل گیا ہے اور وہ منظر آج بھی میرے تصور میں اپنی تمام تابناکی کے ساتھ زندہ تھا۔

رابعہ ساری کے ایک کونے کو انگلی پر لپیٹ اور کھول رہی تھی۔ "مجھے نہیں آنا چاہئے تھا نا یہاں...."

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "ہاں۔ آنا مجھے چاہئے تھا تمہارے پاس۔ تمہارا مجرم ہوں میں...."

اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "فضول باتیں مت کرو۔"

"تم خفا تو ہو نا مجھ سے...؟" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ہاتھوں میں دبا لیا۔

"خفا تو تم بھی ہو جاتے ہو۔" وہ مسکرائی۔ "یہ کون سی انوکھی بات ہے۔"

میں نے اسے کھینچ کر اپنے قریب کر لیا۔ اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا اور ..... "سچ رابعہ تم خفا نہیں ہو مجھ سے۔ نہیں۔ تم میرا دل رکھنے کو ایسا کہہ رہی ہو۔ میں نے دل دکھایا تھا تمہارا۔ میں بڑا گنہگار ہوں۔ میں نے جانتے بوجھتے یہ سب نہیں کیا تھا لیکن میں اپنی غلطی مانتا ہوں۔ مجھے معاف کر دو۔ تمہاری بدگمانی...."

رابعہ نے بڑی مشکل سے خود کو چھڑایا۔ "سکندر! ایسا مت کہو۔ کون کہتا ہے میں بدگمان ہوں تم سے۔ بھلا یہ ممکن ہے!"

میں نے اسے بیڈ پر بٹھا دیا اور خود گھٹنوں کے بل اس کے سامنے قالین پر بیٹھ گیا۔ آنسو خود بخود اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے تھے۔ یہاں آنے سے پہلے یقیناً اس نے نہ رونے کا عہد کیا ہو گا۔ اپنے آنسوؤں سے وعدہ لیا ہو گا کہ وہ اس کے عہد کو شکست نہیں دیں گے مگر وہ جذبات کا رکا ہوا سیلاب تھا جو ضبط کے سارے بند توڑ کے ہر عہد کو بہا لے گیا تھا۔

میں نے اپنے ہاتھوں سے اس کے رخساروں پر بہنے والے آنسوؤں کو صاف کیا۔ "تمہیں روتا دیکھ کے میرا احساسِ جرم بڑھ جاتا ہے رابعہ۔"

اس نے اپنی انگلیوں سے بالوں کو پیچھے کیا۔ "میں کہاں رو رہی ہوں، یہ آنسو تو بس ایسے ہی نکل آتے ہیں آنکھوں سے۔"

میں نے اس کی گود میں سر رکھ دیا۔ "میں بہت شرمندہ ہوں رابعہ۔"

"کس بات پر؟" اس کی انگلیاں میرے بالوں سے کھیلنے لگیں۔ "یہ جو کچھ بھی ہوا۔ محض غلط فہمی تھی...."

"ہمارے درمیان غلط فہمی کا کیا کام۔ تم مجھے سمجھتے ہو۔ میں تمہیں جانتی ہوں۔"

"پھر بھی۔ بہت کچھ ہو گیا جو نہ ہوتا تو اچھا تھا۔ تمہارا دل دکھانے کا نہیں سوچا تھا میں نے۔ کبھی نہیں...."

"محبت بڑی حاسد ہوتی ہے سکندر۔ شک کی پرچھائیں بھی برداشت نہیں کرتی۔" اس نے کہا۔ "میں پاگل ہو گئی تھی۔ حالانکہ میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ تم صرف میرے ہو مگر میں کیا کروں۔ اندر سے میں بہت کمزور ہوں۔ میرے دل میں ایک ڈر بیٹھا رہتا ہے۔ شاید ہر عورت کے دل میں ہوتا ہے۔ یہ ڈر کہ کہیں پانے سے پہلے میں تمہیں کھو نہ دوں۔"

"تمہیں بھروسا نہیں اپنے آپ پر...."

"بھروسا ہے۔ مگر شک کا درد تو چوروں کی طرح آتا ہے۔ اس سے بچنا آسان نہیں ہوتا۔ آدمی ہر وقت روشنی میں رہنا چاہتا ہے مگر کیا یہ ممکن ہے۔ سائے کے بغیر روشنی کا تصور بھی نہیں؟ محرومی کا خوف بھی محبت کے ساتھ ہے... مجھے غالب نے بتایا...."

"کیا بتایا؟"

"یہی.... کہ وہ سب میرے دماغ کا فتور تھا۔" وہ جھینپ کر ہنس پڑی۔

میں نے کہا۔ "تمہارے رویّے پر مجھے بہت غصہ آیا تھا.... مجھے بھی غالب نے بتایا کہ تم نے ایسا کیوں کیا تھا۔"

"تم ہر ایک پر اعتبار کرتے ہو۔ اس لئے کہ خود تم کسی کو دھوکا نہیں دیتے۔"

"مجھے بہت افسوس ہے اس بے وقوف لڑکی کے مارے جانے کا...."

"تمہیں افسوس ہے؟" رابعہ نے حیرانی سے کہا۔

"ہاں۔ وہ لڑکی بُری نہیں تھی۔ اس کی قسمت خراب تھی کہ بُرائی کی دلدل میں قدم رکھ بیٹھی۔" میں نے کہا۔ "خیر چھوڑو۔ یہ تو دنیا کا چلن ہے اور زندگی اسی کا نام ہے۔ تم بتاؤ کیسے پہنچ گئیں۔ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں چھپا ہوا ہوں۔ یہ بات صرف غالب کو معلوم تھی۔"

"اس نے مجھے بتا دیا۔"

"لیکن ابھی ابھی اس کا فون آیا تھا۔ اس نے کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا تمہارا۔" میں نے کہا۔ "مجھے تو اس نے سختی سے منع کیا تھا کہ نہ باہر جاؤں، نہ کسی سے بات کروں۔"

"میں تمہیں اپنے ساتھ لے جانے آئی ہوں۔ چلو اُٹھو۔"

"کہاں لے جاؤ گی مجھے آخر؟"

"اپنے ساتھ۔ اپنے گھر۔ ایک وہی جگہ ہے جو ابھی تک پولیس کی نظر میں نہیں ہے۔" رابعہ نے کہا۔ "سب یہی سمجھتے ہیں کہ میں منظر کے گھر میں ہوں۔"

"تمہارا یہ نیا گھر... کب تک محفوظ رہے گا۔ بالآخر معلوم ہو جائے گا کہ تم نے مجھے چھپا رکھا ہے۔ غالب نے کہا تھا کہ خانہ تلاشی کے وارنٹ کے ساتھ مجسٹریٹ چھاپے خود ماریں گے۔"

"آج اس کا کوئی امکان نہیں۔ میں نے معلوم کر لیا ہے؟"

"کل یا پرسوں پولیس نے مجھے تمہارے گھر سے برآمد کر لیا تو بلاوجہ تم بھی مشکل میں پڑو گی۔"

وہ ہنسی۔ "اتنا بے وقوف مت سمجھو مجھے۔ خطرہ ہوتا تو میں تمہیں ساتھ کیوں لے جاتی۔ ابھی کوئی دیکھنے والا نہیں ہے۔ بس ایک بار تم اندر پہنچ جاؤ پھر وہ دس بار بھی تلاشی لیں۔"

"کیا کرو گی آخر تم۔ جادو منتر سے ان کی آنکھوں کو اندھا کردو گی؟ یا مجھے کبھی مچھر بنا کے ماچس کی ڈبیا میں بند کردو گی۔"

"یہ تم خود دیکھ لینا کہ میں کیا کرتی ہوں۔ چلو اب باتوں میں وقت ضائع کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ گھر چل کے باتیں کریں گے۔"

دس منٹ بعد میں نے ریسپشن ڈیسک پر جا کے چیک آف کیا تو میرے بل میں لندن کی دو کالیں شامل تھیں۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میں نے کتنی دیر گفتگو کی تھی۔ عام شرح پر مجھے کال چارجز بہت زیادہ لگے لیکن میں مجبور تھا کہ ہوٹل کے ریٹ اور آپریٹر کے بتائے ہوئے ٹائم کے مطابق ہی ادائیگی کروں۔

باہر نکل کے میں نے کہا۔ "اب ٹیکسی لیں۔"

اس نے مسکرا کے مجھے دیکھا۔ "سکندر صاحب۔ یہ گاڑی آپ کی ہی ہے جس کو آپ اتنے غور سے دیکھ رہے ہیں۔"

"یہ سرخ فاکس ویگن۔ اسے میں غور سے نہیں۔ رشک سے دیکھ رہا تھا۔ یہ تمہاری ہے؟" میں نے کہا۔

"تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟"

"قطعی نہیں۔ میں حسد سے کباب ہو گیا ہوں۔" میں نے کہا۔ "ایسی ہی ایک لال فاکس ویگن پہلے بھی تھی تمہارے پاس۔ پرانا ماڈل تھا۔"

"جی۔ اس کو آپ نے بڑی کوشش اور ہمت سے کباڑ بنا کے ٹھکانے لگا دیا تھا۔ بڑی محنت سے تباہ کیا تھا۔"

"اسے بھی کردیں گے انشاء اللہ۔" میں نے بالکل نئے ماڈل کی گاڑی میں بیٹھ کے کہا۔ "بڑے رئیسانہ ٹھاٹھ ہیں تمہارے۔"

رابعہ نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ "ایک نئی زندگی کا آغاز ہے تو ہر چیز نئی ہونی چاہئے۔"

"نئی کوٹھی تو مفت میں مل گئی۔"

"مفت میں کیوں!" رابعہ نے خفگی سے کہا۔ "دلاور سستا چھوٹ گیا۔ دھوکے' فراڈ اور ناجائز قبضے کے دس کیس کردیتی میں تو اس کوٹھی کی مالیت سے دگنا ہرجانہ وصول کرتی۔"

"حیرت ہے تم وکیل ہو کے ایسی بات کرتی ہو۔ بی بی دیوانی مقدمہ نہ جانے کتنے سال چلتا۔ اتنا آسان نہیں تھا اس سے کچھ وصول کرنا۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔ بس وہ ڈر گیا کہ پبلک میں بدنامی ہوگی۔ کوٹھی پر قبضہ تو رکھ نہیں سکتا تھا وہ۔ اس نے کہا کہ کوٹھی لو اور میری جان چھوڑو۔ میں نے بھی کہا کہ اچھا جاؤ معاف کیا۔ حساب کتاب برابر۔ ویسے کوٹھی اس نے بڑی زبردست بنوائی تھی۔"

"اس نے بنوائی تھی یا چاندنی بیگم کے لئے اس کے پرستار نے' دلاور نے تو خالی زمین پیش کی ہوگی کہ یہ پلاٹ پڑا ہوا ہے۔ تم لے لو۔ حلوائی کی دکان پر نانا جی کی فاتحہ۔"

"اس کا کہنا یہی تھا کہ میرا بہت خرچہ ہو گیا۔"

"تم نے پوچھا نہیں حرامزادے سے کہ کسی اور کے پلاٹ پر اس نے یہ خرچہ کیوں کیا تھا۔ کیا اسے معلوم نہیں تھا کہ یہ غیر قانونی کام تھا؟"

"غیر قانونی چکر تو بہت لمبا تھا۔ اس کے بہت سے پہلو تھے۔ چاندنی بیگم پر عنایت تھی کہ اس عقل سے محروم پہلوان کے کندھے پر رکھ کے بندوق چلائی گئی تھی۔ چاندنی کا قتل اور اس کے شوہر۔"

"خاک شوہر۔ جیسی روح ویسے فرشتے۔ ایک طوائف کا کیا شوہر اور بوالہوس کی کیسی بیوی۔ دنیا اندھی نہیں ہے کہ اس نام نہاد رشتے کی حقیقت کو نہ سمجھتی ہو۔"

"مجھے ان معاملات سے کیا۔ جب میں یہاں نہیں تھی تو جو ہوا غلط ہوا لیکن اس کی ذمے داری مجھ پر نہیں آتی۔ بھاڑ میں جائیں سب میری طرف سے۔ زمین میری تھی۔ چاہیں تو اپنا محل اٹھا کے لے جائیں اور خالی پلاٹ چھوڑ دیں۔ یہ دلاور کے لئے مسئلہ ہو جاتا۔ میں نے اس کی وضاحت قبول کرلی۔"

"وضاحت یا پیشکش!"

"جو بھی تم سمجھو۔ اس نے کہا کہ مس رابعہ۔ مجھ سے غلطی ہو گئی تھی۔ میں معافی چاہتا ہوں۔ جرمانے کے طور پر یہ عمارت آپ کی۔ آپ کا کوئی نقصان نہیں ہوا۔ قانون کے چکر میں مت پڑیں اور میں نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ میں نے بات ختم کی۔ میں پوچھتی کہ یہ کیا چکر تھا۔ ایسا کیوں کیا تھا۔ ویسا کیوں کیا تھا۔ قانوناً یہ غلط تھا' وہ غلط تھا۔ نوٹس دیتی۔ کیس کرتی۔ سزا اسے کیا ہوتی۔ مجھے قبضہ ملنا مشکل ہو جاتا۔ میں نے خود کو پریشانی سے بچایا اور دلاور نے خود کو۔"

"چاندنی بیگم کے قتل اور پہلوان کی خودکشی کا کیس داخل دفتر ہو گیا؟"

"اور کیا ہو سکتا تھا۔ نہ مدعی نہ شہادت۔ حساب پاک ہوا۔" رابعہ نے کہا۔

"فرض کرو کل یہ مسئلہ کھڑا ہو کہ تمہارے مکان میں وہ کیسے رہتے تھے؟" میں نے کہا۔

"اوّل تو مسئلہ اٹھے گا نہیں۔ اٹھا تو میں نمٹ لوں گی۔ میرا اٹارنی تھا وقار یوسف۔ اس نے کرائے دار رکھے تھے۔ کرایہ نامہ ضروری نہیں لیکن پچھلی تاریخ میں بھی بنایا جا سکتا ہے۔"

"اور یہ مکان کس نے بنایا؟ تمہاری عدم موجودگی میں۔ اس کا نقشہ وغیرہ۔ کیا اخراجات ہوئے۔ ان کی تفصیل!"

"سکندر۔ قانون میں بہت کچھ ہے مگر دنیا کے معاملات ایسے ہی چلتے ہیں۔ ایک قانون ہو تو دس طریقے لوگ ایجاد کر لیتے ہیں اس قانون سے بچنے کے۔ بدنیتی سے میں نے کچھ نہیں کیا مگر خود کو بچانے کے لئے۔ کچھ کروں گی۔ تم بے فکر رہو۔ مجھے کوئی نہیں پکڑ سکتا۔ خود پکڑنے والوں کو کس نے پکڑا ہے آج تک۔ بیشتر سرکاری

ملازم جو پبلک سرونٹ کہلاتے ہیں اتنی جائیداد رکھتے ہیں کہ ان کی ساری عمر کی تنخواہ جوڑی جائے تب بھی مالیت کا دس فیصد بنے گی۔ کسٹم ہی نہیں۔ ریلوے' واپڈا' بینک' پی آئی اے' پولیس اور وزارت تجارت و صنعت۔ ورکس ڈپارٹمنٹ' جنگلات کا عملہ' شپنگ کارپوریشن' امپورٹ آفس۔ سب میں معمولی حیثیت کے لوگوں کی کوٹھیاں ہیں۔ بڑے بڑے کاروبار ہیں۔ یہ کون نہیں جانتا۔ حکومت جانتی ہے۔ عوام جانتے ہیں۔ عوام کے نمائندے جانتے ہیں۔ یہ سب کو معلوم ہے لیکن جاننے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ خرابی تو بڑھتی جارہی ہے۔"

میں نے کہا۔ "تمہاری کار تم سے بھی زیادہ خوبصورت ہے۔"

وہ ہنس پڑی۔ "مجھ سے زیادہ خوبصورت تو شیلی تھی۔"

میں نے آہ بھر کے کہا۔ "کیا فائدہ اس خوبصورتی کا جس کے ساتھ ایسی بدبختی اور نحوست ہو۔ ذلت کی موت ہو اور مر کے بھی رسوائی ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ تم سب اس کو ساری خرابی کا ذمے دار سمجھتے ہو اور اس کے لئے نفرت کے جذبات رکھتے ہو لیکن آج مجھے بہت سی ایسی باتیں معلوم ہوئی ہیں جو پہلے معلوم نہیں تھیں۔"

"چنانچہ تمہیں دکھ ہو رہا ہے۔"

"دکھ تمہیں بھی ہوگا رابعہ۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس کے ساتھ جو بھی ہوا وہ اپنی ہی نیت کا پھل سمجھا جا سکتا ہے لیکن چوہدری دلاور نے اسے دھوکا دیا اور ایسے حالات پیدا کردیے کہ وہ مجبور ہو گئی۔ اس نے کوشش کی تھی کہ مجبوری کی دلدل سے نکل جائے مگر اس وقت تک بہت دیر ہو گئی تھی۔ وہ اتنی بے بس تھی کہ کچھ نہ کرسکی اور دلاور نے اسے قتل کرا دیا۔"

"قتل۔ تم اس کی خودکشی کو قتل کہہ رہے ہو۔"

"ہاں۔ مگر اسے قتل ثابت نہیں کر سکتا۔" میں نے کہا۔

گاڑی اب پرانے راستے سے کراؤن سنیما کی طرف مڑ گئی تھی۔ رابعہ کی کوٹھی کے دروازے پر چوکیدار کھڑا تھا۔ اس نے دروازہ کھولنے سے پہلے کار کے اندر جھانکا' اس کے پاس ریوالور بھی تھا۔

رابعہ نے کہا۔ "ٹھیک ہے دین محمد۔"

"یہ کون ہیں بیگم صاحب جی؟" اس نے مجھے غور سے دیکھا۔

رابعہ نے کہا۔ "یہ میرے دوست ہیں سکندر بخت۔"

اس نے سر ہلایا اور پیچھے چلا گیا۔ پچھلے شیشے میں سے اس نے کار کے اندر نہ جانے کیا دیکھا اور پھر مطمئن ہو کے گیٹ کھول دیا۔

میں نے کہا۔ "یہ کس قسم کا چوکیدار ہے؟"

رابعہ مسکرائی۔ "اسے غالب نے سیکورٹی کے بارے میں سخت ہدایات دی ہیں کہ جب تک خود نہ پہچانو کسی کے لئے دروازہ مت کھولو۔ رابعہ کے ساتھ کوئی ہو تو اچھی طرح دیکھو کہ دوست ہے یا دشمن۔ بی بی اندر ہوں تو ہر آنے والے کا نام پوچھو۔ گاڑی کا نمبر نوٹ کرو اور اندر بتاؤ۔ چند افراد کے سوا جن کا نام حلیہ اسے بتا دیا گیا ہے۔ کسی اجنبی کو گاڑی اندر لے جانے کی اجازت نہیں۔"

میں نے کہا۔ "غالب نے تو حد کردی۔ کیا تلاشی بھی ہوتی ہے گیٹ پر؟"

"مشکوک افراد کی تلاشی بھی لی جا سکتی ہے باہر ہی۔ دین محمد ریٹائرڈ فوجی ہے اور ملٹری پولیس میں تھا۔ سیکیورٹی کا مطلب سمجھتا ہے۔" رابعہ نے کہا۔

میں اس کوٹھی میں پہلے بھی آچکا تھا۔ رابعہ نے اس کی تزئین و آرائش بدل دی تھی لیکن اسباب وہی تھے۔ ڈرائنگ روم میں مجھے کوئی تبدیلی نظر نہیں آئی۔

پرانے مکان کی زمین کا رقبہ دس مرلے تھا مگر نقشہ ایسا تھا کہ یہ ایک کنال کی کوٹھی لگتی تھی۔ ڈیزائن کی خوبصورتی کے علاوہ اس میں کشادگی کا احساس ہوتا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ طرز رہائش بدلتا ہے تو گھر کے نقشے بھی تبدیل ہوتے ہیں۔ پرانے گھروں میں چھوٹی سلاخوں والی کھڑکیاں تھیں جن کے چھوٹے چھوٹے مستطیل شیشے تھے۔ اب سلائیڈنگ پٹ والی المونیم کی کھڑکیاں تھیں جن میں لمبے اور بڑے بڑے ٹنٹڈ (TINTED) شیشے تھے۔ دہلیزیں اتنی ہی چوڑی ہو گئی تھیں جتنی دیواروں کی موٹائی تھی۔ حفاظت کے لئے باہر لوہے کی ڈیزائن والی گرل نصب کر دی گئی تھی۔ پرانے دروازے بہت بلند اور بھاری تھے۔ ان کے اوپر محرابی روشن دان تھے جن کے نصف دائرے میں مختلف رنگ کے شیشے لگے ہوتے تھے اور شیشوں کے پیچھے فریم کی کھڑکیاں ابھرتے سورج کی کرنوں کا تاثر دیتی تھیں۔ اب فلش ڈورز آگئے تھے جن میں جدید ڈور لاک تھے۔ اسی طرح چھت سے ذرا اونچے جو ہوا دان رکھے جاتے تھے وہ بھی غائب ہو چکے تھے' ان کی جگہ ائر کنڈیشنز یا ایگزاسٹ فین لے چکے تھے۔ بیڈ روم کے ساتھ باتھ روم کا تصور ناپید تھا۔ سارے کنبے کے لئے ایک باتھ روم گھر کے دور دراز حصے میں بنایا جاتا تھا۔ اب فلش وغیرہ نے اٹیچ باتھ کو ایک ضرورت بنا دیا تھا۔

مکان میں تین بیڈ روم تھے اور ڈرائنگ روم سب سے الگ تھا۔ تقریباً پورے گھر میں سینتھیٹک کارپٹ بچھا دیا گیا تھا جس کا رنگ بالکل تازہ گھاس جیسا گہرا سبز تھا اور آنکھوں کو تراوٹ دیتا تھا۔ گھر کی ساخت اور طرز آرائش پر یقیناً بہت پیسہ خرچ کیا گیا تھا مگر میں ابھی تک یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ چوہدری دلاور جیسا ہوشیار آدمی یہ حماقت کیوں کر بیٹھا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا ہوگا کہ یہ گاؤں دیہات نہیں جہاں زمیندار کسی پٹواری کے ساتھ مل کے کسی غریب کسان کی زمین ہتھیا لے۔ یہ شہر تھا اور زمین بھی ایک وکیل کی تھی۔ اس نے کیوں سمجھ لیا تھا کہ رابعہ اب کبھی واپس نہیں آئے گی اور زمین کا کوئی والی وارث اس قبضے کے خلاف نالش نہیں کرے گا۔ یہی سمجھا جا سکتا تھا کہ خود کو بہت عقلمند اور بہت طاقتور سمجھنے والا بھی بعض اوقات ایسی غلطی کر بیٹھتا ہے جو اس

کے گلے پڑ جاتی ہے اور اسے پیچھا چھڑانے کے لئے اپنی غلطی کا خمیازہ ایسے ہی بھگتنا پڑتا ہے۔

پورے مکان کا معائنہ فرمانے کے بعد میں نے کہا۔ "مس رابعہ بادل ناخواستہ میں آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ میری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی۔ اس کے برعکس تمہارے پرانے مکان کی تباہی میں بھی قدرت کی مصلحت پوشیدہ تھی۔ دیکھ لو اس پرانے مکان کے بدلے تمہیں اس نے کیا دے دیا۔"

"مگر وہ مکان میرا اپنا تھا......"

"خاتون۔ مکان کسی کے نہیں ہوتے۔ اینٹ چونے کے حصار ہوتے ہیں۔ بہت کم مکان ایسے ہوتے ہیں جن میں ایک کے بعد دوسری یا تیسری نسل بھی اپنی زندگی گزار سکے۔ اس سے پہلے ہی مکان بک جاتے ہیں۔ تقسیم ہو جاتے ہیں گروائے جاتے ہیں۔ ان میں رہنے والے دوسرے شہروں یا ملکوں میں کوچ کر جاتے ہیں۔ مکانوں میں کرائے دار آتے جاتے رہتے ہیں۔ آدمی جہاں آباد ہو وہ گھر ہوتا ہے اور یہ آج تمہارا گھر ہے۔"

"پرانے گھر سے میرے بچپن کی یادیں وابستہ تھیں۔"

"اس گھر سے جوانی کی اور پھر ہمارے بچوں کی یادیں منسوب ہوں گی۔ یہ تو آغازِ سفر ہے۔ آنے والے وقت کا ہر لمحہ ایک سنگ میل ہو سکتا ہے۔"

وہ تھوڑا سا شرمائی پھر اداس ہو گئی۔ شاید اس خیال سے کہ وہ وقت جس کا اسے انتظار ہے نہ جانے کب آئے گا۔ ابھی تو اتنے بڑے گھر میں اس کی رفیق وہی تنہائی تھی جس کے ساتھ وہ عمر کا نصف سفر تو طے کر چکی تھی۔ شاید نصف سے کچھ کم۔ احساس بڑی عجیب چیز ہے۔ بچپن اور جوانی کے پُر لطف ماہ و سال پر لگا کر اڑتے ہیں اور زندگی کا پہلا نصف حصہ احساسِ زیاں ہونے سے پہلے تمام ہو جاتا ہے۔ آخری ایام میں آدمی اپنی مجبوری' معذوری اور تنہائی کے ساتھ زندگی کا بوجھ ڈھوتا ہے اور وقت کے بے رحم ہاتھ اسے زبردستی آگے دھکیلتے ہیں۔ اس کے انجام کی جانب۔ وہ نئی دنیا کے ماحول اور نئے چہروں کے درمیان پرانا آدمی ہو جاتا ہے۔ بے مصرف اور بے وقعت۔

رابعہ نے کہا "یہ کس سوچ میں پڑ گئے؟"

میں نے اپنے خیالات کو چھپا لیا "سوچ رہا تھا کہ تمہارا پرانا گھر سلامت رہتا تو تم اسے ہرگز گرا کر اتنا جدید اور ایسا شاندار بنگلا نہ بنواتیں۔"

"ظاہر ہے۔"

"وقت کا ساتھ دو رابعہ! وقت کے ساتھ چلو۔ تبدیلی کو قبول کرو ورنہ تم پیچھے رہ جاؤ گی۔" میں نے کہا۔ "اپنے ماضی سے جذباتی طور پر زنجیر کی طرح بندھے رہنے والے ترقی نہیں کرتے' آثارِ قدیمہ صرف دیکھنے کے لئے ہوتے ہیں۔ رہنے کے لئے نہیں۔"

"ابھی تو بہت کچھ نہیں دیکھا ہے تم نے۔" وہ بولی اور آگے چل پڑی۔

"اب اپنی اور دیگر خواتین کی سب سے پسندیدہ جگہ دکھاؤں... کچن۔" میں نے ہنس کے کہا "میری اور تمہاری دادی پردادی یہ لکڑی کوئلے اور اُپلے جلاتی آئی تھیں۔ اگلی نسل نے ... انقلاب دیکھا۔ جب مٹی کے تیل والے چولھے آ گئے جن ... دھواں نہیں ہوتا تھا اور برتن کالے نہیں ہوتے تھے۔ ... دور ختم ہو گیا' اب گیس اور کوکنگ رینج ہیں لیکن کچن میں ... ہے جو آبا و اجداد کھاتے تھے۔ خاندانی نسخے کے مطابق دال ... گوشت۔ وہی پلاؤ' زردے' قورمے اور شامی کباب...... ار... یہ میں نے کیا کہہ دیا۔ زبان پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا' ... چوہے گھوڑوں کی طرح دوڑنے لگے ہیں۔"

رابعہ ہنسی "کھانا تو جناب یہاں نہیں مل سکتا۔"

مین نے کہا "تُف ہے اس شاندار کچن پر۔ مبارک ... دُھواں' وہی لکڑیوں والا چولہا جس پر آدھی رات کے وقت ... والے مہمانوں کے لئے بھی گرما گرم روٹیاں اُترتی تھیں۔"

"بابا' میں مذاق کر رہی تھی۔"

"بابا۔ کون بابا۔ ایک تو وہ ہوتا ہے جسے کہا جاتا ہے کہ معاف کرو بابا۔ جیسا کہ تم نے ابھی مجھ سے کہا۔ دوسرا ہوتا ہے ... بابا۔ جس سے بچوں کو ڈرایا جاتا ہے کہ چپ ہو جاؤ نہیں تو بڈھا ... آ جائے گا۔"

رابعہ کھلکھلا کر ہنسی "تم تیسری قسم کے بابا ہو' انگریز صاحب کے بگڑے بچوں کو دیسی آیا بابا کہتی تھی جس کی جمع تھی بابا لوگ۔ چلو اب اپنا کمرا بھی دیکھ لو پھر کھانا وہیں کھائیں گے۔"

"میرا کمرا۔ سب کمرے تو دیکھ لیے...." میں نے اس کے پیچھے چلتے ہوئے کہا "تم نے یہاں کچھ نہیں کیا۔ تشریف لانے کے علاوہ۔"

"یہ کارپٹ میں نے ڈلوائے ہیں۔ اس بیڈ روم کا سارا سامان بدلا ہے۔ جس میں چاندنی کا خون ہوا تھا اور اس کے پہلوان پرستار نے خودکشی کی تھی۔ اس کا رنگ تک تبدیل کرا دیا ہے میں نے۔"

"پھر بھی ان کی بدروحیں تو نہیں نکلی ہوں گی۔"

"سچ بتاؤں' مجھے بڑا ڈر لگتا ہے اس کمرے میں۔ میں نے اسے مقفل کر دیا ہے۔ گیسٹ بیڈ روم بنا دیا ہے۔"

"اچھی مہمان نوازی کی روایات ڈالی ہے جو آئے اسے بھوتوں کے حوالے کر دو۔ خود گزر جائے گا یا رات گزار کے بھاگے گا تو پلٹ کر نہیں آئے گا۔" میں نے کہا "نوکر نہیں رکھے تم نے؟"

"بس ایک خادمہ کی ضرورت ہے۔ منظر نے وعدہ کیا ہے کہ وہ کسی کو لائے گا۔ کوئی بیوہ ہے جس کا دس بارہ سال کا لڑکا بھی ہے۔ میری ضرورت کے لئے کافی ہیں۔" رابعہ نے اپنے بیڈ روم کی الماری کھولی۔

"چشم بددور' ملبوسات کی نمائش ہے۔ ناچیز کی رائے یہ ہے کہ آپ لباس سے نہیں لباس آپ سے حسین لگتا ہے۔"

"خوب چمک رہے ہو۔" رابعہ ہنسی اور الماری میں داخل ہو گئی۔

میں نے اسے کپڑے ہٹا کے وارڈ روب کی پچھلی دیوار میں کچھ کرتے دیکھا۔ ایک دم پچھلا حصہ دروازے کی طرح اندر کی جانب کھل گیا۔

"تشریف لایئے!"

میں نے حیرانی سے کہا "یہ دولت خانہ ہی نہیں عجائب خانہ بھی ہے۔"

"تم جیسے عجوبے جہاں رہیں گے۔ وہ عجائب خانہ ہی کہلائے گا۔" رابعہ اس دروازے سے نیچے اُترنے لگی۔

میں اس کے پیچھے گیا۔ اس عجوبے کو یعنی مجھے واقعی نیچے رکھا جائے گا۔ انڈر گراؤنڈ......"

رابعہ نے کہا "اپنے پیچھے دروازے کو لاک کر دو۔" میں نے دروازہ بند کیا تو کلک کی ہلکی سی آواز کے ساتھ ہی دروازہ لاک ہو گیا اب میں تصور کر سکتا تھا کہ باہر کی طرف سے وہ دیوار کا حصہ بن گیا ہو گا۔ ایک نظر میں کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا کہ وارڈ روب کے پیچھے دیوار نہیں لکڑی کا دروازہ ہے۔ اس کا رنگ و روغن ایسا تھا کہ کمرے کی دیواروں سے مل گیا تھا۔

میں نے نیچے اُترتے ہوئے کہا۔ "حیران تو میں پہلے بھی تھا اب پریشان بھی ہوں کہ چوہدری دلاور نے یہ تہ خانہ کیوں تعمیر کرایا تھا۔"

"یہ پُرانا تہ خانہ ہے۔ ہمارے گھر میں پہلے سے تھا۔"

"پُرانے گھر میں!"

"ہاں۔ اس زمانے میں یہ رواج تھا۔ ہندوؤں کے گھروں میں تہ خانے عام تھے۔ جہاں ایک کمرے میں بھگوان رہتے تھے۔"

"یہ انکشاف ہے میرے لیے کہ بھگوان آکاش پر نہیں پاتال میں رہتے تھے" میں نے کہا "مجھے یہ تہ خانہ پُرانا تو نہیں لگتا۔"

"اس کا رنگ و روغن نیا ہے۔ پہلے یہاں کباڑ بھرا رہتا تھا اور ہوا کی آمد و رفت نہیں تھی چنانچہ نیچے آ کر دم گھٹتا تھا۔ راستہ یہی تھا مگر اب میں نے اسے بڑی صفائی سے چھپا دیا ہے۔" رابعہ نے ایک بٹن دبایا۔

ایک جانی پہچانی سرسراہٹ سے میں نے اندازہ کر لیا کہ کہیں ایئر کنڈیشنر نے کام شروع کر دیا ہے۔ لائٹ بھی ذرا سی دیر کے لئے کم ہوئی تھی۔ "یہ اے سی بھی جدی پشتی ہے؟"

"یہ میں نے لگوایا ہے۔"

"اپنے قیدی کے لئے۔" میں نے کہا "بہت پُرتکلف قید خانہ بنوایا ہے تم نے۔"

"تم جو چاہو سمجھو لیکن تمہاری حفاظت کرنا ہم سب کی مشترکہ ذمہ داری ہے اور ہم نے مل کے طے کیا ہے کہ جب تک حالات کا یہ خطرناک دور گزر نہیں جاتا تم یہیں رہو گے۔"

میں نے کہا "زنجیریں ڈال کر رکھو تو اور بات ہے۔ ورنہ۔"

"ورنہ کیا۔ تم بھاگ جاؤ گے۔" رابعہ نے کہا "آرام سے بیٹھ جاؤ یہاں میں کھانا لے کر آتی ہوں۔"

"بازار سے؟"

"میں نے خود پکایا ہے۔ میں صرف وکیل ہی نہیں ہوں۔"

وہ لوٹ کے اوپر چلی گئی تو مجھے سچ مچ ایسا لگا جیسے میں مجرم ہوں' دہشت گرد ہوں' جان بچانے کے لئے چھپ کے رہنا میری مجبوری ہے اور میں اپنے لئے ہی نہیں دوسروں کے لئے بھی باعث خطرہ ہوں۔ بات صرف میرے احساس کی تھی ورنہ بارہ فٹ چوڑے اٹھارہ فٹ لمبے کمرے میں آسائش کے تمام لوازمات فراہم کئے گئے تھے۔ بیڈ بہت آرام دہ تھا۔ لائٹ بہت خوب صورت تھیں اور کارپٹ بہت قیمتی تھا۔ ایک طرف لکھنے کی میز تھی اور کتابوں کی الماریاں تھیں۔ چوہدری دلاور کا پڑھنے لکھنے سے اور کتابوں سے دور کا بھی رشتہ نہیں تھا' یہ انتظام رابعہ نے کیا تھا اور ظاہر ہے بڑی عجلت میں کیا تھا شاید گزشتہ چند روز میں غالب اور نازو کے ساتھ مل کے یہ طے کر لیا گیا تھا کہ روپوشی کے لئے مجھے ہرگز لندن نہیں جانے دیا جائے گا۔ انہوں نے آپس میں سارا پروگرام بنا لیا تھا کہ میں یہاں رہوں گا۔ پھر انہوں نے میری ضروریات اور خواہش کے مطابق یہاں ہر چیز فراہم کی تھی۔ کمرے کی دوسری دیوار کے ساتھ ایک کونے میں ٹی وی موجود تھا تو دوسرے کونے میں بالکل نیا خریدا ہوا ریڈیو گرام رکھا ہوا تھا اور اس کے نچلے خانوں میں ریکارڈ بھرے ہوئے تھے۔

آخر انہوں نے کیسے فرض کر لیا تھا کہ میں غیر معینہ مدت کے لئے اس قیدِ تنہائی کو قبول کر لوں گا؟ میں نے برہمی سے سوچا۔ کیا وہ مجھے زبردستی اس جیل میں رکھ سکتے تھے؟ یہ ناممکن تھا۔ بزدلی کے ساتھ جان کے خوف سے چھپ کر رہنا تو موت سے بھی بدتر ہے۔ اتنا ہی پیار ہوتا مجھے زندگی سے اور اتنا ہی کم ہمت ہوتا تو دلاور سے صلح کر لیتا۔ میں اتنا غصے میں تھا کہ کسی سے لڑنا چاہتا تھا۔ وہ رابعہ ہو' غالب ہو یا نازو۔ کوئی میرے سامنے آ کے مجھے بتائے کہ مجھ سے پوچھے بغیر انہوں نے یہ فیصلہ کیوں کیا تھا۔

ایک باغیانہ جذبے کے ساتھ میں اوپر چڑھ گیا اور الماری کے دروازے سے گزر کے بیڈ روم میں آ گیا۔ رابعہ کچن میں تھی اور میز پر کھانا لگا رہی تھی۔ چار افراد کے لئے چھوٹی سی گول میز کچن کے ایک حصے میں تھی۔ دوسری بڑی ڈرائنگ روم سے ملحق کھانے کے کمرے میں لگی ہوئی تھی جس پر بارہ افراد بیٹھ سکتے تھے۔

میں نے کرسی پر بیٹھ کے کہا۔ "میں اس اے کلاس جیل سے بھاگ آیا ہوں اور واپس جانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔"

رابعہ نے جیسے میری بات سُنی ہی نہیں۔ "غالب اور نازو بھی پہنچ رہے ہیں۔ کھانا ساتھ ہی کھائیں گے یہاں۔"

میں نے میز پر مکا مارا۔ "اچھا ہے وہ بھی آ جائیں۔ ان سے بھی پوچھنا ہے کہ یہ احمقانہ آئیڈیا کس کا تھا۔"

اسی وقت باہر کا دروازہ کھلا اور نازو سیدھی کچن کی طرف آئی۔ اس کے پیچھے غالب تھا۔ وہ بہت تھکا ہوا لگتا تھا۔

"اف' کیسی جان لیوا خوشبوئیں میرے حواس پر یلغار کر رہی ہیں۔ کتنی بڑی ٹریجڈی ہو گی اگر میں کھانے کی میز پر فوت ہو گیا۔" غالب نے کہا۔

میں نے کہا۔ "تمہاری فوتیدگی کا وقت تو آ گیا ہے۔ کھانا چھوڑ جاؤ دنیا میں کسی کے لئے۔"

"سکندر جب گیا دنیا سے تو دونوں ہاتھ خالی تھے مگر پیٹ تو بھرا ہوا تھا۔ بھوکا مرتا تو سکندر اعظم کون مانتا اسے۔ اور کھانا میں کس کے لئے چھوڑوں؟"

"تمہارے سوئم کی فاتحہ ہو سکتی ہے اسی کھانے پر....."

نازو نے گھبرا کے کہا۔ "کیسی باتیں کرتے ہو تم؟"

میں نے کہا۔ "لڑکی۔ ادھر آ کے بیٹھو۔ تم سے بھی خوفناک لڑائی لڑنی ہے مجھے۔"

غالب نے کہا۔ "بھوکے زیادہ دیر نہیں لڑ سکتے۔ کھا پی کے کچھ توانائی تو آ جائے پھر خوب لڑیں گے صبح تک۔"

"میں نے کہا۔ "بات یہ بھی ٹھیک ہے۔"

رابعہ نے ابھی پوری طرح کھانا سرو بھی نہیں کیا تھا کہ میں اور غالب اس پر ٹوٹ پڑے۔ گھر کی فضا میں ایک پر تحفظ اپنائیت آ گئی تھی۔ پہلی بار رابعہ کے اپنے گھر میں تھا اور اپنوں کے درمیان تھا۔ اس گھر کی ہر چیز پر ان لوگوں کی محبت تک سب پر میرا حق ملکیت تھا۔ زندگی کا ایک پر آشوب دن مجھ پر اپنی نحوست کا سایہ ڈالے بغیر گزر گیا تھا۔ اجل کے شکاری ہاتھ اس حفاظتی حصار سے گزر کے مجھ تک نہ پہنچ سکے تھے جو مجھ سے محبت کرنے والوں نے قائم کر رکھا تھا۔

جب رابعہ اور نازو ہمارے ساتھ آ کے بیٹھیں تو غالب نے مڑ کے پیچھے سے مجھے لات ماری۔ "یار یہ کیسا قورمہ ہے۔ لگتا ہے ڈیزل کا تڑکا دیا گیا ہے۔"

میں نے سرہلایا۔ "گوشت بھی پتا نہیں کس چوپائے کا ہے۔"

غالب بولا۔ "بریانی کے چاول تو بالکل بھوسے کی طرح ہیں۔"

"ٹھنڈے پانی میں ڈال کے نکال لئے گئے ہیں۔ انہیں کھانا لوہے کے چنے چبانے کے مترادف ہے۔" میں نے کہا۔ "کس ہوٹل سے منگوایا تھا کھانا مس رابعہ!"

رابعہ نے آنکھیں نکال کے کہا۔ "ہونہہ۔ کھانا میں نے پکایا ہے۔"

میں نے بوکھلاہٹ کا مظاہرہ کیا۔ "آپ نے! ابھی پہلے کیوں نہیں بتا دی تھی یہ بات۔"

غالب نے کہا۔ "ہاں۔ ہم سچ تو نہ بولتے۔"

میں نے کہا۔ "اگر آپ نے ایجاد کی ہیں یہ چیزیں تو بخشی کا اللہ۔ اور ماشاء اللہ۔ ذرا نام تو بتاؤ ان کھانوں کے۔"

"جو ہم قورمہ بریانی سمجھ کے کھانے پر مجبور ہیں۔" غالب نے میز پر مکا مار کے گہری سانس لی۔ "اتر گیا حلق سے لقمہ۔"

نازو نے اسے گھورا۔ "موقع ملا اور دونوں نے ایک ہی راگ شروع کر دیا۔"

"راگ بکواس ساڑھے تین تال میں۔ اسے بے وقت راگنی بھی کہتے ہیں اور یہ رات کے کھانے کے وقت گائی جاتی ہے۔" غالب نے کہا۔

کھانے کے بعد بھی ہم وہیں بیٹھے رہے۔ نازو نے برتن اٹھائے اور سنک میں دھونے لگی۔ رابعہ نے چائے رکھ دی۔

میں نے کہا۔ "مرزا جی۔ تم اسپتال گئے تھے؟"

"ہاں۔ میں نے آج پکا حفاظتی انتظام کر لیا تھا۔ نیا شناختی کارڈ بنوا لیا تھا۔ سرکاری ایکریڈیشن کارڈ تو پہلے بھی تھا میرے پاس جو سب سے بڑی سند ہوتی ہے وزارتِ اطلاعات و نشریات کی طرف سے صحافی ہونے کی۔" غالب نے کہا۔ "ورنہ پولیس تو کسی کو قریب نہیں پھٹکنے دے رہی تھی۔"

"کچھ معلوم ہوا..... یہ سب ڈرامہ کیا تھا۔ نقوی صاحب کے قتل کا۔"

"ڈرامہ کیسا۔" نازو پلٹ کے بولی۔ "تم سمجھتے ہو انہیں قتل نہیں کیا گیا؟"

میں نے کہا "ہاں میرا خیال ہے کہ انہیں اسپتال میں قتل نہیں کیا گیا۔ ان کی موت کا سبب وہی زہر ہو گا جو کسی نے ان کو گھر پر دیا تھا۔"

غالب نے سوچتے ہوئے کہا۔ "نہیں یار۔ اس زہر سے ان کی موت واقع نہ ہوتی۔ ڈاکٹروں نے ان کا معدہ واش کر دیا تھا۔ اور غالباً وہ ہوش میں بھی آ گئے تھے۔ رات کسی وقت انہوں نے کسی ڈاکٹر کو بلایا اور کہا کہ میں اپنا بیان ریکارڈ کرانا چاہتا ہوں۔ اس قسم کے بیان جو دفعہ ۱۶۴ کے تحت رضاکارانہ طور پر کسی مجسٹریٹ کی موجودگی میں دیے جائیں تو ان کی قانونی حیثیت ہوتی ہے مگر رات کے وقت مجسٹریٹ کہاں سے آتا۔ ڈاکٹر نے کہا کہ آپ صبح تک انتظار کر لیں لیکن نقوی صاحب کو شاید اندازہ تھا کہ انہیں مہلت نہیں دی جائے گی۔ بعد میں انہوں نے کسی نرس سے کہا کہ مجھے کہیں سے کوئی ٹیپ ریکارڈر لا دو۔ جس میں کیسٹ بھی ہو۔ نرس پہلے تو تیار نہ تھی پھر نقوی صاحب نے اپنے تکیے کے نیچے رکھے ہوئے پرس میں سے ایک ہزار دیے کہ یہ تمہارا انعام ہے۔ وہ گئی' وہاں ایک مریض کے ساتھ تیماردار کے طور پر رہنے والی کسی خاتون کے پاس چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر تھا۔ وہ خاتون ٹہلنے کے لئے باہر گئی ہوئی تھیں۔ یا باتھ روم میں تھیں اور مریض شاید سو رہا ہو گا کہ نرس چپکے سے ٹیپ ریکارڈر اٹھا لائی۔

"کسی کو کچھ بتائے بغیر؟" نازو نے کہا۔ "یہ تو چوری ہوئی۔"

"اور تمہیں یہ سب کس نے بتایا آخر؟" رابعہ نے سوال کیا۔

"اگر آپ لوگ خاموش بیٹھنے سے قاصر ہیں تو کہیں اور چلی جائیں۔" غالب نے انہیں ڈانٹا۔ "سوالات بعد میں کرنا۔ ہم صحافی ہیں کوئی گھسیارے نہیں۔ اندر تک کی خبر لا سکتے ہیں ہم خواہ خود اندر ہو جائیں۔"

میں نے کہا۔ "بیان جاری رکھئے۔"

"نقوی صاحب نے اس ٹیپ ریکارڈر کی مدد سے کوئی بیان ریکارڈ کیا تھا۔ کیسٹ تو ایک گھنٹے کا ہوتا ہے لیکن انہوں نے ایک سائڈ استعمال کی تھی اور اس کے آخری دس منٹ رہ گئے تھے۔ یعنی بیس منٹ تک بولتے رہے تھے وہ۔ پھر انہوں نے اسی نرس کو طلب کیا اور ٹیپ ریکارڈر اسے دے کر کہا کہ "دیکھو یہ انتہائی اہم پیغام ہے جو میں نے ریکارڈ کیا ہے۔ تم اس کیسٹ کی حفاظت کر سکتی ہو؟" نرس نے کہا "سر یہ کوئی مشکل کام نہیں۔" نقوی صاحب نے پوچھا کہ کیا کسی نے تمہیں ٹیپ ریکارڈ لاتے ہوئے دیکھا تھا۔" نرس نے تسلیم کیا کہ وہ ٹیپ ریکارڈر ایسے ہی اٹھا لائی تھی۔ "جس کا ٹیپ ریکارڈر ہے اسے بھی نہیں معلوم۔" نقوی صاحب مطمئن ہو گئے اور بولے۔ "ویری گڈ۔ مگر اسے معلوم ہو جائے گا۔" نرس نے کہا۔ "میں ابھی اسے واپس کر دوں گی۔ کہوں گی کہ میں ذرا دل بہلانے کے لئے لے گئی تھی۔ یہاں کوئی بھی نہیں تھا جس سے پوچھتی۔ زیادہ سے زیادہ سوری کہہ دوں گی۔" نقوی صاحب نے کہا۔ "مگر یہ کیسٹ اسے واپس نہیں کرنا ہے۔" نرس نے کہا۔ "یہ تو مسئلہ بن جائے گا سر۔" نقوی صاحب نے کہا۔ "اس سے شک بھی پیدا ہو گا کہ آخر تم نے کیسٹ کیوں نکالا۔ تم ایسا کرو کہ ٹیپ ریکارڈر غائب کر دو۔ اپنے ساتھ لے جاؤ اور کہیں چھپا دو۔ تمہاری ڈیوٹی کب ختم ہو گی؟" نرس نے کہا۔ "صبح آٹھ بجے سر۔" نقوی صاحب نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ صبح اسے بھی اپنے بیگ میں ڈال کے لے جانا۔" نرس پریشان ہو گئی۔ "سر۔ ایسے تو چوری کا مسئلہ بن جائے گا۔ کسی نے پکڑ لیا مجھے تو میری نوکری چلی جائے گی۔" نقوی صاحب نے کہا۔ "دیکھو لڑکی۔ اگر میں زندہ رہا تو نوکری کی فکر مت کرو۔ جیسی نوکری تم مانگو گی مل جائے گی۔ جہاں تم چاہو گی۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ ابھی تم ہی یہ کام کر سکتی ہو۔ چاہو تو ٹیپ ریکارڈر یہیں چھوڑ دو لیکن کیسٹ ضرور نکال لو اور اپنے ساتھ لے جاؤ۔ پھر انہوں نے نرس کو اپنا کارڈ دیا۔ اس کے پیچھے لکھا کہ "یہ نرس کیسٹ پہنچا دے تو اسے منہ مانگا انعام دیا جائے۔ احسان کی قیمت کوئی نہیں ہوتی اور مجھ پر اس کے احسان کا قرض ہے۔" انہوں نے پیغام کے نیچے اپنی بیٹی کا فون نمبر لکھا تھا۔ نرس نے اندازہ تو کر لیا تھا کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔ انہیں زہر دیا گیا تھا۔ یہ بھی نرس جانتی تھی۔ وہ سمجھ گئی کہ کیسٹ میں کوئی ایسی بات ہے جس کی قانونی اہمیت ہے۔ اسے علم تھا کہ نقوی صاحب کوئی ٹاپ چیز ہیں۔ وی آئی پی وارڈ میں ایرے غیرے نہیں آتے۔ اس نے کہا۔ "سر۔ میری ایک بہن ہے۔ اس نے بھی نرسنگ کا کورس کیا ہے۔ اسے میری جگہ لگوا دیں اور مجھے باہر بھجوا دیں۔ بہت ڈاکٹرز اور نرسیں سعودی عرب جا رہے ہیں۔" نقوی صاحب نے کہا۔ "میرا وعدہ ہے تم سے۔ اگر میں آفس گیا تو پہلا کام یہی کروں گا۔" نرس نے کہا کہ۔ "سر آپ تو اب ٹھیک ہیں۔ ایک دو دن میں آپ کو ریلیز کر دیا جائے گا۔" نقوی صاحب نے ایک آہ بھری اور کہا کہ "میرے لئے دعا کرنا۔ جاؤ اب وہی کرو جو میں نے کہا ہے۔ چوری کا الزام تم پر کیسے آ سکتا ہے جب تم کو کسی نے دیکھا ہی نہیں تھا اور موقع ملے تو بعد میں نظر بچا کے ٹیپ ریکارڈر واپس رکھ آنا جیسے اٹھا کے لائی تھیں۔ تم ہوشیار لڑکی ہو۔" وہ نرس ٹیپ ریکارڈر لے کر چلی گئی۔ اس نے کیسٹ نکال کے اپنے ہینڈ بیگ میں ڈال لیا اور ٹیپ ریکارڈر کو چھپا دیا۔ نرس کوئی پیشہ ور چور نہیں تھی۔ نوجوان لڑکی تھی۔ چاہتی تو ٹیپ ریکارڈر کو کھڑکی سے باہر سڑک پر پھینک دیتی۔ اس نے بے وقوفی کی اور اسے دواؤں کی الماری میں رکھ دیا۔ رات کے وقت تو کچھ نہیں ہوا۔ صبح ہوتے ہی وہ عورت ڈیوٹی آفیسر کے پاس پہنچ گئی۔ اس نے شکایت کر دی کہ کمرے میں سے میرا ٹیپ ریکارڈر چوری ہو گیا ہے۔ ظاہر ہے میڈیکل آفیسر نے پہلے اسٹاف کا دفاع کیا کہ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا۔ آپ پہلے اپنے کمرے میں ہی دیکھ لیں۔ عورت ذرا بددماغ تھی۔ شور کرنے لگی کہ آپ کا کیا خیال ہے۔ میں اپنے کمرے میں دیکھے بغیر آپ سے شکایت کرنے آ گئی ہوں۔ پہلے کی بات میں نہیں جانتی کہ کیا ہوا اور کیا نہیں ہوا۔ آج میرا ٹیپ ریکارڈر چوری ہوا ہے تو میں یہ بات میڈیکل سپرنٹنڈنٹ کو بھی ضرور بتاؤں گی خواہ ٹیپ ریکارڈر مجھے ملے یا نہ ملے مگر اسپتال میں جو چور ہے وہ پکڑا جانا چاہئے۔ یہ سب اس نرس نے بھی سنا لیکن وہ انجان بنی رہی۔ رات کے وقت ڈیوٹی پر وہ اکیلی نہیں تھی کہ اس پر الزام آتا۔ اس نے ڈیوٹی افسر کا ساتھ دیا اور عورت کو یقین دلایا کہ ہم معلوم کریں گے۔ ٹیپ ریکارڈ اسے مل جائے گا۔ وہ نہ ملا تو دوسرا دے دیا جائے گا مگر وہ عورت ٹیپ ریکارڈر کے نقصان پر نہیں اسپتال میں چوری پر برہم تھی۔ آٹھ بجے وہ جانے لگی تو اس نے خود ہی میڈیکل آفیسر آن ڈیوٹی سے کہا کہ "دیکھیں جی۔ بعد میں بلاوجہ میرا نام نہ آئے اس معاملے میں۔ آپ میری تلاشی لے لیں۔" ڈیوٹی افسر نے کہا۔ "ارے وہ پاگل عورت ہے۔ مل جائے گا اسے کمرے میں ہی ٹیپ ریکارڈر۔" مگر نرس نے جانتے بوجھتے اپنا بیگ کھول کر دکھا دیا اور یہاں اس سے ایک معمولی سی غلطی ہو گئی۔ ڈاکٹر نے اس میں کیسٹ دیکھ لیا۔ اس پر لتا کی تصویر تھی اور وہ فلم "پرچھے" کے گانے تھے۔ ڈاکٹر نے حیرانی سے کہا۔ "یہ کیسٹ کیوں لئے پھر رہی ہو اپنے ساتھ۔" آسان جواب یہ تھا کہ میں نے آتے ہوئے بازار سے خریدا تھا۔ اس نے

کہا کہ کسی نے میری بہن کے لئے دیا تھا کل مگر میں اسے دینا بھول گئی تھی۔ خیر یہ بات بھی چل جاتی لیکن بعد میں ڈاکٹر نے بتایا کہ وہ کچھ نروس ہو گئی تھی۔"

"بعد میں تفتیش ہوئی تھی؟"

"ہاں۔ یہ بڑے لوگ بعض اوقات عجیب ذہانت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ وہ عورت بھی کسی ڈی ایس پی کی بیوی تھی اور اسپتال میں اس کا بھائی داخل تھا۔ یہ لوگ خود تو ہوتے ہیں بڑے چور۔ سرکاری خزانے پر ڈاکے ڈالتے ہیں۔ انکم ٹیکس نہ دے کر۔ پبلک کو لوٹتے ہیں مگر ان کا تنکا بھی چوری ہو جائے تو یہ ہر داڑھی والے کو پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہی چور ہے۔ انا کا مسئلہ بن جاتا ہے کہ چور کی یہ مجال کہ کوتوال کی چیز چرائے۔ اس عورت نے آٹھ بجے کے بعد میڈیکل سپرنٹنڈنٹ اور ایک سینئر ڈاکٹر سے راؤنڈ کے وقت شکایت کر دی۔ پوچھ گچھ شروع ہوئی۔ معلوم ہوا کہ رات کے وقت وہاں چار نرسوں کے ساتھ ایک ڈاکٹر تھا۔ اس فلور پر۔ دو وارڈ وائف اور ماسی قسم کی چیزیں تھیں۔ وہ سب جا چکے تھے۔ چوکیدار کیا بتا سکتا تھا کہ کون اپنے ساتھ جاتے وقت کیا چیز لے گیا تھا۔ ٹیپ ریکارڈر بڑا ہوتا تو کسی کے ہاتھوں میں نظر آتا۔ چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر کسی کے ہینڈ بیگ میں تھا تو اسے کیا معلوم۔ وہ کسی باہر جانے والے کی تلاشی لینے کا مجاز نہیں تھا۔ نیچے یا اوپر کے فلور سے بھی کسی کے آنے جانے پر پابندی نہیں تھی اور وی آئی پی وارڈ میں ملاقاتی کسی وقت بھی آ سکتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ عام لوگوں کی طرح وہ مقررہ اوقات میں وقت کے پابند نہیں۔ جب کہ ایسی کوئی بات نہیں تھی مگر یہاں تو دستور ہی ایسا ہے کہ وی آئی پی کو قاعدے قوانین سے بالاتر سمجھ لیا جاتا ہے پھر آئی سی یو کے باہر برآمدے یا ٹیرس جیسی جگہ میں کرسیاں لگی ہوئی ہیں۔ وہاں ہر مریض کے ساتھ آنے والا ایک آدمی ٹھہر سکتا ہے۔

"پھر نقوی صاحب کی بیٹی وہاں کیوں نہیں رکی تھی؟"

"اچھا سوال کیا تم نے برخوردار۔" غالب نے کہا۔ "وہ رکنا چاہتی تھی لیکن اسے وقار یوسف زبردستی گھر لے آیا تھا۔ وہ وہاں بہ آواز بلند رونے سے باز نہیں آتی تھی۔ آنے جانے والے ڈاکٹروں کو پریشان کر رہی تھی۔ وقار یوسف نے گھر آنے کے بعد اسے ڈبل ڈوز دے کر سلا دیا تھا۔ خیر۔ اصل بات تھی ٹیپ ریکارڈر کی۔ چوری یوں پکڑی گئی کہ صبح کی شفٹ میں آنے والی نرس نے کوئی دوا تلاش کی اور دوا اسے ملی نہیں تو اس نے کیبنٹ کو اچھی طرح کھنگالا۔ پیچھے سے وہ ٹیپ ریکارڈر برآمد ہو گیا۔ اس نے وہ ڈیوٹی افسر کو پیش کر دیا اور اس نے بات ختم کرنے کے لئے خاتون کو دیا مگر خاتون تھی ڈی ایس پی کی بیوی۔ کڑوا کریلا نیم چڑھا۔ اس نے کہا کہ اس میں جو کیسٹ تھا۔ وہ کہاں ہے۔ ایک اور مسئلہ۔ ڈاکٹر سمجھدار تھا۔ اس نے سوچا کہ اسٹاف کی بدنامی ہوتی ہے بات کو لمبا کرنے سے۔ اس نے پوچھا کہ کون سا کیسٹ تھا۔ خاتون نے فرمایا

کہ قلم پر تیچے کا۔ ڈاکٹر نے یقین دلایا کہ وہ بھی مل جائے گا۔ نے کسی لڑکے کو پیسے دیئے کہ بازار سے قلم پر تیچے کا کیسٹ لا دو۔ وہ ایسا گیا کہ دوپہر کے وقت لوٹا اور درمیان میں آ گیا... بحران۔ اچانک نقوی صاحب کا انتقال ہو گیا۔ چند منٹ پہلے راؤنڈ ہوا تھا تو وہ بالکل ٹھیک تھے اور انہوں نے اصرار کیا تھا انہیں ڈسچارج کر دیا جائے۔ ان کے فزیشن نے انکار کر دیا کہ کچھ بلڈ ٹیسٹ ہوں گے اور رپورٹ دیکھنے کے بعد فیصلہ کیا جا... لیکن اس میں مزید دو دن بہرحال لگیں گے۔ اب اس کے بعد کچھ ہوا وہ واضح نہیں ہے بلکہ خاصا کنفیوژن ہے۔ میڈیکل رپورٹ۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ۔ پولیس رپورٹ اور چند... شاہدوں کی رپورٹ میں بہت زیادہ فرق ہے۔"

میں نے کہا۔ "کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ اگر ہم اس موضوع پر آپ کی رپورٹ بھی سن لیں مگر اطمینان سے بیٹھ کے۔"

"میں بھی تھک گیا ہوں بہت۔ آج سارا دن بھاگ دوڑ... اور مختلف ذرائع سے معلومات حاصل کرنے میں لگا رہا۔"

"نیچے چلتے ہیں۔" رابعہ نے کہا۔

میں نے احتجاج کیا۔ "تم کیوں مجھے اس جیل خانے میں ٹھونسنے پر مصر ہو۔"

"تمہارا دماغ خراب ہے۔ ہم تمہارے ساتھ ہوں گے... محفوظ جگہ ہے۔" رابعہ نے کہا۔

غالب نے اس کی بات سے اتفاق کیا۔ "رابعہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ حالات کا کچھ بھروسا نہیں۔ آج رات بھی یہاں چھاپا پڑ... ہے۔ منظر کی خانہ تلاشی تو ہو چکی؟"

"اچھا' کس وقت؟" رابعہ نے کہا۔

"ابھی دو گھنٹے پہلے۔ منظر نے خود اخبار والوں کو اطلاع دی... ایک مجسٹریٹ اور ڈی ایس پی کے علاوہ لیڈی سرچر ساتھ تھی... وارنٹ تھے۔ منظر نے پوری طرح تعاون کیا۔ اس شرط پر کہ جو چیز جہاں سے اٹھائی جائے گی وہیں رکھی جائے گی۔ ٹوٹ پھوٹ نہیں ہونی چاہئے اور غائب ایک پیسہ نہیں ہونا چاہئے۔ ڈی ایس پی اور مجسٹریٹ خود بڑے محتاط تھے۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں بندہ تلاش کرنا ہے۔ سوئی نہیں کہ ہم میزوں کی درازیں اور الماریوں کے خانے دیکھیں۔"

"انہوں نے میرے بارے میں پوچھا ہو گا؟"

"ہاں۔ منظر نے کہہ دیا کہ یہ میرا گھر ہے۔ ایک بیوی اور چند بچے۔ سولھواں ہو گا تو دکھا دوں گا۔ ان کے علاوہ یہاں کوئی نہیں رہتا۔ ظاہر ہے اس کے بعد پولیس یہاں آ سکتی ہے۔"

ہم سب باری باری الماری سے گزر کے نیچے چلے گئے۔ رابعہ نے کوٹھی کی ساری لائٹس آف کر دی تھیں۔ بیڈ روم لاک کر دیئے تھے اور چوکیدار کو سمجھا دیا تھا کہ کوئی بھی آئے۔ تم یہی کہنا کہ کوٹھی میں کوئی نہیں ہے۔ بیگم صاحبہ کل آئی تھیں۔ اس کے بعد

معلوم نہیں کہاں گئی ہیں۔ میں نوکر ہوں۔ وہ مجھے بتا کے نہیں جاتیں۔"

دوسری بار سب کے ساتھ مجھے وہ جگہ واقعی بہت محفوظ اور آرام دہ لگی۔ یہاں ایک فون بھی تھا جو گیٹ کے انٹر کام سے بھی منسلک تھا اور گھر کے دوسرے حصوں سے بھی۔

"داماد اور بیٹی جب ڈاکٹر شیلی کے ساتھ اسپتال پہنچے تو پہلے داماد ہی نقوی صاحب سے ملا۔ وہ ٹھیک تھے اور انہوں نے وقار یوسف سے ڈاکٹروں کے رویئے کی شکایت کی جو انہیں زبردستی دو دن تک وہاں لٹائے رکھنے پر بضد تھے۔ اس وقت وہاں ایک ڈاکٹر تھا جس نے ڈرپ دیکھی اور اس کے فلو یعنی قطرہ قطرہ ٹپکنے کی رفتار کو کچھ کم کیا۔ اس کے جاتے ہی نقوی صاحب نے داماد کو ہاتھ پکڑ کے اپنے پاس بٹھا لیا اور اس کے کان میں سرگوشی کی۔ "وقار مجھے لے چلو اپنے ساتھ۔ ابھی۔ اسی وقت۔" ظاہر ہے وقار نے مخالفت کی۔ "پاپا۔ جلدی نہ کریں۔ ڈاکٹرز ٹھیک کہتے ہیں۔" نقوی صاحب نے گھبرا کے کہا۔ "تم احمق ہو۔ سمجھتے کیوں نہیں۔ میں ایک منٹ نہیں ٹھہرنا چاہتا یہاں۔" وقار ان کی ذہنی کیفیت کو سمجھتا تھا۔ اسپتال میں کون رہنا پسند کرتا ہے اور نقوی صاحب جو چوبیس گھنٹے کا سرکاری افسر۔ جس نے کبھی بیماری میں بھی چھٹی نہ لی ہو۔ بستر پر بے کار لیٹے رہنا ان کے لئے ذہنی اذیت تھا۔ وقار یوسف نے سمجھایا کہ "میں ڈاکٹروں کو مجبور نہیں کر سکتا۔" پھر نقوی صاحب منت سماجت پر اتر آئے۔ وہ بے حد پریشان اور خوفزدہ لگ رہے تھے۔ "وقار۔ جو بات میں محسوس کر رہا ہوں۔ وہ تم نہیں سمجھتے۔ مجھے ایک سازش کے تحت یہاں لایا گیا ہے اور تم کیا سمجھتے ہو' یہ مجھے جانے دیں گے۔ نہیں۔ یا تو میں خود بھاگ جاؤں' خود اپنی مرضی سے یا تم مجھے لے جاؤ۔ ورنہ میں بتا رہا ہوں کہ میں لوٹ کے زندہ گھر نہیں جاؤں گا۔" وقار یوسف ان کی بات سن کے فکر مند ہو گیا۔ وہ ان کو ذہنی عدم توازن کا شکار نہیں سمجھ سکتا تھا۔ وہ جو کچھ کہہ رہے تھے بقائمی ہوش و حواس کہہ رہے تھے اور کسی حد تک وقار یوسف کو بھی اندازہ تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ اس نے کہا۔ "اوکے پاپا۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ ابھی آپ کو لے جاؤں لیکن پلیز آپ اپنی بیٹی کو کچھ مت بتایئے وہ مجھے کچھ نہیں کرنے دے گی۔" نقوی صاحب نے اسے کچھ اور بھی بتانا چاہا تھا کہ شیلی اندر آ گئی۔ وقار یوسف کے کہنے کے مطابق سوا دس بجے۔ اس کے ساتھ کوئی ڈاکٹر بھی تھا مگر وہ نہیں جس کو وقار نے ڈرپ کی رفتار کم کرتے دیکھا تھا۔

"ایک منٹ۔ کیا اس ڈاکٹر نے صرف فلو کو ایڈجسٹ کیا تھا یا ڈرپ میں کوئی دوا بھی ڈالی تھی سرنج کی سوئی سے پلاسٹک کی تھیلی میں کوئی بھی انجکشن براہ راست محلول میں شامل کر دیا جاتا ہے۔"

"وقار سے یہ سوال پولیس نے بھی کیا تھا اور میں نے بھی۔ اس نے پورے یقین کے ساتھ کہا کہ میری موجودگی میں اس نے

کچھ نہیں کیا تھا مگر وہ پہلے سے موجود تھا۔ اس کی ڈیوٹی تھی۔ وقفے وقفے سے وہ تمام پرائیوٹ وارڈز میں جاتا تھا۔ وی آئی پی وارڈ میں ہر مریض کو بہرحال زیادہ توجہ دینی پڑتی ہے۔ شیلی کے ساتھ آنے والا وہ فزیشن تھا جو نقوی صاحب کا معالج تھا۔ ان کی حالت کے مطابق کوئی دوا وہی کھلا سکتا تھا۔ ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر اس میں کسی ردوبدل کا مجاز نہیں ہوتا۔ وہ صرف ایمرجنسی میں مریض کو سنبھالتا ہے ورنہ دوا دینا نرسوں کی ذمے داری ہے۔"

"فزیشن نے شیلی کو کیسے اجازت دے دی تھی؟"

"اس نے وہی کہا تھا جو اسے سمجھایا گیا تھا۔ شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی کیوں کہ نقوی صاحب کی بیٹی اس کے ساتھ تھی۔ وقار کی موجودگی میں ڈاکٹر شیلی نے وہ چارٹ دیکھے جو بیڈ سائیڈ پر لگے ہوئے تھے۔ فزیشن سے ان کی حالت کے بارے میں بات بھی کی جو کوئی ڈاکٹر ہی کر سکتا تھا۔ ایک دوا سے اختلاف کیا کہ اس کے سائیڈ ایفیکٹ نسبتاً ضرر رساں ہیں اور دوسری متبادل دوا تجویز کی۔ فزیشن نے اعتراف کیا کہ اس کی بات ٹھیک ہے لیکن وہ دوا ابھی پاکستان میں دستیاب نہیں جو لندن میں استعمال ہو رہی ہے۔ اس کے بعد فزیشن چلا گیا۔ یہ بات ساڑھے دس بجے کی ہے۔ شیلی نے بعد میں کہا کہ یہ بات ناقابل فہم ہے کہ جو دوا ایک سال سے استعمال ہو رہی ہے اور جو ملٹی نیشنل دوا ساز کمپنی پاکستان میں ہر دوا بنا رہی ہے ابھی تک اس نے یہاں وہ دوا نہیں بنوائی۔ اگر مقامی طور پر نہ بنتی ہو تو بڑے بڑے کیمسٹ تو خود باہر سے ہر دوا امپورٹ کرتے ہیں یا اسمگل کر لیتے ہیں۔

"اس کی بات سے وقار یوسف نے بھی اتفاق کیا۔ اس نے کہا کہ میں فون کرتا ہوں۔ اپنے ایک کلائنٹ کو۔ وہ ہول سیل کیمسٹ ہے کہیں نہ کہیں سے منگوا دے گا۔ نقوی صاحب نے اسے روکنے کی کوشش کی کہ یہ سب مت کرو۔ وہی کرو جو میں نے کہا ہے لیکن وقار یوسف نکل گیا۔ نقوی صاحب کی بیٹی باہر ٹیرس میں کرسی پر بیٹھی تھی۔ وقار نے اسے بتایا کہ شیلی تو بڑی قابل ڈاکٹر ہے۔ اس نے ایک نئی دوا بتائی ہے اور میں پتا کرتا ہوں کہیں سے مل جائے۔ اس نے بیوی کو نقوی صاحب کی ضد سے بھی آگاہ کیا کہ وہ ڈاکٹروں کی مرضی کے خلاف اسپتال سے بھاگنا چاہتے ہیں مگر اس نے سازش یا خطرے کی بات گول کر دی کہ بیوی خوامخواہ پریشان ہو گی۔ یہ سب بتانے میں کتنا وقت لگا؟ وقار نے بہت غور کر کے بتایا تھا کہ شاید پانچ سے سات منٹ۔ اس نے یقین کے ساتھ کہا کہ دس منٹ نہیں ہو سکتے۔ اس عرصے میں نقوی صاحب کے پاس صرف شیلی تھی لیکن شیلی کا کہنا تھا کہ ایک نرس آ گئی تھی جس نے بلڈ پریشر اور ٹمپریچر وغیرہ لیا تھا اگر اس نے ڈرپ میں کچھ ڈالا تھا تو شیلی کی پیٹھ تھی اس نے نہیں دیکھا۔ شیلی باہر آئی تو نقوی صاحب کی بیٹی اندر گئی۔ ایک وقت میں ایک ہی وزیٹر اندر جا سکتا تھا۔ دس بج کر چالیس منٹ سمجھ لو۔ ایک منٹ آگے پیچھے ہو سکتا ہے۔ اس

نے جا کے دیکھا تو نقوی صاحب پر نزع کا عالم تھا۔ اس نے چیخ مار کر ڈاکٹروں کو بلایا۔ ڈاکٹر فوراً پہنچ گیا تھا مگر اس کے کچھ کرنے سے پہلے ہی نقوی صاحب فوت ہو گئے۔ اس وقت شیلی باہر تھی۔ غور طلب بات یہ ہے کہ اس نے کچھ کیا ہوتا تو کیا اس کے لئے یہ مہلت کافی نہیں تھی۔ وہ فرار ہو سکتی تھی مگر وہ وہیں بیٹھی رہی پھر نہ جانے کس نے چلاّ کے کہا۔ "پکڑلو اسے۔ یہ جعلی ڈاکٹر ہے۔" شیلی نے بتایا تھا کہ چلاّنے والا کمرے سے برآمد ہوا تھا۔ اس وقت نقوی صاحب کے گرد دو ڈاکٹر اور تین نرسوں کے علاوہ کتنے لوگ تھے۔ یہ کسی نے غور ہی نہیں کیا تھا۔ اچانک آئی سی یو کے گیٹ پر مامور سنتری نے شیلی کو پکڑ لیا۔ شیلی نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ اس شخص نے کہا۔ "اس نے قتل کر دیا ہے مریض کو۔ پولیس کو بلاؤ۔" شیلی نے چلاّ کے کہا "تم کون ہو۔ جھوٹ کہتے ہو تم۔" مگر وہ شخص تیزی سے کاریڈور میں غائب ہو گیا اور شیلی کو زبردستی اسٹور میں بند کر دیا گیا۔ وقار یوسف ٹیلی فون کرنے نیچے گیا تھا۔ اس کے واپس آنے تک ہڑبونگ مچ گئی تھی۔ اس نے پہلے تو بیوی کو سنبھالا جو پاگلوں کی طرح چیخ رہی تھی "اس نے میرے باپ کو مار دیا۔ وہ قاتل ہے۔ میں اسے جان سے مار دوں گی۔" بڑی مشکل سے وقار یوسف کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ وہ ڈاکٹر شیلی کا نام لے رہی ہے۔ پتا نہیں وقار یوسف کی بیوی سے یہ کس نے کہا تھا۔ شاید جو شخص کمرے سے نکلا تھا اور ڈاکٹر نظر آتا تھا اسی نے اندر بھی یہ شوشہ چھوڑا تھا۔"

میں نے بہت سکون محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "تمہیں یقین ہے کہ شیلی پر بے بنیاد الزام لگایا گیا تھا۔ میرا بھی یہی خیال تھا۔"

رابعہ اور نازو نے ایک ساتھ مجھے بڑی عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ ان نظروں میں ایک ہی سوال تھا۔ کیا ابھی تک تمہارے سر سے شیلی کا بھوت نہیں اُترا۔

غالب نے ایک آہ بھری۔ "حالات اور واقعات کی شہادت سے وہ بے گناہ ثابت ہوتی ہے دوست اور میں مخالفت کے جذبات میں اس پر کوئی الزام کیسے عائد کر دوں۔ میں نے تو حقائق اکٹھے کئے ہیں آج سارا دن۔ کچھ یہاں سے کچھ وہاں سے۔ میرے صحافی دوست بھی ہیں۔ ان سے تبادلۂ خیالات کا موقع ملا۔ ان کے اندر تک پُرانے سورس (SOURCE) ہیں۔ سب کرائم رپورٹر تھے۔ میں نے انہیں نازو سے بھی متعارف کرا دیا۔"

"بہت متاثر ہوئے ہوں گے۔" میں نے کہا۔

"نہیں برادر۔ سب فریفتہ ہو گئے۔" غالب نے فریادی لہجے میں کہا۔ "سالوں نے مجھے لفٹ دینا ہی چھوڑ دی اور نازو نے خاصی انفارمیشن لے لی۔ پھر میں نے اسے وقار یوسف کی بیوی کے ساتھ گھر بھیج دیا۔ اس کی حالت غیر تھی۔ ڈاکٹرز نے اسے پکڑ کر انجکشن لگا دیا تھا تاکہ وہ گھر پہنچ کر سو جائے۔"

"وہ راستے میں ہی سو گئی تھی؟" نازو نے دکھی دل کے ساتھ کہا۔

"اسپتال میں وقار یوسف کا رہنا ضروری تھا۔ اسے قانونی کارروائی کی تکمیل کرانی تھی۔ میں اس کے ساتھ رہا۔" غالب نے اپنی بات جاری رکھی۔ "دس منٹ میں پولیس آ گئی اور گیارہ بجے ڈاکٹر شیلی کو پولیس نے باقاعدہ رپورٹ لکھ کے گرفتار کر لیا۔ ساڑھے گیارہ بجے پوسٹ مارٹم کے لئے وقار لاش کے ساتھ ایمبولینس میں سرکاری اسپتال گیا۔ میں وہیں رک گیا۔ گیٹ تک میں بھی وقار کے ساتھ تھا اور ایمبولینس میرے سامنے روانہ ہوئی تھی۔ وقار بڑے حوصلے سے کام لے رہا تھا۔ میں نے اسے تسلی دی اور کہا کہ میں ابھی کچھ دیر میں پہنچتا ہوں۔ جب میں لوٹ رہا تھا تو ایک دم شور مچا اور میں نے کچھ لوگوں کو جمع ہوتے دیکھا۔ میری نظروں نے اوپر سے کسی کو گرتے دیکھا تھا۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ ڈاکٹر شیلی ہو گی۔ بس اپنا تجسس رفع کرنے کے لئے میں نے وہاں جا کے دیکھا تو شیلی کی لاش پکے فرش پر پڑی تھی۔ دیوار کے ساتھ جو تین فٹ چوڑا راستہ تھا وہ سیدھی اس پر گری تھی اور سر کے بل۔ نتیجہ یہ کہ اس کا سر پاش پاش ہو گیا تھا۔ مغز اور خون ہر طرف پھیلا ہوا تھا اور اس کی گردن بھی یوں مڑی ہوئی تھی کہ ایک نظر میں ہی میں نے سمجھ لیا کہ ٹوٹ چکی ہے۔ میں تیزی سے اوپر گیا۔ پولیس والے بھاگم بھاگ نیچے آ رہے تھے۔ میرے سوال کا جواب کسی نے نہیں دیا۔ اوپر ایک سب انسپکٹر کھڑا ہوا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ ملزمہ نے خودکشی کر لی ہے۔

میں نے کہا "کیسے خودکشی کر لی۔" وہ گرم ہو گیا کہ تم میرے افسر لگتے ہو کیا جو تمہیں بتاؤں۔ میں بھی گرم ہو گیا۔ میں نے کہا کہ میں تمہارے افسر کو رکھتا ہوں جوتی کی نوک پر۔ اوہ سوری قلم کی نوک پر۔ میں چشم دید گواہ ہوں پولیس کی تحویل میں ایک ڈاکٹر کی نام نہاد خودکشی کا۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ ایسے تمہارا جرم چھپ جائے گا۔ میں ابھی رپورٹ بھیجتا ہوں اس قتل کی۔ بس اس کی تو شاید پتلون ہی خراب ہو گئی۔ کہنے لگا۔ "سر! آپ تو خوامخواہ الزام لگا رہے ہیں۔ ہم تو بس تفتیش کر رہے تھے۔" میں نے کہا۔ "تفتیش میں اس کی گردن ٹوٹ گئی اور تم نے اسے یہاں سے نیچے پھینک دیا سر کے بل۔" دوسری بار شاید اس کی پتلون پیچھے سے خراب ہو گئی۔ کہنے لگا۔ "سر جی۔ قسم لے لیں جو ہم نے ہاتھ بھی لگایا ہو۔ ہم نے تو بس پوچھا تھا کہ تم نے نقوی صاحب کو کیسے مارا اور کیوں مارا۔" میں نے کہا "تھانیدار جی۔ میں جانتا ہوں تم لوگ کیسے پوچھتے ہو لیکن ایک تو وہ عورت تھی۔ دوسرے لیڈی ڈاکٹر تھی۔ تیسری بات یہ کہ وہ پاکستانی شہری ہونے کے علاوہ برطانوی شہری تھی۔"

"تیسری بار اس کی پتلون کہاں سے خراب ہوئی؟" میں نے کہا۔

رابعہ اور نازو ہنس پڑیں۔ "بھئی اس نے پتلون بدل لی ہو گی۔"

غالب افسردہ ہو گیا۔ "یار تم لوگ ہنس سکتے ہو۔ تم نے کچھ نہیں کہا۔ میں نے نقوی صاحب کی لاش بھی دیکھی تھی۔ پوسٹ مارٹم کے بعد لیکن شیلی کی لاش نے میرا نروس بریک ڈاؤن کر دیا تھا۔ یار ہمارے سامنے شیلی گھر سے گئی تھی۔ اس وقت کتنی پرسکون تھی۔ نازو نے مجھے بتایا کہ راستے میں وہ ہنس ہنس کے ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔ وہ ذرا بھی پریشان یا متفکر نہیں تھی۔ آئی سی یو میں جا کے کسی کو قتل کر دینا آسان کام تو نہیں تھا اور قتل بھی اس عورت کے والد کا جس کے گھر میں وہ رات بھر رہی۔ جس کی گاڑی میں وہ اسپتال جا رہی تھی۔"

"پھر تمہارا کیا نظریہ ہے؟ یہ سب کس نے کیا تھا؟"

"ایک ڈاکٹر یا ڈاکٹر کے بھیس میں کوئی شخص تھا جس نے موقعے سے فائدہ اُٹھایا۔ وہ اپنا کام کر کے نکل گیا اور جاتے جاتے شیلی کو مجرم بنا گیا۔ وہ مجرم تھی یا نہیں۔ یہ تو بعد میں معلوم ہو جاتا لیکن پولیس فوراً آ گئی اور انہوں نے اس کا کام تمام کر کے فائل بند کر دیا۔ اب کہاں کی تفتیش اور کیسی تفتیش! قاتل نے خودکشی کر لی۔ پولیس سب انسپکٹر میری بات سے اتنا پریشان ہوا کہ اس نے فوراً اعلیٰ افسران کو طلب کر لیا۔ ایک ایس پی اور ڈی ایس پی کے ساتھ ہی کرائم برانچ والے آ گئے۔ ان کے سامنے سب انسپکٹر نے یہ مؤقف اختیار کیا کہ ملزمہ کو اسٹور میں بند کیا گیا تھا اس نے اعترافِ جرم بھی کر لیا تھا کہ اس نے نقوی صاحب کو زہر دیا تھا۔"

"کون سا زہر۔ کیسے دیا تھا؟"

"پولیس کا کہنا ہے کہ وہ ڈاکٹر تھی۔ اس نے کوئی ایسی دوا ڈرپ میں ڈال دی جس سے ان کی موت واقع ہوئی۔ اتنا زود اثر صرف ایک زہر ہو سکتا ہے سائنائیڈ۔"

میں نے کہا۔ "لیکن پوسٹ مارٹم رپورٹ میں کچھ اور ہے۔"

"ہاں۔ اس میں تو لکھا ہے کہ اس دوا سے الرجی ہوئی۔ ان کا سانس لینا مشکل ہو گیا اور نتیجے میں ہارٹ فیل۔ یہ غلط ہے۔ ان کی موت فوری ہوئی تھی۔ نازو، وقار یوسف اور اس کی بیوی گواہ ہیں مگر پوسٹ مارٹم رپورٹ کو کیسے چیلنج کیا جا سکتا ہے۔"

"کیا جا سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"بعد میں سب کچھ ہو سکتا ہے مگر کون کرے گا؟ کیا حاصل ہو گا اس سے؟ کون پکڑا جائے گا، نہ کسی پر الزام آئے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ڈرپ کے محلول میں اس شخص نے جو ڈاکٹر بن کے پہنچا تھا۔ سائنائیڈ بھی شامل کیا ہو گا۔ بعد میں وہ ڈرپ بدل دی گئی۔ یقیناً اندر کا کوئی آدمی اس سازش میں شریک تھا جس نے صحیح وقت اور موقع دیکھ کے قاتل کی مدد کی۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں سائنائیڈ کا کوئی ذکر نہیں لیکن ڈرپ کے بارے میں یہ بتایا گیا ہے کہ اس میں فلاں فلاں دوا شامل تھی۔ فزیشن۔ ڈیوٹی آفیسر اور نرسنگ اسٹاف اس بیان پر قائم ہیں کہ انہیں نسخے کے مطابق دوا دی گئی۔ جس دوا کو موت کا سبب بتایا جا رہا ہے وہ ڈرپ کے محلول میں شامل تھی مگر یہ ذمے داری کوئی قبول نہیں کرتا کہ ایسا کس نے کیا تھا۔ الزام صرف شیلی پر آتا ہے جو پانچ سات منٹ اکیلی کمرے میں تھی۔ سب انسپکٹر نے مجھے بتایا کہ تفتیش کے دوران ملزمہ نے اعترافِ جرم نہیں کیا تھا لیکن یہ تو سب مجرم کرتے ہیں۔ اس نے کہا تھا کہ اس وقت ایک نرس آئی تھی۔ وہ معمول کے مطابق ٹمپریچر وغیرہ لے رہی تھی اس لئے شیلی نے توجہ نہیں دی۔ شاید وہی کچھ کر گئی تھی مگر اسپتال کے عملے کا کہنا ہے کہ اس وقت کوئی اس کمرے میں نہیں گیا۔ ٹمپریچر اور بلڈ پریشر دو دو گھنٹے کے وقفے سے لیا جا رہا تھا۔ آٹھ بجے کے بعد دس بجے لیا گیا تھا پھر بارہ بجے لینا تھا۔ دس بج کر پینتیس یا چالیس منٹ پر ان کے چارٹ میں کوئی اندراج نہیں ہوا۔ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ دس بجے کی کیفیت موجود ہے۔ ظاہر ہے شیلی کی بات پر یقین کون کرتا۔ میں نے تین چار کرائم رپورٹرز کے گھر فون کر دیئے تھے وہ سو رہے تھے مگر میری بات پر فوراً اسپتال پہنچ گئے۔ ان کے سامنے ایس پی نے کہا "ملزمہ کو یقین تھا کہ اسے کوئی نہیں بچا سکتا۔ اس کا جرم تو پہلے ہی ثابت تھا۔ چشم دید گواہ بھی تھے۔ اسے جیسے ہی موقع ملا وہ اسٹور کے دروازے سے نکل بھاگی۔ سب انسپکٹر نے اسے پکڑنے کی کوشش کی مگر وہ اُلٹی لٹک کے گر گئی۔" میں نے سوال کیا کہ۔ "عینی شاہد کون ہیں؟" تو ایس پی نے جواب دیا کہ۔ "ہم عدالت میں پیش کریں گے۔" میں نے کہا۔ "اب کس کے خلاف چالان پیش ہو گا عدالت میں؟" اس نے کہا کہ "نقوی صاحب کی موت کی عدالتی تحقیقات تو ہوں گی۔" اس نے مزید سوالات کا جواب دینے سے انکار کر دیا۔ شیلی کی لاش بھی اٹھوا لی گئی تھی اور ساڑھے بارہ بجے پوسٹ مارٹم کے لئے پہنچا دی گئی۔ میں اور چند دوسرے کرائم رپورٹرز کو میں نے شیلی کے بارے میں آف دی ریکارڈ بہت کچھ بتا دیا تھا۔ میرے ساتھ ہی سرکاری اسپتال بھی پہنچے۔ ہم نے پوسٹ مارٹم رپورٹ دیکھی تو نہیں مگر ہمیں معلوم ہو گیا کہ اس میں کیا لکھا گیا ہے۔ ایک بجے نقوی صاحب کی میت گھر بھیج دی گئی۔ میں وہیں موجود رہا۔ میں شیلی کی پوسٹ مارٹم رپورٹ دیکھنا چاہتا تھا مگر پوسٹ مارٹم نہیں ہوا۔ پتا چلا کہ اعلیٰ حکام کی مداخلت پر خصوصی تفتیشی ٹیم بنائی گئی ہے۔ اس میں وہی ایس پی اور ڈی ایس پی تھے اور وہی سب انسپکٹر۔ انہوں نے کچھ بتانے سے صاف انکار کر دیا۔ یہ بھی نہیں بتایا کہ ملزمہ کے پاس سے شناختی دستاویزات ملی ہیں تو ان سے کیا ثابت ہوتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "کیا تم نے آف دی ریکارڈ یہ بھی بتا دیا تھا کہ شیلی اپنے چوہدری دلاور کی سوتیلی بہن تھی؟"

"ہاں، مگر آف دی ریکارڈ جو بات کی جائے وہ اہم ہو۔ تب بھی عام نہیں کی جاتی۔ اخلاقی طور پر ہم رازداری کے پابند ہوتے ہیں۔ ہاں، اپنے طور پر کوئی اس کیس پر کام کرنا چاہے اور کچھ معلوم

کرے تو اس کی مرضی لیکن مجھے معلوم ہے یہ کوئی نہیں کرے گا۔ اول تو اس سے کچھ حاصل نہیں پھر یہ کہ اپنے چوہدری صاحب یقیناً صحافی برادری کے بہت سے لوگوں کا منہ بند کر دیں گے۔ جن کا کام ہی بلیک میلنگ پر اپنی صحافت کی دکان چلانا ہوتا ہے۔ سنجیدہ قسم کے صحافی اس میں دلچسپی نہیں لیں گے۔"

"یہ تو بڑی غلط بات ہے۔"

"صحیح بات کرنے سے کسی کو پریشانی کے سوا کیا ملے گا۔ پولیس کے مؤقف کو۔ ڈاکٹروں کے مؤقف کو اور جو عینی شاہد لائے جائیں گے ان کے مؤقف کو غلط ثابت کرنا آسان نہیں ہوگا۔ سب سے دشمنی لو وہ بھی بے سبب۔ اصل مجرم کبھی سامنے نہیں آئے گا۔"

"میں اور تم جانتے ہیں کہ اصل مجرم کون ہے۔"

"ہم ایک ذاتی وجہ رکھتے ہیں۔" غالب نے کہا۔ "میں نے اسپتال سے نقوی صاحب کے قیام کی میڈیکل فائل نکلوالی ہے۔ وہ بڑی دلچسپ اور مختلف کہانی کہتی ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ جب انہیں داخل کیا تو ان کی کیا کیفیت تھی۔ پھر کیا کیفیت ہوئی اور کیا علاج ہوئے۔ یہ سب ہے۔ گڑبڑ ہے گزشتہ رات کے ریکارڈ میں۔ ایک خون کی رپورٹ کے مطابق ان کے خون میں کاربن ڈائی آکسائڈ کی مقدار ساٹھ فیصد پائی گئی۔ یہ خصوصی ٹسٹ ہے جو ہر لیبارٹری میں نہیں ہوتا۔ ایسی کیفیت میں مریض کو بہت بے چینی اور غنودگی میں ہونا چاہئے جب کہ نقوی صاحب بالکل ٹھیک تھے۔ مزید یہ کہ انہیں آکسیجن نہیں دی جا رہی تھی۔"

"تمہارا مطلب ہے رپورٹ غلط ہے۔"

"بوگس رپورٹ ہے۔ اس کے مطابق صبح چھ بجے نقوی صاحب کی حالت غیر اطمینان بخش قرار دی گئی ہے۔ یہ لکھا ہے کہ ان کے ذہن پر اثر ہے۔ وہ بے ربط باتیں کر رہے ہیں اور ان کا رویّہ جارحانہ ہے۔ یہ سب بکواس ہے پھر آٹھ بجے اس میں اندراج ہے۔ آکسیجن کی کمی سے یادداشت متاثر ہوئی ہے اور وہ بے سروپا گفتگو کر رہے ہیں۔ ان کو ILLUSIONS ہو رہے ہیں یعنی جو بات نہیں ہے وہ محسوس ہو رہی ہے۔ وہ خیال کو حقیقت سمجھ رہے ہیں اور تصور سے دھوکا کھا رہے ہیں۔ آوازیں سن رہے ہیں اور غیر موجود چیزیں دیکھ رہے ہیں یعنی HELLUCINATIONS میں مبتلا ہیں۔ اس حساب سے ان کی دوائیں بھی لکھی گئی ہیں۔

"دوائیں تو ان کا فزیشن تجویز کرتا تھا۔"

"یار اسے جو بتایا جائے گا وہ اسی کے مطابق دوا لکھے گا۔ وہ خود دوا نہیں دیتا اور انحصار کرتا ہے نرسوں کی رپورٹ پر۔ نقوی صاحب کا بلڈ پریشر' ٹمپریچر وغیرہ سب غلط لکھا گیا تھا۔ پہلے سے اسباب بنائے گئے تھے۔ ان کا خوف بے جا نہیں تھا۔ ایسے وقت میں آدمی کی چھٹی حس بھی رہنمائی کرتی ہے اور خطرے کی گھنٹی بجا دیتی ہے۔ نقوی صاحب تو گرگ باراں دیدہ آدمی تھے۔ انہیں اپنا انجام سامنے نظر آ رہا ہوگا۔ اب وقار یوسف روتا ہے کہ میں نے ان کی بات کیوں نہیں مان لی تھی۔ اسپتال میں ان کو اس دنیا سے رخصت کرنے کا پورا انتظام مکمل تھا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ لوٹ آتے تو بچ جاتے۔ شاید کچھ مہلت انہیں اور مل جاتی لیکن بس ان کا وقت پورا ہو گیا تھا۔ افسوس صرف اس بات کا ہے کہ قتل کا الزام شیلی پر آیا اور پھر اسے بھی قتل کر دیا گیا پھر سب جانتے ہوئے بھی کچھ نہیں کر سکے۔ اب میں اسپتال کے ریکارڈ کو چیلنج کروں تو پہلے تو یہ سوال اٹھے گا کہ میرے پاس یہ ریکارڈ آیا کیسے۔ ظاہر ہے میں نے تو فوٹو کاپی اسمگل کروائی تھی پھر اس ریکارڈ' پولیس کے بیانات اور پوسٹ مارٹم رپورٹ کے ساتھ عدالت میں جاؤں اور لاشیں نکلوا کے دوبارہ پوسٹ مارٹم کرانے کے احکامات حاصل کروں۔ دوسرا میڈیکل بورڈ ہو جو پوسٹ مارٹم کرے۔ بہت مشکل ہے یہ کام دوست لیکن میں ساری رپورٹس اپنے پاس رکھوں گا۔"

"وہ کس لئے؟" نازو نے کہا۔

"کیا اپنے چوہدری دلاور صاحب کو ہم ایسے ہی بخش دیں۔ ڈاکٹر شیلی نے کہا تھا کہ وہ آپس میں سوتیلے بہن بھائی ہیں۔"

میں نے کہا۔ "اس نے جھوٹ نہیں بولا تھا غالب۔ تمہیں تو دعویٰ تھا کہ جو بھی اس نے کہا تھا سب غلط ثابت ہو جائے گا۔ نہ وہ ڈاکٹر ہو گی نہ شہلا خان۔ وہ لندن کے اسپتال میں نیورو فزیشن نہیں ہو گی اور نہ کوئی شیخ صاحب ہوں گے۔ میں نے معلوم کر لیا ہے۔ وہ سب سچ تھا۔"

غالب کی صورت تصویرِ حیرت بن گئی۔ "وہ سچ تھا!"

"سو فیصد۔" میں نے کہا۔ "اپنے بارے میں جو کچھ بھی اس نے بتایا تھا اس میں کوئی بات بھی غلط نہیں تھی۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہو گیا اچانک؟"

"اچانک کیا۔ میں نے لندن فون کیا۔ اسپتال والوں سے بات کی۔ ان سے شیخ صاحب کا فون نمبر لیا پھر ان سے بات کی۔"

رابعہ' نازو اور غالب مجھے یوں دیکھ رہے تھے جیسے میں نے انہیں زمین پر مریخ کی مخلوق کی آمد کے صحیح وقت اور دن سے مطلع کیا ہے۔

"اس میں تھوڑا سا جھوٹ بھی تھا۔" میں نے کہا۔

"آٹے میں نمک کے برابر یا نمک میں آٹے کے برابر؟"

"اس کا تعلق دوسروں سے تھا۔ اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ پہلے اس کی ایک شادی طلاق پر ختم ہوئی تھی۔ اس کا سابق شوہر ایک پاکستانی ماجد علی شمسی اسی اسپتال میں ہے۔ شیخ صاحب کے گھر کا نمبر اسی نے بتایا۔ شیخ صاحب کے بارے میں اس نے جھوٹ بولا تھا کہ ان کی بیوی کو کسی نے قتل کر دیا ہے اور وہ اسپتال میں بے ہوش پڑے ہیں۔ وہ مجھے گھر پر ملے۔"

"تم اسے تھوڑا سا جھوٹ کہتے ہو!"

"اب تم کچھ بھی سمجھو۔ مجھے شیخ صاحب سے معلوم ہوا ہے کہ اسے پاکستان بلانے والا خود چوہدری دلاور تھا۔ اس نے ڈاکٹر شیلی سے کہا تھا کہ وہ یہاں آ کے وزیر خان ٹرسٹ اسپتال کا سارا انتظام سنبھال لے۔"

"یہ کہا تھا۔ دلاور نے؟"

"ہاں۔ اور شیخ صاحب نے شیلی کو منع کیا تھا۔ ان کی رائے چوہدری دلاور کے بارے میں بہت خراب تھی۔" میں نے کہا۔

چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد غالب بولا۔ "تم نے اپنے متعلق کیا کہا تھا۔ اپنا نام بتایا تھا!"

"نام غلط بتایا تھا۔" میں نے کہا۔

غالب سوچ میں پڑ گیا۔ "یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ کال کس نمبر سے کی گئی تھی۔ دن تاریخ وقت سب کا پتا چل سکتا ہے۔ تم نے ہوٹل کی آپریٹر سے یہی کہا ہوگا نا۔ اسے نمبر دیا ہوگا اور بل میں تمہارے نام کے ساتھ کال چارجز ہوں گے۔ روم نمبر ہوگا۔"

"ہوا کرے۔ وہ کون سا صحیح تھا۔" میں نے کہا۔ "اس کے علاوہ خوامخواہ کی پریشانی کون مول لے گا۔ نہ ماجد علی کو شک ہو سکتا تھا نہ شیخ صاحب کو لیکن ہمیں مفید معلومات حاصل ہوئی ہیں جو بعد میں بھی کام آ سکتی ہیں اور فوراً بھی۔"

"فوراً کیسے؟"

"بھئی اپنے چوہدری دلاور سے اظہارِ تعزیت کیا جائے کہ بڑا افسوس ہوا یہ جان کر کہ آپ کی سوتیلی ہمشیرہ صاحبہ کا انتقال ہو گیا ہے۔ سوتیلی بھی اپنی ہی ہوتی ہے خون کے رشتے سے۔ سُنا ہے خودکشی کر لی تھی انہوں نے۔ وہ بہت پریشان ہوگا کہ یہ کون ہے اور اس نے یہ کہاں سے سُن لیا۔"

غالب ہنسا۔ "اچھا آئیڈیا ہے۔"

رابعہ بولی۔ "وہ فوراً سمجھ جائے گا کہ سوائے ہمارے یہ حرکت کس کی ہو سکتی ہے۔"

غالب نے کہا۔ "کیا میں فون کر کے اس سے پوچھوں کہ تدفین کب ہو گی؟"

"پوچھ لینا مگر یہاں سے فون کرنے کی ضرورت نہیں۔" نازو نے کہا۔

میں نے کہا۔ "میں سارا دن سوچتا رہا کہ شیلی نے ایسا کیوں کیا۔ یعنی چوہدری دلاور کی آلۂ کار کیوں بنی تھی؟ اور میں اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ بلیک میل ہوئی۔ چوہدری دلاور نے اسے لالچ دے کر بلایا۔ بہترین معاوضہ' کار' رہنے کے لئے بنگلہ اور ایک پورے اسپتال کے مکمل انتظامی اختیارات۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ پاکستان جائے۔ باپ نے ہمیشہ یہی چاہا تھا۔ چوہدری دلاور کو شاید یہ بھی معلوم ہوگا۔ اس نے اس موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دانہ ڈال دیا اور شیلی اپنی خواہش کے دام میں گرفتار ہو گئی۔ اس نے تو سمجھا ہوگا کہ یہ تائید ایزدی ہے ورنہ اتنا اچھا چانس کہاں ملتا ہے اور مجھے شک ہے کہ اس نے اپنے رشتے کو چھپایا ہوگا۔"

"پھر شیلی نے یہ راز کیوں فاش کیا؟"

"میرا خیال ہے کہ شیلی یہاں آ کے پھنس گئی۔ اسے اندازہ ہوا کہ دور کے ڈھول سہانے لگ رہے تھے۔ اسپتال تو ٹرسٹ کا ہے اور اسے چلانے والا بورڈ ہے جس کے ڈائریکٹرز میں دلاور کے علاوہ بھی بہت سے لوگ ہیں۔ ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ وہ واپس کیوں نہیں چلی گئی تھی۔ اس کی کون سی کمزوری تھی جس کو استعمال کرتے ہوئے چوہدری دلاور نے اسے یہاں روکا اور پھر میرے پیچھے لگا دیا۔"

"وہ برطانوی نیشنل تھی۔ اسے کون روک سکتا تھا؟"

"یہی تو معلوم کرنا چاہئے کہ دلاور نے اسے کس طرح اپنے جال میں گرفتار کر لیا۔" میں نے کہا۔ "دوسری غور طلب بات یہ ہے کہ کیا واقعی شیلی اپنے بھائی سے بدلہ لینا چاہتی تھی۔ اگر اسے بدلہ لینا تھا تو اس نے دلاور کا ساتھ کیوں دیا اور اس کا ساتھ دیا تھا تو مجھے یہ بات کیوں بتائی۔"

"تم اس سے زیادہ قریب رہے ہو۔ تم ہی بتاؤ۔"

"میرا صرف خیال ہے جو غلط بھی ہو سکتا ہے کہ شیلی مجبوری کے جال سے نکلنا چاہتی تھی لیکن وہ اعلانیہ ہمارے ساتھ مل کے دلاور کے خلاف کسی قسم کی انتقامی کارروائی کرتے ہوئے ڈرتی تھی۔ شاید اس نے دلاور سے اپنی نفرت کا کبھی اظہار نہیں کیا تھا اور نہ یہ پتا چلنے دیا تھا کہ اس کے عزائم کیا ہیں۔ دلاور کے چنگل سے نکلنے کے لئے پہلے اس نے وہی کیا جو دلاور نے کہا' بعد میں آہستہ آہستہ اس نے میرا اعتماد حاصل کیا اور مجھے وہ باتیں بتا دیں جو شاید دلاور کو بھی معلوم نہیں تھیں لیکن دلاور کو معلوم ہو گیا۔"

"کیا معلوم ہو گیا۔ اور کیسے؟" غالب نے کہا۔

"یہی کہ شیلی اس کی گرفت سے نکل گئی ہے۔ اس کا رویّہ کچھ ایسا ہی ہو گیا تھا۔ جذباتی وابستگی کی اداکاری اور حقیقی جذباتی وابستگی میں فرق کا پتا چل جاتا ہے۔ تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔ انہوں نے دلاور کو رپورٹ دے دی کہ لڑکی گئی ہاتھ سے۔ اس کا بندوبست کرو۔ دلاور نے اس کی نگرانی سخت کر دی مگر شیلی نے انہیں بھی مروا دیا۔ ظاہر ہے اس کے بعد دلاور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کے بیٹھا نہیں رہ سکتا تھا۔ اس نے پکا بندوبست کیا کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ شیلی انتقام کیا لیتی۔ خود تصویرِ عبرت بن گئی۔"

"بیچاری۔" رابعہ نے بڑے دکھ سے کہا۔ "ماری گئی اس چکر میں۔"

نازو نے کہا۔ "بے غیرت بھائی اس کی لاش بھی نہیں لے جائے گا۔"

غالب نے انہیں ٹوکا۔ "لیڈیز۔ جذباتی نہ بنو۔ یہ ایک خیال تھا۔ مصدقہ بات نہیں تھی۔"

"تصدیق ہو سکتی ہے دو منٹ میں۔ ایک فون کرو دلاور کو اور دیکھو۔ تم تو خود بھی مل سکتے ہو۔"

"میں یہی سوچ رہا ہوں۔" غالب نے کہا۔ "آج نقوی صاحب کے جنازے میں کافی لوگ تھے۔ بیشتر سرکاری افسران اور ان کے ماتحت تھے۔ میں بھی قبرستان تک گیا تھا اور تدفین کے وقت موجود رہا۔"

میں نے کہا۔ "خاتون کرائم رپورٹر اس وقت کہاں تھیں؟"

"میں اسپتال میں تھی۔ اس چکر میں کہ شیلی کی لاش کا پوسٹ مارٹم کب ہوتا ہے اور اس کا کوئی وارث سامنے آتا ہے یا نہیں۔"

"تم اکیلی تھیں؟"

"نہیں' پہلے ایک پرانا کرائم رپورٹر تھا میرے ساتھ۔ بڑی سرپرستی کر رہا تھا میری۔ سمجھا رہا تھا کہ یہ کام کیسے کرنا چاہئے۔ گر کی باتیں بتا رہا تھا۔ خاصا فری ہو گیا تھا بعد میں۔"

غالب نے میز پر مکا مارا۔ "اس آخری جملے کی وضاحت کی جائے۔ میرے دل میں رقابت کی آگ بھڑکنے لگی ہے۔"

"اس نے ایک بار میرا ہاتھ پکڑا۔ قلم پکڑانے کے بہانے سے' دو بار انجانے میں مجھ سے ٹکرایا۔ اس نے مسکرا کے سوری کہا پھر وہ مجھے ایک کمرے میں لے گیا۔ وہاں اس وقت کوئی نہیں تھا۔"

"کمرے میں لے گیا۔" غالب نے گرج کر کہا "اور تم چلی گئیں؟"

"ہاں۔ پولیس سرجن کا کمرا تھا۔" نازو نے معصومیت سے کہا۔

"اور وہاں تم دونوں کے سوا کوئی نہیں تھا؟" غالب چلایا۔

"ہاں' دو منٹ تک پھر پولیس سرجن آگیا باتھ روم میں سے نکل کے۔" نازو نے کہا۔

ہم سب ہنس پڑے اور غالب نے جھینپ کر کہا۔ "اگر تم کرائم رپورٹر رہو گی تو ہر روز ایک کرائم میں کروں گا۔ روز کوئی مارا جائے گا میرے ہاتھوں۔"

"پولیس سرجن نے راز داری سے بتایا کہ شیلی کی لاش فی الحال کولڈ اسٹوریج میں رکھوا دی گئی ہے اور بڑے سخت آرڈر ہیں کہ اس کو ابھی نہ چھیڑا جائے۔ کوئی لاش لینے آئے تو اسے روک لیا جائے۔ ظاہر ہے اس کے بعد میرا وہاں ٹھہرنا بے کار تھا۔ میں اسی رپورٹر کی کار میں بیٹھ کے گھر آگئی۔ بڑی اچھی کار ہے اس کی۔ گھر چھوڑ کر گیا۔"

"یہ کہو کہ گھر دیکھ گیا۔" غالب بولا۔ "اس سے تو میں نمٹ لوں گا۔ جو بات میں بتانے والا تھا وہ بیچ میں رہ گئی۔ تدفین کے وقت میں نے دلاور کو دیکھا۔ میں کھسکتا ہوا اس کے قریب جا کھڑا ہوا۔ میں نے کہا "اپنے چوہدری صاحب! اب کسے لا رہے ہیں آپ نقوی صاحب کی جگہ؟" وہ مجھے گھورنے لگا مگر کچھ بولا نہیں۔ میں نے کہا "اب میں بیورو چیف ہو گیا ہوں۔" اسے اخبار کا نام بتایا تو اس کی صورت کا تاثر بدل گیا۔ سیاست کے میدان میں قدم رکھا ہے تو کسی صحافی سے بگاڑ نہیں مول لے سکتا۔ میں نے پھر سوال دہرایا تو کہنے لگا "غالب صاحب' یہ تو ہم سے زیادہ آپ لوگوں کو معلوم ہونا چاہئے" میں نے بڑے معنی خیز لہجے میں کہا "معلوم ہو جائے گا آپ کو بھی اپنے دلاور صاحب!" اور وہ چلا گیا۔ اس نے دھمکی ہی سمجھا ہو گا میرے الفاظ کو۔ جنازے کے بعد میں پھر ملا اس سے اور پوچھا کہ "رفیق کا کچھ پتا چلا؟" وہ مسکرا کر بات ٹال گیا "یہ سوال تو آپ کو پولیس والوں سے پوچھنا چاہئے۔ اتنے بڑے بڑے افسران ہیں یہاں۔" میں نے بڑی حیرانی کا اظہار کیا۔ "اچھا۔ آپ پہچانتے ہیں سب کو؟ سادہ کپڑوں میں ہوں گے۔ مجھے بتائیں کہ کس سے پوچھوں؟" اس نے ایک شخص کی طرف اشارہ کر دیا کہ وہ ہیں ڈی آئی جی صاحب۔ میں سیدھا اس کے پاس چلا گیا اور دلاور کے حوالے سے کہا۔ "ڈی آئی جی صاحب۔ چوہدری دلاور کا خیال ہے کہ رفیق کے قتل اور لاش کی گمشدگی کے بارے میں آپ بتا سکتے ہیں۔" وہ گرم ہو گیا کہ کون ہے یہ الو کا پٹھا۔ چوہدری دلاور؟ میں نے اسے اشارے سے بتا دیا اور خود پیچھے ہو گیا۔ بعد میں دلاور کی اور ان کی گفتگو تو میں نے نہیں سنی مگر دلاور کی صورت دیکھ کے مزے لیتا رہا۔

قبرستان سے باہر وہ پھر مجھے مل گیا بلکہ ٹکر گیا۔ وہ اپنی کار میں بیٹھ رہا تھا اور ناچیز ہمیشہ کی طرح ذاتی ٹانگوں پر سوار تھا۔ اس نے بڑی محبت اور خلوص سے مجھے پیش کش کی کہ "اپنے غالب صاحب۔ ہمارے ساتھ آجاؤ۔ جہاں کہو گے چھوڑ دیں گے۔" میں نے کہا۔ "آپ چھوڑنے والے کہاں ہیں چوہدری صاحب۔ ایک کو چھوڑتے ہیں تو دوسرے کو پکڑ لیتے ہیں۔ سنا ہے آج کل سیاست کے ساتھ زیادتی کر رہے ہو۔" بے غیرت آدمی ہے نا۔ ہنسنے لگا اور مجھے زبردستی اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ میں سمجھ رہا تھا اس عنایت خسروانہ کا مطلب۔ وہ صحافت میں میری سابقہ ساکھ سے واقف تھا اور اسے اندیشہ تھا کہ میں اس کے مستقبل کے خوابوں کو راکھ کر سکتا ہوں۔ پہلے میرا خیال تھا کہ اس سے شیلی کے موضوع پر بات کروں پھر اس خیال سے خاموش رہا کہ وہ قبل از وقت نہ بھڑک جائے اور کرائم رپورٹنگ کے میدان میں نووارد ہماری خاتون رپورٹر کی پہلی اسائنمنٹ متاثر نہ ہو۔ اس نے خود ہی راستے میں بات چھیڑ دی کہ۔ "اپنے غالب صاحب خیر سے تمہاری بڑی عزت ہے۔" میں نے کہا۔ "کہاں چوہدری صاحب۔ پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں۔ نہ کوٹھی' نہ کار نہ کیش۔ نہ کاروبار نہ کمال۔ سکھوں کے بھی پانچ ککے ہوتے ہیں۔ آپ کو تو معلوم ہو گا۔ کنگھی کچھ کڑا' کرپان اور کیس۔ اب بڑے آپ جیسے سمجھے جاتے ہیں جن کو پانچ کاف حاصل ہوں۔ کوٹھی' کار' کیش' کاروبار اور کمال۔" وہ جان چھڑانے کے لئے بولا کہ ہم تو ہیں ان پڑھ بے کمال لوگ۔" میں نے پھر پکڑ لیا کہ۔ "نہیں چوہدری صاحب آپ کے کمال میں جو شک کرے وہ کافر۔ ایک کے دس اور دس کے ہزار بنانے میں آپ کا کمال۔ سب کچھ کرتے اور پکڑے نہ جانے میں آپ کا کمال۔ احمد کی پگڑی محمد کے سر والی مثال ذرا پرانی ہو گئی۔ احمد کا پھندا محمود کے گلے میں ڈالنا آپ کا کمال۔ اداکاری میں تو آپ کا کمال۔ سیاست میں آپ کا کمال۔ وزیر خاں جیسے کسی بھی دوست کی پیٹھ میں خنجر گھونپنا آپ کا کمال۔" وہ کہنے لگا "اپنے صحافی صاحب۔ میں نے سوچا تھا آپ سے کوئی کام کی بات ہو گی۔ آپ صرف بے عزت کرنے آئے ہو ہمیں تو اپنا شوق پورا کرو۔" میں نے کہا۔ "عزت ہوتی آپ کی تو میں ضرور بے عزت کرتا اپنے چوہدری صاحب۔ خیر سچ کا بھی برا مانتے ہو آپ تو سوری۔ کیا حکم ہے میرے لئے؟" وہ بولا۔ "تمہارا وہ سکندر اعظم اپنی بات تو مانتا نہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ دل صاف کرو۔ غلطی ہوئی تو معاف کرو۔ وہ پتا نہیں کیا چاہتا ہے۔" میں نے کہا۔ "سچ پھر آپ کو برا لگے گا۔ وہ چاہتا ہے کہ آپ تجارت' سیاست اور عداوت' منافقت اور خباثت وغیرہ چھوڑ کے رحلت اختیار کریں اس دنیا سے۔" وہ بولا کہ "دیکھتے ہیں اب رحلت کون کرتا ہے' کیا کم مقدمات تھے اس کے خلاف۔ بس قسمت کی بات ہے کہ ابھی تک پھندا گلے میں نہیں پڑا مگر خیر سے یہ بہت بڑا کام کیا ہے اس نے۔ نقوی صاحب کو قتل کر کے اس نے اپنے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی ہے۔ اس کی گرفتاری کے لئے پولیس کی ساری نفری لگا دی ہے۔ ڈی آئی جی صاحب نے۔ دیکھتے ہیں اب وہ اس شہر میں یا اس ملک میں کیسے چھپ کے رہتا ہے۔ کل ہر اخبار میں اس کی تصویر ہو گی۔ گلی کوچوں میں پوسٹر ہوں گے۔ خیر سے اتنی مشہوری ہو گی کہ شیطان بھی شرمائے۔ یہ نقوی صاحب تو شاید کچھ کرتے اور اب جو آئے گا وہ کسی وقار یوسف کا سسر نہیں ہو گا۔" میں سب سنتا رہا کیوں کہ میں جاننا چاہتا تھا کہ حالات کس رخ پر جا رہے ہیں۔ اس نے بتایا کہ آج ہی رات سے سکندر کے لیے کہیں پناہ لینا مشکل ہو جائے گا۔ جو اسے پناہ دیں گے وہ بھی مشکل میں پڑ جائیں گے۔ مارے جائیں گے سب۔ اس کی ساری بکواس سُن کے میں نے کہا کہ اپنے چوہدری صاحب۔ گاڑی یہیں روک لیں۔ مجھے واپس قبرستان جانا ہے۔ اپنے لیے میں قبروں کا آرڈر دے دوں۔ دنیا میں ایک ساتھ رہے مر کے بھی ساتھ رہیں گے۔ آپ نے اچھا کیا کہ پہلے سے بتا دیا مگر ایک بات میں بھی بتاؤں۔ پنجابی کا محاورہ ہے کہ کوؤں کی بددعا سے ڈھور یعنی مویشی نہیں مرتے اور اب کہتے ہیں کہ مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے۔ وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔ احتیاطاً آپ بھی اپنے ساتھ چھ ناموں کے کتبے بنوا کے رکھ لیں۔ کیا پتا ان قبروں پر لگانے پڑیں۔" بس اس کے بعد میں اتر گیا۔ اسے میں اپنے ساتھ یہاں تک تو لا نہیں سکتا تھا۔"

میں نے کہا۔ "اس سے پوچھ لیتا تھا کہ استاد پیڈرو صحیح سالم اور زندہ ہے یا......"

"میں نے پوچھا تھا۔ کہنے لگا کہ وہ مزے میں ہے اور مزے میں رہے گا۔ خواری تمہارے نصیب میں لکھی ہے۔" غالب بولا۔

"کل رات جس گاڑی نے ہمارا تعاقب کیا تھا۔ اس میں کون تھا؟" میں نے پوچھا۔

"اس حادثے کی خبر مل گئی تھی۔ تھانے کی رپورٹ کے مطابق اس میں چار افراد تھے جو سب نشے میں تھے۔ گاڑی چلانے والا ایک مکینک تھا اور گاڑی کے مالک کو ٹرائی دے رہا تھا۔ وہ مارا گیا۔ مالک زخمی اور سرکاری اسپتال میں ہے۔ جس شخص کے بنگلے کی دیوار ٹوٹی تھی اسے دیوار بنوا کے دینے کا وعدہ کر چکا ہے۔"

"یہ سب جھوٹ ہے۔"

"بجا ارشاد۔ آپ کیوں توقع رکھتے ہیں ان سے سچ کی۔ جس کار کو آپ اور ڈاکٹر شیلی چھوڑ کے فرار ہوئے تھے وہ پولیس کی تحویل میں ہے اور اس پر واقعی ریسرچ ہو رہی ہے۔ مجھے یقین ہے تمہارے فنگر پرنٹ تک اُتارے جائیں گے۔"

میں نے کہا۔ "ایک اہم بات تو رہ گئی۔ وہ کیسٹ اب کہاں ہے جس پر نقوی صاحب کا آخری پیغام تھا۔"

"اس نرس کے پاس۔"

"اور وہ نرس کہاں ہے؟" میں نے کہا۔ "زندہ ہے یا نہیں؟"

"شام چار بجے تک تو زندہ تھی۔" غالب نے کہا۔ "اس کو نقوی صاحب کی موت کا علم ہو گیا تھا۔ شاید کسی ساتھی نرس نے بتا دیا ہو گا کہ بعد میں کیا ہوا تھا۔ ظاہر ہے وہ پریشان ہو گئی۔ اس نے وقار یوسف کے گھر فون کیا اور کہا کہ مجھے نقوی صاحب کی بیٹی سے بات کرنا ہے۔ وہ اس وقت نیند میں تھی اور وقار یوسف تدفین کے انتظامات میں مصروف تھا۔ گھر میں جنازہ تیار تھا اور باہر لوگ جمع تھے۔ اس نے کہہ دیا کہ بعد میں فون کرنا۔ اس نے پھر فون کیا اور وقار سے کہا کہ یہ انتہائی اہم بات ہے جو مجھے صرف ان کی بیٹی سے کرنی ہے۔ وقار یوسف نے کہا کہ "دیکھو بھئی ان کے والد کا جنازہ تیار ہے لیکن ہم انہیں نہیں جگا رہے ہیں کیوں کہ ان کے ذہن پر صدمے کا شدید اثر ہے۔ باپ کا جنازہ اٹھتے دیکھ کر اس کی طبیعت زیادہ خراب ہو سکتی ہے۔ اگر ایک منٹ میں بتا سکتی ہو تو مجھے بتا دو۔" وہ کہنے لگی "بات ذرا لمبی ہے مگر صبح پتا نہیں کیا ہو جائے۔" وہ اتنی گھبرائی ہوئی تھی کہ وقار یوسف نے عقل سے کام لیتے ہوئے اسے رابعہ کا فون نمبر دے دیا۔ تم ان کی بیٹی کو بتا دو۔ نقوی صاحب کی بڑی بیٹی ہیں رابعہ قاری ایڈووکیٹ۔ پھر وہ ریسیور رکھ کے بھاگ گیا۔ نقوی صاحب کے گھر میں تین فون تھے۔ دو سرکاری تھے مگر ایک پرائیوٹ نمبر چند ہی لوگوں کو معلوم تھا۔ سرکاری ٹیلی فون کی گھنٹی تو مسلسل بج رہی تھی اور وہاں نقوی صاحب کا پی اے بیٹھا ہوا پیغامات وصول کر رہا تھا۔ آگے رابعہ سے سُنو۔"

رابعہ نے گھڑی دیکھی۔ "بارہ بج رہے ہیں۔ صبح بات کر لیں گے۔"

"ابھی اتنی دیر نہیں ہوئی۔" میں نے کہا۔ "ہم ایک بجے بھی سو سکتے ہیں۔ صبح دس بجے تک پڑے رہیں گے تو کون ڈسٹرب کرے گا۔"

غالب نے جماہی لی۔ "اللہ کے نام پر کوئی نیک دل خاتون ہم فقیروں کو ایک ایک کافی ہی پلا دے۔"

"فقیر صاحب!" نازو نے کہا۔ "اس وقت کچن میں کوئی نہیں جا سکتا۔"

رابعہ نے کہا۔ "انتظام یہاں بھی ہے۔ دیکھو اس الماری میں سب کچھ ہو گا۔"

میں نے کہا۔ "واہ! اے کلاس قیدی کو ہر سہولت فراہم کر دی گئی ہے لیکن میں پھر صاف کہے دیتا ہوں کہ اس آزاد پنچھی کو سونے کے پنجرے میں بھی قید نہیں کیا جا سکتا۔"

غالب نے غیر موجود مونچھوں کو تاؤ دیا۔ "سکندر اعظم! ہمیں چیلنج مت کرو ـــــ ہم وہ ہیں جن کے بارے میں علامہ صاحب نے فرمایا تھا۔

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

میں نے کہا۔ "مومن میں بھی ہوں بیٹے۔ اس شعر کا اطلاق مجھ پر نہیں ہوتا۔"

نازو نے الماری میں سے الیکٹرک کیٹل نکالی اور پلگ میں لگا دی۔ کافی کے دیگر لوازمات ڈبوں میں پیک تھے۔ رابعہ نے میری پسند کا خاص خیال رکھتے ہوئے۔ "نیس کیف گولڈ" کافی کے ساتھ کافی میٹ' نان ڈیری کریم کے بڑے بڑے جار خریدے تھے۔ کافی کے لئے نئے فرنچ مگ بھی بہت خوبصورت اور قیمتی تھے۔

کمرے میں بڑی خوشگوار ٹھنڈک تھی جو بے آواز ائرکنڈیشنر نے پیدا کی تھی ورنہ زیرِ زمین کمرے میں ہمارا دم گھٹ جاتا۔ باہر مکمل خاموشی تھی کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس ویران اور تاریک کوٹھی کے زیرِ زمین کمرے میں اتنی روشنی ہے اور رونق ہے۔

رابعہ نے موقع پاتے ہی اپنی بات شروع کی۔ "میرے پاس اس نرس کا فون ساڑھے پانچ بجے آیا تھا اس کا نام شاہدہ ہے۔ پہلے اس نے مجھ سے تصدیق کی کہ میں نقوی صاحب کی بیٹی رابعہ قاری ہوں۔ یوسف نے تو مجھے نہیں بتایا تھا مگر میں سمجھ گئی کہ یہ غلط فہمی نہیں ہو سکتی جس نے اسے میرے گھر کا نمبر دیا ہے۔ اس نے یہ بھی کہا ہو گا کہ نقوی صاحب کی بیٹی کا نام رابعہ قاری ہے۔ صرف یہ جاننے کے لئے کہ یہ جھوٹ کس نے بولا تھا اور کیوں میں نے کہہ دیا کہ "ہاں میں رابعہ قاری بول رہی ہوں۔" وہ کہنے لگی کہ "آپ رابعہ نقوی کیوں نہیں ہیں کیا شادی ہو چکی ہے آپ کی؟"

"میں نے کہا کہ تم سمجھدار ہو۔ یہ بتاؤ بات کیا ہے؟ کیوں فون کیا ہے مجھے؟" اس نے مجھے ساری بات بتا دی۔ یہ بھی بتا دیا کہ کیسٹ اس نے سُن لیا ہے۔ اس کے بعد سے میری پریشانی بڑھ گئی ـــ۔ پتا نہیں کیوں میں اس چکر میں پڑ گئی۔" میں نے کہا۔ "شاہدہ نے بہت زبردست کام کیا تھا۔ اب اس کیسٹ کی حفاظت کرو اور اپنی بھی..... ہو سکے تو اسی وقت کیسٹ لے کر میرے پاس آ جاؤ۔ اس نے کہا میں بُری طرح پھنس گئی ہوں جی۔ اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں کیا کر رہی ہوں اور اس کا نتیجہ کتنا خطرناک ہو گا۔ میں نے لالچ میں یہ کام کیا اور ایک ہزار روپے نوکری کے برابر تو نہیں ہوتے۔ نقوی صاحب نے وعدہ کیا تھا کہ مجھے بھی میری پسند کی نوکری مل جائے گی اور میری بہن کو بھی لیکن میں نے سنا ہے کہ انہیں قتل کر دیا گیا ہے۔ میں نے اسے سمجھایا کہ فون پر ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ وہ میرے پاس آ کے مجھے تفصیل سے ساری بات بتائے۔ اگر نقوی صاحب نہیں ہیں تو کیا ہوا۔ میں بھی بہت کچھ کر سکتی ہوں۔ اس پر شاہدہ نے کہا کہ وہ ایک گھنٹے میں نکلے گی اور ساڑھے چھ بجے تک پہنچ جائے گی۔ میں نے اسے اچھی طرح اپنا پتا سمجھا دیا تھا اور چوکیدار کو سمجھا دیا تھا کہ اگر شاہدہ نام کی لڑکی اکیلی آئے تو اسے میرے پاس پہنچا دے۔ وہ پونے سات بجے پہنچی۔ کہنے لگی کہ بس دیر سے ملی اور پھر کوٹھی تلاش کرتے کرتے میں آگے نکل گئی تھی۔ خیر ڈرائنگ روم میں اس نے مجھے ساری بات بتائی کہ کس طرح اس نے ٹیپ ریکارڈر چرا کے نقوی صاحب کو لے جا کر دیا تھا۔ کیسے انہوں نے پیغام ریکارڈ کر کے دیا تھا اور بعد میں وہ کیسے کیسٹ کو نکال کر لے گئی تھی۔ "مجھے تو اندازہ نہیں تھا کہ ایک معمولی سے ٹیپ ریکارڈ کے لئے اسٹاف کے خلاف چوری کا الزام آ جائے گا اور وہ عورت اتنا ہنگامہ کرے گی۔ جلدی میں مجھے سوچنے کا موقع نہیں ملا ورنہ میں اس سے ٹیپ ریکارڈ مانگ کر لے آتی اور اسے وہیں چھپانا بھی میری غلطی تھی۔ میں کسی خالی کمرے میں رکھ دیتی۔ باہر پھینک دیتی' وہ بعد میں وہیں دواؤں کی الماری میں مل گیا۔ ظاہر ہے دو چار آدمی ہیں جن پر شک ہو گا۔ ڈاکٹر کی حیثیت ایسی ہوتی ہے کہ وہ بچ جائے گا۔ میں اور ایک مڈ وائف پکڑے جائیں گے۔" اب میں اس سے کیسے کہتی کہ پکڑے جانے سے زیادہ خطرہ اس کے مارے جانے کا ہے۔ حالات و واقعات کی کڑیاں اسے مجرم ثابت کر دیں گی۔ اس ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ شاہدہ کے بیگ میں لتا کی تصویر اور فلم "پرتیجے" کا کیسٹ تھا اور ڈی ایس پی کی بیوی نے تصدیق کر دی تھی کہ وہی کیسٹ غائب ہوا تو سمجھنے والے سمجھ جائیں گے کہ اس نے ٹیپ ریکارڈ چرایا تھا اور وہی کیسٹ نکال کر لے گئی۔ اس کے بعد سوال ہوا ہو گا کہ اس نے ایسا کیوں کیا تھا تو جواب بھی آسان ہو گا۔ وہ نقوی صاحب کی خدمت پر مامور تھی۔ نقوی صاحب نے اس کی معرفت کوئی پیغام باہر بھیج دیا۔ شاہدہ نے مجھے وہ کارڈ دیا جس پر نقوی صاحب کی تحریر تھی۔ میں نے کہا۔ "تم نے واقعی بہت بڑا کام کیا ہے۔" کہنے لگی۔ "میرا انعام کیا ہو گا؟" میں نے کہا۔ "کیسٹ مجھے دے دو میں سن کر طے کروں گی۔" وہ کہنے لگی۔ "نقوی صاحب نے تو یہ نہیں کہا تھا۔ ایسی کوئی شرط نہیں لگائی تھی کہ پہلے آپ کیسٹ سُنیں گی۔" میں نے کہا۔ "اچھا تم بتاؤ..... تم کیا چاہتی ہو۔" اس نے کہا۔ "دس ہزار روپے۔" میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ تمہیں دس ہزار روپے مل جائیں گے۔ کیسٹ نکالو۔" وہ کہنے لگی۔ "کیسٹ تو میں نہیں لائی تھی۔ بُرا نہ مانیں جی آپ۔ یہ معاملہ ہی ایسا تھا۔ میرے دل میں خیال آیا کہ وہاں کسی نے مجھ سے کیسٹ چھین لیا تو میں کیا کروں گی۔ آپ کے لئے کیسٹ اہم ہے۔ میرے لئے میری زندگی اہم ہے۔" میں نے کہا۔ "تم بے وقوف ہو۔ جب تک وہ کیسٹ تمہارے پاس ہے تمہاری زندگی کو لاحق خطرہ کم نہیں ہو گا۔ تمہارے گھر میں اور کون ہے؟" اس نے کہا۔ "ایک ماں ہے' ایک بہن اور ایک چھوٹا بھائی۔ باپ مر چکا ہے۔" میں نے پوچھا۔ "کیسٹ کہاں رکھا ہے؟" اس نے کہا۔ "یہ میں نہیں بتاؤں گی۔" مجھے غصہ تو بہت آیا لیکن میں نے کہا۔ "اچھا گھر جاؤ اور کیسٹ لے آؤ۔ کیسٹ دو اور دس ہزار کا چیک لے لو۔" اس نے چیک لینے سے صاف انکار کر دیا۔ مجھے اس کی توقع تھی۔ "میں نقد لوں گی۔ ایک کاغذ کا پرزہ ہوتا ہے چیک تو' آپ کے حساب میں رقم ہے یا نہیں مجھے کیا معلوم۔" میں نے کہا۔ "شاہدہ یہ کوٹھی میری ہے۔ یہ کار میری ہے اور میں وکیل ہوں۔ عام وکیل نہیں..... بہت مشہور وکیل ہوں۔ میں دس ہزار کے لئے تم سے دھوکا نہیں کر سکتی۔" اس نے کہا۔ "آپ ٹھیک کہتی ہیں جی لیکن چیک سے آدمی پکڑا جاتا ہے۔ میں صبح آ جاؤں گی۔ ابھی تو ویسے بھی اسپتال جا رہی ہوں۔" میں نے اسے سمجھایا۔ "بے وقوف لڑکی۔ اسپتال کیوں جا رہی ہو۔ تمہیں نہیں معلوم بعد میں وہاں کیا ہوا تھا۔ تم کو تو ابھی گھر میں بھی نہیں رہنا چاہئے۔ جاؤ اسی وقت کیسٹ لے کر آؤ۔ میں تمہارے لئے نقد رقم کا انتظام کرتی ہوں مگر یہ اچھی طرح سمجھ لو کہ دس ہزار کے مقابلے میں تمہاری زندگی کی قیمت کچھ لوگوں کے لئے بہت زیادہ ہے۔ میری مانو تو اپنے گھر والوں کے ساتھ کہیں شفٹ ہو جاؤ۔" وہ چلی گئی اب یہ نہیں معلوم کہ وہ اسپتال گئی تھی یا اپنے گھر۔"

"گھر کا پتا لیا تھا تم نے؟"

"نہیں..... مگر پتا تو اسپتال سے بھی مل جائے گا۔"

میں نے کہا۔ "وہ پلٹ کر نہیں آئی؟"

رابعہ نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں نے اسپتال فون کیا تھا مگر اس وقت تک شاہدہ کی ڈیوٹی شروع نہیں ہوئی تھی پھر میں تمہاری طرف چلی گئی تھی۔"

غالب نے کہا۔ "فون اس وقت بھی کیا جا سکتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "مجھے تو تم نے منع کر دیا تھا کہ کہیں فون مت کرنا۔ کیا اب یہ خطرہ نہیں رہا کہ اس فون نمبر کو ٹیپ کیا جا رہا ہو گا۔"

"شاہدہ سے رابطہ بے حد ضروری ہے۔"

نازو نے کہا۔ "وہ کیسٹ ٹائم بم ہے۔ شاہدہ کے پورے گھرانے کو تباہ کر دے گا اور ہمیں مل گیا تو نقوی صاحب کے قاتل....."

"ابھی سے کچھ فرض مت کرو۔ کیا پتا اس کیسٹ میں نقوی صاحب نے وصیت کی ہے یا انکشافات کئے ہیں۔" غالب بولا۔

میں نے کہا۔ "جب وہ کیسٹ ہی لینے گئی تھی تو اسے ایک دو گھنٹے میں آنا چاہئے تھا۔ مجھے ڈر ہے کہ واپس جا کے وہ پھنس گئی۔"

غالب نے کہا۔ "یہ ہو سکتا ہے کہ کیسٹ کے خریدار دوسرے لوگ بھی ہوں انہوں نے زیادہ قیمت لگا دی ہو۔ مس رابعہ آپ اگر تھوڑی سی عقل اور ہمت سے کام لیتیں تو اسے اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھا کے لے جاتیں اس کا گھر بھی دیکھ لیتیں اور راستے ہی میں کسی سے دس ہزار روپے پکڑ کے اسے دے دیتیں۔"

میں نے کہا۔ "اب جو ہونا تھا ہو گیا۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس وقت ہم سب کا دماغ تھکن اور پریشانی کے باعث کام نہیں کر رہا ہے۔ سب کا دن پریشانی میں گزرا ہے چند گھنٹے آرام کر لو..... باقی باتیں صبح۔" میں نے سب کے دل کی بات کہی تھی۔ ذرا سی دیر میں رابعہ اور نازو بیڈ پر لیٹ گئیں اور لیٹتے ہی سو گئیں۔ میں اور غالب وہیں قالین پر صوفوں کے کشن کا تکیہ بنا کر لیٹے رہے اور مستقبل کے بارے میں اپنے اپنے اندیشوں کا اظہار کرتے رہے۔ کل کی فکر سب کو تھی مگر کل کیا ہو گا آنے والے وقت کے مسائل سے ہم کیسے نمٹیں گے۔ یہ ہزار جت رکھنے والا ایسا مسئلہ تھا جس کا حل آسانی سے تلاش نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بالآخر ہم بھی سو گئے۔ اس زیرِ زمین خواب گاہ میں آرام آسائش سکون اور خاموشی اتنی مکمل تھی کہ ہم دس گھنٹے دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑے رہے۔

سب سے پہلے گیارہ بجے اٹھنے والا میں تھا۔ میری آنکھ بھی ان ہی آوازوں سے کھلی تھی جو اوپر سے سنائی دے رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے تہ خانے کے اوپر پورے گھر میں زلزلہ آیا ہوا ہے۔

میں نے فوراً غالب کو ہوشیار کیا۔ "یہ کیا ہے؟"

غالب کے حواس پوری طرح بے دار ہو گئے۔ "اوپر کون لوگ یہ توڑ پھوڑ کر رہے ہیں۔"

ہماری آوازوں پر رابعہ بھی اٹھ گئی اور اس نے نازو کو بھی جگا دیا۔ ہم سب آنکھوں میں سوال لئے ان اٹھانے پٹخنے اور توڑنے پھوڑنے کی آوازوں کو سنتے رہے جو مختلف حصوں سے پہنچ رہی تھیں۔ میں اور غالب سیڑھیاں چڑھ کے اس دروازے تک پہنچے جو درحقیقت کمرے کی الماری کا پچھلا حصہ تھا یہاں سے شور میں لوگوں کی باتیں کرنے کی آوازیں بھی سنائی دینے لگی تھیں۔

میں نے سرگوشی میں کہا۔ "یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں؟"

"پولیس والے ہو سکتے ہیں۔" غالب نے کہا۔

"چوکیدار بھی تو تھا دروازے پر؟"

"ایک غریب چوکیدار کی حیثیت ہی کیا ہے انہوں نے اسے بھی مارا ہو گا کہ فرائض کی ادائیگی سے روکتا ہے۔" غالب نے

کہا۔

رابعہ اور نازو بھی چپکے چپکے باتیں کر رہی تھیں اور خاصی خوفزدہ تھیں۔ ہم اس پناہ گاہ سے نکل بھی نہیں سکتے تھے اور مجبور تھے کہ لاقانونیت کے اس طوفان کے گزرنے کا خاموشی سے انتظار کریں۔ قانون کے محافظوں نے خانہ تلاشی کے احکامات اور اختیارات کے ساتھ یلغار کی تھی اور انہوں نے چوکیدار کے بیان کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی کہ گھر کے مکین موجود نہیں۔ انہوں نے طاقت کے بل پر بند دروازے کھول لئے تھے۔ تالے توڑ ڈالے تھے اور اب وہ پورے گھر میں دندناتے پھر رہے تھے۔ خانہ تلاشی کے نام پر لوٹ مار اور توڑ پھوڑ کر رہے تھے اور بے خوف تھے کہ انہیں روکنے والا کوئی نہیں۔ ان کے خلاف گواہی کون مائی کا لال دے گا اور کس میں ہمت ہے کہ انہیں مجرم ثابت کر سکے۔

رابعہ ہی نہیں۔ ہم سب ہی مشتعل تھے مگر کوئی بھی اس قید تنہائی سے نکل کر انہیں للکارتا تو مجرم نا ہونے پر بھی مجرم بن جاتا۔ چوکیدار غلط بیانی کے الزام میں دھر لیا جاتا اور یہ جگہ جو ایک حفاظت گاہ تھی۔ قانون کی نظر میں آجاتی تو مجرموں کا ٹھکانا کہلاتی۔

آدھے گھنٹے تک ہم اندر ہی اندر کھولتے رہے اور یہ سوچتے رہے کہ پولیس نے اتنی جرأت کیسے کی۔ ہائی کورٹ کی ایک سینئر ایڈووکیٹ کے گھر میں اس کی عدم موجودگی میں داخل کیسے ہو گئی اور اتنی توڑ پھوڑ کیسے مچا گئی۔ کیا منظر کو یا وقار یوسف کو بھی اس خفیہ کارروائی کی اطلاع نہیں ملی تھی۔

جب آوازوں کا سلسلہ موقوف ہو گیا تو سب سے پہلے غالب نے اوپر طلوع ہونے والے راستے پر قدم رکھا۔ کوئی آہٹ کیے بغیر لاک کھولا اور دبے پاؤں الماری میں داخل ہو گیا۔ اس کی خواہش کے مطابق ہم نے دروازہ پھر اندر سے لاک کر دیا۔

دس منٹ کے بعد اس نے پہلے دو بار' پھر تین بار' پھر تین انگلیوں سے دروازہ بجایا۔ باری باری ہم سب نکل کر اوپر گئے تو بیڈ روم میں داخل ہوتے ہی تباہی کا پورا منظر ہمارے سامنے آگیا۔ تلاشی لینے والوں نے بیڈ الٹ دیا تھا۔ صوفے الٹ دیے تھے۔ انہوں نے بیڈ کو ایسے پھاڑا تھا کہ اندر کے اسپرنگ تک باہر نظر آرہے تھے۔ یہی حشر صوفوں کا ہوا تھا۔ ان کے کشن بھی ادھیڑ دیے گئے تھے۔ الماریوں میں سے ہر چیز نکال کر باہر پھینک دی گئی تھی۔ رابعہ کے سلیقے سے لٹکے ہوئے کپڑے فرش پر پڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے باتھ روم کیبنٹ گرا دی تھی۔ فلیش ٹینک کا ڈھکن اتار کر پھینک دیا تھا۔ سب سے خراب حالت میں کچن تھا جہاں سب الماریوں کے ہر ڈبے کو کھولا گیا تھا اور ڈنر سیٹ کے ڈونگے نکالتے ہوئے بہت سے برتن گرا دیے گئے تھے۔ فرش پر شیشہ ہی شیشہ بکھرا ہوا تھا۔

رابعہ کو غصے کے ساتھ صدمہ بھی تھا۔ اس کے سجے سجائے گھر کی حالت کباڑ خانے سے بدتر ہو گئی تھی۔ غالب آتش فشاں بنا ہوا تھا۔

"میں ابھی بلاتا ہوں سارے پریس کو' کوئی چیز مت اٹھانا' کسی چیز کو ہاتھ مت لگانا۔" غالب نے کہا۔ "فون کہاں ہے۔ میں ایس پی سے بات کرتا ہوں۔"

نازو نے کہا "پہلے چوکیدار کی خبر تو لو۔"

چوکیدار مجھے گیٹ کے اندر اور دیوار کے ساتھ بے ہوش پڑا ہوا ملا۔ اس کا سر پھٹا ہوا تھا اور زخم سے نکلنے والا خون بالوں میں جم کے خشک ہو گیا تھا۔ مار پیٹ کے نشانات اس کے چہرے پر بھی تھے۔ وہ ریوالور بھی غائب تھا جو اسے حفاظت کے لئے دیا گیا تھا لیکن گیٹ اسی طرح مقفل تھا جیسے کسی نے اسے چھوا تک نہ ہو۔

غالب نے فون کرنے کی کوشش کی تو اسے فون ڈیڈ ملا۔ میں نے باہر کٹی ہوئی لائن دریافت کی اور اسے جوڑ لیا۔ غالب کہاں کہاں فون گھماتا رہا۔ آخر میں اس نے ایس پی سے بات کی۔ اس کے چیخنے چلانے سے اندازہ ہوتا تھا کہ ایس پی غالب کی بات ماننے پر تیار نہیں۔ اس نے جھٹ سے ریسیور رکھا اور اسے ایک گالی دی۔ "حرام زادہ کہتا ہے کہ پولیس اگر خانہ تلاشی کے لئے آتی تو ہرگز ایسا نہ کرتی۔ ہم قانون کے دائرے میں رہتے ہیں اور یہ ثابت ہو گیا کہ کسی نے اختیارات سے تجاوز کیا تو میں اس کی پیٹی اتروا دوں گا۔ میں نے کہا کہ اخبار والے آرہے ہیں تم خود بھی دیکھ لو کہ تمہارے کارندوں نے کیا تباہی پھیلائی ہے۔"

میں نے کہا کہ "وہ نہیں مانتا کہ پولیس کا کام تھا۔"

"ارے وہ لوگ ڈراما کرتے ہیں۔ میں ان کی رگ رگ سے واقف ہوں۔" غالب نے کہا۔

میں نے کہا۔ "مرزا جی! کیا پتا وہ ٹھیک ہی کہہ رہا ہو۔ یہ دیکھو کہ تلاشی لینے والے کیوں آئے تھے۔ پولیس میری تلاش میں آتی تو صوفے اور بیڈ کیوں پھاڑتی' کیا مجھے وہ کچن کے ڈبوں میں سے برآمد کرنا چاہتے تھے۔"

نازو نے میری تائید کی۔ "یہ پولیس نہیں ہو سکتی۔ کیسٹ تلاش کرنے والے تھے۔"

رابعہ نے سر ہلایا۔ "خدا معلوم شاہدہ کے ساتھ انہوں نے کیا ظلم کیا۔ کیسٹ مل گیا ہوتا تو وہ یہاں نہ آتے۔"

غالب نے کہا۔ "پریس کا سامنا کریں گے میں اور رابعہ۔ رابعہ کا بیان ہوگا کہ میں گھر میں اکیلی تھی اور سو رہی تھی۔ انہوں نے مجھے اٹھا کر بیڈ روم سے ملحق باتھ روم میں بند کر دیا تھا۔ وہ سادہ کپڑوں میں تھے۔ میں صورت دیکھ کر کم سے کم دو افراد کو شناخت کر سکتی ہوں۔ میں یہ کہوں گا کہ مجھے گیارہ بجے آنا تھا۔ دروازے پر موجود چوکیدار کو نہ پا کر مجھے حیرانی ہوئی۔ اسے سخت ہدایات دی تھیں کہ باہر موجود رہے اور کسی غیر متعلقہ شخص کو بلا اجازت اندر نہ جانے دے۔ میں گیٹ پھاند کے اندر آیا تو میں نے چوکیدار کو زخمی اور بے ہوش پڑا دیکھا پھر اندر کا حال دیکھا اور ایک باتھ روم میں سے رابعہ کو برآمد کیا۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اس کے ہاتھ پیچھے باندھے گئے تھے اور انہیں ٹونٹی کے ساتھ باندھ دیا گیا تھا۔"

میں نے کہا۔ "اخبار والے اور پولیس والے نشانات دیکھیں گے۔"

غالب نے کہا۔ "یہ کیا مشکل ہے۔"

اس نے ایک چادر پھاڑ کر رابعہ کے دونوں ہاتھ سختی سے پیچھے باندھے' بس ایک منٹ تکلیف برداشت کر لو۔ ذرا نشان گہرے ہو جائیں۔"

رابعہ نے سر ہلایا۔ "تم دونوں تو جاؤ۔ ابھی کوئی آجائے گا۔"

"آئے گا تو باہر سے کال بیل بجائے گا۔" میں نے کہا۔

غالب نے رابعہ کے ہاتھ کھولے اور چادر کا وہ لمبا سا ٹکڑا باتھ روم میں ڈال دیا۔ رابعہ نے اٹھنے کے بعد ہاتھ منہ بھی نہیں دھویا تھا چنانچہ اس کے بال پریشان تھے۔ آنکھ کھلتے ہی نازل ہونے والی اس پریشانی کے آثار سب کی طرح اس کے چہرے پر بھی عیاں تھے۔

پہلی گھنٹی بجی تو میں اور نازو نیچے اتر گئے۔ دروازے کو ہم نے مقفل کر دیا۔ رابعہ نے کیمو فلاج کے تاثر کو برقرار رکھنے کے لئے اپنے بکھرے ہوئے کپڑے پھر اس میں لٹکا دیے تھے۔

غالب کی پریس کانفرنس اور پولیس کی تفتیش میں ایک گھنٹا صرف ہو جانا معمولی بات تھی۔ میں نے نازو سے کہا کہ وہ کافی بنائے۔ اگر یہ افتاد نہ آتی تو ہم سکون سے ناشتا کرتے مگر اب بھوک بالکل مر چکی تھی۔ کال بیل وقفے وقفے سے بجتی رہی جس سے میں نے اندازہ کیا کہ غالب کی صدائے احتجاج صدا بہ صحرا ثابت نہیں ہوئی اس کے ہم پیشہ صحافی لاقانونیت کے خلاف جہاد میں اس کا ساتھ دینے کے لئے پہنچ رہے تھے۔ شاید پولیس والے بھی فرض شناسی ثابت کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ صرف ایک بار میں نے اوپر والے کمرے سے غالب کی آواز سنی۔ وہ کسی کو بتا رہا تھا۔ "یہ دیکھو۔ یہ شرافت ہے۔ کوئی قانون ہے اس ملک میں؟ چادر اور چار دیواری کا کوئی خیال ہے کسی کو؟ اکیلی عورت گھر میں تھی اور آپ لوگ جانتے ہیں وہ عورت کون تھی....."

جواب میں کسی نے کہا۔ "میں جو بات سمجھا رہا ہوں اس پر بھی آپ لوگ غور کریں۔"

"غور آپ کریں ایس پی صاحب' یہ آپ کا علاقہ ہے۔ واردات رات کے اندھیرے میں نہیں ہوئی' دن دہاڑے ہوئی ہے۔" غالب کی آواز آئی۔

پھر وہ لوگ دوسری طرف چلے گئے اور میں نیچے اتر آیا۔ میں نے دوسری دفعہ کافی پی اور نازو بے چینی سے ٹہلتی رہی۔ بالآخر غالب نے دستک دی اور ہم باہر نکلے۔ چوکیدار کو ایمبولینس میں اسپتال بھیج دیا گیا تھا اور پولیس تفتیش کی رسمی کارروائی کر کے جا چکی تھی۔ غالب کے بلائے ہوئے پریس فوٹو گرافرز نے مخصوص زاویوں سے تصویریں اتاری تھیں۔ وہ رائی کو پہاڑ یا پہاڑ کو رائی دکھانے کا فن جانتے تھے۔

پولیس نے کیسٹ کی بات نہیں کی تھی مگر یہ واضح کر دیا تھا کہ جو لوگ رابعہ کی کوٹھی میں توڑ پھوڑ مچا کے گئے تھے ان کا مقصد کسی کو نقصان پہنچانا نہیں تھا۔ وہ کوئی چیز تلاش کر رہے تھے جو ان کے خیال میں کہیں بھی چھپائی جا سکتی تھی۔ انہوں نے رابعہ سے اور غالب سے پوچھا تھا کہ آپ بتائیں ایسی کیا چیز ہو سکتی ہے۔ کوئی خط' ڈائری یا تصویر۔ آپ کا شک کس پر جاتا ہے۔ کون کر سکتا ہے یہ قابل مذمت کارروائی۔ ایس پی نے رابعہ کے گھر پر گارڈ بٹھانے کی پیشکش کی تھی جسے غالب نے مسترد کر دیا تھا۔ نامعلوم حملہ آوروں کے خلاف مقدمہ بھی درج کر لیا گیا تھا اور ایس پی نے بڑی سیاسی سمجھ بوجھ سے کام لیتے ہوئے اخبار نویسوں کے سامنے وہی پرانا گھسا پٹا بیان دے دیا تھا کہ لاقانونیت کے ایسے مظاہرے پر پولیس خاموش نہیں بیٹھے گی۔ مجرموں کی گرفتاری کے لئے سارے وسائل بروئے کار لائے جائیں گے اور انہیں عبرتناک سزا دلوائی جائے گی وغیرہ وغیرہ۔ اس نے واضح الفاظ میں اعلان کیا تھا کہ نہ پولیس نے مس رابعہ قاری ایڈووکیٹ کے بنگلے کی تلاشی کے لئے وارنٹ حاصل کئے تھے اور نہ پولیس کا ایسا کوئی ارادہ ہے۔

قیاس آرائی کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ حملہ آور اس کیسٹ کو تلاش کر رہے تھے جس میں نقوی صاحب نے اپنے خدشات کا اظہار کیا ہوگا اور یہ بتایا ہوگا کہ کن لوگوں سے ان کی جان کو خطرہ لاحق ہے۔ دوپہر کے بارہ بجنے والے تھے اور کسی نے نہ منہ دھویا تھا اور نہ ناشتا کیا تھا۔ باورچی خانے کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہاں ناشتا بنایا جا سکتا۔ میں نے رابعہ کی مدد کی اور اس نے صفائی شروع کی۔ غالب اس کی گاڑی لے کر حلوہ پوری لینے چلا گیا اور جاتے جاتے نازو کی ڈیوٹی لگا گیا کہ وہ اسپتال سے نرس شاہدہ کے گھر کا پتا معلوم کرے۔

حسب توقع شاہدہ کی کوئی خبر نہ تھی۔ وہ گزشتہ رات ڈیوٹی پر بھی نہیں آئی تھی اور کچھ لوگ اسے پوچھتے ہوئے اسپتال پہنچے تھے۔ اس کی تلاش پولیس کو بھی تھی کیوں کہ ڈی ایس پی صاحب کی بیگم نے اپنے ٹیپ ریکارڈر کی چوری کا کیس بنا دیا تھا اور اس نے شک ظاہر کرنے کے بجائے صاف شاہدہ کو چور قرار دیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ باتھ روم میں تھی جب شاہدہ اس کے کمرے میں آئی تھی اور اس نے آواز سن کر دیکھا تو وہ ٹیپ ریکارڈر اٹھا کر نکل رہی تھی۔ نازو نے کرائم رپورٹر کی حیثیت سے فون کیا تھا اور یہ معلومات اسے دوسری نرس نے فراہم کر دی تھیں۔ جسے اپنی ہم پیشہ نرس سے ہمدردی تھی اور وہ اس کے بارے میں قسم کھانے کو تیار تھی کہ وہ چور نہیں ہو سکتی۔ اس نے ایک واقعہ بھی بتایا کہ اس نے کس طرح ایک مریض کے سات ہزار روپے لوٹا دیے تھے جو وہ

ڈسچارج ہوتے ہوئے کمرے میں چھوڑ گیا تھا۔

ناشتے کے ساتھ غالب اخبارات بھی لے آیا تھا۔ ان سب میں ایک چھوٹی سی خبر نقوی صاحب کے بارے میں ان کی تصویر کے ساتھ چھپی تھی اور جیسا کہ غالب نے بتایا تھا کہ ان کی موت کو اسپتال والوں نے کوئی سازش یا قتل قرار نہیں دیا تھا۔ خبر میں تو یہ بھی واضح نہیں کیا گیا تھا کہ کسی نے انہیں کافی میں زہر دیا تھا بلکہ فوڈ پوائزننگ کا امکان ظاہر کیا گیا تھا۔ خوراک کے زہریلے اثرات کو کسی بھی چیز سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ بعض اوقات آدمی غلطی سے ایسی چیز کھا لیتا ہے جو اسے موافق نہیں آتی۔ کوئی سالن میں غلطی سے نمک کے بجائے ڈی ڈی ٹی ڈال لے تو زہر خورانی کا کیس بن جائے گا۔

ڈاکٹر شیلی کی موت کی خبر اندر ان صفحات میں لگائی گئی تھی جہاں مقامی خبریں نہیں ہوتیں۔ وہ صفحات ملک کے اندرونی علاقوں' چھوٹے قصبوں اور ضلعی نمائندوں کی رپورٹ کے لئے وقف ہوتے ہیں۔ یہ عمداً ایک خبر کو دبانے کے لئے کیا گیا تھا اور جس نے بھی یہ کوشش کی تھی اس نے دھن یا دھونس کا دباؤ استعمال کیا تھا۔ خبر کے ساتھ تصویر بھی کوئی نہیں تھی اور خود کشی والی بات بالکل گول کر دی گئی تھی۔ صرف ایک اخبار نے لکھا تھا کہ۔ "پولیس کی تحویل میں مشکوک عورت کی خود کشی۔" باقی سب وہی تھا جو پولیس اور اسپتال کی انتظامیہ کا مشترکہ مؤقف تھا کہ ملاقات کے اوقات میں کسی مریض کی عیادت کر کے جانے والی عورت اوپر سے گر کر ہلاک ہو گئی۔ وہ کہاں سے گری؟ کیسے گری اس کا نام حلیہ سب گول کر دیا گیا تھا۔

تیسری اہم خبر کی طرف مجھے غالب نے متوجہ کیا' یہ وزارتِ داخلہ کے ایک ڈپٹی سیکریٹری کے امریکا سے واپسی پر ایڈیشنل ہوم سیکریٹری کی حیثیت سے تقرر کے بارے میں تھی۔ جناب بدرالحسن فاروقی اس وقت اقوامِ متحدہ کے اجلاس میں شرکت کرنے والے پاکستانی وفد کے رکن ہیں اور انہیں فوری طور پر زیڈ یو نقوی صاحب کا چارج لینے کی ہدایت کی گئی ہے۔ جن کا گزشتہ روز انتقال ہو گیا تھا۔

غالب نے ایک آہ بھری۔ "ویسے تو مرنے والوں کو ہمیشہ کون یاد رکھتا ہے لیکن سرکاری نظام کی بے حسی پر تو انسانیت شرماتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "ہاں' وہاں ایک آدمی نہیں مرتا۔ ایک پوسٹ خالی ہوتی ہے۔ جس پر بہت سے آس لگائے بیٹھے ہوتے ہیں۔ اب انہیں ہوم سیکریٹری بننا تھا۔ نقوی صاحب کو..... نہ جانے کتنے پہلے سے ان کے حلقہ بگوش بن چکے ہوں گے' آج اچانک وفاداری اور خدمت گزاری کے جذبات کا رخ بدرالحسن فاروقی کی طرف ہو گیا ہو گا۔ کل تک جو نقوی صاحب کے تلوے چاٹتے ہوں گے وہ اب ہار لے کر ائرپورٹ پہنچ جائیں گے۔

غالب نے کہا۔ "اور افسری کا نشہ بھی ایسا ہے کہ آدمی اصل اور نقل کا فرق نہیں دیکھ سکتا۔ یہ نہیں سمجھتا کہ خوشامدی جو راگ الاپ رہے ہیں کیوں الاپ رہے ہیں۔ اسے یہ سُر سچے اور میٹھے لگتے ہیں اور اپنی ذات والا صفات لائقِ تحسین نظر آنے لگتی ہے۔"

غالب بولا۔ "صاف ظاہر ہے کہ اب بدرالحسن فاروقی کو ریٹائرڈ ہونے والے ہوم سیکریٹری کی جگہ لایا جائے گا۔ اچانک بیوروکریسی کا ایک گروہ اقتدار سے محروم ہو گیا' دوسرا گروہ جو اب تک معتوب یا ناپسندیدہ عناصر میں شامل ہو گا برسرِاقتدار آ گیا۔ بہت سے لوگوں کے کام ہوتے ہوتے رک گئے۔ کچھ لوگ اب اقربا پروری اور دوست نوازی کا سلسلہ شروع کریں گے۔ جیسے تاریخ میں ایک خاندان کی حکومت ختم ہوتی تھی اور دوسرا خاندان برسرِاقتدار آتا تھا تو سب کچھ بدل جاتا تھا۔ ایسے ہی وزارتوں میں ڈویژن اور سیکشن کی سطح پر افسرانِ اعلیٰ کی تبدیلی سے ہوتا ہے۔ اب نیچے سے اوپر تک ہلچل ہو گی۔ ایک سیکشن افسر جو کسی کا منظورِ نظر ہو گا۔ اسسٹنٹ سیکریٹری بن جائے گا۔ ایک اسسٹنٹ سیکریٹری جگہ لے گا بدرالحسن فاروقی کی۔ ظاہر ہے وہ اپنے آدمی کو ڈپٹی سیکریٹری بنائیں گے جو ان کے لئے مشکلات پیدا نہ کرے' اس کے لئے جوڑ توڑ اور بھاگ دوڑ تو اسی وقت شروع ہو گئی ہو گی جب نقوی صاحب اسپتال میں داخل ہوئے ہوں گے۔ یقینی کامیابی تو اسی گروہ نے حاصل کی ہو گی جس نے نقوی صاحب کو گھر سے اسپتال اور پھر قبرستان پہنچانے کا پورا انتظام کر لیا تھا۔

"اس لئے تو چوبیس گھنٹے کے اندر اندر پوسٹنگ ہو گئی ورنہ سرکاری عہدے مہینوں خالی پڑے رہتے ہیں اور ایڈہاک انتظام کے تحت کوئی قائم مقام دُہرا چارج اپنے پاس رکھتا ہے۔"

"خلاصہ یہ کہ ہمیں بدرالحسن سے نیک توقعات وابستہ کرنے کی غلطی نہیں کرنی چاہئے۔" غالب نے کہا۔ "اب ہم چلتے ہیں۔ ہم سے مراد ہے میں اور نازو۔ ہم جائیں گے اسپتال اور ڈاکٹر شیلی کے بارے میں پیش رفت کا جائزہ لیں گے۔ نازو کو وہاں چھوڑ کر میں شاہدہ کا پتا چلاؤں گا۔"

دوپہر تک میں اخبارات کی ورق گردانی کرتا رہا۔ منظر نے نوکروں کا ایک معتبر جوڑا ارسال کیا تھا۔ ایک دیہاتی قسم کی بدصورت عورت تھی جو سمع خراشی کرنے والی پتلی آواز میں بات کرتی تھی۔ اسے دعویٰ تھا کہ وہ پاکستانی ہی نہیں چینی کھانے بھی پکا سکتی ہے۔

میں نے کہا۔ "بی بی! پکانا تو مجھے بھی آتا ہے ہر قسم کا لیکن جو میں پکاتا ہوں اسے کھانا سب سے بڑا مسئلہ ہوتا ہے۔"

اس نے خاصا بُرا مانا۔ "ہو جی! انگلیاں نہ کھا جاؤ تو میرا ذمہ۔"

میں نے کہا۔ "نا بی بی۔ انگلیوں کے بعد تم کون سی ہاتھ کھا جاؤ۔ بات ہو رہی ہے تمہارے چینی کھانے کی۔ ایسا نہ ہو چین جیسے

دوست ملک سے ہمارے سفارتی تعلقات خراب ہو جائیں۔ وہ بُرا مان جائیں کہ ہم ایسا کھاتے ہیں۔"

اس کا مجہول سا شوہر بہت کم گو تھا۔ اس نے اپنے بارے میں بتایا کہ "ہمارا اسمِ گرامی ہے عاشق علی تڑپ۔"

میں نے تڑپ کے کہا۔ "بھئی واہ! عاشق کے ساتھ تڑپ!"

وہ بولا۔ "یہ ہمارا تخلص ہے۔ تخلص سمجھتے ہو آپ۔"

مجھے ہنسی آ گئی۔ "نہیں' تمہاری ذات ہے کیا؟"

اس کی بیوی نے وضاحت کی۔ "اجی شعر بنا دے ہے کمبخت۔ لگا دے ہے انگوٹھا لیکن باتیں بڑی مسکل مسکل کرے ہے۔"

رابعہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "باتیں تم سمجھا دینا۔ یہ بتاؤ کام کیا کرے گا؟"

"ہم بطریقِ احسن سب کچھ کر سکتے ہیں۔" وہ بولا۔ "اندرونی و بیرونی معاملات سرانجام دے سکتے ہیں جو ذمّے داری کے متقاضی ہوں۔"

میں نے کہا۔ "معاملات کی تشریح فرمائیے۔"

"ہم انتظام سبزہ و گل سے جاروب کشی تک اور خرید و فروخت سے آدابِ میزبانی تک سب پر مہارت کا دعویٰ رکھتے ہیں۔"

رابعہ نے کہا۔ "مطلب یہ کہ جھاڑو دے سکتے ہو۔ مالی کا کام کر سکتے ہو۔ بازار سے سودا سلف لا سکتے ہو۔"

اس نے خاصا احتجاجی تاثر دیا لیکن خاموش رہا۔ اگلا مرحلہ معاوضے کا تھا۔ بیوی اپنے سرتاج پر غالب تھی اور خود پاؤں کی جوتی بن کے رہنے کے بجائے اسے جوتی کی نوک پر رکھتی تھی۔ وہ مردِ قلندر قوتِ برداشت اور عفو و درگزر سے کام لینے میں بھی جواب نہیں رکھتا تھا۔ بعد میں اس نے اپنی خاندانی تاریخ اظہار سے واضح کیا کہ علوم شرقیہ اور شعر و سخن پر اس کی دسترس کا سبب والد ماجد تھے جو مدرسے میں عربی فارسی پڑھاتے تھے لیکن شاعری کے اور شاعروں کے دشمن تھے۔ "انہیں وہ غیر شرعی اور افعالِ قبیح گردانتے تھے۔" اس نے بتایا۔

ابھی تک میری ہمت نہیں پڑی تھی کہ وقار یوسف سے اور اس کی بیوی سے تعزیت کروں۔ خود رابعہ کو یقین نہیں تھا کہ اب اس کی جذباتی کیفیت کیا ہو گی۔ ان کے گھر پر تعزیت کے لئے آنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا چنانچہ وقار یوسف بھی مصروف تھا ورنہ وہ آ جاتا تو میں اس کے سامنے ساری صورتِ حال کی وضاحت کر دیتا۔ یہ بداخلاقی بہرحال تھی چنانچہ میں نے رابعہ کے گھر سے ٹیلیفون کیا۔ ایک لائن انگیج مل رہی تھی۔ دوسرے نمبر پر وقار نے ریسیور اُٹھا لیا۔

میں نے کہا۔ "وقار..... یار مجھے افسوس ہے۔"

اس نے چند سیکنڈ کے بعد کہا۔ "سوری۔ رانگ نمبر۔" اور ریسیور رکھ دیا۔

میں نے رابعہ سے کہا۔ "وہ تو شاید بات بھی نہیں کرنا چاہتا مجھ سے۔ اس کی بیوی کے جذبات کا خود اندازہ کر لو۔"

رابعہ نے کہا۔ "نہیں' یہ بات نہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہاں کوئی ہو گا جس کی موجودگی میں اس نے تم سے بات کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نقوی صاحب کے دونوں فون نمبر ٹیپ ہو رہے ہوں۔ تم خوامخواہ پریشان ہو۔ وہ سمجھدار ہیں دونوں۔"

رابعہ کی بات ٹھیک تھی۔ آدھے گھنٹے بعد کار کا ہارن سُنائی دیا تو رابعہ نے پردہ ہٹا کر دیکھا۔ "لو وہ آ گئے۔"

میں نے گیٹ کھولا۔ وہ چمکتی دمکتی سیاہ کیڈلاک جو نقوی صاحب کے زیرِ استعمال تھی سرسراتی ہوئی اندر آ گئی۔ میں نے گیٹ بند کیا اور وقار یوسف کی بیوی کو گاڑی سے اُتر کر اندر جاتے ہوئے دیکھا۔ وقار میرا انتظار کر رہا تھا۔

"سوری سکندر صاحب! لیکن تمہیں فون نہیں کرنا چاہئے تھا۔ ہر کال ٹیپ ہو رہی ہے۔ نرے پراسرار قسم کے لوگ کوٹھی کے چاروں طرف منڈلاتے ہوئے نظر آ رہے ہیں اور تعزیت کے لئے آنے والے بھی نہ جانے کون ہوتے ہیں' میں تو سب کو پہچانتا بھی نہیں۔ مجھے تو یقین ہے کہ انہوں نے گھر کے اندر بھی خفیہ مائکروفون وغیرہ لگا دیے ہوں گے۔ بہانہ ہے تفتیش کا" وہ بولا۔

میں نے تلخی سے کہا "ڈراما تو ضرور ہو گا بھائی۔ اور ڈراما کرنے والے وہی لوگ ہوں گے جو نقوی صاحب کے وجود کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دینا چاہتے تھے۔ تمہاری بیوی تو مجھے ہی قصوروار سمجھتی ہو گی۔"

"تمہیں تو نہیں۔ لیکن شیلی کو سمجھتی ہے۔"

"شیلی کو میں ہی لے کر گیا تھا۔"

"وہ سمجھتی ہے کہ شیلی نے تمہیں دھوکا دیا تھا۔ یہ غلطی ضرور ہے تمہاری کہ تم نے اسے نہیں سمجھا اور اس پر اعتبار کر لیا۔"

"مجھے ڈر لگتا ہے۔ اس کے سامنے جاتے ہوئے۔"

وقار نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ "کیسی باتیں کرتے ہیں آپ۔ آئیں میرے ساتھ۔"

میں اندر گیا تو رابعہ فون اُٹھائے کھڑی تھی۔ "کیا؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ نہیں میں تم کو غلط نہیں کہہ رہی ہوں...... لیکن غالب..... اسپتال سے لاش کہاں جا سکتی ہے..... اور اس لاش کا ابھی پوسٹ مارٹم تک نہیں ہوا تھا..... اس کے لئے تو حفاظتی اقدامات کرنے بھی ضروری تھے۔ پولیس کا پہرا ہو گا۔ نہیں تھا...... یہ تو بڑی بے قاعدگی ہے۔ خیر تم جیسا مناسب سمجھو کرو...... دھاندلی ہے یا لاقانونیت مگر غیر متوقع کچھ بھی نہیں ہے۔"

"رابعہ نے ریسیور رکھ کر میری طرف دیکھا۔ "شیلی کی لاش

اسپتال میں نہیں ہے۔"
"پھر کہاں ہے؟" میں نے کہا۔
رابعہ کے جواب دینے سے پہلے ہی کال بیل بجی۔ وقار یوسف اندر اپنی بیوی کے پاس چلا گیا تھا۔ وہ تعزیت کرنے والوں سے گھبرا کر ادھر آگئے تھے۔ وقار یہ بھی چاہتا تھا کہ اپنی بیوی کو اس سوگوار ماحول سے نکال لے۔
رابعہ نے کہا "ایمبولنس آئی ہے۔ میرا خیال ہے چوکیدار کو لائی ہوگی۔ اس کی حالت ٹھیک نہیں مگر اتنی جلدی اسے کیوں ڈسچارج کردیا۔"
میں نے کہا "میں دیکھتا ہوں۔"
ایمبولنس اندر آئی تو ڈرائیور نے مجھ سے پوچھا "مس رابعہ قاری ایڈووکیٹ کا بنگلا یہی ہے۔"
میں نے کہا "ہاں' ان کے چوکیدار کو لائے ہو؟"
"اس نے پوچھا۔ "آپ سکندر بخت صاحب ہو!"
میں نے جواب دینے سے گریز کیا۔ "اندر آجانے کے بعد یہ سارے سوال کرنا ضروری ہیں؟"
ڈرائیور نے کہا "صاحب! لاش ہے ڈاکٹر شیلا خان کی۔ آپ وصول کرلیں۔"
میں نے ایمبولنس کا دروازہ کھولا۔ اصولاً مجھے باہر نہیں نکلنا چاہئے تھا لیکن اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ گیٹ ابھی کھلا ہوا ہی تھا اور میں شیلی کی یخ بستہ لاش کو دیکھ رہا تھا جو چادر میں لپٹی ہوئی تھی اور سوچ رہا تھا کہ اس خطرناک چال کا مقصد کیا ہوسکتا ہے۔ یہ میری بدقسمتی تھی کہ اس وقت وقار یوسف کی بیوی بھی پہنچ گئی تھی جو شیلی کو اپنے باپ کا قاتل سمجھتی تھی۔
رابعہ اور وقار ایک ساتھ باہر آئے۔ اسی وقت گیٹ سے پولیس کی ایک گاڑی اندر آگئی۔ ایمبولنس کا پیچھے والا دروازہ کھلا ہوا تھا اور شیلی کی لاش سامنے تھی۔

صورتِ حال کی سنگینی ایک دم مجھ پر عیاں ہوگئی تھی مگر اس وقت رابعہ کی حاضر دماغی نے یا میری قسمت نے مجھے بچالیا۔
رابعہ نے مجھے ڈانٹ کے کہا "جناب عاشق علی تڑپ صاحب! یہاں کھڑے کیا کر رہے ہیں؟ کیوں آئی ہے ایمبولنس؟"
میں نے اندازہ کرلیا کہ ایمبولنس کے ساتھ آنے والی پولیس کی گاڑی میں اس علاقے کے تھانے سے تعلق رکھنے والے لوگ نہیں ہیں اور وہ مجھے نہیں پہچانتے۔ میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ ایمبولنس ڈرائیور کے سوال کے جواب میں' میں نے خود کو سکندر بخت تسلیم نہیں کیا تھا۔
میں نے مضحکہ خیز آواز میں مظلوم لہجے میں کہا "بیگم صاحب۔ ہم تو بس حاضر ہونے ہی والے تھے" اور سر جھکا کے اندر چل پڑا۔
رابعہ آگے بڑھ گئی۔ "کیا بات ہے بھئی؟"

ایمبولنس ڈرائیور نے ایک نظر اسے دیکھا پھر پیچھے پیچھے آنے والی پولیس کی گاڑی کو "میں نے بتایا تھا بیگم صاحبہ کے......"
"وہ تو ملازم تھا۔ مجھے بتاؤ۔"
اب وقار یوسف نے کہا "تم لوگ کیا لینے آئے ہو؟" وہ جیپ سے اُترنے والے سب انسپکٹر سے مخاطب تھا۔
سب انسپکٹر نے کہا "تم ہو سکندر بخت؟"
وقار یوسف نے متانت سے انگریزی میں کہا "فرض کرو ہوں لیکن انکار کردیتا ہوں' پھر تم کیا کروگے؟"
سب انسپکٹر تھوڑا سا پریشان ہوا۔
وقار نے ایک دم دہاڑ کے کہا "تم کس کی اجازت سے اندر آئے ہو؟ کیا یہ شارعِ عام ہے؟ تمہیں نظر نہیں آتا یا عقل نہیں ہے تمہارے پاس۔ منہ اُٹھا کے اپنی فوج کے ساتھ کسی کے گھر چڑھائی کرنا تمہارے اختیار میں نہیں ہے۔ یہ نہیں جانتے تم؟"
سب انسپکٹر نے کہا "زیادہ گرمی کھانے کی ضرورت نہیں۔ میں ڈیوٹی پر ہوں اور وردی میں ہوں۔"
"یہ سب مجھے مت بتاؤ۔ میں وقار یوسف ایڈووکیٹ ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ پولیس کے فرائض اور وردی کے اختیارات کی حد کیا ہے اور میرے ساتھ یہ ہیں رابعہ قاری ایڈووکیٹ ہائی کورٹ۔"
وقار یوسف بگڑ گیا۔ "تم نے ٹریس پاس کیا ہے۔"
رابعہ قاری نے کہا "وقار۔ میں بات کرلیتی ہوں۔"
سب انسپکٹر کی جان میں جان آئی "آپ کے شوہر تو...."
"شٹ اپ۔ زبان سنبھال کے بات کرو" رابعہ نے کہا۔ "یہ میرا بھائی ہے۔"
سب انسپکٹر کی پوزیشن پھر خراب ہوگئی "سوری۔ میں سمجھا۔"
"تمہارے پاس کوئی خانہ تلاشی کا وارنٹ ہے؟" رابعہ نے پوچھا۔
"وارنٹ!"
"وارنٹ نہیں سمجھتے۔ ملازمت کرتے کتنا عرصہ ہوگیا؟"
"وارنٹ تو نہیں ہے لیکن..."
"لیکن ویکن کچھ نہیں۔" وقار نے چٹکی بجا کے کہا "باہر گاڑی باہر لے جاؤ۔ آؤٹ۔"
"اور اگر میں نہ لے جاؤں تو؟" سب انسپکٹر گرم ہوگیا۔
"تو میں فون کرتا ہوں ایس ایس پی کو۔ تمہارا نام اور گاڑی نمبر بتانا کافی ہوگا۔"
سب انسپکٹر نے لہجہ بدلا "جناب۔ ایک عرض سُن لیں۔"
"سب سُنوں گا لیکن باہر۔ تمہارے گھر میں داخل ہونے کا جواز کوئی نہیں۔ پہلے باہر جاؤ۔ تم شرافت سے گھنٹی بجا کے ہماری مرضی سے اندر آتے تو میں بد اخلاق نہیں ہوں۔ تمہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کے تم سے بات کرتا لیکن تم نے وردی کی دھونس دی۔ مجھے بتاؤ ایسے ہی کوئی تمہارے گھر میں گھس جائے تو تم کیا کروگے؟"
رابعہ نے کہا "چلو جانے دو وقار۔ یہ لوگ اپنی فرعونیت میں ایسی غلطی کرجاتے ہیں۔"
وقار بڑبڑانے لگا "وردی پہن کے قانون کے محافظ بن جاتے ہیں۔ قانون کا خاک پتا نہیں۔"
میں یہ گفتگو ڈرائنگ روم کی کھڑکی سے لگ کے سُن رہا تھا اور خود پردے کی اوٹ میں تھا۔
سب انسپکٹر نے کہا "بیگم صاحب۔ اس ایمبولنس میں لاش آئی ہے۔"
"لاش؟ کس کی لاش۔ کیا میرا چوکیدار مرگیا؟" رابعہ نے پریشان ہوکے کہا۔
"چوکیدار۔" سب انسپکٹر چکرا گیا "نہیں جی۔ کون چوکیدار...؟"
"پھر کس کی لاش ہے؟ اسپتال میں تو میرا چوکیدار ہی داخل تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے زخمی ہوگیا تھا۔"
سب انسپکٹر نے کہا "جناب۔ اس میں کسی عورت کی لاش ہے۔"
ایمبولنس ڈرائیور ابھی تک احمقوں کی طرح خاموش کھڑا پریشان ہو رہا تھا۔ "ڈاکٹر شیلا خان کی لاش ہے بیگم صاحب۔ میں نے آپ کے اس نوکر کو بتایا تھا۔"
"شیلا خان کی لاش۔ یہاں کیوں لائے ہو؟" رابعہ نے کہا۔
"وہ جی۔ سکندر بخت صاحب ہیں نا یہاں.... ان..."
"تم پاگل ہو یا نشے میں ہو۔ کس نے کہا تھا تم سے کہ سکندر بخت نام کا کوئی شخص یہاں رہتا ہے؟" وقار یوسف نے یہ ظاہر کیا کہ وہ غصے کا بہت تیز ہے۔
ڈرائیور بگڑ گیا "سر۔ آپ مجھ پر ایسے ہی غصہ ہو رہے ہیں۔ مجھے تو کہا گیا تھا کہ یہ لاش اس پتے پر پہنچادو۔ دیکھ لیں پتا یہی ہے۔"
وقار یوسف نے سلپ لے لی "پتا تو ٹھیک ہے۔ کس نے دیا ہے تمہیں؟"
"اسپتال والوں نے سر۔ انہوں نے کہا تھا کہ سکندر بخت صاحب سے دستخط کرالینا۔" ڈرائیور بولا۔
"یہ کیا چکر ہے؟" رابعہ نے وقار یوسف کی طرف دیکھا "ایس آئی صاحب' تمہیں معلوم ہے کچھ؟"
سب انسپکٹر نے ٹوپی اُتار کے رومال سے سر صاف کیا۔ وہ عمر رسیدہ شخص تھا جس کا سر درمیان سے صاف ہوچکا تھا "آپ کو نہیں معلوم؟"
وقار یوسف نے کہا "تم کیا چیز ہو یار۔ معلوم ہوتا تو تم سے پوچھتے؟ اسی لیے ترقی نہیں کی تم نے۔ یہ عمر ہوگئی ابھی تک ایس آئی ہو۔"
"آپ میری بے عزتی کر رہے ہیں میرے ماتحتوں کے سامنے۔ وکیل ہونے کا یہ مطلب نہیں۔"
"میری بہن نے جو رعایت دی ہے وہ کافی ہے۔ مختصر بات کرو اور جاؤ۔ عزت اور بے عزتی کے چکر میں مت پڑو۔ سمجھے' جرم تم نے کیا ہے بلا اجازت اندر آکے۔ میں نے نہیں۔"
"وقار۔ پلیز مجھے بات کرنے دو۔ تم اندر جاؤ۔" رابعہ نے اسے بڑی بہن کی طرح ڈانٹا۔
سب انسپکٹر نے ایک گہری سانس لی "بیگم صاحب۔ اسپتال میں کوئی جھگڑا ہوا تھا۔ دو آدمی مُردہ خانے میں گئے۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ میں ڈاکٹر شیلا خان کی لاش لینے آیا ہوں۔ مُردہ خانے میں اس وقت صرف ایک ہی بندہ تھا۔ اس نے کہا کہ لاش لے جانے کی اجازت تو صرف انچارج صاحب ہی دے سکتے ہیں۔ وہ انچارج کو لے آیا۔ انچارج ایک ڈاکٹر ہے۔ اس نے لاش دینے سے انکار کیا اور کہا کہ اس کا پوسٹ مارٹم ہوگا۔ ویسے بھی یہ پولیس کیس ہے اور ابھی تفتیش ہو رہی ہے۔ ان میں سے ایک نے ڈاکٹر کو ہاتھ مار کے لمبا لٹادیا۔ اس نے اپنا نام تو بتایا ہی نہیں تھا۔ دوسرے بندے کو انہوں نے ریوالور سے ڈرا کے کہا کہ لاش کہاں ہے؟ سیدھی طرح ہمارے حوالے کردو ورنہ خود بھی سرد خانے میں پڑے نظر آؤگے۔ وہ بے چارا ڈر گیا۔ اس نے سرد خانے سے لاش نکلوائی وہ اس کے پیچھے پیچھے تھے۔ انہوں نے کہا کہ جیسا ہم چاہتے ہیں ایسا ہی کرتے جاؤ' لاش وارثوں کے حوالے کرنے کا طریقہ کیا ہے۔ اسی کے مطابق چلو۔ کسی رجسٹر میں کچھ لکھنا ہے تو لکھو۔ کوئی فارم بھرنا ہے تو بھرو۔ ایمبولنس منگواؤ اور لاش رکھوادو۔ اس کے بعد تمہارا کام ختم۔"
وقار نے کہا "وہ زبردستی لاش لے گئے۔ کوئی روکنے والا نہیں تھا انہیں؟"
"لے کہاں گئے۔ یہاں بھیج دی" رابعہ بولی۔
"سر وہاں جھگڑا ہوتا رہتا ہے۔ پوسٹ مارٹم تو ایک قانونی ضرورت ہے۔ آپ کو معلوم ہے" سب انسپکٹر نے پھر ماتھے سے پسینہ صاف کیا "بہت سے لوگ پوسٹ مارٹم نہیں کراتے۔ مخالفت کرتے ہیں اور شور مچاتے ہیں کہ لاش کی بے حرمتی ہوتی ہے۔ ویسے ٹھیک بھی ہے۔ جو بندہ سڑک پر حادثے میں مرگیا۔ کسی گاڑی کے نیچے آگیا یا کسی نے خودکشی کرلی' ٹرین کی پٹڑی پر لیٹ کر تو پوسٹ مارٹم سے کیا فائدہ جی۔"
"کمال ہے۔ تم پولیس میں واقعی بھاڑ جھونکتے رہے۔ او میاں جی دنیا میں سب کچھ ہوتا ہے۔ بندے کو مار کے سڑک پر ڈال دیتے

ہیں یا ریلوے لائن پر کہ رات کو بس ٹرک یا ٹرین گزرے گی تو لگے گا حادثہ تھا یا خودکشی کا کیس بن جائے گا۔ پوسٹ مارٹم سے ہی پتا چلتا ہے کہ بندہ پہلے مرا تھا اور پھر اسے گاڑی کے آگے یا پٹری پر ڈالا گیا تھا۔"

"وہ..... ہم تو سمجھتے ہیں جی... میں لوگوں کی بات کر رہا تھا۔ اکثر جھگڑے ہوتے ہیں وہاں اور بعض اوقات زبردستی بھی لے جاتے ہیں لوگ لاش۔ ٹک مکا بھی ہو جاتا ہے۔ دو چار سو دے کر خانہ پُری کراتے ہیں پھر چیر پھاڑ کے پوسٹ مارٹم رپورٹ کا فارم بھرواتے ہیں اور لاش لے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر کو معلوم تھا یہ کیا کیس ہے۔ دوسرا بندہ تو معمولی ملازم تھا' اس نے وہی کیا جو اسے کہا گیا تھا۔ جو لاش لے جانے آئے تھے ان میں سے ایک نے اسپتال کی ایمبولینس منگوائی کہ لاش گھر لے جانی ہے۔ اس ڈرائیور نے بھی دیکھا ہوگا اسے۔"

ڈرائیور چونکا "بادشاہو۔ میرا کیا قصور ہے۔ اسپتال میں روز مرتے ہیں لوگ۔ ہم تو سارا دن یہی کام کرتے ہیں۔ مریض کو گھر سے لانا۔ کوئی فوت ہو جائے تو گھر پہنچانا۔"

"ہاں ہاں۔ معلوم ہے ہمیں لیکن شناخت کے لیے تو تمہیں بلالیں گے ہم" سب انسپکٹر نے غرا کے کہا اور پھر رابعہ سے مخاطب ہو گیا "دوسرا بندہ مُردہ خانے میں تھا۔ اس نے پرچی بنوالی۔"

ڈرائیور نے کہا "اس نے مجھے پرچی دی اور کہا کہ وہاں تمہیں سکندر بخت صاحب ملیں گے۔ ان سے دستخط کرالینا۔ مجھے کیا معلوم تھا جی کہ کیا ڈراما چل رہا ہے۔ میں گاڑی لے کر روانہ ہو گیا۔"

"ان کے جاتے ہی مُردہ خانے کا ملازم شور مچاتا بھاگا اور اس نے دوسرے لوگوں کو بلالیا۔ جو ڈاکٹر بے ہوش پڑا تھا اسے تو وارڈ میں لے گئے تھے۔ ہم شعبۂ حادثات کے سامنے کھڑے تھے۔ ایک بلوہ ہو گیا تھا۔ اس میں دو بندے مرے تھے کچھ زخمی ہوئے تھے۔ ان کو لے کر آئے تھے۔ ہم سے کہا گیا کہ اس ایمبولینس کے پیچھے جاؤ۔ ابھی ابھی نکلی ہے۔ ہمیں پتا بھی بتادیا گیا اور یہ کہا گیا کہ سکندر بخت جو بھی ہو اسے پکڑ لانا۔"

"تم ہر ایک کا حکم مان لیتے ہو؟" وقار نے طنز سے کہا۔

"نہیں جی۔ وہاں پہلے سے ایک ڈی ایس پی صاحب موجود تھے۔ انہوں نے حکم دیا تھا۔" سب انسپکٹر بولا "اب ہماری تو مصیبت ہے نا جی۔ افسر کا حکم کیسے نہ مانتے۔ یہاں آئے تو آپ نے بے عزت کر دیا۔"

رابعہ نے کہا "دیکھو۔ یہ جو کچھ بھی ہوا' غلط ہوا۔ اب تم ایسا کرو کہ یہ لاش واپس لے جاؤ۔ بلکہ ایک منٹ ٹھہرو۔ میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔ ایسا نہ ہو راستے میں کوئی گڑبڑ ہو جائے۔"

وقار یوسف نے کہا "میں بھی چلوں گا ساتھ۔"

سب انسپکٹر نے کہا "بڑی مہربانی ہوگی جناب۔ میری جان چھوٹ جائے گی۔"

ڈرائیور نے بھی کہا "میں تو غریب آدمی ہوں جی۔"

رابعہ نے اسے تسلی دی "کچھ نہیں ہوگا تمہیں۔ میں اسپتال والوں سے بھی بات کرلوں گی اور انہیں سمجھادوں گی کہ کسی نے بے ہودہ مذاق کیا ہے یا پھر غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہاں کوئی سکندر بخت نہیں رہتا جسے ڈاکٹر شیلا خان کی لاش کی ضرورت ہو۔"

میں نے دل ہی دل میں رابعہ کی فہم و فراست کی داد دی۔ اس نے بڑی صفائی سے مجھے بچالیا تھا اور اب لاش لے کر آنے والی ایمبولینس اور پولیس کے ساتھ اسپتال جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس طرح واپسی کے سفر میں لاش کے غائب ہو جانے کا احتمال نہیں رہا تھا۔ جس نے بھی کوشش کی تھی کہ شیلا خان کے نام کے ساتھ میرا نام شریکِ جرم کے طور پر آئے اس نے مجھے مجرم ثابت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ ڈاکٹر شیلا خان میرے ساتھ تھی۔ ہم نے مل کے رفیق کا قتل کیا تھا اور اس کی لاش غائب کر دی تھی۔ یہی فرض کیا جا سکتا تھا کہ میں نے ہی نقوی صاحب کو گھر میں زہر دینے کی کوشش کی اور میری ناکامی کے بعد یہ کام ایک ڈاکٹر بن کے شیلا خان نے پورا کیا۔ اب میں نے اس کی لاش حاصل کرنے کے لیے مُردہ خانے میں ہنگامہ کیا۔ اکثر مجرم اپنے ساتھی کی لاش نہیں چھوڑتے کہ کہیں لاش سے ان کا سراغ نہ مل جائے۔

کرنے والوں نے سب ٹھیک ہی کیا تھا۔ انہوں نے مُردہ خانے کے ڈاکٹر کو ایک بار مار کے لٹایا تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ حملہ آوروں میں سے ایک جوڈو کراٹے سے واقف تھا۔ اس طرح شک کا رخ فوراً میری جانب ہو جاتا تھا کیونکہ میں خالی ہاتھوں سے اپنا دفاع کرنے میں شہرت رکھتا تھا۔ غلطی ان سے صرف ایک ہوئی تھی جو بہت بڑی غلطی تھی۔ انہوں نے ڈرائیور کو سکندر بخت کا نام بتایا تھا کہ اس سے لاش کی وصولی کی دستاویز پر دستخط کرالینا۔

اوّل تو کوئی اور میرے دستخط نہیں کر سکتا تھا۔ دوسرے مجھ سے اس حماقت کی توقع میرے دشمن بھی نہیں کر سکتے تھے۔ سوچنے کی بات یہ تھی کہ اگر اسپتال کے مُردہ خانے سے لاش لے جانے والا سکندر بخت تھا تو اس نے وہیں دستخط کیوں نہ کر دیے اور وہ سکندر بخت کا آدمی تھا تو اسے سکندر بخت کا نام بتانے کی کیا ضرورت تھی۔ سکندر بخت اتنا احمق بہرحال نہیں تھا کہ شیلی کی لاش اٹھاتا تو رابعہ کی کوٹھی پر لے جاتا۔

یہ پلاننگ کی غلطی تھی یا اس طرح ایک خبر بنانا مقصود تھی جس میں پھر ڈاکٹر شیلا خان کے نام کے ساتھ میرا نام آئے۔ رابعہ بدنام ہو اور یہ چرچا ہو کہ میں اسی کوٹھی میں ہوں۔ قسمت نے مجھے بچالیا ورنہ یہ ثابت ہو جاتا کہ مجھے رابعہ نے چھپا رکھا ہے۔

رابعہ کی گاڑی کو وقار یوسف نے ڈرائیو کیا اور تینوں گاڑیاں روانہ ہوئیں۔ شاید رابعہ نے تاکید کی تھی کہ پولیس اپنی گاڑی آگے پیچھے رکھے اور ایمبولینس درمیان میں رہے۔ وہ خود سب سے پیچھے تھی۔ ایمبولینس کے لیے فرار ہونے یا راستہ بدلنے کا موقع نہیں رہا تھا اور یہ امکان بھی کم ہو گیا تھا کہ واپسی میں کوئی لاش چھپانے اور ایمبولینس ڈرائیور اپنی جان بچانے کے لیے جھوٹ بولنے پر مجبور ہو جائے کہ وہ تو لاش رابعہ قاری ایڈووکیٹ کی کوٹھی پر سکندر بخت کے حوالے کر آیا تھا۔ نہ وہ سکندر بخت کو پہچانتا تھا اور نہ یہ تصدیق کر سکتا تھا کہ اس نے اپنے دستخط ٹھیک کیے ہیں یا غلط۔ وقار یوسف ریوالور بھی ساتھ لے گیا تھا۔

وقار یوسف کی بیوی تو پہلے ہی ڈپریشن کا شکار تھی۔ وہ یہاں سکون کی تلاش میں آئی تھی۔ وہ ہم سب کو اپنا سمجھتی تھی اور رسمی تسلی کے کھوکھلے الفاظ بولنے والوں کے سامنے دل کھول کے نہیں رکھ سکتی تھی۔ بعض اوقات آدمی ایک مخلص اور حقیقی غمگسار چاہتا ہے۔ لوگوں کی بھیڑ میں اسے سب ہی مصنوعی جذبات رکھنے والے لوگ نظر آتے ہیں جن کے سامنے دردِ دل بیان کرنا بھی وقت کا زیاں محسوس ہوتا ہے۔

لیکن یہاں آ کے وقار کی بیوی کو نئی پریشانی سے واسطہ پڑ گیا۔ اب اس کی دلجوئی کے لیے نازو ہی یہاں تھی۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ ان حالات میں وہ مجھ پر اعتماد کرے گی لیکن میرا دل صاف تھا اور میرا ضمیر مطمئن تھا۔

وہ نازو کے سامنے چپکے چپکے رو رہی تھی کہ میں اس کے پاس جا بیٹھا۔ میں نے کہا "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کہوں؟"

وہ میرے کندھے پر سر رکھ کے اور پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی "یہ سب میری وجہ سے ہوا بھائی۔"

میں نے اس کے سر پر محبت سے تھپکی دی "یہ تو مجھے کہنا چاہیے۔ اسی خیال نے مجھے تمہارے سامنے مجرم بنا دیا ہے۔"

اس نے میرا دوسرا ہاتھ پکڑ لیا "ایسا مت کہیں خدا کے لیے۔"

میں نے کہا "کہنے کو کہا جا سکتا ہے کہ موت کا ایک دن معین ہے لیکن میں خود کو قصوروار سمجھتا ہوں کہ تم سے تمہارا باپ چھین لیا۔"

"سکندر بھائی۔ مرنا تو ایک دن سب کو ہے" اس نے سسکیوں کے درمیان کہا "اور کس کے والدین ہمیشہ رہتے ہیں لیکن آپ خود کو مجرم سمجھتے ہیں تو آپ سے زیادہ میں مجرم ہوں۔ میں نے انہیں مجبور کیا تھا کہ آپ کے خلاف مقدمات کو ختم کریں۔ مجھے معلوم تھا کہ ان کی سب سے بڑی کمزوری میں ہوں۔ وہ میری بات ٹال ہی نہیں سکتے تھے۔ شروع سے مجھے ان کے لاڈ نے بگاڑ دیا تھا۔ میں ناجائز فرمائش کرتی تھی اور وہ اسے پورا کرتے تھے۔ میں روٹھ جاتی تھی تو وہ اُداس ہو جاتے تھے۔ میں روتی تھی تو وہ تڑپ اٹھتے تھے۔ میری آنکھوں میں آنسو وہ دیکھ ہی نہیں سکتے تھے۔ اب میں کتنا رو رہی ہوں مگر وہ چپ لیٹے ہیں اپنی قبر میں۔"

ایک دم اس کے آنسوؤں کا زبردست ریلا آیا۔ یہ خیال بھی اس کے لیے بڑا دکھ دینے والا تھا کہ جو باپ اس کی آنکھ میں آنسو نہیں دیکھ سکتا تھا وہ اس کو یوں روتا دیکھنے کے لیے موجود نہیں اور اس کے آنسو رائگاں جا رہے ہیں جن کی وہ منہ مانگی قیمت وصول کر لیتی تھی۔

نازو نے اسے خاموش کرانے کی کوشش کی۔ وہ خود بھی اس کے ساتھ رو رہی تھی۔ میں نے بہتر یہی سمجھا کہ ان آنسوؤں کو بہہ جانے دوں۔ بند باندھنے سے وقتی طور پر دریا کی روانی رک جاتی ہے مگر پیچھے جمع ہو جانے والا پانی اپنی قوت سے بند کو توڑ ڈالے تو پھر سب کچھ بہا لے جاتا ہے اور یہ آنسوؤں کا دریا تو موسمی ندی کی طرح ہوتا ہے۔ دکھ کا موسم گزر جائے تو خود ہی خشک ہو جاتا ہے۔

میرے سامنے اس کا احساسِ غم تازہ ہو گیا تھا۔ یہ ایک فطری بات تھی۔ غیروں کے مقابلے میں اپنا پہلی بار سامنے آئے تو زخمِ دل سے پھر لہو بہنے لگتا ہے۔ اس کا مشاہدہ روز مرّہ کی زندگی میں ہوتا ہے۔ کسی مرنے والے کو رو دھو کے اور دفنا کے گھر والے خاموش ہو جاتے ہیں۔ ایسے میں اچانک باہر سے کوئی بیٹا یا بھائی پہنچ جائے تو نئے سرے سے سب اس کے گلے لگ کر رونے لگتے ہیں۔

اس کا موڈ بدلنے کے لیے میں نے نازو سے کہا "کھانے کا تو ابھی کوئی موڈ نہیں۔"

نازو نے وقار کی بیوی کو دیکھا "تم نے کچھ ناشتا وغیرہ کیا تھا؟"

"ہاں کیا تھا" وہ بولی "مگر کھانا نہیں کھاؤں گی۔"

"اچھا تو میں کافی لے آتی ہوں" نازو نے کہا۔

وقار کی بیوی نے باتھ روم میں جا کے منہ دھویا اور پھر میرے سامنے آ کے بیٹھ گئی۔ "سکندر بھائی۔ جتنا دکھ ہے وہ اپنی جگہ۔ لیکن ایک عجیب سا سکون ملتا ہے یہ سوچ کر کہ انہوں نے ایک مقصد کے لیے جان دی۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ بیٹھے بیٹھے ان کا ہارٹ فیل ہو جاتا۔ لوگ حادثات کا شکار بھی ہو جاتے ہیں۔ امی کو دیکھیں کتنے عرصے سے بستر پر مفلوج پڑی ہیں۔ انہیں ابھی تک کسی نے نہیں بتایا کہ ان کا رفیقِ سفر بچھڑ گیا ہے۔ کیا فائدہ انہیں مزید دکھ دینے کا۔ وفاقت کا احساس اگر ہے تو ان کے ذہن میں۔ اسے کیوں چھینا جائے۔ وہ خود کو سہاگن سمجھتی رہیں۔ جب تک زندہ ہیں۔ بیوہ ہو کے ہر عورت کٹی پتنگ ہو جاتی ہے۔ ان کی تو بات ہی الگ ہے۔ ڈیڈی نے بڑی ترقی کی تھی۔ وہ کلرک بھرتی ہوئے تھے۔ کچھ اور جیتے تو ہوم سیکریٹری بھی ہو جاتے مگر اس مقام تک پہنچنا بھی کیا کم تھا۔ ان کا بیک گراؤنڈ تو ایسا تھا کہ انہیں کوئی مدد نہیں ملی۔"

میں نے کہا "میں ان کے متعلق واقعی کچھ نہیں جانتا۔"

"ان کے والد موچی تھے۔ انڈیا میں جہاں ان کا گھر تھا اسی گلی کے نکڑ پر بیٹھتے تھے۔ ایک لکڑی کا باکس ان کا کل سرمایہ تھا۔ وہ جوتے بناتے نہیں تھے۔ مرمت کرتے تھے۔ کسی کا تلا لگا دیا' کسی کی

ایڑی ٹھونک دی۔ کہیں سے سلائی اُدھڑ گئی تو اسے ٹھیک کردیا۔ اس زمانے میں غریب لوگ چمڑے کا جوتا بار بار نہیں خرید سکتے تھے۔ وہ اوپر والے حصے پر سوراخ ہو جانے کی صورت میں پیوند بھی لگوا لیتے تھے۔"

میں نے کہا "غریب آج بھی ایسا ہی کرتے ہیں اور اسی شہر کی نہ جانے کتنی گلیاں ہوں گی جن کے نُکڑ پر ایسے ہی جوتے مرمت کرنے والے اسی طرح اپنا پیٹ پال رہے ہیں۔"

"سچ کہا آپ نے سکندر بھائی۔ بس اب ہماری نظر نہیں جاتی ان پر۔ ہم ان گلیوں اور بستیوں سے بہت دور آ گئے ہیں نا لیکن آج میں سوچتی ہوں کہ وہ کیا کمائی کرتے ہوں گے' اتنی مہنگائی ہے۔"

میں نے کہا "مہنگائی کب نہیں تھی۔ کبھی لوگوں نے کہا کہ بھئی بڑا سستا زمانہ آگیا ہے۔ وہ تو جب چیزوں کی قیمت چڑھتی ہے تب پچھلے زمانے کو سستا کہنے لگتے ہیں ورنہ گزارا کرنے والے اس وقت بھی گزارا کر لیتے تھے اور آج بھی کرتے ہیں۔ گلی کے نُکڑ پر بیٹھا ہوا موچی زیادہ قوتِ برداشت رکھتا ہے۔ وہ تقدیر سمجھ کے غربت سے سمجھوتا کر لیتا ہے اور صبر شکر سیکھ جاتا ہے۔ مہنگائی کا رونا وہ زیادہ روتا ہے جس کے پاس کوٹھی ہے اور کار ہے۔ گورنمنٹ نے ٹیکس بڑھا دیا۔ پیٹرول کی قیمت بڑھا دی۔"

"یہ تو بالکل ٹھیک ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ لوگ نوکروں کے نخروں کی بات کرتے ہیں۔ شکایت کرتے ہیں کہ نوکروں کا دماغ خراب ہو گیا ہے اتنے منہ پھاڑ کے پیسے مانگتے ہیں۔ خود کو نہیں دیکھتے کہ خدا نے کتنا دیا ہے۔ ان کا گزارا نہیں ہوتا تو بے چارا نوکر کیسے گزارا کرتا ہوگا۔ ڈیڈی کے والد نے بڑی محنت سے کام لے کے انہیں پڑھایا۔ چاہتے تو اپنے ساتھ جوتے گانٹھنے کے لیے بٹھا لیتے مگر وہ کہتے تھے کہ ایسے تو ایک کے بعد دوسری نسل یہی کام کرتی رہے گی اور کبھی کسی کی حالت نہیں بدلے گی۔ ڈیڈی بتاتے تھے کہ جب انہوں نے بی اے کیا تھا تو بڑا بے روزگاری کا زمانہ تھا۔ گریجویٹ واقعی بوٹ پالش تک کرتے تھے۔"

میں نے کہا "بڑے ہمت والے اور قابلِ تعریف ہوتے ہیں وہ لوگ جو ڈگری بھی رکھتے ہیں اور عزتِ نفس بھی لیکن محنت کر سکتے ہیں۔"

"جب ڈیڈی کو کلرکی ملی تو گویا بادشاہت مل گئی تھی۔ وہ بتاتے تھے کہ محلے میں مٹھائی تقسیم کی گئی تھی۔ لوگ بڑے رشک و حسد کے ساتھ کہتے تھے کہ دیکھو جی' موچی کا لونڈا تو بابو بن گیا۔ اس کے بعد تو سب کچھ بدل گیا۔ اب کسی کو معلوم ہی نہیں تھا کہ زیڈ یو نقوی ایڈیشنل ہوم سیکریٹری کے ڈیڈی جوتے گانٹھتے تھے۔ پاکستان آجانے کے بعد وہ کچھ بھی کہہ سکتے تھے کہ والد کا بزنس تھا یا وہ زمیندار تھے لیکن یہ بات وہ بڑے فخر سے بتاتے تھے کہ ان کے والد نے کس طرح انہیں اس مقام تک پہنچایا۔ بابو بننے کے بعد انہوں نے والد کو کام کرنے سے روکا تھا۔ نوجوان تھے' لوگوں کی باتیں بُری لگتی تھیں۔ والد نے ان کی نہیں مانی اور اپنا کام کرتے رہے۔ سرکاری ملازمت میں تبدیلی تو ہوتی ہے۔ انہیں پہلی بار دوسرے شہر جانا پڑا تو والد کو ساتھ لے گئے اور یوں وہ کام ختم ہو گیا جو وہ بچپن سے کرتے چلے آئے تھے۔ پھر ڈیڈی نے ایک انگریز افسر کی حوصلہ افزائی پر آئی سی ایس کا امتحان دیا۔ انگریز متعصب بھی ہوتے تھے اور فراخ دل بھی۔ سب ایک جیسے نہیں ہوتے۔ اس نے صلاحیت دیکھی تو ڈیڈی سے کہا کہ رینگ رینگ کر آگے بڑھنے سے بہتر ہے' ایک لمبی چھلانگ لگاؤ۔ ناکامی سے مت ڈرو۔ جہاں ہو یہ جگہ تو رہے گی۔ ڈیڈی نے امتحان دیا اور کامیاب بھی ہوئے۔ افسر بنے اور لائق افسر کہلائے۔ ان کے والد نے سب دیکھا۔ انیس سو ساٹھ میں جب ان کا انتقال ہوا تو وہ پشاور میں تھے۔ نارو سرکلر روڈ پر کوٹھی سے ان کا جنازہ اُٹھا۔ درجنوں کاریں پیچھے تھیں۔ فخر اور غرور تھا انہیں تو جائز تھا۔ کسی کی تقدیر ایسے بدلتی ہے۔ کتنے خوش نصیب ہوتے ہیں ان کی طرح؟ کوئی کہہ سکتا تھا کہ یہ جنازہ اسی موچی کا ہے جو فلاں قصبے کی فلاں گلی کے نکڑ پر ایک ایک پیسے میں جوتیاں گانٹھتا تھا۔"

میں نے اسے بولنے دیا۔ اس کے غم کا بار ہلکا ہوتا جا رہا تھا۔ نازو کافی لے آئی تھی۔ کافی پیتے ہوئے وہ پھر بولنے لگی۔

"سکندر بھائی۔ ڈیڈی کو سب معلوم تھا۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ آپ کے بارے میں تو وہ کہنے لگے۔ چھوکری۔ وہ مجھے ایسے ہی بُلاتے تھے۔ کبھی کہتے تھے اے بھنگن' کبھی نوکرانی' لیکن مجھے اداس دیکھتے تھے تو پوچھتے تھے شہزادی کو کیا دکھ ہے۔ میری بلبل کیوں خاموش ہے؟"

میں نے جلدی سے اسے وہ بات یاد دلا دی جو پھر آنسوؤں کے ریلے میں بہنے والی تھی۔ "تم نے میرے بارے میں بتایا تو کیا کہا انہوں نے؟"

"کہنے لگے کہ تو کیا مجھ سے زیادہ جانتی ہے۔ ارے لڑکی' ہمیں تو پل پل کی خبر رہتی ہے۔ اس ملک میں کون کیا کر رہا ہے اور کیوں کر رہا ہے۔ ہمارا تو یہی کام ہے کہ معلوم کرتے رہیں۔ افواہ بھی ہو تو تصدیق کریں کہ اس کی بنیاد کیا تھی۔ انہیں چوہدری دلاور کے بارے میں بھی معلوم تھا اور اس کی غیر قانونی سرگرمیوں کے بارے میں بھی۔"

"پھر انہوں نے کچھ کیا نہیں؟" میں نے بے اختیار کہہ دیا۔

"وہ کہتے تھے کہ میں مجبور ہوں۔ بہت سی رُکاوٹیں ہیں۔ ایسے ان لوگوں پر ہاتھ ڈالنا آسان نہیں۔ اُلٹے لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ زمانہ اب وہ نہیں رہا جب ایمانداری کی قدر تھی۔ قائدِ اعظم تھے۔ ان کے بعد لیاقت علی خان آئے تو انہیں راستے سے ہٹا دیا گیا۔ پھر ناظم الدین جیسے گھر بٹھا دیے گئے۔ اب انہی لوگوں کا راج ہے۔ انہی کی چلتی ہے جنہوں نے پاکستان بنانے والوں سے ان کا پاکستان چھین لیا تھا۔"

"میرے بارے میں تم نے ان سے کہا تھا کہ مقدمات ختم کرا دیں؟"

"ہاں۔ میں نے کہا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ یہ میرے بس کی بات نہیں لیکن میں ضد پر اڑ گئی تو انہوں نے کہا کہ اچھا' میں کوشش کروں گا۔"

"کوشش یقیناً کی تھی انہوں نے۔"

"ہاں۔ اسی کا انجام ہے یہ" وہ رونے لگی "مگر سکندر بھائی۔ میں سمجھتی ہوں کوئی نیک مقصد کے لیے کوشش کرے اور بُرے لوگوں کے ہاتھوں مارا جائے تو وہ شہید کہلائے گا' کیا یہ غلط ہے؟"

میں نے کہا "میں کوئی مفتی نہیں۔ دین کا علم بھی واجبی سا رکھتا ہوں' لیکن میری عقل اصولی طور پر تسلیم کرتی ہے کہ نقوی صاحب کو شہادت نصیب ہوئی۔ وہ جانتے تھے کہ ظلم اور ناانصافی کا شکار میں ہوا تھا اور میری حمایت کرکے وہ ایسے لوگوں کو دشمن بنالیں گے جو کسی اصول' ضابطہ' اخلاق یا قانون کی پروا نہیں کرتے۔ ان کی طاقت کیا ہے اور وسائل کیا ہیں؟ ان کے ہاتھ کتنے لمبے ہیں اور ان کی مخالفت میں جان جانے کا خطرہ بھی ہے۔ اس کے باوجود انہوں نے ہماری مدد جاری رکھی تو یہ کسی جہاد سے کم نہیں۔"

وقار کی بیوی کے چہرے پر اطمینان کی مسکراہٹ آگئی "ڈیڈی نے یہ بھی بتایا تھا مجھے کہ آج میرے سامنے پھن اُٹھانے والے سانپ وہی ہیں جن کو میں نے ہی دودھ پلایا تھا۔ پتا نہیں اس بات کا کیا مطلب تھا!"

میں اس بات کا مطلب اسے سمجھا سکتا تھا لیکن ایک دل زدہ بچی کو دل آزار سچ بتا کے زیادہ دکھی کرنے کا یہ کوئی موقع نہیں تھا۔ اختیار اور اقتدار نقوی صاحب کے پاس بھی تھا مگر انہوں نے اس کا استعمال کرتے ہوئے ذاتی مفاد کو اہمیت دی۔ شاید نقوی صاحب بھی ان پُرانے لوگوں کی آخری کھیپ میں شامل تھے جو خوش آیند توقعات' بلند و بانگ دعوے اور سنہرے خواب لے کر پاکستان بنانے والوں کے ہراول دستے میں شامل ہوئے تھے۔ جب یہ توقعات غلط ثابت ہوئیں۔ دعوے پُرفریب نعرے بن گئے اور سنہرے خوابوں کو بدنما تعبیر ملی تو باقی بچ جانے والوں میں دو قسم کے ردِعمل نے جنم لیا۔ ایک گروہ شرافت سے اپنی عزت و ناموس اور وضع داری کے ساتھ الگ ہو کے گوشہ نشین ہو گیا۔ دوسرے گروہ نے جیسا دیس ویسا بھیس کے فارمولے پر عمل کیا اور اصول فراموش کر دیے' مقاصد کو بالائے طاق رکھ دیا اور ہر عہد کو بُھلا دیا جو انہوں نے قوم سے' اپنے آپ سے اور خدا سے کیا تھا۔ ذاتی مفاد کی جنگ چھڑی تو وہ بھی اس میں کود پڑے اور انہوں نے وقت سے فائدہ اٹھایا۔ وہ خسارے میں نہیں رہے۔ مقام اور مرتبے کے ساتھ انہوں نے دولت سمیٹی لیکن یہ دولت انہی کی عطا کردہ تھی جو نقوی صاحب سے مراعات حاصل کرتے تھے۔ ان کے صوابدیدی اختیارات کا فائدہ اُٹھاتے تھے اور انگریز حاکم کی ایجاد "عمومی قوانین میں نرمی" (IN RELAXATION OF NORMAL RULES) سے استفادہ کرتے تھے۔ یہی وہ سانپ تھے جو اب اتنے قوی ہو گئے تھے کہ نقوی صاحب کے سامنے پھن پھیلائے کھڑے ہوئے تھے اور نقوی صاحب میں اتنی طاقت نہ تھی کہ ان کا سر کچل دیں۔ بالآخر انہوں نے ہی نقوی صاحب کو ڈس لیا۔

"یہاں آکے مجھے بڑا سکون ملا۔ مجھے تو اب وہ سرکاری گھر بالکل "سب جیل" کی طرح لگتا ہے" وقار کی بیوی نے کہا۔

نازو نے کہا "تو مت رہو وہاں۔"

"ہاں۔ سوئم ہو جائے پھر ہم سامان اٹھالیں گے۔ ایک صاحب بڑی ہمدردی سے فرما رہے تھے کہ ابھی آپ چھ مہینے رہ سکتی ہیں یہاں۔" وہ بولی "ایک اور نے کہا کہ مزید مہلت بھی مل سکتی ہے۔"

نازو نے کہا "ہوگا کوئی سرکاری چمچہ۔"

"ایک تو مجھے اس ماحول سے وحشت ہوتی ہے۔ وہاں ہر چیز سے ڈیڈی کی یاد آتی ہے۔" وقار کی بیوی نے کہا۔

"تمہارے پاس اپنا گھر بھی ہے پھر نئی کوٹھی ہے۔"

"نئی کوٹھی میں جاکے ہم کیا کریں گے۔ اسے تو کرائے پر اُٹھا دیں گے۔ ہمیں یہی گھر بہت ہے" وہ بولی "مجبوری یہ ہے کہ تعزیت کرنے والے سب سرکاری کوٹھی میں آرہے ہیں۔ ہمیں سوئم تک وہیں رہنا پڑے گا۔"

میں نے کہا "تمہیں کچھ اندازہ ہے۔ نقوی صاحب کس حد تک اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے تھے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "وہ بہت مایوس تھے۔"

"انہوں نے فائلیں تو منگوائی تھیں؟"

"ہاں۔ وقار نے ذکر کیا تھا مجھ سے۔" وہ بولی۔

میں نے عمداً اپنی اور دلاور کی اسی گھر میں ملاقات کا ذکر نہیں کیا "میں نے اور غالب نے کل صبح فائلیں تلاش کی تھیں۔"

"اچھا! کس وقت' کہاں کہاں دیکھا تھا؟"

"ہر جگہ۔ جب تم شیلی کے ساتھ اسپتال گئی تھیں" میں نے کہا۔

نازو اٹھ کھڑی ہوئی۔ "تم لوگ باتیں کرو۔ میں دیکھتی ہوں عاشق علی تڑپ اور اس کی اہلیہ کیا کر رہے ہیں۔ انہیں کھانے پکانے میں لگا دوں یا بازار سے منگواؤں کچھ۔"

وقار یوسف کی بیوی نے کہا "فائلیں مل جاتیں تو تم کیا کرتے؟"

"سوچا تو یہی تھا کہ انہیں غائب کر دیں گے پھر خیال آیا کہ کہیں نقوی صاحب کسی مشکل میں نہ پڑ جائیں۔ فائلیں ملی ہی نہیں" میں نے کہا۔

"آخری بار جب میری ان سے بات ہوئی تھی تو انہوں نے کہا

تھا کہ چھوکری۔ مجھ سے میری جان مانگ لے مگر وہ چیز مت مانگ جو میرے اختیار میں نہیں ہے۔ میں نے کہا تھا کہ ڈیڈی۔ ایسی باتیں مت کریں۔ وہ بولے کہ میری جان آخر کس کے کام آئے گی۔ کسی کے کام آجائے تو اچھا ہے۔ میں رونے لگی تو انہوں نے کہا کہ اچھا اس بے وقوف لڑکے سے کہنا کہ مجھ سے ملے۔"

میں نے کہا "میری اور ان کی ملاقات ہوئی تھی۔ انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ مجھے باہر بھجوادیں گے۔ لندن' میں نے بتایا کہ مجھے تو لندن سے نکالا گیا تھا۔ وہاں کون گھسنے دے گا تو انہوں نے کہا تھا کہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ تم فی الحال پاکستان سے چلے جاؤ بعد میں دیکھیں گے۔ پہلے تم گمنام ہوجاؤ اور گمنام ہی رہو۔ لوٹ کے پاکستان آؤ تو ایسے آؤ کہ کسی کو بھی معلوم نہ ہو۔"

"پھر تم نے کیا کہا؟"

"اس وقت فوری طور پر میں کیسے فیصلہ کرسکتا تھا۔ وہ ایک تجویز تھی۔" میں نے کہا "چلو اچھا ہوا تم نے یہاں آکے میرا بوجھ ہلکا کردیا۔ مجھے بڑا ڈر لگ رہا تھا تمہارے سامنے جاتے ہوئے۔"

"آپ نے ایسا کیوں سوچا سکندر بھائی۔ دھوکا خود آپ کے ساتھ ہوا تھا۔ آپ کو کیا معلوم تھا شیلی کے بارے میں؟"

میں نے کہا "اب تمہارا کیا خیال ہے؟"

"شیلی کے بارے میں؟"

"ہاں۔ تم اسے مجرم سمجھتی ہو؟"

وہ سوچ میں پڑگئی "وقار بھی کہتے ہیں کہ اس نے کچھ نہیں کیا تھا۔"

میں نے کہا "یہ ٹھیک ہی ہے۔"

"پھر خودکشی کیوں کی تھی اس نے؟"

"خودکشی! اسے قتل کیا گیا تھا۔ غالب نے مجھے سب بتادیا ہے۔" میں نے کہا "کل میں نے بھی لندن فون کرکے پوچھا۔"

وقار کی بیوی کی دلچسپی ایک دم بڑھ گئی "تمہیں معلوم ہے۔ اس کی سب چیزیں میرے پاس ہیں؟"

میں چونکا "کون سی چیزیں؟"

"اس کے پاس ایک بیگ تھا۔"

"ہاں۔ بیگ وہ ہر وقت اپنے ساتھ رکھتی تھی۔ اس میں پاسپورٹ اور ضروری کاغذات ہوتے تھے۔ انٹرنیشنل ڈرائیونگ لائسنس تھا اور غالباً امریکن ایکسپریس کے ٹریولر چیک۔"

"آپ تو معلوم ہوتا ہے بڑی تفصیل سے بیگ میں جھانک چکے تھے۔"

میں نے خفیف ہوکے کہا "وہ خود بتاچکی تھی لیکن بیگ تمہارے پاس کیسے پہنچا؟"

وہ ہمارے ساتھ ہی تو گئی تھی گاڑی میں۔ آئی سی یو میں بیگ لٹکا کے جانا مجھے بھی ٹھیک نہیں لگا تھا۔ میں نے اپنا بیگ گاڑی میں چھوڑا تو اس نے بھی چھوڑ دیا تھا۔ مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ کوئی حرج تو نہیں؟ میں نے کہا حرج کیسا' بہت مال ہے تو ساتھ لے لو۔ کہنے لگی نہیں' مال کی پروا نہیں اور مال میں اتنا رکھتی بھی نہیں۔ ٹریولر چیک لے جاکے کوئی کیا کرے گا؟ گاڑی میں سے بیگ تو نہیں چوری ہوگا؟ میں نے کہا کہ بھئی آج تک تو سنا نہیں۔ ویسے لوگ ہاتھ سے چھین کر بھی لے جاتے ہیں۔ اس نے احتیاطاً یہ کی کہ بیگ کو سیٹ کے نیچے رکھ دیا۔ آگے ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ کے نیچے۔ اتنی احتیاط میں بھی کرتی ہوں کہ بیگ کو نیچے رکھ کے ریزر کو اوپر کردیتی ہوں۔ سیٹ پر صاف نظر آئے بیگ تو چور کی نظر متوجہ ہوتی ہے۔ ورنہ کیا پتا چلتا ہے۔"

میں نے کہا "اور وہ بیگ گاڑی میں ہی رہ گیا۔"

"ہاں۔ وہ ہمارے ساتھ واپس کہاں آئی تھی' بے چاری۔"

میرا دل کچھ اور ہلکا ہوگیا "تمہیں بھی ہمدردی ہے اس سے؟"

"دیکھو سکندر بھائی۔ وہ لڑکی تھی' عام لڑکی نہیں تھی ڈاکٹر تھی۔ لندن سے یہاں آئی' اپنی غلطی سے ماری گئی یا دشمنی میں۔ افسوس کی بات تو ہے نا۔" وقار کی بیوی نے کہا "غالب تو کہتا تھا وہ جھوٹ بولتی ہے۔"

"اور وقار کیا کہتا تھا؟"

"وقار کہتے تھے کہ اتنا بڑا جھوٹ کوئی نہیں بولتا' خدا جانے..."

"مجھے وقار کی سمجھ بوجھ کی داد دینی پڑے گی۔ مجھے بھی غالب نے قائل کرلیا تھا کہ نہ وہ ڈاکٹر ہے نہ اس کا نام شیلا خان ہے لیکن میں نے لندن فون کیا' اس اسپتال سے معلوم کیا تو سب غلط نکلا۔"

اس نے حیرانی کا اظہار کیا "اچھا! وہ نیورو فزیشین تھی؟"

میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ دو بج چکے تھے اور ابھی تک رابعہ اور وقار یوسف نہیں لوٹے تھے۔ نازو کچن میں دوپہر کا کھانا تیار کرانے کی کوشش میں مصروف تھی۔ وقت گزاری کے لیے میں نے وقار کی بیوی کو تفصیل سے ڈاکٹر شیلی کے بارے میں بتادیا۔

اس نے کانوں کو ہاتھ لگایا "توبہ خدایا۔ واقعی دلاور نے اس کی ماں کو قتل کیا تھا۔ اور وہ سوتیلی بہن تھی اس کی!"

"مجھے تو یہی پتا چلا ہے..."

"اور وہ ذلیل اس کی لاش خراب کررہا ہے... بے غیرت۔"

میں نے کہا "وہ سمجھتا ہے کہ کسی کو کچھ معلوم نہیں۔ اس نے تو بہن کو چکر دیا تھا۔ مجھے چکر میں ڈالنے کے لیے۔ لیکن... گڑبڑ ہوئی کہ بہن شاید خود میرے چکر میں پڑگئی..."

وہ مسکرانے لگی "کیسے نہ پڑتی... آپ تو خود..."

میں نے اس کی بات کاٹ دی "نہیں۔ پہلے ہی اس غلط فہمی نے بڑی خرابی پیدا کردی تھی۔ سب خفا تھے مجھ سے حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ رابعہ سے اور غالب سے مجھے ہرگز یہ امید نہیں تھی۔"

"آپ اس کے چکر میں نہیں پڑے تھے؟"

"بھئی کس کی قسم کھاؤں۔ تمہاری یا رابعہ کی... خدا کی...؟"

"ناراض نہ ہوں۔ مجھے معلوم ہے' آپ ایسے نہیں ہیں لیکن وہ آپ کے چکر میں کیسے پڑگئی۔ کوئی بات تو کی ہوگی آپ نے ایسی۔ وہ غلط سمجھی مگر حوصلہ افزائی...؟"

"ویسے تو گُل کی مثال ہے۔ وہ محسن کے چکر میں ایسی پڑی تھی کہ پاگل ہوگئی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ محسن کی شادی شہلا سے ہوچکی ہے۔ اس کا ایک بچہ بھی ہے۔ ہم سب سمجھاتے تھے مگر وہ ایک ہی بات کہتی تھی۔ میں محسن سے کچھ مانگ تو نہیں رہی ہوں۔ محبت کرنے سے مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔ تھی نا پاگل پن کی بات۔ محسن نے کبھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی۔ اُلٹا وہ اس کے ساتھ بدسلوکی سے پیش آتا تھا۔ بے عزت کردیتا تھا اسے لیکن جتنا محسن اس کو دور رکھنے کی کوشش کرتا رہا اتنا ہی وہ محسن کے قریب ہوتی گئی۔ اب یہ قدرت کے کھیل ہیں۔ اسے جو چاہو سمجھو۔ بالآخر اس نے محسن کو پالیا۔" میں نے کہا۔

وقار کی بیوی مسکرانے لگی "یعنی وہ بھی چاہتی آپ کو اگر زندہ رہتی۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ اُلٹا مطلب نکالا تم نے۔ میں وضاحت کررہا تھا اس کے رویے کی۔ مجھے یقین نہیں' صرف شک ہے کہ وہ اپنے مقصد کو فراموش کربیٹھی تھی۔ جس کام کے لیے اسے بُلایا گیا تھا اور میرے پیچھے لگایا گیا تھا وہ کام بھول گئی تھی۔ دلاور کے آدمی مسلسل اس کی نگرانی کررہے تھے۔ انہوں نے آگے خبر پہنچادی کہ چوہدری صاحب' کام بگڑتا نظر آرہا ہے۔ ایسا نہ ہو وہ لڑکی بھانڈا پھوڑ دے۔ چوہدری صاحب نے کہا کہ یہ بات ہے تو اس کا قصہ پاک کرو۔ اس کا یوں کام تمام کیا گیا کہ ایک ساتھ دو کام ہوگئے۔ تمہارے ڈیڈی کو اپنے راستے سے ہٹانے کا فیصلہ وہ پہلے ہی کرچکے تھے۔ شیلی پر الزام عائد کرکے اور اس کے قتل کو خودکشی بنا کے انہوں نے تفتیش بھی روک دی۔ چوہدری دلاور کو یقین ہے کہ شیلی کی حقیقت سے کوئی واقف نہیں۔ جب اس کی لاش کو لاوارث قرار دے کر دفنایا جائے گا کہیں تو چوہدری صاحب لندن جائیں گے اور اپنے حقِ وراثت کا ثبوت پیش کرتے ہوئے اس کے مکان اور ترکے پر قابض ہوجائیں گے۔"

"لیکن تم یہ سب جانتے ہوئے بھی...؟"

میں نے کہا "ابھی دیکھو۔ دلاور خود اپنے جال میں پھنس رہا ہے۔ ہم معلوم کرچکے ہیں کہ ڈاکٹر شیلی کون تھی۔ شیلی نے خود ہی سب بتادیا تھا۔ نقوی صاحب نے ایک کیسٹ چھوڑا تھا۔ ابھی تک وہ دلاور اینڈ کمپنی کے ہاتھ نہیں لگا ہے۔ اس نرس کے پاس ہے۔"

"وہ نرس کہاں ہے؟"

"نرس لاپتا ہے۔ وہ اسپتال نہیں پہنچی تھی۔ غالب اور نازو ایک ساتھ نکلے تھے۔ انہیں شیلی کی لاش کے بارے میں معلوم کرنا تھا اور اس نرس کے گھر بھی جانا تھا۔ لاش تو خود یہاں آگئی تھی۔ اب دیکھو نرس کے بارے میں وہ کیا خبر لاتے ہیں۔"

وقار کی بیوی نے مایوسی سے سرہلایا "جب یہاں پہنچ گئے تھے وہ تو کیا نرس کے گھر نہیں گئے ہوں گے۔"

"یقیناً گئے ہوں گے مگر انہیں کیسٹ مل جاتا تو وہ یہاں نہ آتے۔ اس سے مجھے اُمید ہے کہ نرس ان کے ہاتھ نہیں آئی۔"

"اس نرس نے بھی پھر فون نہیں کیا۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر شیلی کا وہ بیگ اب کہاں ہے؟"

"وہیں۔ اسی سیٹ کے نیچے" وقار کی بیوی نے کہا "بعد میں مجھے کہاں ہوش تھا کہ بیگ یاد آتا۔"

"دلاور کو یقیناً اس کی تلاش ہوگی۔" میں اٹھ کھڑا ہوا "ذرا چابی دو اپنی گاڑی کی۔ میں دیکھ لوں۔"

"چابی تو وقار کے پاس تھی۔ وہ ساتھ لے گئے ہوں گے۔"

"خیر۔ دیکھ لیں گے اس کے آنے کے بعد..."

میری بات ختم ہونے سے پہلے ہی کال بیل بجی۔ کھڑکی کا پردہ ہٹا ہوا تھا۔ اس میں سے مجھے پولیس کی گاڑی نظر آگئی اور نہ جانے کیسے مجھے میری چھٹی حس نے خطرے سے خبردار کردیا۔ شاید یہ مجھے عجیب سا لگا تھا کہ کچھ دیر پہلے ایک پولیس کی گاڑی آئی تھی۔ اب دوسری آگئی۔ میں نے نازو کو باہر بھیجا اور خود غائب ہوگیا۔ غائب ہونا بہت آسان تھا۔ رابعہ کی وارڈروب سے گزر کے میں نیچے پہنچ گیا۔

نیچے میرا آدھا گھنٹا انتظار کرتے گزرا پھر نازو نے خطرہ ٹل جانے کا سگنل دیا اور میں اوپر لوٹ آیا۔ پہلی بار آنے والی پولیس کی گاڑی کو ایمرجنسی میں ایمبولینس کے پیچھے دوڑایا گیا تھا اور ان میں سے کوئی بھی مجھے نہیں پہچانتا تھا جو گاڑی میں آئے تھے۔ اُلٹا وارنٹ نہ ہونے کی وجہ سے انہیں خاصی خفت اٹھا کے واپس جانا پڑا تھا لیکن دوسری گاڑی میں علاقے کی پولیس نے ایک ڈی ایس پی اور مجسٹریٹ کے ساتھ چھاپا مارا تھا۔

وہ مجھے تلاش کرتے ہوئے آئے تھے۔ نازو نے واجبی سی مزاحمت کی تھی کہ اس وقت گھر کی مالکن موجود نہیں ہیں مگر انہوں نے ایک نہیں سُنی اور دندناتے ہوئے کمروں میں پھیل گئے۔ نازو مطمئن ضرور تھی کہ انہیں میرا سراغ نہیں ملے گا لیکن اس نے مجسٹریٹ کو اور ڈی ایس پی کو خبردار کردیا تھا کہ وہ ایک کرائم رپورٹر ہے چنانچہ ان کی طرف سے کوئی زیادتی ہوئی یا انہوں نے اختیارات سے ذرہ برابر تجاوز کیا تو اس کے بارے میں پوری رپورٹ پریس کو جاری کردی جائے گی۔

اس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ وہ محتاط ہوگئے اور انہوں نے صرف انہی مقامات پر مجھے تلاش کیا جہاں مجھے چھپایا جاسکتا تھا۔ انہوں نے انڈر گراؤنڈ واٹر ٹینک بھی کھول کے دیکھا اور ٹارچ کی

روشنی میں پانی کے نیچے تک جھانکا پھر وہ اوپر چھت پر چڑھ گئے' اوور ہیڈ واٹر ٹینک میں دیکھا اور آس پاس کے مکانوں کی چھت پر کود کے میرے فرار ہوجانے کے امکانات کا جائزہ لیا۔ کوٹھی کی عقبی دیوار کو دیکھا کہ کہیں میں رسی لٹکا کے دیوار کے ساتھ تو نہیں چپکا ہوا ہوں۔ جاتے وقت رسمی طور پر مجسٹریٹ نے کہا کہ ہم نے ایک قانونی ضرورت پوری کی ہے اور ہم زحمت کے لیے معذرت خواہ ہیں۔ وہ نیا ایس ڈی ایم خاصا مہذب اور معقول آدمی تھا۔ اس نے نازو کے سوال کے جواب میں یہ بھی تسلیم کیا کہ اس کوٹھی میں سکندر بخت کی موجودگی کی اطلاع ایک مخبر نے دی تھی پھر اسپتال سے ایک ٹیلی فون آیا کہ ڈاکٹر شیلا خان کی لاش یہاں لائی گئی ہے۔ اس نے کہا کہ ہم مجبور ہیں۔ اطلاع غلط ہو تب بھی جانا تو پڑتا ہے۔ یہاں تو لوگ فائر بریگیڈ کو بھی نہیں بخشتے۔ انہیں آگ لگنے کی جھوٹی اطلاع دے کر دوڑاتے ہیں اور لطف بھی لیتے ہیں اس غیر ذمے دارانہ مذاق سے۔ انہیں بھاگنا پڑتا ہے تصدیق کیے بغیر بھی۔"

میں نے نازو کی بات سن کے کہا "ان کی ٹائمنگ تھوڑی سی غلط ہوگئی۔ شاید وارنٹ وغیرہ ملنے میں دیر ہوئی یا مجسٹریٹ مصروف تھا۔ پلان تو یہ ہوگا کہ اُدھر اسپتال سے ایمبولینس میں لاش پہنچے اِدھر چھاپا مار پارٹی پہنچ جائے۔"

"اسی لیے تم بچ گئے" نازو نے کہا۔

"ہاں۔ جسے اللہ رکھے' اسے کون چکھے۔" میں نے کہا "میں تو بالکل رنگے ہاتھوں پکڑا جاتا۔ ڈاکٹر شیلی کی لاش کے ساتھ۔"

عاشق علی تڑپ نے دروازے میں نمودار ہو کے کہا "ہم حاضر ہوئے تھے یہ استفسار فرمانے کہ ماحضر تناول کرنے میں تاخیر کیوں؟"

میں نے کہا "تڑپ صاحب' آپ حاضر نہیں ہوئے۔ تشریف لائے ہیں۔ جیسے پوچھتے نہیں استفسار فرماتے ہیں۔"

وقار کی بیوی نے کہا "یہ کیا نمونہ ہے؟"

"یہ منظر نے ارسال کیا ہے۔ عاشق علی نام ہے۔ تڑپ تخلص کرتے ہیں" نازو نے کہا۔

میں نے کہا "تڑپ صاحب کچھ نمونہ کلام سے مستفید فرمایئے۔"

اس کی آنکھیں چڑھ گئیں اور وہ چھت کی طرف دیکھنے لگا۔ یہ استغراق کی کیفیت تھی۔ "عرض فرماتے ہیں۔

عشق کا اب چل پڑا ہے سلسلہ
تو ہے بلبل میں ہوں تیرا بلبلہ

مجھے بے اختیار ہنسی آگئی "واہ..... بلبل کے ساتھ بلبلا۔"

اندر سے ان کی اہلیہ نے چیخ مار کے کہا "ارے نامراد۔ کھانے کو پوچھنے گیا تھا۔ شعر پڑھنے کھڑا ہوگیا۔"

وہ فوراً واپس ہوگیا۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ چار بجنے والے تھے اور ابھی تک نہ غالب کا پتا تھا نہ رابعہ اور وقار کا۔ ان میں سے کوئی فون ہی کردیتا تو ہم سب کی بے سکونی کچھ کم ہوجا[illegible] کے اصرار پر میں نے بھی کچھ کھانا منظور کرلیا۔ اصل مقص[illegible] کی بیوی کو کچھ کھلانے کا تھا۔ یہاں آ کے وہ خاصی پُرسکو[illegible] تھی لیکن میرا بھی یہی خیال تھا کہ اپنے گھر کی ماتمی فضا میں [illegible] ناشتا بھی ٹھیک سے نہیں کیا ہوگا۔ اس کی آنکھیں کچھ تو [illegible] سرخ ہورہی تھیں۔ شاید گزشتہ رات وہ سوئی بھی نہیں ہو[illegible] سے آنکھوں کے گرد سوجن سی محسوس ہوتی تھی۔

ہم میز پر بیٹھے ہی تھے کہ ایک ساتھ سب وارد ہوگئے رابعہ کی فاکس ویگن کی آواز آئی۔

نازو نے عاشق علی کو بھیجا۔ "دیکھو' دروازہ کھولو۔ اب [illegible] گھر کے فرد ہو۔ ایک بات اچھی طرح سمجھ لو۔ یہاں سکن[illegible] نام کا کوئی شخص نہیں رہتا۔"

میں نے کہا "فرشتہ اجل بھی پوچھے تو انکار کردینا۔"

وہ سرہلاتا ہوا چلا گیا "خلاف ہدایات ہم حالت خواب [illegible] کوتاہی فرمائیں تو آپ کی پاپوش مبارک اور ہمارا سر عزیز۔"

اس کی بیوی نے سر پر ہاتھ مارا "اللہ مارا۔ پتا نہیں کہ[illegible] ہے۔"

وقار کی بیوی نے کہا "تم بھی بلبل کی طرح چہکتی ہو۔ [illegible] تھا اس کا۔"

غالب کو رابعہ کے ساتھ دیکھ کے میں نے حیرانی سے [illegible] ان کے انتظار میں گیٹ پر کھڑے ہوئے تھے؟"

"حالت تو ایسی ہورہی ہے جیسے گاڑی کے پیچھے دوڑتے آئے ہو" نازو نے کہا۔

غالب نے کہا "اس وقت پیٹ خالی ہے۔ دماغ مت [illegible] ورنہ وہ بھی خالی ہوجائے گا۔"

وقار اپنی بیوی کی طرف دیکھ کے مطمئن انداز میں [illegible] "ہم ٹھیک وقت پر پہنچ گئے نا!"

رابعہ نے کہا "نازو نے تو کمال کردیا۔ میں سوچ رہی تھ[illegible] نہیں دوپہر کے کھانے کا کیا ہوگا؟"

"جملہ تفکرات امورِ خانہ داری کے لیے ہم تشریف [illegible] ہیں بیگم صاحب۔" عاشق علی تڑپ نے سر جھکا کے کہا "ہمارا [illegible] انتظام و انصرام!"

میں نے ہنس کے کہا "بس بھائی۔ اتنی اردو کافی ہے۔ [illegible] کھانا تو بغیر لغت کے کھانے دو۔"

عاشق علی کی سب سے مضحکہ خیز عادت اپنے لیے "ہم [illegible] ہیں" اور "ہم تشریف لاتے ہیں" جیسے الفاظ کا استعمال تھا۔ [illegible] کرنا اور حاضر ہونا اس نے نہیں سیکھا تھا اور عموماً یہ الفاظ کا[illegible] سے کہہ جاتا تھا۔ تاہم وہ بعد میں ایک وفادار' فرض شنا[illegible] قابل اعتماد ملازم ثابت ہوا۔ مستعدی میں وہ کچھ کم تھا اور [illegible] حرکات و سکنات سے کچھ سویا ہوا یا افیمچی لگتا تھا۔ اس کی [illegible]

بالکل برعکس زبان کی ہی نہیں کام کاج میں بھی بہت تیز ثابت ہوئی۔ اس نے کھانے پکانے میں ہی اپنی مہارت کے دعوے کو بہت جلد تسلیم کرالیا۔

کھانے کے بعد وقار نے بیوی سے پوچھا "کیا خیال ہے' گھر چلیں؟"

اس نے صاف انکار کردیا "تم جاؤ۔ مجھے نیند آرہی ہے۔"

وہ سوگئی تو رابعہ نے ایک بار پھر عاشق علی اور اس کی بیوی کو سمجھایا کہ جب تک چوکیدار نہیں آجاتا انہیں ہر آنے والے کے لیے دروازہ کھولنے سے پہلے پوچھنا ہوگا کہ ان کا نام کیا ہے اور کام کیا ہے؟ کوئی زبردستی اندر نہیں آئے گا۔ فون آئے تو خود کسی کو کچھ نہیں بتانا ہے۔ رابعہ کے سوا کوئی بات نہیں کرے گا۔

ہم سب رابعہ کے بیڈ روم میں بیٹھ گئے۔ رابعہ کی پریشانی اس کی صورت سے عیاں تھی مگر کھانے کی میز پر اس نے عمداً بات نہیں کی تھی۔

میں نے کہا "وقار تم بتاؤ پہلے۔"

وقار نے کہا "کیا بتاؤں سکندر صاحب۔ عجب چکر ہیں۔ ہم یہاں سے ایمبولینس کے ساتھ ہی اسپتال پہنچے تھے۔ پولیس والے تو پھنس گئے تھے۔ وہ جان چھڑا کے واپس شعبۂ حادثات کی طرف چلے گئے۔ ہم نے گاڑی مُردہ خانے کے ساتھ روکی۔ وہاں پارکنگ کی اجازت نہیں ہے۔ رابعہ باجی کو میں نے گاڑی کے ساتھ بھیج دیا اور خود مُردہ خانے کے انچارج سے ملا۔ وہاں اچھی خاصی افراتفری تھی۔ پولیس پہلے سے موجود تھی۔ انہوں نے سب سے پہلے تو ایمبولینس ڈرائیور کو گرفتار کرلیا۔"

"اس کا کیا قصور تھا؟"

"قصور کوئی دیکھتا ہے غریب آدمی کا۔ اسے بھی نہ پکڑتے تو پھر کسے پکڑتے۔" وقار نے کہا "میری ایک انسپکٹر سے منہ ماری ہوگئی۔ میں نے کہا کہ یہ اسپتال ہے یا چنڈو خانہ۔ غالب وہاں موجود تھا اور اس کی سب سے جھڑپ ہوچکی تھی۔ میڈیکل سپرنٹنڈنٹ نے مُردہ خانے کے انچارج کو معطل کردیا تھا اور اس نے ماتحت کو۔"

غالب نے کہا "اس کے سوا وہ کر بھی کیا سکتے تھے۔ کسی کے پاس نااہلی اور کوتاہی کے الزام کا کوئی جواب نہیں تھا۔ میں نے لا کے رپورٹر بھی بلائے تھے۔ سب کا ایک ہی سوال تھا کہ مُردہ خانے میں حفاظتی انتظام کیوں نہیں ہے۔ میڈیکل سپرنٹنڈنٹ پر جھلاہٹ سوار ہوگئی۔ کہنے لگا کہ آپ لوگ صحافی ہیں۔ کمانڈوز متعین کرادیں یہاں۔ اسپتال کی اپنی کوئی فوج تو ہے نہیں جو مُردوں کو چوری ہونے سے روکے۔ ویسے اس قسم کا کوئی واقعہ پہلے ہوا نہیں اور نہ سیکیورٹی کا انتظام بھی ہوجاتا۔"

وقار نے کہا "بات تو ٹھیک ہی کہہ رہا تھا وہ لیکن میں نے تو نوکری کی دھمکی دے دی کہ اس کیس میں ابھی تک لاش کا پوسٹ مارٹم کیوں نہیں ہوا تھا۔ لاش کو اسپتال سے رابعہ قاری ایڈووکیٹ کی کوٹھی پر کیوں بھیجا گیا تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے پولیس بغیر وارنٹ کے کیوں آئی تھی۔ میڈیکل سپرنٹنڈنٹ کی شامت آگئی تھی۔ وہ کہنے لگا کہ وکیل صاحب۔ آپ جو چاہیں کریں۔ میں نے کچھ نہیں کیا تھا اور نہ میں یہ بتا سکتا ہوں کہ ایسا کیوں ہوا اور کیسے ہوا؟ تحقیقات ہوں گی تو سب سامنے آجائے گا۔"

غالب بولا "اخبار والوں نے پوچھا کہ آخر مُردہ خانے کے انچارج اور اس کے ماتحتوں کو معطل کرنے سے کیا ہوگا۔ قصور ان کا تو نہیں تھا۔ میڈیکل سپرنٹنڈنٹ کہنے لگا کہ معطل تو میں بھی ہوسکتا ہوں۔ قصور میرا بھی کوئی نہیں۔ اوپر والے کچھ تو کرتے ہیں۔"

وقار نے کہا "خیر اس کے بعد میں نے کہا چلئے اب آپ اس لاش کو واپس سرد خانے میں رکھوایئے۔ ابھی تک اس کو کسی نے کلیم تو نہیں کیا ہے؟ اس نے کہا کہ کلیم کرنے والے تو زبردستی لے گئے تھے۔ آپ واپس لے آئے۔ میں آج ہی پوسٹ مارٹم کرا کے کسی کے حوالے کرتا ہوں۔ لاش اندر لائی گئی تو اسی طرح لپٹی ہوئی تھی۔ بس اچانک مجھے خیال آیا کہ شیلی کی گردن ٹوٹ گئی تھی۔ سرد خانے میں رکھی ہوئی لاش منجمد ہو کے اکڑ جاتی ہے مگر اس لاش کو سرد خانے سے نکلے ہوئے کافی دیر ہوچکی تھی۔ ایمبولینس میں آتے جاتے دوپہر کی دھوپ سے گاڑی میں خاصی گرمی ہوگی۔ لاش ابھی تک ویسی کی ویسی ہے۔ گردن ٹوٹی ہوئی ہو تو سر ضرور ہلنا چاہیے۔"

میں نے کہا "بڑی باریک بینی سے کام لیا تم نے۔"

رابعہ نے بھی سرہلایا "واقعی۔ وقار نے کمال کردیا۔"

"اب جو لاش کو کھولا گیا تو جناب وہ لاش تھی کسی اور کی۔"

میں اچھل پڑا "کسی اور کی؟"

"ہاں۔ لاش ڈاکٹر شیلی کی نہیں تھی۔"

"پھر کس کی تھی؟" نازو نے کہا۔

"کسی لاوارث بڑھیا کی لاش تھی اور وہ ٹھنڈی بھی نہیں تھی جیسی کہ سرد خانے کی لاش ہوتی ہے" وقار نے کہا۔

"پھر شیلی کی لاش کہاں گئی؟"

غالب نے کہا "میرا خیال ہے کہ وہ بھوت بن کے غائب ہوگئی۔ میرا سسر بھی بھوت ہے۔ وہ لے گیا اسے ورغلا کے۔ بڑا دل پھینک بھوت ہے۔"

نازو نے گھبرا کے کہا "شرم آنی چاہیے تمہیں۔"

"کیوں۔ یہ حرکت میری ہوتی تو مجھے ضرور شرم آتی۔ حد ہوتی ہے کوئی ہوس کی بھی۔" غالب نے کہا۔

"میرے ابا کی شرافت کی قسم کھاتے تھے لوگ۔"

"قسم کھانے والے تو ویسے بھی جھوٹے سمجھے جاتے ہیں اور میں اپنے سسر کو کچھ بھی کہوں۔ تم اپنے ابا کو کہاں سے بیچ میں لے آتی ہو۔ یا تو مان لو کہ وہ بھوت ہیں" غالب نے کہا۔

نازو نے خفیف ہو کے کہا "بھوت ہو تم خود۔"

"آف کورس۔ مائی ڈیئر بھتنی" غالب نے سینے پر ہاتھ رکھ کے کہا "میں پہلے بھوت تھا۔ اب پروموشن ہو گئی ہے میری جن کے عہدے پر اور تمہیں معلوم ہے جن بڑے حسن پرست اور عاشق مزاج ہوتے ہیں خصوصاً دیسی جن۔"

میں نے ایک ہاتھ غالب کے منہ پر رکھا اور دوسرا نازو کے منہ پر "بس آج کے لیے اتنی چخ چخ کافی ہے۔ کھانا ہضم ہو جائے گا۔"

غالب ہنسنے لگا "وہ دراصل۔ ماحول بے حد ڈراؤنا اور سنجیدہ ہو گیا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا حضرات و خواتین کے خوفزدہ چہرے۔"

وقار مسکرایا "بات ہی ایسی ہے یار۔ میں خود وہاں بہت ڈر گیا تھا کہ یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ شیلی راتوں رات اتنی بوڑھی کیسے ہو گئی۔ مرنے کے بعد۔ ہم نے ہنگامہ کیا تو وہاں موجود ڈاکٹروں کے بھی ہوش گم ہو گئے۔ پولیس الگ پریشان ہوئی۔ ایمبولینس کے ڈرائیور سے پوچھا کہ یہ کیا چکر ہے تو وہ دہائی دینے لگا کہ مجھے کیا معلوم۔ میں تو ان کے ساتھ ساتھ آیا ہوں۔ یہ تو لاش دینے والوں کو دیکھنا چاہیے کہ کس کی لاش دے رہے ہیں۔ اب سردخانے میں دیکھا گیا مگر شیلی کی لاش وہاں نہیں تھی۔"

یہ میرے لیے دوسرا شاک تھا "کیا! لاش وہاں نہیں تھی؟"

"نہیں۔ سردخانے میں صرف تین ہی لاشیں تھیں۔ جو وہاں مرتے ہیں ان سب کی لاشیں تو وارث لے جاتے ہیں۔ شاذونادر ہی ایسا ہوتا ہے کہ کسی کا کوئی بھی نہ ہو۔ دو چار دن انتظار کیا جاتا ہے کہ وارث آ جائے۔ عموماً حادثات میں سڑک پر مرنے والے وہاں پہنچتے ہیں جن کے پاس سے کوئی بھی ایسی چیز نہیں ملتی جس سے ان کی شناخت ہو سکے۔"

میں نے کہا "یہ تو نیا ہی کیس ہو گیا۔"

"کیس تو بن گیا ہے مگر نامعلوم لوگوں کے خلاف مقدمہ درج کیا گیا ہے۔ وہ ہمیشہ نامعلوم رہیں گے" غالب نے طنز سے کہا۔

نازو بولی "مجھے معلوم ہے یہ حرکت دلاور کے سوا کوئی نہیں کر سکتا۔"

"اچھا۔ ماشاءاللہ کتنی ذہین ہو تم" غالب بولا "صدقہ اُتارنا چاہیے کہ کہیں تمہیں نظر نہ لگ جائے۔"

"کیا یہ غلط ہے؟" وہ خفا ہو کے بولی۔

"غلط نہیں ہے تو باہر جاؤ ڈھول لے کر اور ہر چوک پر اعلان کرو۔ کیونکہ پولیس تو مانے گی نہیں تمہاری بات۔"

رابعہ نے کہا "سچ تو یہی ہے۔"

غالب نے کہا "ثبوت کے بغیر سچ کیسا۔ مجھے ایک بینک کے کیشیئر کا لطیفہ یاد آ رہا ہے۔ اخباروں میں بھی آیا تھا یہ واقعہ۔ مولانا صاحب غبن کے الزام میں گرفتار ہوئے تھے تو بضد تھے کہ مجھے ورغلانے والا شیطان تھا۔ اس کے خلاف ایف آئی آر درج کی جائے۔ میرے بارے میں تو سب ہی جانتے ہیں کہ کتنا ایما...
پرہیزگار اور نمازی آدمی ہوں۔"

میں نے کہا "خیر اس میں شک کی تو بات نہیں کہ اس وار...
میں دلاور اینڈ کمپنی کے سوا کسی کا ہاتھ نہیں ہو سکتا۔ دلاور کو...
لاحق ہو گی کہ ڈاکٹر شیلا خان کے ساتھ اس کا رشتہ ثابت ہو...
اسے لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔"

اب غالب نے میری تائید کی "یہ تو اس نے پہلے ہی...
ہو گا۔ جب اسے اطلاعات ملی ہوں گی تشویش ناک قسم کی...
ہمیں مل رہی تھیں۔"

نازو نے معصوم بن کے کہا "کیسی اطلاعات؟"

"یہی کہ رومانٹک سین کچھ غیر فلمی ہوتے جا رہے ہیں...
مطلب ہے حقیقت سے قریب تر۔"

میں نے کہا "بکومت..."

"میں تو عرض کر رہا تھا۔ دیکھئے وہ کیا چیزیں بیان کی ہیں...
نے کہ چھپائی نہیں جا سکتیں... اعصابی امراض کی ماہر...
اعصاب پر انہی میں سے ایک سوار ہو گئی تھی۔ عین سے شر...
ہوتی ہے۔ قاف پر ختم ہوتی ہے۔ بیچ میں شین بھی آتا ہے...
غالباً۔"

"مار کھاؤ گے تم" میں نے خفت سے کہا کیونکہ سب ہنس...
تھے۔

"جی نہیں۔ میں کھا کے آیا ہوں۔ آپ شوق فرمائیے۔ آ...
اپنا گھر ہے بھئی۔ مس رابعہ! یہ کچھ کھانا چاہتے ہیں" غالب...
پوزیشن بدل لی اور پھر دور جا بیٹھا۔

"پریشانی تو ہو گی دلاور کو" رابعہ نے کہا۔

"یقیناً۔ تم سے بھی زیادہ" غالب نے لقمہ دیا۔

"اب تم واقعی سب سے پٹو گے" رابعہ نے خفت سے کہا۔

غالب نے آہ بھری "اف۔ یہ دستورِ زباں بندی ہے کیسا...
محفل میں۔ میں کہاں جا کے سچ بولوں؟"

میں نے کہا "قطب شمالی چلے جاؤ یا ماؤنٹ ایورسٹ پر۔"

نازو بولی "ویسے باتھ روم بھی ہے دوسرے کمرے کا۔"

اب عاشق علی تڑپ نے رہنمائی کی "منجانب اہلیہ محترمہ...
دریافت فرمانے آئے تھے کہ نوشِ جاں فرمانے کے لیے۔ وقت...
مناسبت اور جملہ حاضرین کی خواہش و انفرادی ترجیح کے مطابق...
حاضر کیا جانا چاہیے؟"

غالب نے کہا "اس کا اردو میں ترجمہ کرو۔ ورنہ یہاں تو...
میں جواب دینے والے بھی ہیں۔"

میں نے کہا "بھئی شام کو ہم سب کافی پیتے ہیں۔"

رابعہ نے سرہلایا "مجھے تو ہر وقت لغت ساتھ رکھنی پڑے...
پتا نہیں اس کی بیوی کیسے سمجھ لیتی ہے؟"

میں نے کہا "بیویاں سب سمجھ لیتی ہیں۔"

غالب آہ بھر کے بولا "بڑی دردناک حقیقت بیان فرما دی آپ
...نے اکثر غلط سمجھ لیتی ہیں۔"

شام کے چھ بج رہے تھے۔ پہلے رابعہ نے اسپتال فون کیا اور
...کی خیریت معلوم کی پھر وقار نے نقوی صاحب کی کوٹھی کا
چوکیدار...
نمبر ملایا جہاں ایک ملازم ہر فون کے جواب میں اور ہر آنے والے
کو مطلع کر رہا تھا کہ گھر میں کوئی نہیں ہے۔ وقار نے اسے کہا
"ٹھیک ہے۔ کوئی پوچھے تو یہ مت بتانا کہ ہم کہاں ہیں؟"

کافی پیتے ہوئے مجھے شیلی کے بیگ کا خیال آیا۔ "وقار تمہاری
گاڑی باہر موجود ہے؟"

"ہاں۔ ہے" اس نے باہر جھانک کے کہا۔

"اس میں شیلی کا بیگ ہو گا۔ مجھے تمہاری بیوی نے بتایا تھا۔"

"ہونا تو چاہیے۔ وہ ہمارے ساتھ اسپتال گئی تھی تو اس نے
گاڑی میں ہی چھوڑ دیا تھا پھر کسی نے دیکھا ہی نہیں مگر سکندر
صاحب یہ بھی ایک ثبوت سمجھا جا سکتا ہے۔ شیلی کی بے گناہی کا۔
وہ ہمارے ساتھ گئی تھی تو اس کے ہاتھ میں کچھ نہیں تھا۔ اسے کوئی
دوا یا انجکشن لے جانا ہوتا تو وہ بیگ ساتھ رکھتی۔"

غالب نے کہا "برخوردار۔ ذرا پولیس کی عینک لگا کے دیکھو۔ وہ
تو کہیں گے کہ اس نے جانتے بوجھتے ایسا کیا تھا۔ تاکہ شک کی
گنجائش نہ رہے۔"

میں نے کہا "خیر اب اسے نکال لاؤ۔ میرا خیال ہے یہ بیگ نہ
ملنے سے دلاور کو زیادہ پریشانی لاحق ہوئی ہو گی۔ شیلی نے خلافِ
عادت اسے گاڑی میں چھوڑ دیا تھا ورنہ ہدایات تو واضح ہوں گی کہ
اس کا بیگ مت چھوڑنا۔ اسی میں شناخت کے سارے ثبوت
تھے۔"

"اور بیگ نہیں ملا تو دلاور کو لاش اُٹھوانی پڑی۔ سوال یہ ہے
کہ لاش گئی کہاں؟" غالب نے کہا۔

"ہمارے پاس ایک ٹرمپ کارڈ تھا جو ہمارے ہاتھ سے نکل
گیا۔ دلاور بہت مطمئن ہو گا کہ اب مجھے کچھ معلوم ہوا ہے تو اس
کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔ وہ صاف انکار کر دے گا۔"

"ڈاکٹر شیلا خان سے اور رشتے سے بھی..."

"نہیں۔ رشتہ رہے گا۔ کوئی پوچھے گا تو کہے گا کہ ہاں' شیلا
خان لندن میں ہے۔ عرصے سے اس کی کوئی خبر نہیں اور ہمارے
درمیان کبھی رابطہ رہا بھی نہیں۔ بفرضِ محال یہ ثبوت مل جائے کہ
لا یہاں تھی تو وہ سب سے زیادہ حیران ہو گا کہ اچھا! بڑی عجیب لڑکی
ہے۔ سوتیلا سمجھتی ہے نا اس لئے مجھے لاعلم رکھا۔ خیر جی ہمیں کیا۔"

غالب نے کہا "سارا کھیل بدمعاشی کا ہے اور بدمعاشی ہے
دولت کی۔ حق حلال کی کمائی سے پیسہ پیسہ جوڑا جائے تو آدمی خرچ
بھی پیسہ پیسہ دیکھ بھال کے کرتا ہے۔ کالا دھن جو کالی آندھی کی
طرح آتا ہے وہ ایسے کالے دھندوں میں پھونک دیا جاتا ہے۔"

وقار نے سرہلایا "ہم قانون اور انصاف کی لکیر پیٹتے رہ جاتے
ہیں۔"

"جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اب سوال ہے مستقبل کا" میں نے
کہا۔

غالب نے کہا "کس کے مستقبل کا؟"

"ظاہر ہے ہم سب کے مستقبل کا۔"

"میرا مستقبل میرے سامنے ہے" اس نے نازو پر نظر جما کے
کہا "اور خاصا مایوس کن ہے۔ بلکہ پُر خطر ہے۔ صحافت کا مستقبل
بھی مجھے تاریک نظر آ رہا ہے۔"

"تمہاری صحافت کا تو ماضی بھی تاریک ہے۔ جب صحافی تھے تو
کون سا تیر مارا تھا؟"

اس نے پھر آہ بھری "ارے ہم کیا تیر مارتے۔ تیر تو تم نے
چلایا ہے ایسا کہ ہائے ہائے۔ نشانہ تھا دل۔ پھوڑ دی آنکھ۔ اب
ساری دنیا کو ایک آنکھ سے دیکھتا ہوں۔ گدھے گھوڑے ایک جیسے
نظر آتے ہیں۔"

"ایک جیسے ہوتے بھی ہیں۔ ایک لاٹھی سے ہانکے بھی جاتے
ہیں۔" رابعہ ہنسی۔

میں نے کہا "میں اپنے مستقبل کی بات کر رہا تھا۔ محسن کی
زندگی میں اب ٹھہراؤ آ جانا چاہیے۔ یہی گل کے حق میں بھی بہتر
ہے ورنہ جیسے گیہوں کے ساتھ گھن پس جاتے ہیں۔ میرے ساتھ
ان کے لیے تحفظ کی کوئی ضمانت نہیں ہو گی۔ اُلٹا وہ عدم تحفظ کا شکار
ہو جائیں گے۔ محسن ہر معاملے میں ملوث ہو گا۔ یہ الگ بات ہے۔
گل کا ماضی اس کی سب سے بڑی کمزوری بن جائے گا۔ یہ بہت
زیادہ پرانی بات نہیں ہے کہ وہ شیش ناگ کی بیٹی تھی اور ناگ منی
کہلاتی تھی۔ اس کے خلاف اِدھر اُدھر کے گاؤں' دیہات اور
قصبوں میں لوٹ مار' ڈکیتی' رہزنی اور قتل و غارت گری کے درجنوں
مقدمات درج ہوں گے۔ شیش ناگ تو مارا گیا مگر ناگ منی کے
بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ اس نے کینچلی بدلی ہے۔ اس کا ماضی
خود اس کے خلاف سب سے بڑی فردِ جرم ہے اور فائدہ اٹھانے
والے اس کی کمزوری کو ہماری کمزوری بنا سکتے ہیں۔ جب تک ہم
یہاں نہیں تھے وہ منظرِ عام پر نہیں تھی یا اس ملک کے قانون کی
دسترس سے دور تھی۔ اب اس کے لیے گھر سب سے محفوظ جگہ
ہے پھر محسن کا گھر ایک بار بس کے اُجڑ چکا ہے۔ ظاہر ہے یہ زخم
آسانی سے بھرنے والا نہیں مگر گل کی چاہت اور وقت کا مرہم اسے
مندمل کر سکتے ہیں۔ گل کو یہی کرنا چاہیے اور کچھ نہیں۔"

"اور خود تمہیں محسن کے نقشِ قدم پر چلنا چاہیے۔ خدا
تمہیں عقل دے اور اس کی توفیق دے۔ آمین۔" غالب نے ہاتھ
اُٹھا کے منہ پر پھیرے۔

"یہی دعا میں تمہارے لیے مانگوں؟" وقار بولا۔

"اپنے لیے میں خود دعا مانگ سکتا ہوں۔ اللہ مجھے جن بھوتوں
کے قبیلے سے بچا۔ جو بلا میرے گلے پڑ رہی ہے اس سے مجھے محفوظ

رکھ۔ ہا' مجھے بھوت بنایا اس بھوت سے میری جان چھڑا جو میرا سسر کہتا ہے خود کو۔ آمین۔ ثم آمین۔" غالب نے بڑی دردمندی سے دعا مانگ کے منہ پر ہاتھ پھیرے۔

غصے سے نازو کا چہرہ سرخ پڑ گیا تھا کیونکہ باقی سب لوگ ہنس رہے تھے "تم نے مجھے بلا کہا ہے؟"

"لاحول ولا قوۃ۔ اتنے گواہ بیٹھے ہیں۔ پوچھ لو کسی سے بھی 'کیا میں نے تمہارا نام لیا ہے؟" غالب نے کہا۔

"تمہارے گلے تو میں ہی پڑ رہی ہوں نا؟" اس کی شکل رونے والی ہو گئی "تم نے مجھے بلا کہا ہے۔ مجھے معلوم ہے۔"

"بھئی نازو۔ بلا میں اور خوب صورت بلا میں بڑا فرق ہوتا ہے اور دیکھو' ایک شعر بھی تو ایسے ہی موقعے کے لیے کہا تھا میں نے۔

قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو
کاش کہ تم مرے لیے ہوتے

میں نے کہا "غالب کے بچے۔ تم موقع محل نہیں دیکھتے۔ ابھی نازو جلال میں آ گئی نا تو دماغ درست کروے گی۔"

"چلو معافی مانگو نازو سے۔" رابعہ بولی۔

"کیا' میں معافی مانگوں؟" غالب نے کہا "بڑا افسوس ہے خاتون کہ آپ بھی جانبداری سے کام لے رہی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ میں اپنی دعا میں ترمیم کر سکتا ہوں کہ اللہ' کوئی خوب صورت بلا نازل فرما مجھ پر' آمین۔"

نازو ہنس پڑی "تم جیسے ڈھیٹ بھی کم دیکھے ہیں میں نے۔"

"مطلب یہ کہ دیکھے ہیں پہلے" غالب نے مجھے دیکھ کے کہا "ہاں۔ انہی کی محبت نے مجھے نکما کر دیا ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے۔"

"ہم تو نکمے آدمی پر بھی رشک کرتے ہیں۔ شوہر جو ہوئے۔" وقار یوسف ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

"اچھا۔ یہ بات ہے۔ بیٹے' ابھی تمہاری بیوی اُٹھتی ہے سو کے تو میں بتاتا ہوں۔ دوسرے الفاظ میں تم اعلان کر رہے ہو کہ اب تم آدمی نہیں رہے۔ تم گدھے ہو۔ اُلو ہو یا پاگل کُتے ہو۔ بے عزتی تو تمہاری بیوی کی ہے۔" غالب نے کہا "جاؤ نازو۔ سوئے شیر کو جگا دو۔"

"یار' اسے مت چھیڑو۔ کل سے اس کی حالت خراب تھی۔ یہاں آ کے ایک دم ٹھیک ہو گئی ہے وہ۔ میں تو یہ دیکھ کے حیران رہ گیا۔ دن تو خیر جیسا گزر رہا تھا گزر گیا تھا۔ رات کو بھی وہ ایک منٹ کے لیے نہیں سوئی۔ مسلسل روتی رہی۔ سکون آور گولیوں کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا۔ ایک نیم بے ہوشی کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ جس میں وہ مسلسل بولتی رہی۔"

میں نے کہا "وقار تم نے رابعہ کا جتنا ساتھ دیا......"

"ایسی باتیں کرنے کی کیا ضرورت ہے؟" وہ بولا۔

"نہیں یہ حقیقت ہے۔" رابعہ نے کہا "یہ صرف تمہاری محبت اور تمہارے خلوص کا نتیجہ ہے کہ آج میں پھر سیٹ ہو... اپ سیٹ ہونے بھی نہیں دیا تھا تم نے۔ تم مقدمات لیتے... فرم کو چلاتے رہے اور میرے اکاؤنٹ میں برابر رقم جمع کرا... رہے۔ اتنی ایمانداری کی توقع کوئی اپنوں سے بھی نہیں رکھتا۔"

غالب نے کھنکار کے کہا "سکندر۔ اشارہ سمجھو!"

میں نے کہا "اب میں توقع رکھتا ہوں کہ تم پہلے کی طرح... کا خیال رکھو گے۔"

"منظر صاحب کا ذکر نہیں کیا آپ نے۔ جو انہوں نے... میرے بس کا نہیں تھا۔"

"ہاں۔ وہ چراغ کا جن ہے۔ تم انگوٹھی کے جن ہو" غالب... نے کہا "حوالہ ہے مسٹر الہ دین کی اسٹوری کا لیکن اپنے... اعظم صاحب۔ آپ کی تقریر سے بڑے دردناک الوداعی جذبات... ایسے ٹپک رہے تھے کہ میں باتھ روم میں جا کے آٹھ آٹھ آنسو... چاہتا تھا۔ کم سے کم چار چار۔ نصیبِ دشمناں کوچ کا ارادہ تو نہیں ہے؟"

رابعہ نے کہا "جو منہ میں آتا ہے بکتے چلے جاتے ہو۔"

"تم تو ایسے بگڑ رہی ہو جیسے میں نے دنیا سے کوچ کی بات... تھی۔ بھئی کوچ کا مطلب تو ہے روانگی۔ خیر سے یہ منہ اُٹھا کے کر... بھی جا سکتے ہیں۔ آدمی ہو تو اس کا پتا ہوتا ہے۔ یہ ہیں سکندر اعظم... ابھی نعرہ لگائیں اور منہ ہو مشرق کی طرف تو ناک کی سیدھ... بھارت فتح کرنے چل پڑیں۔ دنیا تج دیں اور باقی زندگی دین کے لیے... وقف کر دیں۔ مہاتما بدھ کی طرح کسی پیڑ کے نیچے لنگوٹ باندھ... بیٹھ جائیں۔" اس نے آنکھیں بند کیں اور آلتی پالتی مار کے بیٹھ... "ستیم' شوم.... سندرم۔ جہنم میں ڈالم ورستم۔ عشقم...... رابعہ...

اس کی اداکاری پر ہنستے ہنستے سب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے... جتنا میں اپنے مستقبل کے بارے میں سنجیدگی سے بات کرنے کی... کوشش کرتا تھا اتنا ہی وہ ماحول کو غیر سنجیدہ بنا دیتا تھا۔ مجھے خیال... وقار کی بیوی کا۔ ظاہر ہے وہ ہوتی تو ہم سب ایسے نہیں ہنس رہے... تھے لیکن وہ اٹھ جاتی تو یقیناً برا مانتی۔ دکھ ہمیں بھی تھا مگر وہ نقوی... صاحب کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اس کے غم کی شدت کو ہم محسوس نہیں... کر سکتے تھے۔ خود وقار بھی ہمارے ساتھ سسر محترم کی موت کے... صدمے کو بھولا ہوا تھا۔ سسر اسے کبھی زیادہ عزیز نہیں تھے اور... وہ سسر کی پسند تھا۔ ان حالات میں وہ بیوی کے دکھ پر دکھی تو... نقوی صاحب کی وفات حسرتِ آیات پر نہیں۔ ہم سب مختلف... کے بنے ہوئے تھے۔ ہم آلام و مصائب کی ہر آزمائش سے... مسکراتے گزرنا جانتے تھے۔ سکھ میں تو سب ہی ہنس سکتے ہیں... دکھ میں بھی روتے نہیں تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہم زندگی کے... مسائل کا سامنا کرتے ہوئے نہ پریشان ہوتے تھے اور نہ ہمت... ہارتے تھے۔ آپس میں مشورہ کر کے بڑے سکون سے ہم نے کسی... بحران سے نمٹنا سیکھ لیا تھا۔ ہمارے ذہن اور اعصاب کو بدلتے... حالات میں شکست کا خوف ماؤف نہیں کرتا تھا۔

رات آٹھ بجے عاشق علی تڑپ یہ استفسار فرماتے تشریف لائے کہ رات کے کھانے میں کیا ہو گا۔ اسی وقت وقار کی بیوی بھی اٹھ کے آ گئی۔ رابعہ نے نازو سے کہا "ذرا تم بتا دو' تڑپ صاحب کو۔ گھر میں تو کچھ ہے نہیں۔ بازار سے منگوا کے دے دو نہیں۔"

نازو بڑی فرمانبرداری سے کھڑی ہو گئی۔ اس نے وقار کی بیوی سے کہا "آؤ تم بھی منہ دھو لو۔ بلکہ نہا لو۔ فریش ہو جاؤ تو چائے پی لو۔"

"اللہ کے نام پر کچھ ادھر بھی" غالب نے ہانک لگائی۔

وقار کو اچانک ان کاغذات کا خیال آیا جو اس کی گاڑی میں سیٹ کے نیچے رکھے ہوئے تھے۔ وہ شیلی کا بیگ لے کر لوٹا تو کچھ متفکر نظر آ رہا تھا۔ "باہر مجھے کچھ مشکوک قسم کے لوگ نظر آئے ہیں۔"

غالب نے کہا "مشکوک کی وضاحت کرو۔ میری نظر میں تم بھی مشکوک ہو۔"

"ایک شخص گیٹ کے اوپر سے جھانک رہا تھا۔ اس کا کالا سر مجھے گیٹ کے اوپر اُبھرا ہوا دکھائی دیا۔ میں نکلا تو وہ غائب ہو گیا۔ میں نے لپک کے گیٹ پر سے جھانکا تو ایک شخص دوسری طرف منہ کیے کھڑا تھا۔ میں نے اسے متوجہ کیا اور پوچھا کہ کیا بات ہے؟ وہ اکڑ گیا کہ "کیا بات ہے" میں نے کہا "یہاں کیوں کھڑے ہوئے ہو؟ گیٹ کے سامنے" وہ بد تمیزی سے بولا۔ گیٹ تمہارا ہے۔ فٹ پاتھ تو تمہاری نہیں ہے وکیل صاحب۔" ظاہر ہے وہ مجھے پہچانتا تھا مگر یہ بات کہہ کے وہ چل پڑا اور سڑک پار کر گیا۔ وہاں دو گاڑیاں کھڑی ہوئی ہیں۔ ان کے ڈرائیور باہر کھڑے سگریٹ پی رہے ہیں مگر تم خود دیکھ سکتے ہو کہ وہ کوٹھی کی نگرانی کر رہے ہیں۔"

"کیا صورت سے پولیس والے لگتے ہیں؟"

"نہیں۔ پولیس والے نہیں ہیں۔" وقار نے کہا "ان کا اسٹائل ہے بدمعاشوں جیسا۔"

غالب نے کہا "میں جا کے ابھی قتلِ عام کر دیتا ہوں۔"

رابعہ نے کہا "ہم نیچے چلتے ہیں۔ وقار تم اوپر رہو۔ منظر آنے والا ہے۔"

وقار نے سر ہلایا "ہاں۔ آٹھ بجے اُٹھتے ہیں وہ اپنے چیمبر سے۔"

میں نے کہا "آج تم سب نے چھٹی کی؟"

رابعہ بولی "ہاں۔ دوسرے لوگ ہیں کلائنٹس سے نمٹنے کے لیے۔"

غالب نے کہا "اپنی تو نوکری ایسی ہی ہے اور ابھی شروع ہوئی ہے۔"

میں رابعہ اور غالب الماری سے گزر کے نیچے پہنچ گئے۔ بند کمرے میں حبس تھا۔ رابعہ نے جاتے ہی اے سی چلا دیا۔ وہ بیگ رابعہ کے کندھے پر پڑا عجیب لگ رہا تھا۔ جو بالکل اسی طرح شیلی لٹکائے پھرتی تھی۔ یہ نرم چمڑے کا شولڈر بیگ تھا جس کے تسمے لمبے تھے۔ اس کے دونوں جانب سنہرے نقوش تھے۔ ایک طرف اسپین کے کلچر کی عکاسی تھی۔ ایک بل فائٹر جو "ماتادر" کہلاتے ہیں اپنے مخصوص روایتی لباس میں بپھرے ہوئے سانڈ کو چیلنج کر رہا تھا۔ نوکیلے سینگوں والا سانڈ سر جھکا کے اس پر حملہ آور ہو چکا تھا۔ اس کے نتھنوں سے دُھواں سا نکل رہا تھا اور سُموں سے گرد اُڑ رہی تھی۔ دوسری طرف اہرامِ مصر تھے۔ کھجور کا ایک درخت تھا اور ایک شخص اونٹ کی مہار تھامے ریت پر پیدل جا رہا تھا۔ پس منظر میں چاند سے رات کا وقت ظاہر ہوتا تھا۔

یہ ہینڈی کرافٹ کا خوب صورت نمونہ اس نے نہ جانے کہاں سے لیا تھا۔ اس کے اندر دو زپس تھیں جن سے بیگ میں تین خانے بن گئے تھے۔ رابعہ نے میرے سامنے بیڈ پر اس کی ایک ایک چیز نکالی تو مجھے ایک مانوس خوشبو نے بے چین کر دیا۔ پرفیوم کی چھوٹی سی خوب صورت شیشی اس کے سامان میں سے برآمد ہوئی۔ غالب نے فوراً اسے اچک لیا۔

"بڑی قیمتی خوشبو ہے۔" وہ بولا اور فوراً اس کا اسپرے رابعہ پر کر دیا۔

رابعہ چلائی "یہ کیا بد تمیزی ہے!"

"کیوں۔ خوشبو بُری لگی ہے تمہیں یا ڈر لگتا ہے اس خوشبو سے؟" غالب بولا۔

رابعہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے شیشی چھین کے نیچے رکھ دی مگر اب کمرے میں وہ خوشبو پھیل گئی تھی جو میرے احساس میں شیلی کے وجود سے منسوب ہو چکی تھی۔ رابعہ نے اس کے دونوں پاسپورٹس دیکھے اور پھر غالب کو تھما دیے۔ شاید غالب کو رابعہ کے اور میرے چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس خوشبو نے ہمیں ڈسٹرب کر دیا ہے۔ اس نے پاسپورٹ پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ بیگ میں پندرہ بیس ہزار نقد باقی تھے اور خاصی مالیت کے ٹریولر چیک الگ موجود تھے۔ ایک چھوٹی سی ڈائری میں بہت سے ٹیلی فون نمبر لکھے ہوئے تھے۔ پرانے نمبر لندن کے تھے۔ نیا اضافہ پاکستان کے نمبروں کا نظر آتا تھا۔ ان میں منظر کے گھر کا فون نمبر تھا۔ رابعہ کے آفس کا نمبر تھا۔ چار نمبر ان کے علاوہ تھے۔

میں نے رابعہ سے پوچھا "ان میں کوئی نمبر دلاور کا ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم لیکن یہ ایک نمبر وزیر خان اسپتال کا ہے۔ ظاہر ہے وہاں اس سے رابطہ ہو سکتا ہے۔"

"اور باقی تین نمبر کس کے ہیں؟" میں نے کہا۔

"مجھے نہیں معلوم لیکن معلوم کیا جا سکتا ہے۔"

غالب نے کہا "یہ نمبر کار آمد ثابت ہو سکتے ہیں۔"

"کار آمد تو یہ ساری دستاویزات ہیں۔ میرا خیال ہے دلاور

اینڈ کمپنی کو ان کی ضرورت پڑے گی۔ کیا پتا آج صبح وہ انہی چیزوں کی تلاش میں یہاں آئے ہوں۔ ان کو اسی جگہ کہیں چھپادو۔"

غالب نے کہا "میں حیران ہوں کہ اس بیمار نرس شاہدہ کے ساتھ کیا ہوا؟"

میں نے کہا "تم گئے تھے اس کے گھر؟"

"میں اور وقار ایک ساتھ گئے تھے' اسپتال سے فارغ ہو کر لیکن وہاں تالا پڑا ہوا تھا۔ محلّے میں کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں ملیں گے۔ ان کے شہر میں بہت سے رشتے دار تھے۔ چچا تایا' ماموں اور خالائیں۔ وہ شہر کے مختلف حصوں میں رہتے ہیں اور اکثر ان کے گھر آتے رہتے تھے۔ ظاہر ہے وہ بھی ان کے گھر جاتے ہوں گے۔"

اوپر سے انٹرکام کے بزر کی ہلکی سی میوزیکل ٹون آئی۔ رابعہ نے ریسیور اُٹھا کے کہا "ہاں۔ کیا ہے نازو۔ ٹھیک ہے بھیج دو۔ پوچھنے کی کون سی بات ہے؟" پھر وہ ہنسنے لگی۔

میں نے کہا "کون آیا ہے... منظر؟"

"بالکل صحیح اندازہ لگایا تم نے۔ کہہ رہا ہے کہ میں اس چوہے دان میں سے کیسے گزر کے آؤں" رابعہ بولی اور سیڑھیاں چڑھ کے دروازہ کھولنے گئی۔

غالب بولا "واقعی۔ گینڈا کیسے گزر سکتا ہے چوہے دان سے۔"

منظر کا اپنی غیر معمولی جسامت اور خاصے بڑھے ہوئے پیٹ کے ساتھ کپڑوں کی الماری میں داخل ہونا اور پھر اس دروازے سے گزر کے تہ خانے تک پہنچنا یقیناً مشکل کام تھا۔ وہ اوپر سے لڑھکتا ہوا آیا۔

میں نے رابعہ کو خبردار کیا "اس کے پیچھے رہا کرو ورنہ یہ لُڑھکا تو تم پر روڈ رولر پھر جائے گا۔"

اس نے بیٹھتے ہی مجھے نصف درجن گالیوں سے نوازا "سالے سکندرِ اعظم کے خچر۔ عاشقی کی ٹٹو۔ تُو یہاں بیٹھا ہوا ہے سالے۔"

"بے شک۔ گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے۔ لیکن تو صیاد کے اس پروپیگنڈے پر مت جا۔ ایک بلبل کے نقطۂ نظر سے دیکھ۔"

"ابے ساڑھے پندرہ بچّوں کے باپ سے کہتا ہے کہ بلبل کی نظر سے دیکھ۔ میں تو باپ ہوں تیری اس بلبل کا۔" اس نے رابعہ کی طرف اشارہ کیا "پوچھنا تو مجھے اس سے چاہیے کہ تیرے ساتھ یہ سلوک کیوں ہو رہا ہے؟"

"پھر کیا ہونا چاہیے؟" میں نے ہنس کے کہا۔

"چھترول۔ تیری تو بج وقتہ چھترول ہونی چاہیے" وہ شور مچانے لگا "اور روز تجھے کھانے چاہئیں پہلے سو پیاز پھر سو جوتے۔ جوتے پڑنے چاہئیں سر پر' سر منڈوانے کے بعد۔ دماغ آجائے راہِ راست پر تو شادی..."

میں نے ہنستے ہوئے کہا "تیرے ساتھ یہی ہوا تھا شادی سے پہلے؟"

"رابعہ۔ مجھے بڑا تاؤ آرہا ہے۔ اس سے کہو مرغا بن جائے اور سوبار اذان دے کر کہے میری توبہ۔ آئندہ کسی کی طرف نظر اُٹھا کے دیکھوں تو۔"

رابعہ مسکرائی "چلو اس بار معاف کردو۔"

"معاف تو خیر میں نے کردیا تھا لیکن تم اس کے گلے میں بی بی' ورنہ یہ ہوگیا ہے آوارہ۔ اسے باندھو کسی کھونٹے سے۔ اب مزار بھی یہیں بنے گا بیٹے۔"

میں نے کہا "دیکھ منظر۔ میں ابھی سے صاف بتا رہا ہوں یہاں قید ہو کے نہیں رہ سکتا۔"

"تو پھر جیل چلا جا۔ بڑی بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں تیرا" وہ بولا "پھانسی چڑھ جا۔ ایسے مر مر کے کیا جینا۔ تجھ سے تو ہم مرتے ہیں پریشانی میں۔ یہ کیا ہے؟"

میں نے آہ بھر کے کہا "ایک شعر عرض ہے۔"

بال و پر دو چار دکھلا کر کہا صیاد نے
یہ نشانی رہ گئی ہے اب بجائے عندلیب

"میں سمجھا" اس نے شیلی کے پاسپورٹ دیکھتے ہوئے "مرحومہ کی باقیات کو سامنے رکھے رو رہا تھا تو۔ مجھے بتا لاش کہاں ہے اس کی؟"

"میں بتاؤں' میں کیسے بتاؤں؟"

"تیرا تو باپ بھی بتائے گا۔ بھوتنی کے۔ مجھے معلوم ہے یہ سب تیرا حرامی پن ہے۔ لاش تو نے ہی غائب کرادی ہے۔ کہیں اس کا مزار بنائے گا اور وہیں مجاور بن کے بیٹھے گا۔ بحرِ ظلمات میں دوڑنے والے اندھے گھوڑے۔ ویسے لڑکی اچھی تھی مس رابعہ۔ اس بے چارے کو معاف کردو۔ میں بھی بہک جاتا۔"

رابعہ نے کہا "کیا جرم ہے ان کا جو میں معاف کروں؟"

"بس یہی ڈھیل دے رکھی ہے نا تم نے۔ اسی کا نتیجہ ہے سب۔ میری بیوی کو دیکھو۔ کیسا باندھ رکھا ہے مجھے جیسے باندھتے ہیں مالِ غنیمت۔ اس کے لیے تو مالِ غنیمت ہی ہوں جانتی ہے نا کہ دوسرا کاٹھ کا اُلّو کہاں ملے گا۔ سب کو ایک ہے۔ تم بھی پر کاٹ دو اس کے ورنہ میں بتا رہا ہوں۔ بڑی ... اولاد ہے یہ تمہاری۔"

"آپ بھی حد کرتے ہیں" رابعہ جھینپ کر بولی۔

میں نے کہا "منظر کیا تیری معلومات اپ ٹو ڈیٹ نہیں؟ تجھے معلوم ہے آج کیا ہوا تھا؟"

منظر بولا "اپنے برخوردار وقار یوسف نے خلاصہ سُنا دیا تھا فون پر۔ ہاں وہ میں نے دو پیں بھیجے تھے۔"

رابعہ ہنسی "بڑے چُن کے بھیجے تھے۔ کہاں سے ملے؟"

"وہ اپنا ایک جاننے والا تھا۔ اللہ کو پیارا ہوا۔ اس کے گھر میں کئی سال رہے تھے۔ بعد میں بیوی اپنے انڈے بچّے سمیٹ کر پیچھے چلی گئی تو ان کی چھٹی ہوگئی تھی۔ دو جگہ انہیں مرضی کے مالک نہیں ملے۔"

"شعر نہیں سنتے ہوں گے۔"

"ہاں۔ ایک تو خود شاعر تھا۔ وزن' ردیف' قافیے پر اعتراض کرتا رہتا تھا اور ان کی فکر کو بھی عامیانہ قرار دیتا تھا۔ دوسرا گجراتی میمن تھا اور اس کی بیوی تو سوتے میں بھی بولتی تھی۔ وہاں یہ کیا بولتے۔ مجھے خیال آگیا کہ رابعہ کی اچھی کمپنی رہے گی۔ پیسے کا مسئلہ نہیں ہے بے چاروں کو۔ ایک ٹھکانا چاہیے اور تھوڑی سی محبت۔ زمانہ ایسا ہے کہ لوگ پیسہ بھی دیتے ہیں تو عزت کے بغیر..."

"میں نہیں جانے دوں گی یہاں سے" رابعہ نے کہا۔

منظر نے آہ بھری "کاش تم نے کہا ہوتا کہ ہم اور یہ پھر ہماری اولاد بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ صرف میں..."

میں نے کہا "منظر۔ بار بار ایک ہی بات مت کر۔ میں شادی ضرور کروں گا لیکن پہلے یہ معاملات سمیٹ لوں۔"

منظر نے اپنے جوتے کی طرف ہاتھ بڑھایا "بھوتنی کے۔ تیرے ان معاملات کی اور تیری تو ایسی تیسی۔ خود پھیلاتا جاتا ہے۔ سمیٹے گا کون تیرا باپ۔ اس کا تو یہی علاج ہے۔"

"نہیں منظر۔ اب میں واقعی سمیٹ دینا چاہتا ہوں۔ یہ جو کچھ ہوا۔ یہاں آنے کے بعد۔ غلط تھا مگر زندگی کے حادثات آدمی کا مقدر ہوں تو انہیں کون روک سکتا ہے۔"

"سچ فرمایا آپ نے۔ پتا نہیں کب میں نے بھی چاہا تھا کہ اب پیداوار روک دوں مگر وہ کیا شعر ہے
مٹی بہت زرخیز ہے ساقی...."

میں نے کہا "میرا پہلے ارادہ تھا کہ شیلی کے ساتھ لندن بھاگ جاؤں۔ نیک نیتی کے ساتھ۔"

"نیک نیتی کے ساتھ میرا دل بھی چاہتا ہے کہ نیلو کے ساتھ بھاگ جاؤں۔ نیت تو بعد میں خراب ہوتی ہے" منظر بولا۔

رابعہ ہنسنے لگی "میں بھابی کو بتادوں گی۔"

"اسے معلوم ہے۔ میں خود بتا چکا ہوں کئی بار۔ سچ کسی سے تو بولنا چاہیے۔ وہ سمجھتی ہے کہ یہ بھوتنی کا اب کہاں جائے گا۔ اس کے ساتھ تو ڈرکولا بھی فرار نہ ہو۔" منظر نے کہا۔

"میرا پلان کچھ اور تھا۔ اس کی منظوری مرحوم نقوی صاحب نے بھی دے دی تھی کہ بیٹا مقدمات تو ختم ہونے سے رہے۔ یہاں تم کمبل کو چھوڑو گے مگر کمبل کب تمہیں چھوڑے گا۔ یہ مقدمات کی دلدل ایسی ہے کہ تم اس میں اُترتے جا رہے ہو باہر نکلنے کی کوشش ہی فضول ہے۔"

"کہا تو ٹھیک ہی تھا انہوں نے۔"

"یہ شیلی کی تجویز تھی۔ خدا جانے اس میں وہ کس حد تک مخلص تھی۔"

"تجھے ورغلانے میں وہ ضرور مخلص ہوگی۔ اب میں کیا کہوں اسے۔ عورت ہی عورت کی دشمن ہوتی ہے بی بی رابعہ۔ یہ بڑی تلخ حقیقت ہے۔ اسے فرشتۂ اجل نہ لے جاتا تو وہ لے گئی تھی اس بھوتنی والے کو۔"

میں نے کہا "یار اب تو کوئی میرے کہے کا اعتبار نہیں کرتا مگر خدا گواہ ہے۔ مجھے امید کی ایک صورت نظر آئی تھی۔ میں لندن جاتا فرضی نام سے۔ اصلی نام سے مجھے وہاں کوئی داخل نہیں ہونے دے گا۔ نقوی صاحب نے لائن کلیر کرانے کا وعدہ کیا تھا۔ وہاں سے دو چار ماہ بعد میں لوٹتا۔"

"یا دو چار سال بعد۔ دو چار بچّوں کے ساتھ۔"

"منظر۔ مجھے غصہ آیا تو تیرا یہ پیٹ پھاڑ دوں گا۔"

"ابے کچھ اور بھی پھاڑ دے۔ زمانے نے پہلے ہی پھاڑ دیا ہے سب کچھ۔ اب تو دل چاہتا ہے کپڑے پھاڑ کے نکل جاؤں کہیں۔ تُو بتا کہاں جاؤں؟"

میں نے کہا "پاگل خانے۔ اب بیچ میں مت بولنا۔ جب میں لندن سے واپس آتا تو میرا حلیہ بھی بدلا ہوا ہوتا اور نام بھی۔ میں اپنے ماضی کو بُھلا کے ایک نئی زندگی کا آغاز کرتا۔ دو چار افراد کے سوا۔ یعنی تم لوگوں کے سوا کسی کو معلوم نہ ہوتا کہ میں وہی سکندر بخت ہوں۔"

"کیا بن کے آتا تُو۔ مولوی نعمت اللہ سیالکوٹی۔ یا مسٹر الیگزینڈر نیومین۔"

"ظاہر ہے میک اپ سے حلیہ بدل کے آدمی کتنے دن رہ سکتا ہے۔ ہاں مستقل داڑھی مونچھیں بڑھا کے اور بیٹلز جیسے ہپی اسٹائل کے بال رکھ کے میں کچھ عرصہ کراچی میں گزارتا۔ کوئی بزنس کرتا۔ اپنا ایک حلقہ بناتا جس میں مجھے جاننے والے کسی اور نام سے جانتے۔ میرا بیک گراؤنڈ بھی مختلف ہوتا۔ میں ہفتے میں ایک بار نائٹ کوچ سے لاہور آتا اور نائٹ کوچ سے ہی چلا جاتا۔ تم سے رابطہ ایسے رکھتا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو اور سال دو سال بعد جب دنیا سکندر بخت کو ڈھونڈنے میں ناکامی کے بعد تھک ہار کے بیٹھ جاتی۔ تم سب دنیا کے سامنے اسے رو پیٹ کے صبر کرلیتے۔ یہ مشہور کردیا جاتا کہ وہ مردِ حق پرست تو اللہ کو پیارا ہوا۔ تو میں لاہور منتقل ہو سکتا تھا۔ فی الحال یہ پروگرام تو ختم ہوا لیکن اس منصوبے کے بلیو پرنٹ پر دوسرا منصوبہ زیرِ غور ہے۔"

"کس کے زیرِ غور ہے۔ تیرے زیرِ غور ہے تو ابھی سے نامنظور اور ہم غور فرما رہے ہیں تو منظور" منظر نے کہا۔

"منصوبہ یہ ہے کہ روپوشی کے پروگرام پر یہاں عمل کیا

جائے۔ لندن جانے کے بجائے میں اسی زیرِ زمین قید خانے میں رہوں اور کسی کے ساتھ نظر نہ آؤں۔ میرے مشیران یعنی تم سب میری گمشدگی کی افواہ پھیلا دو۔ دشمن آسانی سے چکر میں آنے والے نہیں ہیں۔ وہ اسے افواہ ثابت کرنے کی سرتوڑ کوشش کریں گے مگر انتظام اتنا پکا ہو کہ انہیں میرا سایہ تک نہ ملے۔"

"پھر آپ بھوت بن جائیں۔ وہ کسی کو نظر نہیں آتے اور ان کا سایہ بھی نہیں ہوتا" غالب نے کہا۔

"تجویز تو یہ بھی تھی کہ میں سلیمانی ٹوپی اوڑھ کے سب کی نظروں سے غائب ہو جاؤں مگر سب کے درمیان رہوں۔ مجھے سب تجاویز ایک سی ناقابلِ عمل لگتی ہیں۔ انڈر گراؤنڈ رہنے کی اسکیم سمیت" میں نے کہا۔

"کیوں۔ یہاں رہنے میں کیا ہے بھوتنی کے۔ مفت کی روٹیاں توڑو' لمبی تان کے سو جاؤ۔ ناز نخرے اٹھانے والی ایک چھوڑ دو دو ہیں۔"

"میں چھ مہینے ساری دنیا سے کٹ کے اس قید خانے میں رہا تو پاگل ہو جاؤں گا۔"

غالب بولا "وہ تو خیر سے آپ ہیں۔ دھمکی یہ دینی چاہیے کہ میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

"دیکھ پیارے۔ اگر ہم نے فیصلہ کرلیا نا تو اس پر عمل بھی کریں گے۔ جیل کی طرح تجھے باندھ دیں گے کسی کونے میں اور وہیں کھولی بنا دیں گے تیرے لیے۔ پاگل ہوتا ہے تو شوق سے ہو جا۔ پہلے ایک مسئلے سے نمٹ لیں پھر دماغ کا علاج بھی کرالیں گے۔"

غالب نے تائید کی "بالکل ٹھیک۔ پہلے جان بچائی جائے۔ ورنہ دماغ بھی نہیں ہوگا تو ٹھیک کیا کرائیں گے" غالب نے کہا "اور یہ ہو سکتا ہے کہ اس کارِ خیر میں چھ مہینے نہ لگیں۔ یہ تو زیادہ سے زیادہ وقت ہے۔"

"اور کم سے کم؟"

"پانچ مہینے انتیس دن۔" غالب نے کہا "ہم اس عرصے میں تمہارے لاپتا ہونے کا یقین دلا دیں گے۔ تمہاری رحلت کا بندوبست کرلیں گے اور سرکاری طور پر تمہاری دردناک موت کا پورا ڈراما اس طرح پیش کیا جائے گا کہ خود تمہیں اپنی جواں مرگی پر رونا آئے گا۔ یہ میری ڈائریکشن کا کمال ہوگا۔"

"یہ بہت مشکل۔ بلکہ ناممکن ہے۔ جھوٹ کا پتا چل جائے گا۔ دلاور اینڈ کمپنی ہی نہیں۔ پولیس والے بھی ہیں۔ اب تو وزارتِ داخلہ کا اوپر سے دباؤ بھی ہوگا کہ دیکھو یہ کوئی چال تو نہیں ہے۔ زندہ آدمی کو اتنی آسانی سے مرحومین میں نہیں شامل کیا جا سکتا" میں نے کہا۔

"ہم نے اس پر تفصیل سے غور کیا ہے اور بحث کی ہے۔ یہ آپ ہم پر چھوڑ دیں اور خاموشی سے صرف تماشا دیکھیں۔ ہمیں اپنا کام کرنے دیں۔"

منظر نے بھی سر ہلایا "پہلے میرا بھی یہی خیال تھا کہ سار... کو دھوکا دینے والوں کو دھوکا دینا ناممکن ہے مگر اب میں کسی حد تک قائل ہو گیا ہوں کہ سوچ سمجھ کے ہر قدم اٹھایا جائے تو مرحلہ وار ... کام ہو سکتا ہے" منظر نے کہا "مگر شرط یہی ہے کہ دنیا چھ مہینے تمہاری منحوس شکل نہ دیکھے۔"

"شکل کو کچھ مت کہنا۔ بڑی بڑی یکتائے روزگار حسینان... جمال اس پر فریفتہ ہوئی ہیں" میں نے کن انکھیوں سے رابعہ کو دیکھا۔

منظر نے عادت کے مطابق گلا پھاڑ کے قہقہہ مارا "سالے غلط فہمی ہے تیری۔ ابے یتیم لاوارث سمجھ کے کسی نے ترس کھاتے ہوئے تجھے گود لے لیا....."

میں نے تصحیح کی "گود میں لے لیا۔ گود عرف آغوشِ محبت"

رابعہ نے خفگی سے کہا "بکو مت۔"

منظر نے کہا "چھ مہینے کی جیل کاٹ لے۔ سارے کیس ختم ہو جائیں گے ورنہ میں بتا دوں بیٹا۔ اس بار تو پکڑا گیا تو میں یا رابعہ تیری ضمانت تک نہیں کرا سکیں گے۔ پولیس بڑی سرگرم ہوگی تمہاری تلاش میں۔ ہر جگہ چھاپے مارے گی۔ ہم سب کے گھروں کی اور دفتروں کی نگرانی ہوگی۔ ہمارا پیچھا کیا جائے گا یہ دیکھنے کے لیے کہ کہیں گاڑی کی ڈکی میں تو سکندر بخت نہیں ہے۔ برقعہ اوڑھ کے تو نہیں بیٹھا ہوا ہے۔ آنا جانا کہیں نہیں ہے۔ نہ دن کے اجالے میں نہ رات کے اندھیرے میں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "یہ سب میں نہیں کر سکوں گا۔"

"تیرا تو باپ بھی کرے گا بھوتنی کے۔ قسم خدا کی انجکشن دے دے کر لمبا لٹائے رکھیں گے یہیں۔"

غالب نے کہا "ہمارے لیے بھی یہاں بڑا رسک ہے۔ ذرا سی بے احتیاطی سے تو پکڑا گیا تو ساتھ ہی ہم سب بھی اندر ہو جائیں گے۔ دھوکا دہی کا اور قانون کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کا۔ پتا نہیں کتنے سنگین الزامات کا سامنا کرنا پڑے گا۔"

"اسی لیے تو میں کہتا ہوں کہ یہ سب مت کرو۔"

"اور کوئی طریقہ نہیں ہے سکندر۔"

میں نے کہا "فرض کرو' میں کہیں چلا جاؤں۔ لندن نہ سہی کراچی۔"

غالب نے انکار میں سر ہلایا "پولیس ہی نہیں پبلک بھی تمہیں کہیں نہ کہیں پہچان جائے گی اور پکڑے گی۔ تمہارے خلاف پولیس کی زبردست مہم شروع ہونے والی ہے۔ اخباروں میں تصویریں چھپ چکی ہیں۔ جب پوسٹر لگ جائیں گے ہر شہر کی ہر گلی میں تو تم لوگوں کی نظر سے کیسے بچو گے!"

"فرض کرو میں تمہاری بات مان لوں پھر بھی کیا گارنٹی ہے؟ چھ مہینے بعد نئے نام اور بدلے ہوئے حلیے میں بھی کوئی مجھے پہچان جائے۔ میں اپنے فنگر پرنٹ تو نہیں بدل سکتا نا۔ میری صورت سے ملتی جلتی صورت والوں کو بھی پکڑا جا سکتا ہے اور تصدیق کے لیے فنگر پرنٹ ہیں پولیس کے پاس جو سکندر بخت نہیں ہوگا وہ نہیں پکڑا جائے گا۔ سکندر بخت پکڑا گیا تو حلیے یا نام کی تبدیلی سے بچ نہیں سکے گا۔"

غالب نے کہا "امید پر دنیا قائم ہے۔ سو فیصد یقین کے ساتھ کوئی کام آغاز نہیں ہوتا۔ ابتدائی اندازے' تجزیے' سروے اور FEASIBILITY رپورٹس کی بنیاد پر بڑے بڑے پروجیکٹ شروع کیے جاتے ہیں تو کامیابی کے غالب امکانات کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ اسی نوے فیصد کامیابی کی امید ہو تو کم سے کم بیس فیصد تو تقدیر پر یا خدا کی مرضی پر بھی بھروسا کرنا چاہیے یار۔ ویسے تو سب کچھ خدا کی مرضی پر منحصر ہے مگر وہ بھی تو کہتا ہے کہ کوشش کرو۔"

"او کے۔ میں تم سب کو انکار نہیں کر سکتا۔ میں تعاون کروں گا لیکن مشروط طور پر۔ مجھے سب کچھ بتایا جائے گا اور ٹھیک دو مہینے بعد میں پیش رفت دیکھ کے فیصلہ کروں گا کہ اس منصوبے کو جاری رکھا جائے یا ختم کر دیا جائے؟"

"ٹھیک ہے۔ لیکن تمہاری جان چھوٹ گئی تمام قانونی مسائل سے۔ بہ الفاظِ دیگر تم کو تختۂ دار تک پہنچنے سے بچا لیا گیا۔ جس کا موجودہ حالات میں ایک فیصد چانس نہیں کیونکہ تمہارے خلاف درجنوں مقدمات ہیں اور کم سے کم تین میں تمہیں سزائے موت لازمی ہو سکتی ہے۔ تو بقیہ زندگی تم شرافت سے گزارو گے۔"

"بالکل میری طرح" منظر نے کہا "بس ایک ہی کام ہوگا۔"

میں نے جلدی سے کہا "بس بس۔ میں سمجھ گیا لیکن میں بھی ایک بات لگی لپٹی رکھے بغیر بتا دینا چاہتا ہوں۔ میں اپنے مقصد سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔"

"ابے کون سا مقصد۔ وہی بینڈ باجے کے ساتھ رخصتی؟" منظر نے کہا "پھر دن رات فیکٹری چلاؤ۔"

"کون سی فیکٹری؟" غالب نے کہا۔

"بی پی فیکٹری اور کون سی فیکٹری۔ غالب کے گھوڑے۔"

"بی پی۔ وہ ڈبل روٹی اور ٹافیوں والی فیکٹری۔ کیا وہ خریدنے کا پروگرام بھی ہے؟"

منظر گلا پھاڑ کے ہو ہو کرنے لگا "ابے گاؤدی۔ شادی کے بعد وہ فیکٹری میں کیسے چلا رہا ہوں۔ بچہ پروڈکشن فیکٹری۔"

رابعہ کا رنگ لال پڑ گیا "تم بھی حد سے بڑھ جاتے ہو بے ہودگی میں۔"

میں نے فوراً سنجیدگی سے کہا "منظر۔ ابھی تک میرے باپ کے قاتل آزاد گھوم رہے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ درمیان میں زیادہ اہم مسائل نے مجھے ذاتی انتقام کے مقصد کو التوا میں رکھنے پر مجبور کر دیا تھا لیکن میں اس خیال کو دل سے نکال نہیں سکا تھا۔ مجھے آج بھی خیال آتا ہے کہ میرے والد کے ساتھ دلاور نے کتنا انسانیت سوز ظلم کیا تھا اور ان کو کتنی بے رحمی سے تڑپا تڑپا کے مارا تھا اور وہ کتنی بے بسی سے سب برداشت کرنے اور خاموش رہنے پر مجبور کر دیے گئے تھے۔ تو میرا خون میری رگوں میں سنسنانے لگتا ہے۔ مجھے بعض اوقات شرم آتی ہے اپنے آپ سے کہ میں نے ابھی تک انہیں سزا دینے کے لیے کچھ نہیں کیا۔ میری غیرت مر گئی ہے کیا؟"

"یار۔ یہ انتقام تو کس کس سے لے گا؟" غالب نے کہا۔

"سب سے۔ میں مسلمان ہوں اور پٹھان ہوں نسلاً۔" میں نے کہا "ہم قصاص کے اصولوں کو تسلیم کرتے ہیں۔ آنکھ کے بدلے آنکھ۔ جان کے بدلے جان۔ اور میرا پٹھان خون انتقام کو انصاف سمجھتا ہے۔ یہ میری بے حسی تھی کہ دلاور کے دل میں خوف نہیں رہا۔ وہ سمجھتا ہے بات پرانی ہو گئی اور میں بھول گیا۔ نہیں' میں اس کے جرم کو کیسے بھلا سکتا ہوں۔"

منظر نے مایوسی سے کہا "اچھا یار۔ جو تیری مرضی ہے وہ کر لیکن ہماری بھی کوئی حیثیت ہے یا نہیں۔"

غالب نے کہا "پہلے تم ہماری بات مانو۔ اپنی جان بچاؤ پھر جو چاہو کرو۔ ہم تمہارے ساتھ ہوں گے۔"

میں نے رابعہ کی طرف دیکھا "شاید تم اتفاق نہ کرو اس سے لیکن میں مجبور ہوں۔ نہ میں تم کو کھونا چاہتا ہوں اور نہ اپنے مقصد سے دور ہونا قبول کر سکتا ہوں۔ تمہیں انتظار کرنا پڑے گا۔"

اس نے بڑے سکون سے کہا "میں انتظار کر رہی ہوں اور کرتی رہوں گی۔"

"یہ انتظار غیر معینہ حد تک طویل بھی ہو سکتا ہے" میں نے کہا۔

"مگر میرا وعدہ محدود ہے۔ زندگی کی آخری سانس تک" رابعہ نے سر جھکا کے آہستہ سے کہا۔

میں نے سکون کی گہری سانس لی "تم نے میرے دل کی سب سے بڑی خلش دور کر دی ہے۔ یہ وعدہ ہی میرا سب سے بڑا سہارا ہوگا۔ اس کی خاطر میں اپنی حفاظت بھی کروں گا کیونکہ میں بھی پابند ہوں تمہارے پاس لوٹ کر آنے کا۔"

منظر نے گھڑی دیکھی "یار' اب میں تو چلتا ہوں۔ ورنہ بیوی مارے گی۔ بہت دیر ہو گئی۔"

"کیوں اس اللہ میاں کی گائے کو بدنام کرتا ہے منظر۔ وہ کچھ کہتی ہے تجھے' وہ مار سکتی ہے تجھے؟"

"ابے وہ ہر وقت کچھ نہ کچھ کہتی رہتی ہے۔ یہی تو سب سے بڑی مار ہے اس کی۔" منظر اٹھ کھڑا ہوا "وہ اللہ میاں کی گائے نہیں۔ مرغی ہے جو ہر وقت کڑکڑاتی رہتی ہے مگر کڑک نہیں ہوتی۔"

وقار نے کہا "جب آپ آئے تھے تو کیا آپ کو محسوس ہوا تھا کہ باہر کچھ لوگ کھڑے ہیں۔ بڑے مشکوک انداز میں؟"

"اب غور کروں گا۔ میری تو گاڑی ہی باہر کھڑی ہوئی ہے" منظر نے کہا اور اوپر چڑھ گیا۔ الماری سے گزرا اور غائب ہو گیا۔

وقار نے کہا "میرا خیال ہے کہ ہم بھی چلیں۔ اپنے گھر۔"

رابعہ بولی "یہ پرایا گھر ہے؟"

"میرا مطلب تھا جو میرا گھر ہے۔ نقوی صاحب کی سرکاری کوٹھی نہیں۔ وہاں تو کل جائیں گے۔ سوئم ہوگا۔ بس اس کے بعد جائیں گے تو سامان اٹھانے کے لئے" وقار نے کہا۔

میں نے کہا "اپنی بیوی سے تو پوچھ لو۔ وہ جائے گی؟ آج کا دن یہاں گزار کے وہ خاصی پُرسکون ہو گئی ہے۔"

"وہ رہنا چاہے رات کو بھی تو رہے۔ سچی بات یہ ہے کہ مجھے اجنبی ماحول میں صحیح نیند نہیں آتی اور میں آج رات واقعی سونا چاہتا ہوں" وقار یوسف نے کہا "اپنے بیڈ روم میں۔"

"پھر تم ضرور جاؤ" رابعہ نے کہا۔

وقار کے جانے کے بعد میں نے کہا "ابھی سے میں خود کو ایک قیدی محسوس کرنے لگا ہوں۔ یہ احساس بڑا عجیب لگتا ہے مجھے کہ دنیا میرے لیے سمٹ کر اس کمرے کی چاردیواری اور چھت تک محدود ہو چکی ہے اور میں یہاں چھپ کر رہنے پر مجبور ہوں کیونکہ باہر خطرہ ہے۔ موت ہے۔"

"ایسی باتیں مت سوچو۔"

"یہ سوچنے کی بات نہیں۔ وہ حقیقت ہے جس سے سمجھوتا کرنا مشکل لگتا ہے۔ بالکل جیل میں نووارد قیدی کی طرح۔ تم سب آزاد ہو۔ باہر کی دنیا میں جو کچھ ہے سب تمہارے لیے ہے۔"

غالب نے کہا "باہر کی دنیا کو ہم یہاں لا سکتے ہیں۔ کیا چاہیے تمہیں؟"

"مجھے آزادی چاہیے۔ اس حد تک کہ میں چاہوں تو گوالمنڈی جا کے تکے کباب کھا سکوں۔ مزنگ چلا جاؤں مچھلی کھانے۔ انارکلی' مال.... سب ہی میرے لیے ممنوعہ علاقے ہو چکے ہیں۔ جب تک میں اس دنیا میں تھا یہ نہیں سوچا تھا کہ اس سے محرومی کیا چیز ہوگی۔ اب اندازہ ہوتا ہے کہ چھ مہینے تک لاہور میں رہ کے لاہور سے دور رہنا۔ لاہور کو نہ دیکھنا۔ لاہور کو محسوس نہ کرنا۔ کتنا مشکل ہوگا۔ نہر کے کنارے کی صبح' انارکلی کی دوپہر۔ باغِ جناح کی شام اور مال روڈ کی رات۔"

"بس کر یار۔ ابھی سے رونا شروع کر دیا۔ کیسے ہوگا پھر یہ کام اور زندگی کیسے گزرے گی۔ زندہ رہنے کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور زندہ رہنے کے لیے بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ کڑوی دوا بھی پیتا ہے آدمی اور اپنے جسم کی چیر پھاڑ اور کاٹ چھانٹ بھی قبول کرتا ہے۔"

"یہ وقتی مایوسی اور فرسٹریشن کا ردِعمل ہے۔ جیل میں نووارد بھی بہت جلد مستقبل کی امید کے ساتھ آزمائش کے دن کاٹنے لگتا ہے اور دن کتنے ہی مشکل ہوں کٹ جاتے ہیں۔ بالآخر وہ گھر میں اپنوں کے درمیان ہوتا ہے۔ جن کے لیے وہ جیتا ہے۔"

"یہی سوچ کے میں بھی مجبور ہو جاتا ہوں کہ میری یہ صرف میری نہیں" میں نے کہا۔

"اگر صرف اپنی ہوتی تب بھی کیا اسے ضائع کیا جا سکتا فضول اور بے وقعت سمجھ کے۔ نہیں' ایسا ہوتا تو وہ سب کر لیتے جو فٹ پاتھ پر گوشت کے لوتھڑوں کی طرح پڑے نظر ہیں۔ اندھے اور اپاہج' مفلوج اور لاچار بھی زندگی سے چمٹے ہیں۔ اتنی بدصورت اور کریہہ نظر آنے والی زندگی بھی بہت صورت اور قابلِ قدر ہوتی ہے... تم تو لاکھوں کروڑوں سے خوش نصیب ہو۔ کیا میسّر نہیں ہے تمہیں؟ مال و دولت' صحت۔ ہم سب کی رفاقت اور سب سے بڑھ کے رابعہ کی محبت"

میں نے شرمندگی سے کہا "میں کفرانِ نعمت کا گناہ کر سکتا۔ خدا کا شکر ادا کرنا بھی مشکل نظر آتا ہے مجھے جس نے گنت مواقع فراہم کیے مجھے۔ حادثات سے بچایا۔ دشمنوں سے محفوظ رکھا۔ ذلت و رسوائی سے بچایا۔ ورنہ یہ بھی ہو سکتا تھا استاد ٹیڈی کی طرح میں آج ایک ڈھانچا ہوتا۔ کسی تیر میں ایک ہاتھ پیر یا آنکھ سے محروم ہوتا' کسی ذہنی صدمے سے ہو جاتا یا کال کوٹھری میں پھانسی چڑھنے کی تاریخ کا انتظار کر رہا ہوتا۔

یہ سب دستِ قدرت کی عنایت ہے کہ اس نے مجھے زندگی بدصورتی سے دور رکھا اور سارا حسن میری جھولی میں ڈال دیا۔ کافر اپنی خوش نصیبی کا اقرار نہیں کرے گا۔"

"عملی اقرار یہی ہے کہ تم زندہ رہو۔ زندگی کی جدوجہد کرتے رہو۔"

"وہ میں ضرور کروں گا۔ بس مجھے اس بزدلانہ طریقِ کار سے اختلاف تھا۔ چوہے کی طرح بِل میں گھس جانا۔ اس خوف سے باہر نکلنے میں خطرہ ہے۔ بس اس خیال سے میرا ذہن باغی ہوتا ہے۔ مجھے پھر ٹیپو سلطان شہید کا قول یاد آتا ہے کہ گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے۔"

"وہ زمانہ اور تھا۔ اب پاکستان میں شیر صرف چڑیا گھر میں ہیں اور ان کی زندگی سو سال کی ہو تب بھی قابلِ رشک نہیں۔ وہ گیدڑ ہی بہتر ہے جو آزاد ہے اور تماشائے عبرت نہیں بنا ہے۔"

بحث لاحاصل تھی۔ ایک میرا نقطۂ نظر تھا جو سب کو غیر لگتا تھا۔ ایک عملی طریقہ تھا جس پر عمل کر کے میں جینے کی سکتا تھا۔ زندگی کی ضمانت تو خدا نے اپنے کسی خاص بندے کو نہیں دی تھی جو اس کے محبوب تھے اور اس سے اتنے قریب کہ عرش پر عالمِ بالا کی سیر اور خدا سے شرفِ ملاقات کے لیے کیے گئے تھے۔ دیگر انبیاء و اولیاء تھے۔ قطب اور ابدال تھے کے اعمالِ صالحہ اور اسوۂ حسنہ انہیں پہلے سے منظور شدہ زندگی کی ایک سانس کی اضافی مہلت نہ دلا سکے تھے۔ میں کس شمار قطار میں تھا کہ اپنی حفاظت کا سارا عذاب جھیل کے دعویٰ کر سکوں کہ اب مجھے کوئی نہیں پکڑ سکتا۔ کوئی نہیں مار سکتا۔ اگر نوشتۂ تقدیر کچھ تھا تو اسے میری تدبیر کیسے بدلے گی؟ میرے مقدر میں دلاور کے ہاتھوں مارا جانا ہے تو ایسا ہی ہوگا۔ میری موت تختۂ دار پر لکھی ہے تو مجھے کوئی گولی نہیں لگے گی۔ اور مجھے جینا ہے۔ رابعہ سے شادی کر کے گھر بسانا ہے اور گھر میں چراغ جلانے ہیں تو پھر کیا دلاور اور کیا کوئی اور شکاری۔ نہ کسی کو وہ گولی ملے گی جس کا نشانہ وہ مجھے بنا سکے نہ دنیا کی کوئی طاقت مجھے تختۂ دار تک لے جا سکے گی۔

یہ میرے لیے بڑے اعتماد آفریں اور حوصلہ افزا خیالات تھے مگر انہی کی وجہ سے میں ذہنی انتشار میں مبتلا تھا۔ ایک طرف دوستوں کا اصرار تھا کہ میں زندہ رہنے کے لیے ان کی تدبیر کا ساتھ دوں' دوسری طرف مجھے تقدیر سے لڑنا بے سود لگتا تھا۔ میرے خیالات میں انتشار تھا اور میری قوتِ فیصلہ دو متضاد قوتوں کے درمیان بے عمل ہو رہی تھی۔ جیسے برابر کی ٹیموں کی رسہ کشی میں طاقت کا توازن رسے کو نہ اِدھر ہونے دے نہ اُدھر۔

اب ہم رات کا کھانا اپنی مرضی سے آزادی کے ساتھ کہیں بھی کھانے کے لیے نہیں جا سکتے تھے۔ غالب کا خیال تھا کہ اس سے فرق نہیں پڑتا۔ کھانا منگوایا جا سکتا ہے مگر اس دلیل کے پیچھے میرا دل رکھنے کا خیال کارفرما تھا ورنہ وہ خود بھی جانتا تھا کہ فرق پڑتا ہے۔ وہی کھانا' آئس کریم یا چاٹ جو گھومتے پھرتے کھائی جاتی ہے جب گھر منگوائی جائے تو اس سے تفریح کا لطف غائب ہو جاتا ہے۔ تاہم میں نے اس سے اتفاق کیا۔ شاید اسی انتظام کے پیشِ نظر منظر نے عاشق علی تڑپ اور ان کی نااہلیہ کو ارسال کیا تھا۔ جیسا کہ بعد میں ثابت ہوا۔ وہ عورت ہر قسم کے کھانے پکانے میں کمال رکھتی تھی اور اس کا مجہول نظر آنے والا شوہر نما اور شاعر ٹائپ عاشق بے حد کائیاں تھا اور حقِ نمک ادا کرنے میں اس کی عقل پر بھروسا کیا جا سکتا تھا۔

رابعہ اور نازو اوپر ایک ہی بیڈ روم میں سو گئیں۔ تڑپ صاحب برآمدے میں لیٹ گئے اور کہا "ہم یہاں استراحت فرمائیں گے اور دورانِ خوابیدگی فرائضِ دربانی سے بھی غافل نہیں ہوں گے۔" یہ ایک مضحکہ خیز بات تھی کہ آپ سوئیں گے تو چوکیداری کیسے کریں گے بھائی لیکن کسی نے اس سے یہ سوال نہیں کیا تھا۔

میں اور غالب انڈر گراؤنڈ تھے۔ وہاں اعصاب شکن سکون اور سکوت تھا جس میں اے سی کی ہوا کی سرسراہٹ کے سوا کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ میں باتیں کرنا چاہتا تھا لیکن جانتے بوجھتے غالب نے لائٹ آف کر کے نیند کا بہانہ کیا۔ دراصل وہ چاہتا تھا کہ میں آرام کروں اور اس ماحول سے آشنائی کا رشتہ خود استوار ہو جائے جہاں مجھے آج کی رات کے بعد بھی نہ جانے کتنی راتیں گزارنی تھیں۔

میں اندھیرے اور سناٹے میں آنکھیں کھولے پڑا رہا اور چشمِ تصور سے بہت کچھ دیکھتا رہا۔ شیلی کی لاش جو اس وقت مُردہ خانے میں بھی نہیں تھی اور کسی گمنام مدفن میں یومِ حشر تک کے لیے گم ہو چکی تھی۔ دلاور اس لاش سے بھی ڈرتا تھا کہ کہیں وہ اس کے جرم کا راز فاش نہ کر دے۔ اپنے خون کے رشتے کو اس نے خود اپنے لیے حلقۂ دام بنالیا تھا۔ وہ بہت بڑا شکاری تھا' کمان کی طرح شیلی کو استعمال کر کے اس نے ایک تیر سے دو شکار کرنے چاہے تھے مگر پھر ایک تیر کا رخ اسی کی طرف ہو گیا تو دلاور نے کمان ہی توڑ دی۔

آسٹریلیا کے قدیم باشندے حرف "ر" کی شکل کا ایک ہتھیار استعمال کرتے ہیں جس کے دونوں طرف دھار ہوتی ہے مگر اصل کمال اس کے استعمال میں ہے۔ ماہرِ فن اسے پھینکتے ہیں تو یہ ہوا میں اُڑتا ہوا جاتا ہے اور شکار کا کام تمام کر کے لوٹ آتا ہے۔ عموماً پھینکنے والے کے قدموں میں آگرتا ہے۔ اسے آسٹریلیا میں بوم رینگ BOOMRANG کہا جاتا ہے۔ پرانے فنونِ حرب اور قدیم ہتھیاروں کی طرح' جو اب صرف میوزیم میں نظر آتے ہیں بوم رینگ اور اسے استعمال کرنے والے بھی ختم ہو رہے ہیں لیکن ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں۔ ملکہ الزبتھ نے آسٹریلیا کا دورہ کیا تھا تو ان کے سامنے اس فن کا مظاہرہ ہوا تھا۔ بوم رینگ کے بارے میں جدید سائنسی تحقیق کہتی ہے کہ یہ ہوائی جہازوں' کاروں اور خلائی سیاروں کے ڈیزائن کی طرح AERODYNAMICS کا کمال ہے۔ قدیم غیر مہذب اور جاہل قبائل یہ کیسے جانتے تھے؟ یہ خدا ہی جانے!

کہنے کا مقصد یہ تھا کہ آج بھی کوئی چال پلٹ کے چلنے والے کے حق میں شکست کا سبب بن جائے تو کہا جاتا ہے کہ بوم رینگ ہو گئی کیونکہ بعض اوقات اناڑی ہاتھوں میں یا اندازے کی غلطی سے بوم رینگ اُڑتا ہوا جاتا ہے مگر دشمن کا سر بچ جاتا ہے۔ وہ پلٹ کر پھینکنے والے کی گردن اُتار دیتا ہے۔ ایسا ہی شیلی کے کیس میں دلاور کے ساتھ ہوا تھا۔ اب ہم دلاور کا اس سے رشتہ ثابت کر سکتے تھے۔ ہمارے پاس دستاویزی ثبوت بھی تھے اور گواہ بھی مگر اس کی لاہور میں موجودگی ثابت نہیں کر سکتے تھے۔

چوہدری دلاور معمولی ایکٹر نہیں تھا۔ اس کے لیے ایمان یا ضمیر نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہ حلف اُٹھا کے بھی کہہ سکتا تھا کہ اس نے شیلی کو آخری بار لندن میں ہی دیکھا تھا۔ وہ لاہور میں کیسے ہو سکتی ہے۔ اگر کسی کو معلوم ہے تو مجھے بتائے وہ کہاں ہے؟

اچانک میں اٹھ بیٹھا۔ میرے لاشعور میں ایک گتھی تھی جسے میں نے سلجھانے کی کوشش ہی نہیں کی تھی کیونکہ اور کسی نے بھی مسئلے پر اس پہلو سے غور بھی نہیں کیا تھا۔ مسئلہ جو لاشعور میں

محسوس نہ ہونے والی خلش کی طرح موجود رہے ایسے ہی حل ہوتا ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ وحی کی طرح یہ خیال نازل ہوا۔ غیب سے ایک کرشمہ ظہور پذیر ہوا۔ ہوتا یہ ہے کہ آپ اپنا کام کرتے رہتے ہیں اور لاشعور کا کمپیوٹر خاموشی سے اس مسئلے کا حل تلاش کرنے میں مصروف رہتا ہے اور جیسے ہی حل ملتا ہے فوراً شعور کو پیغام موصول ہو جاتا ہے۔ بڑے بڑے سائنس دانوں اور فنکاروں نے ایجادات سے تخلیقی کام تک ایسے ہی وحی کی طرح نازل ہونے والے خیال کی صورت میں کیے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ بیتھوون نے اپنی شہرۂ آفاق پانچویں سمفنی خواب میں سُنی تھی جو درحقیقت لاشعور ہی کا سینما ہے۔

میں نے غالب کو بیدار کیا "غالب کیا سو رہا ہے؟"

"سبحان اللہ کیا سوال کیا ہے" وہ بولا "جگا کے پوچھ رہے ہو کہ سو رہا ہے۔ فرمایئے کیا مسئلہ ہے؟ شیلی کا بھوت آ گیا ہے یہاں یا میرے سسر نے غلطی سے تمہیں لات مار دی۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ جاگ رہا تھا ورنہ اتنی بکواس نہ کرتا۔ "یار۔ اُٹھ۔"

"اُٹھ گیا بھائی۔ اب کیا دنیا سے اُٹھ جاؤں۔"

میں نے کہا "مرزا جی۔ باہر چلو' خبردار جو اختلاف کیا یا حلق سے آواز نکالی۔ تمہیں نازو کی قسم۔"

غالب نے تکیے کو مُکا مارا "یہ حرامی پن ہے۔ بلیک میلنگ ہے۔"

میں نے ہنس کے کہا "اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ چلو۔"

"لیکن کہاں؟ ولاور کو قتل کرنا ہے تو صبح نو بجے کریں گے یار۔ ناشتے کے بعد۔"

میں نے کہا "تمہیں پھر نازو کی قسم جو سوال کرو۔"

غالب نے اپنے سر کے بال نوچ لیے "اب تمہیں رابعہ کی قسم جو پھر مجھے نازو کی قسم دی۔"

"او کے۔ مزید کوئی قسم نہیں" میں نے کہا "اب اُٹھو۔ باہر چل کے میں بتاتا ہوں۔"

ہم چوروں کی طرح اپنے ہی گھر سے باہر آئے۔ اس وقت رات کے بارہ بجے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ رابعہ اپنی گاڑی کی چابیاں کہاں رکھتی ہے مگر میں نے انہیں اُٹھایا اور واپس رکھ دیا۔ رات کی خاموشی میں کسی فاکس ویگن کی آواز سُن کے ہی وہ اُٹھ بیٹھتی۔ اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے۔ والی بات ہو جاتی۔ برآمدے میں تڑپ صاحب ویسے ہی سوتے رہے۔ غالب نے میرے ساتھ گیٹ عبور کیا۔

"باہر آ گئے۔ اب بولو مجھے بھگا کے کہاں لے جا رہے ہو؟"

"مرزا۔ تم نے کہا تھا کہ اس ایمبولینس ڈرائیور کو پولیس نے گرفتار کر لیا تھا؟" میں نے کہا "جو شیلی کی لاش لایا تھا۔"

غالب نے کہا "اس سوال کا جواب میں نیند میں بھی دے سکتا تھا۔ ہاں۔"

"اس کا قصور تو کوئی نہیں تھا؟"

"میرے خیال میں نہیں تھا" غالب نے کہا۔

"تمہارا خیال غلط ہے۔ فرض کرو ابھی اسی وقت ہم اس ڈرائیور سے ملنا چاہیں تو وہ کہاں ملے گا؟"

"حوالات میں۔"

"کون سے تھانے کی حوالات میں؟"

"تھانہ انارکلی۔ ویسے پولیس کی مرضی اسے تفتیش کے لیے سانده کلاں لے جائے۔"

میں نے کہا "شرط لگاتے ہو مجھ سے۔ وہ کسی تھانے میں نہیں ہو گا۔"

"کتنی شرط ہے۔ میں ہارتا ہوں۔"

میں اسے گھسیٹ کر آگے لے گیا "زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں ہم واپس آ جائیں گے۔ صبح وہیں سوتے ہوئے پائے جائیں گے جہاں رات کو دیکھے گئے تھے۔"

غالب نے سر پر ہاتھ مارا۔ "بھائی تم نے تہیہ کر لیا ہے اندر ہونے کا اور اپنے ساتھ ہم سب کو مروانے کا۔ تم تھانے جاؤ گے تو واپس کیسے آؤ گے؟"

"میں اندر نہیں جاؤں گا۔ تم دیکھ آنا" میں نے غڑاپ سے ایک ٹیکسی میں داخل ہو کے کہا۔

ٹیکسی ڈرائیور اگلی سیٹ پر سو رہا تھا۔ وہ ہڑبڑا کے اُٹھا۔ "یہ کیا ہے؟"

میں نے کہا "یہ بڑا حرامی صحافی ہے' غالب۔ اس کو تھانے جانا ہے۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے کہا "مجھے کسی تھانے نہیں جانا۔ چلو اُترو۔"

میں نے کہا "سو روپے میں چلو گے؟"

اس کی بتیسی نمودار ہو گئی "ننانوے میں بھی چلوں گا۔"

راستے میں غالب نے کہا "اگر وہ وہاں ہوا؟"

میں نے کہا "اسے کہنا کہ بھائی صاحب۔ اللہ آپ کو حوالات میں ہی خوش رکھے اور واپس آ جانا۔ میں شرط ہار جاؤں گا۔"

"اس سے کیا ہو گا؟"

"کچھ نہیں" میں نے دانت نکال کے کہا "تم ہار گئے تو بہت برا ہو گا تمہارے ساتھ۔ تمہاری عزت لُٹ جائے گی۔ میرے ہاتھوں۔"

"ایک صحافی کی عزت پر کون ہاتھ ڈال سکتا ہے" غالب بولا "نہ نواب کالا خان نہ فیلڈ مارشل ایوب خان آف ہریانہ۔"

ٹیکسی کو میں نے تھانے سے کچھ دور ہی روک لیا۔ غالب دو قدم پیدل چل کے تھانے میں داخل ہو گیا۔

"میرا بھی دل چاہتا ہے صحافی بن جاؤں۔ کیسی ٹور ہوتی ہے اور کوئی جا سکتا ہے اس طرح تھانے میں" ٹیکسی ڈرائیور نے حسرت سے کہا۔

"عجیب بات ہے۔ وہ کہتا ہے ٹیکسی ڈرائیور بن جاؤں۔ سارا دن سیر ہوتی ہے۔ سیر پر پیسے خرچ نہیں ہوتے۔ پیسے ملتے ہیں۔ چلو میں بات کرا دیتا ہوں۔ تم یہ ٹیکسی اس کے نام کر دو۔ وہ تمہیں اپنی جگہ لگوا دے گا۔"

وہ ہنس پڑا "وہ تو ٹیکسی چلا لے گا۔ ہم مڈل فیل اخبار کا بھٹا بٹھا دیں گے۔"

کسی عظیم فلسفی کی طرح میں نے کہا "یاد رکھو۔ ہر شخص کے لیے ایک کام ہے اور ہر کام کے لیے ایک شخص۔"

اس نے فوراً ایک نوٹ بک نکالی اور لکھتے ہوئے بولا "کیا زبردست قول ہے جی۔ کس کا ہے؟"

میں نے سوچ کے کہا "ان کا جو ہر چیز دیکھ کے رو پڑتے تھے۔ دیکھ کبیرا رویا والے کبیر داس۔ کچھ لوگ انہیں کبیر خان بھی کہتے تھے۔"

غالب نمودار ہوا تو اس کی چال سے ہی میں نے اندازہ کر لیا کہ وہ شرط ہار گیا ہے۔ اس نے اندر بیٹھتے ہی سر کھجا کے کہا "پیر و مرشد۔ آپ کے پیر کہاں ہیں۔ میں چھونا چاہتا تھا۔"

میں نے کہا "اس وقت گندے ہو رہے ہیں۔ کل دھو کے پی لینا۔"

"وہ تو واقعی نہیں ہے یہاں" غالب نے کہا "ایک پاپڑ جیسا لڑکا یہاں تھانے دار بیٹھا تھا۔ میں نے تعارف کرایا تو ململ کی طرح نرم ہو گیا۔ کہنے لگا کہ جناب اس ڈرائیور کا کیا قصور تھا۔ میں نے کہا قصوروار کو تم کب پکڑتے ہو لیکن اپنی زبان سے اقرار کر رہے ہو تو اس کا مطلب صاف یہ ہے کہ تم نے رشوت لے کر اسے بے قصور ہونے کا سرٹیفکیٹ دیا اور چھوڑ دیا۔"

"پھر کیا بولا؟"

"وہی ڈراما کرنے لگا۔ کانوں کو ہاتھ لگانے لگا کہ رشوت؟ توبہ توبہ۔ مجال ہے جو کبھی ایک پیسہ لیا ہو کسی سے۔"

"سچ ہے۔ ایک پیسہ تو فقیر بھی نہیں لیتا۔"

"بعد میں پتا چلا کہ اس کی سفارش تو خود گرفتار کرانے والوں نے کی۔ فون آ گیا اسپتال سے۔ کوئی پولیس افسر خود آیا اور اس نے کہا کہ اسے جانے دو۔ نیک آدمی ہے۔ ایمبولینس چلاتا ہے۔ بڑے ثواب کا کام ہے۔"

"تم نے پوچھا کہ وہ کہاں رہتا ہے؟"

"ہاں۔ بڑے پیداگیر لوگ ہیں۔ فوراً گھر پہنچ جاتے ہیں۔ اطلاع کروا دیتے ہیں کہ تمہارا بندہ ہمارے پاس ہے۔ آج رات اسے تفتیش سے بچانا ہے تو نذرانہ لے کر حاضر ہو جاؤ۔ تھانے دار نے ذرا مختلف انداز میں بتایا کہ بے چارا پریشان تھا کہ میرے بیوی بچوں کو پتا نہیں۔ ہم نے کہا کہ اچھا بُلوا لیتے ہیں۔ گھر سے کھانا بھی آیا تھا۔ بڑی اچھی عورت ہے۔ کھانا اچھا پکاتی ہے۔ ہمارے لیے بھی لائی تھی۔"

"اس ٹیکسی والے کو بتاؤ اب کہاں جانا ہے؟"

"کہاں جانا ہے' واپس جانا ہے اور کہاں؟"

"نہیں۔ ایمبولینس ڈرائیور کے گھر۔" میں نے کہا۔

غالب سے پہلے ٹیکسی ڈرائیور نے غل کیا "بات تھانے جانے کی ہوئی تھی۔"

غالب نے کہا "اچھا۔ تھانے جاؤ گے؟ تمہاری مرضی' کتنے دن کے لیے جاؤ گے؟ یہ بھی بتا دو۔"

"یہ.... یہ تو بڑا ظلم ہے جناب۔"

"ہاں یار ظلم تو ہے" غالب نے کہا "اب ذرا سنت نگر چلو ورنہ ہم اور ظلم کریں گے۔ بڑے ظالم لوگ ہیں ہم۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے ہمارے تیور دیکھ لیے تھے اور لہجے سے اندازہ کر لیا تھا کہ ہم ٹیڑھے لوگ ہیں۔ اس نے بادلِ ناخواستہ گاڑی کو اسٹارٹ کیا اور بولا "سو روپے میں یہاں تک کی بات ہوئی تھی۔"

میں نے کہا "ننانوے روپے میں۔ سنت نگر تک ایک روپیہ بنے گا تو پورے سو ہو جائیں گے۔"

"یہ تو بدمعاشی ہے" اس نے گاڑی بند کر دی "آپ دوسری گاڑی لے لیں۔"

غالب نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ "کہاں ہے دوسری گاڑی؟"

وہ اکڑ گیا "نہیں ہے تو میں کیا کروں۔ میں سنت نگر نہیں جا سکتا۔ بند کروا دیں آپ مجھے تھانے میں۔"

اب غالب کو پھر اُتر کے تھانے جانا پڑا۔ ٹیکسی ڈرائیور کو یقین نہیں تھا کہ اس دھمکی پر عمل بھی ممکن ہے۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کر کے فرار ہونے کا سوچا ہی تھا کہ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور پھر چابی نکال لی۔ ادھر غالب دو سپاہیوں کے ساتھ نمودار ہوا' ادھر ڈرائیور نے میری منت سماجت شروع کر دی اور ہاتھ جوڑنے لگا مگر میں نے مناسب یہی سمجھا کہ اسے ہم اپنے ساتھ نہ لے جائیں۔ واپسی میں گاڑی اس کے سپرد کرتے ہوئے اسے مزید کچھ رقم بھی دی جا سکتی تھی۔ ورنہ سو روپے بھی کم نہ تھے۔

پولیس والوں نے اس کی ایک نہیں سُنی اور اسے پکڑ کے اندر لے گئے۔ شاید غالب نے انہیں سمجھا دیا تھا کہ ڈرائیور کے ساتھ زیادتی نہ ہو۔ ورنہ وہ صرف گھسیٹ کر نہ لے جاتے وہیں سے جوتا کاری بھی شروع کر دیتے۔

اب ڈرائیونگ غالب نے سنبھال لی "شرافت کا زمانہ ہی نہیں رہا یار۔"

میں نے کہا "جس کی لاٹھی اس کی ٹیکسی۔ زمانے کا یہی دستور

ہوگیا ہے۔ تو ہم کیا کریں۔"
"میں نے کہہ دیا ہے کہ اسے صبح تک روکو۔ صبح سے پہلے ہی ہم واپس آجائیں گے۔" غالب نے کہا۔
"جرم کیا بتایا اس کا؟"
"کیا سواری اُٹھانے سے انکار کرنا جرم نہیں ہے؟ میں دخل نہ دیتا تو وہ اور بھی جرم بنا دیتے" غالب نے کہا۔
"کیا تم پوچھو گے نہیں کہ ہم ایمبولینس ڈرائیور کے گھر کیوں جا رہے ہیں؟"
غالب بولا "میری عقلِ شریف میں کچھ آرہا ہے۔"
رات کے وقت پرانی آبادی میں کسی معمولی ڈرائیور کا گھر تلاش کرنا یقیناً آسان نہ ہوتا مگر اتفاق سے ہم غلط جگہ مڑ کے صحیح گلی میں داخل ہوگئے۔ گلی کے نکڑ پر حلوائی کی دُکان پر لوگ بڑے بڑے پیالوں میں برفی ملا دودھ پی کے جان بنا رہے تھے اور خوش باشی سے گپ لگا رہے تھے۔ یہ ہماری طرح کافی پینے اور جھک مارنے سے یقیناً بہت بہتر کام تھا۔ وہ جانتے تھے کہ گلی میں کون ایمبولینس چلاتا ہے اور کس کی بیوی زبان چلاتی ہے تو وہ جوتا چلاتا ہے۔
ہم نے صحیح دروازے پر دستک دی۔ اندر کچھ ہڑبونگ مچی کیونکہ گھر والے سوئے پڑے تھے اور ان کے لیے آدھی رات کے وقت دستک بڑی غیر متوقع تھی۔ جس کے دل میں چور ہو وہ تو ہر آہٹ پر سمجھتا ہے کہ شامت آگئی۔ ڈرائیور نے بہ زبانِ زوجہ کہلوایا "کون ہے جی؟"
میں نے آواز بدل کے کہا "چوہدری صاحب نے بھیجا ہے۔"
کچھ دیر بعد زوجہ نے شوہر کے ڈائیلاگ بولے "کون چوہدری صاحب؟"
میں نے کہا "وہ جو تمہارے پیچھے بول رہا ہے نا۔ اسے معلوم ہے کہ چوہدری ایک ہی ہے۔ کیا ہم اندر آکے سمجھائیں یا وہ خود اپنا دیدار کرائے گا باہر آکے۔"
ڈرائیور فوراً باہر آگیا۔ جلدی میں اس نے ہماری اشکال پر بھی غور نہیں کیا تھا اور اندر سے ہمیں اس لیے نہیں دیکھ سکا تھا کہ ہم عین دروازے کی جھری کے سامنے کھڑے ہوئے تھے۔
میری صورت پہچانتے ہی وہ بدکا اور واپس ہونے لگا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا "مقابلہ کرو گے یا شور کرو گے تو اپنی عزت خراب کرو گے سمجھے!"
غالب نے کہا "دروازے کے پیچھے سے بھی آواز نہ آئے۔"
لیکن آواز آئی "آخر کیا چاہتے ہو جی آپ؟"
غالب نے آہ بھری "یہ بڑا دردناک سوال ہے اور اس کا جواب زیادہ دردناک ہے۔ اس لیے خاموش رہو۔"
میں نے کہا "ہم مختصرات کریں گے۔"
وہ کانپنے لگا تھا "اچھا... اندر... اندر آجاؤ" وہ بولا اور پھر اپنی نصف بہتر سے مخاطب ہوا "چل پردہ کر لے۔"
ہم ٹاٹ کا پردہ ہٹا کے ایک ڈیوڑھی میں داخل ہوئے اور وہیں رک گئے۔ یہی اس کا ڈرائنگ روم یا مہمان خانہ سب کچھ کہا جاسکتا تھا۔ اندر شاید چار گز کا دالان ہوگا۔ ایک یا دو کوٹھریاں ہوں گی جن میں فرش پر اس کی تمام اسنادِ حقوقِ زوجیت بکھری پڑی ہوں گی۔
میں نے کہا "ہم جھوٹ سچ کو پرکھنے کا آلہ بھی اپنے ساتھ لائے ہیں۔ تم اسپتال میں ہو۔ یہ آلہ دیکھا ہے کبھی!"
"ایسا... آلہ تو نہیں دیکھا..." وہ بولا۔
"اچھا آج دیکھ لو۔" میں نے شیلی کے بیگ سے برآمد ہونے والا چھوٹا سا ریوالور نکال لیا "کوئی جھوٹ بولے تو اس میں معمولی سا دھماکا ہوتا ہے۔ یہاں سے ایک چیز نکلتی ہے اور جھوٹ بولنے والا پنکچر ہو جاتا ہے۔"
غالب نے کہا "یہ سچا آدمی ہے۔ جھوٹے کا منہ کالا ہوتا ہے اس کا کتنا گورا رنگ ہے۔"
میں نے کہا "غور سے میری بات سنو۔ آج تم اسپتال سے ایک لاش لے کر گئے تھے۔ ایڈووکیٹ رابعہ قاری کے گھر۔"
"ہاں جی۔ آپ ملے تھے وہاں۔"
غالب نے سراہا "یادداشت اچھی ہے، سچے آدمی کی۔"
میں نے کہا "اسپتال سے روانہ ہونے کے بعد تم کہاں گئے تھے؟"
"جو پتا مجھے بتایا گیا تھا گڑھی شاہو۔"
میں نے ریوالور کو اُچھالا اور پھر پکڑ لیا "بچ گئے تم بال بال۔ سوچ جھوٹ بتانے والا آلہ خود کار ہے۔ تم نے جھوٹ بولا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے بچایا ہے تمہیں۔"
"اب سوچ کے جواب دو۔ چاہو تو پہلے اندر جا کے بیوی کو وصیت کر آؤ۔" غالب نے کہا "دعا مانگ لو، پانی پی لو۔ یا کلمہ پڑھ لو۔"
وہ سخت دہشت زدہ ہوا "میں... میں بتاتا ہوں۔ نکلا تو میں گڑھی شاہو جانے کے لیے تھا...... لیکن باہر نکلتے ہی مجھے آگے پیچھے سے دو گاڑیوں نے روک لیا۔ ایک آدمی اُتر کے میرے ساتھ آبیٹھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی یہی تھا۔"
"یہ تو جھوٹ سچ پکڑنے والا آلہ ہے۔ وہ ریوالور ہوگا" غالب بولا۔
اس نے اقرار میں سر ہلایا "اس نے کہا کہ جدھر سے میں کہوں ادھر سے چلو۔ اس نے... کچھ نوٹ... دس ہزار روپے تھمائے مجھے اور کہنے لگا پانچ منٹ کی بات ہے۔ پانچ منٹ میں دس ہزار بھی نہیں کما سکتے تم؟"
"اور تم بہت مجبور تھے پہلے ہی" میں نے کہا۔
اس نے بے بسی سے میری طرف دیکھا "ہر غریب آدمی مجبور ہوتا ہے۔ جس کی تین بیٹیاں شادی کے لائق ہوں اور وہ خدا پر آس لگائے بیٹھا ہو۔ ریوالور کے سامنے میں کیا بول سکتا تھا ویسے بھی۔ وہ مجھے مار کے گاڑی لے جاتے۔ میں نے گاڑی کا رخ موڑ لیا۔ وہ مجھے ایک گھر میں لے گئے۔ وہاں میں تو گاڑی میں بیٹھا رہا۔ انہوں نے پیچھے سے لاش اُتاری۔ اندر لے گئے اور واپس لے آئے چند منٹ بعد۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ اب جاؤ۔ سمجھ لو کچھ ہوا ہی نہیں۔"
غالب بولا "یعنی تمہیں معلوم تھا کہ راستے میں لاش بدل دی گئی ہے، سچے آدمی؟"
اس نے اقرار میں سر ہلایا "اللہ مجھے معاف کرے۔"
"اللہ کیوں معاف کرے آخر۔ دس ہزار میں لاش کا سودا کرنے والے کو کس اصول کے تحت معاف کیے جانے کا حق حاصل ہے؟" میں نے کہا۔
"تم دستخط کرا کے بھاگنے کی فکر میں تھے۔ بھگتنا ہمیں پڑتا۔ جی چاہتا ہے تمہارے ایک جھانپڑ ضرور رسید کروں لیکن خیال آجاتا ہے تمہاری بیوی کا اور تین بیٹیوں کا۔ موقع ملا تو کل صبح دس بج کے دس منٹ پر ماروں گا.... باہر۔" غالب نے کہا۔
میں نے کہا "ہمارے ساتھ چلو اور بتاؤ وہ کون سا گھر تھا۔"
وہ ہاتھ جوڑنے لگا "وہ مجھے مار ڈالیں گے۔"
"کمال ہے۔ ہم سے یہ ڈر کیوں نہیں ہے تمہیں۔ ہم بھی مار ڈالیں گے تمہیں" غالب نے اسے یقین دلایا "اگر تم نے انکار کیا۔"
"تم نے جُوا کھیلا تھا۔ جُوئے میں رسک تو ہوتا ہے۔ تم کہہ سکتے ہو کہ میں نے کسی کو نہیں بتایا تھا۔ کیا پتا وہ تمہاری بات مان لیں۔ ترس کھا کے تمہیں چھوڑ دیں۔ ان کے پاؤں پڑ جانا۔ رونا دھونا" میں نے کہا۔
اس نے اندازہ کر لیا کہ ہم ٹلنے والے نہیں ہیں "میں دور ہی سے بتا دوں گا۔"
"ٹھیک ہے مگر اس جھوٹ سچ کا پتا چلانے والے خود کار آلے کا خیال رکھنا۔ غلط گھر کی طرف انگلی اٹھائی تو یہاں سوراخ ہو جائے گا۔" غالب نے اس کی پیشانی کو انگلی سے چھوا۔
میں نے کہا "ہمیں کچھ اندازہ تو ہے کہ وہ گھر کہاں ہوگا۔ بس تصدیق کرنی ہے۔"
اس کے ذہن میں اگر کوئی غلط فہمی تھی تو میری بات سے رفع ہوگئی۔ اس کی صورت پر بے بسی کے آثار مزید واضح ہوگئے۔ اس نے اندر کی جانب منہ کر کے کہا "میں ابھی آتا ہوں۔"
اس کی زوجہ جو غالباً کان لگائے تمام گفتگو سُن رہی تھی، چلّانے لگی "نہ جاؤ جی ان کے ساتھ۔ پتا نہیں کون ہیں یہ۔"
اس نے ڈانٹ کے کہا "چپ کر کُتّے کی اولاد۔ ابھی جگائے گی سارے محلّے کو۔ خبردار جو حلق سے آواز نکالی۔"
خالص شوہرانہ انداز میں بیوی کے احتجاجی مظاہرے پر قدغن لگا کے وہ ہمارے ساتھ چل پڑا۔ اس وقت تک گلی کے نکڑ پر جان بنانے والے ڈکار لے کر جا چکے تھے۔ حلوائی صاحب کڑھائی کی کھرچن نوش فرما رہے تھے جو ان کے نزدیک ملائی تھی۔ اس نے ڈرائیور کی طرف دیکھ کے خوش دلی سے کہا "او خیر ہووے صوفی" اور صوفی نے جواب میں بے تکلفی سے اسے مشورہ دیا کہ وہ کھرچ کھرچ کر کڑھاؤ نہ کھائے، توڑ کے کھا جائے۔
"سچا آدمی اچھا ہمسایہ ہے" غالب نے کہا۔
ٹیکسی میں بیٹھنے کے بعد سچا آدمی پریشان نظر آنے لگا "دیکھو جی۔ میں دس ہزار واپس کر دوں گا۔ اگر آپ کہو گے۔"
"ہم تو چاہتے ہیں تم مزید دس ہزار وصول کرو۔ دس ہزار بہت کم دیے تھے انہوں نے۔" غالب بولا۔
"اچھا جی۔ کم دیے تھے!"
"اور کیا۔ تمہاری جگہ میں ہوتا تو ایک لاکھ مانگتا۔ پچیس ہزار مل جاتے مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا۔" میں نے کہا۔
وہ سوچتا رہا 'کیا پتا وہ دے ہی دیں' یہ تو انہوں نے دیے اور میں نے رکھ لیے۔
تقریباً پندرہ منٹ تک ٹیکسی چلتی رہی۔ ایمبولینس ڈرائیور مسلسل "سیدھے کھبے" کی ہدایات دیتا رہا۔ بالآخر ایک جگہ اس نے کہا "یہاں روک لو۔"
میں نے ریوالور کو فلمی اسٹائل میں اُچھال کے دوبارہ پکڑنے کی کوشش کی مگر اس مرتبہ ناکام رہا۔ تاہم میں نے اپنی متانت میں فرق نہیں آنے دیا اور نیچے سے ریوالور اٹھا کے کہا "کون سا مکان ہے؟"
اس نے کہا "وہ تیسرا... جس کی باری کُھلی ہوئی ہے۔"
میں نے کہا "اچھا، اب تم جاؤ۔ گھر جا کے دعا کرو کہ ہم سے پھر ملاقات نہ ہو۔"
غالب نے کہا "یہ سچا آدمی ہے۔ اچھا آدمی ہے اور کچا آدمی ہے۔ یہ ایک جھانپڑ میں ٹوٹ سکتا ہے۔ صبح دس بج کر دس منٹ پر میں اس کو پیار سے چپت لگاؤں گا، ایسے۔"
وہ سخت نروس تھا۔ کوئی سوال کیے بغیر اُترا اور چل پڑا۔ اس کی خواہش تھی کہ ہمارے کُھلی باری (کھڑکی) والے مکان تک پہنچنے سے پہلے وہ اس گلی سے نکل جائے۔
"یہاں بھی وہی ڈراما چلے گا" غالب نے کہا۔
میں نے کہا "اگر ضروری ہوا۔ کوئی ویسے ہی نکل آیا تو جھوٹ نہیں بولیں گے کہ ہمیں چوہدری صاحب نے بھیجا ہے۔"
"سچ کہہ دیں گے کہ ہمیں شامتِ اعمال نے بھیجا ہے۔"
غالب نے کُھلی کھڑکی سے ہٹ کے دروازے پر دستک دی اور

پھر غیرارادی طور پر اندر جھانکنے لگا۔ میں نے اسے شرمندہ کیا تو اس نے دانت نکال کے نفی میں سرہلایا جس کا مطلب تھا کہ اندر کوئی قابلِ دید منظر نہیں۔ دوبارہ کنڈی ہلانے پر کوئی بولا "اچھا اچھا۔ چھری تلے سانس لو۔" یہ بات پنجابی میں کہی گئی تھی جس کا مطلب تھا کہ ذرا دم تو لو۔ لہجہ کسی آدم بیزار بوڑھے کا تھا اور تہمد میں جو شخص برآمد ہوا وہ واقعی آدمی دنیا سے بیزار لگتا تھا۔ باقی آدمی دنیا اس سے بیزار ہوگی۔

"تم... تم کون ہو؟ میں سمجھا وہ حرامی آگیا۔"

میں نے اور غالب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا "ہم حقیقتاً اس تعریف کے مستحق نہیں تھے۔ اس کی مراد غالباً کسی دیر آید درست آید فرزند سے ہوگی۔ شخصِ مذکورہ اچانک آگیا اور اس نے ثابت بھی کردیا کہ وہ اسمِ بامسمیٰ ہے۔"

"ابا۔ یہ کون ہیں؟" اس نے ہمیں گھور کے دیکھا۔

ابا نے اپنی جان چھڑائی "تو خود ہی پوچھ لے۔ آجاتے ہیں نیند حرام کرنے‘ پتا نہیں کہاں کہاں سے؟"

وہ دبلا پتلا مگر تیز طرار نوجوان تھا۔ اس کی گلے میں لال ریشمی رومال تھا اور اس کے ہونٹ بھی پان سے لال تھے۔ دیر سے گھر لوٹنے والے تماش بینوں کی طرح اس نے ایک کلائی پر موتیے کی کلیوں کا ہار بھی لپیٹ رکھا تھا۔

اس نے بلاوجہ اکڑ کے پوچھا "کیا بات ہے؟" حالانکہ یہی بات وہ شریفانہ لہجے میں بھی کرسکتا تھا مگر وہ تھا حرامی۔ بقول والد۔

میں نے کہا "دروازے پر شور کروگے تو محلّہ اکٹھا ہوجائے گا۔"

غالب نے کہا "ہم بدمعاش ہیں۔ مارپیٹ گالی گلوچ سب کرسکتے ہیں۔"

میں نے کہا "اور ڈزاڈز بھی۔"

تیسری بار ریوالور کو گھما کے اُچھالنے اور پکڑنے کا مظاہرہ کامیاب رہا اور اس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ وہ فوراً ہمیں اشارے سے دور لے گیا "حکم کرو موتیاں والیو۔" اس کا لہجہ اب ریشم کی طرح ملائم تھا۔

میں نے کہا "تمہارے گھر میں کوئی میت ہوئی تھی؟ آج کل میں؟"

وہ بھونچکا رہ گیا۔ میرا تیر نشانے پر لگا تھا "میری دادی فوت ہوئی تھی لیکن وہ تو بہت بڈھی اور بیمار تھی۔"

غالب نے اسے ٹٹولا "تم نوجوان اور ہٹے کٹے ہو۔"

وہ ڈر گیا "کیا مطلب؟"

میں نے کہا "کچھ نہیں۔ جوان اور صحت مند لوگ بھی فوت ہوجاتے ہیں۔"

"دادی کو کہاں گاڑا اور کب؟" غالب نے کہا "ہمیں ان کی قبر پر لے چلو۔"

"اس وقت!" وہ ہکلا کے بولا "کرشن نگر کے پیچھے قبرستان ہے۔"

"ہم فاتحہ پڑھنے آئے تھے۔" میں نے کہا "فاتحہ پڑھ کے جائیں گے۔" غالب نے کہا "تمہاری دادی میری دادی۔"

میں نے کہا "میری تو دادی بھی نہیں تھی۔ صرف دادا تھا۔ بمبئی میں اس کے نام سے سب اسی طرح تھر تھر کانپتے تھے جیسے تم کانپ رہے ہو۔ موتیاں والیو۔"

"آخر... کون ہو تم لوگ۔ کیا چاہتے ہو؟"

میں نے اسے ٹیکسی کی طرف دھکیلا۔ "ہمارے ساتھ چل کے بتاؤ کہ دادی کی قبر کون سی ہے۔ خاموشی سے چلوگے یا شور مچاتے ہوئے۔"

"تم... مجھے قتل کردوگے... وہاں لے جاکے؟" وہ چلّانے لگا تھا کہ میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھا اور اسے ٹیکسی میں کھینچ لیا۔ غالب نے دروازہ پہلے ہی کھول دیا تھا۔ شوقین مزاج نوجوان نے واجبی سی مزاحمت کی اور زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑایا مگر میری گرفت سے اس نے اپنی کوشش کے رائگاں جانے کا یقین کرلیا۔ اس نے ٹانگیں چلانی بند کردیں۔

ٹیکسی روانہ ہوئی تو میں نے اسے چھوڑ دیا۔ اس نے سب سے پہلے لال ریشمی رومال کو گلے سے الگ کیا جس کی وجہ سے اس کا دم گھٹنے کی نوبت آگئی تھی۔ موتیے کی کلیاں تو پہلے ہی بکھر چکی تھیں۔

میں نے کہا "تمہاری دادی کا انتقال اسپتال میں ہوا تھا نا؟"

اس نے لمبے لمبے سانس لے کر کہا "ہاں... تم ہی ہو نا؟"

میں نے کہا "نہیں۔ ہم وہ نہیں ہیں۔ آج کس کے کوٹھے پر گئے تھے؟"

"نگینہ بائی..." اس نے کہا "امرتسر والی نہیں... دوسری..."

"روز جاتے ہو؟ مال کہاں سے لاتے ہو؟" میں نے کہا۔

وہ پریشان ہوگیا "کاروبار کرتا ہوں‘ اپنا۔"

غالب نے کہا "کاروبار کی وضاحت کرو۔ شکل سے تم کھاد فروش بھی نہیں لگتے۔ شوق رئیسوں والے ہیں۔ لاشیں تو نہیں بیچتے؟"

"لاشیں... کیسی بات کرتے ہو جی..."

میں نے ایک دم اس کو الٹے ہاتھ کا چانٹا مارا۔ "شروع سے بتاؤ کہ تم نے اپنی دادی کی لاش کا سودا کتنے میں کیا تھا؟ اس کے بدلے کس کی لاش دفنائی گئی تھی اور کیسے؟"

وہ بھوں بھوں کرکے رونے لگا۔

غالب نے کہا "تمہاری دادی کی لاش شاید اس وقت بھی مُردہ خانے میں ہے۔ سردخانے میں محفوظ پڑی ہوگی۔ دیکھوگے؟"

اس نے نفی میں سرہلایا "آپ پولیس والے ہو؟ خدا کے لیے مجھے معاف کردو۔ میں پاگل ہوگیا تھا۔ نگینہ بائی کے عشق میں..."

"نگینہ بائی کے بچے۔ اپنی دادی کی لاش بیچ دی تو نے۔ یہ عشق ہے تیرا۔ ٹھیک کہا تھا تیرے باپ نے کہ تُو حرامی ہے۔" میں نے اس کے بال پکڑ کے سر کو کئی بار سامنے مارا "کتنے پیسے ملے تھے؟"

"دس... دس ہزار۔ مجھے نہیں معلوم وہ کون لوگ تھے۔ انہوں نے کہا کہ یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ تمہاری دادی کو مرنا ہی تھا۔ اتنی بوڑھی تھی وہ اور تین ہفتے سے اسپتال میں پڑی تھی۔ اب تو کوئی گھروالا بھی اسے دیکھنے تک نہیں جاتا تھا۔ اس کی لاش ہمیں دے دو۔ ہم دوسری لاش دیں گے۔ اسے دفنادو۔ میں نے سوچے سمجھے بغیر ہاں کردی۔ بعد میں بڑی مشکل پڑی مجھے۔ میں اسپتال سے لاش لایا اور اسے گھر میں پلنگ کے نیچے رکھ دیا۔"

"گھر میں کسی کو نہیں بتایا؟"

"نہیں۔ گھر میں کون ہے۔ سوائے ابا کے۔ اسے بھی ٹھیک نظر نہیں آتا۔ آنکھوں میں موتیا ہے۔ ماں پہلے ہی مرگئی تھی۔ ایک بہن کراچی میں ہے۔ وہ کبھی آتی نہیں۔ بس میں رہتا ہوں یہاں۔"

"اس انتظار میں کہ ابا بھی جائے تو مکان تمہارا ہو اور تم اسے بیچ کے نگینہ بائی پر نچھاور کردو۔ تمہارا باپ بھی کتنا بدنصیب ہے۔ جس ماں کے قدموں میں جنت تھی۔ اس کو وہ مرنے کے لیے اسپتال میں پھینک آیا تھا۔ بیٹے نے پلٹ کے خبر نہیں لی تو پوتا کیوں لیتا۔ اب خود اس کی باری آنے والی ہے جب کوئی اسے پوچھنے والا نہیں ہوگا۔ جیسے ماں کے مرنے پر اس نے سکون کا سانس لیا ہوگا ایسے ہی تم اس کو گاڑ کرلوگے۔"

وہ چپ چاپ سُنتا رہا۔ آدمی کی کمینگی اور خود غرضی کا یہ نقشہ اتنا عبرت ناک تھا کہ میں تصور نہیں کرسکتا تھا۔

غالب نے کہا "باقی بات بھی ختم کرو۔ پھر کیا ہوا؟"

"جب لاش بدل گئی۔ کوئی ایمبولینس ڈرائیور آیا تھا... وہ لے گیا تو میں نے باپ سے کہا کہ دادی کی لاش آگئی ہے۔ اس نے کہا "اچھا‘ کفن دفن کا انتظام کر۔ اور محلّے والوں کو بتادے۔"

"وہ رویا نہیں؟"

"بعد میں رودیا تھا۔ اس وقت تو چپ بیٹھا رہا۔ میں نے فٹافٹ کفن لاکے خود ہی پہنادیا اور اس کے بعد محلّے والوں کو اطلاع دی۔ عورتیں ہمارے گھر میں آتی جاتی نہیں تھیں مگر ڈر تھا کہ میت نہلانے نہ آجائیں۔"

"صورت دیکھنے تو آسکتی تھیں!"

"ہاں۔ میں نے جنازہ گاڑی میں رکھ دیا تھا۔ جو لوگ آتے ان سے کہا کہ سب انتظام اسپتال میں ہی ہوگیا تھا۔ یہاں کون کرتا۔ خیراتی ادارے نے نہلا دُھلا کے کفن دے دیا۔ محلّے کے دوچار لوگ ساتھ ہوگئے۔ سب نامحرم تھے اس لیے قبرستان میں بھی مسئلہ پیدا نہیں ہوا۔ شک کسی کو کیسے ہوسکتا تھا۔ سب ہی جانتے تھے کہ دادی تین مہینے سے اسپتال میں مررہی ہے مگر مرنے کا نام نہیں لیتی۔ دو گھنٹے میں مٹی ڈال کے لوٹ آئے۔"

باقی راستہ وہ خاموش رہا۔ رات کے دو بجے ہم قبرستان میں تھے۔ اس کا مین گیٹ آگے تھا۔ اندر جانے کے لیے راستے بہت تھے۔ جہاں سے بھی کسی نے چاہا تھا دیوار گرا کے ایک شارٹ کٹ نکال لیا تھا۔ آدھی رات کے بعد نہ قانونی طور پر تدفین کی اجازت ہوتی ہے اور نہ کوئی فاتحہ خوانی کے لیے آتا ہے۔ خود گورکن اسی شہرِ خموشاں کے کسی حصے میں اپنے کچے مکان میں سو رہا ہوگا۔

لوگ کہتے ہیں کہ گورکن بہت کماتے ہیں اور مُردوں کے کاروبار میں بھی بہت ہیرا پھیری ہے۔ ممکن ہے ہو مگر میں نے آج تک کسی گورکن کو خوشحال یا صاف ستھرا نہیں دیکھا تھا۔ ان کے چہروں پر طمانیت اور خوشی نہیں دیکھی تھی۔ ان کے گھر بھی ایسے تھے کہ شاید مرنے کے بعد انہیں بہت کم فرق کا احساس ہوتا ہوگا۔ پہلے زمین کے اوپر قدرے کشادہ کچی کوٹھری تھی۔ بعد میں زمین کے نیچے کچھ کم جگہ میں لیٹ گئے۔ زندگی تو اس مٹی کو کھودتے‘ بھرتے برابر کرتے اور مٹی کو مٹی میں ملتا دیکھتے ہی گزرتی ہے۔

ہم بہت سی پختہ‘ نیم پختہ‘ شکستہ اور دھنسی ہوئی قبروں سے بچتے بچاتے‘ انہیں پھلانگتے اور بعض اوقات ان پر انجانے میں جوتوں سمیت یوں قدم جما کے گزرے کہ شاید مُردہ بول سکتا تو کہتا کہ بھائی صاحب‘ آپ تو سر پر چڑھ گئے‘ یا مہذب شاعرانہ مزاج کا مالک ہوتا تو کہتا۔

اِک ذرا آپ کو زحمت ہوگی
آپ کے پاؤں کے نیچے دل ہے

قبرستان میں خوف اور دہشت کے بجائے اس قسم کے خیالات میرے لیے باعثِ ندامت تھے۔ قبرستان تو‘ جائے عبرت سرائے فانی ہے۔

بالآخر وہ ایک قبر کے پاس رک گیا اور اِدھراُدھر دیکھ کے بولا "یہی قبر ہے۔"

اندھیرے میں بھی قبر کے اوپر گلاب کے پھول نظر آرہے تھے اور میں نم آلود مٹی کی مہک کو محسوس کرسکتا تھا۔ میرے دل کی کیفیت بڑی عجیب ہوگئی تھی۔ یہ تصور کرنا ایک دل گداز تجربہ تھا کہ مٹی کے اس ڈھیر کے نیچے وہی خوش باش خوش ادا اور خوش شکل شیلی سفید لٹھے کے کفن میں شکستہ گردن اور پاش پاش سر کے ساتھ یومِ حشر کا انتظار کررہی ہے جب بالآخر وہ دنیا میں لمبے ہاتھ رکھنے والوں کے دامن پکڑ سکے گی اور داورِ محشر سے انصاف طلب ہوگی۔ "ہاں یار۔ وہاں تو دھاندلی نہیں چلے گی نا..." میرے کانوں میں اس کی آواز گونجی۔ "دیکھو کیسے دلاور نے مجھے دھوکا دیا۔ یہاں بُلا کے اپنے فریب کے جال میں گرفتار کرلیا اور پھر بلیک میل کیا۔ سوری یار‘ میں تم کو سب نہ بتاسکی جو میں بتانا چاہتی تھی۔"

غالب میرے جذبات سے آگاہ تھا۔ اس نے کہا "چلو یار چلیں۔"

"میرا دکھ دوچند ہو گیا ہے یار۔ یہاں آ کے" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "ہم صرف فاتحہ پڑھنے آئے تھے۔ چلو فاتحہ پڑھیں۔"

رات کے سوا دو بجے ہم نے اس عورت کے لیے فاتحہ پڑھی جسے لندن سے یہاں تک قضا کھینچ لائی تھی۔ اس نے کیا سوچا تھا اور کیا ہو گیا۔ وہ ایک نیورو فزیشین تھی۔ وطن لوٹ کے اپنے باپ کی خواہش کے مطابق ان کے دکھ دور کرنا چاہتی تھی جو بے استطاعت تھے۔ دھوکا تقدیر نے دیا اور اسے لالچ کے اندھے کنویں میں دھکیل دیا۔

ہم دل گرفتہ واپس ہوئے۔ مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے۔ "کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ کیا ابھی رسوائی کا کچھ اور تماشا باقی ہے یار۔" شیلی کی صدا کسی بازگشت کی طرح آئی۔

نگینہ بائی کے عاشق زار سے کچھ کہنا بے سود تھا۔ جب آدمی رشتوں کے احترام سے اس حد تک بے گانہ ہو جائے تو وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ آخر اس دنیا میں وہ بے غیرت بھی تو جیتے ہیں جو خود اپنی ماں بہن یا بیٹی کی عزت کا سودا کرتے ہیں۔

یہ طے کرنا مشکل تھا کہ زیادہ بدنصیب کون تھا۔ وہ بوڑھی عورت جو تمام عمر خدمت کرتی رہی۔ پہلے باپ کی' پھر شوہر کی پھر اپنے بچوں کی۔ سب کے ناز اٹھاتی رہی اور سب کے دکھ سمیٹتی رہی۔ شوہر تو خیر مجازی خدا تھا۔ وہ پاؤں کی جوتی بنا کے بھی رکھے تو صابر عورت زبان پر شکوہ نہیں لاتی مگر تمام عمر قربانیاں دے کر اور ہر ستم برداشت کر کے وہ ایک جنت کے خواب ضرور دیکھتی ہے۔ جو صرف اس کے قدموں کے نیچے ہوتی ہے لیکن اولاد اس جنت کو بھی جہنم بنا دے۔ اس عورت سے زیادہ بدقسمت کون ہے؟

اس بڑھیا کی لاش سے دس ہزار میں قبر تک چھین لی گئی تھی اور اب اس کی لاش' بیٹا بیٹی اور پوتے نواسے ہونے کے باوجود لاوارث پڑی تھی۔ شیلی کو اپنوں کے ہاتھوں نہ سہی غیروں نے مٹی دے دی تھی مگر اسے کسی اور کی قبر میں جگہ ملی تھی۔

باہر آتے ہی میں نے نگینہ بائی کے عاشق سے کہا "خدا کرے تمہیں اور تمہارے باپ کو بھی قبر نصیب نہ ہو۔ تمہارا کیا تمہارے آگے آئے۔"

غالب نے کہا "اگر تم نے کسی سے اس ملاقات کا ذکر کیا تو کسی روز ہم تمہاری موت بن کے آ جائیں گے۔ تمہیں گاڑ جائیں گے یہاں۔"

میں نے کہا "اور نگینہ بائی کا مجرا دیکھنے چلے جائیں گے۔ ذرا اِدھر آؤ۔"

وہ ڈرتے ڈرتے آگے بڑھا "کیا... کیا بات ہے؟"

"اب کتنا مال ہے جیب میں؟" میں نے اس کی تلاشی لی اور ہر جیب خالی کر دی۔ اس کے پاس اب بھی پانچ چھ ہزار روپے موجود تھے۔ غالب نے مجھے ٹیکسی کے گلوز کمپارٹمنٹ میں سے ماچس نکال کے دی اور میں نے نوٹ ڈھیر کی صورت میں زمین پر رکھ دیے۔ وہ سمجھ گیا کہ میں کیا کرنے والا ہوں۔ وہ دیوانہ وار میری طرف لپکا۔ میں نے اس کے ایک لات ماری۔ وہ دس گز دور جا کے گرا۔ میں نے نوٹوں کو آگ لگا دی۔ وہ پھر اٹھ کے آیا۔ میں نے اسے رائٹ پنچ مارا اور وہ ایسا گرا کہ پھر نہ اٹھا۔

میں نے ہاتھ جھاڑ کے کہا "چلو مرزا جی۔ آج کا کام ختم۔"

غالب نے ٹیکسی اسٹارٹ کی تو وہ پھر اُٹھا۔ اس امید میں کہ ہم اسے بھی ساتھ لے جائیں گے مگر ہم نے پلٹ کے نہیں دیکھا۔

غالب نے کہا "پہنچ جائے گا صبح تک حرامی۔"

میں نے کہا "مرزا جی۔ تم نے قبر دیکھ لی تھی نا۔ یاد رہے گی؟"

"ہاں۔ دائیں بائیں پکی قبروں پر کتبے تھے۔ وہ یاد ہیں۔"

میں نے کہا "پرانے مصری لاشوں کو محفوظ کرتے تھے ہزاروں سال بعد بھی وہ اسی حالت میں برآمد ہوئی ہیں۔ یہ فن آج بھی زندہ ہے۔ لینن کا جسم اصلی حالت میں موجود ہے۔ غالباً ماسکو کے ریڈ اسکوائر میں۔"

"یہ فن TAXIDEEMI کہلاتا ہے۔ شیروں کے اور بارہ سنگھوں کے سر۔ نیولے وغیرہ آج بھی حنوط کیے جاتے ہیں۔"

غالب میری بات کا مطلب سمجھ گیا "شاید شیلی کی لاش کو محفوظ نہ کیا جا سکے۔ حنوط کرنے یا کچھ عرصہ محفوظ حالت میں رکھنے والے فوراً ہی اپنا کام شروع کر دیتے ہوں گے۔ جسم کے ڈی کمپوز ہونے کا عمل تو سانس کی آمد و رفت رکتے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ شیلی کو مر کے چوبیس گھنٹے تو اسپتال میں ہی گزر گئے تھے۔ بے شک وہ کولڈ اسٹوریج میں تھی مگر اب تو دفن ہوئے بھی کتنے گھنٹے ہو گئے۔"

"پھر اپنے چوہدری صاحب کو کیسے قائل کریں گے ہم؟" میں نے کہا۔

"منظر سے مشورہ کرتے ہیں پھر کچھ سوچیں گے" غالب نے کہا۔

ٹیکسی ڈرائیور تھانے کی حوالات میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ اٹھ کے آگے آیا اور سلاخیں پکڑ کے کھڑا ہو گیا۔

"سر جی۔ میری توبہ۔ میرے باپ کی توبہ۔"

غالب نے کہا "تمہاری ٹیکسی اچھی ہے۔ بریک ٹھیک کرا لینا۔"

"مجھے باہر تو نکالیں۔ میں اپنا دماغ بھی ٹھیک کرا لوں گا۔ اس کی بریک بھی خراب ہے" وہ بولا۔

جب اسے رہائی مل گئی تو میں نے اسے سو کا نوٹ پیش کیا "کرائے کی اصل رقم سے دُگنی رقم ضرور ہے۔"

غالب نے کہا "ایک روپیہ واپس کرو اور جاؤ۔"

اس نے حیرانی سے ہمیں دیکھا۔ خاموشی سے ایک روپیہ نکال کے دیا اور بھاگ گیا۔ آخری وقت تک اسے یقین نہیں تھا کہ ہم اس کو سو کا نوٹ دے کر واپس نہیں لیں گے۔ ہم نے پاپڑ جیسے سخت تھانیدار کا شکریہ ادا کیا جو ململ کی طرح ملائم ہو چکا تھا۔

اس نے مونچھیں ہلا کے کہا "آپ... آپ کو دیکھا ہے پہلے بھی۔"

میں نے کہا "آئندہ نہیں دیکھو گے۔ دیکھ لو آج ہم کو جی بھر کے۔"

وہ مسکرایا تو اس کی مونچھیں اوپر کی طرف اٹھ گئیں۔ مجھ سے غیر ارادی غلطی ہو گئی تھی اور تھانے دار کی یادداشت بروقت کام نہیں آئی ورنہ وہ مجھے گلے لگا لیتا اور جانے نہ دیتا۔ بات پھر سچ ہو جاتی کہ دوسروں کے لیے گڑھا کھودنے والا خود ہی اس میں گرتا ہے۔ ہم نے ایک ٹیکسی ڈرائیور کو دھونس سے تھانے میں بند کرا دیا تھا اور اس کی ٹیکسی لے گئے تھے۔

واپسی کے لیے کوئی سواری دستیاب نہ تھی۔ ہم نے پیدل چلنا شروع کیا۔ رات بڑی پرسکون تھی مگر میرے دل میں سناٹا تھا۔ شیلی کا ہنستا مسکراتا چہرہ باربار سامنے آ جاتا تھا۔ ایک مصرعہ یاد آیا۔ خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں۔ اسپتال کے سرد خانے میں ایک بڑھیا کی لاش رکھی ہوئی ہے جس کی تدفین کے اہالیانِ محلہ گواہ ہیں۔ اس کا اپنا بیٹا مطمئن سو رہا ہے کہ چلو اماں بھی چین سے قبر میں جا کے سو گئی۔ بڑھیا کی خاموشی پکار رہی ہے۔ اے بیٹا' اے بیٹا' دیکھ تو ذرا بدمعاشی' کیسی دھاندلی ہے۔ ارے میری قبر میں وہ بے حیا گھس گئی ہے۔ وہی جو لندن سے آئی تھی۔ ہر ایک کو یا یار کہتی تھی۔ ارے کوئی نکالو اسے۔ مجھے میری قبر چاہیے۔

غالب بھی خاموش تھا اور ہم ساتھ چلتے ہوئے اپنے اپنے خیالوں کے گرداب میں گھوم رہے تھے۔ ہماری خاموشی ہمکلام تھی کیونکہ خیالوں کا محور و مرکز ایک تھا اور سوال جواب ایک تھے۔

صبح چار بجے کے قریب' پہلے میں دروازے کے اوپر سے کودا۔ پھر غالب' ہم دبے پاؤں آگے بڑھے۔ ہمیں یقین تھا کہ دروازہ ایسے ہی کھلا ہوا تھا جیسا ہم چھوڑ گئے تھے چنانچہ واپس اپنے کمرے میں اُتر کے سو جانا کوئی مشکل نہیں تھا۔ ترپ صاحب جو دربان کے فرائض ادا فرمانے پر مصر تھے باقاعدہ خراٹے لے رہے تھے۔

ہم اندر پہنچے ہی تھے کہ ایک دم لائٹ جل گئی۔ ہم ایک دم رک گئے۔ ہمارے سامنے رابعہ اور نازو ایک جیسے جارحانہ تیور اور پوز میں کھڑی تھیں۔

"کہاں سے تشریف لا رہی ہے سواری؟" نازو نے کہا۔

غالب نے دانتوں کی نمائش کی "ذرا چوک تک پان کھانے گئے تھے۔"

نازو نے غرا کے کہا "دانت تو دودھ کی طرح چمک رہے ہیں۔ ہونٹوں پر لپ اسٹک ہی لگا لیتے کہ لال نظر آتے۔"

غالب نے میری طرف دیکھا "کس قدر غیر منطقی اندازِ گفتگو ہے ان جاہل نظر آنے والی خاتون کا۔ بابا یہ میں نے کب کہا ہے کہ ہم نے پان کھایا بھی ہے۔ پان کھانے گئے تھے۔"

میں نے کہا "ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے۔ یہ غالب نے کہا تھا۔"

"جھوٹ۔ میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی اور ڈوبیں میرے دشمن۔" غالب نے کہا "ویسے خفگی کی کون سی بات ہے اس میں۔ تمہیں پان کھانا ہے تو بتا دو۔ میں آگے سے لے آتا ہوں دوڑ کر۔ یہاں تو ختم ہو گئے تھے۔"

رابعہ بولی "غالب۔ سچ بتاؤ' کہاں گئے تھے؟"

"حد ہو گئی۔ تم بھی مجھے ہی ڈانٹ رہی ہو۔ اسے ڈانٹو ہمت ہے تو۔ یہ مجھے بھی ورغلا کے لے گیا تھا۔"

میں نے کہا "غالب۔ وہ نگینہ بائی والی بات مت بتانا۔"

"یار میں کوئی بے وقوف ہوں" غالب نے منہ پھاڑ کے جماہی اور پھر انگڑائی لی۔ "ہائے۔ بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا۔"

رابعہ اور نازو نے بے یقینی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ "تم مجرا دیکھنے گئے تھے؟"

میں نے بے وقوفوں کی طرح کہا "مجرا؟ وہ کیا ہوتا ہے۔"

غالب نے کہا "یار' حجرہ کہہ رہی ہیں۔ جیسے سائیں پاپڑ والے کا اور کیکر شاہ کا حجرہ تھا۔ اپنا حجرہ تو نیچے ہے' چلو چلیں۔"

نازو نے چراغ پا ہو کے اس کا راستہ روک لیا "تم سیدھی طرح بتاؤ گے یا نہیں!"

"نہیں۔ میں ٹیڑھی طرح بتاؤں گا کیونکہ میں کُتے کی دُم ہوں۔ تم بے شک مجھے کسی نلکی میں ڈال کے چیک کر لو۔ میں سیدھا نہیں ہو سکتا۔"

میں نے تائید میں سر ہلایا "میں نے کوشش کی تھی۔ نلکی ٹیڑھی ہو گئی۔"

رابعہ نے مجھے گھورا "سکندر۔ بہت بری بات ہے۔ دو گھنٹے ہو گئے۔"

میں نے کہا "تین گھنٹے دس منٹ بیس سیکنڈ۔"

غالب نے کہا "یار وہ دو کہہ رہی ہیں۔ تم تین۔ چلو ڈھائی پر سودا کر لو۔ دیر ہو رہی ہے سونے میں۔ جھگڑا مت کرو۔"

نازو نے کہا "اب سونے کا خیال آ رہا ہے۔ صبح ہو رہی ہے۔"

غالب نے آہ بھری "صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے۔"

میں نے غلط مصرع جوڑا "یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟"

اگر ہم شرافت سے کہہ دیتے کہ بھئی صبح بات کریں گے تو شاید وہ مان جاتیں مگر اب ہم نے انہیں چڑا دیا تھا اور اب انہیں بھی ضد

ہوگئی تھی کہ ہمیں سونے نہیں دیں گی۔ بالآخر ہمیں ہی ہتھیار ڈالنے پڑے۔ تھکن اور نیند سے آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں چنانچہ ہم کچن میں چلے گئے جہاں چار افراد کے لیے ٹیبل تھی اور کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ چھوٹی ہونے کی وجہ سے خدمت میں اولیت کا بار نازو کو اٹھانا پڑتا تھا۔ وہ کافی بناتی رہی اور میں نے مختصراً بتادیا کہ مجھے کیا شک ہوا تھا اور تصدیق سے کیا ثابت ہوا۔

رابعہ نے کہا "اگر تم اس قسم کے خطرات مول لیتے رہے اور ایڈونچر کی خاطر کسی کو بتائے بغیر جاتے رہے تو کسی دن واپس نہیں آؤ گے۔"

"یہ تو بجا فرمایا آپ نے۔ ہم ابن بطوطہ کی طرح دنیا دیکھنے نکل جائیں گے اور واپسی پر سفرنامہ لکھ کے پیش کریں گے" غالب نے کہا۔

"سفرنامے کے قابلِ اعتراض حصے سنسر کرنے کے بعد" میں نے کہا۔

"وہ ایک پاکیزہ سفرنامہ ہوگا" غالب نے کہا "ابن بطوطہ کسی عورت کی طرف آنکھ اُٹھا کے نہیں دیکھے گا' جو پچاس سے اوپر ہو۔"

"اس سے کم تو لڑکیوں میں شمار ہوتی ہیں' آپ لوگوں کی طرح۔"

غالب نے کہا "چلو' یہ ہر سال بائیسویں سالگرہ کرتی ہیں۔ پچھلے چھبیس سال سے۔ یہ لڑکیاں ہی رہیں گی۔"

رابعہ اور نازو نے احتجاجی مظاہرہ نہیں کیا بلکہ سنی ان سنی کرتی رہیں۔ ہم خفیف ہو کے خاموش ہو گئے۔

رابعہ نے پوچھا "اب کیا تم لاش نکلواؤ گے؟"

میں نے کہا "کیسے نکلوائیں۔ کس عذر پر۔ اس کے لیے تو کورٹ کے آرڈر ضروری ہیں اور کورٹ آرڈر کے چکر میں پڑیں گے تو دلاور اینڈ کمپنی کو خبر مل جائے گی۔ وہ لاش کہیں اور دفنا دیں گے۔"

غالب نے کہا "یہ کارروائی تو اچانک اور خاموشی سے ہونی چاہیے۔"

رابعہ نے سرہلایا "یہ مشکل ہے۔ بلکہ ناممکن۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" میں نے کہا "قانون ہماری راہ میں حائل ہے۔ اس لیے ہمارے پاس غیر قانونی طریقہ اختیار کرنے کے سوا چارہ نہیں۔"

نازو نے کہا "کیا کرو گے تم۔ لاش نکال کے اسپتال لے جاؤ گے؟"

"تم اپنی طرح ہمیں بے وقوف کیوں سمجھتی ہو؟" غالب نے کہا۔

"میں بے وقوف ہوں؟"

"نہیں۔ تم بے وقوفی کی چیمپئن ہو۔ یہی وجہ ہے کہ [illegible] غنڈہ گردی اور مار دھاڑ سیکھی۔ لڑکیوں والے کوئی گُن نہیں میں۔ سینا پرونا' کاڑھنا۔ شرمانا لجانا' کچھ نہیں آتا تمہیں" [illegible] نے اسے باقاعدہ ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"یہ سب تم سیکھ لو نا۔" نازو نے کہا "عورتیں اب مردوں والے سب کام کر رہی ہیں تو مرد آخر عورتوں کے کام کیوں نہیں کرتے"

"اس لیے کہ وہ کوئی احمقانہ کام نہیں کرسکتے۔ ناقص العقل نہیں ہوتے۔"

میں نے انہیں ہاتھ اُٹھا کے خاموش کیا "یار ریکھو ہو رہی ہے۔"

"میں بھی مذاق نہیں کر رہا تھا" غالب بولا "خیر تم فرماؤ۔"

میں نے کہا "ہمیں کیا معلوم ہے۔ نمبر ون۔ چوہدری دلاور اور ڈاکٹر شیلا خان کا باپ ایک تھا۔ نمبر دو' وہ پشاور کے قریب کے کسی علاقے کا ایک کارپینٹر تھا جو پہلے' بیوی کو یہاں چھوڑ کر لندن بھاگ گیا اور پھر کسی وجہ سے لندن والی بیوی کو چھوڑ کر پاکستان چلا گیا۔ یا مارا گیا لیکن ہمیں اس سے سروکار نہیں۔ اہم چیز ہے ڈاکٹر شیلی کا دلاور سے رشتہ۔ نمبر تین لندن میں وہ لوگ ہیں جو شیلی کے خاندانی حالات کے گواہ ہیں۔ نمبر چار۔ لندن کی جیل میں ایک بے گناہ دُہرے قتل کی سزا کاٹ رہا ہے جو اس نے نہیں دلاور نے کیے تھے۔ ہم اس کا سراغ لگا سکتے ہیں اور وہ دلاور کو شناخت کر سکتا ہے۔ اس نے دلاور کو دیکھا تھا مگر وہ بچا کے فرار ہونے میں کامیاب رہا تھا۔ شیلی کی ماں کو مارنے کے بعد دلاور نے اسی نیگرو کی گرل فرینڈ کو شیلی سمجھ کے ختم کر دیا تھا۔ نمبر پانچ وہی ڈاکٹر شیلا خان جو دلاور کی سوتیلی بہن تھی پاکستان میں آئی اور عین اسی روز جب نقوی صاحب کا انتقال ہوا وہ قتل کر دی گئی۔"

"سرکاری ریکارڈ پر یہ ہے کہ اس نے نقوی صاحب کو قتل کیا اور پھر خودکشی کر لی۔"

"اس کی موت خودکشی تھی یا قتل تھا۔ یہ الگ مسئلہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ قتل کو دلاور کے کھاتے میں ڈالنا اور اسے ثابت کرنا عملی طور پر ناممکن ہوگا اس لیے ہم اس چکر میں پڑیں گے نہیں۔" میں نے کہا "اگر یہ ثبوت مل جائے کہ وہ ڈاکٹر شیلا تھی جس کی لاش بدل دی گئی۔ اس کی جگہ اسپتال میں ایک کی لاش موجود ہے اور پوسٹ مارٹم سے یہ تصدیق ہو جائے کہ قبر میں سے نکالی جانے والی لاش ڈاکٹر شیلا خان کی ہے۔ جس کے پاسپورٹ وغیرہ ہمارے پاس ہیں۔"

"فنگر پرنٹ تو شاید نہ ملیں" غالب نے سوچ کے کہا۔

"پوسٹ مارٹم کے لیے عدالتی احکامات حاصل کرنے میں کچھ وقت تو لگے گا۔"

"تصدیق کے دیگر سائنٹیفک طریقے ایجاد ہو چکے ہیں۔ آج کل فنگر پرنٹ سے زیادہ دانتوں کی ساخت سے ساری دنیا میں شناخت کی جاتی ہے۔ دانتوں کی ساخت کے اعتبار سے دنیا کے سب افراد ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ فنگر پرنٹ مٹ جاتے ہیں۔ میڈیکل DENTURE رپورٹ ہمیشہ دستیاب رہتی ہے۔ بعد میں ڈھانچا رہ جائے تب بھی۔"

"یہاں کسی نے پوسٹ مارٹم تک نہیں کیا۔ دانتوں کی ساخت کی رپورٹ کہاں ملے گی!"

"یہ رپورٹ لی جاسکتی ہے۔ ڈاکٹر شیلی خان کی پرسنل میڈیکل ہسٹری لندن میں محفوظ ہوگی۔ کرامویل اسپتال میں ہوگی۔ موازنے سے ناقابلِ تردید ثبوت حاصل ہو جائے گا کہ وہ ڈاکٹر شیلا خان ہی تھی۔"

"او کے۔ یہ ثابت ہوگیا' پھر؟"

"پھر اپنے چوہدری دلاور صاحب سے پوچھا جاسکتا ہے کہ وہ کیا اسباب تھے جن کی بنا پر انہوں نے ڈاکٹر شیلی کو شناخت نہیں کیا اور اس کے قانونی وارث کی حیثیت سے سامنے نہیں آئے۔"

"وہ کہے گا کہ مجھے کیا معلوم۔ وہ میری سوتیلی بہن تھی اور اس سے میرے مراسم ہی نہیں تھے۔ اس نے مجھے پاکستان پہنچنے کی کوئی اطلاع نہیں دی تھی اور یہاں بھی وہ ہوٹل میں ٹھہری۔ میرے دشمنوں نے اسے ورغلایا تھا یا وہ خود ان سے مل گئی تھی۔ وہ ثابت کردے گا کہ شیلی تو سکندر کے ساتھ فلاں فلاں جگہ دیکھی گئی اور اس کے ساتھ رہی تھی۔ مجھے میری بہن نے کچھ نہیں بتایا تو اور کون بتاتا؟ ظاہر ہے وہ خود ایسا نہیں چاہتی تھی ورنہ سیدھی میرے پاس آتی اور میرے گھر میں ٹھہرتی۔ تو یہ سب نہ ہوتا اس کے ساتھ۔"

"تمہارا اعتراض درست ہے" میں نے کہا "ہم مان لیں گے۔"

"وہ کہے گا کہ اسپتال میں کوئی لڑکی اوپر سے گر کے مرگئی تھی۔ یہ خبر کسی اخبار کی شہ سرخی نہیں تھی کہ میں ضرور دیکھتا۔ پتا نہیں شہر میں ہر روز ایسے ہی کتنے لوگ حادثات میں مر جاتے ہیں۔ ایسی غیر اہم خبریں کوئی بھی نہیں پڑھتا۔"

رابعہ نے کہا "الٹا وہ تم پر الزام عائد کر سکتا ہے کہ تم نے اس کی بہن کو ورغلایا۔ اسے اپنے ساتھ رکھا اور اسے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ وہ سوتیلے پن کے جذبات میں دشمنوں کی آلۂ کار بن گئی تھی۔ وہی لوگ اس کی موت کے ذمے دار ہیں۔"

میں نے کہا "اس الزام سے فرق نہیں پڑتا۔"

غالب نے کہا "فرض کرو وہ سوال کرے کہ تمہیں تو سب معلوم تھا۔"

"مجھ سے؟"

"میری مراد تھی ہمارے وکیل سے۔ جو اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کرے گا۔ وہ رابعہ قاری ہوں یا بھائی منظر۔ وہ پوچھ سکتا ہے کہ تمہارے مؤکل کو تو سب معلوم تھا۔ اس نے اسپتال والوں کو یہ بات کیوں نہیں بتائی۔ پولیس کو حقائق سے آگاہ کیوں نہیں کیا۔ غالب نے اخبار والوں کو کیوں نہیں بتایا؟"

رابعہ نے کہا "ہاں۔ وہ تو ہے ایک نمبر کا مکار اداکار۔ روئے گا یہ ثابت کرنے کے لیے کہ میں بڑا بدنصیب ہوں۔ مجھے معلوم ہو جاتا کہ وہ میری سوتیلی بہن تھی جو اسپتال میں مری تھی۔ حادثے' خودکشی یا قتل کے اسباب سے مجھے کیا۔ جو شیلی نے کیا وہ اس کی مرضی۔ اللہ اسے معاف کرے۔ میں تو سب سے پہلے وارث بن کے پہنچتا اور عزت و آبرو سے دفناتا۔"

غالب نے بھی سرہلایا۔ "ہاں۔ وہ کہے گا کہ مجھے تو علم ہوا نہیں پھر اس کی لاش لاوارث سمجھ کے غائب کردی گئی یا دفنادی گئی تو اس میں میرا کیا قصور؟"

"اور کچھ فرمانا ہے کسی کو؟" میں نے کہا۔

"ہم دخل اندازی فرمانے پر مجبور ہیں۔" عاشق علی تڑپ نے اندر آ کے کہا "کیونکہ وقفہ برائے ناشتا دوران گفت و شنید لازم ہے اور ہم زحمت برائے انخلا دینے کے لیے تشریف لائے تھے۔"

میں نے کہا "اچھا یار ہم چلے جاتے ہیں یہاں سے۔ تم بناؤ ناشتا۔"

"صبح صبح اتنی مشکل اردو ڈال دی کان میں" غالب نے کان میں انگلی ڈال۔ کے ہلائی "خالی پیٹ آدمی کو بدہضمی ہو جائے۔"

رابعہ کے بیڈ روم میں پہنچ کے میں نے اپنی بات پوری کی "میں چاہتا ہوں کہ ڈاکٹر شیلا خان کا چوہدری دلاور سے رشتہ ثابت ہو جائے اور وہ اسے تسلیم بھی کرلے۔ اس کے بعد سوال اٹھایا جائے گا کہ آخر اس کی سوتیلی بہن کے اور اس کے درمیان دشمنی کے اسباب کیا تھے؟ محض سوتیلے ہونے کا رشتہ یا کچھ اور...... اور اصل اسباب ہم بتائیں گے۔ چوہدری دلاور نے ڈاکٹر شیلی کی ماں یعنی اپنے باپ کی دوسری بیوی کو قتل کیا تھا۔ اس کا چشم دید گواہ اس عورت کا تیسرا شوہر ہے۔ وہ چوہدری دلاور کا یقیناً مشکور ہوتا اگر اس نے صرف ایک قتل کیا ہوتا لیکن دلاور نے تو اس کی گرل فرینڈ کو بھی شوٹ کر دیا تھا۔ ناکردہ گناہ کی سزا وہ کاٹ رہا ہے۔ وہ دلاور کو شناخت کر لے گا۔ یہاں کی بات اور ہے۔ دلاور برطانیہ کی جیل میں ایک دُہرے قتل کے چشم دید گواہ کو ختم نہیں کرا سکتا۔"

"بالکل ٹھیک۔ یہ چوہدری دلاور کا سب سے بڑا مسئلہ بن جائے گا کہ وہ خود کو کیسے بے گناہ ثابت کرے۔ یہاں تو بندہ لاہور

میں مارو اور خود کو اسی وقت کراچی میں موجود ثابت کردو مگر دلاور لندن میں تھا تو انکار نہیں کر سکے گا۔ سوال صرف یہ ہے کہ جرم ہوا لندن میں، مجرم ہے پاکستانی شہری۔ مقدمہ وہاں چلایا جا سکتا ہے۔ یہاں نہیں۔ جیسے یہاں سے کوئی قتل کر کے باہر نکل جاتا ہے واپس نہیں آتا۔ دلاور بھی لندن نہیں جائے گا۔"

میں نے کہا "برطانیہ اور پاکستان کے درمیان مجرموں کے تبادلے کا معاہدہ ضرور ہو گا۔"

"یہ بہت لمبی کارروائی ہے۔ کون ہو گا مدعی؟"

میں نے کہا "حکومتِ برطانیہ۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ڈاکٹر شیلا خان برطانوی شہری بھی تھی۔ پورا کیس ڈاکٹر شیلی کی تمام شناختی دستاویزات کے ساتھ ہائی کمشنر کو بھیجا جا سکتا ہے۔ برطانوی ہائی کمیشن خود باقی کارروائی کر لے گا۔ ان کے ایک شہری کی پراسرار موت اتنی معمولی بات نہیں کہ وہ نظرانداز کر دیں۔ نہ انہیں دلاور خرید سکتا ہے نہ دبا سکتا ہے اور نہ وہ یہاں کی پولیس کو خاطر میں لائیں گے۔"

غالب نے مجھ سے ہاتھ ملایا "ویری گڈ۔ سب سے آسان تو پھر یہی کام ہے کہ ہم یہ پاسپورٹ وغیرہ تمام تفصیلات، خدشات، امکانات اور حقائق کے ساتھ، اسے ارسال کر دیں۔"

"ہم یہی کریں گے۔ چوہدری دلاور کی پبلک لائف اس کیس میں تباہ ہو جائے گی لیکن سب سے پہلے ضروری ہے کہ ایک لاوارث لاش کے بارے میں ڈاکٹر شیلی ہونے کا تصدیق نامہ ملے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ لاش اس وقت تک محفوظ رہے جب تک عدالتی اجازت ملتی ہے اور سرکاری کارروائی ہوتی ہے۔"

"اسی لیے تم لاش محفوظ رکھنے کے سائنسی طریقوں پر غور فرما رہے تھے" غالب نے کہا۔

"ہاں، مگر مسئلہ ہے قانونی طریقِ کار کا۔ اس سے پہلے کہ عدالت قبر کھود کے لاش نکالنے کے احکامات صادر کرے اور ان پر عمل ہو۔ اصل مجرم لاش غائب کر دیں گے۔ ابھی کسی کو ہمارے عزائم کا علم نہیں چنانچہ پہل ہم کریں گے۔ آج ہی شیلی کی لاش کسی اور قبر میں منتقل کر دی جائے۔"

رابعہ اور نازو کی حالت غیر ہو گئی "یہ.... یہ کیسے ہو گا؟"

میں نے کہا "ہو جائے گا۔ تم فکر مت کرو۔"

"سکندر۔ اس چکر میں مت پڑو" رابعہ نے کہا۔

"میں دلاور کو چھوڑ دوں۔ یہی مطلب ہے نا تمہارا۔" میں نے برہمی سے کہا "مجھے اس سے بدلہ لینا ہے۔ اسے ذلیل کر کے کتے کی موت مارنا ہے مگر خود نہیں۔ میں بتا چکا ہوں کہ میں اسی دنیا میں اسی عدالتی نظام سے انصاف حاصل کر کے رہوں گا۔ میں اسے مجرم ثابت کر کے تختۂ دار تک پہنچاؤں گا۔ یہی میرا مقصدِ حیات ہے۔ ایسی صورت میں اس کے خلاف اتنی اہم شہادت کو میں کیسے ضائع کر دوں؟"

غالب نے کہا "رابعہ کی تشویش غلط نہیں۔ اسے تمہاری [illegible] ہے۔"

"میری فکر کا یہ مطلب نہیں کہ رابعہ یا تم میں سے کوئی میرے مقصد کی راہ میں حائل ہو" میں نے کہا۔

"آخر تم یہ کام کیسے کرو گے؟ تم پکڑے جاؤ گے۔"

"تم کر سکتے ہو تو تم کرو۔" میں نے کہا "کسی کو یہ کام بہرحال کرنا ہے۔"

غالب نے کہا "ٹھیک ہے۔ میں کروں گا یہ کام۔"

اب نازو پریشان ہو گئی "یہ جرم ہے، کہیں گڑبڑ ہو گئی تو؟"

"گڑبڑ نہیں ہو گی" غالب نے اسے تسلی دی "یہاں ناانصافی اور دھاندلی کیوں ہوتی ہے آخر۔ صرف اس لیے کہ جس کے پاس طاقت ہے وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ طاقت میں یا تو اثر رسوخ کام کرتا ہے۔ یا پیسہ اور یا بدمعاشی۔ ہمارے قومی کردار کے زوال کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ یہاں ہر شخص ذاتی مفاد کو مدِنظر رکھتا ہے۔ اس کے لیے پیسہ سب سے اہم ہے۔ کوئی اصول قاعدہ ضابطہ نہیں۔ ہم بھی مجبور ہیں کہ روم میں رہ کر ویسا ہی کریں جیسا کہ رومن کر رہے ہیں۔ میں پیسے کی طاقت سے کام لوں گا۔ میں گورکن کو یہ کام کرنے کی منہ مانگی قیمت ادا کروں گا۔ وہ پہلے سے قبر کھود کے رکھے گا اور میرے سامنے لاش منتقل کر دے گا۔ اصل قبر پھر اسی طرح نظر آئے گی۔"

"لیکن اسے کوئی اور زیادہ رقم کے لالچ میں نئی قبر کا سراغ بتانے پر مجبور کر سکتا ہے۔" نازو نے کہا۔

"کبھی تم غلطی سے عقل کی بات کرتی ہو تو میں سوچتا ہوں کہ اگر تمہارا منہ...."

"بکو مت۔" نازو کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔

"تمہارا منہ بھی اتنا ہی اچھا ہوتا" غالب نے اپنی بات گھما دی۔

رابعہ ہنسنے لگی "یہ منہ خراب ہے کیا؟ تمہیں پسند نہیں؟"

"کیوں خواہ مخواہ لڑاتی ہو ہمیں بی جمالو۔" غالب بولا "نازو کے منہ کو کوئی بُرا کہے تو میں ایسا منہ توڑ جواب دوں اسے۔ کہ کہنے والا اپنا سا منہ لے کر رہ جائے۔"

"فضول بولتے ہو تو سوچتے ہی نہیں۔" نازو نے کہا۔

"نہیں۔ یہ بات نہیں۔ سوچتا ہوں کہ آخر دنیا میں مجھ سے بھی زیادہ فضول بولنے والے ہیں" غالب نے کہا اور میری طرف دیکھا "پھر میں کیوں خاموش رہوں۔"

"تم نے نازو کی بات کا جواب نہیں دیا" میں نے کہا۔

"وہ لاجواب بات تھی۔ جواب اس کا یہ ہے کہ آگے گورکن کی مرضی۔ ہم اسے منہ مانگا معاوضہ ادا کریں گے ایک غلط کام، گناہ اور جرم کرانے کے لیے۔ تو یہ بھی اس پر واضح کر دیں گے کہ کچھ بولنے سے پہلے وہ اپنی قبر کھود لے۔ قطعی لاعلمی کا مظاہرہ اس کو بچا سکتا ہے۔ کوئی کچھ بھی پوچھے۔ تو کہے کہ مجھے کیا معلوم رات کو کیا ہوتا ہے۔ میں رات کو گھر میں سوتا ہوں مُردے بیچ کر۔"

میں نے کہا "ظاہر ہے گھوڑے بیچ کر تو ہارس ٹریڈنگ کرنے والا ہی سو سکتا ہے۔"

"دوسری بات یہ کہ فوری طور پر کچھ نہیں ہو گا۔ جب برطانوی ہائی کمشنر یا قونصلیٹ کا کوئی نمائندہ عدالت سے یا حکومتِ پاکستان سے رجوع کرے گا اور قانون مجبوراً حرکت میں آئے گا تو دلاور اینڈ کمپنی کو احساس ہو گا کہ یہ کام تو خراب ہو گیا۔ پھر وہ لاش ہٹانے کا سوچیں گے۔"

"یہ مفروضہ غلط بھی ہو سکتا ہے۔ کیا پتا وہ اس وقت یہی پلاننگ کر رہے ہوں۔ جیسے ہم کر رہے ہیں" میں نے کہا۔

"میں اوّلین فرصت میں یہ کام کرتا ہوں" غالب نے گھڑی دیکھی "ناشتے کے بعد چلا جاتا ہوں۔"

میں نے کہا "گورکن کا ایمان اگر تم خرید سکتے ہو تو کوئی اور زیادہ قیمت دے کر خرید سکتا ہے۔ تم اسے ذرا دھمکا کے خاموش رہنے پر مجبور کر سکتے ہو تو کوئی اور اس کی زبان کھلوا سکتا ہے۔ اور زبان بند رکھنا زیادہ مشکل کام ہے" میں نے کہا۔

"پھر تم بتاؤ کیا ہو سکتا ہے؟"

"ایک تو یہ کہ قبر خالی نہ چھوڑی جائے۔ اس قبر میں گورکن کسی اور کو ڈال دے۔ وہ تیار قبریں بھی رکھتے ہیں۔ شیلی کی موجودہ قبر کو کھلا رکھے اور آج بھی کوئی ضرورت مند آئے تو اس کو دے دے۔ اسے مالی فائدہ ہو گا۔ وہ قبر کھودنے کی محنت سے بچ جائے گا اور بعد میں کوئی اور پہنچا تو اسے قبر میں ایک لاش مل جائے گی۔"

"پھر وہی بات۔ اگر وہ لاش کسی مرد کی ہوئی تو؟"

"گورکن کہہ سکتا ہے کہ آپ نے جو قبر کھودنے کا کہا وہ میں نے کھود کے دکھا دی۔ اب سارا قبرستان تو نہیں کھود سکتا۔ آپ لوگ قبر بھول گئے ہوں گے۔ دوسرا کام یہ ہو سکتا ہے کہ اس میں وہ کسی عورت کی میت رکھ دے۔ بعد میں جب پوسٹ مارٹم وغیرہ کی رپورٹ مل جائے گی تو انہیں احساس ہو گا کہ وہ دھوکا کھا گئے۔"

غالب کا ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا "دیکھو یار۔ عدالت کوئی حکم جاری کرنے سے پہلے پوچھے گی نہیں کہ وہ کون سی قبر ہے اور حکم پر عمل درآمد میں کچھ وقت لگے گا۔ اس کے لیے پولیس کی ڈیوٹی لگتی ہے۔ ایک مجسٹریٹ موجود رہتا ہے اور میڈیکو لیگل آفیسر جو عموماً وہیں سب کچھ کرتا ہے۔ اس کے لیے قبرستان میں ٹینٹ بھی لگایا جاتا ہے اور گورکن یہ کام سب کی موجودگی میں کرتا ہے۔ جب قبر کی نشاندہی پہلے سے ہو جائے گی تو کیا انتظامات مکمل ہونے تک کرنے والے اپنا کام نہیں کر جائیں گے۔ قبر پر گارڈ کون بٹھائے گا۔"

"گارڈ بھی بٹھائی جا سکتی ہے۔ ہم خود بھی حفاظت کر سکتے ہیں اور یہ ممکن نہ ہو تو عدالت میں اپنے اندیشے کا اظہار کیا جا سکتا ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ نشاندہی مجسٹریٹ کے پہنچنے کے بعد کی جائے گی۔"

رابعہ نے نفی میں سر ہلایا "ایسے نہیں ہو گا۔ عدالت پہلے تدفین کرنے والوں کو یا گورکن کو طلب کرے گی۔ اس کا ریکارڈ دیکھے گی۔ گورکن کے پاس ایک رجسٹر ہوتا ہے جس میں مرنے والے کے سارے کوائف اس کے لواحقین درج کرتے ہیں۔ گورکن قبر کا تعین کرتا ہے۔ اس سے ایک طرح کی ضمانت حاصل ہو جاتی ہے کہ پوسٹ مارٹم کے لیے غلط قبر تو نہیں کھودی جائے گی۔ اصل قبر میں سے برآمد ہوگی غلط لاش۔ اس کے بعد کوئی کہے کہ یہ نہیں۔ وہ ہے نئی قبر۔ تو بڑا مسئلہ بن جائے گا۔ مجسٹریٹ یہ نہیں کہہ سکتا کہ اچھا، اب دوسری قبر کھود کے دیکھو۔"

نازو نے کہا "بس تو پھر یہ سب کچھ برطانوی ہائی کمیشن یا قونصلیٹ پر چھوڑ دیا جائے۔ انہیں بتا دیا جائے کہ قانونی پوزیشن کیا ہے اور اس میں کیا گھپلا ہو سکتا ہے۔ تمہیں کیا ضرورت ہے لاشوں کو اِدھر سے اُدھر کرنے کی۔ وہ خود شیلی کی قبر پر پہرا لگوا دیں گے اور ایک دو روز میں پوسٹ مارٹم کرانے کا تصدیق نامہ بھی حاصل کر لیں گے۔"

غالب نے کہا "ذرا اپنا منہ اِدھر کرو۔ میرے سامنے۔"

نازو چلّائی "غالب۔ ہوش میں رہو۔ سمجھے!"

"حد ہو گئی یار۔ میں نے کیا چومنے کی بات کی ہے؟ میں تو دیکھنا چاہتا تھا کہ جب تم عقلمندی کی بات کرتی ہو تو تمہارے چہرے پر کیسا نور ہوتا ہے۔"

رابعہ ہنسنے لگی "میں آج ہی۔ بلکہ ابھی یادداشت کا مضمون بنا کے ڈرافٹ کرتی ہوں۔ ٹائپ کرواتی ہوں۔ بار کونسل کا صدر اور سیکریٹری میرے ساتھ جانے پر تیار ہو جائیں گے۔ میں انہیں سب بتا دوں گی۔ ہم اسلام آباد جا کے ہائی کمیشن کو یہ میمورینڈم پیش کرتے ہیں اور اسے معاملے کی اونچ نیچ سے بھی آگاہ کر دیتے ہیں۔"

میں نے کہا "ویری گڈ۔ یہ سب شناختی دستاویزات بھی انہی کی تحویل میں دے دو۔ ٹریولر چیک وغیرہ سمیت۔ ان کے پاس محفوظ رہیں گے۔"

"ہم انہیں بتا دیں گے کہ کسی بھی مرحلے پر مجھے یا غالب کو عدالت گواہی کے لیے یا شناخت کے لیے طلب کر سکتی ہے۔ ہم بتا سکتے ہیں کہ وہ کب، کس ہوٹل میں اور کس کمرے میں تھی۔ اس کی موت کہاں اور کیسے ہوئی تھی۔ ہم تمام گواہوں کے نام بھی دے سکتے ہیں اور پتے بھی۔ ابھی ہم مختصراً حقائق بتا کے درخواست کریں گے کہ اس معاملے میں فوراً وزارتِ خارجہ کے ذریعے ایکشن لیا جائے اور حتی الامکان رازداری برتی جائے۔ دیر کی صورت میں سارا معاملہ چوپٹ ہو سکتا ہے۔"

"تمہارے واپس آنے تک ہم قبرستان میں اپنے حفاظتی انتظامات رکھیں گے" غالب نے کہا۔

"تم بندوق لے کر پہرا دو گے؟"

"پہرے دار مل جاتے ہیں۔ ایک نہیں چار محافظ رکھے جاسکتے ہیں جو چھپ کر نگرانی کرتے رہیں۔ ایک فوٹو گرافر کی خدمات حاصل کی جاسکتی ہیں جو ہر کارروائی کی تصویر کشی کرے۔ اس سے معلوم ہو جائے گا کہ مجرم کون تھے۔ لاش کو کس نے نکالا اور کہاں دفنا دیا۔ بعد میں عدالت کے روبرو سب پیش کیا جاسکتا ہے۔"

ناشتے کے بعد رابعہ نے منظر کو فون کیا کہ عدالت جاتے ہوئے اس کو اپنے ساتھ لے جائے۔ وہ راستے میں اسے پورے پلان کی تفصیلات بتا کے اس سے مشورہ چاہتی تھی۔ وہ اپنی گاڑی بھی غالب کے لیے چھوڑنا چاہتی تھی جسے بہت سے کام نمٹانے تھے۔

رابعہ کے پاس اپنے اکاؤنٹ میں بھی خاصی رقم تھی۔ جو ہم کسی بھی ضرورت میں استعمال کرسکتے تھے۔ مالی مسائل کے حل میں وقار یوسف اور اس کی بیوی پر بھی بھروسا کیا جاسکتا تھا اور منظر بھی پیچھے رہنے والا نہیں تھا مگر ایک بیوی اور پندرہ بچوں کی کفالت کرنے والے وکیل سے مالی معاونت کی توقع رکھنا غلط تھا۔ یہی کیا کم تھا کہ اس نے ہماری عدم موجودگی میں تمام معاملات کی نگرانی کی اور اب بھی وہی سارے قانونی مسائل سے نمٹتا تھا۔ وہ وزیر خان ٹرسٹ اسپتال کے انتظامی امور میں بھی اپنی ذمّے داریاں پوری کرتا تھا اور اسی کی وجہ سے دلاور جیسے لوگ اسپتال کو ذاتی مفاد یا سیاسی مقاصد کے لیے استعمال نہیں کرپاتے تھے۔ رابعہ کے پاس ایک ڈاکو بھائی کا نذرانہ بھی تھا۔ اس نے اپنے چار لاکھ مجھے پیش کردیے تھے کہ ناگ منی کو دے دوں۔ اس میں سے ایک لاکھ محسن بڑے اصرار کے بعد لے گیا تھا اور باقی تین لاکھ ایک طرح سے "ایم آر ایس" کے فنڈ کے لیے ریزرو فنڈ میں تھے۔

غالب کا خیال یہ تھا کہ وہ چار مسلح محافظوں کی خدمات حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ کچھ لوگ لائسنس یافتہ اسلحے کے ساتھ بینکوں اور کمپنیوں میں پرائیویٹ سیکیورٹی گارڈ کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ یہ عام طور پر ریٹائرڈ فوجی ہوتے تھے۔ جس طرح لوگ اپنے شوفرز کو وردی پہنا کے اپنی شان بڑھاتے تھے ایسے ہی بنگلوں کے باہر گارڈز کو بھی وردی دے دیتے تھے۔ غالب کو یقین تھا کہ کسی قسم کی وردی میں چار مسلح افراد قبر پر موجود رہیں تو دلاور اینڈ کمپنی کے شکاری کتّے قریب پھٹکنے کی ہمت نہیں کرسکتے۔ چار مسلح افراد کو قتل کرنا بھی آسان نہ تھا اور اس میں اپنے بندوں کے مارے جانے کا خطرہ الگ تھا۔ قبرستان میں گورکن یا کوئی بھی شخص ان گارڈز کی موجودگی میں معترض نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ بھی سمجھتے کہ کسی وجہ سے سرکاری طور پر گارڈ لگائی گئی ہوگی۔

غالب کی اسکیم واقعی بہت محفوظ تھی اور بحث مباحثے کا فائدہ یہ ہوا تھا کہ ایک مشکل مسئلے کا آسان حل نکل آیا تھا جو کم پُرخطر مگر زیادہ مؤثر تھا۔ غالب کے خیال میں اس پر مشکل سے بیس ہزار کا خرچ تھا۔ چار چار ہزار گارڈز کی تنخواہ۔ چار ہزار کی وردیاں۔ ہر قسم کی وردی مال روڈ پر رینکن اینڈ کمپنی سے دستیاب تھی۔ گورکن کو رشوت دے کر قبر کھدوانے کا گناہ کرنے اور یہ جرم کرتے ہوئے پکڑے جانے اور بعد میں افشائے راز کے خوف میں مبتلا رہنے سے یہ کہیں بہتر تھا۔

فی الوقت ہمارے پاس ایک ہی ریوالور تھا اور وہ بھی شیلی کا زنانہ ماڈل کا بائیس بور والا۔ رابعہ کا چوکیدار ابھی اسپتال میں تھا اور اس کا ایک ہفتے سے پہلے ڈیوٹی پر حاضر ہونا مشکل تھا۔ میں نے غالب سے کہا تھا کہ چار کے بجائے پانچ سیکیورٹی گارڈ مل جائیں تو ایک کو ساتھ لے آئے۔ اسے وقتی طور پر رابعہ کی کوٹھی کے گیٹ پر کھڑا کیا جاسکتا تھا اور بعد میں اپنے ساتھ رکھنے میں فائدہ تھا۔ کہیں بھی آتے جاتے جب رابعہ گاڑی چلا رہی ہو تو وہ آگے پیچھے نظر رکھ سکتا تھا اور پیچھا کرنے والے سے نمٹ سکتا تھا۔

میں نے غالب سے یہ بھی کہا تھا کہ ممکن ہو تو وہ کہیں سے ہم سب کے لیے ریوالور لے آئے۔ ریوالور حاصل کرنا عام آدمی کے لیے جوئے شیر لانے کے مترادف تھا مگر کرائم رپورٹر یا کوئی غالب جیسا صحافی کسی بھی پولیس اسٹیشن سے اسلحہ خرید سکتا تھا۔ وہ ضبط شدہ اور تلاشی میں برآمد ہونے والا یا چوروں، ڈاکوؤں کے پاس سے برآمد ہونے والا سب اسلحہ سرکار کے مال خانے میں جمع نہیں کراتے تھے۔ کچھ "ضرورت مند" منہ مانگی قیمت پر خرید لیتے تھے تو کچھ وقتِ ضرورت کسی پر پکا کیس بنانے میں کام آتا تھا۔ حکومت کے کسی وزیر کے خلاف جو ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دیتا ہو۔ ایک قطعہ لکھ دینے والے شاعر کے پاس سے بغیر اسلحے کا پستول برآمد ہو جائے تو وہ ساری عمر کے لیے شاعری سے توبہ کرلیتا تھا اور اس کے انجام سے دس دیگر شاعر یا کالم نویس عبرت پکڑتے تھے اور آزادیٔ صحافت یا آزادیٔ اظہار کے مطالبے کی جذباتی حماقت سے تائب ہو جاتے تھے۔

رابعہ کے اور غالب کے جاتے ہی میں کچھ دیر اخبار دیکھتا رہا۔ تقریباً سب ہی اخباروں میں رابعہ کے گھر میں "نامعلوم" حملہ آوروں کی توڑ پھوڑ اور مجرمانہ کارروائی کی تصاویر تھیں۔ شاید مصلحت کے تحت غالب نے ڈاکٹر شیلی کی لاش کے بارے میں خبر کی اشاعت رُکوادی تھی۔ نہ کسی اخبار میں لاش کے رابعہ کے گھر پہنچائے جانے کا ذکر تھا اور نہ لاش کے ساتھ پولیس کے کسی وارنٹ کے بغیر اندر داخل ہونے کا۔ تاہم اسپتال کے مُردہ خانے میں پیش آنے والے ایک واقعے کا ذکر یوں تھا کہ "نامعلوم" افراد پوسٹ مارٹم کرائے بغیر لاش لے جانے میں کامیاب ہوگئے۔"

دوپہر سے کچھ دیر پہلے ہی میں نیچے جا کے سو گیا اور تین گھنٹے تک سوتا رہا۔ نازو نے مجھے دوپہر کے کھانے کے لیے اٹھایا۔ اس وقت تک نہ غالب لوٹا تھا اور نہ رابعہ واپس آئی تھی۔ رابعہ شاید اپنے آفس میں یادداشت (MEMORENDUM) ٹائپ کرا رہی تھی جو اسے اسلام آباد جا کے برطانوی ہائی کمیشن کو پیش کرنا تھی۔ وہ شیلی کے سب کاغذات بھی اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ غالب کے متعلق بھی یہی فرض کیا جاسکتا تھا کہ وہ کہیں شہر میں بھٹک رہا ہوگا۔ اس کا کام بھی آسان نہیں تھا۔

کھانے کی میز پر میرا ساتھ نازو نے دیا۔ ہم کھانے سے فارغ نہیں ہوئے تھے کہ وقار کا فون آگیا "عصر اور مغرب کے درمیان سوئم ہے۔"

میں نے کہا "مجھے معلوم ہے۔ تم کہاں سے بات کر رہے ہو، آفس سے؟"

"نہیں۔ نقوی صاحب کی سرکاری کوٹھی سے" وہ بولا "میں ذرا سی دیر پہلے آفس گیا تھا۔ سوئم کے انتظامات بھی کرنے تھے۔"

میں نے کہا "رابعہ وہیں تھی!"

"ہاں۔ وہ میمورنڈم ٹائپ کرا رہی تھیں۔ مجھ سے کہا تھا کہ میں سیدھا وہیں آجاؤں۔ غالب کہاں ہے؟"

میں نے کہا "وہ رابعہ کی گاڑی لے کر نکلا تھا۔ بہت سے کام تھے۔ ہوسکتا ہے وہ بھی وہیں پہنچ جائے۔"

"میں نے تو غور ہی نہیں کیا تھا کہ رابعہ باجی گاڑی لے کر نہیں گئی ہیں۔ ورنہ میں اپنی گاڑی ان کے لیے چھوڑ دیتا۔ خود ٹیکسی سے گھر پہنچ جاتا۔ یہاں دو گاڑیاں ہیں ابھی تو۔"

میں نے کہا "ہم بھی آجائیں گے۔"

وقار نے کہا "ہم نہیں۔ صرف نازو آجائے اگر ضروری سمجھے۔"

"ضروری تو رسمِ دنیا ہے۔ اسے نباہنا پڑتا ہے۔ میں بھی آؤں گا۔"

"نہیں۔ آپ مت نکلیں گھر سے۔"

"یار اب ایسا ظلم بھی مت کرو مجھ پر۔ تمہاری بیوی نے غیر معمولی فراخ دلی کا ثبوت دیا ورنہ عورتیں کہاں معاف کرتی ہیں۔"

وہ بولا "اگر آپ سوئم میں شریک نہیں ہوں گے تو وہ آپ کی مجبوری کو بھی معاف کردے گی۔"

"ایسی کوئی مجبوری نہیں کہ میں گھر کے اندر سے گاڑی میں بیٹھ کے نقوی صاحب کی کوٹھی کے اندر بھی نہ پہنچ سکوں۔ بس تم گاڑی بھجوا دو۔ میں ٹیکسی سے نہیں آؤں گا۔"

اس نے ہتھیار ڈال دیے۔ "آپ مصر ہیں تو ٹھیک ہے۔"

میں نے کہا "وہ سرکاری گاڑی مت بھیجنا۔ سب سرکاری گاڑیاں ایک جیسی نظر آتی ہیں۔"

وہ کہنے لگا "نہیں۔ وہ تو ایسے ہی کھڑی ہوئی ہے۔ ایک دو روز میں واپس ہو جائے گی۔ میں اپنی یا نقوی صاحب کی ذاتی گاڑی بھیج دوں گا۔"

نازو کچھ خاموش تھی "آپ کھانا کھائیں۔ مجھے بھوک نہیں ہے۔"

میں نے اسے چھیڑا "ان کے بغیر حلق سے لقمہ نہیں اُترتا؟"

وہ مسکرائی "فکر کی بات تو ہے۔ دیکھیں نا کب سے گیا ہوا ہے وہ۔"

میں نے اسے تسلی دی "تم بھی دیکھو نا کہ اس کے سپرد جو کام کیا گیا ہے۔ وہ بازار سے آٹا دال لانے کا نہیں تھا۔ اسے سیکیورٹی گارڈ تلاش کرنے تھے۔ مجھے تو معلوم بھی نہیں کہ یہ مخلوق کہاں ملتی ہے۔ ظاہر ہے کسی دُکان پر نہیں ملتی۔ وہ صحافی ہے اس لیے سارے ٹھکانے جانتا ہے۔"

"ایمپلائمنٹ ایکس چینج سے ڈرائیور چوکیدار خانساماں سب مل جاتے ہیں۔"

"جس قسم کے کام کے لیے وہ چار آدمی تلاش کرے گا۔ بلکہ پانچ، وہ ایسے ہی راہ چلتے نہیں پکڑے جاسکتے۔ وہ سب کچھ دیکھے گا۔ عمر صحت، تجربہ اور مہارت۔ مستعدی اور حاضر دماغی اور یہ کہ کون کس قسم کا اسلحہ استعمال کرسکتا ہے اور اس کے پاس لائسنس ہے یا نہیں۔ پھر رینکن اینڈ کمپنی سے وردیاں پسند کرے گا سب کے لیے۔ آخری مرحلہ ہوگا انہیں یہ سمجھانے کا کہ انہیں کہاں ڈیوٹی دینی ہے اور کیسے؟"

نازو نے سرہلایا "پتا نہیں ان کے کھانے پینے اور رہنے کا انتظام کیسے ہوگا؟ چار محافظ چوبیس گھنٹے کچھ کھائے پیئے اور آرام کے بغیر تو وہاں کھڑے نہیں رہ سکتے۔"

"ظاہر ہے ایک وقت میں دو افراد ڈیوٹی دیں گے۔ اب وہ آٹھ آٹھ گھنٹے کی شفٹ کرتے ہیں یا بارہ گھنٹے کی۔ یہ وہ آپس میں طے کرسکتے ہیں ورنہ غالب انہیں بتادے گا۔ کھانے پینے کا بندوبست اور رہنے کی جگہ کا انتظام بھی کہیں قریب ہی کرنا ہوگا۔ مجھے غالب کی انتظامی صلاحیت پر پورا بھروسا ہے۔"

کھانے کے بعد میں نے سوچا کہ رابعہ سے بات کرلوں۔ اگر اس نے اپنا کام ختم کرلیا ہو تو ہم اسے بھی ساتھ لے جائیں۔ وقار یوسف کی گاڑی شاید آنے ہی والی تھی۔ میں نے ریسیور اُٹھایا تو ڈائل ٹون غائب تھی۔ فون ڈیڈ تھا۔ مجھے مایوسی ہوئی۔ فون کی خرابی کی شکایت درج کرانے کے لیے بھی فون ضروری ہوتا ہے۔ شکایت درج کرنے والا پوچھتا ہے کہ آپ کس نمبر سے بول رہے ہیں۔

باہر سے وقار یوسف کی گاڑی کا ہارن سُنائی دیا تو میں نے ایک کھڑکی کا پردہ ہٹا کے دیکھا۔ "نازو۔ گاڑی تو آگئی۔ تم نے ابھی تیاری بھی نہیں کی۔"

"تیاری کیسی۔ چلیں۔"

میں نے کہا "غالباً نسوانیت کی تاریخ میں تم پہلی خاتون ہو جس نے واقعی کسی تیاری کے بغیر کھڑے کھڑے کہہ دیا کہ چلیں۔ ورنہ خواتین کہتی یہی ہیں کہ مجھے کون سی تیاری کرنی ہے یا یہ کہ بس میں ابھی تیار ہوتی ہوں ایک منٹ میں۔ اس کے بعد پون گھنٹا تو ضرور کپڑے بدل کے 'میک اپ' میں لگا دیتی ہیں۔"

"آپ گاڑی میں بیٹھیں۔ میں ترپ صاحب کو سمجھا دوں کہ

ہمارے جانے کے بعد کسی کے لیے بھی دروازہ نہ کھولیں۔ دروازے تک جا کے بات بھی نہ کریں کسی سے۔ فون آئے تو کہہ دیں کوئی نہیں ہے۔"

"فون تو خراب ہے۔"

"کیا پتا ٹھیک ہو جائے۔ بعض اوقات لائن ہولڈ اپ کا مسئلہ چند منٹ میں ختم ہو جاتا ہے۔"

باہر نکلنے سے پہلے میں نے بٹن دبا کے الیکٹرانک لاک کھولا اور کنڈی کھول کے پھاٹک کھلا چھوڑ دیا۔ نازو باہر آ کے اسے بند کرتی تو وہ خود بخود پھر لاک ہو جاتا اندر سے بٹن دبائے بغیر اسے نہیں کھولا جا سکتا تھا۔ یہ کوئی سو فیصد قابلِ اعتماد انتظام نہیں تھا۔ جیسا کہ مشہور ہے۔ دروازے صرف شرفا کے لیے ہوتے ہیں۔ چوروں یا جانوروں کے لیے نہیں۔

کار کا اگلا گیٹ کھلا ہوا تھا۔ میں نے ڈرائیور کی صورت پر غور کرنا اس لیے ضروری نہیں سمجھا کہ کار تو بہرحال وقار یوسف کی تھی۔ اس کا خمیازہ میں نے فوراً بھگتا۔ ابھی میں بیٹھا بھی نہ تھا کہ میرے سر پر پیچھے سے کسی نے ضرب لگائی۔ وہ کوئی ڈنڈا تھا یا سلاخ تھی جس پر کپڑا لپیٹ دیا گیا تھا تاکہ میرا سر نہ پھٹے مگر وار کرنے والے ہاتھوں میں بڑی جان تھی۔ ایک دم سارا منظر میری نظروں میں دُھندلا پڑ گیا۔ میں نے اپنے دفاع کی ایک لاشعوری کوشش میں پیچھے پلٹ کے دیکھنا چاہا اور اپنا ایک ہاتھ گیٹ کی طرف بھی بڑھایا جسے ابھی میں نے بند ہی نہیں کیا تھا۔ دوسری بار ڈنڈا سر کی سائڈ میں لگا اور میں حلق سے کراہ نکال کے سیٹ پر ڈھیر ہو گیا۔ تاہم اس وقت تک میں اجنبی ڈرائیور کی شکل دیکھ چکا تھا۔

مجھے پولیس لاک اپ میں ہوش آیا۔ میں حوالات کے غلیظ اور کھردرے فرش پر لیٹا ہوا تھا۔ آنکھیں کھولنے کے بعد سب سے پہلے مجھے اپنی بے لباسی کا خیال آیا۔ میرے سب کپڑے اُتار لیے گئے تھے۔ فرش گیلا تھا اور یہ مجھے اپنا ہی پیشاب لگتا تھا۔

میرے سر میں دھما دھم ہو رہی تھی اور وحشی درد جیسے اندر کاسۂ سر سے ٹکرا رہا تھا۔ درد کا ایک سمندر تھا جس کی طوفانی موجیں پیہم یلغار کر رہی تھیں اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میں نے اُٹھنے کی کوشش کی تو سر وہیں فرش پر پڑا رہ جائے گا۔ اس کا بوجھ میرے شانوں پر کسی چٹان کی طرح تھا۔

ہمت کر کے میں دونوں ہاتھوں کے بل آہستہ آہستہ اُٹھا۔ لباس ہر انسان کا اعتماد ہوتا ہے۔ اس کا عملی ثبوت عام زندگی میں ملتا ہے۔ پیوند لگے، میلے اور پرانے کپڑوں والا جیب میں پیسے ہونے کے باوجود اپنے بچے کے لیے کھلونوں کی کسی بڑی دُکان میں جاتے ہوئے ڈرتا ہے۔ سوٹ اور ٹائی میں خالی جیب آدمی کسی فائیو اسٹار ہوٹل کی کسی تقریب میں بن بُلائے مہمان کی حیثیت سے بھی شریک ہو سکتا ہے لیکن لباس نہ ہو تو آدمی بزدل چوہے کی طرح چھپنے کے لیے کونے اور پناہ گاہیں تلاش کرتا ہے۔ یہ چاہتا ہے کہ زمین پھٹ جائے تو میں اس میں سما جاؤں۔

حوالات میں میرے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ یہ بھی بڑی عجیب بات تھی۔ اندر تفتیش کے وقت کچھ بھی ہو لیکن کسی حوالاتی کو میں نے آج تک کپڑوں کے بغیر نہیں دیکھا تھا۔ حوالات ویسی ہی تھی جیسی کسی بھی تھانے کی ہوتی ہے۔ گندی، ہر قسم کے داغوں سے اور خون کے بدنما دھبوں سے بھری ہوئی دیواریں۔ برسوں کی غلاظت کے تعفن میں بسی ہوئی۔ ناقابلِ شکست فولادی سلاخوں کے دروازے والی۔ نیچی چھت سے جالے لٹک رہے تھے۔ فرش پر چیونٹے اور کاکروچ گھوم رہے تھے اور دیواروں پر چھپکلیاں چل رہی تھیں۔

حوالات کے ماحول کو پُرآسیب نحوست زدہ اور ناقابلِ برداشت حد تک غلیظ رکھا جاتا ہے تاکہ وہاں پہلی بار آنے والوں کے اعصاب تفتیش کے عمل کے آغاز سے پہلے ہی جواب دے جائیں۔ جیسے عاشق، خط کا مضمون بھانپ لیتے ہیں لفافہ دیکھ کر۔ ایسے کسی حوالات کو دیکھ کر تھانے کا اندازہ نہیں ہوتا۔ ہر حوالات اور سب تھانے اس حد تک آپس میں ملتے ہیں جیسے سب قبرستان ایک جیسے نظر آتے ہیں۔

میرے لیے بھی یہ سمجھنا مشکل تھا کہ مجھے کس تھانے میں بند کیا گیا ہے۔ حوالات کے باہر جو علامتی قسم کا محافظ روایتی قسم کی بندوق لیے کھڑا رہتا ہے اور جس کا اصل کام حوالات میں بند ملزموں اور ان کے رشتے داروں کے درمیان رابطہ کرانا اور پھر رعایت کے ریٹ پر معاوضہ وصول کرنا ہوتا ہے۔ وہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ تھانے کے اندر بھی خاموشی تھی۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ حوالات میں کسی کا نہ ہونا ایک اتفاق سمجھا جا سکتا تھا مگر تھانے کا عملہ تو ہونا چاہیے۔ یہ تو سوچا ہی نہیں جا سکتا تھا کہ بیک وقت سب غیر حاضر ہوں۔ گشت پر نکل گئے ہوں یا خاموشی سے کام میں مصروف ہوں۔

میں نے پہلے سوچا کہ کسی کو متوجہ کرنے کے لیے شور مچاؤں مگر مجھے اپنی حالت پر شرم آئی۔ میں ایک دیوار سے ٹیک لگا کے اور گھٹنے سمیٹ کر بیٹھ گیا۔ بالآخر میں پکڑا گیا تھا۔ سارے حفاظتی انتظامات اور مستقبل کی ساری منصوبہ بندی دھری رہ گئی تھی۔ صورتِ حال کی سنگینی کے باوجود مجھے ایک لطیفہ یاد آیا۔ جنگل کے بادشاہ سخت خفا تھے کہ فلاں شکاری کی دیدہ دلیری ملاحظہ ہو۔ عین ہمارے سامنے آ کے کھڑا ہو جاتا ہے۔ نشانہ اتنا خراب ہے کہ گولی پھر بھی نہیں لگتی۔ لومڑی نے جو مشیرِ خاص تھی، عرض کی کہ جہاں پناہ، جان کی امان ملے تو عرض کروں کہ وہ اس لیے بچ جاتا ہے کہ آپ چھوٹی چھلانگ نہیں لگا سکتے اور اس کا نشانہ اس لیے خطا ہوتا ہے کہ آپ چھلانگ مارتے ہیں تو اس کے اوپر سے گزر جاتے ہیں۔ جنگل کے بادشاہ نے غور فرما کے کہا کہ تھینک یو بی لومڑی۔ کل سے ہم چھوٹی چھلانگ لگانے کی پریکٹس کریں گے۔

میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ حلیہ بدل کے اور نام بدل کے ہر شکاری کی آنکھوں میں دھول جھونکنا آسان ہے مگر یہ نہیں سوچا تھا کہ شکاری بھی اتنے ہی اعتماد کے ساتھ مجھے دھوکا دے کر پکڑ سکتے ہیں۔ انہوں نے آسانی سے وقار یوسف کی گاڑی چھین لی تھی۔ وہ نقوی صاحب کی سرکاری گاڑی بھی چھین سکتے تھے اور سرکاری ڈرائیور کو گن پوائنٹ پر رابعہ کے گھر لا سکتے تھے۔ میرا دھیان ہی اس طرف نہیں گیا کہ وقار یوسف کی گاڑی میں میرے لیے خطرے کی کوئی بات ہو سکتی ہے۔ خصوصاً اس صورتِ حال میں جب چند منٹ پہلے ہی اس نے مجھ سے گاڑی بھیجنے کی بات کی تھی۔

صاف ظاہر تھا کہ انہوں نے رابعہ کے گھر کا فون ٹیپ کیا تھا۔ یا نقوی صاحب کے گھر کا۔ وقار یوسف نے گزشتہ روز ہی رابعہ کی کوٹھی کے گیٹ پر اور اس کے سامنے مشتبہ افراد کی موجودگی کو نوٹ کر لیا تھا۔ کسی دشواری کے بغیر انہوں نے وقار یوسف کی گاڑی چھین لی جس میں مجھے نازو کے ساتھ نقوی صاحب کے گھر جانا تھا۔ ڈرائیور یونیفارم میں تھا اور اس نے پی کیپ بھی لگا رکھی تھی۔ میں نے اس کی صورت پر اس وقت غور کیا تھا جب میں اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ جسے میں سرکاری ڈرائیور سمجھا تھا وہ اسی وردی میں کوئی شکاری تھا۔

حوالات میں اور باہر اندھیرے سے رات کا پتا چلتا تھا مگر وقت کا کوئی اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ میرے ہاتھ کی گھڑی بھی کپڑوں کے ساتھ اُتار لی گئی تھی۔ حوالات سے میرا فرار ہونا محال ہی نہیں ناممکن تھا۔ میرے کپڑے چھین لینے کا مقصد تو یہی تھا کہ مجھے عدم اعتماد کے رُسوا کن امتحان میں ڈال دیا جائے۔ اس کا دوسرا مقصد میرے فرار کے امکانات کو کم کرنا تھا۔ اس حالت میں موقع حاصل کر لینے کے باوجود میرا باہر جانا مشکل ہو جاتا۔

میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں کتنی دیر بے ہوش رہا تھا۔ یہ وقفہ ایک گھنٹے کا بھی ہو سکتا تھا اور ایک دن کا بھی۔ یہ وہی رات تھی یا اس سے اگلی۔ اس وقت رات کے آٹھ بجے تھے یا آدھی رات کے بعد کا وقت تھا۔ اس کا اندازہ بھی گھڑی کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا۔

صبر کے ساتھ انتظار کا وقفہ طویل سے طویل تر ہوتا گیا۔ گھنٹوں اور منٹوں کے پیمانے سے اس اذیت کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ آہستہ آہستہ میری بے سکونی بڑھتی گئی۔ مجھے پیاس لگ رہی تھی اور یہ سر کی چوٹ کا اثر تھا کہ میں متلی محسوس کر رہا تھا۔ خیال کا پنچھی پرواز کی کسی سمت کا پابند نہیں ہوتا۔ وصالِ یار فقط آرزو کی بات نہیں مگر آرزو مجبور تو نہیں۔ مجھے بھی خیال آ رہا تھا کہ کہیں سے اسپرین کی گولیاں بھی پانی کے ساتھ مل جائیں اور بلیک کافی کی آرزو تھی۔ یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ ایں خیال است و محال است و جنوں۔

رفتہ رفتہ میری قوتِ برداشت ختم ہونے لگی۔ کچھ نہ کرنا اور صرف صبر و استقامت کے ساتھ اُمید کا دامن نہ چھوڑنا ایک لاحاصل کوشش بن گیا، اُمید کیسی اور انتظار کس کا؟ ابھی تو خود مجھے معلوم نہیں کہ میں کہاں ہوں تو یہاں اور کون آ سکتا ہے۔

میں نے چلّا کے کہا "کوئی مردود ہے یہاں؟"

خلافِ توقع مختصر برآمدے کے بعد نظر آنے والے چق پڑے دروازے سے کوئی باہر نکلا "کیا بات ہے۔ آرام سے بیٹھو" میں نے ایک مانوس آواز سُنی۔

"آرام کے بچے۔ یہ آرام کی جگہ ہے تو تم میری جگہ آ جاؤ۔"

وہ بھاری قدم اٹھاتا آگے آیا۔ دور سے وہ ایک تنومند سیاہ فام شخص لگتا تھا۔ پولیس کی وردی سے اس کے عہدے کا اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ نشانات اس کے کندھے پر ہوں گے اور میں کھڑا ہوئے بغیر انہیں دیکھ نہیں سکتا تھا۔

جب وہ بالکل میرے سامنے آ گیا تو مجھے یوں لگا جیسے میں کوئی بھیانک خواب دیکھ رہا ہوں یا میری آنکھیں مجھے دھوکا دے رہی ہیں۔ وہ استاد پیڈرو تھا۔

"پیڈرو" میں نے چیخ کے اسے ماں کی گالی دی "تم، پولیس کی وردی میں؟"

اس نے مجھے حیرانی سے دیکھا "پیڈرو۔ میرا نام رشید عباسی ہے۔"

میں نے اسے مزید گالیاں دیں "میں تیری سات پشتوں کو پہچانتا ہوں ابلیس کی اولاد۔ سارے نام جانتا ہوں تیرے۔ یہ بتا مجھے یہاں اس حالت میں کیوں رکھا گیا ہے؟"

اس نے ماتھے پر بل ڈال کے کہا "یہ سب ڈی ایس پی صاحب سے پوچھنا۔"

"کون ڈی ایس پی۔ میں پوچھتا ہوں یہ کون سا تھانہ ہے؟"

وہ واپس جاتے جاتے رکا "یہ جہنم کا تھانہ ہے، اور کچھ؟"

میں نے چلّا کے کہا "میں منظر سے یا رابعہ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ مسکرایا "کرو۔ ساری رات کرو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

میری گالیوں سے وہ ذرا بھی مشتعل نہیں ہوا تھا۔ شک کی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ پولیس کی وردی میں استاد پیڈرو تھا۔ میں اس کے کسی ہم شکل بھائی کے وجود کی جھوٹی کہانی نہیں سُن سکتا تھا۔

اپنے رویّے سے وہ مجھے دھوکا نہیں دے سکتا تھا۔

وہ میری چیخ وپکار کی پروا کیے بغیر واپس کمرے میں چلا گیا۔ میں سلاخوں سے سر لگائے سوچتا رہا کہ یہ سب کیا ہے۔ کیا یہ تھانہ جعلی ہے؟ مجھے پولیس نے گرفتار نہیں کیا تھا۔ اغوا کرنے والے دلاور اینڈ کمپنی کے شکاری تھے اور میرے ساتھ کوئی نیا گیم کھیل رہے تھے۔ میں نے ذہن کو پُرسکون کرنے کی اور سوچنے کی کوشش کی کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے؟ ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے جب کہ میں کچھ کر ہی نہیں سکتا۔

ایک بار پھر میں خاموش ہو کے بیٹھ گیا۔ اندر سے میں کسی جوالا مکھی کی طرح کھول رہا تھا۔ میرا ذہن شکست خوردگی کے حوصلہ شکن احساس سے دوچار تھا اور مایوسی مکڑی کے جالے کی طرح میری سوچ کو گرفت میں لیتی جا رہی تھی۔

میں نے چلّا کے کہا "پیڈرو۔ میری بات سُنو۔"

وہ پھر چق ہٹا کے باہر نکلا "پیڈرو تمہاری ماں کا یار تھا کوئی کہ اسے یاد کر رہے ہو؟"

میں نے کہا "آج کیا دن ہے۔ کیا تاریخ ہے؟"

اس نے کہا "آج تمہاری زندگی کا آخری دن ہے۔ کل تمہاری تاریخ وفات۔"

میں غصے کو پی گیا "وقت کیا ہوا ہے؟"

اس نے کہا "تم پر بُرا وقت آیا ہوا ہے۔"

میں نے اسے پھر نصف درجن فحش گالیاں دیں۔ "تم لوگوں میں ہمت ہوتی تو مجھے بہت پہلے قتل کر چکے ہوتے۔ تم صرف ڈرامے کرتے ہو۔"

اس نے کہا "لو وہ ڈی ایس پی صاحب آ گئے۔"

مجھے ایک اور شاک لگا۔ ڈی ایس پی کی وردی میں آنے والا چوہدری دلاور تھا۔ وہ بڑے وقار اور متانت کے ساتھ چلتا ہوا میری طرف آیا۔

میں نے کہا "آیئے چوہدری دلاور صاحب۔ خوب بہروپ بھرا ہے تم نے بھی لیکن مجھے اس کا فائدہ بتا دو۔"

اس نے حیرانی سے پیڈرو کی طرف دیکھا "عباسی۔ یہ کیا کہہ رہا ہے؟"

پیڈرو نے نفی میں سر ہلایا "پتا نہیں سر۔ یہ مجھے بھی پتا نہیں کیا کہہ رہا تھا۔ ہاں 'استاد پیڈرو۔"

دلاور مسکرایا "نام تو اچھا رکھا ہے اس نے تمہارا لیکن یہ مجھے چوہدری دلاور کیوں سمجھ رہا ہے۔ کون ہے چوہدری دلاور؟"

آخری جملہ اس نے مجھ سے مخاطب ہو کے کہا تھا "کیا تم مجھے پاگل ثابت کر سکتے ہو اس طرح...." میں نے دلاور کو ایک گندی گالی دی۔

"تم خود اپنے آپ کو پاگل ثابت کرنا چاہتے ہو... نہیں سکے کہ میرا نام احسان الحق ہے۔" اس نے اپنے ... ہوئے نام کی پٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا۔ ٹھیک ہے تم احسان الحق ہو۔ تم ڈی ایس..." میں نے اپنا سر سلاخوں پر مار کے کہا "لیکن مجھے اس طر... گیا ہے؟ میرے کپڑے کہاں ہیں؟"

دلاور نے سوالیہ نظروں سے پیڈرو کو دیکھا "اسے... گرفتار کیا تھا؟"

"ایس آئی قریشی نے سر۔ اس وقت بھی ملزم نے کپڑ... پہن رکھے تھے۔"

مجھے یہ بے سروپا گفتگو پاگل کر سکتی تھی۔ میں نے اپنے ... قابو پا کے کہا "اچھا مجھے دوسرے کپڑے لا دو۔"

دلاور مسکرایا "عباسی۔ اپنی وردی دے دو اسے۔"

پیڈرو نے کہا "سر۔ میری بیوی کے کپڑے ہیں۔ میں... کلینرز سے لیے تھے۔ وہ دے دوں؟"

میرا حوصلہ جواب دے چکا تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہ نیا... اور شاید وہ مجھے پاگل کر دینا چاہتے ہیں۔ میرا گالی گلوچ اور... بے کار تھی۔ میں آہنی سلاخوں سے سر ٹکرا کے اپنا سر تو... تھا۔ ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔

میں نے کہا "مجھے پانی چاہیے۔"

"اور کچھ....؟" دلاور نے کہا۔

"اگر اسپرین مل جائے۔ میرے سر میں بہت درد ہے..."

"کیوں نہیں۔ بھئی عباسی۔ یہ ملزم... کیا نام ہے اس..."

میں اسے گالی دیتے دیتے رک گیا۔ مجھے سوچنے... صلاحیت بحال کرنے کی ضرورت تھی اور جسمانی قوت کی... ضروری تھی۔

"اس کا نام اکبر علی ہے سر۔" پیڈرو کا ڈراما جاری تھ... میں نے تلخی سے کہا "عباسی صاحب۔ مجھے کافی بھ... ہے؟"

وہ سوچ میں پڑ گیا "اچھا' میں دیکھتا ہوں۔ کافی نہیں... شاید مل جائے۔"

ڈی ایس پی بنا ہوا چوہدری دلاور واپس جا رہا تھا او... والے کمرے میں داخل ہونے ہی والا تھا کہ باہر سے ایک... اندر آئی۔

ایک لمحے کے لیے مجھے اپنے پاگل ہونے کا یقین آ... عورت رابعہ تھی۔ اس نے میری طرف اجنبیت کی نظر... ڈالی پھر دلاور نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور اسے کمر... گیا۔

میری آنکھیں رابعہ کی شناخت میں غلطی نہیں کر سکتی ... اس کا ثانی نہ تھا نہ کوئی ہو سکتا تھا۔ ... کائنات میں حسن کے رنگ لامحدود تھے اور تخلیق کا ہر تصویر تو خالق کی قدرتِ کاملہ کی گواہی دیتا تھا لیکن میری ... راز ویسے ... رابعہ وہ شاہکار تھی جو صرف ایک بار وجود پاتے ہیں۔

... میں کوئی بھیانک خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں؟ میں نے ایک ... کے لیے آنکھیں بند کر کے سوچا۔ وہ خوف اور اندیشے جو آدمی کے لاشعور میں چوروں کی طرح دبکے رہتے ہیں' جاگتے میں ڈرائیں ... آسیب بن جاتے ہیں اور نیند میں پریشان کریں تو ڈراؤنے خواب ... جاتے ہیں۔

اگر میں پاگل ہو جاتا تب بھی تصور میں یہ نہیں دیکھ سکتا تھا کہ ... میرے سامنے دلاور نے رابعہ کی کمر میں ہاتھ ڈالا مگر اس نے کوئی ... مزاحمت نہیں کی اور کوئی احتجاج کیے بغیر اس کے ساتھ یوں کمرے ... میں چلی گئی جیسے میں کوئی اجنبی حوالاتی تھا اور ایسا مجرم تھا جس پر ... عزت کی نگاہ ڈالنا بھی ضروری نہ تھا اور دلاور اس کا اصلی پرستار ...

یہ ناممکن تھا۔ میرے شعور میں ایسے خوف کا وجود بعید از امکان تھا۔ کسی مکمل ذہنی مریض کے ذہن سے بھی شاید ایسے خیال گزر نہیں ہو سکتا جس کا احساس یا تجربہ اس نے ہوش وحواس کی کیفیت میں نہ کیا ہو۔

رابعہ مجسم وفا تھی اور پیکرِ محبت تھی۔ وہ جان دے سکتی تھی مگر دلاور کے ناپاک ہاتھوں کو اجازت نہیں دے سکتی تھی کہ اس کے ... کی پاکیزگی کو اپنے لمس سے گناہ گار کریں۔

پھر یہ سب کیا تھا؟ میری نظر کا دھوکا یا میرے حواس کا فریب! میرے دماغ کا فتور یا عالم خواب؟ میں نے اپنی انگلی کو دانتوں سے ... تو تکلیف کے احساس نے مجھے یقین دلایا کہ میں جاگ رہا ہوں۔ ... یہ کسی ذہن کو متاثر کرنے والی دوا کا اثر ہو سکتا ہے جس میں ... حواس ہی نہیں عقل بھی دھوکا دیتی ہے اور وہ اپنے وہم ... گمان کو حقیقت تسلیم کر لیتا ہے۔ دنیا کی (اس وقت کی) سب سے ... بڑی عمارت ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ پر سے ایک شخص اس یقین کے ساتھ کود گیا تھا کہ وہ اُڑ سکتا ہے چنانچہ بحفاظت کسی پرندے کی ... طرح نیچے اُتر جائے گا۔ ایسا ایک دوا ایل ایس ڈی (LS.D) کے استعمال کی وجہ سے ہوا تھا جو نشے کی جدید ترین صورت تھی۔

تاہم میرے ایل ایس ڈی کے زیر اثر ہونے کا امکان ایک ... فیصد تو کیا ایک فیصد ہزار بھی نہیں تھا۔ مجھ پر کوئی عام بے ہوش کرنے والی دوا آزمائی گئی تھی جس کا اثر اب ختم ہو رہا تھا۔ مجھے صرف اتنا یاد تھا کہ جب میں وقار یوسف کی گاڑی میں بیٹھا تھا تو کسی نے میرے سر پر کوئی چیز ماری تھی۔ اس کے بعد میں بے ہوش ہو گیا تھا اور کچھ دیر بعد ہوش میں آنے لگا ہی تھا کہ کسی نے میرے ... رومال رکھ دیا تھا۔ وہ شاید کلوروفارم کی بو تھی جو پہلے مجھے محسوس ہوئی تھی لیکن اب میں بالکل ٹھیک تھا۔

میری نظر اس دروازے پر جم کے رہ گئی تھی جس پر چق پڑی ہوئی تھی۔ نظر کے درمیان ایک پردہ تھا مگر تصور کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ اگر رابعہ ہی پردے کے پیچھے دلاور کے ساتھ موجود تھی تو یہ فرض کرنا محال تھا کہ وہ شرافت سے آمنے سامنے بیٹھے قانونی مسائل پر تبادلۂ خیالات کر رہے ہوں گے۔ جس طرح دلاور اسے اندر لے کر گیا تھا اس کے بعد تصور میں قابلِ اعتراض مناظر کے سوا کچھ آتا ہی نہیں تھا۔ میرے وجود میں آتش فشاں بھڑکنے لگتا تھا لیکن میں اپنی بے بسی کی آگ میں جل کے خاکستر ہونے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

رابعہ ایک وکیل کی حیثیت سے نہ جانے کتنی بار پولیس اسٹیشن جا چکی تھی اور قانونی مقدمات کے سلسلے میں اس کا پولیس کے ساتھ براہِ راست واسطہ رہتا تھا مگر آج وہ جس طرح تھانے آئی تھی یہ اس کا انداز نہ تھا۔ وہ ہمیشہ بڑے وقار' اعتماد اور عزم کے ساتھ آتی تھی۔ عام لوگوں کی نظر میں اس کا پیشہ زیادہ باعزت تھا۔

وہ کوئی عام وکیل نہ تھی اور اسے اپنی کامیابی پر فخر سے سربلند رکھنا آتا تھا مگر آج میرے سامنے سے گزر کے جانے والی رابعہ کے اطوار عامیانہ تھے اور وہ ایک بازاری عورت لگتی تھی۔

ولاور کا ایس پی کی وردی میں نظر آنا بھی ناقابلِ فہم تھا مگر ولاور کچھ بھی کر سکتا تھا۔ کوئی نیا چکر چلانے کے لیے وہ میرے سامنے جوکر بن کر بھی آسکتا تھا اور جنرل بن کے بھی لیکن رابعہ یہ سب کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ کسی جائز مقصد کے حصول کی خاطر بھی وہ اپنی عزتِ نفس کو داؤ پر لگانے کا جھوٹا کھیل بھی نہیں کھیل سکتی تھی۔ اگر اس کے یہاں آنے کا مقصد میری رہائی کے لیے کوشش کرنا ہوتا تو پہلے وہ مجھ سے بات کرتی اور پھر ڈیوٹی افسر سے۔ بفرضِ محال ولاور نہ ہوتا کوئی اصلی ایس پی بھی رابعہ سے میری رہائی کا وعدہ کرتا اور پھر اس کی کمر میں ہاتھ ڈالنے کی جسارت کرتا تو رابعہ اس کے منہ پر تھپڑ مارتی۔

اس یقین سے مجھے کچھ سکون ملا کہ وہ جعلی ایس پی تو ولاور ہو سکتا ہے مگر وہ عورت رابعہ نہیں ہے۔ ضرور ولاور کے ذہن نے کوئی نیا ڈراما تیار کیا ہے اور اسی ڈرامے کا ایک کردار یہ عورت ہے جو رابعہ کی ہم شکل ہے یا اسے میک اپ سے رابعہ کے مشابہ بنا دیا گیا ہے۔ نصف صدی یا اس سے بھی پہلے کسی نے کہا تھا کہ

سچائی چھپ نہیں سکتی بناوٹ کے اصولوں سے
کہ خوشبو آ نہیں سکتی کبھی کاغذ کے پھولوں سے

چنانچہ وہ عورت رابعہ جیسی نظر تو آسکتی تھی مگر رابعہ نہیں بن سکتی تھی۔ میں نے بھی اسے دور سے دیکھا تو دھوکا کھا گیا۔ وہ میرے پاس آتی یا مجھ سے بات کرتی تو سارا پول کھل جاتا۔ میں یہ سوچنے لگا کہ یہ سب ڈراما ہے تو پھر پولیس اسٹیشن کیسے اصلی ہو سکتا ہے۔ یہ بھی تھانہ نہیں تھانے کا سیٹ ہے جو ایک سین پیش کرنے کے لیے لگایا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حوالات خالی پڑی ہے اور پولیس کی وردی میں بھی دو ہی افراد نظر آرہے ہیں جو اس ڈرامے کے مرکزی کردار ہیں اور آج سے پہلے بھی چہرے 'حلیے' اور نام بدل بدل کے مجھے دھوکا دینے کی کوشش کر چکے ہیں۔ تھانے میں تو ماتحت عملہ بھی ہوتا ہے۔ ڈیوٹی افسر' محرر' حوالات کی گارڈ اور کانسٹیبل وغیرہ۔ وہاں جھوٹی سچی رپورٹیں لکھوانے والے' چھوٹے چور کو پکڑوانے والے بڑے چور۔ ظلم کرنے والے' مظلوم اور بے گناہ مجرم سب ہر وقت آتے جاتے رہتے ہیں۔ عزتوں کے سودے' پکڑ دھکڑ' تفتیش اور لین دین کے معاملات دن رات جاری رہتے ہیں۔

اچانک پیڈرو پھر نمودار ہوا۔ اس کے چہرے پر وہی مخصوص پُرخباثت مسکراہٹ تھی جس کی نقل شاید شیطان بھی نہ کر پاتا۔ اس کے ایک ہاتھ میں سلور کا گلاس تھا اور دوسرے میں بظاہر کچھ نہیں تھا مگر میرے پاس آ کے اس نے مٹھی کھول کے ہتھیلی سامنے کر دی "یہ لو اسپرین کی گولیاں اور پانی۔"

میں نے ایک ہاتھ سے گلاس پکڑ لیا اور دوسرے میں گولیاں لے لیں پانی قدرے گرم تھا اور اس میں سے ایک ایسی کراہیت انگیز بو اُٹھ رہی تھی جس نے میرے حواس مختل کر دیے۔ یہ پیشاب کی بو تھی۔ اسپرین کی گولیاں بھی بھیڑ بکری کی مینگنیاں تھیں۔

احساسِ ذلت نے مجھے پاگل کر دیا اور میں نے مشتعل ... گلاس پیڈرو کو کھینچ مارا۔ "کُتّے کی اولاد۔ یہ پانی ہے؟"

وہ اس ردِ عمل کے لیے ذہنی طور پر تیار تھا۔ اس ... بچاتے ہوئے قہقہہ مارا "اور کیا ہے شہزادے!"

"یہ وہ دودھ ہوگا جو تیری ماں نے تجھے پلایا تھا۔ سور ..." میں نے دوسرے ہاتھ کو غلاظت کے احساس سے نجات ... لیے دیوار پر رگڑا۔

وہ افسوس سے سرہلانے لگا "میں تو سمجھا تھا کہ ... تمہیں دشمنی میں بند کرادیا ہوگا مگر تم تو خطرناک قسم کے پاگل ..."

"کس نے بند کرایا ہے مجھے؟"

"تمہارے ہی دوست رشتے دار ہیں" وہ مجھے گھور ...

"نام تو میں نہیں جانتا سب کے۔ ان میں سے ایک عورت ... پی صاحب کے پاس آئی بیٹھی ہے رابعہ نام ہے اس کا۔"

میں نے کہا "ذرا قریب آکے بات کرو۔"

"کیوں؟ تم بہرے بھی ہو؟"

میں نے کہا "میں اپنا اس عورت کا اور تمہارا نام ... بتا سکتا ہوں جو تم بھول گئے ہو پیڈرو۔"

وہ تھوڑا سا آگے آیا "مجھے ترس آتا ہے تم پر۔ ... پڑھے لکھے بندے لگتے ہو۔ کیوں پنگا لیتے ہو ہر ایک سے۔ ... تمہاری بڑی یاری تھی اس عورت رابعہ سے!"

میں نے سلاخوں سے ہاتھ نکال کے اس کی گردن دبو... ناکام کوشش کی "وہ رابعہ نہیں ہے...." میں نے اسے ... ڈکشنری سے منتخب گالیاں دے کر کہا۔

وہ ڈھٹائی سے ہنسنے لگا "پھر کیا اماں ہے تمہاری؟ بڑی ... ہے۔"

ایک بار پھر میں نے خود پر کنٹرول حاصل کیا۔ میں نے خو... دلایا کہ ہر قسم کی اشتعال انگیزی کا مقصد میری ذہنی استعداد کو ... کرنا ہے۔ دشمن جانتے ہیں کہ طاقت کے مقابلے میں سب ... ہتھیار عقل ہوتی ہے اور اب تک میرا یہ ہتھیار کند نہیں ہوا ... کمرے کی چق ہٹا کے ولاور نے سر نکالا "اوئے عباسی۔ ... رولا ہے؟"

عباسی یعنی پیڈرو نے فریاد کی "آپ کا ہی بندہ ہے جی۔"

اندر ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی تو ولاور کا چہرہ پھر چق ... غائب ہو گیا۔ میں نے اس کی آواز سُنی۔

"ہیلو۔ کون.... اچھا اچھا.... اپنے وکیل صاحب.... کیسے یاد کیا جی اس وقت؟" لہجہ اور آواز بدل کے بات کر... ولاور نادانستہ طور پر اپنے فطری اندازِ گفتگو پر آگیا "ہاں جی ... آپ کا بندہ ہمارے پاس بالکل ٹھیک ہے ابھی تک تو۔ صحیح ... ہے۔ باتیں بڑی الٹی سیدھی کر رہا ہے۔ دماغ پر کچھ اثر معلو... کوئی پیچ ڈھیلا ہو۔ ... دماغ درست کرتا۔ لیکن ہم جانتے ہیں جی ... ٹھیک نہ ہو۔ زبان بند ہو' سب ٹھیک ہو جاتا ہے اس ... یادداشت ... ورکشاپ میں بڑے اچھے استاد قسم کے کاریگر ہیں اور ان کے ... آلات بھی ایسے ہیں.... دھمکی.... توبہ جی وکیل صاحب۔ ... پاس ... دھمکی اگر کوئی فون پر دیتا ہے تو وہ بونگا ہے۔ اب آپ نے فون نمبر ... پتا کر لیا تو یہ بھی معلوم کر لو کہ جگہ کون سی ہے۔ ہیں جی' پھر آجاؤ ... بے شک۔ کیا پتا ہم مل ہی جائیں۔ نہ ملیں تو بُرا مت ماننا" اس نے ریسیور رکھ دیا۔

وہ پھر کمرے سے نکلا اور آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا میری طرف ... آیا۔ اس کے لبوں کی فاتحانہ مسکراہٹ میں میرے لیے چیلنج تھا اور ... اپنی عیاری کا غرور۔

"کیا بات ہے۔ تم آرام سے نہیں بیٹھ سکتے؟"

"بہت آرام سے ہوں میں تو" میں نے تلخی سے کہا۔

پیڈرو نے شکایت کے انداز میں کہا "اس نے پانی مانگا تھا ... جناب کے سامنے اور اسپرین کی گولیاں۔"

"میں نے کہا تھا کہ لا دو...."

"یہ دیکھیں سر جی۔ گلاس مار دیا میرے منہ پر کہ یہ پانی نہیں پیشاب ہے اور یہ دیکھیں' اسپرین کی گولیاں ہیں.... ان کو مینگنی کہتا ہے۔"

"یہ پاگل ہے عباسی۔ زبردستی مت کرو۔"

"میں نے کچھ نہیں کیا جنابِ عالی۔ ابھی کہہ رہا تھا کہ یہ عورت رابعہ نہیں ہے۔ اسی کی شکایت پر تو پولیس نے اسے پکڑا تھا۔"

"مجھے معلوم ہے۔ اس نے گھر میں بہت توڑ پھوڑ کی تھی۔ رابعہ کو مارا تھا۔ اتنا عرصہ کوئی بھی پریشان رہے۔ بندے کا گھربار کوئی نہ ہو اور وہ موت سے چھپتا پھرتا ہو۔ اتنے مقدمات میں گرفتاری کا ڈر ہو۔ تو کوئی بھی پاگل ہو سکتا ہے۔"

"سر جی! اب کیا اسے سزا ہوگی؟"

"اوئے بے وقوف۔ سزا دینا نہ دینا ہمارا کام نہیں ہے۔ عدالت جو چاہے کرے۔ ویسے کسی پاگل کو جیل خانے نہیں پاگل خانے بھیجا جاتا ہے۔ تم بلاوجہ بحث مت کرو۔"

میں نے محسوس کیا کہ اس بار انہوں نے مجھے پاگل قرار دینے کی سازش کی ہے اور میں نے اپنا رویّہ جارحانہ رکھا۔ میں ان پر چیختا چلاتا رہا' انہیں گالیاں دیتا رہا تو اس سے میرے دشمنوں کے عزائم کی تکمیل میں مدد ملے گی۔ ان کے کسی سفید جھوٹ' بے بنیاد الزام اور بے سروپا دعوے کی تردید کرنے سے مجھے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ یہاں میری سُننے والا کون ہے اور کون ہے جسے میں دلائل سے قائل کر سکوں کہ میرا دماغ بالکل ٹھیک ہے۔ ان لوگوں سے کچھ بعید نہیں کہ وہ کسی خفیہ کیمرے سے فلم بندی میں مصروف ہوں اور اس اشتعال انگیزی کا مقصد ہی میرے پاگل پن کا وہ ثبوت حاصل کرنا ہو جو دنیا کے سامنے پیش کیا جا سکے۔

ولاور نے نیچے جھک کے کچھ اُٹھایا "اکبر علی۔ یہ کیا ہے؟"

میں نے غور سے اس کی ہتھیلی کو دیکھا جس پر سفید رنگ کی دو گولیاں رکھی ہوئی تھیں "یہ اسپرین کی گولیاں ہیں۔"

ولاور نے مسکرا کے پیڈرو کی طرف دیکھا "تم تو بتا رہے تھے...."

پیڈرو نے احتجاج کیا "سر جی۔ قسم خدا کی...."

"عباسی۔ طریقہ ہوتا ہے بات کرنے کا۔ سمجھنے کی کوشش کرو یار کم.... یہ نارمل نہیں ہے۔" ولاور نے کہا "مگر تم نارمل ہو۔ اس جیسا بننے کی کوشش کرو گے تو پھر تم کو بھی اندر اسی کے ساتھ بند کرنا پڑے گا۔"

پیڈرو نے بے بسی سے اپنے افسر کو دیکھا پھر مجھے خوں آشام نظروں سے گھورا۔

"جاؤ' میرے کمرے سے پانی لاؤ" ولاور نے حکم دیا۔

"پہلے بھی وہیں سے لایا تھا سر۔"

"جاؤ پھر لاؤ۔ میں بتاتا ہوں تمہیں کہ پاگلوں کے ساتھ کیسا برتاؤ رکھنا چاہیے۔" ولاور نے کہا۔ پیڈرو کے جاتے ہی وہ مجھ سے مخاطب ہو گیا۔ "انسپکٹر عباسی جاہل ہے اور بے وقوف بھی...."

میں نے پُرسکون لہجے میں کہا "پھر وہ انسپکٹر کیسے بن گیا۔ اپنے ڈی ایس پی احسان الحق صاحب؟"

وہ مسکرانے لگا "سفارش سے۔"

"آپ تو اہلیت کی بنیاد پر اس عہدے تک پہنچے ہوں گے!" میں نے طنزاً کہا۔

پیڈرو دوسرے گلاس میں پانی بھر کر لے آیا "آپ بھی ٹرائی کر لیں سر۔"

ولاور نے گلاس لے کر کہا "اکبر علی۔ کیا یہ پیشاب ہے؟"

میں نے کہا "آپ دیکھ کے بتائیں۔"

اس نے ایک گھونٹ لیا "یہ پانی ہے۔ لو.... اور یہ لو گولیاں۔"

میں نے اطمینان سے گولیاں حلق میں رکھ کے پانی کا گلاس خالی کر دیا۔ اس سے پیڈرو کو مایوسی ہوئی "مجھے تو اس کی سمجھ نہیں آتی۔"

ولاور نے کہا "اب میرے سامنے اس سے جو پوچھنا ہے پوچھو۔"

پیڈرو نے کہا "اوئے کون پاگل ہے.... میں کہ تم....؟"

میں نے کہا "ظاہر ہے میں.... ورنہ میں باہر ہوتا اور تم اندر ہوتے۔"

"نام یاد ہے اپنا؟"

میں نے سرہلایا "اکبر علی۔"

"میرا کیا نام لے رہے تھے تم ابھی۔" ولاور بولا۔

"احسان الحق۔ جو آپ نے بتایا تھا۔"
"پھر یہ چوہدری دلاور کون ہے؟" پیڈرو نے کہا۔
میں نے کہا "مجھے نہیں معلوم۔"
پیڈرو جھلا گیا۔ "اوئے تم تو مجھے بھی کیا کہہ رہے تھے...... استاد پیڈرو؟"
"استاد پیڈرو؟" میں نے سوچ کے کہا "مجھے یاد نہیں۔"
دلاور نے پوچھا "اس عورت کو پہچانتے ہو جو مجھ سے ملنے آئی تھی۔ میرے کمرے میں ہے اس وقت بھی؟"
میں نے اقرار میں سرہلایا "وہ رابعہ تھی۔"
"ویری گڈ۔ تم نے دیکھا عباسی۔ اس وقت یہ کتنا نارمل ہے۔"
پیڈرو نے کہا "بندے کا دماغ خراب ہوتے دیر نہیں لگتی جی۔"
"اچھا چلو اب تم اسے چائے شائے دو..... اور دیکھو پھر کوشش کرو۔ شاید یہ کپڑے پہن لے" دلاور نے جاتے جاتے کہا۔
"پہلے کتنے جوڑے خراب کرچکا ہے سر..."
"چلو ایک اور سہی..."
میں خاموشی سے سب سُنتا رہا۔ وہ مجھ پر ثابت کرچکے تھے کہ میں نے پاگل پن کے دورے میں رابعہ کو مارا۔ اس کے گھر میں توڑ پھوڑ کی اور رابعہ پولیس سے مدد لینے پر مجبور ہوگئی۔ میرے پاگل پن کی وجہ میرے حالات کا دباؤ تھا۔ میں نے مسلسل بے سکونی اور آلام و مصائب سے بھرپور خانہ بدوشی اور بے سروسامانی کی زندگی گزاری تھی اور میرے خلاف فوجداری نوعیت کے اتنے قانونی مقدمات درج تھے کہ سزا کا خوف میرے اعصاب پر سوتے جاگتے سوار رہتا تھا۔ اب وہ مجھے بتا گئے تھے کہ شغلِ دیوانگی میں کئی بار میں اپنے لباس کو بھی تار تار کرچکا تھا۔
مُردہ بدستِ زندہ۔ میں کس کس تہمت سے دامن بچاتا۔ کس کس الزام کی نفی کرتا اور نفی کرنے سے کیا ہوتا؟ ایک دیوانہ اگر سفید کو سفید کہے تو ہوش مند اسے سیاہ تسلیم کراسکتا ہے۔ ابھی تک مجھے علم نہیں ہوا تھا کہ میرا ذہنی توازن کب بگڑا تھا۔ عزیزوں اور دوستوں نے مجھے پولیس کے حوالے کرنے سے پہلے میرا نفسیاتی اور ذہنی علاج معالجہ کرایا تھا یا نہیں اور انہوں نے پاگل خانے بھیجنے کے بجائے مجھے پولیس کے حوالے کیوں کردیا تھا جہاں بڑے بڑے ذی ہوش رات بھر کی تفتیش کے بعد مجذوب کی بڑ مارنے لگتے ہیں۔ مجھے امید تھی کہ رفتہ رفتہ وہ مجھے میرے دورِ جنوں کی اور بھی کہانیاں سنائیں گے جن سے مجھ پر چودہ طبق روشن ہوجائیں گے اور جو باتیں مجھے یاد نہیں وہ سب میرے حافظے میں نقش ہوجائیں گی۔
دلاور دروازے تک گیا اور لوٹ آیا "وہ اپنے اکبر علی۔ ابھی فون کیا تھا تمہارے لیے کسی وکیل نے۔ کیا نام ہے اس کا....."
میں نے بے اختیار کہا "منظر۔"
مجھے فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ دلاور نے سوچ کے "منظر... کیسا منظر؟ یہاں سے تو کوئی منظر دکھائی نہیں دیتا۔"
پیڈرو نے کہا "سرجی۔ پتا نہیں اس کے دماغ میں اس وقت کون سا منظر ہے۔ کاغان میں گھوم رہا ہے یا مری میں۔"
دلاور نے اتفاق کرتے ہوئے سرہلایا "کوئی وکیل تھا۔ نام بتایا بھی تھا اس نے۔ وہ آرہا ہے تم سے ملنے۔ مس رابعہ قا... بھی بہت فکر تھی تمہاری کہ کہیں ہم تشدد نہ کریں۔ میں نے ... ہے کہ جی ہمیں کون سا چوری کا مال برآمد کرنا تھا یا کوئی اقبال ... کرانا تھا۔ کیس تو سارے پرانے ہیں عدالتوں میں۔ ہم تو بس ... پیش کردیں گے۔ آگے عدالت جیسے چاہے کرے۔ میڈیکل ... خود پتا چل جائے گا کہ پاگل پن اصلی ہے یا چکر بازی ہے۔ یہاں ... روز واسطہ پڑتا ہے قاتلوں سے۔ جب پھانسی کا پھندا نظر آنے ... ہے تو پاگل بن جاتے ہیں لیکن سائنس بڑی ترقی کرگئی ہے۔ اب ... فوٹو اُتار لیتے ہیں دماغ کے اندر کا۔ سب معلوم ہوجاتا ہے کہ ... مشینری ٹھیک ہے یا واقعی خراب ہے۔ ویسے اس بے چاری ... اپنے پاس سے دس ہزار دیے ہیں مجھے۔ ورنہ میڈیکل سے پہلے ... ہم بتا دیتے۔" وہ معنی خیز انداز میں ہنسا۔
اس کی باتوں نے اور اس کے یقین نے مجھے اُلجھن میں ڈال دیا "اگر وہ رابعہ ہے تو وہ مجھ سے کیوں نہیں ملی!"
دلاور نے سرہلایا "اوئے، تم سے مل کے کیا کرے گی۔ ... تمہارا دماغ ٹھکانے ہے۔ تھوڑی دیر پہلے انسپکٹر عباسی سے ... سیدھی باتیں کررہے تھے۔ دورہ پڑتے دیر لگتی ہے۔ وہ ڈرتی ... اور پھر اس حالت میں..."
رابعہ مجھ سے ڈرتی ہے!" میں نے زیرِ لب کہا اور تقدیر کے اس مذاق پر یا بے رحمی پر مجھے بیک وقت ہنسنا بھی چاہیے تھا اور رونا بھی۔ دیوانے سے یہ مت پوچھو 'دیوانے پر کیا گزری ہے؟'
"اوئے تم سے کیا بولا تھا میں نے۔ جاکے اس کے لیے کپڑے لادو۔ ابھی یہ کچھ ٹھیک لگتا ہے مجھے۔"
"میں کدھر سے لاؤں جی کپڑے۔ اپنے پاس تو یہی وردی ہے۔ لیکن...؟"
"لیکن کیا؟"
"سرجی۔" آپ نے بیگم صاحب کے کپڑے منگوائے تھے دھوبی سے..."
"دھوبی سے نہیں ڈرائی کلینرز سے مگر زنانہ کپڑے؟" دلاور نے ایک لمحہ غور کیا "خیر لے آؤ۔ جب کچھ نہیں ہے تو زنانہ مردانہ سب چلے گا اور اسے کیا اچھے بُرے سے۔ آجاتے ہیں اس کو ٹھیک ہے۔"
"اچھا جی، ہم بھی تھوڑا رونق میلہ دیکھ لیں" پیڈرو ہنسا اور چلا گیا۔
"دیکھو بھئی۔ اب مت پھاڑنا کپڑے۔ ورنہ میری گھر والی تو پیچھے پڑ جائے گی کہ دوسرے لاکے دو۔" دلاور نے کہا "زنانہ کپڑے پہن لوگے؟"
میں نے کہا "بہت شوق سے پہنوں گا جی۔ آج تک نصیب ہی نہیں ہوئے تھے۔ ایک بات بتائیں اپنے ڈی ایس پی صاحب!"
وہ جاتے جاتے رک گیا "بولو۔"
"میں کپڑے پہن لوں گا۔ اس کے بعد رابعہ سے مل سکتا ہوں؟"
"یہ مرضی ہے اس کی۔ ویسے میں سفارش کردوں گا کہ ابھی خطرے کی بات نہیں۔" دلاور نے بڑی شانِ استغنا سے کہا "ابھی تو اسے تشویش تھی کہ تمہارے ساتھ زیادتی نہ ہو۔ میں نے تسلی کردی ہے اس کی۔"
پیڈرو یا انسپکٹر عباسی کپڑے لے کر آیا تو زنانہ قمیص اور شلوار پہنتے ہوئے مجھے بہت عجیب لگا لیکن مکمل برہنگی کے احساس سے نجات پاکے مجھے بہت ذہنی سکون ملا۔ ابھی تک میں فرش پر گھٹنے سمیٹے بیٹھا تھا اور اسی حالت میں رہنے پر مجبور تھا۔ میری ٹانگیں اکڑ گئی تھیں اور کمر درد کرنے لگی تھی۔ اب میں نے اس حوالات جیسے پنجرے میں زخمی شیر کی طرح ٹہلنا شروع کیا جس کی انا سب سے زیادہ زخم خوردہ تھی۔ دیوانگی اور برہنگی کے بعد یہ ہیئت کذائی میرے احساسِ بے بسی اور رسوائی کے لیے تازیانۂ عبرت تھی۔
معلوم نہیں وہ فون کس وکیل کا تھا۔ دلاور نے جھوٹ بولا تھا یا واقعی فون منظر نے کیا تھا۔ اگر یہ عورت رابعہ ہوتی تو منظر بھی اس کے ساتھ آتا۔ اگر یہ تھانہ نہیں تھا تو پھر منظر یہاں کیسے فون کرسکتا تھا۔ پھر مجھے ایک اور خیال آیا۔ کہیں منظر کو خود کسی شکاری نے یہ نمبر نہ دیا ہو کہ فون کرکے دیکھ لو۔ تمہارے سکندرِ اعظم کو ہم نے شکار کرکے پنجرے میں کسی جانور کی طرح بند کررکھا ہے۔
اس خیال سے ہی مجھے پسینہ آگیا کہ منظر یا غالب کو یہاں بُلایا گیا اور ان کے ساتھ رابعہ یا نازو آگئیں تو میرے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہوگا۔ کیا پتا یہاں میری اسیری کے مناظر کی تصویر کشی جاری ہو اور اس پاگل خانے میں میری شرمناک حالت کی عکاسی کا مقصد مجھے بلیک میل کرنا ہو۔ خیر، مجھے نہ شرمندہ ہونے کی ضرورت ہے اور نہ ڈرنے کی۔ دلاور جیسا کمینہ شخص اس سے کہیں زیادہ کرسکتا ہے اور جتنا وہ آج سے پہلے کرچکا ہے اس کے مقابلے میں تو یہ کچھ بھی نہیں۔
وہ عورت جسے میں نے رابعہ سمجھا تھا اور تسلیم بھی کیا تھا حوالات سے تقریباً بیس گز دور چھت والے کمرے میں کسی بات پر ہنسی۔ میں نے چونک کے اُدھر دیکھا۔ رابعہ کبھی ایسے نہیں ہنستی تھی۔ وہ بڑی نرمی سے اور نزاکت کے ساتھ ہنستی تھی اور بہت کم۔ عام طور پر وہ مسکرا کے رہ جاتی تھی۔ کھُل کے شیشلی ہنستی تھی یا پھر نازو۔
ان سب کی یاد آئی تو میں دل مسوس کر رہ گیا۔ وہ سب میری گم شدگی سے کتنے پریشان ہوں گے۔ نازو نے انہیں بتادیا ہوگا کہ ہمیں سوئم میں شرکت کے لیے جانا تھا اور وقار یوسف نے ہمیں لے جانے کے لیے اپنی گاڑی بھیجی تھی۔ شک کی کوئی بات بھی نہیں تھی۔ وقار یوسف نے فون کرکے کہا تھا کہ وہ نقوی صاحب مرحوم کی سرکاری گاڑی نہیں اپنی گاڑی بھیج رہا ہے اور جو گاڑی آئی تھی وہ واقعی اس کی گاڑی تھی۔ اس جیسی دوسری نہیں تھی۔
ساری گڑبڑ ایک منٹ کے فرق سے ہوگئی تھی۔ نازو میرے ساتھ رہتی تو شاید صورتِ حال مختلف ہوتی۔ یہ ہوسکتا تھا کہ میں پہلے اسے پیچھے بٹھانے کے لیے دروازہ کھولتا تو وہ ڈرائیور کی صورت دیکھ لیتی یا اس شخص سے نمٹ لیتی جو پچھلی سیٹ پر ایسے دبکا ہوا تھا کہ مجھے نظر نہیں آرہا تھا۔ شکاری نادان نہیں تھے۔ انہیں معلوم ہوگا کہ مقابلہ ایک سے نہیں دو سے ہوگا اور دونوں مل کے ایک اکیلا اور دو گیارہ ہونے کا ثبوت دیں گے مگر وہ اس کا بھی انتظام کرکے آئے ہوں گے۔
نازو نے گاڑی کو روانہ ہوتے دیکھا ہوگا تو پہلے اسے یقین نہیں آیا ہوگا کہ میں اسے چھوڑ کے اکیلا جارہا ہوں۔ ممکن ہے ایک لمحے کے لیے اسے یہ خیال بھی آیا ہو کہ میں مذاق کررہا ہوں مگر ہم نقوی صاحب کے سوئم میں جارہے تھے اور یہ مذاق کا موقع نہ تھا پھر وہ سمجھ گئی ہوگی کہ گڑبڑ ہوگئی ہے۔
کسی نے یقیناً ٹیلی فون ٹیپ کرکے ہماری گفتگو سُنی تھی اور انہیں ہمارے پروگرام کا پتا چل گیا تھا۔ انہوں نے وقار یوسف کی گاڑی کو رابعہ کے گھر پہنچنے سے پہلے ہی چھین لیا۔ اصل ڈرائیور کو مار کے پھینک دیا یا ریوالور دکھا کے نیچے اُتار دیا اور شوفر کی وردی میں دوسرا شخص گاڑی چلا کے رابعہ کے گھر لے آیا۔ ایک روزمرہ کی لاشعوری عادت کے مطابق میں نے غور سے ڈرائیور کا چہرہ دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ وردی میں آدمی کی شخصیت ایسے کیموفلاج ہوجاتی ہے کہ سب چہرے ایک سے نظر آنے لگتے ہیں۔ میں نے تو ڈرائیور کی طرف نظر اُٹھا کے بھی نہیں دیکھا تھا۔ ایک اعتماد یا اطمینان کی بات یہ تھی کہ گاڑی وقار یوسف کی ہے تو ڈرائیور بھی وہی ہوگا لیکن ایسا نہیں تھا۔
مجھے اغوا کرنے کے لیے آنے والوں نے لڑنے بھڑنے کا یا لڑائی کرنے کا خطرہ مول نہیں لیا تھا۔ انہیں علم ہوگا کہ مجھے چند سیکنڈ کی مہلت بھی مل گئی تو میں ان کا باجا بجادوں گا اور اتنی دیر میں نازو پہنچ گئی تو یک نہ شد دو شد والی بات ہوگی۔ جیسے آندھی طوفان کے ساتھ زلزلہ بھی آجائے۔ انہوں نے بلاتاخیر میرے سر کا نشانہ

لے کر وار کیا اور مجھے گاڑی میں ڈال کے فرار ہو گئے۔ نازو ساتھ ہوتی تو شاید وہ ریوالور سے کام لیتے اور ہمیں مجبور کردیتے کہ شرافت سے گاڑی میں بیٹھ جائیں۔

بہت سوچنے پر بھی مجھے یاد نہیں آتا تھا کہ گاڑی میں کتنے لوگ تھے اور میں نے بے ہوشی سے پہلے کوئی آواز سُنی تھی یا نہیں۔ مجھے یہ اندازہ بھی نہیں تھا کہ میں کتنا عرصہ ہوش سے بے گانہ رہا۔ ایک گھنٹا' ایک دن۔ ایک دن رات۔ یہ اسی شام کے بعد آنے والی رات تھی جب مجھے اغوا کیا گیا تھا یا اس سے اگلی۔ چوٹ شدید تھی مگر ایسی بھی نہیں کہ میں چوبیں گھنٹے سے زیادہ بے ہوش رہتا۔ ایسی چوٹ سے تو اللہ ہی بچائے ورنہ دو چار گھنٹے گزر جانے کے بعد ڈاکٹر بھی یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہتے۔ آدمی مفلوج ہو سکتا ہے۔ اندھا ہو سکتا ہے یا مہینوں زندہ لاش کی طرح گزار سکتا ہے۔

سوتے جاگتے وقت کا حساب رکھنا کتنا آسان کام ہے لیکن بے ہوشی سے ہوش کی منزل تک وقت کی مسافت کا اندازہ کرنا عملاً ناممکن ہے۔ عام حالات میں گھڑی بھی اتنی اہم نہیں رہتی۔ آدمی خود بھی گھٹتے بڑھتے سایوں سے وقت کا صحیح اندازہ کرلیتا ہے لیکن اس وقت مجھے دن تاریخ اور وقت کی پیمائش ظاہر کرنے والے اس آلے کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی تھی اس کے بغیر میں مجبور تھا کہ سُنی سُنائی پر اعتبار کروں جو بتایا جائے اسے ہی سچ مانوں۔ سر پر ضرب لگا کے مجھے بے ہوش کرنے کے بعد جو لوگ مجھے یہاں لائے ہوں گے انہیں بھی معلوم ہوگا کہ بہت جلد مجھے ہوش آجائے گا۔ زیادہ امکان یہی تھا کہ شام سے رات تک چند گھنٹے ہی گزرے ہوں گے مگر کسی کو لمبے عرصے کے لیے بے ہوش رکھنا کوئی مشکل کام نہیں۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ مجھے مسلسل خواب آور دواؤں کے زیرِ اثر رکھا گیا ہو۔ ہر چھ آٹھ گھنٹے بعد انجکشن لگا دیا گیا ہو۔

مجھے اُمید تھی کہ یہ ڈراما زیادہ لمبا نہیں ہوگا۔ چوہدری دلاور کیا چاہتا ہے۔ یہ بہت جلد معلوم ہو جائے گا۔ آٹھ فٹ دس فٹ کے اس پنجرے میں مسلسل چکر لگاتے ہوئے میں نے عجیب سی اعصابی بے چینی محسوس کی۔ بے سکونی کی یہ کیفیت اس شخص کی حالت سے مختلف نہ تھی جس کا نشہ ٹوٹ رہا ہو۔ مقررہ وقت پر طلب پوری نہ ہو تو اعصابی نظام احتجاج کی اذیت برداشت کرتا ہے۔ شاید مجھے بھی خواب آور ادویات سے ذہنی و جسمانی طور پر ناکارہ کردیا گیا تھا لیکن اب ان دواؤں کا اثر ختم ہو رہا تھا۔

آخر مجھے یہاں کب تک کسی جنگلی جانور کی طرح قید میں رکھا جائے گا؟ میرے دوست اور ساتھی میری پُراسرار گم شدگی سے کتنے پریشان ہوں گے۔ اپنے تمام وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے انہوں نے مجھے کہاں کہاں تلاش کیا ہوگا۔ انہوں نے سارے تھانوں سے اور تھانے داروں سے رابطہ کیا ہوگا۔ پولیس کے مخبروں سے پوچھا ہوگا۔ منظر اور وقار یوسف وکیل تھے چنانچہ ا[illegible] تعلق دو طرفہ تھا۔ ایک طرف وہ پولیس کے تمام قانونی اور [illegible] قانونی اعمال سے باخبر رہتے تھے تو دوسری طرف وہ ملزموں کے [illegible] وار اور مددگار تھے اور جرائم کی دنیا کے تمام رازہائے سربستہ [illegible] واقف تھے۔ انہوں نے اسپتالوں کے شعبۂ حادثات میں بھی [illegible] دیکھا ہوگا اور مُردہ خانے پہنچنے والی لاوارث لاشوں میں بھی [illegible] تلاش کیا ہوگا لیکن یہ کوئی گمنام جگہ تھی جہاں مجھے قید کردیا گیا [illegible] یہ جگہ اس شہر میں کہیں بھی ہو سکتی تھی۔ یہ دوسرا قصبہ یا شہر [illegible] ہو سکتا تھا۔ جب تک مجھے اغوا کرنے والے خود راہنمائی نہ کر[illegible] میرے دوست اور مددگار میرا سراغ نہیں لگا سکتے تھے۔

رابعہ بن کے یہاں آنے والی عورت خاموش تھی یا آہستہ آواز میں باتیں کررہی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ اور دلاور [illegible] کے سوا سب کچھ کررہے ہوں۔ میں نے صرف ایک بار اس کی [illegible] سُنی تھی لیکن اس سے آواز کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔

پیڈرو آدھے گھنٹے بعد باہر سے چائے کی ٹرے کے ساتھ نمودار ہوا اور سیدھا کمرے میں چلا گیا۔ ایک عجیب بات یہ تھی کہ دلاور خود تو پولیس کی وردی پہن کے ڈی ایس پی بن گیا تھا اور اس نے [illegible] نام بھی احسان الحق کرلیا تھا۔ پیڈرو پولیس انسپکٹر عباسی کا رول کررہا تھا اور وہ بھی مصر تھے کہ میں خود کو اکبر علی سمجھوں مگر اپنا نام انہوں نے نہیں بدلا تھا۔ اپنی مصلحت وہ خود سمجھتے تھے۔ میرے خیال میں ان کا مقصد میرے ذہن میں اُلجھن اور انتشار پیدا کرنے کے سوا کچھ نہ تھا۔ اب مجھے صبر' حوصلے اور استقامت کے ساتھ ان کا مقابلہ کرنا تھا اور یہ دیکھنا تھا کہ ان کا اگلا قدم کس سمت میں اُٹھتا ہے۔

پیڈرو چائے کی پیالی اُٹھائے بڑبڑاتا ہوا باہر آیا' اس نے پیالی میری طرف بڑھا کے کہا "عیش کرو' شہزادے۔"

پیالی کے بجائے میں اس کی کلائی بھی پکڑ سکتا تھا اور [illegible] جھٹکے سے سلاخوں کی طرف بھی کھینچ سکتا تھا۔ اس کا ایک بازو سلاخوں کے اندر ہوتا اور وہ خود باہر تو میرے لیے اس کے بازو کو جسم سے الگ کرنا بھی ممکن تھا اور اس کی گردن توڑنا بھی مگر اس سے مجھے کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ اُلٹا نقصان یہ ہو سکتا تھا کہ دلاور مشتعل ہو کے مجھے گولی ماردے۔

پیڈرو نے ایک فحش اشارہ کرتے ہوئے کہا "یار تم [illegible] عورت ہوتے نا تو..."

اس کی باقی بات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ دلاور کا قابل ماتحت تھا۔ اتنا ہی سفاک' اتنا ہی پُرفریب اور عیار۔ اتنا ہی اداکار۔ اس کی توقعات پر ہمیشہ پورا اُترنے والا۔ بھروسے کے اور وفادار۔ فرق صرف مثبت اور منفی سوچ کا تھا ورنہ میں اور [illegible] یا غالب بھی ایک دوسرے کے ایسے ہی قابلِ اعتماد ساتھی [illegible]

اس وقت بھی پیڈرو اپنے مالک اور ان داتا چوہدری دلاور کی ہدایات کے عین مطابق اپنا یہ رول نبھا رہا تھا اور یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ حلیے اور نام کی تبدیلی سے وہ مجھے دھوکا نہیں دے سکتا وہ اپنا کام بڑی دل جمعی سے کررہا تھا۔

چائے ان حالات میں ایک نعمتِ غیر مترقبہ ثابت ہوئی۔ میں نے خود کو خاصا تازہ دم محسوس کیا اور میں دیوار سے پیٹھ لگائے بیٹھ گیا۔ ابھی تک مجھ پر دلاور کے عزائم واضح نہیں ہوئے تھے۔ یہ ڈراما بچگانہ بلکہ احمقانہ تھا اور دلاور احمق بہرحال نہیں تھا کہ سوچے سمجھے بغیر کوئی ایسا کام کرے جس میں وقت ضائع ہو لیکن حاصل کچھ نہ ہو۔ وہ اغوا کرانے کے بعد مجھے پولیس کے حوالے کرسکتا تھا۔ یہ سب سے آسان کام تھا۔ پولیس کو شاید درجن بھر مقدمات کے سلسلے میں میری تلاش تھی اور ان میں سے نصف مقدمات انتہائی سنگین نوعیت کے تھے۔ جن میں میری ضمانت بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ دو مقدمات قتل کے تھے جن میں مفرور مجرم کی حیثیت سے مجھے زندہ یا مُردہ گرفتار کرنے یا میری گرفتاری کے کارِ خیر میں معاون ثابت ہونے والے کے لیے نقد پچاس ہزار روپے کا انعام تھا۔ دلاور کے لیے نہ سہی پیڈرو جیسے لوگوں کے لیے یہ بڑی رقم تھی اور قانونی طریقے سے مجھے ٹھکانے لگا کے وہ بہت سے مسائل سے نجات حاصل کرسکتے تھے جو میں نے پیدا کر رکھے تھے۔

اگر دلاور اینڈ کمپنی نے ایسا نہیں کیا تو اس کا سبب صرف ایک خوف ہو سکتا تھا کہ بعد میں ایم آر ایس کے مجاہد بھی جارحانہ کارروائی پر اُتر آئے تو ان کا جینا حرام ہو جائے گا۔ وہ ہر قیمت پر مفاہمت چاہتا تھا۔ مخالفت نہیں۔ اس کی اصل کمزوری وہ ماضی تھا جس کی داستان کے ہر ورق' ہر سطر اور ہر حرف کے عینی گواہ ہم تھے۔ وہ شہرت کے راستے سیاست کی منزل تک پہنچنا چاہتا تھا اور اپنے مستقبل کی نیک نامی کو ماضی کے کسی حوالے سے داغ دار کرنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔ غالب اور نازو کے میدانِ مخالفت میں اُتر آنے سے یہ رسک اور بڑھ گیا تھا اور مجھے اس کے مقابلے کے لیے پہلے سے زیادہ مؤثر طاقت حاصل ہو گئی تھی۔ اگر پولیس اس کے سیاہ کارناموں سے پردہ اُٹھاتا تو وقار یوسف' منظر یا رابعہ جیسے وکیل اسے عدالت میں کھینچ لیتے پھر اس کے بخیے اُدھڑتے تو مزید تشہیر ہوتی۔ بدلے ہوئے حالات کا تقاضا تھا کہ دلاور ساری بدمعاشی چھوڑ دے۔ ناجائز دھندوں سے تائب ہو اور قتل و خونریزی کا باب ہمیشہ کے لیے بند کردے۔ یہ اسی وقت ممکن تھا جب اس کے اور میرے درمیان مُجرّامن بقائے باہمی کا معاہدہ طے پاجائے۔ اس کے نقطۂ نظر سے یہ ممکن تھا لیکن میرے یقین کے مطابق ناممکن۔

مجھ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی تھی جو کچھ عجیب سی بات تھی۔ بے ہوشی کی طویل نیند سے جاگنے کے بعد میں خود کو ذہنی طور پر بہت مستعد اور چوکس محسوس کررہا تھا۔ میرا جسمانی اضطراب اور بے سکونی کی کیفیت بھی ختم ہو گئی تھی اور میرا جی چاہتا تھا کہ فرش پر دراز ہو جاؤں۔ شاید مجھے چائے میں پھر خواب آور دوا دی گئی ہوگی۔ میں نے بند ہوتی آنکھوں کو بڑی مشکل سے وا کیا اور سر گھما کے چھت والے کمرے میں سے اس عورت کو برآمد ہوتے دیکھا جو رابعہ بن کے آئی تھی۔ برآمدے میں لگے ہوئے بلب کی روشنی میں وہ مجھے بالکل رابعہ لگی۔ اس کا لباس بھی بالکل رابعہ کے لباس جیسا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ اس قسم کا ایک سوٹ اسے پسند تھا جس میں سیاہ و سفید کا بڑا دلفریب امتزاج تھا۔ کیا اسے اتفاق ہی سمجھنا چاہیے کہ اس عورت نے رابعہ کا سوٹ پہن لیا ہے لیکن رابعہ کا یہ سوٹ اس نے کہاں سے حاصل کیا؟ بات کپڑے کے ڈیزائن کی نہیں تھی۔ اس قمیص کے گلے پر اور آستینوں پر' نچلے بارڈر پر اور شلوار کے پائنچوں پر ایک جیسا کڑھائی کا کام تھا یا شاید کروشیا کی بنائی کا۔ پھر کیا یہ عورت سچ مچ رابعہ تھی؟ میں نے نیم خوابیدہ ذہن کے ساتھ سوچا۔

میری آنکھیں بند ہو چکی تھیں۔ جب میں نے رابعہ کی آواز سُنی۔ وہ میرے بہت قریب تھی "سکندر۔ میری طرف دیکھو۔"

"کون ہو... تم؟" میں نے آنکھیں کھولنے کی ناکام کوشش کی

"میرا نام... اکبر علی ہے۔"

"کیا ہو گیا ہے تمہیں' میں رابعہ ہوں۔"

"جھوٹ۔ تمہارا چہرہ... اور یہ... کپڑے رابعہ کے ہیں۔ باقی سب دھوکا ہے۔" میں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا "تمہاری... آواز... ہاں... آواز بھی وہی ہے... کیا تم واقعی..."

"سکندر۔ میں رابعہ ہی ہوں۔ میرے ساتھ چلو گے؟"

"مجھے یہ... اپنے ڈی ایس پی۔ اپنے چوہدری دلاور صاحب... سوری' احسان الحق صاحب... یہ نہیں جانے دیں گے... اور وہ... سؤر کا بچہ انسپکٹر عباسی' تمہیں معلوم ہے نا... وہ... پیڈرو ہے..."

اپنی انتہائی کوشش کے باوجود میں خود فراموشی کے غالب

آتے ہوئے احساس سے نجات حاصل کرنے میں ناکام رہا۔ میں چاہتا تھا کہ آنکھیں کھول کے رابعہ کو دیکھوں۔ وہ میرے اتنے قریب تھی۔ میں اس کی آواز سن رہا تھا۔ اس آواز کو پہچان بھی رہا تھا۔ وہ خوشبو جو رابعہ استعمال کرتی تھی جیسے اس فضا میں شامل تھی جس میں میں سانس لے رہا تھا۔ انکار یا تذبذب کی کیفیت اب ختم ہوچکی تھی۔ مجھے اس کے رابعہ ہونے کا یقین آچکا تھا لیکن اس یقین نے میری کوئی مدد نہیں کی۔ میں سوگیا یا بے ہوش ہوگیا۔

جب ایک بار پھر میں نے آنکھیں کھول کے دیکھا تو مجھے گھومتا ہوا آسمان نظر آیا۔ آسمان کسی نیلی چھتری کی طرح تھا جس میں جا بجا سفید پیوند لگے ہوئے تھے۔ یہ ضرور بادل ہوں گے۔ میں نے پھر آنکھیں کھولیں اور بند کرلیں۔ آسمان سمٹ کے ایک دائرے کے برابر رہ گیا تھا اور یہ دائرہ واقعی چھتری جتنا تھا۔ اس چھتری کے چاروں طرف سے نامانوس چہرے جھانک رہے تھے۔ گندے چہرے' بوڑھے اور بالوں بھرے چہرے۔ گنجے سروالے چہرے۔ مونچھوں والے اور غلیظ دانتوں والے چہرے۔ غالباً میں کسی کنوئیں کی تہ میں لیٹا ہوا تھا اور وہ سب اوپر کنوئیں کی گول منڈیر پر سے مجھ پر خندہ زن تھے۔ ان کی آنکھوں میں تمسخر تھا اور بے رحمی تھی۔ کسی کو مجھ سے ہمدردی نہیں تھی۔ کوئی مجھے اس کنوئیں سے نکالنے کے لیے ہاتھ بڑھانے پر آمادہ نہ تھا۔ لیکن میں..... میں آخر اس کنوئیں کی تہ میں کیسے لیٹ گیا تھا۔ میں خود کنوئیں میں گرا تھا یا کسی نے مجھے دھکیل دیا تھا؟ کیا عجیب بات ہے۔ کنوئیں کی سطح ہموار ہے اور اس میں پانی کیوں نہیں ہے۔ پانی ہوتا تو میں ڈوب نہ جاتا۔

اچانک مجھ پر انکشاف ہوا کہ یہ کنوئیں کی تہ نہیں ہے بلکہ میں سخت زمین پر لیٹا ہوا ہوں اور میرے اردگرد تماشائی حلقہ بنائے کھڑے ہیں۔ آوازوں کا جو شور پہلے واضح نہیں تھا اب صاف سنائی دینے لگا تھا۔

"اوئے پاگل ہے کوئی۔"

"پاگل تے خیر ہیگا جے پر اے وی پتا لگے کہ تیرا ماما ہے کہ مامی" کوئی ہنسا۔

"داڑھی مونچھ سے ماما ہے' کپڑوں سے مامی" جواب ملا "میرا ماما تیری مامی۔"

"یہ کہہ نا کہ اوپر سے ماما ہے نیچے سے مامی۔ کہیں درمیان کی چیز نہ ہو یار" میرا دوسرا بھانجا بولا۔

کسی نے بزرگانہ سختی سے کہا "کیا بک بک لگا رکھی ہے۔ پتا نہیں کون ہے بے چارہ۔"

"بے چارہ کہ بے چاری۔ پہلے یہ تو دیکھ لو بزرگو۔ اچھی طرح ٹٹول کے۔"

میں اُٹھ بیٹھا۔ وہ سب ایک دم سیدھے ہوگئے جو رکوع کی حالت میں تھے اور زیادہ تفصیل سے میرا مطالعہ کررہے تھے جیسے میں خلائی مخلوق ہوں یا ازمنہ قدیم کی کوئی تاریخی چیز۔ جو کھڑے ہوئے تھے وہ بھی ایک قدم پیچھے ہٹ گئے۔ میں نے دُھندلائی ہوئی نظروں سے تماشا دیکھنے والوں کو دیکھا۔ وہ سب عام لوگ تھے۔ راہ گیر جو جلدی میں نہیں ہوتے اور ان کے پاس ہر تماشائے سرراہ گزر کے لیے وقت کی کمی کوئی مسئلہ نہیں ہوتی۔ فٹ پاتھ پر مُرغے لڑ رہے ہوں یا کوئی ٹرک کسی بچے کو کچلتا ہوا گزر گیا ہو۔ ان کی دلچسپی یکساں ہوتی ہے۔ فی الحال ان کی دلچسپی کا مرکز میں تھا۔ ایک صحت مند نظر آنے والا جوان آدمی۔ جس کی شیو بڑھی ہوئی تھی اور جس نے مضحکہ خیز انداز میں زنانہ ریشمی کپڑے پہن رکھے تھے۔ کپڑے قیمتی اور صاف ستھرے تھے مگر میرے جسم پر بہت تنگ تھے۔

میں نے بوجھل سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کے کہا "میں کہاں ہوں؟"

کچھ لوگ میرے سوال پر ہنسے "کسی دوسری دنیا سے آیا ہے بندہ۔"

کھچڑی داڑھی اور صافے والا ایک شخص گھٹنوں کے بل میرے پاس بیٹھ گیا "کون ہے تو پتر۔ کیا نام ہے تیرا؟"

میں نے بے خیالی میں کہا "اکبر علی..... نہیں سکندر....."

میرے ناخلف بھانجے پھر ہنسے "اس کی یادداشت گم ہوگئی ہے چاچا۔ جیسے تمہاری بھوری بھینس گم ہوگئی تھی۔"

"پھر تھانے سے ملی تھی۔"

ایک اور شخص میرا ہمدرد ثابت ہوا "چلو پھٹو ادھر سے۔ فضول گلاں ہی گلاں۔ کرنا کرانا کچھ نہیں۔ سارا دن مستی....."

"اوئے چل یار۔ ادھر تو بڑی گرما گرمی ہے" میری جنس کے بارے میں سوال جواب کرنے والے کھسک لیے۔

"کوئی ٹھکانا ہے تمہارا؟" دوسرا شخص بھی میرے پاس بیٹھ گیا۔ "تم کو ادھر پہلے کبھی دیکھا نہیں۔ ماں پیو' بہن بھائی کہاں ہیں؟"

میں اب سنبھل گیا تھا "میں سب بتادوں گا۔ پہلے مجھے یہاں سے نکالیں۔ میں بڑی مصیبت میں پڑ گیا تھا۔"

"چاچا ذرا خیال سے۔ ایسا نہ ہو ہمدردی گلے پڑ جائے" کسی نے مشورہ دیا۔

"آہو جی۔ زمانہ خراب ہے۔ میری مانو تو اسے سیدھا تھانے لے جاؤ۔" یہ دوسرا مشورہ تھا "ادھر سب پتا چل جائے گا۔"

ایک دم ان سب کے درمیان مجھے تھانے لے جانے پر اتفاقِ رائے ہوگیا "یہ ٹھیک ہے۔" کئی آوازیں آئیں۔

"نہیں۔ مجھے گھر جانے دیں۔"

"اوئے تجھے تو اپنا نام بھی یاد نہیں۔ اکبر علی ہے کہ سکندر؟"

میں نے کہا "آپ یقین کریں۔ میری یادداشت متاثر نہیں ہوئی ہے اور نہ میں کچھ بھولا ہوں" میں نے کہا۔

"پھر یہ کیا ہے..... یہ حُلیہ.....؟"

میں نے کہا "یہ بڑی لمبی اور عجیب کہانی ہے۔ آپ لوگ اس چکر میں مت پڑیں۔ میں خود ہی لاہور چلا جاؤں گا۔"

اب بڑے میاں بھی مسکرانے لگے "اوئے پتر۔ لہور نہیں تو کیا یہ کراچی ہے!"

"مجھے۔ میرا مطلب ہے' یہ جگہ کون سی ہے؟" میں نے بات بنانے کی ناکام کوشش کی "میں تو خود لاہور ہی میں رہتا ہوں۔"

اس سے میرا بیان مزید مشکوک ہوگیا "لاہور میں رہتا ہے بندہ اور کہتا ہے لاہور جاتا ہے۔"

"اوئے یار' جھلا ہے کوئی۔"

"جھلا نہیں جی۔ گلاں ٹھیک ٹھاک کرتا ہے۔ یہ کوئی اور ہی چکر ہے۔"

"اس سے پوچھیں چاچا جی کہ آج دن کیا ہے۔ تاریخ کیا ہے۔ ابھی پتا چل جائے گا کہ پاگل بن رہا ہے یا....."

اس بات نے مجھے نروس کردیا "بھائی صاحب۔ آپ کیا سمجھتے ہیں۔"

"چھوڑ اسے کہ میں کیا سمجھتا ہوں۔ بتا آج سوموار ہے کہ منگل۔"

میں بُری طرح پھنس گیا تھا۔ یہی ایک ایسا سوال تھا جس کا جواب میں نہیں دے سکتا تھا۔ میں خود نہیں جانتا تھا کہ وقار یوسف کے گھر سے اغوا ہونے کے بعد اس تماش گاہ تک میں نے رسوائی کا یہ سفر کتنے عرصے میں طے کیا۔ اگر میں کہتا کہ مجھے معلوم نہیں تو خود ثبوت فراہم کردیتا کہ میں دیوانہ ہوں۔ اس سے بہتر تھا کہ میں چانس پر جُوا کھیلوں اور اندھیرے میں تیر چلادوں۔

میں نے کہا "سوموار۔ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔"

ایک دم سوالیہ چہرے قہقہہ بار ہوگئے۔ کسی نے کہا "اوئے پاگل دے پتر۔ آج تو جمعرات ہے۔"

مجھ سے سوال پوچھنے والا بہت کائیاں تھا۔ اس نے مجھے ففٹی ففٹی کا چانس نہیں دیا تھا۔ میرا جواب سو فیصد غلط ہوگیا تھا۔

"دیکھیں۔ آپ لوگ غلط سمجھ رہے ہیں۔ وہ بات کچھ ایسی ہے۔" میں نے ہجوم کے جارحانہ تیور دیکھتے ہوئے دفاعی انداز اختیار کیا۔

"تاریخ پتا ہے؟"

میں نے بے بسی سے سوال کرنے والے کو دیکھا۔ "سوئم والے دن تو بارہ تاریخ تھی....."

"کس کا سوئم۔ کون مرگیا تھا تیرا؟"

"شاید اسی صدمے کا اثر ہے۔"

"او نہیں جی۔ مکر کررہا ہے۔ پاگل نہیں تو پھر نشے باز ہے یا انڈین جاسوس۔"

صورتِ حال ایک دم خطرناک ہوگئی تھی۔ میں دن اور تاریخ بتاتا تو اپنا اعتبار قائم کرلیتا اور شاید کوئی ہمدرد دل رکھنے والا میری وضاحت بھی قبول کرلیتا مگر اب رائے عامہ مجھے تھانے پہنچانے کے حق میں تھی اور میرے گرد ہجوم نے اپنا حلقہ تنگ کرلیا تھا۔ میں نے پہلے سوچا کہ ایک جست لگاؤں اور دو چار کو گرا کے نکل بھاگوں مگر اس میں خطرہ یہ تھا کہ ہجوم میرا تعاقب کرتا اور میرے پیچھے شور مچاتے ہوئے دوڑنے والے جب 'پکڑو' پکڑو' چلاتے تو آگے والے بھی میرا راستہ روکتے۔ یہ کوئی چھوٹا سا بازار تھا۔ ابھی تک میں اس علاقے کو پہچان نہیں پایا تھا حالانکہ مجھے یقین تھا کہ لاہور کا چپہ چپہ میرا دیکھا بھالا ہے۔ آج مجھے اندازہ ہوا کہ میرا یقین باطل تھا۔ پیدائش کے بعد ساری عمر لاہور کی گلیوں کی پچاس سال تک خاک چھاننے والا بھی ایک نظر دیکھ کے نہیں بتا سکتا کہ وہ کس محلے کی کس گلی میں ہے۔

دو چار ہاتھ میری طرف بڑھے اور انہوں نے مجھے کسی خطرناک مجرم کی طرح پکڑلیا۔ ذلت و رسوائی کے اس تماشے میں جہاں میرے لیے ذہنی اذیت تھی وہاں اطمینان کا ایک پہلو بھی تھا کہ ابھی تک کسی نے مجھے پہچانا نہیں اور مجمع دیکھ کے کوئی پولیس والا اِدھر نہیں آیا۔

میں نے نرمی سے کہا "بھائی صاحب۔ میں بھاگ نہیں رہا ہوں۔ آپ مجھے تھانے لے جانا چاہتے ہیں تو شوق سے چلیں میرے ساتھ لیکن ایسے مت پکڑیں مجھے۔"

کسی نے مجھے پیچھے سے دھکیلا "چل آگے ہو۔ باتیں مت کر زیادہ۔"

سب سے بڑا خطرہ انڈین جاسوس قرار دیے جانے کی صورت میں پیدا ہوسکتا تھا۔ جنگ ابھی ختم ہوئی تھی اور ہندوستان کے خلاف نفرت کے جذبات انتہا پر تھے۔ بھارتی جاسوس ہونے کے شبے میں بہت سے بے گناہ پٹ چکے تھے۔ کوئی نیم دیوانہ یا حُلیے سے عجیب نظر آنے والا شخص مشکوک حرکت کرتا نظر آتا تھا تو پبلک کی انٹیلی جنس تفتیش کے معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیتی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ اچانک کسی جیالے کا جذبۂ حب الوطنی جوش میں آگیا اور اس نے جلد بازی سے کام لیتے ہوئے میرے بھارتی جاسوس ہونے کا اعلان کردیا تو عوامی جذبات ایک دم بھڑک اٹھیں گے۔ ہجوم کے صرف جذبات ہوتے ہیں۔ عقل صرف ان کے پاس ہوتی ہے جو ان جذبات سے کھیلتے ہیں۔

میں نے سخت لہجے میں کہا "میرے حُلیے پر مت جاؤ۔"

پیچھے سے کسی نے میرے ہاتھ ماردیا "اور کیا صورت پر جائیں تیری....."

میں نے دہاڑ کے کہا "پولیس اسٹیشن چلو پھر معلوم ہوجائے گا کہ میں کون ہوں۔"

لیکن اب لوگوں کا موڈ بدل چکا تھا۔ وہ وقت جب میں اسی شہر کے معتبر حوالوں سے رائے عامہ کو ہموار کرسکتا تھا بے مقصد باتوں میں ضائع ہوگیا تھا۔ اب کوئی دلیل یا حوالہ میرے کام نہیں آسکتا

تھا۔ زیادہ خرابی میرے حُلئے نے پیدا کی تھی۔ اگر میں پھٹے پُرانے کپڑوں میں ہوتا لیکن وہ مردانہ کپڑے ہوتے تو تماشا نہ بنتا۔ یہ سمجھا جاتا کہ میں کوئی غریب آدمی ہوں جو بیماری یا فاقہ کشی کے باعث سڑک پر گر کے بے ہوش ہو گیا تھا لیکن ان لوگوں نے مجھے جس حالت میں دیکھا تھا وہ شک پیدا کرنے والی تھی۔

میرے دہاڑنے کا الٹا اثر ہوا "واہ جی۔ ہم پر گرمی کھاتا ہے۔"

"ابھی پاگل کُتے کی طرح کاٹ لے گا۔"

"دو ہاتھ اور مارو ذرا کس کے" کسی نے مشورہ دیا۔

اب میرے لیے اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ میں مارنے والوں کی ایسی تیسی کر کے جائے واردات سے فرار ہو جاؤں۔ یہ میرے لیے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ چند سیکنڈ میں دائیں بائیں والے اوپر نیچے ہو گئے۔ میں نے ہر طرف ہاتھ پیر چلائے اور یہ نہیں دیکھا کہ کس کو کہاں لگی۔ کچھ تو وہیں لمبے لیٹ گئے۔ دو پیٹ پکڑ کے دُہرے ہو گئے۔ باقی چلاتے ہوئے بھاگے۔

میں نے میدان صاف دیکھا تو بے تحاشا بھاگا۔ نہ جانے کس نے چلا کے کہا "دیکھا۔ میں نے کہا تھا نا۔ بھارتی جاسوس ہے۔"

"انڈین کمانڈو ہے" کوئی اور چِلایا "خبردار۔ اس کے پاس پستول ہو گا۔"

"دستی بم پھینک دے گا۔"

دوسرے شور مچانے والے زیادہ تھے مگر کچھ واقعی جی دار لوگ تھے جو میرے تعاقب میں دوڑتے چلے آ رہے تھے اور پکڑو پکڑو بھی چلا رہے تھے۔

یہ ریس کب اور کہاں ختم ہو گی؟ اس کا انحصار میری کوشش سے زیادہ تقدیر پر تھا۔ مجھے راستہ صاف ملتا۔ میں کسی بند گلی میں داخل نہ ہوتا۔ ٹھوکر کھا کے نہ گرتا یا کسی سے ٹکرا کے نہ رُکتا تو شاید ایک کلومیٹر دوڑ سکتا تھا لیکن یہ بھی ہو سکتا تھا کہ تعاقب کرنے والوں میں کوئی میراتھن ریس (۲۶ میل کی دوڑ) میں حصہ لینے والا شامل ہو۔ اس سے میں کسی طرح بھی نہیں بچ سکتا تھا کیونکہ وہ بڑی مستقل مزاجی سے دوڑے گا اور اس کا اسٹیمنا بھی میرے مقابلے میں بہت زیادہ ہو گا۔ عام لوگوں کا حال تو چند منٹ بعد مجھ سے بھی بُرا ہو گا۔

میں خود آؤٹ آف پریکٹس تھا ورنہ تین چار کلومیٹر کی دوڑ ایک زمانے میں معمول کی بات تھی اور میں ہر صبح جاگنگ کرتا تھا۔ اس وقت سب سے زیادہ پریشانی لباس کی وجہ سے ہو رہی تھی۔ جاگنگ سوٹ میں شاید میری کارکردگی بہت بہتر ہوتی لیکن تنگ اور چھوٹے زنانہ شلوار قمیص میں دوڑنا مشکل کام بھی تھا اور شرمناک بھی۔

میں پیچھے دیکھے بغیر بھاگتا گیا اور گلیوں سے گزرتے ہوئے راہ میں حائل ہونے والے ہر شخص کو دھکا دے کر گراتا گیا۔ میری خواہش تھی کہ کوئی ٹیکسی آ جائے تو میں سامنے جا کے اسے روک لوں اور زبردستی اس میں بیٹھ کے ڈرائیور کو چلنے پر مجبور کر دیتا یا جان بچا کے نکلنے کی خاطر میں کسی پرائیویٹ کار والے کو بھی کے باہر پھینک دیتا اور خود اس کی کار لے کر بھاگ جاتا مگر بدقسمتی کہ اس راستے پر میرے قریب سے نہ کوئی ٹیکسی گزری نہ کار۔

حیرت انگیز رفتار سے میں نے ایک کلومیٹر یا اس سے بھی زیادہ فاصلہ طے کرنے میں پانچ چھ منٹ ہی لگائے ہوں گے۔ تنگ گلیوں سے گزر کے میں پھر کسی سڑک پر پہنچ گیا تھا جو نسبتاً غیر آباد تھی۔ مجھے امید تھی کہ تعاقب کرنے والے پیچھے رہ گئے ہوں گے تو ہار کے بیٹھ گئے ہوں گے یا اس فضول تعاقب سے اُکتا کے لوٹ گئے ہوں گے۔ ایک باریش نوجوان کو اپنے پیچھے دیکھ کے مجھے حیرت ہوئی۔ وہ شور مچائے بغیر خاموشی سے میرا پیچھا کر رہا تھا اور اس کی مستقل مزاجی سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ لمبی دوڑ میں بالآخر مجھے شکست دینے کا ارادہ رکھتا ہے۔

ایک آدمی سے نمٹنا آسان تھا۔ میری سانس بھی اتنی پھولی ہوئی تھی کہ میں ہانپ زیادہ رہا تھا' دوڑ کم رہا تھا۔ رفتار کم کر کے میں سڑک کے ایک کنارے ٹھہر گیا۔ عزم و استقلال کا پیکر مولوی جیسے ہی مجھے پکڑنے کے لیے حملہ آور ہوا میں نے اس کی ایک کلائی پکڑلی اور اسے ایک جھٹکا دے کر پہلے اپنی طرف کھینچا پھر میں ذرا گھوم گیا اور مولوی نے "اوئے' اوئے" کرتے ہوئے نصف دائرے میں رسی سے بندھے ہوئے پتھر کی طرح چکر کاٹا پھر میں نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ خطِ مستقیم میں گیا اور ایک پُرانے دروازے سے ٹکرایا جس کے سامنے ٹاٹ کا پردہ لہرا رہا تھا۔ کواڑ شاید پہلے ہی کھلے ہوئے تھے۔ ایک دھماکے کے ساتھ میں نے اسے اندر جاتے دیکھا لیکن پھر میری توجہ ایک گاڑی کی طرف ہو گئی جو بریک لگا کے میرے پیچھے آ گئی تھی۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ کسی دیوانے کے خواب کا حصہ تھا یا کسی بے سروپا کامیڈی فلم کا سین۔ سڑک کے دوسری جانب سے دو پولیس والے میری طرف لپکے۔ ان میں سے ایک ٹریفک والا تھا اور دوسرا عام وردی میں کوئی کانسٹیبل جو اس کے ساتھ گپ شپ میں مصروف تھا۔ مضحکہ خیز حُلئے میں ایک عورت نما مرد کو دوڑتا دیکھ کر وہ پہلے ہی متوجہ ہو گئے تھے۔ مولوی کے ساتھ میری ہاتھا پائی بھی انہوں نے دیکھی پھر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ قانون حرکت میں نہ آتا۔ حرکت میں برکت ہے۔

میں اس خیال سے گاڑی کی طرف دوڑا تھا کہ اس میں جو بھی ہو گا اسے پہلے شرافت سے کہوں گا کہ مجھے یہاں سے دور لے جائے اور اس نے تذبذب کا مظاہرہ کیا یا اکڑفوں دکھائی تو اسے کھینچ کر باہر ڈال دوں گا اور خود گاڑی لے کر بھاگ جاؤں گا لیکن اس سے پہلے کہ میں گاڑی تک پہنچتا وہ خود ہی اُتر کے بھاگ کھڑا ہوا۔ حیران ہونے کے لیے بھی وقت نہیں تھا۔ یہ شخص میرے پاس گاڑی چھوڑ کے میری طرف پیٹھ کیے سرپٹ بھاگا جا رہا تھا۔ میں اس کی صورت تک نہ دیکھ سکا۔

گاڑی کا انجن چل رہا تھا۔ میں نے اس میں بیٹھتے ہی گیئر ڈال دیا اور دروازہ بعد میں بند کیا۔ گاڑی تھوڑا سا لہرائی اور پھر ایک جست لگا کے آگے بڑھی۔ قانون کے دونوں محافظ چھلانگ مار کے ایک طرف نہ ہوتے تو ایک ساتھ اس دنیا سے رخصت ہوتے۔ میں اسی وقت میری نگاہ اسی ٹاٹ کے پردے والے دروازے کی طرف گئی جس سے گزر کے مولوی کسی اجنبی گھر میں داخل ہو گیا تھا۔ کوئی پہلوان ٹائپ شخص مولوی کو واپس باہر پھینک چکا تھا اور اب اس کے سینے پر سوار تھا۔

خطرے کی حدود سے باہر جاتے ہی مجھے زبردست شاک لگا۔ ابھی تک تو میں نے گاڑی کی طرف دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ مجھے ایک کار یا ٹیکسی کی ضرورت تھی جو میرے پاس آ گئی تھی۔ اس کے مالک نے کیسے اندازہ کر لیا تھا کہ میں کار چھین سکتا ہوں اور وہ کیوں بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ یہ سوچنے کی فرصت کسے تھی۔ اب میں نے گاڑی کو دیکھا تو بے اختیار میرے پاؤں بریک پر جم گئے۔

گاڑی رک گئی اور میں نے اسے اندر باہر سے دیکھا۔ مزید تصدیق کے لیے میں نیچے اُترا اور گاڑی کا نمبر چیک کیا۔ یہ وقار یوسف کی وہی گاڑی تھی جس میں مجھے اغوا کیا گیا تھا۔ میری عقل خبط ہونے لگی۔ اسٹیئرنگ پر سر رکھ کے میں نے سوچا۔ یہ سب آخر کیا ہے؟ حقیقت میں تو ایسا نہیں ہوتا۔ ضرور میں خواب دیکھ رہا ہوں لیکن میرے کپڑے' میرے جسم پر زنانہ کپڑے تھے لیکن جو کپڑے پہن کے میں روانہ ہوا تھا وہ بڑے سلیقے سے تہ کیے ہوئے ساتھ والی سیٹ پر رکھے ہوئے تھے۔

یا مظہر العجائب! یہ کوئی طلسم ہوشربا ہے یا قصہ سوتے جاگتے کا ہے۔ کیا میں کسی جادو نگری میں آ گیا ہوں یا کارخانۂ قدرت اور نظامِ کائنات میں کوئی چیز کسی نظم و ضبط کے قاعدے' اسباب و علل اور عقل یا دلیل کی تابع نہیں رہی۔ میرے ساتھ جو کچھ بھی ہو رہا ہے کیوں اور کیسے ہو رہا ہے؟ یہ واقعی ہو رہا ہے یا میں کسی ٹرانس میں نشے یا خواب کی کیفیت میں دیکھ رہا ہوں مگر حقیقت سمجھ کے قبول بھی کر رہا ہوں اور اسی کیفیت میں واقعات کا منطقی تجزیہ کرنے کی کوشش میں بھی مصروف ہوں۔۔ ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے تھے خواب میں۔

حالات و واقعات کا ایک گورکھ دھندا تھا جس میں ہر لمحہ ایک نیا سوال ایک نئی اُلجھن اور دماغ خراب کرنے والی نئی صورتِ حال کو سامنے لاتا تھا۔ مجھے اب واقعات کے اس سلسلۂ ناممکنات سے خوف آنے لگا تھا۔ پتا نہیں اس کے بعد کیا ہو جائے گا۔ اچانک مجھے نظر آئے گا کہ ساتھ والی سیٹ پر رابعہ بیٹھی ہوئی ہے۔ میں نے خالی سیٹ کو دیکھا اور وہاں کسی کو نہ پا کے سکون کا سانس لیا۔ کسے خبر کہ اگلے روڈ پر کیا ہونے والا ہے۔ آخر میں کیسے اس حوالات سے نکل کے اس سڑک پر پہنچ گیا۔ کون تھا جو وقار یوسف کی کار میں میرا تعاقب کرتا رہا اور موقع پاتے ہی گاڑی میرے تصرف میں چھوڑ کے بھاگ گیا؟ اسے کسی نے ہدایات دی تھیں کہ اس وقت فلاں جگہ وقار یوسف کی گاڑی پہنچا دینا۔ سکندر کو ضرورت ہو گی۔ اس کے کپڑے لے جانا مت بھولنا مگر اپنی شکل اسے مت دکھانا۔ ظاہر ہے یہ "حسنِ انتظام" از خود چوہدری دلاور کے ذہن کی کارفرمائی کا ثبوت تھا مگر سوال وہی تھا کہ کیوں۔۔۔؟

ان پاگل کر دینے والے حالات کے باعث میرے خیالات' میری قوتِ فیصلہ اور میری کارکردگی بُری طرح متاثر ہوئی تھی۔ ذہن اور جسم کے افعال میں ہم آہنگی باقی نہ رہنے کے نتائج سامنے آ رہے تھے۔ میں کچھ سوچتا تھا تو بے یقینی اور انتشار کے گرداب میں پھنس جاتا تھا اور کوئی فیصلہ نہیں کر پاتا تھا کہ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا۔ خواب کیا ہے سراب کیا اور حقیقت کیا۔ جسم فیصلے کے انتظار میں اعصابی دباؤ کا شکار ہو جاتا تھا مگر کچھ کرنے کی نوبت نہیں آتی تھی یا مجھے احساس ہونے لگتا تھا کہ میں نے جو بھی کیا غلط کیا۔

اس کی ایک مثال میرے سامنے تھی۔ میں نے یہ احساس ہوتے ہی کہ گاڑی وقار یوسف کی ہے بریک لگا دیے تھے اور اب اپنے مضحکہ خیز حُلئے میں سڑک کے کنارے گاڑی میں بیٹھا آتے جاتے لوگوں کی نظروں کا نشانہ بن رہا تھا جو غور سے دیکھتے تھے تو کنفیوز ہو جاتے تھے کہ کار میں عورت تھی تو اس کی شیو اتنی کیوں بڑھی ہوئی تھی اور مرد تھا تو زنانہ بہروپ میں چہ معنی دارد۔

میرا دماغ ٹھکانے ہوتا تو میں اِدھر اُدھر کی سوچوں میں وقت گنوانے کے بجائے پہلا کام یہ کرتا کہ لباس بدل لیتا تاکہ میرا حُلیہ تو مشکوک نہ رہے پھر یہ دیکھتا کہ گاڑی کے انجن یا بونٹ میں کسی جگہ نصب ٹائم بم میری زندگی کی آخری گھڑیوں کے آخری لمحے تو شمار نہیں کر رہا ہے اور کچھ نہ ہوتا تو سیدھا رابعہ یا غالب کے پاس پہنچ جاتا۔ باقی سوالات کے جوابات سب مل کے تلاش کر سکتے تھے کہ ان اُلجھے ہوئے واقعات کی گتھی کو سلجھانا موجودہ کیفیت میں میرے اکیلے کے بس کی بات نہیں تھی۔

یہ خیال آتے ہی میں نے گاڑی کو پھر گیئر میں ڈالا۔ اب یہ اتفاق ہی تھا کہ عین اسی وقت خوفناک مونچھیں اور خطرناک عزائم رکھنے والے ایک شخص نے اندر منہ ڈال کے اپنا تجسس رفع کرنا چاہا اور یہ جاننے کی کوشش کی کہ یہاں میں کس کا انتظار کر رہا ہوں یا کر رہی ہوں۔ گاڑی اچانک چل پڑی تو اس کا سر کھڑکی سے لگا' اس کی کنپٹی پر کار کی اگلی کھڑکی کے درمیانی حصے سے چوٹ آئی ہو گی۔ اس نے چلا کے کہا "اوئے تیری۔۔۔" مگر اس کی گالی کا اصل حصہ میں نے نہیں سنا۔

بہت سی باتیں اب میری سمجھ میں آ چکی تھیں۔ ایک یہ کہ میں شاہ جمال کے علاقے میں ہوں۔ دوسری یہ کہ وقت صبح کے دس

گیارہ بجے کا ہے اور یہ کہ ذہنی و جسمانی طور پر میں بہت تیزی سے نارمل ہوتا جارہا ہوں۔ موقع پاتے ہی میں نے کار کو ایک دیوار کے ساتھ پارک کیا۔ گاڑی کے آگے پیچھے درخت تھے۔ کار اور دیوار کے درمیانی خلا کو ڈریسنگ روم کی طرح استعمال کرتے ہوئے میں نے ایک منٹ میں زنانہ کپڑوں سے نجات حاصل کی اور اپنے اصل کپڑے پہن کے پھر کار میں بیٹھ گیا۔ اگر کوئی دیکھتا بھی تو یہی سمجھتا کہ انتہائی مجبوری کے باعث میں جسم میں جمع ہوجانے والا فاضل پانی سرِراہ خارج کررہا ہوں۔ وہ لعنتی زنانہ کپڑے میں نے وہیں چھوڑ دیے جن کے تصور سے بھی مجھے خجالت محسوس ہوتی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ ابھی کوئی ضرورت مند غریب انہیں اٹھا کے بہت خوش ہوگا غریب کی گھروالی انہیں پہن کے اس سے بھی زیادہ خوش ہوگی اور گھروالی کو خوش دیکھ کے وہ مزید خوش ہوگا۔ سب ضرورت مندوں کو ایسی خوشیاں راستے میں پڑی مل جایا کریں تو دنیا ہی جنت ہوجائے۔

اپنے پرانے حلیئے کے ساتھ ہی میری خود اعتمادی لوٹ آئی تھی اور میں گاڑی یوں چلارہا تھا جیسے میرے ساتھ کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا اور میں اپنے معمول کے مطابق واپس گھر جارہا ہوں۔ میں نے ساری اُلجھنوں کو اور پریشان کن سوالوں کو ذہن سے خارج کردیا تھا۔ ان کے بارے میں فرصت سے سوچا جاسکتا تھا۔ فوری طور پر مجھے ذہنی یکسوئی اور سکون کی ضرورت تھی۔

اس فیصلے پر پہنچنے کے بعد کہ مجھے لوٹ کر رابعہ کی طرف نہیں جانا چاہیے میں نے وقار یوسف کے گھر کا راستہ اختیار کرلیا تھا اور تقریباً پچاس میل کی رفتار سے رواں تھا کہ اچانک میرے کانوں نے دلاور کی آواز سنی۔

"کیا حال ہے جی اپنے سکندر اعظم صاحب! طبیعت کیسی ہے؟"

میں بُری طرح اُچھل پڑا۔ گاڑی تھوڑا سا لہرائی پھر میں نے اسٹیرنگ کو سنبھال لیا اور رفتار کم کردی۔ یہ انارکلی جیسی تنگ اور پُرہجوم جگہ ہوتی یا مال روڈ تو گاڑی کے لہرانے سے ضرور کوئی ناخوش گوار حادثہ پیش آجاتا۔

بالکل غیر ارادی طور پر میں نے پیچھے دیکھا حالانکہ آواز میرے سامنے ڈیش بورڈ کے نیچے نصب ریڈیو کے اسپیکر سے آئی تھی۔

دلاور ہنسا تو مجھے یوں لگا جیسے وہ میری گھبراہٹ دیکھ کے لطف اندوز ہورہا ہے حالانکہ وہ نہ جانے کہاں بیٹھا تصور اور قیاس کی بنیاد پر بات کررہا تھا "آپ تو ایسے ہی نروس ہورہے ہو جی۔ ایسا نہ ہو گڈی سمیت..."

میں نے اس کی بات کاٹ دی "ماشاء اللہ سے اپنے چوہدری دلاور صاحب ریڈیو پر قوم سے خطاب فرمارہے ہیں۔ اس بدنصیب قوم کے ہونے والے لیڈر۔ ہیں جی!"

"ہاں جی۔ اللہ آپ کی زبان مبارک کرے۔ قوم کی بدنصیبی میں تو ہمیں بھی شک نہیں لیکن لیڈر تو وہی بنتے ہیں نا جو بڑے خوش نصیب ہوتے ہیں۔"

"بدنصیبی تو سزا ہے بداعمالی کی۔ اپنا سب کچھ قربان کردینے والے قائدِ ملت کو اسی قوم نے قربان کردیا۔ ناظم جیسے مخلص آدمی کو قائدِ ملت کا خطاب دے کر سیاسی موت اس کے بعد آگئے تم جیسے قائدِ ذلت اور بابائے ذلالت سب"

"اور کوئی بھی ان کا راستہ نہ روک سکا" دلاور نے میری کاٹ دی "پھر تم کیوں اپنا وقت اور اپنی توانائی ضائع کرتے ہو"

"میں اپنا کام کرتا رہوں گا دلاور۔ برائی کے خلاف جہاد فرض ہے۔ کامیابی اور ناکامی خدا کے ہاتھوں میں ہے۔ تم ہتھکنڈوں سے خوف زدہ کرکے مجھے اپنا راستہ بدلنے پر مجبور نہیں کرسکتے۔"

"یار سکندر۔ دیکھ ذرا سوچو۔ عقل سے کام لو" دلاور سمجھانے لگا "میں نے ایک موقع دیا ہے تمہیں۔ آخری موقع"

"تم ہر بار یہی کہتے ہو دلاور۔ اصل بات یہ ہے کہ تم کچھ نہیں سکتے۔ تم ڈرتے ہو۔"

وہ بدمعاشوں کی طرح ہنسا "کس سے ڈرتا ہوں؟ تم سے؟ تمہاری چنڈال چوکڑی سے؟ یار مجھے بتاؤ کہ تمہارے ساتھ کیا ہوسکتا تھا۔ قتل کرنا تو دور کی بات ہے۔ تمہیں پولیس کے حوالے کرنا یا پاگل خانے میں جمع کرادینا تو بہت آسان تھا۔ کون تھا بچانے والا... ہیں جی!"

"وہی خدا جس نے آج تک بچایا ہے" میں نے کہا "مجھے تم سے اتنے احمقانہ ڈرامے کی اُمید نہیں رکھتا تھا۔"

"ابھی اپنے سکندر صاحب۔ یہ تو بس ایک کھیل تھا۔ خیال تھا کہ تم سیانے بندے ہو۔ ہیں جی... اشارہ سمجھ لو۔ ایسے ڈرامے چلتے نہیں ہیں۔ تم نے بھی تو بڑے منصوبے بنائے خیر سے لیکن تم لندن جاؤ چھ مہینے کے لیے یا ماسکو چھ سال کے لیے لوٹ کر تو آؤ گے نا۔ تام بے شک تمہارا سکندر بخت نہ ہو دلاور کے دشمن پھر بھی رہو گے۔ ہیں جی! اور جب ہمارے پاس آؤگے تو ہم بھی تمہیں ایسے پہچان لیں گے جیسے تم نے پولیس کی وردی میں ہمیں شناخت کرلیا تھا۔ بڑی ہنسی آتی تھی تمہاری باتیں سن کے۔ جو تم اور تمہارے سب حمایتی کرتے تھے۔"

"تم سب سُنتے تھے؟"

وہ پُرتمسخر لہجے میں بولا "کیوں جی۔ کان تو دیواروں کے بھی ہوتے ہیں۔ ہم کیسے نہ سُنتے۔ اپنے کانوں میں روئی ڈال لیتے جاتے کہ بُری بات ہے۔"

"میں سمجھ گیا۔ ان دیواروں میں خفیہ مائیکروفون تھے"

"اب سمجھے ہو!" وہ حیرانی سے بولا "کمال ہے سکندرِ اعظم صاحب۔ بڑی دیر سے سمجھے۔ ہمارا تو خیال تھا اللہ سے تمہارے ساتھ ایک سے ایک ہوشیار بندہ ہے"

بڑے جاسوس اور سراغ رساں ہیں' ہیں جی۔ ایسے چٹکی بجاتے میں پتا چلا لیں گے۔"

میں نے ہنس کے کہا "چوہدری دلاور۔ یہ سب جھوٹ ہے اور بکواس سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں تمہارے دعوے کی۔"

ہوچی ہاتھ ٹنکن کو آر سی کیا۔ گاڑی کا وہ کھولو' کیا کہتے ہیں گلوز کمپارٹمنٹ۔ اس میں ٹیپ پڑے ہیں۔ ابھی نہیں' گھر جاکے سن لینا۔ وہی باتیں ہیں جو تم کرتے تھے۔"

پہلے میں نے بے اختیار گلوز کمپارٹمنٹ کی طرف ہاتھ بڑھادیا تھا۔ دلاور کچھ نہیں دیکھ رہا تھا مگر اسے اندازہ تھا کہ میرا فطری ردِعمل کیا ہوگا۔ اس کی بات سن کے میرا ہاتھ رک گیا تھا لیکن میں نے کہا "اب سمجھ میں آیا کہ رابعہ کو وہ کوٹھی تم نے کیوں دی تھی؟"

وہ ہنسا "چلو اچھا ہوا سمجھ آگئی۔ ہیں جی' چوہدری دلاور کوئی پاگل نہیں ہے کہ لاکھوں خرچ کرکے کوٹھی بنائے مگر کسی اور کی زمین پر اور پھر بندہ ایرے غیرے کی زمین تو پکڑ سکتا ہے۔ دشمن اور بھی تمہاری رابعہ جیسی توپ وکیل۔ توبہ توبہ' یہ تو زہر کھا کے مرنے والی بات ہوئی۔ ایسے اناڑی شکاری بھی نہیں ہیں خیر ہم کہ ایک تیر سے بس دو شکار کریں۔ یہ تو سب ہی کرلیتے ہیں۔ ہیں جی' ہم نے کئے تین شکار۔ ایک تو چاندنی بیگم کو اور اس کے ساتھ والے بے مغز ہاتھی جیسے یار کو خوش کردیا۔ کام کے بندے تھے پہلے۔ چوہدری دلاور کو بلیک میل نہ کرتے تو جب تک جیتے خوش رہتے۔"

"ابھی جہنم میں بڑے خوش ہوں گے۔ دعائیں دیتے ہوں گے تمہیں۔"

"اوجی ہم تو جس دنیا میں ہیں اسی کی بات کرتے ہیں۔ آگے کی اللہ جانے" دلاور بولا "کوٹھی میں جی ہم نے بہت کچھ لگایا تھا۔ عیاشی اور عیاشی کے لیے خرچہ زیادہ ہوا تھا مگر کچھ کام کی چیزیں بھی لگوا دی تھیں۔ آہستہ آہستہ پتا چلے گا تمہیں کہ یہ سودا ہمیں مہنگا نہیں رہا اپنے سکندر صاحب۔ دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ تمہارے پروگرام کا پتا چل گیا۔ ہیں جی۔ مجھے معلوم ہوگیا کہ تم اور تمہارے ایم آر ایس کے سورما' صحافی اور وکیل۔ سب مل کے کیا کرنا چاہتے ہیں۔ سن رہے ہو نا جنابِ عالی۔ تیسرا فائدہ یہ ہوگیا کہ ہم نے کوٹھی دی تمہاری اس کو... کیا کہتے ہیں اسے... محبوبہ یا داشتہ' ہونے والی بیوی یا بیوہ۔" وہ قہقہہ مار کے ہنسا۔

میں نے مشتعل ہوئے بغیر کہا "تم ہمیشہ کی طرح اپنی گھٹیا ذہنیت کا مظاہرہ کررہے ہو... اور کچھ نہیں۔"

"اور تم کیا کہوگے اس کے سوا اپنے سکندر صاحب مگر پیار اور لالچ کی بلا ہے۔ سارے اصول اور قانون بھول گئی وہ بھی۔ مفت میں ملی کوٹھی کی بھی جو ل گئی۔ چوہا ایسے ہی چوہے دان میں پھنستا ہے... ہمارا بیانا ہے۔"

"تم کوئی نئی دھمکی دے رہے ہو؟"

"ہاں۔ کھلی دھمکی ہے یہ" دلاور نے ایک دم لہجہ بدل لیا "جس بلی نے حج پر جانے سے پہلے نوسو چوہے کھائے ہوں۔ وہ نو چوہے اور بھی کھاسکتی ہے۔ اب یا تو تم شرافت سے باز آجاؤ۔ میرے ساتھ پنگا لینا چھوڑ دو اور مجھ سے سودا کرلو۔ اگر تم میرے راستے میں آؤگے تو یہ سمجھ لو کہ میں وہی پرانا چوہدری دلاور ہوں۔ جیسے میں نے تمہارے باپ کی قبر کا نشان تک مٹادیا تھا۔ ایسے ہی تمہاری قبر کا سراغ بھی نہیں ملے گا کسی کو۔ ایسی جگہ لے جاکے ماروں گا۔"

"لیکن میں ایسے نہیں کروں گا۔" میں نے غیر سنجیدہ لہجے میں کہا "ہم تمہیں چوک میں پھانسی دیں گے۔"

"اپنی لیلیٰ کو بھی سمجھادینا... کہ جو ایک بار ہوچکا ہے وہ پھر ہوسکتا ہے۔ کوٹھی کی جگہ ملبہ اور کھنڈر باقی رہ جائے گا۔ پہلے ماں گئی تھی' اب بیٹی کی باری ہے۔ ایک عورت ہی ہے نا وہ۔ اس خوش فہمی میں نہ رہے کہ میں اس کی قانونی طاقت سے ڈر جاؤں گا۔ اسے شاہی محلے کے کوٹھے پر نہ بٹھادیا تو... تو کہنا دلاور اپنے باپ کا نہیں کسی کُتے کا بچہ تھا۔"

"یہ کہنے کی کیا ضرورت ہے' سب جانتے ہیں۔"

"بہت شوخی ہوگئی اپنے سکندر صاحب۔" وہ دہاڑ کے بولا "اسی شہر میں رابعہ اگر کوٹھے سے قدم نیچے رکھ دے تو مجھے بتانا۔ اپنے سارے وکیلوں کو اور سارے ایم آر ایس کے مجاہدوں کو لے جانا ساتھ۔"

"غالب اور نازو کے بارے میں کچھ ارشاد فرمائیے" میں نے ہنس کے کہا۔

"ابھی معلوم ہوجائے گا تمہیں۔ انہیں تم سے پہلے معلوم ہوچکا ہے۔ تم گھر پہنچنے والے ہو۔ میں اب واپس جارہا ہوں۔ ضرورت محسوس ہو تو رابطے کا یہی ذریعہ استعمال کرلینا۔" دلاور کی آواز بند ہوگئی۔

میں نے پلٹ کے دیکھا۔ میرے تعاقب میں کوئی کار نہیں تھی یا تھی تو آخری موڑ پر ہی رک چکی تھی۔ اس سے پہلے میں نے دھیان ہی نہیں دیا تھا کہ میرے پیچھے آنے والی گاڑیوں میں سے کون سی مسلسل ساتھ چلتی رہی ہے۔ سڑک پر ٹریفک معمول کے مطابق رواں تھا اور میرے ذہن میں یہ خیال ہی نہیں آیا تھا کہ کوئی میرا پیچھا بھی کرسکتا ہے حالانکہ موجودہ حالات میں مجھے سوچنا چاہیے تھا کہ جو لوگ اب تک کھلونے کی طرح مجھ سے کھیل رہے تھے اور میری زندگی کے ہر لمحے کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں رکھتے ہوئے میری بے اختیاری کا تماشا کررہے تھے وہ اچانک پیچھے کیسے ہٹ سکتے ہیں۔

اصل بات یہ تھی کہ میں نے سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ سوچنے سے ذہنی انتشار کے سوا کچھ حاصل نہیں ہورہا تھا چنانچہ میں سوچ کے

سب در بند کرکے سلامتی اور عافیت کی جانب بھاگ رہا تھا۔ جب میں نے گاڑی کو وقار یوسف کی کوٹھی کے کھلے گیٹ میں موڑا تو میرے ذہن میں دلاور کی دھمکی کے آخری الفاظ گونج رہے تھے۔ "انہیں تو تم سے پہلے معلوم ہوگیا ہے۔ ابھی معلوم ہوجائے گا تمہیں بھی۔"

میں گاڑی بند کرکے اُترا ہی تھا کہ ایک کھڑکی کا پردہ ہٹا کے وقار یوسف کی بیوی نے باہر جھانکا۔ ایک لمحے میں اس کی صورت پر خوف' بے یقینی اور مسرت کے جذبات کا ہر رنگ نظر آیا۔ اس نے چیخ مار کے نازو کو آواز دی۔

"نازو... نازو... سکندر بھائی۔" پھر اس کا چہرہ غائب ہوگیا۔

نازو رسہ تڑا کے فرار ہونے والی گائے کی طرح دوڑتی ہوئی دروازے سے نکلی۔ وقار یوسف کی بیوی اس کے پیچھے تھی۔ ایک ساتھ ان دونوں نے مجھے دونوں طرف سے پکڑلیا۔

"ارے بھئی۔ یہ کیا ہورہا ہے۔ ایسے کیوں گرفتار کیا جارہا ہے مجھے۔ میں گھر آیا ہوں' گھر سے بھاگ کے نہیں جارہا ہوں" میں نے مسکرا کے کہا۔

"اندر چلو پھر بتاتے ہیں تمہیں" نازو نے چراغ پا ہو کے مجھے دھکیلا "بھاگنے والے لوٹ کے گھر آتے ہیں تو جوتے پڑتے ہیں ان کو۔"

میں ہنستا ہوا اندر گیا اور صوفے پر بیٹھ گیا "آخر ہوا کیا ہے...؟"

"کمال کرتے ہیں آپ بھی" وقار یوسف کی بیوی نے بھی خفگی کا مظاہرہ کیا "ہم سے پوچھ رہے ہیں کہ کیا ہوا ہے۔ کہاں تھے آپ۔ ایسے بتائے بغیر چلے گئے اچانک۔ کسی پروگرام کے بغیر۔"

"یعنی اب یہ نوبت آگئی ہے... کہ ہم بھی اعتبار کے قابل نہیں رہے" نازو روہانسی ہوگئی "میری تو خیر اوقات کیا لیکن غالب یا رابعہ کو بھی اپنا نہیں سمجھا تم نے کہ ان سے ہی ذکر کردیتے۔ تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے سکندر۔"

"یہاں میں تم سے اتفاق کرتا ہوں۔" میں نے کہا "اور مزید ثبوت کے طور پر کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔"

نازو نے کبھی مجھ سے اس لہجے میں بات نہیں کی تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ سب غلط فہمی کی بنا پر مجھ سے کتنے بدگمان ہیں "عرض ورض کیا کرنا۔ تم جو چاہتے ہو کرتے ہو۔ بعد میں وضاحت سُن کے ہم کیا کریں۔ یہ تمہاری زندگی ہے۔ تم اس پر کسی کو اختیار دینا ہی نہیں چاہتے تو تمہاری مرضی۔"

"جب عورت کی زبان قینچی کی طرح چلنے لگے اور کسی صورت بند نہ ہو تو بزرگوں کا آزمودہ نسخہ ہے۔"

"کہ ایک جھانپڑ رسید کرو اور خاموش کردو اسے۔ سوری سکندر' اپنا سمجھ کے تم جو چاہو کہو۔ ایک نہیں دو تھپڑ مار لو۔ لیکن ایسے تم ہاتھ اُٹھا کے دیکھو۔ نازو تمہاری عزت ضرور کرتی ہے۔ تم سے ڈرتی نہیں ہے۔"

میں نے خود کو بے عزت محسوس کیا۔ وہ واقعی غیروں کی بات کررہی تھی۔ میں نے سر جھکا کے جوتے اُتارے اور ... لیٹ کے چھت کو دیکھنے لگا۔ مجھے رنج یہ تھا کہ نازو نے صرف ... اظہار کیا تھا۔ تشویش کا نہیں۔ بچہ دیر سے گھر لوٹے تو وہ ... سے زیادہ سخت سست کہتی ہے جو سب سے زیادہ متفکر ہوتی ... بعد میں گلے لگا کے پوچھتی بھی ہے کہ تو کہاں تھا میرے لال ... روتی بھی ہے۔

میرے رویّے نے نازو کو تھوڑا سا پشیمان کیا۔ وقار یوسف ... بیوی اس سے پہلے میرے پاس بیٹھ گئی "آپ بولتے کیوں ... سکندر بھائی۔"

"کیا کروں گا بول کے۔ جب سننے والا ہی کوئی نہیں ... سب کی سُنی ہے۔ تمہارے بعد غالب کی پھر رابعہ کی۔ مظہر اور وقار یوسف کی۔ سب پہلے سے ایک بات طے کرچکے ہیں کہ میرا ... خراب ہوگیا ہے۔ میں کسی کو اپنا نہیں سمجھتا اور اپنی کرتا ہوں ... نے ایک مفروضے کو حقیقت سمجھ لیا ہے کہ میں جہاں بھی گیا ... مرضی سے گیا تھا اور جانتے بوجھتے میں نے سب کو آخری وقت ... کچھ نہیں بتایا تھا۔"

نازو نے شرمندگی سے کہا "یہ غلط ہے تو تم تردید کرسکتے ہو۔"

"کیا فائدہ تردید کرنے سے بھی۔ اگر ملزم کو پہلے ہی مجرم ... دے دیا جائے تو وہ اپنی صفائی میں کیا کہے... اور کیوں کہے' مجرم ... پاس تو پھر بھی اپیل کا حق محفوظ رہتا ہے۔ میں تم سب کے فیصلے ... خلاف اپیل لے کر کہاں جاسکتا ہوں" میں نے افسردگی سے کہا۔

"آئی ایم سوری سکندر۔ میں غصے میں زیادہ ہی بول گئی" ... نے کہا "تمہیں سمجھنا چاہیے ہمارے جذبات کو۔ بات پریشانی ... بہت آگے بڑھ گئی تھی۔ آخر کہاں تھے تم؟"

"میں کیا بتاؤں کہ کہاں تھا" میں نے سوچ کے کہا "خود ... کچھ معلوم نہیں۔ پہلے یہ بتاؤ کہ آج دن کیا ہے؟"

نازو نے اور وقار یوسف کی بیوی نے ایک دوسرے کی ... سوالیہ نظروں سے دیکھا "دن۔ جمعرات ہے' تمہیں نہیں معلوم ...

میں نے نفی میں سر ہلایا "اور تاریخ...؟"

"کیا تمہاری گھڑی خراب ہے؟" نازو نے مجھے غور ... دیکھا۔

"گھڑی... کہاں ہے گھڑی..." میں نے کلائی اُٹھا کے ...

"اوہ... مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا۔"

"کیا معلوم نہیں تھا؟" نازو نے کہا۔

"یہی... کہ گھڑی ہے میری کلائی پر۔ ورنہ میں تم سے ... تاریخ کیوں پوچھتا اور جب انہوں نے مجھ سے پوچھا تو میں گھڑی ... کے انہیں بتا دیتا۔" میں نے جیسے خود سے باتیں کرتے ہوئے ...

"معاملہ اتنا خراب نہ ہوتا۔ جتنا بعد میں ہوا۔ سب اُلّو کے ... پاگل سمجھ رہے تھے۔"

نازو نے کہا "تمہیں آرام کی ضرورت ہے لیکن پہلے نہا کے ایزی ہوجاؤ۔"

"آپ نے ناشتا کیا ہے؟" وقار یوسف کی بیوی نے پوچھا "ظاہر ہے نہیں کیا ہوگا۔ میں بھی پاگل ہوں کہ ایسی بات پوچھ رہی ہوں۔ خیر آپ آجائیں نہا دھو کے۔ میں کافی بناتی ہوں آپ کے لیے اور سینڈوچ۔ کھائیں گے نا سکندر بھائی۔ مجھے آپ کی طبیعت... ٹھیک نہیں لگتی۔"

"مجھے لگتا ہے کہ اب تم رونے لگوگی۔ بے وقوف' میں بالکل ٹھیک ہوں" میں نے اُٹھتے ہوئے کہا "کہاں ہے تمہارا میاں اور غالب کہاں گیا ہے؟ سب نکلے ہوئے ہوں گے مجھے تلاش کرنے۔ اسپتالوں' مُردہ خانوں اور قبرستانوں میں..."

وقار یوسف کی بیوی ایک دم رو پڑی "مت کریں ایسی منحوس باتیں۔ پتا نہیں کس کی نظر لگ گئی ہے ہمیں۔ کیا ہوگیا ہے آخر دنیا کو۔"

میں نے کہا "نہ دنیا کو کچھ ہوا ہے نہ ہمیں۔ زندگی اسی کا نام ہے۔ دکھ اور مسائل۔ سختی اور پریشانی میں ہی آدمی کی آزمائش ہوتی ہے۔ تم ابھی سے گھبرا گئی ہو۔ حوصلہ رکھو' خدا سب ٹھیک کرے گا۔"

یہ تسلّی کی رسمی باتیں تھیں۔ ہمارے اس گھر میں قدم رکھنے سے پہلے وقار یوسف اور اس کی بیوی ایک پُرسکون' محفوظ اور مطمئن زندگی گزار رہے تھے۔ ہم ایسے سبز قدم تھے کہ اپنے ساتھ آلام و مصائب کا ایک سلسلہ ساتھ رکھتے تھے۔ نقوی صاحب پہلے اپنی سرکش بیٹی سے صرف اس لیے خفا تھے کہ اس نے اپنی مرضی سے زندگی کے شریکِ سفر کا انتخاب کرلیا تھا اور یہ کوئی غلط فیصلہ نہیں تھا جس کا نقوی صاحب کو بھی بالآخر احساس ہونے لگا تھا مگر اب تو وہ ہمیشہ کے لیے اس سے روٹھ کے چلے گئے تھے۔ کسی حد تک ان افسوس ناک حالات کا ذمّے دار خود میں تھا جو اُن کی موت کا سبب بنا۔ اب یہ کہنا تو آسان تھا کہ موت کا ایک دن معین ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ کس کے لیے موت کا بہانہ کیا ہوگا مگر میرے لیے اپنے احساسِ جرم و پشیمانی سے چھٹکارا پانا مشکل کام تھا۔

دن اور تاریخ کا علم ہوتے ہی مجھے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ میرے ساتھ جو کچھ بھی ہوا وہ دو چار دن کی نہیں صرف بیس گھنٹے کی واردات تھی۔ مجھے گزشتہ روز چار بجے اغوا کیا گیا تھا اور میں درمیانی شب اس جعلی حوالات میں گزار کے دوپہر بارہ بجے لوٹ آیا تھا۔ دلاور ڈرامے باز آدمی تھا۔ وہ کوئی بات براہِ راست نہیں کہتا تھا اور سیدھے سادے مسئلے کو جان بوجھ کے پیچیدہ طریقے سے حل کرنا اس کی عادت تھی۔ اس طرح وہ پُراسرار بنتا تھا۔ اپنی دہشت پھیلاتا تھا یا خود کو بہت چالاک اور عیّار ثابت کرتا تھا لیکن یہ حقیقت تسلیم کیے بنا چارہ نہ تھا کہ اس کے شکاری ذہن نے ہمارے لیے مسائل کے جال پھیلا دیے تھے۔ اس کی منفی ذہانت اور ہماری مثبت سوچ میں طاقت کا توازن وقتی طور پر کبھی ایک طرف ہوجاتا تھا تو کبھی دوسری طرف۔ کبھی دفاعی اور کبھی جارحانہ حکمتِ عملی اختیار کرنے کے باوجود ابھی تک نہ کسی کو فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی تھی اور نہ کسی نے اپنی شکست تسلیم کی تھی۔ چنانچہ صورتِ حال کسی حد تک جوں کی توں تھی بلکہ آج کل دلاور کا پلڑا کچھ بھاری تھا۔

اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ایم آر ایس ایک مقصد پر متحد تھی اور اس کی تمام قوت کا ارتکاز اسی مقصد کے حصول پر تھا۔ جب یہ مقصد نہ رہا تو وہ شیرازہ بندی نہ رہی اور اپنی اپنی زندگی کے مسائل زیادہ اہمیت اختیار کرگئے جن کا تعلق مستقبل سے تھا۔ غالب کو پھر صحافت کے روز و شب کی کشش بُلانے لگی اور قدرتی طور پر اس نے نازو کی صلاحیت کا رخ بھی اسی پیشے کی طرف کردیا جس میں دلچسپی کے ساتھ ایڈونچر بھی تھا۔ جدوجہد بھی تھی اور چیلنج کی سنسنی خیزی بھی۔ غالب اپنی شریکِ سفر کے ساتھ رفاقت کو گھر کی چار دیواری تک محدود رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ زندگی کے ہر لمحے میں وہ ایک دوسرے کے جذبات ہی نہیں تجربات کے بھی شریک ہوں اور اس فارمولے پر مکمل اتفاق رائے سے وہ اپنی منزل کی جانب پہلا مثبت قدم اُٹھا چکے تھے۔

اسی طرح محسن اپنی ازدواجی زندگی کے پہلے دور پر احساسِ جرم کا شکار تھا۔ اسے شدت سے یہ احساس تھا کہ یکے بعد دیگرے اس نے دو غلطیاں کی تھیں۔ اس نے وقت کے تقاضوں کو سمجھے بغیر' عجلت میں یا جذبات کی رو میں بہہ کر ہم سب سے پہلے شادی کرلی تھی اور دوسری غلطی یہ کی تھی کہ زیادہ بڑی خرابی کا انتخاب کرلیا تھا۔ اگر وہ ہم سے معذرت کرلیتا کہ میں بیوی بچّوں کو چھوڑ کے تم سب کے ساتھ نہیں جاسکتا تو شاید ہمارے جذبات کو ٹھیس پہنچتی اور ہم کچھ مایوسی کا اظہار کرتے مگر اس کے انکار سے ہمارے عزائم تبدیل نہیں ہوتے اور ہماری جدوجہد یا ہمارے جذبے میں کمی نہ آتی لیکن اس نے بیوی بچّوں کو چھوڑ دیا تھا اور اس کی عدم توجہی کا' واپسی کے انتظار کا اور اُمید کا طویل عذاب جھیلنے والے بیوی بچّے بالآخر اپنی مجبوری' محرومی اور صبر کے ساتھ محسن کے فیصلے پر قربان ہوگئے تھے۔ محسن کو ایک جہنم سے گزر کے گل کی محبت کسی گمشدہ جنت کی طرح پھر مل گئی تھی۔ وہ اتنا ڈر گیا تھا کہ دوسری بار اس نے سابقہ گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کو ترجیح دی اور باقی زندگی صرف محبت کی بارگاہ میں نذر کردی اور گل کا ہاتھ تھام کے سکون' راحت اور مسرت کی تلاش میں نکل گیا۔ اکرام شیخ اور کاجل پہلے ہی کراچی میں سکھ چین کی زندگی گزار رہے تھے۔ اب رابعہ بھی چاہتی تھی کہ میں ہر قیمت پر دلاور سے مفاہمت کرلوں۔ اس نے اپنی پریکٹس پھر شروع کردی تھی اور اسے بھی اپنی گم گشتہ جنت پھر مل گئی تھی۔ اس کی تکمیل عہدِ رفاقت کے خواب کے بغیر

ممکن نہ تھی چنانچہ اس کا اصرار بھی بے جانہ تھا۔

غسل سے فارغ ہوتے ہوتے میں نے مجموعی صورتِ حال کو سمجھ لیا تھا۔ اب مسئلہ صرف میرا تھا اور میں ایک دائرے میں گھوم کے نقطۂ آغاز پر پہنچا تھا تو پھر بالکل اکیلا تھا۔ مجھے دلاور کے ساتھ اپنا حساب خود چکانا تھا اس سے خود انتقام لینا تھا اور اس معاملے میں کسی اور کے وہ جذبات نہیں ہوسکتے تھے جو میرے تھے۔ ظلم میرے والد پر ہوا تھا جو اکیلے اور بے بس تھے۔ رزقِ حلال کے فلسفے پر ایمان رکھتے ہوئے انہوں نے جو کچھ اپنی محنت اور صلاحیت کے بل پر جمع کیا تھا وہ انہی زور آور لٹیروں نے چھین لیا تھا جن کے دامن پر وزیر خان کے لہو کے داغ بھی تھے۔ وہ آج بھی آزاد تھے اور قانون کا خوف انہیں اتنا بھی نہیں تھا جتنا مالک کو اپنے پالتو کُتّے کا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے انہیں کیفرِ کردار تک پہنچانا صرف میرا مسئلہ تھا اور یہ میرے لیے ایسا مسئلہ نہیں تھا جسے میں وقتِ گزشتہ کہہ کے نظرانداز کرسکوں۔ بات اپنی اپنی فطرت اور مزاج کی ہے۔ جو انسانیت سوز سلوک میرے والد وزیر خان کے ساتھ ہوا تھا اس نے میرے وجود میں دکھ کے زخم بھردیے تھے اور میرے احساس میں اذیت کا زہر کسی آتشِ سیال کی طرح شامل ہوگیا تھا۔ اس کی شدت اور حدت میں وقت گزرنے کے ساتھ کمی نہیں آئی تھی، نفرت اور اشتعال کا جو آتش فشاں ان کی مظلومیت کی موت اور ان کے المناک انجام کی خبر پاکے بھڑک اُٹھا تھا وہ آج بھی اسی طرح روشن تھا۔ شاید یہی میری مجبوری تھی یا بے بسی تھی۔ اگر میں انتقام کے خیال سے تائب ہوسکتا یا عفو و درگزر کی اہمیت کو دلائل سے تسلیم کرسکتا تو کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ میں ان کی مغفرت کی دعا کرتا اور صبر کرتا کہ ظالموں کے لیے بہرحال ایک میزانِ عدل اور ایک یومِ حشر ہے لیکن میں دلاور اور پیڈرو جیسے لوگوں کے سامنے قانون کی بے بسی اور سب کچھ جان کے انجان بن جانے والوں کی بے حسی دیکھتا تھا تو میری رگوں میں اُبلنے والا لہو پکارتا تھا کہ سکندر تم پر وزیر خان کا انتقام قرض ہے اور ظالموں سے اپنا حق چھیننا تم پر فرض ہے۔ میں فیصلہ کرچکا تھا کہ یہ میرا کام ہے اور میں ہی کروں گا۔

لنچ کے وقت ناشتا کرتے ہوئے وقار یوسف کی بیوی نے اور نازو نے بہت چاہا کہ میں انہیں کچھ بتاؤں مگر میں نے ٹال دیا "پہلی بات تو یہ کہ تم مانوگی نہیں کیونکہ تمہاری جگہ میں ہوتا تو میں بھی نہ مانتا۔"

"ایسی بھی کیا بات ہے؟"

"ہے کچھ ایسی ہی بات جو چُپ ہوں" میں نے کہا "غالب کو اور باقی سب لوگوں کو آنے دو۔ ایک ہی بار پریس کانفرنس میں سارے حقائق بیان کردوں گا۔ اس وقت جسے جو سوال کرنا ہو کرے۔ ابھی تو سونا چاہتا ہوں۔"

"رابعہ باجی تو پہنچ رہی ہیں" وقار یوسف کی بیوی نے کہا۔

"تمہارے پاس سکون آور گولیاں ضرور ہوں گی" میں نے کہا۔

"میں لاتی ہوں" وہ اُٹھ کے اپنے بیڈ روم کی طرف چلی گئی۔

میں نے نازو سے کہا "وقار یوسف کی گاڑی کے گلوز کمپارٹمنٹ میں شاید کچھ کیسٹ ہوں گے۔"

"کیسٹ...!"

"ہاں۔ میں نے دیکھے نہیں۔ تم نکال لینا اور وقت ملے تو سُن بھی لینا۔ سب کے ساتھ" میں نے کہا۔

نازو نے سہلایا "تم کچھ پُراسرار بننے کی کوشش کررہے ہو۔"

"میں بے حد پُراسرار ہوں خاتون اور میری طلسم ہوشربا سُن کے تو تمہارے بھی ہوش اُڑ جائیں گے۔ تم نے مرزا جی کے بارے میں کیوں خاموشی اختیار کی ہوئی ہے آخر۔ نصیبِ دشمناں وہ بے وفا تمہیں چھوڑ کے کسی اور کے ساتھ...."

نازو نے میری بات کاٹ دی "اسے ابھی تک کوئی ڈاکٹر شیلی نہیں ملی.... فیصل آباد گیا ہے۔"

میں نے شرمندگی کے احساس میں دکھ کی ٹیس محسوس کی "بہت دندان شکن طعنہ دیا ہے تم نے ہمیں۔ ہم لاجواب ہوگئے۔ کیا اس کا خیال تھا کہ ہم فیصل آباد کے گھنٹا گھر پر ملیں گے؟"

"اسے محسن نے بُلایا تھا" نازو بولی۔

"کیوں؟" میرے کانوں میں دلاور کی آخری بات پھر سُنائی دینے لگی۔

"اس نے کچھ بتایا نہیں تھا۔ بڑی عجلت میں نکل گیا۔ فون رکھا اور روانہ ہوگیا۔ کہہ رہا تھا کہ محسن کا کوئی مسئلہ ہے۔"

"یہ کب کی بات ہے؟" میں نے کہا۔

"آج صبح کی۔ سات بجے فون آیا تھا۔ سوا سات بجے غالب روانہ ہوگیا۔"

"تم نے محسن کو فون کرلیا ہوتا..."

"لگتا ہے اس گھر میں کوئی نہیں ہے۔ گھنٹی مسلسل بج رہی ہے۔ ریسیور کوئی نہیں اُٹھاتا۔"

"محسن تو فوزیہ کے گھر میں تھا۔"

"ہاں۔ اب معلوم نہیں کیا بات ہے۔ فون کٹ جائے تب بھی ایسا ہی ہوتا ہے" نازو نے کہا۔

میں سکون آور گولیاں کھاکے اندر والے کمرے میں جالیٹا اور بہت دیر تک غالب کے اچانک فیصل آباد جانے کے اسباب پر غور کرتا رہا۔ بات یقیناً ایسی تھی کہ چھپایا جائے۔ اس کا مطلب ہے کہ واقعی کوئی بات ہوچکی ہے جس کا علم غالب کو ہے اور محسن کو بھی ہے۔ دلاور نے کہا تھا۔ تمہیں بھی معلوم ہوجائے گا۔ کہیں گُل تو مشکل میں نہیں پڑگئی۔ گُل کا سب سے بڑا دشمن اس کا ماضی تھا۔ وہ کہیں بھی گرفتاری کے خطرے سے محفوظ نہ تھی۔ پولیس کے پاس ناگ منی کا پورا ریکارڈ تھا۔ خدا ناخواستہ کسی کینہ پرور دشمن نے

گُل بانو کے پردے میں ناگ منی کو دیکھ کر کوئی پرانا بدلہ تو نہیں چکایا؟ وہ ڈاکو تھیں ناگ کی بہن تھی اور ڈاکو کا دوست کوئی نہیں ہوتا۔ وہ بھی بھائی کے ساتھ مل کے ڈاکے ڈالتی تھی۔ اس گروہ کے مخالف گروہ بھی ہوں گے۔

گولیوں نے بالآخر اثر دکھایا اور میں اُٹھا تو رات ہورہی تھی۔ وقار یوسف کے ساتھ رابعہ بھی آچکی تھی۔ وہ سب ڈرائنگ روم میں جمع تھے۔ وہی کیسٹ سن رہے تھے جن میں ہم سب کی آوازیں صاف پہچانی جاسکتی تھیں۔ کس نے کیا کہا تھا اور کب؟ اس کا ایک ایک لفظ ریکارڈ ہوگیا تھا۔ اس تہ خانے کی دیواروں میں پوشیدہ ایف ایم مائیکروفون یقیناً بہت حساس اور طاقتور تھے کہ ہماری گفتگو سنتے رہے اور نشر کرتے رہے۔ عام قسم کے مائیکروفون سو میٹر کے دائرے میں ہی کام کرتے ہیں لیکن مصنوعی آلات کا دائرہ میلوں وسیع بھی ہوسکتا ہے۔ رازداری کے سارے انتظامات دھرے رہ گئے تھے اور دشمنوں نے ہمارے ارادوں اور منصوبوں کی سب تفصیلات جاری کردی تھیں۔ معلوم نہیں دلاور نے یہ راز افشا کرنے میں کیا مصلحت دیکھی۔ اگر وہ چاہتا تو اسی طرح ہمارے تمام معاملات سے باخبر رہتا اور ہمارے سارے منصوبوں کو خاک میں ملاتا رہتا۔

غالب نے ٹیپ ریکارڈر بند کردیا۔ "یہ سب وہی باتیں ہیں جو ہم نے کی تھیں۔"

وقار یوسف نے اس کی تائید میں سرہلایا "دوبارہ سُننے کا فائدہ کچھ نہیں۔"

رابعہ اور وقار کی بیوی زیادہ متفکر نظر آرہی تھیں۔ شاید نازو نے انہیں پہلے ہی میرے ردِعمل سے آگاہ کردیا تھا کہ اس وقت سب نے محتاط رویہ اختیار کیا ورنہ غالب ضرور ہاتھ دھوکے میرے پیچھے پڑجاتا۔ رابعہ کی نظر باربار اٹھتی تھی اور میرے چہرے کا طواف کرکے لوٹ جاتی تھی۔ اس کے دل کی اضطرابی کیفیت اس کی آنکھوں سے عیاں تھی مگر وہ سب کے ساتھ نارمل نظر آنے کی کوشش کررہی تھی۔

میں غالب کے ساتھ بیٹھ گیا "تم کب آئے؟ محسن کا کیا مسئلہ تھا؟"

"کوئی خاص نہیں" غالب نے ٹالنے کے انداز میں کہا "میں ابھی آدھا گھنٹا پہلے ہی واپس پہنچا تھا۔"

میں نے کہا "مجھے تم سب کے رویّے میں اجنبیت سی محسوس ہوتی ہے۔ مجھ سے کچھ پوچھو۔ میری اچھی طرح خبرلو۔ جیسے نازو نے مجھے آڑے ہاتھوں لیا تھا۔"

"تم جو بُرا مان جاؤگے" غالب نے کہا "اجنبیت کے اس احساس کا ذمّے دار کون ہے۔ ہمارے درمیان عدم اعتماد کی یہ فضا کیسے پیدا ہوگئی؟ یہ سب اچانک تو نہیں ہوا۔ تم نے پہلے ہمیں نظرانداز کیا۔ ڈاکٹر شیلی کے معاملے میں غلط فہمی کو بنیاد بناکے منفی ردِعمل کا اظہار کیا اور اب اتنی پُراسرار خاموشی اور رازداری کے ساتھ اٹھارہ بیس گھنٹے کے لیے غائب ہوگئے۔ کسی کو ہوا تک نہیں لگنے دی اس بات کی کہ تم کیا سوچ رہے ہو اور کیا کرنے والے ہو۔"

میں نے مسکرا کے کہا "رابعہ۔ تم بھی بولو، کیا تمہارا بھی یہ خیال ہے کہ میں اتنا بدل گیا ہوں؟"

"یہ سوال تم اپنے آپ سے کروگے تو جواب مل جائے گا۔"

"نہیں۔ تم بتاؤ، کیا ایسا ممکن ہے کہ میں تم سے کوئی بات چھپاؤں۔ تمہیں یا غالب کو پتا نہ چلنے دوں کہ میں کیا سوچ رہا ہوں، ایسا ہوسکتا ہے؟"

"ایسا ہوچکا ہے" نازو نے کہا۔

"غلط۔ تم نتائج سے اسباب کا تعین کررہے ہو۔ یہ محض اندازے کی بات نہیں۔ تم سب کو یقین ہے کہ ایسا ہی ہوا تھا۔ یعنی جو کچھ میں نے کیا اس کا واحد سبب یہ تھا کہ میں کسی کو بھی کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا۔ آخری لمحے تک میرا خیال تھا نقوی صاحب کے سوئم میں شرکت کا مگر پھر ایک لمحے میں میرا دماغ اُلٹ گیا اور میں نازو کو چھوڑ کے ملکِ پرستان یا صحرائے گوبی کی طرف چل پڑا؟ سوفیصد اپنی مرضی سے اور خوشی سے؟ میرے بے وقوف دوستو! یہ صرف اسی صورت میں ہوسکتا تھا جب اچانک میرا دماغ چل جائے۔ پاگل پن کے آثار پہلے نہیں تھے پھر کیا دورہ پڑا تھا مجھ پر؟ اور دورے کا اثر ختم ہوا تو میں لوٹ آیا۔ تم کہہ سکتے ہو کہ یہ شیلی کے موت کا صدمہ تھا جسے میں نے بظاہر برداشت کرلیا تھا مگر صدمہ اتنا شدید تھا کہ میرے اعصاب کی کشیدگی انتہا تک پہنچی تو میرا نروس بریک ڈاؤن ہوگیا اور جس آدمی پر ایک بار پاگل پن کا ایسا دورہ پڑے اس کا کیا بھروسا۔ کل کو پھر نکل بھاگے، کیا پتا کپڑے پھاڑ کے۔"

رابعہ نے کہا "ایسی باتیں مت کرو۔ یہ کسی نے نہیں کہا۔"

"کہا نہیں مگر مجھے احساس دلادیا کہ میں نے ناقابلِ معافی جرم کیا تھا، سب پر عدم اعتماد کا مظاہرہ صرف غلطی نہیں "گناہ ہے" جرم ہے لیکن میں جو کچھ اپنی صفائی میں کہنے والا ہوں۔ وہ اس سے بھی زیادہ ناقابلِ اعتبار ہے۔ میرے بیان کو ریکارڈ کرلو کسی ماہرِ نفسیات کی موجودگی میں۔ یا ذہنی امراض کے ڈاکٹر کے سامنے۔ میں شرط لگاتا ہوں کہ اس کا فیصلہ کیا ہوگا۔ وہ مجھے پاگل قرار دے گا۔ کہے گا کہ میں وہم کو سچ، خواب کو حقیقت اور غیر موجود کو موجود تسلیم کرنے لگا ہوں۔ میرے لاشعور کا خوف بے بنیاد تصورات (MELUCINATIONS) کو جنم دے رہا ہے۔"

وقار یوسف کی بیوی نے کہا "سکندر بھائی۔ چلیں آپ چائے پئیں پہلے۔ کسی نے کچھ فرض نہیں کیا اور خدا نہ کرے کہ آپ کا ذہنی توازن خراب ہو۔"

غالب نے سوچ کے کہا "کیا تمہیں اغوا کیا گیا تھا؟"

"اغوا صرف عورتوں ہی کو نہیں کیا جاتا۔" میں نے چائے کی پیالی لے لی۔

"پہلے ہم بتائیں گے کہ تمہاری گمشدگی سے ہم پر کیا بیتی۔ ہم کتنے پریشان ہوئے۔ ہم نے کیا سوچا اور کہاں کہاں تمہیں تلاش نہیں کیا۔ رابعہ اور نازو نے مل کے اس ایک رات میں کتنے لیٹر آنسو بہائے تھے اور کتنی دُعائیں مانگی تھیں۔۔۔ اور ہم نے رات بھر میں کتنی جاسوسی کی تھی' کس کس سے پوچھا تھا" غالب بولا۔

میں نے کہا "چوہدری دلاور سے بھی پوچھا تھا؟"

"ہاں۔ مجبوری تھی۔"

"پھر اس نے کیا کہا؟"

"پہلے تو اس سے بات نہیں ہو سکی۔ یہ ایک لمبی کہانی ہے مگر بالآخر ہم اس کا ایک فون نمبر حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے جہاں اس سے براہِ راست گفتگو ہوئی" وقار یوسف بولا۔

"ہم نے۔ یعنی میں نے کہا کہ دلاور دشمنی اور عداوت کے رشتے اپنی جگہ۔ نہ ہم اتنے بے وقوف ہیں کہ تم سے رعایت کی اُمید رکھیں اور نہ اتنے بزدل کہ رحم کی بھیک مانگیں۔ تم ہمیں جانتے ہو اور ہم تم سے واقف ہیں اس لیے اُمید ہے کہ تم جھوٹ نہیں بولو گے۔ وہ کہنے لگا "جھوٹ بولتا ہے ڈرنے والا" میں نے اسے تھوڑا سا بانس پر چڑھایا "اسی لیے پوچھ رہا ہوں تم سے۔ تم کم ظرف دشمن نہیں ہو۔ کیا سکندر کو تم نے اغوا کیا ہے؟" وہ ہنسنے لگا "غالب صاحب۔ یار ہم اتنے گھٹیا کام نہیں کرتے اور اغوا کرنا ہی ہوگا تو پھر نازو کو یا رابعہ کو کرائیں گے۔ ہیں جی" میں نے اس کی بات پر غور کر کے پوچھا "اچھا تمہیں کچھ معلوم ہے کہ سکندر کہاں ہے؟" اس نے کہا "کمال کی باتیں کرتے ہو آپ بھی۔ یہ فون پر پوچھ رہے ہو مجھ سے؟ دوسری طرف ٹیپ کرتے جا رہے ہو ساری باتیں۔ میں کیا بتاؤں سکندرِ اعظم نمبر دو کے بارے میں۔ ویسے وہ بھی دنیا کو فتح کرنے نکلا تھا۔ اب کیا پتا پولیس اُٹھا کے لے گئی ہو۔"

"یہ ٹھیک ہے" میں نے کہا۔

"کیا ٹھیک ہے؟" رابعہ چونکی "تم کو پولیس نے گرفتار کر لیا تھا؟"

"گرفتار تو نہیں کیا تھا۔"

"پھر۔۔۔ تم خود پیش ہو گئے تھے گرفتاری دینے کے لیے" نازو نے کہا۔

"لیکن پولیس کو شرم آئی کہ یہ تو بڑی بے عزتی کی بات ہو گئی۔ مفرور مجرم خود آگیا ہے تھانے۔ نہ اسے پولیس پکڑ سکی اور نہ پبلک۔ حالانکہ انعام کی رقم بھی کم نہ تھی۔ انہوں نے کہا ہو گا کہ چلو پھر بھاگ جاؤ۔ ہم خود پکڑ لیں گے تمہیں اور ثابت کر دیں گے کہ ہم نااہل نہیں ہیں۔"

میں نے کہا "یہ بات دلاور کو معلوم تھی کہ میں پولیس کی تحویل میں ہوں۔"

وقار یوسف' رابعہ اور نازو نے ایک ساتھ کہا "اچھا؟"

پھر غالب نے کہا "اس نے پکڑوا دیا تھا تمہیں؟"

"نہیں۔ میں تو دلاور کے ساتھ تھا۔"

غالب نے سر پکڑ لیا "دیکھو۔ تم خود پاگل ہو چکے ہو تو ہمیں پاگل مت کرو۔"

میں نے انہیں ساری بات بتا دی جو ان کے لیے ناقابلِ یقین بھی تھی اور انتہائی پُرتجسس اور تحیر انگیز بھی۔ انہوں نے بیچ میں سوال بھی بہت کیے لیکن میں نے سب کا جواب تحمل سے دیا۔ کبھی شہرِ طلسمات کے مسافر کو ناممکن محسوس ہونے والے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے اسی دشواری کا سامنا ہو گا۔ اسے ثابت کرنا پڑے گا کہ جو کچھ اس نے دیکھا وہ خواب یا وہم و گمان کی بات نہیں تھی۔ وہ ہوش و حواس کے تجربات کا بیان کرتے ہوئے بھی ہوش و حواس میں ہے۔ اس کی بے سروپا داستان میں جو انہونی بات ہے وہ محض فریبِ خیال و نظر نہیں اور جو دوسروں کو بعید از قیاس لگتا ہے وہ بھی سچ ہے۔ راوی اگر عادی دروغ گو نہ ہو تو بالآخر لوگ یقین کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

میں نے عقل کی دلیل اور قطعی جواز کے ساتھ سب بتا دیا تھا مگر میں دیکھ رہا تھا کہ بے یقینی اب بھی سننے والوں کے چہروں سے عیاں ہے۔ وہ ابھی تذبذب اور گومگو کی کیفیت میں تھے کہ پوچھیں تو کیا پوچھیں؟

سب سے پہلے غالب نے کہا "تمہیں معلوم ہے نازو نے کیا دیکھا تھا؟"

"کیا دیکھا تھا؟ میرے سر پر ڈنڈا پڑتے ہوئے؟"

"نہیں۔ اس نے دیکھا تھا کہ تم گاڑی میں بیٹھ کے نکل گئے تھے۔"

"اور گاڑی میں کوئی نہیں تھا" نازو بولی۔

"ڈرائیور بھی نہیں تھا" میں نے کہا "پھر وہ گاڑی کیا خود چل کے آئی تھی؟"

"ممکن ہے اسے بھوت سر چلا رہا ہو" غالب نے کہا۔

رابعہ نے فوراً مداخلت کی "لیکن یہ کیسٹ تو واضح ثبوت ہے کہ سکندر جھوٹ نہیں بول رہا ہے۔"

وقار یوسف نے کہا "باجی۔ ان کو جھوٹا کس نے کہا ہے۔ نہ کوئی کہہ سکتا ہے۔"

غالب نے بھی سر ہلایا "سکندر کو کیا ضرورت ہے جھوٹ بولنے کی مگر جو سوالات ہمارے ذہن میں ہیں۔۔۔"

میں نے کہا "یار پوچھو۔ پوچھتے کیوں نہیں؟"

غالب نے سوچ کے کہا "تم بتا سکتے ہو۔۔۔ وہ جگہ کون سی تھی' جہاں تم کو قید میں رکھا گیا تھا۔۔۔ اور جہاں تمہیں چھوڑا گیا تھا؟"

میں نے کہا "سوری۔ نہ میں اس وقت ہوش میں تھا جب مجھے لے جایا گیا تھا اور پھر بے ہوشی کی حالت میں سڑک پر ڈال دیا گیا تھا۔"

"تم ہمیں وہاں لے جا سکتے ہو نا!" نازو نے کہا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا "اس کا فائدہ بھی کوئی نہیں۔"

"اچھا وہ کپڑے کہاں ہیں؟" غالب نے سوال کیا۔

"یہ مجھ سے غلطی ہوئی۔ میں نے جلدی میں انہیں جہاں اُتارا وہیں چھوڑ دیا ورنہ ایک اور ثبوت ہوتا میرے پاس" میں نے برہمی سے کہا "وہ جگہ یاد ہے مجھے لیکن کپڑے اب وہاں نہیں ملیں گے ورنہ میں تمہیں لے جاتا اور دکھا دیتا۔ اچھے خاصے قیمتی کپڑے تھے۔ کسی نے چھوڑے ہوں گے۔"

رابعہ نے پھر میری مدد کی۔ اس نے بات کا رخ موڑ دیا "یہ کیسٹ سننے کے بعد مجھے تو خوف محسوس ہو رہا ہے اس گھر سے۔"

غالب نے کہا "ہاں۔ وہ جگہ خطرناک ہے۔"

میں نے کہا "جہاں ایسے خفیہ مائیکرو فون نصب کیے جا سکتے ہیں۔ وہاں سب کچھ نصب ہو سکتا ہے۔ دلاور کی دھمکی سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ محل کی جگہ کھنڈر باقی رہ جائے گا۔ پہلے ماں گئی تھی' اب بیٹی کی باری ہے۔ کیا پتا اس نے تہ خانے کی دیواروں میں یا بنیادوں میں آتش گیر اور دھماکا خیز مادہ بھر دیا ہو۔ ڈائنامائٹ فٹ کر رکھے ہوں۔ ایک چنگاری دکھانے یا ایک بٹن دباتے ہی سب اُڑ جائے گا۔"

وقار یوسف نے سر ہلایا "یہ تو اس نے ایک طرح سے صاف بتا دیا ہے کہ چوہا ایسے ہی چوہے دان میں پھنستا ہے اور مارا جاتا ہے۔"

وقار یوسف کی بیوی نے جھرجھری لی "میں تو کہتی ہوں کہ لعنت بھیجو اس محل پر۔ اس سے تو جھونپڑی اچھی جہاں آدمی چین کی نیند سو سکتا ہے۔"

وقار ہنسنے لگا "اچھا ڈائیلاگ ہے۔ ویسے تم نے کبھی جھونپڑی میں قدم رنجہ فرما کے اندر سے دیکھا ہے؟"

وہ بولی "جس گھر سے میں آئی تھی اس کے مقابلے میں جھونپڑی تھا تمہارا یہ گھر۔۔۔"

"چلو ایک سچ تو تسلیم کیا تم نے۔۔۔ کہ تمہاری نظر میں ہماری اوقات کیا تھی۔ ہم جھونپڑی میں رہنے والے تھے اور تم محلوں کی شہزادی مگر بیوی دنیا جسے جھونپڑی کہتی ہے اس میں میرے مرحوم سسر کا بچپن گزرا تھا۔ جہاں وہ پیدا ہوئے تھے' وہ جھونپڑی تھی۔۔۔ بُرا مت ماننا۔"

وقار کی بیوی بُرا مان چکی تھی چنانچہ میں نے فوراً بات کا رخ رابعہ کی طرف کر دیا "بُرا یہ خاتون بھی مانیں گی اگر میں کہوں گا کہ لالچ کا انجام۔"

"میں نے کوئی لالچ نہیں کیا تھا" رابعہ بولی "وہ زمین میری تھی۔"

"لیکن جس شخص نے اس زمین پر تمہیں ایک محل کھڑا کر کے دیا تھا وہ تمہارا بھی جانی دشمن تھا۔ دشمن کی مہربانی بھی بے سبب تو نہیں ہوتی۔"

"اس نے جان چھڑائی تھی اپنی۔۔۔"

میں نے ہنس کے کہا "یہی تو اس کی چالاکی تھی۔ اس نے کہا کہ سوری وکیل صاحب۔ غلطی ہو گئی۔ معاف کر دیں اور یہ لیں اپنی کوٹھی۔۔۔ اسے میں نے ہی تباہ کیا تھا۔ میں ہی بنا کے دے رہا ہوں۔ تم نے اس کی معافی بھی قبول کر لی اور کوٹھی کے بدلے کوٹھی کو حق سمجھ کے قبول کر لیا۔ یہیں تم اس کی عیّاری سے مار کھا گئیں۔ اس نے جان بوجھ کے یہ "غلطی" کی تھی۔ بعد میں جو کچھ ہوا ہے اس کی منصوبہ بندی اور مرضی کے مطابق ہوا۔"

رابعہ نے خفگی سے کہا "میری جگہ تم ہوتے تو کیا کرتے؟"

میں نے دانت نکال کے کہا "وہی کرتا جو تم نے کیا۔"

"پھر میں نے کون سی غلطی کی۔۔۔"

"غلطی بھی محبت کی طرح کی نہیں جاتی۔ ہو جاتی ہے مِس رابعہ۔ ظاہر ہے کوئی عقلمند بھی دلاور سے مطالبہ نہ کرتا کہ کوٹھی گرا دو اور اپنا ملبہ اُٹھا کے لے جاؤ۔"

رابعہ مطمئن ہو گئی "میں نے تو اپنا بھی بہت کچھ لگا دیا ہے اس میں۔"

میں نے کہا "چاہو تو نکال لو۔"

"کیسے نکال لوں۔ جان کی بازی لگا کے۔ نہ بابا' مجھے تو ڈر لگتا ہے اب اس کے بارے میں سوچ کے بھی۔"

"آئیڈیا۔۔۔ غضب کا آئیڈیا۔۔۔ میرے عظیم دماغ کا کمال" غالب نے چٹکی بجا کے کہا "مِس رابعہ آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ کو میرے جیسے ذہین مشیر کی خدمات حاصل ہیں۔"

"آگے بھی کچھ بولو" رابعہ مسکرانے لگی۔

"دیکھیے۔ مالی معاملات میں مشورہ مفت نہیں دیا جاتا۔ آخر آپ بھی تو قانونی مشورے کی فیس لیتی ہیں" وہ ہاتھ مل کے بولا "آپ کو لاکھوں کا فائدہ ہو گا۔ مجھے کیا ملے گا؟"

"وہی جو تمہارے نصیب میں ہے" نازو نے کہا۔

میں نے کہا "موقعے کی مناسبت سے اپنے عاشق علی تڑپ کا ایک شعر یاد آگیا ہے' فرماتے ہیں۔

ہاتھی یا گھوڑے کے لیے روتا ہی پھرے گا
قسمت میں جو کھوتا ہے تو کھوتا ہی ملے گا

"دولہا کھوتے پر سوار ہو پھر بھی دولہا ہی ہوتا ہے' کیوں نازو؟" غالب نے کہا۔

"ہاں۔ اب تو گدھے بھی سرا باندھ کے آجاتے ہیں" نازو بولی۔

غالب نے آہ بھری "گدھے اور دولہا میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں کے نصیب میں ساری عمر بوجھ اُٹھانا ہوتا ہے۔"

رابعہ نے کہا "اب تم لڑنے لگو گے۔ وہ غضب کا آئیڈیا کہاں

گیا؟"

"بس رابعہ قاری۔ آپ وہ کوٹھی بیچ دیں۔" غالب بولا۔

"کوٹھی بیچ دوں!"

"میں نے فارسی میں یہ تو نہیں کہا تھا کہ سکندر کو بیچ دو خرکاروں کے ہاتھ۔"

رابعہ سوچ میں پڑ گئی "کسے بیچ دوں؟"

"کسی بھی خریدار کو۔ سازو سامان سمیت۔ اپنے جذبات سمیت۔"

رابعہ نے کہا "بات جذبات کی نہیں۔ خطرات کی ہے۔"

وقار یوسف کی بیوی نے کہا "بہت فائدہ ہے اس میں رابعہ باجی۔"

میں نے کہا "یہ ٹھیک ہے کہ مالی فائدہ بہت ہوگا مگر جانتے بوجھتے کسی کو موت کے منہ میں دھکیلنا......"

غالب نے کہا "دیکھو ہم اس کا اشتہار دیں گے۔ یہ اشتہار چوہدری دلاور کی نظر سے بھی گزرے گا اور وہ سمجھ جائے گا کہ ہم جان بچا کے بھاگ گئے۔ کسی ایسے شخص کو جس سے اس کا تعلق ہی نہ ہو۔ وہ کیوں مروائے گا۔ اگر وہاں کوئی ہلاکت خیزی کا سامان ہوگا۔ تو وہ دلاور کے کام نہیں آئے گا۔ اگر بنیادوں میں ڈائنا مائٹ ہے تو رہے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "پہلی بات تو یہ کہ خریدار کو لاعلمی میں رکھتے ہوئے ہم اس کا سودا کریں گے تو یہ بہت غلط بات ہوگی۔ یہ بڑا جان لیوا دھوکا ہوگا۔ حادثات کے امکان کو مسترد نہیں کیا جاسکتا۔ خوانخواستہ کبھی گھر میں آگ لگ گئی۔ یا بعد میں کسی مالک نے سوچا کہ نقشے میں تبدیلی کی جائے یا اس محل کی جگہ سینما اور شاپنگ سینٹر بنادیا جائے تو ظاہر ہے عمارت گرائی جائے گی۔ ایسا دس بیس سال میں بھی ہوسکتا ہے اور پچاس سال بعد اس گھر میں رہنے والی اگلی نسل کے ساتھ بھی۔ لاعلمی میں جتنے لوگ مارے جائیں گے سب کے خون کا الزام ہم پر آئے گا۔ اس دنیا میں نہ سہی۔ میدانِ حشر میں جواب دار ہم ہوں گے۔"

غالب نے کہا "چلو ہم خریدار کو بتادیں گے۔"

نازو نے طنز سے کہا "اشتہار میں یہ بھی لکھ دینا کہ اجتماعی خودکشی کے خواہش مندوں کے لیے سنہری موقع۔ آپ کے بعد لواحقین بھی صبرِ جمیل کی ضرورت سے بے نیاز ہوں گے۔ وہ آپ کے ساتھ ہی کوچ کریں گے۔"

وقار یوسف نے کہا "اس کے علاوہ چوہدری دلاور یہ سودا نہیں ہونے دے گا۔ اسے معلوم ہوگا کہ کوئی دلچسپی لے رہا ہے تو وہ خود اسے مطلع کردے گا کہ اس سودے میں وہ مارا جائے گا۔"

نازو نے کہا "یہی تھا تمہارا عظیم آئیڈیا؟"

غالب کھسیانا ہوگیا "ایڈیسن جیسا عظیم موجد بھی جب انڈوں پر بیٹھا تھا تو اس کا ایسے ہی مذاق اُڑایا گیا تھا۔"

نازو بولی "عظیم آئیڈیا نکلا ہے دماغ سے' بھوسے ...
نہیں۔"

"کاش میں تمہیں اپنا دل چیر کے دکھا سکتا" غالب ...

"اور تمہارا سر توڑ کے دیکھ سکتا۔ تم کو میرے جذبات کا اور ... تمہاری عقل کا صحیح اندازہ ہوجاتا۔"

وقار یوسف کسی گہری سوچ میں تھا۔ "سوال یہ ہے ... صاحب کہ اگر دلاور نے وہاں ایسا قاتلانہ انتظام کیا تھا' تو ... تک..."

میں نے اس کی بات کاٹ دی "وقار۔ دلاور کی مرضی ... نہیں تھی کہ ہم سب کو ختم کرادے۔ ایسے مواقع تو اسے بہت ... ملے جب وہ چاہتا تو باری باری سب کو قتل کردیتا لیکن وہ اچھی ... جانتا ہے کہ اس طرح مسائل میں اضافہ ہوجائے گا۔ وہ ڈرتا ... ہے کیونکہ اس کا بھی ایک خاندان ہے۔ بیوی بچے ہیں جو ابھی ... محفوظ ہیں۔ آپس میں ہم سب بھی ایک خاندان کے فرد ہیں ... فوقیت کے اعتبار سے ہمارا جذباتی رشتہ شاید زیادہ مضبوط ہے۔ ... چوہدری دلاور نے کسی ایک کی جان لی تو باقی سب اس کی جان ... دشمن ہوجائیں گے۔ ہمارا خاندان نہ رہا تو اس کا بھی نہیں ... گا۔"

"پھر یہ سب وہ کیوں کرتا ہے؟" وقار یوسف نے کہا۔

"یہ مجھ پر دباؤ ڈالنے کے حربے ہیں" میں نے کہا "اور ... کے ساتھ اس کی ذاتی دشمنی نہیں ہے۔ ایم آر ایس کے وجود ... آنے سے پہلے وہ شاید تم میں سے کسی کے نام سے بھی واقف ... تھا۔"

"اس کی بات کیوں کرتے ہو۔ تم کب جانتے تھے ہمیں۔"

"یہ بھی صحیح ہے" میں نے اعتراف کیا "میرے ساتھ صرف ... محسن تھا۔ ہوسکتا ہے اس نے محسن کا نام سُنا ہو۔ باقی سب بعد ... میرے ساتھی بنے جب اس کی اور میری ذاتی جنگ کا معاملہ ... منظر میں چلا گیا۔ ہم نے دلاور کے خلاف وہ جنگ لڑی جو ہر محاذ ... اس قوم کے ہر فرد نے لڑی تھی۔ اب پھر میرا اور اس کا معا... ہے۔ اسے میری وجہ سے اپنا سیاسی مستقبل خطرے میں نظر ... ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ میں اپنی خواہشِ انتقام سے دستبردا... ہوجاؤں۔"

"جو تمہارے لیے ناممکن ہے" غالب نے طنز سے کہا۔

"ظاہر ہے۔ وزیر خان میرا باپ تھا۔ اس کے وارث ... حیثیت سے یہ صرف میرا فرض بنتا ہے کہ اس کے قاتلوں کو ... دار تک پہنچاؤں۔ کسی اور کا نہیں۔ تم کہہ سکتے ہو کہ انتقام ... جہالت کی بات ہے۔ کینہ پروری ہے۔ عفو و درگزر میں ... ہے۔ ہوگی.... میں اصولی طور پر اس سے اختلاف نہیں کرتا ... میری فطرت کے تقاضے میری مجبوری بن گئے ہیں۔ شاید یہ ... پٹھان خون کی صفت ہے کہ ہم دشمن کے ساتھ اپنا حساب ا...

برابر کرنے کے قائل ہیں۔ چوہدری دلاور نے میرے والد کے اعتماد کا خون کیا۔ ان کا سب کچھ چھین کے انہیں پیسے پیسے کا محتاج کردیا۔ ایسا ہی دلاور کے ساتھ ہوگا۔ اس نے میرا حق غصب کیا۔ اس کی اولاد اپنے باپ کے ترکے سے محروم ہوگی۔ میرے حصے میں ذلت و خواری آئی۔ چوہدری دلاور کی اولاد بھی ذلیل و خوار ہوگی۔ میں اپنا حق حاصل کرکے رہوں گا اور آخری بات یہ کہ وزیر خان کا قاتل کوئی بھی ہو۔ اگر اسے قانون سزا نہ دے سکا تو میں دوں گا۔ جیسے میرے باپ کی قبر کا سراغ نہیں ایسے ہی دلاور کی قبر کا نام و نشان باقی نہیں رہے گا۔ یہ میرا عہد تھا اور میں آج بھی اس پر قائم ہوں۔ وقت گزرنے سے میرے جذبات نہیں بدلے۔ اس لیے کہ حقائق نہیں بدلے۔ جو کل سچ تھا وہ آج بھی سچ ہے۔"

فرطِ جذبات میں میرا لہجہ بہت تلخ ہوگیا تھا۔ میرا چہرہ گرم ہوگیا تھا اور آخری بات کہتے ہوئے میں نے صوفے کی ہتھی پر مُکا مارا تو میں نے دیکھا کہ باقی سب لوگ مجھے کیسی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

پھر خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہے ہیں اور کیا کہنا چاہتے ہیں مگر کہہ نہیں سکتے۔ میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ آج ان سب کی مشکل آسان کردوں گا۔ ان کی دوستی کے خلوص کی بہت آزمائش ہوچکی تھی۔ ان کے مجھ پر اتنے احسانات تھے کہ میں خود بھی اس سے زیادہ بارِ احسان کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا تھا کہ میں خودغرضی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ذاتی مقاصد اور اپنی زندگی کے مفادات کی خاطر انہیں اپنا ساتھ دینے پر مجبور کروں۔

جب وقار یوسف کی بیوی اُٹھی کہ "میں کچھ کھانے کا بندوبست کروں" تو میں نے کہا "دیکھو۔ بُرا ماننے یا ناراض ہونے کی بات نہیں۔ تم لوگوں نے میرا بہت ساتھ دیا۔ اب میں نہیں چاہتا کہ تم میرا ساتھ دو۔ دو[illegible] کا رشتہ جو قائم ہے' وہ باقی رہے گا۔ زندگی کی آخری سانس تک لیکن ہر ایک کی اپنی زندگی ہے اور اپنا مستقبل ہے۔ کوئی بھی اپنے حالات کے تقاضوں کو تمام عمر نظرانداز کرکے دوسرے کا ساتھ نہیں دے سکتا' یہ ناممکن ہے۔"

نازو نے غصے سے کہا "یہ قدر رہ گئی ہے اب ہماری۔"

میں نے ہنس کے کہا "قدر نہ کرتا تو کہتا کہ لعنت بھیجو اپنی زندگی پر۔ چلو میرے ساتھ۔ میں جس آگ میں کود رہا ہوں اس میں تم بھی کود جاؤ لیکن میں ایسا نہیں کرسکتا۔ مجھے تم جیسے دوستوں کی' ان رشتوں کی' خلوص اور محبت کی ہمیشہ ضرورت رہے گی۔ شاید کل زیادہ ضرورت محسوس ہوگی' کون سہارا دے گا مجھے اگر تم سب نہ رہے۔"

نازو نے کہا "میں ابھی تک سمجھی نہیں شاید کہ تم کیا کرنا چاہتے ہو اور کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"بہت آسان اور صاف بات ہے" غالب نے کہا "سکندر کا

کہنا یہ ہے کہ مجھے اب تمہاری ضرورت نہیں۔ جاؤ شادی کرو۔ گھر بساؤ اور خوش رہو۔"

"بالکل ٹھیک" میں نے بُرا مانے بغیر کہا "جیسے اکرام شیخ اور کاجل نے کیا جو محسن نے اور گُل نے کیا۔"

"تم طنز کر رہے ہو؟" غالب بولا۔

"نہیں یار۔ میں حقیقت بتا رہا ہوں۔ دیکھو آج تک ہم سب پریشانی میں اور ضرورت پڑنے پر کہاں جاتے تھے؟ منظر کے گھر۔ وقار یوسف کے گھر۔ نقوی صاحب کے گھر اور ہماری پہلی پناہ گاہ تھی انکل رضوی مرحوم کا گھر۔ اب محسن کہاں گیا آخر....؟ فوزیہ کے گھر۔ یہ گھر ہمارے لیے تحفظ کے حصار تھے۔ کیونکہ ہم سب کا اپنا کوئی گھر نہیں تھا۔ اب میرے لیے دو گھر اور ہو گئے ہیں۔ ایک گھر ہے اکرام شیخ اور کاجل کا۔ دوسرا محسن اور گُل کا۔ میں چاہتا ہوں کہ ایک گھر تمہارا بھی ہو۔ ظاہر ہے وہ بھی میرا گھر ہوگا۔"

"نہیں۔ وہ تمہارا گھر نہیں ہوگا۔ یہ حقیقت پسندی نہیں ہے۔ محض تغافل ہے" غالب نے کہا۔

میں نے ہنس کے کہا "جو گھر میرے والد نے چھوڑا تھا وہ میرا ہے۔"

"زیادہ چالاک مت بنو۔ سب کے ساتھ اپنی بات کیوں نہیں کرتے کہ رابعہ کا اور تمہارا گھر بھی...."

میں نے اس کی بات کاٹ دی "میں رابعہ کو دھوکے میں نہیں رکھ سکتا۔ ابھی میں خود نہیں جانتا کہ ایفائے عہد کی منزل کہاں ہے۔ عہد کرنا واقعی آسان ہے۔ نبھانا مشکل اور کبھی ناممکن ہو جاتا ہے کیونکہ حالات پر کسی کا اختیار نہیں۔"

"اپنے حالات تم خود پیدا کرتے ہو" نازو نے کہا۔

"میں اپنی مجبوری کی وضاحت کر چکا ہوں" میں نے کہا "میری وجہ سے تم سب نے بہت قربانی دی۔ بہت سختی جھیلی۔ نقصان اُٹھایا لیکن اب انتہا ہو چکی ہے۔ شیلی کی موت اور نقوی صاحب کے قتل نے مجھے جھنجوڑ کے رکھ دیا ہے۔ مجھے احساس ہو رہا ہے کہ مجھ سے تعلق کی وجہ سے خرابی کا دائرہ پھیلتا جا رہا ہے۔ کل کو خدانخواستہ وقار یوسف اور اس کی اتنی محبت کرنے والی بیوی کے پُرسکون گھر کو بھی میرے حالات نے تباہ کر دیا تو میں خود کو کبھی معاف نہیں کر سکوں گا۔ مجھے تو چاہیے کہ ان سب سے دور رہوں جو میرے اپنے کہلاتے ہیں۔ جو مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ انہیں سزا تو نہیں ملنی چاہیے اس محبت کی۔ یہ میری دوستی نہیں دشمنی بن جائے گی ان کے حق میں۔"

"پھر تم کیا کرو گے؟ سب کو چھوڑ دو گے؟" غالب نے غصے سے کہا۔

"ہاں۔ اسی میں بہتری ہے سب کی۔"

"لعنت سب پر۔ تمہاری بہتری کس میں ہے؟ یہ بھی سوچو۔"

"بہت سوچا ہے میں نے اور مزید سوچنا نہیں چاہتا۔ میں بتا چکا ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے لیکن یہ سب کچھ میں اکیلا ہی کروں گا۔ بُرا مانتے ہو تو مانو مگر تھینک یو ویری مچ۔ مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں۔ یہ احساسِ جرم میرے لیے سوہانِ روح ہوتا جا رہا ہے کہ میری دوستی نے تم سب کو آباد نہیں برباد کیا" میں نے اچانک رُخ رابعہ کی طرف کر لیا "ان سب کو گواہ سمجھ لو رابعہ۔ ان کے سامنے میں تم سے صاف کہنا چاہتا ہوں کہ مجھ سے توقعات مت رکھو۔ میرا کچھ پتا نہیں۔ میں کب لوٹ کے آؤں.... آؤں یا نہ آؤں۔"

رابعہ ایک دم اُٹھی تھی مگر میں نے اس کی کلائی پکڑ لی۔ اس نے خود کو چھڑانے کی واجبی سی کوشش کی "جہنم میں جاؤ۔"

"پوری بات سُن کے جاؤ۔"

"میں کچھ سُننا نہیں چاہتی۔ تم پاگل ہو۔"

"ہاں۔ میں پاگل ہوں۔ تم پاگل مت بنو ایک پاگل کے لیے" میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا "اپنی پریکٹس کرو۔ نام کماؤ، پیسہ کماؤ۔ سکندر کے آسرے پر مت رہو۔ اپنی زندگی برباد مت کرو۔ سنا تم نے!"

لیکن رابعہ کچھ سُنے بغیر دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی اور اب شاید کسی بیڈ پر گر کے رو رہی تھی۔

نازو آگ بگولا ہو کے اُٹھی "سکندر۔ شرم آنی چاہیے تمہیں۔"

"شرم سچ کہنے پر! مجھے دکھ ضرور ہے کہ میں نے سب کو یہ کڑوی گولی نگلنے پر مجبور کیا لیکن میں مطمئن ہوں کہ اب مجھ پر کوئی بار نہیں۔"

غالب نے صورتِ حال کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے کہ اس موضوع پر ہم بعد میں بات کریں گے۔"

"او کے۔ جیسی تمہاری مرضی" میں نے کہا "چلو تم مجھے یہ بتاؤ کہ فیصل آباد کیوں گئے تھے اتنی افراتفری میں؟ کوئی بات ضرور تھی جو تم نے چھپائی تھی۔"

غالب نے سپاٹ لہجے میں کہا "ہاں۔ محسن بہت پریشان تھا۔ وہ تم سے بات کرنا چاہتا تھا مگر میں نے کہا کہ سکندر کا کچھ پتا نہیں کہاں گیا ہے پھر اس نے مجھے بتایا کہ کسی نے فوزیہ کے شوہر کو اغوا کر لیا ہے۔"

"اس کی دشمنی تھی کسی سے؟"

"اغوا کرنے والے محسن کے دشمن تھے" غالب نے کہا "انہوں نے فون کر کے اسے دھمکی دی کہ تمہارا بہنوئی ہمارے قبضے میں ہے۔"

"او مائی گاڈ۔ پھر....؟"

"محسن پریشان ہو گیا۔ اس نے پوچھا کہ تم لوگ کون ہو اور کیا چاہتے ہو۔ اس نے جواب میں ایک قہقہہ لگایا اور کہا "اپنے محسن خاں شیروانی صاحب۔ ہم وہ ہیں، کیا کہتے ہیں اسے.... ہیں جی! شکاری.... تم خود سمجھ لو کہ ہم کیا چاہتے ہیں" محسن نے کہا کہ "میری بہن کو بیچ میں کیوں گھسیٹتے ہو۔ اس کا تو کسی بھی معاملے سے تعلق نہیں" تو اس نے کہا "فوزیہ کا تعلق تم سے تو ہے نا۔ کیا تم چاہتے ہو کہ وہ بیوہ ہو جائے؟" بس اس کے بعد لائن کٹ گئی اور محسن نے پریشانی کی کیفیت میں مجھے فون کر دیا۔"

"یہ بات فوزیہ کو معلوم تھی؟"

"نہیں۔ محسن نے فون ریسیو کیا تو فوزیہ کچن میں تھی۔ اس نے کچھ سُنا ہی نہیں تھا۔ اس نے بعد میں پوچھا کہ کس کا فون تھا تو محسن نے کہہ دیا کہ اپنے جیجا جی تھے۔ فوزیہ گرم ہونے لگی کہ مجھے کیوں نہیں بُلایا۔ میں پوچھتی کہ کہاں سے بول رہے ہو۔ محسن نے کہا کہ معذرت کر رہے تھے کہ مجھے اچانک سیالکوٹ جانا پڑ گیا۔ کسی ساتھی پروفیسر کا انتقال ہو گیا تھا۔ فوزیہ نے کہا کہ گھر پر فون کر کے اطلاع بھی نہیں دے سکتے تھے؟ محسن نے کہا کہ وہ کہتے ہیں میں فون کرتا رہا۔ کوئی اٹھاتا ہی نہیں تھا۔ فون خراب تھا شاید۔ اس وقت تو محسن نے ٹال دیا مگر بعد میں اسے اور کچھ نہ سوجھا۔ اس نے فوراً مجھے بُلا لیا کہ سکندر نہیں ہے تو تم آ جاؤ۔ اس وقت تک محسن نے پولیس کو بھی رپورٹ نہیں دی تھی۔"

"محسن تو سب کی آواز پہچانتا ہے۔ کون تھا فون کرنے والا؟"

"فون پر آواز بدل جاتی ہے اور شاید وہ اصل آواز میں بول بھی نہیں رہا تھا مگر محسن کو یقین تھا کہ یہ حرکت دلاور اینڈ کمپنی کی ہے۔ اس نے گُل کو بھی کچھ نہیں بتایا تھا مگر محسن کی حالت دیوانوں جیسی ہو رہی تھی جس سے فوزیہ کو بھی شک ہو رہا تھا کہ کوئی بات ضرور ہے۔ جب میں پہنچا تو ان کے شک کی تصدیق ہو گئی۔"

"پھر....؟" میرے اندر غصے کا آتش فشاں اُبلنے لگا۔

"بس یوں سمجھ لو کہ میرے ساتھ ساتھ ہی فوزیہ کا شوہر بھی پہنچ گیا اور فوزیہ سے پہلے محسن نے اسے ڈانٹا کہ سیالکوٹ جانا تھا تو فون کر دیتے اور فون نہیں ملا تھا تو کسی سے پیغام بھجوا دیتے۔ دیکھو فوزیہ کتنی پریشان ہے۔ وہ سمجھ گیا کہ محسن نے معاملے پر پردہ ڈال دیا ہوگا۔ معصوم صورت بنا کے کہنے لگا "کیا کروں یار۔ بات ہی ایسی تھی" محسن نے کہا کہ "کیا ہوا تھا تمہارے اس ساتھی کو۔ اچانک انتقال ہوا یا پہلے سے بیمار تھے؟" وہ ذہین آدمی ہے۔ اس نے فوراً ایک کہانی گھڑ کے سنا دی اور بات اس وقت تو ختم ہو گئی ابھی اسے اور مجھے گھر پہنچے آدھا گھنٹا ہوا تھا کہ پھر فون آ گیا۔ فون کرنے والا وہی تھا۔ اس نے کہا کہ محسن صاحب' خیر سے آپ کے وہ گھر پہنچ گئے کیا کہتے ہیں انہیں.... دولہا بھائی۔ ہیں جی' ہم نے کہا چلو ایک موقع دیں تمہیں۔ بہن کا سہاگ عزیز ہے تو ہماری بات سمجھ لو اور اپنے اس سکندرِ اعظم کو بھی سمجھا دو۔"

"آخر کیا سمجھانا چاہتے تھے مجھے وہ...." میں نے بے اختیار ایک گالی دے کے کہا۔

"محسن نے بعد میں مجھے بتایا کہ دلاور کے لہجے کی نقل کرنے والا دلاور بہرحال نہیں تھا" غالب بولا "لیکن وہ دلاور اینڈ کمپنی کا آدمی یقیناً تھا۔ اسے سب کچھ معلوم تھا۔ اس نے محسن سے یہ بھی کہا کہ دیکھو تم تو پہلے ہی بہت نقصان اُٹھا چکے ہو اس دوستی کے چکر میں۔ سکندر کا کیا گیا؟ تمہارے بیوی بچے مارے گئے اور ایسا نہ ہو کہ پولیس تمہاری گُل بانو کو ناگ منی سمجھ کے پکڑ لے۔ اگر وہ گرفتار ہو گئی تو اسے پھانسی ہوگی اور بچ گئی تب بھی عمر قید تو لازمی ہے۔ تم پھر گھاٹے میں...."

"محسن نے کیا جواب دیا اسے؟"

"کچھ نہیں۔ وہ سنتا رہا کیونکہ اس وقت وہاں گُل بھی موجود تھی۔ دھمکی دینے والے نے یہ بھی کہہ دیا کہ خبردار' اپنے ٹیلی فون کو آبزرویشن پر مت لگوانا۔ ویسے ہم کہیں سے بھی فون کر سکتے ہیں جیسے کہ تم کرتے تھے۔ کسی ٹیلی فون کے کھمبے پر چڑھ کے' ہمیں کون پکڑے گا۔"

"یہ بھی معلوم تھا اسے؟"

"ہاں یار۔ اس نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے فوزیہ پاس بیٹھی ہے یا گُل اس لیے تم چپ ہو۔ خیر' میں پھر بات کروں گا۔ پولیس کے پاس جانے کی حماقت مت کرنا۔ ان سے پہلے ہم پہنچ جائیں گے تمہارے پاس۔ محسن کا ڈرنا جائز تھا۔ وہ تو شاید دروازے پر نظر رکھے بیٹھے تھے کہ اِدھر میں پہنچا اُدھر انہوں نے فوزیہ کے شوہر کو چھوڑ دیا۔ دوسری بار فون آیا تو انہوں نے میرا نام لے کر کہا تھا کہ تم نے اچھا کیا غالب کو بُلا لیا۔ اب اسے سمجھا دینا کہ آج ہی واپس جائے اور سکندرِ اعظم سے کہے کہ وہ بھی سمجھ جائے۔"

میں نے کچھ دیر بعد کہا "غالب۔ کیا اس کے بعد بھی کسی دلیل کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ دیکھو یہ حرام زادے کہاں تک پہنچ گئے ہیں۔ ان کا ٹارگٹ صرف میں ہوں مگر براہِ راست دباؤ میں نے قبول نہیں کیا تو انہوں نے دوسروں کو نشانہ بنا لیا۔ ان کے ہاتھ کتنے لمبے ہیں۔ یہی ثابت کرنے کے لیے انہوں نے محسن کی بہن کا گھر تاکا۔ یہ وارننگ میرے لیے تھی کہ اس بار تو فوزیہ کے شوہر کو زندہ سلامت واپس کر دیا گیا ہے۔ وہ اگلی بار اس کی لاش بھی بھیج سکتے ہیں۔ ان کا اگلا نشانہ اکرام شیخ کا گھر بھی ہو سکتا ہے۔ وقار یوسف کا بھی ہو سکتا ہے۔"

"اس مشکل کا حل تمہارے نزدیک یہ ہے کہ ہم سب کو چھوڑ دو۔"

"اور کیا کر سکتا ہوں میں۔ اب تک جو ہوا سو ہوا۔ آئندہ کے لیے میں کوئی خطرہ مول لوں گا تو صرف اپنی خاطر۔ تم بس اپنی حفاظت خود کرو' ویسے اللہ تمہاری حفاظت کرنے والا ہے۔ میرے کسی معاملے میں تمہیں ملوث ہونا ہی نہیں چاہیے۔"

"یہ نہیں ہو سکتا یار" غالب نے جھنجلا کے کہا۔

"یہ ہونا چاہیے اور ہوگا" میں نے مضبوط لہجے میں کہا "ایک طرف میرے قانونی مسائل ہیں جن کا کوئی حل نہیں۔ پولیس سے

میں کب تک چھپ کے رہ سکتا ہوں۔ گنے چُنے ٹھکانے ہیں میرے۔ وہ بھی اب غیر محفوظ ہوگئے ہیں۔ یہ بات بھی معلوم ہوجائے گی دلاور کو۔"

"کون سی بات؟"

"یہی کہ میں تم سب کا ساتھ چھوڑ گیا ہوں یا تم سب نے بالآخر میرا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ میں خود بھی بتادوں گا دلاور کو کہ اب میری اور تمہاری جنگ ہے۔ ون ٹو ون۔ لیکن، اس نے میرے جذباتی رشتوں کو خراب کیا تو اس کے رشتے بھی محفوظ نہیں رہیں گے۔ آخر اس کے عزیز دوست اور رشتے دار بھی ہوں گے۔ اس کی بیوی کے بہن بھائی اور ماں باپ ہوسکتے ہیں۔ دلاور کے اپنے بچے ہیں۔ میں معلوم کرسکتا ہوں کہ وہ کہاں رہتے ہیں اور کہاں پڑھتے ہیں۔"

غالب نے مجھے نفرت سے دیکھا "یعنی اب اتنا گر جاؤ گے تم۔"

"اگر مجھے دیوار کے ساتھ لگادیا گیا۔ کوئی راستہ نہ چھوڑا گیا میرے لیے۔ فوزیہ کا' کاجل کا یا وقار کا گھر برباد کیا کسی نے تو میں دلاور کے لواحقین کو نہیں بخشوں گا۔ یہ مجبوری ہے یار۔ جنگ میں یکطرفہ اصول پرستی اور شرافت نہیں چلتی۔ تاہم میں پہل نہیں کروں گا۔ مجھے اُمید ہے کہ میری طرف سے بھی ایک دھمکی ہی کافی ہوگی پھر وہ سنبھل جائے گا۔ اگر اس نے فوزیہ کے شوہر کو اُٹھایا تو یہ ہوسکتا ہے کہ میں اس کی بہن، مگر اس کی بہن ہے کہاں... ایک شیلی تھی' خیر اس کی بیوی کی بہن تو ہوگی۔ یا اس کا بھائی ہوگا۔ میں اسکور ایک مرتبہ برابر کرنے میں کامیاب رہا تو دلاور کی پیش قدمی رُک جائے گی۔ اس کو بریک لگانا ضروری ہوگا غالب۔"

"شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو مگر تم اکیلے سب کچھ نہیں کرسکو گے" غالب گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

"اکیلا تو صرف خدا رہ سکتا ہے یا شیطان۔ یہ انگریزوں کا قول ہے۔" میں نے کہا "میں کہاں اکیلا ہوں۔ تم سب میرا ساتھ دو گے مگر سامنے آئے بغیر۔"

"صرف مورل سپورٹ (MORAL SUPPORT) کافی نہیں ہوتی" غالب نے کہا۔

"نہیں۔ تم بہت کچھ کرتے رہو گے۔ تم اخبار میں ہو۔ تمہارے ساتھ نازو ہے۔ یہ کتنا بڑا سہارا ہے" میں نے کہا "تمہارے' وقار اور منظر کے سارے وسائل میری دسترس میں ہوں گے۔ میرا تم سے رابطہ تو ختم نہیں ہوگا۔ دلاور کی جارحانہ کارروائی کے خوف سے بے نیاز ہوکے تم میری زیادہ مدد کرسکو گے۔ کیا غلط کہہ رہا ہوں میں؟"

"پتا نہیں یار۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا ہے۔ رابعہ قائل ہوجائے گی تو میں بھی قائل ہوجاؤں گا۔"

میں نے کہا "وہ مان جائے گی۔ یہ جذبات کا سیلاب گزر جائے پھر میں اسے سمجھادوں گا۔"

رات کے کھانے کا وقت ہوگیا مگر بھوک کسی کو نہیں تھی۔ وقار یوسف کی بیوی نے سب کو کھینچ کر میز پر لا بٹھایا۔ وقار یوسف نے بیوی کی مدد کی۔ اس نے نازو کو سمجھایا تو بیوی نے رابعہ کو ڈانٹا کہ تم عجیب بے وقوف ہو۔ رونے کی کیا ضرورت ہے۔ دماغ درست کردو خود کو سکندرِ اعظم سمجھنے والے کا۔"

اس کے باوجود کہ کھانے کی میز پر سب کی دل پسند چیزیں تھیں اور وقار یوسف کے ساتھ اس کی بیوی حقِ میزبانی ادا کرنے میں بے حد مستعد تھی سب نے جبرًا تھوڑا بہت کھایا۔ میری بات کرنے کی اور غالب کی ہنسانے کی کوشش ناکام ہوئی۔ کھانے کے بعد انہوں نے سب کو باہر لے جاکے آئس کریم کھلانے کی پیش کش کی۔ ابھی سب تیار ہی ہوئے تھے کہ منظر کا فون آگیا۔ میں نے وقار سے کہا کہ وہ مجھے اور غالب کو چھوڑ جائے کیونکہ منظر آرہا ہے۔ وقار یوسف کی بیوی نے بڑی ہمت سے کام لیا۔ ان حالات میں کہ اس کے باپ کا سوئم صرف ایک دن پہلے ہوا تھا وہ اپنا غم چھپاکے سب کی دلجوئی میں مصروف تھی۔ رابعہ نے سب سے زیادہ مزاحمت کی تھی مگر اسے نازو نے ساتھ چلنے پر مجبور کردیا۔

میں اور غالب چھت پر جابیٹھے۔ نیچے کے مقابلے میں اوپر حبس اور گھٹن کم تھی۔ چھت پر ایک طرف دو تخت بھی بچھے ہوئے تھے۔ ظاہر ہے ان پر وقار اور اس کی بیوی سوتے تھے۔ کچھ فاصلے پر بہت سی فولڈنگ کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ کینوس کی یہ ایزی چیئرز بہت آرام دہ تھیں اور دھوپ یا بارش سے خراب ہونے والی بھی نہیں تھیں۔

"کافی پیو گے؟" غالب نے کہا۔

"منظر آجائے۔ پہلے اس کی گالیاں کھالوں پھر کافی بھی پی لیں گے۔"

"تم نے شیلی کی بات تو کی تھی۔ اس کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا" غالب نے کہا۔

میں سوال جواب کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ ایک داستان تھی وہ بھی...... ختم ہوگئی۔"

"میں نے اس کی لاش اصل قبر سے نکلوا کے دوسری جگہ دفن کرادی تھی۔" غالب نے کہا۔

"کیسے؟ اجازت لے کر...؟"

"اجازت کون دیتا اور اس سے پہلے ہی چوہدری دلاور اپنی بہن کی لاش کا سراغ بھی مٹادیتا" غالب نے کہا "بس یہ کام تو ایسے ہی ہوگیا۔ جیسے ہوسکتا تھا۔"

"اب اس کا مدفن کہاں ہے؟"

"یہ میرے سوا کسی کو معلوم نہیں اور میں بتاؤں گا نہیں۔"

"مجھے بھی نہیں؟"

غالب نے نفی میں سر ہلایا "خدا نخواستہ کل تم سے کسی نے زبردستی معلوم کرنے کی کوشش کی تو ہوسکتا ہے کہ تم بتادو۔ آدمی مجبور ہوجاتا ہے۔ چوہدری دلاور اس معاملے میں بُری طرح پھنس گیا ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"رابعہ نے سب کچھ برٹش کونسلیٹ کو بھیج دیا تھا۔ شیلی کے تمام کاغذات' پاسپورٹ' کریڈٹ کارڈز' ٹریولرز چیک جو غیر استعمال شدہ رہ گئے تھے اور اس کی موت کے بارے میں تمام واقعات کی رپورٹ جس سے یہ خودکشی نہیں قتل ثابت ہوتا ہے۔ اس نے شیلی کا سارا بیک گراؤنڈ بھی بتادیا ہے کہ وہ کون تھی اور کہاں سے آئی تھی...؟ دلاور سے اس کا کیا رشتہ تھا۔ اس کی ماں کون تھی اور اس کا قتل کن حالات میں ہوا تھا۔ قاتل کون تھا اور اسے کس نے دیکھا تھا۔ وہ نیگرو جو چشم دید گواہ ہے۔ لندن کے شیخ صاحب اور شیلی کا سابقہ شوہر۔ یہ مکمل کیس اوپر پہنچ گیا ہے۔ اسی کی نقل آئی جی' پاکستان کے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کے صدر کو دی گئی ہے۔"

میں فکرمند ہوگیا۔ "رابعہ نے بہت بڑا خطرہ مول لیا ہے۔"

"وہ بے وقوف نہیں ہے۔ اس پر بارہ وکیلوں کے دستخط ہیں اور وہ سب سینئر وکیل ہیں۔ رابعہ اور منظر کے علاوہ دس ایسے لوگ ہیں جن پر دلاور کا باپ بھی ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔"

"اب لاش کا پوسٹ مارٹم کیسے ہوگا یا میرا مطلب ہے اصل قبر کی نشاندہی کیسے ہوگی؟"

"یہ بعد میں دیکھیں گے۔ پہلے قانون کا پہیہ تو حرکت میں آئے۔ عدالت سے احکامات مل جائیں کہ لاش کو نکال کے پوسٹ مارٹم کیا جائے۔ برطانوی سفیر کا نمائندہ' میڈیکل بورڈ اور پولیس کے افسران کی تفتیشی ٹیم کے ساتھ مجسٹریٹ قبرستان پہنچ جائیں گے تو کسی نہ کسی طرح یہ اطلاع بھی فراہم کردی جائے گی۔"

"مگر اس وقت وہ پابند ہوں گے کہ وہی قبر کھودیں۔"

"ہاں۔ قبر یا تو خالی ملے گی یا اس میں سے کسی اور کی لاش نکلے گی پھر خصوصی اختیارات کے تحت مجسٹریٹ کارروائی کرسکے گا۔ وہاں صحافی بھی ہوں گے اور وہ سب وکیل بھی جن کی درخواست پر ساری کارروائی ہوگی۔ وہ اپنی ذمّے داری پر دوسری قبر کی نشاندہی کریں گے۔"

"کیا دلاور کو معلوم نہیں ہوگا کہ لاش کو غائب کردیا گیا ہے اور یہ کام کس نے کیا ہے؟"

"اسے یہ معلوم نہیں ہوسکتا کہ اس میں صرف میرا ہاتھ تھا۔ میں نے کرائے کے مزدور حاصل کیے تھے۔ بڑی دور سے لایا تھا اور بہت بھاری معاوضے کے لالچ میں۔ انہیں بتادیا گیا تھا کہ خطرناک کام ہے مگر پکڑے جانے کا کوئی ڈر نہیں۔ سب کو دس دس ہزار روپے کے لالچ نے مجبور کردیا اور وہ میرے ساتھ میری شرائط پر چلنے کے لیے تیار ہوگئے۔ میں انہیں آنکھوں پر پٹی باندھ کے لایا تھا۔ پہلے تو انہوں نے گورکن کو باندھ کے ڈال دیا پھر دو نے شیلی کی قبر کھودی اور دو نے ایک نئی قبر تیار کی۔ صبح چار بجے تک سارا کام ختم ہوگیا۔ شیلی کی پرانی قبر اصل حالت میں نظر آنے لگی اور نئی قبر کا سراغ باقی نہ رہا تو میں انہیں پھر گاڑی میں بٹھاکے لے گیا اور وہیں چھوڑ آیا جہاں سے وہ آئے تھے۔ یہ خالص فلمی قسم کا سین تھا۔ میرے چہرے پر نقاب تھا اور گاڑی کی نمبر پلیٹ بدل دی تھی۔ ماڈل وغیرہ کو مزدور کہاں پہچان سکتے تھے۔"

"گاڑی کس کی تھی؟"

"کرائے کی۔ منظر نے اپنے نام سے حاصل کی تھی" غالب نے کہا۔

"گھر سے تم کچھ اور پروگرام بنا کے گئے تھے؟"

"ہاں لیکن بعد میں مجھے یہ خیال آیا کہ قبرستان میں کسی ایک قبر پر وردی والے محافظوں کی موجودگی سب کو متوجہ کرلے گی۔ اخبار والے دوڑیں گے پھر پولیس آجائے گی یہ پوچھنے کے لیے کہ معاملہ کیا ہے؟ میں نے دوسرا طریقہ اختیار کیا۔"

میں نے گھڑی دیکھ کے کہا "منظر کیوں نہیں پہنچا ابھی تک؟"

"اس کے پاس کوئی مؤکل بیٹھا ہوا تھا۔ منظر نے کہا تھا کہ اس سے فارغ ہوکے آتا ہوں۔"

اسی وقت سڑک پر ایک گاڑی نمودار ہوئی۔ اس میں دونوں طرف ڈبل ہیڈ لائٹس تھیں اور چار ہیڈ لائٹس والی گاڑی منظر کی نئی کورونا بھی ہوسکتی تھی۔ چھت پر سے سڑک دور تک نظر آتی تھی۔ وہ گاڑی سیدھی وقار کے گھر کی طرف آرہی تھی۔

میں نے کہا "شیطان کا نام لیا اور وہ نازل ہوگیا۔"

غالب اُٹھ کر منڈیر تک گیا تھا کہ منظر کو اوپر بُلالے۔ میں نے بھی گاڑی کو خاموش ہوتے سُنا اور اس کی ہیڈ لائٹس کے آف ہونے کو محسوس کیا مگر اس کے بعد مجھے غالب کا جھک کر نیچے دیکھنا اور خاموش رہنا کچھ عجیب سا لگا۔ یہ صرف چند سیکنڈ کی بات تھی۔ منظر گاڑی بند کرنے کے بعد باہر نکلتا تو غالب اسے اوپر بُلانے کے لیے آواز دیتا۔

میں اُٹھا ہی تھا کہ غالب نے پلٹ کے خاموشی سے مجھے قریب آنے کا اشارہ کیا اور میں نے اس کے ساتھ جھک کر منڈیر کی جالی سے جھانکا تو مجھے کار میں سے یکے بعد دیگرے چار افراد برآمد ہوتے دکھائی دیے۔

"منظر کہاں ہے؟ یہ کار تو اسی کی ہے" میں نے غالب کے کان میں سرگوشی کی۔

غالب نے سر ہلایا "ابھی معلوم ہوجائے گا جب یہ اوپر آئیں گے۔ نیچے تو کوئی بھی نہیں ہے۔"

"واٹ اے چانس! باقی لوگ آئس کریم کھانے کے لیے نہ جاتے تو ہم بھی نیچے ہی ملتے" میں نے کہا "ان چار سے تو ہم نمٹ لیں گے۔"

"انہوں نے منظر سے گاڑی چھینی ہوگی۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ وقار کا اور منظر کا فون بھی ٹیپ ہو رہا ہے" میں نے کہا "خدا کرے منظر محفوظ ہو۔"

گاڑی سے نکلنے والے چاروں افراد نے خود کو رات کی سیاہی میں گم کرنے کے لیے کالے کپڑے پہن رکھے تھے اور شاید باہر آنے سے پہلے انہوں نے منہ پر کالے نقاب بھی ڈالے تھے۔ اس نقاب میں جہاں آنکھوں کے لیے سوراخ تھے وہاں سے دھوپ کے چشموں کی چمک نظر آرہی تھی۔ انہوں نے آہٹ کیے بغیر گیٹ کھولا اور پھر کمانڈوز اسٹائل میں دوڑ کے اندر گھس گئے۔ انہوں نے بند دروازوں کو ٹکر ماری تھی لیکن دروازے مقفل نہیں تھے۔ ہم نے تو اندر سے کنڈی بھی نہیں لگائی تھی۔ نتیجہ یہ کہ دروازے ایک دم کھل گئے اور پچھلی دیوار سے ٹکرائے۔ میں اور غالب زینے کے دونوں جانب دیکھتے ہوئے نچلی منزل کے شور کو سنتے رہے۔ وہ دروازوں کو لاتیں مار مار کے کھول رہے تھے۔ باتھ روم اور کچن میں گھسے ہوئے بلند آواز میں ایک دوسرے کو بتا رہے تھے کہ یہاں بھی کوئی نہیں ہے۔ وہ غصے میں گالیاں بک رہے تھے اور توڑ پھوڑ کر رہے تھے۔

"...... بھاگ گئے" کسی نے ایک فحش گالی ہم سب کے لیے استعمال کی۔

"کیسے بھاگ گئے..." دوسرے نے دوسری گالی دی "کیا انہیں پتا چل گیا تھا؟"

"مگر گھر تو کھلا پڑا ہے!"

چوتھے نے کہا "دیکھو ہوشیار رہو۔ وہ بھاگے نہیں ہوں گے۔ آس پاس ہی چھپے ہوئے ہوں گے۔"

"اوئے کالیے۔ اوپر چھت پر جا کے دیکھ۔"

کالیے نے کہا "گورے کی اولاد۔ میں اکیلا جاؤں، تو چل میرے ساتھ۔"

"ساتھ نہیں، آگے پیچھے۔"

میں اور غالب سنبھل گئے۔ غالباً وہ کالیا ہی تھا جو دبے پاؤں اوپر آرہا تھا۔ اسے کور فراہم کرنے والا پیچھے تھا۔ حسب توقع وہ اپنے سامنے اندھیرے میں دیکھتے ہوئے سیدھے چلتے گئے۔ کالیے کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ چند قدم پیچھے آنے والا مشین گن سے مسلح تھا۔ میں نے اشاروں کی زبان میں غالب کو سمجھایا کہ میں پیچھے والے کو دبوچتا ہوں۔ کالیا پلٹ کے فائر کرنے کی کوشش کرے گا مگر اسے کچھ وقت لگے گا۔ غالب کے ذہن میں شاید اس سے بہتر منصوبہ تھا کہ اس نے گونگے بہروں کی زبان میں ہی مجھ سے کہا کہ تم اپنا کام کرو۔ میرا کام مجھ پر چھوڑ دو۔"

میں نے کالیے کے محافظ مشین گن والے کو ایک جست میں جالیا اور اسے ساتھ لیتا ہوا زمین پر گر گیا۔ اس کا سر پکے فرش والی چھت پر یوں لگا جیسے کوئی ناریل کو پوری قوت سے دیوار پر دے مارے۔ اس کا گلا میں نے پیچھے سے دبوچ لیا تھا۔ وہ آواز نکالے بغیر تھوڑا سا تڑپ کے ساکت ہو گیا مگر اس کے اور میرے گرنے سے چھت ہل گئی تھی۔

کالیے کی آواز میں نے اس وقت سنی جب میں مشین گن قبضے میں لے چکا تھا اور میدانِ جنگ میں لڑنے والے سپاہی کی طرح الٹا لیٹ کر اس کا نشانہ لے چکا تھا۔ کالیے نے چیخ مارنے کے انداز میں "ہائے" کہا اور اس کا بایاں ہاتھ بے اختیار سر کی طرف اٹھا پھر وہ لڑکھڑا کے وہیں ڈھیر ہو گیا۔ غالب کی نشانے میں مہارت پہلے سے ثابت تھی۔ ایک اور ثبوت اس نے ابھی ابھی کالیے کے سر کا نشانہ لے کر فراہم کیا تھا۔ جہاں وہ بیٹھا ہوا تھا وہیں اس کو آدھی اینٹ مل گئی تھی۔ ہر چھت پر تھوڑا بہت کاٹھ کباڑ ہوتا ہی ہے۔ اس نے وہ آدھی اینٹ توپ کے گولے کی طرح داغ دی تھی اور اسے اپنے نشانے پر اتنا بھروسا تھا کہ وہ اٹھ کے آگے نہیں آیا تھا۔

کالیے کی آواز نیچے سنی گئی تو کسی نے چلا کے کہا "اوئے کیا ہو گیا کالیے؟"

غالب نے ناک پکڑ کے حلق سے عجیب سی آواز نکالی اور پتا نہیں کون سی ناقابلِ فہم زبان میں کچھ کہا جو میری سمجھ میں نہیں آیا تو نیچے کون سمجھ سکتا تھا۔ ایک اور شخص جو نسبتاً جلد باز اور احمق تھا دوڑتا ہوا اوپر آگیا۔ اس وقت تک میں واپس اپنے مورچے میں آچکا تھا۔ میں نے پیچھے سے اس کے سر پر مشین گن کا بٹ مارا اور وہ منہ کے بل گر گیا۔ اس کے ہاتھ میں جو ریوالور تھا وہ فرش پر پھسلتا ہوا سیدھا گیا اور کالیے سے ٹکرا کے ٹھہر گیا۔

اب میں نے اوپر سے نیچے جھانک کر دیکھا۔ زینہ دو حصوں میں تھا اور عام زینوں کی طرح گھوم کے چھت تک پہنچتا تھا۔ اوپر والے کٹہرے سے میں نے پورچ میں چوتھے شخص کو دیکھا جو ریوالور تھامے اوپر دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"اٹن شن ہو جاؤ بیٹے۔ یہ گولی مار آلہ نیچے گرا دو" میں نے آواز بدل کے کہا "ورنہ میں اوپر سے تمہاری کھوپڑی میں سوراخ کر کے تمہیں گرا دوں گا۔"

شاید وہ چند سیکنڈ سوچتا رہا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ہتھیار ڈالنا بہتر ہے یا ادائے فرض کے لیے جان دینا۔ ظاہر ہے فرض پر زندگی کی محبت غالب آگئی اور اس نے ہاتھ نیچے رکھتے ہوئے ریوالور چھوڑ دیا۔

غالب وہ آدھی اینٹ اٹھا لایا تھا جس سے اس نے کالیے کو شکار کیا تھا۔ جیسے ہی آخری شخص نے ریوالور چھوڑا، غالب نے اوپر سے اینٹ چھوڑ دی۔ اینٹ اس پر قہرِ خداوندی بن کے نازل ہوئی۔ اس کے کاسۂ سر میں شگاف پڑنے سے خون کا فوارہ ابلا اور وہ پورچ میں لیٹ کر تڑپنے لگا۔

میں نے کہا "مرزا جی۔ مصیبت پیدا کر دی تم نے بلاوجہ۔ اتنا خون پھیلا دیا۔ اب اسے صاف کون کرے گا؟"

"اس کا سر کچا تھا" غالب نے اپنا دفاع کیا۔

"جلدی کرو۔ وہ لوگ واپس آنے والے ہوں گے" میں نے کہا۔

"جلدی کیا کروں؟"

"گاڑی کی ڈکی کھولو" میں نے کہا "میں دیکھتا ہوں کتنی لاشیں ہیں۔"

لاشیں تین تھیں۔ صرف کالیا پیشانی پر اینٹ لگنے سے بے ہوش ہوا تھا۔ اس کی حفاظت کرنے والے کی گردن ٹوٹ گئی تھی اور بعد میں اوپر آنے والا شاید سر کی اندرونی چوٹ سے مر گیا تھا۔ بظاہر وہ صحیح سالم نظر آتا تھا۔ میں نے کالیے کو نیچے منتقل کیا اور ایک لاش کو کندھے پر ڈال کے باہر گیا تو غالب ڈکی میں سے منظر کو نکال رہا تھا۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا گیا تھا۔

"میں... میں زندہ ہوں" منظر نے ہانپتے اور کانپتے ہوئے کہا "خدا تیرا شکر ہے۔ ورنہ بچے یتیم ہو جاتے۔"

میں نے کہا "چلیں آپ اندر تشریف لے جائیں۔"

"یہ... یہ کیا ہے؟" منظر نے میرے بوجھ کی طرف اشارہ کیا مگر غالب اسے کھینچ کے لے گیا۔

تیسری لاش نے بڑی خرابی پھیلائی تھی۔ میں نے اوپر جا کر مٹی سے بھرے ہوئے تین گملے گرائے۔ مٹی نے خون جذب کر لیا تو میں نے اندر سے برش لاکے مٹی کو اور گملے کے ٹکڑوں کو اکٹھا کیا اور اس ڈھیر کو ایک بوری میں بھر کے واپس چھت پر لے گیا۔ خون کی مقدار والی مٹی بڑی زرخیز ثابت ہوگی۔ میں نے دل ہی دل میں کہا اور یہ مٹی چند خالی گملوں میں بھر دی جو بالکل کورے تھے اور غالباً حال ہی میں لیے گئے تھے۔ گملے کے ٹکڑوں کو میں نے مکان کے پچھلے حصے میں ڈال دیا جہاں خالی میدان تھا۔

یہ سب کام مجھے دوڑ دوڑ کے بڑی تیزی سے کرنے پڑے۔ اتنی دیر میں غالب نے پورچ کو صاف کر دیا۔ میں نے اوپر سے ایک اور گملا نیچے گرا دیا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" غالب نے خفگی سے کہا۔

"سوری۔ نشانہ خطا ہو گیا" میں نے نیچے آتے ہوئے کہا "اب یہ مٹی کا پڑی رہنے دو۔ اس میں سے تھوڑی سی مٹی کالیے کے سر میں ڈال دو۔" غالب مٹی لے کر اندر گیا تو میں نے ہکا بکا کھڑے ہوئے منظر سے کہا "وکیل صاحب۔ تم ہوش میں ہو نا؟"

"چودہ طبق روشن ہو چکے ہیں بھوتنی کے۔ چودہ اور ہوں گے۔"

"دیکھو بات غور سے سن۔ تیرے ساتھ راستے میں جو بھی ہوا وہ ہم بعد میں سنیں گے" میں نے کہا "گھر والے باہر گئے ہوئے ہیں۔ جب وہ واپس آئیں تو انہیں یہ سب نہیں بتانا ہے۔ ہم چلتے ہیں یہاں سے۔"

غالب نے کہا "تم کہاں جا رہے ہو یار! مجھے اکیلا چھوڑ کے۔"

"تمہارے ساتھ کالیا ہے" میں نے ہنس کے کہا "ابھی باقی سب لوگ بھی آتے ہوں گے۔"

"میں کیا بتاؤں انہیں؟ یہ بھی بتا دو۔"

"کہنا یہ شخص چوروں کی طرح گھر میں گھسا تھا۔ میں نے اوپر سے گملا مار دیا۔" میں نے کہا "میں ان لاشوں کو ٹھکانے لگا کے بھائی منظر کو گھر چھوڑوں گا اور آجاؤں گا واپس ایک گھنٹے میں۔"

غالب کو میری حکمتِ عملی سے اختلاف ہوگا مگر اسے سوچنے سمجھنے یا جرح کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ میں نے حملہ آوروں کا اسلحہ اسٹور میں چھپایا اور منظر کو ساتھ لے کر روانہ ہو گیا۔ وقار یوسف شاید کسی اچھی جگہ کے چکر میں دور چلا گیا تھا یا وہ لوگ آئس کریم کھانے کے بعد باتوں میں مصروف ہو گئے تھے چنانچہ مجھے اتنی مہلت مل گئی تھی۔

ڈرائیونگ میں کر رہا تھا "منظر! یہ حملہ آور کون تھے؟"

"میرے سالے تھے سب۔ دوزخ سے آئے تھے؟" منظر جھلا کے بولا۔

"تجھے کہاں مل گئے...؟"

"راستے میں یار۔ سامنے آگئے گاڑی کے۔ ایک ہوتا تو میں سالے کے اوپر سے گزر جاتا مگر وہاں تو چار تھے اور سب مسلح تھے۔ مجھ سے کہنے لگے "وکیل صاحب، ہم ساتھ چلیں گے تمہارے۔ جہاں بھی تم جا رہے ہو" میں نے کہا "میں تو جہنم میں جا رہا ہوں" وہ ڈھیٹ تو سب تھے مگر یہ کالیا بڑا حرامی ہے۔ کہنے لگا کہ "ہم جہنم رسید بھی کر سکتے ہیں تمہیں لیکن تم شرافت سے چلو گے تو اسی دنیا میں اور کچھ دن گزار لو گے" میں نے کہا "تم سب خاندانی شرافت کا ثبوت دے رہے ہو" بس سالے نے کھٹ سے ریوالور مار دیا میرے سر پر اور ٹھونس دیا مجھے ڈکی میں۔"

منظر کی بات سنتے ہوئے میں راستے پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ ایک ویران اور تاریک موڑ پر میں نے گاڑی روکی اور ڈکی کھول کے ایک لاش باہر گرا دی۔ ایک میل بعد میں نے دائیں جانب موڑ کاٹ کے دوسری لاش چھوڑ دی اور پھر ایک میل بعد سیدھے ہاتھ پر آخری لاش پھینکی تو وہاں سے وقار یوسف کے گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔

"اب تم بھی اترو۔" میں نے منظر سے کہا۔

"ابے بھوتنی کے۔ تو بھی اپنے سالوں جیسا سلوک کر رہا ہے۔"

میں نے کہا "وکیل صاحب۔ کون سا پولیس اسٹیشن یہاں سے قریب ہے؟"

"قریب کوئی نہیں۔ ایک ڈیڑھ میل دور ہے۔"

"گاڑی میں یہاں چھوڑ رہا ہوں۔ میں خود بھی پیدل واپس جاؤں گا۔ تم رپورٹ لکھواؤ کہ تم سے چار مسلح افراد نے گاڑی چھین لی تھی۔ تم اپنے سر کے گومڑ کو بطور شہادت پیش کر سکتے ہو۔ معلوم نہیں وہ کون لوگ تھے اور کیا چاہتے تھے۔ تم تو گھر سے وقار

یوسف ایڈووکیٹ کے گھر جانے کے لیے نکلے تھے۔ تمہارا بیان بس اتنا ہی ہوگا۔"

"اور جو کچھ وقار یوسف کے گھر میں ہوا تھا؟"

"وہاں تم نہیں پہنچے وکیل صاحب۔ وہاں کی بات کیوں کرتے ہو۔ وہاں کے معاملات ہم سنبھال لیں گے۔"

"دیکھ یار سکندر۔ میری پہلی غلطی معاف کر۔ بیوی تو اپنا حقِ مہر معاف کر چکی۔ حقِ زوجیت تک معاف کرنے کو تیار ہے۔"

میں نے کہا "مگر میری کیا غلطی ہے؟"

"ابے غلطی تیری نہیں' میری تھی۔ دوستی کا پنگا لیا تیرے ساتھ۔ خواہ مخواہ۔"

میں نے ہنس کے کہا "تیری پہلی غلطی تھی تیرا پیدا ہونا۔"

"نہیں یار۔ تو چھوڑ یہ سارے دھندے۔ میں اپنی جان بچا کے بھاگ جاتا ہوں اور اپنے ساتھ رابعہ کو بھی ورغلا کے لے جاتا ہوں۔ تو میرے سارے بچے لے جا اور یتیم خانہ کھول لے۔ قسم خدا کی بڑے فائدے میں رہے گا۔ بڑی کمائی ہوگی۔ رابعہ یوں بھی تجھے عاق کرنے والی ہے۔"

میں نے گاڑی روک کے انجن بند کیا' چابی نکالی اور کہا "خدا حافظ۔"

"ابے سکندر۔ بھوتنی کے۔ اللہ کرے تیرے بھی سولہ بچے ہوں ایک بیوی سے اور تیری چار بیویاں ہوں۔ ایسی کی تیسی وکالت کی۔ میں ابھی تھانے جاکے تیرے سب جرائم کا اقرار کرلیتا ہوں کہ سب کچھ میں نے کیا تھا سکندر بن کے۔ مجھے پھانسی چڑھادو۔"

وہ بکتا جھکتا چلا گیا اور میں مخالف سمت میں چلتا ہوا آدھے گھنٹے بعد وقار یوسف کے گھر پہنچا تو حسبِ توقع وہاں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ مجرم یعنی مسٹر کالیا کو ایک کرسی سے باندھ دیا گیا تھا اور سب لوگ اس کے گرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ کالیا ویسے تو ہوش میں تھا مگر ایسا لگتا تھا کہ غالب نے جو اینٹ ماری تھی اس نے دماغ کے اندر پیچ پرزے ڈھیلے کردیے تھے۔ وہ گول گول آنکھیں گھمارہا تھا اور جھومنے کے انداز میں سرہلاتے ہوئے بلاوجہ مسکرارہا تھا۔

غالب نے مجھے دیکھتے ہی کہا "آپ کہاں تشریف لے گئے تھے؟"

میں نے کہا "حرام خوری... معاف کرنا' ہوا خوری کے لیے۔ یہ کون ہے؟"

وقار نے مجھے غور سے دیکھا "غالب کا کہنا ہے کہ یہ چور ہے مگر کمال کی بات یہ ہے کہ یہ کچھ لے کر نہیں گیا۔"

"میں نے آہٹ سنی اور اوپر سے دیکھا تو حضرت تھے۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ ایک پھول پھینکا تھا ان پر۔ گملے سمیت" غالب بولا۔

وقار نے کہا "چور اندر پھرتا رہا۔ اس نے الماریاں کھول کر دیکھ لیں۔ سب کچھ سامنے ہی رکھا تھا۔ چاہتا تو سب سمیٹ کر نکل جاتا۔"

"بے وقوف یا ناتجربہ کار لگتا ہے" میں نے ... مار کے کہا۔

وقار کی بیوی نے کہا "چلو خدا کا شکر ہے کچھ گیا ... بلاؤ پولیس کو اور ان کے حوالے کرو۔"

"خواہ مخواہ مصیبت کو بلاتی ہو" وقار نے کہا "... نہیں ہوا تو رپورٹ لکھوانے سے فائدہ۔ یہ مجھے ویسے ... لگتا ہے یا پھر مجہول ہے۔"

"یہ خود کیا بتاتا ہے اپنے بارے میں؟" میں نے کہا۔

"پہلے کہہ رہا تھا میں قطب مینار ہوں پھر کہنے لگا ... قطب الدین ہے اور میں ہرن مینار پر ہرن پکڑنے چڑھا ... سے کہہ رہا تھا کہ تم میری پھوپی ہو۔ رابعہ سے پوچھ رہا تھا ... فلم کے والی میں جو ٹوپی لگائی تھی وہ کہاں ہے۔ نازو خا... بات پر" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "یہ پاگل ہے تو پھر اسے باندھ کیوں رکھا ..."

رابعہ نے کہا "شاید یہ پاگل بن گیا ہے۔ اصل بات ... ہے۔"

شک نازو کو بھی تھا مگر میرے اور غالب کے بیان میں ... تضاد تھا اور نہ شک پیدا کرنے والی کوئی بات تھی۔ کالیا ... بتانے کی پوزیشن میں نہیں تھا یا بتانا نہیں چاہتا تھا۔

موقع ملتے ہی میں نے وقار یوسف سے کہا "اس کو پولیس کے حوالے کرنے کے بہانے باہر لے جاؤ اور اپنی گاڑی کی ڈکی میں ... دو۔ اچھی طرح باندھ کے اور منہ بند کرکے پھر گاڑی ... آجاؤ۔"

"یہ چکر کیا ہے آخر؟"

"تمہیں معلوم ہوجائے گا لیکن خواتین کو کچھ ... چاہیے" میں نے کہا "واپس آنے کے بعد چابیاں گاڑی ... دینا اور کہہ دینا کہ چور کو پولیس کے حوالے کردیا ہے۔ وہ ... چلا لیں گے کہ پاگل پن اصلی تھا یا نہیں۔ رپورٹ نہیں لکھوا...

سخت کنفیوز ہونے کے باوجود وقار یوسف نے میری ... لی۔ اس نے رات بارہ بجے گاڑی پورچ میں کھڑی کی ... اشارے سے بتادیا کہ سب میری مرضی کے مطابق ہوا ... رابعہ اور نازو خاصی پریشان اور متفکر نظر آتی تھیں۔ ... شک ہورہا تھا کہ اندر ہی اندر ہم کوئی کھچڑی پکا رہے ہیں ... بالکل نارمل نظر آنے کی کوشش کررہے تھے۔ وقار یوسف ... بیوی کے ساتھ اپنے بیڈ روم میں جاکے سو گیا۔ ظاہر ہے نیند ... بھی نہیں آرہی تھی مگر وہ اپنی بیوی کو ٹینشن سے بچانا ... رابعہ اور نازو دوسرے بیڈ روم میں چلی گئیں اور بہت دیر ... چپکے باتیں کرتی رہیں۔ غالب نے مجھ سے پوچھا کہ میں ... کہاں چھوڑا تھا اور لاشوں کا کیا ڈسپوزل کیا تھا۔ میں ...

... کے سونے کا انتظار کرتا رہا۔

... بتانا رہا اور اس ڈرائنگ روم کے کلاک نے دو گھنٹے بجائے۔ میں اس وقت بھی نیند سے لڑ رہا تھا۔ میں باتھ روم جانے کے بہانے اٹھا اور میں نے کان دروازے سے لگا کے رابعہ اور نازو کی گفتگو سننے کی کوشش کی مگران کی کھسر پھسر کے سوا کچھ سنائی نہ دیا غالباً وہ لائٹ آف کیے ہمارے ملکوک رویے پر اظہارِ خیالات فرمارہی تھیں۔ غالب نے مجھے باہر جاتے دیکھا تھا اور خود بھی میرے پیچھے آیا تھا۔ اس نے مجھے باتھ روم سے برآمد ہوتے اور پھر دوسرے بیڈ روم کے دروازے پر رکتے دیکھا تو پھر اپنی جگہ جاکے لیٹ گیا۔

"کیا جاگ رہی ہیں دونوں؟" غالب نے کہا۔

میں نے جھوٹ بول دیا "نہیں۔ تمہیں کیوں نیند نہیں آرہی ہے؟" میں نے جماہی لے کر کہا اور بستر پر ایسے گر گیا جیسے میں گہری نیند سے جاگا تھا۔

بالآخر تین بجے کے بعد مجھے یقین آیا کہ غالب سچ مچ سوگیا ہے اور اس کے خراٹے مصنوعی نہیں ہیں۔ میں کروٹ بدل کے اٹھ بیٹھا۔ اچانک فیصلے کا لمحہ آگیا تھا تو میرے عزم اور یقین کی چٹان میں جیسے دراڑ پڑنے لگی تھی۔ شاید غالب یا رابعہ کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ میں نے جو فیصلہ کیا ہے اس پر آج ہی رات عمل درآمد بھی کرگزروں گا لیکن تذبذب اور سوچ وبچار میں عمل کی گھڑی گزر جائے تو بعض اوقات دامن میں تمام عمر کے پچھتاوے رہ جاتے ہیں بقول علامہؒ کے۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق

عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی!

مجھے ان سب کے جذبات کا خون کرتے ہوئے اور ان کے خلوص کے رشتوں کی زنجیر توڑ کے جاتے ہوئے دکھ بھی ہورہا تھا اور یہ خوف اندر سے میرے دل میں انگارہ بن کے سلگ رہا تھا کہ کہیں یہ تعلق ہمیشہ کے لیے ختم نہ ہوجائے۔ ایسا نہ ہو کہ ان سے بچھڑنے کے بعد دوبارہ ملنا میرے اختیار کی بات نہ رہے۔ میں سچ مچ اکیلا نہ رہ جاؤں اور یوسفِ بے کارواں نہ ہوجاؤں۔

میں نے ڈر کو اور وسوسوں کو شیطان کی رخنہ اندازی سمجھتے ہوئے لاحول پڑھ کے دل سے نکال دیا اور آہستہ سے کھڑا ہوگیا۔ دنیا امید پر قائم ہے۔ ملنا ہو تو برسوں وقت کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے والے بھی اچانک کسی موڑ پر مل جاتے ہیں اور تقدیر میں جدائی ہو تو زندگی کے بے خطر راستوں پر ساتھ ساتھ سفر کرنے والوں میں سے ایک کو دستِ اجل اچانک یوں اچک لیتا ہے کہ دوسرے کی بات بھی پوری نہیں ہوپاتی۔ امید کے ساتھ یقین کا دامن بندھا رہے تو آدمی کبھی حوصلہ نہیں ہارتا۔

میں نے خاموشی سے باہر آکے اسٹور کا دروازہ کھولا اور اس میں سے وہ اسلحہ نکال لیا جو ہم نے حملہ آوروں سے چھینا تھا۔ ایک اسٹین گن کے ساتھ اضافی راؤنڈ تھے۔ دو اعشاریہ بتیس بور کے ریوالور تھے جو پوری طرح لوڈڈ تھے۔ میں نے ان چیزوں کو وقار یوسف کی گاڑی میں پیچھے کی سیٹ پر رکھ دیا۔ گاڑی کا ڈرائیونگ سائڈ والا دروازہ لاک نہیں تھا۔ اندر سے چابیاں نکال کے میں نے ڈکی کھولی تو ہلکا سا کھٹکا ہوا۔ میں نے فوراً پورچ کی لائٹ آف کردی۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد میں نے ڈکی میں جھانک کر دیکھا۔ کالیا بے حس وحرکت پڑا ہوا تھا۔ مجھے شک ہوا کہ کہیں وہ مر نہ گیا ہو۔ میں جھک کر اس کی سانس کو محسوس کرنا چاہتا تھا کہ اس نے آنکھیں کھول دیں۔

وقار جب اسے تھانے لے گیا تھا تو کالیا کو مضبوطی سے باندھ کر اچھی طرح پیک کرنے میں غالب نے بھی مدد کی تھی۔ اکیلا وقار یوسف یہ کام اتنی خوبی سے نہیں کرسکتا تھا۔ میں نے اس کے کندھے پر تھپکی دی جس کا مطلب یہ تھا کہ حوصلہ رکھو۔ ابھی سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

میں نے ڈکی بند کی اور گیٹ کی طرف گیا۔ فولادی گیٹ کی کنڈی کو آواز کیے بغیر کھولنا آسان کام نہیں تھا۔ گھر کے اندر جو لوگ سو رہے تھے ان کے لاشعور میں خوف جاگ رہا تھا۔ وہ معمولی سی آہٹ پر اٹھ کر بیٹھ جاتے یا تصدیق کے لیے آجاتے کہ کہیں چور کے بعد ڈاکو تو نہیں آگئے۔ وہ سب ایک سے حالات سے دوچار تھے اور سوتے جاگتے انہیں ہر سمت سے خطرات کی یلغار کا نفسیاتی خوف لاحق رہتا تھا۔ نقوی صاحب کے بعد شیلی کے قتل نے اور بعد کے واقعات نے سب سے تحفظ کا احساس چھین لیا تھا۔ اگر میری موجودگی میں وہ خود کو زیادہ غیر محفوظ سمجھتے تھے تو حق بجانب تھے۔ بعد میں مجھے امید تھی کہ وقت گزرتا جائے گا اور زندگی معمول پر آجائے گی تو سب ٹھیک ہوجائے گا۔

میں نے پھاٹک کھولا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ ابھی تک کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی۔ اس وقت کوئی بھی جاگ اٹھتا تو وہ سب کو اٹھا دیتا اور میرے فرار کی پہلی کوشش ہی ناکام ہوجاتی تو دوسری کی کامیابی زیادہ غیر یقینی ہوجاتی۔ اب مرحلہ تھا گاڑی کو باہر نکالنے کا۔ میرا خیال تھا کہ گاڑی کو خود ہی دھکیل کر باہر لے جاؤں پھر گیٹ بند کروں اور گھر سے کچھ دور لے جاکے گاڑی اسٹارٹ کروں تاکہ کسی کو پتا نہ چلے اور سکندر کی دغابازی کا علم صبح سے پہلے کسی کو نہ ہو۔

میں گیٹ کھول کر پلٹا تو میرے قدم ایک جھٹکے سے یوں رک گئے جیسے غلطی سے میرا پاؤں بجلی کے ننگے تار پر پڑگیا تھا۔ گاڑی کی اگلی سیٹ پر ایک سایہ سا نظر آرہا تھا۔ تاریکی میں ونڈ اسکرین کے شیشے کے پیچھے رابعہ کا چہرہ یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے اندھیرے کمرے میں گھڑی کا روشن ڈائل نظر آتا ہے۔ نہ جانے کب وہ ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر آبیٹھی تھی۔

میں تھکے قدموں کے ساتھ آگے بڑھا۔ "رابعہ..."

اس نے مسکرا کے ہونٹوں پر انگلی رکھی "چلو۔"

میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ "کہاں جانا ہے تمہیں؟" میں نے بدمزگی سے کہا۔

"جہاں تم جارہے ہو" وہ بولی۔

مجھے اپنی کوشش ناکام ہونے پر صدمہ بھی تھا اور پکڑے جانے کی خفت الگ تھی "میں تمہیں ساتھ نہیں لے جاسکتا" میں نے غصے کو ضبط کیا۔

"پھر تم بھی نہیں جاسکتے" اس نے پُرسکون اور مضبوط لہجے میں کہا۔

"رابعہ' دیکھو میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔"

"پہلے یہاں سے نکلو' پھر بات بھی سمجھ لوں گی تمہاری۔ کوئی آگیا تو۔" وہ گھر سے بھاگنے والی کسی کالج گرل کی طرح شوخی سے مسکرائی۔

میں نے سر پر ہاتھ مارا۔ قسمت کی خوبی دیکھئے ٹوٹی کہاں کمند۔ رابعہ نے میرے کئے کرائے پر پانی پھیر دیا تھا اور اب مجھے کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا کہ آج رات میرے لیے اپنے منصوبے پر عمل کرنا ممکن ہو۔ میں زبردستی بھی نہیں کرسکتا تھا۔ ورنہ میری پوزیشن زیادہ خراب ہوتی۔ ایک آخری امید یہ تھی کہ میں رابعہ کو ابھی اپنے ساتھ لے جاؤں اور اسے قائل کرنے کی کوشش کروں کہ جو کچھ میں کرنا چاہتا ہوں اس میں سب کی بہتری ہے لیکن میرا ساتھ کوئی نہیں دے سکتا۔ یہ مجھے کسی قیمت پر منظور نہیں ہوگا۔ اگر میں رابعہ کو قائل کرسکا تو شاید وہ صبر اور جبر سے کام لیتے ہوئے مجھے جانے دے ورنہ خیر سے بدھو گھر کو آئے۔ یہ تو طے ہے۔

"اچھا نیچے اترو۔ دھکا لگاؤ گاڑی کو" میں نے کہا۔

"پہلے تم اترو۔" اسے ڈر تھا کہ شاید میں اسے دھوکا اور دھکا دے کر نکل جاؤں گا۔

میں نے گاڑی کو دھکیلا۔ پورچ کی ڈھلوان سے گاڑی خود ہی پتلی سی سڑک پر پہنچ گئی۔ میں نے احتیاط سے گیٹ برابر کیا اور پھر گاڑی کو دھکا لگانے لگا۔ خود میں شاید اتنی دور تک گاڑی کو نہ دھکیلتا مگر غصے میں اور ایک انتقامی جذبے کے تحت میں نے رابعہ کو بھی ایک ایسا کام کرنے پر مجبور کیا جو ہرگز زنانہ کام نہیں تھا۔ میں اسے سزا دینا چاہتا تھا۔

جب خود میرا سانس پھولنے لگا تو میں دروازہ کھول کے اندر بیٹھ گیا۔ رابعہ فوراً دوسری سیٹ پر گر گئی۔ "مروادیا..." اس نے بڑی مشکل سے کہا۔

"مروادیا...! میں نے؟ تم نے مروادیا مجھے۔" میں نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اور ہانپتے ہوئے کہا "کس الو کے پٹھے نے کہا تھا..."

"خود کو.... گالی مت دو" وہ بولی۔

"میں نے.... میں نے کہا ہو تو لعنت مجھ پر" میں نے جل بھن کے کہا۔

"تمہارا کیا خیال ہے تم اس طرح جاسکتے تھے مجھے ... کے؟" رابعہ نے خفگی سے کہا "مجھے معلوم نہیں تھا کہ اتنے کمینے ہو تم۔"

"اب تو معلوم ہوگیا نا" میں نے کہا "جتنا تم سمجھتی ہو اس سے کہیں زیادہ کمینہ ہوں میں۔"

"پھر میں بھی کم نہیں ہوں۔ کمینوں کے ساتھ کمینہ بننا پڑتا ہے۔"

"تم دیکھنا میں جاؤں گا... اور ضرور جاؤں گا" میں نے اسٹیئرنگ پر مکا مار کے کہا "آج نہ سہی کل۔ تم مجھے روک نہ سکو گی۔"

"میں آج کب روک رہی ہوں تمہیں!"

میں نے دانت پیس کے کہا "میرا واپس جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں بھی جاؤں گی۔"

میں بھونچکا رہ گیا "تم.... پاگل ہوگئی ہو۔"

"ابھی کچھ دیر پہلے یہی بات میں نے تم سے کی تھی... جواب دیا تھا تم نے' یاد ہے؟ پاگل کا ساتھ پاگل ہی دے ... تو پھر.... خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔"

میں نے کہا "کہاں بیٹھیں گے۔ تمہارے ماموں کی حویلی کے مہمان خانے میں۔ جنگل میں یا کسی درگاہ کے مجاور بن کے ... ہی ہوتا تو یہیں نہ بیٹھا رہتا آرام سے؟"

"گاڑی چلاؤ آرام سے۔ ابھی کھمبے سے ٹکرا جاتے۔"

"تم مجھے غصہ دلا رہی ہو۔ اگلے کھمبے سے میں خود گاڑی ٹکرادوں گا۔"

"اگلا کھمبا تو گزر گیا۔ آگے تمہاری مرضی۔ ساتھ جئیں گے اور ساتھ مریں گے۔"

میں نے گاڑی روک لی "ڈیئر رابعہ۔ سمجھنے کی کوشش کرو ہماری یہ زندگی لیلیٰ مجنوں کی کہانی نہیں ہے۔ یہ تو ایسی کہانی ہے کہ اس پر فلم بن ہی نہیں سکتی۔ اب صحرا نوردی اور جوئے شیر لانے کے زمانے گئے۔ اصل قیس بھی جنگل میں اکیلا ہو تو اسے پولیس یا محکمہ جنگلات والے پکڑ لیں گے۔ سانپ کاٹ لے گا یا ملیریا ہوجائے گا مچھروں کے کاٹنے سے۔ فلموں والے ڈائیلاگ مت بولو کہ ساتھ جئیں گے اور ساتھ مریں گے۔ مریں ہمارے دشمن ہم ساتھ جئیں گے لیکن...."

"لیکن ساتھ رہیں گے نہیں۔ یہ کیا بات ہوئی؟"

میں نے کہا "لڑکی۔ عقل سے کام لو۔"

"صرف میں عقل سے کام لوں پھر جذبات کا کیا کروں؟ ... تجوری یا کولڈ اسٹوریج میں رکھوانے کی چیز ہوتی تو رکھوادیتی۔ ... بھی میں عورت ذات ناقص العقل۔ میرا سارا اثاثہ تو یہی جذبات ہیں۔"

میں سمجھ گیا کہ رابعہ کو بحث سے قائل کرنا مشکل ہوگا "رابعہ۔ ذرا سوچو تم میرا ساتھ کیسے دے سکتی ہو۔ میری اور تمہاری پوزیشن میں بہت فرق ہے۔ میں ایک مفرور اشتہاری مجرم ہوں۔ تم ایک نامور عزت دار وکیل ہو۔"

"میں تو بس ایک بات جانتی ہوں وہ یہ کہ تم سکندر ہو اور میں رابعہ۔ باقی سب باتوں سے مجھے کیا لینا دینا۔ ہاں تم انکار کردو کہ تم مجھ سے محبت نہیں کرتے۔ یقین دلادو مجھے کہ تمہیں کل بھی میری ضرورت نہیں ہوگی۔ کبھی نہیں ہوگی۔ تو میں تمہارا ساتھ کیا یہ دنیا چھوڑ دوں گی۔"

"بس اب تم اپنا آخری ہتھیار آزماؤ گی۔ رونا شروع کردو گی" میں نے زچ ہو کے کہا "لیکن میں اس ڈرامے سے متاثر ہونے والا نہیں۔"

وہ تنک کے بولی "کون کررہا ہے ڈراما۔ تم مجھے رلانا چاہتے ہو۔"

میں نے طنز سے کہا "یہ تو خالص زنانہ ادا ہے کہ تم تو مجھے چھیڑو گے' مجھے معلوم ہے تم مجھے چھیڑو گے۔ میں تو چاہتا ہوں کہ تم ہنستی رہو۔"

"تو پھر چلو۔" اس نے میری بات کاٹ دی۔

"تم جذباتی ہورہی ہو۔ بعد میں پچھتاؤ گی۔"

رابعہ نے سپاٹ لہجے میں کہا "بہت پچھتا چکی میں۔ پچھتائی میں تم سے مل کے تھی۔ زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی پھر تم سے محبت کرکے پچھتائی تھی میں مگر یہ میرے اختیار کی بات نہیں تھی۔ ہونی کو انہونی کون کرسکتا تھا پھر میں تمہارا ساتھ چھوڑ کے اور واپس آکے پچھتائی تھی۔ مجھے بتاؤ کیا تمہیں دکھ نہیں ہوا تھا۔ کیا تم نے طعنے نہیں دیے تھے بعد میں کہ رابعہ کم ہمت ثابت ہوئی تھی۔"

"وہ.... اور بات تھی..." مجھے کوئی جواب نہ سوجھا۔

"پھر میں پچھتائی تھی اپنی پریکٹس دوبارہ شروع کرکے۔ میں پچھتائی تھی تمہارے ساتھ بے نیازی کا اور غیریت کا انداز اختیار کرکے۔ حالانکہ اس میں بھی میرے جذبات کی خیر خواہی شامل تھی لیکن اس کی بہت سخت سزا دی تم نے مجھے۔ تم نے یہ ظاہر کیا کہ تمہیں میری پروا نہیں اور تم شیلی کے ساتھ ہوگئے۔"

"اپنے دل پر ہاتھ رکھ کے کہو۔ کیا تمہیں واقعی یقین تھا کہ میں شیلی کی خاطر تمہیں چھوڑ دوں گا۔"

"نہیں۔ یہ تو خیر ناممکن تھا.... لیکن.... میں تمہارا جھوٹا تعلق بھی برداشت نہیں کرسکتی۔ تم کسی عورت میں مجھے جلانے کے لیے دلچسپی لو۔ یہ بھی گوارا نہیں مجھے۔ پتا نہیں کیسے میں نے ضبط سے کام لیا۔ غالب اور ناز نہ روکتے رہتے تو کسی روز.... خیر چھوڑو...."

"مجھے شیلی کی موت کا کتنا دکھ ہے!"

"تم سے زیادہ مجھے دکھ ہے" رابعہ نے کہا "اب میں نے فیصلہ کرلیا ہے۔"

"کیا فیصلہ کرلیا ہے؟"

"میں اور کوئی غلطی نہیں کروں گی۔ مجھے معلوم ہوگیا ہے کہ تم کتنے ضدی ہو۔ تم کسی کی نہیں مانو گے اور جب تک انتقام نہیں لوگے چین سے نہیں بیٹھو گے۔ میں نے بہت سوچا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ رابعہ قاری ایڈووکیٹ ہائی کورٹ بن کے رہنا چاہیے' اپنے شاندار نئے گھر میں؟ اور جدائی کے بعد انتظار کے عذاب کو نوشتہ تقدیر سمجھ کے صبر کرنا چاہیے؟ وقت ہر درد کا درماں بن جاتا ہے تو کیا مجھے وقت گزارنے کے لیے خود کو شب و روز کی مصروفیات میں خود کو بھی بھلادینا چاہیے؟ کیا مجھے تمہارے بغیر زندگی کو جینے کی سزا بناتے ہوئے خود کو تنہائی کی اذیت' محبت سے محرومی اور احساسِ پشیمانی کے جہنم میں جھونک دینا چاہیے؟ یا... یا کوئی اور سہارا تلاش کرلینا چاہیے۔ جینے والے یوں بھی تو جیتے ہیں آخر کہ تو نہیں اور سہی۔ اور نہیں اور سہی..... ایک سکندر میں کیا ہے جو کسی اور میں نہیں لیکن افسوس کہ ہر سوال کا واضح جواب نفی میں تھا۔ وہ سب ناممکن تھا جو میرے دیوانہ وار بھٹکتے ہوئے ذہن نے سوچا تھا۔ میرے سامنے تو صرف ایک ہی در امکاں کھلا ہوا تھا۔ باقی سب در بند تھے۔ اگر تم میرا ساتھ نہیں دے سکتے تو پھر میں تمہارا ساتھ دوں۔ سایہ تو وجود کے ساتھ ہی رہے گا۔ آگے رہے یا پیچھے۔"

میں نے اسے بانہوں میں سمیٹ لیا۔ اس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں کو۔ اس کے لب و رخسار کو چومتے ہوئے میں نے کہا "رابعہ۔ پلیز میری بات مان لو۔ واپس چلی جاؤ۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ لوٹ کر ضرور آؤں گا تمہارے پاس۔"

اس نے میرے شانے پر سر کو نفی میں ہلایا "نہیں سکندر۔ میں نے سب کو چھوڑ دیا ہے۔ میں صرف تمہارے ساتھ ہوں۔ نہیں کرنی مجھے وکالت۔ کیا ملے گا مجھے دنیا کے مقدمات لڑ کے اگر میں اپنی محبت کا کیس ہی ہار گئی۔ پیسے کی کسے ضرورت ہے۔ بہت ہے ہمارے پاس ہماری زندگی کے لیے۔ اب نہ میں تمہاری وکیل ہوں اور نہ تم میرے موکل۔ تم میری زندگی ہو۔ میرا مستقبل ہو۔ تم میرے ہو۔ میرے مالک اور میری ملکیت ہو۔ جب ہم اپنا گھر آباد کریں گے تو تم میرے مجازی خدا' اس گھر کے سربراہ' میرے بچوں کے باپ بنو گے۔"

میں دم بخود اسے دیکھتا رہا "اور تب تک..."

"تب تک تم میرے محافظ ہو اور میں تمہاری محافظ ہوں۔ ٹھیک ہے کہ میں تازو کی طرح لڑ بھڑ نہیں سکتی۔ بہت سی خامیاں ہیں مجھ میں مگر میں مر تو سکتی ہوں تمہارے ساتھ۔ واپسی تمہارے لیے نہیں ہے تو میرے لیے بھی نہیں ہے۔ میں نے بھی سب کشتیاں جلادی ہیں۔"

میں نے اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو صاف کئے۔ "او کے' او کے جانم۔ معاف کردو اپنے سکندر کو جو تمہیں چھوڑ کے جارہا

تھا۔ کون کہتا ہے کہ تم میں خامیاں ہیں۔ تمہاری سب سے بڑی خوبی تو یہ ہے کہ تم رابعہ ہو۔ باردھاڑ میں سکھاؤں گا تمہیں۔ قتل کرنا تو آتا ہے تمہیں۔ عشوہ و غمزہ و ادا سے۔"

وہ مسکرانے لگی۔ میں نے پھر گاڑی اسٹارٹ کی۔ اب صبح کے ساڑھے چار بجنے والے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ اجالا پھیلنے سے پہلے آبادی سے نکل جاؤں۔ وقار کی گاڑی کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اس کی چوری یا گمشدگی کی رپورٹ نہیں لکھوائے گا۔ اسے یہ بھروسا بھی رہے گا کہ میں اس کی گاڑی کسی واردات میں استعمال نہیں کروں گا۔ اس کے پاس اپنے سسر نقوی صاحب مرحوم کی چھوڑی ہوئی دو کاریں تھیں۔ نقوی صاحب کی واحد وارث کی حیثیت سے ان کی بیٹی کو سب کچھ مل گیا تھا۔ قانونی کارروائی محض رسمی ضرورت تھی۔ نقوی صاحب کی نئی عالی شان کوٹھی اور ان کا سارا اثاثہ بالآخر وقار کے تصرف میں آگیا تھا۔ تدبیر کند بندہ۔ تقدیر زند خندہ۔ نقوی صاحب نے تو سوچا ہوگا کہ میری بیٹی کسی توپ بیوروکریٹ یا صنعت کار کے گھر جائے گی۔ دولت کا یہ دریا کسی دوسرے دولت کے دریا میں گرے گا تو دولت کا سمندر بن جائے گا اور ان کے بعد ان کی آنے والی نسلیں اس سمندر پر حکمرانی کریں گی۔ ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا۔ شاید زیادہ عبرت ناک ایک دوسرا مصرعہ ہے کہ۔ سامان سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں۔ آدمی جسے زیادہ سے زیادہ سو برس بعد قبر میں جا لیٹنا ہے کیوں پریشان رہتا ہے کہ اس کے بعد اگلے سو سال یا دو سو سال میں اس کی دولت کا درخت کتنا پھیلے گا۔ کیا کر سکتا ہے کسی کروڑ پتی یا ارب پتی کا ڈھانچا جس نے عمر پیسہ پیسہ جوڑ کے گزاری ہو۔ اگر اس کی اولاد سب جوئے میں ہار دے یا فقیروں میں بانٹ دے۔

وقار یوسف کی گاڑی فی الحال میری ضرورت تھی۔ ایک تو اس لیے کہ میرے پاس دلاور کے رابطے کا واحد ذریعہ اس گاڑی میں نصب ریڈیو وائرلیس سسٹم تھا پھر اس کی ڈکی میں ایک شخص بند تھا جو مجھے مفید معلومات فراہم کر سکتا تھا۔ یہ گاڑی محفوظ بھی تھی کیونکہ ایک وکیل کے نام یہ رجسٹرڈ تھی اور اس کے بارے میں چوری کی رپورٹ ہونے کا امکان نہیں تھا۔

میں سیدھا قصور کی طرف نکل آیا تھا اور اب کسی مناسب جگہ کی تلاش میں تھا جہاں میں اپنی گاڑی کے ساتھ بحفاظت ایک دن گزار سکوں۔

اچانک رابعہ نے کہا "نہر۔"

میں نے کہا "ہاں۔ حیرانی کی کیا بات ہے۔ پہلے نہر نہیں دیکھی؟"

"نہر پر ریسٹ ہاؤس ہے" رابعہ نے کہا۔

"ریسٹ ہاؤس۔ یعنی آرام کرنے کی جگہ؟" میں نے اسے ڈانٹا "ابھی سے آرام کی سوجھ گئی" اور گاڑی کا رخ ریسٹ ہاؤس کی طرف کردیا۔

"تم نے اسلحہ سیٹ پر ڈال رکھا ہے۔"

"اوہ۔ یہ تو میں بھولا ہوا تھا" میں نے گاڑی روک لی۔

"اسے سیٹ کے نیچے کردو۔ اور یہ لو۔"

میں نے کہا "یہ کیا ہے؟ گھر سے سفر کے لیے آلو قیمہ اور پراٹھے پکا کے لائی ہو؟"

وہ ہنسی "اس میں باقی رقم ہے۔ دو لاکھ اور کچھ۔"

"یہ رقم کہاں سے آئی؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"بھول گئے، کل کو اس کے من موجی بھائی نے چار لاکھ دیے تھے۔ ایک لاکھ تو محسن لے گیا تھا... باقی غالب نے..."

"اچھا اچھا۔ حساب بعد میں دینا۔ یہ بتاؤ کہ تم کیوں اٹھا لائی ہو یہ رقم؟"

"اس لیے کہ ضرورت پڑے گی تو ہم کس بینک سے چیک کیش کرائیں گے۔ ضرورت کہیں بھی پڑ سکتی ہے۔"

میں نے پیچھے والی سیٹ نکالی۔ "تم نے اپنی افادیت ثابت کرنی شروع کردی ہے ابھی سے۔"

پیچھے والی سیٹ کے نیچے ایک سب مشین گن کے لیے جگہ تھی۔ میں نے نقد رقم میں سے کچھ اپنے پاس رکھ کے باقی وہیں پھیلادی اور سیٹ کو پھر فکس کردیا۔ ایک ریوالور چیک کرکے میں نے رابعہ کو تھمادیا اور دوسرا اپنے پاس رکھ لیا۔

نہر کے کنارے والی سڑک پر دو فرلانگ ڈرائیونگ کے بعد میں نے محکمۂ انہار کا ریسٹ ہاؤس دیکھا۔ سرکاری عمارات کے طرز کا ریسٹ ہاؤس خاصی محفوظ جگہ تھی۔ اس کے احاطے میں ایک ہی جیپ کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے طویل برآمدے کے دوسرے کنارے پر گاڑی روکی تو دائیں جانب کی گلی سے ایک بوڑھا نمودار ہوا۔ اس کے سر کے بال تقریباً سفید تھے اور خاکی وردی برسوں پرانی لگتی تھی۔

کوئی سوال کیے بغیر اس نے مجھے ہاتھ اٹھا کے سلام کیا۔ ان غریب چوکیدار قسم کے ملازموں میں اتنی اخلاقی جرأت بھی نہیں ہوتی کہ وہ کسی کار میں آنے والے سے آمد کی غرض وغایت پوچھ سکیں یا ریسٹ ہاؤس میں قیام کی اجازت دینے سے پہلے شناخت کرانے کی درخواست کریں۔ کمرے دستیاب ہوں تو ہر افسر اور صاحبِ ثروت ان کمروں کو استعمال کرلیتا ہے اور خود چوکیدار بھی بخشش کی توقع میں انہیں خوش آمدید کہتا ہے۔ اس وقت سورج طلوع ہو چکا تھا۔

ریسٹ ہاؤس انگریزی حرف ایچ کی شکل میں بنا ہوا تھا۔ دو کمرے بالکل سامنے تھے اور وی آئی پی روم تھے۔ ان کے پیچھے کچن تھا۔ دائیں بائیں عمودی رخ پر چار چار کمروں کی قطار تھی۔ کار پارکنگ سامنے والے حصے میں تھی۔ عقبی حصے میں لان تھا جس کی حالت بتاتی تھی کہ اس کی دیکھ بھال کوئی ہنر مند مالی کرتا ہے۔

کسی دشواری کے بغیر ہمیں دائیں طرف کی قطار کا پہلا کمرا مل

گیا۔ جہاں گاڑی کو ہم سامنے تک لا سکتا تھا۔ چوکیدار نے کمرا کھولنے کے بعد کہا کہ وہ ابھی دس منٹ میں صفائی کرادے گا اور بستروں کی چادر بھی بدل دے گا۔ میں نے افسروں کی طرح سہلایا اور اسے سو کا ایک نوٹ دے دیا "بابا یہ اخراجات کے لیے ہے۔"

"دوپہر کے کھانے میں کیا ہوگا؟" رابعہ نے سوال کیا "خیر جو بھی ہوگا چلے گا۔ ابھی تم چائے لاؤ پھر ناشتا پورا۔"

"جی بیگم صاحب۔"

"اور کون ٹھہرا ہوا ہے یہاں؟" میں نے کہا۔

"واپڈا کے کوئی صاحب ہیں جی" وہ بولا۔

جب وہ چادریں بدلنے آیا تو اس کی بغل میں ایک رجسٹر بھی تھا۔ اس میں نام لکھ دیں اپنا سر۔"

میں نے رجسٹر لے کر اس کے دونوں صفحات کا مطالعہ کیا اور پھر ایک نام کا انتخاب کیا۔ یہ پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ کا کوئی ایکس ای ایس شیخ رشید تھا۔ ایک تو اس کے دستخط کرنا آسان تھا دوسرے اس کا ہینڈ رائٹنگ بھی کاپی کیا جا سکتا تھا۔ ظاہر ہے چوکیدار نے اندراج پر نظر نہیں ڈالی اور رجسٹر کو اسی طرح بغل میں دبا کے واپس لے گیا۔ وہ کچھ دیر بعد چائے لے کر آیا اور برتن درمیان کی ٹیبل پر سجا کے رخصت ہوگیا۔

رابعہ باتھ روم میں جا کے منہ دھو چکی تھی اور ایک بیڈ پر چپ لیٹی تھی۔ اسے میں نے یہ نہیں بتایا تھا کہ کار میں ہمارے ساتھ تیسرا مسافر بھی تھا جو ابھی تک ڈکی میں بند ہے۔ مجھے اس کی طرف سے تشویش یہ ہونے لگی تھی کہ کہیں وہ مر نہ چکا ہو۔ ایسے بے حس و حرکت اور بند پڑے رہنے کے علاوہ پچھلے حصے کے جھٹکوں سے صحت مند آدمی کی قوتِ برداشت بھی جواب دے جاتی ہے۔

چائے پیتے ہوئے میں نے کہا "رابعہ۔ ایک آدمی کو اندر لانا ہے۔"

وہ چونکی "کون ہے وہ آدمی؟"

"کالیا۔ جو کل رات وقار کے گھر میں پکڑا گیا تھا۔ گاڑی کی ڈکی میں بندھا پڑا ہے۔"

"گاڑی میں۔ تم ساتھ لائے ہو اسے؟... وہ تو..."

میں نے کہا "وقار میرے کہنے پر اسے باہر گھمانے لے گیا تھا اور ڈکی میں پیک کرکے واپس لے آیا تھا۔"

"اس نے تو کہا تھا کہ میں تھانے چھوڑ آیا ہوں۔"

"وہ ایک سیاسی بیان تھا جو اس نے میرے کہنے پر دیا تھا" میں نے کہا۔

"یعنی وقار بھی..." رابعہ خفگی سے بولی "مجھے نہیں بتایا اس نے۔"

"دفتر میں وہ تمہارا ماتحت ضرور تھا لیکن اپنے گھر میں وہ اپنی مرضی کا مالک ہے۔ میری بات ماننے کے لیے اس نے تم سے اجازت لینے کی ضرورت محسوس نہیں کی تو کوئی قصور نہیں کیا تھا۔"

رابعہ نے پریشانی سے کہا "اندر کیسے لاؤ گے اسے۔ اور لا کے کیا کرو گے؟"

میں نے کہا "پہلے طریقہ بتاؤ اسے اندر لانے کا۔"

رابعہ نے باہر جھانکا۔ وہ جیپ تو اب نہیں ہے۔ میں ایسا کرتی ہوں کہ ڈاک بنگلے کا ایک چکر لگاتی ہوں۔ دیکھتی ہوں بابا کیا کر رہا ہے۔ میں اس سے بات کروں گی۔ تم آگے پیچھے دیکھ کے اسے اٹھا لاؤ۔"

"مجھے بس دو منٹ لگیں گے" میں نے چٹکی بجا کے کہا۔

"اس کے بعد گاڑی کو پچھلی طرف لے جانا تاکہ سڑک پر سے نظر بھی نہ آئے" رابعہ نے کہا "کل رات کیا ہوا تھا؟"

"خاصی گڑبڑ ہوگئی تھی پھر بتاؤں گا" میں نے چائے کی پیالی خالی کرکے رکھی۔

رابعہ کے جانے کے پانچ منٹ بعد ہی میں گاڑی کی چابی لے کر گیا۔ تین سیڑھیاں اتر کے میں نے کار کی ڈکی کھولی، تو کالیا بے ہوش پڑا تھا۔ وہ ہوش میں ہوتا تو مجھے آنکھیں کھول کے ضرور دیکھتا۔ میں نے دائیں بائیں دیکھا اور اسے بنڈل کی طرح کھینچ کے اٹھا لیا۔

واپس کمرے تک پہنچنے میں مجھے آدھا منٹ ہی لگا ہوگا لیکن عین اس وقت جب میں دروازے پر تھا ایک لمبی چوڑی اسٹیشن ویگن اندر آگئی۔ میں نے پلٹ کے دیکھا۔ اس کی نمبر پلیٹ سے ہی مجھے پتا چل گیا کہ گاڑی پولیس کی ہے۔ پولیس والوں نے عام لوگوں کو باادب باملاحظہ ہوشیار کرنے کے لیے اس پر پینٹ کے مونوگرام سے واضح کردیا تھا کہ یہ سواری خاص ایس پی صاحب کی ہے۔ ونڈ اسکرین کے پیچھے مجھے جو ڈرائیور نظر آیا وہ بھی پولیس کی وردی میں تھا۔

وہ صرف ایک لمحہ تھا جب میں گاڑی کی آواز پر ٹھٹک کر رکا تھا۔ پولیس کے نام سے ہی مجھے الرجی تھی اور اس گوشۂ عافیت میں ہمارے ساتھ ہی پولیس کا پہنچنا کوئی اچھا شگون نہیں تھا۔ کالیے کو بیڈ پر ڈالتے ہی میں نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کے دیکھا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ پولیس مجھے پکڑنے کے لیے نہیں آئی تھی۔ اس گاڑی میں ایس پی صاحب کی فیملی تھی جو شاید گھومنے پھرنے پکنک منانے یا شکار کے موڈ میں تھی۔ فیملی صرف چار افراد پر مشتمل تھی۔ خود ایس پی صاحب، ان کی نصف بہتر اور دو بچے۔

اب تشویش کی بات یہ رہ گئی تھی کہ کیا ڈرائیور نے یا اگلی سیٹ پر تشریف فرما ایس پی صاحب نے میرے کندھوں پر بنڈل کی صورت میں سوار کالیا کو دیکھا ہوگا؟ یہ نہ ہو کہ ایس پی صاحب تفریحاً تفتیش شروع کردیں۔ شک تو ان لوگ کی عادت پھر فطرت اور اس کے بعد جبلت بن جاتا ہے۔ اتنی دور سے ایک جھلک دیکھنے والا عام آدمی شاید یہ سمجھے گا کہ میرے کندھے پر لپٹا ہوا بستر تھا یا

کوئی بوری نہی گر دیس میں۔ کہ ذہن میں جو البم ہوتا ہے اس میں ذرا مختلف قسم کے عکس محفوظ ہوتے ہیں۔ میں چور تھا اور میری داڑھی میں تنکا بھی تھا چنانچہ میرا خوف زدہ ہونا ایک فطری سی بات تھی۔

میں نے کالیا کو بیڈ کے نیچے ڈالا اور پھر دروازہ کھول کے جھانکا۔ ایس پی صاحب کے بچے پچھلے حصے کے لان میں دوڑ لگانے چلے گئے تھے اور ادھر سے ان کے چیخنے چلانے کی آواز آرہی تھی۔ دوسری آواز ایس پی کی بیگم صاحبہ کی تھی جو اردلی کو عادتاً چلا چلا کے سامان احتیاط سے اندر لانے کا حکم دے رہی تھیں۔ ظاہر ہے وہ بھی حکم چلانے اور حاکمیت کا اعلان کرنے کی عادی تھی۔

پھر ایک عجیب بات ہوئی۔ اس نے رابعہ کو دیکھ لیا جو شاید کچن سے برآمد ہوئی تھی۔ رابعہ اپنے لباس، وقار حسن اور رکھ رکھاؤ سے بڑی چیز لگتی تھی۔ ایس پی کی بیوی ابھی زیادہ پرانی نہیں ہوئی تھی کہ روایتی تھانے دارنی کی طرح پھول کے ڈھول ہو جاتی۔ قبول صورت وہ بھی تھی۔ ایک اور اپنی ہمسر، ہم مرتبہ بیگم صاحبہ کر دیکھ کر وہ خود ہی آگے بڑھی اور انھوں نے مصافحہ کیا تو میں نے سر پیٹ لیا۔ بھلا چور کی بیوی اور کوتوال کی بیوی سہیلی ہو سکتی ہیں؟ سماجی تعلقات استوار کرنے کا یہ کوئی موقع نہ تھا۔ رابعہ بے رخی سے اس کی طرف دیکھے بغیر نکل آتی تو ٹھیک تھا۔ وہ دل ہی دل میں اسے خردماغ اور بداخلاق کہتی مگر اس کے بعد سلام ودعا کو بھی کسر شان سمجھتی۔

رابعہ نے معلوم نہیں کیا کہا اور کیا نہیں کہا۔ جب تعارف طویل ہونے لگا تو میں نے کالیا کو پھر نیچے سے گھسیٹ کر نکالا اور بیڈ پر ڈال کے اس کے ہاتھوں پیروں کو جکڑنے والی رسیاں کھولنے لگا۔ غالب اور وقار یوسف نے کوئی چانس نہیں لیا تھا اور اسے اتنی مضبوطی سے باندھا تھا کہ میرے لیے کھولنا مشکل ہو رہا تھا۔

رسی کے سارے بل کھل جانے کے بعد بھی کالیا اسی طرح پڑا رہا۔ میں نے کھینچ کر اس کے ہاتھوں کو سیدھا کیا اور پھر پیروں کو تو وہ کراہنے لگا۔ یہ ایک اچھی علامت تھی۔ اس کی کلائیوں پر گہرے نشان پڑ گئے تھے اور دوران خون رک جانے کے باعث وہ تقریباً مفلوج ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے مالش کر کے خون کی گروش کو رواں کیا پھر جگ سے پانی لے کر اس کے منہ پر چھینٹے مارنے لگا۔ اوپر چھت سے معلق پنکھا مجبوراً چل رہا تھا۔ سرکاری دفاتر کے اہلکاروں کی طرح سرکاری ریسٹ ہاؤس کے پنکھے کا مزاج بھی بگڑ گیا تھا۔

دروازے پر دستک سن کے میں نے پردہ ہٹایا اور شیشے کے پیچھے رابعہ کے ملبوس کی جھلک دیکھ کے کنڈی کھول دی "اپنی سہیلی کو اور ان کے میاں کو بھی ساتھ لے آتیں" میں نے کہا۔

"میں کیا کرتی؟ وہ خود ہی گلے پڑ گئی۔"

"تم کسی جاہل وزیر کی بدتمیز بیگم کا رول ادا کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھے بغیر نکل جاتیں۔ بڑا اچھا ہوتا اگر وہ برا مانتی۔ اب وہ شوہر سمیت آدھمکے گی ہمارے ساتھ چائے پینے کے لیے اور شوہر ہے اس کا ایس پی۔ واپسی میں وہ مجھے اپنے ساتھ لے جائے گا۔ تم میکے لوٹ جانا۔"

"خواہ مخواہ بولتے جا رہے ہو۔ ایس پی گیا۔ کسی واردات کی تفتیش کے لیے آگے جانا تھا۔ شام کو واپسی میں بیوی بچے ساتھ لے کر واپس چلا جائے گا۔" رابعہ نے کہا "نیلوفر میری کلاس فیلو تھی بی اے میں۔"

"کون نیلوفر؟"

"یہی۔ ایس پی کی بیوی۔ اس نے پہچان لیا مجھے تو میں کیسے کسی جاہل وزیر کی بدتمیز بیوی بن جاتی۔"

"اسے معلوم ہے کہ تم وکیل ہو؟"

"نہیں۔ یہ کراچی چلی گئی تھی۔ شادی حیدر آباد میں ہوئی اور یہ لوگ وہیں رہتے ہیں" رابعہ نے کہا "کل واپس چلے جائیں گے۔"

"پھر ٹھیک ہے" میں نے کہا "بس اسے مدعو مت کرنا۔ وہ بلائے تو بے شک چلی جانا اور شام تک اسی کے ساتھ رہنا۔ کہہ دینا میرا میاں فلسفی اور پاگل ہے۔ کسی سے نہیں ملتا۔ اس وقت بھی سلطنت ہسپانیہ کے زوال کے اسباب پر غور کر رہا ہے۔ ڈسٹرب کیا جائے تو باؤلے کتے کی طرح کاٹنے دوڑتا ہے۔"

"کون کرتا ہے ایسی باتیں؟"

"شادی کے بعد بیویاں صرف نقائص بتاتی ہیں شوہروں کے۔ خوبیاں شادی سے پہلے دیکھ کر فارغ ہو جاتی ہیں۔ اس لیے..."

رابعہ ہنسی "واقعی۔ اس نے بھی رونا شروع کر دیا تھا کہ ان کے پاس وقت ہی نہیں ہے۔ یہ بھی کوئی تفریح ہے بھلا۔ بھاگتے آئے اور دوڑتے گئے۔ ہر وقت نوکری نوکری۔"

میں نے کہا "کالیا تمہاری نظر کرم کا طلب گار ہے۔"

"اس پاگل نے ہوش میں آتے ہی شور مچا دیا... پھر نیلوفر تو فوراً آجائے گی۔"

"کہہ دینا سکندر اعظم کے زمانے کا مردہ ہے۔ میرے میاں تحقیق کر رہے ہیں اس لیے شور مچا رہا ہے۔ تمہارے میاں تفتیش کرتے ہیں تو کیا ملزم شور نہیں کرتے؟" میں نے کہا "تمہارا ریوالور کہاں ہے؟"

"کسے شوٹ کرنا ہے ابھی؟" اس نے ریوالور نکال لیا۔

"اسے۔ اگر یہ حلق سے آواز نکالے۔ ویسے تو آنکھیں کھول کے تمہیں دیکھے گا تو پھر بے ہوش ہو جائے گا۔"

"وہ کیوں؟" رابعہ نے برا مان کے کہا "اتنی بری ہے میری صورت؟"

"میرے جیسے عاقل و بالغ اور ذہین و جری شخص کے ہوش گم ہو گئے تھے تمہیں پہلی بار دیکھ کے تو یہ کالیا کیا چیز ہے۔ ہاتھ میں

دیکھے گا تو دہرا اثر ہو گا۔ ڈبل ڈوز جیسا پھر بھی شرارت پر آمادہ ہو تو اسے یقین دلانا کہ تمہارے حلق سے آواز نکلی تو ریوالور سے آواز نکلے گی اور منہ کھلا ہو گا تو حلق میں اتر جائے گی۔"

"لیکن تم کہاں جا رہے ہو؟"

"میں ذرا گاڑی لے کر جا رہا ہوں۔"

"گاڑی لے کر؟" وہ پریشان ہو گئی۔

"گاڑی کو پیچھے کھڑا کرنے کا مشورہ تم نے ہی دیا تھا" میں نے

"اچھا۔ جلدی آجانا" اندیشہ ہو کہ اتنی دیر میں..."

"نیلوفر آجائے" میں نے جاتے جاتے پلٹ کے کہا "مصیبت نیلوفر۔ کہہ دینا میرے ماموں ہیں۔ ذہنی مریض ہیں۔ صرف ریوالور سے ڈرتے ہیں۔ خدا کے علاوہ۔"

گاڑی کو پیچھے لے جانے کا صرف بہانہ تھا۔ میں نے کار کو ساتھ کی گلی میں روک کے ریڈیو آن کیا۔ اس کے اسپیکر میں سرسراہٹ سنائی دینے لگی۔ میں نے باہر ہاتھ نکال کے ایریل کو کھینچا اور کہا "ہیلو۔" جواب میں کسی نے ہیلو نہیں کہا۔ میں وقفے وقفے سے کہتا رہا۔ "ہیلو۔ چوہدری دلاور... ہیلو..."

بالآخر ایک آواز ابھری "کون بھونک رہا ہے؟"

"تمہارا باپ" میں نے کہا "کتے کے بچے۔ دلاور کہاں ہے؟"

"کون دلاور؟" بات کرنے والا سنبھل گیا۔

"اپنی والدہ سے پوچھو۔ وہ اپنے یاروں کی فہرست میں سے نام نکال کر کے بتائے گی۔ ورنہ میں خود آکے بتاؤں گا تمہیں۔"

"کیا کام ہے دلاور سے؟" وہ ڈر گیا۔

"دلاور کیا تمہارا غلام ہے کہ اس کا نام ایسے لے رہے ہو۔ چوہدری صاحب کیا تم ہو!" میں نے غرا کے کہا۔

"وہ جی۔ غلطی ہو گئی۔ آپ چوہدری صاحب سے شکایت نہ کریں جی" وہ ایک دم منت سماجت پر اتر آیا "حکم کریں جناب عالی۔"

"چوہدری دلاور کو پیغام دو میرا۔ آج رات تک کسی وقت بھی کال اس سے بات کروں گا۔ خود نہیں بیٹھ سکتا فون کے پاس تو کسی اور کو بٹھا دے۔ ٹیپ کر لے میری بات۔"

"جی سر۔ جیسا حکم جناب۔"

"ایک بات اسے پہلے بتا دینا۔ کالیا پہنچ گیا ہے ہمارے پاس بالکل خیریت کے ساتھ۔ باقی مال ہم نے واپس کر دیا تھا" میں نے کہا اور ریڈیو بند کر دیا۔

میں کمرے میں پہنچا تو کالیا پٹ پٹ آنکھیں کھول رہا تھا اور بند کر رہا تھا۔ میں نے رابعہ سے کہا کہ وہ کچن تک جا کے ایک کپ گرم دودھ لائے۔ یہ دیکھی خلاف تھا پانی کی نہر سامنے بہہ رہی تھی۔ دودھ کی نہر بھی یہاں محاورے کے مطابق بہتی تھیں لوگ دونوں کو مد نظر رکھتے تھے اور استعمال کرتے تھے۔ شہر والے رفتہ رفتہ پانی میں دودھ ملانے لگے تھے۔ دودھ میں پانی ملانا چھوڑ چکے تھے۔

رابعہ خالص بھینس کے خالص دودھ سے بھرا ہوا گلاس لے کر لوٹی اور فوراً واپس جانے لگی۔ "وہ نیلوفر بضد تھی ناشتا ساتھ کریں گے۔ میں وہیں جا کے کر لیتی ہوں۔ تمہارے بارے میں وہی کہہ دیا میں نے جو تم چاہتے تھے۔"

"یہی کہ میں پاگل فلسفی ہوں؟"

"نہیں۔ میں نے کہا کہ اپنا تحقیقی مقالہ مکمل کرنے آئے ہیں اور اسی میں لگے ہوئے ہیں۔"

میں نے سرہلا کے اسے جانے کی اجازت دی اور کنڈی لگا کے اپنے تحقیقی مقالے کو دیکھا۔ اب میں اس پر زیادہ یکسوئی کے ساتھ کام کر سکتا تھا۔

میں نے کہا "مسٹر کالیا۔ یہ ٹانک پی لو۔ اگر اس سے تمہارا دماغ درست نہ ہوا تو پھر کھانے کی دوا دیں گے۔"

وہ مجھے دیکھتا رہا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ "تم کون ہو؟"

"بھول گئے مجھے؟" میں نے پیار سے اس کے چپت لگائی "میں تایا ہوں تمہارا پتر کالیا۔ بھالیہ میں چھالیہ بیچتا تھا۔ یاد آیا میرا نام!"

اس نے نفی میں سرہلایا مگر میرے ہاتھ سے دودھ کا گلاس لے کر غٹ غٹ پینے لگا۔ اسے نقاہت بھی تھی اور وہ بھوکا بھی تھا۔

"تایا جی۔ یہ کون سی جگہ ہے؟" اس نے ہونٹ صاف کر کے کہا۔

میں نے ریوالور نکال لیا "یہ جانوروں کا دماغی اسپتال ہے۔ چوہدری دلاور کے کھوتے۔ یہاں اس کے کتوں کو بھی ٹھیک کر سکتا ہوں میں جو بھونکنے کے ساتھ کاٹنے بھی لگیں۔"

وہ بے وقوفوں کی طرح مسکرانے لگا "یہ پٹاخے والا پستول ہے نا۔ میں شبرات پر لایا تھا۔"

میں نے اس پر نظریں جما کے کہا "رات کو تمہارے پاگل پن کا دورہ اس لیے چل گیا تھا کہ اس وقت علاج نہیں ہو سکتا تھا۔"

اس نے ایک دم رونی صورت بنالی "میں گھر جاؤں گا۔"

میں شک میں پڑ گیا۔ سر کی چوٹ سے یادداشت کے متاثر ہونے پر بہت سی فلمی کہانیاں لکھی گئی تھیں اور یہ کوئی بے بنیاد بات بھی نہیں تھی۔ دماغ کے کمپیوٹر کو قدرت نے کاسہ سر میں بہت محفوظ کر دیا ہے لیکن شدید چوٹ سے کسی ایک حصے کا متاثر ہو جانا ناممکن نہیں ہے۔ میں نے سنا تھا کہ لوگ اندھے یا مفلوج بھی ہو جاتے ہیں مگر میرے ذاتی مشاہدے میں کوئی ایسا کیس نہیں تھا۔ وقتی صدمے یا (CONCUSSION) سے دماغ ہل جاتا ہے تو عارضی بے ہوشی طاری ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات آدمی کو پوری طرح ہوش و حواس میں آنے میں وقت لگتا ہے لیکن اس سے پہلے اندرونی چوٹ کی علامات بہت واضح ہوتی ہیں جو کالیا میں نظر نہیں

آرہی تھیں۔

اس کے پیشہ ور بدمعاش ہونے میں کلام نہیں تھا۔ بدمعاش بننا بھی آسان کام بہرحال نہیں ہے۔ ذلت و رسوائی کے احساس سے عاری ہونے کے علاوہ بدمعاشی میں اچھی خاصی قوتِ برداشت کی ضرورت پڑتی ہے تاکہ بندہ پولیس کی چھترول اور جیل کی سختی بھی جھیل جائے۔ چھترول سے پہلے پولیس کے سامنے معصوم اور بے گناہ بننے کے لیے اچھی اداکاری بھی ضروری ہوتی ہے اور مجرم ذہین بھی ہوتے ہیں کہ پکڑنے والوں کی آنکھوں میں دھول جھونک دیں۔ سب دیکھتے رہ جائیں اور وہ مالِ غنیمت سمیٹ کے غائب ہو جائیں۔ چالاک چوروں کے بارے میں تو مشہور ہے کہ وہ آنکھوں سے کاجل چُرالیں اور آنکھوں والے کو پتا نہ چلے۔

کالیا اگر ایکٹنگ کررہا تھا تو اس کا پتا چلانے کے لیے مجھے یہاں سائنٹیفک طریقے دستیاب نہ تھے مثلاً سوڈیم پینتھنال یعنی (SODIUM PANTHENOL) کے انجکشن جس کو سچ کا ٹیکہ یعنی (TRUTH SERUM) بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے اثر سے پاگل بن جانے والا بظاہر سو جاتا ہے مگر ذہنی طور پر بیدار رہتا ہے اور واقعی پاگل نہ ہو تو پھر ہر سوال کا صحیح جواب دیتا ہے۔ ہپناٹزم کے بھی ایسے ہی مؤثر طریقے ہیں مگر میں نہ ڈاکٹر تھا اور نہ ہپناٹزم کا ماہر۔

میں نے کہا "تو تم شرافت کی زبان سمجھنا نہیں چاہتے۔ اویار' تمہارا پاگل پن ابھی دور ہو جائے گا۔ آسان کام مجھے مشکل طریقے سے کرنا بھی آتا ہے۔"

جانتے بوجھتے میں نے یہ ظاہر کیا جیسے میں اس کی طرف سے غافل اور بے پروا ہو گیا ہوں۔ میں نے گھڑی دیکھی اور ایک جماہی لے کے ریوالور بیڈ کے ساتھ والی ٹیبل پر رکھ دیا۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا میری توقع کے مطابق تھا اور میں اس کے لیے تیار بھی تھا۔ کالیا بجلی کی طرح اُٹھا اور اس نے ریوالور پر قبضہ کرنے کے لیے جست لگائی۔ اس کا ہاتھ ریوالور سے چند انچ ہی دور تھا جب میرے بوٹ کی ٹھوکر اس کی کلائی پر پڑی' وہ تھوڑا سا آگے جھکا ہوا تھا۔ میں نے پیچھے سے اس کی گدی پر ہاتھ مارا تو وہ بیڈ سے قلابازی کھا کے لڑھک گیا۔

نیچے گرتے ہی وہ تڑپنے اور مچلنے لگا۔ "میں پستول لوں گا' پستول میرا ہے۔"

اس کی عیاری نے مجھے حیران کردیا۔ ریوالور پر قبضے کے لیے ہاتھ بڑھاتے وقت اس کی ساری دیوانگی ختم ہو چکی تھی۔ وہ پوری طرح ہوش میں تھا اور اسے معلوم تھا کہ وہ کیا کررہا ہے۔ کوشش میں ناکامی کے ساتھ ہی اس نے پھر دیوانگی کی آڑ لے لی لیکن اب میں سمجھ چکا تھا کہ یہ ڈراما ہے اور میرا شک دور ہو گیا تھا۔

میں نے اسے اُٹھا کے بیڈ پر ڈال دیا "آرام سے لیٹ جاؤ اور شور مت کرو پھر پستول ملے گا تمہیں۔"

وہ کسی فرمانبردار بچے کی طرح خاموش ہو گیا۔ مگر یہ کھولو تو اس نے منہ کھول دیا۔ یہ اس کی بے وقوفی تھی اندازہ بھی نہ تھا کہ میں کیا کرنے والا ہوں۔ میں نے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا اور اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا۔ حلق سے غوں غوں کی بے معنی آوازیں نکالیں اور مجھے ہٹانے کی کوشش بھی کی مگر اس کی گردن میری گرفت میں اس کی ٹانگیں چلانے سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ میرے گھٹنوں سے دبے ہوئے تھے۔

اس کی گردن کو جھٹکے دے کر میں نے سرگوشی کی "بولو تمہارا پاگل پن ٹھیک ہوا یا نہیں؟"

اس کی سانس رکنے لگی اور آنکھیں حلقوں سے ابلنے لگیں' اس نے مزاحمت چھوڑ دی تو میں نے اس خیال سے کہ وہ مر ہی نہ جائے اپنے ہاتھ اس کی گردن پر سے ہٹا لیے۔ وہ ساکت آنکھوں سے مجھے گھورتے ہوئے لمبی لمبی سانسیں لے رہا تھا۔

"میں تمہیں جان سے مارنا نہیں چاہتا۔ تم سے مجھے معلوم ہے تم نے صرف حکم کی تعمیل کی تھی اور تم مجبوری کی دو ہی صورتیں ہوتی ہیں۔ یا تمہیں خوف تھا۔ تمہاری ناکامی کے بعد لگام میرے ہاتھ میں آگئی ہے۔ میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔ جو تم مجھے مناسب معاوضہ دے سکو ہو یا پھر جان دے کر۔"

رقم رابعہ نے ذاتی استعمال کے کپڑوں کے ساتھ رکھی تھی۔ میں نے اس کے دونوں ہاتھ پھیلا دیے۔ ایک کلائی پر رسی باندھ لگا کے رسی کو بیڈ کے نیچے سے گزارا اور دوسری کلائی کو باندھ دیا۔ اس کے بازوؤں کے ساتھ رسی نے بیڈ کے گرد حلقہ بنا لیا۔ اب وہ بیڈ سمیت اُٹھ کے کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ ریسٹ ہاؤس کے سرکاری بیڈ بہت بھدے' بڑے اور بھاری تھے۔

"مجھے تم سے چند سوالات کرنے ہیں" میں نے کہا۔ "تمہارا واسطہ پولیس سے تو رہا ہو گا۔ ان سے بہتر طریقے آتے ہیں آدمی کی زبان کھلوانے کے اور صحیح معلومات حاصل کرنے کے عام طور پر بلکہ ننانوے فیصد مجرم شرافت سے کچھ نہیں بتاتے۔ تم بھی دلاور کے پٹھے ہو۔ آسانی سے کچھ نہیں بکو گے۔ تمہیں ڈر ہے کہ دلاور نمک حرامی کے جرم کی سزا دے گا۔ کبھی یہ سوچا کہ اس کے دشمنوں نے پکڑ لیا تو وہ کیا سزا دیں گے؟"

وہ زور زور سے نفی میں سر ہلانے لگا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔

"یہ جگہ کچھ محفوظ نہیں ہے۔" میں نے کہا "یہاں کچھ نہیں ہو سکتا پھر یہاں نہ جانے کدھر سے ایک ڈی ایس پی بھی آگئی ہے۔ اب ان کے جانے کے بعد تمہاری زبان کھلوائیں گے یا پھر رات کو تمہیں ایسی جگہ لے جائیں گے جہاں شیطان کے سوا کوئی دخل نہیں دیتا۔ اس وقت تک چپ رہو' آرام کرو اور سوچو۔ ویسے آٹھ گھنٹے سے تم ذرا کم میں بھی گزار سکتے ہو۔ فکر مت کرنا۔ ہم تمہیں تو ہاتھ مدام میں نہیں دیں گے ابھی۔"

اس نے پھر سر کو ہلا کے وضاحت کرنے کی کوشش کی۔

"کچھ بتانا چاہتے ہو؟" میں نے کہا۔

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔

"تمہارا دماغ ٹھکانے آگیا ہے نا؟" میں نے کہا۔

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔

"ایک بات اور سمجھ لو کہ چلا کے تم کوئی فائدہ نہیں حاصل کر سکتے۔ الٹا نقصان یہ ہو گا کہ تم اعتبار کھو دو گے۔ کیا دلاور نے تمہیں بتایا تھا کہ میں جوڈو کراٹے بھی جانتا ہوں؟ نہیں بتایا... خیر' ایک ہاتھ مار کے آدمی کو اس دنیا سے دوسری دنیا میں پہنچانا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے دیکھو گے؟"

میں نے کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھ کے ایک آرام کرسی کا انتخاب کیا۔ یہ بھی بیڈ کی طرح بھدے موٹے اور بھاری سال کی لکڑی کے تختوں کی بنی ہوئی تھی۔ پُرانے وقتوں کی عمارتوں کی طرح فرنیچر بھی اتنا مضبوط ہوتا تھا کہ انگریزوں کے عہد کی میز کرسیاں آج بھی ریلوے کے ویٹنگ رومز' پُرانے ڈاک بنگلوں اور دفتروں میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ جو ٹھیکے دار پہلے روپے میں چار آنے منافع کو بہت سمجھتے تھے وہ اب روپے میں بارہ آنے کما کے چار آنے اوپر والوں کو نذرانہ دیتے ہیں' چالو کام منظور کرا لیتے ہیں اور دوگنا منافع لے کر الگ ہو جاتے ہیں۔ آج پوچھنے والا کوئی نہیں تو کل کون ہو گا۔

خیر' یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا۔ میں نے کرسی کو اس کے قریب کیا اور کالیا سے کہا "اس لکڑی کے بازو زیادہ مضبوط ہیں یا تمہارے؟ میرا خیال ہے کہ تم اس کرسی کے بازو پر چڑھ کے کود بھی جاؤ تو کچھ نہیں ہو گا۔ اب دیکھو۔"

میں نے ہتھیلی سے ایک وار کیا اور کرسی کا بازو درمیان سے ٹوٹ گیا۔ "تم کو شک ہو گا کہ یہ لکڑی ہی کمزور تھی" میں نے کہا "ہم دوسرے کی مضبوطی چیک کر لیتے ہیں۔"

میں دوسرے بازو پر خود چڑھ گیا اور میرے ایک سو اسّی پونڈ کے بوجھ سے بازو نہیں ٹوٹا پھر میں نے کھڑی ہتھیلی مار کے اسے بھی توڑ دیا۔

"تم اندازہ کر سکتے ہو کہ اس کے مقابلے میں تمہاری ہڈیاں تو کچھ بھی نہیں۔ تمہارے بازو' کلائی سے اوپر یا نیچے' اسی طرح توڑ دیے جائیں تو تم کیسے لگو گے؟ اور ایسے ہی تمہاری ٹانگیں چار جگہ سے ٹوٹ جائیں پھر گیارہ پسلیوں کو توڑا جائے باری باری' اس کے علاوہ بیس انگلیاں ہیں۔ ٹخنے ہیں اور گھٹنوں پر چپنی کی ہڈی ہے۔ ان سب کے ٹوٹنے سے تم مرو گے نہیں کالیا لیکن جیلی فش جیسی چیز بن جاؤ گے۔ سب سے نازک اور اہم ہے گردن۔ پھانسی دیتے ہیں تو گردن ہی توڑتے ہیں۔" میں نے ٹوٹے بازوؤں والی سرکاری کرسی کو ایک کونے میں فٹ کیا اور اس کے بازوؤں کو یوں آپس میں ملا دیا کہ ایک نظر دیکھنے میں وہ جُڑے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ "میں تمہیں بولنے کی اجازت دے سکتا ہوں۔ اگر تم نے چالاکی دکھائی اور مدد کے لیے ایک چیخ ماردی تو کیا ہو گا؟ وہ بابا دوڑا ہوا آئے گا اور پوچھے گا کہ صاحب کیا ہوا؟ اس نے میرے اور رابعہ کے سوا کسی کو نہ گاڑی سے برآمد ہوتا دیکھا تھا نہ کمرے میں آتے۔ میں اسے ٹال دوں گا کہ میں ہی چلایا تھا۔ پاؤں میں کیل چُبھ گئی تھی۔ ویسے میں کہوں کہ پاؤں کے نیچے شیر آگیا تھا تب بھی وہ مانے گا لیکن کالیا' اس وقت تک تمہاری گردن تمہارے جسم کے ساتھ ایل کی شکل میں پڑی ہو گی۔ اپنے حلق سے نکلنے والی آخری آواز کے بعد تم قبر میں صورِ اسرافیل ہی سنو گے۔ اس لیے شور مچانے سے تو بہتر ہو گا کہ تم کلمہ پڑھ کے مرو۔"

میں دیکھ رہا تھا کہ وہ کتنا ڈر گیا ہے۔ میں نے اس کے منہ میں سے کپڑا نکالا تو وہ بڑی مشکل سے بولا "مجھے... چھوڑ دو... میں سب... بتا دوں گا۔"

"تمہیں دلاور کا کوئی ڈر نہیں؟"

"دلاور..." اس نے نفرت کے زہر سے بجھے ہوئے لہجے میں کہا "اس نے مجھے مجبور... کردیا تھا... اب جو اسے کرنا ہے... وہ کرے گا... پھر جو مجھے کرنا ہو گا میں کروں گا۔"

"کوئی کہانی گھڑلی ہے تم نے اتنی دیر میں...؟"

"تم نہ یقین کرو... تمہاری مرضی... اب میں نہیں ڈرتا اس سے۔"

"کیوں... اب کیا ہوا ہے؟" میں نے کہا۔

"جب تک کوئی دھمکی دیتا رہے کہ تمہارے گھر کو آگ لگادی جائے گی۔ گھر والا ڈرتا ہے لیکن گھر جل کے خاک ہو جائے تو پھر کیسا ڈر؟ میری بھی بس یہی ایک آرزو باقی ہے کہ آگ لگانے والے اور اس کے گھر کو آگ لگا دوں۔"

میں نے کہا "کس نے آگ لگادی تھی تمہارے گھر کو؟... کون ہے وہ؟"

"وہی... چوہدری دلاور" اس نے نام سے پہلے ایک غلیظ گالی دی۔

میں نے اسے حیرانی سے دیکھا "مگر تم تو اسی کے نمک خوار اور وفادار رہو۔"

"وہ میری مجبوری تھی۔ وفاداری نہیں۔"

"اور اب مجبوری باقی نہیں رہی؟"

"بس یہی سمجھ لو۔" اس نے سانپ کی طرح پھنکار کے کہا۔

میں نے سوچا کہ اس آدمی کی بات سُن لینی چاہیے۔ وہ جھوٹ بول رہا ہے یا ایکٹنگ کر کے مجھے بے وقوف بنانا چاہتا ہے۔ یہ معلوم ہو جائے گا اور اس کی نیت کا بھی پتا چل جائے گا۔ مجھے وہ کیا نقصان پہنچا سکتا ہے۔ وہ خالی ہاتھ بے یارومددگار اور میرے

مقابلے میں بہت کمزور ہے۔

میں نے اسے آزاد کردیا۔ وہ پاؤں سمیٹ کے بیٹھ گیا اور اپنی کلائیاں رگڑنے لگا۔

دروازے پر دستک دے کر بابا نے کہا "ناشتا سر۔"

کالیا پر نظر رکھتے ہوئے میں دروازے تک گیا اور کنڈی کھول دی۔ کالیا کچھ کرنے پر آمادہ نظر نہ آتا تھا۔ میں نے بابا سے ٹرے لے لی۔ اسے شاید علم نہیں تھا کہ رابعہ اپنی سہیلی کے ساتھ ناشتا کرنے چلی گئی تھی۔ وہ دو افراد کے لیے ناشتا لایا تھا۔

دروازہ بند کرکے میں نے کہا "چلو پہلے کچھ کھا پی لو پھر بتانا کہ وہ کیا مجبوری تھی جس کی وجہ سے تم ایک لشکر کے ساتھ حملہ آور ہوئے تھے۔"

صبح کے نو بجنے والے تھے اور میرا بھوک سے حال خراب ہونے لگا تھا۔ چائے تو جیسی تھی سو تھی۔ پراٹھے بہت نفیس تھے اور ان میں مردانہ ہاتھوں کی سختی یا کھردرا پن نہیں تھا۔ یہ ضرور کسی عورت نے بنائے تھے۔ میں نے ایک فلمی اتفاق پر غور کیا' ڈاک بنگلے کے چوکیدار کی ایک چندے آفتاب چندے ماہتاب بیٹی کا تصور کیا۔ اگر میں اکیلا اور ہیرو ٹائپ شہری بابو ہوتا تو میرا اس کا رومانس لازمی تھا۔ وہ کمرے کی صفائی کرنے آتی تو مجھ سے ٹکرا جاتی یا میں ٹہلتا ہوا نہر کی طرف جاتا تو اسے نہر میں نہاتا دیکھ لیتا۔ اس کے بعد دوگانے کے لیے فضا خاصی سازگار تھی۔ درختوں کے گرد گھوم گھوم کے گانا اور لاج کی ماری ہیروئن کا سنسنی خیز رقص۔ میں ہنس پڑا۔

کالیا نے مجھے حیرانی سے دیکھا۔ ایک وحشی خونخوار جانور سے وہ اچانک ایک پریشان حال اور دکھی انسان بن گیا تھا۔

"تم مجھے بیس ہزار دے سکتے ہو؟" اس نے اچانک کہا۔

میں نے کہا "بیس ہزار! میں تیس ہزار دے سکتا ہوں مگر ایسے نہیں۔"

اس نے نفی میں سرہلایا "صرف بیس ہزار کی ضرورت ہے مجھے۔"

میں نے کہا "فرض کرو میں تمہاری خواہش پوری کردوں' پھر کیا ہوگا؟"

"میں بیس ہزار دلاور کے منہ پر ماردوں گا۔ میری مجبوری ختم ہوجائے گی۔ میری جنت مجھے مل جائے گی۔"

میں نے کہا "بیس ہزار میں جنت!"

اس نے کہا "جنت میری چھوٹی بہن کا نام ہے۔ مجھ سے دس سال چھوٹی ہے وہ۔ میں نے اسے باپ بن کے پالا تھا۔"

اس نے مجھے ایک افسوس ناک کہانی سنائی۔

کالیا کا باپ ایک خوش حال کسان تھا۔ گاؤں میں اس کا بجلی والا پکا مکان تھا۔ وہ ایک محنتی اور ایماندار آدمی تھا جو سب کے کام آتا تھا چنانچہ سب اس کی عزت کرتے تھے۔ وہ ایک ذمے دار شوہر اور باپ بھی تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ اپنے بیٹے اور بیٹی کا رشتہ شہر کے کسی پڑھے لکھے آدمی سے کرے لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ جوان ہوا ہی تھا کہ اس کی ماں بیمار ہوئی اور شہر کے ڈاکٹروں نے بہت علاج کے بعد فیصلہ دے دیا کہ اسے کوئی نہیں بچا سکتا۔ اسے کینسر ہوگیا تھا۔ کالیا کے باپ نے سب کچھ بیچ دیا لیکن جس مرض کا علاج دنیا میں کسی بڑے سے بڑے ڈاکٹر کے پاس نہیں تھا اس سے شفا کہاں تھی۔ بالآخر کالیا کی ماں مرگئی۔ اس کی موت سے پہلے ہی کالیا کا باپ چوہدری دلاور کے کارخانے میں ملازم ہوگیا تھا۔ یہ کارخانہ شاہدرہ میں تھا اور اس میں زرعی مشینری کے پرزے اور آلات بنتے تھے۔

کالیا کی بات نے مجھے چونکا دیا "تمہارا باپ میروز برادرز میں کام کرتا تھا؟"

اب کالیا کے چونکنے کی باری تھی "یہ... آپ کو کیسے پتا ہوا؟"

میں نے کہا "جو میں نے پوچھا ہے اس کا جواب دو۔"

"یہی نام تھا کمپنی کا۔ چوہدری دلاور نے مجھے بھی نوکر رکھ لیا لیکن میری ماں کے مرتے ہی میرا باپ بھی مرگیا تھا۔ وہ زندہ تھا جیسے مجبوری میں۔ ماں کی بیماری نے ہمیں مقروض بھی کردیا تھا۔"

"دلاور نے دیا تھا یہ قرض...؟"

اس نے نفی میں سرہلایا "ایک اور مالک تھے۔"

میں نے بے اختیار کہا "وزیر خان؟"

"وزیر خان!" وہ سوچ میں پڑگیا "نہیں۔ ان کا تو نام شرافت علی تھا اور وہ واقعی شرافت کی تصویر تھا۔ اس نے بڑا سہارا دیا میرے باپ کو۔ ہم تو معمولی اجرت پر کام کرتے تھے مگر اس نے پہلے دس ہزار دلوائے۔ دوسری بار پھر دس ہزار دیے۔ وہ میری ماں کو دیکھنے کے لیے اسپتال بھی آیا تھا اور اس کے جنازے میں بھی شریک تھا۔"

میں نے کہا "یاد کرو۔ اس کے ساتھ ایک اور شخص ہوگا۔ درمیانے قد کا سانولا سا۔ خشخشی داڑھی والا۔ ماڈل ٹاؤن میں رہتا تھا۔"

"تم وزیر خان کی بات کررہے ہو پھر؟"

میں نے مضطرب ہوکے کہا "تم نے دیکھا تھا وزیر خان کو؟"

"ہاں۔ دیکھا تو تھا... ایک بار..."

"میں وزیر خان کا بیٹا ہوں۔" میں نے جوش سے کہا۔

"تم میر شرافت علی کے قاتل ہو" کالیا نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"کیا یہ بات تمہیں چوہدری دلاور نے بتائی تھی؟" میرا جوش و خروش سرد پڑگیا "خیر' تم آگے کہو۔"

"ماں کی موت کے پانچ سال بعد ابا بھی مرگیا۔ اس وقت تک ہم قرض کا ایک پیسا نہیں ادا کرسکے تھے۔ آمدنی بہت کم تھی۔ ابا بیمار رہنے لگا تھا۔ اسے دہرے قرض کے غم نے ماردیا۔ ایک تو بیس ہزار کا قرض تھا۔ دوسرا بیٹی کا۔ میری بہن اس کی موت کے وقت اٹھارہ سال کی ہوگئی تھی۔ ہم گاؤں میں ہوتے تو اس کی شادی چودہ سال کی عمر میں ہوجاتی۔ شہر آنے سے پرانے رشتے بھی ٹوٹ گئے تھے۔ گاؤں کے لوگ اسے بھول گئے تھے اور وہ گاؤں والوں کو بھی بھلا چکا تھا۔ میں خود اٹھائیس کا ہوگیا تھا مگر مسئلہ تو بیٹی کا ہوتا ہے۔ یہاں اس کے لیے پیغام بھی آئے مگر شادی کے لیے جہیز نہیں تھا اور دوسرے اخراجات کے لیے رقم نہیں تھی اور کس منہ سے ادھار مانگتے۔ شرافت علی کی یہ شرافت کیا کم تھی کہ وہ قرضہ ہماری تنخواہ میں سے صرف پچاس روپے مہینے کے حساب سے کاٹ رہا تھا۔ ہر مہینے سو روپے کم ہوجاتے تھے مگر گزارا بڑی مشکل سے ہوتا تھا۔ جب ابا مرگیا تو چوہدری دلاور نے مجھے بلایا اور کہا کہ کالیا..."

"یہ تمہارا اصل نام تو نہیں ہوسکتا" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"نہیں۔ اصل نام تو جمال شاہ تھا مگر رنگ ایسا ہی کالا تھا۔ چھوٹا تھا تو سب کالو کہتے تھے۔ اب کالیا کہتے ہیں۔ چوہدری دلاور نے کہا "کالیا' تمہیں تو معلوم ہے کہ تمہارے باپ نے بیوی کی بیماری کے زمانے میں بیس ہزار روپے کا قرض لیا تھا؟" میں نے کہا معلوم ہے جناب" وہ کہنے لگا۔ "اس وقت کوئی رسید نہیں لی گئی تھی تم سے۔ حساب کتاب گڑبڑ ہورہا تھا۔ اچانک مجھے یاد آگیا کہ بیس ہزار کہاں خرچ ہوئے تھے۔"

"پانچ سال بعد حساب میں گڑبڑ ہونے لگی تھی؟"

"میں نے کہا کہ جناب رسید اب لے لیں" اس نے کہا "کالیا۔ برا مت ماننا۔ لین دین کے بارے میں حدیث شریف میں بھی ہے کہ لکھ لیا کرو۔ یہ تو کمپنی کا حساب ہے" اس نے میرے سامنے پکی رسید رکھ دی' میں نے اس پر دستخط بھی کردیے اور انگوٹھا بھی لگادیا۔"

"دستخط کے ساتھ انگوٹھا!"

"دلاور نے کہا تھا کہ بھئی لوگ مکر بھی جاتے ہیں کہ دستخط میرے نہیں ہیں۔ خواہ مخواہ کا لمبا چکر پڑجاتا ہے۔ انگوٹھے کا نشان ہی پکا ہوتا ہے" میں نے کہا "جناب' کیا آپ ایسا سمجھتے ہیں مجھے؟" اس وقت تو میں غصے میں چلا آیا۔ بعد میں مجھے خیال آیا کہ ہم کچھ قرضہ اتار بھی چکے تھے۔ میں نے اگلے دن چوہدری صاحب سے کہا تو وہ ہنسنے لگے "بے وقوف۔ بیس ہزار پر یہ تو بہت کم سود تھا۔ بینک میں ہوتی یہ رقم یا کاروبار میں لگاتے ہم تو ہزار روپیہ مہینے کا لیتے" آگے میں کیا بولتا۔ خود چوہدری دلاور ہی بولتا رہا کہ "معلوم کرو کوئی سو روپے مہینہ سود پر بیس ہزار دیتا ہے۔ سود خود افغان تو ہزار پر سو روپے مہینہ لیتے ہیں۔ ہم نے تو کسی ضمانت کے بغیر ہی قرض دیا تھا۔ ورنہ بینک والے تو مکان کے کاغذات رکھوا لیتے ہیں۔"

"اس وقت تک تم کتنا سود دے چکے تھے؟"

"چوہدری دلاور کے حساب سے چوبیس سو" وہ بولا "رسید لکھوانے کے بعد ہر مہینے مجھے تنگ کرنے لگا۔ اب وہ مجھ سے دو سو رکھوا لیتا تھا اور کہتا تھا کہ یہ تو بینک کے ریٹ پر لے رہا ہوں۔ اصل کب لوٹاؤ گے؟ بیس ہزار بہت بڑی رقم تھی۔ میں نے ایک دن صاف کہہ دیا کہ ایسے تو میں ساری زندگی یہ رقم نہیں لوٹا سکتا اور میرے باپ کو بھی معلوم ہوتا کہ یہ قرض حسنہ نہیں بلکہ سود پر ملنے والا قرض ہے تو شاید وہ نہ لیتا۔ پکی رسید دے کے میں پھنس گیا تھا۔ اس سے تو یہ ثابت ہوتا تھا کہ قرض میں نے لیا تھا۔ اس نے نئی تاریخ جو ڈال دی تھی۔ میں نے کئی بار سوچا کہ بہن کو ساتھ لے کر بھاگ جاؤں مگر مجھے معلوم ہوگیا کہ چوہدری دلاور سے بچ کے میں کہیں بھی نہیں جاسکتا۔ اس کے آدمی میری نگرانی کرتے تھے۔ شاید اسے بھی اندازہ تھا کہ مجبوری کی حالت میں' میں اور کچھ نہیں کرسکتا۔ میرے پاس زمین' مکان' زیور کچھ بھی تو نہیں تھا جو بیچ کے میں بیس ہزار پورے کرسکتا۔ اس کے علاوہ چوہدری کے ہاتھ بہت لمبے تھے۔ میں کہیں بھی جاتا پکڑا جاتا۔ دلاور کی رپورٹ پر پولیس بھی مجھے پریشان کرنے لگی۔ تھانے والے آئے دن مجھے اٹھوا لیتے تھے اور رات بھر تھانے میں ٹھکائی کرتے تھے اور پھر دلاور یہ مہربانی کرتا تھا کہ مجھے مزید مہلت کے وعدے پر رہائی دلوا دیتا تھا۔ بالآخر ایک دن اس نے میرے سامنے دو باتیں رکھیں۔ ایک یہ کہ میں اس کی خدمت کرکے قرضہ معاف کرا سکتا ہوں۔ دوسری یہ کہ قرض کے بدلے میں اسے کوئی چیز دے سکتا ہوں۔ اس وقت میں مطلب نہیں سمجھا تھا۔ مطلب اس نے بعد میں سمجھادیا۔ اس نے کہا کہ تمہاری ماں کی بیماری میں تمہارا اصل ہمدرد میر شرافت علی تھا جس نے تمہارے باپ کو قرض بھی دلوایا تھا اور اسی کی وجہ سے تم باپ بیٹا یہاں ملازم بھی رکھ لیے گئے تھے۔ ایک شخص نے بعد میں اسی میر شرافت علی کو قتل کردیا تھا۔ وہ تمہارا محسن تھا اور اس کے قتل کا بدلہ لینا تم پر فرض ہے۔ تم یہ فرض ادا کرو تو قرض معاف کیونکہ میر شرافت علی میرا بھی دوست تھا۔"

"دوسری شرط اس حرام زادے نے یہ رکھی ہوگی کہ ڈرتے ہو تو اپنی بہن کی شادی مجھ سے کردو" میں نے طیش میں دانت پیس کے کہا۔

کالیا کا چہرہ دکھ سے مزید تاریک ہوگیا "بالکل ٹھیک اندازہ کیا آپ نے۔ اس کی نظر میری بہن پر تھی جو چوبیس سال کی ہوگئی تھی اور ابھی تک بھائی کے گھر میں بیٹھی تھی۔ اب میں کیا کہوں۔ ہر بھائی کو اپنی بہن اچھی لگتی ہے۔ خصوصاً چھوٹی بہن جسے اس نے ماں اور باپ کی محبت بھی دی ہو لیکن وہ واقعی بہت خوب صورت اور معصوم ہے۔ اگر وہ پڑھی لکھی ہوتی تو بڑے بڑے لوگ اس کو اپنے گھر کی بہو بنا کے فخر کرتے۔"

میں نے کہا "پھر کیا جواب دیا تھا تم نے؟"

"ظاہر ہے وہی جو ایک عزت دار بھائی دے گا۔ غریب ہونا اور بات ہے، بے غیرت تو لکھ پتی بھی ہو سکتا ہے۔ جنت کی شادی۔ یہ میری بہن کا نام ہے۔ میں دُگنی سے زیادہ عمر والے دلاور جیسے شخص کے ساتھ کیسے کر دیتا۔ جنت سے بڑی تو شاید اس کی اپنی بیٹیاں ہوں گی۔ اور وہ کیسا آدمی ہے، یہ بھی جانتا ہوں میں۔ جانتے بوجھتے اپنی معصوم بہن کو اس ہوس ناک بھوکے بھیڑیئے کے آگے ڈال دیتا۔ وہ بھی صرف بیس ہزار کی خاطر۔ بیس ہزار تو میں کسی کا گلا کاٹ کے کہیں ڈاکا ڈال کے لے آتا اور جیل جاتا یا پھانسی چڑھ جاتا مگر جنت پر دلاور کی پرچھائیں بھی نہ پڑنے دیتا۔ میں نے پہلی شرط مان لی۔ اس نے مجھے تمہارے بارے میں بتایا اور کہا کہ تم اس کی بیوی کو اُٹھالاؤ۔ وہ خود ہی آجائے گا۔ اس کے بعد قرض کی پکی رسید تمہیں مل جائے گی۔"

"مگر میری تو کوئی بیوی نہیں ہے۔ شادی کہاں ہوئی ہے میری؟"

کالیا چکرا گیا "پھر یہ..... آپ کے ساتھ..."

میں نے کہا "یہ رابعہ ہے۔ بہت مشہور وکیل۔ میری شادی اسی سے ہوگی اگر قسمت کو منظور ہوا لیکن ابھی میری بیوی نہیں ہے وہ۔"

"اچھا؟ دلاور نے تو یہی کہا تھا۔"

"تو تم رابعہ کو اغوا کرنے کے لیے آئے تھے، باقی لوگ کون تھے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ دلاور نے کہا تھا کہ ڈرو نہیں۔ تم اکیلے نہیں جاؤ گے۔ تمہارے ساتھ تین آدمی اور بھی ہوں گے۔"

"ذرا سوچ کے جواب دو" میں نے کہا "کیا ان تینوں کو تم نے کبھی فیکٹری میں دیکھا تھا؟"

"نہیں۔"

"دلاور کے ساتھ؟" میں نے کہا۔

کالیا نے پھر نفی میں سر ہلایا "وہ بھی مجھے نہیں جانتے تھے۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کرائے کے بدمعاش تھے۔ خیر اب بتاؤ تم کیا کرو گے۔ تم دلاور کی پہلی شرط پوری کرنے میں ناکام رہے۔"

"اب..... ظاہر ہے۔ جنت کا نکاح ہوگا چوہدری دلاور سے۔" وہ ایک دم اُداس ہوگیا "وہ اس کی قید میں ہے۔"

"قید میں؟"

"وہ دلاور کے سالے کے گھر میں ہے۔ اس کا سالا جواری شرابی ہے۔ دلاور نے اسے خرید رکھا ہے۔ وہ اس کو پیسے دیتا رہتا ہے۔ وہ پولیس کا مخبر بھی ہے اور نشے کی لت نے اسے اتنا بے غیرت بنا دیا ہے کہ وہ خود اپنی بہن کے گھر میں لڑکیاں لاتا ہے۔ اب بہن پر سوکن لانے کی سازش میں وہ دلاور کے ساتھ ہے۔ بہن کا گھر تباہ کرنے کی کوئی فکر نہیں۔ نکاح اس ... ہوگا۔"

"فرض کرو۔ فرض کرو تم اپنے مقصد میں کامیاب ... تم رابعہ کو اغوا کرکے لے جاتے" میں نے کہا "اور اس ... دلاور تمہاری بہن کو اپنے گھر میں ڈال لیتا۔ تو کیا کرتے تم؟"

"اس کا بندوبست پکا کرلیا تھا جی میں نے۔ میں نکاح ... سب کے سامنے دلاور کی گردن اُتار دیتا۔"

"اگر میں بیس ہزار تمہیں دے دوں تو تمہیں یقین ... دلاور پکی رسید تمہارے حوالے کردے گا اور تاجاں کو تمہارے ... حوالے کرکے کہے گا کہ جاؤ کالیا، خوش رہو" میں نے ...

"بے وقوف ہو تم اگر ایسا سمجھتے ہو۔ وہ تم سے بیس ہزار ... قرض معاف نہیں کرے گا اور تم سے رشتہ ضرور جوڑے گا۔"

"میں اس کی....."

میں نے کہا "گرمی کھانے سے دماغ متاثر ہوتا ہے۔ ... کام لو۔ جب اسے بیس ہزار دینے ہیں تو اپنا بندوبست پکا رکھو ... کا یہ مطلب نہیں کہ دلاور کی گردن اُتارنے کے لیے چھری ... کرلو۔ نہیں، ایسے لوگوں کی موجودگی میں قرضہ ادا کرو ... گواہ ہوں۔ ضرورت پڑنے پر تمہارے حق میں گواہی دیں ... بہن کے ساتھ دلاور کے عقدِ ثانی کو روکنے کی ترکیب کرو ... قرض ادا ہوگیا تو شادی کیسی! یہ بات تمہیں سب کے سامنے ... پڑے گی لیکن یہ کام آسان نہیں ہوگا۔ تم دلاور کو بھی جانتے ... اس کا سالا بھی کوئی شریف آدمی نہیں ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ... کوئی بھائی ہی نہ رہے۔"

وہ طیش میں آگیا "کالیا بھی کم نہیں ہے۔ میں اپنے ساتھ ... جاؤں گا ایسے بندے..."

میں نے کہا "نہیں کالیا۔ سوری... جمال، آئندہ ... تمہیں جمال ہی کہوں گا اور بھی کوئی تمہیں کالیا کہے تو اس کے منہ پر تھپڑ مارنا۔ کالا رنگ اللہ نے بلال حبشیؓ کو بھی دیا تھا ... تحقیر کرنے کا حق کسی کو حاصل نہیں۔"

"آپ..... بڑی عجیب باتیں کرتے ہو۔"

میں نے کہا "جمال۔ تمہارے ساتھ ہم جائیں گے۔"

"آپ...؟"

"ہاں ہم۔" میں نے کہا "پیسے نہیں۔ بھیس بدل کے ... کچھ اخبار والے بھی پہنچ جائیں گے۔ تم فکر مت کرو ... نہیں۔ چوہدری دلاور تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ایک بات ... بتاؤں تمہیں۔ میں نے میر شرافت علی کو قتل نہیں کیا تھا ... چوہدری دلاور نے قتل کروایا تھا۔ شاید پیڈرو کے ہاتھوں ...

... میرے والد وزیر خان ہی تھے۔ انہیں بھی ایسے ہی ... الگ کیا گیا تھا اور بعد میں مروا دیا گیا تھا۔ چوہدری ... جھوٹ بول کے تمہیں پھنسانے کی کوشش کی تھی۔ اس ... اپنا آلۂ کار بنا لیا تھا۔ پکڑے جاتے یا مارے جاتے تو تم ... کون روک سکتا تھا شادی سے۔ اب تم غصے میں مت ... کہہ رہا ہوں وہ سُنو۔ پہلے یہ بتاؤ کہ شادی کہاں ہو رہی ... مطلب ہے اس کے سالے کا نام کیا ہے اور وہ رہتا کہاں ...

... کا نام ہے نیکا گُڈی۔ رفیق اصل نام ہے۔ نشہ کرتا ہے ... کہ ہم تو بس ایک دم لگاتے ہیں اور گُڈی کی طرح اُڑ جاتے ... اس دنیا سے بہت اوپر۔" (گُڈی پتنگ کو کہتے ہیں) رہائش ... شیر انوالہ گیٹ کے اندر ہے مگر نکاح ہوگا کالا شاہ کاکو کے ... ایک کوٹھی میں۔ یہ کوٹھی دلاور نے کرائے پر لی ہے۔ نیکا ... آج کل وہیں ہے۔"

"اور جنت اکیلی ہے اس کے ساتھ؟"

"نہیں جی۔ دلاور کے بیوی بچے سب وہیں ہیں لیکن نیکا بڑا ... ہے۔ اس کی بہن کو بھی نہیں معلوم کہ کیا ڈراما ہونے والا ... جنت بھی اسی گھر میں ہے۔ نکاح کے وقت دلاور اپنی بیوی کو ... بھگا دے گا کہ یہاں کچھ خطرہ ہے۔"

میں نے کہا "بس ٹھیک ہے۔ اب تم دلاور سے ملو۔ معافی مانگو ... جناب کام تو ہوا نہیں۔ اب آپ کی دوسری شرط مجھے منظور ... وہ تاریخ بتا دیں مجھے نکاح کی اور وقت۔ میں اپنے دو گواہ لاؤں ... جب قرضے کی پکی رسید لے آئیں۔ اُمید ہے دلاور جھانسے میں ... آجائے گا۔ اسے تم پر شک نہیں ہوگا۔ ہر کام اس کی مرضی کے ... ہی ہو رہا ہے۔ عین وقت پر وہاں کچھ لوگ پہنچ جائیں گے۔ اس ... تم بیس ہزار نکال کے سامنے رکھ دینا۔"

وہ کچھ خوف زدہ نظر آنے لگا "اگر..... اگر جنت کو....."

"کچھ نہیں ہوگا جنت کو۔ دلاور سے نمٹنے کو ایسے بہت ہوں ... دیکھا ہے نا تم نے؟" میں نے ریوالور دکھا کے کہا "ایسا ہی ... کے پاس بھی ہے اور اخبار والوں کے سامنے دلاور چوں نہیں ... کرے گا۔"

"مگر رابعہ..."

"رابعہ کی فکر ابھی مت کرو۔ وہ بھی سنبھال لیں گے ہم....."

ایک دم دروازہ کھلا "ویری گڈ۔ پلان بہترین اور مکمل ہے ... مسٹر رجنٹ۔" ڈی ایس پی نے ایک دم اندر آکے کہا۔

اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ رابعہ اس کے پیچھے تھی۔

کامیابی کے یقین کی شکست اتنی اچانک اور غیر متوقع تھی کہ ... سرے سے میرا بُرا حال ہوگیا۔ رابعہ کو کچھ کہنا بے سود ... صرف تقدیر کو دیا جاسکتا تھا جو حالت کا کینوس بناتی ہے اور پھر اس پر زندگی کے ہر رنگ میں واقعات و حادثات کی تصویر۔

شاید دس سال پہلے نیلوفر نام کی ایک لڑکی کے ساتھ رابعہ نے ایک ہی کالج سے ایک ساتھ بی اے پاس کرنے کی غلطی کی تھی۔ اس وقت یہ غلطی بہرحال نہیں تھی۔ آج میری بدقسمتی نے اس پُرانے تعلق کو دوبارہ جوڑ دیا تھا۔ قسمت کا ہاتھ شامل نہ ہوتا تو میں ایک مفرور و مطلوب اشتہاری مجرم کیوں ہوتا یا نیلوفر کا شوہر ڈی ایس پی کیوں ہوتا۔ میں ایک دن بعد یہاں آتا یا ڈی ایس پی صاحب ہمارے جانے کے بعد تفتیش کے لیے آجاتے۔

لیکن بقول فلسفیٔ دوراں جب جب جو جو ہوتا ہے تب تب سو سو ہوتا ہے۔

رابعہ کے چہرے پر دکھ، خجالت اور بے بسی کے جذبات کی تصویر بہت واضح تھی۔ میں اس تصویر کو دیکھتا یا توپ کے دہانے کی طرح نظر آنے والے ریوالور کی نال کی طرف۔

کالیا اس صورتِ حال سے فائدہ اُٹھا سکتا تھا مگر اب وہ میرا دشمن نہیں رہا تھا۔ وہ میرا محتاج ہوگیا تھا۔ یکلخت اس کو اپنی مجبوری کی تاریک سرنگ کے دوسرے کنارے پر اُمید کی جھلملاتی روشنی نظر آنے لگی تھی۔ شاید وہ یہی سوچتا رہ گیا کہ اسے قانون کی مدد نہیں چاہیے یا قانون کے مقابلے میں ایک مجرم کی مدد کے وعدے پر بھروسا کرنا چاہیے۔

میں نے رضاکارانہ طور پر ہاتھ اُٹھا دیے "آپ نیلوفر کے شوہر ہیں؟"

"میں صرف نیلوفر کا شوہر نہیں ہوں۔"

"سوری! مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ کی کتنی بیویاں ہیں۔"

"شٹ اپ۔ میرا مطلب تھا کہ میں ایک پولیس افسر بھی ہوں بلکہ پولیس افسر پہلے ہوں۔ شوہر، اس کے بعد۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

میں نے کہا "کوئی بیوی یہ بات سُن کے خوش نہیں ہو سکتی۔"

"میں بیوی کو خوش کرنے کے لیے فرض شناسی کا مظاہرہ نہیں کرتا۔" اس نے کہا "ویسے بھی کون خوش رکھ سکتا ہے بیوی کو۔ نہ ڈاکٹر، نہ وکیل، نہ صحافی، نہ تاجر کسی کے پاس وقت ہوتا ہے اتنا جتنا بیویاں مانگتی ہیں؟"

"تم عام پولیس والوں سے مختلف باتیں کرتے ہو۔"

"اور تم؟ کیا تم عام مجرموں جیسی باتیں کرتے ہو۔" اس نے کہا "میرا نام عمر قریشی ہے۔"

میں نے کہا "کیا مجھے اپنا نام بتا کے مصافحہ کرنا چاہیے اور کہنا چاہیے کہ بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کے۔"

اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا "اس نام سے تمہیں کچھ یاد نہیں آتا؟"

میں نے کہا "مجھے بہت سے سنسنی خیز کرکٹ میچ یاد آتے ہیں جن پر ریڈیو کمنٹری میں نے عمر قریشی سے سُنی تھی اور مجھے جمشید مار کر

کا نام یاد آتا ہے جو ان کا ساتھ دیتے تھے۔"

وہ ریوالور کا رخ میری طرف رکھتے ہوئے دوسری کرسی پر بیٹھ گیا "میں ایس ایس پی ضامن رضوی صاحب کے زمانے میں اے ایس آئی تھا۔ ان کے ساتھ بھی رہا تھا۔ جب تم ان کی کوٹھی میں رہتے تھے۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا مگر مجھے کچھ یاد نہ آیا "گویا ہم پُرانے شناسا ہیں۔"

اس نے سرہلایا "ویسے تو پولیس میں تمہارے شناسا بہت ہیں' میں تمہیں ذرا پہلے سے جانتا تھا۔"

میں نے مظلوم لہجے میں کہا "پھر تو تمہیں معلوم ہوگا کہ میں بے گناہ ہوں۔"

"میرے جاننے یا نہ جاننے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس کا فیصلہ عدالت کرتی ہے۔" عمر نے کہا "تمہارا ایک اور ساتھی بھی تھا۔"

میں نے ایک آہ بھری "تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ...

سہرا باندھے ہوئے چلنے کو یہاں سب تیار بیٹھے ہیں

بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

وہ مسکرایا اور میں نے رابعہ کی طرف دیکھا جو میرے پیچھے کھڑی اپنے ہونٹ کاٹ رہی تھی۔ اس نے میری بات سُنی نہیں یا وہ اتنی پریشان تھی کہ اسے شرمانے اور پیار بھرا غصہ دکھانے کا خیال نہیں آیا۔

"یعنی تمہاری شادی نہیں ہوئی ابھی تک؟" عمر نے طنز سے کہا۔

میں نے نفی میں سرہلایا "مس رابعہ کے جھوٹ کا اعتراف میں کرتا ہوں۔"

"جھوٹ کا اندازہ تو مجھے ہوگیا تھا۔ مس رابعہ کو دیکھ کر۔"

"تم نے انہیں بھی پہچان لیا ہوگا۔" میں نے افسوس سے سر ہلایا۔

"یہ بھی اچھی خاصی مشہور ہیں۔ مگر تم سے کچھ کم۔ جب نیلو نے مجھے بتایا۔"

میں نے کہا "تم جانتے ہو نیلو کو۔ کیا غضب کیا تھا اس نے فلم زہرِ عشق میں۔"

"نیلوفر کو میں نیلو کہتا ہوں۔ فلمسٹار نیلو کی اجازت کے بغیر۔"

میں نے کہا "ایک جیسے نام رکھنا کاپی رائٹ ایکٹ کی خلاف ورزی نہیں ہے۔ کیا وہ اخلاقاً تمہیں وربن کہتی ہے۔"

اس نے میرے مذاق کو نظرانداز کردیا "مجھے حیرانی ہوئی تھی کہ خاتون نے وکالت چھوڑ کے کسی خبطی پروفیسر سے کیوں شادی کرلی؟ اور وہ خبطی آخر کسی ریسٹ ہاؤس میں چھپ کے کیوں ریسرچ کررہا ہے۔"

"اس کے بعد تمہاری پولیس مین کی رگ پھڑ[ک] آئے تفتیش پ[ر]۔"

"میری بیوی سخت ناراض ہے مجھ سے مگر میں..."

"فرض سے مجبور ہوں۔" میں نے اس کی بات [...] "انعام کی بات بتادیتے اپنی نیلو کو اور اس سے وعدہ [...] ساری رقم اسے زیور کپڑے بنانے کے لیے دے دوگے تو [...]"

اب اس نے میری بات کاٹ دی "وہ اسی لیے ناراض [...] میرا انعام کی رقم لینے کا بھی کوئی خیال نہیں۔ میں نے تو [...] بتادیا تھا کہ تمہاری یہ سہیلی جو تمہاری کلاس فیلو تھی وکیل [...] اس نے تم سے جھوٹ بولا ہے۔ میں نے اسے تمہارے [...] بتادیا تھا کہ تمہاری گرفتاری پر کتنا انعام ہے۔ اور وہ بڑ[ی خوش] ہوئی تھی کہ خدا نے ہمیں یہ موقع دیا ہے۔"

میں نے رابعہ کی طرف دیکھا۔ اس نے مجھ سے نظ[ر نہیں] ملائی۔

"دراصل ہم کچھ مقروض ہیں۔ مکان بنایا تھا قرضہ [...] زیور کا تو اسے اتنا شوق نہیں۔ وہ خوش تھی کہ اب یہ قرض [ادا] ہوجائے گا۔ وہ تو میری مدد بھی کرنا چاہتی تھی مس رابعہ [...] تھی کہ اتنا خطرناک مجرم ہے تو رسک مت لو۔ میں رابعہ [...] جا کے اسے باتوں میں لگائی ہوں تم اچانک آجانا۔"

رابعہ نے زخم خوردہ لہجے میں کہا "مجھے نیلوفر سے اتنی [...] کی توقع نہیں تھی۔"

"محترم خاتون۔ وکیل ہو کے بھی آپ ایسی بات کرتی [...] ہر روز عدالت میں آپ کو یہ تجربہ نہیں ہوتا کہ پیسہ آدمی کو کتنا [...] بنادیتا ہے اور دولت کی طاقت کے مقابلے میں خون کے رشتے [...] سوت کے دھاگے ثابت ہوتے ہیں۔ نیلوفر تمہارا بُرا نہیں [چاہتی] تھی۔ اپنے گھر کی بھلائی کے لیے خودغرض ہوگئی تھی۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا "اس معاملے میں شاید ہر [...] ہی خودغرض ہوتی ہے۔"

"جب میں نے اسے بتایا کہ انعام کی رقم کو بھول جاؤ [...] صرف اپنا فرض ادا کروں گا۔ فرض کی خاطر۔"

"آئی سی۔ تم ایمانداری کے مرض میں مبتلا ہو۔"

"ہاں۔ یہ بیماری مجھے رضوی صاحب سے لگی تھی۔ میں [...] مدّاح تھا۔ وہ میرے آئیڈیل تھے اور میں انہی جیسا بننا چاہتا [...] لیکن اس خوش فہمی سے دور رہنا کہ ان سے تعلق کی بنا [پر] تمہیں کوئی رعایت دوں گا۔ میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا [...] تم نے فرار ہونے یا مجھ پر حملہ کرنے کی کوشش کی تو میں [...] تمہیں شوٹ کردوں گا۔ یہ جذباتی رعایت میں نے اپنی بیوی [کو نہیں] دی تو تمہیں کیسے دے سکتا ہوں۔"

میں نے کہا "انکل رضوی مرحوم کے حقیقی جانشین [...]

اُمید بھی نہیں رکھ سکتا۔"

"مرحوم کے ساتھ تم نے جو سلوک کیا تھا اس کے بعد تم کسی رعایت کے مستحق ثابت نہیں ہوتے۔"

میں نے حیرانی سے کہا "میں نے کیا سلوک کیا تھا؟"

"تم نے انہیں آزمائش میں ڈال دیا تھا۔ فرض اور محبت کی کشمکش کے عذاب میں مبتلا کردیا تھا اور جو شخص کبھی ہارا نہیں تھا' وہ اس جنگ میں ہار گیا تھا۔ انہوں نے تم کو پناہ دی تھی اور تحفظ فراہم کیا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ قانون کی نظر میں تم مجرم ہو۔ وہ تمہارے طرفدار ہوگئے تھے۔"

"شاید اس لیے مسٹر عمر قریشی کہ وہ حقیقت کو جانتے تھے۔" میں نے تلخی سے کہا۔

"حقیقت تو میں بھی جانتا ہوں۔ مگر حقیقت کو تسلیم کرانا میرا کام نہیں ہے۔ یہ اعلان عدالت کرتی ہے۔ رضوی صاحب بھی یہ بات سمجھتے تھے لیکن تم نے ان کا جذباتی استحصال کیا تھا۔ ان کا سارا کیریئر ایک کُھلی کتاب تھا۔ ان کے ضمیر کی اُجلی چاندنی بے داغ تھی مگر آخری وقت میں تم نے اسے میلا کردیا۔ مرتے وقت ان کے ضمیر پر یہ بوجھ تھا کہ ان کا ریکارڈ خراب ہوگیا۔ صرف تمہاری وجہ سے۔ ان کی بہت عزت تھی لیکن انہیں قبل از وقت ریٹائرمنٹ دی گئی تو اس ذلت کو انہوں نے اپنی سزا سمجھ کے قبول کیا تھا۔ دنیا کی بات نہیں' وہ خود اپنی نظر میں بے عزت ہوگئے تھے۔"

"میں اپنی صفائی میں کچھ کہوں گا تو عذرِ گناہ' بدتراز گناہ والی بات ہوگی۔ مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ میری وجہ سے وہ آزمائش میں پڑے تھے لیکن یہ احساس آج تم نے دلایا ہے کہ وہ میری وجہ سے شکست کے عذاب سے دوچار ہوئے تھے۔ میں اپنے جرم کی تلافی بھی نہیں کرسکتا۔ اس پر شرمندہ ہونے سے بھی کیا ہوگا۔"

"اس ایماندار پولیس افسر کے پاس رہنے کے لیے ذاتی مکان تک نہیں تھا۔ ان کی موت کے بعد کیا بیتی اس فیملی پر!"

"مجھے معلوم ہے۔" میں نے کسی مجرم کی طرح سر جھکالیا "انکل رضوی کی وائف ایک اسکول چلا تو رہی تھیں۔ پھر وہ بھی تباہ ہوگیا تھا۔ معلوم نہیں اب وہ کہاں ہیں۔"

"وہ لندن میں ہیں۔" عمر نے کہا "کچھ خیرخواہ بھی تھے ان کے مگر تم جیسے نہیں۔ انہوں نے سب بندوبست کردیا تھا کہ وہ بحفاظت اس ملک سے نکل جائیں۔ جہاں تمہارے دشمن ان کی جان لینا چاہتے تھے۔ مسز رضوی نے اب ایسٹ اینڈ میں ایک بوتیک کھول لیا ہے اور ان کے بچے وہیں پڑھ رہے ہیں۔ تم نے کیا کیا ان کے لیے؟"

"بہت کچھ کیا تھا۔ لیکن وہ کسی کا احسان لینے کی روادار نہیں تھیں۔" میں نے احتجاج کیا۔

"تمہیں حیرت ہوگی کہ وہ ایک بہت بدنام شخص تھا۔ ایک ہسٹری شیٹر مجرم اور کئی بار کا سزایافتہ۔ پولیس اس کو قتل کے ایک کیس میں ملوث کرکے پھانسی لٹکانا چاہتی تھی تاکہ مصیبت ختم ہو۔ اصل گواہ اس کے خلاف سامنے نہیں آتے تھے اور ناکافی شہادت کی بنا پر وہ دوبار قتل کے الزام سے صاف بچ گیا تھا۔ تیسری بار پولیس نے پکا بندوبست کرلیا تھا۔ گواہ بھی پولیس کے اپنے تھے اور پولیس نے واقعاتی شہادت بھی جمع کرلی تھی۔ آلۂ قتل وغیرہ سب دستیاب تھا مگر تمہارے انکل ایس ایس پی رضوی مرحوم نے جھوٹا کیس بنانے پر پولیس والوں کو معطل کردیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ملزم کو سزا ضرور ہونی چاہیے مگر انصاف کے تقاضے بھی پورے کرنا لازی ہے۔ اگر مجرم رہا ہوجاتا ہے تو یہ پولیس کی نااہلی ہے اور نااہلی کو جعلسازی سے چھپانا زیادہ بڑا جرم ہے۔ اس ہسٹری شیٹر بدمعاش نے رضوی صاحب کے احسان کا بدلہ یوں چکایا کہ ان کی فیملی کو لندن پہنچادیا۔"

"مگر مسز رضوی نے اس کی مدد کیسے قبول کرلی تھی؟"

"انہیں آج بھی علم نہیں کہ یہ سب انتظام کس نے لیا تھا۔ انہیں تو اچانک پتا چلا کہ ان کے شوہر کے ایک اکاؤنٹ میں خاصی بڑی رقم موجود ہے جس کا مرحوم نے کبھی بیوی سے بھی ذکر نہیں کیا تھا۔ اکاؤنٹ نیا کھولا گیا تھا مگر یہ مسز رضوی کو کیسے معلوم ہوسکتا تھا۔ خود بینک منیجر نے انہیں بتایا کہ یہ رقم تو کئی سالوں میں جمع ہوئی تھی۔"

"بینک منیجر نے جھوٹ بولا تھا؟"

"وہ جھوٹ کیسے نہ بولتا۔ اسے اپنی جان عزیز تھی۔ یہاں سے لندن چلے جانے کا مشورہ مخلص دوستوں نے دیا۔ پاسپورٹ وغیرہ کا انتظام مشکل نہیں تھا۔ وہ اپنا سب کچھ سمیٹ کر چلی گئیں۔ ان کا جہاز ٹیک آف کرنے تک میں خود ائرپورٹ پر موجود تھا۔ اس نامی گرامی بدمعاش کے علاوہ۔"

"مجھے شرم آرہی ہے اپنے شریف آدمی ہونے پر۔ اور اس خیال سے کہ میں انہیں انکل کہتا تھا۔ تم مجھے پتا دے سکتے ہو ان کا۔"

"ہرگز نہیں۔ میرا ان سے رابطہ ہے اور میں انہیں سمجھاتا رہتا ہوں کہ وہ کسی پُرانے تعلق کا کہیں حوالہ نہ دیں۔ گمنام رہیں اور اپنے بچوں کے مستقبل کو محفوظ بنائیں۔"

خاموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد میں نے کہا "تھینک یو مسٹر عمر۔ تم نے مجھ پر احسان کیا۔"

"میں نے کسی پر احسان نہیں کیا۔" وہ برہمی سے بولا۔

"وہ بدمعاش کون تھا؟"

"اب کیا کروگے اس کا نام جان کے۔ وہ اس دنیا میں ہی نہیں۔"

"وہ مر چکا ہے؟"

"اسے ایک طوائف نے قتل کردیا تھا۔ ایک لاوارث کمزور سی عورت نے خنجر اس کے سینے میں اُتار دیا تھا۔ یہ تو ہوتا ہے سکندر صاحب۔ مکافاتِ عمل اسی کو کہتے ہیں شاید۔ ایسی کہانیاں تو بہت ملیں گی تمہیں۔ یہ بتاؤ تم یہاں کیا کررہے ہو۔ اور یہ کون ہے؟"

"یہ کالیا ہے۔ پہلے میرا دشمن تھا۔"

"اب دوست کیسے بن گیا؟"

"ایک مظلوم دوسرے مظلوم کا ساتھی ہوجاتا ہے۔"

"اوہ! تو یہ بھی مظلوم صاحب ہیں۔" عمر نے طنزیہ لہجے میں کہا "مگر مجھے کوئی دلچسپی نہیں اس پر ہونے والے ظلم کی داستان سے۔"

"بڑے افسوس کی بات ہے۔"

"ہاں، مگر ظلم کہاں نہیں ہورہا ہے اور کیا خود اس نے کبھی کسی پر ظلم نہیں کیا ہوگا۔ اس کی تو صورت بتاتی ہے کہ یہ جرائم پیشہ ہے۔"

میں نے تلخی سے کہا "عجلت میں فیصلہ کیا تم نے۔ اگر چہرے دیکھ کے معلوم ہوسکتا کہ کون ظالم ہے اور کون مظلوم، کون مجرم ہے اور کون بے گناہ تو پھر پولیس، قانون اور عدالت کی کیا ضرورت تھی۔"

"میں یہاں کسی اور کام سے آیا تھا۔" عمر قریشی نے کہا "ایک قاتل کی تلاش میں حیدر آباد سے خصوصی ٹیم کے ساتھ۔ وہ ایک صنعت کار کا ڈرائیور تھا۔ اسے لوٹ کے قتل کرنے کے بعد فرار ہوگیا تھا۔ اس کا آبائی گاؤں قریب ہی ہے جہاں اس کے بیوی بچے رہتے تھے۔ وہیں سے پکڑا گیا آج۔"

"تمہاری کامیابی میں خوش قسمتی کا بھی بہت دخل ہے۔ چھوٹے مجرم کو پکڑنے آئے تھے بڑا مجرم ہاتھ آگیا۔ میں تمہارے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوں مگر مجھے جمعے تک مہلت چاہیے۔" میں نے کہا۔

"سوری، میں تو کل ہی واپس جارہا ہوں۔ جانے سے پہلے میں تم کو مقامی پولیس کی تحویل میں دوں گا۔"

میں نے کہا "میں وعدہ کرتا ہوں کہ جمعے کے بعد...."

"سکندر، میں مہلت دینے کا اختیار نہیں رکھتا۔"

"اور اگر میں گرفتار ہونے سے انکار کردوں؟"

"میں کب یہ اُمید رکھتا ہوں کہ تم رضاکارانہ گرفتاری دو گے۔ یہ میرا کام ہے اور میں قانونی طور پر اتنا بے اختیار بھی نہیں ہوں۔ ایک گھنٹے میں میری پولیس پارٹی مجرم کے ساتھ پہنچنے والی ہے۔ وہ تمہیں بھی ساتھ لے جاسکتے ہیں، اس وقت تک میں تمہیں......"

رابعہ میرے پیچھے صوفے کے ساتھ لگی کھڑی تھی اگر وہ چاہتی تو میرے ساتھ ہی بیٹھ بھی سکتی تھی مگر ذہنی کشیدگی کے باعث مجھے بھی خیال نہیں آیا کہ اس سے بیٹھنے کے لیے کہوں۔ میرے دائیں ہاتھ پر وہ بیڈ تھا جس پر کالیا بظاہر تمام معاملات سے لاتعلق بیٹھا اپنے مستقبل کی خانہ خرابی پر تقدیر کو کوس رہا تھا۔ وہ رابعہ کو اغوا کرکے ساتھ لے جانا چاہتا تھا مگر خود اغوا ہوگیا تھا۔ پھر اس کو اُمید کی روشنی سراب کی طرح نظر آئی تھی۔ عین اس وقت جب اسے یقین آچکا تھا کہ تائیدِ ایزدی سے میں اس کی بدبختی کے ناسور کا علاج کرسکتا ہوں، میں بھی اپنی بدبختی کے تیر کا نشانہ بن گیا تھا۔

معلوم نہیں کیا سوچ کے اس نے جان کی بازی لگائی اور اس میں اتنی ہمت کیسے آگئی کہ وہ گھات میں بیٹھے ہوئے چیتے کی طرح جست لگا کے سیدھا اپنے شکار پر گرا اور ڈی ایس پی عمر قریشی کو ساتھ لیتا ہوا کرسی سمیت فرش پر اُلٹ گیا۔

عمر قریشی کو فائر کی مہلت ہی نہیں ملی۔ اس کی تمام توجہ میری طرف تھی اور وہ غالباً سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کالیا اس پر یوں حملہ کردے گا۔ اس کوشش میں کالیا کی جان جاسکتی تھی اور عمر قریشی گولی چلا دیتا تو یہ گولی مجھے یا رابعہ کو بھی نشانہ بنا سکتی تھی مگر عمر قریشی ٹھنڈے دماغ کا اور اعصاب پر قابو رکھنے والا شخص تھا۔ اس نے بلا ارادہ اور بے سبب گولی نہیں چلائی۔

کالیا کو خطرہ ڈی ایس پی کی وردی سے نہیں اس کے ریوالور سے تھا۔ اس نے دیوانہ وار جدوجہد کی اور عمر قریشی سے ریوالور چھیننے میں کامیاب ہوگیا۔ عمر قریشی نے زبردست مزاحمت کی مگر پہل کرنے کا فائدہ کالیا نے اُٹھالیا تھا۔ اس نے ریوالور ہاتھ میں آتے ہی دور پھینک دیا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ڈی ایس پی کے مقابلے میں وہ کمزور حریف ہے اور یہ ہتھیار اس کے قبضے میں رہا تو پھر چھن جائے گا۔

یہ صرف چند سیکنڈ کی بات تھی۔ اُدھر کالیا نے ریوالور پھینک کے اُٹھنا چاہا اِدھر عمر قریشی نے اسے ٹانگ پکڑ کر پھر کھینچ لیا۔ اب کالیا نیچے تھا اور عمر قریشی اوپر۔ وہ دونوں خون کے پیاسے درندوں کی طرح لڑ رہے تھے۔ اپنی ناکامی نے ڈی ایس پی کو مشتعل کردیا تھا تو کالیا نے بھی آخری وقت تک موت سے لڑنے کا عزم کر رکھا تھا۔

ریوالور صوفے کے نیچے سے گزرا اور اس سے پہلے کہ میں اسے پکڑتا رابعہ کے پیروں سے ٹکرا گیا۔ وہ میرے پیچھے ہی موجود تھی۔ اس نے جھک کے ڈی ایس پی کا ریوالور اُٹھالیا۔

"بس کرو" اس نے دونوں ہاتھوں میں ریوالور تھام لیا اور چیخ کے کہا۔

میں نے کہا "رابعہ گولی مت چلانا۔"

رابعہ پر جنون سوار تھا "میں کہتی ہوں چھوڑ دو اسے ورنہ میں گولی ماردوں گی عمر۔"

عمر نے رابعہ کے لہجے کی وحشت اور دیوانگی کو محسوس کرلیا۔ وہ تجربہ کار پولیس افسر تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ کب کس کی بات کھوکھلی دھمکی ہوتی ہے اور کب لہجے میں خون کی پیاس بولتی ہے۔ اس نے کالیا کو چھوڑ دیا۔ وہ اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے آہستہ آہستہ کھڑے ہوگئے۔ انہوں نے ایک دوسرے کے کپڑے پھاڑ دیے تھے۔ بال نوچے تھے اور چہروں پر خونی خراشیں ڈال دی تھیں۔

میں نے کہا "رابعہ۔ یہ ریوالور مجھے دے دو۔"

"نہیں۔ مجھے معلوم ہے تم ریوالور اسے واپس کردوگے۔"

"سکندر" عمر قریشی نے کہا "فرض کرو میں تمہیں جمعے تک کی مہلت دے دوں۔"

میں نے تلخی سے کہا "کیا اچانک تمہیں اس کا اختیار مل گیا ہے؟"

"نہیں۔ میں مجبور ہوگیا ہوں۔ تم سے سودا کرنے پر۔"

"سودا کیسا" رابعہ نے کہا "تم سکندر کو گرفتار نہیں کرسکتے۔"

"مگر سکندر نے تو خود گرفتاری دینے کا وعدہ کیا تھا۔"

"سکندر کون ہوتا ہے یہ وعدہ کرنے والا۔ رابعہ نے چلّا کے کہا "اس کی زندگی صرف اسی کی نہیں۔ میری بھی ہے۔"

اسی وقت دروازے میں نیلوفر نمودار ہوئی۔ اس نے ایک چیخ ماری "رابعہ! یہ کیا ہورہا ہے۔ تم مارنا چاہتی ہو عمر کو....."

رابعہ نے کہا "اگر اس نے سکندر کو ہاتھ بھی لگایا تو تمہارے بچے یتیم ہوجائیں گے۔ نیلوفر، پہلے اپنے فرض شناس شوہر سے اس کی مرضی پوچھ لو۔ وہ ادائے فرض کی خاطر جان دینا چاہتا ہے تو اس کی مرضی۔ میں بھی کوئی رعایت نہیں کروں گی۔"

"عمر، اس پاگل عورت سے کہہ دو.....پلیز...." نیلوفر بولی۔

عمر نے اس کی بات کاٹ دی "نیلو، بچے کہاں ہیں؟" وہ نرمی سے بولا۔

"ٹونی اور نینا سو رہے ہیں۔" نیلوفر رونے لگی۔

"ٹھیک ہے۔ تم جاؤ ان کے پاس۔" عمر نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

"اور تم!"

"میں آتا ہوں۔ چلو تم۔" عمر نے دہاڑ کے کہا "ایسا نہ ہو بچے بھی آجائیں یہاں۔"

رابعہ نے کہا "خبردار نیلوفر، اگر تم نے کسی کو کچھ بتایا یا کہیں فون کیا تو اپنا نقصان کروگی۔"

"نہیں، میں کچھ نہیں کروں گی۔ تم جیسا کہوگی ویسا ہی ہوگا۔" نیلوفر نے روتے روتے کہا "خدا کے لیے عمر کو معاف کردو۔ اسے مت مارو۔"

میں نے کہا "تمہارے شوہر کو کچھ نہیں ہوگا۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔ ہم ابھی آدھے گھنٹے میں یہاں سے چلے جائیں گے مگر تم بچوں کے ساتھ اپنے کمرے میں رہوگی۔ ہماری روانگی تک۔ ریسٹ ہاؤس میں صرف ملازم ہے، اسے بھی کچھ معلوم نہیں ہونا چاہیے۔"

"تم جس کی چاہو قسم لے لو۔ میں اپنے بچوں کی زندگی کی قسم کھاتی ہوں کہ کسی کو بھی کچھ نہیں بتاؤں گی۔ نہ آج نہ بعد میں کبھی۔ عمر بھی نہیں بتائے گا۔"

"نیلو؟" عمر نے سختی سے کہا "فضول باتیں مت کرو، جاؤ۔"

لیکن نیلوفر نے اس کی سنی ان سنی کردی۔ نہ اس کے لیے عمر ڈی ایس پی تھا اور نہ وہ اس کا حکم ماننے کی پابند تھی۔ وہ صرف ایک بیوی اور ایک ماں کی حیثیت سے بات کررہی تھی اور مجھ سے اپنے پیار کی سلامتی کی ضمانت چاہتی تھی۔ وہ پیار جو مانگ کا سیندور بھی ہوتا ہے اور ماںتا کا سرچشمہ بھی۔ اسے اپنے شوہر پر بھروسا نہیں تھا۔ وہ ڈرتی تھی کہ کہیں وہ محبت کو فرض پر قربان نہ کردے۔ وہ ایسا کرسکتا تھا۔ وہ ایسا ہی آدمی تھا۔

میں نے کہا "نیلوفر، اس قسم کے بعد بھی.... تم پر اعتبار نہ کرنے والا شیطان ہی ہوسکتا ہے۔ انسان نہیں۔ تمہارے عمر کو خدا عمرِ خضر دے، اسے میں حفاظت اور سلامتی کے ساتھ تمہارے حوالے کرکے جاؤں گا۔"

"تمہاری بیوی ...... رابعہ اسے ماردے گی۔" وہ اب بھی نروس تھی۔ میں نے ایک ہاتھ بڑھا کے رابعہ سے ریوالور لے لیا۔ رابعہ کی وحشت کا دور ختم ہوچکا تھا۔ اس نے انکار نہیں کیا۔ عمر کو اپنی بیوی پر طیش آرہا تھا جس نے اپنے جذبات کے پاگل پن میں براہِ راست مجھ سے ایک وعدہ کرلیا تھا اور بدلے میں ایک وعدہ مجھ سے بھی لے لیا تھا۔

نیلوفر کے جاتے ہی میں نے کہا "ڈی ایس پی صاحب یہ جو کچھ بھی ہوا۔ ہم سب کی مجبوری تھی۔ کالیا کی اور میری۔ نیلوفر کی یا رابعہ کی مجبوری کی نوعیت کچھ بھی سہی۔ اصل بات یہ ہے کہ ہم سب جینا چاہتے ہیں، ہم سب زندگی سے اور اس کے سارے رشتوں سے پیار کرتے ہیں۔"

رابعہ نے کہا "سکندر، باتیں کرنے کے لیے وقت نہیں ہے ہمارے پاس۔"

میں نے ایک قدم آگے بڑھایا "مسٹر عمر قریشی، تم مجھے جانتے ہو تو تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ ایس ایس پی سراج جیسے سفاک اور چوہدری دلاور جیسے عیار شکاری ابھی تک مجھے زیرِ دام نہیں لاسکے۔ میں تمہاری اصول پرستی اور فرض شناسی کی قدر کرتا ہوں اور میری دعا ہے کہ خدا تمہیں انکل رضوی مرحوم کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا کرے۔ تمہیں دوستوں کی دشمنی اور دشمنوں کی دوستی سے بچائے۔ لاؤ دوسرا ریوالور مجھے دے دو۔"

"کون سا دوسرا ریوالور؟"

میں نے کہا "جو ریوالور کالیا نے تم سے چھینا تھا وہ تم نے رابعہ سے لیا تھا۔ تمہارا اپنا ریوالور کہاں ہے؟"

اس نے تذبذب کے ساتھ کہا "وہ کمرے میں ہے۔"

"میں نے تمہاری بیوی سے ایک وعدہ کرلیا ہے اس لیے میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔" میں نے ریوالور کو جیب میں ڈال لیا "میں تلاشی لوں گا تمہاری۔"

اس کا ہاتھ تیزی سے پتلون کی جیب کی طرف گیا ہی تھا کہ میں نے کِک ماری جو اس کی کلائی پر لگی۔ اس نے مشتعل ہو کے میرے پیٹ میں مُکا مارا۔ یہ کسی پیشہ ور اور مشاق باکسر کا مُکا تھا جس نے مجھے دُہرا کردیا۔ اس کا دوسرا مُکا میرے منہ پر پڑا۔ میں نے پیچھے ہٹتے ہٹتے لات گھمائی جو اس کی پسلیوں پر پڑی۔ وہ سنبھل نہ سکا اور لڑکھڑا کے بائیں جانب گرنے لگا۔ وہ باہمت اور سخت جان آدمی تھا۔ جب کالیا نے اسے ٹکر ماری تو وہ ریوالور نکال چکا تھا۔

کالیا اس کے بازو سے لٹک گیا اور اپنے دانت اس کی کلائی میں گاڑ دیے۔ ایک بار پھر وہ ڈی ایس پی سے ریوالور چھیننے میں کامیاب رہا۔ تکلیف کی شدت میں عمر نے اسے ایک گالی دی اور اس کی پسلی میں اپنے دوسرے ہاتھ سے گھونسا مارا مگر کالیا کسی پاگل کتے کی طرح اس سے چمٹ گیا تھا اور اس کی بوٹی اُتارے بغیر اسے چھوڑنے پر تیار نہ تھا۔

مجھے اندیشہ تھا کہ عمر غصے میں اسے مار نہ ڈالے۔ وہ اب کالیا کے سر پر مُکے مار رہا تھا اور یہ ایک ماہر باکسر کے مُکے تھے۔ کالیا کے دماغ کی کوئی شریان بھی پھٹ سکتی تھی جس سے وہ ہمیشہ کے لیے مفلوج یا اندھا بھی ہوسکتا تھا اور بے ہوشی میں ہلاک بھی ہوسکتا تھا۔

میں نے ناپ تول کے عمر کی گردن پر کان سے ذرا نیچے کھڑی ہتھیلی کا وار کیا اور وہ ایک دم ڈھیلا پڑ گیا۔ اس کے مُکے یوں رک گئے جیسے بجلی بند ہونے سے گھومتا ہوا پنکھا رک جاتا ہے۔ میں نے ایک جھٹکا دے کر کالیا کو الگ کیا اور عمر کو سنبھال کے فرش پر لٹا دیا۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

"تم پاگل ہوگئے ہو کالیا۔" میں نے اسے جھنجوڑ کے کہا "ہوش میں آؤ۔"

کالیا نے خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھا اور ایک آستین سے اپنے ہونٹ صاف کیے جن پر خون لگا ہوا تھا۔ یہ عمر قریشی کا خون تھا "کیا اسے میں نے مار دیا ہے؟"

میں نے کہا "یہ زندہ ہے، تم جا کے اپنا حلیہ ٹھیک کرو۔ منہ دھو کے یہ کپڑے بدل ڈالو ورنہ جو خون تمہاری آستین پر ہے یہی تمہیں پکڑوا دے گا۔"

"کپڑے تو یہی ہیں میرے پاس۔"

میں نے کہا "بیگ میں سے میرا کوئی جوڑا لے لو۔ کم آن جلدی کرو۔ اس کے بعد تمہیں اور مجھے بہت سے کام کرنے ہیں اور وقت کم ہے۔ اور تم رابعہ، تم اس کے پٹی باندھو، باتھ روم میں ڈیٹول کی ایک شیشی ہے۔"

"وہ تو خالی ہے۔" رابعہ بولی۔

"چند قطرے ہیں اس میں۔ کلائی کا زخم صاف ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔

رابعہ میرے بیگ میں سے کپڑوں کا ایک جوڑا نکال چکی تھی۔ اس نے باتھ روم سے ڈیٹول کی شیشی لا کے بھیگے ہوئے رومال سے عمر کے زخم کو صاف کیا اور اس پر ڈیٹول کی شیشی انڈیل دی۔ یہ شیشی نہ جانے کب سے باتھ روم کے ریک میں پڑی تھی۔ اس کے اوپر مٹی کی تہ بتاتی تھی کہ خالی سمجھ کے اسے عرصہ دراز سے کسی نے ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ شاید یہ چند قطرے ہمارے لیے ہی تھے جو اس وقت کام آگئے۔

کالیا باتھ روم سے برآمد ہوا تو خاصا بدلا ہوا لگ رہا تھا "پُرانے کپڑوں کا کیا کروں؟"

میں نے کہا "ابھی ساتھ رکھو راستے میں کہیں پھینک دینا۔ اب یہ سامان اُٹھا کے گاڑی میں لے جاؤ۔"

رابعہ بھی پیکنگ میں مصروف تھی "ایک منٹ رُکو۔"

میں نے کہا "چلو تم اتنی دیر میں فون ڈس کنکٹ کر آؤ۔ اس کا تار کاٹ دینا اس طرح کہ پھر جوڑا بھی نہ جاسکے۔"

"میں تار کاٹ کے پول پر سے کھینچ لوں گا۔" کالیا باہر نکل گیا۔

"رابعہ، اب تم جا کے نیلوفر کو بلا لاؤ۔" میں نے کہا "جانے سے پہلے مجھے بھی بیگ میں سے پینٹ شرٹ نکال دو۔"

"یہ فرمائش آپ ایک منٹ پہلے نہیں کرسکتے تھے۔" رابعہ نے دوبارہ بیگ کھولتے ہوئے کہا۔

رابعہ کے جاتے ہی میں نے عمر قریشی کی وردی اُتار لی اور اپنے جسم کے کپڑے اسے پہنا دیے۔ خود رابعہ کی دی ہوئی پینٹ شرٹ پہن کے میں نے عمر کی سرکاری وردی کو ایک اخبار میں لپیٹ لیا۔ اس وقت تک کالیا نے تینوں بیگ گاڑی میں رکھ دیے تھے۔

"اب میری بات غور سے سُنو کالیا۔" میں نے کہا "رابعہ کے آتے ہی تم اسے اپنے ساتھ لے کر نکل جاؤ۔"

"اور تم......"

"میں کچھ دیر بعد آؤں گا۔ تم دائیں طرف سیدھے ایک فرلانگ تک نہر کے کنارے چلو گے۔ پھر دائیں طرف ایک فرلانگ کچے راستے پر۔ گاڑی کے سلومیٹر پر نظر رکھنا۔ تمہیں ایک فرلانگ کا صحیح اندازہ ہو جائے گا۔ جہاں پر فاصلہ پورا ہو وہاں رک کے میرا انتظار کرنا۔ کوشش کرنا کہ گاڑی درختوں یا جھاڑیوں کی اوٹ میں رہے۔ دور سے بھی سورج کی چمک پڑے تو سڑک پر کسی کو محسوس ہو سکتا ہے کہ مجھے دیر ہو جائے۔ رابعہ کو پریشان مت ہونے دینا۔ اسے سمجھا دینا کہ میں نے کیا کہا تھا۔ خواہ شام ہو جائے تم میں سے کوئی پلٹ کے ادھر نہیں آئے گا۔"

رابعہ کے ساتھ نیلوفر اندر آئی۔ اس نے ایک دل دوز چیخ ماری اور دوڑ کے عمر پر گر گئی۔ "تم... تم نے مار دیا اسے؟" وہ مجنوں کی طرح عمر کو ٹٹولنے لگی۔

"عمر زندہ ہے۔" میں نے کہا۔

"مگر یہ ایسے کیوں پڑا ہوا ہے۔ کیا کیا ہے تم نے اس کے ساتھ؟" وہ چیخ کے بولی۔

میں نے کہا "اسے آدھے گھنٹے میں ہوش آجائے گا۔"

"میں، میں ڈاکٹر کو بلاتی ہوں۔ بابا کو معلوم ہوگا۔"

میں نے اسے روک دیا "بابا کچھ نہیں کرسکتا۔ ٹیلی فون خراب پڑا ہے۔ کیا تمہیں اعتبار نہیں ہے میری بات پر۔"

"مگر اسے ہوش نہ آیا۔ او میرے خدا، میں کیا کروں گی اس بنگلے میں۔ یہ اس کی کلائی پر پٹی کیوں ہے؟"

میں نے کہا "معمولی زخم ہے۔ رابعہ نے ڈیٹول سے صاف کر دیا تھا لیکن میرا مشورہ ہے کہ بعد میں اسے انجکشن ضرور لگوا دینا۔"

"اے ٹی ایس کا؟"

"نہیں، ANTI-RABIES کا۔ جسے غلطی سے کُتے کے کاٹے کا انجکشن کہا جاتا ہے۔"

"کیا۔ کسی کُتے نے کاٹ لیا ہے عمر کو۔ کتا کہاں ہے یہاں؟" وہ دہشت زدہ ہو کے بولی۔

میں نے کالیا سے کہا "تم کیوں کھڑے ہو۔ جاتے کیوں نہیں۔ رابعہ تم بھی جاؤ، میں نے کالیا کو سب سمجھا دیا ہے۔"

رابعہ نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے اور پھر میری نظر کا اشارا سمجھ کے خاموشی سے کالیا کے ساتھ نکل گئی۔

"کس کُتے نے کاٹا تھا عمر کو۔ بتاتے کیوں نہیں۔" نیلوفر نے کہا۔

میں نے کہا "اسے کالیا نے کاٹ لیا تھا۔ یہ دونوں آپس میں اُلجھ گئے تھے۔ وہ انجکشن اس لیے ضروری ہے کہ ہر گوشت خور جانور کے دانتوں میں ایک خاص قسم کا زہر ہوتا ہے۔ کُتے کی طرح انسان بھی گوشت کھاتا ہے۔ بلی چوہا بھی کاٹ لیں تو وہی چودہ انجکشن لگوانے چاہئیں۔"

"خدا کرے اسے پاگل کتا کاٹے۔ وہ پاگل ہو کے بھونکتا ہوا مرے۔" نیلوفر رونے لگی۔

میں نے کہا "کیا میں عمر کو تمہارے کمرے میں پہنچا دوں۔"

"مگر بچوں سے کیا کہوں گی؟"

"کہہ دینا ڈیڈی کی طبیعت ذرا خراب ہے۔"

نیلوفر سخت مضطرب تھی "تم جھوٹ بول رہے ہوتا۔ عمر ایسے ہی پڑا رہے گا۔ یہاں فون بھی نہیں ہے۔ ڈاکٹر بھی نہیں آسکتا۔"

"بابا ہے یہاں اور وہ پولیس پارٹی بھی آتی ہوگی جو مجرم کو گرفتار کرکے لا رہی ہے۔" میں نے کہا "میں اب چلتا ہوں۔ عمر جیسے پولیس افسر کی بیوی کو بہادر ہونا چاہیے۔ یہ نوکری ہی ایسی ہے۔"

"بھاڑ میں جائے ایسی نوکری۔ ہزار بار کہا ہے میں نے کہ لعنت بھیجو نوکری پر۔ اپنا کاروبار چلاؤ۔ کس چیز کی کمی ہے ہمیں۔ ایک ٹاول فیکٹری ہے۔ ہوزری مل ہے۔ مگر میری کون سُنتا ہے۔ کہتا ہے نیلو بات صرف پیسے کی یا پیسہ کمانے کی نہیں۔ دنیا میں اور بھی بہت سے کام زیادہ اہم ہیں میرے لیے۔"

میں نے کہا "کچھ لوگ ایسے ہی دیوانے ہوتے ہیں نیلوفر جو کسی مقصد کے بغیر نہیں جیتے اور ان کے لیے مقصد حیات پیسہ نہیں ہوتا۔ موجد، فلسفی، تخلیق کار ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں اور تمہیں فخر ہونا چاہیے اپنے شوہر پر کہ وہ کوئی عام آدمی نہیں ہے۔ وہ زندگی کو جہاد سمجھتا ہے دکانداری نہیں۔"

میری بات نے اسے کچھ نفسیاتی تسلی دی۔ دروازہ بند کرتے ہوئے میں نے نیلوفر کو خدا حافظ کہا اور پچھلی طرف کے لان پر سے گزر کے دیوار پھاند گیا۔ اب میرے سامنے کھیت تھے اور تاحدِ نگاہ پھیلا ہوا جنگل تھا جس میں کہیں کہیں درخت جُھنڈ کی صورت میں نظر آتے تھے۔ مشرق کی طرف بھارتی سرحد یہاں سے زیادہ دور نہیں تھی۔

ریسٹ ہاؤس کے ملازم نے مجھے دیوار پھاند کے فرار ہوتے نہیں دیکھا تھا اور آس پاس مجھے گائے بھینس چرانے والے لڑکوں کے سوا کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ بہت دور نہر کے کنارے پر عورتیں کپڑے دھونے اور نہانے میں مصروف تھیں اور دوسری طرف چند کچے گھروندے نظر آرہے تھے۔

میں نے ایک گڑھے میں اُتر کے پھر کپڑے بدلے۔ اب میرے جسم پر ڈی ایس پی کی وردی تھی اور میرے کپڑے اخبار میں لپٹے ہوئے پیکٹ کی صورت میں میری بغل میں تھے۔

گڑھے سے باہر نکل کے میں پھر دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا ریسٹ ہاؤس کے گیٹ پر پہنچ گیا۔ میں نے خود کو نیلوفر یا بابا کی نظروں سے محفوظ رکھا اور ایک سائڈ پر کھڑا نہر کے کنارے دونوں طرف دیکھتا رہا۔ اپنے انداز و اعتماد سے میں ڈی ایس پی نظر آنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ ایک ٹریکٹر میرے سامنے سے گزرا جس کے پیچھے ٹرالی میں محکمہ انہار کے مزدور لدے ہوئے تھے۔ ڈرائیور نے اور مزدوروں نے مجھے سر تک ہاتھ اُٹھا کے عاجزی سے سلام کیا اور میں نے دستور کے مطابق اپنی اکڑی ہوئی گردن کو افسرانہ

رعونت سے ہلانے پر اکتفا کیا۔

ہم جس مذہب کے پیروکار تھے اس میں سلام میں سبقت لے جانے کی فضیلت تھی لیکن محمود و ایاز کے ایک ہی صف میں کھڑے ہونے کا زمانہ گزر گیا تھا۔ اب محکوم ہی حاکم کو سلام کرتا تھا۔ حاکم کی مرضی جواب دے نہ دے۔

مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ آدھے گھنٹے بعد بائیں طرف سے ایک جیپ آتی دکھائی دی۔ میں گیٹ سے کچھ آگے جا کے رُک گیا۔ یہ وہی پولیس پارٹی تھی جو کسی مفرور قاتل کی گرفتاری کے لیے عمر قریشی کی نگرانی میں حیدر آباد سے آئی تھی۔

ڈرائیور نے میرے قریب لا کے جیپ روک لی اور نیچے اُتر کے مجھے سیلوٹ کیا۔ جیپ کی پچھلی سیٹ پر چار پولیس والے ایک شخص کو ہتھکڑی سمیت درمیان میں گھیرے بیٹھے ہوئے تھے۔

میں نے کہا "مل گیا بندہ؟"

"یس سر۔ ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے ہوئے اے ایس آئی نے بھی سیلوٹ مار کے کہا "ملتا کیسے نہیں؟"

میں نے پیچھے جا کے ملزم کا معائنہ کیا۔ اس کو گرفتار کرتے ہوئے پولیس نے خاصی بہادری کا ثبوت دیا تھا۔ بہادری کے آثار ملزم کی حالت سے عیاں تھے۔ اس کی آنکھوں کے گرد سوجن اور نیل تھے۔ ہونٹ بھی سوجے ہوئے تھے اور اوپر والے ہونٹ کا ایک کنارا پھٹ گیا تھا۔ اس سے خون رِس رہا تھا۔ ملزم کی پیشانی پر ایک گومڑ تھا اور وہ کراہ رہا تھا۔

"کیوں اوئے نمک حرام۔" میں نے اس کے بال پکڑ کے چند جھٹکے دیتے ہوئے کہا "حیدر آباد سے بہت دور سمجھا تھا تُو نے اس جگہ کو؟ اوئے ہم تو تجھے سات سمندر پار سے پکڑ لاتے۔ ڈرائیوری کرتے کرتے خود گاڑی کا مالک بننا چاہتا تھا؟ کوٹھی میں رہنا چاہتا تھا۔ بول، جیسی فیکٹری مقتول کی تھی ویسی ہی تُو بھی بنانا چاہتا تھا؟"

اپنے دل پر جبر کرتے ہوئے میں نے اس مظلوم شخص کو عین پولیس کی روایات کے مطابق بے رحمی سے مارا اور گالیاں بھی دیں۔ وہ چلاتا رہا "ہائے میں مرگیا۔ ہائے ربّا میری توبہ۔ سرجی معاف کردیں مجھے۔ غلطی ہوگئی مجھ سے۔"

صاف ظاہر تھا کہ ملزم پہلے ہی اپنے جرم کا اقرار کرچکا ہے۔ اسے مارنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ جو ملزم اعتراف جرم نہ کرتا ہو یا جس سے کچھ اُگلوانا ہو اس کے ساتھ تشدد آمیز سلوک کی بات سمجھ میں آتی ہے مگر جو سب بتا چکا ہو اسے پولیس کیوں مارتی ہے؟ پریکٹس کے لیے یا اپنی اذیت پسند فطرت کی تسکین کی خاطر۔ عدالت اسے قانون کے مطابق سزا دیتی ہے پھر یہ اضافی سزا کس لیے؟

تاہم اس ظلم کے بغیر میں خود کو پولیس افسر ثابت نہیں کرسکتا تھا "پکڑ کے رکھو اسے اچھی طرح۔ ٹکڑے کرکے رکھو بے شک......"

سب انسپکٹر نے کہا "سرجی، وہ عمر قریشی صاحب......"

میں نے کہا "ہاں، وہ گئے ہیں اوکاڑے۔"

"اوکاڑہ؟ وہ کس لیے سر؟"

"او یار، ان کی وہ نیلو ہے نا۔ نیلوفر۔ عمر صاحب کی" میں نے کچھ پُرتمسخر انداز میں کہا "اس کا کوئی ماما فوت ڈی ایس پی صاحب نے کہا کہ چلو ادھر بھی تعزیت کرلیں۔ آئے گا حیدر آباد سے۔"

"پھر ہمارے لیے کیا حکم ہے سر؟"

"تم ملزم کو ٹرین سے لے جاؤ حیدر آباد۔"

اے ایس آئی پریشان ہوگیا "وہ سر۔ ٹرین سے تو......"

"خرچہ دے گئے ہیں عمر صاحب۔ یہ لو۔" میں نے اسے کے پانچ نوٹ تھما دیے۔ "جیپ تمہیں اسٹیشن چھوڑ کے اِدھر آئے گی۔ وہ میری گاڑی لے گئے ہیں۔"

"تھینک یو سر۔" اے ایس آئی نے کہا۔

میں نے کہا "ڈرائیور کو جلدی فارغ کردینا۔ عمر صاحب بچّے ادھر ہی ہیں۔"

اے ایس آئی جاتے جاتے رک گیا "بچّے......"

"ہاں ٹونی اور نینا۔" میں نے کہا "وہ ساتھ جا کے ہوتے۔ عمر صاحب نے جانا ہے اور آجانا ہے شام تک۔ میں رُکا ہوا ہوں ادھر۔ بچّوں کے لیے کچھ ٹافیاں شافیاں ڈرائیور کے ساتھ۔"

جیپ چلی گئی تو میں نے اپنی کامیاب اداکاری پر دل ہی دل خود کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ عمر قریشی، اس کی بیوی اور بچّوں نام بڑے مستند حوالے تھے جن سے ثابت ہوگیا تھا کہ میں سب مل چکا ہوں اور انہیں اچھی طرح جانتا ہوں ورنہ عمر قریشی صاحب کو اوکاڑہ جانے کے لیے اپنی گاڑی کیوں دیتا۔

وردی پر جیب کے اوپر جہاں عمر قریشی کے نام کی پٹی لگی تھی وہ میں نے کاغذ میں لپٹے ہوئے پیکٹ کے نیچے چھپائے رکھی چنانچہ اے ایس آئی یا کوئی دوسرا سپاہی بھی میرا نام نہ دیکھ سکا۔ جیپ کے نگاہ سے اوجھل ہوتے ہی میں لوٹ کر اسی کمرے طرف گیا جہاں میں نے اپنا لباس بدل کے پولیس کی وردی تھی۔ ایک بار پھر میں نے اپنے کپڑے تبدیل کیے اور پولیس وردی کو پیکٹ بنا کے بغل میں دبالیا۔ اب پولیس پارٹی کے واپس آنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ ان کی دوبارہ عمر قریشی ڈی ایس پی ملاقات حیدر آباد میں ہوگی۔ ڈرائیور جیپ کے ساتھ ایک گھنٹے میں واپس آئے گا تو اسے معلوم ہوجائے گا کہ کسی جعلی ایس پی نے انہیں بے وقوف بنایا تھا۔ اس وقت تک عمر قریشی ہوش میں آچکا ہوگا۔ وہ سمجھ جائے گا کہ یہ سارا چکر میرا چلایا

بچّوں کے ساتھ واپس لاہور پہنچ کے وہ پولیس کو سکندر بخت نے ریسٹ ہاؤس میں کیا واردات کی نام کی ایک ایڈووکیٹ کے ساتھ پولیس کی وردی ممکن ہے ملزم نے بعد میں وردی اُتار دی ہو لیے ہوں۔ اس کے ساتھ کالیا نام کا ایک سیاہی رنگ کی شلوار قمیص میں۔"

غلط ہوگا۔ میں اب براؤن شرٹ اور کالی پتلون میں میری سفید قمیص اور شلوار پہن لی تھی۔ صرف رابعہ نہیں بدلا تھا جو اب بدلا جاسکتا تھا مگر اصل چیز تھی ہمارا حلیہ تو نہ جانے کب سے مشتہر ہورہا تھا۔ کالیا کے بارے تمام معلومات فراہم کرسکتا تھا مگر فوری طور پر نہیں۔ رابعہ تھی۔ وہ کسی جرم میں مطلوب نہیں تھی اور اسے وقار آسانی سے کور کرسکتے تھے کہ اس وقت تو وہ ہمارے نہر کے کنارے کسی ریسٹ ہاؤس میں وہ سکندر کے ہوسکتی ہے۔ ضرور مسٹر عمر قریشی کو غلط فہمی ہوئی۔

ریسٹ ہاؤس سے میں نے اپنی سمت کا تعین کیا۔ میں ایک جا کے ایک فرلانگ بائیں طرف چلتا تو ٹھیک اس جگہ جہاں کالیا کے ساتھ رابعہ میرے انتظار میں تھی مگر میں نے مختصر کرنے کے لیے ایک فرلانگ مربع کے وتر کی فرضی لکیر پر کیا۔

یہ کوئی صاف میدانی راستہ نہیں تھا۔ دوپہر سے کچھ دیر پہلے دھوپ کی تمازت بڑھ چکی تھی۔ میں کھیتوں کی منڈیر پر چلتا رہا اور جھاڑیوں سے بچتا ہوا پیچھے دیکھتا گیا۔ ریسٹ ہاؤس جب تک نظر آتا مطمئن تھا کہ میں صحیح سمت میں جا رہا ہوں۔ پھر نشیبی علاقہ درختوں نے ریسٹ ہاؤس کو چھپالیا۔

تقریباً پون گھنٹے بعد میں نے رک کے چاروں طرف نظر کی۔ اپنے اندازے کے مطابق میں اس جگہ پہنچ چکا تھا جہاں کو موجود ہونا چاہیے تھا۔ پچاس یا سو گز دائیں بائیں ہونے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اگر کالیا کی آنکھیں ایک طرف دیکھ رہی ہوں تو دوسری طرف رابعہ کی نظریں مجھے آسانی سے دیکھ سکتی کسی درخت کی اوٹ میں یا جھاڑی کے پیچھے تھے تو میری ان کو نہیں تلاش کرسکتی تھیں مگر کھلی جگہ میں میرا وجود بہت تھا۔

میں نے چند قدم چل کے پھر دائیں بائیں دیکھا۔ اسی وقت پتھر میرے سر میں لگا۔ میں بے اختیار پلٹا۔ ایک درخت کے پیچھے سے نمودار ہو کے رابعہ نے قہقہہ لگایا ایک کنکری ہے؟"

میں نے دو کلو کا ایک پتھر اُٹھا کے کہا "آپ کی نظر میں یہ پتھر کیا ہوتا ہے؟ کوہ قراقرم۔"

قراقرم یعنی کے ٹو۔ وہ تو تم ہو۔" رابعہ نے کہا "کبیر خان عرف چیف کے ٹو۔"

"اس نام سے ذہن میں امریکی ریڈ انڈین قبیلے کا کوئی سردار آتا ہے۔ ننگ دھڑنگ۔ منہ پر اور بدن پر رنگ سے لکیریں اور سر پر شترمرغ کے پروں کا تاج۔ چیف کیٹو پیٹو۔"

"تمہاری وردی کہاں ہے؟"

میں نے پیکٹ اسے تھمادیا "اسے سنبھال کے رکھو ابھی۔ کیا پتا کب حُلیہ بدلنے کے لیے اس کی ضرورت پڑجائے۔ کالیا کہاں ہے اور گاڑی کہاں ہے؟"

"کالیا گاڑی کی ٹیوننگ کررہا ہے۔ اِدھر۔"

"وہ موٹر مکینک بھی ہے؟" میں نے کہا۔

"راستے میں دو جگہ گاڑی بند ہوئی تھی۔ میں تو سمجھی پیٹرول ختم ہوگیا۔"

"پیٹرول کتنا ہے؟"

"ہاف سے زیادہ۔" وہ میرے ساتھ چل پڑی۔

کالیا ٹیوننگ سے فارغ ہو کے انجن کی آواز بڑے دھیان سے سُن رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کے اس نے پُراطمینان انداز میں سرہلایا اور بونٹ بند کردیا۔

"ابھی کدھر چلنا ہے؟" اس نے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے کہا "تم ہمیں جی ٹی روڈ تک لے چلو۔"

"گاڑی پکڑی نہ جائے مین روڈ پر۔ ناکا بندی ہوگی ضرور۔"

میں نے کہا "اس گاڑی کا نمبر پولیس کے پاس نہیں ہوگا۔ نہ یہ چوری کی گاڑی ہے اور نہ چھینی ہوئی۔"

"اس ڈی ایس پی نے تو نمبر دیکھا ہوگا۔"

میں نے نفی میں سرہلایا "گاڑی سائیڈ میں نہ ہوتی تو وہ ضرور دیکھ لیتا۔ اس وقت قدرت نے ہمارا ساتھ دیا۔ عمر قریشی نے خود ہی کہہ دیا تھا کہ اسے تمہاری ظلم کی داستان سے کوئی دلچسپی نہیں ورنہ شاید میں اسے تمہارے بارے میں بتا دیتا۔"

"بڑی خرابی ہوجاتی پھر تو۔" رابعہ نے کہا۔

مین روڈ پر پہنچ کے میں نے ڈرائیونگ خود سنبھال لی اور کالیا نیچے اُتر گیا "میں اب کیا کروں۔ کہاں جاؤں؟"

"تم جاؤ سیدھے چوہدری صاحب کے پاس۔" میں نے کہا "ان کے پاؤں پکڑ کے معافی مانگو کہ جو کام تمہیں سونپا گیا تھا وہ تم نہیں کرسکے اور بڑی مشکل سے جان بچا کے واپس پہنچنے میں کامیاب ہوئے ہو۔ تمہاری حالت تمہاری بات کے سچ ہونے کا ثبوت ہوگی۔ دلاور کو یقین دلا دینا کہ کسی نے مخبری کردی تھی اور وہاں سب پہلے سے تیار بیٹھے تھے۔ تین بندے مارے گئے اور تم خود بال بال بچے۔ ویسے دلاور کو پوری رپورٹ تو مل گئی ہوگی۔ اب تک

تین لاشیں اٹھالی گئی ہوں گی اور منظر نے اپنی گاڑی کے چھینے جانے کی رپورٹ بھی لکھوائی ہوگی۔"

"منظر کون؟"

"وہی جس کی کار تم نے چھینی تھی۔ بہت بڑا وکیل ہے وہ۔" میں نے کہا "دلاور کے سامنے ہاتھ جوڑنا کہ جناب ایک موقع اور دیں۔ وہ تمہیں دوسرا موقع نہیں دے گا کیونکہ اسے تو بہانہ چاہیے دوسری شادی کا۔ جب وہ نہ مانے تو تم مجبوراً مان جانا۔ ہنسی خوشی نہیں۔ روتے دھوتے کہنا کہ اچھا جی رب کی یہی مرضی ہے تو....."

"یہ تو میں کرلوں گا لیکن... اس کے بعد....."

"فکر مت کرو پھر ہم پہنچ جائیں گے۔ تم ایک کام تو یہ کرو کہ ہمیں پورا پتا سمجھادو۔ اور اگر تمہارے رشتے دار ہیں تو ان کے نام....."

"رشتے دار!" اس نے تلخی سے کہا "غریب آدمی کو اپنا رشتے دار کون مانتا ہے۔"

میں نے کہا "اچھا تو دو چار نام رکھ لو۔ دور کے چاچے ماے بنالو، ہم جمعہ کی نماز کے بعد پہنچ جائیں گے۔ تمہارے چاچے، ماے بن کے۔"

"دلاور شک میں پڑجائے گا۔"

"کیوں، تم نکاح کررہے ہو اپنی بہن کا تو کیا اس میں تمہاری طرف سے کوئی شریک نہیں ہوگا۔ تمہارے گواہ کون ہوں گے؟" میں نے کہا "یہ حق ہے تمہارا۔"

رابعہ نے کہا "ویسے کالیا، کیا تمہیں یقین ہے کہ دلاور نیک نیتی کے ساتھ دوسری شادی کرنا چاہتا ہے۔"

"اس نے یہی کہا تھا۔"

"اس کے کہنے پر مت جاؤ۔ فرض کرو بعد میں اس نے انکار کردیا کہ کوئی شادی نہیں ہوئی تھی۔ یہ لڑکی اور اس کا بھائی مجھے بلیک میل کرنا چاہتے ہیں۔"

"نکاح نامہ تو ہوگا۔"

"وہ کہہ سکتا ہے کہ نکاح نامہ جعلی ہے۔ پولیس تمہیں ہی پکڑے گی کیونکہ تم ہی پکڑے جاسکتے ہو۔ دلاور جھوٹا ہوکے بھی سچا بن جائے گا اور پولیس تمہارا اور جنت کا وہ حشر کرے گی کہ تم خود نکاح نامے کو جعلی مانو گے۔ اتنی بدنامی کے بعد تم شاید زندہ بھی رہنا پسند نہ کرو۔"

"ایسا ہوگا تو میں اسے مار کے مروں گا۔ لیکن یہ شک کیوں ہے تمہیں؟" کالیا نے سوچتے ہوئے کہا۔

"اس لیے کہ تمہاری بہن جنت سے اچھی نہ جانے کتنی لڑکیاں ہیں جو ہنسی خوشی اس کی دوسری تیسری یا چوتھی بیوی بننا قبول کریں گی۔ یہاں ایسی پڑھی لکھی اور ماڈرن لڑکیاں بھی مل جائیں گی جو چوتھائی شوہر کو کافی سمجھیں گی کیونکہ اس کی دولت بھی ان کے سارے خوابوں کو حقیقت میں بدل سکتی ہے۔ دلاور کو کیا ضرورت ہے کہ جنت جیسی معمولی لڑکی کو سار لیے گلے کا ہار بنائے۔ ایسے ہار تو وہ ہر رات نسل کے پیچھے ہوگا۔"

کالیا کی آنکھوں میں خون کی سرخی اُتر آئی "جنت سے کوئی چوہدری دلاور ایسا کرے گا تو....."

میں نے کہا "آرام سے، آرام سے، غصے میں مت بہت بڑا خطرہ مول لے رہے ہیں تمہارے لیے اور تمہاری لیے۔ دلاور کی نیت کچھ بھی ہو۔ وہ تمہاری بہن کے ساتھ ڈراما نہیں کرسکے گا۔ یا تو شادی ہوگی باقاعدہ حق مہر کے ساتھ

رابعہ نے کہا "وہ چالاک آدمی شرعی حق مہر پر اصرار گا۔"

"تم خاموش ہوجانا مگر عین وقت پر جب میں اشارہ کے اپنی شرائط پیش کردینا۔ حق مہر ایک لاکھ۔ جنت کے نام اور کاروبار میں حصہ۔"

"وہ گولی ماردے گا مجھے۔"

"کیسے گولی ماردے گا۔ ہم ہی نہیں اور بھی بہت سے ہوں گے، ان میں اخبار والے بھی ہوں گے۔"

"اخبار والوں کو اندر کون جانے دے گا؟"

"دو چار آدمی ہمارے ساتھ ہی آئیں گے۔ یا آگے پیچھے ساری باتیں ریکارڈ کرتے رہیں گے اور اچانک تصویریں بھی گے۔"

کالیا پریشان نظر آنے لگا "وہ بہت خطرناک آدمی ہے۔ اس کے بندے ہوں گے سب۔ ایسا نہ ہو....."

میں نے ہنس کے کہا "کالیا، تم کیا سمجھتے ہو اخبار والوں کی انگلی نہیں اُٹھا سکتا دلاور کا باپ بھی۔ یا تو تمہاری بہن باعزت طور پر قانونی بیوی بنے گی یا تم ہمیشہ کے لیے آزاد اور ہوجاؤ گے۔ نکاح کا وقت چار بجے رکھنا۔ اس سے پہلے مولوی نکاح مت پڑھانے دینا۔ ہم ساڑھے تین بجے یا پونے چار آئیں گے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ تم بھی ہمیں نہ پہچان سکو۔ اس ابھی سن لو کہ ہم نیلی پگڑیاں باندھ کے آئیں گے۔ تم بھی نیلی باندھنا۔ دو گھوڑا بوسکی کا کرتا اور چابی مارکہ لٹھے کی دھوتی میں لال گلاب کے ہار۔ یہ ہوگی ہماری پہچان۔ رابعہ اسے ایک دے دو ابھی۔ تیاری کے لیے۔"

رابعہ نے اسے پانچ ہزار دے دیے۔ "ایک ہزار تمہار تمہاری بہن کے لیے۔ آخر اسے بھی تو دلہن بننا ہوگا۔"

کالیا رونے کے قریب ہوگیا "کتنی بدقسمت ہے بیچاری بھی مجبوری میں بنے گی۔ پھر پتا چلے گا کہ مجبوری بھی جھوٹی

ریشمی جوڑا ہار سنگھار سب تماشا تھا۔"

"اللہ نے چاہا تو بہت جلد سچ مچ دلہن بنے گی۔ تم اپنا دل میلا مت کرو۔" رابعہ نے کہا۔

"کیا... میں جنت کو بھی بتادوں۔ پہلے سے....."

"ہرگز نہیں۔ بات جب ایک سے دوسرے تک پہنچتی ہے تو پرائی ہوجاتی ہے۔ تم شاید مجبوری کی اداکاری کرلو۔ جنت ایکٹنگ نہ کرسکی تو بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔ اسے رونے دو اپنی قسمت پر۔"

کالیا رخصت ہوگیا تو میں نے گاڑی کے پیٹرول ٹینک کو فُل کرایا اور پھر گاڑی کو پنڈی جانے والی شاہراہ پر ڈال دیا۔ موسم اچانک خوشگوار ہوگیا تھا۔ میرا موڈ اس سے زیادہ خوشگوار تھا۔ میں خود کو بہت ہلکا پھلکا اور آزاد محسوس کررہا تھا۔ لاہور میں میرے گرد مخالف حالات کا حصار تنگ سے تنگ تر ہونے لگا تھا۔ ہر گزرنے والے دن کے ساتھ شکاری جال پھیلاتے جارہے تھے اور حلقہ در حلقہ آفات وحادثات کی زنجیر مجھ سے لپٹتی جارہی تھی۔ میں اتنا بے بس اور مجبور ہوگیا تھا کہ اپنی مرضی سے کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا۔ مجھے دوسروں کے بارے میں زیادہ سوچنا پڑتا تھا اور میرے دل پر ندامتوں کے بوجھ کی چٹان بڑھ کے پہاڑ بن گئی تھی۔ وہ میرے دوست تھے جو میرا بھلا چاہتے تھے مگر بدلے میں ان کو میری طرف سے کیا مل رہا تھا؟ مصیبت اور پریشانی۔ دکھ اور ذلت۔ تباہی اور بربادی۔ رابعہ نے اگر فیصلہ کرلیا ہے کہ وہ میری خاطر سب کچھ چھوڑ دے گی۔ اپنا کیریئر اور مستقبل بھی۔ اپنے رشتے بھی اور تعلقات بھی۔ تو یہ مجبوری ہے اسی عشق کی جس میں انتہا کے بغیر ابتدا کچھ نہیں۔ اور ابتدا نہیں تو انتہا بھی نہیں۔ رابعہ نہیں تو میں نہیں اور میں نہیں تو رابعہ نہیں۔

رابعہ نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا تھا کہ میں اسے کہاں لے جارہا ہوں۔ اب ایسا ہر سوال بے معنی اور بے مقصد ہوچکا تھا۔ وہ بڑی مطمئن تھی۔ باہر خلا میں دیکھ رہی تھی اور نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔

گوجرانوالہ شہر سے گزرتے ہوئے میں نے گھڑی دیکھی تو دو بج چکے تھے۔ شاہراہوں پر تانگے ریڑھے سائیکلوں والے اور پیدل حضرات کی اکثریت تھی چنانچہ جمہوری اصولوں کے مطابق وہی حکمراں تھے اور انہی کا قانون تھا۔ رکشا اور موٹر سائیکلوں والے کسی قانون کو تسلیم نہ کرتے ہوئے اپنا راستہ خود نکال لیتے تھے۔ ٹرک اور بسوں والے پریشر ہارن سے خلقِ خدا کو دہشت زدہ کرکے نکل جاتے تھے۔ مشکل ہم جیسے کار والوں کی تھی جو ٹریفک کے قوانین پر کاربند رہنے کی کوشش میں رینگنے پر مجبور تھے۔ بیشتر لوگ کار کے سامنے سے چیلنج کے انداز میں گزرتے تھے کہ ہمت ہے تو ٹکرمار کے دیکھو۔ وہ رابعہ کو گھورتے تھے اور میں انہیں گھورتا تھا۔

یہ پہلوانوں کا شہر تھا۔ اس سے زیادہ میں کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ شہر سے باہر آکے میں نے سکون کا سانس لیا۔

"اُف! یہاں تو ایسا لگتا تھا کہ سب ہی مرنا چاہتے تھے۔"

رابعہ مسکرائی "وہ کیسے؟"

"آدھے تم پر مرچکے تھے، آدھے میری گاڑی کے نیچے آنا چاہتے تھے۔ تھکن سے میرا بُرا حال ہورہا ہے۔" میں نے کہا۔

"چلو تھوڑی دیر کہیں رک جاتے ہیں۔" رابعہ نے کہا۔

میں نے گاڑی روک لی "لو رک گئے اب بولو۔"

"بھئی میرا مطلب تھا کہ کچھ کھالینا چاہیے۔"

میں نے ایک نظر چاروں طرف ڈالی "سب کچھ حاضر ہے۔ گنڈیریاں۔ پیڑے والی لسی۔ گرد دھوئیں اور مکھیوں والے دہی بھلے۔"

"کھانے کا وقت ہے لیکن میرا موڈ چائے کا ہے۔" رابعہ بولی۔

"چائے کے ساتھ ہی کچھ کھالیتے ہیں۔" میں نے گاڑی ایک روڈ سائیڈ ریسٹورنٹ کے سامنے روک لی۔ وہاں پراٹھے تلے

رہے تھے۔ بُھنے قیمے کے مسالے میں دُھواں دھار مرچیں تھیں
ر ہم سوں سوں کرتے کھا گئے۔ اس کے بعد ٹھنڈی یخ بوتل
ردری تھی۔

رابعہ نے دوپٹے سے آنسو پونچھ کے کہا "کیسا لگ رہا ہے؟"

میں نے بوتل حلق میں انڈیلتے ہوئے کہا "اِک آگ سی ہے
بٹ کے اندر لگی ہوئی۔"

رابعہ بولی "یہ آگ وہ نہیں جسے پانی بُجھا سکے۔"

بعد میں ہم نے ایک جگہ چائے پی جو بقول خاص دعام دودھ
نی کا ایسا مشروب تھا جسے چائے کی چند پتیوں کو گلا کے حل کرنے
کے لیے ہمہ وقت اُبالا جاتا تھا۔ دو گھنٹے بعد میں نے کار کو جہلم کے
یب اُلٹے ہاتھ پر دینا جانے والی سڑک پر موڑلیا۔

اب رابعہ خاموش نہ رہ سکی "ادھر کیا ہے؟"

میں نے کہا "منگلا ڈیم۔ اس کے آگے آزاد کشمیر۔ باقی تم دیکھ
رہی ہو۔ کھیت درخت اور پوٹھوہار کی سرزمین کے نشیب و فراز۔
لا آسمان اور سورج' کچھ پرندے۔ کیا یہ سب کافی نہیں؟"

"افوہ۔ آخر کہاں جارہے ہیں ہم!"

"شمال کی طرف۔ کسی جائے پناہ کی تلاش میں لیکن یہ کہنا
شکل ہے کہ اس کوشش کا انجام کیا ہوگا۔ ہم شامتِ اعمال سے
ج کے جارہے ہیں یا شامتِ اعمال ہمیں بُلا رہی ہے؟" میں نے
گاڑی کو ایک بہت تنگ ٹوٹی پھوٹی سڑک پر ڈال دیا۔

سورج اب مغرب میں تقریباً ہمارے سامنے غروب کی جانب
کل تھا اور اس کی ترچھی کرنیں اکا دُکا درختوں سے چھن کر
یدھی میری آنکھوں پر پڑرہی تھیں۔ دھوپ چھاؤں کے اس کھیل
سے بچنے کے لیے میں نے سن وائزر کو سامنے کرلیا۔ تقریباً ایک
یڑھ فرلانگ آگے ایک جیپ جارہی تھی۔ پہلے اس نے ٹریکٹر کو
دور ٹیک کیا پھر ہم نے۔ اچانک ایک پُل آگیا جو اتنا ہی چوڑا تھا کہ
یک وقت میں ایک گاڑی گزر سکے۔ یہ دریائے جہلم کی کوئی شاخ
تھی یا برساتی نالا۔ اس کا پاٹ بہت تھا۔ بارش کے موسم میں شاید
یہ بھی چھوٹے موٹے دریا کی طرح نظر آتی ہوگی۔ ابھی اس میں پانی
بہت کم تھا۔ ایک جگہ ندی عبور کرنے کے لیے پانی میں بڑے بڑے
پتھر بھی پڑے ہوئے تھے۔

عین وقت پر میں نے گاڑی روک لی۔ کیونکہ مخالف سمت سے
ایک جہازی سائز کی شیورلیٹ امپالا نمودار ہوگئی تھی جس کے پہیے
پل کے کناروں سے شاید ایک فٹ ہی اندر ہوں گے۔ کار ہمارے
قریب سے گزری تو مجھے اس کی کھڑکیوں پر سیاہ پردے نظر آئے۔
غالباً اس میں کسی بڑے زمیندار گھرانے کی معزز اور پردہ دار
خواتین جارہی تھیں۔ ڈرائیور نے مجھے اور رابعہ کو مشکوک نظروں
سے دیکھا۔ دیہی علاقوں میں اجنبی ہم سفر مشکوک رہتا ہے اور
گاڑی والا تو دس کوس دور ہوتا ہے کہ اس کے آنے کی خبر باعثِ
تشویش بن جاتی ہے۔

یہی ہمارے ساتھ بھی ہوا۔ چھوٹے سے گاؤں کی آبادی شاید
سو ڈیڑھ سو گھروں پر مشتمل تھی۔ ان میں چند پکے گھر بھی تھے۔
ایک مسجد کے میناروں کی سفیدی سرسبز درختوں اور نیلے آسمان کے
پس منظر میں نمایاں تھی۔ ایک ٹیوب ویل کے قریب جو اس وقت
بند تھا دو نوجوان لنگوٹ باندھے کشتی لڑرہے تھے۔ وہیں ایک قطعۂ
زمین پر مٹی دھول میں کچھ لوگ والی بال کھیل رہے تھے۔ انہوں
نے شلواریں اوپر چڑھالی تھیں اور وہ ننگے پیر تھے۔ گاڑی کو دیکھتے
ہی وہ اپنا کھیل بھول گئے۔

میں نے گاڑی روکی اور دوستانہ ماحول پیدا کرنے کے لیے
کشتی لڑنے والے نوجوانوں کو السّلام علیکم کہنے کے بعد مصافحے
کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

وہ مٹی دھول میں بھرے ہوئے تھے۔ چند سیکنڈ انہوں نے
اپنے گندے ہاتھوں کو دیکھا اور پھر یہ محسوس کرتے ہوئے کہ میں
نے اپنا ہاتھ پیچھے نہیں کیا ہے پہلے ایک نے اور پھر دوسرے نے
اپنا ہاتھ بڑھادیا۔

اگر ہاتھ ملانے کے بعد میں اپنے ہاتھ جھاڑتا تو یہ بد دماغی کا
مظاہرہ ہوتا۔ میں نے پنجابی میں کہا "یہ کون سا گاؤں ہے؟"

ان میں سے ایک نے چک نمبر بتایا "کس سے ملنا ہے جنابِ
عالی؟"

میں نے کہا "میں یہاں منگلا ڈیم پر انجینئر ہوں۔ رہنے والا
لاہور کا ہوں۔ میری ابھی شادی ہوئی ہے لیکن میری بیوی نے کبھی
گاؤں نہیں دیکھا تھا۔"

اب والی بال ٹیم کے ارکان بھی ہمارے گرد جمع ہوگئے تھے۔
میرے بیان کے بعد انہوں نے دانت نکالتے ہوئے رابعہ کو قابلِ
رحم نظروں سے دیکھا۔

"دراصل یہ ولایت میں تھی۔" میں نے رابعہ کی پوزیشن
واضح کی "پھر کراچی میں رہی۔ اسے بہت شوق تھا گاؤں دیکھنے
کا۔ میں نے کہا کہ چلو آج تمہیں گاؤں دکھاتے ہیں۔ اس لیے
ادھر چلا آیا۔"

اب ایک پختہ عمر کا آدمی شلوار نیچے کرتا آگے آیا "جم جم آؤ
جناب۔ شوق سے دیکھو گاؤں۔ میں پوسٹ مین ہوں اس علاقے
کا۔ سب کی چٹھیاں لکھتا بھی ہوں۔ پڑھتا بھی ہوں اور بانٹتا بھی
ہوں۔ لفافے ٹکٹ بھی رکھتا ہوں۔"

میں نے اس سے ہاتھ ملایا "میرا نام ابراہیم بیگ۔"

"خادم کو جانن دین کہتے ہیں۔" اس نے میرا ہاتھ دونوں
ہاتھوں میں تھام لیا۔

"کریلے" پیچھے سے کسی نے "لے" کو کھینچ کے کہا۔

وہ تڑپ کے پلٹا "کون ہے' کس نے بکواس کی ہے مہمانوں
کے سامنے۔"

میں سمجھ گیا کہ یہ اس کی چڑ ہوگی۔ اسے چڑانے والا منہ بند

کیے معصوم صورت بنائے کھڑا تھا اور باقی لوگوں کے ہنسنے سے نمایاں
ہوگیا تھا۔

میں نے فوراً کہا "ماسٹر جانن دین۔ یہ بتاؤ کہ ہم ایک دن رہنا
چاہیں گے گاؤں میں تو کہاں رہیں۔"

"ایک دن نہیں جناب سو دن رہو۔ جم جم رہو۔ ویسے تو خادم
کا گھر بھی ہے لیکن اپنے ملک صاحب کا ڈیرا ہے۔ شہر سے ڈی ایس
پی صاحب آتے ہیں۔ انسپکٹر اسکول اور جناب سرکاری افسران
بھی۔ سب ان کے مہمان ہوتے ہیں۔"

ایک نوجوان نے کہا "آپ نے راستے میں گاڑی دیکھی ہوگی
ان کی۔"

دوسرے نے سرہلایا "اس سے بہت بڑی ہے۔"

میں نے کہا "اچھا وہ شیورلیٹ امپالا۔ کیا کرتے ہیں ملک
صاحب؟"

پوسٹ مین نے میری گاڑی کو چھوٹا قرار دینے والے کو گھورا
"جی کرنا کیا ہے۔ خیر سے زمیندار ہیں۔ یہ جو ممبر اسمبلی ہیں ملک
انور' ان کے سگے چاچا ہیں۔"

نہ میں کسی ملک انور کو جانتا تھا اور نہ مجھے یہ سمجھ آئی تھی کہ
کون کس کا چچا ہے لیکن یہ مجھے معلوم تھا کہ اس گاؤں میں ہم کسی
نمبردار' تحصیل دار یا زمیندار وغیرہ کے ہی مہمان ہوں گے۔ باقی
رعایا کی کیا مجال کہ کسی معزز کو اپنے غریب خانے میں قیام کی
دعوت بھی دے سکے اور خود مہمان کسی زمیندار کے مقابلے میں
غریب مزارع کو ترجیح دے تو گھاٹے میں رہتا ہے۔

میں نے پوسٹ مین صاحب کو گاڑی میں بیٹھنے کی دعوت دی تو
اس نے صاف انکار کردیا۔ مٹی گرد سے گاڑی کی سیٹ خراب کرنا
اس کے نزدیک گناہِ کبیرہ سے کم نہ تھا۔ دیگر حضرات پر بھی دھول کم
نہ تھی۔ اس سے خاصی مضحکہ خیز صورتِ حال پیدا ہوگئی۔

"آپ چلو جنابِ عالی' ہم پیچھے آئیں گے۔"

میں نے چشمِ تصور سے یہ منظر دیکھا کہ میں رابعہ کے ساتھ کار
کو پیدل کی رفتار سے چلاتا جارہا ہوں اور ہمارے پیچھے پندرہ بیس
افراد جلوس کی شکل میں آرہے ہیں جو حُلیے سے بھوت لگتے ہیں۔
راستے میں مزید افراد کا اس جلوس میں شامل ہونا یقینی تھا۔

میں نے کہا "جانن دین یہ تو بارات بن جائے گی۔"

اس نے میری بات سمجھ لی "اچھا جی پھر میں سب کو منع کردیتا
ہوں۔ آپ آگے چلیں۔ میں پیچھے آتا ہوں۔"

میں نے اس تجویز سے بھی اتفاق نہیں کیا "اگر تم گاڑی میں
نہیں بیٹھو گے تو پھر ہم سب پیدل چلیں گے فاصلہ ہی کتنا ہے۔"

"اور گاڑی؟"

"وہ بعد میں آجائے گی۔ تم کسی سے کہہ دو کہ اس کا خیال
رکھے۔"

جانن دین نے ایک نوجوان کو محافظ مقرر کیا اور میرے ساتھ
چل پڑا۔ حاسد لوگ اس کی عزت افزائی سے خوش نہیں تھے
چنانچہ ہمارے روانہ ہوتے ہی پھر کسی نے "کریلے" کا نعرہ لگایا اور
جانن دین نے غضب ناک ہوکے پیچھے دیکھا۔ کریلے کا لفظ بڑے سُر
اور لے میں ایسے ادا کیا جاتا تھا جیسے کوئی ریڑھی پر سبزی بیچنے والا
صدا لگاتا ہے۔

"بڑے کنجرد ے پتر ہیں جی۔" جانن دین نے مجھے مطلع کیا "وہ
جس نے آپ کی گاڑی کو چھوٹا کہا تھا۔ حکیم صاحب کی پہلی بیوی کا
لڑکا ہے۔ باپ کی دُکان پر سے کوئی معجون کھا گیا تھا حلوہ سمجھ کے۔
آدھا مرتبان خالی کردیا تھا اور جناب وہ تھی بڑی خاص دوائی۔
حکیم صاحب ان عورتوں کو دیتے تھے جن کے لڑکیاں پیدا ہوتی
ہوں۔"

میں نے تعجب سے کہا "اور اس معجون کے کھانے سے لڑکا
پیدا ہوتا ہے؟"

"ہاں جی' یہ حرامی خود ایسے ہی پیدا ہوا تھا۔" جانن دین نے
کہا "دوا کھا کے دماغ پر اثر ہوگیا ہے۔ آپ نے سُنا کیسی واہیات
آوازیں نکال رہا تھا۔"

رابعہ نے دبے لہجے میں پوچھا "یہ جو کریلا کریلا کررہا تھا؟"

"نام نہ لیں بیگم صاحب ایسی واہیات چیز کا۔" جانن دین نے
بیزاری سے کہا۔ "میں نے جس لڑکے کو رکھوالی کے لیے کھڑا کیا ہے
جناب' وہ فرزند ہے خادم کا۔ کسی نے گاڑی کو ہاتھ بھی لگایا تو وہ
ہاتھ اس کی ....." اچانک اسے خیال آگیا کہ رابعہ یعنی ایک خاتون
کی موجودگی میں جملہ مکمل نہیں کیا جاسکتا۔

جانن دین نے ملک انور کے ڈیرے تک پہنچتے ہوئے کم سے کم
نصف درجن متجسس افراد کو۔ ایک بکری کو اور دو کتوں کو دُھتکار
کے دور بھگایا۔ ٹریفک جام کرنے والی ایک بھینس کو ڈانٹ کے
ہٹایا۔ بھینس سے دور رہنے کی کوشش میں رابعہ نے اُپلوں سے بجی
ہوئی ایک دیوار کو گلے لگایا۔ میں دیوار سے بچا تو اب بھینس سے نہ
بچ سکا اور اس نے میرے ہاتھ چومے۔

ملک انور ہمیں اپنی حویلی کے دروازے پر چشم براہ ملا۔ کسی
نے برق رفتاری سے اس کو معزز مہمانوں کے آنے کی خبر پہنچادی
تھی۔ وہ پینتالیس سالہ وسیع و عریض شخص تھا جس نے زیادہ معزز
اور باوقار نظر آنے کے لیے اپنے سرپر پگڑی بھی سجالی تھی۔ اس کی
بل کھاتی ہوئی مونچھیں' بیس گز کپڑے کی گھیردار شلوار اور اکڑی
ہوئی گردن اس کے صاحبِ اقتدار ہونے کی دلیل تھیں لیکن وہ
خوش اخلاق اور نرم خو ثابت ہوا۔

جانن دین نے تعارف کا فریضہ ادا کیا "ملک صاحب یہ منگلا
ڈیم کے چیف انجینئر ہیں۔ ولایت سے شادی کرکے آئے ہیں۔ آپ
سے ملنے کے بڑے مشتاق تھے۔"

جانن دین نے نیک نیتی سے حقائق میں مبالغہ شامل کردیا تھا۔
اس سے پہلے کہ میں تصحیح کرتا' ملک نے اسے ٹوک دیا "اچھا اب تو

جا۔ تیرا کام ختم۔"

"جی ملک صاحب" وہ بُجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

"مہمانوں کی گاڑی اُدھر ہی چھوڑ دی کر لیے۔"

چانن دین نے زخم خوردہ لہجے میں کہا "میرا پتر کھڑا ہے جی اُدھر۔"

"اس نے خاک حفاظت کرنی ہے۔ وہ چڑھ گیا ہوگا اس کی چھت پر۔ جا اسے دھکا لگا کے اپنے ساتھ لا۔ خبردار جو اندر کسی چیز کو ہاتھ لگایا۔ احاطے میں کھڑی کر کے اس پر تنبو لگاتا ہے۔"

"جی ملک صاحب۔"

ملک صاحب نے مجھ سے کہا "جناب اسے چابی دے دیں۔"

میں نے کہا "میں خود چلا کے لے آتا ہوں۔"

"چھوڑیں جی۔ آپ آرام کریں۔" ملک نے کہا اور مجھ سے چابی لے کر چانن دین کی طرف اُچھال دی۔

چانن دین نے چابی پکڑی اور واپس ہونے لگا۔

"اوئے چانن دین، ذرا بوتھا اِدھر کر۔"

"جی ملک صاحب۔" وہ گھوم گیا۔

"اوئے میں نے سُنا ہے منی آرڈر آیا تھا شہر سے۔"

"جی ملک صاحب، دو ہزار۔ میں نے منجھلی بیگم صاحب کو دے دیے تھے۔"

"بکواس نہ ہو تو....."

"قسم رب کی ملک صاحب۔ انہوں نے بقلم خود انگوٹھا لگایا تھا۔"

"اوئے انگوٹھے کے گھوڑے۔ وہ تیری بے بے لگتی ہے۔ میں نے کیا کہا تھا؟"

"غلطی ہو گئی ملک صاحب! آئندہ آپ کو ہی دوں گا" چانن دین نے ہاتھ جوڑ کے کہا۔

"چل دفع ہو" ملک صاحب نے فراخ دلی سے اسے معاف کر دیا۔

یہ ملک صاحب کی حاکمیت کا مظاہرہ تھا جو مہمانوں پر یہ واضح کرنے کے لیے ضروری تھا کہ باقی سب یعنی ان کی رعایا..... یعنی اس گاؤں میں بسنے والی خدا کی مخلوق کی اوقات کیا ہے؟ ہم نے چانن دین کے ساتھ جو عزت کا برتاؤ کیا تھا وہ ملک صاحب کے رویّے کے بعد ہمارے لیے باعثِ ندامت بن گیا تھا۔ لیکن خود چانن دین اور اس جیسے لاکھوں کروڑوں تھے جو اس سلوک کے عادی تھے اور اپنی ذلت کو نوشتۂ تقدیر سمجھتے تھے جسے بدلا نہیں جا سکتا۔

ملک صاحب کی حویلی بہت بڑی تو نہیں تھی پھر بھی اس کا رقبہ چار پانچ کینال تھا جبکہ گاؤں کے دوسرے گھر پانچ سات مرلے سے زیادہ نہیں تھے۔ حویلی کے دو حصے تھے۔ پچھلے حصے میں زنان خانہ تھا۔ چانن دین کی بات سے میں نے اندازہ کیا تھا کہ ملک صاحب کی کم سے کم تین عدد بیویاں اس حویلی میں موجود ہوں گی۔ بڑی، منجھلی اور چھوٹی۔ ان کی اولادیں بھی اپنی اپنی ماؤں کے ساتھ رہتی تھیں اور جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا، دستور کے مطابق حکم بڑی کا چلتا تھا جس کے دو جوان بیٹے تھے اور ایک بیٹی بیاہی جا چکی تھی۔ منجھلی نے غالباً سوکن کو چڑانے کے لیے پیداوار کا یہی تناسب رکھا تھا مگر اس کے بچے ابھی چھوٹے تھے۔ چھوٹی بہرحال چھوٹی تھی اور ملک صاحب کی منظورِ نظر تھی۔ شہری ہونے کے ساتھ ساتھ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ یعنی میٹرک پاس تھی۔ ملک صاحب نے اس سے وعدہ کر رکھا تھا کہ جب وہ فلم بنائیں گے تو ہیروئن وہی بنے گی چنانچہ اسے ماں بننے کا شوق نہیں تھا۔

سامنے والے حصے میں مہمان خانہ تھا۔ ایک بڑے کمرے میں دریاں بچھی ہوئی تھیں۔ یہ دربارِ عام تھا۔ اس کے آگے قالین تھا اور سامنے صوفہ سیٹ۔ قالین کے دونوں طرف کرسیاں تھیں۔ یہاں آنے والے کی حیثیت دیکھتے ہوئے خود ملک صاحب فیصلہ کرتے تھے کہ وہ دری پر بیٹھے گا، قالین پر، کرسی پر یا ان کے ساتھ صوفے پر۔ ہم نے خود اپنے لیے صوفے کا انتخاب کیا۔

دوسرے کمرے میں چارپائیوں پر بستر بچھے ہوئے تھے اور اسے مہمانوں کی خواب گاہ کا درجہ حاصل تھا۔ اس کے بعد اصطبل، گیراج اور ملازموں کی رہائش گاہ تھی۔ دونوں حصوں کے درمیان ہاکی کے گراؤنڈ جتنا صحن تھا مگر اس کو بھی ایک دیوار نے تقسیم کر رکھا تھا۔ آٹھ فٹ اونچی دیوار کے آخری حصے میں جو چھوٹا سا دروازہ تھا اس کو صرف وہی عبور کر سکتے تھے جو نامحرم نہیں تھے۔

ایک بار پھر میں نے ملک صاحب سے اپنا تعارف کرایا اور چانن دین کے نہ ہونے کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے کہہ دیا کہ میری ولایت پلٹ بیوی اردو بھی نہیں جانتی۔ میں خود پنجابی میں بات کر رہا تھا۔ اپنے خاندانی پس منظر کے بارے میں، میں نے بتایا کہ میرے دادا کی نارووال میں بہت زمین تھی لیکن والد صاحب نے زراعت پر کاروبار کو ترجیح دی اور لاہور میں خراد مشینوں کی فیکٹری لگالی۔ خیر سے اب ہم ٹرانسپورٹر بھی ہیں۔

ملک انور متاثر نظر آنے لگا۔ "بڑا اچھا کیا جی آپ کے والد صاحب نے۔ بڑی مصیبت ہے اب تو زمینداری میں۔ مزارع آنکھیں دکھاتے ہیں۔ پانی کے لیے نہر والوں کے پیچھے پھرنا پڑتا ہے۔ بیچ میں آڑھتی آگئے ہیں۔ خیر جی یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ آپ کا خیر سے کتنے دن کا پروگرام ہے؟"

میں نے کہا "بس ایک دو دن۔"

"لو جی۔ ہم تو آپ کو ایک ہفتے سے پہلے جانے نہیں دیں گے۔ اِدھر تو ہماری مرضی چلتی ہے جناب۔ ہم آپ کو شکار پر لے چلیں گے۔"

میں نے کہا "ملک صاحب۔ اب آپ سے ملاقات ہوگئی۔ ہم آتے رہیں گے۔ ابھی ایک ہفتے کی چھٹی مشکل ہے۔ ڈیم پر اتنا کام ہے۔"

اب ہماری خاطر تواضع کا عمل شروع ہوا۔ ملک چاہتا تھا کہ ہم کپڑے بدل کے آرام سے بیٹھ جائیں اور چاہیں تو نہا دھولیں۔ عام دستور یہی تھا کہ خواتین مہمانوں کو اندر زنان خانے میں ٹھہرایا جاتا تھا جہاں ملک صاحب کی بیویاں خاطر مدارات کی ذمّے دار تھیں مگر ہمارے ساتھ مسئلہ ذرا مختلف ہو گیا تھا۔ رابعہ کی جان بچ گئی تھی کہ وہ صرف انگریزی بول سکتی تھی۔ اندر اس کا تماشا بن جاتا۔ خود رابعہ نے بھی صاف کہہ دیا کہ وہ اسی کمرے میں رہنا پسند کرے گی۔ یہ بات میں نے ملک صاحب کو سمجھا دی۔

ملک انور نے کہا "جیسی آپ کی خوشی جناب۔ ویسے میری نئی بیوی انگریزی جانتی ہے۔"

میں نے رابعہ سے کہا "تم اندر جا کے ان سے مل لو۔ اس میں تو کوئی حرج نہیں۔ ورنہ بداخلاقی ہوگی۔"

"حرج یہ ہے کہ وہ میرے بارے میں جتنی اُلٹی سیدھی باتیں کریں گی وہ سب میں سُنوں گی لیکن کسی کو جواب نہیں دے سکوں گی۔"

"یہی تو مزہ آئے گا۔ مجھے بتانا ان کی کیا رائے تھی" میں نے کہا "وہ کُھل کے بات کریں گی کیونکہ ان کے خیال میں تم تو پنجابی، اردو جانتی ہی نہیں ہو۔"

ملک صاحب کے طلب کرنے پر سترہ اٹھارہ سال کی ایک خادمہ لچکتی مٹکتی نمودار ہوئی۔ دیہات کی یہ الھڑ مٹیار قبل از وقت جوان ہو چکی تھی یا کر دی گئی تھی۔ اس کا ریشمی جوڑا، آنکھوں میں بھرا ہوا سُرمے اور کاجل کا ڈھیر اور ہونٹوں پر بھونڈی نارنجی لپ اسٹک اور اس کی بے باک مسکراہٹ سب بتاتے تھے کہ وہ محض خادمہ نہیں، غالباً شاہزادوں کی دلبستگی کا سامان فراہم کرنے والی کنیزِ خاص ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ اس انارکلی پر شہزادہ سلیم ہی نہیں خود مغلِ اعظم بھی عنایت کی نظر رکھتے ہوں۔ کسی غریب مزارع کی بیٹی کو بدقسمتی سے خوب صورتی مل جائے یا اس کی جوانی خود چوروں کو بلانے لگے تو اسے ڈاکو لے جاتے ہیں۔ موری کی اینٹ چوبارے چڑھنے کے خواب دیکھنے لگتی ہے۔ کیا پتا چھوٹے ملک صاحب ہی اسے ملکانی بنا دیں۔ وہ نہیں جانتیں کہ شاہزادے تخت نشین ہو جاتے ہیں۔ انارکلی دیوار میں چُن دی جاتی ہے۔

میزبانی کے پہلے راؤنڈ میں ملک صاحب کے صاحب زادوں نے ہمیں شرفِ ملاقات بخشا۔ بڑے یعنی ولی عہد نمبر ایک اور دو نیم چڑھے کڑوے کریلے کی مثال تھے اور کیوں نہ ہوتے۔ باپ کی جاگیر اور حاکمیت کا زعم الگ۔ جوانی کی بے لگام شہ زوری الگ۔ باپ کے برعکس انہوں نے اپنے رویے سے یہ ظاہر کیا کہ انجینئر، پروفیسر، وکیل، کچھ نہیں ہوتے۔ ایسے ہی نام بڑے اور درشن تھوڑے۔ چیز ہوتی ہے ڈپٹی کمشنر یا محکمۂ جنگلات کا افسر اور ایس پی وغیرہ۔ میں نے ان سے اتفاق کیا۔ منجھلی کے نمونے ماشاءاللہ سے بڑے ذہین ہوشیار تھے۔ ملک صاحب نے ہنستے ہوئے بتایا کہ بڑا آٹھ سال کی عمر میں تھانے دار پر بگڑ گیا تھا تو اسے ایسی سُنائی تھیں کہ تھانے دار کانوں کو ہاتھ لگانے لگا۔ ابھی سے آنکھ مارتا ہے..... اس لڑکی کو۔ یہ جو خادمہ بیگم صاحبہ کے ساتھ گئی ہے۔"

"اللہ چشمِ بد سے بچائے" میں نے طنز سے کہا مگر ملک صاحب طنز سے ناواقف تھے "اور یہ چھوٹا برخوردار۔"

"یہ بھی بڑا..... ہے" ملک صاحب نے اسے تعریفی سند کے طور پر ایک شاندار گالی سے نوازا۔

ظاہر ہے قصور بچوں کا نہیں تھا۔ وہ جو کچھ دیکھ رہے تھے اور سُن رہے تھے وہی دُہرا رہے تھے۔ بڑوں کے نزدیک یہ معیوب بات نہیں تھی وہ اسے اپنی موروثی تہذیب کے عین مطابق سمجھتے تھے۔

میزبانی کے دوسرے راؤنڈ میں مجھے چائے سے نوازا گیا جس کے ساتھ کپڑے دھونے والے صابن کی شکل والی برفی تھی اور لڈو تھے جو اخروٹ کی طرح توڑ کے کھائے بھی جا سکتے تھے مگر میرا خیال ہے انہیں غلیل میں زیادہ مؤثر طور پر استعمال کیا جا سکتا تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا جب برفی کا ایک سالم پیس کھا لینے کے بعد بھی میرے حواس برقرار رہے۔ چائے کا دوسرا کپ مجھے زبردستی پلایا گیا تھا مگر میں جانبر ہو گیا۔ دیہات میں یہ سب کچھ متوقع تھا۔

رابعہ کی بھی اندر اچھی خاصی درگت بنی۔ خواتین نے آپس میں اسے بہت بُرا بھلا بے شرم... ولایتی مرغی، نقلی میم وغیرہ قرار دیا۔ یہ بھی سُنا کبھی کہ بندہ اپنی زبان بھول جائے۔ ولایت میں رہ کے دماغ خراب ہو گیا ہے اور کچھ نہیں۔ اپنا کتا بھی دس برس ولایت میں رہے تو بھونکنا نہیں بھولتا۔ یہ شبہ ظاہر کیا گیا کہ اس نے مجھے پھانس لیا ہے اور وہ میری بیوی نہیں ہے۔ چائے کیسے نخرے سے پی رہی ہے جیسے کڑوی دوا ہو۔ مٹھائی کو چھوا تک نہیں۔ ڈرتی ہے موٹی نہ ہو جائیں۔ ہڈیوں پر سوکھی چمڑی اچھی لگتی ہے۔

ملک صاحب کی تازہ ترین دلہن نے میٹرک کی انگلش گرامر اینڈ کمپوزیشن کا ایسا آملیٹ بنایا جو کوئی پھوہڑ بیوی اپنے شوہر سے لڑنے کے لیے ہی بنا سکتی ہے۔ بعد میں وہ بھی رابعہ کی انگریزی سے زیادہ اس کی صورت سے حسد کرنے والوں میں شامل ہو گئی۔ رابعہ نے بتایا کہ ایک دفعہ تو اس کی قوتِ برداشت جواب دینے کے قریب ہو گئی تھی۔ وہ ان سب کی صرف ایک جملے میں ایسی تیسی کر دیتی کہ بند کرو یہ بکواس۔ میں اردو پنجابی سب سمجھتی اور بولتی ہوں۔ مگر پھر میری وجہ سے اس نے ولایت پلٹ بیوی کا مشکل کردار نبھایا۔ رات کو وہ مجھ پر برس پڑی کہ یہ تم نے مجھے کس امتحان میں ڈال دیا۔ خود تو مزے سے گپ لگا رہے ہو۔ مصیبت میری کہ غلطی سے بھی اردو کا جملہ زبان سے نہ نکل جائے۔

اس رات میری اصل آزمائش ڈنر کے وقت ہوئی جس میں معززین کو میری خدمت میں پیش کیا گیا تھا۔ ایک ڈاکٹر تھا جو بیک وقت دو اور چار پیروں پر چلنے والی خدا کی سب مخلوق کا مسیحا تھا اور

عموماً مساوات کے اصول پر عمل کرتے ہوئے سب کو ایک ہی دوا بھی دیتا تھا جو قطعی بے ضرر ہوتی تھی۔ اس سے نہ مرض کو فائدہ ہوتا تھا اور نہ مریض کو نقصان۔ شفا کا کریڈٹ اسے ملتا تھا۔ قضا تقدیر کے کھاتے میں جاتی تھی۔ موقع پاتے ہی اس نے میرے کان میں اعتراف جرم کرلیا کہ وہ کسی ڈاکٹر کا کمپاؤنڈر تھا۔ سوال اس کی روزی کا ہے اور آج تک اس کی غفلت یا نااہلی سے کوئی نہیں مرا۔ ویسے موت برحق ہے اور جب وقت آجائے تو حکیم بقراط اور حکیم جالینوس بھی کیا کرسکتے ہیں۔ میں نے اسے تسلی دی کہ میرا ارادہ ہرگز اس کی ڈگریوں کے بارے میں کوئی سوال کرنے کا نہیں ہے۔

دوسرا مہمان اسکول ٹیچر تھا۔ اس نے حیرت انگیز انکشافات اور علم و فضل کے دریا بہا کے جملہ حاضرین کو بے حد متاثر کیا۔ ان میں راقم بھی شامل تھا جو اس کے کسی دعوے کو غلط نہیں کہہ سکتا تھا مثلاً امام مسجد صاحب کے ساتھ مل کے اس نے آدمی کے چاند پر اترنے کے دعوے کو فریب قرار دیا۔ یہ عالم اسلام کے خلاف یہودی سازش ہے۔ امت مسلمہ کو کیمرا ٹرک سے بے وقوف بنایا گیا ہے۔"

دسترخوان پر بکرے، خرگوش، مرغی، مرغابی اور تیتر بٹیر سب ہی صف بستہ تھے جو دیسی گھی میں بھونے گئے تھے۔ چاول دو قسم کے تھے۔ نمکین اور میٹھے۔ انہیں پلاؤ زردہ کہا جا رہا تھا۔ کھانے میں حساب غلط ہوگیا۔ میں نے اس سے دگنا کھالیا تھا جتنا مجھے کھانا چاہیے تھا مگر اکثریت متفق تھی کہ میں نے اس کا دسواں حصہ بھی نہیں کھایا۔ جب باقی لوگوں نے دسترخوان صاف کردیا تو مجھے خاصی شرمندگی کے ساتھ تسلیم کرنا پڑا کہ شہری لوگ کھاتے نہیں، چکھتے ہیں۔

رات کے نو بجے یہ پرتشدد تقریب اختتام پذیر ہوئی تو آٹھ دس افراد مجھ سے گلے مل کے اور مجھے نچوڑ کے یوں رخصت ہوئے جیسے ان سے میری یہ آخری ملاقات ہے۔ صبح تو مجھے پھانسی ہو جانی ہے۔ بے شک وہ خلوص نیت سے سب کچھ کر رہے تھے مگر ہم پر جو بیت رہی تھی، ہم ہی جانتے تھے۔ رابعہ اندر سے آئی تو دھڑام سے چارپائی پر گر پڑی۔

"مروا دیا تم نے مجھے۔"

میں نے کہا "انگریزی میں۔ پلیز، تم کو اردو نہیں آتی۔ یا پھر میرے کان میں کہو جو بھی ارشاد فرمانا ہے۔"

جب وہ اپنی کہہ چکی تو میں نے کہا "شب بخیر۔"

"ابھی سے کہاں شب بخیر۔ تم چاہتے ہو میں ساڑھے نو بجے سو جاؤں۔"

میں نے کہا "پھر کیا کریں، باہر شاید چاندنی رات ہو۔ کھیت میں چل کے دوگانا گائیں؟"

"باہر کتنے کتے بھونک رہے ہیں۔ توبہ۔"

میں نے سوچ کے کہا "سترہ گنتے ہیں۔ بے شک گن لو باہر جا کے۔"

"سکندر۔ کیا مقصد ہے آخر اس کا۔ کیوں پھنسے ہیں ہم یہاں آکے؟" رابعہ نے بیزاری سے کہا۔

"خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے تمہیں کہ یہاں دشمن کوئی نہیں ہے۔ سب تمہیں سر آنکھوں پر بٹھا رہے ہیں۔ وی آئی پی جیسا سلوک ہو رہا ہے ہمارے ساتھ، یہ ان کی محبت کا انداز ہے جو تمہیں ناگوار گزر رہا ہے۔ دو دن چھپ کے رہنے کی اس سے بہتر جگہ تمہیں کہاں ملتی؟"

"پنڈی، مری، ایبٹ آباد کہیں چلے جاتے۔ ہوٹل بہت تھے۔"

"پہلی بات تو یہ کہ میں کسی بھی ہوٹل کو محفوظ نہیں سمجھتا۔ دوسری یہ کہ مجھے جمعے کو ایک شادی میں شریک ہونے کی تیاری کرنا ہے۔ چوہدری دلاور کے گھر میں داخل ہونا۔ اس کی تقریب نکاح میں ایسے شامل ہونا کہ اسے شک بھی نہ ہو۔ پھر عین وقت پر دولہن کی طرح اعلان کرنا کہ ٹھہرو، یہ شادی نہیں ہوسکتی۔ یہ آسان کام نہیں ہے۔"

"کیا یہاں رہ کے آسان ہو جائے گا۔"

"میرا یہی خیال ہے۔ آگے تم دیکھتی جاؤ۔ انشاء اللہ براتی بھی یہیں سے جائیں گے۔ ڈھول باجے کے ساتھ۔"

"تمہیں..... ان کی بالکل فکر نہیں۔"

"کالیا کی اور جنت گڈی کی۔"

"بنو مت۔" رابعہ نے خفگی سے کہا "تم جانتے ہو، میں کس کی بات کر رہی تھی۔ غالب اور نازو، وقار..... سب بہت پریشان ہوں گے۔"

"میرا خیال ہے کہ خوش ہوں گے" میں نے کہا "پریشان ہوتے ہیں ماں باپ، اگر لڑکا لڑکی گھر سے بھاگ جائیں۔ ان کی تو عین خواہش تھی کہ ہم سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے نکل جائیں۔ سب نے یہی کہا ہوگا کہ بالآخر رابعہ ورغلا کے لے گئی سکندر کو۔ خیر وہ جہاں رہیں خوش رہیں۔"

"سکندر، مجھے غصہ آرہا ہے۔"

"میں وہ شعر پڑھوں۔ مجھ کو غصے پہ پیار آتا ہے۔"

"دیکھو کہیں سے فون کرکے انہیں یہ تو بتادو کہ ہم خیریت سے ہیں" رابعہ نے کہا "پتا نہیں وہ کیا سمجھ رہے ہوں گے۔"

میں نے رابعہ کو مطمئن کرنے کے لیے جھوٹ بول دیا "خاتون۔ میں اتنا بے وقوف بہرحال نہیں ہوں جتنا نظر آتا ہوں۔ اس سے زیادہ ہی ہوں۔ میں نے ایک دردناک نوٹ چھوڑ دیا تھا کہ میں وہاں جا رہا ہوں جہاں سے کوئی لوٹ کے نہیں آتا۔ نہیں، یہ نہیں لکھا تھا۔ مفہوم یہ تھا کہ میں لوٹ کر نہیں آؤں گا چنانچہ مجھے تلاش کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ اللہ آپ سب کو صبر جمیل اور نیک اولاد عطا کرے۔ جو ہم میں سے کسی کے نقش قدم پر نہ چلے۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔ کھاؤ میری قسم۔"

میں لاجواب ہوگیا "میں نے غالب کو بتا دیا تھا۔"

رابعہ کے مزید کچھ کہنے سے پہلے کنیز خاص ایک ٹرے میں دو بڑے بڑے گلاس رکھ کے حاضر ہوئی۔

میں نے دہشت زدہ ہو کے کہا "لال پری۔ یہ کیا ہے؟"

وہ اٹھلا کے ہنسی "دودھ ہے سرکار۔ اصلی اور خالص مکھن والا۔ ملائی پر بادام پستے۔ پی کے دیکھو۔ رات کو دل خوش کرنے والی چیز ہے۔"

اس کی بات اتنی فحش تھی کہ رابعہ کا چہرہ سرخ پڑ گیا مگر وہ اپنی ذومعنی بات پر ہنس رہی تھی "صاحب جی۔ یہ گلاس خاص آپ کے لیے ہے۔"

اس سے پہلے کہ رابعہ پھٹ پڑتی میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا "تم بھی کیا چیز ہو۔ لال پری، چھپن چھری۔"

"ہائے میں مرگئی" اس نے گھبرا کے اپنا ہاتھ چھڑایا "اپنی ووہٹی کے سامنے تو بڑے ملک صاحب بھی میرا ہاتھ نہیں پکڑتے" وہ بھاگی مگر جاتے جاتے مجھے آنکھ مار گئی۔ اس کی بات کا مطلب بہت واضح تھا کہ جب بیوی سامنے نہ ہو تب دست درازی کرنا۔

رابعہ غصے میں آتش فشاں بن گئی "بے شرمی کی کوئی حد ہوتی ہے۔ اس نے بتادیا سب کو تو کیا عزت رہ جائے گی تمہاری۔ وہ تو ہے..... بس اب کیا کہوں میں۔"

میں ہنس پڑا "پاگل ہو تم بھی۔ ارے بھئی یہاں جو مہمان آتے ہیں وہ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ وہ یقیناً سب کو بہت خوش ہو کے بتائے گی کہ صاحب نے مجھے دوبار لال پری کہا اور ایسے لٹو ہوئے مجھ پر کہ بیوی کے سامنے ہی میرا ہاتھ پکڑ لیا۔"

"دیکھو۔ مجھ سے یہ سب برداشت نہیں ہوگا۔ مذاق میں بھی۔"

میں نے کہا "رابعہ۔ ہم جو کر رہے ہیں سب ڈراما ہے۔ جھوٹ ہے، اسے ایک کھیل سمجھ کے انجوائے کرو۔ جلنے کڑھنے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔ لو دودھ پیو اور جان بناؤ۔"

"کیا!" رابعہ نے آنکھیں نکالیں "میں یہ دودھ پیوں؟"

"اور کیا دونوں گلاس میں پیوں؟ نہ پیئے تو میزبانوں کے جذبات مجروح ہوں گے۔" میں نے کہا "بہت صدمہ ہوگا انہیں۔"

"جذبات مجروح ہوں یا خود میزبان صدمے سے ہلاک ہوجائیں۔ میں اپنی جان کو ہلاکت میں نہیں ڈال سکتی۔ انہوں نے پہلے ہی زبردستی میرے حلق تک بھر دیا ہے۔"

"ان کے بس میں ہوتا تو کوٹ کوٹ کر بھرتے۔ لیکن اب اس دودھ کا کیا کریں آخر" میں نے کھیر جیسے گاڑھے دودھ کو دیکھا "ابھی ایک ترکیب آئی ہے میرے ذہن میں۔ تم ذرا اندر والے دروازے کی کنڈی لگاؤ۔"

میں نے کھڑکی کھول کے باہر جھانکا۔ ایک ویران اور تاریک گلی میں بے خوابی کے مرض میں مبتلا دو کتے بے مقصد پھر رہے تھے۔ گاؤں میں ہو کا عالم تھا اور عشا کی نماز پڑھ کے سو جانے والے خوابوں میں مگن تھے۔ کتے بھی بالآخر روانہ ہوگئے اور موقع پاتے ہی میں نے دودھ کو کچی مٹی میں انڈیل دیا۔

رزق کو ایسے ضائع کرتے ہوئے مجھے احساس گناہ بھی ہوا اور میں نے خود کو مجرم بھی محسوس کیا۔ اس دنیا کی ایک تہائی آبادی فاقہ کشی کا شکار تھی۔ دودھ جن معصوم بچوں کی زندگی تھا ان کی ماؤں کی چھاتیاں سوکھی تھیں اور شیر خوار نوزائیدہ بچے اس وقت بھی بھوک سے دم توڑ رہے تھے، دوسری طرف میں ملائی پستے اور بادام والا دودھ مٹی میں ملا رہا تھا کیونکہ میرا پیٹ تو انواع واقسام کے لذیذ اور مرغن کھانوں سے بھرا ہوا تھا۔

"اللہ مجھے معاف کرے" میں نے کھڑکی بند کرکے کہا "میں نے کفران نعمت کیا ہے مجبوری میں۔"

رابعہ بولی "کیا مجبوری تھی۔ مستحق کم تو نہیں ہیں دنیا میں۔"

میں نے کہا "اس وقت میں کہاں جاکے تلاش کرتا مستحق کو۔ گاؤں کے لوگوں کو جگاتا؟ اتنی اخلاقی جرات ہوتی تو میں کہہ دیتا کہ واپس لے جاؤ۔ مگر ہماری معاشرتی مجبوریاں بھی بعض اوقات عذاب جاں ہو جاتی ہیں۔"

وہ ساری رات نیند لینے کی کوشش کرتے گزری۔ اجنبی جگہ اور آسیب زدہ محسوس ہونے والے ماحول میں اپنی تنہائی کا خیال کچوکے دینے لگا۔ جو خیال دن کے اجالے میں اور ظاہری مصروفیت میں دور دور تھے وہ ایک دم یلغار کرکے ذہن پر قابض ہوگئے۔ میں نے رات کے مختلف حصوں میں کبھی ان کے بارے میں سوچا جن کو میں سوتا چھوڑ کے فرار ہوگیا تھا۔ معلوم نہیں وہ میرے بارے میں کیا سوچتے ہوں گے۔ میں نے انہیں قابل اعتبار نہیں سمجھا۔ ان پر بھروسا نہیں کیا۔ میں بزدل تھا۔ خود غرض تھا یا پریشانیوں میں گھر کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہوگیا تھا۔ پھر خیال آتا تھا کہ نہیں، وہ سب جانتے تھے۔ میں انہیں بتا چکا تھا کہ اپنی وجہ سے میں ان کی زندگی اور ان کا مستقبل خراب نہیں کرسکتا۔

مجھے محسن کا اور گل کا خیال بھی آیا۔ فوزیہ اور اس کے شوہر کو ملنے والی دھمکی بھی پریشان کن تھی۔ دلاور اگر اس حد تک آگے بڑھ گیا تھا تو مجھے بھی ایک قدم آگے جاکے اس کا یہ چیلنج قبول کرنا ہوگا۔ اگر میں نے جوابی کارروائی نہ کی تو وہ سمجھے گا کہ اس نے میری کمزوری پکڑلی ہے اور وہ اپنا دباؤ بڑھائے گا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ میں بھی اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دوں اور اس کی زبان میں اسے دوٹوک جواب دوں کہ بولو اب کیا مرضی ہے تمہاری؟ میرے رشتے محفوظ نہیں ہوں گے تو تمہارے رشتوں کی

سلامتی بھی خطرے میں پڑے گی۔ تم میرے گھر کی دیواروں پر پتھر مارو گے تو وہی پتھر لوٹ کے تمہارے گھر کی طرف آئیں گے۔

میں فوزیہ اور اس کے شوہر کو یہ مشورہ نہیں دے سکتا تھا کہ جان بچا کے کہیں بھاگ جاؤ۔ فوزیہ کا شوہر لیکچرار تھا اور یہ اس کے لیے مشکل ہی نہیں ناممکن تھا لیکن محسن یا گل سے ضرور کہہ سکتا تھا کہ روپوش ہو جاؤ۔ اگر شادی نہیں کی ہے ابھی تو کرلو اور بھاگ جاؤ کہیں۔ کراچی چلے جاؤ اکرام شیخ کے پاس یا کسی اور جگہ۔ جہاں دلاور کے خیال کی رسائی بھی نہ ہو۔ جہاں کوئی شکاری ان تک پہنچ نہ پائے۔

رات کے آخری پہر میں غنودگی کچھ گہری ہوگئی تھی کہ خیال نے خواب کی صورت اختیار کرلی اور مجھے یوں لگا جیسے اندھیرا کمرا اچانک روشن ہوگیا ہے۔ تاریکی میں دُھندلی روشنی کا ایک ہیولا تھا جو میرے سامنے آکے ٹھہر گیا تھا۔ یہ شیلی تھی' اس کے جسم پر چاندنی کے چمکیلے تاروں کا کفن تھا جس سے یہ اُجالا پھوٹ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں مدھم انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ سکندر' آخر کون تھے وہ سب لوگ۔ اجنبی اور بے رحم' جو مجھے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے رہے۔ کیا بگاڑا تھا ان کا میں نے کہ انہوں نے میرے وجود کو روح سے جدا کرکے بھی قرار نہ لینے دیا۔ ایک مدفن میں خاک ہونے سے پہلے دوسری قبر کے زنداں میں ڈال دیا؟ مگر شکوہ ان سے کیسا۔ وہ تو دشمن ہی تھے نا؟ تم میرے ساتھ کیوں نہیں رہے۔ ایک بار بھی اگر میرے بے جان جسم کو تمہارے مہرباں ہاتھوں کا لمس میسّر آجاتا تو..... خیر' تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے۔ ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا۔ دیکھ لو خود مجھے ہی آنا پڑا۔ تم سے تو ایک بار بھی آیا نہ گیا۔ جو پھول تم لاتے ان کی خوشبو اندر تک میری مٹی کو معطر کرتی.....“

میں ایک دم اُٹھ بیٹھا۔ موسم اچھا خاصا خنک تھا لیکن میرا اپنا جسم پسینے میں تر ہو رہا تھا۔ میری طرح شاید رابعہ نے بھی رات سوتے جاگتے گزاری تھی۔ اس نے تاریکی میں بھی مجھے ہڑبڑا کر اُٹھتے دیکھ لیا۔

”کیا ہوا؟ کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ لیا ہے کیا؟“

مجھے اپنی چوری پکڑے جانے پر خفت ہوئی لیکن اندھیرے میں رابعہ میرے چہرے کے تاثرات کو نہیں پڑھ سکتی تھی ”نہیں۔ سونے کی کوشش کرتے کرتے تھک گیا تھا“ میں پھر لیٹ گیا۔

”پھر تمہاری آواز میں خوف اور پریشانی کیوں ہے؟“

میں نے چڑ کے کہا ”اس لیے کہ یہ جگہ مجھے بھوتوں کا ڈیرا لگتی ہے۔ اس ماحول میں نیند آسکتی ہے؟“

”کتنی دیر ہے صبح ہونے میں؟“

میں نے روشن ڈائل والی گھڑی دیکھی ”ساڑھے چار بجے ہیں۔ اب معلوم نہیں یہاں سورج نکلنے پر صبح ہوتی ہے یا مُرغوں کے اذان دینے پر۔“

”مُرغے تو ساری رات اذان دیتے رہے ہیں۔“

”وہ نفسیاتی مریض ہوں گے۔ ویسے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نیند میں تمہیں کُتّوں کے بھونکنے پر ایسا لگا ہو کہ مُرغے بول رہے ہیں۔“

”پھر تو جاگتے میں مجھے مُرغوں کی آواز ایسے سنائی دینی چاہیے جیسے کُتّے بھونک رہے ہیں؟“ رابعہ نے خفگی سے کہا ”کیا میں پاگل ہوں۔“

”تم لڑنا چاہتی ہو مجھ سے؟ ویری گڈ۔ اس طرح وقت اچھا گزرے گا۔ تو تمہارے سوال کا جواب یہ ہے مس رابعہ کہ تم پاگل ہی نہیں ہو۔ دیوانے تو ہوشیار بھی ہوتے ہیں۔ تم احمق بھی ہو..... ورنہ اس طرح منہ اُٹھا کے میرے ساتھ نہ چل پڑتیں۔ اب تم بولو' کیا میں پاگل ہوں؟“

”پتا نہیں۔ مگر تم ایسے بولتے رہو گے تو یہ ثابت ہو ہی جائے گا کہ پاگل کون ہے؟“

گاؤں کی کسی مسجد سے آوازِ اذان آئی تو مجھے صبح ہونے کی اتنی خوشی ہوئی کہ پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ حویلی کے اندر والے حصے میں بھی کچھ ہلچل شروع ہوئی تھی۔ غالباً ملازمین یا نماز کے عادی اُٹھ گئے تھے۔

میں نے کہا ”مس رابعہ..... آپ کو زحمت تو ہوگی...“

”کیا بات ہے؟“

”مجھے بیڈٹی چاہیے۔ کافی ہو تو بہتر ہے۔“

”چُپ کرکے لیٹے رہو۔ یہ خالہ جی کا گھر نہیں ہے کہ جب جو چاہا مانگ لیا۔“

میں نے آہ بھری ”سچ کہتی ہو۔ مُردہ بدستِ زندہ۔ اور مہمان بدستِ میزبان۔ یہاں تو وہی ہوگا جو ملک صاحب چاہیں گے۔ دیکھو وہ ناشتے میں چائے پلاتے ہیں کہ بالٹی بھر کے لسّی۔ مجھے یقین ہے کہ پاؤ بھر مکھن اور چار پراٹھے بھی لازمی ہوں گے۔ تم لکھ لو کہ یہاں میری وفاتِ حسرت آیات کا سبب کثرتِ خوراک ہوگی۔“

”زبردستی کون ٹھونستا ہے تمہارے منہ میں؟ مت کھاؤ۔“

”ابھی تمہیں اندازہ نہیں نیک بخت کہ ملک صاحب حکم عدولی کی کیا سزا دے سکتے ہیں۔“ میں نے کہا ”تمہارا شہری قانون کچھ نہیں کرسکتا۔ وہ کہیں گے کہ کھاؤ تو مجھے کھانا پڑے گا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ سے پتا چلے گا کہ جب معدے میں گنجائش نہ رہی تو لسّی پھیپھڑوں میں بھر گئی۔ مکھن سے دل بھر گیا۔ پراٹھوں کے ٹکڑے جگر میں چلے گئے۔“

”تم جاؤ نماز پڑھ آؤ۔ فاسد خیالات دماغ سے نکل جائیں گے“ رابعہ بولی۔

مجھے یہ تجویز پسند آئی۔ شرمندگی تو بہت ہوتی تھی کبھی کبھی اللہ میاں کے سامنے جا کے سجدہ ریز ہونے سے مگر میں ڈھیٹ بن کے حاضر ہو جاتا تھا کہ۔

رحمت پہ تیری میرے گناہوں کو ناز ہے

بندہ ہوں جانتا ہوں تُو بندہ نواز ہے

اندھیرے بہت سے گھروں کے دروازوں سے نمازی نکل رہے تھے۔ یہاں شہر والی بات تو تھی نہیں کہ میں کسی سے راستہ معلوم کرتا۔ آواز کی سمت کا اندازہ کرتے ہوئے میں اسی گلی میں ہو گیا تھا جو درحقیقت گاؤں کی مال روڈ سمجھی جا سکتی تھی۔ یہاں ملک صاحب کا دولت کدہ واقع تھا۔ آگے مطب اور اسکول تھا اور چند دکانوں پر مشتمل بازار تھا۔

میں نمازیوں کی صف میں شاید مجھے کوئی نہ پہچانتا اور اجنبی سمجھ کے نظرانداز کردیتا مگر پوسٹ مین چانن دین نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ نماز کے بعد وہ سیدھا میری طرف لپکا۔

”ابراہیم صاحب۔ بڑی خوشی کی بات ہے جی آپ سے اللہ کے گھر میں بھی ملاقات ہوگئی“ اس نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

چانن دین نے وہیں اعلانِ عام کردیا کہ میں وہی کاروالا مہمان ہوں' چیف انجینئر منگلا ڈیم ہوں جس نے ملک صاحب کو میزبانی کا شرف بخشا ہے۔ مزید یہ کہ میں اردو یا پنجابی سے نابلد ولایت کی گوری بیوی کا شوہر ہوں جو اپنے حسن و جمال سے میموں کو شرمندہ کرے۔ کچھ لوگوں کی خودی زیادہ بلند تھی۔ وہ محض مصافحہ کرکے رخصت ہوگئے۔ تقریباً ایک تہائی مجھ سے گلے ملے اور باقی مجھے چھوڑنے پر آمادہ نہ تھے۔ اردو میں وہ ”کمبل“ ہوگئے تھے اور پنجابی میں لیس ہوگئے تھے۔ ان میں دو ایسے خوش نصیب بھی شامل تھے جنہوں نے چانن دین کے ساتھ مل کے میری گاڑی کو دھکا لگایا تھا اور اس کے انجن کو تکلیف دیے بغیر گاڑی کو ملک صاحب کے احاطے تک لائے تھے۔

بڑی مشکل سے اپنی جان چھڑا کے میں مسجد سے باہر آیا تو صرف ایک شخص ساتھ تھا اور یہ پیش امام صاحب تھے۔ وہ بضد تھے کہ میں ان کے ساتھ ایک پیالی چائے ضرور پی کر جاؤں۔ چائے کی طلب نے مجھے مجبور کردیا کہ میں مسجد سے ملحق ان کے غریب خانے میں قدم رنجہ فرماؤں۔ بعد میں مجھے اپنے اس فیصلے پر پچھتانا نہیں پڑا۔ پیش امام صاحب سے تعارف تو گزشتہ رات ہی ہوگیا تھا۔ انہوں نے علم کے جو دریا بہائے تھے ان میں ڈوب کے میں نے خود کو جاہل تسلیم کرلیا تھا لیکن حیرت انگیز طور پر مجھے وہاں اچھی چائے پینے کو ملی۔

مجھے ایک مختصر سے کمرے میں صاف ستھری دری پر بٹھایا گیا تھا۔ دری پر دیوار کے ساتھ ساتھ گاؤ تکیے تھے جن پر ہاتھ سے گل بوٹے کاڑھے گئے تھے۔ دوسرے کمرے کو ملانے والے دروازے پر ایک سوتی چادر کو پردے کے طور پر لٹکا دیا گیا تھا۔

اچانک اس کے پیچھے سے آواز آئی ”چینی کتنی اباجی؟“

میں نے بے اختیار کہہ دیا ”ایک چمچہ“ حالانکہ اباجی میں نہیں تھا۔ ظاہر ہے مجھے مولوی صاحب کے سامنے سخت شرمندہ ہونا پڑا۔ پردے کے پیچھے سے دوسرا سوال کیا گیا کہ ”دودھ کتنا؟“ تو میں نے مولوی صاحب سے کہا ”کہہ دیجیے دودھ نہ ڈالیں۔“

پھر پردے کی اوٹ سے ایک بے حد اُجلا گلابی' نازک اور شفاف جلد والا ہاتھ باہر آیا۔ مولوی صاحب نے ٹرے لے لی اور وہ ہاتھ اپنی چکا چوند پھیلا کے ہمیشہ کے لیے یوں غائب ہوا کہ میرے تصور میں صرف روشنی رہ گئی۔ مولوی صاحب نے مجھے بتایا کہ ان کی بیٹی ایف اے سی ٹی ہے۔ اس کا رشتہ اپنوں میں ہی طے ہوا تھا مگر لڑکا جاہل ہونے کے علاوہ لالچی تھا۔ وہ دوبئی گیا اور وہیں اس نے کسی مال دار پاکستانی فیملی میں شادی کرلی۔ ان کی بیٹی اب شہر کے اسکول میں پڑھاتی ہے اور شادی کے نام سے بدکتی ہے۔

آخر میں انہوں نے وہی کہا جو ہر لڑکی کا باپ کہتا ہے۔ ”آپ تو ماشاء اللہ صاحب حیثیت ہیں۔ خیال رکھیے گا۔ بیٹی کا بڑا بوجھ ہے مجھ پر۔ یہاں تعلیم ہی اس کا عیب بن گئی ہے۔ قصوروار اس کا منگیتر تھا مگر سزا اسے مل رہی ہے۔ اللہ سب جاہلوں کو معاف کرے..... جو سمجھتے ہیں کہ علم صرف مردوں کے لیے ہے.....“

مجھے ایک تعلیم یافتہ اور فراخ دل شخص سمجھتے ہوئے اس چھوٹے سے گاؤں کے مولوی نے بہت بڑی بات کی تھی۔ اس نے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے میرے ساتھ وہ دکھ بانٹ لیا تھا جس کا بار کوئی اور نہیں اُٹھا سکتا تھا۔ میں باہر آیا تو میرا دل بھی اتنا ہی بوجھل تھا کیونکہ میں نے اسے جھوٹ بول کے ٹال دیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میں اس کی کوئی مدد نہیں کرسکوں گا۔ نہ آج نہ کل اور اس کے بعد کبھی۔ شاید میں کبھی زندگی میں پھر ادھر نہیں آؤں گا۔ مگر میں نے عیاری اور ہوشیاری سے خود کو ہر ذمے داری سے بچا لیا تھا اور کہہ دیا تھا کہ ”انشاء اللہ۔ میں کچھ ضرور کروں گا“ یعنی اگر اللہ نے چاہا تو۔ میں یہ جھوٹ نہ بولتا تو کیا کرتا؟ میں سچ بھی نہیں بول سکتا تھا۔ میں اسے نہیں کہہ سکتا تھا کہ مولوی صاحب' آپ کو کس عقل مند نے مشورہ دیا تھا کہ اس منافق' متعصب اور بے رحم مردوں کے معاشرے میں رہتے ہوئے اپنی بیٹی کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کریں۔ آپ نے اسے جاہل ہی رہنے دیا ہوتا تو وہ کب کی ٹھکانے لگ جاتی اور کسی جاہل عم زاد کے دو چار بچوں کی ماں ہوتی۔

اس افسوسناک تضاد سے ہمارے شہر بھی محفوظ نہ تھے۔ لوگ قولِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ضرور دُہراتے تھے کہ علم حاصل کرنے کے لیے چین جاؤ اور دین کی یہ بات مانتے تھے کہ ہر مرد عورت پر علم فرض ہے مگر احساسِ کمتری کا مارا ہوا مرد اگر میٹرک پاس ہو تو بی اے پاس لڑکی کے نام پر کانوں کو ہاتھ لگاتا ہے۔ توبہ توبہ۔ وہ بے لگام اور منہ زور عورت مجھے شوہر کہاں تسلیم کرے گی۔ یہ کہنا مشکل ہوتا ہے کہ وہ ظلم برداشت نہیں کرے گی اور غلام بن کے نہیں رہے گی۔

میں نے گاؤں کے باہر کا ایک چکر لگایا۔ اس وقت تک سورج طلوع ہوچکا تھا اور دیہی زندگی کے عام مناظر دیکھے جا سکتے تھے۔ کسان ہل بیل کے ساتھ کھیتوں میں ایک زرخیز دن کا آغاز کر رہے

تھے۔ عورتیں ایک کنوئیں کے ڈول سے مٹی کے گھڑے بھر رہی تھیں۔ ننگ دھڑنگ بچے کیچڑ سے پانی میں بھینسوں کے ساتھ نہا رہے تھے۔

واپسی پر رابعہ مجھے ایک ایس ایچ او کی طرح پریشان لگی جس کی حوالات سے قیدی فرار ہو گیا ہو "نماز پڑھنے گئے تھے کہ حج کرنے؟"

میں نے سعادت مندی سے کہا "کیا دشمنوں کا مزاج برہم ہے؟"

"دشمنوں کا نہیں۔ ملک صاحب نے ہر طرف ہرکارے دوڑا دیے تھے۔ خبر ملی کہ بندہ گیا تو مسجد تھا مگر صراط مستقیم سے بھٹک گیا۔ کہیں اور رہے تھے تم۔"

"گویا مخبروں نے اطلاع پہنچا دی۔" میں آہ بھر کے بیٹھ گیا "آج صرف تمہاری وجہ سے ایک گولڈن چانس نکل گیا۔"

"کیسا گولڈن چانس؟"

"عین فلمی انداز میں شہری بابو اور گاؤں کی فیشن ایبل مٹیار کے رومانس کا جس کا انجام بھی ناظرین کی خواہشات کے مطابق ہوتا ہے۔ آہ کیا جلوہ تھا۔ وہ برق طور تھی کہ ویلڈنگ کا شعلہ اور کیا آواز تھی۔ جی چینی کتنی ڈالوں؟ دودھ کتنا پئیں گے آپ اور وہ چائے کا کپ کیا سرور تھا اس میں۔ ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں۔"

رابعہ نے برا مان کے کہا "جاؤ جاؤ۔ آنے کی بھی کیا ضرورت تھی؟"

"کیسے جاؤں؟ تمہیں پناہ دینے والا ترس کھا کے چاہنے والا یا مجبوراً شریک حیات بنانے والا بھی تو نہیں ہے ساری دنیا میں۔"

"اچھا ہوا تمہیں تو کوئی مل گیا۔ میری فکر مت کرو۔"

رابعہ کے مزاج کا درجۂ حرارت زیادہ بلند ہونے سے قبل ہی ملک صاحب کی طرف سے ناشتے کی دھمکی آ گئی۔ میں نے رابعہ کو سمجھایا کہ یہاں عورتیں مردوں کے ساتھ کھیتوں میں کام کر سکتی ہیں مگر وہ کمیں یعنی نچلے طبقے کے لوگ ہیں۔ ہم خواص میں شامل ہیں۔ یہاں بیوی بھی شوہر کے ساتھ نہیں پھرتی اور اس کے ساتھ بیٹھ کے کھانا نہیں کھاتی۔ لیکن رابعہ نے زنان خانے میں جا کے ناشتا کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

"ان کا جو دل چاہے سمجھیں۔ میں بے شرم ہوں' بے حیا ہوں۔ تم نے میری زبان بند کر دی ہے اور ان عورتوں کی باتیں۔ توبہ' میرا کھانا زہر ہو جائے گا۔"

اب میں نے ملک صاحب کو قائل کرنے کے لیے رابعہ کو موردِ الزام ٹھہرایا کہ ولایت میں رہ کے یہاں کے آداب سے واقف نہیں اور یہاں کے رسم و رواج کو نہیں مانتی۔ کچھ وقت لگے گا پاکستانی معاشرے کے طور طریقے اپنانے میں۔ ملک صاحب برا ماننے یا انکار کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ میں شرافت سے بات نہ کرتا اور صاحب لوگوں کی طرح حکم دیتا کہ ناشتا تیار کر لاؤ تب بھی وہ مانتے۔

ناشتا بھگتنے کے بعد دن کا باقی وقت ہم نے گاؤں دیکھنے اور آس پاس کے علاقے کی سیر میں گزارا۔ ملک صاحب کو اس وقت پھر مایوسی ہوئی جب ہم نے ان کی شاہانہ شیورلٹ امپالا کار کی سواری پر پیدل گھومنے کو ترجیح دی۔

ہم گاؤں کی گلیوں سے گزرے تو راہ چلتے لوگ راستہ چھوڑ کے دیوار سے لگ گئے۔ بچوں کو بھی کتوں کی طرح دھتکار کے بھگا دیا گیا۔ عورتیں بند دروازوں کے پیچھے سے صاحب اور میم کا نظارہ کرتی رہیں۔ میں تصور کر سکتا تھا کہ ان کی آنکھوں میں تجسس اور دلچسپی سے زیادہ نفرت اور ملامت ہو گی۔ جہاں عورت آزادی کی خواہش پر بھی احساس جرم میں مبتلا ہو وہاں وہ اس کے سوا کیا کر سکتی ہے کہ آزادی کو برا سمجھے اور کہے۔ خواہ آزادی مذہب اور اخلاق و شرافت کے دائرے میں ہی کیوں نہ ہو۔

ملک صاحب نے چلتے چلتے کہا "آپ آج صبح مولوی صاحب کے گھر چلے گئے تھے۔"

میں نے کہا "جی۔ بہت عمدہ چائے پلائی انہوں نے۔ بڑے اچھے آدمی ہیں۔"

"ان کی بیٹی...... منگیتر نے چھوڑ دیا تھا اسے۔"

میں نے کہا "جاہل اور لالچی ہی نہیں' بدبخت تھا وہ۔ اور میں تو سمجھتا ہوں خدا نے بچا لیا اس لڑکی کو اس کمینے شخص سے۔ انشاء اللہ اس کی شادی اب ہم کرائیں گے کسی بہت اچھے خاندان میں۔"

ملک صاحب کو چپ لگ گئی "اچھا ہے جی۔ نیکی کا کام ہے۔"

میں نے کہا "ملک صاحب! یہ نیکی آپ کیوں نہیں کرتے۔ ایک تعلیم یافتہ مذہبی ماحول کی پروردہ سلیقہ مند لڑکی کو اپنی بہو کیوں نہیں بنا لیتے۔ صورت بھی اچھی ہی ہو گی اس کی۔ ویسے بھی اصل چیز تو سیرت ہے۔"

ملک کا موڈ خراب ہو گیا "ابراہیم صاحب! آپ ان معاملات کو نہیں سمجھتے۔ ہم خاندانی لوگ ہیں۔ وہ ہمارا نمک خوار۔ ہمارے ٹکڑوں پر پلنے والا۔ دو ٹکے کا آدمی۔"

میں نے کہا "آپ نماز پڑھتے ہیں اس کے پیچھے۔ وہ اچھا آدمی نہیں ہے تو اسے نکال کیوں نہیں دیتے گاؤں سے۔"

"بس وقت بدل گیا ہے جناب۔ ورنہ اس کی مجال نہ تھی کہ لڑکی کو شہر میں پڑھاتا اور وہیں نوکری کراتا مگر اس کا سالا ہو گیا ہے اب کرنل اور لڑکی اپنے ماموں کے ساتھ رہتی ہے۔ چلیں جی کریں جی اس بات کو۔ بیگم صاحب سے پوچھیں گاؤں کیسا لگا؟"

میں نے رابعہ سے انگریزی میں کہا "اس ابو جہل کی باتوں کو کھولنے کی ضرورت نہیں۔"

"مجھے تم پر غصہ آ رہا ہے۔"

"ہمیں سیاست سے کام لے رہا ہوں اور ہماری سیاست کی تو بنیاد ہی منافقت پر ہے" میں نے کہا "میری مجبوری کو سمجھتے ہوئے کسی بات کا برا مت ماننا۔"

اب میں نے ملک سے کہا "بیگم صاحبہ گاؤں والوں کی سادگی اور خلوص سے بے حد متاثر ہیں۔ لیکن ان کی خواہش ہے کہ یہ گاؤں کی کوئی شادی دیکھیں۔ کیا آج کل میں کوئی شادی ہے؟"

"شادی...... ہے تو سہی...... مگر۔"

"مگر کیا۔ کوئی کام ہے آپ کو تو ہم چلے جائیں گے۔"

"نہیں جی۔ وہ ایک مزارع ہے اپنا۔ ذات کا نائی ہے اور اس کی ساری برادری بہت نیچ ہے۔"

رابعہ نے مجھ سے کہا "کیا وہ شودر ہے۔ اس کمینے سے پوچھو کہ کیا اسلام میں ذات پات ہے۔ یہ دولت مند ہے اس لیے اشراف میں شامل ہے۔"

میں نے کہا "بیگم صاحبہ فرماتی ہیں کہ کیا ہم بتائے بغیر اس شادی میں نہیں جا سکتے۔"

ملک نے کہا "ہمیں کوئی روک سکتا ہے؟ یہ تو ہماری شان کے خلاف بات ہے مگر ہم آپ کی وجہ سے اس کو یہ عزت دیں گے......"

"بیگم صاحبہ کا مطلب یہ تھا کہ بتانے سے وہ ڈر جائیں گے۔ کھل کے تقریب میں حصہ نہیں لیں گے۔ ہم انہی جیسے بن کے جائیں گے تو زیادہ مزہ آئے گا۔"

رابعہ نے کہا "کیا خواہ مخواہ کہتے جا رہے ہو میری طرف سے۔"

میں نے کہا "شہر کی شادیاں تو دیکھی ہوں گی تم نے۔ گاؤں کی شادی بھی دیکھ لو۔ پھر بتا دینا کہ ہماری شادی کیسے ہونی چاہیے شہری یا دیہی؟"

"مجھے کوئی شوق نہیں۔"

"مجھے تو بہت شوق ہے۔ اور کیا پتا یگانی شادی میں عبداللہ دیوانہ ہو جائے۔ میں مولوی صاحب سے کہوں کہ چلو جی اپنا بھی نکاح پڑھا دو لگے ہاتھوں۔"

"دماغ خراب ہے تمہارا۔ تم تو پہلے ہی کہہ چکے ہو۔"

میں نے اپنے سر پر ہاتھ مارا "اوہ۔ یہ تو میں بھول ہی گیا تھا کہ ہماری شادی ہو چکی ہے۔"

تیسرے پہر ہم نے شکار کھیلا۔ اس کے لیے ملک صاحب کے اصطبل سے گھوڑے منگوائے گئے تھے۔ ملک کا خیال تھا کہ ہم گھڑ سوار خاک شہسوار ہوں گے۔ میں نے مدت ہوئی گھوڑے پر سواری نہیں کی تھی مگر لندن میں چار سالہ قیام کے دوران ہومنگ کے علاوہ میرا ایک شوق ہارس رائڈنگ تھا۔ جوڈو کراٹے سیکھنے کا مجھے کوئی شوق نہیں تھا مگر وہاں ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ میں نے ایک جاپانی کلاس فیلو کے ساتھ شام کی کلاس میں جانا شروع کر دیا۔ وہاں متعصب قسم کے بدمعاش انگریز لڑکے جو سر پر استرا پھرا کے (SKIN HEADS) کہلاتے تھے ایشیائی باشندوں کو اکیلا پا کے گھیر لیتے تھے اور خوب مارتے تھے۔ ایک مرتبہ شامتِ اعمال کے باعث انہوں نے مجھے گھیر لیا کیونکہ میں اور محسن انگریز لڑکیوں سے معاشقے لڑانے میں حد سے زیادہ بدنام ہو چکے تھے اور گوروں کی عزتِ نفس اس سے سخت مجروح ہوتی تھی کہ کالے لوگ گوری لڑکیوں سے انتقاماً عشق لڑائیں۔ میں نے اپنے دفاع میں کچھ ہاتھ پیر چلائے مگر وہ چار تھے اور پٹائی کے فن میں مہارت رکھتے تھے۔ اچانک ایک ہندوستانی لڑکا آ گیا۔ اس نے چاروں کو دھنک کے رکھ دیا۔ اس پر مجھے مزید غیرت آئی کہ میرے ایک دشمن نے مجھے چار دشمنوں سے بچایا ورنہ وہ میری ہڈی پسلی ایک کر دیتے۔ مجھے اپنا دفاع خود کرنا آنا چاہیے۔

گھوڑے بہت اچھی نسل کے تھے۔ ملک نے سیاہ رنگ کی ایک گھوڑی پر تھپکی دے کے کہا "لو جی یہ اپنی لاڈو ہے۔ کسی کو پیٹھ پر ہاتھ نہیں رکھنے دیتی۔ اپنے سوا۔"

میں نے کسی عظیم فلسفی کی طرح ایک نکتہ بیان کیا "ہر لاڈو ایسا ہی کرتی ہے" اور پھر رابعہ سے انگریزی میں کہا "مثلاً تم۔"

ملک بولا "آپ یہ گھوڑی لے لو۔ اس کے مزاج میں بھی بڑی مسکینی ہے اور ہے بھی خوب صورت۔ راضی خوشی سب کے پاس چلی جاتی ہے لالی کی طرح۔"

"لالی۔ کون لالی؟"

"وہی جسے آپ نے رات لال پری کا خطاب دیا تھا" ملک نے مجھے آنکھ ماری "بانہہ جب پکڑلی تھی تو اسے چھوڑنا نہیں تھا جناب۔ مرد تو ایسا ہی کرتے ہیں۔"

مجھے پسینہ آ گیا۔ ملک سمجھ رہا تھا کہ رابعہ کچھ نہیں سمجھ رہی ہے۔ اس الو کی پٹھی نے واقعی سب کو بتا دیا تھا اور ملک نے بھی برا نہیں منایا تھا۔ گھر میں تفریح کے لیے ایک چیز تھی' سب کی دولت مشترکہ تھی۔ مہمانوں کے لیے گھوڑی بھی حاضر اور لالی بھی۔

میں نے رابعہ سے نظریں نہیں ملائیں "آپ برا تو نہیں مانیں گے اگر میں آپ کی لاڈو کو لے لوں۔"

رابعہ نے غرا کے کہا "بلاوجہ شیخی میں مت آؤ۔ پھر شرمندگی ہو گی۔"

میں نے کہا "اب ہم بہت بے شرم ہو گئے ہیں جی۔"

لاڈو اتنی سرکش ہرگز نہیں تھی جتنا ملک مجھے اس سے ڈرا رہا تھا اور خود میں پریکٹس نہ ہونے کے باوجود شہسواری بھولا نہیں تھا۔ ویسے تو سب ہی جانوروں کو پیار سے سدھایا جا سکتا ہے مگر گھوڑوں کے رسیا گھوڑوں کی نفسیات پر خاصی ریسرچ کر چکے ہیں۔ اس کا مطالعہ میں نے بھی کیا تھا چنانچہ لاڈو نے واجبی سی مزاحمت کے بعد تابعداری اختیار کر لی۔ ملک نے اپنے لیے دوسری گھوڑی منتخب کی اور چتکبری کو رابعہ کے حوالے کر دیا گیا۔

غریب مزارعین کا ایک جم غفیر دائیں بائیں ایک میل تک

قطار میں پھیل گیا اور انہوں نے ڈانگ سوٹوں سے جھاڑیوں کو کھنگالنا شروع کیا۔ کچھ لوگ گھی کے خالی کنستر بھی بجا رہے تھے اور حلق سے ہر قسم کی آوازیں برآمد کر رہے تھے۔ ہمارے پیچھے شکاری کتوں کے ٹرینر چل رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں زنجیروں سے بندھے ہوئے اونچے قد اور پتلی کمر والے شکاری کُتے تھے۔

اچانک دونوں طرف کی جھاڑیوں سے کوئی خرگوش نکلتا تھا اور جان بچا کے بھاگتا تھا تو کُتوں کو آزاد کردیا جاتا تھا۔ پھر کُتے اور خرگوش کی دوڑ شروع ہوتی تھی جو درحقیقت فنا و بقا کی جدوجہد ہوتی تھی۔ خرگوش کی تیز رفتاری مشہور ہے اور وہ بڑی پھرتی سے راستہ کاٹ کے رخ بدل لیتا ہے مگر کُتوں کو بھی شکار کی خصوصی تربیت دی گئی تھی۔ وہ خرگوش کی چستی' چالاکی اور تیز رفتاری کو مات دیتے تھے اور اسے بالآخر زندہ پکڑ کر اور دانتوں میں دبا کے مالک کی خدمت میں پیش کردیتے تھے۔ زندگی کے لیے خرگوش کی دیوانہ وار جدوجہد کے بعد اس کی ناکامی اور پکڑے جانے کے بعد موت کے منہ میں اس کی مظلوم بے بسی میں ملک جیسے لوگوں کے لیے بڑی سنسنی خیزی تھی۔ فتح کا نشہ تھا اور کمزور پر غالب آجانے کا غرور تھا۔ لیکن رابعہ جیسی خواتین کے لیے شدید جذباتی قنوطیت اور عبرت کا سامان تھا۔ اس کے نزدیک یہ شکار نہیں آدمی کی حیوانی جبلت کا سفاک مظاہرہ تھا۔ اس نے مجھ سے سوال بھی کیا کہ فرض کرو خرگوش کی جگہ تم ہوتے...

میں نے کہا "ایسا صرف اس صورت میں ہوسکتا تھا کہ تم خرگوشنی ہوتیں اور ایک جنرل فارمولے کے تحت میں کوئی بھی چوپایہ نر بننا قبول کرتا بشرطیکہ مادہ تم ہوتیں۔"

رابعہ نے بھُنے ہوئے خرگوش پر نظر ڈالنے سے انکار کردیا۔ بلکہ اس کی طبیعت اتنی متعفن ہوئی کہ اس نے کچھ بھی نہیں کھایا "مجھے عجیب سا محسوس ہو رہا ہے۔"

میں نے کہا "معاف کرنا۔ تم اس سے بڑی چیزیں ہضم کرچکی ہو مثلاً بکرے' اللہ میاں کی گائے۔ اور وہ جانور جس کے سامنے لوگ بین بجانا سیکھتے ہیں۔ سیکڑوں مرغیاں تم چرغے' چکن تکے اور بریانی کی صورت میں نوش فرماچکی ہو۔ آخر خرگوشوں سے کیوں خفا ہو؟"

"میں نے تمہیں منع تو نہیں کیا۔ تم کھاؤ' بس میرا سر مت کھاؤ۔" وہ بولی۔

میں نے کہا "بکری کا سر میں بڑے شوق سے کھاتا ہوں کیونکہ اس میں مغز ہوتا ہے۔ اللہ تمہارے سر پر تمہارے سر کے تاج کا سایہ سلامت رکھے..."

خرگوش جنگل میں ہی خیمہ لگا کے بھونے گئے تھے اور غالباً اس کے لیے کہیں سے اسپیشل باورچی درآمد کیا گیا تھا۔ اس نے اپنے کمال سے خرگوش کو چرغا بنادیا تھا۔ بھاگ دوڑ میں تھکن اور پسینے سے بُرا حال ہوگیا تھا۔ طعام سے پہلے ملک نے مجھے ٹیوب ویل کے شاور میں غسل کی پیش کش کی جو میں نے رابعہ کی وارننگ والی نظروں کو نظرانداز کرتے ہوئے قبول کی۔ میں لنگوٹ باندھ کر طوفانی آبشار جیسے دھارے میں نہاتے ہوئے رابعہ کو بھی اشارہ کرتا رہا کہ آجاؤ تم بھی۔ وہ بہت خفا تھی مگر کچھ کر نہیں سکتی تو وہ کافی فاصلے پر خیمے کے پیچھے جا کے بیٹھ گئی۔

خرگوش مسلّم نوش فرماتے ہوئے بھی میں نے اسے پریشان اور اسے دکھا دکھا کے بوٹیاں کھاتا رہا۔ ملک نے اس کے لیے منگوائی مگر وہ بھی رابعہ نے چکھ کے واپس کردی۔ آدھا گلاس پیتے وہ چکھنا کہتے تھے۔ ملک نے اپنے زریں خیالات کا اظہار فرماتے ہوئے رابعہ کی عادت کو ولایت کے ماحول کی خرابی کا نتیجہ قرار دیا جہاں لوگ آم بھی چمچوں سے کھاتے ہیں اور پائے چھری کانٹے سے۔ میں نے کہا کہ رابعہ تو عید کی سویاں بھی اسٹرا STRAW سے کھاتی ہے۔

"ہم تو جناب شکاری ہیں خاندانی۔ باپ دادا بھی شکار کرتے تھے تو یہ نہیں دیکھتے تھے کہ جانور کے چار پاؤں ہیں یا دو۔ اور نر ہے یا مادہ۔ مادہ ہے تو کس کی۔ بس جو دل کو بھاجائے۔" اس نے مجھے آنکھ مار کے کہا۔

"آنکھ بھی اچھی مارتے ہیں آپ" میں نے کہا "جھک مارتے ہیں یا نہیں؟ میرا مطلب ہے مچھلی کا شکار۔"

ملک نے رازدارانہ لہجے میں سوال کیا "میم صاحب کی طبیعت تو خیر سے ناساز نہیں ہے۔ کوئی کھٹی چیز اچار امچور وغیرہ منگوادوں؟"

اسے جھانپڑ رسید کرنے کے بجائے میں نے سیاسی بصیرت سے کام لیتے ہوئے کہا "بڑی تاڑنے والی نظر ہے آپ کی ملک صاحب۔"

شام کو ہم واپس لوٹے تو حسب توقع تخلیہ میسر آنے پر میری شامت آگئی "یہ سب کیوں کر رہے ہو تم آخر...."

میں نے کہا "میں آرام یعنی RELAX کر رہا ہوں... تم بلاوجہ ٹینشن TENSION مت لو۔ روم میں ویسے ہی بن جاؤ جیسے رومن ہیں۔ شہر میں شہری۔ دیہات میں دیہاتی۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر دوسروں کے سامنے بدتمیزی کیوں کرتے ہو؟"

"اس لیے خاتون کہ میں بدتمیز ہوں۔" میں نے سر خم کرکے کہا "اب میں سو رہا ہوں۔ آپ اپنا وعظ جاری رکھیں۔ میں آنکھیں ہی نہیں کان بھی بند کرکے سوتا ہوں۔"

میں دو گھنٹے بعد اُٹھا تو حالت ابتر تھی۔ بہت عرصے بعد گھوڑے کی سواری نے جسم کا جوڑ جوڑ ہلا دیا تھا۔ رابعہ نے گھوڑے کو ایڑ ہی نہیں لگائی تھی۔ وہ خراماں خراماں چلتی رہی تھی اور جب خرگوش ذبح کرچکے ہوتے تھے تو پھر آگے بڑھنے سے پہلے اس کے پہنچنے کا انتظار کرتے تھے۔

میں ہائے ہائے کرتا ہوا اُٹھا تو اس نے طنز سے کہا "تمہاری لاڈو کیا کہے گی اگر ایسے کراہتا ہوا دیکھ لیا۔"

"کون لاڈو؟" میں نے کہا "کون سی لاڈو۔ اس کا نام لالی ہے خاتون۔ وہ کراہتا دیکھے گی تو تمہاری طرح پتھر بن کے نہیں بیٹھی رہے گی۔ ہاتھ پاؤں دبائے گی۔ تم تو بڑی سنگدل ہو' دل کا درد بھی نہیں سمجھتیں۔ آہ۔"

رابعہ مسکرائی "لالی کو بُلادوں؟ یا مولوی صاحب کی دخترِ نیک اختر کو؟"

"ارے تم ہی سر دبادو۔ ظالم حسینہ" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"چھوڑو۔ تم تو کچھ زیادہ ہی رومانٹک ہو رہے ہو یہاں۔" رابعہ نے ہاتھ چھڑا کے کہا "رات کو شادی میں بے ہودگی مت کرنا۔"

"میں صرف ہودگی کروں گا۔ وعدہ..." میں نے کہا "یعنی وہ سب جو اپنی منکوحہ کے ساتھ سرعام کیا جاسکتا ہے۔"

رابعہ ہنسی "منہ دھوکے رکھو اپنا۔ میں منکوحہ نہیں ہوں کسی کی۔"

ملک صاحب نے سرِ شام نوٹس دیا کہ شادی میں چلنا ہے تو تیار ہوجائیں۔ فرمائش پر مجھے ریشمی لنگی۔ بوسکی کا ڈھیلا کرتا اور ایک نیلی پگڑی بھی فراہم کردی گئی۔ ملک بطورِ خاص نیلی پگڑی کے مطالبے پر حیران تھا لیکن اس کے لیے ناممکن کچھ نہیں تھا۔ صرف آدھے گھنٹے میں ایک سفید پگڑی کو نیلا رنگ دے کر سکھا دیا گیا۔ کلف اور استری کے بعد ملک کے ایک ملازم نے پگڑی باندھی اور میرے سر پر رکھ دی۔ ملتانی کھسّے پہن کے میں نے آئینہ دیکھا۔

"واہ جی ملک صاحب۔ ٹور بن گئی اپنی۔ بس آپ جیسی مونچھوں کی کسر رہ گئی" میں نے ہونٹوں پر فرضی مونچھوں کو بل دیا "بڑا رعب ہوتا ہے مونچھوں کا۔"

ملک بہت خوش ہوا "مونچھ تو مرد کا زیور ہے جی۔"

میں نے کہا "کیا میم صاحب بھی تیار ہیں؟"

ملک نے قہقہہ مارا "لو جی۔ کمال کرتے ہو آپ بھی۔ عورتوں کی تیاری اتنی جلدی ختم ہوسکتی ہے۔ جو ٹائم پر تیار ہوجائے وہ زنانی نا کیا۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا "شہر اور گاؤں میں کم سے کم ایک قدر مشترک ہے۔ کیا آپ کی بیویاں بھی ساتھ جائیں گی؟"

ملک کا چہرہ ایسا ہوگیا جیسے میں نے نادانستگی میں اسے گالی دے دی ہو "ابراہیم صاحب! ہم تو مرد ہیں اور حاکم ہیں۔ عورت ہوتی ہے گھر کی عزت۔ ان کو اس بے حیثیت شخص کی شادی میں لے جاسکتا ہوں۔ اور وہ بھی بن بلائے۔ ناک کٹ جائے گی ہماری۔"

"اگر وہ دعوت دیتا آپ کو..."

"اس کے سر پر جوتی نہ توڑ دیتا میں۔ آج تک کسی کمیں نے ایسی گستاخی کی جرات نہیں کی۔ میں تو آپ کا دل رکھنے کے لیے ساتھ جا رہا ہوں۔"

رابعہ تیار ہوکے آئی تو میں اسے دیکھ کے بھونچکا رہ گیا۔ خالص دیہاتی اسٹائل کے زرق برق کپڑوں میں وہ پہچانی نہیں جاتی تھی۔ کپڑے قیمتی تھے اور شاید اس کی کسی بیوی کے زیرِ استعمال تھے۔ اسے سونے کے بھاری بھرکم زیورات سے بھی لاد دیا گیا تھا۔ ظاہر ہے یہ سب خصوصی انتظام ملک کے حکم پر ہوا تھا۔ رابعہ کی بے بسی اور جھنجلاہٹ جائز تھی۔ اس کی کسی نے نہیں سُنی تھی اور جیسا کہ اس نے مجھے بعد میں بتایا اسے "ملکانی" بناتے ہوئے بڑی' منجھلی اور چھوٹی بیگمات کے علاوہ حویلی کی ہر ملازمہ اور خود لال پری نے رابعہ کا خوب تمسخر اُڑایا تھا اور اسے سخت اشتعال انگیز باتیں سننی پڑی تھیں۔

وہ مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہی تھی کہ دیکھا اپنے مذاق کا انجام۔ اسے میرا دیہاتی ایڈیشن بھی پسند نہیں آیا تھا۔ وہ بہرحال حسین لگ رہی تھی۔

میں نے کہا "ملک صاحب۔ یہ کیا' اتنا زیور؟"

"اجی یہ تو ضروری ہے شادی بیاہ میں۔ آخر ہمارے مہمان ہیں آپ۔"

میں نے کہا "ملک صاحب' ہم عام دیہاتی بن کے شادی میں شریک ہونا چاہتے تھے۔"

"آپ خاص آدمی ہیں" ملک نے گویا فیصلہ کردیا۔ "اور سارے گاؤں کو معلوم ہے کہ آپ کتنے بڑے سرکاری افسر ہیں۔ یہ تو بس شغل ہے۔"

شغل کا سارا لطف تو وہیں غارت ہوگیا تھا۔ شادی والے گھر میں ہمارا پہنچنا ایک تاریخی واقعہ بن گیا۔ بالکل اسی طرح جیسے ملک کا صدر اطلاع دے کے اپنے چپراسی کے گھر پہنچ جائے۔ اس حلقے میں ہمارا پیدل جانا خود کو تماشا بنانے کے مترادف ہوتا۔ میں نے اپنی گاڑی کو احاطے میں خاص طور پر لگائے گئے خیمے کے نیچے باپردہ کھڑا دیکھا تھا۔ شادی کے لئے ہم اس جہازی کار میں بیٹھے جس کی چوڑائی گلی سے کچھ ہی کم تھی چنانچہ دونوں طرف سے ٹریفک رک گئی تھی یا روک دی گئی تھی۔

ہمارے پہنچتے ہی جیسے افراتفری پھیل گئی۔ جملہ حاضرین احتراماً صف بستہ ہوگئے اور خوش نصیب خاندان کے چیدہ چیدہ افراد پر مشتمل پندرہ بیس افراد نے نثری قصیدے پڑھتے ہوئے ہمارے گلوں میں ہار ڈال دیے۔ کسی نے ہم سے مصافحہ کرنے کی گستاخانہ جرات نہیں کی۔ پروٹوکول کے تحت یہ ممنوع ہوگا۔ ان کے لیے اور آنے والی نسلوں کے لیے یہی کم فخر اور غرور کی بات نہ تھی کہ ملک صاحب بقلم خود اپنی ذاتی گاڑی میں ایک بہت بڑے سرکاری افسر اور اس کی ولایتی بیوی کے ساتھ شادی میں شریک ہوئے تھے۔ ہمیں ایک تخت کے اوپر لگے ہوئے صوفے پر بیٹھنا پڑا۔

معلوم نہیں اس گاؤں میں ملک صاحب کے علاوہ صوفہ کس کے گھر میں تھا اور کہاں سے منگوایا گیا تھا۔ شادی کی تقریب قانونی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔ سب لوگ دبے دبے اور کچھ خائف سے تھے۔ ان کی شوخی اور خوشی، بے تکلفی اور ہلڑ بازی جو ہر شادی کو جشن طرب بناتی ہے یکسر مفقود تھی۔ نکاح خاموشی سے ہوا اور اس کے بعد کچھ لوگوں نے آپس میں گلے مل کے ایک دوسرے کو مبارک باد دی۔ چھوارے جو ایسی تقریب میں لٹائے جاتے ہیں اور شرکا بڑے جوش و خروش سے لوٹتے ہیں خصوصاً بچے، سب کے ہاتھوں پر رکھ دیے گئے اور ہمارے سامنے ایک شیشے کی پلیٹ میں لائے گئے۔ لانے والا خود دلہن کا باپ تھا۔

میں نے اسے گلے لگا کے مبارک باد دی تو وہ خوشی سے رونے کے قریب ہوگیا "کیا بات ہے۔ کچھ بلہ گلہ نہیں ہے۔ باجا شاجا کدھر ہے؟"

ملک صاحب نے ناگواری سے مسکراتے ہوئے کہا "کیا ادھر کوئی میت ہوگئی ہے جو سب کو چپ لگی ہوئی ہے؟"

مجھے بہت افسوس ہوا۔ ملک کو ایسے موقعے پر یہ بات نہیں کہنی چاہیے تھی۔ میں نے بڈھے کی دل آزاری کا تدارک یوں کیا کہ اپنی جیب سے ایک ہزار روپے نکالے اور کہا "یہ ہماری طرف سے منہ دکھائی۔"

بڈھا ڈر گیا "نہیں جناب...."

میں نے کہا "بیگم صاحبہ خود اندر جا کے دلہن کو منہ دکھائی کے بعد دیں گی۔"

بڈھے کی زبان گنگ ہوگئی۔ وہ کبھی میری طرف دیکھتا تھا کبھی ملک کی طرف۔ میں نے نوٹ رابعہ کو دے دیے "بیگم صاحبہ کو اردو پنجابی نہیں آتی مگر دعا اور مبارک باد کے لیے الفاظ نہیں جذبات ہوتے ہیں۔ جاؤ۔"

اتنی دیر میں غالباً ملک نے آنکھوں ہی آنکھوں میں بڈھے کو اجازت دے دی تھی جو اس کے لیے حکم کا درجہ رکھتی تھی۔ رابعہ اندر کیا گئی ایک قیامت آگئی۔ یہ بھی گردونواح کے دیہات کی صدیوں کی تاریخ میں پیش آنے والا پہلا واقعہ تھا جس پر سب کی عقل دنگ تھی۔

رابعہ ایک کچے گھر کی کوٹھری میں گئی اور جیسا کہ اس نے بعد میں مجھے بتایا۔ اس کوٹھری میں سے دیگر خواتین کو بڑی عجلت میں نکالا گیا۔ چند قریبی سہیلیاں جو زیادہ بہادر تھیں اور ولایتی میم کو دیسی لباس میں دیکھنے کی بہت شوقین تھیں، وہ دیوار سے لگ کے کھڑی ہوگئی تھیں۔ جب رابعہ نے دلہن کا گھونگھٹ اٹھا کے اسے پیار کیا اور گلے لگا کے ایک ہزار روپے تو سناٹا چھا گیا۔ خواتین کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ دلہن کی ماں نے زار و قطار روتے ہوئے رابعہ کے پاؤں چھونے کی کوشش کی اور اتنی دعائیں دیں کہ رابعہ گھبرا کے فوراً واپس نکل آئی۔

میرے اصرار پر گانا بجانا شروع ہوا۔ ایک ڈھول والا نفیری والا جو برات کے ساتھ آئے تھے مگر احتراماً فارغ بیٹھے تھے میدان میں اتر آئے۔ رنگین ڈھول پر خوب رنگین پھندنے چمکیلے تارے لگے ہوئے تھے اور اسے بجانے والا بھی ترنگ میں آگیا تھا۔ بہت بڑے سرکاری افسر کی فیاضی اور دریا دلی کی دھوم ہو گئی تھی چنانچہ ڈھول والا بھی بہت بڑے انعام کی توقع رکھتا تھا۔

ڈھول کے ساتھ ہی چار نوجوانوں کی ٹولی میدان میں آ گئی جو دولہا کے ساتھی تھے۔ ہم نہ آتے تو وہ بہت دھما چوکڑی مچاتے۔ اب انہیں موقع ملا تو انہوں نے دل کی بھڑاس نکالی اور ایک دم رنگ محفل شباب پر آگیا۔

جیسا کہ مجھے قوی امید تھی ملک تھوڑی ہی دیر میں اس شغل سے اکتا گیا جسے وہ طوعاً و کرہاً برداشت کر رہا تھا۔ اس کے ذہن پر یہ احساس مسلط تھا کہ وہ اپنی حیثیت اور مرتبے اور آباواجداد کی روایات کو پامال کرتے ہوئے اپنے سے کمتر اور کمین لوگوں کے گھر میں شادی میں شریک ہوا۔ شرکت کی حد تک وہ عذر پیش کر سکتا تھا کہ مجھے مہمانوں نے مجبور کر دیا تھا لیکن اب صورت حال یہ تھی کہ اس کے سامنے باادب باملاحظہ ہوشیار رہنے والے اسے نظرانداز کرتے ہوئے بے ہودگی میں مگن تھے۔ اس کی حیثیت عام تماشائی کی ہو گئی تھی۔

اس نے اشارے سے دلہن کے باپ کو بلایا "اوئے کیا تم بھول گئے ہو بڈھے کہ بیٹی کو رخصت بھی کرنا ہے۔"

اس نے ہاتھ جوڑ کے کہا "جو حکم سرکار۔"

"حکم دے پتر۔ ظاہر تو تم یہ کر رہے ہو جیسے میرے حکم کے بغیر سانس بھی نہیں لیتے۔ کیا ان مہمانوں کا پیٹ شور شرابے سے بھر جائے گا۔"

"غلطی ہوگئی عالی جاہ...."

اب میں نے مداخلت کی "ملک صاحب مزہ آرہا ہے۔ ابھی اتنی بھوک بھی نہیں ہے۔"

ملک کو جیسے میری بات پر یقین نہیں آیا "کیا آپ کھانا بھی یہاں کھائیں گے۔ کھیل تماشا دیکھ لیا۔ اب حویلی چلیں۔"

میں نے کہا "ملک صاحب یہ تو بڑی خلاف اخلاق بات ہوگی کہ ہم شادی میں شریک ہوں اور کھانا کھائے بغیر چلے جائیں۔"

"اچھا تو آپ تشریف رکھیں۔ مجھے معاف کریں" وہ اٹھ کھڑا ہوا "مجھے کچھ ضروری کام بھی تھا۔ میں گاڑی بھیج دوں گا آپ کے لیے۔"

میں نے کہا "اگر آپ کو ضرورت ہو گاڑی کی تو میری گاڑی بھیج دیں۔"

"نہیں، مجھے گاڑی نہیں چاہیے" وہ اٹھا اور سب کے بیچ سے واک آؤٹ کے انداز میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا نکل گیا۔

ایک لمحے کے لیے سب کچھ رک گیا۔ ڈھول بجانے والے کے ہاتھ، رقص کرنے والوں کے قدم۔ ساتھ دینے والوں کی مسرت آوازیں اور تماشا کرنے والوں کا انہماک۔ سب ایسے ساکت و صامت کھڑے تھے جیسے کوئی بہت ناخوشگوار واقعہ پیش آیا۔ ملک نہیں برات کا دولہا اٹھ کے چلا گیا ہے۔

میں نے آواز دے کے کہا "چلو بھئی جوانو۔ شروع ہو جاؤ پھر۔ ملک صاحب کو ایک ضروری کام یاد آگیا تھا۔"

یہ اجازت نامہ گویا تجدید شادمانی کا لائسنس تھا۔ ایک دم ڈھول والے نے ڈم ڈم کر کے دلوں کی دھڑکن اور خون کی گردش کو گرما دیا۔ لڈی ڈالنے والے پھر جوش میں آئے اور تماشا پہلے سے زیادہ ہنگامہ خیز ہوگیا۔ وہ ملک کی موجودگی سے خائف تھے میرے رویے نے انہیں احساس دلا دیا کہ میں خود دماغ افسر نہیں ہوں اور ان کی خوشی میں دل سے شریک ہوں۔

رابعہ نے مجھ سے پوچھا "ملک کیوں چلا گیا؟"

میں نے کہا "وہ اپنے نمک خواروں کا نمک کیسے کھاتا۔ کل کو وہ اسے نمک خواری کا طعنہ دیتے پھر....؟"

"تم واقعی یہاں کھانا ضرور کھاؤ گے؟"

"مجھے بتاؤ کہ تمہارے شہر میں مہمان کسی شادی میں شریک ہوں مگر کھانا کھائے بغیر چلے جائیں تو کیا میزبان اسے اپنی توہین نہیں سمجھیں گے؟ آخر ان غریبوں کی بھی عزت ہے اور دیکھو یہ کتنے خوش ہیں ہماری موجودگی سے۔ اور ابھی تم دیکھنا میں لڈی میں کیسے لوسٹ ڈانس شامل کر کے ثابت کرتا ہوں کہ مغرب اور مشرق مل سکتے ہیں۔"

"دیکھو میرے ساتھ بدتمیزی مت کرنا۔ مجھے مت گھسیٹنا۔"

"گھسیٹ لیا تو تم کیا کرو گی؟"

"میں مار بیٹھوں گی۔ بے عزتی ہو جائے گی سب کے سامنے۔ دیکھو تمہیں میری قسم۔ مجھے مجبور مت کرنا۔"

جب اس نے قسم دے دی تو میں مجبور ہو گیا۔ "یہ فاؤل کھیل گئی ہو تم۔ خیر۔"

موقع پاتے ہی میں ڈانس کرنے والی ٹولی میں شامل ہو گیا۔ لڈی کوئی بہت زیادہ مشکل رقص نہیں ہے۔ میں جسم کو مخصوص لے اور تال کے ساتھ ہم آہنگ رکھتے ہوئے دوسروں کی نقل کرنے لگا۔ وہاں ایک دم شور مچ گیا۔ یہ منظر ان سب کے لیے ناقابل یقین تھا۔ بعد میں میری حرکات مضحکہ خیز ہو گئیں کیونکہ میں ردھم (RYTHEM) میں نہیں رہا تھا۔ لوگ ہنس ہنس کے بے حال ہو گئے مگر وہ میرا تمسخر نہیں اڑا رہے تھے۔ خوش تھے اس لیے ہنس رہے تھے۔

چند منٹ میں مجھے پسینہ آگیا اور میں ہانپنے لگا۔ خود رابعہ میرے ڈانس سے بے حد محظوظ ہو رہی تھی۔ میں نے عزت کے ساتھ الگ ہو جانا بہتر سمجھا اور صوفے پر جا بیٹھا۔ اس کے ساتھ شاید تماشا ختم ہو گیا کیونکہ مہمان اب کھانے کے لیے بے چین تھے۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے وہ مجھے اور رابعہ کو ڈائیں پر ہی کھانا کھلانے کا اہتمام کر چکے تھے لیکن ہم نے عام مہمانوں میں شامل ہو کے کھانا کھایا۔ اس سے لوگ بہت خوش ہوئے۔ حویلی کے اندر تو رابعہ کا بڑا تحقیر آمیز انداز میں مذاق اڑایا جاتا تھا اور اسے بہت اشتعال انگیز قسم کی باتیں سننا پڑتی تھیں مگر یہاں رابعہ نے جتنے سنا تعریف کرتے سنا۔ سب کے لبوں پر ایک ہی بات تھی۔ کتنے بڑے لوگ ہیں اور کتنے سادہ۔ کیسے ملنسار اور نیک دل۔

میرا مقصد بھی لوگوں میں گھل مل کے اپنا کام نکالنا تھا۔ میں نے دولہا سے کہا جو بڑا گبرو جوان تھا۔ کہ کیا مجھے ایسے دو چار جوڑے مل سکتے ہیں جیسے میں نے پہن رکھے ہیں۔ پیسوں کی فکر نہیں۔ بس کل تک بندوبست ہو جائے تو میں اپنے ساتھ لے جاؤں۔ دوستوں کو تحفہ دوں گا۔ اس نے اپنے ایک دوست کو بلا کے میرا مسئلہ بیان کیا۔ اس نے کہا "سرجی، یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔"

میں نے کہا "کل کس وقت تک مل جائیں گے ایسے کپڑے۔"

اس نے سوچ کے کہا "دوپہر تک۔ ویسے یہ کپڑے خاصے مہنگے ہیں۔"

میں نے اسے ایک ہزار روپے دے "اس میں کام ہو جائے گا؟"

"بالکل ہو جائے گا جناب۔ ملک صاحب کے ڈیرے پر حاضر کروں؟"

میں نے کہا "..... صاحب کے گھر رکھوا دینا۔ میں وہاں سے لے لوں گا۔"

پھر میں نے ڈھول والے سے بات کی "استاد بڑا غضب کا ڈھول ہے۔ بجاتے بھی خوب ہو تم۔ واہ واہ۔"

وہ ہاتھ جوڑ کے دانت نکالنے لگا۔ کسی میراثی کی اتنی تعریف یہاں کون کرتا تھا "حضور کی مہربانی ہے۔"

میں نے کہا "یہ ڈھول بیچو گے؟"

وہ بھونچکا رہ گیا "جی!"

میں نے ہنس کے کہا "بابا جی ڈھول چاہیے مجھے۔ کتنے میں دو گے؟"

"سرکار۔ یہ تو روزی ہے ہماری۔" وہ گڑگڑانے لگا۔

"ڈرو نہیں۔ میں زبردستی نہیں لوں گا۔ مجھے کہیں سے لا دو۔"

"حضور۔ ایسا تو..... مشکل ہے۔ یہ تو میں نے سنگھار کیا ہے اس کا۔ ڈھول بنوانا پڑتا ہے۔"

میں نے کہا "سادہ ڈھول کسی سے مل جائے تو میں اچھی قیمت دوں گا۔ دو سو چار سو۔ مجھے تو اندازہ نہیں۔ سو اوپر ہو جائیں بے شک۔"

اب دولہا نے اسے ڈانٹ لگائی "اوئے نخرے مت کر زیادہ....

بول کتنے پیسے لے گا ڈھول کے۔ چپ کرکے صاحب کو دے دے ورنہ تیرا یہ ڈھول پھاڑ دوں گا۔ اور دیکھوں گا پھر تجھے کون بلاتا ہے یہاں۔"

میں نے کہا "نہیں بھئی۔ زبردستی مت کرو۔ چلو بابا تم بھی ہزار لے لو۔ جب تک تمہارا اپنا ڈھول نہ بن جائے گزارا کرنا۔"

"او جی مہینے کے سو کمالے یہ تو اس کا دماغ خراب ہونے لگتا ہے۔ آپ نے بہت دے دیے۔ ڈھول کا کیا ہے۔ سو، دو سو میں بن جائے گا۔ بہت لگا تو مہینہ لگ جائے گا" دولہا نے مجھے سمجھایا۔

مگر میں اسے ایک ہزار دے چکا تھا "یہ صبح ملک صاحب کے ڈیرے پر پہنچا دینا۔"

جب ہم واپس ملک کے ڈیرے پر پہنچے تو ہم سے پہلے ہماری بداعمالیوں کی داستانیں حویلی کے اندر تک پہنچ چکی تھیں۔ ملک سخت مضطرب تھا۔ خاص و عام کا فرق مٹا کے میں نے اس کے لیے جذباتی مسائل پیدا کردیے تھے۔ ظاہر ہے میرے مقابلے میں اس کا رویّہ پہلے سے زیادہ ناپسندیدہ ہوگیا تھا۔

اس نے مجھے لیکچر دینے کی کوشش کی "سر جی ان کمیں کمینوں کو منہ لگاؤ تو جینا مشکل ہوجاتا ہے۔ حاکم اور افسر لوگ اس لیے نیچے والوں سے دور رہتے ہیں۔ ان سے یاری لگائیں گے تو ان پر حکم کیسے چلائیں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا ایک مقام رکھا ہے۔ زمین نیچے ہے سورج اوپر۔ ایسے ہی..."

میں نے کہا "ملک صاحب۔ اگر تم نے خلفائے راشدین کی تاریخ پڑھی ہوتی تو تمہیں اندازہ ہوتا کہ اسلامی مساوات کیا ہے۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ حضرت عمرؓ اور ان کا غلام ایک اونٹ پر باری باری سفر کرتے تھے۔ تمہارے رواج اور طور طریقے اپنی جگہ لیکن مجھ پر یہ ثابت مت کرو کہ اسلام کی تعلیم بھی یہی ہے۔"

اگلے دن مزید بدمزگی ہوئی جب ملک کو معلوم ہوا کہ میں نے جیسے کپڑے گزشتہ رات پہنے تھے ویسے ہی منگوائے بھی ہیں اور میراثی کا ڈھول بھی خرید لیا ہے۔ وہ ہمہ وقت میرے ساتھ تھا ورنہ یہ سمجھتا کہ میں نے بہت پی لی ہے اور یہ سب کچھ میں نے نشے کی حالت میں کیا ہوگا۔ اسے اندازہ ہوچکا تھا کہ میں دوسری قسم کا افسر ہوں جو "مولوی ٹائپ" ہوتے ہیں۔ رابعہ نے اندر کی رپورٹ دی۔ خواتین یقین کرنے پر تیار نہیں تھیں کہ میں نے لڈی ڈالی۔ سب کے ساتھ نمکین اور میٹھے چاول کھائے اور میراثی سے دوستوں کی طرح بات کرتا رہا۔ ان سب کے خیال میں میرے دماغ کا کوئی پیچ ڈھیلا تھا۔ چھوٹی بیگم نے تو یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ بوتل میری جیب میں ہوگی اور میں چھپ چھپ کے پیتا رہا یہاں تک کہ نشے میں آؤٹ ہوگیا۔

ملک کو یہ معلوم ہوتا تو نہ وہ ہمیں شادی میں لے جاتا اور نہ خود جاتا۔ شاید وہ شادی ہی ملتوی کرا دیتا۔ اس کی پوزیشن بڑی خراب ہوگئی تھی۔ اس کا ظلم سہنے والی رعایا کے سامنے مثالی حاکم کا ایک نمونہ آگیا تھا جو فرعون صفت نہیں تھا بلکہ ان کا دوست، ہمدرد اور عالی ظرف تھا۔ ملک نے بعد میں ان کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ یہ ہمیں کبھی معلوم نہ ہوسکا۔ شاید وہ ان پر گرجا برسا ہوگا کہ مجھ سے پوچھے بغیر اور میری اجازت کے بغیر تم نے اس کی ہر بات کیوں مانی؟ میراثی کو جوتے مارے ہوں کہ تو نے ڈھول بیچ دیا؟ اب تیری کھال کا ڈھول بنوا کے دیتا ہوں۔ تو انکار نہیں کرسکتا تھا کہ ملک صاحب سے پوچھو۔ اور لنگی کرتا پگڑی لانے والے سے کہا ہوگا کہ نمک حرام! تو نے ہمارے مہمان سے پیسے لیے؟ کیا ہم اسے ایسے سو جوڑے نہیں دے سکتے تھے؟ اور یہ مولوی تیرا کیا لگتا ہے کہ تو نے اس افسر کے کہنے پر جوڑے وہاں رکھوائے؟

جھلایا ہوا حاکم کسی بھی بہانے رعایا کو ناکردہ گناہوں کی سزا دے سکتا ہے۔ قصور سارا میرا تھا مگر غصہ شاید اس نے کمزور بے بس لوگوں پر اُتارا ہوگا۔ اگلے دن ہماری روانگی سے قبل اس نے تحائف کا ایک انبار پیش کرکے اپنی حیثیت سے ہمیں مرعوب کرنے کی کوشش کی۔

اس نے وہ لباس مجھے پیش کیا جو میں شادی میں پہن کے گیا تھا۔ میں نے شکریے کے ساتھ قبول کرلیا۔ رابعہ کے جوڑے کی حد تک بھی سب ٹھیک تھا مگر اس نے کہا کہ لباس کے ساتھ سارے گہنے بھی جائیں گے تو میں نے انکار کردیا۔

"یہ ہماری ریت ہے جناب عالی۔"

"ہوگی.... مگر تحفہ حد سے بڑھ جائے تو رشوت کہلاتا ہے۔ پندرہ بیس ہزار کا سونا دینے کا مقصد؟"

"پندرہ بیس کہاں جی۔ دو چار ہزار کی چیز کی کیا حیثیت ہوتی ہے۔" اس نے جانتے بوجھتے زیور کی قیمت کم بتائی۔ "ہمارا تو کوئی کام نہیں ایسا کہ ہم رشوت دیں۔ آپ تحفہ ہمارے منہ پر مار کے ہمیں بے عزت کرنا چاہتے ہیں تو آپ کی مرضی۔ آپ بڑے افسر ہیں، جوتے بھی مار سکتے ہیں ہمیں۔ ہم بھی کوئی فقیر نہیں ہیں۔ اپنی حیثیت کے مطابق تحفہ دیتے ہیں۔"

میں مجبور ہوگیا۔ میرے پاس ایسی کوئی چیز نہیں تھی جو میں اسے تحفے میں پیش کرکے حساب برابر کرسکتا پھر رابعہ نے مجھے ایک ترکیب سمجھائی۔

رخصت ہونے سے پہلے میں نے کہا "ملک صاحب۔ اپنے سب بچوں کو بلوائیں، میں تو ان سے ملا ہی نہیں۔"

ملک نے سب کو حاضر کردیا۔ جب وہ سب کا تاریخ جغرافیہ بتا کے ہمیں سلام کروا چکا تو میں نے ہر بچے کو دو دو ہزار روپے دیے۔

"یہ.... یہ آپ کیا کررہے ہیں جناب عالی" ملک نے احتجاج کیا۔

"یہ ہماری ریت ہے" میں نے کہا "جب ہمارے گھر بچّہ مہمان آتے تھے تو اپنی اپنی استطاعت کے مطابق جاتے وقت بچوں

...کرجاتے تھے اب تم نہیں بولوگے۔"

...تھلایا مگر میں نے حساب برابر کردیا تھا۔ شام ہوتے ...سے نکلے تو سارا گاؤں ہمیں الوداع کہنے کے لیے ...ان میں چانن دین بھی تھا، پیش امام بھی۔ ایک نوبیاہتا ...دلہا کے ساتھ کھڑی رو رہی تھی۔ شاید ہم جیسا دیوانہ پھر ...گاؤں میں نہ آیا ہوگا۔ ہمارے چرچے رہے ہوں گے۔ ...بیت کھلی ہوگی کہ ابراہیم نام کا تو منگلا ڈیم پر کوئی انجینئر ...تھا تو لوگوں نے کہا ہوگا کہ "وہ تو فرشتے تھے فرشتے۔ غیب ...ہوئے تھے۔ میراثی سے ملک صاحب تک سب کا دل ...لے گئے۔" اس گاؤں میں دو دن کا قیام ایسا دلچسپ اور ...تھا جس کی یاد نے مجھے ہمیشہ بے چین کیا۔ میں نے ...چاہا کہ ایک بار پھر وہاں جاکے دیکھوں۔ چانن دین زندہ ہے ...مرگیا؟ مولوی صاحب کی بیٹی کی رخصتی ہوئی یا نہیں۔ اس ...کے کتنے بچے ہیں جس کی شادی ہماری شرکت سے تاریخی ...لیکن میں کبھی وہاں نہ جاسکا۔

...میں رابعہ بھی اُداس تھی "کیسے خواب کی طرح لگتا ہے ...کل شام کتنی رونق تھی۔"

میں نے کہا "یہ ہماری دنیا نہیں تھی رابعہ۔ عالمِ آزادگاں ہے ...جہاں سب سے الگ۔ سندباد نے کتنے سفر کیے تھے۔ ہر سفر ایسا ...کسی نئی حیرت انگیز دنیا کا تجربہ۔"

"سندباد کا اب کیا ارادہ ہے؟" رابعہ بولی۔

"آج تو کچھ نہیں کرنا۔ کل جمعہ ہے۔ چوہدری صاحب کے ...مسنونہ میں شرکت پہلے سے طے ہے۔"

اس رات ہم نے لاہور کے ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ میرا ...آنے والے دن کی منصوبہ بندی میں اُلجھا ہوا تھا۔ رابعہ جانتا ...تھی کہ آخر میں کیا سوچ رہا ہوں مگر کسی نتیجے پر پہنچے بغیر میں ...کچھ بتانے کے موڈ میں نہیں تھا۔

رات کے بارہ بجے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کیس میں مجھے ...کی مدد لیے بنا چارہ نہیں۔ میں نے آپریٹر کو وقار کے گھر کا نمبر ...ا۔

"...کال ہوگی۔ صرف مسٹر غالب کے لیے" میں نے کہا۔

"یہ تو لوکل کال ہے سر" آپریٹر نے کہا۔

"میرا مطلب ہے کہ مسٹر غالب نہ ہوں تو کال ملانے کی ضرورت نہیں۔"

"آپ بات کریں گے؟"

"...مسز کاجل شیخ بات کریں گی۔"

...ہوٹل میں اپنا نام اکرام شیخ لکھوایا تھا۔ چند منٹ بعد ...اور فون رابعہ نے اُٹھا کے کہا "ہیلو..." اور ریسیور مجھے ...ظاہر ہے غالب نے رابعہ کی آواز پہچان لی تھی۔

"رابعہ۔ ہیلو... رابعہ...."

میں نے کہا "رابعہ کے بچے۔ شور مت کرو۔ ابھی سب کو اُٹھا دے گا۔ تیرے کان خراب ہیں کہ دماغ۔ مردانہ اور زنانہ آوازوں میں فرق نہیں کرسکتا۔"

"سکندر۔ کاش کوئی ایسا فون ایجاد ہوجائے کہ اِدھر سے جوتا مارا جائے تو دوسری طرف بات کرنے والے کے منہ پر لگے۔"

میں نے کہا "جیسے راکٹ نشانے پر مارے جاتے ہیں ایسے ہی راکٹ والے جوتے میں ایجاد کررہا ہوں۔ مگر ابھی جو میں کہہ رہا ہوں وہ غور سے سُن۔ تیرے علاوہ یہ بات کسی کو معلوم نہیں ہونی چاہیے ورنہ...."

"ورنہ کیا۔ ابے بھگوڑے ہمیں دھمکی دیتا ہے۔ ہماری بہن کو بھگا کے لے گیا۔ تیری تو..."

میں نے کہا "خواہ مخواہ سالا مت بن میرا۔ میں نے دوست سمجھتے ہوئے تجھ پر اعتبار کیا ہے۔"

"کوئی کام ہوگا ضرور۔"

"ظاہر ہے۔ دوست اور کب کام آتے ہیں۔"

"تجھے معلوم ہے سب کو کتنا دکھ ہے اور کتنا غصہ ہے؟ رابعہ سے ہرگز یہ اُمید نہیں تھی کہ وہ بھی تیرے ساتھ فرار ہوجائے گی۔ وہ تو خود بڑی مخالفت کررہی تھی۔ کون سا جادو کردیا اس پر؟"

"اسے محبت کا جادو کہتے ہیں" میں نے ہنس کے کہا۔

"اچھا اب تم لیلیٰ مجنوں یقیناً صحرا میں مارے مارے پھروگے۔ میں پتا بتا دیتا ہوں۔ ایک تو اپنا تھر کا ریگستان ہے۔ دوسرا چولستان کا علاقہ بھی موزوں ہے۔ اونٹ وغیرہ کرائے پر مل جاتے ہیں۔ چڑھنے کے لیے سیڑھی...."

"اپنی بکواس بند کریں آپ تو میں کچھ فرماؤں۔ جو خبر میں پریس کے ایک معزز رکن اور سینئر صحافی کو سُنانے والا ہوں۔ وہ خصوصی ہے یعنی آپ کی زبان میں اسکوپ SCOOP اور وہ بھی EXCLUSIVE۔ یہ خبر سُن کے آپ اُچھل پڑیں گے تو اچھلتے ہوئے خیال رکھیں کہ زیادہ اوپر جاکے چھت سے نہ ٹکرائیں اور گریں تو فرش پر۔ عرش پر نہ جائیں۔"

"کیا ہوا آخر؟ رابعہ سے شادی کرلی تُو نے؟ یا تُو نے رابعہ کے چاند سے بیٹے کو جنم دیا ہے؟"

میں نے کہا "اپنے چوہدری دلاور صاحب کل عقدِ ثانی فرما رہے ہیں۔"

"میں نہیں اُچھلا۔ اس کا عقدِ ثانی بہت پہلے ہوگیا تھا۔ اس کی بیوی نمبر دو کراچی میں ہے۔ وہ سمجھتا ہے کسی کو معلوم نہیں۔ مجھے پتا بھی معلوم ہے۔"

"او کے۔ اب میں اُچھلتا ہوں حیرت سے" میں نے کہا "ایسی صورت میں آپ کل عقد کا سوئم سمجھ لیں۔"

"کہاں ہورہی ہے یہ سوئم کی تقریب؟"

"کالا شاہ کاکو میں۔ کالیا کی بہن سے۔" میں نے کہا "اس کی

بھی ایک اسٹوری ہے۔ مختصراً یہ کہ کالیا مقروض تھا۔ دلاور نے کہا کہ یا تو رابعہ کو اٹھالاؤ یا اپنی بہن دے دو۔ پہلی کوشش رائیگاں گئی۔ اب وہ دوسری شرط پوری کرے گا۔ میرا خیال ہے کہ یہ شادی نہیں، محض شادی کا ڈراما ہوگا۔ کچھ عرصے بعد کالیا کی بہن منہ کالا کرا کے روتی پھرے گی اور دلاور اسے پہچاننے سے بھی انکار کردے گا۔ عین ممکن ہے جھوٹے نکاح سے بلیک میلنگ کے الزام میں لڑکی کو اندر کرادے۔ وہ بس اس کی عزت سے کھیلنا چاہتا ہے۔"

"پھر ہم اور آپ کیا روک سکتے ہیں دلاور کو؟"

میں نے کہا "ہم تو براتی ہوں گے۔ عین وقت پر کالیا قرض کی رقم دلاور کے منہ پر مارے گا اور کہے گا کہ یہ شادی نہیں ہوسکتی۔ اب دو تین جیالے صحافی ہوں جو براتی کے بھیس میں اندر پہنچ جائیں۔"

"دلاور کہاں گھسنے دے گا انہیں۔"

"وہ سب طے ہے۔ لڑکی کے چاچے مامے ہوں گے سب۔ جو بھی تیرے ساتھ ہو وہ پہلے تو کیمرا چھپا کے لائے۔ پھر عین وقت پر تصویریں اتارے، جب اپنے چوہدری دلاور سرا باندھے نمودار ہوں۔ وہ چونکے گا۔ وہ ڈرے بغیر اس سے کھٹا کھٹ سوال کریں اور مار دھاڑ کے لیے تیار رہیں۔ ہم تو خیر شیر کی دھار میں جارہے ہیں۔ اگر نازو بھی ثواب دارین کے لیے اس کار خیر میں شریک ہونا چاہے تو اس کی مرضی۔"

"تم ہو کہاں۔ اس مسئلے پر مزید تفصیلی گفتگو ضروری ہے۔"

میں نے کہا "میں پتا بتا دیتا ہوں لیکن غالب۔ بات اعتبار کی ہے۔ اگر رازداری میں فرق آیا تو آئندہ میں رابطہ نہیں کروں گا خواہ کچھ بھی ہوجائے۔"

"یار خوامخواہ مت دھمکی دو۔ میں اکیلا آؤں گا۔"

"کوئی سن تو نہیں رہا ہے؟"

"میں سن رہا ہوں۔ ممکن ہے آپریٹر بھی سن رہا ہو۔ یا سن رہی ہو۔"

میں نے اسے پتا سمجھا دیا اور وہ صبح ہمارے جاگنے سے پہلے ہی پہنچ گیا۔ میں نے وہ پوری اسکیم اسے بتادی جس پر میرے اور کالیا کے درمیان اتفاق ہوچکا تھا۔

"براتیوں کے لباس گاڑی میں پڑے ہیں" میں نے کہا۔

"ڈھول سے کیا ہوتا۔ اس کے مسلح محافظوں سے کیسے نمٹیں گے وہ سب کو اندر ہی مار کے گاڑ دیں گے۔"

"ہم چوڑیاں پہن کے نہیں جارہے ہیں۔ سب مسلح ہوں گے۔ سب کا مطلب ہے میں اور تم، رابعہ اور نازو۔ اور یہ جو تمہاری صحافی برادری کے جیالے آئیں گے کیا وہ اپنی حفاظت کا بندوبست کرکے نہیں آئیں گے۔ کسی کو بتادیں کہ ہم فلاں جگہ جا رہے ہیں۔ رات تک واپس نہ آئیں تو پولیس کے ساتھ پہنچ جائیں۔"

"ٹھیک ہے۔ یہ سب تو میں کرلوں گا۔ وہاں جاؤ گے کیسے؟"

"ایک ہی تانگے میں" میں نے کہا۔

"وقار کی گاڑی کیا بیچ کھائی؟"

"ضرورت پڑے گی تو بیچ بھی دیں گے۔ ابھی تو پڑی ہے۔"

"کیا دلاور تمہیں پہچانے گا نہیں؟"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا" میں نے کہا "میں شرط لگانے کو تیار ہوں۔"

"بیٹے۔ سو حرامی مرے ہوں گے تو دلاور پیدا ہوا ہوگا۔ اس کی آنکھ ایکسرے کرلیتی ہے۔ تم شرط ہار جاؤ گے۔"

"اگر اس نے مجھے پہچان لیا تو میں تین بار گدھے کی آواز نکال کے کہوں گا کہ میں گدھا ہوں" میں نے کہا "ورنہ آپ۔"

"یہ کیا شرط ہوئی۔"

"جیتنے والا یہ مطالبہ کہیں بھی کرسکتا ہے۔ مثلاً پہلی بار شادی کی تقریب میں جہاں سیکڑوں معزز مہمان ہوں۔ دوسری بار کسی فرسٹ کلاس ریسٹورنٹ میں ڈنر کرتے ہوئے اور تیسری بار کسی مجمع عام میں مثلاً محفل موسیقی میں یا سینما میں۔"

غالب نے ہنس کے ہاتھ ملایا "پھر منظور۔ ہر موقعے پر ہارنے والا یہ اعلان تین بار کرے گا۔"

"اب آپ تشریف لے جائیں" میں نے کہا "وقار ہوتا تو اس کی بیوی کو شک نہ ہو۔ نہ منظر کو پتا چلے اور نہ محسن یا کلیم کو۔"

غالب نے سر ہلایا "فوزیہ کو پھر دھمکی ملی ہے۔"

میں نے کہا "کل ہم دلاور کے سالے کو اٹھالیں گے۔"

"یعنی مسٹر نیکا گڈی کو" غالب نے کہا "مگر کیا اسے سالے سے بہت محبت ہے؟"

"سوال محبت کا نہیں۔ اہمیت کا ہے۔ ساری خدائی ایک طرف، جورو کا بھائی ایک طرف۔ دلاور کی اصلی تے وڈی بیوی قیامت ڈھادے گی۔ باقی معاملات میں سنبھال لوں گا۔ تم کل محسن سے کہہ دو کہ کچھ دن کے لیے روپوش ہوجائیں۔ کراچی چلے جائیں اکرام شیخ کے پاس۔ فوزیہ کو اور اس کے شوہر کو بھی ساتھ لے جائیں تو اور اچھا ہے۔"

"کراچی کیوں؟"

"اس لیے کہ شاید میں بھی کراچی جاؤں۔" میں نے کہا "اچانک مجھے اپنے چوہدری دلاور صاحب کی دوسری بیوی کا اشتیاق مجبور کر رہا ہے۔"

وہ کچھ دیر اور ٹھہرا۔ میں نے اسے گاؤں میں گزرے دنوں کا احوال سنایا۔ وہ بہت ہنسا۔ اس نے ناشتا ہمارے ساتھ کیا اور پھر رخصت ہوگیا۔ وہ صبح صبح گھر سے نکل آیا تھا "تازہ دم"

بھی گھر سے بھاگ گیا۔ تم نے ریت جو ڈال دی ہے۔"

میں نے کہا "یار وہ شبلی کے کیس کا کیا بنا؟"

"وہ آگے چلا گیا۔ اب معاملہ برٹش کونسلیٹ اور وزارت کے درمیان ہے۔ دلاور کے ہاتھوں کے تو الو اڑے ہوئے ہیں تو اس کے فرشتے بھی کوچ کریں گے۔ اس نے اپنے آدمی چھوڑ رکھے ہیں کہ قبر کا پتا چلاؤ۔ میں نے اپنا جاسوسی نظام جوڑ رکھا ہے جو مجھے اس کی ناکامی اور پریشانی کی خبریں دیتا رہتا ہے۔"

میں نے کہا "اس کالے کی حفاظت ضروری ہے جو دلاور کے قتل کے الزام کا عینی گواہ ہے اور اس کے جرم کی سزا کاٹ رہا ہے۔"

"ہم نے کیس کی ایک نقل برطانیہ میں کاؤنٹی جیل کے حکام کو بھی بھیجی ہے کہ اس قیدی کی حفاظت کی جائے۔ وہ دوہرے قتل کے الزام میں سزا کاٹ رہا ہے۔ اب اصل قاتل کے بے نقاب ہونے کا خطرہ ہے تو ممکن ہے کوئی عینی گواہ کو ختم کرنے کی کوشش کرے۔"

"ویری گڈ۔ پکا کام کیا ہے تم لوگوں نے۔ دلاور اس بار پھنس گیا" میں نے کہا "یہاں بھی دو افراد کی حفاظت ہونی چاہیے۔ ایک ایمبولینس ڈرائیور کی جو شبلی کی لاش لایا تھا اور جس نے لاش دی تھی۔ دوسرے اس خبیث پوتے کی جس نے دادی کی لاش دے کے شبلی کی لاش دفن کرادی تھی۔ دلاور کے لیے ان کو مروانا مشکل نہیں ہوگا۔"

"منظر نے آئی جی کو مطلع تو کردیا ہے مگر ہمارے ملک میں پولیس محض خطرے کی صورت میں کچھ نہیں کرتی۔ ان کا تو اصول ہے کہ بندہ قتل ہوجائے تو پھر کریں گے تفتیش۔ ایسے کسی کے خطرہ ظاہر کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ ہر بندے کے ساتھ گارڈ تو لگائی نہیں جاسکتی۔"

"اس کا مطلب ہے، وہ مارے جائیں گے۔" میں نے مایوسی سے کہا۔

"ہاں۔ دلاور کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ اور قانون بہت کمزور ہے۔ ہم کیا کرسکتے ہیں" غالب نے ہاتھ پھیلا کے کہا۔

غالب چلا گیا اور پھر ایک بجے نازو کے ساتھ آیا۔ گلے شکوے اور پھر رونے دھونے کا راؤنڈ ختم ہوا تو میں نے کہا کہ وقت کم ہے۔ بتاؤ کہ برات روانہ کہاں سے ہوگی۔ غالب نے اپنے ایک صحافی دوست کے گھر میں سارا انتظام کیا تھا۔ ہم گاڑی میں بیٹھ کے دس منٹ میں اس کے گھر پہنچ گئے۔ وہ غیر شادی شدہ تھا اور اکیلا ہی رہتا تھا۔

"یہ غازی ہے فی الحال۔ بہت جلد شہید ہوجائے گا۔" غالب نے مسکراتے ہوئے کہا "اس کے کرتوت ایسے ہی ہیں۔"

اس کا نام واقعی غازی تھا۔ میں نے کہا "غالب نے سب بتادیا ہے آپ کو... کہ معاملہ کیا ہے؟"

وہ چھ فٹ چار انچ قد کا تیم شحیم آدمی تھا "اجی ہم تو آپ کے بارے میں بھی سب جانتے ہیں۔ آپ فکر ہی نہ کرو۔ آج ڈنکا بجادیں گے۔"

ڈنکا بجادیں گے اس کا تکیہ کلام تھا۔ وہ ایک مشہور انگریزی اخبار کا چیف رپورٹر تھا اور سنسنی خیز انکشافات کے چکر میں کئی بار پٹ چکا تھا۔ اغوا ہوچکا تھا مگر وہ صحافت کو جہاد سمجھتا تھا۔ وہ بلیک میلنگ کرتا تو انہی سے لاکھوں وصول کرلیتا جن کے چہرے وہ بے نقاب کرچکا تھا مگر وہ انتہائی فضول قسم کے کباڑ خانے میں اکیلا رہتا تھا اور اس کا سو روپے ماہانہ کرایہ دیتا تھا۔

"صرف سو روپے!" میں نے حیرانی سے کہا۔

"دراصل یہ رعایت صرف مجھے حاصل ہے" وہ بولا "ایک تو میں نے وعدہ کر رکھا ہے کہ مالک مکان کو کبھی پریشان نہیں کروں گا۔ خصوصاً کرائے کے معاملے میں۔ دوسرے میں اس کے کسی کرائے دار کو تھانہ کچہری نہیں کرنے دوں گا۔ اس کے بہت سے مکان ہیں جو کرائے پر اٹھے ہوئے ہیں۔ سب وقت پر کرایہ دیتے ہیں اور نوٹس ملتے ہی خالی کرجاتے ہیں۔ راتوں رات پولیس میرے کہنے پر انہیں دور چھوڑ آتی ہے۔ اس مشورے کے ساتھ کہ اب کیس کرکے اپنا خانہ خراب مت کرنا۔"

"یعنی تم بدمعاشی سے مکان خالی کراتے ہو۔"

"شرافت کا زمانہ کہاں ہے بھائی۔ لوگ مالک مکان کو سالوں کھینچتے ہیں عدالتوں میں۔ قانون کس کا ساتھ دیتا ہے۔ یہ تم مجھ سے زیادہ جانتے ہو۔ ہمیشہ شریف اور غریب آدمی مارا جاتا ہے۔" غازی نے کہا۔

غازی نے ایک میک اپ مین کا بندوبست بھی کر رکھا تھا۔ جب ہم سب دیہاتی خلعت فاخرہ پہن چکے تو اس نے اپنا کام شروع کیا۔ رابعہ اور نازو نے تو گھونگھٹ نکال لیے۔ خود غازی اور غالب نے عام قسم کی داڑھی مونچھ کو کافی سمجھا مگر میری باری آئی تو میک اپ مین کو خاصی محنت کرنی پڑی۔ میں ساٹھ ستر سال کا سفید داڑھی، سفید بالوں اور بھوؤں والا بابا نظر آنا چاہتا تھا۔ یہ کام اس کے لیے چیلنج بن گیا تھا تو میرے لیے بھی۔ غالب نے متعدد بار اصرار کیا کہ بھئی اب بس کرو۔ دیر ہورہی ہے مگر میں اطمینان سے خامیاں دور کراتا رہا۔ اگر دلاور مجھے پہچان جاتا تو فوری طور پر وہاں جو بھی ہوتا اس سے نمٹنے والے ہم سب تھے مگر بعد میں شرط ہارنے کی پاداش میں مجھے نہ جانے کہاں اور کس کس موقعے پر ڈھینچوں ڈھینچوں کرکے اعلان عام کرنا پڑتا کہ حضرات و خواتین۔

گو سر پہ نہیں سینگ دو پیروں پہ کھڑا ہوں
انسان نظر آتا ہوں لیکن میں گدھا ہوں

جب میں مطمئن ہوگیا تو غازی نے میرا یوں معائنہ کیا جیسے خریدار قربانی کے بکرے کو دیکھتے ہیں "ویسے تو سب ٹھیک ہے لیکن"

جوانی تمہاری آنکھوں سے جھانکتی ہے بلکہ پکارتی ہے۔"

میں نے کہا "کیا کروں آخر میں اس جوانی دیوانی کا۔"

"تم گول شیشوں والا سیکنڈ ہینڈ چشمہ پہن لو۔ راستے میں کہیں سے خرید لیں گے۔"

"غازی، تم ہم پیشہ ہو کے مجھ سے دغا کر رہے ہو" غالب نے آہ بھری "اگر میں شرط ہار گیا تو سوچو تمہاری کتنی بے عزتی ہوگی۔"

"میری کیوں بھائی....؟"

"اس لیے کہ تم بھی صحافی ہو۔ جب ایک صحافی چلّا چلّا کے کہے گا کہ میں گدھا ہوں تو سُننے والے کیا نتیجہ اخذ کریں گے۔"

"سُننے والوں میں نو بے وقوف ہوں گے۔ ان کی مجھے یا تمہیں پروا نہیں کرنی چاہیے۔ دسواں عقل مند ہوگا۔ وہ تمہاری بات سے متاثر نہیں ہوگا۔"

"یہی تو تم نہیں سمجھتے۔ وہ دسواں آدمی میں خود ہوا تو باقی نو میں تم جیسے شامل ہوں گے۔" غالب نے آہ بھری۔

ہم ایک بجے دو تانگوں میں لد کے روانہ ہوئے۔ پہلے تانگے میں پیچھے خواتین یعنی رابعہ اور نازو تھیں۔ آگے ان کا دادا نظر آنے والا خاکسار ڈھول سمیت تشریف فرما تھا۔ ہمارے دیہاتی لباس کے اندر ریوالور تھے اور یہ برات "ٹروجن ہارس" (TROGEN HORSE) کی طرح تھی۔

تاریخ میں ٹروجن ہارس بہت مشہور ہے۔ یونان کی دو ریاستوں کے درمیان جنگ میں محاصرہ طول کھینچ گیا تو ایک عقل مند نے یہ مشورہ دیا تھا کہ لکڑی کا ایک دیو ہیکل گھوڑا بنایا جائے جس کے پیٹ میں پچاس سپاہی بیٹھ جائیں اور اس کی ٹانگوں میں پہیے ہوں۔ جب گھوڑا تیار ہو گیا تو فوج نے محاصرہ اُٹھالیا۔ شہر والے بہت خوش ہوئے کہ راتوں رات دشمن بھاگ گیا۔ وہ فتح کا جشن مناتے ہوئے گھوڑے کو شہر میں کھینچ لائے اور جلوس کی شکل میں لیے پھرے۔ رات ہوئی تو گھوڑے کے اندر سے پچاس سپاہی نکل آئے۔ انہوں نے پہرے داروں کو قتل کیا اور شہر پناہ کے دروازے کھول دیے۔ ان کی اپنی فوج رات کو لوٹ آئی اور سیدھی شہر میں داخل ہو گئی۔

ہم بھی اسی طرح دلاور کے قلعے میں داخل ہوئے جہاں حفاظتی انتظام اتنا سخت تھا کہ پرندہ پر نہیں مار سکتا تھا۔ وہ خود ہمیں بڑی عزت احترام کے ساتھ اندر لے گیا۔ حسب توقع ساڑھے تین بجے کالیا منہ لٹکائے رونی صورت بنائے گیٹ پر موجود تھا۔ نیلی پگڑی دیکھتے ہی اس نے دلاور کے ساتھ آگے بڑھ کے ہمارا استقبال کیا۔

میں نے کالیا کو گلے لگالیا۔ "یہ کیا ہے پتر۔ ایسے فٹافٹ شادی..."

اس نے مؤدب ہو کے کہا "دادا جی۔ مجبوری تھی۔ اور پھر اچھا رشتہ روز کہاں ملتا ہے۔ یہ اپنے چوہدری صاحب بڑے چنگے آدمی ہیں۔"

دلاور نے کہا "سلام بابا جی۔"

میں نے کہا "کیا کرتا ہے اپنا دلاور..."

کالیا نے میرے کان میں چلّا کے کہا "بہت بڑا کاروبار ... کا۔"

میں نے آواز بدلنے کے ساتھ ہاتھوں میں تھوڑا سا رعشہ ... پیدا کر لیا تھا۔ کانپتے ہاتھوں سے میں نے دلاور کو پھر گلے ... اپنا اطمینان کر لیا کہ اس کے پاس کوئی ریوالور نہیں ہے ... دولہا بنا ہوا تھا۔ کورے لٹھے کی شلوار کے ساتھ اس نے ... شیروانی پہنی تھی اور قراقلی ٹوپی۔ اس کے گلے میں ہار بھی تھے۔

کالیا نے حاضر دماغی سے کام لیا "یہ میرے ماما جی ہیں" ... نے غالب کو چوہدری دلاور سے ملوایا اور غالب نے بھی اس کے ساتھ ماموں جیسا سلوک کیا اور اسے جپھی ڈال کے خوب دبایا ... بھی تصدیق کرنا چاہتا تھا کہ اندر کوئی ریوالور جیسی سخت چیز ... نہیں۔ غازی کو چاچا قرار دیا گیا۔ وہ لحیم شحیم تھا اور اس نے ... محبت میں دلاور کو ایسا نچوڑا کہ برداشت کرنے کے باوجود دلاور کی ... نکل گئی۔ رابعہ اور نازو نے مامی اور چاچی کا منصب قبول کرتے ہوئے دولہا کو دعائیں دیں۔

"چلیں جی، اندر چلیں" دلاور نے گھڑی دیکھ کے کہا۔

میں نے کہا "اوئے ابھی ٹھہر پتر۔ یہ جنج ہے کوئی جنازہ نہیں ... ہے کہ خاموشی سے سب ہو جائے۔"

چاچا یعنی غازی نے کہا "ابا جی خود ڈھول بجائیں گے ... بہت عرصے بعد..."

غالب بولا "ہاں جی۔ ہمارا تو یہ پیشہ ہے۔"

"تم.... تم لوگ میراثی ہو...." دلاور کا موڈ خراب ہو گیا۔

"آہو پتر۔" میں نے ڈھول گلے میں لٹکا کے کہا "اپنے تو ... دادا بھی بینڈ بجاتے تھے۔ گوروں کی پلٹن میں۔ چلو بھئی جوانو ... شاوا۔"

ایک سیدھی پتلی چھڑی اور دوسری قدرے خم دار۔ درانتی ... جیسی لکڑی سے میں نے ڈھول کی پٹائی شروع کی۔ پہلے تو تال ... ہوئی مگر غازی نے بات بنائی کہ ابا جی کے ہاتھ قابو میں نہیں رہے ... پھر میں نے اکھاڑوں کی مخصوص تال پر ڈھول بجانا شروع کیا ... تک تک دھن نا۔ غالب اور غازی نے منہ پر ہاتھ رکھ کے "بیا...با...بابا" کی آوازیں نکالیں اور پھر ہاتھ اُٹھا کے ڈانس کرتے ہوئے اندر چل پڑے۔

دلاور اس ہنگامہ آرائی سے بہت پریشان نظر آرہا تھا ... اِدھر اُدھر کے بہت سے لوگ تماشا دیکھنے کے لیے رک گئے تھے ... ڈھول کی آواز سُن کے عورتیں اور بچے چھت پر نمودار ہو گئے ... اس کا خیال تھا کہ سارا کام خاموشی سے ہو جائے۔ کسی کو پتا ... نہیں چلے گا اور نکاح کا ڈراما ختم ہو جائے گا۔

اس نے کالیا سے کہا "تم نے پہلے نہیں بتایا تھا کہ یہ ...

... بھی ساتھ ہوگا۔"

"... چوہدری صاحب! آخر جنج ہے" وہ بولا "اور اپنے دادا ... کوئی روک سکتا ہے۔"

... کوٹھی نئی تعمیر شدہ تھی اور اس کی آٹھ فٹ بلند دیواروں پر ... شیشوں کے نوکیلے ٹکڑے جڑ دیے گئے تھے۔ گیٹ پر کوئی ... چوکیدار نہیں تھا مگر اندر مجھے استاد پیڈرو کے علاوہ تین افراد ... نظر آئے۔ وہ صورت سے ہی شکاری کُتے لگتے تھے اور تھوتھنی ... یوں دیکھ رہے تھے جیسے خطرے کی بو سونگھنے کی کوشش کر رہے ہوں۔

ہم سب کو ایک وسیع ہال جیسے ڈرائنگ روم میں لے جایا گیا۔ ... کوٹھی کی تزئین و آرائش کا سلسلہ جاری تھا۔ یہ نئی کوٹھی ... دلاور کے پرانے گھر کے مقابلے میں کہیں زیادہ وسیع، خوب صورت اور پُرشکوہ تھی۔ یہ ہو سکتا تھا کہ اس نے اپنی نئی بیوی کو بھی ... رکھنے کے لیے یہ کوٹھی بنوائی ہو۔ ابھی کھڑکیوں پر پردے ... تھے اور فرش پر صرف قالین نظر آرہا تھا۔ ایک دیوار کے ... پلنگ جیسا تخت لگا دیا گیا تھا جس پر ایک دُبلا پتلا چگی داڑھی ... مگر ہونق نظر آنے والا مولوی رکھا ہوا تھا۔

سہرا باندھ کے دلاور اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ میں بڑے زور شور سے ڈھول کوٹتا رہا۔ ہال میں اس کی گونج کان کے پردے پھاڑ ... تھی مگر میں کسی خبطی بڈھے کی طرح اپنے کام میں لگا ہوا تھا۔ ... ہے لیے اپنی خوشی کو چھپانا مشکل ہو رہا تھا۔ دلاور نے مجھے نہیں پہچانا تھا اور غالب کی صورت پر شرط ہار جانے کے خیال سے بارہ بجے ہوئے تھے۔

بالآخر غازی نے چلّا کے کہا "بس کرو ابا جی۔"

میں نے کہا "کیوں بس کروں۔ تو کون ہوتا ہے مجھے بس کرانے والا۔"

اس نے کہا "اب نکاح کے وقت تو ڈھول نہیں بجاتا۔"

میں نے ہاتھ روک لیا "نکاح ہو رہا ہے.... اچھا اچھا.... کون پڑھائے گا۔"

"یہ مولوی صاحب بیٹھے ہیں" غالب نے کہا۔

میں نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ کے غور سے دیکھا "یہ... یہ تو منڈا ہے کوئی۔ بغیر داڑھی کا۔"

غازی نے کہا "ابا جی۔ داڑھی ہے۔ ذرا چھوٹی ہے۔"

بنگالی مولوی نے جز بز ہو کے کہا "ہم مدرسہ خزینتہ العلوم ... گنج سے فارغ التحصیل ہیں۔"

"کون سی تحصیل کا ہے۔ اور گنجا کس کو کہا ہے تو نے کاکا۔"

غازی نے مجھے پکڑ کے بٹھا دیا "ابا جی۔ آپ نہ سمجھتے ہو نہ سنتے ... چپ کر کے بیٹھو۔"

رابعہ اور نازو کو اندر دلہن کے پاس پہنچا دیا گیا تھا۔ استاد پیڈرو اور نیلا کو نکاح کا گواہ مقرر کیا گیا۔ غالب اور غازی بحیثیت ماما اور چاچا دلہن کے وکیل بنے اور دلاور نے مولوی کو اشارہ کیا کہ وہ نکاح پڑھائے۔ نکاح کے دونوں گواہ چوہدری دلاور کے ساتھ کھڑے تھے۔ میں ان کے قریب ہی ڈھول اپنے سامنے رکھ کے بیٹھ گیا۔ کالیا میرے ساتھ تھا اور اس کے بعد غالب اور غازی۔

میں نے دلاور کی نظر بچا کے بیس ہزار کے نوٹوں کی گڈی کالیا کو پکڑا دی تھی۔ وہ ایک دم کھڑا ہو گیا "ٹھہرو مولوی صاحب۔"

دلاور نے اسے گھور کے دیکھا "اب کیا ہے؟"

"میری کچھ شرائط ہیں" کالیا نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

"شرائط۔ تیرا دماغ تو ٹھیک ہے کالیا" پیڈرو نے غرا کے کہا۔

غازی نے کہا "اوئے جوان گرمی مت دکھا۔ بیٹی دے رہے ہیں ہم کوئی مخول نہیں کر رہے ہیں۔"

غالب نے بھی سرہلایا "یہ بات تو بڑوں کے سامنے ہی ہوتی ہے۔ بول پتر۔"

کالیا نے کہا "حق مہر ہوگا ایک لاکھ۔"

دلاور نے مشتعل ہو کے کہا "ایک لاکھ..... تیری تو..."

کالیا ڈٹا رہا "گالی مت دیں چوہدری صاحب۔ شادی کے بعد ہم اور آپ برابر ہو جائیں گے۔"

غازی نے سرہلایا "سالا تے بہنوئی۔"

کالیا بولا "یہ کوٹھی میری بہن کے نام لکھی جائے گی۔"

اب پیڈرو نے اسے ماں کی گالی دی "..... میراثی کی اولاد۔"

غازی کھڑا ہو گیا "اوئے اتنی بے عزتی ہم برداشت نہیں کرتے۔ کون ہے تو۔ اِدھر آ ذرا۔"

دلاور نے صورتِ حال کو سنبھالنے کی کوشش کی "ٹھہرو۔ یہ کیسا تماشا ہے کالیا۔ پیڈرو، بکواس بند کرا اِنہیں۔"

"میری تیسری شرط ہے..... پکی رسید کہ اب مجھ پر کوئی قرضہ باقی نہیں رہا۔ پُرانی رسید کی واپسی۔"

دلاور نے ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا "تیری صرف ایک شرط منظور کی جا سکتی ہے۔ یہ لے اپنی پُرانی رسید" اس نے جیب سے ایک کاغذ نکال کے پھینکا۔

غازی نے یہ کاغذ اُچک لیا "اس پر لکھ دیں کہ بقایا کچھ نہیں۔ ابھی..."

دلاور نے غصے میں قلم نکالا اور رسید پر لکھ دیا کہ قرض کی ساری رقم وصول پائی "تیری باقی دو شرطیں فضول ہیں۔ تو جانتا ہے کوٹھی کرائے کی ہے..."

کالیا نے کہا "پھر جناب یہ لیں اپنے بیس ہزار۔ مجھے یہ نکاح منظور نہیں۔"

ایک لمحے کے لیے یوں لگا جیسے دلاور کو ہارٹ اٹیک ہو جائے گا۔ وہ کبھی بیس ہزار کے نوٹوں کو دیکھتا تھا تو کبھی کالیا کو۔ یہی حالت اس کے حواریوں کی تھی۔

"تو یہ بات تھی۔ اس لیے کُتے کی طرح بھونک رہا تھا تو۔" ...

ایک دم طیش میں آگیا "شرلیس بتا رہا تھا..... کس سے بھیک مانگی ہے تونے؟"

اسی وقت ایک عجیب و غریب کردار اندر آگیا۔ میں نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا کہ وہ نیکا گڈی کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ وہ جوان آدمی تھا مگر اسے نشے کی لت نے تباہ کردیا تھا۔ اس کے بال اُلجھے ہوئے تھے اور آنکھوں کے گرد گہرے حلقے تھے۔ اس کے کپڑے بھی میلے تھے۔

اس نے کہا "او بھائیا جی۔ یہ کیا شور شرابا ہے؟"

"نیکے۔ تُونے کہا تھا کہ سب ٹھیک ہوگیا ہے" دلاور نے اپنے سالے کو مخاطب کیا "پھر یہ کیا ہے؟"

"کیا ہے بھائیا جی۔ کچھ بھی تو نہیں ہے۔ میں نے تو پکی بات کرلی تھی کالیا سے۔ اور اندر اس کی بہن بھی راضی خوشی بیٹھی ہے..."

"مگر یہ..... تو شرلیس لگا رہا ہے۔ یہ دیکھ..... اس نے بیس ہزار میرے منہ پر ماردیے ہیں۔" دلاور بگڑ گیا "رسید بھی لے لی ہے مجھ سے۔"

"رسید دے دی ہے آپ نے۔ بھائیا جی یہ تو بڑی غلطی کی آپ نے" نیکا گڈی بولا۔ "ضرور یہ کہیں سے چرا کے لایا ہوگا۔"

"اب یہ نکاح سے انکار کررہا ہے۔"

اب غازی نے اپنی اصلی آواز میں کہا "چوہدری دلاور صاحب۔ آپ جیسی حیثیت کے شخص کو یہ شرائط مان لینی چاہئیں۔ ایک لاکھ نقد اور یہ کوٹھی نہ سہی کوئی مکان تو..."

دلاور اُچھل پڑا "تم..... کون ہو تم؟"

"میں جناب غازی بن شہید۔ آپ نے میرا نام تو ضرور سُنا ہوگا" غازی نے اپنے انگریزی اخبار کا نام بتا کے کہا۔

"تم کیسے اندر آئے" دلاور چیخ کے بولا۔

"ہم لوگ ہر جگہ پہنچ جاتے ہیں چوہدری صاحب۔" اب غالب نے بھی اصلی آواز میں کہا "ہمیں پتا چلا تھا کہ آپ عقدِ ثانی فرما رہے ہیں۔ اپنی پہلی بیوی سے اجازت لیے بغیر۔"

صدمے سے دلاور کی حالت غیر ہوگئی "تم..... تم نے چلایا ہے یہ چکر۔"

"چکر تو آپ نے چلایا تھا چوہدری صاحب۔ بہت پہلے" غازی نے بے خوفی سے کہا "اس کا ثبوت میری جیب میں ہے۔ مجھے کالیا نے سب بتادیا ہے۔"

پیڈرو نے اسے ایک سانس میں بہت سی غلیظ گالیاں دیں "اس سے تو میں بعد میں نمٹ لوں گا۔ پہلے تیری صحافت کی..."

"پیڈرو۔ یہاں ہونے والی گفتگو کا ہر لفظ ریکارڈ ہوا ہے لیکن میرے پاس ایک مائیکروفون کے سوا کچھ نہیں ملے گا تمہیں" غازی نے پیچھے ہٹ کے کہا "ہم کچا کام نہیں کرتے۔"

دلاور نے پیڈرو کو روک دیا "تم دھوکے سے اندر آئے ہو۔"

"جی نہیں۔ آپ خود میرے استقبال کے لیے موجود تھے۔"

"مگر تم نے جعلسازی کی۔ براتی کا بھیس بدلا۔"

غازی مسکرایا "بھیس تو پولیس بھی بدلتی ہے۔ ... بھی بدلتے ہیں۔ یہ جعلسازی نہیں ہوشیاری کہلاتی ہے۔"

غالب نے کہا "ہم اپنے اپنے اخبار کے لوگوں کو بتا کے تھے اور پولیس کو اطلاع دے کر آئے تھے کہ ہم کہاں ... ہیں۔"

دلاور کی حالت غیر ہورہی تھی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ سب غالب کا چلایا ہوا ہے اور کالیا نے اسے دھوکا دے کر اس ... میں خنجر گھونپا ہے۔ وہ اخبار والوں کے پاس پہنچ گیا تھا اور ... والوں میں اس کا ایک دشمن بھی تھا جس نے سازش کا جال پھیلا کے اسے شکار کرلیا۔ وہ کالیا کو قرض کی اصل رسید بھی ... کرچکا تھا اور یہ تحریر بھی دے چکا تھا کہ اس پر کچھ بھی واجب ... نہیں۔ تاہم ابھی تک اس نے مجھے نہیں پہچانا تھا۔

میں نے ہاتھ جوڑ کے کہا "اوئے یہ کیا ڈراما ہے۔ مجھ ... آدمی کو کیوں مروادیا۔"

غازی نے کہا "بابا، ڈرو نہیں۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔"

غالب بولا "تمہیں پیسے بھی مل جائیں گے۔"

میں نے کانپتے ہوئے کہا "اوئے مجھے جانے دو۔ لعنت ہو ... پر۔ مجھے کیا معلوم تھا..... ہائے او ربا۔"

دلاور نے اپنے سالے سے مخاطب ہوکے کہا "اندر جاکے ... وہ عورتیں کون ہیں۔ اُلو کے پٹھے۔"

نیکے کی حالت اپنے بھائیا جی سے بھی زیادہ خراب تھی "... تو مجھے مار ڈالے گی۔ میں نے اسے بڑے بہانے سے بھیجا تھا۔"

"تم جیسے بے غیرت بھائیوں کے ساتھ یہی ہونا ... چاہیے۔" غازی نے کہا "اب تو یہ کہانی اخبار میں چھپے گی۔"

"تصویروں کے ساتھ" غالب نے کہا۔

دلاور نے محسوس کیا کہ اس کا سیاسی مستقبل ہی ... ازدواجی مستقبل بھی داؤ پر لگا ہوا ہے۔ اس گفتگو کے ریکارڈ ... والی بات غلط تھی مگر اس تقریبِ سعید کی تصویریں واقعی ... جاچکی تھیں۔

رابعہ اور نازو سیدھی اس کمرے میں چلی گئی تھیں ... ڈرائنگ روم سے متصل تھا۔ یہ دلہن کا کمرا تھا جو لال ... سمٹی بیٹھی تھی۔ وہاں ان تینوں کے سوا کوئی بھی نہیں تھا۔ ... یہ خصوصی کیمرا غازی نے فراہم کیا تھا اور غالب نے ... استعمال کا طریقہ سمجھنے کے بعد نازو کو سمجھادیا تھا۔ پہلے ... ایک کھڑکی کے شفاف شیشے کے پیچھے سے اور پھر ایک ... دروازے کی جھری سے دلاور کو اس وقت فوکس کیا تھا جب ... باندھے نکاح خواں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے پیچھے ...

... استاد پیڈرو اور نیکا گڈی بھی موجود تھے۔ کھڑکی کے سامنے ... تھا اور جھری کے پیچھے سے نازو کو نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔ ... خصوصی کیمرے میں رات کے وقت نظر نہ آنے والی ... (INFRA-RED) شعاعوں سے بھی تصویر اتاری جاسکتی ... میں اس کی ضرورت نہیں تھی۔ غازی نے اس میں ... بہت زیادہ حساس یعنی ہائی اسپیڈ ... فلم ڈال دی تھی اور یہ بتادیا تھا کہ عام دن کی ... (HIGH) ... صاف آئے گی۔ روشنی کم ہو تو شٹر ... کی رفتار بھی کم کردی جائے۔ نازو نے ذہانت کا ... (SHUTTER) ... کیمرے کا صحیح استعمال کیا تھا اور بہت کار آمد ... تھیں۔

دلاور کے سالے رفیق عرف نیکا گڈی نے اندر جاتے ہی چلانا ... شروع کردیا "او بھائیا جی۔ اوئے نس گئی۔ کوئی بھی نہیں ہے اندر ..."

استاد پیڈرو بدحواسی میں اندر گیا "کیا بکواس کرتا ہے۔"

"بکواس نہیں جی۔ دیکھ لو، سارا کھیل ختم۔" نیکا بولا پھر اس ... کے چلانے کی آواز آئی "مجھے کیوں مارتے ہو..."

پیڈرو نے اسے گالی دی "باہر جاکے دیکھ..... وہ دور نہیں گئی ہوں گی۔ وہ ضرور اس..... صحافی کی اماں نازو ہوگی۔ اور اس کے ساتھ ہوگی وہ وکیل کی اولاد..."

دلاور ایک دم چونکا اور مجھے گھورنے لگا "بابا جی۔ خیر سے ذرا ... منہ تو کراؤ۔ ہم بھی دیکھیں صرف لشکر آیا ہے کہ سپہ سالار بھی ..."

میں نے اپنی اداکاری جاری رکھی اور ہاتھ جوڑتا رہا "میری ... مجھے جانے دو۔ مجھے کیا معلوم تھا سو روپے کی خاطر..."

غازی نے اسے اپنی طرف متوجہ کرلیا "چوہدری دلاور ... اب یہ آپ کی دوسری شادی ہوتی۔"

"کون..... کررہا تھا شادی" دلاور نے سہرا اُتار کے پھینک دیا "... کنجر نے خود اپنی بہن پیش کی تھی مجھے کہ میں بیس ہزار نہیں ... دے سکتا۔ شادی کرلو میری بہن سے۔"

"بیس ہزار میں لڑکی بُری نہیں تھی" غازی نے کہا "کیا آپ ... دوستوں کو اور اہلِ خانہ کو اس شادی کی اطلاع نہیں تھی۔ یہ ... بے خبر شادی کیوں تھی؟"

"بکواس بند کرو۔ میں کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔ یہ ... پریس کانفرنس نہیں ہے" دلاور نے چیخ کے کہا۔

پیڈرو مشتعل بیل کی طرح اندر آیا "چوہدری صاحب! لڑکی کو ... والے لے گئیں۔ رابعہ اور نازو۔"

دلاور نے کہا "وہ رابعہ کا یار..."

پیڈرو نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہا "یہ بڈھا ... کون ہے؟"

دلاور نے نفی میں سر ہلایا "اسے یہ لوگ سو روپے میں پکڑ لائے تھے، وہ باہر ہوگا۔ وہی لے گیا ہوگا انہیں۔"

"میں دیکھتا ہوں چوہدری صاحب" پیڈرو باہر بھاگا۔

"ان صحافیوں سے تو میں نمٹ لوں گا" چوہدری دلاور نے کہا "چلو اوئے تم دونوں۔ دروازے بند کردو سارے۔"

میں نے زار و قطار رونا شروع کیا "اجی مجھے تو جانے دو۔"

میری بوڑھوں کی طرح کانپتی آواز اور لرزتے بدن نے دلاور کو شک نہیں ہونے دیا۔ اس نے میرا ڈھول اُٹھا کے باہر پھینکا۔ پھر مجھے گریبان سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا لے گیا۔ میں ایسے لڑکھڑاتا ہوا گیا جیسے کوئی بھی ضعیف شخص جاسکتا تھا۔ اس نے مجھے ایک لات ماری۔ میں فرش پر گرا اور ہائے ہائے کرنے لگا۔ "ہائے میں مرگیا، یا رب جی..."

دلاور نے کہا "دفع ہوجا ادھر سے..... ویسے ہی مرنے کے قریب ہے۔ میرے متھے لگے گا۔"

کمرے کے اندر سے میں نے غالب اور غازی کی آواز سنی "خبردار۔"

دلاور پھر اندر چلا گیا "تم اسلحہ لے کر آئے تھے میرے گھر میں؟"

غالب بولا "ہاں، اپنی حفاظت کے لیے یہ ضروری تھا۔ اب ہم جارہے ہیں۔"

غازی نے کہا "کسی نے راستہ روکا ہمارا تو مارا جائے گا۔"

دلاور نے ایک دم پینترا بدل لیا "اپنے غازی شہید صاحب۔"

"غازی بن شہید" اس نے تصحیح کی۔

"چلو بھئی غازی بن شہید صاحب۔ اپنے غالب صاحب کی طرح آپ بھی بہت مشہور صحافی ہو" دلاور نے خوشامدانہ لہجے میں کہا "کالیا جیسے دو ٹکے کے لوگوں کا تو کام یہی ہے، ہم جیسے عزت داروں کو بلیک میل کرنا۔"

"آپ کالیا کی بہن سے شادی کرنے والے تھے" غازی نے اسے ٹوکا۔

غالب نے کہا "اس دو ٹکے کے آدمی کو اتنی عزت دے رہے تھے آپ۔"

"چلو چھوڑو جی۔ مٹی پاؤ" دلاور نے کہا "بات ختم ہوئی اور نہیں ہوئی تو آپس کی بات ہے۔ ختم ہوجانی چاہیے۔ میں یہ بیس ہزار بھی کالیا کو واپس کردیتا ہوں۔ رسید بے شک آپ پھاڑ دیں۔"

میں برآمدے میں جہاں گرا تھا وہیں بیٹھا تھا اور میرے قریب ایک کھڑکی تھی جس میں سے اندر ہونے والی ساری گفتگو صاف سُنائی دیتی تھی۔

"کالیا کی جان کی کیا ضمانت ہے؟" غالب نے کہا۔

"آپ بتاؤ کیا ضمانت چاہیے۔ دیکھیں نا اب تو سارا قصہ ہی ختم ہوگیا۔ آپ اخبار والوں سے تو ہمیں بہت ڈر لگتا ہے۔ ہیں جی۔"

"ہم سے صرف مجرم اور چور ڈرتے ہیں" غازی نے کہا "میں ان کی بات نہیں کررہا ہوں جو پولیس سے ڈرتے ہیں۔ میں معزز اور بااختیار چوروں کی بات کررہا تھا۔ آپ جیسے معاشرے کے مجرموں..."

"آپ بیٹھو جناب۔ تسلی سے بات کرتے ہیں ہم۔ ہیں جی۔ کیا کہتے ہیں اسے۔ آف دی ریکارڈ۔ (OFF THE RECORD)

"چلیں ٹھیک ہے" غازی نے کہا "آف دی ریکارڈ بات بتائیں۔"

"پہلے آپ بتاؤ کہ یہ سب ریکارڈ تو نہیں ہورہا ہے؟"

غالب ہنسا "اپنے چوہدری دلاور صاحب' ریکارڈ تو کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ ہمارے پاس کوئی مائکروفون نہیں تھا۔ آپ تلاشی لے سکتے ہیں ہماری" غازی نے کہا۔

"تم پھر بلف کررہے ہو مجھے" دلاور نے بے یقینی سے کہا۔

"ہم قسم کھانے ... کے لیے تیار ہیں" غالب نے کہا "کوئی مسلمان جھوٹی قسم نہیں کھاتا۔"

غازی بولا "ہم تو ایسے ہی دل لگی کے لیے آئے تھے۔ ہاں رقم ہم نے کالیا کو فراہم کی تھی۔ اس نے پریس کلب آ کے ساری بات سب کے سامنے بتادی تھی۔"

"اس کی تو..." دلاور کا حوصلہ ایک دم بڑھ گیا "مگر تم لوگ بھی کم حرامی نہیں ہو۔ تم صحافی نہیں بلیک میلر ہو۔ شوق سے چھاپو یہ خبر۔ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تم۔ تمہارے پاس کوئی ثبوت نہیں۔ میں تردید کردوں گا۔"

غالب نے کہا "تردید کا مطلب پبلک تائید لیتی ہے۔ لیکن خبر کو ہم دبا بھی سکتے ہیں۔ ورنہ ہمارے پاس کالیا کے بیان کی تائید میں یہ رسید ہوگی۔ پھر اس کی بہن کا بیان بھی ہوگا۔ تصویریں ہوں گی۔ تم کس کس ثبوت کو جھٹلاؤ گے دلاور۔ بہتر ہے سودا کرلو۔ کالیا اور اس کی بہن ہمارے پاس ہیں۔"

"سودا؟" وہ چونکا "بولو کتنی رقم چاہیے۔ ایک لاکھ' دو لاکھ... پانچ لاکھ۔"

"بس؟" غازی نے کچھ دیر بعد کہا "تم تو خاصے امیر ہوچکے ہو دلاور۔ وطن فروشی کے کاروبار میں بہت مال اکٹھا کیا ہے تم نے۔"

"اب اپنے چوہدری صاحب محبِ وطن ہیں۔ اس قوم کے لیڈر بننا چاہتے ہیں" غالب نے طنز سے کہا۔

"ہاں۔ پیسہ بہت ہے میرے پاس اور تم جانتے ہو پیسے کی طاقت سے کیا ہوسکتا ہے۔ لیڈر بننا تو معمولی بات ہے۔ شیطان چاہے تو خود کو فرشتہ تسلیم کرالے۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ تم ... روک سکو گے۔ کوئی یقین نہیں کرے گا تم پر غالب صاحب ... مجھے سچا کہنے والے ہوں گے' تم دیکھ لینا۔"

غالب نے کہا "تم سودا کرلیتے تو فائدے میں رہتے۔"

دلاور بھڑک اٹھا "کیسا سودا۔ بولو' بکواس کرو۔"

"اگر تم تیار ہو تو تمہیں سکندر سے بات کرنی ہوگی۔"

"سکندر سے؟" دلاور نے سوچ کے کہا "اس سے ... کرسکتا ہوں اپنے غالب صاحب۔ میں تو شروع سے ... کررہا ہوں کہ وہ سمجھ جائے اور ضد چھوڑ دے۔ لیکن وہ ... بات نہیں مانتا۔ میں نے اسے ہر پیش کش کی۔ اس نے ... ٹھکرادیا۔ خیر... اب بھی میں تیار ہوں مگر وہ ہے کہاں؟"

"ہم اسے بلالیں گے۔ جب ہمیں آپ کی نیک ... آجائے گا۔"

غازی نے کہا "اب وہ باتیں جو آف دی ریکارڈ ہیں۔"

"آف دی ریکارڈ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ شیلی کی لاش ... لوگوں نے کہاں دفن کیا ہے؟" دلاور بولا۔

"یہ تو صرف سکندر جانتا ہے" غالب انجان بن گیا۔

"اگر وہ مجھے بتادے کہ اس فاحشہ..."

"چوہدری صاحب۔ وہ غالباً آپ کی بہن تھی۔" غازی ... کہا۔

"یہ جھوٹ ہے" دلاور نے کہا "اسے میرے خلاف ... کیا گیا ہے۔"

"پھر اس کی لاش کے لیے تم کیوں پریشان ہو؟"

دلاور نے غالب کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا "سکندر ... شیلی کی قبر دکھادے تو... میں بتاسکتا ہوں کہ اس کے باپ کو ... کہاں دفن کیا گیا تھا۔"

"یعنی تم اعتراف کرتے ہو...؟"

"نہیں۔ میں نے کچھ نہیں کیا تھا" دلاور نے فوراً ... بات کاٹ دی۔

"پھر تمہیں کیسے معلوم...؟"

"یہ کام پیڈرو نے کیا تھا" چوہدری دلاور نے کہا "وزیر ... قاتل بھی وہی ہے۔ میر شرافت علی کو بھی اسی نے قتل کیا ... اسی نے وزیر خان کی لاش پوسٹ مارٹم سے پہلے قبر سے ... تھی۔"

"کیا تم یہ پولیس کے سامنے کہہ سکتے ہو؟" غازی نے کہا۔

دلاور ہنسا "یہ باتیں آف دی ریکارڈ ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ تم پیڈرو کو ہمارے حوالے کردو۔ ہم ... سے پوچھ لیں گے" غالب نے کہا۔

اسی وقت میں نے پیڈرو کو سخت پریشانی میں واپس ... دیکھا۔ وہ رابعہ' نازو اور کالیا کی بہن کے پیچھے گیا تھا اور ... تھا۔ وہ سیدھا میری طرف آیا۔ میں کھڑکی سے کان لگائے اندر کی باتیں سن رہا تھا اور اس سے میری پوزیشن بہت مشکوک ہوگئی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ اب میرے بچنے کی کوئی صورت نہیں رہی۔ پیڈرو کو پہلے ہی مجھ پر شک تھا۔ وہ ضرور مجھے پہچان جائے گا اور میں اچھی بھلی جیتی ہوئی شرط ہار جاؤں گا۔

اس سے پہلے کہ پیڈرو اپنے حلق سے کوئی آواز نکالتا' میں نے پھرتی سے اٹھ کے اس کے ایک ہاتھ مارا۔ یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ وہ خود کو بچا نہ سکا اور میرا وار اتنا موثر ثابت ہوا کہ پیڈرو کٹے ہوئے درخت کی طرح گرنے لگا۔

میں نے اسے سنبھال لیا اور آہستہ آہستہ کھینچ کے برآمدے کی اس کھڑکی سے دور لے گیا۔ میں نے پہلا کھلا دروازہ دیکھا تو پیڈرو کو اس میں ایک بیڈ پر ڈال دیا۔ یہ غالباً چوہدری دلاور کا بیڈ روم تھا۔ کالیا نے بتایا تھا کہ آج کل اس نے بیوی بچوں کو کرائے کی ایک کوٹھی میں رکھا ہے مگر عارضی طور پر کہیں بھیج دیا ہے۔

بیڈ کے سرہانے ٹیبل پر فریم میں کسی نئے شادی شدہ جوڑے کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ میں نے اسے غور سے دیکھا تو دلاور کی صورت پہچاننے میں کامیاب ہوگیا۔ یقیناً یہ اس کی شادی کی تصویر تھی اور وہ دلہن اس کی پہلی بیوی ہی ہوسکتی تھی کیونکہ وہ دلاور کی ہم عمر تھی۔ یہ دسمبر ۱۹۴۸ء کی تصویر تھی۔ اس حساب سے دلاور کی شادی کو چوبیس سال سے زیادہ ہوچکے تھے۔ اس وقت وہ پچیس چھبیس سال کا تھا تو اب یقیناً پچاس کا ہوچکا تھا۔ دوسری اس نے نہ جانے کب کی تھی مگر جس لڑکی سے وہ تیسری شادی کرنے والا تھا وہ تو اس کی بیٹی سے بھی چھوٹی تھی۔ میں نے کالیا کی بہن کو دیکھا تو نہیں تھا مگر جیسا کہ اس نے بتایا تھا وہ کالیا سے بہت چھوٹی تھی۔ ممکن ہے وہ اٹھارہ کی ہو یا بیس کی۔

چوہدری دلاور کی بیوی بے انتہا حسین تھی۔ دلہن کے سنگھار اور لباسِ عروسی میں تو چڑیل بھی پری لگتی ہے مگر میک اپ کے بغیر بھی اس کی صورت کے نقوش میں بڑی دلکشی تھی۔ اس کا رنگ روپ اتنا اجلا تھا کہ تضاد میں اس کی بڑی بڑی کالی آنکھیں زیادہ ہی سیاہ محسوس ہوتی تھیں۔ وہ بھی اتنی ہی تھی۔ اٹھارہ یا بیس سال کی دبلی پتلی مگر گداز بدن معصوم سی لڑکی۔ شاید اب وہ پھیل گئی ہو اور بیالیس چوالیس سال کی ادھیڑ عمر عورت بن کے اپنی وہ کشش کھو بیٹھی ہو جس نے اب تک دلاور کو پابند کررکھا تھا۔ اس کے جوان بیٹے بیٹیاں ہوں گے چنانچہ دولت کی طاقت سے خود کو پُرشباب سمجھنے والے چوہدری دلاور نے دوسری بیوی خرید لی تھی۔ یہ کوئی انوکھی اور نرالی بات نہیں تھی۔ ایک مسئلہ نفسیاتی تھا۔ مرد فطرتاً بے وفا اور آوارہ مزاج ہے۔ بیس پچیس سال میں اس کا جی جب عورت سے بھر جاتا ہے تو وہ دوسری کرنے کے بہانے تلاش کرتا ہے۔ بہانہ دولت فراہم کردے تو پھر اسے کون روک سکتا ہے۔

بیڈ کے دوسری جانب ایک اور دلہن کی تصویر تھی جو اپنے دولہا کے ساتھ بڑی شرمیلی اور پُرتفاخر مسکراہٹ کے ساتھ کھڑی تھی۔ یہ دلاور کی بیٹی تھی کیونکہ وہ ماں کے آغازِ شباب کا نقشِ ثانی تھی۔ اس کا شوہر نیوی یا مرچنٹ نیوی کا کوئی افسر تھا اور بلاشبہ ایک ہینڈسم جوان تھا۔ تصویر پر شادی کی تاریخ صرف ایک سال پہلے کی تھی۔ دوسرے فریم میں تین بچے نظر آرہے تھے۔ ان میں سے دو لڑکے صوفے کے بازو پر بیٹھے ہوئے تھے اور درمیان میں ان کی چھوٹی بہن اپنی گود میں گڑیا رکھے بیٹھی تھی۔ بڑا لڑکا بارہ چودہ سال کا تھا۔ چھوٹا شاید آٹھ دس سال کا ہوگا۔ سب سے چھوٹی لڑکی پانچ سال کی بھی نہیں تھی۔

اس کمرے میں بڑی گھریلو فضا تھی۔ یہاں دلاور صرف ایک شوہر تھا یا ان بچوں کا باپ تھا۔ وہ کوئی دہشت گرد' اسمگلر' غدارِ وطن یا بین الاقوامی مجرم نہیں تھا۔ عام انسانوں کی طرح وہ بھی اس گھر میں رہنے والوں کے لیے محبت اور شفقت' سکون' فلاح اور نیکی کا سائبان تھا جس کے نیچے ایک خاندان پل رہا تھا اور اچھے مستقبل کی جانب گامزن تھا۔ دلاور باہر جو بھی تھا جیسا بھی تھا' اپنے گھر پر باہر کی زندگی کا سایہ تک نہیں پڑنے دیتا ہوگا۔ وہ ہرگز دل سے نہیں چاہتا ہوگا کہ اس کے بیٹے بھی وہی زندگی اختیار کریں جو اس نے گزاری اور اس کے نقشِ قدم پر چلیں۔ صرف پیسہ کمائیں۔ ناجائز اور جائز کی پروا نہ کریں۔ نہیں' صورتِ حال اس کے برعکس ہوگی۔ شاید دل سے وہ چاہتا ہوگا کہ اس کا بیٹا سکندر بخت جیسا ہو تو بیٹی رابعہ جیسی۔ انسان کی فطرت کا یہ تضاد ہر جگہ نظر آتا ہے۔ چور یا ڈاکو بھی چاہتا ہے کہ اس کا بیٹا پڑھ لکھ کے ڈاکٹر' پروفیسر' وکیل یا انجینئر بنے۔ کوئی بھی ناجائز اور غیر قانونی ذرائع سے پیسہ جمع کرنے والا ہمیشہ ضمیر کی خلش اور بے اطمینانی میں مبتلا رہتا ہے کہ اسے عزت نہیں ملی۔ پھر وہ اولاد کے لیے دولت کی نہیں عزت کی خواہش کرتا ہے۔

میں نے اس کمرے میں بلاوجہ اتنا وقت ضائع کردیا تھا۔ چند منٹ میں دوسری طرف نہ جانے کیا ہوا ہوگا۔ یہ خیال آتے ہی میں وہاں سے نکلا اور پھر برآمدے میں آگیا۔ دلہن کے ساتھ فرار ہونا ہمارے پروگرام میں شامل نہیں تھا۔ معلوم نہیں کیا مجبوری تھی کہ رابعہ اور نازو ہمارا ساتھ چھوڑ کے کالیا کی بہن کے ساتھ چلی گئیں اور وہ بھی اپنا پتا نشان چھوڑے بغیر۔ اندازہ یہ کیا جاسکتا تھا کہ وہ لوٹ کے غازی کے گھر ہی گئی ہوں گی۔

کمرے میں سے فائر کی آواز سن کے میں اچھل پڑا۔ پھر کسی نے بڑی دل خراش چیخ ماری۔ غالب نے چلا کے کہا "اس حرام زادے کو جانے مت دینا غازی" اس کے بعد دوسرا فائر ہوا اور کوئی دروازہ دھڑ سے بند ہوا۔

میں دوڑ کے کمرے میں گیا تو مجھے دلاور کے دو ساتھیوں میں

سے ایک فرش پر دم توڑتا دکھائی دیا۔ نکاح خواں مولوی صاحب دہشت سے بے ہوش ہو چکے تھے یا انہوں نے بہتر یہی سمجھا تھا کہ بے ہوشی اختیار کر کے بالکل غیر جانب دار فریق بن جائیں۔ ویسے بھی بے ہوش پڑے ہوئے شخص کو گولی کون مارتا ہے۔

غالب اندر کھلنے والے دروازے کے قریب غازی پر جھکا ہوا تھا۔ دوسرے فائر کا نشانہ غازی بنا تھا۔ گولی اس کی ٹانگ میں لگی تھی۔

میں نے کہا "یہ کیا ہوا۔ دلاور کہاں ہے؟"

"وہ سور کا بچہ بھاگ گیا" غالب نے کہا "ذرا غازی کو اٹھاؤ۔"

میں نے ایک طرف سے غازی کو سہارا دیا۔ گولی لگنے کے باوجود اس کی صورت پر اذیت کا کوئی احساس نہیں تھا۔ یہ اس کے حوصلے اور برداشت کی صلاحیت تھی ورنہ اپنا خون بہتا دیکھ کے اچھا بھلا آدمی بھی بے ہوش ہو جاتا ہے۔ ہم نے غازی کو قالین پر سیدھا لٹا دیا۔ میں باتھ روم میں سے پانی کی بالٹی اٹھا لایا۔ وہاں دوسری بہت سی چیزوں کے ساتھ ڈیٹول بھی تھی۔

غالب نے زخم کا معائنہ کرنے کے بعد کہا "تمہاری تو ہڈی بھی ٹوٹی ہے یار۔"

غازی نے کہا "ہاں۔ ہڈی نہ ٹوٹتی تو میں اپنے پیروں پر چل کے اسپتال جاتا۔ اب تم مجھے میو اسپتال لے چلو۔"

"کسی پرائیویٹ آرتھوپیڈک سرجن کے پاس کیوں نہیں؟"

"یار' یہ پولیس کیس ہوگا۔" غازی نے کہا "میو اسپتال میں مجھ سے کوئی کچھ نہیں پوچھے گا اور رسمی قانونی کارروائی پوری کرنے کے لیے میں کوئی کہانی سنا دوں گا کہ مجرموں کے ایک ٹولے نے فائر کیا تھا۔ میں ان کا پیچھا کر رہا تھا۔"

"کسی ٹولے کا نام تو لینا ہی پڑے گا۔"

"ہاں۔ سوچ رہا ہوں کس کا لوں؟" غازی مسکرایا "ایک تو رنگ محل میں جعلی دوائیں بنانے والے ہیں جن کے بارے میں فیچر چھاپا تھا میں نے۔ انہوں نے بھی دھمکی دی تھی مجھے۔ میرے گھر آکے' اسی کو پکڑوا دیتا ہوں۔"

غالب نے کہا "یار۔ آئی ایم سوری۔"

"پھر وہی فضول بات۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ میری گولی کا نشانہ تم بن جاتے یا تمہاری گولی میرے سر میں لگتی۔ خدا کا شکر ادا کرو یار کہ صرف ٹانگ ٹوٹی۔ دو چار ہفتے گزر جائیں گے پلاسٹر میں اور بیساکھی کے سہارے۔ کم آن' فکر کی کوئی بات نہیں۔"

میں نے حیرانی سے کہا "تم نے گولی چلائی تھی غازی پر۔"

غازی ہنسا "ہاں۔ یہ مجھے غازی سے شہید کرنا چاہتا تھا مگر میں بچ گیا۔"

غالب نے شرمندگی سے کہا "گولی تو میں نے دلاور پر چلائی تھی مگر وہ نکل گیا۔ غازی اس کے پیچھے تھا' یہ نشانہ بن گیا۔"

ہم نے قالین کے خراب ہونے کی پروا کئے بغیر زخم کو ڈیٹول سے دھو کے صاف کیا۔ فرسٹ ایڈ کے اصولوں کے مطابق پٹی باندھنے سے پہلے پنڈلی کے اوپر نیچے لکڑیاں رکھنا ضروری تھا۔ میں اندر گیا تو تلاش کرنے پر مجھے اسٹور سے اپنے مطلب کی سیدھی اور صاف لکڑیاں مل گئیں۔ کوٹھی کی تعمیر کے بعد کھڑکیاں اور دروازے بنے ہوں گے۔ یہ اسی کا بچا ہوا مال تھا۔

پٹی باندھتے ہوئے غالب نے مجھے ساری بات بتائی۔ دلاور کو اندازہ ہو گیا تھا کہ کالیا نے ہمارے ساتھ مل کے اس کے خلاف سازش کی تھی اور وہ بری طرح پھنس گیا ہے۔ اس کا سالا رنتو عرف نیکا گنڈی پکڑا جا چکا تھا۔ دلاور کو اب بھی یقین نہیں تھا کہ رنتو نے ساری گفتگو ریکارڈ نہیں کی ہے۔ اس کے اطمینان کی خاطر غالب اور غازی نے نیکا گنڈی کو اجازت دی کہ وہ ان کی تلاشی لے سکتا ہے۔ دلاور اسے ہدایات دیتا رہا کہ اندر کی جیب میں دیکھو۔ بیلٹ کو دیکھو۔ پین کھول کے دیکھو۔ قمیص کے بٹن دیکھو۔ سر کے بالوں میں دیکھو۔ نیکا گنڈی میں اتنی عقل نہیں تھی کہ وہ کسی خفیہ مائکروفون کا سراغ لگا سکتا۔

جب دلاور کو یقین آگیا کہ اس کی گفتگو ریکارڈ نہیں ہوئی ہے تو اسے شک ہوا کہ ہم اسے اغوا کرنے آئے ہیں۔ ایک وجہ تو اس کے دل کا چور تھا۔ وہ محسن کے بہنوئی کو اغوا کر چکا تھا اور یہ ہماری جوابی کارروائی ہو سکتی تھی۔ پھر رابعہ اور نازو کے فرار ہونے کا مطلب اس نے یہ نکالا کہ وہ کالیا کی بہن کو اغوا کر کے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آئی تھیں اور ہمارا پروگرام اسے اور پیڈرو کو پکڑنے کا تھا۔ پیڈرو کو اس نے رابعہ اور نازو کے تعاقب میں بھیج دیا تھا۔ جب وہ واپس نہیں آیا تو دلاور کو یقین آنے لگا کہ پیڈرو اپنی جان بچا کے نکل گیا ہے اور وہ اکیلا پھنس گیا ہے۔

اس نے اچانک اپنے ایک محافظ کو مروانے کا فیصلہ کر لیا جو اس کے ساتھ ہی کھڑا تھا۔ دلاور نے اسے غالب پر دھکیل دیا اور غالب کے ریوالور سے جو گولی نکلی وہ دلاور کے محافظ کے سینے میں اتر گئی۔ دلاور دروازے کی طرف دوڑا۔ غالب نے چلا کے غازی سے کہا کہ اس حرام زادے کو جانے مت دینا۔ اس کی آواز میں نے بھی برآمدے میں سنی تھی۔ تاہم غازی کو دلاور کے دوسرے محافظ نے ٹانگ اڑا کے گرا دیا۔ اس مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دلاور بھی نکل گیا اور اس کا محافظ بھی۔ غالب نے گولی دلاور پر چلائی تھی جو بعد میں نکلا تھا مگر بدقسمتی سے غازی عین دروازے پر منہ کے بل گرا تو گولی اس کی ٹانگ میں لگ گئی۔

ظاہر ہے قصور غالب کا نہیں تھا اور اس نے عمداً غازی کو نشانہ نہیں لیا تھا مگر اس کی ٹانگ کے زخمی ہونے پر وہ شرمندہ تھا۔

"میں غازی کو اسپتال لے جاتا ہوں" غالب نے کہا "وہ حرامی پیڈرو بہت ہوشیار ثابت ہوا۔ جان بچا کے نکل گیا اور واپس نہیں آیا۔"

میں نے مسکرا کے کہا "مرزا جی۔ آپ اس ناچیز کے بارے میں اپنی رائے بدل دیں۔ میں زیادہ ہوشیار ہوں۔ پیڈرو اسی کوٹھی کے ایک بیڈ روم میں بے ہوش لیٹا ہوا ہے۔ شامت اعمال اسے راہی میرے پاس لے آئی تھی۔"

"اس کو پیڈرو کی بے وقوفی کہا جا سکتا ہے۔ تمہاری ذہانت نہیں۔"

"بیٹے' اب تم شرط بھی ہار چکے ہو۔ اس لیے مان لو کہ میں تم سے زیادہ عقل مند بھی ہوں اور ذہین بھی۔" میں نے ہنس کے کہا۔

"ابھی یہ فیصلہ ہونا باقی ہے" غالب نے کہا۔

"فیصلہ تو ہو گیا۔ پیڈرو کے توجہ دلانے کے باوجود دلاور نے مجھے سکندر تسلیم نہیں کیا تھا۔ غازی گواہ ہے۔"

غازی نے سرہلایا "یہ تو ٹھیک ہے۔ تمہاری اداکاری نے بچالیا تمہیں۔"

"بس اب کوئی گنجائش نہیں رہی" میں نے بے حد مسرت کے ساتھ کہا "اب زندگی میں تین مواقع ایسے آئیں گے مرزا جی کہ تم اپنے گدھا ہونے کا اعلان عام کرو گے۔ پہلا موقع میرے ذہن میں ہے۔"

غالب نے مُردہ لہجے میں کہا "میں جانتا ہوں۔ اس وقت جب دولہا سہرا باندھ کے ویسے ہی اُلو نظر آتا ہے تم مطالبہ کرو گے کہ خود کو گدھا کہو سب کے سامنے۔"

"بالکل ٹھیک سمجھا تم نے۔ حاضرین میں تمہارے دوستوں کے علاوہ معززین شہر بھی ہوں گے۔ وہ بہت خوش ہوں گے تمہارا اعتراف سُن کے۔ نہ جانے کتنے تم کو گدھا اور بہت کچھ کہنے کے خواہش مند ہوں گے۔ خیر' اب کل کی بات کل کریں گے۔ یہ بتاؤ وہ نیکا گنڈی بھی اُڑ گیا؟"

"اُڑ کیسے سکتا ہے وہ۔ ڈور ہتھے پر سے کاٹ دی سالے کی۔ باتھ روم میں لیٹا ہوا ہے" غالب نے کہا "کالیا پہرا دے رہا ہے۔"

اس وقت ایک غیر متوقع اور مضحکہ خیز بات ہوئی۔ نکاح خواں مولوی صاحب جن کو ہم اپنی پریشانی میں بھولے ہوئے تھے ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ وہ بنگالی لب و لہجے میں اردو بولتے تھے تو ویسے ہی ہنسی آتی تھی۔

"ابی صاحب۔ ہم کو معاف کرو۔ ہمارے والد صاحب کو معاف کرو۔ دادا صاحب کو معاف کرو۔ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ یہاں کیا ہوگا ورنہ ہم تو جنازہ پڑھانے بھی نہ آتے اس مردود کا۔ ہم سے دھوکا ہوا ہے۔ ابھی ہم اللہ کو پیارے ہو جاتے' آپ کی گولی سے یا دولہا کی گولی سے" اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا اور کانوں کو ہاتھ لگانے لگا۔

میں نے کہا "مولوی صاحب' آپ جائیں۔ آپ سے ہمارا کوئی جھگڑا نہیں لیکن ایک بات کا خیال رکھیں۔ آپ سمجھ لیں کہ یہاں کچھ بھی نہیں ہوا۔ آپ کسی کو بھی کچھ نہیں بتائیں گے... سمجھے۔"

"ابی ہم اپنی اہلیہ کو بھی نہیں بتائیں گے۔ منکر نکیر کو بھی نہیں بتائیں گے۔ میدان حشر میں بھی نہیں بتائیں گے" اس نے جلدی جلدی اپنا بستہ بغل میں دبایا اور دروازے کی طرف لپکا "السلام علیکم۔ خدا حافظ" یہ الفاظ اس نے باہر جا کے کہے تھے۔ "او شد ملکم۔ کھودا ہو پھی" مگر مطلب ہم نے سمجھ لیا تھا۔

"کیا میں ٹیکسی لے آؤں" میں نے کہا۔

"کیا یہ پوچھنا ضروری ہے۔ ہم میو اسپتال تک پیدل تو نہیں جا سکتے۔"

غازی نے کہا "کوئی ضرورت نہیں۔ ہم باہر تک ایسے ہی جا سکتے ہیں۔"

"ایک ٹانگ پر۔"

"ہاں۔ ایک طرف سے تم سہارا دو گے۔ چند قدم کا تو فاصلہ ہے۔" غازی نے کہا "سکندر کو یہاں رہنے دو۔ نیکا اور پیڈرو سے ہم نہیں نمٹ سکتے۔"

میں نے کہا "میں غازی کے گھر ہی آجاؤں گا۔ رابعہ اور نازو وہیں ہوں گی۔"

غالب نے کہا "امید ہے وہ کالیا کی بہن کو وہیں لے گئی ہوں گی۔ مگر یار انہیں بتا کے جانا چاہیے تھا۔"

غازی بہادر آدمی تھا۔ وہ ایک ہاتھ غالب کے شانے پر رکھے ایک ٹانگ پر اُچھلتا ہوا دروازے تک گیا اور پھر مین گیٹ تک لیکن صاف نظر آرہا تھا کہ وہ سخت اذیت میں ہے۔ سڑک جہاں سے کوئی سواری مل سکتی تھی اس جگہ سے سو گز دور تھی اور غازی کا ایک ٹانگ پر یہ فاصلہ طے کرنا محض ارادے کی بات نہیں تھی۔ میں نے کالیا سے کہا کہ وہ ہوشیار رہے۔ میں ابھی دس منٹ میں واپس آتا ہوں۔

ایک بار پھر ابتدائی طبی امداد کی تربیت کام آئی۔ میں نے اور غالب نے آپس میں ہاتھ پکڑ کر جھولا سا بنایا اور غازی کو اُٹھا لیا۔ غازی کا وزن ڈھائی سو پونڈ سے زیادہ ہی ہوگا۔ چند قدم چل کے ہم ہانپنے لگے مگر قدرت نے مدد کی۔ ایک پرائیویٹ کار والے نے ہمارے پاس گاڑی روکی اور وہ شریف آدمی انہیں میو اسپتال تک لے جانے پر تیار ہو گیا۔

میرا خیال ہے کہ مجھے واپس پہنچنے میں دس منٹ بھی نہیں لگے تھے۔ گیٹ سے اندر قدم رکھتے ہی مجھے احساس ہوا کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔ میں جس دروازے کو کھلا ہوا چھوڑ گیا تھا وہ اب بند تھا۔ میں نے ریوالور نکال لیا اور آہستہ آہستہ برآمدے کے دروازے کو قریب جا کے لات ماری۔ دروازے پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

میں پیچھے کی طرف سے گیا۔ پوری کوٹھی کھلی پڑی تھی۔ اس میں ایک نامعلوم شخص کی لاش موجود تھی اور اگرچہ پیڈرو بے ہوش پڑا ہوا تھا مگر چوہدری دلاور کے فرار ہو جانے سے صورت حالات میرے لیے خاصی غیر محفوظ ہو گئی تھی۔ وہ اپنے مددگاروں

کے یا پولیس کے ساتھ کسی بھی وقت یہاں پہنچ جاتا تو میں اور کالیا ہی پکڑے جاتے۔ کالیا کا انجام تو بُرا ہی ہوتا مگر تفتیش کے نتیجے میں میرا اصلی چہرہ برآمد کیا جاتا تو دلاور خوشی سے پاگل ہو جاتا۔ مجھے شکار کرنے آئے تھے اپنے سکندرِ اعظم۔ تقدیر سے بڑے شکاری سمجھنے لگے تھے خود کو؟ ہیں جی' بڑے بڑے غازی سو رہا ساتھ لائے تھے۔

میں کوٹھی کے نقشے سے تو واقف نہیں تھا مگر اندازے سے میں نے پچھلے حصے کی طرف سے کمرے میں پہنچنے کی کوشش کی اور اس دروازے سے اندر داخل ہوا جس سے دلاور فرار ہوا تھا۔ باتھ روم کا دروازہ کھُلا ہوا تھا اور کالیا جسے میں چوکیداری پر مامور کر گیا تھا غائب تھا۔ میں چند قدم آگے بڑھا اور رُک گیا۔

باتھ روم کے کھُلے دروازے سے میں نے پہلے دو جھولتے ہوئے پیر دیکھے۔ پھر کالیا کی لاش نظر آگئی۔ اسے مارنے کے بعد گلے میں پھندا ڈال کے لٹکایا گیا تھا اور رسّی کا دوسرا سرا باتھ روم کے روشندان کی سلاخ سے باندھا گیا تھا جو روشن دان کو دو حصوں میں تقسیم کرتی تھی۔ کالیا کے سر سے خون بہہ کر اس کے جسم پر آگیا تھا اور قطرہ قطرہ باتھ روم کے سفید ٹائلوں والے فرش پر جمع ہونے لگا تھا۔

میں نے فوراً دروازہ بند کر دیا۔ خطرے سے خبردار کرنے والی چھٹی حِس نے مجھے آہوئے صیادِ دیدہ سے زیادہ چوکنا کر دیا تھا۔ کالیا کا قتل اس بات کا ثبوت تھا کہ شکاری گھات میں ہیں۔ چوہدری دلاور کمرے سے نکل کے فرار نہیں ہوا تھا۔ وہ اسی کوٹھی میں چھپ گیا تھا اور موقع پاتے ہی اس نے سب سے پہلے اس کو ٹھکانے لگایا تھا جو ساری خرابی کا ذمّے دار تھا۔

میں نے آہستہ سے کمرے کا دروازہ اندر سے کھولا۔ غالباً دلاور نے کالیا کو مارنے سے پہلے اندر سے کنڈی لگا دی ہوگی۔ اسے معلوم تھا کہ میں اسی راستے سے واپس آسکتا ہوں۔ دوسری طرف سے راستہ تلاش کرنے میں مجھے چند منٹ اور لگے۔ دلاور کو بھی چند منٹ کی مہلت ہی درکار تھی۔ اس تصور سے میرے جسم میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی کہ شاید اس وقت جب میں نے دروازے پر لات ماری تھی شکاری اپنے شکار کا کام تمام کر رہا تھا۔ لات مار کے میں نے اسے اپنے آنے کی خبر دے دی اور میرے کمرے میں پہنچنے سے پہلے وہ باہر نکل گیا۔ اب وہ یقیناً اسی کوٹھی میں کہیں موجود تھا اور منتظر تھا کہ میں خود اپنے پیروں سے چل کے اس کے ریوالور کی زد میں آجاؤں۔

میرے لیے نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن والی بات تھی۔ میرا اس کمرے میں محصور ہو جانا بھی خطرناک تھا اور باہر نکلنے کی کوشش کرنا بھی۔ پھر مجھے پیڈرو کا خیال آیا۔ اسے یرغمال بنا کے میں بچ سکتا تھا۔ میں پیڈرو کو ڈھال کی طرح استعمال کرتے ہوئے نکلنے کی کوشش بھی کر سکتا تھا۔ دلاور گولی چلاتا تو پہلے پیڈرو کو لگتی۔

یہ خیال آتے ہی میں نے دوڑ لگائی اور ایک زقند میں اس بیڈ روم میں جا پہنچا جہاں میں نے پیڈرو کو ناک آؤٹ کر کے ڈالا تھا۔ وہاں ہر چیز ویسی ہی تھی اور وہیں تھی سوائے پیڈرو کے جواب کہیں نہیں تھا۔ میں نے بے یقینی سے اس جگہ کو دیکھا جہاں پیڈرو پڑا ہوا تھا۔ بستر کی ہر شکن اس بات کی گواہی دیتی تھی کہ کچھ دیر پہلے تک وہاں کوئی تھا۔

مجھے پورا یقین تھا کہ پیڈرو ایک گھنٹے سے پہلے ہوش میں نہیں آئے گا مگر بعض اوقات آدمی اپنے یقین ہی سے مات کھا جاتا ہے۔ میرا یہ خیال بھی غلط ہو گیا تھا کہ کالیا کو قتل کرنے والا دلاور تھا۔ اسے خود استاد پیڈرو نے قتل کیا ہوگا۔

سوال یہ تھا کہ وہ اب کہاں ہے؟ شاید اسی کوٹھی میں۔ میری نظر وال کلاک کی طرف گئی۔ کلاک کی ٹک ٹک مجھے خبردار کر رہی تھی کہ وقت گزرتا جا رہا ہے۔ سب چلے گئے ہیں۔ کچھ بھاگ گئے ہیں۔ کچھ اس دنیا سے ہی رخصت ہو چکے ہیں۔ صرف تم ہو جو تم قضا کے نشانے پر کھڑے رہ گئے ہو۔ اور دستِ اجل نے اپنی کمان کھینچ لی ہے۔

میں بھاگنے کے خیال سے پلٹا ہی تھا کہ میرے قدم زمین میں گڑ گئے۔ دروازے میں ایک عورت چپ چاپ کھڑی تھی مگر اس کے ہاتھ میں بہت خطرناک قسم کا سائلنسر والا ریوالور تھا جس کا رُخ میرے سینے کی طرف تھا۔ اسے پہچاننے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ وہ دلاور کی بیوی تھی۔ وہ بیوی جو اس کے ساتھ زندگی کے اٹھائیس سال گزار چکی تھی۔

"اپنے ہاتھ اوپر اٹھالو بڈھے" اس نے مجھ پر سے نظر ہٹائے بغیر کہا۔

میں نے ہاتھ اوپر اٹھائے "دیکھیے۔"

"میں سب دیکھ رہی ہوں" اس نے تیز لہجے میں کہا "کون ہو تم..... اور میرے کمرے میں کیا کر رہے ہو؟"

میں نے کہا "آپ مسز دلاور ہیں.....؟"

"یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔"

"خاتون' میں آپ کے ہر سوال کا جواب دوں گا۔ میں چور ڈاکو نہیں ہوں۔ ایک شریف آدمی ہوں۔"

"شریف آدمی کیا لوگوں کے بیڈ روم میں اس طرح گھستے ہیں؟" اس نے طنز سے کہا "مجھے تو تمہاری یہ ڈاڑھی بھی نقلی لگتی ہے۔ آواز سے تم جوان آدمی ہو۔ حلیہ بوڑھوں کا بنا رکھا ہے۔ کیا چکر ہے یہ؟"

میں نے آہ بھری "مسز دلاور۔ یہ تقدیر کے چکر ہیں' بہت پرانے لیکن آپ ان چکروں میں مت پڑیں۔"

"مجھے باتوں میں مت الجھاؤ۔ اگر تم نے ذرا سی بھی چالاکی دکھائی تو میں تم کو گولی مار دوں گی اور قانون کی نظر میں یہ جرم نہیں ہوگا۔"

میں نے طنز سے کہا "آپ بھی قانون کو سمجھتی ہیں۔ کمال ہے' آپ کے شوہر تو قانون کو کچھ نہیں سمجھتے۔"

"تم نے بتایا نہیں کہ تمہارا نام کیا ہے۔ اور کیا کام ہے تمہارا میرے بیڈ روم میں؟"

میں نے ایک جُوا کھیلنے کا فیصلہ کیا "آپ کسی بدبخت سکندر کو جانتی ہیں؟"

"بہت اچھی طرح۔"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا "میں وہی خانہ خراب ہوں۔"

اُس کی آنکھیں بے یقینی سے مجھ پر جمی رہیں "تم جھوٹ بول رہے ہو۔"

میں نے محسوس کیا کہ شاید اس جوئے میں بازی جیتنے کے امکانات پیدا ہونے لگے ہیں "اس حلیے پر نہ جائیں خاتون۔ یہ صرف میک اپ کا کمال ہے۔"

"پھر میں تمہارا اصل چہرہ دیکھنا چاہتی ہوں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "اس وقت..... یہاں تو بہت مشکل ہے۔ خود کو چھپانے کے لیے ہی تو میں نے یہ بھیس بدلا ہے۔"

"تم مجھے کیسے جانتے ہو؟"

"جیسے آپ مجھے جانتی ہیں۔ اس کے علاوہ..." میں نے پرانی تصویر کو دیکھ کر کہا "حسن و جمال کی یہ آب و تاب ابھی ماند نہیں پڑی ہے۔ میں نے آج ہی یہ تصویر دیکھی اور میری خوش قسمتی کہ آج ہی آپ کو بھی دیکھ لیا۔ مجھے رشک آتا ہے دلاور پر۔"

خوشامد اور حسن کی تعریف عورت کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ اس کے لہجے کی زہرناکی کم ہو گئی "فضول باتیں مت بناؤ' چالاک آدمی۔"

میں نے کہا "کیا واقعی آپ بھی مجھے اتنا ہی برا سمجھتی ہیں' جتنا آپ کے شوہر نامدار نے مجھے دنیا کے سامنے بنا دیا ہے؟"

"میں دنیا کی ذمّے دار نہیں ہوں لیکن دلاور کے دوست بہت برے ہیں۔"

"کیا اس کا مطلب میں یہ لوں کہ دشمن اچھے ہیں۔"

"نادان دوستوں سے تو دانا دشمن اچھے ہی ہوتے ہیں۔ یہ پرانی کہاوت ہے' دلاور کو اس کے دشمنوں نے نہیں..... دوستوں نے خراب کیا۔ وہ ایسا نہیں تھا۔" اس کی آنکھیں جیسے ماضی کے کسی خواب کا منظر دیکھ رہی تھیں۔

"کب کی بات کر رہی ہیں آپ۔ چوبیس سال پہلے کی جب آپ کی اس سے شادی ہوئی تھی۔"

وہ چونکی "سکندر بخت' دلاور کسی بھی وقت یہاں آسکتا ہے۔ مجھے بتاؤ تم یہاں کیا کر رہے تھے؟"

"اگر میں کہوں کہ میں آپ کے شوہر کی برات میں ڈھول بجا رہا تھا تو آپ مانیں گی؟ یا میں یہ کہوں کہ دلہن تو خیر بھاگ گئی مگر دلاور کے ہونے والے برادرِ نسبتی کی خون آلود لاش اسی کوٹھی کے باتھ روم میں موجود ہے تو......!"

"میں سمجھوں گی تم مجھے بے وقوف بنا کے کوئی حرکت کرنا چاہتے ہو۔ جھوٹ وہ چھتا ہے جس کے پاؤں ہوں۔"

میں نے کہا "مجھے قسم کھانے کی عادت نہیں ہے مسز دلاور۔ قسم جھوٹے لوگ کھاتے ہیں لیکن آپ کو یقین دلانے کے لیے میں یہ بھی کر سکتا ہوں۔ کیا آپ نے اندر آتے ہوئے ایک رنگین ڈھول نہیں دیکھا تھا؟"

"ایک رنگین..... بہت بڑا ڈھول باہر پڑا ہوا تو تھا" وہ سوچ میں پڑ گئی۔

"دیکھیے' آپ کے ساتھ میرا کوئی اختلاف نہیں۔ آپ اپنے انداز و اطوار اور رویّے سے شائستہ خاتون لگتی ہیں اور آپ کی شخصیت میں حسن کے ساتھ جو وقار ہے وہ آپ کے خاندانی ہونے کی دلیل ہے۔"

یہ تعریف اور خوشامد کی ایسی گولی تھی جس نے فوراً اثر دکھایا۔ "تم بھی باتوں سے تو معقول آدمی لگتے ہو۔ پھر یہ کیا کھیل شروع کر رکھا ہے تم نے۔ کیوں اپنی جان کے دشمن ہوئے ہو؟" اس کا لہجہ اب بالکل بدل گیا تھا۔

میں نے کہا "اس کھیل سے اپنا دامن بچائیں محترم خاتون۔ یہ آگ کا کھیل ہے۔ مجھے جانے دیں' میں دلاور کا دشمن ضرور ہوں مگر اس عورت کو جو کسی کی بیوی ہو' بہن ہو یا ماں ہو' میں دشمن کی نظر سے دیکھنا بھی گناہ سمجھتا ہوں۔ میرے لیے آپ اتنی ہی قابلِ تعظیم ہیں جتنی کوئی بھی شریف اور گھریلو عورت ہو سکتی ہے۔ جس کے ایسے پیارے پیارے بچے ہوں۔"

اس نے بیڈ سائیڈ پر رکھی ہوئی تصویروں کو دیکھا۔ وہ موقع تھا جب میں آسانی سے جست لگا کے اس پر قابو پا سکتا تھا اور اس کے ہاتھ سے وہ خطرناک ہتھیار بھی لے سکتا تھا جو یقیناً اسے دلاور نے اپنی حفاظت کے لیے دیا ہوگا لیکن وہ بازی ہار چکی تھی "ان بچوں کو ماں کی ضرورت ہے۔ ماں کی محبت کا بدل دلاور کی ساری دولت بھی نہیں ہو سکتی۔" میں نے ہپناٹزم کے کسی ماہر کی طرح اپنی آواز کو پُرتاثیر بنا لیا تھا کیونکہ میں اسے متاثر کر چکا تھا۔ یہ حربہ غلط سہی میری نیت غلط نہیں تھی۔ میں اپنی جان بچانے کے لیے اسے نقصان پہنچانا نہیں چاہتا تھا۔

"جاؤ۔ بھاگ جاؤ یہاں سے" اس نے تھکے ہوئے شکست خوردہ لہجے میں کہا "اس سے پہلے کہ دلاور آجائے۔"

میں نے کہا "خاتون' اگر دلاور آگیا تو مشکل میں آپ بھی ہوں گی۔ آپ کو بھی میرا یہی مشورہ ہے۔"

اس نے مجھے حیران اور سوالیہ نظروں سے دیکھا "کیا مطلب ہے

آخر اس بات کا؟"
"آپ کو اس وقت یہاں نہیں ہونا چاہیے۔ دلاور نے تو آپ کو اور بچوں کو....."
اس نے میری بات کاٹ دی "میں یہیں رہتی ہوں۔ اپنے بچوں کے ساتھ۔"
"مجھے معلوم ہے لیکن دلاور نے آپ کو یہاں سے رخصت کردیا تھا۔ کہیں بھیج دیا تھا۔ مجھے معلوم نہیں کہاں؟"
"میں اپنی بہن کے گھر گئی تھی۔ یہ ٹھیک ہے اور مجھے دو چار دن وہیں رہنا تھا پھر ہم نے ایک ساتھ مری جانے کا پروگرام بنالیا تو میں نے سوچا کہ دلاور کو بھی بتادوں۔ میں فون کرتی رہی" اس نے ایک ریسیور اٹھاکے کان سے لگایا "یہ تو ڈیڈ ہے۔ مگر دوسرے فون....."
"ہوسکتا ہے سارے فون ایک ساتھ مرگئے ہوں" میں نے کہا۔
"کہیں سے کوئی جواب نہیں دے رہا تھا۔ اس لیے مجھے آنا پڑا۔"
"اگر آپ تھوڑی دیر پہلے آتیں تو بہت برا ہوتا۔ دلاور واقعی تیسری شادی کرنے والا تھا۔"
وہ خوف زدہ نظروں سے مجھے گھورنے لگی "تیسری شادی..... یہ کیسا مذاق ہے۔ کیا بے ہودگی ہے۔"
"حقیقت آپ کو معلوم ہوجائے گی۔ وہ کالیا کی بہن تھی۔"
"کون کالیا؟"
میں نے آہ بھری "اب میں کیا بتاؤں جب آپ کو کچھ معلوم ہی نہیں۔ کالیا کی لاش دیکھنے کی ہمت ہے تو چلیں میں دکھاتا ہوں۔ وہاں ایک اور شخص بھی مرا پڑا ہے۔ ڈرائنگ روم میں۔"
"نہیں..... میں نہیں..... مگر یہ سب۔"
میں نے کہا "خدا کے لیے آپ جائیں۔ تاکہ میں بھی جاؤں۔ دلاور آگیا تو قیامت آجائے گی۔"
"میں کسی قیامت سے نہیں ڈرتی۔ کیا کرے گا آخر وہ۔ مجھے مار ڈالے گا؟ اس لیے کہ چوبیس سال بعد اسے نئی مل گئی ہے۔" وہ تلخی سے بولی۔
میں نے نرمی سے کہا "آپ کے بچوں کو نئی ماں تو نہیں مل سکتی۔ ان کے لیے آپ کو جینا چاہیے۔"
اسی وقت باہر ایک گاڑی کے رکنے کی آواز آئی۔
"دیکھاوہ..... وہ آگیا نا..... دلاور آگیا....." اس کا رنگ فق ہوگیا تھا اور وہ ہکلا رہی تھی۔
یہ غلطی میری تھی یا اُس کی بے وقوفی کہ ہم نے قدرت کی طرف سے عطا ہونے والی مہلت کو ضائع کردیا تھا۔ "اب میں کیا کروں؟"
"چھپ جاؤ۔ خدا کے لیے کہیں چھپ جاؤ۔ بے وقوف آدمی۔ اس بیڈ کے نیچے گھس جاؤ۔ جلدی....." وہ سخت دہشت زدہ تھی۔
صورت حال اچانک ڈرامائی طور پر سنگین اور مضحکہ خیز ہوگئی تھی۔ میرے پاس چند ہی سیکنڈ تھے۔ میں سوچے سمجھے بغیر بیڈ کے نیچے چلا گیا۔ کسی حد تک مجھے یہ اعتماد حاصل ہوچکا تھا کہ دلاور کی بیوی ہی مجھے بچالے گی۔ اپنی کوشش اور ہمت سے خود کو بچانے کا وقت گزر گیا تھا اور میں فرار ہونے کی یا مقابلہ کرنے کی کوشش کرتا تو مارا جاتا۔
دلاور کی بیوی بڑی پھرتی سے جوتے اتار کر بیڈ پر آرام سے لیٹ گئی تھی۔ تریا چلتر کے چرچے میں نے بہت سنے تھے۔ تریا چلتر کے تجربے سے میں اس روز آشنا ہوا اور اسی تریا چلتر نے ہی مجھے بچا بھی لیا۔
بیڈ کے نیچے میرے لیٹنے کے لیے وافر جگہ تھی۔ کنگ سائز بیڈ کے دونوں جانب لمبائی کے رخ بیڈ کور قالین تک لٹکا ہوا تھا۔ ایک طرف دیوار تھی اور دوسری طرف برہانیک کا وہ حصہ جو پاؤں کی طرف رہتا ہے۔ دیوار کے ہر گوشے تک پھیلے ہوئے دبیز قالین پر لیٹنا مشکل کام نہیں تھا اور دم سادھے خاموش پڑے رہ کر میں گھنٹوں گزار سکتا تھا بشرطیکہ اس وقفے میں ناقابلِ برداشت چھینک یا کھانسی نہ آئے۔
دلاور نے اندر آتے ہی کہا "نوشی..... تم.....!"
ظاہر ہے نوشی اس کی بیوی کا نام تھا جو نوشابہ 'نوشین یا نوشاد وغیرہ کا مخفف ہوگا "کیا بات ہے۔ تم تو ایسے پریشان ہو جیسے مجھے کسی اور کے بیڈ روم میں دیکھ لیا ہے۔"
"فضول باتیں مت کرو۔ تم کیوں آئی ہو یہاں؟" دلاور نے جھنجلا کے کہا۔
"فضول باتیں تم کررہے ہو۔ مجھ سے پوچھ رہے ہو کہ میں اپنے گھر میں کیوں آئی ہوں۔ کیا ہوگیا ہے تمہیں!"
"وہ..... میرا مطلب تھا کہ تم تو ہفتے بھر کے لیے گئی تھیں۔ جلدی کیوں آگئیں؟ جواب دو میری بات کا۔ چھوڑ دو یہ رسالہ۔"
"اُفوہ۔ رسالہ کیوں پھینک دیا اٹھاکے۔"
"حد ہے۔ میں تم سے بات کررہا ہوں۔ تم رسالہ پڑھ رہی ہو۔"
وہ ذرا ایک ڈیزائن دیکھ رہی تھی گلے کا۔"
"بھاڑ میں گیا ڈیزائن۔ میں نے کچھ پوچھا تھا" دلاور نے دہاڑ کے کہا۔
نوشی نے معصومیت سے انجان بن کے کہا "سوری ڈیئر۔ کیا پوچھا تھا؟"
"یہی کہ تم اتنی جلدی کیوں آگئیں اور بچے کہاں ہیں؟"
"بچے خالہ کے گھر میں ہیں اور میں آئی تھی مجبوراً۔ فون کرکرکے تھک گئی تھی۔"

دلاور نے فون اٹھاکے دیکھا "فون ڈیڈ ہے۔"
"سارے فون ڈیڈ ہیں۔ اجتماعی خودکشی کرلی ہے سب نے۔"
"تم اندر بھی گئی تھیں؟" دلاور نے کہا۔
"نہیں۔ ابھی تمہارے آنے سے پانچ منٹ پہلے تو آئی ہوں۔ خود گاڑی ڈرائیو کی۔ اتنی تھک گئی تھی کہ سیدھی یہاں آکر لیٹ گئی۔ پلیز ذرا اے سی چلادو۔"
دلاور نے اے سی چلایا تو میں نے اس کے اسٹارٹ ہونے کی آواز صاف سنی۔ بیڈ کے نیچے لیٹ کر میں خود کو خاصا محفوظ سمجھ رہا تھا۔ میرے لیے اب شک کی کوئی بات نہیں رہی تھی۔ دلاور کی بیوی واقعی مجھے بچا رہی تھی۔
"ہمارا اچانک مری جانے کا پروگرام بن گیا تھا۔ ذرا یہ رسالہ بھی اٹھادو۔ اس پر کیا غصہ..... تھینک یو۔"
"آج تو تمہارا لہجہ ہی بدلا ہوا ہے۔ زہر کی جگہ شہد ٹپک رہا ہے باتوں سے" دلاور نے کہا۔
"تالی ایک ہاتھ سے تو نہیں بجتی دلاور۔ ادھر آؤ میرے پاس۔ کب سے تم نے بھی مجھے نظر اٹھاکے نہیں دیکھا۔ میں اتنی بری تو نہیں ہوں۔"
یا اللہ خیر۔ میں نے بیڈ کے نیچے لیٹ کے سوچا۔ خدانخواستہ دلاور نے سابقہ طرز تغافل کا کفارہ ادا کرنے کا فیصلہ کرلیا اور خلوت میں اس کا موڈ رومانٹک ہوگیا تو.....
مگر دلاور نے کہا "اس وقت ان چونچلوں کا وقت نہیں ہے' مری جانا ہے تو چلی جاتیں۔"
"میں نے سوچا تمہیں بتادوں۔"
"اچھا بتادیا نا' بڑی مہربانی۔ اب جاؤ' یہاں پولیس آئی ہوئی ہے۔"
"پولیس..... ہائے میں مرگئی۔" اس نے بڑی ادا سے چیخ ماری۔ "پولیس کیوں آئی ہے میرے گھر میں؟"
"خدا کے لیے عقل سے کام لو۔ پولیس مجھے یا تمہیں پکڑنے نہیں آسکتی۔" دلاور نے برہمی سے کہا "ہوئی ہے کوئی ایسی بات یہاں کہ مجھے پولیس کو بلانا پڑا۔"
"آخر مجھے بھی تو پتا چلے۔"
"اُفوہ۔ یہ عورتوں کے معاملات نہیں ہیں۔"
"یعنی کسی عورت کا معاملہ نہیں ہے" نوشی نے یوں کہا کہ نیچے میں مسکرانے لگا۔
"وہ حرام زادہ سکندر بخت یہاں آگھسا تھا بھیس بدل کے۔"
"اچھا۔ کس بھیس میں؟" نوشی نے حیرت سے کہا۔
"وہ..... فقیر کا بھیس بنا کے آیا تھا۔" دلاور نے کہا۔
"تم بھی نہیں پہچان سکے اسے۔ کیا وہ اب بھی کوٹھی میں ہے؟"
"نہیں۔ وہ ٹھہرتا یہاں تو میں خود اسے گولی نہ ماردیتا۔ میں تو ذرا سی دیر کے لیے باہر گیا تھا۔ وہ پاگل کا بچہ پیڈرو تھا یہاں۔ مجھے کیسے دھوکا دے سکتا تھا سکندر۔"
"پھر کیا کیا سکندر نے یہاں.....؟"
"وہی جو اس کا کام ہے۔ کالیا کو قتل کردیا۔"
"قتل!" نوشی نے پھر چیخ ماری "یہ کالیا کون ہے؟"
"جب تم نہیں جانتیں تو منہ بند رکھو۔ پاگلوں کی طرح مت چلاؤ۔ ادھر پولیس والے تفتیش کررہے ہیں۔" دلاور نے برہمی سے کہا "ایک نہیں دو قتل کردیے اس نے۔"
"اور پیڈرو......" نوشی نے دبے دبے لہجے میں کہا۔
"کہاں ہے وہ؟" دلاور نے اس کی بات کاٹ دی۔
"مجھے کیا معلوم؟" نوشی نے بڑی نزاکت سے کہا۔
"وہ یہیں پڑا تھا۔ کہاں گیا؟"
"یہاں..... میرے بیڈ روم میں' تمہارا دماغ خراب ہے۔"
"دیکھو میرا دماغ بالکل ٹھکانے ہے۔ تم جاؤ' یہاں تمہارا کوئی کام نہیں۔"
"میں تھوڑی دیر بعد جاؤں گی۔ پولیس چلی جائے۔ تھوڑی دیر آرام بھی کرلوں۔ ڈرائیونگ سے تھک گئی ہوں۔"
"خود ڈرائیونگ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"
"وہ شوفر بچوں کو لے گیا تھا۔ ان کی خالہ کی گاڑی میں۔"
"اچھا اب کمرے سے مت نکلنا۔ وہ لاشیں لے جائیں گے۔ تم دیکھ لوگی تو رات کو ڈروگی" دلاور نے باہر جاتے ہوئے کہا۔
چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد نوشی نے کہا "سنو۔ میں دروازہ بند کرلوں اندر سے؟ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"
"کرلو" دلاور کی آواز باہر سے آئی۔
نوشی نے بیڈ پر سے اٹھ کر کنڈی لگائی تو میں نے اس کی آواز بھی سنی۔ پھر نوشی نے بیڈ کور کو ایک سائیڈ سے اٹھاکے کہا "تم چاہو تو باہر آسکتے ہو بابا جی۔"
میں نے کہا "مسز دلاور۔ خدا کے لیے مجھے یہاں سے نکال دو۔ دلاور کو پتا چل گیا تو وہ نہ جانے کیا سمجھے گا۔"
"کیا سمجھے گا۔ یہ کہ تم میرے عاشق ہو۔ نان سینس۔"
"دیکھو۔ مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن تم سے اس کا بدگمان ہونا ٹھیک نہیں" میں نے سائیڈ سے سر نکال کے کہا۔
"بدگمانی تو اس کی فطرت میں ہے۔ وہ ہمیشہ شک کرتا رہا ہے مجھ پر" وہ تلخی سے بولی "مرد خود کو بہت عقل مند سمجھتے ہیں نا اور عورت کو ناقص العقل۔ اسی خوش فہمی میں مارے بھی جاتے ہیں....." وہ ہنسی۔
"کیا مطلب.....؟"
"مطلب کیا سمجھاؤں میں تمہیں۔ یہ بال تم نے دھوپ میں سفید کیے ہوتے تو سمجھ جاتے۔ دیکھو کسی کو بلاوجہ چور سمجھا جائے اور کہا جائے تو اس کا ردِعمل کیا ہوگا۔ وہ کہے گا کہ بھاڑ میں جائے

شرافت۔ اب چور بن کے ہی دکھاؤں گا سب کو۔"
بات واضح ہوگئی تھی۔ شکی مزاج دلاور ہمیشہ ایک باوفا بیوی کے خلاف بے اعتباری کے وہم کا شکار رہا۔ شاید یہ اس کا احساسِ کمتری تھا۔ بیوی صورت ہی میں نہیں سیرت اور خاندانی نجابت میں بھی اس سے کہیں ارفع و اعلیٰ تھی۔ اس نے ایک حد تک برداشت کیا۔ اب وہ کھلے دل سے میرے سامنے اعتراف کررہی تھی کہ بالآخر اس نے وہی کیا جس کا اس پر الزام تھا۔ پہلے بے سبب تھا پھر اس نے انتقاماً سبب پیدا کردیا۔
میں پریشان ہوگیا۔ دلاور کی بیوی نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ کوئی فرشتہ سیرت شوہر پرست اور وفا شعار بیوی نہیں ہے۔ جیسی روح ویسے فرشتے۔ ایسے کو تیسا ملتا ہے۔ دلاور کو باہر تو عزت ملی نہیں اس کے اعمال نے گھر کی عزت کا بھرم بھی نہ رہنے دیا۔
اس وقت دلاور کی بیوی نے اس کے بدترین دشمن کو پناہ دے رکھی تھی اور اگر میں اس کی عنایت کو بے سبب سمجھتا تو بڑا بے وقوف کہلاتا۔ عورت کی محبت میں انتہا پسندی ہوتی ہے تو نفرت میں بھی۔ یہ ایک منطقی نفسیاتی ردِعمل تھا۔ چوبیس سال ساتھ گزارنے کے بعد دلاور کی بیوی اس سے اتنی نفرت کررہی تھی کہ وہ مشرقی عورت کی مثالی اور روایتی وفا پرستی کی راہ بھی ترک کرچکی تھی اور اس کے دشمن کے سامنے اس کا اعتراف بھی کررہی تھی۔ اس کے اشتراک کی پیش کش سے مجھے خوف آیا۔ یہ دریا میں ڈوبنے سے بچنے کے لیے دلدل میں اتر جانے کے مترادف تھا۔
"مسز دلاور...."
"میرا نام نوشابہ ہے" اس نے کہا۔
میں نے بادلِ ناخواستہ کہا "نوشابہ، میں کب تک یہاں قید رہوں گا آخر!"
وہ مسکرائی "جب تک میں چاہوں گی۔"
"کیا تم وہ ظالم جادوگرنی ہو جس نے طوطا بنا کے ایک شہزادے کو پنجرے میں بند کردیا تھا۔"
وہ ہنسی "تم خود کو شہزادہ کہہ رہے ہو یا یہ کہ میں نے تم پر جادو کردیا ہے؟"
میرا دل چاہتا تھا کہ اپنا سر پیٹ لوں "خدا کے لیے آہستہ بولو۔ کہیں اس نے باہر سے سن لیا تو پوچھے گا کہ کس سے باتیں کررہی تھیں؟"
"میں کہہ سکتی ہوں کہ فون پر بات کررہی تھی۔"
"لاحول ولا قوۃ۔ فون ڈیڈ ہے۔"
"اوہ۔ یہ تو میں بھول ہی گئی تھی۔" وہ بڑی ادا سے بولی "اچھا دیکھو، یہ میری گاڑی کی چابیاں ہیں۔"
میں نے کہا "کیا میں تمہاری گاڑی لے کر بھاگ جاؤں؟"
"نہیں۔ ایسا مت کرنا۔" وہ بولی "گاڑی تو اندر کھڑی ہوئی ہے۔ ابھی جب پولیس چلی جائے گی تو تمہیں موقع مل جائے گا۔ گاڑی کی ڈکی میں چھپ کر لیٹ جانا۔"
"یہ تم کیسی فلمی سچویشن پیدا کررہی ہو میرے لیے۔ تمہارے بیڈ روم میں عین تمہارے بیڈ کے نیچے لیٹا ہوا ... کی جگہ کوئی بھی شوہر ہو تو رقابت کے جنون میں سوال ... ماردے پھر میں ڈکی میں پایا گیا تو.... یا اس سے پہلے ہی دلاور ... لیا تو۔"
"ڈرو نہیں۔ دلاور اس وقت میرے پاس ہوگا۔ تم ... انتظار کرنا پھر میں تمہیں لے جاؤں گی۔ دلاور ساتھ نہیں ہوگا۔"
"چند منٹ کا مطلب چند گھنٹے ہوا تو میں ڈکی کے اندر ... فوت ہوجاؤں گا جیسے قفس میں بہار کا انتظار کرتے کرتے بلبل ... کو پیاری ہوجائے، یہاں بھی میں خوف سے تھرتھر کانپ رہا ہوں ... چابی اپنے پاس ہی رکھو۔"
"میں نے تو سنا تھا کہ تم بڑے جی دار آدمی ہو؟"
"کس سے سنا تھا؟"
"خود دلاور تسلیم کرتا ہے۔"
مجھے تھوڑی سی خوشی ہوئی "پتا نہیں میں کتنی دیر یہاں ... رہوں گا۔"
"اوپر آجاؤ۔ میرے ساتھ.... آرام سے لیٹ جاؤ۔"
مجھے پھر پسینہ آنے لگا "تھینک یو۔ آگ اور پانی ایک ساتھ نہیں رہ سکتے اور تم وہ آگ ہو جس کی تپش مجھے یہاں بھی محسوس ہورہی ہے۔"
اس خراجِ تحسین پر حیا سے زیادہ خوشی سے اُس کا چہرہ ... لگا "آگ سے کھیلتے ہو اور جلنے سے ڈرتے ہو؟"
میں سچ کیسے بولتا کہ تم آگ تو کیا انگارہ بھی نہیں۔ بس ایک چنگاری ہو جو راکھ ہونے کو ہے اور یوں بھی پرائی آگ میں ... میری عادت نہیں تاہم جان بچانے کے لیے حرام کو حلال کرلیا ... ہے تو پھر جھوٹ بولنا بھی گناہ نہیں۔ "وقت نے مجھے برف کی ... کردیا ہے۔ اس وقت آگ مجھ پر اثر نہیں کرسکتی۔"
"یہ وقت بھی گزر جائے گا۔ دن کی تپش میں برف پگھل جائے گی تو رات کی تاریکی میں آگ زیادہ روشن محسوس ہوگی۔"
میں اس کی بے شرمی پر شرمندہ ہوا۔ وہ ایک شادی شدہ عورت تھی۔ جوان بچوں کی ماں تھی۔ شاید نانی بننے والی تھی مگر ... کے وجود میں انتقام کا جذبہ ہوس بن گیا تھا۔ جیسے شمع بجھنے سے پہلے بھڑکتی ہے ایسے ہی وہ حسن و شباب کی باقی ماندہ پونجی کو پرائے مال کی طرح لٹا رہی تھی حالانکہ یہ اس کی اپنی نسوانیت کی توہین تھی۔ دلاور کا رویہ کتنا ہی غلط کیوں نہ رہا ہو انتقام کے نام پر اس کے ... عمل سے عورت کے نام کی تقدیس رسوا ہورہی تھی۔ اگر انتقام لینے کے لیے وہ دلاور کو قتل کردیتی تو یہ ایک فطری ردِعمل ہوتا جیسا کہ انگریزی میں کہتے ہیں کہ دوسری غلطی پہلی غلطی کا جواز نہیں بنتی۔

معلوم نہیں حسد، دکھ اور پچھتاوے، بے بسی اور اشتعال کے کتنے طویل اور صبر آزما دور سے گزر کے اس نے بے راہروی اختیار کی اور وہ کون تھا جس نے ایک عورت کی جذباتی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے غلط راستے پر ڈال دیا۔ یقیناً وہ کوئی خود غرض اور بے ضمیر مرد ہی ہوگا جو اسے شجرِ ممنوعہ کی لذت سے آشنا کر کے خود کسی اور کے باغ سے چوری کے پھل کا مزہ لینے نکل گیا۔ یہ بھی انگریزی مثل ہے کہ چوری کے پھل زیادہ میٹھے لگتے ہیں۔
(STOLEN FRUITS TASTE SWEETER)
اب یہ عورت اپنی عزتِ نفس کے احساس سے محروم ہو کے کسی بھکاری کی طرح جھوٹی محبت کے لیے دامن پھیلاتی تھی۔ مجھے شرم آئی کہ میں نے جھوٹ کو ڈھال بنایا مگر اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ مجھے یہ جھوٹ کتنا مہنگا پڑے گا۔ گو میرے ہاتھ میں دلاور کی بہت بڑی کمزوری آگئی تھی لیکن میں ذلت کی اس انتہا میں گرنے سے پھانسی چڑھ جانا بہتر سمجھتا تھا۔
اس بیڈ کے نیچے لیٹے لیٹے مجھے دلاور کی بیوی پر یقیناً ترس بھی آیا۔ یوں تو ہر عورت کمزور ہوتی ہے مگر وہ حد سے زیادہ کمزور ثابت ہوئی کہ نفس کے خلاف کوئی مزاحمت نہ کرسکی۔ اسے یہ خیال بھی نہیں آیا کہ اس کی اولاد کو ماں کے کردار کا یہ تاریک پہلو نظر آگیا تو ان پر کیا بیتے گی۔ ماں کے قدموں کے نیچے تو جنت ہوتی ہے۔ گناہ کے انگارے دیکھ کے وہ خود اپنی نظر میں گر جائیں گے۔ ماں کی مامتا بے آبرو ہوجائے گی۔
برائی سے برائی پیدا ہوتی ہے اور برائی کا انجام بھی برائی پر ہوتا ہے۔ شاید یہ مکافاتِ عمل کی بات تھی کہ جس دلاور نے اپنے مال و زر کے خزانوں کو جرم و گناہ کے کاروبار کی کمائی سے بھرلیا اسے پتا بھی نہیں چل سکا کہ گھر کے اندر اس کی عزت و غیرت کا خزانہ لٹ چکا ہے۔ کاش یہ بات میں اسے بتا سکتا۔ میں اس کا دشمن ضرور تھا لیکن اس کے گھر کی عزت میری نظر میں اپنے گھر کی عزت کے برابر تھی۔ ماں تو ماں ہی ہوتی ہے۔ بیٹی یا بہن تو سب کی ایک سی ہوتی ہے۔
دلاور تقریباً آدھے گھنٹے بعد آیا "نوشی۔ تم سو رہی ہو!"
"آں.... نہیں.... بس ایسے ہی۔" اس نے اداکاری کی "کیا وہ لوگ چلے گئے؟"
"ہاں۔ پیڈرو بھی آگیا ہے" دلاور نے کہا "وہ مجھے تلاش کرنے نکل کھڑا ہوا تھا۔ بے وقوف..."
"گھر میں اب کوئی لاش تو نہیں ہے؟"
"نہیں ہے۔ ڈرو مت۔ چلو میں تم کو چھوڑ آؤں پھر مجھے کام ہے۔"
"میں چلی جاؤں گی۔ تم جاؤ، شوفر کو بھیج دینا۔"
دلاور نے کہا "کہاں سے بھیج دوں۔ تم نے ہی تو کہا تھا کہ وہ بچوں کو گھمانے لے گیا ہے۔"
"اب آگیا ہوگا۔ کہیں سے فون کردینا۔ شام کو ہم سب مری جارہے ہیں۔"
"جاؤ بابا جاؤ، جان چھوڑو میری۔ یہ بتانے کے لیے تمہارا یہاں آنا بھی ضروری نہیں تھا" دلاور نے باہر جاتے ہوئے کہا۔
میں خاموش لیٹا نوشابہ کی ریاکاری دیکھتا رہا۔ دلاور کو اس کی پروا بھی نہیں تھی۔ وہ ایک ہی زنجیر میں جکڑے ہوئے دو قیدیوں کی طرح ایک دوسرے کا ساتھ نبھانے پر مجبور تھے اور یہ زنجیر معاشرتی قدروں کی نہیں تھی۔ بچوں کی تھی جو اُن کی مجبوری بن چکے تھے۔
دلاور کے جاتے ہی نوشابہ اٹھ کے باہر گئی اور کچھ دیر بعد لوٹ آئی "اب تم آزاد ہو۔"
میں نے باہر آتے ہوئے سوچا کہ کیوں نہ میں مکمل آزادی حاصل کرلوں۔ میں ایک ہاتھ مار کے نوشابہ کو بھی لٹادوں اور اس کی گرفت سے نکل جاؤں مگر وہ میری توقع سے زیادہ چالاک ثابت ہوئی۔ میں بیڈ کے نیچے سے نکلا تو وہ اسی طرح ہاتھ میں ریوالور لیے کھڑی ہوئی تھی جیسے مجھے پہلی بار نظر آئی تھی۔
میں نے مسکرا کے کہا "اب یہ قتل کا سامان کس لیے۔ قتل تو تم پہلے ہی کرچکی ہو۔"
"مجھے بے وقوف مت سمجھو سکندر۔ میں مردوں کو سمجھتی ہوں۔ کسی حد تک میں تمہیں بھی جانتی ہوں" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا "میرے جیسی عورت اگر یقین کرلے کہ تم واقعی اس کے حسن و شباب سے متاثر ہوگئے ہو تو وہ انتہائی بے وقوف عورت ہوگی۔ مجھے معلوم ہے اب کوئی مجھ سے لیلیٰ مجنوں والی محبت نہیں کرسکتا۔ ہاں جن کی ہوس کی پیاس گھر کے پانی سے نہیں بجھتی وہ میرے جسم کو بالکل کوکا کولا کی طرح قبول کرلیتے ہیں۔"
میں نے بے بسی سے کہا "پھر کیا حکم ہے میرے لیے۔ مس کوکا کولا۔"
"آگے چلو اور ڈکی میں لیٹ جاؤ۔ ڈکی میں نے کھول دی ہے۔ راستے میں ڈکی کھول کے چھلانگ لگانے کی کوشش بھی مت کرنا۔ ڈکی اندر سے نہیں کھل سکتی۔"
میں نے کہا "اگر میں اس حکم کی تعمیل سے انکار کردوں تو؟"
"تو مجھے تمہیں گولی مارتے ہوئے ذرا بھی ہچکچاہٹ نہیں ہوگی اور میرا شوہر میری دلیری کی داد دے گا۔ میں اسے بتادوں گی کہ سکندر بخت بدمعاش تو بیڈ کے نیچے چھپا ہوا تھا اور میں باہر نکلی تو وہ میرے تعاقب میں آیا۔ اسے شاید معلوم نہیں تھا کہ میرے پاس ریوالور ہے۔ بیڈ کے نیچے تمہاری موجودگی کے آثار پولیس خود تلاش کرلے گی۔ شاید تمہارے کچھ بال ہوں یا کھال کے ذرات۔"
میں نے ہتھیار ڈال دینا ہی بہتر سمجھا۔ وہ عورت بے حد خطرناک تھی اور کیوں نہ ہوتی، ایک تو وہ دلاور کی بیوی تھی۔ دوسرے زخم خوردہ عورت جونا گن سے کم نہیں ہوتی۔ اس کا داؤ پر کچھ نہیں لگا ہوا تھا۔ وہ سب کچھ ہار کے بھی جیتنے کی پوزیشن میں

تھی۔

اس امید میں کہ تقدیر سے بہتری کی امید رکھنی چاہیے اور عورت سے حماقت کی، میں ڈکی میں جالیٹا۔ ڈکی کھٹ سے بند ہوگئی۔ میں نے گھپ اندھیرے میں ہاتھوں سے اس کا لاک کھولنے کی ناکام کوشش کی اور پھر تسلیم کرلیا کہ وہ ٹھیک کہتی تھی۔ ڈکی کا لاک یا چابی سے کھولا جاسکتا تھا یا ڈیش بورڈ پر بٹن دبا کے۔ اس گاڑی کا لاکنگ سسٹم الیکٹرانک بھی تھا اور سنٹرل بھی یعنی ایک بٹن دبانے سے سارے دروازے اور ڈکی بند بھی ہوتے تھے اور کھلتے بھی تھے۔

صورت حال واقعی مضحکہ خیز اور ڈرامائی تھی۔ رابعہ یا غالب میں سے کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ اس وقت میں کہاں ہوں۔ اگر میں انہیں بتاتا کہ مجھے دلاور کی بیوی نے اغوا کرلیا تھا اور اپنے ساتھ لے گئی تھی کیونکہ بے وقوفی یا بدقسمتی سے میں اس کے حسن و شباب کے لیے جھوٹے خوشامدانہ الفاظ استعمال کر بیٹھا تھا۔ تو میری بات کو پہلے مذاق ہی سمجھا جاتا۔

لیکن یہ مذاق نہیں بڑی سنگین حقیقت تھی کہ معاملات کچھ اور الجھ گئے تھے۔ کالیا کی بہن کی عزت ضرور بچ گئی تھی مگر کالیا مارا گیا تھا اور اس کی بہن ہماری ذمے داری بن گئی تھی۔ دلاور کے خلاف کچھ رسوا کن ثبوت ہمارے ہاتھ لگ گئے تھے، جن سے اسے بلیک میل کیا جاسکتا تھا مگر باقی سب جان بچا کے نکل گئے تھے اور میں دشمن کے قلعے میں اتنا اندر تک چلا گیا تھا کہ واپسی کا راستہ بھی مجھ پر بند ہوگیا تھا۔

ڈکی میں ٹائر کے اوپر کارپٹ تھا مگر اس کے باوجود میں ہر جھٹکے پر اچھل رہا تھا۔ اپنے سر کو چوٹ سے بچانے کے لیے میں نے دونوں ہاتھ نیچے رکھ لیے تھے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ نوشابہ مجھے کہاں لے جائے گی۔ اپنے گھر یا کسی خلوت گاہ میں۔ اس عورت کی تو جتنی عزت تھی وہ لٹا چکی تھی مگر میری عزت خطرے میں تھی۔ میں سوچتا رہا کہ اس آگ سے اپنا دامن بچانے کے لیے مجھے کیا کرنا چاہیے..... ابھی تک وہ میری طرف سے بدگمان نہیں ہوئی تھی۔ کوکا کولا کی بچی۔ اسے یہ بتانا بھی مشکل تھا کہ مجھے صرف گھر کا سادہ پانی پسند ہے۔ میں اسے استعمال کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے لیے شرط یہ تھی کہ پہلے میں خود استعمال ہونا قبول کروں۔ میں نے اس فلسفے پر غور کیا کہ مقصد براری کے لیے جنگ کی حکمت عملی میں کچھ بھی غیر اخلاقی نہیں ہوتا مگر خود کو اس فلسفے پر عمل کرنے کے لیے قائل نہ کرسکا۔

سوچنا بے کار تھا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا "بھئی اپنے سکندر اعظم صاحب۔ اب یا تو تدبیر کام آئے گی یا تقدیر۔ ہیں جی، اور تدبیر اس لیے کام آئے گی کہ تمہارے مقابل ہے ایک عورت جو وہ ہوتی ہے، کیا کہتے ہیں اسے 'ناقص العقل'۔ ہیں جی، اس کی عقل تو ہوتی ہے گٹوں میں.... گٹے سمجھتے ہو آپ... ٹخنے۔ تمہاری عقل خیر سے بالکل صحیح جگہ پر ہے چنانچہ تم اس ناگن کو بھی ڈسنے سے پہلے قابو کرلو گے اور لاٹھی سلامت تمہارے ہاتھ میں رہے گی۔ انشاء اللہ۔"

یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ میں نے خود کو تن بہ تقدیر چھوڑ دیا کہ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا۔ سب مطمئن ہوں گے کہ سارے کام ٹھیک ہوگئے۔ کالیا کی بہن خوش ہوگی کہ عین وقت پر ہم فرشتۂ غیب کی طرح امداد لے کر پہنچے اور کالیا نے بیس ہزار ایک ہوسناک بھیڑیئے کے سامنے ڈال کے اس کے دامن عزت کو تار تار ہونے سے بچالیا۔ اب وہ بھائی بھی آ ہی ہوگا، وہ اپنے محسنوں کا شکریہ ادا کریں گے اور جان بچا کے فرار ہوجائیں گے۔ افسوس لڑکی، کالیا سے زیادہ کالی تیری تقدیر تھی جس نے تجھے رسوائی کے عذاب سے بچالیا تو تنہائی کے عذاب میں گرفتار کردیا۔

گاڑی رک گئی اور میرے خیالات کا بے سروپا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ میں نے ہلکا سا کھٹکا سنا اور ایک ہاتھ سے ڈکی کو دھکیلا تو اس کا ڈھکن پورا اوپر اٹھ گیا۔ میں کود کے باہر آیا۔ نوشابہ اسی طرح میری جان کی دشمن بنی کھڑی تھی۔

میں نے مسکرانے کی فضول کوشش کرتے ہوئے کہا "یہ تو تمہارا پرانا گھر ہے۔ یہاں کیوں لائی ہو مجھے؟"

"معلوم ہوجائے گا" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا "اندر چلو۔"

"کلوپیٹرا ہر شب ایک غلام کو اپنی خواب گاہ میں طلب کرتی تھی اور صبح محل کی فصیل سے اس کی لاش دریا میں پھنکوا دیتی تھی۔" میں نے کہا۔

"نہ میں کلوپیٹرا ہوں اور نہ تم غلام ہو۔ نہ یہاں محل ہے اور نہ دریا۔ پھر اس بات کا مقصد۔" اس نے مسکرا کے کہا "چلو شرافت سے اندر۔"

میں نے اندر کی جانب روانہ ہوتے ہوئے کہا "یہ ایک لطیفہ تھا۔ تمہیں ہنسی نہیں آئی تو سوری۔ میں اس بند دروازے سے نہیں گزر سکتا۔ میں بھوت نہیں ہوں۔ غالب کا سسر بھوت ہے۔"

وہ میری بات پر مسکرائی بھی نہیں۔ اس نے چابیوں کا ایک گچھا میری طرف پھینک دیا "سات نمبر چابی لگاؤ۔"

"کیا کھل جا سم سم کہنے سے کام نہیں چلے گا۔" میں نے سات نمبر چابی لگاتے ہوئے کہا "سات میرے لیے مبارک عدد ہے۔ ایک طوطے کی معرفت مجھے معلوم ہوا تھا کہ ساتویں مہینے کی سات تاریخ کو میری شادی ہوگی۔ اس وقت میری عمر ستتر سال ہوگی اور میری بیوی کی سات سال کم یعنی ستر۔ ہمارے سات بچے ہوں گے۔ جن کی سات آنکھیں ہوں گی یعنی وہ کانے ہوں گے۔"

نوشابہ ہنس پڑی "دلاور یہ بھی کہتا تھا کہ تم بکواسی ہو۔ جوکر ہو۔ یہاں بیٹھ جاؤ اور فون کا ریسیور اٹھاؤ۔"

میں ڈرائنگ روم میں قدم رنجہ فرما چکا تھا۔ یہ نسبتاً قدیم طرز کا مکان تھا۔ اس کا فرنیچر بھی پرانا تھا۔ اس گھر سے بہت سی تلخ یادیں وابستہ تھیں مگر آج میں یہاں ایک مجبور مہمان کی حیثیت سے لایا گیا تھا اور یہ بیک وقت تلخ و شیریں تجربہ تھا۔

نوشابہ نے مجھے ایک نمبر ملانے کو کہا اور ریسیور میرے ہاتھ سے لے کر ریوالور درمیانی میز پر عین میرے سامنے رکھ دیا پھر وہ اپنی بیٹی سے بات کرنے لگی اور اسے بتانے لگی کہ اسے کچھ دیر ہوجائے گی۔ وہ ایک ضروری کام نمٹا کے آئے گی۔ شام کو مری روانگی کا پروگرام طے ہے۔

میں نے اتنی دیر میں ریوالور اٹھالیا تھا۔ یہ اٹلی کا بنا ہوا بہت قیمتی کولٹ آٹومیٹک تھا۔ دلاور کی بیوی ایک پُراسرار عورت تھی اور بلاوجہ مجھے حیران کررہی تھی۔ اس نے مجھے ریوالور اٹھانے سے بالکل نہیں روکا تھا۔

ریسیور رکھ کے وہ میرے سامنے بیٹھ گئی "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں کیا سمجھوں۔ انتہائی احمق یا چالاک۔ تم مجھے گن پوائنٹ پر یہاں لائیں اور پھر گن میرے حوالے کردی" میں نے کہا۔

"یہاں مجھے تم سے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا۔"

"وہاں کیا خطرہ تھا؟ ایک شریف اور نہتے آدمی سے؟"

"اگر دلاور یا اس کا کوئی جاسوس مجھے دیکھ لیتا تو میری پوزیشن محفوظ رہتی۔ مجھ پر یہ الزام نہ آتا کہ میں تمہیں ورغلا کے یہاں لائی ہوں۔"

"اور اگر اب کوئی آجائے؟"

"یہاں کوئی نہیں آئے گا" وہ بولی "ذرا میں گاڑی کو گیراج میں بند کر آؤں پھر بات کریں گے۔"

"تم مجھے..... صرف باتیں کرنے کے لیے یہاں لائی ہو؟"

اس نے جاتے جاتے پلٹ کے مجھے دیکھا "ہاں۔ مجھے معلوم ہے کہ تم اس قسم کے مرد نہیں ہو جو بات کرنے سے پہلے ہاتھ پکڑتے ہیں۔"

اُس کی واپسی تک میں سوچتا رہا کہ مجھے بھاگ جانا چاہیے یا اس کی واپسی کا انتظار کرنا چاہیے۔ کمرے کے نیم تاریک ماحول میں صرف ایک لائٹ تھی جس سے خاموشی بھی پُراسرار لگتی تھی۔ اندر کئی ہفتے یا کئی مہینے کی محبوس ہوا کی بُو تھی۔ شاید ایک مدت سے ادھر کوئی نہیں آیا تھا۔ دلاور نے خطرات کے پیشِ نظر اپنی پرانی رہائش گاہ کو چھوڑ دیا تھا۔

وہ واپس آ کے پھر میرے سامنے بیٹھ گئی۔ اب وہ ایک بالکل بدلی ہوئی عورت تھی۔ سنجیدہ اور باوقار "مجھے اس شادی کے بارے میں بتاؤ۔ کون ہے یہ کالیا کی بہن؟"

میں نے کہا "سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے اسے دیکھا تک نہیں اور نہ میں اس کا نام جانتا ہوں لیکن آج دلاور اُس سے نکاح کرنے والا تھا۔ غالباً یہ نکاح اس لڑکی کے ساتھ ایک دھوکا ہوتا۔"

پھر میں نے اسے مختصراً کالیا کے بارے میں بتادیا۔ نوشابہ کے چہرے کی کیفیت بتارہی تھی کہ میری بات سے اسے کتنا صدمہ ہوا ہے۔ وہ سخت مشتعل ہوگئی۔ "مجھے معلوم ہوا تھا کہ اس نے کراچی میں بھی ایک شادی کررکھی ہے۔"

"سنا میں نے بھی ہے۔ تم نے اپنی سوکن کو دیکھا نہیں؟"

اس نے نفی میں سرہلایا "تمہیں کس نے بتایا تھا؟"

"میرے دوست اخبار والے ہیں۔ وہ سب پتا چلا لیتے ہیں۔"

وہ سوچتی رہی۔ "میری ایک بیٹی ہے۔"

"وہی جس کی تصویر میں نے دیکھی تھی، اپنے شوہر کے ساتھ؟"

"ہاں۔ ابھی سال بھر پہلے اس کی شادی مرچنٹ نیوی کے ایک ریڈیو آفیسر سے ہوئی تھی" وہ ایک دم اداس ہوگئی "ندیم شادی سے پہلے بڑا اچھا لڑکا تھا۔"

"ندیم اسی کا نام ہے؟"

اس نے سرہلایا "سوہنی کے شوہر کا۔ میری بیٹی کا اصل نام تو ریحانہ تھا مگر وہ شروع سے اتنی خوب صورت تھی کہ ہم اسے سوہنی کہنے لگے اور پھر یہی اس کا نام ہوگیا۔ سوہنی لندن میں پڑھتی تھی۔ ندیم وہاں ریڈیو آفیسر کا کورس کررہا تھا۔ وہ ایک دوسرے سے ملے تو بس..."

"یہ لو میرج تھی؟"

"ہاں۔ ندیم کو ایک یونانی شپنگ کمپنی نے بہت اچھی آفر دی اور اس نے وہ ملازمت قبول کرلی۔ ایک سال میں اس نے تین بار ملازمت چھوڑی۔ آج کل وہ لیٹن امریکن کمپنی میں ہے اور اس کی تنخواہ ایک سال میں تین گنا ہوچکی ہے۔ دوسرے فوائد الگ ہیں جو سب حاصل کرتے ہیں۔"

"جو اِدھر کا مال اُدھر کرنے سے حاصل ہوتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ غالباً یہی دیکھتے ہوئے دلاور نے اس کا رشتہ منظور کرلیا۔ اب مجھے شک ہے کہ ندیم کو دلاور کسی ناجائز مقصد کی خاطر استعمال کررہا ہے۔ سوہنی نے مجھے بتایا تھا کہ ندیم کے بارے میں عجیب وغریب خبریں مل رہی ہیں۔ ایک شخص نے گمنام فون کرکے سوہنی کو بہت کچھ بتایا تھا مگر اس بے وقوف لڑکی نے یقین نہیں کیا۔ اسے اپنے شوہر پر بہت اعتماد ہے۔ یہ نہیں سمجھتی کہ وہ داماد کس کا ہے۔"

میں نے کہا "کیا وہ اسمگلر ہے؟"

"اسمگلنگ تو کوئی خاص بات نہیں۔ تقریباً سب ہی کرتے ہیں۔"

"پھر کیا بات ہے؟"

"وہ جب جہاز پر جاتا ہے تو اپنی بیوی کے ساتھ جاتا ہے۔"

"یہ تو اچھی بات ہے؟" میں نے کہا۔

اس نے مجھے افسردگی سے دیکھا "مگر سوہنی کبھی اس کے ساتھ نہیں گئی اور یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ ہر بار اس کے ساتھ نئی بیوی جاتی ہے۔"

میں نے چونک کر اسے دیکھا "کیا.... وہ بردہ فروشی کرتا ہے؟"

"اس کی بیوی قانونی ہوتی ہے۔ نکاح نامے اور پاسپورٹ کے مطابق۔ مگر وہ اس کے ساتھ واپس نہیں آتی۔ اسے وہ طلاق دے کر کہیں چھوڑ آتا ہے۔ ظاہر ہے اس کی قانونی پوزیشن ہمیشہ بہت محفوظ رہتی ہے۔ وہ چاہے تو تین بھی ساتھ لے جاسکتا ہے۔ باہر کے ملکوں میں تو یہ تاثر عام ہے کہ مسلمان چار شادیاں کرتے ہیں اگر ایک پاکستان میں ہے تو کیا ہوا؟"

میں دم بخود بیٹھا رہا۔ بدبختی نوشابہ کے بعد اس کی سوہنی بیٹی کا نصیب ہوگئی تھی۔ "نوشابہ۔ کیا وہ بنگالی لڑکیاں ہوتی ہیں؟"

"بنگالی۔۔ یہ خیال کیسے آیا تمہیں؟"

"اس لیے کہ وہ مشرقی پاکستان جاتا تھا تو موت کا سامان لے کر مگر وہاں سے خالی ہاتھ نہیں لوٹتا تھا۔ وہ کسی کی زندگی خرید لیتا تھا جس کے پاس جوان جسم ہو۔ لاوارث اور برائے فروخت۔"

شاید یہ اس کے لیے نئی پُر آزار اطلاع تھی۔ وہ اپنے آنسو پیتی رہی اور ہونٹ کاٹتی رہی۔ "سکندر۔ تمہیں دولت اچھی نہیں لگتی؟"

"دولت سے زیادہ اچھی چیزیں ہیں میرے پاس۔ خوشی ہے اپنے انسان ہونے پر۔ خدا مجھے کُتا یا اس سے بھی گھٹیا جانور بنا سکتا تھا۔ اس نے مجھے اپاہج یا معذور نہیں بنایا۔ مجھے سب کچھ دیا جس کی خواہش کی جاسکتی ہے۔ ایک خوب صورت زندگی، صحت اور تعلیم، عزت اور محبت، مخلص دوست اور...... پیار کرنے کی صلاحیت۔ لوگوں سے، اپنے وطن سے۔ کیا اس کے بعد دولت کی ضرورت باقی رہتی ہے؟"

"تم نے ٹھیک کہا۔ جن کے پاس یہ سب نہ ہو وہ دولت اکٹھی کرتے ہیں اور پھر دولت سے سب کچھ خریدنا چاہتے ہیں۔ یہ سمجھتے ہیں کہ خوشی اور محبت بھی خریدی جاسکتی ہے۔ حالانکہ دولت کماتے کماتے اس نے سب کچھ گنوادیا ہے۔ میری محبت مرگئی ہے۔ اس کا قاتل خود دلاور ہے۔ وہ اپنی بیٹی سے بہت پیار کرتا تھا۔ سوہنی اب اس سے نفرت کرتی ہے لیکن اس کا مجھے کوئی افسوس نہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ سوہنی اپنے باپ کی بیٹی کہلانا پسند نہیں کرتی۔ دکھ کی بات تو یہ ہے کہ وہ ندیم سے نفرت کرنے لگی ہے۔"

اُس کی بات ادھوری رہ گئی اور وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ میں نے اسے رونے دیا۔ میں نے سوچا کہ مجھے یہ سب سننے کی کیا ضرورت ہے؟ نہ میرا اس عورت کی زندگی کے معاملات سے کوئی تعلق ہے اور نہ سوہنی سے۔ میں چاہوں بھی تو ان کی کوئی مدد نہیں کرسکتا۔

نوشابہ نے آنسو پونچھ کے کہا "تمہیں معلوم ہے وہ کیا کرتا ہے، سوہنی کا شوہر۔ وہ بہت ہینڈسم نوجوان ہے اور بہت چرب زبان۔ غالباً اس میں سیکس اپیل بھی بہت ہے۔ سوہنی جیسی بے وقوف لڑکیاں آسانی سے اس کے جال میں پھنس جاتی ہیں۔ وہ ان سے لو میرج کرلیتا ہے اور انہیں ہنی مون کے لیے باہر لے جاتا ہے۔ سوہنی کو تو یہ بھی علم نہیں ہوتا کہ وہ کس شپ پر تھا۔ کب کراچی آیا اور کب گیا۔ مہینے میں ایک دوبار وہ گھر کا چکر بھی لگالیتا ہے اور ڈھیروں سامان چھوڑ جاتا ہے۔ سوہنی کو سامان کی نہیں، شوہر کی ضرورت ہے مگر شوہر تو وہ نہ جانے کتنی لڑکیوں کا ہے اور وہ لڑکیاں بھی نہ جانے کون تھیں اور اب کہاں ہیں؟"

"تم یہ سب کچھ مجھے کیوں بتارہی ہو آخر؟"

"میں.... میں چاہتی ہوں کہ تم کچھ کرو۔ تمہارے اخباری دوست...."

"مسز دلاور.... نوشابہ۔ فرض کرو میں نے سب کچھ معلوم کرلیا۔ معلوم ہے اس کے بعد کیا ہوگا؟ ندیم کی ملازمت ختم ہوجائے گی۔ وہ اندر ہوجائے گا اور ہوسکتا ہے وہ جیل سے کبھی باہر نہ آئے۔ کیا پتا باہر لے جانے کے بعد اس نے اپنی بیویوں کو صرف طلاق دی یا انہیں کسی کے ہاتھ بیچ دیا اور جنہوں نے اس کی مطلقہ بیویوں کو خریدا انہوں نے بعد میں ان لڑکیوں کو کیسے رکھا۔ کنیز یا داشتہ بنا کے زبردستی۔ سرکش قسم کی لڑکیوں کو قید میں رکھا یا موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس دنیا میں جہاں پیسہ حکمران ہے شیطان کا قانون چلتا ہے جس کے سامنے انسان کا قانون بہت بے بس ہے۔ تم اپنے ساتھ سوہنی کی زندگی کو بھی داؤ پر لگاؤ گی۔"

"مجھے اس کی پروا نہیں۔ تم میری مدد کرو۔ اس کے بدلے میں تمہارے لیے بہت کچھ کرسکتی ہوں۔ وہ نہیں جو تم سمجھ رہے ہو۔ میں دلاور کے خلاف تمہارا ساتھ دوں گی۔"

"وہ کیسے۔ تم بیوی ہو اُس کی اور ہر بیوی بہت مجبور ہوتی ہے۔"

"لیکن ہر بیوی بہت کچھ جانتی ہے۔ جو باہر کا آدمی جان ہی نہیں سکتا۔"

میں نے کہا "اوکے۔ فرض کرو میں ندیم کے متعلق سب کچھ معلوم کرکے تمہیں بتادیتا ہوں پھر تم کیا کروگی؟ اسے سمجھاؤ گی؟ وہ سمجھنے والا آدمی نہیں ہوگا۔ اگر تم نے اسے بلیک میل کیا تو بیک وقت دو خطرناک دشمنوں سے کیسے مقابلہ کروگی۔ دلاور اور اس کا داماد تمہاری اور تمہاری سوہنی بیٹی کی زندگی کو جہنم بنادیں گے۔ یا تم دونوں کو جہنم رسید کردیں گے۔"

"تم ہماری فکر مت کرو۔ میں سنی سنائی پر اعتبار نہیں کرتی۔ مجھے ثبوت مل جائے پھر میں خود نمٹ لوں گی دلاور سے بھی اور اس سے بھی۔ جس نے میری سوہنی بیٹی کی زندگی برباد کی۔ کیا تمہیں معلوم ہے دلاور نے مجھ سے کس طرح شادی کی تھی؟"

"وہ ضرور آپ پر مرمٹا ہوگا اور آپ کے سیکڑوں چاہنے والوں کے مقابلے میں جیت گیا ہوگا۔ خوش قسمت تو وہ ہے ورنہ اب تک جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہوتا یا...." میں کہنا چاہتا تھا کہ نہیں مگر ایک بیوی کے سامنے اتنی بھیانک بات کہنا مناسب نہ تھا۔

"اس نے مجھے زبردستی حاصل کیا تھا۔ یوں سمجھ لو کہ کالیا کی بہن کو تم نے بچالیا۔ مجھے بچانے کے لیے غیب سے کوئی فرشتہ نہیں آیا تھا۔ میرا بھائی نہیں، باپ تھا جو مجھے بیچنے پر مجبور ہوگیا تھا۔"

"تمہیں یہ شادی منظور نہیں تھی.... آخر کیوں؟"

"اس کی وجہ بہت معمولی ہے۔ میں کسی اور کو پسند کرتی تھی۔ وہ دلاور کے مقابلے میں تو غریب تھا لیکن وہ انسان تھا۔ دلاور نہیں تھا۔"

"تم انکار کرسکتی تھیں۔ کیا تم میں بغاوت کی ہمت نہیں تھی؟"

اس نے کہا "ہمت تو بہت تھی۔ میں بے وقوفی کی حد تک بہادر تھی لیکن وہ شریف آدمی تھا اس لیے بزدل تھا۔ اس نے صاف انکار کردیا کہ نوشابہ عام حالات میں سول میرج میں کوئی حرج نہ تھا مگر تم نے ایسا کیا تو تمہارا باپ خودکشی کرلے گا۔ اس کے پاس دوسرا کوئی راستہ ہی نہیں رہے گا۔ میں تمام عمر احساسِ جرم کی اس خلش کے ساتھ نہیں گزار سکتا۔ میں اپنی محبت کو قربان کرسکتا ہوں مگر کسی مجبور آدمی کے خون کا الزام قبول نہیں کرسکتا۔ میں نے کہا کہ الزام تم پر کیسے آسکتا ہے تو اس نے کہا کہ نوشابہ، میں اس عدالت کی بات نہیں کررہا تھا جہاں جھوٹی گواہی پر قاتل بھی رہا ہوجاتے ہیں۔ میں تو اپنے اندر کی عدالت میں مجرم ثابت ہوجاؤں گا اور اپنے آپ سے بچ کر کوئی کہاں جاسکتا ہے؟"

"وہ واقعی انسان تھا" میں نے کہا۔

"بس اس کے بعد میں نے نوشتۂ تقدیر جان کے خود کو دلاور کے حوالے کردیا تھا۔ چوبیس سال کی جیل کاٹ چکی ہوں میں صرف ان بچوں کی خاطر جن کو میں پیدا کرنا نہیں چاہتی تھی مگر انہیں پیدا ہونا تھا۔ مجھے بعد میں یہ بھی پتا چلا کہ میرے باپ پر مجبوری کا قرض میری رخصتی کے بعد بھی باقی رہا تھا۔ اس کو دلاور کے چنگل سے موت کے بعد رہائی ملی۔"

"کیا یہ موت طبعی تھی؟" میں نے کہا۔

"تم بہت ذہین آدمی ہو۔ کاش ندیم سے پہلے تم سوہنی سے ملے ہوتے۔ وہ ضرور تمہیں پسند کرتی اور یہ ناممکن تھا کہ تم اس کی چاہت میں گرفتار نہ ہوتے، میں نے سنا ہے کہ جسے تم چاہتے ہو...."

"سوہنی وہی ہوتی ہے جسے مہیوال چاہے۔ اس ندیم کا پورا نام کیا ہے؟"

"ندیم ناصر۔"

"آج کل وہ کس جہاز پر ہے اور کہاں ہے؟"

اس نے نفی میں سرہلایا "یہ تو تمہیں معلوم کرنا پڑے گا۔"

"ابھی تک مجھے یہ معلوم نہیں ہوا کہ اس سے مجھے کیا حاصل ہوگا۔ تم کیا مدد کرسکتی ہو میری؟"

"تم اپنے باپ کے قاتل کو تلاش کررہے ہو نا؟ میں تمہیں اس کے بارے میں وہ سب بتاسکتی ہوں جو تمہیں معلوم نہیں۔"

میں اسے بے یقینی سے دیکھتا رہا "اگر ایسی ہی بات تھی تو تم نے مجھ سے پہلے رابطہ کیوں نہیں کیا تھا؟ آج کی ملاقات تو اتفاقیہ تھی۔"

"ہر کام کے لیے ایک وقت بہرحال مقرر ہے۔"

"یہ سب کچھ تم دلاور کے کہنے پر کہہ رہی ہو؟" میں نے کہا۔

اُس کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا "میں... جھوٹ بول رہی ہوں؟ یہی مطلب ہے نا تمہارا...؟"

"ہاں۔ جھوٹ سب بولتے ہیں اور دلاور وہ شاطر ہے جس کے پاس سارے مہرے ہیں۔ وہ اچانک کوئی مہرا ایسے آگے بڑھادیتا ہے کہ تقدیر ساتھ نہ دے تو حریف کو مات ہوجائے۔ سانپ کا ڈسا ہوا رسّی سے ڈرتا ہے۔ ایک بار اکبر خان مجھے یقین کا فریب دینے میں کامیاب رہا تھا۔ وہ دلاور کا بھائی تھا اور اس یقین نے مجھے عذابوں کے بدترین جہنم میں جھونک دیا تھا پھر اس کی بہن آگئی اور ابھی تک میں اس پر اعتبار کی سزا بھگت رہا ہوں۔ ان حالات میں یہ ناممکن نہیں ہے کہ اس نے اپنی بیوی کو آگے بڑھادیا ہو۔ وہ بڑا زبردست ایکٹر اور ڈائریکٹر ہے۔ جب وہ کوئی سچویشن پیدا کرتا ہے تو وہ حقیقت سے زیادہ حقیقی لگتی ہے۔ اکبر خان کی کہانی، شیلی کی کہانی اور تمہاری کہانی۔ ہر کہانی میں سچ کا وہ زہر تھا جسے میں نے سقراط بن کے قبول کرلیا مگر اب مجھے عقل آگئی ہے مسز دلاور۔ میں کسی اور کے لیے نہیں مرسکتا۔ میں مروں گا تو صرف اپنے لیے یا رابعہ کے لیے۔ میں اظہار ہمدردی کرسکتا ہوں مگر اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اگر یہ سب سچ تھا تو خدا تمہاری مشکل آسان کرے۔ جھوٹ تھا تو دلاور کو بتادینا کہ اس کا شکار زیرِ دام آکے نکل گیا۔"

اُس نے ایک دم مجھ پر دیوانہ وار حملہ کیا "تم.... تم بھی ذلیل اور کمینے مرد ہو۔ میں سمجھی تھی تم انسان ہو۔"

اُس کی ہر لحظہ بدلتی ہوئی حالت مجھ سے پوشیدہ نہ تھی۔ اس کے جذبات کا تغیّر اس کی صورت سے عیاں تھا اور میں اس ردِّ عمل کے لیے ذہنی و جسمانی طور پر تیار تھا۔ اگر میں بے خبر ہوتا تو وہ اپنے ناخنوں سے میرا منہ نوچنے میں کامیاب ہوجاتی، میرے چہرے کو لہولہان کردیتی اور میرے کپڑے پھاڑ دیتی۔

میں نے اس کے ایک زوردار تھپڑ رسید کیا۔ وہ پلٹ کے پیچھے گری اور پھر اٹھ کے آئی۔ میں نے دوسرا ہاتھ مارا اور اسے نیچے گرادیا۔ وہ بے حس و حرکت ہوکے قالین پر لیٹ گئی۔ میں نے جھک کے اس کی نبض دیکھی تو اس کی رفتار بہت تیز تھی۔ اس کا سانس بھی دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ میں نے اس کے دوپٹے سے اس کے ہاتھوں اور پیروں کو باندھا اور پھر فون کا ریسیور اٹھالیا۔

نمبر ملتے ہی میں نے کہا "غالب..."
غالب نے کہا "تم ابھی تک وہیں ہو' خدا کے بندے؟"
"نہیں۔ میں خدا کی ایک بندی کے ساتھ ہوں۔ وہ مجھے ورغلا کے یہاں لے آئی۔ تم تو جانتے ہو میں کتنا بھولا بھالا اور معصوم نوجوان ہوں۔"
"سیدھی طرح بات کرو' تم کہاں ہو؟"
"تم نے دلاور کا پرانا گھر دیکھا ہوگا۔ جہاں وہ شروع میں رہتا تھا۔"
غالب نے کہا "دیکھا ہے۔"
"وقار یوسف کی گاڑی میں وہاں آجاؤ۔ فوراً....." میں نے ریسیور رکھ دیا اور نوشابہ کو دیکھنے لگا۔
وہ ہوش میں آنے کے بعد اپنے ہاتھ پاؤں آزاد کرانے کے لیے زور لگا رہی تھی اور بل کھا رہی تھی۔ اس کی شعلہ بار آنکھیں مجھ پر نفرت کے زہریلے تیر برسا رہی تھیں۔ "کیوں باندھا ہے تم نے مجھے؟" وہ چیخ کے بولی۔
میں نے کہا "شور مچانے سے گلا بھی بیٹھ جائے گا۔ تم خود بتا چکی ہو کہ ادھر کوئی نہیں آسکتا۔"
"تم کیا..... کیا چاہتے ہو' ذلیل انسان؟"
"کچھ نہیں۔ بس تم کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں کچھ دن۔"
"تم..... تم پچھتاؤ گے۔"

"میں پچھتانے کا قائل نہیں۔ غلطی سب کرتے ہیں۔ میں بھی غلطی کرتا ہوں تو نقصان اٹھاتا ہوں مگر پچھتاتا نہیں۔"
"میں چلانے لگوں گی تو کوئی ضرور آجائے گا۔"
میں نے کہا "مجھے مجبور مت کرو کہ میں تمہارا منہ بند کردوں۔ یا تمہیں باتھ روم میں بند کردوں۔"
اُس نے جیسے اپنی شکست مان لی۔ اس نے عورت کا آخری حربہ بھی آزمالیا۔ وہ رونے لگی "خدا کے لیے یہ مت کرو۔ تم آزاد ہو۔ مجھے چھوڑ دو۔ میری گاڑی میں چلے جاؤ لیکن مجھے ساتھ مت لے جاؤ۔ دلاور مجھے مار ڈالے گا.....وہ بہت شکی آدمی ہے۔"
"وہ مجھ پر شک نہیں کرسکتا۔ کم سے کم تمہارے معاملے میں۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ میں خطرناک دشمن ضرور ہوں مگر ذلیل آدمی نہیں ہوں۔"
دس منٹ بعد غالب نے باہر سے ہارن بجایا تو میں نے دروازہ کھولا "آیئے' تشریف لایئے۔ اسے اپنا ہی گھر سمجھئے۔"
غالب نے حیرانی سے نوشابہ کو دیکھا "یہ ہے وہ خدا کی بندی جو تمہیں ورغلا کے یہاں لے آئی تھی؟"
"یہ مسز دلاور ہیں۔ اصل نام نوشابہ ہے۔"
غالب اچھل پڑا "مسز دلاور۔ دلاور کی بیوی..... اصلی؟"
"بالکل اصلی..... اور پہلی" میں نے کہا "یہ ہمارے ساتھ جائیں گی۔"

نوشابہ کے منہ میں کپڑا ٹھونس کے میں نے اسے غالب کے سپرد کیا "چاند سی بنو اب تیرے حوالے۔"
"یار' اس پینڈورا کے باکس کو میں کہاں لے جاؤں؟"
"اس سے پوچھو تو یہ کہے گی۔ ماںجھی میری قسمت کے جی چاہے جہاں لے چل۔" میں نے دروازے کو پھر سات نمبر چابی سے لاک کیا اور اس پر سے اپنی انگلیوں کے نشانات صاف کئے "تم چلو' میں تمہارے پیچھے آتا ہوں۔"
"کیسے آؤ گے..... دوڑ لگاؤ گے گاڑی کے ساتھ؟"
"ابے یہ گاڑی ہے؟" میں نے گاڑی کو ایک لات ماری۔ "اس کھٹارے سے تو گدھا گاڑی اچھی ہوگی۔ ہم آئیں گے ایک بیش قیمت کیڈیلاک میں۔"
غالب نے ایک آہ بھری "کسی کیڈیلاک والی نے کبھی ہمیں نہیں ورغلایا۔ ملی بھی تو وہ بھوت کی بچی۔ قاتل حسینہ۔"
"میں مسز دلاور کو بتا چکا ہوں کہ تمہارا سسر بھوت ہے۔" میں نے گیراج کی طرف جاتے ہوئے کہا "ٹھیک ایک کلومیٹر کے بعد گاڑی روک لینا۔ خاتون کو ذرا سنبھال کے لے جانا۔ دلاوری میں یہ دلاور کی مونث ہیں بالکل۔"
اس پرانے بنگلے سے دونوں گاڑیاں آگے پیچھے روانہ ہوئیں۔ میں نے غور کیا تو مجھے کار میں ٹیلی فون بھی نظر آگیا۔ ایک فرلانگ کے بعد میں گاڑی روک کے آگے گیا۔ میں نے نوشابہ سے دلاور کا

نمبر پوچھا۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا اور خطرہ یہ تھا کہ کپڑا نکالا گیا تو وہ شور مچا کے راہ گیروں کو متوجہ کرلے گی۔
غالب نے ڈیش بورڈ میں دیکھا تو اسے ایک نوٹ بک اور پنسل مل گئی۔ "تم یہ نمبر لکھ سکتی ہو۔"
میں نے غالب کی تائید کی "اس کے لیے تمہارے ہاتھ کھولے جاسکتے ہیں۔ تمہیں منہ کھولنے کی اجازت بھی دی جاسکتی ہے۔ بشرطیکہ تم اپنی آواز کم رکھو اور حلق سے لاؤڈ اسپیکر کا کام نہ لو۔"
اُس نے اقرار میں سر ہلایا اور میں نے گاڑی میں اس کے ساتھ بیٹھتے ہوئے اس کے حلق سے کپڑا نکال لیا۔ میں پوری طرح چوکس تھا کہ اگر وہ چلانے کی ہمت بھی کرے تو اس کا منہ دبالوں مگر وہ خاموش رہی اور لمبے لمبے سانس لینے لگی۔
"تم میرے ساتھ اچھا سلوک نہیں کررہے ہو۔"
"اگر یہ ہمارا گھر ہوتا تو ہم دست بستہ خدمت کے لیے کھڑے نظر آتے اور تمہارے ہر حکم کی تعمیل کرتے مگر یہ سڑک ہے" میں نے کہا۔
"تم نے تو کہا تھا کہ تمہاری نظر میں ہر عورت ماں' بہن یا بیٹی ہے۔"
"میں نے جو کچھ کہا تھا غلط نہیں تھا۔ میں اس بات پر قائم ہوں۔"
"دلاور کا ٹیلی فون نمبر تو مجھے معلوم نہیں" اس نے کہا۔

"اب یہ ایسی بات ہے جس پر اصولاً تمہارے جھانسے میں رسید ہونا چاہیے لیکن میں ایسا نہیں کروں گا۔ کیا یہ بات قابلِ یقین ہے کہ بیوی کو شوہر کا فون نمبر معلوم نہ ہو۔ تم سے کیسے بات کرتا تھا وہ؟"
"مجھ سے...؟"
"میں گاڑی میں لگے ہوئے فون کا نمبر نہیں پوچھ رہا تھا۔ وہ شاید خفیہ قسم کے ایف ایم بینڈ پر کام کرتا ہوگا اور کال کسی عام فون کے تھرو ملتی ہوگی۔ یہ بتاؤ کہ گاڑی سے دلاور کا تم سے رابطہ کس نمبر پر ہوتا تھا؟"
وہ تذبذب میں پڑ گئی "معلوم نہیں' اس وقت کہاں ہوگا وہ۔ ایسے تو بہت سے نمبر ہیں۔"
میں نے کہا "خاتون۔ زیادہ چالاک مت بنو۔ میں اس فون کے بغیر بھی اس کو پیغام دے سکتا ہوں لیکن اس کو پیغام دیر سے ملے گا تو پریشانی تمہیں ہوگی۔ ڈائریکٹ بات ہوجائے تو تمہارے حق میں اچھا ہے۔"
اس نے مجھے ایک نمبر دیا "اس پر کوشش کرلو۔"
"وہ خود ہوگا اس نمبر پر؟"
"نہیں ہوگا تو کوئی اور ملے گا۔ تم کہہ دینا کہ پیغام... ایکس وائی زیڈ ہے۔ اس کا مطلب ہے انتہائی اہم اور فوری پھر وہ خود بات کرلے گا تم سے مگر تم کیا کہو گے اُس سے؟"
"یہی کہ آئے اور تمہیں لے جائے" میں نے کہا۔
"وہ نہیں آئے گا۔"
"تو کسی کو بھیج دے گا۔ تم خود بات کرلینا اُس سے کہ یہ بدمعاش مجھے بے ہوش کرکے اغوا کرلایا ہے۔"
وہ جگہ ایسی تھی کہ دونوں گاڑیاں سڑک سے کافی فاصلے پر کھڑی ہوئی تھیں۔ غالب نے وقار کی گاڑی کا بونٹ اٹھادیا تھا جس سے یہ تاثر ملتا تھا کہ ایک گاڑی خراب ہوگئی ہے اور دوسری گاڑی اس کی مدد کے لیے رکی ہوئی ہے۔
کار فون لندن میں عام تھے۔ خصوصاً ٹیکسیوں میں لیکن دلاور کی شاہانہ کیڈیلاک میں وائرلیس فون کا سسٹم کچھ اور تھا۔ اسے سمجھنے اور آپریٹ کرنے میں مجھے تھوڑا سا وقت لگا۔ پہلا مسئلہ ایریل کا تھا جو ایک بٹن دبانے سے خود بخود باہر نکل کے اوپر اٹھ گیا۔ دوسرا ٹیلی فون کی پاور لائن کا تھا۔ یہ سگریٹ لائٹر سے جوڑی گئی تھی۔
ریسیور میں لائٹ آتے ہی میں نے نوشابہ کا دیا ہوا نمبر ملایا۔ فوراً ہی دوسری طرف گھنٹی بجنے لگی۔ تین گھنٹیوں کے بعد کسی نے ریسیور اٹھالیا۔
"ہیلو' ہیلو... کون بول رہا ہے؟"
دلاور نے آواز بدلی تھی مگر میں نے اسے لہجے سے پہچان لیا۔
"اپنے چوہدری دلاور صاحب۔ کیا حال ہے خیر سے آپ کا؟"
"تم..... سکندر بخت۔ کیا بات ہے؟" اس نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ شاید اسے امید تھی کہ میرے خود فون کرنے کا مقصد

مصالحت کے سلسلے کا آغاز بھی ہوسکتا ہے۔ "اچھا سوانگ بھرا تھا تم نے۔"
"تم کب پہچانے تھے مجھے۔ بڑا افسوس ہے اپنے چوہدری صاحب' آپ اب بڈھے ہوگئے ہو۔ نظر دھوکا دے جاتی ہے۔"
وہ ہنسا "شکر ہے عقل دھوکا نہیں دیتی۔ جو تم جیسے نوجوانوں کو اکثر دھوکا دیتی ہے۔ یہ بتاؤ فون کیوں کیا ہے؟"
"پوچھنا یہ تھا جناب عالی۔" میں نے اسی کے لہجے میں کہا "کہ اس وقت حاضر اسٹاک میں خیر سے آپ کی کتنی بیویاں ہیں...؟ ہیں جی' ایک دو کہ تین؟"
وہ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد بولا "تیسری بھی ہوگی سکندر...... تم ڈھول پیٹتے رہ جاؤ گے ساری دنیا میں۔"
میں نے کہا "میں تو حاضر اسٹاک کی بات کررہا تھا۔ اس وقت کتنی ہیں۔ شاید تمہیں معلوم نہیں' خیر میں بتادیتا ہوں کہ جواب ہے ایک۔"
"اب بھی تم نے اصل بات نہیں کی۔ ایک بیوی ہے میری۔ ٹھیک" دلاور نے کہا "آگے بولو۔"
"ایک کون سی۔ لاہور والی یا کراچی والی؟"
غالباً اسے میرے انکشاف سے الیکٹرک شاک لگا "کراچی والی!"
میں نے کہا "ہم سے مت چھپاؤ اپنے چوہدری صاحب۔ ہم تو یہاں بیٹھ کے اس کا ناک نقشہ بھی بتادیں گے۔ پتا ٹھکانا بھی اور یہ بھی کہ خیر سے وہ کتنے دن بعد ماں بنے گی۔"
"اس طرح تم مجھے بلیک میل کرنے کی سوچ رہے ہو تو احمق ہو' بے شک یہ بات میری بیوی کو..... میری پہلی بیوی کو معلوم نہیں مگر معلوم ہوجائے گی تو کیا ہوگا؟ تھوڑا سا شور کرے گی' روئے گی' پیٹے گی مگر جائے گی کہاں؟ اس کا کون سا میکہ ہے۔ ہیں جی' ایک وہ پاگل دا پتر ہے..... اس کا بھائی۔"
میں نے کہا "چوہدری صاحب۔ میں بلیک میلر نہیں ہوں۔ کم سے کم ایسی فضول دھمکی سے آپ جیسے بڑے شکاری کو بلیک میل کرنے کی کوشش ایسی ہے جیسے کوئی چھرے والی بندوق سے شیر کو مارنا چاہے۔ یہ بتاؤ کہ تمہاری بیویاں اس وقت کہاں ہیں۔ کس جگہ اور کس کے ساتھ؟"
"بکواس ختم کرو اپنی۔ کیا تم نے فردوس کو اغوا کرلیا ہے؟"
"فردوس یعنی جنت۔ جنت کو تو ہم واقعی اغوا کرکے لے گئے تھے لیکن وہ تمہاری بیوی کب بنی تھی" میں نے کہا "وہ تو انشاء اللہ تمہاری قاتلہ بنے گی کیونکہ تم نے اس کے بھائی کو مار دیا ہے۔"
"وہ جو چاہے کرے۔ تم جیسے اُلو کے پٹھے نہ جانے کب سے یہ حسرت لیے پھر رہے ہیں... میں اس کی بات نہیں کررہا تھا۔"
"اوہ۔ میں سمجھ گیا۔ یہ کراچی والی زوجۂ ثانی ہوں گی۔ نہیں جناب عالی' ہم نے تو آپ کی پہلی بیوی کو اغوا کیا ہے۔ جھوٹ بولنے سے کیا فائدہ۔"

"نوشابہ کو؟ بکواس کرتے ہو تم؟"

"میں تو بہت کچھ کرتا ہوں دلاور۔ جو تم اچھی طرح جانتے ہو۔ مثلاً اس وقت میں تمہاری شاندار کیڈیلاک چلا رہا ہوں اور تم سے تمہارے ہی کار فون پر بات کر رہا ہوں۔ یہ بھی بکواس ہے تو مجھے کال کر کے دیکھ لو۔" میں نے ریسیور بند کر دیا۔

میری توقع کے عین مطابق آدھا منٹ بھی نہیں گزرا تھا کہ کار فون "پیپ پیپ" کرنے لگا' اس کی ننھی سی سرخ روشنی جلنے بجھنے لگی۔

"چوہدری دلاور اسپیکنگ" میں نے اسی کی آواز بنا کے کہا۔

"سکندر۔ یہ تم نے اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری ہے" دلاور اب نروس تھا۔

میں نے ہنس کے کہا "کلہاڑیاں اب میرے پیروں پر اثر نہیں کرتیں۔ اتنی بار ماری ہیں کہ یاد بھی نہیں۔"

"تم پکڑے جاؤ گے۔ گاڑی خود اپنا پتا دے گی۔"

"گاڑی پکڑی جائے گی۔ یہ تو ہو سکتا ہے مگر اس کے ساتھ میں بھی پکڑا جاؤں یا تمہارے بچوں کی اوریجنل ماں تمہیں مل جائے۔ یہ ذرا مشکل ہو گا۔"

"میں بات کرنا چاہتا ہوں نوشابہ سے۔"

"بسم اللہ۔" میں نے کہا "تمہیں شرعی حق حاصل ہے اپنی منکوحہ کی آواز سننے کا۔"

میں گاڑی کو اسٹارٹ کر کے تھوڑا سا آگے لے گیا اور اسے وقار کی گاڑی سے ملا کے کھڑا کر دیا۔ وقار کی گاڑی سڑک کی جانب رہی۔ کھڑکی کھول کے میں نے ریسیور ساتھ والی کھڑکی سے پاس کر دیا۔

"دلاور۔ انہوں نے مجھے اغوا کر لیا ہے۔ میرے گھر سے اور کہاں سے...... میرا وہاں آنا غلطی نہیں تھا۔ جو کچھ وہاں ہو رہا تھا وہ غلط تھا...... اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں ادھر تھوکنے بھی نہ آتی۔ کیا سنوں میں...... تم نے کبھی سنی میری... میں یہی کہتی تھی کہ بہت ہو گئی اب بس کرو ورنہ باہر کی آگ تمہارے گھر کے اندر پہنچ جائے گی۔ اس کو گالیاں دینے سے کچھ نہیں ہو گا۔ اندھے ہو تم اور تمہارے سارے..."

میں نے کہا "مختصر بات کرو۔ دلاور لمبی بات کر کے وقت لینا چاہتا ہے مسز دلاور۔"

"اچھا سنو۔ میں...... دماغ خراب ہے تمہارا۔ وہ اسی کوٹھی میں چھپا بیٹھا تھا۔ تمہارے شکاری کتے اس کی بو بھی نہ پا سکے اور نہ وہ قانون کے رکھوالے جو تمہارے جرائم پر پردہ ڈالنے آئے تھے۔ تمہارے جاتے ہی وہ آ گیا۔ میں نے بھاگنے کی کوشش کی تھی مگر کار تو اندر ہی تھی۔ ریوالور نکالنے کا موقع کہاں ملا مجھے۔ ڈرائیور ساتھ ہوتا تو کیا کر لیتا...... وہ بھی مارا جاتا۔ میرے ساتھ کوئی برا سلوک تو نہیں ہوا...... ہاں' بے ہوش نہ ہوتی تو میں شور مچاتی...... چلتی گاڑی سے کود جاتی۔ اب بھی ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے ہیں میرے۔

دلاور۔ انہوں نے صرف تم سے بات کرانے کے لیے منہ سے کپڑا نکالا تھا......"

میں نے ریسیور لے لیا "اچھا جی' اپنے چوہدری صاحب۔ خیر سے آپ نے اپنی گھر والی کی زبانی سب سن لیا۔ اب ہم چلتے ہیں۔"

"سنو۔ کہاں جا رہے ہو؟"

"سوئزرلینڈ براستہ تلہ گنگ" میں نے کہا۔

"آخر کیا چاہتے ہو تم...... بات کرو۔"

میں نے کہا "بات کرنے کے لیے ایک عمر پڑی ہے اپنے چوہدری صاحب' ہیں جی...... یار زندہ صحبت باقی۔"

میں نے ریسیور بند کیا۔ گاڑی کی چابیاں نکالیں اور گلوز کمپارٹمنٹ کو خالی کر دیا۔ اس میں گاڑی کے کاغذات کے علاوہ ایک چیک بک تھی اور ایک لفافے میں تقریباً دس ہزار روپے۔ پھر میں نے ڈکی کھولی۔ اس میں مجھے ایک سب مشین گن نظر آئی۔ میں نے اسے خالی کر کے بے مصرف کر دیا۔ گاڑی کو لاک کرنے سے پہلے میں نے بونٹ کھولا اور وہ سب تار نکال لئے جو نکالے جا سکتے تھے۔ ایک رومال سے میں نے ہر اس جگہ کو پہلے ہی رگڑ کے صاف کر دیا تھا جہاں جہاں میرے فنگر پرنٹ ہو سکتے تھے۔ تار میں نے وقار کی گاڑی میں ڈال دئے اور چابی غالب کے حوالے کر دی پھر میں نے کار فون کا ریسیور بھی کھینچ لیا۔

"اب تم جاؤ۔ مسز دلاور کو وی آئی پی مہمان بنا کے رکھو۔"

"تم...... تم مجھے کہاں لے جاؤ گے؟" وہ چلانے لگی "دلاور مجھے لینے آ رہا ہے۔"

"اس میں شور کرنے کی کون سی بات ہے۔ وہ پھر آ جائے گا۔ ایک بار نہیں دس بار آئے گا اگر اسے تمہاری ضرورت ہے۔ ظاہر ہے اب محبت کا مسئلہ تو ہے نہیں" میں نے کہا اور اسے دبوچ کے پھر اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔

"دلاور اب تمہیں ضرور پہچان لے گا۔" غالب نے کہا۔

"اب کی بات مت کرو بیٹے۔ تم شرط ہار چکے ہو۔ جاؤ اپنے یار غازی کے گھر۔ میں وہیں آ جاؤں گا۔"

گاڑی کے جاتے ہی میں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور سڑک عبور کر کے ایک پیڑ پر چڑھ گیا جہاں سے میں دلاور کی کار پر نظر رکھ سکتا تھا۔ مشکل سے پانچ منٹ گزرے ہوں گے کہ ایک ساتھ دو گاڑیاں آئیں اور کیڈیلاک کے آگے پیچھے رک گئیں۔ ایک گاڑی میں سے دلاور برآمد ہوا اور دوسری میں سے استاد پیڈرو۔ وہ غصے سے پاگل ہو رہے تھے۔

تقریباً سو گز کے فاصلے سے میں ان کی باتیں نہیں سن سکتا تھا لیکن ان کی حرکات و سکنات سے ان کی جذباتی کیفیت عیاں تھی۔ گاڑی کو لاک دیکھ کے پیڈرو نے اس پر لات ماری۔ دلاور نے اسے غصے سے دیکھا اور پھر جیب میں سے ڈپلی کیٹ چابی نکال کے دروازہ کھول لیا۔ وہ غصے کے باوجود سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم

...ہیں ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ٹیلی فون ریسیور جیسا ایک آلہ بھی ...تھا۔ شاید اس کی کار میں حفاظتی اقدام کے طور پر کوئی ایسا الیکٹرک ...سٹم بھی نصب تھا جو مسلسل سگنل نشر کرتا تھا اور اس سے یہ ...معلوم ہو جاتا تھا کہ گاڑی کس سمت میں ہے۔ سمت کا تعین ہونے ...کے بعد سگنل کی قوت دیکھتے ہوئے عین اس جگہ پہنچنا مشکل نہ تھا ...جہاں گاڑی موجود ہے۔ یہ عام قسم کے "سگنل ڈی ٹیکٹر" (SIGNAL DETECTOR) راڈار کے اصول پر کام کرتے ...ہیں اور اگر ملک کے اندر کہیں سے خفیہ نشریات جاری ہوں تو ان کا ...سراغ بھی انہی کی مدد سے لگایا جاتا ہے۔"

دلاور کو یہ ڈر ضرور تھا کہ کسی دن وہ گاڑی سمیت اغوا ...ہو جائے گا یا اس کے بیوی بچے۔ گاڑی کو چوری سے بچانے کا یہ ...نیا نظام تھا جو ضرورت پڑنے پر اس کے کام نہیں آیا تھا۔ تار ...الگ ہو جانے کے بعد گاڑی کا الیکٹرانک نظام بے کار ہو گیا تھا جس ...میں الیکٹرانک لاک۔ پاور ونڈو اور اگنیشن وغیرہ شامل تھے۔ اب ...کار اسٹارٹ بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ ایسی پُر تعیش اور پُر تکلف ...گاڑیوں میں یہی خرابی ہوتی ہے۔ جب ان کا خود کار نظام جواب ...دے جائے تو وہ عام گاڑیوں کی طرح چلنا اپنی توہین سمجھتی ہیں۔

دلاور نے یقیناً مجھے بہت گالیاں دی ہوں گی مگر میں درختوں کی ...شاخوں میں چھپا ہوا اس کی جھنجلاہٹ اور بے بسی سے لطف اندوز ...ہو رہا تھا۔ میرے ہاتھ میں دلاور کی بیوی کا سائلنسر والا ریوالور تھا۔ ...اگر میں چاہتا تو یہیں سے نشانہ لے کر دلاور کی کھوپڑی میں سوراخ ...کر دیتا اور اسے پتا بھی نہ چلتا کہ گولی کہاں سے آئی تھی مگر اسے ...قتل کرنا میرا مقصد نہیں تھا۔

دلاور اور پیڈرو کے ساتھ دو دو محافظ بھی آئے تھے جو منتظر تھے ...کہ اشارہ ملے تو وہ دشمن کو بھون کے رکھ دیں مگر دشمن چھلاوہ بن ...کے غائب ہو چکا تھا۔ دلاور بڑے غور سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ ...اس نے کچھ آتے جاتے لوگوں سے بھی پوچھا اور اس کے حکم پر ...حکم کے غلام دونوں طرف کے گھروں میں بھی گئے۔ یہ سب نئی ...کوٹھیاں تھیں جہاں عام لوگ نہیں رہتے تھے کہ وہ منہ اٹھا کے ...اندر چلے جاتے۔ ایک حکم کا غلام عین اس درخت کے نیچے سے ...بھی گزرا جس پر میں بڑی فراغت سے بیٹھا ہوا تھا۔

انہیں ہر طرف سے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ اگر کسی کوٹھی کے ...اندر سے کوئی ملازم یا مالی مجھے پیڑ پر چڑھتا دیکھ لیتا تو یہ ہو سکتا تھا کہ ...پیڑ کو گھیر لیتے مگر ایسی صورت میں قریب آنے سے پہلے ہی چاروں ...حکم کے غلام مارے جاتے اور دلاور کے ساتھ پیڈرو جان بچا کے ...بھاگتا پھر موقع پاتے ہی میں خود بھی نو دو گیارہ ہو جاتا۔

دلاور سمجھ گیا تھا کہ میں نے گاڑی کو چلنے کے قابل نہیں ...چھوڑا ہے اس نے میری ساری تخریبی کارروائی کا پہلی نظر میں ہی ...اندازہ کر لیا ہو گا۔ اس کے پاس چارہ نہ تھا کہ وہ اپنی اعلیٰ نسل کی ...دوسری گھٹیا گاڑی کے پیچھے باندھے اور کھینچ کر لے جائے۔ ...خدمت استاد پیڈرو کے سپرد ہوئی۔ میں گاڑی کو آہستہ آہستہ دور جاتا دیکھتا رہا۔

دلاور اب بھی وہیں موجود تھا اور اس کے ساتھ حکم کے دو غلام رہ گئے تھے۔ اس نے انہیں بھی غیر مسلح کر دیا تھا۔ ان کی سب مشین گنیں پیڈرو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ دلاور نے اپنی جیب میں سے بھی ریوالور نکال کے گاڑی میں ڈال دیا تھا۔ اس نے یہ سب کارروائی بڑے واضح انداز میں کی تھی۔ وہ چالاک آدمی یہ سمجھنے میں حق بجانب تھا کہ میرا کہیں آس پاس موجود ہونا بعید از امکان نہیں۔ وہ مجھے یہ دکھانا چاہتا تھا کہ اب اسلحہ کسی کے پاس نہیں اور میں چاہوں تو مذاکرات کے لیے تشریف لے آؤں مگر میں دلاور کی رگ رگ سے واقف تھا اور اس امکان کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا کہ ان سب کے پاس دوسرے ریوالور بھی ہوں گے۔

دلاور کی تشویش سے مجھے خوشی ہوئی۔ اگر وہ بیوی کو اہمیت نہ دیتا تو کبھی وہاں نہ آتا۔ بات صرف بیوی کی ہوتی تو وہ کہتا کہ سکندر اعظم صاحب' شوق سے رکھو اس سیکنڈ ہینڈ عورت کو اپنے پاس۔ بازار میں نئی بہت ہیں میرے لیے مگر معاملہ تھا اس کے بچوں کا۔ اگر ان کو ماں واپس نہ ملتی تو وہ دلاور کو عاق کر دیتے۔ دلاور بیوی کو چھوڑ سکتا تھا بچوں کو نہیں اور بچوں کی وجہ سے وہ بیوی کو ہر قیمت پر واپس حاصل کرنے پر مجبور تھا۔ میں نے اس بار جو گیم کھیلا تھا اس میں تقدیر نے میرا ساتھ دیا تھا۔ میں نے کالیا کی بہن کو شکار ہونے سے بچا لیا تھا اور تقدیر نے دلاور کی بیوی کو خود شکار ہونے بھیج دیا تھا۔ کالیا کی موت کے باوجود یہ بڑی کامیابی تھی۔

دلاور نے آدھے گھنٹے بعد ہمت ہار دی۔ اس نے سمجھ لیا ہو گا کہ بیوی کو بہ زور بازو واپس لے جانا ممکن نہیں اور جیسا کہ اغوا کر کے تاوان وصول کرنے والوں کا مروجہ طریقہ کار ہے۔ میں نے بھی پہلی بار اسے صرف یہی دیکھنے کے لیے بلایا تھا کہ وہ اکیلا آتا ہے یا اپنی فوج ظفر موج کے ساتھ؟

آدھے گھنٹے بعد اس نے واپس جانے کا فیصلہ کیا۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہاں اکیلا ٹھہرتا۔ جیب میں ریوالور ہوتا تب بھی اسے یہ خدشہ لاحق ہوتا کہ میں اچانک کہیں سے ٹپک پڑوں گا اور بیوی کی طرح شوہر کا اغوا حماقت کے ایک ڈرامے کا حرفِ آخر بن جائے گا۔ وہ نام کا دلاور تھا اور اس کی بہادری آتشیں اسلحے اور حکم کے غلاموں کی طاقت پر منحصر تھی۔ شاید وہ خود کو بہرصورت آزاد رکھنا بہتر سمجھتا تھا۔ اگر وہ بھی شکار ہو جاتا تو پھر سوہنی کے اماں ابا کو چھڑانے والا کوئی نہ رہتا۔

دلاور دوسری گاڑی میں بیٹھ کے نکل گیا تو میں نے اترنے کا ارادہ کیا اور ملتوی کر دیا۔ احتیاط کا تقاضا تھا کہ میں دس منٹ انتظار کروں۔ اس احتیاط نے مجھے محفوظ رکھا۔ ابھی پانچ منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ وہ کار واپس آئی۔ میں ایک سمت سے آنے والی سب ہری گاڑیوں کو دیکھ رہا تھا۔ دلاور ہرے رنگ کی ایک فورڈ اسکورٹ میں گیا تھا۔ دور سے میں اس کا نمبر نہیں نوٹ کر سکتا تھا مگر وہ لوٹ کر آئی تو عام رفتار سے نہیں بہت آہستہ آہستہ گزری۔ ظاہر

ہے دلاور اطمینان سے جائزہ لے رہا تھا کہ میں اپنی کمین گاہ سے نکل آنے کی حماقت کروں تو غیر متوقع طور پر پکڑا جاؤں۔

دلاور کو دوسری بار مایوسی ہوئی تو میں نے پیڑ کے اوپر سے کہا۔ "فکر مت کرو اپنے چوہدری صاحب۔ اب ہماری ملاقات ضرور ہوگی۔ ہیں جی اور ہمارے گراؤنڈ پر ہوگی۔ اپنی گلی میں کتا بھی شیر ہوتا ہے۔ ہم تمہیں وہاں بلائیں گے جہاں تم دم دبائے آؤ گے۔ اتنا تو پتا چل ہی گیا ہے کہ تمہیں نوشابہ نہیں اپنے بچوں کی ماں کی ضرورت ہے۔"

مزید دس منٹ کے بعد میں نے اترنے کا فیصلہ کیا۔ میں جس شاخ پر بیٹھا بلکہ لیٹا ہوا تھا وہ درخت کے تنے کا حصہ تھی۔ تنا اوپر سے انگریزی حرف وائی کی طرح دو حصوں میں تقسیم ہوگیا تھا اور یہ حصہ نسبتاً چوڑا اور سیدھا تھا۔ ٹاہلی یعنی شیشم کے اتنے بڑے درخت میں نے کم ہی دیکھے ہیں۔

پریکٹس نہ ہونے کی وجہ سے درخت پر چڑھتے ہوئے میری کہنیاں چھل گئی تھیں۔ اترتے ہوئے میں توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ نیچے والی کمزور شاخیں میرے وزن سے جھکنے لگیں تو مجھے چھلانگ مارنی پڑی۔ بلندی اب بھی کافی تھی۔ عقلمندی مجھ سے یہ سرزد ہوئی کہ میں شاخ پکڑ کے جھول گیا چنانچہ لچک کے ساتھ کافی نیچے پہنچ کے گرا۔ اس سے میری ہڈی پسلی بچ گئی۔

دو بچے جو وہاں گلی ڈنڈا کھیل رہے تھے۔ ایک مولانا صاحب جو سائیکل پر ہانپتے ہوئے محوِ سفر تھے۔ (حالانکہ دو من کے مولوی کو ڈھوتے ہوئے سائیکل کو ہانپنا چاہیے تھا) اور بس کے انتظار میں کھڑی ہوئی ایک عورت سب دم بخود رہ گئے۔ میں نے سب کو مسکرا کے دیکھا اور ایک طرف روانہ ہوگیا۔ جس کا جو دل چاہے سمجھے، مجھے کیا؟

دلاور کی کار سے ملنے والی رقم میری جیب میں تھی۔ میں نے ایک ٹیکسی کو روکا اور اسے غازی کے گھر کا پتا بتایا تو اس کی گردن دائیں بائیں ہلنے لگی۔ میں زبردستی بیٹھ گیا۔

"یار انکار سے دل مت توڑو۔ پیسے بے شک دگنے لے لو۔ مال حرام بہت ہے میرے پاس۔"

"بات پیسوں کی نہیں یار۔ میری مرضی نہیں تو پھر..."

میں نے کہا "چلو پھر میں یہ ٹیکسی خرید لیتا ہوں۔ بولو کتنے میں دو گے؟ میں تم کو گھر چھوڑ دوں گا۔"

وہ سمجھ گیا کہ میں پاگل نہیں تو ضرور خردماغ ہوں اور عام ٹیکسی ڈرائیوروں والا رویّہ میرے ساتھ نہیں چلے گا۔ وہ چل پڑا۔ "بڑی زیادتی ہے۔ لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ ٹیکسی میری ہے۔"

میں نے کہا "یہی تو غلط فہمی ہے تمہاری۔ یہ ٹیکسی ہے، کار ہوتی تو تمہاری ہوتی۔ ٹیکسی پبلک پراپرٹی ہوتی ہے۔ کیسی بھی ہو؟" میں نے اسے آنکھ ماری جس کا مطلب اس نے سمجھ لیا۔ ٹیکسی کا لفظ اس زمانے میں طوائف یا کال گرل کے لیے بھی مستعمل تھا۔

"میں نہ جاتا تو تم کیا کر لیتے؟ کیا بگاڑ لیتے میرا؟"

"میں مار مار کے تمہارا حلیہ بگاڑ دیتا" میں نے اطمینان سے کہا "آج رات تم اسپتال میں گزارتے۔ گھر نہ جاتے۔"

اُس نے سخت مشتعل ہو کے پیچھے دیکھا اور شاید اپنی صحت کا موازنہ میری صحت سے کرتے ہوئے خاموش ہو جانا بہتر سمجھا۔ غازی کے گھر سے کچھ فاصلے پر میں نے اسے سو کا نوٹ دیا۔ وہ کچھ دیر باقی رقم واپس کرنے کے لیے جیب ٹٹولتا رہا۔ پھر ایک دم گاڑی گیئر میں ڈال کے بھاگ گیا۔ دراصل گاڑی پہلے سے گیئر میں تھی۔ کلچ چھوڑ کے اس نے پوری ریس دی اور گویا مجھ سے بدلہ لے لیا۔ میں چاہتا تو اسے دوڑ کے بھی پکڑ لیتا مگر میں نے مسکرا کے کہا۔ "جا عیش کر پُتر۔ ہمارا کون سا باپ کا مال تھا" اور غازی کے گھر والی گلی میں داخل ہوگیا۔

غازی ٹانگ پر پٹی باندھے لیٹا ہوا تھا اور غالب وعظ کر رہا تھا۔ "اس کی تو خیر عقل میں کیڑے پڑ گئے ہیں۔ جب اسے کسی لڑکی کے ساتھ بھاگ جانا چاہیے تھا تب تو وہ ڈٹا رہا اور غالباً تم نے بھی جوانی ایسے ہی گزار دی۔ کسی چاہنے والی کے ساتھ فرار ہوئے بغیر۔ اب اس عمر میں جب تمہارے اللہ اللہ کرنے کے دن تھے۔"

میں نے اندر داخل ہو کے بہ آواز بلند کہا "اللہ اللہ۔ کیا زورِ بیان ہے۔ مرزا غالب میں شرم سے ڈوب مرنے کے لیے کہاں جاؤں؟"

غازی اٹھ بیٹھا "وہ آیا تھا... دلاور...؟"

میں نے کہا "کیسے نہ آتا وہ ایسے آیا جیسے..."

"شمع پر پروانہ آتا ہے" غازی نے کہا۔

"پرانی گھسی پٹی تشبیہ ہے مگر خیر۔ وہ شمع کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

"شمع یعنی پانچ بچوں کی اماں اندر ہے۔ اسے یہاں لا کے تم نے میری عزت داؤ پر لگا دی ہے۔ محلے والے جانتے ہیں کہ میں اکیلا ہوں۔ یہاں کبھی کسی عورت نے قدم نہیں رکھا۔"

"انہیں بتا دینا کہ تمہارے ہونے والے سسرال سے لوگ آئے تھے۔ محلے والوں کو دیکھنے" غالب نے کہا "محلّہ خراب ہو تو آدمی مکان نہیں لیتا۔ رشتہ کیسے کر سکتا ہے... رشتہ نہیں ہوا۔"

میں اندر گیا تو نوشابہ ایک پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں بھی اسی طرح بندھے ہوئے تھے اور اس کا منہ بھی بند تھا۔ ظاہر ہے وہ سخت تکلیف میں تھی۔

میں نے کہا "میں معافی چاہتا ہوں اس سلوک کی لیکن ہم رسک لینے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ تمہارا شوہر آیا تھا مگر توپ خانہ لے کر۔ بندوق اور گولی کی زبان میں بات کیسے ہو سکتی تھی۔ وہ واپس چلا گیا۔ میں اسے پھر بلاتا ہوں۔ اس میں کچھ وقت تو لگے گا۔"

اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور التجا تھی۔

میں نے کہا "مجھے معلوم ہے کہ شام کو تمہارا پروگرام اپنے بچوں کے ساتھ مری جانے کا تھا۔ وہ یقیناً پریشان ہوں گے۔ باپ کے اعمال کی سزا اولاد کو بھگتنی پڑتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ دلاور اس بات کو پھیلنے نہیں دے گا کیونکہ اس میں سب کی بدنامی ہے۔ وہ بچوں کو سمجھا سکتا ہے کہ تمہاری امی بہت جلد خیریت سے لوٹ آئیں گی۔ دلاور اتنا ضرور جانتا ہے کہ میں کمینہ شخص نہیں ہوں۔ اب تمہیں اس وقت تک ہماری قید میں رہنا ہوگا جب تک ہمارے اور دلاور کے درمیان کوئی معاہدہ نہ ہو جائے۔ یہ تم پر منحصر ہے کہ تم یہاں قیدی بن کے رہنا چاہتی ہو یا مہمان بن کے؟"

رابعہ میرے پیچھے آ کے کھڑی ہوگئی تھی "مسز دلاور۔ آپ تعاون کریں تو مشکلات کم ہوں گی۔ ہمارے لیے بھی اور آپ کے لیے بھی۔"

"ورنہ ہم آپ کو ایسے بھی رکھ سکتے ہیں۔ انجکشن دے کر سُلا بھی سکتے ہیں" میں نے کہا "مہمان بن کے تم دیکھ لو گی کہ ہم نواب میزبانی میں نہ پٹھانوں سے پیچھے ہیں اور نہ تکلف میں اہالیانِ لکھنؤ سے۔"

اس نے سر ہلا کے اپنی رضامندی کا اظہار کیا تو میں نے اسے کھول دیا۔ دوپٹہ کوئی سخت رسّی نہیں تھی مگر خود نوشابہ سختی کی عادی نہ تھی۔ اس کی کلائیوں پر دوپٹے سے بھی نشانات پڑ گئے تھے۔ جب میں نے اس کے منہ سے کپڑا نکالا تو کچھ دیر وہ چپ بیٹھی رہی اور آنسو پونچھتی رہی۔ رابعہ نے زیادہ رقیق القلب ہونے کا ثبوت دیا اور وہ بڑے دوستانہ انداز میں اس کے پاس بیٹھ کے اسے تسلی دینے لگی۔ نوشابہ کو اپنی نہیں بچوں کی فکر تھی۔

میں نے کہا "فکر مت کرو۔ میں نے دلاور سے کہہ دیا تھا کہ انہیں سمجھا دے۔"

"آخر مجھے قید کر کے تم کیا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا "مسز دلاور۔ تمہارے شوہر نے یہ سلسلہ شروع کیا تھا۔ وہ میرے عزیز ترین دوست کی بہن کو بیوہ کرنے کی دھمکی دے چکا ہے۔ ان کا ہمارے معاملات سے کوئی تعلق نہیں تھا مگر اس نے ان کے بہنوئی کو اٹھوا لیا تھا۔ ہم اسے احساس دلانا چاہتے ہیں کہ یہ بہادری نہیں کمینگی ہے لیکن ہم اینٹ کا جواب پتھر سے دے سکتے ہیں۔ ہمارے تو بیوی بچے ہی نہیں ہیں۔ وہ بیوی کے لیے اتنا پریشان تھا۔"

"تم غلط کہتے ہو۔"

"وہ پریشان نہ ہوتا تو آتا ہی کیوں۔ یقین کریں اسے سخت پریشانی لاحق ہے۔ ابھی آدھے گھنٹے میں اس سے پھر بات ہوگی۔"

"میں بات کروں گی اس سے۔"

"سوری خاتون۔ اب یہ ممکن نہیں" میں نے کہا "رابعہ۔ ان کے لیے چائے کا بندوبست کرو۔"

رابعہ نے مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ میں نے غالب کو اندر بٹھایا اور خود باہر آگیا "اسے ہم یہاں نہیں رکھ سکتے۔ غازی نے کہا ہے۔"

"پھر کہاں لے جائیں؟"

"میں نے نازو کو کالیا کی بہن کے ساتھ اپنے گھر بھیج دیا تھا۔ وہ ٹیکسی میں گئے ہیں۔ گاڑی گلی کے باہر کھڑی ہے۔"

"اوکے۔ قدرت کو اگر یہی منظور ہے کہ لوٹ کے بدھو گھر کو جائیں، مع بدھن کے تو پھر چلو۔"

ہم غازی کو بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے مگر اس نے انکار کر دیا "میں ٹھیک ہوں۔ معمولی زخم ہے۔ اس سے بڑے زخم کھائے ہیں زندگی میں۔"

"لیکن تم اکیلے ہو۔"

"یہ سارا محلّہ میرا خاندان ہے۔ میں اکیلا نہیں ہوں۔ تم جاؤ" وہ بولا۔

آدھے گھنٹے بعد ہم پھر رابعہ کی اسی عالی شان کوٹھی میں تھے۔ جہاں میں ایک منٹ کے لیے بھی قید میں رہنے پر تیار نہ تھا۔ نازو ہم سے پہلے وہاں پہنچ چکی تھی۔ میں نے پہلی بار کالیا کی بہن کو دیکھا تو مجھے حیرانی ہوئی۔ وہ معمولی شکل و صورت کی عام سی لڑکی تھی۔ ایسی پری جمال نہیں تھی کہ دلاور اس پر جان و دل سے فریفتہ ہو کے شادی کرنے پر مجبور ہو جاتا۔ وہ یقیناً اسے کچھ دن کھلونا جان کے کھیلتا اور پھر توڑ دیتا یا چھوڑ دیتا۔ بھائی کا بیس ہزار کا قرض اپنی آبرو سے اتار کے اور شاید رسید کے طور پر گناہ کی نشانی اپنے ساتھ لے کر واپس آجاتی۔ ابھی تک اسے علم نہیں تھا کہ اس کے بھائی نے اب اپنا قرض جان دے کے ادا کر دیا ہے۔ وہ ہم سب کی اتنی ممنون تھی کہ بار بار کہہ رہی تھی کہ "آپ نے خرید لیا ہے مجھے بیگم صاحب۔ میں ساری عمر غلامی کروں گی آپ کی۔ بس مجھے اپنے قدموں سے دور نہ کریں۔ دنیا میں میرا کوئی نہیں۔"

یہ الگ مسئلہ تھا۔ اسے آج نہیں تو کل یہ بتانا ضروری ہوگا کہ اب اس کا بھائی نہیں رہا۔ وہ بتا چکی تھی کہ دنیا میں اس کا کوئی عزیز رشتے دار نہیں۔ اس صورت میں اسے گھر سے بھی نہیں نکالا جا سکتا تھا۔ رابعہ اور نازو نے مل کے طے کیا کہ فی الحال اسے وقار یوسف کے پاس چھوڑا جائے جہاں یہ گھر کا کام کاج کرے اور خوش رہے۔ اسے سمجھا دیا جائے کہ کالیا ابھی دلاور کے خوف سے روپوش ہوگیا ہے۔ اور موقع ملتے ہی آئے گا۔

اب رات ہو چکی تھی۔ دلاور کی بیوی نے رابعہ کی محل نما کوٹھی کو حیرانی سے دیکھا تھا۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ اتنی دولت مند وکیل عورت اس طرح میرے ساتھ خوار پھر رہی ہے۔ پھر وہ مطمئن ہوگئی تھی کیونکہ رابعہ کے ساتھ نازو بھی اس کی خدمت میں مصروف ہوگئی تھی۔ کالیا کی بہن کی نوشابہ کی نظر میں کیا اوقات تھی۔ اس کے جذبات پھر بھی سوکنوں والے ہوگئے تھے کہ یہ عورت میرے شوہر کو مجھ سے چھین رہی تھی۔ حالانکہ معاملہ اس کے برعکس تھا۔ اس کا شوہر اس عورت کی عزت لوٹ رہا تھا۔ شوہر کو تو ایک عورت پہلے ہی چھین چکی تھی جسے نوشابہ نے دیکھا تک

نہیں تھا۔
مجھے اندازہ تھا کہ انتظار کے اس وقفے میں دلاور پر کیا بیت رہی ہوگی۔ درمیان میں دوبار ٹیلی فون کی گھنٹی بجی مگر کسی نے ریسیور نہیں اٹھایا تو دلاور کی بیوی نے کہا "کیا پتا یہ دلاور ہی ہو۔"
میں نے کہا "زیادہ امکان اسی بات کا ہے۔"
"پھر بات کیوں نہیں کرتے؟"
غالب نے مسکرا کے کہا "وہ ہمارے ہر ٹھکانے پر فون گھمارہا ہوگا۔ ہم نہیں چاہتے کہ دلاور اندھیرے میں تیر چلائے اور وہ نشانے پر جا لگے۔"
"ہم نے اسی لیے باہر اندھیرا کردیا ہے۔ اگر اس نے یہاں آنے کی حماقت کی تو بلاوجہ خون خرابہ ہوگا مسز دلاور۔ جو بات مذاکرات سے حل ہوجائے اس میں طاقت استعمال کرنے سے نقصان ہوجاتا ہے۔"
آدھے گھنٹے بعد میں نے باہر آکے وقار یوسف کی کار کے ریڈیو ٹرانسیٹر کو استعمال کیا "کون بول رہا ہے؟" کسی نے کہا۔
"کیا تمہیں یہ چیونٹی کی آواز لگتی ہے؟" میں نے کہا "دلاور کہاں ہے؟"
"کون دلاور؟" اس نے عادتاً پوچھ لیا۔
"وہ تمہارا نام نہاد باپ اور کون۔ اس سے کہو کہ فوراً لائن پر آجائے ورنہ میں اس کی بیوی کو گنجا کرادوں گا۔"
"بکواس مت کرو....." اس نے مجھے مشتعل ہو کے گالی دی۔
"جو میں نے کہا ہے وہی کہنا اس سے..." میں نے جواب میں دگنے وزن کی گالی لڑھکائی "ورنہ خود دلاور تمہاری کھال کا ڈھول بنا کے تمہارے سوئم پر بجائے گا۔"
کسی بدمعاش کی طرح بات کیے بنا بات نہیں بنتی تھی۔ وہ پھر ڈر گیا اور میں نے سوئچ آف کردیا۔ رابعہ آئی اور میرے ساتھ بیٹھ گئی۔
"ہم تو لوٹ کر نہ آنے کے لیے گئے تھے۔"
میں نے سنجیدگی سے کہا "عزیزہ۔ ہر چیز اپنے مرکز سے بھاگنا چاہتی ہے لیکن کششِ ثقل اسے کھینچ لیتی ہے۔ انشاء اللہ ہم پھر فرار ہوں گے۔"
"اور پھر آئیں گے وہیں۔ جتھے دی کھوتی..."
"یہ کھوتی کے بارے میں کہا گیا ہے۔ کھوتے پر یہ تہمت نہیں ہے۔ اس کے علاوہ..... میرا مقصد صرف یہ تھا کہ ہم کسی کے ساتھ نہیں ہوں گے تاکہ ہماری وجہ سے کسی پر آفت نہ آئے۔"
اسی وقت ریڈیو کی لائٹ آن ہوگئی۔ میں نے اس کا والیوم کھولا اور دلاور کی آواز آئی "تم نے ثابت کردیا کہ تم ذلیل ہو۔"
میں نے کہا "میں نے تمہاری شرافت دیکھ لی تھی جو تم دو کاروں میں اپنے ساتھ لائے تھے۔"
"سیدھی طرح بتاؤ تم کیا چاہتے ہو؟"
میں نے کہا "عقلمند کو اشارہ کافی ہوتا ہے مگر تم انجان بن رہے ہو۔ ایک تو یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ جو معاملات میرے اور تمہارے درمیان ہیں ان میں تیسرا فریق نقصان نہیں اٹھائے گا۔"
"تیسرا فریق کون ہے..... تم سب ایک ہو۔"
"میری مراد غیر متعلق لوگوں سے تھی۔ محسن اور گُل شادی کرکے الگ ہوگئے ہیں۔ فوزیہ کے شوہر کی طرح کبھی گل کے شوہر پر ہاتھ مت ڈالنا۔"
"پولیس ناگ منی کو پکڑلے تو الزام مجھے مت دینا۔"
"ناگ منی کا منہ بولا بھائی ہے من موجی۔ وہ شیش ناگ سے کم نہیں ہے دلاور۔ اگر وہ تمہارے بچوں کو بیٹی یا داماد کو اٹھالے تو تم بھی مجھے الزام مت دینا۔"
مجھے دلاور کی صورت کا تصور کرکے خوشی ہو رہی تھی۔ وہ غصے میں زخمی سانپ کی طرح پھنکار رہا ہوگا۔ دل میں نہ جانے کیا ارادے باندھ رہا ہوگا کہ ایک بار یہ گتھی سلجھ جائے تو کہاں کا وعدہ اور کیسی وارننگ۔ وہ ایک ایک کا بینڈ بجادے گا۔ وہ دل ہی دل میں مجھے ایسی گالیاں دے رہا ہوگا جو پولیس والے سن کے شرمائیں اور بدترین عذاب کے ساتھ مجھے اور میرے لواحقین کو ہلاک کرنے کا عہد کر رہا ہوگا لیکن یہ سب کل کی باتیں تھیں۔ گوٹ آج پھنسی ہوئی تھی۔
میں نے کہا "میں تم سے وعدہ نہیں لوں گا اس لیے کہ تمہارے وعدے کی حیثیت جعلی نوٹ کے برابر بھی نہیں ہوسکتی۔ میں تمہیں خبردار کر رہا ہوں۔"
"چلو جی، ہم ہوگئے خبردار۔ اپنے سکندر اعظم صاحب، آگے فرماؤ۔"
"مجھے پیڈرو چاہیے۔" میں نے کہا۔
ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے کہا "چاہیے کا مطلب؟"
"مطلب اردو میں بالکل صاف اور واضح ہے۔ پیڈرو کو میرے حوالے کرو۔ اپنے بچوں کی ماں لے جاؤ۔"
"یہ..... ناممکن ہے۔"
"میں تمہیں کل تک سوچنے کی مہلت دوں گا" میں نے کہا۔ "تم بچوں کو بہلا سکتے ہو کہ آج وہ ماں کے ساتھ مری کیوں نہیں جاسکے۔ کل شام کو وہ براہِ راست ماں کی آواز سنیں گے اور یہ آواز سن کے وہ خوش نہیں ہوں گے اپنے چوہدری صاحب۔"
"تم ایسا نہیں کرسکتے۔ مجھے معلوم ہے۔"
"وقت آدمی کو بہت کچھ سکھاتا ہے۔ پہلے جو بچہ اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہوسکتا وہ سو میٹر کی دوڑ جیت لیتا ہے بعد میں۔ سکندر جو کل نہیں کرسکتا تھا، آج کرنے پر مجبور ہوگا۔ تمہاری چالوں نے اسے ماہر شکاری بنادیا ہے دلاور۔ ورنہ وہ تو شریف آدمی تھا۔ شرافت کی ٹریفک آخر کب تک یک طرفہ چل سکتی تھی۔"
"اچھا۔ پیڈرو تمہیں مل جائے گا۔" دلاور نے شکست خوردہ لہجے میں کہا "لیکن آج نہیں۔"

"کل..... پرسوں..... جب تمہارے پاس مال ہو۔ اس ہاتھ دینا اس ہاتھ لے جانا۔ تمہاری امانت محفوظ ہے۔"
"سنو۔ میں اس سے بات کروں گا۔"
"سوری۔ تمہارا پیغام دیا جاسکتا ہے۔ ویسے وہ سب سن رہی ہے۔"
"جھوٹ مت بولو۔ وہ سن رہی ہے تو بولتی کیوں نہیں؟"
میں نے کہا "شرماتی ہے شاید۔ یا پھر تم سے خفا ہے۔ ایک بات اور سنو اپنے چوہدری صاحب۔ تمہیں دوسرا پیڈرو تو مل سکتا ہے مگر بچوں کو تم اصل ماں کہاں سے لاکے دوگے۔ وہ تمہیں کبھی معاف نہیں کریں گے اگر تم نے ان کو ماتا جیسی نعمت سے محروم کیا۔ پیڈرو تو ہمیں مل ہی جائے گا۔ آج نہ سہی کل۔"
"تم نے نوشی کے ساتھ کوئی زیادتی تو نہیں کی؟" وہ سخت پریشان تھا۔
"وہ مہمان ہے ہماری۔ ہم اس کو سیر کرارہے ہیں شہر کی۔ وہ بہت مطمئن ہے۔ ابھی ہم باہر کہیں کھانا بھی کھائیں گے اور پھر کہیں رات بھی گزاریں گے۔ ایم آر ایس کے کیمپ میں اس کی پہلی رات یقیناً مشکل سے گزرے گی۔ شاید اسے نیند نہیں آئے گی۔ ہم باتیں کریں گے اس سے۔ بہت سی باتیں وہ بتاچکی ہے۔ تمہارے داماد کے بارے میں۔ اس کی نوکری اور دیگر مشاغل کے بارے میں۔"
"تم نے ضرور ٹارچر کیا ہے اُسے....." دلاور نے چیخ کر مجھے ایک گالی دی۔
میں نے فلمی ولن کی طرح ایک قہقہہ لگایا اور ریسیور بند کردیا۔
"تم بھی بڑے ڈرامے باز ہوگئے ہو۔"
"یہ ہارر شو تھا۔ کیا خیال ہے ایک رومانٹک سین ہوجائے۔" میں نے رابعہ کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔
"بدتمیزی مت کرو" وہ گھبرا گئی "ابھی کوئی آجائے گا اندر۔"
"دیکھو چاند نکلا ہوا ہے۔ ایک اوپر..... ایک میرے سامنے۔ ایک مجھے کباب کی طرح لگ رہا ہے دوسرا پراٹھے کی طرح۔ پراٹھا رہے۔ کیوں نہ میں کباب ہی کھالوں۔ بھوک میں تم مجھے شامی کباب لگ رہی ہو۔"
اس نے خود کو چھڑالیا "اپنی شکل دیکھی ہے۔ جلے ہوئے پراٹھے جیسی ہو رہی ہے۔" اس نے مجھے انگوٹھا دکھایا اور اتر گئی۔
میں نے ایک آہ بھری اور گاڑی بند کردی "میں نے سنا ہے تم اچھے ہی پراٹھے پکاتی ہو۔ ویسی ہی شکل بنالی ہے میں نے۔ اس بات پر خیال آیا کہ کیوں نہ ہم رات کو کہیں جاکے پراٹھا کباب کھائیں۔"
"شامت اعمال آواز دے رہی ہے تمہیں۔"
"دیکھو جو ہوتا ہے وہ یہاں بھی ہوسکتا ہے۔ ایک گاڑی میں سب جاسکتے ہیں۔"
"مسز دلاور نمبر ایک، اور نہ ہونے والی مسز دلاور نمبر تین کا کیا ہوگا۔ وہ ہمارے ساتھ کیسے جاسکتی ہیں؟"
"انہیں چھوڑ جاتے ہیں۔ کالیا کی بہن اور نوشابہ کے لیے کھانا لے آئیں گے" میں نے کہا "چلو غالب سے بات کرتے ہیں۔ وہ کیا کہتا ہے؟"
غالب نے تھوڑا سا تامل کیا "تم پھر پرانے ڈھب پر آنے کی کوشش کر رہے ہو۔"
"اس وقت ہمیں جو سیکیورٹی حاصل ہے......"
غالب نے میری بات کاٹ دی "اگر دلاور نے ہم میں سے ایک دو کو اٹھالیا تو حساب برابر ہوجائے گا۔ وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھے نہیں بیٹھا ہوگا۔"
نازو نے یہی کہا "کیا پتا وہ باہر نگرانی کر رہے ہوں۔ ہم نے یہاں آکے عقلمندی کا ثبوت نہیں دیا۔ ایک تجربہ ہمیں پہلے ہوچکا ہے۔ اس نے ہماری ساری گفتگو سن لی تھی اور ریکارڈ کرلی تھی۔"
"وہ تہ خانے کی بات تھی" میں نے کہا۔
"تم کیسے یقین سے کہہ سکتے ہو۔ تہ خانے میں کسی کو کچھ نظر نہیں آیا تھا اور نہ محسوس ہوا تھا" غالب نے کہا "یہ بھی تو ممکن ہے کہ اس نے پورے گھر میں جاسوسی کے آلات نصب کر رکھے ہوں؟"
نازو بولی "پھر تو ہم سب کو یہاں سے نکل جانا چاہیے۔"
میں نے کہا "میں تمہاری رائے سے اتفاق نہیں کرتا۔ جب تک دلاور کی بیوی یہاں ہے وہ کوئی کارروائی نہیں کرسکتا۔ اس کی بیوی کے ساتھ ہم جہاں بھی ہوں گے محفوظ ہوں گے۔ وہ گاڑی میں ہمارے ساتھ ہوگی تو کوئی بھی گاڑی پر فائرنگ نہیں کرے گا۔"
رابعہ نے اندر سے آکے کہا "نوشابہ اپنے بچوں سے بات کرنا چاہتی ہے۔ وہ بہت رو رہی ہے۔"
نازو نے غالب کی طرف دیکھا "بات کرادو نا۔ اس کی بھی تسلی ہوجائے گی۔"
میں نے کہا "ابھی تک اس کے بچوں کو یہ معلوم نہیں ہے کہ ان کی ماں کو اغوا کرلیا گیا ہے۔ دلاور ان کو بہلا چکا ہوگا۔ خواہ مخواہ بچوں کو پریشان کرنے کی ضرورت نہیں اور خود نوشابہ نے ہمارے خلاف کچھ کہہ دیا تو کیا ہوگا۔ یا ٹیلی فون ایکس چینج کی معرفت دلاور نے پتا چلالیا کہ کال یہاں سے ہوئی تھی پھر؟"
بہت بحث مباحثے کے بعد یہ طے پایا کہ ہم دلاور کی بیوی کو کالیا کی بہن کی نگرانی میں چھوڑ کر جائیں گے۔ کالیا کی بہن ریوالور نہیں چلاسکتی تھی اور اکیلے رہ جانے سے ڈرتی تھی لیکن ہمارے سمجھانے سے مان گئی۔ دلاور کی بیوی کو ایک بیڈ روم میں بند کردیا گیا جس سے باہر آنے کا ایک ہی راستہ تھا۔ یہ دروازہ مقفل کرکے چابی کالیا کی بہن کو دے دی گئی۔ خود کالیا کی بہن نے اپنے کمرے کو اندر سے کنڈی لگا کے لاک کرلیا اور لائٹس آف کرکے سوگئی۔ ان دونوں میں سے کسی کا موڈ بھی کھانے کا نہیں تھا۔

ہم تاریکی میں باہر آئے مگر سڑک کی روشنی اتنی تھی کہ باہر سے ہماری نگرانی کرنے والا کوئی بھی شخص گاڑی کو باہر نکلتا دیکھ سکتا تھا۔ جتنی دیر ہم اندر رہے تھے ٹیلی فون کی گھنٹی وقفے وقفے سے بجتی رہی تھی۔ یہ منظر یا وقار یوسف بھی ہو سکتے تھے۔ رابعہ کا کوئی موکل یا غالب کا دوست بھی ہو سکتا تھا اور خود دلاور بھی جو تصدیق کرنا چاہتا ہو کہ ہم یہاں ہیں یا نہیں۔ دلاور بے وقوف نہیں تھا۔ وہ سمجھتا ہوگا کہ ہم اپنی غیر موجودگی اسی طرح ثابت کر سکتے ہیں کہ ریسیور نہ اٹھائیں مگر وہ بار بار نمبر ملا رہا تھا شاید اس امید میں کہ تنگ آ کے یا غلطی سے کوئی ریسیور اٹھالے۔ یقین نہ سہی اسے شک ضرور ہوگا کہ ہم یہاں بھی پناہ گزین ہو سکتے ہیں۔

احتیاطاً میں نے غالب کو ٹیکسی لانے کے لیے باہر بھیجا۔ وہ ٹیکسی کو کمپاؤنڈ کے اندر لے آیا۔ ٹیکسی وقار کی گاڑی کے پیچھے رک گئی۔ غالب نے گیٹ بند کردیا "باہر کوئی ہے۔"

"کون ہے؟" میں نے کہا "تمہیں کیسے اندازہ ہوا؟"

"دوسری طرف دو افراد خاصے مشتبہ انداز میں کھڑے ہوئے تھے۔ میں ٹیکسی میں بیٹھا تو وہ ایک کار میں بیٹھ چکے تھے جو خاصے فاصلے پر کھڑی تھی۔"

میں نے دیوار کے اوپر سے دیکھنے کی کوشش کی "کون سی گاڑی ہے؟"

غالب نے کہا "دائیں جانب پچاس ساٹھ گز دور نیلی کار ہے۔"

میں نے کہا "دائیں جانب کوئی کار ہی نہیں ہے۔ ایک فرلانگ تک۔"

اب غالب نے دروازے سے جھانکا۔ "ابھی تو تھی۔"

"شک ہوگا تمہارا لیکن شک کو بھی نظرانداز نہیں کرنا چاہیے" میں نے کہا "تم نازو کے ساتھ نکلو اور بہتر ہے کہ کالیا کی بہن کو بھی ساتھ لے جاؤ۔ اگر کوئی تمہارا تعاقب کرے تو گھوم کے واپس آجانا۔ ورنہ پانچ منٹ بعد دوسری گاڑی میں ہم روانہ ہوجائیں گے۔ تم کالیا کی بہن کو چھپا کے رکھنا۔ اسے کہنا کہ پچھلی سیٹ پر سر نیچے رکھے۔ میں یہی احتیاط رابعہ کے ساتھ کروں گا۔ کوئی تعاقب کرے تو یہی سمجھے کہ گاڑی میں دو افراد ہیں۔"

ٹیکسی والا شور کر رہا تھا کہ دیر کیوں ہو رہی ہے۔ اسے ہماری حرکات و سکنات بھی شک میں مبتلا کر رہی تھیں۔ غالب نے اسے تھوڑا سا دم دلاسا دیا اور چند منٹ بعد وہ نازو کے ساتھ روانہ ہوگیا۔ کالیا کی بہن پچھلی سیٹ پر بیمار بن کے لیٹ گئی تھی۔ میں گیٹ بند کر کے باہر جھانکتا رہا۔ میں نے غالب کو سمجھا دیا تھا کہ وہ خطرہ محسوس کرے تو پیچھے آنے والوں پر فائر کھول دے۔ ٹیکسی والا خود ہی ڈر کے گاڑی کو بھگائے گا۔ بازار میں یقیناً بھگدڑ مچے گی اس سے فرار میں مدد ملے گی۔ غالب نے مجھے بتا دیا تھا کہ گڑبڑ ہوئی تو وہ سیدھے اپنے اخبار کے دفتر چلے جائیں گے۔ ہم پراٹھا کباب کھائیں یا دھکے کھائیں ہماری مرضی۔

غالب کے خدشات غلط نہیں تھے۔ ابھی ٹیکسی باہر نکلی ہی تھی کہ سائیڈ کی کسی گلی سے ایک نیلے رنگ کی کار برآمد ہوئی اور میرے سامنے سے گولی کی طرح گزر گئی۔ میں نے اندر بیٹھے ہوئے افراد کی صورت کی صرف ایک جھلک دیکھی۔ میری زیادہ توجہ نمبر پلیٹ پر تھی لیکن نمبر جان بوجھ کے خراب کردئے گئے تھے۔ چند سیکنڈ بعد میں نے ایک فائر کی آواز سنی پھر دوسرا فائر ہوا۔ اس کے بعد شور مچ گیا۔ چوک سے پہلے ہی گاڑیوں کے بریک لگانے، ہارن دینے اور آپس میں ٹکرانے کی آوازوں کے ساتھ بہت سے لوگوں کے چیخنے، چلّانے کی آوازیں آئیں تو میں اندر بھاگا۔

دو منٹ بعد میں نے رابعہ سے کہا کہ وہ گاڑی اسٹارٹ کرے۔ یہ وقار یوسف کی کار تھی جسے دلاور اینڈ کمپنی کے شکاری پہچانتے تھے۔ بظاہر اس میں صرف ایک عورت تھی اور وہ رابعہ قاری ایڈووکیٹ تھی جو کار چلا رہی تھی۔ پچھلی نشست پر میں دلاور کی بیوی کو دبوچے لیٹا ہوا تھا۔

رابعہ نے گاڑی کو مخالف سمت میں دوڑاتے ہوئے اپنی نظر عقب نما آئینے پر رکھی اور ہر لمحہ مجھے رننگ کمنٹری سے آگاہ کرتی رہی کہ پیچھے کون ہے۔ پہلے ایک میل میں رابعہ نے کئی گاڑیوں کو اوورٹیک کیا مگر کسی گاڑی نے ہم تک پہنچنے کی کوشش نہیں کی۔ رابعہ نے دو موڑ کاٹے۔ میں اپنے پیروں کے قریب سب مشین گن لیے بالکل تیار تھا کہ کوئی راستہ کاٹے تو اسے اُڑا دوں۔

دلاور کی بیوی اتنی دہشت زدہ تھی کہ دبکی پڑی تھی۔ غالباً میرے بارے میں اس کا ابتدائی تاثر غلط ہوگیا تھا۔ اب میں اس کے نزدیک کسی بھی عام دہشت گرد سے مختلف نہیں تھا چنانچہ مجھ سے شرافت یا رعایت کی توقع عبث تھی۔ شاید اس کا شوہر میرے بارے میں ٹھیک ہی کہتا تھا کہ وہ کتے کی دم ہے۔ اور خود کتا ہے جو بھونکتا بھی ہے اور کاٹتا بھی ہے۔

ایک جگہ رابعہ نے کار کو بریک لگا کے روک دیا۔ وہاں رات کا اندھیرا تھا اور خاموشی تھی "سکندر۔ غالب اور نازو کا پتا کرو۔"

"کیسے پتا کروں؟"

"ان کے آفس چلتے ہیں" وہ بولی۔

"ابھی وہ آفس نہیں پہنچے ہوں گے۔" میں نے کہا اور کار کے ریڈیو کو آن کردیا۔ اس کی سرخ لائٹ چمکنے لگی۔

ہمیشہ کی طرح وہی بلڈاگ کی غراہٹ سنائی دی "کون بول رہا ہے؟"

میں نے بھی وہی جواب دیا "تمہارا نام نہاد باپ۔"

اس نے محتاط ہو کے کہا "چوہدری صاحب...." پھر جیسے کسی نے اس سے ریسیور چھین لیا اور میں نے پیڈرو کی آواز سنی "سکندر اعظم کی ناجائز اولاد۔ مجھ سے بات کرو۔ میرے بدلے میں دلاور کی بیوی واپس کرنا چاہتے تھے تم؟"

میں نے کہا "ٹھیک سنا تم نے۔ تمہارا دھڑ میرے کسی کام کا نہیں صرف سر مل جائے تو بھی غنیمت ہے۔"

"تمہیں..... بھی نہیں ملے گا" اس نے ایک ناقابلِ اشاعت لفظ استعمال کیا۔

میں نے کہا "ظاہر ہے جو چیز تمہارے باپ کے پاس نہیں تھی وہ تمہارے پاس کہاں ہوگی؟"

اس نے مجھے لگاتار گالیاں دیں "تم سے سودا کرلیا ہے دلاور نے اس لیے تم بول رہے ہو مگر تمہاری بولتی بند ہوجائے گی سکندر۔ میں کوئی کتا نہیں ہوں اس کا کہ میری زنجیر تمہیں پکڑا دے۔"

میں نے کہا "اس کا کتا تو خاصا وفادار معزز اور خوددار جانور ہے۔ اپنا موازنہ اس سے مت کرو۔ وہ برا مانے گا۔"

"سنو۔ ایک آفر میری بھی ہے۔"

"میں سن رہا ہوں۔"

"تم شبلی کی لاش کا پتا بتادو۔ میں بتادوں گا کہ تمہارے باپ کی ہڈیاں کہاں دفن ہیں۔"

میں نے پھر فلمی ولن کی طرح قہقہہ مارا۔ "پیڈرو۔ جب تمہارا آقا تمہیں میرے حوالے کردے گا تو پھر میں خود سب کچھ معلوم کرلوں گا۔ اور تم بتادوگے۔ ایسی کی تیسی تمہاری آفر کی اور تمہاری۔ دلاور سے کہہ دینا کہ اسے ایک موقع اور ملے گا۔ پھر میں سمجھ لوں گا کہ وہ جنگ کو محدود رکھنا نہیں چاہتا۔ خاندانوں اور رشتوں کو بھی داؤ پر لگانے کے لیے تیار ہے اگر ایسا ہے تو سکندر اس کے چیلنج کو قبول کرتا ہے۔"

میں نے پھر ریڈیو آف کردیا اور ایریل کو دبادیا۔ ابھی رات کے دس بجے تھے۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ رابعہ کے گھر سے نکل کے ہم نے اچھا ہی کیا تھا۔ دلاور فارغ نہیں بیٹھا تھا۔ اس نے ہمارے تمام ٹھکانوں پر پہرے بٹھادئے تھے اور وہ راتوں رات کمانڈو ایکشن سے اپنی بیوی کی بازیابی کا پروگرام بنا رہا تھا۔

رابعہ نے کہا "تم کہو تو میں یہاں سے فون کرلوں۔"

"یہاں کون سے ماموں رہتے ہیں تمہارے" میں نے اس کوٹھی کی طرف دیکھا جس کی طرف رابعہ نے اشارہ کیا تھا۔

"کوئی شریف آدمی کسی خاتون کو مدد کے لیے ایک فون کرنے سے انکار نہیں کرسکتا۔"

میں نے کہا "بشرطیکہ وہ آدمی واقعی شریف ہو اور خاتون تم جیسی حسین نہ ہو۔ وقت رات کا نہ ہو اور وہ اکیلا نہ ہو۔"

"تم تو بس بولنا جانتے ہو" وہ کار سے اتر کے کسی پرانی کوٹھی کے گیٹ پر پہنچ گئی اور کال بیل بجانے لگی۔ میں اسے دیکھتا رہا۔

نوشابہ نے کہا "خدا کے لیے میری بات دلاور سے کرادو۔ ورنہ زیادہ خرابی ہوگی۔ وہ پاگل ہو رہا ہوگا۔"

"ہم اس کے پاگل پن کا علاج کر رہے ہیں" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا "جب کمزور دب جاتا ہے تو شہ زور کو پہلے سے زیادہ طاقت دیتا ہے۔ اس کا دماغ جب درست ہوگا جب اس کا یہ گھمنڈ ٹوٹے گا کہ سب سے بڑی طاقت نہ وہ ہے نہ اس کی دولت۔ طاقت اوپر والا دیتا ہے تو چوہے کے مقابلے میں بلی بھی دُم دبا کے بھاگنے پر مجبور ہوجاتی ہے۔"

"تم باتوں میں وقت ضائع کر رہے ہو۔"

"تم اپنے آنسو ضائع کر رہی ہو۔ دلاور کی بیوی تو مجسم دلاوری ہونی چاہیے۔"

رابعہ اندر غائب ہوگئی تھی۔ میں دیکھ نہیں سکا تھا کہ اسے اندر لے جانے والا کون ہے۔ وہ پانچ منٹ کے بعد باہر آگئی۔

"میں نے اخبار کے دفتر فون کیا تھا غالب نہیں ملا۔"

"میں نے اور کیا فرمایا تھا۔"

"پھر میں نے وقار کو بتادیا کہ وہ کسی کی طرف سے فکر مند نہ ہو۔ سب ٹھیک ہیں۔ یہ نہیں بتایا کہ میں کہاں سے بات کر رہی ہوں۔"

"اس نے اپنی گاڑی کی خیریت تو دریافت نہیں کی تھی؟"

"نہیں۔ پوچھ رہا تھا کہ غالب اور نازو پھر پہنچ گئے تمہارے ساتھ۔ میں نے کہا کہ نہ ان کے بغیر ہمارا گزارا ہے۔ نہ ہمارے بغیر ان کا۔ وقار تو اور بھی بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن میں نے ریسیور رکھ دیا۔ وہ بے چارا شریف آدمی سوتے سے اٹھ کے آیا تھا اور تکلف میں دوسرے کمرے میں بیٹھا رہا تھا" رابعہ نے کہا۔

"جو رات کے دس بجے سو جائے وہ واقعی شریف آدمی ہے۔"

"بوڑھا اور بیمار تھا۔ غالباً اکیلا بھی۔"

میں نے ایک آہ بھری "یہ بڑھاپا، بیماری اور تنہائی ایک ساتھ کیوں آتے ہیں آخر۔"

جو بات پراٹھے کباب سے شروع ہوئی تھی وہ کہاں آ کے ختم ہوئی تھی۔ اب کھانے کا خیال کسی کو بھی نہیں تھا مگر اتفاق سے راستے میں ایک ریسٹورنٹ آگیا تو رابعہ اتر کے گئی اور پراٹھا کباب لے آئی۔ دلاور کی بیوی کا صدمے، غصے اور احساسِ ذلت سے برا حال تھا۔ اس نے کچھ کھانے سے صاف انکار کردیا۔ ہم نے بھی غالب کے آفس پہنچنے تک کچھ نہیں کھایا۔

غالب ہمیں باہر ہی مل گیا "مجھے معلوم تھا تم یہاں آؤ گے۔"

نازو نے کہا "آج تو تم نے مروادیا تھا سکندر۔ وہ تو گھات لگا کے بیٹھے تھے۔ ایک دم فائرنگ شروع کردی۔"

غالب نے کہا "بس میری ایک گولی نے کام دکھایا جو اُن کے ونڈ اسکرین پر لگی تو ڈرائیور اندھا ہوگیا۔ اس نے گاڑی فٹ پاتھ پر چڑھادی اور پھر ایک کھمبے سے ٹکرادی۔ کھمبا ٹیڑھا ہونے سے تار ٹوٹے اور ان کی گاڑی پر گرے۔ بڑے زبردست اسپارک ہوئے تھے۔ ایک افراتفری مچ گئی تھی۔ PANIC پھیل گئی تھی۔ کاریں بجلی کے تاروں سے بچنے کی کوشش میں اِدھر اُدھر ہوئیں تو آپس میں ٹکرائیں۔ اور پتا نہیں کیا کیا ہوا۔ صبح پتا چلے گا کہ کتنے مرے۔"

"وہ مرے یا نہیں جو تمہارے پیچھے تھے؟"

"وہ کہاں بچے ہوں گے۔ فٹ پاتھ پر کھمبے سے تصادم ہی کافی تھا پھر بجلی کے تار ہائی ٹینشن کیبل (TENSION CABLE HIGH) تھے۔ جل کے کوئلہ ہوگئی ہوں گی لاشیں بھی۔"

"قدرت بھی کیسے اشارے دیتی ہے" میں نے رابعہ کی طرف دیکھ کے کہا "ان کو دیکھ کے اور چاند کو دیکھ کے مجھے پراٹھے کباب کا خیال آیا اور بس میرا موڈ بن گیا۔"

رابعہ کا چہرہ سرخ ہوا تھا مگر اسے نوٹ صرف میں نے کیا تھا۔

"سوچو اگر ہم وہاں سے نہ نکلتے تو اندر ہی مارے جاتے۔ دلاور کو شاید اطلاع مل چکی تھی کہ ہم اندر ہیں۔ وہ اپنی فورس جمع کررہا تھا اور حملے کی منصوبہ بندی میں مصروف ہوگا۔" میں نے کہا۔

اچانک اخبار کے دفتر کی کھڑکی سے سر نکال کے کسی نے کہا۔ "گلاب شیپ.... گلاب شیپ۔"

میں نے رابعہ سے کہا "تمہیں بلا رہا ہے کوئی۔ گلاب صورت تم ہی ہو۔"

غالب نے دانت نکالے "بنگالی چپراسی ہے۔ غالب کہہ رہا ہے۔ ویسے نازو کو تم کیا سمجھتے ہو۔ کریلے کا پھول۔"

"اور تم خود کیا ہو.... کریلے۔"

"خاتون۔ پھول سے پھل نکلتا ہے" غالب نے ایک فلسفیانہ نکتہ اٹھایا "کریلے وہ ہوں گے جو کریلے کے پھول سے نکلیں گے۔ ماشاءاللہ سے آپ کے بچے۔"

رابعہ ہنس پڑی۔ نازو غصے کے باوجود مسکراتی رہی "ہماری ٹیکسی والا پہلے تو سمجھا ہی نہیں تھا کہ فائرنگ ہم پر ہورہی ہے یا ہم کررہے ہیں۔ جب سمجھا تو ایسے بھاگا 'یا رب جی' یا میرے مولا' ایہہ کی بیب پے گیا جے" وہ اپنے آپ کو کوس رہا تھا۔ مجھے بعد میں بہت ہنسی آئی۔ اچھا ہوا اس کی گاڑی پر گولی کا نشان بھی نہیں آیا۔ ورنہ تو اسے ہارٹ اٹیک ہوجاتا۔ بڑی مشکل سے سمجھا بجھا کے اور پانچ سو روپے دے کر رخصت کیا کہ اب دو چار دن گاڑی لے کر مت نکلنا۔"

اوپر سے بنگالی پھر چلانے لگا "گلاب شیپ۔ اوپ کی پھون" تو غالب "ابھی آتا ہوں" کہہ کے چلا گیا۔ دلاور کی بیوی نے خود کو تقدیر کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا اور وہ خلا میں گھور رہی تھی۔ ہماری گاڑی آفس کی دیوار کے عین نیچے نسبتاً تاریک جگہ پر کھڑی ہوئی تھی۔ یہ جگہ بھی محفوظ نہیں تھی۔ دلاور کی بیوی اچانک شور مچادیتی تو مجھے اس کو لے کر فرار اختیار کرنا پڑتا ورنہ اخبار والے تو خود کسی سنسنی خیز کہانی کے پیچھے دوڑے چلے آتے۔ اس لیے میں بہت چوکس تھا۔

غالب کی غیر حاضری میں مجھے پیڈرو کا خیال آیا۔ اسے ریڈیو فون پر بٹھانے والا دلاور ہی ہوگا۔ دلاور کے لیے یہ سکون کی رات نہیں تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ میں مایوس ہوکے اس سے رابطہ ہی ختم کردوں۔ اس نے میری شرائط قبول کرلی تھیں مگر دوسری طرف وہ ہار ماننے پر تیار نہیں تھا اور اس نے اپنے سارے وسائل بروئے کار لاتے ہوئے اپنی پوری طاقت کے ساتھ بیوی کی بازیابی کے لیے کوشش تیز کردی تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ بچوں کو ایک دو دن سے زیادہ بہلایا نہیں جاسکتا۔ بچے اتنے چھوٹے بھی نہیں تھے اور نوشابہ کی بہن بھی شک میں پڑسکتی تھی کہ مری جانے کا پروگرام طے کرنے کے بعد اس کی بہن اچانک روپوش کیوں ہوگئی۔ اسے کتنے بھی ضروری کام سے جانا پڑتا وہ فون ضرور کرتی۔

میرے اور دلاور کے درمیان ہونے والی گفتگو کا علم پیڈرو کو بھی ہوگیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ میں نے نوشابہ کے بدلے اس کو مانگا تھا۔ اگر یہ بات اسے خود چوہدری دلاور نے بتائی تھی تو اس سے دلاور کی بدنیتی ثابت ہوتی تھی۔ وہ حسبِ توقع اپنے وعدے پر عمل کرنے کا ارادہ ہی نہیں رکھتا تھا لیکن یہ بھی ہوسکتا تھا کہ استاد پیڈرو نے خود یہ بات سن لی ہو۔ بہرصورت اس نے مجھے متبادل پیش کش کی تھی۔ اس سے اندازہ ہوا تھا کہ اسے اپنی سلامتی کی فکر لاحق ہوگئی ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ چوہدری دلاور پر سو فیصد بھروسا نہیں کیا جاسکتا۔ کوئی استاد پیڈرو اس کے بچوں کی ماں کے برابر تو کیا اس کا پاسنگ بھی نہیں ہوسکتا۔

غالب جلدی ہی آگیا۔ وہ کچھ متفکر اور سنجیدہ تھا "یار' ایک بُری خبر ہے۔"

سب سے زیادہ نوشابہ چونکی "کیا بُری خبر ہے؟"

غالب نے اسے سپاٹ نظروں سے دیکھا "خبر آپ کے لیے نہیں ہے خاتون۔ آپ کے لیے تو خوش خبری ہے۔ دلاور نے رابعہ کی کوٹھی کو دھماکے سے اُڑا دیا ہے۔"

رابعہ کا رنگ فق ہوگیا "یہ.... کس نے بتایا؟"

"ایک گمنام فون تھا" غالب گاڑی میں بیٹھ گیا "اس نے کہا کہ اپنے مرزا غالب صاحب' بڑی رونق لگی ہوئی ہے یہاں۔ ہیں جی' خوب آتش بازی ہورہی ہے۔ ایسا نظارہ تو ہم نے کبھی زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔ آپ بھی آجاؤ۔ تصویریں بنالو" میں نے کہا "اُلو کے پٹھے' یہ کیا بکواس ہے؟"

"وہ دلاور نہیں تھا؟"

"نہیں۔ مگر اس کے لہجے کی نقل کررہا تھا۔ اس سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ اطلاع چوہدری صاحب کی طرف سے دی گئی ہے۔"

"یہ کتنی دیر پہلے کی بات ہے؟"

"ابھی تو آدھا گھنٹا بھی نہیں ہوا" رابعہ نے کہا۔

غالب نے کہا "میرا خیال ہے کہ چوہدری دلاور نے غلط فہمی میں ایسا کیا۔ پہلے میں نکلا تھا نازو کے ساتھ اور ہم ٹیکسی میں تھے ممکن ہے کالیا کی بہن بھی اُن کو نظر آگئی ہو۔ میں نے اسے کہا تو تھا کہ سر نیچے رکھنا۔ وہ تو بیمار بن کے لیٹی تھی مگر کیا پتا۔ کسی نے دلاور کو اطلاع دے دی کہ وہ گاڑی میں پہنچے تھے اور ٹیکسی میں تمہاری بیوی کو کہیں لے گئے ہیں۔ اس نے کہا ہوگا کہ پیچھا کرو۔ ٹیکسی کو

گولی مار دو انہیں اور ناکامی کے بعد غصے میں پاگل ہوکے کہا اچھا باقی سب کو فنا کردو۔ اس کے خیال میں تم رابعہ اور بہن اندر رہی تھے۔"

"ہوسکتا ہے۔ بالکل ہوسکتا ہے" میں نے کہا۔

"کیا کسی نے بم پھینکا تھا؟" نازو نے پوچھا۔

"نہیں۔ ایک چشم دید گواہ کا کہنا ہے کہ اندر کوئی دیپک راگ گا رہا تھا۔ اسی سے آگ لگی" غالب نے کہا۔

"مجھے تم الٹے جواب کیوں دیتے ہو؟" نازو بگڑ گئی۔

"اس لیے کہ تمہاری کھوپڑی الٹی ہے" غالب نے کہا۔

"ہم نہیں پھینکا تو آگ کیسے لگی؟"

"جیسے میرے دل میں لگی ہوئی ہے اس وقت۔ جیسے شاعر اپنے ... سے اور مقرر اپنی تقریر سے جذبات میں لگاتے ہیں۔ اس ... کے بھی جذبات ہیں' کسی نے سامنے کھڑے ہوکے اسے ... کہہ دیا ہوگا۔ سچ سن کے آگ لگ گئی اسے۔ جیسے تمہیں ... ہے۔"

"تم سچ بولتے کب ہو کہ مجھے آگ لگے۔" نازو نے طنز سے ...

"کیوں؟ جب میں بھوت کی بچی کہتا ہوں تو تم چراغ پا کیوں ہوتی ہو؟"

اس مرحلے پر مجھے دخل دینا پڑا "دیکھو لڑنے کے بجائے ہمیں ... خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس کوٹھی میں جل کے ... نہیں ہوئے۔"

رابعہ نے کہا "چل کے دیکھ تو لیں۔ کیا پتا یہ جھوٹ ہو۔"

میں نے کہا "دیکھوگی تو زیادہ صدمہ ہوگا۔ یہ سچ ہی لگتا ہے ... دلاور نے صرف جاسوسی کے آلات ہی نہیں لگوائے ہوں ... ایسے آتش گیر بم بھی نصب کرادئیے ہوں گے کہ جب ... ضرورت پڑے اور موقع ملے تو ایک بٹن دبانے سے یا سوئچ آن ... کرنے سے فیوز اڑ جائے۔ یاد ہے اس نے دھمکی بھی دی تھی۔"

غالب بولا "اس کی یہ عنایت بے سبب نہیں تھی۔ وہ ... کہہ رہا تھا۔"

میں نے کہا "اس حرام زادے کو یہ حرکت بہت مہنگی پڑے ... اب میں بتادوں گا اسے کہ کمینے پن میں بھی سکندر اُس کا باپ ...

دلاور کی بیوی نے خوف زدہ ہوکے کہا "دیکھو۔ اگر غلط فہمی کی ... تو اس کا کیا قصور۔"

"نہیں۔ قصور تو ہمارا ہے" رابعہ نے تلخی سے کہا۔

"مجھے بات کرنے دو اس سے۔ پلیز' اسے یقین آجائے گا کہ ... نہیں ہوا۔" وہ منت کرنے لگی۔

"غلط۔ ہم پر کیوں یقین نہیں کیا تھا اُس نے۔ اپنی طرف ... سے اس نے ہمارا قصہ پاک کردیا۔ اب کس امید پر وہ سمجھتا ہے

اس نے میری بات کاٹ دی "تمہارا سب نقصان میں پورا کردوں گی۔ میں اسے سمجھاؤں گی کہ تم شریف لوگ ہو۔ تم نے مجھے آرام سے رکھا ہے۔ میرے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی۔ میں اسے مجبور کروں گی کہ جو عہد کیا ہے اس پر قائم رہے۔"

"اونہہ۔ خوش فہمی ہے تمہاری کہ وہ تمہاری مان لے گا۔"

"اچھا مجھے اپنے بچوں سے بات کرنے دو۔ میں انہیں سب سچ بتادوں گی کہ مجھے تمہارے باپ کے دشمنوں نے اغوا کرلیا ہے اور تمہارا باپ عہد شکنی کررہا ہے۔ اس سے میری زندگی خطرے میں پڑگئی ہے۔ وہ باپ کو مجبور کردیں گے پھر دلاور جو بات کرے گا اس میں دھوکا نہیں ہوگا۔"

نوشابہ کی بات قابلِ غور تھی لیکن فوری طور پر میں اس سے کوئی وعدہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ "کالیا کی بہن کہاں ہے؟"

"اوپر۔ چوکیدار کے کمرے میں۔ وہ بڈھا آدمی ہے اور اکیلا رہتا ہے۔ اسے اپنے ساتھ لے جائے گا" غالب نے کہا۔

"یہ اچھا کیا تم نے۔"

رابعہ نے پھر کہا "سکندر' واپس چلو۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں۔ صدمے کی کوئی بات نہیں۔ مجھے تو اطمینان ہے کہ ہم سب بچ گئے۔ اس کوٹھی میں میرا کیا تھا۔"

"خرچ تو تم نے بھی کیا تھا" میں نے گاڑی اسٹارٹ کی۔

"برائے نام۔ باقی سب دلاور کا پیسہ تھا جو حرام تھا۔ اس نے جس مقصد کے لیے خرچ کیا تھا وہ پورا نہیں ہوسکا۔ زمین کی قانونی وارث میں ہوں وہ تباہ نہیں ہوسکتی" رابعہ نے کہا۔

رابعہ کی کوٹھی کے چاروں طرف ایک ہجوم حلقہ بنائے ہوئے کھڑا ہوا تھا۔ پولیس کوشش کررہی تھی کہ لوگ آگ بجھانے والی گاڑیوں کے لیے راستہ چھوڑ دیں۔ مشکل یہ تھی کہ اسی وقت سامنے سینما میں بھی فلم کا انٹرویل ہوا تھا۔ چنانچہ تماشا دیکھنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہوگئی تھی۔ سڑک کے دونوں جانب ٹریفک رک گئی تھی۔ کوٹھی سے اٹھنے والے شعلے محاورے کے مطابق آسمان سے باتیں کررہے تھے۔ شعلوں کے عکس نے واقعی آسمان کا رنگ آتشیں کردیا تھا۔ آس پاس کا علاقہ آگ سے روشن تھا اور دھوئیں کے بادل آسمان کی طرف اُڑ رہے تھے۔ شعلوں کی تپش سے گردوپیش کا درجہ حرارت بڑھ گیا تھا۔ فائر بریگیڈ والے ہر سمت سے پانی کی دھار ڈال رہے تھے لیکن آگ قابو میں آتی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ رابعہ کے گھر سے ملحق گھروں کے مکین خوف و ہراس کی کیفیت میں اپنا اپنا سامان نکال کے لے جارہے تھے۔ سارا سامان لے جانا تو ان کے لیے ناممکن تھا۔ وہ قیمتی اشیا دوسرے گھروں میں منتقل کررہے تھے۔ جو کچھ دور سڑک کے پار تھے۔ اس کارِ خیر میں کچھ لوگ نیک نیتی سے ان کی مدد کررہے تھے مگر میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ ریڈیو اٹھائے نکلا اور مخالف سمت میں چل پڑا۔ ایک آدمی کا گھر جل رہا ہو اور اس کی زندگی کا اثاثہ خاک ہونے کا ڈر ہو تو اسے لوٹنے کا کون سوچ سکتا ہے۔ میں

نے اُس بے ضمیر شخص کو پکڑ لیا۔
"کہاں لے جا رہے ہو یہ ریڈیو۔ چور کی اولاد۔"
"یہ.... میرا ہے۔" اس نے اکڑ کے کہا۔
میں نے اسے مارا تو وہ ریڈیو چھوڑ کے بھاگ گیا۔ میں نے ریڈیو اصل مالک کے حوالے کر دیا جو اتنی بدحواسی میں سامان ڈھونڈ رہا تھا کہ اسے میری طرف دیکھنے یا میرا شکریہ ادا کرنے کا خیال بھی نہیں آیا۔ اچانک وہاں اندھیرا ہو گیا۔ شعلوں سے بجلی کے تار پگھل گئے تھے۔ مین لائن عین رابعہ کے گھر کے سامنے سے گزرتی تھی۔ تاریکی میں آگ اور بھی بھیانک منظر پیش کرنے لگی۔ میں نے رابعہ سے کہا "چلو۔ دیکھ لیا اپنی آنکھوں سے۔ اب یہاں رکنے کا کوئی فائدہ نہیں۔"
مجمع میں ہم بہت پیچھے تھے۔ چنانچہ کسی نے بھی رابعہ کو غور سے نہیں دیکھا تھا۔ میں لوگوں کی باتیں سن رہا تھا۔ عام خیال یہی تھا کہ جانی نقصان کوئی نہیں ہوا۔ وکیل صاحبہ یہاں رہتی نہیں ہیں۔ کچھ لوگ اس کی تردید بھی کر رہے تھے جنھوں نے گاڑی کو وہاں آتے دیکھا تھا۔
دلاور کی بیوی اچانک ہم سب کی نظروں میں مجرم بن گئی تھی اور ڈری ہوئی تھی۔ یہ سب اس کے شوہر کا کیا دھرا تھا۔ شاید پہلی بار اس نے کسی کے گھر کو آگ میں جل کے خاکستر ہوتے دیکھا تھا۔ ابھی ایک گھنٹا پہلے وہ اس گھر کو اندر سے دیکھ کر آئی تھی۔ یہ کسی بھی طرح اس کے رئیسانہ گھر سے کمتر نہ تھا۔ شاید اس کی شان و شوکت دیکھ کے اس نے حسد محسوس کیا ہو کہ یہ محل اس کے شوہر نے ہی رابعہ کو بنوا کے دیا تھا۔ ممکن ہے اسے علم نہ ہو کہ دلاور نے یہ محل چاندنی بیگم کی نذر کیا تھا اور پھر چاندنی بیگم دولت کی اسی قربان گاہ پر قتل ہوئی تھی۔ تاہم وہ رابعہ کا دکھ اس کے چہرے پر پڑھ سکتی تھی۔ اس نے پیش کش بھی کی تھی کہ وہ نقصانات کی تلافی کر دے گی مگر جیسے راکھ سے پھر دیواریں کھڑی نہیں ہوتیں ایسے ہی جذبات مرجائیں تو انہیں صرف دولت سے زندگی نہیں ملتی۔
جب ہم واپس جا رہے تھے تو خاموش تھے۔ گاڑی اب غالب چلا رہا تھا اُس کے ساتھ نازو چپ بیٹھی تھی۔ پچھلی سیٹ پر میرے اور رابعہ کے درمیان نوشابہ تھی۔
"اب ہم کہاں جائیں گے؟" رابعہ نے اچانک پوچھا۔
غالب نے کہا "دنیا بہت بڑی ہے۔"
"مگر اس میں ہمارے لیے جگہ کہاں ہے؟"
غالب نے کہا "جگہ دل میں ہونی چاہیے۔ نازو کا تو مسئلہ نہیں۔"
میں نے مسکرا کے کہا "پھر تو رابعہ کو بھی یہ سوال نہیں کرنا چاہیے۔ مگر رابعہ اداس ہے۔"
"میں ایک بار پھر بے گھر ہو گئی ہوں" وہ اداسی سے بولی۔
"اینٹ پتھروں سے بنے ہوئے چھت والے حصار کو مکان کہتے ہیں، گھر نہیں۔ پہلا گھر تمہاری والدہ کا تھا۔ دوسرا ایک دامِ

اجل۔ ڈیتھ ٹریپ۔ میں (DEATH TRAP) ...
کر سکتا۔ ویسے تو ایک گھر کو میں بھی اپنا کہہ سکتا ہوں مگر تمہاری طرح میں اس میں رہ نہیں سکتا۔"
نازو نے کہا "فی الحال ایک جگہ ہے میرے ذہن میں۔ شاید ابھی خالی مل جائے۔"
غالب نے کہا "بہت سی مسجدیں خالی ہیں۔ مگر اللہ کے گھر پر بھی اس کے بندوں کی اجارہ داری ہے۔ یار سکندر کوئی ایسی جگہ بتاؤ جہاں بھوت رہتے ہوں۔"
"میں کیا بتاؤں۔ نازو سے پوچھو" میں نے اسے چھیڑا۔
خلاف توقع وہ خفا نہیں ہوئی "وہی بتا رہی ہوں۔ تم سوچو۔"
غالب نے کہا "میں گھر داماد نہیں بنوں گا۔"
نازو نے اس کے کان میں کچھ کہا۔ غالب نے ایک ...
"وہاں؟ آخر ہو نا بھوت کی بچی۔ کیا جگہ سوجھی ہے۔"
"کیا کوئی قبرستان یا مرگھٹ ہے۔ کوئی آسیب زدہ گھر۔"
"ایک بھوت بنگلا ہے" غالب نے کہا "اس سے زیادہ ... نہیں بتا سکتا۔"
جب تک گاڑی اس گلی میں نہیں پہنچ گئی میں بھی کچھ نہ سمجھا تھا پھر گاڑی اچانک رک گئی۔ اس وقت تک سب ... ہو گیا تھا کہ وہ کیا جگہ ہے۔ سوائے دلاور کی بیوی کے۔ لیکن ... نے اپنے منہ سے مرحوم نقوی صاحب کا نام نہیں لیا تھا۔ ابھی ... یہ کوٹھی کسی کو الاٹ نہیں ہوئی تھی۔ نازو سے مجھے بعد میں ... ہوا کہ ابھی اسے حکومت کو واپس کرنے کے لیے خالی بھی نہیں ... گیا تھا چنانچہ سرکاری طور پر یہ ابھی تک نقوی صاحب مرحوم ... نام پر تھی۔
غالب خود نیچے اترا اور اِدھر اُدھر دیکھ کے بند گیٹ پر چڑھ ...
بس یہی ایک خطرے کا لمحہ تھا جب کسی کی دوسری کوٹھی کا چوکیدار اسے دیکھ لیتا تو سیٹی بجا دیتا مگر رات کے ساڑھے گیارہ بجے ... ویران تھیں۔ کوٹھیوں میں روشنی تھی مگر مکین محسوس نہیں ... تھے اور چوکیدار اپنے اپنے کیبن میں اسٹولوں پر بیٹھے ہوئے ... گیٹ کے اندر کرسیوں پر۔
غالب نے مین گیٹ کا بغلی دروازہ اندر سے کھول دیا اور ... سب کار سے اتر کے اندر چلے گئے۔ میرے ذہن میں اس کو ... سے بہت سی یادیں منسوب تھیں۔ یہ سیکریٹری حضرات کی سرکاری رہائش گاہیں تھیں جہاں پرندہ پر نہیں مار سکتا تھا مگر دستِ اجل ... شب خون مارنے سے کون روک سکتا ہے۔ ہوم سیکریٹری بننے ... آرزو دل میں لیے نقوی صاحب دنیا سے رخصت ہوئے تھے ... انہیں طویل رخصت سے پہلے ہی ہمیشہ کے لیے رخصت کر دیا ... تھا۔
کوٹھی کی سب لائٹس آف تھیں۔ غالب نے پہلے ...
روشنی جلائی پھر گیٹ کی لائٹس روشن کر دیں تاکہ کسی کو شک ...

... وقار یوسف کی گاڑی باہر کھڑی تھی اور یہاں کے رہنے ... اس کار کو اکثر آتے جاتے دیکھا ہوگا۔ انہیں معلوم ہوگا ... وقار یوسف مرنے والے کا داماد تھا اور وکیل تھا۔
غالب بولا "اب مسئلہ ہے اندر داخل ہونے کا۔"
میں نے کہا "میں نازو کے دماغ کی داد دیتا ہوں۔ اس جگہ کا ... آ سکتا تھا۔"
"مجھے آنے ہی والا تھا۔ بس اس کی زبان تیز ہے نا۔ یہ ایک ... بول پڑی" غالب نے کہا "میں سوچ رہا تھا۔"
"بہت خوب۔ آپ بھی دماغ سے سوچتے ہیں" نازو طنزاً بولی۔
"تمہارے لیے دل سے سوچتا ہوں۔ تم دماغ کی فکر مت ..." غالب نے ایک ہاتھ سینے پر رکھا "اجازت ہو تو میں ... لیے دل کا۔ سوری اس گھر کا دروازہ کھولوں۔"
وہ پیچھے غائب ہو گیا۔ میں دلاور کی بیوی کو دیکھ رہا تھا جو بہت ... چکی تھی۔ اس عورت کے لیے جس کی زندگی کا محور اس کا گھر ... بچے ہوں، عیش و عشرت کی زندگی، سیر و تفریح اور شاپنگ ہو۔ ... ہو اور مجرمانہ نوعیت کی تخریبی سرگرمیوں میں شریک رہنا ... بھیانک تجربہ تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ برداشت کرتے کرتے کہیں ... اس کے اعصاب ہی جواب نہ دے جائیں اور وہ پاگلوں کی ... چیخنا شروع کر دے۔ اسے پہلے جو امید تھی کہ دلاور سے ... ملتے ہی وہ رہا ہو جائے گی اب وہ دم توڑ چکی تھی۔ وہ ... بے بس اور تنہا محسوس کر رہی تھی۔ اسے جتنا غصہ ہم پر تھا ... سے زیادہ شاید دلاور پر تھا۔ آج رات وہ اپنے بچوں کے ساتھ ... کسی پُرفضا بہار آفریں وادیوں کے دل نشیں نظاروں میں ہوتی مگر ... اسے کہاں سے کہاں لیے پھر رہی تھی۔
میں بالکل تیار تھا کہ اگر وہ دیوانگی میں اچانک مجھ پر حملہ ... یا چیخنے کے لیے منہ کھولے تو اس کو دبوچ کے اس کا گلا ... دوں۔ اس کی خاطر میں سب کی زندگی کو داؤ پر نہیں لگا سکتا ... تک مجرم وہ نہیں تھی اور جنگ میں بے گناہ عورتوں یا ... بچوں کو اور بیمار بوڑھوں کو گھسیٹ لینا جنیوا کنونشن کے ... غیر اخلاقی قرار دیا گیا تھا مگر جنگی جرائم میں نازی جرمنی کو سزا ... والے بھی کم مجرم نہ تھے۔
انہوں نے بھی جنیوا کنونشن کی قراردادوں کی دھجیاں بکھیری ... وہ فاتح تھے اور قصوروار صرف مفتوح ہوتا ہے پھر فاتح ... بدل لیتا ہے کہ محبت اور جنگ میں تو سب جائز ہے۔ کچھ ... جذبات اس وقت میرے بھی تھے۔ میں اخلاقیات سے ... کی شکست کے بارے میں سوچ رہا تھا اور یہ چاہتا تھا کہ ... بار وہ سزا دوں جو تمام عمر کا عذاب ہو۔ میں نوشابہ کو قتل ... تھا کہ بعد میں دلاور ساری زندگی پچھتاوے کا دکھ جھیلے ... دلاور اس پر تھوکے۔ اسے ماں کا قاتل کہے اور اس سے ... سے آخر دلاور نے بھی تو میرے باپ کو ایسی انسانیت سوز

موت سے ہمکنار کیا کہ اس کا خیال آج بھی میرے خون میں آگ بھر دیتا تھا۔
فرق صرف یہ تھا کہ وہ دلاور تھا اور میں سکندر۔ جو وہ کر سکتا تھا میں نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا تو ضمیر مر چکا تھا مگر ابھی تک میرا راہنما میرا ضمیر تھا۔
غالب منہ لٹکائے واپس آیا "بھیّا۔ چوروں کے لیے کوئی آسان راستہ نہیں چھوڑا کوٹھی بنانے والوں نے۔"
"بہت قیمتی لوگ رہتے ہیں یہاں۔ ان کی حفاظت ایسے ہی کی جاتی ہے" میں نے کہا۔
"ہر طرف گرل ہے اور دروازے کسی قلعے کے دروازے سے کم نہیں۔" غالب نے کہا "خیر۔ ہم بھی چور نہیں شریف آدمی ہیں۔ فرض کرو ہم سے چابیاں کھو گئی ہیں۔ ہم اندر کیسے جائیں گے؟"
میں نے کہا "گاڑی میں پلاس اور پیچ کس ہوں گے۔"
غالب نے کہا "پچھلی طرف سے گیراج میں داخل ہو کے دیکھا جا سکتا ہے کہ وہاں کیا کچھ ہے؟"
ہم نے دلاور کی بیوی کو نازو کے سپرد کیا اور اسے سمجھا دیا کہ اس کی حیثیت جنگی قیدی کی ہو گئی ہے۔ غلط حرکت کی صورت میں اس کے ساتھ کوئی رعایت نہ کی جائے۔ نازو اسے پچھلی طرف لے گئی۔ دلاور کی بیوی روتے ہوئے اپنے وجود کا بوجھ گھسیٹنے پر مجبور تھی۔ قسمت نے اسے جو ذلت دی تھی وہ اس کے تصور میں بھی نہ تھی۔
میں نے اور غالب نے آدھے گھنٹے کی محنت کے بعد پچھلی طرف سے ہی ایک باتھ روم کے روشندان کی جالی نکال دی۔ غالب کو میں نے اوپر اٹھایا اور وہ اندر اتر گیا۔ اس کے ساتھ ہی سب بند دروازے کھل گئے۔ غالب نے بے خوفی سے پھر لائٹ جلائی اور ایک بیڈ روم سے گزرتا ہوا دوسرے بیڈ روم میں پہنچا۔ پھر اس نے پورچ کا ایک دروازہ کھول دیا۔
خود کو اس ڈرائنگ روم میں پا کے میری ذہنی کیفیت عجیب سی ہو گئی۔ ایک وقت تھا کہ یہاں بیٹھ کے میں نے نقوی صاحب سے اور دلاور سے بات کی تھی۔ ان مقدمات کی فائلوں کو دیکھا تھا جو میرے خلاف زیرِ سماعت تھے۔
اچانک مجھے کچھ یاد آیا "غالب، نقوی صاحب کی مفلوج اور معذور بیوی کا کیا بنا؟"
"وہ اسپتال میں ہیں" غالب نے کہا "اور شاید زندگی کی آخری سانس تک رہیں گی۔ اگر آئیں گی تو سفرِ آخرت کے لیے۔"
"اگر وقار یوسف کی بیوی کو معلوم ہو جائے کہ ہم یہاں کس طرح داخل ہوئے ہیں۔ کیا کہے گی وہ؟"
غالب نے کہا "وہ بے چاری کیا کہے گی۔ اسے تو شکوہ ہوگا کہ ہم نے اسے کیوں نہیں بتایا۔ وہ چابیاں لے کر آ جاتی۔"
نازو اب دلاور کی بیوی کو تسلی دے رہی تھی کہ وہ رونا دھونا بند

کرے۔ خدا نے اور پھر دلاور نے چاہا تو بہت جلد اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل نکل آئے گا۔ اپنی جان ہلکان کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ دلاور مجبور ہے۔ وہ بالآخر مان جائے گا۔ دلاور کی بیوی کی یہ خواہش بہرحال پوری نہیں کی جاسکتی کہ اسے اپنے شوہر یا بچوں سے بات کرنے کا موقع دیا جائے۔

رابعہ نے سیدھا کچن کا رخ کیا۔ وہاں سب کچھ تھا۔ احساسِ تحفظ ملتے ہی سب پر تھکن اور بھوک غالب آگئی تھی اور اب وہ پراٹھا کباب سب کے لیے من و سلویٰ بن گیا تھا۔ جسے پہلے کوئی چکھنے پر راضی نہ تھا۔ رابعہ نے انہیں اوون میں گرم کیا اور الیکٹرک کیٹل لگا کے کافی تیار کرلی۔

میں نے اور غالب نے اتنی دیر میں نقوی صاحب کی بیوی کے کمرے کو کھولا اور وہاں پڑی ہوئی ڈھیروں داؤں میں سے سکون آور گولیاں اٹھالیں۔ بہت سی دوائیں ایسی تھیں کہ میں ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا اور ان کا استعمال خطرناک بھی ثابت ہوسکتا تھا۔ میں خود بھی ذہنی طور پر بہت اپ سیٹ تھا اور ایک رات سکون سے سونا چاہتا تھا۔

دلاور کی بیوی نے سب کے اصرار پر تھوڑا سا کھانا کھایا۔ کافی وہ پیتی نہیں تھی۔ نازو نے اسے سکون آور گولیاں دیں تو اس نے کسی تذبذب کے بغیر قبول کرلیں۔ "یہ تو میں نے بہت کھائی ہیں۔ کسی دن اتنی کھالوں گی کہ دائمی سکون مل جائے گا" وہ بولی۔

میں نے کہا "مسز دلاور۔ یاد رکھیں آپ کو اپنے لیے نہیں' بچوں کے لیے جینا ہے۔ کیا آپ اتنی خودغرض ماں ہیں کہ اپنے سکون کے لیے انہیں ساری عمر ماتا سے محرومی کے عذاب کی سزا دیں گی۔"

وہ خاموش ہوگئی اور کچھ دیر بعد سوگئی۔ یہ پہلے نقوی صاحب کا بیڈ روم تھا۔ اس میں اب بھی ان کا ڈبل بیڈ اسی طرح موجود تھا جیسے ان کی زندگی میں تھا۔ ہر چیز ویسی ہی تھی اور وہیں تھی۔ نازو نے بالآخر رابعہ کی بات مان لی اور دلاور کی بیوی کے ساتھ بیڈ پر سوگئی۔ رابعہ نے وہیں قالین پر تکیہ لگالیا اور دروازے کو اندر سے لاک کرکے چابی سرہانے رکھ لی۔

بیچ کا دروازہ نقوی صاحب کی بیگم کے کمرے میں کھلتا تھا۔ وہاں دواؤں کی بُو بسی ہوئی تھی اور ایک منحوس قسم کی آسیب زدہ فضا تھی لیکن غالب اتنا تھکا ہوا تھا کہ گولی کھا کے لیٹا اور سوگیا۔ خود میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہورہی تھیں لیکن مجھے دلاور کو یہ بتانا تھا کہ ہم ابھی تک زندہ ہیں۔ میں نے باہر جا کے کار کے ریڈیو فون پر بات کرنے کا سوچا مگر یہ طریقہ غیر محفوظ تھا۔ سڑکوں پر رات کے چوکیدار گشت کررہے تھے اور یہ ویسے بھی خواص کا علاقہ تھا۔ یہاں سب ہی نقوی صاحب جیسے توپ قسم کے افسر رہتے تھے چنانچہ پولیس بھی یہاں رسمی گشت نہیں کرتی تھی۔

میں نے ذہن پر زور دیا تو مجھے وہ نمبر یاد آگیا جس پر میں نے دلاور کی کار کے فون سے بات کی تھی۔ مجھے پورا یقین نہیں تھا کہ نمبر کے اعداد صحیح ترتیب میں ہیں۔ خصوصاً آخری دو عدد لیکن میں کوشش کرکے صحیح نمبر ملا سکتا تھا۔ پہلی رانگ کال کے بعد میں کامیاب ہوگیا۔

میں نے ڈراؤنی آواز بنا کے کسی روبوٹ کی طرح آہستہ آہستہ کہا "چوہدری دلاور کو بلاؤ۔"

"میں' دلاور ہوں۔ کون ہو تم؟"

میں نے ایک بھیانک قہقہہ لگایا "میں سکندر کی روح ہوں۔ یہ عالم بالا کی کال ہے۔"

"سکندر....." چوہدری دلاور کو شاک لگا "نوشی کہاں ہے؟"

"جہنم میں" میں نے اسی لہجے میں کہا جیسے فلموں میں روح کو یا مُردے کو بات کرتا دکھایا جاتا ہے۔ "تمہارے لیے جو اسپیشل بنایا گیا ہے۔ اس کے سوا وہ کہاں جاسکتی تھی۔"

"مذاق مت کرو۔"

"اس کی لاش کوئلہ ہوگئی تھی۔ کاش تم دیکھ سکتے اور اس کے بچوں کو دکھا سکتے۔ اپنے چوہدری صاحب" میں نے صداکاری چھوڑ کے کہا "تم نے دنیا پر اس محاورے کی صداقت سچ ثابت کردی کہ جو دوسروں کے لیے گڑھا کھودتا ہے خود اسی میں گرتا ہے۔"

"تم..... جھوٹ بکتے ہو۔"

"ہاں۔ میں واقعی اسی دنیا سے بول رہا ہوں۔ میں تمہیں رابعہ کی آواز بھی سنوا سکتا ہوں۔" میں نے کہا "غالب اور نازو بھی زندہ ہیں چوہدری دلاور۔ اس گھر میں دو ہی بدنصیب عورتیں رہ گئی تھیں۔ ایک تمہاری پہلی بیوی۔ ایک وہ جو تیسری بیوی نہ بن سکی۔"

زندگی میں پہلی بار میں نے اسے روتے سنا "سکندر' خدا کے لیے کہہ دو یہ جھوٹ ہے۔ تم مذاق کررہے ہو۔"

میں نے کہا "دلاور' یہ تو مکافاتِ عمل ہے۔ مذاق تمہارے ساتھ تقدیر نے کیا ہے۔ بڑا بے رحم مذاق ہے یہ۔ کتنی محنت سے تم نے وہ محل بنوایا تھا۔ کیسے کیسے سراغرسانی کے آلات نصب کرائے تھے وہاں۔ تم واقعی بہت چالاک ہو۔ بہت ہوشیار ہو' بڑا زبردست جال بچھایا تھا تم نے ہماری موت کے لیے۔ تم ایک بٹن دباتے اور اس کوٹھی میں ہر طرف نصب ڈائنامائٹ کسی آتش فشاں کی طرح تباہی پھیلا دیتے۔ تمہیں اطلاع دینے والوں نے بھی غلط نہیں بتایا تھا کہ ہم وہاں پہنچ گئے ہیں۔ بس وہ اندازہ نہ کرسکے کہ واپس کتنے لوگ گئے ہیں اور جو گئے ہیں وہ کون تھے؟"

"سکندر' میں اپنے بچوں کے سامنے ان کی ماں کے قاتل کی حیثیت سے نہیں جانا چاہتا۔"

"تو مت جاؤ۔ بن باس لے لو۔ دفع ہوجاؤ کہیں بھی۔ بہت پیسہ ہے تمہارے پاس۔ دوسری بیوی بھی ہے۔"

"دیکھو۔ مجھ سے غلطی ہوئی..... بدعہدی کی میں نے" اس کی ...میرے بچوں کو مت دو۔"

"تت..... تت....تت" میں نے افسوس سے کہا "اتنا بڑا' اتنا ...ور آدمی ایسے گڑگڑا رہا ہے۔ غلطی تم کیسے کرسکتے ہو اپنے ...دری دلاور صاحب۔ ہیں جی' غلطی تو کرتے ہیں ہم جیسے انسان۔ ...تم ہو وہ..... کیا کہتے ہیں اسے... ابلیس یعنی تمہارا غرور ٹوٹنا نہیں ...ہیے۔ ایک نہیں نوشابہ جیسی دس مرجائیں۔ اور اولاد کا کیا ہے ...لے دراہی اور پیدا ہوجائیں گے۔ ابھی تو تم جوان ہو۔"

دلاور پھر سنبھل گیا "دیکھو سکندر..... نوشابہ..."

میں نے کہا "پھر بات کریں گے اپنے چوہدری صاحب۔ نیند ...ری ہے ابھی تو۔"

"سنو۔ ایک منٹ..... تم جہاں کہو جیسے کہو..... میں پیڈرو کو ...سکتا ہوں۔"

"لیکن پیڈرو نے تو کچھ اور ہی پیشکش کی تھی" میں نے کہا اور ...ون بند کردیا۔ مجھے یقین تھا کہ اب وہ رات بھر بے یقینی کے عذاب ...یں تڑپے گا۔ میں نے اسے شک میں ڈال دیا تھا کہ اس کی بیوی کے بارے میں جو کچھ میں نے کہا تھا محض اسے اذیت دینے کے لیے ...کہا تھا۔ شاید خود اسے بھی یقین کرنا مشکل ہوگیا تھا کہ چوبیس سال ...ساتھ نبھانے والی نوشابہ جل کے مرچکی ہے۔ اس کے آدمی غلط رپورٹ کیسے دے سکتے ہیں۔

صبح تک میں گہری نیند سویا۔ ایک عرصے کے بعد مجھے مکمل ...ذہنی احساسِ تحفظ ملا تھا اور تقدیر کی بساط پر بازی میرے حق میں ...پلٹ گئی تھی۔ شاید میں نو بجے کے بعد بھی سویا پڑا رہتا لیکن غالب ...نے بقلم خود بیڈ ٹی تیار کی اور انتہائی مہذب طریقے سے مجھے لات ...مار کے پیش کی۔

"اللہ تمہیں جزائے خیر دے۔ اتنی محبت سے تو شاید بیوی بھی ...نہیں اٹھائے گی" میں نے چائے کا کپ تھام کے کہا۔

"پرانی باتیں بھول جاؤ۔ مستقبل کے شوہروں کی طرح ہم بھی ...ان کو جگا کے بیڈ ٹی پیش کریں گے۔"

"باقی سب لوگ سو رہے ہیں؟"

غالب نے اقرار میں سر ہلایا "سوائے مسز دلاور کے۔ وہ ...رو رہی ہے۔ اب تو مجھے بھی اُس پر ترس آنے لگا ہے۔"

"آج اسے گھر بھیج دیں گے یار" میں نے کہا۔

"آخر کس کی چلے گی۔ دلاور کی یا پیڈرو کی؟"

میں نے اسے گزشتہ رات دلاور سے ہونے والی گفتگو کے ...بارے میں بتایا "ہم اپنی بات پر قائم ہیں۔ ہمیں پیڈرو چاہیے۔ ...مجھے یقین ہے کہ پیڈرو نے اپنی طرف سے کوئی پیش کش نہیں کی ...کہ شیلی کی قبر کا نشان بتادو تو تمہیں وزیر خان کا مدفن دکھا دیا ...جائے گا۔ شیلا کی قبر سے پیڈرو کا کیا واسطہ۔ الزام تو دلاور پر ...ہے۔"

"کہیں پیڈرو فرار نہ ہوجائے۔"

"یہ اندیشہ تو مجھے بھی ہے۔ دلاور بہت زیادہ دباؤ میں ہے اور کوئی راستہ نہ رہا تو وہ پیڈرو کو قربان کرکے بیوی کو بچا لے گا۔ خطرہ تو پیڈرو بھی محسوس کررہا ہوگا۔"

"رابعہ کے گھر کی آتش زدگی کے بارے میں اخباروں کی کیا رپورٹ ہے؟"

"یہاں کوئی اخبار نہیں ڈالتا۔ میں معلوم کرتا ہوں مگر اس وقت کون ہوگا اخبار کے دفتر میں؟" غالب نے کہا "تم دلاور سے آخری بات کرلو۔"

میں نے فون اٹھایا "وہ رات بھر تڑپا اور پھڑکتا رہا ہوگا۔"

غالب نے مجھے روک دیا "دوبارہ یہ فون استعمال مت کرو۔ کیا معلوم دلاور نے اپنے فون کو آبزرویشن پر لگوادیا ہو۔ اسے پتا چل جائے گا کہ کال کہاں سے کی گئی تھی۔"

"چلو پھر باہر گاڑی میں چلتے ہیں۔ بات بھی کرلیں گے اور اخبار بھی لے آئیں گے" میں نے کہا۔

ہم بغلی دروازے سے برآمد ہوئے اور گاڑی میں بیٹھ کے روانہ ہوگئے۔ ریگل کے قریب ہم نے اس میں پیٹرول بھروایا پھر ہم نے اخبار لیا اور پوری چھولے کا ناشتا۔ آدھے گھنٹے میں ہم واپس بھی آگئے۔ اس وقت تک رابعہ اور نازو بھی جاگ گئی تھیں۔ ناشتا رابعہ کے حوالے کرکے میں نے اخبار دیکھا۔ اس میں آگ لگنے کی واردات کو شارٹ سرکٹ کا نتیجہ بتایا گیا تھا۔ مجھے بھی یہی اُمید تھی۔ بم کے دھماکے یا تخریبی کارروائی کی خبر دبادی گئی تھی۔ میں اخبار میں ایسا گم ہوا کہ دلاور سے بات کرنا بھول گیا۔

چونکا دینے والی بات یہ تھی کہ آگ بجھانے والے عملے نے جل کے کوئلہ ہوجانے والی دو لاشیں نکالی تھیں۔ ان میں ایک کسی عورت کی لاش تھی اور دوسری مرد کی۔ عورت کی لاش کو ہاتھ کی کلائی میں رہ جانے والی چوڑیوں سے شناخت کیا گیا تھا۔ میں نے غالب کو متوجہ کیا۔

غالب نے اپنا سر پیٹ لیا۔ "یار یہ عاشق علی تڑپ اور ان کی اہلیہ ہوں گے۔"

صدمے سے میرا دل ڈوبنے لگا "وہ اندر کیسے پہنچ گئے آخر!"

"وہ اور کہاں جاسکتے تھے" غالب نے کہا "رابعہ انہیں وہیں چھوڑ گئی تھی۔"

"مگر ہم نے انہیں کیوں نہیں دیکھا تھا؟"

"میرا خیال ہے کہ نہ انہیں ہمارے آنے کی خبر ہوئی نہ جانے کی۔ ہم تو خاموشی سے گئے تھے اور ہم نے باہر کی لائٹس بھی آف رکھی تھیں۔ اندر بھی ہم دو کمروں تک محدود رہے تھے اور ہماری کوشش تھی کہ کسی کو اندر ہماری موجودگی کا پتا نہ چلے۔ یہی غلطی یا احتیاط اُن بے چاروں کی موت کا سبب بن گئی۔"

"آخر وہ تھے کہاں؟"

"یار بوڑھے لوگ تھے۔ کیا پتا پچھلے حصے میں کہیں سو رہے ہوں۔ ان کی کیا مصروفیات تھیں۔ نہ کہیں آنا جانا' نہ ٹی وی دیکھنا یا پڑھنا۔ گھر کا بھی کوئی کام نہیں رہا تھا۔"

"شاید ایسا ہی ہوا ہوگا" میں نے کہا "ممکن ہے ان میں سے کوئی بیمار ہو۔ دوسرا تیمارداری کے خیال سے وہیں رہتا ہو۔ ہم ٹھہرے بھی کتنی دیر تھے۔ کچن کی طرف کوئی جاتا تو شاید وہ جاگ اٹھتے لیکن وہاں کسی نے چائے بھی نہیں پی تھی۔ ہم کھانا بھی باہر کھانے چلے گئے تھے۔ کیسی بھیانک غلطی ہوگئی ہم سے۔ کسی کو بھی ان کا خیال نہیں آیا۔"

"ہم سے بڑی مجرمانہ کوتاہی سرزد ہوگئی۔"

"کوتاہی بہت معمولی لفظ ہے۔ ہم نے گناہ کیا۔ اللہ اُن کی مغفرت کرے۔" میں نے کہا۔

ناشتے کے دوران بھی مجھے بار بار عاشق علی تڑپ کا خیال آتا رہا اور ان کی صورت آنکھوں کے سامنے پھرتی رہی۔ ان کا چلنا پھرنا' بات کرنے کا انداز' ان کا ذوق شعری۔ سب ایک لطیفہ تھے مگر ان کی موت بہت بڑا المیہ۔ رابعہ نے مجھے خاموش دیکھا تو یہی سمجھی کہ شاید میں رات کو سو نہیں سکا اور اپنے ہی معاملات پر سوچ رہا ہوں۔ میں نے اور غالب نے اتفاق رائے سے اخبارات غائب کردیے تھے تاکہ انہیں اس حادثے کی خبر نہ ہو۔ بے شک یہ خبر ہمیشہ چھپی نہیں رہ سکتی تھی لیکن ابھی ان کو دلاور کی بیوی سے زیادہ ڈیپریشن ہوجاتا۔ خصوصاً رابعہ کو جس پر اپنے گھر کو آگ میں جلتا دیکھنے کا اثر زیادہ ہوا تھا۔

دلاور کی بیوی ہاتھ منہ دھونے کے بعد کچھ بہتر محسوس کررہی تھی۔ اس کا ڈیپریشن جو پہلے مایوسی کا آئینہ دار تھا اب جارحانہ انداز اختیار کرنے لگا تھا۔ اس نے پھر اصرار کیا کہ اسے دلاور سے بات کرنے کا موقع فراہم کیا جائے۔

"کس بات کا ڈر ہے آخر تم لوگوں کو اور میں کیسے یقین دلاؤں تمہیں کہ میں تمہاری سفارش کروں گی۔ دلاور کو مجبور کروں گی کہ تمہاری بات مانے۔ میں تمہارے خلاف کوئی بات کیسے کہہ سکتی ہوں۔ ایک مجبور عورت جسے یہ بھی علم نہیں کہ یہاں سے وہ کہاں جائے گی۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے مسز دلاور۔ آپ کو موقع دیا جائے گا۔"

"کب؟" وہ بے چین ہوگئی "میں بچوں سے بھی بات کروں گی۔"

"میں کوئی وعدہ نہیں کرتا۔ سب کچھ حالات پر منحصر ہے۔"

"کیسے حالات؟ حالات تو یہی رہیں گے" وہ غصے میں بولی۔ "بہانے بازی مت کرو۔"

میں نے اسے گھور کے کہا "اپنی آواز کم رکھو۔ ورنہ تمہیں جو رعایت حاصل ہے آزادانہ اٹھنے بیٹھنے کی اور باتیں کرنے کی' یہ واپس بھی لی جاسکتی ہے۔"

وہ خاموش ہوگئی مگر اس کی یہ خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ تھی۔ وہ اپنے گھر اور اپنے بچوں سے ایک حد تک دوری برداشت کرسکتی تھی اس کے بعد جذبات کے دباؤ سے وہ اسی طرح پھٹ سکتی تھی جیسے بھاپ زیادہ ہونے سے پریشر ککر دھماکے سے پھٹ جاتا ہے۔

میں نے ناشتے کے فوراً بعد گاڑی کے ریڈیو فون پر دلاور سے رابطہ کیا "بیڈ مارننگ۔" میں نے کہا "رات کیسی گزری اپنے چوہدری صاحب؟"

"سکندر۔ تم سے پیڈرو نے کیا کہا تھا؟ وہ تو جیسے رات بھر فون سے لگا بیٹھا رہا تھا اور کسی تمہید کے بغیر اصل بات پر آگیا تھا۔ اس کا غرور اور اس کی اکڑفوں غائب ہوگئی تھی۔

میں نے کہا "کیا وہ تمہیں کچھ بتانے پر تیار نہیں۔ بڑا حرامی ہوگیا ہے' چھتر دل کردی اس کی پھر بتائے گا۔ آپ تو ماہر ہو زبان کھلوانے کے۔"

"میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔"

"لوجی۔ وقت بھی کوئی شے ہے۔ ضائع ہوتی ہے دولت' عزت بھی آنی جانی چیز ہے۔ رشتے دار غریب کے نہیں ہوتے۔ دولت مند کو رشتوں کی یا دوستوں کی کیا کمی۔"

"پیڈرو نے کہا تھا کہ شیلی کی قبر کا نشان بتادو؟"

میں نے ہنس کے کہا "تم باز نہیں آؤگے حرامی پن سے دلاور۔ جب تمہیں معلوم تھا تو مجھ سے کیوں پوچھ رہے تھے؟ یہ پٹی خود تم نے ہی پڑھائی ہوگی اسے' میں نے اسے تو صاف جواب دے دیا تھا مگر تم بھی سن لو' مجھے پیڈرو چاہیے' زندہ سلامت پھر تمہیں بیوی بھی مل جائے گی۔ زندہ سلامت۔"

"کب..... کہاں..... اور کیسے...؟"

میں نے کہا "تم نے ایک سانس میں تین سوال کردیے۔ پہلے سوال کا جواب تم دوگے۔ تم پیڈرو کو ایک گھنٹے میں پیش کرسکتے ہو یا ایک دن میں۔ تمہاری بیوی تو ہمارے پاس بالکل محفوظ رکھی ہوئی ہے۔ بالکل اسی حالت میں جیسے ہم لائے تھے۔ رہ گیا سوال کہاں اور کیسے کا تو اس کا انحصار ہے پہلے سوال کے جواب پر۔ جگہ ہم بتائیں گے اور طریق کار بھی ہمارا ہوگا لیکن نقصان کسی طرح بھی ہمارا نہیں ہوگا۔ اپنی کھوپڑی میں یہ بات اچھی طرح بٹھالو اور کوئی خناس ہے تو نکال دو۔"

"فرض کرو۔ میں ایک گھنٹے بعد تم سے ملنا چاہوں۔"

"مقصد صرف ملاقات ہو تو مجھے فلم اسٹار زیبا یا نیلو سے مل کے زیادہ خوشی ہوگی۔ ہیں جی' بندہ کوئی اچھی شکل دیکھے۔ تمہاری منحوس صورت سے تو مجھے ویسے بھی الرجی ہے۔ ہاں پیڈرو کا تحفہ لاؤگے تو میں وصول کرنے آجاؤں گا۔"

"آخر کہاں؟ مجھے بھی تو انتظام کرنا ہوگا۔"

"انتظام کیسا دلاور۔ بس گاڑی میں بیٹھ کے روانہ ہوجاؤ۔ اگر تم سوچ رہے ہو کہ کوئی جال پھیلاؤ۔ اِدھر اُدھر اپنی غنڈہ فورس کو چھپانے کے لیے جگہ دیکھو۔ بم بندوق اور توپ خانے کا بندوبست کرو تو بہتر ہے کہ اپنی دوسری بیوی پر اکتفا کرو اور بچوں سے کہو کہ اسے ہی ماں تسلیم کرلیں۔ اس ماں کے لیے دعائے مغفرت

...ایسی کوئی بات نہیں" اس نے گم صم لہجے میں کہا۔

...پھر میں اپنی کابینہ سے مشورہ کرکے بتاتا ہوں" میں نے فون ...رکھ دیا۔

...میں نے غالب سے اور رابعہ سے ہنگامی میٹنگ کی۔ "دلاور ...کہا ہے۔ اب دو غور طلب مسائل ہیں۔ بلکہ تین۔ پہلا پیڈرو کو ...کرنے کے لیے کسی محفوظ اور مناسب جگہ کا انتخاب' دوسرا ...کار کا اور تیسرا اسے اپنی تحویل میں رکھنے کا مسئلہ۔"

...کافی غور وخوض کے بعد ہم نے پہلے دو مسائل کو ترجیح دی اور ...عمل پر سب کا اتفاق ہوگیا۔ جب میں نے دوبارہ دلاور کو ...تو ایک گھنٹا گزر چکا تھا۔ میں اس گاڑی کو وکٹوریہ پارک کے ...لے گیا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں اس نے سگنل کی ڈائریکشن ...معلوم کرلی ہو۔

...رابطہ ہوتے ہی میں نے کہا "سنو دلاور۔ یہ تمہارے لیے ...طور پر آخری موقع ہے۔ رحم رعایت کی کوئی گنجائش نہیں اور ...ت سے اب ہم بھی دستبردار ہوگئے ہیں کیونکہ مقابلہ کسی ...دشمن سے نہیں ہے۔ تمہیں معلوم ہوگا کہ ایسے معاملات ...بدعہدی کے نقصانات کیا ہوتے ہیں؟ اغوا کرنے والوں کے ...دھوکا ہو تو وہ بڑے سفاک ہوجاتے ہیں۔ ہم بھی مجبور ...ہوجائیں گے کہ روایتی طریقے پر عمل کرتے ہوئے تمہیں قسطوں ...میں لاش ارسال کریں۔"

"نہیں۔ ایسا ظلم مت کرنا۔"

میں نے کہا "دلاور۔ کیا ظالم بھی سمجھتا ہے کہ ظلم کسے کہتے ...ہیں؟ یاد کرو تم نے کس کس پر کیسے کیسے مظالم توڑے تھے۔"

"یہ وقت پرانی باتوں کا نہیں ہے۔"

"آج تمہارے لیے وہ پرانی باتیں ہوگئی ہیں۔ کل ہم بھی یہی ...کہیں گے۔ ہم کبھی پہل نہیں کرتے دلاور۔ ہم صرف جواب دیتے ...ہیں۔ ہم آج جو کچھ بھی ہیں تمہاری وجہ سے ہیں۔ تم نے محسن کے ...بچوں کو نہ اٹھوایا ہوتا تو ہم بھی نوشابہ کو نہ اٹھاتے۔ اب تم نے یہ ...ثابت کرنے کی کوشش کی کہ تم بڑے شکاری ہو تو شکار ہوگی تمہاری ...بیوی۔"

"مجھے بتاؤ میں کیا کروں؟" دلاور نے بے چینی سے کہا۔

"غور سے سنو۔ اگر ریکارڈ کررہے ہو تو ٹیپ کو پھر سن لینا۔ تم ...ٹھیک بارہ بجے اپنی اسی کیڈیلاک میں نکلوگے جو کل تمہاری بیوی ...کے پاس تھی۔ عین شالامار باغ کے دروازے کے مقابل تم گاڑی ...سے باہر آؤگے۔ ہم دیکھ لیں گے کہ تمہارے ساتھ گاڑی ...میں صرف پیڈرو ہی ہے یا کوئی اور بھی بیٹھا ہوا ہے۔ تم اس کے ...ساتھ ڈگی کھول کے بند کروگے۔ اس کے بعد ڈگی کھولوگے۔ بات ...سمجھ میں آرہی ہے نا؟"

"ٹھیک ہے۔ آگے بولو۔"

"وہاں اپنے ٹرپ میٹر کو زیرو پر کرلینا۔ ٹھیک چار کلومیٹر کے بعد تم گاڑی روک لوگے اور وہاں سے بائیں ہاتھ پر جانے والے کچے راستے پر جانے سے پہلے دس منٹ انتظار کروگے۔ جب تمہارے قریب سے ایک ٹیکسی گزر جائے تو تم بھی روانہ ہوجانا۔ دس منٹ بعد۔ یہ بات مت بھولنا ورنہ بہت خون خرابہ ہوگا۔"

"ٹیکسی میں کتنے آدمی ہوں گے؟"

"ایک تمہاری بیوی اور ایک ڈرائیور۔"

دلاور نے کہا "اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ چار نہیں ہوں گے' ڈگی میں دو آدمی ہوئے تو مجھے کیسے پتا چلے گا۔ وہ نوشابہ کو میرے حوالے کرنے کے بجائے مجھے بھی ساتھ لے جاسکتے ہیں۔"

میں نے کہا "تمہاری تشویش بجا ہے۔ تم بھی خالی ہاتھ تو نہیں آؤگے۔ ہم یہ مطالبہ کریں کہ اسلحہ لے کر کوئی نہیں آئے گا تو یہ احمقانہ بات ہوگی۔ نہ تمہارے وعدے کی ضمانت ہے نہ ہمارے وعدے کی۔ ہاں ٹیکسی ڈرائیور تمہیں ڈگی چیک کراسکتا ہے۔ وہ سڑک پر تم سے آگے نکل کے رک جائے گا اور ڈگی میں لیٹ کر دکھائے گا۔ ظاہر ہے اس میں پہلے سے دو آدمی ہوں یا ایک بھی ہو تو دوسرا آسانی سے نہ اندر لیٹ سکتا ہے اور نہ نکل سکتا ہے۔ طاقت کا استعمال کرنے کی سوچنا بھی نہیں ورنہ نتائج کے ذمے دار تم خود ہو۔ تم اور تمہاری بیوی مارے جائیں۔ پیڈرو مارا جائے اور کوئی بھی نہ بچے۔ رہے نام اللہ کا۔ پولیس دونوں گاڑیوں پر اور لاشوں پر قبضہ کرلے گی۔"

"جب تم خود نہیں آرہے ہو تو مجھ سے کیوں توقع رکھتے ہو..."

"اپنے چوہدری صاحب۔ آخر بیوی تمہاری ہے وہ۔" میں نے کہا۔

"نہیں۔ تم ضرورت سے زیادہ ہی چالاک بن رہے ہو۔ میں نہیں آؤں گا۔ پیڈرو کے ساتھ بھی میرا ڈرائیور آئے گا۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ جیسے تمہاری مرضی۔" میں نے کہا اور فون بند کرکے لوٹ آیا۔

اب افراتفری میں پلان کے دوسرے حصے پر عمل در آمد شروع ہوا۔ میں نے دلاور کی بیوی سے کہا "چلیں جی اللہ نے آپ کے بچوں کی سن لی۔ چوہدری دلاور کا دماغ راہ راست پر آگیا۔"

"اب میں بات کرلوں؟" اس کا چہرہ کھل اٹھا۔

"کرلینا ابھی چند منٹ میں" میں نے کہا۔

پروگرام کے مطابق غالب اور نازو نے وقار کی گاڑی میں سے سب مشین گن نکال کے اندر پورچ میں چوکیدار کے کیبن کے پیچھے رکھ دی پھر وہ رابعہ کے ساتھ روانہ ہوگیا۔ اسے رابعہ کو اخبار کے آفس میں چھوڑنا تھا اور نازو کے ساتھ وقار کے گھر جانا تھا۔ نقوی صاحب کی ذاتی کار بہت کم استعمال ہوتی تھی کیونکہ مال مفت کے مصداق سرکاری خرچ پر چلنے والی کار زیادہ بے دردی سے استعمال کی جاتی تھی۔ ذاتی کار ان کی نئی زیر تکمیل کوٹھی میں کھڑی ہوئی تھی۔ ان کے شوفر کو جو ابھی واپس نہیں بلایا گیا تھا یہ کار لے کر یہاں پہنچنا تھا۔

جب میں اور دلاور کی بیوی اکیلے رہ گئے تو میں نے وہ رقم نوشابہ کے حوالے کردی جو مجھے اس کی گاڑی میں سے ملی تھی۔ "اس میں کچھ مجھ سے خرچ ہوگئی تھی۔ باقی گن لو۔"

وہ حیرانی سے نوٹوں کو دیکھتی رہی "مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ رقم کتنی تھی۔"

"ظاہر ہے تم بے حساب خرچ کرنے کی عادی ہو۔ حساب رکھتی ہیں وہ بیویاں جن کو شوہر لگی بندھی رقم دیتے ہوں گھر کا خرچ چلانے کے لیے۔"

"تم یہ مجھے کیوں واپس کررہے ہو؟"

"اس لیے کہ یہ تمہارا پیسہ ہے۔ میرا اس پر کوئی حق نہیں۔ اگر دلاور سے چھینا ہوتا تو بہت خوش ہوکے خرچ کرتا۔"

وہ کچھ دیر چپ رہی "تم بڑے عجیب انسان ہو۔"

"عجیب؟ مجھے تو اپنے انسان ہونے میں بھی شک ہے۔" میں نے تلخی سے کہا "انسان وہ ہیں جو انسانوں کی طرح اپنے اپنے گھروں میں آباد ہیں۔ مطمئن ہیں اور خوش ہیں۔ نہ وہ کسی کے دشمن ہیں اور نہ کوئی ان کا دشمن ہے جس سے انہیں ہر گھڑی جان کا خطرہ لاحق رہتا ہو۔"

"ایسی زندگی کیوں گزار رہے ہو تم آخر۔ رابعہ بہت اچھی لڑکی ہے۔"

"وہ سب لڑکیاں اچھی ہوتی ہیں جو محبت کرتی ہیں۔ خواہ نام اُن کا کچھ بھی ہو۔ لیلیٰ یا رابعہ یا نوشابہ۔ برے صرف نفرت کرنے والے ہوتے ہیں۔ رہی یہ بات کہ میں ایسی زندگی کیوں گزار رہا ہوں تو خاتون محترم' اس کا جواب کبھی اپنے خداوند مجازی سے پوچھنا۔ میں تمہیں کیا بتاؤں؟"

"تم اپنی زندگی ضائع کررہے ہو؟"

"یہ احساس تو شاید تمہیں بھی ہے' کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

وہ خاموش رہی مگر اس کی آنکھوں میں اتر آنے والے دکھ کی پرچھائیں نے اعتراف کرلیا "میں تمہاری دشمن نہیں ہوں۔ یہ بات یاد رکھنا۔"

"میں تمہاری دوستی سے بھی انکار کرتا ہوں۔ صرف اپنے لیے اور اپنے بچوں کی خوشی کے لیے جیو" میں نے کہا "خدا کرے ہم پھر کبھی نہ ملیں۔"

"قید رکھنے کے باوجود تم نے مجھ سے برا سلوک نہیں کیا۔ تم سب ہی اچھے لوگ ہو۔"

میں نے کہا "دلاور سے بات کرلو۔"

اس نے بے یقینی کے ساتھ آہستہ آہستہ ریسیور کی طرف ہاتھ بڑھایا اور پھر نمبر ملانے لگی۔

"دلاور..... میں نوشی..... ہاں..... نہیں۔ یہ میں کیسے بتا سکتی ہوں۔ مجھے معلوم ہی نہیں۔ کوئی کوٹھی ہے گلبرگ کی طرف۔ ہم رات کو ادھر آئے تھے۔ میں..... نہیں..... مجھے شاید میرے بچوں کی دعا نے بچالیا۔ وہ مجھے وہیں چھوڑ کے جارہے تھے۔ پھر پروگرام بدل گیا ورنہ تم پر ہی آتا میرے قتل کا الزام۔ خواہ مخواہ مت چلاؤ۔ میں تمہارے کئے کو بھگت رہی ہوں۔ اب خدا کے لیے کوئی ایسی حرکت نہ کرنا۔ دلاور..... ہیلو..." اس نے ریسیور رکھ کے غصے سے کہا "کمینہ....."

میں نے کہا "تمہاری بات سنے بغیر فون بند کردیا۔ بہت شوق تھا تمہیں اسے اپنی آواز سنانے کا۔ اب دو منٹ میں بچوں سے بات کرلو ورنہ....."

"ورنہ کیا....؟"

"مجھے ڈر ہے کہ دلاور تمہیں لینے کے لیے خود یہاں نہ پہنچ جائے۔"

اس نے اپنی بہن کے گھر کا نمبر ملایا۔ وہ فرداً فرداً سب بچوں کو بلاتی رہی۔ "ارے نہیں۔ رونے کی کون سی بات ہے۔ ہم کل نہیں گئے تو کیا ہوا۔ آج مری چلیں گے۔ مجبوری تھی نا کوئی اس لیے میں آ نہیں سکی۔"

باہر سے کار کا ہارن سنائی دیا۔ نقوی صاحب کا ڈرائیور ان کی گاڑی لے کر آگیا تھا۔ میں نے کہا "بس۔ ہمیں جانا ہے۔"

اس نے بچوں کو خدا حافظ کہا اور ریسیور رکھ دیا۔ اب وہ مطمئن ہی نہیں خوش تھی۔ "تھینک یو۔" اس نے ایک دم میرا منہ چوم لیا۔

"یہ کیا حرکت ہے" میں نے اپنے ہونٹ صاف کیے "چلو باہر۔"

وہ خوشی خوشی چل دی۔ میں نے چوکیدار کے کیبن کے پیچھے سے سب مشین گن اٹھائی اور نقوی صاحب کی چم چم کرتی ہوئی گاڑی میں نوشابہ کے ساتھ بیٹھ گیا۔ نقوی صاحب کے شوفر نے مجھے مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے سلام کیا۔

"یہ گاڑی کس کی ہے۔ بہت شاندار ہے۔"

"شیورلٹ بلیزر ہے" میں نے کہا "یہ سب مشین گن ایک منٹ میں راؤنڈ ختم کردیتی ہے۔ سامنے دس آدمی ہوں تو ان میں ایک ایک سوراخ ضرور ہوجاتا ہے۔ ایک ہو تو چھلنی ہوجاتا ہے۔"

اُس کا رنگ ذرا سی دیر کے لیے اڑا۔ "اسے استعمال مت کرنا۔"

"کل سے اب تک میں نے ایسی کوئی چیز استعمال کی ہے؟" میں نے کہا "مگر ہر چیز ضرورت پڑنے پر استعمال کے لیے بنائی گئی ہے۔"

وہ خاموش ہوگئی۔ شالیمار تک باقی راستہ خاموشی میں کٹ گیا۔ ابھی گیارہ بجے تھے۔ میں نے دلاور کو روانگی کے لیے بارہ بجے کا وقت جانتے بوجھتے دیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اس سے پہلے ہی طے شدہ مقام پر پہنچ کے پوزیشن سنبھال لوں۔

شالیمار کے سامنے بہت سی گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ میں کچھ فاصلے سے سب کو دیکھتا رہا۔ پھر میں نے ڈرائیور کو رخصت کردیا۔ شالیمار کے صدر دروازے اور سامنے سڑک کے دوسرے کنارے

کھڑی ہوئی گاڑیاں ایک ایک کرکے جاتی رہیں۔ ان کی جگہ دوسری گاڑیوں نے لے لی لیکن ان میں تفریح کے لیے آنے والے خاندان تھے۔

میری نگاہیں پیڈرو کو تلاش کررہی تھیں کیونکہ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کے ساتھ کون ہوگا۔ ساڑھے گیارہ بجے ایک ٹویوٹا کرولا میں مجھے پیڈرو کا چہرہ نظر آیا۔ گاڑی وہ خود چلا رہا تھا۔ اس نے نیچے اتر کے چاروں طرف دیکھا۔ میں خود بھی نیچے سرک گیا تھا اور میں نے دلاور کی بیوی کو سمجھادیا تھا کہ وہ دوپٹہ ڈال کے چہرہ دوسری طرف رکھے۔ وہ میرے کسی حکم کی خلاف ورزی کرکے بنی ہوئی بات بگاڑنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ انجان بنی انگور کے باغ کی طرف دیکھتی رہی۔ پیڈرو کا غالباً اتنی قیمتی گاڑی کی طرف دھیان ہی نہیں گیا۔

حسب ہدایت اس نے سب دروازے کھولے۔ اس کے ساتھ بیٹھا ہوا شخص میرے لیے اجنبی تھا لیکن وہ مجھے ملٹری کا کمانڈو ٹائپ آدمی لگا۔ خاموش' پُرسکون اور بے ضرر نظر آنے والا آدمی جو کسی طرح بھی نمایاں نہ ہو۔ پیڈرو نے ڈکی بھی کھولی اور اندر جھک کے کچھ تلاش کرتا رہا۔ میں نے سر تھوڑا سا اٹھا کے دیکھ لیا کہ ڈکی خالی ہے۔ اسی وقت وقار یوسف کی گاڑی درمیان سے گزر گئی۔ وہ لوگ لیٹ ہوگئے تھے۔ پروگرام کے مطابق ان کو ساڑھے گیارہ بجے طے شدہ مقام پر پہنچ کے پوزیشن لینی تھی۔

پیڈرو کا سر ڈکی میں نہ ہوتا تو وہ وقار یوسف کی گاڑی کو دیکھ لیتا اور پہچان بھی جاتا۔ جب اس نے ڈکی بند کی تو گاڑی بہت دور جاچکی تھی۔ میں بڑے غور سے پیڈرو کی صورت کا مشاہدہ کررہا تھا۔ اس پر ناگواری کے آثار نہیں تھے۔ وہ خوف زدہ بھی نہیں تھا اور یہ بات شک پیدا کرنے والی تھی۔ اگر اسے معلوم ہوتا کہ ایک بارٹر ڈیل یعنی مال کے بدلے مال والے سودے میں اس کا تبادلہ نوشابہ سے کیا جانا ہے تو وہ ادھر آنا ہی کیوں قبول کرتا۔ دلاور نے ضرور اسے کوئی جھوٹ بول کے بھیجا تھا۔

جب کرولا وہاں سے روانہ ہوگئی تو میں نے دلاور کی بیوی سے کہا "گاڑی اب تم چلاؤگی۔"

اس نے سرہلایا اور آگے ڈرائیور کی جگہ آبیٹھی "یہ سب بے حد پُراسرار اور فلمی لگتا ہے۔"

"فرق صرف یہ ہے کہ میں اور تم ہیرو' ہیروئن نہیں ہیں۔"

"تم تو ہیرو ہو۔ بس میں ہیروئن نہیں رہی۔" اس نے حسرت سے کہا۔

"ہم وقت کی شاہراہ پر تھوڑا سا آگے پیچھے چل رہے ہیں۔ بیس سال پہلے تم میرے جیسے ہزاروں کے خوابوں کی شہزادی رہی ہوگی۔"

"میرا دل کہتا ہے کہ میں پھر ملوں گی تم سے۔ ایسے نہیں' جب رات بھی مہربان ہوگا اور ماحول بھی۔"

"دل بڑے خواب دکھاتا ہے۔ دھوکے باز۔"

"مجھے تم بے شرم کہہ سکتے ہو مگر یہ سچ ہے' تم اچھے لگے تھے مجھے' اچھا ہوتا اگر تم مجھے اغوا کرکے کسی ویرانے میں لے جاتے۔ جہاں میرے تمہارے سوا کوئی نہ ہوتا۔ میں نے تو رات کو بھی کوشش کی تھی کہ اٹھ کر آجاؤں لیکن وہ لڑکی نازو بہت چالاک ہے۔ اس نے اپنی اور میری ایک کلائی باندھ رکھی تھی۔"

میں نے اس کی کسی بات کا جواب دینا فضول سمجھا۔ میرا ذہن زیادہ سنگین معاملات میں الجھا ہوا تھا۔ ویران سڑک پر سے اب اِکا دُکا گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ کرولا مجھے آدھے میل کے فاصلے سے نظر آگئی۔ میں نے نوشابہ سے کہا کہ گاڑی کی رفتار کم کرے اور میری ہدایات سنتی رہے۔ میں خود پیچھے والی سیٹ کے سامنے کی خالی جگہ میں فٹ ہوگیا جو پاؤں رکھنے کے لیے ہوتی ہے۔ یہ کوئی آرام دہ پوزیشن نہیں تھی۔ میری کمر اس کوہان جیسے ابھار پر تھی جو درمیان میں ہوتا ہے اور جس کے نیچے کراس والی شافٹ ہوتی ہے جو پیچھے تک جاتی ہے۔

میرے اندازے کے مطابق وہ جگہ ابھی دور تھی جہاں سے ہمیں بائیں جانب مڑنا تھا۔ اچانک گاڑی کی رفتار کم ہوگئی۔

میں نے کہا "کیا بات ہے؟"

"کوئی سڑک کے بیچ میں کھڑا ہے۔ رکنے کا اشارہ کررہا ہے۔"

میں نے سائلنسر والا پستول اس کی گدی پر رکھ دیا "کون ہے؟"

"یہ..... غالب..... غالب ہی ہے" نوشابہ دہشت زدہ ہوکے بولی۔

میں نے سر اٹھاکے دیکھا تو مجھے غالب نظر آیا "ٹھیک ہے۔ گاڑی روک لو۔"

غالب نے کھڑکی کے پاس آکے کہا "استاد پیڈرو بڑی تیزی سے گزرا ہے ابھی ابھی۔"

"میں نے دیکھا تھا اسے۔ اس کے ساتھ ایک اجنبی تھا" میں اٹھ کے بیٹھ گیا۔ "وہ مجھے کوئی پولیس مین یا کمانڈو لگا تھا۔"

"مزید یہ کہ وہ گاڑی رکے بغیر نکل گئی۔ یہاں سے آدھا میل دور وہ کچا راستہ ہے جس پر اسے بائیں طرف گھوم جانا چاہیے تھا۔"

"مطلب یہ کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔" میں نے باہر آکے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ پیڈرو بھاگ گیا۔"

"کہاں بھاگ گیا؟" میں نے کہا۔

"اوہ۔ یہ تو میں نے اس سے پوچھا ہی نہیں" غالب بولا. "روک کے پوچھ لیتا تو اچھا تھا۔"

"میرا مطلب تھا کہ کہیں اس میں بھی کوئی چکر نہ ہو" میں نے شرمندہ ہوئے بغیر کہا "وہ آگے کسی جگہ سے لوٹ کے بھی تو آسکتا ہے؟"

غالب نے نفی میں سرہلایا "چکر اس نے دلاور کو دے دیا۔ پیڈرو کو معلوم ہوچکا تھا کہ دلاور نے اس کا سودا کرلیا ہے، اپنی بیوی کے بدلے۔ وہ احتجاج کرتا یا ہنگامہ تو دلاور اسے پیک کرکے ارسال کردیتا۔ دلاور نے اس سے ہرگز یہ نہیں کہا ہوگا کہ فلاں جگہ جاؤ۔ وہاں تمہیں اپنے سکندر اعظم صاحب ملیں گے۔ تم ان کی خدمت میں حاضر ہوکے عرض کرنا کہ فدوی گرفتاری کے لیے حاضر ہے۔ اب آپ چوہدری صاحب کی اہلیہ محترمہ کو رہا کردیں۔ نہیں.... دلاور نے اسے کوئی جھانسا دے کر بھیجا ہوگا مگر حقیقت پیڈرو کو معلوم تھی۔ اس نے دلاور کے سامنے کسی شک کا اظہار نہیں کیا اور ہمیشہ کی طرح "یس باس" کہہ کے روانہ ہوگیا۔ جہاں تک ممکن تھا اس نے دلاور کے حکم کی تعمیل کی۔ اس کے بعد جیسے ہی خطرے کی سرحد پار کی وہ اپنی جان بچاکے بھاگ گیا۔ اس کی طرف سے دلاور کی بیوی اور دلاور دونوں جائیں جہنم میں۔ وفاداری کا مطلب یہ نہیں کہ وہ رضاکارانہ طور پر قربانی پیش کردے۔"

میں قائل ہوگیا "شاید ایسا ہی ہوا۔"

غالب نے کہا "اس کی تصدیق بھی ہوجائے گی۔"

"وہ کیسے؟"

"جائے واردات پر" غالب نے کہا "آگے ہم چلتے ہیں۔ تم پیچھے پیچھے آجاؤ۔"

"ایسے ایک ساتھ۔"

"فکر مت کرو۔ خطرہ ہوا تو پتا چل جائے گا" وہ بولا۔

"تقریباً پچاس گز کے فاصلے سے دونوں گاڑیاں آگے پیچھے ایک ایسے راستے پر روانہ ہوئیں جو سڑک بھی نہیں تھی اور کچا راستہ بھی نہیں تھا۔ شاید کسی ترقیاتی منصوبے میں اس راستے کو پکی تارکول والی سڑک کا درجہ دینا شامل تھا پھر یا تو منصوبہ ادھورا رہ گیا۔ ٹھیکے دار بھاگ گیا یا اس نے صرف روڑی بچھا دینا کافی سمجھا۔ ادھر کون افسر یا وزیر یہ دیکھنے آئے گا کہ کام ادھورا ہوا یا پورا؟

دائیں بائیں کھیت تھے اور اینٹوں کے بھٹے جن کی لمبی مینار جیسی چمنیاں دھواں اگل رہی تھیں۔ کچے پکے مکانات دور دور بنے ہوئے تھے اور ایک چھوٹی سی مسجد کا اجلا سفید رنگ مٹی کے رنگ سے جدا نظر آرہا تھا۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق میں نے گاڑی مسجد کے عقبی حصے میں روک دی جہاں محراب کا حصہ دیوار سے باہر نکلا ہوا نظر آتا تھا۔ غالب کی گاڑی سیدھی چلتی ہوئی گاؤں کی آخری حد تک پہنچ گئی اور پھر نظر سے غائب ہوگئی۔

دلاور کی بیوی میرے اور غالب کے خفیہ مذاکرات سے تشویش کا شکار تھی "یہاں کیوں لائے ہو مجھے؟"

"ارادہ تو یہی تھا کہ تمہیں معذرت کے ساتھ واپس کردیا جائے لیکن ایسا لگتا ہے کہ تمہارے شوہر کو تمہاری زیادہ ضرورت نہیں رہی۔ وہ کچھ معاہدے کی خلاف ورزی کررہا ہے۔"

نوشابہ کا چہرہ تاریک ہوگیا "یہ غلط ہے۔"

"خدا کرے کہ غلط ہو۔ میری دعا بھی یہی ہے" میں نے ہمدردی سے کہا "مگر بات یہ ہے خاتون کہ کسی کے دعا کرنے سے نہ سیاہ کبھی سفید ہوسکتا ہے اور نہ گدھے کے سر پر سینگ آسکتے ہیں۔ آؤ، کچھ دیر آرام کرلو۔"

وہ بادل ناخواستہ نیچے اتری۔ ہم خالی مسجد کے صحن میں جاکے بیٹھ گئے۔ یہ بڑی پُرسکون جگہ تھی۔ مسجد کے دو مینار صحن کے آخر میں تھے اور بہت زیادہ بلند نہیں تھے۔ میں نے ایک مینار پر غازی کو دیکھا جو مجھے دیکھ کے ہاتھ ہلا رہا تھا۔ میں نے مسکرا کے جواب میں ہاتھ ہلایا۔ غازی کے ہاتھ میں دوربین تھی اور سفید جھنڈی تھی۔ دوربین سے وہ اردگرد کے علاقے پر نظر رکھ سکتا تھا۔ خطرے کی صورت میں وہ سفید جھنڈی لہرا دیتا اور ہم دور ہی سے واپس لوٹ جاتے۔

"ہم کب تک یہاں چھپے رہیں گے؟" نوشابہ نے بے چینی سے کہا۔

میں نے کہا "جب تک کوئی تمہیں لینے کے لیے نہ آجائے۔ جس کو آنا تھا وہ تو ابھی تک نہیں پہنچا۔"

"تم پیڈرو کی بات کررہے ہو؟"

"ہاں۔ تمہیں معلوم ہے؟"

"اگر وہ نہ آیا تو.... کیا تم مجھے واپس لے جاؤ گے؟"

"مجبوری میں اور کیا ہوسکتا ہے۔ دلاور بہت غلط سوچ رہا ہے، اس کو خوش فہمی ہے کہ چالاکی سے سانپ بھی مرجائے گا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی مگر اسے سمجھنا چاہیے کہ لاٹھی ہر جگہ نہیں چلتی۔ جو لاٹھی چارج کرتے ہیں، لاٹھی سے بھینس ہانک کرلے جاتے ہیں اور لاٹھی کو طاقت کی علامت سمجھتے ہیں، ایک وقت آتا ہے کہ ان کے ہاتھوں میں دم نہیں رہتا اور ٹانگوں میں سکت نہیں رہتی تو وہ لاٹھی کو سہارے کے لیے استعمال کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ لاٹھی ان کے کمزور ہونے کی علامت بن جاتی ہے۔"

"مجھے فلسفہ مت پڑھاؤ۔ میں واپس جانا چاہتی ہوں" نوشابہ نے برہمی سے کہا۔

"کیا کروگی واپس جاکے؟" میں نے پھر سنجیدہ لہجے میں کہا "نہ شوہر تمہارا ہے۔ نہ تم شوہر کی ہو۔ اس غلط فہمی کو دل سے نکال دو کہ دلاور کو تمہاری مصروفیات اور تمہارے شب و روز کے بارے میں علم نہیں ہوگا۔ وہ بہت باخبر آدمی ہے۔ بس تھوڑا سا بے غیرت ہے۔ وہ بھی موقعے کا منتظر ہوگا جب کسی پریشانی کے بغیر وہ تم سے نجات حاصل کرسکے۔ اس کی یہ پریشانی ہم نے دور کردی ہے۔ اب وہ بچوں سے کہہ سکتا ہے کہ بھئی تمہاری ماں کو وہ حرام زدہ سکندر بخت اٹھاکے لے گیا ہے اور کسی قیمت پر واپس کرنے کو تیار نہیں۔ میں کوشش کررہا ہوں کہ وہ خیریت سے لوٹ آئے مگر سکندر بہت کمینہ دشمن ہے۔ وہ بچوں کو تسلی دیتا رہے گا اور ان کے نفرت کے جذبات کا رخ میری طرف موڑدے گا۔"

نوشابہ کا چہرہ زرد پڑگیا۔ "تمہارا مطلب ہے.... کہ وہ مجھے واپس لے جانے کی کوشش بھی نہیں کرے گا؟"

"حقیقت بڑی بے رحم ہوتی ہے خاتون۔ عورت دلاور کے لیے کوئی مسئلہ نہیں۔ مجبوری میں اس نے تمہارے ساتھ چوبیس سال گزار دیے۔ وہ خود تمہیں چھوڑتا تو اولاد اس سے بدظن ہوجاتی۔ اب الزام اس پر نہیں آئے گا۔ بچے کتنے دن روئیں گے کتنے دن یاد کریں گے تمہیں۔ دلاور اگر ان سے کہتا کہ تمہاری ماں بدکردار تھی تو وہ دلاور کے دشمن ہوجاتے۔ اب وہ میرے دشمن ہوجائیں گے۔ غور کرو وہ کتنا دور اندیش شکاری ہے۔ اس نے تم سے بھی نجات حاصل کرلی۔ خود برا بنے بغیر۔ بچوں کی ہمدردیاں بھی بالآخر باپ کے ساتھ ہوجائیں گی اور چوہدری دلاور کی اگلی نسل بھی میری دشمن ہوگی۔ میں ایسا سمجھنے پر مجبور ہوں۔"

"ابھی تک.... میں تعاون کررہی ہوں تم سے لیکن تم ہمیشہ مجھے قید میں نہیں رکھ سکتے۔"

"مجھے بھی یہی پریشانی ہے" میں نے کہا "تم ہمارے کسی کام کی نہیں اگر دلاور نے فیصلہ کرلیا کہ نوشابہ جائے جہنم میں۔ تو پھر ہم نہیں رکھ کے کیا کریں گے۔ تمہیں چھوڑنا ہی پڑے گا۔"

نوشابہ کا اُڑا ہوا رنگ بحال ہوگیا "تم مجھے قتل نہیں کروگے؟"

میں نے افسوس سے سرہلایا "ہم بلاوجہ قتل نہیں کرتے۔ ہم نہ پیشہ ور قاتل ہیں نہ قتل کے نفسیاتی جنون میں مبتلا۔ سب کچھ دلاور کے رویے پر منحصر ہے۔ اگر وہ تمہارا نقصان برداشت کرنے کے لیے تیار ہوجاتا ہے تو گھاٹے میں ہم رہیں گے کہ بے مصرف چیز اٹھالائے۔"

اوپر سے غازی نے چلّا کے کہا "سکندر!" میں نے سر اوپر اٹھایا۔ "ایک گاڑی ادھر آرہی ہے۔"

"مسجد کی طرف؟"

"نہیں۔ اسی راستے پر" غازی نے دوربین سے دیکھا۔ "سبز رنگ کی ڈاٹسن۔"

"یہ.... یہ تو میری گاڑی ہے" نوشابہ کھڑی ہوگئی۔

میں نے اسے ہاتھ پکڑ کے پھر بٹھالیا۔ "مبارک ہو۔"

اس نے ملامت سے میری طرف دیکھا "تم بکواس کررہے تھے۔ جو کچھ تم نے سوچا تھا سب غلط تھا۔ دلاور کو پروا ہے میری۔"

میں نے اعتراف کیا "اندازے غلط بھی ہوجاتے ہیں۔ اصل مقصد تو دلاور کو خبردار کرنا تھا کہ وہ باہر کے معاملات طے کرنے کے لیے گھر کے رشتوں کا احترام نہ چھوڑے۔ اگر یہ بات دلاور سمجھ گیا ہے تو بہت اچھی بات ہے۔"

"آخر میں بیوی ہوں اس کی" نوشابہ کے لہجے میں اعتماد آگیا۔

"بیوی تو دوسری بھی ہے اس کے پاس۔" میں نے طنز سے کہا۔ "اور شرع کا سہارا لے کر وہ مزید دو سے نکاح پڑھوا سکتا ہے۔ رہی انصاف کی شرط تو تمہیں بھی خوب معلوم ہے کہ وہ کتنا منصف مزاج ہے۔ واپس جانے کے بعد اسے دو باتیں سمجھا دینا۔ ایک یہ کہ سکندر کمینہ دشمن نہیں ہے بشرطیکہ اس کے ساتھ کوئی کمینگی میں پہل نہ کرے۔ ورنہ وہ کمینہ بن کے بھی دکھا سکتا ہے۔ اس نے تمہارے ساتھ عزت اور شرافت کا برتاؤ کیا تھا۔ دوسری بات یہ کہ اس نے تمہیں منصوبہ بناکے اغوا نہیں کیا تھا۔ تم نے سکندر کا راستہ روکا تھا اور اس وقت سکندر مجبور ہوگیا تھا لیکن اگلی مرتبہ وہ جوابی کارروائی کرسکتا ہے۔ اور یہ ہوسکتا ہے کہ دلاور کی بیوی کو نہ لے جائے، کسی بچے کو لے جائے۔"

"تم ایسا نہیں کروگے۔ مجھے معلوم ہے۔"

"میں ایسا نہیں کرسکتا نوشابہ مگر کیا حرج ہے اگر تم دلاور کو میری طرف سے یہ دھمکی پہنچادو۔ وہ ذرا محتاط رہے گا۔ اس میں فائدہ تمہارا بھی ہے۔ میرے رشتے محفوظ رہیں گے تو تمہارے گھر کی سلامتی کو بھی خطرہ نہیں ہوگا۔ سچ کا برامت ماننا۔ بیوی کے مقابلے میں ہمیشہ بچوں سے زیادہ محبت ہوتی ہے۔ باپ کو بھی ماں کو بھی شوہر سے زیادہ اولاد پیاری ہوتی ہے۔"

غازی لنگڑاتا ہوا نیچے اتر آیا تھا۔ وہ عجیب آدمی تھا۔ پلاسٹر چڑھی ہوئی ٹانگ اور ایک بیساکھی کے سہارے مینار پر چڑھ گیا تھا۔

"وہ گاڑی دور ہی رک گئی ہے۔"

"کون ہے اس گاڑی میں؟" میں نے کہا۔

"ایک تو ڈرائیور ہے۔ وردی سے اور کیپ سے یہی لگتا ہے۔ دوسرا کوئی لڑکا ہے" غازی نے کہا "میں دیکھتا ہوں۔"

میں نے کہا "غالب کی گاڑی کہاں غائب ہوگئی؟"

"وہ پیچھے سے گھوم کے آرہی ہے۔ مجھے ایک جھلک نظر تو آئی تھی پھر پتا نہیں کہاں چلی گئی؟"

"تم بے وقوفی کی حد تک بہادر ہو۔ تم نے تو بہت بڑا خطرہ مول لیا تھا۔" نوشابہ نے کہا "فرض کرو، پولیس محاصرہ کرلیتی؟"

میں نے مسکرا کے کہا "ہم کئی بار محصور ہوئے اور پتا نہیں کتنی بار محاصرہ توڑ کے نکل گئے۔ جب تک قسمت ساتھ ہے میں ایسے خطرات سے محفوظ ہوں۔"

وہ بہت بے قرار تھی "گاڑی مجھے لے جانے کے لیے آئی ہوگی۔"

میں نے کہا "گاڑی یہ بھی بری تو نہیں تھی اور گاڑی نہ ہوتی خاتون تو کیا آپ گھر نہ جاتیں اگر میں اجازت دے دوں تو آپ اسی وقت پیدل بھی روانہ ہوجائیں گی۔"

مسجد کے سامنے غالب کی گاڑی آکے رکی تو میں دروازے کی طرف گیا۔ غالب کی نگاہ بھی سبز ڈاٹسن کار پر تھی جس میں سے ایک لڑکا اتر کے مسجد کی طرف آرہا تھا۔

"یہ.... یہ تو فیصل ہے" نوشابہ نے چیخ ماری۔

میں نے اسے روک لیا "کون فیصل؟"

"میرا بیٹا..... فیصل..... فیصل..." وہ دیوانہ وار چلّانے لگی۔

میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ مسجد گاؤں کے باہر تھی اور اس میں شہر کی مسجدوں کی طرح پیش امام کی قیام گاہ نہیں تھی ورنہ صورتِ حال سنگین ہو جاتی۔ "شور مت کرو۔ ہم اسے کچھ نہیں کہیں گے۔"

نوشابہ تڑپی بھی مگر خود کو میری گرفت سے آزاد نہ کرا سکی۔ غالب نے حیرانی سے کہا "یہ تو اکیلا ہے۔ یہ بچہ کس لیے آیا ہے آخر یہاں؟..... اکیلا...؟"

میں نے کہا "اور ڈرائیور گاڑی میں بیٹھا ہوا ہے۔"

"اس کا اعتماد تو دیکھو۔ کوئی ڈر نہیں اسے" غالب بولا۔

نوشابہ نے مزاحمت ختم کر دی تو میں نے اسے چھوڑ دیا "تمہارا بیٹا آیا ہے تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کے لیے۔ یہ نام کا دلاور نہیں سچ مچ بہادر ہے۔"

حیرت اور فخر و مسرت کے جذبات نے دلاور کی بیوی کو اتنا مغلوب کر لیا تھا کہ وہ کانپ رہی تھی اور آنسو خود بخود اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے تھے۔ "دیکھو اس کو کچھ مت کہنا۔ یہ بچہ ہے، کتنا بھی بہادر کیوں نہ ہو۔"

میں نے کہا "تمہارا کیا خیال ہے کہ ہم اس بچے کو بھی پکڑ لیں گے۔ نہیں مسز دلاور، تمہارا شوہر کمینہ اور بزدل ہے۔ بیٹا نہیں، وہ خود آیا ہے تو تمہیں اپنے ساتھ لے کر ہی جائے گا۔"

فیصل نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا رکھے تھے۔ وہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ اس کے پاس کوئی اسلحہ نہیں اور اس نے پہلے ہی خود کو ہمارے حوالے کر دیا ہے۔ وہ اپنی عمر کی مناسبت سے صحت مند اور ہینڈسم تھا کیونکہ اس کی صورت ماں پر گئی تھی۔ اس نے بیساکھی پر چلنے والے غازی سے ہاتھ ملا کے کچھ کہا پھر وہ دونوں ایک ساتھ قدم بڑھانے لگے۔ میں اور غالب اس منظر کو حیرانی سے دیکھتے رہے۔ گہرے سلیٹی رنگ کی قمیص اور سفید پتلون پہنے وہ لڑکا کوشش کر رہا تھا کہ اپنے خوف اور پریشانی کا اظہار نہ ہونے دے۔ اس کی ذمّے دارانہ متانت کا مظاہرہ یقیناً قابلِ تعریف تھا۔

اس نے سوالیہ نظروں سے ہماری طرف دیکھا پھر اس کی نگاہ مجھ پر ٹھہر گئی "آپ ہیں سکندر اعظم؟"

میں نے مسکرا کے کہا "سکندر بخت میرا اصل نام ہے۔ تمہارے ابا کچھ بھی کہیں۔"

اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا "میں فیصل ہوں۔ چوہدری دلاور کا بیٹا۔"

میں نے کہا "مجھے معلوم ہے۔ یہ میرے دوست مرزا غالب ہیں..... صحافی۔"

اس نے غالب سے بھی ہاتھ ملایا "میں اپنی امی کو لینے آیا ہوں۔ آپ نے انہیں اغوا کر کے قید کر رکھا ہے۔"

میں نے راستہ چھوڑتے ہوئے کہا "تم اندر جا کے اپنی امی سے مل سکتے ہو۔ تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ یہ الزام غلط ہے۔"

وہ اندر گیا تو نوشابہ نے چلّا کے کہا "فیصل..." اور اسے سینے سے لگا کے رونے لگی "تم یہاں کیوں آ گئے فیصل؟"

اس نے پُرسکون لہجے میں کہا "روئیں مت امی۔ میں آپ کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ آپ ٹھیک تو ہیں نا؟"

"ہاں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں فیصل لیکن تمہیں آنا نہیں چاہیے تھا یہاں..... تمہارا باپ کیوں نہیں آیا آخر...؟"

"چھوڑیں امی۔ چلیں میرے ساتھ..."

میں نے کہا "ایک منٹ بیٹا۔ جانے سے پہلے تمہیں یہ ضرور بتانا پڑے گا کہ آخر چوہدری صاحب نے تمہیں کیوں بھیجا؟"

وہ کچھ دیر سوچتا رہا "مجھے کسی نے نہیں بھیجا۔ خود آیا ہوں میں۔"

میں نے مسکرا کے کہا "آئے تو خود ہو۔ تمہارے ساتھ کون آیا ہے؟"

"کوئی نہیں، بس ایک ڈرائیور ہے۔ میں ابھی چھوٹا ہوں۔ گاڑی نہیں چلا سکتا" وہ بولا "لیکن اس کے پاس بھی کچھ نہیں ہے۔"

"کیا نہیں ہے؟" غالب نے کہا۔

"ریوالور یا پستول۔ آپ تلاشی لے سکتے ہیں گاڑی کی۔"

میں نے کہا "میں تم پر اعتبار کرتا ہوں لیکن تم یہاں تک کیسے پہنچے؟"

"ڈرائیور لے کر آیا ہے..."

مگر ڈرائیور کو یہ پتا کس نے بتایا؟" میں نے کہا۔

"ڈیڈی نے۔ چوہدری صاحب نے۔"

چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد میں نے کہا "مگر ہماری اُن سے کچھ اور بات ہوئی تھی..... یہاں تم کو نہیں آنا تھا۔"

"ہاں۔ استاد پیڈرو سے کہا تھا انہوں نے۔"

میں نے عیّاری سے کہا "اچھا۔ کیا کہا تھا؟"

"کہا تھا کہ گاڑی لے جاؤ اور یہ تین لاکھ روپے کی رقم کسی کو دینی ہے۔ انہوں نے پیڈرو کو ایک کاغذ دیا تھا جس پر تین لاکھ لینے والے کا نام اور پتا لکھا ہوا تھا۔ میں نے ان کی باتیں سن لی تھیں۔"

میں نے کہا "لیکن پیڈرو تو یہاں نہیں آیا۔"

"اور ہم نے تو تین لاکھ نہیں مانگے تھے" غالب نے کہا۔

"جب پیڈرو باہر نکلا تو....." وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"بولو۔ رک کیوں گئے...؟"

"میرے ڈیڈی نے پیڈرو کو دھوکا دیا تھا۔ دھوکے سے یہاں بھیجا تھا۔ اگر وہ یہاں آ جاتا تو آپ اسے پکڑ لیتے اور امی کو چھوڑ دیتے۔"

میں نے کہا "اگر وہ نہ آتا تب بھی ہم تمہاری امی کو چھوڑ دیتے۔ تم ان سے پوچھ سکتے ہو۔ ہم نے ان کو بہت آرام سے رکھا تھا۔"

اُس نے ماں کی طرف دیکھا اور پھر جیسے مجبوراً میری بات پر یقین کر لیا "پیڈرو کو معلوم ہو گیا تھا کہ اس کے ساتھ دھوکا ہو گا۔ جب وہ باہر نکلا تو بہت غصے میں تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا۔ پیڈرو میرے ڈیڈی کو گالیاں بک رہا تھا کہ چوہدری کیا مجھے بے وقوف سمجھتا ہے۔ کیا میں قربانی کا بکرا ہوں۔ اسے اتنی فکر ہے بیوی کی تو خود جائے۔ اس کا ساتھی پیڈرو سے کہہ رہا تھا کہ آہستہ بولو۔ کوئی سن نہ لے۔ میں وہیں باغ میں تھا اور سب سن چکا تھا۔ میں نے کہا "انکل پیڈرو۔ مجھے بھی ساتھ لے چلیں" اس نے مجھے گھور کے کہا "تم کہاں جاؤ گے میرے ساتھ؟" میں نے کہا "امی کو لینے۔ مجھے سب معلوم ہے۔" وہ بڑا پریشان ہوا۔ کہنے لگا "ماں کو بھول جاؤ بیٹا۔ تمہارا باپ نئی ماں لا دے گا تمہیں۔" اس کے جانے کے بعد میں نے سوچا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ پیڈرو کی باتوں سے اندازہ ہو گیا تھا کہ جیسے ڈیڈی نے اسے دھوکا دیا ایسے ہی وہ ڈیڈی کو دھوکا دے رہا ہے۔ جانتے بوجھتے کسی اور کے لیے اپنی جان کون خطرے میں ڈالتا ہے؟ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا کہ ڈیڈی خود جائیں۔"

میں نے کہا "تمہارا اندازہ بالکل ٹھیک تھا۔ وہ بھاگ گیا۔"

"تین لاکھ بھی لے گیا تمہارے ڈیڈی کے۔" غالب نے کہا۔

"جب میں اندر گیا تو ڈیڈی کسی سے فون پر بات کر رہے تھے۔ میں نے ان سے بات کرنے کی کوشش کی تو انہوں نے مجھے اشارے سے بھگا دیا۔ میں نے ساتھ والے کمرے سے ان کی باتیں سنیں۔ وہ کسی کو بتا رہے تھے کہ ان حالات میں پیڈرو کو قربان کرنے کے سوا چارہ نہ تھا۔ بس یہ سن کے میں پھر ڈیڈی کے پاس گیا اور میں نے چیخ کے کہا "ڈیڈی۔ میری بات سننی پڑے گی آپ کو۔ آپ نے پیڈرو کے لیے گڑھا کھودا تھا۔ آپ خود گر گئے ہیں اس میں" انہوں نے فون رکھ دیا اور مجھے گھورنے لگے۔ "یہ کیا بکواس کر رہے ہو تم فیصل" انہوں نے کہا۔ میں نے کہا "آپ کیا سمجھتے ہیں میں بچہ ہوں۔ میں بچہ نہیں ہوں۔ مجھے سب معلوم ہو چکا ہے۔ سب سن لیا ہے میں نے۔ آپ کی وجہ سے میری امی کو اغوا کیا گیا اور اب ان کی جان خطرے میں ہے مگر آپ کو پروا نہیں" انہوں نے مجھے بہت مارا اور مجھے بہت گالیاں دیں "بول کیا جانتا ہے تو۔ بتا مجھے کتنا بڑا ہو گیا ہے تو۔ کیا میرا باپ بن گیا ہے تو؟" میں مار کھاتا رہا اور انہیں بتاتا رہا کہ اگر میری امی کو کچھ ہوا تو میں ان کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" اس پر انہیں زیادہ غصہ آیا۔ انہوں نے....."

وہ ایک بار پھر خاموش ہو گیا تھا۔ اس کے چہرے پر متانت کے باوجود کم عمری کی معصومیّت تھی۔ غصے میں اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور لگتا تھا کہ وہ اچانک رو پڑے گا۔

نوشابہ نے کہا "چل دفع کر فیصل۔ اچھا ہوا تو آ گیا۔"

میں نے کہا "مسز دلاور۔ میں آپ کو یا آپ کے بہادر بیٹے کو روکوں گا نہیں لیکن یہ جاننا میرے لیے بے حد ضروری ہے کہ فیصل کو اس جگہ کا علم کیسے ہوا۔ اپنی حفاظت بھی کرنی ہے مجھے۔"

فیصل پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا "ڈیڈی نے..... ڈیڈی نے امّی کو گالیاں دیں..... بہت... بہت برا کہا..... کہا..... تیری ماں..... تیری ماں..."

میں سمجھ گیا کہ دلاور نے کیا کہا ہو گا۔ بیٹے میں اخلاقی جرأت نہ تھی کہ ماں کے سامنے وہ فحش الفاظ دہرا سکتا جو اس کے خیال میں ماں کے مقدس نام پر بدترین تہمت تھے مگر بے بنیاد نہ تھے۔ دلاور نے اپنی بیوی کو فاحشہ بدچلن اور طوائف کہا ہو گا لیکن کسی بیٹے کے سامنے اس کی ماں کے کردار کو ہدف بنانا بارود کو چنگاری دکھانے سے کم خطرناک نہیں ہوتا۔

فیصل نے بھی روتے اور سسکیاں لیتے ہوئے بتایا "جب ڈیڈی نے امی کو گالیاں دیں۔ تو میرا دماغ الٹ گیا۔ میں نے دوڑ کے وہ ریوالور اٹھا لیا جو ڈیڈی اپنے پاس رکھتے تھے۔ ریوالور وہیں موجود تھا۔ سوچے سمجھے بغیر میں نے گولی چلا دی۔ میں اندھا اور پاگل ہو گیا تھا۔"

نوشابہ نے چیخ ماری "تُو نے..... گولی مار دی..... اپنے باپ کو..." وہ فیصل کو دیوانہ وار جھنجوڑنے لگی۔

وہ بالکل پُرسکون رہا۔ "میں کیا کرتا امّی..."

"یہ مجھ سے پوچھتا ہے کمینے..... باپ کو قتل کر دیا۔ ماں کو بیوہ کر دیا تُو نے" وہ اس کو دونوں ہاتھوں سے مارنے لگی۔

"آپ نے غلط سمجھا امّی" اس نے ماں کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے "یہ کب کہا میں نے۔ ڈیڈی کو کچھ نہیں ہوا ہے۔"

"کیا؟..... وہ... وہ ٹھیک ہے" بین کرتی ہوئی نوشابہ کو جیسے جھٹکا سا لگا "مگر... تُو نے گولی چلائی تھی۔"

"ہاں۔ میں مجبور ہو گیا تھا لیکن میں نے ان کا نشانہ لے کر فائر نہیں کیا تھا۔ آپ جانتی ہیں امّی میرا نشانہ کیسا ہے؟"

"شرم نہیں آتی تجھے۔ بے غیرت، یہ حسرت بھی پوری کر لینا اگلی بار۔ تُو اب بڑا ہو گیا ہے نا۔ قد میں باپ کے برابر آ گیا ہے۔ رشتے کا لحاظ ختم کر دیا تُو نے۔ ایک بار ہاتھ اٹھ گیا۔ اب تجھے روکنے والا کون ہے؟" وہ آنسو پونچھ کے بولی "کیا وہ زخمی ہیں؟"

"انہیں خراش بھی نہ آتی مگر انہوں نے فٹ بال کی طرح میرے ہاتھ پر کِک مارنے کی کوشش کی تھی۔ اب وہ پہلے جیسے پھرتیلے تو نہیں ہیں نا۔ اس میں میری کوئی غلطی نہیں تھی کہ گولی ان کی ٹانگ میں لگ گئی۔ چلیں، میں ان سے معافی مانگ لوں گا۔ وہ معاف کر دیں گے مجھے۔"

نوشابہ نے ایک ٹھنڈی سانس لی "معاف نہیں کرے گا تو باپ اور کیا کرے گا؟ سامنے اولاد کی جوانی کا زور ہو تو آدمی مجبور ہو جاتا ہے خود کو بوڑھا ماننے پر۔ کوئی اور ہوتا تیری جگہ تو دلاور تیرے جیسے چار کو بھی اٹھنے نہ دیتا۔"

میں عورت کی فطرت کے روپ بہروپ دیکھ کے حیران تھا جو گرگٹ کی طرح اپنے رنگ بدل رہی تھی۔ پہلا رنگ ایک عام وفاپرست مشرقی بیوی کا تھا جس نے شوہر کے ساتھ چوبیس سال

گزار دیے تھے۔ ہماری تہذیب اور معاشرت میں وفا کا یہ رنگ غالب رہتا ہے۔ لڑکیاں مزاج اور طبیعت کے اعتبار سے اتنی صابر وشاکر اور قناعت پسند ثابت ہوتی ہیں کہ ہر قسم کے شوہر کو مجازی خدا کا درجہ دے کر خوش رہتی ہیں خواہ اس رتبے پر فائز ہونے والا مجموعۂ نقائص ہو اور تمام شرعی عیب رکھتا ہو۔ یہ ہمارے گھروں کی تربیت کا اثر ہے جو عقیدے کی طرح ان کے لہو میں رچ بس جاتا ہے۔

نوشابہ کے کیس میں شوہر سے وفاپرستی کا ملمع بہت جلد اُتر گیا تھا اور اس نے غیر معمولی جرأت یا بے حیائی کے ساتھ تسلیم کرلیا تھا کہ وہ شوہر کے اعتماد کو دھوکا دیتی رہی ہے اور جس حُسن پر اسے ناز تھا اسے پرستش نہیں ملی تو اس نے پرستار تلاش کرلیے تھے۔ بیٹے کو دیکھتے ہی وہ ماں بن گئی تھی اور ایک قلابازی کھا کے اس نے روایتی بیوی کا کردار اپنالیا تھا جس کے لیے شوہر سے گراں قدر کوئی چیز نہ ہو۔

معلوم نہیں وہ دھوکا کسے دے رہی تھی۔ مجھے، اپنے بیٹے کو یا خود کو۔ تریا چلتر کی اصطلاح کے پیچھے شاید عورت کی سرشت کا سیکڑوں صدیوں کا مشاہدہ اور تجربہ ہے۔ کیا اپنی رنگین مزاجی کا ذکر کرکے وہ مجھے آزما رہی تھی کہ میں کتنی مزاحمت رکھنے والا مرد ہوں اور خود اس کی قوتِ تسخیر کتنی ہے؟ اگر وہ اپنے آپ کو رشوت میں پیش کرکے میری قید سے رہائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتی تو اسے اپنی ہمت کا کارنامہ اور ذہانت کا کمال قرار دیتی اور شوہر کی نگاہ میں اتنی ہی پاک باز وپاک دامن رہتی۔ ویسے بھی چوبیس سالہ ازدواجی زندگی کے بعد شوہر کے پاس اس کے دعوے کی صداقت کو آزمانے کا نہ کوئی نسخہ تھا نہ طریقہ۔ جب وہ ناکام رہی تو پھر اپنے اصل روپ میں نظر آنے لگی اور بیٹے کے سامنے شوہر پرست بیوی بن گئی۔ اپنی ماتا کی آبرو کو بچانے کے لیے ازحد ضروری تھا کہ اس کی وفا شعاری کا بھرم قائم رہے۔ کون جوان بیٹا ماں کے خلاف بدکرداری کے الزام کا طعنہ سُن کے اس کی عزت کرسکتا ہے۔ وہ بیٹے کی نظر سے گرتی تو خود اپنی نظر سے گرجاتی۔

نوشابہ کے رویے نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کردیا کہ اگر وہ انتقاماً بھی دلاور سے بے وفائی کی مرتکب ہورہی تھی تو سات پردوں میں رہ کے۔ وہ اپنے شوہر اور اپنی اولاد کی نظر میں معتبر تھی۔ یا پھر خود فریبی کا شکار تھی کہ ایسا ہی ہے۔ اندر کا حال کون جانتا ہے۔

دلاور کا بیٹا صورت میں ماں سے مشابہ تھا۔ اس کا بے پناہ اعتماد اور جارحانہ رویّہ یہ ظاہر کرتا تھا کہ اس کی فطرت پر باپ کی صفات غالب ہیں۔ بہت کم عمری میں اس کی نظر بہت گہرائی تک دیکھنے لگی تھی اور اس کی قوتِ فیصلہ ایسی تھی کہ وہ معاملات کو اپنے ہاتھ میں لے چکا تھا۔

"کیا ہم جاسکتے ہیں؟" اس نے سوال کیا۔

میں چونکا "کیوں نہیں۔ اگر تمہاری جگہ خود دلاور آتا تو بات کچھ اور ہوتی مگر تم سے ہماری کوئی دشمنی نہیں۔ آپ بیٹے کے ساتھ جاسکتی ہیں مسز دلاور۔"

نوشابہ نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا "تھینک یو۔"

فیصل نے ایک ہاتھ آگے بڑھایا "مسٹر سکندر بخت۔ میرے باپ کا کوئی دشمن میرا دوست نہیں ہوسکتا لیکن میں اعتراف کرسکتا ہوں کہ آپ کم ظرف اور بے ضمیر نہیں ثابت ہوئے۔"

"کیا اسی یقین کی بنیاد پر تم نے اتنا بڑا رسک لیا تھا۔ یہاں آنے کا؟" میں نے اس سے ہاتھ ملا کے کہا۔

اس نے اقرار میں سرہلایا "آپ مجھے نہیں جانتے لیکن میں آپ کو بہت اچھی طرح سمجھتا تھا۔ آپ نے مجھے مایوس نہیں کیا۔ لیکن کیا میں ایک بات پوچھ سکتا ہوں؟"

"تم دو باتیں پوچھ سکتے ہو" میں نے کہا۔

"آپ نے ایسا کیوں کیا تھا؟"

میں نے مسکرا کے کہا "جنگ میں آدمی بعض اوقات اتنا مجبور ہوجاتا ہے کہ اصول چھوڑنے پڑتے ہیں۔"

"کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ..... ایسا پھر ہوسکتا ہے؟ آئندہ بھی آپ گھر کی چاردیواری میں داخل ہوسکتے ہیں۔ کسی عام ڈاکو کی طرح؟"

میں نے سوچ کے جواب دیا "اس کا انحصار تو حالات پر ہے۔ اگر تمہارا باپ خوش فہمی کے مرض میں مبتلا رہا۔ یہ سمجھتا رہا کہ ہم شرافت کے حصار سے نکل ہی نہیں سکتے اور اینٹ کا جواب پتھر سے نہیں دے سکتے تو میں نہیں کہہ سکتا کہ نقصان میں کون رہے گا۔"

غالب نے کہا "پہل اس نے کی تھی۔ اگر تم اسے سمجھا سکتے ہو تو ضرور سمجھانا کہ شکاری وہی کہلاتا ہے جو جنگل میں شکار کھیلے۔ پنجروں میں بند طوطا مینا کو نشانہ بنا کے خود کو شکاری سمجھ لینا کوئی بہادری نہیں۔"

"میں آپ کی بات اسے کہہ دوں گا۔ کوشش کروں گا کہ وہ سمجھ بھی جائے۔ وعدہ نہیں کرسکتا، کیونکہ میں اسے جانتا ہوں۔"

میں نے کہا "تم ماشاءاللہ سمجھ دار ہو۔ اپنی عمر سے بڑی باتیں کرتے ہو۔"

"میں اتنا چھوٹا بھی نہیں ہوں۔ میں بڑا ہوگیا ہوں۔"

میں نے کہا "پھر تم یہ فیصلہ کرچکے ہوگے کہ تمہیں کیا بننا چاہیے؟"

"ہر بچہ سوچتا ہے کہ بڑا ہو کے وہ کیا بنے گا" غالب بولا۔

اس نے نفی میں سرہلایا "سوچنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ میرا ایک دوست ہے۔ اس کا بڑا بھائی ڈاکٹر بننا چاہتا تھا۔ اسے داخلہ بھی مل گیا تھا میڈیکل کالج میں..... لیکن..... جب اس کا آخری سال تھا تو سب غلط ہوگیا۔"

"کوئی حادثہ پیش آگیا تھا اس کے ساتھ؟"

"حادثہ ہی تھا۔ اس کے باپ نے ایک قتل کردیا۔ وہ پورے کنبے کی پرورش کررہا تھا۔ بہت عزت دار آدمی تھا اور اچھے عہدے پر تھا۔ وہ جیل چلا جاتا تو اسے پھانسی ہوجاتی۔ ماں بیوہ ہوجاتی۔ اس کی تین جوان بہنیں تھیں۔ ان کی شادی کون کرتا۔ بس اس نے الزام اپنے سر لے لیا۔"

میں نے اس کی اداس صورت کو دیکھا "پھر؟ پھانسی ہوگئی اسے؟"

"نہیں۔ حالات کی شہادت اسے مجرم ثابت نہیں کرسکی۔ عدالت نے اسے شک کا فائدہ دیا اور اسے صرف چھ مہینے کی سزا ہوئی تھی۔ قتل کے جرم میں نہیں۔ حقائق کو چھپانے یا شاید توہینِ عدالت کے جرم میں۔ سزا نہ ہوتی تب بھی کیریئر تو اس کا ختم ہوچکا تھا۔ فیصلہ ہونے تک وہ جیل میں رہا۔ اس سے پہلے پولیس کی تحویل میں۔ ظاہر ہے اسے پھر داخلہ نہیں ملا۔ صرف ایک سال ہی رہ گیا تھا مگر تقدیر کو منظور نہیں تھا۔ وہ ڈاکٹر نہیں بن سکا۔ آج کل غلط دھندوں میں پڑا ہوا ہے۔ پیسہ کمانے کے لیے۔"

میں نے کہا "تمہارے نزدیک پیسہ کمانے کے لیے صرف جائز اور صحیح کام کرنے چاہئیں؟"

"میں انٹرویو نہیں دے رہا ہوں۔ آپ کے ایک سوال کا جواب دے رہا تھا" اس نے چالاکی سے کام لیا۔

میں نے کہا "اچھا۔ ایک سوال میں بھی پوچھوں؟"

"دو پوچھیے" وہ مسکرانے لگا۔

"فرض کرو تمہیں آگے جا کے....."

شاید اس نے میرے سوال کا اندازہ کرلیا "دیکھیے، مستقبل کے بارے میں کوئی نہیں جانتا۔ آپ بھی نہیں جانتے۔"

"تم واقعی بہت ہوشیار ہو۔"

"میں آپ سے ملنا چاہتا تھا۔"

"آخر کیوں؟"

"بس ایسے ہی۔ اتنی باتیں سُنی تھیں میں نے آپ کے بارے میں۔"

میں نے کہا "اچھی یا بُری؟"

"یہ میں نہیں بتاؤں گا۔" اس نے کہا "میری خواہش ہے کہ ہم پھر ملیں تو ایسے ملاقات نہ ہو۔ میرا مطلب ہے ایسے حالات میں۔"

فیصل کی ماں خاموش کھڑی تھی اور اس کا ایک ہاتھ اپنے بیٹے کے کندھے پر تھا جو قد میں اس سے ایک بالشت اونچا تھا۔ اس کی آنکھوں میں فخر وطمانیت کے جذبات موجزن تھے لیکن وہ تھکی تھکی اور کچھ بے چین تھی۔ شاید اسے فکر تھی کہ واپسی کا مرحلہ تو بیٹے نے آسان کردیا مگر واپسی پر اسے جس طوفان کا سامنا ہوگا اس سے بیٹے کو کیسے بچائے گی؟

دلاور کا بیٹا اور اس کی بیوی اب لوٹ کے اپنی گاڑی کی طرف جارہے تھے۔ میں اسے نہ اپنی جیت کہہ سکتا تھا نہ ہار۔ اگر میں یہ سمجھتا کہ دلاور کی بیوی کے بدلے میں استاد پیڈرو کو حاصل کرنے میں ناکام رہا تو یقیناً یہ ہار تھی اور اگر میں یہ کہتا کہ میں نے فوزیہ کے شوہر کے اغوا کا بدلہ دلاور کی بیوی کو یرغمال بنا کے لے لیا تھا تو یہ یقیناً میری جیت تھی۔ کالیا کا قتل میری ہار تھی تو اس کی بہن کو شادی کے نام پر بے آبرو ہونے سے بچالینا میری جیت تھی۔ یہ شطرنج کی بازی نہیں تھی یا کرکٹ کا میچ نہیں تھا۔ یہ زندگی کی رزم گاہ میں دو حریفوں کی جنگ تھی جو ازل سے جاری تھی۔ اس کے دو فریق ہر دور میں ہر جگہ متصادم رہے تھے لیکن نہ باطل کی قوت حق کو شکست دے سکی تھی اور نہ حق نے باطل کو ہمیشہ کے لیے فنا کیا تھا۔

سبز رنگ کی ڈاٹسن کو شاید کوئی شوفر چلا رہا تھا جو بطور باڈی گارڈ بھی ساتھ آیا ہوگا۔ وہ یقیناً مسلح بھی ہوگا اور ممکن ہے اتنے فاصلے سے دوربین لگا کے سب کچھ دیکھتا رہا ہو لیکن اس نے گاڑی سے اُتر کے قریب آنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی یا اسے دخل اندازی سے منع کردیا گیا تھا اور اس میں اتنی جرأت نہ تھی کہ وہ چھوٹے چوہدری صاحب کی حکم عدولی کرسکے۔ خدانخواستہ صورتِ حال خراب ہوجاتی تو اس کے سامنے دو مشکل راستے ہوتے۔ یا وہ اکیلا ہی جاں نثاری کا ثبوت دیتے ہوئے مارا جائے یا واپس جا کے بڑے چوہدری صاحب کے سامنے اپنی کوتاہی، فرض ناشناسی اور نمک حرامی کا اعتراف کرے اور ذلت کی موت قبول کرلے۔

واپسی میں وہ یقیناً بہت پُرسکون اور خدا کا شکر گزار ہوگا کہ وہ چوہدرائن اور چھوٹے چوہدری صاحب کو کسی خرابی کے بغیر زندہ سلامت واپس لے جارہا ہے۔ باغی اور نافرمان بیٹے کے خلاف چوہدری دلاور کی آتش فشانی خود سرد پڑجائے گی۔ جب وہ دیکھے گا کہ بیٹا اپنی ماں کو خطرناک دشمنوں کے قبضے سے چھڑا لایا ہے۔ استاد پیڈرو کی دغابازی کا صدمہ بیٹے کی جرأت وذہانت پر فخر کے احساس سے کم ہوجائے گا۔ اپنا خون اپنا ہی ہوتا ہے۔ شاید وہ بھول جائے کہ بیٹے نے اس پر گولی چلائی تھی اور اسے گلے لگا کے کہے کہ بیٹا، میرے صحیح جانشین ثابت ہورہے ہو تم۔ اب مجھے کسی پیڈرو کی ضرورت نہیں۔

وہ سب جو خود غرضانہ مفادات کی جنگ میں شریک ہیں، خلوص اور وفا کے نام پر بھی ایک دوسرے کو دھوکا دیتے ہیں۔ استاد پیڈرو اور چوہدری دلاور کے مفادات آپس میں ٹکرائے تو رفاقت کی بنیادیں ہل گئیں۔ پہلے دلاور نے استاد پیڈرو کو چکمہ دے کر ہمارے مطالبات منظور کیے اور اسے بڑی چالاکی سے قائل کرلیا کہ خطرے کی کوئی بات ہی نہیں۔ تم فلاں جگہ جاؤ اور وہاں سے میری بیوی کو لے آؤ۔ اس نے پیڈرو کو یقین دلانے کی پوری کوشش کی ہوگی کہ اس نے اپنی چالاکی سے اور وسائل سے ہمارے عزائم کو ناکام کردیا ہے لیکن پیڈرو نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ برسوں

بعد وہ سمجھنے لگا ہو گا کہ دلاور کب اور کیسے جھوٹ بولتا ہے۔ اس کی چھٹی حس نے اسے خطرے سے آگاہ کردیا ہو گا یا ممکن ہے اس کو کسی محرم رازِ درونِ میخانہ نے ظاہر کے سچ پر پڑا ہوا جھوٹ کا پردہ ہٹا کے دکھا دیا ہو۔ اسے یقیناً صدمہ ہوا ہو گا اور سخت طیش آیا ہو گا کہ برسوں کی وفاداری کا چوہدری دلاور نے کیا صلہ دیا ہے۔ اس نے پیڈرو کو صدقے کے بکرے کی طرح قربان کرنا منظور کرلیا تھا تاکہ اس کی بیوی کی جان بچ جائے۔ درجوابِ آں غزل پیڈرو نے اپنی جان بچانے کے لیے دلاور کو بے وقوف بنایا اور فرار ہو گیا۔

غالب نے میرا شانہ ہلایا "چلئے حضور۔ کھیل ختم ہوا۔ کس سوچ میں ہیں اب؟"

میں نے کہا "یار بڑا کا جی دار تھا۔ آگے چل کے نہ جانے کیسا ہو؟"

غالب نے کہا "ہو گا کیسا۔ یہ اگلی نسل کا دلاور ہو گا۔ اکیسویں صدی کا۔"

میں نے کہا "ضروری تو نہیں۔ عمل کے ساتھ ردِ عمل ایک کُلیہ ہے۔ کیا پتا یہ اپنے ماحول سے متنفر ہو جائے۔ آذر کے گھر ہی ابراہیمؑ پیدا ہوئے تھے۔"

"مجھے آثار اس کے برعکس لگتے ہیں۔ محاورہ تو یہ بھی ہے کہ باپ پہ پوت، پتا پر گھوڑا، بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا۔ اور پوت کے پاؤں پالنے میں ہی نظر آجاتے ہیں۔ جو اس عمر میں دلاور جیسے باپ کی دہشت سے متاثر نہ ہوا اور اس پر گولی چلانے کا حوصلہ رکھتا ہو، کیا وہ بعد میں کسی اور کا لحاظ کرے گا؟ دلاور کریلا ہے تو اس کا بیٹا نیم چڑھا بھی ہو گا مگر اس کی فکر ہم کیوں کریں۔"

میں نے کہا "فکر یا مایوسی کی بات نہیں ہے۔ اکیسویں صدی کے ہر دلاور کے لیے سکندر اور غالب بھی تو ہوں گے۔ ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہو گا۔"

"چلو یار۔ دیکھو لوگ کیسے دور دور سے دیکھ رہے ہیں۔ قریب آتے ہوئے ڈرتے ہیں شاید۔"

میں نے کہا "اب نقوی صاحب کی شاندار گاڑی چلانے کا اعزاز تمہیں حاصل ہو گا۔ ان کے غریب داماد کی غریبانہ سواری مجھے دے دو۔"

"ہم ساتھ ہی چل رہے ہیں نا!"

میں نے کہا "تم چلو۔ میں پہلے دلاور کو مغویہ منکوحہ مسماۃ نوشابہ کی بازیابی پر مبارک باد پیش کروں گا پھر تعزیت کروں گا کہ اسے ولی عہد بہادر کی گولی سے شہید ہونے کی سعادت نصیب نہ ہوئی۔"

"جہنم رسید ہونے کی" غالب نے تصحیح کی۔

"پھر مجھے رابعہ کو بھی چُننا ہے۔ یعنی پک کرنا ہے۔ پھول چُننے کے لیے بھی پک PICK کا لفظ ہی استعمال ہوتا ہے۔"

"اس گل کے ساتھ بلبل کی واپسی تو ہو گی نا۔"

"نہیں مرزا جی۔ واپسی کی بات مت کرو۔ رابعہ تو پاگل ہے۔ اس نے قسم کھالی ہے میرے ساتھ مرنے کی اور ایسے ہی مرمر کے جینے کی لیکن دوسروں نے کیا قصور کیا ہے آخر۔ اپنے ساتھ سب کو تباہ کرنا مجھے منظور نہیں۔ میرا تو ابھی کوئی گھر ہی نہیں ہے لیکن وقار یوسف اور منظر، محسن اور فوزیہ کو مجھ سے تعلق کی یہ سزا نہیں ملنی چاہیے کہ ان کے ہنستے بستے گھر برباد ہو جائیں۔ ایسا ہونے سے پہلے ہی مجھے خود کو قانون کے حوالے کردینا چاہیے یا دلاور کے قدموں میں سر رکھ کے اس سے معافی مانگ لینی چاہیے۔ ایک آدمی کی انا پر یا اس کے جذبات پر اتنے گھر مٹ جائیں، یہ میں سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"بالکل ٹھیک۔ مگر میرا تو کوئی گھر نہیں ہے۔ اگر نازو بھی قسم کھالے رابعہ کی طرح..."

"یہ قسم تو وہ کھا چکی ہے مگر تمہارے ساتھ مرنے جینے کی" میں نے غالب کے کندھے پر ہاتھ مارا "لاؤ چابی!"

غالب نے چابی دے کر مجھ سے دوسری چابی لے لی "اچھا تم میرے آفس چلو، رابعہ وہیں ہو گی مگر انتظار کرنا میرا۔ مجھے زیادہ دیر نہیں لگے گی۔"

ہم آگے پیچھے روانہ ہوئے مگر ہم نے واپسی کے لیے دوسرا راستہ اختیار کیا جو مخالف سمت میں جاتا نظر آرہا تھا۔ یہ کچی سڑک تھی جس پر تانگے ریڑھے اور بیل گاڑیاں چلتی ہوں گی۔ مجھے ڈر تھا کہ مین روڈ کی طرف دلاور کے شکاری کُتے نہ مل جائیں۔ یہ ہو سکتا تھا کہ خود زخمی ہونے کے بعد وہ بیٹے کی طرف سے تشویش میں مبتلا ہو گیا ہو اور اس نے اپنے گوریلے پیچھے دوڑا دیے ہوں کہ جاؤ دیکھو کہیں جوش میں وہ بے وقوف لڑکا مارا نہ جائے جسے کوئی اندازہ نہیں کہ اس کا دشمن کتنا سفاک اور چالاک ہے۔ ممکن ہے دلاور نے یہ تاکید بھی کی ہو کہ جب تک تمہیں پورا یقین نہ ہو کہ سکندر میری بیوی کے ساتھ بیٹے کو بھی لے جارہا ہے تم مداخلت نہ کرنا اور دور ہی سے صورتِ حال کا جائزہ لیتے رہنا۔

وہ کسی طاقت ور دوربین کی مدد سے ایک میل دور رہ کے بھی ہم پر نظر رکھ سکتے تھے اور ضرورت پڑنے پر ہر طرف سے ہماری راہ میں یوں حائل ہو سکتے تھے کہ ہم محصور ہو جائیں۔ یہ اندیشہ بے بنیاد نہیں تھا۔ کوئی بھی باپ اپنے بیٹے کو جانتے بوجھتے موت کے منہ میں جاتا دیکھ کے خاموش اور لاتعلق نہیں رہ سکتا۔ اشتعال کے جذبات کی آندھی نے وقتی طور پر اس کے ہوش اُڑا دیے ہوں گے مگر بہت جلد خون نے جوش مارا ہو گا، بیٹے کی حفاظت کے لیے وہ خود بھی پیچھے بھاگا ہو تو کچھ بعید نہیں۔

کچی سڑک پر آگے نقوی صاحب مرحوم کی بیش بہا گاڑی دھول اُڑاتی جارہی تھی اور میں اس غبار کے پیچھے رواں تھا۔ اس علاقے کے جغرافیے سے ناواقفیت کے باوجود مجھے یقین تھا کہ کچی سڑک کسی ذیلی سڑک سے مل جائے گی اور ہم ایک دائرے میں گھوم کے بالآخر دوسری سمت سے لاہور جانے والی سڑک پر پہنچ جائیں گے۔ اس ناہموار تنگ راستے پر گاڑی چلانا آسان نہیں تھا۔ شہر کی شفاف سڑکوں پر سبک رفتاری سے دوڑنے والی گاڑیاں ہچکولے برداشت کررہی تھیں اور گڑھوں کے نشیب و فراز سے نبرد آزما تھیں۔ اس خیال سے میرا دل بیٹھنے لگتا تھا کہ یہاں ایکسل ٹوٹ گیا یا ٹائی راڈ نکل گئی تو کیا ہو گا؟ مجھے شہر جا کے بریک ڈاؤن سروس کا کرین لانا پڑے گا جو گاڑی کو اُٹھا کے اور "ٹو" کرکے کسی ورکشاپ تک پہنچائے گا۔ اس میں خرچ سے زیادہ خواری تھی۔ اس دھول بھرے راستے پر ٹائر کا فلیٹ ہو جانا معمولی بات تھی مگر یہاں جیک لگا کے اسپیئر وہیل کی تبدیلی کا عمل بھی بہت مشکل ہو جاتا۔

دس میل کا سفر ہم نے آدھے گھنٹے میں کیا مگر تھکن اتنی ہو گئی جیسے ہم نے سو میل گاڑی چلائی ہو۔ پسینے میں گرد و غبار شامل ہونے سے میرے چہرے پر کیچڑ کی کریم پھیل گئی تھی، ایسے میں قدرتی حُسن کے نظارے خاک خوشی دے سکتے تھے جب خاک بالوں میں، حلق میں اور ناک میں پہنچ چکی ہو۔ ایک جگہ سامنے سے ریڑھا نمودار ہوا جس کے پائلٹ کی خودی اتنی بلند تھی کہ کسی شاندار گاڑی سے مرعوب ہو کے راستہ چھوڑ دینا اس نے گوارا نہ کیا، نتیجہ یہ کہ ایک ہارس پاور کا ریڑھا اور پچاس ہارس پاور کی گاڑی آمنے سامنے رُک گئے۔ دونوں طرف کھیت کی اونچی منڈیر تھی اور خالی جگہ صرف اتنی تھی کہ گھوڑا یا سوار الگ الگ تو گزر سکتے تھے مگر ریڑھے کے ساتھ نہیں۔

اب غالب کے اور ریڑھے والے کے درمیان ترکی بہ ترکی جواب دینے کا مقابلہ شروع ہوا۔

غالب نے کہا "اوئے بے وقوف۔ تم ذرا انتظار نہیں کر سکتے تھے۔ تھوڑا پیچھے؟"

اس نے بھی کہا "اوئے بے وقوف۔ تم انتظار نہیں کر سکتے تھے۔ تھوڑا پیچھے۔"

غالب گرم ہو گیا "نقل اُتارتے ہو میری۔ پیچھے کرو اپنے ریڑھے کو۔"

"تم پیچھے لے جاؤ اپنی گاڑی کو" وہ اکڑ کے بولا۔

"یار کیسے لے جاؤں۔ پیچھے دوسری گاڑی ہے۔" غالب نے چلا کے کہا "اور اس کا ریورس گیئر خراب ہے۔"

"گھوڑے میں ریورس گیئر ہی نہیں ہے۔" وہ بدمعاشی پر آمادہ تھا۔

مجھے ہنسی بھی آرہی تھی اور غصہ بھی۔ مجبوراً میں نیچے اترا اور میں نے قریب جا کے کوئی بات کیے بغیر ریوالور نکال کے فائر کردیا۔ گولی شاید گھوڑے کے کان کو چھوتی ہوئی گزری ہو گی۔ وہ ایک دم اُچھلا اور بدک کر پلٹا تو سیدھا کھڑا ہوا ڈرائیور دھم سے نیچے گرا۔ گھوڑا اب کھیت کی منڈیر پر چڑھ گیا تھا اور ہل چلی ہوئی زمین پر بھاگ رہا تھا۔ گھوڑے کا مالک گرتے ہی اُٹھا اور گالیاں بکتا ریڑھے کے پیچھے لپکا۔ وہ بیک وقت گھوڑے سے اور مجھ سے مخاطب تھا اور اس کی گالیوں کا ہدف میں ہی تھا۔ اسے گرتا پڑتا اپنے ریڑھے کے پیچھے دوڑتا دیکھ کے مجھے بہت ہنسی آئی۔

غالب نے ہنستے ہنستے کہا "ٹھیک ہوا اس کے ساتھ۔"

لیکن اس کے بعد ہمارے ساتھ بُرا ہوا۔ راستہ اب صاف تھا مگر غالب نے گاڑی اسٹارٹ کرنی چاہی تو انجن کئی بار غرّا کے خاموش ہو گیا۔ میں منتظر تھا کہ اگلی گاڑی بڑھے تو میں بھی چلوں لیکن گاڑی یا تو گرم ہو گئی تھی یا اس میں پیٹرول ختم ہو گیا تھا۔ بیٹری ڈاؤن ہونے کا خطرہ لاحق ہو گیا تو غالب نیچے اتر آیا۔

"کیا ہوا شاہی سواری کو؟" میں نے کہا۔

"گھوڑے کی بددعا لگ گئی" غالب نے کہا "پیٹرول خلاص۔"

"اس کا فیول میٹر خراب تو نہیں ہو سکتا؟"

غالب نے نفی میں سرہلایا "میں نے ہی اس پر نظر نہیں رکھی تھی۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔"

میں نے اتفاق کیا "اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ میری گاڑی میں پیٹرول ہے مگر اس کو تمہاری گاڑی میں منتقل کیسے کیا جائے؟"

"پھر تو گاڑی یہیں کھڑی رہے گی۔"

میں نے کہا "گاڑی مت کہو۔ گاڑیاں کہو۔ میں بھی گاڑی کو اُڑا کے اوپر سے نہیں گزار سکتا ورنہ آگے لے جاتا۔ تمہاری گاڑی کو پیچھے باندھتا اور کھینچ کے لے جاتا۔"

غالب نے مایوسی سے وقار کی گاڑی کو دیکھا "واپس جانا بھی مشکل ہے۔"

میں نے پھر اتفاق کیا "اتنی دور گاڑی ریورس نہیں کی جاسکتی۔"

"پھر کیا کریں۔ گاڑیاں یہیں چھوڑ دیں۔ پیدل جائیں اور کہیں سے پیٹرول لے کر آئیں۔ یہ ریڑھی والا تو اب ہمیں لے جانے سے رہا۔"

"ہاں۔ کینہ پرور لگتا ہے۔ بدلہ لے گا" میں نے اسے خبردار کیا۔

"کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔"

"وہ انکار کردے گا اور ہماری ذلت پر خوش ہو گا۔"

غالب نے کہا "غصے کی طرح ذلت کو بھی پی جائیں گے۔"

ریڑھے والا بالآخر ریس جیت کے گھوڑے کو گرفتار کرچکا تھا اور اب اسے لگام پکڑ کے چمکارتا ہوا واپس لارہا تھا۔ شاید اسے یقین دلا رہا تھا کہ اس پر گولی کسی نے نہیں چلائی تھی۔ وہ تو شہری بابو کی گاڑی کا ٹائر پھٹ گیا تھا۔

جب میں نے اس سے بات کی تو وہ خود پھٹ گیا۔ "میں لے جاؤں تم کو شہر! پیٹرول ختم ہو گیا ہے تو گھوڑے کا پیشاب ڈال لو ٹنکی میں۔"

"بہت بدتمیز آدمی ہو تم۔"

"تم بڑے تمیزدار ہو۔ میرے گھوڑے کو گولی مارنے والے۔" میں نے کہا "میری نظر اتنی کمزور نہیں ہے اور نہ نشانہ اتنا خراب ہے کہ میں گھوڑے پر گولی چلاتا اور اسے نہ لگتی۔ وہ تو بس ایسے ہی غلطی سے فائر ہو گیا تھا۔"

غالب نے کہا "چلو چار سو روپے لے لو۔ اور سو لے لو جرمانہ۔"

"اب تو لاکھ روپے بھی دو تو میں نہیں جانے والا۔ جب گاڑی میں پیٹرول ڈلوانے کے لیے پیسے نہیں تھے تو گاڑی کیوں لی تھی۔ ایسا ہی ریڑھا لیتے" اس نے گھوڑے کو مخاطب کیا "چل اوئے ولایتی شیر۔ تجھے کون سی پیٹرول کی ضرورت ہے۔"

ریڑھا کچے کھیت سے کچے راستے پر اُترا اور روانہ ہو گیا۔ کچھ دیر کے لیے میں غصے سے اتنا مغلوب ہو گیا تھا کہ میں نے پھر ریوالور نکالنے اور اس مرتبہ ریڑھے کے پائلٹ کے کان چھیدنے کا سوچا۔ جوڈو کے دو ہاتھ مار کے اس کی خودی کو عرش سے فرش پر لانے کا سوچا اور گھوڑے کو اغوا کرنے کا بھی سوچا مگر غالب کی طرح مجھ پر بھی شرمندگی غالب تھی۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ ایک مفلس کی قوتِ فیصلہ کو دولت شکست نہ دے سکی تھی۔ پانچ سو روپے اس کے لیے یقیناً بہت تھے مگر اسے اپنے پیارے گھوڑے پر قاتلانہ حملے سے ہونے والے جذباتی صدمے کا ملال کہیں زیادہ تھا۔

"کچھ لوگ واقعی خریدے نہیں جاسکتے۔ آج ثابت ہو گیا" غالب بولا۔

"مرعوب اور خوف زدہ بھی نہیں کئے جاسکتے" میں نے تسلیم کیا۔

ہم سخت پریشانی کا شکار تھے۔ دوپہر کے دو بجے سورج کی تمازت عروج پر تھی۔ نم آلود کھیتوں سے بخارات اُٹھ رہے تھے۔ گرمی سے ہمارا پسینہ پانی کی طرح بہہ رہا تھا اور ہم گرد و غبار سے اٹی ہوئی ویران راہ گزر پر دو گاڑیاں ہونے کے باوجود بے بس ولاچار کھڑے ہوئے تھے۔ کسی کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس جگہ سے قریب ترین سڑک یا آبادی کتنی فاصلے پر ہو گی۔ گاڑیوں کو یوں چھوڑ کے جانا بھی مسئلہ تھا۔ اس سے دونوں طرف کی ٹریفک بلاک ہو گئی تھی۔ اگر سامنے سے کوئی ریڑھا آجاتا یا بیل گاڑی آجاتی تو وہ سیدھی نہیں گزر سکتی تھی اور اُلٹا چلتے ہوئے اتنی بڑی گاڑی کو کھینچ کر لے جانا ناممکن تھا۔ یہی صورتِ حال پیچھے کی طرف تھی میرے لیے ریورس میں جانا مشکل ضرور تھا ناممکن نہیں تھا۔

"کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا دوست" میں نے آہ بھر کے کہا "چلو بیٹھو، جس راہ پُرخطر سے بچ کے آگے جا رہے تھے اب اُلٹے اس پر واپس جاتے ہیں۔ کسی پیٹرول پمپ سے پیٹرول لا کے اس گاڑی میں ڈالیں گے تو یہ مُردہ اپنی جگہ سے ہلے گا۔"

"اور تب تک راستہ بلاک رہے گا؟"

"رہے۔ ہم کیا کرسکتے ہیں" میں نے کہا "جس میں ہمت ہو وہ گاڑی کو راستے سے ہٹا دے یا اوپر سے گزر جائے۔ ہم پہلے ہی بہت لیٹ ہو گئے ہیں۔ دو گھنٹے اور لگ جائیں گے۔ رابعہ پریشان ہو گی۔"

"اچھا؟ اب بھی پریشان ہوتی ہیں خاتون؟" غالب نے میرے ساتھ بیٹھ کے کہا "میرا خیال تھا کہ اتنا عرصہ ساتھ رہ کے عادی ہو چکی ہیں۔ پریشانی نہ ہونے سے پریشان ہونا چاہیے۔"

میں نے آہستہ آہستہ گاڑی کو اُلٹا چلانا شروع کیا۔ مجھے امید تھی کہ کچھ دور جا کے کوئی ہموار جگہ ضرور مل جائے گی جہاں گاڑی کو موڑ کے سیدھا چلانا ممکن ہو گا۔ ابھی ہم نے مشکل سے پچاس ساٹھ گز کا فاصلہ ہی طے کیا ہو گا کہ میرے کانوں میں ایک فائر کی آواز آئی۔

غالب نے بھی بے اختیار پلٹ کے دیکھا "یہ.... گولی کس نے چلائی ہے؟"

میں نے گاڑی روک دی "ادھر شکار کے شوقین تو آتے نہیں۔"

"یار یہ ریوالور کے فائر کی آواز تھی۔" غالب نے کہا۔

ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور گاڑی بند کر کے وہیں اُتر گئے۔ میں نے دائیں جانب اور غالب نے بائیں جانب گندم کے کھیتوں میں پناہ لی۔ یہ ہو سکتا تھا کہ مین روڈ پر ہماری واپسی کا انتظار کرنے والے ہی ہمارے تعاقب میں آئے ہوں۔ دلاور کی سبز گاڑی میں اس کی بیوی اور بیٹا خیر و عافیت کے ساتھ گزر گئے تو ان کو گرین سگنل مل گیا کہ اب خطرے کی کوئی بات نہیں۔ شاید دلاور نے انہیں یہی کہا کہ جب تک میرا بے وقوف بیٹا اور اس کی پیاری ماں سکندر کی تحویل میں ہوں ایسی کوئی کارروائی مت کرنا جس سے ان کی زندگی خطرے میں پڑ جائے۔ ایسی صورت میں یہ مسئلہ طاقت سے نہیں سیاست سے حل ہو گا لیکن ایسا کوئی معجزہ رونما ہو جائے کہ وہ جذباتی نوعمر لڑکا اپنی ماں کو ساتھ لانے میں کامیاب ہو جائے تو پھر اس سکندرِ اعظم کو زندہ یا مُردہ میری خدمت میں پیش کرنے کے لیے تم جس حد تک جاسکتے ہو اس میں کوئی کمی مت کرنا۔ شاید دلاور خود اپنے لشکر کی کمان کر رہا ہو۔ اسے امید ضرور ہو گی کہ ہم وضع داری اور شرافت کے جذباتی چکر میں ایک عورت کے ساتھ غیر انسانی سلوک ہرگز نہیں کریں گے اور ماں کے لیے بیٹے کی درد بھری فریاد اور مامتا کی تڑپ سے متاثر ہو جائیں گے تو کہیں گے کہ جاؤ۔ دلاور آتا یا پیڈرو تو ہم اس سے برابر کی سطح پر بات کرتے مگر اس بچے کی بات کا کیا جواب دیں جو اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کے ماں کو مانگنے آیا ہے۔

ہم دلاور کی توقعات کے عین مطابق شرافت اور حماقت سے مار کھا گئے تھے اور اب میدان صاف پاتے ہی اس نے اپنے شکاری کتوں کے پٹے ڈھیلے کر دیے تھے کہ وہ ہمارے پیچھے لگ جائیں۔ میں

دلاور کے اشتعال کی کیفیت کا اندازہ کرسکتا تھا۔ اس کی بیوی نے پہلے اپنی حماقت سے یہ موقع فراہم کیا تھا کہ دشمن اس کی عزت کو یرغمالی بنالیں۔ رہی سہی کسر صاحب زادے نے پوری کردی تھی۔ غصے نے اسے پاگل کردیا ہوگا لیکن شاید پہلی بار اسے احساس ہوا ہوگا کہ طاقتور سے طاقتور انسان بھی اس وقت خود کو کتنا بے بس اور مجبور محسوس کرتا ہے جب اپنے گھر کی دیوار میں رخنے نمودار ہونے لگیں اور اسے سہارا فراہم کرنے والے اپنے ہاتھ بھی اپنے نہ رہیں۔ باہر کے محاذ پر اس نے ہارہا... شکست کی ذلت برداشت کی تھی مگر یہ جذباتی شکست کا پہلا تجربہ اس کے لیے بہت تلخ ثابت ہوا ہوگا۔ اسے احساس ہوا ہوگا کہ وقت بھی اس کا نہیں رہا۔ اب وہ اپنی بیوی پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتا اور اسے رسوائی کا تماشا بنانے پر عبرت ناک سزا نہیں دے سکتا۔ جو اس کی مجبور بیوی تھی اب ایک جوان بیٹے کی ماں ہے اور وہ بیٹا بغاوت کرچکا ہے لیکن وہ بغاوت کے جرم میں اسے موت کی سزا نہیں دے سکتا۔ جو وہ دوسروں کو دیتا آیا تھا۔

میں کھیت میں تقریباً بیس گز اندر پکی ہوئی فصل کے درمیان اس وقت تک بالکل محفوظ تھا جب تک میں خود دشمن کو اپنی موجودگی کا سراغ نہ دوں۔ میرے سامنے ہزاروں سرکنڈوں جیسی شاخوں' نوکیلی دھار والی پتیوں اور گندم کے خوشوں کی سرسبز دیوار تھی جس میں سے صرف میری نظر کچی سڑک کا ایک حصہ دیکھ سکتی تھی۔ اس سڑک پر سے گزرنے والا کوئی شکاری مجھے تلاش نہیں کرسکتا تھا۔

اب میں واضح طور پر ان کی آوازیں سُن رہا تھا۔ معلوم نہیں کیوں وہ گاڑی یا موٹر سائیکل لے کر نہیں آئے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق وہ کم سے کم چار آدمی تھے جو ادھر دوڑتے ہوئے آرہے تھے۔ بالکل مخالف سمت میں' اس راستے کی دوسری جانب کہیں غالب بھی میری طرح مورچہ بند تھا اور اپنی کمین گاہ سے اس راستے کو دیکھ رہا تھا جس پر دلاور کے چھوڑے ہوئے پیشہ ور قاتل ہمارا سراغ تلاش کرنے آگئے تھے۔ ہم اس وقت تک گولی چلانے کے قائل نہ تھے جب تک ہم پر گولی نہ چلائی جائے ورنہ اس دفاعی پوزیشن میں چار چھ افراد کو نشانہ لے کر گولی ماردینا بہت آسان ہوتا۔

گرمی سے میرا بُرا حال تھا۔ سب پودے خالص آکسیجن فراہم کررہے تھے مگر حبس سے میرا دم گھُٹ رہا تھا۔ جڑوں کے قریب حشرات الارض آزادانہ گھوم رہے تھے اور انہیں جھٹکنے کے لیے مجھے باربار اپنا پاؤں زمین پر مارنا پڑتا تھا۔ ذرا اوپر اُڑنے والے ننھے مُنّے مچھر جیسے جانور صرف گردن یا چہرے پر کاٹ کے مطمئن نہیں تھے۔ وہ قمیص کے گلے سے اندر پہنچ گئے تھے اور میرے جسم کا سروے کررہے تھے۔ انہیں بے دخل کرنا مشکل تھا۔ بیشتر کو میں نے قمیص کے اندر ہی مسل دیا مگر ہر گزرتے لمحے کے ساتھ میرے لیے ساکت بیٹھنا مشکل سے مشکل تر ہونے لگا تھا۔ میرے ہلنے سے پودے اور اوپر گندم کے خوشے ہلتے تھے اور یہ حرکت دشمن کو ہاتھ کے اشارے سے اپنی طرف بُلانے کے مترادف تھی۔

میری نظر نے اچانک دو افراد کو دیکھا جو ہاتھوں میں ریوالور تھامے اِدھراُدھر دیکھ رہے تھے۔ وہ انداز واطوار سے خطرناک بدمعاش نظر آنے کی پوری کوشش کررہے تھے اور ان کے عزائم بہرحال قاتلانہ تھے۔ جو زبان وہ آپس میں بول رہے تھے اس میں شریفانہ الفاظ کم تھے۔ گالیاں زیادہ تھیں۔ غصے والی گالیاں ہمارے لیے تھیں۔ بے تکلفی کی گالیوں سے وہ ایک دوسرے کو مخاطب کررہے تھے۔ وہ سب بیس سے پچیس سال کی درمیانی عمر کے نوجوان تھے۔ جسمانی طور پر صحت مند بھی تھے لیکن ان کی صورتیں ان کے اعمال کی کہانی کہتی تھیں اور ان کے نفرت انگیز ماضی کی تصویر تھیں۔ احساسِ محرومی' غلط صحبت' حادثاتِ زمانہ یا مختصراً قسمت نے انہیں غلط راستوں پر ڈال دیا تھا اور غلط وقت پر ان کے ہاتھوں میں غلط چیز تھمادی تھی۔ کتاب یا قلم کی جگہ ان کے ہاتھوں نے ریوالور کو کامیابی کا شارٹ کورس کرنے کے لیے منتخب کرلیا تھا۔ یہ سوچے بغیر کہ اس شارٹ کورس سے ان کی زندگی کا سفر شارٹ ہوکے اچانک تختۂ دار پر ختم ہوسکتا ہے۔ انہوں نے محنت پر جُوا کھیلنے کو ترجیح دی تھی اور داؤ پر اپنی زندگی لگادی تھی۔

وہ سب گاڑی کے قریب آکے ٹھہر گئے تھے۔ اب وہ ہر طرف گھوم کے ہمارا سراغ لگانے کی کوشش میں مصروف تھے۔

"اوئے فیکے.... دونوں گاڑیاں یہاں کیوں کھڑی ہیں آخر؟"

فیکے نے پُر تمسخر جواب دیا "میں نے پوچھا تھا گاڑیوں سے۔ ایک کہتی ہے میری مرضی۔ دوسری سے تم خود پوچھ لو۔"

ظاہر ہے فیکے نے گالیاں کھائیں کیونکہ ان کے باقی ساتھی ہنس پڑے تھے پھر کسی نے کہا "اویار گاڑی خراب بھی ہوجاتی ہے۔"

"مغز خراب ہے تیرا۔ ایک ساتھ دونوں گاڑیاں کھڑی ہوگئیں؟ اور یہ نویں نکور گاڑی خراب ہوسکتی ہے؟" یہ چوتھے شخص کی آواز تھی۔

"بات کچھ اور ہے۔ پتا کرو" نمبرون زیادہ سنجیدہ تھا اور اس کا دماغ صحیح خطوط پر سوچ رہا تھا۔

جسے نیکا کہہ کے مخاطب کیا گیا تھا وہ اتنا ہی مسخرا تھا "کیا پتا انہیں شیر اُٹھا کے لے گئے ہوں اور کھا گئے ہوں۔ میں کس سے پتا کروں؟"

"جنگلی سور اُٹھا کے لے گئے ہوں گے تا تیری بے بے کو۔ سؤر دے پُتر کرنا کچھ نہیں تھا بکواس کے سوا تو ہمارے ساتھ آنے کی کیا ضرورت تھی۔" نمبرون کا پارہ چڑھ گیا۔

نمبر تین بولا "یار وہ اِدھراُدھر ہوگئے۔"

"ہاں۔ یہی خیال ہے میرا بھی۔ ان کو پتا چل گیا کہ ہم پیچھا کررہے ہیں اور وہ دوڑ کے جان نہیں بچاسکتے۔"

"دوڑنا تو گاڑی کو تھا۔ گاڑی چھوڑنے کا مطلب تو یہ ہوا کہ وہ گاڑی سے زیادہ تیز دوڑ سکتے تھے۔" نیکا بدستور غیر سنجیدہ رہا۔

"تو باز نہیں آئے گا۔"

"نہیں یار۔ سوچنے کی بات ہے۔ انہیں تو پتا نہیں ہوگا کہ ہماری جیپ خراب ہوگئی ہے۔ ہم اب ایک جیپ پر نہیں' دو ٹانگوں پر آرہے ہیں۔"

"کہتا ٹھیک ہے نیکا۔ بھاگنے کے لیے گاڑی زیادہ کام کی چیز تھی' گاڑی ضرور خراب ہوگی" نمبر تین بولا۔

پھر نمبر چار نے کہا "میں بتاؤں' آگے والی گاڑی خراب ہوگئی۔ پیچھے والی پھنس گئی۔"

نمبرون نے دوبارہ اس مفروضے کو مسترد کردیا "اوئے تم سب پاگل ہو؟ یہ خراب ہونے والی گاڑی نہیں ہے۔"

نیکا بولا "نئی گاڑی میں بھی پیٹرول ختم ہوجائے تو نہیں چلتی۔"

گاڑیوں کے بیچ سڑک میں رک جانے کی وجہ معلوم کرنے کے لیے ہر ایک کی تجویز الگ تھی۔ ایک نے کہا کہ شیشہ توڑ دو سائڈ کا اور بونٹ کھول کے دیکھو۔ دوسرے نے کہا کہ بونٹ ویسے بھی کھولا جاسکتا ہے لیکن اسے موقع فراہم کیا گیا تو وہ نیچے لیٹ کر بھی بونٹ کھولنے میں ناکام رہا۔ تیسرے نے مختلف چابیاں آزمانے کا مشورہ دیا۔ اس سے وقار یوسف کی گاڑی کا دروازہ کھُل گیا کیونکہ اس کے لاک پُرانے ہوچکے تھے۔ ان کے دندانے اور گراریاں گھس چکی تھیں۔ نئی کار کے کسی لاک میں کوئی چابی کام نہیں آئی لیکن مسخرا نیکا ایک تار کی مدد سے ایک لاک کھولنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کے بعد بونٹ کھول کے دیکھا گیا اور فیکے نے اس پائپ سے منہ لگا کے پیٹرول کھینچا جو کاربوریٹر سے ملا ہوا تھا۔

"لو جی' پیٹرول تو بہت ہے" اس نے ہوا خارج کرکے کہا۔

"پیٹرول ہے نا۔" نمبرون بولا "میں نہ کہتا تھا۔"

"پیٹرول گاڑی میں نہیں۔ پیٹرول پمپ پر بہت ہے۔ اپنے کویت میں بہت ہے۔" نیکا ہنس پڑا "گاڑی میں پائپ سے صرف ہوا آرہی ہے۔ گاڑی اسی لیے ادھر کھڑی ہوگئی ہے۔"

تیسرے نے کہا "پھر تو پکی بات ہے وہ اِدھراُدھر ہوگئے۔"

نمبرون بولا "ٹھیک ہے۔ تم اِدھر دیکھو۔ تم دونوں' میں اُدھر جاتا ہوں' وہ زیادہ دور نہیں جاسکتے۔ فیکے' چپ کرکے چلنا ہے میرے ساتھ۔"

"میں تو بالکل چپ ہوں پہلے ہی" وہ بولا۔

میں نے پودوں کی سرسراہٹ سے اندازہ کیا کہ وہ کھیت میں داخل ہوگئے ہیں۔ انہوں نے بہت جلد سمجھ لیا تھا کہ ہم گاڑیاں چھوڑنے پر کیوں مجبور ہوئے تھے اور وہ صحیح سمت میں ہمیں تلاش کررہے تھے۔ میں ان کے قدموں کی آواز پر کان لگائے بیٹھا رہا۔

ان کے بوٹوں سے پودوں کے تنے ٹوٹ رہے تھے اور کپڑوں سے رگڑ کھا کے خوشے بکھر رہے تھے۔

"اللہ معاف کرے۔ ہم رزق پر چل رہے ہیں" فیکے کی آواز آئی۔

"رزق کے گھوڑے۔ وہ تیرا باپ اِدھراُدھر ہوگا تو تیری آواز سن لے گا" اس کے ساتھی نے اسے دبی دبی آواز میں ڈانٹا۔

وہ مجھ سے دس گز دور اپنا راستہ بناتے آگے جارہے تھے اور میرا ان کی راہ میں حائل ہونے کا کوئی ارادہ نہیں تھا مگر میں بالکل تیار تھا کہ وہ رخ بدل کے میری طرف آنے لگیں تو انہیں حلق سے آواز نکالنے کا موقع بھی نہ ملے۔ پھر وہ بات ہوگئی جس کا مجھے ڈر تھا۔ کوئی مچھر سے بھی چھوٹا اُڑنے والا کیڑا سیدھا میری ناک میں داخل ہوگیا' اسے آگے راستہ بند ملا تو وہ زیادہ حساس حصوں کی طرف چلا گیا اور انتہائی ضبط کے باوجود میں چھینک کو نہ روک سکا۔ اسے تقدیر کی ستم ظریفی کہا جاتا ہے۔ ہر احتیاط اور حفاظتی تدبیر رائیگاں گئی' ایک حقیر کیڑے نے اشرف المخلوقات کی عقل کے فیصلوں کی ساری افادیت ختم کردی۔

وہاں چھینک کسی بم کے دھماکے سے کم نہ تھی "اوئے فیکے' ہوشیار۔"

فیکے نے جواب دیا "ہوشیار' خبردار۔ بندہ اِدھر ہی موجود ہے۔"

انہوں نے اندازے سے سمت کا تعین کرتے ہوئے فائر جھونک دیے مگر میں اس سے پہلے ہی وہ جگہ چھوڑ چکا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میری موجودگی کا راز فاش ہوتے ہی ان کا ردِّعمل کیا ہوگا۔ اب میں نے جوابی کارروائی کی اور ان کی طرف یکے بعد دیگرے دو فائر کئے پھر میں جگہ چھوڑ کے پیچھے دوڑا۔ مشکل یہ تھی کہ پودوں کی حرکت سے ہم سب ایک دوسرے کی نقل وحرکت کا بالکل صحیح اندازہ کرسکتے تھے۔ اب تک کسی کے زخمی یا ہلاک نہ ہونے کا سبب صرف یہ تھا کہ کسی نے بھی دیکھ کے نشانہ نہیں لیا اور گولیاں دائیں بائیں سے گزر گئی تھیں۔ جب دوبارہ مجھ پر فائر ہوئے اور میں محفوظ رہا تو میرے لیے جگہ بدلنا پھر ضروری ہوگیا۔ مجھے بھی ہلتے ہوئے پودے یہ بتارہے تھے کہ وہ دونوں کہاں ہیں۔ میں نے ایک کا نشانہ درست رکھتے ہوئے گولی چلائی اور جب کوئی چیخ مار کے بلبلایا تو مجھے عجیب سی وحشیانہ خوشی ہوئی۔ چلّانے والا نیکا تھا جو شاید سخت زخمی ہوکے گرا تھا اور تڑپ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ یا پیر چلانے سے طوفان سا آگیا تھا اور ایک طرف کے پودے ایسے گر رہے تھے جیسے آندھی چل رہی ہو۔

دوسرے شخص نے اشتعال اور انتقام کے جنون میں دو جوابی فائر کئے۔ اب اس کے ریوالور کی گولیاں ختم ہوگئی تھیں اور میرے پاس ابھی تین گولیاں بچی ہوئی تھیں۔ میرے حریف نے چھ گولیاں ضائع کردی تھیں جب کہ میں نے تین میں سے ایک کا صحیح استعمال

کیا تھا۔
اپنے ذہن کے حساب کتاب کی مدد سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ جب تک دشمن دوسرا ریوالور استعمال نہ کرے وہ مجھ پر مزید فائر نہیں کرسکتا۔ اگر وہ ایک ہی ریوالور لے کر آیا تھا تو وہ لازماً خود کو مسلح کرنے کے لیے فیکے کا ریوالور حاصل کرے گا جس میں دو گولیاں باقی تھیں۔ اس کے لیے وہ ٹھیک اسی جگہ جانے پر مجبور ہوگا جہاں فیکا دم توڑ رہا تھا۔ اس کی ہنگامہ آرائی اب دل خراش خراٹوں جیسی آواز میں ڈھل گئی تھی جو اس کے حلق سے نکل رہی تھی۔ پودے بھی اب کم ہل رہے تھے جس سے یہی سمجھا جاسکتا تھا کہ زیادہ خون بہہ جانے کے بعد فیکے کا جسم تڑپنے کے قابل بھی نہیں رہا۔

یہ خاموشی کا ایک بھیانک وقفہ تھا جس میں دو جانی دشمنوں کے بہت قریب فرشتۂ اجل بھی موجود تھا یا پہنچنے والا تھا۔ فیکے کی روح قبض کرنے کے بعد اسے ہم دونوں میں کسی ایک کی جان لینی تھی۔ میں دو گولیوں کو بچا کے رکھنا چاہتا تھا اور اس وقت کے انتظار میں تھا جب میرا حریف طاقت کا توازن حاصل کرنے کے لیے حرکت کرے اور وہ ریوالور اُٹھائے جو مرجانے والے کے لیے بے مصرف ہوگیا تھا۔

سڑک کے دوسری طرف سے ایک دم فائرنگ شروع ہوگئی۔ میں نے پہلے تین آوازوں سے اندازہ کیا کہ وہ سب ایک ساتھ گولیاں چلا رہے ہیں پھر کسی نے بھیانک چیخ مار کے گالی دی اور چند سیکنڈ تک دو ریوالور استعمال ہوئے۔ ان میں ایک یقیناً غالب کا ریوالور تھا۔

میرے سامنے ایک دم حرکت ہوئی اور یہ حرکت اسی سمت میں تھی جدھر فیکے کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ میری قیاس آرائی درست ثابت ہونے لگی تھی۔ کسی تذبذب کے بغیر میں نے نشانہ لیا اور ریوالور خالی کردیا۔ آخری فائر کے بعد بھی میں نے کوئی چیخ نہیں سُنی تو مجھے مایوسی نے گھیر لیا۔ میرا نشانہ خطا ہوگیا تھا اور اب میں خالی ہاتھ رہ گیا تھا۔ میرے دشمن کے پاس دو گولیاں تھیں اور وہ بے خوف و خطر میرے سامنے آ کے صرف ایک گولی سے میرا کام تمام کرسکتا تھا۔

خرچ ہونے والی گولیوں کا حساب میں نے رکھا تھا تو میرے دشمن نے بھی رکھا ہوگا لیکن اس نے عجلت سے کام لیا اور ایک فائر فوراً داغ دیا۔ اس وقت میری ساری قوت میری ذہانت ہی ہوسکتی تھی۔ میں نے بھی ایک پُردرد چیخ بلند کی اور ذبح کیے جانے والے بکرے جیسی آوازیں نکالنے لگا۔ میں نے اِدھر اُدھر لاتیں چلا کے اور ہاتھ مار کے پودوں کو اسی طرح ہلایا جیسے فیکے نے نزع کے کرب میں ہلایا تھا۔ یقیناً میرے دشمن نے بھی یہ نظارہ بڑی خوشی اور فتح کے غرور ساتھ دیکھا ہوگا لیکن اس نے دوسری گولی کو محفوظ کرلیا تھا اور ابھی وہیں موجود تھا۔ ایک منٹ سے بھی کم مدت میں مرجانے کی اداکاری کرتے ہوئے میں ہاتھ پیر پھیلا کے ساکت ہوگیا۔

آہستہ آہستہ میں نے اس کے آگے بڑھتے ہوئے قدموں کی صدا سُنی۔ وہ بہت محتاط طریقے سے میرے قریب آرہا تھا اور مجھے خوف یہ تھا کہ کہیں میری موت کا یقین حاصل کرنے کے لیے وہ آخری گولی بھی نہ چلا دے لیکن یہ رسک لیے بنا چارہ نہ تھا۔ وہاں دم سادھ کے لاش کی طرح پڑے پڑے میں نے دل ہی دل میں خدا سے دعا کی کہ مجھے مقابلہ کرنے کی مہلت ضرور دے۔ میں ایسے بے جان لاش کی طرح لیٹے ہوئے گولی کا نشانہ نہ بنوں۔

دوسری طرف کے محاذ کی خاموشی کو پھر ایک فائر اور ایک چیخ کی آواز نے منتشر کیا۔ یہ چیخ غالب کی نہیں تھی۔ غالب کا نشانہ شروع سے ہی قابلِ رشک رہا تھا۔ اس نے اپنے دونوں حریفوں کا خاتمہ کردیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار مجھے یہ یقین نہ رہا کہ تقدیر مجھے مزید مہلت عطا کرے گی۔ یہ خوف میرے اعصاب پر سوار تھا کہ میرے نزدیک پہنچنے کے بعد دشمن میرے سر میں آخری گولی ضرور مارے گا۔ اس کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی یہی کرتا کیونکہ پھر خطرہ کوئی نہ رہتا۔

وہ اب بہت قریب آگیا تھا۔ میں جان کی بازی لگا کے اس پر جست لگانے کا فیصلہ کرچکا تھا۔ ایسے لیٹے لیٹے گولی کا نشانہ بن جانا خودکشی کے مترادف تھا۔ اس سے پہلے کہ میں اپنی قوت کو مجتمع کرکے اُٹھتا، میں نے غالب کی آواز سنی۔ وہ مجھے بھی پکار رہا تھا اور دشمن کو بھی للکار رہا تھا۔
"تو ٹھیک ہے نا؟ دو کُتے مار دیے ہیں میں نے۔ اب ایک باقی ہے نا۔ آنے دے ادھر سالے کو" وہ سڑک کی جانب سے بول رہا تھا۔

میرے جسم سے پسینہ بہہ رہا تھا اور میں آج کہہ سکتا ہوں کہ وہ موت کا پسینہ تھا۔ اچانک جیسے میرے ہاتھ پاؤں میں طاقت نہیں رہی تھی اور میں مفلوج ہوگیا تھا۔ مجھے یہ احساس ہورہا تھا کہ میں نے دیر کردی ہے۔ اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ اس کی نظریں میری لاش پر جمی ہوئی تھیں۔ چشمِ تصور سے میں اس کے لبوں کی مسکراہٹ بھی دیکھ رہا تھا اور یہ بھی کہ اس نے اپنا ریوالور والا ہاتھ اوپر اُٹھالیا ہے۔

پھر اچانک مجھے اپنی دعا کے مستجاب ہونے کی نوید ملی۔ خدا نے میری سُن لی تھی اور مجھے مقابلے کا موقع فراہم کردیا تھا۔ غالب کی آواز نے میرے غنیم کو بدحواس کردیا۔ وہ ایک دم دفاعی پوزیشن پر چلا گیا۔ اس نے اپنی آخری گولی ضائع نہیں کی کیونکہ وہ نہتا نہیں ہونا چاہتا تھا۔ کسی لاش کے مقابلے میں ایک زندہ اور مسلح دشمن پر وہ گولی چلانے سے تحفظ کی ضمانت حاصل ہوسکتی تھی۔ لاش پر تو وہ گولی ضائع ہی جاتی۔ اگر اس کا ارادہ قریب آ کے مجھے پھر شوٹ کرنے کا تھا تو اس نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا ہوگا کہ عین

وقت پر یہ ارادہ بدل گیا ورنہ وہ بھی دست مارا جاتا۔
میں نے آہستہ آہستہ گردن کو حرکت دی اور آنکھیں کھول کے دیکھا۔ وہ مجھ سے چند قدم دور موجود تھا مگر میری طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہ سڑک کی طرف تھی۔ اب میری زندگی کی ضمانت بے حس و حرکت پڑے رہنے میں تھی۔ مقابلہ غالب کے اور میرے دشمن کے درمیان تھا۔ کسی آہٹ کے بغیر میں نے رومال نکالا اور اپنی ناک پر رکھ لیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ پھر کوئی کیڑا مجھے بچ بچ مروا دے۔ چیونٹے میری گردن پر رینگ رہے تھے اور میرے بازوؤں کے راستے قمیص میں داخل ہوچکے تھے لیکن میں سب کچھ برداشت کرنے پر مجبور تھا۔ میں جانتا تھا کہ حشرات الارض بھی اتنے بے وقوف نہیں ہوتے کہ زندہ اور مُردہ میں فرق کو نہ سمجھتے ہوں۔ وہ جانور کی لاش بے خوفی سے کھاتے ہیں مگر زندہ جانور سو رہا ہو تو یہ جسارت نہیں کرتے۔

مجھے ضبط اور قوتِ برداشت کے مظاہرے کا یہ وقفہ گھنٹوں طویل لگا جو چند منٹ کی بات تھی۔ غالب اپنی محفوظ دفاعی پوزیشن میں رہتے ہوئے کوئی حکمتِ عملی وضع کررہا تھا جس سے وہ آخری دشمن کو اچانک مار گرائے۔ میری طرح اس نے بھی ہر فائر کے بعد بلند ہونے والی چیخ سُنی ہوگی۔ چیخ تو میری بھی بہت دلخراش تھی اور میں نے بہت شور کیا تھا۔ غالب کی جگہ کوئی اور ہوتا تو یقیناً دھوکا کھا جاتا مگر وہ مجھے جانتا تھا اور میری آواز کے فطری اور غیر فطری لہجے کے فرق کو محسوس کرسکتا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میرا بلبلانا "اوور ایکٹنگ" ہے۔ سچ مچ مرتے ہوئے میں اتنا ہنگامہ نہیں کرسکتا خواہ مجھے گولی لگے یا گولا۔ مجھے اس کی ذہانت اور اعتماد نے پھر زندگی کی طرف کھینچ لیا تھا ورنہ اپنی طرف سے تو میں کلمہ بھی پڑھ چکا تھا اور موت کو گلے لگا چکا تھا۔

اچانک سڑک کی طرف سے ایک خاصا بڑا پتھر آیا اور مجھ سے کچھ فاصلے پر گرا۔ میں احتیاط بھول گیا اور میں نے آنکھیں کھول کے دیکھا تو میرا دشمن چھلانگ مار کے کچھ آگے چلا گیا تھا۔ میری طرف اس کی توجہ ہی نہیں تھی ورنہ ایک مُردے کو پٹ پٹ آنکھیں جھپکاتا دیکھ کے وہ میرے چکر کو سمجھ جاتا۔ یہ میری خودکشی کی دوسری احمقانہ کوشش تھی جو خوبیٔ قسمت سے ناکام رہی۔
غالب نے چلّا کے کہا "اوئے کچھ بول منہ سے۔ کہاں لگا؟ کیا منہ ہی ٹوٹ گیا ہے؟"
اس نے غالب کو زیرِلب گالی ضرور دی ہوگی۔ مجھے اس بات پر ہنسی آئی تھی لیکن میں صرف مسکرایا۔ اب میں زیادہ بے فکری سے دشمن کی بے بسی کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ میں نے اپنا پوز نہیں بدلا تھا مگر اب وہ میری طرف دیکھ ہی نہیں رہا تھا تو میں آنکھیں کھلی رکھ سکتا تھا۔

سڑک پر سے غالب نے دوسرا پتھر پھینکا جو اس کے سر کے قریب سے گزر کے کھیت کی نرم مٹی میں بھد سے گرا۔ اس نے بدحواس ہو کے پھر جگہ بدلی۔
"اوئے تیری تو..." غالب کا اعلان خاصا اشتعال انگیز تھا۔ غالب پودوں کے ہلنے سے دشمن کی نقل و حرکت کا اندازہ کررہا تھا۔ نشانہ لینے سے پہلے وہ اس کو دائیں بائیں دوڑانا چاہتا تھا۔ یہ بڑی مؤثر حکمتِ عملی تھی کیونکہ خود غالب اپنے دشمن کی نظر سے اوجھل تھا۔ شاید وہ کسی گاڑی کے پیچھے تھا اور اسے پتھر بھی دستیاب تھے۔ پرانے وقتوں میں محصور ہوجانے والے دشمن کو باہر نکالنے کے لیے بھی منجنیق سے ایسے ہی پتھر پھینکے جاتے تھے۔
"تیرا سر نظر آرہا ہے مجھے" غالب نے بہ آواز بلند اسے ایک گالی دے کے کہا "لے بچ۔"
وہ بے اختیار جھکا اور اسی وقت غالب نے فائر کیا۔ دشمن کا حوصلہ جواب دے گیا۔ اسے یقین آگیا تھا کہ وہ غالب کو نہیں دیکھ سکتا مگر غالب واقعی اسے دیکھ رہا ہے۔ بلف کرنے کی یہ چال کامیاب رہی۔ اس نے ایک دم ریوالور اُٹھایا اور غالب کی آواز سے سمت کا تعین کرتے ہوئے آخری گولی چلادی۔ غالب کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ اس وقت تک وہ اپنی جگہ سے کئی گز دور چلا گیا ہوگا۔

فائر کی آواز کے ساتھ ہی میں نے غالب کا فلمی ولن والا قہقہہ سُنا تو میرے جسم میں بجلی بھر گئی۔ میں تڑپ کے اُٹھا اور کسی آدم خور چیتے کی طرح اس پر حملہ آور ہوا۔ سڑک کی طرف سے غالب نے کہا "پھر نشانہ لے تیری تو..."
وہ دیوانہ وار بھاگا مگر وہی کھیت جو اس کے لیے بھی پناہ گاہ تھے اب اس کی راہ میں دیوار بن گئے۔ میں نے چلّا کے کہا "بھاگ... کہاں جائے گا بھاگ کے..." میں نے اس جملے میں دو مرصع گالیاں استعمال کرتے ہوئے اسے گھیرا۔ جب اس نے دیکھ لیا کہ اب میرے ہاتھ اس کی گردن تک پہنچنے ہی والے ہیں تو اس نے وہی ریوالور مجھ پر کھینچ مارا جس کی چھ گولیاں ضائع ہوچکی تھیں۔ اتنے قریب سے نشانہ خطا نہیں ہوسکتا تھا۔ ریوالور میرے ماتھے پر لگا اور مجھے واقعی دن میں تارے نظر آگئے۔ اندھیرے میں جگنو سے اُڑے اور میں لڑکھڑا کے منہ کے بل گرنے لگا۔ اس نے پلٹ کر مجھے دبوچنے کی کوشش کی لیکن وہ میرے ساتھ ہی گرا۔ اس کی گردن میرے ہاتھ میں آگئی اور خود بخود ٹوٹ گئی۔ کم سے کم اس وقت میرا خیال یہی تھا۔

چند منٹ میں مجھے ہوش بھی آگیا۔ غالب مجھے سہارا دے کر اُٹھا رہا تھا۔ میرے قریب ہی آخری دشمن مڑا تڑا ایسے لیٹا ہوا تھا کہ اس کی کھلی آنکھیں مجھے دیکھتی رہ گئی تھیں۔ میرے ہاتھوں نے ہوش کے آخری لمحات میں اس کی گردن مروڑ دی تھی۔ یہ ایک فطری اور غیر ارادی ردِّعمل تھا جس میں صرف میرے ہاتھ شریک تھے، میرے ذہن کو فیصلہ صادر کرنے کی مہلت ہی کہاں ملی تھی۔
"چل بھائی۔ اپنے پیروں پر کھڑا ہوجا" غالب نے میرے

کپڑے جھاڑے۔

میں نے دُکھتے ہوئے سر پر ہاتھ رکھا "بڑے زور سے مارا تھا ریوالور حرامی نے۔"

"تُو نے کہا نہیں کہ بھائی صاحب۔ مروت اور شرافت بھی کوئی چیز ہے۔ ذرا نرمی سے اور نزاکت سے وار کیجیے" غالب مسکرانے لگا۔

"اُدھر کی کیا پوزیشن ہے؟"

"پانی پت کے گراؤنڈ نمبر دو میں بھی فتح ہماری ہوئی۔"

"یہ تو ہمیں سچ مچ قتل کرنے کی نیت سے آئے تھے" میں نے ایک گہری سانس لی۔

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ حالانکہ جھوٹ موٹ ماردینا کافی تھا۔"

"میرا مطلب تھا۔ پہلے دلاور نے ہمیں قتل کرانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ورنہ مواقع تو بہت آئے تھے۔"

غالب نے کہا "یہ موقع زیادہ اشتعال انگیز تھا۔ اس کے ساتھ پنگا لینا تو معمول تھا۔ اس کی گھروالی اور ولی عہد کا پنگا بہت بڑا تھا۔"

"ہمیں فوراً نکل جانا چاہیے۔ دلاور بے چینی سے منتظر ہوگا کہ اس کے بھیجے ہوئے کرائے کے قاتل اپنی کامیابی کی رپورٹ دیں۔"

"سکندرِ اعظم کی کھوپڑی اور غالب کا سرِ عزیز اسے پیش کریں اور انعام پائیں" غالب نے لاش کو اُلٹ پلٹ کے اس کے کپڑوں کی تلاشی لی مگر اس کی کسی جیب میں کچھ بھی نہیں تھا۔

دوسری لاش کی میں نے تلاشی لی مگر وہ اپنی شناخت کی کوئی نشانی ساتھ نہیں لائے تھے۔ کسی کی انگلی میں انگوٹھی یا کلائی میں گھڑی تک نہ تھی۔ باقی دو لاشیں کچی سڑک کے دوسری جانب تھیں مگر غالب ان کی جامہ تلاشی سے پہلے ہی فارغ ہو چکا تھا۔

"ان کے پاس کوئی جیپ تھی" میں نے کہا "جو خراب ہوگئی تھی۔"

"چل کے دیکھ لیتے ہیں" غالب نے کہا "شاید ٹھیک ہوجائے۔"

"یہ حیرانی کی بات نہیں ہے کہ اتنی دیر میں اس طرف سے کسی کا گزر نہیں ہوا۔" میں غالب کے ساتھ چلنے لگا۔

"فرشتۂ اجل چار مرتبہ گزرا تھا۔ دنیاوی ٹریفک کے لیے راستہ بلاک تھا۔" غالب بولا "اس راستے پر مجھے آسیب کا اثر محسوس ہوتا ہے۔ ان کی جیپ کو بھی یہاں آکے خراب ہونا تھا۔"

"میرے سر کے بیچ میں گومڑ نکل رہا ہے" میں نے کہا۔

"دونوں طرف نکلتا تو کہا جاسکتا تھا کہ گدھے کے سر پر سینگ۔"

"میری حِس مزاح مرچکی ہے۔" میں نے کہا "تھکن اور بھوک سے میں خود مرنے والا ہوں۔ تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے۔ اتنے کشت و خون کے باوجود۔"

"میں کچی گندم کھا رہا تھا۔ بڑے مزے کی ہوتی ہے" غالب نے کہا۔

"بڑی فراغت حاصل تھی تمہیں!"

"ہاں۔ میں نے کہا کہ پریشان ہو کے اِدھر اُدھر دوڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ خود ہی آجائیں گے سامنے۔"

"تم تو کھیت چر رہے تھے۔ وہ سامنے آئے بغیر ہی تمہیں ماردیتے پھر؟"

"کیسے ماردیتے یار۔ میری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور کان کُھلے ہوئے تھے۔ اندازہ تھا کہ وہ کہاں ہیں۔"

"مرزا جی۔" میں نے چلا کے کہا۔

غالب اُچھل پڑا "کیا ہوا۔ کیا کوئی مُردہ آرہا ہے تعاقب میں دوڑتا ہوا۔"

"جیپ" میں نے ہاتھ سے دائیں طرف اشارہ کیا۔

جیپ کو انہوں نے ایک کھنڈر کے پیچھے کھڑا کردیا تھا۔ یہ شاید کبھی کسی کا کچا گھروندا ہوگا جو بارش یا سیلاب میں گر گیا تھا۔ اس کی ایک دیوار باقی رہ گئی تھی۔ ہمارے پیچھے آنے والوں نے عقلمندی یہ کی تھی کہ جیپ کو راستے میں نہیں چھوڑا تھا۔ وہ چار تھے اور ایک جیپ کو دھکا لگا کے سڑک سے دور لے جاسکتے تھے۔ وہاں کھیت کی منڈیر بھی نہیں تھی۔ ایک مٹی دھول کا میدان سا تھا۔

میں نے جیپ کا معائنہ کیا مگر اس کی خرابی کو سمجھنا مشکل تھا۔ چابی لگانے کے باوجود انجن ٹھس رہتا تھا۔ میں نے بیٹری کے پول چیک کیے اور کوائل کے تار دیکھے۔ کنڈنسر کا کنکشن دیکھا۔

غالب نے کہا "مستری صاحب 'لعنت بھیجو اس پر' یہ دیکھو۔"

ہر جیپ کی طرح اس کے پیچھے بھی دس لیٹر پیٹرول کا جیری کین موجود تھا۔ غالب نے اسے کھول کے نکال لیا تھا۔ "اپنا کام اس سے چل جائے گا۔"

"یہ تو ایسا لگتا ہے کہ سب دستِ غیب کا انتظام ہے" میں نے کہا۔

"ان بے چاروں کے لیے تو کہا جائے گا کہ موت انہیں یہاں کھینچ لائی تھی۔ ہمارے لیے جیپ کی خرابی تائید ایزدی بن گئی۔ اس کی جگہ کار ہوتی تو مسئلہ پھر وہی ہوتا کہ اس میں سے پیٹرول کیسے نکالیں اور کس چیز میں نکالیں۔ بھرا ہوا جیری کین پورے دس لیٹر کا۔ ہمیں جیپ بنانے والے کی مغفرت کی دعا تو کرنی چاہیے۔"

"نہیں۔ ہم جیری کین بنانے والے کے ممنون ہیں" میں نے واپسی میں کہا۔

"نہیں۔ ہم اس میں پیٹرول بھرنے والے کا شکریہ ادا کرسکتے ہیں۔"

"نہیں۔ جس نے پیٹرول ایجاد کیا' یا نکالا۔"

"نہیں۔ جس نے پیٹرول انجن بنایا۔"

"مختصراً تعریف اس خدا کی جس نے جہاں بنایا۔"

ہم بڑے اچھے موڈ میں تھے۔ میرے سر میں درد تھا لیکن میں دلاور کو نیچا دکھا کے اور اس کا حساب برابر کر کے خوش تھا۔ غالب ایسے ہی سدا خوش رہنے والا قلندر تھا۔ وقت آدمی کو اندر سے اور باہر سے کیسے تبدیل کرتا ہے اس کا اندازہ نہیں ہوتا مگر کبھی آدمی اپنے بہت پُرانے وقت کے ساتھ اپنا موازنہ کرے تو حیران رہ جاتا کہ اچھا! وہ بھی میں تھا اور وہ میری ہی زندگی تھی؟

حالات کی ایک حوصلہ شکن راہ گزر پر چلتے چلتے میرا اور محسن کا ساتھ چھوٹ گیا تھا اور اب محسن کی جگہ غالب نے لے لی تھی۔ زندگی کے حادثات نے سب سے زیادہ محسن کو تباہ کیا تھا۔ پہلے اس کی ماں کینسر سے مرگئی تھی پھر باپ جو وزارتِ خارجہ میں ڈپٹی سیکریٹری تھا ریٹائرمنٹ لیتے ہی زندگی سے بھی ریٹائر ہوگیا تھا۔ فوزیہ کی رخصتی بڑے المناک حالات میں ہوئی تھی' یہ سوچ کے مجھے آج بھی شرم آتی تھی کہ میں نے جوانی کے جذبات کی یلغار میں اس کے ساتھ جتنے عہد و پیمان کیے تھے وہ میں نے لندن میں قیام کے دوران نہیں بُھلائے تھے مگر رابعہ سے ملتے ہی میں فوزیہ کو ایسے بھول گیا تھا جیسے اس نام کی کسی لڑکی سے میرا کبھی جذباتی تعلق نہ تھا حالانکہ یہ تعلق کئی سالوں پر محیط تھا اور غیر سرکاری طور پر یہ طے شدہ بات تھی کہ مجھے اس کا جیون ساتھی بننا ہے۔ فوزیہ کے والدین نے بھی یہ صدمہ اتنی ہی خندہ پیشانی سے برداشت کیا تھا جتنی عالی ظرفی کے ساتھ محسن نے مجھے معاف کردیا تھا۔ فوزیہ اس کی بہن تھی اور میں اس کا دوست تھا۔ اس نے دوستی کی لاج رکھی۔ فوزیہ کو یہ دکھ اٹھانا ہی تھا۔ وہ خاموشی سے اپنا غم اپنے دل میں چھپائے شوہر کے گھر چلی گئی تھی اور اس نے مجھے بھلا بھی دیا تھا مگر میں آج بھی احساسِ جرم سے دامن نہیں چھڑا سکا تھا۔ محسن کی زندگی میرے ساتھ دوستی کی ہر آزمائش سے گزری تھی۔ یہاں تک کہ اس نے شہلا سے محبت اور پھر شادی کی تب بھی میرا ساتھ نہیں چھوڑا یہاں تک کہ انتظار کرتے کرتے اس کی بیوی اور اس کا بیٹا بھی میرے دشمنوں کی بھینٹ چڑھ گئے۔ محسن نے اپنے بیٹے کے دنیا میں آنے کی خوشخبری ضرور سُنی تھی مگر اس کے واپس دوسرے جہان میں جاتے وقت تک باپ بیٹا آمنے سامنے نہ ہوپائے تھے۔

ان سب حالات نے محسن کو اندر سے توڑ پھوڑ کے رکھ دیا تھا۔ وہ درمیان میں ذہنی مریض بھی بن گیا تھا لیکن قسمت اچھی تھی کہ اسے گل نے سنبھال لیا۔ ڈاکو شیش ناگ کی ڈاکو بن ناگ نے گل بانو بنتے ہی محسن کی محبت کو دل میں بسا لیا تھا۔ اس وقت شہلا زندہ تھی مگر وہ سب سے اور انجام سے بے نیاز اپنی محبت کی پرورش کرتی رہی اور یہی محبت اب محسن کی رفاقت اور محافظت کررہی تھی۔ سہارے کی ضرورت گل بانو کو بھی تھی۔ موقع ملتے ہی وہ محسن کو ہم سب سے چھین کے لے گئی تھی۔ اسے اچھی طرح معلوم ہوگا کہ محسن ہمارے ساتھ رہے گا تو کبھی پوری طرح اس کا نہیں ہوگا اور عورت اپنے شوہر میں کسی کی شراکت منظور نہیں کرسکتی۔ نہ اس کے ماں باپ کی' نہ بچپن کے دوستوں کی' کسی دوسری عورت کا تو سوال ہی کیا۔ وہ ان سب سے جلتی ہے جو اس کے شوہر کے وقت یا اس کے خیالات اور جذبات کے کچھ حصے پر قابض ہونے کی کوشش کریں۔ پُرانا شوخ کھلنڈرا بے فکر محسن حادثات کی مار سے مرگیا تھا۔ اب اس کی جگہ صرف گل کا شوہر رہ گیا تھا۔

محسن کے خلا کو غالب نے پُر کیا تھا۔ کبھی جو محسن تھا وہ آج غالب کا ہی روپ محسوس ہوتا تھا۔ خود میں کتنا بدل گیا تھا اس کا اندازہ میرے رویے اور معمولات کے فرق کو دیکھ کے ہوتا تھا۔ خوش رہنے کی کوشش میں آج بھی کرتا تھا مگر بے فکری کی زندگی خوابِ فردا ہوگئی تھی۔ ایک زمانہ تھا کہ میں اور محسن گورے لڑکوں کے خلاف اعلانِ جہاد کرتے تھے تو نوبت زیادہ سے زیادہ مُکے بازی تک آتی تھی اور ہم سُوجی ہوئی ناک یا آنکھ کے ساتھ ماردھاڑ کرکے آتے تھے تو اگلے دن بھول جاتے تھے۔ کسی سے دشمنی کا مسئلہ نہیں تھا لیکن اب میں اشتہاری مجرم اور قاتل تھا۔ قطع نظر اس سے کہ جتنے مقدمات میرے خلاف درج تھے سب ذاتی عناد کا نتیجہ تھے اور جھوٹ پر مبنی تھے۔ میں ایک طویل جنگ کے دوران ان گنت لوگوں کو خود اپنے ہاتھوں سے مار چکا تھا اور بہت سے لوگ میری وجہ سے یا میری خاطر مارے گئے تھے۔ ان میں استاد ٹیڈی جیسے پیارے دوست بھی شامل تھے اور شہلا جیسی معصوم لڑکی بھی۔ ابھی ابھی میں نے دو افراد کو مار دیا تھا جو میری جان کے درپے تھے۔ ان کی لاشوں کو الٹتے پلٹتے مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا اور میری یہ بے حسی تلخیٔ حالات کا نتیجہ تھی۔

میں کتنا بدل گیا تھا۔ اس کا اندازہ صرف میں کرسکتا تھا جس کی یادوں کے البم میں پُرانی معصوم تصویریں بھی تھیں اور آج کی سفاک خونی تصویریں بھی۔ کبھی میرے خوابوں' خیالوں کی دھند سے پُرانا سکندر بخت نکل آتا تھا تو وہ مجھے حیرت سے دیکھتا تھا اور میں اسے۔ ہم ایک دوسرے سے اتنے دور اور اجنبی ہوتے جارہے تھے جیسے بچپن اور عہد طفولیت کی تصویر جوانی میں بالکل نا آشنا لگتی ہے اور بڑھاپے میں جوانی کسی اور کی لگتی ہے۔

خیالات کی یہ فلم کسی بھی وقت میرے دماغ میں چند منٹ چلتی تھی تو یادوں کے سیکڑوں عکس گزر جاتے تھے۔ جیسے فلم کے پروجیکٹر میں سے ایک منٹ میں گزرنے والے سیکڑوں فریم جو الگ الگ ساکت محسوس ہوں مگر مل کے جیتی جاگتی زندگی نظر آئیں۔

غالب نے کہا "سوچ کا دورہ پڑا ہے بھائی؟"

میں نے مسکرا کے کہا "جس کے پاس دماغ ہوگا وہی تو سوچے گا۔ بقولِ شاعر۔ وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے۔"

غالب نے کہا "برائے مہربانی مکالمات لایعنی سے احتراز اور

تضیع اوقات سے گریز فرماتے ہوئے قفلِ دہانہ ذخیرۂ توانائی برائے حرکتِ مشینِ مواصلات وا کیجئے۔"

میں بھونچکا رہ گیا اور پھر قہقہہ مار کے ہنس پڑا "واہ واہ۔ کیا روانی ہے۔ بے اختیار استاد عاشق علی تڑپ مرحوم و مغفور یاد آگئے۔ وہ بتا دیتے اس کا مطلب بھی اور یہ بھی کہ گرامر غلط تھی۔"

"گرامر کا تو مجھے پتا نہیں..... اردو صحیح تھی اور مطلب صرف یہ تھا کہ پیٹرول ٹینک کا ڈھکنا کھولیے۔"

مجھے پھر ہنسی آئی "واہ۔ موٹر کا ترجمہ۔ مشینِ مواصلات اور پیٹرول کا ذخیرۂ توانائی۔" میں نے چابی سے ڈھکنا کھولا۔

"کیا غلط ہے اس میں؟ یہ ایندھن ہے اور ایندھن ہوتا ہے ذخیرۂ توانائی۔ مواصلات کہتے ہیں ٹرانسپورٹ کو۔ وزیرِ مواصلات کی طرح مشینِ مواصلات بھی ٹھیک ہے۔"

اس وقت تین بجے تھے جب ہم اپنے پیچھے کھیتوں میں چار لاوارث لاشیں چھوڑ کے پھر روانہ ہوئے۔ معلوم نہیں گرد و نواح کے لوگوں نے فائرنگ کی آوازیں سُن کے کیا سمجھا تھا۔ پولیس اور چوروں کا مقابلہ ہے یا شکاری پرندوں کا شکار کر رہے ہیں۔ قریب آ کے صورتِ حال کا جائزہ لینے کی ہمت کسی نے نہیں کی تھی۔ شاید عمداً وہ دور رہے تھے اور ادھر سے کوئی گزرا بھی نہیں تھا۔ بعد میں جب انہیں گندم کے کھیتوں میں لاشیں ملیں گی تو وہ کیا کریں گے؟ میں نے اوپر آسمان کی بلندی پر چکر لگانے والے گدھوں اور چیلوں کو دیکھ کے سوچا۔ کیا واقعی یہ گدھ لاشوں پر منڈلا رہے ہیں اور کوئی نہ آیا تو وہ اپنے شکاری پنجے اور مُردار خور منحوس چونچ کے ساتھ لاشوں کا گوشت اُدھیڑنے آجائیں گے؟ موت سے کسی کو رستگاری ہے مگر یہ بھی کیا موت ہے؟ زندگی کی طرح موت بھی انداز جدا رکھتی ہے۔ جو شہید ہیں وہ کبھی نہیں مرتے۔ کچھ اس شان سے مرتے ہیں کہ انسانیت کو اشکبار چھوڑ جاتے ہیں یا پوری قوم کو۔ انہیں کبھی زمانہ روتا ہے، کبھی ایک ملک شہر یا خاندان۔ کچھ گمنام مر جاتے ہیں۔ یوں کہ اُمید رکھنے والے بھی ان کی واپسی کا انتظار کرتے کرتے دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ اور کچھ ایسے مرتے ہیں جیسے یہ چار مرے۔ کہ مارنے آئے تھے اور اپنی زندگی کی قیمت وصول کرنے سے پہلے ہی اس انجام کو پہنچے جو منطقی تھا اور متوقع تھا۔ رزقِ خاک تو سب ہوتے ہیں۔ اشرف المخلوقات، جب حشرات الارض اور مُردار خوروں کا رزق بنتے ہیں تو ان کی لاش پر شیطان رقص کرتا ہے کہ اے بنی آدم، دیکھ میں نے تجھے گمراہ کر کے کس انجام کو پہنچا دیا۔

مزید آدھے گھنٹے کی مسافت کے بعد جب میری جسمانی توانائی تقریباً تمام ہو چکی تھی، ہم ایک سڑک پر پہنچ گئے اور مجھے سڑک کے آغاز میں ہی ایک کیفے ڈی پھونس دیکھ کے وہی مسرت حاصل ہوئی جو صحرا کے پیاسے مسافر کو پانی کا کنواں دیکھ کے ملتی ہوگی۔

میری اور غالب کی حالت ایسی ہو رہی تھی جیسے ہم دوسری جنگِ عظیم کے اپنی بٹالین سے بچھڑے ہوئے سپاہی ہوں۔ ہم نے پہلے دو دو گلاس پانی کے پیے۔ پھر دو دو کپ چائے کے انڈیلے اور یہ بالکل نہیں دیکھا کہ وہ چائے کیسی ہے۔ اس دودھ شکر کے اُبلے آمیزے میں شیزان کی لذت تھی۔ وہاں موجود چند لوگوں نے اور خود کیفے ڈی پھونس کے پروپرائٹر نے ہماری ہیئت کذائی پر خاصی حیرانی کا اظہار کیا مگر ہماری کاریں دیکھتے ہوئے ہمیں مشکوک نہیں سمجھا۔

میرا دل تو کھانا کھانے پر بھی مائل تھا اور تنور کی گرم روٹی کی سوندھی خوشبو کے ساتھ تڑکے والی دال کھانے والوں کو دیکھ کے میرے منہ میں پانی آرہا تھا مگر غالب نے مجھے رابعہ کی یاد دلا کے شرمندہ کرنے کی کوشش کی۔

"پتا نہیں وہ کتنی فکر مند ہوگی۔ تمہیں کھانے کی پڑی ہے!"

میں نے کہا "برادر۔ بڑا حقیقت پسندانہ خیال ہے۔ جدوں پیٹ نہ پیاں روٹیاں۔ فیر سبھے گلاں کھوٹیاں۔ (جب پیٹ میں روٹی نہ ہو تو ساری باتیں جھوٹی) اور بہت پہلے فارسی میں بھی اعتراف کیا گیا تھا کہ اس سال دمشق میں ایسا قحط پڑا کہ لوگ عشق تک بھول گئے۔"

"اچھا اب میں جاتا ہوں اپنے اصطبل کی جانب۔ شام کو کہیں ملو گے؟"

میں نے سوچ کے کہا "مل سکتا ہوں۔ بشرطیکہ آج کے بارے میں تم کسی کو کچھ نہ بتاؤ۔"

"تازو کسی میں شامل نہیں ہے۔"

"ظاہر ہے مرزا جی۔ مجھ میں تو اور تجھ میں 'میں'۔ تمہارا اور تازو کا معاملہ الگ نہیں ہے۔" میں نے کہا "مجھے بہت سے مسائل درپیش ہیں۔ میں رابعہ کو فون کر کے کہتا ہوں کہ وہ تمہارے آفس میں ہے تو نیچے آجائے اور جیسے ہی وقار کی گاڑی دیکھے، سوال کئے بغیر بیٹھ جائے۔ اس کے بعد مجھے اپنا حُلیہ درست کرنا ہوگا۔"

"کسی ہوٹل میں مت جانا۔ دلاور کو بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ اس کی فوج کا کوئی سپاہی نہیں لوٹ کے آیا۔ وہ تو پاگل ہو جائے گا۔"

"تمہارے منہ میں گھی شکر۔ کاش ایسا ہی ہو۔ میں سارے شہر کو پارٹی دوں گا۔" میں نے کہا۔

"رسوا کن شکست کے دُہرے عذاب نے اس کے انتقام کی آگ پر تیل چھڑک دیا ہوگا۔"

"یہ صحیح علاج ہے اس کا۔ تیل کیا پیٹرول اور اسپرٹ چھڑکنی چاہیے اس آگ پر۔ ایک دن اپنی ہی آگ میں جل کے راکھ ہو جائے گا حرام زادہ۔ اگر میرے ہاتھوں مارا نہ گیا۔"

ہم کچھ دور آگے پیچھے چلتے گئے پھر لاہور کی مصروف ترین سڑکوں پر ہمارے راستے جدا ہو گئے۔ میں نے ایک اسپتال کے شعبۂ حادثات کا فون استعمال کرتے ہوئے رابعہ سے رابطہ قائم کیا۔ وہ

سخت غصے میں تھی۔ میری آواز سُنتے ہی اس نے گرجنا برسنا شروع کیا۔

"شور مت کرو" میں نے کہا "فوراً نیچے آجاؤ۔ اسی وقت" اور فون بند کر دیا۔ یقیناً اس نے بعد میں بھی بہت کچھ کہا ہوگا اور میری ڈھٹائی پر مزید مشتعل ہوئی ہوگی لیکن شعبۂ حادثات سے رومانٹک گفتگو نہیں ہو سکتی تھی اور اسے منانے کے لیے اس کی تلخ ترش سُن کے اپنی صفائی پیش کرنے کا وقت نہیں تھا۔ موقع محل کے اعتبار سے بھی یہ حرکت احمقانہ ہوتی۔ میں نے فون کی اجازت دینے والے کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بھی افسردہ نظر آنے کی کوشش کی۔

دس منٹ بعد میں نے رابعہ کو دور سے ہی دیکھ لیا۔ وہ ایک جوس والے کی ریڑھی سے فالسے کے سیاہ جامنی مشروب کا گلاس پی رہی تھی۔ میں نے گاڑی اس کے قریب روکی تو جوس لگانے والے نے باری باری مجھے اور پھر رابعہ کو دیکھا اور غالباً اس نتیجے پر پہنچا کہ ایسے پُراسرار طور پر نمودار ہونے والی گاڑی میں ایک مشتبہ نظر آنے والے نوجوان کے ساتھ بِن بُلائے بیٹھ جانے والی شریف لڑکی نہیں ہو سکتی۔

میں نے کہا "تم کیا افسوسناک مائع پی رہی تھیں؟"

"جی تو چاہتا ہے تمہارا خون پی جاؤں۔ سارا دن کمینے لوگ چائے پلاتے رہے۔ کسی کو توفیق نہیں ہوئی کہ کھانے کو پوچھ لیتا۔"

میں نے کہا "کیا تم نے دیکھا کہ کسی نے اپنے لیے کھانا منگوایا تھا؟"

"نہیں۔ چائے چائے اور بس چائے۔ سگریٹ کے دُھوئیں کے ساتھ۔ سارا دن..... کھانا کچھ نہیں۔"

میں نے کہا "اور پھر ساری رات۔ پاکستان کا غریب صحافی صرف قوم کا غم کھا سکتا ہے۔ ویسے بکثرت سگریٹ اور چائے پینا دانشور ہونے کی دلیل ہے۔ خبریں تو تازہ ترین ملتی رہی ہوں گی۔"

"ہاں۔ نہیں ملی تو ایک تمہاری خبر نہیں ملی۔"

"میں تو ڈر رہا تھا کہ تم اچھی طرح خبر لو گی لیکن تم غصے میں نہیں ہو۔ تمہاری فطرت میں یہ انقلاب..."

"جب تم نے فون کیا تھا تو میں غصے کا بم بنی ہوئی تھی۔ نکل گیا اس وقت سارا غصہ......"

میں نے دانت نکالتے ہوئے کہا "نوّے فیصد ضائع ہو گیا۔"

"تم نے اپنی یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟"

میں نے دل پر ہاتھ رکھ کے آہ بھری "کاش تم نے اصل مجنوں کو دیکھا ہوتا۔ میں تو اس کا چربہ ہوں۔ دو نمبر۔ تم یہ گومڑ دیکھ رہی ہو۔ مجنوں سمجھ کے پتھر مارے تھے لوگوں نے۔ اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا۔"

"سیدھی طرح بتاؤ سارا دن کیسے لگ گیا۔ میں بہت پریشان تھی۔"

میں نے کہا "یہ بڑی درد بھری، آنسو بھری کہانی ہے میری رس بھری۔" میں نے آواز میں رقت پیدا کی "ابھی سنانے لگا تو ساون کی جھڑی لگ جائے گی اور میرے وائپر خراب ہیں۔ پہلے یہ سوچ لوں کہ جاؤں کدھر کو میں... سیدھی راہ چلتا ہوں تو گھوم کے پھر یہیں آجاؤں گا۔ دنیا گول ہے، اور کیسی عجیب بات ہے رابعہ کہ اس شہر میں جو ہمارا شہر تھا اور جہاں ہمارا گھر تھا۔ اب ہم سر چھپانے کا ٹھکانا تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ اتنے دوست ہیں سب کے گھروں کے دروازے ہمارے لیے کھلے ہوئے ہیں لیکن ہم ان سے دشمنی نہیں کر سکتے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔ ہم جہاں جائیں گے تباہی ساتھ لے جائیں گے۔ چلو ایک دن کسی ہوٹل میں گزاریں، پھر سوچیں گے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "آج حالات نے نیا رخ اختیار کر لیا ہے، اگلے دو تین دن میں وہ سارے چھوٹے بڑے ہوٹل چھان ماریں گے۔"

"ایک طریقہ اور ہے" اس نے اخبار اپنے سامنے پھیلا لیا "یہ آج کا نہیں، آنے والے کل کا اخبار ہے۔"

"تم وقت سے آگے جا رہی ہو۔"

"میگزین اور چھوٹے اشتہارات کا صفحہ ایک دن پہلے چھپ کے آجاتا ہے۔ میں نے ایسے ہی اُٹھا لیا تھا" رابعہ بولی "اس میں کرائے کے لیے خالی مکانوں کے بہت سے اشتہار ہیں۔"

"ویری گڈ۔ غور سے دیکھو اور مجھے بتاؤ کہ ہمارے شایانِ شان کوئی محل ہے؟"

"یہ سارے مکان ابھی اُٹھے نہیں ہوں گے۔ کل اخبار آئے گا تو ضرورت مند جائیں گے۔ ہم آج ہی بات کر سکتے ہیں۔"

"مالکِ مکان پوچھے گا نہیں کہ غیب کا علم کہاں سے حاصل کیا آپ نے؟"

"ایسی کوئی بات نہیں۔ اخبار جہاں چھپتا ہے وہاں سب پہلے دیکھتے ہیں۔ اپنے کسی عزیز دوست کو ضرورت ہو تو بتا دیتے ہیں۔ یہ ایک مکان ہے رائل پارک میں۔"

"لوگ تمہیں بھی فلم اسٹار سمجھیں گے اور مجھے ہیرو۔"

"وہاں سب شریف لوگ رہتے ہیں۔ یہ مکان ہے مختصر فیملی کے لیے۔"

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "پھر تو ہمارے لیے نہیں ہے۔"

"کیوں نہیں ہے؟"

"اس لیے کہ ہم تو فیملی میں نہیں ہیں۔ اس کے لیے کم سے کم ایک شوہر اور اس کی زیادہ سے زیادہ چار بیویوں کا ہونا ضروری ہے۔ میری تو ایک بھی نہیں۔" میں نے روتے لہجے میں کہا "آہ قسمت۔"

رابعہ مسکرائی "ہم کہہ سکتے ہیں کہ..... ایک فیملی ہیں ہم۔"

"مجھے تو بہت شرم آئے گی جھوٹ بولتے ہوئے۔ تم بے شرم ہو۔ کہہ دینا یہ میرا میاں ہے" میں نے شرما کے کہا "میں اس کی بیوی ہوں' جھوٹ کا سارا عذاب مجھے کیوں ہو۔"

"یہ بھی کہہ دوں گی بابا؟" رابعہ ہنسی۔

"بابا.... اتنا فرق تو نہیں ہے میری تمہاری عمر میں۔ اور خبطی ہوا کوئی پھر! وہ کہے گا نکاح نامہ نکالو اور ضمانت مانگے گا کہ فیملی آئندہ بھی مختصر رہے گی۔"

رابعہ نے اخبار میرے منہ پر ماردیا "خبطی اور جھکی تم ہو۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا "بھئی یہ تو بنیادی شرط ہے مکان حاصل کرنے والوں کے لیے۔ خیر میں وعدہ کرسکتا ہوں کہ فیملی مختصر رہے گی۔ دیکھونا منظر کے نقشِ قدم پر چلنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔"

"میں کچھ نہیں سُن رہی ہوں" رابعہ باہر دیکھنے لگی۔

میں نے اسے پریشان کرنا جاری رکھا "دیکھونا۔ بلاوجہ خفا ہو تم مجھ سے۔ یہ سب، تو تم پر منحصر ہے۔ تمہیں مختصر فیملی پسند نہیں تو...."

"مت تنگ کرو مجھے۔ میں رونے لگوں گی تو دماغ درست ہوجائے گا۔"

"تم غلط سمجھ رہی ہو۔ مالکِ مکان کا مطلب یہ ہوگا کہ کرائے دار پہلوان اور پہلوانی نہ ہوں۔ ابھی تو ہم دونوں ہی مختصر ہیں۔ وعدہ کرسکتے ہیں کہ آئندہ وزن اور گھٹالیں گے۔ کیا پتا اس کی چھت کمزور ہو یا دروازے چھوٹے ہوں۔ یا اس نے سوچا ہو کہ مختصر لوگ ہوں گے تو مکان خالی کرانا آسان ہوگا۔ لوٹے کی طرح اُٹھا کے باہر پھینک دوں گا۔ کرائے دار اڑجاتے ہیں بعض اوقات۔ ساڑھے تین من کا کرائے دار ہو اور ساڑھے چار کی کرائے دارنی تو۔"

رابعہ ہنس پڑی "سیدھی طرح چلو رائل پارک۔"

میں بھی ڈرائیونگ سے تھک گیا تھا اور فوری طور پر مجھے غسل کے بعد کپڑے بدلنے کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ وعدہ خلافی کرتے ہوئے میں رابعہ کے ساتھ اخبار کے دفتر سے غائب ہوگیا تھا اور اب غالب اس وقت تک مجھے تلاش نہیں کرسکتا تھا جب تک میں اس کو اپنا نیا ٹھکانا نہ بتاؤں۔ مجھے دلاور سے بھی بات کرنی تھی مگر اس کی مجھے جلدی نہیں تھی۔ زیادہ مناسب یہ تھا کہ اسے پریشان اور مشتعل رہنے دیا جائے اور دیوانہ وار بھٹکنے دیا جائے۔ وہ اپنے شکاری کتوں اور اپنے حکم کے غلاموں پر چیخے چلائے کہ تم سب ناکارہ اور حرام خور ہو۔ ابھی تک اس کا پتا نہیں چلا سکے۔ اس نے چار بھروسے کے آدمی ماردیئے۔ کیا پتا وہ پیذرو نمک حرام اس کے ساتھ مل گیا ہو۔ جاؤ' دیکھو' اسے تلاش کرو۔ اس کے سارے ٹھکانے اور تمام ہوٹل دیکھو۔

رائل پارک کا وہ مکان ہماری ضروریات کے عین مطابق بڑی گمنام اور عام سی بلڈنگ کا ایک حصہ تھا۔ تیسری منزل پر دو کمرے اور دیگر خانے۔ خود مالکِ مکان سب سے نیچے مقیم اپنی دو بیویوں کے ساتھ بھی خوش و خرم زندگی نہیں گزار رہے تھے۔ گھر سے زیادہ ان کے دل میں مزید دو کی گنجائش اور ہوس تھی۔ وہ خاصا ٹھرکی بندہ تھا۔ اس نے رابعہ کو بھی ایسی للچائی نظروں سے دیکھا کہ میرا خون حقیقی غیرت مند شوہر کی طرح شوں شوں کرکے اُبلنے لگا لیکن مذاکرات خود رابعہ کررہی تھی چنانچہ میں اس خون کے گھونٹ پیتا رہا۔ اوپر کی دو منزلوں کے متعلق مالکِ مکان نے یقین دلایا کہ بڑے ہی شریف لوگ رہتے ہیں۔ یہ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ایک نمبر کا جھوٹا تھا۔ اوپر بھی اس نے مختصر فیملی کے نام پر بڑے غلط قسم کے لوگ آباد کر رکھے تھے۔ کچھ گھروں سے بھاگ کر فلموں میں کام کرنے کی خواہش مند لڑکیاں تھیں جو دلالوں کے ہتھے چڑھ جاتی تھیں۔ ایک کرسچن لڑکا تھا جس نے کسی ہندو لڑکی سے شادی کی پھر دونوں مسلمان ہوگئے تھے محض اپنی جان بچانے کے لیے اور چھپ کے رہ رہے تھے۔

ان سب باتوں کا پتا فوراً نہیں چل سکتا تھا۔ مالک مکان نے کرایہ وصول کیا اور چابی مجھے تھماتے ہوئے آنکھ ماری "جاؤ عیش کرو۔"

میرا چہرہ گرم ہوگیا "تمہاری یہ آنکھ خراب ہے کیا؟ ادھر چہرہ ذرا روشنی کی طرف کرو۔ میں آنکھوں کا ڈاکٹر ہوں۔"

وہ گھبرا گیا "وہ.... میں سُرمہ ڈالتا ہوں۔ اصلی ممیرے کا۔"

میں نے کہا "اس سے کام نہیں چلے گا۔ میں آئی ڈراپس دوں گا۔ تمہاری اس آنکھ میں تو کالا پانی اُترنے والا تھا۔ دوسری آنکھ کا پانی مرگیا ہے۔"

وہ سچ مچ تشویش میں مبتلا ہوگیا "اچھا جی۔ دوائی ضرور دینا مجھے' سامان کدھر ہے آپ کا؟"

میں نے کہا "آجائے گا کل تک۔ گاڑی تمہارے دروازے پر کھڑی ہوئی ہے خیال رکھنا۔"

اوپر پہنچ کے رابعہ ہنسنے لگی "آنکھوں کا ڈاکٹر بننے کی کیا ضرورت تھی؟"

میں نے کہا "اس کی آنکھوں کا ایسا علاج کروں گا کہ دماغ درست ہوجائے گا۔ کیسے دیکھ رہا تھا تمہیں ہوسناک نظروں سے۔ خبیث نے آنکھ بھی ماری تھی مجھے۔"

"آنکھ تو مجھے بھی ماری تھی" رابعہ نے کہا۔

"اچھا! کل کے بعد آنکھیں جھپکانا بھول جائے گا" میں نے کہا۔

کمرے پُرانی وضع کے تھے۔ اونچی چھت اور لکڑی کے شہتیروں والے۔ سال خوردہ دیواروں پر جو سفیدی باقی تھی اس پر ہم سے پہلے رہنے والوں نے مصوری کے وہ شہکار تخلیق کرنے کی کوشش کی تھی جو کبھی پنڈت کو کارام کے ممنوعہ لٹریچر میں نظر آجاتے تھے۔ رابعہ کی تو حالت غیر ہوگئی۔ میں نے اسے تسلی دی کہ جب تک میں دیواروں پر نیا وال پیپر لا کے نہ لگادوں وہ صرف میری طرف دیکھے۔ پاکیزہ محبت کی نظر سے۔

کپڑوں کے سوٹ کیس میں اُٹھا لایا تھا۔ اسلحہ ابھی گاڑی میں ہی تھا۔ سب سے خطرناک چیز مشین گن تھی۔ اسے اخبارات میں لپیٹ کر ڈِکی میں ڈالنے کا فیصلہ میں نے رات تک مؤخر کردیا اور خود غسل کرنے چلا گیا۔ کپڑے بدلنے کے بعد میں نے واحد غسل خانہ رابعہ کے حوالے کیا اور خود نیچے اُتر گیا۔ آدھے گھنٹے بعد میں بستر اور چارپائیاں خرید لایا۔ ایک مزدور نے چارپائیاں اوپر پہنچادیں۔ ضرورت کا کچھ سامان خریدنا باقی تھا لیکن یہ کام اتنا ضروری نہیں تھا جتنا شب بسری کے بنیادی لوازمات کا حصول۔

میں اب بہت پُرسکون تھا اور ذہنی طور پر تمام ترجیحات کا تعین بھی کرچکا تھا۔ رابعہ نے بھی کپڑے بدل لیے تو میں نے اسے کھانے کی دعوت دی۔

"نیچے اُتر کے "کنگ سرکل" تک چلتے ہیں' لکشمی چوک...."

"لکشمی چوک.... ہرگز نہیں۔"

میں نے کہا "اچھا' کیری ہوم چلیں۔ بیڈن روڈ تک۔"

"کیوں بلاوجہ ایسی جگہ جانے کا رسک لیتے ہو۔ ایک طرف چھپنے کا مسئلہ ہے تو دوسری طرف شوق ہے رونمائی کا۔"

"پھر کیا کروں۔ فاقہ تو مجھ سے ہوگا نہیں۔ اور کچن میں کھانے کے لیے صرف دھول ہے یا مکڑی کے جالے ہیں" میں نے چڑ کے کہا۔

"کل سب انتظام کرلیں گے۔ ابھی پیٹ بھرنے کے لیے قریب سے جو ملے' لے آؤ۔ آرام سے بیٹھ کے باتیں کریں گے ہم" اس نے مجھے پیار سے سمجھایا۔

میں سمجھ گیا۔ جو بات عورت ضد کرکے دو دن میں منواتی ہے وہ پیار سے دو منٹ میں منواسکتی ہے۔ جو عورتیں اڑیل ٹٹو کی طرح مرد کی نفسیات کے اس نکتے کو سمجھتی ہیں وہ فائدے میں رہتی ہیں اور انگریزوں کا یہ قول اس کی صداقت کا ثبوت ہے کہ جو عورت گلوم بن کے رہے وہی مرد پر حکومت کرتی ہے۔ اس کے برعکس عورت کی کمزوری ہے تعریف اور خوشامد۔ ازدواجی جھگڑے وہیں زیادہ ہوتے ہیں جہاں میاں بیوی ایک دوسرے کی فطرت کے بنیادی تقاضوں کو سمجھنے سے قاصر ہوں۔

میں پھر نیچے گیا تو کھانے پینے کا بہت سا سامان خرید لایا۔ رابعہ خفا ہونے لگی "ہم اس کا چوتھائی بھی نہیں کھاسکتے۔ باقی کا کیا ہوگا؟"

میں نے بڑی شان سے کہا "خادمہ سے کہو فریج میں رکھ دے۔ خراب نہیں ہوگا۔"

"فریج ہوتا تو میں تمہیں رکھ دیتی اس میں۔ تم خراب ہوتے جارہے ہو۔" رابعہ مسکرانے لگی۔

"پھر نکاح کے وقت مجھے منجمد حالات میں نکالا جاتا اور قاضی کے سامنے رکھ دیا جاتا۔ شبِ عروسی مجھے اُبالا جاتا قابلِ استعمال بنانے کے لیے۔"

رابعہ نے کھانا چارپائی پر پھیلادیا "تمہارے جانے کے بعد ایک لڑکی آئی تھی۔"

"کیسی تھی؟ میرا مطلب ہے کیوں؟"

"مجھ سے پوچھ رہی تھی آپ نیلو ہیں" رابعہ نے کچھ شرما کے کہا۔

"اس کی نظر اتنی کمزور تھی۔" میں نے تشویش سے کہا "تم نے بتادیا اسے کہ میں تو پاکستان بننے سے پہلے کانن بالا کے نام سے کام کرتی تھی۔ ایک لڑکی مجھے بھی دوبار ملی' اوپر آتے جاتے۔"

"اچھا؟ کیسی تھی؟"

"بڑی بے شرم تھی" میں نے آنکھ مار کے کہا "ایسے آنکھ ماررہی تھی۔ مجھے لگتا ہے کہ اس عمارت میں آنکھ مارنے کی بیماری پھیلی ہوئی ہے۔"

"ہاں۔ تمہیں بھی لگ گئی ہے یہ بیماری۔" رابعہ نے مجھے آنکھ ماری اور پھر ہنس پڑی۔ میں بھی ہنسنے لگا۔ ایک انوکھی انمول اور بے پایاں مسرت میرے رگ وپے میں سکون اور راحت کا نشہ بن کے اترنے لگی۔ میرے ساتھ سب کچھ اچانک ہو رہا تھا۔ دو گھنٹے پہلے میں اس خلوت اور ایسے گوشۂ عافیت کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا جہاں ہم دونوں کے سوا کوئی نہ ہو۔ یہ خیال رابعہ کو آیا تھا اور اچانک وہ خوب صورت خواب ایک حقیقت بن گیا تھا جس کی تعبیر کے پیچھے ہم دیوانہ وار دوڑ رہے تھے لیکن خواب ہم سے گریزاں تھے۔ دنیائے فکروغم' اندیشہ ہائے دور و دراز۔ خوف اور وسوسے' فرشتۂ اجل کے روپ میں تعاقب کرنے والے خونی شکاری۔ ہماری زندگی کے دشمن اور ناکردہ گناہوں کی سزا دینے والے۔ سب اسی بند دروازے سے بے خبر تھے جس کے پیچھے ہم دونوں' صرف میں اور رابعہ۔ باتیں کررہے تھے اور ہنس رہے تھے۔ ایک دوسرے کو چھیڑ رہے تھے اور کاغذی دسترخوان پر سے چیزیں اُٹھا اُٹھا کے ایک دوسرے کو کھلا رہے تھے۔

کاش میں رابعہ کو ہمیشہ اتنا ہی خوش رکھ سکتا۔ وہ ایسے ہی ہنستی رہتی اور ہم کسی احساسِ جرم وگناہ کے بغیر ایک دوسرے کے ہوجاتے۔ بھول جاتے کہ وہ بہت بڑی وکیل ہے اور میں سکندر بخت..... جسے وزیر خان کے قاتلوں سے بدلہ لینا ہے اور اپنا حق حاصل کرنا ہے مگر یہ ناممکن تھا۔ کوئی ایسی غیبی قوت ہوتی جو راتوں رات یا پلک جھپکتے میں سب کچھ بدل سکتی تو یہ ہوسکتا تھا کہ میرے خلاف تمام قانونی مقدمات ختم ہوجائیں۔ دلاور اپنے سب جرائم کا اعتراف کرلے اور مجھے میرا حق دے کر خود جیل جانا قبول کرلے۔ رابعہ کو اس کا گھر مل جائے اور مجھے میرا حق۔

کمرے میں صرف ساٹھ واٹ کے ایک بلب کی روشنی تھی۔

دیوار پر نصب ٹیوب لائٹ پُرانی ہونے کی وجہ سے یا کم وولٹیج کے باعث وقفے وقفے سے بھڑکتی تھی۔ اسے میں نے بند کردیا تھا۔ روشنی رابعہ کے چہرے پر ایک رُخ سے پڑرہی تھی اور اس کے بالوں کی ایک لٹ کا سایہ چہرے پر لرزاں تھا۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟"

"تمہیں۔ اپنے ارمانوں کو۔ خوابوں کو" میں نے آہ بھر کے کہا "یہ سب تو ایک خواب ہے جو بکھر جائے گا۔"

"اگر یہ حقیقت ہوتا پھر؟"

"پھر میں خدا سے کچھ نہ مانگتا۔ اس دنیا کو اپنی جنت سمجھ کے دوبارہ بے دخل نہ ہوتا۔" میں نے کہا "دنیا میں ہر شخص اپنی جنت کا تصور الگ رکھتا ہے رابعہ۔ کسی کے لیے کار کوٹھی بنگلہ اور لامحدود دولت سے دنیا جنت ہے تو کوئی کہتا ہے۔ فراغتے وکتابے وگوشۂ تنہا۔"

"اور تمہارے لیے..؟" وہ میری آنکھوں میں جھانک کے بولی۔

"میرے لیے؟ بس میں اور تم..... اور سب کچھ ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ ملے یا نہ ملے فرق نہیں پڑتا۔"

"جھوٹ' بالکل جھوٹ۔ اگر اتنا ہی محدود ہوتا تمہارے لیے زندگی کی خوشی کا مطلب تو تم سب کچھ پالیتے۔ کیا اس وقت میں تمہارے پاس نہیں ہوں؟ مگر تمہاری خواہشات کی ایک دنیا بیچ میں ہے جسے تم چھوڑ نہیں سکتے۔"

"تم نہیں سمجھوگی... میں آج کی نہیں' آنے والے دن کی بات کررہا تھا۔ آج کا دن میرا نہیں ہے۔"

"کہتے ہیں کل کبھی نہیں آتی" رابعہ اُداس ہونے لگی۔

میں نے اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں کے پیالے میں تھام لیا "ایسا نہیں ہے جانم۔ کل کے یقین پر ہی تو دنیا قائم ہے۔ اسی کے لیے ساری جدوجہد ہے جو تم میرے ساتھ کررہی ہو۔ یہی یقین ہمارا اثاثہ ہے۔ یقین جو غم سے کریم ہے۔ یہ یقین گنوادیا ہم نے تو پھر کیا رہ جائے گا ہمارے پاس۔"

اس نے اپنا سر میرے کندھے پر رکھ دیا "میرا یقین تم ہو۔ میں خود تو بہت کمزور اور بے بس ہوں۔"

"یہ ہوسکتا ہے کل میں نہ رہوں۔"

اس نے میرے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا "تم میرے ساتھ رہوگے۔ ہمیشہ..... وعدہ کرو۔"

"یہ وعدہ تو میں بہت پہلے کرچکا تھا۔"

"آج پھر کرو" اس نے اپنا سر میرے کندھے پر مارا۔

اس کے بال ابھی گیلے تھے۔ چھینٹے میرے منہ پر پڑے۔ اچانک مجھے ہوش آگیا۔ اس کے قرب کی خوشبو اور اس کے وجود کی نرم آگ مجھے پگھلانے لگی تھی۔ میں ڈرا کہ کہیں خود اپنی عدالت میں مجھ پر خیانتِ مجرمانہ کی فردِ جرم نہ عائد ہوجائے۔ شیطان پھر آدم وحوا کی جنت میں سانپ بن کے پہنچ گیا تھا اور انہیں شجرِ ممنوعہ کا ذائقہ چکھنے پر اکسانا چاہتا تھا۔ ابلیس لعین کیا تو پھر مجھے میری جنت سے بے دخل کراسکتا ہے۔ نہیں' کبھی نہیں۔ میں کسی جہنم سے گزر کے جنت میں جانا بھی منظور نہیں کرسکتا۔

میں نے کہا "رابعہ۔ یہ کھانا سمیٹ لو پھر میں بتاتا ہوں آج میں نے اور غالب نے دلاور کی ایسی تیسی کردی۔"

رابعہ نے چونک کے آنکھیں کھولیں "مجھے نیند آنے لگی تھی۔"

"اچھا پھر سوجاؤ۔ صبح باتیں کریں گے۔" میں نے کہا "میں بھی بہت تھکا ہوا ہوں۔ سوچ رہا تھا نیچے جاکے چائے پئیں گے۔"

"چائے نہیں پیوگے تو نیند اچھی آئے گی۔" رابعہ اُٹھی اور اپنے بستر پر گر کے سوگئی۔ میں نے سکون کا گہرا سانس لیا۔ میری جنت محفوظ تھی۔

کچھ دیر بعد میں نے بچ جانے والے کھانے کو اخبار میں لپیٹا اور دروازہ بند کرکے دبے پاؤں نیچے اُتر گیا۔ میں نچلی منزل کے ایک دروازے کے سامنے سے گزر رہا تھا جب دروازہ ایک دم کُھلا۔ میری نظر بے اختیار اُدھر گئی۔ تیسری بار اس لڑکی کو دیکھ کے مجھے پسینہ آگیا۔

"کیا ہے جی۔ باربار آتے ہو دروازے تک اور چلے جاتے ہو۔ اندر آجاؤ نا!" اس نے بے شرمی سے انگڑائی لے کے کہا۔

میں نے ہمت کرکے کہہ دیا "لعنت اس پر جو ایک بار بھی تمہارے در پر آئے۔ مجبور ہوں اس لیے آتے جاتے تھوک کے گزر جاتا ہوں۔"

اس نے بڑے غصے سے دروازہ بند کیا۔ دھماکے سے پوری بلڈنگ ہل گئی ہوگی مگر مجھے خاصی خوشی ہوئی۔ پھر یہ خوشی فکرمندی میں بدل گئی۔ رابعہ نے بھی کسی لڑکی کا ذکر کیا تھا جو اسے نیلو سمجھ بیٹھی تھی۔ رابعہ کی صورت میں نیلو کی مشابہت بہت زیادہ تھی مگر رابعہ نسبتاً دراز قد تھی۔ اس فاحشہ کے رویّے نے مجھے احساس دلایا کہ شاید ہم غلط جگہ آگئے ہیں۔ مالکِ مکان کا رویّہ میرے خیال کو تقویت دیتا تھا۔ وہ مجھے بھی ایسا ہی سمجھا ہوگا جیسے فلمی دنیا میں قدم جمانے کے لیے ایک حسین سہارا ساتھ لیے پھرتے ہیں۔ یہاں رہنے والے بُرے تھے مگر یہ جگہ اس لحاظ سے یقیناً اچھی تھی کہ ادھر وہ شکاری نہیں آسکتے تھے جو ہمیں شریفانہ ٹھکانوں پر تلاش کررہے ہوں گے۔

میں نے سارا کھانا دو گدڑی پوش فقیروں کے سامنے رکھ دیا اور پھر کار میں جابیٹھا۔ ٹھرکی مالکِ مکان نے فوراً دروازہ کھولا۔

"اوہو۔ آپ ہو' میں سمجھا کوئی چور لے گیا گاڑی۔ ڈاکٹر صاحب میری دوائی..."

میں نے کہا "صبح دوں گا۔ یہ تمہارے کرائے دار کیسے ہیں؟"

"کیا ہوا جی؟" وہ کچھ پریشان نظر آنے لگا۔

"ابھی تک تو نہیں ہوا۔ مگر کچھ ہوا تو...." میں نے نیچے جھانک کے گاڑی کے گلوز کمپارٹمنٹ میں سے ریوالور نکالا اور رومال سے صاف کرکے جیب میں رکھ لیا "اوپر میری بیوی سورہی ہے۔ اس کا خیال رکھنا۔"

اس نے بڑی مشکل سے تھوک نگلا "سوال ہی پیدا نہیں ہوتا.... میرا مطلب ہے کسی ایسی ویسی بات کا۔ یہ ریوالور اصلی تھا؟"

میں نے گاڑی اسٹارٹ کردی تھی "گولی چلا کے دکھاؤں۔ تم اپنے سر پر سیب رکھو۔ میں اس میں سوراخ کرتا ہوں۔ تمہارے سر میں نہیں' سیب میں۔"

وہ زبردستی مسکرایا "لائسنس تو ہوگا۔"

میں نے رازدارانہ انداز میں کہا "اس کا تو ہے' جو میری بیوی کے پاس ہے نا اس کا نہیں ہے۔ عقلمند لوگ ایسا ہی کرتے ہیں۔ لائسنس والا دکھا کے بچ جاتے ہیں۔ کام ہمیشہ دوسرے سے لیتے ہیں۔"

جب میں نے کار کو بیک کیا تو وہ ہونقوں کی طرح کھڑا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا ہوگا کہ وہ میری باتوں کو مذاق سمجھے یا حقیقت۔ آنکھوں کے ایک ڈاکٹر کا اتنی خوب صورت بیوی کے ساتھ ایسے گھر میں آنا ہی شکوک پیدا کرتا تھا لیکن میری باتیں سُن کے اس میں شک کا اظہار کرنے کی ہمت بھی نہیں رہی تھی۔ اس نے سمجھ لیا ہوگا کہ معاملہ سخت گڑبڑ ہے اور دال میں کالا ہی کالا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کسی کو بھگالائے ہیں اور شاید علاقہ غیر سے تعلق رکھتے ہیں۔ اب ان سے پنگا لینے کا مطلب ہے بغیر لائسنس والے پستول سے قتل۔ یا ربّ العالمین! ابھی تو میں جوان ہوں۔

مجھے اس کی حالت کا تصور کرکے بہت ہنسی آئی مگر یہ گفتگو ضروری تھی۔ اب رابعہ کو یا مجھے کسی سے دخل در معقولات کا خطرہ نہیں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ مالکِ مکان دیگر کرایہ داروں کو ہوشیار کردے گا کہ یہ جو سب کے سر پر آکے بیٹھے ہیں ان سے ہوشیار' بڑا خونخوار اور غیرت مند خالص پٹھان قسم کا ماہر امراضِ چشم ہے نزلہ نک کا علاج آنکھ میں گولی مار کے کرتا ہوگا۔ اسے اپنے جیسا سمجھنے کی غلطی مت کرنا۔ مجھے دعوتِ گناہ دینے والی لڑکی بھی سمجھ جائے گی کہ گزشتہ رات اس نے کیا فاش غلطی کی تھی۔

میں نے ایبٹ روڈ پر ایک کشمیری چائے والے کی دُکان کے سامنے گاڑی روک لی۔ موسم جاڑوں کا نہیں تھا مگر رات کچھ خنک تھی اور میرا موڈ کافی یا بلیک چائے کا نہیں بن رہا تھا۔ خوشبودار خشک میوے اور دودھ میں سبز پتی کے ساتھ یخنی کی طرح اُبالی ہوئی چائے جو شیشے کے گلاس میں پیش کی جاتی تھی' رشید بٹ پہلوان کی سوغات تھی۔ اس علاقے میں ایک بٹ برادران باڈی بلڈر خالص دودھ اور لسّی کے لیے بھی شہرت رکھتے تھے اور پُرانے لاہور کی دم توڑتی ہوئی روایات کو زندہ رکھنے والوں میں شامل تھے۔ ان میں ایک پہلوان پان والا تھا جو پان بنا کے کسی کے ہاتھ میں نہیں پکڑاتا تھا۔ گلوری خود منہ میں دیتا تھا۔ جسے یہ انداز نہ بھائے وہ جائے۔ مزنگ' اندرونِ لوہاری دروازہ اور گوال منڈی کے علاوہ بھی بہت سے وضع داری کے ٹھکانے تھے جن کو مغربی تہذیب کا عفریت نگلتا جارہا تھا۔ پھر بھی زندہ دلوں کا یہ شہر آباد تھا۔ دلّی کی طرح جو سات بار اُجڑ کے بھی دلّی رہی تھی۔

کشمیری چائے کا ایک پُرسرور گھونٹ لے کے میں نے گلاس کو ڈیش بورڈ پر رکھا اور گھڑی دیکھی۔ ابھی صرف ساڑھے دس بجے تھے۔ فلموں کے آخری شو کا ہاف ٹائم ابھی ہوا تھا چنانچہ شو تینوں نے دودھ سوڈے سے کٹاکٹ تک سب پر یلغار کردی تھی۔ اتنی جلدی سونے کی مجھے بھی عادت نہیں تھی مگر کمرے کے اندر ماحول اتنا پُرسکون اور خواب آور تھا کہ میں باہر نہ آتا تو سوجاتا لیکن مجھے دلاور کی خیر خبر ضرور لینی تھی۔

میں نے ریڈیو آن کیا اور کار کا ایریل کھینچ دیا۔ باہر اتنا شور تھا کہ مجھے شیشے چڑھانے پڑے۔ والیوم بڑھا کے میں نے مائک میں کہا

"ہیلو..... ہیلو کوئی ہے یا سب مرگئے؟"

ایک منٹ پورا ہونے سے پہلے کوئی بولا "کون..... ہے؟" اس نے درمیان میں ماں کی گالی دے کے کہا۔

میں نے اسے بہت موزوں جواب دیا "تمہارا باپ۔ یہ مت پوچھنا کون سا باپ!"

وہ شاید میری آواز پہچان گیا "کیا بات ہے؟"

"وہ خرزاد کدھر ہے؟" میں نے کہا۔

"ہوش میں رہ کے بات کیا کرو۔"

میں نے غرا کے کہا "میں خود آگیا نا تو تمہارے ہوش ٹھکانے آجائیں گے کتے۔ میں بھونکنے والوں کی زبان کھینچ لیتا ہوں۔"

"میں..... دیکھتا ہوں..... ایک منٹ" وہ گھبرا گیا۔

میں اطمینان سے چائے کی چسکیاں لیتا رہا۔ وہ شاید دلاور سے رابطہ کرکے اسے بتارہا تھا کہ ریڈیو فون پر کوئی خاص بات کرنا چاہتا ہے۔ اس کی حیثیت آپریٹر کی طرح تھی مگر کام ٹیلی فون کے بجائے وائرلیس کے نظام پر پیغام دینے اور وصول کرنے کا تھا۔

کچھ دیر بعد دلاور نے کہا "تم زندہ ہو آج بھی اپنے سکندر صاحب۔"

میں نے کہا "ایک آدمی کو مارنے کے لیے تم نے چار بھیجے تھے۔ اگلی بار آٹھ روانہ کرنا۔"

"تمہیں مارنا مقصد ہوتا تو میں تم سے بات کیوں کرتا۔ اس وقت بھی میں بہت مصروف تھا۔"

"کس کے ساتھ؟ خیر چھوڑو' میں تمہیں تمغۂ جرأت پر مبارک باد دینا چاہتا تھا۔"

"جرأت کدھر جی ہم میں..."

"مگر تمغہ پھر بھی مل گیا۔ اور دینے والا بھی اپنا ہی بہادر

سپوت۔"

وہ سمجھ گیا "ایسے ہی کھلونوں سے کھیلتا ہے وہ۔ کیا کریں جی' ہوتا کسی گھسیارے کی اولاد تو باپ کا ہاتھ درانتی سے کاٹ دیتا۔"

میں نے کہا "پہلے اپنی بیوی سے تو پوچھ لو۔"

"کیا پوچھ لوں؟"

"کہیں سچ مچ اس کا باپ گھسیارا نہ ہو۔"

"میں ایسی باتوں سے مشتعل نہیں ہوتا۔"

میں نے کہا "پیڈرو کہاں ہے؟ ایک ساتھ تم نے دو دھوکے دیے مجھے۔ بہت گھٹیا اور چھوٹے بدمعاش ایسی حرکت کرتے ہیں۔"

"کرتے ہوں گے اپنے سکندر صاحب۔ ہمیں کیا معلوم' ہیں جی۔ ہم نے کب دعویٰ کیا ہے بڑی بدمعاشی کا۔ بڑے بدمعاش تو آپ ہو۔ عورتوں کو اٹھالے جاتے ہو۔ یہ ہوئی نا بہادری۔"

میں نے کہا "تم سے زیادہ دلاور تو تمہارا بیٹا ثابت ہوا۔ وہ آگیا سینہ تان کے دشمنوں کے سامنے۔"

"بچے بے وقوف اور جذباتی ہوتے ہیں۔ میں نے اس کی اور اس کی ماں کی کھال اُدھیڑ دی۔"

"آفرین۔ صد آفرین۔ گولی کیوں نہیں ماری؟"

"اس نے گولی چلائی مجھ پر۔ کوئی بات نہیں' وہ کون سا قتل کرنا چاہتا تھا مجھے۔ میں نے ہی ٹانگ اڑادی تھی بیچ میں۔ ہیں جی' اس کی ماں بے وقوفی سے اغوا ہوئی تھی۔ اتنی بے وقوف تو سب عورتیں ہوتی ہیں اپنے سکندر صاحب... سزا میں نے انہیں اس لیے دی کہ وہ تمہاری تعریف کر رہی تھی۔"

"اس شریف عورت پر بہتان مت لگاؤ۔"

"وہ تمہاری اس کی تعریف کر رہی تھی' کیا کہتے ہیں اسے.... طبعی شرافت کی۔ ہاں' اور وہ حرام زادہ۔ وہ بھی ہاتھ ملا کے آیا تھا تم سے۔ اور اپنے سکندر صاحب' وہ بھی کہنے لگا کہ... خیر چھوڑو۔ کہنے کا مطلب یہ تھا کہ جب کوئی اپنے دشمن کی تعریف کرے تو سمجھو وہ ہار گیا۔ اور اپنا تھا تو اپنا نہیں رہا۔ میں نے یہی سمجھایا ہے انہیں کہ دشمن صرف دشمن ہوتا ہے اور برا ہوتا ہے۔ اس میں اچھائی مت دیکھو۔ اس سے نفرت کرو۔ ہیں جی.... ورنہ تم کمزور پڑ جاؤ گے۔"

"انکار کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ تم کمزور پڑ گئے ہو۔ دیکھو اب کون ہے تمہارے ساتھ۔ پیڈرو بھی چلا گیا بالآخر۔"

دلاور قہقہہ مار کے بولا "کہاں چلا گیا؟ اپنے سکندر صاحب! جب تک کوئی اس دنیا سے نہ چلا جائے دلاور سے بچ کے کہاں جاسکتا ہے۔ سودا ہم پکا کرتے ہیں جی' جو بات ہوگئی اس پر قائم ہیں۔ پیڈرو تمہیں ملے گا اور تم وعدے کے مطابق شیلی کی قبر کا نشان بتاؤ گے۔ تم نے برطانوی افسروں کو میرے پیچھے لگادیا ہے۔ کوئی بات نہیں' دلاور ولایتی کتوں سے بھی نمٹ لے گا۔ میں اپنا سب کچھ داؤ پر لگادوں گا اپنے سکندر صاحب' میں کچھ ثابت نہیں ہونے دوں گا۔"

میں نے قہقہہ لگایا "تم کہاں کہاں سے ثبوت مٹاؤ گے دلاور۔"

"کس جرم کے ثبوت' کیسے ثبوت؟"

میں نے کہا "تم خود سب جانتے ہو۔ اس لیے تم بات بھی کر رہے ہو ورنہ اپنی مصروفیت چھوڑ کے بھاگے نہ چلے آتے۔ تمہارا مستقبل تباہ ہوجائے گا دلاور۔ تمہارے خلاف دُہرے قتل کا چشم دید گواہ لندن میں موجود ہے جسے تم ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے۔ تم سمجھ رہے ہو نا شیلی کی ماں کا تیسرا شوہر۔ تم نے ایک لڑکی کو شیلی سمجھ کے قتل کردیا تھا کیونکہ تم اپنی اس سوتیلی بہن کو پہچانتے نہیں تھے۔ اپنی سوتیلی ماں کو مارنے والے بھی تم تھے مگر شیلی کی زندگی باقی تھی۔ اس کی ماں کے تیسرے نیگرو شوہر نے تمہیں قتل کرتے دیکھا تھا مگر وہ اپنی بے گناہی ثابت نہ کرسکا اور لندن میں لمبی جیل کاٹ رہا ہے۔ اسے یقین ہے کہ وہ اصل قاتل کو پہچان سکتا ہے۔ تم نے شیلی کو بھی اسی لیے بھائی بن کے بلایا تھا کہ یہاں اسے قتل کرنا آسان تھا لیکن افسوس دلاور۔ یہاں بھی ایک چشم دید گواہ ہے۔"

"میں ٹیلی فون پر یہ باتیں نہیں کرسکتا۔"

"مت کرو' میں تو کرسکتا ہوں۔ اچھی طرح سمجھ لو دلاور۔ میں جانتا ہوں نقوی صاحب کو تم نے کیسے مروایا تھا۔ اور پھر شیلی کو ملوث کرنے کی کوشش میں ناکام ہو کے کیسے قتل کروادیا تھا۔ تمہارے ہاتھ لمبے ہیں تو میرے وسائل بہت ہیں۔ شیلی کا کیس ہی تمہیں تختہ دار تک پہنچادے گا ایک دن۔ تم نہیں جانتے کہ تمہارے خلاف کتنے خفیہ ہاتھ میری مدد کر رہے ہیں۔ اسی اسپتال کے اندر... باہر' پولیس میں اور.... ہر جگہ۔"

میرا خیال ہے کہ یہ سب اسے بتانا غیر ضروری تھا۔ رابعہ نے کیس کی تفصیلات برٹش قونصلیٹ کو ارسال کردی تھیں اور اس کیس کی تمام دستاویزات کی نقول ہر متعلقہ محکمے کے سربراہ کو بابرہ سینئر وکلا کی طرف سے ایک یادداشت کی صورت میں پیش کردی گئی تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ اس کیس کی تفتیش بہت اعلیٰ سطح پر ہوگی اور ثبوت ملتے ہی دلاور کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہوجائیں گے۔ ایک بین الاقوامی مجرم کی حیثیت سے اس کی ضمانت بھی نہیں ہوگی۔

جب اچانک میں نے گاڑی کے شیشے پر ایک اجنبی چہرہ دیکھا تو مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ دلاور نے اتنی لمبی بات مجھے اُلجھانے کے لیے کی تھی۔ میری کال ملتے ہی اس نے اپنے کتوں کو چھوڑ دیا تھا جو میری بو سونگھتے ہوئے وہاں پہنچ گئے تھے۔ سگنل ڈی ٹیکٹر (SIGNAL DETECTOR) عام چیز تو نہیں ہے۔ یہ غیر قانونی نشریات کا پتا چلانے کے لیے استعمال ہوتا ہے اور ریڈیو ویوز کی نشاندہی کردیتا ہے۔ اسی لیے خفیہ ریڈیو اسٹیشن چلانا عملاً ناممکن ہے۔

پندرہ بیس منٹ میں ان لوگوں نے میرا سراغ لگالیا تھا۔ اس یہ بھی ثابت ہوتا تھا کہ وہ اسی علاقے میں ایک میل کے ے میں کہیں موجود تھے ورنہ وہ اتنی جلدی مجھ تک نہیں پہنچ تھے۔

میں نے دروازے اندر سے لاک کرلیے تھے ورنہ وہ براہ ت میری پسلیوں پر ریوالور رکھ کے کہتے کہ چلو.... اور مجھے جانا ا۔ یہ اتنی مصروف جگہ تھی کہ وہ حملہ کرکے شیشے توڑتے تو ہر ف سے لوگ متوجہ ہوجاتے۔

میں نے دائیں جانب شیشے سے ناک لگا کے گھورنے والے کو ھا اور اشارے سے کہا "معاف کرو بابا۔"

اس نے مجھے ریوالور دکھا کے کہا "شرافت سے دروازہ ولو۔" سامنے ایک چہرہ تھا جو میں دیکھ نہیں سکتا تھا۔ وہ انجن کے ٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔

شیشے بند ہونے کی وجہ سے ان کی آواز بہت کم آرہی تھی اور چلا کے بات نہیں کرسکتے تھے۔ "تھینک یو۔" میں نے مسکرا کے ا اور گاڑی کو اسٹارٹ کیا۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ عین میرے پے بھی گاڑی موجود ہے۔ بیک کیے بغیر میں گاڑی نہیں نکال سکتا ا۔ میرے پیچھے والی گاڑی میں ڈرائیور کی سیٹ پر تیسرا شخص اندر تھا۔ چوتھا میری کار کی ڈکی کا سہارا لیے ایسے کھڑا ہوا تھا جیسے م طور پر لوگ کسی بھی گاڑی کے ساتھ کھڑے ہوجاتے ہیں۔ میں اروں طرف سے گھرا ہوا تھا مگر جب تک کار کے اندر تھا محفوظ نا۔

گاڑی کے انجن کی آواز پر سامنے والے نے مڑ کے دیکھا اور گرایا۔ پیچھے والا بھی سیدھا ہوگیا۔ بدقسمتی یا غلطی سے میں نے گاڑی کو ترچھا کھڑا نہیں کیا تھا۔ اب میرے سامنے مشکل سے دو ٹ کے فاصلے پر بھی گاڑی تھی اور وہ مجھے ایک انچ ہلنے کا موقع ینے پر آمادہ نہ تھے۔ راستہ نہ آگے تھا نہ پیچھے۔

اوکے بوائز' تمہاری مرضی۔ میں نے کہا اور گاڑی کو ایک دم گے بڑھایا۔ اس میں سامنے والی گاڑی سے ٹکرانے کا رسک ت زیادہ تھا۔ دھماکا ہوتا تو مجمع لگ جاتا اور خود گاڑی والا ہنگامہ رتا کہ میرا نقصان پورا کرو۔ نقصان پورا کرنا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا ر مجھے معلوم تھا کہ میرے باہر نکلتے ہی ان تینوں میں سے کوئی یوالور کی نال میری کمر یا میری پسلیوں سے لگادے گا اور مجھ سے ہے چپکا رہے گا کہ کسی کو کچھ پتا نہیں چلے گا۔ میں نے ذرا بھی ت تو گولی میرے دل گردے پھاڑتی ہوئی جسم سے گزر جائے گی گولی کی آواز پر مجمع بھی جوتیاں چھوڑ کے غائب ہوجائے گا۔ بعد یں پولیس میری لاش اُٹھانے آئے گی تو چشم دید گواہ تک نہ ملے

یہ بھی ہوسکتا تھا کہ لوگ مجھے تھانے لے جائیں۔ تباہ ہونے ی گاڑی کا مالک یا اتفاقیہ نمودار ہوجانے والی پولیس الزام عائد کردے کہ میں نشے میں ہوں اور یہ قابل دست اندازی پولیس جرم ہے جس میں تھانے جانا ضروری ہے۔ تھانے جانے سے کہیں بہتر تو یہ ہوتا کہ میں خاموشی سے ان لوگوں کے ساتھ دلاور کی خدمت میں حاضر ہوجاؤں۔

میں نے گاڑی ایک دم بڑھائی تو سامنے کھڑا ہوا شخص زبردست دھکے سے اُلٹ کر آگے گیا اور اس کا دھڑ گاڑی پر منطبق ہوگیا۔ جھٹکے سے اس کی کمر ٹوٹی نہیں ہوگی تو ریڑھ کی ہڈی کے مہرے ضرور ہل گئے ہوں گے۔ شاید اس بے وقوف کو مجھ سے یہ امید نہیں تھی کہ میں اتنے لوگوں کی موجودگی میں اس پر گاڑی چڑھا سکتا ہوں۔ اس کے دونوں ہاتھ اوپر اُٹھ گئے تھے اور وہ آگے والی کار پر اُلٹا پڑا ہوا تھا کہ کار کے بمپر نے اس کی ٹانگوں کو چھولیا۔ میں نے بریک لگا کے گاڑی کو تصادم سے بچالیا تھا۔ ایک دشمن اب میری راہ میں حائل نہیں رہا تھا۔ پھر ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت میں' میں نے گاڑی کو ریورس گیئر میں ڈالا اور ریس دے کے کلچ پر سے پیر ہٹایا۔

گاڑی ایک دم پیچھے گئی۔ پیچھے والے کو مہلت ہی نہ ملی کہ وہ بیچ میں سے نکل جائے۔ میں نے پیچھے والی گاڑی کو پوری قوت سے ٹکر ماری۔ دراصل میں اپنے ذہن کے کمپیوٹر کی مدد سے چند نتائج اخذ کرچکا تھا جو میرے حق میں تھے۔ تصادم سے میری گاڑی کی ٹیل لائٹس کو نقصان ہوتا اور ڈکی پچک جاتی مگر پیچھے والی گاڑی کی ہیڈ لائٹس اور گرل کے ساتھ ریڈی ایٹر کی جالی بھی ٹوٹ سکتی تھی۔ اس کے بعد وہ گاڑی میرا تعاقب کرنے کے قابل نہ رہتی۔ اس ٹکر سے وہ گاڑی مزید اتنا پیچھے چلی جاتی کہ مجھے سامنے سے گاڑی موڑنے کے لیے چھ آٹھ فٹ جگہ مل سکتی تھی۔

جب دھماکا ہوا تو میں نے ایک چیخ بھی سُنی۔ جو شخص پیچھے کھڑا ہوا تھا وہ دونوں گاڑیوں کے درمیان ایسے دب گیا تھا کہ اس کی ٹانگوں کی ہڈیوں کا چورا ہوگیا ہوگا۔ دنیا کا کوئی ڈاکٹر اسے دوبارہ اپنی ٹانگوں پر کھڑا نہیں کرسکتا تھا۔ میں نے ہیڈ لائٹس کے شیشے ٹوٹنے کی مخصوص آواز اور ایک زیادہ بڑا دھماکا سُنا۔ یہ پچھلی گاڑی کے ونڈ اسکرین کے شیشہ ٹوٹنے کی آواز تھی۔ ونڈ اسکرین کا شیشہ جسے میکانک گیس والا شیشہ کہتے ہیں ٹوٹتا ہے تو بکھر جاتا ہے۔ ریزہ ریزہ ہوجاتا ہے۔ ان کے درمیان ویکیوم ہوتا ہے جو دھماکے کا سبب بنتا ہے اور شیشے کے یہ ننھے ننھے ٹکڑے ایسے ہی اُڑتے ہیں جیسے بلب پھٹنے سے کانچ دور دور تک جاتا ہے۔ عام طور پر ان سے ڈرائیور کا چہرہ لہولہان ہوجاتا ہے اور بعض اوقات آنکھیں بھی ضائع ہوجاتی ہیں۔

اب ہر طرف سے لوگ متوجہ ہوگئے تھے۔ کشمیری چائے پلانے والے کا لڑکا میری طرف دوڑا چلا آرہا تھا۔ جو شخص کھڑکی کے ساتھ چپکا ہوا تھا وہ بدحواس ہوگیا تھا اور احمقوں کی طرح آگے پیچھے دیکھ رہا تھا جہاں اس کے دو ساتھی اُلٹے پڑے چیخ رہے تھے۔

میں نے کھڑکی کو ایک انچ نیچے کیا اور اس میں سے دس کا نوٹ چائے والے کی طرف پھینک دیا پھر میں نے دیوانہ وار گاڑی کو موڑا۔ قریب کے لوگ اُچھل کے ایک طرف ہو گئے اور میں گاڑی کو سڑک پر لانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس وقت تک پکڑو پکڑو کا شور مچ گیا تھا۔ میرے جرم کے ایک نہیں دسیوں گواہ تھے جنہوں نے مجھے گاڑی آگے پیچھے کرکے دو بندوں کو لٹاتے اور ایک کار کو تباہ کرتے دیکھا تھا۔ وہ سب یقیناً یہ سمجھے ہوں گے کہ میں نشے میں ہوں۔

سب سے پہلے رونمائی کرنے والا احمقانہ حد تک دلیری کا مظاہرہ کرنے پر آمادہ تھا۔ شاید اسے ڈر ہو گا کہ غلط منصوبہ بندی اور ناکامی پر بھی اس کے لیے دلاور کو جواب دینا مشکل ہو گا اور جو سزا دلاور دے گا اس سے بچنے کے لیے رسک لینا بہرحال بہتر ہے۔

وہ چھلانگ مار کے بونٹ پر میرے سامنے آگیا۔ اسے سنبھلنے میں کچھ وقت لگا، میں نے گاڑی کو تیز رفتاری سے دائیں بائیں لہرایا تو اس کے قدم دو مرتبہ اُکھڑ گئے۔ سامنے سے آنے والی ایک گاڑی اور ایک تانگا بال بال بچے ورنہ ٹکر سامنے سے ہوتی تو کوئی نہ بچتا۔ سڑک پر رات گیارہ بجنے کے بعد بھی ٹریفک تھی اور ایبٹ روڈ پر جہاں تک سینما تھے، مجھے خالی سڑک ملنے کی اُمید بھی نہیں تھی۔ میں بونٹ پر چڑھے ہوئے شخص کو ذرا بھی موقع دیتا تو وہ پلٹ کے فائر کر دیتا اور ونڈ اسکرین میں سوراخ کرتی ہوئی گولی سیدھی میرے سر میں گھس جاتی۔ یہ بھی سائنس کا کمال ہے کہ پتھر لگنے سے کار کا شیشہ بکھر جاتا ہے لیکن گولی سے صرف اس میں سوراخ ہوتا ہے، شیشہ نہیں ٹوٹتا۔ تشریح اس کی غالباً یہ ہے کہ گولی کی تیز رفتاری کا ساتھ شیشہ نہیں دے سکتا چنانچہ راستہ دے دیتا ہے۔ واللہ عالم بالصواب۔ میرا مسئلہ تو ابھی اس پیر تسمہ پا سے نجات حاصل کرنا تھا جسے یہ ہوش بھی نہیں تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ وہ بالکل پاگل ہو چکا تھا۔ اس وقت موت سے کوئی نہیں ڈرتا جب مرنے یا مارنے کا مرحلہ آجائے۔

وہ عین میرے سامنے تھا اور کافی حد تک میری نگاہ سامنے دیکھنے سے قاصر تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ میں کسی گاڑی سے نہ ٹکرایا یا میں نے کسی سائیکل سوار کو نہ روندا تو فٹ پاتھ پر گاڑی ضرور چڑھادوں گا۔ مجھے نہیں معلوم کہ کتنے لوگ اس رات مرتے مرتے بچے۔ دن کا وقت ہوتا تو یہ خونی ریس ثابت ہوتی اور سو گز کے فاصلے میں نہ جانے کتنے حادثات ہوتے۔

وہ پھر سنبھل کے پلٹنا چاہتا تھا کہ میں نے ایک دم بریک لگائے اور پھر کلچ دبا کے رفتار بڑھائی۔ وہ شیشے کے اوپر گرا اور میں نے ایک فائر کی آواز بھی سُنی۔ اب مجھے ایک سیکنڈ کی مہلت ملی۔ میں نے بڑی تیزی سے اپنی طرف کا شیشہ نیچے کیا۔ اسٹیئرنگ کو مجھے اُلٹے ہاتھ سے سنبھالنا پڑا۔ وہ عین میرے سامنے شیشے سے چپکا ہوا تھا۔ میں نے سیدھا ہاتھ باہر نکالا اور اس کی پتلون کا پائنچہ میری گرفت میں آگیا۔ میں نے ایک آخری خطرناک ٹرن لیا اور گاڑی اُلٹے ہاتھ پر ایک کوٹھی کے کھلے گیٹ سے گزر گئی۔ وہ دائیں جانب تھا تو میں نے اسے جھٹکے سے کھینچا اور وہ وہیں گر گیا۔ اب میں نے گاڑی کو سنبھالا ورنہ میں پورچ میں گھُس جاتا جہاں ایک اسٹیشن ویگن موجود تھی۔ بریک لگا کے میں نے گاڑی کو پوری اسپیڈ سے واپس کیا۔ وہ سخت زخمی ہونے کے باوجود کھڑا ہو گیا تھا اور گولی چلانے کے لیے تیار تھا۔ اس کا نشانہ خطا ہوتا تو گولی پیٹرول ٹینک میں لگتی یا پیچھے والے شیشے سے گزر کے میری نشست میں پیوست ہو جاتی۔ شاید اس کے ہاتھوں کی توانائی نے ساتھ نہیں دیا یا وہ لرزتے ہاتھوں سے ریوالور کا رُخ سیدھا نہ رکھ سکا۔ اس نے گولی ضرور چلائی مگر وہ نہ جانے کدھر گئی۔ میں نے پلٹ کے دیکھا تو اس کے دونوں ہاتھ اوپر اُٹھے ہوئے تھے اور اس کا چہرہ وحشت زدہ تھا۔ وہ زندگی کی بازی ہار چکا تھا۔

"نہیں.... "وہ چلایا" رک جاؤ..."

اس میں ہمت ہوتی تو وہ جست لگا کے ہٹ جاتا۔ مجھے بھی یہ اُمید نہیں تھی کہ وہ وہیں کھڑا رہے گا۔ جب گاڑی نے اسے ٹکر ماری تو وہ اوپر اُچھلا اور اس نے ایک بھیانک چیخ بلند کی۔ میں نے اپنی نگاہ گیٹ پر رکھی اور پھر سڑک پر پہنچ گیا۔ اس وقت کوٹھی کے اندر لائٹس جل اُٹھی تھیں اور کوئی باہر آکے چلانے بھی لگا تھا۔ وہ انگریزی میں پوچھ رہا تھا "آخر یہ کیا ہو رہا ہے؟"

میں نے آخری بار ڈرائیو وے پر پڑے ہوئے شخص کو دیکھا جس کے جسم پر سے گزرتے ہوئے کار کے پہیے دو بار ایسے اچھلے تھے جیسے وہ انسان نہیں اسپیڈ بریکر تھا۔ اس کے زندہ بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور کار کو سیدھا لے گیا۔

"یو باسٹرڈ!" میں نے دلاور کو بلند آواز میں گالی دی۔ "کاش اس کی جگہ میں نے تمہیں کچلا ہوتا۔" میں ذہنی طور پر انتہائی اپ سیٹ تھا۔ ایک طرف مجھے ان لوگوں کا تصور پریشان کرتا تھا جن کو میں نے اپنا دفاع کرتے ہوئے کرش کر دیا تھا۔ کسی گاڑی نے میرا تعاقب نہیں کیا تھا، اس کا مطلب یہ تھا کہ گاڑی میں بیٹھا ہوا ڈرائیور بھی ونڈ اسکرین کے شیشوں سے زخمی ہوا تھا۔ دوسری طرف مجھے یہ فکر تھی کہ نہ جانے کتنے لوگوں نے گاڑی کا نمبر بھی نوٹ کر لیا ہو گا۔ ابھی تک مجھے موقع نہیں ملا تھا کہ میں رفتار کی گاڑی کے پچھلے حصے کو دیکھتا اور اندازہ کرتا کہ اس کو کس حد تک نقصان پہنچا ہے۔

اسمبلی کے پیچھے سے اور چیرنگ کراس کا چکر لگا کے بیڈن روڈ کی طرف سے رائل پارک آتے ہوئے میری ایک کیمسٹ سے بھی جھڑپ ہوئی وہ مجھے بغیر نسخے کے ویلیم دینے پر رضامند نہیں تھا۔ اصولاً اس کا انکار جائز تھا مگر مجھے اس وقت کون ڈاکٹر مل سکتا تھا جو میری فرمائش پر ویلیم کو نسخے میں شامل کر دیتا۔

"آپ جانتے ہیں ویلیم خطرناک دوا ہے۔"

"مگر میں تو صرف دو گولیاں مانگ رہا ہوں۔ میں ذرا اپ سیٹ ہوں۔"

"آخر کیوں؟ اور سکون کے لیے لوگ خودکشی بھی کر لیتے ہیں۔"

"صرف دو گولیوں سے خودکشی نہیں ہو سکتی۔"

"مجھے کیا معلوم آپ کہاں کہاں سے ایسی ہی گولیاں جمع کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر کا نسخہ لے آیئے..."

"میں خود ڈاکٹر ہوں" میں نے چلا کے کہا "پیڈ گاڑی میں پڑا ہے۔ بتاؤ کتنے نسخے لکھ کے لا دوں۔ کس کس نام سے؟"

اس نے غور سے مجھے دیکھا "آپ... ڈاکٹر نسیم حسن ہیں!"

میں نے سکون کا سانس لیا "شکر ہے کہ آپ نے پہچان لیا۔"

اس نے مجھے پوری شیشی دے دی۔ دو گولیاں میں نے وہیں اس کے سامنے کھالیں اور اس کا شکریہ ادا کیا۔ جب میں واپس رائل پارک پہنچا تو آدھی رات ہو چکی تھی۔ گلی کے اس حصے میں سناٹا تھا اور بیشتر گھروں کی لائٹس آف تھیں۔ میں نے کار کو خاموشی سے اپنی جگہ پارک کیا اور سیڑھیاں چڑھ گیا۔ کار کا پچھلا بمپر ٹوٹ گیا تھا، ڈکی اندر دب گئی تھی اور ٹیل لائٹس کا تو وجود ہی نہیں رہا تھا۔

دروازہ اسی طرح بند تھا۔ رابعہ خاموش لیٹی ہوئی تھی اور کچھ دیر بعد مجھے یقین آگیا کہ وہ واقعی سو رہی ہے۔ بستر پر لیٹنے کے بعد میں چھت کو کھلی آنکھوں سے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ صبح رابعہ کے سامنے جھوٹ بولنا چاہیے یا اسے سب بتا دینا چاہیے۔ وہ میری خاطر ہر قربانی دینے کا فیصلہ کر چکی تھی اور عملاً دنیا کو چھوڑ آئی تھی۔ اس سے جھوٹ بولنا مناسب نہیں تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا کہ وہ کچھ ناراض ہو گی کہ میں رات کو باہر کیوں گیا تھا اور مجھے خدانخواستہ کچھ ہو جاتا تو اسے معلوم بھی نہ ہوتا۔

دلاور کا رویہ ایک دم جارحانہ ہو گیا تھا جو ایک خطرناک بات تھی۔ خود میں اس خیال سے بے چینی محسوس کر رہا تھا کہ ذہنی طور پر میرا رویہ کسی پیشہ ور قاتل جیسا ہوتا جا رہا تھا۔ ایک دن میں پانچ افراد کی جان لے کر اور کم سے کم دو کو عمر بھر کے لیے معذور بنا کے میں اس خیال سے مطمئن تھا کہ پکڑا نہیں گیا۔ دفاع میرا حق تھا مگر اس حق کو میں احتیاط سے استعمال نہیں کر رہا تھا۔ دوسری طرف دلاور تھا جس کے پاس ناجائز ذرائع سے حاصل ہونے والی اتنی دولت تھی کہ وہ ہر روز نئے لوگ بھرتی کر لیتا تھا جو اس کے مجرمانہ عزائم کی تکمیل کے لیے پیسہ لے کر جان دینے پر تیار ہو جاتے تھے۔ شہر میں چھوٹے موٹے جرائم پیشہ افراد ہزاروں تھے مگر ان سے کہیں زیادہ وہ مجبور لوگ تھے جن کا معاشی استحصال ممکن تھا۔ کچھ مالی پریشانیوں کی اس انتہا کو پہنچ چکے تھے کہ اب خودکشی کا سوچتے تھے یا ڈاکا ڈالنے پر بھی تیار رہتے تھے اور دلاور کی پیشکش قبول کرتے ہوئے وہ یقیناً خوش ہوں گے کہ یہ کام خودکشی یا ڈاکا ڈالنے سے بہرحال بہتر ہے۔ کچھ کم ہمت اور ناکارہ لوگ تھے جو یہ سمجھتے تھے کہ دنیا میں ان کے کرنے کے لیے کوئی کام نہیں رہا اور جو کام ہے وہ دنیا انہیں کرنے نہیں دیتی۔ نشے کے یا جوئے کے عادی۔ غبن کرنے والے اور مقروض، پیسہ لے کر دلاور کا کوئی بھی کام کرنے پر تیار ہو سکتے تھے۔ ان کے مسائل کا حل پیسہ تھا جو دلاور کے پاس بہت تھا اور وہ ہر آدمی کو اس کی ضرورت سے اتنا زیادہ دے سکتا تھا کہ وہ انکار ہی نہ کر سکے۔

ایسے لوگ بلاوجہ مارے جا رہے تھے اس میں قصور میرا نہیں تھا قانونی اور اخلاقی اعتبار سے مجھے حق حاصل تھا کہ میں اپنا دفاع کروں اور کوئی میری جان لینے کی کوشش کرے تو اسے مار ڈالوں۔ قانونِ قدرت بھی یہی تھا جس پر انسان ہی نہیں حیوان بھی عمل کرتے تھے۔ جنگ کے میدان میں توپوں اور ٹینکوں کی گھن گرج سے آگے رہنے والے پیادے اسی طرح مرتے تھے جیسے حشرات الارض۔ طاقتور کے لیے بقا تھی اور کمزور کے لئے فنا لیکن اس کے باوجود مجھے افسوس ہوتا تھا کہ پیسہ انسانی جانوں کا مول کیوں بن رہا ہے۔ لوگ اتنے مجبور کیوں تھے کہ پیسہ انہیں خرید لیتا تھا۔ وہ انکار نہیں کر سکتے تھے۔ نہ مرنے سے اور نہ مارنے سے۔ مرنے والے سب ایسے لوگ تھے جو نہ مجھے جانتے تھے اور نہ میرے اور ان کے درمیان کوئی تنازعہ تھا کہ وہ میرے دشمن ہوتے۔ یہ مالِ حرام اور بیسویں صدی کا رجحان تھا کہ دولت جرم کے فروغ اور مجرموں کی حوصلہ افزائی کے لیے استعمال ہو رہی تھی۔ وہ اچھے دن پچھلی صدی میں رہ گئے تھے جب دولت فلاح کے کاموں میں صرف ہوتی تھی اور مشورہ دینے والے کہتے تھے۔

نام مطلوب ہے تو فیض کے اسباب بنا
پُل بنا.... چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا

مجھے غالب کا خیال بھی آیا جس سے میں نے شام کو ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ یقیناً پریشان ہو گا اور یہ سمجھ رہا ہو گا کہ میں پھر اسے چکمہ دے کے غائب ہو گیا اور میں نے اس کی طرف سے تعاون کی پیش کش کو قابلِ اعتماد نہیں سمجھا۔ ایک مسئلہ مالکِ مکان کا بھی تھا۔ وہ صبح پریشان ہو گا کہ رات کو گاڑی ٹھیک ٹھاک اور صحیح سالم کھڑی تھی۔ صبح تک یہ حشر کیسے ہو گیا؟ اگر کسی نے وہیں اسے ٹکر ماری ہوتی تو دھماکے سے سارا محلہ جاگتا اور ٹکر مارنے والا بھاگ جاتا تب بھی تصادم کی باقیات وہیں مل جاتیں۔ ٹوٹنے والے شیشے اور پلاسٹک کی کرچیاں وہیں پڑی ہوتیں۔ ظاہر ہے اسے بھی کوئی کہانی سُنانی پڑے گی کہ میں رات کو بیوی کے لیے دوا لینے گیا تھا اور واپسی میں یہ حادثہ ہو گیا۔ کوئی کھڑی گاڑی میں پیچھے سے ٹکر مار کے فرار ہو گیا۔

سکون آور گولیوں نے بالآخر کچھ اثر دکھایا اور میں ایک بجے کے بعد سو گیا۔ صبح رابعہ مجھ سے بہت پہلے اُٹھ گئی، اس نے ہاتھ

روم کا دروازہ کھولا تو میں نے سُنا تھا لیکن اندھیرا دیکھ کے میں نے پھر آنکھیں بند کرلیں اور کروٹ لے کے سوگیا۔ تاہم نیند اچاٹ ہوگئی تھی۔ چند منٹ بعد ہی میں پھر جاگا تو رابعہ فرش پر چادر بچھائے نماز پڑھ کے دعا مانگ رہی تھی۔ میں اس کی محویت کو بڑے احترام آمیز خوشی کے ساتھ دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر اتنا سکون' ایسا ملکوتی حسن اور پاکیزگی کا نور تھا کہ وہ کوئی تصوراتی آسمانی مخلوق نظر آتی تھی۔ ایک غیر مرئی پیکر جس نے صبح صادق کی خاموشی کے طلسم' شبنم کے ابر گہربار کی لطافت اور غنچۂ نودمیدہ کی مہک کے ساتھ وجود کا سفر کیا ہو اور اسے سورج کی پہلی کرن کے ساتھ عدم کی جانب لوٹ جانا ہو۔

جب اس نے سلام پھیر کے میری طرف دیکھا اور مسکرائی تو صبح ہوگئی۔ آسمان روشن ہوگیا اور میرے دل میں گزشتہ رات سے چمنی میں جمے ہوئے کالے دُھوئیں کی طرح جم جانے والا مایوسی کا اندھیرا چھٹ گیا۔

میں نے مسکرا کے کہا "صبح بخیر۔"

"السّلام علیکم۔ مسلمانوں کا یہی طریقہ ہے۔ تم پر خدا کی سلامتی ہو۔"

میں نے کہا "تم مجھے شرمندہ کررہی ہو۔"

وہ ہنسی "صرف کوشش کررہی ہوں۔ شرم آتی ہے تمہیں؟"

"آج آرہی ہے۔ آج نماز کے بعد کیا دعا مانگی؟"

"بس خدا سے سلامتی اور اپنے امان میں رکھنے کی۔ اس وقت میں بہت پُرسکون ہوں اور اب میں نے طے کیا ہے کہ ہر دن کا آغاز ایسے ہی کروں گی۔ دل کو بڑی تقویت ملتی ہے اور سارا ذہنی انتشار ختم ہوجاتا ہے نماز کے بعد۔"

"میرے لیے بھی دعا کرنا کہ خدا مجھے توفیق دے۔"

وہ ہنسی "دعا تم خود بھی مانگ سکتے ہو۔ خدا سب کی سُنتا ہے۔ تم رات کو کہاں گئے تھے؟"

میں نے کہا "تمہیں معلوم ہے' تم تو سو رہی تھیں؟"

"ہاں۔ لیکن تم باہر گئے تو مجھے نیند میں ہی ایسا لگا جیسے تنہائی بوجھل ہوگئی ہے اور میں اکیلی ہوں۔"

"میں کشمیری چائے پینے گیا تھا" میں نے کہا۔

"مجھے جب خیال آیا کہ تم چائے پینے کے موڈ میں تھے تو میں مطمئن ہوکے پھر سوگئی تھی۔ تم کب واپس آئے تھے؟"

"ایک بجے کے قریب۔"

"دو گھنٹے چائے پیتے رہے؟" اس نے چادر پھر بستر پر پھیلادی۔

"نہیں۔ ایک حادثہ ہوگیا تھا" میں نے سرسری لہجے میں کہا۔

اس نے پلٹ کے دیکھا "کیسا حادثہ؟"

"میں گاڑی پیچھے کرنے لگا تو دوسری گاڑی سے ٹکر ہوگئی۔"

"زیادہ نقصان تو نہیں ہوا؟"

"اس گاڑی کی ہیڈ لائٹس' گرل اور ونڈ اسکرین ٹوٹ گئے تھے' اپنی گاڑی کی پچھلی سائڈ کا ملبہ ہوگیا۔"

اس نے پریشانی سے کہا "کیا گاڑی بے قابو ہوگئی تھی؟"

"نہیں۔ جان بوجھ کے ایسا کیا تھا میں نے۔ ایک آدمی آگے تھا' ایک پیچھے۔ دونوں کو راستے سے ہٹانے کا اور کوئی طریقہ ہی نہیں تھا۔"

وہ بستر پر بیٹھ گئی "کون تھے وہ؟ پوری بات کیوں نہیں بتاتے آخر۔ توڑ توڑ کے کہہ رہے ہو۔"

میں نے کہا "یہ نفسیاتی طریقہ ہے۔"

"بھاڑ میں گئی نفسیات۔ کیا انہیں معلوم ہوگیا ہے کہ ہم یہاں ہیں۔"

میں نے اسے ساری بات سُنادی "میرا خیال ہے کہ اب یہ کار وقار یوسف کو واپس کردی جائے۔ وہ ڈینٹ پینٹ کرائے گا اور ضرورت پڑنے پر حادثے کی کوئی فرضی کہانی بھی سُنادے گا۔ اسے کون جھٹلا سکتا ہے۔ اس کے گواہ بھی پکے ہوں گے۔ نمبر نوٹ کرنے والے جھوٹے پڑجائیں گے۔"

"دیر کیوں کرتے ہو... فون کردو اسے۔"

میں اُٹھ کھڑا ہوا "آج چھٹی ہے نا۔ وری گڈ۔ ابھی تو وہ سوا پڑا ہوگا۔ میں واپسی میں ناشتا بھی لے آؤں گا۔"

"سکندر۔ دیکھو فون کرنے کے علاوہ کچھ مت کرنا۔"

میں ہنس پڑا "مثلاً...؟"

"کسی چکر میں مت پڑنا۔"

"جانم۔ جو تمہارے چکر میں پڑگیا وہ کسی اور کے چکر میں کیسے پڑسکتا ہے۔ میں یوں گیا اور یوں آیا۔" میں نے چُٹکی بجائی۔

مالکِ مکان اور ان کے "شریف" کرائے دار سب دیر سے سونے اور جاگنے کے عادی معلوم ہوتے تھے۔ ابھی تک کسی نے پیچھے سے تباہ حال گاڑی کو نہیں دیکھا تھا۔ میں اسے گھما کے پچھلی طرف سے باغِ جناح تک لے گیا پھر پلازا سینما کی طرف موڑ کے سڑک کے انتہائی بائیں جانب روک دیا۔ گاڑی میں پوری "ٹول کٹ" یعنی پلائر پیچ کس موجود تھے۔ میں نے غور سے ڈیش بورڈ کا معائنہ کیا اور خفیہ ریڈیو فون کا ٹرانسیٹر دریافت کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ یہ ڈیش بورڈ کے نیچے ریڈیو کے ساتھ منسلک تھا اور اس کو پاور سپلائی کار بیٹری سے دی گئی تھی جس کا مطلب تھا کہ یہ بارہ وولٹ کی کسی بھی بیٹری پر کام کرسکتا تھا۔

پیچ کھول کے اسے ریڈیو کے ساتھ نکالنا خاصا محنت طلب کام تھا۔ مجھے اگلی دونوں سیٹوں کے سامنے والی جگہ میں نیچے لیٹ کے کام کرنا پڑا۔ ڈیش بورڈ کے نیچے اندھیرا تھا اور مجھے ہاتھ اوپر کرکے ایک ساتھ پلائر اور پیچ کس استعمال کرنے پڑے تو میرے بازو شل ہوگئے مگر آدھے گھنٹے بعد مجھے اس محنت کا صلہ مل گیا۔ میں ولادر سے رابطے کے پورے سسٹم کو کار سے نکالنے میں کامیاب ہوگیا۔ مسئلہ مشین گن نے پیدا کیا۔ اسے ہاتھ میں لے کے چلنا اعلانِ عام کے مترادف تھا کہ حضرات وخواتین! ناچیز کی طرف توجہ ہو۔ میں ایک دہشت گرد ہوں۔ (قارئین ذہن میں رکھیں کہ اس وقت کلاشنکوف کا نام بھی کوئی نہیں جانتا تھا) اسے لپیٹنے کے لیے میرے پاس اخبار نہیں تھا۔ سڑک پر سے گزرنے والے اکا دُکا راہ گیر مجھے مصروف دیکھ کے فرض کرلیتے تھے کہ گاڑی میں کوئی خرابی ٹھیک کررہا ہوں۔ مشین گن کے ساتھ راؤنڈ بھی تھے اور اس وزن کو اُٹھا کے چلنا بھی مشکل کام تھا۔ اس کا حل میں نے نکالا کہ آگے والی سیٹوں کے بیک کور اُتار لیے جو تھیلوں کی طرح تھے۔ تمام اسلحہ ایک ہی تھیلے میں سما گیا۔ احتیاطاً میں نے ریڈیو فون وغیرہ کو دوسرے تھیلے میں لپیٹ لیا کیونکہ یہ نازک سامان تھا۔

چابی اندر لگا کے میں نے گاڑی کو لاک کردیا۔ چند منٹ بعد میں نے اس وفادار گاڑی کو الوداع کہا جس نے متعدد مواقع پر میری جان بچائی تھی۔ رکشے والے کو میں نے امرتسری حلوائی کی طرف سے چلنے کو کہا تاکہ میں راستے میں ناشتے کے لیے حلوا پوری لے لوں۔ اسٹالوں پر اخبار بھی آگئے تھے۔ میں نے ایک انگریزی کا اور ایک اردو کا اخبار خریدلیا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ کیا کسی نے کھیتوں میں ملنے والی لاشوں کو دریافت کرلیا ہے یا گزشتہ شب ایبٹ روڈ پر ہونے والی ہنگامہ آرائی کا کوئی تذکرہ ہے۔ روزنامہ "مشرق" کا دفتر اس جگہ سے چند قدم کے فاصلے پر ہی تھا۔

واپس رائل پارک پہنچ کے میں نے گھڑی دیکھی تو صبح کے نو بجنے والے تھے۔ میں نے نیچے ایک چائے والے سے کہا کہ وہ تیری منزل پر چائے پہنچادے تو اس کی بڑی مہربانی۔ ہم نئے آئے ہیں اور ابھی ہمارے پاس سامان نہیں ہے۔ میری لجاجت سے وہ مان گیا اور کچھ معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ گھربار رکھنے والے کہیں جاتے ہیں تو گھر کا اسباب بھی ساتھ لے جاتے ہیں مگر ہماری بدقسمتی کہ وہ بلڈنگ ہی بدنام تھی اور وہاں جو آتے تھے خالی ہاتھ آتے تھے اور اپنے ساتھ امید یا عزائم کے سوا کچھ لاتے تھے تو گھر سے چوری کی ہوئی رقم یا ماں کا زیور۔ لڑکیاں جن کی جوانی بے لگام ہوجاتی تھی یا جو فلمی کہانیوں اور رومانی ناولوں سے متاثر ہوکے کسی ہیرو کے ساتھ محبت کا سرمایہ لے کر گھر سے نکل آتی تھیں اور پھر ان کے ساتھ جو ہوتا تھا وہ سب ہی جانتے تھے۔

مالکِ مکان دروازے کے سامنے گھٹنوں میں سر دیے اونگھ رہے تھے "اوجی ڈاکٹر صاحب' صبح صبح گاڑی بیچ آئے کیا؟"

میں نے کہا "یہ خیال کیسے آیا آپ کو؟"

"نوٹوں سے بھری ہوئی بوریاں جو اُتھار کھی ہیں اور گاڑی غائب ہے۔"

میں نے کہا "گاڑی ایک دوست کی تھی۔ اسے واپس کردی۔ ان بوریوں میں نوٹ ہوتے تو میں یہ بلڈنگ آپ سے خرید لیتا اور باقی کرائے داروں کے ساتھ آپ کو بھی بے دخل کردیتا۔"

"مجھے کیوں جی؟" وہ ہنسنے لگا۔

"یہ ایسے کرائے دار رکھنے کی سزا ہوتی" میں نے کہا۔

"لوجی۔ ہمیں تو غرض ہے کرائے سے اور ماتھے پر کسی کے نہیں لکھا ہوتا کہ وہ کون ہے۔ جیسے آپ نے کہا ڈاکٹر ہیں اور ہم نے مان لیا۔ بعد میں پتا چلے کہ آپ کے پیچھے تو پولیس لگی ہوئی ہے۔ تو ہمارا کیا قصور جنابِ عالی۔ پولیس تو چار چھتر ہمیں بھی مارے گی خواہ مخواہ۔"

میں نے محسوس کیا جیسے وہ عام بات نہیں کررہا ہے بطورِ خاص میرا حوالہ دینے کا مقصد یہی ہے کہ وہ سب جانتا ہے۔ اس کی بات کی صداقت کو مجھ سے بہتر کون سمجھ سکتا تھا۔ میں نے ہنس کے اس سے اتفاق کیا اور اوپر چل پڑا۔ اس نے مجھے پیچھے سے یاد دلایا کہ "وہ جی.... میری دوائی...؟" اور میں نے پلٹ کے کہہ دیا "ہاں۔ یاد ہے مجھے۔ آج مل جائے گی۔"

"خدا کا شکر ہے" رابعہ نے مجھے دیکھ کے کہا "جیسے گئے تھے ویسے آئے' کچھ ہوا تو نہیں؟"

میں نے سخت حیرانی سے کہا "تمہیں نہیں معلوم ابھی تک؟"

رابعہ کا رنگ اُڑگیا "کیا ہوا۔ جلدی سے بتاؤ!"

"بھئی' مجھے بڑا خطرناک قسم کا عشق ہوگیا ہے تم سے۔ پُرانی بات ہے۔"

"بدتمیز۔ ڈرادیا تھا مجھے۔ اُف.... میرا دل کیسے دھڑک رہا ہے۔" اس نے بڑی بے ساختگی سے میرا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ لیا۔

میں نے غور فرما کے کہا "مجھے تو عجیب سی آواز آرہی ہے۔"

اس نے ہنس کے اور کچھ شرما کے ہاتھ چھوڑدیا "کان بج رہے ہوں گے تمہارے۔"

"نہیں۔ آواز بالکل واضح ہے۔ حلوا... پوری..... حلوا... پوری۔ تم میرے دل پر ہاتھ رکھ کے دیکھو۔ بالکل یہی آواز آرہی ہے نا۔"

چائے والا کسی نوٹس کے بغیر اندر آگیا اور اس رومانی منظر سے خاصا محظوظ ہوا۔ رابعہ کا ہاتھ میں نے پکڑ کے اپنے سینے سے لگا رکھا تھا۔ رابعہ نے جلدی سے ہاتھ چھڑالیا۔ چائے والا مسکراتا ہوا چلا گیا۔

"عجیب بدتمیز آدمی ہے۔"

میں نے کہا "کوئی بات نہیں۔ یہاں سب دل والے رہتے ہیں جن کا ایک ہی فلسفۂ حیات ہے۔ جب پیار کیا تو ڈرنا کیا۔ آؤ دل کی پکار سُنیں' میں حلوا پوری لے آیا ہوں۔"

"اور ان بوریوں میں کیا ہے۔ موت کا سامان؟"

"یہ بھی زندہ رہنے کے لیے ضروری ہے" میں نے آہ بھری۔

جب رابعہ ناشتے کو فرش پر چادر اور اخبار بچھا کے لگا رہی تھی تو میں نے تازہ اردو اخبار کی سرخیوں پر نظر ڈالی۔ صفحۂ اوّل پر بین الاقوامی خبروں میں میری دلچسپی واجبی سی تھی۔ جتنی کسی بھی تعلیم یافتہ کہلانے والے شخص کو ہونی چاہیے۔ ناشتے کے بعد ٹھنڈی

چائے پیتے ہوئے میں نے ایک گرماگرم خبر پڑھی جس نے میرے لہو کو گرما دیا۔

میں نے چلّا کے کہا "وہ مارا پاپڑ والے کو۔"

رابعہ دم بخود رہ گئی "کسے مارا؟ پاپڑ والے کو... کیوں؟"

میں نے رابعہ کو گلے لگا کے کہا "بھئی مبارک ہو تمہیں۔ بہت مبارک۔"

اس نے خود کو چھڑا کے کہا "کس بات کی مبارکباد دی جارہی ہے اتنے جوش و خروش سے؟"

"تم نے کارنامہ ہی ایسا سرانجام دیا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ تمہارا جلوس نکالوں۔ تمہیں گھوڑے پر بٹھا کے اور ہاروں سے لاد کے آگے آگے میں ڈھول بجاتا چلوں جو میں نے دلاور کی تیسری شادی کے نہ ہونے سے پہلے بجایا تھا۔ ساری دنیا کو بتادوں کہ کم سے کم اہالیانِ شہر کو کہ یہ ہے وہ عظیم خاتون' جو کام کیا اس نے وہ رستم سے بھی نہ ہوگا۔"

رابعہ ہنسنے لگی "کیوں پاگل ہورہے ہو اتنے؟"

"بات ہی ایسی ہے جانم۔ دلاور کے خلاف پرچا کٹ گیا۔ ایف آئی آر درج ہوگئی۔ آج کی تازہ خبر۔" میں نے ہاکر کی طرح چلّاتے ہوئے اخبار لہرایا۔

چائے والا دبے پاؤں اندر آگیا۔ "برتن لے جاؤں جی؟"

میں نے جھینپ کے کہا "آخر تم چوروں کی طرح کیوں آتے ہو؟"

"آپ کی کون سی چیز چرائی ہے جی؟" وہ بُرا مان کے بولا۔

میں نے کہا "ناراض کیوں ہوتے ہو یار' یہ لو پیسے' باقی رکھو۔ نیچے سے اوپر آنے میں تمہاری توانائی بھی تو خرچ ہوتی ہے۔ چائے ٹھنڈی تھی۔"

"پھر نہیں ہوگی جی" وہ خوش ہوگیا۔

"پھر تمہیں وہ سین بھی دیکھنے کو نہیں ملے گا جو تم نے پہلی بار دیکھ لیا تھا۔"

"کون سا سین جی؟" وہ انجان بن گیا۔

میں نے کہا "آئندہ دستک دے کر آنا' اب جاؤ۔"

رابعہ نے مجھے ڈانٹا "یہ کیا بے ہودگی ہے۔ وہ کیا سمجھتا ہوگا؟"

"وہ سمجھ گیا ہے۔ دراصل یہاں ایسے ہی لوگ رہتے ہیں کہ اچانک پہنچ کے وہ بہت سے ایسے مناظر دیکھ لیتا ہوگا جو فلموں میں سنسر کردیے جاتے ہیں۔ اس لیے وہ سیدھا اندر آتا ہے۔"

"تمہیں بھی تو شرافت سے رہنا چاہیے۔"

"صرف مجھے..... سارا قصور تمہارا ہے۔ تم ایک بدصورت کالی ٹھگنی اور بے ہنگم چیز ہوتیں تو میں خود تم سے چار ہاتھ دور رہتا۔"

رابعہ ہنسنے لگی "اچھا وہ خبر کیا تھی۔ واقعی دلاور گرفتار ہوگیا؟"

"گرفتار بھی ہوجائے گا انشاء اللہ۔ اس کے خلاف تحقیقات کا حکم تو دے دیا گیا ہے۔ آئی جی کی طرف سے اور وزارتِ داخلہ کے ترجمان کی خبر ہے کہ شیلی کے قتل کی تفتیش میں برطانوی کونسلیٹ کے حکام سے پورا تعاون کیا جائے گا۔" میں نے اخبار اس کے سامنے کردیا۔

"اس قسم کے بیانات کی کوئی اہمیت نہیں۔ یہ تو بس ایک سیاسی بیان ہے جو شاید وزارتِ خارجہ کے ایما پر دیا گیا ہوگا تاکہ ہمارے اور برطانیہ کے سفارتی تعلقات خوشگوار رہیں۔"

میں نے کہا "اس میں یقیناً کونسلیٹ کے دباؤ کو دخل ہوگا اور ممکن ہے اس نے رپورٹ اپنے ملک کے حکام کو بھیجی ہو۔ ہدایات وہاں سے آئی ہوں۔ یہ معاملہ دلاور کا باپ بھی نہیں دبا سکتا۔"

"تم پولیس اور عدالتی نظام سے پوری طرح واقف نہیں ہو۔ اس لیے بہت خوش ہو۔" رابعہ نے خبر پڑھ کے کہا "کونسلیٹ نہ خود تفتیش کرے گا نہ اسکاٹ لینڈ یارڈ کے سراغ رساں طلب کیے جائیں گے۔ پرنالا پھر وہیں گرے گا۔ آئی جی صاحب ایک اعلیٰ اختیاراتی ٹیم بنائیں گے جس میں شاید کوئی ایس پی یا ڈی آئی جی کے عہدے کا افسر ہوگا۔ اس کے ساتھ ایک ڈی ایس پی ہوگا اور ایک انسپکٹر۔ وہ کافی وقت گزارنے کے بعد یعنی دلاور سے معاملے کو دبانے کے تمام اخراجات پر بات چیت کے بعد کیس ایف آئی اے کو بھیج دیں گے۔ وہ نئے سرے سے تفتیش شروع کریں گے۔ درمیان میں ہماری وزارتِ خارجہ کا کوئی سیکشن افسر یا ڈپٹی سیکریٹری کونسلیٹ کو بتاتا رہے گا کہ حکومت پاکستان اس معاملے کو خصوصی توجہ دے رہی ہے۔ یہ ایک صنعت کار کا معاملہ ہے اور کیس بھی اس کے کسی زرخرید غلام یا لاوارث کے قتل کا نہیں ہے۔ سب تفتیشی ادارے اپنا اپنا حصہ وصول کریں گے اور وقت گزاریں گے۔ دلاور کو سودا یقیناً مہنگا پڑے گا لیکن وہ کنگال نہیں ہوگا۔ نہ اس کی عزت وحیثیت متاثر ہوگی۔ بالآخر جو رپورٹ کسی ایس ڈی ایم یا انکوائری کمیشن کو پیش کی جائے گی اس میں تمام الزامات کی نفی ہوگی۔ اسے سیاسی سازش' دشمنی کا نتیجہ اور کردار کشی کی مہم وغیرہ قرار دیا جائے گا۔ کونسلیٹ مجبور ہوگا کہ اس رپورٹ کو تسلیم کرے۔ محض ایک مسلمان پاکستانی لیڈی ڈاکٹر کی خاطر جس کے پاس اتفاق سے برطانوی شہریت تھی۔ پاکستان اور برطانیہ کے سفارتی تعلقات متاثر نہیں ہوں گے' لکھ لو میری بات۔"

میں نے مایوسی سے کہا "تم نے میری اُمیدوں پر پانی پھیردیا۔ آخر تم اور تمہارے ساتھی وکیل۔ جنہوں نے یہ کیس بنایا تھا۔"

"ہم گواہی دے سکتے ہیں۔ بیان دے سکتے ہیں۔ شکوک کا اظہار کرسکتے ہیں مگر تفتیش اپنے ہاتھ میں تو نہیں لے سکتے۔"

"پوسٹ مارٹم رپورٹ..."

"کیسے ہوگا پوسٹ مارٹم... شیلی کی قبر میں تو ایک بڑھیا سورہی ہے۔"

"فرض کرو صحیح قبر کی نشاندہی کردی جائے!"

"تو پوسٹ مارٹم سے ثابت ہوگا کہ اس کی موت بلندی سے گرنے کا نتیجہ تھی جس میں اس کا سر پھٹ گیا تھا اور گردن ٹوٹ گئی تھی۔ اس حادثے کو قتل کون کہے گا اور کیسے ثابت کرے گا؟"

"چشم دید گواہ۔"

"اوّل تو ہیں نہیں۔ جو کوئی سامنے آنا چاہے گا اسے بٹھادیا جائے گا یا خرید لیا جائے گا۔"

"اور تم خاموش رہوگی۔ یہ سب جانتے ہوئے بھی؟"

"میں نہ سہی۔ میرے ساتھی شور مچائیں گے۔ پولیس کی دھاندلی پر احتجاج کریں گے۔ غالب اور اس کے صحافی ساتھی ہماری آواز کو پبلک تک اور حکومت تک پہنچائیں گے لیکن عدالت نہ رائے عامہ سے متاثر ہوتی ہے اور نہ اخبارات سے۔ وہ حقائق' ثبوت اور گواہ دیکھ کے فیصلہ صادر کرتی ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے یہ سب بے کار تھا جو کچھ تم نے کیا تھا؟" میں نے برہمی سے کہا "تمہیں اندازہ تھا کہ کچھ نہیں ہوگا تو جھک مارنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"انصاف کے لیے لڑنا ہمارا فرض ہے۔ انصاف کا نہ ملنا ہماری بدنصیبی۔ دنیا کو معلوم ہوجائے گا کہ سچ کیا تھا اور جھوٹ کیا۔ لوگ بہت سیانے ہوگئے ہیں۔ بس وہ مجبوری اور بے بسی سے ظلم دیکھنے اور ظلم برداشت کرنے کے عادی ہوگئے ہیں۔ اپنے انفرادی مسائل میں ایسے اُلجھے ہوئے ہیں کہ اجتماعی مسائل سے پہلو تہی کرتے ہیں۔ یہ بڑی مجرمانہ بے حسی ہے۔ لوگوں کو سمجھنا چاہیے کہ آج جو زید یا بکر کے ساتھ ہوا کل خود ان کے ساتھ ہوگا تب بھی کوئی نہیں بولے گا۔ لوگوں کو ایک آواز ہوکے بولنا چاہیے۔ ایک ملک کے عوام کی آواز کو کوئی دبا سکتا ہے؟ مگر یہ احساس اور یہ شعور رفتہ رفتہ بیدار ہوگا۔ آہستہ آہستہ پھیلے گا۔ ظاہر ہے کچھ لوگوں کی آواز پہلے کوئی نہیں سنتا لیکن بالآخر وہی وقت کی آواز بن جاتی ہے۔"

"مطلب یہ کہ اس وقت تک ہم انتظار کریں؟ کیا ہماری زندگی میں وہ وقت آئے گا؟" میں نے کہا۔

"آبھی سکتا ہے۔ جدوجہد شرط ہے اور مایوسی سے اجتناب۔"

میں نے کہا "میں اپنی زندگی میں دلاور کو آہنی سلاخوں کے پیچھے اور ہتھکڑی لگے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں اسے پھانسی کے تختے پر دیکھنا چاہتا ہوں۔ ایسے کہ اس کی رحم کی آخری اپیل بھی مسترد ہوچکی ہو۔ وہ میرے باپ کا قاتل ہے لیکن اس کے دامن پر تو اور بھی ان گنت بے گناہ انسانوں کے لہو کے داغ ہیں اگر قانون اسے سزا نہ دے سکا۔"

"تو تم دوگے... یہی ہے نا تمہارا مقصدِ حیات؟"

"بالکل۔ میں ایسا ہی کروں گا۔ اسے قتل کرنا تو بہت آسان تھا لیکن میں چاہتا تھا کہ میرے ساتھ انصاف ہو۔ اس ملک کا قانون اتنا بااختیار ثابت ہو کہ محض دولت اور اثرورسوخ کی بنا پر کوئی نہ بچ سکے۔"

"کاش ایسا ہو۔"

"دلاور کے خلاف تو برطانیہ میں بھی دُہرے قتل کا مقدمہ ہے۔"

"مگر دلاور پاکستان میں ہے۔"

"اسے برطانیہ لے جایا جاسکتا ہے" میں نے کہا۔

"کون لے جائے گا۔ پہلے اس کے خلاف وہاں مقدمہ درج ہو پھر برطانوی حکومت یا انٹرپول کے ذریعے حکومتِ پاکستان سے درخواست کی جائے کہ اس مجرم کو برطانیہ کے حوالے کیا جائے اور یہ سارے مرحلے طے ہوجانے کے بعد مجرم پکڑا جائے۔ پھر برطانیہ میں اس پر جرم ثابت ہو۔ سزائے موت تو وہاں ہے نہیں۔ اس کے علاوہ... وکیل وہاں بھی ہوتے ہیں۔ ہر قسم کے مقدمات کے لیے وکیلوں کی مشہور فرم ہوتی ہے جو فیس بہت زیادہ لیتے ہیں مگر ان کی شہرت کی وجہ یہی ہے کہ وہ اپنے مؤکل کو قانونی موشگافیوں سے بچانے کا ہنر جانتے ہیں۔ ظاہر ہے کوئی قانون اتنا مکمل نہیں ہوتا کہ اس میں چور دروازہ ہی نہیں ہو۔ دلاور کے پاس پیسے کی کیا کمی۔ وہ بڑی سے بڑی لیگل فرم کی خدمات حاصل کرلے گا۔"

میں نے کہا "ایک شخص وہاں اس کے جرم کی سزا کاٹ رہا ہے۔ وہ دلاور کے خلاف جرم کا چشم دید گواہ ہوگا۔"

رابعہ نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہا "میں قنوطی ہوکے سوچنا نہیں چاہتی مگر مجھے تمہارا کسی خوش فہمی میں مبتلا رہنا بھی منظور نہیں۔ یہ کیس بہت کمزور ہوگا۔ اسے دوبارہ شروع کرانا بھی مشکل ہوگا مگر فرض کرو اسے پھر ٹرائل کے لیے بھیج دیا گیا۔ سب سے پہلے شناختی پریڈ ہوگی۔ کیا وہ سیاہ فام اتنے عرصے بعد دلاور کو بہت سے دوسرے لوگوں کے درمیان پہچان سکے گا؟ دلاور کے پرانے چہرے کے خدوخال بہت بدل گئے ہوں گے۔ اس سیاہ فام نے دلاور کی صرف ایک جھلک دیکھی تھی۔ وہ کسی حد تک اس کی یادداشت میں محفوظ ہوگی۔ اب اس نے شناخت میں غلطی کی تو کیس وہیں ختم۔ امکانات لامحدود ہیں۔ یہ بھی بعید از قیاس نہیں کہ وہ جانتے بوجھتے دلاور کو نہ پہچانے۔"

"اور خود جیل میں سڑتا رہے؟"

"وہاں کی جیلوں میں سڑتا کوئی نہیں۔ زیادہ سے زیادہ وہ قیدِ تنہائی ہوتی ہے جس میں آپ کو دنیا سے دور رکھا جاتا ہے اور آپ اپنی مرضی سے کچھ نہیں کرسکتے۔ باقی سہولتیں وہاں ایسی ہیں کہ ہمارے پسماندہ علاقوں کے رہنے والے اور انتہائی غریب کہلانے والے ان کی زندگی کو قابلِ رشک سمجھیں۔ وہ گیم کھیلتے ہیں۔ کھانا بھی ٹھیک ملتا ہے۔ اخبار ریڈیو' ٹیلی وژن بھی انہیں میسر ہوتے ہیں۔ وہ ملاقاتیں بھی کرتے ہیں اور ان پر وہ انسانیت سوز ظلم بھی

نہیں ہوتا جن کی وجہ سے ہماری جیلیں بدنام ہیں۔ بے گناہ قیدی کے حق میں آواز اُٹھانے والے بھی اپنا کام کرتے رہتے ہیں اور برسوں بعد بھی ناامید نہیں ہوتے۔ ایسے قیدیوں کی عزت یا سماجی حیثیت کم نہیں ہوتی۔ اُلٹا انہیں مظلوم سمجھا جاتا ہے اور ہمدردی کا مستحق۔ اس کالے کو اگر اتنی دولت دے دی جائے جو اس کے نقصانات کی تلافی کر دے اور اس کے مستقبل کی خوشحالی کی ضامن ہو تو شاید وہ ہنسی خوشی اسیری کے باقی دن کاٹنا قبول کر لے اور دلاور کو پہچان کے بھی نہ پہچانے۔"

"تم نے تصویر کا انتہائی تاریک رُخ پیش کر کے میرا حوصلہ بہت پست کر دیا ہے۔"

"حوصلہ پست نہیں ہونا چاہیے۔ میں نے یہ نہیں کہا کہ ایسا ہی ہوگا۔ اس کے برعکس بھی ہو سکتا ہے۔ وہ کالا کسی قیمت پر دلاور کو معاف نہ کرے اور اڑ جائے کہ اب تم آجاؤ میری جگہ اندر۔ پھر وہ حرجانے کا کیس کر دے۔ اس کی حمایت میں کالوں کی ہر تنظیم اُٹھ کھڑی ہو۔"

"مطلب یہ کہ مجھے بہت زیادہ پُرامید نہیں رہنا چاہیے۔"

"جب بھی آدمی کوئی کام شروع کرتا ہے تو اس میں کامیابی اور ناکامی کے امکانات کا ایک خاص تناسب ہوتا ہے۔ میں بھی وہی چاہتی ہوں جو تم چاہتے ہو اور میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

"مگر کس حد تک؟"

"حد کیا ہوتی ہے۔ محبت کی انتہا کیا ہے؟"

"فرض کرو میں کہوں کہ رابعہ' دلاور کو قتل کر دو.... میری خاطر۔"

"میں کردوں گی۔" رابعہ نے پورے یقین سے کہا "میں مجبور ہوں۔ مجبور تم نے نہیں کیا ہے۔ میں نے خود اپنے آپ کو کیا ہے۔"

میں اسے حیرانی سے دیکھتا رہا۔ نہ جانے کتنی بار میں نے رابعہ کے جذبات کو مجروح کیا تھا۔ اس کی بات نہیں مانی تھی۔ صاف انکار کر دیا تھا کہ میں ایسا نہیں کر سکتا اور میرے مقابلے میں وہ مسلسل سپر ڈالتی جا رہی تھی۔ اپنی ہار مانتی جا رہی تھی۔ لوگ جو کہتے ہیں کہ عورت کی ہار ہی اس کی جیت ہوتی ہے تو یہ رابعہ نے ثابت کر دیا تھا۔

میں نے اسے چوم کے کہا "تمہاری محبت بہت عظیم ہے۔ مجھے شرم آتی ہے۔"

اس نے مجھے دھکیل کر کہا "جھوٹ۔ تم زیادہ ہی بے شرم ہوتے جا رہے ہو۔ بالکل شرم نہیں آتی تمہیں۔"

میں نے ہنس کے کہا "اب ایسا بھی نہیں۔ تمہارے مقابلے میں کم آتی ہے تو یہ فرق ہے مرد اور عورت کا۔ عورتوں کو رونا بھی بہت آتا ہے۔ مکر کرنا بھی بہت آتا ہے۔ محبت اور نفرت کے ساتھ شرم کے جذبات کا بھی ایسا ہی معاملہ ہے۔"

رابعہ نے انگریزی اخبار اُٹھا لیا تھا۔ میں کار سے نکالے ہوئے ریڈیو فون کو استعمال کرنے کے مضمرات پر غور کر رہا تھا کہ رابعہ نے کہا "اس میں کچھ اور بھی ہے۔"

میں نے سر اُٹھایا "کیا ہے اور؟"

"کونسلیٹ نے ہوم آفس کو لکھا ہے کہ اس کیس میں سزا کاٹنے والے ملزم کا پھر بیان لیا جائے اور تصدیق کے ساتھ ارسال کر دیا جائے۔ اس نے پُرانے کیس کا ریکارڈ نکالنے اور اہم دستاویزات کی نقول فراہم کرنے کو بھی کہا ہے۔"

"ویری گڈ۔ تم بلاوجہ مجھے ڈی مورالائز کر رہی تھیں۔ مجھے لگتا ہے کہ اب کچھ ضرور ہوگا۔ لڑکی یا لڑکا۔"

"کیا بک رہے ہو؟"

"سوری۔ وہ ذرا دماغ اور زبان.... دونوں بھٹک گئے۔ کیا تم نیچے جا کے اپنے مرزا غالب کو خیریت سے مطلع کر سکتی ہو۔ بذریعہ فون۔"

"یہاں فون کہاں ہے؟"

"ہمارے پیارے مالکِ مکان کے پاس۔ اس کی آنکھوں کے لیے دوا بھی لیتی جاؤ۔"

"کون سی دوا؟"

میں نے ویلیم کی شیشی خالی کر کے گولیاں کاغذ کی ایک پُڑیا میں باندھ لیں ۔ حلوا پوری کے ساتھ چھولے بھی تھے جو ہم نے صرف چکھے تھے کیونکہ ان میں مرچیں بہت تیز تھیں۔ میں نے اوپر سے روغن کو بڑی احتیاط سے شیشی میں بھرا۔

"یہ دو گے تم اسے!" رابعہ نے بگڑ کے کہا "اندھا ہو جائے گا وہ۔"

"مرچوں سے کوئی اندھا نہیں ہوتا" میں نے کہا "پانی زیادہ بہتا ہے جس سے آنکھیں دُھل کے صاف ہو جاتی ہیں۔"

"سکندر۔ کیا بچگانہ حرکت ہے۔ بہت تکلیف ہوگی اسے۔"

میں نے کہا "جب اس نے تمہیں میلی نظر سے دیکھا تھا تو مجھے بھی بہت تکلیف ہوئی تھی۔"

رابعہ نے شیشی مجھ سے چھیننے کی کوشش کی "میں ایسا نہیں کر سکتی۔"

"ٹھیک ہے میں خود ہی دے دوں گا اسے" میں نے کہا اور دوڑ کے باہر چلا گیا۔ رابعہ میرے پیچھے لپکی مگر دروازے تک پہنچ کے رُک گئی۔

مالکِ مکان ایک صحت مند سیاہ رو حسینہ کو اوپر اوپر سے ہی نہیں اندر سے بھی پرکھنے کی کوشش کر رہے تھے اور اسے یقین دلا رہے تھے کہ اس کے دن پھرنے ہی والے ہیں۔ راتوں کا اصل مسئلہ ہے۔"

مجھے دیکھتے ہی وہ کچھ جھینپ کر مسکرائے "آؤ جی' ڈاکٹر صاحب!"

میں نے کہا "ایک فون کرنا تھا مجھے۔"

"فون۔ فون کا مت پوچھیں جی۔ یہ بھی اسی لیے آئی تھی مس غنچہ۔" مالکِ مکان بولا "کسی فلمساز کی کال آنے والی تھی۔"

میں نے جیب سے لال روغن کی شیشی نکالی "فون خراب ہے گویا۔"

اس نے مجھے آنکھ ماری اور مس غنچہ کو بھی آنکھ مار کے رخصت کردیا "کال آئے گی تو میں بُلوالوں گا آپ کو۔ خدا کرے فون ٹھیک ہوجائے۔"

مس غنچہ کے جاتے ہی اس نے فون میرے سامنے رکھ دیا "اب کیا بتائیں جی' اتنا کرایہ نہیں دے سکتی جتنی کالیں کرنا چاہتی ہے مفت میں" انہوں نے مفت پر زور دیا "آپ سو فون کرلیں۔ یہ دوائی مجھے دے دیں۔"

غالب اپنے آفس میں نہیں تھا لیکن نازو مل گئی "اچھا آپ ہیں!"

"ابھی تو ہوں" میں نے کہا "کوئی اعتراض؟"

"کہاں سے بول رہے ہو؟"

"اس نامعقول سوال کا جواب میں ہمیشہ یہی دیتا ہوں کہ اپنے منہ سے۔ پتا نہیں جُہلا باربار کیوں پوچھتے ہیں۔"

"بڑے موڈ میں ہو۔ اخبار دیکھ لیا ہے شاید۔"

"میں اخبار پڑھتا ہوں۔ صرف دیکھتا نہیں۔ جو دیکھنے کی چیز ہے اسے باربار دیکھتا ہوں۔ دن میں پنج وقتہ۔"

"سکندر۔ کیا ہوگیا ہے تمہیں؟"

"زکامِ محبت' سرسامِ عشق۔ دل میں درد ہے میٹھا میٹھا۔ پہلے کیفیت اختلاجی تھی۔ اب عالمِ وحشت ہے۔"

وہ ہنسی "رات کو تارے بھی گنتے ہوگے۔"

"نہیں۔ وہ کل دن میں ہی نظر آگئے تھے" میں نے کہا۔

"فون کیوں کیا تھا؟"

"فون کرنے کے لیے ہی بنایا گیا تھا۔ دیگر احوال یہ ہے کہ جملہ لواحقین ابھی تک بالکل زندہ سلامت ہیں اور یہ سوفیصد سچ ہے۔ میں پھر فون کروں گا۔ فقط والسّلام۔"

نازو شور کرتی رہ گئی اور میں نے ریسیور رکھ دیا۔ اصل مقصد اسے اپنی خیریت سے آگاہ کرنا تھا۔ باقی باتیں مالکِ مکان کی موجودگی میں نہیں ہوسکتی تھیں جو مجھے ایسے دیکھ رہا تھا جیسے میں نے اس کے فون پر مریخ کی مخلوق سے رابطہ کرلیا تھا اور انہی کی زبان میں بات کررہا تھا۔ اس کے نقطۂ نظر سے تو میں نے کوئی کام کی بات ہی نہیں کی تھی اور محض ایک کال ضائع کی تھی۔

میں نے اخلاقاً پوچھ لیا "کتنے پیسے؟"

"صرف آٹھ آنے۔ میں تو ضرورت پوری کرتا ہوں سب کی۔ منافع تھوڑی کماتا ہوں۔ نہ لوں تو بل دیتے دیتے یہ جائداد قرق ہوجائے.... ہاں وہ دوائی..."

مجھے آٹھ آنے دیتے ہوئے بہت غصہ آیا۔ خبیث منافع کما کے بھی مکر رہا تھا اور ایک ہاتھ سے کال کے پیسے مانگ رہا تھا تو دوسرے سے دوا۔ ابھی لے بیٹا۔ تو بھی کیا یاد کرے گا۔

میں نے شیشی جیب سے نکالی اور اسے تھمادی "دن میں تین بار دونوں آنکھوں میں دو دو قطرے۔ صبح اُٹھتے ہی۔ دوپہر کو کھانے کے بعد اور رات کو سوتے وقت۔"

وہ بہت خوش ہوا "اور پرہیز جناب؟"

"پرہیز بہت ضروری ہے بلکہ پرہیز نہ کیا تو دوا بے کار ہے۔ صبح ناشتے میں اُبلے ہوئے ٹنڈے صرف نمک کے ساتھ۔ دوپہر کے کھانے میں ایک تندوری روٹی سادہ۔ صرف پانی کے ساتھ۔ رات کو اونٹ کے گوشت کے پارچے..."

وہ متفکر ہوگیا "اور سب تو.... ٹھیک ہے مگر رات کا معاملہ...."

میں نے کہا "کالے بکرے کے کانوں کی یخنی بھی چل سکتی ہے۔"

"لو جی' دو قطرے ابھی ڈال دو اپنے مبارک ہاتھوں سے۔"

میں اس کے لیے تیار نہیں تھا "ایسے نہیں۔ ڈراپر ہونا چاہیے۔"

"ڈراپر بھی لو۔" اس نے میز پر رکھی ہوئی بہت سی شیشیوں میں سے ایک ڈراپر برآمد کرلیا۔

حسبِ توقع اس نے ایسی دلخراش چیخ ماری جیسے میں نے اس کے دل میں خنجر گھونپ دیا ہو یا پیٹ پر انگارا رکھ دیا ہو۔ اس نے اتنا واویلا کیا کہ اندر سے اس کے لواحقین دوڑے چلے آئے۔

"پتا نہیں کیا الا بلا کھاتے رہتے ہو۔ مارڈالیں گے تمہیں یہ سنیاسی حکیم جوان بنانے کے چکر میں" ایک لاؤڈ اسپیکر قسم کی عورت نے سر پر ہاتھ مار کے چلاّتے ہوئے کہا "سٹھیا گئے ہو تم"

"دفع ہوجا اُلو کی پٹھی" وہ بلبلایا "ہروقت ساٹھ کا طعنہ دیتی ہے۔ تیرے باپ نے باسٹھ سال کی عمر میں..."

میں فوراً سٹک گیا کیونکہ اب ان کے درمیان پُرانی خاندانی تاریخ کے شرمناک واقعات پر جنگ چھڑ چکی تھی۔ جاتے وقت وہ شیشی میں نے جیب میں رکھ لی۔ اتنی سزا کافی تھی۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ تکلیف زیادہ ہو تو وہ کسی سچ مچ کے ڈاکٹر کو آنکھیں اور دوا دکھادے۔ گلی کے آخر تک میں اس کی "ہائے اوئے میرا ربّا۔ آہ... اوئے مرگیا" سُن سکتا تھا اور اس کی گھروالی کا ہنگامہ جو وہ شوہر کا ہنگامہ فرو کرنے کے لیے کررہی تھی۔

بازار سے میں نے بجلی کا دس گز تار اور ایک بارہ وولٹ کا اڈاپٹر خریدا اور دوبارہ غالب کو فون کیا۔ کاروباری ذہن کے مالک ایک شخص نے باہر لکھ دیا تھا "ضرورت پڑنے پر آپ یہاں سے فون کرسکتے ہیں۔" بظاہر یہ خدمتِ خلق کے جذبے کا اظہار لگتا تھا مگر اس طرح وہ غیر قانونی طور پر پبلک کال آفس چلا رہا تھا اور "ضرورت" کی قیمت لے رہا تھا۔ کال کی نہیں۔

"یہ کیا تماشا ہے۔ میں ذرا سی دیر کے لیے نیچے گیا تھا۔"

"نازو نے تو بڑے المناک طریقے پر بتایا تھا کہ تم اوپر چلے گئے۔ یعنی اوپر والے کے پاس۔"

"رات کیا لفڑا ہوگیا تھا؟"

"کچھ نہیں۔ میں کشمیری چائے پینے گیا تھا۔ بادام پستے والی۔"

"مجھے معلوم ہے۔ مشرق کے ایک رپورٹر نے مجھے فون کردیا تھا۔"

"کیا اس نے پہچان لیا تھا مجھے؟"

"دیکھ لیتا تو پہچان جاتا۔ وہ اس وقت پہنچا جب تم نکل گئے تھے۔ اسٹوری اسے پوری مل گئی تھی لیکن اخبار کی آخری کاپی تیار تھی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ تم چاہو تو لگادو۔ مجھے شک ہوا' گاڑی کے بارے میں جو کچھ لوگوں نے دیکھا تھا بتادیا تھا۔"

میں نے کہا "وقار سے کہنا اس کی گاڑی پلازا سینما کے سامنے کھڑی ہوئی ہے۔ چابی اندر ہے اس لیے ڈپلی کیٹ لے کر جائے۔ ان کا کیا حال ہے؟"

"مجروحین کا؟"

"ہاں۔ جو مجھے کشمیری چائے پینے سے روکنے کے لیے آئے تھے؟"

"وہ سب اسپتال میں ہیں" غالب نے کہا "دو ہڈیوں کے اسپتال میں۔ ان کی ٹانگیں ناکارہ ہوگئی ہیں۔ تیسرے کا چہرہ زخمی تھا۔ ابھی تک کسی نے کوئی بیان نہیں دیا ہے۔ پولیس پہنچ گئی تھی کچھ دیر بعد۔ انہیں صبح ہوش آیا تو سب نے ایک ہی بات کی "پتا نہیں' کوئی شراب کے نشے میں دھت معلوم ہوتا تھا' پہلے آگے ٹکرماری پھر پیچھے اور گاڑی لہراتا ہوا نکل گیا۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"معلوم کرنے سے۔ مجھے رات کو ہی شک ہوگیا تھا کہ تم نکلے ہوگے اپنی بلبل کے ساتھ سیرِ چمن کو۔ کہتے ہیں کہ بہاراں ہے۔"

"نہیں یار۔ بلبل خوابِ ناز میں تھی۔ میں دلاور سے بات کرنے نکلا تھا۔ اس نے باتوں میں اُلجھالیا اور اس کے الیکٹرانک کُتے پہنچ گئے ریڈیو کی لہریں سونگھتے ہوئے۔ اللہ نے بچایا۔ مگر انہوں نے جھوٹ کیوں بولا؟"

"کُتے اپنے مالک کے اشارے پر چلتے ہیں۔ آج صبح مالک کی مرضی سے پولیس بھی واپس چلی گئی تھی۔ کوئی کیس درج کیے بغیر۔"

"وہ کیوں؟"

"اچھے شکاری ناکارہ گھوڑوں کو اور کُتوں کو گولی ماردیتے ہیں۔ دلاور اب انہیں تسلی دینے جائے گا کہ فکر مت کرو۔ تمہارا علاج میں کراؤں گا۔ خواہ تمہیں لندن' امریکا بھیجنا پڑے۔ تمہارے خاندان کو مالی پریشانی سے بچانا میرا ذمّہ۔ اتنی بڑی قربانی کا انعام بھی بہت بڑا ہوگا۔ اس دنیائے فانی کے بدلے عالمِ جاودانی۔ دلاور جیسے لوگ کوئی روگ نہیں پالتے۔"

"میں پھر اس سے بات کرنے والا ہوں۔ دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے۔"

"تم ہو کہاں؟ میرے پاس ایک خبر ہے تمہیں سُنانے کے لیے۔"

"کل کا اخبار دیکھو۔ رابعہ ساتھ لائی تھی۔ سوری' اخبار وہ آج کا ہے' اس میں ایک کرائے کا مکان ہے۔ رائل پارک میں۔ وہاں آنکھوں کے ایک نامور معالج رہتے ہیں۔ مکان مالک بتادے گا۔ وہ ڈاکٹر سے آنکھوں میں تڑکا لگوا چکا ہے۔ خبر کیا ہے؟"

"خصوصی۔ میں آکے سُناؤں گا۔"

میں نے ریسیور رکھا' دس منٹ بات کرنے کے دس روپے بن گئے تھے "میں نے ٹرنک کال تو نہیں کی تھی۔"

"یہاں ایک میل کے علاقے میں دوسرا فون نہیں تھا۔ بس میں جانے میں تو آدھا گھنٹا لگتا۔ ٹیکسی کرتے تو دس روپے خرچ ہوتے۔ تم نے وقت اور پیسہ دونوں بچائے" اس نے ثابت کردیا کہ فائدے میں تو میں رہا تھا۔

میں گھر کے دروازے سے گزر کے سیڑھیاں چڑھنے لگا تو مجھے مالکِ مکان صاحب کے کراہنے کی آواز آئی۔ ان کا شوروغوغا تھم گیا تھا غالباً اب وہ آنکھیں بند کئے پڑے تھے۔ میں نے اپنی حرکت کو ایک مختلف زاویے سے جواز فراہم کیا۔ اگر حکومت کسی کو نظر بند کرتی ہے تو مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ کچھ عرصہ تو امن وامان رہے۔ اس ٹھرکی مکان مالک کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا۔ جب تک اس کی ہر ایک کو بدنیتی سے دیکھنے والی آنکھوں کی نظربندی رہے خود اس کے حق میں بہتر۔ کچھ تو بارِ گناہ کم ہوگا۔

میں نے رابعہ کو مژدہ سنایا "بس آنے والے ہیں وہ دونوں ہنگامہ خیز اور آتش فشاں محبت کے علمبردار۔"

رابعہ نے خوش ہوکے کہا "غالب اور نازو۔ تم نے پتا سمجھادیا تھا نا اچھی طرح!"

"میں نے کہا تھا' آنکھوں کے ڈاکٹر کو پوچھ لینا۔ مریض مالکِ مکان نیچے ہی روتا ہوا مل جائے گا۔" میں نے قہقہہ مار کے کہا اور پھر اسے مکان مالک کی آنکھوں میں خصوصی زارد قطار ڈراپس ڈالے جانے کی روداد سُنائی۔ ہنستے ہنستے خود رابعہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"یہ خطرناک کام ہے سکندر۔ زیادہ خرابی ہوئی اور وہ چلا گیا تمہاری دوا سمیت کسی اچھے آنکھوں کے ڈاکٹر کے پاس پھر؟"

میں نے اسے جیب سے شیشی نکال کے دکھائی "ابھی سے تم ہمیں دنیا کی سب بیویوں کی طرح عقل سے بالکل پیدل سمجھنے لگی ہو۔ بس ایک ڈوز کافی سمجھی میں نے۔ دوسری کے لئے وہ شیشی تلاش بھی نہیں کرے گا۔ چودہ پندرہ طبق روشن ہوگئے تھے اس پر۔"

ساکٹ میں اڈاپٹر کا پلگ لگا کے میں تار کو اوپر چھت پر لے گیا۔ بارہ وولٹ کا کنکشن ریڈیو فون کو فراہم کرتے ہی اس کی لائٹ آن ہوگئی۔ میں نے دلاور سے رابطے کا نمبر ملایا تو ہمیشہ کی طرح وہی

آواز سُنائی دی مگر اس کا لہجہ پہلے جیسا پھاڑ کھانے والا نہیں تھا۔
"کیا بات ہے؟"
"بات تم سے کرنے کی نہیں ہے۔ دلاور کو بُلاؤ۔"
"اچھا۔ تم وہی ہو!" اس نے محتاط لہجے میں کہا۔
"ہاں۔ تمہارا امینہ باپ۔"
"چوہدری دلاور اسپتال میں ہے" اس نے کہا۔
"جھوٹ مت بولو۔ وہ بات نہیں کرے گا تو اسی کا نقصان ہوگا۔"
"میں سچ کہہ رہا ہوں۔"
میں نے کہا "وہ کون سے اسپتال میں ہے؟"
"یہ بتانے کی اجازت نہیں ہے مجھے۔"
"گولی لگی تھی دلاور کو۔ اس لیے جانا پڑا اسپتال۔ کیا زخم کاری ہے؟"
"مجھے نہیں معلوم۔"
"اگر وہ مرگیا تو میں تمہیں مٹھائی کھلاؤں گا۔ دعا کرو..." میں نے ریسیور آف کردیا۔ لمبی بات کرنے کا ویسے بھی میرا پروگرام نہیں تھا لیکن دلاور کے بارے میں اس اطلاع نے مجھے تذبذب میں ڈال دیا تھا۔ اگر ایسا ہی تھا تو غالب کو یہ بات کیوں معلوم نہیں تھی اور اس آپریٹر کو یہ بات مجھے بتانے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ صرف یہ کہہ سکتا تھا کہ چوہدری صاحب نہیں ہیں۔ یہ گمراہ کن اطلاع یعنی "ڈس انفارمیشن" تو نہیں۔
میں اپنے سازوسامان کے ساتھ نیچے پہنچا تو غالب اور نازو براجمان تھے "بلائیں نازل ہوگئیں یہاں پر؟" میں نے کہا۔
نازو نے کہا "رابعہ بتارہی تھی کہ یہ بدنام جگہ ہے؟"
میں نے اس کا براہِ راست جواب دینے سے گریز کیا "نیک نام لوگ آئیں گے تو نیک نام کہلانے لگے گی۔"
غالب بولا "بھوت آنے لگے تو بھوتوں کا ڈیرا مشہور ہوجائے گی۔ میرے سسر کا داخلہ ممنوع کردیتا۔ بڑا بدمعاش بھوت ہے۔"
"غالب۔ ہوش میں رہنا۔ میرے ابّا بہت شریف آدمی تھے۔"
"مجھے کیا معلوم۔ دیکھنے میں تو ہم بھی شریف لگتے ہیں۔"
"اپنا مقابلہ ان سے مت کرو۔ وہ واقعی شریف تھے۔"
"ان کا نام شریف الدین تھا۔ یا شاید محمد شریف۔ میں نے ایک ڈاکٹر قاتل اور جواری کا نام پاکباز خان دیکھا ہے" غالب بولا۔
"میں ان کی شرافت کی بات کررہی تھی۔"
"شرافت کا کوئی سرٹیفکیٹ ہے تمہارے پاس۔ سرٹیفکیٹ کے بغیر کوئی نہیں مانتا کہ آپ میٹرک پاس بھی ہیں۔ برتھ سرٹیفکیٹ نہ ہو تو آدمی پیدا نہیں ہوتا۔ ڈیتھ سرٹیفکیٹ ہو تو مرجاتا ہے۔ سرٹیفکیٹ لاؤ بی بی۔"
نازو نے چلّا کے کہا "کیا مطلب ہے تمہارا۔ وہ بدمعاش تھے؟"
"جوانی میں سب ہوتے ہیں۔ ان کا بڑھاپا تم نے دیکھا تھا۔ تمہارا دل رکھنے کے لیے میں مان لیتا ہوں کہ وہ شریف تھے اور تم شریف زادی ہو بلکہ شریف الدین زادی۔"
"پھر تم نے بدمعاش کیوں کہا تھا انہیں؟"
"میں نے ایک بھوت کو کہا تھا جو خود کو میرا سسر بتاتا ہے۔ اس کے پاس بھی میرا سسر ہونے کا سرٹیفکیٹ نہیں ہے۔ تم کو کیوں باسی کڑھی کی طرح اُبال آرہا ہے۔"
"میں باسی کڑھی ہوں؟" نازو نے آستین چڑھالی "اور تم خود کیا ہو؟"
غالب نے دوزانو ہوکے سینے پر ہاتھ رکھا اور سر جھکایا "میں تمہارا اکلوتا، پہلا اور آخری پرستار۔ جانثار، دلدار، بے حد پائیدار اور روفا... تدرے نابکار۔"
نازو ہنس پڑی "بس کرو، قافیے باز۔"
میں نے کہا "یہ اچھی بات ہے کہ اب تم لڑتے ہو تو آپس میں ہی صلح کرلیتے ہو۔ بیرونی مداخلت کی ضرورت نہیں پڑتی۔ خبر سُناؤ پہلے مجھے۔"
"تم نے اخبار دیکھا آج کا؟"
"پھر وہی احمقانہ بات۔ دیکھا نہیں پڑھا ہے اوّل تا آخر۔ پہلے انگریزی میں اور پھر اسی کا ترجمہ اردو میں۔"
"اس میں ایک خبر دلاور کے بارے میں تھی۔"
"مس رابعہ قاری ایڈووکیٹ ہائی کورٹ فرماتی ہیں کہ وہ کوئی خبر ہی نہیں، انہوں نے مجھے اتنے تاریک پہلو دکھائے کہ مجھے مستقبل میں اندھیرا ہی اندھیرا دکھائی دیتا ہے۔ تارک الدنیا ہوجاتا اگر مسلمان نہ ہوتا۔"
رابعہ نے احتجاج کیا "میں شیخ چلی کے خیالوں کی حمایت نہیں کرسکتی۔ کہ بالکل ٹھیک سوچا تم نے۔ ایسا ہی ہوگا۔"
"خبر تازہ ترین جو اخبارات میں نہیں پہنچی یہ ہے کہ دلاور اسپتال میں ہے۔"
"خود بیٹے نے اس کا دارِ فانی سے کوچ کرادیا تھا، وہ بچ گیا۔"
"یہ جھوٹی اسٹوری ہے۔ بیٹے کو تم کیا سمجھتے ہو۔ وہ اپنے باپ کا بھی باپ ہے ابھی سے۔ دیکھ لو کتنی صفائی سے ماں کو نکال کے لے گیا۔ تمہارے جذبات سے کھیل کے اس نے وہ کام کیا جو دلاور بم بندوق سے نہیں کرسکتا تھا۔ کہانی اور مکالمے بے شک دلاور کے تھے لیکن ادائیگی تو خود بیٹے نے کی۔ اداکاری تو اس کی اپنی تھی۔"
میں نے خود کو سخت احمق محسوس کیا "یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟"
"جیسے میں عقل اور دوراندیشی کی بیشتر باتیں کہتا ہوں۔ اور ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ خود دلاور کو دیکھ لو۔"
میں نے بڑے اشتیاق سے کہا "نکالو نا یار۔ اتنی دیر سے جیب میں چھپا رکھا ہے۔"
غالب ہنسا "تم مذاق سمجھ رہے ہو۔ میری سی آئی ڈی نے بتایا ہے کہ وہ بیٹا کتنا اُلو کا پٹھا ہے۔ اس کا مقصد چند دن غائب رہنا تھا۔ وہ ایک اسپتال کے وی آئی پی روم میں جاکے لیٹ گیا ہے۔ اس کے جسم پر خراش بھی مل جائے نہیں تو میرا نام چقندر بروزنِ سکندر۔"
"کافر وہ جو شک کرے آپ پر یعنی نازو۔ پیرومرشد یہ بھی فرمایئے کہ ایسا دلاور نے کیوں کیا اور اس وقت وہ کہاں ہے؟"
"اسپتال میں اسے گزشتہ ہفتے سے داخل دکھایا گیا ہے تاکہ کل کی کارروائی کو کسی طرح اس کے کھاتے میں نہ ڈالا جاسکے۔"
"مرزا۔ تمہاری سی آئی ڈی کے مخبر کون ہیں؟"
"سوری۔ مخبروں کے نام نہیں بتائے جاسکتے۔ ایک مخبر دلاور کے اندر کے لوگوں میں شامل ہے۔ معتمدینِ خاص میں۔ اس کی اطلاع ہے کہ دلاور نے اسپتال کے ریکارڈ میں اپنا نام استاد پیڈرو لکھوایا ہے۔"
"اور اسپتال والوں نے لکھ لیا!"
"وہ نام پر معترض نہیں ہوتے۔ خصوصاً اس وقت جب مالکان کسی کی مدد کرنا چاہیں اور انہیں مطلوبہ معاوضہ مل جائے۔ یہی نہیں، اسپتال میں استاد پیڈرو کا ایک..... آپریشن دکھایا گیا ہے کل کی تاریخ میں۔ آپریشن تھیٹر کے ریکارڈ میں بھی ضروری اندراجات کرلیے گئے ہوں گے۔"
"میرا تو دماغ چکرا گیا ہے۔ آخر کیا مقصد ہے اس کا؟"
"ظاہر ہے پیڈرو کو حفاظتی چھتری فراہم کرنا۔ دلاور بھی غائب ہوگیا اور پیڈرو کے بارے میں اسپتال کا عملہ اور ریکارڈ یہ شو کرتا ہے کہ وہ وہاں داخل تھا جب کہ وہ کہیں اور کسی خاص کارروائی میں مصروف ہے۔ آئی بات سمجھ میں؟"
دلاور کی عیاری اور مکاری پر میں دم بخود رہ گیا "یار یہ تو بہت ہی حرامی چیز ہے۔"
"دریں چہ شک۔ اپنے جانشین کو کیسی عملی تربیت دے رہا ہے وہ۔ وہ باپ سے بڑا ایکٹر ہے اور بہت آگے جائے گا۔ دلاور نے اسے ساری اسکیم سمجھائی ہوگی کہ بیٹا یہ سکندر اعظم اور اس کے حواری جو اپنے آپ کو ایم آر ایس کہتے ہیں۔ بڑے جیالے اور افلاطون بنتے ہیں۔ جذباتی احمقوں کا ایک ٹولہ ہیں۔ پیڈرو تو کسی اور مشن پر جا ہی رہا تھا۔ دلاور نے بیٹے کو سمجھادیا کہ یہ ڈراما تمہاری کوشش سے کامیاب ہوسکتا ہے۔ طاقت استعمال تو کی جاسکتی ہے مگر اس میں خطرہ ہے تمہاری ماں کی جان جانے کا۔ پہلے اسے نکال لاؤ۔ پھر میں باقی سب سے نمٹ لوں گا اور بیٹے نے باپ کی توقعات پر پورا اُتر کے ثابت کردیا کہ دلاور کے بعد اس سے بڑا دلاور ہوگا۔ اور ہم اس سے بہت پیچھے ہیں" غالب نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔
"ہم پیچھے نہیں ہیں" نازو نے کہا۔
"چودہ پندرہ سال پیچھے ہیں" غالب اپنی بات پر قائم رہا۔
میں نے کہا "وہ کیسے؟"
"بھائی آنے والے دلاور کی تو عملی تربیت بھی شروع ہوچکی ہے۔ کل کے سکندر اور غالب ابھی کہاں ہیں۔ جو اس کا مقابلہ کریں۔"
رابعہ تو مسکرا کے چپ ہوگئی مگر نازو نے جھینپ کے کہا "تو کرلیتے نا پہلے سے اس کا بندوبست۔"
"تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی" غالب بولا۔
"تو دوسرا ہاتھ تلاش کرلیتے۔ اب کیا ہوسکتا ہے" نازو بولی۔
"ہو تو سکتا ہے" غالب نے سوچ کے کہا مگر شرارت اس کے چہرے سے ٹپک رہی تھی۔
میں نے کہا "بتایئے نا حضور۔ کیا ہوسکتا ہے؟"
"بھئی آپ نے وہ قصہ تو سُنا ہوگا۔ کسی نے شادی کے لیے اٹھارہ سالہ دوشیزہ کی شرط رکھی تھی اور یہ کہا تھا کہ ایک نہ ملے تو نو نو سال کی دو لے آنا۔ تو ہم بھی ڈبل سے اسٹارٹ کریں اگر۔"
نازو نے آنکھیں نکال کے کہا "باز آجاؤ غالب۔"
غالب میرے پیچھے آگیا "یار یہ حساب کی بات ہے۔ سات سات سال کے دو ہوں تو چودہ کے برابر ہوں گے یا نہیں؟ یہ جو دلاور زادہ ہے نا۔ مزید سات سال بعد یہ ہوگا اکیس کا۔ اور ہمارے دو اسی طرح دن دونی ترقی کرتے رہے تو مزید سات سال بعد دونوں مل کے اٹھائیس کے اور دلاور کی اولاد بھی اٹھائیس کی۔ ہوگیا نا برابر۔ پھر وہ ایک اور یہ دو۔ یار بس نیت کرلو تین کی۔ دو تو ہوں گے۔"
نازو نے خلافِ توقع مجھے ایک طرف دھکیل کے غالب کو پکڑ لیا "ابھی دو اور تین کا پہاڑا یاد کراتی ہوں میں۔"
"ارے نازو۔ یہ کیا بھئی۔ تم سے کچھ کہا ہے میں نے؟"
غالب اِدھر اُدھر بھاگا مگر نازو نے اسے پکڑ کے اُٹھایا اور چارپائی پر پھینک دیا۔ غالب کی ہنسی نہیں رک رہی تھی "نازو آخر رابعہ کو ہی دیکھو۔ کتنی شرافت سے اس نے اتفاق کیا کہ میں غلط نہیں کہتا۔"
نازو نے پھر اسے ایک ہاتھ پکڑ کے کھینچا اور سر کے اوپر سے گزار کے دوسری چارپائی پر پھینک دیا "کتنے ہوئے، دو کہ چار...؟"
چارپائی زیادہ مضبوط نہیں تھی۔ اس کی ایک پٹی ٹوٹ گئی اور غالب اندر دھنس گیا۔ "آہ۔ توڑ دی میری کمر۔ سُنا سکندر، کیسی صاف آواز آئی ہے۔ ریڑھ کی ہڈی کے دو ٹکڑے ہوگئے۔ ہے نا یہ بھوت کی بچی۔"
رابعہ نے نازو کو روک لیا "بس کرو نازو۔ نیچے لوگ کیا سمجھیں گے۔ اوپر کیا دھما چوکڑی ہورہی ہے؟"
غالب نے اُٹھتے ہوئے کہا "ہر نئے نظریئے کی مخالفت جاہل لوگ ایسے ہی کرتے ہیں۔ بعد میں مان لیتے ہیں۔"
امن وامان بحال ہوتے ہی میں نے کہا "مرزا۔ تمہاری سی آئی ڈی کی رپورٹ غلط بھی تو ہوسکتی ہے۔"
"ہرگز نہیں۔"
"کیوں۔ اس میں سب فرشتے ہیں کیا؟"
غالب نے کہا "میں تصدیق کرچکا ہوں۔"
"یعنی تمہیں معلوم ہے کہ دلاور کسی اسپتال میں لیٹا ہوا

ہے؟"

اس نے اقرار میں سرہلایا "یہ الگ بات ہے کہ اس تک پہنچنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا میرے بھوت سسر تک پہنچنا۔ وہ رابطہ قائم کرسکتا ہے اگر چاہے۔"

"بہت سخت سیکیوریٹی ہے؟"

"ہاں۔ اور اسپتال میں ہم مشین گن سے گولیاں برساتے اور دستی بم پھینکتے ہوئے نہیں جاسکتے۔ اب اس معاملے کے تین پہلو تھے۔ ہمیں بے وقوف بنانا۔ الحمداللہ ہم بن چکے۔ پیڈرو کو کسی ایسے مشن پر بھیجنا جو بہت خطرناک ہے لیکن دلاور کی طرف سے اس کو پورا تحفظ حاصل ہے۔ اس پر الزام آہی نہیں سکتا۔ جس مریض کا اسپتال میں کوئی...... آپریشن ہوا ہو وہ کسی دوسری جگہ یا دوسرے شہر میں قتل کیسے کرسکتا ہے۔"

میں چونکا "دوسرے شہر میں قتل؟"

"ہاں۔ قتل کرکے نکل جانا اس کے لیے مشکل نہیں۔ سو چشم دید گواہ ہوں تب بھی اس کو کچھ نہیں ہوسکتا۔ یہ شہادت زیادہ مضبوط ہے۔"

"یار غالب۔ مجھے سخت پریشانی لاحق ہورہی ہے۔ دوسرے شہر میں قتل کے خیال سے۔"

"قتل ضروری نہیں۔ اغوا بھی ہوسکتا ہے۔"

"گل اور محسن کا یا فوزیہ کا..." میں نے کہا "تم ٹھیک سوچ رہے ہو یار۔ مگر تم نے سوچنے کے علاوہ بھی کچھ کیا؟"

"ہاں۔ میں نے فیصل آباد والوں کو روپوش ہوجانے کے لیے کہہ دیا۔ گل اور محسن تو کراچی چلے گئے ہیں۔ سالے اکرام کے پاس۔"

نازو نے بگڑ کے کہا "گالی دینا ضروری ہے۔"

"یہ پیار کا ایک رشتہ بھی تو ہوتا ہے۔ اور ہے" غالب نے کہا۔

"ابھی نہیں ہے۔"

"ہوجائے گا پھر میں اسے ایسے ہی بلاؤں گا۔ چل سالے اِدھر آ۔ سالے کیا کررہا ہے۔ چل سالے میرے ساتھ۔"

"بڑے اچھے لگوگے" نازو نے جل بھُن کے کہا۔

"ابھی کیسا لگتا ہوں تمہیں۔ وہی کہنا جو اس روز کہہ رہی تھیں۔ تم پیار کے سمندر کو ہلانے والا چودھویں کا چاند ہو۔ تم گلشن عشق کی بہار ہو اور میں خوشبو۔"

نازو دنگ رہ گئی "یہ.... میں کہہ رہی تھی.... غالب کے بچّے!"

"اور کیا میرا سسر کہہ رہا تھا۔ میں جاگ رہا تھا اس وقت۔ اور بتاؤں...؟"

"جھوٹے۔ بے شرم" نازو پھر اس کی طرف لپکی لیکن میں نے اسے روک لیا کیونکہ اس سے سنجیدہ گفتگو میں مداخلت ہورہی تھی۔

"آخر یہ عورتوں سے کُشتی کیوں نہیں لڑتی۔ اسے مردوں سے ہاتھاپائی کا شوق کیوں ہے۔" غالب نے شکایتی انداز میں کہا "ضرور اس کی نفسیات میں گڑبڑ ہے۔ ہمارا دل تو نہیں چاہتا کسی عورت سے گتھم گتھا ہونے کو۔"

میں نے کہا "فوزیہ اور اس کا شوہر وہیں ہیں؟"

غالب نے کہا "ابھی تو وہیں ہیں۔ کیا نام ہے فوزیہ کے شوہر کا؟ ایاز... ایاز صاحب ٹرانسفر کرانے کے چکر میں تھے۔ اس میں وقت لگتا ہے۔ میں نے تو کہا تھا کہ مری کا راؤنڈ لگالو۔"

میں نے کہا "غالب، کہیں دلاور اپنی ناکامی کا بدلہ اب ان سے نہ لے۔ ایاز کو تو پہلے بھی اغوا کرلیا گیا تھا۔ ہم نے اینٹ کا جواب پتھر سے دیا۔ اب کہیں وہ پتھر کا جواب ہتھوڑے سے نہ دے۔"

"فکر کرنے سے کیا ہوسکتا ہے۔ ایاز کوئی بچّہ تو نہیں ہے اور فوزیہ چاہے تو اسے مجبور کرسکتی ہے۔"

"وہ تو سمجھتی ہوگی کہ اس کی زندگی کے سارے مصائب کا ذمّے دار میں ہوں۔ غالب تم جاکے انہیں دیکھو۔ وہ دلاور کا مقابلہ کیسے کرسکتے ہیں۔ انہیں بچاؤ۔"

"اچھا کچھ کرتے ہیں۔ ابھی تو یہاں دلاور کا معاملہ بھی عجیب ہوگیا ہے۔ میں نے اُڑتی سی اک خبر سُنی ہے کہ اس کو بک کرلیا گیا ہے۔ یعنی شیلی مرڈر کیس میں اس کا نام شامل ہوگیا ہے۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے؟"

"اس سے یہ ہوا ہے کہ دلاور کے بیرونِ ملک جانے پر پابندی لگ گئی ہے۔ اس کا پاسپورٹ سرکاری تحویل میں لے لیا گیا ہے۔"

"وہ دوسرے پاسپورٹ پر نکل جائے گا۔ اگر اسے جانا ہوا۔"

"مگر وہ جائے گا نہیں۔ ابھی اس کے خلاف ثبوت کوئی نہیں اور وہ سمجھتا ہے کہ محض شک کی بنا پر کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ایک اور غیر مصدقہ خبر یہ ہے کہ گزشتہ رات ایف آئی اے کے ایک بہت سینئر افسر نے اس سے اسپتال میں ملاقات کی۔ ہوسکتا ہے کہ اسپتال میں داخل ہونے کا مشورہ دینے والا بھی وہی ہو لیکن دلاور سے پوچھ گچھ ضرور ہوئی ہے۔ کونسلیٹ نے اسلام آباد میں وزارتِ داخلہ سے رپورٹ مانگی ہے۔ اسے کچھ تو بتانا ہوگا۔"

"یہ تو خوش خبری ہے۔ بس کسی طرح وہ چکر میں آجائے اور گرفتار ہوکے ایک بار حوالات پہنچ جائے۔ میری بڑی حسرت ہے اسے حوالات کی سلاخوں کے پیچھے دیکھنے کی۔"

اب رابعہ نے مداخلت کی "ممکن ہے وہ ضمانت قبل از گرفتاری کے لیے خاموشی سے کوشش کررہا ہو لیکن ضمانت مشکل ہے قتل کے کیس میں۔"

میں نے مسرت سے کہا "کیا واقعی وہ گرفتار ہوجائے گا؟"

"اگر ایک بار تفتیش میں اس کا نام آگیا تو پھر پوچھ گچھ تو ہوگی۔ اب یہ الگ بات ہے کہ پولیس اسے ہاتھ تک نہ لگائے۔ وہ عزت احترام کے ساتھ گھر میں ہی رہے اور تفتیش مکمل ہوجائے جس میں اس پر کوئی الزام نہ رہے مگر یہ بات ہے مشکل۔ معاملہ ایک برٹش ڈاکٹر کا ہے۔"

"منظر اور وقار سے کہو کہ اس کیس کے پیچھے لگ جائیں۔ معلوم کرتے رہیں کہ کیا ہورہا ہے؟"

غالب نے کہا "ایک منظر ہی کیا۔ وس وکیل اور بھی ہیں۔ دلاور کے خلاف کیس میں بارہ سینئر وکیل تھے جن کی طرف سے کیس کی تفصیلات ارسال کی گئی تھیں۔ وہ سب بڑے مضبوط لوگ ہیں اور دلاور کی چالوں کو ناکام کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کا اصل مقابلہ ہے پولیس سے جو دلاور کے ساتھ ہے۔ تم کو بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ یہ جگہ چھُپ کے رہنے کے لیے بہترین ہے۔"

"بشرطیکہ یہ اندر ہی رہیں" رابعہ نے طنز سے کہا۔

"کیا مطلب؟ میں قید ہوجاؤں ان دو کمروں میں؟"

"چند دن گزار لو۔ اب دلاور بھی دباؤ میں آرہا ہے۔ شاید بہتری کی کوئی صورت نکل آئے۔"

"بہتری کی اُمید دلاور سے؟" میں نے کہا "وہ ڈھیٹ ہڈی ہے جو ٹوٹ تو سکتی ہے خم نہیں ہوسکتی۔"

"کُتّے کی دُم کے بارے میں بھی یہی مشہور ہے کہ بارہ برس نلکی میں ڈال کے رکھو تو نلکی ٹیڑھی ہوجائے گی، دُم سیدھی نہیں ہوگی۔"

"یہ غلط ہے کیا؟"

"میں کہتا ہوں بارہ برس بعد تو کُتّا بھی نلکی کا عادی ہوجائے گا۔ رہنے دو اسے نلکی کے ساتھ۔ بائی داوے۔ کُتّے کی طبعی عمر کتنی ہوتی ہے۔ کیا بارہ سال زندہ رہتا ہے وہ؟" غالب نے کہا۔

"مرزا جی۔ یہ خیال تو ذہن سے نکال دو کہ میں یہاں صبح سے رات تک۔ اور پھر رات سے صبح تک چارپائی پر لیٹا رہوں گا۔ ہوائی قلعے بناتا رہوں گا اور خوابوں کے محل ڈیزائن کرتا رہوں گا۔ اس سے تو بہتر ہے کہ تم لوگ مل کے مجھے پاگل خانے میں داخل کرادو۔ وہ زیادہ محفوظ جگہ ہے جہاں دلاور کے فرشتے بھی نہیں پہنچ سکتے۔ سارا دن جو چاہو کرو، چیخو چلّاؤ۔ چھلانگیں مارو یا قہقہے۔"

"بہت اچھی تجویز ہے۔ رابعہ، کیا خیال ہے؟"

"یہ وہاں سے بھی نکل جائیں گے۔ اپنی جگہ پاگل خانے کے ڈاکٹر کو بند کرکے۔" رابعہ نے کہا "آخر بیمار ہوکے بھی تو آدمی لیٹتا ہے آرام سے۔"

میں نے کہا "میں بیمار نہیں ہوں۔ لیٹا رہا تو بیمار ہوجاؤں گا۔"

"تمہیں اجازت ہے چھت پر چڑھ کے پتنگ اُڑاؤ۔ میں کبوتر لادوں گا۔ اسلاف کا مشغلہ رہا ہے کبوتر بازی۔ بہت خوش ہوں گے عالمِ ارواح میں کہ اس گمراہ نسل میں کوئی تو ہے جو ان کے فنونِ لطیفہ کی سرپرستی کرتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی بازیاں ہیں مثلاً چالبازی، نوسربازی، عشق بازی۔ رابعہ کے ساتھ..."

"غالب۔ حد سے مت بڑھو۔"

"جملہ مکمل تو ہونے دو۔ رابعہ کے ساتھ تم تاش، لوڈو اور لنگڑی پالا کھیل سکتے ہو۔ بالکل بے ضرر کھیل ہیں۔" غالب ہنسا "اونچ نیچ کھیلو۔ ایک دوسرے کو پکڑنے کا کھیل کھیلو۔ میں گڑیا گڈا لادیتا ہوں۔ ان کا بیاہ رچاؤنی الحال۔"

میں نے جوتا اُتار لیا۔ "میں سوچ رہا ہوں۔"

غالب احتیاطاً پیچھے ہٹ گیا "جوتے گانٹھنے کی۔ یہ بھی اچھا کام ہے۔ دن گزر جائے گا مصروفیت میں۔ شام تک ایک جوڑی بنالوگے تو آمدنی الگ۔"

"تمہاری کھال اچھی ہے۔ اس کام کے لئے..."

"اپنے ایمان سے کہو۔ نازو کی یا رابعہ کی کھال کتنی نفیس ہے۔ بڑی ملائم اور کورے لٹھے کی طرح صاف۔"

"جوتے کے لیے ذرا موٹی کھال چاہیے۔ مضبوط قسم کی" میں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"اوکے۔ اوکے۔ تم چلو میرے ساتھ۔ مت بیٹھو گھر میں" غالب نے کہا "رابعہ کو بٹھادو پردے میں۔ یہ جوتا ہاتھ میں نہیں پیر میں اچھا لگتا ہے۔"

میں نے جوتا پھر پہن لیا "وہ اسپتال کہاں ہے۔ جہاں استاد پیڈرو کے نام سے چوہدری صاحب محوِ استراحت ہیں۔ مالک کون ہے اس کا؟"

"مالک ایک اور چوہدری ہیں۔ ان کا سینما بھی ہے" غالب بولا۔

"تم جانتے ہو انہیں؟"

غالب نے کہا "اتنا ہی جتنا وزیراعظم کو جانتا ہوں۔ نام معلوم ہے۔ صورت دیکھی ہے، گھر دیکھا ہے۔"

"کیوں نہ ہم ان سے ملیں اور ان کے کندھوں پر سوار ہوکے جائیں دلاور سے ملنے کے لیے۔"

"وہ بوڑھا آدمی ہے۔ دو مسٹنڈوں کے وزن سے بیٹھ جائے گا لیکن تجویز اچھی ہے۔ اس میں ہمارے اسٹریچر پر واپس آنے، ہڈیوں کے وارڈ یا مُردہ خانے پہنچنے کے امکانات بھی روشن ہیں۔"

"فضول باتیں مت کرو۔" نازو نے خفگی سے کہا "کس کی مجال ہے کہ تم پر انگلی بھی اُٹھائے۔"

"بچّہ بچّہ راہ چلتے مجھ پر انگلی اُٹھاتا ہے۔ کہتا ہے دیکھو وہ جارہا ہے ایک بھوت کا داماد..."

میں نے بات بڑھنے نہیں دی "تم آج فون کرو اسپتال کے مالک کو۔ اخباری نمائندے کی حیثیت سے۔ اور اس سے کہو کہ انٹرویو لینا ہے۔"

"کیوں نہ یہ کام میں کروں؟" نازو نے جوش سے کہا۔

"اللہ تمہیں جزائے خیر اور اولادِ صالح دے" غالب نے دعائیہ انداز میں کہا "میری بلائیں لیتی ہو... اپنے سر..."

میں نے کہا "تم اسے گھیر لاؤ۔ اسپتال کے دروازے تک تو وہاں ہم استقبال کے لیے موجود ہوں گے۔ تمہارے ساتھ ہی چلے جائیں گے۔"

"آج شام کے لئے وقت لے لوں؟" نازو نے کہا۔

غالب نے کہا "ہوشیار رہنا۔ سنا ہے وہ کوئی منتر جانتا ہے۔ ساتویں یا آٹھویں بیوی ہے اس کی۔ چھ کو چھوڑ چکا ہے۔ سب ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ بری تم بھی نہیں ہو۔"

"اس نے پرپوز کیا تو میں آٹھویں بننا قبول کرلوں گی" نازو نے ہنس کے کہا۔

وہ نکل رہے تھے کہ مالکِ مکان سرخ آنکھیں لیے نمودار ہوا "ڈاکٹر صاحب' وہ دوائی کی شیشی پتا نہیں کہاں رکھ دی میں نے۔"

رابعہ نے مجھے گھورا "چچا' آپ چلے جائیں کسی اچھے سے ڈاکٹر کے پاس۔"

وہ بُرا مان گیا "لو جی۔ چچا کیسے کہہ دیا آپ نے؟ میری کیا اتنی عمر ہے اور اچھے ڈاکٹر کیا یہ نہیں ہیں؟"

رابعہ نے کہا "یہ بھی اچھے ہیں مگر انہوں نے شاید بتایا نہیں آپ کو۔ یہ جانوروں کی آنکھوں کے اسپیشلسٹ ہیں۔"

وہ اُچھلا "جانوروں کی آنکھوں کے۔ میں..... میں کیا گدھا ہوں جی۔ میری آنکھوں میں کیا دوائی ڈال دی تھی؟"

میں نے اسے تسلی دی "وہ بندر کی آنکھوں میں ڈالتے ہیں اور انسان پہلے بندر ہی تھے۔ یقین نہیں تو ڈارون کی جو کتاب نظریۂ ارتقا پر ہے..... وہ پڑھ لو۔"

وہ ایسے گیا جیسے سیدھا میری بات کی تصدیق بندروں سے کرے گا۔ کچھ دیر بعد اس کے چلّانے پر میں نے دروازہ کھول کے دیکھا۔ آخری سیڑھی شاید اسے نظر نہیں آئی تھی۔ اب وہ لنگڑاتا ہوا اور گالیاں بکتا ہوا نیچے جارہا تھا۔ ظاہر ہے گالیاں میری شان میں تھیں اور مجھے بُرا ماننے کا کوئی حق نہیں تھا۔

غالب اور نازو چلے گئے تو میں نے رابعہ سے کہا "اب بتاؤ کیا کریں۔ کون سی بازی کھیلیں؟"

"آؤ چھت پر چلیں۔ پتنگ اُڑائیں" رابعہ نے کہا "بڑا مزہ آئے گا۔"

"پتنگ کہاں سے آئے گی؟"

"تم دوڑ کے لے آؤ۔ نسبت روڈ سے۔ مانجھا ذرا اچھا دیکھ کے لانا۔"

پتنگ بازی میں واقعی بہت مزہ آیا۔ رابعہ انتہائی باکمال قسم کی پتنگ باز ثابت ہوئی۔ معلوم نہیں یہ اطلاع نیچے کیسے پہنچی۔ کچھ دیر بعد وہ لڑکی نمودار ہوئی جس سے میرے تعلقات سخت کشیدہ ہوگئے تھے۔ وہ رابعہ کی بھی استاد ثابت ہوئی۔ رابعہ مجھے بھول گئی اور وہ پُرانی سہیلیوں کی طرح ایسے پیچ لڑانے لگیں جیسے پتنگ بازی کے ٹورنامنٹ کا فائنل ہے۔ آخری پتنگ کٹوا کے اس نے مجھے پھر آنکھ ماری اور نیچے اُتر گئی۔ فلمی دنیا کے لیے اس نے اپنا نام لالی رکھا تھا حالانکہ وہ کالی تھی۔

"اُلو کی پٹھی۔ یہ کیوں آئی تھی۔ رنگ میں بھنگ ڈالنے۔"

"چھت پر کسی کو آنے سے روکا نہیں جاسکتا۔"

"مگر تم کیوں بے تکلف ہورہی تھیں۔ اس لیے کہ نیلو کہا تھا اس نے تمہیں؟"

اب رابعہ نے گرمی دکھائی "تم اتنا ناقص مانجھا لائے تھے۔"

"اناڑی کاریگر اپنے اوزاروں کو الزام دیتا ہے۔ ڈور میرے ہاتھ میں ہوتی تو میں بتاتا' خیر چلو کوئی اور بازی کھیلتے ہیں۔"

"کون سی بازی؟" رابعہ نے سمجھنے کے باوجود انجان بن کے کہا۔

"وہی جس کے بارے میں شاعر نے کہا۔ جو چاہو لگادو ڈر کیسا؟"

لالی پھر نمودار ہوئی اور اس نے مجھے چھیڑنے کے لیے آنکھ ماری "فون ہے تمہارا ڈاکٹر صاحب۔ نیچے جانا پڑے گا۔"

"لالی تم اپنا نام ہریالی رکھ لو آج...." میں نے اسے جوابی آنکھ ماری "شاید کوئی ہریالا بنا تمہیں لے جائے۔"

وہ سبز سوٹ میں تھی۔ میری بات سے خوش ہوئی "تمہارے منہ میں بناسپتی گھی اور دیسی شکر۔"

میں نیچے گیا تو مالکِ مکان نے منہ پھیر کے ریسیور کی طرف اشارہ کیا۔ جو تن سے جدا ہوجانے والے سر کی طرح ایک طرف پڑا ہوا تھا۔ حسبِ توقع فون غالب نے کیا تھا۔ نازو نے شام چھ بجے اسپتال کے مالک چوہدری بشارت سے انٹرویو کا ٹائم لے لیا تھا۔ غالب نے مجھے وقت کا خاص خیال رکھنے کی تاکید کی "دیر ہوئی تو نازو کے لیے پرابلم ہوگی۔"

"نازو خود ایک پرابلم ہے" میں نے فلسفیانہ بیان دیا۔

"وہ میری پرابلم ہے" غالب بولا "ہم اس کے ساتھ ہی اندر جاسکتے ہیں۔"

"اندر تو کسی وقت بھی جاسکتے ہیں۔ ہاں صحیح سالم' واپس نہیں آسکتے نازو کی مدد کے بغیر" میں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

مالکِ مکان سے تعلقات بحال کرنا ضروری تھا "آپ تو ایسے ہی بُرا مان گئے مذاق کی بات کا" میں نے کہا۔

"کیا مطلب؟ تم ڈنگر ڈاکٹر نہیں ہو؟"

"کہیں گھوڑوں گدھوں کے بھی آئی اسپیشلسٹ ہوتے ہیں؟ انہیں کیا چشمہ لگانا ہوتا ہے۔"

وہ قائل ہوگیا "یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا مگر معلوم ہے یہ بات سُن کے میری بیوی نے کیا کہا' اس نے کہا تمہاری آنکھیں گھوڑے جیسی لگ رہی ہیں۔"

میں نے کہا "گھوڑے کو ہر چیز چار گُنا بڑی نظر آتی ہے۔ کہہ دینا کہ تم اب مجھے چار گُنا پھیلی ہوئی لگ رہی ہو۔ دوبارہ یہ بات نہیں کہے گی اور ہاں' میں یہ دوا لکھ کے دیتا ہوں۔ بازار سے منگوالینا۔"

میں نے اسے سلفاسیٹامائیڈ کا دس پرسنٹ سلوشن لکھ دیا اور تاکید کی تھی کہ شیرنگ جرمنی کا ہو۔ وہ بالکل مطمئن ہوگیا۔ (اگلے دن تک اس کی آنکھوں کی لالی ختم ہوگئی اور اس نے یہ اعتراف

بھی کیا کہ اب اسے پہلے سے کہیں بہتر دکھائی دے رہا ہے جو محض نفسیاتی اثر تھا)

شام کو میرے ساتھ رابعہ بھی نکلی مگر وہ ٹیکسی لے کر آفس چلی گئی۔ اسے ڈاکٹر شیلی کے کیس کی رپورٹ لینی تھی اور دوسرے وکیلوں سے بات کرنی تھی جنہوں نے اس کے ساتھ مل کے یہ کیس حکام بالا کو ارسال کیا تھا۔ چوہدری دلاور کے خلاف ایف آئی آر کٹ گئی تھی اور اب اسے ختم کرنا بھی ناممکن تھا۔ ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کے بارہ سینئر وکلا کو نہ پولیس ڈرا دھمکا سکتی تھی اور نہ چوہدری دلاور کی دولت خرید سکتی تھی۔

میں دوسری ٹیکسی میں "بشارت آئی کلینک" پہنچا جو مضافات کی تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کے بیچ میں آگیا تھا اور نئے دولت منداس کی جدید سہولیات' خوب صورت عمارت اور پبلسٹی سے متاثر ہوچکے تھے۔ سرسبز لان پر رنگین پھولوں کے تختوں کے درمیان سنگِ مرمر کی بینچوں پر موتیا کا آپریشن کرانے والے بوڑھے افسردہ بیٹھے تھے اور چونکہ ملاقات کے اوقات بھی یہی تھے اس لیے بیٹے پوتے بھی بکثرت موجود تھے۔

غالب کو میں نے ایک مالی کے ساتھ بحث میں مصروف دیکھا وہ مالی کو قائل کرنے کی بے سود کوشش کررہا تھا کہ اتنی محنت کرکے موسمی پھول کھلانے کی کیا ضرورت ہے۔ پلاسٹک کے پھول اصلی سے بہتر ہوتے ہیں کہ سارا سال ویسے ہی رہتے ہیں پھر یہ کہ ان پر جیسی خوشبو کا اسپرے چاہو کردو۔

مالی بہت خفا تھا۔ "صاحب' نقلی پھولوں کا کیا مقابلہ اصلی پھولوں سے۔"

"تم نے عورتوں کے نقلی بال نہیں دیکھے؟ اصلی سے زیادہ خوب صورت ہوتے ہیں اور نقلی دانت' موتیوں جیسے دانت ہوسکتے ہیں تمہارے بھی۔ جب چاہو مسکراؤ۔ بلاوجہ مسکراؤ۔ نقلی روشنی نہ ہو تو دنیا اندھیری ہوجائے۔ کہیں سورج چاند کی روشنی سے دنیا کا کام چل سکتا ہے۔ نیون سائن جل سکتے ہیں۔ اچھا میں چلا۔"

وہ تیر کی طرح ایک نرس کی طرف گیا۔ "سسٹر' سسٹر مجھے آپ نظر آرہی ہیں۔ بالکل صاف' بیوٹی فل۔"

نرس بوکھلا گئی "کیا پہلے آپ نہیں دیکھ سکتے تھے؟"

"دیکھتا کیسے۔ تم ابھی تو آئی ہو۔" غالب بولا اور باڑھ پھلانگ کے میری طرف آیا۔

"تمہاری جیب میں کیا ہے؟" میں نے کہا۔

غالب نے خالی جیب اُلٹ دی "دیکھ لو رابعہ نہیں میرے پاس۔"

"اُلو کے پٹھے۔ خالی ہاتھ جائیں گے اندر۔ اسلحے کے بغیر۔"

"اسلحہ۔" اس نے احمقوں کی طرح کہا "تم بھی کچھ نہیں لائے؟ خیر' مومن ہو تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی۔ لو وہ نازو آگئی۔"

میں نے پلٹ کے دیکھا تو نازو ایک دیو پیکر مرسیڈیز سے اُتر رہی تھی۔

"بڑی کمائی ہے آنکھوں کے اسپتال کی۔ سارے عقل کے اندھے اب شاید یہاں آتے ہوں گے" غالب بولا۔

کار میں سے ایک دُبلا پتلا شخص سوٹ میں برآمد ہوا۔ وہ شوفر کے اُترنے اور دروازہ کھول کے کھڑے ہونے تک بیٹھا رہا تھا۔ کلینک کے دروازے پر کھڑا ہوا سنتری اٹن شن ہوگیا۔ مالی نے فوارہ چھوڑ کے اسے سلام کے لیے ہاتھ اُٹھادیا۔ وہ اس قسم کے استقبال کا عادی معلوم ہوتا تھا۔

"کاش اس کی مونچھیں ہوتیں" غالب نے آہ بھر کے کہا "کلف والی۔"

میں نے کہا "پھر کیا ہوتا؟"

غالب نے افسوس سے مجھے دیکھا "کیا ہوتا۔ کچھ نہیں ہوتا مونچھوں سے۔"

"کاش اس کی داڑھی ہوتی۔ فرنچ کٹ یا جھاڑ جھنکاڑ ٹائپ۔"

"پھر کیا ہوتا؟"

اب میں نے مسکرا کے کہا "کچھ نہیں۔ داڑھی سے بھی کچھ نہیں ہوتا۔ کم آن۔"

ہم ایک چھلانگ مار کے ان کے عین پیچھے پہنچ گئے۔ نازو اور چوہدری بشارت خراماں خراماں ایک روش پر چلتے ہوئے سیدھے مین گیٹ کی طرف جارہے تھے اور سنتری سے چند قدم کے فاصلے پر تھے۔

بشارت نے گھوم کے کہا "کون ہو تم لوگ؟"

میں نے کہا "میں سیٹھ انار خان انگور والا۔ یہ اپنا ریوالور اصلی والا۔"

غالب بولا "میں سیٹھ شیر خان لنگور والا۔ اپن تمہارے ساتھ جانے کو مانگتا۔ چوں چرا نہیں مانگتا۔"

بشارت کا رنگ ریوالور دیکھتے ہی اُڑ گیا تھا۔ جو میں نے اس کی کمر سے لگادیا تھا مگر اس طرح کہ اسے صرف وہ محسوس کرسکتا تھا۔ کوئی اور نہیں دیکھ سکتا تھا۔

"کیا۔ کیا چاہتے ہو تم؟"

نازو نے کہا "بشارت صاحب۔ ان لوگوں کی نیت ٹھیک نہیں معلوم ہوتی۔"

"تم جانتی ہو انہیں؟"

نازو نے سرہلایا "ان کا تعلق پیشہ ور قاتلوں کے ایک گروہ سے ہے۔"

اس نے بشارت کے کان کے قریب سرگوشی میں یوں کہا کہ ہم بھی سُن لیں۔

"پھر..... کیا کروں میں؟" اس نے سرگوشی میں پوچھا۔

"وہی جو یہ لوگ کہیں۔ ابھی اور کیا کرسکتے ہیں آپ۔ اتنے مریض بیٹھے ہیں اور ان کے ساتھ آنے والے۔ خواہ مخواہ دو چار بے گناہ بھی مارے جائیں گے اور آپ کا اسپتال بدنام ہوگا۔"

اس نے نازو کا "مخلصانہ" مشورہ مان لیا۔ ہم دوستانہ طریقے پر مسکراتے ہوئے اور پیچھے پیچھے چلتے ہوئے اسپتال کے مین گیٹ سے گزرے اور اس لفٹ کے سامنے رُک گئے۔ جس پر لکھا ہوا تھا "صرف مریضوں کے لیے" یہ لمبی سی لفٹ تھی جس میں بیڈ یا اسٹریچر پر لیٹے ہوئے مریض اوپر نیچے منتقل کئے جاتے تھے۔ لفٹ کا دروازہ کھلا اور آپریشن کا ایک مریض بیڈ پر باہر لایا گیا۔ ہم اندر چلے گئے تو میں نے پاؤں دروازے کے بیچ میں ... رکھ دیا۔ لفٹ کا دروازہ پورا بند نہیں ہوا۔ لفٹ وہیں رُکی رہی۔

"شرافت سے چوہدری دلاور کے کمرے تک چلو گے تو اسٹریچر پر نہیں لائے جاؤ گے" میں نے کہا۔

"چوہدری دلاور۔ کون چوہدری دلاور؟"

غالب نے کہا "کاش تمہاری مونچھیں ہوتیں۔"

وہ حیران ہو کے بولا "پھر کیا ہوتا؟"

"پھر میں انہیں اُکھاڑ کے تمہارے ہاتھ پر رکھ دیتا اور بتاتا کہ چوہدری دلاور کی بھی مونچھیں نہیں ہیں اور وہ بھی حرامی ہے۔"

میں نے تائید میں سرہلایا اور پیر اندر کھینچ لیا۔ دروازہ بند ہوتے ہی لفٹ اوپر چڑھنے لگی۔ میں نے فورتھ فلور کا بٹن دبا دیا۔

"میں کسی چوہدری دلاور کو نہیں جانتا۔ کیا وہ داخل ہے یہاں؟"

لفٹ اوپر پہنچ گئی تھی۔ غالب نے گراؤنڈ فلور کے "جی" پر انگلی رکھ دی۔ لفٹ نیچے چل پڑی۔ "وہ یہاں استاد پیڈرو کے نام سے پڑا ہے۔"

"استاد پیڈرو۔ نام ریسپشن پر لکھے جاتے ہیں۔ تم کو انکوائری سے معلوم ہوسکتا تھا۔"

"انکوائری تم کرو۔" میں نے نیچے پہنچتے ہی پھر نمبر چار دبا دیا۔ "جب تک تمہیں یاد نہیں آئے گا کہ استاد پیڈرو کس کمرے میں کس نام سے لیٹا ہوا ہے۔ ہم لفٹ میں اوپر نیچے ہوتے رہیں گے۔ بڑا مزہ آرہا ہے" غالب نے کہا "یہ لڑکی کون ہے؟"

"بہن ہے اس کی۔ اسے بعد میں اغوا کرلیں گے" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ شیر خان لنگورو والا اس لومڑی سے شادی کرے گا۔"

میں نے پھر "جی" کا بٹن دبایا "شرم کرو۔ شیر ہو کے لومڑی سے شادی کرو گے؟"

"ہم اپنا نام لومڑ خان لنگورو والا کرلے گا" غالب بولا "تمہارا ریوالور میں کتنا گولی ہے ایک چلا کے دکھاؤ۔"

میں نے بشارت کے سر کا نشانہ لیا "ابھی گولی ادھر سے جائیں گا۔ پیچھے سے نکلے گا۔"

"ہم کیچ کرے گا" غالب نے اس کی گدی پر ہاتھ رکھ دیا۔

بشارت کا حوصلہ جواب دے گیا "میں تمہیں لے کر چلتا ہوں لیکن، مجھے بتاؤ کیا تم اسے قتل کرو گے؟"

میں نے غالب کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا "یہ تو ارادہ نہیں تھا ہمارا اگر تم کہتے ہو تو۔"

"نہیں نہیں۔ ایسا مت کرنا۔"

"عجیب آدمی ہو تم بھی۔ جب استاد پیڈرو کو جانتے ہی نہیں اور یہاں وہ ہے بھی نہیں تو پھر قتل کے نام پر ڈرتے کیوں ہو۔"

غالب ہنسا "ویسے یہ استاد پیڈرو آخر ہے کیا چیز؟"

میں نے کہا "اس کی عرفیت تو ہم جانتے ہیں۔ نام کیا ہے اس کا؟"

"ایاز احمد۔" اس کے منہ سے نکل گیا۔

"ویری گڈ۔ تم پُرانے شناسا معلوم ہوتے ہو اور کسی سے یہ نام ہم نے نہیں سُنا۔ اس ایاز کے محمود۔ چوہدری دلاور سے بھی نہیں" میں نے لفٹ کے کنٹرول کی طرف ہاتھ بڑھایا "کون سے فلور پر روکوں؟"

"سیکنڈ....." بشارت نے سخت مجبوری کے عالم میں کہا۔

میں نے دو نمبر کا بٹن دبا دیا۔ لفٹ نیچے گئی۔ دو کا روشن ہندسہ بجھ گیا تو میں اور نازو آگے ہو گئے۔ غالب نے ریوالور لے کے پیچھے بشارت کو اپنے ساتھ رکھا۔ اگرچہ اسے کسی سے بھی رابطے کا موقع نہیں ملا تھا اور نہ کسی کو یہ اندازہ ہوا تھا کہ مالک کے ساتھ کیا ڈراما ہو گیا ہے لیکن مجھے اندیشہ یہ لاحق تھا کہ لفٹ کے اوپر نیچے ہونے سے کسی کو شک نہ ہو گیا ہو جن لوگوں نے بشارت کو لفٹ میں جاتے دیکھا تھا شاید ان میں سے کسی کی نظر فلور پینل پر ہو اور اس نے تاڑلیا ہو کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ لفٹ فورتھ فلور تک جاتی ہے پھر گراؤنڈ پر پہنچتی ہے مگر دروازہ کھُلنے سے پہلے ہی اوپر چل پڑتی ہے۔

اندیشے بعض اوقات صرف وہم ثابت نہیں ہوتے خطرات کی پیش بندی کا موقع بھی فراہم کردیتے ہیں۔ میرے اور نازو کے آگے رہنے سے فائدہ ہوا ورنہ اسی لفٹ میں ہم ہینڈز اپ کرا کے نیچے لے جائے جاتے۔

دروازہ کھُلتے ہی دو سیکیورٹی گارڈ سامنے آگئے۔ ان کی خودکار رائفلیں بڑے جارحانہ انداز میں ہماری طرف اُٹھی ہوئی تھیں۔ سوچنے کا موقع اس لیے مل گیا کہ لفٹ کا گیٹ آہستہ آہستہ کھلتا ہے۔ میں نے نازو کو اشارہ کیا اور پلک جھپکتے میں ایک پر میں نے ہاتھ ڈال دیا اور دوسرے پر نازو نے۔ ایک جھٹکے میں وہ اندر آئے اور تیزی سے گزر کے سامنے والی دیوار سے ٹکرا گئے۔ میں نے پھر چار نمبر کا بٹن دبا دیا تھا چنانچہ دروازہ بند ہو رہا تھا۔

میں اور نازو ایک ساتھ پلٹے اور گارڈ ابھی سنبھلے بھی نہ تھے کہ ہم نے انہیں محاورے کے مطابق آڑے ہاتھوں لیا۔ آڑی ہتھیلی کے ایک کاری وار نے جوان کی کنپٹی پر پڑا تھا انہیں سارے فرائض کے احساس سے بے نیاز کر دیا۔

صورتِ حال کو کنٹرول میں رکھنے کے لیے غالب نے چلا کے کہا تھا "خبردار! ہلنا مت کوئی۔ سانس بھی مت لینا ورنہ ہوا نکال

"تم جیب میں ہاتھ ڈالے پیغامات بھیجتے رہے۔" میں نے غرّا کے کہا۔

بشارت کی بے بسی دیکھنے کے قابل تھی۔ اسے بھروسا تھا اپنے سیکیورٹی اسٹاف پر جو مسلح تھے پھر شاید اسے یقین تھا کہ سگنل ملتے ہی مدد پہنچ جائے گی اور یہ غنڈے پکڑے جائیں گے مگر اب اس کو سہارا دینے کے لیے کچھ نہیں تھا۔

ہم دوسری منزل پر پہنچے تو ایک ڈاکٹر تیزی سے ہماری طرف آیا "سر۔ کہاں تھے آپ...؟"

میں نے کہا "سر اوپر گئے تھے۔ کچھ ہدایات دینے کے لیے۔"

ڈاکٹر نے میری صورت پر غور نہیں کیا "سر۔ وہ روم نمبر دو سو دو۔

"کیا ہوا ہے دو سو دو میں؟" بشارت پریشان نظر آنے لگا۔

"وہ کوما میں ہے۔ کچھ دیر پہلے ٹھیک تھا وہ۔"

"کیا کہہ رہے ہو" بشارت بولا "ہم موتیا کے آپریشن کرتے ہیں۔ جب مریض بالکل صحت مند ہوں تب داخل کرتے ہیں۔"

میں نے نرمی سے کہا "خود چل کے دیکھ لیں سر۔"

ڈاکٹر آگے چلنے لگا۔ میں اور غالب ایک قدم پیچھے رہے۔

"کسی نے کوئی غلط دوا تو نہیں دے دی تھی؟"

"یہاں تو آپ جانتے ہیں سر۔ سسٹم میں ایسی غلطی کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔

دائیں طرف مڑتے ہی اس نے دوسرے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر چلا گیا۔ بشارت نے میری طرف دیکھا "تم ٹھہر جاؤ یہاں۔"

غالب نے نفی میں سر ہلایا "آپ کی حفاظت کے لئے...."

"یہ ڈسپلن نہیں ہے یہاں کا۔ سیکیورٹی والے کسی مریض کے کمرے میں نہیں جاتے۔"

"یہ خاتون تو جا سکتی ہیں۔ ہم باہر انتظار کریں گے" غالب نے کہا اور اپنا ریوالور نازو کو تھما دیا۔

"اس ریوالور کے بغیر بھی یہ قتل کر سکتی ہے۔ ڈبل مرڈر۔ نگاہِ ناز سے اور خالی ہاتھ سے۔"

بشارت اندر چلا گیا۔ نازو اس کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی پھر میں نے اس کے چلانے کی آواز سُنی۔

میں اور غالب ایک ساتھ اندر گھسنے کی کوشش میں آپس میں ٹکرا گئے پھر غالب نے پہل کی اور میں اس کے پیچھے کمرے میں پہنچا۔ میرا خیال تھا کہ یہاں چوہدری دلاور نے کوئی غیر متوقع اور حیران کردینے والی چال چلی ہوگی۔ وہ استاد پیڈرو بن کے یہاں روپوش تھا اور اس نے اپنا نام بھی ایاز لکھوایا تھا مگر اندر قدم رکھتے ہی مجھ پر چودہ طبق روشن ہو گئے۔

دوں گا۔"

ایک گہری سانس لے کر بشارت نے سینے پر رکی ہوئی ہوا نکالی "ہم کیا سمجھتے ہو بچ کے نکل جاؤ گے۔"

میں نے بتیسی کی نمائش کی "چچا۔ ایسا ہی سمجھتے ہیں ہم"

"احمق ہو تم۔ گدھے ہو۔"

غالب نے گھڑے جیسا سر ہلایا "اور آپ دونوں کے چچا۔ تم لفٹ کو اوپر ہی روکو خاتون۔"

نازو نے گیٹ کو تھوڑا سا کھلا رکھا۔ لفٹ وہیں رہی۔ میں نے باہر جھانک کے دیکھا۔ چوتھی منزل پر ابھی کچھ بھی نہیں تھا۔ تعمیرات کا تھوڑا بہت کام جاری تھا اور سریا سیمنٹ بکھرا پڑا تھا۔ غالباً چوتھی منزل کسی توسیعی منصوبے کا حصہ تھی جس پر عمل ہونے والا تھا۔ اوپر اور کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔

میں نے نازو کو اشارہ کیا "تم ذرا باہر آؤ اور اپنا منہ دوسری طرف رکھو۔ یہ مت پوچھنا کہ کیوں؟"

"ہاں۔ شرم آئے گی ہمیں بتاتے ہوئے۔"

لفٹ تقریباً دس فٹ لمبی تھی اور عام لفٹس کی طرح پانچ فٹ چوڑی۔ ہمیں گارڈ کے ساتھ دو دو ہاتھ کرنے کے لیے خاصی جگہ میسر آگئی تھی۔ اب وہ دونوں منہ کے بل پڑے تھے ان کی رائفلیں کسی کام نہ آسکی تھیں۔ چند منٹ میں ساری کارروائی مکمل ہوگئی تو میں نے بشارت کو بھی باہر آنے کا اشارہ کیا۔ کسی گارڈ کے آدھے گھنٹے سے پہلے ہوش میں آنے کا امکان نہیں تھا۔ میں نے دروازے کو اینٹ لگا کے بند ہونے سے روکا اور ہم زینے کے راستے نیچے اُترے۔ اب میں بھی سیکیورٹی گارڈ کے یونیفارم میں تھا اور غالب بھی۔ ہمارے ہاتھ میں انہی کی خودکار رائفلیں تھیں اور بشارت کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

"اگر تم چوہدری دلاور کے ساتھی ہو تو تم نے ہمارے بارے میں ضرور سُنا ہوگا۔ نہیں سُنا تو اب سُن لو کہ ہم میدانِ جنگ میں لحاظ مروت سب بھول جاتے ہیں" میں نے کہا "یہ اسپتال ہے۔ یہاں کشت و خون نہیں ہونا چاہیے مگر اس کا دارومدار تمہارے اپنے رویے پر ہوگا۔"

اس نے صرف سر ہلایا "میں نے ابھی تک تمہاری مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں کیا۔"

"تم نے سیکیورٹی کو کیسے اطلاع دے دی تھی؟"

غالب نے مجھے ایک چھوٹا سا آلہ دکھایا "یہ دیکھو۔"

"یہ کیا ہے؟"

غالب نے اس چھوٹی سی ڈبیا جیسے آلے پر ایک بٹن دبایا "یہ کوڈ سگنل دیتا ہے۔ اس کی جیب میں تھا۔"

کمرے میں ڈاکٹر کے سوا کوئی بھی نہیں تھا جو بے وقوفوں کی طرح ہکّا بکّا کھڑا ہوا تھا۔ بالکل اس دولہا کی طرح جو حجلۂ عروسی میں قدم رنجہ فرمائے تو دیکھے کہ سیج خالی ہے، دلہن غائب اور کھڑکی کھلی ہوئی ہے۔ سخت بے یقینی کی کیفیت میں وہ صورتِ حال کی وضاحت کرنے کی کوششِ ناکام میں مصروف تھا۔

نازو سب سے پہلے دوڑ کے کھڑکی تک گئی تھی اور جھک کے نیچے دیکھ رہی تھی "وہ بھاگ گیا اس طرح..." اس نے چھلانگ مار

دی۔

"ہاں چھلانگ ماردی۔ ایک دم۔" ڈاکٹر کو جیسے زبان مل گئی اور اس نے نازو کے بیان کی تائید میں اپنا کدو جیسا شفاف سر ہلایا۔

میں نے غالب کو دروازے پر رہنے کا اشارہ کیا اور کھڑکی سے جھانک کے دیکھا۔ بشارت عین کھڑکی کے نیچے سیمنٹ ٹائل سے بنے ہوئے تین فٹ چوڑے راستے پر الٹا پڑا ہوا تھا۔ ٹائلوں کے بیچ میں کچی زمین کی ایک انچ چوڑی پٹی گھاس کے لئے چھوڑی گئی تھی۔ اوپر سے یہ ٹائل سبز کناروں والے چوکور خانے لگتے تھے۔ بشارت سر کے بل گرا تھا۔ اس کا سر ایسے پھٹا تھا کہ خون کے چھینٹے ٹائلوں پر اور دور تک گئے تھے۔

میں نے نازو کی طرف وضاحت طلب نظروں سے دیکھا "یہ کیسے ہوگیا۔"

"بس اچانک ہی ہوا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اُس نے کھڑکی کی طرف دوڑ لگائی۔ ریوالور ہوتا میرے پاس تو میں پیچھے سے شوٹ کردیتی۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ ایسی احمقانہ حرکت کر سکتا ہے۔ میں نے چلّا کے اسے روکا لیکن اتنی دیر میں وہ کھڑکی پر چڑھ کے کود چکا تھا۔"

میں نے کہا "یہ سب ابھی تمہارے ذہن میں تازہ ہے۔ وہ کھڑکی پر چڑھا اور پھر اس نے چھلانگ ماری یا وہ سر کے بل لڑھک گیا؟"

"اس نے چھلانگ لگائی تھی۔"

"بالکل سیدھی؟"

"ہاں۔ جیسے کوئی جان بچانے کے لئے کودتا ہے۔"

"پھر یہ سر کے بل کیسے گرا۔" میں نے شرلاک ہومز کی طرح سوال کئے "دو منزلوں کا فاصلہ اتنا تو نہیں تھا کہ وہ قلابازی کھاتا۔"

"یہ تفتیش آپ کریں۔ اس کا تعلق شعبۂ سراغرسانی سے ہے، میں تو صرف چشم دید گواہ ہوں۔"

ایک خیال کے ذہن میں آتے ہی میں پلٹ کے بھاگا اور غالب کو دھکیل کے باہر نکل گیا۔ سیکیورٹی کی وردی میں ایک شخص کو دوڑتا دیکھ کے کچھ خوف و ہراس کی فضا پیدا ہوئی۔ ہر شخص میرے راستے سے خود ہٹ گیا اور دوسرے سے پوچھنے لگا کہ کیا بات ہوئی ہے۔ ظاہر ہے دوسرا یا تیسرا بھی کچھ جانتے تو بتاتے۔

میں بڑی تیزی سے ریلنگ کے ساتھ ساتھ گھومنے والے زینے پر اترا اور لڑھکتا ہوا نیچے پہنچنے سے بال بال بچا۔ اسپتال میں ایک دم افراتفری پھیل گئی تھی۔ کچھ لوگ پیچھے کی طرف بھاگ رہے تھے۔ باقی میرے بھاگنے سے یہ سمجھ رہے تھے کہ سیکیورٹی کے نقطۂ نظر سے کوئی غیر معمولی بات ہوئی ہے۔ شاید کہیں آگ لگی ہے یا کسی نے بم رکھ دیا ہے۔ خود ساختہ خدشات کے باعث لوگ بھی دروازے کی جانب چل پڑے تھے اور اس "خطرناک" جگہ سے جلد از جلد بھاگنے کی فکر میں تھے۔

خوف و ہراس کے جراثیم جتنی تیزی سے پبلک پر حملہ کرتے ہیں اتنی تیزی سے کوئی وبا یا جنگل کی آگ بھی نہیں پھیلتی۔ چند منٹ میں بھگدڑ مچ گئی اور بھیڑ چال میں لوگوں نے وجہ جانے بغیر اپنی اپنی گاڑیوں کی طرف دوڑنا شروع کیا۔ کچھ گاڑیوں کو بھی بھول گئے اور اسپتال سے نکل بھاگے۔ کاریں نکالنے والوں نے عجلت میں ایک دوسرے سے گاڑیاں ٹکرا کے اپنا بھی نقصان کیا۔

لیکن سب سے زیادہ نقصان مجھے ہوا۔ میں نے باہر آتے ہی چوہدری دلاور کو دیکھ لیا تھا۔ وہ پوری رفتار سے بھاگ رہا تھا۔ اس نے اپنی راہ میں حائل ہونے والی ایک نرس کو بھی دھکا دے کر گرا دیا۔ صرف ایک بار اس نے پلٹ کے میری طرف بھی دیکھا، اس کی نگاہ ایک بدحواس ہجوم میں مجھے تلاش نہ کر سکی لیکن میں اسے صاف پہچان گیا۔

میری مجبوری یہ تھی کہ میں فائر نہیں کر سکتا تھا۔ اس سے یقینی طور پر چوہدری دلاور کو گزند نہ پہنچتی۔ درمیان میں حائل بہت سے بے گناہ گولی کا نشانہ بن جاتے۔ یہ بات صرف میں جانتا تھا کہ دلاور کیوں بھاگ رہا ہے اور کس سے بھاگ رہا ہے۔ باقی بھاگنے والے سب کے ساتھ بھاگ رہے تھے اور خود کو خطرے میں محسوس کر کے بھاگ رہے تھے حالانکہ خطرے کا وجود بھی نہیں تھا۔

دلاور کو میں نے پہلی بار یوں فرار ہوتے دیکھا تھا۔ اپنی عمر کے لحاظ سے اس کی رفتار قابلِ تعریف تھی مگر مسئلہ اس کے لئے صرف عزت کا ہی نہیں فنا یا بقا کا تھا۔ میری نظروں کے سامنے اس نے سڑک عبور کی اور ایک سیاہ رنگ کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔

میں نے چلّا کے کہا "روکو۔ اسے روکو۔"

لیکن میری آواز پر وہاں دھیان دینے والا کون تھا۔ اس کا الٹا اثر ہوا۔ چیخ پکار کا شور... فریاد و فغاں میں بدل گیا۔ نہ جانے کس نے اپنے اندیشے کا اظہار اعلانیہ کردیا "جلدی کرو بم پھٹنے ہی والا ہے بھاگو۔"

ایک ساتھ کئی خواتین نے ہسٹریائی انداز میں کورس شروع کیا اور بے وقت کی راگنی کی طرح بے سُری آوازوں میں رونے لگیں۔ ان کے سرتاج انہیں ڈانٹنے لگے "رونے سے کچھ نہیں ہوگا۔ جلدی چلو۔"

"کیسے چلوں۔ یہ ساری مصیبت ہے۔"

"کیا ساری باندھ کے آنا ضروری تھا۔ فیشن شو ہورہا تھا یہاں؟ دفع کرو ساری کو۔"

"ابھی پوپو کہاں ہے۔ تمہارے ساتھ تھا۔ گڈی کدھر ہے؟"

"ٹائم بم کی اطلاع ملی ہے فون پر۔" کسی پیدائشی شرپسند اور افواہ ساز نے کہا۔

میں یہ سب سنتا رہا کیونکہ اور کچھ کرنے کو تھا بھی نہیں۔ سیاہ کار چوہدری دلاور کے بیٹھتے ہی چل پڑی تھی۔ میں نے اس کا نمبر دیکھنے کی کوشش کی مگر ایک تو درمیان میں دوسری گاڑیاں اور متحرک لوگ تھے۔ دوسرے کار کا نمبر بہت غیر نمایاں تھا اور ایک۔

دفعہ میں پڑھائی میں لیا۔ یہ لیفٹ ہینڈ ڈرائیو فورڈ اسکورٹ تھی۔ ڈرائیور دوسری طرف بیٹھا ہوا تھا۔ دلاور کے چہرے نے اس کا چہرہ چھپالیا تھا۔

میں مایوس لوٹا۔ مجھے غصہ خود پر آرہا تھا کہ میں نے دیر کی۔ اگر میں خود کھڑکی سے باہر کا منظر ملاحظہ نہ فرماتا تو کیا فرق پڑتا۔ نازو نے دیکھ ہی لیا تھا اور مجھے بتا بھی دیا تھا کہ بشارت نے اسے موقع دیئے بغیر کھڑکی سے چھلانگ ماردی۔ مجھے اسی وقت سمجھ لینا چاہئے تھا کہ اصل بات کچھ اور ہے۔

ڈاکٹر سب سے پہلے کمرے میں داخل ہوا تھا۔ شاید اس نے دلاور کو کھڑکی کے راستے نکلتے دیکھا ہوگا۔ اسے دلاور کی صرف ایک جھلک نظر آئی ہوگی جو چند سیکنڈ کے وقفے سے اندر پہنچنے والی نازو نے نہیں دیکھی۔ ڈاکٹر یقیناً دلاور کو روکنے یا بچانے کے لئے بھاگا ہوگا لیکن اپنی سی کوشش کے نتیجے میں وہ کھڑکی تک پہنچ کے توازن برقرار نہ رکھ سکا اور ایک دم آگے جھکا تو باہر گر گیا۔ اس کے سر کے بل گرنے کی دوسری توضیح نہیں ہوسکتی تھی۔

میں نے دو منٹ صورت حال کو سمجھنے اور نازو سے سوال کرنے میں نہ ضائع کئے ہوتے تو میں دلاور کو ضرور پکڑ لیتا۔ اب تو خود ہمارا اپنی جان بچا کے یہاں سے نکل جانا ایک مسئلہ بن گیا تھا۔ اسپتال کی انتظامیہ حرکت میں آگئی تھی اور انہوں نے لوگوں کو چلا چلا کر سمجھانا شروع کردیا تھا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ اندر مختلف مقامات پر لگے ہوئے چھوٹے چھوٹے لاؤڈ اسپیکرز پر بھی یہی اعلان دہرایا جارہا تھا "حضرات و خواتین خطرے اور پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ بے بنیاد افواہوں پر توجہ نہ دیں۔ نظم و ضبط برقرار رکھیں۔"

سیکیورٹی کے دیگر ارکان ایک جگہ جمع ہوچکے تھے۔ ایڈمنسٹریٹر ٹائپ ایک شخص انہیں ڈانٹ رہا تھا "کیسے شروع ہوگیا یہ ہنگامہ۔"

کسی نے میری طرف انگلی اٹھائی "یہ دوڑتا ہوا گیٹ تک گیا تھا۔"

"اور تم کیوں دوڑ رہے تھے؟ اسے دیکھ کر؟ ایڈیٹ... اے سٹر ادھر آؤ ذرا۔"

اب اُس کے حکم کی تعمیل کے سوا چارہ نہ تھا "یس سر۔"

"تم؟ میں نے تمہیں پہلے نہیں دیکھا۔"

"میں نے بھی آپ کو پہلے نہیں دیکھا تھا سر۔ بشارت صاحب نے آج ہی ہم دونوں کو بھرتی کیا تھا۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

دوسرے گارڈ مسکرانے لگے۔ انہیں میری نامعقول بات بھی معقول لگی تھی۔

"ہم دونوں؟ دوسرا کون ہے؟"

"پتا نہیں ہوگا کہیں۔ میرے ساتھ ہی انٹرویو لیا تھا۔ اس لئے مجھے معلوم ہے۔"

"کیوں دوڑے تھے تم کیا ہوا تھا؟"

"جی ہوا تو کچھ نہیں تھا؟" میں نے سر کھجا کے کہا "مگر ہوجاتا۔"

"کیا مطلب؟ ہاتھ نیچے رکھو۔" ایڈمنسٹریٹر چراغ پا ہوگیا۔

"یس سر۔ وہ ایک گاڑی کا تالا کھولنے میں مصروف تھا۔ میں نے روکا تو وہ بھاگ کے دوسری گاڑی کی طرف گیا اور اس میں بیٹھ کر فرار ہوگیا۔ کیا میں نے غلطی کی تھی اس کا پیچھا کرکے۔"

"جاؤ پتا کرو۔ وہ کس کی گاڑی چُرا کے لے گیا ہے۔"

میرا جھوٹ چل گیا تھا۔ اگر اس وقت کوئی بک دیتا کہ اس نے تو مجھے اوپر سے سیڑھیاں اترتے دیکھا تھا تو کار چور والی کہانی غلط ہوجاتی۔ ایک خطرہ یہ بھی پیدا ہوگیا تھا کہ وہ سیکیورٹی گارڈ لباسِ قدرت میں نمودار نہ ہوجائیں جن کی وردی ہم نے اپنے کپڑوں پر زیب تن کرلی تھی۔ انہیں ہوش سے بیگانہ ہوئے آدھا گھنٹا ہوچکا تھا مگر ہوش میں آنے کے لئے آدھا گھنٹا مقرر نہیں تھا۔ کوئی بیس منٹ میں اٹھ بیٹھتا یا گھنٹا بھر لیٹا رہتا تو اس کی مرضی۔

جب ایڈمنسٹریٹر اندر چلا گیا اور دوسرے گارڈ مجھے اجنبی نظروں سے گھورتے ہوئے اپنی اپنی ڈیوٹی کرنے چلے گئے تو میں بڑی مستعدی سے اوپر جانے کے ارادے سے زینے کی طرف بڑھا۔ آدھے راستے میں میری ملاقات غالب اور نازو سے ہوئی۔ غالب نے اپنی وردی اتار پھینکی تھی اور وہ عام ملاقاتیوں کی طرح واپس جارہے تھے۔ لاؤڈ اسپیکر پر ملاقات کا وقت ختم ہونے کا اعلان بے مقصد ہوگیا تھا۔ ملاقاتی ہی نہیں بہت سے مریض بھی بھاگ گئے تھے۔ خود میں نے ایک شخص کو داہنی آنکھ پر پٹی باندھے اسپتال کے لباس میں فرار ہوتے دیکھا تھا۔

"تم چلو سیدھے باہر۔" میں نے رکے بغیر کہا "ٹیکسی میں بیٹھو۔"

غالب نے کہا "تم کیا چوتھی منزل سے براہِ راست ٹیکسی پر کودو گے؟"

پورے اعتماد سے میں چوتھی منزل تک گیا۔ کسی بھی سیکیورٹی گارڈ کو کہیں بھی جانے سے کون روک سکتا تھا۔ میں نے اوپر پھنسی ہوئی لفٹ میں جھانکا۔ اس کے دونوں دروازوں کو ایک اینٹ نے آپس میں ملنے سے روک رکھا تھا۔ اس درز میں سے مجھے گارڈ تو لمبے پڑے نظر نہیں آئے کیونکہ اندر اندھیرا ہوگیا تھا مگر میں نے ایک کے کراہنے کی آواز سنی "اماں میں کہاں ہوں۔" ظاہر ہے وہ ہوش میں آرہا تھا اور بہت جلد اسے احساس ہونے والا تھا کہ بہت پہلے ماں نے اسے اسی حالت میں جنم ضرور دیا تھا مگر اس وقت وہ آغوشِ مادر سے بہت دور تھا۔

میں زینے کے راستے اطمینان سے واپس آیا اور گیٹ کی طرف بڑھا۔ اس وقت تک لان خالی ہوچکا تھا۔ پارکنگ ایریا میں صرف ڈاکٹروں کی گاڑیاں رہ گئی تھیں مگر ڈاکٹر اور انتظامیہ کے ذمے دار ارکان اسپتال کے مالک کی وفات حسرت آیات پر اظہارِ تشویش کرنے کے لئے پچھلے حصے میں جمع تھے۔ غالباً اب تک وہ اس

میں نے کہا "پہلے جنگل کا بادشاہ تھا۔ اب چڑیا گھر کا بادشاہ ہے۔ اسے کیا عام گھوڑوں گدھوں کے ساتھ رکھا جاتا۔ وی آئی پی وارڈ میں تھا وہ۔ رعیت کا حال دیکھنے باہر نکل آیا۔ اس سے بھگدڑ مچ گئی حالانکہ وہ بلی سے زیادہ ڈرپوک تھا اور فوراً ہی اندر لوٹ گیا تھا۔" میں نے کہا "مگر لوگ بھی تو چوہے ہیں۔"

باقی راستے ہماری ڈرائیور سے کوئی بات نہیں ہوئی۔ پتا نہیں وہ میری بات سے مطمئن ہوگیا تھا یا بُرا مان کے خاموش تھا۔

گھر سے کچھ فاصلے پر اتر کے میں نے کہا "مرزا جی۔ اب اِن دو رائفلوں کا کیا کریں۔"

غالب نے کہا "ایک دائیں کندھے پر اٹھالو۔ دوسری بائیں پر۔"

"یار مجھے یہ وردی بھی اتارنی ہے فوراً۔"

"یہاں سب کے سامنے۔" نازو گھبرا گئی۔

"اور کیا مینارِ پاکستان پر چڑھ کے اتاروں۔" میں نے کہا "اس لباس میں جاؤں گا تو مالک مکان کیا سمجھے گا۔"

"کہہ دینا وہ نوکری چھوڑ دی۔ تحفظِ حیوانات کے محکمے میں ملازم ہوگیا ہوں۔ اب تم اور یہاں رہنے والے سب محفوظ ہو۔" غالب بولا۔

میں نے کہا "اچھا تم چلو۔ رابعہ ہے گھر میں۔"

"اور تم کیا کشمیر فتح کرنے جارہے ہو؟" غالب نے کہا۔

"بالکل۔ میں ابھی گیا اور ابھی آیا۔" میں نے کہا "مجھے بس خیال نہیں آیا ورنہ کشمیر تو کب کا مل جاتا۔"

غالب اور نازو آگے بڑھ گئے تو میں نے ایک گوشۂ خلوت میں جہاں پیشاب کرنے والوں کے خلاف خاصی اشتعال انگیز باتیں لکھی ہوئی تھیں، ایک رائفل کا میگزین خالی کیا اور رائفل کو کوڑے میں ڈال کے چھپادیا۔ ایک رائفل کے ساتھ میں جارحانہ انداز میں چلتا ہوا اپنے گھر پہنچا تو حسبِ توقع نیچے ہی مالک مکان سے ملاقات ہوگئی۔

اُس نے مجھے روکا "کدھر منہ اٹھائے جارہے ہو خیر سے۔ ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں۔"

میں نے ڈانٹ کے کہا "تم مالک ہو اس بلڈنگ کے۔"

"ابھی تک تو ہوں۔"

"میں ایس سی آئی کا نمائندہ ہوں۔ سمجھے؟"

"آئی سی ایس کہتے تو سمجھ جاتا۔"

"مشتبہ افراد کی تفتیش کا ادارہ SUSPICIOUS CHARACTERS INVESTIGATION اب سمجھے!"

"کون ہیں مشتبہ افراد یہاں۔ سب شرفا رہتے ہیں۔"

"سب معلوم ہوجائے گا۔" میں نے کہا "لڑکیاں بہت آتی جاتی ہیں۔ ایک مغرور لڑکی ہے لالی۔ اوپر آنکھوں کا ایک ڈاکٹر رہتا ہے۔ وہ بھی کسی کو بھگا کے لایا ہے۔"

نتیجے پر بھی پہنچ گئے ہوں گے کہ مالک نے خودکشی نہیں کی۔ اسے اوپر کی کھڑکی سے اچھالا گیا تھا۔ ایسے کہ وہ سر کے بل نیچے آئے۔ یہ قتل تھا اور قاتل فرار ہوگیا تھا۔ کمرا نمبر دو سو دو میں ایاز نام کا جو شخص داخل تھا وہ اب کمرے میں موجود نہیں تھا۔

ایک گارڈ نے اچانک کہا "تم کہاں جارہے ہو۔"

"نوکری چھوڑ کے۔" میں نے پیچھے دیکھے بغیر کہا "بشارت صاحب نے آج ہی بھرتی کیا تھا۔"

"یہ وردی اور بندوق تو چھوڑ جاؤ تمہارے باپ کا مال ہے کیا۔"

"بھونکنے کی ضرورت نہیں کتے۔" میں نے غرّا کے کہا "مال تمہارے باپ کا بھی نہیں ہے۔"

لیکن اس فرض شناس شخص نے بندوق اٹھالی تھی۔ بادلِ ناخواستہ میں نے شکست تسلیم کرنے کا ڈراما کیا "اچھا اچھا۔ اب گولی مت چلادینا ورنہ پھانسی ہوجائے گی تمہیں۔"

یہ بات فوراً اس کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے بندوق نیچے کرلی اور میں نے اسے مُکّا مار کے لٹادیا "سوری دوست۔ اس کی فرمائش آپ نے کی تھی۔"

میں نے بھاگتے چور کی لنگوٹی والا کیس یاد کرتے ہوئے گارڈ کی رائفل بھی لے لی اور ٹیکسی میں جا بیٹھا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے مجھے مشکوک نظروں سے دیکھا کیونکہ میرے پاس دو رائفلیں تھیں۔

"بے وقوف آدمی۔ جہاں وردی اتاری تھی وہیں اپنی رائفل چھوڑ آئے تھے۔" میں نے غالب سے کہا۔

غالب نے کہا "بھول گیا تھا یار۔"

"تم پیدا ہونا کیوں نہیں بھولے تھے۔" میں نے کہا "یہ سب پرانے چکر ہیں بیٹے۔"

"کون سے چکر۔ شیر خان۔"

"جن میں پڑ کے اپنے باوا آدم جنّت سے نکلے تھے۔ ڈرائیور بادشاہ۔ تم کیا سن رہے ہو چلو۔"

"کہاں چلوں؟" وہ تیکھے لہجے میں بولا۔

"میری سسرال۔" غالب نے کہا "بھوتوں کے ڈیرے پر۔"

"اس کا مطلب ہے لکشمی چوک۔" میں نے ڈرائیور کو ٹھنڈا کردیا۔

ڈرائیور کے لئے اب شک کی کوئی بات نہیں رہی تھی۔ ہم دونوں ہی گارڈز تھے۔ ایک غالباً ڈیوٹی چھوڑ کے کسی نرس کے ساتھ نکلا تھا اور دوسرا ڈیوٹی ختم کرکے گھر جارہا تھا۔ اس نے راستے میں ہم سے ہنگامے کا سبب پوچھا "سنا ہے کسی نے بم رکھ دیا تھا۔"

"غلط سنا ہے تم نے۔ دراصل شیر باہر آگیا تھا۔"

ڈرائیور نے پلٹ کے مجھے دیکھا "شیر؟ یہاں شیر بھی ہے؟"

میں نے کہا "موتیا کے آپریشن کے لئے داخل ہوا تھا۔"

"کیوں مذاق کرتے ہو۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو جناب۔ بیٹھو ذرا آرام سے۔" مالک مکان حواس باختہ ہوگیا "دراصل دشمن بہت ہیں میرے۔"

"مجھے بھی انہی میں شامل سمجھو۔" میں نے کہا اور راوپر چل پڑا "دیکھو خبردار کوئی باہر نہ جانے پائے۔"

مالک مکان نے بڑی مشکل سے سرہلایا "یا میرے مولا۔ کی پے گیا رولا۔"

اپنے کمرے میں پہنچ کے میں نے یہ بات بتائی تو رابعہ خفا ہوئی۔ باقی سب ہنسے "کیوں خواہ مخواہ پیچھے پڑگئے ہو اس شریف آدمی کے۔"

"شریف آدمی۔ اس کا تو باپ بھی شریف نہیں ہوگا۔" میں نے وردی اتارتے ہوئے کہا "یہ لو۔ سنبھال کے رکھو۔ داشتہ آید بکار۔"

"یعنی داشتہ کار میں آتی ہے۔" غالب نے ترجمہ کیا۔

اب دلاور کے مسئلے پر بحث شروع ہوئی۔ میں نے بتایا کہ وہ کس طرح فرار ہوا تھا۔

"یار میں نے کبھی اسے یوں بھاگتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ بالکل چوروں کی طرح بھاگا تھا۔ سوچو ذرا دلاور جیسا بندہ اور ایسے فرار ہو۔"

"سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ تم کیا سوچتے رہے۔"

"اور میں کیا کرتا۔ دوڑ کے اسے پکڑ نہیں سکتا تھا۔ قریب بھی جاتا تو وہ فائر کردیتا۔ میں گولی چلاتا تو مارا جاتا کوئی اور۔ ہر شخص اِدھر سے اُدھر بھاگ رہا تھا۔"

نازو بولی "وہ کمرے سے کیسے نکل بھاگا۔ کھڑکی کے راستے۔"

"یہ تم سے کس نے کہا کہ وہ کھڑکی کے راستے نکلا تھا۔"

میں نے کہا "میری عقل نے۔ بشارت اس کے پیچھے لپکا ہوگا..."

نازو نے میری بات کاٹ لی "اس نے دلاور کو نکلتے دیکھا ہوگا' وہ آگے تھا۔"

غالب نے کہا "اگر یہ بات تھی تو پھر یہ بتاؤ کہ دلاور کیسے آرام سے اتر گیا۔ بشارت کیسے سر کے بل جاگرا۔"

"بشارت تو کھڑکی میں جھکا ہوگا۔ شاید زیادہ جھک گیا اور اس کے قدم اکھڑ گئے۔ ہاں دلاور کیسے اترا۔ یہ ہے غور طلب سوال۔"

"میرا خیال ہے کہ وہ رسّی سے اترا۔" نازو نے کہا۔

"نظر نہ آنے والی رسّی کے ذریعے۔ بھئی مان گئے تمہاری عقل کو ناقص العقل لڑکی۔" غالب نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ مارا۔ "ایسا صرف میرا بھوت سسر کرسکتا تھا۔"

"اپنے ہاتھ کو قابو میں رکھو۔ اور زبان بھی۔"

"سب پر قابو ہے مجھے۔ سوائے دل کے۔" غالب نے آہ بھری "دل ہے پرائے بس میں۔"

"پرائی بس۔ اور بس جارہی ہے مینٹل ہوسپٹل۔" رابعہ نے کہا۔

نازو نے کہا "جب میں نے جھانک کر دیکھا تو مجھے ایسا لگا تھا جیسے کوئی رسّی کا ٹکڑا تھا۔ جو سانپ کی طرح بل کھا کے غائب ہوگیا۔"

غالب نے کہا "چشمہ ہوتا تو صاف نظر آتا کہ وہ سانپ تھا۔"

"وہ رسّی تھی۔" نازو نے بگڑ کے کہا "جو دلاور نے استعمال کی ہوگی۔"

"یعنی وہ رسّی کے ساتھ ہی خود بھی اتر گیا۔ رسّی کیا ہوا میں کھڑی کی تھی اس نے۔" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "نازو کی بات میں وزن ہے۔"

"اس کے دماغ جتنا؟" غالب نے کہا۔

"نہیں بھینس کے دماغ جتنا۔ تم جانتے ہو کہ عقل سے بھینس بڑی ہوتی ہے۔ اگر کوئی ماہر ہو تو رسّی باندھ کے اوپر سے نیچے جاسکتا ہے اور نیچے سے ایک جھٹکا دے کے رسّی بھی کھول سکتا ہے۔ پرانے چور اس فن کے ماہر تھے۔ وہ تو گوہ کو بھی استعمال کرتے تھے۔"

"گوہ کیا؟" نازو نے پوچھا۔

میں نے کہا "نیولے کے قبیلے کا ایک جانور ہوتا ہے۔ قدرے چھوٹا۔ سنا ہے وہ دیوار پر اپنے پنجے گاڑ دیتا تھا اور اس کی دُم سے رسّی باندھ کے چور نیچے اترتے تھے۔ جاتے وقت گوہ کو ساتھ لے جاتے تھے۔"

"اتنی مضبوط تو شاید ہاتھی کی دُم بھی نہیں ہوتی۔" غالب نے سر کھجایا۔

رابعہ نے کہا "رسّی باندھنے اور کھولنے والی بات البتہ سمجھ میں آتی ہے۔ کیا پتا دلاور اس میں مہارت رکھتا ہو۔ وہ ہر فن مولا ہے۔"

غالب نے کہا "چلو تمہاری نازو کا دل رکھنے کے لئے مان لیتے ہیں۔"

"تمہاری نازو؟" رابعہ ہنسنے لگی۔

"چلو تمہارا دل رکھنے کے لئے کہتا ہوں' میری نازو۔" غالب نے کہا۔

نازو نے برہمی سے کہا "کسی کی نہیں ہے نازو۔ فضول باتوں میں الجھ گئے ہیں سب۔ کوئی یہ نہیں سوچتا کہ آخر دلاور کو عین وقت پر فرار ہونے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ پہلے بھی نکل سکتا تھا اور اگر اسے دیر سے پتا چلا تھا کہ حفاظتی انتظامات کے باوجود ہم اندر پہنچ چکے ہیں تو یہ اطلاع اُس کو کیسے ملی۔"

"شوشے" غالب نے پھر شاباشی کے انداز میں اس کی کمر پر دھپ ماری "تم پر ہزار بار آفرین۔ بھوت کا بچی۔"

"غالب کے بچے۔" نازو نے چلّا کے کہا "کمر توڑ دی۔"

"صنم سنتے ہیں تیری بھی کمر ہے۔ کہاں ہے کس طرف کو ہے کدھر ہے۔" غالب نے سر کو اِدھر اُدھر گھما کے شعر پڑھا۔

میں نے کہا "مرزا تمہارے جاسوسوں نے تو یہ بتایا تھا کہ چوہدری دلاور زخمی ہو کے یہاں آیا ہے۔ بیٹے کی گولی لگ گئی تھی اسے۔ یہ تو بالکل غلط ہے۔ تم دلاور کو دوڑتا ہوا دیکھتے تو خود مان لیتے۔ تمہارے جاسوس کی یہ اطلاع بھی ٹھیک نہیں کہ یہاں پیڈرو کا اپنڈکس کا آپریشن دکھایا گیا ہے۔ یہ آنکھوں کا اسپتال ہے۔"

"جیسے صحافی ویسے ان کے جاسوس۔" نازو نے کہا۔

"جاسوس غلط نہیں کہتے۔ یہ آنکھوں کا اسپتال تھا۔ اب توسیع کے بعد اس کو آئی کلینک اینڈ جنرل ہوسپٹل کردیا گیا ہے۔ بس بورڈ ابھی نہیں لگا ہے۔ ٹانگ میں گولی لگنے کی بات دلاور نے خود ہی پھیلائی ہوگی۔ جاسوس کیا کریں۔"

"وہ جاسوسی چھوڑ دیں۔ کوّے ہنکائیں۔" نازو نے پھر اسے چھیڑا۔

"صرف کوّے کیوں۔ بھوت نہ ہنکائیں۔ مجھے بہت پریشان کرتے ہیں۔" غالب نے کہا۔

"سب اعمال کی سزا ہے کہ خواب میں بھی بھوت نظر آتے ہیں۔" نازو بولی۔

"خواب میں تو بھوتنی ہوتی ہے۔ باپ نے بے لگام چھوڑ دیا ہے۔"

رابعہ نے نازو کو ڈانٹا "تمہیں بھی چین نہیں آتا چھیڑخانی کے بغیر۔"

"اچھا آپ پوچھیں اس نے بھوتنی کسے کہا ہے۔" نازو بولی۔

"تمہیں کہا ہے اور کسے۔ کرلو جو کرنا ہے۔" غالب نے چلّا کے کہا "بھوت کی بچی۔"

میں نے غالب کو روکا اور خانہ جنگی پھر ہوتے ہوتے رہ گئی۔ رابعہ نے اپنی دن بھر کی رُوداد پیش کی "ہم آٹھ وکیلوں نے چیف جسٹس کو درخواست دی ہے کہ ایف آئی آر کاٹنے کے باوجود پولیس نے ابھی تک کسی ملزم کو گرفتار نہیں کیا ہے۔ عدالتی احکامات اور وارنٹ کو نظرانداز کیا جارہا ہے۔"

میں نے خوش ہو کے کہا "پھر؟"

"ہم نے ایس ایچ او کے خلاف توہین عدالت کا مقدمہ دائر کردیا ہے۔ اب اسے دلاور کو گرفتار کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور کرنا پڑے گا۔ قتل کا سنگین مقدمہ ہے اور تین سو دو کے کیس میں سیشن کورٹ سے نیچے کوئی ضمانت منظور نہیں کرسکتا۔ دلاور نے وکیل تو بہت بڑا کیا ہے۔"

"کسے وکیل کیا ہے اُس نے۔ تمہیں؟" غالب نے کہا۔

"ہمارا ہی ایک ساتھی تھا۔ پہلے درخواست [illegible] دستخط کرنے والوں میں شامل تھا۔ تگڑی فیس ملی تو دلاور [illegible] ہوگیا۔ ہم نے اس کے خلاف بار میں ریفرنس [illegible] وقت مدعی اور وکیل صفائی کیسے ہوسکتا ہے۔ پہلے الزام عائد کرنے والوں میں تھا' اب ثابت کرے گا کہ الزامات غلط ہیں؟ یہ پیشہ

"ابھی بتاتی ہوں۔ کمر کیا تمہیں کمرا بھی نظر نہیں آئے گا۔" نازو نے گردن سے پکڑنے کی کوشش کی مگر رابعہ نے اسے روک لیا۔

"کیا بچوں کی طرح لڑ رہے ہو۔ آرام سے بیٹھو۔"

"میں تعریف کرتا ہوں اس کی پھر بھی برا مانتی ہے۔" غالب نے شکایت کی "پاگل۔"

"اس کے ہاتھ توڑ دوں گی میں اب ہاتھ مارا اس نے تو۔" نازو بولی۔

میں نے کہا "میٹنگ کو مچھلی بازار مت بناؤ۔ یہ اسمبلی نہیں ہے۔ ہم اس نکتے پر غور کررہے تھے کہ دلاور کو اطلاع کیسے ملی۔ تو اس کا جواب ہے یہ چیز جو غالب نے بشارت کے نیفے سے برآمد کی تھی۔"

رابعہ نے اسے غور سے دیکھا "یہ تو اس الیکٹرانک کاؤنٹر کی طرح ہے جو شیوخ اب تسبیح کی جگہ استعمال کرنے لگے ہیں۔"

"ہاں اس میں بھی بٹن دباتے رہتے ہیں۔ دل اللہ اللہ کرتا رہتا ہے اور کاؤنٹر شمار کرتا جاتا ہے۔" میں نے کہا "یہ اس قسم کا سگنل دینے والا آلہ ہے۔ مورس کوڈ کی طرح استعمال کیا جاسکتا ہے۔ جس کے پاس ایسا ہی ریسیور ہوگا وہ سگنل سن لے گا۔"

"تو یہ بشارت کے پاس کیوں تھا؟"

"سیکیورٹی سے رابطے کے لئے۔" میں نے کہا "خطرے کی صورت میں اگر چلا کے مدد نہ مانگی جاسکے تو خاموشی سے ایس او ایس دے دیا جائے۔"

"ایک ریسیور دلاور کے پاس بھی ہوگا۔" نازو نے کہا۔

"بشارت نے ہمارے ساتھ جاتے ہوئے اس کو خبردار کیا اور وہ کھڑکی کے راستے نکلنے پر مجبور ہوگیا۔"

میں نے کہا "بالکل ایسی ہی بات ہوئی۔ بشارت کو آخری وقت تک امید تھی کہ ہم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے مگر جب ہم نے سیکیورٹی والوں کو گن سمیت پکڑلیا تو اس نے خطرہ محسوس کیا۔ ظاہر ہے دلاور کو دیر سے وارننگ ملی۔"

"پھر بھی اس کے پاس کافی وقت تھا۔"

"اس نے رسک نہیں لیا سامنے سے نکلنے کا۔ کہ کہیں ہم سے آمنا سامنا نہ ہوجائے۔" میں نے کہا "نازو کہتی ہے اس نے رسّی دیکھی تھی۔"

"میری مانو وہ سانپ ہوگا۔" غالب نے پھر پنگا لینے کی کوشش کی۔

میں نے کہا "سوال یہ ہے کہ دلاور کو بروقت رسّی کس نے فراہم کی۔"

رابعہ نے کہا "یہی سمجھا جاسکتا ہے کہ وہ رسّی ساتھ لایا تھا۔ عقلمند اور دور اندیش آدمی ہمیشہ تمام امکانات کو پیشِ نظر رکھتا ہے اسے معلوم تھا کہ وہ یہاں غلط نام سے چھپا ہوا ہے۔ نام تھا استاد پیڈرو کا اور لیٹا ہوا تھا چوہدری دلاور۔"

ورانہ بدعنوانی کے زمرے میں آتا ہے۔"

"دلاور کو وکیلوں کی کمی نہیں۔"

نازو نے کہا "اگر اس نے ضمانت قبل از گرفتاری حاصل کرلی تو؟"

رابعہ مسکرائی "اس کے لئے بھی عدالت میں خود حاضر ہونا پڑتا ہے اور ایسے کیس میں ضمانت قبل از گرفتاری نہیں ہوتی۔ دلاور کو روپوش ہونے کا مشورہ خود ایس ایچ او نے ہی دیا ہوگا۔ روپوش کب تک رہے گا۔ سیشن کورٹ نے ڈاکٹر شبلی کی قبر کھودنے اور پوسٹ مارٹم رپورٹ کے لئے میڈیکل بورڈ کے احکامات جاری کردیئے ہیں۔ تین دن بعد قبر کھودی جائے گی۔"

میں نے بے خیالی میں کہا "کون سی قبر؟"

"جس کی نشاندہی استغاثہ کی جانب سے کی جائے گی۔" رابعہ بولی۔

"اگر قتل ثابت ہوگیا اور دلاور پکڑا نہ جاسکا۔ پھر؟"

"پھر وہ مفرور قرار دے دیا جائے گا۔ اشتہاری مجرم ہوجائے گا۔"

"آمین۔ صد آمین۔ خدا ہم سب کو وہ مبارک دن دکھائے۔" غالب نے کہا۔

"ہاں یار۔ ایک بار تو اسے بھی اندر دیکھ لیں۔ بڑی حسرت ہے۔" میں نے کہا "اب تم جاؤ۔"

"بڑی بے مروّتی کی بات ہے یہ تو۔ آخر ہم تمہارے گھر میں ہیں اور تمہارے مہمان ہیں۔ چائے کے لئے تو پوچھو کم سے کم۔"

"مکان میرا نہیں ـــ وہ نیچے بیٹھا ہے چندھی آنکھوں والا۔ مکان اُس کا ہے اور میں تمہیں مہمان ہی نہیں تسلیم کرتا۔ تم بلائے جان ہو۔"

"میں کرتی ہوں۔" رابعہ نے فوراً اعلان کردیا "چائے میں ابھی بناتی ہوں۔ اپنے دست مبارک سے۔"

میں نے حیرانی سے کہا "یعنی کچن کا افتتاح بھی ہوگیا۔"

"میں آفس سے الیکٹرک کیٹل اٹھالائی تھی۔ چینی پتی پاؤڈر ملک منگوالئے تھے۔ کپ واپس آتے ہوئے خرید لئے۔"

میں نے سر پر ہاتھ مارا "اب کل سے میری شامت۔ نون مرچ مسالہ لاؤ۔ بھنڈی توری ٹنڈے لاؤ۔ شادی کا سب سے افسوس ناک پہلو یہی ہے۔"

"حق ہے پیرومرشد" غالب نے میرے ہاتھ چوم کے آہ بھری۔ "اچھا بھلا آدمی شوہر ہوجاتا ہے۔ تمہیں معلوم ہے گسپانوی زبان میں شوہر کسے کہتے ہیں۔"

میں نے کہا "نہیں، تم بتادو۔"

"لغت میں اس کے معنی ہیں۔ خاموشی سے ٹنڈے کھا کے خدا کا شکر بجالانے والا جانور۔" غالب نے کہا "جو اپنی مادہ سے ڈرتا ہے۔"

"گسپانوی زبان کہاں بولی جاتی ہے؟" نازو نے تنک کے کہا۔

"جغرافیہ پڑھا ہوتا تو معلوم ہوتا۔ گمبا روے اور ریٹا پوز کے بیچ میں۔" غالب نے کہا "اب پوچھوگی یہ کہاں ہیں۔ جاہل۔"

رابعہ نے ہنس کے کہا "چھوڑو بولنے دو انہیں۔ ایسی زبانیں یہی بولتے ہوں گے۔"

میں نے کہا "مرزا جی۔ تم دوڑ کے نیچے سے وہ تو پکڑ لاؤ۔"

"کسے پکڑلاوں؟" غالب بولا۔

"کیک۔ اس پر لکھوانا۔ دلاور کی اسیری مبارک۔"

"ہیپی پرزن ٹو یو" DILAWAR)(HAPPY PRISON TO

غالب ہنسا۔ "میں ابھی لاتا ہوں۔"

چائے بن کر آئی تو رابعہ نے کہا "غالب کو کہاں بھیج دیا۔"

"میں نے کہیں نہیں بھیجا۔ وہ خود چلا گیا غصے میں۔"

"تم نے کچھ کہا تھا۔"

"نہیں، نازو سے روٹھ کے گیا ہے۔"

نازو ہنسی "ایسی چیز نہیں ہے وہ۔ میں تو کہتی ہوں خدا کرے واپس ہی نہ آئے۔"

"کیسی بات کرتی ہو تم بھی نازو۔" رابعہ نے اسے ٹوکا۔

اسی وقت غالب کیک سمیت اندر آگیا "یار یہ کیا جگہ ہے۔ کیسی کیسی چیزیں آباد ہیں اس چڑیا گھر میں۔ ایک تو مالک مکان ہے۔"

"اور کون مل گیا۔"

"مل گئی۔ نیچے رہتی ہے۔ بے شرم۔" غالب نے کیک درمیان میں رکھ دیا "اسے بھی آنکھوں کی بیماری ہے ڈاکٹر صاحب۔ ایسی آنکھ مارتی ہے ظالم۔"

"تمہیں لگی تو نہیں۔ چوٹ تو نہیں آئی۔" نازو بولی۔

کیک ہم نے یوں کاٹا جیسے سچ مچ دلاور جیل جاچکا ہے۔ یہ ابھی آرزو کی بات تھی مگر خوشی کی خبر تھی کہ شکاری بہ دام آیا تو سہی۔ نازو اور غالب بضد تھے کہ رات کا کھانا بھی ہم ساتھ ہی کھائیں مگر رابعہ نے انہیں چلتا کردیا۔

"سکندر کو بہانہ چاہئے باہر جانے کا۔"

"کیا واقعی کھانا بھی تم بناؤ گی۔ بقلم خود۔" غالب نے کہا۔ "فرض کرو اس مظلوم شخص نے کھانے سے انکار کردیا تو ضابطۂ فوجداری کی کون سی دفعہ کا اطلاق ہوگا۔"

"اس پر ضابطۂ دلداری کی دفعہ نو دو گیارہ لگتی ہے۔ چلو۔" میں نے چٹکی بجا کے کہا "ہم فون سے رابطہ رکھیں گے۔ بلاوجہ آنے جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ شرفا رہتے ہیں یہاں۔ بدنامی ہوتی ہے ہماری۔"

"ایک شریف تو نیچے بیٹھا آنکھیں مل رہا ہے اور ہر ایک سے پوچھ رہا ہے کہ بندوق اور وردی میں ایس سی آئی کا جو نمائندہ اوپر گیا تھا وہ واپس کیوں نہیں آیا۔ کس نے چھپا رکھا ہے اسے؟"

غالب اور نازو کے جاتے ہی مالک مکان آگیا۔ وہ خاصا

"اچھا اچھا۔ حکم کریں ابّا جی۔ چوہدری صاحب تو ہیں نہیں۔"

میں نے کہا "بکواس مت کرو۔ ہم اسے بشارت کے اسپتال میں ملنے گئے تھے..... وہ بھاگ گیا۔"

جو ناقابلِ اشاعت لفظ میں نے استعمال کیا اس کا مفہوم بزدل ہی تھا۔

"اسپتال میں، اچھا جی مجھے تو مالوم نہیں۔"

"بشارت کو تو ہم نے ٹھنڈا کردیا۔"

"کیسے جی۔ فریج میں رکھ کے۔ قلفی جمادی اُس کی؟"

"مذاق کرتے ہو میرے ساتھ۔ تمہیں ٹھنڈا کرکے دکھاؤں۔" میں نے دہاڑ کے کہا "اس کنجر سے کہہ دینا کہ چل بھاگ۔ کہاں تک بھاگے گا۔ بڑا شکاری بنا پھرتا تھا۔ کل بات کروں گا میں۔"

میں نے وائرلیس آف کردیا۔ تین چار منٹ کی گفتگو میں کوئی رسک نہیں تھا کہ دلاور کے کتے پھر آواز کی لہروں کا سراغ لگاتے ہوئے آجائیں۔ اب مجھے ایک فون کی ضرورت محسوس ہورہی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ منظر کو اپنی خیریت سے ضرور آگاہ کردوں پھر مجھے خیال آیا کہ وہ دن میں رابعہ سے ملا ہوگا اور شاید رابعہ نے اسے سب بتادیا ہوگا۔ پھر بھی اس سے گپ شپ کرنے اور اس کی گالیاں کھانے کو جی چاہتا تھا۔ سب سے الگ ہوکے مجھے بھری دنیا میں تنہائی کا احساس ہوتا تھا۔ اپنے رشتوں سے اور اپنے گھروں سے کٹ کے آدمی خود اپنی شناخت بھی کھودے تو ایک بھٹکی ہوئی روح رہ جاتا ہے۔ مجھے گل اور محسن کی یاد آئی۔ شاید وہ کراچی میں تھے اور اکرام شیخ کے گھر میں بیٹھے ہماری ہی باتیں کررہے تھے۔ اکرام شیخ کی بیوی کاجل ان کی خاطر مدارات میں لگی ہوئی تھی۔

ممکن ہے وہ کلفٹن کے ساحل پر ہوں یا شہر کی رونق کا حصہ ہوں۔ کسی چینی ریستوران میں کھانا کھارہے ہوں۔ اکرام شیخ کے بارے میں معلوم ہوا تھا کہ اب اس کے پاس دو ٹیکسیاں ہیں اور کاجل نے اپنا اسکول کھول رکھا ہے۔ وقت کتنا بدل گیا ہے۔ ایس آئی سید اکرام شیخ جسے ہم مذاق میں ڈبل ایس آئی شیخ کہتے تھے۔ کہاں پولیس کی نوکری اور کہاں ٹیکسی چلانا۔ مگر وہ خوش تھا اور مطمئن تھا۔ ہزاروں میل دور سے چل کے کاجل خود اس کا گھر بسانے آگئی تھی کیونکہ اس کا اپنا گھر کوئی نہیں رہا تھا۔ یہی تقدیر کا کرشمہ ہے لوگ سچ ہی کہتے ہیں کہ رشتے آسمانوں پر بنتے ہیں۔

رابعہ اوپر آئی تو میں چپ بیٹھا تھا "کیا ہوا؟ اندھیرے میں ایسے کیوں بیٹھے ہو؟"

میں نے مسکرا کے کہا "اب تو اکیلا بھی نہیں ہوں۔ اور اندھیرا بھی دور ہوگیا تمہارے آتے ہی۔ بیٹھو۔"

وہ میرے قریب بیٹھ گئی "دلاور سے بات ہوئی۔"

"نہیں، وہ ابھی تک لاپتا ہے۔"

بدحواس تھا۔

"ہو جی ڈاکٹر صاحب۔ اللہ بھلا کرے آپ کا۔ مجھے تو کچھ زیادہ ہی نظر آنے لگا ہے۔" وہ بولا "کوئی بھی نہیں مانتا کہ وہ اوپر آیا تھا۔"

"کون۔ کسی کا کُتا ہے؟"

"کُتا نہیں جی۔ وہ ادارہ تفتیش مشتبہ افراد کا بندہ تھا۔ وردی میں اور بندوق ایسے اٹھا رکھی تھی اس نے۔" مالک مکان نے پوز بنا کے واضح کیا۔

"ایسا تو کوئی ادارہ ہوتا نہیں۔ خواب دیکھا ہوگا آپ نے؟"

اُس نے سر پر ہاتھ مارا "ہو جی کمال ہوگئی۔ آپ بھی یہی کہتے ہیں۔ گھر والی تو خیر بالکل ہی پاگل سمجھتی ہے مجھے۔ وہ لالی کریاں والی بھی یہی کہہ رہی تھی۔ کیا میں اندر دیکھ لوں؟"

"ضرور۔ پولیس ہوتی تو ہم کہتے کہ وارنٹ دکھاؤ۔ آپ سے کیا پردہ۔" میں نے کہا "کونا کونا دیکھ لیں۔"

اُس نے ہر کونے میں جھانک کے دیکھا اور پھر میرے ساتھ چھت پر گیا۔ اندھیرے میں اسے تار نظر نہیں آیا ورنہ وہ ضرور پوچھتا کہ یہ ایریل کس نے لگایا ہے جب ریڈیو نہیں ہے۔ اس نے یقین کامل کا اظہار کیا کہ وہ خبیث چھت پر سے ساتھ والے مکان میں اتر گیا۔ میں نے اسے بتایا کہ دو طرف گلی ہے اور دو طرف ایک منزلہ مکان، مگر وہ قائل نہیں ہوا۔

"سنا ہے آج تم گڈی بھی اڑاتے رہے ہو۔ تم اور وہ لالی کریاں والی۔" مالک مکان نے جاتے جاتے کہا "لگتے تو تم شریف ہو مگر....."

"میں اکیلا نہیں تھا۔ بیوی ساتھ تھی۔" میں نے احتجاج کیا۔

"یہ کرایہ نامہ میں نہیں تھا کہ تم چھت بھی استعمال کرو گے۔"

میں نے کہا "کرائے نامہ میں یہ کہاں تھا کہ میں تمہاری آنکھوں کا علاج کروں گا۔ اور تمہیں اعتراض ہے تو اپنی چھت نیچے لے جاؤ۔ ہمیں نہیں چاہئے۔"

وہ ڈر گیا "او جی آپ ناراض ہوگئے۔ گڈی کیا جی، آپ بے شک جہاز اڑاؤ چھت پر سے۔ ویسے وہ کل والی دوائی زیادہ اچھی تھی۔"

میں نے کہا "میں اور بنادوں گا۔ وہ بازار میں نہیں ملتی۔"

جب وہ خبطی چلا گیا تو مجھے دلاور سے رابطے کا خیال آیا۔ انگریزی محاورے کے مطابق لوہا گرم تھا اور اس پر چوٹ لگانے کا وقت تھا۔ میں نے وائرلیس کو جوڑا اور کانوں پر ہیڈفون چڑھا کے پاور آن کردی۔

کچھ دیر سرسراہٹ جاری رہی پھر وہی آواز سنائی دی "کون ہے۔"

میں نے پرانا جواب دیا تھا کہ وہ مجھے پہچان لے "تمہارا باپ۔"

"وہ کہیں نہیں جاسکتا۔" رابعہ بولی "استاد پیڈرو کا غائب ہونا زیادہ خطرناک ہے۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔ فوزیہ اور اس کے شوہر کی خیریت معلوم کرنی چاہئے مگر فون نہیں ہے ہمارے پاس۔"

"کل میں پوچھ لوں گی۔ اپنے آفس سے فون کرکے۔"

"اور کل سارا دن میں کیا کروں گا۔ چارپائی پر لیٹ کے تمہاری واپسی کا انتظار۔ آئندہ چند دن اہم ہیں۔ میں بھی چاہتا ہوں کہ تفتیش میں شامل رہوں۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے؟"

"ہوسکتا ہے۔" میں نے کہا "میں اپنی فرنچ سے فائدہ اٹھا سکتا ہوں۔ اگر میک اپ سے مجھے غیر ملکی بنادیا جائے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ میں اس کا وکیل ہوں۔ جو دلاور کی جگہ سزا کاٹ رہا ہے۔ دہرے قتل کے الزام میں اور میں ڈاکٹر شیلی کیس کی تفتیش کے نتائج کا جائزہ لوں گا اور پھر اپنی لیگل فرم کو کیس دوبارہ کھولنے کے امکانات کی رپورٹ دوں گا۔"

"آئیڈیا تو اچھا ہے مگر۔"

"مگر کیا۔ میک اپ مین کا انتظام غالب کا دوست غازی کرسکتا ہے۔"

رابعہ نے کہا "وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن تم قانون نہیں جانتے۔ کسی نے بحث شروع کردی یا تم سے شناخت مانگ لی پھر۔"

"میں ہر ایک سے بات نہیں کروں گا۔" میں نے کہا "پولیس کی تو مجال نہیں کہ سوال کرے۔ گوری چمڑی دیکھ کے یہاں سب ہی مرعوب ہوجاتے ہیں۔ فرنچ بولوں گا تو کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا مگر میں سب کی سنتا رہوں گا۔ میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر بھی ایک غیر ملکی قانونی نمائندے کی موجودگی پر اعتراض نہیں کریں گے۔ میں کسی کے کام میں مداخلت نہیں کروں گا۔ بس مجسٹریٹ سے اجازت لینی ہوگی۔ وہ میں لے لوں گا۔"

"مجسٹریٹ سے اجازت میں بھی دلوا سکتی ہوں۔" رابعہ نے کہا۔ "لیکن اچھی طرح سوچ لو۔ کسی مرحلے پر تمہاری کسی بات سے یا کسی حرکت سے شکوک پیدا ہوئے تو پھر تم بھاگ نہیں سکو گے۔ قانون کی مشینری فوراً حرکت میں آجائے گی۔"

"وہ اس وقت بھی حرکت میں ہے۔"

"اچھا نیچے چلو۔ باتوں سے پیٹ تو نہیں بھرے گا۔"

"دیکھو رابعہ۔ چائے کی حد تک کچن کی ایکٹیوٹی ٹھیک ہے' کھانا پکانے کے چکر میں مت پڑنا۔ مجھے پہلے ہی احساس ہے کہ میری وجہ سے تم بھی یہاں رہنے پر مجبور ہو۔"

"یہاں نہ رہتی کسی اور کرائے کے گھر میں رہتی۔"

"وہ اور بات ہوتی۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمارے وہ عزیز رشتے دار نہیں ہیں جو صرف تہمت اور الزام تراشی یا طعنہ زنی کرسکتے ہیں اور اسی کو اپنائیت سمجھتے ہیں۔ وہ بزرگی کے ٹھیکے دار نہیں ہیں جو اخلاقیات کے خودساختہ معیار پر کسی کو بھی برادری سے خارج کرادیتے ہیں۔ سنگسار کراسکتے ہیں اور عاق نامے شائع کراتے ہیں۔"

"حالانکہ ان کی قانونی حیثیت کچھ نہیں ہوتی۔" رابعہ ہنسی۔

"ہم پر انگشت نمائی کرنے والے وہی ہیں جو دشمن ہیں۔ ہم پروا نہیں کرتے لیکن سوچو اس معاشرے میں میری وجہ سے تمہاری عزت داغدار ہوسکتی ہے۔ اگر یہ بات عام ہوجائے کہ تم شادی کی رسمی کارروائی کے بغیر میرے ساتھ رہتی ہو۔ کون مانے گا کہ ہم ایک دوسرے کا انسانی سطح پر احترام کرسکتے ہیں۔ محبت کو خود اپنی نظر میں بے آبرو کرنے سے ڈرتے ہیں۔"

"میں کسی منافق معاشرے میں دہرے چہرے رکھنے والے کی کسی بات کو اہمیت نہیں دے سکتی۔"

"ایسا نہیں ہے رابعہ۔ آدمی معاشرتی حیوان ہے۔ معاشرے کی قید میں رہتا ہے اور مجبور ہے کہ اس قید خانے کے نظام کو قبول کرے۔ جیل کے اندر جیل مینول چلتا ہے۔"

"خاک چلتا ہے۔"

"میرا مطلب ہے۔ کہنے کی حد تک۔ کیا ہیومن رائٹس یعنی عالمی انسانی حقوق کے منشور کا ڈھول پیٹنے والے اور آئینی حقوق کی بات کرنے والے آج تک ہماری پولیس اور ہمارے نظام انصاف کی خرابیوں کو دور کرسکتے ہیں۔ پتا نہیں کتنے لوگوں کو دنیا میں ضمیر کا قیدی قرار دیا جاتا ہے۔ کیا ہوتا ہے اس سے؟ کوئی ڈکٹیٹر اپنے فولادی ہاتھوں کو نرم کرتا ہے۔ کہیں انسانی یا اخلاقی قدروں کی پامالی رک جاتی ہے؟"

"مگر ہم تو آزاد ہیں۔"

"نہیں۔ زنجیروں کا نظر نہ آنا آزادی نہیں ہے۔ کیا ہم سچ بول سکتے ہیں یا لکھ سکتے ہیں؟ قطعی نہیں۔ یا ہم کافر ہوجائیں گے یا باغی اور غدار۔ حد تو یہ ہے کہ ہم سچ تک رسائی بھی نہیں رکھتے۔ اس کی اجازت نہیں ملتی کہ ہم کسی اور کے سچ سے گمراہ ہوں۔ باہر سے آنے والی کتاب ممنوعہ قرار پاتی ہے کبھی کوئی رسالہ۔ نوجوانوں کا اخلاق۔ اسلام یا ملک کی سالمیت خطرے میں پڑنے لگتی ہے۔ ہمارے بعض برادر اسلامی ممالک تو ہم سے بھی دو ہاتھ آگے ہیں۔ وہاں غیر ملکی نشریات تک جام کردی جاتی ہیں۔ یہاں سنسر شپ تو ہے مگر آپ اپنے گھر میں بی بی سی یا آل انڈیا ریڈیو سنیں تو جرم نہیں۔"

"رابعہ نے کہا "انڈیا میں ریڈیو پاکستان سننا منع تھا۔"

"ہاں' ہمارے حکمراں بھی خوش ہوں تو بی بی سی ٹھیک کہتا ہے ورنہ جھوٹ بولتا ہے۔ یہودی لابی کا ترجمان ہے۔ ویسٹرن بلاک کا میڈیا ہے۔ ایسے ہی ہم اسی دوغلے معاشرے میں جی رہے ہیں۔ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد تو بناتے ہیں لوگ۔ ڈیڑھ اینٹ کا معاشرہ بنا کے الگ رہنا ناممکن ہے۔"

وہ نوکرانی ہو یا ملکہ۔ حسین ہو یا بدصورت' جاہل ہو یا اعلیٰ تعلیم یافتہ۔ اس کے اندر ایک فطری خواہش ایک کمزوری یا طلب ہوتی ہے۔ اچھے کپڑوں کی اور اچھے زیورات کی کیونکہ خوب صورت نظر آنا اس کا حق ہے۔"

"رابعہ" میں نے کہا "ایک بات مانو گی۔"

"نہیں" اس نے صاف کہا "ماننے والی بات ہوتی تو تم پوچھتے کیوں؟"

"تم اپنے آفس میں بھی رہ سکتی ہو۔"

"میں جہنم میں بھی رہ سکتی ہوں۔ مگر تمہارے ساتھ۔" اس نے رسالہ رکھ دیا "پھر کوئی دورہ پڑا ہے تمہیں؟"

"تمہاری پریکٹس......"

"چھوڑ دی میں نے پریکٹس۔ آج بھی میں صرف ڈاکٹر شیلی کیس کی وجہ سے آفس اور کورٹ گئی تھی۔ میرے معاملات وقار یوسف سنبھال رہا ہے۔ منظر بھی ہے۔ اس کی مدد کرنے والا... لیکن وقار اکیلا سب کرنا چاہتا ہے۔ وہ راضی نہیں تھا مگر میں نے اسے مجبور کردیا ہے پارٹنر بننے پر۔ ایک ماتحت وکیل پہلے رکھ لیا تھا اُس نے' دو اور بلائے ہیں۔ عجیب بے غرض نوجوان ہے یہ وقار بھی۔ بغیر کچھ کیے مجھے میرے حصے کی آدھی آمدنی دے گا۔ میری ایک نہیں سنتا کہ سارا کام وہ کررہا ہے تو منافع بھی رکھے۔ مگر وہ بضد ہے کہ نصف میرے اکاؤنٹ میں ڈالے گا۔ جیسے پہلے میری عدم موجودگی میں ڈالتا رہا ہے۔"

"تم اچھے کپڑے پہنتی تھیں' خریدتی تھیں۔"

"یہ برُے ہیں کیا؟" وہ مسکرائی۔

"پوری سج دھج کے ساتھ تم کیا نظر آتی تھیں۔ مجھے معلوم ہے لوگ دم بخود رہ جاتے تھے۔ جہاں بھی تم جاتی تھیں۔"

"اب کسی کو میں اچھی نہیں لگتی تو نہ سہی۔"

"میں چاہتا ہوں۔ تم میک اپ کرو۔ جیولری اور....."

"اس کے بغیر تمہیں بُری لگتی ہوں میں؟" اس نے خفگی سے کہا۔

"یار لڑتی کیوں ہو۔ یہ حق ہے تمہارا....."

"اپنا حق میں خود حاصل کرسکتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے' میرے حقوق کیا ہیں۔ تم خود کو دیکھو ذرا۔"

"مجھے کیا ہوا ہے۔"

"میرے پاس تمہاری پرانی تصویریں ہیں۔ دکھاؤں؟ تمہاری صحت پہلے جیسی نہیں رہی۔"

"میں سوکھ کے کانٹا ہوگیا ہوں یا توند نکل آئی ہے میری۔"

"تمہارا رنگ سانولا ہوگیا ہے۔"

"پہلے کالا تھا۔ بہت جلد گورا ہوجاؤں گا۔"

"تمہاری آنکھوں کے گرد حلقے ہیں۔ بے آرامی کے۔ شیو دیکھی کتنی بڑھی ہوئی ہے اور اپنے کپڑے دیکھو۔"

"دل کی صورت نہیں سیرت دیکھی جاتی ہے اور کپڑے

"چھوڑو یہ فکریں۔ ہم خوش' ہمارا خدا خوش جو نیتوں کا حال بھی جانتا ہے اور اعمال کا بھی۔ بے علم اور بے خبر لوگوں یا شیطان کے چیلوں سے کیا ڈرنا۔"

"ڈرنا انہی سے چاہئے رابعہ۔ اچھے انسان کسی کا گھر نہیں اجاڑتے اور کسی کی دنیا ویران نہیں کرتے۔ کسی کو جنت سے بے دخل کرانے کی سازش میں شریک نہیں ہوتے۔ سوچو اگر ہمارے اس لینڈلارڈ کو پتا چل جائے۔"

"کیا کرے گا۔ نکال دے گا یہاں سے؟ نکال دے۔ ہم بھی جلوس نکال دیں گے اس کی شرافت کا۔" رابعہ نے مجھے ہاتھ پکڑ کے اٹھالیا۔

میں نے کہا "پہلے ہم کھمبوں پر چڑھ کے فون کرلیتے تھے۔ کسی بھی باکس سے تار جوڑ کے۔"

"اب پھر موڈ ہو رہا ہے؟"

"یہ دیکھو۔ یہ ٹیلی فون کے تار ہیں۔" میں نے ایک تار کو پکڑلیا "کتنا آسان ہے۔"

"پتا نہیں کس کی لائن ہے۔ رقم اس کے بل میں لگے گی تو روئے گا۔"

"ٹیلی فون کے محکمے کو لوگ پہلے ہی رو رہے ہیں۔ ہماری ایک کال سے کیا فرق پڑے گا۔" میں نے کہا "ابھی تو خیر ٹیلی فون سیٹ ہی نہیں ہے اپنے پاس۔"

"ورنہ کسے فون کرتے؟"

"منظر کی گالیاں سنتے۔ فوزیہ کی خیریت معلوم کرتے۔"

نیچے آکے میں چارپائی پر لیٹ گیا۔ ابھی میرا موڈ کچھ بھی کرنے کا نہیں تھا۔ رابعہ بہت سی کتابیں اور رسالے لائی تھی۔ ظاہر ہے یہ سب میری دل بستگی کا سامان تھا۔ قید تنہائی میں اپنے خیالوں سے بڑا اذیت دینے والا دشمن کون نہیں ہوتا اور خیالوں کے شر سے بچنے کی بہترین پناہ گاہ کتاب ہی ہے۔ آدمی ساری عمر کتابوں کی کائنات میں ایک مسافر کی طرح پھرتا رہے پھر بھی اس کے سارے طلسمات کا نظارہ نہیں کرسکتا۔ خود رابعہ بھی ایک فیشن میگزین دیکھ رہی تھی۔ مجھے اس کی حالت پر افسوس ہوا۔ مجھے خود سے شرم آئی۔ میں اپنے لئے ہر سختی جھیل رہا تھا مگر وہ میرے لئے دکھ پریشانی اور کسمپرسی کو بڑی خندہ پیشانی سے برداشت کررہی تھی۔ اگر وہ میرے ساتھ نہ ہوتی تو اس وقت اپنے چیمبر میں کسی کیس کی اسٹڈی کرتی۔ پی ایل ڈی کے ضخیم مجموعے اور قانونی حوالوں کی ورق گردانی میں مصروف ہوتی۔ وہ اگلے دن کسی کیس میں دلائل دینے کے لئے نوٹ لیتی اور پھر عدالت میں اپنے منطقی انداز خطابت سے استغاثہ کے جھوٹ کی مٹی پلید کردیتی۔ اس کا وہ پُرشکوہ گھر ہوتا جس میں وہ پوری شان و شوکت کے ساتھ تمام آسائشوں کے ساتھ اور اعتماد کے ساتھ رہتی۔ بہترین لباس پہنتی اور زیورات خریدتی۔ سامان آرائش اور خوشبو لاتی۔ اب وہ صرف فیشن میگزین دیکھ کے گزارا کررہی ہے۔ آرائش و زیبائش کی خواہش عورت کی جبلت ہے۔

بھی زنانہ شوق میں شامل ہیں۔"

"خواہ مخواہ کی باتیں ہیں۔ تم بھی بڑے شوقین مزاج تھے۔ مجھے معلوم ہے پہلے سلیقے سے کپڑوں کا انتخاب کرتے تھے۔ پرفیوم، کرکٹ، میوزک۔ سب شوق تھے تمہارے۔"

"عشق نے سب بھلا دیا۔ خیر ایک فلمی گانا برمحل ہے۔ گا کے سنا دوں۔" میں نے کہا اور میز پر طبلہ بجانے لگا۔

اِک دن یہ آنسو بنیں گے ستارے
کبھی نہ کبھی دن آئیں گے ہمارے

رابعہ ہنسی "اچھا گا لیتے ہو تم تو۔ گاتے کیوں نہیں۔"

میں نے آہ بھری "گاتا بھی تھا میں۔ کیا میں نے پہلے نہیں بتایا۔ برطانیہ میں ایک لوکل ریڈیو اسٹیشن تھا جو ایشیائی باشندے چلاتے تھے۔ اس پر انڈین غالب تھے۔ بھارت سے ان کے سنگر اور میوزک ڈائریکٹر بھی آتے تھے۔ پروگرام پیش کرنے کے لئے۔ ان کا سفارت خانہ بھی بہت سرگرم رہتا تھا۔ ہماری پوزیشن خراب ہی رہتی تھی۔ میرے جیسے سرپھرے مقابلے پر کچھ نہ کچھ کرتے تھے۔ وہ شوق وہیں تک محدود رہا۔ قومی نغمے لکھتا تھا ایک پاکستانی ڈاکٹر۔ دُھن بناتا تھا ایک بنگالی انجینئر اور گاتا تھا آپ کا یہ خادم۔"

"ہم اپنا گھر بنائیں گے تو اس میں موسیقی کی محفل بھی کریں گے، کبھی مہینے دو مہینے میں ایک بار۔" رابعہ نے کہا "امانت علی خان اور مہدی حسن صاحب کو بلائیں گے۔ ساری رات سنیں گے۔ ریکارڈ کریں گے۔"

"اچھا اب تم خواب دیکھو۔ میں سوتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"مجھے بھوک میں نیند نہیں آتی۔"

"اب تو رات کافی ہوگئی ہے۔ نیچے چلتے ہیں اللہ مالک ہے۔"

نیچے مالک مکان کی محفل جمی ہوئی تھی۔ وہ سب پہلوان تھے اور سب کا تعلق ایک ہی اکھاڑے سے تھا۔ اس نے مجھے فرداً فرداً سب سے ملوایا۔

"بڑا کانٹے کا دنگل ہونے والا ہے جی۔ گوجرانوالہ سے۔" اس نے مجھے بتایا "آپ سے بھی کام تھا ایک چھوٹا سا۔"

"مگر میں۔ مجھے کوئی دلچسپی نہیں پہلوانی سے۔" میں نے معذرت کی۔

وہ میرے ساتھ آگے آگیا جہاں رابعہ منتظر تھی کہ میں اپنی جان چھڑا کے آؤں "ڈاکٹر صاحب کوئی ایسی چیز دے دیں۔" مالک مکان نے رازداری سے کہا "اپنے پٹھے ہاتھوں پر مل لیں اور ہاتھ پھیر دیں ان پر تو کھجلی ہوجائے انہیں۔ داؤ بھول جائیں اور پیٹ ملنے لگیں۔ لیکن پتا نہ چلے ہوا کیا تھا۔ یا آنکھوں میں مرچیں لگ جائیں۔"

میں نے کہا "شرم کرو کچھ۔ ایسے جیتنے سے تو بہتر ہے کہ تم ہار جاؤ۔"

"تو جی انہوں نے پچھلی بار ایسا ہی کیا تھا ہمارے ساتھ۔ اب تو جناب الیکشن بھی ایمانداری سے کوئی نہیں جیت سکتا۔ نہ ریس نہ لاٹری۔ سب جگہ بے ایمانی ہے۔"

"مگر یہ کھیل ہے۔"

"تو جی اتنی بڑی بڑی شرطیں لگی ہوئی ہیں۔ ایک دو کا سٹہ چل رہا ہے ہمارے خلاف۔ ہم ایک چار سے جیت جائیں تو آپ کو بھی....."

میں نے سختی سے کہا "میں ایسے دھندے نہیں کرتا۔ اور ایسی آمدنی پر میں لعنت بھیجتا ہوں۔ آپ بھی چھوڑیں پہلوانی۔ جوئے کا اڈہ چلائیں۔"

وہ خاصا مایوس لوٹا۔ دنگل کی انتظامی کمیٹی میں اُس نے کوئی بڑماری ہوگی کہ آنکھوں کے ڈاکٹر سے شرطیہ نسخۂ کامیابی مل جائے گا۔ ایسے لوگوں نے ہی ملک سے فنِ پہلوانی کا جنازہ نکالا تھا۔ غالباً خود مالک مکان بھی پہلے پہلوان ہوگا اور وہ گوشت کے بے ہنگم پہاڑ جن کو پٹھا کہہ رہا تھا اس کے سامنے بچے ہوں گے۔ جب استاد خود شاگردوں کو نسخے پر نورا کشتی سکھائیں گے تو ظاہر ہے فن کا خدا حافظ۔

بگر ہمیں مکتب و ہمیں ملا کارِ طفلاں تمام خواہد شد

رابعہ اور میں ایک ریڑھی پر لگی ہوئی گرما گرم سینوں والے کباب تکے کھا کے اور پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے بوتل پی کے لوٹے تب بھی ڈھول ہمارے کانوں سے نکل رہا تھا۔ دنگل انتظامیہ کمیٹی مجھ سے مایوس ہوچکی تھی۔ انہوں نے میری طرف نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھا۔ غالباً وہ متبادل انتظامات پر غور کر رہے تھے۔ چلو تم روٹھے ہم چھوٹے۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔

فائدہ۔" رابعہ نے کہا "پتا چل جائے گا صبح۔"

لیکن صبح بہت دور تھی اور اس پُراسرار مہمان کے غائب ہوجانے سے میری نیند بھی غائب ہوگئی تھی۔ رابعہ نے میری خواہش پر چائے بنانے کے لئے بجلی کی کیتلی کا پلگ لگایا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی اور میں اُچھل پڑا۔ میں ریوالور ہاتھ میں لے کر دیوار سے لگ گیا۔ دروازہ رابعہ نے کھولا اور غازی کسی بیل کی طرح اندر آگیا۔

"بھئی سلاما لیکم۔ بھائی بہنوں کو۔" اس نے کہا۔

میں نے سکون کا سانس لیا "غازی صاحب۔ آپ شہید ہوجاتے ابھی۔"

وہ میرے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کے مسکرایا "میری بڑی لمبی عمر ہے۔"

"دریں چہ شک۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں نے تمہیں یاد کیا تھا۔" میں نے کہا۔

"صورت دیکھ کے لوگ ایسا کہتے ہیں۔"

"میں لوگوں میں شامل نہیں ہوں۔ لوگ منافق بھی ہوتے ہیں۔ رابعہ سے پوچھ لو۔"

"اچھا پھر تو وہ بات ہوگئی۔ دل سے دل کو راہ ہوتی ہے لیکن یہ راہ بڑی مشکل تھی۔"

میں نے کہا "ڈیڑھ ٹانگ کے ساتھ چار منزلیں چڑھ کے تم کہاں غائب ہوگئے تھے۔ ہم تو چھت پر بھی دیکھ آئے تھے۔"

"میں نیچے چلا گیا تھا۔ ایک بڑی خوش اخلاق اور خوش مزاج خاتون رہتی ہیں نیچے۔" اس نے رابعہ کی طرف دیکھ کے مجھے آنکھ ماری۔

رابعہ چائے بنارہی تھی اس لئے اس نے کچھ نہیں سُنا اور کچھ نہیں دیکھا۔ میں نے کہا "اس بلڈنگ میں آنکھ مارنے کا مرض وبائی صورت اختیار کرچکا ہے۔ تمہیں بھی ہوگیا۔"

اس نے قہقہہ مارا تو رابعہ نے نظر اٹھا کے دیکھا "بڑے خوش ہیں۔"

میں نے کہا "غازی۔ وہ لڑکی کچھ ٹھیک نہیں ہے۔"

اس نے آہستہ سے کہا "کیا خرابی ہے یار۔ مجھے تو ٹھیک ٹھاک لگی اوپر نیچے۔ ہر طرف سے اور خود ہم کون سے اچھے ہیں یار کہ کسی کو بُرا کہیں۔ آج جو دل کو اچھا لگے وہی اچھا۔ کل کس نے دیکھی ہے۔"

میں نے کہا "سچ کہتے ہو تم بھی۔ عیش کرو۔ چائے پیو گے۔"

"ہاں۔ پھر پی لوں گا۔" اس نے کہا "چائے جیسا مکسچر تو اس نے بھی پلایا تھا۔ کیا نام ہے اس کا۔"

"لالی کُراں والی۔" میں نے کہا "بڑی مختصر ملاقات رہی۔"

"نہیں پھر ہوگی ملاقات۔" اس نے دوسری بار مجھے آنکھ ماری "اس نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب آگئے ہیں تو میں نے کہا کہ میں ابھی

اچانک مالکِ مکان نے کہا "او جی ڈاکٹر صاحب۔ مہمان آیا تھا آپ کا۔"

میں یوں چونک کے پلٹا جیسے اس نے میرے پیچھے سانپ چھوڑ دیا ہو "میرا مہمان؟"

"آہو جی۔ مہمان ہی کہا ہے میں نے۔ فارسی تو نہیں بولی۔"

"پھر کہاں گیا۔ کون تھا؟"

"تھا ڈیڑھ ٹانگ والا۔ اوپر گیا ہے۔ میں نے تو کہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب اپنی گھر والی کے ساتھ سیر سپاٹے کے لئے نکلے ہیں۔ پر وہ بندہ بھی ڈنگا ہے۔ کہنے لگا میں دروازے پر بیٹھ کے انتظار کروں گا۔ ادھر ہی کھڑا تھا جب میں نے دیکھا۔"

میں نے تشویش سے رابعہ کی طرف دیکھا "یہ کون آگیا ہمیں تلاش کرتا۔"

رابعہ نے کہا "وہ ہوگا غازی بن شہید۔"

"اوہ۔ میں تو بھول ہی گیا تھا۔" میں نے اطمینان کی سانس لی۔

پریشانی مجھے اوپر اپنے مکان کے دروازے پر کسی کو نہ پا کے ہوئی۔ مالکِ مکان کا کہنا تھا کہ وہ خود تصدیق کرچکا ہے۔ مہمان واقعی دروازے پر کھڑا تھا۔ پھر وہ کہاں گیا۔ میں نے سوچا اور قدرتی طور پر مجھے اوپر کا خیال آیا۔ وہ غائب تو ہو نہیں سکتا تھا۔ زینہ دیکھ کے شاید اسے چھت پر جانے کی سوجھی ہو۔ اس کا یہاں آنا ہی خالی از علت نہ تھا۔ زخمی ٹانگ کے ساتھ اس کا چوتھی منزل تک پہنچنا اس کے غازی ہونے کی دلیل تھی۔

وہ چھت پر بھی نہیں تھا "کہاں گیا آخر وہ۔ کمال ہے۔"

رابعہ نے کہا "وہ واپس چلا گیا ہوگا۔"

"دنگل کمیٹی کو نظر نہیں آیا۔ اتنے مگن تھے وہ پھر ہمیں کیسے دیکھ لیا تھا جاتے وقت بھی اور آتے ہوئے بھی۔"

"وہ غالب کا بھوت سر تو ہے نہیں۔"

میں نے کہا "اس سے زیادہ غور طلب یہ سوال ہے کہ وہ کیوں آیا ہے۔"

"یہی تم جاتے تھے۔"

"مگر اسے کیا ٹیلی پیتھی سے علم ہوگیا میری خواہش کا۔ میں نے غالب سے بات کی ہوتی تو سمجھتا کہ اس نے بھیجا ہوگا۔ تم سے میں نے بعد میں کہا تھا کہ غازی میری مدد کرسکتا ہے۔ وہ رسمی ملاقات یا تفریح کے لئے نہیں آسکتا۔ مجھے پریشانی میں مبتلا کردیا ہے اس نے۔ اور یہ کیا ضروری ہے کہ وہ غازی ہو۔"

"اور کون ہوسکتا ہے۔ ڈیڑھ ٹانگ والا۔"

"چوہدری دلاور۔ لیکن وہ بات تو غلط ثابت ہوگئی تھی۔ اس کی ٹانگ میں گولی لگی ہوتی تو وہ اتنا تیز کیسے دوڑتا۔ مگر خطرے سے دور بھاگنے کے لئے تو بغیر ٹانگوں والا بھی دوڑتا ہے۔"

"چلو نیچے چلو۔ ایسے سوچ سوچ کے پریشان ہونے سے کیا

آتا ہوں آنکھیں دکھا کے۔"

"آنکھیں نہیں۔ تمہارا اخلاق خراب ہوگیا ہے۔ تمہارا کوئی علاج نہیں سوائے شادی کے۔ وہ تمہارے بڑے کریں گے۔"

"بڑے" وہ اپنی شادیاں کرنے میں مصروف ہیں۔" غازی ہنسا "تمہیں معلوم ہے میں کیوں آیا ہوں؟"

"ہاں مجھے اس میک اپ آرٹسٹ کی خدمات فراہم کرنے جس نے مجھے جوان سے بوڑھا کردیا تھا۔ اب میں چاہتا ہوں کہ کالے کو گورا بنادے۔"

"مجھے پیغام ملا تھا استاد پیڈرو کا۔ تمہارے لیے۔" اس نے میری بات ان سُنی کردی "غالب سے بات ہوئی تو اس نے کہا کہ جا کے مل لو۔"

"پہلے یہ بتاؤ کہ تم نے پیڈرو کی آواز فون پر سُن کے اسے کیسے پہچان لیا اور پہچانے بغیر کیوں مان لیا کہ وہ استاد پیڈرو تھا؟"

"میں نے کب کہا ہے کہ وہ یقیناً پیڈرو تھا اور میں اسے پہچان گیا تھا۔" غازی نے رابعہ سے چائے کا مگ لے لیا۔

"پھر یہ کہ کسی بھی معاملے میں بات کرنے کے لیے اس نے براہِ راست غالب سے رابطہ کیوں نہیں کیا؟ وہ جانتا ہے کہ تم ان معاملات میں براہِ راست کم ملوث ہو' صرف ایک بار.....

"دراصل" غازی نے چائے کا گھونٹ لے کر واہ کی۔ "اس وقت غالب نہیں تھا جب فون آیا تھا۔ اور میرا اپنا اندازہ یہ ہے کہ آپریٹر نے جو فون ملاتی ہے۔ سُننے میں غلطی کی۔ غالب اور غازی کے فون خلط ملط ہوجاتے ہیں پھر جب میں نے پیغام غالب کو دیا تو یہ اعتراض اس نے بھی اُٹھایا تھا۔ میں نے کہا کہ بھائی یہ تو تم اسی سے پوچھنا کہ اس نے تم سے بات کیوں نہیں کی۔ مجھ سے تو ایک آدمی نے کہا کہ میں استاد پیڈرو ہوں اور میں جانتا تھا کہ وہ کس قسم کا استاد ہے۔ میں نے کہا کہ اچھا ہو تو پھر؟ کیا حکم ہے میرے لیے۔ اس نے کہا کہ ایک پیغام دینا تھا۔ سکندر سے کہو مجھ سے مل لے۔"

میں نے مگ رکھ دیا "ایک منٹ۔ فون کب آیا تھا؟"

"ابھی کوئی دو ڈھائی گھنٹے پہلے۔"

میں نے کہا "ایک گھنٹے پہلے غالب یہاں سے گیا تھا۔ تم سے اس کی کہاں ملاقات ہوگئی؟"

"ملاقات نہیں ہوئی۔ میں نے اس کے گھر فون کیا تھا۔"

"کون سے گھر؟"

"ایک نمبر دے رکھا ہے اس نے مجھے۔ وہیں وہ موجود تھا۔ اس نے کہا مجھ سے تو میں آگیا ورنہ میرا کیا تعلق تمہارے معاملات سے۔" میری جرح نے اس کا موڈ آف کردیا۔

"بُرا مت مانو۔ ہم پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں۔ اعتبار کے دھوکے میں کئی بار نقصان اٹھا چکے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مجھے تم پر بھی اعتبار نہیں۔ اندیشہ یہ ہے کہ دھوکا تمہارے ساتھ نہ ہوجائے۔" میں نے کہا۔

"اصل بات تم نے ابھی تک نہیں پوچھی۔"

"یہ کہ پیڈرو نے کب اور کہاں ملاقات کی خواہش ظاہر کی ہے؟"

"آدمی تم ذہین ہو۔ میں نے پوچھا تھا کہ استاد مکرم اگر سکندر ملنا چاہے تو ملاقات کب اور کہاں ہوگی؟ اس نے کہا کہ یہ میں پھر بتاؤں گا اور فون بند کردیا۔"

"اچھا اب کبھی اتفاق ہو کہ غالب نہ ملے اور تمہاری بات ہو پیڈرو سے تو اس سے کہنا کہ سکندر تیار ہے بشرطیکہ تم ایسی جگہ کا انتخاب کرو جہاں کسی کی مداخلت کا امکان نہ ہو مثلاً جنگل میں۔ کوئی مضبوط تنے والا درخت ہو۔ ہر قتل کے اعتراف کی تحریر کے علاوہ تم رسّی بھی اپنے ساتھ لاؤ۔ سکندر تمہیں پھانسی دینے کے لیے پہنچ جائے گا۔"

غازی کا رنگ ایک لمحے کے لیے پھیکا پڑا "کہہ دوں گا۔ میرا کیا ہے۔"

میں نے نظر جما کے دیکھا "ویسے تمہارا مشورہ کیا ہے۔"

اس نے سوچ کے کہا "اگر تم ڈرتے نہیں تو مل لو اس سے۔"

"فائدہ ہوگا؟"

"نقصان کیا ہوگا؟" وہ بولا۔

"زیادہ سے زیادہ جان کا لیکن دوست ہمارے پاس لے دے کے یہی ایک جان ہی تو ہے جس کی حفاظت کے لیے ہم دربدر رہیں۔ یہ سب بہروپ اختیار کرتے ہیں اور اتنے پاپڑ بیلتے ہیں۔ خیر پیڈرو کی خواہش کابینہ کے سامنے رکھی جائے گی اور عام بحث کے بعد جو رائے سب کی۔"

وہ اُٹھ کھڑا ہوا "بہت دیر ہوگئی باتوں میں۔ میں نے تو چٹکی بجا کے کہا تھا کہ یوں گیا اور یوں آیا۔"

میں نے طنز سے کہا "ناک کیے بغیر اندر مت گھس جانا۔ کیا پتا اتنی دیر میں اس کا شوہر آگیا ہو۔"

"شوہر کیا وہ شادی شدہ ہے؟"

"کہنے کو تو ہے۔ ویسے بھی احتیاط اچھی چیز ہے۔"

وہ سمجھ گیا لیکن آدمی ڈھیٹ تھا۔ قہقہہ مار کے رخصت ہوگیا۔ میں نے دروازہ بند کیا اور سامنے سے ہٹ گیا۔ دس سیکنڈ کے بعد میں نے اس امید میں ایک دم دروازہ کھولا کہ غازی چابی کے سوراخ میں سے اندر جھانک رہا ہوگا یا کچھ سُننے کی کوشش کرے گا لیکن مجھے مایوسی اور شرمندگی ہوئی۔ باہر کوئی بھی نہیں تھا۔ نہ جانے کیوں غازی کے طرزِ عمل نے مجھے شک میں ڈال دیا تھا۔ آخر وہ میری اور پیڈرو کی ملاقات میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہا تھا۔ اصولاً تو غالب کو پیغام دینے کے بعد اس کا کام ختم ہوگیا تھا' ورنہ وہ تب سے کہہ سکتا تھا کہ مجھے تو معاف ہی رکھو۔ پہلے ایک بار تمہارے پھندے میں پڑا تھا تو ایک ٹانگ ضائع ہوتے ہوتے رہ گئی تھی۔ فون ہوتا تو میں غالب سے بھی معلوم کرلیتا کہ اس نے غازی کو اس وقت میرے پاس پیغام بر بنا کے بھیجنے کی اشد ضرورت کیوں محسوس کی تھی۔ یہ پیغام تو صبح بھی دیا جا سکتا تھا۔

رابعہ نے کہا "غازی پر شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔"

"شک سے فائدہ ہو سکتا ہے نقصان نہیں۔ کوئی قدم اٹھانے سے پہلے پورا اطمینان کرلینا حالات کا تقاضا ہے۔"

رابعہ خاموش ہوگئی اور کچھ دیر بعد سو گئی۔ میں دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھے لیٹا چھت کو گھورتا رہا۔ میرے دل میں ایک خلش سی تھی کیونکہ غالب بھی سوچے سمجھے بغیر کام نہیں کرتا تھا۔ جب تک کوئی مجبوری لاحق نہ ہوتی وہ ایک معمولی سے کام کے لیے غازی پر انحصار نہ کرتا۔ ایک گھنٹا پہلے اسے کوئی مجبوری درپیش نہ تھی لیکن یہ بھی بعید از امکان تو نہیں کہ وہ گھر پہنچا ہو (فی الحال وقار یوسف کا گھر ہی سب کا گھر تھا) تو کوئی نئی بات ایسی معلوم ہوئی ہو۔ لاحول ولا قوۃ۔ میں نے غازی سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ غالب نے اسے رابطے کے لیے کس کا فون نمبر دیا تھا؟

نہ جانے کیوں مجھے خیال آیا کہ میں نیچے جا کے دیکھوں۔ کیا واقعی وہ آج رات لالی کرسان والی کا مہمان تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو مجھے قطعی تعجب نہ ہوتا مگر وہ نہ ملتا تو اس جھوٹ کے پس پردہ غازی کے عزائم کا کچھ اندازہ ضرور ہوجاتا۔ سوال یہ ہے کہ میں کس بہانے اس وقت لالی کا دروازہ بجا کے یہ پوچھوں کہ کیا مسٹر غازی بن شہید یہاں تشریف رکھتے ہیں۔ یہ سخت بداخلاقی اور بدتمیزی کی بات ہوتی۔ غازی کیا کہے گا اور لالی کیا سمجھے گی۔ بھاڑ میں جائیں دونوں۔ جو سمجھتے ہیں سمجھا کریں۔ مجھے گولی تو مارنے سے رہے۔

میں اٹھ کے دبے پاؤں دروازے تک گیا اور آواز کیے بغیر کنڈی کھولی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری اس معیوب حرکت کا علم رابعہ کو بھی ہو۔ وہ مجھے رنگ میں بھنگ ڈالنے کی غیر شریفانہ حرکت کی ہرگز اجازت نہ دیتی۔ ایک سیڑھی میں ننگے پاؤں ہی اُتر گیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ اسی وقت لال چیونٹے بھی سیر سپاٹے کے لیے نکلتے ہیں۔ تین بار لال چیونٹوں نے مجھے کاٹا۔ شاید اس افسوس ناک بلکہ شرمناک حرکت سے باز رکھنے کی کوشش کی۔

میں نے گھنٹی بجانے سے پہلے نیچے جھانکا اور پھر دروازے سے کان لگا دیے۔ اگر مالک مکان' لالی یا رابعہ مجھے اس پوز میں دیکھ لیتے تو وضاحت مشکل ہوجاتی اور مجھے خاصا شرمندہ کیا جاتا کہ چوری چوری خلوت کی آوازیں سُن رہے تھے؟ شیم آن یو مسٹر سکندر بخت۔

اندر خاموشی تھی اور اندھیرا تھا۔ اس میں کوئی غلط بات نہیں تھی۔ میں نے دل کڑا کے گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ اندر روشنی ہونے تک میں نے خود کو پُرسکون اور پُراعتماد کرلیا اور اپنے لبوں پر ایک معذرت خواہانہ مسکراہٹ طاری کرلی۔ لالی پریشان بال سمیٹتی خواب ناک آنکھوں کے ساتھ جس شبِ خوابی کے لباس میں نمودار ہوئی اس نے مجھے نروس کردیا۔

"وہ۔ میں معافی چاہتا ہوں۔ غازی سے کچھ کام تھا مجھے۔"

"غازی؟ کون غازی۔" اس نے جماہی اور پھر ایک قاتل انگڑائی لی۔

"غازی بن شہید۔ وہ صحافی ہے ویسے تو۔"

"سوری۔ میں تو اکیلی ہوں اس وقت۔ اس بہانے آپ اندر آنا چاہیں تو آسکتے ہیں ڈاکٹر صاحب۔ تلاشی لے لیں۔" اس نے مجھے آنکھ ماری۔

میں نے کہا "نہیں میں اندر نہیں آسکتا۔ بیوی نے دیکھ لیا تو مارے گی۔ وہ لنگڑا کہہ رہا تھا۔"

"کون لنگڑا۔ آپ کو نیند میں بولنے اور چلنے کی عادت تو نہیں ہے؟" لالی مسکرانے لگی۔

"وہ صحافی لنگڑا ہے۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ آپ کے ساتھ چائے پی رہا تھا۔ جب ہم آئے تو وہ....."

"اچھا' وہ آپ کا مہمان؟" لالی نے تلخ لہجے میں کہا "فراڈ۔ دھوکے باز۔ میں نے اس لیے بٹھالیا تھا کہ آپ گھر پر نہیں تھے۔ وہ میری ڈائری اُٹھا کے لے گیا اور واپس بھی نہیں آیا۔"

"کیا تھا ڈائری میں؟"

"ڈائری میں کیا ہوتا ہے۔ آپ کیا لکھتے ہیں ڈائری میں؟"

"روز کا خرچ۔ دھوبی کا حساب۔ لیکن آپ کی ڈائری یقیناً آپ کے لیے اہم ہوگی۔ کیا آپ کو یقین ہے۔ میرا مطلب ہے کہ ممکن ہے آپ کہیں اور رکھ کے بھول گئی ہوں۔"

"جب وہ آیا تھا تو ڈائری یہاں رکھی ہوئی تھی۔ میرے تکیے کے بالکل سامنے۔ بعد میں مجھے نہیں ملی۔ اس کے سوا یہاں کوئی نہیں آیا اور ڈائری کو میں تکیے کے نیچے رکھتی ہوں یا دراز میں۔ کسی اور جگہ میں نے بھول کے بھی نہیں رکھی۔ آپ کہہ رہے ہیں وہ صحافی تھا؟" وہ پریشان نظر آنے لگی "وہ ضرور بلیک میل کرے گا مجھے؟"

"اگر اس میں ایسا مواد تھا تو شاید۔"

"ایسے دوست ہیں آپ کے؟ آپ اسے منع نہیں کرسکتے؟"

میں نے کہا "وہ میرا دوست ہرگز نہیں ہے۔ اپنی آنکھیں دکھانے آیا تھا۔ میں اسے کیسے منع کرسکتا ہوں۔ مجھ سے تو اس نے کہا تھا کہ وہ آپ کا مہمان ہے اور آپ نے ہی اسے بھیجا تھا میرے پاس۔"

"میں نے؟" لالی نے برہمی سے کہا۔

"ہاں۔ آپ نے کہا تھا کہ آنکھیں خراب ہیں تو اوپر ایک آنکھوں کے ڈاکٹر رہتے ہیں۔ جا کے دکھا دو۔ میں نے آپ کی وجہ سے فیس بھی نہیں لی تھی۔" میرے لیے اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ میں اپنی جان بچانے کے لیے سفید جھوٹ سے کام لوں۔

"حد کرتے ہیں آپ بھی۔"

"میرا خیال ہے ہم دونوں کے ساتھ فراڈ کیا اس نے۔ معلوم نہیں اس کا نام غازی بن شہید تھا یا نہیں۔ ایسا نام ہوتا تو نہیں۔ کچھ عجیب لگا تھا مجھے۔"

"پھر وہ صحافی بھی نہیں ہوگا۔" لالی نے کہا۔

"مجھے یہی بتایا تھا اس بد معاش نے۔ لیکن وہ لنگڑا تو تھا۔"

"بالکل بھی نہیں۔ کم از کم میرے سامنے وہ ٹھیک چلتا رہا۔"

"نیچے مالکِ مکان نے اسے لنگڑا ہی بتایا تھا۔" میرے منہ سے نکل گیا۔

"مالکِ مکان نے! آپ کو آخر کیوں بتایا تھا؟"

"شاید اس نے میرا نام لیا ہوگا۔ اوپر آیا تو آپ کا مہمان بن گیا۔ یہاں سے ڈائری لے گیا۔ پتا نہیں میرے گھر سے کیا لے گیا ہوگا۔ میں ابھی جا کے دیکھتا ہوں؟" میں اب فرار ہونا چاہتا تھا۔

ایک منٹ ڈاکٹر صاحب۔" لالی نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا "فرض کریں وہ یہاں ہوتا تو آپ کیا بات کرتے اس سے؟"

میں نے ایک گہری سانس لی "اب آپ نے بتا دیا ہے تو میں بھی بتا دیتا ہوں۔ ایک خاص قیمتی گھڑی تھی میری۔ خالص سونے کی چین والی۔"

"گھڑی تو آپ کے ہاتھ پر ہے۔"

"نہیں وہ تکیے کے نیچے رکھی ہوئی تھی۔ لوگوں کو عادت ہوتی ہے تکیے کے نیچے ایسی چیزیں رکھنے کی۔ اس سے فائدہ اُٹھایا اس بد معاش نے۔ خیر آپ بھی صبر کریں' میں نے بھی بلاوجہ ہی جگایا آپ کو۔"

"آپ اس کی رپورٹ کیوں نہیں کرتے۔ چوری آپ کی ہوئی ہے۔"

"کیا فائدہ۔ پولیس آپ کو بھی پریشان کرے گی۔ ڈائری تو آپ کی بھی گئی ہے۔ پولیس پوچھے گی کہ آخر ایسی کیا بات تھی اس میں۔"

"میں ڈائری کا نام نہیں لوں گی لیکن وہ پکڑا گیا تو شاید۔"

"دیکھئے مجھے تو آپ کا نام لینا ہی پڑے گا۔ کہ آپ کا مہمان تھا وہ۔ مجھ سے یہی جھوٹ بولا تھا اس نے۔ خدا حافظ اور شب بخیر۔"

میں اوپر گیا تو رابعہ دروازے میں کھڑی تھی۔ اس نے پہلے مجھے اور پھر میرے ننگے پیروں کو دیکھا "یہ کیا راز و نیاز ہو رہے تھے اس وقت؟"

میں نے خفت سے سر کھجایا "تم نے اگر ساری باتیں سُنی ہیں......"

اس نے دروازہ بند کر دیا "باتیں تو سُنی ہیں مگر اتنا جھوٹ سکندر۔"

"بابا جھوٹ نہ بولتا تو خود پھنس جاتا۔ یہ غازی تو بڑا ہی چکرباز ثابت ہوا۔ میری چھٹی حس صبح شور مچا رہی تھی کہ خطرہ ہے۔ خبردار۔۔۔ خبردار۔۔۔"

"تم صبح تک انتظار نہیں کر سکتے تھے۔ غالب سے پوچھ لیتے؟"

اب مجھے رابعہ کو سب بتانا پڑا "دراصل وہ مجھ سے کہ گیا تھا کہ آج رات لالی کا مہمان ہوگا۔ وہیں بیٹھا ہوا تھا وہ مگر واپسی میں لوٹ کے لالی کرماں والی کے پاس نہیں گیا۔ مجھے یہ بھی شک تھا کہ وہ لالی کے ساتھ نہیں ہوگا۔ اس کی تصدیق صبح نہیں ہو سکتی تھی۔"

رابعہ مطمئن نہیں ہوئی "کیوں نہیں ہو سکتی تھی۔ لالی سچ بتا دیتی۔"

"یار مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔" میں نے جھلّا کے کہا "خلش سی تھی میرے ذہن میں جو مجھے پریشان کر رہی تھی۔ میں نہیں رکا اور معلوم کرنے چلا گیا تو کوئی گناہ کیا؟"

"گناہ کی بات نہیں۔ مالکِ مکان دیکھ لیتا تو کیا سمجھتا؟"

"اجی جس کا جو دل چاہے سمجھے۔" میں نے کہا اور منہ تک چادر لپیٹ کے پڑ گیا "وہ کیا کہا ہے کسی نے 'ڈرتے نہیں دنیا میں مسلمان کسی سے۔ سوائے اللہ کے اور بیوی کے۔ ہاں۔"

کچھ دیر بعد رابعہ کی آواز آئی "یہ غازی بلیک میلر ٹائپ ہے؟"

میں نے چادر سے منہ نکالے بغیر کہا "میں سو رہا ہوں۔ ویسے اس کا جواب ہے کہ واللہ اعلم بالصواب۔"

رابعہ ہنسی "چوروں کی طرح منہ چھپا کے کیا سوچ رہے ہو؟"

"لالی کرماں والی کے بارے میں۔ کوئی اعتراض؟ خواب میں بھی اسے دیکھوں گا۔ سونے دو مجھے۔"

"رابعہ بولی "ایک شعر سُنو۔

سوداؔ جو ترا حال ہے ایسا تو نہیں وہ
کیا جانئے تُو نے اسے کس حال میں دیکھا

"وہ ایسی ہی ہے۔ تم جلتی ہو۔" میں اٹھ بیٹھا "دیکھا اس لیے کہتا تھا کہ فون ضروری ہے۔ ابھی غالب سے بات کر لیتے بلکہ غازی سے۔"

"یہ بھی کوئی ایسا کام نہیں جو صبح پر نہ ٹالا جا سکے۔" وہ منہ پھیر کے سو گئی "تم سوچتے رہو۔"

بالآخر میں بھی سو گیا۔ رات کو میں نے اوٹ پٹانگ خواب دیکھے۔ میں نے دو لنگڑوں کو دیکھا جو ٹیڑھی لکیر بناتے ہوئے دوڑ رہے تھے۔ ایک میرا پیچھا کر رہا تھا دوسرا لالی کا۔ وہ اسی لباس شب خوابی میں تھی۔ ایک لنگڑا دلاور تھا۔ دوسرا غازی اور وہ مقابلے پر اس ریس میں حصہ لے رہے تھے۔ دوسرے خواب میں مجھے دلاور حوالات کے اندر نظر آیا۔ حوالات کے اندر ایک لاش بھی پڑی تھی۔ یہ ڈاکٹر شیلی کی لاش تھی اور دلاور ہنس ہنس کے مجھے بتا رہا تھا کہ اس نے خودکشی کی تھی اپنے سکندر صاحب۔

صبح والا خواب ادھورا رہ گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں نہاتے ہوئے ٹھنڈا پانی کھولنا بھول گیا ہوں اور خالص گرم پانی شاور سے

میرے اوپر گرا ہے۔ آنکھ کُھلی تو رابعہ کو دیکھا۔ وہ چائے کی پیالی لیے کھڑی تھی اور اس میں چمچہ ڈبو کے ایک ایک قطرہ میری ناک پر ٹپکا رہی تھی۔

میں ناک ملتا اُٹھا "یہ کیا ہے جی! یہ تو بڑا ظالمانہ طریقہ ہے کسی مظلوم کو جگانے کا۔"

"مظلوم صاحب' نو بج رہے ہیں۔"

"ہر روز نو بجے کیا مجھے ایسے ہی کھولتا پانی ڈال کے جراثیم سے پاک کیا جائے گا؟"

"یہ چائے ہے۔ گرم پانی نہیں۔"

"گرم چائے کیا ناک پر ڈالی جاتی ہے۔ یا تم ناک کے راستے چائے حلق میں اُتارنے کی کوشش کر رہی تھیں" میں نے پیالی لے لی "ویسے کتنا اچھا ہوتا اگر تم ایمن کلیان کے سُروں میں گنگناتیں "جاگو۔۔۔ جاگو۔۔۔ موہن پیارے۔" اور میں آنکھیں کھولتا تو تمہاری زلفِ عنبریں مجھ پر ابرِ سیاہ کی طرح سایہ فگن ہوتی۔۔۔"

وہ ہنسی "یہ کس رومانی زنانہ ناول کا سین تھا؟"

"وہ لکھا جائے گا۔۔۔۔ بلکہ لکھا جا رہا ہے" میں نے چائے پیتے ہوئے اسے غور سے دیکھا "ہر لمحہ۔۔۔۔ ہر گھڑی۔۔۔ صبح و شام۔ تمہاری رفاقت کی ہر ادا کے عنوان سے اس کا ایک ایک باب مکمل ہو رہا ہے۔"

"باتھ روم ہو کے آجاؤ تو ناشتا کریں" اس نے شرما کے واپس جاتے ہوئے کہا۔

میں چائے کی خالی پیالی لیے بیٹھا رہا۔ محبت' خدمت اور رفاقت کے جذبات کی بھرپور توانائی کے ساتھ عورت کسی بھی مرد کی ناگزیر ضرورت بن جاتی ہے اور پھر اسے عادات کا غلام بنا کے اپنے تابع کر لیتی ہے۔ وہ اس پر اتنا انحصار کرنے لگتا ہے کہ ذہنی و جسمانی طور پر اپاہج ہو جاتا ہے۔ صبح بیڈ ٹی سے دن بھر اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھنا اور بن مانگے ہی اس کو ہر آسائش فراہم کر دینا بھی ماتا کا ایک انداز ہے۔ وہ کچھ اس طرح شوہروں کی دیکھ بھال کرتی ہیں جیسے بچوں کی۔ پھر شوہر بھی بچے بن جاتے ہیں اور خود کچھ نہیں کرتے۔

ناشتے پر میں نے احتجاج کیا "تم میرا جذباتی استحصال کر رہی ہو۔"

رابعہ نے حیرانی سے کہا "وہ کیسے؟"

"یہ سب کیوں کر رہی ہو تم۔ یہ تو میں شادی کے بعد بھی نہیں چاہتا۔ ایسی ناز برداریاں کسی نشے کی لت سے کم تباہ کن نہیں ہوتیں۔ جب نشہ نہ ملے تو آدمی کی کیا حالت ہوتی ہے۔"

اس نے مسکرا کے کہا "تم نے سگریٹ چھوڑ کے ثابت کر دیا ہے کہ تم نشے کے عادی نہیں ہو سکتے۔"

"رابعہ۔ تم میں اور سگریٹ میں بڑا فرق ہے۔ ابھی مجھے سخت زندگی گزارنے دو۔ گزارا ہی کرنا آنا چاہیے مجھے' کل کا کیا پتا' جیل میں یہ سب نہیں ہوگا تو میری سزا زیادہ سخت ہو جائے گی۔ وہ جو فاقہ کش ہیں اور جھگی یا فٹ پاتھ پر رہتے ہیں' ان کو جیل کی سختی سے اتنا فرق نہیں پڑتا۔ وہ عادی ہوتے ہیں۔۔۔"

اس نے متاثر ہوئے بغیر کہا "چپ چاپ ناشتا کرو۔ ابھی آپ جیل نہیں جا رہے ہیں۔ اور نہ میں جانے دوں گی۔"

"ہاں۔ تم خود جیلر سے کم ہو کیا۔ اس وقت بھی حکم چلا رہی ہو مگر سرکار کی جیل میں جانا پڑا تو تمہارے دلائل کوئی چھو منتر نہیں ہیں کہ تم مجھے مکھی بنا کے اُڑا دو یا غائب کر دو اور پولیس کے ہاتھ میں خالی ہتھکڑیاں رہ جائیں۔ وہ منہ دیکھتے رہ جائیں کہ ملزم کدھر گیا؟"

"لالی آئی تھی۔"

"اچھا۔ تمہارے خواب میں بھی آئی تھی؟" میں نے رابعہ کی بات کے بیچ میں کہا۔

"وہ بہت پریشان ہے۔ ڈائری کے نہ ملنے سے۔ غازی سے پوچھنا ہے کہ اس نے یہ گھٹیا حرکت کیوں کی آخر؟"

میں نے کہا "خاتون۔ وہ غالب جیسا صحافی نہیں ہے۔ وکیلوں یا ڈاکٹروں کی طرح اس پیشے میں بھی بدنام بد معاش اور بدکردار لوگ ہوتے ہیں۔ اس کے نزدیک کوئی حرکت گھٹیا نہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ کسی کو بھی بلیک میل کر سکتا ہے اور شاید اسی طرح عیاشی کی زندگی گزار رہا ہے۔ وہ نہ صحافت کا غازی ہے نہ کبھی شہید ہوگا۔ وہ گفتار کا غازی ہے۔ کردار کا نہیں۔ اپنی صحافی برادری کے ساتھ تو وہ ٹھیک چلتا ہوگا مگر باقی دنیا کے ساتھ نہیں۔ پھر بھی میں غالب کی معرفت اسے تمہاری تشویش سے آگاہ کر دوں گا۔ لالی کے لیے تمہاری ہمدردی تمہاری عالی ظرفی اور میری کمینگی کی دلیل ہے۔"

"یہ تو میں نے نہیں کہا۔"

"چلو میں اعتراف کر رہا ہوں۔ تمہارا دل بہت چوڑا ہے۔ میرا مطلب ہے وسیع القلب بھی ہو تم۔ رقیق القلب ہونے کے علاوہ۔ اور اب مجھے اجازت دو خاتون کہ میں اس کمینی دنیا سے دو دو ہاتھ کرنے جاؤں۔ اور فتح مند واپس آؤں۔ آشیرباد دو مجھے۔"

رابعہ ہنسنے لگی "وہ تو غالباً بزرگ دیتے ہیں۔ ہندوؤں میں۔"

"اچھا تم اجازت دو دعا کے ساتھ۔"

"میں باہر جانے کی اجازت ہرگز نہیں دوں گی۔"

"کیا مطلب۔ میں اور تم آخر کب تک یہاں چھپے رہیں گے۔ اتنے بزدل تو ہم کبھی نہ تھے اور پھر یہی وقت ہے کچھ کرنے کا۔ دلاور بہت عرصے بعد خود کو غیر محفوظ سمجھ کے بھاگ رہا ہے۔ ہمیں کا محاصرہ تنگ کرنا ہوگا یہاں تک کہ دلاور پر فرار کے سب راستے بند ہو جائیں اور اس کی کمر دیوار سے لگ جائے تو وہ خود ہاتھ اٹھا دے۔ وہ بہت دباؤ میں ہے اور ہمیں دباؤ بڑھانا چاہیے۔"

"کسی خوش فہمی میں مت رہنا۔ وہ زخمی سانپ ہے۔ پلٹ کے حملہ ضرور کرے گا۔"

"میں اپنی حفاظت کے خیال سے غافل نہیں ہوں۔ تمہیں بھی ڈاکٹر شیلی کے کیس کو آگے بڑھانا ہے یہاں تک کہ پولیس بھی عدالت کے حکم سے مجبور ہوجائے۔ دلاور کی گرفتاری کے لیے۔ اگر اس کے خلاف ایف آئی آر درج ہے اور اس کا پاسپورٹ بھی ضبط ہوگیا ہے تو واقعی اس کے بُرے دن آگئے ہیں۔ صلح صفائی کی پیش کش وہ پہلے بھی کرچکا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان حالات میں اس کا سر کتنا جھکتا ہے۔ وہ قدموں میں سر رکھتا ہے یا..."

رابعہ نے نفی میں سرہلایا "تمہارے سامنے وہ کبھی سر جھکانے نہیں آئے گا۔"

"اس کا باپ بھی آئے گا مس رابعہ۔ وہ ہماری طرح نہیں ہے جو سر کٹا سکتے ہیں لیکن سر جھکا سکتے نہیں۔ عزت غیرت اور حمیت کے جذبات کسی پُرفریب اور مکار آدمی کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتے... وہ ضرور مجھ سے رابطہ کرنا چاہے گا اور میری شرائط پر معاملات کا تصفیہ کرنے کی کوشش کرے گا۔ تم نے کبھی شطرنج کھیلی ہے؟"

"جی نہیں۔ میں افیون نہیں کھاتی۔"

"خیر۔ اس میں شاہ کو مات ہونے لگے تو ہر مہرہ قربان کیا جاسکتا ہے۔ وزیر تک مارا جاتا ہے۔" میں نے کہا "شاہ دلاور کا وزیر ہے استاد پیڈرو۔ ابھی تک وہ اسے بچانے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ اب شاید مجبور ہوکے اسے ہمارے حوالے کردے۔ کسی چکربازی کے بغیر۔"

"اور اس کے بعد...؟"

"شاہ کی بادشاہت کس کے دم سے ہوتی ہے۔ سپاہ کے دم سے۔ سارے مہرے پٹ جائیں گے۔ وزیر تک نہیں ہوگا تو شاہ کب تک مات سے بچے گا اور بچ کے جائے گا کہاں۔ بساط کی طرح یہ دنیا بھی بڑی محدود ہے۔ شطرنج کی چالوں کے بارے میں یہ صحیح ہے کہ لامحدود ہیں مگر پھر بھی آخر میں شاہ کے لیے ایک گھر بھی نہیں رہتا۔"

"یعنی تم ابھی پیڈرو پر قناعت کروگے؟"

"فی الحال۔ یہ ایک عبوری اور عارضی سمجھوتا ہو سکتا ہے۔ یار زندہ صحبت باقی۔ دلاور کا حساب بعد میں چُکائیں گے۔ پہلے پیڈرو کو کیفرِ کردار تک پہنچانا ہے۔"

"وہ خود بھی اتنی آسانی سے ہاتھ آنے والا نہیں ہے۔ آخر دلاور جیسے استاد کا شاگرد ہے۔"

"استاد کے آگے کیا استادی چلے گی اس کی۔ دلاور اسے مٹھی میں بند کرکے یا پنجرے میں ڈال کے ہمارے حوالے کرسکتا ہے اگر وہ واقعی چاہے۔"

تھوڑی سی بحث کے بعد رابعہ مان گئی اور میں چھت پر چڑھ گیا۔ میں نے اسے سمجھادیا تھا کہ مالکِ مکان صاحب تشریف لے آئیں تو انہیں باتوں میں لگا کے روکے اور چھت پر نہ آنے دے ورنہ میری خفیہ سرگرمیوں کو دیکھ کے وہ نہ جانے کیا نتیجہ اخذ کرے گا۔"

"وہ تو ایک بے وقوف اور بے ضرر سا آدمی ہے۔"

میں نے کہا "بے وقوف آدمی ہی مسائل پیدا کرتا ہے۔ وہ مجھ سے تو کچھ پوچھے گا نہیں۔ باہر اعلان کردے گا کہ ایک انڈین ایجنٹ چھت پر موجود ہے جس نے جعلی ڈاکٹر بن کے مکان کرائے پر لے لیا تھا مگر اس وقت وہ وائرلیس پر سرحد پار بھارتی انٹیلی جنس سے رابطہ کرکے انہیں اہم معلومات فراہم کررہا ہے۔ شام تک پھر حملہ نہ ہوجائے۔"

"کون مانے گا ایسی بے سروپا بات۔"

"دس میں سے آٹھ ضرور مانیں گے۔ ابھی حالات بھی ایسے ہیں اور بھارت کے خلاف جذبات نے ایسا ماحول بنادیا ہے کہ حقائق کی تصدیق بعد میں ہوتی ہے پہلے لوگ مار مار کے دنبہ بناتے ہیں اور پھر تھانے پہنچادیتے ہیں۔ تھانے میں کسی کو کچھ بھی ثابت کیا جاسکتا ہے۔ سیاہ کو سفید 'فرشتے کو شیطان۔"

میں نے ریسیور آن کیا تو حسبِ توقع وہی شخص بولا جو غالباً اس کام پر مامور تھا کہ فون ریسیو کرے یا ریڈیو کال اور چوہدری صاحب کو' وہ جہاں بھی ہوں۔ پیغام پہنچائے کہ کوئی ان سے ملاقات یا مذاکرات کا متمنی ہے۔ پھر صاحب جیسا چاہیں۔ آج ایسے لوگ افسرِ رابطہ یا پی آر او کہلاتے ہیں۔ ذرا نچلی سطح کے افسران کے لیے ان کے پی اے یہ کام بڑی سیاسی خوش خلقی' ذہانت اور مہارت سے کرتے ہیں۔ کوئی پی اے یا پی آر او اتنا ہی کامیاب ہے جتنا وہ باس کا مزاج شناس ہو۔ یہ جانتا ہو کہ باس کے لیے کون اہم ہے اور کون غیر اہم۔ کسے دیکھ کے ان کی آنکھوں کو سرور ملتا ہے' کس سے مل کے دل کو قرار آتا ہے اور کس سے ملنا مجبوری ہے۔ کسے دھتکارا جاتا ہے۔ کسے رکھائی سے ٹالا جاتا ہے اور کسے خوب صورتی سے۔ کس سے کہا جاتا ہے کہ صاحب میٹنگ میں ہیں اور کسے بتایا جاتا ہے کہ وہ چشم براہ ہیں' صرف آپ کے لیے۔"

دلاور کے اس پی اے نے بھی اب یہ جان لیا تھا کہ میں تیسری قسم کا ملاقاتی ہوں جن سے نہ چاہنے کے باوجود ملنا پڑتا ہے۔ میں کون ہوں' کیا ہوں؟ یہ جاننا اس کے لیے ضروری نہیں تھا۔

"آپ میرے باپ بول رہے ہو نا زی" اس نے غالباً دانت نکالتے ہوئے کہا "آواز پہچان لی ہے میں نے۔"

"تمہارا دوسرا باپ کہاں ہے؟" میں نے غرا کے کہا۔

"ابھی بات کراتا ہوں زی" وہ ہمیشہ جی کو زی اور شین کے بجائے سین بولتا تھا۔ شاید اس کے سامنے والے ایک دو دانت نہیں تھے چنانچہ خلا میں سے ہوا نکل جاتی تھی۔

کچھ دیر بعد دلاور نے کہا "یار سکندر۔ آخر تم کیا چاہتے ہو؟"

میں نے فلمی ولن اسٹائل کا قہقہہ مارا "آج پوچھ رہے ہو اپنے چوہدری صاحب؟ اتنے ایکشن اور ایڈونچر کے بعد۔ پہلے ہی

"دیکھو جی۔ وہ ڈائری مجھے ہر قیمت پر واپس چاہیے۔"

"یہ بات ہے" میں نے متفکر چہرہ بنالیا "کچھ پتا تو چلے کہ آخر ایسی کیا بات تھی اس میں۔"

"وہ ضرور مجھے بلیک میل کرے گا۔ آپ تو جانتے ہو۔ میں کوئی... شریف لڑکی نہیں ہوں۔" وہ نظر چُرا کے بولی "اس میں کچھ لوگوں کے نام اور پتے ہیں جو انہوں نے خود اپنے ہاتھ سے لکھ کر دیے تھے۔ کچھ خفیہ پتے ہیں اور خفیہ فون نمبر۔ جن کا پتا ان کی بیویوں کو نہیں۔"

"ویری گڈ۔ اور کیا ہے... ڈرنے کی ضرورت نہیں' جب اتنا بتادیا ہے تو سب بتادو" میں نے کہا۔

"اور... اور بھی بہت کچھ ہے۔"

"مثلاً... ایسے ثبوت جو مٹائے نہیں جاسکتے اور جن سے کسی بھی عزت دار کہلانے والے کا اس دنیا میں منہ کالا ہوسکتا ہے۔ تم تو منہ کالا کراتی رہتی ہو مگر وہ۔" روانی میں میرے منہ سے ایک ایسی بات نکل گئی تھی جو معیوب تھی۔

رابعہ نے مجھے گھورا "لالی بہت پریشان ہے۔"

"پریشانی کی بات تو ہے۔ اس کے ذریعۂ آمدنی پر کسی اور نے قبضہ کرلیا ہے۔ اب یہ بے چاری کیا کرے گی۔ جتنا یہ وصول کرتی تھی اس سے دُگنا غازی وصول کرے گا مگر لالی کو کچھ نہیں دے گا۔ لٹا ہی سے کچھ وصول کرنے آتا رہے گا۔"

اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے "میں بہت ذلیل ہوں۔ کیا کروں... مقدر میں ذلت تھی۔"

رابعہ نے اسے تسلی دی "ڈائری مل جائے گی لیکن اسے ضائع کردینا لالی۔ یہ خطرناک کام تمہارے بس کا نہیں۔ اگر نو بلیک میل ہوتے ہیں تو دسواں بلیک میل کرنے والے کو ہر ثبوت کے ساتھ ختم کردیتا ہے۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ صرف نام پتا لکھ دینے سے کسی عزت دار کی عزت کو کیا خطرہ لاحق ہوسکتا ہے۔ بڑے لوگ نہ جانے کس کس کو پتا لکھ دیتے ہیں۔ کارڈ بانٹتے پھرتے ہیں۔"

"ہونا تم بھی وہی... وکیل ہونے کے باوجود ناقص العقل۔ مائی ڈیئر رابعہ' کسی کو پتا لکھ کے دینا واقعی کوئی غیر اخلاقی بات نہیں مگر سوچو کہ لالی جیسی لڑکی کے پاس ایک ہی ڈائری میں سب کے پتے ہوں۔ یہاں تک کہ خفیہ نمبر ہوں۔ تو صاف پتا چلتا ہے کہ یہ سب ایک حمام میں ننگے ہونے والے لوگ ہیں۔"

"اس میں اور بھی بہت کچھ تھا..." لالی نے اعترافِ جرم کرلیا۔

میں نے کہا "تصویریں؟"

اس نے اثبات میں سرہلایا "ڈائری کے بیک کور میں۔ چمڑے کی جلد کے اندر' سامنے والے کور کے نیچے چیک تھے۔"

"ایسے احمق بھی تمہارے مہربانوں میں تھے؟"

پوچھ لیتے تو میں مطالبات کی فہرست پیش کردیتا اور تم دستخط کردیتے... ہیں جی۔"

"دیکھو۔ میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"تو آجاؤ میری کوٹھی پر۔ کراؤن سنیما کے سامنے ہے۔ تم نے تو دیکھی ہوگی۔"

"میں سیریس ہوں۔"

"مگر میں زندگی میں کبھی سیریس نہیں ہوا۔ تم تو جانتے ہو' میں جوکر ہوں۔"

"مجھے نوشی... میری بیوی نے سب بتادیا ہے... اور میرے بیٹے فیصل نے بھی کہ تم نے ان کے ساتھ بڑی شرافت سے کام لیا۔"

"سیاست سے کام لیا" میں نے دلاور کی تصحیح کی "تم نے یہ ظاہر کیا کہ میں شریف یعنی بے وقوف ہوں۔ تم سب ایک خاندان نہیں ایک ڈراما گروپ ہو۔ سب پیدائشی ایکٹر ہیں جن کو تمہاری تربیت اور ڈائریکشن نے کامل کردیا ہے۔ تمہارا ایک بھائی تھا اکبر خان۔ پھر تمہاری بہن بن کے شیلی آئی لیکن وہ اپنا رول بھول گئی۔ تم نے اسے دنیا کے اسٹیج سے بھی رخصت کردیا۔ تمہاری بیوی اور بیٹا اپنا رول نبھاگئے۔"

"میں نے تمہیں ہمیشہ ایک بہادر دشمن تسلیم کیا ہے۔"

"چھوڑو یہ فضول باتیں۔ پیڈرو کہاں ہے؟"

"پیڈرو۔ مجھے نہیں معلوم۔"

"تمہیں معلوم ہے دلاور۔ نہیں معلوم تو معلوم کرلو شام تک" میں نے اس کا جواب سُنے بغیر ریسیور بند کردیا۔

میں لمبی بات کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ نیچے آتے ہوئے میں نے وائرلیس کے ایریل کا تار کھول لیا۔ بارہ وولٹ کے اڈاپٹر کے ساتھ ریسیور بہترین کام کررہا تھا' ایریل کی بلندی سے اس کی رینج بہت بڑھ گئی تھی اور آواز کی کوالٹی بہتر ہوگئی تھی۔

میں نیچے آیا تو لالی موجود تھی "اس کمینے کا کچھ پتا چلا؟"

میں نے کہا "چھت پر تو نہیں ہے۔ میں نے اچھی طرح دیکھ لیا۔"

وہ مسکرائی "آپ مذاق کرتے ہو بھائی جان۔"

"بھائی جان! لاحول ولا قوۃ۔" میں نے احتجاج کیا "یہ راتوں رات تم نے رشتہ کیسے بدل لیا۔ میں کسی کا بھائی نہیں ہوں جی۔ فی الحال' جب یہ عمر گزر جائے گی پھر دیکھیں گے۔ لڑکی کو دیکھ کے لوگ رنگ پکڑتی ہے۔"

"آپ نے تو محاورہ ہی بدل دیا" لالی ہنسنے لگی۔

"تمہیں خربوزہ تو نہیں کہہ سکتا میں۔ خواہ مخواہ اس نے بھی مجھے بھائی جان کہنا شروع کردیا پھر؟" میں نے رابعہ کی طرف اشارہ کیا۔

"لالی کچھ کہنے آئی تھی۔ اس کی بھی سُن لو" رابعہ نے کہا۔

"احمق تو سب ہی تھے۔ کچھ زیادہ تھے' ان کے ہر چیک کی فوٹو کاپی میرے پاس تھی یا چیک نمبر تھے..."

"تم زیادہ دن نہیں چلوگی لالی۔ غلط راستہ تو پہلے ہی اختیار کرلیا تھا تم نے۔ یہ دوسرا راستہ موت کا راستہ ہے۔ تمہیں تو معلوم ہوگا کہ وہ کس قماش کے لوگ ہیں۔ شوقین مزاج رئیس یا بدمعاش اپنی زندگی پر کسی کو اختیار نہیں دیتے۔ وہ تھوڑا تھوڑا تم کو دینے کے بجائے یک مشت بڑی رقم خرچ کردیں گے۔"

"نہیں جی۔ میرے پاس تو معمولی حیثیت کے لوگ آتے ہیں۔ ایک معمولی عورت ہوں میں۔ دفتروں کے بابو' چھوٹے موٹے دُکان دار۔ بے حیثیت افسر۔ وہ بڑے بزدل لوگ ہیں سب۔ بیوی بچوں سے' خاندان سے' معاشرے سے' سب سے ڈرنے والے۔ میں اُن سے اتنا ہی وصول کرتی ہوں جتنا وہ آسانی سے دے سکتے ہیں۔"

رابعہ نے افسوس سے سر ہلایا "اللہ ہی رحم کرے تمہارے حال پر۔ زندگی تمہاری اپنی ہے۔ جیسے چاہو گزارو۔"

"اگر وہ ڈائری کسی بڑے بلیک میلر نے نہ چرائی ہوتی لالی تو ہم اسے تباہ کردیتے مگر اس حرام زادے نے تمہارے ساتھ میرے اعتماد کو بھی ٹھیس پہنچائی ہے اس لیے میں غازی کو سبق ضرور سکھاؤں گا۔ وہ آدمی اس لیے خطرناک ہے کہ اس کا کوئی کردار نہیں۔ کل وہ میرا دوست بنا ہوا تھا تو کل میرے دشمنوں سے بھی مل جائے گا۔ وہ ڈائری اس کے پاس نہیں رہے گی۔ تمہارے پاس بھی نہیں۔"

"پھر کیا خود کروگے یہ کام؟" لالی نے تلخ لہجے میں کہا۔

"اس سوال کا جواب ایک طمانچہ ہو سکتا تھا مگر ایک تو تم عورت ہو اور پھر زمانے کے ہاتھوں ستم رسیدہ۔ ڈائری میں رکھوں گا۔ اس وقت تک جب تک کہ میں فرداً فرداً سب کو خط لکھ کے یا فون کرکے مطلع نہیں کردیتا کہ اب وہ آزاد ہیں اور ان کی عزت محفوظ ہے۔ دوبارہ کسی دلدل میں قدم نہ رکھیں۔ ایک بار تو شیطان کے بہکاوے میں غلطی کر بیٹھے تھے..."

لالی کا چہرہ اُتر گیا "تم نہیں جانتے کہ مجھے کتنا نقصان ہوگا۔"

"اور جو نقصان تمہارے ہاتھوں بلیک میل ہونے والے اُٹھا رہے ہیں....؟"

"وہ عارضی ہے۔ تیس ہزار روپے جمع ہو چکے ہیں میرے پاس۔ میں نے عہد کیا تھا کہ پچاس ہزار ہوتے ہی میں یہ سب چھوڑ دوں گی۔ اپنے شوہر کے ساتھ کراچی چلی جاؤں گی اور ایک بوتیک کھول لوں گی۔"

"تمہارا شوہر بھی ہے۔ کس شوہر کی بات کررہی ہو تم؟"

"وہ جو میرے ساتھ رہتا ہے۔ تم کہہ سکتے ہو کہ وہ بے غیرت ہے مگر یہ محبت ہے اس کی جسے تم سمجھ ہی نہیں سکتے۔ کسی مرد میں اتنا حوصلہ ہی نہیں ہوتا کہ وہ ایسے عذاب کو برداشت کرسکے۔"

"تمہارا.... نکاح ہوچکا ہے اس سے؟" رابعہ نے بے یقینی سے کہا۔

"نکاح؟ ہاں' ایجاب و قبول کا نام نکاح ہے تو وہ ہوگیا۔ کراچی جاکے ہم دنیا کے سامنے دوسرے نکاح کا ڈراما بھی کریں گے۔"

"تمہیں شرم آنی چاہیے۔"

"شرم آتی تو میں یہ سب کیوں کرتی۔ اور تمہیں کیوں بتاتی۔ ابھی میں بے شرم ہوں اور میرا شوہر بے غیرت۔ کل یہ سب ہمارا ماضی ہوگا جسے ہم ہمیشہ کے لیے دفن کردیں گے۔ جیسے شریف زادیاں اپنی محبت کی ناجائز نشانیوں کو دفن کردیتی ہیں۔ شادی کے بعد ان کے احمق شوہر تمام عمر اپنی پاکباز بیوی کی عزت و عصمت پر فخر کرتے رہتے ہیں۔"

"لاعلمی کی بات اور ہے۔"

"میں نے دھوکا نہیں دیا۔ صاف بتادیا کہ میں کیا کرتی ہوں اور کیوں کرتی ہوں۔ اس نے کہا کہ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ تم کوٹھے پر بیٹھنے والی ہوتیں تب بھی میری محبت یہی ہوتی اور محبت کا جذبہ تو ایک ہی ہوتا ہے۔ جیسے پانی ایک ہوتا ہے خواہ وہ نلکے سے بہے' آسمان سے برسے' دریا میں بہے یا جھیل میں ساکت کھڑا ہو۔ لیلیٰ کی اور ملکہ الزبتھ کی' میری یا رابعہ کی محبت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ کل جب میں عزت دار ہوجاؤں گی' میرا اپنا گھر' شوہر اور بچے ہوں گے تو.... خیر چھوڑو.... اب تم کیا سمجھوگے اس بات کو۔"

میں نے کہا "تم نے ٹھیک کہا۔ میں تمہاری محبت کے اس فلسفے سے نہ متفق ہوں اور نہ ایسے گناہ کے کسی جواز کو تسلیم کرسکتا ہوں۔"

وہ تلخی سے ہنسی "خود یہی گناہ کرنے کے باوجود۔"

میں نے برہمی سے کہا "زبان سنبھال کے بات کرو۔ ہم کوئی گناہ نہیں کررہے ہیں۔"

"اچھا؟ خدا کو حاضر و ناظر جان کے کہو' کیا یہ بیوی ہے تمہاری؟" لالی نے میرا تمسخر اُڑاتے ہوئے کہا "بولو۔ چپ کیوں ہوگئے؟ تم مجھ سے نکاح کی بات کررہی تھیں۔ ابھی کہو' تمہارا نکاح ہوا ہے سکندر سے؟ نہیں تو پھر تم اس کے ساتھ کیسے رہتی ہو۔ اگر یہ بات میں دنیا کو بتادوں....؟"

رابعہ کا رنگ فق ہوگیا "تم.... کیسے جانتی ہو؟"

"میں نے پہچان لیا تھا تمہیں سکندر بخت۔ تم آنکھوں کے ڈاکٹر نہیں ہو۔ مگر دیکھو میں نے تمہارا راز فاش نہیں ہونے دیا۔ مجھے تو یہ بھی معلوم ہے کہ تمہارے پاس غالب اور نازو آتے ہیں۔ تم رابعہ قاری ایڈووکیٹ ہو۔ میں بھی لاہور میں رہتی ہوں اور تمہارے قصے بہت سُنے ہیں میں نے۔"

میں ابتدائی صدمے سے سنبھل گیا تھا "لیکن یہ غلط ہے جھوٹ ہے۔ بدترین الزام ہے کہ ہم.... گناہ کی زندگی گزار رہے ہیں۔ میں حلف اُٹھا سکتا ہوں۔"

"اس کی فکر مت کرو۔ خدا کی یہ دنیا بہت بڑی ہے اور ابھی تک ہم اس کی امان میں ہیں ورنہ زمین ہم پر تنگ ہوجاتی۔ تم سامان سمیٹو۔ میں ٹیکسی لے کے آتا ہوں۔"

رابعہ میرے اچانک فیصلے سے کچھ پریشان ہوگئی تھی۔ یہ دربدری میرا اور اس کا نصیب ہوگئی تھی۔ ابھی یہاں چین سے بیٹھے جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے تھے کہ پھر بے سکونی کے اسباب پیدا ہوگئے۔ خانہ بدوشی کی زندگی گزارنے والے بھی ہم سے بہتر تھے جن کا گھر نہیں ہوتا تھا تو وہ کہیں گھر بسانے کی تمنا بھی نہیں رکھتے تھے اور نقلِ مکانی ان کے لیے زندگی کا ایسا معمول تھا جس میں نہ کوئی احساسِ محرومی شامل تھا نہ کوئی دکھ اور نہ خوف۔ یہ ان کی ضرورت تھی یا عادت مگر ہم فرار اختیار کرنے پر مجبور ہوتے تھے۔ کبھی اسیری کا خوف ہمارا تعاقب کرتا تھا تو کبھی مرگِ ناگہاں کا۔ نہ جانے کتنے جان کے طلب گار شکاری تھے جو ہمارے نقشِ قدم دیکھتے ہوئے ہر پناہ گاہ تک پہنچ جاتے تھے۔

میرے ذہن میں اچانک ایک ایسی بات آگئی تھی جس نے میرے لیے فوری فیصلے کو آسان کردیا تھا مگر مالکِ مکان کو سخت صدمہ ہوا۔

"جارہے ہو جی؟ ہم سے کوئی ناراضی ہے ڈاکٹر صاحب؟"

میں نے کہا "کیسی باتیں کرتے ہیں آپ' ناراضی کیسی؟"

"پھر کیا بات ہے؟ کسی نے کچھ کہا ہے' مجھے بتائیں' میں ابھی نوٹس دیتا ہوں۔ ویسے بھی اب میں نے سوچا تھا کہ ان مشکوک قسم کے کرائے داروں کی چھٹی کردوں' آپ جیسے شریف اور معزز لوگوں کو جگہ دوں۔"

میں نے کہا "مجھے کسی سے کوئی گلہ نہیں۔ بس یہ جگہ کچھ مناسب نہیں تھی میرے لیے۔ تیسری منزل تک چڑھنا اُترنا...."

"لو جی۔ آپ تو خیر سے جوان آدمی ہو۔ امریکا میں تو لوگ سو منزل اوپر رہتے ہیں اور خیر سے اپنے لہور میں بھی چھ سات منزل...."

میں نے کہا "آپ نے ٹھیک کہا۔ لیکن مشکل میری وائف کے لیے تھی۔"

اس نے کچھ سوچ کے سر ہلایا اور مسکرانے لگا "اچھا اچھا.... سمجھ گیا میں۔ پھر ٹھیک ہے جی' عورت کو احتیاط کرنی چاہیے پہلی بار۔"

غصہ آنے کے باوجود میں مسکرایا "ویسے تو نوٹس دینا چاہیے تھا مجھے ایک مہینے کا لیکن ایک جگہ مل گئی ہے۔ آپ ایک مہینے کا کرایہ رکھ لیں۔"

وہ بُرا مان گیا "حد کرتے ہو ڈاکٹر صاحب۔ قدر بندے کی ہونی چاہیے یا پیسے کی۔ بندے سے زیادہ پیسے کو اچھا سمجھنے والے ہوتے ہوں گے کنجر۔ خیر سے گیارہ دن رہے آپ۔ بیس دن کا کرایہ ہم سے لو۔ کبھی ملنے آجانا ٹائم ملے تو...."

"چھوڑو.... حلف تو زیادہ جھوٹے لوگ اُٹھاتے ہیں۔ میں ویسے ہی مان لیتی ہوں کہ تم سچ بول رہے ہو مگر اصل مسئلہ ہے دنیا کا۔ کیا دنیا کی نظر میں تم اور میں ایک سے گناہ گار نہیں ہوں گے؟ بدکاری کے مجرم تو بدکار ہی کہلاتے ہیں۔ کم زیادہ کی بات نہیں۔ تم بھی دنیا کی پروا نہیں کرتے' میں بھی نہیں کرتی۔ کل تمہارے لیے بھی خواب ہے اور میرے لیے بھی۔ تم نہ مانو مگر ہم ایک ہی منزل کے مسافر ہیں۔ فرق صرف راستے کا ہے۔"

"بند کرو یہ بکواس۔ میں وہ ڈائری تمہیں نہیں دوں گا۔"

"سوچ لو سکندر بخت۔ تم ایک حمایتی سے محروم ہو جاؤ گے۔ ہزاروں لوگوں کی طرح میں بھی تمہاری مداح ہوں۔ تمہاری کامیابی چاہتی ہوں۔ تمہاری عزت بھی کرتی ہوں۔ تم سے ہمدردی بھی رکھتی ہوں۔ اس لیے کہ جس وطن کی خاطر تم نے جہاد کیا تھا وہ میرا بھی وطن تھا۔ وطن تو یہ اس کُتے کا بھی ہے جو یہاں پیدا ہوا اور یہیں مرگیا۔ چور ڈاکو' طوائف اور زنخے۔ بدکار اور بدمعاش' ہندو سکھ عیسائی۔ حرامی اور حلالی' بھنگی اور کم ذات پاکستانی تو سب ہیں۔ یہاں کے درخت' پہاڑ اور دریا۔ مٹی پتھر سب پاکستانی ہیں۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟"

"بالکل نہیں۔ پاکستان اتنا ہی تمہارا بھی ہے جتنا میرا۔ پھر تم یہ دھمکی کیوں دے رہی ہو مجھے۔"

"مجبوری میں اور زندہ رہنے کے لیے آدمی سب کچھ کر گزرتا ہے۔ میرے اور اپنے آنے والے کل کو بچانا چاہتے ہو تو میرے ساتھ زیادتی مت کرو اور مجھے زیادتی کرنے پر مجبور مت کرو۔ میں تمہارا جرم چھپا رہی ہوں۔ تم میرے گناہ پر پردہ رہنے دو۔ کم سے کم دنیا کے سامنے۔ تم جو کررہے ہو کرتے رہو لیکن مجھے مت روکو۔"

"یہ تو ایسا ہی ہے جیسے چور کہے کہ تھانے دار صاحب' آپ تھانے میں بیٹھ کے حرام کھایئے اور مجھے چوری سے مت روکیے۔"

"کیا ایسا نہیں ہورہا ہے؟"

"لیکن میں چور نہیں ہوں۔ میں کوئی جرم یا گناہ نہیں کررہا ہوں۔" میں نے بگڑ کے کہا "اپنا مقابلہ مجھ سے مت کرو۔"

"قانون کی نظر میں تم بہرحال مجرم ہو۔ ورنہ ایسے چھپ چھپ کے نہ رہتے۔ جیسے میں رہتی ہوں" اس نے جاتے جاتے کہا۔

میں نے اسے بہت گالیاں دیں۔ فاحشہ اور طوائف تو وہ تھی' اوروں کے ساتھ وہ مجھے بھی بلیک میل کرنا چاہتی تھی۔

میں نے کہا "رابعہ۔ اب ہم یہاں نہیں رہیں گے۔ یہ جگہ غیر محفوظ ہوگئی ہے ہمارے لیے۔"

خلافِ توقع رابعہ نے مجھ سے اتفاق کیا۔ "سوچا تو میں نے بھی تھا۔ غازی کے دوغلے کردار پر بھروسا نہیں کرنا چاہیے۔ جو دوسروں کو بلیک میل کرتا ہو... وہ کسی موقعے پر ہمیں بھی لالی کی طرح دھمکی دے سکتا ہے۔ مگر ہم جائیں گے کہاں؟"

میں نے شرمندہ ہو کے کہا "ضرور آؤں گا۔"
مالکِ مکان میں بہت سی خرابیاں اور خامیاں ہوں گی جو ہم سب میں ہوتی ہیں لیکن کچھ خوبیاں بھی تھیں۔ قصوروار آدمی کی نظر ب. واپنی ذات کی خوبیوں تک محدود رہتی ہے اور دوسروں میں صرف خرابیاں دیکھتی ہے۔

ہمارا اسباب خانہ بہت محدود تھا اور سمٹ کر دو سوٹ کیس اور ایک بیگ میں سما گیا تھا۔ جو تھوڑا سا فرنیچر ہم نے عارضی ضرورت پوری کرنے کے لیے لیا تھا وہ چھوڑا جا سکتا تھا۔ لالی کا دروازہ مقفل دیکھ کے مجھے خوشی ہوئی۔ وہ موجود ہوتی تو زینے میں قدموں کی آہٹ سُن کے دروازہ کھولتی اور باہر ضرور جھانکتی۔ شاید ہم سے اچانک روانگی کا سبب پوچھتی اور اصرار کرتی کہ ہم اسے اپنا پتا دے کر جائیں تاکہ وہ بعد میں ہم سے ڈائری حاصل کر سکے۔

جب ٹیکسی روانہ ہو گئی تو مجھے لالی نظر آئی۔ وہ بازار سے کچھ لانے گئی ہوگی۔ کسی کو فون کرنے یا کوئی خط ڈالنے بس اتنی دیر میں ہم نکل گئے تھے۔ ایک لمحے کے لیے اس کی اور میری نظر ملی تو وہ ٹھٹک کے رُک گئی۔ اس نے ٹیکسی کی چھت پر سوٹ کیس دیکھ کے اندازہ کرلیا ہوگا کہ ہم لوٹ کر نہیں آئیں گے اور شاید اسے افسوس بھی ہوا ہوگا کہ وہ دھمکی نہ دیتی تو ہم یہ انتہائی قدم نہ اُٹھاتے۔ حیرت سے زیادہ ندامت اس کے چہرے پر عیاں تھی۔

رابعہ نے کہا "کچھ پتا تو چلے، مجھے بھی کہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟؟"

میں نے مسکرا کے کہا "تمہارے پاس اپنے آفس کی چابی تو ہوگی؟؟"

"ہاں۔ ایک چابی ہمیشہ میرے پاس رہتی ہے۔"

"اس وقت تو آفس میں کوئی بھی نہیں ہوگا۔ پوری بلڈنگ خالی پڑی ہوگی شاید۔" میں نے پوچھا۔

"ظاہر ہے، میری طرح وہاں بہت سے وکیل سہ پہر کے بعد آفس میں آتے ہیں۔ کورٹ سے فارغ ہو کے عموماً گھر جاتے ہیں۔ لنچ کے بعد گھنٹا بھر آرام کرتے ہیں اور پھر رات تک کیس میں سر کھپاتے ہیں یا مؤکلوں سے نمٹتے ہیں۔ ایک انکم ٹیکس کے مشیر ہیں۔ وہ بھی بارہ ایک بجے آتے ہیں۔ ایک انجینئرنگ کمپنی، ایک چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ کی فرم اور ایک امپورٹ ایکسپورٹ والے ہیں۔ دس گیارہ بجے تک ہی نیچے کی دُکانیں بھی کھلتی ہیں۔"

"ویری گڈ۔ اس سے اچھی بات کیا ہو سکتی ہے لیکن افسوس سے کہنا ہے مجھے خاتون کہ آپ کی عقل پر پتھر پڑے ہوئے تھے ابھی تک۔ خاصے بڑے پہاڑ جتنے....."

"کے ٹو جتنے" رابعہ نے میری طرف دیکھ کے کہا۔

اپنے پُرانے نام کبیر خان کی رعایت سے میں کے ٹو بھی کہلاتا تھا اور ایم آر ایس کے دورِ جنون میں مجھے چیف کے ٹو کا لقب بھی دیا گیا تھا۔ "نادان لڑکی، تم کو ہنسنا نہیں رونا چاہیے اور غور کرنا چاہیے کہ آخر ہر لاجواب بات مجھے ہی کیوں سوجھتی ہے۔ کیا وجہ ہے.....؟"

"وجہ کچھ نہیں۔ بس میں موقع دیتی ہوں تمہیں بولنے کا۔ بتاؤ کیا بات ہے؟؟"

میں نے ٹھنڈی سانس لی "مجھے خیال یہ آیا تھا کہ کیوں نہ ہم تمہارے آفس کو بطور رہائش گاہ کے استعمال کریں۔"

"یہ.... یہ خیال تو مجھے بہت پہلے آیا تھا" رابعہ نے کہا۔

"پھر آپ نے اس کا اظہار کیوں نہیں فرمایا تھا؟" میں نے طنز سے کہا۔

"اس لیے کہ آدمی کو پہلے تولنا اور پھر بولنا چاہیے۔ ہر خیال دماغ میں آتا ہے مگر قابلِ عمل نہ ہو تو بے کار ہے۔ آفس میں بھلا کیسے رہ سکتے ہیں ہم، یہ بات لاجواب نہیں، بے جواز ہے۔"

"آخر لوگ فٹ پاتھ پر بھی تو رہتے ہیں۔"

"وہ ایک کمرشل بلڈنگ ہے۔ رات نو دس بجے سب چلے جاتے ہیں تو باہر تالا پڑ جاتا ہے۔"

"کوئی چوکیدار بھی نہیں رہتا؟؟"

"ایک چوکیدار ہے پوری بلڈنگ کا۔ وہ اندر رہتا ہے۔ لوہے کی جالی کو کھینچ کر زینے کے سامنے والا راستہ بند کردیتا ہے اور خود وہیں دری ڈال کے سو جاتا ہے۔ زینے کے نیچے اس کا کیبن ہے۔ صبح نو بجے اس کی ڈیوٹی ختم ہوتی ہے مگر وہ بہت پہلے اُٹھ جاتا ہے پھر صفائی کرنے والے آجاتے ہیں۔"

میں نے کہا "کسی نے اپنے آفس کے لیے اپنا چوکیدار نہیں رکھا ہے؟؟"

"کبھی کسی نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔"

"تم محسوس کرسکتی ہو۔ تمہارے پاس مقدمات کی جو فائلیں ہیں ان کو چُرانے کے لیے کوئی کچھ بھی کرسکتا ہے۔ لاکھوں کی جائداد ہتھیانے کے لیے یا سزائے موت سے بچنے کے لیے کسی بے گناہ کے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈلوانے والے.... ثبوت شہادت ضائع کرنا چاہیں تو.....؟"

"ایسا بہت کم ہوتا ہے۔"

"لیکن ہوتا ہے...." میں نے کہا "ناممکن نہیں ہے۔ تمہیں اپنے آفس میں حفاظت کے لیے کوئی چوکیدار ایسا رکھنا چاہیے۔"

"جو باکسنگ، جوڈو اور کُشتی کے فن سے واقف ہو۔ پستول سے توپ تک چلا سکتا ہو۔ بدمعاشوں کی ہڈیوں کا سُرمہ کردے اور کشتوں کے پشتے لگا دے..... فلمی ہیرو کی طرح اور خود بھی فلمی ہیرو ہی نظر آتا ہو تمہاری طرح۔ تابعدار اتنا ہو کہ ایک اشارے پر آسمان کے تارے توڑ لائے اور وفادار ایسا کہ ساری عمر مالک کا غلام رہے" رابعہ ہنسی۔

میں نے انکساری سے کہا "غلام نہیں زر خرید غلام کہو اور مالک نہیں۔ مالکن، بس بادشاہو.... ٹیکسی ادھر سائیڈ میں لگالو۔"

ٹیکسی رُک گئی اور ڈرائیور نے سامان اُتار کے رکھ دیا تو میں نے صورتِ حال کا جائزہ لیا۔ کونے پر چشمے بنانے والے کی وسیع دُکان باہر سے بند تھی مگر اندر ملازمین شوکیس اور شوونڈوز کے شیشے چمکا رہے تھے اور معمول کے مطابق صفائی میں مصروف تھے۔ باقی دُکانیں ابھی بند پڑی تھیں۔ عمارت کے وسط میں لوہے کی گرل سمیٹ کر ایک طرف کردی گئی تھی اور گیٹ پر اس وقت کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ مجھے رابعہ کے ساتھ کوئی بھی دیکھے اور پہچاننے کی کوشش کرے۔ بہت پہلے جب میں ایک وکیل کی حیثیت سے رابعہ کے پاس آتا تھا تو بہت کم لوگ مجھے جانتے تھے۔ بعد میں میری بدنامی اور نیک نامی کی داستانیں سنسنی خیز خبریں بنیں۔ رابعہ کے ساتھ میرے تعلق کے چرچے عام ہوئے اور مشرقی پاکستان میں خانہ جنگی کے دوران مجھے بیک وقت محبِ وطن اور مفرور مجرم قرار دیا گیا۔ میری تصویریں خبروں کے ساتھ اور اشتہاری مجرم کی حیثیت سے شائع ہوئی ہوں گی تو اس بلڈنگ میں بھی بہت سے لوگ چونکے ہوں گے کہ "اچھا۔ یہ بندہ تھا۔ اسے تو یہاں آتے جاتے دیکھا تھا۔ صورت سے تو ایسا نہیں لگتا تھا۔"

صورت سے کون کیسا لگتا ہے۔ یہ قبل از وقت کسی کو خیال نہیں آتا مگر بعد میں جتنے منہ اتنی باتیں۔ سب قیافہ شناس ہونے کے دعوے کرنے لگتے ہیں۔ عمارت میں بیشتر لوگ آج بھی وہی ہوں گے۔ شاید چوکیدار بھی وہی ہو اور صفائی کرنے والا عملہ بھی پُرانا ہو۔ شام کا وقت ہوتا تو بہت سے لوگوں میں میرے چہرے کو غور سے کوئی نہ دیکھتا مگر اس وقت خود رابعہ کا آفس پہنچنا ہی غیر معمولی بات تھی۔ ہاتھ اُٹھا کے سلام کرنے والے اور خیریت دریافت کرنے والے بھی حیران تو ہوں گے کہ وکیل صاحب صبح صبح سامان سمیت کہیں جا رہی ہیں یا کہیں سے آئی ہیں۔ میں ساتھ ہوتا تو معنی خیز نظریں اور چہ میگوئیاں بہت ہی بے بنیاد افواہوں کا سبب بن جاتیں جن کا مرکزی کردار میں ہوتا۔ شام تک سب کو معلوم ہو جاتا کہ رابعہ کے ساتھ کون تھا۔

ان سب عوامل کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے رابعہ کو آگے روانہ کیا اور اسے تاکید کی کہ وہ چوکیدار کو سامان لانے کے لیے بھیجے۔ چوکیدار وہی تھا۔ میانوالی کا سوا چھ فٹ سے نکلتا ہوا جوان جس کو تیل سے چمکتے ہوئے پٹوں میں کنگھی پھیرنے اور پھولی ہوئی مونچھوں کو آئینے میں دیکھ کے سنوارنے کا شوق تھا۔ وہ گیٹ کے پاس اسٹول پر بیٹھا ہاتھ میں چھوٹا سا شیشہ لیے اتنے انہماک سے مونچھوں اور زلفوں کا جائزہ لیتا رہتا تھا کہ اسے کسی کے آنے جانے کی خبر بھی نہیں ہوتی تھی۔ کوئی غیر متعلقہ شخص کسی غلط ارادے سے کبھی بلڈنگ میں نہیں گھسا تھا مگر ایک بار یہ ضرور ہوا تھا کہ ایک دیوانہ اوپر پہنچ گیا تھا جو عام طور پر جی پی او کے سامنے ننگ دھڑنگ ایک کتے کے ساتھ نظر آتا تھا۔ جاہل اور کمزور عقیدے کے لوگ اسے مجذوب اور کتے کو اس کا ہمزاد سمجھتے تھے۔ جب اوپر بھگدڑ مچی تو چوکیدار بھی دوڑا۔ مجذوب اور اس کے ہمزاد نے فرسٹ اور سیکنڈ فلور کے کاریڈور میں خوب دوڑ لگائی اور پکڑنے کی کوشش کرنے والوں کو خاصا بدحواس کیا۔ ایک پاگل آدمی اور کتا دونوں ایک سے جارحانہ موڈ میں تھے اور خاصی بھاگ دوڑ کے بعد اس وقت پکڑے گئے تھے جب تعاقب کرنے والے بھی تھکن سے ہانپ رہے تھے۔ بیشتر دفاتر میں کرسیاں میزیں اور فائلیں اُلٹ چکی تھیں۔ ڈرپوک حضرات اور سہمی ہوئی اسٹینو لڑکیاں باتھ روم میں بند ہو چکی تھیں اور مجبوراً بہادر بننے والوں میں سے تین کو کتے نے کاٹ لیا تھا، چار کو مجذوب نے۔ کتا پاگل نہیں تھا مگر RABIES کے ڈر سے سب نے چودہ چودہ انجکشن پیٹ میں لگوائے تھے اور اس کے باوجود خوف میں مبتلا رہے تھے کہ کہیں وہ پاگل ہو کے کتے کی طرح بھونکتے ہوئے HYDROPHOEBIA میں مبتلا ہو کے نہ مریں۔ کتے کو بعد میں کارپوریشن والے پکڑ کر لے گئے تھے اور مجذوب کو پاگل خانے پہنچا دیا گیا تھا۔ چوکیدار پر سخت غفلت اور مجرمانہ کوتاہی کی فردِ جرم عائد کرتے ہوئے اسے برخواست کر دیا جاتا اگر وہ رابعہ کے پاؤں نہ پکڑتا اور یہ وعدہ نہ کرتا کہ پھر آئینے میں اپنی زلفیں اور مونچھیں کبھی نہیں دیکھے گا۔ رابعہ کی سفارش کے باوجود اس کے سامنے بطورِ سزا یہ شرط رکھی گئی تھی کہ وہ ایک چیز کو بچا لے۔ نوکری کو یا گیسوئے تابدار کو۔ اسے بہت اچھی تنخواہ ملتی تھی، خدمت کا انعام الگ تھا اور وہاں سب اثر و رسوخ والے لوگ تھے۔ ان کے ساتھ رہنا کسی کے گھر میں چوکیدار یا ڈرائیور اور چپراسی بننے سے لاکھ درجہ بہتر تھا۔ اس نے مونچھوں اور زلفوں سے دستبردار ہونا قبول کرلیا تھا اور ملازمت بچا لی تھی۔ ظاہر ہے جب دیکھنے کو ہی کچھ نہ رہا تو اس نے وہ آئینہ بھی توڑ دیا تھا۔

اب وہ سامان اُٹھانے آیا تو بہت بدلا بدلا لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر دوبارہ مونچھوں کی بہار تھی اور کانوں تک آنے والے پٹے پہلے کی طرح تیل سے جگمگا رہے تھے۔ رابعہ نے مجھے بعد میں بتایا کہ وہ سخت ڈیپریشن میں مبتلا ہو گیا تھا چنانچہ وقار یوسف نے اسے پھر چہرے اور سر پر بال اُگانے کی اجازت دلوا دی تھی مگر آئینہ دیکھنے سے خود اس نے توبہ کرلی تھی۔

جب وہ ایک سوٹ کیس اور ایک بیگ لے کر پلٹا تو میں اس کے پیچھے رہا اور زینے کے ایک موڑ کا فاصلہ رکھ کے چلتا گیا۔ وہ دائیں طرف مڑ کے رابعہ کے کمرے میں داخل ہوا تو میں دائیں طرف آگے نکل گیا اور گیلری میں سڑک کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ جب چوکیدار دوسرا سوٹ کیس اور دوسرا بیگ لانے کے لیے نکلا تو اس نے میری طرف دیکھا ہی نہیں۔ وہ بائیں طرف مڑ کے زینہ اُتر گیا تو میں نے رابعہ کے آفس کا رخ کیا۔ اس وقت کاریڈور کے آخر میں ایک شخص فرش کو گیلا کپڑا رگڑ کے چمکانے میں مصروف تھا اور میری طرف اس کی پشت تھی۔ اس کی نصف بہتر اوپر سے زینے کی صفائی کرتی آ رہی تھی اور اُلٹے قدم اترتے

ہوئے اپنی بے سُری آواز میں گا بھی رہی تھی۔

رابعہ کے آفس کا نقشہ کچھ بدل گیا تھا۔ اس کا رقبہ پہلے کے مقابلے میں دُگنا ہو گیا تھا۔ وقار یوسف نے ساتھ والا کمرا بھی حاصل کر لیا تھا اور درمیان کی دیوار نکال کے ہال کی پارٹیشن اس طرح کی تھی کہ وسط میں ویٹنگ لاؤنج بن گیا تھا۔ دائیں بائیں تین تین کیبن تھے جن میں منشی اور ٹائپسٹ کے علاوہ جونیئر وکیل بیٹھتے تھے۔ سامنے کے حصے میں تین بڑے کمرے تھے۔ درمیان والے کمرے کے باہر کمپنی کے نام کی چمکتی ہوئی تختی لگی ہوئی تھی۔ یہ رابعہ کا آفس تھا۔ اس کے ساتھ والا کمرا عبدالودود منظر اور وقار یوسف مل کے استعمال کرتے تھے۔ تیسرا کمرا سب کا مشترکہ ڈرائنگ روم تھا جسے ریٹائرنگ روم کہنا بہتر ہو گا۔ وہاں ایک صوفہ سیٹ تھا اور ایک بیڈ۔ ایک مختصر حصے میں ٹائلٹ اور اس کے ساتھ چھوٹا سا کچن جسے KITCHENET کہا جاتا ہے۔ یہاں کوئی مؤکل نہیں آسکتا اور اسٹاف کو بھی اجازت کے بغیر داخل ہونے کی ممانعت تھی۔ یہاں پرائیویسی میں مالکان چائے پیتے تھے‘ آرام کرتے تھے اور گپ شپ کرتے تھے یا مشورہ۔ یہ سب باتیں مجھے اندر قدم رکھتے ہی معلوم نہیں ہوئیں۔ میں تو ایک دروازہ کھول کے غائب ہو گیا تھا اور یہ دروازہ اتفاق سے ریٹائرنگ روم کا تھا۔ بعد میں رابعہ کے ساتھ میں نے تفصیل سے آفس کا معائنہ کیا۔ یعنی اس وقت جب چوکیدار دوسرا سوٹ کیس اور بیگ رکھ کے رخصت ہو گیا تھا۔

رابعہ نے اندر سے دروازہ لاک کر کے کہا ”آپ باہر تشریف لا سکتے ہیں۔“

میں اس وقت جوتوں سمیت بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔ ”بہتر ہو گا کہ آپ ہماری خدمتِ اقدس میں حاضر ہو جائیں۔“

رابعہ اندر آگئی۔ ”آتے ہی لیٹ گئے۔ سامان اُٹھاؤ باہر سے۔“

”یہاں تو نقشہ ہی کچھ اور ہے۔ تمہیں یقین ہے کہ تم کسی اور کے آفس میں نہیں گھسی ہو غلطی سے؟“ میں مستعدی سے اُٹھ بیٹھا۔

”وقار نے بتایا تو تھا کہ توسیع کی ہے۔“

”تمہیں بتایا ہو گا‘ میں تو پہلی بار یہ شان و شوکت دیکھ رہا ہوں۔ بہت خوش قسمت ہو تم کہ تمہیں وقار جیسے معاون اور منظر جیسے دوست ملے۔“

”ہم سب پارٹنر ہیں۔ اب کوئی کسی کا معاون نہیں رہا۔“

”بُرا مت ماننا۔ اتنی ترقی شاید تمہاری کوشش سے نہ ہوتی جتنی تمہاری عدم موجودگی میں ہوئی۔“

”کیا مطلب؟ مجھے وکالت چھوڑ کے گھر بیٹھ جانا چاہیے۔“

”مان گئیں نا بُرا۔ میں نے یہ نہیں کہا کہ تم میں صلاحیت نہیں تھی یا تم میں اتنی اہلیت نہیں تھی۔ اس حقیقت کو مجھ سے پہلے دنیا نے تسلیم کر لیا تھا کہ تم کتنی ذہین‘ قابل اور بے باک وکیل ہو۔ میں تمہاری خوش قسمتی کے حوالے سے بات کر رہا تھا۔ کیا ہوتا ہے جب اصل مالک کسی کاروبار سے لاتعلق ہو جائیں۔ کاروبار پر پوری توجہ نہ دیں یا اسے دوسروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں۔ ہر کاروبار چوپٹ ہو جاتا ہے۔ یار لوگ سب کچھ کھا پی کے یا آپس میں بانٹ کے نو دو گیارہ ہو جاتے ہیں اور مالک ہو جاتا ہے دیوالیہ۔ تمہارے ساتھ اس کے برعکس ہوا۔ یہ کتنا بڑا احسان ہے اللہ کا۔ تائیدِ ایزدی نہ ہوتی تو تمہیں بھی نااہل‘ خود غرض اور لالچی معاون مل جاتے۔ تمہاری سب آمدنی اپنی جیب میں ڈالتے اور تمہارے کھاتے میں نقصان ہی نقصان ہوتا۔ تم واپس آتیں تو یہاں ترقی کے نوٹس اور تالے... گرد آلود فائلیں‘ ٹوٹا پھوٹا فرنیچر اور مکڑی کے جالے ملتے۔ تمہاری لیگل فرم ایک بھولا بسرا نام ہوتی۔ مگر دیکھو اور ناز کرو اپنی تقدیر پر۔ تم جہاں تھیں اب اس سے آگے ہو۔“

مجھے یوں لگا جیسے وہ رو پڑے گی۔ یہ خوشی‘ طمانیت اور فخر و غرور کے جذبات کا سیلاب تھا جو اسے بہا لے جاتا ”اور... اور کچھ نہیں؟... بس یہی سب کچھ ہے۔ تم اور تمہاری محبت... اتنی بے پناہ چاہت... یہ بھی تو مجھے حاصل ہے۔“

میں اس کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گیا اور اپنے ایک ہاتھ سے اس کو قریب کر لیا ”وکیل صاحب۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ بے چارے مؤکل کا کچھ خیال کریں۔“

اس نے میرے کندھے پر سر رکھ دیا ”وکالت چھوڑ دوں گی میں۔“

”بڑا نیک خیال ہے۔ پھر تم گھر میں ہانڈی چولہا کرنا اور بچے پالنا۔ میں کسی دفتر میں بابو گیری کروں گا۔ دفتر سے سائیکل پر گھر واپس آؤں گا۔“

”خدا نہ کرے“ رابعہ نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ”تمہارے پاس کس چیز کی کمی ہے۔ بالآخر تمہیں سب کچھ مل جائے گا جو تمہارا ہے۔ تمہارا کاروبار... تمہاری جائداد۔“

میں نے ایک آہ بھری ”ابھی تو تم بھی ہماری نہیں ہو جاناں۔ اللہ تمہاری زبان مبارک کرے۔“

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم یہاں کیسے رہیں گے؟“

”آجائے گا سب کچھ سمجھ میں۔ پہلی بات تو یہ کہ ہم مت کہو۔ یہاں رہنا صرف مجھے ہے۔ تمہارے چوکیدار کی حیثیت سے۔“

”کیسی باتیں کرتے ہو۔“

”کیا تمہیں تحفظ فراہم کرنا میرے ذمّے داری نہیں ہے؟ محافظ اور چوکیدار ایک ہی بات ہے“ میں نے کہا ”اس کے علاوہ خاتون‘ غالباً لنکن صاحب فرما گئے تھے کہ گلاب کو کسی بھی نام سے پکارو وہ گلاب ہی رہے گا۔ میرا نام چوکیدار شیر خان ہو یا جمعدار نتھو رام۔ ہو گا تو یہ ناچیز وہی تمہارا بندۂ بے دام‘ محبت کا غلام‘ پیار کے گھوڑے کی لگام‘ رکھنا ہاتھ میں تھام...“

رابعہ ہنس پڑی ”جمعدار نتھو رام۔ بڑا اچھا ہے یہ نام۔“

”اچھا اب غور سے سُنو کہ یہاں میں کیسے تمہارے ساتھ اور سب کے سامنے رہتے ہوئے بھی کسی کو نظر نہیں آسکتا۔ چالاک چور ہو تو اندھیرے میں روپوش نہیں ہوتا اور تاریک گوشوں میں نہیں چھپتا۔ وہ چور کو تلاش کرنے والوں کے ساتھ ٹارچ ہاتھ میں پکڑے چور چور چلّانے لگتا ہے۔ میرے پاس بھی ایک وردی ہے جو ہم نے اسپتال میں ایک محافظ کے جسم پر سے اُتاری تھی۔ وہ عام سی خاکی وردی ہے اور اسے پہن کے میں رات کو یہاں کا چوکیدار بن جاؤں گا۔ رات کو آرام سے سو کے گزاروں گا اور صبح غائب ہو جاؤں گا۔“

”کیسے غائب ہو جاؤ گے‘ سلیمانی ٹوپی اوڑھ کے۔“

”یہ میں وقت آنے پر تمہیں کر کے دکھا دوں گا۔ فی الحال تم عمارت کے چوکیداروں کو بتا سکتی ہو کہ ہم نے اپنے آفس کے لیے بھی ایک چوکیدار رکھ لیا ہے جو صرف رات کے وقت اندر ہو گا اور صرف آفس کے اندر کی حفاظت کا ذمّے دار ہو گا۔ باہر کی رکھوالی پہلے کی طرح پرانے چوکیدار اپنی اپنی شفٹ میں کریں گے۔“

”چلو یہ تو میں کہہ دوں گی مگر کیا رات نو بجے سے صبح تک ہم آفس کے اندر بند رہیں گے۔“

”ہم نہیں۔ صرف میں...“

”اور میرے بارے میں کیا حکم ہے۔“

”حکم یہ ہے کہ آپ معمول کے مطابق اپنے پیشہ ورانہ فرائض کے معمولات میں مصروف ہو جائیں۔ صبح کورٹ جائیں‘ شام کو مؤکلوں سے ملیں اور ایسا محسوس ہو جیسے یہ وقت آج کا نہیں۔ پونے دو سال پہلے کا ہے جب تم صرف رابعہ قاری ایڈووکیٹ ہائی کورٹ تھیں اور تمہارا ایک سکندر بخت سے پرانا شناسائی کا رشتہ ضرور تھا مگر کسی تجدیدِ وفا کی نہ صورت تھی نہ امکاں تھا۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”ہو سکتا ہے۔ چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں۔ میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں۔ میں تو چاہتا ہوں کہ دنیا کے سامنے تم سب بھول جاؤ۔ ہونٹوں پہ کبھی تیرے مرا نام نہ آئے اور کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے‘ تو بس ایک خامشی تری سب کے جواب میں۔“

”یہ شاعری نہیں باتیں ہیں یا باتوں میں شاعری۔ مجھے تو تمہارا یہ خیال بھی ایسے ہی لگتا ہے۔ جیسے شاعر کی پروازِ تخیل۔“

”تجربہ کر کے دیکھو پہلے پھر کہنا کہ یہ خیال آرائی تھی یا حقیقت۔ سکندر ہر وقت تمہارے ساتھ ہو گا۔ رگِ جاں سے بھی قریب تر۔ ہر جگہ ہو گا مگر اسے پہچاننے والے صرف چار افراد ہوں گے۔ تمہارے علاوہ غالب اور نازو۔ منظر اور وقار یوسف۔ رات

وجب تم آفس سے فارغ ہو کے جاؤ گی۔“

”میں کہاں جاؤں گی؟ یہ بھی بتا دو۔“

”تو کہاں جائے گی؟ کچھ اپنا ٹھکانا کر لے“ میں نے نیچے سے شعر کا مفہوم بدل دیا ”ویسے ٹھکانوں کی کیا کمی۔ تمہارے لیے کہیں کوئی خطرہ نہیں اور پابندی نہیں۔ منظر کے چڑیا گھر میں رہو یا وقار یوسف کے ساتھ۔ لیکن میں وہاں بھی نہیں آؤں گا۔ رات کو ہم باہر کہیں بھی مل لیں گے۔ پہلے سے طے شدہ کسی مقام پر۔ خفیہ میٹنگ کی جگہ صیغۂ راز میں رہے گی اور ہر بار بدلتی رہے گی۔ آئی بات سمجھ میں؟“

”آگئی۔ ابھی تو بلاشبہ یہ بڑی ذہانت کی بات لگتی ہے۔ بعد میں حماقت ثابت ہو۔ اس کا فیصلہ حالات کر سکتے ہیں۔“

”اچھا اب دوپہر سے پہلے میں رخصت ہو جاؤں گا۔ کسی نے بھی مجھے یہاں آتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔“

”جاتے ہوئے تو دیکھے گا؟“

”نہیں دیکھے گا۔ غالب کو فون کرو اور اسے کہو کہ ایک چہرہ ساز چاہیے۔ یعنی میک اپ کرنے والا جو ماہرِ فن ہو اور میری خواہش اور اطمینان کے مطابق ہر صبح میری صورت بدل سکے۔“

”ہر صبح...؟“

”ہاں۔ مجھے دن میں دوسرا چہرہ چاہیے۔ جو ہر روز وہی ہو۔ اگر اس کی کوئی آسان ترکیب ہو تو بہت اچھا ہے ورنہ میں خود اس کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے تیار ہوں۔ معاوضہ وہ جتنا چاہے لے۔ یہ مسئلہ ہے میرے ایک خاص مشن کی کامیابی کا جس پر میرے مستقبل کا انحصار ہے۔“

”میرے یا ہمارے مستقبل کا۔“

”تم تو زبان پکڑتی ہو۔ الگ اب کیا ہے میرے اور تمہارے لیے۔ غالب کو فون کرنے کے بعد اپنا سامان اور سوٹ کیس یہاں سے لے جاؤ۔ اتنے سامان کی جگہ یہاں نہیں ہے۔ میں اپنا سوٹ کیس اس بیڈ کے نیچے رکھوں گا۔ ہمارا اسلحہ اور نقد رقم یہیں رہے گی۔ میرے کپڑے یہاں ہوں گے اور بس۔“

”مجھے تو ٹھیک نہیں لگتا یہ... کہ تم رات بھر آفس میں بند رہو۔ باہر کا گیٹ بھی لاک ہو جاتا ہے“ رابعہ متفکر ہو گئی۔

میں نے ہنس کے کہا ”اس کی مت فکر کرو۔ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے چوکیدار دو۔ میں اس سے دوستی کر لوں گا۔ وہ گیٹ پر ہی تو سوتا ہے۔ جب ضرورت پڑے گی خود میرے لیے تالا کھول دے گا یا مجھے گیٹ کی چابی بنوا دے گا۔ آپس کے اعتماد کی بات ہو گی۔ میں بھی اسے موقع فراہم کروں گا کہ کبھی رات کو سیر سپاٹے کے لیے جانا چاہے تو چلا جائے۔ اب بھی وہ غائب تو ہو جاتا ہو گا۔ رات کو کبھی گھر میں کوئی بیمار ہو۔ مہمان آئے ہوئے ہوں یا کوئی تقریب ہو خاندان میں تو وہ گیٹ بند کر کے ہی تالا ڈال کے جاتا ہو گا۔ کسی کو معلوم کیسے ہو سکتا ہے۔ صبح وہ پھر موجود ہوتا

ہے۔"

رابعہ نے کہا "یعنی تم نے سب سوچ لیا ہے۔ چلو تم کہتے ہو تو ٹھیک ہے۔"

غالب کی تلاش میں رابعہ نے پہلے وقار یوسف کے گھر فون کیا پھر اس کے آفس، اخبار کے دفتر سے بتایا گیا کہ وہ بادامی باغ کے صنعتی علاقے میں کسی کرائم رپورٹ کے چکر میں نکلا ہے۔ رابعہ نے نازو کے اخبار والوں سے پوچھا تو پتا چلا وہ دونوں میو اسپتال کے میڈیکو لیگل افسر کے پاس بیٹھے ہیں۔ بالآخر ایک ڈاکٹر نے اسے تلاش کر کے فون تھما دیا۔

"رابعہ۔ بھئی ہم تو پہنچے تھے تمہارے غریب خانے پر۔ لیکن بڑا افسوس ہوا یہ دیکھ کے کہ تم دونوں انتقال کر چکے ہو" میں نے غالب کی آواز دوسرے فون کے ریسیور میں سُنی۔ "خیر... اللہ تمہیں اسی دنیا میں پھر کسی کے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ ہمیں تو صبرِ جمیل کی ضرورت نہیں۔"

"عقلِ سلیم کی ضرورت تو ہے۔" میں نے کہا۔

"کون سلیم۔ میری اپنی عقل کافی ہے مجھے۔ اور یہ کون نامعقول بول رہا ہے بیچ میں۔ کوئی بھوت لگتا ہے۔ آواز میرے سسر سے ملتی ہے۔ کیا یہ بھوت اب لوگوں کی ٹیلی فون کالیں بھی سُننے لگے ہیں۔"

"تم شکایت کر دو بھوتوں کے وزیرِ مواصلات سے۔ کسی بدروح کی معرفت۔"

"ڈیر تم میرے سسر کو بدروح نہیں کہہ سکتے۔ وہ بدتمیز ہے جاہل ہے احمق ہے لیکن۔" اس کے بعد ایک دردناک ہائے سُنائی دی۔

میں نے کہا "کیا ہوا" کیا نازو نے دھوبی پٹخا مار دیا؟"

"ایڑی سے انگلی کچل دی۔ پاؤں ہے کہ ہتھوڑا۔ ڈاکٹر صاحب بھی دیکھ رہے ہیں اور گواہ ہیں اس قاتلانہ حملے کے..."

بڑی مشکل سے رابعہ نے اسے اپنی بات سمجھائی پھر وہ اپنا سامان الگ کرنے لگی اور ایک سوٹ کیس میں میرے کپڑوں کے نیچے اسلحہ رکھ دیا جس میں اب چار ریوالور باقی تھے اور کچھ فاضل راؤنڈ۔ ایک پرانا ریوالور سائلنسر کے ساتھ بھی تھا۔ لائسنس کے بغیر یہ اسلحہ رکھنا ہی ایک خطرناک جرم تھا مگر کئی وکیلوں کی فرم میں یہ خاصا محفوظ بھی تھا۔ ایک الماری کی طرح بنے ہوئے کچن میں تین شیلف تھے۔ سب سے اوپر والے شیلف میں چائے کے برتن تھے اور کچھ کراکری۔ اس کے علاوہ چائے، کافی اور دودھ کے ڈبے تھے۔ اس کے نیچے والے حصے میں الیکٹرک اسٹوو تھا اور کیتلی تھی۔ سب سے نیچے کے خانے میں برتن دھونے کے لیے سنک لگایا گیا تھا۔ رابعہ نے وہ سب سامان بھی یہاں بھر دیا جو ہم نے چند دن رائل پارک کی تیسری منزل والے گھر میں استعمال کیا تھا۔

ابھی تک عمارت میں چہل پہل نہیں تھی حالانکہ دوپہر کے گیارہ بج رہے تھے۔ سوا گیارہ بجے کسی نے دروازے پر دستک دی۔ یہ غالب کا ارسال کردہ میک اپ مین تھا۔ اس کا اپنا حُلیہ ایسا تھا کہ لگتا تھا، وہ بھیس بدل کے آیا ہے۔ اس کے بچوں جیسے گول چہرے پر نوکیلی مونچھیں بالکل نقلی نظر آتی تھیں اور اسی طرح آنکھوں کا سبز رنگ بھی۔

اس نے خود کو متعارف کراتے ہوئے اپنا چھوٹا سا ملائم ہاتھ آگے بڑھا کے میرے ہاتھ کو چھوا اور فوراً پیچھے کر لیا۔ "میں زاہد زماں زبیری ہوں۔ چارلی نے کہا کہ تین دفعہ نہیں بس ایک زیڈ کافی ہے۔ اب میں زیڈ ہوں۔"

میں نے مسکرا کے کہا "اور یہ چارلی کون ہے؟"

اسے میری جہالت پر سخت صدمہ ہوا۔ "آپ چارلی کو نہیں جانتے۔ کمال ہے۔"

"ایک تو مشہور کامیڈین تھے۔"

"یہ استاد ہیں میرے۔ میک اپ مین بلکہ سپر مین۔ یہ فن ان پر ختم ہے۔"

رابعہ نے حوصلہ افزائی کے لیے کہا "نہیں بھئی۔ آپ ضرور استاد کا نام روشن کریں گے۔ فن کیسے ختم ہو سکتا ہے۔"

"اچھا؟" اس نے بڑی معصومیت اور بے یقینی سے کہا "آپ رابعہ قاری ایڈووکیٹ کو اطلاع کر دیں..."

"مجھے اطلاع ہو گئی۔ میں ہی رابعہ ہوں۔"

وہ حیرت سے پلکیں جھپکاتا رہا "کمال ہے۔" یہ اس کا تکیۂ کلام تھا۔

"کیا کمال ہے" رابعہ بولی۔

"آپ... وکیل" اس نے افسوس سے سرہلایا "فلموں میں آپ تہلکہ مچا سکتی ہیں۔ سب کا چراغ گُل ہو جائے گا۔"

"سب کے چراغ جلنے دو زیڈ۔" رابعہ نے خوش ہو کے کہا۔

"میں بات کر سکتا ہوں شباب کیرانوی صاحب سے... کتنے چہرے متعارف کرائے ہیں انہوں نے... وہ مانتے ہیں میری بات اور آپ کو ضرورت بھی نہیں ہے سفارش کی" اس نے دونوں ہاتھوں کے فریم میں رابعہ کو فوکس کر کے کہا۔

"میں بہت خوش اور مطمئن ہوں اپنے کام سے۔ مجھے فلموں سے دلچسپی بھی نہیں ہے" رابعہ نے کہا۔

وہ خبطی اور جھکّی آدمی تھا "دیکھئے اس میں عزت، دولت اور شہرت ہے۔"

"سب ہے میرے پاس زیڈ۔"

اس نے شانے اُچکا کے "کمال ہے" کہا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔

"پھر آپ میک اپ کیوں کرانا چاہتی ہیں۔"

میں نے کھنکار کے کہا "اگر آپ کی نظرِ کرم اس ناچیز کی جانب ہو تو میں کچھ عرض کروں۔ میک اپ مجھے کرانا ہے۔ میرا نام اے

ہے۔"

"اے؟ صرف اے؟ کمال ہے۔"

"احمد علی عرشی۔ تین اے بہت زیادہ ہیں، ایک کافی ہے" میں نے کہا۔

زیڈ نے سرہلایا "مسٹر اے۔ تمہارا بھی اچھا بھلا چہرہ ہے۔ خیر مجھے کیا۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا "ہاں تمہیں کیا۔ میں اسے بگاڑنا چاہتا ہوں۔ صبح شام بدلنا چاہتا ہوں۔ کمال ہے مت کہنا اور اس کی وجہ مت پوچھنا۔ جس نے بھی تمہیں بھیجا ہے، یہ ضرور سمجھا دیا ہو گا کہ اچھا کام ہو گا تو معاوضہ بھی اچھا ہو گا۔"

"معاوضے کی تو بات نہیں ہوئی تھی" وہ دبے دبے لفظوں میں بولا۔

"خیر۔ معاوضہ تمہاری مرضی کا ہو گا بلکہ دُگنا۔"

"دُگنا کیوں۔" وہ ہر بات پر حیران ہونے والا شخص تھا۔

"ایک معاوضہ کام کا ہو گا۔ دوسرا رازداری کا۔ فلمی دنیا میں تمہاری ماہانہ آمدنی کا اوسط کیا ہے؟"

اس نے دونوں ہاتھ ملتے ہوئے کچھ دیر سوچا "اوسط... کوئی خاص نہیں ہے ابھی... جو استاد نے دے دیا کافی ہے۔"

"یہ کافی کتنا ہوتا ہے۔ آخر اس آمدنی سے تمہارے گھر کا خرچ چلتا ہو گا۔ گزارا ہو جاتا ہے۔"

"ہاں۔ گزارا تو سب کا ہو جاتا ہے۔ دو ڈھائی ہزار ملنے لگے ہیں مجھے بھی" اس نے کہا "پہلے کم تھے۔"

"میں پانچ ہزار ماہانہ پیش کروں گا۔"

"ماہانہ! کمال ہے" اس کا منہ حیرت سے کُھل گیا۔

"ماہانہ اس لیے کہ کام روز کا ہے۔ تم چاہو تو یہاں آجاؤ ورنہ میں بھی آسکتا ہوں تمہارے گھر۔ یا اسٹوڈیو میں۔ میرا خیال ہے مسٹر زیڈ کہ تم ابھی زیرِ تربیت ہو یعنی اپرنٹس ہو۔ کام سیکھ رہے ہو۔"

"میں کام سیکھ چکا ہوں۔ اب تو اکمل میرا شاگرد ہے۔" اس نے بُرا مان کے کہا۔

"اکمل کون؟" میرے منہ سے نکل گیا۔

"آپ اکمل کو نہیں جانتے۔ کمال ہے" میری فلمی جہالت اس کے نزدیک افسوس ناک تھی۔ "یہ جو اپنے ہیرو ہیں اجمل صاحب، ان کا چھوٹا بھائی ہے اکمل مگر میں نے سنا ہے کہ اُسے بھی چانس مل گیا ہے۔ میک اپ مین بننا بہت مشکل ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "معلوم نہیں تمہارے استاد چارلی کیا کرتے ہیں اور تم کتنے پانی میں ہو۔ کام دیکھ کے اندازہ ہو گا۔ مجھے ایک نمبر کام چاہیے۔"

"مسٹر اے۔ مجھے آپ گدھا اُلو پاجی کچھ بھی کہہ سکتے ہیں مگر استاد چارلی کو نااہل نہیں کہہ سکتے" وہ ایک دم بگڑ گیا "یہ ندیم، وحید مراد اور محمد علی۔ ان سب کے چہرے وہی بناتے ہیں ورنہ..."

"سوری مسٹر زیڈ۔ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ مجھے غرض ہے تمہارے کام سے۔ پرفیکشن ہو تو ہزار دو ہزار زیادہ بھی اہمیت نہیں رکھتے۔"

"استاد کے ہوتے خود کو استاد کہنا اچھا نہیں لگتا ورنہ زیڈ کسی سے کم نہیں۔" وہ جوش میں آگیا۔ "چھ ہزار ماہانہ میں صبح شام آدمی کو گدھا اور گدھے کو آدمی بنا کے نہ دکھا دوں تو کہنا۔"

جب رابعہ چلی گئی تو میں نے دروازے کو اندر سے بند کر لیا اور زیڈ سے اپنا مسئلہ بیان کیا۔

"میں غلط کام کرتا نہیں مگر کیا کروں۔ مقروض ہوں غالب صاحب کا۔"

"یہ کوئی غلط کام نہیں ہے۔" میں نے اسے یقین دلایا۔

"کمال ہے۔ کیا صبح و شام چہرہ بدلنا دھوکے بازی نہیں ہے۔ آخر کیا مقصد ہے اس کا۔ خود کو چھپانا؟"

"بالکل ٹھیک۔ میرے لیے خود کو اپنی جان کے دشمنوں سے چھپانا بہت ضروری ہے۔ جان بچانا کوئی غلط کام کیسے ہو گیا؟"

زیڈ قائل نہیں ہوا "اس کے لیے ایک بار حُلیہ بدلنا کافی تھا۔ یہ صبح و شام کا چکر میری سمجھ میں نہیں آیا۔"

"تم اپنی سمجھ کو ناحق تکلیف مت دو۔ چھ سات ہزار کم نہیں ہوتے، کوئی اور آجائے گا" میں نے برہمی سے کہا "جرح اور سوال جواب کئے بغیر کام کرنا ہے تو کرو ورنہ جاؤ۔ غالب کا قرض میں نے معاف کیا۔"

"کمال ہے... قرض تو رہتا ہے۔ خود غالب صاحب کے یہ کہنے سے فرق نہیں پڑتا کہ انہوں نے ایک انسانی فرض پورا کیا تھا لیکن مجھے معلوم ہے کہ وہ مدد نہ کرتے تو کسی اور کے جرم میں مجھے ضرور پھانسی کے تختے تک پہنچا دیا جاتا۔ انہوں نے سب کا بھانڈا پھوڑ دیا اور اصل قاتلوں کے چہرے بے نقاب ہو گئے تو میری جان بچ گئی تھی... خیر آپ بتائیں، مجھے کیا کرنا ہو گا؟"

"ایک بات بہت اچھی طرح سمجھ لو۔ یہ کام غلط نہیں ہے۔ اس کا اندازہ بھی تمہیں بہت جلد ہو جائے گا مگر بعد میں کبھی تمہاری زبان سے اس بارے میں کوئی بات کسی نے بھی سُنی تو ہم بھی سُن لیں گے۔ اخبار والوں کے کان بھی ہزار ہوتے ہیں اور آنکھیں بھی۔"

"آپ بھی اخبار والے ہو؟"

"اور کیا میں تمہیں جیل سے بھاگا ہوا لگتا ہوں؟" میں نے اس کی لاعلمی سے فائدہ اُٹھایا "تمہاری تسلی کے لیے بتا دیتا ہوں کہ یہ بھی تقریباً ویسا ہی معاملہ ہے۔ جیسا تمہارا تھا۔ ایک لیڈی ڈاکٹر لندن سے آئی تھی۔ کچھ لوگوں نے جو بڑے نامی گرامی قاتل اور بدمعاش ہیں اسے اوپر بہت بلندی سے نیچے دھکیل دیا اور قتل کو خودکشی بنا دیا۔"

"لیڈی ڈاکٹر کا جرم کیا تھا؟"

"کچھ نہیں۔ اصل مجرموں نے ایک بہت بڑے آدمی کو زہر دے کر ہلاک کرایا تھا۔ وہ آدمی اسپتال میں داخل تھا۔ جب یہ لیڈی ڈاکٹر اس سے ملنے گئی تو زہر دینے والوں نے الزام لیڈی ڈاکٹر پر عائد کردیا اور یہ کہا کہ اس نے خود کو گرفتاری سے بچانے کے لیے دوڑ کے اوپر سے چھلانگ لگادی تھی۔ حالانکہ اسے اٹھا کے پھینکا گیا تھا۔ اس طرح انہوں نے ایک نہیں دو قتل کئے تھے۔ میں ان کے پیچھے لگا ہوا ہوں مگر کچھ معاملات ایسے ہیں کہ میں بھیس بدلے بغیر یہ کام کروں گا تو ڈاکٹر شیلی کی طرح مارا جاؤں گا۔" روانی میں نام میری زبان پر آگیا۔

"ڈاکٹر شیلی! انگریز ہوگی؟"

میں نے فوراً اپنی غلطی کی تلافی کی "ہاں۔ ظاہر ہے ایسے نام ہماری لڑکیوں کے نہیں ہوتے۔ تفتیش کے لیے میرا دن میں صورت بدل کے پھرنا ضروری ہے۔ رات کو بھی مجھے چھپ کے رہنا ہوگا۔ اصل چہرہ کسی نے غلطی سے بھی دیکھ لیا تو میرے پیچھے لگ جائے گا۔ آئی بات سمجھ میں۔"

اس نے سرہلایا "دن میں کیا حلیہ ہوگا؟"

"ایک غیر ملکی وکیل کا۔ میں ظاہر کروں گا کہ لندن سے آیا ہوں اور ڈاکٹر شیلی کے لواحقین نے مجھے اس کیس میں وکیل نامزد کرکے بھیجا ہے۔ میرے کاغذات تیار ہیں۔ میں پولیس کو بھی تفتیش کا رُخ نہیں بدلنے دوں گا اور خود بھی حقائق کی کھوج میں رہوں گا۔ قاتل اتنے طاقتور نہیں ہیں کہ کسی برطانوی وکیل پر ہاتھ ڈال سکیں۔ ایک برطانوی ڈاکٹر کو مارنے کے الزام میں ان کے خلاف پہلے ہی تحقیقات ہو رہی ہیں اور برطانوی کونسلیٹ نے بہت اعلیٰ سطح پر حکومت پر دباؤ ڈالا ہے۔ میری حفاظت خود حکومت کرے گی۔"

"اچھا کیا آپ نے سب بتادیا۔ اب میں بھی آپ کے ساتھ ہوں۔ اگر اصلی قاتلوں کو پھانسی ہوگی تو مجھے بھی خوشی ہوگی کہ میں نے اس کام میں ہاتھ بٹایا تھا۔"

"اب مسئلہ یہ ہے... زیڈ کہ ہر صبح مجھے ایک برطانوی وکیل کا حلیہ اختیار کرنا ہے۔ شام کو یہ چہرہ بدل کے پھرنا ہے۔ اصل چہرہ بہرحال کسی کو نظر نہیں آئے گا۔ مشکل کام صبح کا ہے۔ رات کو معمولی سی تبدیلی سے کام چل جائے گا۔ کیا اس کے لیے مجھے روز میک اپ اُتارنا پڑے گا۔"

"اور کیا ہوسکتا ہے؟"

"کوئی ترکیب نکالو۔ کوئی ماسک ہو' نقاب قسم کی چیز۔"

"کمال ہے" اس نے نفی میں سرہلایا "کوئی ماسک اتنا حقیقی نہیں ہوتا کہ اصلی چہرہ نظر آنے لگے اور دن کے اجالے میں کسی کو شک نہ ہو۔ اسٹیج پر تو چل جاتا ہے کیونکہ دیکھنے والے دور سے دیکھتے ہیں اور پھر روشنی کتنی بھی ہو سورج کے اجالے کی طرح نہیں ہوسکتی۔ ہاں ایک حل ہے اس مشکل کا۔"

"وہ کیا؟"

"کچھ دن میں خود میک اپ کروں گا۔ ساتھ ساتھ آپ کو بتاؤں گا کہ میں کیا کررہا ہوں۔ آپ آئینے میں دیکھتے رہیں۔ چند دن میں آپ خود سیکھ لیں گے اور اپنا میک اپ خود کرلیں گے۔ زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے میں۔ جو چیزیں رنگ روپ اور حُلیہ بدلنے میں کام آتی ہیں وہ خود میں فراہم کردوں گا۔ میں اور آپ آنے جانے کے چکر سے بچ جائیں گے۔"

"ویری گڈ۔ کیا یہ میک اپ دیرپا ہوگا؟ میرا مطلب ہے دن میں پانی سے یا دھوپ سے خراب تو نہیں ہوگا؟ اور کتنے دن چلے گا؟"

"تین دن تو چلے گا۔"

"اس کے بعد؟"

"سوکھ کے خراب ہوگا تو جھریوں جیسی لائنیں پڑجائیں گی پھر خشک مٹی کی طرح بھربھرا ہوکے جھڑنے لگے گا۔ تین دن میں آپ منہ دھوئیں' نہائیں' شیو مت کریں۔ دھوپ کا اثر ہوگا اگر آپ مسلسل دو دن دھوپ میں ہی پھرتے رہے۔ میک اپ اُتارنے کا طریقہ بھی میں آپ کو بتادوں گا۔ اس میں مخصوص چیزیں استعمال ہوتی ہیں۔"

"سب کیمیکل ہوں گے' میری جلد کا کیا بنے گا؟"

"جلد پر اثر ضرور پڑے گا۔ فلم والے تو کام ختم کرکے میک اپ اُتار دیتے ہیں اور جلد کو ٹھیک رکھنے والے لوشن کریم استعمال کرتے ہیں۔ غیر ملکی اور بہت اچھے قسم کے اسکن ٹانک اور کنڈیشنر۔"

"رات کو میں بھی کرلوں گا۔" میں نے کہا "تم لکھ دینا سب کے نام۔"

"مگر رات کو میک اپ دوسرا ہوگا۔"

"رات کو میک اپ کے بغیر چہرہ کچھ بدل جائے تو کام چل جائے گا۔" میں نے سوچ کے کہا "جب میں میک اپ کا ماہر ہوجاؤں گا تو فلموں میں کوشش کروں گا۔ اچانک مجھے شوق ہوگیا ہے کہ نیلو' زیبا اور رویا کا میک اپ کروں۔ بڑا مزہ آتا ہوگا۔"

وہ ہنسنے لگا "ان کے اپنے میک اپ مین ہوتے ہیں۔ کسی ایرے غیرے کو وہ ہاتھ کہاں لگانے دیتی ہیں۔ ماہر بننے میں تو کئی سال لگ جاتے ہیں مسٹر اے۔"

میں نے مایوسی سے کہا "اچھا' لیکن مسٹر زیڈ۔ جب میں یہ کام خود کرنے لگا تو پھر تم کیا کروگے' تمہاری ضرورت کہاں رہے گی۔"

"کمال ہے" اس کا چہرہ اُتر گیا۔ "میں نے تو آپ کی مشکل آسان کی تھی۔"

میں نے ہنس کے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا "میں مذاق کررہا تھا یار' پانچ ہزار ماہانہ تمہیں ملتے رہیں گے۔ کیا پتا درمیان میں بھی

پھر تمہارے ماہرانہ مشورے کی ضرورت پڑجائے۔ رازداری کی شرط سب سے اہم ہے۔"

"اور یہ کام کب تک چلے گا۔"

"ابھی ہم تین مہینے کا معاہدہ کرتے ہیں۔ کام اس سے پہلے ختم ہوگیا تب بھی رقم تمہیں ملتی رہے گی۔ اس کے بعد ہم دیکھیں گے کہ تم کس حد تک کار آمد ہو۔ یہ ہوسکتا ہے کہ ہم ہزار دو ہزار ماہانہ ایسے ہی دیتے رہیں۔ تمہیں اپنا مشیر رکھ لیں۔ جب ضرورت ہو پھر بُلالیں۔ اچھا اور بھروسے کا آدمی ہو تو ہم قدر کرتے ہیں مسٹر زیڈ۔"

"مجھے منظور ہے" اس نے خوش ہوکے ہاتھ ملایا۔ "آج تو میں کچھ بھی نہیں لایا تھا۔ کل آپ میرا کمال دیکھنا۔"

"آج مجھے بھی فرصت نہیں۔ ویسے بھی آدھا دن گزر گیا ہے۔ کل صبح میں خود تمہارے پاس آؤں گا۔ بتاؤ' میں کہاں آؤں؟"

اس نے مجھے ایک فلم اسٹوڈیو کا پتا بتادیا جہاں اسے رات بھر شوٹنگ میں حصہ لینا تھا "میں اسٹوڈیو کے گیٹ پر ملوں گا ورنہ آپ کو اندر کوئی نہیں جانے دے گا۔"

جانے سے پہلے اس نے مجھے کچھ ٹپ دیے کہ چہرے اور حُلیے کو ناقابلِ شناخت بنانے کے لیے میں خود کیا کرسکتا ہوں۔ مگر وہ عام سی باتیں تھیں جو میں بھی سمجھتا تھا۔ زیڈ خود کو فنکار کہتا تھا۔ جس ملک میں بڑے فنکار بھی خوش حال نہ ہوں وہاں زیڈ جیسے چھوٹے فنکار کی تنگ دستی سمجھ میں آتی تھی۔ انا نے پہلے اسے تذبذب میں مبتلا رکھا مگر بالآخر اس نے ہمت کرکے کچھ ایڈوانس مانگ لیا۔

"بیعانے کے بغیر تو معاہدہ پکا نہیں ہوتا" اس نے کہا۔

میں نے اس کی ضرورت کو سمجھ لیا "بالکل ٹھیک کہا تم نے۔ یہ تو اصولی بات ہے۔"

وہ نصف رقم لے کر خوش بلکہ ممنون نظر آنے لگا۔ میری فرمائش پر اس نے انارکلی بازار سے کچھ حُلیہ بدلنے کا سامان بھی لاکر دیا اور رخصت ہوگیا۔ میں نے دروازے کو اندر سے لاک کرکے چائے بنائی اور ایک ڈبا بسکٹ کھا کے لنچ کی ضرورت سے بے نیاز ہوگیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ دو بجے کے بعد وقار یوسف آجائے گا پھر شاید رابعہ واپس آئے گی اور آخر میں شام کو منظر پہنچے گا۔ اس درمیان میں غالب یا نازو کا آجانا بھی بعید امکان نہ تھا۔

میں نے اپنے کپڑے تبدیل کئے اور چوکیدار کی یونیفارم پہن لی۔ ٹالکم پاؤڈر اور کاجل کے ایک مرکب کی ڈبیا مجھے زیڈ فراہم کرگیا تھا۔ اس کو اپنے ہاتھوں اور چہرے پر ملنے سے میری جلد کا سفیدی مائل گندمی رنگ خاصا سانولا ہوگیا۔ زیڈ کی ہدایات کے مطابق میں نے ٹشو پیپر سے رنگ کو پھیلایا اور اس میں قدرتی یکسانیت پیدا کی۔ وہ انارکلی کے کسی ہیئر ڈریسر سے بالوں کی وگ اور ایک پُرانی عینک بھی لایا تھا۔ سادہ گول شیشوں والی عینک میرے چہرے کے سائز کی مناسبت سے بہت چھوٹی تھی۔ فریم پُرانا ہوکے ڈھیلا ہوگیا تھا۔ اسے ناک پر جما کے میں نے سر پر بیری کیپ (BARET CAP) رکھی اور آئینہ دیکھا تو تبدیلی کے مجموعی تاثر کو دیکھ کے ہنس پڑا۔ میں نے بیڈ کے نیچے سے مشین گن نکالی اور کندھے پر لٹکالی۔ اس کا میگزین آڑی پٹی کی شکل میں سینے پر آگیا تو میں سو فیصد سیکیورٹی گارڈ نظر آنے لگا۔

پہلا شاک وقار یوسف کو ہوا۔ سوا دو بجے اس نے چابی لگا کے باہر سے دروازہ کھولنا چاہا۔ میں نے سوراخ سے جھانک کے دیکھا تو وہ کچھ حیران نظر آرہا تھا کہ آج اس سے بھی پہلے کوئی آفس پہنچ گیا۔ پھر اس نے دستک دی اور میں نے دروازہ کھولا تو میرا ہاتھ پیشہ ورانہ مستعدی کے ساتھ مشین گن سنبھال چکا تھا۔

وقار بوکھلا کے رک گیا "تم... کون ہو تم؟"

میں نے آواز بدل کے کہا "پہلے تم بتاؤ اپنا نام... کیا کام ہے؟"

"میں کام کرتا ہوں یہاں۔ یہ میرا آفس ہے۔"

"کیا ثبوت ہے؟" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا "بی بی صاحب نے بولا ہے کہ اندر کسی کو مت آنے دو۔ پہلے پوچھو کون ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ میں مالک ہوں اس کمپنی کا۔ اور تم کس بی بی کی بات کررہے ہو؟ رابعہ قاری ایڈووکیٹ میری پارٹنر ہیں۔"

"نام بولو اپنا۔"

"وقار یوسف۔ بی بی صاحب نے بتایا نہیں تمہیں؟"

"بتایا تھا۔" میں نے گن کو نیچے کرلیا "ایک وقار یوسف صاحب آئے گا۔ ایک منظر صاحب آئے گا۔ معاف کرنا آپ نام دیر سے بتایا۔"

وقار کرسی پر بیٹھ کے مجھے گھورنے لگا "تمہیں چوکیدار رکھا گیا ہے؟ کیا ثبوت ہے تمہارے پاس؟"

میں نے اسے مشین گن دکھائی "یہ ثبوت ہے۔ ہم ڈاکو ہوتا تو یہ وردی پہن کے ادھر بیٹھا نہ رہتا۔"

اس نے مزید جرح کی۔ بی بی صاحب سے میری ملاقات کہاں ہوئی تھی۔ وہ خود کہاں ہیں۔ مجھے کیوں رکھا گیا ہے؟ کتنی تنخواہ پر۔ ڈیوٹی کب سے کب تک ہوگی؟ آخر میں اس کو خیال آیا کہ اس نے میرا نام تو پوچھا ہی نہیں۔

"شیر خان ولد شمشیر خان تحصیل چارسدہ ضلع مردان۔"

اچانک وقار یوسف نے پشتو بولنی شروع کردی۔ میرے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ وہ اتنی روانی سے پشتو بول لیتا ہے۔ کبھی اسے کسی سے بھی پشتو میں بات کرتے نہیں دیکھا تھا اور نہ اس کی نوبت آئی تھی۔ اب معلوم نہیں وہ کیا پوچھ رہا تھا اور میرا یہ حال تھا کہ ترکی تمام شد۔

"صاحب۔ ہم پشتو نہیں جانتا۔"

"مردان کے پٹھان ہو اور پشتو نہیں جانتے؟ تم ضرور کوئی جعلساز ہو۔ شرافت سے بتادو کہ کیا چاہتے ہو ورنہ میں پولیس کو

فون کرتا ہوں۔ یہاں کوئی بدمعاشی نہیں چلے گی۔ یہ وکیلوں کا دفتر ہے۔"

اسی وقت رابعہ آگئی لیکن وہ میرا بدلا ہوا حلیہ دیکھ کے بدحواس نہیں ہوئی۔ وقار یوسف نے اسے مسکراتے دیکھا تو چکرا گیا۔ پھر میں ہنسنے لگا اور وقار یوسف کو اپنے بے وقوف بننے پر ہنسی آئی۔

"کمال کردیا ہے آپ نے تو۔ بڑے اچھے ایکٹر بھی ہیں آپ" اس نے خفت سے کہا "مگر یہ اچانک آپ دونوں کہاں سے ٹپک پڑے۔"

رابعہ نے کہا "بس آگئے جھک مار کے۔ میں اپنا سامان تمہارے گھر چھوڑ کے آئی ہوں۔ آج سے میں بھی ہر روز آفس میں بیٹھوں گی۔"

"واقعی!" وقار یوسف نے خوش ہو کے کہا "کتنے دن؟"

"کتنے دن کیا۔ مستقل بیٹھوں گی۔ جیسے تم بیٹھتے ہو۔"

"مجھے یقین نہیں آتا۔ ضرور اس میں بھی کوئی اسرار ہے۔"

ریٹائرنگ روم میں بیٹھ کے ہم نے اسے مختصراً اپنا پروگرام بتادیا "سمجھ لو سکندر بخت غائب ہوگیا۔ کسی کو نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے؟"

رابعہ نے کہا "یہی بات میں تمہاری بیوی کو سمجھا کے آئی ہوں کہ حضرت رات کو اچھے بھلے سوئے تھے۔ صبح غائب۔ بس ایک پرچا چھوڑ گئے تھے کہ تم گھر جاؤ۔"

وقار یوسف تابعدار قسم کا' سب کی خوشی میں خوش رہنے والا انسان تھا۔ رابعہ کو وہ باس بھی سمجھتا تھا' استاد بھی اور باجی بھی لیکن میری بھی اتنی ہی عزت کرتا تھا اور اختلاف کرنا جانتا ہی نہیں تھا۔ اس کا خلوص اور اس کی خدمت گزاری سب کے لیے بالکل بے غرض تھی۔ اس نے مجھ سے یہ شکایت بھی نہیں کی کہ میں نے اس کی گاڑی کا کباڑا کردیا تھا۔

رابعہ نے مجھے ڈاکٹر شیلی کے قتل کی فائل دے دی اور میں نے اندر والے کمرے میں لیٹ کے اس درخواست کا مطالعہ کیا جو رابعہ کے ساتھ دوسرے سینئر وکیلوں نے صدر' چیف جسٹس آف پاکستان' آئی جی وغیرہ کے علاوہ برطانوی کونسلیٹ کو ارسال کی تھی اور یہ خبر اخبارات میں شائع ہوئی تو سرکاری مشینری حرکت میں آنے پر مجبور ہوئی اور دلاور کے خلاف ایف آئی آر درج ہوگئی تھی۔ اصل درخواست کے حقائق اتنے ناقابلِ تردید تھے کہ اس معاملے کو دبانا ممکن ہی نہیں رہا تھا اور اعلیٰ سطح پر تفتیش کے احکامات موصول ہوجانے کے بعد مقامی پولیس بھی بے اختیار اور بے بس ہوگئی تھی۔ ایف آئی آر بھی چیف جسٹس کے حکم پر درج کی گئی تھی اور مدعی صرف وکلا ہی نہیں تھے۔ خود برٹش کونسلیٹ نے وزارتِ داخلہ کے توسط سے ایک فریق بننے کی درخواست کی تھی۔ ہوم سیکریٹری نے آئی جی سے تین اعلیٰ افسران کے نام مانگے تھے جو اب کیس کی تفتیش کرکے رپورٹ عدالت عالیہ کو پیش کرنے کے ذمّے دار تھے۔ اسلام آباد سے ایس پی ظفر حیات کو نامزد کردیا گیا تھا۔ اس کے معاون سی آئی اے کا ایک ڈی ایس پی شاہد علی اور ایس ایچ او انسپکٹر خدا بخش تھے۔ ایف آئی آر کو پڑھنا تو ناممکن تھا لیکن میں نے دوسری سب دستاویزات کا مطالعہ کیا جن کی نقول رابعہ کو بھی ارسال کی گئی تھیں۔ ان میں برطانوی کونسلیٹ کا وہ خط بھی شامل تھا جس میں حصولِ انصاف کی خاطر تمام وکیلوں کی کوشش کو سراہا گیا تھا اور یہ یقین دہانی کرائی گئی تھی کہ ڈاکٹر شیلی کے قتل کے سلسلے میں ان سے ہر ممکنہ تعاون کیا جائے گا۔

فائل پڑھنے کے بعد میرا حوصلہ دوچند ہوگیا اور میں فائل کو سرہانے رکھ کے اپنے تصور میں گم ہوگیا۔ میں نے دلاور کو ہتھکڑی سمیت حوالات سے باہر نکلتا دیکھا' عدالت میں اسے مجرموں کے کٹہرے میں دیکھا۔ اسے جیل کے لباس میں کال کوٹھری کے اندر دیکھا' اخبار میں اس کو پھانسی دیے جانے کی خبر دیکھی اور اس کی لاش دیکھی جو صبح صبح جیل کے دروازے پر اس کے ورثا کے حوالے کی گئی تھی۔ دلاور کی گردن ایک ہاتھ لمبی ہوگئی تھی اور چہرہ جانکنی کی اذیت سے مسخ ہوگیا تھا۔

یہ سب میری خواہشات کے عکس تھے۔ حقیقت کی منزل ابھی بہت دور تھی اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ تقدیر کے ترکش کے پہلے تیر کا نشانہ کون ہوگا؟ میں یا دلاور؟ جو میں اس کے لیے سوچ رہا تھا اس سے زیادہ بُرا وہ میرے لیے سوچتا تھا مگر کسی کے چاہنے سے کچھ ہوتا تو دنیا کب کی نیست و نابود ہو جاتی۔ ایسا کوئی نہ تھا جس کا دشمن نہ ہو اور وہ خود کسی کے وجود کو دنیا سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دینا نہ چاہتا ہو۔

باہر کے آفس میں اب مؤکل آنے لگے تھے۔ رابعہ اور وقار یوسف مصروف تھے۔ میں نے سوجانا بہتر سمجھا اور سوچتے سوچتے سوگیا۔ پھر اچانک جیسے بھونچال آگیا۔ مجھے یوں لگا جیسے کوئی میری ٹانگ پکڑے مجھے گھسیٹتا ہوا لے جارہا ہے۔ میں گھبرا کے اُٹھا اور بڑی مشکل سے اپنی ٹانگ چھڑانے میں کامیاب ہوا۔ مگر وہ تھا منظر جس نے مجھے ٹانگ کھینچ کے بیڈ سے نیچے گرانے کی پوری کوشش کی تھی۔ اس کشمکش کے نتیجے میں میری کوشش کسی حد تک کامیاب رہی۔ میں نیچے تو نہیں گرا لیکن میرا جوتا اُتر کے منظر کے ہاتھ میں چلا گیا۔

"یار' حد ہوگئی۔ وکیلوں کے آفس میں ایک وکیل ایسی لاقانونیت کا مظاہرہ کرے" میں نے خود کو سنبھالا۔

"یہ مظاہرہ تو ابھی ہوگا بھوتنی کے" منظر نے جوتے کو گنڈاسے کی طرح لہرایا "تیرا جوتا اور تیرا سر۔ ایک بال نہیں چھوڑوں گا۔"

میں نے کہا "یار' پہلے اپنے بال بچوں کی سنا۔ کتنے ہیں۔ بال زیادہ ہیں سر پر یا بچے۔ اور مشین وہی پرانی چل رہی ہے۔؟"

"مشین! ابے کون سی مشین؟" منظر کنفیوز ہوگیا۔

تھا اور شاہد علی کا ماتحت۔ ان دونوں کو دلاور نے اپنی کوشش سے تفتیشی ٹیم میں شامل کرایا ہے۔ اس نے اوپر مقامی ایس پی اور ڈی آئی جی تک رسائی حاصل کرلی تھی۔ رسائی کا مطلب عام فہم الفاظ میں یہی ہو سکتا تھا کہ اس نے قانون کے لمبے ہاتھوں کی راہ میں دولت کی دیوار اُٹھادی تھی اور خود اس کے پیچھے پناہ لے لی تھی۔

اوپر والے افسران کی شان یہی ہوتی ہے کہ وہ اپنے شاندار بنگلوں سے اپنی شاندار گاڑی میں اپنے شاندار آفس پہنچ کے صرف افسری کریں' احکامات صادر فرمائیں اور رپورٹیں طلب کریں۔ کسی بھی معاملے میں ذاتی دلچسپی لینا اور خود ہر جگہ پہنچ کے تصدیق یا تفتیش کرنا ان کے فرائض میں شامل نہیں ہوتا۔ چنانچہ جو کیس ماتحت بنادیں اس پر دستخط ثبت کرکے وہ بری الذمہ ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر شیلی کے کیس میں بھی اوپر والوں کو بتایا گیا ہوگا کہ اس معاملے میں سابق ایس ایچ او اور موجودہ ڈی ایس پی صاحب کے ساتھ نئے ایس ایچ او کی شمولیت یقیناً اسلام آباد سے آنے والے ایس پی صاحب کی عین خواہش ہوگی کیونکہ یہی دو افسران کیس کے بنیادی حقائق اور ضروری تفصیلات کا صحیح علم رکھتے ہیں۔ دیکھنا اب یہ تھا کہ اسلام آباد سے آنے والا کون ہے' کیسا ہے اور کیا کرتا ہے؟

رات کو میری ملاقات عمارت کے چوکیدار سے ہوئی۔ وہ بیرونی دروازے کی گرل کو کھینچ کر لاک کرچکا تھا اور اطمینان سے بستر بچھائے لیٹا ہوا تھا۔ ریڈیو اس کے سرہانے رکھا تھا اور نہ جانے کس اسٹیشن سے فرمائشی پروگرام کے فلمی نغمے نشر ہو رہے تھے۔ چوکیدار کا سر پنجابی گانے کے بولوں پر بے اختیار ہل رہا تھا۔

میرے قدموں کی آہٹ پر وہ چونک کر اُٹھ بیٹھا۔ میں زینے سے اُتر کے اس کے پاس پہنچا تو مجھے حیرت سے زیادہ اس کی آنکھوں میں خوف کے آثار نظر آئے۔ اس نے ریڈیو کی آواز کم کردی اور تکیے کے نیچے سے ریوالور نکال لیا۔

"کون ہو تم۔ دور ہی رک کے بتاؤ" اس نے سرائیکی میں کہا۔

میں نے مسکراتے ہوئے ہاتھ اُٹھائے "خو. را۔ ابھی گولی مولی مت چلاؤ۔ ہم چو. نہیں اے۔ چوکیدار ہے ماڑا تمہاری طرح۔"

"چوکیدار! چوکیدار تو میں ہوں۔"

میں نے کہا "ہم وکیل صیب کا آفس میں اے۔ اندر ام باہر تم۔"

اس نے ریوالور نیچے کرلیا "کیا نام ہے تمہارا۔ مجھے تو کسی نے نہیں بتایا کہ اندر کے لیے بھی چوکیدار رکھا گیا ہے۔"

"ہم شیر خان اے۔ خو یارا' اس میں ناراضگی کا کیا بات اے۔ تم بڑا چوکیدار ہے۔ پورا بلڈنگ کا۔ ام چوٹا چوکیدار اے۔ ایک آفس کا۔ تم امارا افسر اے۔"

یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی "اچھا۔ آؤ بیٹھو' میرا نام بہرام

"وہی یار۔ جس میں تو بچے بناتا ہے" میں نے کہا۔

"سالے۔ وہ بیوی ہے میری۔"

"خاک بیوی ہے۔ گھر میں جوتے کھاتا ہے اس سے اور باہر آکے لوگوں کی جوتیاں اٹھاتا ہے۔ سولہ بچوں کے اکلوتے ابا۔"

منظر نے جوتا میری طرف پھینکا۔ "تو باز نہیں آئے گا ڈرامے بازیوں سے۔ یہ کیا سوانگ بھرا ہے۔ ویسے ٹھیک ہو رہا ہے تیرے ساتھ جو بھی ہو رہا ہے۔ رابعہ نے چوکیدار کی وردی پہنادی۔ ابھی سے یہ اوقات ہے تیری۔ بعد میں کیا ہوگا تیرے گھر میں۔"

میں نے جوتا کیچ کرلیا "جو بھی ہوگا اچھا ہوگا۔ کوئی گھر کو چڑیا گھر تو نہیں کہے گا۔"

منظر بیٹھ گیا "دیکھ یار' تو مجھے سولہ بچوں کا طعنہ مت دیا کر۔ اس سے میری حوصلہ شکنی نہیں ہوسکتی بھوتنی کے۔ ابھی تو میں جوان ہوں۔ میں تو کہتا ہوں کچھ اور بھی رونق ہونی چاہیے۔ تم سب اپنے اپنے بچے بھیج دینا میرے پاس۔ اس ریوڑ میں شامل ہوکے پل جائیں گے۔ ورنہ تمہیں تو فرصت ملے گی نہیں ان کو پالنے کی۔"

میں نے کہا "کیا سب چلے گئے؟"

"رابعہ کو وقار یوسف اپنے ساتھ ہی لے گیا۔ میں بھی جارہا تھا۔ رابعہ نے کہا کہ چوکیدار کو جگادو۔ اندر سو رہا ہے۔"

میں نے ہنس کے کہا "تجھے معلوم نہیں تھا پھر تو نے کیسے پہچانا مجھے؟"

"وہ کیا ہے.... ولی را ولی می شناسد۔ ایسے ہی سمجھ لے کہ حرامی کو حرامی پہچانتا ہے۔ ویسے تو رابعہ نے بتادیا تھا سب کچھ لیکن یہ نہیں بتایا تھا کہ ڈراما شروع ہوچکا ہے۔ میں نے سوچا کہ آج تو مل ہی لوں۔ ابھی کسی کو پتا نہیں۔"

"ہاں یار۔ آج کے بعد یہاں آفس میں کوئی بات نہیں ہوگی۔ تم لوگ ۔وَ ے تو میں آجاؤں گا۔"

"آئیڈیا اچھا ہے لیکن احتیاط بہت ضروری ہے۔"

"غالب نے بھروسے کا آدمی بھیجا تھا۔ صبح و شام چہرہ بدلے گا۔"

"کسی نے پہچان لیا تو اُلٹا لینے کے دینے پڑجائیں گے بیٹا۔"

میں نے کہا "کیا تو پہچان سکتا تھا مجھے اس حلیے میں۔ اگر معلوم نہ ہوتا؟"

منظر نے نفی میں سر ہلایا "تیرا واسطہ پڑے گا پولیس کے انتہائی ہوشیار افسروں سے۔ اور چوہدری دلاور سے۔ اصل خطرہ تو ان سے ہوگا۔ انہیں کوئی شک نہ ہوا تو پھر کوئی خطرہ نہیں۔"

منظر نے جانے سے پہلے مجھے بتایا کہ انسپکٹر خدا بخش اور ڈی ایس پی شاہد علی تفتیش موڑنے کی پوری کوشش کریں گے۔ ڈی ایس پی شاہد عرصہ پہلے انسپکٹر تھا اور اسی تھانے میں ایس ایچ او بھی جہاں اب خدا بخش آگیا ہے۔ خدا بخش پہلے سب انسپکٹر

میں نے ہنس کے کہا "پہلے بہرام ڈاکو تھا اب بہرام چوکیدار ہے۔"

"کون ڈاکو۔ بہرام خان کا نیازی قبیلے سے تعلق ہے۔"

مجھے یہ بات بھی اسے سمجھانا پڑی کہ پرانے وقتوں میں بہرام نام کا ایک مشہور ڈاکو تھا جس کے نام کی اتنی شہرت تھی کہ اس پر فلمیں بنی تھیں۔ اب یہ خدا جانے کہ لیلیٰ مجنوں کی داستان کی طرح اس بہرام ڈاکو کے قصوں میں کتنی حقیقت تھی اور کتنی رنگ آمیزی۔

کچھ دیر بعد ہم دوست بن چکے تھے۔ اس نے مجھے اپنے بارے میں بتایا کہ میانوالی کے کسی گاؤں کا رہنے والا ہے۔ اس کے والدین بیوی بچے' بہن بھائی وہیں تھے۔ تلاشِ معاش نے اسے بے گھر کردیا تھا اور اب وہ عید بقرعید کے علاوہ گھر جا ہی نہیں سکتا۔ مہینے دو مہینے بعد بیوی بچے خود اس سے ملنے آجاتے تھے لیکن وہ انہیں مستقل یہاں نہیں رکھ سکتا۔ اس تنخواہ میں یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ کرائے کا مکان لے کر ایک گھر بسائے۔ اس کی بیوی تو یہی چاہتی تھی مگر وہ مجبور تھا۔ ابھی وہ اپنی آمدنی میں سے ایک چوتھائی اپنے گزارے کے لیے رکھتا تھا اور باقی گھر بھیج دیتا تھا جہاں سب کا مل جل کے گزارا ہوجاتا تھا۔ یہاں گھر گرہستی رکھتا تو ماں باپ اور بہن بھائیوں کو کیا دیتا۔ وہ بڑا بیٹا تھا اور اس پر سب کی ذمے داری تھی۔

میں نے محسوس کیا کہ اپنوں سے جدائی کی مجبوری کے احساس کو یہاں تنہائی کے عذاب نے دُگنا کردیا تھا اور اسے کوئی ہمدرد مہرباں اور ہمراز نہ ملا تھا جس سے باتیں کرکے وہ اپنے بارِ غم کو ہلکا کرسکتا۔ جب وہ باتیں کرنے لگا تو پھر مسلسل بولتا رہا اور میں نے بھی اسے دل کا غبار نکالنے کا پورا موقع فراہم کیا۔ درمیان میں اس نے ایک بار میرے لیے اپنے کیبن میں چائے بھی بنائی۔

میں نے کہا "یارا' تمارا بی بی لوگ آتا اے تو کدھر رہتا اے؟"

اس نے کہا "یار شیر خان۔ اب تم سے کیا پردہ۔ رات کو انہیں چوری چھپے یہاں رکھتا ہوں۔ صبح رخصت کردیتا ہوں کہ جاؤ لاہور کی سیر کرو۔ وہ چڑیا گھر' شالامار یا جہانگیر کے مقبرے کی سیر نہیں کرتے۔ وہاں بینچ پر یا گھاس کے تختوں پر بیٹھ کے اور سو کے وقت گزارتے ہیں۔"

میں نے افسوس سے کہا "اب فکر مت کرو بہرام خان۔ ابھی تمارا بی بی لوگ آئے گا تو ام ادھر ڈیوٹی دے گا۔ تم امارا آفس میں آرام کرو۔ ادھر سونے کا واسطے کمرا بھی اے۔ غسل خانہ اے... بوہت جگہ ہے۔"

وہ بے حد جذباتی ہوگیا "اچھا۔ یہ تو بڑی مہربانی ہے تمہاری ورنہ وہ یہاں پڑے رہتے تھے۔ ہم میاں بیوی اندر برآمدے میں چلے جاتے تھے۔"

"چھٹی کی فکر بھی مت کرو۔" میں نے اسے ایک اور فراخ

"اب کہاں گیا ہے وہ۔ فضول باتوں کے لیے وقت نہیں ہے میرے پاس۔ آئندہ مجھ سے فون نمبر مت پوچھنا۔ یہ اوپر کی دنیا ہے۔ نیچے والے ہم سے رابطہ نہیں کرسکتے۔ یہاں تک کوئی ٹیلی فون لائن نہیں آتی۔ سمجھے؟"

"ہاں جی... نہیں... میرا مطلب تھا بالکل سمجھ گیا" اس نے میری بات کا غلط مطلب نکالتے ہوئے ڈر کے کہا۔

مجھے چند منٹ انتظار کرنا پڑا۔ پھر دلاور اپنے گھر یا کسی ٹھکانے پر پہنچ گیا اور لائن مل گئی "سکندر۔ یار تم پریشان کررہے ہو مجھے۔"

"یارا! میں لعنت بھیجتا ہوں تمہاری یاری پر۔ اور پریشانی تو ابھی تم نے دیکھی بھی نہیں ہے بیٹا" میں نے کہا "تمہیں تو دن میں تارے نظر آئیں گے اب۔"

"یہ ٹھیک ہے کہ میری ایک معمولی سی غلطی نے کھیل تھوڑا سا بگاڑ دیا ہے مگر میں بازی نہیں ہارا ہوں سکندر" دلاور نے برہمی سے کہا "تم یہ سمجھنے لگے ہو کہ میرے ہاتھ میں کوئی پتا نہیں رہا تو یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ ہرپتا ہے میرے پاس۔"

"پھر چال چلنا کیوں بھول گئے ہو۔ سامنے میدان میں آکے مقابلہ کیوں نہیں کرتے؟" میں نے طنز سے کہا۔

"یہ تمہارا چیلنج ہے تو مجھے منظور ہے۔ تم بھی آجاؤ کھل کے سامنے۔ ابھی کس منہ سے تم میدان میں آنے کی بات کرتے ہو جبکہ خود تم ہی سب سے بڑے بھگوڑے ہو اپنے سکندر صاحب۔ ہمت تم میں نہیں ہے کسی کو منہ دکھانے کی۔ ہیں جی' سنا ہے اب تو تم دوستوں سے بھی ڈرتے ہو۔ دشمنوں کے خوف نے تو پہلے ہی زندگی حرام کردی تھی۔ اکیلے منہ چھپائے پھر رہے ہو' سب سے۔"

میں نے فلمی ولن کی طرح قہقہہ لگا کے اپنی خفت کو چھپایا "میرا چہرہ اتنا بُرا نہیں ہے چوہدری صاحب۔ تمہاری سی آئی ڈی نے میرے بارے میں ہمیشہ غلط خبریں فراہم کی ہیں۔ دوست آج بھی میرے ساتھ ہیں۔ دوست تو نہ چھوڑتے ہیں اور نہ چھوڑے جاسکتے ہیں۔ دوستی کا رشتہ تو زندگی کے ساتھ رہتا ہے اور آزمائش کے وقت ہی خلوص کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے مگر تم یہ باتیں نہیں سمجھو گے' کیونکہ تم ضرورت اور غرض کے رشتوں کو جانتے ہو۔"

دلاور نے کہا "پُرانی باتوں کو چھوڑو اپنے سکندر صاحب۔ اب بتاؤ' تم کیا چاہتے ہو؟ ہیں جی۔ ہماری بات پر غور تو کیا ہوگا تم نے؟"

"بہت غور فرمایا ہم نے اور اس نتیجے پر پہنچے بالآخر کہ ویسے تو معاملات بہت ہیں مگر ایک مسئلے پر سودا ہوسکتا ہے۔ تم پیڈرو کو میرے حوالے کردو اور میں تم کو ڈاکٹر شبلی کی قبر کا نشان بتادوں۔"

"یہ بھی ہوسکتا ہے" دلاور نے قدرے تذبذب کے ساتھ کہا "ابھی تو پیڈرو شہر سے باہر ہے۔ اس نے مجھے بتادیا تھا کہ وزیر خان مرحوم کی لاش اب کہاں دفن ہے۔ وہ جگہ میں تم کو دکھا سکتا ہوں۔"

"دلاور۔ میرے والد کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہم سب

رزقِ خاک ہیں اور خاک ہیں بھی ہو خاک ہے۔ ہمارا یہ عقیدہ کامل ہے کہ یومِ حشر ہر شخص اپنی فردِ عمل کے ساتھ اپنے مدفن سے اٹھے گا۔ اللہ وزیر خان کی مغفرت کرے۔ میری ہرگز یہ خواہش نہیں کہ میں اس کے مدفن پر کوئی مزار تعمیر کروں یا اسے پھر وہیں لاؤں جہاں اسے پہلی بار دفن کیا گیا تھا۔ ان کی روح کے لیے ایصالِ ثواب اور مغفرت کی دعا تو میں کہیں بھی رہ کے کرسکتا ہوں۔ اصل مقصد ہے اس قاتل کی گردن پکڑنا جس کو قانون پھانسی کا پھندا نہ ڈال سکا۔ میرے یقین کے مطابق وہ استاد پیڈرو تھا جس نے میرے شریف النفس اور بے گناہ باپ کو ہر طرح کی ذہنی و جسمانی اذیت دے کر مارا تھا۔ اگر قاتل کوئی اور تھا تو یہ بات بھی مجھے پیڈرو ہی بتا سکتا ہے۔ میں اس کے شہر واپس آنے کا انتظار کرسکتا ہوں۔ تمہیں تو معلوم ہوگا کہ وہ کہاں گیا تھا اور کس کام سے؟"

"اپنے سکندر صاحب۔ ہمارے درمیان۔ بہت سی غلط فہمیاں ہیں۔ ہم ایک بار مل کے بہت سے معاملات ختم کرسکتے ہیں' ہیں جی۔"

"اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ ملنے کے بہانے تم میرے خلاف کوئی نئی سازش نہیں کروگے۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں۔ قسم کھاسکتا ہوں۔"

"تمہارے وعدے اور تمہاری قسمیں..." میں نے تلخی سے کہا "چوہدری صاحب۔ سکندر بخت کو اُلّو کا پٹھا سمجھنا چھوڑ دو۔"

"مجھے ایک چانس دو۔ پلیز' آخری بار اعتبار کرکے دیکھو۔"

اس کا لجاجت آمیز رویّہ بھی مجھے قائل نہ کرسکا۔ "مجھے تو شک ہے کہ اتنی لمبی بات بھی تم صرف اس لیے کررہے ہو کہ تمہارے شکاری کتے پھر مجھ تک پہنچ جائیں۔"

"نہیں۔ پہلی بار وہ میری غلطی تھی۔"

"بہت خوب۔ آپ سے بھی غلطی ہوتی ہے اپنے چوہدری صاحب۔"

"یہ بتاؤ' صبح تم سے کہاں ملاقات ہوسکتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ تمہیں نہ میرے وعدے پر اعتبار ہے نہ میری قسم پر لیکن تم خود سمجھتے ہو میری پوزیشن کو۔ جیسا تم کہو گے ویسا ہی ہوگا۔ مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہے۔"

یہ شاید پہلا موقع تھا جب میرے کان دلاور کے منہ سے اس قسم کے الفاظ سُن رہے تھے۔ گردشِ حالات اسے مجبوری کے اس موڑ پر لے آئی تھی کہ اسے پناہ کے سب راستے بند نظر آرہے تھے اور وہ سمجھ رہا تھا کہ اس وقت میرے سوا کوئی بھی اس کی مدد کرنے والا نہیں ہے۔ مجھ سے بھی اسے کیا توقع ہوسکتی تھی مگر وہ چالاک آدمی پوری کوشش کررہا تھا کہ مجھے اس پر اعتبار آجائے اور میں اس سے باہمی مفاد میں سودے بازی پر راضی ہوجاؤں۔ میں دلاور کی رگ رگ کو پہچانتا تھا۔ خود کو اپنی دولت اور غنڈہ فورس کی طاقت کے بل پر ناقابلِ شکست سمجھنے والا قانون کو اپنی قوتِ خرید کا

دلانہ پیش کش کی "ام ادھر ڈیوٹی دے گا۔ دو چار دن کا کوئی بات نئیں اے۔ کسی کو مالوم نئیں ہوگا۔ رات کو ایک آدمی کافی ہے۔ دل کرتا اے تو سیر کرو جاکے۔"

ظاہر ہے اس کے بعد خود میرے لیے رات کو کسی بھی وقت کہیں آنے جانے کا مسئلہ پیدا ہونے سے پہلے ہی ختم ہوگیا۔ بہرام کے ساتھ باہمی تعاون اور پیشہ ورانہ رفاقت کا یہ سلسلہ بہت عرصے کامیابی سے چلتا رہا۔ بہرام جلد ہی سوجانے کا عادی تھا مگر اس رات وہ بارہ بجے تک مجھ سے باتوں میں مصروف رہا۔ ظاہر ہے میں نے اسے اپنے بارے میں جو تھوڑا بہت بتایا وہ غلط تھا اور میرے اپنے ذہن کی اختراع تھا مگر اس نے یقین کیا۔

رات بارہ بجے میں نے نیند کے بہانے گلوخلاصی حاصل کی ورنہ شاید وہ برسوں کے اکیلے پن کی کسر رات بھر جاگ کے اور مجھے جگا کے پوری کرتا۔ جب مجھے یقین آگیا کہ بہرام بھی سوچکا ہے تو میں نے دلاور سے رابطے کا مواصلاتی نظام برآمد کیا۔ سیکنڈ فلور کے سب دفاتر بند تھے لیکن چھت پر جانے کا راستہ کھلا ہوا تھا۔ نصف شب کے سکوت میں ڈوبی ہوئی رات کا نظارہ ایک ایسا جذباتی تجربہ تھا جو اس شہر میں گزارے ہوئے خوب صورت وقت کی ان گنت تصویروں سے سجا ہوا نگار خانہ لگتا تھا۔ تاحدِ نظر پھیلی ہوئی روشنیاں تاریک آسمان کے ستاروں سے سرگوشیاں کررہی تھیں اور گھروں کے چراغ رفتہ رفتہ گُل ہوتے جارہے تھے۔ نیند کا مہرباں سایہ دن بھر کے تھکے ہاروں کو راحت و سکون کا پیغام دے رہا تھا اور محبتوں کے سمندروں کے شناور بھی بالآخر تھک کے آسودگی کے ساحل پر محوِ خواب ہونے لگے تھے۔

میں نے چھت پر بنے ہوئے اسٹور میں ایک پلگ تلاش کرلیا۔ اڈاپٹر لگا کے میں نے ریسیور کو چیک کیا۔ اس کی سُرخ روشنی سے ظاہر ہوتا تھا کہ ٹرانسیٹر کے عام کل پُرزے اپنی اپنی کارکردگی کے مطابق رابطے کے فرائض سرانجام دینے کے لیے تیار ہیں۔ اتنی بلندی پر ایریل کو مزید اونچا کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے تار کو ایک کھلی جگہ پر ریڈیو ایریل سے منسلک کردیا۔

بٹن دبانے کے بعد کچھ دیر سکوت رہا۔ میں نے مسلسل "ہیلو' ہیلو" کہا تو کسی نے سوتے سوتے جواب دیا "حکم کرو۔"

"حکم کے غلام۔ کہاں مرگئے تھے۔"

"وہ جی' ذرا آنکھ لگ گئی تھی" وہ اب میری آواز پہچاننے لگا تھا "چوہدری صاحب بہت دیر سے یہاں موجود تھے۔ ابھی ابھی گئے ہیں۔"

"لوڈو کھیل رہے تھے تمہارے ساتھ یا تاش؟"

"آپ سے بات کرنا چاہتے تھے۔ اپنا فون نمبر تو دو جنابِ عالی۔ میری شامت آجاتی ہے۔ چوہدری صاحب کہتے ہیں کہ سکندر سے بات کراؤ۔ لو جی میں کیسے بات کراؤں آپ سے۔ مجھے کیا معلوم۔"

غلام سمجھنے والا اور مجھے ایم آر ایس سمیت نیست و نابود کرنے کے دعوے رکھنے والا اچانک خود کو بے بس ولاچار اور مزور تسلیم کر رہا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ اس کی فطرت کسی انقلاب سے دوچار ہو چکی تھی اور کسی معجزے کے نتیجے میں وہ شیطان کے راستے کی پیروی چھوڑ کے صراطِ مستقیم اپنا چکا تھا یا اسے ہدایت مل گئی تھی۔ نہیں' وہ مجھے الو بنا کے اس جال سے نکلنا چاہتا تھا جس میں تقدیر ہر شکاری کو کبھی نہ کبھی گرفتار کرا دیتی ہے۔

ولاور نے کہا "کس سوچ میں پڑ گئے اپنے سکندر صاحب۔"

میں نے سوچ کے کہا "میں بھی اب تھک گیا ہوں چوہدری صاحب۔ مجھے بھی احساس ہو رہا ہے کہ میں نے بہت وقت ضائع کیا۔ کچھ نہیں ملا مجھے اس جذباتی پاگل پن سے۔ اگر میں عقل سے کام لیتا تو آج تمہارے ساتھ میں بھی ایک مطمئن اور خوش حال زندگی گزارتا نظر آتا۔ تم نے معافی تلافی سے بہت پہلے ہی مجھے شراکت کی پیش کش بھی کی تھی۔"

وہ شک میں پڑ گیا "شراکت۔ میرے کاروبار میں؟"

میں نے کہا "نہیں۔ یہ تو خیر ناممکن سی بات تھی۔ ہاں میں تم پر اور تمہارے کاروبار پر لعنت بھیج کے الگ ہو سکتا تھا۔ رابعہ کے ساتھ لندن جا کے آباد ہو سکتا تھا۔ بلکہ اس سے بھی پہلے..... خیر چھوڑو۔ یہ تجربہ تو عمر اور وقت کے ساتھ ہی آتا ہے۔ [illegible] کچھ گنواتا ہے تو پا سکتا ہے۔"

"اگر تم سیریس ہو تو اپنے سکندر صاحب۔ مٹی پاؤ' گزری باتوں پر اور سمجھو کہ بس آج سے پیچھے دیکھنا ہی نہیں۔ ہیں جی' اور نظر رکھنی ہے اس پر۔ کیا کہتے ہیں اسے۔ مستقبل پر۔ دل صاف اور ہر خطا معاف۔ پارٹنرشپ نہ سہی۔ ہم اپنا اپنا کام کر سکتے ہیں۔ ایک دوسرے کے معاملے میں ٹانگ اڑائے بغیر۔ سب کی بھلائی ہے اس میں....."

میں نے اسے بولنے دیا۔ وہ اس خیال سے خوش تھا کہ بالآخر میں نے اس سے مفاہمت کا فیصلہ کر لیا اور موقعے سے فائدہ اٹھایا۔ یہ موقع مجھ سے زیادہ اس کے لیے سازگار تھا اور میرے فیصلے سے اس کو اپنی آج کی ہر مشکل آسان ہوتی نظر آ رہی تھی۔ کل کی بات صرف مجھے خوش فہمی کا فریب دینے کے لیے تھی ورنہ میں بھی سمجھتا تھا کہ کل ولاور پھر وہی ہو گا جو کل تھا۔

"اچھا۔ اب دھیان سے میری بات سنو۔ میں تم سے ملاقات کے لیے تیار ہوں لیکن یہ نہ کسی کی فتح کی تقریب ہے نہ شکست کا جشن۔ نہ کوئی کسی کے سامنے ہتھیار ڈالنے آئے گا اور نہ ہی اپنی مونچھ نیچی کرنے۔"

"فکر مت کرو جی۔ مونچھ تمہاری ہی اونچی رہے گی اپنے سکندر صاحب۔"

"میں پھر تمہیں خبردار کرتا ہوں ولاور کہ تم نے چالبازی کی تو تمہاری خیر نہیں۔ اس بار کوئی تمہیں نہیں بچا سکے گا۔ تم خود کو سلاخوں کے پیچھے دیکھنا نہیں چاہتے تو اس آخری موقعے سے فائدہ"

"میں ٹھیک بارہ بجے وہاں اکیلا آؤں گا۔ اس کے بعد.....؟"

"ہم کہیں بھی جا سکتے ہیں۔ وہیں معاملات کو طے کر سکتے ہیں یا دوبارہ ملاقات کے لیے شرائط طے کر سکتے ہیں۔ یہ سب کل کے بعد دیکھا جائے گا۔ مستقبل کا انحصار تمہارے رویے پر ہے" میں نے ریسیور آف کر دیا۔

مجھے یقین آنے لگا تھا کہ اس بار ولاور خود کو چوہے دان میں پھنس جانے والے چوہے سے زیادہ بے بس محسوس کر رہا ہے اور گرفتاری کے خوف نے اس کی ساری اکڑفوں نکال دی ہے۔ اس کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ اتنی ہوشیاری سے بنایا جانے والا منصوبہ یوں ناکام ہو گا کہ اسے لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ اس نے تو ڈاکٹر شیلی کو لندن سے اس لیے بلوایا تھا کہ ایک تیر سے دو شکار کرے۔ پہلے مجھے شیلی کے جال میں گرفتار کرا دے اور پھر میرے ہاتھوں ہی شیلی کا کام تمام ہو۔ رابعہ مجھ سے بدظن ہو جائے اور ولاور کے راستے کا کانٹا نکل جائے۔ اس کی یہ چال الٹی ہو گئی۔ صورتِ حال یہ تھی کہ خود ولاور قتل کے الزام میں مطلوب تھا۔ اگر اس کا جرم ثابت ہو جاتا تو اسے تختۂ دار سے کوئی وکیل صفائی نہ بچا سکتا۔ جو پولیس اس کی زر خرید اور حلیف تھی وہ اس کی حریف ہو گئی تھی کیونکہ معاملہ اب کسی لاوارث کا نہیں تھا۔ ایک برطانوی شہری کا تھا جو لیڈی ڈاکٹر تھی اور پاکستان آئی ہوئی تھی۔ اگر ولاور اسے نہیں تسلیم کرتا تو پنڈورا کا بکس کھل جاتا اور پھر لندن میں اس کے خلاف دُہرے قتل کی پرانی فائل کھل جاتی اور اسے قاتل کی حیثیت سے شناخت کرنے والا ایک سیاہ فام بھی سامنے آ جاتا جو اس کے جرم کی سزا کاٹ رہا تھا۔ رابعہ کے ساتھی سینئر وکیلوں نے اور برطانوی کونسلیٹ نے ان سب حربوں کو بے اثر بنا دیا تھا جو اس ملک کا ہر دولت مند ذی اثر اور بارسوخ شخص قانون کی عملداری کو بے اثر بنانے کے لیے استعمال کرتا ہے۔

اس رات مجھے عجیب سی بے چینی رہی۔ میں سونے کی کوشش کرتا تھا تو تصور میں نورجہاں کا ویران و شکستہ حال مقبرہ آ جاتا تھا جہاں لوحِ مزار پر خود اس کی پیش گوئی ایک درسِ عبرت کی طرح تحریر تھی۔

بر مزارِ ما غریباں نے چراغے نے گلے
نے پرِ پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

(ہم غریبوں کے مزار پر نہ کوئی چراغ جلاتا ہے نہ پھول چڑھاتا ہے چنانچہ کوئی پروانہ جلنے اودھر نہیں آتا اور کوئی بلبل یہاں نغمہ زن نہیں ہوتی)

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات اٹھارھویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں

جاسوسی ڈائجسٹ کا منفرد و مقبول سلسلہ
شکاری
اٹھارواں حصہ

پسندیدہ رسائل ۔۔۔ حاصل کریں
۔۔۔ تشریف لائیں

شکاری

معاشرے کے ان ناسوروں کی روداد جو گوشت میں
پیوست ہو کر انسانی ہڈیوں میں اتر گئے
ایک کفن بردوش نوجوان کی کہانی جس کے شب و روز
موت کی بستی میں گزر رہے تھے۔ جلتے دن
سلگتی راتیں۔ آس و یاس۔ خوف و ہراس
تلخ حقیقتیں۔ شیریں خواب۔

۔۔۔ مشتمل ایک روایت شکن سلسلہ

میری چشمِ تصور مجھے کبھی ایک منظر دکھاتی تھی تو کبھی دوسرا۔ شکاری دلاور بھی تھا اور شکاری میں بھی تھا۔ ہم ایک ہی شکار گاہ میں آمنے سامنے ہوں گے تو قضا کے تیر کا نشانہ کون ہوگا؟ کون کس کے پھیلائے ہوئے دامِ ہم رنگِ زمیں میں گرفتار ہوگا؟ تدبیر کس کی کارگر ہوگی اور تقدیر کس کا ساتھ دے گی؟ یہ سب سوچ کے مجھے اُٹھا سکتے ہو ورنہ رابعہ ہی نہیں' اس کے ساتھی وکیل تمہارے خلاف درج ہونے والی ایف آئی آر کو تمہارے گلے کا پھندا بنا کے دم لیں گے۔ تمہارا پیسہ' اثر و رسوخ اور بدمعاشی کا زور برطانوی کونسلیٹ کے لیے بے معنی ہے.... خود حکومت بے بس ہے۔"

"میں سب جانتا ہوں۔ مانتا ہوں اپنے سکندر صاحب کہ اس چال میں تم نے مجھے شہ مات دی۔ ہیں جی' اور وہ اُلٹ دی۔ کیا کہتے ہیں اسے.... بساط۔ میں بالکل سمجھ رہا ہوں کہ ڈاکٹر شیلی کی لاش کا پوسٹ مارٹم ہوا تو کیا ہوگا۔ میری عزت میرا مستقبل میری زندگی سب داؤ پر لگے ہوئے ہیں۔ اس لیے تم کو اعتبار کرنا چاہیے مجھ پر کہ میں مجبور ہوں۔ تمہارے ساتھ چالبازی کرنے سے مجھے کوئی فائدہ نہیں نقصان ہوگا۔ تمہارے یار بیلی اور چاہنے والے مجھے چھوڑیں گے نہیں۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ کل تم کہاں ملو گے؟"

"جہاں تم کہو۔"

میں نے کہا "دوپہر ٹھیک بارہ بجے نورجہاں کے مقبرے میں۔"

"اتنی دور۔ ویرانے میں؟"

میں نے کہا "جگہ کا انتخاب میرا ہوگا۔ کسی آبادی میں مجھے یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ تم اکیلے آئے ہو یا اپنے ساتھ حکم کے غلام شکاری کتے بھی لائے ہو۔ تمہارے نزدیک ان کتوں کی جان کی کوئی اہمیت نہیں۔ تم انہیں مرواتے ہی رہتے ہو۔"

"میں نے کہا نا کہ کوئی نہیں آئے گا۔"

"یہی دیکھنے کے لیے میں نورجہاں کے مزار پر موجود رہوں گا۔ اس سڑک پر جو مقبرۂ جہانگیر کی طرف جارہی ہے پام کے یا کھجوروں کے کسی جھنڈ سے میں آنے جانے والوں پر نگاہ رکھوں گا۔ سیر و تفریح کے لیے آنے والے تانگوں میں گزرتے ہیں یا سائیکلوں پر آتے ہیں۔ وہ سب مقبرے کی بیرونی دیوار کے مین گیٹ پر اُترتے ہیں۔ کسی نے اِدھر اُدھر مورچہ بندی کی تو مجھے اندازہ ہو جائے گا۔ حقیقت تو یہ ہے دلاور کہ میں نے اس راستے پر نگرانی کا پکا انتظام کیا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ تم مجھ سے بات ختم کرتے ہی اپنی غنڈہ فورس کو آس پاس پوزیشن سنبھالنے کے لیے روانہ کردو۔ وہ رات بھر چھپے رہیں اور کل دوپہر تک سامنے نہ آئیں۔"

"بڑا افسوس ہے اپنے سکندر اعظم صاحب....."

"یہ افسوس کی بات نہیں۔ احتیاط کا تقاضا ہے کہ دشمن کی ہر چال کا پہلے سے اندازہ ...." میں نے اس کی بات کاٹ دی "تم سے کچھ بعید نہیں۔ یہ بھی ممکن ہے۔ تمہارے بندے مقبرۂ جہانگیر میں سیر کرتے نظر آئیں مگر تمہارا اشارہ ملتے ہی باہر آکے نورجہاں کے مزار کو گھیر لیں۔ اس کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔ اگر مجھے کوئی گڑبڑ نظر نہ آئی تو ملاقات ہو جائے گی۔ اس وقت میری یا تمہاری قانونی پوزیشن تقریباً ایک جیسی ہے۔ اگر پولیس نے مجھے پکڑنے کی کوشش کی تو تم بھی پکڑے جاؤ گے۔"

کیا۔

"آپ کو سرکاری طور پر اس کی اجازت ہے؟" یہ سوال ڈی ایس پی نے کیا تھا جو کچھ پریشان نظر آرہا تھا۔

"کس بات کی اجازت؟" میں نے ہاتھ پھیلا کے کہا "میں صرف ایک فیملی اٹارنی ہوں۔ سراغ رساں بھی نہیں ہوں۔ تفتیش خفیہ تو نہیں ہوگی۔ جیسے سب دیکھیں گے ایسے ہی میں بھی دیکھوں گا۔ یہاں کے صحافی اپنی اپنی رپورٹ اخبار کو دیں گے۔ میں یہ رپورٹ مس شیلی کے انکل کو دوں گا۔ انہیں آپ ضرور جانتے ہوں گے۔"

"وہ جو انگلینڈ میں ہیں" ظفر حیات نے کہا۔

"لیس۔ خود ڈاکٹر شیلی کا تعلق انگلینڈ سے تھا۔"

"پھر انہوں نے ایک فرنچ وکیل کا انتخاب کیوں کیا؟ کیا برطانیہ میں انگریزی بولنے والے وکیل نہیں تھے۔ وہاں تو پرائیویٹ سراغ رساں بھی ہوتے ہیں۔"

"بالکل ہوتے ہیں" میں نے کہا "لیکن ہر فیملی کی اپنی ترجیحات ہوتی ہیں۔ میں ڈاکٹر شیلی کا دوست تھا۔ شاید اس لیے۔"

ظفر حیات چالاک آدمی تھا اور کچھ عرصہ پیرس میں گزار چکا تھا۔ اس نے مجھ سے پیرس کے بارے میں بہت سے سوالات کیے جن کا جواب وہی دے سکتا تھا جو پیرس میں رہا ہو۔ آپ فلاں کیفے میں گئے ہیں کبھی۔ فلاں آرٹ گیلری کے باہر جو فوارہ ہے وہ دیکھا ہے آپ نے۔ فلاں تھیٹر اور آپیرا بہت شاندار ہے۔ رہائش کہاں ہے آپ کی؟ آفس کہاں ہے؟"

میں اور محسن جب لندن میں تھے تو ہر ویک اینڈ پر پیرس جاتے رہتے تھے۔ ہم جرمنی اور سوئزرلینڈ کی سیاحت بھی خوب کر چکے تھے۔ ان ممالک کے درمیان ویزا کا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ اگر آپ کے پاس پاسپورٹ ہے تو آپ اپنی گاڑی میں بلا روک ٹوک برطانیہ سے جرمنی' فرانس' سوئزرلینڈ یا آسٹریا جا سکتے ہیں۔ ویزا ملک کی سرحد پر لگا دیا جاتا ہے اور بعض اوقات اس کا تکلف بھی نہیں کیا جاتا۔ سرحدی محافظ عام سیاح کو اس کے رویّے سے پہچان لیتے ہیں اور اس سے کوئی تعرض نہیں کرتے۔

میں ظفر حیات کو پوری طرح مطمئن کرنے میں کامیاب رہا۔ اس دوران چائے بھی آئی اور فضا خاصی دوستانہ رہی مگر ڈی ایس پی شاہد علی اور انسپکٹر خدا بخش کے چہرے پر ناگواری کے آثار واضح طور پر تشویش میں بدل گئے۔

"کیا آپ انگریزی تھوڑی بہت بھی نہیں جانتے؟" ظفر حیات نے کہا۔

"ویری لسل" میں نے مسکرا کے کہا "یہ مترجم مجھے یہاں بار ایسوسی ایشن کے کچھ عہدے داروں کی طرف سے فراہم کیا گیا ہے۔ غالباً وہ لوگ اس مرڈر کیس میں مدعی ہیں۔"

ظفر حیات ایک دم چوکنا ہو گیا "آپ مل چکے ہیں ان سے؟"

"لیس۔ ان سے اور کچھ مقامی صحافیوں سے کل ملاقات ہوئی تھی" میں نے کہا۔

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس نے کہا "موسیو آندرے۔ اس وقت میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"خدمت کچھ نہیں" میں نے کہا "مجھے ایک اطلاع ملی تھی۔ کسی نے کل رات مجھے کال کیا۔ ہوٹل فلیٹیز میں۔ اس نے کہا کہ ڈاکٹر شیلی کا قاتل کسی مقبرے میں چھپا ہوا ہے۔"

مولوی خادم حسین نے اس کا ترجمہ کیا تو ڈی ایس پی شاہد علی نے بے اختیار کہا "یہ کیا بکواس ہے۔"

انسپکٹر خدا بخش بولا "کس نے چکر دیا ہے اسے؟"

"کس مقبرے میں؟" ظفر حیات لطف اندوز ہو کے بولا۔

میں نے مولوی سے مشورہ کیا۔ یوں جیسے میں اس سے کچھ پوچھ رہا ہوں پھر خادم حسین بولا "مقبرہ ہے نور جہاں کا۔"

"وہ کوئی ملکہ تھی" میں نے مسکرا کے کہا۔

ظفر حیات مسکرایا "موسیو آندرے۔ ایسی بے بنیاد اطلاعات پر آپ کو توجہ نہیں دینی چاہیے اور نہ یہ توقع رکھنی چاہیے کہ ہم کوئی ایکشن لے سکتے ہیں۔"

"چیک تو کر سکتے ہیں آپ۔ اس میں کیا حرج ہے۔"

"اس میں بھی وقت ضائع ہوگا" ظفر حیات نے مایوسی سے سر ہلایا۔

"تفتیش تو امکانات پر ہی کی جاتی ہے۔ اس میں وقت ضائع کرنا پڑتا ہے۔ آپ اس امکان کو نظرانداز کیسے کر سکتے ہیں کہ یہ اطلاع صحیح بھی ہو سکتی ہے۔" میں نے کہا "آخر کسی کو کیا ضرورت تھی مجھے فون پر یہ اطلاع دینے کی؟ بہت کم لوگ مجھے جانتے ہیں۔"

"سر یہ کسی کی شرارت ہوگی۔ بوگس کال" خدا بخش بولا۔

"میں اب تک جتنے لوگوں سے ملا ہوں وہ سب سنجیدہ مزاج اور معقول لوگ تھے۔ بے حد ذمّے دار۔" میں نے ترجمہ سُن کے کہا۔

"سر' کیا ہم اس کی باتوں کو اتنی اہمیت دیں گے۔ اسے کیا پتا یہاں کیا ہوتا ہے؟" شاہد علی بولا۔

"ہم اس کی باتوں کو نظرانداز بھی نہیں کر سکتے" ظفر حیات سوچ میں پڑ گیا "اس کا کیا جاتا ہے۔ یہ کہہ دے گا کہ میں نے ٹپ دیا تھا مگر پولیس نے میری اطلاع پر ایکشن ہی نہیں لیا۔ کل خبر آجائے گی۔"

"تو کیا آپ چھاپا ماریں گے سچ مچ؟" خدا بخش بولا۔

"کیا چھاپا جھوٹ موٹ بھی مارا جاتا ہے" ظفر حیات نے اسے گھورا "کم آن' اپنی نفری سے کہو کہ تیار ہو جائے۔ ایک منٹ ٹھہرو' ہم ساتھ چلیں گے۔ اس کو ابھی ٹاپ سیکرٹ رکھو۔ چھاپا مار پارٹی کو بتایا جائے کہ ہم جا رہے ہیں شاہی قلعے کے پیچھے۔ صرف چار مسلح سپاہی ساتھ لو اور چلو۔"

شاہد علی نے اسے سمجھانے کی کوشش کی "سر! ایسے دباؤ میں

پولیس نے میگا فون سے اعلان کیا "اندر کون ہے۔ تمہیں تین منٹ کی مہلت دی جاتی ہے' باہر آجاؤ۔"

ظفر حیات نے کہا "کیا وہ مسلح ہوگا؟"

بالکل بے خیالی میں خدا بخش کے منہ سے نکل گیا "کون چوہدری دلاور؟"

ظفر حیات کی نظر اس پر جم گئی "چوہدری دلاور!"

خدا بخش سے بہت بڑی غلطی ہو گئی تھی۔ اب وہ اپنے افسرِ اعلیٰ کو کسی طرح بھی مطمئن نہیں کر سکتا تھا کہ یہ نام اس کی زبان پر کیوں آگیا تھا۔

"تم یہ سمجھتے ہو کہ وہی قاتل ہے؟" ظفر حیات نے سخت لہجے میں کہا۔

"نہیں.... نہیں سر۔ وہ تو لوگ بکواس کرتے ہیں۔"

"کون لوگ؟ اور لوگوں کی بات چھوڑو۔ تم نے یہ نام کیوں لیا تھا؟" ظفر حیات نے کہا "اس کا مطلب ہے کہ تم بھی ایسا ہی سمجھتے ہو؟"

شاہد علی نے پھر میگا فون پر اعلان کیا "اب دس تک گنتی ہوگی۔ ایک.... دو.... تین...."

میں نے خادم حسین سے کہا "کیا یہ لوگ پاگل ہیں؟ انہیں پہلے اندر جا کے دیکھنا چاہیے۔ انہوں نے کیوں فرض کر لیا ہے کہ اندر کوئی آتشیں اسلحہ لیے بیٹھا ہے اور مزاحمت کرے گا یا بم پھینک دے گا۔"

خادم نے کہا "کیا پتا اندر کوئی بھی نہ ہو۔"

لیکن اسی وقت اندر سے ایک فائر ہوا اور ایک پولیس مین زمین پر گر کے تڑپنے لگا۔ باقی پولیس والے فوراً لیٹ گئے اور اندھا دھند گولیاں چلانے لگے۔ ان کی رائفلوں کا رخ مقبرے کی طرف تھا۔ انسپکٹر خدا بخش ایک درخت کے پیچھے ہو گیا اور ریوالور سے فائر کرنے لگا۔

ظفر حیات نے جیپ کو گیئر میں ڈالا اور آگے لے گیا۔ اس نے مجھے بھی اپنے ساتھ گھسیٹ لیا اور ہم جیپ کے پیچھے سے پولیس مقابلہ دیکھنے لگے۔ میرے ساتھ ٹائر کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوا مولوی خادم حسین زیرِ لب درود شریف پڑھ رہا تھا اور اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اس کے دعا کے انداز میں اٹھے ہوئے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

ظفر حیات نے کہا "بے وقوف۔ ان کو پہلے خیال نہیں آیا۔ خواہ مخواہ ایک آدمی مارا گیا۔ اس باسٹرڈ انسپکٹر کو ضرور معلوم تھا کہ بہادر علی یہاں ہو سکتا ہے۔ وہ ایک خطرناک آدمی ہے۔"

میں نے یہ ظاہر کیا جیسے میں نے اس کی بات نہیں سمجھی مگر اس کی رائے سُن کے مجھے خوشی ہوئی۔

شاہد علی نے پھر وارننگ دی "مقابلہ بند کرو ورنہ ہم اندر بم پھینک دیں گے۔"

مت آئیں۔ اس طرح خود وکیل اور صحافی آپ کو بہت پریشان کریں گے۔"

"مجھے کوئی پریشان نہیں کر سکتا۔ اور نہ میں دباؤ قبول کرتا ہوں۔ شاہد علی!" ظفر حیات نے برہمی سے کہا "مجھے اپنی نیک نامی عزیز ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے خلاف نااہلی کی جھوٹی خبر بھی کسی اخبار میں شائع ہو۔ فرض کرو ایک فیصد امکان ہے اس اطلاع کے سچ ہونے کا۔ میں یہ ایک پرسنٹ رسک نہیں لینا چاہتا۔ پھر تم یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ اس طرح مجھے کیا فائدہ حاصل ہوگا۔ میں اس فرنچ وکیل پر ثابت کروں گا کہ ہم گمنام اطلاعات پر ایکشن نہیں لیتے تو ٹھیک ہی کرتے ہیں۔ یہ برطانیہ' فرانس نہیں ہے جہاں کوئی شہری پولیس یا فائر بریگیڈ اور ایمبولینس والوں کو جھوٹا فون نہیں کرتا۔ یہاں پڑھے لکھے بھی ایسا بے ہودہ مذاق کرتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سر" شاہد علی قائل ہو گیا "اس کا منہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے گا۔"

ظفر حیات مولوی سے مخاطب ہوا "اس اُلّو کے پٹھے سے کہو کہ ہم اس کی اطلاع پر کارروائی کر رہے ہیں مگر یہ غلط ہو گئی تو آئندہ میں اسے اپنے آفس میں قدم نہیں رکھنے دوں گا۔ جوتے مار کے نکال دوں گا۔ میں گوری چمڑی سے متاثر نہیں ہوتا اور نہ کسی صحافی سے ڈرتا ہوں۔ بس اپنا کام کرتا ہوں۔"

مولوی نے کہا "آپ سمجھ تو گئے ہوں گے موسیو آندرے۔ کیا میں ترجمہ کروں اُلّو کے پٹھے کا۔"

میں نے مسکرا کے کہا "تم ترجمہ کر کے اسے بتاؤ کہ گدھے کے سر پر سینگ نہیں ہوتے۔"

ظفر حیات فوراً کھڑا ہو گیا تھا۔ شاہد علی اور خدا بخش نے بھی بڑی مستعدی کا ثبوت دیا مگر وہ خوش بہرحال نہیں تھے۔

"یار' خواہ مخواہ کی پریڈ لگ گئی" شاہد علی نے زیرِ لب خدا بخش سے کہا۔ اس طرح کہ ظفر حیات نہ سُنے۔

میں نے کہا "آپ نے مجھ سے کچھ کہا' خادم؟"

خادم نے کہا "جواب میں کیا عرض کروں؟ یہ بتا دیں؟"

ایک گھنٹے بعد پولیس نے نور جہاں کے مقبرے کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ میں ظفر حیات کی جیپ میں بیٹھا ہوا ظاہری بے نیازی سے تمام کارروائی دیکھ رہا تھا۔ سڑک پر کچھ راہ گیر بھی رک گئے تھے مگر پولیس نے کسی کو قریب نہیں آنے دیا۔ پولیس ہیڈ آفس سے یہاں تک سارا راستہ میں سخت تشویش میں مبتلا رہا تھا۔ مجھے پریشانی یہ تھی کہ دلاور اندر موجود نہ ہوا تو کیا ہوگا؟ کیا پتا اس کے مخبر دور دور تک موجود ہوں اور انہوں نے محاصرے سے قبل ہی دلاور کو خبردار کر دیا ہو۔ وہ عین وقت پر نکل گیا ہو۔ لیکن یہاں اس کا فرار ہونا آسان کام نہ تھا۔ یہ غیر آباد علاقہ تھا جس کے آس پاس پرانے باغ کے آثار باقی رہ گئے تھے یا چند درخت تھے۔

خوف بھی محسوس ہوتا تھا اگر میری نیت صاف نہ ہو اور میں دل دور جیسے شخص کو اپنی باتوں سے اپنے لہجے کی سچائی سے اور اداکاری سے الو بنا رہا ہوں تو یہ فرض کرنا غلط ہوگا کہ وہ سب وقت بن رہا ہے۔

مجھے کچھ دیر نیند ضرور آئی ہوگی کیونکہ پھر میری آنکھ کھلی تو صبح صادق کا دھندلا اجالا کھڑکیوں کے شیشوں پر پھیل چکا تھا۔ میں نے کلائی کی گھڑی دیکھی تو ساڑھے چھ بجے تھے۔ زیڈ کی ہدایات کے مطابق میک اپ اتارنے کا خیال میں نے کچھ دیر کے لیے ملتوی کردیا۔ نیچے جاکے میں نے بہرام سے ملاقات کی جو نماز سے فارغ ہوکے چائے پی رہا تھا۔ اس نے بڑے خلوص سے مجھے چائے پیش کی مگر میں نے معذرت کرلی کہ نہائے دھوئے بغیر میں کچھ نہیں کھاتا پیتا۔ اصل بات یہ تھی کہ دن کا آغاز ہی میں اس بے گناہ لذت سے نہیں کرنا چاہتا تھا کہ چائے بھی پیوں اور لطف کے بجائے کوفت حاصل ہو۔ بہرام سے ملنے کا اصل مقصد رونمائی تھا۔

واپس اوپر آکے میں نے اپنے لیے چائے بنائی، چند بسکٹ کھاتے ہوئے آفس میں پہنچ گیا۔ وقار کا نمبر ملاکے میں نے بدلی ہوئی آواز میں کہا "مجھے غالب سے بات کرنی ہے۔"

"ابھی تو وہ سو رہے ہیں" وقار یوسف نے کہا "کوئی پیغام دے دیں اگر ضروری ہے۔"

وقار خود بھی نیند میں بول رہا تھا۔ میں نے کہا "پیغام یہ ہے کہ انہیں فوراً جگادیں۔ بہت اہم خبر ہے، میں چیف رپورٹر بول رہا ہوں۔"

اس کے بعد وقار یوسف کی نیند یقیناً اڑگئی ہوگی۔ وہ بھی سمجھتا تھا کہ اخبار والوں پر خبر کے نزول کا کوئی وقت نہیں ہوتا۔ عام محاورہ تو یہ ہے کہ موت اور گاہک کا کوئی بھروسا نہیں مگر اس میں خبر کا اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ اچانک مارشل لا لگ جاتا ہے، کینیڈی کا قتل ہوجاتا ہے یا آدمی چاند پر اتر جاتا ہے اور ساری دنیا کو خبر دینے کے ذمے دار اخباری کارکن سوتے سے اٹھ کے یوں دوڑتے ہیں جیسے صور اسرافیل سن کے سب میدان حشر کی جانب دوڑیں گے۔

غالب نے شاید پوچھا ہوگا کہ چیف رپورٹر کون؟ مگر وقار نے مجھ سے نام نہیں پوچھا تھا۔ ایک منٹ بعد فون پر کم وقت میں غالب آگیا۔

"شرم مت کرنا صحافی کے گھوڑے" میں نے کہا۔ مجھے مجبوراً وقار سے جھوٹ بولنا پڑا۔"

"کیوں؟ کیا تکلیف تھی؟" غالب نے بے زاری سے کہا۔

"تم کوئی بے ہودہ خواب دیکھ رہے ہوگے اس لیے گرم ہورہے ہو" میں نے کہا "شرم آنی چاہیے تمہیں۔ نازو کو پتا چلا تو وہ کیا کہے گی۔"

"وہی جو اس وقت میں تمہیں نہیں کہہ سکتا۔ کام کی بات کرو"

"بس یار، میری آنکھ کھل گئی تھی تو میں نے سوچا کہ دوسرے کیوں خواب غفلت میں پڑے رہیں۔ اٹھو، خدا کو یاد کرو۔ کیا خبر کل صبح نکلا کس طرف سے آفتاب..."

"تم نے مجھے کیا یاد دلایا ہے... یہی بتانے کے لیے... یہ احسان تم صبح آفتاب نکلنے کے بعد بھی کرسکتے تھے۔"

یار۔ میں ایک شریف آدمی کے بیڈ روم سے بات کررہا ہوں۔"

"اوہ۔ سوری" میں نے کہا "مرزا جی، مجھے ایک بندہ چاہیے جو فرنچ بول سکتا ہو یا کم سے کم سمجھ سکتا ہو اور اردو میں وہ بیان کرسکتا ہو۔ جسے جی کیا کہتے ہیں... انٹرپریٹر۔"

"میں دیکھتا ہوں، شاید میری کسی ڈائری میں یا نازو کے ہینڈ بیگ میں ہو۔"

"خفا کیوں ہوتے ہو یار۔ اتنے بڑے صحافی ہو۔ سارے زمانے کی خبر رکھتے ہو۔ یہ تو بہت چھوٹا سا کام ہے۔"

"اتنی صبح میں آپ کے دروازے پر اخبار یا دودھ تو پہنچا سکتا ہوں۔ گلی میں پھرنے والا کوئی پاگل کتا بھی لاسکتا ہوں مگر۔"

"اگر مگر کچھ نہیں... مجھے دس بجے تک ایسا بندہ مل جانا چاہیے، سمجھے؟" میں نے اسے ڈانٹ کے کہا۔

"سمجھ گیا... یہ بات مجھے منہ اندھیرے جگاکے بتانا ضروری تھی۔"

"بے حد ضروری تھی۔ اب نازو کو بھیج دو۔ ذرا ان سے بھی سلام دعا کرلیں۔ تم چاہو تو دوسرا زیادہ بے ہودہ خواب دیکھو۔ نازو سو رہی ہوں ابھی تو۔"

"مگر وہ بہت خوش ہوگی تم سے باتیں کرکے" غالب نے بھناکے کہا "ابھی اٹھاکے لاتا ہوں اسے۔"

ریسیور پر وقار کی آواز آئی "کمال ہے سکندر صاحب۔ ہمیں بھی..."

میں نے ہنس کے کہا "معاف کرنا یار۔ مقصد تمہیں ڈسٹرب کرنا نہیں تھا۔ بیڈ روم میں فون رکھنا ہی نہیں چاہیے ورنہ سوتے وقت اس کی گھنٹی ضرور بند کردینی چاہیے۔ اب تم ایسا کرو کہ ریسیور رکھ کے سوجاؤ۔ نازو کے آنے سے پہلے۔ اور نازو پوچھے تو کہنا کہ فون تو کسی کا بھی نہیں آیا۔ ورنہ گھنٹی بجتی۔"

جب نازو نے کہا "ہیلو" تو میں خاموش رہا۔ دو تین بار ہیلو کرکے اس نے ریسیور رکھ دیا۔ میں دل ہی دل میں بہت خوش ہوا کہ اب غالب کی شامت آئی۔ اس نے نہ جانے نازو کو کیا کہہ کے جگایا ہوگا کہ فون پر کون بات کرنا چاہتا ہے۔ نازو سمجھے گی، غالب نے اسے پریشان کرنے کے لیے جھوٹ بولا۔

آٹھ بجے بہرام رخصت ہونے سے پہلے میرے پاس آیا۔ اس نے فوری طور پر میری پیش کش سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ "دو چھٹیاں پڑ رہی ہیں۔ جمعہ ہفتہ، پھر اتوار ہے۔ میں سوموار کی شام کو آؤں گا" اس نے عمارت کے بیرونی گیٹ کی چابیاں میرے حوالے کردیں "تم سنبھال لوگے؟"

میں نے کہا "خوب تم کدھر جاتا اے۔ میانوالی؟"

"ہاں۔ واپسی پر بیوی بچوں کو ساتھ لے آؤں گا۔ دو چار دن وہ بہت ہیں اور یتیم خانے..."

"بس دو تین دن تو۔ ہم کو غالب نے بھیجا ہے۔ ہم مترجم ہوں گے آپ کے" وہ بولا۔ "مگر آپ تو فرفر اردو بولتے ہیں۔ انگریزی بھی جانتے ہوں گے۔ پھر مترجم کی کیا ضرورت ہے؟"

میں نے خود کو فوراً سنبھال لیا "میری ضرورت کو چھوڑیے۔ آپ کو حق خدمت کے طور پر پانچ ہزار ماہانہ کی ضرورت ہے یا نہیں؟"

اس نے تھوک نگل کے کہا "پانچ... پانچ سو... یا ہزار؟"

"پانچ ہزار۔ مگر شرط یہ ہے کہ آپ کوئی سوال نہیں کریں گے۔ جو بات میں فرنچ میں کہوں گا آپ اس کا ترجمہ اردو یا انگریزی میں کریں گے۔ اور کسی کو یہ بھی نہیں بتائیں گے کہ میں اردو یا انگریزی سمجھتا ہوں۔"

"بہت بہتر۔ بہت بہتر۔ لیکن آپ یہ بتادیتے کہ معاملہ کیا ہے؟"

"سوال شروع کردیے آپ نے۔ خیر، پہلی غلطی ہے اس لیے معاف کرتا ہوں۔ میں ایک سراغ رساں ہوں۔ قتل کے ایک مقدمے کی سراغ رسی کے لیے برطانیہ سے آیا ہوں۔ ویسے میں پاکستانی ہوں مگر یہاں کی پولیس کا رویہ تفتیش میں معاون نہیں ہوتا ہے۔ اس لیے میں اپنی شناخت ظاہر نہیں کرنا چاہتا۔ خود میں سب کی باتیں سنتا رہوں گا... کیا خیال ہے اب چلیں؟"

"چلیے جناب۔ ہم تو آئے ہی خدمت کے لیے ہیں۔ نام بھی خادم حسین رضوی ہے۔" وہ بولا۔

"یہ فرنچ آپ نے کیسے سیکھ لی؟"

"بس۔ سوچا تھا کوئی غیر ملکی زبان سیکھنے سے معاش کا مسئلہ حل ہوجائے گا بہتر طور پر" اس نے آہ بھر کے کہا "اللہ مالک ہے۔"

اسلام آباد سے آئے ہوئے ایس ایس پی ظفر حیات کو تلاش کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ پولیس ہیڈ کوارٹر میں مجھے بتایا گیا کہ ان کا کمرا دوسری منزل پر ہے۔ جب میں نے اس کمرے میں قدم رکھا تو ڈی ایس پی شاہد علی اور انسپکٹر خدا بخش وہاں پہلے سے موجود تھے۔

میں نے فرنچ میں اپنا تعارف کرایا۔ "مجھے ڈاکٹر شیلی کیس میں ان کے ایک دوست کی طرف سے اٹارنی مقرر کیا گیا ہے۔ میں یہاں تفتیش میں بطور مبصر شریک رہوں گا۔ میرا نام ہے موسیو آندرے ژاں سوبارتے ہینری۔ مختصراً آپ مجھے آندرے کہہ سکتے ہیں۔"

ظفر حیات محظوظ ہوا "تفتیش ہم خود بھی کرسکتے ہیں۔"

"آپ غلط سمجھے۔ میں صرف دیکھوں گا اور اپنی رپورٹ دوں گا کہ میں اس سے مطمئن ہوں یا نہیں۔ میرا ارادہ ہرگز دخل اندازی کا نہیں ہے" میں نے وضاحت کی اور مولوی نے فرفر ترجمہ یہاں رہ لیں گے" بہرام بولا "اس کے بعد تم چاہو تو ایک ہفتے کے لیے پشاور چلے جانا۔"

"اویار! کام چل جائے گا۔ تم جاؤ" میں نے مجبوراً یہ ذمے داری قبول کی۔ خود کردہ را علاج نیست۔ اب یہ مصیبت بھی بھگتنی ہی پڑے گی۔

زیڈ ٹھیک وقت پر نمودار ہوا "میں نے آپ کے مسئلے کا حل تلاش کرلیا ہے، بلکہ ایجاد کرلیا ہے۔"

"وہ کیسے۔ کسی کا سر کاٹ کے تو نہیں لے آئے ہو کہ میں اپنا سر اتار کے لگالوں؟ روز شام کو بدل لوں۔"

"کمال ہے۔" اس نے ملال سے کہا "آپ ہی نے کہا تھا کہ کوئی طریقہ ایسا ہو جس سے صبح و شام میک اپ آسان ہوجائے۔"

"بالکل کہا تھا اور مجھے تم جیسے ذہین آدمی سے یہی امید تھی۔"

وہ خوش ہوگیا "یہ دیکھیں۔ یہ فرنچ کٹ داڑھی ہے اس کو آپ ہر روز ایسے چپکا سکتے ہیں۔ یہ خاص قسم کا گلو ہے۔ ایسا گوند سمجھ لیں جو آپ کی جلد کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اور ہے بھی اتنا مضبوط......"

"کہ داڑھی کے ساتھ کھال بھی اتر جائے گی۔"

"نہیں جی۔ یہ صرف گرم پانی سے نرم پڑجائے گا۔ اور یہ دیکھ لیں ہٹلر جیسی مونچھیں" اس نے دونوں چیزیں اپنے چہرے پر سجاکے دکھائیں۔

اس کی صورت میں نمایاں ہونے والی تبدیلی نے مجھے حیران کردیا "واہ بھئی تم تو زیڈ لگتے ہی نہیں۔ ایکس وائی لگتے ہو۔"

وہ مسکرایا "اور دیکھیے یہ عینک۔ اس کے ساتھ یہ سنہری زنجیر ہے۔ اس کے شیشوں میں سے آپ کی آنکھیں بڑی نظر آئیں گی۔"

"اور مجھے دنیا چھوٹی لگے گی۔"

"نہیں۔ آپ کو فرق نہیں پڑے گا۔ عینک کے نیچے آنکھوں میں آپ یہ لینز خود پہن سکتے ہیں۔ نیلا رنگ آپ کی رنگت کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ اور سنہرے بال ہوں تو اچھا لگتا ہے۔ یہ ہے آپ کی وگ۔ گولڈن براؤن، اس کے ساتھ فیلٹ ہیٹ پہن کے آپ سوفیصد فرنچ یا برطانوی نظر آئیں گے۔ سوٹ اور ٹائی تو آپ ظاہر ہے استعمال کریں گے۔"

زیڈ ایک گھنٹے بعد گیا تو میرا حلیہ اتنا بدل چکا تھا کہ اب میری شناخت عملاً ناممکن تھی۔ غالب کا بھیجا ہوا فرنچ سمجھنے والا مولوی ٹائپ شخص اس کے جاتے ہی آگیا۔ اس نے بڑی قرات کے ساتھ سلام کرکے مجھ سے مصافحہ کیا۔

"فرمایئے۔ میں کیا خدمت کرسکتا ہوں آپ کی؟" میں نے کہا۔

"جی! خدمت کے لیے تو ہم حاضر ہوئے ہیں۔"

"دیکھیے۔ میں چندہ دینے کا قائل نہیں۔ مسجدیں پہلے ہی

"او مائی گاڈ۔" میں نے سوچا" کیا یہ لوگ واقعی ایک قومی تاریخ کے ورثے کو محض ایک مجرم کی خاطر تباہ کردیں گے۔ پتہ نہیں مجھے سخت ملال تھا کہ رائفلوں کی گولیاں نور جہاں کے مقبرے کی خستہ حال دیواروں کو مزید زخمی کررہی ہیں۔ مجھے اپنے آپ سے شرم آئی۔ نور جہاں کا گلہ جائز تھا۔ خود میں آج تک نہ جانے کتنی بار مقبرۂ جہانگیر گیا تھا مگر تفریح کی خاطر۔ ایک بار بھی مجھے نور جہاں کی قبر پر پھول رکھنے یا اس کے سرہانے چراغ روشن کرنے کا خیال نہیں آیا تھا۔ الٹا میں پولیس کو یہاں لانے کا ذمے دار تھا اور خود کو مجرم محسوس کررہا تھا کہ میری وجہ سے آج اس مزار کی دیواروں پر گولیاں چلائی گئیں۔

اس سے پہلے کہ پولیس والے چھپے ہوئے مجرموں کو باہر نکالنے کے لیے واقعی دستی بم پھینک دیتے' میں نے خادم حسین سے کہا "یار' ان لوگوں کو سمجھاؤ۔ یہ ایک یادگار ہے' اس پر گولیاں نہ چلائیں۔"

"پھر کیا کریں جی؟ اندر سے بھی تو پھول نہیں مارے جارہے ہیں۔ یا میرے مولا' جل تو جلال تو....."

میں نے کہا "ان سے کہو انتظار کریں۔ محاصرہ قائم رکھیں۔ مجرم آخر کب تک اندر رہیں گے۔ کچھ کھائے پیئے بغیر ایک دو دن۔"

"پولیس والے تو کھائے پیئے بغیر ایک گھنٹا نہیں گزارتے۔"

"وہ ملزموں کو خبردار کریں کہ اندر گیس چھوڑدی جائے گی۔ دستی بم سے تو عمارت بھی تباہ ہوجائے گی" میں نے برہمی سے کہا۔

اب خادم حسین نے میری بات ظفر حیات تک پہنچادی اور شاید خود اسے بھی خیال آگیا کہ اس کو محکمۂ آثار قدیمہ والوں کے سخت ردِ عمل کا سامنا بھی کرنا ہوگا اور پریس تو اس کا ناطقہ بند کردے گا لیکن اس کے احکامات جاری کرنے سے پہلے ہی شاہد علی کی دھمکی کام کرگئی۔

اندر سے ایک شخص ہاتھ اٹھائے باہر آگیا۔ ظفر حیات ریوالور سمیت آگے چلا گیا۔

"وہ مارا پاپڑ والے کو" میں نے خادم کے کندھے پر دھپ مار کے خوشی کا نعرہ بلند کیا۔

خادم اُچھل پڑا "جی..... کسے ماردیا..... کون پاپڑ والا۔"

انسپکٹر خدا بخش نے ایک فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھا۔ یوں جیسے وہ اکیلا اس معرکے میں کامیابی کا ذمے دار ہے لیکن اس کی مسکراہٹ کا مفہوم کچھ اور تھا۔

نہ جانے کس سمت سے ایک فائر ہوا۔ اندر سے "ہینڈز اپ" کرکے آنے والا لڑکھڑایا اور وہیں گرگیا۔

گولی اس شخص کے سر میں لگی تھی۔ اس سے گولی چلانے والے کی نشانہ بازی میں مہارت ثابت ہوتی تھی۔ گولی کافی فاصلے سے چلائی گئی تھی لیکن نشانہ خطا نہیں ہوا تھا۔ آواز سے میں نے بھی محض سمت کا اندازہ کیا لیکن اس سمت میں جہانگیر کا مقبرہ تھا جہاں ہر روز کی طرح سیاح اور سیر سپاٹے کے شوقین آرہے تھے۔ تانگوں اور سائیکلوں پر۔ کاروں میں اور اسکوٹرز پر۔

مقبرۂ جہانگیر کافی فاصلے پر تھا اور قاتل کہیں درمیان میں کسی بلند جگہ پر موجود تھا جہاں سے وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور شاید میگا فون کی آواز بھی سن رہا تھا۔ میں نے دائیں جانب کے ہر درخت کو غور سے دیکھا کہ کہیں کوئی حرکت محسوس ہو مگر میری نظر کسی کا سراغ لگانے میں ناکام رہی۔ خود ایس پی صاحب حواس باختہ تھے۔ اس کے خیال میں تو میری اطلاع ہی بے بنیاد تھی۔ وہ یہاں محض خانہ پُری کی کارروائی کے لیے چند سپاہی ساتھ لایا تھا۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ یہ نفری بہت کم ہے۔ مقابلہ اگر کسی منظم گروہ کی طاقت سے ہوگا تو باقی تین سپاہی۔ انسپکٹر اور ڈی ایس پی خود اپنی حفاظت کے لیے بھی ناکافی ہوں گے۔ مشکل یہ تھی کہ اب وہ پسپائی اختیار نہیں کرسکتا تھا۔ اس پر بہت سے سنگین الزامات عائد ہوجاتے۔ پریس اور پبلک سوال کرتی کہ اس نے ایک غیر مصدقہ اطلاع پر یقین کرلیا تھا تو پھر یہ قدم اتنی بے دلی اور ناقص منصوبہ بندی کے ساتھ کیوں اُٹھایا تھا۔ مقابلے کے لیے اتنی کم فورس کیوں ساتھ لی تھی اور ایک پولیس مین کو مروانے کے بعد فرار اختیار کرنے میں کیا عقلمندی تھی۔ کیا وہ مجرموں کی طاقت کا اندازہ نہیں کرسکتا تھا؟ کیا پولیس کا یہی کام ہے کہ جب اصل مقابلہ ہو تو جان بچاکے بھاگ جائے اور فرضی مقابلوں میں جسے چاہے ہلاک کرکے بہادری کی سند حاصل کرلے۔ اس پر نااہلی' کوتاہی اور مجرمانہ غفلت کا الزام آتا۔

اس سب کا ذمے دار میں تھا۔ پہلے میری حیثیت مخبر کی تھی تو اب معتبر گواہ کی۔ نہ مجھے جھٹلایا جاسکتا تھا اور نہ پولیس کی مرضی کے مطابق بیان دینے پر مجبور کیا جاسکتا تھا۔ [illegible] شدید ذہنی اضطراب سے دوچار تھا مگر بظاہر پُرسکون [illegible] ڈرامائی صورت حال سے واجبی طور پر متاثر نظر آنے کی کوشش کررہا تھا۔

ایس پی نے اپنی فورس کو حکم دیا کہ وہ [illegible] فائر کریں اور آہستہ آہستہ فائر کرتے ہوئے آگے بڑھتے جائیں۔ خود اس نے بھی یہی حکمتِ عملی اختیار کرلی تھی اور مجھے جیپ کے پیچھے رہنے کی تاکید کرکے آگے بڑھ گیا تھا۔

خادم حسین پر رعشہ طاری تھا "سر..... آخر یہ کیا ہورہا ہے؟ مجھ سے تو آپ نے کچھ اور کہا تھا۔"

میں نے کہا "کیا کہا تھا؟ مجھے یاد نہیں۔"

"حد ہوگئی جی۔ آپ نے کہا تھا کہ مجھے جان کے دشمنوں سے خطرہ ہے۔ یہ تو کچھ اور ہی معاملہ نظر آتا ہے۔"

میں نے فلسفیانہ انداز اختیار کرلیا "خادم حسین۔ وہ کیا کہا ہے اپنے مرزا غالب نے....."

"جی انہوں نے تو صرف یہ کہا تھا کہ میک اپ کرتا ہے..."

"بھئی میں اردو کے عظیم شاعر مرزا غالب کی بات کررہا تھا۔

تمام کردیتا یا شاید دلاور کے بجائے پولیس سکندر کو گرفتار کرکے سرخرو ہوتی۔

تینوں کانسٹیبل پُرانی ساخت کی رائفل سے فائر کرتے جارہے تھے۔ ایک گولی چلانے کے بعد وہ تھوڑا سا آگے کھسک جاتے تھے اور اپنی کہنی اور پیٹ کے بل وہ مزار تک کا فاصلہ رینگتے ہوئے طے کررہے تھے۔ رائفل کے فائر کا دھماکا اتنا خوف ناک تھا کہ اس کی گونج سے فضا مرتعش محسوس ہوتی تھی۔ میرے کانوں میں سیٹی سی بجنے لگی تھی اور خادم حسین ہر بار اُچھل کے یا اللہ کہتا تھا۔ درختوں کے طیور اس شور محشر سے گھبرا کے فضا میں چکر کاٹتے ہوئے اپنے اضطراب کا اظہار کررہے تھے اور مقبرۂ جہانگیر میں بھی بھگدڑ مچ گئی تھی۔ باہر نان چھولے بیچنے والے خوان اُٹھا کے اندر چلے گئے تھے اور سیر کے لیے آنے والے بھی غائب ہوچکے تھے۔ بہت کم ایسے بہادر تھے جو دور سے تماشا کررہے تھے اور اس بات سے خائف نہیں تھے کہ کوئی گولی حادثاتی طور پر انہیں بھی مرحومین میں شامل کرسکتی ہے۔

لاہور شاہدرہ کی طرف سے آنے والے تانگے بھی دور ہی ٹھہر گئے تھے اور میدان میں مزار سے ایک فرلانگ دور جمع ہونے والے اس سارے منظر کو یوں دیکھ رہے تھے جیسے یہ کسی فلم کی شوٹنگ کا منظر ہو۔ یہاں فلم یونٹ اکثر دکھائی دیتے تھے چنانچہ پردۂ سیمیں کے فنکاروں کو جیتا جاگتا دیکھنے کے شائقین حسب توفیق دخل در معقولات کرتے تھے اور عموماً پولیس کے لاٹھی چارج سے فیض یاب ہوکے منتشر ہوتے اور [illegible] مرمت طلب حالت میں گھر پہنچتے تھے۔ کئی مضروب شانے یا ٹوٹے ہوئے ٹخنے پر مرہم تھوپتے ہوئے آہیں بھرتے تھے۔ ہائے نیلو کو دیکھنے گئے تھے۔ نیل ہی نیل پڑگئے۔

ایک ایسا ہی باہمت جیالوں کا گروہ بہت آگے تک آگیا تھا۔ ان کو یقین تھا کہ پولیس والے نقلی ہیں اور وردی میں ایکسٹرا ہیں۔ ایس پی ظفر حیات نے ان کو چلاّ کے خبردار کیا مگر وہ ایک دوسرے کو بتاتے رہے۔ اوئے یہ وہی ہے چمن والا' اور یہ..... اجمل ہے نا... جب ایس پی ظفر حیات نے انہیں بھگانے کے لیے ایک کی ٹانگ کا نشانہ لے کر فائر کیا اور وہ چیخ مار کے گرا تو اس کا اصل خون دیکھ کے سب سرپٹ دوڑے۔ زخمی کی کسی نے مدد نہیں کی۔ وہ خود اُٹھا اور ایک ٹانگ پر اُچھلتا ہوا چلاّنے لگا۔ "اوئے مینوں مروا کے نس چلے ہو" (مجھے مروا کے بھاگ رہے ہو)

پولیس بالآخر نور جہاں کے مزار میں داخل ہوگئی۔ ظفر حیات اور اس کے دو ماتحت افسروں نے تینوں سپاہیوں کو ڈھال بنالیا تھا مگر انہیں یقین دلارہے تھے کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ ہم پیچھے ہیں تمہارے اور تمہاری حفاظت کررہے ہیں۔ ماتحت مجبوراً خودکشی کی نیت کرکے اندر داخل ہوئے۔ اس نوکری میں یہی ایک خرابی ہے کہ افسر کے حکم پر آگے جانا پڑتا ہے مرنے کے لیے۔

خلافِ توقع اندر سے کسی نے بھی قانون کے محافظوں کا تمہارے اس نام نہاد صحافی کی نہیں۔ شاعر نے فرمایا ہے۔ ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی۔ کیا سمجھے.... پھر کہا ہے کہ ہیں کواکب کچھ' نظر آتے ہیں کچھ' کیا سمجھے؟"

"جی کچھ نہیں" اس نے سرہلا کے روتی آواز میں کہا۔

"اب بھی کچھ نہیں سمجھے؟ خیر' پھر انتظار کرو۔ دیکھو اور غور کرو۔ سب سمجھ میں آجائے گا بالآخر۔"

"میں کچھ سمجھنا نہیں چاہتا۔ مجھے تو آپ اجازت دیں ورنہ ابھی ٹھاہ سے گولی مجھے بھی لگ جائے گی..."

"دلدل میں قدم رکھنے سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ بعد میں اپنی مرضی سے باہر آنا ممکن نہیں ہوتا' کیا سمجھے... باہر تم اسی صورت میں نکل سکتے ہو جب کوئی تمہارا ہاتھ تھامے اور تمہاری مدد کرے۔ میری مدد کے بغیر تم کوئی حماقت کروگے تو مصیبت میں پڑجاؤ گے۔"

"میں نے..... میں نے کیا کیا ہے؟"

"یہی تو ہوتا ہے دنیا میں۔ جو کچھ نہیں کرتے وہی پکڑے جاتے ہیں۔ اور ان پولیس والوں سے تو خدا بچائے۔ ابھی مجھ سے کہہ کے تم کو گرفتار کرسکتے ہیں کہ گولی تم نے چلائی تھی۔"

خادم حسین اُچھل پڑا "میں نے....! آپ تو گواہ ہیں۔"

"دیکھو یار۔ یہ گواہی وغیرہ تو ہوگی بعد میں۔ اس سے پہلے کیا ہوگا؟ یہ تم نہیں جانتے" میں نے کہا "تم نے میرا راز افشا کیا تو یہ غالب کے ساتھ احسان فراموشی ہوگی۔ اور غالب تمہیں اس پر کبھی معاف نہیں کرے گا۔ اس کے ہاتھ بھی بہت لمبے ہیں اور پولیس تو اس کی مٹھی میں ہے۔ وہ تمہیں دس دیگر مقدمات میں ملوث کرادے گا۔ کیا سمجھے؟ اب تمہیں میں اور صرف میں ہی بچاسکتا ہوں۔ میرے ساتھ رہوگے تو عیش کروگے۔"

"خاک عیش کروں گا۔ میری تو شلوار بھی ناپاک ہوگئی ہے۔ شیطان کے بہکاوے میں آگیا تھا میں۔ لالچ بُری بلا ہے..."

"حوصلے اور صبر سے کام لو خادم حسین اور خدا پر بھروسا رکھو کہ تمہاری نیت صاف تھی تو تمہیں کسی سے نقصان نہیں ہوگا..."

نور جہاں کے مزار کی اینٹوں کا رنگ سُرخ ہوگیا تھا اور فرش پر دم توڑنے والا اب ساکت پڑا ہوا تھا۔ معلوم نہیں وہ کون تھا اور اس نے جانتے بوجھتے اپنی زندگی کو داؤ پر لگایا تھا یا اسے تقدیر نے دھوکا دیا تھا۔ قریب سے دیکھے بغیر اس کی شناخت ناممکن تھی مگر میرا یقین کہتا تھا کہ وہ دلاور کا مہرا تھا۔ بالآخر وہی ہوا تھا جس کا ڈر تھا۔ میں نے دلاور کو فریب دے کر گرفتار کرانا چاہا تھا تو اس نے بھی خلوصِ نیت کا فریب دے کر مجھے مروانے کا پورا اہتمام کیا تھا۔ اگر میں اعتماد کے دھوکے میں اکیلا اندر چلا جاتا تو ملکہ نور جہاں کی آخری آرام گاہ سے سیدھا عالمِ بالا کے سفر پر روانہ کردیا جاتا۔ نیم تاریکی میں چھپا ہوا کسی قاتل کا ہاتھ نظر آنے سے پہلے ہی میرا قصہ

استقبال گولیاں چلا کے نہیں کیا۔ مجھے خاصی حیرانی ہوئی۔ کیا اندر صرف ایک ہی شخص تھا۔ وہ اکیلا تھا تو اس نے فائرنگ کیوں کی تھی اور مقابلے کا آغاز کرنے کا پنگا کیوں لیا تھا؟ اس سوال کا جواب یہی ہو سکتا تھا کہ اسے بھی دھوکے سے مروا دیا گیا تھا۔ شاید اسے کہا گیا ہوگا کہ مزار کے اندر کوئی خطرہ نہیں۔ وہاں اکیلا سکندر بخت آئے گا۔ اگر اس کے ساتھ وہ سرکس کے جوکر آئے جو خود کو ایم آر ایس کے مجاہد کہتے ہیں تو باہر ہم ان سے نمٹ لیں گے۔ ان میں سے کسی کو قریب نہیں پھٹکنے دیں گے۔

ہوا اس کے برعکس یہ تھا کہ ایک آدمی کو وہاں اسی طرح رکھا گیا تھا جیسے شیر کے شکار کے لیے بکرا باندھا جاتا ہے۔ اوپر مچان پر بیٹھے ہوئے شکاری اس کے محافظ نہیں ہوئے۔ یہ شخص مجھے نہ مار سکتا تو خود میرے ہاتھوں مارا جاتا۔ اسے باہر آنا پڑا تو خود چوہدری دلاور اینڈ کمپنی نے اس قربانی کے بکرے کو مار دیا ورنہ وہ پولیس کی تحویل میں بکرے کی طرح چلانے لگتا تو زیادہ خرابی ہوتی۔

ایس پی ظفر حیات اب لاش کا معائنہ کر رہا تھا۔ میری موجودگی اس کے لیے غیر اہم ہو چکی تھی اور اس کا ارادہ ہرگز مجھے شاملِ تفتیش کرنے کا نہیں تھا مگر میں خود ہی خادم حسین کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ خادم حسین کی پوری کوشش تھی کہ شلوار کے گیلے حصے پر کسی کی نظر نہ جائے۔ اس نے جیپ میں رکھے ہوئے پانی کے کین کو منہ لگا کے حلق تر کیا تھا اور اس بہانے تھوڑا سا پانی کپڑوں پر گرا لیا تھا تاکہ سب صرف پانی نظر آئے۔ اندر کا یا باہر کا فرق پتا نہ چلے۔

ظفر حیات نے خاصی ناگواری سے کہا "یہ کیا مصیبت گلے پڑ گئی ہے یار۔ کیا ہر جگہ یہ..... ہمارے سر پر سوار رہے گا۔"

اس کے تجربہ کار ماتحت ڈی ایس پی شاہد علی نے چند نفیس گالیوں سے نواز کے مجھ سے جان چھڑانے کا ایک طریقہ بتایا "سر جی' یہ آیا ہے ولایت سے۔ اس کو تھوڑا سا نمونہ دکھائیں اگر حکم ہو۔"

"کیسا نمونہ؟" ایس پی نے کہا۔

"یہی سر۔ کہ پاکستان میں پولیس کیسے کام کرتی ہے اور کوئی پنگا لے پولیس کے ساتھ تو کیا ہوتا ہے؟"

"دیکھو۔ کوئی بے وقوفی مت کر بیٹھنا" ایس پی نے سخت لہجے میں کہا "پہلے ہی بڑی مصیبت میں ہیں ہم لوگ۔ سارے وکیل مدعی ہو گئے ہیں اور یہ ان سب سے بڑھ کر ہے۔ کڑوا کریلا نیم چڑھا۔ سفیر آ جائے اس کی ایک شکایت پر اور تمہارے ساتھ میری نوکری بھی جائے گی۔"

ڈی ایس پی نے کھنکار کے کہا "وہ۔۔۔ آپ بجا فرماتے ہیں سر۔ لیکن یہ جو مولوی ہے اس کے ساتھ۔۔۔"

ایس پی نے خادم حسین کو غور سے دیکھا "ہاں۔ اسے ذرا طریقے سے سمجھا دینا۔"

ڈی ایس پی مسکرانے لگا "اپنے طریقے سے سر؟"

"شرافت سے۔ بھول جاؤ کہ یہ وکیل پاکستان میں ہے۔ یہ سمجھ لو کہ تم فرانس یا برطانیہ میں ہو۔ جانتے ہو نا وہاں کیا رویّہ ہوتا ہے پولیس کا عوام کے ساتھ۔"

"جی سر" ڈی ایس پی مُردہ آواز میں بولا "مگر یہاں ایسے کون سمجھتا ہے۔ عوام بھی تو ولایتی نہیں ہیں۔"

مشکل خادم حسین کی تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ میں ہر لفظ سمجھ رہا ہوں لیکن پولیس کو یہ بات معلوم نہیں۔ جو کچھ وہ مجھ سے کہیں گے اسے لفظ بہ لفظ صحیح ترجمہ کر کے بتانا ہوگا۔ شاید پولیس اسے مجبور کرے گی کہ اس گورے "وکیل" کو وہی بتاؤ جو ہم کہیں مگر خادم کے لیے یہ ناممکن ہوگا۔ اسے مقامی پولیس کے بارے میں بھی معلوم ہوگا کہ جو ان کی مرضی اور منشا کے مطابق نہ چلے وہ زیادہ دن نہیں چلتا۔

خادم حسین نے فرنچ میں کہا "سُن رہے ہیں آپ موسیو۔۔۔"

میں نے کہا "خادم۔ تم ڈر گئے تو سمجھو مر گئے۔ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بات کرو۔ یہ مجھ سے ڈرتے ہیں اور تم میرے ساتھ ہو۔"

"مگر کتنے دن۔۔۔"

"میں انہیں سمجھا دوں گا کہ تمہارا میرا ساتھ عارضی نہیں ہے۔ بہت لوگ ہیں یار جو تمہاری حفاظت کر سکتے ہیں۔ خدا پر بھروسا ہونا چاہیے تمہیں۔۔۔"

"خدا نے یہ تو نہیں کہا کہ پاگل کُتّے کی دُم کھینچو اور اللہ پر بھروسا رکھو کہ وہ کاٹے گا نہیں۔۔۔"

ایس پی نے ہیڈ آفس سے مزید فورس طلب کی تھی۔ ایک ایمبولینس کے ساتھ جو سائرن بجاتی آگے آ رہی تھی پولیس کے مسلح جوانوں کی پوری پلٹن میدانِ جنگ میں اس وقت پہنچی جب مورچا فتح ہو چکا تھا۔ ایک پولیس مین اور ایک چور کی میت لے کر ایمبولینس واپس چلی گئی۔ ایس پی کے حکم پر تازہ دم فورس نے آس پاس کے علاقے میں کسی مشتبہ افراد کو تلاش کرنے کی رسمی کوشش کی اور ایک مجذوب صفت فقیر کو پکڑنے میں کامیاب رہے۔ مقبرۂ جہانگیر کے اندر ابھی تک خوف و ہراس کی فضا تھی۔ ایس پی نے عقلمندی سے کام لیتے ہوئے اعلان کرا دیا کہ لوگ پریشان نہ ہوں' پولیس کو ایک مفرور مجرم کی تلاش تھی اور وہ مارا جا چکا ہے۔ شہر کی طرف سے آنے والے بیشتر لوگ پولیس کی اتنی نفری دیکھ کے واپس چلے گئے تھے۔ بعد میں آنے والوں کو کچھ معلوم نہ تھا۔ رفتہ رفتہ سڑک پر بھی ٹریفک بحال ہو گیا اور پولیس بھی واپس چلی گئی۔

ایس پی ظفر حیات میرے پاس آیا "خادم۔ اس اُلو کے پٹھے کا کیا خیال ہے؟"

خادم نے گڑبڑا کے کہا "کس معاملے میں سر؟"

"یہاں جو کچھ ہوا اس نے بھی دیکھا تھا' کچھ بولا؟"

"نہیں سر۔ مجھ سے تو کچھ نہیں کہا۔"

ایس پی نے کہا "یہ دلاور کی ٹپ اسے کس نے دی تھی؟"

"ٹپ؟ وہ تو بیروں کو دی جاتی ہے۔"

"بے وقوف۔ اس کو کسی نے بتایا تھا کہ دلاور یہاں ہوگا؟"

میں نے کہا "اس سؤر کے بچّے سے کہو کہ مجھے فرشتے بتا گئے تھے۔"

خادم حسین نے بے بسی سے کہا "ایسی بات میں کہہ سکتا ہوں؟"

"اچھا اسے کہہ دو کہ ہم اپنے ذرائع رکھتے ہیں اور ان کے بارے میں کچھ بتانے کے پابند نہیں" میں نے کہا۔

ایس پی نے سر ہلایا "مگر دلاور تو یہاں نہیں ملا۔"

میں نے کہا "پھر یہ کون تھا؟ دلاور کا ماموں؟"

خادم کی معرفت ایس پی نے جواب دیا "یہ شاید کوئی چور تھا۔ اندر سے مالِ غنیمت بھی ملا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی گروہ تھا جو اپنا مال یہاں چھوڑ گیا تھا۔ ایک شخص چوکیداری کر رہا تھا۔ شاید وہ رات کو کسی وقت آ کے حصے تقسیم کرتے۔"

میں نے کہا "خادم۔ یہ تو بہت ہی چغد قسم کا ایس پی ہے۔ اگر یہ بات تھی تو پھر اسے یہاں پولیس کو چھوڑنا چاہیے جو چُھپ کے نگرانی کرتی رہے اور جب رات کو گروہ کے باقی ارکان آئیں تو انہیں پکڑے۔ اس کے علاوہ مالِ غنیمت کہاں ہے؟"

خادم نے میری بات آگے پہنچائی تو ایس پی کا پارا چڑھ گیا "اس وکیل سے کہو کہ ہر معاملے میں دخل نہ دے۔ ہم اپنا کام جانتے ہیں۔ یہ اپنا کام کرے۔ یہ واپس جائے گا ہمارے ساتھ یا یہیں جھک مارے گا؟"

میں نے مقبرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "خادم۔ اس سے کہو کہ دفع ہو جائے۔ اپنی شکل گم کرے۔ ہم سیر سپاٹا کریں گے۔ نان چھولے کھائیں گے اور واقعی جھک ماریں گے۔"

"پولیس کے جانے کے بعد۔۔۔ کیا ہم محفوظ ہوں گے؟"

"پولیس کی وجہ سے ہی ہم غیر محفوظ تھے۔ اس سے پوچھو کہ یہ کیا جگہ ہے؟ کیا یہ کوئی مسجد ہے؟"

"یہ تو میں بھی بتا سکتا ہوں۔"

"یار خادم۔ خود کو احمق ثابت مت کرو۔ معلوم تو مجھے بھی ہے مگر اس سے پوچھنے کا مقصد کچھ اور ہے۔" میں نے کہا۔

خادم نے مجبوراً پوچھا "سر پوچھ رہے ہیں کہ یہ کیا جگہ ہے۔ کیا یہ کوئی مسجد ہے؟"

"اور تم مجھ سے پوچھ رہے ہو" ایس پی ظفر حیات نے گرج کے کہا "تم خود نہیں بتا سکتے تھے۔ تم تو پیرس میں پیدا نہیں ہوئے تھے گورے کی اولاد۔"

خادم نے ہمت سے کام لیا "گالی مت دیں ایس پی صاحب۔ گورے خنزیر کھاتے ہیں اور میں الحمدللہ ایک دیندار مومن گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔"

"میری طرف سے تم دونوں جہنم میں جاؤ" ظفر حیات نے جیپ اسٹارٹ کی اور مجھ پر ایک قہر آلود نگاہ ڈال کے روانہ ہو گیا۔

"مروا دیا نا آپ نے جناب۔۔۔" خادم بولا۔

"مجھے تمہارا جواب پسند آیا۔ اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی۔ اب تم میرے ساتھ چکڑ چھولے اور نان کا لنچ کرنا چاہو تو مجھے کسی ٹورسٹ گائیڈ کی طرح مقبرۂ جہانگیر لے چلو۔ اور جانا چاہو تو فی امان اللہ۔ غالب سے رابطہ کر کے اسے وہ سب بتا دینا جو تم نے دیکھا تھا۔ باقی کام غالب خود کر لے گا۔"

خادم تذبذب میں پڑ گیا۔ اسے میرا ساتھ دینا بھی اتنا ہی پُرخطر لگتا تھا اور اکیلے واپس جانا بھی۔ مشن کی ناکامی نے مجھے بھی مایوس اور بددل کر دیا تھا لیکن دلاور کو آسان شکار سمجھنا میری غلطی تھی۔ چال چلنے سے پہلے میں نے اپنا دفاع مضبوط کر لیا تھا اور حُلیہ بدل کے یہاں آیا تھا۔ ظاہر ہے میں دلاور پر اعتماد کرتا تو اس حماقت کا خمیازہ بھی مجھے ہی بھگتنا پڑتا۔ کچھ یہی کیفیت دلاور کی تھی۔ وہ بھی محتاط تھا اور جوابی چال چلنے سے پہلے اس نے اپنے تحفظ کا پورا بندوبست کیا تھا۔ بظاہر اب یہ ناممکن سی بات لگتی تھی کہ ہم ایک دوسرے کی زبان کی ضمانت پر اعتبار کرتے ہوئے پھر کسی جگہ ملاقات پر رضامند ہوں اور اکیلے پہنچ بھی جائیں۔

مقبرۂ جہانگیر کی سیر سے مجھے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ میرا ذہن اپنے مسائل میں اُلجھا ہوا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ دلاور کا ہی آدمی تھا جسے خود اس نے یا کسی محافظ نے ہتھیار ڈالنے کے بعد زبان کھولنے کی مہلت نہ دی اور نور جہاں کے مزار سے باہر آتے ہی گولی مار دی۔ شاید یہ بات پولیس انسپکٹر اور ڈی ایس پی نے بھی سمجھ لی تھی۔ ایس پی باہر کا آدمی تھا مگر باقی دو اس کھیل میں شریک سمجھے جا سکتے تھے۔ خاموش تماشائی بھی غیر جانبدار بہرحال نہیں ہوتا' یہ الگ بات ہے کہ مصلحت کے باعث وہ جذبات کا اظہار نہ کرے۔ پولیس پھر کیسے جانبداری کے ساتھ تفتیش اور حصولِ انصاف کے عمل کو آگے بڑھانے کا دعویٰ کر سکتی ہے۔ زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو۔ خلقت فریاد کناں ہے کہ ظالم اور طاقتور' بااثر اور بدمعاش کا پلڑا صرف انہی کے دم سے بھاری ہے۔

ایس پی ظفر حیات کی کہانی میں بڑا جھول تھا۔ پولیس کی گولی کا نشانہ بن جانے والا کوئی چور نہیں ہو سکتا تھا۔ نہ وہاں سے مالِ غنیمت برآمد ہوا تھا اور نہ وہ چوروں کے مال کی حفاظت کر رہا تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو پولیس والے کب وہاں سے ٹلتے۔ وہ رات تک اور پھر اگلی صبح تک انتظار کرتے کہ باقی چور بھی آئیں تو وہ اپنا حصہ وصول کریں۔ لیکن وہ ایک لاش لے کر خاموشی سے چلے گئے تھے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ظفر حیات نے اس کہانی پر اعتبار کیا اور یہ سمجھ لیا کہ میں بھی اس کہانی کو من و عن تسلیم کر لوں گا۔ نہیں۔۔۔ اس میں کہیں کچھ گڑبڑ ہے۔ شاید انسپکٹر کو یا ڈی ایس پی کو پہلے سے معلوم تھا یا پھر وہ میری بات سے اندازہ کر چکے تھے کہ دلاور کا یہاں

ملنا بعید از امکان نہیں۔ وہ ہلاک ہونے والے کو بھی جانتے تھے چنانچہ وہ لاش لے کر جلد از جلد رخصت ہو گئے۔ انہوں نے دلاور کو نکل جانے کا موقع فراہم کیا۔ آج تک وہ دلاور کی غیر قانونی سرگرمیوں میں اس کے معاون اور مددگار تھے اور اس اعانتِ مجرمانہ کا جتنا معاوضہ انہیں دلاور جیسے مجرموں سے ملتا تھا اس کا ہزارواں حصہ بھی سرکار بطور تنخواہ نہیں دیتی تھی۔ حکومت سے زیادہ وہ دلاور اینڈ کمپنی کے ملازم و نمک خوار تھے چنانچہ آزمائش کی گھڑی میں وہ فرض شناسی سے زیادہ ذاتی وفاداری کو اہم سمجھتے تھے۔

آج کل دلاور کی تقدیر بھی گردش میں تھی۔ اس پر برا وقت آیا ہوا تھا اور وہ روپوشی پر مجبور تھا ورنہ پولیس کے لیے گرفتاری کی رسمی کارروائی لازمی ہو جاتی۔ دلاور گرفتاری سے یا سزا سے نہیں ڈرتا تھا۔ وہ بدنامی سے اور بدنامی کی تشہیر سے ڈرتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ہم کب سے اسی انتظار میں ہیں کہ پولیس اسے ہتھکڑیاں پہنانے پر مجبور ہو اور پریس فوٹو گرافرز اس کی زندگی کے ایک ناقابل فراموش لمحے کا عکس اپنے کیمروں میں محفوظ کر لیں۔ اس کی تصاویر نمایاں طور پر شائع کرائیں اور باتصویر پوسٹر شہر کی گلیوں میں پھیلا دیں۔ اس کی سطح عام مجرموں سے بہت بلند تھی جو ہر روز حوالات میں جوتے کھاتے نظر آتے ہیں۔ دلاور کی سطح کے مجرم تو ہمارے معاشرے میں معزز ہو جاتے ہیں اور اتنے طاقتور کہ کسی کو ان کی طرف انگلی اٹھانے کی جرات نہیں ہوتی۔

میں نے اچانک کہا "خادم، ہم یہاں کیا کر رہے ہیں؟" خادم اچھل پڑا۔ اس کے اعصاب خاصے کمزور تھے یا وہ پولیس ایکشن سے بہت ڈرا ہوا تھا۔

"اتنی دیر سے آپ مقبرۂ نور جہاں کو گھور رہے تھے۔ میں تو سمجھا کوئی عمل کر رہے ہیں۔"

"عمل کی گھڑی آ گئی خادم حسین۔ آؤ ہم نور جہاں سے معافی مانگتے ہیں۔"

خادم حسین بھونچکا رہ گیا "نور جہاں سے! آپ کا مطلب ہے وہ جو ملکۂ ترنم ہیں... مادام...؟"

"نہیں یار! ملکہ نور جہاں کی روح سے۔ میں سخت شرمندہ ہوں کہ میری وجہ سے مزار پر گولیاں چلیں۔ پھول نہیں بکھیرے گئے۔"

"آپ.... معافی مانگ کے آ جائیں۔ میں یہیں ٹھیک ہوں۔"

"کیا تم نے کبھی نور جہاں کے مزار کو اندر سے دیکھا ہے؟ نہیں دیکھا ہو گا۔ کوئی بھی نہیں جاتا اس کھنڈر میں۔ آہ.... جہانگیر کے دل پر کیا گزرتی ہو گی۔ وہ ہند پر حکومت کرتا تھا اور نور جہاں اس پر حاکم تھی...."

"جی نہیں۔ مجھے تو آپ معاف ہی رکھیں۔ میں چلتا ہوں" اس نے قریب آنے والے ایک رکشا کو روکا اور اس میں بیٹھ کے فرار ہو گیا۔

میں نے دونوں ہاتھ پتلون کی جیب میں ڈال کے سیٹی بجاتے ہوئے مقبرے کی طرف چلنا شروع کیا۔ میرا دایاں ہاتھ اس ریوالور کی سختی اور ابھار کو محسوس کر سکتا تھا جو پتلون کی بیلٹ سے بندھا تھا مگر کوٹ نے اسے چھپا رکھا تھا۔ اپنے انداز و اطوار سے اور ... سے میں پاکستانی کم اور غیر ملکی سیاح زیادہ نظر آتا تھا۔ پولیس ایکشن کے دوران میں نے خود کو بالکل الگ اور بہت دور رکھا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ کسی نے مجھے ظفر حیات سے باتیں کرتے دیکھا ہو گا تو یہی سمجھا ہو گا کہ میں محض تجسس سے مجبور ہو کے اس ہنگامے کا سبب دریافت کر رہا ہوں۔ میں ایس پی ظفر حیات کے ساتھ اس کی جیپ میں یہاں آیا ضرور تھا مگر واپس اس کے ساتھ نہیں گیا تھا۔ میرے لیے یہ کہنا آسان تھا کہ میں نے اس سے لفٹ لی تھی یا یہ کہ میں اسلام آباد سے اس کے ساتھ آیا تھا۔ میں یہاں کے آثار قدیمہ دیکھ رہا تھا اور وہ اپنا کام کر رہا تھا۔

مقبرے کے باہر مارے جانے والے ایک مجرم کے خون کی لالی اب ماند پڑ رہی تھی اور اس کا رنگ سیاہ ہونے لگا تھا۔ مجھے پھر حیرت ہوئی کہ پولیس نے اس کیس میں کتنی کم پیشہ ورانہ دلچسپی لی تھی بلکہ اسے کوئی واردات ہی نہیں سمجھا تھا۔ جیسے وہ حادثے میں مرنے والے کی لاش اٹھا کے لے جاتے ہیں ایسے ہی ایک مجرم کی لاش لے کر چلے گئے تھے حالانکہ اس مجرم کا قاتل بھی کہیں آس پاس ہی موجود تھا۔ اگر وہ پولیس کی گولی سے مارا جاتا تو اور بات تھی مگر مجرم نے تو خود ایک پولیس والے کی جان لی تھی۔ ایک پولیس مین کے قاتل کو کس نے مارا تھا اور کیوں؟ اس سوال کو نہ ڈی ایس پی نے اہمیت دی تھی اور نہ ایس پی نے۔ کیا اس کا مطلب یہ نکالا جا سکتا ہے کہ وہ ایسا ہی چاہتے تھے یا سمجھتے تھے کہ ایسا ہی ہو گا۔

یہ بڑا چکرا دینے والا سوال تھا۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا تھا کہ پولیس کو چوہدری دلاور کی اور سکندر کی ملاقات کے وقت اور مقام کا علم تھا۔ دلاور کی حفاظت اس کے اپنے آدمی کر رہے تھے یا خود پولیس والے یا پھر اس کا مقصد سکندر کی گرفتاری ہو گا۔ جب ایک غیر ملکی وکیل کی دخل اندازی کے باعث یہ سازش طشت ازبام ہوئی تو افشائے راز سے قبل ہی معاملے کو دبا دیا گیا۔ انسپکٹر خدا بخش اور ڈی ایس پی شاہد علی کی حد تک پولیس کی ملی بھگت سمجھ میں آتی تھی مگر کیا ایس پی ظفر حیات بھی....؟

میں نے پلٹ کے مقبرے کی پُر آسیب نیم تاریک فضا میں قدم رکھا تو مجھے گرد و غبار، وقت کی یلغار کی شکستگی کا نشانہ بننے والی بھدی دیواروں اور بلند گنبد کی وسعت میں پھڑپھڑاتے پرندوں کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ میرا دل یہ ماننے کو تیار نہ تھا کہ وہاں چور اپنا لوٹا ہوا مال چھوڑ گئے تھے اور ایک محافظ بن گئے تھے۔ وہ مال کیا تھا، کتنا تھا، کہاں تھا؟ یہ سارے سوال بے معنی ہو گئے تھے۔

اچانک میری نظر کاغذ کے ایک پرزے پر گئی۔ سفید اجلے رنگ کا یہ ٹکڑا اس فرسودگی اور کہنگی کی فضا میں یوں لگتا تھا جیسے کوئلوں کے ڈھیر پر سنگ مرمر کا ٹکڑا۔ میں نے اسے اٹھا لیا۔ اس پر

پنسل سے صرف ایک ہی جملہ تحریر تھا "مجھے تم سے یہ امید نہ تھی۔"

میں دلاور کی ہینڈ رائٹنگ کو پہچانتا تھا اور خاصے وثوق سے کہہ سکتا تھا کہ یہ اسی کی تحریر تھی۔ عام آدمی کے لیے یہ کسی محبت کرنے والے کا بے وفا محبوب کے نام آخری پیغام بھی ہو سکتا تھا اور اعتماد کو دھوکا دینے والی محبوبہ پر کسی عاشق کا الزام بھی۔ لیکن میں جانتا تھا کہ پیغام میرے لیے تھا اور خود دلاور نے بھیجا تھا۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ پولیس کے ساتھ میں نہیں آیا مگر وہاں پولیس کو میں نے ہی بھیجا ہو گا۔

سوال یہ تھا کہ پیغام کون لایا۔ دلاور کی یہ تحریر وہاں کس نے چھوڑی تھی۔ میں نے کسی کو بھی آتے جاتے نہیں دیکھا تھا۔ کیا مارا جانے والا ہی دلاور کا نامہ بر تھا یا پولیس کا کوئی اہل کار اس کا ایجنٹ تھا؟ دلاور کو کیسے معلوم ہوا کہ میں ہی پولیس کو لانے کا ذمے دار تھا؟

میں نے کاغذ کے اس پرزے کو جیب میں ڈال لیا اور باہر نکل آیا۔ اب یہاں رکنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میرے ذہن میں ایک ... بیدار ہو گئی تھی کہ کیا میرے اس ... کی تبدیلی کے باوجود دلاور نے مجھے شناخت کر لیا تھا؟ یہ تو ناممکن تھا کہ اسے کسی نے خبردار کر دیا ہو۔ اس راز سے ہم چھ افراد کے سوا کوئی واقف نہ تھا۔ میں اور منظر غالب اور نازد، وقار یوسف اور رابعہ۔ خادم حسین نے شاید دلاور یا سکندر کا نام بھی نہ سنا ہو۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ وہاں میرے علاوہ بھی کوئی ہے اور میں نے پلٹ کے دیکھا تو مجھے یوں لگا جیسے بے خبری میں میرے ہاتھ نے بجلی کے ننگے تار کو پکڑ لیا ہو۔ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر دلاور موجود تھا۔

اگر میرے پیچھے افریقہ کا آدم خور ببر شیر آ جاتا تب بھی میں اتنا حیران و پریشان نہ ہوتا جتنا دلاور کو دیکھ کے ہوا۔ ابھی چند منٹ پہلے میں اندر تھا اور میں نے ہر طرف سے گھوم پھر کے دیکھا تھا۔ میرے سوا وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی روح کی طرح وہ میری نظروں سے اوجھل رہا اور اچانک مجسم ہو کے سامنے آ گیا۔ وہ بہت بڑا ایکٹر، شعبدہ باز، شاطر شکاری سب کچھ تھا اور اس کا شیطانی ذہن ڈرامائی صورت حال پیدا کر کے اپنے حریف پر نفسیاتی غلبہ حاصل کرنے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتا تھا لیکن اس وقت تو دلاور نے جیسے سچ مچ خود کو مافوق الفطرت قوتوں کا مظہر ثابت کر دیا تھا۔

میرا حیرت سے دم بخود رہ جانا ایک فطری سی بات تھی مگر خود دلاور اپنے دائیں بائیں دیکھتا ہوا بڑی بے فکری سے ٹہلتا ہوا آ رہا تھا۔ مجھے سنبھلنے کا موقع مل گیا اور میں نے چند سیکنڈ میں سخت جدوجہد کے بعد چہرے سے حیرانی کے جذبات کو مٹا کے پھر اجنبیت اور بے نیازی طاری کر لی۔

صرف ایک لمحے کے لیے مجھے خیال آیا تھا کہ ...

دبوچ لوں اور اپنی گرفت میں بے بس کر دوں اور پھر اسے ڈھال بنا کے خود بھی نکل جاؤں مگر دوسرے لمحے میں نے اس خیال کو مسترد کر دیا۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ اکیلا ہے یا اس کے محافظ ہر طرف سے خفیہ طور پر اس کی نگرانی کر رہے ہیں۔ میرے پاس تو اپنی گاڑی بھی نہیں تھی کہ میں اسے اٹھا کے گاڑی میں ڈالتا اور بھاگ جاتا۔ یہ عام گزرگاہ تھی اور یہاں کوئی تماشا ہوتا تو خود تماشائی مجھے گھیر لیتے۔

دلاور ٹہلتا ہوا میرے قریب آیا۔ حد سے بڑھا ہوا انداز تغافل ہی اسے شک میں مبتلا کرتا۔ میں نے اسے مسکرا کے دیکھا۔ یہ رسمی خوش اخلاقی کا مظاہرہ تھا۔ کسی اجنبی مقام پر دو ہی افراد ہوں تو وہ ایک دوسرے کو کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں۔ شلوار قمیص کے بجائے دلاور نے سفاری سوٹ پہن رکھا تھا اور سنہرے فریم والے "رے بین" کے سن گلاسز لگا رکھے تھے۔ اس کا ہیئر اسٹائل بھی بالکل بدلا ہوا تھا۔ وہ ہمیشہ سر پر ٹوپی رکھتا تھا مگر آج اس نے کریو کٹ بالوں میں مانگ نکال کے انہیں سلیقے سے جما لیا تھا۔ اس کی بغل میں بیٹن تھی یعنی وہ چھڑی جو سینئر فوجی افسران اور پولیس افسران اپنی اتھارٹی کی سند کے طور پر بغل میں یا ہاتھ میں رکھتے ہیں۔ اس کے جوتے پیٹنٹ لیدر کے تھے۔ اس حلیے میں اگر وہ اپنا تعارف چوہدری دلاور حسین کے بجائے سی ڈی حسین کے نام سے کراتا تو مجھے قطعی تعجب نہ ہوتا۔

"گڈ مارننگ!" دلاور نے لہجہ بدلا تو مجھے وہ محاورہ یاد آیا کہ کوا چلا ہنس کی چال تو اپنی چال بھی بھول گیا۔

میں نے مسکرا کے اس سے مصافحہ کیا "گڈ مارننگ۔"

"تم کون ہو اور یہاں کیا کر رہے ہو؟" دلاور نے حیرت انگیز طور پر انگریزی کا پورا جملہ ٹھیک بولا جس میں گرامر بھی غلط نہیں تھی۔

میں نے اپنی صورت پر بارہ بجائے "پاردن؟" جس کا مطلب تھا کہ میں معذرت چاہتا ہوں۔ فرنچ ڈی اور ٹی کے تلفظ سے نا آشنا ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے فارسی اور عربی بولنے والے۔

اس کی مسکراہٹ غائب ہو گئی "تم انگریزی نہیں سمجھتے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا "نو انگلش۔ فرنچ.... وری لٹل انگلش۔ نی اے تورسٹ" (میں سیاح ہوں، بہت کم انگریزی جانتا ہوں)

"تم نے یہاں کسی کو دیکھا؟" دلاور مطمئن ہو گیا کہ اب اس کی مڈل پاس انگلش کی غلطیاں بھی چلیں گی۔

میں نے مسکرا کے کہا "آئی سی یو۔" (میں تمہیں دیکھ رہا ہوں)

دلاور نے مجھے گھور کے دیکھا "میں سی ڈی حسین ہوں، ایس پی۔"

مجھے بے اختیار ہنسی آئی مگر میں نے ضبط سے کام لیا اور اپنا تعارف کراتے ہوئے پورا فرنچ نام لیا۔

دلاور نے پھر انگریزی کا آملیٹ بناتے ہوئے پوچھا کہ کیا میں نے اس جگہ کسی اور کو بھی دیکھا ہے۔ اشاروں کنایوں سے اس نے میرا قد' حلیہ اور ناک نقشہ واضح کیا اور یہ بھی بتایا کہ وہ ایک خطرناک مجرم ہے۔

میں اسے احمقوں کی طرح دیکھتا رہا اور ایسے مسکراتا رہا جیسے وہ مجھے کوئی لطیفہ سنا رہا ہے۔ دلاور پر اب جھنجلاہٹ سوار ہوگئی تھی۔

"کیا مصیبت ہے" اس نے زیرِ لب بڑبڑا کے کہا۔

"پاردن؟" میں نے معصومیت سے کہا۔

"کچھ نہیں۔" دلاور غرایا اور پلٹ کے دوسری طرف چلا گیا۔

میں اسے کن انکھیوں سے دیکھتا رہا اور نورجہاں کے مزار کی بیرونی دیوار کا جائزہ بھی لیتا رہا۔ میں نے اس کے پلاسٹر کا ایک ٹکڑا اٹھا کے دیکھا اور اینٹوں کی چُنائی پر انگلی پھیر کے سہلایا۔ میں چاہتا تھا کہ دلاور مجھے آثارِ قدیمہ پر تحقیق کرنے والا کوئی خبطی اسکالر سمجھ لے جو گھربار اور زندگی کے عیش و آرام چھوڑ کے اسی طرح ہزاروں سال پرانی تہذیب کا سراغ لگانے کے لیے دنیا کی خاک چھانتے پھرتے ہیں۔

دلاور نے بھی روپوشی کے لیے بہروپ اختیار کیا تھا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ وہ پولیس کے خوف سے چُھپتا پھر رہا تھا۔ اسے خطرہ تھا کہ گھر یا دفتر میں پولیس اسے ضرور گرفتار کرلے گی۔ ڈاکٹر شیلی کے قتل کا کیس رابعہ کی اور اس کے ساتھی وکیلوں کی کوشش سے اتنا اوپر چلا گیا تھا کہ اب نہ دلاور کی دولت اسے دبا سکتی تھی نہ پولیس کی حمایت۔ واقعاتی شہادت سے ثابت ہوتا تھا کہ ڈاکٹر شیلی اس کی سوتیلی بہن تھی جسے خود اس نے پاکستان بُلایا تھا۔ ایک سیاہ فام چشم دید گواہ برطانیہ کی جیل میں طویل قید کاٹ رہا تھا جس نے دلاور کو دُہرے قتل کا ارتکاب کرتے دیکھا تھا لیکن بدقسمتی اور حالات کی شہادت نے اسے مجرم بنا دیا تھا۔ یہ دُہرا قتل شیلی کی ماں کا تھا اور ایک لڑکی کا جسے دلاور نے غلطی سے شیلی سمجھ لیا تھا کہ وہ اس سیاہ فام کی گرل فرینڈ تھی۔ وہ سیاہ فام شیلی کی ماں کا تیسرا شوہر تھا۔ ان سب شہادتوں کو مٹانا ناممکن تھا۔ ڈاکٹر شیلی کا قتل دلاور کی سب سے بڑی غلطی تھی جس کی وجہ سے پرانے گڑے مُردے بھی اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ اب یہ دلاور کے لیے صرف غیرت کا نہیں زندگی اور موت کا معاملہ بن گیا تھا کہ وہ ڈاکٹر شیلی کے قتل کا سراغ ملنے سے پہلے مٹا دے۔ یہ اسی صورت میں ممکن تھا جب اسے ڈاکٹر شیلی کی قبر کا سراغ ملے اور وہ قبر میں سے لاش غائب کرادے پھر کوئی کیسے ثابت کرے گا کہ اس نام کی کوئی لڑکی پاکستان آئی تھی اگر آئی تھی تو پُراسرار حالات میں ہلاک ہوگئی تھی اور ان پُراسرار حالات کے پیچھے دلاور کا ہاتھ تھا۔ ڈاکٹر شیلی برطانوی شہریت رکھتی تھی۔ اس لیے تفتیش بھی اہم ہوگئی تھی ورنہ دلاور کے لیے پولیس کی مدد سے رسمی کارروائی کے بعد تفتیش کے لاحاصل نتائج کی رپورٹ حاصل کرنا مشکل نہ ہوتا۔

اگر وہ چاہتا تو اس کیس میں ضمانت قبل از گرفتاری بھی حاصل کرسکتا تھا مگر اسے ڈر تھا کہ کہیں ہم اعلیٰ سطحی دباؤ سے اس کی کوشش کو ناکام نہ کردیں وہ گرفتاری کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔ حالانکہ عدالتِ عالیہ سے اس کی ضمانت منظور ہونے کے امکانات زیادہ تھے۔ قتل خود اس نے نہیں کیا تھا۔ شک یہ تھا کہ جرم اس کے ایما پر اور اس کی اعانت سے ہوا تھا اور اس قتل سے اس کے مخصوص مفادات وابستہ تھے۔ اس کے جرم میں ملوث ہونے سے دنیا کی کوئی عدالت انکار نہیں کرسکتی تھی۔

یہی وجہ تھی کہ اب وہ اسی طرح ایک مفرور مجرم کی زندگی گزار رہا تھا جیسے میں۔ میں تو اب دربدری کی زندگی کا عادی ہوگیا تھا اور میرے ہر کیس میں دلاور نے دھن دھونس اور دھاندلی سے حالات اور واقعات کی شہادت کو اس حد تک مسخ کردیا تھا کہ اب مجھے دنیا کی کسی عدالت سے انصاف کی اُمید نہیں رہی تھی۔ میں نے اپنا معاملہ اس کے سپرد کردیا تھا جو سب سے اوپر ہے اور جس سے نہ ظاہر پوشیدہ ہے نہ باطن۔ دلاور کے لیے خوف اور اذیت' ذلت اور بے بسی کا یہ دور بڑا صبر آزما ثابت ہو رہا تھا جس نے اس سے سب کچھ چھین لیا تھا۔ دولت کی طاقت کا غرور۔ گھر کی راحت اور خون کے رشتوں کی قربت۔ وہ مجبور ہوگیا تھا کہ سر جھکا کے مجھ سے میری شرائط پر مفاہمت کی بات کرے مگر میں اتنی جلدی اسے کیسے بخش دیتا۔ ابھی تو اس کے لیے آزمائش کا عذاب شروع ہوا تھا۔

میری نظر وقفے وقفے سے دلاور کی کیفیت کا جائزہ لے رہی تھی۔ اسے وہاں میری موجودگی سخت ناگوار گزر رہی تھی مگر وہ مجھے حکم نہیں دے سکتا تھا کہ یہاں سے دفع ہوجاؤ۔ اسے یقیناً کسی کا انتظار تھا۔ وہ ادھر منہ کئے کھڑا تھا۔ جدھر شاہدرہ کا ریلوے اسٹیشن تھا اور بار بار گھڑی دیکھتا تھا۔ خوشی مجھے اس بات پر تھی کہ دلاور کی نگاہ میرے میک اپ سے دھوکا کھا گئی اور وہ میرے انداز و اطوار میں بھی سکندر بخت کی جھلک نہ دیکھ سکا۔

زیرِ لب باتیں کرتے اور دیواروں کا بنظرِ غائر مطالعہ فرماتے ہوئے میں گھوم کے دوسری طرف چلا گیا۔ وہاں سے میں بھی شاہدرہ ریلوے اسٹیشن کی جانب دیکھ سکتا تھا۔ مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ایک جھنڈ کے پیچھے گرد سی اُڑی اور کچے راستے پر چلتی ہوئی ایک جیپ نمودار ہوئی۔ اس میں صرف دو ہی افراد تھے۔ ایک ڈرائیونگ کر رہا تھا اور دوسرا اس کے ساتھ بغل مارے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی بغل کے نیچے کسی خودکار مشین گن کو چھپانے کی واجبی سی کوشش ادھوری تھی۔ ڈرائیور پولیس کی وردی میں تھا مگر پولیس والا نہیں تھا۔

میں اتنے کم فاصلے پر تھا کہ ان کی گفتگو صاف سُن سکتا تھا۔

"بہت دیر سے آئے ہو تم لوگ۔" دلاور نے غصے سے کہا "کوئی کام وقت پر بھی کرلیا کرو۔"

"وہ میرا مطلب سمجھ گیا کہ مجھے ٹیکسی چاہیے اور میں ان کے ساتھ مین روڈ تک جانا چاہتا ہوں۔ اس نے سرہلا کے مجھے ساتھ آنے کی اجازت دی میں بغل والے کے ساتھ پیچھے بیٹھ گیا۔

"رات کو کتنے آدمی تھے یہاں؟" دلاور نے پوچھا۔

"نو جناب عالی۔"

"کس وقت آئے تھے؟"

"بس یہی نو بجے۔ ساڑھے نو بجے۔ میں نے خود ان کو اپنی اپنی جگہ پر بٹھایا تھا اور وہ بندے بھی ہوشیار تھے جنابِ عالی۔"

"مزار سے کتنی دور تھے؟"

"آپ نے چالیس پچاس گز بولا تھا۔ سڑک کے پیچھے اور مزار کے پیچھے۔ ایک چوکی سے دوسری چوکی سو گز دور ہوگی۔"

"تمہیں یقین ہے کہ رات یہاں کوئی نہیں آیا؟" دلاور بولا۔

"اگر چوہے کا بچہ بھی نزدیک آتا تو پتا چل جاتا۔ ان کے پاس اندھیرے میں دیکھنے والی دوربین تھی' ہر بندے کے پاس۔"

دلاور نے سرہلایا "اور وہ جاگتے رہے رات بھر؟"

"سونے کا سوال ہی نہیں تھا۔ میں نے سب کو جگانے والی دوائی کی دو دو گولیاں خود کھلادی تھیں۔" بغل والا بولا "اور جنابِ عالی میں خود چوکیداری کرتا رہا۔ چکر لگاتا رہا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ اسے معلوم ہوگیا" دلاور مایوسی سے بولا۔

"[illegible] ہوسکتا تھا جی۔"

"تمہاری طرح بے وقوف نہیں ہے وہ۔ جو بات ہماری عقل میں رات کو آتی ہے وہ دن میں سوچ لیتا ہے اور دن کی بات اسے رات کو پتا چل جاتی ہے۔ میں نے کہا تھا کہ رات ہوتے ہی پہنچ جانا۔ تم تو آئے تھے نو ساڑھے نو بجے" دلاور گرم ہوگیا "مغرب کے بعد نہیں آسکتے تھے؟ اس کے بندے تم سے پہلے موجود ہوں گے۔ اس نے جب مجھ سے بات کی تھی تو اپنے بندے وہاں پہلے ہی بٹھادیے ہوں گے۔ انہوں نے سب کو دیکھا ہوگا اور جا کے بتادیا ہوگا کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔"

میں سپاٹ چہرے کے ساتھ احمقوں کی طرح بیٹھا رہا۔ مین روڈ تک مشکل سے پانچ منٹ کا راستہ تھا مگر پیلی ٹیکسی لاہور جانے والے راستے پر کچھ آگے نظر آئی۔ میں نے گاڑی رکوالی اور خالص فرانسیسی انداز میں مسکراتے ہوئے [illegible] ان کا شکریہ ادا کیا۔ انہیں کیسے معلوم ہوسکتا تھا کہ میں نے انہیں کیسی شاندار گالیوں سے نوازا ہے۔

جیپ مجھے چھوڑ کے آگے بڑھ گئی تو میں نے ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور پیچھے بیٹھ گیا۔ اس کا میٹر ڈاؤن تھا۔

"گاڑی خالی نہیں ہے میں کسی کا انتظار کر رہا ہوں" ڈرائیور نے احتجاج کیا "بندہ سامنے گھر میں گیا ہے۔"

میں نے کہا "گولی مارو بندے کو۔ وہ دوسری ٹیکسی لے لے گا۔"

"سب کا انتظار تھا باس" بغل والا بولا۔

"میری گھڑی کے حساب سے تو۔۔۔" دوسرے نے کہا۔

"دفع کرو اپنی گھڑی کو۔ وہ حرام زادہ نہیں آیا نا۔"

"رپورٹ تو یہی ہے۔" بغل والے نے کہا۔

"پھر پولیس کیسے آگئی تھی یہاں؟"

ڈرائیور نے کہا "یہ اُسی کی کارستانی ہے استاد۔ وہ آپ کو چکر دے گیا۔"

"میری اطلاع کے مطابق تو وہ غائب ہے۔ اس کے ہر ٹھکانے پر میری نظر ہے۔ ہاں اس نے کہیں باہر سے پولیس کو فون کردیا ہوگا۔ مجھے بے وقوف سمجھتا ہے نا۔ ایک بندہ خواہ مخواہ مروانا پڑا مجھے۔ ساری بات مجھے انسپکٹر خدا بخش سے معلوم ہوگئی۔"

"یہ ساری مصیبت ایس پی کی ہے باس۔ وہ بڑا فرض شناس بن رہا ہے۔ کیوں نہ اسے۔۔۔"

"کوئی ضرورت نہیں۔ وہ مجبور ہے۔ اسے ڈراما تو کرنا ہی پڑے گا" دلاور بولا "اس سے کوئی خطرہ نہیں۔"

"آہستہ بولو۔ کوئی ہے یہاں۔"

دلاور نے کہا "کوئی نہیں ہے۔ یہ ہے کوئی پاگل' اردو انگریزی کچھ نہیں جانتا۔"

بغل والے کی آواز مجھے جانی پہچانی لگ رہی تھی۔ غور کرنے پر مجھے یاد آیا کہ وہ ریڈیو آپریٹر تھا جو وائرلیس پر مجھ سے بات کرتا تھا اور پھر دلاور کو پیغام دیتا تھا۔ مجھے یہ اندازہ بھی ہوچکا تھا کہ آس پاس دلاور کے بہت سے مخبر موجود تھے جو میری راہ دیکھ رہے تھے۔ دلاور نے ان سب کے پیچھے بھی اپنے آدمی لگا رکھے تھے جو میرے دوست اور ساتھی تھے۔

جس پرچے پر دلاور نے مجھے ایک سطر کا پیغام دیا تھا وہ میری جیب میں تھا۔ اسے جیب میں رکھنا میری غلطی تھی۔ کسی اجنبی کو جو اردو کا ایک لفظ سمجھتا بھی نہ ہو ایسے کسی رقعے کو اُٹھانے اور سنبھال کر رکھنے کی کیا ضرورت ہوگی۔ اس طرح تو میں خود اپنا راز فاش کرنے کے درپے تھا۔ یہ خیال آتے ہی میں نے وہ رقعہ وہیں ڈال دیا جہاں مجھے نظر آیا تھا۔ ایک طرح سے یہ بروقت ہوا۔

دلاور جیپ میں بیٹھنے ہی والا تھا کہ اسے اپنا چھوڑا ہوا پیغام یاد آگیا۔ وہ لوٹ کے اندر آیا۔ رقعہ وہیں موجود پا کے اسے کچھ مایوسی ہوئی۔ اس نے کاغذ کو اُٹھا کے چرمر کیا اور گولہ سا بنا کے پھینک دیا۔ یہ گولہ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر گرا۔ جب دلاور پلٹا تو میں نے اسے پھر اٹھا کے جیب میں ڈال لیا اور تیزی سے آگے بڑھا۔

"موسیو!" میں نے دلاور کو مخاطب کیا۔

وہ رُک گیا اور ماتھے پر تیوری ڈال کے مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ "کیا بات ہے؟"

میں نے عاجزی اور لجاجت سے کام لیا "ٹیکسی موسیو۔ می وانت۔۔۔" میں نے انگلی سے سڑک کی طرف اشارہ کیا۔

"اور اس کا کرایہ......؟"

"کرایہ میں دوں گا۔ یہ لو..." میں نے جیب سے سو کا نوٹ نکال کے اسے تھماتے ہوئے کہا "اور چاہیے؟ یہ لو۔"

دوسرا نوٹ پکڑتے ہی اس نے ٹیکسی اسٹارٹ کردی "کدھر جانا ہے؟"

"آگے ایک جیپ جارہی ہے۔ اس کا پیچھا کرنا ہے۔ اس طرح کہ انہیں پتا نہ چلے" میں نے کہا۔

اس نے مڑ کے مجھے دیکھا "باؤجی مروا مت دینا۔"

میں نے کہا "خطرے کی بالکل کوئی بات نہیں۔ جیپ دور نہیں گئی ہوگی۔ ان کی رفتار زیادہ نہیں تھی۔ تھوڑی سی کوشش کروگے تو انہیں پکڑلوگے۔ پھر آرام آرام سے پیچھے چلتے جانا۔"

وہ کچھ پریشان تھا۔ "گولی شولی تو نہیں چلائیں گے نا۔ آپ تو پیچھے ہو، پہلے مجھے لگے گی۔"

"یار تم پیچھے آجاؤ۔ میں چلاتا ہوں ٹیکسی۔"

اس نے یہ بھی قبول نہیں کیا "کچھ بتاؤ تو سہی معاملہ کیا ہے؟"

"معاملہ بس یہی ہے کہ وہ جیل سے بھاگے ہوئے ہیں اور حلیہ بدل کے پھر رہے تھے کہ میں نے دیکھ لیا۔ وہ مجھے نہیں پہچانتے۔ میں خفیہ پولیس کا آدمی ہوں۔ شاباش ذرا اسپیڈ لگاؤ گاڑی کو۔"

ڈرائیور کے لیے اب انکار کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ خفیہ پولیس کے نام پر اس نے مجھے پلٹ کے دیکھا ضرور تھا لیکن بے یقینی سے نہیں۔ شاید وہ حیران تھا کہ آخر خفیہ پولیس کا افسر نظر آنے والا بندہ اتنی شرافت سے بات کیوں کررہا ہے۔ دھمکی یا دھونس سے ٹیکسی لے جانے کے بجائے دو سو روپے دے رہا ہے؟ اللہ خیر کرے۔

جیپ مجھے دور سے ہی نظر آگئی۔ ٹیکسی نے راوی کا پل پار کیا تو دلاور کی جیپ موڑ کاٹ رہی تھی۔ میں نے ڈرائیور کو اشارے سے بتادیا۔ "آگے ایک ٹرک ہے۔ اس کے آگے بس، پھر جیپ۔"

"میں نے دیکھ لیا ہے جناب۔ نمبر صاف نہیں ہے لیکن ابھی نظر آجائے گا۔ آپ فکر ہی نہ کرو" اس نے ٹرک کو پیچھے چھوڑ دیا "ہاں..... نمبر ہے.....؟"

میں نے کہا "نمبر سے کچھ نہیں ہوتا۔ جیپ نظر سے اوجھل نہ ہو۔ آگے ٹریفک زیادہ ہوگی۔ اگر انہیں پتا چل گیا کہ کوئی پیچھا کررہا ہے تو وہ تمہیں چھوڑیں گے۔"

"پتا کیسے چل سکتا ہے جناب۔ اتنی گاڑیاں ہیں سڑک پر۔ کیا وہ آپ کو پہچانتے ہیں۔"

"ہاں۔ یہی تو اصل مسئلہ ہے۔"

"بس تو آپ لیٹ جاؤ سیٹ پر اور باقی سب مجھ پر چھوڑ دو۔ میں آپ کو بتاتا رہوں گا۔"

اس کی بات معقول تھی۔ میں نے خود کو سیٹ پر لیٹ کر چھپالیا۔ اب جیپ کا ڈرائیور عقب نما شیشے میں دیکھتا تو اسے پیچھے ایک خالی ٹیکسی نظر آتی۔ ڈرائیور نے رننگ کمنٹری کرتے ہوئے مجھے صورتِ حال سے باخبر رکھا۔ "لوجی داتا صاحب سے جیپ آگے نکل گئی۔ اب جی اردو بازار کے قریب ہے۔ او تیرا بیڑا غرق..... ریڑھا بیچ میں آگیا۔ اس کو دیکھو 'اوئے تیلے پہلوان' موٹر سائیکل الار ہورہی ہے۔ پیچھے بٹھالی ہے ڈھائی من کی بے بے... خود ڈھائی چھٹانک ہے اور چل رہا ہے بیچ میں۔ مرنے کی صلاح ہے کھوتے۔ یہ لوجی، جیپ تو رک گئی ہے عین نعمت کدے پر۔"

میں نے کہا "تم بھی رُک جاؤ۔ اگر یہ لوگ کھانے پینے بیٹھ جائیں تو تم بھی لسّی کا ایک جگ پکڑلاؤ۔ ہم دونوں کیوں بھوکے رہیں۔"

جیپ آدھے گھنٹے بعد پھر روانہ ہوئی اور شاہ عالمی کی طرف سے رام گلی پہنچ کے رُک گئی۔ ٹیکسی ڈرائیور کو اب اس تعاقب میں مزہ آنے لگا تھا۔

"اب کیا کروں جی۔ گلی میں تو ٹیکسی نہیں جاسکتی۔"

میں نے فوراً باہر چھلانگ لگائی "کون سی گلی میں گئے ہیں وہ لوگ؟"

ڈرائیور نے اشارے سے بتایا "جہاں جیپ کھڑی ہوئی ہے۔ اس سے اگلی والی۔"

میں نے کہا "تم انتظار کرسکتے ہو..... اسی جگہ؟"

"کب تک جناب؟"

"زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ ویسے تم ایک پورے دن کا کرایہ مجھ سے وصول کرچکے ہو۔ بلکہ کچھ زیادہ ہی۔"

"کرائے کی بات نہیں جناب" وہ کھسیانا ہوگیا "خالی ٹیکسی دیکھ کے لوگ پریشان کرتے ہیں۔ انکار کرنا بھی مشکل ہوتا ہے اور آپ جیسا کوئی آجائے تو....."

جاتے جاتے میں نے کہا "بتادینا ڈی ایس پی شاہد علی کو لایا ہوں اور انہیں واپس لے جانا ہے۔"

جس گلی کی طرف ڈرائیور نے اشارہ کیا تھا وہ مشکل سے چھ فٹ چوڑی تھی اور اس میں بھی جگہ جگہ دروازوں کے سامنے چبوترے سے بنے ہوئے تھے۔ دلاور اس کے ساتھی غائب ہوگئے تھے اور یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ وہ کس گھر میں داخل ہوئے ہوں گے۔ میں گلی کے آخر تک گیا تو وہ تینوں مجھے دائیں طرف نظر آئے ایک سہ منزلہ عمارت کے سامنے رک کے بکل والے نے گھنٹی بجائی یا شاید دستک دی۔ میں نے عمارت کے محل وقوع کو نوٹ کیا۔ اس کا دروازہ پرانے لاہور کی عمارتوں جیسا تھا۔ باہر سے محرابی اور خاصی بلند چوکھٹ والا۔ اس کے دونوں پٹ سال خوردہ شیشم کی لکڑی کے اور انتہائی مضبوط تھے۔ اڑے ہوئے نیلے رنگ میں ابھرے ہوئے ڈیزائن کے سفید چوکور ٹکڑے بھی میلے نظر آتے تھے۔ اس کے دائیں جانب والے مکان کا بیرونی حصہ غالباً توڑ کے

"میں گلی کے موڑ سے تمہیں بھی دیکھوں گا اور ان پر بھی نظر رکھوں گا۔ ویسے وہ اتنی جلدی شاید نہ آئیں۔ جب یہ کام کرلو تو پھر ٹیکسی لے کر جاؤ" میں نے غالب کے نام اور فون نمبر والی چٹ اسے تھمادی "اخبار کے دفتر۔"

"اس اخبار کا دفتر تو میں نے دیکھا ہے۔"

"وہاں غالب صاحب ہوں گے۔ یا مس نازلی۔ ان کو خاموشی سے بتادینا کہ میں یہاں ان کا انتظار کررہا ہوں۔"

"سب بتادوں انہیں؟"

"سب بتادو... مگر لمبی کہانی مت سُنانا۔ وقت ضائع کئے بغیر انہیں یہاں... لے آنا" میں واپس چل پڑا۔

"اچھا جی۔ بس آپ ان کا دھیان رکھنا، ایسا نہ ہو وہ آجائیں ایک دم اور مار مار کے میری ہڈیاں توڑ دیں۔"

میں گلی کے نکڑ سے دیکھتا رہا۔ ڈرائیور نے بونٹ کھولا اور چند منٹ بعد تار نکال کے بند کردیا۔ اس نے ہاتھ ہلایا اور ٹیکسی میں بیٹھ گیا تو میں پھر اندر کی طرف لپکا۔ مجھے ڈر یہ بھی تھا کہ اتنی دیر میں دلاور گلی کی دوسری طرف سے نہ نکل گیا ہو یا اچانک مجھے سامنے سے آتا نہ دیکھ لے۔ وہ فوراً تاڑ جائے گا کہ میں نے نور جہاں کے مقبرے سے یہاں تک اس کا پیچھا کیا ہے۔

گلی میں خود کو چھپا کے اس دروازے پر نظر رکھنے کے لیے کوئی بھی جگہ نہیں تھی اور بلاوجہ گلی میں کھڑے ہونا یا چہل قدمی کرنا بھی محلے والوں کی نظر میں شک پیدا کرتا۔ ایک گلی میں رہنے والے ایک دوسرے کے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں۔ گھر میں کتنے افراد ہیں۔ وہ کیا کرتے ہیں اور کیا نہیں کرتے۔ ان کی عادات واطوار سے رشتے داریوں تک کا حال پُرانے لوگوں سے پوشیدہ نہیں ہوتا۔ کس کے گھر میں کون لوگ اکثر آتے ہیں، وہ خود کہاں جاتے ہیں۔ ان کے چاچے مامے شہر میں کہاں رہتے ہیں اور بیٹی داماد کا گھر کہاں ہے۔ ایسی صورت میں کوئی اجنبی ویسے ہی سب کی نظر میں کھٹک جاتا ہے اور وہ محلے والوں کے بارے میں سوال کرے کہ اس گھر میں کون رہتا ہے تو سو فیصد مشکوک ہوجاتا ہے۔ مجھے افسوس ہونے لگا کہ یہ کام میں نے اس ٹیکسی ڈرائیور سے کیوں نہیں لیا۔

مشکل کا حل قدرت کے اختیار میں ہے۔ میں گلی کے آخر سے واپس لوٹ رہا تھا کہ ایک دروازہ کھلا اور کسی عورت نے آٹھ دس سال کے ایک بچے کو باہر نکال دیا۔ لڑکا یقیناً حرام خور تھا یا والدہ کے احکامات کی تعمیل اسی طرح مشروط طور پر کرتا تھا۔ خراب لاؤڈ اسپیکر جیسی آواز والی ماں نے چلّا کے اعلانِ عام کیا "جائے گا کیسے نہیں تو سُور دے پتر۔ مامے دی ہٹی تک کام سے جانا پڑے تو بہانے کرتا ہے۔ ویسے سارا دن کھوتے کی طرح گلی میں دوڑتا پھرتا ہے۔ چل جھاڑو لے کر آ نہیں تو آج تیری ٹانگیں توڑ دواں گی۔"

لڑکا باہر بیٹھ گیا "لے آؤں گا۔ ابھی نہیں جارہا میں۔"

نئی طرز کا بنایا گیا تھا۔ اس کی کھڑکیوں کے شیشے بڑے تھے اور باہر گرل تھی۔ دوسری طرف پرچون کی چھوٹی سی دُکان تھی۔ ایسی دُکانیں گلی محلوں میں عام نظر آتی ہیں۔ جہاں پُرانے وقتوں کے بڈھے سستی ٹافیاں ریوڑیاں لٹو اور پتنگ، چورن اور تھوڑا بہت دال چاول یا صابن رکھ کے دکان داری سے زیادہ وقت گزاری کا سامان کرتے ہیں۔

سہ منزلہ عمارت میں مجھے ایک ہی دروازہ نظر آرہا تھا۔ اوپر کی منزل پر دو دو کھڑکیاں تھیں اور یہ اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ پہلے حصے میں مکان کی دیواریں کسی دوسرے مکان کی دیواروں سے ملی ہوئی ہوں گی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ دلاور یا اس کے ساتھی صرف سامنے والے حصے کے واحد دروازے سے ہی آجاسکتے تھے۔

تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا میں پھر سڑک تک آیا جہاں ٹیکسی ڈرائیور گاڑی سے کچھ فاصلے پر یوں بیٹھا ہوا تھا جیسے اس کا ٹیکسی سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔

مجھے دیکھ کے وہ مستعد ہوگیا "کام ہوگیا جناب؟"

میں نے ایک کاغذ کے پُرزے پر غالب کا نام اور اخبار کے علاوہ وقار کے گھر کا فون نمبر لکھا "ایک کام کروگے؟"

"بس جی غلط کام نہ کرائیں مجھ سے۔ میں غریب آدمی ہوں۔"

"غلط کام نہیں ہے" میں نے اسے تسلی دی "انعام بھی ملے گا۔ میں گلی کے اندر موڑ سے ان پر نظر رکھوں گا۔ تم مجھے دیکھتے رہنا۔"

"یہ تو کوئی کام نہ ہوا جی۔"

"پوری بات سُن لو" میں نے کہا "پہلے تو ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے جیپ کو خراب کردو۔"

"ہوا نکال دوں ٹائروں کی؟"

"ایسا کام مت کرو کہ پکڑے جاؤ۔ لوگ پوچھیں گے کہ یہ کیا کررہے ہو پھر؟" میں نے کہا "جیپ کھلی ہوئی ہے۔ تم بونٹ اٹھاؤ اور اندر اس کے کنڈنسر کا تار نکال دو۔ کھینچ کے توڑ دو۔"

"کنڈنسر کہاں ہوتا ہے جنابِ عالی؟"

"کمال ہے۔ ٹیکسی چلاتے ہو اور یہ بھی نہیں جانتے۔ خیر، ڈسٹری بیوٹر کیپ تو دیکھی ہے نا۔ اس میں سے جو تار نکلتے ہیں وہ پلگ میں لگ جاتے ہیں۔"

اس نے سر ہلایا "درمیان والا تار نکال دوں؟"

"نہیں۔ وہ نظر آئے گا نکلا ہوا تو انہیں شک ہوگا کہ کسی نے پنگا لیا ہے۔ پھر وہ ہوشیار ہوجائیں گے اور میں نہیں چاہتا کہ انہیں شک بھی ہو۔ اگر تم غور سے دیکھو گے تو ڈسٹری بیوٹر کیپ پر ہی ایک چھوٹی سی ڈبیا نظر آئے گی۔ ٹیوب لائٹ کے اسٹارٹر جیسی۔ اس کو کہتے ہیں کنڈنسر۔ جو تار اس پر لگا ہوا نظر آئے اسے توڑ کے الگ کردو۔ پتلا سا تار ہوگا۔"

"اگر کسی نے دیکھ لیا تو....."

"ابھی کیوں نہیں۔ آج آنے دے تیرے ابّے کو" ماں مجبور تھی اور گلی میں آکے ناخلف بیٹے کی اصلاح نہیں کرسکتی تھی۔

"نکے والی پتنگ بھی لوں گا میں" لڑکے نے بالآخر شرط پیش کردی۔

"اس طرح بکواس کرنا۔ مگر دیکھ... اس زینب کی ماں سے پھر کہنا کہ ہماری پیالی ان کے گھر میں ہے کب سے.... خود تو کسی کو خیال نہیں آتا کہ برتن واپس کردے۔"

"ماں.... اوپر جانا پڑے گا" لڑکا بسورنے لگا۔

"تو چلا جا۔ تیری ٹانگیں گھس جائیں گی کیا فرید" ماں نے چلّا کے کہا۔

"کھوکھر صاحب کی گھنٹی کرنٹ مارتی ہے۔ دروازہ بجاؤ تو اس کی پاگل ماں کاٹنے کو دوڑتی ہے۔" لڑکا آٹھ آنے کے سکّے کو ٹاس کرنے کے انداز میں اُچھالتا ہوا چل پڑا۔

یہ ساری گفتگو لاہور کی مخصوص پنجابی زبان کے چٹخارے والی تھی جس کا یہاں صرف ترجمہ پیش کیا جاسکتا ہے۔ ہر جگہ زنانہ لغت کے الفاظ میں لہجہ اپنا الگ مفہوم رکھتا ہے۔ میں سرجھکا کے زیرِ لب مسکراتا ہوا گزر گیا لیکن اس گفتگو سے مجھے مفید معلومات اخذ کرنے میں مدد ملی۔ وہ چھوٹی سی دُکان "ماے دی ہٹی" تھی جو غالباً سب سے زیادہ آسان حوالہ سمجھا جاتا ہے کیونکہ ایسی دُکانوں پر سائن بورڈ نہیں ہوتے۔ جب جھاڑو خرید کے لڑکا اسی گھر کے دروازے تک گیا جس میں دلاور اپنے ساتھیوں سمیت داخل ہوا تھا تو مجھے یہ پتا چل گیا کہ وہاں کوئی کھوکھر صاحب رہتے ہیں جن کی بیٹی زینب ہے اور غالباً ایک چڑچڑی بدمزاج ماں۔ مزید یہ کہ ان کی کال بیل میں کرنٹ آتا ہے۔

لڑکے نے غالباً پتنگ مل جانے کی خوشی میں ماں کا دوسرا کام کرنے کا ارادہ کرلیا تھا۔ اس نے گھنٹی کو ہاتھ نہیں لگایا بلکہ جھاڑو سے دبادیا۔ وہ سائنس کے اس بنیادی اصول سے واقف تھا کہ لکڑی میں کرنٹ نہیں آتا۔ دو منٹ بعد کسی نے دروازے کا تھوڑا سا پٹ کھول کے لڑکے سے بات کی۔ لڑکا واپس ہوا ہی تھا کہ میں نے اسے انگلی کے اشارے سے بُلالیا۔ وہ جھاڑو کو تلوار کی طرح لہراتا آگیا۔

"تمہارا نام فرید ہے نا" میں نے دوستانہ لہجے میں کہا "یہ کھوکھر صاحب ہیں نا۔ جن کی لڑکی ہے زینب۔ یہ آج گھر پر کیوں ہیں؟"

"رات کی ڈیوٹی تھی ان کی" لڑکے نے کہا "پھر رات کو جائیں گے۔"

میں نے ایک روپے کا نوٹ نکالا "یہ تمہیں مل سکتا ہے ڈور پتنگ کے لیے۔ پہلے یہ بتاؤ کہ کھوکھر صاحب کے گھر میں کتنے لوگ رہتے ہیں۔"

لڑکے نے پہلے مجھے اور پھر نوٹ کو دیکھا "نیچے وہ خود۔ ان کی گھروالی اور بیٹی... پاگل ماں۔"

"کیا وہ سچ مچ پاگل ہے؟" میں ڈر گیا۔

"اور کیا... اسے تو وہ پاگل خانے میں داخل کرادے۔ ان کی بیوی... لیکن کھوکھر صاحب کہتے ہیں کہ تم بھی ساتھ رہو ماں سے تو پھر ٹھیک ہے ورنہ ادھر باہر بورڈ لگادیتے ہیں پاگل خانے کا۔"

"اوپر کون رہتا ہے؟" میں نے ہنسی ضبط کی۔

"کرائے دار۔ دوسری منزل پر آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ زیادہ دن کوئی نہیں رہ سکتا۔"

"کیوں؟ کیا کھوکھر صاحب تنگ کرتے ہیں؟"

لڑکے نے نفی میں سرہلایا "اوپر جنّات رہتے ہیں۔ جو اُن کی نہ مانے اسے اوپر سے گلی میں پھینک دیتے ہیں۔ ایک عورت کو پھینک دیا تھا۔ ماں کہتی ہے وہ مغرب کے وقت بال کھول کے کوٹھے پر گئی تھی۔ اس سے پہلے ایک ترکھان کو پھینک دیا تھا۔ وہ اُدھر الماری بنا رہا تھا جہاں ایک جن نماز پڑھتا تھا۔"

میں نے اسے روپیہ دے دیا۔ "بیٹا یہ سب فضول باتیں ہیں۔"

"لو جی۔ آپ فضل دین سے پوچھ لو۔ ماے دی ہٹی کے ساتھ والا مکان اس کا ہے۔ کیا آپ کرائے پر مکان لینے آئے ہو؟"

"ارادہ تو تھا..."

"ابھی تو مشکل ہے۔ یہ نئے کرائے دار ہیں۔ یہ خالی کریں تو آپ بے شک آکے دیکھ لینا۔ جن کسی کو نہیں چھوڑتے۔ جب تمہیں اوپر سے نیچے گلی میں پھینک دیں گے تو تمہیں بھی پتا چل جائے گا" اس نے طنز اور تمسخر کے ساتھ کہا۔

میں فوراً واپس ہوگیا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں لڑکا میرے بارے میں اپنی والدہ سے ذکر نہ کردے۔ ایک روپے کی رشوت اس کا منہ بند رکھنے کے لیے تھی۔ کسی اجنبی سے ایک روپیہ لینے پر ماں ضرور اس کو چھینٹی لگاتی مگر وہ روپے کا حوالہ دیے بغیر بھی بات کرسکتا تھا۔

ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ غالب کا آدھے گھنٹے سے پہلے آنا قطعی ناممکن تھا۔ اگر وہ نازو کے ساتھ آفس میں مل جاتا اور وہ فوراً روانہ ہوجاتے تب بھی ٹیکسی کے جانے آنے میں چالیس پینتالیس منٹ سے کم نہیں لگتے۔ ایک گھنٹے میں وہ پہنچ سکتے تھے مگر یہ ایک گھنٹا گزارنا میرے لیے بہت مشکل ہورہا تھا۔ میں اس گھر کے دروازے پر نظر رکھنا چاہتا تھا جہاں جن مالکِ مکان کو کچھ نہیں کہتے تھے مگر کرائے داروں کو بے دخل کرنے کے شوقین تھے۔ عدالت سے بے دخلی کا حکم مل جائے تب بھی پولیس کسی کرائے دار کو کھڑکی کے راستے گلی میں نہیں پھینکتی۔

مجھے کھوکھر صاحب کی شخصیت سے کچھ دلچسپی پیدا ہونے لگی تھی۔ وہ کوئی پُراسرار آدمی تھا۔ رات کی ڈیوٹی تو بہت سے لوگ دیتے ہیں۔ کارخانوں میں رات کی شفٹ ہوتی ہے۔ رات کو ٹرین چلتی ہے اور ہوائی جہاز اُڑتے ہیں۔ مگر کھوکھر کا کردار مشکوک اور تجسس کو بیدار کرتا تھا۔ اس کا گھر آسیب زدہ مشہور تھا اور مجرموں

کے بہت سے ٹھکانے ایسے ہی ہوتے ہیں جہاں عام آدمی قدم رکھتے ہوئے ڈرتا ہے۔ وہ خود اپنے ٹھکانوں کو جن بھوتوں کا ڈیرا مشہور کرتے ہیں اور اس طرح مدافعت کے ڈر سے بے نیاز ہوجاتے ہیں۔ چوہدری دلاور کا اس گھر میں قدم رنجہ فرمانا بھی کھوکھر کے خلاف میرے شکوک کو تقویت پہنچاتا تھا۔

گلی میں بے وجہ ٹھہرنا میرے لیے مسائل پیدا کردیتا۔ مجبوراً میں سڑک پر آگیا جہاں دلاور کی جیپ کھڑی ہوئی تھی۔ کسی وجہ کے بغیر دلاور کا جیپ کو یہاں چھوڑ جانا مشکل ضرور تھا مگر ناممکن نہیں تھا۔ یہ جیپ میں نے اس کے پاس کبھی پہلے نہیں دیکھی تھی۔ یہ ہوسکتا تھا کہ وہ حفاظت کے خیال سے جیپ کو دوبارہ استعمال نہ کرے۔ گلی کی دوسری طرف سے پیدل نکل جائے یا آگے کہیں جاکے اپنی گاڑی میں بیٹھ جائے۔ روپوشی میں آدمی چہرہ اور مقام ہی نہیں گاڑیاں بھی بدلتا رہتا ہے۔

میں جیپ سے اتنے فاصلے پر تھا کہ دلاور اچانک آجاتا تو مجھے دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن میں دل ہی دل میں ڈر رہا تھا کہ ایسی صورت میں میرے لیے تعاقب جاری رکھنا' میرے اختیار کی بات نہیں رہے گی۔ فوراً کوئی ٹیکسی مل گئی اور ڈرائیور نے بھی تعاون کیا تو شاید میں اپنے مقصد میں کامیاب رہوں ورنہ جیپ چلی جائے گی اور جب غالب آئے گا تو میں ٹھنڈی سانس بھر کے ایک شعر پڑھنے کے سوا کچھ نہ کرسکوں گا کہ.... بے بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے۔

چالیس منٹ بعد بھی جیپ وہیں موجود تھی۔ جب ٹیکسی غالب اور نازو کے ساتھ واپس آئی۔ سڑک کے دوسرے کنارے سے میں نے انہیں اشارہ کیا اور خود سڑک عبور کرگیا۔ نازو نے پیچھے والا دروازہ پہلے ہی کھول دیا تھا۔

ٹیکسی ڈرائیور نے مسکرا کے کہا "دیکھا میرا کمال آپ نے سر! کتنی جلدی آگیا۔"

غالب نے کہا "کیا چکر ہے؟"

نازو نے بھی کہا "تم کیا کررہے ہو یہاں؟"

میں نے کہا "میں نے ایک ایسا گھر دریافت کیا ہے جس میں بھوت رہتے ہیں۔"

غالب مسکرایا "میرے سسرال کی بات کررہے ہو؟"

نازو نے مجھے گھورا "یہ بے ہودہ مذاق کرنے کے لیے ہمیں بُلوایا تھا یہاں؟"

میں نے ٹیکسی والے کی طرف دیکھا "تم نے کچھ نہیں بتایا انہیں؟"

"اس نے تو بتادیا تھا اب تم بتاؤ۔"

"تم خالی ہاتھ تو نہیں ہونا؟" میں نے غالب اور نازو کی طرف دیکھا۔

وہ میرا مطلب سمجھ گئے "نہیں گزارا ہوجائے گا۔" غالب نے یوں کہا کہ ٹیکسی ڈرائیور سمجھے ذکر پیسے کا ہے۔

ٹیکسی ڈرائیور کا اب کوئی کام نہیں رہا تھا۔ میں نے اسے سو کا ایک اور نوٹ دیا "تھینک یو" میں نے اس کے کندھے پر شاباش دی "تم نے آج قانون کی مدد کی۔ سب شہری تمہاری طرح تعاون کریں تو اس شہر سے لاقانونیت ختم ہوجائے۔"

اس نے بے حد خوش ہوکے کہا "نہیں جی یہ تو میرا فرض تھا۔" اصل خوشی اسے دو گھنٹے میں تین سو کمانے کی ہوگی۔ یہ اس کی دو دن کی کمائی سے زیادہ رقم تھی۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا ہوگا کہ پولیس نے اسے بیگار میں نہیں پکڑا ورنہ لینے کے دینے پڑجاتے۔ الٹا ہم اس سے کچھ وصول کرلیتے تو اپنی تقدیر کے سوا وہ کس سے شکایت کرتا۔

ٹیکسی ڈرائیور چلا گیا تو میں نے غالب سے کہا "وہ جیپ دلاور کی ہے۔ دلاور اس گلی کے ایک گھر میں چھپا ہوا ہے اور میرا خیال ہے کہ سورہا ہے۔ وہ رات بھر جاگتا رہا ہوگا اُس کے ساتھ اور آدمی بھی ہیں ایک کو میں نے آواز سے شناخت کیا تھا۔ دوسرا بھی کوئی جانثار ہوگا۔"

غالب نے حیرانی سے کہا "دلاور کہاں مل گیا تھا؟"

میں نے مختصراً نورجہاں کے مزار پر پیش آنے والے واقعات کا خلاصہ پیش کردیا "وہاں رات بھر دلاور کے شکاری گھات میں رہے کہ میری بو بھی پائیں تو مجھ پر ٹوٹ پڑیں۔ دلاور ان کی ناکامی پر غصے میں ہے۔ اس کا خیال ہے کہ میں نے پہلے سے اپنے جاسوس وہاں بٹھادیے تھے۔ انہوں نے مجھے فرار کرادیا اور میں ادھر گیا بھی نہیں۔ حالانکہ میں تو پوری بارات لے کر گیا تھا۔ دلاور ذرا دیر سے پہنچا ورنہ آج حوالات میں اس کی سہرا بندی ہوتی۔"

"کیا واقعی اس نے تمہیں نہیں پہچانا؟" نازو بولی۔

"واقعی سے آپ کی مراد کیا ہے؟"

"ممکن ہے وہ نہ پہچاننے کی اداکاری کررہا ہو۔ اسے یہ بھی معلوم ہو کہ آپ اس کے پیچھے تشریف لارہے ہیں۔" غالب بولا۔

"یار آخر وہ آدمی ہے۔ نعوذ باللہ۔ خدا تو نہیں ہے۔ اب یہاں باتوں میں وقت مت ضائع کرو۔ ایسا نہ ہو وہ نکل جائے۔"

"ہم تو ابھی آئے ہیں۔ اتنی دیر میں تم نے کیا سوچا ہے؟"

"میں سمجھتا ہوں کہ دلاور کو پکڑنے کا اس سے اچھا موقع نہ پہلے کبھی آیا تھا اور نہ پھر کبھی ملے گا۔ وہ مطمئن ہے کہ اس کے بارے میں کوئی بھی نہیں جانتا کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔ اس نے

خود کو محصور کرلیا ہے ایک ایسی جگہ جہاں سے اس کا نکلنا بھی آسان نہیں اور اس کے حفاظتی انتظامات بھی ہنگامی صورتِ حال میں ناکافی ثابت ہوں گے۔"

"تمہیں کیا معلوم اندر کتنے لوگ ہیں اور ان کے پاس کتنا اسلحہ ہے؟" غالب نے کہا۔

نازو نے تائید میں سرہلایا "وہ قلعے کے اندر ہیں۔ ہم کھلی جنگ میں براہ راست نشانہ بن جائیں گے۔"

"میں نے کب کہا ہے کہ نعرۂ تکبیر لگا کے حملہ کردو۔ تم آگے جاؤ۔ بائیں طرف تمہیں ایک چھوٹی سی پرچون کی دکان نظر آئے گی جو مامے دی ہٹی کہلاتی ہے اس کے ساتھ والا گھر فضل دین کا ہے۔"

"کون فضل دین؟"

"جانتا تو میں بھی نہیں اسے مگر وہ غالباً پہلے اسی گھر میں رہتا تھا جس میں اب دلاور موجود ہے۔" میں نے کہا "تم دستک دے کر اندر داخل ہو جاؤ۔ کسی عورت کے لئے یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ چند منٹ میں تم گھر والوں کو مجبور کرسکتی ہو کہ وہ خاموش رہیں اور ہم سے تعاون کریں۔ تمہارا کوئی سگنل ملتے ہی میں پہنچ جاؤں گا۔"

نازو نے کہا "میں انگلی منہ میں ڈال کے سیٹی بجاؤں گی۔"

غالب نے افسوس کے ساتھ سرہلایا "تمہارے سب اطوار حد درجہ غیر شریفانہ بلکہ لوفرانہ ہیں۔"

"جب واسطہ تم جیسے بدمعاشوں سے ہو تو شرافت نہیں چلتی۔"

"یہ قربِ قیامت کی نشانیاں ہیں۔ گز بھر کی زبان ہوتی ہے لڑکیوں کی۔" غالب نے توبہ کے انداز میں کانوں کو ہاتھ لگایا۔

میں نے کہا "حد کرتے ہو تم بھی۔ مجھے فکر ہے کہ بنا بنایا کھیل نہ بگڑ جائے تم آپس میں لڑ رہے ہو۔"

نازو نے کہا "سوری۔ میرے سگنل پر تم اندر آگئے.... پھر؟"

"پھر اس گھر کے مکینوں سے میں نمٹ لوں گا۔" میں نے کہا "تم پہنچ جاؤ دوسری طرف۔ جس گھر میں دلاور ہے اس میں کوئی کھوکھر صاحب رہتے ہیں۔ کھوکھر صاحب کے دوسرے پڑوسی کون ہیں۔ یہ مجھے معلوم نہیں مگر تم کسی بھی بہانے اندر پہنچ سکتی ہو۔ پوری کوشش کرنا کہ ہنگامہ آرائی نہ ہو۔ عورتیں اور بچے خوف زدہ ہوکے چلانے نہ لگیں۔ انہیں سمجھا دینا کہ تمہارا ارادہ کسی کو نقصان پہنچانے کا یا لوٹ مار کرنے کا نہیں ہے۔ اس کے باوجود کوئی مردانہ وار سامنے آئے تو اسے خاموش رکھنے کے لئے تم ہاتھ کی صفائی دکھادو یا ریوالور.... یہ تمہاری مرضی ــ کام مکمل ہو جائے تو یہ گھر غالب کے حوالے کردینا اور خود باہر آکے سامنے سے ناکا بندی کرنا۔ میں اور غالب دو طرف سے کھوکھر کے گھر میں داخل ہونے کی کوشش کریں گے۔ عین ممکن ہے دلاور مقابلہ نہ کرے اور فرار ہونے کی کوشش کرے۔ فرار کے لئے صرف سامنے کا راستہ ہے۔ تمہارے لئے گلی میں یا دروازے پر کھڑا رہنا مشکل ہوگا۔ تمہارے لئے ایک محفوظ مقام تو مامے دی ہٹی ہے لیکن وہ بڈھا شاید نہ مانے کہ تم اس کی دکان میں مورچا بناؤ۔ وہاں لوگوں کی آمد و رفت رہتی ہے۔ اس نے کسی سے بھی کچھ کہہ دیا تو بات پھیل جائے گی اور وہاں مجمع لگ جائے گا۔ بہتر ہے کہ تم کھوکھر کے گھر کے بالکل سامنے والے گھر میں اپنی جگہ بناؤ جہاں سے تم دروازے پر نظر رکھ سکو اور ضرورت پڑنے پر دلاور کا راستہ بھی روک سکو۔"

نازو کچھ پریشان نظر آنے لگی "یکے بعد دیگرے تین گھروں میں گھس کے سارے گھر والوں کو قابو میں رکھنا مشکل ہوگا۔ کیا پتا کون کہاں ہو۔ ہمیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ کسی گھر میں عورتوں بچوں اور مردوں کی تعداد کیا ہے۔ کوئی شکاری بندوق ہی لے کے آگیا تو!"

میں نے کہا "میں تمہیں سائیلنسر والا ریوالور دیتا ہوں۔ ویسے تو تم خالی ہاتھوں سے کسی بھی پہلوان کو لمبا لٹا سکتی ہو مگر مقابلے پر کوئی آتشیں اسلحہ اُٹھالے تو اسے بلا تکلف گولی مار دینا۔ بس اتنا خیال رکھنا کہ گولی چلانے کا مقصد اس کی جان لینا نہ ہو۔ یہ ایک فیصلہ کن معرکہ ہے نازو اور اس میں سب سے اہم کردار تمہارا ہے۔ اگر تم نے کامیابی سے پہلا مرحلہ طے کرلیا تو دوسرا مرحلہ بہت اسان ہو جائے گا۔"

"ہاں دوسرے مرحلے میں ہم سب اللہ کو پیارے ہو جائیں گے یا پولیس کو...."

میں نے کہا "دوسرے مرحلے میں ہم کوشش کریں گے کہ دونوں طرف سے کھوکھر کے گھر میں داخل ہو جائیں۔ چھت پر پہنچ جائیں اور زینے کے راستے نیچے جاکے بے خبری میں دلاور کو گرفتار کرلیں۔ اسے مہلت ہی نہ دیں مقابلے کی لیکن وہ مرنے مارنے پر آمادہ ہو تو پھر رعایت ہماری طرف سے بھی نہیں ہوگی۔"

"فائرنگ ہوئی تو محلے میں کھلبلی مچ جائے گی۔"

"مرزا جی اس کے بعد جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ بندوق کی گولی کے سامنے کوئی نہیں ٹھہرتا۔ ہم دلاور کے ساتھ نکلیں گے اور اپنا راستہ خود بنائیں گے۔ صرف سڑک تک پہنچنے کی بات ہے۔ اس کے بعد جو پہلی گاڑی نظر آئے گی وہی ہمارے کام آئے گی۔ یہ ایک کمانڈو ایکشن ہے۔ خاموشی سے ہم نے مقصد میں کامیابی حاصل کرلی تو ٹھیک ہے ورنہ جتنی خرابی ہو منظور۔ نیت یہ ہے کہ ایک کو بھی نہ مارنا پڑے مگر ناکامی سے بچنے کے لئے جو بھی راہ میں حائل ہو اسے ماردو۔ اس سے پہلے کہ وہ تمہیں مارے۔ جنگ کا اصول یہی ہے۔ تذبذب اور سوچ بچار کی کوئی گنجائش نہیں۔ رانی۔"

نازو نے مسکرا کے سرہلایا "میں جاتی ہوں۔"

"جاؤ اگلے جہاں میں ملاقات کی اُمید مت رکھنا۔" غالب بولا "اس جہاں میں کافی بھگت لیا ہے تمہیں۔"

"ابھی تو ساری عمر بھگتو گے۔" نازو نے ہنس کے کہا "اتنی آسانی سے پیچھا چھوڑنے والی نہیں ہوں۔"

"آخر ہونا بھوت کی بچی۔"

نازو سڑک عبور کرگئی تو میں نے کہا "مرزا جی۔ ہم پلاننگ کوئی نہیں کرسکتے۔ نہ مجھے معلوم ہے نہ تمہیں کہ پڑوسی کے گھروں کا نقشہ کیا ہے اور وہاں سے ہم درمیان والے گھر کی چھت تک کیسے جائیں گے۔"

"اللہ مالک ہے۔" غالب بولا۔

"ہاں اپنی اپنی عقل سے وسائل اور ذرائع پیدا کرنا ہی اصل آزمائش ہے اگر تم دشمن کے علاقے میں پہلے اتر جاؤ تو میرا انتظار کرنا۔ اور اپنے پیچھے ایسا انتظام کرکے آنا کہ بعد میں بھی گڑبڑ نہ ہو۔"

پانچ منٹ بعد میں بھی سڑک پار کرکے گلی میں داخل ہوگیا۔ میرے اندازے کے مطابق نازو کو پانچ سے دس منٹ کا وقت درکار ہوسکتا تھا۔ آہستہ آہستہ میں نے وہ فاصلہ طے کیا جو مشکل سے سو گز تھا۔ میرے کان نازو کی سیٹی کی آواز پر تھے۔ مامے دی ہٹی کے سامنے میں شش و پنج میں پڑگیا کہ آگے جاؤں یا چند منٹ انتظار کروں۔ اس چھوٹی سی نیم تاریک اور اُجڑی ہوئی دکان پر ایک گم صم بڈھا مسلسل کھانستے ہوئے حقے کے کش لے رہا تھا۔ اس نے مجھے تیسری بار زیادہ غور سے دیکھا۔

"ہاں جی کس کو دیکھ رہے ہو؟" اس نے کھانستے ہوئے سوال کردیا۔

میں اس کے قریب چلا گیا "بابا جی کئی سال پہلے میں آیا تھا یہاں اب مکان بھول گیا ہوں۔"

"نام بتاؤ مجھے۔ میں تو یہیں پیدا ہوا تھا اور یہیں مروں گا۔ مجھے سب کا پتا ہے۔ ان کا بھی جو مرگئے میرے سامنے۔"

میں نے کہا "فضل دین۔"

"کون فضل دین؟ ایک تو یہ اپنے ساتھ ہے۔ بڈحرام چرسی۔ اس کا باپ لوکو شاپ میں تھا نا؟"

اسی وقت نازو کی سیٹی سنائی دی۔

میں نے کہا "ہاں مگر یہ گھر تو نہیں تھا اس کا۔"

مامے نے کہا "ٹھیک کہتے ہو تم بھی۔ پہلے یہ کھوکھر کے گھر میں تھے۔"

"اچھا جی بڑی مہربانی۔" میں نے سلام کے انداز میں ہاتھ اُٹھایا اور ساتھ والے گھر کا دروازہ کھول کے اندر چلا گیا۔

وہ میرے اندازے کے مطابق پانچ چھ مرلے کا گھر تھا۔ مختصر صحن کے دائیں جانب ایک کمرا تھا اور سامنے دو کمروں کے دروازے نظر آرہے تھے۔ بائیں طرف شاید باورچی خانہ اور غسل خانہ وغیرہ تھے۔ نازو کی اواز پر میں سیدھا گزر گیا۔ سامنے والے ایک کمرے کے پیچھے مجھے تیسرے کمرے کا دروازہ نظر آیا۔ یہ کمرا اتنا تاریک تھا کہ وہاں دن میں بھی بلب جل رہا تھا۔ اندھیرے کے علاوہ اس میں سیلن تھی اور گھٹن محسوس ہوتی تھی۔ فرش پر ایک نوجوان اوندھا پڑا ہوا تھا۔ ایک حد سے زیادہ صحت مند عورت چارپائی پر چت لیٹی چھت کو دیکھ رہی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ نیچے لٹکا ہوا تھا اور وہ بے ہوش ہونے کی کوشش کررہی تھی۔ تیسری عورت عمر رسیدہ تھی جو دیوار سے ٹیک لگائے خاموش کھڑی آنسو بہا رہی تھی۔ اس کے دائیں بائیں دو بچے تھے۔ لڑکا شاید دس بارہ سال کا تھا۔ لڑکی عمر میں اس سے کچھ کم لگتی تھی۔

نازو نے میری سوالیہ نظروں کے جواب میں کہا "میں نے کچھ نہیں کیا۔ یہ لڑکا فضل دین ہے۔ اس نے شور مچانے کی کوشش کی تھی۔ یہ بیوی ہے اس کی۔"

دُبلے پتلے اور بیمار نظر آنے والے فضل دین کی بیوی کا وزن کسی طرح بھی دو سو پاؤنڈ سے کم نہ تھا۔ اس کی عمر زیادہ نہیں ہوسکتی تھی کیونکہ خود فضل دین نوجوان تھا۔ اس کے بارے میں مجھے معلوم ہوچکا تھا کہ وہ بڈحرام ہی نہیں چرسی بھی ہے۔ شاید چرس کے نشے نے ہی اس کی صحت کو گھن کی طرح چاٹ لیا تھا۔

"آپ فضل دین کی ماں ہیں؟" میں نے احترام آمیز لہجے میں کہا "یہ دونوں آپ ہی کے بچے ہیں؟"

اس عورت نے اقرار میں سرہلایا "ہمارے پاس کچھ نہیں رہا اب تو۔"

میں نے نرمی سے کہا "آپ پریشان نہ ہوں۔ ہم چور ڈاکو نہیں ہیں۔ نہ ہم کسی کے ساتھ کوئی زیادتی کرنا چاہتے ہیں۔"

"پھر اس طرح میرے گھر میں داخل ہونے کا کیا مقصد۔ اگر فضل دین نے قرض لیا ہے تم سے تو میری چوڑیاں لے لو۔ میں کیا کروں آخر۔ میری تو زندگی عذاب میں ہے۔ روز کوئی آجاتا ہے۔"

میں نے اسے روک دیا "خدا فضل دین کو نیک ہدایت دے۔ مجھے قرض وصول کرنا ہوتا، تب بھی کسی ماں کے ہاتھوں سے چوڑیاں میں نہیں اُتروا سکتا تھا۔ اپنی بہو سے کہیں کہ مکر چھوڑے اور سیدھی بیٹھ جائے ورنہ یہ لال بیگ چھوڑتا ہوں میں اس کی شلوار میں۔"

لال بیگ کہیں نہیں تھا مگر میری دھمکی کام کرگئی۔ وہ ایک چیخ مار کے اُٹھ بیٹھی "ہائے میں مرجاؤں گی۔ اُف ارے کوئی مجھے پانی پلادو۔"

میں نے غرا کے کہا "لگتا ہے لال بیگ تمہارے حلق میں ڈالنا پڑے گا۔ خبردار جو اب آواز نکالی۔"

وہ چپ ہوگئی۔ اس کا گوشت کے پہاڑ جیسا جسم یوں لرز رہا تھا جیسے زلزلے سے چارپائی ہل رہی ہو۔

میں نے کہا "ہم خفیہ پولیس کے لوگ ہیں۔ تمہارے ساتھ والے گھر کی نگرانی کررہے تھے۔ اس میں کچھ جرائم پیشہ لوگ رہتے ہیں۔ تمہیں کچھ معلوم ہے؟"

عمر رسیدہ عورت نے سرہلایا "لوگ کہتے ہیں جی...."

"کیا کہتے ہیں؟" میں نے کہا۔
"یہی کہ اس گھر میں جنات ہیں۔ آوازیں آتی ہیں عجیب و غریب۔"
"یہ سب کھوکھر کا ڈراما ہے۔ اصل کام کچھ اور ہوتا ہے یہاں۔"
"یہ جعلی نوٹ بناتے ہیں یہاں۔" موٹی عورت نے کہا۔
ساس نے اسے گھورا "ایسے ہی نہیں بولا کرتے۔ تُو نے دیکھا ہے؟"
"تو دیکھا نہیں تو کیا۔ فضل دین کہہ نہیں رہا تھا۔" بہو بولی۔
"میرے بیٹے کا نام مت لے خواہ مخواہ....."
میں نے ساس بہو کی لڑائی ختم کرائی "ہم خود پتا کر لیں گے آج۔ ہم نے ہر طرف سے انہیں گھیر لیا ہے۔ سب گرفتار ہو جائیں گے تھوڑی دیر میں لیکن آپ لوگ صرف اتنا کرو کہ خاموش رہو۔ گھر سے باہر کوئی نہیں جائے گا۔ گھر کے اندر آرام سے جو چاہو کرو۔ ہم اوپر جا کے ساتھ والے گھر کی چھت پر اُترنا چاہتے ہیں۔"
"یہ تو بڑا مشکل ہے۔" موٹی پھر بولی "ہمارا مکان دو منزلہ ہے۔ کھوکھر کا تین منزلہ۔ ویسے چھت پر سیڑھی رکھی ہے۔"
"ہم سیڑھی کے بغیر بھی چڑھ جائیں گے۔ تم چلو مجھے راستہ دکھاؤ۔"
"ہائے میں مرگئی۔" اس نے سینے پر دونوں ہاتھ رکھ لئے "میں کیسے جا سکتی ہوں تمہارے ساتھ۔ اماں کو لے جاؤ۔"
میں نے آنکھیں نکال کے کہا "سیدھی طرح چلو گی یا میں گلے میں رسّی باندھ کے گھسیٹتا ہوا لے جاؤں۔"
وہ فوراً کھڑی ہو گئی۔ اوپر جانے والا زینہ قدرے تنگ تھا۔ اس کے پیچھے چلتے ہوئے میں ڈرتا رہا کہ کہیں اس کا پیر پھسل گیا تو واپس نیچے جاتے ہوئے وہ مجھ پر سے گزرے گی اور مجھے روڈ رولر کی طرح چپٹا کر جائے گی۔ وہ ہانپ رہی تھی اور خوف سے بھی اس کے گھٹنے کانپ رہے تھے۔
دوسری منزل برآمدے اور ایک ہال جیسے طویل کمرے پر مشتمل تھی۔ ہال کی چھت تک پہنچنے کے لئے لکڑی کا زینہ استعمال ہوتا تھا۔
"اسے تم اوپر کھینچ سکتے ہو۔" موٹی عورت نے مجھے بتایا لیکن یہ بات میرے ذہن میں پہلے سے موجود تھی۔
اخلاقاً میں نے کہا "جتنی موٹی تم خود ہو اتنی موٹی عقل نہیں ہے تمہاری۔ تم نے کہا تھا کہ یہاں جعلی نوٹ چھاپے جاتے ہیں اور کیا ہوتا ہے؟"
اس نے سوچ کے کہا "اور عورتیں آتی ہیں یہاں۔"
"عورتیں ہر گھر میں آتی ہیں۔"
"وہ میرا مطلب تھا۔ وہ شریف عورتیں نہیں ہوتیں۔"
"یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"
"فضل دین بتاتا ہے مجھ کو۔ اس کی ایک بہن بھی تھی اس پر جن عاشق ہو گئے تھے۔ جنات نے اسے شام کے وقت کھلے بالوں کے ساتھ دیکھ لیا تھا۔ اسی لئے تو کہتے ہیں کہ شام کے وقت نہانا نہیں چاہئے۔ خاص طور پر منگل کو۔ وہ منگل کی رات تھی جب اسے جنات نے تیسری منزل کی کھڑکی سے باہر پھینک دیا تھا۔" اس نے توبہ توبہ کرتے ہوئے دونوں پھولے ہوئے گالوں کو ہاتھ لگایا "بڑی بُری حالت تھی اس کی۔ تن پر ایک لیر بھی نہیں تھی۔ تڑپ تڑپ کے مرگئی سب کے سامنے۔"
اس کے عقائد اور نظریات سے اختلاف کیا جا سکتا تھا جو مبنی برجہالت تھے مگر اس واقعے کی ایک اور شہادت مل گئی تھی جس کا حوالہ سب سے پہلے آٹھ دس سال کے ایک بچّے نے دیا تھا۔
"یہ کتنی پُرانی بات ہے؟" میں نے کہا۔
"میری شادی سے پہلے کی۔ میری ساس کو مت بتانا کہ میں نے تم کو کچھ بتایا ہے۔" وہ بولی "سُنا ہے اس نے بیٹی کی شادی کھوکھر سے کی تھی اور بدلے میں یہ مکان اپنے نام لکھوا لیا تھا۔ اس کا شوہر یہ محلّہ ہی چھوڑ کے چلا گیا تھا اور لوٹ کے نہیں آیا مگر یہ بے حیا رہتی ہے اسی گھر میں۔ اچھا اب میں جاؤں؟"
"ہاں مگر دیکھو۔ خیال رکھنا کہ شور شرابا نہ ہو۔" میں نے لکڑی کا زینہ اوپر کھینچ لیا۔
زینے کے تختے چھ انچ چوڑے تھے۔ یہ تقریباً تیس درجے کے زاویے پر رکھا ہوا تھا۔ میں نے اسے نسبتاً سیدھا اور عمودی رکھا اس طرح سب سے اوپر والے تختے پر قدم جما کے میں کھوکھر کے مکان کی منڈیر تک پہنچ گیا۔ منڈیر پر چار فٹ اونچی دیوار تھی۔ اندیشہ یہ تھا کہ میں نے اس کا سہارا لیا تو اینٹ اکھڑ کے ہاتھ میں آجائے گی اور میں اینٹ سمیت واپس نیچے پہنچ جاؤں گا۔ میں نے احتیاط سے دو انچ باہر نکلے ہوئے کنگورے پر پنجے جمائے اور ہاتھوں کے بل خود کو اُٹھا کے دوسری طرف اُتار دیا۔
مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ آس پاس کی کسی چھت سے کوئی مجھے دیکھ رہا ہوگا تو کیا سمجھے گا۔ چھت پر ریڈیو اور ٹی وی کے ایریل لگے ہوئے تھے۔ ایک جہازی سائز کا اینٹینا امرتسر ٹی وی کی نشریات وصول کرنے کے لئے تھا اور اس میں اٹکی ہوئی پتنگ ہوا سے پھڑپھڑا رہی تھی۔ چھت کے درمیان میں چار تخت بچھے ہوئے تھے جو گرمیوں کے موسم میں سونے والوں کے کام آتے ہوں گے۔ ایک کونے میں خالی ڈبے، پرانے ٹائر اور ٹوٹا پھوٹا فرنیچر ڈھیر کی صورت میں پڑا ہوا تھا۔
دس منٹ تک میں تخت پر لیٹا رہا اور زینے کے اس راستے کو دیکھتا رہا جو اوپر کھلتا تھا۔ غالب کے آنے تک مجھے بہرحال انتظار کرنا تھا۔ اس کا انحصار نازو کی پیش قدمی پر تھا۔ پہلے گھر میں اسے عملاً کوئی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ وہاں کوئی لڑنے بھڑنے والا مرد ہی نہیں تھا۔ واحد جوان آدمی چرس کا نشہ کرتا تھا اور ناک

خراب کیا۔ وار نشانے کے بجائے گردن پر پڑ گیا۔ اس کے دو پٹھے بھی تھے انہیں باندھ کے ڈال دیا ہے کمرے میں۔"
"سارے پہلوان رہتے ہیں اس گھر میں؟"
"ہاں عورتیں بچّے نہیں تھے محلے میں پچاس سال ہو گئے۔ سب عزت کرتے ہیں ان کی اور وہ ایک طرح سے گلی والوں کے محافظ تھے۔ نازو جاتے وقت باہر سے تالا لگا گئی ہوگی ورنہ کیا پتا بعد میں کوئی آجاتا۔ پہلوانوں کا اڈا ہے۔"
"یہ اچھا کیا۔ اب کوئی آیا بھی تو تالا دیکھ کے لوٹ جائے گا۔" میں نے کہا "اب چلیں نیچے؟"
"چلو اوپر جانے کی یہ عمر تو نہیں مگر ہمارے کرتوت ٹھیک نہیں۔" غالب نے آہ بھری "چلیے پہلے آپ۔"
"مرزا جی۔ آج تخت یا تختہ۔ صرف دلاور کو زندہ ساتھ لے جانا ہے۔ یہ کھوکھر بھی بڑی نامی گرامی چیز ہے۔ سُنا ہے یہاں جعلی نوٹ چھاپے جاتے ہیں اور خفیہ طور پر کچھ بردہ فروشی کا سلسلہ بھی ہے۔ جنات وغیرہ کا چکر بھی مجرمانہ سرگرمیوں کا پردہ ہے۔ ممکن ہے دلاور بھی اس کا شریکِ کار ہو۔ دونوں پکڑے جائیں تو کیا بات ہے۔"
"ایسے لوگ آسانی سے ہاتھ نہیں آتے۔ مقابلہ ہوگا۔"
"ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ دلاور سے میں نمٹ لوں گا۔ تم باقی لوگوں کو موقع مت دینا۔ فائرنگ کے بعد بھی ہمیں اتنا وقت ضرور مل جائے گا کہ یہاں سے نکل جائیں۔ بعد میں جو ہوتا ہے ہوتا رہے۔ مجھے اُمید ہے کہ کوئی بھی ہمارا راستہ روکنے کی غلطی نہیں کرے گا۔"
میں پھونک پھونک کے قدم رکھتا ہوا نیچے اُترنے لگا۔ اپنا ریوالور میں نے نازو کو دے دیا تھا۔ اس کا ریوالور میرے پاس ضرور تھا مگر میں اسے استعمال کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ میرے ہاتھ زیادہ کار آمد تھے۔ گولی چلانے کی نوبت آتی تو میں غالب کے بے خطا نشانے پر زیادہ اعتماد کر سکتا تھا۔
نچلی منزل پر خاموشی تھی۔ میں نے اور غالب نے خاموشی سے ہر کمرے کا دروازہ کھول کے دیکھا۔ مکان کی اس منزل کے بارے میں مشہور کر دیا گیا تھا کہ یہاں جنّات رہتے ہیں۔ ایک کمرے میں ہر قسم کی پرنٹنگ انک کے چھوٹے بڑے ڈبے بکھرے ہوئے تھے۔ مختلف سائز کے ڈرافٹنگ بورڈ تھے اور یہ کسی آرٹ ڈیزائنر کا اسٹوڈیو نظر آتا تھا۔ دوسرے کمرے میں مختلف قسم کے کیمرے انلارجر اور فوٹو گرافک میٹریل کے علاوہ کرنسی کی چھپائی میں استعمال ہونے والے کاغذ کے ڈھیر رکھے ہوئے تھے۔ تیسرے کمرے میں چھپائی کی مشینیں تھیں اور ایک سرسری جائزہ لے کر میں اور غالب اس نتیجے پر پہنچے کہ یہاں واقعی جعلی کرنسی چھاپی جاتی تھی۔ انگریز کہتے ہیں کہ دھواں وہیں سے اٹھتا ہے جہاں آگ ہو۔ بغیر وجہ کے افواہ بھی نہیں پھیلتی۔ غالب نے تو یہ بھی معلوم کر لیا کہ

آؤٹ ہو گیا تھا۔ اب نازو کو تیسرے گھر میں سے غالب کے لئے راستہ بنانا تھا۔
نازو پر مجھے پورا اعتماد تھا۔ عورتوں کا اصل مسئلہ تھا جو دہشت زدہ ہو کے چیخنے چلّانے لگتی تھیں۔ مرد اگر چار بھی ہوتے تو نازو کے قریب آتے اور لیٹ جاتے۔ مردانگی اور شہ زوری کے زعم میں انہیں خیال بھی نہ آتا کہ یہ نرم و نازک لڑکی جو حسن و طاقت کا مجموعہ ہے درحقیقت برقِ تپاں ہے اور شعلۂ جوالہ ہے جو آناً فاناً سب کو بھسم کر دے گی۔ کوئی لمبا چوڑا پہلوان ٹائپ مرد یا خود کو ٹارزن سمجھنے والا ہمیشہ خوش فہمی میں مارا جاتا تھا اور نازو اپنی معصومیت آمیز ادائے حسن سے دھوکا دے کر پورا فائدہ اٹھاتی تھی۔
اس کے باوجود مجھے پریشانی ہو رہی تھی۔ یہ ہو سکتا تھا کہ کوئی چھپ کے وار کر دے، دور سے کوئی چیز کھینچ مارے یا ریوالور نکال لے۔ نازو کی جگہ میں جاتا تب بھی پیچھے سے سر پر ڈنڈا یا سریا مارنے والے کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ مقابلہ صرف اس سے کیا جا سکتا ہے جو سامنے ہو۔ سامنے سے کوئی نازو پر گولی بھی نہیں چلا سکتا تھا۔ اگر چلاتا تو نازو کے جوابی فائر سے مارا جاتا لیکن فائرنگ سے گریز ضروری تھا ورنہ باہر مجمع لگ جاتا اور ہمارے لئے فرار کے راستے خود پولیس بند کر دیتی۔
میں ٹہلتا ہوا دوسری طرف کے مکان تک گیا جس کی چھت کی بلندی تقریباً اتنی ہی تھی۔ چھت پر کوئی بھی نہیں تھا۔ آگے کے سارے مکانوں کی چھتوں پر کہیں دُھلے ہوئے کپڑے سوکھ رہے تھے۔ ایک عورت کنگھی سے بال سُلجھا رہی تھی مگر اس کا رخ دوسری طرف تھا۔ دوسری طرف غور کرنے پر مجھے ایک کبوتر باز نظر آیا جو زلف بردوش حسینہ کی کافر جوانی پر ایمان لٹانے کے لئے تیار تھا اور ظاہر ہے دونوں طرف تھی آگ برابر لگی ہوئی۔
غالب خاصی بدحواسی میں نمودار ہوا "تم کب سے کھڑے ہو؟"
میں نے اس سوال کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا "تم نے بہت دیر کی۔ خیریت رہی نا؟"
"خیریت کہاں رہی یار۔ ایک بے وقوف خواہ مخواہ جان سے گیا۔ دھوبی پٹخا دینے آیا تھا۔ کہتا تھا رستمِ بوریوالہ ہوں۔ مردوں کی طرح لڑو مجھ سے۔"
"یہ نازو سے کہہ رہا تھا؟" میں مسکرانے پر مجبور ہو گیا۔
"نہیں یار۔ پہلے تو سب نے شرافت سے ہاتھ اوپر اُٹھائے تھے۔ جب میں اندر گیا تو پہلوان جوش میں آگیا۔ کہنے لگا کہ اب آیا نا مرد میدان میں۔ وہ مجھے دھوبی پٹخا دینے ہی والا تھا۔ سالے نے ایک دم دبوچ لیا تھا۔ نازو ہاتھ نہ مارتی اس کے تو میں گیا تھا۔ ہاتھ کچھ سخت پڑ گیا اس کا اور پہلوان کی گردن ڈھلک گئی۔ نازو کو بھی افسوس ہوا۔ اس نے احتیاط کی تھی مگر پہلوان کی پھرتی نے کام

وہاں صرف پاکستانی کرنسی ہی نہیں ڈالر اور پاؤنڈ بھی چھاپے جاتے تھے۔

ایک تو یہ دولت ہوجانے سے دوسری وجہ شہرت بھی سمجھ میں آتی ہے۔ جیسے مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے ایسے ہی ناجائز ذرائع سے آنے والی دولت آدمی کو ہوس اور گناہ کی طرف لے جاتا ہے اور ایک برائی سے دوسری کا راستہ کھلنے لگتا ہے اور پھر اس خرابی کے دائرے VISCIOUS CIRCLE سے نکلنے کی نہ کوئی خواہش کرتا ہے نہ کوشش۔ شراب، عورت، نشہ اور جُوا۔ عیش و عشرت کے لوازمات سب کی طلب بڑھتی جاتی ہے اور جب احساس نہ رہے تو برائی بھی نہیں رہتی۔ حدِ فاصل کو عبور کرلینے کے بعد انسان ہی شیطان بن جاتا ہے۔

نچلی منزل پر دلاور کے ساتھ دو افراد تو میرے سامنے داخل ہوئے تھے۔ وہاں اور کتنے لوگ تھے اس کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ کھوکھر اپنی فیملی کے ساتھ رہتا تھا۔ ایک بیوی کے علاوہ اس کی کم سے کم ایک بیٹی تھی۔ شاید دلاور اینڈ کمپنی کو باہر والے کمرے میں جگہ ملی ہوگی جسے بیٹھک کہا جاسکتا تھا۔ کھوکھر کا کوئی بھائی بزنس پارٹنر یا ملازم بھی اندر ہوسکتا تھا۔

ابھی میں نے آخری زینے سے نیچے جھانکا ہی تھا کہ ایک عورت کی مجھ پر نظر پڑگئی۔ وہ مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر تھی اور غالباً کچن میں داخل ہورہی تھی۔ ابھی اس نے چیخ مارنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے جست لگائی اور اس کے منہ کو ایک ہاتھ سے دبالیا۔ وہ مچلی لیکن میں نے اسے اندر کھینچ لیا۔ اس کشمکش میں عورت کی لاتیں دروازے پر لگیں اندر سے کسی نے چلّا کے پوچھا "صغراں کیا بات ہے؟"

غالب اس وقت تک نیچے آگیا تھا اور کمرے کے دروازے سے لگ کے کھڑا ہوگیا تھا۔ صغراں کی خیریت دریافت کرنے والا جیسے ہی باہر آیا اس نے مجھے اپنی بیوی کے ساتھ زبردستی کرتے دیکھا اور ہر مرد کی طرح اپنی بیوی اپنی عزت کو لٹتا دیکھ کے غیرت میں آگیا۔ وہ مجھے گالی دیتے ہوئے آگے بڑھا تھا۔ غالب نے پیچھے سے اس کی گردن پر پستول کا دستہ مارا... چیخ مار کے سیدھا منہ کے بل صحن میں گرا۔

میں نے بھی اس کی بیوی کو سمجھا بجھا کے خاموش کرنے کی کوشش میں وقت ضائع نہیں کیا اور اس کی کنپٹی پر ہاتھ مار کر اسے وہیں لٹادیا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا غالب نے کھوکھر کو ناک آؤٹ کیا تھا۔ اس کا وار بھرپور تھا کہ کھوکھر جیسا لمبا تڑنگا اور قابلِ رشک صحت کا مالک جوان آدمی برداشت نہ کرسکا ورنہ وہ پلٹ کے حملہ کرتا تو غالب کو گولی چلانی پڑتی۔

کھوکھر کی ہائے نے اندر خطرے کا الارم بجادیا تھا۔ مجھے یہ ڈر تھا کہ دلاور مقابلہ کرنے کے بجائے گلی میں کھلنے والے دروازے سے نکلنے کی کوشش کرے گا۔ اندر سے اس نے مجھے یا غالب کو دیکھ لیا ہوگا اور یہ سمجھ لیا ہوگا کہ ہم کس طرح اور کس سمت سے نازل ہوئے تھے۔ اس کا دماغ بڑی تیزی سے صورتِ حال کو سمجھنے کی اور فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

اندر سے یکے بعد دیگرے تین فائر ہوئے۔ نشانہ میں تھا مگر پہلی گولی تارکول کے ڈرم میں لگی جسے اینٹوں کی چوکی پر رکھ کے اور پیتل کی ٹونٹی لگا کے حمام بنالیا گیا تھا۔ اس کے سوراخ میں سے پانی کا دھارا نکلا تو سیدھا صغراں کے چہرے پر آیا۔ میں نے سر جھکا کے غوطہ مارا اور تیر کی طرح اس کمرے میں چلا گیا جہاں سے فائر کیا گیا تھا۔ دوسری اور تیسری گولی میرے سر کے اوپر سے گزر گئی۔

اچانک میں نے دلاور کے بغل والے ساتھی کو مقابل دیکھا۔ وہ پھر میرا نشانہ لے رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ میں پھر غوطہ مار کے بچنے کی کوشش کروں گا۔ میں نے اس کو فلائنگ کک ماری۔ گولی اس بار میرے قدموں کے نیچے فرش اور دیوار کے سنگم پر لگی۔ وہ اُلٹ کے گرا تو اپنے ساتھ استری کے اسٹینڈ کو بھی لے گیا اور پیچھے دیوار سے لگی ہوئی شیشے کے پٹوں والی الماری میں گھس گیا۔ بہت سے قیمتی برتن اس کے اوپر گرے۔ اس کا دوسرا ساتھی ابھی تک سامنے نہیں آیا تھا اور نہ میں نے دلاور کی آواز سُنی تھی۔

ساتھ والے کمرے میں دو فائر ہوئے تھے اور میں نے کسی کے چیخنے کی آواز بھی سُنی تھی مگر وہ غالب کی آواز نہیں تھی۔ میں نے برتنوں کی الماری میں گرنے والے کو اٹھانے کی کوشش کی لیکن وہ بے ہوش تھا۔ میں نے اسے وہیں چھوڑا اور باہر آیا تو غالب دوسرے کمرے کے دروازے پر کھڑا ہوا تھا۔

"کیا ہوا۔ دلاور ملا؟" میں نے آواز بدل کے کہا۔

"نہیں" غالب نے تیسرے کمرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو کچن کے مقابل اسٹور جیسا لگتا تھا۔

اچانک اس کی کھڑکی سے ایک ہاتھ باہر آیا۔ یہ دلاور کا ہاتھ تھا... اور اس میں مجھے ایک دستی بم نظر آرہا تھا۔

"میرا راستہ چھوڑدو غالب"

"ورنہ تم کیا کروگے؟ یہ دستی بم پھینک دوگے؟" غالب نے اس کا تمسخر اُڑاتے ہوئے کہا۔

"میں مجبور ہوجاؤں گا۔"

"نیک کام میں دیر کیسی دلاور۔ اچھا ہے آج جھگڑا ہی ختم ہوجائے۔"

"سکندر میں ہمت ہوتی تو وہ خود تمہارے ساتھ آتا۔ وہ بزدل تو بھاگ گیا۔ تم کو مرنے کے لئے بھیج دیا۔"

"وہ تمہارے استقبال کے لئے باہر موجود ہے اور تمہارا جنازہ اُٹھانے والوں میں بھی شامل ہوگا۔" غالب نے کہا۔

"تم مارے جاؤ گے۔ بلاوجہ....."

"اور تم بچ جاؤ گے؟ بم کو سمجھا دینا کہ دوست کون ہے اور دشمن کون۔" غالب نے مجھے ہاتھ سے پیچھے رہنے کا اشارہ کیا۔

دلاور کے لہجے میں اعتماد نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ دستی بم صحن میں گرے گا۔ کھوکھر اور اس کی بیوی کے بہت قریب۔ ظاہر ہے ان کے پرخچے اُڑ جائیں گے۔ مگر دھماکے سے اس کمرے کی دیوار یا چھت بھی منہدم ہوسکتی تھی جس میں خود دلاور نے پناہ لے رکھی تھی۔ غالب اس کے مقابلے میں بہتر دفاعی پوزیشن سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ وہ دھماکے سے پہلے کمرے میں جا کے لیٹ جاتا یا کسی تخت کے نیچے گھس جاتا تو بم کی ہلاکت خیزی سے محفوظ بھی رہ سکتا تھا۔ شاید ابھی تک دلاور نے میری صورت نہیں دیکھی تھی اور وہ آواز سے دھوکا کھا گیا تھا۔ یہ میرے حق میں بہتر تھا ورنہ میرا فرنچ وکیل کا کردار یہیں ختم ہوجاتا۔

"مقابلہ بے کار ہے دلاور۔" غالب نے کہا "باہر پولیس موجود ہے۔ وہ تمہیں نہیں کھوکھر کو گرفتار کرنے آئے ہیں۔ جعلی کرنسی چھاپنے کے جرم میں۔ تم بونس میں پکڑے جاؤ گے اور شریکِ جرم کہلاؤ گے۔"

"میں خود کو تمہارے حوالے کرسکتا ہوں۔" دلاور نے گھبراہٹ اور پریشانی سے کہا "بشرطیکہ تم مجھے نکلنے کا موقع دو۔"

"ٹھیک ہے۔ میں کچھ نہیں کہوں گا تمہیں لیکن تم جاؤ گے کدھر سے؟"

"جدھر سے تم آئے تھے۔" چالاک دلاور نے کہا۔

غالب نے پلٹ کے اجازت طلب نظروں سے مجھے دیکھا اور میں نے سرہلا کے غالب کو رضامندی کا اظہار کرنے کے لئے کہا۔

"تم کوشش کرسکتے ہو۔ ویسے باہر گلی کے ہر کونے پر پولیس ہے۔ تم نکلو گے کیسے؟"

"تم کچھ نہیں کرسکتے؟" دلاور نے بے بسی سے کہا۔

"میں... میں تو خود ہی پولیس کو یہاں لانے کا ذمّے دار ہوں۔ اس جعلی نوٹوں کے کیس کا سراغ لگانے میں پولیس ناکام ہوگئی تھی۔ کھوکھر کے ایک ساتھی نے مخبری کی تھی۔ باقی سب پکڑے جاچکے ہیں۔"

"غالب۔ میں نے سکندر سے کہا تھا کہ مجھے اس کی ہر شرط منظور ہے۔ وہ مجھ سے مل لے لیکن وہ نہیں آیا۔ تم مجھے اس کے پاس لے چلو۔" دلاور اب منت سماجت پر اُتر آیا تھا "دیکھو یہ میری عزت کا سوال ہے۔"

غالب ہنسا "آج معلوم ہوا کہ تمہاری بھی عزت ہے۔"

"پلیز۔ مجھے ایک موقع دو۔ میں رابعہ سے۔ سکندر سے اور تم سے۔ سب سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ سب کے نقصانات کی تلافی کرنا چاہتا ہوں۔ تم سب کا جتنا بھی نقصان ہوا میری وجہ سے....."

"او کے باہر آجاؤ۔" غالب نے میری ہدایت پر کہا "لیکن ہاتھ اوپر اُٹھا کے۔ چالاکی نہیں چلے گی۔" باہر سے میں لوگوں کی آوازوں کا شور سُن رہا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ فائرنگ نے اس پُرسکون رہائشی علاقے میں سنسنی پھیلادی ہے اور باہر مجمع لگ چکا ہے۔ ایسے میں پولیس کی آمد کسی بھی لمحے متوقع تھی۔

میں کمرے کے دروازے کے پیچھے رہتے ہوئے دلاور کی بے بسی اور مجبوری کا تماشا کررہا تھا یہ میرے لئے زندگی کا سب سے زیادہ مسرت بخش اور کامیابی کا سب سے بڑا موقع تھا جو اچانک ہی آگیا تھا۔ سوچا تو میں نے پہلے بھی کئی بار تھا۔ منصوبہ بندی بھی بہت کی تھی اپنی عقل اور ذہانت پر انحصار کرتے ہوئے جال بھی کئی پھیلائے تھے جتن بھی بہت کئے تھے اور جان کی بازی لگا کے اس کے ٹھکانوں پر حملے بھی لیکن تقدیر کی نارسائی سے ہر تدبیر الٹی ہوتی چلی آئی تھی۔

دلاور نے دروازہ کھولا تو غالب ایک ستون کے پیچھے فائر کرنے کی پوزیشن میں بالکل تیار تھا۔ دلاور کے ہاتھ اوپر اُٹھے ہوئے تھے اور اس کی صورت سے میں دلاور کی ذہنی اذیت کا اندازہ کرسکتا تھا۔ دھوکا اسے تقدیر نے دیا تھا کہ جب وہ خود کو بالکل محفوظ سمجھ رہا تھا اسے یقین تھا کہ بھیس بدلنے کے بعد اسے شناخت کرنے والا کوئی بھی نہیں اور اس کا یہ ٹھکانا ایسا ہے کہ کسی دشمن کے وہم و گمان کی رسائی بھی یہاں ممکن نہیں۔ تو بدبختی نے چور دروازے سے اس کی شکست اور ذلت کے اسباب فراہم کردیے تھے۔ غالب کے ساتھ تو وہی ہوا تھا کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے۔ وہ آیا تھا ایک جعلی نوٹ چھاپنے والے کی گرفتاری کے لئے اور گرفتار ہوگیا چوہدری دلاور جس کے سائے کو بھی پولیس سلام کرتی تھی اور بدخواہ آج تک نہ پکڑ پائے تھے۔ خود دلاور نے یقیناً اس وقت کو کوسا ہوگا جب اس نے کھوکھر کے گھر کو محفوظ سمجھ کے یہاں اپنی بدلی ہوئی صورت کے ساتھ رہنا قبول کیا تھا۔ اپنے سکندرِ اعظم تو شاید یہی حسرت دل میں لئے دنیا سے جاتے مگر ایک معمولی صحافی نے کہاں آکے ناممکن کو ممکن کردکھایا۔ خرگوش کے شکار کرنے والے کی گولی شیر کو جا لگی، بدقسمتی اور کیا ہوتی ہے۔

مجھے پوری امید تھی کہ دلاور اپنی ہار کو جیت میں بدلنے کے لئے کوئی چال ضرور چلے گا میں اس کے سامنے آئے بغیر غالب کو موقع فراہم کررہا تھا کہ وہ دلاور کی ایک نہ چلنے دے۔

غالب نے ستون کی اوٹ سے ریوالور نکالا "تمہیں یقیناً معلوم ہوگا کہ ایم آر ایس میں سب سے بڑھ کر بے خطا میرا ہی نشانہ تھا۔"

"اگر تم مجھے شوٹ کرنے کا فیصلہ کرچکے ہو تو...."

"تمہاری جیب میں جو کچھ ہے باہر نکالو۔" غالب نے حکم دیا "مجھے ذرا بھی شک ہوا تمہاری نیت پر تو میری گولی تمہاری ناک کے اوپر پیشانی کے وسط میں ہوگی۔"

دلاور کا چہرہ احساسِ ذلت سے مسخ ہورہا تھا "کچھ نہیں ہے میری جیب میں۔"

"وہ دستی بم کیا تم نے سکون آور گولی کے طور پر نگل لیا ہے؟"

"وہ... اندر ہی رکھا ہوا ہے۔"

"ویری گڈ جس کے پاس رکھا ہوا ہے اسے بھی باہر بُلالو۔"

"اندر تو کوئی نہیں تھا۔ میرے سوا....؟"

"تم یہ موقع گنوادو گے دلاور۔ باہر کیا ہنگامہ ہورہا ہے۔ آواز تم بھی سُن رہے ہو۔ میرے ساتھ پریس فوٹوگرافر بھی آیا ہے۔ میں اسے کہہ دیتا ہوں کہ دروازے کھول دے۔ نازو باہر پولیس کے ساتھ ہے۔"

دلاور نے اپنے پیچھے زینے کو دیکھا "تم اس طرف سے آئے تھے؟"

"ہاں ساتھ والے گھر کی چھت سے کود کے۔"

"تم مجھے اس طرف سے نکال دو گے؟" دلاور اب سخت بدحواس تھا۔

"یقیناً مجھے کون روکے گا۔ اس گھر سے تو میں نگرانی کررہا تھا کھوکھر کے غیرقانونی کاروبار کی۔ اور کوئی صورت نہیں ہے تمہارے بچنے کی دلاور۔ اپنے آپ کو میرے حوالے کردو۔ تمہارا کوئی محافظ پولیس کی مسلح فورس کا مقابلہ کرے گا تو کُتے کی موت مارا جائے گا۔ تم خود سوچو کہ کل کے اخبار کیا کہیں گے۔ چوہدری دلاور جعلی نوٹ چھاپتا تھا۔ بردہ فروش تھا۔ تمہارا تو سیاسی مستقبل تباہ ہوجائے گا۔ اس کے علاوہ یہاں سے اسلحہ برآمد ہوگا۔ اس میں دستی بم بھی ہے۔ تم پر بیک وقت کتنے خطرناک مقدمات بن جائیں گے۔ ابھی تو صرف ڈاکٹر شیلی کے قتل کا معاملہ ہے جو تم سکندر سے مل کے ختم بھی کراسکتے ہو۔ جلدی فیصلہ کرو۔"

غالب کی تقریر کام کرگئی۔ دلاور نے پیچھے پلٹ کے کہا "باہر آجاتو بھی چیمہ۔"

چیمہ وہی ڈرائیور نکلا جو دلاور کی جیپ چلا کے لایا تھا۔ اس کی شکل پر بارہ بجے ہوئے تھے اور لگتا تھا' وہ بے ہوش ہو کے گرنے ہی والا ہے۔

"چیچہ صاحب۔ جیب میں اور ڈب میں جو مال مسالہ ہے سب نکال کے باہر ڈال دو۔" غالب نے حکم دیا۔

"کچھ نہیں۔ کچھ نہیں ہے میرے پاس۔" اس نے ہکلاتے ہوئے ساری جیبیں اُلٹ کے دکھادیں "میں جاؤں؟"

دلاور نے کہا "اگر یہ اوپر جاکے راستہ دیکھ لے...."

"کیوں نہ میں خود اسے اوپر کا راستہ دکھادوں۔" غالب نے کہا اور چیمہ کے سر میں گولی ماردی۔ سوراخ بالکل پیشانی کے وسط میں ہوا تھا۔ خون اس سوراخ سے ایسے نکلا جیسے ٹونٹی سے پانی کی دھار نکلتی ہے۔ اس خون نے دلاور کے کپڑوں کو رنگ دیا۔

"یہ... یہ کیوں کیا تم نے؟"

"میں ایسا نہ کرتا تو میرے ساتھ یہی ہوتا۔ چیمہ اوپر جاکے مجھے گولی ماردیتا۔ کیا یہ پلان اسے تم نے سمجھایا تھا؟"

"چیمہ کے پاس اسلحہ کہاں تھا؟"

"اس نے جھوٹ بولا تھا۔ بے وقوف بنانے کی کوشش کی تھی مجھے۔ اس کی دائیں ٹانگ پر بندھا ہوا ریوالور مجھے صاف نظر آرہا ہے۔"

غالب کی بات کے سچ ثابت ہونے میں دیر نہیں لگی۔ نزع کے کرب میں تڑپنے والے اور لاتیں چلانے والے چیمہ کا ریوالور ایک ٹھوکر سے غالب کے قریب آگرا۔ اسے شاید چیمہ نے موزے میں اُڑا رکھا تھا۔

"تم خود کو بہت چالاک سمجھتے ہونا دلاور۔ باقی احمق ہیں تمہاری نظر میں۔" غالب مشتعل ہوگیا "انسانوں کی جان کی تمہاری نظر میں کبھی کوئی قیمت نہیں رہی۔ اس وقت تم کیسا محسوس کررہے ہو جب تمہارے ساتھ کوئی نہیں۔ تم بالکل اکیلے ہو اور ایک گولی اسی طرح تمہارا ہر نشہ ختم کرسکتی ہے۔ طاقت' دولت اور عزت کا' عیاری اور بدمعاشی کا سارا جھوٹا غرور تمہارے سر کے ایک سوراخ سے اسی طرح بہہ جائے گا۔"

دلاور کا رنگ زرد پڑگیا تھا اور وہ کانپ رہا تھا "دیکھو خدا کے لئے مجھے موقع دو۔ آخری موقع۔"

"ہر موقع تمہارے لئے آخری ہوتا ہے دلاور۔ مگر میں خود تمہارا کوئی فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ میں تمہیں سکندر کے سامنے پیش کروں گا۔ اس کے بعد جو سب کا فیصلہ۔ چلو منہ دوسری طرف کرو۔"

دلاور نے تعمیل میں دیر نہیں لگائی۔ وہ باہر کے شور سے سخت بدحواس تھا اور اسے خطرہ تھا کہ دروازہ بجانے والے کسی بھی وقت اندر داخل ہوجائیں گے تو وہ جائے واردات پر رنگے ہاتھوں پکڑا جائے گا۔ ظاہر ہے غالب کے لئے خطرے کی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ وہ تو چشم دید گواہ کی حیثیت سے چیمہ کے قتل کا الزام بھی دلاور پر عائد کرسکتا تھا۔

غالب آگے بڑھا۔ ریوالور اب بھی اس کے ہاتھ میں تیار تھا۔ میں اس کی حکمتِ عملی کو کچھ کچھ سمجھ رہا تھا۔ مگر تاخیر سے پریشان تھا۔

"چلو آگے" غالب نے دلاور کو حکم دیا مگر اس نے جیسے ہی ایک قدم آگے بڑھایا' غالب نے پوری قوت سے اس کے سر پر ریوالور مارا۔ دلاور لڑکھڑایا اور وہیں گرگیا۔

اب میرے لئے چھپے رہنا ضروری نہیں تھا "ویری گڈ تم نے کمال کردیا آج تو نورِ چشم۔"

غالب نے ریوالور کو ایک کپڑے سے صاف کیا "دیکھو اوپر کیمرے ہیں۔ اچھا چھوڑ دو میں خود ہی جاتا ہوں۔"

اس نے ریوالور کو دلاور کے ہاتھ کی گرفت میں دیا اور خود اوپر بھاگا۔ اوپر والی منزل پر جہاں جعلی نوٹ چھاپے جاتے تھے مختلف قسم کے کیمرے موجود تھے مگر صحیح کیمرے کا انتخاب اور استعمال غالب ہی کرسکتا تھا۔ لوگ اب دھڑ دھڑ دروازہ پیٹ رہے تھے اور اندیشہ یہ تھا کہ آخرکار وہ دروازہ توڑ دیں گے۔ میں نے اندر ایک

"اچھا۔ سوری۔ ویری سوری جناب۔"

نازو کو کسی کی پروا نہیں تھی "سچ کہو کیا وہ واقعی پکڑا گیا؟ واقعی گرفتار ہوگیا آج۔ میرا تو دل خوف سے دہل رہا تھا فائرنگ کی آوازیں سُن سُن کے۔ غالب تو ٹھیک ہے نا؟ ویسے تو دیکھا تھا میں نے اسے۔ کیمرا کہاں سے ملا؟"

میں نے کہا "صرف سوال کرو گی یا کسی سوال کے جواب کی مہلت دو گی؟" وہ ہنسنے لگی "غالب نے کیسی تصویریں بنائی ہیں؟"

"یہ تو غالب ہی بتا سکتا ہے۔"

"ایسا تو نہیں کہ وہ خبیث بعد میں نکل جائے۔ ہمیں انتظار کرنا چاہئے تھا۔"

"زیادہ فکر مت کرو۔ تمہاری صحت پہلے ہی قابلِ رشک نہیں ہے۔"

وہ ہربات پر ہنسنے کے موڈ میں تھی "اسی سے تو دھوکا کھاجاتے ہیں تم جیسے سورما مرد۔ رستم بوریوالہ۔" وہ قہقہہ مار کے ہنسی "کیا تھل تھل کرتا ہوا بے ہنگم گوشت کا ڈھیر تھا۔ میں نے فلائنگ کک ماری تو لگا کہ پیر فوم میں دھنس گئے ہیں۔"

میں نے اسے حیرانی سے دیکھا "غالب تو کہہ رہا تھا کہ تم نے اسے کڑیچ کردیا۔" میں نے ہاتھ کی حرکت سے گردن توڑنے کا ایکشن دکھایا۔

"کڑیچ کردیا؟ ارے نہیں میرا ہاتھ دیکھ رہے ہو۔ اس سے میں بھینسے کی گردن توڑ سکتی ہوں؟ اسے لگا ہوگا ایسا ہی مگر رستم بوریوالہ کے پیٹ کی مشک دیکھی تھی میں نے..... اس کی نبض سانس اور دل کی رفتار سب بالکل ٹھیک تھے۔ بس اس کے لئے کھڑا ہونا مشکل ہوگیا تھا۔ اور وہ الّو کے پٹھے....."

ڈرائیور نے اسے پُرملامت نظروں سے دیکھا۔ اس کی نظروں کا مطلب بہت واضح تھا کہ پڑھی لکھی اور مہذب نظر آتی ہو مگر بات چیت اور اطوار سے خود کو بدمعاش اور داداگیر ثابت کررہی ہو۔

"تم اس کے پٹھوں کی بات کررہی ہو۔ رستم بوریوالہ کے۔"

"ہاں استاد سے کم نہیں تھے وہ بھی۔ ہکا بکا کھڑے کانپ رہے تھے۔ ہاتھ جوڑنے لگے' ایک تو رونے پر آگیا تھا کہ میری بہن۔ میری ماں میری پھوپی۔ میرا دل بہت کمزور ہے تم جیسا کہو گی ویسا ہی ہوگا۔" وہ پھر زور سے ہنسی اور ڈرائیور کو ڈانٹنے لگی "تم کیا بار بار دیدے گھما کے پیچھے دیکھ رہے ہو۔ آگے دیکھ کے گاڑی چلاؤ یا آنکھیں پیچھے لگوالو۔"

وہ بوکھلا گیا "آپ نے دل خوش کیا جی۔ یہ جو رستم بوریوالہ ہے نا آپ کو پتا ہے اس نے میرے تایا کے ساتھ کیا بدمعاشی کی تھی۔ اس کا جوڑ پڑگیا تھا میرے تایا سے۔ اس نے دنگل سے پہلے انہیں دھونی دے دی۔"

"دھونی کیسے دے دی؟"

ٹیلی فون دیکھا تھا۔ جتنی دیر میں غالب نے کیمرے سے قاتل اور مقتول یعنی دلاور اور چیمہ کی تصاویر بنائیں' میں نے پولیس کا ایمرجنسی نمبر گھمادیا۔

ابھی میں بات کرہی رہا تھا کہ دروازہ ٹوٹ گیا اور ایک ساتھ آٹھ دس افراد اندر آگئے۔ ان سب نے ایک ساتھ چلانا شروع کردیا "کیا ہورہا ہے اندر اتنی دیر سے؟"

"فائرنگ کون کررہا تھا؟"

غالب نے گرج کے کہا "خبردار جو کوئی آگے آیا۔ اگر کسی نے کوئی سراغ مٹانے کی کوشش کی تو وہ بھی مجرم سمجھا جائے گا۔"

لوگ رک گئے اور خاموش بھی ہوگئے۔ دروازے کے باہر میں نے تقریباً تیس چالیس افراد کو دیکھا جو خوف اور تجسس میں گردن اٹھا اٹھا کے اندر جھانکنے کی کوشش کررہے تھے۔

میں نے فون رکھ کے کہا "آپ لوگ پریشان نہ ہوں۔ یہ کارروائی اسپیشل پولیس نے کی ہے۔ ہمیں اطلاع ملی تھی کہ یہاں جعلی کرنسی چھاپی جاتی ہے۔ ہمارے ساتھ اخباری نمائندے بھی ہیں اور پریس فوٹوگرافر بھی۔ ایک مجرم ہلاک ہوا ہے۔ باقی صرف بے ہوش ہیں۔ چھت پر بھی ہماری فورس موجود ہے اور علاقہ پولیس آرہی ہے۔ میں آپریشن کمانڈر کی حیثیت سے درخواست کروں گا کہ آپ قانون کو اس کا فرض ادا کرنے دیں اور کسی کام میں رکاوٹ نہ ڈالیں۔ پلیز تھینک یو۔"

میری بات کا بہت اچھا ردِعمل ہوا۔ لوگ باہر چلے گئے اور کچھ فاصلے پر گھیرا بناکے کھڑے ہوگئے۔ سامنے والے گھر سے نازو نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ وہ خاموشی سے نکلی اور سڑک کی طرف چلی گئی۔ کچھ دیر بعد غالب باہر آیا اور لوگوں کو اس گھر میں رہنے والوں کی مجرمانہ سرگرمیوں کی رپورٹ دینے لگا۔ جب پولیس پہنچی تو مجھے بھی نکلنے کا موقع مل گیا۔ میرا کام اب ختم ہوگیا تھا۔ باقی کام غالب کا تھا۔

نازو سڑک پر ٹیکسی روک چکی تھی۔ اس کا چہرہ مسرت سے کھلا ہوا تھا۔ اگر ہم سڑک پر نہ ہوتے تو فرطِ جذبات سے وہ مجھ سے لپٹ جاتی اور مجھے مبارکباد دیتی۔ یہ حرکت اُس نے میرے ٹیکسی میں بیٹھتے ہی کی۔

"تم نے تو کمال کردیا آج۔" اس نے دو بار میرا منہ چوم کے کہا۔

"ارے پاگل ہوئی ہو۔" میں نے ہنستے ہوئے اسے دور کیا "ایسی بھی کیا خوشی۔ بھئی اللہ کی مدد سے سب ہوا۔ تمام کام کے لئے اس نے وقت مقرر کیا ہے۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھا "اگر کوئی لاٹری نکل آئی ہے صاحب تو بیگم صاحبہ کو خوش ہونے دیں۔"

"بکومت۔ یہ بیگم صاحبہ نہیں۔ میری بہن ہے۔" میں نے کہا۔

"بس جی ۔۔۔ ملنگ کو بھیج دیا۔ وہ اپنا تین پیالیوں والا ا(؟)چھ لے کر اندر چلا گیا جہاں تایا جی جوڑ کے لئے تیار ہو چکے تھے۔ اس نے پتا نہیں کیا پڑھتے ہوئے آگ میں کچھ ڈالا اور تایا کے ساتھ سب کو دھونی دے دی۔ معلوم ایسا ہوتا تھا کہ تایا کو رستم بوریوالہ بننے کی دعا دے رہا ہے۔ وہ حرامی اپنا کام کر گیا۔ دھوئیں سے اس وقت تو کچھ نہیں ہوا بعد میں سب کو چکر چڑھ گئے۔ تایا جی جوڑ شروع ہونے کے پانچ منٹ بعد پٹ سے گرے اور یہ ان کے سینے پر چڑھ کے رستم بوریوالہ ہو گیا۔"

میں نے ہنس کے کہا "تایا جی نے دوبارہ اسے چیلنج نہیں کیا؟"

"نہیں جی۔ شرط یہی تھی کہ جو ہار جائے گا وہ پھر بوریوالہ میں اس کے سامنے نہیں آئے گا۔" ڈرائیور نے بڑے دکھ سے کہا "اسی طرح وہ پہلے بھی چار پانچ نامی گرامی پہلوانوں کو مٹا چکا تھا۔"

"دھونی دے کر؟" نازو بولی "تم اس ملنگ کو پکڑتے۔"

"پکڑا تھا جی۔ قبر بھی تیار تھی اس کی مگر وہ بڑی اونچی چیز نکلا۔ پتا نہیں اس نے ڈب میں سے کیا نکال کے سنگھا دیا۔ دو بندے اسے اٹھا کے لا رہے تھے انہیں اسٹریچر پر اٹھا کے لانا پڑا۔ وہ ایسا غائب ہوا کہ پھر بوریوالہ میں نظر نہیں آیا۔"

میں نے ٹیکسی رابعہ کے آفس سے کچھ فاصلے پر رکوائی۔ ہم نے تھوڑا سا فاصلہ پیدل طے کیا اور اوپر چلے گئے تو آفس میں بڑا سنجیدہ ماحول تھا۔ وقار یوسف اور منظر کے سامنے کلائنٹ بیٹھے ہوئے تھے۔ دو حضرات اور ایک خاتون اپنی باری کے انتظار میں تھے۔ ہم سیدھے اس کمرے میں چلے گئے جس کے باہر پرائیویٹ لکھا ہوا تھا۔ جاتے جاتے میں نے رابعہ کو اندر بلا لیا۔ اس نے سر ہلایا اور کچھ دیر بعد مؤکل کو وقار کے سپرد کر کے آ گئی۔

رابعہ بولی "کیا ہو گیا تمہارے چہروں پر لڈو پھوٹ رہے ہیں۔"

"یہ تمہارا آفس نہ ہوتا تو میں نعرہ لگاتا۔ وہ مارا پاپڑ والے کو۔ اب تم منہ میٹھا کراؤ۔ خیر سے تمہارا دلاور پولیس کی تحویل میں پہنچ گیا ہے۔"

"وہ کیسے؟" رابعہ کا چہرہ کھل اُٹھا۔

"یہ لمبی کہانی ہے۔ ابھی تم کو میرے ساتھ چلنا ہے۔ فوراً۔"

"مگر یہاں... اچھا چلو کہاں جانا ہے؟"

"ایس پی ظفر حیات کے پاس۔ ممکن ہے اسے تلاش بھی کرنا پڑے۔ اس کے ساتھ میں اور تم پولیس اسٹیشن چلیں گے۔"

"میرا نام کیوں خارج کر دیا؟" نازو بولی۔

"بابا تم صحافی لوگ ہو۔ ہم وکیل ہیں۔" میں نے کہا "تم آ جانا بعد میں اپنے ساتھ دو چار بندے لے کر۔ اپنی برادری کے۔"

نازو نے اِدھر اُدھر فون ملا کے ایس پی ظفر حیات کا سراغ لگا لیا۔ وہ سخت جزبز ہوا۔ اس کی شام غارت ہو گئی تھی لیکن وہ رابعہ کو ٹال نہیں سکتا تھا۔ اس نے اپنی خصوصی ٹیم کے ساتھ پہنچنے کی ہامی بھری۔ منظر ابھی تک نہیں آیا تھا۔ رابعہ نے فون کیا تو وہ گھر سے روانہ ہونے ہی والا تھا۔ رابعہ نے اسے بھی براہِ راست تھانے پہنچنے کی تاکید کی۔ آخری فون نازو نے اپنے آفس کیا اور فوٹو گرافر کو رابعہ کے آفس میں طلب کیا تھا۔

رابعہ اور میں فوراً روانہ ہو گئے۔ نازو کو کچھ دیر بعد اپنے فوٹو گرافر کے ساتھ آنا تھا۔ راستے میں رابعہ نے مجھ سے اس کارنامے کی روداد سنی۔

"نہ جانے کیوں مجھے یقین نہیں آتا۔" رابعہ نے ساری بات سُن کے کہا۔

"بات ہی ایسی ہے کہ کوئی آسانی سے یقین نہیں کرے گا مگر دیکھ کر تو مانو گی۔" میں نے کہا "آج میرے ساتھ غالب اور نازو نہ ہوتے تو میں اکیلا کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ نازو تو واقعی قیامت ہے۔ انجام کی پروا کئے بغیر خطرے میں کود پڑتی ہے۔"

"مجھے حسد محسوس ہو رہا ہے۔" رابعہ نے کہا۔

میں ہنس پڑا "تم اس سے بڑی پاگل ہو۔ دیکھو اب خیال رکھنا ایک بات کا مجھے اردو یا انگریزی نہیں آتی۔ صرف فرنچ جانتا ہوں میں۔ تمہیں کچھ معلوم ہے کہ کہاں جانا ہے۔ رام گلی کا علاقہ کس تھانے میں آتا ہے۔"

"تم فکر مت کرو۔ مجھے سب معلوم ہے۔" رابعہ ہنسی "چلو"

رابعہ خود گاڑی چلاتی رہی اور میں اسے بتاتا رہا کہ کیسے نورجہاں کے مزار سے دلاور کی شامتِ اعمال اسے کھوکھر کے گھر لے گئی تھی اور کیسے میں نے ایک ٹیکسی ڈرائیور کی مدد سے یہ ناقابلِ یقین کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ جعلی نوٹوں کا ریکٹ اس کے لئے بھی حیرت کا سبب بنا۔

"غالب کو کیا دھانسو اسٹوری ملی ہے۔ لاٹری میں۔"

رابعہ نے کہا "پولیس کو خاصی مایوسی ہو گی کہ اخبار والے پہلے پہنچ گئے۔"

"انہیں معلوم ہو جاتا تو تک مکا کر لیتے؟"

"ایسے کیس کو دبانا تو مشکل ہوتا ہے مگر ہاں اس کا کریڈٹ پولیس کو ملتا۔ اب تو اُلٹی جواب طلبی ہو جائے گی کہ علاقے میں یہ سب ہو رہا تھا تو پولیس کیسے بے خبر رہی۔ اس وقت ضمانت تو ہو نہیں سکتی۔ غالب صبح کے اخبارات میں یہ ساری خبریں لگوا سکتا ہے کہ چوہدری دلاور کو چھاپا مار کے جعلی کرنسی چھاپنے کے علاوہ قتل اور خطرناک آتشیں اسلحہ رکھنے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ بدلے ہوئے حُلیے کے ساتھ اس کی تصویریں بھی شائع ہوں گی تو کسی ثبوت کی ضرورت نہیں رہے گی کہ وہ ڈاکٹر شیلی کے قتل کے کیس میں گرفتاری کے ڈر سے روپوش تھا۔ عدالت شاید اس کی ضمانت بھی منظور نہ کرے۔"

رابعہ نے پولیس اسٹیشن جانے سے پہلے ہیڈ کوارٹر کا رخ کیا۔ وہاں صرف ایمرجنسی ڈیوٹی والے موجود تھے مگر وائرلیس کنٹرول روم نے آخر کار ایس پی ظفر حیات سے رابطہ کر لیا اور ہمارا پیغام

کہے گا جاؤ چوہدری صاحب کوئی تمہارا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ قانون سے ہم نمٹ لیں گے۔"

"تم تو ابھی سے مایوس ہو۔" میں نے کہا "اور مجھے بھی مایوس کر رہی ہو۔"

"میں دیکھ رہی ہوں سکندر کہ تفتیشی ٹیم میں اچھی شہرت کے حامل افراد کو جان بوجھ کے نہیں شامل کیا گیا۔ پولیس میں بڑے ذہین اور باصلاحیت افسر ہیں جن کی ایمانداری اور فرض شناسی کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔ مگر انہیں انتظامی اور دفتری امور میں اُلجھا دیا جاتا ہے۔ جرائم سے نمٹنے کے لئے رہ جاتے ہیں پولیس کے نام کو بدنام کرنے والے۔ خیر اس کیس میں غفلت اور نااہلی کی سزا صرف معطلی یا برطرفی نہیں ہو گی۔ ہم انہیں مجرموں کا ساتھی بنا کے جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچائیں گے۔ میں اکیلی تو نہیں ہوں بہت سے سینئر وکیل ہیں میرے ساتھ اور پریس۔"

"ایم آر ایس کو بھول گئی ہو؟" میں نے کہا۔

رابعہ مسکرائی "وہ تو میں خود ہوں۔"

پولیس اسٹیشن کے باہر سڑک کے دوسرے کنارے پر وہ جیپ بھی موجود تھی جسے میں نے عارضی طور پر ناکارہ بنا دیا تھا۔ اس کے علاوہ دو گاڑیاں تھیں ان میں سے ایک وہی سبز رنگ کی ڈاٹسن تھی جس میں دلاور کا بیٹا اپنی ماں کو واپس لے گیا تھا۔ اس گاڑی کی یہاں موجودگی یہ ثابت کرتی تھی کہ دلاور کے گرفتار ہونے کی خبر اس کے گھر والوں کو بھی دی جا چکی ہے۔ دوسری گاڑی کے قریب چار خونخوار قسم کے شکاری تھے جو دلاور کی فیملی کے باڈی گارڈ بن کے آئے تھے مگر ان کے تیور بڑے جارحانہ تھے۔ وہ دلاور کی خصوصی فورس کے ایسے ارکان ہو سکتے تھے جو موقع پاتے ہی دلاور کو قانون کی گرفت سے نکال کر لے جائیں۔ ابھی وہ مجبور تھے لیکن انہیں یقین تھا کہ چوہدری دلاور کبھی مجبور نہیں ہوتا۔

نہ جانے کہاں سے خادم حسین اچانک نمودار ہو گیا "یہ آپ نے مجھے کہاں طلب کر لیا جناب۔ خدا دشمن کو تھانے نہ لے جائے۔"

میں سمجھ گیا کہ اسے غالب نے بُلایا ہو گا "دشمن تھانے پہنچ گیا ہے خادم حسین مگر تم کسی مجرم کے ساتھ نہیں۔ ایک عالمی شہرت یافتہ وکیل کے معاون ہو۔ کوئی ہمیں ٹیڑھی نظر سے نہیں دیکھ سکتا۔"

"وہ اندر غالب صاحب کا جھگڑا ہو رہا ہے۔ اچھا ہوا آپ آ گئے۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا۔"

"جھگڑا کس بات پہ......؟"

"تصویریں اُتاری تھیں نا انہوں نے۔ پولیس کیمرا چھین رہی تھی۔ انہوں نے کہا کہ ایس پی کے حوالے کروں گا۔ پولیس والے چکر میں آ گئے۔ غالب صاحب نے یہاں آتے ہوئے کیمرا کسی کو دے دیا راہ چلتے۔"

دے دیا۔ وہ کسی پارٹی میں جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس کا ... خراب ہو گیا۔

"... مجھے ابھی تک پولیس کی رپورٹ نہیں ملی۔"

"یہ تو پولیس کی نااہلی ہے۔ میں کیا کر سکتی ہوں۔"

"صبح بھی میرا کافی وقت ضائع ہوا۔ اس غیر ملکی وکیل نے بِلاوجہ مجبور کیا۔ ورنہ وہاں میں کیوں جاتا۔"

"یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہاں کچھ نہیں ہوا۔"

ظفر حیات نے کہا "جو کچھ ہوا اس کا تعلق ان معاملات سے نہیں تھا جن کی تفتیش کے لئے مجھے بطورِ خاص بھیجا گیا ہے۔" وہ گرم ہو گیا۔

"اور اب میں آپ کو بتا رہی ہوں کہ اسی کیس میں جو شخص اصل ملزم ہے جس کے خلاف ایف آئی آر ہے وہ گرفتار ہو گیا ہے تو آپ ماننے کے لئے تیار نہیں۔" رابعہ نے بھی تیز لہجے میں کہا "وہ بھیس بدل کے پھر رہا تھا۔ جعلی نوٹوں کے کیس کو چھوڑ دیں مگر چوہدری دلاور کو اپنی تحویل میں لینا کیا میری ذمّے داری ہے؟"

"اوکے، اوکے۔ میں آتا ہوں۔" ظفر حیات نرم پڑ گیا "میں ایس ایچ او سے کنفرم کرتا ہوں۔ آپ پولیس اسٹیشن جائیں۔"

"ایس پی صاحب۔ مجھے آپ کے ڈی ایس پی شاہد علی اور انسپکٹر خدا بخش پر بالکل بھروسا نہیں۔"

"اس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مجھے ان پر بھروسا ہے۔"

"فرق اس وقت پڑے گا جب میں اور میرے ساتھی مدعی کی حیثیت سے ان کی نااہلی اور جانبداری ثابت کر دیں گے۔ آپ اپنی پوزیشن خراب مت کریں۔ اخبار والے وہاں پہلے سے موجود ہیں اور تمام تفصیلات جمع کر چکے ہیں۔ حقائق کو مسخ کرنے اور شہادتوں میں ردّوبدل کرنے کی کوشش کی گئی تو......"

لیکن ایس پی ظفر حیات اس سے پہلے ہی فون رکھ چکا تھا۔ رابعہ سخت غصے میں تھی اور ... دھمکی نے ظفر حیات کو مشتعل کر دیا تھا۔

میں نے کہا "یہ سب فون ... کی ... ضرورت تھی۔"

"تم نہیں سمجھتے۔ انہیں پہلے سے خبردار نہ کیا جائے تو انہیں خوش فہمی رہتی ہے کہ قانون موم کی ناک ہے جسے اپنی مرضی سے موڑا مروڑا جا سکتا ہے۔ ابھی دیکھو یہ دلاور سے کیا سودا کرتے ہیں اسے کیسے بچاتے ہیں۔"

"اپنی نوکری کو داؤ پر لگا کے؟"

"نوکری!" رابعہ نے تلخی سے کہا "اب تک یہ اتنا کما چکے ہیں کہ باقی عمر صرف خرچ کریں تب بھی بہت ہو۔ پھر دلاور انہیں اپنی عزت آبرو اور اپنا مستقبل بچانے کی اتنی بڑی قیمت دے سکتا ہے کہ یہ خود نوکری کو لات مار دیں۔ وہ ایس پی ظفر حیات کو بزنس پارٹنر بنانے کی پیشکش کر دے تو کیا ظفر حیات اسے جیل بھجوا دے

"راہ چلتے ... دے دیا؟" میں نے حیرانی سے کہا۔
"پتا نہیں جی مگر پولیس کو پتا نہیں چلا۔" خادم حسین نے مسرت سے کہا۔
میں رابعہ کے ساتھ اندر گیا تو ایس ایچ او اور غالب کے درمیان سخت زبانی جنگ چل رہی تھی۔
"میری فکر مت کرو۔ صحافی جیل جاتے ہیں تو ان کی عزت کم نہیں پہلے سے زیادہ ہوتی ہے۔ مولانا محمد علی جوہر سے فیض تک سب جیل گئے تو بے روزگار نہیں ہوئے تھے۔ تم اپنی فکر کرو۔ ایک بار یہ پٹی اُتر گئی نا تو چپراسی کی نوکری بھی کوئی نہیں دے گا۔"
"بار بار دھمکی مت دو مجھے۔ میں سچ مچ اندر کردوں گا تمہیں۔"
"کس جرم میں۔ چلو وکیل بھی آگئے میرے۔" غالب نے کہا۔
رابعہ نے فوراً صورتِ حال کو سنبھالا "یہ کیا چیخ پکار ہے غالب؟"
غالب نے فریاد کی "بلاوجہ میرے پیچھے پڑگیا ہے یہ تھانیدار کہ کیمرا دے دو۔ بابا کیسا کیمرا۔ کیمرا ہے کہاں؟"
تھانیدار دھاڑا "کیمرا تمہارے پاس تھا۔ تصویریں اُتاری ہیں تم نے۔"
"پھر کیا میں نے اسے نگل لیا۔ جادو منتر سے غائب کردیا؟"
"میں وہیں تم سے کیمرہ چھین لیتا تو ٹھیک تھا۔ میں نے شرافت کا ثبوت دیا اور اعتبار کیا تم پر۔ تم نے کہا تھا کہ تم ایس پی صاحب کو دو گے لیکن تم نے راستے میں ہی کسی کو دے دیا۔"
"کس کو دے دیا؟ کسی نے دیکھا مجھے کیمرا دیتے ہوئے۔ میں تو اسی گاڑی میں بیٹھا ہوا تھا جس میں تم آئے ہو۔" غالب نے کہا۔
"تم پیچھے تھے۔ تم نے کسی سگنل پر دیکھ لیا ہوگا کسی جاننے والے کو۔ بس میری نظر چوک گئی۔"
رابعہ نے کہا "فرض کرو ایسا ہی ہوا۔ ضابطۂ فوجداری کی کون سی دفعہ کے تحت اپنا کیمرا کسی کو دینا جرم ہے اور اس میں کون سی ایسی تصویریں تھیں، کیا غالب نے کسی ممنوعہ علاقے کی تصویر اُتاری تھی؟"
ایس ایچ او کرسی پر بیٹھ گیا "اچھا آپ سب لوگ یہاں سے تشریف لے جائیں فی الحال۔ تم بھی صحافی صاحب۔"
رابعہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی اور مجھے دوسری کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا "ہمیں ایس پی ظفر حیات نے یہاں ملنے کو کہا ہے۔ وہ آتے ہی ہوں گے۔"
"ایس پی صاحب۔ انہیں کس نے بتایا؟" ایس ایچ او پریشان ہوگیا۔
"میں نے انہیں مطلع کیا تھا کہ ڈاکٹر شیلی مرڈر کیس کا اصل ملزم بھی گرفتار ہونے والوں میں شامل ہے۔" رابعہ نے کہا "اس کا نام چوہدری دلاور ہے۔"
"آپ کو ملزمان کے نام کیسے معلوم ہوگئے؟"
"ایس پی صاحب صرف چوہدری دلاور کو اپنی تحویل میں لینا چاہتے ہیں۔ یہ ان کا کیس ہے اور اس کیس میں استغاثہ کے ایک وکیل یہ بھی ہیں۔ یہ برطانیہ سے آئے ہیں اور برٹش کونسلیٹ کے نمائندے ہیں۔ ان کی ملاقات ایس پی ظفر حیات سے بھی ہوچکی ہے۔"
"دیکھیے وکیل کا یہاں کوئی کام نہیں۔" وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔
"یہ انگلش اردو نہیں جانتے۔ فرنچ میں بات کرو یا ان کے مترجم کے ذریعے۔" رابعہ نے کہا "رہا یہ سوال کہ وکیل کا یہاں کیا کام تو تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ میں مدعی بھی ہوں، کچھ اور وکیل آنے والے ہیں جو سب مدعی ہیں۔ ملزم کی شناخت تم نہیں کرسکتے۔ ہم کریں گے۔ ہم نے چند اور اخبار والے بُلائے ہیں۔ ایس پی صاحب پریس کانفرنس میں سب بتائیں گے۔"
ایس ایچ او پھر اُٹھ کھڑا ہوا "پریس کانفرنس۔ اچھا تو ساری تیاری کرکے آئے ہیں آپ لوگ۔"
وہ ایک دم ایکٹو ہوگیا۔ اس نے ماتحت عملے کو حکم دیا کہ تھانے کے اندر... باہر سے سارا "گند" صاف کردے۔ گند میں اس نے ہمیں بھی شامل کیا تھا مگر ظاہر ہے ہمیں وہاں سے نکالنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔
"غیر متعلقہ لوگ نظر نہ آئیں مجھے۔ کوئی اخبار والا بھی میری اجازت کے بغیر داخل نہ ہونے پائے ورنہ سب کو لائن حاضر کردوں گا۔ یہ ساری گاڑیاں گیٹ کے سامنے کیوں کھڑی ہیں۔ وکیل صاحب اپنی گاڑی ہٹالیں۔"
رابعہ نے قانونی سوال کیا "کیوں؟ یہ نو پارکنگ زون نہیں ہے اور میں نے گاڑی گیٹ کے سامنے بھی کھڑی نہیں کی ہے۔"
"تمام ملزمان ہوں حوالات میں۔" ایس ایچ او نے عمداً رابعہ کی بات نہیں سُنی اور ایس پی صاحب کے استقبال کے لئے تیار ہوگیا۔
غالب نے کہا "ملزمان کے علاوہ جتنے لوگ ہیں حوالات میں انہیں آگے پیچھے کردو۔"
"تم نے مجھ سے کچھ کہا؟" ایس ایچ او غرایا۔
"نہیں میں کسی فضول آدمی سے فضول بات نہیں کرتا۔" غالب نے کہا۔
رابعہ نے آہستہ سے پوچھا "کیمرا کسے دیا تھا؟"
غالب مسکرایا "اپنے دفتر کا ایک چپراسی ڈاک لے کر جارہا تھا۔ میں نے اسے آنکھ ماری اور کیمرا تھمادیا۔ وہ مجھے پولیس کی گاڑی میں دیکھ کے سمجھ گیا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔"
"تھانیدار دیکھ لیتا پھر؟"
"وہ موٹر سائیکل پر تھا۔ وہیں سے لوٹ گیا۔ اس کا تو باپ بھی اسے نہیں پکڑ سکتا تھا۔" غالب بولا۔
ایس پی کی جیپ اندر آئی تو کھٹا کھٹ سیلوٹ ہوئے۔ اس

"اب تم کرو گے؟" غالب نے کہا۔
"ابے مرزا غالب کے گھوڑے۔ صحافت میں نمالی نام سے کچھ نہیں ہوتا۔ دام وصول کرو بیٹا دام" اس نے انگلی اور انگوٹھے سے مال شمار کیا۔
"کسی کے اعتماد کو دھوکا دینا صحافت نہیں ہے۔ اگر تم نے ڈائری واپس نہ کی تو میں کسی دن تمہاری دوسری ٹانگ بھی توڑ دوں گا۔"
"بات سمجھا کرو۔ میرے چاند، بلیک میل ہم انہی کو کرتے ہیں جو خود کالے دھندے کرتے ہیں۔ جن کے پاس کالا دھن ہے۔ جن کے کرتوت کالے ہیں۔ کسی شریف آدمی کی عزت سے نہیں کھیلتے۔ لالی کے پاس آنے والے آخر کون تھے۔ انہیں تو سزا ملنی چاہیے۔"
"سزا دینے کے لیے قانون ہے، عدالتیں ہیں۔"
غازی کا زبردست قہقہہ تھانے میں گونجا "یار، یہاں بیٹھ کے بھی تم ایسی باتیں کرتے ہو۔ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں سر، مالِ حرام تو حرام میں ہی جاتا ہے۔ میں کون سا اس کمائی سے حج کرنے جارہا ہوں۔ یہ سارے بدمعاش چور ڈاکو، انکم ٹیکس کھانے والے اور رشوت لینے والے عیش کررہے ہیں تو ہم کیوں نہ کریں، انہی کے مال سے۔ صحافت اپنی جگہ، عیاشی اپنی جگہ۔ صحافی ہونے کا مطلب یہ تو نہیں کہ دنیا تیاگ دو۔ جوگی ہوجاؤ۔"
"یہ تو وہی فلسفہ ہوگیا کہ نماز میرا فرض ہے، چوری میرا پیشہ۔"
"واہ۔ کیا بات ہے تیری مرزا غالب ثانی۔ دریا کو بلکہ سمندر کو کوزے میں بند کردیا۔ اپنا یہی فلسفۂ حیات ہے اور رہے گا۔ تم کرو اپنی مقدس پیشہ ورانہ صحافت۔ ہم تو چور کو بھی پکڑیں گے اور کوتوال کو بھی اور دونوں سے بھتا بھی لیں گے۔ دونوں کو تڑی بھی دیں گے۔ یہ سالی دنیا اسی طرح قابو میں رہتی ہے۔ شرافت کا زمانہ کہاں ہے۔"
"غازی۔ وہ ڈائری واپس کردے۔ مجھے دے دے، میں اُسے تباہ کردوں گا۔"
"ہرگز نہیں۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ میں لالی کو حصہ دیتا رہوں۔ اسے تو پہلے سے زیادہ ہی مل جائے گا۔ اور وہ محفوظ بھی رہے گی۔ وہ اناڑی ہے بے ابھی..."
غازی کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی ایس پی ظفر حیات مسکراتا ہوا آگیا۔ ایس ایچ او کی کرسی پر بیٹھ کے اس نے چند کرسیاں اور منگوائیں جو میز کے گرد لگادی گئیں۔ خود ایس ایچ او اپنے افسر اعلیٰ کے بالکل پیچھے بیٹھا۔
"آئی ایم سوری کہ آپ لوگوں کو کچھ انتظار کرنا پڑا۔" ظفر حیات نے سگریٹ سُلگا کے اطمینان سے بات شروع کی "جیسا کہ آپ لوگ جانتے ہیں مجھے خصوصی تفتیش کے لیے یہاں بھیجا گیا تھا۔ ایک برٹش لیڈی ڈاکٹر مس شیلی کے بارے میں اس شبے کا اظہار کیا گیا تھا کہ اس کی موت حادثاتی نہیں تھی۔ اسے قتل کیا گیا
وقت وہ وردی میں نہیں تھا۔ سوٹ پہنے آیا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی تیوری پر بَل پڑ گئے۔ اس کے پیچھے پیچھے آنے والوں میں تازو کے علاوہ دو چار اخباری نمائندے تھے جن میں غازی بھی شامل تھا۔ وہ بیساکھی کے سہارے چلتا ہوا آیا تھا مگر بڑے کروفر کے ساتھ۔
"واٹ از دس؟" ظفر حیات نے حیرانی سے کہا "یہ سب لوگ آخر کیا کررہے ہیں یہاں؟"
"سر آپ نے ہی کہا تھا کہ اخبار والوں کو تفصیلات پریس کانفرنس میں بتائی جائیں گی۔" ایس ایچ او بولا۔
"میں نے؟" ظفر حیات حیرانی اور برہمی سے بولا۔
اب غالب نے کہا "ہم سے بھی یہی کہا تھا تم نے ایس ایچ او صاحب۔"
تازو نے فوراً بات اچک لی "ابھی تم نے ہی تو تمام اخبار والوں کو فون پر بتایا ہے۔ یہ سب لوگ ایسے ہی تو نہیں آگئے ہیں۔"
رابعہ نے بھی تائید میں سر ہلایا۔
"یہ غلط ہے۔ جھوٹ ہے سر۔"
اب غازی نے بیساکھی زمین پر مار کے کہا "اچھا ہم جھوٹے۔ تم سچ خود بتادو۔ یہ کیا قصہ ہے جعلی نوٹوں کا۔ یا اس معاملے کو بھی نوٹوں کے ساتھ دبانے کی فکر میں ہو۔"
غالب ہنسا "اس کیس کی اطلاع تو میں نے دی تھی۔ میں چشم دید گواہ ہوں۔ سارا محلّہ جانتا ہے، تصویریں بھی ہیں۔"
ظفر حیات نے فوراً صورتِ حال کی نزاکت کو سمجھ لیا "آل رائٹ لیڈیز اینڈ جنٹلمین مجھے کچھ مہلت دیں۔ میں ابھی آپ سب کے سامنے آیا ہوں۔ مجھے اپنے ایس ایچ او سے کیس کی تفصیلات حاصل ہوجائیں۔ پھر میں آپ لوگوں کو بریف کرسکوں گا۔ آپ لوگ تشریف رکھیں، چائے وغیرہ پئیں۔ میں اندر دس منٹ بات کروں گا۔ صرف دس منٹ۔"
ایس ایچ او نے طوعاً و کرہاً سب کے لئے پُرتکلف چائے کا انتظام کرنے کے احکامات جاری کئے اور خود ظفر حیات کے ساتھ اندر چلا گیا۔
"یہ ملزمان کو غائب تو نہیں کرسکتے نا؟" میں نے کہا۔
غالب ہنسنے لگا "کھوکھر اور چوہدری دلاور کو میرے سامنے حوالات میں بند کیا گیا تھا۔"
رابعہ نے فکرمندی سے کہا "مجھے ان کی ملی بھگت کے پیچھے گڑبڑ محسوس ہورہی ہے۔"
غازی نے کہا "ایسی کی تیسی گڑبڑ کرنے والوں کی۔ یہ حرامی ہیں تو ہم ان کے باپ ہیں۔"
غالب نے کہا "اپنے بارے میں تم نے سچ بولا غازی۔"
"تمہیں شکایت ہے مجھ سے۔ مجھے معلوم ہے۔"
"تم اس لڑکی لالی کی ڈائری چُرا لائے تھے؟" غالب نے کہا۔
"تمہیں کیوں ہمدردی ہے اس سے یار۔ وہ سالی سب کو بلیک میل کرتی تھی۔"

تھا۔ عدالتِ عالیہ میں ایک مدعی مس رابعہ قاری ایڈووکیٹ بھی ہیں۔ مس شیلی کے فیملی فرینڈز نے لندن سے بھی ایک وکیل کو نامزد کیا ہے جو تفتیش اور عدالتی کارروائی میں بحیثیت مبصر شریک ہوگا۔"

میں نے ہاتھ اُٹھا کے خادم سے کہا "ایس پی کو بتادو کہ میں اس نیگرو کا بھی وکیل ہوں جو چوہدری دلاور کو مجرم سمجھتا ہے مگر دُہرے قتل کے الزام میں اس کی جگہ جیل میں بند ہے۔ وہ دُہرے قتل کی واردات کا چشم دید گواہ تھا۔ جس میں دلاور نے اپنی سوتیلی ماں کو اور شیلی کے دھوکے میں اس نیگرو کی گرل فرینڈ کو قتل کیا تھا۔ وہ نیگرو چوہدری دلاور کی دوسری ماں کا تیسرا شوہر تھا۔"

خادم حسین نے میری بات دُہرادی "تہمت سے چہروں پر آخری جملے کے بعد مسکراہٹ نظر آنے لگی۔

"ٹھیک ہے۔ اب پلیز اپنے وکیل صاحب سے کہیں کہ دخل اندازی نہ کریں اور مجھے بات کرنے دیں۔ اگر تم ان کے کان میں میری بات کا فرنچ ترجمہ ساتھ ساتھ کرسکتے ہو تو اجازت ہے۔"

میں نے خادم کا پیر دبایا "کہہ دو ٹھیک ہے۔"

ایس پی نے اپنی بات پھر شروع کی "آج صبح مجھے ٹپ دی گئی کہ ڈاکٹر شیلی کا مبینہ قاتل چوہدری دلاور شاہدرہ میں نورجہاں کے مزار پر موجود ہے۔ یہ گمنام اطلاع تھی لیکن میں نے اسے نظرانداز نہیں کیا اور پولیس فورس کے ساتھ وہاں پہنچا لیکن میرے محترم دوست کی اطلاع غلط فہمی پر مبنی تھی۔ میرا اس کیس سے کوئی تعلق نہیں۔"

"کیونکہ آپ خصوصی تفتیش کررہے ہیں۔" کسی نے طنز کیا۔

"اور اب آپ کے سامنے قتل بھی ہوجائے تو آپ ایکشن نہیں لیں گے۔" غالب نے کہا "دوسری طرف دیکھتے رہیں گے کہ یہ میرا کام نہیں ہے۔"

غازی بولا "وہاں ایک نہیں دو قتل ہوگئے۔ پولیس فورس کے ایک آدمی کی موت کا ذمّے دار کون ہے آخر؟"

ایس پی نے تحمل سے کام لیا "وہاں چوروں کے ایک گروہ نے ٹھکانا بنالیا تھا۔ اس وقت ایک ہی چور موجود تھا۔"

"کیا اس نے خود کو چور تسلیم کرلیا تھا؟"

"یا اس کے ماتھے پر چور کا لیبل لگا ہوا تھا؟" غالب بولا "اسے تو کچھ بولنے کا موقع ہی نہیں دیا گیا۔"

ایس پی نے کہا "پولیس نے اسے ہلاک نہیں کیا تھا۔"

"پھر کس نے ہلاک کیا تھا؟ یہ تفتیش کون کررہا ہے؟" ایک صحافی بولا۔

"اگر وہ جگہ چوروں کا ٹھکانا تھی تو اس کی نگرانی کیوں ضروری نہیں سمجھی گئی؟" نازو نے سوال کیا "گروہ کے دیگر ارکان..."

ایس پی نے کہا "آپ لوگ غیر متعلقہ سوالات کررہے ہیں۔ یہ میرے دائرۂ اختیار میں نہیں آتے۔ آپ علاقہ ایس پی سے پوچھیں۔ میرے پاس وقت کم ہے۔"

"کیا آپ واپس اسلام آباد جارہے ہیں؟" غالب نے [illegible] "[illegible] کی فلائٹ ہے؟"

"مجھے اور بھی کام ہیں۔" ایس پی نے ضبط سے کام لیا۔

"کیا یہ کام زیادہ اہم نہیں ہے جس کے لیے آپ کو بھیجا گیا تھا۔ دیگر مصروفیات کو آپ ملتوی کرسکتے ہیں" غازی نے کہا۔

"اوکے۔ میں آپ کے ڈسپوزل پر ہوں اور جب تک آپ چاہیں گے یہاں موجود رہوں گا۔ ہر سوال کا جواب بھی دوں گا مگر پلیز، پہلے مجھے اپنی بات تو مکمل کرنے دیں۔" ایس پی نے برہمی سے کہا "پریس کانفرنس کے ایٹی کیٹس تو میں نہیں سکھاؤں گا آپ کو۔"

وقتی طور پر اس کی بات کا اثر ہوا۔ ظفر حیات نے دوسری سگریٹ جلا کے ایک گہرا کش لیا۔ "ایس ایچ او نے مجھے بتایا ہے کہ اس علاقے میں جعلی نوٹ کافی مقدار میں پکڑے گئے تھے دوسرے علاقوں میں بھی ملے تھے لیکن یہاں کچھ زیادہ تھے چنانچہ شک یہی تھا کہ کوئی گروہ اس علاقے میں سرگرم ہے۔ پولیس نے چھاپا مارنے کی تیاری مکمل کرلی تھی لیکن خبر لیک آؤٹ کرگئی۔ ہماری طرح اخبار والوں کے بھی مخبر ہوتے ہیں۔ کسی نے ایک سینئر صحافی مرزا غالب کو ٹپ دی اور یہ پولیس سے پہلے پہنچ گئے۔ پولیس کے کام میں دخل اندازی کو جرم سمجھا جاسکتا ہے۔ اگر اس طرح عام شہری معاملات کو خود ڈیل کرنے لگیں تو پھر پولیس کی کیا ضرورت ہے۔ مرزا غالب نے بہت بڑا رسک بھی لیا تھا۔ پولیس وہاں دس منٹ بعد پہنچی تھی۔ اگر مجرم ہمارے صحافی دوست کو مار کے نکل جاتے تو پولیس کی ساری پلاننگ فیل ہوجاتی۔ خیر اب مجرم پکڑے جاچکے ہیں اور تفتیش کے نتائج سامنے آجائیں گے۔"

خاموشی کا وقفہ آتے ہی غازی نے سوال کیا "اگر پولیس کا دعویٰ ہے کہ جعلی نوٹ پہلے ہی پکڑے گئے تھے تو یہ بتایا جائے کہ کب اور کہاں یہ نوٹ چلانے والے گرفتار ہوئے تھے؟"

ایس ایچ او نے کہا "کچھ لوگوں نے خود یہ نوٹ دیے تھے۔"

"وہ کون لوگ تھے "کیا ان کے بارے میں تفتیش ہوئی تھی؟"

"آخر پولیس ریکارڈ پر کیا ہے یہ ثابت کرنے کے لیے کہ اسے جعلی نوٹ چھاپنے والوں کے گروہ کا پہلے سے علم تھا اور وہ چھاپا مارنے ہی والے تھے؟" غازی نے اونچی آواز میں کہا۔

"یہ بھی جھوٹ ہے کہ وہ دس منٹ بعد پہنچ گئے تھے" غالب نے کہا۔

ایس پی نے ہاتھ اُٹھایا "میں متنازعہ سوالات کے جواب نہیں دوں گا۔"

رابعہ نے کہا "ٹھیک ہے۔ آپ یہ بتائیں کہ کیا چوہدری دلاور کو بھی وہیں سے گرفتار کیا گیا ہے؟"

"اسے سامنے لایا جائے" غالب نے مطالبہ کیا۔

سکتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہاں اتنے لوگ موجود ہیں۔ سب ذمّے دار صحافی ہیں۔ میں انہیں حقیقت سے آگاہ کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ حیدر بخش عرف مٹھو فیصل آباد کا رہنے والا ہے۔"

اب رابعہ نے احتجاج کیا "یہ غلط ہے۔ یہ چوہدری دلاور ہے۔ اس کا اصل چہرہ میک اپ سے بدلا گیا ہے۔"

"خاتون۔ آپ جذباتی ہورہی ہیں" ظفر حیات بولا "میں پوری ذمّے داری اور یقین کے ساتھ بتارہا ہوں کہ یہ ملزم کا اصل چہرہ ہے۔ میک اپ کے بغیر۔ یہ رب نواز کھوکھر کا ایک ساتھی ہے۔ اس کا دوسرا ساتھی زاہد علی عرف بادل مارا جاچکا ہے۔ غالباً اس کا قتل افشائے راز کے ڈر سے خود مٹھو نے کیا..."

"یہ ہم سب کی آنکھوں میں دھول جھونکی جارہی ہے" غالب نے غصے سے میز پر مکّا مارا "میں مطالبہ کرتا ہوں کہ اس میک اپ..."

"واٹ میک اپ" ظفر حیات نے گرج کے کہا "بی ہیو یور سیلف مسٹر غالب۔ ورنہ میں تمہیں باہر نکلوادوں گا۔"

"تم ایک مجرم کو بچارہے ہو" نازو... نے چلّا کے کہا "تم سچے ہو تو ہمیں چیک کرنے دو۔"

غازی نے بیساکھی زمین پر ماری "بالکل ٹھیک۔ میک اپ ہوگا تو ابھی معلوم ہوجائے گا۔ میرے پاس لاؤ اسے۔"

"سوری جنٹلمین۔ تفتیش آپ لوگوں کا کام نہیں ہے۔ ہم نے بھی زندگی مجرموں سے نمٹتے گزاری ہے۔ ہم اتنے اندھے نہیں ہیں کہ کوئی مجرم میک اپ کرکے ہمیں دھوکا دے سکے۔ آپ لوگ خود اس سے کچھ پوچھنا چاہیں تو میری طرف سے اجازت ہے۔"

غازی نے کہا "مٹھو بیٹے۔ اپنا نام بتاؤ۔"

کچھ لوگ مسکرانے لگے "مٹھو بیٹے نہیں' میں حیدر بخش ہوں۔ فیصل آباد میں رہتا ہوں۔ باپ کا نام غلام قادر..." غالب نے طوطے کی نقل اُتاری۔

ایس ایچ او نے دونوں ملزموں کو واپس بھجوادیا۔ ظفر حیات اُٹھ کھڑا ہوا "خادم حسین' تمہارا گوری چمڑی والا وکیل مطمئن ہے یا نہیں؟"

خادم نے مجھ سے کہا "میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے جی۔"

میں نے کہا "اسے کہو کہ ملزم کو پھر یہاں لایا جائے۔ میں مطمئن نہیں ہوں۔"

ظفر حیات نے مجبوراً میری خواہش پوری کی۔ اب ساری نظریں مجھ پر تھیں کہ ایک ماہر غیر ملکی وکیل کے پاس پولیس کے جھوٹ کا کیا توڑ ہے۔

میں نے خادم کی معرفت کہا "حیدر بخش۔ اپنے بارے میں سب کو تفصیل سے بتاؤ' اونچی آواز میں تاکہ سب سُن لیں۔"

چوہدری دلاور نے قطعی بدلی ہوئی آواز میں کہنا شروع کیا

"میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ یہ بے بنیاد افواہ کس نے پھیلائی تھی اور کیوں؟" ایس پی ظفر حیات نے کہا۔

"بے بنیاد افواہ!" غالب نے چلّا کے کہا "پولیس پارٹی کے ساتھ میں آیا تھا۔ میں نے اطلاع دی تھی پولیس کو۔"

ظفر حیات بولا "کیا اطلاع دی تھی آپ نے مرزا غالب صاحب؟"

"چوہدری دلاور نے میرے سامنے ایک قتل بھی کیا تھا۔ کھوکھر کے گھر میں۔ اس نے دلاور کا راستہ روکا تھا۔"

"کون تھا وہ آدمی؟" ایس ایچ او بولا۔

"میں اسے نہیں جانتا۔ مگر اس کی لاش پولیس نے اُٹھائی تھی۔ کیا پولیس کو وہاں چوہدری دلاور بے ہوش پڑا نہیں ملا تھا؟ آلۂ قتل اس کے ہاتھ میں تھا۔"

"وہ ریوالور بھی پولیس کے قبضے میں ہے..."

"اس پر دلاور کے فنگر پرنٹس ہوں گے" غالب نے کہا۔

"مرزا غالب صاحب۔ کیا آپ چوہدری دلاور کو پہچانتے ہیں؟" ظفر حیات نے سکون سے کہا۔

"میں اس سوال کا کیا جواب دوں؟ کیا آپ نہیں پہچانتے۔ یہاں جتنے لوگ موجود ہیں سب پہچانتے ہیں اُسے" غالب نے کہا۔

ایس پی نے رابعہ' نازو اور دیگر صحافیوں کی طرف دیکھا۔ پھر اس نے پیچھے پلٹ کے ایس ایچ او سے کچھ کہا۔ ایس ایچ او نے سر ہلایا اور اندر چلا گیا۔

"میں جائے واردات سے پکڑے جانے والوں کو ابھی پیش کرتا ہوں" ایس پی ظفر حیات بولا "چوہدری دلاور کو آپ سب یقیناً پہچان لیں گے۔ یہی ہے نا اس کی تصویر!" اس نے جیب میں سے ایک تصویر نکال کے دکھائی۔

"لیکن اس نے بھیس بدل رکھا ہے" غالب سمجھ گیا کہ پولیس اب کیا چال چلنے والی ہے۔

ایس ایچ او دو افراد کے ساتھ واپس آیا۔ ان دونوں کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔

"یہ ہے چوہدری دلاور" غالب نے کہا۔

ظفر حیات مسکرانے لگا "اور یہ دوسرا کون ہے؟"

"اسے میں نہیں جانتا۔ یہ کھوکھر ہوگا۔"

"آپ اسے بھی نہیں جانتے۔" ظفر حیات نے کہا "یہ چوہدری دلاور نہیں ہے۔ حیدر بخش عرف مٹھو ہے۔ باپ کا نام غلام قادر۔"

"یہ جھوٹ ہے" غالب اور نازو ایک ساتھ کھڑے ہوگئے۔

ظفر حیات نے دوسرے لوگوں کی طرف دیکھا "آپ کا خیال کیا ہے؟"

"یہ میک اپ میں ہے" غالب نے چلّا کے کہا۔

"ڈونٹ شاؤٹ۔ چیخنے چلّانے سے جھوٹ کبھی سچ نہیں بن

"میرا نام حیدر بخش ولد غلام قادر ہے۔ میں فیصل آباد میں بلاک میکر تھا۔ مجھے رب نواز کھوکھر نے یہاں بلایا اور کہا کہ کرنسی چھاپنے کے کام میں ایک ماہر کاریگر کی مدد چاہیے۔"

میں نے اس کی آواز نازو کے چھوٹے سے ٹیپ پر ریکارڈ کی تھی جو مجھے نازو نے میز کے نیچے سے تھما دیا تھا۔

"تھینک یو۔ اتنا کافی ہے" میں نے کہا "حیدر بخش۔ تم بلاک میکنگ کا کام کب سے کر رہے ہو؟"

"کئی سال سے جی" چوہدری دلاور بولا۔

"ہر قسم کا بلاک بنا سکتے ہو' اگر میں کہوں؟"

"ہاں جی" دلاور ذرا بھی نہ گھبرایا۔

میں نے میز پر سے ایک پیپر ویٹ پہلے ہی اُٹھا لیا تھا اور اسے پتلون پر رگڑ کے صاف بھی کر لیا تھا "یہ دیکھو۔ اس پیپر ویٹ کے اندر کتنے رنگ کے پھول ہیں؟"

دلاور نے پیپر ویٹ لے لیا اور غور سے دیکھ کے بولا "تین رنگ کے۔"

میں نے خادم کی زبانی کہا "تھینک یو۔ اب تم جا سکتے ہو۔ ایس پی صاحب۔ آپ کی اجازت سے میں یہ پیپر ویٹ اپنے پاس رکھوں گا۔"

"وہ کس لیے؟" ایس ایچ او چونکا۔

"میں نے اس پر ملزم کے فنگر پرنٹ حاصل کیے ہیں۔ ان کا موازنہ بعد میں چوہدری دلاور کے فنگر پرنٹس سے کیا جا سکتا ہے" میں نے کہا۔

غالب اور نازو کا چہرہ کھل اُٹھا۔ غازی نے بے ساختہ کہا "ابے واہ" اور دوسرے صحافی بھی متاثر ہوئے مگر ایس ایچ او کا رنگ اُڑ گیا۔ خود ظفر حیات کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمودار ہو گئے مگر وہ انکار کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

میں نے کہا "ابھی جو کچھ میں نے ملزم سے پوچھا تھا۔ وہ بھی میرے پاس ٹیپ ریکارڈ میں محفوظ ہے۔ اس کا اصل مقصد ملزم کی آواز کا نمونہ حاصل کرنا تھا۔ آپ یقیناً جانتے ہوں گے کہ آواز کا ایک اسپیکٹرم SPECTRUM ہوتا ہے۔ ایک شخص کی آواز کا گراف مشین پر بنایا جائے تو کبھی دوسرے شخص کی آواز سے نہیں ملتا اور کوئی آواز بدل کے بات کرے تب بھی گراف نہیں بدلتا۔ میں سونوگرافی سے چوہدری دلاور کی آواز کے گراف اور اس ملزم کے گراف کا موازنہ کر سکتا ہوں۔ لیبارٹری سے رپورٹ بھی لے سکتا ہوں کہ دونوں میں کیا فرق ہے۔"

پلک جھپکتے میں ظفر حیات اور ایس ایچ او کے جھوٹ کی عمارت زمیں بوس ہو گئی۔ "آئی ایم سوری۔ میں اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

میں نے کہا "میں بلا اجازت کچھ نہیں کروں گا۔ یہ ملزم آپ کی تحویل میں ہے۔ آپ خود اس کے فنگر پرنٹس لے کر عدالت میں پیش کر دیں اور سونوگراف کے لیے ملزم کی آواز اور دلاور کی آواز کے نمونے بھی لے آئیں۔"

اب رابعہ نے اور غازی نے محاذ سنبھال لیا "ایس پی صاحب۔ ملزم کے فنگر پرنٹ دینے میں پولیس کا کیا نقصان ہے؟ اور آواز تو سب نے ریکارڈ کی ہے۔ پوری پریس کانفرنس کی ریکارڈنگ ہے۔"

غازی نے سر ہلایا "ہم آف دی ریکارڈ بات پر ٹیپ نہیں چلاتے ورنہ ہر لفظ کو بطور ثبوت محفوظ رکھتے ہیں۔"

ظفر حیات کے لیے ہتھیار ڈالنے کے سوا چارہ نہ رہا۔ "او کے۔ میں اسے انا کا مسئلہ نہیں بناؤں گا۔"

میں نے مسکرا کے خادم کی معرفت کہا "تھینک یو" اور پیپر ویٹ کو رومال میں لپیٹ لیا "کیا مجھے چوہدری دلاور کے فنگر پرنٹ کا نمونہ مل سکتا ہے؟ اور کسی فنگر پرنٹ ایکسپرٹ کا نام پتا...."

میں نے باہر آ کے دیکھا تو چوہدری دلاور کی جیپ موجود تھی لیکن سبز رنگ کی ڈاٹسن کار غائب ہو چکی تھی۔ وہ چار خونخوار قسم کے شکاری بھی نظر نہیں آ رہے تھے جن کی صورت سے ہی ان کے قاتلانہ عزائم کا اظہار ہوتا تھا۔

غازی نے بڑے جوش کے ساتھ مجھ سے ہاتھ ملایا اور بولا "بھئی مان گئے' ولایتی مال ولایتی ہی ہوتا ہے۔"

میں نے خادم حسین کے ذریعے سے جواب دیا "اتنے حسین وکیل یورپ میں نہیں ہوتے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس کیس میں مدعی اور وکیل کی حیثیت سے یہ خاتون پیش ہوں گی تو جج دل کے ہاتھوں مجبور ہو جائے گا۔ دلیل سُنے گا ہی نہیں اور آپ کے حق میں فیصلہ صادر کر دے گا۔"

خادم حسین نے اس کا ترجمہ کیا تو رابعہ کا رنگ لال ہو گیا "خادم حسین ان سے کہو کہ یوں فیصلہ ہوا تو اپیل منظور ہو جائے گی۔ ہاں ملزم دل کے ہاتھوں مجبور ہو کے خود پھانسی پر لٹک جائے تو بات ہے۔"

میں نے جواب دیا "اگر میں ملزم ہوتا تو ایسا ہی کرتا۔"

رابعہ نے دوسروں کی موجودگی کا لحاظ کرتے ہوئے موضوع بدل دیا "آج تو آپ کی ایک چال نے بساط اُلٹ دی۔ پولیس کو چاروں شانے چت کر دیا۔"

مولوی خادم حسین سر کھجانے لگا "سمجھ تو آپ گئے ہوں گے۔ ایسی بامحاورہ اردو کا میں کیا ترجمہ کروں۔ ویسے خاتون سے مجھے بھی اتفاق ہے۔"

غازی نے بڑی بے تکلفی سے میرے کندھے پر ہاتھ مارا "ابھی پاکستان کی پولیس سے پہلا سابقہ پڑا ہے بیٹے۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔"

میں نے کہا "خادم۔ اس لنگڑے صحافی سے کہو کہ پھر اس نے مجھے بیٹا کہا یا ہاتھ مارا تو میں اس کی بیساکھی سے اس کا سر توڑ دوں گا۔"

خادم حسین نے ترجمہ کیا "وکیل صاحب فرماتے ہیں کہ میں اب اجازت چاہتا ہوں۔ آپ سب کا بہت بہت شکریہ۔"

رابعہ نے کہا "اگر وکیل صاحب چاہیں تو میں انہیں ہوٹل چھوڑ سکتی ہوں۔"

میں نے جواب دیا "چاہتے تو ہم یہ ہیں کہ خاتون ہوٹل چلیں مگر چھوڑ کر نہ جائیں۔"

اب دوسرے لوگ رخصت ہو چکے تھے چنانچہ خادم حسین کی ضرورت بھی نہ رہی تھی۔ سورج غروب ہو چکا تھا اور سڑک پر بیشتر گاڑیاں ہیڈ لائٹس کے ساتھ چل رہی تھیں۔ خادم بھی چلا گیا تو میں نے کہا "فی الحال آپ لوگ بھی جائیں۔ جیسے سب گئے ہیں۔"

"کیا مطلب۔ تم ساتھ نہیں چلو گے؟" رابعہ بولی۔

"نہیں۔ میری چھٹی حس کہتی ہے کہ پوشیدہ آنکھیں مجھے دیکھ رہی ہیں اور خفیہ ہاتھ میری گوشمالی کے لیے تیار ہیں" میں نے رابعہ سے اور پھر نازو سے رخصت ہونے کے انداز میں ہاتھ ملایا "میں پیدل جاؤں گا۔"

رابعہ متفکر ہو گئی۔ "یعنی انہیں موقع فراہم کرو گے کہ پنگا لیں۔"

غالب نے کہا "اتفاق سے میری چھٹی حس کا سگنل بھی یہی ہے لیڈیز' میرا خیال ہے کہ آپ لوگ اپنی صورت گم کریں۔"

"بدتمیزی مت کرو۔" نازو بولی "اتنی بُری لگتی ہے ہماری صورت۔"

"فرق صرف الفاظ کا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ تھا کہ تشریف لے جائیں۔ رہی صورت کی بات تو اس میں کیا شک ہے کہ بدقسمتی ہے ہماری۔ ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا۔"

"خاک ہوتا۔ جھک مارتے پھرتے۔ کوئی منہ نہ لگاتا" نازو بولی۔

"منہ تم کب لگاتی ہو۔ کبھی منہ کے قریب نہیں آنے دیا۔" غالب نے آہ بھری۔

میں نے کہا "دیکھو فضول باتوں کے لیے وقت نہیں ہے۔ تم دونوں گاڑی میں جاؤ۔ میں اور غالب بھی آفس پہنچ جائیں گے۔"

"لیکن...."

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ سارے کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔ دلاور نے پولیس کے ساتھ مل کے جو چال چلی ہے اس کے جواب میں ہم ہاتھ پر ہاتھ رکھ کے بیٹھ نہیں سکتے۔ تم جاؤ' غالب تم پیچھے مخالف سمت میں پیدل روانہ ہو جاؤ اور سو قدم کا فاصلہ رکھ کے واپس میرے پیچھے آؤ۔"

"تم پیدل جاؤ گے؟" رابعہ مجبوراً نازو کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی "ٹیکسی لے لو۔ آفس تو بہت دور ہے۔"

"مشورے کا شکریہ' ضرورت پڑنے پر میں بحری جہاز لے کر آ جاؤں گا۔" میں نے کہا "اور تم تک پہنچنا ہو تو قطب شمالی بھی میرے لیے دور نہیں۔"

غالب مخالف سمت میں جا رہا تھا۔ کار بھی گئی تو میں بے فکری سے دونوں ہاتھ پتلون کی جیب میں ڈال کے سڑک پر چلنے لگا۔ کسی اجنبی کی طرح میں ہزار بار کے طے کیے ہوئے راستوں پر ہر چیز کو ایسے دیکھتا رہا جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہوں لیکن اس طرح میں گرد و پیش پر نظر رکھ سکتا تھا۔

ابھی میں زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ پیچھے سے دلاور کی سبز رنگ کی ڈاٹسن کار بڑی تیزی سے آئی۔ اگر میں پہلے سے محتاط نہ ہوتا اور چھلانگ مار کے فٹ پاتھ پر نہ چڑھتا تو شاید کار مجھے کچل دیتی۔ ایک ساتھ وہ سب وحشیانہ انداز میں ہنسے جو کار میں تھے۔ پھر کار رُک گئی۔ میں نے جن چار بدمعاش قسم کے افراد کو تھانے کے باہر دیکھا تھا ان میں سے دو پچھلا دروازہ کھول کے باہر آ گئے۔ ان دونوں نے میرا راستہ روک لیا۔

ایک نے بڑک مار کے کہا "کھلو جا تھاں اتے وکیل دیا سوریا" (رُک جا یہیں وکیل کے سسر) اس نے بڑی آواز کے ساتھ کمانی دار چاقو کھولا۔

دوسرے نے بھی چمکیلے پھل والا خنجر میری پسلی سے لگا دیا "کڈ دیاں آندراں ایتھے ای تے نالے تیری فرنچ؟" (آنتوں کے ساتھ تیری فرنچ بھی نکال دوں؟)

میں نے خوف زدہ ہو کے ہاتھ اوپر اُٹھائے اور فرنچ میں کہا "میرا اندازہ بالکل ٹھیک تھا۔"

وہ سمجھے کہ میں ان سے تشریف آوری کا مقصد پوچھ رہا ہوں۔ گاڑی میں سے سر نکال کے ڈرائیور نے کہا "اوئے پاگل دے پتر۔ جلدی کام کروا اپنا۔ خبردار جو اسے خراش بھی آئی۔"

ایک خنجر والے نے اشارے سے کہا "ٹیپ ریکارڈر؟"

میں نے سر ہلایا اور چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر اسے دے دیا۔ کسی مزاحمت کے بغیر یہ ان کے لیے بڑی غیر متوقع کامیابی تھی۔ اب دوسرے نے اشارے سے پیپر ویٹ مانگا۔ "پیپر ویٹ۔ فنگر پرنٹ؟"

میں نے کچھ دیر سوچا اور دوسری جیب میں سے دلاور کے فنگر پرنٹ والا پیپر ویٹ بھی دے دیا مگر اس کے ساتھ ہی میں فرنچ میں احتجاج بھی کرتا رہا۔ میں نے پولیس اور رپورٹ کے الفاظ بھی استعمال کیے تھے کہ وہ اندازہ کر لیں کہ میں ان کے خلاف پولیس کو رپورٹ کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔

"او جا یار۔ سو واری جا پولیس کول۔"

دوسرے نے ناقابلِ اشاعت الفاظ میں یہ واضح کیا کہ پولیس کے پاس جا کے میں واپس کیسے آؤں گا۔ وہ قہقہہ مار کے ہنسے اور پھر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ گاڑی چند منٹ میں غائب ہو گئی۔ یہ ساری کارروائی فٹ پاتھ سے ذرا ہٹ کے اندھیرے میں ہوئی تھی۔

سڑک پر سے گزرنے والی ہر گاڑی تانگے اور رکشا میں بیٹھا ہوا مسافر یا ڈرائیور کیسے اندازہ کر سکتا تھا کہ اتنی خاموشی سے دائیں بائیں کوئی مجرمانہ فعل کا ارتکاب کر رہا ہے۔ بفرضِ محال میں چلاتا تب بھی کسی کے مدد کے لیے آنے سے پہلے ہی وہ اپنا کام کر کے نکل جاتے۔ میں رضاکارانہ طور پر دونوں چیزیں انہیں نہ دیتا تو وہ زبردستی میری تلاشی لیتے۔ اس میں یہ خطرہ تھا کہ وہ مجھ سے ریوالور بھی چھین کر لے جاتے۔

غالب چند منٹ بعد ہی پہنچ گیا "یہ وہی تھے؟"

میں نے کہا "ہاں۔ مجھے پورا یقین تھا کہ ایسا ہی ہوگا۔"

"تم نے چاروں کی صورت دیکھ لی ہے نا؟"

"پہلی بار دور سے دیکھی تھی۔ اب اتنے قریب سے دیکھی ہے کہ بھول نہیں سکتا۔ تم کہاں تھے؟"

"جب انہوں نے خنجر نکالے تھے تو میں مشکل سے پچاس قدم کے فاصلے پر تھا اور فائر کرنے کے لیے بالکل تیار تھا۔"

"اب تیار ہو جاؤ اس کھیل کے آخری خطرناک سین کے لیے" میں نے کہا "تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ پولیس کیا گیم کھیل رہی ہے؟"

غالب نے اقرار میں سرہلایا "میرے اور تمہارے خیالات کی حد بالکل متوازی چل رہی ہے۔ آخری راؤنڈ میں مقابلہ بس ہم دو کریں گے؟"

"ویسے تو نازو کا ساتھ ہونا اشد ضروری ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ پھر رابعہ کہاں پیچھے رہے گی۔" میں نے کہا "مجھے آج شدت سے گل اور محسن کی کمی محسوس ہو رہی ہے۔ اکرام شیخ اور کاجل بھی ہوتے تو کیا بات تھی۔"

"اللہ ان سب کی مغفرت کرے۔" غالب نے ہاتھ اُٹھا کے کہا "اب انہیں یاد کرنے سے کیا فائدہ جو گزر گئے۔ یادیں چھوڑ کے۔ بیویوں کو پیارے ہو گئے۔"

"مرزا جی۔ آج تم نے جس کیمرے سے تصویریں اُتاری تھیں۔ کیا وہ مل سکتا ہے؟"

"بالکل مل سکتا ہے۔"

"وہی فلم بھی ہوگی اس میں۔ کسی نے نکالی تو نہیں ہوگی؟"

غالب نے نفی میں سرہلایا "کیمرا میری الماری میں بحفاظت رکھ دیا گیا ہوگا۔ میری مرضی اور اجازت کے بغیر فلم کو کوئی نہیں چھوئے گا۔"

"ویری گڈ۔ اب یا تو تم بقلم خود جا کے وہ کیمرا لاؤ۔ فلیش کے ساتھ ہو تو بہتر..."

"فلیش اسی کے ساتھ ہے۔"

"ایک اور کیمرا چاہیے جو اندھیرے میں تصویریں اُتارے۔ اس حد تک صاف کہ صورتیں شناخت ہو جائیں۔"

"بہتر تھا انفرا ریڈ کیمرا ہو مگر خود جا کے لانا پڑے گا۔ خدا کرے فلم ہو اس میں" غالب نے کہا۔

"اچھا تم جاؤ۔ میں بھی آتا ہوں حلیہ بدل کے۔ پھر اسی جگہ ملیں گے" میں نے کہا۔

غالب نے گھڑی دیکھی "ایک گھنٹے بعد۔"

"ایک گھنٹا زیادہ ہے۔ بس جا کے آنے میں جتنا وقت لگے" میں نے کہا اور قریب سے گزرنے والے ایک رکشا میں گھس گیا۔

رابعہ اور نازو بڑے جوش و خروش سے آج کی روداد منظر کو سُنانے میں لگی تھیں۔ . وقار یوسف بڑی سعادت مندی سے ان کے لیے چائے بنا رہا تھا۔

"لو۔ آ گیا وہ جعلی وکیل جس کا ذکر ہو رہا تھا۔" منظر بولا "سالا فرنچ گدھا۔"

میں نے کہا "تو جل رہا ہے میری تعریف سُن کے۔"

منظر نے قہقہہ مارا "ابے بھوتنی کے۔ یہ تعریف ہے؟ ابے لیلیٰ اگر مجنوں کو اچھا نہیں کہے گی تو کیا اس کے گدھے کو اچھا کہے گی۔"

"تیری بیوی گدھے کو اچھا کہتی ہوگی تیرے مقابلے میں۔ شرط لگا لے۔"

منظر نے آہ بھری "سچ کہتا ہے شاید تُو۔ سولہ بچے کس گدھے کے ہوتے ہیں۔"

"فرنچ گدھے کے" میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

منظر گلا پھاڑ کے ہنسنے لگا "ہو ہو ہو۔ بھئی بڑے نیک ارادے ہیں تیرے۔ اللہ مبارک کرے۔ آمین، صد آمین۔"

رابعہ نے بڑ کے کہا "پتا نہیں کیا اناپ شناپ بولتے رہتے ہیں آپس میں اور خود ہی ہنستے رہتے ہیں۔"

"ہاں۔ تمہیں تو رونا ہی آ رہا ہوگا۔" منظر نے زار و قطار ہنستے ہوئے کہا "بات ہی ایسی ہے..."

نازو اور وقار یوسف بھی مسکرانے لگے تو رابعہ کو بھی ہنسی آ گئی اور میں فوراً حلیہ بدلنے کے لیے اندر گھس گیا۔ زیڈ نے میرا مسئلہ آسان کر دیا تھا۔ مجھے وکیل سے دوبارہ چوکیدار بننے میں دس منٹ بھی نہیں لگے۔ میں وردی پہن کے باہر نکلا تو منظر رخصت ہو رہا تھا۔

"یار میں بھی جا رہا ہوں واپس" میں نے کہا۔

"واپس کہاں۔ تھانے؟" منظر رُک گیا "اب کیا سوجھی ہے؟"

میں نے کہا "دلاور کو دلاور ثابت کرنا ہے۔ اور اس کا ثبوت حاصل کرنا ہے۔"

منظر نے ٹھنڈی سانس لی "میں یہ نہیں پوچھوں گا کہ کیسے کیونکہ تیری بات میری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ میری بات تو مانتا نہیں۔ جو جی میں آئے کر بھوتنی کے۔ بھگتنے کے لیے ہم جو ہیں۔"

"میرے ساتھ غالب بھی ہوگا یار۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔"

"۔۔۔ کی نوبت نہیں آئے گی مگر کوئی بات خلاف توقع ہو سکتی ہے۔ ایسی صورت میں آپ تو پتہ بھی نہیں کریں گی وکیل صاحب۔"

"کیوں؟" رابعہ نے بُرا مان کے کہا "میں وہی کروں گی جو میرا دل چاہے گا۔"

"یہ نہیں کہ تمہارا کوئی کردار ہی نہیں ہے۔ تمہارا رول بہت اہم ہے" میں نے کہا اور پھر انہیں مختصراً اپنے پروگرام سے آگاہ کر دیا۔

غالب مجھ سے پہلے طے شدہ جائے ملاقات پر موجود تھا "یہ بلائیں بھی ساتھ ہیں؟" اس نے نازو کی طرف دیکھ کے کہا۔

میں نے کہا "دیکھا؟ میں نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ اب خود سُن لیا نا۔"

"تمہاری بلائیں تو میں دور کروں گی بعد میں۔" نازو نے کہا۔

میں نے کہا "کیمرے لائے ہو؟"

غالب نے شولڈر بیگ آگے بڑھا دیا "دونوں کیمرے اس میں ہیں۔"

میں نے فلیش والا کیمرا رابعہ کو پکڑا دیا۔ "اس سے تم کو شاید ایک ہی تصویر کھینچنے کا موقع ملے گا۔ دوبارہ فلیش کے چارج ہونے میں ایک منٹ تو لگتا ہے اور اتنی مہلت تمہیں کوئی نہیں دے گا۔ تمہیں اپنی حفاظت بھی کرنا ہوگی اور کیمرے کی بھی۔ اگر اور کچھ نہ سوجھے تو تصویر اُتارتے ہی بھاگ لینا۔ گاڑی لے کر بھاگ جانا۔"

رابعہ نے کہا "یہ ایک تصویر کب کھینچی جائے گی؟"

"تم پولیس اسٹیشن کے گیٹ سے کچھ فاصلے پر گاڑی میں بیٹھ کے دیکھتی رہو گی۔ مجھے اُمید ہے کہ چوہدری دلاور اپنے اصل حلیے میں برآمد ہوگا۔ شاید اس کے ساتھ کوئی اور بھی ہوگا مثلاً ڈی ایس پی شاہد علی یا انسپکٹر خدا بخش۔ تمہیں ان کو فوکس کرنا ہے۔ اس طرح کہ وہ تھانے کے اندر نظر آئیں۔ فلیش لائٹ پر وہ چونکیں گے۔ یاد رکھو یہ تصویر ہی اصل کام کرے گی۔ اس میں باقی تصویریں آج دن میں اُتاری گئی تھیں اور جس واردات کا یہ ریکارڈ ہے اس کی رپورٹ کل کے اخبارات ضرور دیں گے۔ وقت اور تاریخ کے ساتھ۔ جو تصویر تم اُتارو گی وہی ثبوت ہوگی کہ بعد میں اُتاری گئی تھی۔ ہماری بالکل فکر مت کرنا۔ تصویر کو بچا کر کیمرے سمیت بھاگ جانا۔ کسی کو پیچھا کرنے کا موقع بھی نہ ملے۔"

"تصویر تھانے میں دلاور کی موجودگی کا ثبوت ہوگی۔ رات کا وقت اور آج کی تاریخ" رابعہ نے تعریفی لہجے میں کہا۔

"اب تم جاؤ۔ موقع محل دیکھ کے پوزیشن لے لو" میں نے کہا۔

رابعہ نے سرہلایا اور گاڑی میں بیٹھ کے روانہ ہو گئی۔ میں نے دوسرا کیمرا نازو کو دیا "تمہیں اندر کی عکاسی کرنی ہے۔"

"کیمرا لے کے مجھے اندر کون جانے دے گا؟"

میں نے کہا "ابھی چل کے دیکھتے ہیں۔ راستہ بناتے ہیں"

"میری فکریں تو اسی دن تمام ہوں گی جس دن یہ دونوں تم کو شرع کے مطابق گود لیں گی۔ اور تمہارے وجود میں یہ جو فالتو پنگا انرجی بھری ہوئی ہے نا یہ صَرف ہو گی پیداواری مقاصد میں تو دنیا میں بڑا سکون ہو جائے گا۔ ابھی تو نافرمان اولاد کی طرح تم عاق کر دینے کے قابل ہو مگر کیا کروں، مجھ میں بھی شفقتِ پدری اتنی بھری ہوئی ہے۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا "جتنی ہماری پنگا انرجی۔"

منظر چلا گیا۔ تو نازو نے ماتھے پر تیوری ڈال کے کہا "میں تو سمجھی تھی کہ غالب اپنے آفس چلا گیا۔"

"آج اتفاق سے تم نے ٹھیک سمجھا تھا.... لیکن وہ بھی آفس کو ہاتھ لگانے گیا ہے... خدا حافظ۔"

نازو اُٹھ کھڑی ہوئی "تم ایسے نہیں جا سکتے۔ پہلے بتاؤ ہمیں بھی کہ کیا کرنا چاہتے ہو تم دونوں؟"

"کرنا تو بہت کچھ چاہتے ہیں مگر بتاتے ہوئے شرم آتی ہے۔"

رابعہ نے کہا "میں بھی ساتھ چلوں گی تمہارے۔"

"ایسے نہیں۔ گا کے سُناؤ۔ تمہارے سنگ میں بھی چلوں گی پیا جیسے پتنگ پیچھے ڈور" میں نے زنانہ آواز بنا کے گایا۔

"یہ مذاق کی بات نہیں ہے۔ ہم تمہیں بے مہار نہیں چھوڑ سکتے۔"

"چلو بابا چلو۔ غالب ٹھیک ہی کہتا تھا۔ بلائیں چمٹ گئی ہیں ہماری جان کو" میں نے کہا۔

"غالب ایسا نہیں کہہ سکتا" نازو بولی۔

"تمہیں کیا معلوم۔ تم اسی میں خوش ہو جو وہ تمہارے منہ پر کہتا ہے مگر وہ ایک نمبر کا جھوٹا اور لپاڑیا ہے۔"

"بالکل تمہاری طرح؟" رابعہ نے دروازے کو مقفل کر دیا۔

"میری بات اور ہے۔ میں تو اتنا بھولا بھالا، شرمیلا اور نیک ہوں کہ بس دل سے دعا نکلتی ہے۔"

"کس کے لیے؟"

"تمہارے لیے اور کس کے لیے۔ کہ اللہ تمہیں ایسی ہی اولاد دے۔"

"اب تم حد سے بڑھ رہے ہو۔" رابعہ نے خفگی سے کہا "بے ہودگی پر اُتر آئے ہو۔"

"کیا کسی کو دعا دینا بے ہودگی ہے؟" میں نے نازو سے پوچھا "چلو جی ہم کہتے ہیں اللہ تمہیں استاد پیڈرو جیسی اولاد دے۔ فقیر کی جھولی میں تو سب کے لیے ہر قسم کی دعا ہے۔"

"فقیر صاحب۔ گاڑی چلاؤ چپ چاپ" رابعہ نے پیچھے بیٹھ کے کہا۔

"اچھا اب سنجیدگی سے سُنو کہ میں تم دونوں کو ساتھ لے جانے پر کیوں تیار ہو گیا۔ کسی رشوت کے بغیر۔ تمہیں ایک ایڈونچر میں حصہ لینا ہے ہمارے ساتھ۔ اللہ سے اُمید تو یہی ہے کہ مار دھاڑ

تمہارے لیے بھی۔ تم پولیس اسٹیشن کے پیچھے چلو۔ اس کی بیک سائڈ پر حوالات کی دیوار ہے۔ اس میں اوپر دو روشن دان ہیں جن میں سلاخیں لگی ہوئی ہیں۔ بہت بدبودار جگہ ہے۔ تم وہاں انتظار کرو ہمارا۔"

پولیس اسٹیشن کی عمارت مستطیل تھی۔ صدر دروازہ سڑک کی جانب تھا لیکن پیچھے بھی گلی تھی۔ انتہائی بائیں طرف حوالات بنائی گئی تھی اور ایس ایچ او صاحب دائیں جانب بیٹھتے تھے۔ درمیان کے بیرک جیسے حصے میں ہیڈ محرر کا۔ ڈیوٹی افسر کا اور غالباً تفتیش کا کمرا تھا۔ ایک کمرا ہر تھانے میں ڈیوٹی دینے والوں کے آرام کا کمرا ہوتا ہے جس میں چارپائیاں نظر آتی ہیں اور جو فارغ ہوتے ہیں وہ وہاں سوتے رہتے ہیں۔

سامنے والے گیٹ سے گزر کے ایس ایچ او کے کمرے تک پہنچنا مشکل کام تھا۔ برآمدے میں کھلنے والے تین کمروں کے دروازے سے کوئی نہ کوئی اندر آنے والے کو ضرور دیکھ لیتا تھا۔ ایک سنتری مین گیٹ پر ہوتا تھا تو دوسرا حوالات کے فولادی گیٹ کے باہر۔ عموماً تیسرا ایس ایچ او کے کمرے کے باہر گھنٹی کے انتظار میں رہتا تھا اور گھنٹی بجتے ہی لپک کے اندر چلا جاتا تھا۔ اس کا یہ کام بھی تھا کہ فالتو لوگوں کو انچارج صاحب کے پاس نہ جانے دے اور ڈیوٹی افسر کے پاس بھیج دے۔

میں دائیں طرف سے گھوم کے گیا تو مجھے کھلی کھڑکی کے نیچے سے جھک کے جانا پڑا۔ کمرے کے اندر سے تھانہ انچارج کے علاوہ چوہدری دلاور کی آواز صاف سنی جاسکتی تھی۔ تیسری آواز کو بھی میں نے کسی دشواری کے بغیر پہچان لیا۔ وہ ڈی ایس پی شاہد علی تھا اگر میرے پاس چھوٹا ٹیپ ریکارڈر ہوتا تو میں ان سب کی گفتگو آسانی سے ریکارڈ کرسکتا تھا لیکن گلی میں لوگوں کی آمدورفت تھی۔ ایس ایچ او کی کھڑکی کے نیچے رُک کر باتیں سننے کی کوشش کرنے والا فوراً پکڑا جاتا۔

میں سیدھا آگے نکل گیا اور پھر گھوم کے اُلٹے ہاتھ پر عمارت کی لمبائی کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ ادھر چار کھڑکیاں نظر آرہی تھیں لیکن دروازہ صرف ایک تھا جو عمارت کے وسط میں تھا اور غالباً بعد میں نکالا گیا تھا تاکہ پیچھے والی گلی میں پہنچنے کے لیے پوری عمارت کا چکر نہ لگانا پڑے۔ اشیائے ضرورت کی چند دکانیں پچھلی طرف ہی تھیں۔

غالب مخالف سمت سے میرے سامنے آگیا "اندر جانا پڑے گا؟"

میں نے اقرار میں سرہلایا "اور اسی ایک دروازے سے۔"

دروازہ اچانک کھلا اور ایک شخص دھوتی بنیان میں باہر نکلا۔ غالب فوراً پیچھے ہٹ گیا مگر میں نے آگے بڑھ کے کہا "ملک صاحب ہیں ڈیوٹی پر؟"

"ملک؟ کون ملک؟ ہیڈ کانسٹیبل ملک احسان؟" اس نے میری وردی کو غور سے دیکھا "سیدھے ہاتھ پر دیکھ لو۔ سو رہا ہے۔"

"مہربانی۔" میں نے ایسے کہا جیسے میں اکثر وہاں آتا رہتا ہوں اور ملک احسان میرا لنگوٹیا ہے یا سالا۔ ملک یا شاہ تو کسی کے بھی باپ کا حصہ ہوسکتا تھا۔ دھوتی بنیان والا کوئی چھوٹی موٹی چیز لینے نکلا تھا اس نے پلٹ کے بھی نہیں دیکھا اور میں اندر داخل ہوگیا۔ غالب میرے پیچھے تھا۔ یہ تفتیش کا کمرا تھا جہاں ہر رات بربریت اور سفاکی، ظلم و تشدد کے نت نئے تجربات سے جرائم کا سراغ لگایا جاتا تھا۔ یہاں بھیانک آلاتِ تشدد میں ایسی چیزیں بھی نظر آتی تھیں جو عام گھروں کے کچن یا باتھ روم میں استعمال ہوتی تھیں مثلاً چپل، کپڑے دھونے والا ڈنڈا۔ لوٹا اور بالٹی یا کونڈی اور گھوٹنا۔ پولیس کے اذیت پسند ذہن کا کمال ہی تھا کہ وہ ان کو بڑی کامیابی سے تشدد کے لیے استعمال کرتے تھے۔

میں نے بائیں طرف ملک احسان کو لمبی نیند سُلانے کا فیصلہ کیا۔ غالب دائیں طرف گیا۔ مجھے اس کمرے میں ایک شخص سویا ہوا نظر آیا۔ دوسرا اپنی وردی تبدیل کررہا تھا۔ اس نے مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

میں نے قریب جاکے کہا "اپنے ملک احسان صاحب ابھی سوئے ہیں؟"

"ہاں ابھی سوئے ہیں۔" اس نے دونوں ہاتھ اُٹھا کے قمیص اُتاری اور اس وقت مجھے موقع ملا کہ میں اسے بھی سُلا دوں۔ اس کے ہاتھ انگڑائی کے انداز میں تھے کہ میں نے پیچھے سے اس کی گردن میں ہاتھ ڈال کے کھینچ لیا۔ میرا ہاتھ اس کے منہ پر آگیا اور ایک ضنا مَر کے نیچے۔ کہنی سے میں نے اس کی کنپٹی پر ضرب لگائی تو وہ تڑپ کے ڈھیلا پڑگیا۔ میں نے اسے فوراً چارپائی کے نیچے ڈال کے آگے کھسکا دیا۔ ملک احسان کے حق میں یہی بہتر تھا کہ وہ سوتا رہے۔ فوری طور پر اس کے جاگ اُٹھنے کا امکان نہیں تھا۔

میں واپس ہوا اور دائیں طرف والے کمرے میں جانے ہی والا تھا کہ باہر سے دھوتی بنیان والا ہاتھ میں صابن کی ٹکیا لیے نمودار ہوا "کیا ہوا؟"

میں نے کہا "ملک احسان تو ابھی سویا ہے، میں پھر آجاؤں گا۔"

وہ سرہلا کے گزرنے لگا تو میں نے اسے دبوچ لیا اور دو منٹ بعد وہ ملک احسان کے ساتھ والی چارپائی پر سو رہا تھا۔ اس کی وردی غالب کے سائز کی تھی اور اس کے کام آسکتی تھی۔ دائیں جانب غالب نے ایک شخص کے سر پر پیچھے سے ریوالور مار کے اسے ناک آؤٹ تو کردیا تھا مگر اس کا سر پھٹ گیا تھا۔ میں نے وردی اسے تھمادی "تم جاؤ نازو کو لے آؤ" غالب نے کہا "میں لباس بدل رہا ہوں۔"

میں نے زخمی اور بے ہوش پڑے ہوئے شخص کو دوسری چارپائی کے نیچے کردیا جس پر ملک احسان دراز تھا۔

ہوئے سپاہی کو ہٹا کے اس کی جگہ لے لینا۔"

"اس کی جگہ میں کیسے لوں گا یار....."

"اچھا پھر تم کٹ آؤٹ لے کے تھانے سے باہر جاؤ۔ تمہیں معلوم ہوجائے گا کہ رابعہ کہاں کھڑی ہوئی ہے۔ اس کی کار نظر آجائے گی۔ رابعہ سے کہنا کہ کیمرا فوکس کرے اور فٹ پاتھ پر کہیں چُھپ کے کھڑی ہوجائے۔ اس کی گاڑی لے کر تھانے کے مین گیٹ سے اندر آؤ اور احاطے میں دائیں طرف سے پیچھے پہنچ جاؤ۔ انچارج صاحب کے کمرے کی کھڑکی کے قریب۔"

"ٹھیک ہے۔ گیٹ پر کوئی روکے گا نہیں مجھے؟"

"گاڑیاں آتی جاتی رہتی ہیں۔ ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی میں کسی کو پتا نہیں چلتا کہ اندر کون بیٹھا ہوا ہے۔" میں نے کہا "رابعہ سے کہنا کہ پریشان نہ ہو۔ ہم جاتے ہوئے اسے پک کرلیں گے۔ نازو تم گھوم کے پیچھے جاؤ۔ انچارج صاحب کے کمرے کی کھڑکی کے پاس انتظار کرو۔"

"تم ساتھ نہیں آؤ گے؟"

"نہیں۔ میں اندھیرا ہوتے ہی برآمدے کی طرف سے آؤں گا۔ انچارج کے کمرے کے باہر جو سپاہی کھڑا ہوا ہے۔ اسے ناک آؤٹ کرکے دروازے سے اندر پہنچ جاؤں گا۔ اور اندر سے کنڈی لگادوں گا۔ اتنی دیر میں تم تصویریں اُتار لینا۔ پھر تم کھڑکی سے اندر کود کے آجانا۔ چار افراد سے نمٹنا ہوگا وہ آرام سے کرسیوں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ کچھ دیر تو انہیں صورتِ حال کو سمجھنے میں اور سنبھلنے میں لگے گی۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ اسلحہ نکالیں ہم انہیں لمبا لٹادیں گے۔ دلاور کو ہم کھڑکی کے راستے باہر لے جائیں گے۔ غالب وہاں پہلے سے گاڑی کے ساتھ موجود ہوگا۔"

"پھر رابعہ کا کیا بنے گا؟ وہ تصویر کیسے اُتارے گی؟"

"ظاہر ہے اسے کچھ انتظار کرنا پڑے گا۔ یہ ہوسکتا ہے کہ میں اس کو تمہارے ساتھ روانہ کروں اور خود وہاں انتظار کروں۔ جب افسران ہوش میں آئیں گے اور لائٹ بحال ہوگی تو بھاگ دوڑ شروع ہوگی۔ تم مجھے دونوں کیمرے دے جانا۔ میں اندھیرے میں ان کی تصویریں اُتارتا رہوں گا۔"

"اتنی دور سے کچھ پتا نہیں چلے گا۔"

"میں اس وردی میں قریب بھی جاسکتا ہوں۔" میں نے کہا "فلیش کیمرے کی تصویر آخری ہوگی۔ اس کے بعد ظاہر ہے میں فرار ہوجاؤں گا۔"

"ابھی وقت ہے۔ سوچ لو" نازو بولی۔

"سوچنے کا وقت نہیں ہے نازو۔ تم جاؤ، غالب تم بھی جاؤ۔"

اگلے پانچ منٹ میں بہت کچھ ہوگیا۔ غالب پولیس کی وردی میں تھا۔ کسی نے اس کی صورت پر غور نہیں کیا اور وہ اطمینان سے بجلی کے بورڈ تک پہنچ گیا۔ جو اسی کمرے میں تھا جہاں ملک احسان واقعی سو رہا تھا مگر اس کے ساتھ تین افراد بے ہوشی کی نیند میں

میں نے عمارت کے آخری حصے تک دوڑ لگائی جہاں نازو تاریکی میں بہت سی گاڑیوں کے ڈھانچوں کا معائنہ کررہی تھی۔ یہ سب وہ گاڑیاں تھیں جو پولیس نے چوروں سے برآمد کی تھیں یا ضبط کی تھیں۔ ایسی گاڑیوں کے انجر پنجر عموماً ہر تھانے کے احاطے میں انصاف کی بھیک مانگتے نظر آجاتے ہیں۔ انہیں قانونی الجھنوں سے گھبرا جانے والے مالک چھوڑ دیتے ہیں یا مقدمات کی طوالت سے تنگ آنے والے۔ پھر ان لاوارث گاڑیوں کو کسی کی "سپردگی" میں دے دیا جاتا ہے جو اچھی حالت میں ہوں۔ سپردگی کا مطلب یہ ہے کہ اصل مالکان کا پتا چلنے تک کوئی ان کی حفاظت کرے گا۔ یہ "کوئی" ہمیشہ انہی کے بھانجے بھتیجے ہوتے ہیں جو اس ملک کے کروڑوں عوام کی تقدیر کے مالک بنے ہوئے ہیں۔ ناکارہ گاڑیوں کے پُرزے ٹائر ٹیوب غائب ہوتے رہتے ہیں اور کباڑی بازار پہنچ جاتے ہیں۔

"یہاں تو واقعی سخت بدبو ہے۔"

میں نے کہا "ادھر گندا نالا ہے اور حوالات کے قیدیوں کی ساری غلاظت بھی بہہ کے آتی ہے۔ اس سوراخ کے راستے جو نیچے نظر آرہا ہے۔"

"وہ حوالات کے اندر ہی سب کچھ کرتے ہیں؟"

"اور کیا حوالات میں اٹیچ باتھ ہوتا ہے؟" میں نے کہا "حوالات ایسی انسانیت سوز جگہ ہے جہاں شاید کتّے کو باندھ دیا جائے تو وہ عفونت سے مرجائے۔"

غالب وردی پہنے باہر کھڑا تھا۔ "ابھی ابھی ایس پی پہنچا ہے۔"

"اچھا؟ انچارج کے کمرے میں ہیں سب لوگ؟"

"اور کہاں ہوسکتے ہیں مگر وہاں پہنچنا مشکل کام ہے۔ ساتھ والا کمرا ہیڈ محرّر کا ہے۔"

"وہاں کتنے لوگ ہیں؟"

"ایک تو وہ خود ہیڈ محرّر ہے۔ فریادی اور ملزمان زیادہ ہیں۔ پہلے دو پارٹیاں تھیں جو ایک دوسرے کے خلاف مارپیٹ کا پرچہ کٹوانے آئے تھے۔ اب آرام سے حوالات میں بیٹھے ہیں سب۔ تین آدمی رہ گئے ہیں مگر اور آجائیں گے باہر سے۔"

"پھر کیا کریں؟"

"میرے ذہن میں ایک آئیڈیا ہے۔"

"وہ کیا..... جلدی بولو۔"

"میں لائٹ بند کررہا ہوں۔ میں نے مین سوئچ دیکھ لیا ہے۔ نازو گھوم کے باہر جائے اور اندھیرا ہوتے ہی کھڑکی سے تصویریں اُتار لے۔ ایک دم اندھیرا ہوگا تو اسے کوئی بھی نہیں دیکھ سکے گا۔"

میں نے کہا "ویری گڈ۔ مین سوئچ آف کرنے کے ساتھ ہی کٹ آؤٹ بھی نکال لینا۔ پھر تم سیدھے نکل جانا برآمدے میں انچارج صاحب کے کمرے کی طرف اور کسی طرح وہاں کھڑے

پڑے ہوئے تھے۔ ایک ساتھ والی چارپائی پر اور دو ان کے نیچے۔

اندھیرا ہوتے ہی مختلف لوگ چلّائے "اوئے' کیا مصیبت ہے۔"

کسی نے کہا "پھر لائٹ چلی گئی۔ موم بتی جلاؤ بھئی۔"

"اِدھر اُدھر تو لائٹ ہے۔ دیکھو اپنا ہی فیوز اُڑا ہوگا۔"

میں اندھیرے میں سیدھا چلتا ہوا برآمدے سے گزر گیا۔ انچارج کے کمرے کے باہر کھڑا ہوا سپاہی وہاں موجود نہیں تھا۔ اسے اندر بُلایا گیا تھا۔

میں نے انچارج کی آواز سُنی "اوئے بے وقوف۔ یہ تو مجھے بھی معلوم ہے کہ لائٹ چلی گئی ہے۔ جا کے موم بتی لاؤ کہیں سے۔"

"یس سر" وہ تیزی سے باہر آیا اور میرے قریب سے گزر گیا۔

میرا کام کچھ آسان ہوگیا تھا۔ میں دروازے سے بالکل سامنے والی کھڑکی کو دیکھ سکتا تھا جو پوری کھلی ہوئی تھی۔ اس میں مجھے نازو کا سایہ تین بار دکھائی دیا۔ وہ سر اُٹھا کے ایک تصویر اُتارتی تھی اور پھر نیچے ہو جاتی تھی۔ فلم کو ری وائنڈ کرنے میں شاید پانچ سیکنڈ لگتے تھے تو تصویر اُتارنے میں اس سے بھی کم۔

ایک منٹ بعد میں اندر داخل ہوگیا۔ میرے دروازہ بند کرتے ہی اندر بیٹھے ہوئے لوگوں کو گڑبڑ کا احساس ہوا۔ اس سے پہلے شاید وہ سمجھے تھے کہ میں موم بتی لے کر آیا ہوں۔

"خبردار۔ جو کوئی اپنی جگہ سے ہلا" میں نے کہا "میرے پاس ریوالور میں سائیلنسر لگا ہوا ہے۔"

اس دھمکی کا اثر ہوا اور وہ ایک لمحے کے لیے اپنی جگہ پر منجمد ہوگئے۔ اسی لمحے میں نازو کھڑکی سے اندر آئی۔ اس کا پہلا نشانہ انچارج ہی تھا جو زیادہ قریب تھا۔ اس کی پشت کھڑکی کی طرف تھی لیکن گردن کرسی کے اوپر بھی نظر آرہی تھی۔ نازو نے اسی کو نشانہ بنایا ہوگا۔ اس کی جگہ میں ہوتا تو یہی کرتا۔

میرا پہلا شکار ڈی ایس پی بنا۔ اگر وہ کھڑا نہ ہوتا تو زندہ رہتا۔ اس نے اُٹھنے کی کوشش کی تو کنپٹی پر لگنے والی کھڑی ہتھیلی کا بھرپور وار اس کی گردن پر پڑگیا۔ اس کی گردن خاصی موٹی تھی۔ مگر ضرب اتنی شدید تھی کہ ہڈی ٹوٹنے کی آواز صاف سُنائی دی۔ میری نظر نے اس وقت دلاور کو اپنا ہاتھ جیب کی طرف بڑھاتے دیکھ لیا تھا۔ میں نے اس کے بازو پر لات ماری اور پھر اس کی ٹھوڑی کے نیچے گردن کے سامنے والے حصے پر ضرب لگائی تو اس کی آواز حلق میں گھٹ کے رہ گئی اور وہ کرسی پر ڈھیر ہوگیا۔

نازو نے بھی ایس پی ظفر حیات کو ناک آؤٹ کردیا تھا۔ اب ہمارا راستہ صاف تھا۔ باہر سے سپاہی نے دروازہ بجانا شروع کیا "سر جی' موم بتی لایا ہوں میں۔"

کسی اور نے چلّا کے کہا "دروازہ اندر سے کیوں بند ہے؟"

"اور یہ شور شرابا کیسا ہے؟" کوئی اور بولا۔

میں نے نازو سے کہا "چلو تم باہر نکلو۔ دیکھو غالب آیا ہے یا نہیں۔"

نازو پھر کھڑکی سے نکل گئی۔ میں نے دلاور کو بغلوں کے نیچے ہاتھ دے کے اُٹھایا تو ساتھ ہی کرسی بھی لڑھک گئی۔ دلاور کو میں نے کھڑکی کی دہلیز پر رکھا اور خود اس کے اوپر سے گزر گیا۔ نازو نے کسی حد تک دلاور کو سنبھال لیا تھا۔ غالب کو گاڑی کے ساتھ دیکھ کے میری جان میں جان آئی' اس نے دلاور کو اُٹھانے میں مدد کی۔ ہم دونوں نے اسے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر ڈال دیا۔

نازو نے بڑی حاضر دماغی کا ثبوت دیا اور اتنی دیر میں ڈرائیور کی جگہ بیٹھ کے گاڑی اسٹارٹ کردی۔ میں دلاور کے اوپر گرا اور گیٹ بند کردیا۔ غالب نے آگے بیٹھ کے ریوالور نکال لیا۔

"جو راستہ روکے اسے شوٹ کردو" میں نے کہا۔

"گاڑی اوپر سے گزار دینا اگر کوئی سامنے آجائے" غالب نے نازو سے کہا۔

اندر اب خاصا ہنگامہ برپا تھا۔ لوگ انچارج صاحب کے کمرے کا دروازہ توڑ رہے تھے۔ نازو نے ایک دم کار کو ریس دی اور گاڑی کسی زخم خوردہ وحشی جانور کی طرح غرا کے آگے بڑھی۔ گیٹ پر کھڑا ہوا سنتری چھلانگ مار کے ایک طرف گر گیا۔ اس کی جان بچ گئی۔ کار تیزی سے سڑک پر آئی اور دائیں جانب مڑ گئی۔ مخالف سمت سے آنے والی ایک کار نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو بچایا ورنہ دونوں کاروں میں خوف ناک تصادم ہوتا۔

"دیکھو رابعہ کا خیال رکھنا۔" میں نے کہا۔

نازو نے بریک لگائے اور ٹائر سڑک کی رگڑ سے چیخنے لگے۔ میں اب دلاور کے اوپر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے ساتھ والا دروازہ کھولا اور قریب آتے ہی رابعہ کو اندر کھینچ لیا۔ اس نے دروازہ پوری طرح بند بھی نہیں کیا تھا کہ نازو نے پھر گاڑی کا ایکسیلریٹر دبا دیا۔ اب میرے ساتھ رابعہ بھی چوہدری دلاور پر سوار تھی۔

"یہ... مجھے یقین نہیں آتا" رابعہ نے کہا۔

میں نے کسی کا خیال کئے بغیر اسے چوم لیا "جانم۔ شکاری بالآخر شکار ہوگیا۔"

"تم اسے اغوا کرلائے' کسی پروگرام کے بغیر۔"

"کسی پروگرام کے بغیر میں تم پر بھی عاشق ہوگیا تھا" میں نے قہقہہ مار کے کہا "پروگرام سے چلتی ہیں مشینیں' ہم نہیں چل سکتے۔"

غالب نے پلٹ کے دیکھا "ایک تصویر بناؤں۔ شکاری لوگ شکار کے بعد اس کی لاش پر پاؤں رکھ کے بنواتے ہیں۔"

رابعہ نے کہا "نازو گاڑی روکو۔ مجھے وحشت ہو رہی ہے اس کے اوپر بیٹھ کے۔ اسے سیدھا بٹھالو۔"

نازو نے گاڑی روکی۔ اس وقت تک ہم تھانے سے بہت دور آگئے تھے۔ اور خطرے کی کوئی بات نہیں رہی تھی۔ دلاور بدستور

کسی نے غرا کے حکم دیا۔

میں نے غالب کی طرف دیکھا۔ پھر اپنے ہاتھ اُٹھا دیے۔ میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ تعاقب کرنے والے اتنی مستعدی کا ثبوت دیں گے۔ اور ہماری کامیابی کی خوشی اتنی جلدی خاک میں مل جائے گی۔

پولیس کو دیکھتے ہی غالب یوں زینے کے پیچھے روپوش ہوگیا تھا کہ کسی نے اسے نہیں دیکھا تھا۔

ایک سب انسپکٹر نے پولیس کے روایتی خونخوار لہجے میں سوال کیا "یہ گاڑی ابھی یہاں آئی ہے؟"

میں نے سر ہلایا "ہاں جی۔ ابھی کوئی دس منٹ پہلے۔"

"جھوٹ کیوں بولتا ہے۔" اس نے اب عادتاً ایک گالی دے کر گویا مجھے اپنے بیان میں تصحیح کا موقع فراہم کیا۔

"آٹھ نو منٹ ہوئے ہوں گے جناب عالی" میں نے لہجے میں انکساری یا خوف پھر چوکیدار کے احساسِ ذمّے داری کو غالب نہیں آنے دیا "میں نے تو اندازے سے بتایا تھا۔"

"گاڑی کس کی ہے؟"

"وکیل صاحب کی" میں نے کہا۔

"کون وکیل صاحب؟"

"وکیل صاحب... مس رابعہ قاری جناب۔ کسی اور کی مجال تھی کہ یہاں گاڑی کھڑی کرتا۔ اور پہچانے بغیر میں بھی دروازہ نہیں کھولتا۔"

"فالتو بات مت کرو۔ جتنا پوچھا جائے اتنا بتاؤ" سب انسپکٹر بگڑ گیا۔ "اور کون تھا گاڑی میں؟"

"اور کون ہوگا جی۔ میں نے تو کسی کو دیکھا نہیں۔ ویسے گاڑی آپ کے سامنے ہے' آپ تلاشی لے لو" میں نے کہا۔

"اس وقت وکیل صاحبہ کو اکیلے آنے کی کیا ضرورت پیش آگئی؟" وہ طنز سے بولا "کیا کوئی آنے والا ہے یا پہلے سے موجود ہے؟"

"یہ تو وکیل کی مرضی ہے جناب عالی۔" میں نے کہا "اس کے آفس میں کون آتا ہے' کون جاتا ہے' خود اسے کون روک سکتا ہے کسی بھی وقت آفس آنے سے۔"

"اچھا جاؤ انہیں بلا کے لاؤ" سب انسپکٹر نے مجھے حکم دیا۔

میں نے گیٹ کو پھر لاک کردیا "میں بتا دیتا ہوں انہیں۔ آپ ٹھہریں۔"

سب انسپکٹر نے مجھے پھر گالی دی "... یہ گیٹ کیوں بند کیا ہے؟"

میں نے کہا "مجھے حکم ہے جناب عالی کہ اجازت کے بغیر کسی کو بھی اندر نہ آنے دوں۔ خاص طور پر رات کے وقت۔ مجھے اسی لیے چوکیدار رکھا گیا ہے۔"

پولیس کے ایک زیادہ حساس یا مچھ گیری کے ماہر کانسٹیبل نے

بے ہوش تھا۔ میں نے اسے درمیان میں سیٹ کا سہارا دے کر بٹھالیا۔ اس کے ایک طرف رابعہ اور دوسری طرف میں بیٹھ گیا تو گاڑی پھر روانہ ہوئی۔

رابعہ بولی "اب یہ بھی تو سوچو کہ اسے لے کر کہاں جائیں گے؟"

"ابھی تو چلتے ہیں تمہارے آفس۔ وہاں چوکیدار بھی نہیں ہے اور کل دوپہر تک کسی کی دخل اندازی کا اندیشہ بھی نہیں ہوگا۔"

"پھر اسے وہاں سے کیسے لے جائیں گے؟"

"ہم اسٹریچر پر بھی لے جاسکتے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ اس وقت تک چوہدری صاحب خود تعاون پر آمادہ ہوں گے" میں نے کہا۔

غالب بولا "لیکن چوہدری دلاور کے اغوا اور تھانے پر حملے کی خبر پھیل چکی ہوگی۔ شک ہم پر کیا جائے گا۔"

"ہم کون..؟" میں نے کہا "صبح ہوتے ہی میں پھر فرنچ وکیل بن جاؤں گا۔ تمہاری اور نازو کی پوزیشن ویسے ہی محفوظ ہے۔ کیا تمہارے اخبار کے ساتھی اتنا بھی نہیں کرسکتے کہ تمہارے حق میں گواہی دیں۔"

"ہم رات بھر اخبار کے دفتر میں تھے" غالب ہنسا "گواہ بہت۔"

"اب رہی رابعہ۔ تو یہ تھی منظر کے گھر میں۔ دونوں سینیئر وکیل ہیں ان کا نام کون لے سکتا ہے۔" نازو بولی "منظر کو ابھی فون کرکے بتا دیتے ہیں کہ ہم کیا چیز اُٹھالائے ہیں۔ اور کہاں سے۔"

رابعہ کے آفس کی سیڑھیوں کے قریب گاڑی رُک گئی۔ میں نے غالب کی مدد سے چوہدری دلاور کو اوپر پہنچایا۔ عمارت کا چوکیدار پہلے ہی مجھ سے غیر سرکاری چھٹی لے کر جاچکا تھا۔ اس وقت میں ہی چوکیدار بھی تھا۔

میں نے نازو سے کہا "اپنے چوہدری صاحب کی تلاشی لے کے انہیں بحفاظت رکھنا تمہاری ذمّے داری ہے۔"

"کیوں؟ تم جا رہے ہو کہیں؟"

"ہاں۔ مجھے فلیش کیمرے سے ایک تصویر اُتارنی ہے" میں نے کہا۔

غالب بولا "تم یہاں چوکیداری کرو۔ تاکہ کسی کو خلافِ معمول کچھ نہ ملے۔ میں جاتا ہوں۔"

میں غالب کے ساتھ نیچے تک گیا۔ میرا ارادہ تھا کہ غالب کے جاتے ہی میں گرل بند کرکے گیٹ کو پھر لاک کردوں گا۔ گیٹ کے بالکل سامنے نازو کی گاڑی تھی۔ اچانک ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی ہم پر آئی۔ پھر تیزی سے آنے والی ایک جیپ گاڑی کے پیچھے رُک گئی۔ اس میں سے چار پولیس والے کود کے اُترے' وہ سب مسلح تھے۔

"خبردار۔ ہلنا نہیں۔ اپنے ہاتھ اوپر اُٹھا کے کھڑے ہو جاؤ۔"

آگ بگولا ہو کے کہا "پولیس کا راستہ کون.... روک سکتا ہے۔ کھول دروازہ نہیں تو...."

میں نے سپاٹ لہجے میں کہا "مجھے آپ جتنی گالیاں مرضی دیں۔ میں غریب چوکیدار ہوں مگر یہاں سارے دفتر وکیلوں کے ہیں۔ انہوں نے مجھے خاص ہدایت دی ہے کہ وارنٹ نہ ہو تو ڈی آئی جی کے لیے بھی دروازہ نہ کھولوں۔ میں وکیل صاحب کو بلانے جارہا ہوں۔ آپ دروازہ توڑ کے اندر داخل ہوسکتے ہو تو آجاؤ۔"

سب انسپکٹر کا چہرہ غصے سے لال پڑ گیا مگر وہ طیش میں اپنے ہونٹ کاٹنے کے سوا کچھ نہ کرسکا۔ اس کو اپنے اختیار کی حدود کا علم تھا اگر وہ نشے میں ہوتا تب بھی اپنے ماتحتوں کو یہ حکم نہیں دے سکتا تھا کہ اس بدتمیز چوکیدار کو گولی ماردو اور دروازہ توڑ کے اندر چلے جاؤ۔ اس نے ضرور محسوس کیا ہوگا کہ میری عاجزی میں بھی تمسخر اُڑانے کا انداز شامل ہے اور بے رتبہ ہونے کے باوجود میں اس کے اختیار واقتدار کو چیلنج کرچکا ہوں لیکن وہ مجبور تھا کہ اپنے ماتحتوں کے سامنے اس بے عزتی کو برداشت کرے۔

ابھی تک غالب سیڑھیوں کی اوٹ سے میرے اور پولیس کے مذاکرات کے نتیجہ خیز ہونے کا انتظار کررہا تھا۔ اب اس نے رونمائی کا فیصلہ کیا اور یوں سامنے آیا جیسے ابھی ابھی اوپر سے اُترا ہو۔

"ہاں بھئی چوکیدار۔ کیا بات ہے۔ کیا ہنگامہ ہے یہ؟"

سب انسپکٹر معنی خیز انداز میں مسکرایا "دیکھا۔ ہم نے ٹھیک ہی سمجھا تھا۔"

اس کے فرمانبرداروں نے سوفیصد تائید کا اظہار گھوڑے جیسا سرہلا کے کیا۔

"جو تم نے سمجھا تھا وہ مجھے بھی سمجھادو تھانے دار صاحب۔" غالب نے کہا "ایک ان پڑھ چوکیدار کیا سمجھے گا تمہیں۔"

اس نے گھور کے غالب کو دیکھا "تم کون ہو اوئے۔"

"میں خدائی فوج دار ہوں جو تھانے دار، صوبے دار اور نمبر دار وغیرہ سے ذرا اونچی چیز ہوتا ہے۔" غالب نے کہا۔

"اوپر تم تھے... اور کون ہے اوپر؟"

"مجھ سے اوپر تو بہت ہیں اور بالآخر تم کو بھی اوپر ہی جانا ہے مگر اپنی باری پر۔ اس وقت تشریف آوری کا مقصد بیان کرو" غالب نے چٹکی بجائی۔

"بڑی اکڑفوں میں ہے بندہ" سب انسپکٹر نے اپنے ماتحتوں کی طرف دیکھا "ذرا باہر آکے بات کرو نا۔"

غالب نے مجھے اشارہ کیا اور میں نے گیٹ کھول دیا "شاید اندر سے آواز صاف نہیں پہنچ رہی تھی تمہارے کانوں میں، اب بولو۔"

غالب کے اعتماد نے سب انسپکٹر کو محتاط کردیا "وکیل ہو تم بھی۔ کیا نام ہے اس عورت کا جس کی یہ گاڑی ہے؟"

"رابعہ قاری" ایک کانسٹیبل نے سعادت مندی سے کہا۔

"ہاں۔ رابعہ قاری۔ ابھی ابھی بڑے ضروری کام سے اس گاڑی میں یہاں پہنچی ہے جہاں پہلے سے تم اس کے لیے چشم براہ تھے۔ ضروری کام تو شاید ابھی شروع بھی نہیں ہوا تھا۔"

سب انسپکٹر نے بیک وقت مجھے رابعہ کو اور غالب کو گالی دی تھی مگر حالات متقاضی تھے کہ ہم اینٹ کا جواب پتھر سے نہ دیں۔

غالب نے اپنا کارڈ اس کی ناک کے سامنے کردیا۔ "اگر تم نے پی رکھی ہے تو خیریت اسی میں ہے کہ یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ فضول بولنے کے نتیجے میں صبح تمہاری وردی پیٹی اتر جائے۔ ایک ساتھ وکیلوں سے اور صحافیوں سے پنگا لینے کا انجام زیادہ برا بھی ہوسکتا ہے؟"

سب انسپکٹر نے کارڈ کو غور سے پڑھا۔ وہ نیا اور ناتجربہ کار سب انسپکٹر تھا جو اختیار کے نشے میں زیادہ ہی آؤٹ ہوگیا تھا۔

"ابھی اخبار شائع نہیں ہوا۔ کیا میں تمہارے غیر قانونی چھاپے کی خبر دے دوں؟ یہاں بہت بڑے بڑے وکیلوں کے دفتر ہیں۔ ڈی آئی جی صاحب تمہاری کارکردگی کی خبر پڑھ کے خود تمہیں تمغۂ حماقت دینے آجائیں گے۔ انہیں کیا معلوم پولیس میں تم جیسے بھی بھرتی ہوگئے ہیں۔"

سب انسپکٹر کی حالت غیر ہوگئی "آپ تو ناراض ہوگئے سر جی۔ چھاپے کی بات تو ہم نے کی ہی نہیں۔ ہم تو بس رات کی ڈیوٹی پر گشت کررہے ہیں۔ ادھر گاڑی آکے رکی تو ہم نے پوچھ لیا کہ کہیں غلط قسم کے لوگ نہ ہوں۔ آپ لوگوں کی حفاظت کرتے ہیں ہم تو۔"

غالب نے اپنا کارڈ چھین لیا۔ "مجھے معلوم ہے سب کہ تم کیا کرتے ہو جو تمہیں نہیں کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرتے جو کرنا چاہیے۔"

"اچھا جناب عالی غلطی معاف۔ غلط فہمی ہو جاتی ہے..."

"یہ غلط فہمی نہیں۔ تم نے تعاقب کیا تھا اس گاڑی کا.... آخر کیوں؟ ایک شریف عورت کو جو بہت معزز وکیل بھی ہے اس طرح ہراساں کرنے کا کیا مقصد تھا؟" غالب نے دہاڑ کے کہا۔

"ہم اتنی جرات کرسکتے ہیں جی...."

"مجھے خود میڈم نے بتایا ہے کہ تم ان کے پیچھے لگے ہوئے تھے، آخر کیوں؟ انہیں اغوا کرنا چاہتے تھے یا تمہیں شک تھا کہ وہ اپنی گاڑی میں کسی کو اغوا کرلائی ہیں۔"

"سر۔ اجازت ہو تو اندر آکے ایک منٹ اکیلے میں کچھ عرض کروں؟" سب انسپکٹر نے لجاجت سے کہا۔

غالب نے راستہ چھوڑ دیا "اپنے بندوں سے کہو دور جا کے کھڑے ہوں۔"

سب انسپکٹر کے اشارے پر وہ یتیموں کی طرح دور جا کھڑے ہوئے۔

"دیکھیں جناب۔ ہم تو بہت معمولی حیثیت کے نوکر ہیں۔ ہماری وردی پیٹی اُتروا کے آپ کو کیا ملے گا" سب انسپکٹر نے گیٹ کے اندر آکے کہا "اوپر سے حکم آیا تھا کہ ایسی ایک گاڑی سڑک پر جہاں بھی نظر آئے، اسے روک لو۔"

"ایس پی ظفر حیات کا حکم تھا؟"

سب انسپکٹر تقریباً اچھل پڑا "جی.... نہیں.... میرا مطلب ہے، آپ کو پتا ہے تو پھر مجھ سے کیوں پوچھتے ہیں سر۔ وائرلیس پر سب کو پیغام دیا گیا تھا۔"

"کیا پیغام تھا؟"

وہ تذبذب میں پڑ گیا "آپ خبر بنادو گے.... میری نوکری..."

"نہیں جائے گی تمہاری نوکری" غالب نے اسے تسلی دی۔

"آپ کسی کو بتاؤ گے تو نہیں؟"

"یار کیا اشٹامپ لکھ دوں....؟"

اس نے میری طرف دیکھا "یہ بندہ کچھ مشکوک لگتا ہے۔"

"اگر تم کچھ بتانا نہیں چاہتے تو جاؤ، میں خبر فون پر لکھوا دیتا ہوں" غالب نے کہا۔

"نہیں سر۔ دراصل.... یہ ایس پی صاحب آئے ہیں اسلام آباد سے کسی قتل کی تفتیش کے لیے۔ انہوں نے مجرم گرفتار کرلیے تھے مر مجرموں کے کچھ ساتھیوں نے تھانے پر حملہ کیا اور انہیں چھڑا کے لے گئے۔ ہمیں اس گاڑی کا........ نمبر تو نہیں بتایا تھا بس کہا تھا کہ اس قسم کی گاڑی ہے لیکن ایسی تو سر نہ جانے کتنی گاڑیاں ہوں گی اور آپ معزز لوگ ہو۔ آپ کا اس واردات سے کیا تعلق۔ آپ کام کریں اپنا اور مجھے اجازت دیں" اس نے صورتِ حال کی وضاحت کے بعد بڑی عقیدت کے ساتھ غالب سے مصافحہ کیا اور پھر خیر سگالی کے جذبات کو فروغ دینے کے لیے مجھ سے بھی ہاتھ ملایا۔

اس کے جاتے ہی غالب نے کہا "یہ جگہ اب قطعی محفوظ نہیں رہی۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا "پولیس کو شک ہوگیا ہے کہ یہ کارروائی ہماری ہے۔ وہ یقیناً ایم آر ایس کے بارے میں جانتا ہوگا۔ چلو رابعہ سے بات کرتے ہیں۔"

اس صورت حال نے رابعہ کو بھی پریشان کردیا "اگر بات شک تک محدود رہے تب بھی ٹھیک نہیں۔ یہ سب انسپکٹر رپورٹ ضرور دے گا کہ اس قسم کی ایک گاڑی میں رابعہ قاری ایڈووکیٹ آدھی رات کے وقت آفس پہنچی تھیں اور وہاں مرزا غالب نام کے صحافی بھی پائے گئے پھر شک کی بات نہیں رہے گی۔ اس عمارت کی نگرانی ہوگی۔"

نازو نے کہا "یہ تو بڑی گڑبڑ ہوگئی۔ اب اس وقت ہم کہاں جاسکتے ہیں اور وہ بھی دلاور کے ساتھ۔"

"اگر اپنے بھوت سسر کے ساتھ میرے اچھے تعلقات ہوتے تو میں اس کے گھر لے جاتا سب کو۔ بھوتوں کے ڈیرے پر پولیس چھاپا کیسے مار سکتی تھی۔" غالب نے کہا۔

میں نے اسے ٹوک دیا "مذاق نہیں۔ صورت حال کچھ دیر میں سنگین ہوجائے گی۔ ایس پی ظفر حیات صبح سے پہلے بھی تلاشی کے خصوصی وارنٹ حاصل کرسکتا ہے۔ اسے دلاور کا حق نمک بھی ادا کرنا ہے اور اپنی فرض شناسی ثابت کرکے نوکری بھی بچانی ہے۔"

"میرا تو دماغ کام نہیں کرتا" نازو بولی۔

"ناقص چیز کا یہی تو نقصان ہے۔ عین ضرورت کے وقت دغا دے جاتی ہے۔" غالب نے کہا۔

نازو نے اسے گھورا "تم باز نہیں آؤ گے، کیا میرا دماغ خراب ہے؟"

"خراب یا اچھی وہ چیز ہوتی ہے جو اپنا وجود رکھتی ہو۔ اس دنیا میں کہیں پائی جاتی ہو" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "رابعہ۔ انہیں لڑنے دو۔ تم فوراً دلاور کو ساتھ لے کر یہاں سے چلی جاؤ۔ آفس کو لاک کرجاؤ۔"

"مگر دلاور کے ساتھ۔ میں کہاں جاؤں؟" رابعہ گھبرا گئی۔

"فی الحال سیدھی منظر کے گھر جاؤ۔"

"منظر کے گھر میں کیسے رکھا جاسکتا ہے دلاور کو؟"

"ایک رات ہی کی بات ہے" میں نے کہا۔

"صبح کیا ہوگا؟"

میں چڑ گیا "سب اسی وقت بتادوں؟ کل کیا ہوگا، پرسوں کیا ہوگا؟ پولیس کا دھیان ادھر نہیں جاسکتا۔ دلاور کو ڈکی میں بند رکھو یا بے ہوش کرکے گیراج میں۔ صبح ہونے میں دیر ہی کتنی ہے۔ چھ آٹھ گھنٹے۔"

"اس کے بعد ہم کوئی جگہ دیکھ لیں گے" غالب نے کہا "میرا بھی یہی خیال ہے کہ یہاں چھاپا پڑے گا۔"

رابعہ نے بے بسی سے کہا "منظر مشکل میں نہ پڑ جائے۔"

"وہ مشکل میں کب نہیں تھا۔ جب سے ہمارا اس کا ساتھ ہے، وہ مشکل میں ہے" غالب بولا۔

"اسے.... بتادوں سب....؟"

"بتادینا۔ چھپانے کی ضرورت بھی نہیں اور چھپانا ناممکن ہوگا۔ اسے بتادینا کہ صبح دلاور کو کہیں شفٹ کردیا جائے گا۔ پھر وہ سارے معاملات سنبھال لے گا۔ وہ گواہ بن جائے گا کہ تم اسی کے گھر میں تھیں اور تم اکثر وہاں رات کو رُک جاتی ہو چونکہ اس کے بچے پھوپی کو بہت چاہتے ہیں۔" غالب بولا۔

میں نے کہا "ویسے وہاں پولیس کے آنے کا ایک فیصد امکان بھی نہیں۔"

غالب نے کہا "میں اور نازو جاتے ہیں اپنے آفس۔ یہ بھی تو دیکھنا ہے کہ خبروں میں کیا ہے؟"

"اور کیا نہیں ہے" نازو نے کہا۔

"رہ گیا میں غریب چوکیدار۔ پولیس وارنٹ لے کر آئے تو میں کیا کروں؟" میں نے کہا۔

"تم منظر کے گھر فون کر کے رابعہ کو اطلاع دینا۔ پھر اخبار کے دفتر فون کر کے مجھے بتانا۔"

میں نے کہا "یہ ہو سکتا ہے کہ وہ مجھے فون نہ کرنے دیں۔ ان کی نظر میں کسی چوکیدار کی کیا وقعت ہے۔ میں نے مزاحمت کی تو وہ تشدد پر اتر آئیں گے۔"

"تم انہیں مت روکنا۔ کریں جو ان کا دل چاہے۔ اگر وارنٹ ہوگا ان کے پاس تب بھی وہ محتاط رہیں گے۔ یہ کوئی جوئے کا اڈا یا کسی کا غریب خانہ نہیں ہے۔ ایک لیگل فرم کا آفس ہے۔" رابعہ نے کہا۔

"یہاں کوئی خفیہ کیمرا نصب نہیں کیا جا سکتا؟"

غالب نے نفی میں سر ہلایا "اس کے لیے وقت نہیں ہے اور پھر فائدہ بھی کیا ہوگا اس سے۔ ان کی کارروائی عین قانون کے مطابق ہوگی۔ مجسٹریٹ یقیناً ان کے ساتھ ہوگا۔"

دس منٹ بعد چوہدری دلاور کو گٹھری بنا کے پھر رابعہ کی گاڑی میں ڈال دیا گیا۔ وہ ہوش میں آنے لگا تھا۔ نازو نے ایک ہاتھ مار کے اسے پھر بے ہوشی کی دنیا میں پہنچا دیا۔ جب تک ان کی گاڑی روانہ نہیں ہوگئی میں سخت تشویش میں مبتلا رہا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اچانک ادھر اُدھر سے پولیس کی گاڑیاں نمودار نہ ہو جائیں۔

پروگرام کے مطابق رابعہ کو اخبار کے آفس میں غالب اور نازو کو ڈراپ کرنا تھا اور پھر منظر کے گھر جانا تھا۔ میں نے لائٹ بجھا کے اپنا بستر گیٹ کے قریب بچھایا اور ٹانگ پر ٹانگ رکھ کے لیٹ گیا۔ نیند آنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ دلاور کی گرفتاری کے خیال سے میرے جسم کے روئیں روئیں میں سنسنی بھر گئی تھی اور شدید اضطرابی کیفیت میں میرے اعصاب پر سخت دباؤ تھا۔ شاید میری ایک خواہش پوری ہوگئی تھی۔ بالآخر ہم سب نے قانون کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ دلاور پر مجرم کی حیثیت سے ہاتھ ڈالے۔ اس پر جرم ثابت کرنا اور اسے تختۂ دار تک پہنچانے کے مرحلے ابھی باقی تھے۔

پولیس نے دو گھنٹے بعد دھاوا بولا۔ میں ایک کروٹ پر لیٹا ہر سمت سے یلغار کرنے والے مچھروں کو بھگانے میں مصروف تھا۔ مچھر میرے جسم کے کھلے حصوں سے میرا لہو پینے کے ساتھ میرے کانوں میں خوشی کے شادیانے بھی بجا رہے تھے۔ ظاہر ہے میں اکیلا ان کی ائرفورس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

تیز روشنی اور گھن گرج کے ساتھ پولیس کی تین گاڑیوں پر مشتمل پولیس فورس نے بڑی مستعدی سے عمارت کا محاصرہ کر لیا۔ یہ افسرانِ بالا کی خوشنودی حاصل کرنے، انہیں بدنامی سے بچانے اور ان کے مفادات کے تحفظ کا مسئلہ تھا۔ عام آدمی کے لیے وہ قلم اُٹھا کے رپورٹ لکھنے کا تردد بھی بڑی مشکل سے کرتے ہیں۔

گاڑی سے اُترنے والا ڈی ایس پی شاہد علی تھا۔

ڈی ایس پی شاہد علی کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا تھا، وہ یہ کہ شاہد علی تھانے میں میری کھڑی ہتھیلی کی ضرب سے ہلاک ہو چکا تھا لیکن وہ زندہ تھا۔ گویا مرنے والا کوئی اور تھا جسے میں نے اندھیرے کی وجہ سے شاہد علی سمجھا تھا۔

ڈی ایس پی شاہد علی نے مجھے حکم دیا "دروازہ کھول۔"

پولیس کی گالی کا اب کوئی اس لیے بُرا نہیں مانتا کہ وہ اپنی فطرت سے مجبور ہوتے ہیں۔ کرخت آواز میں بھونکنے والے کُتے سے یہ توقع کون رکھتا ہے کہ وہ شرافت اور نرمی سے بلی کی طرح ایک بار "میاؤں" کہے اور خاموش ہو جائے۔ میں تالا کھول کے انہیں خوش آمدید کہنے کے انداز میں ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

شاہد علی کے ساتھ ہی درجن بھر ماتحت اندر آ گئے۔ ان میں سے تین دائیں طرف چلے گئے اور تین بائیں جانب۔ باقی نے اوپر کا رُخ کیا۔

میں نے تھر تھر کانپتے ہوئے ہاتھ جوڑ کے پوچھا "مائی باپ۔ آخر معاملہ کیا ہے؟"

شاہد علی کے بعد آنے والے سویلین نے جو خود کو زیادہ مہذب، متین اور بارعب ثابت کرنا چاہتا تھا میری طرف دیکھے بغیر جواب دیا "ہم عمارت کی تلاشی لیں گے۔ میں ایس ڈی ایم ہوں اور میرے پاس تلاشی کا وارنٹ ہے۔"

شاہد علی نے کاغذ کا ایک پُرزہ مجھے تھما دیا "ہم کوئی بھی غیر قانونی کام نہیں کرتے۔"

میں نے زیرِ لب کہا "دریں چہ شک۔"

"کیا کہا ہے تم نے؟"

"یہی جناب کہ آپ سچ فرماتے ہیں۔ آپ قانون کے رکھوالے ہیں۔ یہاں قانون داں اپنا کام کرتے ہیں۔"

"اوپر چل کے رابعہ قاری ایڈووکیٹ کے آفس کا تالا کھولو۔" مجسٹریٹ نے مجھے حکم دیا۔

"میں تو جناب، باہر کے گیٹ کا چوکیدار ہوں۔" میں نے اردو، سرائیکی اور پنجابی کا ملیچھ بنایا "باقی سب کے اپنے اپنے آفس ہیں اور ان کی چابیاں وہ ساتھ لے جاتے ہیں۔"

"کوئی بات نہیں" مجسٹریٹ نے شاہد علی کو مخاطب کیا "تالا توڑ دو۔"

"آپ انہیں فون کر کے گھر سے بُلا لیں سر۔"

"بکو مت۔ ہمیں تمہارے مشورے کی ضرورت نہیں" شاہد علی بولا۔

"تم تلاشی کے دوران ہمارے ساتھ رہنا چاہو تو اجازت ہے" مجسٹریٹ بولا "تم گواہی دو گے کہ پولیس نے کوئی توڑ پھوڑ نہیں کی۔ ریکارڈ کو نہیں چھیڑا اور کوئی چیز ساتھ نہیں لے گئے۔"

"مائی باپ۔ پھر تلاشی لینے کا مقصد کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"ہمیں اطلاع ملی ہے کہ کچھ دہشت گرد ایک شخص کو اغوا کر کے یہاں لائے ہیں۔ ہمیں صرف ان مجرموں کو گرفتار کرنا ہے" مجسٹریٹ نے گول مول جواب دیا۔

شاہد علی نے مجھے آگے دھکیلا "زیادہ جرح مت کر۔۔۔ آگے چل۔"

میں لڑکھڑا کے سنبھلا اور اوپر چلا گیا۔ پولیس ہر ممکن احتیاط سے کام لے رہی تھی کیونکہ معاملہ قانون کی جنگ لڑنے والوں کا تھا، جو معمولی غلطی کو بھی بہت بڑا جرم بنا سکتے تھے۔ وہ اپنے ساتھ تالے کھولنے کا سامان اور ایک ماہرِ فن کو بھی لائے تھے۔ ماہرِ فن بھی پولیس کی وردی میں تھا۔ غالباً اس نے تالے کھولنے کی تربیت سند یافتہ چوروں سے حاصل کی تھی اور پھر محنت یا خداداد صلاحیت سے اس کام میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ چٹکی بجاتے میں اس نے رابعہ کے آفس کا دروازہ کھول دیا اور اندر داخل ہو کے لائٹ جلا دی۔

پولیس کے نصف درجن جوان یوں اندر داخل ہوئے جیسے اندر سے انہیں خوفناک مزاحمت کا اندیشہ ہو اور مجرم جواب میں توپ اور ٹینک خانے سے، مشین گنوں اور دستی بموں سے حملہ کریں گے۔ اندر کسی کو نہ پا کے وہ خاصے مایوس ہوئے۔

شاہد علی نے کہا "اچھی طرح دیکھو ہر جگہ۔"

مجسٹریٹ نے انہیں خبردار کیا "کسی فائل کو ہاتھ مت لگانا۔ درازیں مت کھولنا اور کوئی چیز گرانا نہیں۔"

شاہد علی نے بُرا سا منہ بنایا "اتنا ڈرنے کی کیا ضرورت ہے مجسٹریٹ صاحب۔ چھاپا تو چھاپا ہی ہوتا ہے۔"

"ہاں مگر جواریوں کے اڈے پر اور وکیلوں کے آفس میں چھاپا مارنا ایک بات نہیں ہوتی۔ آدمی درازوں میں یا فائلوں میں نہیں مل سکتے۔ بس الماریوں میں، باتھ روم میں اور ایسی جگہ دیکھ لو جہاں کوئی چھپ سکتا ہے۔"

تالا کھولنے والا اس کارروائی میں عملی حصہ نہیں لے رہا تھا اور ایک طرف کھڑا جماہیاں لے رہا تھا۔ غالباً اسے سوتے سے اٹھا کے لایا گیا تھا۔

میں نے اس سے سرائیکی میں کہا "تم کہاں پولیس میں پھنس گئے؟"

"کیا مطلب ہے آخر اس فضول بات کا؟" وہ بولا۔

میں نے کہا "یہی کام تم دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کے کرتے جو پولیس کی طرح وقت ضائع نہیں کرتے، تالے کھولتے ہیں، تجوریوں کے اور مال سے بھری ہوئی الماریوں کے۔ نقد زیورات، پرائز بانڈ سمیت کے ساتھ لے جاتے ہیں۔ خالی ہاتھ نہیں لوٹتے۔"

اس پر رقت طاری ہو گئی "شاید تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔"

میں نے رازداری سے کہا "تم کہو تو میں بات کروں تمہارے لیے ایک پارٹی ہے۔"

وہ سوچ میں پڑ گیا "بندے بے ایمان تو نہیں ہیں نا؟ آج کل میں جن کے ساتھ ہوں، وہ بڑے مکار ہیں۔ حصہ دیتے وقت ڈنڈی مار جاتے ہیں۔"

شاہد علی نے دہاڑ کے کہا "اوئے تم دونوں کیا راز و نیاز کر رہے ہو؟"

قفل شکن کانسٹیبل نے بڑی بے خوفی سے کہا "سر جی، میں اِس کُتے کے تخم سے پوچھ رہا تھا کہ بندے اس عمارت میں کہیں چھپے ہوئے ہیں تو بتا دے ورنہ بعد میں پولیس برآمد کر لے گی تو سب کے ساتھ۔"

میرے عدم تعاون کی سزا کیا ہوگی، اسے ناقابلِ اشاعت سمجھا جائے۔

ڈی ایس پی شاہد علی نے تعریفی نظروں سے اپنے ذہین ماتحت کو دیکھا "ٹھیک ہے، ذرا اچھی طرح پوچھ اس سے" پھر وہ دوسروں کی طرف متوجہ ہو گیا جو مجسٹریٹ کی واضح ہدایات کے باوجود ایسے مقامات پر طحان کو تلاش کر رہے تھے جہاں سے انسان تو کیا چوہا بھی برآمد نہیں ہو سکتا تھا۔

"چوکیداروں سے اپنا بڑا یارانہ ہے۔ وہی صحیح مخبری کرتے ہیں۔ ابھی دو ہفتے پہلے پتا چلا تھا کہ پلاٹ کا سودا ہوا ہے اور ادائیگی شام کو ہوئی۔ پیسہ رات بھر گھر میں ہوگا۔۔۔ چار لاکھ ہاتھ لگے تھے مگر میرے ساتھ دھوکا ہوا، بس دس ہزار دیے کہ تجوری میں کچھ نہیں تھا۔ رقم تو الماری میں سے ملی تھی۔ اور الماری پہلے سے کھلی ہوئی تھی۔ یہ تو بڑی غلط بات ہے۔ میں تجوری کھولتے ہوئے پکڑا جاتا تو سب بھاگ جاتے۔ کوئی میرے ساتھ مار نہ کھاتا۔ پھر میرا حصہ کم کیوں۔۔۔"

میں نے آہ بھری "دنیا میں انصاف کہاں ہے یار۔ مگر خیر یہ پارٹی ایسی نہیں ہے۔ میں بتاؤں گا تمہیں۔"

تلاشی لینے والے اپنی ناکامی کا اعلان کر چکے تھے۔ "یہاں کوئی نہیں ہے سر جی۔"

"چھت پر جا کے دیکھو" شاہد علی نے کہا۔

"ہاں۔ کہیں وہ چھت پر سے کود کے فرار نہ ہو گئے ہوں" میں نے کہا۔

شاہد علی نے مجھے خونی نظروں سے دیکھا "ہم سے مذاق کرتا ہے۔"

مجسٹریٹ نے اسے روک لیا ورنہ اس کا ہاتھ مجھ پر اٹھ جاتا "تمہیں صرف تلاشی لینے کا اختیار ہے۔ مار پیٹ کا نہیں۔ قاضی کے گھر کے چوہے بھی سیانے ہوتے ہیں۔ یہ کل مجھے گواہ بنائے گا کہ پولیس نے اس پر تشدد کیا تھا۔"

میں نے کہا "میں بیگم صاحبہ کو اطلاع دینا چاہتا ہوں۔"

"کس بات کی؟"

"جو کچھ یہاں ہو رہا ہے، اس کی" میں نے کہا "اچھا ہے اگر وہ

خود دیکھ لیں اپنی آنکھوں سے۔"

مجسٹریٹ اجازت دینے پر آمادہ نظر آتا تھا اور شاہد علی کی صورت پر ناخوشی کے آثار تھے مگر کسی کے انکار یا اقرار سے پہلے دھماکا ہوگیا' مرزا غالب نے یوں قدم رنجہ فرمایا کہ خود میں بھونچکا رہ گیا۔

"چوکیدار۔ یہ کیا ہو رہا ہے یہاں؟" غالب نے سخت برہمی کا اظہار کیا۔ "کیا کوئی قتل ہوگیا ہے' پولیس کیا کر رہی ہے یہاں؟"

"اپنا وقت ضائع کر رہی ہے جناب' میری نیند تو خراب......"

"نیند کے بچے۔ سیدھی طرح کیوں نہیں بتاتے کہ ہم خانہ تلاشی کے وارنٹ لے کر آئے ہیں" ڈی ایس پی شاہد علی نے دانت پیس کے کہا "تم کو بھی دکھا چکے ہیں۔"

"لیکن کیوں..... ایک لیگل فرم میں ایسی کیا بات ہے؟"

اب مجسٹریٹ نے کہا "تم کون ہو؟ یہ تمہارا آفس ہے؟"

"اگر یہی سوال میں تم سے کروں پھر؟" غالب نے کہا "باقی سب تو پولیس والے لگتے ہیں۔"

"میں مجسٹریٹ ہوں۔"

"میں چیف رپورٹر ہوں۔" غالب نے اپنا کارڈ اس کے سامنے کردیا "اس کمپنی کے تینوں پارٹنر میرے قریبی دوست ہیں۔ مس رابعہ قاری' عبدالودود منظر اور وقار یوسف۔ کیا انہیں اس کارروائی کا علم ہے؟"

میں نے کہا "میرے منع کرنے کے باوجود انہوں نے تالا خود کھول لیا اور مجھے فون بھی نہیں کرنے دیا۔"

"تالا کیسے کھول لیا؟" غالب نے حیرانی سے کہا۔

"یہ ایک چور کو بھی وردی پہنا کے ساتھ لائے تھے" میں نے تالا کھولنے والے کی طرف اشارہ کیا "تالے کھولنے کا سب سامان ہے اس کے پاس۔"

"یہ بکواس کرتا ہے" ڈی ایس پی شاہد علی نے کہا۔

"اچھا پھر تم بتاؤ کہ اس آفس میں تالا کھولے بغیر اتنے لوگ کیسے داخل ہوگئے؟" غالب نے کہا "سارے دروازے مقفل تھے اور چابی صرف انہی کے پاس رہتی ہے جو مالک ہیں۔ یہاں جتنے آفس ہیں سب اس وقت بند ہیں اور کسی کی چابی چوکیدار کے پاس نہیں۔ ڈی ایس پی صاحب۔ بولتے کیوں نہیں آپ؟ اور آپ مجسٹریٹ صاحب۔ ان قفل شکن چوروں کے اس غیر قانونی فعل کی نگرانی آپ کر رہے ہیں؟"

"اتنا وقت نہیں تھا ہمارے پاس۔" ڈی ایس پی نے بغلیں جھانکتے ہوئے اپنا دفاع کیا "ملزمان کی گرفتاری ضروری تھی۔"

"کیوں۔ کیا قیامت آنے والی تھی؟ آسمان گرنے والا تھا۔ اندر ایسے مجرم تھے جو ایٹم بم کا دھماکا کرنے والے تھے؟" غالب نے دہاڑ کے کہا "اور یہ ملزمان کون ہیں آخر' جن کی تلاش میں تم اتنا بڑا لشکر لے کر یہاں آگئے۔ اتنی تیاری سے تم رات کو حملہ کرتے تو کشمیر فتح کرلیتے۔ میں ابھی بات کرتا ہوں ڈی آئی جی صاحب سے اور سب اخبار والوں کو بتاتا ہوں۔"

ڈی ایس پی نے ٹیلی فون پر ہاتھ رکھ دیا "اتنی گرمی مت دکھا[ؤ] صحافی صاحب۔ کوئی فائدہ نہیں ہوگا تمہیں اس سے۔ ہم نے سب کچھ قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے کیا ہے۔ ایک چوکیدار کی گواہی کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ خود مجسٹریٹ صاحب جانتے ہیں کہ تالا اسی نے کھولا تھا۔ چابی تھی اس کے پاس۔"

اب مجسٹریٹ کے تیور بھی بدل گئے "ہاں۔ اور ہم نے اندر داخل ہونے سے پہلے انہیں اطلاع کردی تھی۔ کیا نام ہے خاتون کا؟"

"مس رابعہ قاری۔ انہوں نے فون پر چوکیدار سے بات کی تھی اور اسے اجازت دی تھی کہ دفتر کھول دے۔"

میں نے احتجاج کیا "یہ جھوٹ ہے۔"

"سچ وہ ہوتا ہے..... جس کے گواہ ہوں۔" شاہد علی نے مجھے ایک اور گالی دی "تیرے بھونکنے سے کیا ہوتا ہے۔ جو میں نے کہا ہے وہی سچ ہے۔"

غالب بولا "کہاں فون کیا تھا تم نے؟"

ڈی ایس پی بڑی عیاری سے جواب کو گول کرگیا۔ "مجھے کیا معلوم' چوکیدار نے کیا نمبر ملایا تھا۔ ایک اور بات بتادیں تمہیں جب ہم یہاں سے چلے جائیں گے تو تم کیسے ثابت کروگے کہ ہم یہاں آئے تھے؟ خبر بنتی ہی نہیں اپنے جرنلسٹ صاحب۔"

غالب نے یہ ظاہر کیا جیسے اس نے اپنی شکست تسلیم کرلی ہے "اچھا سر' اگر مقابلہ جھوٹ بولنے کا تھا تو تم جیت گئے۔ اب میں بات کرلوں مس رابعہ سے؟"

ڈی ایس پی نے مسکرا کے فون پر سے ہاتھ ہٹالیا اور اپنی فورس کو حکم دیا کہ وہ کام ختم کرکے نیچے پہنچ جائیں۔ انہوں نے کسی بھی چیز کو چھیڑا نہیں تھا۔ جانے سے پہلے انہوں نے ہر جگہ کو کپڑے سے صاف کردیا جہاں ان کے ہاتھ لگے تھے۔

مجسٹریٹ نے کہا "میں خود بھی بات کرنا چاہتا ہوں وکیل صاحب سے۔"

غالب نے ریسیور اسے پکڑادیا "پہلے آپ فرمالیں جو فرمانا ہے۔"

دوسری طرف سے غالباً منظر نے ریسیور اٹھایا تھا۔ وہ وضاحت سننے سے پہلے ہی مجسٹریٹ کے گلے پڑ گیا۔ مجسٹریٹ سخت پریشان نظر آرہا تھا۔ منظر کی زبان کا مقابلہ وہ کیسے کرتا؟ وہ پہلے سنیں تو سہی' آپ بھی حد کرتے ہیں۔ یہ کیسے بات کرتے ہیں آپ شرافت بھی کوئی چیز ہوتی ہے" اور اسی قسم کے ادھورے جملے بولتا رہا۔ پھر ان کی باقاعدہ لڑائی شروع ہوگئی اور مجسٹریٹ نے غصے میں ریسیور ڈی ایس پی کو تھمادیا۔ منظر نے جس طرح اس کی ایسی تیسی کی اس کا عکس شاہد علی کی صورت پر نظر آرہا تھا۔ اس نے ریسیور پٹخ کے منظر کو وہ گالیاں دیں جو فون پر نہیں دے سکا تھا اور وہ دھمکیاں دیں جو احمقانہ تھیں۔

غالب نے دانت نکالتے ہوئے میرے ہاتھ پر ہاتھ مارا "دماغ خراب ہے ان لوگوں کا۔ بھلا ملزم اتنی رات گئے کسی وکیل کے آفس میں چھپنے کے لیے کیسے آسکتے ہیں۔ سارے شہر میں کیا یہی ایک جگہ تھی؟"

ہم پولیس کی لاقانونیت اور غیر انسانی طرز عمل پر انہیں برا بھلا کہتے رہے اور خاموشی سے ان تمام مقامات کا جائزہ لیتے رہے جہاں وہ خفیہ مائکروفون لگا سکتے تھے۔ ایک عام قسم کا ایف ایم مائکروفون ہماری گفتگو کا ہر لفظ نشر کرسکتا تھا اور سو دو سو میٹر یا ایک کلومیٹر دور بیٹھ کے پولیس والے سب کچھ سن بھی سکتے تھے اور ریکارڈ بھی کرسکتے تھے۔ ہم محتاط نہ ہوتے تو آزادانہ گفتگو میں دلاور کی گرفتاری کا حوالہ بھی دیتے اور یہ ذکر بھی کرتے کہ رابعہ نے اسے منظر کے گھر پہنچا کے اچھا کیا جہاں پولیس کے فرشتے نہیں پہنچ سکتے۔ فرشتوں سے پہلے وہ خود وہاں سے دلاور کو برآمد کرلیتے۔ وہ مجسٹریٹ کو اسی لیے ساتھ لیے پھر رہے تھے کہ جب اور جہاں ضرورت پڑے وارنٹ کے قانونی تقاضے پورے ہوجائیں۔ دلاور اگر منظر کے گھر سے برآمد ہوتا تو صورت حال بہت خراب ہوجاتی۔ وکیل ہو یا جج۔ قانون کی گرفت سے تو کوئی بھی بالاتر نہیں ہے۔

میں نے میز کی اور کرسیوں کی سطح کے نیچے ہاتھ پھیر کے دیکھا' صوفوں اور الماریوں کے پیچھے ہر کرسی کی پشت پر اور کچن کے ہر شیلف میں برتن ہٹا کے دیکھا۔ بیڈ کے نیچے جھانکا اور دروازوں کے پٹ اور چوکھٹوں پر ٹارچ کی روشنی ڈالی کہ کہیں کوئی دھبا یا ایسا داغ نظر آئے جو پہلے وہاں نہیں تھا۔ مقناطیسی قسم کے ایف ایم مائکروفون کسی بھی لوہے کی چیز پر خود چپک جاتے ہیں ورنہ انہیں ایک خاص قسم کی چپکنے والی شفاف گوند سے لگایا جاسکتا ہے۔

غالب نے فریچر کو نہیں دیکھا۔ اس نے میز پر رکھی ہوئی بہت سی چیزوں کی تلاشی لی۔ ان میں ٹیبل لیمپ' گل دان اور ایش ٹرے وغیرہ شامل تھے' اس نے ٹیوب لائٹس کی پٹی پر ہاتھ پھیرا۔ وال لائٹس کے شیڈ' سوئچ بورڈ' پنکھوں اور ریگولیٹرز پر مائکروفون تلاش کیا اور بالآخر کامیابی اسی کے حصے میں آئی۔

مائکروفون ایک پینٹنگ کے فریم کی پشت پر دریافت ہوا۔ یہ ایک مشہور برطانوی مصور کانسٹیبل کی بنائی ہوئی تصویر تھی جو مناظر فطرت کو پینٹ کرنے میں لافانی شہرت کا حامل ہے۔ ظاہر ہے یہ اصل تصویر نہیں' اس کا پرنٹ تھی۔ اس کی وسعت کے اعتبار سے فریم بھی تین انچ چوڑی اور آدھا انچ موٹی لکڑی کا تھا جس کے نقش و نگار پر سنہرا رنگ پھیرا گیا تھا۔ اس کے پیچھے دو انچ چوڑا اور چار انچ لمبا مائکروفون کسی کو نظر نہیں آسکتا تھا کیونکہ اس کا رنگ سیاہ تھا اور فریم کے پیچھے اندھیرا رہتا تھا۔ فریم کا وہ کنارا جس پر مائکروفون چسپاں تھا رابعہ کی ٹیبل کے قریب دائیں ہاتھ والی دیوار پر مشکل سے چھ فٹ دور ہوگا۔

میں نے پولیس والوں کی ہوشیاری کو سراہا۔ انہوں نے ہماری گفتگو ریکارڈ کرنے کا پکا بندوبست کیا تھا۔ (...)

غالب مسکراتا رہا "شوق پورا ہوگیا آپ کا۔ اب آپ عزت سے تشریف لے جائیں۔"

"تم سے بھی نمٹ لوں گا میں بیٹا" ڈی ایس پی جاتے ہوئے بولا۔

غالب نے کہا "ہم صحافی تو تمہارے باپ ہوتے ہیں۔ تمہاری رگ رگ کو پہچانتے ہیں۔ تمہیں بھی پتا چل جائے گا کل کہ یہاں کتنے خفیہ مائکروفون تھے' کتنے ٹیپ ریکارڈر اور کیمرے۔ تم نے یہ نہیں سوچا ڈی ایس پی کہ میں اچانک کیسے پہنچ گیا تھا؟ وحی نازل نہیں ہوئی تھی مجھ پر۔ مجھے پہلے سے اندازہ تھا کہ اب تم کیا کروگے۔ پکا بندوبست کیا تھا میں نے بھی۔"

ڈی ایس پی کا رنگ اڑ گیا۔ "میں نے کوئی غیر قانونی کام نہیں کیا۔"

"جتنی گالیاں تم نے دی ہیں اور جو دھمکیاں دی ہیں ان کی قانونی حیثیت کیا ہوگی؟ اب گھر جا کے صبح تک سوچتے رہنا کہ پولیس کی نوکری چھوڑ کے تم کیا کروگے؟ انارکلی میں دہی بھلے بیچو کے یا گنڈیریاں؟"

مجسٹریٹ پڑھا لکھا اور سمجھ دار آدمی تھا۔ اس نے فوراً صورت حال کو سنبھال لیا۔ "چلو تم جاؤ شاہد علی۔ کارروائی پوری ہوگئی نا۔ رپورٹ میں دے دوں گا اور غالب صاحب' آپ اس چوکیدار سے کہیں کہ نیچے جائے' مجھے کچھ بات کرنی ہے۔"

"مجھے کوئی بات نہیں کرنی آپ سے.... جب تک ڈی ایس پی اس چوکیدار سے معافی نہیں مانگتا۔"

"آپ تو جانتے ہیں ان لوگوں کو..." مجسٹریٹ نے بے بسی سے کہا "یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ڈی ایس پی معافی مانگے اور وہ بھی ایک چوکیدار سے... ناممکن۔"

"یہ فرعون بنے پھرتے ہیں۔ کیا کسی غریب چوکیدار کی عزت نہیں ہوتی' میں اسے اچھی طرح سمجھادوں گا" غالب نے کہا۔

لیکن مجسٹریٹ نے بالآخر اسے منالیا۔ غالب بھی ایکٹنگ ہی کر رہا تھا۔ اس نے درگزر کرکے گویا بڑا احسان کیا اور ایس ڈی ایم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ بلائے ناگہانی کی طرح نازل ہونے والے صحافی سے جان چھوٹی۔ میں نیچے تک گیا اور دروازے کو مقفل کر آیا۔

میں واپس گیا تو غالب نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور ایک کاغذ پر لکھا "مجھے شک ہے کہ پولیس یہاں کوئی خفیہ مائکروفون نصب کرگئی ہے۔ محتاط رہ کے بات کرنا۔"

میں نے کہا "سر' جی اچھا ہوا کہ آپ آگئے ورنہ میں تو مارا جاتا۔"

آنکھوں میں دھول جھونکتے ہوئے بڑی صفائی سے مائکروفون لگایا تھا اور اس کے لیے جگہ بھی خوب منتخب کی تھی۔ کمرے کی ہر دیوار پر آرائشی تصاویر آویزاں تھیں۔ برطانوی مصور کی طرح پاکستان کے قدرتی مناظر کی نقاشی کرنے والے استاد اللہ بخش کے علاوہ زین العابدین اور....... حنیف رامے کی مصوری کے نمونے بھی دیواروں پر موجود تھے۔ یہ نقل نہیں بلکہ اصل شاہکار تھے جو رابعہ نے کسی نمائش سے خریدے ہوں گے۔ ان کے فریم بھی مائکروفون چھپانے کے لیے موزوں تھے مگر بستا دور تھے۔

میں حیران تھا کہ یہ کام کس نے کیا اور کب کیا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ یہ تو وہی جگہ ہے جہاں میں قفل کھولنے کے ماہر کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اسے باتوں میں لگا کے میں نے بڑی ہوشیاری دکھائی ہے۔ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ مجھے باتوں میں الجھا کے وہ اپنا کام کر گیا تھا۔

میں نے اور غالب نے سراغ رسی کے اس کارنامے پر ہاتھ ملا کے ایک دوسرے کو مبارک باد پیش کی اور پھر وہیں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ میں نے چائے بناتے ہوئے سرائیکی میں بات کی اور غالب پنجابی میں اظہار خیال کرتا رہا۔

کچھ دیر بعد منظر آگیا۔ حسب عادت اس نے ہنگامہ برپا کردیا "میں کہتا ہوں نام بتاؤ مجھے اس بھوتنی والے مجسٹریٹ کا۔ ڈی ایس پی شاہد علی کی تو پی ڈبلیو ایل۔"

میں نے چوکیدارانہ جہالت سے کہا "وہ کیا ہوتا ہے جی۔"

"ابے جی پی کو کہتے ہیں۔ مگر تو کیا سمجھے گا۔" منظر نے مجھے آنکھ ماری اور میں نے بڑی مشکل سے ہنسی ضبط کی کیونکہ میں ان تمام انگریزی حروف تہجی کے مطلب سے بخوبی واقف تھا۔ تاہم یہ جن الفاظ کا مخفف ہیں وہ پریس کی آزادی کے دور میں بھی شائع نہیں کیے جاسکتے۔

"رابعہ نہیں آئی تمہارے ساتھ۔۔" غالب نے بہ آواز بلند کہا۔

منظر نے مائکروفون کی طرف رخ کرکے جواب دیا "اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے کل سے۔ بخار تھا شام کو۔ ڈاکٹر نے گھر آکے دیکھا تھا اور دوا دے دی تھی۔ بس اس کے بعد سے گدھے بیچ کے سو رہی ہے۔"

"اسے عشق کا معیادی بخار ہے" غالب نے کہا "اور اس کا علاج کسی چارہ گر کے پاس نہیں۔ سوائے اُس کے۔"

"جو سالا غائب ہے۔ مجھے تو لگتا ہے اسے خرکار پکڑ کر لے گئے۔"

"خر کو خرکار ہی لے جاسکتے ہیں۔ خیر اچھا ہوا" غالب نے کہا "تمہاری جان بھی چھوٹی اور عذاب ختم ہو رابعہ کا بھی۔"

انہوں نے میرے گھورنے کی پروا نہیں کی۔ اصل مقصد تو پولیس کو یہ بتانا تھا کہ رابعہ دو دن سے منظر کے گھر میں ہے اور بخار کی حالت میں اس کے کسی اغوا کی واردات میں ملوث ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

"اس خبیث الدہر کا بھی کچھ پتا ہے؟" منظر نے کہا۔

"وضاحت فرمایئے آپ کس کو پوچھ رہے ہیں؟" غالب بولا۔

"ابے وہی رابعہ کے عشق کا وائرس۔ سکندر اعظم کی اولاد ایسے غائب ہے جیسے تمہارے سر سے سینگ۔"

غالب ہنسا "میرا خیال ہے کہ وہ اور چوہدری دلاور اپنے سارے جھگڑے خود نمٹانے کے لیے کہیں چلے گئے ہیں۔ ڈوئل لڑنے کے لیے۔ تلواریں سونت کے آمنے سامنے مقابلہ ہو۔ کیسی عدالت، کہاں کا قانون؟ جو جیتا وہی سکندر، جو ہارا وہ دارا۔"

"یہ سب حرامی پن اسی کا ہے مرزا۔ اس نطفہ نا تحقیق کا۔ میں سکندر کو بتادوں گا کہ اس کے بارے میں۔"

"ابے صحافی کے گھوڑے۔ میں چوہدری دلاور کی بات کررہا تھا۔ اسی نے بھیجا ہوگا پولیس کو۔"

"وہ تو خود مفرور ہے پولیس کے ڈر سے۔"

"یار سب ڈراما ہے۔ شرط لگالو تم مجھ سے وہ اسی ایس پی کے ساتھ بیٹھا ہوگا جو اسلام آباد سے تفتیش کا ناٹک رچانے آیا ہے۔" منظر بولا۔

"سنا تو یہ ہے کہ وہ بڑا ایماندار اور فرض شناس ہے۔"

منظر نے قہقہہ بلند کیا "ان کا یہی طریق کار ہے بیٹے۔ جو واقعی ایماندار ہوں ان کے بارے میں جھوٹے قصے پھیلائے جاتے ہیں کہ بڑا راشی ہے اور منہ کو حرام لگا ہوا ہے لیکن بنتا ہے پارسا۔ جو حرام کھاتے ہیں ان کے بارے میں باقاعدہ تشہیری مہم چلائی جاتی ہے کہ بڑے ولی اللہ ہیں۔"

"پیسہ ایسی ہی چیز ہے بھائی" غالب نے آہ بھری۔

"مجھے ابھی تک یہ پتا نہیں چلا کہ آخر تیری سواری ادھر کیسے آگئی؟"

غالب بولا "بس یار۔ میں آخری کاپی جانے سے پہلے ہی نکل کھڑا ہوا تھا۔ کچھ پروگرام تھا۔"

"اسی کے ساتھ جو تجھے دوہری مار مارتی ہے؟ ایک عشق کی اور دوسری نازک ہاتھوں کی" منظر نے ملامت سے کہا "نام دیکھو ذرا۔۔۔ نازو۔ نہ ناز نہ نزاکت۔ اس کا نام تو کچھ فتنہ بانو یا خونی بیگم ہونا چاہیے تھا۔"

"ایسے تو تمہاری منکوحہ کا نام بھی زرخیز خانم یا مس زود افزا ہونا چاہیے۔" غالب بولا۔

منظر نے زبردست قہقہہ مارا "ابے مان گئے تجھے بھوتنی کے کیا نام تجویز کیا ہے۔ مس زود افزا۔ مس تو خیر وہ نہیں ہے مگر بڑی تیز رفتاری سے اس نے مجھے سولہ بچوں کا باپ بنایا ہے اس کے لیے تو یہی نام جچتا ہے اس پر۔ آیندہ زود افزا ہی کہوں گا اسے اور بتاؤں گا کہ نام تو نے دیا ہے۔"

اطلاع کچھ دیر سے ملی کہ اغوا کی اس واردات میں استعمال ہونے والی گاڑی کہاں دیکھی گئی ہے۔ ہم نے چھاپا مارنے والی پولیس پارٹی کے واپس جاتے ہی رابعہ کو دلاور سمیت وہاں سے رخصت نہ کیا ہوتا تو سارے کیے کرائے پر پانی پھر جاتا۔

ڈی ایس پی شاہد علی کو تلاشی کے وارنٹ حاصل کرتے ہوئے پورا یقین ہوگا کہ وہ بہت بڑا دھماکا کرے گا۔ دلاور کو برآمد کرنے کے علاوہ سکندر بخت کی گرفتاری اور اعانت مجرمانہ میں رابعہ کو حراست میں لے کر وہ شاید اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ سرانجام دیتا لیکن تقدیر نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔ رابعہ اور دلاور کا وہاں کوئی سراغ نہیں ملا اور سکندر بخت کو اس کی نظریں چوکیدار کے روپ میں شناخت کرنے سے قاصر رہیں۔ اُلٹا غالب نے بروقت نمودار ہوکے اس کے لیے پریشانی کے اسباب پیدا کردیے تھے مگر اس کے باوجود شاہد علی اپنا کام کر گیا تھا۔ خفیہ مائکروفون کی تنصیب سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کا شک دور نہیں ہوا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ ہم چالاک لوگ ہیں، جادوگر نہیں کہ رابعہ اور دلاور کو چھومنتر سے غائب کردیا ہوگا۔ انہیں ہم نے اِدھر اُدھر کردیا تھا اور ڈی ایس پی شاہد علی کو پوری اُمید تھی کہ وہ اس جگہ کا سراغ لگالے گا۔

صبح میں نے اطمینان سے ناشتا کیا اور پھر اپنا حُلیہ تبدیل کرکے باہر آیا تو صبح کا سورج بہت اوپر آچکا تھا۔ میری آنکھ ہی دیر سے کھلی تھی۔ اگر عمارت میں صفائی کے لیے آنے والا عملہ گیٹ نہ بجاتا تو میں نہ جانے کب تک سوتا رہتا۔ آفس میں آکے میں پھر سو گیا تھا اور نو بجے اُٹھا تھا۔

دس بجے تک عمارت میں چہل پہل کے آثار مفقود تھے چنانچہ میں نے باہر نکلنے کا ارادہ ملتوی کردیا۔ اگر سادہ کپڑوں والے پولیس کے جاسوس عمارت کے آس پاس منڈلا رہے ہوں گے اور آنے جانے والوں پر نظر رکھے بیٹھے ہوں گے تو یہ رپورٹ ضرور دیں گے کہ صبح سے اندر کوئی نہیں گیا تھا لیکن وہ فرنچ وکیل باہر آیا ہے۔ کیا وہ رات بھر اندر رہی تھا؟

آفس کے ٹیلی فون کو استعمال کرتے ہوئے میں نے منظر کے گھر کا نمبر ملانا چاہا تو مجھے اندازہ ہوا کہ فون ڈیڈ ہے یا لائن کٹی ہوئی ہے۔ شاید اسی لیے صبح سے اب تک غالب یا رابعہ میں سے کسی نے بھی مجھ سے رابطہ نہیں کیا تھا اور فون کی گھنٹی ایک بار بھی نہیں بجی تھی۔

کچھ دیر بعد میں نے اسی فلور پر انکم ٹیکس ایڈوائزر کے آفس سے غالب کو فون کیا۔ وقار یوسف کی بیوی میری بدلی ہوئی آواز نہ پہچان سکی۔

"غالب صاحب تو صبح ہی چلے گئے تھے" وہ بولی۔

"ان کی وائف ہوں گی۔"

"وائف!" وہ ہنسی "ابھی زیادہ سے زیادہ آپ انہیں منگیتر کہہ سکتے ہیں۔ وہ بھی نصف، آپ کون ہیں؟"

"ابے کیوں پٹواتا ہے مجھے اس سے۔ بہت ماریں گے اس کے بچّے مجھے۔"

"وہ سمجھے گی کہاں۔ خوش ہوگی کہ میں اسے روح افزا جیسی ٹھنڈی اور میٹھی چیز کہہ رہا ہوں۔" منظر بولا "اب نکل یہاں سے تاکہ میں تالا لگاؤں۔"

نیچے آکے منظر نے مجھے آڑے ہاتھوں لیا "ابے چوکیدار کے گھوڑے۔ فرنچ وکیل کے کھوتے۔ یہ کیا مصیبت بھیج دی ہے تو نے میرے گھر۔ قسم خدا کی مجھے تو یقین نہیں آیا دلاور کو دیکھ کے۔ اتنے بڑے بدمعاش ہوگئے ہو تم لوگ۔ تھانوں پر حملے کرنے لگے ہو۔ سوچو بیٹا کہ پکڑے جاتے تو کیا ہوتا؟"

"اس کے بارے میں کیا سوچنا جو ہوا ہی نہیں۔ مگر دلاور کو اغوا کرکے نہ لاتے تو کیا کرتے؟ پولیس نے تو اسے صاف بچالیا تھا۔ قانون کی ایسی تیسی کرنے والوں کے ساتھ یہی ہونا چاہیے۔ اب تم جاؤ اپنے گھر، صبح ملاقات ہوگی۔"

"اور وہ آدم خور شیر۔ چوہدری دلاور میرے گھر میں کب تک رہے گا؟"

"زیادہ سے زیادہ کل تک۔"

"اور کل کے بعد۔۔" منظر سخت پریشان تھا۔

"جہنم میں۔۔" میں نے بھنّا کے کہا۔

"یعنی تمہارے ساتھ؟ ٹھیک ہے۔ بس واپس مت آنا جہنم سے۔ قسم خدا کی سولہ بچوں کی یتیمی کا خیال نہ ہوتا تو میں خودکشی کرلیتا۔ ابے نہ دن کو چین، نہ رات کو آرام۔ تم تو عذابِ الٰہی بن گئے ہو میرے لیے۔"

"تیرے اعمال ایسے ہوں گے نور چشم۔ اب جا، اپنے سترھویں نونہال کے بارے میں سوچ۔"

"اب کیا خاک سوچنا ہے۔ سنگِ بنیاد تو رکھ دیا" منظر نے بڑبڑاتے ہوئے کہا "اے بھائی، نیچے اُترو گاڑی سے۔"

غالب اس کی گاڑی سے اُتر گیا۔ "کیوں۔ دھکا لگانا ہے کیا؟"

"میں جارہا ہوں اپنے گھر" منظر نے دروازہ بند کرلیا۔

غالب نے شور مچایا "یار، تو مجھے بھی وہیں جانا ہے۔"

"تمہاری وہ میری تحویل میں نہیں ہے۔ وقار کے پاس ہے۔ پیدل جاؤ بیٹا۔" وہ گاڑی نکال کرلے گیا "تمہاری سزا یہی ہے۔"

"اُلّو کا پٹھا۔ مجھے اُدھر چھوڑ جاتا تو کیا اس کی گاڑی کے ٹائر گھس جاتے" غالب نے خفگی سے کہا اور پیر پٹختا ہوا چل پڑا۔

رات کا باقی حصہ میں نے بڑے سکون سے سو کے گزارا۔

مجھے یقین تھا کہ گزشتہ شب کی ناکامی پر شرمندہ ہونے کے بجائے دلاور کے نمک خوار زیادہ چراغ پا ہوں گے۔ تھانے میں بجلی نہ ہونے سے گھپ اندھیرا تھا۔ اس کے باوجود ہم دلاور کو نکال کر لے گئے تھے۔ منصوبہ بندی، ٹیم ورک اور کمانڈو ایکشن کی طرح ہونے والی واردات سے انہوں نے بالکل صحیح اندازہ کیا تھا کہ یہ کام صرف ایم آر ایس کے سرپھرے دیوانے ہی کرسکتے تھے۔ بس

"میں اخبار کے دفتر سے ہی بول رہا تھا۔"

"یہ تو خیر غلط ہے" وہ بولی "آپ ان کے ساتھی ہوتے تو یہ ضرور معلوم ہوتا آپ کو کہ غالب نے ابھی تک شادی نہیں کی ہے۔"

اس نے ذہانت کا ثبوت دیا تھا اور مزید بات کئے بغیر فون رکھ دیا تھا۔ اب میں نے منظر کا نمبر ملایا۔ انکم ٹیکس ایڈوائزر کے آفس میں ابھی تک ایک کلرک کے سوا کوئی نہیں پہنچا تھا اور وہ اپنی میز پر کاغذات کو ادھر سے اُدھر رکھنے میں مصروف تھا۔ یہاں فون سب کی اشد ضرورت تھی اور ایک آفس کا فون خراب ہو تو دوسرے آفس کے فون کو استعمال کرنا پڑتا تھا۔ کلرک کو اس سے کوئی سروکار نہ تھا کہ میں کس کس سے بات کررہا ہوں اور کیا کہہ رہا ہوں؟

غالب نے منظر کے گھر سے "ہیلو" کہا تو میں نے سلام عرض کیا۔

"کہاں سے بول رہے ہو۔ جواب یہ مت دینا کہ اپنے منہ سے۔"

میں نے کہا "رابعہ کے آفس کا فون فوت ہوگیا ہے یا اس کی لائن قتل کردی گئی ہے۔"

"ہمیں معلوم ہے۔ ہم صبح سے کوشش کررہے تھے۔ صبح کا مطلب ہے' آٹھ بجے سے۔ تمہاری صبح اب ہوئی ہے؟"

میں نے کہا "نہیں۔ میری صبح منہ اندھیرے ہوئی تھی۔ آنکھ کُھلتے ہی اس بُت طناز کو دیکھا جس کے سر پر ٹوکری اور ہاتھ میں جھاڑو دیکھ کے کسی شاعر نے کہا تھا۔

وہ دیکھو چلا آتا ہے معشوق ہمارا
ہے سر پہ فلک ہاتھ میں دُم دار ستارہ

غالب ہنسا "اور تب سے اب تک گویا اس کے ساتھ..."

میں نے کہا "میں آفس میں جاکے پھر سوگیا تھا۔ ساتھ والا آفس بند تھا۔ فون کہاں سے کرتا۔ باہر نکلوں گا جب لوگوں کی آمدورفت شروع ہوجائے گی۔"

"اس سے ثابت ہوا کہ سوچنے سمجھنے کی تھوڑی بہت صلاحیت اب بھی ہے تم میں" غالب بولا "باہر کی صورتِ حال مخدوش ہے۔"

"تمہیں کیسے اندازہ ہوا؟"

"تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔ ایک دودھ فراہم کرنے والا ریڑھا دائیں طرف بہت دیر سے موجود ہے۔ اس پر جو لوگ دودھ کے مٹکوں کے ساتھ تشریف فرما ہیں وہ نہ حُلیے سے گوالے لگتے ہیں نہ صورت سے۔ مزید یہ کہ وہ ٹکٹکی باندھ کے اس راستے کو دیکھ رہے ہیں جہاں سے ہم برآمد... ہم کا مطلب ہے ملزمان اور اپنے چوہدری صاحب جو رات کو ملے نہیں تھے۔"

"اور کون ہے دوسری طرف؟"

"دوسری طرف ایک شخص پوری چھولے بنا رہا ہے اور اس نے فٹ پاتھ کے پیچھے ایک میز کے گرد بینچیں ڈال دی ہیں۔ ایک بینچ پر گدھ بیٹھا ہے۔ گدھ جیسا ایک گنجا اور منحوس شکل والا حرام خور۔ وقفے وقفے سے پوریاں نگل رہا ہے۔ شام تک اس کا بچنا محال ہے۔ ہیضہ ہوجائے گا۔"

"تمہیں کون رپورٹ دے رہا ہے؟"

"اپنا ایک شاگرد ہے۔ دفتر میں چپراسی کا کام کرتا ہے۔ اصولاً تو اسے کہیں سراغ رساں ہونا چاہیے تھا۔"

"اپنے چوہدری صاحب کا کیا حال احوال ہے؟"

"رات بھر مزے سے گیراج میں سوتے یا روتے رہے۔ ہم نے ناشتا زہر مار فرمایا۔ اور بھی بہت کچھ فرمایا جو فون پر نہیں بتایا جاسکتا۔"

"منظر کی بیوی کو بھی معلوم ہے؟"

"ہاں۔ مجھ سے بصد اصرار کہہ رہی تھی کہ بھیا قصہ ختم کرو۔ میں ڈال دیتی ہوں پراٹھے میں چوہے مار سفوف۔ پتا نہیں اس کے خاندان میں کون گورکن کا پیر ہے۔ پیر صاحب کے حکم پر گورکن ایسا گاڑے گا کہ پولیس کیا منکر نکیر کو پتا نہیں چلے گا۔ میں نے ہاتھ جوڑ کے اسے منع کیا کہ وہ اس موضوع پر اظہار خیال نہ فرمائے۔ تم آؤ تو چوہدری صاحب کو اور ورہال کریں۔ نازو بہت پُرجوش ہے اور گوشمالی کا ٹھیکا لینا چاہتی ہے۔ رابعہ البتہ فکر مند ہے۔"

میں نے کہا "تم کہیں سے کرائے کی گاڑی لے کر آؤ۔ عین گیٹ کے سامنے لاکے روکو۔ میں اوپر سے دیکھ لوں گا اور ایسے بیٹھ جاؤں گا کہ کوئی دیکھ ہی نہ سکے۔"

کلرک میری گفتگو کی طوالت سے کچھ پریشان ہونے لگا تھا۔ شاید خود اسے بھی کسی سے بات کرنی ہوگی۔ وہ بار بار میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے ریسیور رکھ کے اس سے معذرت کی "مس رابعہ قاری کا فون خراب تھا۔"

"وہ تو کوئی بات نہیں" وہ بولا "آپ بھی وکیل ہیں؟"

"میں انہی کے ساتھ ایک کیس میں شریک ہوں۔"

"غالباً آپ کو علم نہیں کہ وہ شام کے وقت ملتی ہیں۔ اس وقت تو ان کا آفس بند ہوتا ہے۔" وہ بولا۔

مجھ سے غلطی ہوگئی تھی اور اسے نبھانا ضروری تھا "دراصل۔ رات ہم بہت دیر تک کام کرتے رہے تھے۔ پھر وہ چلی گئیں منظر صاحب کے ساتھ اور میں یہیں لیٹ گیا۔"

وہ مطمئن ہوگیا لیکن میرے دل میں خلش باقی رہی۔ اگر کبھی ایسا موقع آیا کہ میں نے خود کو فرنچ وکیل ظاہر کیا اور شامتِ اعمال سے اس کلرک نے سُن لیا تو گڑبڑ ہوجائے گی۔ یہ بتا سکتا ہے کہ وکیل صاحب تو میرے آفس میں فرفر اردو بول رہے تھے۔ میں نے خود کو تسلی دی کہ ایسا موقع شاید کبھی نہ آئے مگر یہ فیصلہ بھی کیا کہ

ایک شخص کو روک لیا جو پڑھا لکھا نظر آتا تھا۔ میری فرنچ سُن کے وہ بوکھلا گیا۔

"سوری۔ میں کچھ سمجھا نہیں۔ کیا آپ انگریزی نہیں جانتے؟"

"فرنچ" میں نے افسوس سے سرہلایا "ی۔ نو انگلش۔ یو ہیلپ۔" اس نے انگریزی میں کہا "واٹ ہیلپ؟"

میں نے کہا "وانٹ ٹیکسی... نو ٹیکسی ہیر۔"

اس نے سرہلایا اور اشارے سے کہا "کم ڈیئر۔" اور پھر میرے ساتھ چل پڑا "کم آن۔ آئی ول گیٹ یو اے ٹیکسی۔"

شاید اس کا خیال تھا کہ اول تو ٹیکسی والا میری بات ہی نہیں سمجھے گا اور سمجھا تو اجنبی جان کے مجھے بلاوجہ شہر کی سیر کرائے گا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ مجھے کہاں جانا ہے اور میں نے اسے بتایا کہ پہلے میں پولیس ہیڈ آفس جاؤں گا۔ وہ مجھے ٹیکسی میں بٹھا کے اور شکریہ وصول کرکے چلا گیا تو میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا کہ پہلے مجھے اخبار کے دفتر جانا ہے۔ اس نے کسی حیرانی کا اظہار نہیں کیا کیونکہ اس اجنبی نے مجھ سے انگریزی بولی تھی اور میں نے صرف "تھینکس" کہا تھا۔ پولیس ہیڈ آفس جانا اسے ویسے بھی پسند نہ تھا اور میرا مقصد پورا ہوگیا تھا۔ نگرانی کرنے والوں نے رپورٹ دے دی ہوگی کہ مرزا غالب ایک غیر ملکی وکیل کے ساتھ آیا تھا۔ غیر ملکی کچھ دیر بعد ٹیکسی میں بیٹھ کے کہیں چلا گیا۔

غالب میرے انتظار میں آفس کے باہر ہی موجود تھا۔ وہ میرے ساتھ بیٹھ گیا اور ہم ٹیکسی کو گرینڈ ہوٹل لے گئے۔ راستے میں ہم نے ایسی کوئی بات نہیں کی جس کا تعلق براہِ راست دلاور کے معاملے سے ہوتا۔ جب غالب کرائے کی کار لے کر آیا تو میں نے ڈرائیونگ سنبھالی۔

"اُف... رات تو بال بال بچے" میں نے سکون کا سانس لے کر کہا۔

"سوال یہ ہے کہ اب کیا ہوگا؟" غالب نے کہا "ہمارا نہیں' دلاور کا۔"

"کچھ نہیں۔ بس ہم دلاور کو پولیس کے حوالے کریں گے۔ اصل حُلیے میں۔ اس حالت میں کہ نہ وہ فرار ہوسکے' نہ کوئی فرار کراسکے۔ وہ پکڑا جائے..."

"تاکہ پولیس پھر اسے چھوڑ دے بعد میں۔"

"پکی گرفتاری کے لیے اسٹیج سیٹ کرنا تمہارا کام ہے یا رابعہ کا۔ بعد میں جو ہوگا وہ مجھے معلوم ہے۔ ایک بار اس کو ہتھکڑیاں لگواکے حوالات میں پہنچانا اور اس تقریب کی اخبارات میں رپورٹ شائع کرانا اصل کام ہے۔ وہ ایس پی ظفر حیات ایک بار تو دلاور کے بدلے ہوئے حُلیے سے فائدہ اُٹھا گیا' اس بار کیا کرے گا؟"

غالب نے سوچ کے کہا۔ "اس کا تو باپ بھی دلاور کو گرفتار کرے گا' سب کے سامنے۔ ہم ایک نہیں چلنے دیں گے اس کی۔

آئندہ صبح کے وقت یہاں کسی کو بھی نظر نہ آؤں۔ آج کا معاملہ مختلف تھا۔ پولیس روز تو نگرانی نہیں کرے گی۔

سفید رنگ کی ایک شیورلٹ گیارہ بجے کے بعد نمودار ہوئی تو میں نے ونڈ اسکرین کے پیچھے غالب کا چہرہ دیکھ لیا اور فوراً نیچے اتر آیا۔ گاڑی گیٹ کے سامنے رُکی ہی تھی کہ میں پچھلا دروازہ کھول کے اندر بیٹھ گیا۔ شاید کسی بھی دور سے دیکھنے والے کو کچھ نظر ہی نہیں آیا ہوگا۔ چند سیکنڈ بعد میں اور غالب ایک ساتھ گاڑی سے باہر آئے اور کچھ دیر گیٹ کے سامنے رُک کے اوپر چلے گئے۔ گاڑی وہیں کھڑی رہی۔ نگرانی کرنے والوں نے تو یہی دیکھا ہوگا کہ گیارہ بجے ایک سفید لمبی سی کار آئی تھی جس میں ایک تو وہی جرنلسٹ تھا۔ وہ گاڑی چلاکے لایا تھا۔ اس کے ساتھ فرنچ وکیل آیا تھا۔ وہ پچھلی سیٹ پر تھا۔ دونوں اُتر کے اوپر چلے گئے تھے۔

"تم نے میری مشکل آسان کردی" میں نے کہا "اب تم جاؤ۔"

"تم ساتھ نہیں چلوگے؟"

"نہیں۔ میں چند منٹ بعد نکلوں گا۔ پولیس والوں نے دیکھ لیا ہے کہ میں تمہارے ساتھ آیا تھا۔ مجھے یہاں چھوڑ کے تم اکیلے واپس چلے گئے۔ اب مجھے کوئی خطرہ نہیں۔ میں ٹیکسی لے کر کہیں بھی جاسکتا ہوں۔ بہتر ہے کہ تم اخبار کے دفتر جاؤ۔ میں بھی وہیں آتا ہوں۔ کسی نے تمہارا پیچھا کیا تو مایوس ہوکے لوٹ جائے گا۔ ممکن ہو تو یہ کار بھی واپس کردینا اور دوسری لے لینا۔ یا ہم منظر کے گھر جاتے ہوئے پکڑلیں گے۔"

غالب میرے ساتھ اوپر تک گیا اور پانچ منٹ بعد اکیلا اُتر کے گاڑی میں بیٹھ گیا۔ میں نے اسے اوپر گیلری سے ہاتھ ہلاکے خدا حافظ کہا اور دونوں جانب نگرانی کرنے والوں پر بھی نظر رکھی۔ حسبِ توقع وہ بڑے غور سے غالب کو دیکھ رہے تھے لیکن کسی نے بھی کار کا پیچھا کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ شاید وہ صرف رپورٹ دینے پر مامور تھے اور اپنی جگہ چھوڑ کے کہیں جانا ان کے اختیار کی بات نہیں تھی۔

پانچ منٹ بعد میں بڑے اطمینان سے ایک ہاتھ پتلون کی جیب میں ڈالے اُترا اور اِدھراُدھر دیکھتا ہوا مال روڈ تک گیا...... اُن خالی گاگر جیسے دودھ کے مٹکوں کا پیتل دھوپ میں چمک رہا تھا۔ نہ جانے ریڑھے کا اصل مالک کون تھا اور کہاں تھا۔ شاید وہ کسی حوالات میں بند اپنی قسمت کو رورہا تھا۔ ریڑھے پر قابض سادہ کپڑوں میں پولیس والوں کی نظر مجھ پر تھی لیکن میں نے انہیں کوئی اہمیت نہیں دی۔ ان سے چند قدم کے فاصلے پر رُک کے میں آتی جاتی گاڑیوں میں خالی ٹیکسی کو تلاش کرتا رہا مگر یہ وقت ہی ایسا تھا کہ سب گاڑیاں بھری ہوئی تھیں۔ مجھے اندازہ تھا کہ اگر میں سڑک عبور کرکے ہائی کورٹ کی طرف چلا جاؤں تو مجھے ٹیکسی مل جائے گی۔ وہاں وکیل بھی آتے تھے اور مؤکل بھی۔ گواہ بھی اور پولیس والے بھی۔ لیکن انجان آدمی کی طرح میں نے قریب سے گزرنے والے

میں رابعہ سے کہوں گا کہ سارے مدعی موجود ہوں۔ ہر اخبار کے رپورٹر اور پریس فوٹو گرافر کو حاضر کرنا میرا کام۔"

میں نے گاڑی منظر کی کوٹھی کے باہر ہی روک دی۔ غالب کے ساتھ میں گیٹ سے اندر داخل ہوا تو میری نظر نے نازو کو دیکھا۔ وہ گیراج کے سامنے آرام کرسی پر نیم دراز اخبار کا مطالعہ کر رہی تھی مگر صاف ظاہر تھا کہ وہ گیراج کے دروازے پر چوکیدار بنی بیٹھی ہے۔ دلاور کا وہاں سے نکلنا بعید از امکان تھا مگر نازو کوئی چانس لینے کے موڈ میں نہیں تھی۔ ناممکن کو ممکن بنا کے دلاور نکل جاتا تو نازو سے بچ کے کہاں جاتا۔ اس نے تو گود میں ریوالور بھی رکھ لیا تھا حالانکہ اپنے خالی ہاتھوں سے وہ دلاور جیسے چار کو چت کر سکتی تھی۔

غالب نے کہا "سب ٹھیک ہے نا حوالات میں؟"

نازو کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا "یس باس۔ مہمان بالکل خیریت سے ہے۔"

"آج مجھے باس کہہ کے تم نے دل خوش کردیا۔ تمہارا چہرہ بھی سُرخ گلاب کی طرح نظر آرہا ہے۔ جی چاہتا ہے تمہارا گُل قند بنا کے کھالوں۔" غالب نے کہا۔ "رابعہ کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

"وہ تو منظر کے ساتھ کورٹ چلی گئیں۔"

مجھے کچھ مایوسی ہوئی "کورٹ چلی گئی۔"

"ہاں۔ سب کچھ معمول کے مطابق نظر آنا چاہیے" غالب نے کہا "کورٹ سے وہ آفس جائے گی اور ہماری اس سے ملاقات رات کو ہوگی۔ اگر ضروری ہوا ورنہ آفس سے وہ منظر کے ساتھ ہی لوٹ کر آئے گی۔ نگرانی کرنے والوں کا مطمئن ہونا بے حد ضروری ہے۔ دلاور سے ہم دونوں نمٹ لیں گے۔ شام کو میں اور نازو پھر اخبار کے دفتر میں ہوں گے۔ دن میں تم بھی اپنا کام کرو یعنی جس کیس کی تفتیش کے لیے آئے ہو اسی میں مصروف رہو۔ دل چاہے تو ایس پی ظفر حیات کا سر کھاؤ یا پولیس سرجن سے ملو اور پوچھو کہ ڈاکٹر شیلی کی پوسٹ مارٹم رپورٹ دکھائے۔ جائے واردات کا معائنہ فرماؤ اور ان ڈاکٹروں، نرسوں سے بات کرو جو قتل کے وقت موجود تھے۔ تمہارے پاس وقت گزاری کے لئے مصروفیت بہت ہے۔"

غالب مجھے منظر کی بیوی سے بچائے پچھلی طرف سے گیراج بھی لے گیا۔ سامنے سے گیراج مقفل تھا۔ پیچھے سے اس کا راستہ اسٹور روم سے ہو کے جاتا تھا۔ وہاں اندھیرا تھا اور کاٹھ کباڑ کے ڈھیر میں میرا پاؤں نہ جانے کس کس چیز پر پڑا۔ ان چیزوں میں ایک بچہ بھی تھا جو وہاں اپنے مطلب کی کوئی چیز تلاش کر رہا تھا یا چھپا رہا تھا۔ اس نے ایک دلخراش چیخ ماری۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ منظر کا دسواں لختِ جگر تھا یا شاید نواں۔

دلاور کی حالت دیکھ کے میں حیران رہ گیا۔ ایک رات کی اسیری نے اسے بے حال کردیا تھا۔ وہ بیمار اور پژمردہ نظر آرہا تھا اور اس کی بے خواب آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے تھے۔ اس کی شیو خاصی بڑھ گئی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ کمر کے پیچھے بندھے ہوئے تھے اور وہی رسّی اس کے ٹخنوں سے ذرا اوپر ہی دونوں پیروں پر کر کے لپیٹ دی گئی تھی۔ یہ نائلون کی رسّی تھی جسے تارزن بھی زور لگا کے نہیں توڑ سکتا تھا۔ رسّی کا آخری حصہ گیراج کی دیوار سے لگی ہوئی ٹونٹی سے باندھ دیا گیا تھا۔ اس طرح کہ دلاور کے لیے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا عملاً ناممکن تھا۔ وہ پاؤں پھیلا کے آرام سے بیٹھ سکتا تھا مگر دیوار کا سہارا نہیں لے سکتا تھا۔ پیچھے سے ٹونٹی اس کی کمر میں گڑ رہی تھی۔ یہ ٹونٹی گیراج میں کار کو دھونے کے لیے لگی گئی تھی اور کچھ خراب تھی چنانچہ پانی قطرہ قطرہ بہہ رہا تھا اور دلاور کے کپڑوں میں جذب ہوتا جا رہا تھا۔ وہ گیلے فرش سے دور جا نہیں سکتا تھا۔

میں نے دروازے کی اوٹ سے ہی دلاور کو دیکھا اور لوٹ آیا۔ فی الحال میں اس کے سامنے جا کے اپنی شناخت کا راز افشا کرنا نہیں چاہتا تھا حالانکہ دلاور کو اس حال میں دیکھ کے میرے دل میں زبردست خواہش پیدا ہوئی تھی کہ میں پُرانے حساب کو تھوڑا بہت بے باق کردوں۔

"تم نے کیا سوچا ہے آخر۔ پولیس اسے کہاں سے گرفتار کرے گی؟" میں نے باہر آ کے پوچھا۔

"یہ ہم سب مل کے طے کریں گے۔ جلدی کیا ہے؟"

میں نے کہا "منظر اسے کتنے دن رکھ سکتا ہے یہاں؟"

"وہ تو کہتا ہے کہ اسے ساری عمر یہاں قید رکھو یا مار کے یہیں گاڑ دو۔ اسے کوئی اعتراض نہیں" غالب نے کہا "نازو یہاں اس کی حفاظت کے لیے موجود ہے اور ضرورت پڑنے پر تفتیش بھی کر سکتی ہے۔"

"تفتیش بے کار ہے۔ تم جانتے ہو دلاور کو۔ وہ کچھ نہیں بتائے گا اور ہم جان کے کیا کریں گے۔ سب کچھ ہمیں پہلے ہی معلوم ہے۔ یہ دیکھ لو کہیں اس کے شکاری کتے یہاں نہ پہنچ جائیں۔ وہ سارے شہر میں اس کی بو سونگھتے پھر رہے ہوں گے۔ خود ایس پی ظفر حیات کی حالت زخمی سانپ سے کم خطرناک نہیں ہوگی۔ اس کی افسری کے منہ پر زبردست طمانچہ پڑا ہے۔ مجھے اس کا اندازہ ڈی ایس پی شاہد علی کی حالت سے ہوگیا تھا۔"

غالب نے کہا "یہ ٹھیک ہے کہ دلاور کے اغوا سے کھلبلی مچ گئی ہوگی۔ اس کے حکم کے غلام الگ بوکھلائے پھر رہے ہوں گے اور اس کے ٹکڑوں پر پلنے والے سرکاری اہلکار الگ پریشان ہوں گے مگر وہ اتنی جلدی یہاں دھاوا نہیں بول سکتے۔ گزشتہ رات تصدیق ہوگئی تھی کہ رابعہ اور منظر جائے واردات سے بہت دور اپنے کمروں میں سو رہے تھے بلکہ منظر نے تو رابعہ کی بیماری کی تصدیق کردی تھی۔ میں اور نازو رات کو وہاں نہیں ٹھہرے تھے۔ صبح دونوں صاحب اور وکیل صاحبہ اپنی اپنی گاڑیوں میں کورٹ گئے۔ ہر روز کی طرح۔ دن میں وہ معمول کے مطابق مقدمات کی پیروی کریں گے۔ شام کو آفس جائیں گے اور رات کو پھر گھر۔ ان پر کسی کا

"شاہد علی، تم اسی لیے ترقی نہیں کرسکے کہ عقل نام کی کوئی چیز تمہارے سر میں نہیں تھی" ظفر حیات نے خفگی سے کہا "بابا یہ کوئی عام آدمی ہے؟ کسی کی ضمانت نہیں ہوگی اگر اسے کچھ ہوا۔ برطانوی حکومت جان نہیں چھوڑے گی۔ اسکاٹ لینڈ یارڈ سے آجائیں گے سراغ رساں۔"

شاہد علی نے مجھے گھور کے کہا "اس وقت ہم میٹنگ میں ہیں۔ میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے دانتوں کی نمائش کی "یس۔ آئی میٹ یو۔"

ظفر حیات نے سر پر ہاتھ مارا "اب اس پاگل کے بچے کو سمجھاؤ کہ ہم اس سے میٹنگ کرنا نہیں چاہتے، یہ میٹنگ کا مطلب ملاقات لے رہا ہے۔"

شاہد علی نے پھر کوشش کی "آفیشل میٹنگ۔"

میں نے سوچ کے سرہلایا "یس۔ خادم حسین کم۔۔۔ کم ہیئر۔"

شاہد علی نے مجھے گالی دی "یو گو ناؤ۔"

میں نے نفی میں سرہلایا "آئی کم۔ شیلی کیس۔"

شاہد علی واضح کرنا چاہتا تھا کہ مجھے سرکاری میٹنگ سے چلا جانا چاہیے۔ میں نے یہ ظاہر کیا کہ میں شیلی مرڈر کیس کے لیے آیا ہوں اور تفتیش مکمل ہونے سے پہلے نہیں جا سکتا۔

"چھوڑو اسے۔ بیٹھا رہے یہاں" ظفر حیات بولا "وہ مولوی آجائے پھر اسے سمجھادیں گے کہ آئندہ بلا اجازت نہ آئے۔ مجھے فکر ہے اپنی رپورٹ کی۔ ابھی تک میری پروگریس صفر ہے بلکہ کیس میری موجودگی میں زیادہ خراب ہوگیا ہے۔ کل کے واقعے کی پوری رپورٹ اخبار میں آجائے گی۔"

"وہ رپورٹ تو آگئی ہے سر۔"

"یار شاہد علی۔ پتا نہیں کیوں مجھے تم جیسے احمق دیے گئے ہیں۔ وہاں نور جہاں کے مزار پر جو کچھ ہوا اس سے میرا کیا تعلق۔ اور اس کیس کو میں سنبھال سکتا ہوں مگر رات تھانے میں جو کچھ ہوا۔۔۔"

"آپ کا اس سے بھی کوئی تعلق نہیں سر۔"

ایس پی نے نفی میں سرہلایا "اتنی زبردست پلاننگ کرنے والے معمولی لوگ نہیں تھے۔ مجھے یقین ہے کہ انہوں نے تصویریں بھی اُتاری ہوں گی۔"

"تصویر اُتارتے تو پتا چل جاتا۔۔۔"

"یہی تو تم سمجھ نہیں رہے ہو۔ تصویر اندھیرے میں خاموشی سے بھی اُتاری جاسکتی ہے۔ یہاں ہم سب کے ساتھ دلاور بھی تھا اور وہ میک اپ میں نہیں تھا۔ جب ہم نے اسے صحافیوں کے سامنے پیش کیا تھا تو اس کا حُلیہ بدلا ہوا تھا اور اسی لیے ہم نے صاف انکار کردیا تھا کہ وہ دلاور نہیں ہے۔ جعلی نوٹ چھاپنے والوں کا ساتھی ہے۔"

"اس حرامی نے تو فنگر پرنٹ لے لیے تھے۔ آپ کا گراف

ہوگی تو وہ یہی رپورٹ دے گا کہ اس واردات میں رابعہ بہرحال شریک نہیں تھی۔"

"نازو کو باہر بیٹھنے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہیے۔ اگر وہ سارا دن باہر اسی طرح موجود رہی تو کیا پتا کسی کو شک ہو جائے؟"

"یہ بات اسے سمجھائی جاسکتی ہے" غالب نے کہا۔

"دلاور کو تلاش کرنے والے ہر جگہ دیکھیں گے اور انہیں جہاں کوئی بات خلاف معمول لگی، وہیں پہنچ جائیں گے۔ میرا تو خیال ہے کہ وقار یوسف کا اور منظر کا گھر قطعی محفوظ جگہ نہیں ہے۔ "پھر اسے کہاں لے جائیں۔ ویسے تو ہر جگہ غیر محفوظ ہے۔ ہاں ایک جگہ ہے میری نظر میں۔۔۔" وہ کچھ سوچ کے بولا۔

"کون سی جگہ؟"

"رابعہ کا پُرانا گھر۔۔۔" غالب بولا۔

"وہ کھنڈر۔ آگ لگنے کے بعد وہاں کیا رہا ہوگا؟"

"تہ خانہ محفوظ ہوگا۔ تم نے اچھا وقت گزارا تھا وہاں۔"

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "بہت خوب صورت کوٹھی تھی اور تہ خانہ واقعی بڑی پُرسکون اور محفوظ جگہ تھی۔ رابعہ نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی اسے آرام دہ بنانے میں لیکن اب وہاں کیسے جاسکتے ہیں ہم۔ اس پر ملبے کا ڈھیر ہے۔ نیچے پہنچنے کا راستہ ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گا۔"

"میرا خیال ہے اگر میں چند مزدور لگادوں کھدائی کے لیے۔۔۔ اور ملبہ صاف کرانے کا ٹھیکا دے دوں۔ تو ہو سکتا ہے، وہ راستہ نکال لیں۔ میں اس جگہ کی نشاندہی کر سکتا ہوں جہاں زینہ تھا۔"

"ایسا ہو جائے تو کیا بات ہے۔ وہ جگہ آئندہ بھی ہمارے لیے بہترین پناہ گاہ ثابت ہوگی۔" میں نے کہا "چلو آج یہی کام کرتے ہیں پہلے۔"

"یہ کام میں اکیلا کرلوں گا۔ تم جاؤ ظفر حیات سے مل کے اس کے جذبات کی آتش فشانی دیکھو۔ خادم حسین کو گھر سے ساتھ لے جانا۔" "وہ کہاں رہتا ہے۔ میں تو کبھی اس کے گھر نہیں گیا۔"

"گھر تو پُرانے شہر کی گلیوں میں ہے لیکن فون ہے اس کے پڑوس میں۔ پیغام دے دینا کہ وکیل صاحب نے بلایا ہے۔ تم جہاں کہو گے وہ خود پہنچ جائے گا۔ تم یہ گاڑی اپنے پاس رکھو اور ممکن ہو تو فلیٹیز میں اپنے نام سے کمرا بھی بک کرالو" غالب نے کہا۔

اس کی تجویز معقول تھی۔ میں گاڑی لے کر نکلا تو راستے میں ایک پبلک کال آفس سے خادم حسین کو پیغام دیتا ہوا سیدھا پولیس ہیڈ آفس پہنچ گیا۔ حسبِ توقع وہاں ہنگامی میٹنگ جاری تھی جس میں ڈی ایس پی شاہد علی بھی شریک تھا۔

مجھے دیکھتے ہی ایس پی ظفر حیات کا موڈ بگڑ گیا "یہ مصیبت کیوں آگئی۔ اسے کہو پھر کبھی آئے، ابھی ہم مصروف ہیں۔"

"آپ ہی نے اس گوری چمڑی والے کو سر چڑھا رکھا ہے۔ میں تو ایسا بندوبست کر سکتا ہوں کہ پھر اس کی صورت نظر نہ آئے۔"

بنوانا چاہتا تھا" شاہد علی نے مجھے خونی نظروں سے گھور کے ایک اور گالی دی۔

"چلو وہ معاملہ تو ختم ہوا۔ اب جعلی نوٹوں والا کیس ہماری ذمے داری نہیں ہے۔ خبر جاری کردو کہ وہ بلاک میکر پولیس حوالات سے فرار ہوگیا تھا۔ متعلقہ لوگوں کو معطل کرادو جو اس کی حفاظت پر مامور تھے۔"

"یہ سب کرچکا ہوں میں۔ اصل مسئلہ دلاور کا ہے۔ اسے وہی ایم آر ایس والے لے گئے ہیں۔ میں شرط لگا سکتا ہوں۔"

"شرط مت لگاؤ۔ ثابت کرو۔ وہ سب تو تمہارے سامنے معصوم بنے پھر رہے ہیں۔ سوائے سکندر بخت کے سب کے بارے میں معلوم ہوچکا ہے کہ کون کہاں تھا اور کیا کر رہا تھا۔"

"ان کا سرغنہ تو وہی ہے' سکندر بخت۔ چھلاوہ ہے وہ سر بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ۔ گرگٹ اتنی تیزی سے رنگ نہیں بدلتا جیسے وہ چہرے بدلتا ہے اور ایسے غائب ہوتا ہے سامنے سے۔"

"شاہد علی' اتنے مرعوب ہو تم اس سے جیسے وہ عام آدمی نہیں سپرمین ہے۔ مافوق الفطرت قوتوں کا مالک ہے۔ تم کو احساسِ کمتری ہے پہلے سے تو پھر تم کچھ نہیں کرسکتے۔"

شاہد علی نے اِدھر اُدھر دیکھا "وہ۔۔۔ ایسی بات نہیں سر۔ میں نے بڑے بڑے نوسرباز اور بدمعاش دیکھے ہیں اور۔۔۔"

"زبانی دعووں سے کام نہیں چلے گا۔ یہ پتا چلاؤ کہ دلاور کہاں ہے' اگر انہوں نے دلاور سے کچھ اگلوالیا تو سمجھو' ہم سب گئے کام سے۔"

"دلاور کو آپ کیا سمجھتے ہیں سر۔ وہ فولاد کا بنا ہوا ہے۔ خالص فولاد کا۔ سکندر کا باپ بھی اس سے کچھ معلوم نہیں کرسکتا۔"

سکندر کا باپ تو خیر واقعی کچھ نہیں کرسکتا۔ میں نے اپنے دل میں سوچا لیکن بیٹا یہ کام ضرور کرے گا۔ اس فولاد کو پگھلا کے گندے پانی کی طرح گٹر میں نہ بہایا تو میں بھی وزیر خان کا بیٹا نہیں۔

"آدمی تو آدمی ہی ہوتا ہے شاہد علی۔ اور وہ کوئی جوان آدمی بھی نہیں ہے۔ آج کل تو تشدّد کے حربے بھی بہت عام اور مؤثر ہوگئے ہیں۔ میری اور تمہاری نوکری اور زندگی دونوں کی سلامتی چاہتے ہو تو دلاور کا سراغ لگاؤ۔"

"سرجی' پھر آپ مجھے آزادی سے کام کرنے دیں۔ ولایتی طریقوں سے دیسی مجرم کچھ نہیں بتاتا۔ میں ابھی پکڑتا ہوں دو چار بندے اور آپ کے سامنے وہ سب نہ بک دیں تو میرا نام شاہد علی نہیں۔ ہم تو بندے کو گنے کی طرح مشین میں سے گزار سکتے ہیں۔ جیسے گنے کا رس نکلتا ہے سر ایسے ہی اس کے دل کی بات زبان سے نکلتی ہے۔"

"کس کو پکڑنا چاہتے ہو تم؟"

"وہی جو خاص بندے ہیں' ایم آر ایس کے پیچھے۔"

"یار یہ ایم آر ایس کیا بلا ہے۔ بلاوجہ اتنا ہوّا کھڑا کردیا ہے تم لوگوں نے۔ مجھے تو اس کا مطلب بھی معلوم نہیں۔"

شاہد علی کو اب اپنے افسرِ اعلیٰ کی لاعلمی اور جہالت پر طنزیہ مسکرانے کا موقع مل گیا "ایم آر ایس کا مطلب ہے مائٹ از رائٹ سوسائٹی۔"

"مائٹ از رائٹ۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس؟"

"جی سر۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ زمانہ خراب ہے۔ قانون کوئی چیز نہیں' نہ قانون کسی کا محافظ ہے' نہ مددگار۔ بس جس کے پاس طاقت ہے اس کا ہر کام ہوجاتا ہے اور وہ مجرم کو مجرم یا بے گناہ کو بے گناہ ثابت کرسکتا ہے ورنہ تھانے کچہری میں انصاف نہیں ملتا۔"

"نظریات تو کسی حد تک ٹھیک ہے۔ یہ وہی لوگ ہیں نا جو گئے تھے مشرقی پاکستان میں بھارتی فوج سے لڑنے؟"

"نہیں سر۔ ان کی لڑائی تو بس دلاور سے تھی جو یہاں سے باغیوں اور علیحدگی پسندوں کو اسلحہ فراہم کرتا تھا۔ ان میں سکندر کی دلاور سے خاندانی دشمنی ہے۔ کچھ وراثت کا جھگڑا ہے۔ سکندر سمجھتا ہے کہ اس کے باپ کو دلاور نے مروادیا تھا۔ اس کا ایک دوست تھا محسن شیرازی۔ کسی ڈپٹی سیکریٹری کا بیٹا تھا۔ پھر یہ رابعہ جو سکندر کی یار ہے۔"

"تم اس مشہور وکیل کی بات کر رہے ہو؟"

"ہاں جی۔ مشہور کیا۔۔۔ اس نے سکندر کی خاطر پہلے خصم کو چھوڑ دیا تھا حالانکہ وہ آج کل سیکریٹری ہے سر۔"

"سیکریٹری۔ کس محکمے کا؟" ایس پی چونکا "یہ اچھا پوائنٹ ہے۔ ہم اسے رابعہ کے خلاف استعمال کرسکتے ہیں۔"

"محکمے کا پتا بھی چل جائے گا سر۔ لیکن۔۔۔"

"لیکن کیا۔۔۔؟"

"اس کا نام مجھے معلوم نہیں" شاہد علی خفت سے بولا۔

"کوئی بات نہیں" ظفر حیات نے طنز کیا "ہم ہر محکمے کے ہر سیکریٹری سے پوچھ لیں گے۔ بلکہ تم فون اُٹھا کے یہ کام شروع کردو۔ کوئی نہ کوئی ضرور مان جائے گا کہ وہ رابعہ کا خصم ہے اور اس کا یار تھا سکندر۔"

"میں پتا کرلوں گا سر" شاہد علی کو پسینہ آگیا۔ "میں آپ کو کچھ اور بتانے والا تھا۔ محسن' رابعہ اور سکندر۔ ان کے نام سے ایم آر ایس بنی تھی۔ بعد میں دوسرے لوگ بھی شامل ہوگئے۔ سارے آپس میں دوست تھے اور جذباتی نوجوان تھے۔ بمع مرزا غالب صحافی' اس کی یار نازو۔ بڑی ماہر ہے جوڈو کراٹے کی۔ ایک لڑکی گل تھی جس کے بارے میں معلوم ہوا تھا کہ ناگ منی ہے۔"

"ناگ منی! کون ناگ منی؟"

"ڈاکو شیش ناگ کی بہن۔ بڑا نامی گرامی ڈاکو تھا۔ پولیس مقابلے میں ہلاک ہوا تھا مگر جاتے جاتے وہ بہن کو سکندر کے حوالے کرگیا۔ خود ناگ منی کم نہیں تھی مگر وہ گل بانو بن کے بالکل ڈیل کر رہے ہو اور تمہارے ساتھ وہ انسپکٹر بھی ہے۔ وہ کہاں ہے اس وقت۔"

"وہ موبائل میں گھوم رہا ہے سر" شاہد علی مسکرایا "اس کے پاس ایک خاص ریسیور ہے۔ ہم نے دلاور کو ایک سگنل ٹرانسمیٹر دے دیا تھا جو پولیس کی فریکوئنسی پر کام کرتا ہے۔"

"کس کی اجازت سے۔ تم جانتے ہو یہ کتنا سنگین جرم ہے۔"

"اوپر والوں کا حکم تھا سر۔ اور ٹرانسمیٹر ویسے تو پولیس کا ہے مگر ہمیں بھی حکومت نے فراہم نہیں کیا تھا۔"

"پھر؟"

"ہمارے پاس تو پُرانے وقتوں کے آلات ہیں سر۔ جو گورے ہندوستان چھوڑتے وقت کباڑ سمجھ کے چھوڑ گئے تھے۔"

"پورا نظام وہی ہے۔۔۔ قاعدے قانون تک۔"

"یہ ٹرانسمیٹر دراصل چھوٹا سا یو ایچ ایف مائکروفون ہے۔ دلاور نے خود ہی باہر سے اسمگل کیا تھا۔ ایک ایس ایس پی ہوتے تھے مرحوم ضامن رضوی۔"

"نام سُنا ہے ان کا۔"

"کوئی کچھ بھی کہے جنابِ عالی۔ ماننا پڑتا ہے کہ ویسا افسر نہیں دیکھا۔ ملنگ بندہ تھا جی اور اتنا قابل۔ پہلے ترقی کی پھر تو جی وقت بدل گیا اور اس کا گزارا نہیں ہوا۔ پُرانے لوگ لحاظ کرتے تھے۔ نئے دشمن ہوگئے اس کے۔ اللہ اس کی مغفرت کرے۔ اچھا افسر تھا ماتحتوں کے لیے بھی۔"

مجھے اس وقت ایک دشمن کے منہ سے مرحوم انکل ضامن رضوی کے لیے تعریف کے الفاظ سُن کے دلی سکون اور مسرت حاصل ہوئی۔ گزرے ہوئے وقت کی بہت سی یادوں کے نقش تازہ ہوگئے۔ ہم نہ ہوں گے تو بہت یاد کرے گی دنیا۔ ان کی صورت نے میرے تصور میں سرگوشی کی۔

"ضامن رضوی کا کیا ذکر تھا یہاں؟" ظفر حیات بولا۔

"انہوں نے یہ سگنل دینے والا آلہ ضبط کرلیا تھا۔ پھر ہم نے بھی خاص خاص لوگوں سے یہ آلات منگوائے۔ خاص استعمال کی چیز ہے۔ ہر جگہ استعمال نہیں کرسکتے اور خفیہ رپورٹ تو اس کے بغیر نہیں بنتی۔ مگر سرکاری طور پر کچھ نہیں ہے۔ لکھا یہ جاتا ہے کہ رپورٹ مخبروں نے دی تھی۔ ایسا ہی ایک سگنل دینے والا آلہ چوہدری دلاور کے پاس ہر وقت موجود رہتا ہے۔ اس سے پتا چل جاتا ہے کہ وہ کہاں ہے۔ سگنل مسلسل نشر ہوتا ہے اور طاقتور ریسیور ہو تو سراغ لگایا جاسکتا ہے۔"

"مگر یہ تو اس کی گاڑی میں ہوگا۔"

"ہاں جی۔ ٹرانسمیٹر گاڑی میں ہے۔ مائکروفون تعویذ کی طرح گلے میں پڑا رہتا ہے۔ لگتا ہے چاندی کے کیس میں کوئی نقش ہوگا یا کلام پاک کا خوردبینی نسخہ۔ سونے کی زنجیر ہے۔ مگر اندر وہ آلہ ہے اور زنجیر اس کا ایریل ہے۔ اس کا سگنل گاڑی میں وصول ہوتا ہے بدل گئی۔ ہمارے محکمے کا ایک اے ایس آئی تھا۔ اکرام شیخ' نوکری چھوڑ گیا۔ وہ نازو کا بھائی تھا۔ یہ سارے اکٹھے ہوگئے تھے۔ چوہدری دلاور کو غدار اور ملک دشمن سمجھتے ہیں اور اس کو تباہ کرنا چاہتے ہیں حالانکہ وہ معزز اور امن پسند شہری ہے' محبِ وطن ہے۔"

ظفر حیات عجب طرح سے مسکرایا "یہ بات میرے سامنے تو مت کہو۔ جھوٹ کی بھی حد ہوتی ہے شاہد علی۔"

شاہد علی پھر بغلیں جھانکنے لگا "ویسے تو سر یہاں الزام کس پر نہیں ہے؟ لوگوں نے قائداعظمؒ اور قائدِ ملت کو معاف نہیں کیا تھا۔۔۔"

"دوبارہ میرے سامنے یہ موازنہ مت کرنا شاہد علی۔ میں بہت بُرا آدمی ہوں مگر پاکستانی ہوں اور نہ اس ملک کے خلاف کچھ سُن سکتا ہوں' نہ قائداعظمؒ کے خلاف۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ دلاور کیا ہے لیکن میں تمہاری زبان سے سُننا چاہتا تھا۔ افسوس کہ یہ میرے دائرۂ اختیار میں نہیں۔ میں صرف ڈاکٹر شبلی مرڈر کیس کی تفتیش کے لیے آیا ہوں ورنہ۔۔۔" اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

شاہد علی کا رنگ فق ہوگیا "آئی ایم سوری سر۔"

"دلاور کی بازیابی کے لیے کیا کر رہے ہو تم؟"

"ہر جگہ نگرانی ہورہی ہے۔ جہاں بھی یہ ایم آر ایس والے آتے جاتے ہیں' ہمارے بندے وہاں موجود ہیں۔ ابھی تک رپورٹ وہی ہے۔"

"کہ کوئی رپورٹ نہیں۔ تمہارے یہ بندے کون ہیں۔ تم جیسے ہیں تو پھر رپورٹ خاک دیں گے۔ ان کو نظر آتا ہے؟ سُنائی دیتا ہے ٹھیک سے اور وہ بیٹھے بیٹھے سو تو نہیں جاتے؟"

"نہیں سر۔ بڑے خاص بندے لگائے ہیں۔ ابھی تک رابعہ کے آفس اور وقار یوسف کے گھر کی نگرانی ہورہی تھی۔ دونوں جگہ خفیہ مائکروفون لگادیے تھے۔ جو بات ہوگی صاف سُنی جائے گی۔ اب تیسری جگہ بھی ایک پارٹی روانہ کی ہے۔ جو منظر وکیل کی کوٹھی کا فون ٹیپ کرے گی۔ اندر جاکے مائکروفون لگانا تو مشکل تھا' رابعہ اور منظر کی گاڑی کے نیچے مائکروفون لگائے ہیں۔ مقناطیسی مائکروفون ہیں۔ گر نہیں سکتے اور نظر بھی نہیں آسکتے۔"

میرا دل ڈوبنے لگا۔ یہ بات نہ رابعہ کے علم میں تھی اور نہ منظر کے۔ اچھی بات یہ ہوئی تھی کہ وہ ایک ہی گاڑی میں نہیں گئے تھے ورنہ آپس میں ضرور باتیں کرتے اور باتوں باتوں میں بھانڈا پھوٹ جاتا۔ خود وقار یوسف کو معلوم نہیں تھا کہ اس کے گھر کی باتیں کوئی باہر سُن رہا ہے۔ ان سب کو یہ بتانا ضروری تھا مگر سوال یہ تھا کہ کیسے بتایا جائے۔

"دلاور کے گھر والوں کی حفاظت کے لیے کیا کیا ہے تم نے؟"

"یہ میرا کام تو نہیں تھا سر۔ خود دلاور نے بندوبست کرلیا اور انہیں غائب کردیا۔ ان پر کوئی ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔"

"تمہاری اپنی عقل کیا کہتی ہے۔ تم شروع سے اس کیس کو

اور اس کے ٹرانسیٹر سے نشر ہوتا ہے تو گھر کے فون پر بھی سنا جا سکتا ہے۔ لیکن اس وقت گاڑی نہیں ہے اس کے پاس۔ تعویذ جیسے آلے کا سگنل اتنا کمزور ہوتا ہے کہ مشکل سے سو گز تک جاتا ہے۔ انسپکٹر کے پاس ریسیور بہت طاقتور ہے۔ اس نے پکڑ لیا تو معلوم ہو جائے گا کہ دلاور سو گز کے اندر کہیں موجود ہے۔"

ظفر حیات متفکر ہو گیا "آئیڈیا یقیناً اچھا ہے مگر بہت سے عوامل ہیں جو انسپکٹر کی تلاش کو ناکام بنا سکتے ہیں۔ فرض کرو اغوا کرنے والوں نے اسے تعویذ نہ سمجھا۔ یا تعویذ کو کھول کے دیکھا۔ اس کے گلے سے اُتار لیا۔"

"ویسے تو تعویذ گنڈے پر یقین نہ رکھنے والے بھی تعویذ کو نہیں چھیڑتے۔ گلے میں چھوڑ دیتے ہیں لیکن خطرہ ضرور ہے کیونکہ یہ تعویذ زیادہ بڑا نظر آتا ہے۔"

"اس کی بیٹری کتنی پاورفل ہے؟"

"بیٹری کا مجھے پتا نہیں سر۔"

"کمزور ہو گی تو سگنل بھی کمزور ہو گا۔ سو گز کے بجائے پچاس گز جائے گا۔ اس کو کسی کوٹھی میں رکھا گیا جو کنال دو کنال کی ہو یا تہ خانے میں۔ تو سڑک پر سے گزرتے ہوئے تمہارے انسپکٹر صاحب کو کچھ بھی سُنائی نہیں دے گا۔ خواہ ریسیور اچھے سے اچھا ہو۔"

"یہ چانس تو ہے سر' لیکن کوشش کرنا ضروری ہے۔"

ان کی گفتگو نے مجھے خاصا نروس کر دیا تھا۔ میں تصور کر سکتا تھا کہ سڑک سے وہ جگہ کتنی دور ہے جہاں دلاور اس وقت موجود تھا۔ میرے اندازے کے مطابق سڑک سے گیٹ اور پھر گیراج تک کا فاصلہ کسی طرح بھی پچاس گز سے زیادہ نہیں تھا۔ دلاور کے گلے میں تعویذ کس نے دیکھا ہو گا۔ تلاشی میں اسلحہ وغیرہ تو نہیں چھوڑا جاتا مگر چاندی کی نقشین ڈبیا پر کسی کا شک نہیں جاتا کہ اس میں چُھپا ہوا کوئی آلہ سگنل نشر کر رہا ہو گا۔ وہ بدستور دلاور کے گلے میں لٹکا ہوا ہو گا۔ منظر کا گھر بھی سب کی نظر میں ایک مشکوک جگہ تھی۔ انسپکٹر وہاں ضرور چیک کرے گا۔ کیا پتا اب تک اسے کوٹھی میں دلاور کی موجودگی کا سراغ مل گیا ہو۔ وہ چھاپا مار چکا ہو یا اس کے لیے قانونی مرحلے پورے کر چکا ہو۔ وہ کسی دشواری کے بغیر دلاور کو برآمد کر لیں گے اور نازو اسے حبسِ بے جا میں رکھنے کے الزام میں گرفتار ہو جائے گی۔ منظر بھی چکر میں آ جائے گا۔

میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں یہ معلومات کیسے آگے پہنچاؤں۔ میرے لیے پُرسکون رہنا بھی مشکل ثابت ہو رہا تھا۔ ان کی گفتگو ابھی جاری تھی مگر میں وہاں سے اُٹھنے کی سوچ رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ غالب نے اتنی جلدی دلاور کو منظر کے گھر سے شفٹ نہیں کیا ہو گا۔ میں رابعہ کو خبردار کر سکتا تھا کہ وہ دلاور کے لاکٹ جیسے تعویذ کو گلے سے اُتار کے توڑ دے۔

اچانک خادم کے چلّانے کی آواز آئی "حد کرتے ہو تم لوگ بھی۔ اندر وکیل صاحب فرنچ بول رہے ہوں گے اور ا[illegible] صاحب انگریزی۔"

ایس پی نے گھنٹی بجائی "اندر آنے دو مولوی کو۔"

خادم حسین اندر آیا تو خاصا خفا تھا۔ "مجھے کوئی اسپیشل پاس بنوا دیں سر ورنہ یہ بک بک ہو گی روز۔"

"تمہاری بک بک تو ہم ایک منٹ میں بند کر سکتے ہیں اسپیشل پاس کے بچے" شاہد علی نے کہا "کتا بھونکنے سے باز نہ آئے تو زبان کاٹ دینی چاہیے۔"

خادم نے مجھ سے فرنچ میں کہا "یہ لوگ مجھے دھمکی دے رہے ہیں کہ میری زبان کاٹ سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "ان سے کہو کہ تم صرف زبان ہی نہیں ناک کان اور سب کچھ کاٹ سکتے ہو۔"

مولوی نے جواب میں کہا "وکیل صاحب فرماتے ہیں کہ مولوی خادم حسین کو لاوارث نہ سمجھا جائے۔ یہ بات اعلیٰ افسران کے گوش گزار کی جائے گی۔ تحریری طور پر۔"

میں نے اتنی دیر میں بہت کچھ لکھ لیا تھا "خادم حسین۔ باہر جا کے کہیں سے فون پر یہ باتیں سب کو بتا دو۔ میں نے نام اور نمبر لکھ دیے ہیں۔ یہ کام فوراً کرو اور فوراً مجھے واپس آ کے بتاؤ۔"

میں نے اسے جیب میں سے دس کا نوٹ نکال کے دیا۔ "جب واپس آؤ تو کوئی دوا لیتے آنا۔ کھانسی کا شربت ہی لے آنا۔"

مولوی سمجھ گیا "میں ابھی دوائی لے کر حاضر ہوتا ہوں۔"

ایس پی نے کہا "تم بیمار ہو تو یہاں کیوں بیٹھے ہو۔"

خادم رُک گیا۔ اس نے مجھ سے کہا "آپ کچھ بیمار تو نظر آئیں۔ میں کیا جواب دوں انہیں آخر؟"

"ان سے کہو کہ وکیل صاحب خدانخواستہ نزع کے عالم میں نہیں بس معمولی گلے کی خرابی ہے۔"

خادم حسین کے جانے کے بعد بھی میرا اضطراب کم نہیں ہوا۔ ڈی ایس پی شاہد علی کے پاس کاغذات کا ایک نیا پلندا لایا گیا۔ یہ نگرانی کرنے والوں کی تازہ ترین رپورٹیں تھیں جو اس نے ایس پی کی طرف بڑھا دیں۔

"کچھ نہیں شاہد علی۔ سب نکمّے لوگ ہیں۔"

"آپ فکر مت کریں سر۔ شام تک اُمید ہے۔"

"رات کو تم کہہ رہے تھے کہ صبح تک اُمید ہے۔ ادھر مجھے اپنے کیس کی پریشانی ہے۔ یہ جو تمہارا باپ سامنے آ کے بیٹھ گیا ہے' یہ مجھے آسانی سے چھوڑنے والا نہیں ہے۔ ابھی تک تو اس کی قبر کا بھی پتا نہیں۔ میں اس کا نام نہیں لینا چاہتا۔ گورکن مددگار ثابت ہو سکتا تھا۔"

"کیا کریں جی۔ بڈھا آدمی تھا' بھول گیا۔"

"اور تم نے فرض کر لیا کہ وہ بتانا نہیں چاہتا۔ معلوم کرنے کی کوشش میں اسے ہی ختم کر دیا۔ اب کیا اس کی روح سے معلوم

کرو گے؟ یہ تو دیکھنا تھا کہ بڈھے کی قوتِ برداشت کتنی ہے" ظفر حیات نے برہمی سے کہا۔

"زیادہ سختی نہیں کی تھی سر۔ وہ بھی مجبوری تھی۔ بڈھا بکا ہوا تھا۔"

"بکا ہوا تھا۔ کیا مطلب۔؟"

ڈی ایس پی شاہد علی نے عیّاری سے کہا "اسے خاموش رہنے کی قیمت دی جا چکی تھی۔"

"کس نے دی تھی قیمت؟"

"انہی لوگوں نے سر۔ جو یہ کہتے پھرتے ہیں کہ ڈاکٹر شیلی کو قتل کیا گیا تھا حالانکہ حادثہ ساری دنیا کے سامنے پیش آیا تھا۔"

ظفر حیات کا غصہ اور بڑھ گیا "شاہد علی' قتل کیا گیا تھا یا نہیں' یہی معلوم کرنے کے لیے مجھے بھیجا گیا ہے مگر مصیبت یہ ہے کہ تم میری مشکلات میں اضافہ کر رہے ہو۔ ایک طرف مدعی ہیں سینئر وکیل۔ بال کی کھال نکالنے والے پرانے پاپی۔ ان کا ساتھ دینے والے ہیں چوہدری دلاور کے پُرانے دشمن۔ ان کو حمایت حاصل ہے برٹش کونسلیٹ کی اور مجھ پر دباؤ ہے حکومت کا۔ میں کیسے بچا سکتا ہوں دلاور کو جب تم خود استغاثہ کے کیس کو مضبوط بنانے پر آمادہ ہو۔ اس بڈھے گورکن کا قتل کوئی معمولی غلطی نہیں ہے۔ وہ ہمارے حق میں گواہی دے سکتا تھا۔ ہمیں پتا بتا سکتا تھا شیلی کی قبر کا۔ اب تمہارے اور دلاور کے دشمن اس قتل کو بھی دلاور کے کھاتے میں ڈالیں گے' یہ ثابت کریں گے کہ دلاور کے کہنے پر پولیس نے اسے اُٹھایا۔ اس سے شیلی کی قبر کا پتا پوچھا تاکہ وہاں سے لاش غائب کی جا سکے اور اس نے انکار کیا تو تشدّد سے اسے مار ڈالا۔ کیا کہو گے تم جواب میں؟ بولو" اس نے میز پر مُکّا مارا۔

"چلّائیں نہیں سر۔" شاہد علی کے چہرے پر ایک زہریلی مسکراہٹ نمودار ہوئی "کون الزام لگا سکتا ہے پولیس پر قتل کا؟"

"کیوں؟ وہ گورکن کیا طبعی موت مرا تھا؟"

"یہ آپ سے کس نے کہا کہ وہ مر گیا ہے اور اس کی موت پولیس تشدّد سے ہوئی تھی" شاہد علی مسکراتا رہا۔

"کیا مطلب۔؟"

"مطلب یہ سر کہ ہم تو اسے رات کے وقت اُٹھا لائے تھے اور صبح واپس چھوڑ آئے تھے۔ آپ کو یہ بات میں نے اس لیے بتا دی کہ آپ سے کیا پردہ۔ لیکن اور کسی کو کچھ بھی نہیں معلوم۔ نہ بڈھے کا بیٹا آیا تھا فریاد لے کر' نہ اس نے کسی کے خلاف رپورٹ لکھوائی اور نہ کوئی بیان دیا۔ گاڑ دیا ہو گا باپ کو خود ہی اور قبرستان کا مالک خود بن گیا ہو گا۔"

ظفر حیات نے اطمینان کا سانس لیا اور سگریٹ جلانے لگا۔

"اس کے لڑکے کو کچھ معلوم ہے؟"

"نہیں سر۔ ابھی تک تو اس نے بیان نہیں بدلا مگر میرا خیال ہے وہ جھوٹ بولتا ہے۔ گورکن بڈھا آدمی تھا۔ ستّر سال کا ضرور ہو گا۔ وہ خود تو قبریں نہیں کھودتا ہو گا۔ بیٹا اس کے کام میں مدد کرتا ہو گا۔ قبر کھودنا بڑی جسمانی مشقت کا کام ہے۔ جوان آدمی ہی کر سکتا تھا۔ ڈاکٹر شیلی کی قبر بھی گورکن کے بیٹے نے یا بیٹوں نے مل کے کھودی ہو گی۔"

"کتنے بیٹے ہیں اس کے؟"

"دو سر۔ لیکن اب ایک رہ گیا ہے۔ ایک بھاگ گیا باپ کی موت کے بعد۔ شاید وہ جانتا تھا۔"

"اب تم دوسرے کو بُلا کے وہ سب مت کرنا جو بڈھے کے ساتھ کیا تھا۔ ان لوگوں کے لیے مار سے بڑی چیز پیسہ ہے۔ پیسے کی خوب مار دو۔ کون سا تمہاری جیب سے جائے گا۔ دس ہزار' بیس ہزار۔ پچاس ہزار۔ نقد ایک لاکھ رکھو اس کے سامنے۔"

"اتنا نقد میں کہاں سے لاؤں گا سر۔؟"

"شاہد علی!" ظفر حیات نے اسے سرزنش کی "کیا تم یہ بھی چاہتے ہو کہ میں تمہارا بینک بیلنس معلوم کروں۔ اور پھر تمہیں بتاؤں کہ تم ایک لاکھ کس بینک کی کس برانچ سے اور کون سے اکاؤنٹ سے لا سکتے ہو۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ۔"

"میں کر لوں گا سر۔" شاہد علی نے جلدی سے کہا "یہ لیڈی ڈاکٹر ہوتی پاکستانی تو کوئی مسئلہ نہیں تھا سر۔ ہم کسی بھی لاش کو' میرا مطلب ہے کسی بھی عورت کی پُرانی لاش کو پوسٹ مارٹم کرنے والوں کے حوالے کر دیتے۔ لیکن اس ڈاکٹر کا تو پورا ریکارڈ ہے برطانیہ میں۔ فنگر پرنٹس سے لے کر دانتوں کے ایکسرے تک۔"

"فنگر پرنٹ تو مٹی میں مل گئے۔ ہاں دانتوں کی ساخت کا ریکارڈ ہو گا۔ آج کل DENTAL STRUCTURE ہی شناخت کا سب سے مؤثر اور صحیح طریقہ سمجھا جاتا ہے۔"

خادم حسین نے اندر آ کے کھانسی کا ایک شربت میرے سامنے رکھ دیا اور بولا "آپ کے منظر صاحب اور مس رابعہ سے بات تو نہیں ہو سکی لیکن میں نے بار روم میں پیغام دے دیا تھا۔"

"بے وقوف۔ کیا پیغام دے دیا تھا اور کسے؟" میں نے کہا۔

"وہ مل گئے تھے۔ وقار یوسف صاحب" خادم حسین نے کہا "پھر میں نے ان کے گھر فون نہیں کیا۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا "اور منظر صاحب کے گھر کون ملا تھا؟"

"وہی جناب۔ جتنی تیز ان کی زبان چلتی ہے" اس نے توبہ کے انداز میں کانوں کو ہاتھ لگا لیا "قینچی کیا چیز ہے جناب۔ الیکٹرک زبان ہے بالکل۔"

"منظر کی بیوی؟" میں نے کہا "اسے نہیں بتانا تھا کچھ بھی خادم۔"

"نہیں بتایا جی۔ میں کوئی بے وقوف ہوں۔ بس جیسے ہی وقفہ آیا' میں نے کھٹ سے کہہ دیا کہ مجھے تو مس نازو سے بات کرنی تھی۔ آپ کیوں پنجے جھاڑ کے میرے پیچھے پڑ گئی ہیں۔ میں وہ خادم

نہیں ہوں جسے آپ نے مرغی خریدنے کے لیے ایک سال پہلے بازار بھیجا تھا اور وہ سو کا نوٹ لے کر بھاگ گیا تھا۔ اگر اس کا نام بھی خادم تھا تو یہ میرا قصور نہیں۔ وہ خفا ہو گئیں کہ سو روپے بھی لے گئے تھے اور جھوٹ بھی بولتے ہو۔ تمہاری آواز وہی ہے۔ میں نے کہا کہ جناب میں وہی خادم ہوتا تو آپ کو فون کیوں کرتا سال بھر بعد۔ اگر آواز ملتی ہے میری تو یہ بھی میرا قصور نہیں۔ بڑی قسمیں کھائیں تب انہیں یقین آیا۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا "چلو خدا کا شکر ہے یقین آگیا ورنہ وہ آسانی سے ماننے والی خاتون نہیں ہیں۔ پھر بات ہوئی نازو سے۔"

"بات ہوئی مگر انہوں نے کہا کہ وہ تعویذ تو دلاور کے گلے میں نہیں ہے۔"

میں فکرمند ہو گیا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"سب کچھ ہو سکتا ہے جی دنیا میں۔ انہوں نے تصدیق کرلی تھی۔"

ظفر حیات نے میز پر چھڑی ماری "مولوی خادم حسین' زیادہ فرنچ مت بولو۔ کیا رپورٹ لائے ہو تم باہر سے؟ تم مجھے مترجم سے زیادہ جاسوس لگتے ہو۔ کیا چکر چلا رکھا ہے تم نے؟"

"چکر کیا سر۔ یہ دوا لایا ہوں آپ کے سامنے۔"

"تمہارے اس وکیل کو ایک گھنٹے میں چھینک تک نہیں آئی۔ تم کھانسی کا شربت اٹھا لائے ہو۔ سچ بتاؤ باہر کیوں گئے تھے؟"

میں نے اطمینان سے کھانسی کے شربت کی بوتل اٹھائی اور ڈھکن کی مدد سے تقریباً دو چمچے پی گیا۔ اس کا ذائقہ برا نہیں تھا۔

ظفر حیات ایک دم ایس پی بن گیا تھا "خادم' تمہاری کھال کھینچ کے اچھی جوتے بنوا سکتا ہوں میں اور اس جوتے سے تمہارے اس ولایتی وکیل کا سر گنجا کر سکتا ہوں۔ سیدھی طرح بتاؤ کہ تمہیں اس نے کس مشن پر بھیجا تھا؟ تم نے منظر' رابعہ' وقار یوسف اور نازو سب کے نام لیے تھے۔"

مولوی نے فریادی نظروں سے مجھے دیکھا "آپ سُن رہے ہیں جناب۔ میری کھال کی کوئی بات نہیں مگر آپ کو جوتے پڑیں۔۔۔"

میں نے غصے میں بولنا شروع کیا "اس سے کہو کہ میں ابھی اور اسی وقت آئی جی صاحب سے بات کروں گا۔ پھر برٹش کونسلیٹ سے۔ اور میں ایک ایف آئی آر بھی درج کرانا چاہتا ہوں کہ میرے معاون کو دھمکی دی جا رہی ہے۔"

خادم حسین نے یہ بات آگے پہنچائی تو ظفر حیات اور شاہد علی دونوں کا جوش و خروش سمندر کے جھاگ کی طرح ختم ہو گیا۔ خادم حسین کو یقین آگیا کہ میں کوئی معمولی چیز نہیں ہوں۔ مجھ سے تو ایس پی بھی ڈرتا ہے۔ وہ زیادہ اعتماد کے ساتھ مسکراتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔

اب خادم حسین کی مدد سے میں نے ڈاکٹر شیلی مرڈر کیس کے بارے میں کچھ تفصیلات حاصل کرنے کے لیے دستاویزات کی نقول مانگیں۔

"پوسٹ مارٹم رپورٹ نہیں ہے" ظفر حیات کے بجائے [illegible] علی بولا۔

میں نے سخت حیرانی کا اظہار کیا "کمال ہے۔ یہ حادثہ [illegible] قتل۔ یہ تو بعد میں طے ہو گا مگر پوسٹ مارٹم ہر صورت میں [illegible] ہے۔"

"پوسٹ مارٹم اب ہو گا۔ عدالت کے حکم سے قبر کھو[illegible] جائے گی۔ اگر قبر کا سراغ مل گیا۔"

"کیا مطلب؟ قبر بھی نہیں ہے۔ میں تو اپنے ساتھ [illegible] میڈیکل ریکارڈ لے کر آیا تھا۔ سوشل سیکیورٹی والوں نے [illegible] فراہم کر دیا تھا۔ اس میں شیلی کے ڈینٹل اسٹرکچر کی رپورٹ [illegible] شامل ہے۔"

مجھے شاہد علی اور ظفر حیات کے چہروں پر تردد کے آثار [illegible] کے خوشی ہوئی۔

"ہم قبر کا پتا چلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

میں نے کہا "او کے۔ مجھے چوہدری دلاور کے فنگر پرنٹ [illegible] چاہئیں۔"

"چوہدری دلاور کوئی مجرم نہیں ہے۔ ریکارڈ ہوتا ہے جرا[illegible] پیشہ افراد کا۔ سزا یافتہ لوگوں کا۔" شاہد علی بولا "وہ معزز [illegible] ہے۔"

میں نے کہا "فنگر پرنٹ کسی معزز آدمی کے بھی لیے جا[illegible] ہیں۔"

"کہاں سے لائیں ہم اس کے فنگر پرنٹ آخر؟ وہ خود کہاں [illegible] کہاں ہے؟"

میں نے کہا "اس کے گھر سے' دفتر سے' اس کی گاڑی [illegible] جہاں تک میں جانتا ہوں اس کے خلاف قتل کی ایف آئی آر [illegible] وہ مجرم نہ سہی ملزم ضرور ہے۔ پولیس کو اس کی تلاش بھی ہے [illegible] میں دیکھ رہا ہوں کہ ابھی تک پولیس نے کچھ نہیں کیا ہے [illegible] کوشش شروع ہی نہیں کی ہے۔"

شاہد علی گرم ہو گیا۔ اس نے غصے میں بتایا کہ ایک انسپ[illegible] گاڑی لے کر شہر کی خاک چھانتا پھر رہا ہے اور اس کے ذمے [illegible] چوہدری دلاور کا سراغ لگانا ہے۔ سارے شہر کی پولیس فورس [illegible] آدمی کے لیے وقف نہیں کی جا سکتی۔

میں جانتا تھا کہ انسپکٹر شہر میں کیوں پھر رہا ہے۔ اس تلا[illegible] مقصد دلاور کی گرفتاری نہیں تھا۔ اسے بازیاب کر کے بحفاظ[illegible] قانون کے ہاتھوں کی دسترس سے دور پہنچانا تھا۔

میں نے کہا "چوہدری دلاور کا ایک بھائی تھا' اکبر خان۔"

"ہم اس کے متعلق نہیں جانتے۔"

میں نے کہا "چوہدری دلاور کا باپ پشاور کے قریب کسی گا[illegible] میں کارپینٹر تھا۔ بڑا اچھا کاریگر تھا۔ اچانک وہ اپنے بیوی بچو[illegible] گھر میں موجود تھا کہ اس کی بیوی آگئی اور شور کرنے لگی۔ اس کا جھگڑا چل رہا تھا کہ چوہدری دلاور آگیا۔ وہ نام نہیں جانتا بیوی سے۔ اس نے کہا کہ ایک انڈین یا پاکستانی آگیا۔ جو حلیہ اس نے بتایا تھا۔ اس نے کہا کہ ایک انڈین یا پاکستانی آگیا۔ جو حلیہ اس نے بتایا تھا۔ وہ سو فیصد چوہدری دلاور کا ہے۔ اس پاکستانی نے ڈاکٹر شیلی کی ماں کو مار دیا۔ پھر اس نیگرو کی گرل فرینڈ کو مار دیا' ڈاکٹر شیلی سمجھ کے۔ نیگرو جان بچانے کے لیے باتھ روم میں گھس گیا تھا۔ اسے پولیس نے ڈبل مرڈر کے الزام میں پکڑ لیا۔ ساری گواہیاں اس کے خلاف گئیں۔ اسے سزا ہو گئی مگر۔۔۔ عدالت کے ریکارڈ پر ہر بیان ہے۔ اس کا دفاع کرنے والے وکیل نے اس بیان کی روشنی میں ایک اسکیچ بنوایا تھا۔ ایک خاکہ۔۔۔ اس شخص کا جسے نیگرو اصل قاتل قرار دیتا تھا۔ نیگرو نے تسلیم کیا کہ وہ خاکہ بالکل اصل تصویر جیسا تھا۔ عدالت نے یہ بات نہیں مانی مگر فائل میں خاکہ موجود ہے اور اب چوہدری دلاور کی تصویر سے ملا کے دیکھا جائے گا۔ تو ثابت ہو جائے گا کہ نیگرو جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔ وہ کسی فرضی شخص کا حلیہ نہیں بیان کر رہا تھا۔۔۔"

"وقت آنے پر جو ہو گا اس کا فیصلہ نہ ہم کریں گے نہ تم" ظفر حیات اُٹھ کھڑا ہوا "اب مجھے کام سے جانا ہے۔ آئندہ جب آؤ پہلے اپائنٹمنٹ لو ورنہ میں نہیں ملوں گا۔"

اس کے آفس سے باہر آتے ہوئے میں خاصا مطمئن تھا۔ مجھے مفید معلومات حاصل ہوئی تھیں اور میں نے بروقت خطرات کا سدِباب کر لیا تھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ پولیس کس طرح چوہدری دلاور سے مل کر قانون کے عمل کو سبوتاژ کرنے کی پوری کوشش کر رہی ہے اور اس کا پیسہ کیسے انصاف کے راستے میں دیوار بن رہا ہے۔ مجھے گورکن کی موت کا بھی پتا چل گیا تھا اور میں ظفر حیات کو اپنی معلومات سے ہراساں کرنے میں بھی کامیاب رہا تھا۔

اب مجھے منظر کے گھر جانے کی جلدی تھی۔ پولیس اس یقین کے ساتھ دلاور کو تلاش کر رہی تھی کہ شہر میں کہیں نہ کہیں ہمارے مخصوص ٹھکانوں کے آس پاس چوہدری دلاور کے لاکٹ کا سگنل سنائی دے گا مگر نازو کا کہنا تھا کہ دلاور کے گلے میں ایسا کوئی لاکٹ ہی نہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ دلاور نے وہ لاکٹ گلے سے اُتار کے کہیں ڈال دیا ہو۔ رابعہ کے آفس میں۔ اس کی گاڑی میں' منظر کے گھر میں' اسی گیراج کے کباڑ خانے میں جہاں اسے کوئی دیکھ نہ سکے مگر اس کا سگنل نشر ہوتا رہے۔

میں نے خادم کو گاڑی میں بٹھایا اور اسے پیچھے نظر رکھنے کی ہدایت کی "اگر کوئی ہمارا پیچھا کرے تو بتانا۔"

"کی؟ میں۔۔۔ میرا مطلب ہے مجھے کیسے معلوم ہو گا۔ پیچھے تو جناب گاڑیاں ہی گاڑیاں ہیں۔ سب ہمارا پیچھا کرنے والے نہیں ہیں۔ شریف لوگ ہیں اپنے اپنے کام سے جا رہے ہیں۔"

"یار' عقل کہاں ہے تمہاری' ٹخنوں میں؟" میں نے کہا "ابھی میں گاڑی کو موڑتا ہوں۔ دیکھنا کون سی کار ہر موڑ پر ساتھ رہتی چھوڑ کے لندن چلا گیا تھا' آخر کیوں؟"

"اس سوال کے جواب پر آپ روشنی ڈالیں۔"

"لیکن وہ یہاں کا رہنے والا تھا۔ کیا وہ کوئی جرم کر کے فرار ہوا تھا۔ یہ اس کے آبائی گاؤں اور متعلقہ تھانے کے ریکارڈ سے معلوم ہو جائے گا۔"

"ہم اس کی ضرورت نہیں محسوس کرتے۔"

میں نے ایک نوٹ بک میں یہ لکھ لیا اور کہا "دلاور کے باپ نے لندن میں شادی کر لی تھی۔ ایک انگریز عورت سے جو پہلے سے طلاق یافتہ تھی۔"

ظفر حیات نے اقرار میں سر ہلایا "وہ شیلی کی ماں تھی۔"

"یس۔ دلاور کے باپ نے فرنیچر کا اچھا کاروبار کیا مگر ایک روز وہاں سے بھی اچانک غائب ہو گیا۔ بیٹی اور بیوی کو چھوڑ کے۔"

ظفر حیات نے کہا "آخر کیوں۔ تم نے وہاں معلوم کیا۔ کیا وہ کوئی جرم کر کے فرار ہوا تھا؟"

میں نے کہا "اس بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا مگر شیلی کی ماں نے تیسرے مرد سے شادی کی تھی۔ جو ایک نیگرو تھا اور آج کل جیل میں ہے۔ کیا تم جانتے ہو وہ کس کے جرم کی سزا کاٹ رہا ہے؟"

"تم بہتر بتا سکتے ہو" ظفر حیات بولا۔

"ویل۔ میں نے اس سے ملاقات کی تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ قتل کے جرم میں عمر قید کاٹ رہا ہے۔ اس پر ڈاکٹر شیلی کی ماں کے قتل کا الزام ثابت ہو گیا تھا۔ لیکن وہ کہتا ہے کہ یہ غلط ہے۔"

"پھر ہم کیا کریں' وہ اپیل کرتا۔۔۔"

"اپیل سے کام نہیں بنا۔ حالات کی گواہی بھی اس کے خلاف تھی۔ اس کا کہنا ہے کہ قتل کرنے والا چوہدری دلاور تھا۔"

"کیا وہ چوہدری دلاور کو جانتا تھا؟" شاہد علی بولا۔

"نہیں۔ مگر میں نے اسے تصویر دکھائی تو اس نے پہچان لیا اور شور کرنے لگا کہ یہی ہے قاتل۔ یہ کون ہے' اسے میرے سامنے لاؤ۔"

"وہ کسی بھی تصویر کو دیکھ کر شور مچا سکتا تھا" ظفر حیات مسکرانے لگا۔ "کیا اسے کہا گیا تھا کہ وہ دلاور کو ملزم بنا دے؟"

"کیا مطلب؟"

"جو لوگ چوہدری دلاور کے دشمن ہیں۔ سکندر بخت کا نام سرِفہرست ہے۔ اس کے لیے یہ کام مشکل نہیں تھا۔ وہ لندن میں زیرِ تعلیم تھا۔ وہاں اس کے بہت دوست ہیں۔ کسی نے قاتل کو دلاور کی تصویر پہلے ہی دکھا دی ہو گی اور یہ بھی بتا دیا ہو گا کہ اس کا ڈاکٹر شیلی سے کیا رشتہ تھا۔ اسے موقع مل گیا ایک جھوٹی کہانی سنانے کا۔ یا شاید یہ کہانی اسے بنا کے دے دی گئی۔"

"میں امکانات کو مسترد نہیں کر سکتا۔ حقائق جو بھی ہوں گے سامنے آجائیں گے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ

ہے؟"

"آہستہ آہستہ جناب۔ میں تو تربوز کی طرح لڑھک رہا ہوں دائیں بائیں' پیچھے کیسے دیکھوں؟" خادم حسین نے واویلا کیا "لاحول ولا قوۃ۔ بڑی بے حیا عورت ہے۔ یہ لگ جائے گی پیچھے۔ نہیں' وہ تو دوسری طرف چلی گئی۔ اس کا لباس۔۔۔"

میں نے کہا "بہت بے ہودہ تھا' مجھے معلوم ہے۔"

"بے ہودہ! لباس تھا ہی کہاں جناب۔ بالشت بھر کے بلاؤز میں سے۔۔۔"

"خادم حسین۔ تم نے جو دیکھا' اس سے مجھے کوئی سروکار نہیں۔ اب کون پیچھے ہے ہمارے؟"

"اب تو۔ یہ دیکھا آپ نے۔ موٹر سائیکل پر۔ کیا بے شرمی سے کمر میں ہاتھ ڈالے ساتھ لگی بیٹھی تھی۔ یہ سواری۔۔۔"

میں نے ہنس کے کہا "اونٹ پر بھی ایسے ہی بیٹھتی وہ۔۔۔"

منظر کے گھر جاتے جاتے میں نے گاڑی کراؤن سنیما کی طرف موڑ لی۔ رابعہ کی پرانی کوٹھی کے ملبے پر چار مزدور کام کر رہے تھے۔ ایک محل نما خوب صورت عمارت کا بیشتر حصہ گر گیا تھا مگر کچھ آثار باقی تھے۔ جلی ہوئی کھڑکیوں اور دروازوں کے خلا میں ویرانی نوحہ خواں تھی اور دھوئیں سے کالی دیواروں پر وقت کے آنسو جم گئے تھے۔ میری نظروں میں سارے منظر آج بھی زندہ تھے۔ ایک کوٹھی وہ تھی جہاں میں پہلی بار رابعہ کے گھر آیا تھا۔ پرانی کوٹھی کے لان اور مختصر سے باغ میں بارہا میں نے اس کے ساتھ چاندنی کے سائے گھٹتے بڑھتے دیکھے تھے۔ اس کی ماں کا جنازہ اٹھتے ہی یہ کوٹھی زمیں بوس ہو گئی تھی۔ اسے تباہ کرنے والا بھی چوہدری دلاور تھا۔ اس نے دوبارہ اس گھر کا ملبہ صاف کر کے یہاں جدید طرز کی خوب صورت کوٹھی بنوائی تھی۔ اس کوٹھی میں چاندنی بیگم اور گولو پہلوان سے بھی میں ملا تھا۔ پھر کس عیاری سے دلاور نے یہ کوٹھی رابعہ کی نذر کر دی تھی۔ نقصان کی تلافی کے طور پر لیکن یہ دام اجل تھا۔ اس کی بنیادوں اور دیواروں میں آتش گیر اور تباہ کن مادہ رکھا گیا تھا۔ یہ دلاور کے اختیار میں نہ تھا کہ ہمیں خدا کی طرف سے ملنے والی زندگی کی مہلت کو ایک ساعت بھی کم کر سکے چنانچہ جس دن اس نے اپنی دانست میں ہم سب کو اس محل کے ملبے میں دفن کرنے کا فیصلہ کیا تھا اس دن ہم تائید ایزدی سے بچ گئے تھے۔

کیا اب اس ملبے پر تیسری بار تعمیر ہو گی؟ میں نے سوچا اور گاڑی سے اتر کے ایک مزدور کے پاس چلا گیا۔ وہ ایک ٹرک میں ملبہ ڈال رہا تھا۔

"سیٹھ کدھر ہے تمہارا؟" میں نے کہا۔

وہ حیران ہو کے مجھے دیکھنے لگا "کون سیٹھ؟"

"جس نے تمہیں یہاں کام پر لگایا ہے" میں نے کہا۔

"ٹھیکے دار سے پوچھو جناب۔ وہ ادھر بیٹھا ہے" مزدور نے سڑک کے پار چائے کی ایک ریڑھی کی جانب اشارہ کیا۔

ٹھیکے دار بینچ پر پاؤں سمیٹے بیٹھا تھا۔ "سیٹھ۔ سیٹھ تو... نے کہا کہ یہ سب ملبہ لے جاؤ۔ ایک دم مفت دے دیا۔... لیے۔ بولتا تھا شام کو آئے گا۔ تم کون ہے؟"

میں نے کہا "میں۔۔۔ میرا مکان بنے گا یہاں۔... میرا۔"

"تمہارا منشی عجب ہے۔ ہم ایک طرف سے ملبہ ہٹا... کہ نہیں پہلے ادھر سے ہٹاؤ۔ بیچ میں سے" ٹھیکے دار بولا "... نہیں سنتا۔ بولتا کہ جیسا بولے گا ویسے کرے گا ورنہ بھاگ... اپن کو کیا۔ تھوڑا مشکل ہوا مگر ہم بیچ والا حصہ پہلے صاف... دوسرا ٹرک جاتا ہے۔"

میں نے واپس جا کے صاف شدہ حصے کا معائنہ کیا اور... ہو گیا۔ غالب نے فرش کا وہ حصہ صاف کرا لیا تھا جس... خانے کا زینہ تھا۔ اس فرش میں بھی دراڑیں پڑی ہوئی تھی... جگہ سے فرش چٹخ گیا تھا۔ سیمنٹ ٹوٹنے سے شگاف پڑ گئے... سریے کا جال سلامت تھا۔ یہاں سے نیچے جانے کا راستہ... آسان ہو گیا تھا۔

خادم حسین کی حالت بھوک سے غیر ہو رہی تھی۔ ... نے اسے طلب کیا تھا تو دوپہر کے کھانے کا وقت ہو چکا تھا... میں شام ہو گئی تھی۔ جب میں نے چائے کے لیے پوچھا تو... کی طرح بجنے لگا۔

"گستاخی معاف۔ آپ نے تو مروت بھی چھوڑ دی۔ بھلا... سے پیٹ بھر سکتا ہے۔ مشین میں بھی کچھ ڈالنا پڑتا ہے... پٹرول۔ انسان کے ساتھ بھی پیٹ لگا ہوا ہے اور آدمی جو... ہے پاپی پیٹ کی خاطر کرتا ہے۔ پیٹ میں تو جناب آنتیں... ہو اللہ پڑھ رہی تھیں۔ اب صاف انا اللہ کی آواز آ رہی ہے... کو کہاں سنائی دے گی کسی غریب کے پیٹ کی فریاد۔"

میرے لیے کھانے کا وقت نکل گیا تھا۔ میں نے جلدی... کافی کے ساتھ سینڈوچ کھائے اور خادم حسین کو بھرپور... مصروف چھوڑ کے نکل گیا۔ "میں بل دے جاؤں گا۔ تم... سے کھاپی کے گھر چلے جانا۔ اب تمہاری ضرورت کل ہی ہو گی... پر ہی ملو گے نا؟"

"آپ بتا دیں۔ میں کہاں آ جاؤں؟" وہ بولا "فارغ ہوں... وقت کیونکہ گھر والی بھی میکے چلی گئی ہے۔"

میں نے کہا "صبح منظر صاحب کے گھر فون کر لینا۔"

ابھی میں اپنی کار تک بھی نہیں پہنچا تھا کہ میں نے ریستو... کے باہر پولیس کی گاڑی دیکھی۔ ڈی ایس پی شاہد علی آگے... سیٹ پر تھا۔ وہ بڑی تیزی سے باہر نکلا اور اندر چلا گیا۔ اس کے... پیچھے جانے والا دوسرا شخص انسپکٹر تھا۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔... مولوی خادم حسین کو اٹھانا چاہتے تھے اور نہ جانے کیسے ان... مل گئی تھی کہ وہ میرے ساتھ ہے۔ اس سوال کا جواب بھی...

ریوالور اڑ کے چھت تک گیا اور پھر نہ جانے کہاں گرا۔ میں نے شاہد علی کو کھینچ کے پلٹ دیا۔ وہ تیسری مرتبہ اٹھا تو میں نے اس کی کلائی پکڑلی اور خود گھوم گیا۔ اسے کندھے کے اوپر سے گزار کے میں نے دھوبی پٹکا دیا تو اس کا سر فرش پر لگا اور وہ بے سدھ ہو گیا۔

انسپکٹر کا دھیان دروازے کی طرف تھا۔ اسے اپنے افسر کی مدد کا خیال ہی نہیں آیا۔ وہ گرنے کے بعد پھر اٹھا اور دروازے کی طرف لپکا۔ اس وقت تک ایک دروازے سے ایک ساتھ گزرنے کی کوشش کرنے والے راستہ بلاک کر چکے تھے۔ انسپکٹر نے چیخ چیخ کے انہیں اپنی اتھارٹی سے متاثر کرنے اور ادائے فرض کی سزا سے ڈرانے کی بے سود کوشش کی۔ وہ لوگوں کو دھکیلتا گالیاں بکتا سب کے بیچ میں سے باہر پہنچا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ مولوی خادم حسین سر پر پاؤں رکھ کے بھاگا تھا۔ یا وارننگ سے وہ سمجھ گیا تھا کہ اجل اس کے تعاقب میں ہے۔ وہ پولیس کے ہاتھ نہیں لگا۔

شاہد علی کے ناک آؤٹ ہوتے ہی نہ جانے کہاں سے منیجر نکل آیا "یہ کیا بدمعاشی ہے۔ کون ہو تم؟ پولیس کیوں آئی تھی یہاں اور یہ مار پیٹ' توڑ پھوڑ کیوں ہوئی ہے یہاں؟" اس نے چلانا شروع کیا۔

میں نے جواب فرنچ میں دیا اور تیس سیکنڈ تک مسلسل بولتا رہا "یہ سب تم پولیس سے پوچھنا۔ میں تو ایک وکیل ہوں اور قتل کے ایک مقدمے کی پیروی کے لیے لندن سے آیا ہوں۔"

کبھی اچانک آدمی کو ایسی غیر متوقع صورت حال سے دوچار ہونا پڑتا ہے کہ مفروضات پر قائم یقین کی دیوار خود اسی پر آگرتی ہے۔ ایسا ہی کچھ میرے ساتھ ہوا۔ میرے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ میری فرنچ کے جواب میں ایک ریسٹورنٹ کا منیجر فرنچ بولنے لگے گا۔

"اگر تم فرنچ وکیل ہو تو کیا تمہیں پاکستان میں قتل کرنے کا لائسنس حاصل ہے۔ تم قتل کے کس مقدمے کی پیروی کر رہے ہو۔ تم تو خود قاتل ہو۔ تم نے ایک ڈی ایس پی کو مار ڈالا ہے۔ تمہیں معلوم ہے' یہ کتنا سنگین جرم ہے۔ اگر پولیس کسی وکیل کو بلاوجہ سب کے سامنے مارے تو یہ کوئی جرم نہیں ہوتا مگر وہ جواب میں اپنے دفاع میں کسی کو تھپڑ بھی مار دے تو اس کی بخشش نہیں ہوتی۔"

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ فرانسیسی بولتے ہوئے میں نے کوئی بے ربط یا فضول بات نہیں کی تھی۔ یہ فرض کرتے ہوئے کہ یہاں فرنچ کون سمجھے گا' میں فرنچ کی کوئی نظم پڑھ دیتا یا کوئی لطیفہ سنا دیتا تو مزید خرابی ہوتی۔ میرا ردِ عمل فطری تھا چنانچہ جو بات میرے لبوں تک آئی وہ بھی غلط نہیں تھی۔

میں نے کہا "تم کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ پولیس افسر مرا نہیں ہے' بے ہوش ہے۔"

"پریشانی تو میرے لیے ہے۔ تمہارا کیا ہے' تم صاف بچ

طرح میرے ذہن میں آ گیا۔ پولیس نے میری گاڑی کے نیچے بھی خفیہ مائک چپکا دیا تھا۔ اس وقت جب میں ایس پی ظفر حیات سے باتیں کر رہا تھا' پولیس کو اپنی کارروائی کے لیے کافی وقت ملا تھا۔ یقیناً انہوں نے میری اور خادم حسین کی ساری گفتگو سنی ہو گی اور ان پر یہ راز فاش ہو گیا تھا کہ فرنچ بولنے والا وکیل اردو بھی جانتا ہے۔

اگر وہ خادم حسین کو گرفتار کر لیتے تو اس سے سب کچھ اگلوا لیتے۔

میں نے واپس دوڑ لگائی اور پولیس کے ساتھ ہی اس ٹیبل پر پہنچ گیا جہاں خادم حسین بڑے مزے سے دونوں وقت کا کھانا ایک ساتھ کھانے میں مگن تھا۔ پولیس کو دیکھتے ہی اس کا نوالہ حلق میں اٹک گیا اور اس کی نظروں میں خوف سمٹ آیا۔ میں بڑی تیزی سے آگے بڑھا اور درمیان کی میزوں سے ٹکراتا ہوا شارٹ کٹ سے خادم حسین کی میز تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔

میں نے اس سے فرنچ میں کہا "خادم حسین بھاگ جاؤ۔ ان کو میں روک لوں گا۔ روپوش ہو جاؤ فی الحال۔"

اس سے زیادہ کہنے کی مجھے مہلت ہی نہ ملی۔ شاہد علی نے مجھے گالی دی "تیری فرنچ تو میں ابھی نکالتا ہوں۔۔۔"

خادم حسین اچھل کے کھڑا ہوا اور میرے پیچھے سے دروازے کی طرف دوڑا۔ انسپکٹر نے اس کو چلا کے آواز دی "رک جاؤ ورنہ گولی مار دوں گا۔"

ریسٹورنٹ میں بھگدڑ مچ گئی تھی۔ ٹیبل پر بیٹھے ہوئے لوگ بڑی گھبراہٹ میں اٹھ کے دروازے کی طرف بھاگ رہے تھے اور خادم حسین انہی میں شامل تھا۔ انسپکٹر گولی چلاتا تو وہ کسی اور کو بھی لگ سکتی تھی۔ کئی کرسیاں اور میزیں الٹنے سے بھی انسپکٹر کی مشکلات میں اضافہ ہوا۔ وہ دروازے کی طرف گیا مگر پہلے اس سے ایک ویٹر ٹکرا گیا۔ اس نے ویٹر کو دھکا دے کر گرایا تو خود ایک کرسی کی ٹانگوں میں الجھ گیا۔ خادم حسین کے لیے اتنی مہلت بہت تھی۔ وہ بڑی پھرتی سے لوگوں کے بیچ میں گھس چکا تھا اور زیادہ تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اصل خطرہ اسی کی جان کو ہے۔

شاہد علی اپنی کوشش میں ناکامی پر سخت مشتعل تھا۔ اس نے پہلے انسپکٹر کو ہدایات دیں کہ وہ بالکل لحاظ نہ کرے اور مولوی کو گولی مار دے مگر انسپکٹر خود فرنیچر کے ساتھ فرش پر پڑا نظر آیا تو اس کی مایوسی میرے خلاف غیظ و غضب کے طوفان میں ڈھل گئی۔ وہ گالیاں بکتا ہوا مجھ پر حملہ آور ہوا۔ میں اس کے لیے تیار تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے اس کا استقبال کیا اور ایک منٹ میں اسے تین بار اٹھا کے اِدھر سے اُدھر پھینکا۔ پہلی بار وہ ایک میز پر گرا اور میز پر سے پھسل کے فرش پر گیا تو میز اس کے اوپر آئی مگر وہ فوراً ہی کھڑا ہو گیا۔ اس نے ریوالور نکالا ہی تھا کہ میں اس کے سر پر پہنچ گیا۔ میری ایک کک نے اس کے ہاتھ سے ریوالور کو غائب کر دیا۔

جاؤ گے۔"

میں نے کہا "بلاوجہ شور مت کرو۔ تم نے کچھ نہیں کیا ہے۔ قصوروار ہیں یہ پولیس والے جو استغاثہ کے ایک گواہ کو اٹھانے آئے تھے۔ یہ اس کو لے جاتے تو تھانے میں تشدد سے ہلاک کردیتے۔ میں نے اس گواہ کو بچایا۔ باقی جو کچھ تم نے دیکھا تم بتاسکتے ہو۔ پولیس کسی قانونی اختیار کے بغیر اندر آگئی اور انہوں نے ساری توڑ پھوڑ کی....."

"قانونی اختیار۔" وہ تلخی سے بولا "کون پوچھتا ہے یہاں قانونی اختیار کو۔ میں نے ان کے حق میں گواہی نہ دی تو یہ پہلے مجھے بند کردیں گے پھر میرا ریسٹورنٹ بند کرادیں گے۔ تم کس کے قتل کی تفتیش کررہے تھے؟"

"تفتیش نہیں، مقدمے کی پیروی۔ ایک برطانوی لیڈی ڈاکٹر شیلی کو یہاں قتل کردیا گیا تھا۔"

"پھر تم بھاگ جاؤ۔ ورنہ مجھے تمہارے خلاف بھی گواہی دینی پڑے گی۔ میں وہیں چھپ جاتا ہوں جہاں سے ابھی نکلا تھا۔"

"تم فرنچ کیسے جانتے ہو؟"

"میں پیرس میں رہا تھا نو سال تک۔ اب جاؤ، میں کہہ دوں گا کہ مجھے کچھ پتا نہیں تمہارے بارے میں" وہ کاؤنٹر کے پیچھے غائب ہوگیا۔

میں دروازے کی طرف بڑھا۔ اس وقت تک سب لوگ فرار ہوگئے تھے۔ اندر کا منظر ایسا تھا جیسے وہاں بیٹھے ہوئے لوگ اندر بم ہونے کی اطلاع پر بھاگے ہوں۔ کرسیاں، میزیں، کراکری اور بوتلیں فرش پر بکھری ہوئی تھیں۔ دروازے کا شیشہ جو چھ فٹ لمبا اور ڈھائی فٹ چوڑا ہوگا کسی نے راستہ بنانے کے لیے توڑا ہوگا۔ اس کے ٹکڑے راستے میں بکھرے ہوئے تھے اور کچھ فریم میں لگے رہ گئے تھے۔

میں باہر نکلا تو مجھے دروازے کے سامنے تماشا دیکھنے والوں کا ہجوم نظر آیا۔ راہ چلتے لوگ ریسٹورنٹ کے سامنے ٹھہر گئے تھے۔ بہت سی کاریں کھڑی ہوگئی تھیں۔ اس سے ٹریفک جام ہوگیا تھا اور راستہ مانگنے والے اب مسلسل ہارن بجارہے تھے۔ میں نے اِدھراُدھر دیکھا تو انسپکٹر مجھے خاصے فاصلے پر لوگوں سے کچھ پوچھتا نظر آیا۔ غالبا وہ یہ معلوم کررہا ہوگا کہ مولوی خادم حسین کو کس طرف فرار ہوتا دیکھا گیا ہے۔

میں نے موقع غنیمت جانا اور خاموشی سے لوگوں کے درمیان سے گزر کے اپنی کار تک پہنچ گیا۔ وہاں سے کار نکالنے میں مجھے دس منٹ لگ گئے مگر بالآخر میں چوک تک پہنچ گیا۔ آگے راستہ صاف تھا۔ منظر کے گھر پہنچنے کا خیال میں نے بدل دیا تھا۔ شاید پولیس کی نظر میں میری گاڑی تھی اور یہ گاڑی غالب نے اپنے نام سے کرائے پر حاصل کی تھی۔ اس کو غالب کے اخبار کے دفتر کے سامنے چھوڑنا ہی بہتر تھا۔

گاڑی کو وہاں کھڑا کرنے سے پہلے میں نے رومال سے اندر کی ہر وہ جگہ صاف کردی جہاں میرے فنگر پرنٹ پائے جانے کا احتمال تھا۔ میں نے دفتر کے استقبالیہ پر بیٹھے ہوئے سیکیورٹی گارڈ سے کہا کہ وہ مرزا غالب کو بلائے حالانکہ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ غالب ابھی آفس نہیں پہنچا ہوگا۔ نفی میں جواب پاکے میں نے گاڑی کی چابیاں گارڈ کو دے دیں۔

"مرزا غالب کو فون کردو کہ ان کی گاڑی یہاں پہنچ گئی ہے۔"

گارڈ نے چابیاں لے لیں "وہ آتے ہی ہوں گے۔"

"پھر یہ چابیاں انہیں دے دینا" میں نے کہا "گاڑی باہر کھڑی ہوئی ہے۔ دیکھ لو۔"

"ٹھیک ہے" اس نے گاڑی پر نظر ڈال کے کہا "آپ کا نام۔"

میں نے کہا "چوہدری دلاور....." اور باہر نکل گیا۔

منظر کے گھر میں ٹیکسی میں پہنچا۔ منظر اور رابعہ کے گھر پر ملنے کا امکان نہیں تھا۔ یہ ان کے آفس میں بیٹھنے کا وقت تھا مگر مجھے غالب کو نہ پاکے مایوسی ہوئی۔ نازو مجھے ڈرائنگ روم میں لے گئی۔

"کیا بات ہے۔ تم بہت بدحواس نظر آرہے ہو؟"

"پہلے یہ بتاؤ کہ دلاور کہاں ہے؟"

"اسے تو غالب اپنے ساتھ لے گیا ہے۔"

"کیلا؟" میں نے کہا "اسے میرا انتظار کرنا چاہیے تھا۔"

"اس نے بہت انتظار کیا۔ اور معاف کرنا۔ بہت گالیاں دیں تمہیں" نازو بولی "تم کہاں غائب ہوگئے تھے؟"

"میں ایس پی ظفر حیات کے ساتھ تھا۔"

"سارا دن؟"

"ہاں سارا دن۔" میں نے جھلّا کے کہا "مجھے یہ بتاؤ کہ وہ بے وقوف دلاور کو کہاں لے گیا ہے۔"

"وہیں۔ جہاں اسے رکھنے کا خیال تھا۔ قید خانے میں۔ اس نے راستہ بنالیا تھا۔"

"میں نے دیکھا تھا۔ وہاں مزدور ملبہ صاف کررہے تھے لیکن غالب اکیلا اسے تہ خانے میں کیسے لے جائے گا۔"

"ابھی تو دلاور اس کی گاڑی میں ہے۔ ڈکی میں سو رہا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ سکندر کو ادھر بھیج دینا۔ وہ جب بھی آئے تم اسے رات آٹھ بجے ملوں گا۔"

"گاڑی کس کی ہے؟"

"کرائے کی۔" نازو بولی "وہ مولوی خادم حسین کیا کہہ رہا تھا۔"

میں نے کہا "نازو۔ دلاور کے گلے میں ایک لاکٹ تھا۔ دیکھنے میں تعویذ لگتا تھا مگر اس کے اندر چھوٹا سا سگنل نشر کرنے والا آلہ تھا۔ پولیس اسے سگنل کی مدد سے تلاش کرتی پھر رہی ہے۔"

"مجھے تو ایسی کوئی چیز نہیں ملی تھی۔"

"چلو گیراج میں دیکھتے ہیں" میں نے کہا "ایسا نہ ہو کہ پولیس کو سگنل سنائی دے تو وہ یہاں پہنچ جائیں۔"

نازو متفکر ہوگئی "وہاں تو بہت کاٹھ کباڑ ہے۔ کیسے تلاش کریں گے ہم ایک لاکٹ کو۔"

"میں نے رابعہ اور منظر کے لیے بھی پیغام دیا تھا" میں نے کہا۔

"تمہارا پیغام مجھے مل گیا تھا تو انہیں بھی مل گیا ہوگا۔"

"تمہاری سارا دن کوئی بات نہیں ہوئی ان سے۔ یا وقار سے۔"

نازو نے نفی میں سرہلایا "مجھے اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ وہ عدالت میں تھے اور ظاہر ہے میں اپنا کام کررہی تھی۔ تم بھی تو بتاؤ کہ سارا دن کیا مصروفیت رہی۔"

"بتاؤں گا۔ ذرا پہلے رابعہ کے آفس کا نمبر ملاؤ۔"

"یہاں سے بات کروگے؟ فون ٹیپ نہ کررہے ہوں شکاری۔"

میں نے کہا "کہتی ٹھیک ہو تم۔ لیکن خطرہ تو باہر سے بات کرنے میں بھی ہے۔ آفس کا فون بھی ٹیپ ہوسکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں چلتا ہوں۔"

"ایسے نہیں، پہلے مجھے بتاؤ کہ بات کیا ہے؟" "اتنے پریشان نظر آرہے ہو تم کہ مجھے وحشت ہورہی ہے۔"

میں نے ایک گہری سانس لی اور آرام سے بیٹھ گیا۔ "بات یہ ہے مس نازو کہ پولیس نے دلاور کا سراغ لگانے کے لیے اور ہمیں اغوا کا مجرم ٹھہرانے کے لیے بڑے پیمانے پر کارروائی کی ہے۔ رابعہ کی کار اور منظر کی کار کے نیچے خفیہ مائیکرو فون نصب کردیے گئے تھے۔ وہ اگر ساتھ جاتے تو ضرور آپس میں کوئی بات دلاور کے متعلق کرتے اور پولیس کو سب معلوم ہوجاتا کہ اسے کہاں رکھا گیا ہے۔ وقار یوسف کے گھر میں بھی کہیں ایسا ہی مائکروفون لگایا گیا ہے۔ معلوم نہیں کہاں؟ رابعہ کے دفتر میں مائکروفون آسانی سے مل گیا تھا مگر وقار کا گھر بہت بڑا ہے۔"

"یہ کارروائی تو پولیس یہاں بھی کرسکتی ہے۔"

"ہاں۔ مگر اس کے لیے انہیں اندر آنا پڑے گا۔ معلوم نہیں وقار یوسف کے گھر میں یہ کیسے ممکن ہوا۔ یہ مائکروفون حساس بہت ہوتے ہیں لیکن ان کی رینج کم ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ وقار یوسف کے بیڈ روم یا ڈرائنگ روم کا انتخاب کیا ہوگا انہوں نے۔ تم ذرا وقار کی بیوی سے پوچھو کہ آج کل میں کوئی اجنبی تو گھر میں نہیں آیا تھا؟"

نازو نے فون کیا تو حقیقت کُھل گئی۔ ایک شخص ٹیلی فون کے محکمے کا لائن مین بن کے پہنچا تھا۔ اس نے پوچھا تھا کہ آپ کا فون خراب ہے۔ وقار کی بیوی نے حیرانی سے کہا کہ فون تو ٹھیک ہے۔ اس نے اصرار کیا کہ آپ چیک کرلیں کیونکہ ہمارے پاس خرابی کی شکایت ہے اور مجھے فون ٹھیک کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ جب میں واپس چلا جاؤں تب آپ کو خرابی کا پتا چلے۔ وقار کی بیوی نے دیکھا تو فون واقعی ڈیڈ تھا۔ اس نے لائن مین کو اندر آنے کی اجازت دے دی۔ لائن مین نے بیڈ روم کے سیٹ کو بھی چیک کیا اور ڈرائنگ روم کی ایکس ٹینشن کو بھی۔ وقار کی بیوی اپنے کام میں مصروف رہی۔ وہ لائن چیک کرنے کے لیے پول پر چڑھا اور کچھ دیر بعد اس نے کہا کہ فون ٹھیک ہے اب۔ چیک کرلیں۔

نازو فکرمند نظر آنے لگی "اس کا مطلب ہے وہ فون بھی ٹیپ کرگیا اور مائکروفون بھی لگا گیا۔"

"اب ایسا نہ ہو کہ یہاں بھی کوئی فون ٹھیک کرنے والا آجائے یا میٹر ریڈر بن کے پہنچ جائے۔ منظر کی بیوی کو سمجھادو کہ گھر میں باہر کا کوئی آدمی نہ آئے۔ بجلی کی استری، ٹی وی، غسل خانے کا نل، کچن کا چولہا کچھ بھی خراب ہو، ابھی خراب رہنے دو۔"

"میں کہہ دوں گی اس کو۔ لیکن یہ تو بڑی تشویش ناک بات ہے۔" نازو نے کہا "کوئی رات کے وقت چوروں کی طرح اندر آکے بھی یہ کام کرسکتا ہے۔"

"ابھی کچھ دیر پہلے میں بال بال بچ گیا۔ میں پولیس ہیڈ آفس میں بیٹھا ہوا تھا۔ انہوں نے میری گاڑی کے نیچے مائکروفون لگادیا۔ یہ بہت عام اور سستی سی چیز ہے۔ کیا پتا دلاور نے درجن کے حساب سے منگوا کے انہیں فراہم کردی ہو۔ میں اور مولوی خادم حسین واپسی میں باتیں کرتے گئے اور پولیس ہمارے تعاقب میں رہی۔"

"تمہاری باتیں سُن لیں انہوں نے؟"

"باتیں کوئی خاص نہیں تھیں مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ میرا راز کھل گیا ہوگا۔ میں مولوی سے اردو میں باتیں کرتا رہا تھا۔ پولیس کے سامنے میں ظاہر کرتا تھا کہ میں تو پیدائشی فرنچ وکیل ہوں اور انگلش تک نہیں جانتا۔"

"کیا خادم کو پکڑلیا انہوں نے؟"

"خادم کو میں نے فرار کرادیا اور پولیس کو بھی روکے رکھا لیکن خادم کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کب تک روپوش رہ سکے گا۔ وہ پکڑا گیا تو پولیس اس سے ایک ایک بات پوچھ لے گی۔ میرا یہ فرنچ وکیل کا کردار اب نہیں چلے گا۔ میں نے خاصی مارپیٹ کی تھی پولیس کے ساتھ۔ وہ تو مجھے گرفتار کرلیں گے دیکھتے ہی۔ ادائے فرض میں مداخلت کا الزام تو کچھ بھی نہیں۔ میں ان کے ہتھے چڑھ گیا تو میری اصلیت ان پر ظاہر ہوجائے گی کہ میں تو سکندر بخت تھا۔ فرنچ وکیل کو غائب ہوجانا چاہیے اب۔"

"تمہارے غائب ہونے سے رابعہ اور منظر بھی مشکل میں پڑسکتے ہیں۔"

"کیوں۔ فرنچ وکیل کوئی دھوکے باز تھا۔ پولیس دھوکا کھاگئی تو رابعہ اور منظر کا کیا قصور۔ نہ مجھے رابعہ نے پناہ دے رکھی تھی اور

نہ میں منظر کے گھر میں رہتا تھا۔"

نازو بولی "انہوں نے تمہیں رابعہ کے آفس میں دیکھا تھا۔"

"میں تو ایس پی ظفر حیات کے آفس میں بھی نظر آیا تھا۔ اس سے ظفر حیات پر کیا الزام آسکتا ہے" میں نے کہا "اور یہ پولیس کا کام ہے کہ وہ اس جعلی فرنچ وکیل کو تلاش کرے۔ انہوں نے شناخت طلب کئے بغیر کیسے مان لیا تھا کہ وہ واقعی وکیل ہے اور ڈاکٹر شیلی مرڈر کیس میں اسے برطانیہ سے بھیجا گیا ہے۔ برٹش کونسلیٹ اس کے ساتھ آیا تھا ورنہ کونسلیٹ سے اس کو کسی قسم کی اتھارٹی لیٹر جاری ہوا۔ اس کا پاسپورٹ ویزا دیکھنا پولیس کا فرض تھا۔" میں اُٹھ کھڑا ہوا۔

"تم اب کہاں جاؤ گے؟"

"غالب میرے انتظار میں ہوگا" میں نے کہا "میں باہر کہیں سے رابعہ کو بھی فون کروں گا۔ تم ذرا احتیاط رہو۔"

"میں گیراج میں وہ لاکٹ تلاش کرتی ہوں۔"

"نہیں۔ ایک اور خیال آیا ہے مجھے۔" میں نے کہا "فرض کرو دلاور نے لاکٹ گلے سے اُتار کے گیراج میں پھینک دیا تھا۔ اس ڈر سے کہ کہیں وہ ہمارے قبضے میں نہ آجائے۔ اسے یہ اندازہ نہیں ہوگا کہ اتنی جلدی وہ شفٹ کردیا جائے گا۔ وہ سمجھ رہا ہوگا کہ سگنل ملتے ہی تلاش کرنے والے اس تک پہنچ جائیں گے۔ اب وہ بے بس ہے اور غالب کو بالکل خطرہ نہیں مگر خطرہ یہاں موجود ہے۔ ممکن ہے پولیس یہاں دھاوا بولے۔ تم ایک کیمرا لے کر تیار بیٹھو۔ اگر وہ آئے تو بڑی تیاری کے ساتھ آئیں گے اور اس یقین کے ساتھ گیراج کا گیٹ توڑدیں گے کہ دلاور اندر موجود ہے کیونکہ اندر سے سگنل وصول ہو رہا ہے۔ وہ کچھ بھی کریں۔ تم اپنا کام کرتی رہنا۔ تصویریں اُتارتی جانا۔ منظر کی بیوی سے کچھ نہیں ہوگا۔ کسی بچے کو باہر بھیج دینا۔ کسی طرف سے بھی نکال دینا۔ وہ پڑوس کے کسی گھر سے اخبار کے دفتر فون کردے اور اخبار والے گواہ بن کے آجائیں۔ انہیں پتا بھی نہ چلنے پائے۔ وہ ٹیلی فون کی لائن کاٹ دیں گے اور کسی کو باہر نہیں جانے دیں گے۔ ایک بچہ شاید نکل جائے۔"

"تم مجھے ڈرا رہے ہو۔"

"ڈرو گی تو کچھ نہیں ہوگا۔ پولیس والے بھی ڈرے ہوئے ہیں۔ کل جو کچھ ہوا اس کے بعد وہ اخبار والوں سے پنگا نہیں لیں گے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ جب دلاور گیراج میں نہ ملے تو وہ اندر گھس جائیں۔ خانہ تلاشی کا وارنٹ ضرور لائیں گے وہ اور مجسٹریٹ بھی ساتھ ہوگا۔ تمہاری حفاظت کا ذمّے دار خود وہ ہوگا تاہم رسک اپنی جگہ ہے کہ وہ خود تم سے کیمرا چھین کر توڑ ڈالے مگر اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں کریں گے اور پانچ منٹ میں اپنا کام کرکے چلے جائیں گے" میں نے کہا۔

"پانچ منٹ میں اخبار والے کیسے پہنچ سکتے ہیں۔"

میں نے سوچتے ہوئے کہا "انہیں اطلاع مل جائے۔۔۔ میں آکے دیکھ سکتے ہیں کہ پولیس نے ایک بہت بڑے وکیل کے گھر میں کیا کارروائی کی ہے۔ منظر کی بیوی ان کے سامنے دہائی دے سکتی ہے۔ ہنگامہ کرسکتی ہے کہ وہ سب لٹیرے تھے۔ سارا زیور اور نقد لے گئے۔ ان کے ہوش ٹھکانے آجائیں گے۔ آئندہ ایسی کارروائی کرنے سے پہلے سوچیں گے سو بار۔"

"ٹھیک ہے۔ تم جاؤ، میں کچھ کرتی ہوں۔" نازو نے کہا۔

میں باہر نکلا تو سورج غروب ہوچکا تھا اور اندھیرے کی چادر دم بہ دم گہری ہوتی جارہی تھی۔ تھوڑا سا پیدل چلنے کے بعد میں نے ایک ٹیکسی روک لی۔ اس وقت سوا سات بجے تھے۔ ساڑھے سات بجے میں پھر رابعہ کے پُرانے گھر کے سامنے تھا۔ دن میں ملبہ اُٹھانے والے مزدور اس وقت نہیں تھے اور نہ وہ ٹھیکے دار جس سے میری بات ہوئی تھی۔ اردگرد کی عمارتوں کے بیچ میں ایک رابعہ کے گھر کی خالی جگہ یوں لگتی تھی جیسے روشنیوں کے جزیروں میں کوئی تاریک خلا۔

خود میں نے عمداً روشنی میں نمایاں نظر آنے سے گریز کیا۔ میرے دل میں یہ خوف بیٹھا ہوا تھا کہ اب تک میرے ہاتھوں ناک آؤٹ ہونے والا ڈی ایس پی شاہد علی بھی ہوش میں آگیا ہوگا اور شاید اپنے پاگل پن میں وہ میرے قتل کے درپے ہوگا۔ انسپکٹر نے مولوی خادم حسین کی گرفتاری میں ناکامی کے بعد اپنے افسرِ اعلیٰ کی پٹائی کا منظر دیکھا ہوگا اور اسے پتا چلا ہوگا کہ ولایتی وکیل بھی نکل گیا تو وہ بھی کم مشتعل نہیں ہوگا۔ وائرلیس پر انہوں نے سب کو مطلع کردیا ہوگا کہ وکیل جہاں نظر آئے، اسے گرفتار کرلیا جائے۔ کسی غیر ملکی پر ملکی قوانین کے تحت مقدمہ چلایا جاسکتا ہے یا اسے سفارت خانے کی تحویل میں دینا ضروری ہے۔ یہ سب بعد میں دیکھا جائے گا۔ ایک رات اسے اپنا مہمان رکھ کے یہ تو سمجھا دیں کہ یہاں پولیس پر ہاتھ اُٹھانے کا مطلب کیا ہوتا ہے۔

میں غالب کی تلاش میں ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ ایک بچہ میرے قریب آیا۔ اسے پہچان کے میں بھونچکا رہ گیا۔ یہ منظر کا چوتھا یا پانچواں لختِ جگر تھا۔ صحیح ترتیب کے ساتھ ان سب کے نام اور عمریں یاد رکھنا مشکل کام تھا۔

اس نے قریب آکے مجھ سے کہا "انکل، آپ کو انکل بلا رہے ہیں۔"

میں نے سوچا کہ اس سے نام پوچھوں کہ وہ رشید ہے یا سعید، اس طرح یہ ظاہر ہو تا کہ میں اسے پہچانتا ہوں۔

"کون انکل؟" میں نے پوچھا۔

"انکل غالب۔" اس نے کہا "میرے ساتھ آئیں۔"

مجھے خوشی سی ہوئی اس کی جرأت اور ذہانت پر مگر افسوس بھی ہوا کہ غالب نے اس خطرناک کام میں ایک بچے کو بلاوجہ شریک کرلیا۔ وہ آگے آگے چلتا ہوا مجھے پچھلی طرف ایک گلی میں لے گیا۔ وہاں غالب ایک عجیب سی گاڑی میں بیٹھا ہوا تھا جو مسافروں سے زیادہ باربرداری کے کام آتی ہوگی۔

"مگر بہت سے لوگوں نے دیکھی ہوگی۔ اب تم یہ باکس اُٹھاؤ میرے ساتھ مل کے۔ دلاور کو اس کے مدفن میں لے چلیں۔ چار چھ مزدور پکڑلاؤ۔"

میں نے کہا "یار اتنا بڑا بکس یہ نیچے کیسے جائے گا۔"

غالب بولا "تہ خانے کا زینہ میں نے دریافت کرلیا تھا۔ مزدوروں نے راستہ بھی بنادیا ہے مگر یہ ٹھیک ہے کہ بکس اس میں سے نہیں اُتر سکتا۔ بکس کو ہم عین اس جگہ تک لے جائیں گے تاکہ شک کسی کو نہ ہو۔ وہاں بھی دلاور کو باکس میں سے نکالیں گے تو کوئی ضرور دیکھے گا۔ ہم میں سے ایک نیچے اُتر جائے گا اور دوسرا دلاور کو اوپر سے لٹکادے گا۔ رات کو یہ باکس شگاف کے اوپر رہے گا تاکہ کتے بلیاں اندر نہ آئیں۔"

"ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آیا کہ دلاور کو صندوق سے نکالے بغیر شگاف میں سے نیچے کیسے لٹکایا جائے گا۔" میں نے کہا۔

"سمجھ میں آجائے گا۔ باکس کے پیندے میں دو فٹ بائی دو فٹ کا ایک تختہ ہے جو پیچ لگا کے فٹ کیا گیا تھا اور دو منٹ میں پیچ کھول کے ہٹایا جاسکتا ہے۔ یہ حصہ عین فرش کے شگاف پر آئے گا۔ تم باکس کے اندر رہتے ہوئے دلاور کو نیچے لٹکا سکتے ہو۔ اوپر سے باکس بند رہے گا۔ خود ہم باہر نکلیں گے تو تختہ پھر فٹ کردیں گے اور صندوق کا ڈھکن کھول کے باہر آجائیں گے۔ یہ باکس کوئی اُٹھا کے نہیں لے جاسکتا۔ دن میں وہیں پڑا رہے گا۔ کوئی کھول کے دیکھتا ہے تو دیکھے۔ اسے خالی صندوق کے سوا کچھ نظر نہیں آئے گا۔"

میں نے کہا "آئیڈیا تو اچھا ہے لیکن آپ کے دماغ میں آیا کیسے؟"

"ویسے تو اچھوتے خیالات قابلِ رشک نظریات اور عظیم منصوبوں نے ہمیشہ اس ناچیز کے دماغ میں جنم لیا ہے لیکن یہ خیال باکس دیکھ کے آیا تھا۔ مسئلہ تھا دلاور کو کہیں رکھنے کا۔ یہ باکس اتنا بڑا تھا کہ اسے ہم میانی صاحب کے قبرستان کی دیوار کے ساتھ رکھ دیتے تو دلاور اس میں دو چار دن گزار لیتا۔ ہم رات کو اس سے ملاقات کرسکتے تھے۔ اسے سارا دن سُلائے رکھنا اور باندھ کے اندر لٹائے رکھنا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ میں نے دو سو میں باکس لے لیا۔ اس باکس کو یہاں رکھنے کا خیال مجھے اندر جھانکنے کے بعد آیا جب میں نے پیچھے دو فٹ چوڑا دو فٹ لمبا چوکور تختہ الگ دیکھا۔ معلوم نہیں اسے کس مقصد کے لیے بنایا گیا تھا؟"

میں نے کہا "اب یہ کہا جاسکتا ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دُہرا رہی ہے۔ ممکن ہے پہلے بھی کسی چوہدری دلاور کو اس میں ایسے ہی لایا گیا ہو لیکن مرزا جی، کیا تم یہ باکس منظر کے گھر لے گئے تھے؟"

"نہیں یار۔ وہاں سے تو دلاور کو ٹیکسی میں لایا تھا۔ اس وقت وہ بالکل ہوش میں نہیں تھا۔ ایک گودام کے احاطے کے باہر یہ

"یہ کیا حرکت ہے؟" میں نے کہا "اس بچے کو بھیجنا ضروری تھا؟"

"بھئی ہم خود سامنے آنا نہیں چاہتے تھے۔"

"کیا منظر کی بیوی کو معلوم ہے کہ اس کا ایک بچہ گھر میں نہیں ہے۔"

"منظر کا بچہ۔ تمہارا دماغ تو ٹھکانے ہے دوست۔ میں پاگل نہیں ہوں کہ منظر کے بچوں کو ساتھ لے کر پھروں۔"

"پھر یہ کون تھا۔ رشید یا سعید نہیں تھا؟"

غالب ہنس پڑا "یار اسے تو میں نے پانچ روپے دیے تھے۔ یہیں کھیل رہا تھا۔"

میں نے خفت سے کہا "کمال ہے۔ منظر کے ایک بچے سے کتنا ملتا تھا۔"

"اس کے سولہ بچے ہیں۔ کسی نہ کسی سے ہر بچہ مل جائے گا۔" غالب نے کہا "تم نے سارا دن کہاں جھک ماری آج؟"

"جھک نہیں ماری۔ ایک ڈی ایس پی کو مارا ورنہ مولوی خادم حسین مارا جاتا۔ اسے بچایا تو خود مارا گیا۔۔۔ باقی سب بھی مارے جاتے آج بیٹا۔ قسمت نے بچالیا۔ یہ صرف سُرخیاں ہیں۔ پوری خبر بعد میں۔۔۔ یہ بتاؤ دلاور کہاں ہے؟"

غالب نے پیچھے اشارہ کیا "میرے ساتھ۔"

"اس باکس میں؟ زندہ بھی ہے کہ مرگیا؟" میں نے اس گاڑی کے پچھلے حصے میں رکھے ہوئے باکس کو دیکھا "کہاں سے لیا یہ باکس اور یہ گاڑی کس کی ہے؟"

"ایک کباڑیے کی۔ اس نے کار کی باڈی پر بنائی تھی۔ سامان ڈھونے کے لیے۔" غالب بولا "بڑی مشکل سے مجھے دینے پر راضی ہوا۔ یہ باکس اسی سے خریدا تھا۔ میں نے کہا کہ آخر اسے میں کیسے لے جاؤں؟ ویسے تو وہ خود ہی چلاتا ہے اس عجوبۂ روزگار گاڑی کو۔ آج وہ کچھ علیل تھا بلکہ بدہضمی کے باعث صاحب فراش تھا۔ ڈرائیونگ نہیں کرسکتا تھا۔ میں نے کہا کہ تم بیٹھو میرے ساتھ۔ میں باکس گھر پر چھوڑ کے تمہیں واپس کباڑ خانے چھوڑ دوں گا۔ وہ مان گیا مگر آدھے راستے میں اسے اُترنا پڑا۔ بہت مجبور ہوگیا تھا۔ کہنے لگا کہ میں ابھی آیا ایک منٹ میں۔ تم یہیں ٹھہرنا۔ میں نے وعدہ کیا اور اس کے غائب ہوتے ہی بھاگ آیا۔"

مجھے ہنسی آگئی "وہ کہاں غائب ہوگیا تھا۔"

"ہے ایک جگہ۔ کارپوریشن کے زیرِ انتظام۔" غالب بولا "اسی لیے تو میں سڑک پر نہیں آیا۔ وہ اپنی گاڑی کو تلاش کر رہا ہوگا اور گاڑی ایسی ہے کہ شاید سارے شہر میں ایک ہی ہوگی۔ لوگ دیکھ چکے ہوں گے۔"

"میں نے تو کبھی نہیں دیکھی پہلے۔"

گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ جب ٹیکسی چلی گئی تو میں نے دلاور کو اس میں ڈالا اور یہاں آگیا اور انتظار تھا تمہارا۔"

"اتنا تردد بے سبب کیا تم نے۔ ہم دلاور کو قید میں نہیں رکھنا چاہتے۔" میں نے کہا "اسے پولیس کے حوالے کرنا چاہتے ہیں۔"

"کل یہی ہوگا۔ مگر ایسے کہ صورتِ حال ڈرامائی ہوگی اور پولیس دلاور کو یہاں سے برآمد کرے گی تو تماشائی بھی بہت ہوں گے اور گواہ بھی۔ تم جا کے مزدور لاؤ۔"

چھ مزدوروں نے ہانپتے ہوئے اس باکس کو رابعہ کے گھر کے کھنڈر میں عین اس جگہ پہنچا دیا جہاں فرش کے ایک شگاف میں صرف تاریکی نظر آتی تھی۔ جتنی دیر میں غالب اس مضحکہ خیز گاڑی کو ریلوے اسٹیشن گودام پر چھوڑ کے آیا میں نے دیگر انتظامات کیے اور اس جگہ کی نگرانی کی۔ لوگ دن میں وہاں مزدوروں کو کام کرتا دیکھ چکے تھے۔ اب مزدوروں کو ایک باکس وہاں رکھتے دیکھ کر کسی نے غیر معمولی تجسس کا اظہار نہیں کیا۔ شاید دیکھنے والوں نے یہی سمجھا کہ اس میں تعمیراتی سامان ہوگا یا مشینری۔ سڑک کے پار سے اندھیرے میں ساری کارروائی کسی کے لیے اتنی دلچسپی کا باعث نہیں بنی کہ وہ قریب آ کے مجھ سے کچھ پوچھتا۔

غالب آدھے گھنٹے میں لوٹ آیا۔ اس کے پاس رسّی' ٹارچ' موم بتی اور پیچ کس سب تھے۔ اس نے باکس کا ڈھکنا اُٹھایا اور اندر غائب ہوگیا۔ دس منٹ بعد اس نے باکس کا سائڈ بجا کے مجھے اندر تشریف لانے کا سگنل دیا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ کوئی بھی میری طرف متوجہ نہیں تھا۔ میں نے ڈھکنا اٹھایا اور باکس میں اُتر گیا۔ یہ تقریباً چھ فٹ لمبا چار فٹ چوڑا اور پانچ فٹ اونچا باکس تھا۔ اس میں بیک وقت دو افراد کا سمانا آسان نہ تھا مگر غالب تختہ ہٹا کے شگاف میں اُتر چکا تھا۔ باکس میں دلاور کسی لاش کی طرح بندھا پڑا تھا۔ اس کے ہاتھ اور پاؤں جسم کے ساتھ ملا کے ایک ہی رسّی سے باندھ دیے گئے تھے۔ میں نے خاصی دشواری سے اپنے سر کو نیچا رکھتے ہوئے دلاور کو شگاف سے گزارا۔ اس طرح کہ پہلے اس کے پاؤں نیچے گئے۔ پھر وہ پھانسی کے پھندے سے لٹکنے والی لاش کی طرح جھولنے لگا۔ غالب نے اسے نیچے سے تھام لیا تو میں نے رسّی چھوڑ دی اور ایک گہرا سانس لیا۔ میرے ہاتھ اس بوجھ کو بڑی مشکل سے سنبھال پائے تھے۔ رسّی میری ہتھیلی میں گڑ گئی تھی اور بازو شل ہونے لگے تھے۔

خود نیچے اُترنے کے بعد میں نے باکس کے تختے کو برابر کیا اور موم بتی کی روشنی میں تہ خانے کو دیکھا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا اور وہی تھا۔ آرام و آسائش کے سب اسباب اپنی جگہ تھے۔ بیڈ قالین اور پردے دھول میں اٹے ہوئے تھے۔ ریڈیو گرام پر' ریکارڈوں پر اور کتابوں پر بھی گرد و غبار تھا۔ یہ سب سامان دلبستگی میرے لیے فراہم کیا گیا تھا مگر آج یہ آسیب زدہ جگہ مجھے کسی فرعون کے مدفن کی طرح لگ رہی تھی۔ اہرامِ مصر جب کھودے گئے تھے تو حنوط شدہ لاشوں کے ساتھ دنیاوی مال و متاع کے انبار نکلے تھے۔ اپنی زندگی عیش و عشرت سے گزارنے والے مرنے کے بعد یہ سب ساتھ لے گئے تھے تاکہ دوسری دنیا کی زندگی بھی پُر آسائش رہے مگر لوگوں نے اہرام کھود کے سب نکال لیا اور خود فرعون کی ممّی کو میوزیم میں تماشائے عبرت بنا کے رکھ دیا۔ پہلے یہ تہ خانہ ائرکنڈیشنڈ تھا اور یہاں خوابناک روشنیاں جھلملاتی تھیں۔ اب یہاں حبس تھا اور تعفن تھا۔ اندھیرا تھا اور ایک وحشت ناک خاموشی تھی۔ موم بتی کی مدھم روشنی نے ماحول کو زیادہ ڈراؤنا بنا دیا تھا۔ غالب نے دلاور کی رسّیاں کھول دیں۔ "چلو اب ہم چلیں۔ آج رات دلاور کو یہاں آرام کرنے دو۔" غالب نے کھانے پینے کی چیزوں کا ایک لفافہ اور پانی کی ایک بوتل اس کے پاس رکھ دی "اس پر و ـلیم کے انجکشن کا اثر ہے۔ صبح تک یہ اثر ختم ہو جائے گا۔"

"رات کو یہ ہنگامہ نہیں کرے گا۔"

"کرنے دو ہنگامہ چوہدری صاحب کو۔ ان کی سُننے والا کون ہوگا۔ یہ جتنی زور سے چاہے چلاّلے۔ اس کی آواز باہر نہیں جاسکتی۔"

"یہ خود تو باہر جاسکتا ہے۔"

"کیسے؟ اسے کیا معلوم کہ اوپر شگاف پر کوئی باکس رکھا ہوا ہے۔ ہم جاتے وقت تختہ کس جائیں گے۔" غالب نے کہا "یہ نیچے سے اس کو توڑ بھی نہیں سکتا۔ یہاں ایسی کوئی چیز نہیں ہے۔ آدھی رات گزر جانے کے بعد اسے ہوش آنے لگے گا۔ آہستہ آہستہ' صبح تک یہ اُٹھ کر بیٹھنے کے قابل ہو جائے گا۔ شاید کھڑا بھی ہو سکے مگر اس میں اتنی طاقت نہیں ہوگی کہ اس زندان کی دیواریں توڑ کے نکل جائے۔ کچھ کھا پی کے اس کی حالت یقیناً بہتر ہو جائے گی۔ یہ سوچنے کے قابل بھی ہوگا مگر کچھ کرنے کے قابل نہیں ہوگا۔ موم بتی تھوڑی دیر میں گل ہو جائے گی۔ پھر یہ ٹارچ جلتی رہے گی۔ آہستہ آہستہ اس کے سیل ختم ہوں گے مگر صبح تک تھوڑی بہت روشنی رہے گی۔ شاید اسے اندازہ ہو جائے گا کہ یہ کہاں ہے۔ پھر یہ تنہائی اور بے بسی کی پُر اذیت موت کا تصور کرے گا۔ بھوکے پیاسے ایک تہ خانے میں تڑپ تڑپ کر جان دینے کا خیال اسے پاگل کر دے گا۔ یہ چیخے گا' مدد کے لیے چلاّئے گا مگر اس کی آواز صرف یہ دیواریں سنیں گی۔"

مجھے غالب کی باتیں سن کے دلی طمانیت حاصل ہو رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کاش یہ ممکن ہوتا کہ دلاور اسی تہ خانے میں اتنے ہی عذاب کے ساتھ مر جاتا۔ مگر یہ میرے انتقامی جذبات کا ردِ عمل تھا۔ عقل صرف اندیشوں کا شکار تھی۔

"اگر یہ کسی طرح نکل گیا۔ کوئی اس کی آواز پر پہنچ گیا' پھر؟"

غالب نے نفی میں سہلایا "آج رات کو اس کا امکان ایک فیصد بھی نہیں' صبح میں خود یہاں آجاؤں گا۔ اس باکس پر بیٹھ کے ملبہ ہٹانے کے کام کی نگرانی کروں گا۔ کوئی آواز سُنوں گا تو سب سے گرفتار نہیں کیا تھا تو اس کی کیا وجہ ہے؟ ایس پی ظفر حیات اور شاہد علی ڈی ایس پی کا پہلا کام تو یہی تھا کہ شیلی مرڈر کیس میں نامزد ملزم کو گرفتار کریں۔"

"کیا انہیں معلوم ہے کہ ان کی تصویریں اُتاری گئی ہیں؟"

"نہیں۔ ابھی تک وہ دلاور کے اغوا کو راز رکھے ہوئے ہیں۔ اس کی تلاش خاموشی سے جاری ہے۔ وہ خاصے مطمئن ہیں اپنی کارکردگی سے۔"

میں نے کہا "میرا بھی یہی خیال ہے۔ آج ایس پی ظفر حیات سے باتوں کے دوران بہت سے انکشافات ہوئے۔ رابعہ اور منظر کی گاڑیوں کو بگ BUG کیا گیا تھا اور وقار یوسف کے گھر کو بھی۔ میں نے سب کو خبردار کر دیا تھا۔"

"رابعہ کے آفس میں تو مائکروفون مل گیا تھا" غالب نے کہا "چھوٹی جگہ تھی۔ وقار یوسف کے گھر میں ذرا مشکل سے ملے۔"

میں نے کہا "یہ کام انہوں نے خود آسان کر دیا ہے۔ خفیہ مائکروفون ٹیلی فون سیٹ میں ہوگا۔ ایک جعلی لائن مین گھر پہنچا تھا یہ پوچھنے کے لیے کہ کیا فون ڈیڈ ہے۔ فون ٹھیک تھا مگر وقار کی بیوی نے چیک کیا تو خراب نکلا اسے وہ ٹھیک کر گیا مگر اس بہانے اپنا کام بھی کر گیا۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"شام کو نازو نے پہلے وقار کی بیوی سے بات کی تھی۔ پھر مجھے بتایا تھا" میں نے کہا "تم دفتر میں اپنی گاڑی کو بھی نیچے سے چیک کر لینا' مجھے شک ہے کہ اس میں بھی خفیہ مائکروفون ہے۔"

"کیا تمہارا پیچھا کیا تھا کسی نے؟"

میں نے اسے خادم حسین کے اغوا کی ناکام کوشش کے بارے میں بتا دیا "ڈی ایس پی شاہد علی تو میری جان کا دشمن ہو رہا ہوگا۔ تم معلوم کرو کہ ریسٹورنٹ کے واقعے کی رپورٹ کیا ہے۔ کسی طرح یہ بھی پوچھو کہ وہاں پولیس کیسے پہنچی تھی۔ کسی نے مخبری کی تھی۔ انہوں نے گاڑی کا پیچھا کیا تھا یا گاڑی سے نشر ہونے والے سگنل کے ذریعے۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

میں نے کہا "اگر پولیس والوں نے میری باتیں سُنی ہیں پھر تو مجھے فرنچ وکیل والا کردار ختم کرنا پڑے گا اور ایسا نہیں ہے تو پھر مجھے ضمانت قبل از گرفتاری کی فکر کرنی چاہیے۔"

"رات کو تم رابعہ کے دفتر میں ہی ہو گے؟"

"اور کہاں جاسکتا ہوں میں" میں نے کہا "تم رابعہ سے بھی بات کر کے مجھے بتانا۔"

میں اور غالب اپنے اپنے راستے پر روانہ ہوئے۔ رات بھر کے لیے آفس بلڈنگ میں بند ہونے سے پہلے میں نے بیڈن روڈ پر کھانا کھایا اور دس بجے ٹہلتا ہوا رابعہ کے آفس پہنچا تو دروازہ کُھلا ہوا تھا۔ اصل چوکیدار مجھے اپنی جگہ چھوڑ کے غیر سرکاری چھٹی پر پہلے ہی۔ تیسرے پہر چوہدری دلاور کو پولیس اس تہ خانے سے نکالے گی۔"

میں اور غالب باہر آئے تو رات کا آخری شو بھی شروع ہو چکا تھا اور کراؤن سنیما کے آس پاس رونق خاصی کم تھی۔

غالب نے کہا "میری گاڑی۔۔۔ میرا مطلب ہے وہ گاڑی کہاں ہے جو تمہارے پاس تھی؟"

میں نے اسے بتا دیا "تمہارے آفس کے باہر موجود ہے۔ چابیاں میں نیچے گارڈ کو دے آیا تھا۔ تم آفس جاؤ گے؟"

"ہاں۔ دیکھنا ہے کہ پولیس نے گزشتہ روز کی واردات کے بارے میں کیا پریس نوٹ جاری کیا ہے؟"

"تم کیا خبر لگا رہے ہو۔ اسٹاف رپورٹر کے حوالے سے؟"

"ظاہر ہے' پولیس تو تھانے سے دلاور کے اغوا کی خبر چھپائے گی۔ دلاور فی الحال ایک مفرور اور مطلوب مجرم ہے۔ وہ تھانے میں کیسے آیا اور آیا تو فرار کیسے ہو گیا؟ اغوا ہوا تو کس نے کیا اور سارے تھانے والے اغوا کرنے والوں کو نہیں روک سکے؟ ایسی خبر سے تو پورا تھانہ معطل ہو سکتا ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہ کہیں گے کہ گزشتہ رات نامعلوم شرپسندوں نے تھانے پر فائرنگ کی اور ایک زیرِ حراست مجرم کو چھڑانے کی کوشش کی جسے تھانے والوں نے ناکام بنا دیا۔ ہم تصویریں شائع کر رہے ہیں جن میں چوہدری دلاور اپنے اصل حُلیے میں ایس پی ظفر حیات' ڈی ایس پی شاہد علی اور ایس ایچ او کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے اور ان کی یہ میٹنگ بڑے دوستانہ ماحول میں ہو رہی ہے۔ تھانے کی میز پر چائے کے برتن بھی رکھے ہوئے ہیں۔"

"کیا تم نے پرنٹ دیکھے ہیں؟"

"میں نے تو نہیں دیکھے مگر کرائم رپورٹر نے مجھے بتایا تھا۔ اسے تو مفت میں اتنی زبردست اسٹوری مل گئی ہے۔"

"کرائم رپورٹر تو تم بھی ہو۔"

"میں کورٹ رپورٹنگ کرتا ہوں۔ میرا اور کرائم رپورٹر کا کام تقریباً ایک ہے۔ ہم مل جل کے کرتے ہیں۔ عام خبریں تو سب اخبار والے پول POOL کر لیتے ہیں یعنی شہر میں دس تقریبات ہیں تو ہر جگہ ایک رپورٹر پہنچ جاتا ہے۔ پھر تمام تقریبات کی رپورٹ اور خبریں آپس میں تبادلہ کر لیتے ہیں مگر کچھ خصوصی یعنی EXCLUSIVE اسٹوری ہوتی ہیں جو کوئی رپورٹر خود تلاش کر کے لاتا ہے۔ ہر اخبار کی ساکھ ایسی ہی خصوصی خبروں سے قائم ہوتی ہے۔ تم دیکھنا ہماری رپورٹ کے شائع ہوتے ہی یہ ٹیم بدل جائے گی جو اس وقت ڈاکٹر شیلی کے قتل کی تفتیش کر رہی ہے۔"

"یہ تو کوئی سزا نہ ہوئی۔"

"سزا دینا محکمہ جاتی کارروائی ہے۔ اوپر والے جو چاہیں کریں۔ وہ پوچھیں گے ضرور کہ دلاور تھانے میں کیسے آیا تھا۔ تم نے گرفتار کیا تھا تو اس کا اندراج روزنامچے میں کیوں نہیں ہے اور

گیا ہوا تھا اور نیا چوکیدار یعنی میں غائب تھا۔ آفس سے رخصت ہوتے وقت کسی نے بھی گیٹ کو لاک نہیں کیا تھا۔ ہر شخص نے فرض کرلیا ہوگا کہ چوکیدار یہ کام خود کرے گا۔ وہ سامنے نہیں تو کیا' آس پاس ہی کہیں ہوگا۔ میں نے گیٹ کو مقفل کیا اور اوپر جاکے اپنا لباس اور میک اپ بدلا۔ چوکیدار بن جانے کے بعد یہ ضروری تھا کہ میں گیٹ پر جاکے بستر بچھاؤں' تھکن سے میرا اتنا برا حال تھا کہ میں آفس میں آرام سے سونا چاہتا تھا' مسئلہ صبح آنے والوں کا تھا۔ صفائی کرنے والا عملہ طلوع آفتاب سے قبل ہی آجاتا تھا۔ میں اوپر سوجاتا تو وہ نیچے چلاتے رہتے اور مجھے پتا نہ چلتا۔

مجھے غالب کے فون کا بھی انتظار تھا اور میں رابعہ کی خیریت معلوم کرنا چاہتا تھا۔ میں نے چائے بناکے پی اور ایک چکر نیچے کا لگایا۔ میں لوٹ کے آیا تو فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔

غالب نے کہا "کیا سوگئے تھے؟"

"نہیں۔ میں چوکیدار ہوں بھائی' گشت پر تھا۔"

"میں نے گاڑی کو چیک کرلیا ہے۔ اس میں مجھے کوئی ایسا آلہ نظر نہیں آیا جسے خفیہ مائکروفون سمجھا جاسکے۔"

میں نے کہا "کہاں کہاں دیکھا تھا؟"

"ڈیش بورڈ پر' گاڑی کے نیچے۔ انجن میں۔"

میں نے کہا "اتنی جلدی کیسے دیکھ لیا۔ خفیہ مائکروفون تو بہت چھوٹی سی چیز ہوتی ہے۔ پولیس ہیڈ آفس کے باہر گاڑی دو گھنٹے کھڑی رہی تھی۔ انہیں اطمینان سے کام کرنے کے لیے کافی وقت مل گیا تھا۔"

"یار میں نے الیکٹرانک چیک بھی کرالیا ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"ہمارا ریڈیو مانیٹر ایک پاگل ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے کوئی جینیئس" میں نے کہا۔

"یہی سمجھ لو۔ اسے دنیا بھر کے ریڈیو اسٹیشن کی نشریات سننے کے علاوہ پورے نشریاتی نظام سے دلچسپی ہے۔ پتا نہیں کیا کرتا رہتا ہے ان چیزوں کے ساتھ۔ مجھے تو کچھ سمجھ آتی نہیں۔ اس کی HOBBY ہے۔ اس نے کسی آلے سے چیکنگ کی تھی۔ کہہ رہا تھا کہ کہیں سے بھی سگنل نشر ہوگا تو گرین لائٹ آن ہوجائے گی۔ ایک بینڈ کا عام ریڈیو ہے۔ اسی میں کچھ اختراع کی ہے۔"

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ تم وہ چیز لے لو اس سے۔"

غالب بولا "تمہارے کہنے سے پہلے لے لی ہے۔"

میں نے کہا "ڈی ایس پی شاہد علی سے بات ہوئی؟"

"ہاں۔ وہ خود مجھے دوبار فون کرچکا تھا۔ رابعہ سے بھی بات کی تھی اس نے مگر رابعہ نے ٹال دیا کہ مجھے کچھ معلوم نہیں' وہ فرنچ وکیل کہاں ہے اور کیا کررہا ہے؟"

"تم سے کیا چاہتا تھا؟"

"پریشان تھا کہ آج ہم ایک مجرم کو گرفتار کرنے گئے تھے۔ وہاں وہ فرنچ وکیل اور اس کا مولوی خادم حسین یہ سمجھے کہ ہم انہیں پکڑنے آئے ہیں۔ وہ بلاوجہ وہاں سے فرار ہوئے اور اس کی وجہ سے ریسٹورنٹ میں لوگوں کو کچھ غلط فہمی ہوگئی۔"

"اس نے مارپیٹ کا ذکر نہیں کیا؟"

"نہیں۔ غالباً ظفر حیات کا دباؤ ہے کہ جیسے بھی ہو اس غیر ملکی وکیل سے معذرت کرو۔ آخر یہ غلط فہمی کیوں ہوئی اسے۔ تم نے ضرور ایسی کوئی حرکت کی ہوگی۔ ایس ایس پی نے کہا ہے کہ اس معاملے میں کوئی شکایت ملی تو میں تم کو معطل کرنے پر مجبور ہوجاؤں گا۔"

میں نے ہنس کے کہا "چلو اب تم میری طرف سے اس کو بتادو کہ مجھے کوئی شکایت نہیں۔ یہ تو اچھی خبر ہے میرے لیے کہ ابھی میرا فرنچ وکیل کا کردار چل سکتا ہے۔"

"کل کے ڈرامے کی تصویریں میں نے دیکھ لی ہیں۔ تم صبح کے اخبار میں ملاحظہ کرنا۔ دل خوش ہوجائے گا۔"

"ایسی کیا بات ہے آخر؟"

غالب نے کہا "کھڑکی کے عین سامنے کیلنڈر تھا۔ نازو نے تصویریں اُتاریں تو نیل کیلنڈر کی تاریخ آگئی اور اس سال کا کیلنڈر تو بالکل صاف ہے۔"

میں نے کہا "رابعہ اور منظر سے بات ہوئی؟"

"ہاں۔ تمہارا پیغام جو مولوی خادم حسین نے وقار یوسف کو دیا تھا بڑا ڈرانے والا تھا۔ وہ دونوں پریشان ہوگئے تھے۔"

"مولوی خادم حسین نے ایسی کیا بات کہہ دی تھی؟"

"اس نے کہا تھا کہ آج آپ لوگ گاڑی استعمال نہ کریں۔ خطرہ ہے۔ وہ سمجھے کہ شاید کسی نے گاڑی میں بم وغیرہ نصب کرادیا ہوگا۔ انہوں نے پولیس کو اطلاع دی۔ بم ڈسپوزل والے آگئے۔ انہوں نے گاڑی اپنی تحویل میں لے کر چیک کی مگر ملا کچھ نہیں۔ میرا مطلب ہے بم تو نہیں ملا مگر وہ خفیہ مائکروفون برآمد ہوگئے جو گاڑی کے فرش پر نیچے چپکے ہوئے تھے۔ کورٹ کے احاطے میں خاصی سنسنی پھیلی تھی لیکن اب خطرے کی کوئی بات نہیں رہی۔"

"یہ حرکت دوبارہ بھی کی جاسکتی ہے۔ ہم سب کو محتاط رہنے کی ضرورت ہوگی" میں نے کہا۔

"منظر نے مجھے بتایا ہے کہ پولیس دلاور کو تلاش کرتی ہوئی اس کے گھر پہنچی تھی۔ انہوں نے دلاور کا نام تو نہیں لیا۔ یہ کہا کہ ہم سکندر بخت کو گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔ ہماری اطلاع کے مطابق وہ یہاں روپوش ہے۔ ان کے پاس وارنٹ تھا۔ مجسٹریٹ اور لیڈی سرچر سب آئے تھے۔ حیرانی کی بات یہ ہے کہ وہ صرف گیراج میں دیکھ کے چلے گئے۔"

"اس کا مطلب ہے وہ لاکٹ... دلاور کی موجودگی کی خبر دے رہا تھا۔ خاصے مایوس ہوئے ہوں گے پولیس والے کہ صرف لاکٹ ملا۔ دلاور نہیں۔ بے وقوف لوگ ذرا اندر بھی جھانک لیتے۔"

"وہ منظر اور رابعہ کی وجہ سے بہت محتاط بلکہ ڈرے ہوئے تھے۔"

جب میں نیچے بستر بچھا کے لیٹا تو مجھے دلاور کا خیال آیا۔ اس زیرِ زمین ویران اور آسیب زدہ کمرے کے فرش پر وہ خود کو اکیلا پاکے کیا محسوس کرے گا؟ ابھی سب کچھ اس کے پاس ہے۔ اس کی دولت کا غرور۔ بدمعاشی کی طاقت' حکم کے غلاموں کی فوج' کرائے کے قاتلوں اور زر خرید شکاری کتوں کے غول۔ ایک بدعنوان راشی اور بے ضمیر بیوروکریسی کے بااثر ارکان کی حمایت اور کرپٹ انتظامیہ سے گٹھ جوڑ' اثر ورسوخ۔ مگر اس کے باوجود وہ چوہے دان میں پکڑے جانے والے چوہے سے زیادہ بے بس ہے۔ یہ زندان خود اس نے تعمیر کیا تھا جو اسے اپنا مدفن لگے گا۔ ہوش میں آنے کے بعد اسے یہ کہاوت ضرور یاد آئے گی کہ جو دوسروں کے لیے گڑھا کھودتا ہے' خود اس میں گرتا ہے۔ لو آپ اپنے دام میں صیاد آگیا۔ ایک ہی بات ہے۔ وہ کتنا دہشت زدہ ہوگا اس احساس سے کہ اس شہر میں جہاں اسے کسی چیز کی کمی نہیں' جہاں وہ زمین پر اکڑ کے چلتا تھا۔ جہاں اس کی ہیبت قائم تھی۔ اسے اَن داتا جان کے سلام کرنے والے سیکڑوں تھے۔ اس کی دسترس میں تمام وسائل تھے۔ وہ ہر چیز کو' ہر انسان کو اور ہر نظام کو خریدنے کی سکت رکھتا تھا۔ وہاں آج وہ اتنا اکیلا ہوگیا ہے کہ کوئی اس کی سننے والا نہیں رہا۔ صرف چند فٹ اوپر وہ شہر آباد ہے جس میں چوہدری دلاور ایک طاقت کا نام تھا۔ اس کی مافیا میں سب شامل تھے۔ قانون کی دھجیاں بکھیرنے کا حوصلہ رکھنے والے بھی' قانون کے علمبردار بھی۔ قانون کے رکھوالے بھی۔ قانون سے کھیلنے والے بھی اور قانون کو تماشا بنانے والے بھی۔ مگر کوئی اس کی مدد کے لیے نہیں آئے گا۔ کسی کو پتا ہی نہیں چلے گا کہ اسی زمین پر جہاں وہ ہر طرف چوہدری دلاور کی تلاش میں دن رات ایک کررہے ہیں' ایک کھنڈر کے نیچے دلاور موجود ہے اور ابھی زندہ ہے۔ وہ ہر سمت میں دیکھ رہے ہوں گے مگر اس چھٹی سمت کو بھولے ہوئے ہوں گے۔ وہ مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک چوہدری دلاور کو ڈھونڈیں گے۔ پانچویں سمت افق کی انتہا ہے مگر عالم ارواح کی جانب کوئی اس اُمید میں نہیں دیکھتا کہ وہاں جانے والا لوٹ کے نہیں آسکتا ہے۔ ہاں نیچے زمین کی گہرائی میں پاتال تک چھٹی سمت ہے ادھر تو کوئی دیکھے' کسی کو تو خیال آئے اس مدفن کا بھی۔ مگر یہ ناممکن ہے۔

چوہدری دلاور اگر وہاں ایڑیاں رگڑ رگڑ کے مرجاتا تو مجھے کیا حاصل ہوتا؟ اسے مارنا تو ہر وقت ممکن تھا مگر میرا مقصد تو کچھ اور تھا۔ میں اس سے اپنا حق وصول کرنا چاہتا تھا اور اس کو انصاف کے تقاضوں کے مطابق ان تمام جرائم کی سزا دلوانا چاہتا تھا جو اس کے نامۂ اعمال میں درج تھے۔ اس نے پہلے میرے باپ کو ذلت ورسوائی دی اور پھر بڑا عذاب دے کر مارا تھا۔ اس نے ایک محسن اور ایک شریف آدمی کے ساتھ غیر انسانی سلوک روا رکھا تھا اور اس کا سب کچھ چھین لیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ یہی سب کچھ اس کے ساتھ ہو۔ وہ دنیا میں رُسوا ہو۔ جیسے میں دنیا میں امان تلاش کرتا پھرتا تھا اور مجھے امان کہیں نہ ملتی تھی ایسے ہی اس کی اولاد پر یہ زمین تنگ ہوجائے اور دلاور اسی طرح ذلت اور عذاب کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو جیسے وزیر خان گیا تھا۔ میں یہ تماشائے عبرت دیکھوں اور میرے ساتھ وہ سب بھی چوہدری دلاور کا انجام دیکھیں جنہوں نے میرے باپ کی اور میری بے بسی کا نظارہ کیا تھا اور جب تختہ دار سے دلاور کی لاش تاابد قبر کی گہرائی میں دفن کرنے کے لیے لائی جائے تو میں پھر اس سلطنت کے وارث کی حیثیت سے نظم ونسق سنبھالوں جس کا بانی وزیر خان تھا۔

مجھے یقین تھا کہ چوہدری دلاور مجھ سے ہر قیمت پر سودا کرے گا۔ وہ اپنی ذلت ورسوائی کی تشہیر سے بچنے کے لیے میرا ہر مطالبہ تسلیم کرے گا۔ وہ استاد پیڈرو کو میرے حوالے کردے گا۔ وزیر خان ٹرسٹ اسپتال سے دستبردار ہوجائے گا۔ تمام نقصانات کی تلافی کے لیے تیار ہوگا لیکن صرف مادی نقصان پورا کرنے سے جذبات کے گھاؤ نہیں بھر سکتے۔ مجھے صرف میرا حق ہی نہیں' انصاف بھی چاہیے۔

تھکن کے باوجود اس رات میں پُرسکون نیند سے محروم رہا۔ میرے دل میں خوف کی ایک خلش بھی موجود تھی کہ کہیں یہ سب میری خام خیالی نہ ہو۔ صبح پتا چلے کہ دلاور تو رات کے وقت نکل گیا۔ مرزا غالب کا یقین بے بنیاد ثابت ہوجائے اور معلوم ہو کہ دلاور کے شاطر ذہن نے ہم سب کو پھر شکست دے دی ہے۔ مجھے چوہدری دلاور کی شکاری فوج کی طرف سے کسی جوابی کارروائی کا بھی ڈر تھا۔ وہ دلاور کی بازیابی کے لیے کچھ بھی کرسکتے تھے۔ مجھے بالکل معلوم نہیں تھا کہ آج کل استاد پیڈرو کہاں ہے اور کیا کررہا ہے؟ دلاور کے نئے ساتھی کون ہیں؟ پبلک لائف میں آنے کے بعد اس نے بہت سے نئے دوست بنالیے تھے اور یہ سیاسی رفیق اس کے مستقبل سے اپنا مستقبل وابستہ سمجھتے تھے۔

صبح دم دروازہ ہلا کے جمعدار اور اس کی چھبیلی نصف بہتر نے مجھے بیدار کیا۔ وہ اصل چوکیدار سے زیادہ بے تکلف تھی جو اسے علی الصباح چائے بھی پیش کرتا تھا اور اس کی سرمے کاجل سے چمکتی آنکھوں کے علاوہ کپڑوں سے چھلکتے سیاہ جوبن کے نظارے سے آنکھیں بھی سینکتا ہوگا۔ گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی۔ ظاہر ہے میں اتنا بے مروت اور بے نیاز شخص تھا کہ مجھے تو وہ پورا مرد بھی تسلیم نہیں کرتی ہوگی ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی اس کی طرف ایک نظر بھی نہ دیکھے۔

اوپر آکے میں نے غنودگی کا ایک راؤنڈ پورا کیا اور پھر بلیک کافی پی کے حواس بحال کیے۔ غسل کرکے لباس اور حلیہ بدلتے ہوئے مجھے ایک گھنٹا لگ گیا۔ آٹھ بجے میں نے آفس کو مقفل کیا اور پھر فرنچ وکیل کے روپ میں باہر نکل گیا۔ فوری طور پر مجھے ناشتے

سے زیادہ اخبار کی طلب تھی۔ اخبار مجھے چوک سے ہی مل گیا۔

صفحۂ اول پر ڈاکٹر شیلی کا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھ کے میرے دل میں ایک کانٹا سا چبھ گیا۔ اس سے دل لگانے کی تہمت تو محض ال گئی تھی۔ افسوس اس کا تھا کہ وہ اچھی لڑکی تھی جو ہمارا ساتھ دے رہی تھی اور زندہ رہتی تو شاید نازو اور گل کی طرح ایم آر ایس کا مضبوط ستون ثابت ہوتی۔ پتا نہیں ایسی لڑکی چوہدری دلاور کی سوتیلی بہن بھی کیوں ہوئی؟

اس تصویر کے ساتھ ہی ڈاکٹر شیلی مرڈر کیس میں تفتیش کے لیے خصوصی طور پر بنائی جانے والی ٹیم کے بارے میں سنسنی خیز انکشافات تھے کہ وہ قاتلوں سے مل گئے ہیں اور چوہدری دلاور نے منہ مانگی قیمت پر ان کے ایمان کو خرید لیا ہے چنانچہ وہ دلاور کو گرفتار کرنے سے گریز کر رہے ہیں۔ چوہدری دلاور مفرور نہیں ہے' پولیس جانتی ہے کہ وہ کہاں ہے کیونکہ ہر رات ان کی ملاقات ہوتی ہے اور وہ بھی تھانے میں۔ ثبوت کے طور پر وہ تصویریں شائع کی گئی تھیں جو نازو نے اندھیرے میں انفراریڈ کیمرے سے بنائی تھیں۔ اس رپورٹ میں جو کرائم رپورٹر سے منسوب تھی سارا زورِ بیان مرزا غالب کا تھا۔ اس نے ثابت کردیا تھا کہ خود پولیس ہی چوہدری دلاور کو تحفظ فراہم کر رہی ہے اور خصوصی تفتیشی ٹیم کی تشکیل ایک پُرفریب ڈراما ہے۔ اس میں اچھی شہرت کے حامل افراد کو عمداً شامل نہیں کیا گیا۔ وغیرہ وغیرہ۔

آج ... کسی اخبار میں نہ چوہدری دلاور کے اغوا کی خبر شائع ہوئی تھی اور نہ اس کی گرفتاری کی چنانچہ اس رپورٹ کی اشاعت سے طوفان کھڑا ہونا یقینی بات تھی۔ اس کیس میں مدعی بھی کوئی ایک آدمی نہیں تھا۔ ہائی کورٹ بار کے گیارہ ارکان اس کیس میں استغاثہ دائر کرنے والوں میں شامل تھے۔ غالب نے ٹھیک کہا تھا۔ اب تفتیشی ٹیم کو عتاب سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔ اس خبر کے ردِعمل میں پریس اور پبلک کے ساتھ وکیلوں کی ہر تنظیم احتجاج کرے گی اور پھر حکومت کے مخالف سیاسی لیڈر بھی پیچھے نہیں رہیں گے۔

ریسٹورنٹ میں ہنگامے کی کوئی خبر سرے سے نہیں تھی۔ ڈی ایس پی شاہد علی کو معلوم ہوتا کہ اگلے دن اس کے خلاف کیا دھماکا خیز مواد شائع ہونے والا ہے تو وہ ایک رپورٹ فرنچ وکیل کے خلاف لکھوا دیتا جس نے اسے سب کے سامنے مارا تھا۔ اسے گواہ بھی میسر تھے مگر اسے ایس ایس پی ظفر حیات نے معاملہ رفع دفع کرنے پر مجبور کردیا تھا۔ گزشتہ رات ایک مفرور ملازم سکندر بخت کے لیے منظر کے گھر کی تلاشی کا بھی کسی خبر میں ذکر نہیں تھا۔

اب میں خود کو خاصا محفوظ محسوس کر رہا تھا۔ میری شناخت کا راز فاش نہیں ہوا تھا اور میرے خلاف کوئی کیس نہیں بنا تھا۔ ظاہر ہے مولوی خادم حسین کی جان بھی فی الحال بچ گئی تھی۔ میں نے ناشتے کے بعد منظر کے گھر فون کیا تو وہاں صرف نازو تھی۔

اس نے میری آواز سنتے ہی کہا "مبارک ہو۔"

"کیا ہوا؟ لڑکا یا لڑکی۔۔۔؟" میں نے کہا۔

"لڑکا اور لڑکی دونوں کو مبارک ہو" نازو ہنسی۔

"یہ سب کمال ہے ایک اور لڑکے کا جس کا سر بھوت..." میں نے کہا "وہ بھوت کی طرح چمٹ گیا پولیس والوں سے۔"

"تم خود کم بھوت ہو۔ سب کی چھٹی کرادی۔"

"چھٹی ہوجائے گی۔ انشاء اللہ" میں نے کہا۔

نازو بہت خوش تھی۔ "اجی حضرت کس دنیا میں ہیں... چھٹی تو ہوگئی۔ صبح صبح آئی جی کے حکم سے سب معطل بھی ہو... اور گرفتار بھی۔"

"آخر ہونا اخبار والے کی۔۔۔ اخبار والی" میں نے کہا "... ترین خبر اور کہاں سے مل سکتی تھی؟"

وہ ہنسی "غالب کو کسی نے فون کرکے اطلاع دی تھی۔"

"وہ خود کہاں ہے۔ خیر۔۔۔ مجھے معلوم ہے۔" میں ...

"رابعہ کہاں ہے؟ مگر یہ بھی معلوم ہے مجھے۔ وہ منظر کے ساتھ چلی گئی ہوگی۔ آج کورٹ روم میں جاکے اس سے ملوں گا۔ ... ہوگئیں اسے دیکھے ہوئے۔"

"مولوی خادم حسین نے فون کیا تھا۔"

"اب اس کا فون آئے تو اسے یقین دلانا کہ خطرے کی ... بات نہیں۔ وہ فوراً مجھ سے ملے۔ غالب کے پاس پہنچ جائے۔"

"اگر کچھ دیر میں پھر فون آیا تو کہہ دوں گی۔ ورنہ میں ... جارہی ہوں۔"

"کہاں؟ اپنے آفس؟"

"آج چوہدری دلاور کو گرفتار کیا جائے گا۔ عصر اور مغرب کے درمیان۔ اس تقریبِ سعید میں شرکت فرما کے ثواب دارین حاصل کریں' یہ دعوت نامہ دینا ہے کچھ خاص لوگوں کو۔"

"اگر سب پہنچ گئے اور تماشا نہ ہوا' پھر؟"

"اخبار والے پہنچ جائیں گے۔ پولیس کو لانا میری نہیں ... اور منظر کی ذمے داری ہے۔ ویسے تو یہ بھی غالب کی بڑی دھماکا خیز ... اسٹوری ہوتی مگر کوریج زیادہ چاہیے۔ بہت سے گواہ درکار ہیں ... لیے بڑی رازداری سے خاص خاص لوگوں کو بلایا جائے گا۔ جن پر ... اعتماد کیا جاسکتا ہے۔"

آدھے گھنٹے بعد میں مرزا غالب سے ملا۔ وہ ملبہ اٹھانے والے مزدوروں کو ہدایات دے رہا تھا کہ دو بجے تک کام ختم کرلیں ... ٹھیکا ختم۔ ٹھیکے دار مزید ایک دن کی مہلت چاہتا تھا مگر غالب نے صاف کہا کہ مفت کا مال جتنا اٹھالیا وہ اٹھالیا' سب نہیں اٹھا... دو بجے تک تو صبر کرو۔ لکڑی کا بدصورت اور بھاری باکس وہیں ... ہوا تھا جہاں ہم اسے چھوڑ گئے تھے۔ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں دلاور کے بارے میں پوچھا تو غالب نے سر کے اشارے سے جواب دیا کہ سب ٹھیک ہے۔

صاف شدہ جگہ پر مجھے ایک خیمہ بھی نظر آرہا تھا جو شاید صبح ہی نصب کیا گیا تھا۔ یہ جھونپڑی جیسا خستہ حال خیمہ تھا جیسا کہ عام طور پر کھلے آسمان کے نیچے رہنے والے خانہ بدوش یا چوکیدار استعمال کرتے ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ اس کا مقصد سڑک کی طرف رکاوٹ کھڑی کرنا ہوگا۔ دن میں ہم باکس کھول کے اندر اترتے تو نہ جانے کتنے لوگ شک میں مبتلا ہوجاتے۔ خیمے کے اندر عام ضروریات کا سامان دیکھ کے مجھے حیرانی ہوئی۔

"یہ کیا اسباب ہے اور کس کا ہے؟"

"یہ اپنے چوہدری دلاور صاحب کی ضرورت کا سامان ہے۔"

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا "ان سے شرف نیاز حاصل کرلوں میں۔"

"ضرور۔۔۔ وہ بے چینی سے منتظر ہوگا۔ ذرا خیال رکھنا اپنا۔ کہیں وہ تمہارے استقبال کے لیے زیادہ جذباتی نہ ہو۔"

"میں بھی کم جذباتی نہیں ہوں۔" میں نے کہا اور باکس کا ڈھکنا اٹھا کے اندر اتر گیا۔ لکڑی کا وہ باکس کسی چھوٹے سے کیبن کی طرح تھا۔ پہلے مجھے اندر گھپ اندھیرا محسوس ہوا۔ پھر میری آنکھیں عادی ہوگئیں تو ہر طرف درزوں سے آنے والی روشنی میں مجھے وہ چوکٹا صاف نظر آنے لگا جس کو ہٹا کے میں نیچے اُتر سکتا تھا۔

اچانک میرے کانوں میں دلاور کی آواز آئی۔ وہ مدد کے لیے چلّا رہا تھا۔ شاید چلّاتے چلّاتے اس کی آواز بیٹھ گئی تھی اور کوئی جواب نہ پاکے وہ خوف اور مایوسی سے پاگل ہورہا تھا۔ وہ گالیاں بک رہا تھا۔ کسی کو مخاطب کئے بغیر۔۔۔ "کوئی۔۔۔ نہیں سنتا۔ سب بہرے ہوگئے ہیں۔۔۔ کے بچے۔۔۔ ارے کوئی ہے۔ میری آواز نہیں پہنچ رہی ہے کسی۔۔۔ کے کانوں تک؟ کیا ہوگیا ہے سب کو۔ کہاں مرگئے ہو سب۔۔۔ تم سب کی۔۔۔ ایک ایک کا دماغ درست کردوں گا میں۔۔۔ کے بچو۔ میں دلاور ہوں۔۔۔ چوہدری دلاور۔۔۔ میں سب کی۔۔۔"

مجھے اس کی دیوانگی میں کوئی شبہ نہ رہا۔ انتہائی مضبوط اعصاب کا مالک نظر آنے والا' عیار اور مکار۔ ذہین اور فطین شکاری۔ پُرفریب اداکاری کا ماہر۔ اپنی عقل سے جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ بنا کے پیش کرنے والا چوہدری دلاور موت کو روبرو دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنے پُرعذاب انجام کا اندازہ ہو رہا تھا۔ وہ تصور میں اپنی لاش کو اس تہ خانے میں سرد ہوکے اکڑتے' ڈی کمپوز ہوتے' گلتے سڑتے اور کیڑے مکوڑوں کی خوراک بنتے اور بالآخر ہڈیوں کے بدوضع پنجر میں ڈھلتے دیکھ رہا تھا اور ہر منظر اس کے اعصاب کی شکست کا ساماں فراہم کر رہا تھا۔ آس ٹوٹ رہی تھی۔ ناامیدی بڑھ رہی تھی۔ ایسے وقت میں آدمی کو اس کا ماضی بھی ڈراتا ہے۔ ہر جرم اور ہر گناہ کا احساس اس کی اذیت میں اضافہ کرتا ہے۔ اسے کچوکے لگاتا ہے۔ تم تو موت کو بھولے ہوئے تھے۔ اپنے انجام کے بارے میں سوچتے تک نہیں تھے۔

آہستہ آہستہ میں نے تختے کے پیچ کھولے اور تختے کو تھوڑا سا ہٹا کے نیچے جھانکا مگر مجھے تاریکی کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا۔ میں نے تختے میں صرف ایک پیچ باقی رہنے دیا اور تختے کو تھوڑا سا گھما کے ایک کونے میں چھوٹے سے تکونے خلا کے سوا باقی حصے کو بند رکھا۔ میں خود تختے کے اوپر بیٹھ گیا۔ تکونے خلا پر گھٹنوں کے بل جھک کے میں نے آواز لگائی "کیا حال احوال ہے اپنے چوہدری دلاور صاحب؟"

میری یہ آواز سن کے دلاور کا کیا حال ہوا ہوگا' اس کا میں صرف اندازہ کرسکتا تھا۔ موت کے مہیب سناٹے میں یہ آواز اس کے لیے بم کا دھماکا ثابت ہوئی ہوگی مگر اس کے ساتھ ہی دلاور کی امید کا بجھتا ہوا چراغ پھر روشن ہوگیا ہوگا۔

"سکندر۔۔۔" وہ چلّایا "خدا کے لیے مجھے یہاں سے نکالو۔"

میں نے کہا "خدا ہی نکالے گا تمہیں اس مدفن سے دلاور۔ اس کے لیے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ قربِ قیامت کی پیش گوئی کب سے کر رہے ہیں لوگ۔ جیسے ہی صورِ اسرافیل سنو باہر آجانا۔ میدانِ حشر میں۔"

"سکندر۔ میں مرنا نہیں چاہتا۔"

"مرنا کون چاہتا ہے اپنے چوہدری صاحب" میں نے تمسخر کے ساتھ کہا "وہ سب بھی مرنا نہیں چاہتے تھے جن کو تم نے بے دریغ قتل کیا تھا۔ تم کہہ سکتے ہو کہ موت کا ایک دن معین ہے اور انہیں اسی طرح مرنا تھا۔ یہی میں تمہارے بارے میں کہوں گا۔ تم کو بھی یہاں مرنے کے لیے آنا تھا۔ اب موت کب آتی ہے' یہ شاید تمہیں پتا نہ چلے مگر چند دن اور۔۔۔"

وہ اندھیرے میں میری آواز کی سمت آیا اور ٹھوکریں کھاتا ہوا اوپر چڑھنے لگا "مجھے باہر آنے دو۔ خدا کے لیے۔"

"خدا کا نام ایسے ہی وقت میں زبان پر آتا ہے۔ زندگی بھر شیطان سوار رہتا ہے۔۔۔"

اس کا چہرہ مجھ سے چند فٹ قریب آگیا "میری بات سنو۔ میں اپنے ہر جرم کا اقرار کرتا ہوں۔ ہر غلطی کو مانتا ہوں۔ تمہارے ساتھ میں نے جو زیادتی کی سب میرا قصور تھا۔ میں بہت بُرا آدمی ہوں' بہت کمینہ ہوں۔"

میں نے قہقہہ لگایا "دلاور۔ تم اس وقت ہوش میں نہیں ہو۔ موت کے خوف نے تمہارے حواس گم کردیے ہیں۔ تمہیں نہیں معلوم کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ تختۂ دار پر آدمی کچھ بھی کہہ سکتا ہے اگر اسے یقین ہو کہ وہ بچ جائے گا۔ ایسا تم نے کئی بار کیا ہے۔ تم نے وعدہ خلافی کی۔ تلافی کا ذکر کیا مگر تلافی نہیں کی۔ تم خود کو بہت ہوشیار اور چالاک سمجھ کے اپنے ہر وعدے سے منحرف ہوتے رہے۔"

"اب ایسا نہیں ہوگا۔ یہ آخری بار ہے۔ بالکل آخری

موقع....."

"سوچو دلاور کہ پہلے تم نے آخری موقع کب مانگا تھا۔ آج اگر میں تم کو یہاں سے نکال لوں، تمہیں زندگی کا یقین حاصل ہو جائے، تمہاری سب دولت اور طاقت پھر تمہارے ساتھ ہو تو تمہارے جذبات اس کے برعکس ہوں گے۔ تم کہو گے کہ میں نے کیسا بے وقوف بنایا سکندر کو۔ کتنی اچھی اداکاری کی اور کیسے اسے اپنی نیک نیتی کا یقین دلایا....."

"یقین کرو، میں....."

"یقین ایک بار ٹوٹتا ہے پھر قائم ہو تو اس میں بال آجاتا ہے۔ دوسری بار یہ ریزہ ریزہ ہو جائے تو خدا کے سوا کوئی ٹکڑے جوڑ کے بے داغ آئینہ نہیں بنا سکتا۔ تمہاری آخری اپیل مسترد کی جاتی ہے۔"

"سنو سکندر۔ تم اتنے بے رحم نہیں ہو سکتے۔" وہ چلّایا۔

میں نے کہا "دلاور۔ کیا تم مجھے اعترافِ جرم کی تحریر دے سکتے ہو؟"

"ہاں..... ہاں..... میں تیار ہوں۔"

"اس میں اپنے ہر جرم کا اعتراف کرو گے، سب بتاؤ گے کہ تم نے میرے والد کے ساتھ کیا دھوکا کیا تھا۔ کیسے ان سے سب کچھ چھینا تھا اور کس طرح ان کی زندگی کو بھی ایک سزا بنا دیا تھا۔ خود ان کے لیے اور پھر میرے لیے۔ تم نے اس ملک کے ساتھ جو کیا....."

"میں سب لکھ دوں گا....."

"یہ بھی بتاؤ گے کہ تم نے ناجائز دولت کہاں سے اور کیسے کمائی تھی؟"

"ہاں۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔"

میں نے کہا "کتنے لوگوں کو اذیت دے کر ہلاک کیا اور کروایا؟"

"تم مجھ پر اعتبار کیوں نہیں کرتے.....؟"

"تم واقعی پاگل ہو گئے ہو دلاور۔" میں نے افسوس سے کہا "تم کیا سمجھتے ہو کہ میں تمہارے جھوٹ پر یقین کر رہا ہوں؟ ایسی تحریر تم دے سکتے ہو مجھے، جو تمہیں سیدھا تختہ دار پر لے جائے۔ جو تمہیں دنیا میں رسوا کر دے۔ تمہارا مستقبل تباہ کر دے۔ تمہاری عزت کا جنازہ نکال دے اور جو تم سے محبت کرتے ہیں وہ بھی تم سے نفرت کرنے لگیں۔ شیطان سے زیادہ تم پر لعنت ہو..... ہوش و حواس میں رہتے ہوئے کوئی اس قسم کا اعترافِ جرم کر ہی نہیں سکتا۔ میں جانتا ہوں تمہیں اچھی طرح۔ تم بعد میں کہو گے کہ یہ تحریر جبر سے لی گئی تھی۔ جو سکندر بول رہا تھا میں لکھ رہا تھا، جان بچانے کے لیے مجھے سب لکھنا پڑا۔ قانون کی نظر میں اس اعترافِ جرم کی حیثیت صفر رہ جائے گی۔ اُلٹا وہ میرا جرم بن جائے گا۔ بہتر ہے کہ تم مر جاؤ۔"

"دیکھو سکندر۔ میں اس ملک سے چلا جاؤں گا۔ اپنے بچوں کے ساتھ۔ مجھے زندہ رہنے دو" وہ دھاڑیں مار مار کے رونے لگا۔

"یہ نسبتاً باعزت موت ہے دلاور۔ کسی کو کچھ معلوم نہ ہوگا۔ تم غائب ہو جاؤ گے۔ یہ سمجھا جائے گا کہ دلاور کو اس کے دشمنوں نے مار دیا۔ تمہارا خاندان ذلت و رُسوائی سے بچ جائے گا۔"

"نہیں..... نہیں....." اس نے چیخ چیخ کے کہا "مجھے مجھے معاف کر دو سکندر" پھر وہ منت سماجت پر آگیا "دیکھو تم کو خدا اور رسولؐ کا واسطہ۔"

"اس کے بعد تم مجھے وزیر خان مرحوم کے نام کا واسطہ دو گے۔ پھر رابعہ کی محبت کا۔" میں نے طنز سے کہا۔ "لیکن یہ بے کار ہے دلاور۔ اور ہاں، ایک بات تو میں نے بتائی نہیں تمہیں جو کچھ تم بول رہے ہوتا۔ یہ سب میں نے ریکارڈ کر لیا ہے۔"

وہ نیچے سے چیزیں اُٹھا اُٹھا کے اوپر پھینکنے لگا۔ اس کے شگاف تک پہنچنا مشکل تھا کیونکہ آدھا زینہ ملبے سے اٹا ہوا تھا۔ آدھے زینے سے اس کے ہاتھ اوپر تک نہیں پہنچ رہے۔ "جھوٹے، لعنتی شیطان۔ کتے کی اولاد۔" وہ دیوانہ وار مجھے گالیاں دینے لگا۔ ایک سے ایک فحش اور گندی گالی۔ جو چیزیں وہ پھینکتا تھا وہ شگاف تک پہنچنے سے قبل ہی چھت سے ٹکرا کے گر جاتی تھیں۔ وہ کھانے کے برتن، کراکری، ریکارڈ، جو کچھ نظر آرہا تھا مجھ پر مارنا چاہتا تھا شاید اس کی آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے لگی تھیں ورنہ موم بتی رات کو ہی ختم ہو چکی تھی اور ٹارچ کے سیل بھی اتنی دیر نہیں چل سکتے تھے۔ اوپر سے آنے والی روشنی نہ ہونے کے برابر تھی۔

دلاور کسی جنگلی جانور کی طرح اپنے پنجرے میں اُچھل کود کر کے اپنے غصے کا اظہار کر رہا تھا۔ مجھے اندیشہ یہ تھا کہ کہیں وہ سچ پاگل نہ ہو جائے۔ دیوار سے سر پھوڑ کے خودکشی نہ کر لے۔ موت کے خوف سے اس کا ہارٹ فیل نہ ہو جائے۔

میں نے کہا "دلاور۔ اب جو میں کہہ رہا ہوں وہ غور سے سنو۔ میرا ارادہ ہرگز تمہیں قتل کرنے کا نہیں تھا ورنہ تم کب کے قبر میں ایک ڈھانچا بن چکے ہوتے۔ میں تمہیں ماروں گا نہیں۔"

"کیا؟ تم مجھے نہیں مارو گے؟" وہ رُک گیا۔

"ہاں۔ تم زندہ رہو گے۔ اگر تم اس تہ خانے میں مر جاؤ تو مجھے افسوس ہوگا کہ دنیا نے تمہارا عبرت ناک انجام نہیں دیکھا۔ میں تمہیں موقع دوں گا۔"

"تم مجھے موقع دو گے؟" وہ خوشی سے چلّایا۔

"ہاں۔ آج تمہیں پولیس گرفتار کرے گی۔ تمہارے خلاف فردِ جرم پہلے سے موجود ہے۔ تم نے اپنی سوتیلی بہن ڈاکٹر شیلی کو قتل کیا تھا۔ اس سے پہلے بھی تم نے ان گنت قتل کیے تھے جن میں

"رابعہ آج چیف جسٹس کے سامنے درخواست پیش کر دے گی کہ ملزم کے بارے میں کچھ اطلاعات ملی ہیں۔ اندیشہ یہ ہے کہ پولیس نے اسے پناہ دے رکھی ہے انہیں پابند کیا جائے کہ وہ ملزم کو گرفتار کریں۔"

"کہاں سے گرفتار کریں۔ عدالت پوچھے گی نہیں۔"

"اس جگہ کی نشاندہی پولیس کو کر دی جائے گی مگر اندیشہ یہ ہے کہ کچھ بدعنوان اہلکار ملزم کے فرار میں معاون ثابت نہ ہوں اس لیے صرف ڈی آئی جی کی براہِ راست نگرانی میں کارروائی کی جائے۔"

"یار ہم کس بنیاد پر نشاندہی کریں گے۔"

"ہم بتائیں گے کہ کچھ لوگوں کو جو چوہدری دلاور کے ساتھی ہیں۔ اس جگہ مشتبہ انداز میں آتے جاتے دیکھا گیا ہے۔ یہ جگہ رابعہ قاری ایڈووکیٹ کی ملکیت تھی مگر اس پر چوہدری دلاور نے قبضہ کر لیا تھا۔ اس نے یہاں ایک کوٹھی تعمیر کی تھی جو اس نے غیر قانونی طور پر ایک طوائف کو دے رکھی تھی۔ بعد میں اس کا قبضہ رابعہ قاری ایڈووکیٹ کو مل گیا تھا مگر اس کو پُراسرار طور پر آتش زنی سے تباہ کر دیا گیا۔ اس کوٹھی میں ایک تہ خانہ تھا اور غالباً اب دلاور اسی تہ خانے میں چھپا ہوا ہے۔ ہم نے رات کو بارہا نگرانی کی تو ہمیں چوہدری دلاور کے خاص آدمی یہاں آتے جاتے دکھائی دیے۔ ہم ان کو پہچانتے ہیں مگر نام نہیں جانتے۔"

"کم سے کم میں ایسا نہیں کہہ سکتا۔"

"میں رابعہ اور وقار یوسف یہ بات کہیں گے۔ تم تو محض دباؤ کا ایک ذریعہ ہو۔ ڈاکٹر شیلی کے وکیل جس کے مطالبے کو پولیس آسانی سے مسترد نہیں کر سکتی۔ خصوصاً آج کے اخبار میں شائع ہونے والی خبر اور تصویروں کے بعد جو کارروائی ہوئی ہے۔ اس سے کافی حوصلہ شکنی ہوئی ہے دلاور کا ساتھ دینے والوں کی۔ اُمید ہے نئی تفتیشی ٹیم کا چند روز میں اعلان ہوگا۔ اس میں سب باہر کے لوگ ہوں گے۔ وکلائے استغاثہ مطالبہ کریں گے کہ تحقیقاتی کمیشن بنایا جائے جس کا سربراہ ہائی کورٹ کا جج ہو۔ ان حالات میں آج دلاور کا گرفتار ہو جانا یقینی ہے۔ ابھی تک کسی کو ہمارے عزائم کی خبر نہیں ورنہ ابتک تو دلاور کی غنڈا فورس اسے نکال کر لے جاتی اور ساتھ ہی ہمیں بھی۔"

اچانک میں نے مولوی خادم حسین کو دیکھا۔ وہ تیر کی طرح ہماری طرف آرہا تھا۔ "السلام علیکم جناب۔ میں تو بہت ڈرا ہوا تھا۔ تمام رات سو بھی نہیں سکا تھا کیا واقعی اب خطرہ نہیں رہا؟"

میں نے کہا "خادم حسین۔ خطرہ ہر شخص کے لیے ہر جگہ موجود رہتا ہے۔"

"جی، یہ کیا فرما رہے ہیں آپ....."

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ کیا یہ ناممکن تھا کہ یہاں آتے ہوئے تم کسی گاڑی کے نیچے آجاتے۔"

میرے والد کا قتل بھی شامل ہے مگر سزائے موت تو آدمی کو ایک بار ہی ہوتی ہے۔ تمہیں ساری دنیا کے سامنے گرفتار کیا جائے گا۔ تم پر مقدمہ چلے گا اور ایک دن تم پھانسی پر لٹکائے جاؤ گے۔ تمہاری ہر اپیل مسترد ہوتی جائے گی۔ بالآخر مجھے میرا حق ملے گا اور انصاف ہوگا۔ صرف اسی لیے تم زندہ تھے اور زندہ رہو گے۔ تم بہت بڑے شکاری تھے مگر تقدیر سے بڑے شکاری نہیں تھے۔ تم قدرت کے نظامِ انصاف سے نہیں لڑ سکتے۔ اجل کو دھوکا نہیں دے سکتے۔ یہ ثابت ہونے تک تم زندہ رہو گے....."

میں نے تختہ برابر کر دیا اور پیچ لگا کے کس دیے۔ پھر میں باکس سے باہر آگیا۔ خیمے سے گزرا اور غالب کے سامنے پہنچ گیا "میرا دل بہت مسرور ہے۔ دلاور کو موت کی دہشت نے دیوانہ کر دیا ہے۔ جا کے اس کی حالت دیکھو۔"

"میں دیکھ چکا ہوں۔" غالب نے کہا "میرا دل تو چاہتا ہے کہ اسے یہیں قیدِ تنہائی میں مر جانے دوں۔ یہ بڑی پُرعذاب موت ہوگی۔ بے بسی اور بے چارگی کے ساتھ دکھ اور پچھتاوے۔ خوفِ عاقبت اور ہر لمحہ قریب آتی موت کا تصور۔ تڑپ تڑپ کے بھوک، پیاس سے مرنے کا اور اس زنداں میں لاش کے سرعت سے گلنے کا خیال۔ دلاور کے انجام کی فلم بنائی جا سکتی تو دنیا کی سب سے ڈراؤنی فلم بنتی۔ اس فلم کا ہر منظر دیکھنے والوں پر کپکپی طاری کر دیتا۔ ان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔"

"نہیں یار۔ ہم انسان ہیں۔ شیطان نہیں ورنہ یہی کرتے۔ ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ مجرم کو قانون کے مطابق سزا ملے اور سزا کا انسانی تصور یہ ہے کہ قاتل کتنا ہی سفاک اور درندہ صفت کیوں نہ ہو۔ اسے کم سے کم اذیت کے ساتھ سزائے موت دی جائے۔ پھانسی کے بعد الیکٹرک چیئر۔ پھر گیس چیمبر اور اب زہریلے انجکشن سے بھی سزائے موت دی جاتی ہے۔"

"کیا واقعی تمہیں یقین ہے کہ اسے سزائے موت ہوگی؟ یعنی اس پر عمل درآمد بھی ہوگا؟" غالب نے کہا۔

"مجھے یقین ہے کہ ایسا ضرور ہوگا۔ انصاف کا عمل طویل اور پیچیدہ ضرور ہے مگر قانون کی مدد ہم کریں گے۔"

"قانون کی مدد وکیل کرتے ہیں۔"

"وکیل اپنا کام کریں گے۔ جہاں قانونی سقم ہوگا وہاں ہم وکیلوں کی مدد کر سکتے ہیں۔ ثبوت اور شہادت کو مکمل اور حتمی بنا سکتے ہیں۔ ہم گواہ لا سکتے ہیں اگر اصل گواہ سامنے نہ آتے ہوں، قتل کر دیے جاتے ہیں یا منحرف ہو جاتے ہوں۔ انصاف تو ثبوت اور شہادت کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ مجھے یہ بتاؤ کہ پولیس یہاں آکے دلاور کو گرفتار کر لے گی؟ کون قائل کرے گا پولیس کو کہ دلاور یہاں چُھپا ہوا ہے۔"

"میں رابعہ اور تم۔ ہم قائل کریں گے۔"

"کیسے قائل کریں گے۔ علاقہ ایس ایچ او کو؟"

خادم حسین نے جھرجھری لے کے کہا "توبہ توبہ۔۔۔"

"یا ابھی جہاں تم کھڑے ہو۔ یہ زمین پھٹ جائے اچانک زلزلہ آجائے۔"

خادم حسین فوراً دو قدم دور ہوگیا پھر اپنی حرکت پر خود ہی جھینپ کر مسکرانے لگا۔ "اس مردود کو بروقت روک لیا آپ نے ورنہ جناب رات بھر مجھے اُلٹا لٹکائے رکھتے وہ لوگ۔ خود گرفتار ہوگئے اللہ کے حکم سے۔"

میں نے کہا "چلو ان سے مل کے آتے ہیں۔"

"ہرگز نہیں۔۔۔ یعنی آپ مجھے دعوت دے رہے ہیں زخمی شیر سے ملاقات کی۔ میں تو اس کے پنجرے کے قریب نہ جاؤں۔"

"فکر مت کرو۔ وہ پنجرے سے باہر نہیں آسکتا" میں نے کہا "تمہیں نہیں مجھے ان سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔"

غالب ٹھیکے دار کو نوٹس دے چکا تھا "بس ایک گھنٹے میں یہاں سے سب غائب ہوجائیں ورنہ حوالات میں نظر آئیں گے۔ پھر نہ کہنا۔"

ٹھیکے دار بوکھلا گیا "جی ایسا ظلم مت کریں۔ ابھی آدھے گھنٹے میں جاتے ہیں ہم۔"

میں نے کہا "مرزا جی۔ ایک اطلاع کل نہیں دے سکا تھا میں۔ مجھے ایس پی سے گفتگو کے دوران پتا چلا تھا کہ پولیس نے اس گورکن کو اٹھالیا تھا۔ اس سے شیلا کی قبر کا پتا معلوم کرنے لیے۔ مگر وہ کچھ بتانے سے پہلے ہی ہلاک ہوگیا۔ پولیس نے تشدد کیا تھا اس پر۔ مگر اس کے بیٹے نے خاموشی سے باپ کو دفنا دیا۔ کیا کرتا بے چارا۔"

"اچھا۔ یہ کل کی اسٹوری ہوگی۔ خصوصی رپورٹ مس نازو کی۔ میں اسے کہتا ہوں کہ آج ہی گورکن کے بیٹے سے مل کے اس کا بیان ریکارڈ کرے اسے بتائے بغیر" غالب نے کہا "اگر اسے پتا چل گیا کہ نازو صحافی ہے اور اس کا بیان اخبار میں شائع ہوگا تو شاید وہ کچھ بھی نہ بتائے۔"

خادم حسین کے ساتھ میں نے پولیس ہیڈ آفس میں قدم رکھا تو میں نے یہ ظاہر کیا جیسے مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میں رابعہ کی گاڑی اپنے ساتھ لے آیا تھا۔

"ایس پی ظفر حیات۔۔۔ وہ تو نہیں ہیں" ایک سب انسپکٹر نے بتایا جو ملحقہ کمرے میں پہلے بھی بیٹھتا تھا۔

"کل تو تھے۔ اچھا ڈی ایس پی شاہد علی۔۔۔" میں نے خاصی حیرانی سے کہا۔

"وہ۔۔۔ وہ بھی نہیں ہیں" سب انسپکٹر نے کہا۔

"ایک ساتھ کہاں چلے گئے سب لوگ۔۔۔"

"کل پرسوں تک نئی ٹیم کے ارکان کا اعلان ہوگا۔ آپ معلوم کرلیں اور پھر تشریف لائیں۔"

میں نے کہا "مجھے کسی ٹیم سے نہیں۔ انہی لوگوں سے ملنا تھا۔ میرے کچھ کاغذات ان کے پاس تھے۔۔۔ یہ ایک ذاتی مسئلہ ہے۔"

سب انسپکٹر نے بادل ناخواستہ مجھے اوپر بھیجا۔ معطلی اور بحالی تو ایک ایسا معمول ہے کہ رائے عامہ کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کا اس سے بہتر نسخہ کوئی نہیں۔ پولیس سے کوئی جرم سرزد ہوجائے اور بیک وقت پریس اور پبلک شور مچانے لگیں تو ملزم کے معطل ہونے کی یا لائن حاضر کئے جانے کی خبر فوراً جاری ہوجاتی ہے۔ یہ کبھی کسی کو پتا نہیں چلتا کہ وہ کتنے گھنٹے یا کتنے دن معطل رہا۔ اور بحال ہوکے کہاں گیا۔ اس کیس میں مسئلہ زیادہ سنگین تھا۔ ملزمان کی گرفتاری بھی ظاہر کی گئی تھی چنانچہ وہ زیرِ حراست تھے یعنی ایک پُرتکلف کمرے میں اپنے اپنے بیڈ پر لیٹے اخبارات و رسائل کا مطالعہ فرمارہے تھے۔ صحافیوں اور وکیلوں کی شان میں ایک سے قصیدے پڑھ رہے تھے اور بے حد مطمئن ہشاش بشاش اور فارغ نظر آتے تھے۔ ان کے لیے ریڈیو' ٹی وی بھی فراہم کیا گیا تھا اور چائے پانی کا خصوصی انتظام تھا۔

مجھے دیکھتے ہی ان کا موڈ خراب ہوگیا "یہ۔۔۔ کیوں آیا ہے یہاں؟" عادت کے مطابق ڈی ایس پی شاہد علی نے گالی دے کے کہا۔

خادم حسین نے میرا جواب پہنچایا "محترم وکیل آپ سے اظہارِ ہمدردی کرنے کے لیے آئے تھے لیکن یہاں پہنچ کے معلوم ہوا کہ خبر غلط تھی۔ آپ لوگ گرفتار تو نہیں ہوئے ہیں۔ کیا معطل ہونے کی خبر درست ہے؟"

"مولوی۔ اس کو لے کر یہاں سے دفع ہوجاؤ۔ کل تو میرے ہاتھ آجاتا تو رات کو میں۔۔۔"

"میں ڈی آئی جی صاحب سے معلوم کروں گا کہ حقیقت کیا ہے؟" میں نے چلتے چلتے کہا "اگر یہ حوالات ہے تو میں بہت متاثر ہوا ہوں۔ زیرِ حراست مجرموں کو دنیا میں کہیں اتنے آرام سے نہیں رکھا جاتا۔"

ظفر حیات نے تشویش سے کہا "یہ باسٹرڈ ہمیں سچ مچ حوالات میں دیکھنا چاہتا ہے۔"

میں نے کہا "مقامی صحافی اور وکیل کہتے پھر رہے ہیں کہ تم نے اصل ملزم کو گرفتار نہ کرنے کا معاوضہ ایک کروڑ روپے لیا تھا۔"

ڈی ایس پی شاہد علی نے پھر ایک ناقابلِ اشاعت بات کی۔

"یہ بھی سنا ہے کہ خود تم نے چوہدری دلاور کو کہیں چھپا رکھا تھا۔ اور اسے آج وہاں سے گرفتار کرلیا جائے گا۔"

"یہ کون۔۔۔ کہتا ہے؟"

"میری اطلاع کے مطابق رابعہ قاری ایڈووکیٹ۔ مرزا غالب جرنلسٹ اور میں ابھی ڈی آئی جی صاحب سے ملیں گے۔"

ایس پی ظفر حیات اُٹھ کے آگے آیا "کس سلسلے میں؟"

"اس جگہ کا پتا چل گیا ہے جہاں تم نے ملزم کو بحفاظت رکھا تھا۔ میں تو خیر نہیں جانتا۔ مگر ڈی آئی جی صاحب خود نگرانی کریں گے۔ گرفتاری کی کارروائی عدالت کے حکم پر ہوگی۔"

ظفر حیات کا رنگ فق ہوگیا تھا۔ اس نے شاہد علی کی طرف دیکھا "یہ کیا بکواس کررہا ہے؟ کیا واقعی تم نے دلاور کو چھپا رکھا تھا؟ پیسہ لے کے۔۔۔"

"یہ کتا بھونکتا ہے" شاہد علی نے غرا کے کہا "بھونکنے دیں اسے بھی اور دوسرے کتوں کو بھی۔ مجھ پر شک نہ کریں۔"

"شک کیوں نہ کروں؟ تمہارا اور انسپکٹر کا رویّہ میرے لیے شروع سے مشکوک رہا ہے۔ تم مجھے بھی ڈبل کراس کررہے تھے۔"

"سر غلط فہمی ہے آپ کی۔ رفع ہوجائے گی۔ اگر دلاور گرفتار ہوگا تو آپ کو بھی پتا چل جائے گا" شاہد علی نے بگڑ کے کہا۔

"کوئی بات ضرور ہے ورنہ عدالت کا حکم کیسے ہوا" ظفر حیات بولا۔

"عدالت ایسا حکم نہیں جاری کرسکتی۔ یہ بھی جھوٹ ہے۔"

میں بھُس میں چنگاری ڈال کے نیچے آگیا۔ اب وہ آپس میں دست و گریباں تھے۔ ظفر حیات کو شک ہوگیا تھا کہ شاہد علی نے ساری رقم خود ہضم کرلی اور اسے دلاور کی مدد کرنے پر آٹے میں نمک کے برابر حصہ بھی نہیں ملا۔ شاہد علی ایک کروڑ کے جھوٹ پر چراغ پا تھا' دراصل اس کے نزدیک یہ جھوٹا پروپیگنڈا تھا۔ وہ کیسے جان سکتا تھا کہ کچھ دیر میں یہ جھوٹ اس کے خلاف سب سے سنگین سچ ثابت ہوجائے گا۔

میں اپنی گاڑی میں جا بیٹھا۔ رابعہ اور غالب کو وقار یوسف کی گاڑی میں آنا تھا۔ میں نے عین پولیس ہیڈ آفس کے سامنے ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اور گاڑی کو اگلے چوک تک لے گیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ تینوں ادھر ہی سے گزریں گے۔ انتظار کی یہ مہلت غنیمت تھی۔ میں نے اور خادم حسین نے قریب ہی ایک ہوٹل میں بیٹھ کے کھانا کھایا۔ مجھے بالکل بھوک نہیں تھی اور جو تھی وہ کھانا دیکھ کے مرگئی لیکن خادم حسین کی حالت غیر ہونے لگی تھی "بھوک برداشت نہیں ہوتی مجھ سے جناب۔ میں خود مرسکتا ہوں' بھوک نہیں مرسکتی' تختۂ دار پر بھی۔"

میں نے کہا "خادم حسین۔ تم جھوٹی گواہی دوگے؟"

وہ اچھل پڑا "نہیں۔۔۔ جھوٹی گواہی۔ لاحول ولا قوۃ۔"

میں نے کہا "فرض کرو ایک شخص کو قتل کے جرم میں پھانسی کی سزا ہونے والی ہو۔ تمہیں علم ہو کہ اصل قاتل یہ شخص نہیں بلکہ کوئی اور ہے۔ تم قاتل کو بھی جانتے ہو اور تمہارے یقین کی بنیاد مفروضات پر نہیں' حالات اور واقعاتی شہادت پر ہے۔ اصل گواہ تمہارے سامنے اعتراف کرچکے ہیں کہ انہوں نے سب دیکھا تھا مگر وہ ڈر کی وجہ سے گواہی دینا نہیں چاہتے۔"

"میں کہہ سکتا ہوں اپنے بیان میں کہ فلاں فلاں چشم دید گواہ ہیں۔"

"وہ صاف مکر جائیں گے۔ جھوٹا حلف بھی اٹھائیں گے۔ یہ بھی طے ہے۔ ایسی صورت میں کیا تم کہہ سکتے ہو کہ جس پر قتل کا الزام ہے' وہ تو واردات کے وقت تمہارے ساتھ تھا۔ اس جھوٹ سے ایک بے گناہ کی جان بچتی ہے۔"

"یہ۔۔۔ یہ تو بڑی مشکل میں ڈال دیا ہے مجھے آپ نے۔"

"یا فرض کرو تم چشم دید گواہ بن جاؤ۔۔۔"

"جی کیا کرتے ہیں آپ۔۔۔ جب اصل گواہ ڈرتے ہیں تو مجھے کیوں آگے دھکیل رہے ہیں آپ مرنے کے لیے۔"

"میرا مطلب تھا کہ بعض اوقات سچ زہر بن جاتا ہے اور جھوٹ تریاق۔ ویسے بھی جان بچانے کا مسئلہ ہو تو حرام بھی حلال ہوجاتا ہے۔"

"آپ کھُل کے بات کریں جناب۔"

میں اسے بھی چشم دید گواہوں میں شامل کرانا چاہتا تھا جو کہیں کہ انہوں نے رابعہ کے پلاٹ پر چوہدری دلاور کو دیکھا تھا مگر وہ نظر آنے کے بعد غائب ہوگیا۔ اس کی گواہی کیس کو زیادہ مضبوط بناتی تھی۔ مولوی خادم حسین کے بارے میں میرا خیال یہ تھا کہ وہ بس نام کا مولوی ہے اور درحقیقت اس کا ایمان بھی ہم جیسے گناہ گاروں کی طرح نیم پختہ ہے۔

ابھی میں وضاحت کا سوچ ہی رہا تھا کہ سڑک کے پار میری گاڑی کے بالکل پیچھے ایک اور گاڑی آکے رُک گئی۔ رابعہ کی یہ سُرخ واکس ویگن خاصی جانی پہچانی چیز تھی۔ میں نے پیچھے والی گاڑی میں دیکھا تو سب سے پہلے مجھے نازو نظر آئی۔ میں حیران ہوکے اٹھا ہی تھا کہ دوسری طرف سے اُترنے والے کی صورت دیکھ کے مجھے اپنی آنکھوں پر دھوکے کا گمان ہوا۔ لیکن یہ دھوکا نہیں تھا گاڑی سے اُترنے والا استاد پیڈرو ہی تھا۔

نازو اب بھی اگلی سیٹ پر بیٹھی سامنے خلا میں گھور رہی تھی اور پچھلی سیٹ پر مجھے دو افراد کے سر نظر آرہے تھے۔ اس دوسری ہلکے نیلے رنگ کی فاکس ویگن کے پچھلے شیشے ڈارک تھے۔ پلک جھپکتے میں میں نے خادم حسین کے ساتھ جگہ بدل لی تاکہ پیڈرو کی نظر مجھے نہ دیکھ پائے۔

خادم حسین کے لئے میری بدحواسی باعث حیرت بن گئی "کیا ہوا جی یہ اچانک آپ کو؟ صورت سے تو ایسا لگتا ہے جیسے آپ نے کوئی ایسی ویسی چیز دیکھ لی ہے۔ بھوت پریت وغیرہ۔"

میں نے آگے جھک کر کہا "بالکل ٹھیک سمجھے تم مگر میں یہ نہیں چاہتا کہ بھوت پریت بھی مجھے دیکھ لیں۔"

"یہ تو بڑی زیادتی کی بات ہے جناب کہ خود کو بچانے کے لئے آپ نے مجھے ان کے سامنے کردیا۔ اور ایسے بھوت پریت کو دھوکا کون دے سکتا ہے۔ میری اور آپ کی تو صورت ذرا بھی نہیں ملتی' جگہ بدلنے سے کچھ نہیں ہوگا۔" وہ بڑے جوش و خروش سے کھانے میں لگا رہا۔

میں نے کہا "خادم حسین۔ تم اپنے معدے پر ظلم کررہے ہو۔"

"ظلم کی بات مت کریں جی۔ خادم حسین پر کم ظلم ہو رہا ہے؟ آپ بھی ظلم کرنے والوں میں شامل ہیں اور پولیس بھی۔ غریب آدمی پر دنیا میں ہر جگہ ظلم ہو رہا ہے۔ میں تو پورا انصاف کرتا ہوں اپنے پیٹ کے ساتھ۔ اسے بھوکا کبھی نہیں رکھتا۔ جن بھوت آئیں یا حضرت عزرائیل۔ ہم کھانا ختم کئے بغیر اُٹھنے والے نہیں ہیں۔ صاف بات ہے۔"

"خادم حسین، ذرا سامنے دیکھو۔"

"سامنے کیا ہے جی۔ سامنے رزق ہے یا آپ کی ذاتِ بے برکات و پُر آفات ہے....." وہ خاصے خوشگوار موڈ میں تھا۔

"سامنے ہماری گاڑی کے ساتھ ہی دوسری گاڑی ہے۔"

اس نے چونک کے سر اُٹھایا "ہے بالکل ہے جناب، بادامی رنگ کی۔"

میں نے کہا "کہاں دیکھ رہے ہو تم؟ نیلے رنگ کی ویسی ہی گاڑی ہے جیسی ہماری لال گاڑی ہے۔"

"یہ بھی سچ کہا آپ نے۔ بادامی رنگ کی گاڑی آگے ہے۔ نیلے رنگ کی پیچھے۔" اس نے ایک ڈکار لی اور زور سے الحمد للہ کہا۔

"کون ہے اس گاڑی میں۔ غور کرو۔"

پانی کا گلاس اس کے ہونٹ تک پہنچ کے رُک گیا۔ "واللہ یہ تو..... یہ تو وہی ہیں جناب۔ اپنی مس نازو۔ غور کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"ایک شخص گاڑی سے اُترا ہے۔ مکرانی ٹائپ۔"

اس نے پانی پیتے ہوئے سرہلایا اور پھر گلاس میز پر رکھ دیا "پیچھے کھڑا ہے۔ رنگ ایسا کہ کچھ نہ پہنے تو اندھیرے میں دکھائی بھی نہ دے۔ موٹے گھونگریالے بال۔ پکوڑا ناک۔ کانوں میں سونے کی مندری۔"

"میں نے حُلیہ نہیں پوچھا تھا۔ بہت اچھی طرح جانتا ہوں میں اسے۔"

"مگر یہ تو مجھے شریف آدمی نہیں لگتا۔ آپ کیسے جانتے ہیں اسے۔"

میں نے جھنجلا کے کہا "یار جانتا میں تمہیں بھی ہوں اور دلاور کو بھی۔ میرا مطلب ہے کہ میرے جاننے والوں میں ہر قسم کے لوگ ہیں۔ بدمعاش بھی شریف بھی۔"

"کتنے افسوس کا مقام ہے۔ پہلے آپ نے میرا نام لیا تھا۔ یعنی میں بدمعاش ہوں۔ مؤخرالذکر دلاور شریف ہے!"

"بے وقوفی کی باتیں مت کرو اور اپنا سر نیچے رکھو۔ یہ بتاؤ وہ کالا بھوت کیا کر رہا ہے؟"

"کچھ نہیں جی۔ بس اِدھر اُدھر نظریں اُٹھا رہا ہے۔ حیرانی تو مجھے مس نازو پر ہے۔ وہ کیسی انجان بنی بیٹھی ہیں۔ دو بار نظریں چار ہو چکی ہیں مگر انہوں نے مجھے نہیں پہچانا۔ ضرور ان کی نظر کمزور ہے۔ وہ خود بھی کمزور ہیں ویسے تو....."

"اس کی آنکھیں اور تمہارا دماغ دونوں بعد میں چیک کرائیں گے۔ ابھی یہ بتاؤ کہ وہ کلموہا اِدھر تو نہیں دیکھ رہا ہے۔"

"دیکھتا ہے کبھی کبھی۔ کیا بلاؤں اسے؟"

"خبردار جو یہ غلطی کی۔ ننانوے قتل کر چکا ہے یہ شخص۔ تمہیں مار کے سنچری بنا لے گا۔ تم یہ چابیاں پکڑو۔ گاڑی چلا لو گے نا۔"

"کیوں نہیں جناب۔ زندگی کی گاڑی آخر چل ہی رہی ہے۔ ابھی سال بھر پہلے میں راکٹ چلاتا تھا۔ خلائی راکٹ۔"

"خلائی راکٹ؟"

"ہاں جی۔ وہ بیڈفورڈ ٹرک تھا۔ اس کا نام تھا۔"

"اچھا اچھا۔ تم یہ گاڑی لے کر جاؤ۔ کالا جن تم سے میرے بارے میں ضرور پوچھے گا۔ وہ جانتا ہے کہ یہ رابعہ کی کار ہے اور میرے پاس تھی، تم صاف مکر جانا کہ ولایتی وکیل صاحب تو وہیں پولیس ہیڈ آفس میں تشریف رکھتے ہیں۔ مجھے بھوک لگی تھی، میں اکیلا یہاں کھانا کھانے آیا تھا اور اب واپس جا رہا ہوں۔"

"اگر اس نے شرافت سے میری بات نہ مانی جناب۔ خدانخواستہ دست درازی پر اُتر آیا زبان درازی کے بعد۔ شکم سیر ہونے کے بعد مجھ پر کچھ غنودگی طاری ہوتی ہے، میں بیوی سے بھی نہیں لڑ سکتا۔"

"لڑنے کی ضرورت نہیں۔ زورِ بیان سے اسے قائل کر لینا کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو سچ کہہ رہے ہو۔"

"نازو بی بی سے ڈر لگتا ہے۔ وہ پہچان لیں گی۔"

"نہیں۔ وہ تمہیں نہیں پہچانیں گی۔" میں نے خادم حسین کو یقین دلایا "مگر وہ میرے بارے میں کوئی سوال کرے تو اسے بھی یہی جواب دینا۔"

خادم نے چہرہ آسمان کی طرف اُٹھایا "اللہ مالک ہے جی۔"

میں نے کہا "بزدل مت بنو خادم حسین۔ مسکراتے ہوئے جاؤ اور گاڑی لے کر چلے جاؤ پولیس ہیڈ آفس۔ میں بعد میں نکلوں گا۔"

"یعنی ان لوگوں کے میرے تعاقب میں روانہ ہونے کے بعد۔"

"ٹھیک سمجھے تم۔ کالا جن تمہارا پیچھا کرے گا۔"

"اُف۔ میرا تو کھایا پیا برابر ہو گیا۔ آپ نے تو کہا تھا کہ اب کوئی خطرے کی بات نہیں رہی۔ پھر یہ کالا جن کہاں سے آ گیا۔ یہ میرا پیچھا ایسے تو نہیں کرے گا جیسے میں سائیکل پر تانگے کا پیچھا کرتا تھا۔" اس نے آہ بھری۔

میں نے حیرانی سے کہا "تم..... کب مولوی خادم حسین۔"

"وہ سر! ایسے ہی بات نکل گئی منہ سے۔ خیر سے شادی بھی ہو چکی ہے اب تو۔ یہ قصہ ہے تب کا جب خادم جوان تھا۔"

"یعنی کامیاب عاشق ہو تم۔ ایسے پیچھے لگے تھے کہ شادی کر کے ہی دم لیا۔" میں نے کہا۔

"ایسی ہماری قسمت کہاں جناب۔ شادی تو میری ہو گئی اس

چار روپے کی ٹپ ایسے ہی تھی جیسے چار سو کے بل پر سو روپے چھوڑ دیے جائیں۔ میری کنجوسی کا تاثر ختم ہو گیا اور ویٹر کے ساتھ دوسرے لوگوں نے مجھے خبطی سمجھ کے معاف کر دیا۔ میرا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ ویٹر نے مجھے تحفظ فراہم کر دیا تھا ورنہ پیڈرو کی نظر ضرور مجھے دیکھ لیتی۔ وہ مجھے پہچان نہیں سکتا تھا مگر اس معمولی ریسٹورنٹ میں سے جہاں سب ہی شلوار قمیص یا دھوتی والے تھے کوئی شخص سوٹ میں برآمد ہوتا تو پیڈرو فوراً سمجھ جاتا کہ یہی وہ غیر ملکی وکیل ہو سکتا ہے۔ ابھی مجھے یہ علم نہیں تھا کہ آخر وہ نازو کے ساتھ یہاں کیوں آیا تھا اور نازو اس کے ساتھ آنے پر کیسے آمادہ ہوئی تھی۔ نازو کی صورت اور اس کا موڈ بتاتے تھے کہ وہ اپنی مرضی سے نہیں آئی تھی۔

جب میں ریسٹورنٹ سے باہر آیا تو پیڈرو اور خادم کے مکالمے نے تلخ کلامی اور پھر شور ہنگامے کی صورت اختیار کر لی تھی۔ جان بچانے کے لئے یہ مؤثر حکمتِ عملی تھی کہ مجمع لگا لیا جائے اور خادم اس میں کامیاب رہا تھا۔ جب میں نے سڑک عبور کی تو میرے کانوں میں خادم کی آواز آئی۔

"تو جی ان سے پوچھو کہ یہ کون ہوتے ہیں مجھ سے سوال جواب کرنے والے۔ بے شک گاڑی مس رابعہ قاری ایڈووکیٹ کی ہے مگر اس وقت وہ ساتھ نہیں ہیں۔ میں ڈرائیور ہوں ان کا۔ گاڑی چُرا کے نہیں لایا ہوں اور اگر چوری کا شبہ ہے تو چلو پولیس آفس۔ میں بھی تو وہیں جا رہا ہوں۔"

پیڈرو کچھ پریشان ہوا "تم غلط سمجھ رہے ہو یار۔ مجھے تو کام ہے تمہارے وکیل صاحب سے۔"

"کس وکیل صاحب سے۔ منظر صاحب، وقار یوسف اور مس رابعہ سب آفس میں ملیں گے۔" خادم حسین کار میں جتنے گا "اور پھر مجھے یار مت کہنا۔ میں ہر ایک سے یاری نہیں لگاتا پھرتا اور ویسے بھی یہ بڑا غیر شریفانہ لفظ ہے۔"

پیڈرو کے ساتھ کچھ لوگ اور بھی مسکرانے لگے "میری مراد اس وکیل سے تھی جو باہر سے آیا ہوا ہے۔ بڑا مشکل نام ہے اس کا۔"

"اس سے ملنا بھی بہت مشکل ہو گا۔ وہ ہر ایرے غیرے سے نہیں ملتا۔"

پیڈرو گرم ہو گیا "کیا سمجھتا ہے آخر وہ خود کو۔ ایک معمولی وکیل ہی ہے وہ۔ کسی ملک کا سربراہ نہیں ہے۔"

مولوی خادم حسین مسکرانے لگا "پہلی بات تو یہ کہ وہ معمولی وکیل نہیں ہے۔ دوسری بات یہ کہ وہ ہر ایرے غیرے کی زبان نہیں سمجھتا۔ صرف فرنچ بولتا ہے۔ تمہیں فرنچ آتی ہے؟"

"تمہیں تو آتی ہے۔ ارے غیرے کے بچے۔"

میں نے اتنی دیر میں حلقہ بنا کے کھڑے ہوئے آٹھ دس افراد کے پیچھے سے صورتِ حال کا جائزہ لیا تو نازو کی خاموشی کی وجہ میری سمجھ میں آ گئی۔ نازو کی پچھلی سیٹ پر ایک مرد اور عورت بظاہر

تانگے والے کی بیٹی سے۔ اس نے پسند کر لیا تھا مجھے، اور وہ تانگے والی تو کالج جانے لگی تھی کار میں۔ پہلے ہی دن اس نے میرے اوپر سے کار گزارنے کی کوشش بھی کی تو سائیکل کا چورا ہو گیا۔ میں گرا سائیڈ میں اس لئے بچ گیا۔ وہ تو صاف نکل گئی جناب۔ پھر تانگے والا ہی ہمیں اُٹھا کے اپنے گھر لے گیا۔"

میں نے کہا "اچھا اچھا۔ یہ کہانی پھر کبھی سُنیں گے۔ ابھی تم جاؤ۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔"

"اچھا جی۔ ون دن گولیاں تو نہیں چلیں گی پیچھے!" وہ اُٹھا۔

میں نے اسے یقین دلایا "کالے جن کی تم سے کوئی دشمنی نہیں۔"

"لیکن آپ سے تو ہے۔" اس نے سر ہلایا اور آہ بھر کے نکل گیا "پھر ہم کیسے محفوظ رہ سکتے ہیں جناب۔"

بدقسمتی سے اس کے اندیشے کی فوراً ہی تصدیق بھی ہو گئی۔ میں پلٹ کر دیکھے بغیر تصور کر رہا تھا کہ اب وہ سڑک پار کر چکا ہو گا۔ شاید اب گاڑی کی طرف بڑھا ہو گا اور اس نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی ہو گی۔ تھوڑے بہت فرق کی گنجائش میں نے ٹریفک کے لئے رکھی اور پھر آہستہ آہستہ سر گھما کے دیکھا۔ استاد پیڈرو اور مولوی خادم حسین کے درمیان مکالمہ جاری تھا مگر یہاں تک ان کے لبوں سے ادا ہونے والے کسی لفظ کی شنوائی نہ تھی۔ میں نے موقع سے فائدہ اُٹھایا اور ویٹر کو بُلا کے رقم پوچھی۔ اس قسم کے کسی بھی ریستوران میں بل لانے کا تصور نہیں پایا جاتا۔

بل کی رقم میری توقع سے بہت کم تھی مگر میں نے ویٹر کو سامنے روک رکھنے کے لئے کہا "اتنے پیسے بن گئے؟ حد کرتے ہو تم لوگ بھی۔ لوٹتے ہو۔"

ویٹر نے بے زاری سے کہا "اِدھر یہی ریٹ ہے، کھانے سے پہلے پاکٹ دیکھنی چاہئے۔ معلوم کر لینا چاہئے۔"

ویٹر عین میرے مقابل تھا اور اس کا ایک ہاتھ کمر پر تھا۔ بازو کی خالی تکون میں سے مجھے پیڈرو اور خادم حسین نظر آ رہے تھے۔ میں نے صرف بات لمبی کرنے کے لئے پوچھا کہ کھانے کے دام کیا ہیں۔ چائے کے کیا ہیں۔ کھانے میں سالن کی پلیٹ کتنے کی تھی اور خادم نے کتنی روٹیاں کھائی تھیں۔ اس گفتگو سے خاصے لوگ محظوظ ہو رہے تھے مگر میں کسی کنجوس کی طرح حساب کی پائی پائی جوڑ رہا تھا۔ جیب سے ایک کاغذ نکال کے میں نے رقم لکھی اور پھر ٹوٹل کیا تو دو روپے کم نکلا۔ ویٹر اکثر ایسا کرتے ہیں کیونکہ بیشتر گاہک جمع تفریق کئے بغیر نوٹ پکڑا دیتے ہیں اور اپنی راہ لیتے ہیں۔ دن بھر میں دو دو چار چار روپے اضافی لے کر بیرے کافی کما لیتے ہیں مگر کسی گاہک کو دو چار روپے کی خاطر حساب کتاب کے چکر میں پڑنا اچھا نہیں لگتا یا انہیں اس کی فرصت اور عادت نہیں ہوتی۔ جھلایا ہوا بیرا اب کچھ خفیف کھڑا تھا۔

میں نے کہا "بُرا مت ماننا دوست۔ اپنی عادت ہی کچھ ایسی ہے۔ یہ لو بل کے سولہ روپے۔ باقی چار تم رکھو۔"

سارے معاملے سے بے نیاز اور چُپ بیٹھے ہوئے تھے مگر ان کی خاموشی ہی ان کے مجرمانہ عزائم کا راز فاش کرتی تھی۔ ایک ہی کار میں سوار افراد ایک دوسرے سے اتنے اجنبی' ناآشنا اور لاتعلق نہیں ہوسکتے۔ ان سب کے درمیان کشیدگی اور بے زاری کے جذبات کا بوجھل پن تھا جو ان کے چہروں پر صاف دیکھا جاسکتا تھا۔ وہ ایک دوسرے کے وجود کو جبر کے ساتھ برداشت کررہے تھے۔ نازو کی بے بسی بھی اس مجبوری کا اعتراف کرتی محسوس ہوتی تھی کہ خالی ہاتھوں سے اپنا دفاع اور دشمن کا خانہ خراب کرنے کی بے مثل صلاحیت' ذہانت اور ہمت رکھنے کے باوجود وہ کچھ نہیں کرپارہی ہے تو اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ مقابلے پر آتشیں ہتھیاروں سے لیس خطرناک دشمن ہیں جو خون بہانا جانتے ہیں۔ وہ نازو کے عین پیچھے موجود تھے' ان کے ہاتھوں میں ریوالور بھی ہوں گے اور ان کی انگلیاں ٹریگر پر ہوں گی۔ مستعد اور مضطرب اور ایک اشارے کی منتظر......

میں اس صورت حال میں سوچے سمجھے بغیر مداخلت کی حماقت کرتا تو خمیازہ نازو کو بھگتنا پڑتا۔ میں اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ عام تماشائی کی حیثیت سے کچھ بول سکوں۔ میں صرف فرنچ سمجھ اور بول سکتا تھا۔ میں نہ اردو سمجھ رہا تھا اور نہ انگریزی اور میرے ترجمان کے فرائض ادا کرنے والا خود اس معاملے میں فریق تھا مگر میرے کہنے سے انجان بن گیا تھا۔ استاد پیڈرو سے براہ راست اُلجھنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ ابھی مجھے اپنی شناخت پر پڑے ہوئے پردے کی ضرورت تھی۔ میرا غیر ملکی وکیل کا کردار خاصا فائدہ مند ثابت ہورہا تھا۔ جب تک بدقسمتی سے جنم لینے والے کسی حادثے کے باعث افشائے راز نہیں ہوتا سکندر بخت کو روپوشی سے تحفظ حاصل رہنا چاہئے۔ موسیو آندرے کی ذات ابھی تک شک شبے سے بالاتر ہے اور جیسے جیسے وقت گزرے گا اس کی صورت میں کسی اور کی مشابہت تلاش کرنے والی نظریں از خود مایوسی کا شکار ہوجائیں گی۔

تاہم نازو کی مدد کرنا بھی لازم تھا اور ایسے حالات پیدا کرنے کے لئے میں کسی مؤثر بہانے کی تلاش میں تھا جس سے افراتفری پھیلے یا ہنگامہ ہو تو نازو کے محافظوں کی توجہ پل بھر کے لئے دوسری طرف ہوجائے اور نازو کو اپنے نازک ہاتھوں کی ہلاکت آفرینی کا مظاہرہ کرنے کا موقع مل جائے لیکن خادم حسین کے روانہ ہونے تک مجھے کچھ بھی نہیں سوجھا۔ نازو آسانی سے قابو میں آجانے والی چیز نہیں تھی چنانچہ میری فکرمندی جائز تھی۔ آخر استاد پیڈرو نے ایسا کیا داؤ آزمایا کہ جنگلی بلی سے زیادہ خونخوار نازو پالتو بلی کی طرح دبک گئی۔

لوگ منتشر ہوگئے اور پیڈرو اپنی گاڑی میں خادم حسین کے پیچھے روانہ ہوگیا تو میں نے بھی پولیس ہیڈ آفس کا رُخ کیا۔ مجھے یقین تھا کہ اب تک رابعہ اور منظر کے ساتھ دوسرے سینئر وکلائے استغاثہ عدالتی احکامات کے ساتھ پولیس ہیڈ آفس پہنچ گئے ہوں گے۔ ڈاکٹر شبلی کے قتل کی ایف آئی آر درج کرانے کے مقدمے میں بارہ وکیل مدعی تھے۔ پھر ان میں سے ایک نے دلاور کا وکیل صفائی بننا منظور کیا تو اس کا نام مدعی وکیلوں میں شامل نہیں رہا۔ اس کا کیس بدعنوانی کے الزام میں بار کونسل کو بھیج دیا گیا کہ اس کی بنیادی رکنیت معطل کی جائے۔ جو وکیل ایک وقت میں کسی کو قاتل نامزد کرے وہ دوسرے وقت میں اسی کی بے گناہی ثابت کرنے پر تُل جائے تو اس کی بے کرداری میں کون شک کرسکتا ہے۔ عدالت سے دلاور کی گرفتاری کے لئے احکامات حاصل کرنے والے گیارہ وکیل تھے۔ پولیس آفس میں ان سب کا جانا لازمی نہیں تھا۔ ڈی آئی جی صاحب کو عدالت کا حکم کوئی ایک بھی پہنچا سکتا تھا اور یہ ذمے داری منظر کے ساتھ رابعہ نے رضاکارانہ طور پر قبول کی تھی۔

پولیس ہیڈ آفس زیادہ دور نہیں تھا۔ مجھے پیدل چل کے بھی پہنچنے میں دس منٹ بھی نہیں لگے تھے۔ پیڈرو کی کار کو میں نے دروازے سے خاصے فاصلے پر دیکھا۔ خادم حسین کی گاڑی اور رابعہ کی سُرخ فاکس ویگن اندر کے پارکنگ ایریا میں موجود تھی۔ خادم حسین برآمدے میں بڑی بے چینی سے میرا انتظار کررہا تھا۔

"اللہ نے بچایا جی اس وقت تو۔ آپ نے بالکل کچھ نہیں بولا۔ خاموش تماشا دیکھتے رہے اور نازو بی بی۔"

میں نے کہا "یہ حالات کا تقاضا تھا۔"

"کمال ہے جی۔ حالات کے تقاضے میں اپنی جان چلی جاتی تو....." میں نے اسے تسلی دی "ہم تمہاری مغفرت کی دعا تمہارے چہلم تک مانگتے۔ سوئم تک تو یقیناً کرتے۔ اب جو ہوا نہیں اس پر دُکھی ہونے کی کیا ضرورت ہے۔"

"وہاں آپ انجان بن گئے۔ کیا اب وہ لوگ جان نہیں گئے کہ میں آپ کا مترجم ہوں۔ ایک نمبر کا دھوکے باز اور جھوٹا سمجھیں گے وہ مجھے۔"

"سمجھنے دو خادم حسین جو سمجھتا ہے۔ آخر اتنا ڈرتے کیوں ہو تم۔ مسلمان تو موت سے نہیں ڈرتا۔"

"موت سے کون کافر ڈرتا ہے جناب۔ مار سے ڈر لگتا ہے۔ ہڈیاں توڑ کے مجھے تمام زندگی کے لئے اپاہج بنادیا۔ لنگڑا لولا یا اندھا کانا کردیا مجھے تو؟"

"یار بہت بزدل ہو تم۔ خدا پر بھروسا رکھو۔ ہم بھی تو ہیں اور پھر تم بھی مرد ہو۔"

"اچھا جی....." اس نے یوں کہا جیسے میں نے کوئی انکشاف کیا تھا "اب تو اوکھلی میں دے دیا سر۔ فرنچ نہ سیکھی ہوتی علی بابا جی ہوتی تو اس عذاب میں کیوں گرفتار ہوتا۔ اب تو لگتا ہے دارِفانی سے آپ کے ساتھ ہی کوچ ہوگا۔ ساتھ نہیں دیا تو آپ کے دشمن مجھے آپ سے پہلے چلتا کردیں گے۔" اس نے اوپر میاں کی طرف دیکھ کے ایک فریادی آہ بھری "خیر جی' آپ یہاں

نیچے والے تیرہ نمبر کے جوتے۔ تصویریں بنائیں اس دھاندلی کی۔" "چُپ کر جا مولوی ورنہ تجھے بھی نیچے بھیجتا ہوں۔" سب انسپکٹر نے غرا کے کہا "ایک بار تو بھی چکھ تیرہ نمبر کی چھترول کا مزہ۔" خادم حسین نے سینہ نکال کے کہا "یہ تو تمہارے ڈی آئی جی کا باپ بھی نہیں کرسکتا میرے ساتھ۔" اور پھر ایک دم آگے ہوکے چلنے لگا۔

سب انسپکٹر اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتا تھا چنانچہ اس نے ایک زبردست گالی ارسال کی "چتر' ابھی..... کی طرح اکڑ رہا ہے نا۔ جب یہ تیرا ولایتی باپ نہیں ہوگا پھر دیکھیں گے تیری اکڑفوں..... مردہ چوہے کی طرح لٹکا ہوا نظر آئے گا۔"

میں نے خادم کو خبردار کیا "مولوی..... سانپ بچھو اور پاگل کتے کے ساتھ مذاق میں بھی پنگا نہیں لینا چاہئے۔"

ڈی آئی جی کے وسیع اور شاندار طریقے پر آراستہ کمرے میں بالکل دربار کا سماں تھا۔ وہ خود بڑے کروفر سے گھومنے والی کرسی پر یوں بیٹھے ہوئے تھے جیسے یہ تختِ شاہی ہے۔ ان کے سامنے بہت مرعوب کرنے والی سیاہ براناٹیک کی گلاس ٹاپ ٹیبل تھی جس کی وسعت ان کے عہدے اور کمرے کے شایان تھی۔ اس کے گرد ایک درجن کرسیاں نیم دائرے میں لگی ہوئی تھیں۔ میز کے بائیں طرف قطار میں چار فون رکھے ہوئے تھے۔ سُرخ' سفید' سیاہ اور سبز۔ باقی سب سامان آرائشی تھا جو وہ شاید ہی استعمال کرتے ہوں گے۔ پیتل کی مٹھ والی چھڑی عصائے اختیار کے طور پر ان کی دسترس میں تھی۔

بارہ کرسیوں میں سے دائیں جانب کی چار کرسیوں پر پولیس کی وردی پہنے چار افسران باادب باملاحظہ ہوشیار بیٹھے ہوئے تھے۔ ان سب کے چہرے میرے لئے اجنبی تھے۔ اتنا عرصہ پولیس سے واسطہ رکھنے کے بعد میں نیچے اور اوپر والے افسران کے عہدے محض صورت دیکھ کر بتاسکتا تھا۔ جتنا بڑا افسر ہوتا تھا اس کی صورت پر اقتدار کے غرور کا' بے اعتنائی کا اور اپنی برتری کے اظہار کا انداز اتنا ہی زیادہ نمایاں نظر آتا تھا۔ ان میں ایک ایس ایس پی تھا۔ ایک نوجوان اے ایس پی۔ یہ دونوں پولیس سروس کے براہِ راست افسری پانے والے افسر تھے۔ باقی دو میں سے ایک انسپکٹر تھا اور دوسرا اس کا ماتحت سب انسپکٹر۔ غالباً وہ بھی ڈائریکٹ اے ایس آئی بھرتی ہوا تھا چنانچہ ان میں سفید بالوں والا عمر رسیدہ انسپکٹر سب سے الگ نظر آتا تھا۔

ڈی آئی جی صاحب کے عین مقابل چار وکلا میں سے ایک تو رابعہ تھی۔ دوسرا عبدالودود منظر۔ باقی دو بھی متانت اور پختہ سالی کے باعث بار کے سینئر ارکان لگتے تھے۔ ان کی سوالیہ نظریں ایک ساتھ مجھ پر ٹھہر گئی تھیں۔

ڈی آئی جی نے کہا "یہ کون ہے۔ میں نے کہا تھا کہ صحافی کوئی اندر نہ آنے پائے۔"

اوپر یہاں کیوں کھڑے ہیں' سب لوگ آچکے ہیں۔"

"لاحول ولا قوۃ۔" میں نے تیزی سے اوپر کا رُخ کیا "جو بات سب سے پہلے بتانے والی تھی وہ آخر میں بتارہے ہو۔ تم بھی آؤنا ساتھ ورنہ میری فرنچ کون سمجھے گا۔"

کوتوال شہر عرف ڈی آئی جی صاحب اوپر سب سے الگ ایسی جگہ بیٹھے تھے جہاں واقعی پرندہ پر نہیں مار سکتا تھا۔ وہاں برآمدے میں چند صحافی جھک مار رہے تھے اور محافظِ خاص کو مرعوب کرنے کی ناکام کوشش میں مصروف تھے۔ محافظ ایک سب انسپکٹر تھا۔

"جو دل چاہے لکھو جی۔ ہمیں کیا ہم تو حکم کے بندے ہیں اور ڈی آئی جی صاحب نے کہا ہے کہ کسی صحافی کے باپ کو آگے مت آنے دو۔"

"میں باپ نہیں بیٹا ہوں ایک صحافی کا۔" کسی دل جلے نے کہا۔ "بیٹے کے لئے تو منع نہیں کیا ہے۔" غالب نے اس کی حمایت کی "اسے جانے دو ورنہ ناراض ہوں گے ڈی آئی جی صاحب۔"

سب انسپکٹر پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے مجھے بھی روک لیا "سر جی آپ کیا چیز ہو؟"

میں نے فوراً فرنچ بگھاری "کیا یہ غلام ابن غلام نہیں جانتا کہ ہم سابق حکمراں قوم کے نمائندے ہیں۔"

خادم نے ترجمہ یوں کیا "یہ لندن سے آئے ہوئے بڑے وکیل ہیں ان کو تو ڈی آئی جی صاحب روک ہی نہیں سکتے۔"

سب انسپکٹر تذبذب میں پڑ گیا "اچھا چلو پاکستانی وکیل اندر ہیں تو ولایتی وکیل بھی جائے مگر تم کدھر چلے مولوی۔"

"میں ولایتی وکیل کی دیسی زبان ہوں۔" خادم نے کہا "میری مدد کے بغیر ان کی بات کون سمجھے گا؟"

خادم حسین کو کلیئرنس مل گئی۔ آگے جانے سے پہلے میں نے ایک پریس کانفرنس کر ڈالی "خادم حسین ان کو بتاؤ کہ خصوصی تفتیشی ٹیم کے جو ارکان معطل کئے گئے تھے ان کو گرفتار کرنے کے بعد عام قیدیوں کی طرح نہیں بلکہ سرکاری مہمانوں کی طرح رکھا گیا ہے۔ وہ پولیس میں ہونے کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے اسی عمارت کے ایک کمرے میں یوں فروکش ہیں جیسے یہ کوئی فور اسٹار ہوٹل ہے۔ یہ لوگ خود دیکھ سکتے ہیں اور ساری دنیا کو دکھا سکتے ہیں کہ انہیں آرام دہ بستر' ریڈیو' ٹی وی' اخبار' بہترین کھانا اور نوکر چاکر سب فراہم کئے گئے ہیں۔ کیا وہ مجرم نہیں ہیں جو مجرموں کو غیرقانونی مراعات دیتے ہیں۔"

خادم نے خاصی جذباتی تقریر کی جس میں میری بات کو زیادہ مؤثر طریقے پر پیش کیا گیا تھا اور انصاف کی دھجیاں اُڑانے اور قانون کو تماشا بنانے پر پولیس کے خوب لتے لئے گئے تھے۔ اس نے سب انسپکٹر کے گھورنے کی پروا نہیں کی۔

"یہاں کھڑے رہنے سے کیا فائدہ جی۔ آپ لوگ جائیں اور دیکھیں کہ قانون میں جس مساوات کا ذکر ہے وہ کہاں ہے۔ نیچے حوالات میں بھی قیدی ہیں' اوپر والے قیدی پلاؤ قورمے کھا رہے

منظر نے اتنے سنجیدہ ماحول میں بھی اپنی عادت نہیں چھوڑی "کمال ہے ڈی آئی جی صاحب۔ آپ کو ولایتی مال کی پہچان نہیں۔ سُنا ہے آپ کے گھر میں ہر چیز باہر کی ہے۔ ذاتی استعمال کی......"

مجھے بعد میں پتا چلا کہ ڈی آئی جی کی بیوی غیر ملکی تھی۔ اس نے گھور کے منظر کو دیکھا "ڈونٹ ٹرائی ٹو بی پرسنل اِن یور جوکس۔" (مذاق میں بھی کسی کی ذات کو نشانہ مت بناؤ)

"سوری سر.... میں آپ کی بیوی کے حوالے سے بات نہیں کررہا تھا۔" منظر نے انگریزی میں کہا۔

ڈی آئی جی معذرت کے اس انداز پر مزید جزبز ہوا۔ منظر کہہ دیتا کہ "چور کی داڑھی میں تنکا" تب بھی مطلب یہی ہوتا۔

رابعہ نے فوراً مداخلت کی "سر یہ موسیو آندرے ہیں۔"

"آئی سی۔ وہ برٹش وکیل جو انگریزی نہیں جانتا۔" ڈی آئی جی نے طنز اور تمسخر آمیز لہجے میں کہا اور مجھ سے مصافحہ کیا "یہ کون ہے، مترجم؟"

خادم نے سر جھکا کے کہا "ماشاء اللہ بالکل ٹھیک سمجھے آپ اب ڈی آئی جی نے چھڑی سے زردی والوں کی نشاندہی کرتے ہوئے تعارف کی رسم نبھائی "یہ نئی تفتیشی ٹیم ہے۔ وزارتِ داخلہ نے محکمے کے بہترین دماغ ہمارے حوالے کردیے ہیں۔"

منظر نے کہا "پہلی ٹیم کا انتخاب کرتے ہوئے بھی یہی معیار مدنظر رکھا جاتا تو اچھا تھا۔"

ڈی آئی جی نے بُرا مان کے کہا "وہ بھی کم نہیں تھے مگر خدا سمجھے ان اخبار والوں سے.... یہ سب بلیک میلرز......"

ایک وکیل نے احتجاج کیا "آپ سب کا لفظ کیوں استعمال کرتے ہیں۔"

"میرا مطلب تھا کہ کچھ بلیک میلرز نے ان کے بارے میں حقائق کو ایسے مسخ کیا کہ ان کا کیریر خراب ہوا۔"

"حقائق کو کیسے مسخ کیا؟ کیا وہ تصاویر جعلی تھیں جن میں وہ لوگ ایک مفرور مجرم کے ساتھ ہیں۔"

"وہ بھی پولیس اسٹیشن کے اندر......"

"خیر چھوڑیں یہ بحث...." ڈی آئی جی نے ناگواری سے کہا۔

اب میں نے دخل دیا "خادم اس سے پوچھو کہ کیا اسی لئے صحافیوں کو یہاں نہیں آنے دیا گیا ہے کہ حقائق چھپانے مقصود ہیں؟ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ ہم اخبار والوں کو سب بتاتے رہیں گے۔ ہم نے انہیں بتادیا ہے کہ یہاں زیرِ حراست پولیس والوں کے ساتھ معزز مہمانوں جیسا سلوک ہورہا ہے۔"

خادم حسین نے پھر ایک جذباتی تقریر کرڈالی جس میں حقائق بہرحال وہی تھے مگر الفاظ اس کے اپنے جذبات کی ترجمانی کرتے تھے۔

ڈی آئی جی آگ بگولا ہوگیا "بکواس کرتا ہے تمہارا یہ وکیل۔"

میں نے جواب دیا "جو کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اسے کوئی جھٹلا نہیں سکتا۔ ڈی آئی جی صاحب اگر سچ بولتے ہیں تو پھر صحافیوں سے کیوں ڈرتے ہیں۔ میں اس دُہرے معیار وا[le] انصاف سے اچھی توقعات وابستہ نہیں کرسکتا اور یہ سمجھتا ہوں شیلی مرڈر کیس میں پولیس ایک فریق کا کردار ادا کررہی ہے۔ ایف آئی آر میں نامزد قتل کا مجرم پولیس اسٹیشن میں تفتیش والوں کے ساتھ چائے پیتا ہے اور پھر روپوش ہوجاتا ہے اس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟ یہی کہ پولیس کا محکمہ قاتل کو بچانے کی پوری کوشش کررہا ہے۔ تفتیش میں اسی لئے پیش رفت نہیں ہوئی۔"

ڈی آئی جی صاحب مجبور تھے ورنہ میری جگہ عام آدمی ہوتا تو ان کا جلال آتش فشانی اس کو ہی نہیں اس کے سارے خاندان کو بھسم کردیتا۔ ان کے سامنے قانون کے ٹھیکے دار بیٹھے ہوئے تھے جن کو وہ ایسا سمجھتے تھے ورنہ درحقیقت یہی لوگ قانون کی روح کو مسخ ہونے سے بچانے کا مقدس فریضہ بجالا رہے تھے۔ ڈی آئی جی ایک حد تک اپنے غصے کا اظہار کرسکتا تھا جو اس نے کر ہی دیا تھا۔ اس حد سے بڑھ کے کسی کو گالیاں دینا یا جوتے کی دھمکی دینا بھی اس کے لئے عزت و وقار کا مسئلہ بن جاتا۔

اس نے سیاسی مصلحت کوشی سے کام لیا اور اپنا غصہ پی گیا۔

اس نے مسکرا کے اپنے ماتحتوں کی طرف دیکھا اور پھر وکیلوں کی طرف "اب اس شخص کی رائے کو میں کیسے بدل سکتا ہوں۔"

منظر نے پھر پنگا لیا "آپ کوشش تو کرسکتے ہیں۔ مثلاً صحافی حضرات کو بُلا کے اس کے ایک خیال کو فوراً غلط ثابت کردیں۔"

ڈی آئی جی نے اب دفاعی گیم کھیلنے کا فیصلہ کیا تھا۔ کسی بڑے سیاستدان کی طرح اس نے ہر سنگِ الزام اور تیرِ دشنام کا جواب تحمل اور بردباری کا پیکر بن کے دیا تھا کہ اس کے ماتحت سیکھ لیں اور ان کے سامنے یہ ظاہر نہ ہو کہ اتنی بے عزتی ہونے کے باوجود ڈی آئی جی صاحب چیخنے چلّانے کے سوا کچھ نہ کرسکے۔ اس نے گھنٹی بجائی اور حاضر ہوکے سیلوٹ جھاڑنے والے عادی کانسٹیبل سے کہا کہ وہ تمام صحافیوں کو بُلا لے۔ کانسٹیبل بالکل مشینی انداز میں حرکت کرتا تھا۔ وہ پھر سیلوٹ مار کے گھوما اور چابی کے کھلونے کی طرح باہر نکل گیا۔

دوسرے وکیلوں نے ڈی آئی جی صاحب کے اقدام کو سراہا لیکن نظروں ہی نظروں میں مجھے اور منظر کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ چار مقامی صحافی بھی وکیلوں کے ساتھ فٹ ہوگئے۔ دو فوٹوگرافر مخالف سمتوں سے اپنے کیمروں کے فلیش چمکانے لگے۔

اب ڈی آئی جی نے محتاط انداز میں اپنی پریس کانفرنس کا آغاز کیا "لیڈیز اینڈ جنٹلمین" اس نے بالوں پر ہاتھ پھیر کے خوش دلی سے کہا "آپ سب تو ایک دوسرے سے واقف ہوں گے۔ اس وقت میں آپ کا تعارف ان افسران سے کراتا ہوں جن کو وزارت

"یہ عالم خورشید آفریدی کے بیٹے تو نہیں۔" ایک رپورٹر بولا۔

اے ایس پی نے خوش ہوکے اسے دیکھا "یو آر ویری رائٹ۔"

اس رپورٹر نے عجیب انداز میں آنکھیں گھما کے اوپر دیکھا اور پھر ایک ٹھنڈی سانس یوں لی کہ سب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔ بغیر کہے اس نے انا للہ کہہ دیا تھا۔ اے ایس پی کا چہرہ بے عزتی کے احساس سے سُرخ ہوا مگر وہ خون کا گھونٹ پینے پر مجبور تھا۔ اس کو اعلیٰ افسران کی موجودگی کا بھی خیال آیا ہوگا اور یہ بھی کہ کیریر کا آغاز ان لوگوں سے بگاڑ کے نہیں کرنا چاہئے جن کی اوقات تو کچھ نہیں ہوتی مگر ان کے منہ لگنے سے بڑے بڑے پاپی سیاستدان بھی ڈرتے ہیں۔

دیگر دو ارکان میں انسپکٹر ساجد تھا اور نیا اے ایس آئی افتخار۔ یہ سب لوگ مختلف شہروں سے بڑی عجلت میں پہنچے تھے انہیں حکم ملا تھا کہ چوبیس گھنٹے میں رپورٹ کریں۔ ابھی انہیں پوری طرح علم بھی نہیں تھا کہ اس کیس کی نوعیت کیا ہے جس کی خصوصی تفتیش کے لئے یہ ٹیم بنائی گئی تھی۔

"انہیں کچھ وقت دیں۔ یہ ریکارڈ دیکھ لیں اور تفتیش کے لئے کوئی حکمتِ عملی بنائیں۔" ڈی آئی جی نے کہا۔

رابعہ نے احتجاج کیا "کتنا وقت چاہئے۔ ہم تو فوری طور پر ایکشن چاہتے ہیں۔ عدالتی احکامات کے مطابق۔"

"عدالتی احکامات کے سامنے میں بے بس ہوں۔ میں پولیس فورس فراہم کرسکتا ہوں۔ مگر ذمے داری آپ کی ہے۔"

"ہمارے پاس مصدقہ اطلاعات ہیں۔"

"کیا ذرائع ہیں آخر آپ کی اطلاعات کے۔ آپ لوگ وکیل ہیں جاسوس نہیں۔" ڈی آئی جی نے کہا۔

"کیا ہم نے جعلی نوٹ چھاپنے والے گروہ کی نشاندہی نہیں کی تھی اور کیا ہماری فراہم کردہ معلومات غلط تھیں۔ پولیس کو اس وقت تک کچھ پتا نہیں تھا۔" غالب نے کہا۔

"یہ کہنا غلط ہے۔ پولیس چھاپا مارنے کی پلاننگ کررہی تھی، آپ نے بلاوجہ دخل اندازی کی۔ اس سے کام خراب ہوسکتا تھا۔"

"پولیس کے پاس کوئی ثبوت نہیں کہ انہیں کچھ معلوم تھا۔ پھر وہ پلاننگ کیسے کررہے تھے؟ اور کب تک پلاننگ کرتے وہ؟ جب تک کہ مجرم ٹھکانا بدل کے فرار نہ ہوجاتے!" غالب نے کہا "کیا پولیس کے مجرموں سے مذاکرات ہورہے تھے۔"

"کمیشن پر۔" دوسرے رپورٹر نے لقمہ دیا۔

"جنٹلمین آپ لوگ فضول باتوں میں اُلجھ رہے ہیں۔" ڈی آئی جی نے برہمی سے کہا۔

رابعہ نے کہا "اچھا آپ کریں کام کی بات۔ کہاں ہے وہ پولیس فورس جس کی آپ نے بات کی تھی۔"

"مجھے ٹھوس شہادت چاہئے کہ پولیس کا وقت ضائع نہیں

داخلہ نے فوری طور پر شیلی مرڈر کیس کی خصوصی تفتیش کے لئے نامزد کیا ہے۔ پُرانی ٹیم کے معطل کئے جانے کے بعد۔"

"غالباً آپ ان کی گرفتاری کے احکامات جاری کرچکے ہیں۔" کسی رپورٹر نے لکھتے لکھتے کہا۔

"غالباً کیوں 'یقیناً'۔" غالب بولا۔

"صرف احکامات جاری کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ عمل درآمد کی نیت ہی نہ ہو تو۔" منظر نے طنزیہ لہجے میں تبصرہ کیا۔

"پلیز۔ آپ لوگ مجھے بات ختم کرنے دیں۔" ڈی آئی جی بولا "میں آپ کو ہر طرح سے مطمئن کرسکتا ہوں۔"

"ابھی آپ کیا نہیں کرسکتے۔" منظر نے زیرِ لب کہا۔

ڈی آئی جی نے اس اشتعال انگیزی کو نظر انداز کردیا "یہ نئی ٹیم کے نگراں ہیں ایس ایس پی جاوید صدیقی۔ ان کی بہت گڈوِل ہے۔"

غالب نے سر جھکائے جھکائے کہا "خدا کرے ان کی واپسی بھی عزت کے ساتھ ہو۔"

"بس آپ لوگوں کے ہاتھوں محفوظ رہے۔" ڈی آئی جی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا "ان کا ریکارڈ بہت اچھا ہے لیکن موجودہ حالات میں ان کا کام بھی زیادہ مشکل ہوگیا ہے۔ میں آپ لوگوں سے تعاون کی درخواست کروں گا۔"

ایک وکیل نے کہا "تعاون کا جذبہ دو طرفہ ہوتا ہے۔"

ایک رپورٹر نے کہا "رائٹ۔ ابھی جو سلوک ہمارے ساتھ روا رکھا گیا تھا اس کے بعد آپ یہ توقع رکھیں کہ ہم آپ کی خوش اخلاقی کے گُن گائیں تو یہ ناممکن ہے۔"

غالب نے کہا "چلو یار دیر آید درست آید۔ ہم پچھلی بات نہیں کرتے۔ آئندہ کے لئے تعاون کا یقین دلا سکتے ہیں بشرطیکہ ہمیں حقائق سے باخبر رکھا جائے۔ جب آپ یہ اختیار کی چھڑی گھُماتے ہیں تو ماتحت عملہ لاٹھی چارج کردیتا ہے۔ گدھے گھوڑے ایک ہی لاٹھی سے ہانک دیے جاتے ہیں۔"

اب ایس ایس پی جاوید نے کھنکار کر کہا "آپ کو مجھ سے کوئی شکایت ہو تو پہلے مجھے بتائیں۔ لیڈ لگانے سے پہلے۔"

"ہم زرد صحافت کے قائل نہیں۔ آپ بھی سچ کی کڑواہٹ کو قبول کرنا سیکھ لیں۔ ہر سُرخی کو سنسنی خیزی کا شاہکار مت کہیں۔"

ڈی آئی جی نے سر ہلایا "آئی ہوپ۔ کہ تعاون سے سب ٹھیک ہوجائے گا۔ غلط فہمی تو ہوتی رہتی ہے۔"

"غلط بیانی کے باعث۔" غالب نے کہا "غلط فہمی کوئی خودرو چیز نہیں ہے۔"

"یہ اے ایس پی آفتاب عالم ہیں۔ نئے نئے پولیس سروس میں آئے ہیں مگر یہ ہمارے محکمے کے ایک آئی جی صاحب کے ہونہار سپوت ہیں اور اپنے والد کے نقشِ قدم پر چلنے کا عزم لے کر آئے ہیں۔" ڈی آئی جی نے انگریزی میں کہا۔

ہوگا۔ مطلوبہ مجرم وہاں موجود ہے۔ یہ ثابت کریں پہلے.....“

”یہ ثابت کیسے ہوگا۔ آپ خود چل کے دیکھ سکتے ہیں ڈی آئی جی صاحب۔ ٹھوس شہادت کا کیا مطلب ہے آخر؟ کیا آپ لوگ اپنے مخبروں کی اطلاع پر چھاپے نہیں مارتے۔ شک اور شبے کی بنیاد پر کوئی کارروائی نہیں کرتے۔“

منظر نے کہا ”مخبر تو ان کے اپنے آدمی ہوتے ہیں۔ خود مجرم اور سزا یافتہ۔ ہماری بات پر یہ کیوں اعتبار کریں۔“

وقفے وقفے سے خادم مجھ سے بات کرلیتا تھا اور میں سر ہلا کے ظاہر کرتا تھا کہ میں سب سمجھ رہا ہوں۔ حالانکہ ہمارے درمیان ساری گفتگو نازو کے بارے میں ہوئی تھی جسے پولیس آفس کے سامنے دلاور کے ایک ساتھی نے یرغمال بنا رکھا تھا۔ مجھے اس کی طرف سے سخت تشویش لاحق تھی۔ ابھی تک میں نے غالب یا رابعہ کو کچھ نہیں بتایا تھا اور ان کے رویے سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ تازہ ترین صورتِ حال سے بے خبر ہیں۔

”اوکے۔ جاوید صدیقی۔ تم اپنی ٹیم کے ساتھ جاؤ۔ ڈاکٹر شیلی مرڈر کیس میں نامزد ملزم گرفتار ہو جاتا ہے تو یہ تمہارے کریڈٹ پر جائے گا کہ تم نے چارج لیتے ہی اتنا بڑا کارنامہ سرانجام دیا۔ حالانکہ مجھے اس کی اُمید بہت کم ہے۔ ہم عدالت کے حکم کو نظرانداز کر سکتے تھے مگر یہ مدعی خود بہت بڑے وکیل ہیں اور خود کو بہت بڑا سراغرساں بھی ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ صحافی بھی موجود ہیں یہاں۔ ہمیں بُرائی مول لینے کی کیا ضرورت ہے۔“

رابعہ نے کہا ”رازداری بہت اہم ہے اس کیس میں۔“

”کیا مطلب ہے آپ کا مس رابعہ۔ میں ان سب کو سلیمانی ٹوپی پہنا کر روانہ کروں کہ یہ کسی کو بھی نظر نہ آئیں۔ چھاپا رازداری سے کیسے مارا جا سکتا ہے۔“ ڈی آئی جی نے کہا ”جو کچھ ہوگا سب کے سامنے اور سرِعام ہوگا۔“

میں نے غالب کی طرف جُھک کے اس کے کان میں کہا ”نازو باہر پیڈرو کی گاڑی میں بیٹھی ہوئی ہے۔“

غالب نے مجھے یوں دیکھا جیسے میں نے اردو نہیں فرنچ بولی ہو۔ میں نے سر ہلا کے اسے یقین دلانا چاہا کہ اس کے کانوں کو دھوکا نہیں ہوا اور میں نے وہی کہا تھا جو اس نے سمجھا ہے۔

ڈی آئی جی نے ازراہِ تمسخر دوسروں سے اردو میں کہا ”بھئی اس ولایتی وکیل کو معلوم ہونا چاہئے کہ محفل میں کانا پھوسی بدتہذیبی کہلاتی ہے۔ ہم دیسی لوگ تو انہی سے ایٹی کیٹ سیکھتے ہیں۔“

مجھ سے ایک خطرناک غلطی ہوگئی تھی مگر غالب نے ڈی آئی جی کے پکڑنے سے پہلے ہی بات بنالی ”سوری۔ میں سمجھا نہیں۔ مترجم صاحب آپ پوچھیں یہ کیا کہہ رہے ہیں۔“

میں نے خادم سے کہا ”تم وہی بات دُہرا دو جو باہر صحافیوں کے سامنے کہی تھی۔“

خادم شروع ہوگیا ”موسیو آندرے جذباتی ہو کے بھول گئے تھے کہ یہاں ان کی زبان کوئی نہیں سمجھتا۔ اب تو انہیں گلہ ہے ... بات سمجھنے والے بھی ان کی بات کو ایک کان سے سُن کے دوسرے سے اُڑا دیتے ہیں۔ انہوں نے زیرِ حراست پولیس افسران کے ساتھ ہونے والے امتیازی سلوک کی بات کی تھی۔ آپ لوگوں نے ... کچھ دیکھا؟“

یہ آخری سوال صحافی حضرات سے کیا گیا تھا۔ یکلخت ان ... کو اس تذلیل کا بدلہ لینے کا موقع مل گیا جو ڈی آئی جی نے ان ... اپنے دربارِ خاص سے دور رکھ کے کی تھی۔ وہ سب ایک ... بولنے لگے۔ وہ لوگ اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ آئے تھے ... ملزمان تو عیش کر رہے ہیں۔

ڈی آئی جی نے بڑی مشکل سے انہیں خاموش کیا ”ضرور ... غلط فہمی ہوئی ہے آپ لوگوں کو۔“

”غلط فہمی“ ایک چیف رپورٹر بھڑک اُٹھا ”یہی تو آرٹ ... آپ لوگوں کا۔ جھوٹ خود بولتے ہیں۔ غلط فہمی ہماری بنا دیتے ... آخر یہ غلط فہمی یکطرفہ کیوں ہوتی ہے؟ آپ لوگوں کو کبھی غلط ... ہوئی؟“

دوسرے نے کہا ”یہ لوگ تو صرف خوش فہمی کا شکار رہا ... کرتے ہیں۔“

تیسرا بولا ”اس بات کا مطلب تو یہ ہوا کہ جو ہم کہہ رہے ... وہ غلط ہے۔ جو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ آئے ہیں وہ بھی غلط ... کچھ خدا کا خوف کیجئے۔ جہاں آپ بیٹھے ہوئے ہیں سر اس عمارت ... کے ایک کمرے میں یہ کھلی دھاندلی ہو رہی ہے۔ آپ اتنے ... اور بے خبر تو نہیں ہو سکتے۔“

غالب نے اُٹھتے ہوئے کہا ”میں معذرت چاہتا ہوں۔ ... موسیو آندرے نے شام کی چائے پر مدعو کیا ہے۔ انہیں مجھ سے ... خاص بات کرنی ہے اسی سلسلے میں۔“

خادم نے بڑی ذہانت کا ثبوت دیا ”جی ہاں، بہت خاص ... ہے۔“

ڈی آئی جی نے اسے غور سے دیکھا ”کس بارے میں؟“

خادم کچھ گھبرایا ”ظاہر ہے سر سات سمندر پار سے ... صاحب جس کام کے لئے تشریف لائے ہیں اسی بارے میں ہوگی۔“

”ہوگی کیا، تمہیں نہیں معلوم؟“ ڈی آئی جی نے سختی سے ...

”مجھے... مجھے کیسے معلوم ہو سکتی ہے سر۔ ابھی تو بات ہوئی ... نہیں۔ ہوگی ضرور میری معرفت مگر... میں پہلے ہی وضاحت کر دوں ... کہ معلوم ہونے کے بعد بھی میں کچھ بتاؤں گا نہیں۔ میں رازداری کا پابند ہوں۔ اخلاقاً... شرعاً اور قانوناً.... کیا میں نے غلط کہا؟“

آخری سوال اس نے پھر وکیلوں اور صحافیوں پر داغ دیا ... ان سب نے تقریباً ایک زبان ہو کے اس کی تائید کی۔ مولوی ... حسین نے بالواسطہ طور پر قانون اور صحافت کے پیشوں سے ... رکھنے والوں کی حمایت حاصل کرلی تھی۔ ڈی آئی جی صاحب ... ہم پولیس ہیڈ آفس میں ہوں گے۔ وہ یہاں آئے ہوں گے تو کسی نے بتا دیا ہوگا کہ لال رنگ کی گاڑی یہاں کھڑی ہوئی تھی مگر اب پھر اس سمت میں چلی گئی۔ میں اور خادم چائے پینے گئے تھے۔ کار سڑک پر کھڑی ہوئی تھی۔ پیڈرو نے بالکل اس کے پیچھے اپنی گاڑی لگائی تو میں نے اسے دیکھ لیا۔ اسے بھی اور نازو کو بھی۔“

”پھر تم چُھپ گئے۔“ غالب نے تلخی سے کہا۔

”نہیں یار۔ میں نے خادم سے کہا کہ گاڑی لے جائے۔ مجھے اُمید تھی کہ وہ اس سے ضرور پوچھیں گے ہمارے بارے میں اور ایسا ہی ہوا۔ خادم نے میری ہدایات کے مطابق کہہ دیا کہ وہ تو اکیلا آیا تھا چائے پینے کے لئے۔

باقی بات خادم نے بتا دی۔ غالب سُن سُن کے پریشان ہوتا رہا ”پھر اب کیا کریں۔ کہاں لے گئے ہوں گے وہ نازو کو؟“

”گھبرانے کی بات نہیں۔ پیڈرو زیادہ بے تاب ہے ہم سے رابطے کے لئے۔“

”نازو تو منظر کے گھر میں تھی۔“

”پیڈرو نے پکڑا ہوگا باہر دھوکے سے؟“

”مفروضات قائم کرنے سے بہتر تھا کہ تم منظر کے گھر فون کر کے پوچھ لیتے۔“ غالب نے کہا ”نازو کو دھوکا کون دے سکتا ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے انہوں نے منظر کے گھر میں گھس کے نازو کو گن پوائنٹ پر اُٹھا لیا ہوگا۔“ میں نے کہا ”اگر ایسا ہوتا برخوردار تو منظر کو پتا چل جاتا۔“

”کیسے پتا چل جاتا۔ فرشتے بتاتے اسے؟ فون کرنے کی اجازت دیتے اسے اغوا کرنے والے۔“ غالب مجھ پر برس پڑا۔

”ایسی سنگین واردات کا ارتکاب کرنے والے ٹیلی فون چھوڑتے کہاں ہیں۔ لائن پہلے کاٹتے ہیں مگر پیڈرو سے اتنی بڑی حماقت کی اُمید نہیں کی جا سکتی کہ وہ منظر کے گھر میں گھس جائے۔“

”یہ حماقت ہے تمہارے نزدیک۔ اس نے تو بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔“ غالب خلا میں گھورنے لگا ”حساب برابر کر دیا۔ اب سودا کرلو اس سے دلاور کے بدلے نازو کا۔“

میں نے کہا ”شاید ایسا ہی کرنا پڑے۔ تم فون کر کے دیکھو منظر کے گھر یا وقار یوسف کی بیوی کو۔ اگر کچھ پتا نہیں چلتا تو ہم یہ آپریشن روک دیتے ہیں۔ ویسے مجھے سو فیصد یقین ہے کہ ان سے تمہارا آج ہی رابطہ ہوگا شاید ابھی۔“

”تم رابعہ کو سمجھاؤ کہ دلاور کی گرفتاری کا معاملہ فی الحال ٹال دے۔ کوئی بھی بہانہ کردے۔ پولیس کو پہلے ہی بہانے کی تلاش ہے۔“ میں اوپر واپس گیا اور غالب نیچے کسی کے آفس میں گھس گیا۔ فون تقریباً ہر کمرے میں تھا اور غالب کو ایک کال کرنے سے کون روک سکتا تھا۔ خادم کو غالب کی بدحواسی پر سخت تشویش تھی۔

”یہ تو کچھ معاملہ بہت اُلجھ گیا۔ اغوا کرنے والے کیا ان سے واقف نہیں تھے۔ میں تو حیران ہوں مس نازو اغوا کیسے ہوگئیں۔

کچھ بعید نہ تھا کہ بعد میں کسی وقت بھی اسے طلب کرلیں اور جتنی باتیں اسے معلوم ہیں وہ سب یوں سُن لیں جیسے لوگ ٹیپ ریکارڈر میں کیسٹ لگا کے وہ سب سُن لیتے ہیں جو اس میں محفوظ ہو۔ آدمی کو کیسٹ کی طرح بجانے کے لئے پولیس کے پاس خصوصی آلات ہوتے ہیں۔

میں اور غالب باہر آئے تو میں نے واضح طور پر رابعہ اور منظر کو پریشان دیکھا۔ اندر اب خاصی گرما گرمی پیدا ہو چکی تھی۔ ڈی آئی جی کو خبر نہ تھی کہ صحافی اتنی دیر میں کیا گُل کھلا چکے ہیں۔ انہیں باہر روکنا اسے مہنگا پڑا تھا۔ وہ شاہی مہمانوں کی خاطرداری کے سارے ثبوت جمع کرلائے تھے اور اب ڈی آئی جی صاحب کی تردید خود انہی کے لئے باعثِ خفت ہو رہی تھی۔ دوسری طرف رابعہ اور منظر کو جلدی تھی کہ دلاور کی گرفتاری کے لئے عدالتی احکامات پر عمل درآمد میں تاخیر نہ کی جائے۔

غالب نے باہر آتے ہی مجھ سے کہا ”یہ کیا فرما رہے تھے آپ“

”ٹھیک فرما رہے تھے ہم۔“ میں نے کہا ”نیچے چلو اور خود ہی دیکھ لو اپنی آنکھوں سے۔ ایک ہلکے نیلے رنگ کی فاکس ویگن مین گیٹ کے سامنے نظر آجائے گی۔ تھوڑا سا دائیں جانب۔ پیڈرو کو تم پہچانتے ہو؟“

”یار یہ کیا مذاق ہے۔ نازو کیوں ہے ان کے ساتھ؟“

”تم نروس ہو رہے ہو؟ یہ سوال میں نازو سے نہیں کرسکا۔ کرتا بھی کیسے۔ وہ فرنچ نہیں جانتی۔“ میں نے سیڑھیاں اُترتے ہوئے کہا۔

”بھاڑ میں گئی تمہاری فرنچ۔ اور لعنت تمہاری وکالت پر۔ تم کو زیادہ فکر تھی اپنی۔“ غالب اب مشتعل تھا۔

”چلاؤ مت مرزا جی۔ مجھے نازو کی فکر کرنے سے کچھ حاصل نہ ہوتا۔ یہ سب اچانک پیش آیا تھا میرے سامنے اور وہاں کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔“ میں نے کہا ”دیکھو ہم گیٹ سے باہر نہیں جائیں گے، پہلے یہاں رُک کے میری بات سُن لو۔“

”بولو جلدی۔“ غالب نے گیٹ سے باہر جھانک کے کہا ”گاڑی تو مجھے کوئی بھی نظر نہیں آرہی ہے۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ میں نے کہا اور گیٹ سے باہر آگیا۔

”کہاں ہے وہ نیلی فاکس ویگن؟“

”یار خدا کی قسم۔ وہ یہاں موجود تھی۔ جب میں اوپر گیا تھا۔ تم خادم سے پوچھ لو۔“

خادم نے سر ہلایا ”اجی وہ تو سائے کی طرح لگ گیا تھا میرے پیچھے۔ خبیث کہیں کا۔“

”تم نے اوپر آتے ہی کیوں نہیں بتایا تھا؟“

”میرا خیال تھا کہ وہ انتظار کریں گے۔ وہ کسی سے بات کرنا چاہتے تھے اور اسی لیے نازو کو ساتھ لائے تھے۔ ورنہ وہاں کیوں پہنچتے جہاں رابعہ کی کار کھڑی ہوئی تھی۔ نازو نے انہیں بتایا ہوگا کہ

بڑے گھاٹے کا سودا کیا ہے جی ان کو لے جانے والوں نے۔ وہ پہنچادیں گی سب کو ہڈیوں کے وارڈ میں......"

میں نے کہا "مولوی خاموش ہو جاؤ۔ تم ابھی کچھ نہیں جانتے نہ ہمیں نہ ہمارے دشمنوں کو۔"

"آپ کے کہاں جی۔ اب تو برابر کی دشمنی ہے مجھ سے ان کی۔ مارا گیا ڈڈو (مینڈک) ہاتھیوں کی لڑائی میں۔"

میرے واپس پہنچنے تک صورتِ حال میں کوئی ڈرامائی تبدیلی آچکی تھی۔ میں نے رابعہ کا اُڑا ہوا رنگ دیکھا اور منظر کی صورت پر بارہ بجے ہوئے نظر آئے تو میرے خدشات کی تصدیق ہوگئی۔ انہیں نازو کے بارے میں معلوم ہوچکا تھا۔

رابعہ نے اپنے لہجے پر قابو پانے کی کوشش کی "آئی ایم سوری سر لیکن فی الحال یہ نہیں ہوسکتا۔"

"مگر کیوں؟ ابھی تو آپ بچّوں کی طرح ضد کررہی تھیں کہ ابھی چلو۔" ڈی آئی جی نے کہا اور دوسروں کی طرف دیکھ کے مسکرایا۔

منظر بولا "اب یہ بڑوں کی طرح آپ کو کچھ سمجھا رہی ہیں تو آپ نہیں سمجھ رہے ہیں۔ آپ بچّے بن گئے ہیں۔"

دوسرے وکیل اور صحافی سب تجسّس میں مبتلا ہوگئے تھے

"آخر یہ کس نے فون کیا تھا آپ کو؟"

"یہ میں نہیں بتا سکتی۔" رابعہ نے اُٹھتے ہوئے کہا "اسے میرا مصدقہ ذریعہ سمجھ لیں۔ اس نے سابقہ اطلاع کے بارے میں کچھ شک کا اظہار کیا ہے۔ ایسی صورت میں چھاپا مارنے میں وقت ضائع ہوگا سب کا۔"

"ہمارے وقت کی فکر مت کریں۔ ضائع کرتے ہی رہتے ہیں اور پھر بھی بہت بچ جاتا ہے؟" ایس ایس پی جاوید بولا "عام تاثر یہی ہے۔ کہ ہم مکھیاں مارتے رہتے ہیں۔ مفت کی روٹیاں توڑتے ہیں۔ کرتے کچھ نہیں۔" یہ بات انسپکٹر نے کی تھی "بس ٹائم ضائع کرتے ہیں۔"

اب منظر اُٹھا "خیر جھوٹ یہ بھی نہیں ہے۔ مگر اس وقت ہم اپنا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتے۔ ہمارا وقت بہرحال قیمتی ہے۔"

ڈی آئی جی بولا "آپ کی مرضی۔ ہم تو بالکل تیار تھے۔ جاوید صدیقی کیا خیال ہے؟"

"چھاپا مارنا چاہئے سر۔ شک پر بھی۔"

منظر سمجھ گیا کہ درجواب آں غزل پولیس وہی کہہ رہی ہے جو پہلے رابعہ کہہ رہی تھی "مجھے بات کرنے کی اجازت دیں مس رابعہ سے۔ پھر میں بتاتا ہوں۔"

اس نے چند قدم دور جاکے ایک منٹ بات کی اور پھر لوٹ آیا "پوزیشن کلیر ہوگئی ہے سر۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ ملزم اب وہاں نہیں ہے جہاں پہلے تھا۔ اسے کسی نے خبردار کردیا ہے کہ چھاپا پڑنے والا ہے۔ اسے فرار کرادیا گیا ہے۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ ہم بھی نہیں جانتے کہ چھاپا کہاں مارنا ہے۔" ڈی آئی جی نے کہا۔

"چالاک مجرم ہوا کا رُخ دیکھتا ہے۔ یہاں سے اس کے نمک خوار نے پوری رپورٹ دی ہوگی کہ کیا کارروائی ہو... ہے۔" یہ کیوں نہیں مانتے کہ تمہارے پاس کچھ نہیں تھا۔ ... سنی سُنائی پر ایکٹو ہو رہے تھے۔ بلکہ اوور ایکٹو ہوگئے تھے۔"

"حقیقت سامنے آجائے گی آپ کے۔" رابعہ نے کہا "... نہ سہی کل۔ اس ملزم کو ہم ہی گرفتار کرائیں گے۔"

"ویری گڈ۔ کہاں سے؟" ڈی آئی جی نے طنزیہ پوچھا۔

"آپ کے گھر میں سے۔" منظر بولا "مصدقہ ذریعے ... اطلاع ملی ہے کہ وہ آپ کے گھر میں شفٹ ہوگیا ہے۔"

"واٹ نان سنس۔" ڈی آئی جی نے برہمی سے کہا۔

"ظاہر ہے سُنی سُنائی پر ہم بھی یقین نہیں کرتے۔" منظر ... "مگر دنیا میں ناممکن کچھ نہیں ہے۔ ہم بھی تصدیق کریں ... بھی۔ اس کے بعد دیکھیں گے۔"

"یہ مجھے بدنام کرنے کی سازش ہے۔ اگر اس بارے میں ... لفظ بھی شائع ہوا تو میں......" ڈی آئی جی لال پیلا ہونے لگا۔

"آپ قانون کے مطابق کارروائی ضرور کریں۔" ایک ... نے اس کا چیلنج قبول کرلیا "اندر کرادیں جھوٹ چھاپنے وا... ایڈیٹر اور پبلشر کو۔ پریس بند کرادیں اس کا اختیار آپ کے ... بھی ہے اور کمشنر صاحب کے پاس بھی۔ پریس اینڈ پبلی... آرڈیننس کا ہتھیار ہے آپ کے پاس۔"

"دفع کریں جی قانونی کارروائی کو۔ آپ حاکم ہیں۔ ... اسی وقت ڈک دیں۔ کون پوچھنے والا ہے۔" ایک وکیل نے ... آئی جی کو چیلنج کردیا۔

جو صحافی ایک سنسنی خیز سُرخی کے چکر میں آئے تھے خاصے مایوس تھے اور غالب کو پوچھ رہے تھے کہ سب سے ... کہاں غائب ہوگیا۔ وکیل برادری کو رابعہ سے زیادہ ہمدردی ... اور وہ جاننا چاہتے تھے کہ اچانک دلاور کی گرفتاری کو التوا میں ڈال دیا گیا ہے؟ کیا اسے فون پر کسی نے دھمکی دی تھی؟ کیا ... فرار ہوگیا ہے۔ رابعہ نے بڑی مشکل سے اپنی جان چھڑائی ... انہیں یقین دلایا کہ ایسی کوئی بات نہیں۔

ان کے جاتے ہی منظر نے پوچھا "بھوتنی کے کیا تُو نے کوئی ... چلایا ہے۔ تُو نے فون کیا تھا نیچے جاکے۔"

میں نے نفی میں سرہلایا "چکر کچھ اور ہے۔ رابعہ بتائے گی۔"

رابعہ سخت خوف زدہ تھی "گاڑی میں بیٹھ کے بات ... گے۔"

میں نے کہا "نہیں، گاڑی کا کیا بھروسا۔ اتنی دیر میں ... کہیں مائیک چپکا دیا ہو۔"

رابعہ اپنی گاڑی سے کچھ فاصلے پر رُک گئی "پتا نہیں ... فون تھا۔ کہہ رہا تھا کہ نازو ہمارے پاس ہے۔ یقین نہیں ... ڈرائیور سے پوچھ لو۔ مولوی خادم حسین سے۔"

"ارے بھائی تمہیں کیا ہوا ہے۔ تم کیوں رو رہے ہو۔ مجنوں تھا۔ دیوانہ ہوکے لیلیٰ کے پیچھے گیا ہے' یہ کون سی انوکھی بات ہے۔ اگر نہ جاتا تو عجیب بات ہوتی۔ چلو ہم بھی چلیں۔ رابعہ تم جاؤ گاڑی لاؤ باہر۔" رابعہ نے کہا "منظر بھائی۔ نازو اور غالب کسی مصیبت میں پڑگئے ہیں۔ میرا دل کہتا ہے۔"

"چھوڑو مارو دل کو۔ تمہارا دل تو پہلے ہی پاگل ہے۔ یار انہیں کیا ہوسکتا ہے۔ کیا بگاڑ سکتا ہے کوئی ایک بھوت کا اور بھوتنی کا۔ وہ آجائیں گے۔ سب کا خانہ خراب کرکے۔ تم تو اچھی طرح جانتی ہو ان دونوں کو۔"

میں نے برہمی سے کہا "مگر یہ بہت غلط حرکت کی اس نے۔ وہ کیا سمجھتا ہے ایک اسی کو نازو کی فکر ہے۔ ہم کچھ نہیں۔ واسطہ پڑے گا استاد پیڈرو سے تو یاد آئے گی ہماری۔ اب بتاؤ ہم کیا کریں کدھر جائیں۔"

"یار ہم چلتے ہیں اپنے آفس۔" منظر نے اپنی گاڑی کا دروازہ میرے لئے کھول دیا "اور انتظار کرتے ہیں ان کا۔ یا کسی خبر کا۔"

"صرف انتظار؟" میں نے تلخی سے کہا۔

"ابے بھوتنی کے اور کیا کریں۔ پریشانی میں روئیں دھوئیں ایک دوسرے کے گلے لگ کے؟ چیخیں چلّائیں۔ بال نوچیں یا کپڑے پھاڑیں۔ کیا ہوگا اس سے اور یہی سب کرنا ہے تو ٹھیک ہے اپنے آفس میں بیٹھ کے کریں گے۔ یہاں پولیس آفس کے گیٹ پر کب تک کھڑے رہیں گے۔"

میں نے رابعہ کی طرف دیکھا جو اپنی گاڑی میں میری منتظر تھی "مولوی خادم حسین۔ تم کہاں جاؤ گے؟"

اس نے صورتِ حال سمجھ کے کہا "کون سی جگہ رہ گئی ہے اب میرے لئے اپنے گھر سے بیوی بچّوں کو بھگادیا اور خود بھی بے گھر ہوگیا۔"

میں نے کہا "تم ہمارے ساتھ چلو۔"

"کیا اور فرنچ بولنی ہے آپ کو؟ نہ جانے کون سی منحوس گھڑی تھی جب میں نے فرانسیسی سیکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ عربی شریف پڑھی ہوتی تو اس عذاب کے بجائے تھوڑا بہت ثواب ہی ملتا۔"

میں نے کہا "اگر تمہیں یہاں لاوارث چھوڑ دیا تو تم بھی غائب کردیے جاؤ گے۔ پولیس والے تمہاری میزبانی کے لئے خاصے مشتاق ہیں۔ تم بیٹھ جاؤ منظر صاحب کی گاڑی میں۔"

منظر نے ٹھنڈی سانس لی "اپنے نصیب میں ایسی ہی چیزیں رہ گئی ہیں پیارے۔ مولوی خادم حسین کاش کہ تم ایک لڑکی ہوتے۔ حسین نہ سہی جوان تو ہو۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ پھر کیا ہوتا جی۔" خادم بُرا مان کے بولا۔

"کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا۔ لڑکا یا لڑکی۔" منظر بولا "اچھا اب یہ دروازہ بند کرو ورنہ گاڑی چلی تو لڑھک جاؤ گے باہر ناریل کی طرح میں رابعہ کے ساتھ بیٹھنے ہی والا تھا کہ نہ جانے اندھیرے میں

"وہ پیڈرو تھا؟" میں نے کہا۔

"نہیں' پیڈرو کی آواز پہچانتی ہوں میں۔"

میں نے کہا "میں اس کی صورت پہچانتا ہوں۔ نازو کو اس کے ساتھ دیکھ چکا ہوں۔ وہ آواز بدل کے بات کررہا ہوگا یا بات کرنے والا اس کے دو ساتھیوں میں سے کوئی ہوگا۔ وہ گاڑی میں پیچھے اسلحہ لئے بیٹھے تھے' نازو آگے تھی۔"

رابعہ نے کہا "تو کیا......؟"

"ہاں' نازو کو اغوا کیا گیا ہے۔ اور کیا کہا تھا اس نے؟ یہی کہا ہوگا کہ دلاور کو چھوڑ دو۔ ورنہ......"

رابعہ نے اقرار میں سرہلایا "کہاں لے گئے ہیں وہ نازو کو۔"

"مجھے معلوم ہوتا تو میں یہاں نہ آتا۔ وہ میرے ساتھ آئے تھے لیکن اب نہ جانے کدھر غائب ہوگئے ہیں۔ غالب کو انہی کی تلاش تھی۔ وہ کسی سے بات کرنا چاہتے تھے۔ مجھے تو پہچانتے نہیں تھے۔ میں بھی ظاہر نہیں کرسکتا کہ میں کسی کو جانتا ہوں۔"

"پھر غالب کہاں گیا؟" منظر نے پوچھا۔

"غالب فون کررہا تھا۔ تمہارے گھر۔" میں نے کہا "میں دیکھتا ہوں لیکن غالب پولیس ہیڈ آفس میں کہیں بھی نہیں تھا۔

ڈرائیونگ لائسنس برانچ سے متصل کمرے میں فارغ بیٹھے ہوئے ایک سارجنٹ نے تصدیق کی کہ غالب نے کچھ دیر پہلے وہاں سے فون کیا تھا۔

منظر نے کہا "تم اس وقت بھی یہاں موجود تھے؟"

سارجنٹ نے اقرار میں سرہلایا "خیر تو ہے وکیل صاحب۔"

"تم نے اس کی گفتگو سُنی تھی؟"

"اپنے کان تو میں بند نہیں رکھ سکتا تھا۔ ویسے کوئی خاص بات نہیں کی تھی اس نے۔ بس پوچھا تھا کہ سب خیریت ہے نا۔ اب یہ نہیں معلوم کہ جواب اسے کیا ملا تھا۔ ہاں یا نہیں۔ لیکن صحافی صاحب کی صورت دیکھ کے میں نے تو یہی اندازہ کیا کہ خیریت ہی ہوگی۔ یہ اندازہ کیسے ہوا تمہیں؟"

"لو جی صورت دیکھ کے ہم تو بندے کا سارا حال احوال پتا کرلیتے ہیں کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے یا سچ۔ شریف آدمی ہے یا چور۔ جب وہ آئے تھے مرزا غالب صاحب تو شکل پر بارہ بج رہے تھے۔ بات کرنے کے بعد گیارہ ہوگئے۔ پھر دس۔ اس نے اطمینان کا سانس لے کر مجھے تھینک یو کہا اور سرہلا کے چلا گیا۔ بُری خبر سنتا تو فون اتنے آرام سے نہ رکھتا اور بھاگتا ایسے کہ تھینک یو کہنا بھول جاتا۔ میں نے اور رابعہ نے دروازے کے باہر سے ساری گفتگو سُنی تھی مگر اس سے اُلجھن بڑھ گئی تھی۔ پریشانی کی بات نہیں تھی تو اسے ہمیں بھی بتانا چاہئے تھا۔ کسی سے کچھ کہے بغیر غائب ہوجانا سب کی پریشانی میں اضافہ کرنے کے مترادف تھا۔ پُرسکون اور بے فکر نظر آنے والا منظر بھی متفکر تھا مگر خوف اور اندیشوں کے طوفان میں بھی مسکراتے رہنا اس کی عادت تھی اور مشکل وقت کی آزمائش میں خود ہنسنا اور دوسروں کو ہنسانا اس کے مزاج میں شامل

سے کہیے۔ ایک ہیولا نمودار ہو گیا "ٹھہر جا۔" اس نے ہاتھ اُٹھا کے جلالی لہجے میں کہا۔

ایک لنگوٹ کے سوا اس کے جسم پر کچھ نہیں تھا۔ اس کی عمر پچاس ساٹھ سال ضرور ہوگی مگر وہ لمبا تڑنگا اور صحت مند تھا۔ اس کے جٹادھاری بال بے ہنگم طریقے پر پھیلے ہوئے تھے اور جھاڑ جھنکاڑ کھچڑی داڑھی نے اس کے سینے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کے گلے میں لال نیلے پیلے منکوں کی مالا تھی۔

رابعہ نے خوف زدہ ہو کے کہا "یہ تو کوئی پاگل ہے۔ تم بیٹھو۔"

میں نے کہا "ایک منٹ ٹھہرو۔ یہ ہم سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔"

"کیا کہے گا۔ بھیک مانگے گا۔"

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ یہ موقعے کا منتظر تھا۔ اکیلے میں ہم سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔"

فقیر میری طرف آنے کے بجائے رابعہ کی طرف بڑھا اور کھڑکی پر جھک گیا "تو رابعہ ہے؟"

رابعہ نے بے اختیار اپنا چہرہ پیچھے کر لیا "کیا.... کیا بات ہے؟"

"تو سکندر کو جانتی ہے؟" فقیر نے اسے خوف زدہ دیکھ کے لہجے میں ذرا ملائمت کی بجائے گرج پیدا کی "جانتی ہے نا؟"

رابعہ نے امداد طلب اور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے سر ہلا کے اسے ہاں کہنے کو کہا اور فقیر کے بالکل پیچھے مستعد اور چوکس کھڑا رہا کہ وہ حد سے بڑھے تو اسے پیچھے کھینچ لوں۔ فقیر کے بدن سے کوڑے کے ڈھیر سے اُٹھنے والی بو محسوس ہوتی تھی۔

رابعہ نے روپٹا ناک پر رکھ کے اقرار میں سر ہلا دیا۔

فقیر کا ایک ہاتھ آگے بڑھا "لا سو روپے دے۔"

"کس بات کے؟" رابعہ اور دور ہو گئی "ہاتھ ہٹاؤ پیچھے۔"

"سکندر کے نام پر سو روپے نکال دے ہم فقیروں کے لئے۔"

فقیر کا ہاتھ گاڑی کے اندر پہنچ گیا۔

اب میں نے اس کی گردن پر ہاتھ رکھا اور اسے پیچھے کھینچ لیا۔ فقیر نے گردن چھڑا کے مجھے غصے سے گھورا۔ میرے لئے فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ میں اس بدتمیز فقیر کے سامنے بھی فرنچ وکیل بنا رہوں اور یہ ظاہر کروں کہ میں اس کی بات نہیں سمجھتا مگر ایک خاتون کے ساتھ اس کا جارحانہ رویہ مجھے سخت ناپسند ہے یا اس کی زبان میں پوچھوں کہ یہ کیا ڈراما ہے۔ صاف ظاہر تھا کہ اسے رابعہ اور سکندر کے نام کسی اور نے بتائے تھے۔ وہ خود رابعہ کو کیسے جان سکتا تھا مگر اس نے چہرے اور حلیے سے گاڑی کے رنگ سے یا نمبر سے رابعہ کو پہچانا تھا اور اسے یہ معلومات فراہم کرنے والا پیڈرو کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا تھا۔ کچھ دیر پہلے وہ اسی جگہ گاڑی میں موجود تھا اور غالباً عین پولیس آفس کے سامنے موجود رہنے کا خطرہ محسوس کرتے ہوئے اس نے ایک فقیر کو پیغام رسانی کا ذریعہ بنانا بہتر سمجھا تھا۔ یہ فقیر بھی آس پاس کہیں اسی فٹ پاتھ پر براجمان ہوگا یا خیرات مانگنے پہنچ گیا ہوگا۔ پیڈرو نے اسے سو پچاس دے کر نامہ بر بنا لیا اور سمجھا دیا کہ اسے کس سے کیا کہنا ہوگا۔

فقیر ڈرامے باز بھی تھا اور اس نے تاڑ لیا تھا کہ پیغام دینے والا سو پچاس دے گیا ہے تو سو پچاس اس سے بھی وصول کئے جا سکتے ہیں جس کے لئے پیغام ہے۔ اس کا اندازہ شاید یہی تھا کہ اتنی خوب صورت لڑکی اور کسی سکندر کے معاملے میں عاشقی کے فلمی چکر کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔

رابعہ نے ہمت سے کام لیا "دیکھو سو روپے کی کوئی بات ہوگی تو سو روپے ضرور ملیں گے ورنہ سو جوتے پڑیں گے ملنگ بابا۔ اچھی طرح سمجھ لو۔"

"ہم کیا جانیں سو روپے کی بات ہے کہ لاکھ روپے کی۔ چھوڑو ہم جاتے ہیں۔" فقیر نے کہا۔

"اب ایسے نہیں جا سکتے تم" رابعہ کا حوصلہ بحال ہو گیا "یہ ہا سو کا نوٹ۔ پہلے بتاؤ کہ تمہیں میرا نام کس نے بتایا تھا اور سکندر کا۔"

"تھا ایک سخی۔" فقیر نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

"ملنگ بابا' یہ جو تمہارے پیچھے کھڑے ہیں' یہ پولیس کے بہت بڑے افسر ہیں۔ یہ خود بھی تمہاری ہڈیاں ڈھیلی کر سکتے ہیں اور انہوں نے اندر پہنچا دیا تمہیں تو رات بڑی مشکل سے گزرے گی تمہاری۔"

فقیر کی حالت غیر ہو گئی۔ "اجی بیگم صاحب۔ وہ تھا ایک کالا بھجنگ بدمعاش قسم کا آدمی۔"

رابعہ نے پیڈرو کا حلیہ بیان کیا "ایسی ہی گاڑی تھی جو یہاں کھڑی ہوئی تھی؟"

اس نے اقرار میں گردن ہلائی "ایسی شکل کی ضرور تھی اللہ قسم اس کے مقابلے میں کھٹارا تھی بالکل کھٹارا۔"

رابعہ نے سو کا نوٹ اسے دے دیا "اب جلدی سے بولو اس نے کیا کہا تھا؟"

فقیر نے میری طرف دیکھا "اس نے۔ اس نے کہا تھا کہ رابعہ کو ایک بات بتا دینا۔ لیکن کسی کے سامنے نہیں بتانا۔"

رابعہ نے کہا "ان کی فکر مت کرو۔ یہ صرف فرنچ جانتے ہیں۔ میرا مطلب ہے اردو پنجابی نہیں سمجھتے۔ ولایت سے آئے ہیں' اپنے ہی آدمی ہیں۔"

"اچھا جی۔ بیگم صاحبہ فقیر کی سفارش کر دو۔ ہم بھی ایک بار ولایت پہنچ جائیں۔ میرا چاچا لندن میں ہے' خوب کما رہا ہے۔ گورے خیرات میں پاؤنڈ دیتے ہیں۔"

"فضول بک بک مت کرو۔ ورنہ یہ سو روپے واپس لے لوں گی اور دماغ درست کرا دوں گی۔" رابعہ نے بگڑ کے کہا "کیا کہا تھا اس نے؟"

"اس نے کہا تھا کہ سکندر کے ساتھ اسپتال پہنچ جاؤ۔ قسم اللہ کی بس اتنا ہی کہا تھا۔" فقیر پیچھے ہٹنے لگا۔

تمہارے پاس آیا تھا یا تم خود اس کے پاس گئے تھے۔ اس نے بلایا تھا یا تم خیرات مانگنے گئے تھے؟"

"یہ ایک سوال ہے جی؟ اس میں تو دس سوال ہیں۔" فقیر نے فریادی لہجے میں کہا "ہم تو سوال کرنے گئے تھے۔ اس نے کہا کہ ایک کام کرو تو سو روپے ملیں گے۔ میں نے کہا کہ معاف کرو بابا۔ ہم کام کرنے والے ہوتے تو بھیک کیوں مانگتے۔ وہ بولا کہ بہت آسان کام ہے۔ ابھی اندر سے ایک لال گاڑی آئے گی۔ بالکل ایسی ہی مگر چمکتی دمکتی۔ اس میں ایک لڑکی بیٹھی ہوگی۔ رابعہ نام ہے اس کا۔ اسے ایک پیغام دینا ہوگا۔ ممکن ہے وہ بھی خوش ہو کے تمہیں سو روپے بخش دے۔ جب میں نے پوری بات سُنی بیگم صاحب تو میں نے سو روپے لے لئے۔ سب بتا دیا میں نے اب جاؤں؟"

رابعہ نے کہا "ایک آخری سوال۔"

وہ چلانے لگا "یہ تو پہلے بھی کہا تھا آپ نے۔ آخری سوال کتنے ہیں آخر....."

"اس گاڑی کا نمبر دیکھا ہوگا تم نے۔"

"نہیں جی۔ قسم لے لو۔"

"قسم مت کھاؤ خبیث آدمی۔ میں جانتی ہوں کہ تم پولیس ہیڈ آفس کے سامنے کیوں بیٹھے ہو۔ تمہیں بٹھایا گیا ہے یہاں۔ تم پولیس کے مخبر ہو بلکہ مجھے تو شک ہے کہ تم فقیر نہیں ہو پولیس کے آدمی ہو۔ بھیس بدل کے یہاں بیٹھے رہتے ہو اور آنے جانے والوں پر نظر رکھتے ہو۔ تمہاری زبان بہت صاف ہے۔ تم پڑھے لکھے ہو۔"

فقیر بدحواسی میں پلٹا تو مجھے راہ میں حائل پایا "یا میرے مولا۔"

رابعہ نے کہا "گاڑی کا نمبر بتا دو اور جاؤ۔"

خلافِ توقع فقیر نے ہتھیار ڈال دیے اور گاڑی کا نمبر بتا دیا۔ میں رابعہ کی ذہانت اور معاملہ فہمی کا قائل ہو گیا۔

"اپنی زبان بند رکھنا' سمجھے؟" رابعہ نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا "اگر میرے بارے میں یا ان سوالات کے بارے میں جو میں نے تم سے پوچھے تھے کسی کو بتایا تو میں اخبار والوں کو تمہارے پیچھے لگا دوں گی۔ وہ تمہاری تصویر چھاپ دیں گے کہ یہ شخص فقیر نہیں ہے پولیس کا آدمی ہے۔ دھندا چوپٹ ہو جائے گا تمہارا۔"

سو کا نوٹ ابھی تک فقیر کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے کانوں کو ہاتھ لگایا "توبہ میری بیگم صاحب۔ غریب کے پیٹ پر لات مار کے آپ کو کیا ملے گا۔"

"غریب!" رابعہ نے طنز سے کہا "لات تو میں مارتی تمہیں دو غلے کتے۔ تمہارے یہ بال اور داڑھی سب جعلی ہیں۔ اچھے خاصے جوان اور ہٹے کٹے آدمی ہو تم۔ چلو دفع ہو جاؤ۔"

احساسِ ذلت و خفت سے وہ سخت برافروختہ نظر آتا تھا مگر میری وجہ سے رابعہ کو پلٹ کے جواب نہ دے سکا اور زیرِ لب بکواس کرتا ہوا اسی اندھیرے میں گم ہو گیا جس میں سے وہ سائے

میں نے اسے روک لیا اور آگے دھکیل دیا۔ وہ ڈر کے چلانے لگا۔

"اچھی طرح سوچ لو اور کچھ تو نہیں کہا تھا۔" رابعہ بولی "ایسا نہ ہو تمہیں بعد میں یاد آئے۔"

"قسم اللہ کی یہی کہا تھا۔ اب فقیر کو جانے دو۔"

"جاؤ مگر یہ مت بھولنا کہ تمہاری بات جھوٹ نکلی یا ہمیں معلوم ہوا کہ تم نے نشے میں سُنا کچھ تھا بکا کچھ....."

"توبہ جی بیگم صاحب توبہ' ہم نشے کو ہاتھ لگائیں تو ہمارے ہاتھ ٹوٹ جائیں۔ ایک ایک لفظ وہی بتایا ہے جو سُنا تھا۔"

میں چاہتا تھا کہ رابعہ اس سے نازو کے بارے میں اور دوسرے لوگوں کے رویئے سے عیاں شکوک و شبہات کی بات کرے اور اس واحد چشم دید گواہ سے کار آمد تفصیلات حاصل کرے۔ میں خود گونگا بہرا بنا ہوا تھا اور یہ ظاہر کرنے پر مجبور تھا کہ میں ایک لفظ بھی سُننے یا بولنے کے قابل نہیں ہوں ورنہ میں سو روپے کے بدلے سو سوال کرتا۔

رابعہ نے شاید میرے جذبات کو میرے چہرے پر پڑھ لیا "ملنگ بابا۔ ایک تو وہ کالا کلوٹا بدمعاش تھا۔ اس کے ساتھ گاڑی میں اور کون تھا؟"

فقیر نے مکاری سے کہا "اور تو کوئی بھی نہیں تھا بیگم صاحب۔"

رابعہ نے اسے ڈانٹا "جھوٹ بولتے ہو تم۔"

"وہ..... ہاں جی۔ ایک لڑکی تھی۔" فقیر میرے تیور دیکھ کے پریشانی میں مبتلا ہو گیا۔ "وہ کار سے اُتری نہیں تھی۔ میں نے غور سے نہیں دیکھا تھا اسے مگر تھی آپ جیسی.... میرا مطلب ہے بہت خوب صورت... ہوگی بائیس چوبیس سال کی۔ دبلی پتلی' رنگ گورا' سرخ اور سیاہ دھاری والی قمیص تھی۔ کانوں میں سفید ٹاپس' انگوٹھی تھی دائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی میں۔"

"بدمعاش' پھر کہتے ہو غور سے نہیں دیکھا تھا۔"

فقیر کھسیانا ہو کے سر کھجانے لگا "بس جی' اب میں جاؤں؟"

"ٹھہرو۔ جب تم نے اتنے قریب سے لڑکی کو دیکھا تھا کہ سیدھے ہاتھ کی چھوٹی انگلی میں انگوٹھی بھی نظر آ رہی تھی تو تم نے پچھلی سیٹ پر بھی نظر تو ضرور ڈالی ہوگی۔"

فقیر پھنس گیا "آپ تو جرح کرتی ہو جی۔"

"آخر سو روپے لئے ہیں تم نے۔ پوری بات بتانی پڑے گی۔ کون تھا پچھلی سیٹ پر۔ خبردار جھوٹ مت بولنا۔"

"دو بندے تھے۔ ان کی شکل میں نے نہیں دیکھی۔ میرا مطلب ہے اتنے غور سے نہیں دیکھی۔"

"کسی اور سے تمہاری کوئی بات نہیں ہوئی تھی؟"

اس نے انکار میں سر ہلایا "باقی سب چُپ بیٹھے تھے۔"

"اب ایک آخری سوال۔ جس نے تم سے بات کی تھی وہ گاڑی چلا رہا تھا یعنی ڈرائیور کی جگہ بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اُتر کے

کی طرح نکلا تھا۔

"یہ سب بلاوجہ کیا تم نے۔ ایسے لوگوں کے منہ نہیں لگنا چاہئے۔" میں نے رابعہ کے ساتھ بیٹھ کے کہا۔

رابعہ نے گاڑی آگے بڑھادی "ایسے لوگوں کو ان کی اوقات بتادینی چاہئے۔ چالاک بنتے ہیں۔ میں رگ رگ سے واقف ہوں ان کی۔"

"غصہ تو مجھے بھی آرہا تھا لیکن کیا فائدہ۔ جو معلوم کرنا تھا معلوم ہوگیا۔" میں نے گھڑی دیکھی "بہت پیچھے رہ گئے ہم۔"

رابعہ نے رفتار بڑھادی "منظر کو اب ہماری فکر لاحق ہوگی کہ غالب گیا سو گیا۔ ہم کہاں چلے گئے۔"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "ہم کہاں جاسکتے ہیں اپنی مرضی سے۔ یا تو کوئی لے جاتا ہے یا تقدیر کہیں پہنچادیتی ہے۔ خود جاتے ہیں تو بس اپنی شامتِ اعمال کے پیچھے۔ بیچارہ سکندر بخت تو کہیں بھی نہیں ہے۔ دن میں ملتا ہے ایک فرنچ وکیل جس کی زبان ہے مولوی خادم حسین۔ رات کو نظر آتا ہے ایک چوکیدار۔"

رابعہ مسکرائی "تم قنوطی ہو رہے ہو مگر یہ وقت ایسی باتوں کا نہیں ہے....."

"وقت، وقت، وقت۔" میں نے چلّا کے کہا "کہاں گیا میرا وقت آخر۔ وہ وقت جو میں تم سے ایسی باتوں کے لئے نکال لیتا تھا۔ خود تمہارے پاس وقت نہیں ہے اب سکندر کے لئے ایک نگاہِ التفات کا۔ ہم سب اجنبی ہوگئے ہیں۔ کوئی صحافی ہے، کوئی وکیل ہے۔ تم اور منظر اور وقار یوسف سب وکیل ہو۔ غالب اور غالباً رپورٹر ہیں۔"

رابعہ ہنسی "اور تم؟"

"میں... میں سب کچھ ہوں اور کچھ بھی نہیں ہوں۔ میں ولاور کا دشمن ہوں۔ ایم آر ایس کا چیف ہوں۔ مفرور مجرم ہوں۔ چوکیدار ہوں اور فرنچ وکیل ہوں۔ بس وہ سکندر نہیں ہوں جو رابعہ کے عشق کو زندگی کی معراج مانتا تھا اور اپنے بخت پر ناز کرتا تھا۔"

"سکندر بخت تم وہی ہو۔ اگر رابعہ کی نظر سے دیکھو۔ کیوں دیکھتے ہو خود کو کسی اور کی نظر سے۔" رابعہ نے بائیں ہاتھ سے میرا ہاتھ تھام لیا "تم تو مجھے حوصلہ دیتے تھے کہ اب ظلم کی میعاد کے دن تھوڑے ہیں۔ اِک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں۔"

"تم نے ہمیں شرمندہ، دکھی اور لاجواب کیا عزیزہ۔" میں نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑلیا "ایک فلمی شعر سُنو۔ ترا ہاتھ ہاتھ میں آگیا کہ چراغ راہ میں جل گئے۔"

"چراغ نہیں یہ کارپوریشن کی اسٹریٹ لائٹس ہیں۔ ہاتھ چھوڑو میرا۔"

میں نے فلمی ہیرو کی طرح کہا "ایک بار یہ ہاتھ تھاما ہے تو....."

"افوہ... بھئی مجھے گیئر بدلنا ہے۔"

میں نے اس کا ہاتھ سینے سے لگالیا "زندگی کی گاڑی کو عشق کے ہائی وے پر ٹاپ گیئر میں چلنے دو۔"

"کیا کرتے ہو۔ گاڑی بند ہوجائے گی۔ سگنل ہے آگے۔" اس نے جھنجلا کے کہا۔

"میرے دل کی دھڑکن بند ہوجائے گی اگر تم نے میرے پیار کا سگنل توڑا۔" میں نے کہا۔

رابعہ نے بریک لگائے تو گاڑی بند ہوگئی۔ میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ رابعہ نے اپنا ہاتھ دبا کے دیکھا۔ مسکرائی اور گاڑی پھر اسٹارٹ کرلی "پاگل۔"

"دیوانہ، مجنوں، عاشق، گدھا" میں نے سر جھکا کے کہا۔

منظر اپنے آفس میں مشتعل بیٹھا تھا "کہاں رہ گئے تھے تم دونوں۔ اِدھر مجھ سے نظر ملا کے بات کرو۔ تمہاری شکلیں بتارہی ہیں کہ تمہیں شیطان نے بہکادیا تھا۔ آوارہ گردی ہورہی تھی۔"

میں نے معصومیت سے کہا "بابا جی۔ جو کہنا ہے شیطان کو کہیں۔ ہمارا کیا قصور ہے۔ ویسے بھی آپ کی تو اب عمر نہیں رہی بہکنے کی۔"

رابعہ نے فوراً بات بدل دی "منظر بھائی، پیڈرو نے اسپتال بُلایا ہے۔"

منظر نے اسے غور سے دیکھا "اسپتال بُلایا ہے؟ پیڈرو نے؟"

"آپ مذاق سمجھ رہے ہیں.... ہمیں اسی لئے دیر ہوئی۔"

"چلے تو ہم ایک ساتھ تھے۔ پھر یہ پیڈرو کا پیغام تمہیں کس نے دیا اور کب دیا؟"

میں نے کہا "رابعہ سچ کہہ رہی ہے۔"

"بھوتنی کا گواہ بھوت..... ابے پیڈرو کو کیا ہوا کہ وہ اسپتال پہنچ گیا۔ دل کا دورہ پڑا تھا یا وہ آگیا تھا تمہاری گاڑی کے نیچے۔ اب اسپتال میں لیٹا ہوا ہے عالمِ نزع میں اور مجھے یاد کررہا ہے۔ آخری وصیت میں اقبالِ جرم کرنا چاہتا ہے یا مجھے مار کے مرنا چاہتا ہے۔"

میں نے بھنّا کے کہا "کسی اُلو کے پٹھے کی سُنے گا یا اپنی ہی کہے جائے گا۔"

"اچھا بول۔ تیری سُن لوں پہلے۔ مولوی... یار تم فرنچ کا ترجمہ کرنے کے علاوہ بھی کچھ کرسکتے ہو یا نہیں۔ چائے بناسکتے ہو۔ پھر بیٹھے کیوں ہو، چلو ثواب کمالو تھوڑا سا۔ تم بتارہے تھے نا کہ بیوی سارا کام تم سے کراتی ہے۔"

خادم حسین نے بُرا سا منہ بنایا مگر بولا نہیں اور خاموشی سے چائے بنانے لگا۔ میں نے منظر کو فقیرے سے حاصل ہونے والی معلومات سے آگاہ کیا۔ رابعہ نے اتنی دیر میں غالب کی تلاش میں اِدھر اُدھر فون گھمائے مگر وہ کہیں بھی نہیں تھا۔ نہ منظر کے گھر میں نہ وقار یوسف کے گھر اور نہ اپنے اخبار کے آفس میں۔

منظر نے کہا "یہ نمبر کس گاڑی کا ہے جو فقیرے نے بتایا تھا۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے، سوال یہ ہے کہ پیڈرو کیا چاہتا ہے؟"

منظر ہو ہو ہو کر کے ہنسنے لگا "میں چلا جاتا ہوں یار۔ مگر کباب میں ہڈی مولوی خادم حسین بھی ہے۔ یار تمہیں بیوی پیار سے کیا کہتی ہے۔ خادم؟"

خادم حسین نے چائے کی ٹرے درمیان میں رکھ دی "منظر صاحب یہ بڑی زیادتی کی بات ہے۔"

"ابھی ہم نے تمہارے ساتھ زیادتی کہاں کی ہے بیٹے۔" منظر نے بے تکلفی سے اس کے شانے پر ہاتھ مارا "ہم خود جورو کے غلام ہیں یار اور یہ سالے سب ہم سے بڑھ کر زن مرید ہوں گے۔ تمہارا تو خیر نام ہی ایسا ہے۔ ان کو بھی خادم کہہ کر ہی بُلائیں گی۔ بیویاں شرط لگالو۔"

خادم حسین مسکرانے لگا۔ آہستہ آہستہ وہ ہمیں سمجھنے لگا تھا۔

رابعہ نے کہا "اگر نو بجے تک غالب کا فون نہ آیا....."

اسی وقت فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ منظر نے رابعہ کو اشارہ کیا "اس وقت میری کال تو نہیں ہوسکتی۔ میں اُٹھ جاتا ہوں آٹھ بجے۔"

رابعہ نے کہا "میں بھی اُٹھ جاتی ہوں تمہارے ساتھ۔"

گھنٹی پانچویں بار بجی تو ریسیور میں نے اُٹھالیا "ہیلو!" میں نے لہجہ اور آواز بدل کے کہا۔

جواب میں پیڈرو نے کہا "کون بول رہا ہے؟"

میں نے ایک جاہل چوکیدار کی عاجزی کے ساتھ سرائیکی لہجے میں جواب دیا "اس دفتر کا چوکیدار۔"

"اور کوئی نہیں ہے یہاں۔" پیڈرو نے تحکمانہ بلکہ جارحانہ لہجے میں پوچھا "رابعہ یا سکندر؟"

میں نے قدرے تامل سے کہا "یہاں ایک تو بڑے وکیل صاحب ہوتے ہیں منظر صاحب۔ وقار صاحب ہوتے ہیں۔ سکندر صاحب تو کوئی نہیں۔ باقی سب چلے گئے۔ رابعہ بی بی جارہی ہیں بس...."

"اُلو کے پٹھے۔ فضول بولنے کی عادت ہے تجھے۔ رابعہ ہے تو میری بات کرادے۔"

میں نے کہا "چوکیدار کی بھی عزت ہوتی ہے۔ مگر جو خود بے عزت ہوتے ہیں وہ کسی کی عزت نہیں کرتے۔"

"بکواس مت کر....." اس نے مجھے ایک اور گالی دی۔

"گالی کا جواب دیتا میں اگر تم میرے سامنے ہوتے۔ ٹیلی فون پر کسی کو گالی دینا کوئی مردانگی نہیں ہے۔"

"ایک معمولی چوکیدار مجھ سے زبان چلاتا ہے۔ سامنے ہوتا تو کیا بگاڑ لیتا تو میرا....." وہ چیخنے لگا۔

میں نے کہا "یہاں نوکری کرنے سے پہلے ہی بتادیا تھا میں نے کہ سب کچھ کرسکتا ہوں میں مگر گالی اور بے عزتی برداشت نہیں کرسکتا۔ سات سال جیل کاٹی ہے میں نے۔ گالی دینے والے افسر کو دفتر میں ہی جان سے ماردیا تھا۔ اگلی بار پھانسی بھی چڑھ سکتا

"اس نے رابعہ اور سکندر کو بُلایا ہے۔ ظاہر ہے وہ بات کرنا چاہتا ہے۔ مگر اس نے وقت کوئی نہیں دیا اور اسپتال کا نام تک نہیں بتایا۔" منظر بولا۔

میں نے کہا "یار تیری ساری عقل سولہ بچوں میں بٹ گئی۔ تیرے پاس کچھ نہیں رہا۔ پیڈرو کی مراد ہوگی وزیر خان ٹرسٹ اسپتال سے جہاں ہم جب چاہیں چلے جائیں۔ وہ منتظر ہوں گے۔ نازو بھی وہیں ہوگی اور ممکن ہے اس کے پیچھے مرزا غالب بھی اندر چلے گئے ہوں۔ یہ سوچ بغیر کہ اندر جانا تو آسان ہے۔ واپس باہر آنا مشکل ہوگا۔"

منظر اُچھل پڑا "ابے ایمان سے بھوتنی کے۔ اس وقت رابعہ نہ ہوتی تو میں تیرا منہ چوم لیتا۔"

میں نے رابعہ کی طرف دیکھا "تھینک یو۔ اس وقت تمہاری وجہ سے میرا منہ ناپاک ہونے سے بچ گیا۔ اس منہ کو چومنے کے جملہ حقوق محفوظ ہیں منظر صاحب۔"

"یہ تو بڑا مسئلہ ہوگیا۔" منظر نے سوچتے ہوئے کہا۔

"مسئلہ کیسے ہوگیا۔ تیری بیوی کا منہ ہے۔"

"ابے میں کچھ اور کہہ رہا تھا۔ اکیلی رابعہ کیسے جائے گی وزیر خان ٹرسٹ اسپتال۔ سکندر تو ہے نہیں۔ جوان جہان اکیلی لڑکی۔ بھولی بھالی۔"

میں نے کہا "سب غلط۔ اوّل تو وہ لڑکی نہیں... رابعہ ہے، ایک سینئر ایڈووکیٹ۔ اتنا عرصہ ہمارے ساتھ رہ کے بھولی بھالی بھی نہیں رہی۔ اور اسپتال میں وہ اکیلی کیسے ہوسکتی ہے۔ اس کے ساتھ سکندر نہ سہی تم جاسکتے ہو۔ غالب جاسکتا ہے۔"

"غالب؟ غالب تو پہلے ہی اندر ہوگیا ہے سالا۔"

"ابھی یہ ایک مفروضہ ہے۔"

"لاپتا بہرحال ہے۔ میرا ساتھ جانا بے کار ہے۔ میں اپنی حفاظت خود نہیں کرسکتا تو رابعہ کی خاک حفاظت کروں گا۔"

رابعہ نے اچانک کہا "سکندر جاسکتا ہے میرے ساتھ۔"

میں نے اور منظر نے اسے یوں دیکھا جیسے رابعہ کا دماغ چل گیا ہو "دیکھو بی بی اگر تم اس فرنچ وکیل کے ساتھ جاؤ گی تو تمہیں کوئی نہیں ملے گا سوائے ڈاکٹروں اور نرسوں کے اور ان سے تم نے پوچھا استاد پیڈرو کے متعلق تو وہ رجسٹر دیکھ کر کہیں گے کہ اس نام کا تو کوئی بھی مریض داخل نہیں ہے۔ خود میں یا وقار ساتھ ہوں تب بھی بات نہیں بنے گی۔"

"سکندر اس عمارت کا محافظ بھی ہے۔ وہ میری حفاظت کے لئے میرے ساتھ جاسکتا ہے۔ اگر ایک عورت باڈی گارڈ کے طور پر کسی کو ساتھ رکھے تو جائز ہے۔ پیڈرو کو شک نہیں ہوگا۔"

میں نے منظر کی طرف دیکھا "بھوتنی کے اس وقت تُو نہ ہوتا تو....."

رابعہ نے جھینپ کے کہا "بکو مت"

ہوں۔ تم جو بھی ہو سامنے آ کے آزمالو مجھے۔"
حسبِ توقع وہ سنبھل گیا "چل بات کرا اپنی رابعہ بی بی سے۔"
"پہلے نام بتاؤ اپنا۔ آج تک یہاں کسی جاہل اور بدتمیز آدمی نے فون پر ایسے بات نہیں کی۔ رابعہ بی بی کی مرضی ہوگی تو میں بلاؤں گا۔"
"ان سے کہو پیڈرو بات کرنا چاہتا ہے۔ استاد پیڈرو۔"
"استاد جی ذرا زبان سنبھال کے بات کرنا ان سے..... جیسے ماں بہنوں سے کی جاتی ہے۔"
"اچھا میرے باپ۔ تُو چوکیدار ہے یا خدائی فوجدار ہے یہاں۔"
"چوکیدار ہر بات کا ذمے دار ہوتا ہے۔ کوئی غلط آدمی یہاں نہ آئے۔ نہ کوئی کسی سے غلط بات کرے۔ بھونکنے اور کاٹنے والے کُتے کو گولی ماردوں۔ یہ بھی میرے فرائض میں شامل ہے۔ لو بات کرو۔"

رابعہ میری بات پر مسکرا رہی تھی اور منظر اشاروں میں مجھے شہہ دے رہا تھا کہ میں پیڈرو کو اس سے زیادہ سُناؤں مگر میں رابعہ کی موجودگی میں اس کے شجرہ نسب میں آباد اجداد کی جگہ ناپاک جانوروں کو شامل نہیں کرسکتا تھا۔ آزادانہ مقابلہ ہوتا تو اسے اینٹ کا جواب پتھر سے دے کر مجھے خوشی ہوتی۔
رابعہ نے کہا "تمہارا پیغام مل گیا تھا مجھے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم نے نازو کو قید کررکھا ہے۔"
دوسرے ہینڈ فری فون کے اسپیکر میں پیڈرو کی آواز آئی "اور کیا معلوم ہے جی آپ کو وکیل صاحب۔"
"تم وزیر خان ٹرسٹ اسپتال میں ہونا۔"
"واہ جی۔ مان گئے آپ کو۔" پیڈرو ہنسا۔
"کیا غالب بھی پہنچ گیا ہے وہاں؟"
پیڈرو کے تامل سے ہم نے اندازہ کیا کہ یہ سوال غیر متوقع تھا اور جواب دینے سے پہلے اسے سوچنا پڑا "بلایا تو ہم نے آپ کو تھا اور اپنے سکندر اعظم صاحب کو۔ خیر جی، وہ آگئے دل کے ہاتھوں مجبور ہوکے تو ہم نے کہا آؤ جی بسم اللہ۔"
"پیڈرو انہیں کچھ ہوا تو....."
"وکیل صاحب، فون پر دھمکی مت دو۔ آپ کا چوکیدار تو گالی بھی نہیں سُنتا۔ ہم بھی غلط بات نہیں سُنیں گے۔ شرافت سے بات کرنی ہے تو آجاؤ۔ بس دو باتوں کا خیال رکھنا۔ ایک تو چوہدری صاحب کو کچھ نہیں ہونا چاہئے۔ دوسری بات یہ کہ اسپتال میں پولیس نہیں آنی چاہئے ورنہ بات نہیں ہوگی۔ کوئی نہیں ملے گا تمہیں۔"
"تمہارے چوہدری صاحب بالکل خیریت سے اور آرام سے ہیں۔ پولیس نہیں آئے گی مگر میں بھی اکیلی نہیں آسکتی۔"

"اکیلی کیوں۔ اپنے سکندر اعظم کو ساتھ لاؤ۔"
"کہاں سے لاؤں سکندر کو۔ کیا تمہیں معلوم نہیں وہ روپوش ہے۔"
"بے وقوف مت بناؤ مجھے۔ تمہیں ضرور معلوم ہوگا۔"
"تم نہیں مانتے تو تمہاری مرضی۔"
"صاف کہو کہ وہ بزدل آنا نہیں چاہتا۔ ڈرتا ہے۔"

رابعہ نے کہا "گرفتاری سے ضرور ڈرتا ہے وہ مگر تم سے نہیں ڈرتا اور موت سے بھی نہیں ڈرتا۔ میرا اس سے رابطہ ہوتا تو تمہارا پیغام پہنچادیتی اور وہ آجاتا۔ تم اسے مار سکتے تھے گرفتار نہیں کراسکتے تھے۔ اب بولو کیا مجھ سے بات کروگے؟"
"تم اکیلی آؤگی؟"
"اکیلی تو نہیں۔ میرا چچا زاد بھائی میرے ساتھ آئے گا۔"
"وہی جو ابھی بکواس کررہا تھا۔"
"ہاں، وہ ڈرائیور بھی ہے اور جاں نثار بھی۔ وہ کسی بات میں دخل نہیں دے گا اور ایک طرف خاموش کھڑا رہے گا لیکن بہت خطرناک آدمی۔ کسی نے میرے ساتھ بدتمیزی کی یا بد مظاہرہ کیا تو وہ سب کو ماردے گا۔ آخر میں مجھے بھی اور اپنے کو بھی۔"
"کیا وہ مسلح ہوگا؟"
"ہاں، تم اپنے ساتھ مسلح آدمی رکھ سکتے ہو۔ میں بھی جان کی بازی لگا کے آرہی ہوں لیکن اپنی حفاظت کے خیال سے غافل نہیں رہ سکتی۔ میں منظر کو بتا کے آؤں گی اور تمہارے چوہدری کے مہمان خانے کی نگرانی بھی اسے سونپ کر آؤں گی۔"
"ٹھیک ہے۔ ہم تمہیں دروازے پر ملیں گے۔" پیڈرو نے کہا اور فون بند کردیا۔
میں اور منظر یہ گفتگو خاموشی سے سُن رہے تھے۔ رابعہ نے ریسیور رکھا تو منظر نے میرے کندھے پر ہاتھ مارا "ابے بوڑھے ڈوب کے مرجا شرم سے۔ بڑا مجنوں کا ماما بنا پھرتا ہے۔ تجھے اور چوکیدار بنادیا سالے۔"
میں نے کندھا سہلا کے کہا "جاں نثار بھی تو کہا تھا۔"
"قربانی کا بکرا اور کسے کہتے ہیں۔ تیرے جیسے احمقوں کو"
"اور کولہو کا بیل کہتے ہیں عبدالودود منظر کو۔" میں نے کہا "ذرا سوچ کہ تیری زندگی کا اب کوئی مقصد ہے؟ سوائے بچوں اور ان کی ماں کی پرورش کا بار اُٹھانے کے علاوہ اِدھر تو بوڑھا ہے اُدھر یہ بوجھ بڑھتا جارہا ہے۔"
"یہ آج دوسری بار بوڑھا کہا ہے تُو نے مجھے۔ زیادہ بولا تو ایک ساتھ تین شادیاں اور کرکے دکھادوں گا۔ تم جیسے لوگوں کی جوانی پر لعنت جو ٹھنڈی آہیں بھرنے، دکھ بھرے شعر پڑھنے اور تنہائی میں بیٹھے بیٹھے چلانے کے سوا کچھ نہیں کرسکتے۔

رابعہ نے بیگ سے ریوالور نکالا "یہ بندوبست پہلے ہی کرلیا تھا میں نے۔ اب آپ ہماری حفاظت کے لئے کوئی فول پروف بندوبست کریں۔ ہم گر...... تک لوٹ کر نہ آئیں تو....."
"میں ...... کو مطلع کردوں گا کہ ...... اور کہاں ہوگا۔ یہ ...... ادم حسین ...... بیٹھے ہیں ...... یہ کوئی ...... کرتے رہیں ......"
"آپ بھی ...... کہا نہیں؟"
"میں یہ کرسکتا ہوں کہ ...... کو فون کرکے تمہارے اغوا کی رپورٹ لکھوادوں اور ...... میں نام لکھوادوں چوہدری دلاور کا۔ اس کے نائب استاد پیڈرو کا۔ یہ جو نیا ایس پی آیا ہے ڈاکٹر شبلی کے قتل کی تفتیش کے لئے۔ جاوید صدیقی۔ اسے بتاؤں کہ آج شام ڈی آئی جی صاحب کی میٹنگ کے بعد سے رابعہ قاری ایڈووکیٹ اور ...... جرنلسٹ دونوں غائب ہیں اور اندیشہ ہے کہ ڈاکٹر شبلی کے قاتلوں کی پشت پناہی کرنے والے افراد نے انہیں یرغمال بنالیا ہے اور ممکن ہے اغوا کرنے والے انہیں قتل کردیں۔"
میں نے حیرانی سے منظر کو دیکھا "آئیڈیا تو بُرا نہیں۔"
"اچھا کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ نیا ایس پی پریشان ہوگا کہ سر منڈاتے ہی اولے پڑگئے۔ تفتیش ابھی شروع نہیں ہوئی اور مدعی نمبر ایک کے ساتھ ایک چیف رپورٹر غائب ہوگیا جس کی وجہ سے پہلی خصوصی ٹیم پر حکام بالا کا عتاب نازل ہوا تھا۔ معطل ہونے والے رسمی طور پر گرفتار کرلئے گئے تھے مگر اخبار والوں نے ملی بھگت کا راز فاش کردیا۔ اب انہیں بھی حوالات میں بند کرنا پڑے گا اور ہتھکڑی ڈال کے عدالت میں ضمانت کے لئے پیش کرنا ہوگا جو کل تک اتنے بااختیار تھے کہ جسے جب چاہیں کسی بھی الزام میں اندر کرادیں۔ جاوید صدیقی کو اپنی فکر لاحق ہوگی تو وہ خود آئے گا میرے پاس اور میں اسے بتاؤں گا کہ غالباً یہ کارروائی انہی کی ہے جو چوہدری دلاور کو بچانا چاہتے تھے مگر وکیل اور صحافی برادری کے اتحاد نے ان کی کوشش کو ناکام بنادیا اور انہیں اندر کرادیا۔ میں اسے ایک انتقامی کارروائی قرار دے سکتا ہوں اور باتوں باتوں میں کہہ سکتا ہوں کہ پولیس ہیڈ آفس کے باہر نیلے رنگ کی ایک فاکس ویگن میں مجھے چوہدری دلاور کے خاص آدمی نظر آئے تھے۔ ان میں سے استاد پیڈرو کو میں پہچانتا ہوں۔ میں گاڑی کا نمبر بھی بتا سکتا ہوں اور اس شبے کا اظہار بھی کرسکتا ہوں کہ انہی لوگوں نے رابعہ اور غالب کو اغوا کیا ہوگا۔"
"ونڈر فل منظر۔"
"فائن تھنگ یہ ہوسکتا ہے کہ جاوید صدیقی کی موجودگی میں مولوی صاحب مجھے باہر کہیں سے فون کریں اور کوئی فرنچ لطیفہ سُنائیں۔ بے ہودہ قسم کا۔"
خادم جز بز ہوکے بولا "میں شریف آدمی ہوں جی۔"

کے لئے بھی چیلنج ہے میرا۔ کوئی میرا ریکارڈ توڑ کے دکھائے۔"
میں سینے پر ہاتھ مار کے یہ چیلنج قبول کرنے والا تھا مگر رابعہ نے میری نیت کو تاڑتے ہوئے ایک کشن مجھ پر کھینچ مارا "چلو اُٹھو، بدلو یہ لباسِ فاخرہ اور آجاؤ اپنی اصل پوشاک پہن کے جاں نثار صاحب۔"
"اچھا ہوا یہ کشن تھا اینٹ نہیں تھی۔ اتنا غصہ آخر کس لئے۔ میں اس چیلنج کو قبول کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔" میں اُٹھ کے اندر لپکا۔
منظر نے قہقہہ مارا "تیرا تو باپ بھی نہیں ٹھہر سکتا تھا مقابلے پر۔ ابے یہ مردوں کے کام ہیں۔"
"منظر بھائی، آپ بھی موقع محل دیکھے بغیر شروع ہوجاتے ہیں۔" رابعہ نے مصنوعی خفگی سے کہا۔
"ارے بابا تم سے کرلیتے ہیں تھوڑا سا ہنسی مذاق دل بہلانے کو ورنہ گھر میں ایک اژدحام ہے۔ اور وہاں موقع کہاں ملتا ہے ہمیں اپنی کہنے کا۔ تمہاری زود افزا بھابی کی الیکٹرک زبان تو فل اسٹاپ کاما لگائے بغیر چلتی ہے۔"
رابعہ ہنسنے لگی۔ میں چوکیدار کی وردی میں باہر آیا تو اس کی نظر مجھ پر تھی "کیا میں سرکس کا جوکر لگ رہا ہوں۔ کھی کھی مت کرو ورنہ میں بوقتِ نکاح بھی یہی کپڑے پہن کے آجاؤں گا۔"
"ابے نکاح تو بغیر کپڑوں کے بھی ہوجاتا ہے۔" منظر ہنسا "بس پانچ چیزیں ضروری ہیں۔ قاضی، میاں بیوی اور دو گواہ۔"
میں نے رابعہ کو سائلنسر والا وہ پستول نکال کے دکھایا جو بہت عرصے سے بحفاظت رکھا ہوا تھا "یہ کافی ہے یا سب مشین گن لے لوں۔"
"سب مشین گن لے کر جاؤ گے اسپتال میں۔ اس کا تو لائسنس بھی نہیں ملتا۔" رابعہ نے کہا "وہ لوگ اسپتال میں گڑبڑ نہیں کریں گے۔"
منظر نے اقرار میں سرہلایا "ان کا اصل مسئلہ ہے چوہدری دلاور کی رہائی۔ ان کی رگ دبی ہوئی ہے۔ وہ جھگڑا نہیں سودا چاہتے ہیں۔"
"کیا خیال ہے سودا کرلیا جائے؟"
"مجھ سے کیا پوچھتے ہو بھائی۔ خود تول کے دیکھ لو کون سا پلڑا بھاری ہے۔ نازو اور غالب ایک طرف ہیں، دوسری طرف چوہدری صاحب۔"
میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ پلڑا تو ہمارا ہی بھاری رہے گا۔ وہ نازو یا غالب کو نقصان نہیں پہنچاسکتے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم کوئی رسک لیں گے۔" میں نے کہا "چلو مس رابعہ۔ ڈرائیور اور باڈی گارڈ ڈیوٹی کے لئے حاضر ہے۔"
"میری مانو تو تم بھی اپنے بیگ میں کوئی آلۂ قتل لے جاؤ، کیا پتا تمہارا دل چاہے دو چار خون کرنے کا....."

"مجھے تو تمہارے آدمی ہونے میں بھی شک ہے۔ اور شریف تو میں بھی ہوں مگر احمق نہیں ہوں۔ ابھی یہ دفع ہو جائیں پھر تمہیں ایسے لطیفے سناؤں گا کہ تم ساری فرنچ بھول جاؤ گے۔"

"مجھے تو معاف رکھیں جناب۔"

"تمہاری یہ روتی شکل دیکھ کے تو مجھے بھی رونا آتا ہے۔ مولوی ہنسنے ہنسانے والے زیادہ جیتے ہیں۔ مُردہ دل کیا خاک جیا کرتے ہیں۔ خیر اصل مقصد کچھ اور ہو گا فون کا۔ تم السلام علیکم کہہ کے ریسیور رکھ دینا اور پھر چلے جانا اپنے گھر۔ میں ایس پی جاوید صدیقی کے سامنے ریسیور پکڑے اکیلا بولتا رہوں گا۔ صورت سے تشویش اور بدحواسی کا اظہار کروں گا اور پھر اسے بتاؤں گا کہ کسی نے وزیر خان ٹرسٹ اسپتال سے فون کیا تھا مگر اپنا نام نہیں بتایا۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ مرحوم وزیر خاں کے ایک سابق نمک خوار کا بیٹا ہے اور اس نے ابھی ابھی دیکھا ہے کہ دلاور کا دستِ راست استاد پیڈرو یہاں پہنچا ہے۔ وہ ایک مرد اور عورت کو اغوا کر کے لائے ہیں۔ مرد کو میں پہچانتا ہوں۔ وہ مشہور صحافی مرزا غالب ہیں اور مجھے معلوم ہے کہ آپ کے دوست ہیں اس لئے آپ کو بتا رہا ہوں۔ جاوید صدیقی اس ڈرامے کو خاک سمجھے گا۔ وہ تو پولیس فورس لے کے میرے ساتھ دوڑے گا وزیر خان اسپتال کی طرف۔ اُمید ہے اس وقت تک تمہارے مذاکرات ختم ہو جائیں گے۔ کوشش کرنا کہ گیارہ بجے تک تم وہاں سے نکل جاؤ کیونکہ گیارہ بجے کے بعد میں اسپتال کا مکمل محاصرہ اور چھاپا مارنے کی بھرپور کارروائی چاہتا ہوں۔"

"یار منظر۔ اسپتال میں یہ سب کیسے ہو گا۔" میں نے سوچ کے کہا۔

رابعہ بولی "وہ ایک خیراتی اسپتال ہے۔"

"ہوا کرے۔ مجرم تو مسجدوں سے بھی پکڑے جاتے ہیں۔ ایس پی جاوید صدیقی کے پاس خصوصی اختیارات ہیں۔ وہ خود اجازت بھی حاصل کرے گا اور مجسٹریٹ کو بھی بلوائے گا۔ مجھ پر یا تم پر کوئی الزام نہیں آسکتا لیکن اس آپریشن کے نتیجے میں پیڈرو گرفتار ہو گیا اور اس کے قبضے سے نازو اور غالب برآمد کر لئے گئے تو چوہدری دلاور کی پی ڈبلیو ایل۔"

رابعہ نے کہا "پی ڈبلیو ایل؟"

"فضول سوالات مت کیا کرو بی بی۔ یہ مردانہ بات ہے جی پی سمجھتی ہو؟"

"جنرل پریکٹیشنر ڈاکٹر کو کہتے ہیں۔"

منظر ہو ہو کر کے ہنسنے لگا۔ اس کے مٹکے جیسے پیٹ میں زلزلہ سا آگیا۔ رابعہ جھینپ کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

میں نے کہا "یار منظر۔ اتنا لمبا چوڑا منصوبہ اچانک کیسے آگیا تیرے دماغ میں؟"

"ابے اچانک کے گھوڑے... یہ تو کمال ہے اپنے دماغ کا۔ جب زبان سے ہم اول فول بک رہے ہوتے ہیں تب بھی ... کا کارخانہ بند نہیں ہوتا۔ ایک بازی کھیلنے تم جا رہے ہو ... کا تمہیں بھی پتا نہیں، دوسری بازی میں کھیلوں گا۔ گر ... کیا کہنا اور ہار کی صورت میں کسی کی صحت پر کیا اثر ... رات کی خاموشی میں ایک آپریشن ہو گا جس کی کسی کو کانوں ... نہیں ہو گی۔ پیڈرو پکڑا گیا۔ غالب اور نازو برآمد ہو گئے تو ... ورنہ کچھ نہیں۔ میں جاوید صدیقی کو سمجھا دوں گا کہ ... جائے۔ اسپتال پر چھاپا کس نے مارا؟ کب مارا اور کس ... پولیس نے محاصرہ کیا تھا؟ کون کہتا ہے۔" منظر نے قہقہہ ... مجھے آنکھ ماری۔

"ٹھیک ہے پھر ہم چلتے ہیں۔" رابعہ نے کہا "دعا ... خیریت رہے۔"

منظر نے خادم حسین کو ہلایا "بھئی تم سے کچھ کہہ رہا ... کہاں کس کے خیال میں گم ہو۔"

وہ جھینپ کر مسکرانے لگا "بس جی اپنی گھر والی یاد آ ... کی نیند سو رہی ہو گی میکے میں۔"

منظر نے کہا "ہاں تمہارے ساتھ اور تمہارے گھر ... بہت دُکھی ہو گی۔ مولوی کیا تم نے لو میرج کی تھی۔"

"اجی لاحول ولا قوۃ۔" خادم حسین نے یوں کہا کہ ... آگئی۔

"ہنسنے دو انہیں۔ فائدے میں تم رہے۔" منظر نے کہا ... لو تو میرج سے پہلے ہی خلاص ہو جائے گا۔ تم نے شروع ... میرج کے بعد۔ میری طرح۔ کبھی آؤ میرے گھر اور دیکھو ... پیار کی نشانیاں نظر آئیں گی تھوک کے بھاؤ۔"

رابعہ نے میرے مشورے پر پیچھے بیٹھنا قبول کر لیا ... خواتین صرف اپنے شوہر کے ساتھ بیٹھتی ہیں شوفر کے ... نہیں۔"

رابعہ اپنے خیال میں کھوئی ہوئی تھی "غالب تو بالکل ... ہے۔ ایسے منہ اُٹھا کے نکل گیا۔"

میں نے کہا "کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا۔"

"اونہہ۔ ہمارا عشق تو پھر عشق نہ ہوا کیونکہ ہمارے ... خلل نہیں ہے۔" رابعہ نے کہا "مل کے فکر کرتے نازو ... لانے کی۔ اب خود بھی گرفتار ہیں یک نہ شد دو شد۔"

"میرے ایک دوست نے اولاد کی خواہش میں دو ... کی۔ مجھے سال بعد پتا چلا تو میں نے فون پر تعزیت کی کہ ... کرتا ہے ٹھیک کرتا ہے یک نہ شد دو شد۔ حوصلے سے کام ... کہنے لگا کہ کمال ہے یار۔ پہلی بیوی اسپتال میں ہے ... فون آیا تو وہ بھی یہی کہہ رہا تھا۔ دو بیٹے ہوئے ہیں۔"

رابعہ ہنسنے لگی "خوب گھڑ کے سُنا رہے ہو۔"

"اور پھر کیا کروں۔ تم اپنے ساتھ مجھے بھی ذی ...

پھر وہ دور آیا جب خدا نے وہ امانت مجھ سے واپس لے لی۔ جس کی حفاظت سے میں غافل ہو گیا تھا۔ بڑے ہونے کے بعد میں نے اپنے والد اور ان کے کاروبار کی اتنی فکرمندی سے حفاظت نہیں کی تھی جیسے بچپن میں دس کے ایک نوٹ کی کی تھی۔ شاید میں اس بارِ امانت کا مستحق ثابت نہ ہوا تھا کہ خدا نے مجھ سے سب کچھ واپس لے لیا۔ باپ کی شفقت کا سایہ، دولت جائیداد اور کاروبار جس کا میں خود کو مالک سمجھتا تھا۔ لندن میں تعلیم کے نام پر عیش کرتے ہوئے میں نے اپنے والد کا دیا ہوا سبق بُھلا دیا تھا کہ سب کا مالک خدا ہے۔ جو میرا تھا مجھ سے چھن گیا تھا یہاں تک کہ وطن کی زمین مجھ پر تنگ ہو گئی تھی اور اپنے پرائے ہو گئے تھے۔ آزمائش کا یہ دور ابھی ختم نہیں ہوا تھا مگر میں راضی برضا تھا اور پُرامید تھا کہ خدا معاف کرنے والا اور منصف ہے۔ وہ غاصبوں سے میرا حق ضرور مجھے واپس دلوائے گا جو میری کوتاہی کے سبب مالک بنے بیٹھے تھے۔

جہاں اب اسپتال تھا وہاں کبھی زراعت میں کام آنے والی مشینری کے پرانے پرزے بنتے تھے۔ پھر یہاں اسلحہ بننے لگا اور صرف میرے ہی نہیں وطن کے دشمنوں نے ضمیر فروشی سے اپنے خزانے بھر لئے۔ مجھے اس جدوجہد کا ہر دن اور ہر عذاب یاد تھا۔ دربدری اور جلاوطنی کے اس دورِ مصائب کا ہر زخم ہنوز تازہ تھا۔ وقت نے مجھے تجربے کی ایک کسوٹی عطا کی تھی جس پر میں اچھے بُرے، غلط اور صحیح اپنے اور پرائے کی پہچان کر سکتا تھا۔

وقت بدلا تھا تو ایک آزمائش میرے ایمان کی ہوئی تھی جب میرے دشمنوں نے مجھ سے میرا اعتبار اور میرا یقین خریدنے کی پوری کوشش کی تھی مگر یہ رابعہ کی محبت تھی اور کچھ مخلص دوستوں کی رفاقت کی طاقت تھی کہ مجھے دولت کے پہاڑ کی کشش بھی نہ کھینچ سکی۔ آج میں فخر سے سر اُٹھا کے اپنے رب کے حضور بھی جا سکتا تھا اور میدانِ حشر میں بھی اپنے والد سے کہہ سکتا تھا کہ آپ کا دیا ہوا کوئی سبق میں نے کبھی نہیں بُھلایا۔ آج خود کو فاتح سمجھ کے غرور سے زمین پر اکڑ کر چلنے والے اسی زمین میں چند فٹ نیچے مُردوں سے بدتر حالت میں اور میری قید میں تھے اور طاقت کے نشے میں خود کو نمرود کی خدائی کا دعویدار سمجھنے والے جھک کر مجھ سے ملنے پر مجبور تھے اور صلح کے طلب گار تھے۔

مرحوم وزیر خان کے قاتل اور اس کی حق حلال کی کمائی کو نگلنے والے اژدھے اب بھی یہ اُمید رکھتے تھے کہ وہ دنیا کے قانون کو دھوکا دے کر بچ جائیں گے۔ انہوں نے یہ اسپتال وزیر خان کے نام سے اسی جگہ کھڑا کیا تھا جہاں اس نے کھیتوں کو ہریالی دینے والی مشینوں اور زمین کی زرخیزی بڑھانے والے آلات کی فیکٹری لگائی تھی۔ خدا نے وزیر خان کو وسیلہ بنایا تھا کہ کچھ لوگوں کو روزگار ملے۔ ان کی کوشش سے پیداوار بڑھے تو ان گنت بھوکے پیٹ بھر جائیں اور غربت کے دکھ خوش حالی کے سکھ میں بدل جائیں مگر کر رہی ہو۔ تمہارے چہرے پر ہنسی دیکھ کے مجھے بھی حوصلہ ملتا ہے۔"

"پتا نہیں دلاور میں کتنی دلاوری رہ گئی ہو گی۔ کہیں مر ہی نہ جائے۔ ہم نے اس کی خبر ہی نہیں لی۔"

"عام آدمی بھی کچھ کھائے پئے بغیر دو دن گزار لیتا ہے تھوڑا سا سخت جان ہو تو ہفتہ۔ دلاور جیسے ڈھیٹ آسانی سے نہیں مرتے۔ دنیا کی ہوس کا رشتہ اتنا مضبوط ہوتا ہے کہ سانس کی ڈور کو ٹوٹنے نہیں دیتا۔ یا شاید موت کے بعد شروع ہونے والے عذاب کا خوف جان اٹکائے رکھتا ہے۔"

میں نے محسوس کیا کہ رابعہ اپنے خیالات کے انتشار کا شکار ہے اور میری بات دھیان سے نہیں سُن رہی ہے۔ خود میرے جذبات کی کیفیت کچھ عجیب سی تھی۔ برسوں پہلے یہ جگہ میری تھی۔ کبھی میں اپنے باپ وزیر خان کے ساتھ یہاں آتا تھا تو کارخانے کے مالک کی حیثیت سے مجھے وہی عزت و تکریم ملتی تھی جو کسی بادشاہ کے جلو میں چلنے والے ولی عہدِ سلطنت کو حاصل ہوتی تھی "چھوٹے مالک سلام" جب پہلی بار گیٹ کھولنے والے چوکیدار نے مجھے کار میں دیکھ کے یہ الفاظ کہے تھے تو وزیر خان نے گاڑی روک لی تھی اور کہا تھا "دیکھو چوکیدار۔ سلام کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے مگر یہ چھوٹے بڑے مالک والی بات غلط ہے۔ سب کا مالک اور سب سے بڑا مالک ایک ہے۔ ہم سب تو فقط امانت دار ہیں۔ کیا سمجھے؟" ظاہر ہے چوکیدار کچھ نہیں سمجھا تو میں کہاں سمجھتا۔ میں نے آفس میں پہنچ کے ان کی گھومنے والی کرسی پر بیٹھ کے جھولتے ہوئے سوال کیا تھا کہ امانت دار کیا ہوتا ہے اور اس دن جو بات انہوں نے مجھے سمجھائی تھی وہ آج بھی مجھے یاد تھی۔ انہوں نے مجھے دس کا نوٹ دیتے ہوئے کہا تھا کہ بیٹا اسے شام تک سنبھال کے رکھنا۔ امانت دار کا مطلب میں رات کو سمجھاؤں گا۔ اس زمانے میں دس کے نوٹ کی حیثیت اور وقعت سو کے نوٹ سے بھی دُگنی تھی اور کسی بچے کے لئے جو اسکول میں جیب خرچ کے چار آنے خرچ کرتا تھا یہ بہت بڑی دولت تھی۔ شام تک میں نے دس کے نوٹ کو پتلون کی جیب میں دبائے رکھا اور سارا دن بار بار اس کی موجودگی کو محسوس کرتا رہا کہ کہیں وہ پھسل کے گر تو نہیں گیا یا کسی نے نکال تو نہیں لیا۔ شام کو گھر پہنچ کے ابا نے دس کا نوٹ واپس مانگا تو میں نے محسوس کیا جیسے میرے سر سے کوئی بوجھ اُتر گیا۔ پھر انہوں نے کہا کہ "بیٹا" یہ دس کا نوٹ میری امانت تھی اور تم اس کے امانت دار تھے۔ تم نے اس کی حفاظت کی تو اپنا فرض ادا کیا۔ اپنی امانت میں نے واپس لے لی۔ ایسے ہی یہ زندگی اور جو کچھ ہمارے پاس ہے سب خدا کی امانت ہے اور ہم صرف امانت دار ہیں۔" یہ بات میرے ذہن میں ایسی بیٹھی تھی کہ دنیا کے فلسفی اور مبلغ اپنی کتابی تعلیم سے اتنی بڑی سچائی کو اتنی آسانی سے کسی کو نہیں سمجھا سکتے تھے۔

ملک کے معماروں کے سب خواب غاصبوں نے چھین لئے۔ اسی فیکٹری میں موت کا سامان ہوا۔ نفرتوں کا زہر گولیوں کی صورت میں برسانے کے اسباب ہوئے اور اپنوں کا لہو بہا کے ہوسِ زر کی تسکین و تکمیل کا سلسلہ دراز ہوا۔ جب دشمنوں اور غداروں کے لئے مکافاتِ عمل کا وقت آیا تو انہوں نے چہرے بدل لئے۔ وہ قوم کے مصلح اور لیڈر بننے لگے۔ انہوں نے اسلحہ ساز فیکٹری کی جگہ خیراتی شفاخانہ قائم کردیا۔ مجھے معافی تلافی کی فراخدلانہ پیشکش کی تاکہ ان کے ماضی کا مکروہ چہرہ چھپا رہے۔

آج پہلی بار میں اس اسپتال میں جارہا تھا جہاں میرے والد نے دس کا ایک نوٹ دے کے مجھے امانت دار کا مطلب سمجھایا تھا۔ آج یہ جگہ کروڑوں کی نہ سہی لاکھوں کی تھی مگر میری نہیں تھی۔ قانونی طور پر میں اس کا وارث تھا مگر میں یہاں بھیس بدل کے آیا تھا۔ میں مالک تھا مگر میری حیثیت کیا تھی؟

رابعہ نے اچانک کہا "کیا ہم گوجرانوالہ کے راستے شاہدرہ جائیں گے۔"

وزیر خان ٹرسٹ اسپتال کا راستہ بھی جی ٹی روڈ پر بائیں جانب وہیں تھا جہاں کسی زمانے میں وزیر خان انڈسٹریز تھی۔ ایک چھوٹی سی عام فاؤنڈری جس کا مالک صرف میرا باپ تھا۔ پھر اس میں میر شرافت علی اور دلاور کا سرمایہ شامل ہوا تو یہ ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلکس بن گیا تھا۔ وزیر خان اور میر شرافت علی پہلے اس کارخانے کے حقِ ملکیت سے محروم ہوئے تھے اور آخر کار زندگی پر اپنے اختیار سے۔ اب عملاً چوہدری دلاور ہی یہاں سب کچھ تھا لیکن خود کو قانونی گرفت سے بچانے کے لئے اس نے اپنی بدباطنی پر خیر خواہی کا پردہ ڈال دیا تھا اور اسلحہ سازی کے وطن دشمن کاروبار سے اپنی تجوریاں بھر کے یہاں وزیر خان کے نام سے خیراتی شفاخانہ قائم کردیا تھا۔

یہاں میں نہ جانے کتنی بار آیا تھا۔ بچپن سے اب تک ہر دور میں میرے آنے کا مقصد یا انداز بدلتا رہا مگر راستہ بہرحال کبھی نہیں بدلا تھا۔ آج میں بڑول کے آگے نکل گیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ فیکٹری کی جگہ اسپتال کی سہ منزلہ عمارت بن جانے سے جگہ اور گردوپیش کا سارا ماحول اجنبی سا ہوگیا تھا۔ کچھ تبدیلیاں ساتھ والی عمارت کے خدوخال میں بھی رونما ہوچکی تھیں۔ ہوزری کا کارخانہ پہلے صرف ایک ہال پر مشتمل تھا اب اس کی جگہ نئی دو منزلہ عمارت کھڑی ہوئی تھی۔ آگے واشنگ مشین اور گیزر بنانے والی فیکٹری نئی تھی۔ وہاں پہلے خالی پلاٹ پر پانی بھرا نظر آتا تھا جس کو بھینسوں کا سوئمنگ پول کہا جاتا تھا۔ پچھلی طرف چھوٹی سی مسجد تھی مگر اب اس کا ایک مینار آس پاس کی تمام عمارتوں سے اوپر دکھائی دینے لگا تھا۔

میں نے گاڑی کو ریورس کیا "جگہ اتنی بدل گئی ہے۔"

"ہاں میں نے بھی بورڈ دیکھ لیا تھا۔ میری نظر اسی طرف تھی۔" رابعہ بولی "ڈرائیونگ کرتے ہوئے نگاہ سڑک پر رہتی تو میں بھی اس موڑ کو مس کردیتی۔"

تقریباً سو گز پیچھے جا کے میں نے بائیں طرف تنگ سی سڑک پر موڑ کاٹا جو پہلے سیدھی ایم ڈبلیو ڈی کمپلکس کے گیٹ تک جاتی تھی۔ اس پتلی سی سڑک کے دونوں جانب سیمنٹ کے جنگلوں میں جو پودے لگائے گئے تھے اگر ان کی دیکھ بھال کی جاتی تو وہ بڑھ کر اتنے بڑے ضرور ہوجاتے کہ درخت لگتے مگر جیسا کہ ہمارے ملک میں ہوتا ہے۔ شجر کاری کا ہر تجربہ ناکام ہوجاتا ہے۔ ان کی حفاظت کوئی بھی اپنی ذمے داری نہیں سمجھتا۔ چنانچہ پودوں کو بکریاں جڑ سمیت اکھاڑ کے کھالیتی ہیں اور ٹھیکے پر بنے ہوئے جنگلے بکھر جاتے ہیں یا چوری ہوجاتے ہیں۔ اب راستے کے دونوں طرف جھاڑ جھنکاڑ تھا۔ آوارہ کتے تھے اور فقیروں کے اڈے تھے۔ کسی اسپتال کے باہر ان کا ٹھکانا عام گزرگاہ کے مقابلے میں زیادہ منافع بخش ثابت ہوتا ہے۔ بیمار یا ان کے ساتھ آنے والے تیماردار دوا کے ساتھ دعا کے بھی طلب گار ہوتے ہیں اور یہ فقیر دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر۔ جو صورت سے زیادہ پریشان اور مایوس نظر آتا ہے وہی زیادہ خیرات دیتا ہے اور دعائیں بھی زیادہ سمیٹتا ہے۔

"باہر سے تو اسپتال کسمپرسی کا شکار نظر آتا ہے۔" رابعہ بولی "پہلے کے مقابلے میں یہ جگہ زیادہ صاف اور خوب صورت ہونی چاہئے۔ ایک فیکٹری سے اسپتال کے ماحول کا....."

میں نے کہا "مت سوچو کہ کیا ہونا چاہئے اور کیا نہیں ہونا چاہئے۔ یہ سب دھوکا فراڈ اور ڈراما ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ یہ اسپتال بھی یہاں کیوں ہے۔ آس پاس جو کارخانے ہیں وہ سب پہلے بھی تھے۔ یہاں ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلکس کیوں نہیں ہے۔"

رابعہ سمجھتی تھی کہ میرے لہجے میں یہ تلخی میرے جذبات کے ردِعمل کی آئینہ دار ہے۔ اس نے نرمی سے میرے شانے پر ہاتھ رکھا "ٹیک اِٹ ایزی۔"

میں نے ایک گہری سانس لے کے سر ہلایا اور گاڑی روک لی۔ مین گیٹ پر بھدے سیاہ رنگ کا بورڈ نیم دائرے میں لگا ہوا تھا اور اس پر بدخطی کے نمونے میں اسپتال کا نام انگریزی میں لکھا تھا مگر لکھنے والا حد درجہ عالم فاضل تھا۔ ہوسپٹل کو HOSEPETAL لکھا گیا تھا اور چیری ٹیبل کو بھی CHERRY-TABLE بنادیا گیا تھا۔ بورڈ کچھ آگے جھکا تھا اور اس کے نیچے جا کے خیال ضرور آتا تھا کہ کہیں وہ اچانک اوپر نہ آگرے۔ بورڈ کو رات کے وقت نمایاں کرنے کے لئے بریکٹ لائٹ لگائی گئی تھی اس کا بلب شاید پہلے فیوز ہوا ہوگا۔ اب تو لائٹ بھی ٹوٹ کے جھول رہی تھی۔ نچلی منزل کے دو کمرے روشن نظر آرہے تھے۔ اوپر کی دونوں منزلیں مکمل تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

رابعہ نے کہا "کیا یہاں صرف او پی ڈی ہے۔ مریض داخل نہیں کئے جاتے؟"

میں نے کہا "پھر اتنی بڑی عمارت کس لئے؟ گیٹ بھی بند ہے۔ مجھے تو اسپتال سے زیادہ یہ جیل خانہ یا پاگل خانہ لگتا ہے۔"

"عام طور پر اسپتالوں میں چوبیس گھنٹے ایمرجنسی کا شعبہ ہوتا ہے جو یہاں بے حد ضروری ہے۔ آس پاس کسی بھی کارخانے میں کوئی حادثہ پیش آجائے پھر؟"

"پھر کیا۔ یہ خیراتی اسپتال ہے مس رابعہ۔ کوئی سرکاری اسپتال نہیں ہے۔" میں نے تلخی سے کہا "شاید وزیر خان بھی یہ نام پسند نہ کرتا۔ وہ اسپتال کے ساتھ اپنا نام بھی نہ لکھتا۔ وہ خیرات کے لفظ سے چڑتے تھے۔ کہتے تھے کہ ہم حسبِ توفیق امداد کرتے ہیں حسبِ استطاعت نہیں۔"

"میں سمجھی نہیں؟"

"بھئی استطاعت والے تو بہت ہیں مگر اتنی توفیق کسے کہ سب راہِ خدا میں دے دے۔ کیا مصیبت ہے۔ یہاں تو کوئی پوچھنے والا بھی نہیں۔"

رابعہ نے اِدھر اُدھر گھنٹی کی تلاش میں نظر دوڑائی اور پھر پھاٹک کی کُنڈی بجائی۔ میں ایک قدم پیچھے جیب میں ریوالور کو گرفت میں لئے کھڑا رہا۔ ایک منٹ بعد پہلے کوئی کھانسا پھر اس نے آدم بے زار لہجے میں اندر ہی سے سوال کیا "کون ہے؟ کیا بات ہے؟"

رابعہ نے کہا "دروازہ کھول کے دیکھو گے تو پتا چل جائے گا کہ کون ہے پھر بات بھی بتادیں گے۔"

گیٹ کھولنے والا گہری نیند سے بیدار ہوا تھا یا شاید یہی اس کے بولنے کا انداز تھا۔ وہ پھولے ہوئے گالوں اور گھنی مونچھوں والا پہلوان ٹائپ شخص تھا جس نے گھنی سیاہ داڑھی کو صفائی سے ترشوایا تھا مگر سر پر استرا پھروا دیا تھا۔ اس نے کھیس کی بکل مار رکھی تھی۔ رابعہ سے زیادہ وہ مجھے دیکھ کے چونکا۔

"کس سے ملنا ہے جی۔ یہ ملاقات کا وقت نہیں ہے۔"

رابعہ نے کہا "میں کسی سے ملنے نہیں آئی ہوں۔"

وہ حیران نظر آنے لگا "پھر کیا۔ آپ بیمار ہو یا....."

میں نے کہا "میں تم کو بیمار لگتا ہوں؟"

اس نے میرے لہجے کا بُرا مانا "اسپتال کا ٹائم صبح نو بجے ہوتا ہے۔ اس وقت....."

رابعہ نے اسے ڈانٹا "تمہارے علاوہ بھی کوئی ہے یہاں؟ جب ایک بار بتادیا کہ ایسی کوئی بات نہیں۔"

"پھر کیا بات ہے جی۔ کچھ پتا نہیں مجھے۔ کون داخل ہے آپ کا یہاں۔ میں دیکھتا ہوں اگر شاہ صاحب سو رہے ہوں گے تو پچھلے گیٹ سے آپ کو اندر لے جاؤں۔ لیکن....." وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

"لیکن کیا؟" رابعہ نے بیگ کھول کے دیکھا اور سو کا ایک نوٹ نکال لیا "شاہ صاحب کون ہیں؟"

اس کا آگے بڑھنے والا ہاتھ پیچھے ہٹ گیا "آپ نہیں جانتی ہو شاہ صاحب کو۔ ڈاکٹر شاہ....."

رابعہ نے فوراً بات بنائی "اچھا وہ ڈاکٹر شاہ۔ میں سمجھی کوئی اور شاہ صاحب آگئے بیچ میں۔"

وہ سو کا نوٹ اچک کے گیٹ کے پیچھے غائب ہوگیا اور ہمیں چکر میں ڈال گیا۔

"اب کیا کریں؟ یہاں تو معاملہ ہی کچھ اور ہے؟"

"یہ سمجھ رہا ہے کہ ہم کسی مریض سے بے وقت ملنا چاہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا مریض داخل بھی کئے جاتے ہیں یہاں۔" میں نے کہا۔

"مگر ہم کس سے ملیں گے اور کیوں؟ ہم تو استاد پیڈرو سے ملنے آئے تھے۔"

میں نے کہا "کہیں وہی ڈاکٹر شاہ نہ ہو۔ دیکھتے ہیں اندر جا کے۔"

"پچھلی طرف کون سا گیٹ ہے اور اس کا راستہ....."

میں نے کہا "آؤ دیکھتے ہیں۔ یہ گلی سی نظر آرہی ہے مجھے۔"

پتلی سی گلی اسپتال کی قدِ آدم دیوار اور ساتھ والے واشنگ مشین کے کارخانے کی بارہ فٹ اونچی دیوار کے بیچ میں تھی۔ یہ مشکل سے تین فٹ چوڑی جگہ بھی سیوریج لائن کے لئے چھوڑی گئی تھی جس میں شاید پیچھے کی طرف واقع فیکٹریوں کی لائن بھی ملتی ہوگی۔ سیمنٹ کے اس پختہ نالے پر سیمنٹ کے سلیب تھے جو اوپر ایسے ہی رکھ دیے گئے تھے تاکہ صفائی کے لئے نالے کو کہیں سے بھی کھولا جاسکے۔ اس پر چلتے ہوئے رابعہ کا بُرا حال تھا۔ بدبو سے بچنے کے لئے اس نے رومال کا گولا سا بنا کے ناک پر رکھ لیا تھا۔ اندھیرے میں بو کے ساتھ ہی مچھر اور دوسرے کیڑے مکوڑے بھی تھے جو میرے چہرے سے ٹکرا رہے تھے۔

رابعہ نے کہا "اُف۔ میرا تو دماغ خراب ہوگیا۔"

میں نے کہا "یہ بات نہیں۔ تمہیں پتا آج چلا۔"

"کیسی جان لیوا بدبو ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ کارخانوں کے ویسٹ WASTE اور کیمیائی اخراج سے پیدا ہورہی ہے۔"

"بالکل ٹھیک خیال ہے آپ کا۔ اس سے زہریلی گیس بھی پیدا ہوتی ہے کوئی تو اس کا پتا تمہیں اس وقت چلے گا جب تم چکرا کے ہٹ سے گروگی۔ ویسے یہ سیمنٹ کے سلیب بھی بہت ناقص اور پرانے ہیں۔ سنبھل کے چلنا کوئی ٹوٹ گیا تو غڑاپ سے اندر....."

رابعہ نے کہا "سکندر میں کہتی ہوں واپس چلو۔ ایسا نہ ہو چوہے کی طرح ہم سیدھے چوہے دان میں پھنس جائیں۔"

"کم سے کم میں خود کو چوہا تسلیم نہیں کرسکتا۔ دیکھو بائیں طرف مڑ جاؤ ورنہ دیوار سے ٹکراؤ گی۔"

"آجائیں۔ آجائیں جی۔" کسی نے سرگوشی میں کہا اور میں

نے سرمُنڈے مونچھوں والے چوکیدار کی نشے میں ڈوبی ہوئی آواز پہچان لی۔ وہ موڑ پر ہمارے انتظار میں کھڑا ہوا تھا۔ بائیں طرف چند فٹ کے فاصلے پر وہ چور دروازہ تھا جو تاریکی میں کسی مجرمانہ سرگرمیوں کے اڈے کا خفیہ راستہ لگتا تھا۔

"بس جی قسمت ہے آپ کی۔ شاہ صاحب سو رہے تھے۔ میں نے میز کی دراز میں سے چابی نکال لی۔" وہ آگے چلتے ہوئے بولا۔

رابعہ نے پلٹ کر پھر مجھے دیکھا مگر میں نے اسے آگے دھکیل دیا۔ وہ آگے بڑھتے ہوئے ڈر رہی تھی مگر میں اب حقیقتِ حال جانے بغیر واپس جانا نہیں چاہتا تھا۔ اچانک میرا یہ شک یقین میں بدل گیا تھا کہ ایک بار پھر وزیر خان کے نیک نام کو مذموم مقاصد کی تکمیل کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے اور خیراتی اسپتال کا بورڈ بھی فریب کا پردہ ہے جس کے پیچھے پُرانے شکاری بدلے ہوئے حالات میں کوئی نیا جال پھیلائے بیٹھے ہیں۔

میں حیران بھی تھا اور بعد میں مجھے افسوس بھی ہوا کہ آخر یہ خیال مجھے پہلے کیوں نہیں آیا تھا۔ اتنا عرصہ چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کے ظاہر و باطن کو ہر پہلو سے پرکھنے کے بعد مجھے سمجھ لینا چاہئے تھا کہ ان کی نیکی بھی خالی از بدی نہیں ہو سکتی۔ وہ جسے کھرا سونا بتاتے ہیں وہ ملمع بھی نہیں ہوگا۔ صرف پیتل ہوگا۔

اس خوف ناک انکشاف کے ساتھ ہی میرے ذہن میں نئے شبہات کے سنپولئے کلبلانے لگے تھے اور سوالیہ نشانوں کی طرح پھن اُٹھا رہے تھے۔

رابعہ نے رُک کے مجھے آگے نکلنے کو کہا۔ وہ خود دیوار سے لگ گئی تھی۔ میں بچ کے نکلتا ہوا کھلے دروازے سے اندر چلا گیا۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے کہا "اتنا اندھیرا کیوں ہے یہاں؟"

"تم کیا پہلی بار آئے ہو؟"

میں نے کہا "ہاں۔ تم کون ہو؟"

"میں.... سیکیورٹی کا آدمی ہوں۔ نذیر باؤلا۔ ناجی کہتے ہیں سب مجھے۔ تم سے پہلے بیگم صاحب کے ساتھ کون آتا تھا؟" وہ کنفیوژ ہو گیا۔

"دوسرا آدمی تھا۔" میں نے سوچے سمجھے بغیر کہا۔

"اچھا آپ ادھر انتظار کریں۔ میں ابھی آتا ہوں اسے ساتھ لے کر۔" وہ اندر کے دوسرے دروازے میں غائب ہو گیا۔

اب میری آنکھیں برائے نام اجالے میں دیکھنے لگی تھیں۔ اندر کا دروازہ کھلا تو تھوڑی سی روشنی میں کمرے کے خدوخال واضح ہو گئے۔ یہ مشکل سے آٹھ فٹ چوڑا اور دس فٹ لمبا کمرا تھا۔ جس میں ایک دیوار کے ساتھ لکڑی کی بینچ لگی ہوئی تھی۔ اس قسم کی بینچ ریلوے پلیٹ فارم کے علاوہ پارک وغیرہ میں ہی نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک بھدی سی کرسی تھی۔ کمرے کی دیواریں بھی خالی اور سپاٹ تھیں اور ان کا میلاپن تاریکی میں بھی محسوس ہوتا تھا۔ کمرے کے اندر عجیب سی پُر آسیب گھٹن تھی اور کسی اسپتال سے زیادہ یہ تھانے کی لاک اپ جیسا کمرا لگتا تھا۔

رابعہ کو میں نے زبردستی بینچ پر بٹھا دیا ورنہ وہ کمرے کے وسط میں بُت بنی کھڑی ہوئی تھی "ٹینس (TENSE) ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"یہ کیا ہو رہا ہے سکندر۔" اس کی آواز میں کپکپی تھی "ہم تو پیڈرو سے ملنے آئے تھے۔"

"پیڈرو آتا ہوگا۔"

رابعہ نے نفی میں سر ہلایا "وہ باؤلا تو کسی اور کو بُلانے گیا ہے معلوم نہیں وہ کیا سمجھ رہا ہے ہمیں۔"

"یہ سب ڈراما ہے۔ پیڈرو شاگرد کس کا ہے۔ چوہدری دلاور نے اسے سب سکھا دیا ہے۔"

"نہیں سکندر۔ معاملہ کچھ اور ہے۔"

ذہنی طور پر اس سے ہم خیالی کے احساس کو دباتے ہوئے میں نے یوں محسوس کیا۔ جیسے میں اپنے آپ کو دھوکا دے رہا ہوں "اور کیا معاملہ ہو سکتا ہے۔ اس اسپتال میں نازو اور غالب ہوں گے کہیں۔ پیڈرو کہے گا کہ تم دلاور کو چھوڑ دو ہم انہیں چھوڑ دیتے ہیں۔"

"یہاں مریض داخل کئے جاتے ہیں؟"

میں نے بے نیازی سے شانے اچکا کے کہا "ممکن ہے۔"

"پھر یہاں اتنا سناٹا کیوں ہے۔ جہاں مریض داخل ہوں وہاں ڈاکٹرز بھی ڈیوٹی پر ہوتے ہیں۔ نرسیں اور اسپتال کا عملہ۔"

"ڈاکٹر شاہ تو ہیں۔"

"کسی مریض کے ساتھ کوئی اور نہیں۔ اندر نہ سہی باہر برآمدے اور کاریڈور میں یا گیٹ کے سامنے بھی کوئی نہیں۔ میو اسپتال میں تو ہر طرف لواحقین تیماردار اور پریشان حال عزیز نظر آتے ہیں۔"

"یہ اتنا بڑا اسپتال تو نہیں ہے۔"

"پھر بھی۔ ادھر بالکل اندھیرا ہے۔ وارڈ اوپر ہی ہوں گے۔" میں نے جھوٹ سے رابعہ کو بہلانے کا شغل جاری رکھا۔ "مریض سو رہے ہوں گے۔ لائٹس آف کر دی گئی ہوں گی۔"

"لائٹس بالکل کہاں بند ہوتی ہیں۔"

"اچھا بھئی جو ہوگا معلوم ہو جائے گا۔ میں بھی تو آج پہلی بار ہی آیا ہوں۔" میں نے چڑ کے کہا "میرا سر مت کھاؤ بلاوجہ۔"

رابعہ چُپ ہو گئی۔ مجھے اپنی درشتی پر ندامت ہوئی۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا "مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"آیت الکرسی پڑھو اور ہاتھ ریوالور پر رکھو۔" میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی اور اس کے گالوں پر تھپکی دی۔

دروازے کے پیچھے آہٹ کے ساتھ چوں چوں کی آواز بھی سُنائی دی۔ میں چوکس ہو گیا۔ دروازہ کھلا اور ناجی ایک وہیل چیئر دھکیل کر اندر لے آیا۔ اس پر ایک اجنبی بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اسپتال کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ گہری سُرخ یا سیاہ دھاریوں والی ڈھیلی قمیص اور ایسا ہی پاجامہ۔ اس کے سر پر مشین پھیری گئی تھی مگر اس بات کو کچھ عرصہ گزر چکا تھا۔ اب اس کے سر پر آدھا انچ سے کچھ کم لمبے بال تھے۔

ناجی نے ایک سوئچ دبانے سے پہلے اندر والا دروازہ اچھی طرح بند کر دیا۔ کمرے میں زیرو واٹ کے بلب کی بیمار اور اداس روشنی پھیل گئی۔ یہ بلب بھی خاصی بلندی پر چھت میں نصب تھا اور سُرخ رنگ کا تھا "لو جی دس منٹ بات کرو آپ۔ میں باہر بیٹھتا ہوں۔" ناجی نے کہا "سگریٹ ہوگی آپ کے پاس۔ کے ٹو پیتا ہوں میں۔"

میں نے کہا "نہیں ختم ہو گئی ہے۔ یہاں کہیں ملتی ہوگی؟"

اس نے قدرے تذبذب کے ساتھ کہا "باہر ملتی ہے۔ ساتھ والی فیکٹری میں کینٹین ہے رات کی شفٹ والوں کے لئے۔"

"پھر تو چائے بھی ہوگی وہاں۔" میں نے کہا۔

رابعہ نے میری نیت کو بھانپتے ہوئے ناجی کو پچاس کا نوٹ پکڑا دیا "یہ لو۔ اپنے لئے بھی سگریٹ لے لو اور اس کے لئے بھی۔ میرے لئے بلکہ ہم سب کے لئے چائے بسکٹ لے آؤ تو بڑی مہربانی۔ باقی رقم تمہاری۔"

وہ لالچی آدمی خوش ہو گیا "سگریٹ کون سی؟"

میں نے کہا "کے ٹو اور کون سی۔ اپنا بھی برانڈ یہی ہے یار۔"

بے وقوف ہونے کے باوجود اس میں اتنی عقل ضرور تھی کہ اس نے جاتے ہوئے دروازے کو باہر سے بند کر دیا۔ رابعہ ٹکٹکی لگائے اس شخص کو دیکھ رہی تھی جو سپاٹ چہرہ لئے خالی خالی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا جیسے دیواروں کی بے حسی اور ہماری اجنبیت میں اپنی پہچان تلاش کر رہا ہے۔ وہ صحرا میں سمت گم کر دینے والے مسافر کی طرح ہکا بکا اور پریشان تھا یا کسی اجنبی شہر کی سڑک پر یادداشت کھو دینے والے کی طرح بالکل بے کس و لاوارث لگتا تھا۔ وہ نہ میری طرف متوجہ تھا اور نہ رابعہ کی طرف۔ اس کے لئے ہمارا وجود بھی اتنا ہی بے معنی تھا جتنا اس کمرے کا یا کمرے میں رکھی ہوئی بینچ کا۔

میں نے اس سے دوستانہ لہجے میں کہا "ہیلو۔"

وہ مسکرانے لگا "ہیلو"

میں نے کہا "استاد پیڈرو نے بھیجا ہے تمہیں کہاں ہے وہ؟"

رابعہ نے مجھے پُرملامت نظروں سے دیکھا۔ اس کی نظریں صاف کہتی تھیں کہ اس دیوانے سے کیا پوچھتے ہو جسے شاید اپنا پتا بھی معلوم نہیں۔

"وہ... وہ تو میں ہوں۔" اس نے سوچ کے جواب دیا۔

"کیا تم! استاد پیڈرو؟"

"نہیں بس استاد۔" وہ بولا "وہ کہتے تھے کہ بڑے استاد بنتے ہو تم ہمارے ساتھ استادی کرتے ہو۔ ہم ایسا سبق دیں گے تمہیں کہ ساری استادی بھول جاؤ گے۔"

"یعنی تم استاد تھے۔ پڑھاتے تھے کہیں۔ کسی کالج میں یا یونیورسٹی میں۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔ تم شاگرد ہونا میرے۔ خبیث۔ تم ان سے ملے ہوئے تھے۔ تم ہی ساری باتیں ان تک پہنچاتے تھے۔ ورنہ وہ کیسے جان سکتے تھے۔"

"وہ کون؟"

"شش!" اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ لی "آہستہ بولو۔ وہ سب سُن رہے ہیں۔ میرے بیٹے۔"

"تمہارے بیٹے۔ کتنے بیٹے ہیں تمہارے؟"

وہ مسکرانے لگا "ہیں نہیں۔ تھے۔ سب مر گئے۔ نہیں دنیا کے لئے میں مر گیا۔ ایک ہی بات ہوئی نا۔ پروفیسر غیاث الدین دوسری دنیا میں اکیلا گیا اور باقی سب وہیں رہے۔ تم کیسے آئے یہاں۔"

میں نے بڑی مشکل سے کہا "ہم آپ سے ملنے آ گئے۔"

صورتِ حال کچھ کچھ میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ اگر مجھے وقت ملتا تو میں پروفیسر غیاث الدین سے سب پوچھ لیتا کہ آخر اس کے ناخلف بیٹوں نے اسے پاگل بنا کے یا پاگل کرنے کے لئے اس اسپتال میں اکیلا کیوں چھوڑ دیا تھا لیکن مجھے ناجی کی واپسی کا بھی خیال تھا۔

رابعہ بہت خوف زدہ تھی "سکندر اگر ناجی کو پتا چل گیا کہ ہم اس کے کچھ نہیں۔ یا وہ ڈاکٹر شاہ آ گیا۔"

میں نے کہا "پروفیسر صاحب چلیں میں آپ کو اندر چھوڑ آؤں۔"

"اندر" اس نے دروازے کی طرف دیکھا "کیا اس وقت میں باہر ہوں۔ تم بھی تو اندر رہو۔"

"میرا مطلب تھا آپ کے بیڈ پر۔ آپ کے سونے کا وقت ہے۔"

اس نے سر ہلایا اور ایک بازو پر سے آستین کھینچ کر اوپر کر لی۔ میں نے دیکھا کہ بازو پر ان گنت سُرخ نشانات تھے جو اب سیاہ پڑ چکے تھے۔ اس بازو میں ان گنت انجکشن لگائے گئے تھے۔ سونے کے نام پر اس کا ردِ عمل کسی معصوم بچے کی طرح تھا جو ایک معمول کا عادی ہو۔ یہ جانتا ہو کہ اس نے دانت برش نہ کئے یا کپڑے نہ بدلے ٹی وی بند نہ کیا یا ممی پاپا کو گڈ نائٹ نہ کہا تو وہ خفا ہوں گے۔

میں نے اس کی کرسی کو موڑ لیا "انجکشن کون لگاتا ہے تمہیں؟"

"ڈاکٹر شاہ۔ اس سے نیند اچھی آتی ہے۔ اچھی نیند اچھی صحت کی ضامن ہوتی ہے۔ میں جب یہاں آیا تو بیمار تھا۔ اب کتنا صحت مند ہوں دیکھ لو لیکن دیکھو۔ یہ بات انہیں مت بتانا۔ ڈاکٹر

شاہ نے بھی منع کیا ہے۔"

میں نے کہا "رابعہ دروازہ کھولو۔"

رابعہ نے میرا بازو پکڑلیا "سکندر پلیز...... چلو ہم واپس چلیں۔ ورنہ کسی مصیبت میں پڑجائیں گے۔"

میں نے اپنا بازو چھڑالیا "کسی مصیبت میں پڑنے سے پہلے میں ایک ایک کو شوٹ کروں گا۔ میں دیکھوں گا یہاں کیا ہورہا ہے۔"

"تم پاگل ہوگئے ہو۔"

"ہاں جو بھی پاگل خانے میں آتا ہے پاگل ہوجاتا ہے لیکن ہر بات کی حد ہوتی ہے۔"

"تمہیں غالب اور نازو کی فکر نہیں۔"

"انہیں کچھ نہیں ہوسکتا۔ دروازہ کھولو۔" میں نے سختی سے کہا۔

رابعہ نے دروازہ کھول دیا۔ سامنے ایک کاریڈور سا تھا جس کے دونوں طرف کمروں کے بند دروازے تھے۔ آخری حصے میں آمنے سامنے کے دو کمروں میں روشنی تھی جو ہم نے سڑک کی طرف سے بھی دیکھی تھی۔ میں نے وہیل چیئر کو آہستہ آہستہ دھکیلا اور بے آواز قدموں سے چلنے لگا۔

پہلا کھلا دروازہ لفٹ کا تھا جس میں شاید پروفیسر کو نیچے لایا گیا تھا۔ میں کرسی سمیت اندر داخل ہوگیا۔ رابعہ نے اچانک کہا "ناجی باؤلا" اور اندر قدم رکھتے ہی بٹن دبادیا۔ دروازہ بند ہوا اور لفٹ اوپر جانے لگی۔ یہ لفٹ اتنی لمبی تھی کہ اس میں مریض کو بیڈ پر یا اسٹریچر پر بھی اوپر نیچے منتقل کیا جاسکتا تھا۔

"وہ آگیا۔ ناجی۔" رابعہ نے کہا "اس نے ہمیں دیکھ بھی لیا ہے۔"

میں نے مجرمانہ فرار کا ارادہ بدل دیا اور لفٹ کو واپس نیچے لانے والا بٹن دبادیا۔ گراؤنڈ کو چھوتے ہی لفٹ کا دروازہ کھل گیا اور میں نے ناجی کا بدحواس چہرہ اپنے مقابل پایا۔

"یہ کیا ہے جی۔" اس نے خفگی سے کہا "آپ اندر کیوں جارہے تھے؟"

میں نے سکون سے کہا "مریض کو بیڈ پر پہنچانے کے لئے۔ ان کو نیند آرہی تھی۔"

رابعہ نے میری تائید کی "پروفیسر غیاث الدین سے پوچھ لو۔"

ناجی کے ایک ہاتھ میں سگریٹ کے دو پیکٹ تھے اور دوسرے میں چائے کی ٹرے جس میں نیلے اسٹیل والی پشاوری ٹائپ چائے کی کیتلی رکھی ہوئی تھی۔

"آجاؤ تم بھی اندر۔" میں نے کہا۔

"نہیں آپ باہر نکلو۔ آپ تو بڑے غلط آدمی ہو جی۔ میری نوکری کا بھی خیال نہیں۔ اوپر کوئی نہیں جاسکتا۔"

"اچھا ہمیں معلوم نہیں تھا۔" میں نے کہا اور کرسی کو پھر دھکیل کر باہر لے آیا۔

ناجی خوفزدہ نظروں سے کاریڈور کے آخری حصے کو دیکھ رہا تھا جہاں روشنی تھی "اگر ڈاکٹر شاہ نکل آئے تو۔"

"تو کیا ہوگا؟" میں نے پوچھا "فکر مت کرو۔ ہم ان کے سامنے اپنی غلطی مان لیں گے۔ تمہاری نوکری نہیں جائے گی۔"

اس نے کہا "شش... آہستہ بات کرو۔ اور چلو یہاں سے واپس۔"

خفیہ ملاقات کے کمرے میں پہنچ کے دروازہ بند کرنے کے بعد ناجی کے چہرے پر سکون کے آثار نمودار ہوئے "شاہ جی بہت ظالم آدمی ہیں۔ آپ نہیں جانتے۔"

"کیا ظلم کرتے ہیں؟" رابعہ بولی۔

"اگر ان کو پتا چل جائے کہ میں نے اس طرح آپ کو پروفیسر صاحب سے ملوایا تھا تو مجھے جیل ہوجائے گی۔ کم سے کم چھ مہینے کی۔"

میں نے رابعہ کو والد کے لفظ پر چونکتے دیکھا تھا۔ معلوم نہیں وہ ہم میں سے کسے پروفیسر غیاث الدین کا بیٹا یا بیٹی سمجھ رہا تھا۔ پروفیسر نے یہ تو بتا ہی دیا تھا کہ اسے ذی ہوش اور زندہ انسانوں کی دنیا سے الگ کرکے اس جگہ پہنچانے کے ذمے دار اس کے بیٹے تھے۔ جو شاید یہ مشہور کرچکے تھے کہ ان کا باپ مرگیا یا خود پروفیسر ایسا محسوس کرتا تھا کہ اس کی یہ زندگی مُردوں سے بدتر ہے اور یہ جینا کوئی جینا نہیں۔ ان حالات میں اس کے کسی بیٹے کا رات کے وقت باپ سے ملنے کے لئے آنا مشکل لگتا تھا۔ ہاں یہ ہوسکتا تھا کہ اس کی کوئی بیٹی چوری چھپے پروفیسر سے ملنے آتی ہو اور ناجی نے میری صورت میں اس کی مشابہت دیکھ لی ہو یا اسے غلط فہمی ہوگئی ہو کہ میں اس کا بیٹا ہوں۔

میں نے کہا "یہاں جیل بھی ہے؟"

"ہاں جی۔ بڑی سخت جیل ہے۔" ناجی نے چائے ایک پیالی میں ڈالی اور مجھے پکڑادی "کھانے کو کچھ نہیں ملتا اور مار بھی پڑتی ہے۔"

"مگر یہ تو اسپتال ہے۔" رابعہ نے کہا۔

"اسپتال بھی ہے۔" ناجی نے اس سے اتفاق کیا اور پیالی پُر کرکے چائے پینے لگا۔

میں نے کہا "پروفیسر صاحب سے بھی پوچھو۔ چائے پئیں گے؟"

پروفیسر نے سرہلایا "صائمہ کے ہاتھ سے پیوں گا۔" اس نے رابعہ کی طرف دیکھ کے کہا "پاپے بھی کھاؤں گا۔"

میں نے رابعہ کو اشارہ کیا "صائمہ، تم پاپے لائی تھیں؟"

رابعہ نے ندامت سے کہا "وہ... وہ تو میں بھول گئی تھی۔ اگلی بار ضرور لاؤں گی۔ ابھی آپ چائے پی لیں۔"

پروفیسر کا خیال تھا کہ اس کی صحت یہاں آنے کے بعد بہتر ہوگئی ہے۔ نشے کی حالت میں یا دواؤں کے زیر اثر یہ بات اس کے لاشعور میں بٹھادی گئی تھی۔ ورنہ حقیقت اس کے برعکس

کمرے ہیں۔ اس نے پروفیسر کو چھوڑ کے ہماری طرف رُخ کیا "تم جاتے کیوں نہیں۔"

میں نے کہا "اگر ہم جانے سے انکار کردیں تو کیا کروگے تم؟"

رابعہ نے سرہلایا "ہاں سو روپے دیے تھے. آخر ہم نے اور تم نے ایک گھنٹا بھی بات نہیں کرنے دی۔ چالیس روپے اس کے علاوہ بھی رکھ لیے تم نے پھر بھی دھمکی دیتے ہو اور ڈراتے ہو پروفیسر صاحب کو۔"

وہ ڈر گیا "اچھا جی میں کچھ نہیں کہوں گا کسی سے۔"

"یہ بھی نہیں کہ ہم یہاں کسی سے ملنے کے لئے آئے تھے۔ ہم کل رات پھر آئیں گے لیکن ذرا دیر سے گیارہ بارہ بجے۔"

وہ انکار میں سرہلانے لگا "دس بجے سب سوجاتے ہیں اور ہر روز موقع نہیں ملتا۔ آج تو شاہ جی۔"

"آج کیا ہوا تھا شاہ جی کو؟"

"کچھ نہیں۔ آج زیادہ پی گئے ہیں وہ۔ اور اکیلے بھی نہیں ہیں۔ کوئی عورت ہے اندر۔" ناجی نے خود ہی اگل دیا "بہت خوب صورت عورت ہے۔ وہی لائی تھی شراب کی بوتل بھی۔"

"اگر کل تم نے ہمارے لئے دروازہ نہ کھولا تو ہم آج کی ہر بات راناصاحب کو بھی بتادیں گے اور شاہ جی کو بھی۔"

اس نے سو اور پچاس کا نوٹ نکالا "یہ لیں جی اپنے پیسے، مجھے معاف کریں۔ غلطی ہوگئی تھی مجھ سے۔"

میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا "کل رات گیارہ بج کے تیس منٹ۔ چلو صائمہ۔"

میں آگے بڑھا ہی تھا کہ پیچھے کا دروازہ کھلا۔ ایک عورت تیزی سے اندر آئی۔ ہمیں دیکھ کے رُکی اور پھر باہر کے دروازے کی طرف بڑھی۔ وہ اٹھائیس تیس سال کی بھرپور عورت تھی۔ میک اپ اور ہیراسٹائل سے حسین بھی لگتی تھی مگر اس کی اصل خوب صورتی پُرشباب بدن کے مدوجزر میں تھی جسے لباس نے زیادہ نظر نواز کردیا تھا۔ وہ کچھ نروس اور پریشان نظر آرہی تھی۔ اس نے بکھرے بالوں کو سمیٹ کر مجھے اور پھر رابعہ کو دیکھا۔ ایک نظر ناجی پر ڈالی اور دوسری پروفیسر پر۔ شاید اس کا خیال تھا کہ اس وقت کوئی بھی دیکھنے والا نہیں ہوگا اور وہ خاموشی سے نکل جائے گی۔ ایک ساتھ چار افراد کی موجودگی اس کے لئے ایک غیر متوقع صدمہ بن گئی تھی۔ اس کے چہرے پر وہی تاثرات تھے جو گھر سے فرار کی کوشش کرتے ہوئے ماں باپ اور بھائی بہن کے ہاتھوں پکڑے جانے والی لڑکی کے ہوسکتے ہیں۔

خاموشی کا ایک لمحہ ہم سب پر کسی بوجھل چٹان کی طرح آگرا تھا۔ آخر کار عورت نے کہا "میں جارہی ہوں۔ کیا نام ہے تمہارا؟ ناجی۔ اور یہ کون ہے تمہاری باجی۔" وہ ہنسی۔

ناجی بوکھلاہٹ کا شکار ہوگیا "نہیں جی۔"

"کیا نہیں۔ ناجی کی باجی۔ چلو باجی کی ناجی سہی۔" اس نے

تھی کہ وہ برسوں کا بیمار اور فاقہ زدہ نظر آتا تھا۔ اس کی آنکھیں حلقوں میں دھنسی ہوئی تھیں اور زرد گال اتنے پچک گئے تھے کہ رخساروں کی ہڈیاں اُبھری ہوئی لگتی تھیں۔ اس کی عمر اگر پچاس سال تھی تو وہ ساٹھ کا نظر آتا تھا۔

جب رابعہ اسے چائے پلارہی تھی تو اس نے اچانک رابعہ کا ہاتھ پکڑلیا "صائمہ مجھے اپنے گھر لے چلو۔"

رابعہ نروس ہوگئی "اپنے گھر۔"

"ہاں اپنے گھر۔ مجھے اسٹور میں چُھپادینا۔" وہ رازدارانہ انداز میں بولا "یا باہر جو مرغیوں کا ڈربا ہے اس میں بند کردینا تاکہ انہیں پتا نہ چلے۔"

میں نے کہا "ہم آپ کو گھر میں رکھیں گے۔ الگ بیڈروم دیں گے۔"

وہ کانپنے لگا "نہیں نہیں۔ وہاں تو وہ آجائیں گے اور اکیلا پاکے... مگر میں اندر سے کُنڈی لگاسکتا ہوں۔ دروازے کو لاک کرسکتا ہوں اور تم کھڑکیوں کو بند کراسکتے ہو۔ چُنائی کرکے۔ میں سرہانے پتھر رکھ کے سویا کروں گا۔ جیسے ہی وہ میرے قریب آئے میں یوں پتھر کھینچ کے سر میں ماروں گا۔"

اس نے ایک دم رابعہ کے ہاتھ سے چائے کی پیالی لے کر ناجی پر کھینچ ماری تھی۔ ناجی باؤلے کے گھٹے ہوئے سر پر پیالی لگی تو وہ طیش میں آگیا "میں تمہاری شکایت کروں گا راناصاحب سے۔"

پروفیسر کا رنگ پیلا پڑگیا "راناصاحب سے نہیں وہ ماریں گے مجھے کوڑے سے۔ مجھے بہت ڈر لگتا ہے ان سے۔"

"پھر بدتمیزی مت کرنا میرے ساتھ۔" ناجی نے کہا "اب چلو واپس۔"

"نہیں۔ میں صائمہ بیٹی کے ساتھ جاؤں گا۔"

"ڈاکٹر شاہ کی اجازت کے بغیر تم باہر نہیں جاسکتے۔" ناجی نے اسے ڈانٹا "چلو اب اپنے کمرے میں ورنہ میں راناصاحب کو بتادوں گا۔"

"پھر وہ مجھے بجلی لگائیں گے۔" وہ سہم گیا۔

"ہاں۔ کہنا نہیں مانوگے تو بجلی لگانی پڑے گی۔"

"میں کہنا مانوں گا۔" پروفیسر نے کہا۔

"اچھا جی آپ جائیں۔ بہت دیر ہوگئی۔" ناجی نے کہا "دس بجے شاہ جی راؤنڈ کرتے ہیں۔"

میں نے گھڑی دیکھی تو پونے دس ہورہے تھے "ٹھیک ہے ہم جارہے ہیں۔ ناجی۔ یہاں اور کتنے مریض ہیں؟"

وہ ایک دم چوکنا ہوگیا "کیا آپ اخبار والے ہو؟"

میں نے کہا "نہیں ایسے ہی پوچھ رہا تھا۔ بہت بڑا اسپتال ہے اور تم اکیلے ہو۔ سب کو کیسے سنبھالتے ہو۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور وہیل چیئر کو گھما کے دروازے کی طرف چل پڑا پھر اسے خیال آیا کہ ہم ابھی تک دہیں

اپنے کندھے پر جھولتا ہوا بیگ اُتارا اور اس میں کچھ تلاش کرنے لگی۔

واضح طور پر وہ نشے میں تھی اور اسے نہ اپنی حرکات و سکنات پر کنٹرول تھا اور نہ اپنے خیال و اظہار پر۔ اس نے آخر کار بیگ میں سے سو سو کے نوٹ نکال لئے۔ شاید خود اسے علم نہیں تھا کہ بیگ میں کتنی رقم ہے اور اس کی مٹھی میں کتنے نوٹ آئے ہیں۔

"یہ لو۔ آپس میں بانٹ لینا۔" اس نے مٹھی بھر نوٹ ناجی کے سامنے پھینک دیے "کسی کو کچھ مت بتانا میرے بارے میں۔"

ناجی نوٹ اُٹھانے لگا "کیا نہ بتاؤں بی بی جی؟"

"یہی کہ میرا نام صوفیہ ہے۔" وہ ہنسی "اور میں تمہارے شاہ جی کے پاس آئی تھی۔ ناجی کی باجی کے ساتھ کون ہے۔ باجی کا باجا۔ باجا یا راجا۔ راجا کے ساتھ رانی لگتی ہے بالکل۔ کنگلے راجا۔ لو تم بھی عیش کرو۔" اس نے دو مٹھیاں بھر بھر کے نوٹ اُچھال دیے۔

مجھے اس عورت پر ترس بھی آرہا تھا اور حیرانی بھی ہو رہی تھی۔ اگر وہ کوئی آبرو باختہ عورت نہیں تھی تو کسی نام نہاد ڈاکٹر شاہ کے ساتھ خلوت میں کیوں شریک تھی اور اب تاب میں اپنے شباب کو ڈبو کے اس نے یہ دولت کمائی تھی تو پھر اسے مالِ مفت کی طرح کیوں لٹا رہی تھی۔ وہ شریف عورت تو ہو نہیں سکتی تھی کہ بدنامی سے ڈرتی۔ پھر وہ کیوں چاہتی تھی کہ کسی کو اس کے یہاں آنے کا علم نہ ہو اور وہ اتنی خوف زدہ ہو کے کیوں فرار ہو رہی تھی۔ نشے میں ہونے کے باوجود اسے اتنا ہوش یقیناً تھا کہ وہ افشائے راز کرنے والی زبانوں کو عہدِ خاموشی کی قیمت چُکانا نہیں بھولی تھی۔ کسی دولت مند کے عشرت کدے سے رخصت ہونے والی جسم فروش عورت دیکھنے والوں کو رشوت دے کر مجبور نہیں کرتی کہ وہ اس کے آنے جانے کا ذکر کسی سے نہ کریں۔ اس نے رشوت کسی اور زیادہ سنگین جرم کو چُھپانے کے لئے دی تھی۔

مجھے یا رابعہ کو کچھ بولنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا اور میں نے اس کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی۔ میں خاموشی سے تماشا دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ وزیر خان خیراتی اسپتال میں اور کیا کچھ نہ ہوتا ہوگا۔ ابھی میں نے صرف ٹریلر دیکھا تھا مگر میں پوری فلم کا اندازہ کر سکتا تھا۔

صوفیہ کسی بگولے کی طرح باہر نکل گئی تو ناجی نے دانت نکالتے ہوئے کہا "نشے میں تھی۔"

"ہم کب پاگل کہہ رہے ہیں۔" میں نے کہا "نشہ تو تمہیں بھی ہو رہا ہے اتنے ڈھیر نوٹ دیکھ کر۔ اُٹھالو یہ سب۔"

"سب اُٹھالوں؟" اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

میں نے نیچے جھک کے ایک کارڈ اُٹھالیا "ہاں سب مگر دیکھو۔ جو وعدہ تم نے صوفیہ سے کیا ہے اور ہم سے کیا ہے اس پر قائم رہنا' کسی کو بھی کچھ پتا نہیں چلنا چاہئے۔"

اس نے سر ہلایا "اب نکل جائیں آپ بھی۔ ڈاکٹر شاہ نہ آجائیں۔ وقت ہو گیا ہے۔"

میں نے کہا "وقت پورا ہو گیا ہے شاید۔ یہ ہو سکتا ہے ناجی کہ ڈاکٹر شاہ نہ آئیں۔"

رابعہ نے کہا "پھر انجکشن کون لگائے گا آج؟"

ناجی نوٹ سیدھے کرتا رہا "اس کی فکر نہیں۔ ایک رات نہ سہی اور ضرورت پڑنے پر میں بھی یہ کام کر لیتا ہوں۔ انجکشن لگانا کیا مشکل ہے۔"

"اچھا؟ کس چیز کا انجکشن لگاتے ہو تم؟"

"کوئی دوا ہوتی ہے۔" اس نے بے پروائی سے کہا۔

رابعہ اور میں باہر آگئے۔ دروازہ بند ہونے سے پہلے رابعہ نے پروفیسر کو مسکرا کے ہاتھ ہلایا۔ ہم تنگ بدبودار تاریک سرنگ جیسی گلی سے گزرے اور جب اسپتال کے سامنے والے حصے میں طلوع ہوئے تو میں نے گہری سانس لی۔

"اُف یہ اسپتال تو واقعی پاگل خانہ ہے۔ میرا تو دماغ گھوم گیا ہے۔ یہ سب کیا تھا سکندر؟" رابعہ بولی۔

میں نے کہا "پاگل ہو جاؤ گی اگر سوچنے لگیں۔"

"سوچنے کی بات تو ہے۔"

"نہیں۔ آج اندازہ ہو گیا۔ کل دیکھ لیں گے کہ یہ سب کیا تھا۔" رابعہ نے گاڑی کا دروازہ کھولنا چاہا تو حیران ہوئی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ "شاید میں ہی لاک کرنا بھول گئی تھی۔"

میرا ذہن اب اسپتال سے زیادہ ان مسائل میں اُلجھا ہوا تھا جن کا حل تلاش کرنے ہم یہاں آئے تھے مگر یہاں نہ پیڈرو ملا تھا اور نہ اس کی طرف سے کوئی پیغام۔ اسپتال کے معاملات ایسے تھے کہ ان سے بعد میں بھی نمٹا جا سکتا تھا۔ صورتِ حال کسی حد تک مجھ پر عیاں ہو گئی تھی اور اچھی بات یہ تھی کہ حادثاتی طور پر یا باہی باؤلے کی غلطی کے باعث ایسا ہوا تھا۔ تاہم اس بارے میں یقین سے کچھ کہنا بھی مشکل تھا۔ خود دلاور اس فن میں کمال رکھتا تھا کہ حقیقت کو فریبِ نظر بنا دے اور جھوٹ کو سچ کے پیرائے میں یوں پیش کرے کہ ہم جیسے بال کی کھال نکالنے والے اور خود کو بہت ہوشیار سمجھنے والے بھی ٹامک ٹوئیاں مارتے نظر آئیں۔

پیڈرو کا طے شدہ وقت اور مقام پر نہ آنا احتیاط کا تقاضا بھی ہو سکتا تھا۔ اسے خوف بہرحال ہوگا کہ کہیں ہم اپنی حماقت کے ساتھ اس کی سازش کے قلعے کو مسمار نہ کر دیں اور دلاور کو چھڑانے کے چکر میں وہ خود بھی جنگی قیدی نہ ہو جائے۔ عدم اعتماد کی یہ فضا تو دونوں طرف تھی مگر دلاور جیسے سپہ سالار کی عدم موجودگی میں غنیم کے لشکر کا حوصلہ زیادہ پست ہو گیا تھا۔ اپنی سرتوڑ کوشش کے باوجود اور دن رات ایک کرکے بھی وہ یہ سراغ لگانے میں ناکام رہے تھے کہ دلاور کو ہم نے زمین آسمان کے درمیان کس زنداں میں ڈال رکھا ہے۔

اس بات کا قوی امکان تھا کہ پیڈرو نے چھپ کے دیکھا ہو اور

اسے یقین آچکا ہو کہ رابعہ کے ساتھ واقعی صرف ایک ڈرائیور اور باڈی گارڈ آیا تھا۔ اب وہ ملاقات کے لئے نئی جگہ تجویز کرے گا اور مطمئن ہو جائے گا کہ دھوکے یا تصادم کا امکان نہیں تو سامنے بھی آجائے گا۔

ہم تقریباً آدھا گھنٹا اندر گزار کے آئے تھے اور آدھا گھنٹا رابعہ کی بیر بہوٹی جیسی لال فاکس ویگن اسپتال کے سامنے موجود رہی تھی۔ یہ گاڑی خود رابعہ کی شناخت تھی۔ شہر میں بلاشبہ ایک نہیں سیکڑوں ایسی گاڑیاں تھیں مگر ایسا دمکتا ہوا شوخ لال رنگ میں نے کسی کا نہیں دیکھا تھا۔ اس عرصے میں پیڈرو کہیں دور بیٹھا جائزہ لیتا رہا ہوگا کہ فاکس ویگن میں سے بعد میں کتنے شکاری برآمد ہوتے ہیں یا اس گاڑی کے پہنچنے کے کتنی دیر بعد ایم آر ایس کے کمانڈوز آتے ہیں مگر ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔

جب رابعہ نے کہا "یہ دیکھو، تم کدھر دیکھ رہے ہو۔"

میں نے اسے دیکھا "یہ کیا ہے؟"

"یہ سیٹ پر رکھا ہوا تھا۔" رابعہ نے ایک لفافہ مجھے تھما دیا "مخاطب مجھے کیا گیا ہے۔ ڈیئر مس رابعہ۔ رابعہ کی جگہ صرف آر۔"

"تم نے پڑھ لیا؟ کیا لکھا ہے؟"

"یہی کہ ویری سوری۔ میں آج رات نہ آسکا۔ خیر بہت جلد ملاقات ہوگی۔ میں فون کروں گا۔ تمہارا۔ پی۔"

الو کا پٹھا۔ ڈیئر مس آر کی اولاد۔ میرے سامنے آئے تا تمہارا پی۔" میں نے کہا۔

"بس جل گئے۔"

میں نے کہا "تمہارے لئے اس قسم کے خطاب اور الفاظ ادا کرنے کے جملہ حقوق میرے نام محفوظ ہیں۔ تحریر کس کی ہے؟"

"کسی کی نہیں۔" رابعہ نے خط میرے سامنے کر دیا۔

روایتی مجرمانہ انداز میں اخبار یا رسالے میں سے طبع شدہ الفاظ اور جملے کاٹ کر سادہ کاغذ پر چپکائے گئے تھے تاکہ کسی کی تحریر کو شناخت نہ کیا جا سکے اور مضمون بھی ایسا تھا کہ لگتا تھا ظالم سماج کی نظروں سے چھپ کر دو محبت کرنے والوں کی کہانی ہے۔

"میں نے دروازہ یقیناً لاک کیا تھا۔ مجھے عادت ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ میں نے اُترنے کے بعد دروازہ کھلا چھوڑ دیا ہو۔"

"غیر شعوری طور پر سب گاڑی والے یہی کرتے ہیں بعد میں کسی نے لاک کھولا ہوگا۔" میں نے کہا "تمہیں اب ڈور لاک بدل دینا چاہئے پُرانا ہو گیا ہے۔"

رابعہ نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی "اس کا مطلب ہے کہ یہاں تک تو وہ بھی پیچھے تھے۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ ہم نے کس حد تک وعدے کی پابندی کی ہے۔"

میں نے کہا "کیا پتا وہ اس وقت بھی چُھپ کر ہمیں دیکھ رہے ہوں۔"

رابعہ نے خط کو ڈیش بورڈ پر ڈال دیا "مگر ہم انہیں کہاں دیکھیں؟"

میں نے کہا "ایک منٹ ٹھہرو۔ میں گاڑی کو چیک کرلوں۔"

"تم کیا دیکھو گے یہاں اندھیرے میں۔"

میں نے چابی لے کے پیچھے انجن پر نظر ڈالی مگر ظاہر ہے یہ سرسری نگاہ کچھ نہیں بتا سکتی تھی۔ کوئی بہت بڑی چیز تو انجن کے پرزوں میں الگ نظر آسکتی ہے مگر ڈھائی سو گرام کا تباہ کن مادہ جو گاڑی کے پرخچے اُڑا دے۔ چھوٹا سا ڈائنامائٹ جو الیکٹرک اسپارک سے متحرک ہو جائے یا ٹائم پیس جتنا بم تو کہیں بھی لگایا جا سکتا ہے اور لگانے والا فنکار ہو تو اسے دن کے اُجالے میں بھی تلاش کرنا مشکل ہوتا ہے۔ میں نے بونٹ بند کیا اور ڈکی میں دیکھا لیکن آگے اسپیئر وہیل اور جیک وغیرہ کے سوا کچھ نہ تھا۔ میں نے رابعہ کو اشارے سے واضح کیا کہ شاید وہ مائیکروفون لگا گئے ہوں گے۔

"چلیں جی اللہ مالک ہے۔" میں نے ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھ کے کہا۔

رابعہ نے کہا "ہاں۔ ہماری نیت تو صاف تھی۔ ہم تو چاہتے ہیں کہ آج ہی بات ہو جائے مگر وہ بزدل ہیں۔ ڈرتے ہیں خواہ مخواہ۔"

"جھوٹا اور مکار آدمی کسی پر آسانی سے اعتبار نہیں کرتا جی۔" میں نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہی اپنا لہجہ بدل لیا "اب کدھر جانا ہے؟"

"واپس" رابعہ نے کہا "تمہیں آفس میں ڈراپ کرکے میں گاڑی لے جاؤں گی۔"

ہم نے راستے میں ایسی کوئی بات نہیں کی جس سے یہ ظاہر ہوتا کہ ہم نے اسپتال کے اندر جا کے بہت کچھ دیکھ لیا ہے اور سُن لیا ہے جس سے ہم پر اسپتال کی آڑ میں ہونے والے لرزہ خیز مجرمانہ راز افشا ہو گئے ہیں اور اب ہم اپنے طور پر فیصلہ کر چکے ہیں کہ پسِ پردہ ہونے والی پُراسرار سرگرمیوں کو بے نقاب کرنا ہمارا اخلاقی قانونی اور معاشرتی فریضہ ہے۔ کم سے کم مجھے اس انکشاف نے سخت جذباتی صدمہ پہنچایا تھا کہ وزیر خان کے نام پر قائم ہونے والے رفاہی اسپتال میں بیماروں کو شفا نہیں ملتی۔ وہاں تو ایک عقوبت خانہ قائم ہے۔ وہ جگہ جیل خانے سے بدتر ہے۔ جیل خانے میں مجرم پہنچتے ہیں اور انہیں کسی قانون اور ضابطے کے مطابق نظامِ انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے بعد اپنے جرم کی سزا کاٹنے کے لئے وہاں بھیجا جاتا ہے۔ یہاں تو بظاہر بے ضرر اور معصوم لوگ ایک کبھی ختم نہ ہونے والی قید کاٹ رہے تھے۔ پتا نہیں ان کا کیا جرم تھا۔ شاید کوئی جرم نہ ہونا ہی ان کا جرم تھا۔ میری طرح وہ بھی حالات کی سازش کا شکار ہوئے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ کمزور تھے اور شکاری ان کے مقابلے میں زیادہ طاقتور۔ یا وہ سادہ لوح تھے اور شکاری زیادہ عیار۔ دنیا میں سب شکاری ہیں۔ ڈارون کے نظریۂ

ارتقا کے مطابق جو حالات کا مقابلہ نہ کرسکے وہ معدوم ہوجاتا ہے۔ علامہ اقبال نے بھی یہ بات یوں کہی تھی "ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات۔"

مجھے نہیں معلوم کہ راستے بھر رابعہ نے مجھ سے کیا باتیں کی تھیں اور میں نے کیا جواب دیا تھا۔ میرا ذہن بیک وقت دو طرفہ آزمائش کے عذاب سے دوچار تھا۔ مجھے نازو کی فکر تھی تو غالب پر غصہ تھا کہ اس نے خود کو گرفتاری کے لئے پیش کرنے کی جذباتی حماقت کا ارتکاب کیوں کیا۔ نازو تو خیر مجبور تھی مگر غالب کو رضاکارانہ طور پر مجبوری کی قید میں جانے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ ہمارے ساتھ ہوتا تو ہماری طاقت کم نہ ہوتی اور ہم بہرحال نازو کو چھڑالیتے۔ اب ایک کے بجائے دو کی رہائی کا مسئلہ درپیش تھا۔ میرے اشتعال کے جذبات کا ایک ہدف استاد پیڈرو تھا تو دوسرا چوہدری دلاور۔ میں چاہتا تھا کہ دلاور کو اسی تہ خانے میں تڑپ تڑپ کے مرجانے دوں اور پیڈرو کو اس اذیت گاہ میں اسی طرح ذہنی و جسمانی طور پر معذور کرکے دھکیلتا ہوا موت کے اندھے غار تک لے جاؤں مگر یہ ابھی ناممکن تھا۔ میں مجبور تھا کہ دلاور کو زندہ رکھوں اور پیڈرو سے برابری کی سطح پر بات کروں۔

میں نے آفس بلاک کے نیچے گاڑی روکی اور بند کردی۔ اسی وقت نیلے رنگ کی وہ فاکس ویگن گولی کی طرح ہمارے قریب سے گزر گئی۔ اس کی لائٹس آف تھیں مگر عقبی شیشے میں سے مجھے دو سر نظر آئے۔ ان میں سے ایک یقیناً استاد پیڈرو کا تھا۔ انہوں نے شاہدرہ سے ہمارا تعاقب کیا تھا۔ اس خیال نے مجھے پریشان کردیا کیونکہ سارا راستہ میں نے ایک بار بھی اس امکان پر غور نہیں کیا تھا اور پیچھے دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ یہ ایک فاش غلطی تھی جس کا خمیازہ کچھ بھی ہوسکتا تھا مگر مجبوری نے دونوں طرف کے حریفوں کو جارحیت کے ارتکاب سے باز رکھا تھا اور اعتماد کی ضرورت نے دفاعی حکمتِ عملی کو ناگزیر کردیا تھا۔

"یہ تو وہی تھے۔" رابعہ نے کہا۔

"ہاں اور یہ ہمارے تعاقب میں تھے۔ تم نے ایک بار بھی نہیں دیکھا؟"

رابعہ نے کہا "بیک ویو مرر تمہارے سامنے تھا مگر تم تو ذہنی طور پر نہ جانے کہاں تھے۔ خدا کا شکر ہے کوئی حادثہ نہیں ہوا۔"

"سوری۔ میں واقعی بہت اَپ سیٹ ہوں۔" میں نے کہا۔

اوپر منظر کو موجود پاکے مجھے حیرانی ہوئی۔ وہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے سوگیا تھا۔ اس کا سر پشت سے لگا ہوا تھا۔ آنکھیں بند تھیں مگر منہ کھلا ہوا تھا اور وہ خراٹے لے رہا تھا۔ مولوی خادم حسین البتہ وہیں دوسری کرسی پر دونوں پاؤں اوپر اُٹھا کے گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکائے بیٹھا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اسی حالت میں منجمد ہوچکا ہے۔ اس کی حالت میں ہمیں دیکھ کے بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ بس وہ پلکیں جھپکاتا رہا۔ ہونٹوں پر انگلی رکھ کے میں نے اسے چُپ رہنے کا اشارہ کیا اور دبے پاؤں اندر جاکے چٹکی بھر نمک لے آیا۔ یہ نمک میں نے منظر کے حلق میں ڈال دیا۔

رابعہ زور سے ہنسی اور منظر ہڑبڑا کے اُٹھا "ابے تیری تو ایسی کی تیسی۔ بھوتنی کے۔ آخ... ارے مولوی صاحب پانی دو۔ مجھے دم کرکے۔ زہر دے دیا ہے دشمنوں نے مجھے۔ اُف۔"

رابعہ نے پانی کا گلاس اس کی طرف بڑھادیا "کوئی بہت میٹھا خواب دیکھ رہے تھے۔ سویٹ ڈریم۔"

منظر نے دو بار غرارے کئے اور پانی نگل لیا پھر ایک سانس میں گلاس خالی کرکے میز پر رکھ دیا "اسی لئے نمک زیادہ کڑوا لگا کہ میں مٹھائی کھا رہا تھا۔"

"تقریب کیا تھی؟" میں اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"منگنی تھی میرے باپ کی۔ کوئی اعتراض۔ تم تو مجھے یہاں بند کرکے چلے گئے تھے اس حجلۂ عروسی میں۔" منظر نے مولوی خادم حسین کی طرف اشارہ کیا "اس منحوس دلہن کے ساتھ۔"

خادم حسین کے جسم میں حرکت ہوئی لیکن وہ بولا نہیں۔ پھر میں نے غور کیا تو وہ زیرِ لب کچھ پڑھ رہا تھا "خادم کوئی وظیفہ پڑھ رہا ہے۔ دافعِ بلیات قسم کا۔"

خادم حسین نے اقرار میں سر کو خفیف سی جنبش دی۔

میں نے کہا "تم تو گھر جانے والے تھے؟"

"ابے مقدر میں نہ ہو تو آدمی اپنے گھر کیا بڑے گھر بھی نہیں جاسکتا۔ ادھر تم نکلے ادھر فون آگیا۔"

"کس کا فون آگیا؟ پیڈرو کا؟"

"اس خرمجنوں کا۔ مرزا غالب کے گھوڑے کا۔" منظر بولا۔

رابعہ نے اور میں نے ایک ساتھ کہا "غالب نے فون کیا تھا؟"

"ابے تو کیا میں کرتا اسے فون۔"

"کہاں سے بول رہا تھا۔ تم نے اچھی طرح خبر لی اس کی یا نہیں؟"

"خبر تو خوب لی میں نے۔ سالے کو وہ سُنائیں۔ رابعہ تم ذرا باہر جاؤ تو میں بتاؤں۔" منظر بولا "اصل گالیاں جو میں نے دیں۔"

رابعہ ہنسنے لگی "گالیوں کو سنسر کرکے سُنادو۔"

"وہ ہے کہاں آخر؟" میں نے کہا۔

"وہیں جہاں اسے ہونا چاہئے۔ قید میں ہیں دونوں گُل و بلبل اور فون صیاد کی مرضی سے کیا تھا۔"

مجھے سخت مایوسی ہوئی "اچھا؟ کیا نازو نے بھی بات کی تھی؟"

"نہیں خود اس بھوتنی والے کے حلق سے بات یوں نکل رہی تھی جیسے ڈائریا ہوگیا ہو۔ کنپٹی پر ہوگی ریوالور کی نال لیکن کہہ رہا تھا کہ ہماری بالکل فکر مت کرنا ہم خیریت سے ہیں۔ خیریت کا بچہ۔"

رابعہ کا چہرہ اداس ہوگیا "اور کیا کہا اس نے۔"

"اور یہی کہ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔ نازو بھی آرام سے ہے۔ میں نے کہا کہ اچھا بیٹے جہاں رہو خوش رہو۔ دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو۔ ہمارے ساتھ تو یہ ممکن نہیں تھا۔ ہم دشمن تھے تمہاری خوشیوں کے اور اصل دوست تو تمہارے دشمن ہیں۔ اب واپس مت آنا۔ لیکن لائن پتا نہیں کب کٹ گئی تھی۔ پتا نہیں اس نے کتنا سُنا۔"

میں نے کہا "یہ بات غالب سے اس لئے کہلوائی گئی ہوگی کہ ہم بھی دلاور کو آرام سے رکھیں۔"

"میں بھی سمجھ گیا تھا۔ بس جذباتی ہوکے زیادہ بول گیا۔ ساری باتیں انہوں نے سُنی ہوں گی۔ جو بھی وہاں ہوں گے۔ میں نے ریسیور رکھا ہی تھا کہ پھر گھنٹی بجی اور کسی نے تمہارا پوچھا کہ سکندر بخت سے بات کرنی ہے۔ میں نے کہا کہ آپ کی والدہ ماجدہ نے بلایا تھا اسے اپنی خلوتِ خاص میں وہیں ملاقات کرلو بھوتنی کے۔ بے غیرت ہنسنے لگا اور بولا کہ وکیل صاحب اسے کہاں غائب کیا ہے آخر۔ مدت سے درشن نہیں ہوئے۔ میں نے کہا کہ یہاں آؤ تو میں تمہیں ایک اور چیز دکھاؤں۔ تمہاری تسلی ہوجائے گی۔ وہ کہنے لگا کہ رابعہ کا گزارا آج کل کیسے ہورہا ہے۔"

رابعہ کا چہرہ کانوں تک سُرخ ہوگیا۔

"میں نے کچھ اور سُنائیں تو بہت ہنسا۔ کہنے لگا کہ اس کو بتا دینا آج شاید ملاقات نہ ہو۔ کل ملیں گے اگر خدا لایا۔ وقت اور جگہ وہی۔ پھر اس نے فون بند کردیا۔ میں نے اس حرام زادے کی آواز پہچان لی تھی حالانکہ وہ آواز بنا کے بول رہا تھا۔"

"استاد پیڈرو؟"

"ہاں تم ملے تو نہیں ہوگے اس سے؟"

میں نے کہا "نہیں یہ پیغام ملا ہے البتہ۔"

منظر نے رابعہ سے خط لے لیا "اچھا۔ پھر تم اتنی دیر کہاں رہے؟ میں تو مجبور تھا یہاں بیٹھنے پر۔ یہ مولوی خادم حسین تو بالکل شترمرغ ہے جو خطرہ دیکھ کے ریت میں منہ چُھپالے۔ خطرہ ٹل جائے تو سر اُٹھا کے چلنے لگے۔"

اب خادم حسین نے کہا "منظر صاحب۔ سراسر زیادتی کررہے ہیں آپ میرے ساتھ۔ کیسے خطرناک حالات میں آپ کا ساتھ دے رہا ہوں میں۔ اغوا، قتل، مار دھاڑ، بلیک میلنگ، پُرانی لاش کا پوسٹ مارٹم۔ توبہ توبہ ادھر پولیس کی دشمنی اور خانہ خرابی۔ سب کچھ تو برداشت کرنا پڑرہا ہے مجھے۔ اچھا بھلا اپنے گھر میں بیوی کے ساتھ سورہا ہوتا۔ ایسے اُلو کی طرح نہ جاگ رہا ہوتا اس ویرانے میں۔"

جب منظر نے ہوہو کرکے ہنسنا شروع کیا تو خادم حسین کو احساس ہوا کہ وہ انجانے میں کیا کہہ گیا ہے۔

خادم حسین نے سر کھجا کے کہا "آپ تو بچ جاؤ گے جی۔ مجھے معلوم ہے مارا جاتا ہے غریب آدمی میرے جیسا۔ نزلہ بر عضوِ ضعیف۔ ابھی قدر نہیں ہے تو بعد میں کون پوچھے گا۔"

رابعہ نے کہا "سچ تو کہہ رہا ہے بیچارہ۔ بلایا تھا صرف مترجم کے طور پر اور ساتھ دے رہا ہے ہر مصیبت میں۔ میرا خیال ہے خادم حسین کہ تھکن سے تمہارے اعصاب متاثر ہورہے ہیں۔ تم اندر جاکے سوجاؤ۔"

مولوی افسوس سے سر ہلانے لگا "آپ بھی کم سنگدل نہیں ہیں جی۔ معاملہ اعصاب کا نہیں پیٹ کا ہے۔ خالی پیٹ آدمی کو بھلا نیند آسکتی ہے۔ قسم لے لیں جو دوپہر سے اب تک ٹھنڈی سانسوں کے سوا کچھ گیا ہو پیٹ میں۔ پیٹ میں بھوک سے دوڑنے والے چوہے تک نڈھال پڑے ہیں اور آپ کہہ رہی ہیں سوجاؤ۔ کتنا اچھا ہوتا اگر آدمی کا گزارا صرف نیند پر ہی ہوجاتا۔"

ہم سب کو بے اختیار ہنسی آگئی۔ مولوی غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ ہمیں تو ایک عادت سی ہوگئی تھی کہ کھانا جب ملا کھالیا نہ ملا تو نہ سہی۔ جب وقت ملا نیند پوری کرلی ورنہ جاگ رہے ہیں مسلسل اور تھکن ہے تب بھی آرام کی فرصت نہیں۔ زندگی کسی معمول کی پابند ہی نہیں رہی تھی مگر خادم حسین کی قوتِ برداشت اس امتحان میں فیل ہوجاتی تھی۔

منظر نے گھڑی دیکھی "اُف آدھی رات ہوگئی گھر پہنچتے پہنچتے اگلا دن شروع ہوجائے گا۔"

"کھانا کھالو ہمارے ساتھ۔"

"مجھے جوتے کھانے ہیں گھر جاکے اور گالیاں کھانی ہیں سویٹ ڈش کے طور پر۔" وہ اُٹھ کھڑا ہوا "اپنے ساتھ مجھے بھی نہ گھر کا رکھا نہ گھاٹ کا۔ ابے جو کرنا ہے کرو سالے۔ آر یا پار۔ ہماری بھی جان چھوٹے اس روز روز کے عذاب سے۔"

"سچ بتاؤں جی۔ یہ گئے تھے کہیں کھانا کھانے۔ مجھے چھوڑ گئے تھے اکیلا یہاں اور خود سالم مرغ کھاکے آئے تھے۔"

"مولوی۔ ایک ٹانگ سالم جو تم نے نگلی تھی۔ وہ بھول گئے۔"

خادم حسین نے ایک آہ بھری "صرف ایک ٹانگ۔ معدے تک کہاں پہنچی۔ داڑھ میں ہی رہ گئی تھی۔"

میں نے کہا "منظر تم لے جاؤ نا رابعہ کو اپنے ساتھ۔ تمہارے ساتھ یہ بھی کھالے گی جو تمہیں ملا۔"

"اللہ بھلا کرے تمہارا۔ تم ساتھ چلو گی تو خانہ جنگی کو روک لو گی ورنہ اس کی زبان ویسے تو الیکٹرک قینچی کی طرح چلتی ہے مگر غصے میں بن جاتی ہے مشین گن۔ تمہارا بہت لحاظ کرتی ہے۔ یہ تو ہوگیا دو کوڑی کا شوہر۔"

وہ چلے گئے تو میں نے خادم حسین کو ساتھ لیا اور ہم دفتر کے ساتھ مین گیٹ کو مقفل کرکے نکل کھڑے ہوئے۔ مجھے خیال آیا کہ اس عمارت کے چوکیدار کو ان آفیشل چھٹی پر گئے ایک مہینے سے زیادہ ہوچکا ہے۔ مجھ سے وہ دو چار دن کی رعایت لے کر گیا تھا۔ دو اور چار کو جمع کرنے سے بھی چھ دن ہی بنتے ہیں۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ

اب تک اپنی فیملی سے دوری کی ساری کسر پوری کرے گا۔ اگر میں نے ڈھیل دی اور اس نے محسوس کیا کہ اس کے نہ ہونے سے بھی فرق نہیں پڑا تو وہ مہینے میں ایک دو بار چکر لگا جائے گا لیکن تنخواہ پوری لے گا۔ خیر جب تک کچھ نہیں ہوتا عیش کرے۔ کوئی بات ہوگی تو خود ہی پکڑا جائے گا۔

بیڈن روڈ پر کھانا کہیں نہیں تھا۔ لسی اور دودھ سے میرا گزارا ہو جاتا مگر خادم حسین کی تسلی مکمل ڈنر کے بغیر مشکل تھی۔ مجھے لکشمی چوک سے گزر کے ریلوے اسٹیشن تک جانا پڑا جہاں دن رات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ خادم کے ساتھ میں نے بھی کھانے میں مقابلہ کرنے کی کوشش کی مگر بہت جلد ہار گیا۔ واپسی پر ڈرائیونگ میں خادم حسین کو سونپنا چاہتا تھا۔

"مجھے راستے میں اُتار دینا۔ تم گڑھی شاہو کے راستے آفس چلے جانا' میں آجاؤں گا صبح ہونے سے پہلے۔"

اس نے سڑ سڑ کر کے چائے پیتے ہوئے سر ہلایا "اب اکیلا تو میں فرشتہ اجل کے ساتھ نہ جاؤں۔ آپ کا اور میرا ساتھ رہے گا ہر جگہ جی۔"

"میں بڑی خطرناک جگہ جا رہا ہوں۔"

"ہر جگہ خطرناک ہے جی میرے لئے جہاں آپ ہیں۔ یہاں بھی آسکتا ہے کوئی استاد پیڈرو یا چوہدری دلاور اور خادم حسین کے سر پر ایٹم بم مار سکتا ہے یا گولیوں کے ایک سو ایک سوراخ کر سکتا ہے۔"

"دفتر محفوظ جگہ ہے۔"

"قطعی نہیں' کیا پتا میں وہاں پہنچتا ہوں یا راستے میں ہی کوئی اچک لیتا ہے۔ آفس جاؤں اور دروازہ کھولتے ہی بم پھٹے یا گولی لگے سر کے بیچ میں۔ کلمہ تک پڑھنے کا موقع نہ ملے.....؟"

"حد ہے یار۔ جب یہ جانتے ہو کہ موت سے کہیں مفر نہیں تو پھر یہاں وہاں سب ایک ہی بات ہے۔"

"بس آپ کے ساتھ دل کو تھوڑی سی تسلی رہتی ہے جی۔"

مجبوراً میں نے خادم حسین کو بھی ساتھ ہی لیا۔ ہوٹل میں بل ادا کرتے ہوئے میں نے ایک جلی ہوئی خشک روٹی بھی لے لی۔ ایسی روٹی گاہک کے سامنے نہیں رکھی جا سکتی چنانچہ تنور والا خود ہی ایک ٹین کے کنستر میں ڈال دیتا تھا۔ ہوٹل کے مالک نے عنایتِ خسروانہ سے کام لیتے ہوئے مجھے وہ روٹی بلا معاوضہ پیش کر دی اور میں نے اسے کاغذ میں لپیٹ لیا۔

خادم حسین کا تجسس بیدار ہو گیا تھا "یہ کس لئے جی؟"

میں نے کہا "تمہیں بار بار بھوک لگتی ہے نا۔ بعض اوقات فرصت نہیں یا وقت نہیں ہوتا۔ کچھ موجود ہونا چاہئے آڑے وقت کے لئے۔"

خادم حسین نے بُرا سا منہ بنایا "آڑے وقت میں یہ کھاؤں گا تو خود بھی آڑا لیٹ جاؤں گا۔"

میں نے وہ روٹی کو پیچھے بونٹ اُٹھا کے انجن پر ایسی جگہ رکھ دیا جہاں سے وہ گر نہیں سکتی تھی اور بونٹ بند کر کے چابی خادم کو دے دی۔

"تم اونگھنے لگے ہو گاڑی چلا لوگے؟"

"مجبوری ہے جی۔ نام بھی خادم ہے اور نوکر تو نوکر ہوتا ہے انکار کیسے کر سکتا ہے۔ حادثہ ہو جائے تو برا مت مانئے گا۔" وہ پھر مذاق کے موڈ میں آگیا تھا۔

میں پچھلی سیٹ پر لیٹ کے اسے ہدایات دیتا رہا اور وہ مجھے بتاتا رہا کہ اب ہم کہاں ہیں۔ رابعہ کے گھر کے پیچھے ایک گلی میں گاڑی روک کے میں نے اسے ہدایت کی کہ وہ اسی جگہ میرا انتظار کرے لیکن گاڑی میں بیٹھ کے نہیں۔ گاڑی اندھیرے میں دو بسوں کے درمیان ایسے کھڑی تھی کہ دور سے نظر بھی نہیں آتی تھی۔ خادم ٹہلتا ہوا گلی کے آخر تک گیا اور ایک کوٹھی کے باہر بنے ہوئے چوکیدار کے کیبن میں بیٹھ گیا۔ وہ کوٹھی خالی تھی یا پھر اب وہاں کوئی چوکیدار نہیں تھا۔

"اب یہاں سو مت جانا۔ نظر رکھنا دونوں طرف۔ گاڑی پر بھی اور مجھ پر بھی۔"

اس نے ٹھنڈی سانس لی "چار آنکھیں ہوتیں تو آپ کہتے کہ چاروں طرف نظر رکھنا۔"

میں کسی دشواری کے بغیر خیمے کے اندر پہنچ گیا جو رابعہ کی کوٹھی کے خالی پلاٹ پر نصب تھا۔ اس میں سے گزر کے باکس تک پہنچنے میں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ میں نے کیبن جیسے صندوق کا ڈھکنا آہستہ سے اُٹھایا اور اندر اُتر گیا۔ وہ روٹی میرے ہاتھ میں تھی جو انجن کی گرمی سے سوکھ کے سخت بھی ہو گئی تھی۔ اندر ٹارچ اور اسکریو ڈرائیور بحفاظت رکھے ہوئے تھے۔ کوئی آہٹ کئے بغیر میں نے اسکریو ڈھیلے کئے اور وہ تختہ الگ کر دیا جو عین فرش کے شگاف پر تھا۔

نیچے گھپ اندھیرا تھا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی ڈالی تو دلاور مجھے فرش پر پڑا ہوا نظر آیا۔ اس نے ایک دم اُٹھنے کی کوشش کی مگر نقاہت کے باعث پھر گر گیا۔ میں لٹک کے تہ خانے میں اُتر گیا۔ دلاور مجھ پر حملہ کرتا تو میری ایک لات سے دور جا کر گرتا لیکن نہ اس میں جسمانی ہمت تھی اور ذہنی طور پر بھی وہ مجھ سے مقابلے کا نہیں سوچ سکتا تھا۔ اس کی اصل طاقت دولت تھی جو اسلحہ' ہم کے غلام' جاں نثار اور کرائے کے قاتل سب فراہم کرتی تھی۔

دلاور کی حالت عبرت آموز ہو گئی تھی۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی اور بکھرے ہوئے بال گرد آلود ہو رہے تھے۔ فرش پر لوٹنے سے اس کے کپڑے بھی مٹی میں بھرے ہوئے تھے۔ اس کی دھنسی ہوئی آنکھوں میں بے خوابی اور وحشت تھی اور دیوانگی کے آثار تھے۔

اس سے پہلے کہ میں دلاور سے خیریت پوچھتا وہ عجب بیجز ہوئی اور مضحکہ خیز حد تک بے سُری آواز میں بھوں بھوں کر کے

"تم۔ مذاق مت سمجھو میری بات کو۔"

میں نے اسے ایک ٹھوکر ماری۔ وہ بلبلا کے دور جا گرا "موت کو مذاق تم سمجھ رہے ہو۔ زندگی کا ایک دن کیا ایک سیکنڈ نہیں خرید سکتے اپنی ساری دولت سے دلاور۔ موت کا فرشتہ مقررہ وقت پر آتا ہے اور جان لئے بغیر ٹلتا نہیں۔"

وہ فرش پر سر رکھ کے رونے لگا "مجھے مت مارو۔"

میں نے کہا "ابھی نہیں ماروں گا میں تمہیں۔ تمہاری زندگی اگر باقی ہے تو میں کیسے مار سکتا ہوں تمہیں۔"

"کتنے دن ہو گئے ہیں مجھے اس قید خانے میں۔ سکندر کہاں ہے اس سے کہو۔ ایک بار میری بات سُن لے۔"

"کیا بات ہے؟ مجھے بتاؤ۔ میں اس کو تمہارا پیغام پہنچا دوں گا۔ پیسہ چاہئے؟ کتنا چاہئے بولو۔" میں نے جیب میں سے کچھ نوٹ نکالے اور اس کی طرف اُچھال دیئے "یہ لو۔ کافی ہے یہ رقم یا....."

"مجھے... مجھے کھانے کے لئے کچھ چاہئے۔ تھوڑا سا پانی لا دو مجھے۔" وہ ہانپنے لگا۔

"خرید کیوں نہیں لیتے سب کچھ۔ فون کرو شیزان یا تلیٹیز کو۔ اتنے دولت مند ہو تم کہ ہوٹل خرید سکتے ہو۔ میرے پاس تو یہی روٹی ہے۔" میں نے اسے جلی ہوئی اور سوکھی ہوئی روٹی کی جھلک دکھائی۔

اس نے گرسنہ نظروں سے روٹی کو دیکھا اور آگے آیا "لاؤ یہی دے دو۔"

"یہ بالکل خشک اور جلی ہوئی ہے۔"

"میں... میں گزارا کر لوں گا۔ لاؤ۔" اس نے قریب آ کے ہاتھ بڑھایا۔

میں نے اس کی ٹھوڑی کے نیچے بوٹ سے زبردست کِک ماری۔ دلاور چیخ مار کے فرش پر لوٹنے لگا۔ اس کے ہونٹوں سے خون جاری ہو گیا تھا۔ میں نے دو ٹھوکریں اس کی پسلی میں ماریں "یہ کھانا کیسا ہے؟ جوتے لاتیں اور گالیاں سب کھاتے تھے تمہارے زر خرید۔ آج تم بھی مزہ چکھو۔"

وہ ذبح کئے ہوئے بکرے کی طرح آوازیں نکالنے لگا اور تڑپنے لگا "میں... میں مر جاؤں گا خدا رسولؐ کے لئے۔ مجھ پر رحم کرو۔ میرے... میرے گھر۔ میرے بیوی بچے۔ انہیں بُلا دو۔"

"وہ آئیں گے تمہارے مرنے کے بعد۔" میں نے کہا "ان کے سامنے تمہاری لاش کے ٹکڑے کُتوں کے آگے ڈالے جائیں گے۔ وہ تمہاری ہڈیاں تک چبا جائیں گے۔ کئی دن کے بھوکے کتے پاگل ہو رہے ہیں۔"

وہ کراہنے لگا "پانی... پانی۔"

میں نے ایک پُرنفرت قہقہہ بلند کیا "پانی پیو گے۔ تھوڑا سا پانی میرے جسم کے اندر جمع ہے۔ وہی پلا سکتا ہوں میں۔ منہ کھولو اپنا۔"

رونے لگا۔

میں اس سے چند قدم کے فاصلے پر رُک گیا۔ ٹارچ کی روشنی اس کی آنکھوں کو چندھیا رہی تھی۔ میں اسے دیکھ سکتا تھا مگر وہ میری صورت دیکھنے سے قاصر تھا۔

آہستہ آہستہ اس نے اپنے وجود کو کسی کوڑھی یا مفلوج بھکاری کی طرح ہاتھوں کے بَل فرش پر گھسیٹنا شروع کیا "تم کون ہو خدا کے لئے رحم کرو مجھ پر۔"

میں ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اپنی آواز بدل کے میں نے ایک بھیانک قہقہہ لگایا جو اس آسیب زدہ تہ خانے کی ویرانی میں موت کی سفاک ہنسی بن کے گونجا "تم نہیں پہچانتے مجھے؟ پہچانو گے بھی کیسے؟ کبھی پہلے مجھے دیکھا جو نہیں۔ تم نے سُنا ضرور ہوگا میرے بارے میں لیکن سوچا نہیں ہوگا کہ اتنی جلدی مجھ سے ملاقات بھی ہو جائے گی۔ پہچانو مجھے دلاور۔ میں موت کا فرشتہ ہوں۔ ہاہاہا....."

دلاور کا جسم یوں کانپنے لگا جیسے ناقابلِ برداشت تیز بخار میں کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ وہ مجھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگا "موت ..... موت کا فرشتہ۔ نہیں جھوٹ بول رہے ہو تم۔ یہ وردی۔ تم چوکیدار ہو۔ میری حفاظت پر مامور ہو۔ چوکیدار۔ میری بات سُنو۔ دیکھو وہ تمہیں کیا دیتا ہے۔ دو چار سو۔ میں تم کو سو گُنا' ہزار گُنا زیادہ دے سکتا ہوں دو لاکھ چار لاکھ۔ بس مجھے یہاں سے نکال دو۔"

میں نے سوچ کے کہا "یہ... یہ تو کم ہیں۔"

اس نے محسوس کیا کہ بولی بڑھا کے وہ مجھے خرید سکتا ہے "اچھا تم بولو کتنا چاہئے۔ خود بتا دو۔ پانچ لاکھ لے لو۔ اچھا دس لاکھ۔"

میں نے کہا "مجھے منظور ہے۔ لاؤ نکالو دس لاکھ۔"

"تم.... تم میرے ساتھ چلو۔" وہ تھوڑا سا آگے آیا "میرے گھر۔"

"ضرور چلوں گا۔ پہلے دس لاکھ تو دو۔"

"یہاں۔ یہاں دس لاکھ۔ چوکیدار۔ میں تو قیدی ہوں۔ کچھ نہیں ہے میرے پاس یہاں مگر میں بہت دولت مند آدمی ہوں۔ چوہدری دلاور نام ہے میرا۔ بڑے بڑے دولت مند لوگ جانتے ہیں مجھے۔"

"جانتے ہوں گے۔ میں تو سیدھی بات جانتا ہوں۔ دس لاکھ دو اور چلو میں تمہیں خود باہر نکال کے گھر چھوڑ آتا ہوں۔"

وہ اور آگے آیا "مجھ پر اعتبار کرو۔ میں پورے دس لاکھ نقد دوں گا۔ بعد میں....."

"بعد کی بات مت کرو۔ ادھار سودا نہیں ہو سکتا۔ دس لاکھ نہیں۔ صرف دس روپے نکالو دلاور سیٹھ۔ آزادی صرف دس روپے میں خرید لو۔ فرشتۂ اجل سے زندگی صرف دس روپے میں لے لو۔"

دلاور مجھے گندی گالیاں بکنے لگا۔ اس کا ذہنی توازن بگڑ رہا تھا۔
میں نے اس کے قریب بیٹھ کے روٹی کو اس کے سامنے کیا "دیکھو یہ روٹی۔ تمہارے کتے بھی شاید نہ کھاتے۔ اس وقت یہ روٹی جان بچا سکتی ہے تمہاری۔"

اس نے ایک دم روٹی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں نے ہاتھ پیچھے کرلیا۔ وہ آگے آیا تو میں پیچھے کھسک گیا "نو۔ لے لو یہ روٹی۔ آگے بڑھو۔ پانی بھی ملے گا۔ پہلے یہ روٹی کھالو۔ ایسے نہیں چاروں ہاتھوں پیروں پر چل کے آؤ۔"

وہ پاگل کُتّے کی طرح میرے پیچھے چلنے لگا۔ اس کی نظر روٹی پر تھی۔ میں نے اسے بھونکنے کے لئے کہا تو وہ سچ مچ بھونکنے لگا۔ کمزوری اور تھکن کے باوجود اس جلی ہوئی سوکھی روٹی کے لئے اس نے اتنے بڑے کمرے کا پورا چکر لگایا اور پھر تھک کے گر گیا۔ میں نے روٹی کا ایک ٹکڑا توڑ کے اس کے سامنے ڈال دیا۔ اس نے لپک کر وہ ٹکڑا اُٹھایا اور منہ میں ڈال کے چبانے لگا۔ وہ اس وقت انسان نہیں ایک جانور تھا۔ اس کی حرکات و سکنات میں دیوانگی تھی۔ مجھے افسوس ہوا کہ میرے پاس فلم بندی کرنے والا کیمرا نہیں ہے ورنہ میں اس منظر کو محفوظ کرلیتا۔

تھوڑا سا پیچھے ہٹ کے میں نے دوسرا ٹکڑا پھینکا۔ اس نے تیزی سے آگے بڑھ کے اسے بھی اٹھالیا حالانکہ اس پر مٹی بھی لگ گئی تھی۔ اسے خشک روٹی کو چبانے اور نگلنے میں سخت دشواری ہورہی تھی مگر وہ ہانپ رہا تھا اور روٹی کو حلق سے اُتارنے کی دیوانہ وار کوشش کررہا تھا۔ میں اندازہ کرسکتا تھا کہ خشک حلق سے وہ روٹی ایسے اُتر رہی ہوگی جیسے سوکھے اور موٹے گتے کے ٹکڑے' خشک گھاس یا درختوں کی چھال لیکن وہ کھا رہا تھا اور چبائے بغیر اسے نگلنے کی کوشش میں بار بار اُگل رہا تھا پھر اُٹھا رہا تھا اور مٹی کی پروا کئے بغیر منہ میں ڈال کے دانتوں سے پیس رہا تھا۔

آدھی روٹی کھانے کے بعد اس کا حوصلہ جواب دے گیا۔ اس کی آواز بند ہوگئی کیونکہ روٹی نے اس کے حلق کا راستہ روک دیا تھا۔ وہ اب عجیب سی آوازیں نکال کے ابکائیاں لے رہا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ مرجائے چنانچہ اوپر جاکے میں ایک گلاس میں پانی لایا۔ یہ اشیائے خورونوش خیمے میں پہلے سے موجود تھیں۔

اس نے پانی یوں پیا کہ اسے کئی بار پھندا لگا اور کھانسی کے ساتھ حلق سے روٹی کے ٹکڑے واپس گلاس میں آئے مگر وہ سب پی گیا۔ پھر میں نے اسے باقی روٹی دے دی۔ وہ روٹی کو دانتوں سے کاٹ کاٹ کر کھانے لگا۔ پانی پیتے ہی اس کی جسمانی توانائی کچھ بحال ہوگئی تھی۔

"ابھی رات ہے دلاور۔" میں نے کہا "صبح تمہیں ہر چیز مل سکتی ہے۔ ناشتے میں حلوا پوری۔ گرما گرم چائے۔ لسی یا دودھ۔"

وہ ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا اور مجھے ایسے دیکھنے لگا جیسے پالتو کُتّا اپنے مہربان مالک کو دیکھتا ہے۔

"میرا کہنا مانو گے؟ جو میں کہوں گا کرو گے؟" میں نے کہا۔
اس نے اقرار میں سر ہلایا "کروں گا۔"
میں نے کہا "اچھا یہ کپڑے اُتار دو۔ اور دور پھینک کر سیدھے کھڑے ہو جاؤ۔"

میرا خیال تھا کہ وہ انکار کرے گا یا تذبذب کا مظاہرہ کرے گا لیکن مجھے بڑی حیرت ہوئی جب ایک لمحے کا توقف کئے بغیر اس نے میرے حکم کی تعمیل کی اور الف ننگا کھڑا ہوگیا۔ اس کی مزاحمت بالکل ختم ہوچکی تھی۔

میں نے کہا "چلو سر کے بل کھڑے ہو جاؤ۔ وہاں ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے۔"

اس نے کوشش ضرور کی لیکن یہ جسمانی طور پر اس کے لئے ناممکن تھا۔

میں نے کہا "اچھا چھوڑو۔ چوہدری دلاور۔ ذرا اپنی حالت دیکھو آئینے میں۔ اس وقت کیا ہو تم۔ تمہاری دولت اور تمہاری طاقت کہاں ہے جس پر تمہیں اتنا غرور تھا۔ اگر تم کو وہ سب لوگ اس حالت میں دیکھ لیں۔ بڑے بڑے دولت مند جو تمہارے آگے عزت کرتے تھے۔ تمہارے نوکر چاکر حکم کے غلام۔ بیوی بچے"

وہ زمین پر گر گیا اور دھاڑیں مار مار کے رونے لگا "یہ میرے اعمال کی سزا ہے۔"

"آج پہلی بار صحیح بات کی ہے تم نے۔ کیا تم چاہو گے کہ میں ساری دنیا کو تمہارا تماشا دکھاؤں؟"

"نہیں اس سے تو بہتر ہے کہ تم مجھے مار ڈالو۔" وہ چیخا۔

"ابھی سے موت کی آرزو کرنے لگے ہو۔ موت اتنی آسانی سے نہیں ملے گی دلاور۔" میں نے ریوالور نکال کے اسے دکھایا "اس کی ایک گولی کی قیمت کیا ہے؟ کچھ بھی تو نہیں۔ تم نے لاکھوں' شاید کروڑوں اسلحے کی تجارت میں ہی کمالئے تھے۔ کیا نہیں بیچا تھا تم نے لہو کے تاجروں کو۔ مگر اس وقت تم کتنے بے بس اور مجبور ہو۔ تم واقعی مرنا چاہتے ہو؟"

"ہاں۔ میں ایسے جینے سے مرجانا بہتر سمجھتا ہوں۔"

میں نے قریب جاکے ریوالور اس کی کنپٹی پر رکھ دیا "جیسی تمہاری مرضی۔ اپنی آخری خواہش بتادو۔ کیا ہوگا اس دولت کا جو تم نے وزیر خان کو قتل کرکے' میر شرافت علی کو مروا کے' ہزاروں لاکھوں بے گناہوں کی جان لے کے جمع کی تھی۔ تمہاری جائیداد....."

وہ لرزنے لگا "میں سب واپس کردوں گا۔ سکندر کو صرف ایک بار بلا کے لے آؤ۔ یہی آخری خواہش ہے میری۔"

میں نے ریوالور ہٹالیا "رانا صاحب کون ہیں دلاور؟"

وہ اس سوال کے لئے بالکل تیار نہ تھا "رانا صاحب؟"

میں نے ریوالور کا دستہ اس کے جبڑے پر مارا "وزیر اسپتال میں کیا ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر شاہ کون ہے' رانا کون ہے؟"

"محسن کی بہن فوزیہ کو اور اس کے شوہر کو اغوا کرنے کے لئے۔"

جواب بم کے دھماکے کی طرح تھا "فوزیہ کو؟" میں نے چیخ کے کہا "اس نے کیا بگاڑا تھا تمہارا۔ اب کہاں ہیں وہ؟"

"مجھے نہیں معلوم۔"

میں اس پر ٹوٹ پڑا "تجھے یقیناً معلوم ہے بتا مجھے نہیں تو میں تجھے جان سے مار ڈالوں گا۔"

اس میں اتنا دم ہی کہاں تھا کہ میرے وحشیانہ حملے کا مقابلہ کرسکتا۔ نازو کی بے بسی کی وجہ اب میری سمجھ میں آگئی تھی۔ معاملہ اس کے اپنے سگے بھائی اکرام شیخ کا ہوتا تو شاید وہ ڈٹ جاتی۔ خون کے اس آخری رشتے کو بھی داؤ پر لگا دیتی مگر فوزیہ کی وجہ سے وہ مجبور ہوگئی تھی۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ دلاور بے حس ہوگیا ہے۔ اب میرے مکے لاتیں اس پر کوئی اثر نہیں کررہی ہیں۔ میں نے اپنے اشتعال پر قابو پاکے اسے غور سے دیکھا تو مجھے یوں لگا جیسے اس کی سانس رُک گئی ہے۔

میں نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھا اور پھر کان لگا کے دل کی دھڑکن سننے کی کوشش کی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ مرجائے اور پھر میرے ہاتھوں ہونے والے اس قتل کے جرم کی سزا غالب اور نازو کو ملے۔ ان کی رہائی کے لئے دلاور کا زندہ رہنا ضروری تھا۔ دوسرے مجرموں تک پہنچنے اور دلاور سے اس کے ماضی کے ہر جرم کا اعتراف کرانے کے لئے بھی یہ لازمی تھا کہ دلاور ہماری قید میں رہے مگر زندہ رہے۔

لیکن اس کے دل کی دھڑکن خاموش تھی۔

تنفس اور حرکت قلب کی بحالی کے طریقے میں نے سیکھے بھی تھے مگر آزمائے کبھی نہیں تھے۔ فرسٹ ایڈ کے اصول اُس وقت زندگی بچالیتے ہیں جب ڈاکٹر دستیاب نہ ہو اور مریض کو اسپتال پہنچانا فوری طور پر ممکن نہ ہو۔

باہر کے ملکوں میں طبّی امداد فراہم کرنا ہر شہری کی تعلیم اور معاشرتی ذمے داری کا لازمی حصہ سمجھا جاتا ہے اور ناگہانی حادثے کی صورت میں ہر شخص یہ جانتا ہے کہ ڈاکٹر یا ایمبولینس کے آنے تک اسے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ یہاں اوّل تو قانونی اُلجھنوں کے خوف سے کوئی بھی معاملات کو اپنے ہاتھ میں لے کر دخل در معقولات کا الزام نہیں لیتا' زیادہ سے زیادہ کوئی ایمبولینس والوں کو فون کردیتا ہے۔ باقی رہے نام اللہ کا۔ زندگی ہوئی تو وقت پر ایمبولینس بھی آجائے گی' ڈاکٹر بھی فوراً توجہ دیں گے اور دوا بھی دستیاب ہوجائے گی ورنہ انا للہ۔

میرے لیے دلاور کا مرجانا جیتی ہوئی بازی میں بساط اُلٹ جانے کے مترادف ہوتا۔ جس شکاری کو زیرِ دام لانے کے لیے میں نے اپنی زندگی کے روز و شب' ساری توانائی' تمام وسائل صرف

"تم۔ تم کیسے جانتے ہو۔ کون ہو تم؟" وہ کراہتے ہوئے بولا۔
میں نے اس کی گردن دبوچ لی اور اسے دیوار پر دے مارا "یہ میرے سوال کا جواب نہیں تھا۔"

وہ دیوار سے ٹکراتے ہی نیچے گرا تو بے سدھ ہوگیا۔ میرے ہلانے جلانے کا بھی اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تو میں نے اس کے چٹکی لی مگر وہ مکر نہیں کررہا تھا۔ وہ واقعی بے ہوش ہوگیا تھا۔

ایک بار پھر مجھے اس کے لئے پانی لینے اوپر جانا پڑا۔ اس بار میں خیمے سے موم بتی بھی لے آیا۔ اسے جلا کے میں نے پگھلے موم کا ایک قطرہ دلاور کی پیشانی پر ٹپکایا مگر اس پر اثر نہیں ہوا۔ میں نے قریب بیٹھ کے اس پر پانی کے چھینٹے ڈالے تو وہ کراہنے لگا۔ اس کے ہوش میں آنے سے پہلے میں بسکٹوں کا ایک پیکٹ بھی اٹھا لایا اور پانی کے بھرے ہوئے گلاس کے قریب رکھ دیا پھر میں کرسی پر جابیٹھا۔

دس منٹ بعد اسے ہوش آگیا لیکن اُٹھ کر بیٹھنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ آنکھیں کھولے چھت کو دیکھتا رہا۔

میں نے کہا "دلاور دیکھو تمہارے قریب ہی پانی ہے اور بسکٹ بھی ہیں۔"

اس نے بے یقینی سے سر گھمایا اور ایک دم اُٹھ بیٹھا۔ اس کے ہاتھ بڑھانے سے پہلے میں نے دونوں چیزیں اُٹھالیں۔ "تم سے کچھ پوچھا تھا میں نے۔ یاد ہے رانا کون ہے؟"

"رانا.... میرا ساتھی ہے۔" دلاور نے آہستہ سے کہا "بزنس پارٹنر۔"

"ویری گڈ۔" میں نے ایک بسکٹ اس کی طرف پھینکا پھر دوسرا۔ وہ اٹھا اُٹھا کے کھا تا گیا۔

"رانا کا پورا نام کیا ہے۔ کہاں رہتا ہے وہ؟"

"رانا شوکت علی۔ گلبرگ میں کوٹھی ہے اس کی۔ گلبرگ تھری میں" اس نے سمجھ لیا تھا کہ اب اسے ہر سوال کا جواب دینا ہی پڑے گا۔

"اچھا رانا کے علاوہ اور کون ہے تمہارے ساتھ؟"

اس نے دو نام اور بتائے۔ ان کے پتے اور ٹیلی فون نمبر سب اسے یاد تھے۔ اس نے اپنے کاروبار کی نوعیت کے بارے میں بتایا اور اسپتال کے بارے میں بھی ہر سوال کا صحیح جواب دیا۔ سارے بسکٹ کھانے اور پانی پینے کے بعد اس کی ذہنی' جسمانی صلاحیتیں اس حد تک بحال ہوگئی تھیں کہ اس نے مجھ سے کپڑے پہننے کی اجازت مانگی۔ وہ جانور سے پھر انسان بن گیا تھا۔

میں نے اسے اجازت دے دی "چوہدری دلاور۔ استاد پیڈرو کو تم نے کہاں بھیجا تھا؟"

"کراچی" دلاور نے مٹی دھول کی پروا کئے بغیر کپڑے پہن لئے۔

"کس کام سے؟"

کردیے تھے۔ اُمیدوں کا سرمایہ جھونک دیا تھا' ارمانوں کا خونِ رنگ اور خوابوں کا اُجالا قربان کردیا تھا وہ ایک حادثاتی غلطی سے مجھے احساسِ شکست دے کر مرجائے اور میری کامیابی میں احساسِ جرم کی ندامت شامل ہوجائے' یہ مجھے منظور نہیں تھا۔

میں نے ایک سیکنڈ ضائع کیے بغیر دلاور کو سیدھا چت لٹا کے اس کے سینے پر دل کے مقام کو دبانا شروع کیا۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس پر پورا دباؤ ڈال کے دل کو متحرک کرنے کی کوشش کی اور اس کے منہ سے منہ لگاکے پوری قوت سے اپنا سانس اس کے پھیپھڑوں میں بھردیا۔

میری چند سیکنڈ کی کوشش بار آور ثابت ہوئی۔ دلاور کا رک جانے والا دل پھر دھڑکنے لگا اور اس نے ایک جھٹکے سے سانس لیا پھر سانس خود چلنے لگا اور میں نے دل کو معمول کے مطابق اپنی توانائی سے چلنے کا موقع فراہم کیا۔ آکسیجن کی فراہمی بحال ہوتے ہی جسم کے ایندھن نے زندگی کی حرارت پیدا کردی اور دلاور موت کی سرحد کو چھوکے لوٹ آیا۔

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ زندگی اور موت کے درمیان یہ وقفہ نہایت مختصر ہوتا ہے جب کوشش کی جاسکتی ہے کہ جسم کے سارے طبعی افعال پھر معمول پر آجائیں۔ زیادہ سے زیادہ ایک منٹ۔ اس کے بعد سب سے پہلے دماغ کے خلئے آکسیجن کی کمی سے مرنے لگتے ہیں اور دماغ کو پہنچنے والا نقصان ناقابلِ تلافی ہوتا ہے۔ جسم کی موت کے بعد جب دماغ بھی مرجائے تو موت قطعی کہلاتی ہے۔ ڈاکٹر اسے CLINICAL DEATH قرار دیتے ہیں۔

دلاور کے جسم پر پسینہ پانی کی طرح بہہ رہا تھا اور شاید وہ کمزوری بھی محسوس کررہا ہوگا۔ یہ ایک قدرتی بات تھی۔ اس کی وہی کیفیت تھی جو دل کے دورے سے جانبر ہونے والے کی ہوسکتی ہے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ اسے کچھ آرام ملے اور مناسب خوراک کے ساتھ طبی امداد بھی ورنہ اس کی حالت پھر بگڑنے کا امکان تھا لیکن میری مجبوری یہ تھی کہ میں اسے اسپتال نہیں لے جاسکتا تھا اور کسی ڈاکٹر کو اس تہ خانے میں نہیں لاسکتا تھا۔

میں نے اپنی طبی معلومات پر انحصار کیا۔ دل کے مرض اتنے عام تھے کہ ان کے بارے میں معلومات بھی عام ہورہی تھیں اور دوا علاج کے ساتھ احتیاط کے مسائل پر اخبارات و رسائل میں مضامین بھی میں پڑھتا ہی رہتا تھا۔ صحت کے بارے میں آگاہی کو ترقی یافتہ معاشرے میں بنیادی اہمیت حاصل تھی اور میں نے لندن میں رہتے ہوئے اچھی خاصی میڈیکل انفارمیشن حاصل کرلی تھی۔

باہر آکے میں نے خادم حسین کو تلاش کیا۔ وہ اس خالی کیبن میں بے بسی اور مظلومیت کی تصویر بنا بیٹھا تھا۔ وہ عجیب شخص تھا۔ شاید طبعاً وہ قنوطیت پسند تھا۔ وہ خوش ہونا جانتا ہی نہیں تھا اور رضاکارانہ طور پر ناخوشی اور پریشانی کے اسباب تلاش کرنا اسے پسند تھا ورنہ وہ میرا ساتھ چھوڑ کے بھی جاسکتا تھا۔ اسے کوئی مجبوری لاحق نہیں تھی کہ میرے ساتھ رہ کے خطرات مول لے اور مصائب کا شکار ہو تو مجھ سے یا تقدیر سے شکایت کرے مگر دکھ اور پریشان حالی میں بھی اس کے لیے تسکین کا کوئی ایسا پہلو تھا کہ وہ ہمارے ساتھ خوار ہورہا تھا اور دن رات دھکے کھارہا تھا۔

میں نے اسے ہلاکے کہا "کیا سوگئے خادم حسین؟"

وہ ہڑبڑاکے اُٹھا تو گرتے گرتے بچا "سونا اب کہاں ہمارے نصیب میں" اس نے ایک آہ بھری "جب ہر طرف فرشتۂ موت منڈلا رہا ہو تو کون کافر سوسکتا ہے۔"

میں نے کہا "کہتے ہیں نیند تو سولی پر بھی آجاتی ہے۔"

"ہاں جی۔ ہمیشہ کی نیند سوجاتا ہے بندہ' یہ تو ٹھیک فرمایا آپ نے" اس نے منہ پھاڑ کے جماہی لی "اب کیا حکم ہے؟"

"حکم کیسا خادم۔ درخواست کرسکتے ہیں ہم تو۔ چلو ذرا اسپتال تک۔"

اس نے مجھے غور سے دیکھا "خیریت تو ہے نا جی۔ حالت ٹھیک نہیں لگتی آپ کی۔ کہیں دلاور نے پاگل ہوکے کاٹ تو نہیں لیا آپ کو؟ وہی انجکشن لگیں گے جو پاگل کتے کے کاٹے پر لگتے ہیں' پیٹ میں پورے چودہ۔"

"یار ایسی کوئی بات نہیں..... بس ذرا دلاور کی حالت خراب ہے۔ خادم نے گاڑی اسٹارٹ کی "ذرا کیا جی؟ صاف نہیں کہتے کہ نزع کا عالم ہے اس پر۔ دوا سے کچھ نہیں ہوگا۔ مجھے لے چلیں۔"

"تم کیا کروگے؟"

"سورہ یٰسین پڑھوں گا اس کے سرہانے۔ تو پھر تو اب تکلیف ہونے سے رہی۔"

میں نے ایک اسپتال کی ساری رات کھلی رہنے والی فارمیسی سے گلوکوز میں ویلیم فین کا انجکشن لیا اور چند دوسری دوائیں۔

کیمسٹ نے کہا "ویلیم کس کے لیے چاہیے؟"

میں نے کہا "ظاہر ہے مریض کے لیے۔"

"مریض کہاں ہے' کون ہے؟" وہ شکی مزاج آدمی تھا۔

میں نے کہا "گھر پر ہے۔ میرا پڑوسی ہے۔"

"انجکشن کس نے لکھا ہے۔ نسخہ دکھاؤ" اس کے نزدیک ویلیم اپنی ورودی کے باعث چوکیدار قسم کی چیز تھا اور مجھ پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا تھا۔

میں نے وضاحت کرنے کی کوشش کی "دراصل وہ پرانے مریض ہیں۔ اس وقت ان کا علاج کرنے والا ڈاکٹر تو ہے نہیں انہوں نے مجھ سے کہہ دیا کہ یہ دوائیں لادو۔"

"اندر جاکے ڈاکٹر سے لکھوالو۔ دل کا دورہ ہے تو اسے ساتھ لانا چاہیے تھا۔ دیکھو شاید ڈاکٹر تمہارے ساتھ چلا جائے۔"

اسی وقت اندر سے ڈاکٹر نمودار ہوگیا اور کیمسٹ نے اسے ساری بات بتادی "یہ دوائیں ایسے نہیں دی جاتیں۔ میں تمہارے ساتھ چل کے دیکھ لیتا ہوں مریض کو۔"

انکار کی صورت میں میری پوزیشن زیادہ مشکوک ہوجاتی۔ وہ پہلے ہی یہ سمجھ رہے تھے کہ میں یا خادم نشے کے طور پر ویلیم

انجکشن لیتے ہیں۔ قیافہ شناسی کوئی سائنس نہیں اور صورت دیکھ کے میں ڈاکٹر کی لالچی طبیعت کا اندازہ نہیں لگاسکتا تھا مگر میں نے اسے اپنے ساتھ بٹھانے کے بعد قسمت آزمانے کا فیصلہ کیا۔

میں نے آدھے راستے میں جیب سے پانچ سو روپے نکالے اور خادم سے کہا کہ گاڑی روک دے۔

"ڈاکٹر صاحب۔ میں صاف بات کروں گا۔ اب یا تو آپ اُتر کے واپس چلے جائیں' پیدل....."

"کیا؟ پیدل واپس جاؤں.... اس وقت......؟" ڈاکٹر نے بوکھلا کے کہا۔

"یا آپ یہ فیس رکھ لیں" میں نے کہا "آپ رازداری کے ساتھ مریض کو دیکھنے کے بعد اسے دوا دیں گے۔ اس کے علاج کے لیے نسخہ لکھ کردیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

میں نے نفی میں سرہلایا "زبانی وعدے پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ ہم تمہاری آنکھوں پر پٹی باندھ کرلے جائیں گے۔"

ڈاکٹر اُترنے لگا "سوال ہی پیدا نہیں ہوتا....."

میں نے اسے پکڑلیا اور ریوالور نکال لیا "اب سوال پیدا ہوگیا ہے۔"

ڈاکٹر کی حالت ایسی ہوگئی جیسے خود اسے دل کا دورہ پڑگیا ہو۔ میرے اشارے پر خادم نے گاڑی آگے بڑھادی۔ میں نے ہکابکا اور دم بخود بیٹھے ہوئے ڈاکٹر کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔ میں نے رومال کو پٹی کی جگہ استعمال کیا۔ ڈاکٹر نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ میری ہدایات کے مطابق خادم نے گاڑی کو بلاوجہ مختلف گلیوں میں گھما پھراکے گزارا تاکہ ڈاکٹر کو راستے کا اندازہ نہ ہوسکے۔ چالاک لوگ یاد رکھتے ہیں کہ گاڑی دائیں بائیں کتنی بار گھومی تھی اور کتنے وقفے کے بعد پھر اندازے سے پولیس کو بھی جائے واردات تک لے آتے ہیں۔

خادم نے گاڑی عین اسی جگہ روکی جہاں خیمہ نصب تھا۔ میں ڈاکٹر کا ہاتھ پکڑ کے اسے ساتھ لے گیا۔ اس نے کئی بار ناہموار زمین پر ٹھوکر کھائی اور ملبے کے ڈھیر پر اس کے قدم لڑکھڑائے۔

"یہ تو جنگل ہے کوئی" اس نے کہا "آخر تم کہاں لے آئے ہو مجھے۔ کون ہو تم؟"

میں نے کہا "عقلمند لوگ صحیح اندازہ کرلیں تب بھی زیادہ سوالات نہیں کرتے۔"

"تم ڈاکو ہو۔ مجھے اپنے اڈّے پر لائے ہو" وہ بولتا رہا۔

"فرض کرو' ایسا ہی ہے۔"

"کیا تمہارے کسی ساتھی کو گولی لگی ہے۔ پولیس مقابلے میں؟" "ابھی تم خود دیکھ لوگے۔ اب ایک دیوار ہے سامنے۔"

"کتنی اونچی دیوار ہے۔ دروازہ کوئی نہیں ہے؟"

"دروازہ تو ہے مگر ہم ادھر سے جا نہیں سکتے" میں نے کہا اور ڈاکٹر کو اُٹھاکے باکس میں اُتاردیا۔

"یہ کیا کرتے ہو۔ میں خود بھی دیوار پھاند سکتا تھا اور یہ کیا؟ فرش لکڑی کا ہے" وہ بھونچکا رہ گیا۔

میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔

"دیکھو ڈاکو صاحب۔ تم مجھے یہاں مار کے تو نہیں ڈال جاؤگے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ....."

میں نے کہا "ہم نیکی کا صلہ بدی سے نہیں دیتے۔ تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ تمہیں واپس اسپتال پہنچانا ہماری ذمے داری ہے۔ اب ذرا سنبھل جاؤ۔ ہم نیچے جائیں گے۔ ایک تہ خانہ ہے مگر اس کا زینہ نہیں ہے۔ میں تمہیں نیچے اتاردوں گا بلکہ لٹکاؤں گا۔ تم فرش پر گروگے۔"

"کتنی بلندی ہے؟ میری ہڈیاں....."

"ہڈیاں نہیں ٹوٹیں گی.... آٹھ دس فٹ کی بلندی ہے۔ چلو اِدھر..... پاؤں نیچے لٹکاؤ اور اپنے ہاتھ میرے ہاتھوں میں دے دو۔"

وہ تہ خانے کے فرش پر صفائی سے اُترگیا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ساتھ ہی میں بھی نیچے پہنچا اور میں نے اس کی آنکھوں پر سے پٹی اتاردی۔ اس نے حیرانی اور خوف سے آسیب زدہ نظر آنے والے ویران کمرے کے ماحول کو اور پھر چوہدری دلاور کو دیکھا جو اب فرش پر سیدھا بیٹھا ہوا تھا۔

"یہ کون ہے؟" دلاور بولا۔

میں نے کہا "کمال ہے۔ تم نے پہچانا نہیں۔ یہ تمہارے گم شدہ مامے کا پتر ہے۔ اب آگے کوئی سوال مت کرنا ورنہ میں تمہاری زبان اور تمہارے دانتوں کو حلق سے اُتاردوں گا۔ تمہاری طبیعت خراب ہوگئی تھی اس لیے میں ڈاکٹر کو تمہارے علاج کے لیے لایا ہوں۔"

دلاور چلّانے لگا "جھوٹ بکتے ہو تم۔ یہ ڈاکٹر نہیں ہے۔"

"میں ڈاکٹر ہوں۔ سند یافتہ۔"

"ڈاکٹر۔ خاموشی سے مریض کا معائنہ کرو۔ نہ کچھ اپنے بارے میں بتانے کی ضرورت ہے اور نہ اس سے کچھ پوچھنے کی" میں نے خطرناک انداز میں ریوالور لہراکے کہا "یہ نہ ہو کہ میں تم کو بھی دوسرے کمرے میں بند رکھنے پر مجبور ہوجاؤں۔"

دلاور نے کہا "تم مجھے زہر کا انجکشن لگادوگے' جلّاد!"

ڈاکٹر نے نفی میں سرہلایا "آپ مطمئن رہیں۔ آرام سے لیٹ جائیں۔ مارنا ہمارا کام نہیں ہے۔"

میں نے کہا "اور تمہیں مارنا میرے لیے کیا مشکل تھا۔ میں تم کو چھوڑ جاتا اور پلٹ کے نہ آتا تو کیا ہوتا۔"

دلاور کی سمجھ میں یہ بات آگئی۔ اس نے خاموشی سے خود کو ڈاکٹر کے رحم و کرم پر چھوڑدیا۔ ڈاکٹر نے اسے دوا انجکشن لگائے۔ اس کے لیے نسخہ لکھا اور میرے حوالے کردیا۔ میں نے اسے باہر پہنچایا اور ہم دلاور کو اس کے زنداں میں چھوڑ کے روانہ ہوگئے۔ ڈاکٹر کو ہم نے اسپتال سے کچھ فاصلے پر اُتار کے اس کی آنکھوں پر سے پٹی کھول دی۔

"باقی تھوڑا سا فاصلہ ہے۔ تم پیدل جا سکتے ہو۔"

اس نے شاید دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا ہوگا کہ وہ زندہ سلامت لوٹ آیا ہے "میں چلا جاؤں گا۔"

میں نے اسے سو کا نوٹ دیا "یہ تمہاری فیس۔"

"اس کی کیا ضرورت ہے؟"

"شاید آئندہ بھی ہمیں تمہاری ضرورت پڑے گی۔ تعاون کرو گے تو فائدے میں رہو گے۔ جو ہمارے کام آئے ہم اسے دوست سمجھتے ہیں اور جسے ایک بار دوست کہہ دیں اس کے لیے جان بھی دے سکتے ہیں۔"

اس نے ہاتھ جوڑ دیے "تمہاری جان لے کے میں کیا کروں گا۔ بس میری جان بخش دو۔ کسی اور کو دوست بنالو۔"

"ٹھیک ہے مگر اپنی زبان بند رکھنا۔ ورنہ معلوم تو ہو جائے گا ہمیں اور ہم پھر آجائیں گے۔ اسپتال میں یا تمہارے گھر۔"

"میں سمجھوں گا کہ آج رات میں کسی کے ساتھ کہیں نہیں گیا تھا۔ رات بھر اسپتال میں ہی رہا۔"

"تھینک یو۔ ہم بھی مجبور تھے۔" میں نے کہا "ایک بات بتاؤ۔ یہ مریض زندہ تو رہے گا؟"

"بظاہر اس کے مرنے کا امکان نہیں۔ ویسے موت کا وقت کوئی نہیں بتا سکتا۔"

"میرا مطلب تھا دل کا یہ دورہ کس حد تک سیریس تھا؟"

"حتمی رائے تو ای سی جی دیکھے بغیر نہیں دی جا سکتی مگر میرا خیال ہے کہ دل کا مسئلہ کوئی نہیں۔"

"یعنی انجائنا یا تھرامباسس کی پرابلم نہیں؟"

"غالباً نہیں۔ یہ ایک شاک کی کیفیت کا اثر تھا جس کے نتیجے میں دل بند ہو سکتا تھا لیکن CARDIAC ARREST کا وقفہ بہت مختصر تھا۔ اگر اس سے خفیف سا نقصان ہوا ہوگا تو اس کا پتا بھی ای سی جی سے ہی چلے گا۔ دل دنیا کی سب سے حیرت انگیز اور مضبوط مشین ہے۔ یہ ایک سیلف ریپئرنگ یونٹ ہے۔ میں نے صرف سپورٹنگ ٹریٹمنٹ دیا ہے۔"

"کتنا عرصہ ضرورت رہے گی اس کی؟"

"یہ دوائیں استعمال کرنے کے بعد کسی ڈاکٹر کو دکھا لینا۔ اگر ضرورت محسوس ہو۔ ویسے تم نے یہ جھوٹ بلاوجہ بولا۔"

"کون سا جھوٹ؟"

"یہی کہ تم ڈاکو ہو۔ تمہارے پاس ریوالور تھا۔ وہ کافی تھا۔"

میں نے مسکرا کے کہا "تھینک یو۔ اینڈ سوری۔۔۔"

"تم پڑھے لکھے آدمی ہو۔۔۔۔۔"

"[illegible] ت انگریزی تو جاہل بھی جانتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"وہ انجائنا اور تھرامباسس جیسے الفاظ نہیں بولتے۔ تم نے ای سی جی کا مطلب بھی نہیں پوچھا تھا۔ یہ لو اپنے سو روپے۔ مجھے ان کی ضرورت نہیں۔ بس تمہاری ضرورت پوری ہو گئی۔ مجھے اس سے کیا کہ تم جیسا پڑھا لکھا اور شریف صورت آدمی یہ [illegible] کر رہا ہے اور کس کے لیے؟" اس نے نوٹ گاڑی میں ڈال [illegible] چل پڑا۔

خادم نے نوٹ اٹھا کے آہ بھری "دیکھا جی آپ نے [illegible] کا بڑا انجام۔ کیسے ہمارے منہ پر سو کا نوٹ مار گیا جوتے کی طرح"

"اور اس جوتے کو جیب میں رکھ لیا تم نے [illegible] اوور ٹائم کیا ہے تم نے۔ اسے حق محنت سمجھ لو۔ جوتا خرید لیے۔ یہ جوتے تو اب اس قابل بھی نہیں رہے کہ کسی کے بھی مارے جائیں۔"

"بس جی یہی خیال میرے دل میں بھی آیا تھا۔ جوتے بہت پرانے ہو گئے ہیں" اس نے گاڑی آگے بڑھائی "سال پہلے میرے سسرال سے آئے تھے۔ میرا سسر خود تو ہاتھی [illegible] دل اس کا ہے کاکروچ کے دل جتنا۔ بہت کنجوس ہے۔ امیر ہونے کے باوجود۔"

میں نے ہنس کے کہا "خادم۔ وہ کنجوس نہ ہوتا تو دولت کیسے بنتا۔"

"اور جناب یہ جوتے بھی اس کی اولاد نے [illegible] ایک ہی تو سالی ہے میری۔ پانچ سو مانگ رہی تھی مگر مجھے جی کہ یہ تو ہوگا۔ ایک فالتو جوڑا لے گیا تھا میں۔ میرے [illegible] بغل میں تھا اس نے فوراً نکال کے مجھے دے دیا اور [illegible] جاؤ بابا معاف کرو۔ پچاس روپے کے جوتے کے میں پانچ [illegible] پاؤں لے کتے نے کاٹا ہوتا مجھے تب بھی میں ایسا نہ کرتا۔ رکھوا اپنے پاس۔ کہنا تو میں یہ چاہتا تھا کہ مار دو اپنے باپ کے سر [illegible] کے علاوہ میری زندگی خطرے میں پڑ جاتی جناب۔ وہ تو پورا [illegible] میرے جیسے دو کو بغل میں دبا کے دوڑ لگا سکتا ہے۔ جیسے بابر [illegible] قلعے کی فصیل پر۔ بخیل مرتا بھی تو نہیں۔"

میں نے کہا "تم دعا تو مانگتے ہوگے اس کے مرنے کی۔"

"اب آپ سے کیا پردہ جی۔۔۔۔ وہ مرے گا تو اپنے دن [illegible] گے۔ یہ دولت قبر میں تو لے جانے سے رہا۔ آدھی بھی بہت [illegible]" اس نے پھر آہ بھری۔

رابعہ کے آفس پہنچ کے میں نے وقت دیکھا تو رات کے [illegible] چکے تھے۔ میں نے خادم سے کہا کہ وہ اندر سو جائے مگر [illegible] صوفے کو ترجیح دی۔ میں اتنا تھک گیا تھا کہ بیڈ پر گرتے ہی [illegible] صبح کھٹ پٹ سے میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ خادم [illegible] بنانے میں مصروف ہے اور زیر لب بڑبڑا رہا ہے۔ چھ گھنٹے کی نیند نے میری جسمانی توانائی کو پوری طرح بحال کر دیا تھا۔

میں نے کہا "کیا بات ہے خادم حسین۔ دیواروں سے [illegible] کر رہے ہو۔ بیوی یاد آرہی ہے؟"

اس نے چونک کے مجھے دیکھا اور محبت سے مسکرایا "[illegible] بغیر تو بڑا اچھا لگ رہا ہے جی۔ بڑا ہلکا پھلکا اور آزاد محسوس ہوں میں۔" "پھر کس پر خفا ہو رہے تھے؟"

[illegible] تھوڑا بہت ڈر تھا تو اب باقی نہیں رہا تھا۔ اس سے میرا اعتماد دو چند ہو گیا تھا اور میں اس صورت حال سے پورا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔

اوپر پہنچتے ہی مجھے ایک غیر متوقع صدمے سے دوچار ہونا پڑا۔ آفس میں خادم حسین کے علاوہ ایک اور شخص بھی موجود تھا جس کی پشت میری طرف تھی۔ جب اس نے سر گھما کے دیکھا تو میں نے اسے پہچان لیا۔ پورا جوان نظر آنے والا یہ لڑکا چوہدری دلاور کا بیٹا فیصل تھا جو ایک بار اپنی ماں کو ہماری تحویل سے چھڑانے کے لیے دلاور کا نمائندہ بن کے مذاکرات کرنے آیا تھا۔ اس نے بڑے اعتماد کے ساتھ ایک جھوٹ بولا تھا اور ایک ایسی کہانی سنائی تھی جس پر ہم نے بھی یقین کر لیا تھا۔ فیصل نے خود کو چوہدری دلاور کا صحیح جانشین ثابت کیا تھا، عمر اور تجربے کے فرق کے باوجود بازی اس نے جیت لی تھی۔

میں نے حیرت کے ردعمل کو ظاہر نہیں ہونے دیا اور خادم حسین سے سرائیکی لہجے میں پوچھا "یہ سوہنا منڈا کون ہے؟"

خادم حسین اسٹول پر ہمیشہ کی طرح پاؤں سمیٹ کر اور گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکائے بیٹھا تھا "کہتا ہے میں چوہدری دلاور کا بیٹا ہوں۔"

"اچھا! پھر۔۔۔؟ پھر کیا کریں؟"

"پھر یہ کہ سوہنا منڈا بیٹھا ہے رابعہ بی بی کے انتظار میں۔ ان سے بات کرنا چاہتا ہے اپنے دلاور کے بارے میں۔"

"ضرور کرے مگر رابعہ بی بی تو آئیں گی شام کو۔ یہ ابھی سے یہاں کیوں آ کے بیٹھ گیا۔ چلو پتر، چار بجے آنا۔"

اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا "تم ان کی گاڑی لے کر کہاں گئے تھے۔ تم چوکیدار ہو یا ڈرائیور۔"

میں نے کہا "دونوں کام آتے ہیں مجھے اور بھی بہت کچھ کر سکتا ہوں میں۔ اب تمہیں کیا بتاؤں۔"

"تم چوبیس گھنٹے یہیں رہتے ہو؟"

میں نے اقرار میں سر ہلایا "دن میں سوتا ہوں، رات کو جاگتا ہوں۔"

"تم نے کبھی سکندر بخت کو آتے جاتے دیکھا؟"

میں نے خادم حسین کی طرف حیرانی سے دیکھا "سکندر بخت کون؟"

"ایکٹنگ مت کرو میرے سامنے۔ تم پرانے آدمی ہو۔ رابعہ بی بی کو [illegible] ہو تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ سکندر بخت کو نہ جانتے ہو۔" اس کے تیور دیکھ کے مجھے حیرت ہوئی "دیکھو، ہمارے ساتھ [illegible] کی بات مت کرو۔ تم چھوکرے ہو ابھی۔ لاٹ صاحب کی اولاد ہو تو ہمیں کیا، ہم کس کو جانتے ہیں اور کس کو نہیں۔ تم کون ہوتے ہو پوچھنے والے؟" میں نے چوکیدار کے انداز [illegible] ۔

وہ بالکل متاثر نہیں ہوا "سکندر بخت کو جانتے ہو یا نہیں؟"

"ہاں ہاں جانتے ہیں۔" میں نے کہا "یہاں آتے تھے وہ بھی۔ بدمعاش لوگ ان کے پیچھے لگ گئے۔ ابھی وہ کہیں چلے گئے ہیں۔"

"کہاں چلے گئے ہیں؟" وہ مسکرایا۔

"یہ جو حرافہ یہاں آتی ہے صفائی کرنے۔ توبہ توبہ، ایسی بے حیا اور زبان دراز عورت ہے۔ بوٹی بوٹی تھرکتی ہے اس کی تو اور آنکھیں تو ایسے مٹکاتی ہے، میں نے بس اتنا ہی کہا تھا کہ اندر سے بھی صاف کرنا ہے۔ میرے گلے پڑ گئی کہ صوفی بہانے بہانے سے اندر بلاتا ہے۔ اپنی صورت دیکھی ہے جھاڑو پھرے۔ میرے منہ لگا تو مور بنا دوں گی۔ کیا مطلب ہے جی ایسی واہیات بات کا آخر؟"

ہنستے ہنستے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے "چھوڑو، مطلب سمجھ کے کیا کرو گے خادم حسین۔ اندر کی صفائی وہ نہیں کرتی۔ ہم خود کرتے ہیں۔ چائے تو بہت اچھی بناتے ہو تم۔"

اس نے عادتاً ٹھنڈی سانس لی "امور خانہ داری کے سوا میں نے کیا کیا ہے شادی کے بعد۔ برتن کپڑے دھونے اور کھانا پکانے کی تو کوئی بات نہیں مگر وہ تو شاید چاہتی تھی کہ بچے بھی میں پیدا کروں جی۔ اللہ نے سبب بنا دیا کہ میری جان چھوٹ گئی۔ میں تو اب اسے لینے جاؤں تو الو کا پٹھا۔۔۔"

میں نے مناسب سمجھا کہ صبح صبح ایک بار دلاور کو دیکھ آؤں۔ وہ جاگ رہا تھا اور اندھیرے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ اس نے اپنی قید تنہائی کو ذہنی طور پر قبول کر لیا تھا اور یہ بھی سمجھ لیا تھا کہ اب اس کی رہائی صرف ہماری صوابدید پر منحصر ہے مگر بے بسی اس کے اعصاب پر اثر انداز ہونے لگی تھی۔ اس کا وہ پرسکون انداز باقی نہیں رہا تھا جس میں مصنوعی بے حسی اور رعونت آمیز بے نیازی نظر آتی تھی۔ وہ کچھ گھبرایا ہوا۔ بے چین اور مضطرب، خوف زدہ اور مایوس تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے گہرے ہو گئے تھے اور اس کی شیو بڑھ کے باقاعدہ داڑھی نظر آنے لگی تھی۔

"کیا حال ہے اپنے چوہدری دلاور کا؟" میں نے کہا۔

"فکر مت کرو۔ میں مروں گا نہیں اور خودکشی بھی نہیں کروں گا اپنے سکندر اعظم صاحب۔ میں تم سے رحم کی بھیک بھی نہیں مانگوں گا۔"

"وہ چیز مانگنے سے کیا فائدہ جو ملنے کی امید ہی نہ ہو۔ دوائیں سب موجود ہیں۔ کھانے پینے کو بھی ہے۔ ابھی پتا نہیں کتنے دن اس قید خانے میں گزریں تمہارے۔"

"میں حوصلہ ہارنے والا آدمی نہیں ہوں۔"

"یہ تو اچھی بات ہے۔ میں بھی چاہتا ہوں کہ گردن میں پھانسی کا پھندا پڑنے تک تم زندہ رہو۔"

"پھانسی تم جب چاہو دے سکتے ہو۔"

"ہاں مگر یہ کام میرا نہیں۔ سزا تمہیں قانون دے گا۔ جب انصاف ہوگا تو ساری دنیا دیکھے گی۔ بالکل اسی طرح جیسے وزیر خان کے ساتھ ناانصافی ہوئی تھی تو ساری دنیا دیکھتی رہی تھی۔"

میں واپس پہنچا تو نو بج رہے تھے۔ اب مجھے اپنا چوکیدار کا حلیہ بدل کے پھر فرنچ وکیل کا روپ دھارنا تھا۔ یہ کام اب میرے لیے اتنا آسان ہو گیا تھا جیسے کپڑے بدلنا۔ ابھی تک کسی نے غیر ملکی وکیل کے بھیس میں سکندر بخت کو نہیں پہچانا تھا۔ ابتدا میں اگر

"اگر ہمیں پتا ہوتا تب بھی تمہارے باپ کو بھی نہ بتاتے۔ چلو اب اُٹھو اور باہر جاؤ۔ یہ آفس کا ٹائم نہیں اور پارک نہیں ہے کہ بچے اِدھر آکے بیٹھ جائیں۔"

"ہاں میاں شہزادے۔ تمہارے تو اسکول جانے کا وقت ہے یہ" خادم حسین بولا "تم کہاں بھٹک رہے ہو۔"

"تم چپ رہو مُلّا دوپیازہ کی بدروح" فیصل نے اسے بُری طرح جھڑک دیا۔

میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے کھینچ کے باہر لے گیا "ابھی اس کو مُلّا دوپیازہ بولا۔ ہم کو بیربل کہہ دوگے۔ ہم تو ہاتھ مار کے تمہارا منہ کردیں گے پیاز جیسا۔"

اس نے مزاحمت کی مگر میری گرفت اتنی سخت تھی کہ وہ بلبلا کے رہ گیا اور آفس کے باہر برآمدے میں کھڑا ہوگیا۔ اس نے مجھے خونی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا "میں چوہدری کا بڑا بیٹا ہوں، فیصل!"

"ارے بہت دیکھے ہیں ہم نے چوہدری۔ اِدھر جو بیٹھے ہیں وہ بھی کم نہیں ہیں۔ بڑے بڑے وکیل لوگ ہیں۔ چلو نیچے ورنہ ہم اوپر سے پھینک دیں گے سڑک پر" میں آگے بڑھا۔

وہ زینے کی طرف چل پڑا "تم بہت بدتمیز آدمی ہو۔ میں تو تمہاری رابعہ بی بی کے لیے ایک پیغام لایا تھا۔ انہی کا فائدہ تھا..."

"بولو۔ ہم بتادیں گے" میں نے کہا۔

وہ رُک گیا "ان سے کہہ دینا کہ شیر کا بچہ بھی شیر ہی ہوتا ہے۔ وہ گھاس نہیں کھاتا۔ خون پیتا ہے اور گوشت کھاتا ہے، خواہ وہ آدمی کا ہو۔"

"یہ تو ہم بھی جانتے ہیں۔ کون سی نئی بات ہے۔ رابعہ بی بی کو بھی پتا ہوگی۔" "یہ بھی بتا دینا اسے کہ میرا ایک ہی باپ ہے۔"

"ہاں یہ نئی بات ہے۔ بتادیں گے۔"

"اگر اسے کچھ ہوا، تو بہت کچھ ہوگا۔ جس کا ابھی اسے اندازہ نہیں ہے۔ میری ماں کا سہاگ اُجاڑنے والے کا میں گھر اُجاڑ دوں گا۔ اور پھر بھی سمجھ میں نہ آئے اس کی" وہ ایک لمحے کے لیے رُکا اور پھر اس نے ایک لفافہ مجھے تھمادیا "تو یہ دے دینا اسے۔"

میں اس لڑکے کی بے خوفی اور ہمت کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ لفافہ لیتے ہوئے اچانک میرا ارادہ بدل گیا اور میں نے اسے روکنے کا فیصلہ کرلیا "اس میں کیا ہے؟"

"تمہارے مطلب کی چیز نہیں ہے" اس نے کہا اور تیزی سے زینے کی طرف بڑھا "الٹی میٹم ہے اس میں مگر تم کیا سمجھوگے۔"

میں نے ایک دم اس کا راستہ روک لیا "ایٹم بم ہے اس میں۔ پھر تو ہم نہیں جانے دیں گے تمہیں۔ ہم تم کو پولیس کے حوالے کریں گے۔"

"پولیس۔" اس نے حقارت سے کہا "راستہ چھوڑو میرا۔"

"دیکھو ہم رابعہ بی بی کو فون کرکے بُلا لیتے ہیں [illegible]"

"نہیں۔ مجھے جانا ہے۔ تم یہ ان کو دے دینا" [illegible] کی فکر میں تھا۔

"اچھا تم خود ان سے بات کرو۔ وہ کہیں کی تو ہم جانے [illegible] تمہیں۔"

"ورنہ؟ ورنہ کیا کروگے؟ مجھے باندھ کے رکھوگے یہاں [illegible]" عمر لڑکا بہت تیز مزاج تھا۔

"ہاں۔ ہم یہی کریں گے۔ تم کو بوری میں ڈال [illegible] گے۔ ہم تو چوکیدار ہیں۔ ایسا ویسا کوئی آدمی آفس میں گھس [illegible] یا کوئی کتے کا بچہ اِدھر آکے بھونکنے لگے تو ہم یہی کرتے ہیں [illegible] نے اسے ایک جھٹکے سے پیچھے کھینچ لیا اور اسے دوسری بار [illegible] موقع دیے بغیر دھکیل کر آفس میں کردیا۔ وہ پیچھے قالین پر [illegible] پھر کھڑا ہوگیا۔ اب اس کا حوصلہ جواب دے گیا تھا اور وہ [illegible] نظر آنے لگا تھا۔

"بیٹھ جاؤ اِدھر۔" میں نے اسے اندر والے کمرے [illegible] پہنچادیا۔

"میری ماں کو بھی معلوم ہے کہ میں یہاں ہوں" اس [illegible] مرعوب کرنے کی آخری کوشش کی "اور وہ زیادہ دور بھی نہیں [illegible] یہاں سے۔" "ہمیں بتاؤ کہاں ہے وہ۔ ہم اسے بھی لے آئیں [illegible]"

"وہ خود آجائے گی اگر مجھے دیر ہوئی۔"

"وہ کیا توپ لے کر آجائے گی۔ ہم کیا عورت ذات سے [illegible] جائیں گے چھوکرے۔" میں نے کہا۔

میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی وہ آگئی۔ میں نے [illegible] پہلے بھی دیکھا تھا اور مجھے اس پر ترس آیا تھا۔ وہ ایک حسین [illegible] باوقار عورت تھی جس نے حالات کی مجبوری کے سامنے سر جھکا[illegible] ہوئے دلاور سے عہدِ وفا استوار رکھا تھا۔ وہ ایسی عورت تھی [illegible] قسمت نے دھوکا دیا ورنہ وہ کسی بہت بڑے آدمی کی شریکِ حیات ہوتی۔ آدمی دلاور بھی بڑا تھا مگر فرق مثبت اور منفی اندازِ فکر کا [illegible] وہ بہت بڑا لیڈر بھی بن سکتا تھا مگر وہ بہت بڑا بدمعاش بن گیا۔

"تم کیوں بیٹھے ہو یہاں فیصل" اس نے مجھے نظرانداز کر[illegible]

"اس خبیث نے بٹھا رکھا ہے" فیصل پھر شیر ہوگیا۔

"گالی دوگے تو ہاتھ مار کے تمہارا فوٹو بگاڑ دیں گے۔ تمہارے باپ نہیں ہیں کہ لاڈ میں بدتمیزی برداشت کریں۔"

دلاور کی بیوی نے صورتِ حال کی سنگینی کو سمجھ لیا "چلو [illegible] دو چوکیدار۔ بے وقوف بچہ ہے۔" "یہ بچہ ہے [illegible] کا بچہ ہے [illegible]" "میرا اور [illegible]"

"کاٹنے کو دوڑتا ہے اس لیے پوچھا ہم نے۔ اسے سنبھال کے رکھو بیگم صاب" میں نے کہا "آپ کی وجہ سے چھوڑ رہے ہیں [illegible] ہم تو پولیس کے حوالے کردیتے۔"

"ہمت ہے تو بلاؤ پولیس کو۔"

ماں نے اسے ڈانٹا "چپ کرو فیصل۔ خواہ مخواہ بات [illegible]

[illegible] یہ ہم برداشت نہیں کرسکتے۔"

کوئی ہمیں مُلّا قورمہ کہے... میری نظر لفافے میں سے برآمد ہونے والے خط کی تحریر پر جم [illegible] اصل خط نہیں تھا۔ اس کی فوٹو کاپی تھی لیکن اس تحریر [illegible] تھی۔ یہ [illegible] آج بھی بھولا نہیں تھا۔ اس کا ہر لفظ فوزیہ کے لبوں سے اسی [illegible] کو میں [illegible] لہجے میں بولتا محسوس ہوتا تھا۔

"تم فاتحِ اعظم ہو۔ خدا کرے تمہاری عظیم فتوحات کا یہ سلسلہ تاابد جاری رہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ مجھ سے پہلے اور میرے بعد تم نے کہاں کہاں فتح کے جھنڈے گاڑے اور کتنے مفتوحہ دلوں کو شکست سے دوچار کرکے چھوڑ دیا۔ ہلاکو اور چنگیز خان نے بھی یہی کیا تھا۔ وہ گھروں کو اور بستیوں کو تاخت و تاراج کرکے آگے بڑھ گئے تھے۔ فاتح پلٹ کر نہیں دیکھتے کہ لُٹ جانے اور مٹ جانے والوں پر کیا بیتی۔ ویران بستیاں بھی آباد ہوہی جاتی ہیں۔ اپنی پہلی شکست کو میں نے تم سے شکوہ کیے بغیر قبول کرلیا تھا۔ اپنے اُجڑے گھر کو پھر بسانے کے لیے میں نے خود پر بڑا جبر کیا تھا۔ بڑی مشکل سے اور محنت سے میں نے ماضی کے ہر زخم کا نشان تک مٹادیا تھا اور اب میں خوش تھی کہ میں نے اپنی شکست کو فتح میں بدل دیا ہے لیکن ایسا لگتا ہے کہ میرے گلشن کی یہ بہار بھی تمہیں گوارا نہیں اور تم پھر میری دنیا اُجاڑ کے مجھے احساسِ شکست کے اِسی زنداں میں قید کرنا چاہتے ہو جس سے رہائی آسان نہ تھی۔ میں تمہاری منت کرتی ہوں۔ خدا کے لیے مجھے معاف کردو۔ میرے گھر کو اپنے انتقام کی آگ سے خاکستر مت کرو۔ پہلی ہار کا سارا عذاب صرف میں نے جھیلا تھا مگر اب فوزیہ ایک بیوی ہے اور ایک ماں بھی ہے سکندر۔ اپنے تعلق کے عہدِ ماضی کو میرے شوہر اور میرے بچوں کے مستقبل کا آسیب مت بناؤ۔ غلطی اگر کی تھی تو میں نے۔ سزا انہیں کیوں ملے۔ وہ تو کچھ بھی نہیں جانتے۔ کچھ بھی نہیں سمجھتے۔ انہیں دن رات ہراساں کیا جارہا ہے۔ دھمکیاں دی جارہی ہیں، آخر ہم کیا کریں؟ کہاں جائیں جہاں یہ خوف کے سائے ہمارے تعاقب میں نہ ہوں۔ میرے شوہر نے ٹرانسفر کرالیا پھر نوکری چھوڑ دی۔ وہ شہر چھوڑ دیا۔ ہم مفرور مجرموں کی طرح روپوش رہنے پر مجبور ہیں۔ میرے شوہر کو بڑی مشکل سے ایک ایوننگ کالج میں لیکچرر کی نوکری ملی ہے۔ وہ رات کے وقت گھر آتے ہوئے ڈرتا ہے۔ راستے میں دوبار اسے انجان لوگوں نے روک کے مارا اور اس کے کپڑے پھاڑ دیے۔ اسے دھمکی دی کہ اگر تمہارے سالے نے حرامی پن نہ چھوڑا تو ہم اس کی بہن..... میں آگے کیا لکھوں۔ تم سمجھ سکتے ہو کہ انہوں نے کیا کہا ہوگا۔ میرا شوہر کچھ نہیں کرسکتا۔ وہ کس کے خلاف پولیس میں رپورٹ لکھوائے۔ وہ نہ کسی کو جانتا ہے نہ پہچانتا ہے اور نہ اس کے پاس کوئی ثبوت ہے نہ گواہ۔ وہ قصوروار محسن کو سمجھتا ہے اور مجھے الزام دیتا ہے کہ تمہارے بھائی اور اس کے پاگل دوست کی وجہ سے ہماری زندگی عذاب ہورہی ہے۔ میرا محسن سے کوئی رابطہ نہیں۔ کسی نے فون پر مجھے بتایا تھا کہ وہ بھی کراچی میں ہے اور اس نے کسی نامی گرامی ڈاکو کی بہن سے شادی کرلی ہے

کی کیا ضرورت ہے۔ معاف کرنا چوکیدار۔ جب سے اس کا باپ غائب ہوا ہے اس کا مزاج بگڑا ہوا ہے۔ کھانا پینا چھوڑ رکھا ہے۔ چڑچڑا ہوگیا ہے۔ مجھ سے بھی لڑتا ہے۔ تم اس کی بات کا بُرا مت مانو۔"

"اچھا جی۔ آپ لے جائیں اسے۔ ہم آپ کے کہنے سے چھوڑ رہے ہیں۔ آپ بھلی مانس ہیں۔"

معلوم نہیں ماں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے کیا اشارہ کیا تھا کہ فیصل کا رویّہ ایک دم بدل گیا۔ "سوری چوکیدار۔ میرا دماغ آج کل ٹھکانے نہیں ہے ڈیڈی کی وجہ سے۔ وہ پتا نہیں کہاں چلے گئے ہیں۔"

میں نے افسوس سے سرہلایا "تھانے میں رپورٹ لکھوادو۔ شاید پتا چل جائے۔ پتا نہیں کیسے لوگ ہوتے ہیں جو گھربار، بیوی بچوں کو چھوڑ جاتے ہیں۔"

"وہ ہمیں چھوڑ کر نہیں گئے ہیں۔ انہیں اغوا کیا ہے دشمنوں نے۔" "دشمن ہوں آدمی کے تو پھر ڈرنا چاہیے۔ ہم نہیں ڈرتے کیونکہ ہم صرف دوست بناتے ہیں۔"

"دشمن ہوتے ہیں بڑے لوگوں کے۔ حسد کرنے والے اور جلنے والے۔ تم جیسے لوگوں کا دوست بھی کون ہوتا ہے۔ خوش فہمی رہتی ہے تمہیں کہ جس نے مسکرا کے سلام کا جواب دے دیا وہ تمہارا دوست ہے۔"

"مسکرا کے سلام کا جواب دینے والا بھی دشمن تو نہیں ہوتا نا بیٹا۔ جاؤ اپنی ماں کے ساتھ۔ ہم کیا سمجھائیں تمہیں۔ وقت خود تمہیں دوست اور دشمن کا فرق بتادے گا۔"

جب دلاور کی بیوی اپنے بیٹے کے ساتھ نیچے اُتر گئی تو میں نے خادم کو اشارہ کیا "ان کے پیچھے جاؤ۔"

"ہرگز نہیں۔ یہ لڑکا ہے یا بم کا گولا" خادم حسین نے کانوں کو ہاتھ لگایا "یہ مُلّا تو خیر ٹھیک ہے مگر دوپیازہ کیوں کہا اس نے۔ دوپیازہ ہم پکالیتے ہیں۔ گوشت کا سالن ہوتا ہے۔"

"خادم حسین۔ اوپر سے ہی جھانک کے دیکھ لو وہ کس گاڑی میں آئے تھے اور کون تھا ان کے ساتھ؟" میں نے بھنّا کے کہا "وہ نیچے نہ کھڑے رہیں میرا پیچھا کرنے کے لیے..."

خادم دوڑا اور گیلری سے نیچے جھانکنے لگا۔ میں ابھی تک وہ لفافہ ہاتھ میں پکڑے کھڑا تھا جو فیصل دے گیا تھا۔ اس پر نام رابعہ کا ہی لکھا ہوا تھا مگر کھولنے سے پہلے میں نے اس کو اُلٹ پلٹ کے دیکھا۔ یہ ہوسکتا تھا کہ پیکٹ میں بم رکھ دیا جائے یا زہریلی گیس بھردی جائے لیکن ایک لفافے میں الٹی میٹم کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ مجھے اس کے اندر صرف ایک کاغذ ہی نظر آرہا تھا۔

خادم نے کہا "گاڑی وہی تھی جناب کل والی اور اس کو وہ کالے منہ والا ہی چلا کے لایا تھا۔"

"استاد پیڈرو" میں نے لفافہ کھولتے ہوئے کہا۔

"وہ دوپیازہ والی بات رہ گئی جی۔ ہم تو قورمہ بھی پکا سکتے ہیں مگر

جو خود بھی قتل اور ڈکیتی کی متعدد وارداتوں میں مطلوب ہے' کیا یہ صحیح ہے سکندر؟ میرے بچے اسکول جاتے ہیں تو میں ان کی واپسی تک دروازے اندر سے بند کیے ان کی خیریت کے ساتھ واپسی کے لیے دعا مانگتی رہتی ہوں۔ رات کو جب تک میرا شوہر لوٹ کے نہیں آجاتا میرا دل خوف سے کانپتا رہتا ہے۔ تمہیں یہ ضرور معلوم ہوگا کہ محسن کہاں ہے؟ اس سے کہو کہ مجھ سے ملے۔ میرے ساتھ آکے رہے تاکہ میں خود کو اتنا اکیلا اور کمزور محسوس نہ کروں۔ اگر اس کا تم سے کوئی تعلق نہیں ہے تو وہ بلاوجہ ہماری زندگی کے دشمن ہوجانے والوں کو اس بات کا یقین دلا سکتا ہے۔ انہیں قائل کرسکتا ہے کہ ہمارا تم سے کوئی تعلق' کوئی رشتہ نہیں ہے۔ میں تمہیں خدا رسول کا' رابعہ کی محبت کا اور چچا وزیر خان کے نام کا واسطہ دے کر کہتی ہوں سکندر کہ اپنی جنگ میں میرا گھر تباہ مت کرو۔ اگر میرے شوہر کو کچھ ہوا یا میرے بچوں پر آنچ بھی آئی تو میں مرجاؤں گی مگر میرے مرنے سے تمہیں کیا فرق پڑے گا۔ تمہاری فتوحات جاری رہیں گی۔ فوزیہ اب تمہارا راستہ کیسے روک سکتی ہے جب پہلے بھی وہ تمہارے لیے گردِ راہ تھی۔ تم تو چٹانوں سے ٹکرا کے انہیں ریزہ ریزہ کرسکتے ہو۔ اگر تم مجھے جینے کا حق بھی دینا نہیں چاہتے تو تمہاری مرضی۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ وہ ہمیں ماردیں گے۔ قسمت میں اگر یہی ہے تو ٹھیک ہے مگر یاد رکھنا سکندر کہ اس دنیا کی ساری فتوحات کے بعد تمہارے لیے بھی یومِ حساب آئے گا جب تمہارا دامن تھام کے میں داورِ محشر سے سوال کروں گی کہ اس پر لہو کے جتنے داغ ہیں وہ جرم کس پر ثابت کرتے ہیں۔ تم تو انصاف انصاف پکارتے پھرتے ہو۔ کبھی سوچنا کہ خود تم نے میرے ساتھ انصاف کیا تھا؟ اور میں کیا لکھوں؟ بات تو تمہارے سمجھنے کی ہے۔ میں یہ خط چوری چھپے لکھ رہی ہوں۔ کسی کے کہنے پر۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میرا پیغام تمہیں پہنچادیا جائے گا۔ خدا کرے ایسا ہی ہو اور یہ خط میرے خلاف اعترافِ جرم کی تحریر نہ بنے۔ میں کہاں تک ڈروں اور کس کس سے ڈروں؟ میرا خدا جانتا ہے کہ نہ میرا کوئی گناہ ہے نہ جرم پھر بھی وہ میرے صبر کا امتحان لیتا ہے تو میں ہر امتحان کے لیے تیار رہوں۔

نقشِ فریادی۔ ایک بھولا بسرا شہرِ مفتوحہ۔ فوزیہ' ایک نام جو تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو...!

خط پڑھ کے میرے دماغ میں سائیں سائیں سی ہونے لگی۔ ایک ہولناک مہیب سناٹے میں فوزیہ کی آواز یوں پکارنے لگی جیسے ویران قبروں کے درمیان اندھیری رات میں کوئی بین کرتا ہو۔ ملامتوں کی بادِ سموم ماضی کے ہر کھنڈر سے سر ٹکرا رہی تھی۔ تم انصاف انصاف پکارتے پھرتے ہو۔ کبھی سوچنا کہ کیا میرے ساتھ تم نے انصاف کیا تھا؟ کیا میرے گلشن کی یہ بہار بھی تمہیں گوارا نہیں؟ ہلاکو اور چنگیز خان نے بھی یہی کیا تھا۔ سکندرِ اعظم' فاتحِ اعظم!

میں نے خط وایک بار' دوبار' پھر پڑھا یہاں تک کہ اس کا ہر لفظ مجھے ازبر ہوگیا اور فوزیہ کے زخم خوردہ ٹوٹے ہوئے دل نے زہر میں بجھے ہوئے نشتر کی طرح میرے دل کو زخموں سے...

فوزیہ نے اپنا نام ضرور لکھا تھا مگر پتا نہیں لکھا تھا اور... نمبر بھی نہیں دیا تھا ورنہ میں اس سے بات کرلیتا مگر کیا کرتا؟ کہتا کہ سوری فوزیہ' میرا کوئی قصور نہیں۔ نہ میں نے... سوچا تھا اور نہ ہی میں ایسا چاہتا ہوں۔ میں بھی مجبور ہوں... کے آگے کس کا بس چلتا ہے۔ تمہارے لیے میں سب کچھ... ہوں مگر میں کیا کروں۔ شٹ اپ سکندر' تمہارے لیے یہ سب... تماشا تھا۔ یہاں تم فوزیہ سے محبت کرتے رہے۔ لندن میں... لڑکیوں سے دل بہلاتے رہے اور آج رابعہ کے عشق کے... کرتے ہو۔ کیا بات ہے' اپنی ڈائری دیکھو اور بتاؤ تم نے کتنی... کو پھانسا۔ ہر لڑکی ایک شہرِ مفتوحہ سے زیادہ نہیں تھی تمہارے... سکندرِ اعظم۔ پلٹ کے کون دیکھتا ہے کہ اس نے کتنے گھر اجاڑے اور کتنے دل توڑے۔ مردوں کے یہی کام ہیں!

خادم حسین میری دہشت سے خوف زدہ نظر آرہا تھا۔... نے دوبار پوچھا تھا کہ خیر تو ہے جی؟ کیا ہے آخر یہ الٹی میٹم۔ کوئی سیدھی بات لکھ دی ہے کسی نے تو دفع کریں۔

بالآخر میں نے میز پر مکا مار کے کہا "میں ان سب کو جان سے ماردوں گا خادم۔ چڑھادیں یہ لوگ مجھے پھانسی۔ میں ان کی..."

آگے جو کچھ میں نے کہا وہ منظر کی زبان میں "بی پی" اور "ڈبلیو ایل" کی تفسیر تھا چنانچہ یہاں نقل نہیں کیا جاسکتا۔ خادم نے عقلمندی یہ کی کہ رابعہ کو فون کردیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ کورٹ جاچکی ہوگی مگر منظر کی گاڑی میں کچھ خرابی ہوگئی تھی جسے کوئی میکینک ٹھیک کرنے کی کوشش کررہا تھا۔

"آپ تو فوراً آجائیں جی۔ بہت بُرا حال ہے ان کا۔ اب میں آپ کو کیا بتاؤں کیا کہہ رہے ہیں۔ بہت افسوس ناک قسم کے الفاظ کہہ رہے ہیں جی ان کی زبان سے خود بخود۔ وہ اپنی مرضی سے تو ایسی باتیں نہیں کرسکتے۔ اثر ہوگیا ہے ان کے دماغ پر۔ نہیں جی، ... پریت کا نہیں۔ الٹی میٹم کا۔ اچھا جی میں تو سمجھا تھا کہ سید ھی ہی بھی کوئی چیز ہوگی الٹی میٹم کی طرح۔ لاحول ولا قوۃ۔ میں تو جی ... نہیں پیتا۔ واٹر بری کمپاؤنڈ۔ نوفیصد الکحل ہوتی ہے نا اس میں ... نوفیصد ایمان توگیا۔"

میں نے ریسیور اس سے چھین لیا "یہ کیا فضول بکواس ... ہو اور فضول سوال کررہی ہو۔"

"بھوتنی کے۔ یہ سن رہی ہو اور کررہی ہو کہ کہہ رہا ... میں تیری وہ نہیں' تیرا وہ ہوں۔ باپ کا باپ سالے۔ یہ کیا ڈرامہ ہے۔ آکے سر پر سو جوتے ماروں گا اور سو پیاز کھلاؤں گا تو ... ٹھکانے آجائے گا۔"

میں نے کہا "منظر' یہ ڈراما نہیں۔ سخت سنگین معاملہ ہے۔ فوراً آجاؤ۔ لعنت بھیجو کورٹ پر۔"

... نے خط پڑھ کے کہا "ہوں۔ تو یہ حرامی پن ہے۔ کون لایا ...؟"

"میں نے بتایا تھا ناکہ دلاور کا بیٹا آیا تھا۔"

"وہی جو پہلے بھی ایک بار تجھے اڑا چکا تھا۔ سالے کو پکڑ کے کیوں نہیں رکھا؟"

میں نے کہا "اس کی ماں نہ آتی تو یہی کرتا۔ میں نے یہاں بٹھالیا تھا اسے۔ لیکن..."

"لیکن ماں کو دیکھ کے سب بھول گیا۔ ابے اتنی حسین تو نہیں ہے وہ۔"

"بکواس مت کر۔ مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ لفافے میں کیا ہوگا۔ میں تو سمجھا تھا کہ اس کی ماں نے درد بھری فریاد کی ہوگی یا دھمکی دی ہوگی کہ ہم غالب اور نازو کے ساتھ یہ کردیں گے' وہ کردیں گے۔"

منظر ہنسا "ان کی تو پی ڈبلیو ایل۔"

رابعہ نے کہا "کیسی عجیب بات ہے کہ کراچی میں محسن اپنی بہن سے چھپ کے رہتا ہے۔ اتنا ڈرتا ہے وہ؟"

"یہ ڈر کی بات نہیں۔ وہ خود بہن کو محفوظ رکھنے کے لیے اس سے لاتعلق رہا ہوگا۔"

"یا وہ ناگ منی کا ڈسا ہوا گھر سے نکلتا ہی نہیں ہوگا۔ پڑا رہتا ہوگا عشق کے نشے میں چور۔ سالا ویسے بھی زن مرید تو ہے تیری طرح۔ وہ ڈانٹ لگاتی ہوگی تو دبک کے بیٹھ جاتا ہوگا۔"

"بات کچھ بھی ہو۔ سوال یہ ہے کہ اب میں کیا کروں؟"

"تم عیش کرو بیٹے۔ عشق کرو' قتل وغارت گری کرو۔ بدمعاشی اور حرامی پن کرو۔ یہ سب کام کر ہی رہے ہو تم۔"

میں نے کہا "یار منظر۔ کبھی تو سیریس ہوجانا چاہیے۔ میں بہت پریشان ہوں۔ فوزیہ پر کوئی مصیبت آئی تو..."

"ابے قبل از مرگ واویلا کیسا۔ ابھی مصیبت آئی تو نہیں۔ ان سے کہتے ہیں کہ بھاگ جائیں اس ملک سے۔ یہ صرف دھمکی ہے فی الحال۔ کسی کو موقع ہی کیوں دیا جائے کہ وہ کمزوری سے فائدہ اٹھائے۔"

رابعہ بولی "باہر جانا کوئی آسان کام ہے۔"

"اس کا بندوبست ہوجائے گا عزیزہ۔ تم خود کو ہلکان مت کرو۔ افسوس کہ تمہارا دل سوکن کے جذبات سے خالی ہے۔ بھئی آخر فوزیہ سے یہ الو کا پٹھا محبت کرتا تھا اور پہلی محبت وہی ہے اس کی۔ تم نمبر دو ہو یا شاید محبوبہ نمبر چار سو بیس۔ پہلی محبت کون بھولتا ہے۔"

رابعہ مسکرائی "میں ایسی باتوں سے متاثر نہیں ہوتی۔ مگر منظر بھائی' ہمیں کیسے پتا چلے گا ان کا کہ وہ کہاں ہیں' خط میں تو کچھ بھی نہیں لکھا ہے۔"

"یہ بھی پوچھ لیں گے دلاور سے۔ باقی سب خاموشی سے"

"ابے تیری یہ توہین عدالت ہے۔" منظر نے کہا "عدالت کیسے چھوڑ سکتا ہوں میں' میرے کیس...؟"

"بھاڑ میں گئے کیس۔ اگر آج تو فوت ہوجاتا تو کیا ہوتا؟ تجھے ہیضہ ہوجاتا یا نمونیہ تو کیا ایمبولینس میں اور اسٹریچر پر عدالت میں پیروی کے لیے جاتا۔" میں نے چلا کے کہا۔

"اچھا اچھا۔ اتنا چلاتا ہے تو فون رکھ دے۔ آواز ویسے ہی آجائے گی یہاں تک۔ یہ لے' وہ بھی آگئی' سولہ بھتیجوں کی پھوپی۔"

"کیا بات ہے؟ یہ خادم کیا کہہ رہا تھا؟"

میں نے کہا "منظر کے ساتھ فوراً آجاؤ۔"

"گاڑی ابھی ٹھیک ہورہی ہے۔"

"گولی مارو گاڑی کو۔ ٹیکسی لے کر آجاؤ۔ یہاں آتے ہوئے دیکھنا کہ نیچے استاد پیڈرو تو موجود نہیں ہے اسی گاڑی میں۔ ہاں وہ آیا تھا۔ چوہدری دلاور کے حرام زادے کے ساتھ۔ ہاں فیصل کے ساتھ اور ایک خط دے گیا ہے۔ اسی کو الٹی میٹم کہہ رہا تھا خادم۔ اب کیا فون پر سب بتاؤں میں۔ تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہے۔"

میں نے دھڑ سے ریسیور نیچے مارا۔

خادم نے مجھے فوراً پانی کا گلاس پیش کیا "پہلے جناب سو تک گنتی کریں۔ پھر اللہ کا نام لے کر یہ پانی پی لیں۔"

"اس سے کیا ہوگا؟"

"آگ بجھ جائے گی جی۔ جو آپ کے دل اور دماغ میں لگی ہوئی ہے۔ بڑا مجرب نسخہ ہے۔"

میں صوفے پر بیٹھ گیا اور خاصی کوشش سے سو تک گننے میں کامیاب ہوا۔ پانی پیتے ہی میں نے محسوس کیا کہ مجھے اپنے آپ پر کنٹرول حاصل ہوچکا ہے۔ میں خاصا پُرسکون تھا اور میرا ذہنی انتشار کم ہوگیا تھا۔ میں نے اندر جاکے اپنی وردی بدلی اور سوٹ پہن کے فرنچ وکیل بن گیا۔

میری تیاری آخری مراحل میں تھی کہ باہر سے رابعہ کی اور پھر منظر کی آواز آئی۔

"اندر کپڑے بدل رہے ہیں جی وہ۔" خادم نے بتایا۔

"مولوی۔ تمہاری صورت سے تو لگتا ہے کہ رات کو تم نے کوئی قابلِ اعتراض خواب دیکھا تھا۔"

"رات تو میں نے اپنی گھروالی کو دیکھا تھا جی۔"

"اچھا! کس کے ساتھ؟" منظر نے خاصے دکھ سے کہا۔

"لاحول ولا قوۃ۔ آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ وہ پیاز کاٹ رہی تھی اور رو رہی تھی۔ خیر جی آپ یہ الٹی میٹم دیکھیں۔ مجھے تو یہ خط ہی لگتا ہے۔"

جب میں باہر آیا تو رابعہ خط پڑھ رہی تھی۔ میں اس کی میز پر پاؤں لٹکا کے بیٹھ گیا۔ رابعہ نے پورا خط پڑھنے کے بعد منظر کے حوالے کردیا۔ اچانک رابعہ کے چہرے پر بھی تشویش کے آثار نمودار ہوگئے تھے۔

ہو جائے گا۔ جب وہ نکل جائیں گے تب پتا چلے گا دشمنوں کو۔ اب رہی محسن اور اپنی گل بانو کی جوڑی کے مستقبل کی بات تو ایسا کرتے ہیں کہ انہیں ساری صورت حال بتا دیتے ہیں۔ ہمیں تو معلوم ہے کہ وہ اکرام شیخ اور کاجل کے ساتھ ہیں' کاجل کوئی اسکول چلا رہی ہے اور سابق اے ایس آئی اکرام شیخ ٹیکسی چلا رہے ہیں۔"

"مجھے ان کا گھر اور فون نمبر معلوم ہے۔" میں نے کہا "کیوں نہ انہیں یہاں بلا لیں۔"

منظر نے نفی میں سر ہلایا "ابے بھوتنی کے۔ کیوں اپنے ساتھ انہیں خراب کرتا ہے۔ کاجل اور اکرام شیخ سے تو بالکل امید نہیں کہ وہ گھربار اور کاروبار چھوڑ کے چل پڑیں' ہاں محسن کا دماغ ہے پاگل بیل کی طرح۔ جدھر چل پڑا' چل پڑا۔ اچانک عشق کا دورہ ختم ہو جائے اور دوستی کا دورہ پڑ جائے۔ خود گل بانو بھی ناگ منی بن جائے تو خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ ہنی مون تو خاصا منالیا۔ وہ پھر کود سکتے ہیں میدانِ عمل میں۔ حمل نہ ہو تو۔"

میں بے اختیار ہنس پڑا "یہ ٹھیک ہی فرمایا آپ نے۔"

رابعہ بدستور گم صم رہی "سوال یہ ہے کہ اس خط کا جواب کیا دیا جائے۔"

"نہیں۔ سوال یہ ہے کہ جواب کسے دیا جائے اور کیسے دیا جائے" منظر بولا "یہ اندازہ تو ہو گیا کہ دلاور کے غائب ہو جانے سے دشمن کے کیمپ میں کتنی کھلبلی مچ گئی ہے۔ پہلے انہیں یقین ہو گا کہ وہ دلاور کو ڈھونڈ نکالیں گے اور اسے بزورِ بازو چھڑا کے لے جائیں گے لیکن اب ان پر مایوسی اور جھنجلاہٹ سوار ہے۔ انہوں نے افراتفری میں ادھر تو غالب اور نازو کو پکڑ لیا ہے اور دوسری طرف کراچی میں بھی کارروائی کی دھمکی دے دی ہے مگر میں اس دھمکی کو قطعی اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ اگر کسی کا بال بھی بیکا ہوا تو نقصان دلاور کو ہو گا۔ وہ کریں گے کچھ بھی نہیں۔ ابھی وہ اپنی پوزیشن کو مستحکم کر رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جب ان کا پلڑا بھاری ہو جائے گا تو ہم سودا کرنے پر مجبور ہوں گے۔ وہ اپنے پلڑے میں غالب اور نازو کو پہلے ہی ڈال چکے تھے۔ اب فوزیہ کو پکڑنے کی بات کر رہے ہیں۔ اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ وہ ایسا کر سکتے ہیں کیونکہ فوزیہ کے ذریعے دباؤ دوطرفہ ہو گا۔ بیک وقت تم پر اور محسن پر لیکن اگلا قدم اٹھانے سے پہلے وہ ہمارا ردِعمل دیکھیں گے۔ پوچھیں گے کہ اب کیا سوچا ہے؟ تمہارے پاس ایک ترپ کا پتا ہے تو ہمارے پاس دو ہیں۔ دلاور کی سلامتی اور رہائی کے بدلے غالب اور نازو۔ اور فوزیہ کے گھربار کے تحفظ کی ضمانت۔"

میں نے منظر کی بات غور سے سنی تھی۔ اس کی دلیل میں وزن تھا۔ "کون کرے گا ہم سے سودا؟"

"دلاور کے بیٹے کا یہاں آنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ زیادہ پریشانی اس کے گھر والوں کو ہے۔ پیڈرو جیسے لوگوں کا کیا ہے... ہو گا تو وہ بدمعاشی کی سلطنت کا تاج اپنے سر پر رکھ لیں گے... دوسے نمبر ون ہو جائیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ دلاور کی... شوہر کی اور فیصل نے باپ کی رہائی کا معاملہ اپنے ہاتھ میں... ہے۔ پیڈرو دل سے تو چاہتا ہو گا کہ دلاور کا پتا صاف ہو جائے... بدنیتی کا اظہار نہیں کر سکتا۔ وہ ڈرتا ہے کہ اس کی خواہش کے برعکس دلاور اچانک آ گیا تو جس پر بھی بدخواہی کا الزام... ہو گیا کہ اس نے جانتے بوجھتے اس کی رہائی کے لیے کوشش... کی تھی' اس کی خیر نہیں۔ دلاور کا ولی عہد یا اس کی ماں... کسی ذریعے سے رابطہ کریں گے۔"

رابعہ نے سر ہلایا "منظر بھائی کی بات میں وزن ہے۔"

"منظر بھائی کا اپنا وزن جو بات میں شامل ہے" میں ...

"سوال ایک یہ بھی ہے کہ فوزیہ کو یہ خط لکھنے پر کس نے ... کیا تھا؟ فوزیہ نے کوئی اشارہ بھی نہیں دیا" رابعہ بولی۔

"میرے ذہن میں صاف پیڈرو کا نام آتا ہے۔ دلاور نے ... بتایا تھا کہ وہ کراچی گیا تھا۔ یہی مقصد تھا اس کے دورے کا... محسن اور گل کو تلاش نہیں کر سکا۔"

"پھر فوزیہ کو کیسے تلاش کیا اس نے؟"

"بھئی فوزیہ کا شوہر پروفیسر ہے۔ یا تھا پہلے۔ اس کا نام... معلوم ہے۔ فیصل آباد سے فرار ہو کے کراچی جانے والا... وہاں جا کے پرچون کی دکان تو کھولنے سے رہا یا حلیم کی ریڑھی... سے رہا۔ وہاں بھی وہ کسی کالج میں ہی پڑھائے گا۔ پیڈرو نے... کے ہر کالج سے معلوم کیا ہو گا کہ حال ہی میں یہاں اس نام... لیکچرر آیا ہے یا کسی نے ملازمت کے لیے درخواست دی ہے... کے کسی کلرک نے سو پچاس روپے لے کر بتا دیا ہو گا کہ ... میں کیا پتا درج تھا۔ فوزیہ نے لکھا ہے نا کہ اس نے ہر جگہ... کی تھی مگر اب کسی ایوننگ کالج میں پڑھا رہا ہے۔ ظاہر... معلوم ہو جانے کے بعد پیڈرو کے لیے فوزیہ کو پریشان کرنا کیا... تھا۔ اس کے شوہر اور بچوں کے لیے خطرہ پیدا کرنے کے بجائے... نے کسی کو ہمدرد بنا کے بھیج دیا ہو گا اور فوزیہ کے دل میں... بٹھا دی ہو گی کہ ساری خرابی کا ذمے دار میں ہوں۔ اگر وہ ... مجھے مجبور کر دے اور میں راہِ راست پر آ جاؤں تو سب... ہو جائے گا۔ کسی کے لیے کوئی خطرہ نہیں رہے گا اور سب ... سے رہ سکیں گے۔ عین ممکن ہے اس خط کا مضمون بھی ا... نے تجویز کیا ہو اور فوزیہ جذباتی استحصال کا شکار ہو گئی... شکاری ایسے ہی جال پھیلاتے ہیں۔ فوزیہ بے چاری کیا جا...

رابعہ نے مجھے تعریفی نظروں سے دیکھا "تمہارا دماغ... ٹھیک کام کر رہا ہے۔" خادم حسین بلاوجہ پریشان تھا۔

اب خادم کو بولنے کا موقع ملا۔ "آپ یقین کریں جی... ڈر گیا تھا کہ کہیں میری کسی بات سے مشتعل ہو کے میرا سر...

میں نے تلخی سے کہا "خوش فہمی کا شکار مت ہو بھوتنی کے۔ پہلے بھی ایک بار آئے تھے اسکاٹ لینڈ یارڈ والے جب اس ملک کے پہلے اور سب سے مقبول وزیراعظم کو قتل کیا گیا تھا اور سراغ بھی لگا لیا تھا انہوں نے کہ قتل کرنے والے اور کرانے والے کون تھے مگر خود ان کا انجام کیا ہوا تھا۔ کہاں ہے ان کی تفتیش کی رپورٹ؟ ایک ایئر کریش میں سب ختم کر دیا گیا تھا پھر آج تک..."

"خیر یہ کوئی سیاسی قتل نہیں ہے" منظر نے میری بات کاٹ دی "یہ ایک عام قسم کا مرڈر کیس ہے اور دلاور جیسے قاتلوں کے سر پر کسی سپاور کا ہاتھ نہیں ہے۔ جاوید صدیقی نے غالب اور نازو کے اغوا کی رپورٹ درج کرا دی ہے۔ ایف آئی آر میں دلاور کے ساتھ استاد پیڈرو کا نام بھی آ گیا ہے۔ وہ تم سے بھی ملنا چاہتا ہے۔"

"گویا معاملات ڈھب پر آ رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

"ظفر حیات اینڈ کمپنی حوالات میں ہے۔" رابعہ بولی "جاوید صدیقی کا اصرار تھا کہ ہم خود بھی دیکھ لیں اور کل کے اخبار میں یہ خبر بھی تصویر کے ساتھ آ جائے۔ کسی نامزد ڈی آئی جی نے اس خواہش کا اظہار کیا ہے۔ یہ کیس غالباً سی آئی اے کے سپرد کیا جائے گا۔"

"کون ہے نامزد ڈی آئی جی؟"

"مجھے نہیں معلوم لیکن میرا اندازہ ہے کہ سی آئی اے کے ایس ایس پی کو اس کی جگہ لایا جائے گا۔ یہ محکمہ جاتی چپقلش کا سلسلہ ہے۔ جوڑ توڑ ہوتے ہیں۔ دھڑے بندی ہوتی ہے۔ ڈی آئی جی کو معطل کرانے والے جب برسرِاقتدار آئیں گے تو خمیازہ بھگتنے والوں میں ظفر حیات اور شاہد علی بھی ہوں گے۔ نوکری تو خیر ان کی گئی۔ انہیں تو اب فکر ہو گی کہ جیل جانے سے اور تفتیش سے بچ جائیں۔ حوالات سے نکل کر گھر چلے جائیں تو یہی بہت ہے۔ عمر بھر کھانے کے لیے بہت ہے۔ بس کھایا پیا اگلنا نہ پڑے۔"

"اچانک میں بہت پُرامید ہو گیا ہوں۔ شاید ظالموں کے لیے یومِ حساب قریب آ گیا ہے۔" میں نے کہا "کل رات رابعہ اور میں وزیر خان کے نام پر چلنے والے اسپتال گئے تھے۔"

"مجھے سب بتا چکی ہے رابعہ۔"

"کیا ہو رہا ہے وہاں منظر" میں نے کہا "تمہیں کیوں اندازہ نہیں تھا' آخر تم بھی تو اس کے بورڈ آف ڈائریکٹرز میں شامل تھے۔"

"ہاں۔ اجلاس میں ضرور شریک ہوتا تھا میں۔"

"کبھی اندر جا کے نہیں دیکھا تھا؟"

"دیکھا تھا ایک بار مگر وہی جو مجھے دکھایا گیا تھا۔ جیسے وزیر کسی اسپتال کے دورے پر جاتا ہے تو کیا دیکھتا ہے۔ اس کے ساتھ اخبار والے بھی ہوتے ہیں۔ سب کو مثالی ماحول نظر آتا ہے۔ علاج معالجہ۔ مثالی ستھرائی۔ غذا اور دوا' توجہ اور انتظام سب بہترین۔"

کر دیں۔ مشکل وقت کے لیے ایک وظیفہ ہے میرے پاس۔ میں نے وہی پڑھ کے پانی پر پھونکا اور انہیں پلا دیا۔ یہ سب اسی کا کرشمہ ہے۔"

میں نے ہنس کے کہا "تو وظیفہ اور دم درود بھی کر لیتے ہو تم۔ جادو ٹونا اور کالے علم میں بھی دسترس ہے کچھ...؟"

"مذاق کی بات نہیں جی۔ کئی بار آزمایا ہوا نسخہ ہے۔ میری گھر والی... اللہ اسے جلد جنت نصیب کرے۔ غصے میں زبان درازی کے بعد دست درازی پر اتر آتی ہے جی۔ اور خیر سے وہ ہے بھی خاصی صحت مند۔ چمٹا چھری' جھاڑو اور کپڑے دھونے کا ڈنڈا تو بڑے مہلک ہتھیار ہوتے ہیں۔ باورچی خانے کے برتن بھی توپ کے گولوں کی طرح داغ دیتی ہے۔ اس وقت یہی وظیفہ اسے یوں ٹھنڈا کر دیتا ہے جیسے ابھی آپ چولہے کی طرح بھڑک رہے تھے پانی پیتے ہی ٹھیک ہو گئے۔"

منظر نے زور سے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا "مولوی۔ تم تو بڑے کام کے آدمی ہو۔ یار ہمیں بھی بتا دو یہ وظیفہ مگر ابھی نہیں' ابھی تو چائے بنا کے لاؤ تم۔"

خادم حسین ہائے ہائے کرنے لگا۔ "دیکھیں جی' منظر صاحب یہ ڈھول دھپے کا مذاق بڑا جان لیوا ہوتا ہے۔ میرا آپ کا کیا مقابلہ جناب۔ اپنے برابر کا دیکھ کے بے تکلف ہونا چاہیے۔"

"ٹھیک تو کہہ رہا ہے خادم حسین" رابعہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"بھئی زبان کی طرح ہاتھ بھی قابو میں نہیں رہتے میرے۔ رفتہ رفتہ تم بھی عادی ہو جاؤ گے مولوی صاحب۔"

"عادی ہونے سے پہلے تو میں فوت ہو جاؤں گا جی۔" وہ بڑبڑاتا ہوا اندر چلا گیا۔

"جاوید صدیقی نے فون کیا تھا مجھے" منظر بولا۔

"کب' کیا کہہ رہا تھا؟"

"وہ سب سچ مچ اندر ہو گئے ہیں۔ ظفر حیات ایس ایس پی اور اس کے ماتحت۔ آج کے اخبارات میں خبریں اور تصویریں دیکھ کے ہوم سیکریٹری نے تو ڈی آئی جی کو بھی معطل کر دیا ہے۔ کل میرا رویّہ بھی زیادہ جارحانہ تھا۔ جاوید صدیقی بڑی نیاز مندی دکھا رہا تھا کہ آپ کا تعاون چاہیے اور مس رابعہ کو یقین دلائیں کہ جیسا وہ چاہتی ہیں ویسا ہی ہو گا۔ آخر میں غالب کا پتا پوچھنے لگا کہ میں خاص خاص صحافیوں کو مدعو کرنا چاہتا ہوں۔ سب کی مدد چاہیے مجھے اس کیس میں۔ انشاء اللہ ڈاکٹر شبلی کے قاتل کو بہت جلد بے نقاب کر کے تختۂ دار تک پہنچا دیا جائے گا۔" منظر نے قہقہہ مارا "ہوا خراب تھی سالے کی۔"

"ابھی تو ہو گی۔ جب اوپر سے دباؤ بڑھے گا اگر برطانوی حکومت نے سچ مچ اسکاٹ لینڈ یارڈ والوں کو بھیج دیا تو حکومت بھی بے بس ہو جائے گی۔ وہ گڑے مُردے اکھاڑ کے سب کا نام بتا دیں گے۔" رابعہ بھی بولی۔

"تم نے کبھی چھاپا نہیں مارا؟"

"چھاپے کے بچے۔ کون مارنے دیتا مجھے چھاپا۔ اگر میں کوشش بھی کرتا تو خود اندر ہوتا۔ انہی کے ساتھ جن کو تو نے اتفاق سے دیکھ لیا۔ مجھے نہ شک تھا نہ فرصت تھی۔ ایک دن میں چوبیس گھنٹے ہوتے ہیں بھوتنی کے اور ہفتے میں سات دن۔ بکھیڑے ہوتے ہیں ہزار۔ ادھر تمہارے مسئلے۔ تمہاری رابعہ بی بی کے دفتر اور ان کے کیس۔ اپنے قانونی معاملات۔ گھربار' اتنا وقت کہاں سے نکالتا میں کہ اسپتال کے انتظام کی پوری نگرانی کرتا۔"

میں نے کہا "سوری یار' تو ناراض ہو گیا۔"

"ابے ناراض ہوتی ہے محبوبہ۔ بیوی بھی روٹھتی ہے تو آدمی کہتا ہے کہ چلو تم روٹھے ہم چھوٹے۔ ہم تو ہیں دوست' بُرا مانیں گے تو گالی دیں گے یا لات ماریں گے۔ تمہارے ایسی کہ پھر کبھی پیٹھ ہماری طرف نہیں کرو گے۔ تشریف رکھو گے تو دل سے ہائے نکلے گی۔ مولوی خادم حسین' تم بھی سُن لو۔"

خادم حسین نے چائے کا مگ منظر کے سامنے رکھ دیا۔ ان کے تعلقات مزید کشیدہ ہو گئے تھے۔ "آپ واہیات باتیں کرتے ہیں جی اور خود بھی واہیات آدمی ہیں۔"

"بالکل ٹھیک۔ سمجھے تم۔ اب ہماری اور تمہاری دوستی پکی۔ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔"

خادم حسین وار بچا گیا ورنہ اس کا دوسرا شانہ منظر کے بھاری بھرکم ہاتھ کا نشانہ بنتا۔ "خدا نہ کرے کہ میں آپ جیسا یا دیوانہ کہلاؤں۔"

میں نے کہا "میں اور خادم حسین رات کو دلاور سے ملنے گئے تھے۔ تم خادم حسین کو محض مولوی مت سمجھو۔ اس کے گُن تو آہستہ آہستہ سامنے آ رہے ہیں۔ ہیرا بندہ ہے ہیرا۔"

"دیکھنے میں تو کھیرا لگتا ہے" منظر بولا۔

"آپ خود بھی تو بے ہنگم کدو لگتے ہیں" خادم حسین جل کے بولا۔

میں نے کہا "رات کو دلاور مارا گیا میرے ہاتھوں۔"

رابعہ اور منظر نے مجھے بے یقینی سے دیکھا اور پھر انتظار کرنے لگے کہ یہ مذاق ہے تو میں حقیقت بتا دوں۔

"میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔ اس کی حالت پہلے ہی تباہ تھی۔ بھوک پیاس' قید کی سختی اور اعصابی دباؤ سے۔ میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اسپتال میں کیا ہوتا ہے۔ رانا کون ہے اور ڈاکٹر شاہ کا وہاں کیا کام ہے۔ اب ظاہر ہے وہ شرافت سے کچھ بتانے والا تو تھا نہیں' مجھ سے کچھ زیادتی ہو گئی۔"

"اور وہ مر گیا؟" منظر نے چلّا کے کہا "اُلو کے پٹھے۔"

رابعہ نے افسوس سے سر ہلایا "یہ تم نے کیا کر دیا سکندر۔"

میں نے کہا "پہلے میری بات تو سُن لو۔"

"ابے بات اب کیا رہ گئی ہے سُننے کو بھوتنی کے۔ اس کی لاش کیا وہیں پڑی ہے؟"

"کس کی لاش؟" میں نے معصومیت سے کہا۔

"رابعہ۔ میرا بلڈ پریشر بہت بڑھ گیا ہے۔ میں ابھی گالیاں دوں گا اسے یا ماروں گا۔ تمہارا لحاظ کر رہا ہوں میں۔ اسے سمجھاؤ۔"

"یار لاش کوئی نہیں ہے وہاں۔"

"دلاور کی لاش بھی ٹھکانے لگا دی تم نے؟" رابعہ نے [illegible] سے کہا۔

"حد کرتی ہو تم بھی۔ دلاور زندہ ہے تو لاش ٹھکانے لگانے کا سوال؟"

"ابھی تم نے کہا تھا۔"

"میں نے کہا تھا کہ وہ مارا گیا میرے ہاتھوں سے مگر پھر میں نے کوشش کی تو وہ زندہ ہو گیا۔ کیوں خادم حسین؟"

خادم حسین نے سر ہلایا "ہم ایک ڈاکٹر کو بھی اُٹھا لائے تھے آنکھوں پر پٹی باندھ کے۔"

اب میں نے انہیں ساری بات بتائی "آج صبح میں پھر اسے دیکھنے گیا تھا۔ وہ بالکل ٹھیک تھا۔"

اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے رابعہ کو اشارہ کیا اور اس نے ریسیور اُٹھا کے کہا "ہیلو۔ جی میں رابعہ قاری ہوں۔ کون' دیکھئے میں نے پہچانا نہیں۔ اچھا اچھا.... مسز دلاور۔"

میں نے رابعہ کو اشارہ کیا اور ہم نے اندر جا کے دوسرے فون کا بٹن دبا دیا۔

"جی میں نے پڑھ لیا وہ خط۔"

"وہ تمہارے نام تو نہیں تھا۔"

"اس کے باوجود میں نے پڑھ لیا تو کوئی قانونی جرم نہیں کیا۔ یہ معاملہ ہے میرے اور سکندر کے درمیان۔ مجبوری یہ ہے کہ خط سکندر کو پہنچایا بھی نہیں جا سکتا۔ معلوم نہیں وہ کہاں ہے۔"

"تم جھوٹ بول رہی ہو۔"

"اصولاً بات یہاں ختم ہو جانی چاہیے لیکن میں ایک موقع دے رہی ہوں تمہیں کہ جو کہنا ہے اور جس بات کے لیے تم نے فون کیا ہے کہہ دو۔"

"اس خط کے بارے میں مجھے کچھ نہیں کہنا ہے۔ مجھے کیا معلوم اس میں کیا لکھا ہوا تھا۔"

"مسز دلاور۔ خط پہنچانے والا تمہارا اپنا بیٹا تھا۔ تم نے اسے بروقت پہنچ کے بچا لیا ورنہ اب تک وہ سب بتا چکا ہوتا کہ خط اس کے پاس کہاں سے آیا تھا اور اسے کس نے یہ خط ڈلیور کرنے کو کہا تھا۔ اس خط کی اصل کہاں ہے؟"

"میری سمجھ میں تمہاری کوئی بات نہیں آ رہی ہے۔ تم میرے کس بیٹے کا ذکر کر رہی ہو؟"

"میں فیصل کی بات کر رہی تھی جو آج صبح فوزیہ کے خط کی نقل دے گیا تھا۔"

"عدالت میں.... وہاں تو ثبوت کے بغیر کوئی بات اہمیت نہیں رکھتی۔ یہ محض میرا شک ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کسی حادثے کا شکار ہو گیا ہو۔"

"حادثہ یا سازش۔ دشمنی اور رقابت۔ انتقام یا شامت اعمال۔ دلاور جیسے لوگوں کی موت کے بہانے کم نہیں ہوتے۔"

"قیامت کہو۔ وہ زندہ ہے۔"

"ہاں۔ مجھے بھی یقین ہے کہ وہ زندہ ہے لیکن مجھے یہ بھی یقین ہے کہ وہ زیادہ عرصہ روپوش نہیں رہ سکے گا۔ بہت جلد اسے اپنے ہر جرم کی سزا بھگتنے کے لیے عدالت میں پیش کیا جائے گا۔ اس طرح کہ دلاور کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ہو گی اور وہ مجرموں کے کٹہرے میں۔"

"یہ غلط فہمی ہے تمہاری۔ مجرم اگر دلاور ہے تو اس سے بڑا مجرم سکندر ہے۔ دلاور مفرور ہے تو سکندر بھی روپوش ہے۔ جتنے الزام دلاور پر لگائے گئے ہیں اس سے دس گنا جرم سکندر کے ہیں۔ پھر سزا ایک کو کیسے ہو سکتی ہے۔ جیل جائیں گے تو دونوں' پھانسی پہلے سکندر کو ہو گی۔"

"بکواس بند کرو اپنی۔" رابعہ نے برہمی سے کہا۔

"یہ بکواس نہیں ہے رابعہ بیگم۔ اگر میں بیوہ ہوئی تو تم سہاگن ہی نہیں بنو گی۔ دولت کی بات چھوڑو۔ وہ بھی تم سے کہیں زیادہ ہے میرے پاس' میرا اصل سہارا ہوں گی دلاور کی نشانیاں۔ میرے بیٹے تمہارے پاس کیا ہو گا وکیل صاحبہ۔ بدنامی کے سوا۔"

"تم ذاتیات پر اُتر آئی ہو.... مجھے رشتوں کی کمی نہیں۔"

"ہاں۔ ایک خصم کر کے چھوڑ دیا۔ دوسرے کو یار بنا کے رکھا اس کے بعد تو ہر رات نیا رشتہ ملے گا تجھے فاحشہ۔"

"شٹ اپ ذلیل عورت" رابعہ نے چیخ کے کہا اور ریسیور پٹخ دیا مگر اندر والے فون پر دلاور کی بیوی کی آواز آتی رہی۔

"یہ راتوں کے یار وفادار نہیں ہوتے۔ ان پر بھروسا مت کرنا۔ تیرا مقابلہ اب مجھ سے ہے۔ دلاور کی بیوی سے۔ تُو نے دیکھا ہے میرے فیصل کو۔ وہ دوسرا دلاور ہے۔ وہ دلاور کا وارث ہے۔ تجھے اپنی داشتہ بنا لے گا۔"

میں نے بٹن دبا کے لائن کاٹی اور باہر لپکا۔ رابعہ صوفے پر گر کے غصے اور احساسِ ذلت سے کانپ رہی تھی۔

"میں چھوڑوں گی نہیں اس کو...."

منظر نے کہا "پاگل مت بنو۔ وہ ایک جاہل عورت ہے۔ بکنے دو اسے۔"

میں نے کہا "اس کا تو مقصد ہی تمہیں گالیاں دینا تھا۔ تمہیں اپنے جذبات پر کنٹرول رکھنا چاہیے۔"

خادم حسین نے فوراً پانی کا گلاس پیش کیا "یہ لیں جی۔ پہلے سو تک گنیں' پھر اللہ کا نام لے کر پانی پی لیں۔ بڑا مجرب نسخہ ہے۔"

رابعہ نے اسے گھور کے دیکھا لیکن گلاس لے لیا۔ وہ پانی پینے

"کون فوزیہ؟"

"چھوڑو یہ بات مسز دلاور۔ فیصل نو بجے کے بعد آیا تھا اور میرے آفس میں چوکیدار کے سامنے بہت اکڑ فوں دکھا رہا تھا۔ بچہ سمجھ کے اسے چھوڑ دیا..."

"لیکن فیصل تو اسکول میں تھا نو بجے۔ اسکول آٹھ بجے لگتا ہے اس کا۔ تم معلوم کر سکتی ہو۔"

رابعہ نے تلخی سے کہا "اب میں کہوں گی کہ تم نیلے رنگ کی ایک فاکس ویگن میں آئی تھیں جسے استاد پیڈرو چلا رہا تھا تو تم کہو گی کون استاد پیڈرو۔ فیصل کی اسکول میں اور تمہارے گھر میں یا کسی اور کے ساتھ موجودگی ثابت ہو جائے گی مگر یہاں جو کچھ ہوا اس کا گواہ کوئی نہیں۔ سوائے ایک غریب چوکیدار کے جس کی گواہی بھی معتبر نہیں سمجھی جائے گی۔ خیر' یہ بتاؤ کہ تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟"

"دیکھو میری طرح تم بھی ایک عورت ہو مگر ابھی ایک فرق ہے تمہاری اور میری حیثیت میں' تم ابھی بیوی اور ماں نہیں بنی ہو۔ میں اپنے شوہر کے لیے اور بچے اپنے باپ کے لیے بہت پریشان ہیں۔ خدا کے لیے ہم پر رحم کرو۔"

"میں کیا مدد کر سکتی ہوں تمہاری؟"

"اگر تمہیں معلوم ہے کہ چوہدری دلاور کہاں ہے..."

"مجھے معلوم نہیں اور معلوم ہوتا تب بھی تمہیں یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ میں تم کو بتاؤں گی۔ اگر تم اتنا احمق سمجھتی ہو مجھے تو یقیناً افسوس کی بات ہے میرے لیے۔"

"دلاور کے خلاف قتل کا مقدمہ تم نے درج کرایا تھا......؟"

"مدعی صرف میں نہیں تھی۔ میرے ساتھ دس وکیل اور بھی ہیں۔"

"مگر ابتدا تم نے کی تھی۔ آج ایک اور مقدمہ بنا دیا گیا ہے اس پر کہ وہ غالب اور نازو کے اغوا کا ذمے دار ہے۔ جس آدمی کا کسی کو علم ہی نہیں کہ وہ کہاں ہے' زندہ بھی ہے یا نہیں' وہ اغوا کے جرم میں کیسے ملوث ہو سکتا ہے۔"

"دلاور خود کچھ نہیں کرتا خاتون۔ دوسروں سے سب کچھ کرواتا ہے۔ تم اتنی بھولی نہیں ہو کہ تمہیں یہ سب بتانا ضروری ہو۔ مجھے تو یقین ہے کہ یہ فون بھی تم نے دلاور کے کہنے پر کیا ہے۔ شاید وہ تمہارے قریب ہی موجود ہے یا تم وہاں ہو جہاں وہ روپوش ہے۔ تم بھی جانتی ہو اور ہم بھی جانتے ہیں کہ وہ کتنا بڑا ڈرامے باز ہے لیکن اس کے سب ڈرامے فلاپ ہو گئے ہیں اور اب کوئی ڈراما چلنے والا نہیں ہے۔ پولیس اسے برآمد کر لے گی وہ جہاں بھی ہو گا' ممکن ہے خود تم سے' دلاور کے ولی عہد بہادر سے تفتیش کی جائے۔ کیا تمہیں اندازہ ہے کہ تفتیش کیسے ہوتی ہے؟"

وہ رونے لگی "یقین کرو مجھے کچھ نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے۔ اگر تمہیں معلوم نہیں تو پھر پولیس نے اسے غائب کیا ہے۔"

"یہ بات تم عدالت میں کہہ سکتی ہو؟"

ہی والی تھی کہ خادم نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا "ایسے نہیں جی۔"

میں نے کہا "ہاں، پہلے گِنتی۔"

منظر نے مجھے حیرانی سے دیکھا "ابے تو بھی باؤلا ہو گیا ہے۔"

"نہیں۔ خادم ٹھیک کہتا ہے۔ میں تجربہ کر چکا ہوں۔ تم 'آن' دل ہی دل میں سو تک گنو۔"

رابعہ نے ایک گہری سانس لی اور ایک منٹ بعد پانی پی کے مسکرانے لگی کیونکہ میں اور منظر دونوں ہی اسے غور سے دیکھ رہے تھے جیسے خادم حسین کے تجربے کی کامیابی یا ناکامی کا حتمی فیصلہ اب ہو گا۔

خادم حسین کا چہرہ چمک اُٹھا۔ "دیکھا جی آپ نے۔ کیسی تاثیر ہے میرے وظیفے میں۔ ایک دم مسکرانے لگی ہیں دیبا کی طرح۔"

"دیبا کے بچے" منظر بولا "چکر دیتے ہو ہمیں۔ قسم کھا کے کہو تم وظیفہ پڑھتے ہو۔"

خادم سر کھجانے لگا "وہ جی۔ قسم کھانا کیا ضروری ہے؟"

میں نے کہا "ہمیں معلوم ہے خادم حسین کہ موڈ بدلتا ہے سو تک گنتی گننے سے۔ دھیان بٹ جاتا ہے آدمی کا۔"

"دلاور کی بیوی خطرناک عورت ہے۔" رابعہ بولی۔

"سانپ کے بارے میں کیا مشہور ہے۔ جوڑے میں سے ایک کو مار دو تو دوسرا پیچھا نہیں چھوڑتا اور سانپ کا بچہ سنپولیا ہی ہوتا ہے۔ وہ بھی بدلہ ضرور لیتا ہے" میں نے کہا۔

"یہ سب جہالت کی بات ہے۔ نہ آدمی سے زیادہ کینہ پرور کوئی جانور ہے اور نہ خطرناک چیز۔ دلاور کی بیوی چالاک بنتی ہے مگر ہے احمق۔ اس نے ظاہر کیا کہ اسے خط کے بارے میں کچھ پتا نہیں مگر توقع اسے یہ تھی کہ ہم فوزیہ کے مسئلے پر تشویش کا اظہار کریں گے اور اسے ذریعہ بنا کے دھمکیاں دینے والوں سے تحفظ حاصل کرنے کی درخواست کریں گے مگر ہم نے بڑی سمجھ بوجھ کا ثبوت دیا اور اسے گھاس نہیں ڈالی۔"

"بے وقوف عورت خط کے بارے میں سوال کر رہی تھی کہ تم نے پڑھا اور یہ بھی ظاہر کر رہی تھی کہ اسے خط کے بارے میں کچھ پتا نہیں پھر یہ کیسے جان لیا اس نے کہ وہ میرے نام تھا" میں نے کہا۔

"بس یار۔ اس وقت ہم یہ گفتگو ریکارڈ نہیں کر سکے ورنہ اپنے چوہدری دلاور کو سنواتے کہ لو سنو اپنی بلبل کی آواز۔" منظر بولا "اچھا اب ہم تو جاتے ہیں کورٹ۔ تم جاوید صدیقی سے مل لو۔"

"بھئی تم اپنی گاڑی سے جاؤ" میں نے رابعہ سے کہا "ہر جگہ پہچانی جاتی ہے۔ اس کا رنگ ہی ایسا ہے۔"

"کیسا ہے؟" رابعہ نے بُرا مان کے کہا "اتنا اچھا رنگ تو ہے۔"

"میں خراب کب کہہ رہا ہوں۔ بالکل لال سالن کے عروسی جوڑے میں لپٹی ہوئی دلہن لگتی ہے مگر لال جوڑا پہن کے دلہن انار کلی میں گھوم رہی ہو تو ہر نظر اُٹھتی ہے۔"

منظر بولا "جیسے شبِ عروسی کے بعد تم اپنے لال جوڑے ... کورٹ پہنچ جاؤ تو مدعی ملزم جج سب پر سکتہ طاری ہو جائے۔"

رابعہ نے غصے سے کہا "آپ واقعی واہیات آدمی ہیں ... ٹھیک کہتا ہے۔"

منظر ہو ہو ہو کر کے ہنسنے لگا۔ "مولوی کو غلط کون کہہ سکتا ہے بھائی۔ فوراً کافر ہونے کا فتویٰ لگا دے گا۔ مولوی تمہیں دیبا ... لگتی ہے؟"

خادم چونکا "لاحول ولا قوۃ۔"

"پھر اس کی مسکراہٹ کی مثال کیوں دی تھی؟" منظر نے اسے ڈانٹا۔

جب وہ چلے گئے تو میں نے آفس کو لاک کیا اور خادم ... کے ساتھ نیچے اُتر گیا۔

خادم نے ایک دم مجھے کہنی ماری "وہ جی۔ اُدھر..."

میں نے کہا "کیا بات ہے۔ یہ کوئی غیر ملکی ٹورسٹ میم ہے ... تو ہوتی ہی بے حیا ہیں۔ تم مت دیکھو اُدھر۔ سب کچھ نظر آ رہا ... اس عالم کم لباسی میں۔"

"آپ بھی ایسی باتیں کرنے لگے ہیں جی۔" مولوی نے ... سے کہا "میں تو اس گاڑی کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔"

سڑک کے دوسرے کنارے پر بہت سی کاروں کے درمیان وہی فاکس ویگن موجود تھی جس کو کل سے اب تک میں کئی ... دیکھ چکا تھا۔ پہلی بار اس میں تازو نظر آئی تھی تو میں اور خادم ... جگہ کھانا کھا رہے تھے پھر ہم نے اسے پولیس ہیڈ آفس کے باہر ... تھا۔ اس کے بعد رات کو اسی کار نے ہمارا تعاقب کیا تھا اور صبح اس میں دلاور کی بیوی اپنے بیٹے کے ساتھ آئی تھی۔ ڈرائیور ... سیٹ پر ہر بار مجھے استاد پیڈرو ہی نظر آیا تھا۔

اتنی دور سے خادم کی دوربین نگاہوں نے کار کو پہچان لیا ... میں نے کہا "ظاہر یہ کرو کہ ہم نے کچھ نہیں دیکھا۔"

خادم حسین کی نظر اس میم کو دیکھ رہی تھی جس نے لباس ... نام پر چار گرہ کپڑے کو بدنام کیا تھا اور اس کے گورے بدن کی ... و تاب نے ہر نگاہ کو خیرہ کر دیا تھا۔ ایک موٹر سائیکل والا فٹ ... چڑھ گیا۔ ایک تانگے والے نے نعرہ لگایا "اوئے صدقے ... توں" خادم حسین اپنے ہی حلیے کے ایک زیادہ کیم شحیم نمونے ... ٹکرا گیا۔ ظاہر ہے وہ بھی سامنے نہیں دیکھ رہا تھا۔

میں نے اس کی گردن پر ہاتھ رکھا "خادم حسین۔ کیا ... ہے تمہارا، دوسری شادی ایسی ہی کسی فرنگن سے کرا دوں؟ ... جانے والی ہیں۔"

وہ جز بز ہو کے بولا "لاحول ولا قوۃ جی۔"

"لاحول پڑھتے جاتے ہو مگر خود بھٹکنا چاہتے ہو۔ اس کار ... دیکھ سکتے ہو؟ یا ڈرائیور نظر آ رہا ہے تو بتاؤ۔"

شاہد علی نے کہا "مولوی۔ ایک بار میں باہر آ جاؤں، پھر..."

"پھر کیا ہو گا۔ بڑے بول مت بولو۔ کیا پتا تم باہر ہی نہ آؤ۔ یا آ تو دوسروں کے لیے عبرت بن جاؤ۔" خادم حسین نے کہا۔

ظفر حیات کچھ نہیں بولا۔ وہ غالباً رو تا بھی رہا تھا۔ یہ فرق عہدے کا نہیں احساس کی شدت کا تھا اور تعلیم کے فرق کا تھا۔ شاہد علی نیچے سے اوپر تک دھکے اور رگڑے کھاتا، ذلیل کرتا اور ذلیل ہوتا تیس برس میں اس عہدے تک پہنچا تھا۔ ظفر حیات اچھے خاندان اور اعلیٰ تعلیم کے ساتھ براہِ راست افسری کے منصب پر فائز ہوا تھا۔ اس نے صرف عزت دیکھی تھی اور یہ سزا اس کے لیے شرمناک تھی جب کہ شاہد علی اس طبقے سے تھا جس کے نزدیک پیسہ زیادہ اہم ہوتا ہے۔ عزت اور شرم آنی جانی چیز ہے۔

جاوید صدیقی اپنے آفس میں تھا اور خصوصی ٹیم کے دیگر ارکان کانفرنس میں شریک تھے۔ وہ سب آپس میں آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی جاوید صدیقی مستعد ہو گیا۔ اس نے اپنے ماتحتوں کو خبردار کرنے کے انداز میں کہا "دیکھو ذرا سنبھل کے" اور پھر مسکراتا ہوا مجھ سے ہاتھ ملانے کے لیے آگے آیا۔

"میں آپ ہی کا منتظر تھا۔" اس نے بڑی شائستگی سے کہا "میری آج صبح منظر صاحب سے بھی بات ہوئی تھی اور مس رابعہ قاری سے بھی۔"

مولوی نے میری طرف سے جواب دیا "وکیل صاحب فرماتے ہیں کہ آج سب کا رویہ بدلا ہوا دیکھ کے انہیں لگتا ہے، وہ راتوں رات کسی اور ملک میں پہنچ گئے ہیں۔"

جاوید صدیقی مسکراتا رہا "انشاء اللہ اب کسی کو شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔ ہم نے ڈاکٹر شبلی کی پوسٹ مارٹم رپورٹ مانگی تھی مگر مجھے یہ جان کے تعجب ہوا کہ اس کیس میں واقعی پوسٹ مارٹم نہیں ہوا۔ یہ بہت بڑی بے قاعدگی ہے اور ہم یہ یقین کرنے پر مجبور ہیں کہ ایسا کسی گھپلے کو چھپانے کے لیے کیا گیا تھا۔"

میں نے خادم کو سمجھایا "اسے بتاؤ کہ کس طرح اسپتال سے لاش چوری ہوئی تھی اور ڈاکٹر شبلی کو ایک بڑھیا کی جگہ دفن کر دیا گیا تھا۔ بڑھیا کا شوقین مزاج پوتا اس سازش میں شریک ہو گیا تھا چنانچہ کسی کو پتا نہیں چل سکا تھا کہ جنازہ بڑھیا کا نہیں، دفنانے والے ڈاکٹر شبلی کو دفنا آئے تھے۔ کسی نے اس کا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ ڈاکٹر شبلی کہیں اور دفن ہے مگر یہ بات صرف گورکن جانتا تھا جسے قتل کر دیا گیا ہے۔"

"او مائی گاڈ!" جاوید صدیقی نے سر پکڑ کے کہا "یہ بڑی عجیب کہانی ہے مگر کیا ثبوت ہے اس کی صداقت کا۔"

"یہ سب عدالت سے دوبارہ پوسٹ مارٹم کی اجازت کی درخواست میں بتایا گیا ہے۔ کیا ایس پی صاحب نے یہ درخواست

خادم نے نظر جما کے دیکھا اور ایک ایک کر کے نمبر پلیٹ کے سارے حروف اور اعداد دُہرا دیے۔ اس کی نظر واقعی عقابی تھی۔

"ڈرائیور آس پاس تو نظر نہیں آ رہا ہے۔ ہاں، وہ رہا.... پان سگریٹ کی دُکان پر کھڑا ہوا ہے؟ ہماری طرف پیٹھ کیے۔ وہی کالے منہ والا ہے۔"

"اس نے پہلے دیکھ لیا ہو گا ہمیں۔ خیر، تم کوئی ٹیکسی روکو، پولیس ہیڈ آفس جانے کے لیے۔" میں نے کہا۔

حسبِ توقع نیلے رنگ کی فاکس ویگن نے ہمارا پیچھا کیا۔ اتفاق سے ٹیکسی کا بیک ویو مرر کا رُخ ایسے تھا کہ میں بھی پیچھے کا ٹریفک دیکھ سکتا تھا حالانکہ میں پچھلی سیٹ پر تھا۔ ڈرائیور کے لیے اس کا رُخ یقیناً غلط ہو گا مگر اسے پروا نہیں تھی۔ وہ سڑک پر دوسروں کی پروا کیے بغیر اپنی مرضی سے چلتا تھا اور قاعدے قانون سے بھی بے نیاز تھا۔

ایک بار میں نے اسے ٹوکا "یہ تم کیا کر رہے ہو۔ سگنل توڑا ہے تم نے۔"

"پھر کیا ہوا بادشاہو۔ توڑنے والوں نے تو سب کچھ توڑ دیا" وہ سرد آہ بھر کے بولا "نیلو نے میرا دل توڑ دیا۔ میں تو ابا کو ساتھ لے کر گیا تھا شادی کا پیغام دینے پھر اس کے چوکیدار نے ابا کا چشمہ توڑ دیا اور میرا بازو۔ مہینہ بھر پلستر میں رہا۔ ادر جی اس بات پر میری بہن کا رشتہ توڑ دیا میرے ماما نے۔ چور تالے توڑتے ہیں۔ مجرم جیل توڑتے ہیں اور توڑنے والوں نے تو یہ ملک توڑ دیا۔ ہم نے سگنل توڑ دیا تو آپ گرم ہو رہے ہیں۔"

مجھے ہنسی بھی آئی اور غصہ بھی آیا کیونکہ وہ باتونی بلکہ بکواسی شخص خطرناک طریقے پر گاڑی چلا رہا تھا۔ یہ دوسرے لوگوں کا کمال تھا کہ وہ بچ گئے اور حادثہ نہیں ہو سکا۔ پولیس ہیڈ آفس کے دروازے پر اُتر کے میں نے اسے کرایہ ادا کیا "اگر اس وقت میں تم کو اندر لے جاؤں تو توڑنے والے تمہاری ہڈیاں توڑ دیں گے اور تم کو حوالات میں ڈال دیا تو تم زنجیریں اور سلاخیں نہیں توڑ سکو گے۔ تمہارے ساتھ ہم بھی مارے جاتے۔"

"لو جی۔ بندہ کبھی تو مارا جاتا ہے۔ ٹرین اُلٹ جاتی ہے۔ جہاز گر جاتا ہے۔ مرنے سے کیا ڈرنا۔" اس نے سلیوٹ کے انداز میں سلام کیا، نوٹ جیب میں رکھا اور باقی رقم دیے بغیر بھاگ گیا۔

جاوید صدیقی کے پاس جانے سے پہلے میں نے حوالات کو ملاحظہ فرمایا۔ وہاں ٹوٹے پھوٹے خستہ تن مجرموں کے درمیان سابق ایس ایس پی ظفر حیات اور ڈی ایس پی شاہد علی بھی سر جھکائے بیٹھے تھے۔

خادم کے ساتھ مجھے دیکھتے ہی شاہد علی گالیاں بکنے لگا "دفع ہو جاؤ...."

خادم نے کہا "عقل نہیں آئی ابھی تمہیں۔ سوچو کیا دعوے کر رہے تھے تم۔ مجھے بند کرنے کی دھمکی دے رہے تھے۔"

ملاحظہ نہیں کی۔"
"اتفاق سے مجھے ابھی تک موقع نہیں ملا۔"
"عدالت سے اس کی اجازت مل چکی ہے اور شیلی کی قبر کا سراغ بھی لگالیا گیا ہے مگر قبل از وقت اس کا انکشاف نہیں کیا جاسکتا ورنہ اندیشہ یہ ہے کہ بااثر ملزم وہاں سے لاش کھود کے لے جائیں گے اور ہمیشہ کے لیے غائب کردیں گے۔"
"ہم وہاں مسلح پہرا بٹھا سکتے ہیں۔"
"مسلح گارڈز کی زندگی داؤ پر لگانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ بہتر ہے کہ دیگر انتظامات مکمل ہوتے ہی میڈیکل بورڈ کے ارکان' مجسٹریٹ اور مسلح گارڈز قبرستان کا رُخ کریں۔ قبر کی نشاندہی کردی جائے گی۔"
"کیا وکیل صاحب بھی جانتے ہیں کہ قبر کہاں ہے؟"
"وکیل صاحب نے سُنا ہے کہ قبر کے بارے میں دلاور کیس کے مدعی جانتے ہیں۔"
"کیس میں اب گیارہ مدعی ہیں۔"
"انہی میں سے کسی کو معلوم ہوگا۔ یا شاید کسی صحافی کو بھی علم ہو۔"
"کل یہاں ایک صحافی موجود تھا۔ مرزا غالب۔ مجھے پتا چلا ہے کہ باہر نکلتے ہی اسے اُٹھالیا گیا۔"
"آپ نے بالکل ٹھیک سُنا ہے۔ اغوا کرنے والوں کی نشاندہی کردی گئی ہے۔ گاڑی کا نمبر اور دیگر تفصیلات بھی فراہم کی جاسکتی ہیں۔"
"ایف آئی آر میں سب ہے۔"
"پھر کیا وہ گاڑی پولیس کی تحویل میں لے لی گئی ہے؟"
"معلوم کیا جارہا ہے کہ وہ گاڑی کس کی ہے۔"
"وہ گاڑی غالباً باہر موجود ہے۔ ایک ملزم نے اسی میں ہمارا تعاقب کیا تھا۔ ممکن ہے پولیس ہیڈ آفس تک آکے وہ سیدھا نکل گیا ہو۔"
جاوید صدیقی نے بڑی پُھرتی دکھائی اور انسپکٹر کو حکم دیا کہ وہ فوراً دیکھے اور گاڑی موجود ہو تو اسے قبضے میں لینے کی بھرپور کارروائی کرے' ملزم کو زندہ پکڑنا ضروری ہے مگر وہ مزاحمت کرے یا فرار ہونے کی کوشش کرے تو اسے بے دریغ گولی ماردی جائے۔
"مارنے کے لیے گولی نہ ماری جائے۔ پکڑنے کے لیے ماری جائے" خادم نے کہا اور میں حیران رہ گیا کیونکہ یہی بات میں کہنا چاہتا تھا مگر اپنے طور پر کہتا تو یہ ظاہر ہوجاتا کہ میں جاوید صدیقی کی بات سمجھ رہا تھا۔
جاوید صدیقی نے غور سے خادم حسین کو دیکھا "اب تک سُنا تھا کہ قاضی کے گھر کے چوہے بھی سیانے ہوتے ہیں۔ آج دیکھ لیا' تم تو اس وکیل سے بھی زیادہ ہوشیار ہو۔"
"وکیل باہر سے آیا ہے جی۔ ہم اسی ملک میں رہتے ہیں۔ یہ اکثر سُنا ہے کہ جب کوئی مجرم جو پولیس سے ملا ہوا ہو خطرناک ہوجائے اور یہ اندیشہ ہو کہ گرفتاری کی صورت میں وہ پول کھول دے گا تو اسے ہمیشہ کے لیے خاموش کردیا جاتا ہے۔ عذر ہمیشہ تین ہوتے ہیں۔ ملزم نے حوالات میں اپنی شلوار کے ازار بند سے خودکشی کرلی۔ اس نے پولیس پر فائرنگ کی اور گرفتاری میں مزاحمت کی۔ اس نے فرار ہونے کی کوشش کی۔"
"تمہارا نام کس نے تجویز کیا تھا۔ بطور مترجم؟"
"منظر اور غالب صاحب نے۔ انہیں معلوم تھا کہ میں فرنچ جانتا ہوں۔"
"تم اس کے علاوہ بھی بہت کچھ جانتے ہو۔ اس غیر ملکی وکیل کو انہی باتوں سے ہمارے خلاف مت کرنا ورنہ...."
"دیکھیں جی ایسی دھمکیاں مجھے ظفر حیات اور شاہد علی بھی بہت دیتے تھے۔ ورنہ کا لفظ بہت استعمال کرتے تھے مگر میں صاف بتادوں کہ میں اپنا کام دیانت داری سے کرتا ہوں۔ نہ کسی کو ورغلاتا ہوں' نہ کچھ چھپاتا ہوں اور نہ کسی کی دھمکی سے ڈر کے وہ بات بتاتا ہوں جو میرے وکیل کو دورانِ تفتیش معلوم ہو۔ اسے میرے ذریعے بتائی جائے اور جس کا افشا کرنا استغاثہ کے مفاد میں نہ ہو۔"
میں نے فرنچ میں کہا "خود بولے جارہے ہو۔ کچھ مجھ سے بھی کہو۔ تاکہ میں تمہیں سپورٹ کرسکوں۔"
خادم حسین نے ایک جذباتی تقریر کی اور کہا کہ رازداری بعض اوقات وفاداری کی شرط ہوتی ہے اور یہ وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے۔ میں نے اس کی پیٹھ پر تھپکی دی۔
"اب ان کو سمجھادو کہ وکیل صاحب کیا فرماتے ہیں۔ اگر تمہیں کسی نے ٹیڑھی نظر سے بھی دیکھا تو ہم اسے ہمیشہ کے لیے بھینگا کردیں گے۔ وہ ساری عمر سب کو ٹیڑھی نظر سے دیکھے گا۔"
انسپکٹر نے بڑی مستعدی دکھائی تھی مگر وہ تھوڑی دیر بعد ہی منہ لٹکائے واپس آگیا "باہر تو ایسی کوئی گاڑی موجود نہیں سر۔"
"کہاں تک دیکھا تم نے؟ کسی سے پوچھا؟"
"میں نے دونوں طرف پولیس کی نفری کھڑی کردی ہے۔ سادہ لباس میں کہ پھر گاڑی نظر آئے تو روک لیں۔"
"اب وہ ہر شریف آدمی کو پریشان کریں گے جو نیلے رنگ کی فاکس ویگن میں گزرے گا۔ ابھی تک پتا نہیں چلا کہ گاڑی کس کی ہے۔ ملزم اسی میں دندناتا پھر رہا ہے۔"
ڈی ایس پی آفتاب نے وضاحت کی "یہ نمبر غالباً بوگس ہوگا۔"
"پھر بھی۔ پتا تو چلے کہ کسے دیا گیا تھا۔"
ایک کانسٹیبل نے اوپر آکے سلیوٹ کیا اور صاحب کے سامنے ایک سلپ رکھ دی۔
"اسے اندر بُلاؤ۔"
ایک شخص سخت برہمی کی کیفیت میں اندر آیا "واٹ از آل تھی۔ اتفاق سے آج ایم ایس صاحب بھی بارہ اور ایک کے درمیان دستیاب ہیں۔ میں نے قبرستان کے گورکن کو طلب کیا تھا۔"
"وہ لڑکا باہر بیٹھا ہے سر" انسپکٹر نے کہا۔
"کیا کہتا ہے وہ۔ قبر کی نشاندہی کرسکتا ہے؟"
"وہ تو برابر انکار کررہا ہے کل سے۔" ڈی ایس پی نے کہا۔
"کل سے؟" میں نے فرنچ میں خادم سے کہا "کیا یہ لوگ رات بھر اس سے یہی معلوم کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔"
"اسے لاؤ میرے سامنے" جاوید صدیقی نے حکم دیا۔
ایک دُبلے پتلے سوکھے اور بیمار نظر آنے والے لڑکے کو اندر لایا گیا جو اپنے پیروں پر کھڑا بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ اس نے اندر آتے ہی دھاڑیں مار مار کے رونا شروع کردیا۔ پولیس نے واقعی اسے رات بھر "بڑی احتیاط" سے مارا تھا۔ بے احتیاطی سے تفتیش کے نتیجے میں اس کا باپ ضائع ہوگیا تھا اور یہ کیس بڑی مشکل سے دبایا گیا تھا۔
"چُپ کرکے سیدھا کھڑا ہو...." انسپکٹر نے گرج کے کہا "کیا سمجھایا تھا تیرے کو۔ افسروں کے سامنے تمیز سے بات کرتے ہیں۔"
"تم نے میرے باپ کو ایسے ہی مار ڈالا تھا۔ مجھے بھی مار ڈالو۔ میں کیسے بتاؤں وہ بات جو مجھے معلوم ہی نہیں۔"
خادم نے کہا "ڈرنہ نہیں تے۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ وکیل صاحب بیٹھے ہیں یہاں اور لوگ بھی آنے والے ہیں۔ انہیں سب بتانا۔"
"اسے لے جاؤ اور چھوڑ دو۔ یہ واقعی کچھ نہیں جانتا" جاوید صدیقی نے صورتِ حال کو سمجھتے ہوئے کہا۔
میں نے خادم سے کہا "ان سے کہو کہ گورکن کو روک لیں۔ یہ ہمارے ساتھ ہی جائے گا۔"
"جانے دیں جی غریب کو۔"
"تم نہیں سمجھتے خادم۔ یہ چھوڑنا کیا ہے۔ یہاں سے نکل کے یہ گھر نہیں پہنچے گا۔ شرط لگالو۔ یہ غائب ہوجائے گا اور کہا جائے گا کہ وہ ڈر کے بھاگ گیا۔ یا اسے حادثہ پیش آجائے گا اور بعد میں پتا چلے گا کہ یہ شراب کے نشے میں دھت سڑک کے بیچ میں چل رہا تھا۔ اس کی چال بتاتی تھی کہ یہ ہوش میں نہیں تھا۔ اصل وجہ بتانے والا کون ہوگا پھر....؟"
خادم نے میری بات آگے پہنچادی "وکیل صاحب چاہتے ہیں کہ اس گورکن کو پولیس اپنی تحویل میں بحفاظت رکھے۔ جب تک پوسٹ مارٹم ختم نہیں ہوتا۔ اندیشہ یہ ہے کہ اسے بھی ماردیا جائے گا۔"
جاوید صدیقی نے کہا "تمہارے وکیل صاحب کس حیثیت میں یہ درخواست کررہے ہیں؟"
"یہ برطانیہ سے خاص طور پر تفتیش میں شامل رہنے کے لیے دس۔ مجھے آفس میں اتنی اہم میٹنگ سے کیوں تھانے لایا گیا ہے؟"
"یہ تمہاری گاڑی کا نمبر ہے؟" جاوید صدیقی نے کہا۔
"ہاں مگر کل سے اب تک میں یا تو اسپتال میں تھا یا گھر میں۔"
"اس کار کا نمبر ایک ایف آئی آر میں لکھوایا گیا ہے۔"
اچانک خادم بولا "ڈاکٹر صاحب۔ کیا نیلی فاکس ویگن ہے آپ کی؟"
"نیلی فاکس ویگن۔ باہر جاکے دیکھ لو۔ اس سے چار گنا لمبی شیورلٹ بلیزر ہے۔"
"نہیں دکھائیں جی۔ اصل کار تو نیلی فاکس ویگن ہے۔"
جاوید صدیقی نے کہا "مگر نمبر تو یہی ہے۔"
"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ کل کسی قتل یا ڈکیتی میں کوئی بھی گاڑی استعمال ہوتی ہے' مجرم اس پر کوئی بھی بوگس نمبر پلیٹ لگالیتے ہیں' پکڑا وہ جائے گا جس کی نمبر پلیٹ اصلی ہوگی۔"
"آئی ایم سوری۔ یہ کنفیوژن دور ہوجائے پھر گاڑی آپ کو واپس مل جائے گی۔"
"کیا مطلب۔ میں گاڑی چھوڑ جاؤں؟"
"آپ ٹھیک سمجھے۔ گاڑی پولیس کی تحویل میں رہے گی فی الحال۔ آپ آزاد ہیں۔"
"نہیں' آپ مجھے بھی بند کردیں کہ گاڑی میں چلا رہا تھا۔"
ڈاکٹر سخت مشتعل تھا "مجھے ملزمان کا ساتھی بنادیں۔"
"بوگس نمبر پلیٹ والی گاڑی ملتے ہی...."
"مجھے بے وقوف مت بناؤ۔ وہ گاڑی کیسے مل سکتی ہے۔ اب تک وہ پھر نمبر پلیٹ بدل چکے ہوں گے اور آج میں یہ گاڑی تھانے میں چھوڑ گیا تو کل مجھے اس کی جگہ صرف اس کا ڈھانچا ملے گا۔"
"میں شک کی بنا پر اسے روک رہا ہوں۔"
"میں کیس کردوں گا.... تم نے کیا سمجھ رکھا ہے مجھے۔"
"جاؤ کردو۔ دھمکیاں دوگے تو تمہیں بھی بند کرادوں گا۔" جاوید صدیقی نے دھاڑ کے کہا۔
ڈاکٹر پیر پٹختا باہر چلا گیا۔ سب کچھ سمجھنے کے بعد میں نے ساری بات خادم حسین سے سُنی اور جاوید صدیقی سے واجبی سا احتجاج بھی کیا کہ یہ ایک شریف شہری کے ساتھ زیادتی ہے مگر یہاں شہری کے حقوق کون مانتا ہے اور پولیس تو شریف شہری صرف اسے سمجھتی ہے جو شرافت کی سند قیمت دے کر حاصل کرسکتا ہو یا اوپر سے شرافت کی گواہی دلوادے۔
"ہمیں احکامات موصول ہوگئے ہیں۔ آج بارہ بجے لاش کو قبر سے نکال کر قبرستان میں ہی پوسٹ مارٹم ہوگا۔" جاوید صدیقی نے کہا۔
میں نے کہا "کیا میڈیکل بورڈ تشکیل دے دیا گیا ہے؟"
"یس۔ عدالت نے پولیس سرجن کے علاوہ میو اسپتال کے ایم ایس کو سربراہ مقرر کیا ہے۔ ابھی میری مجسٹریٹ سے بات ہوئی

آئے ہیں جی اور مقتولہ کے وکیل ہیں۔ یہ تحریری درخواست بھی دے سکتے ہیں ریکارڈ پر رکھنے کے لیے۔ گورکن کی حفاظت کے ذمے دار اب آپ لوگ ہیں کیونکہ آپ ہی اسے اُٹھائے لائے تھے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ بن جانے کے بعد آپ کی ذمّے داری ختم۔"

اب جاوید صدیقی کے لیے چارہ نہ رہا کہ گورکن کی حفاظت کے لیے نہ کہے "یہ اس نے نیا جھگڑا کھڑا کردیا ہے۔ تم لوگ بھی بالکل احمق ہو۔ کسی پر بھروسا نہیں کیا جاسکتا۔ اسے خاموش رکھنا کوئی مشکل کام تھا۔ ابھی سب وکیل اور صحافی آجائیں گے تو ایک مقدمہ اور پولیس کے خلاف۔ میں پہلے سے خبردار کررہا ہوں سب کو۔ یہ نہ ہو کہ تمہارا سب کا انجام بھی وہی ہو....."

اچانک اسے خیال آیا کہ خادم حسین سب سُن رہا ہے اور وہ یقیناً یہ بات بھی فرنچ میں مجھے سمجھادے گا۔ باقی سب کے چہرے لٹک گئے تھے۔ وکیلوں اور صحافیوں نے ان کے اختیارات کو قانون کی زنجیروں میں جکڑ کے انہیں بے اقتدار کردیا تھا۔ وہ من مانی کرنے کے مجاز نہیں رہے تھے اور خود کو بہت بے عزت محسوس کررہے تھے۔

خادم حسین نے خاموش رہنے میں عافیت جانی۔ اس وقت گیارہ بجنے والے تھے اور اگر پوسٹ مارٹم کے عدالتی احکامات واقعی موصول ہوگئے تھے تو رابعہ اور منظر کے علاوہ کسی نہ کسی اخبار نویس کو بھی یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔

"یہ عجیب بے سروپا کیس ہے؟" جاوید صدیقی بولا "کل جب ہم اس کیس کے اہم ملزم چوہدری دلاور کی گرفتاری کے لیے تیار تھے تو وہ خاتون پیچھے ہٹ گئیں جو عدالتی احکامات لائی تھیں۔ انہوں نے اعتراف کرلیا کہ انہیں پوری انفارمیشن نہیں تھی اور آج جب قبر کھود کے پوسٹ مارٹم کرنے کے احکامات جاری کردیے گئے ہیں تو ابھی تک کسی کو معلوم نہیں کہ قبر کہاں ہے؟"

خادم نے مجھ سے بات کی اور میں نے کہا "پولیس کو سب معلوم ہوجائے گا۔ ساری بات وقت کی ہے۔ وکیل ذمّے دار لوگ ہوتے ہیں اور سُنی سُنائی پر عدالت سے احکامات حاصل کرنا بھی دشوار ہوتا ہے۔ ان کی عزت داؤ پر لگی ہوئی ہے۔ وہ چوہدری دلاور کی گرفتاری کو یقینی بنائیں گے اور قبر کی صحیح نشاندہی کریں گے لیکن وہ رسک نہیں لیں گے اور قبل از وقت کچھ بتانے کے لیے تیار نہیں۔"

اسی وقت رابعہ کے ساتھ دو وکیل اندر آگئے پھر منظر داخل ہوا اُس کے پیچھے ایک وحشی ریچھ ٹائپ شخص اندر آیا جس کی شخصیت کا سب سے نمایاں حصّہ اس کے بال ہی تھے۔ سر کے بال شانوں تک آرہے تھے اور انہیں شاید عید کے عید ہی دھویا جاتا تھا یا ممکن ہے جب نیا چاند نکلتا ہو تو وہ نہا بھی لیتا ہو اور بال بھی سلجھا لیتا ہو۔ یہ گرد آلود اُلجھے ہوئے بال اس کے چہرے کا احاطہ کیے ہوئے تھے۔ چہرے کے باقی حصّے پر جھاڑ جھنکار داڑھی مونچھوں کا قبضہ تھا اور جیسے خودرو جنگل کے پودے، بیلیں اور شاخیں ... میں مل جاتی ہیں ایسے ہی سر داڑھی اور مونچھوں کے بال ... ہوگئے تھے چنانچہ دو آنکھوں اور ایک ناک کے سوا چہرہ ... تھا۔ اس نے ایک رنگین مگر پُرشکن اور میلی قمیص بھی پہن ... تھی جس کا گریبان اس حد تک چاک تھا کہ اس کے سینے ... کا کھیت بھی صاف نظر آتا تھا۔ خاکی زین کی پتلون بھی وہ ... بعد اُتارنا بھول گیا تھا اور جوتوں کا یہ حال تھا کہ مجنوں کو ... نوردی کے لیے مفت دیے جاتے تو وہ معذرت کرلیتا کہ ... پاؤں ہی بھلا۔

سب سے ہاتھ ملانے کے بعد جاوید صدیقی نے قدرے ... کے ساتھ سوال کیا "یہ بالکل نئی چیز دیکھ رہا ہوں میں۔"

اس نے اعلان کے انداز میں کہا "ابھی نووارد ہونا ... دیکھا ہی کیا ہوگا تم نے ایس پی بہادر۔ اور بھی بہت کچھ دیکھو ... کرسی پر بیٹھنے والا کیا دیکھ سکتا ہے ویسے ہی۔ اپنی تو عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں جسے دنیا کہتے ہیں۔"

منظر نے کہا "یہ البرٹ چندر عاصی ہیں۔"

"واٹ؟" ایس ایس پی کی حیرانی کا ردِ عمل فطری تھا "البرٹ چندر عاصی!"

منظر نے بتایا "یہ ایک جینئس ہیں۔"

"وہ تو ان کے حُلیے سے ظاہر ہے" ایس ایس پی نے طنزاً ...

"ویسے کرتے کیا ہیں؟"

"یہ پوچھو کہ کیا نہیں کرتے۔ رپورٹر، فوٹو گرافر، ایڈیٹر سب کچھ ہیں۔ جرنلزم میں ایم اے کرچکے ہیں۔ شاید آپ کو یاد ہو اس واقعے کی اخبار میں بڑی تشہیر ہوئی تھی۔ ایک شخص نے کانووکیشن میں ایک وی وی آئی پی سے ڈگری وصول کرنے کے بعد اسٹیج پر مائک سنبھال لیا تھا اور کہا تھا کہ آپ سب گواہ ہیں۔ میں نے ڈگری وصول کی لیکن ڈگری یہ نہیں، یہ کاغذ کا ایک ٹکڑا ہے۔ ڈگری میں ہوں اور ڈگری میرے سر میں محفوظ ہے۔ میں ماسٹر آف جرنلزم نہیں، کبھی نہ کوئی ہوا نہ ہوگا۔ میں ہمیشہ طالب علم رہوں گا۔ پھر اس نے ڈگری سب کے سامنے پُرزہ پُرزہ کرکے اُچھال دی تھی اور اسٹیج سے اُتر گیا تھا۔ یہی ہے وہ چیز۔"

ایس ایس پی کے علاوہ خود میں بے حد متاثر ہوا تھا۔ آج تک اس شہر میں رہنے کے باوجود نہ میں نے اس کا ذکر سُنا تھا، نہ کبھی اس سے ملا تھا۔

جاوید صدیقی نے نسبتاً احترام آمیز لہجے میں کہا "کس اخبار سے منسلک ہیں آپ؟"

"زندگی کے اخبار سے" عاصی نے ڈرامائی لہجے میں کہا۔

منظر نے وضاحت کی "مستقل یہ کہیں نہیں رہتے۔ سال میں چھ مہینے تو جیل میں گزارتے ہیں کیونکہ خطرناک قسم کا سچ بولتے ہیں جو کوئی حکومت نہیں سُن سکتی۔ باقی عرصہ کبھی رپورٹنگ کرتے ہیں ...

پیشہ اس نے اتنا بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے تو سب کو ویری گڈ تو کہنا ہی چاہیے۔ اتنی دیر میں دو وکیل اور تین اخبار کے نمائندے پہنچ چکے تھے۔ جاوید صدیقی نے پھر گھڑی دیکھی۔

"آدھا گھنٹا ابھی ہے۔ ایک کپ چائے کافی کے ہم چلتے ہیں۔ اتنی دیر میں پولیس محاصرہ کرلے گی اور قبرستان میں پرندہ پر نہیں مار سکے گا۔"

عاصی بولا "پرندہ معصوم ہوتا ہے۔ اس کے پر مارنے سے ہوا میں خفیف سا ارتعاش ہوتا ہے اور کچھ نہیں۔ اسے پر مارنے دو ایس ایس پی بہادر۔ پرندے کو پابند مت کرو۔ پکڑو سانپ، بچھو، پاگل کتے اور بے ضمیر آدمی کو۔"

سب مسکرانے لگے لیکن عاصی کو کسی کی پروا نہیں تھی۔ اس نے ایک سچائی بیان کردی تھی اور مطمئن تھا۔ "چائے کا ایک کپ" سارے لوازمات کا نام تھا، سرکاری خرچ پر نظر آنے والا تواضع کا یہ بندوبست بھی پولیس نے بزورِ بازو کیا ہوگا۔ وہ بھتا صرف نقدی وصول نہیں کرتے، نقد کے بدلے کچھ بھی طلب کرسکتے ہیں۔

منظر نے میری طرف دیکھے بغیر میرے کان میں کہا "زٹ کے حرام کھا بھوتنی کے۔"

میری مجبوری یہ تھی کہ میں غیر ملکی وکیل تھا اور پاکستانی اطوار کا مظاہرہ نہیں کرسکتا تھا جو عموماً مفت کی دعوتوں میں نظر آتے ہیں۔ میں نے بڑے تکلف سے چائے کے ساتھ صرف ایک سینڈوچ لیا مگر میری کسر خادم حسین نے پوری کردی۔ اسے صاف نظر آرہا تھا کہ آج صبح کا وقت تو قبرستان کی منحوس فضا میں گڑے مُردے اُکھاڑتے اور نحوست زدہ دھول مٹی کھاتے گزرے گا۔ اس لیے مولویوں کو مزید بدنام کیا اور ایسے بڑھ چڑھ کے ہاتھ مارے کہ مجھے خفت ہوئی۔

"اس بھوتنی والے کو بھی جگا ڈکے آنا پڑے گا۔ اسے شرطیہ ہیضہ ہوگا" منظر نے رابعہ سے کہا۔

خادم نے سُن لیا "منظر صاحب۔ میرا تو اصول ہے کہ جب مرنا ہی ہو تو آدمی خالی پیٹ کیوں مرے۔ فاقے سے مرنے والا صورِ اسرافیل پر خود کیسے کھڑا ہوگا؟"

خادم کا اصل مقابلہ ہوا عاصی کے ساتھ۔ باقی سب ایٹی کیٹس کے چکر میں تکلف سے کام لیتے رہے۔ ان دونوں نے میدان صاف کردیا پھر خادم نے بہ آوازِ بلند الحمدللہ کہا اور عاصی نے زبردست ڈکار لی۔ یہ بھی اعلان تھا کہ کھایا پیا ہضم ہوگیا۔ اب چلنا چاہیے۔

وکیل اور صحافی حضرات اپنی اپنی کاروں میں بیٹھے۔ ایس ایس پی نے قیادت سنبھالی اور اپنی جیپ کو آگے رکھا۔ اس جیپ پر ایک گھومنے والی لائٹ تھی اور ایک سائرن نصب تھا۔ پولیس کی بڑی گاڑی جس میں دس بارہ مسلح جوان بے زار صورتوں اور متروک

کبھی فوٹو گرافر بن جاتے ہیں۔ ان کے فیچر چھاپتے ہوئے یہاں کے اخبار والے ڈرتے ہیں اس لیے باہر بہت قدر ہے ان کی۔ فوٹو گرافی کے ایوارڈ لے چکے ہیں۔"

"گریٹ، مگر ان کا نام....؟"

"نام... نام میں کیا رکھا ہے" عاصی نے پھر اعلان کیا "میرا باپ عیسائی تھا۔ ماں ہندو تھی لیکن میں مسلمان ہوں۔ میرا وجود تمام مذاہب کا سنگم ہے۔"

"عاصی غالباً آپ کا تخلص ہوا۔ شاعر بھی ہوں گے آپ؟"

"شاعر کون نہیں ہے لیکن میں عاصی ہوں۔ عاصی یعنی گنہگار۔ ہر قدم پر گناہ کرتا ہوں۔ سانس لیتا ہوں تو گناہ۔ جینا بھی گناہ، مرنا بھی گناہ مگر میں ہر قدم پر توبہ بھی کرتا ہوں اور اس خدا سے پوری اُمید رکھتا ہوں کہ وہ معاف کرنے والا ہے" اس نے اوپر انگلی اُٹھا کے جھومتے ہوئے کہا "جو سب کا خدا ہے، ہر مذہب کا، ہر انسان کا۔"

جاوید صدیقی نے گھڑی دیکھی "میرا خیال ہے ہمیں پہلے ہی دیر ہوگئی ہے، چلنا چاہیے۔"

منظر کے ساتھ آنے والا ایک وکیل بولا "آپ کی پولیس فورس تیار ہے؟"

دوسرے نے کہا "قبرستان کے چاروں طرف پہرا سخت ہونا چاہیے۔"

"کیوں؟ کیا حملے کا ڈر ہے؟" جاوید صدیقی مسکرایا۔

"یس۔ آپ کو تو پہلے سے اندازہ ہونا چاہیے۔" منظر نے کہا "اپنے پیش رو سے سبق نہیں لیا آپ نے۔ وہ بھی چلے گئے تھے نورجہاں کے مقبرے چار سپاہی لے کے اور ان میں سے تین مارے گئے تھے۔"

جاوید صدیقی متفکر ہوگیا "اتنی فورس.... خیر میں کرتا ہوں۔ آفتاب، تمام تھانوں سے ایمرجنسی کی بنیاد پر فورس طلب کرو۔ میں خود بات کرتا ہوں ڈی آئی جی سے۔"

"اپنی پولیس فورس پہلے روانہ کردیں۔ وہ اندر باہر مورچے سنبھال لیں۔ مسلح حملے کی صورت میں انہیں جوابی کارروائی کے لیے تیار رہنا چاہیے۔" رابعہ نے کہا "ہم سب کی حفاظت کے ذمّے دار آپ ہیں۔"

"آف کورس۔" ایس ایس پی نے فون اُٹھا کے ڈی آئی جی سے بات کی اور اسے اجازت حاصل کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ اس نے کہا "اس کیس میں ملزمان کی طرف سے مسلح مداخلت کا اندیشہ ہے۔ ممکن ہے وہ لاش چھین کرلے جانے کی کوشش کریں۔ وہ انتہائی بااثر اور خطرناک قسم کے لوگ ہیں۔ اس کے علاوہ مدعی وکلا اور سینئر صحافی مناسب حفاظتی انتظامات کے بغیر وہاں جانے کے لیے تیار نہیں۔ یس سر، تھینک یو سر۔"

اس نے مسکرا کے ریسیور رکھا اور سب کی طرف یوں دیکھا

ہتھیاروں کے ساتھ یوں بیٹھے ہوئے تھے جیسے واقعی میدانِ جنگ جا رہے ہوں۔ منظر کی کار میں آگے رابعہ تھی اور پیچھے میرے ساتھ خادم۔ میں نے ایک کاغذ کے پُرزے پر پہلے ہی لکھ لیا تھا "کوئی مجھ سے بات کرے گا تو خادم کی معرفت۔ احتیاط ضروری ہے" یہ پُرزہ باری باری سب نے دیکھا۔ رابعہ نے صرف سر ہلایا۔ منظر نے البتہ مجھے مخاطب کئے بغیر کہا "ابے ہم کیا خالی کھوپڑی لیے پھر رہے ہیں دنیا میں۔ مولوی خادم حسین سمجھ رکھا ہے مجھے۔"

"دیکھئے آپ پھر زیادتی کر رہے ہیں" خادم نے احتجاج کیا۔

"زیادتی تو اپنے پیٹ کے ساتھ کی تم نے۔ اتنا بھر دیا کہ اب تمہیں ہوگا ہیضہ ورنہ کم سے کم ڈائریا۔ قبرستان میں جھاڑیاں ڈھونڈتے پھرو گے۔ خیال رکھنا مولوی، خالی نظر آنے والے گڑھے کہیں پُرانی قبریں نہ ہوں۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ منظر صاحب آپ کو شرم آنی چاہیے۔"

منظر نے آہ بھری "ہاں نورِ چشم۔ آنی تو چاہیے مگر کیا کریں اگر نہیں آتی۔ خواتین کو تو باقاعدگی سے آتی ہے۔ تمہیں کب آتی ہے؟"

یہ ذو معنی بات تھی۔ میں نے بڑی مشکل سے ہنسی ضبط کی اور رابعہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ خادم حسین مزید جزبز ہوا "آپ کو کم سے کم خواتین کی موجودگی کا خیال رکھنا چاہیے۔"

"خوا..... تین..... تین کہاں، ایک رابعہ ہی تو ہے۔ یہ سب زیادہ کھانے کا نتیجہ ہے کہ تمہیں ایک کے تین نظر آ رہے ہیں۔ وہاں تین چپڑیاں تم ایک سمجھ کے کھا رہے تھے۔ آخر وہ سب گیا کہاں۔ پیٹ تو تمہارا میری عظیم توند کے مقابلے میں ایسا ہی ہے جیسے نئی دلہن کے مقابلے میں سال بھر سینئر بڑی بہو کا۔"

اب رابعہ نے کہا "منظر بھائی۔ بس بھی کریں۔ کیوں تنگ کرتے ہیں اس شریف آدمی کو۔"

"تنگ اور چوڑا میں کیا کروں گا۔ میں تو دل بہلا رہا ہوں تم لوگوں کا ورنہ ابھی سے تم سب کے چہرے آسیب زدہ ہو جاتے۔ میں تو کہتا ہوں کہ تم بھی دور ہی رہنا۔ اور اس بھوتنی والے کو بھی دور رکھنا۔ زیادہ اچھا ہوتا اگر تم شملہ پہاڑی پر بیٹھ کے کوئی پیار بھرا سین پیش کرتے۔ وہاں کیا ہے تمہارے دیکھنے کے لیے اور جو ہے وہ نہ دیکھنا بہتر۔ اب بھی وقت ہے، اُتر جاؤ یہیں دردناک جذباتی مناظر دیکھنے سے موڈ ہی خراب ہوگا۔"

خادم حسین نے کہا "اگر..... مجھے اجازت ہو تو، میں اُتر جاؤں۔"

منظر نے اسے ڈانٹا "میں تم سے بات نہیں کر رہا تھا۔ تمہیں عبرت پکڑنی ہے۔ میں خود پکڑاؤں گا تمہیں مولوی۔"

قبرستان کی چار دیواری کے ساتھ ساتھ پولیس والے پوزیشن سنبھال رہے تھے۔ انہیں مختلف تھانوں سے یہاں تک لانے والی سرکاری گاڑیاں کچھ فاصلے پر لائن میں کھڑی ہوئی تھیں۔ ہر تھانے سے سب انسپکٹر کے رینک کا ایک افسر بھی آیا تھا۔ [illegible] تھیں تھا کہ قبرستان میں اچانک مُردوں کو کیا خطرہ [illegible] جس کے لیے اتنی نفری طلب کی گئی ہے۔ ڈی ایس پی [illegible] فوراً ان کی کمان سنبھال لی اور [illegible] مطابق احکامات جاری کئے گئے۔

جاوید صدیقی سے [illegible] ابھی تک نہ مجسٹریٹ صاحب [illegible]

ایک سب انسپکٹر نے کہا "مجسٹریٹ صاحب اندر ہیں۔"

"اندر کہاں؟"

"اندر خیمہ لگا دیا گیا ہے سر۔ ایک اور صاحب بھی ساتھ ہیں۔ ان کو میں نہیں جانتا۔"

گیارہ افراد پر مشتمل قافلہ جاوید صدیقی کے پیچھے اندر دریک (بکائن) اور ٹاہلی (شیشم) کے دو درختوں کے درمیان سایہ دار جگہ پر نصب خیمہ اور سائڈ میں کھڑی ہوئی کار نظر آئی۔ گاڑی لے جانا منع تو نہیں تھا مگر لوگ احتراماً ایسا نہیں کرتے۔ کچے راستے کے دونوں جانب قبریں تھیں اور میں نے نوٹ کیا کار کے پہیوں سے چند قبروں کی سائیڈ پر نشان آ گئے تھے۔ مجسٹریٹ صاحب کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ [illegible] انسانوں کے گھر مسمار کرا دیتے تھے تو مُردوں کے مدفن کیا [illegible] تھوڑا سا فاصلہ بھری دوپہر کی گرمی میں پیدل طے کرنا ان کی حاکمیت کے خلاف تھا۔

مجسٹریٹ کے ساتھ ایک دبلا پتلا عینک والا اسمارٹ [illegible] بھی تھا۔ یہ ایم ایس تھا جسے مجسٹریٹ صاحب اپنی کار میں لائے تھے۔

مجسٹریٹ خردماغ آدمی تھا اور قبر کھود کے پُرانی گلی سڑی [illegible] نکالنے کی یہ ڈیوٹی اس نے طوعاً و کرہاً قبول کی تھی۔ اس کیس [illegible] وکیل صحافی برادری کے اتحاد نے کرپٹ بیوروکریسی کے حربے [illegible] کر دیے تھے اور بقول منظر سب کو "وخت" ڈال دیا تھا۔ مال [illegible] والے اندر کرا دیے تھے اور باقی کی نوکری خطرے میں پڑ گئی تھی [illegible]

مجسٹریٹ نے ایک نظر سب پر ڈالتے ہوئے ماتھے پر بل [illegible]

"یہ پورا جلوس کیوں آیا ہے یہاں؟"

منظر بولا "غنیمت ہے آپ نے جلوس کو برات نہیں [illegible] قاضی خود آپ ہیں۔ دولہا دلہن لانے پڑتے۔"

"میں فضول بات پسند نہیں کرتا۔"

"میں صرف فضول باتیں کرتا ہوں۔ جسے پسند نہیں [illegible] سُنے" منظر نے آتے ہی مجسٹریٹ سے پنگا لے لیا۔

اب عاصی بولا "فضول تو تمہارا سوال تھا۔ تمہیں اچھی [illegible] معلوم ہے کہ یہاں کیا ہونے والا ہے۔"

جاوید صدیقی نے فوراً صورتِ حال کو سنبھال لیا "یہ [illegible]

[illegible] میں سے جو قبر کی نشاندہی کر سکتا ہو وہ ساتھ رہے۔ ایک اخباری نمائندہ اور ایک یہ گورا شاہی وکیل۔"

رابعہ نے کہا "نشاندہی میں کروں گی۔ منظر بھی میرے ساتھ ہوگا۔"

"ٹھیک ہے۔ تم چلو میرے ساتھ۔ جب گورکن کُھدائی کر لے تو لاش برآمد کرتے وقت ایک تصویر بنانے کی اجازت ہے۔ اس کے بعد سب واپس یہاں آ جائیں گے۔ اس خیمے میں 'پوسٹ مارٹم' وہیں ہوگا اور اس کی رپورٹ عدالت کو دے دی جائے گی۔"

یہ بات صرف غالب کو معلوم تھی کہ ڈاکٹر شیلی کی لاش کس قبر میں ہے۔ شاید اس نے رابعہ کو شریکِ راز کر لیا تھا۔ میرے لیے یہ انکشاف باعثِ حیرت تھا کہ رابعہ بھی یہ بات جانتی تھی مگر اس نے کبھی بھولے سے بھی اس کا ذکر نہیں کیا تھا۔ اس نے بڑی عقلمندی کی تھی ورنہ یہ بات عام ہو جاتی تو رابعہ کی زندگی بھی خطرے میں پڑ جاتی۔ شاید غالب نے بھی بعد میں طے کیا ہوگا کہ کم سے کم ایک شخص اور ایسا ہونا چاہیے جسے یہ معلوم ہو۔ آج غالب نہیں تھا تو رابعہ سامنے آ گئی تھی ورنہ شاید وہ قبرستان آنا بھی گوارا نہ کرتی۔

"یہ..... یہ تو کسی اور کی قبر ہے" مجسٹریٹ نے کہا۔

جاوید صدیقی بولا "اس پر تو کتبہ کسی اور کے نام کا ہے۔"

رابعہ نے کہا "آپ کتبے پر نہ جائیں۔ ڈاکٹر شیلی کی یہی قبر ہے۔"

مجسٹریٹ نے نفی میں سر ہلایا "میں کیسے مان لوں؟"

"میں عدالت میں حلف نامہ دے چکی ہوں۔ ذمے دار میں ہوں، آپ نہیں" رابعہ نے کہا۔

"ایک AFFIDAVIT میں نے بھی داخل کیا تھا" منظر بولا "اب بھی آپ عدالتی احکامات کو نظر انداز کرتے ہیں تو سوچ لیں۔ یہ توہینِ عدالت کا کیس ہوگا۔ گواہ یہ سب ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ مجھے کیا۔ گورکن سے کہو کھدائی کرے۔"

گورکن کی جسمانی حالت ایسی کہاں تھی کہ وہ دوپہر کی دھوپ میں قبر کھود سکتا۔ اس کے ایک معاون نے کدال چلائی اور مٹی ایک طرف پھینکنے لگا۔ اس وقت میرے دل کی کیفیت بہت عجیب تھی۔ مجھے وہ شوخ ادا، انتہائی پُراعتماد، تیز طرار حسین و جمیل لڑکی یاد آ رہی تھی جس کی رفاقت کے سارے لمحات میری یادوں میں زندہ تھے۔ وہ چوہدری دلاور کی سوتیلی بہن تھی جسے اپنی دانست میں دلاور قتل کر چکا تھا۔ اب اسے دھوکے سے بلا کے دلاور نے ایک تیر سے دو شکار کرنے چاہے تھے۔ اسے یقین تھا کہ شیلی مجھے اپنے دامِ حسن میں گرفتار کر لے گی۔ وہ میرے خلاف شیلی کے ذہن میں جھوٹ کا اتنا زہر بھر چکا تھا کہ شیلی میری دشمن تھی مگر وہ مجھ سے ملی تو اس پر حقیقت آشکار ہو گئی۔ وہ ایک باضمیر لڑکی تھی۔ دلاور کی اسکیم فیل ہو گئی۔ مجھے مروا کے اس جرم میں شیلی کو تختۂ دار تک

صحافی ہیں یا مدعی دکلا۔"

"میں کسی کو تصویر اتارنے کی اجازت نہیں دوں گا۔"

"ہم بلا اجازت بنا لیں گے پھر تم لاٹھی چارج کا حکم دو گے۔ کیمرے توڑو گے اور ہم سب کو بند کرا دو گے۔" عاصی نے اعلان کیا "ہمیشہ تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس بار شاید یہ ڈراما نہ چلے قاضی صاحب۔ ہم تو بڑے گھر جاتے ہی رہتے ہیں۔ تمہیں گھر نہ بھیج دیا جائے۔"

"وہ بھی بڑا گھر ہی ہوگا۔ قاضی صاحب چھوٹے گھر میں تو نہیں رہتے ہوں گے" منظر بولا۔

"واٹ نان سنس۔ یہ کیا قاضی قاضی لگا رکھی ہے تم سب نے۔" مجسٹریٹ چراغ پا ہو گیا۔

"مجسٹریٹ پہلے قاضی کہلاتے تھے۔ چیف جسٹس کو قاضی القضاۃ کہا جاتا تھا اور تھانے دار کو کوتوال" خادم حسین بولا۔

"تم کون ہو؟"

"یہ ڈاکٹر شیلی کے وکیل ہیں جو لندن سے آئے ہیں۔ برٹش کونسلیٹ اور کامن ویلتھ افیئرز کی طرف سے یہ تفتیش کے آفیشل مبصر ہیں۔" جاوید صدیقی نے کہا "یہ برطانوی حکومت کو رپورٹ دیں گے کیونکہ ڈاکٹر شیلی برٹش نیشنل تھی، خادم حسین ان کا مترجم ہے کیونکہ یہ صرف فرنچ بولتے اور سمجھتے ہیں۔"

"تم فرنچ جانتے ہو؟" مجسٹریٹ نے کہا۔

"آپ بول کے دیکھ لیں" خادم حسین نے کہا۔

"آپ لوگ وقت ضائع کر رہے ہیں" ایم ایس نے کہا "میں ڈاکٹر قاسم ہوں۔ آخر وہ پولیس سرجن ابھی تک کیوں نہیں آیا۔ میرے پاس ایک پورے اسپتال کے انتظامی مسائل بھی ہیں۔"

مجسٹریٹ نے کہا "قبر کی نشاندہی کون کرے گا؟ گورکن کہاں ہے؟"

"گورکن تو تھانے میں تھا" منظر بولا "وہیں رہ گیا شاید۔"

"گورکن تھانے میں کیا کر رہا تھا؟"

"انصاف کی قبر کھود رہا تھا شاید" عاصی بولا۔

ایس ایس پی جاوید نے اسے گھور کے دیکھا "وہ ہمارے ساتھ ہی آیا ہے اسے حفاظت کے خیال سے پولیس نے اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔"

"میری سمجھ میں تو نہیں آتا کہ اس قسم کے حفاظتی انتظامات کی کیا ضرورت ہے۔ قانون کے مطابق یہ کارروائی پہلی بار تو نہیں ہو رہی ہے۔" مجسٹریٹ نے کہا "کیا مُردوں سے خطرہ تھا کہ مل کے حملہ کر دیں گے؟"

"مُردوں سے نہیں... زندوں سے ڈرنا چاہیے آپ کو بھی مجسٹریٹ صاحب۔ ایک گولی کے مقابلے میں آپ کی جان یقیناً بہت قیمتی ہے اور گولی کسی بھی سمت سے آ سکتی ہے" منظر بولا۔

"کیا فضول بات ہے" مجسٹریٹ نے ناگواری سے کہا "آپ

پہنچانے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا اور جب وہ بے وقوف لڑکی انجانے میں میری جانب جذباتی پیش قدمی کرنے لگی تو دلاور نے اسے دوسرے طریقے سے ٹھکانے لگادیا۔ اس کا قتل بھی خودکشی کا کیس بن گیا تھا مگر پھر خوش قسمتی کے پتّے دلاور کا ساتھ چھوڑنے لگے اور وہ ہر بازی ہارنے لگا۔ اب وہ میری قید میں تھا اور اس کے خلاف قتل کے جرم کی شہادت مکمل ہوگئی تھی۔

رابعہ نے میرا ہاتھ پکڑ کے کہا "چلو۔ اب یہاں کھڑے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ دل خراب ہوگا گلی سڑی لاش کا ڈھانچا دیکھ کر۔"

میں نے سرہلایا اور خیمے کی طرف چل پڑا "میری نظر میں تو اس کا وہی سراپا ہے ابھی تک۔"

"بڑی اچھی لڑکی تھی بے چاری۔ موت اسے کہاں لے آئی۔"

آہستہ آہستہ دوسرے وکیل بھی ہمارے پیچھے آگئے۔ خادم حسین ہمارے درمیان چل رہا تھا جس سے ظاہر یہی ہوتا تھا کہ ہم اس کی معرفت محوِ گفتگو ہیں۔ کھُدی ہوئی قبر کے پاس اب صرف عاصی رہ گیا تھا۔ مجسٹریٹ اور ڈاکٹر قاسم ناک پر رومال رکھے دور کھڑے تھے۔

باقی لوگ درمیان میں حلقہ بنائے کھڑے تھے اور بڑے اندوہناک تجسس کے ساتھ قبر کی مٹی کے ڈھیر کو بلند ہوتا دیکھ رہے تھے۔ شیلی کا لندن سے اپنے وطن لوٹ کر آنا اور پھر اپنے ہی بھائی کے مذموم عزائم کا شکار ہونا ہی کم المیہ نہ تھا کہ مر کے بھی اس کو اپنی ابدی آرام گاہ میں سکون سے سونا نصیب نہ ہوا تھا۔ میں تصور کرسکتا تھا کہ اس کا وہ جوان جسم جو گلاب اور مرمر کی آب و تاب رکھتا تھا اور پیراہن کے بہار آفریں رنگ جس کے نشیب و فراز میں وہی نظرنواز کشش پیدا کرتے تھے جو سبزہ و گل وادیوں اور کوہساروں میں کرتے ہیں۔ اب وہ گل سڑ کے حشرات الارض کا رزق بننے اور خاک میں ملنے کے بعد کتنا بھیانک اور کریہہ المنظر بن چکا ہوگا۔ زندگی اور موت کے درمیان یہ فرق ایسے کون دیکھ سکتا ہے۔ قبر کی مٹی کے ڈھیر کے نیچے کیا ہوتا ہے۔ کیسے.......
ایک شناسا چہرے کے مانوس خدوخال اور ایک آشنا شخصیت رکھنے والے کا جسم ڈی کمپوز ہوتا ہے۔ یہ آدمی دیکھ لے تو موت کا مفہوم پوری ہولناکی کے ساتھ عیاں ہوجائے۔

میلے کفن میں لپٹی ہوئی لاش نکالی جاچکی تھی اور بدبو کے بھبکوں سے بچنے کے لیے سب نے ناک پر رومال رکھ لیے تھے۔ ہڈیوں کے پنجر اور بچے کھچے گوشت کے اس ڈھیر کو مٹی پر رکھ دیا گیا تھا جو کبھی ڈاکٹر شیلی تھی' نہ جانے کون خوش نصیب ہوگا جس نے اس کے بدن کے گلشن کی بہار کا خیرہ کن حسن دیکھا ہوگا۔ اب کفن کھولنے والے کیا دیکھیں گے۔ محض بدصورتی اور زندگی کے عناصر کی بے ترتیبی۔

جاوید صدیقی اور مجسٹریٹ پریشان تھے کہ ابھی تک پولیس سرجن نہیں پہنچا تھا اور اس کی عدم موجودگی میں پوسٹ مارٹم کے قانونی تقاضے پورے نہیں ہوتے تھے۔ ایم ایس خود بھی بہت بڑا پروفیسر تھا اور اس کے لیے پوسٹ مارٹم روز مرہ کے معمولات کی طرح تھا۔ ایک ایسا کام جس میں اس کی عمر کا تجربہ ہی کسی نتیجے پر پہنچنے کے لیے کافی تھا۔ شاید وہ سیکڑوں پوسٹ مارٹم کرچکا ہوگا مگر ضابطے کی کارروائی کے لیے پولیس سرجن کا ہونا ضروری تھا۔ ایس پی نے اس کی تلاش میں گاڑیاں روانہ کردی تھیں اور کئی بار فون کرنے بھی بھیجا تھا مگر ہنوز پولیس سرجن لاپتا تھا اور جانے والے بھی کوئی خبر لے کر نہیں لوٹے تھے۔

ڈاکٹر شیلی کی لاش مٹی کے ڈھیر پر گٹھری کی طرح پڑی تھی۔ مجسٹریٹ کی جاوید صدیقی کے ساتھ کانفرنس جاری تھی پھر وہ ہماری طرف آیا۔

"آخر ہم اور کتنی دیر انتظار کرسکتے ہیں۔ پولیس سرجن نے انتہائی غیر ذمّے دار ہونے کا ثبوت دیا ہے۔"

عاصی بولا "اس کے خلاف محکمہ جاتی سُرخ فیتے کی کارروائی شروع کی جائے اور بطور سزا اسے دوسرے اسپتال ٹرانسفر کیا جائے۔"

اس کے طنز سے جاوید صدیقی متاثر نہیں ہوا "یہ سب بعد کی بات ہے۔ سوال یہ ہے کہ ابھی ہم کیا کریں؟"

"انتظار" منظر نے مختصراً کہا۔

"ہم میں سے کوئی بھی اتنا فارغ نہیں ہے کہ شام تک یہاں پولیس سرجن صاحب کے انتظار میں سارے کام چھوڑ کے کھڑا رہے۔"

"پولیس سرجن نہ پہنچا تو کیا ہوگا؟" ایک صحافی نے کہا۔

"کچھ نہیں ہوگا" ایک وکیل نے کہا۔

"ہاں۔ لاش پھر دفن کردی جائے گی۔ پوسٹ مارٹم کے لیے کوئی تاریخ مقرر ہوگی۔"

عاصی نے کہا "ایم ایس لاش کے اجزا اور کیمیائی مواد کو محفوظ کرسکتا ہے۔ لیبارٹری ٹیسٹ کے لیے اور وہ چاہے تو رپورٹ بھی مرتب کرسکتا ہے۔ ہم اس کو مستند سمجھتے ہوئے تسلیم کرلیں گے۔"

رابعہ نے کہا "پولیس سرجن کو اس پر صرف دستخط کرنے ہوں گے۔ وہ بعد میں بھی کرسکتا ہے۔"

"یہ بات خلافِ ضابطہ ہوگی۔ فرض کریں اس نے انکار کردیا کہ جب میں موجود ہی نہیں تھا اور نہ میں نے پوسٹ مارٹم کی کارروائی میں حصّہ لیا تو میں دستخط کیسے کردوں؟"

اب میں نے خادم سے کہا "ان سے کہو کہ پولیس سرجن کا نہ پہنچنا اس قانونی عمل کو سبوتاژ کرنے کی سازش کا حصّہ ہے۔ وہ عمداً نہیں آیا ہے یا اسے آنے نہیں دیا گیا ہے۔"

خادم نے میری بات آگے پہنچادی "وکیل صاحب فرماتے ہیں کہ پولیس سرجن کو یہاں نہ پہنچنے کی قیمت چکادی گئی ہے یا اسے روک دیا گیا ہے۔ اغوا کرلیا گیا ہے' ممکن ہے قتل کردیا گیا ہو۔"

میں نے اسے سرزنش کی "خادم۔ جو میں کہوں وہی آگے بتاؤ۔ ترجمے میں اپنی طرف سے نمک مرچ مت ڈالو۔"

"میں ذرا کھل کے بات کررہا ہوں۔ وضاحت کے ساتھ۔ یہ لوگ اسی قابل ہیں کہ انہیں کھری کھری سنائی جائے۔ کوئی لحاظ کیے بغیر۔"

شاید جو بات میرے دل میں تھی وہی اندیشہ بن کے ہر شخص کے خیال میں تھی مگر لبوں تک نہیں پہنچی تھی۔ رابعہ کا چہرہ فکر و تردد سے دُھواں دُھواں ہوگیا اور منظر کی صورت پر جھنجلاہٹ نظر آنے لگی۔ ایک معمولی سی فروگزاشت سے ہماری تمام محنت رائگاں جارہی تھی۔ شکاری اپنی سازش میں کامیاب ہوگئے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ اس عمل میں کیسے رخنہ اندازی کی جاسکتی ہے اور عین وقت پر ہماری ناکامی پر کیسے اپنی کامیابی کا لیبل لگایا جاسکتا ہے۔

آج تک ہم نے ڈاکٹر شیلی کی قبر کو بے نام و نشان اور خفیہ رکھنے کی جتنی جدوجہد کی تھی وہ ضائع ہوتی نظر آرہی تھی۔ اب لاش کو پھر دفن کردیا جاتا تو اگلی تاریخ مقرر ہونے تک لاش کی حفاظت کون کرسکتا تھا۔ یہ بات یقینی تھی کہ دوسری بار لاش نکالی جائے گی تو وہ کسی اور کی ہوگی۔

جاوید صدیقی نے گھڑی دیکھی "سوا دو۔ ہم پندرہ منٹ اور انتظار کریں گے۔"

ایم ایس نے برہمی سے کہا "میں ڈائریکٹر جنرل ہیلتھ سے سفارش کروں گا کہ پولیس سرجن کو معطل کردیا جائے۔ یہ مجرمانہ غفلت ہے۔"

مجسٹریٹ نے اس سے اتفاق کیا "میرے اختیار میں ہوتا تو میں اسے اندر کردیتا۔ میں جوڈیشنل رپورٹ میں اس کا ذکر ضرور کروں گا۔"

یہ ساری باتیں بے کار تھیں۔ ہم اپنے مقصد میں ناکام رہے تھے اور اب ہمارے سامنے زیادہ مشکل مرحلہ دوسری بار قبر کھُدوا کے پوسٹ مارٹم کی تاریخ حاصل کرنے تک قبر کی حفاظت کا تھا۔

اچانک منظر نے کہا "ڈاکٹر صاحب۔ پوسٹ مارٹم تو خیر نہیں ہوا لیکن آپ بتاسکتے ہیں کہ لاش مرد کی ہے یا عورت کی؟"

ایک دم سب وکیل اور صحافی متوجہ ہوگئے۔ جاوید صدیقی نے مجسٹریٹ کی طرف دیکھا مگر وہ ایم ایس کو اس سوال کا جواب دینے سے منع نہیں کرسکتے تھے۔

"لاش بلاشبہ عورت کی ہے۔"

عاصی نے پوچھا "عمر' قد اور وزن کے بارے میں کوئی اندازہ؟"

"نہیں۔ عورت TWENTIES میں تھی۔"

"بیس سے تیس سال کے درمیان" ایک صحافی نے نوٹ بک میں لکھتے ہوئے کہا۔

"قد درمیانہ۔ پانچ فٹ چار انچ کے قریب۔ وزن ایک سو دس پونڈ سے کچھ کم یا زیادہ۔ سر کے بالوں کا رنگ آپ نے بھی دیکھا ہے۔ ناخونوں کے معائنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسے زہر دیا گیا تھا۔ غالباً آرسینک۔ جسے سنکھیا بھی کہا جاتا ہے۔"

مجسٹریٹ نے احتجاج کیا "یہ سب آفیشل نہیں ہے۔"

جاوید صدیقی نے کہا "ڈاکٹر صاحب۔ آپ پریس کو یہ انفارمیشن کس اتھارٹی پر دے رہے ہیں؟"

ایم ایس نے رُکھائی سے کہا "تمہاری جتنی عمر ہے آفیسر۔ اتنا تجربہ ہے میرا میڈیکل پروفیشن میں۔ آفیشل یا اَن آفیشل۔ یہ میری رائے ہے جو غلط نہیں ہوسکتی۔ میں وہی بتارہا ہوں جو میں دیکھ چکا ہوں۔" مجسٹریٹ نے کہا "لاش کو پھر دفنا دیا جائے۔"

رابعہ نے مطالبہ کردیا "میں سب کی طرف سے درخواست کروں گی کہ قبر پر مسلح پہرا رکھا جائے ورنہ اندیشہ ہے کہ لاش غائب کردی جائے گی۔"

"مجھے اس کا اختیار نہیں ہے۔ عدالتی احکامات لے آئیں آپ یا میرے افسران حکم دیں تو....."

منظر نے کہا "مجسٹریٹ تمہیں حکم دے سکتا ہے۔ خصوصی حالات میں اپنے اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے۔"

"میں یہ ضروری نہیں سمجھتا" جاوید صدیقی نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ تمام مدعی کل عدالت میں تمہارا بیان آن ریکارڈ دے آئیں گے۔ ایم ایس کی رائے بھی اس میں شامل ہوگی۔ کل کے اخبارات پوری رپورٹ دیں گے۔ اس کے بعد لاش غائب ہوئی تو جواب وہی تم کروگے۔ ساری ذمّے داری تمہاری ہوگی۔ یہ سمجھا جائے گا کہ تم نے قانون کی نہیں مجرموں کی مدد کی۔ بالواسطہ طور پر۔"

"یہ بے بنیاد بات ہے" وہ گرم ہوگیا۔

رابعہ اس سے اُلجھ گئی "تم من مانی کررہے ہو۔ کسی کی سُننے کو تیار نہیں۔ مجھے تو شک ہے کہ پولیس سرجن کو یہاں نہ آنے کا مشورہ دینے والوں میں تم بھی اتنے ہی شامل ہو جتنے اسے منہ مانگی قیمت پر روکنے والے۔ میں اپنی ذمّے داری پر تمہارے خلاف یہ بیان دے سکتی ہوں۔"

"خاتون۔ آپ کچھ ثابت نہیں کرسکیں گی۔ آپ جذباتی ہورہی ہیں۔"

"تم کیس کردینا مجھ پر۔ اخبار پر' اس کے پبلشر پر۔ انہیں بند کرسکتے ہو تو بند کرادینا۔ تمہارے اختیارات لامحدود نہیں ہیں آفیسر اور تم کس کس کی زبان پکڑوگے۔ کس کس کو غلط کہوگے۔

اگر تمہارے خلاف بھی ملزمان کی بے جا طرف داری کا الزام آگیا تو تمہیں وضاحت مشکل ہو جائے گی۔ میں تو اسمبلی تک لے جا سکتی ہوں یہ معاملہ۔" رابعہ لال پیلی ہو گئی۔

جاوید صدیقی کا جوش و خروش سمندر کے جھاگ کی طرح ختم ہو گیا "یہ تو سراسر زیادتی ہے۔"

"تم اسے بلیک میلنگ کہنا چاہو تو مجھے اعتراض نہیں" منظر بولا۔ یہ مسئلہ طے ہو رہا تھا کہ باہر سے ایک کانسٹیبل دوڑتا ہوا آیا "وہ سر۔ سرجی..... سر اُدھر....."

"آگے بھی بولو۔ کیا پاگل کتا لگ گیا ہے تمہارے پیچھے۔"

"نہیں سر۔ اُدھر والی دیوار کے ساتھ ایک لاش پڑی ہوئی ہے، قبرستان کے اندر۔"

"یہ بات تم ڈی ایس پی کو بھی بتا سکتے تھے۔"

"بتائی تھی سر۔ وہ وہیں موجود ہیں۔ انہوں نے کہا تھا سر کہ آپ کو اطلاع دی جائے۔"

"چلو اطلاع دے دی تم نے۔ اب جاؤ، علاقہ تھانے دار کو ضابطے کے مطابق کارروائی کرنے دو۔ ہم خصوصی تفتیش میں مصروف ہیں۔"

"وہ سر..... انہوں نے آپ کو بُلانے کا حکم دیا تھا..... میرا مطلب ہے مجھے حکم دیا تھا کہ آپ سے درخواست کروں....." کانسٹیبل بدحواس ہو گیا۔

لاش کو ایم ایس ڈاکٹر قاسم نے پہچانا "یہ تو غلام رسول ہے۔"

جاوید صدیقی اسلام آباد سے آیا تھا اس نے پولیس سرجن کو نہیں پہچانا تھا۔ اس کے سوال کا جواب ایک وکیل نے اور عاصی نے دیا۔

"اب تو سازش ثابت ہو گئی" رابعہ نے کہا۔

"اس میں کوئی شک نہیں۔ اس قتل کا مقصد ہی پوسٹ مارٹم کی کارروائی کو التوا میں ڈالنا تھا" ڈاکٹر قاسم نے تاسف سے سر ہلایا۔

"اب نیا بورڈ تشکیل دیا جائے گا۔ ظاہر ہے اس میں دیر لگے گی۔ جب تک کوئی اور پولیس سرجن کا چارج لینے نہیں آتا۔ کارروائی رُکی رہے گی۔" رابعہ نے کہا "اور اس مہلت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے جرم کا سراغ مٹانے کی پوری کوشش کی جائے گی۔"

جاوید صدیقی نے قطعی بدلے ہوئے لہجے میں کہا "آپ مطمئن رہیں۔ اب یہ ناممکن ہے۔"

مجسٹریٹ نے بھی احکامات صادر کر دیے "قبر کی دن رات حفاظت کی جائے۔ جب تک ضابطے کے مطابق....."

"تو بھیل دو یو ضابطہ" ڈاکٹر قاسم نے برہمی سے کہا "میں اکیلا بھی پوسٹ مارٹم کرتا رہا ہوں اور میری سیکڑوں رپورٹس عدالتوں نے تسلیم کی ہیں۔ میں اکیلا یہ کام کروں گا۔"

"آپ اپنے رسک پر جو چاہیں کر لیں۔"

"رسک..... مائی فٹ۔ میرے لیے کیا رسک ہے اس میں جب لاش قبر سے نکالی جا چکی ہے تو میں دیکھ سکتا ہوں۔ میں اپنی رپورٹ بنا دوں گا۔ آگے عدالت کی مرضی اسے قبول کرے یا مسترد کر دے۔ رپورٹ کو کاؤنٹر سائن بھی مجھے کرنا تھا۔ غلام رسول میرا ماتحت تھا۔ میں اس کی FINDINGS سے اختلاف بھی کر سکتا تھا اور اس کی رپورٹ کو مسترد کر کے اپنی رائے دے سکتا تھا۔"

رابعہ نے خوش ہو کے کہا "پھر آپ ختم کریں یہ کام آج ہی۔ کل کا کیا بھروسا۔"

"ہاں۔ کل میرے ساتھ بھی یہی ہو سکتا ہے جو غلام رسول کے ساتھ ہوا ہے۔ میں اس سے پہلے ہی تمام FACTS سب کے سامنے رکھ دیتا ہوں۔ اس کے بعد مجھے مار کے کسی کو کچھ حاصل نہیں ہو گا پھر کوئی لاش لے جانا چاہے تو لے جائے۔ میں بوڑھا آدمی ہوں۔ چالیس سال سے زیادہ ہو گئے موت سے دن رات واسطہ رہا۔ میں موت سے کیا ڈروں گا۔"

ڈاکٹر قاسم کو ایک دم وکیلوں اور صحافیوں کی مکمل حمایت حاصل ہو گئی تھی۔ اسے ایک ہم پیشہ ڈاکٹر کی موت نے مشتعل کر دیا تھا۔ وہ جس معاشرے کا فرد تھا وہاں قانون کی دھجیاں بکھیرنے والے مجرم اتنے طاقتور تھے کہ انصاف مانگنا تک جرم ہو گیا تھا۔ پُرانے وقتوں کا ڈاکٹر ان لوگوں میں سے تھا جو پُرانی نسل کی اصول پرستی اور وضع داری کو مادہ پرستی کے عہدِ حاضر میں بھی زیادہ اہم سمجھتے تھے۔

ایس ایس پی جاوید صدیقی یا مجسٹریٹ اسے کیسے منع کر سکتے تھے کہ وہ پوسٹ مارٹم نہ کرے۔ ایک بار پھر قبرستان کی سوگوار اور مایوس فضا میں گہما گہمی پیدا ہو گئی۔ ڈاکٹر شیلی کی لاش ابھی پوری طرح پھر سپردِ خاک نہیں ہوئی کہ دوسری مرتبہ نکالی گئی اور ایم ایس ڈاکٹر قاسم نے سب کے سامنے ضروری ٹیسٹ لیے جن کے لیے کیمیائی مرکبات اور ضروری سامان وہ ساتھ لایا تھا۔ تمام صحافی اور وکلا اس کے گرد جمع رہے۔ اب سب کے ساتھ رابعہ اور میں بھی وہیں موجود رہے۔ ڈاکٹر شیلی کے ساتھ ہونے والے تماشائے عبرت کا ابتدائی جذباتی ردِ عمل باقی نہیں رہا تھا اور ہم دکھی بوجھل دل کے ساتھ وہ سب دیکھ رہے تھے جو شیطان کے ہاتھوں انسانیت کی توہین اور تذلیل کے مترادف تھا مگر زندگی کے ساتھ یہ سب آزمائشوں کا سلسلہ یونہی چلتا ہے اور اُجالوں کے متلاشی مسافر تاریکی میں بھی تھک کر بیٹھ نہیں جاتے۔

ڈاکٹر قاسم نے اپنی رپورٹ ایک انتقامی قسم کے ردِ عمل کے تحت سب کو براہِ راست دے دی۔ کاغذی کارروائی میں بھی سب کچھ لکھا جاتا لیکن ضابطے کی کارروائی میں سقم پیدا کرنے والے اس حد تک کامیاب رہے کہ پوسٹ مارٹم رپورٹ پر پولیس سرجن کے دستخط نہیں ہوئے اور اسی بنا پر مجسٹریٹ نے اسے سندِ اعتبار AUTHENTICITY عطا نہیں کی۔ تاہم ہمارا مقصد پورا ہو گیا تھا اور اب لاش کو غائب کرنے سے دلاور کے جرم کی سنگینی کم نہیں ہو سکتی تھی۔ لاش کو بدلنا بھی آسان نہ رہا تھا۔ اسی عمر، قد و قامت اور وزن کی اتنی ہی پُرانی لاش حاصل کرنا عمداً ناممکن تھا۔ لندن سے موصول ہونے والے ڈاکٹر شیلی کے فنگر پرنٹس اور ڈینٹل اسٹرکچر سے موازنہ کیے بغیر قانونی طور پر عدالت اسے ڈاکٹر شیلی کی لاش تسلیم نہ کرتی مگر واقعاتی شہادت اور ڈاکٹر قاسم کی رپورٹ بہت حد تک ہمارے مؤقف کی تائید میں تھی۔

ایک ایک کر کے پولیس کی وہ سب گاڑیاں روانہ ہو گئیں جو دوسرے تھانوں سے نفری لے کر آئی تھیں۔ قبل از وقت کیے جانے والے حفاظتی انتظامات بھی بے مصرف ثابت ہوئے تھے اور کرنے والے اپنا کام کر گئے تھے۔ پولیس سرجن کا قتل بھی ڈاکٹر شیلی کے قتل کے سلسلے کی ایک کڑی تھا مگر اس کی تفتیش معمول کے مطابق ہو رہی تھی۔ کسی نے بھی پولیس سرجن کو آتے نہیں دیکھا تھا اور نہ کہیں اس کی گاڑی نظر آئی تھی۔ یہ اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ مقررہ وقت سے بھی پہلے اس وقت پہنچا تھا جب پولیس بھی نہیں تھی اور قاتلوں کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔

یہ ساری کارروائی پہلے ہی کم دل آزار نہ تھی کہ ایک قتل نے فضا کے ماتمی بوجھل پن کو اور بڑھا دیا۔ مرنے والا بھی کوئی جرائم پیشہ نہیں تھا، ایک معزز ڈاکٹر تھا۔ مجرمانہ زندگی گزارنے والے ایسے مر جائیں تو کوئی غیر متوقع اور افسوسناک بات نہیں ہوتی۔ بُرے کام کا بُرا انجام اگر آج دشمنوں یا قانون کے رکھوالوں کی گولی کا نشانہ نہ بنے تو کل اپنوں کے ہاتھوں بھی مارے جا سکتے ہیں لیکن ڈاکٹر کو کسی سے خطرہ نہیں ہوتا کیوں کہ وہ زندگیاں بچاتا ہے۔ بیماری اور معذوری سے نجات دیتا ہے۔ اُمید اور خوشیاں بانٹتا ہے۔ مجرم بننا بہت آسان ہے لیکن ڈاکٹر بننے کے لیے برسوں تک رات دن کتابوں میں سر کھپانا پڑتا ہے، اعلیٰ ترین نمبر لینے والوں کو ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملتا ہے۔ وہ کم سے کم پانچ سال حصولِ علم اور تجربات میں صرف کرتے ہیں۔ ڈاکٹر بننے کے بعد بھی کامیابی کی منزل فوراً ہی نہیں مل جاتی۔ پولیس سرجن کی پوسٹ تک پہنچنے والے نے پندرہ بیس سال تو اس پیشے میں ضرور گزارے ہوں گے نہ جانے کتنے سرد و گرم دیکھے ہوں گے۔ سیکڑوں ہزاروں آپریشن کیے ہوں گے اور لاکھوں مریض دیکھے ہوں گے۔ ایک منٹ میں کسی نامعلوم قاتل کی گولی نے جسے شاید وہ پہچانتا تک نہیں تھا کامیابی کے اس سفر کا اختتام کر دیا۔ مرنے والے کی کسی سے دشمنی نہیں ہو گی مگر مارنے والے کو بھی اس سے صرف یہ شکایت ہو گی کہ وہ اپنا ایمان بیچنے پر تیار نہیں تھا اور دولت سے خریدا نہیں گیا ہو گا۔ اس نے غلط پوسٹ مارٹم رپورٹ دینے سے انکار کیا ہو گا۔

"حضور تشریف لائیں گے خود یا ہم پتا ڈال کے لے جائیں" منظر نے دروازہ کھول کے کہا۔

میں چونکا۔ آفس آ گیا تھا۔ میرے ساتھ بیٹھی ہوئی رابعہ بھی اُتر گئی تھی۔ غالب کی گاڑی اپنی مخصوص جگہ پر پارک تھی اور خادم نیچے کھڑا تھا۔

میں نے کہا "میں اپنے خیالوں میں کھو گیا تھا۔"

"خیالوں میں یوں کھوتے رہے تو کھوتے بن جاؤ گے" منظر بولا۔

"اصلی کھوتے تو ہم ہیں جی" خادم آہ بھر کے بولا "انسان تو ہمیں کوئی سمجھتا ہی نہیں۔ گھر والی بس شوہر سمجھتی تھی۔ آپ لوگ تو پتا نہیں کس مٹی کے بنے ہوئے ہو۔ وہ کیا کہا ہے شاعر نے..... خونِ دل پینے کو اور زخمِ جگر کھانے کو۔ اس پر گزارا کر لیتے ہو۔"

"آخر بات کیا ہے، کیوں خفا ہو، کچھ بتاؤ تو سہی؟"

"کیا بتانا ضروری ہے جی۔ خود آپ کو دکھائی نہیں دیتی ناچیز کی فاقہ زدہ صورت۔ کبھی دو لقمے زیادہ کھا لوں تو سب کو نظر آتا ہے۔ یہ کسی کو نظر نہیں آ رہا ہے بھوک سے خادم حسین کا۔ دم واپسیں پر سرِ راہ ہے، اور سرِ راہ کیسے کیسے اشتہا انگیز مناظر تھے۔ کہیں پلاؤ، کہیں سیخ کباب، کہیں قورمہ، خوشبو سے ہی دم نکل رہا تھا جی مگر آپ تو جتلا تھے مُردوں کی فکر میں۔ زندوں کا خیال ہی نہیں....."

رابعہ نے مسکرا کے کہا "اُفوہ۔ سیدھی طرح بھی تو کہہ سکتے ہو کہ بھوک لگی ہے۔ روزے رکھتے ہو رمضان میں کہ نہیں۔"

"نہیں کا کیا سوال جی۔ مجال ہے جو ایک بھی چھوٹا ہو کبھی۔"

"اس کے باوجود اتنی بھی برداشت نہیں حالانکہ روزہ نام ہی صبر اور قوتِ برداشت کا ہے۔" رابعہ نے کہا۔

"رمضان کی اور بات ہے جی۔ اللہ توفیق دیتا ہے۔ سارا سال تو رمضان نہیں ہو سکتا۔"

منظر اوپر جا چکا تھا۔ میں نے خادم کو سو کا نوٹ دے دیا "دیکھو، آس پاس قریب سے ہم سب کے کھانے کے لیے کچھ لے آؤ۔"

میں رابعہ کے ساتھ آفس میں پہنچا تو منظر ایک لفافہ کھول رہا تھا "یہ کسی نے نیچے سے ڈالا ہے۔"

رابعہ نے کہا "کیا ہے؟"

"ایک اور خط آیا ہے سکندر کے نام۔ کوئی بھوتنی کا ماننے کو تیار نہیں کہ سکندر غائب ہے۔"

"اب کیا پیغام ہے؟"

منظر نے پڑھتے ہوئے کہا "ایک ٹیلی فون نمبر لکھا ہوا ہے۔ کس کا نمبر ہے یہ؟"

میں نے اور رابعہ نے باری باری اس کاغذ کے پُرزے کو دیکھا جس پر سوائے ایک فون نمبر کے کچھ بھی نہیں تھا۔ اعداد کی ترتیب یہ ظاہر کرتی تھی کہ فون سمن آباد یا ماڈل ٹاؤن ایکس چینج کے علاقے کا ہو گا۔ قصور میری یادداشت کا نہیں ذہنی انتشار کا تھا کہ اس نمبر نے میرے ماضی کی کتاب کے اوراق نہیں پلٹے اور میں کچھ دیر ان اعداد کو یوں گھورتا رہا جیسے مجھے حساب کا کوئی مشکل سوال حل کرنے کو دے دیا گیا ہو۔

پھر اچانک مجھے یاد آ گیا "یہ..... یہ تو میرا..... میرے گھر کا پُرانا نمبر ہے۔"

"پُرانا نمبر.....؟"

"ہاں۔ جب میں لندن گیا تھا تو ہمارے گھر کا فون نمبر یہی تھا۔ اسی نمبر پر میں والد صاحب سے بات کرتا تھا مگر بعد میں جب وہ گھر کسی اور کی ملکیت ہوا تو نمبر بدل گیا تھا۔ پہلے والا نمبر کٹ گیا تھا اور نئے مالک نے اپنے نام سے کنکشن لیا تھا۔ اس کے بعد رابعہ نے وہ گھر پھر میرے لیے خریدا تو نئے سرے سے فون کے لیے درخواست دی تھی۔"

"ہاں۔ فون جو ایک شخص کے نام پر ہو کسی اور کے نام نہیں کیا جاسکتا۔ جب تک کہ وہ قانونی وارث نہ ہو۔ اور عدالت یہ تسلیم کر چکی ہو۔" منظر نے کہا۔

"مجھے جو ملا وہ تیسرا نمبر تھا" رابعہ بولی۔

"میں حیران ہوں کہ مجھے اتنی دیر سے کیوں یاد آیا؟"

"حیران و پریشان ہونے سے بہتر ہے تم سوچو کہ کسی نے تم کو یہ نمبر کیوں بھیجا ہے؟" منظر نے کہا۔

رابعہ بولی "بعد میں تو یہ نمبر کسی اور کو ملا ہوگا؟"

"ابھی معلوم کرلیتے ہیں۔ نمبروار یعنی NUMERICAL ڈائریکٹری تو ہوگی یہاں" منظر نے کہا۔

رابعہ نے اسے ڈائریکٹری نکال کے دی مگر اس میں یہ نمبر ابھی تک بدلا نہیں تھا۔ اس میں بدستور وزیر خان کے نام اور پتے کا اندراج تھا۔ اسے ٹیلی فون کے محکمے والوں کی نااہلی سمجھا جاسکتا تھا اور فون نمبر کے موجودہ مالک کی عدم دلچسپی بھی کہ اس نے تصحیح کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

رابعہ نے مشورہ دیا "بات کرکے دیکھ لو۔"

میں نے نفی میں سرہلایا "مجھے کیا ضرورت ہے۔"

"بھئی لفافے پر تمہارا نام تھا...."

میں نے کہا "یہ چال ہے کسی کی۔ جال پھیلایا گیا ہے میرے لیے۔ کہ میں اس فون نمبر کو دیکھتے ہی جذباتی ہو کے ڈائل گھمادوں۔ بعض اوقات تجسس ہی آدمی کو مروا دیتا ہے۔ دلاور اینڈ کمپنی کسی طرح یہ فون نمبر حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی ہے۔ اگر میں نے بات کی تو میری آواز ٹیپ ہو جائے گی۔ یہ ثابت ہو جائے گا کہ میری روپوشی ایک فریب ہے۔ درحقیقت میرا سب سے رابطہ ہے اور میں اسی جگہ موجود ہوں۔ یہ نمبر آبزرویشن پر ہوگا۔ وہ معلوم کرلیں گے کہ سکندر نے کہاں سے کال کی تھی۔"

"اس کی بات سمجھ میں آتی ہے۔" منظر بولا "اب اللہ کا نام لے کے تم یہ نمبر ملا دو بی بی اور دیکھو پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔" "میں نمبر ملاؤں؟"

"یار' اس میں ڈرنے کی کون سی بات ہے۔ یہ تمہارا آفس ہے اور یہ رقعہ تمہیں اپنے آفس میں ملا ہے۔ ابھی تک ایسا کوئی سائنسی طریقہ ایجاد نہیں ہوا تخریب کاری کا کہ آپ کسی کا فون نمبر ملائیں اور خود دھماکے سے اُڑ جائیں۔"

میں نے سوچ کے کہا "یہ بھی ہوسکتا ہے منظر صاحب۔ ذرا عقل کے گھوڑے دوڑایئے۔ امکانات کتنے بھی کم ہوں مگر ناممکن کچھ نہیں۔ تمہیں معلوم ہے کہ آج صبح دلاور کی بیوی اور اس کا بیٹا آئے تھے۔ جب بیٹا آیا تو یہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ سوائے اس مولوی خادم حسین کے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ اس لونڈے نے مولوی کو چکر دے کے اِدھر اُدھر بھیجا اور نظر بچا کے فون میں بم نصب کر گیا۔ ایک چھوٹا کاج۔ خط دینے کا بہانہ تھا۔ ادھر یہ نمبر تھمایا کسی نے اور.... بوم...."

"کیا ایسا ہو نہیں سکتا؟"

"بھوتنی کے یہ وہی فون ہے جو ہم روز استعمال کرتے ہیں۔"

"گاڑیاں بھی وہی تھیں جو ہم روز استعمال کرتے تھے مگر ان میں جاسوسی کے آلات نصب کردیے گئے تھے اور یہاں اس آفس میں ہم نے کتنے خفیہ مائکروفون دریافت کیے تھے۔"

"مائکروفون اور بم میں بہت فرق ہوتا ہے نور چشم" منظر نے کمزور سا دفاع کیا۔

"کور چشم۔ نمبر والے قفل ہوتے ہیں یا نہیں؟ اِدھر اُدھر ہزار نمبر ملاؤ تالا نہیں کھلتا۔ ایک مخصوص نمبر پر لیور حرکت میں آجاتے ہیں۔ یہ سسٹم کیا تخریب کاری میں استعمال نہیں ہوسکتا۔ جتنی DEVICES ہیں جو ٹائم پر' مخصوص فریکوئنسی پر کام کرتی ہیں۔ ریموٹ کنٹرول۔ انفراریڈ یا الٹراوائلٹ شعاعوں سے چلنے والے الیکٹرانک آلات۔ خود کار دروازے۔ کیا یہ سب سائنس فکشن ہیں؟ یہ سب آج کے حقائق ہیں' یہ سائنس ہے۔"

"ابے سائنس کے گھوڑے۔ میں مانتا ہوں سب مگر اتنا وقت کہاں تھا اس لونڈے کے پاس۔ تو نے خواہ مخواہ وہم ڈال دیا ہے میرے دل میں" منظر نے ٹیلی فون کو گھورتے ہوئے کہا۔

رابعہ نے کہا "احتیاط کرنے میں کیا حرج ہے۔"

میں نے کہا "اگر اس نمبر پر بات کرنی ہے تو باہر کہیں جا کے کرلیتے ہیں۔ یہ تمہارے ساتھ والے آفس میں بھی فون ہے۔"

منظر بولا "اس فون کو میں معائنے کے لیے بھیج دوں؟"

رابعہ نے کہا "بھئی سیٹ بدل دیتے ہیں۔ وہم دور ہو جائے گا۔ مولوی خادم حسین کی آمد نے سہ پہر چار بجے لنچ کا موقع فراہم کردیا ورنہ ہم تو شاید چائے کافی پی کے وقت گزار دیتے۔ ان حالات میں نہ بھوک محسوس ہوئی تھی اور نہ کسی کے نزدیک کھانے کی اتنی اہمیت تھی مگر کھانا سامنے آیا تو سب اس پر ٹوٹ پڑے۔ اس وقت تک مؤکل آنے لگے تھے۔ وقار یوسف اور اس کے ساتھی وکیل ٹائپسٹ اور عملے کے دیگر ارکان ہر روز کی طرح اپنے کام میں لگ گئے پھر منظر کو بھی چند معاملات میں راہنمائی اور ہدایات دینے کے لیے جانا پڑا اور وہ وہیں اُلجھ کے رہ گیا۔

میں نے رابعہ سے کہا "تم کہیں سے اس نمبر پر بات کرکے دیکھو۔ مجھے شک ہے کہ پیڈرو یا دلاور کا کوئی والی وارث مجھ سے رابطہ کرنا چاہتا ہے۔"

"کوئی ضرورت نہیں کسی سے بات کرنے کی۔ لیں گے۔ بعد میں کچھ نہیں ہو سکے گا۔ ہم زیادہ سے زیادہ دلاور کو مار دیں گے مگر ہمیں غالب اور نازو تو نہیں ملیں گے۔"

"تم کیا چاہتے ہو آخر؟"

"یہی کہ انہیں اُمید کے جال سے نکلنے نہ دیا جائے۔ مایوسی کی اس انتہا کو نہ پہنچنے دیا جائے جہاں وہ صدمے یا اشتعال سے پاگل ہو کے مرنے مارنے پر تل جائیں۔ سب کو ماردیں اور خود بھی مر جائیں۔ دوسروں سے یہ امید نہیں مگر دلاور کا بیٹا جذباتی ایٹم بم ہے اور اس کی بیوی زخم خوردہ ناگن۔ ان دونوں سے ڈرنا چاہیے۔ آج رات ہم وزیر خان اسپتال میں داخل ہونے کی کوشش کریں گے۔ باہر کے حفاظتی انتظامات منظر یا وقار یوسف کے سپرد کر جائیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ غالب اور نازو کو وہیں رکھا گیا ہوگا۔"

رابعہ اُٹھی "میں فون کرکے آتی ہوں۔"

مجھے بہت کم اُمید تھی کہ رابعہ کی کوشش کے نتائج امید افزا ہوں گے مگر وہ واپس آئی تو اس کی صورت کے تاثرات سے میں نے اندازہ کیا کہ کوئی نئی بات ضرور ہوئی ہے۔

"وہ نمبر تو کسی ڈاکٹر علی حیدر کا ہے۔"

"میں کسی ڈاکٹر علی حیدر کو نہیں جانتا۔" میں نے کہا۔

"منظر اور وقار یوسف بھی نہیں جانتے۔ میں نے پوچھ لیا ہے لیکن گھر پر صرف ملازم تھا اس لیے زیادہ بات نہیں ہوئی۔"

میں نے سوچتے ہوئے کہا "خود ڈاکٹر سے کب بات ہوگی؟"

"وہ پانچ سے چھ بجے کے درمیان گھر پر ملتے ہیں۔ چھ بجے کلینک جاتے ہیں تو پھر رات کو دس بجے لوٹتے ہیں۔ بیوی بچے انہیں بہت پہلے چھوڑ گئے تھے۔ تب سے وہ اکیلے رہتے ہیں۔"

"نمبر کہاں کا ہے' میرا مطلب ہے پتا؟"

"وہیں۔ ہمارے گھر کے قریب ہی کوٹھی ہے ڈاکٹر علی حیدر کی۔"

رابعہ کا میرے گھر کو ہمارا گھر کہنا مجھے اچھا لگا "جب تک ڈاکٹر صاحب سے بات نہ ہو کچھ پتا نہیں چل سکتا۔"

"ایک اور بات بتائی وقار یوسف نے۔ اس کی عدم موجودگی میں کسی علی حیدر نے فون کیا تھا۔ اس کی بیوی کو علی اصغر یاد رہا مگر وہ بھی ڈاکٹر تھا۔ اس نے تمہارا پوچھا تھا کہ سکندر بخت صاحب ہیں؟" "پھر اس نے کیا کہا کہ ہیں....؟"

رابعہ مسکرائی "ہاں۔ اس نے کہا کہ ہیں تو سہی ایک صاحب اس نام کے مگر یہ پتا نہیں کہ دنیا میں کہاں ہیں۔ غالباً میرے شوہر کے کلائنٹ ہیں۔ کبھی کبھار آتے تھے ان کے پاس مگر اب مدت سے ذکر نہیں سنا۔"

"ویری گڈ۔ بہت سمجھ داری کا جواب ہے۔"

"اس کے بعد اور کچھ نہیں پوچھا گیا۔ وقار یوسف کسی علی اصغر نام کے ڈاکٹر کو بھی نہیں جانتا تھا۔ اس نے ابھی مجھ سے پوچھا کہ تمہارا یا سکندر کا کسی ایسے شخص سے کوئی واسطہ رہا ہے جس کا

میں نے کہا "جو حکم سرکار کا۔ میں خود بھی بات کرکے اپنی پوزیشن خراب نہیں کرنا چاہتا۔"

"ویسے بھی اب بات کرنے کا وقت گزر گیا ہے۔ دلاور ہمارے پاس ہے... اس کی فردِ جرم تیار ہے۔ ثبوت شہادت' سب ہے ہمارے پاس..."

"لیکن ہم اس کے باوجود چوہدری دلاور کو ابھی تک قانون کے حوالے نہیں کرپائے" میں نے کہا۔

"مگر اس بار وہ ہمارے چُنگل میں ایسا پھنسا ہے کہ نکل نہیں سکتا۔ میں نے کہا "مجھے ایک بات بتاؤ۔ دلاور خود تو واقعی کچھ بھی کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے لیکن اس کے والی وارث تو ہیں۔ انہوں نے ہتھیار نہیں ڈالے ہیں۔ وہ دلاور کو واپس حاصل کرنے کے لیے سب کچھ کر گزرنے پر کمربستہ ہیں۔ غالب اور نازو ان کے قبضے میں ہیں۔ فوزیہ کو دھمکی ملی ہے۔ محسن اور گل کی طرف سے خبردار کردیا گیا ہے۔ وہ مایوس بالکل نہیں ہیں۔ انہیں پوری اُمید ہے کہ ہم دباؤ میں آجائیں گے۔ جس دن یہ اُمید ختم ہوگئی' یہ سمجھو کہ سب ختم ہوجائے گا۔"

"پھر ہم کیا کریں' دلاور کو چھوڑ دیں؟"

"ایسے نہیں۔ بازی کو لمبا کرو۔ اپنے پتے سنبھال کے رکھو اور دشمن کو اپنے پتے شو کرنے پر مجبور کردو۔ اگر کوئی بات کرنا چاہتا ہے ہم سے تو اس کی بات سُنو اور سمجھو۔ یہ عقل کا کھیل ہے۔ اس کھیل میں ہمارے مقابل دلاور تھا اور اس کا ذہن شیطانی چال چلنے میں ماہر تھا۔ وہ بلاشبہ بہت بڑا شکاری تھا۔ کچھ شکاری اسپورٹس مین ہوتے ہیں جو ایڈونچر یا شوق کی خاطر شکار کرتے ہیں اور شکار کے اصولوں کی پیروی کرتے ہیں۔ ان کے لیے یہ گیم ہوتا ہے۔ دلاور جیسے شکاری KILLERS ہوتے ہیں جن کے نزدیک شکار نہ تفریح ہے نہ ایڈونچر بلکہ صرف اپنی وحشی طاقت کا مظاہرہ ہے جس میں شکار کو ماردینا ہی اہم ہے۔ کوئی طریقہ یا اصول اہم نہیں۔ اب میدان میں دوسرے درجے کے شکاری ہیں جو عیاری' مکاری اور سفاکی میں دلاور کے ہمسر نہیں۔ انہیں ہم شکست دے سکتے ہیں مگر اس کے لیے وقت چاہیے۔ عقل چاہیے اور صبروسکون چاہیے۔ ورنہ یہ بات لکھ لو کہ اناڑی شکاری جلد بازی میں اپنا بھی نقصان کریں گے اور ہمارا بھی۔"

"شاید تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو؟" رابعہ نے مایوسی سے کہا۔

"دیکھو رابعہ۔ اگر آج ہمارے سامنے سیدھا سوال ہو۔ ایک ڈیڈ لائن آجائے فیصلے کی۔ اچانک دلاور کی بیوی یا اس کا گرم خون رکھنے والا جوان بیٹا اعصابی دباؤ سے نروس بریک ڈاؤن کا شکار ہو جائیں۔ وہ ذہنی طور پر دلاور کی موت کو قبول کرلیں۔ ہر طرف سے مایوس ہو کے اور ہر کوشش کا انجام ناکامی دیکھتے ہوئے نوٹس دے دیں کہ آج رات بارہ بجے تک دلاور کو چھوڑ دو ورنہ ہم نازو اور غالب کو نہیں چھوڑیں گے پھر کیا ردعمل ہوگا ہمارا۔ اگر ہم نے سمجھا کہ وہ ایسا نہیں کرسکتے' یہ محض دھمکی ہے تو ہم بہت بڑا رسک

نام ڈاکٹر علی اصغر یا علی حیدر ہو۔ میں چونکی تو آپ نے باقی بات بتائی۔ پھر...؟"

پھر کیا' اب جیسا تم مناسب سمجھو۔ علی حیدر کا کوئی تعلق ضرور ہے اس کیس سے۔"

"کیوں نہ اس سے مل لیں اس کے گھر جا کر' ساری بات صاف ہو جائے گی۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" رابعہ بولی۔

چونکہ اندر ہمارے سوا کوئی نہیں تھا اس لیے میں نے رابعہ کا منہ چومنے میں دیر نہیں لگائی۔ اسی وقت آواز آئی "لاحول ولا قوۃ۔"

"یہ کیا بدتمیزی ہے" وہ گھبرا کے اور بگڑ کے بولی۔

میں نے کہا "ہر بار کہنے سے کیا فائدہ کہ اس بات پر تمہارا منہ چوم لیتا۔ آدمی کو پریکٹیکل ہونا چاہیے مگر یہ لاحول کس نے پڑھی تھی۔" "وہی تمہارا مولوی خادم حسین تھا اور کون۔ تمہیں ذرا خیال نہیں کہ یہ دفتر ہے۔" رابعہ نے خفگی سے کہا۔

"بات جگہ کی نہیں موقعے کی ہوتی ہے۔ اس الّو کے پٹھے کو اندر جھانکنے کی کیا ضرورت تھی۔ عین اسی وقت۔"

"وہ شریف آدمی ہے۔"

"تو ہم کیا بدمعاش ہیں اور میں تمہاری یہ غلط فہمی دور کر دینا چاہتا ہوں کہ محض مولوی خادم حسین کہلانے سے وہ شریف آدمی ہونے کی سند حاصل کر چکا ہے۔ وہ مجھ سے بڑا بدمعاش ہے۔"

رابعہ کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی "ابھی پوچھ رہے تھے مجھ سے کہ کیا ہم بدمعاش ہیں۔ اب خود تسلیم کر رہے ہو۔"

میں نے دروازہ کھول کے جھانکا تو مولوی خادم حسین دوسری طرف منہ کیے سر کھجا رہا تھا۔

میری آواز پر وہ چونکا اور جھینپ کر مسکرانے لگا۔ "وہ جی... غلطی ہو گئی۔"

میں نے کہا "ہاں۔ ہم سے غلطی ہو گئی لیکن کیا کریں۔ انسان خطا کا پُتلا ہے اور حوا کی بیٹی خطا کی پُتلی۔ اللہ ہم سب کو معاف کرے۔"

وہ مزید شرمندہ ہوا۔ رابعہ باہر آئی تو اس کا چہرہ بھی گلابی ہو رہا تھا۔ ہم خاموشی سے آفس سے گزرے۔ رابعہ نے منظر کے کان میں کچھ کہا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ اسے علی حیدر ملک کے گھر کا پتا بتا رہی ہوگی اور یہ کہ ہم اس سے ملنے کے لیے جا رہے ہیں۔

میں نے ڈرائیونگ خادم حسین کو سونپی اور خود رابعہ کی کار میں اس کے ساتھ پیچھے بیٹھ گیا۔ جب سے کاروں میں لگائے ہوئے خفیہ مائکروفون دریافت ہوئے تھے ہم دورانِ سفر ایسی کوئی بات نہیں کرتے تھے جو افشائے راز کا سبب بنے یا دشواریاں پیدا کرے۔ ہر بار آتے جاتے گاڑی کو چیک کرنا کہ اس میں کسی نے کہیں ایف ایم مائکروفون تو نہیں چپکا دیا ہے عملاً ناممکن تھا۔ ماچس کی ڈبیا جتنا مائکروفون کوئی راہ چلتے ایک منٹ میں لگا سکتا تھا

مگر اسے پوری کار کی باڈی میں تلاش کرنا ہو تو ایک گھنٹا بھی...

رابعہ نے خادم حسین کو سمجھا دیا تھا کہ ہمیں کہاں جانا ہے۔ پیچھے خاموشی سے رابعہ کے ساتھ بیٹھ کے میں نے پیچھے... نگاہ رکھی کہ ہمارا تعاقب تو نہیں کیا جا رہا ہے اور رابعہ کے... بھی۔ میں نے رابعہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تب بھی اس... مزاحمت نہیں کی۔

میں نے خادم حسین سے فرنچ میں کہا "مادام سے کہو کہ... وقت کرۂ ارض پر آپ سے زیادہ حسین خاتون کوئی نہیں اور... مس یونیورس بنی پھر رہی ہیں نا' یہ سب صیہونی سازش ہے... بوگس کارروائی ہے۔"

"یہ میں نہیں کہہ سکتا جناب!"

"کیوں نہیں کہہ سکتے۔ آخر تم مترجم ہو۔ ہمارے جذبات... ترجمانی بھی تمہارے فرائض میں شامل ہے۔"

"مادام ماریں گی مجھے۔"

"نہیں ماریں گی۔ میں نے ان کا ہاتھ پکڑ رکھا ہے۔"

نہ جانے کس موڈ میں خادم حسین نے میری بات کا لفظ بہ لفظ ترجمہ رابعہ کو سُنا دیا۔ رابعہ نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ اس کا چہرہ... سے اور حیا سے لال پڑ گیا۔ وہ خادم پر برس پڑی۔

"خادم۔ کیا تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ بدتمیزی کرتے ہو میرے ساتھ۔"

"جی' میں نے تو انکار کیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ ماروں گا اگر... نے ایسا نہ کہا۔ ترجمہ کرنا تمہارا کام ہے۔"

میں نے کہا "خادم ان سے کہو کہ سچ بولنا کوئی جرم نہیں۔"

"اجی لعنت سچ بولنے والے پر۔ آپ مجھے جوتے پڑوائیں گے۔ خود کیوں ڈرتے ہیں اتنا۔"

میں نے کہا "کون کہتا ہے کہ ہم ڈرتے ہیں۔" رابعہ سخت... میں تھی۔ میں پھر بولا "میں نے کہا ہے کہ سچ بولنا کوئی جرم نہیں... یہ غلط ہے؟ مگر مولوی تم انتہائی بزدل ہو۔ حق بات کہتے ہوئے... ڈرتے ہو۔"

"مجھے نہیں معلوم جی آپ کے جھوٹ سچ کا۔"

رابعہ کی خفگی دور ہو گئی تھی اور اس کا ثبوت یہ تھا کہ... دوسری طرف کر کے باہر دیکھ رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ مسکرا رہی ہوگی۔ ڈاکٹر علی حیدر کی کوٹھی تلاش کرنا میرے لیے بہت آسان تھا۔ کیونکہ میں اس علاقے کے چپے چپے سے واقف تھا۔ جہاں... میرے والد وزیر خان کی اور اب ہماری کوٹھی تھی۔ اس کے بالکل پیچھے والی گلی میں ڈاکٹر علی حیدر کی چوتھی کوٹھی تھی۔ پورچ میں... کی شاندار گاڑی کو ایک ڈرائیور مزید چمکانے میں مصروف تھا۔

"ڈاکٹر صاحب سے کہو کہ ہم ملنا چاہتے ہیں" رابعہ بولی۔

"کیا نام بتاؤں جناب عالی؟" ڈرائیور نے مؤدبانہ کہا۔

رابعہ نے سوچ کے کہا "کہنا مسٹر اور مسز سکندر بخت۔"

ڈرائیور اندر چلا گیا تو میں نے مسکرا کے خادم حسین کو...

"میں رابعہ قاری ہوں۔ ایڈووکیٹ ہائی کورٹ۔ اور یہ موسیو آندرے برطانیہ کے مشہور وکیل ہیں۔ یہ انگلش بھی نہیں سمجھتے۔ صرف فرنچ بول سکتے ہیں اس لیے یہ مترجم ہے۔"

علی حیدر بیٹھ گیا۔ "میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آپ کو جھوٹ بول کے اندر آنے کی کیا ضرورت تھی۔ کون ہے یہ کم بخت سکندر بخت جس کی وجہ سے میری زندگی خواہ مخواہ عذاب میں ہے۔"

"سکندر بخت ہمارا ایک دوست تھا... بلکہ ہے۔"

"تھا یا ہے۔ ایک بات کرو سوچ کے خاتون۔"

رابعہ نے کہا "دراصل وہ لاپتا ہے۔ ہم اس کو تلاش کر رہے ہیں۔"

"میرا نام کس نے بتایا تمہیں۔ کیا میں نے چھپا رکھا ہے تمہارے دوست کو؟"

"ہمیں کسی نے آپ کا فون نمبر دیا تھا اور کہا تھا کہ اس نمبر پر رابطہ قائم کریں۔ اتفاق سے یہ نمبر پہلے سکندر بخت کے والد کا تھا۔ کافی پُرانی بات ہے۔ وہ پیچھے والی سڑک پر رہتے تھے' وزیر خان۔"

"وزیر خان" اس نے ذہن پر زور دیا "لیکن وہ تو مر چکا ہے۔"

"آپ جانتے تھے انہیں؟"

"آف کورس۔ کبھی کبھی ہم شطرنج کھیلتے تھے اور مچھلی کا شکار کرنے بھی جاتے تھے۔ وہ بھی اکیلا تھا اور میں بھی۔ اسی کا فون نمبر تھا۔ رابعہ نے کہا "ان کا ایک لڑکا تھا۔"

"یس۔ غالباً لندن میں زیرِ تعلیم تھا وہ"

"بالکل ٹھیک۔ اسی کا نام سکندر بخت تھا۔ اس کا نام کبیر خان بھی تھا۔" رابعہ نے خوش ہو کے کہا۔

"اگر تم دوسرا نام نہ بتاتیں تو مجھے یقین کرنا مشکل ہوتا۔ یہ فیملی نیم بہت ہی کم لوگ جانتے تھے۔ خیر' تم اسے کیسے جانتی ہو؟"

"وہ میرا کلاس فیلو تھا اور لندن سے آیا تھا تو ہماری نسبت طے ہو گئی تھی پھر حالات کچھ ایسے ہو گئے کہ شادی سے پہلے وزیر خان کا انتقال ہو گیا اور سکندر بخت ایسی مشکلات میں گرفتار ہو گیا کہ وہ غائب ہو گیا۔ مجبوراً روپوشی اختیار کی اس نے۔"

"تمہیں بھی نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے؟" علی حیدر نے افسوس سے کہا۔

"مجھے بھی بہت رنج ہے" رابعہ دکھی لہجے میں بولی "کہ اس نے مجھے بھی اعتماد کے قابل نہیں سمجھا۔ میرا خیال ہے وہ لندن میں ہے۔ وہی ایک جگہ تھی جہاں اس کے دوست ہیں اور وہ محفوظ رہ سکتا ہے۔"

"آئی فیل سو سوری فار یو گرل" ڈاکٹر نے شفقت سے کہا "مجھے تو کسی نے فون پر کہا تھا کہ سکندر بخت کے نام سے تمہیں ایک تحفہ ملے گا یہ اسے دے دینا۔ میں نے کہا کہ میں تو کسی سکندر بخت کو نہیں جانتا تو مجھے ایک اور فون نمبر دیا گیا کہ یہاں سے پوچھ لو۔ وہ کسی وکیل کے گھر کا نمبر تھا۔ تم دونوں بھی وکیل ہو' اسے ضرور جانتے ہو گے۔"

"یار' کچھ لوگ خواہ مخواہ گلے کا ہار ہو جاتے ہیں۔ بلاوجہ رشتہ جوڑتے ہیں۔"

رابعہ نے مجھے گھورا "یہاں شرافت سے رہو' سمجھے۔"

میں نے خادم حسین سے کہا "تمہاری شرافت کی رگ نہیں پھڑکی؟ کسی عقدِ شرعی کے بغیر انہوں نے ایک نامحرم کو کیا کہہ دیا۔ تمہارے منہ سے لاحول ولا قوۃ نہیں نکلا۔"

ڈرائیور دوسرے دروازے سے نمودار ہوا۔ "اندر آ جائیں جنابِ عالی۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا ہے کہ مہمانوں کو بٹھاؤ۔ وہ باتھ روم میں ہیں۔"

میں نے جیب میں ریوالور کی موجودگی کو محسوس کیا اور ڈرائنگ روم کا جائزہ لے کر ایک ایسی جگہ بیٹھ گیا جہاں میرے پیچھے سے بے خبری میں کوئی نہیں آ سکتا تھا اور میں ہر آنے والے کو پہلے دیکھ سکتا تھا۔ صورتِ حال ابھی تک واضح نہیں تھی کہ علی حیدر ملک کی حیثیت کیا ہے۔ وہ دلاور اینڈ کمپنی میں شامل ہے یا اسے رابطے کا وسیلہ بنایا گیا ہے۔ بظاہر کسی ڈاکٹر کا دلاور کے مذموم کاروبار میں شریک ہونا مشکل لگتا تھا لیکن اس کا دلاور سے کوئی تعلق نہ ہوتا تو اس معاملے میں وہ کیوں ملوث ہوتا۔ یہ تعلق دور کا بھی ہو سکتا تھا مثلاً یہ کہ وہ دلاور کا فیملی ڈاکٹر ہو اور اب دلاور کی بیوی نے اسے سکندر کو بُلوانے کے لیے استعمال کیا ہو۔ زبردستی یا اس کی مرضی سے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

ڈرائنگ روم کی شان و شوکت سے صاف ظاہر تھا کہ وہ کوئی عام ڈاکٹر نہیں ہے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ڈاکٹر اکیلا تھا۔ اس کی کوئی فیملی نہیں تھی۔ بیوی بچے آخر اسے کیوں چھوڑ گئے تھے؟ میں نے سوچا۔ اگر ڈاکٹر نے دوسری شادی کی ہوتی تو پہلی بیوی طلاق لے کر جا سکتی تھی یا احتجاجاً واک آؤٹ کر سکتی تھی لیکن گھر میں دوسری عورت بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ جس گھر میں وجودِ زن نہ ہو وہ ایک بے رنگ تصویر کی طرح نظر آتا ہے۔ کیا پتا ڈاکٹر نے دوسری شادی ہی نہ کی ہو۔ وہ شوقین مزاج ہو اور بیوی کے جانے سے اسے عیاشی کی مکمل آزادی مل گئی ہو۔ ایسا شخص دلاور کا ساتھی ہو سکتا تھا۔

ڈاکٹر اچانک اندر آ گیا۔ وہ صورت سے ذرا بھی ڈاکٹر نہیں لگتا تھا۔ اگر میں ڈاکٹر ہوتا تو کمپاؤنڈر بھی اچھی صورت کا رکھتا۔ خدا نے اسے جیسی بھی صورت دی تھی اس میں ڈاکٹر کا قصور نہیں تھا اور صورت کا تمسخر اُڑانا یقیناً گناہ تھا مگر نہ جانے کیوں وہ میرے ذہن میں موجود ڈاکٹر کے تصور پر پورا نہیں اُترتا تھا۔ وہ پستہ قد' سیاہ فام اور کسی حد تک فربہ تھا۔ اس کے دائیں رخسار پر جھلسی ہوئی جلد کا ایک بدنما داغ اسے مزید بدصورت بناتا تھا۔

"تم میں سے سکندر بخت کون ہے؟" اس نے اندر آتے ہی کسی تمہید کے بغیر کہا۔

رابعہ نے خفت سے کہا "سکندر بخت تو کوئی بھی نہیں۔"

"واٹ! پھر تم لوگ کون ہو؟" اس نے غصے سے کہا۔

"وقار یوسف کو' بالکل جانتے ہیں۔"

ڈاکٹر نے تعجب سے سرہلایا "عجیب بات ہے۔ وہ تحفہ آخر براہِ راست تمہیں کیوں نہیں ارسال کیا گیا۔ بہت سی باتیں تمہاری صداقت ثابت کرتی ہیں۔ ایک تو تمہیں سکندر بخت کا اصل نام معلوم ہے۔ تم جانتی ہو کہ یہ فون نمبر پہلے کس کے نام پر تھا اور یہ کہ وقار یوسف کے گھر سے بھی مجھے بس اتنا ہی پتا چلا تھا کہ سکندر بخت کا کسی کو علم نہیں۔"

میں نے بے چینی سے خادم کے ذریعے کہا "وہ تحفہ کیا ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ کوئی میرے کلینک میں چھوڑ گیا تھا۔ آئی جسٹ ڈونٹ نو کہ مجھے اس ڈرٹی گیم میں کیوں گھسیٹا گیا ہے۔ نام ضرور جانتا ہوں میں اس کا مگر سکندر بخت میرے سامنے آجائے تو میں اسے پہچان نہیں سکتا۔"

"وہ تحفہ آپ کے کلینک میں ہے؟"

"نہیں۔ میں گھر لے آیا تھا مگر یہ حرکت بھی عجیب تھی کہ پیغام میرے گھر پر دیا گیا اور تحفہ کلینک پہنچادیا گیا۔ میں لے کر آتا ہوں۔"

میں نے رابعہ کی طرف دیکھا۔ ہم دونوں کی نظر میں ایک ہی سوال تھا جس کا جواب آنے والا وقت ہی دے سکتا تھا۔

خادم حسین نے آہستہ سے کہا "اس میں بم ہوگا جی۔ شرط لگالیں۔"

رابعہ نے آہستہ سے ڈانٹا "تم چُپ نہیں بیٹھ سکتے۔ ہم بھی اتنے ناسمجھ نہیں کہ اس فضول بات پر شرط لگائیں تم سے۔"

علی حیدر دوبارہ اندر آیا۔ اس کے ہاتھ میں چھ انچ لمبا چوڑا پارسل تھا جس پر مضبوط کپڑا سی کر سلائی پر لاکھ سے مُہریں لگادی گئی تھیں۔ "کیا یہ ڈاک سے آیا تھا؟"

"یس۔ انشورڈ پارسل تھا۔" اس نے پارسل رابعہ کی طرف بڑھادیا۔

"سکندر بخت معرفت ڈاکٹر علی حیدر۔" رابعہ نے مجھے سُنانے کے لیے اس پر لکھا ہوا پورا پتا پڑھا۔

"اس میں کوئی گڑبڑ ہے۔ دیکھو' بھیجنے والے نے اپنا نام کبیر خان لکھا ہے اور پتا میرے گھر کا۔ کیا مقصد ہے آخر اس کا سوائے اس کے کہ بعد میں اس کا سُراغ نہ لگایا جاسکے۔ خیر ناؤ اٹ از یور بے بی۔ میں صرف دعا کرسکتا ہوں کہ پھر کوئی مجھے اس معاملے میں ملوث نہ کرے ورنہ مجبور ہوکے میں پولیس سے رجوع کروں گا۔ ابھی تو میں نے خود ہی گریز کیا۔"

"یہ آپ نے اچھا کیا۔ تھینک یو ویری مچ۔ آپ کو جو ذہنی کوفت ہوئی اس کے لیے ہماری معذرت قبول کریں۔"

ڈاکٹر نے رابعہ کے شانے پر تھپکی دی "اٹ از او کے۔ تمہاری تو کوئی غلطی نہیں اس میں۔ خدا کرے تمہیں تمہارا سکندر بخت مل جائے۔"

"آمین" میں نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں ایک بات اور۔ میں اس پارسل کو براہِ راست گھر لے کر لایا تھا۔ میرا ایک مریض بم ڈسپوزل یونٹ میں ہے۔ اسے دکھایا تھا کہ چیک کرے۔ میں بھی پریشان تھا کہ کہیں اس میں ٹائم بم نہ ہو مگر ایسی کوئی بات نہیں۔"

"یہ تو آپ نے ہمارا کام آسان کردیا" رابعہ نے کہا "ہم چلتے ہیں۔" "ایسے کہاں چلتے ہیں۔ میں چائے پینے والا تھا۔ اس کے بعد میں کلینک چلا جاؤں گا۔ میرے ساتھ ایک کپ چائے پی کر جاؤ" اس نے یہ بات درخواست سے زیادہ حکم کے انداز میں کہی تھی۔

خود میرا موڈ چائے پینے کا تھا اور ڈاکٹر کے گھر میں مجھے اپنی پسند کی چائے بھی مل گئی۔ ہم وہاں سے رخصت ہوئے تو شام ڈھل چکی تھی۔ گاڑی کوٹھی سے باہر آئی تو رابعہ نے پارسل کھولنے کے لیے کہا۔ "ایسی کیا جلدی ہے۔ آفس چل کے دیکھ لیں گے۔"

رابعہ نے کہا "یہاں کیا حرج ہے۔"

خادم نے سر گھما کے کہا "حرج تو بہت ہے جی۔ چند سیکنڈ لگتے ہیں اس دنیا سے دوسری دنیا میں پہنچنے میں۔"

"سنا نہیں تھا ڈاکٹر کیا کہہ رہا تھا۔" رابعہ بولی۔

"پھر بھی جناب کلمہ ضرور پڑھیں کھولنے سے پہلے..."

میں نے سلائی کی طرف سے کپڑے کو پھاڑا تو اندر سے گتّے کا ایک ڈبا نکل آیا۔ اس پر ایک سلپ لگی ہوئی تھی اور اس پر لکھا ہوا تھا "یہ پہلی قسط ہے۔"

نہ جانے کیوں مجھے خیال آیا کہ میں پارسل کو رابعہ کے سامنے نہ کھولوں۔ کوئی نامعلوم خوف میرے دل میں ایک خلش پیدا کررہا تھا کہ کوئی ایسی ویسی بات ہونے والی ہے اور یہ تحریر وارننگ ہے لیکن رابعہ کا اصرار تھا کہ میں پیکٹ کھولوں۔

مجبوراً میں نے گتّے کے ڈبّے پر سے کاغذ اُتارا اور اس کا ڈھکنا کھولا۔ اس کے اندر سفید روئی کا گولا سا رکھا ہوا تھا۔ کار کے اندر کی فضا نسبتاً تاریک تھی مگر میں نے کاٹن کی سفیدی پر لہو کی سُرخی کا رنگ دیکھ لیا۔

میں نے ڈرتے ڈرتے روئی کے گولے کو ڈبّے سے نکالے بغیر کھولا تو اس کے عین وسط میں دو ڈھائی انچ کی کوئی سخت سی چیز محسوس ہوئی۔ میں چاہتا تھا کہ رابعہ سے پہلے خود اسے دیکھ لوں مگر رابعہ نے ڈبا اچانک مجھ سے لے لیا۔

دوسرے لمحے اس نے ایک دلخراش چیخ ماری اور ڈبے کو میری طرف پھینک کر سیٹ پر گرگئی۔ میں نے ڈبے کو فرش پر گرنے دیا اور رابعہ کو سنبھالا مگر وہ بے ہوش ہوچکی تھی۔

خادم حسین بہ آواز بلند آیت الکرسی پڑھ رہا تھا۔ میں نے اسے کار ایک طرف روکنے کے لیے کہا۔ اس نے گاڑی روکی نہ تھی کہ میں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔

"وقار یوسف کے گھر چلو۔" میں نے کہا۔

خادم نے ہکلاتے ہوئے کہا "کیا... کیا ہوا جی۔ کیا تھا اس میں؟"

انگلیاں تو نہیں رہ گئی ہیں۔ مجھے بالکل پتا نہیں تھا کہ کہیں میری بھی چار انگلیاں تو نہیں رہ گئی ہیں۔ مجھے بالکل پتا نہیں تھا کہ اندر کے درد کی اذیت سے میرے آنسو نکل آئے ہیں اور میری آنکھوں سے بہنے لگے ہیں۔

اچانک میری نظر ایک کاغذ پر گئی۔ پہلے میرا خیال تھا کہ یہ وہی سلپ ہے جو ڈبے پر لگی ہوئی تھی لیکن میں نے اسے اُٹھایا تو مجھے نازو کے ہاتھ کی تحریر نظر آئی۔

اس نے لکھا تھا۔

"مجھے پوری اُمید ہے کہ آپ لوگ حوصلہ نہیں ہاریں گے اگر آپ نے ڈر کے ان کی کوئی بھی شرط مانی تو میں خودکشی کرلوں گی۔ میں نے غالب کو اپنی قسم دی تھی اور آپ کو اپنی قسم دیتی ہوں۔ نازو ہارماننے والی نہیں ہے۔"

مجھے یہ تحریر پڑھ کے بے اختیار رونا آیا۔ میری چشم تصور نے نازو کے اس ہاتھ کو دیکھا جس کے حُسن و رعنائی کی مثال نہیں دی جاسکتی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ کی انگلی اس سے جدا ہوگئی تھی مگر وہ ہاتھ پہلے سے زیادہ خوب صورت ہوگیا تھا۔ کیا یہ سفاک منظر غالب نے بھی دیکھا ہوگا۔ اس کے دل پر تو قیامت گزری ہوگی مگر نازو یقیناً مسکراتی رہی ہوگی۔ میں اس بات پر کسی سے بھی شرط لگا سکتا تھا کہ نازو کے حلق سے آہ بھی نہیں نکلی ہوگی۔

ایک گاڑی طوفانی رفتار سے اندر آئی۔ ڈرائیور اتنی جلدی میں تھا کہ بریک لگاتے لگاتے اس نے کار کو رابعہ کی گاڑی سے ٹکرا دیا۔ ٹکر بہت معمولی تھی اور اس سے کسی کا نقصان بھی نہیں ہوا۔ "کَلی کہاں ہے۔ میرا مطلب ہے وقار کی بیوی۔ موڈ کیسا ہے اس کا۔ میں ڈاکٹر رشید ہوں۔ اس کا کزن۔"

"تم جو بھی ہو اندر جاؤ۔" میں نے برہمی سے کہا۔

"بہت غصے میں تھی وہ۔ خدا خیر کرے۔" وہ بیگ اُٹھا کے اندر چلا گیا۔

میں ڈاکٹر کے پیچھے پیچھے گھر میں داخل ہوا۔ وہ رابعہ کا معائنہ کررہا تھا اور وقار یوسف کی بیوی کی ڈانٹ ڈپٹ مسکراتے ہوئے سُن رہا تھا۔ میں نے خادم کو اشارے سے اپنی طرف بُلایا۔

"ڈاکٹر پوچھے گا کہ کیا ہوا تھا؟"

"میں بتادوں گا جی۔" اس نے سرہلایا۔

"بے وقوف۔ کسی کو کچھ نہیں بتانا ہے ابھی۔" میں نے کہا "کہہ دینا کہ گاڑی میں طبیعت اچانک بگڑ گئی تھی۔ کسی کو بھی اس... چیز کے بارے میں معلوم نہیں ہونا چاہیے۔"

"کس چیز کے بارے میں جی۔ مجھے تو خود کچھ پتا نہیں کہ وہ کیا شیطانی چیز تھی۔ میں نے تو خبردار کیا تھا۔ بم سے زیادہ خطرناک سفلی علم ہوتے ہیں۔"

میں نے دوسرے کمرے میں جا کے منظر کا نمبر ملایا "اسی وقت وقار یوسف کے گھر پہنچ جاؤ سارے کام چھوڑ کے۔"

"وقار یوسف کے گھر۔ اس کی بیوی کو کچھ ہوا ہے؟"

"نہیں یار۔ وہ ٹھیک ہے۔ بہت بھیانک واردات ہوگئی۔

"گاڑی چلاؤ۔" میں نے دہاڑ کے کہا۔

میں نے رابعہ کو سیٹ پر سیدھا لٹادیا۔ اس طرح کہ رابعہ کا سر میری گود میں آگیا اور اس کا جسم سیٹ پر رہا۔ اس کے پیر میں نے اوپر اُٹھا کے سمیٹ دیے تھے۔ رابعہ کا جسم ٹھنڈا ہورہا تھا اور اس کی نبض کی رفتار بھی مدھم تھی مگر خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔ یہ شدید ذہنی صدمے کا اثر تھا اور بے ہوشی کی کیفیت میں جسم کا ردِعمل یہی ہوسکتا تھا۔

وقار یوسف کی بیوی نے ڈاکٹر کو فون کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ رابعہ کو بیڈ پر آرام سے لٹا کے میں باہر گیا۔ کسی حد تک اندازہ تو میں نے کرلیا تھا مگر میں تصدیق چاہتا تھا۔ میں نے کار کی پچھلی سیٹ کے سامنے فرش پر پڑے ہوئے ڈبّے کو اُٹھایا اور دل کو مضبوط کرکے روئی کی تہ میں رکھی ہوئی اس چیز کو دیکھا۔

یہ ایک کٹی ہوئی انگلی تھی۔ دائیں یا بائیں ہاتھ کی سب سے چھوٹی انگلی۔ اس کا رنگ خون نکل جانے سے سفید ہوگیا تھا مگر اس کی جلد کی رنگت اُجلی تھی۔ یہ نازک زنانہ انگلی کس کی ہوسکتی تھی۔ میں اس کا اندازہ کرسکتا تھا۔

اچانک مجھے متلی سی محسوس ہوئی اور مجھے چکر آگیا۔ میں نے سخت کمزوری محسوس کی اور میں جہاں کھڑا ہوا تھا وہیں گرگیا۔

دوبارہ میری آنکھ وقار یوسف کے گھر میں کھلی۔ بے ہوشی کا یہ وقفہ مشکل سے دس منٹ کا ہوگا۔ خادم حسین نے مجھے اندر پہنچایا تھا اور وہی اب میرے جوتے اُتار کے ہاتھوں سے میرے تلوے مل رہا تھا اور مجھ پر پانی کے چھینٹے مار رہا تھا۔ وہیں ساتھ والے بیڈ پر رابعہ بے سدھ پڑی تھی اور وقار یوسف کی بیوی ٹیلی فون پر چلا رہی تھی "کیا بات ہے کب آؤ گے تم آخر؟ میں نے کہا تھا ایمرجنسی ہے۔ تمہاری سمجھ میں نہیں آتی یا نخرے بڑھ گئے ہیں تمہارے۔ میں اسپتال لے جاؤں ہاں' پانچ منٹ میں نہ آئے تم تو میں یہی کروں گی۔"

میں اُٹھ بیٹھا "تھینک یو خادم میں ٹھیک ہوں۔"

خادم حسین زیرِ لب کوئی وظیفہ پڑھتا رہا اور مجھ پر پھونکیں مارتا رہا "سب ٹھیک کہاں ہے جی۔"

میں نے کہا "بس مجھے چکر آگیا تھا۔"

وقار یوسف کی بیوی چلائی "اب کہاں جارہے ہیں آپ؟"

میں نے کہا "کہیں نہیں۔ مجھے ڈاکٹر کی ضرورت نہیں ہے۔"

میں جس کیفیت سے دوچار تھا اسے سرجیکل شاک کہا جاتا ہے۔ ڈاکٹر اس کے عادی ہوجاتے ہیں مگر عام آدمی انسانی خون کی بو یا جسم کے کسی کٹے ہوئے حصّے کو دیکھ کے نروس بریک ڈاؤن کا شکار ہوجاتا ہے۔ رابعہ پر صدمے کا اثر زیادہ شدید تھا۔ میں نے فرج میں سے بوتل نکال کے پانی پیا اور پھر باہر آکے اس ڈبّے کو اُٹھایا۔

کٹی ہوئی انگلی کو میں نے روئی میں دفن کردیا۔ اب مجھے ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے میرے دائیں ہاتھ کی سب سے چھوٹی انگلی درد کی شدت سے سُن ہوگئی ہے۔ میں نے غور سے اپنے ہاتھ کو دیکھا

ہے۔"

"کس کے ساتھ۔ رابعہ کے ساتھ؟"

"رابعہ بھی ٹھیک ہے تم وقت ضائع مت کرو۔"

"یار ایک کال موصول ہوئی تھی تمہارے لیے۔ میرا خیال ہے کہ دلاور کی بیوی بول رہی تھی اس نے کہا کہ رابطے کا جو طریقہ پہلے استعمال کیا جاتا تھا وہی استعمال کیا جائے۔ وہ بات کرنا چاہتی ہے۔" "کیا تم ساری باتیں فون پر ہی کرو گے۔" میں نے ریسیور دھڑ سے نیچے رکھا اور لوٹ کر اس کمرے میں گیا جہاں ڈاکٹر نے رابعہ کا معائنہ ختم کرلیا تھا اور اب صرف اپنی کزن کی جھاڑ کھا رہا تھا۔

"یار رنگی۔ اب خدا کے لیے معاف کرو۔ میں کیا کرتا۔ تمہاری کال ملتے ہی جوتے پہنے بغیر دوڑ لگاتا۔ مریض سمجھتے ڈاکٹر پاگل ہوگیا۔" پھر اس نے مجھے دیکھا تو مجھ سے مخاطب ہوگیا "خاتون ٹھیک ہیں انہیں سونے دیں۔ صبح اُٹھیں گی تو ٹھیک ہوں گی۔"

"ٹھیک نہ ہوئیں تو ٹھیک نہیں ہوگا ڈاکٹر صاحب۔"

"رنگی تم ذرا نہیں بدلی ہو۔" وہ باہر جاتے ہوئے بولا "ویسی ہی پٹاخا ہو ابھی تک۔"

میں نے اسے باہر تک چھوڑا اور اس کے سوالات کے جواب گول کرگیا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ رابعہ کی یہ حالت اچانک کیسے ہوئی تھی۔

میں نے کہا "وہ بیوی ہے میری۔ مجھے غصہ آگیا تھا۔ میں نے اس کے جھانپڑ مار دیا تھا۔"

وہ اپنی کار میں بیٹھ گیا "نہیں بتانا چاہتے تو مت بتاؤ۔ جھوٹ کیوں بولتے ہو بلاوجہ۔"

اس کی کار ابھی باہر گئی ہی تھی کہ ایک اور گاڑی خاموشی سے اندر آئی مگر فاکس ویگن کی خاموشی خود اپنی آمد کا اعلان کرتی ہے۔ یہ وہی نیلی فاکس ویگن تھی اور اس میں دو افراد بیٹھے ہوئے تھے۔

گاڑی میں سے دلاور کی بیوی کو اُترتا دیکھ کے ایک لمحے کے لیے تو میری عقل کا فیوز بھک سے اُڑ گیا اور میرا ذہن جذبات کی تاریکی میں ڈوب گیا۔

وہ بڑے غلط وقت پر آئی تھی۔ میرے دل میں دلاور سے انتقام کی خواہش کا الاؤ یوں بھڑک اُٹھا تھا جیسے کوئی پیٹرول کے لاکھوں گیلن والے ٹینک میں جلتی ہوئی دیا سلائی پھینک دے اور ایک دھماکے سے شعلے آسمان تک بلند ہو جائیں۔ جب آتش فشاں پھٹتا ہے تو سیال آگ کی بے پناہ ہلاکت خیز قوت رکھنے والی موج اپنی راہ میں آنے والی ہر چیز کو تہس نہس کرتی جاتی ہے۔ ویرانوں کے ساتھ آبادیاں راکھ ہو جاتی ہیں۔ خارزاروں کے ساتھ گلشن جل جاتے ہیں۔ سانپ بچھو اور زہریلے گرگٹ ہی نہیں خوش رنگ معصوم تتلیاں اور سُریلے نغمے الاپنے والے پرندے بھی آشیانوں میں خاکستر ہو جاتے ہیں۔ وہ ایسا ہی وقت تھا جب دلاور سے نفرت کے جذبات کا لاوا پھٹ پڑا تھا اور ایسے میں اچانک دلاور کی بیوی میرے سامنے آگئی تھی۔

دلاور نے ابھی ابھی میرے احساس پر سفاکی کی انتہا کرتے ہوئے اذیت کے خنجر سے ایسا وار کیا تھا کہ میرے دل کے زخم سے لہو اُبل رہا تھا۔ اگرچہ نازو پر یہ انسانیت سوز ظلم کرنے والا خود دلاور نہیں تھا۔ وہ ہماری قید میں تھا اور اس مجرم سے زیادہ بے بس کسی نامعلوم اور دور افتادہ جیل خانے کی کال کوٹھری میں زنجیر سے بندھا پڑا ہو۔ نازو کے ہاتھ کی ایک انگلی کاٹنے والا خود دلاور نہیں تھا مگر میں اس کے وجود کو نازو پر ہونے والے ظلم کا ذمے دار سمجھتا تھا۔

یہ کہنا غلط ہو گا کہ ایسی وحشیانہ بربریت کا ارتکاب خود دلاور کی بیوی نے کیا تھا۔ یہ جلادی صرف استاد پیڈرو ہی کر سکتا تھا مگر اس شیطانی فعل کی تجویز یا تائید میں دلاور کی بیوی کا ذہن ہونا بعید از امکان نہیں تھا۔

معلوم نہیں بے اختیاری کا وہ ایک لمحہ کیسے خیریت سے گزرا جب میں پاگل ہو کے دلاور کی بیوی کو دبوچ سکتا تھا اور اسے نازو کے بدلے یرغمال بنا کے اپنے انتقامی جذبات کی تسکین کا ذریعہ بنا سکتا تھا۔ شیطان نے مجھے بھڑکایا تھا مگر خدا نے مجھے بچا لیا اور بروقت عقلِ سلیم سے کام لینے کی توفیق عطا کی۔

مجھے خیال آگیا کہ اس وقت میں سکندر بخت نہیں فرخ ہوں جسے وہ سب معلوم نہیں جو غالب یا نازو پر بیت رہی تھی اور میرا سکندر بخت کے ذاتی معاملات سے بھی کوئی تعلق نہیں۔ اگر میں ضبط سے کام نہ لیتا تو ظاہر کا یہ پردہ باقی نہ رہتا اور اس سے بیک وقت دو نقصانات ہوتے، سکندر کی روپوشی کا ڈراما ختم ہو جاتا اور میں فرنچ وکیل کی حیثیت سے حاصل ہونے والی مراعات اور فوائد سے محروم ہو جاتا۔

میرے اشتعال کے فرو ہونے کی ایک وجہ وہ اجنبی شخص بھی تھا جو دلاور کی بیوی کے ساتھ گاڑی ڈرائیو کر کے لایا تھا۔ میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ ڈرائیور بھی نہیں تھا کیونکہ گاڑی سے اُترنے کے بعد وہ دلاور کی بیوی کے ساتھ ہی آگے آیا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں خادم حسین کو بُلاتا یا وقار یوسف کی بیوی کو مہمانوں کی آمد سے مطلع کرتا۔ دلاور کی بیوی نے مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر آ کے کہا "بات کرو نا۔ گونگے کیوں ہو گئے ہو؟"

اس کے ساتھ آنے والا چوبیس پچیس سال کا نوجوان لا اُبالی سا لڑکا چونکا اور مسکرانے لگا پھر اس نے مجھ سے فرنچ میں کہا۔ "مادام آپ سے کچھ بات کرنے کے لیے آئی ہیں۔"

میرا حیران ہونا فطری تھا "مجھ سے؟"

"ہاں۔ مادام کہتی ہیں کہ آپ اس وقت مصروف ہوں تو کوئی اور وقت رکھ لیں۔ اور مادام کہتی ہیں کہ وہ....."

"مجھے تو مادام کچھ کہتی نظر نہیں آتیں..... وہ چپ کھڑی ہیں۔ تم بول رہے ہو" میں نے کہا۔

وہ ہنس پڑا "یہ سب تو مادام نے مجھ سے راستے میں ہی کہہ دیا تھا۔"

"کہاں لے گئی؟" میں اس کے اندازِ بیان سے محظوظ ہوا۔

"پتا نہیں۔ آخر کہاں لے جاتی ہیں اس قسم کی لڑکیاں ایسے کاٹھ کے اُلو چاہنے والوں کو؟"

"تمہاری گرل فرینڈ تمہیں کہاں لے جاتی ہے؟" میں نے کہا۔

"گرل فرینڈ" وہ بسورنے لگا "جناب یہ فرانس نہیں ہے۔ پاکستان ہے یہاں زیادہ سے زیادہ منگیتر ہوتی ہے مگر وہ شجرِ ممنوعہ سے کم نہیں ہوتی۔ کوئی چوڑیاں پہنانے والا اس کا ہاتھ پکڑ سکتا ہے۔ ڈاکٹر سارا جسم ٹٹول کے دیکھ سکتا ہے۔ وہ گلی میں سبزی بیچنے والے سے بھاؤ تاؤ کر سکتی ہے مگر جہاں نظر آیا گلی میں وہ جو اس کا منگیتر ہے اور مستقبل کا ہونے والا مجازی خدا ہے تو ایک دم غائب۔ سات پردوں میں سے اس کی جھلک نہیں دیکھی جا سکتی جناب۔"

میں نے ہنسی کو ضبط کیا "تمہاری باتیں میرے لیے ناقابلِ فہم ہیں۔"

اس نے ایک آہ بھری "مادام کی تھیوری یہ ہے کہ جب ڈاکٹر شیلی درمیان میں آئی تھی تو محبت میں رقابت کا عنصر شامل ہوا۔ اس نے سکندر بخت کو اپنی طرف کھینچا اور محبوبہ نمبر ون یعنی وکیل رابعہ جو سمجھتی تھی کہ سکندر تو اس کے مقدر میں لکھا جا چکا اور اس کے جملہ حقوق اسی کے نام محفوظ ہیں۔ کاپی رائٹ ایکٹ کی اس خلاف ورزی پر سخت چراغ پا ہوئی اور اس نے جوشِ رقابت میں ڈاکٹر شیلی کا پتا صاف کر دیا یا کرا دیا۔"

"یہ غلط ہے" میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"کیوں؟ آپ جانتے ہی نہیں سکندر بخت کو تو پھر یہ کیسے کہہ سکتے ہیں؟"

"وہ۔ دراصل میں ڈاکٹر شیلی مرڈر کیس کے حقائق و شواہد دیکھ چکا ہوں۔ اس کے قتل کی وجہ کچھ اور تھی اور اسے قتل کرانے والے لوگ بھی دوسرے تھے۔ سکندر بخت کا چکر مجھے نہیں معلوم مگر رابعہ کا نام یقیناً اس کیس کی ایف آئی آر میں نہیں ہے۔ وہ تو مدعی ہے اس کیس میں۔"

"یہی تو ہوتا ہے یہاں جناب۔ جو قتل کرتا ہے وہی مدعی بن جاتا ہے اگر بااختیار ہو مگر اسے آپ میرے ذاتی جذبات سمجھ لیں۔ مادام ایک عورت ہونے کے ناتے جس قسم کے خیالات کا اظہار فرما رہی ہیں وہ ایک منطقی بات ہے۔ کیونکہ ایسا تو دنیا میں ہر جگہ ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہے گا۔"

اب دلاور کی بیوی کے لیے چُپ رہنا مشکل ہو گیا "اتنی دیر سے کیا بولے جا رہے ہو فرنچ میں۔ مجھے بھی تو پتا چلے۔"

"میں ذرا چھیتی اور گھن چکر کی وضاحت کر رہا تھا" لڑکے نے چالاکی سے کہا "وکیل صاحب کی ناقص عقل میں یہ بھی نہیں آتا کہ لڑکی گلے کا ہار کیسے ہو سکتی ہے۔ اب آپ ذرا سلیس اور سادہ زبان میں بات کریں تو مہربانی۔ ویسے یہ صاف منکر ہیں کہ کسی سکندر

دلاور کی بیوی کی تیوری چڑھ گئی "دانت کیوں نکال رہے ہو؟"

لڑکا مسکراتا تھا "دانت نکالنا میرا پیشہ ہے۔ بی ڈی ایس آخر کس لیے کیا ہے میں نے؟"

میں انجان بنا کھڑا رہا "مادام کون ہیں اور تم کون ہو۔ کسی تعارف کے بغیر میں کیا سمجھوں کہ وہ مسئلہ کیا ہے جس پر گفتگو ضروری ہے؟"

وہ لڑکا اپنے بارے میں یہ انکشاف کر چکا تھا کہ وہ دندان سازی میں ڈگری لے چکا ہے۔ اس کا ارادہ ڈینٹسٹ کا پیشہ اختیار کرنے کا ہوگا اگر اس کا کلینک ہوتا تو وہ اس وقت مسز دلاور کے ساتھ بطورِ مترجم اور ڈرائیور نہ آتا۔ شام کے وقت سب ڈاکٹر مصروف ہوتے ہیں خواہ دن میں وہ کسی سرکاری اسپتال میں ہوں لیکن شام کو پرائیویٹ پریکٹس ضرور کرتے ہیں۔ ڈینٹسٹ کو فی الحال ہمارے ملک میں اتنی اہمیت نہیں دی جاتی جتنی ملنی چاہیے یا عام ڈاکٹر کو حاصل ہوتی ہے۔ شاید یہ لڑکا ابھی سیٹ ہو رہا تھا اور موقعے کی یا وسائل کی تلاش میں تھا۔

"مادام کہتی ہیں کہ وہ آپ سے سکندر بخت کے بارے میں بات کریں گی" اس نے مسز دلاور سے مشورہ کر کے کہا۔

میں نے کہا "سکندر بخت! لیکن میرا اس کے معاملات سے کیا تعلق۔ میں اسے نہیں جانتا۔ میں نے اس کا نام ضرور سُنا ہے لیکن اسے ابھی تک دیکھا نہیں ہے۔"

میری بات سمجھنے کے بعد دلاور کی بیوی بولی "بنتا ہے حرامی۔ سب جانتا ہے یہ۔ دن رات اس کی چھیتی رابعہ کے ساتھ اس کی گاڑی میں گھومتا ہے۔ ہر جگہ اس کے ساتھ نظر آتا ہے۔ وہ حرافہ بتا سکتی ہے....."

لڑکا سر کھجانے لگا۔ "کیا یہ سب اس سے کہوں؟ چھیتی کا ترجمہ مشکل ہے۔ محبوبہ کہہ سکتا ہوں۔ اور حرافہ....."

"اس سے پوچھو کہ جب یہ ڈاکٹر شیلی کے قتل کی تفتیش کے لیے آیا ہے تو کیا اسے نہیں معلوم کہ وہ بھی سکندر بخت کے گلے کا ہار ہوئی تھی۔ بالکل بھول گیا تھا وہ رابعہ کو اور اس بے حیا کی ولایتی اداؤں نے گھن چکر بنا دیا تھا سکندر کو۔ طوطا چشم..."

"طوطا چشم..... گھن چکر؟ اتنے مشکل الفاظ مت بولیں۔ میری فرنچ ایسی ہی ہے جیسی یہاں کے بی اے پاس کی انگلش ہوتی ہے اور جو دل باغ باغ ہو گیا کا ترجمہ ہارٹ گارڈن گارڈن بی کیم کرتا ہے۔"

میں ڈاکٹر شیلی کے حوالے پر چونکا تھا "ڈاکٹر شیلی کا کیا حوالہ تھا؟"

اس نے کہا "مادام کے خیال میں وہ محبت اور رقابت کی ازلی تکون کا وہ ضلع تھی جس کے بغیر کوئی فلمی کہانی آگے نہیں بڑھتی۔ سکندر بخت چاہتا تھا رابعہ کو اور جواب میں وہ بھی چاہتی ہوگی۔ وہ ریل کی متوازی پٹریوں کی طرح زندگی کے سفر میں آگے بڑھ رہے تھے کہ ڈاکٹر شیلی بیچ میں کودی اور سکندر بخت کو چھین کر لے گئی۔"

بخت کو نہیں جانتے۔"
"چلو تم اس سے وقت لو۔ یہاں کھڑے کھڑے تو ساری بات نہیں ہوسکتی۔ یہ اتنا بدلحاظ ہے کہ اندر بیٹھنے کو بھی نہیں کہتا۔ میں خود یہاں کب بیٹھنا چاہتی ہوں۔"
لڑکے نے ترجمہ کیا "مادام آپ سے اکیلے میں کہیں ملنا چاہتی ہیں۔"
میں نے حیرانی سے کہا "آخر کیوں؟"
"جب اکیلے میں ملاقات ہو تو یہ خود پوچھ لیں مگر اکیلے میں آپ کیسے مل سکتے ہیں۔ کوئی مترجم درمیان میں ضرور ہوگا۔ غالباً میں ہی آپ دونوں کے جذبات کی ترجمانی کروں گا۔"
"یہ کیا بکواس ہے۔ مجھے کوئی شوق نہیں اس بڑھیا سے تنہائی میں ملنے کا جو مجھے قطبی ریچھ کی طرح بے ہنگم اور خطرناک لگتی ہے۔ ایسی عورت کے بارے میں کیا جذبات ہوسکتے ہیں میرے جیسے حسین اور جوان مرد کے۔"
مترجم پریشان ہوگیا لیکن اس نے ترجمہ یوں کیا "وکیل صاحب فرماتے ہیں کہ وہ بے حد مصروف ہیں۔"
دلاور کی بیوی نے غصے میں اپنا ہینڈ بیگ کھولا۔ میں تھوڑا سا نروس ہوا پھر مجھے خیال آیا کہ یہاں وہ ریوالور نکال کے مجھے گولی نہیں مار سکتی۔ اس نے بیگ میں سے سو سو کے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کے مترجم کو تھمادی "یہ وکیل اور ڈاکٹر ایسے ہی کہتے ہیں۔ انہیں جب تک فیس نہ ملے یہ بات نہیں کرتے۔ پتا نہیں بیوی کے ساتھ کیا کرتے ہوں گے؟"
مترجم نے کہا "بیوی کے ساتھ تو سب شوہر وہی کرتے ہیں۔"
"بکو مت۔ اسے کہو کہ یہ فیس ہے اس کے وقت کی۔"
مترجم مجھ سے مخاطب ہوگیا "یہ فیسِ مشورہ ہے...."
میں نے کہا "مگر میں یہاں پریکٹس نہیں کرتا۔ خاتون سے کہو کسی پاکستانی وکیل سے بات کرلیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جن سے میرا واسطہ ہے سب اچھے وکیل ہیں۔ مس رابعہ 'مسٹر منظر۔"
"یہ دس ہزار کیوں ٹھکراتے ہیں وکیل صاحب۔ مفت میں مل رہی ہے اتنی رقم تو ملاقات کرنے میں کیا حرج ہے۔ ان کے لیے تو دس ہزار کچھ بھی نہیں۔ آپ ایک لاکھ مانگ سکتے ہیں اور یقین کریں' میں سودا کرادوں گا ایک لاکھ میں۔ آپ صرف ایک گھنٹا دے دیں۔ پچیس ہزار میرے۔ باقی آپ کے۔ یقین کریں میں سخت ضرورت مند ہوں۔ کلینک جمانے کے لیے مجھے پیسہ چاہیے۔ خالی بی ڈی ایس کی ڈگری سے کچھ نہیں ہوتا۔ اس عورت کے پاس بہت دولت ہے۔ اس کے شوہر کا مالِ حرام...."
میں نے اسے ٹوکا "کون ہے اس کا شوہر؟"
"آپ نہیں جانتے' یہ مسز دلاور ہے۔ چوہدری دلاور کی بیوی جسے خطرہ ہے کہ یہ چوہدری دلاور کی بیوہ نہ ہوجائے۔ اس کی جگہ میں ہوتا تو بڑی خوشی سے ہوتا۔ اتنا عرصہ استعمال کرلیا۔ پُرانے شوہر اور پُرانے کمبل سے جان چھڑا لینی چاہیے۔ دونوں بو آنے لگتی ہے۔"
"شٹ اپ۔ تم میاں بیوی کے مقدس رشتے کو کیا سمجھتے ہو اس کے بارے میں رائے کیوں دیتے ہو۔"
"مقدس رشتہ!" اس نے طنز سے اور تلخی سے کہا۔
"یہ کون چوہدری دلاور ہے۔ وہی تو نہیں جس کا نام ... کے قتل کی ایف آئی آر میں ہے؟"
"یہ سو فیصد وہی ہے جناب!"
میں نے برہمی سے کہا "ایسی صورت میں یہ دس ہزار ... جاسکتے ہیں۔ مجھے رشوت دی جارہی ہے اور تم مجھے ... کہ میں ایک لاکھ لوں؟ آخر کس لیے۔ یہ اس کیس کی ... دستبرداری کا معاوضہ ہے۔ کیا میں اتنا بے ضمیر ہوں۔"
میں نے بات کو ایک خاص مقصد کے تحت طول دیا تھا۔ صرف وقار یوسف کی بیوی تھی جو میری کوئی مدد نہیں کرسکتی تھی۔ رابعہ بے ہوش پڑی تھی اور ہوش کی طرف آتی تو طویل ... مسافت طے کرکے صبح سے پہلے ہرگز بے دار نہ ہوتی۔ اچانک ... خود کو بہت تنہا محسوس کررہا تھا۔ محسن اور گل کے جانے ... غالب اور نازو نے رفاقت کا حق ادا کرنے میں کوئی کمی نہیں ... تھی۔ اس کے باوجود کبھی کبھی احساس ہوتا تھا کہ ہماری طاقت ... جیسی نہیں رہی۔ اب غالب اور نازو کے نہ ہونے سے ... احساس شدید تر ہوگیا تھا۔ وقار یوسف یا منظر پہلے بھی صرف ... جنگ میں مددگار تھے۔ ایم آر ایس کے ساتھ وہ کسی محاذ پر ... بشانہ نہیں لڑتے تھے۔ میں اکیلا اس لیے مقابلہ کررہا تھا کہ ... پکڑا جاچکا تھا۔ اور ہماری قید میں تھا۔ اس سے طاقت کا توازن ... نہیں تھا۔ دشمنوں کے حوصلے اس لیے پست تھے کہ ان کا ... سپہ سالار نہیں رہا تھا۔ اس کا نائب استاد پیڈرو یوں بھی ... کہ دلاور کے ساتھ ہی خود سکندر بخت بھی غائب ہوگیا تھا ... پوری کرنے کے لیے اس نے غالب اور نازو کو اُٹھالیا تھا ... دی تھی کہ فوزیہ کے گھر کو تباہ کردیا جائے گا۔ محسن اور گل ... جاتا تو شاید انہیں بھی نہ چھوڑا جاتا۔ آخری حربے کے طور پر ... رابعہ کو اغوا کراسکتے تھے مگر ایک تو رابعہ کی حیثیت بہت ... اور اس پر ہاتھ ڈالنا آسان نہ ہوتا۔ دوسرے دشمنوں کے ... رابعہ ہی سکندر تک رسائی کا واحد ذریعہ تھی۔ دلاور کی بازیابی کے ... لیے رابعہ ہی کو وسیلہ بنایا جاسکتا تھا۔ دباؤ بڑھانے کے لیے ... ہاتھ کی ایک انگلی کاٹ کر بھیجنا انتہائی بزدلانہ اور ذلیل حرکت ... مگر دشمن بہرحال دشمن ہوتا ہے۔ اس سے شرافت کی اُمید ... حماقت ہے۔ اب دلاور کی بیوی انتہائی مجبور ہوکے میرے پاس ... تھی۔ اس اُمید میں کہ یہ فرنچ وکیل سکندر سے بات کرکے ... کو سلجھانے میں مدد کرسکتا ہے۔ اسے صرف اپنے شوہر کی ... مطلوب تھی۔ میرے انکار نے اسے مایوس کیا۔
"یقیناً تم وہاں برتن دھوتے ہوگے کسی ہوٹل میں۔"
"مگر اب نہیں دھوتا۔ تم تو آج بھی اس گھر میں یہی کام کرتے ہو یا کوئی اس سے بھی بدتر کام۔"
اب دلاور کی بیوی چلّانے لگی "یہ کیا ہورہا ہے آخر۔ کیا میں تمہیں اس لیے اپنے ساتھ لائی تھی۔ میری بات کرتے کرتے تم ہونے لگ گئے۔"
"مادام یہ لڑائی میں بلامعاوضہ لڑرہا ہوں۔ اپنی مرضی سے۔ زبان میں روانی پیدا کرنے کے لیے" وہ بولا۔
میں منظر اور وقار یوسف کا منتظر تھا۔ میں نے انہیں آدھا گھنٹا پہلے فون کیا تھا اور اتنی دیر میں ان کو پہنچ جانا چاہیے تھا۔ میری نظریں گیٹ پر تھیں اور دل اندر رابعہ میں اٹکا ہوا تھا۔
دلاور کی بیوی نے پلٹ کے کہا "اچھا چلو واپس۔ جانے سے پہلے اس کو بتادو کہ ایک لاکھ بہت ہوتے ہیں۔ سوچ لے پھر۔"
خادم چونکا "یہ ایک لاکھ میں کیا خریدنے آئی تھی جناب؟"
میں نے کہا "اس سے پوچھو کہ وکیل صاحب تم سے بات کرنا چاہیں تو تم سے کیسے رابطہ ہوسکتا ہے؟ کوئی فون نمبر ہے؟"
دوسرے مترجم نے جواب دیا "مادام کہتی ہیں کہ وہ خود فون کریں گی۔"
"مگر میں ہر جگہ ہر وقت دستیاب نہیں ہوتا" میں نے کہا "اور ایسی کوئی بات کسی آفس کے فون پر نہیں ہوسکتی۔ شاید میں باہر کہیں سے فون کروں۔"
دلاور کی بیوی نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر بیگ میں سے ایک کارڈ نکالا "یہ وکیل صاحب کو دے دو۔ رات کے آٹھ بجے سے صبح کے آٹھ بجے تک میں اس فون پر بات کرسکتی ہوں۔"
میں نے کارڈ پر ایک نظر ڈالی۔ یہ کسی کمپنی کا بزنس کارڈ تھا مگر اس کا نام "سی ڈی انٹرپرائز" تھا۔ سی ڈی اور ای کے حروف بہت بڑے ابھرے ہوئے اور سُرخ رنگ میں نمایاں تھے۔ باقی عبارت میں عام ٹائپ رائٹر سائز کے حروف کا رنگ سیاہ تھا۔ کسی دشواری کے بغیر میں اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ سی ڈی کا مطلب چوہدری دلاور کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا مگر میرا یہ ظاہر کرنا ضروری تھا کہ میرے لیے انگریزی کی وہ تحریر اس وقت تک کوئی مفہوم نہیں رکھتی جب تک کوئی مجھے اس کا مطلب فرنچ میں نہ سمجھادے۔ کمپنی کا پتا ڈیوس روڈ کا تھا اور نیچے ہی فون نمبر لکھا ہوا تھا۔
میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں دلاور کی بیوی کو وہاں کیسے روکوں۔ اس کے ساتھ میرے جارحانہ رویّے کا کوئی جواز نہیں بنتا تھا۔ وہ بڑا رسک لے کر وہاں آئی تھی اور اب جلد از جلد بھاگ جانا چاہتی تھی۔ خادم حسین سے کوئی توقع رکھنا عبث تھا۔ میں اسے فرنچ میں بھی کچھ سمجھانے سے قاصر تھا۔ دلاور کی بیوی کے ساتھ بھی ایک فرنچ سمجھنے والا موجود تھا ورنہ میں خادم حسین سے کہتا کہ وہ اس کی ویگن کا ٹائر پنکچر کردے اور جتنی دیر میں ٹائر بدلا جاتا میں
"کیا بکتا ہے یہ گورا وکیل؟ کس بات پر برہم ہے؟"
مترجم نے آہ بھری "کہتا ہے کہ ساری دنیا کے خزانے بھی اس کا ضمیر نہیں خرید سکتے۔ ہاں آپ دس سال قبل ملی ہوتیں تو بس ایک مسکراہٹ کافی تھی۔"
وہ مسکرائی "اچھا اس سے کہو کہ میں ایک لاکھ بھی دے سکتی ہوں۔ اگر یہ مجھے سکندر سے ملوادے یا اس سے بات کرادے۔ سکندر کو مکمل تحفظ کی ضمانت حاصل ہوگی۔ میں خود ملاقات کے لیے آجاؤں گی۔ جہاں بھی یہ چاہے..."
اندر سے مولوی خادم حسین برآمد ہوا۔ اس نے ہماری وہ باتیں کرنے کی آواز سُن لی تھی اور غالباً فرنچ سُن کے حیران ہوا تھا۔ دلاور کی بیوی کے ساتھ اس نوجوان مترجم کو دیکھ کے وہ چونکا۔
"لوجی یہ خطرناک عورت یہاں بھی آگئی؟ آپ دور ہٹ کے بات کریں جی۔ اس کا بھروسا کوئی نہیں۔ مجھے اس کے تیور کچھ اچھے نہیں لگتے۔ کہیں آپ پر کچھ پڑھ کے نہ پھونک دے۔ کالے علم کے منتر...." وہ فرنچ میں ہی بولا۔
میں نے کہا "خادم حسین۔ فضول باتیں کم کیا کرو۔"
"باتیں میں کم ہی کرتا ہوں جناب لیکن یہ فضول بات نہیں ہے۔ خود مجھ پر کالا جادو کرادیا تھا میری چچی نے۔ وہ اپنی بیٹی کو میرے سر منڈھنا چاہتی تھیں۔ میں گدھا ہوگیا تھا جی۔ گھاس کھانے لگا تھا۔ دولتیاں چلاتا تھا اور گدھے جیسی آوازیں نکالتا تھا۔"
اب مسز دلاور کے مترجم سے برداشت نہ ہوا "تم اب بھی ویسی ہی آوازیں نکال رہے ہو۔"
خادم حسین کو جیسے کرنٹ لگ گیا "کیا؟ تم نے مجھے گدھا کہا؟"
"نہیں۔ انسان اپنی باتوں سے بھی خود کو گدھا ثابت کردیتا ہے۔ تمہاری بات بالکل ناقابلِ یقین اور بے سروپا ہے۔ بلکہ لغو اور جھوٹ ہے۔"
خادم حسین چراغ پا ہوگیا۔ "جو مجھے جھوٹا کہے میں اس کے دانت توڑ کے ہتھیلی پر رکھ دیتا ہوں۔"
"پھر تو ہمارے درمیان کاروباری اشتراک ہوسکتا ہے کیونکہ میں ہوں ڈینٹسٹ۔ ایک دن میں تم جتنے کیس بھیجو گے۔ ہتھیلی پر دانت لانے والے' سب میں تمہارا کمیشن.... ففٹی پرسنٹ..."
"تمہارا دماغ خراب ہے مسخرے دندان ساز۔"
"خراب ہے تو ٹھیک ہوجائے گا مگر تم اپنی شکل کا کیا کروگے' پہاڑی بکرے۔"
خادم حسین اُچھلا "سر۔ آپ اسے روک لیں ورنہ مجھے غصہ آگیا تو پہلا خون اسی کا ہوگا میرے ہاتھوں۔ آخر کون ہے یہ؟ اس کی فرنچ کتنی غلط ہے۔ بہت گھٹیا اور بازاری۔ جیسا یہ خود ہے۔"
"تمہاری گرامر غلط ہے۔ شاید فحش کتابوں سے سیکھی ہوگی۔ میں تو فرانس میں رہا ہوں۔" مسز دلاور کا مترجم بولا۔

اندر جا کے حلیہ بدل کے پچھلی طرف سے نکل جاتا اور پھر جیسے ہی گاڑی باہر آتی میں مترجم دندان ساز کو ناک آؤٹ کرکے دلاور کی بیوی کو بھی دلاور کے پاس پہنچا دیتا۔ موجودہ فرنچ وکیل کے حلیے میں میرے لیے ایسا کرنا ممکن نہیں تھا۔

مولوی خادم حسین میں یہ صلاحیت بھی نہیں تھی کہ وہ دلاور کی بیوی کو باتوں میں اُلجھا کے مجھے نکلنے کا موقع فراہم کردے۔ زیادہ سے زیادہ وہ اپنے حریف مترجم سے لڑسکتا تھا مگر دلاور کی بیوی ایسی باتوں میں وقت ضائع کرنے والی نہیں تھی۔

یہ گھر وقار یوسف کا نہ ہوتا تو میں کسی بات کی پروا نہ کرتا اور دلاور کی بیوی کو احمقانہ جرأت کا یہ مظاہرہ منگا پڑتا۔ نہ جانے کیسے وہ یہاں آپہنچی تھی۔ اگر خود اس نے ہمارا تعاقب نہیں کیا تھا تو پھر اس کے جاسوس ہماری نقل و حرکت کی نگرانی پر مامور تھے اور انہوں نے بھی اطلاع دی ہوگی کہ اس وقت فرنچ وکیل سے رابطہ کرنے میں کوئی خطرے کی بات نہیں۔ اس کے ساتھ رابعہ ہے اور وہ مولوی۔

دلاور کی بیوی کے پُراعتماد بے خوف انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسے تازہ ترین واردات کا علم نہیں ہے ورنہ وہ میرے سامنے آتے ہوئے گھبراتی کہ نہ جانے میرا جوابی ردِعمل کس قسم کا ہوگا۔ وہ عورت میرے لیے ناقابلِ فہم تھی۔ کبھی تو وہ بہت مظلوم بن جاتی تھی۔ کبھی انتہائی عیار اور چالاک نظر آتی تھی، کبھی یوں لگتا تھا جیسے دلاور کی عدم موجودگی میں وہ اس کی جگہ دشمنی کے رشتے کو پوری دلاوری اور "دلاورانہ" روایات کے ساتھ نبھائے گی۔ دوسرے لمحے وہ عام سی کمزور اور جذباتی عورت رہ جاتی تھی جو سوچے سمجھے بغیر نادان بیٹے کی نادانی میں شریک ہوجاتی تھی اور اپنے شوہر کی خیروعافیت سے واپسی کے لیے جان ومال کے تمام خطرات قبول کرنے پر تیار تھی۔ شاید وہ اپنی مرضی سے کچھ بھی نہیں کررہی تھی۔ دلاور کے ہوتے اسے نہ کسی کا ڈر تھا اور نہ کوئی فکر تھی مگر اب دلاور کی سلامتی سے اس کے مستقبل کا تحفظ وابستہ تھا اور اس کی اولاد کی خوشیاں۔ وہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھی کہ کس کی مانے اور کس کی نہ مانے۔ اپنے جذبات کی یا عقل کی۔ سرکش اور جوان اولاد کی یا دلاور کے نام نہاد دوستوں کی اور زرخرید جانثاروں کی۔ وہ کہاں جائے کیا کرے؟

میں نے دلاور کی بیوی کو گاڑی میں بیٹھ کے جاتے دیکھا۔ نوجوان جس نے مترجم کے فرائض سرانجام دیے تھے۔ ڈرائیور بن گیا تھا اور گاڑی کو ریورس گیئر میں ایسے لے جارہا تھا جیسے پیچھے کھلا میدان ہو۔ اس نے "بائی بائی" کہنے کے انداز میں ہاتھ بھی ہلایا تھا مگر درحقیقت اس نے خادم حسین کو انتہائی فحش اشارہ کیا تھا۔

خادم حسین نے سخت دُکھی لہجے میں کہا "دیکھا جی آپ نے۔ ہمت تھی تو سامنے کچھ کرتا۔ خبیث الزماں نطفۂ ناتحقیق۔"

میں نے کہا "خادم۔ یہ گاڑی تو وہی تھی مگر نمبر بدلا ہوا تھا۔"

میری بے اعتنائی نے خادم کو مزید دُکھی کردیا۔ "ابی بدلا ہوا تھا تو میں کیا کروں۔ ایسے لوگ گاڑی کا نمبر کیا باپ کا نمبر بدلتے ہیں۔"

اسی وقت ایک دھماکا ہوا اور خادم گیٹ کی طرف ... اندھے مردود کی اولاد۔ ماردی گیٹ کو ٹکر۔"

فاکس ویگن کا باہر نکلا ہوا مڈگارڈ عموماً ... ڈرائیور کے لیے مسئلہ بن جاتا ہے جو اس کی باڈی ... نہیں کرپاتے۔ گاڑی کا پیچھے والا مڈگارڈ بہت زیادہ ... تھا۔ رگڑ سے گیٹ کے ستون کا ایک کونا بھی گرگیا تھا ... والا مڈگارڈ لگا تو پلر میں دراڑ پڑگئی اور وہ گیٹ کے ساتھ ... گیا۔

میں گیٹ کی طرف بڑھا اور رُک گیا۔ شاید میرا ... نوجوان ڈرائیور کی پُرجوش عجلت سے آسان ہوگیا تھا۔ ... گئی تھی اور یہ بات اب یقینی تھی کہ مولوی خادم ... کارروائی کے ملزم کو نقصان کی تلافی کیے بغیر فرار نہیں ... گا۔ ایک گیٹ لائٹ بھی بجھ گئی تھی اور وہ دندان ساز ... ڈرائیور باہر نکل کے اپنی کارکردگی کا جائزہ لے رہا تھا۔

خادم حسین کے علاوہ میں نے دلاور کی بیوی کو بھی ... وہ جائے واردات سے فرار ہونا چاہتی تھی "بے وقوف ... چلو یہاں سے۔ گاڑی کا تو بیڑا غرق ہوگیا۔"

خادم چلّا رہا تھا "ابی جہنم میں گئی گاڑی۔ یہ پلر ... بنائے گا۔"

"ہاں۔ میرا باپ یہی کام کرتا ہے۔ شور مچانے کی ... نہیں مولوی۔"

دلاور کی بیوی نے گھبراہٹ میں پھر کہا "چھوڑو ... کرو۔ اس سے پوچھو کتنا نقصان ہوا ہے۔ جان چھڑاؤ ... میں بنے گا نیا پلر؟"

"ہزار دو ہزار تو خرچ ہوں گے...."

دلاور کی بیوی نے کچھ نوٹ اپنے ساتھ آنے ... تھمادیے "چلو دے دو اسے۔"

معلوم نہیں خادم حسین میں ایسی کیا بات تھی کہ اس ... سے بھی بنتی نہیں تھی اور لوگ اس سے چھیڑخانی پر مجبور ... تھے۔

دلاور کی بیوی کے مترجم نے نوٹ آگے بڑھا کے ہاتھ ... لیا "پہلے رسید لکھو۔"

خادم نے چڑ کے کہا "ابھی آجاتے ہیں منظر ... تمہیں پکی رسید دیں گے بیٹے۔"

"اچھا چھوڑو۔ یہ لو پورے دو ہزار" اس نے نوٹ ... تھمادیے "اب چاہو تو دونوں پلر نئے بنوالینا۔ تمہیں ... چار سو بچ جائیں گے اور ہاں یہ پُرانے پلر سنبھال کے رکھنا ... ان کی قیمت مل چکی ہے۔ کسی دن میں لے جاؤں گا۔"

"ہاں لے جانا۔ اپنے ابا کو بھی ساتھ لے آنا۔ ابا کے ... سر پر بھی رکھوا دوں گا۔" خادم بولا۔

شور سُن کے وقار یوسف کی بیوی باہر آگئی "سکندر بھائی...."

میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھی "شش... کیوں بھانڈا پھوڑتی ہو۔"

اس نے آہستہ سے کہا "یہ کیا ہورہا ہے۔ کون ہے یہ عورت؟"

میں نے اندر جاتے ہوئے کہا "یہاں فرنچ میں بتاؤں گا تو تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔ رابعہ ٹھیک ہے؟"

"ہاں مگر اُٹھے گی اب صبح۔ آخر ہوا کیا تھا اسے؟"

"کچھ نہیں۔ بس نروس بریک ڈاؤن ہے۔"

میں چاہتا تھا کہ میک اپ اُتار کے وقار کے کپڑے پہنوں اور باہر جا کے گاڑی سے دلاور کی بیوی کو اُتار لوں مگر بیک وقت بہت سی مشکلات نے میرے ارادوں کو ناکام کردیا۔ میں میک اپ اُتارنے میں ناکام رہا۔ اس کے لیے جو سامان درکار تھا وہ رابعہ کے آفس میں رکھا ہوا تھا پھر وہ گاڑی روانہ ہوگئی جس کے بارے میں میرا خیال تھا کہ چلنے کے قابل نہیں رہی۔ اس نوجوان نے سپرمین کی طرح دونوں ہاتھوں کا زور لگا کے مڈگارڈ باہر کھینچ لیا تھا جو اس حد تک اندر گھس گیا تھا کہ ٹائروں سے رگڑ کھا رہا تھا۔ میں نے کھڑکی سے گاڑی کو جاتے دیکھا اور خاصا مایوس ہوا پھر میں نے سوچا کہ اگر اس وقت میں ساتھ آنے والے کو ناک آؤٹ کرکے دلاور کی بیوی کو مجبور کردیتا کہ میرے ساتھ چلے تو میں اسے کیسے لے جاتا؟ ظاہر ہے وہ شور مچاتی اور مجھے اس کو بھی خاموش کرنا پڑتا۔

اس کی ٹوٹی پھوٹی گاڑی کو چلا کے لے جانا بھی آسان نہ تھا۔ اگر میں مجبوری میں ایسا کرتا تو بہت بڑا خطرہ مول لیتا۔ شاید باہر کچھ اور لوگ بھی ہوں گے جو دلاور کی بیوی کے ساتھ بطورِ محافظ آئے ہوں گے مگر باہر ہی رُک گئے ہوں۔ وہ فرشتۂ اجل کی طرح میرا تعاقب کرتے اور مجھے آدھے راستے میں روک کے اپنے ساتھ لے جاتے۔ اگر باہر کوئی نہیں تھا تب بھی اس گاڑی میں وہاں جانا خطرناک تھا جہاں اپنے چوہدری دلاور صاحب کا زمین دوز قید خانہ تھا۔ مجھے گاڑی سڑک پر روکنی پڑتی۔ بہت سے لوگ اس کی حالت پر غور کرتے اور اسے یوں گھور گھور کے دیکھتے جیسے یہ گاڑی نہیں چاند گاڑی ہے۔ ان کے سامنے اس میں سے دو نیم مُردہ لاش نظر آنے والے افراد کو نکال کے تہ خانے میں پہنچانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہوجاتا۔

جب منظر آیا تو میں اس شیر کی طرح ٹہل رہا تھا جس کو ایک لومڑی اور ایک گیدڑ، بے وقوف بنا کے نکل گئے ہوں اور جنگل کا بادشاہ غصے میں تھرتھر کانپتا رہ گیا ہو۔ وقار یوسف اس کے ساتھ ہی داخل ہوا تھا مگر غالباً اسے کسی دروازے کی اوٹ سے بیوی نے وہ مقناطیسی اشارہ کردیا جس پر نئے شوہر کھنچے چلے جاتے ہیں۔

منظر دھم سے یوں صوفے پر گرا کہ صوفے کی چولیں ہل گئیں۔ "کیا قیامت آگئی تھی بھوتنی کے۔ فون پر تیری بات سُن کے تو لگتا تھا کہ تجھے کسی نے ٹائم بم پر بٹھادیا ہے اور بم پھٹنے والا ہے۔"

منظر صورتِ حال اس سے بھی زیادہ سنگین ہے۔"

"تمام صورتِ حال کو بھی سنگین بنانا تو تمہارا شوق ہے بیٹے۔"

میں نے کہا "ابھی ابھی دلاور کی بیوی یہاں سے گئی ہے۔"

"کچھ خاطر مدارات کی اس کی؟ مجھے تو لگتا ہے وہ فریفتہ ہوگئی ہے تجھ پر۔"

"یہ بکواس بند کریں آپ تو میں کچھ فرماؤں" میں نے کہا "وہ یعنی فرنچ وکیل سے تنہائی میں ملنا چاہتی تھی۔"

منظر نے میرے شانے پر ہاتھ مارا "دیکھا۔ ٹھیک کہا تھا نا میں نے شرط لگالے وہ تنہائی میں تجھ پر دست درازی کرے گی۔"

"یار منظر، نازو کی جان خطرے میں ہے۔ تجھے مذاق سوجھ رہا ہے تجھے معلوم ہے نا ہم گئے تھے ڈاکٹر علی حیدر کے گھر۔ وہاں ہمارے لیے کسی نے ایک تحفہ بھیجا تھا۔ چھوٹا سا پیکٹ تھا جو ڈاکٹر نے ہمارے حوالے کردیا۔ معلوم ہے کیا تھا اس میں؟"

منظر نے دانتوں کی نمائش کی "برتھ کنٹرول کی دوائیں، کسی نے مذاق میں شرمندہ کیا ہوگا تجھے کہ شادی نہیں کرتے تو برتھ کنٹرول ہی کرو۔"

میں نے کہا "اس میں ایک انگلی تھی، نازو کے ہاتھ کی انگلی۔"

منظر پلکیں جھپکائے بغیر مجھے یوں دیکھتا رہا جیسے اچانک میں نے ایک جملہ فرنچ کا بول دیا ہے۔ اندر خادم حسین، وقار اور اس کی بیوی اونچی آواز میں بات کررہے تھے پھر وقار بدحواسی میں آیا اور منظر کے ساتھ بیٹھ گیا۔

"میں نے باہر گیٹ کا پلر تو ٹوٹا ہوا دیکھا تھا لیکن یہ خادم حسین کیا کہہ رہا ہے، دلاور کی بیوی نے گاڑی کی ٹکر سے..."

میں نے کہا "تم دونوں میرے ساتھ باہر چلو۔ میں کچھ دکھانا چاہتا ہوں تمہیں۔"

منظر نے شاید میری صورت سے اندازہ کرلیا کہ معاملہ واقعی سنگین ہے۔ وہ میرے ساتھ باہر نکل آئے۔ میں نے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر رکھا ہوا گتے کا باکس اُٹھا کے منظر کو تھمادیا۔ منظر اور وقار یوسف نے پیٹھ پھیر کے ڈبے کو روشنی کے رُخ کھولا۔

وقار کا ردِعمل زیادہ شدید تھا۔ وہ دہشت زدہ ہو کے ایک قدم پیچھے ہٹا۔ منظر نے ایک دم سر گھما کے مجھے دیکھا۔ اس کے ماتھے پر بھی پسینے کی نمی آگئی تھی اور اس کا چہرہ فق ہوگیا تھا۔

"یہ... یہ نہیں ہوسکتا۔" منظر نے کھوکھلے لہجے میں کہا۔

"خدا کرے ایسا نہ ہو مگر کمینے دشمن سے کچھ بھی بعید نہیں۔"

وقار نے بے جان لہجے میں کہا "کیا.... یہ رابعہ باجی نے بھی دیکھی تھی؟"

میں نے اقرار میں سر ہلایا "مجھ سے غلطی ہوگئی تھی لیکن مجھے کیسے معلوم ہوسکتا تھا کہ اس میں کیا ہوگا؟"

منظر نے ڈبے کو گاڑی کے گلوز کمپارٹمنٹ میں رکھ دیا اور دروازہ بند کرکے گاڑی کے سہارے کھڑا ہوگیا۔ اس کی نظریں خلا

میں دیکھ رہی تھیں۔ وقار یوسف بھی ساکت وصامت تھا۔ ہم سب ایک ہی بات سوچ رہے تھے اور ہم سب کے ذہن میں ایک ہی سوال تھا۔ یہ بے ضمیر اور سفاک شکاری اس اذیت ناک تحفے کی دوسری قسط کب ارسال کریں گے اور اس میں کیا ہوگا؟ نازو کی دوسری انگلی یا اس کا چار انگلیوں والا پورا ہاتھ؟ اپنی دھمکی کو زیادہ مؤثر اور یقینی بنانے کے لیے وہ کسی بھی انتہا تک جاسکتے تھے۔

بالآخر منظر بولا "تم نے رابعہ سے کیا کہا تھا؟"

"میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ چیخ مار کے بے ہوش ہوگئی تھی۔" وقار نے کہا "نکی نے اپنے ایک کزن کو بلالیا تھا۔ وہ ڈاکٹر ہے مگر نکی اسے کیا بتاتی۔"

میں نے کہا "ہاں۔ ابھی تمہاری بیوی کو بھی پتا نہیں۔"

"رابعہ ہوش میں آئے گی تو معلوم ہوگا کہ اس نے کتنا اثر لیا ہے۔ منظر خلا میں دیکھتا رہا۔ "دیکھو' اگر ہم سب نے مل کے جھوٹ نہ بولا تو وہ پاگل ہوجائے گی۔ ہم اسے یقین دلا سکتے ہیں کہ اس نے غلط سمجھا تھا۔ وہ سب جھوٹ تھا۔ دھوکا تھا' وہ انگلی نازو کی نہیں تھی۔"

"وہ اتنی بے وقوف نہیں ہے کہ آسانی سے مان جائے۔"

"یار' جھوٹ کو سچ بنانا پڑے گا۔ رابعہ کو قائل کیا جا سکتا ہے کہ اس نے سمجھنے میں غلطی کی تھی۔ وہ عقل سے کام لیتی اور تھوڑا سا غور کرتی تو اسے معلوم ہوجاتا کہ نازو کی انگلی اتنی بڑی اور بے ہنگم نہیں ہوسکتی۔ اس نے گاڑی میں دیکھا تھا' سرسری نگاہ ڈالی تھی اور گاڑی کے اندر اندھیرا تھا۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "منظر۔ وہ انگلی نازو کے ہاتھ کی ہے۔"

منظر نے برہمی سے کہا "بھوتنی کے۔ کیا اس پر نام لکھا ہوا ہے نازو کا؟ اور کیا میڈیکل رپورٹ سے تصدیق ہوگئی ہے۔ ایسی انگلی کسی اور کی نہیں ہوسکتی۔ ٹھیک ہے یہ انگلی بھی کسی عورت کے ہاتھ کی ہے اور ہاتھ بھی نازک سا ہے مگر اس امکان کو مسترد تو نہیں کیا جاسکتا کہ انہوں نے مُردہ خانے سے کسی لڑکی کے ہاتھ کی انگلی کاٹ کے بھیج دی ہو؟"

مایوسی کے اندھیرے میں اُمید کی ایک کرن روشن ہوگئی۔ "واقعی۔ یہ خیال تو مجھے نہیں آیا تھا۔ ہمیں خوف زدہ کرنے کے لیے وہ ایسا کرسکتے ہیں مگر نہ ہمارے پاس نازو کے فنگر پرنٹس ہیں اور نہ ہی کوئی ایسی چیز جس سے موازنہ کرکے ہم یقین کے ساتھ کچھ کہہ سکیں۔"

"یار' اسی لیے میں کہتا ہوں کہ اتنا مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس قسم کے ڈرامے ہم بھی کرسکتے ہیں۔"

میرا عزم بحال ہونے لگا "تو ٹھیک کہتا ہے۔ دشمن اگر بندوق سے گولی چلائے تو جواب میں گولی' توپ چلائے تو جواب میں توپ' داغنا ضروری ہے۔ وہ بم پھینکے تو بم اس پر بھی گرے۔ ہم آج ہی جوابی تحفہ ارسال کردیتے ہیں۔"

میرے پیچھے سے خادم حسین نے کہا "آنکھ کے بدلے آنکھ' جان کے بدلے جان۔ یہ تو بنیادی اصول ہے قصاص کا۔ چوہدری دلاور کی ایک انگلی بھیج دیں جی۔ دوسری قسط کی باری جائیں گے۔"

میں نے پلٹ کے دیکھا "تم بھی سُن رہے تھے؟"

منظر نے ایک دم مولوی خادم حسین کا ہاتھ دبوچ لیا۔ "یہ ہاتھ تو بالکل دلاور کے ہاتھ کی طرح ہے... ہے نا۔"

خادم حسین زور لگانے لگا "چھوڑیں جی میرا ہاتھ۔"

منظر نے کہا "ایک انگلی سے کیا فرق پڑتا ہے۔ فرض کیا چھوٹی انگلی کے جواب میں یہ چھوٹی انگلی بھیج دیں۔"

خادم شور کرنے لگا۔ "منظر صاحب۔ آپ کا دماغ خراب ہے۔ اپنا ہاتھ دیکھیں' یہ بھی ویسا ہی ہے۔"

"بالکل غلط۔ میرا ہاتھ بہت بھاری ہے" منظر نے اس کا ہاتھ نہیں چھوڑا "یار سکندر' ایک انگلی کم ہوجانے سے خادم کو کیا فرق پڑے گا۔ اس کی پانچوں گھی میں ہیں اور سر کڑاہی میں' سر بعد میں کاٹیں گے۔"

خادم نے اپنے ہاتھ کو یوں دیکھا جیسے اس میں چار ہی انگلیاں رہ گئی ہیں۔ "آپ کے دماغ میں فتنہ انگیز خیالات ہی کیوں آتے ہیں منظر صاحب' اور مجھ سے کیا دشمنی ہے جی آپ کو؟"

"مولوی صاحب۔ جاں نثاری اور نمک خواری کا تقاضا تو یہ ہے کہ تم اپنا سب کچھ قربان کردو" منظر نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

مولوی خادم حسین نے کراہ کے کندھا ہلایا "میں آپ کو اپنا سب سمجھتا ہوں جی۔ بے شک قربان کردیں آپ کو منظر صاحب۔"

وقار یوسف نے کہا "آپ لوگ باتوں میں وقت ضائع کر رہے ہیں۔ فیصلہ کرلیں جلدی سے کیا کرنا ہے۔ کہیں نکی آگئی تو۔"

"فیصلہ کرلیا برخوردار۔ تم جاکے نکی تے وڈی (چھوٹی اور بڑی) دونوں کو سنبھالو" منظر کی مراد اس کی بیوی اور رابعہ سے تھی "میں خادم حسین اور سکندر کے ساتھ جارہا ہوں۔"

خادم حسین نے سر ہلایا "کم سے کم آپ کے ساتھ جان خطرہ میں مول نہیں لے سکتا جی۔ جب تک یہ معلوم نہ ہو۔"

منظر نے پھر اسے دھپ مارنے کی ناکام کوشش کی "مولوی صاحب۔ کچھ ثواب کمائیں گے آپ کی خاطر تواضع کرکے فرائی 'چرغا' لیمب روسٹ ہم بھی چکھ لیں گے۔"

خادم نے ہونٹوں پر زبان پھیری "اچھا جی۔ مذاق کررہے ہیں آپ تو پھر چلیں۔ نیک کام میں دیر کیسی؟"

میں سمجھ گیا تھا کہ منظر کے ذہن میں کچھ اور ہے جو وہ ابھی نہیں بتانا چاہتا۔ اس نے تحفے میں موصول ہونے والا ڈبا اٹھایا

بالکل مختلف مزاج رکھتی تھی۔ وہ دولت سے زیادہ تعلق اور محبت کے خلوص کو اہمیت دیتی تھی۔ اس نے باپ کی دولت کو ٹھکرا کے وقار یوسف سے شادی کی تھی۔ دولت آج بھی اس کے لیے بے معنی تھی۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ اور ہمارے ساتھ جذبات کے رشتے پر اس دولت کو پھر قربان کرسکتی تھی۔

تاہم اس دلیل نے خادم حسین کو قائل نہیں کیا اور اس نے دو ہزار کے بارے میں اپنا فیصلہ برقرار رکھا کہ اس میں سے ایک دھیلہ بھی بلا اجازت خرچ نہیں ہوگا۔ اب یہ وقار یوسف کی مرضی کہ وہ اس سے گیٹ بنوائے یا ساری رقم خادم حسین کو بخش دے کہ جاؤ اپنے سارے سسرال کو فلم یکے والی دکھاؤ اور پھر فالودہ کھلاؤ۔

منظر نے مایوسی سے کہا "مولوی کا ایمان واقعی پکا ہے۔"

میں نے کہا "منظر۔ نازو کی تحریر تو اصلی ہے۔"

"بھائی' میں نے کب کہا کہ نقلی ہے۔"

"میرا مطلب یہ تھا کہ اس میں جو کچھ نازو نے لکھا ہے۔"

"تحریر اس سے پہلے لی گئی ہوگی۔ ممکن ہے اسے بھی دہشت زدہ کیا گیا ہو۔ دلاور کی بیوی نے جو کارڈ دیا تھا۔ اس پر پتا بھی ہے؟"

میں نے کہا "ہاں۔ سی ڈی انٹر پرائز۔ ڈیوس روڈ پر ہے۔ فون نمبر بھی ہے۔ تم گاڑی چلاؤ' میں دیکھ رہا ہوں۔"

"مگر اس وقت تو آفس بند ہوتے ہیں۔ وہ رات کے وقت اس فون نمبر پر کیسے ملے گی؟"

"کال ٹرانسفر کا چکر ہوگا۔ جو فون ریسیو کرے گا وہ پیغام وصول کرکے آگے پہنچادے گا۔ جواب ہمیں مل جائے گا۔"

ہم ڈیوس روڈ پر سے دوبار گزرے مگر مجھے کہیں بھی سی ڈی انٹرپرائز کا بورڈ نظر نہیں آیا۔ مختلف مقامات پر گاڑی روک کے لوگوں سے پتا معلوم کرنے کی کوشش بھی ناکام رہی۔

"اگر بوگس پتا نہیں ہے تو کل دن میں تلاش کریں گے" منظر بولا۔

"پتا بوگس ہوسکتا ہے۔ فون نمبر نہیں" میں نے کہا۔

"تونے بڑا اچھا کیا کہ مشتعل نہیں ہوا۔ دلاور کی بیوی نے اعتماد میں رابطے کا نمبر دے دیا۔ غلطی کرگئی ناقص العقل عورت ذات۔"

"مگر وہ خود نکل گئی۔ میں اکیلا نہ ہوتا تو...."

"ابے بھوتنی کے۔ نکل کے کہاں جائے گی وہ' اب تو اس کو اعتماد کے جال میں پھانس لے۔ وہ خود آئے گی تجھ سے ملنے اور ایک لاکھ روپیہ نقد بھی لائے گی۔ رقم جیب میں ڈال کے اس سے وعدہ کرلینا کہ سکندر سے بات ہوجائے گی پھر ایک بار اس کی بات بھی کرادینا سکندر سے۔ شوہر کی جدائی اس سے برداشت نہیں ہورہی ہے۔ دو دن بعد اسے بھی پہنچادینا شوہر کے پاس۔ جو کام تسلی سے' ٹھنڈے دماغ کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اس میں خرابی کا احتمال نہیں رہتا۔ جلدی کی کیا ضرورت ہے۔"

اور اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ میں اگلی سیٹ پر اس کے ساتھ تھا۔ اس نے ڈبا پیچھے مولوی خادم حسین کو تھمادیا۔ "ذرا سنبھال کے رکھنا اسے۔"

خادم حسین نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا "لاحول ولا قوۃ۔ آپ ہی رکھیں اسے اپنے پاس۔ توبہ توبہ۔"

میں نے ڈبے کو ڈیش بورڈ پر رکھا تو وحشت انگیز خیالات کا آسیب مجھے بھی پریشان کرنے لگا۔ اگرچہ اب میرے ذہن میں بھی شکوک پیدا ہوگئے تھے اور مجھے منظر کی بات قابلِ اعتبار محسوس ہوتی تھی کہ یہ انگلی نازو کی نہیں مگر خوف کے عفریت نے یوں دل میں پنجے گاڑ دیے تھے کہ میرے تصور میں باربار نازو کا ہاتھ آجاتا تھا۔ گلابی مرمریں اور نازک جس کی ایک انگلی کی جڑ سے لہو پھوٹ رہا تھا۔ گھبرا کے میں نے اس ڈبے کو گلوز کمپارٹمنٹ میں بند کردیا۔

گیٹ سے گاڑی نکالتے ہوئے منظر نے گیٹ کو دیکھا "اس لڑکے نے اپنا نام نہیں بتایا تھا؟ کہاں سے پکڑا تھا دلاور کی بیوی نے وہ مترجم؟"

"میں نے نام پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ وہ کوئی ڈینٹسٹ تھا جس نے ابھی پریکٹس شروع نہیں کی۔ فرانس میں رہا تھا اس لیے فرنچ جانتا تھا۔"

"مسز دلاور کا کوئی ملازم یا رشتے دار تھا؟"

"نہیں۔ وہ تو ضرورت مند تھا کوئی۔" میں نے اسے تفصیل سے ساری بات بتادی۔

"یار' تم سے اچھا تو مولوی خادم حسین رہا۔ دو ہزار وصول کرلیے۔ اب دعوت اس کی طرف سے۔"

"ہرگز نہیں۔ وقار صاحب کے گیٹ کی مرمت کے اخراجات ہیں۔"

"یار سکندر! یہ مولوی واقعی وہ ہے۔ بے دال کا بودم۔"

"بے دال کا بودم؟" خادم نے غور کیا "یعنی بوم۔ بوم تو اُلو کو کہتے ہیں؟"

"پہلے کہتے تھے۔ اب خادم کہتے ہیں۔ یار تم کیا سمجھتے ہو وقار کو۔ اس کی بیوی کا نام ضرور نکی ہے مگر وہ ہے بڑی توپ چیز کی اولاد۔"

مجھے وقار یوسف کا سسر یاد آیا جو واقعی بڑی توپ چیز کہلاتا تھا اور ایک مثالی بیورو کریٹ تھا۔ فرعون صفت۔ سازشی' لالچی' ہوسِ زر کا مارا ہوا لیکن نجی زندگی میں دیکھنے والوں کے لیے درسِ عبرت۔ اس کا انجام بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ اس کی واحد وارث وقار یوسف کی بیوی کے لیے ایک گیٹ پلر کا ٹوٹ جانا کوئی قابلِ ذکر نقصان نہیں تھا۔ وہ کئی کوٹھیوں اور کاروں کی مالک ہوگئی تھی اور بلامبالغہ اس کی ذاتی آمدنی اتنی تھی کہ وقار یوسف کو ساری عمر کچھ کرنے کی ضرورت نہیں تھی مگر ایک تو وہ احساسِ کمتری کی حد تک خوددار آدمی تھا اور نکی اس کے مزاج کو سمجھتی تھی۔ اس کے علاوہ وقار یوسف میں شرافت کی وضع داری تھی تو نکی بھی اپنے باپ سے

مجھے منظر کی بات پسند آئی۔ "میں آج رات ہی بات کر کے دیکھتا ہوں۔ اگر اس فون نمبر پر اس سے رابطہ ہو گیا تو سمجھو وہ پھنس گئی۔"

جب منظر نے گاڑی کو میو اسپتال کے گیٹ سے اندر موڑا تو خادم حسین نے کہا "یہ تو اسپتال ہے۔ یہاں کیا کام ہے جی؟"

"مُردہ خانے میں رکھوانا ہے تم کو" منظر بولا "تم چلتی پھرتی لاش ہو۔"

خادم نے گھبرا کے کہا "لاحول ولا قوة۔ آپ جب بات کرتے ہیں ایسی ہی واہیات بات کرتے ہیں منظر صاحب۔"

"مولوی۔ کیا تم مُردوں سے ڈرتے ہو" منظر نے افسوس سے کہا "ڈرنا چاہیے زندہ انسانوں سے۔ یا شیطان سے۔"

"اسی لیے تو میں آپ سے ڈرتا ہوں جی۔"

"اچھا تم نے کبھی مُردہ خانہ دیکھا ہے؟ آج دیکھو۔ آدمی کو عبرت پکڑنے کے لیے قبرستان جانا چاہیے۔ زیادہ عبرت پکڑنی ہو تو مُردہ خانے جانا چاہیے کوئی پتا نہیں کل کیا ہو۔ تم بھی پڑے ہو یہیں اور دوسرے عبرت پکڑ رہے ہوں۔ بس گزر جائے تم پر سے۔ ڈبل ڈیکر۔ یا کوئی تمہیں رقابت میں خنجر گھونپ دے مثلاً مجھے غلط فہمی ہو جائے کہ تم میری بیوی پر ڈورے ڈال رہے ہو تو میں تمہیں گولی مار دوں۔ یا آج ہی زیادہ کھانے سے تمہیں ہیضہ ہو جائے۔"

خادم حسین نے بگڑ کے کہا "لاحول ولا قوة۔ آپ کی تو زبان ہی اتنی خراب ہے اور پتا نہیں ایسی باتیں صرف آپ کے دماغ میں کیوں آتی ہیں جی۔ آپ تو اچھے خاصے ذہنی مریض ہیں۔ بلکہ پاگل ہیں۔"

منظر نے گاڑی مُردہ خانے کے سامنے روک دی "بالکل ٹھیک کہا تم نے مولوی۔ میں واقعی پاگل ہوں۔ پتا ہے میں تم کو یہاں کیوں لایا ہوں؟ ہم اور تم یہاں ڈانس کریں گے۔ مُردہ خانے میں' کیسا اچھوتا خیال ہے۔ مُردے اکیلے پڑے بور ہو رہے ہوں گے۔ ان کا بھی دل بہل جائے گا۔"

خادم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کا موڈ سخت خراب تھا اور خوف سے رنگ اُڑا ہوا تھا۔ ہمارے ساتھ وہ فش فرائی' چرغا اور لیمب روسٹ کھانے آیا تھا۔ مُردہ خانے کے دروازے پر اس کی روح فنا ہو رہی تھی اور ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ وہ زیرِ لب جل تو جلال تو کا ورد کر رہا تھا۔

اس نے مجھ سے کہا "سکندر صاحب۔ آپ ہی بتائیں یہ کیا ہو رہا ہے؟"

میں نے کہا "ہر سال آج ہی کے دن منظر کو دورہ پڑتا ہے۔ اس کے ماموں سسر آج ہی کے دن مُردہ خانے سے فرار ہو گئے تھے۔ جب ان کی برسی آتی ہے تو یہ سیدھا یہاں آتا ہے اور مُردوں کو ماموں ماموں کہہ کر گلے لگاتا ہے۔"

ظاہر ہے میرے اس جواب کے بعد خادم حسین کے لیے خاموشی سے ہمارا ساتھ دینے کے سوا چارہ نہ رہا۔ ویسے بھی ... اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ ورنہ شاید وہ بھاگ جاتا۔

مُردہ خانے کے اندر کا منظر میں نے پہلے بھی دیکھا تھا ... ہے منظر نے بھی دیکھا ہو۔ اس کے پیشہ ورانہ فرائض ... میں قاتل سے مقتول تک اور قتل سے مقتل تک ... معائنے کے سارے مراحل شامل تھے۔ منظر نے مذاق ... بات کہی تھی مگر حقیقت یہی ہے کہ مُردہ خانے سے بڑھ ... عبرت کوئی نہیں اور میت کی حرمت کے مسائل زبانی ... والے کبھی خود مُردہ خانے جائیں تو اشرف المخلوقات کہلا... انسان کی بے توقیری دیکھ کے صدمے سے پاگل ہو جائیں۔

مُردہ خانے کا نگراں کلرک ہمیشہ کی طرح غائب تھا ... سے متعلق جملہ امور کا نگراں ایک جلاد صفت کم ذات ...

"آؤ جی سرکاراں۔ کوئی بندہ ہے آپ کا ادھر؟" اس ... موٹی اسامی سمجھ کے خوش خلقی سے ہمارا استقبال کیا اور ... کھول کے اندر لے گیا۔ "پہچان لو اگر ان میں ہے۔"

وہاں مُردے اسی طرح پڑے ہوئے تھے۔ زمین پر ... تر چھے۔ سلیب پر' تختوں پر اور بینچوں پر۔ ہر عمر کے چھوٹے ... لوگ۔ کچھ قتل ہوئے کچھ حادثات کا شکار ہو کے وہاں پہنچے ... کچھ سڑکوں پر اور فٹ پاتھوں سے اُٹھائے گئے تھے۔ ان ... اکثریت لاوارث اور غریب غربا کی تھی جن کی کوئی شناخت نہ ... ہوتی۔ جن کو شناخت کرنے والا ہی نہیں ملتا۔

خادم حسین کی حالت غیر تھی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ... بے گور و کفن لاشوں کو دیکھ رہا تھا جو غلیظ متعفن ماحول میں ... پڑی ہوئی تھیں جیسے وہ انسان نہیں کارپوریشن کی مہم کے نتیجے ... ہلاک ہونے والے گلیوں کے آوارہ کتے ہیں۔

"توبہ توبہ۔ کیسی بے حسی ہے جی۔ آخر یہ بھی کسی کے باپ ... بھائی یا شوہر ہوں گے۔ کیا بیتے گی ان کے دل پر جو لاش لینے آئیں ... گے۔ یہ سب جو خدمتِ خلق کی باتیں کرتے ہیں۔ انسانیت ... درس دینے والے اور آدمی کی عظمت کے ترانے گانے والے ... لمبے چوڑے وعظ کرنے والے اور لیکچر دینے والے کیا یہاں ... نہیں آتے؟"

میں نے کہا "خادم حسین۔ کاش ہم باتیں نہ کرتے ... عمل سے خود کو انسان ثابت کر سکتے تو یہ سب نہ ہوتا۔"

"ایک ائر کنڈیشنر میں نے پالتو کتوں کے لیے دیکھا ... کوٹھیوں میں اور ہوٹلوں میں بھرمار ہے ائر کنڈیشنرز کی۔ یہاں ... تک نہیں۔"

میں نے تلخی سے کہا "صفائی نصف ایمان ہے ... حدیث یاد رکھنا کافی سمجھ لیا ہے ہم نے۔ ہم نصف ایمان ... بھی نہیں رہے۔"

منظر نے اتنی دیر میں مطلب کی بات کر لی تھی۔ لاوارث ...

... خادم حسین نے زور سے لاحول ولا قوة کہا اور اُبکائیاں لیتا ہوا ... باہر بھاگا۔ میں اس کے پیچھے لپکا۔ دروازے تک پہنچنے سے پہلے ہی خادم حسین نے ایک لاش سے ٹھوکر کھائی اور منہ کے بل گر کے ... بے ہوش ہو گیا۔ میں اسے اُٹھا کے باہر کھلی ہوا میں لے گیا اور ... برآمدے میں لٹا دیا۔ خود میری طبیعت بھی بُری طرح مالش کر رہی ... تھی مگر میں ضبط سے کام لے رہا تھا۔ قریب لگے ہوئے ایک نلکے ... سے میں نے اپنے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور دو گھونٹ پانی پیا تو ... میری حالت سنبھل گئی۔ خادم حسین کو ہوش میں لانے کے لیے ... میں نے ایک ٹوٹی ہوئی بوتل کو استعمال کیا جو وہیں کچھ فاصلے پر پڑی ... تھی۔ اسے دھو کے میں نے پانی سے بھر لیا اور یہی پانی خادم حسین پر ڈالا۔ تھوڑا سا اس کے حلق میں بھی گیا تو وہ ہوش میں آگیا ... اور بآوازِ بلند سورۂ یٰسین پڑھنے لگا۔

میں نے کہا "خادم حسین۔ زندگی کی قدر ایسے ہی ہوتی ہے۔ ... موت کا یہ روپ دیکھا تم نے؟"

منظر نے قریب آ کے کہا "مولوی خادم حسین۔ تم میں حوصلہ ہونا چاہیے سب کچھ دیکھنے کا۔ زندگی کا خوب صورت اور روشن پہلو دیکھنے والے ذرا سی آزمائش سے گھبرا جاتے ہیں۔ معمولی سی تکلیف پر شکوہ کرنے لگتے ہیں تقدیر سے۔ اب اندازہ ہوا کہ ہم ان سب کے مقابلے میں کتنے اچھے ہیں اور خوش نصیب ہیں۔"

"ٹھیک کہتے ہیں آپ جی۔ بندہ بڑا ناشکرا ہے۔ ڈرنا چاہیے سب کو اس انجام سے۔" وہ کانوں کو توبہ کے انداز میں پکڑے بیٹھا رہا۔

میں نے کہا "تمہارا کام ہو گیا؟"

"ہو جائے گا۔ سو روپے میں بات ہوئی ہے" منظر بولا۔

"اللہ ہمیں معاف کرے" میں نے کہا۔

مُردہ خانے کے عقبی حصے میں ایک چھوٹا سا تالاب تھا جس میں کیمیائی محلول بھرا ہوا تھا۔ یہ حصہ نسبتاً تاریک اور ویران نظر آتا تھا۔ کھلے شیڈ کے آخر میں مجھے آتش دان جیسی بھٹی بھی نظر آ رہی تھی۔ خادم حسین اب قدرے پُرسکون تھا اور بڑے غور سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

مُردہ خانے کے ملازم نے آستین چڑھا کے تالاب میں ہاتھ ڈالا۔ اس کا ہاتھ باہر آیا تو اس میں ایک انسانی ٹانگ تھی۔ ٹانگ گھٹنے پر سے کاٹی گئی تھی۔ اس نے ٹانگ کو واپس اسی محلول میں ڈال دیا اور پھر ہاتھ ڈالا تو کسی کا بازو نکال لیا۔

"یہ تو کسی زنانی کا بازو ہے۔" اس نے خود سے کہا اور بازو کو دوبارہ غرق کر دیا۔

اس تالاب میں نہ جانے کتنے مختلف انسانوں کے جسمانی اعضا پڑے ہوئے تھے۔ صرف خادم حسین کو ڈرانے کے لیے ملازم نے بالوں سے پکڑ کر ایک سر بھی نکالا اور چھوڑ دیا۔ اس ...

لاشوں میں سے ایک کا رنگ روپ اور جسامت دلاور جیسا تھا مگر مُردہ خانے کا ٹھیکے دار سر کھجانے لگا۔

"سرکاراں' یہ لاش ذرا جھگڑے والی ہے۔ ابھی پوسٹ مارٹم نہیں ہوا اور سُنا ہے ذہنی مریض تھا مگر ہے کوئی بڑا آدمی۔"

"میں نے یہ نہیں کہا کہ اس کی دو انگلیاں کاٹ دو۔ مجھے اس قسم کے ہاتھ کی دو انگلیاں لا دو۔ تمہارے پاس تو اسپیئر پارٹس کا اسٹور ہے۔ میں جانتا ہوں۔"

وہ کچھ حیران ہوا "وہاں تو باسی مال ہے۔ یہ تازہ چیز ہے۔ آپ پانچ سو دو سرکاراں تو میں اس کی انگلیاں نکال دوں۔ پوسٹ مارٹم کے وقت انگلیاں کون گنتا ہے جی؟" اس نے آنکھ دبا کے کہا۔

منظر نے نفی میں سر ہلایا "فضول بات مت کرو۔"

"چلو جی چار سو۔ اچھا تین سو..."

"لعنتی شخص!" خادم حسین نے نفرت اور حقارت سے کہا "خدا کو کیا منہ دکھائے گا میدانِ حشر میں؟"

وہ ڈھیٹ آدمی متاثر ہونے والا نہیں تھا "مولوی صاحب' جو منہ دیا ہے خدا نے وہی دکھائیں گے۔ تم کیا کسی اور کا منہ

تالاب میں نامکمل لاشیں بھی تھیں اور یہ سب لاوارث لوگ تھے یا لاشوں کا دھندا کرنے والے ٹھیکے دار نے ان کو لاوارث قرار دے کر فروخت کردیا تھا۔ یہ لاشیں میڈیکل کے طلبا کے لیے بڑی اہم تھیں۔ وہ انسانی جسم کی ساخت اور نظام کو سمجھنے کے لیے انہی کی چیر پھاڑ کرتے تھے۔ مستقبل کے مسیحا اور سرجن بننے والوں کے لیے یہ عملی تربیت کا ایک حصہ تھا۔ بے حسی کا قطعی غیر جذباتی رویہ اختیار کیے بغیر نہ وہ انسانی جسم کی مشینری کو سمجھ سکتے تھے اور نہ ان کے افعال کو۔

خادم نے کانپتے ہوئے کہا "بعد میں ان کا کیا کرتے ہیں جی۔ یہ جو مختلف انسانوں کے ٹکڑے اس تالاب میں پڑے ہیں۔"

میں نے کہا "جب یہ استعمال کے قابل نہ رہیں تو دفنا دیے جاتے ہوں گے۔"

منظر نے کہا "دفنانے کی نوبت کم آتی ہے۔ جلا دیتے ہیں یہاں اس بھٹی میں۔"

مُردہ خانے کے ملازم نے اس کی تائید کی اور تالاب میں ایسے ہاتھ ڈالتا رہا جیسے وہ مچھلیاں پکڑ رہا ہو۔ میں نے ہمت کرکے بھٹی کو قریب سے دیکھا۔ خوف کے باوجود خادم حسین کا تجسس اسے بھی کھینچ لایا۔ وہاں بہت سے جلے ہوئے اعضا کی ہڈیاں بکھری پڑی تھیں۔ بہت سے اعضا پوری طرح جلنے سے رہ گئے تھے۔ یہ مُردہ خانے کے نظارے سے بھی زیادہ بھیانک منظر تھا۔ یہ تصور کرنا مشکل تھا کہ وہ کون لوگ ہوں گے جن کے اعضا اس طرح بکھرے پڑے تھے۔ ان کی صورت کیسی ہوگی۔ وہ کیسا لباس پہنتے ہوں گے۔ کیسے بات کرتے ہوں گے۔ کیسے ہنستے ہوں گے۔ کیسے محبت کرتے ہوں گے اور کیسے دکھ سکھ سہتے ہوں گے۔ ان کے گھر کیسے ہوں گے اور وہ کون ہوں گے جو انہیں چاہتے ہوں گے۔ جن کو وہ چاہتے ہوں گے۔

یہ سب فرضی باتیں نہیں۔ تلخ حقائق ہیں۔ عام آدمی کی نظر یہ سب نہیں دیکھ پاتی اور جو جانتے ہیں وہ خاموش رہنا بہتر سمجھتے ہیں۔ اخبار والوں نے بہت کچھ دیکھا اور دکھایا۔ اصل تصاویر شائع کردیں اور ساری تفصیل بیان کردی مگر وائے بے حسی۔ نہ ان نام نہاد علما پر اثر ہوا جو فروعی باتوں پر کفر کے فتوے صادر کردیتے ہیں اور معاشرے میں صرف بے حیائی اور بُرائی کے پیچھے لٹھ لے کر پڑے رہتے ہیں۔ کسی نے اس مسئلے پر مذمت کا ایک لفظ تک نہیں کہا۔ کسی فلاحی یا دینی' سیاسی یا معاشرتی تنظیم نے اس موضوع پر اظہارِ خیال تک نہیں کیا۔

ہم جب واپس ہوئے تو خود بھی شرمندہ تھے کہ ہم نے سو روپے دے کر اس خرابی کے اسباب کی حوصلہ افزائی کی مگر ہمارے پاس مجبوری کا عذر تھا۔ نازو اور غالب دو زندہ انسان تھے اور ان کی زندگی بچانے کے لیے کسی نامعلوم شخص کے ہاتھوں کی دو انگلیاں وہ کام کرسکتی تھیں جو قانون کی طاقت بھی نہیں کرسکتی تھی۔ اسے ہم اپنی خود غرضی سمجھ سکتے تھے مگر اس میں بدنیتی کو دخل نہیں تھا۔ ہمارا مقصد غلط نہیں تھا۔ وہ ایک لاوارث ہاتھ تھا اور بے کار ہوگیا تھا۔ ہاتھ بازو سے اور بازو جسم سے جدا ہوچکا تھا۔ اب اس سے کیا فرق پڑتا تھا کہ دو انگلیاں ہاتھ سے جدا ہوجاتیں۔ جل کے خاک ہوجانے اور حشرات الارض کا رزق بننے والے ہاتھ کی مدد سے اگر دو زندگیوں کو بچالیں تو وہ ہاتھ کسی زندہ ہاتھ سے زیادہ محترم تھا جو کسی بے کس عورت کی آبرو تار تار کرتا ہے یا بھوکے نادار سے سوکھی روٹی کا ٹکڑا بھی چھین لیتا ہے۔ وہ ہاتھ چوہدری دلاور کے ہاتھ سے زیادہ نیکوکار تھا۔

منظر نے اس نازک زنانہ انگلی کو الگ ایک کاغذ کی تہ میں لپیٹ کر محفوظ کرلیا اور پیکٹ میں اس کی جگہ مردانہ ہاتھ کی انگلی رکھ دی "جب رابعہ ہوش میں آجائے نا تو اسے بتانا تمہارا کام ہے کہ تحریر ضرور نازو کی ہے مگر انگلی نازو کی نہیں۔ غور سے دیکھو اس پر چھوٹے چھوٹے بال ہیں۔ رابعہ نے اس پر سرسری نگاہ ڈالی تھی اور وہ بھی چلتی گاڑی میں۔ روشنی میں دیکھے گی تو اسے اس کو فرق خود نظر آجائے گا۔"

میں نے کہا "اسے میں قائل کرلوں گا۔"

منظر نے کہا "اس زنانہ انگلی کو میں میڈیکل رپورٹ کے لیے ایک پرائیویٹ لیبارٹری کے حوالے کردوں گا۔"

"یار' وہ کیا بتائیں گے۔ موازنے کے لیے ہمارے پاس کچھ بھی نہیں۔"

"یہ معلوم ہوجائے گا کہ انگلی کب سے بے جان ہے۔ کس کی انگلی ہے اس کی عمر کیا تھی۔ قد و قامت اور وزن کے بارے میں بھی پتا چل جاتا ہے۔ اگر رپورٹ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عورت کی عمر تیس سے اوپر تھی یا اس کا وزن ڈیڑھ دو سو پاؤنڈ تھا تو ثابت ہوجائے گا کہ وہ نازو نہیں ہوسکتی۔ اگر یہ بھی پتا چل جائے کہ انگلی سات آٹھ دن پُرانی تھی تو کچھ اطمینان ہوگا مگر یہ کچھ مشکل بھی ہیں۔ نتائج سو فیصد حتمی بھی نہیں ہوتے۔ نازو کو اللہ اپنی امان میں رکھے۔ اس وقت تمہارے ساتھ آنے کا اصل مقصد یہ تھا کہ اس طرح ہم رابعہ کے ہوش میں آنے سے پہلے ہی اس کے اطمینان کے لیے یہ ثبوت حاصل کرلیں۔ دوسرا مقصد تھا جارحانہ کارروائی کو روکنے کے لیے بروقت جوابی کارروائی۔ اب تم گھر جاؤ۔ میں ایک خط کے ساتھ چوہدری دلاور کی طرف سے اس کی بیوی کو محبت بھرا تحفہ پہنچادوں گا۔"

میں نے کہا "اس کی بیوی کو.... ڈیوس روڈ کے پتے پر؟"

"ہاں۔ اور تو کوئی ذریعہ نہیں" منظر بولا۔

میں نے کہا "یار' میرا خیال ہے کہ یہ حرکت اس نے نہیں کی ہوگی' یہ کام استاد پیڈرو کا تھا۔"

"ابے' ہمیں اس سے کیا۔ یہ حرکت جس نے بھی کی ہو اسے پتا چل جائے گا اور دلاور کی بیوی کو پہلے معلوم نہیں تھا تو اب مجھے نازو کے ہاتھ کی ایک انگلی ارسال کی گئی تھی۔ نازو کے طور پر مجھے جان ہیں۔ اللہ ان کا رکھوالا ہے۔ ان کے ہاتھوں پیروں اور سب جان ہیں... انگلیوں کی تعداد چالیس بنتی ہے۔ دلاور کے پاس ہاتھوں پیروں کی انگلیاں صرف بیس ہیں۔ اکیسویں قسط میں شاید اس کا بازو یا اس کی ٹانگ بھیجنی پڑے گی۔ یا ممکن ہے پہلے کان اور ناک کاٹنے پڑیں۔ آپ خود بھی تصور کرسکتی ہیں کہ دلاور کا سر کاٹنے سے پہلے اور کیا کچھ کاٹا جائے گا۔ نازو اور غالب مر کے بھی شہید ہوں گے اور کبھی نہیں مریں گے۔ اللہ ہمیں بھی صبر دے گا مگر آپ کو دوسرا شوہر اور آپ کے بچوں کا دوسرا باپ کہاں سے ملے گا۔ ابھی تو وہ زندہ سلامت ہے اور ایک انگلی کے کم ہوجانے کے باوجود چوہدری دلاور ہے۔ جیسے میں ہوں وہی....

سکندر بخت۔"

منظر ہمیں گیٹ پر ڈراپ کرکے چلا گیا۔ وقار یوسف کے گھر میں داخل ہوتے ہی میں نے پہلا کام یہ کیا کہ کٹی ہوئی انگلی والی ڈبیا اس گاڑی میں رکھ دی جس میں ہم یہاں پہنچے تھے پھر میں اور خادم حسین ایسے داخل ہوئے جیسے ہم باہر ٹہلنے گئے تھے۔ رابعہ سکون سے سو رہی تھی۔ وقار کی بیوی نے لائٹس آف کرکے دروازہ بھی بند کردیا تھا اور اسے سُلا دیا تھا۔

"آپ لوگ بغیر بتائے کدھر نکل جاتے ہیں" وہ خفا ہونے لگی۔

میں نے کہا "نکی' ہماری یہی شان ہے اور ہم ایسا ہی کرتے ہیں۔ یہ صوفی ہے اور ہم درویش ہیں۔ یہ دنیا ہمیں روک نہیں سکتی۔"

"دنیا کیا' بیوی خود روک لے گی۔ ابھی تو بے مہار ہیں نا۔"

خادم نے متانت سے کہا "خاتون کو بتادیں کہ میں الحمد اللہ شادی شدہ ہوں لیکن میں کوئی اونٹ نہیں جسے وہ مہار ڈال دے۔"

"تم خود بتادو یار کہ میں اونٹ نہیں گدھا ہوں۔ کاٹھ کا اُلّو ہوں اور کولہو کا بیل ہوں۔ مختصراً یہ کہ شوہر ہوں۔"

وقار ہنسنے لگا "سچ کہا آپ نے۔ یہ تمام صفات تو مجھ میں بھی بدرجہ اتم موجود ہیں۔"

"نکی خوش قسمت ہے کہ اسے مثالی شوہر ملا۔"

"یہ آپ نے نکی کب سے کہنا شروع کردیا ہے مجھے۔ کس نے بتایا ہے میرا یہ نام آپ کو؟"

میں نے کہا "کسی نے نہیں۔ بس تم نکی ہو یعنی چھوٹی۔ میرے ساتھ کھڑی ہوکے دیکھ لو۔ وزن کرلو اپنا اور میرا۔ عمر اور عقل کا حساب رکھو۔"

"ضرور وہ ڈاکٹر صاحب بتاکے گئے ہوں گے۔ وہ بدلہ لے رہا ہے مجھ سے۔ میں نے اس کی بیوی کو بتادیا تھا کہ بچپن میں تمہارے شوہر کو بچے کیا کہتے تھے۔ کیونکہ اس کی آنکھیں ہری کانچ کی گولیوں جیسی تھیں۔ بنٹوں کی طرح۔ بیوی اب اسے سب کے سامنے بنٹی کہتی ہے تو بہت چڑتا ہے۔"

معلوم ہوجائے گا۔ ظاہر ہے وہ شوہر کی سلامتی چاہے گی تو نازو کی سلامتی کو یقینی بنانے کے لیے خود بھی کچھ کرے گی۔ پیڈرو کا یا کسی اور کا کیا جاتا ہے اگر دلاور لنگڑا لولا ہوجائے۔ کوئی اس کا ہاتھ کاٹ لے یا سر کاٹ لے۔ نازو یا غالب کے ساتھ زیادتی کرنے والا مشکل میں پڑجائے گا کہ ایک انگلی کے بدلے میں دلاور کی ایک انگلی موصول ہوگئی۔ دوسری قسط بھی دلاور کی بیوی کو بھیجی گئی تو کیا ہوگا۔ وہ سب کی رگ رگ سے واقف ہے۔ یہ معاملہ اس کے شوہر اور بچوں کے باپ کا ہے۔"

میں نے کہا "میری بھی ایک تجویز ہے۔"

"جلدی سے فرماؤ" منظر نے گاڑی کی رفتار بڑھادی۔

"اس پارسل کے ساتھ تحریر نازو کے ہاتھ کی تھی۔ اس کا جواب میں دوں گا۔"

"وہ کس لیے؟"

"خط میرے نام تھا۔ انہیں پتا چل جائے کہ مکتوب الیہ تک پہنچ گیا۔ میری تحریر سے تصدیق ہوجائے گی کہ سکندر بخت بے پتا ہونے کے باوجود بے پتا نہیں ہے اور اس شہر میں کہیں موجود ہے۔ اس سے ان کا حوصلہ بھی پست ہوگا اور دلاور کی بیوی زیادہ پُرامید ہوجائے گی کہ دلاور کی بازیابی کے لیے سکندر سے اس کی ملاقات ناممکن نہیں۔ ظاہر ہے وہ رابعہ کے ذریعے یا فرنچ وکیل کی معرفت سکندر بخت سے براہِ راست مذاکرات کی پوری کوشش کرے گی۔"

منظر کو میری تجویز پسند آئی "تیرا دماغ ابھی کام کررہا ہے بھوتنی کے۔ چل لکھ کیا لکھنا ہے۔"

میں نے کہا "کیسے لکھوں۔ خونِ دل میں انگلیاں ڈبو کے۔"

اس نے مجھے بریف کیس میں سے ایک پیڈ اور پین نکال کے دیے "ذرا اختصار سے کام لینا۔ مجھے گھر بھی پہنچنا ہے۔ نو بج رہے ہیں۔ بیوی مارے گی۔"

"تو گھر کیسے جاسکتا ہے۔ فرائی فش' چرغا اور لیمب روسٹ کھلائے بغیر" میں نے پیچھے دیکھا جہاں خادم گم صم بیٹھا ہوا تھا "کیوں خادم....!"

"میری تو آج بھوک مرگئی ہے جی۔"

"یہ تو غالباً پہلی بار ہوا ہے۔ تاریخی واقعہ شمار ہوگا۔"

"ہاں جی۔" اس نے آہ بھری "میں نے اس روز بھی خوب ڈٹ کے کھایا تھا جس دن میرا نکاح ہوا تھا اور اس دن بھی جب اباجی اللہ کو پیارے ہوئے تھے۔"

میں نے کمپنی کے لیٹر ہیڈ پر لکھا۔

"اپنے چوہدری دلاور صاحب کی نصف بہتر کے نام' جو تحفہ مجھے ڈاکٹر علی حیدر کی معرفت بھیجا گیا تھا وہ مجھے موصول ہوگیا۔ یہ ہوسکتا ہے کہ تحفہ ارسال کرنے والی آپ نہ ہوں۔ آپ کے شوہرِ نامدار کے وہ یارِ غار ہوں جو بالآخر اسے موت کے اندھے غار میں دھکیل دیں گے۔ تاہم آپ کے علم میں ہونا چاہیے کہ "پہلی قسط"

چند منٹ میں وقار کی بیوی نے کھانا لگادیا اور بھوک نہ ہونے کے باوجود مولوی خادم حسین نے ایسی ہاتھ کی صفائی دکھائی کہ سب صاف کردیا۔ کھانے کے بعد مجھے مشکل سے چند منٹ ملے اور میں نے وقار کو اپنی کارگزاری سے آگاہ کردیا۔

"معلوم نہیں کون بار بار فون کررہا ہے" وقار نے کہا "پہلی بار کسی عورت نے تمہارے بارے میں پوچھا تھا تو میں نے رانگ نمبر کہہ کے رکھ دیا تھا۔ اس نے پھر فون کیا اور بولی کہ مجھے معلوم ہے آپ وقار یوسف ایڈووکیٹ ہیں لیکن مجھے سکندر بخت کا پتا بتادیں۔ میں نے کہا کہ خاتون' میں کسی سکندر بخت کو نہیں جانتا تو کہنے لگی کہ اتنا جھوٹ مت بولیں۔ میں نے ریسیور رکھ دیا اور دس منٹ تک نہیں اُٹھایا۔ تیسری بار کسی مرد نے رابعہ کو پوچھا تھا تو میں نے کہہ دیا کہ وہ منظر صاحب کے گھر پر ہوں گی۔"

"یہ ضرور دلاور کی بیوی ہوگی۔ خیر' میں آج رات اس سے رابطہ کرلوں گا۔"

"فون کروگے اسے؟"

"آفس سے فون نہیں کرسکتا۔ وائرلیس ریڈیو فون پر پیغام دوں گا' پہلے دلاور سے بات ہوتی تھی۔ شاید اس کی بیوی کو بھی پیغام مل جائے۔"

"آپ یہاں رُک جایئے۔ رات کو رابعہ باجی نے پوچھا تو..."

"بتادینا کہ چوکیدار تو رات کے وقت آفس میں ہی ہوتا ہے۔ اگر وہ چاہے گی تو بات کرلے گی ویسے مجھے اُمید کم ہے کہ صبح سے پہلے اس کی آنکھ کھلے" میں نے کہا۔

"اگر انہوں نے مجھ سے کچھ پوچھا' نازو کے بارے میں؟"

"تو بتادینا کہ نازو کو کچھ نہیں ہوا۔ جو بات میں سمجھا سکتا ہوں' تم بھی کہہ سکتے ہو۔"

مولوی خادم حسین پر مُردہ خانے کی فضا کا اثر بہت شدید تھا مگر آہستہ آہستہ احساس کی شدت میں کمی آرہی تھی۔ پہلے زیرِ لب اپنے آپ سے باتیں کرنے لگتا تھا جو دراصل خیالات کا بلند آواز میں غیر ارادی اظہار تھا۔ اس کے بعد وہ گم صم اور خاموش ہوگیا تھا اور سخت افسردہ تھا۔ صدمے کے ردِ عمل سے اس کی بھوک تک اُڑ گئی تھی۔ انتہائی نامساعد اور پُرخطر حالات میں بھی اس کا معدہ متاثر نہیں ہوتا تھا اور وہ چوہے جو عام آدمی کے پیٹ میں خطرے کے وقت دوڑنا بھول جاتے ہیں کھانے کا وقت ہوتے ہی خادم حسین کے پیٹ میں اچھل پھاند مچانے لگتے تھے۔ اس کا اصول ہی یہ تھا کہ آدمی کھانے کے لیے جیتا ہے۔ جینے کے لیے نہیں کھاتا اور ساری جدوجہد پیٹ کی خاطر ہی تو کرتا ہے۔

اس وقت مولوی خادم حسین کا ساتھ بھی مجھے غنیمت محسوس ہورہا تھا جب میرے ساتھ کوئی بھی نہیں تھا۔ آج مجھے یہ خیال بھی آرہا تھا کہ عملاً ایم آر ایس کا وجود ختم ہوگیا ہے اور ایک بار پھر میں اکیلا ہی اپنے دشمنوں سے نبرد آزما ہوں۔ آغاز میں یہ صرف میری جنگ تھی جو میں اپنے باپ کے قاتلوں سے لڑ رہا تھا۔ اس کے بے گناہ لہو کی پکار پر انصاف مانگنے کے لیے' اپنا حق حاصل کرنے کے لیے۔ اس وقت محسن کے بعد میرا ساتھ رابعہ نے دیا تھا۔ محسن نے بھی گُل کے ساتھ اپنا گھر آباد کرلیا تھا۔ ڈاکو شیش ناگ بن ناگ منی اب گُل بانو بھی نہیں رہی تھی۔ وہ مسز محسن ہوگئی تھی۔ نازو کا بھائی سابق سب انسپکٹر اکرام شیخ بھی کا... ساتھ خوش و خرم زندگی گزار رہا تھا اور وہ ایک خوش حال ... کی طرف گامزن تھے۔ منظر کبھی بے گھر نہیں ہوا تھا۔ وقار ... نے تو عشق کی پہلی جست میں شادی کی منزل پالی تھی اور ... کو بلند رکھتے ہوئے ایک توپ قسم کے سسر کی دولت کو بھی ... ہاردی تھی مگر سسر صاحب بھی سکندر کی طرح دنیا سے خالی ہاتھ ... اور دولت بالآخر وقار یوسف کو ملی۔ دیر آید درست آید۔ ہم ... کے مقابلے میں وہ انتہائی خوش قسمت تھا۔

میرا ساتھ دینے والوں میں اب صرف غالب اور نازو ... گئے تھے لیکن انہوں نے بھی کسی حد تک اپنے مستقبل کو تحفظ فراہم کرلیا تھا۔ غالب پھر کوئے صحافت میں قسمت آزمانے کے لیے لوٹ آیا تھا اور اس بار وہ اکیلا نہیں تھا۔ مجنوں کے ساتھ ... بھی دشت نوردی میں ہم رکاب تھی۔ اگر وہ کسی بھی آزمائش ... ناکامی سے گھبرا کے' کسی حوصلہ شکن لمحے کی سازش کا شکار ہو... غیر جذباتی انداز میں صرف اپنی زندگی اور اپنے مستقبل کے ... سے مغلوب ہو کے فیصلہ کرلیتے کہ اب انہیں بھی ٹھہر جانا چاہیے ... نہ مجھے دُکھ ہوتا نہ تعجب۔ آخر کیا ملا کسی کو اس سعیٔ لاحاصل ... ایک ایسی جدوجہد سے جس میں مسلسل فرار تھا یا تعاقب کا سلسلہ تھا۔ اگر پیش قدمی تھی تو اپنے دفاع میں اور پسپائی تھی تو اپنی ... سے بچنے کے لیے۔ شکاری کبھی ہم تھے تو کبھی دلاور اینڈ کمپنی ... کے اُجرتی قاتل اور پالتو کُتے مگر اصل شکاری تو اجل تھی جس ... جب چاہا کبھی بساط پر سے ایک طرف کا مہرا غائب کردیا تو ... دوسری طرف کا۔ بازی ابھی تمام نہیں ہوئی تھی اور کوئی فریق ... کا دعویٰ کرسکتا تھا اور نہ شکست کا اعلان۔ میں اب یہ محسوس ... تھا کہ جنگ پھر ذاتی ہوگئی ہے لیکن کل جو بازی میرے والد ... خان نے ہاردی تھی وہ آج میری جیت بن سکتی ہے۔ جہاں ... دلاور سے پُرانا حساب بے باق کرنے کا سوال تھا تو صرف موت ... میرے ارادوں کو بدل سکتی تھی۔ نہ میرے حوصلے میں کمی آئی ... اور نہ یقین میں۔ میرے جذبات آج بھی وہی تھے جو روزِ اوّل ...

مایوسی اور قنوطیت کے موڈ کو بدلنے کے لیے میں مولوی ... حسین کو مزنگ چونگی لے گیا جہاں کباب اور تلی ہوئی مچھلی کی ... نے ہم دونوں پر ایک سا خوشگوار اثر کیا۔

میں نے کہا "مولوی خادم حسین۔ آج رابعہ بھی نہیں ... صرف تم میرے ساتھ ہو۔"

اس نے سالم مچھلی میں سے کانٹے جدا کرتے ہوئے کہا "... گھر والی بھی وہیں لوٹ گئی جہاں سے آئی تھی۔"

"اللہ مغفرت کرے اس کی۔ کب انتقال ہوا اس کا؟"

آفس میں پہنچ کے میں نے وکیل سے چوکیدار بننے کے بعد نیچے جا کے گیٹ کو لاک کیا تو مجھے چوہدری دلاور کا خیال آیا۔ اس کا قید سے نکل کر فرار ہونا تقریباً ناممکن تھا مگر وہ قیدوبند کی اذیت سے ہلاک ہوسکتا تھا۔ ایک ہفتے سے اس نے دن کا اُجالا نہیں دیکھا تھا اور اس کی نقل و حرکت اس تہ خانے تک محدود تھی جہاں وہ اتنا ہی اکیلا تھا جتنا کوئی مُردہ اپنے مدفن میں۔ وہ سختی جھیلنے کا عادی نہیں تھا اور بیمار بھی تھا۔ کچھ تو عمر کے روگ ہوتے ہیں لیکن دلاور ابھی اتنا بوڑھا نہیں ہوا تھا کہ اس کی بیماری کو عمر کا تقاضا سمجھا جاتا۔ یہ سب جوانی کی بے اعتدالی' کثرتِ مے نوشی' عیاشی اور خوف' تفکرات اور اعصابی دباؤ کی زیادتی کا نتیجہ تھا۔

خادم حسین کو مطلع کیے بغیر میں نے قفل کھولا اور باہر سے تالا لگا کے پیدل ہی روانہ ہوگیا پھر ایک موٹر سائیکل سوار نے مجھے ریلوے اسٹیشن تک لفٹ دی اور وہاں سے میں نے فی سواری کے ریٹ پر چلنے والے تانگے میں سفر کیا تو دس منٹ بعد کراؤن سنیما کے چوک پر تھا۔

سنیما کا انٹرول ختم ہوچکا تھا۔ دُکان دار اور گیٹ کے سامنے موبائل شاپ یعنی ریڑھی لگانے والے کاروبار سمیٹ چکے تھے۔ صرف وہ پان سگریٹ والا مصروف تھا جس کے کھوکھے کی رونق آخری شو کے آخری تماشائی کے رخصت ہونے تک باقی رہتی تھی۔

رابعہ کی کوٹھی کے پلاٹ پر خیمہ جوں کا توں نصب تھا اور لکڑی کا وہ چھوٹے موٹے کمرے جتنا باکس بھی اپنی جگہ پر موجود تھا۔ میں ڈھکنا کھول کے اندر غائب ہونے ہی والا تھا کہ کسی نے خیمے کے اندر سے فریاد کے انداز میں کہا "یا اللہ۔"

میں چونک پڑا اور میں نے خیمے کے اندر غور سے دیکھا تو مجھے فرش پر کوئی گدڑی میں لپٹا ہوا نظر آیا۔ وہ کوئی فقیر تھا جو خیمے کو خالی پاکر اس پر قابض ہوگیا تھا۔ پہلے میرا خیال تھا کہ اسے سونے دوں۔ کیا حرج ہے اگر کسی بے گھر کو رات بھر کے لیے پناہ کی جگہ مل جائے لیکن پھر مجھے خیمے کے اسباب میں اضافے کا احساس ہوا۔ غالباً فقیر صاحب اپنا سامان بھی اُٹھا لائے تھے اور یہاں مستقل آباد ہونے کا ارادہ رکھتے تھے۔ میں نہ آتا تو شاید دو چار دن میں وہ فیملی بھی لے آتے۔

میں نے فقیر کی بے دخلی پر عمل درآمد کے پروگرام کو واپسی تک مؤخر کردیا اور تہ خانے میں اُتر گیا۔ اپنے ساتھ میں موم بتی اور ماچس بھی لے گیا تھا جو باکس کے اندر ہی رکھی ہوئی تھی۔

دلاور کی نظریں اندھیرے میں دیکھنے کی عادی ہوگئی تھیں۔ اس نے اوپر سے آہٹ بھی سُن لی ہوگی۔ مکمل خاموشی اور تاریکی میں آدمی کے کان سُننے کے ساتھ دیکھنے بھی لگتے ہیں۔ ابھی میں نیچے اُترا بھی نہیں تھا کہ اس نے مجھ پر حملہ کردیا۔ معلوم نہیں وہ کیا چیز تھی جو اس نے دیوانگی کے جوش میں میری ٹانگوں پر ماردی۔ اگر وہ

"میرا مطلب تھا جی اپنے میکے۔"

میں نے چرغے کی آخری رسوم ادا کرکے ڈکار لی "آج رات تم ہی میرے رفیق اور غم خوار ہو۔ ایسا نہ ہو تم بھی ساتھ چھوڑ جاؤ' صبح ہونے تک۔"

"بری بات منہ سے کیوں نکالتے ہیں جی۔"

"میں تمہاری خوش خوراکی کا مظاہرہ دیکھ کے ایسا سوچنے پر مجبور ہوں۔ ایک چرغا اور ایک سیر مچھلی کھا چکے ہو تم۔ کسی کی نظر نہ لگ جائے تمہیں۔ سب دیکھ رہے ہیں۔"

"اچھا جی۔ چلیں پھر یہاں سے۔ اب کہیں اور جا کے کھیر کھائیں گے اور پھر ایک گلاس لسّی کا پی کے خدا کا شکر ادا کریں گے۔"

"یعنی خدا کا شکر بھی اس سے پہلے ادا نہیں کروگے؟ خیر بل ادا کرو۔"

وہ چونکا "میں۔ کہاں سے ادا کروں گا۔ غریب آدمی۔"

میں نے کہا "خادم حسین۔ اتفاق سے آج میری جیب خالی ہے۔ گھر سے پیسے لانا یاد نہیں رہا۔ تمہاری جیب میں تو دو ہزار ہیں۔"

وہ سوچ میں پڑگیا "مگر یہ تو... امانت میں خیانت ہوگی جناب۔"

"اور یہ حماقت میں حجامت ہوگی اگر جیب میں رقم ہونے کے باوجود تم نے بل ادا کیے بغیر فرار ہونے کی کوشش کی۔ اس پہلوان کو دیکھ رہے ہو جو راستے میں کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا ہے۔ تمہیں بھی مچھلی کے ساتھ فرائی کردے گا۔"

خادم حسین مسکرانے لگا "آپ بھی تو ساتھ ہیں آخر۔"

میں نے کہا "میں تو ہوں پردیسی خادم حسین۔ فرنچ بول کے انجان بن جاؤں گا اور اشاروں میں واضح کردوں گا کہ مجھے تم لائے تھے۔ تم نہیں بچ سکتے۔"

"آپ بعد میں مجھے لوٹا دینا جی۔" خادم حسین بولا "سارا گناہ آپ کے سر۔"

"بارِ گناہ تو پہلے ہی پہاڑ جتنا ہے خادم حسین۔ اس پر ایک کنکری اور رکھنے سے کیا فرق پڑے گا۔" میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

رابعہ کی آفس بلڈنگ کا گیٹ کھلا ہوا تھا۔ یہ میری یعنی قائم مقام چوکیدار کی نااہلی تھی مگر مجھ سے زیادہ اصل چوکیدار کی بدمعاشی تھی جو چھٹی لے کر گیا تھا تو لوٹ کے آنا ہی بھول گیا تھا۔ غنیمت ہے کہ ابھی تک کسی کو اس بے پرواہی سے نقصان نہیں ہوا تھا۔ سب لوگ اپنے آفس بند کرکے جاتے ہوئے فرض کرلیتے تھے کہ بلڈنگ کو بعد میں چوکیدار مقفل کردے گا اور وہ سامنے نہیں تو کوئی بات نہیں۔ ہوگا آس پاس ہی۔ صبح سب کو بلڈنگ کا مین گیٹ کھلا ہوا ملتا تھا تو بھی فرض کرلیا جاتا ہوگا کہ چوکیدار اپنا کام کررہا ہے۔

چند لمحے انتظار کرتا تو اسے میرے سر پر وار کرنے کا موقع مل جاتا۔ میں لٹک کر نیچے اُترا تھا۔ اس نے جلدی میں سوچا نہیں اور میں بال بال بچ گیا۔

میری ایک ٹانگ پر ضرب خاصی شدید پڑی تھی اور نیچے گرنے کے بعد میں اس قابل نہیں رہا تھا کہ فوراً کھڑا ہو سکوں لیکن دلاور نے دوبارہ حملہ کیا تو میں نے دوسری لات ماری اور وہ بلبلا کے دور جا گرا۔ میں نے اندھیرے میں ایک سایہ سا دیکھ کے لات چلائی تھی جو اس کے سینے پر پڑی تھی۔ اُٹھنے کے لیے مجھے اتنی مہلت بہت تھی لیکن میں سیدھا کھڑا ہوتا تو شاید دلاور پھر وار کرتا۔ میں نے پہلے ماچس کی ایک تیلی روشن کی اور دلاور کی پوزیشن دیکھ لی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ڈنڈا تھا اور وہ دیوانہ وار مجھ پر حملہ کرنے آ رہا تھا۔ وہ کسی کرسی کا پایہ تھا جو دلاور کے ہاتھ میں ایک خطرناک ہتھیار بن گیا تھا۔

میں نے اسے قریب آنے کا موقع دیا اور آخری لمحے میں دیا سلائی پھینک کر پہلو کے بل پلٹ کے ایک طرف ہو گیا مگر اپنی ٹانگ دلاور کی راہ میں اَڑا دی۔ وہ منہ کے بل گرا تو میں کھڑا ہو گیا۔ دوسری ماچس جلا کے میں نے دلاور کو جا لیا۔ اس کے ہاتھ سے ڈنڈا چھوٹ گیا تھا۔ اس نے میری طرف اور پھر اپنے ہتھیار کی طرف دیکھا مگر اسے آگے بڑھنے کا موقع بھی نہ ملا۔

میں نے اس کی ٹانگ پکڑلی اور وہ پھر گرا۔ اس نے لاتیں چلا کے خود کو چھڑانے کی پوری کوشش کی۔ اس کے ہاتھ آگے پھیلے ہوئے تھے مگر ڈنڈا بہت دور تھا۔ میں نے اسے گھسیٹ لیا اور کمرے کی آخری دیوار تک کھینچ کر لے گیا۔

وہ مجھے گالیاں بک رہا تھا اور پاگلوں کی طرح چیخ رہا تھا۔ قید‘ احساسِ بے بسی اور تنہائی نے اس کے ذہن پر بُرا اثر ڈالا تھا۔

موم بتی روشن کر کے میں نے اسے خبردار کیا "دلاور۔ مجھ سے دور رہو ورنہ....."

"ورنہ کیا.... ورنہ تُو مار ڈالے گا مجھے سور کے بچے۔ مار دے‘ مار دے مجھے۔ میں ایسے زندہ رہنا نہیں چاہتا" وہ چلّانے لگا۔

میں نے موم بتی کو ایک طرف رکھ دیا۔ "موت تو کسی کو بھی وقت سے پہلے نہیں آتی۔ تم تو ابھی بہت دن زندہ رہو گے۔ ایک وقت آئے گا جب تم منت سماجت کرو گے۔ ہاتھ جوڑو گے اور موت کی خواہش کرو گے مگر میں تمہارے قتل کا الزام اپنے سر کیوں لوں۔ مارنا ہوتا تو میں نے تمہیں بہت پہلے مار دیا ہوتا۔"

وہ فرش پر بیٹھ گیا "پھر کیا چاہتے ہو تم‘ مجھے بتاؤ۔"

"تم یہ سوال کر رہے ہو؟ حیرت ہے" میں نے کہا "تم واقعی پاگل ہو گئے ہو۔ تم سے بہتر کون سمجھ سکتا ہے یہ بات کہ میں کیا چاہتا ہوں؟"

"مجھ سے سب کچھ لے لو سکندر۔ میرے پاس جو کچھ ہے وہ لے لو۔" وہ دھاڑیں مار مار کے رونے لگا۔

میں نے کہا "تمہارے پاس اپنا کچھ نہیں ہے میرا ہے جس پر تم قابض تھے۔ میرا حق تو مجھے مل گیا تمہاری سزا کا قرض پھر بھی باقی رہے گا۔ تم قاتل ہو۔"

"ہاں ہاں۔ میں قاتل ہوں۔ میں نے قتل کیا تھا میں نے اس سے سب کچھ چھین لیا تھا۔ میں اپنے اعتراف کرتا ہوں۔ اب مجھے جو سزا دینی ہے تو...."

میں نے افسوس سے سر ہلایا "اپنے چوہدری صاحب جلدی بھی کیا ہے۔ پھانسی دینا تو جلاد کا کام ہے۔ دے سکتا ہوں تمہیں۔ قتل تم نے ایک وزیر خان کا تمہارے دامن پر تو ہزاروں بے گناہوں کے لہو کے فرصت میں حساب کر کے دیکھنا کہ جتنا اسلحہ تم نے بھیجا تھا اس سے کتنے لوگ مارے گئے ہوں گے۔ اس کا تم ہی کر سکتے ہو کیونکہ اسلحے کا اس کی فروخت سے حاصل والی رقم کا حساب بھی تمہارے سوا کوئی نہیں جانتا۔ ہم انداز ے قائم کرتے تھے۔ تم نے ایک ایک گولی کا اور ایک پائی کا حساب رکھا ہو گا۔ تمہیں یہ بھی معلوم ہو گا کہ یہاں پاکستان میں تم نے کتنے لوگوں کے لیے موت کے فرمان جاری تھے۔ اس کے لیے کرائے کے کتنے قاتل حاصل کیے تھے اور کیا معاوضہ ادا کیا تھا۔"

وہ گھٹنوں پر سر رکھ کے روتا رہا۔ اس کی حالت بھی جیسی ہو رہی تھی۔ اب تک اس کے تن پر وہی کپڑے تھے نے گرفتاری کے وقت پہن رکھے تھے۔ یہ کپڑے مٹی غلاظت میں اَٹ گئے تھے اور جگہ جگہ سے پھٹ چکے تھے۔ شیو اتنی بڑھ گئی تھی کہ داڑھی نظر آنے لگی تھی اور اس کا بدلا لگتا تھا۔ اس کی آنکھیں متورم تھیں اور ان کے گرد حلقے نمودار ہو چکے تھے۔ اس کے سر کے بال اچانک سفید تھے اور وہ اپنی اصلی عمر سے بیس پچیس سال زیادہ کا نظر غالباً ہیئر کلر لگانے کا نتیجہ تھا کہ اس کے بال بالکل سیاہ لگتے وہ بہت صحت مند جوان آدمی نظر آتا تھا۔

اس کے پاس کھانے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ بسکٹوں کے ڈبے ہر طرف بکھرے ہوئے تھے۔ بوتل میں پانی بھی نہیں مجبور تھا کہ اسی جگہ کو حوائج ضروریہ سے فراغت کے لیے کرے۔ کمرے میں پیشاب‘ پاخانے کی بدبو بھر گئی تھی اور اخراج کا نظام نہ ہونے سے یہ تعفن زیادہ محسوس ہوتا تھا میں یہاں رہتا تھا تو یہ ایک صاف ستھرا اور بڑی خوب آراستہ بیڈ روم تھا جس میں ائرکنڈیشنڈ کام کرتا تھا اور جگمگاتی تھیں۔

جب میں واپس آنے لگا تو دلاور میرے پیچھے خدا کے لیے مجھے چھوڑ کے مت جاؤ۔"

اپنا ہے" میں نے کہا "خبیث۔ وہ سب کھانے پینے کا سامان کہاں ہے جو یہاں رکھا ہوا تھا۔ بول نہیں تو تیرا پیٹ پھاڑ کے سب نکال لوں گا۔"

وہ گھگھیانے لگا "کیا ہوا اگر دو چار ڈبے بسکٹ کے ہم فقیروں نے کھا لیے۔ روز تو وہی روکھی سوکھی ملتی ہے۔ مجبور اور محتاج....."

میں نے کہا "میں جانتا ہوں تم جیسے ہٹے کٹے محتاجوں کی مجبوری۔ سارا دن گھر گھر سے ملنے والا تر مال چھانٹ کے کھاتے ہو۔ روکھی سوکھی بیچ کے فلم دیکھتے ہو یا نشہ کرتے ہو۔ ادھر دکھاؤ مجھے اس تھیلے میں کیا ہے؟"

"کچھ نہیں بابا! فقیر کی جھولی میں کیا ہو گا۔ خیرات کے ٹکڑے اور پھٹے پُرانے کپڑے" اس نے بیگ نیچے کر لیا۔

میں نے بیگ چھین کے اُلٹ دیا۔ اس میں وہ سب بسکٹوں کے ڈبے اور کھانے پینے کی چیزیں اوپر ہی بھری ہوئی تھیں جو ہم نے ضرورت کے لیے خیمے میں رکھ دی تھیں۔ ان سب کے ساتھ نقد مال بھی فرش پر بکھر گیا۔ یہ بلا مبالغہ ہزاروں روپے تھے۔

فقیر دیوانہ وار نوٹ پھر تھیلے میں بھرنے لگا۔ "ارے ظالم ڈاکو‘ لٹیرے‘ فقیروں کے مال پر بُری نیت رکھتا ہے۔ اللہ تجھے غارت کرے۔"

میں نے کہا "یہ سب سمیٹو اور دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ شور مچائے بغیر ورنہ پولیس آ گئی تو اندر ہو جاؤ گے اور یہ سارا مال بھی ہاتھ سے جائے گا۔ اتنی دولت جمع کر رکھی ہے اور پھر بھی ہاتھ پھیلاتے ہو۔"

"ہاتھ کون نہیں پھیلاتا بابا۔ کیا تم کسی کے محتاج نہیں ہو۔" وہ بڑبڑاتا ہوا ایک بغل میں گدڑی اور سر پر ٹین کا پرانا صندوق رکھ کے روانہ ہو گیا۔ اصل خزانہ یعنی وہ بیگ جس میں اس کی ساری رقم محفوظ تھی اس نے بازو والے اسٹریپ کی مدد سے کندھے پر لٹکا لیا تھا۔

خالی ڈبوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ فقیر نے خوب پیٹ بھر کے سب کچھ کھایا تھا پھر بھی جو بچ گیا تھا دلاور کو دو چار دن کے لیے کافی تھا۔ اگر میں بروقت نہ دیکھتا تو وہ فقیر مجھے باکس کے راستے آتا جاتا دیکھ لیتا اور شک میں پڑ جاتا۔ خالی پلاٹ پر ناجائز قابضین اسی طرح بیٹھ جاتے ہیں۔ جیسے خیمہ خالی دیکھ کے فقیر نے ڈیرا جما لیا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ یہاں کسی کو چوکیدار مقرر کر دینا چاہیے بلکہ جب تک دلاور یہاں ہے مجھے خود رات یہاں گزارنی پڑے تو کوئی حرج نہیں۔

میں نے دلاور کو خوراک اور پانی فراہم کرنے کے بعد ٹوٹی ہوئی کرسی کو دیکھا۔ کرسی مضبوط تھی مگر دلاور نے اس کی ٹانگ توڑ کے خود کو مسلح کر لیا تھا۔ اس میں اتنی طاقت تھی تو وہ اگلی مرتبہ وار کر کے میرا سر بھی پھاڑ سکتا تھا لیکن اس وقت میں اکیلا فرنیچر نکال

"پھر کیا تمہارے ساتھ باقی زندگی اسی زنداں میں گزاروں۔ یہ زنداں تو خود تم نے اپنے لیے بنایا تھا۔ ورنہ یہ ایک محل نما کوٹھی کا سب سے زیادہ پُرتکلف اور آرام دہ کمرا تھا۔ اس کوٹھی کو بنایا بھی تم نے تھا اور کھنڈر میں بھی تم نے تبدیل کیا تھا۔"

"میں مر جاؤں گا۔ مجھ پر رحم کرو۔"

"بالآخر ہم سب مر جائیں گے۔ ابھی میں تمہیں زندہ رکھنا چاہتا ہوں لیکن تم خودکشی کرنا چاہو تو دیوار سے سر ٹکرا کے مر سکتے ہو۔ کم سے کم اس کی کوشش ضرور کر سکتے ہو اور کچھ تو ہے نہیں‘ نہ خنجر نہ پستول۔ نہ زہر اور نہ پھانسی کا پھندا بنانے کے لیے رسی۔ نہ بجلی ہے کہ تم خود کو ELECTRICUTE کر سکو اور نہ خود کو آگ لگا سکتے ہو۔ ویسے بھی تم مایوس ہو کے ہمت ہارنے والے نہیں ہو۔ تم اس لیے میرے دشمن ہو کہ اس کے اہل ہو۔ کوئی کم ہمت بزدل اور احمق آدمی مجھ سے دشمنی نبھا ہی نہیں سکتا۔ دوستی تو ناممکن تھی مگر تم کو دشمن کہنے یا سمجھنے سے میری توہین نہیں ہوتی۔"

میں دلاور کے سامنے جتنا مطمئن نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا اندر سے اتنا ہی متفکر ہو رہا تھا۔ اس کی دیوانگی میں جنوں کے آثار ابھی پیدا نہیں ہوئے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ کہاں ہے اور اس کی حیثیت کیا ہے۔ وہ کس حد تک مجبور ہے اور میں کتنا اختیار رکھتا ہوں۔ اسے اپنی فردِ جرم کا علم تھا اور یہ معلوم تھا کہ میں سزا کی بات کیوں کر رہا ہوں۔ اس کا دماغ ابھی کام کر رہا تھا۔ صرف قید اور چوبیس گھنٹے کی پُرعذاب تنہائی بھوک پیاس اور جسمانی تکلیف اس کے اعصاب کو شکست دینے لگی تھی اور کبھی کبھی وہ بے اختیار ہو کے اشتعال میں ہوش کھو بیٹھتا تھا۔ میں اندازہ کر سکتا تھا کہ بالآخر اس کی قوتِ برداشت بالکل جواب دے جائے گی تو پاگل پن کے مختصر اور عارضی دورے مستقل دیوانگی میں ڈھل جائیں گے۔ مجھے اس انتہا تک جانے سے گریز کرنا تھا اور دلاور کو اسی طرح زندہ اور صحت مند رکھنا تھا جیسے جیل والے سزائے موت پانے والے قیدی کو رکھتے ہیں۔

اوپر آ کے میں نے فقیر بادشاہ کی گدڑی کھینچ لی۔ وہ ہڑبڑا کے اُٹھ بیٹھا۔ "کون۔ کون ہے کھوتا...."

میں نے کہا "جو سوتا ہے وہ کھوتا ہے۔"

"فقیروں کو تنگ کرتا ہے۔ چل ہُٹ ادھر سے۔ سونے دے ہمیں۔" اس نے مجھے نیم غنودگی میں ڈانٹا "ہم ملنگ لوگ ہیں۔"

میں نے اس پر پانی کا جگ اُنڈیل دیا۔ "یہ کیا تمہیں جہیز میں ملنے والے محل کا بیڈ روم ہے۔ تم یہاں گھسے کیسے ملنگ کی اولاد۔ چلو اُٹھاؤ اپنا بوریا بستر۔ ورنہ میں تمہیں بھی اسی میں لپیٹ کر سڑک پر پھینک دوں گا۔"

وہ ایک دم کھڑا ہو گیا "اچھا اچھا۔ خفا کیوں ہوتے ہو سنتری بادشاہ۔ ہم تو خالی جگہ دیکھ کے آ گئے تھے۔ کہیں اور لے جاتے ہیں اپنا ڈیرا۔ فقیروں کا کیا ہے۔ خدا کی ساری زمین اپنی ہے۔ آسمان

دلاور کی بیوی نے مجھے جو کارڈ دیا تھا اس پر بھی ڈیوس روڈ والے آفس کا نمبر تھا چنانچہ مجھے اُمید تھی کہ یہ لڑکی ابھی مسز دلاور کو فون کرکے ساری بات بتادے گی۔ پہلے اس کی جگہ ایک بے وقوف چرسی ٹائپ شخص بولتا تھا جو شاید اس لیے رخصت کردیا گیا ہوگا کہ وہ رات کو سوتا ہوا ملتا تھا۔ رات کے وقت کسی کو وائرلیس فون پر اس لیے تو نہیں بٹھایا جاتا کہ جب اچانک ارجنٹ کال آئے تو ریسیو کرنے والا خوابِ خرگوش میں ہو۔

چوہدری دلاور کے سب دھندے خفیہ اور پُراسرار تھے۔ ابھی مجھے معلوم نہیں تھا کہ سی ڈی انٹرپرائز کہاں ہے اور اس آفس میں رات کے وقت کیا کام ہوتا ہے مگر ٹیلی فون ریسیو کرنے کے لیے ایک ہوشیار لڑکی کا موجود ہونا یہی ثابت کرتا تھا کہ وہاں دنیا کے کسی بھی حصّے سے کسی بھی وقت کال آجاتی ہوگی۔ اگر آدھی دنیا میں رات ہو تو باقی آدھی دنیا میں دن رہتا ہے اور آدھی دنیا اس حصّے میں سوجاتی ہے تو دوسرے حصّے میں لوگ جاگ رہے ہوتے ہیں اور کاروبارِ حیات جاری رہتا ہے۔

حسبِ توقع دس منٹ بعد فون کی گھنٹی بجی اور میں نے ریسیور اُٹھاکے ہیلو کہا تو دوسری طرف سے دلاور کی بیوی کی آواز سُنائی دی۔

"کون بول رہا ہے؟"

"میں چوکیدار ہوں جی، حکم؟"

"دیکھو چوکیدار۔ یہ رابعہ کا آفس ہے نا؟"

"یہ تو آپ کو ملوم ہونا چاہیے کہ آدھی رات کو آپ نے کدھر فون کیا ہے" میں نے اجڈ لہجے میں کہا "اور حکم؟"

"مجھے رابعہ سے بات کرنی ہے، ابھی۔۔۔"

"کرو جی، مجھ سے اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے اور کوئی حکم؟"

"بدتمیز آدمی۔ مجھے فون نمبر چاہیے ان کے گھر کا۔"

"گھر کا فون تو نہیں ہے جی اور ہوتا بھی تو میں آپ کو نہ بتاتا۔"

وہ برہمی سے بولی "وہ جو باہر سے ایک وکیل آیا ہوا ہے۔ وہ کہاں ملے گا اس وقت؟"

"مجھے کیا پتا جی۔ کوٹھی میں ملے گا یا کوٹھے پر۔ آپ کو آدھی رات کے وقت اس کی کیا ضرورت پڑگئی۔ گھر میں اور محلّے میں کوئی مرد نہیں آپ کے کام کا؟"

"کیا بکواس ہے۔ کیسا کام؟" وہ گرم ہوگئی۔

"پتا کام ہے تو ہمیں کیا جی اور بُرا ہے تو کیا۔۔۔" میں نے کہا مگر مجھے زنانہ لغت کی چند فحش گالیوں سے نواز کے اور نکلوانے کی دھمکی دے کے اس نے فون رکھ دیا۔

صرف تصدیق کے لیے میں نے سی ڈی انٹرپرائز کے کارڈ پر دیا ہوا فون نمبر ملایا تو وہی آواز سُنائی دی۔

"یس سر!"

میں نے کہا "ہیلو، کیا حال ہے؟"

وہ چکرا گئی "جی۔ آپ کو کس سے بات کرنی ہے۔"

میں نے کہا "دیکھو ناراض مت ہونا۔ ایک رات مجھے نیند نہیں آرہی تھی تو میں نے تمہیں فون کیا تھا اور تمہاری آواز کا رس میرے کانوں میں ٹپکا تو میں سکون سے سوگیا تھا۔"

وہ ہنسی "ایسی کیا بات ہے میری آواز میں؟"

"یہ پوچھو کیا نہیں ہے اس نغمۂ ساز میں۔ آبشاروں کا گیت، پہاڑی ندی کا سنگیت۔ برسات کی رم جھم۔"

"آپ کوئی شاعر ہیں جو راتوں کو جاگتے ہیں یا اِدھر اُدھر فون گھما کے کسی لڑکی سے بات کرنا آپ کی ہابی ہے۔"

"کچھ بھی سمجھ لو۔ بات تو تمہاری آواز کی ہے۔ اس میں جو نرمی اور مٹھاس ہے، جو نشہ ہے اور خمار ہے۔ وہ نہ چرس میں ہے نہ افیون میں اور نہ شراب میں۔"

"سب آزما چکے ہوں گے آپ، تجربے کی بات کررہے ہیں یا صرف بکواس۔"

میں نے اپنی بات جاری رکھی "اور جب آواز کا یہ انداز ہے تو حُسن کا جلوہ کتنا قاتل ہوگا۔ تھری ناٹ تھری کی گولی سے بھی بڑھ کر۔ گیارہ ہزار وولٹ کے کرنٹ سے زیادہ۔ سائنائیڈ سے زیادہ مہلک۔ میں نے تمہیں دیکھا نہیں مگر تم حُسن کا ایٹم بم ہو۔"

"سوجائیں مسٹر۔ فالتو وقت نہیں ہے میرے پاس" وہ بولی مگر اس نے فون بند نہیں کیا۔ ایسی باتیں کسے اچھی نہیں لگتیں۔

"ہاں۔ اب مجھے نشہ ہورہا ہے۔ نیند آرہی ہے۔ آج میں خواب میں تم کو دیکھوں گا مس ایٹم بم۔ میں وعدہ کرتا ہوں اور کوئی بدتمیزی نہیں کروں گا۔۔۔ آؤگی نا خواب میں مس ایٹم بم۔"

وہ ہنسی "تم تو پاگل ہو۔ میرا نام مس ایٹم بم نہیں حسینہ ہے۔"

فون بند ہوگیا تو میں ہنسا۔ میری باتیں اسے پسند آئی تھیں اور اندازِ تغافل ظاہری عدم دلچسپی اور خفگی کے باوجود اس نے اپنا نام بتا کے مجھے سلسلہ جاری رکھنے کا اجازت نامہ عطا کردیا تھا۔ خوشامد کسی حد تک سب کی کمزوری ہے اور اپنی تعریف سُن کے کون خوش نہیں ہوتا۔ عورت اگر واقعی حسین ہو تو اسے بطورِ خراج تحسین وصول کرتی ہے اور بدصورت ہو تو سچ سمجھ کے سُنتی ہے۔ ہر بے وقوف لڑکی ایسے ہی لفظوں کے جال پھینکنے والے شکاری کے دام میں گرفتار ہوجاتی ہے اور جب کھوکھلے لفظوں کا بھرم ٹوٹتا ہے تو روتی ہے۔

میرا ذہن اب زیادہ مستعد ہوگیا تھا۔ نیند کا کوسوں پتا نہیں تھا چنانچہ میں نے منظر کو فون کیا۔ کچھ نہ کرنے سے کچھ کرنا بہرحال بہتر تھا۔ گھنٹی مسلسل بجتی رہی۔ بالآخر خود منظر نے خواب آلود لہجے میں "ہے۔۔۔ لو" کہا۔

"معاف کرنا اپنے منظر صاحب، نیند نہیں آرہی تھی مجھے۔"

سرسراہٹ کی جگہ شور سُنائی دیتا اور ٹیوننگ کے ٹھیک ہونے کا پتا نہ چلتا۔ میں منتظر تھا کہ ایک جانی پہچانی آواز پوچھے کہ "تم کون ہو؟" تو میں حسبِ سابق جواب دوں کہ "تمہارا باپ" اور کسی رسمی سلام دعا کے بعد ایک دوسرے کو پہچان کے ہم کام کی بات کریں مگر خلافِ توقع ایک شائستہ اور شیریں لہجے والی نسوانی آواز نے کہا "یس سر"

میں نے آواز بدل کے انگریزی میں کہا "کیا میں مسٹر چوہدری سے بات کرسکتا ہوں؟"

"مسٹر چوہدری تو موجود نہیں ہیں سر۔"

"مجھے معلوم ہے وہ اس وقت کہاں ہوگا۔۔۔"

اس نے قدرے توقف کے بعد کہا "اچھا؟ پھر آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"میں مسز دلاور سے بات کرنا چاہتا تھا۔"

"مسز دلاور سے۔۔۔ سوری سر۔"

"کیا تم مجھے ان کا فون نمبر دے سکتی ہو؟" میں نے کہا۔

"نہیں سر۔ مجھے معلوم نہیں۔ ویسے بھی پرائیویٹ فون نمبر ایسے تو نہیں بتائے جاسکتے" اس نے معذرت کی۔

"اچھا تم ان کو پیغام تو دے سکتی ہو؟"

"آپ کون ہیں سر۔ اپنا نام بتائیے۔ میں صبح کوشش کروں گی۔"

میں نے کہا "نام سے شاید ان کو یاد نہ آئے۔ میں ڈاکٹر شیلی کا زند ہوں۔ لندن سے بات کررہا ہوں۔ میں نے یہاں سے موسیو آندرے کو بھیجا تھا۔ وہ ایک مشہور وکیل ہیں۔"

"میں مسز دلاور سے کیا کہوں سر؟"

"ان سے کہو کہ وکیل نے مجھ سے پوچھا تھا اور میں نے اسے اجازت دے دی ہے۔ وہ معاملات طے کرا سکتا ہے۔ بس یہی پیغام ہے۔"

"آپ اپنا فون نمبر یا پتا لکھوائیں گے؟"

"نہیں۔ مسز دلاور جانتی ہیں کہ موسیو آندرے کہاں مل سکتے ہیں" میں نے کہا اور پھر اچانک ایک خیال کے تحت اندھیرے میں تیر چلادیا۔ "یہ چوہدری دلاور کا ڈیوس روڈ والا آفس ہے نا۔ سی ڈی انٹرپرائز۔"

لڑکی نے عادتاً یا بوکھلا کے پہلے کہا "یس۔۔۔" پھر بولی "میرا مطلب ہے آپ کو علم ہونا چاہیے کہ آپ نے کہاں فون کیا ہے؟"

میں نے کہا "میں کنفرم کررہا ہوں۔"

فون بند کرکے میں نے اپنے آپ سے کہا "وہ مارا پاپڑ والے کو" یہ بات میں اور محسن یا غالب کسی بڑی کامیابی پر ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کے کہتے تھے۔ اندھیرے میں چلایا ہوا تیر نشانے پر لگا تھا اور مجھے دلاور کے خفیہ ریڈیو فون کا سُراغ مل گیا تھا۔

پریت یا مُردوں کا مجھے کوئی ڈر نہیں۔ ایک بار آیت الکرسی پڑھ کے اور چاروں طرف پھونک مار کے دم کردوں گا تو کوئی خواب میں نہیں آسکتا" وہ ایک دم اُداس ہوگیا "ہاں وہ نیک بخت آسکتی ہے۔ میری گھر والی، بہت دن ہوگئے۔"

میں نے اسے ڈانٹا "گویا اب تم قابلِ اعتراض خواب دیکھو گے مولوی خادم حسین۔ خیر مجھے کیا، میں تمہارے اخلاق و کردار کا ذمّے دار نہیں ہوں۔"

انتہائی مضطرب اور بدحواس نظر آنے والا خادم حسین چند منٹ میں گھوڑے بیچ کے سوگیا۔ مجھے اس کے خراٹے سُنائی دیے تو حیرانی ہوئی۔ ذہنی انتشار کی ایسی کیفیت میں اتنی جلدی سکون کی نیند سوجانا میرے لیے ناممکن نہ سہی انتہائی مشکل کام تھا۔

میں نے بیڈ کے نیچے سے پُرانا وائرلیس ریڈیو فون نکالا جو عرصے تک میرے اور دلاور کے درمیان رابطے کا مؤثر اور محفوظ وسیلہ بنا ہوا تھا مگر اب بے کار پڑا تھا۔ اس کی بیٹری کمزور پڑچکی تھی۔ میں نے اسے پلگ میں لگایا تو بیٹری کی پاور بتانے والی روشنی سرخ رہی۔ اس کے سبز ہونے میں کچھ وقت درکار تھا۔ میں چھت پر گیا اور ایک ریڈیو ایریل سے ٹرانس میٹر ریسیور کا تار منسلک کردیا۔ تار کا دوسرا سرا میں نے نیچے لٹکادیا اور پھر کھڑکی سے ہاتھ بڑھا کے پکڑلیا۔ اونچے اور لمبے ایریل کے استعمال سے آواز صاف بھی ہوجاتی تھی اور اس کی RANGE بھی بڑھتی تھی۔

خادم کے کمرے میں لائٹ جل رہی تھی لیکن اسے فرق نہیں پڑرہا تھا۔ میں نے کچن میں اپنے لیے ایک کپ کافی بنائی اور باہر آتے ہوئے لائٹ بجھا کے دروازہ بند کردیا۔ بیٹری کی لائٹ ابھی تک ریڈ تھی۔ میں نے رابعہ کے کیبن میں میز کے پیچھے گھومنے والی کرسی پر بیٹھ کے کافی پی۔ آج میرا پروگرام پھر رابعہ کے ساتھ وزیر خان اسپتال کے اندر جانے کا تھا۔ اگر ہم اس کوشش میں کامیاب ہوجاتے تو ہمیں پتا چل جاتا کہ وہاں کتنے قیدی ہیں اور علاج کے نام پر ان کے ساتھ کیا ظلم ہورہا ہے۔ ان مریضوں کو رہا کرانا تو ہمارے بس کی بات نہیں تھی۔ شاید پولیس بھی قانونی طور پر ایسا نہیں کرسکتی تھی لیکن بعد میں اپنے طور پر ہم معاملات سے بخوبی نمٹ سکتے تھے۔ ابھی تو اصل مقصد یہ دیکھنا تھا کہ کیا غالب اور نازو کو بھی اسی اسپتال میں قیدی بنا کے رکھا گیا ہے۔ ان کی رہائی اور بازیابی دوسرے تمام مسائل پر فوقیت رکھتی تھی لیکن ابھی تک ہم نے ان کے لیے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ معلوم نہیں اس وقت وہ کہاں ہوں گے اور کیا سوچ رہے ہوں گے۔

اچانک بیٹری کی لائٹ گرین ہوگئی اور میں نے ریڈیو کو آن کرکے ہیڈ فون کانوں پر چڑھائے۔ ہیڈ فون سے منسلک مائیکروفون خود میرے سامنے آگیا۔ اس کی ٹیوننگ کو کسی نے بھی نہیں چھیڑا تھا۔ میرے کانوں میں ہلکی ہلکی سرسراہٹ آرہی تھی جو اس بات کی علامت تھی کہ دوسری طرف کے ریسیور کی فریکوئنسی یہی ہے اور میرا مواصلاتی رابطہ قائم ہوچکا ہے۔ ایریل اونچا نہ ہوتا تو

کے اوپر نہیں لے جاسکتا تھا اور نہ میرے لیے یہ ممکن تھا کہ میں دلاور کی نقل و حرکت کو محدود کردوں۔ میں اسے باندھ کے ڈالتا تو وہ یقیناً مرجاتا۔ دن کا وقت ہوتا اور بازار کھلے ہوتے تو میں کہیں سے زنجیر اور قفل لے آتا اور دلاور کے ایک پاؤں میں بیڑی ڈال کے دوسرا سرا دیوار میں نصب ہُک سے یا روشن دان کی سلاخ سے جوڑ دیتا پھر دلاور دو تین گز کے دائرے میں رہتا اور اس کا ہاتھ انہی چیزوں تک پہنچ پاتا جو میں اس کے قریب رکھ جاتا۔ باقی سامان اس کی دسترس سے بھی دور رہتا۔

دلاور اب نسبتاً پرسکون تھا "آخر تم نے کیا سوچا ہے۔ کیا کرنا چاہتے ہو تم۔ مجھے بھی تو بتاؤ۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر شیلی کی لاش قبر سے نکال کے اس کا پوسٹ مارٹم کیا گیا ہے۔ اس سے ثابت ہوگیا ہے کہ اسے قتل کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر شیلی کے دوستوں نے برطانیہ سے ایک وکیل بھیجا ہے۔ اس کے پاس زیادہ تفصیلات ہیں۔ وہ D.N.A ٹیسٹ سے ثابت کردے گا کہ ڈاکٹر شیلی تمہاری سوتیلی بہن تھی۔ اس کا اور تمہارا باپ ایک ہی تھا۔"

"یہ کوئی قیامت تک ثابت نہیں کرسکتا۔"

"قیامت تو بہت دور کی بات ہے۔ تختۂ دار پر تم اس حقیقت کو تسلیم کرلوگے۔ تم ایک جاہل آدمی ہو۔ شاید تمہیں معلوم نہیں کہ آج کل D.N.A ٹیسٹ سے سات پشتوں کا سُراغ لگایا جاسکتا ہے اور یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ کون کس کی اولاد تھا۔ یہ ثبوت اتنا ہی ناقابلِ تردید ہوتا ہے جتنا ریاضی کا فارمولا۔ اس کے بعد لندن سے اس عینی شاہد کو لایا جائے گا جس نے تمہیں دُہرا قتل کرتے دیکھا تھا۔ تم نے اپنے باپ کی دوسری بیوی اور اس کے تیسرے شوہر کی گرل فرینڈ کو شیلی سمجھ کے قتل کیا تھا۔ وہ عینی شاہد ایک نیگرو ہے۔ شیلی کی ماں کا تیسرا شوہر جو بے گناہ اس جرم میں جیل کاٹ رہا ہے جو تم نے کیا تھا۔"

"مجھے پھانسی ہوجائے گی تو تمہیں کیا حاصل ہوگا؟ تمہیں کبھی معلوم نہیں ہوگا کہ وزیر خان کا قاتل کون تھا اور اس کی لاش اب کہاں ہے؟"

میں نے کہا "دلاور۔ تمہاری چالاکی اب نہیں چلے گی۔ پہلے میں تم کو ٹھکانے لگادوں پھر پیڈرو سے بھی نمٹ لوں گا۔ وہ سب بتادے گا۔"

"قانون کی نظر میں تم مجرم ہی رہوگے۔"

"مجھے سامنے آنے کی ضرورت بھی نہیں۔ تمہیں پولیس گرفتار کرے گی اور تم پر عام عدالت میں مقدمہ چلے گا۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ مدعی میں نہیں، رابعہ ہے۔ اس کے ساتھ دس وکیل اور بھی ہیں۔ یہ قید خانہ ہی ایک کال کوٹھری ہے دلاور۔ تم یہاں سے نکلوگے تو جیل کی سلاخوں کے پیچھے جاؤگے اور وہاں سے اس دن نکلوگے جس دن صبح دم تمہیں پھانسی دی جائے گی۔

تمہارے خلاف میر شرافت علی کے قتل کی ایف آئی آر بھی چاندنی بیگم اور گولو پہلوان کے قتل کی بہت جلد درج ہوگی۔ تم نے وقار یوسف کے سسر کو اسپتال میں قتل کروایا تھا۔ ایسے تین چار درجن مقدمات کے گواہ اب سامنے آئیں گے۔ ثبوت اور شہادتوں کے ساتھ۔ یہ ٹھیک ہے کہ تم نے نوے جرائم ایسے کیے ہیں جن کا گواہ ہے نہ ثبوت مگر باقی دس تمہیں دس بار موت کی سزا دلوانے کے لیے کافی ہیں۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ میرے خلاف بھی مقدمات بہت ہیں اور میں ایک مفرور مجرم ہوں مگر میں ابھی تک پکڑا نہیں گیا اور نہ میں پکڑا جاؤں گا۔ میں ہمیشہ کے لیے روپوش ہوجاؤں گا۔ کیا ضرورت ہے مجھے سکندر بخت کے نام سے جینے کی۔ رابعہ کے ساتھ میں کہیں بھی رہ سکتا ہوں۔ یہاں یا باہر کے کسی ملک میں۔ میرے دوست بہت ہیں اور میرا محافظ خدا ہے۔ تمہارے سب دشمن ہیں اور تمہارا ساتھی شیطان تھا جو اب تمہارا ساتھ چھوڑ چکا ہے۔"

دلاور کی حالت غیر ہوگئی تھی۔ وہ خدا رسول کے واسطے دیتا میرے پیچھے دوڑا مگر میں نے اسے لات مار کے پیچھے گرادیا اور خود باہر نکل گیا۔ دلاور آسانی سے شکست تسلیم کرنے والا آدمی نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ آخری وقت تک مقابلہ کرے گا۔ اپنی دولت لٹاکے جان بچانے کی پوری کوشش جاری رکھے گا۔ وہ عدالت میں پیشی سے تمام امیدیں وابستہ کیے بیٹھا رہے گا۔ جب وہ بڑے سے بڑے وکیل کی خدمت حاصل کرے گا۔ رشوت سے گواہوں کو خریدنے اور ثبوت مٹانے کے لیے خزانوں کے منہ کھول دے گا۔ نیچے سے اوپر تک سب کو خریدنے کے لیے اپنی ساری دولت لٹادے گا اور آخری وقت تک اس یقین سے دستبردار نہیں ہوگا کہ نظام انصاف اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اگر سپریم کورٹ نے بھی اس کی سزائے موت بحال رکھی تو وہ صدر سے رحم کی اپیل منظور کرالے گا۔

چنانچہ میرا یہ یقین غلط نہیں تھا کہ دلاور خودکشی نہیں کرے گا خواہ میری قید میں اس پر کتنی ہی سختی کیوں نہ ہو۔

رات کے ایک بجے میں واپس آفس پہنچا تو مولوی خادم حسین سخت پریشانی کا شکار تھا۔

"کمال کرتے ہیں آپ جی۔ ایسے غائب ہوگئے بغیر کچھ بتائے؟" اس نے خفگی سے کہا۔

"تمہارا لہجہ اور تمہاری باتیں کسی شوہر پرست، وفاشعار بیوی کی طرح ہیں" میں نے کہا۔

"مجھے بہت ڈر لگ رہا تھا۔ اکیلے جی۔"

"کیوں۔ یہاں جن بھوت نظر آرہے تھے؟" میں نے کہا۔

"دراصل آج تم نے اتنے مُردے دیکھے ہیں کہ خواب میں بھی۔"

"بس بس۔ مجھے اور مت ڈرائیں۔ میں سونا چاہتا ہوں جناب۔ آپ کے انتظار میں مجبوراً جاگ رہا تھا اور جناب بھوت

اس نے بگڑ کے کہا "بھوتنی کے یہ کیا مذاق ہے۔ سالے اب شادی کرلے پھر دیکھ کیسی نیند آتی ہے۔"

"یار منظر شادی تو صبح سے پہلے نہیں ہوسکتی نا..."

"نہیں ابھی کرلے۔ جیسے مجھے جگا کے گناہ کیا ہے ایسے ہی جاکے اسے اُٹھا اور کھالے نیند کی گولی ڈاکٹری نسخے کے بغیر ہی۔ تجھے معلوم ہے میں کیا کررہا تھا؟"

"معلوم ہے۔ سب معلوم ہے" میں نے کہا "مگر میں نے خلل اس لیے ڈالا کہ ایک کام کی بات معلوم ہوئی ہے۔"

"جو اسی وقت بتانی ضروری تھی۔ ایک منٹ..."

ایک منٹ بعد منظر کی بیوی نے جو مشین گن چلائی تو میں گھبرا گیا۔ اس کی زبان چلتی تھی تو قینچی شرماتی تھی اور اس وقت وہ غصّے میں تھی۔ اس نے مجھے شارٹ ہینڈ کی رفتار سے وہ گالیاں دیں جو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

میں نے کہا "ارے بھابی۔ میں سکندر ہوں۔"

اسے شاید یہ جان کے شاک لگا "کون.... سکندر! تم مگر انہوں نے تو کہا تھا۔"

اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے منظر نے شاید ریسیور چھین لیا اور میں نے اس کے ہنسنے کی آواز سُنی "کیوں بے، کچھ مزہ آیا؟"

"یار، تُو نے کیا نام بتایا تھا میرا؟"

"سالے نام کو چھوڑ۔ یہ حقیقی جذبات تھے ایک بیوی کے۔ یہ ہوتا ہے جب غلط وقت پر کوئی ڈسٹرب کرتا ہے۔ تیرا نام بتاتا تو وہ جھوٹ اور منافقت سے کام لیتی۔"

میں نے کہا "یار، میں نے سی ڈی انٹرپرائز میں ایک جان پہچان نکال لی ہے۔ میں چاہتا ہوں وہ کام اسی وقت ہوجائے۔ میں جاؤں اور جوابی تحفہ ابھی ڈلیور کردوں۔ صبح ہونے سے پہلے اسے مل جائے گا۔"

"پھر کیا ہوگا؟"

"یار وقت بچے گا۔ وقت ہی اہم ہے۔ غالب اور نازو پر ایک ایک پل بھاری ہوگا۔ میں مسز دلاور سے بھی بات کرچکا ہوں۔ وہ اس ناچیز سے ملنے کے لیے مثلِ ماہی بے آب تڑپ رہی ہے اور آپ کا ارشادِ گرامی ہے کہ وہ مجھ پر فریفتہ ہوچکی ہے۔ میں اس پر لٹو ہوں۔ نہار منہ ہماری ملاقات ہوسکتی ہے۔ مجھے ایک لاکھ روپے مل جائیں تو میں اپنا گھر ایسی جگہ بنالوں کہ بقول شاعر۔ جیتے بندہ نہ بندے دی ذات ہووے۔ مثلاً کے ٹو پر اور کل ہی رابعہ کے ساتھ۔"

"یار، میری طرف سے تو جہنم میں جا لیکن رابعہ کے ساتھ۔"

"سی ڈی انٹرپرائز تو مجھے اکیلا ہی جانا پڑے گا۔ رابعہ تو اُٹھے گی نہیں، اسے اُٹھانا پڑے گا۔ اچھی خاصی وزن دار چیز ہے وہ۔ یہ فلمی ہیرو پتا نہیں کیسے اُٹھاتے پھرتے ہیں ہیوی ویٹ ہیروئنوں کو۔ وہ چیز کہاں ہے؟"

"میری گاڑی میں۔" منظر کی آواز رونے والی ہوگئی "خدا کے لیے مجھے پھر مت اُٹھانا۔ مجھے صبح کورٹ بھی جانا ہے۔ پیشی بھی بھگتنی اور دلائل بھی دینے ہیں۔ سوتا رہ گیا تو ہوجائے گی میرے مؤکل کو پھانسی۔ چابی ہوگی گاڑی میں۔ خاموشی سے چوروں کی طرح گاڑی لے جانا اور واپس بھی چھوڑ جانا۔ اگر زندہ سلامت لوٹنے کا ارادہ ہوتو۔"

میں نے کہا "تھینک یو منظر صاحب۔ یور آر گریٹ۔ اب آپ اپنی اننگ پھر شروع کرسکتے ہیں۔ آپ بیٹنگ کررہے تھے یا باؤلنگ۔ آپ کے والد ماجد بھی ویسے تو سیدھا پکڑنا نہیں جانتے تھے۔ نہ بیٹ کو' نہ بال کو۔"

اس کی جوابی گالیوں سے میں بہت محظوظ ہوا اور فون ریسیور پر رکھ کے کھڑا ہوگیا۔ آفس کو لاک کرکے میں نیچے گیا اور مین گیٹ کھول کے باہر آگیا۔ رات کے دو بجے مال پر بڑا سکون اور سکوت تھا۔ ہوا میں بڑی فرحت بخش خنکی اور تازگی تھی۔ میں فٹ پاتھ پر چلتا گیا اور پیچھے دیکھتا گیا۔ اِکاّ دُکاّ کاریں اس وقت بھی آجارہی تھیں۔ نیت نیک ہو تو وسائل بھی پیدا ہوجاتے ہیں۔ ایک شریف آدمی نے مجھے لفٹ دی اور میری جھوٹ پر مبنی دردناک کہانی سے اتنا جذباتی ہوا کہ مجھے منظر کے گیٹ پر ڈراپ کرکے واپس گیا۔ میں نے اسے بتایا تھا کہ میرے ہونے والے سسر فوت ہونے والے ہیں اور انہوں نے فرشتۂ اجل سے بس اتنی مہلت لی ہے کہ آخری سانس آنے سے پہلے اپنی چاند سی بنو کو شرع کے مطابق میرے حوالے کرجائیں۔"

میں گیٹ پھاند کے اندر گیا اور منظر کی گاڑی کا دروازہ کھول کے دیکھا تو چابیاں واقعی موجود تھیں۔ میں نے خاموشی سے گیٹ کھولا اور گاڑی کو دھکیل کر پورچ سے باہر لے گیا۔ ڈھلوان سطح پر یہ کوئی مشکل کام ثابت نہیں ہوا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز پر منظر کی بیوی اُٹھ بیٹھے اور میں چوروں کی طرح پکڑا جاؤں تو سزا کے طور پر اس کا لیکچر ساٹھ الفاظ فی منٹ کی رفتار سے سُنوں۔

میری تحریر کے ساتھ مسز دلاور کے نام تحفہ ڈیش بورڈ پر ہی رکھا ہوا تھا۔ منظر نے اسے ٹشو پیپر میں پیک کرکے اوپر وہ کاغذ لپیٹ دیا تھا جس پر میں نے پیغام لکھا تھا اور اوپر ربر کا چھلاّ چڑھادیا تھا۔

ڈیوس روڈ تک میں نے منظر کی نئی کورونا کی کارکردگی کو آزمایا۔ اس وقت ہر سڑک خالی تھی۔ سو میل کی رفتار پر گاڑی قابو سے باہر ہونے لگی۔ قصور نہ گاڑی کا تھا اور نہ ڈرائیور کی نااہلی کا۔ لندن اور پیرس کی سڑکوں پر میں نے اس سے زیادہ تیز رفتاری کا مظاہرہ کیا تھا۔ فاسٹ لین میں وہاں کم سے کم رفتار کی حد نوّے میل تھی اور دوبار میرا چالان ایک سو بیس میل کی رفتار سے گاڑی چلانے پر ہوا تھا میرا خیال تھا کہ میں حد میں ہوں مگر میری نگاہ اسپیڈو میٹر پر نہیں تھی اور لندن میں پولیس مین کو غلط کوئی نہیں کہتا۔ وہ خود بھی غلط نہیں کہتے۔ سڑکوں کے کنارے نصب راڈار سب بتادیتے ہیں۔

لاہور کی سڑک پر اتنی میل بھی بہت تھے۔ گاڑی کا حوصلہ اس سے کہیں زیادہ تھا مگر میں کسی گڑھے یا اسپیڈ بریکر پر اس کے شاک ابزربر توڑنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا اور نہ اپنی ہڈیاں تڑوانے کا۔ میری برق رفتاری کو ایک پولیس پارٹی نے رسمًا سیٹی بجا کے چیک کیا لیکن اپنی قدیم اور از کار رفتہ گاڑی میں میرے پیچھے دوڑنے اور ریس ہارنے کی شرمندگی اُٹھانے سے گریز کیا۔

ڈیوس روڈ پر پہنچ کے میں نے گاڑی کو گھوڑے کی طرح تھپکی دے کے کہا "شاباش" اور گاڑی دلکی چلنے لگی۔ آہستہ آہستہ ایک طرف کی سب عمارتوں کو غور سے دیکھتے ہوئے میں نے پوری سڑک عبور کی۔ میری نظر نے ہر سائن بورڈ کو پڑھا جو کسی دُکان یا بلڈنگ پر آویزاں تھا یا سڑک کے کنارے دو ٹانگوں پر نصب تھا پھر میں نے گاڑی کو یوٹرن دیا اور دوسری طرف دیکھتا گیا۔ سی ڈی ای کے حروف پر نظر پڑتے ہی میرے پاؤں خود بخود حرکت میں آگئے۔ ایک نے کلچ دبایا اور دوسرے نے بریک۔

بورڈ ایک سائڈ روڈ کی دیوار پر لگا ہوا تھا اور تیر کا نشان یہ ظاہر کرتا تھا کہ آفس اندر کسی عمارت میں ہے۔ میں نے گاڑی وہیں روک دی اور پیکٹ ہاتھ میں اُٹھا کے باقی راستہ پیدل طے کیا۔ اس بغلی گلی میں ہونے کی وجہ سے منظر کے ساتھ مجھے یہ بورڈ نظر نہیں آیا تھا۔ گلی میں رہائشی کوٹھیاں تھیں جن کے باہر گیٹ لائٹس جل رہی تھیں اور ہر گیٹ پر کوٹھی کا نمبر نہیں تھا لیکن نام کی تختی موجود تھی۔

چوتھی کوٹھی کے باہر مجھے سی ڈی انٹر پرائز لکھا ہوا نظر آیا۔ یہ بھی عام سائز کی نیم پلیٹ ہی تھی جسے دور سے کوئی بھی آفس کا بورڈ نہیں سمجھ سکتا تھا مگر جاننے والے جانتے ہوں گے کہ انہیں کہاں جانا ہے اور وہ کسی سے کچھ پوچھے بغیر پہنچ جاتے ہوں گے۔

گیٹ پر کوئی بھی نہیں تھا لیکن کال بیل بجانے پر ایک درمیانی عمر کا نیم خوابیدہ شخص نمودار ہوا اور اس نے گیٹ کے اوپر سے مجھے دیکھنے کے بعد باہر آنے کے لیے چھوٹا گیٹ استعمال کیا جو بڑے گیٹ ہی کا حصّہ تھا۔

"کیا بات ہے؟" اس نے بالکل اسی لہجے میں پوچھا جیسے وہ سوال کرتا تھا کہ "تم کون ہو؟" اور جواب میں "تمہارا باپ" سُن کے بُرا نہیں مانتا تھا۔ میں نے آواز کے چرسی پن سے اسے پہچان لیا۔

"اچھا تو اب تم چوکیداری کررہے ہو؟" میں نے پُرانے بے تکلف دوستوں کی طرح پوچھا۔

وہ چونکا "کیا مطلب ہے اس بات کا؟"

میں نے کہا "پہلے تم فون ریسیو کرتے تھے۔ خیر' یہ لو۔"

"یہ کیا ہے؟" اس نے غور سے پیکٹ کو دیکھا۔

"کوئی حسینہ ہے یہاں۔ یہ اسی کے لیے ہے" میں نے کہا۔

"مگر کیا ہے اور کس نے بھیجا ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ رانا صاحب کی بات ہوئی تھی ابھی حسینہ سے۔ وہی جو ٹیلی فون آپریٹر ہے۔ اسے معلوم ہوگا۔"

اس نے کچھ تذبذب کا مظاہرہ کیا مگر شاید اس نتیجے پر پہنچا کہ اتنے حوالوں کے بعد میری بات پر یقین کیا جاسکتا ہے۔ اس نے پیکٹ لے کر کہا "میں دے کر آتا ہوں' تم یہیں ٹھہرو۔"

"فکر مت کرو۔ میں اندر نہیں آؤں گا" میں نے کہا۔

اس نے گیٹ کو احتیاط سے بند کیا اور مجھے گھورتا ہوا اندر

چلا گیا۔ میں نے سرپٹ دوڑ لگائی اور سڑک پر کھڑی ہوئی کار میں بیٹھ گیا۔ گاڑی کے روانہ ہونے تک کوئی بھی گیٹ سے باہر نہیں آیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ حسینہ نے تحفہ کھول کے ضرور دیکھا ہوگا اور شاید فوراً بے ہوش ہوگئی ہوگی۔ میں کچھ قریب ہوتا تو شاید رات کی خاموشی میں اس کی چیخ بھی سُن لیتا۔

حسینہ کی بے ہوشی کے بعد یقینًا سابق ٹیلی فون آپریٹر اور موجودہ چوکیدار نے بھی تحفہ ملاحظہ کیا ہوگا اور میری تحریر پڑھنے کے بعد مالکن کو مطلع کیا ہوگا کہ بیگم صاحبہ' مالک کی پہلی قسط آئی ہے۔ اب انشاء اللہ تھوڑا تھوڑا کرکے آپ کا باقی سہاگ بھی موصول ہوجائے گا۔

ابھی صرف تین بجے تھے۔ ایک گھنٹے میں سارا کام اطمینان بخش طریقے پر ہوگیا تھا اور اب میں بجا طور پر مسز دلاور کے ہسٹریائی ردِعمل کی توقع کرسکتا تھا۔ شام کو نازو کی تحریر کے ساتھ ہم نے ایک تحفہ وصول کرنے کا صدمہ برداشت کیا تھا۔ چند گھنٹے ہی گزرے تھے کہ ہماری طرف سے مؤثر طریقے پر جواب ارسال کردیا گیا۔ دلاور کی بیوی کو معلوم ہوجائے گا کہ کسی نے لندن سے بات کی تھی اور کہا تھا کہ اب فرنچ وکیل کو معاملات طے کرنے کے اختیار دے دیے گئے ہیں۔ یہ بات صرف وہ جانتی تھی یا اس کے ساتھ آنے والے مترجم کو معلوم تھی کہ اس نے فرنچ وکیل کے ذریعے سکندر سے مذاکرات کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ فرنچ وکیل کسی کا نمائندہ تھا۔ پہلے تو اس نے صاف انکار کردیا تھا اور کسی قیمت پر اپنا ضمیر بیچنے کے لیے تیار نہیں تھا مگر گھر آئی لکشمی کو بھلا کون ٹھکراتا ہے۔ اس نے بھی لندن فون کرکے اپنے مؤکل سے پوچھا کہ معاملہ ایک لاکھ کا ہے اور اجازت حاصل کرلی۔ مؤکل نے کہا ہوگا کہ اچھا کراسکتے ہو تو بات کرادو۔ بات کرانے میں ہمارا کیا نقصان ہے۔

ٹیلی فون آپریٹر حسینہ اسے پہلے ہی مطلع کرچکی تھی کہ لندن سے کسی کا فون آیا تھا۔ فون وصول کرنے والے کو کہاں پتا چلتا تھا کہ کال کوئی ساتھ والے گھر سے کررہا ہے یا لندن سے۔ اب میری تحریر دیکھ کے اس کے لیے شک کی گنجائش ہی نہیں رہے گی۔ رابعہ اور وہ فرنچ وکیل یقینًا جانتے ہیں کہ سکندر کہاں روپوش ہے۔ ان کا سکندر سے مسلسل رابطہ ہے اور سکندر آرام سے نہیں بیٹھا ہوا ہے۔ تازہ ترین کارروائی یہ ثابت کرتی ہے کہ چوہدری دلاور کو اسی نے کہیں قید کررکھا ہے اور خود وہیں دن رات پہرے داری کررہا ہے۔ رابعہ یا اس فرنچ وکیل سے زبردستی کچھ معلوم نہیں کیا جاسکتا۔ سارے معاملات تو سکندر کے ہاتھ میں ہیں اور اس تک رسائی ہی اصل کام ہے۔

منظر کی گاڑی واپس چھوڑنے سے پہلے میں نے رابعہ کا حال معلوم کرلینا بہتر سمجھا اور کار کو اسی طوفانی رفتار سے دوڑاتا ہوا وقار یوسف کے گھر جاپہنچا۔ یہ بھی اچھا ہی ہوا کیونکہ رابعہ پر خلافِ توقع انجکشن کا اثر صبح تک نہیں رہا تھا۔ وہ جاگ گئی تھی اور اب خاموشی سے آنسو بہارہی تھی۔ وقار یوسف اور نگی اس کو سمجھا کے تسلی دینے میں ناکام ہوچکے تھے اور دوبارہ ڈاکٹر کو بُلانے کا سوچ رہے تھے کہ وہ ایک اور انجکشن لگا جائے۔

مجھے دیکھ کے وقار یوسف حیران بھی ہوا "آپ اس وقت۔ مگر شاید اسی کو جذبۂ دل کی تاثیر اور عشق کی بے اختیاری کہتے ہیں۔"

"بجا ارشاد' اس تجربے سے آپ بھی گزرے تو ہوں گے پھر حیرانی کی کیا بات ہے۔ میں صرف یہ پوچھنے آیا تھا کہ....."

"یہاں مت پوچھیں۔ خود جاکے دیکھ لیں اور سنبھالیں اپنے مریض کو" وقار یوسف مسکرایا۔

میں نیچے اُتر آیا "تم جاگ رہے تھے؟"

"ہم باری باری جاگ رہے تھے۔ میرے سونے کی باری آئی تو رابعہ باجی جاگ گئیں اور اب وہ روئے چلی جارہی ہیں۔"

مجھے دیکھتے ہی رابعہ اُٹھ کے بیٹھ گئی اور پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ "سکندر۔ وہ قتل کردیں گے نازو کو۔ ان سے بات کرلو' چھوڑ دو دلاور کو۔"

میں نے اس کا سر اپنے کندھے پر رکھ لیا۔ "انہیں کچھ نہیں ہوگا۔"

اس نے ایک جھٹکے سے سر اُٹھایا "اور ہونے کو کیا باقی رہ گیا ہے۔ تم اتنے سنگ دل اور خود غرض ہو۔ کیا تم چاہتے ہو..."

میں نے کہا "پاگل مت بنو۔ تم غلط سمجھ رہی ہو۔"

"کیا غلط سمجھ رہی ہوں۔ جو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔"

"تم نے غلط دیکھا تھا۔ میں جھوٹ نہیں بول سکتا تم سے۔ نازو بالکل ٹھیک ہے اور دھمکی دینے والے اس کا بال بیکا نہیں کرسکتے۔ نہ وہ ہمیں بے وقوف بناسکتے ہیں۔"

"سکندر۔ خدا کے لیے ایسی باتیں مت کرو۔ میں کوئی دودھ پیتی بچی نہیں ہوں جسے تم باتوں سے بہلادو..."

میں نے کہا "جذبات کی پٹی ہو آنکھوں پر۔ عقل پر جذبات حاوی ہوں اور اعصاب جواب دے چکے ہوں تو یہی ہوتا ہے۔ اب تمہیں مجھ پر بھی اعتبار نہیں۔ ہمت ہے تو آؤ میرے ساتھ چلو۔"

"مگر کہاں؟"

"میں تمہیں بتاتا ہوں کہ حقیقت کیا ہے؟ اُٹھو۔"

وقار یوسف نے پریشانی سے مجھے دیکھا "میرے خیال میں ان کا اُٹھنا ٹھیک نہیں ہے۔"

میں نے کہا "رابعہ سے پوچھ لو۔ یہ چل سکتی ہیں۔"

"میں ٹھیک ہوں" رابعہ کھڑی ہوگئی۔

میں نے اس کا ہاتھ پکڑلیا اور اسے باہر لے آیا۔ وہ بار بار پوچھتی رہی "سکندر۔ مجھے بتاؤ' ہم کہاں جارہے ہیں؟"

میں نے پورچ میں کھڑی ہوئی گاڑی کا دروازہ کھولا اور خود بیٹھ

کے ساتھ والا دروازہ رابعہ کے لیے کھول دیا۔ وقار یوسف اور نگی برآمدے میں پریشان کھڑے تھے۔ میں نے انہیں ہاتھ کے اشارے سے اندر جانے کو کہا مگر وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلے۔

رابعہ نے وحشت زدہ نظروں سے گلوز کمپارٹمنٹ کو دیکھا۔ اس کا ایک ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ اس کے ارتعاش سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ خوف سے کانپ رہی ہے۔ اس کا جسم ٹھنڈا پڑ رہا تھا۔

میں نے کہا "رابعہ۔ انہوں نے بے وقوف بنانے کی کوشش کی تھی۔ وہ تحریر یقیناً نازو کی تھی مگر...... مگر انگلی نازو کی نہیں تھی۔"

"جھوٹ..... بالکل جھوٹ ہے یہ۔ میں نے دیکھا تھا۔"

"اچھا پھر دیکھو" میں نے وہ پیکٹ کھول کے اسے تھمادیا "ڈرو نہیں۔ ڈیش بورڈ کے اوپر والی لائٹ جلالو اور غور سے دیکھ کے بتاؤ۔ یہ انگلی زنانہ ہے کہ مردانہ۔ کیا نازو کی انگلیوں پر اتنے سیاہ موٹے بال ہوسکتے ہیں؟"

رابعہ کی آنکھوں میں ذرا سی دیر کے لیے بے یقینی کے سائے اُبھرے پھر اسے میری سنجیدگی نے قائل کرلیا اور اس نے ہاتھ بڑھا کے ونڈ اسکرین کے اوپر والے حصے میں بیک ویو مرر کے ساتھ لگی ہوئی لائٹ جلادی۔

"سکندر۔ تم مجھے مطمئن کرنے کے لیے حقیقت پر کوئی پردہ تو نہیں ڈال رہے ہو؟"

میں نے کہا "لاحول ولا قوۃ۔ کیا ہوگیا ہے آخر تمہاری عقل کو۔ حقیقت جو تمہاری نظر کے سامنے ہے۔ پردہ ڈالنے سے بدل سکتی ہے؟ یہ جو چاند نکلا ہوا ہے آسمان میں۔ کیا میں اسے سورج ثابت کرسکتا ہوں؟ یہ کہوں کہ برآمدے میں وقار یوسف نہیں غالب کھڑا ہوا ہے تو کیا تم مانوگی؟ لاؤ مجھے دو یہ ڈبا' میں دکھاتا ہوں تمہیں۔"

بڑی بے خوفی سے میں نے وہ انگلی یوں اُٹھالی جیسے وہ کسی انسان کے ہاتھ کا حصہ نہیں مرغی کی ٹانگ ہے جسے کاٹتے' بھونتے اور کھاتے وقت کوئی نہ جذباتی ہوتا ہے نہ دکھی "یہ کیا ہے۔ دیکھو' روشنی میں دیکھو۔ لو خود پکڑو اسے اپنے ہاتھ میں۔ کچھ نہیں ہوگا تمہیں۔ پتا نہیں کس بدبخت کے ہاتھ کی انگلی ہے یہ۔ بے جان انگلی تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔"

رابعہ نے نگاہ انگلی پر رکھی مگر خود اسے چھونے کی ہمت نہیں کی "میں... میں دیکھ رہی ہوں۔ دور ہٹاؤ اسے۔ دیکھ تو رہی ہوں میں۔"

"کیا دیکھ رہی ہو...؟ مجھے بتاؤ یہ انگلی نازو کی ہوسکتی ہے؟"

رابعہ کی آنکھوں میں اُلجھن کے آثار تھے۔ اس نے نفی میں سرہلایا۔

"تمہیں بہت جلدی تھی چیخ مار کے بے ہوش ہونے کی...؟"

رابعہ نے کہا "مجھے یقین نہیں آتا۔ یہ وہی انگلی ہے؟"

"نہیں' میں نے اپنی انگلی کاٹ کے رکھ دی ہے اس کی جگہ۔" میں نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کے کہا "گن لو پوری دس انگلیاں ہیں۔ وقار یوسف کی انگلیاں بھی گن لینا۔ تمہارے دماغ پر اتنا اثر تھا نازو کی تحریر کا کہ تم نے اچھی طرح دیکھا بھی نہیں تھا اور گاڑی میں نظر بھی کیا آتا۔ وہ تو میں نے بعد میں روشنی میں جائزہ لیا تو صاف پتا چل گیا کہ یہ ہمیں وحشت زدہ کرنے کی احمقانہ کوشش تھی۔ انہوں نے نازو کو بھی ڈرایا ہوگا اور ممکن ہے پورا ڈرایا ہو مگر ان میں ہمت نہیں تھی اتنی کہ اپنی دھمکی پر عمل کرتے۔ انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ دلاور ہمارے قبضے میں ہے۔ نازو اور غالب سے یہی معلوم کرنا چاہتے ہوں گے وہ کہ دلاور کو کہاں قید میں رکھا گیا ہے۔ یا پوچھا ہوگا کہ سکندر کہاں چھپا ہوا ہے۔ غالب اور نازو بھی اتنے کچے نہیں ہیں کہ جیتے جی کوئی ان سے کچھ معلوم کرسکے۔ وہ انہیں کوئی نقصان اس لیے نہیں پہنچا سکتے کہ انہیں دلاور کی اتنی ہی فکر ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ ان کی حماقت کا خمیازہ دلاور بھگتے گا۔ انہوں نے ہمیں چکر دیا تھا۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ تم نے سوچنے سمجھنے کی زحمت ہی نہیں کی۔"

رابعہ پر آہستہ آہستہ میری بات کا خوش گوار اثر ہوا تھا اور وہ قائل ہونے لگی تھی۔ اس کے چہرے پر پریشانی دکھ اور خوف کی جگہ کچھ اطمینان کے اثرات نظر آرہے تھے۔

میں نے اتنی تقریر کو کافی جانا "آؤ۔ اب اندر چلیں۔ تمہیں مجھ پر اعتبار آگیا ہوگا اب تو۔ اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد۔"

اس نے آہستہ سے اقرار میں سرہلایا۔ رابعہ کا ذہن اتنی دور کیسے جاسکتا تھا کہ وہ میری اور منظر کی سازش کو سمجھ سکتی اور یہ اندازہ کرلیتی کہ ہم نے کیا چکر چلایا ہے۔ اس کے خیال میں تو میں کہیں گیا ہی نہیں تھا سوائے اپنے آفس کے جہاں ہر رات میں چوکیدار بن کے گزارتا تھا۔

"آئی ایم سوری سکندر۔" رابعہ نے بے خیالی میں میرے سینے پر سر رکھ دیا "میں.... پتا نہیں کیا ہوگیا ہے مجھے۔"

وقار یوسف اور اس کی بیوی فوراً اندر غائب ہوگئے تھے۔ میں نے اس کے گرد بازوؤں کا حصار قائم کرکے اس کے بالوں پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔ "حکما کے نزدیک یہ وہی مرض ہے جو چھپائے نہیں چھپتا۔ یہ عشق کا وائرس بہت پُرانا ہے اور اس سے دل و دماغ اور اعصاب متاثر ہوتے ہیں۔"

وہ مسکرائی "میں تو اکتا گئی ہوں اب اس لیلیٰ مجنوں کے فضول کھیل سے۔"

"پھر اب کیا کریں۔ شیریں فرہاد' ہیر رانجھا بن جائیں اور تم محبت کو فضول کھیل کہتی ہو؟ محبت تو وہ عظیم جذبہ ہے...."

"کیا محبت محبت۔ سب نے اپنے گھر بسا لیے ہیں۔ ایک ہم ہی بے گھر ہیں۔ گھر ہونے کے باوجود۔"

"غالب اور نازو کا گھر کہاں ہے۔ پتا لکھوا دو مجھے۔"

نیند لیتا ہوں مگر دیکھو تم ضرور سوجانا ورنہ میں بھی جاگتا رہوں گا ادھر۔"

"ڈراما مت کرو۔"

"یہ ٹیلی پیتھی ہے۔ اس کا تعلق جذبات سے ہے اور دل کی ڈائریکٹ ٹیلی فون لائن سے ہے" میں نے اسے چوما۔ وہ اندر چلی گئی۔

میں نے منظر کے گھر میں گاڑی کھڑی کی تو صبح کی اذان ہورہی تھی۔ گیٹ بند کرکے میں باہر کودا اور واپس چل پڑا۔ رات بھر میں نے بہت سے جھوٹ بولے تھے۔ رابعہ پر ایک جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کے لیے میں نے اور منظر نے بڑا لمبا چکر چلایا تھا جس کا علم خدا کے علاوہ صرف مولوی خادم حسین کو تھا۔ اس جھوٹ کو نبھانے کے لیے مجھے مُردہ خانے میں بہت سے جھوٹ بولنے پڑے تھے۔ پھر میں نے دلاور کی بیوی سے جھوٹ بولا تھا۔ حسینہ نام کی ایک ٹیلی فون آپریٹر سے جھوٹ بولا تھا۔ سی ڈی انٹرپرائز کے چوکیدار سے جھوٹ بولا تھا۔ جھوٹ بولے بغیر منظر کی بیوی سے جھوٹ بولا تھا۔ اسے خاک پتا نہیں چلے گا کہ رات کو میں نے کیوں فون کیا تھا اور میں چوروں کی طرح گھر میں گھس کے گاڑی لے گیا تھا اور پھر واپس لاکے کھڑی کرگیا تھا۔

حساب کرنا مشکل تھا کہ ہر روز میں کتنے جھوٹ بولتا تھا۔ میں دُہری بلکہ تہری زندگی گزار رہا تھا۔ فرنچ وکیل' چوکیدار اور سکندر بخت کے تین کردار نبھا رہا تھا مگر میں مجبور تھا۔ دنیا نے جیسے سازش کرلی تھی کہ "حق کا بول بالا اور جھوٹ کا منہ کالا" اس محاورے کو غلط ثابت کردے۔ کالا منہ استاد پیڈرو کا تھا مگر وہ قانون کی نظر میں نہ مجرم تھا' نہ قصوروار اور آزادانہ گھوم رہا تھا۔ میں حق گوئی و بے باکی کے جرم کی سزا پارہا تھا۔ خیر' ایسا ہمیشہ نہیں ہوتا۔ خدا ظالم کی رسّی کچھ دراز کرے تو اسے فرعونیت کا بخار چڑھ جاتا ہے۔ اس کے نیک بندوں کی آزمائش ہوتی ہے۔ بالآخر صراطِ مستقیم پر استقامت سے چلنے والے کامران نہ ہوتے تو اس دنیا میں رحمان کی نہیں شیطان کی پرستش کرنے والے حکمران ہوتے۔ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ دنیا میں آج بھی نیکی اور نیکی کرنے والے اور نیکی کو برحق سمجھنے والوں کا غلبہ ہے۔ ہمیشہ رہا ہے اور رہے گا۔ دو ایٹم بم پھینک کے پچاس سال سے امریکا مردود و مطعون ہے بالکل اسی طرح جیسے ایک حسینؓ کو شہید کرکے چودہ سو سال سے یزید ملعون ہے۔ طاقتور تو سقراط کو زہر کا پیالہ پینے پر مجبور کرنے والا بھی تھا مگر وہ حق پر نہیں تھا۔ تاریخ میں یہی لکھا گیا۔

یہ بڑے حوصلہ افزا خیالات تھے اور شاید یہ ایک رات کی محنت کا ثمر تھا کہ میں کامیابی کی منزل کے اور قریب ہوگیا تھا۔ زیادہ پُرامید تھا اور آنے والے دن سے بہتری کی توقعات رکھتا تھا۔

علی الصبح بیدار ہوکے خدا کے حضور ادائے فرض کے لیے پیش ہونے والے مسجدوں کا رُخ کررہے تھے۔ ایک بار پھر دل نے مجبور کیا تو میرے قدم بھی بے اختیار ادھر اٹھ گئے۔ اس نماز کا لطف تھا کچھ اور تھا جس میں ارادے سے زیادہ جذبے کو دخل تھا۔

"وہ بھی ہماری وجہ سے خوار ہیں۔ ختم کرو اسے سکندر۔ دلاور کو پولیس کے حوالے کرو۔ قانون خود نمٹ لے گا اس سے۔"

"نادان لڑکی! کیا اس سے سارے مسائل حل ہوجائیں گے؟ وہ اکیلا نہیں ہے۔ آج بھی سب کچھ اس کے پاس ہے۔ قانون کو وہ کیا سمجھتا ہے۔ قانون اگر اتنا بااختیار ہوتا تو خرابی کا ایک خودرو پودا بُرائی کا اتنا بڑا درخت کبھی نہ بن پاتا مگر تم فکر مت کرو۔ میں اس درخت کو جڑ سے اکھاڑ کے چھوڑوں گا۔ اس کے بعد ہی ہم محفوظ ہوں گے ورنہ تم سے بہتر کون جانتا ہے کہ قانون نے تو ہمیں کوئی تحفظ فراہم نہیں کیا تھا۔ اُلٹا ہمیں مجرم بنادیا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ آج بھی ہم مجرم ہیں۔ میں روپوش رہنے پر کیوں مجبور ہوں۔ کیا مجھے انصاف مل جائے گا اگر میں روپوشی ختم کرکے خود کو قانون کے حوالے کردوں؟ نہیں رابعہ' دلاور کل سنپولیا تھا' آج سانپ ہے تو کل اژدہا بن جائے گا اگر ہم نے اس کا سر کچلنے سے پہلے سمجھ لیا کہ اب کوئی خطرہ نہیں رہا۔ آج وہ بے بس ہے مگر کل وہ قانون سے ہر ضمانت حاصل کرلے گا اور پھر اتنی طاقت حاصل کرلے گا کہ خود قانون اس کے سامنے بے بس ہوجائے گا۔"

"یہ سب مجھے کیوں بتا رہے ہو۔ میں روز تماشا دیکھتی ہوں انصاف کرنے والوں کی بے بسی کا۔"

"اچھا اب سکون سے سوجاؤ۔ اپنے اس نازک سے دماغ پر اتنا بوجھ مت ڈالو فی الحال۔ خدا نے چاہا تو کل نازو اور غالب ہمارے ساتھ ہوں گے۔"

وہ خوش ہوگئی "اچھا۔ وہ کیسے؟"

میں نے کہا "دلاور کی بیوی نے خود رابطہ کیا تھا مجھ سے۔ یعنی فرنچ وکیل سے۔ کہ سکندر سے بات کرادو۔ ایک لاکھ رشوت بھی دے رہی تھی۔"

وہ ہنسی "اسے رشوت کیوں کہتے ہو۔ بات کرادو۔"

"ہاں ہاں۔ بات کرادیں گے۔ پہلے ایک لاکھ تو وصول ہوں اور کوئی اُمید افزا بات ہو۔ یہ پتا چل جائے کہ وہ غالب اور نازو کو رہا کراسکتی ہے یا اس معاملے میں بے اختیار ہے۔ اسے کچھ معلوم ہی نہیں۔ یہ بدمعاشی ہے پیڈرو کی اور وہ دلاور کی بیوی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ پیڈرو کی باس ہے۔ پیڈرو ہمیشہ ڈبل گیم کھیلتا ہے۔ ایک طرف دلاور کے جاں نثاروں میں شامل ہے اور اسے دلاور کا پورا اعتماد حاصل ہے مگر وہ دلاور کی جڑیں کاٹنے کی سازشوں میں بھی بالواسطہ طور پر شریک رہتا ہے تاکہ خود نمبرون ہوجائے۔ کبھی وہ دلاور سے مل کے ہمیں بے وقوف بناتا ہے تو کبھی سچ مچ ہم سے مل کے دلاور کو بے وقوف ثابت کردیتا ہے جو ایسے شخص پر اتنا اعتبار کرتا ہے۔"

"تم رات بھر سوئے نہیں؟"

"سونے کی کوشش ضرور کرتا رہا۔ نیند نہیں آئی تو منظر سے گاڑی لے کے ادھر آگیا۔ خادم حسین سو رہا ہے آفس میں۔ اب مجھے بھی اطمینان ہوگیا ہے تمہاری طرف سے تو جاکے دو چار گھنٹے کی

خشوع و خضوع کی کیفیت از خود طاری ہوتی تھی۔ بے غرض، بے خوف اظہار بندگی اور اپنی عبودیت کا اقرار کرتے ہوئے مجھے کوئی شرمندگی محسوس ہوتی تھی تو وہ ایسی ہی تھی جیسے گھر میں کوئی نالائق بچہ یہ جانتا ہو کہ وہ نالائق ہے مگر پھر بھی سمجھتا ہو کہ سب کی طرح ماں باپ اس سے کم پیار نہیں کرتے۔

اخبار والے اور دودھ والے اب سڑکوں پر نکل آئے تھے مگر مجھے ایک رکشا مل گیا جس نے دگنا کرایہ وصول کرکے مجھے رابعہ کے آفس پہنچادیا۔

"کم سے کم یونہی تو ٹھیک کیا کرو" میں نے اسے شرمندہ کرنے کی کوشش کی "صحیح کرایہ تو آدھا بھی نہیں ہوتا۔"

"یونہی غلط کرتا تو سارا دن ایسے ہی گزرتا جی" اس نے خود کو صحیح ثابت کرتے ہوئے مجھے شرمندہ کردیا "سب آدھا کرایہ دیتے۔"

مولوی خادم حسین سویا پڑا تھا مگر آہٹ پر اٹھ بیٹھا "کیا بات ہے جی۔ کہاں سے آرہے ہیں آپ؟"

میں نے لائٹ جلا کے کہا "کیا بتاؤں خادم حسین۔ رات بھر میں قدموں کی چاپ سنتا رہا۔ دروازے کھل رہے تھے اور بند ہورہے تھے۔ پتا نہیں کون لوگ آجارہے تھے۔ کبھی یوں لگتا تھا جیسے کوئی کرسی کھینچ کے بیٹھا ہے۔ فائل کیبنٹ کھولی ہے کسی نے۔ کوئی فون کررہا ہے۔ ڈائل گھومنے کی آواز صاف سنائی دیتی تھی۔ باہر جاؤ تو کچھ نہیں۔ میرا خیال ہے یہ انہی کی روحیں تھیں جن کے اعضا کو ہم نے دیکھا تھا۔ جیسے لوگ قصائی کی دکان پر بکرے کی ران اور گردن یا سینہ دیکھتے ہیں۔"

خادم حسین بلند آواز میں آیت الکرسی پڑھنے لگا۔ اس کا رنگ فق ہوگیا تھا۔ صبح صبح ایک اور جھوٹ بلاوجہ۔ میں نے شرمندگی سے سوچا۔

"معاف کرنا خادم حسین۔ یہ سب مذاق کی بات تھی۔ میں ذرا باہر گیا تھا۔ منظر صاحب کے گھر اور پھر وہاں سے رابعہ کے پاس۔ نیند نہیں آرہی تھی۔"

وہ تشویش میں مبتلا ہوگیا "یہ آثار ٹھیک نہیں ہیں جی۔ میرے ایک چچا تھے وہ بھی رات بھر بھٹکتے پھرتے تھے۔ پاگل خانے میں فوت ہوئے۔"

"مگر میں تمہارا چچا نہیں ہوں۔ اب میں سو رہا ہوں۔ صبح دس بجے سے پہلے کوئی بھی آئے، کوئی بھی فون کرے۔ اگر تم نے مجھے جگایا تو تمہارا انجام وہی ہوگا جو سوئے شیر سے پنگا لینے کا ہوتا ہے۔"

"ایک وظیفہ ہے جی آپ کے لیے میرے پاس۔"

"اچھا میرے سرہانے بیٹھ کے کرو" میں نے آنکھیں بند کرلیں "مگر دیکھو وظیفہ الٹا نہ ہوجائے۔ تم پہنچ جاؤ پاگل خانے اپنے چچا کی طرح۔ کیا چچی نے عقد ثانی کرلیا تھا بعد میں۔ چچا کو پاگل خانے پہنچا کے۔"

اس نے مردہ لہجے میں کہا "ہاں جی مگر..."

"اگر مگر کیا۔ تمہاری گھر والی بھی کرے گی۔ اس لیے خیال رکھنا۔"

کہنا آسان تھا مگر سونا مشکل ثابت ہوا۔ ایک تو خادم حسین نے سچ مچ میرے سرہانے بیٹھ کے نہ جانے کیا پڑھ کے بار بار پھونک شروع کردیا تھا۔ اور پھونک بھی وہ براہ راست میرے منہ پر مارتا تھا کہ اسے پھنکار کہا جاسکتا تھا۔ پھر وہ اپنے لیے چائے بنانے لگا اور چائے کی خوشبو نے ناک کے راستے دماغ میں پہنچ کے نیند کے آثار بھی مٹادیے۔ اس کے بعد فون کی گھنٹی بجنے لگی تو میں نے چھلانگ مار کے اٹھا کہ مولوی خادم حسین کے ہاتھ سے چائے کا کپ گرتے گرتے بچا۔ میں نے کپ اس سے چھینا اور بابر جانے ریسیور اٹھالیا۔

فون دلاور کی بیوی کا ہی تھا "چوکیدار۔"

میں نے کہا "تم وہی ہو۔ رات والی؟"

اس نے کہا "دیکھو میں بہت پریشان ہوں۔ کسی سے بھی میری بات کرادو۔ اس گورے وکیل سے یا رابعہ سے..... منظر صاحب سے....."

"اچھا جی۔ ایسی کیا پریشانی ہے آخر۔ اس وقت تو نہ گورا وکیل ہے نہ کالا۔"

"میں تمہیں بہت انعام دوں گی۔ مجھے کسی کا فون نمبر دے دو۔"

"اچھا جی لکھ لیں پھر۔" میں نے کہا "یہ میرے ماموں کا نمبر ہے۔ آپ کی سب پریشانی دور کردیں گے۔ بڑے پہنچے ہوئے پیر ہیں۔"

اس نے مجھے گالیاں دیں اور فون بند کردیا۔ اس کی آواز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ کتنی نروس اور پریشان ہے۔ اسے یقیناً دلاور کی پہلی قسط موصول ہوچکی تھی۔ وہ شاید روتی رہی تھی یا ضبط سے کام لے رہی تھی۔ اگر رات بھر میں اور رابعہ جاگتے رہے تھے تو نیند اس کی بھی حرام ہوئی تھی اور اب ہم پُرسکون تھے تو اس کے لیے بے سکونی کا آغاز ہوگیا تھا۔

فون رکھ کے میں نے کہا "مولوی خادم حسین۔ ایسی چائے تو جیل میں قیدیوں کو ملتی ہے۔ چائے تک نہیں بناسکتے تم۔ اس لیے بیوی بھی چلی گئی میکے۔ امور خانہ داری کا ذرا سلیقہ نہیں ہے تم میں۔"

"مگر کل تو آپ تعریف کررہے تھے جی" وہ جل کے بولا۔

"اب ہر روز تعریف کی تو تمہارا دماغ خراب ہوجائے گا۔ وہ پہلے ہی بہت اچھا نہیں ہے۔ بس گزارے لائق ہے۔ رات خواب میں آئی تھی گھر والی؟"

"نہیں جی۔" اس نے دل گرفتہ لہجے میں کہا "عورت کی ذات بھی بڑی بے وفا ہے۔"

"بالکل ٹھیک کہا تم نے۔ تم فرنچ جانتے ہو۔ کسی فرنچ لڑکی سے

آنکھیں کام نہیں کرتیں۔ کمزور کیوں ہوجاتی ہیں آخر۔ وہ کیا کہا ہے جی کسی نے کہ بھوکا ہو تو انساں کو چاند نظر آتی ہیں پوریاں۔ اور حساب کے سوال کا جواب اس نے دیا تھا کہ دو اور دو چار پوریاں۔ چھولے تو مفت ملتے ہیں ساتھ" خادم حسین دانت نکالنے لگا۔

میں اس کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ ہم بیڈن روڈ تک پیدل گئے۔ امرتسری حلوائی کی دکان پر گھمسان کا رن پڑ رہا تھا مگر مولوی خادم حسین کی مردانہ وار جدوجہد کے طفیل مجھے بھی ناشتہ میسر آیا۔ ہم واپس آئے تو مجھے دلاور کی بیوی آفس کے باہر کھڑی نظر آئی۔ اس کے ساتھ اور کوئی نہیں تھا۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا اور رات بھر جاگنے سے آنکھیں سرخ ہورہی تھیں۔

اب خادم حسین نے دو طرفہ مترجم کے فرائض ادا کیے۔ وہ اندر پہنچتے ہی پھٹ پڑی۔

"اپنے وکیل صاحب کو بتاؤ کہ وہ دلاور کو قتل کررہے ہیں۔"

میں نے حیران ہوکے کہا "وہ کون؟ خاتون سے پوچھو۔"

"ان سے کہو کہ اتنے بھولے نہ بنیں۔ وہی سکندر بخت اور اس کا شیطانی ٹولہ۔"

"اگر خاتون کو یہ بات معلوم ہے تو انہیں پولیس کے پاس جاکے رپورٹ لکھوانی چاہیے۔"

"ان سے کہو کہ فضول باتوں میں وقت ضائع نہ کریں" اس نے میرے سامنے ایک لاکھ روپے پھینک دیے "بس میری بات کرادیں سکندر بخت سے۔"

"مولوی خادم حسین۔ خاتون سے کہو کہ اس کے لیے کوشش کی جاسکتی ہے مگر ایسے نہیں۔ خاتون شرافت اور عاجزی سے درخواست کریں اور یہ رقم ایسے پھینکنے سے کام نہیں ہوگا۔ وہ کتے کو ہڈی نہیں ڈال رہی ہیں اور نہ وہ وکیل صاحب کو خرید رہی ہیں۔ وکیل صاحب کا بہت بڑا احسان ہوگا ان پر اگر انہوں نے ایک لاکھ قبول کرلیے اور سکندر کو بات کرنے پر آمادہ کرلیا۔ سکندر انکار بھی کرسکتا ہے مگر ایسی صورت میں رقم واپس نہیں ہوگی۔"

وہ غور سے سنتی رہی اور اپنے ہونٹوں کو دانت سے کاٹتی رہی۔ پھر اس نے خونخوار لہجے میں کہا "مولوی۔ تم نہیں کرسکتے شرافت سے بات۔"

"میں تو جی وہی کہوں گا جو آپ کہیں گی۔"

"اچھا اچھا۔ اپنی فرنچ میں کہہ دو وہی... جو یہ وکیل چاہتا ہے۔"

"کیا کہہ دوں... آپ بھی تو بولیں کچھ۔ میں صرف ترجمہ کرتا ہوں" خادم حسین نے معصوم بن کے کہا۔

اب دلاور کی بیوی مجبور ہوگئی۔ اس نے بڑی شرافت اور لجاجت سے میرا ہاتھ پکڑ کے رقم مجھے دی۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ بہت ذلت بھی برداشت کررہی تھی اور اذیت بھی۔ اس نے بتایا کہ کس طرح رات کو ان ظالموں نے

شادی کرلو۔ وہ روز خواب میں آئے گی اور خواب بھی ایسے کہ تم خواہش کروگے ہمیشہ کی نیند آجائے۔ دوبارہ اٹھنے کو دل نہیں چاہے گا۔ ویسے تمہاری گھر والی خواب میں آتی تو کیا دوپٹہ سر پر ہوتا؟ وہ سوئمنگ کاسٹیوم میں ہوتی یا لباسِ فطرت میں؟"

"لباس فطرت کیا ہوتا ہے جی؟"

"وہی۔ جس میں کائنات نظر آتی ہے۔ درخت اور پہاڑ۔ خوشنما پرندے اور جنگل کے درندے۔ جس میں اشرف المخلوقات پیدا ہوتا ہے۔"

"یہ سب منظر صاحب کی صحبت بد کا نتیجہ ہے" وہ بگڑ گیا "ایسی بے شرمی کی باتیں۔ توبہ توبہ وہ بھی ایک پردہ نشین کے لیے جو کسی اور کی شریک حیات ہو۔"

مجھے خطرہ یہ محسوس ہورہا تھا کہ وحشت کی کیفیت میں دلاور کی بیوی صبح صبح یہاں نہ آدھمکے۔ اگر اسے معلوم ہوگا کہ نازو کی ایک انگلی پہلی قسط کے طور پر ارسال کرنے والا کون تھا تو وہ اب تک احکامات صادر کرچکی ہوگی کہ نازو اور غالب کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے جو جیل میں اے کلاس سیاسی قیدیوں کے ساتھ ہوتا ہے اور انہیں تیار رکھا جائے تاکہ ایک منٹ کے نوٹس پر ان کا تبادلہ اپنے چوہدری دلاور سے کیا جاسکے۔ اگر یہ بات اسے معلوم نہیں ہوگی اور کرنے والے اپنی مرضی کے معاملے میں سرکشی کی حد تک خود مختار ہوچکے تھے تو وہ انہیں خبردار کرچکی ہوگی کہ دلاور کو کچھ ہوا تو ذمے دار وہ ہوں گے اور دلاور واپس آتے ہی سب سے خود نمٹ لے گا۔

میں نے خلاف معمول صبح سات بجے ہی چوکیدار کی وردی اتار کے فرنچ وکیل کا لباس پہن لیا اور خادم حسین کو باہر گیلری میں کھڑا کردیا کہ وہ آنے جانے والوں پر نظر رکھے۔

اس نے رننگ کمنٹری شروع کردی "ہائی کورٹ کی طرف سے رکشا آیا ہے۔ کوئی نہیں ہے اس میں۔ نہیں، رکشا ڈرائیور کا سر تو یقیناً ہے۔ ادھر سے ایک کار گئی ہے۔ اس میں دو موٹے موٹے ایک جیسے بندے بیٹھے ہوئے تھے۔ جڑواں بھائی تھے غالباً۔ ایک ہزار پونڈ کے ہوں گے۔"

میں نے چلا کے کہا "کیا۔ پیدائش کے وقت ایک ہزار پاؤنڈ؟"

"نہیں جی۔ آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ پانچ سو پاؤنڈ کا بچہ ہوسکتا ہے؟"

"برطانوی بچہ پانچ سو پاؤنڈ کا ہوسکتا ہے۔ اگر تم جیسے بچے کی قیمت ماں کی نظر میں کوہ نور ہیرے سے زیادہ ہوسکتی ہے۔ مولوی خادم حسین زبان کو ناحق تکلیف مت دو۔ اگر نیچے دلاور کی بیوی نظر آئے یا استاد پیڈرو کی منحوس صورت دکھائی دے تو بتانا۔"

"میری تو جناب، نظر دھندلا رہی ہے۔ ناشتا کرنے سے پہلے اس سخت محنت کی عادت نہیں ہے۔"

"محض آنکھیں کھلی رکھنا بھی مشقت ہے تمہارے لیے۔"

چوہدری صاحب کی ایک انگلی کاٹ کے بھیجی تھی اور وہ دھمکی دے رہے ہیں کہ ان کے ٹوٹے ٹوٹے کرکے قسطوں میں مار ڈالیں گے اور سارے ٹکڑے مجھے ارسال کریں گے۔ ان کو سمجھاؤ کہ یہ ظلم نہ کریں۔ وہ مجھے بتائیں کہ انہیں کیا چاہیے۔ میں چوہدری صاحب سے ہر بات منوالوں گی۔ جیسے بھی وہ چاہیں گے۔ وہ اسٹامپ لکھوالیں۔ کسی کی ضمانت لے لیں۔"

میں بے نیاز رہنے کے باوجود ظاہر یہ کررہا تھا کہ اس کی آہ و زاری سے میرے دل پر اثر ہورہا ہے۔

میں نے کہا "خاتون سے کہو کہ اس معاملے میں اعتماد بہت ضروری ہے۔ اگر انہوں نے کسی سے ذکر کیا تو کام نہیں ہوگا۔"

اس نے کہا "وکیل صاحب سے کہو کہ مجھے ان پر پورا بھروسا ہے۔ میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گی۔"

"اس معاملے میں پولیس کے یا کسی اور کے بیچ میں آنے سے ان کا نقصان ہوسکتا ہے۔ اگر سکندر بخت کے ساتھ دھوکا ہوا تو نتائج کی ذمّے دار یہ خود ہوں گی۔ اگر اس نے ملنے پر آمادگی ظاہر کی تو یہ اکیلی اس سے ملنے جائیں گی۔ جہاں بھی وہ بُلائے گا۔ اگر وہ فون پر بات کرنا پسند کرتا ہے تو انہیں یہاں آنا ہوگا یا جہاں سکندر کہے۔ اسے ڈر ہوگا کہ فون ٹیپ کیا جائے گا اور کال ٹریس کرنے کی کوشش ہوگی۔ اس کا مکمل اطمینان ضروری ہے۔"

"وکیل صاحب سے کہو کہ ایسا ہی ہوگا۔ اس وقت بھی میں اکیلی ہی آئی تھی۔ اگر وکیل صاحب کی کوشش سے چوہدری صاحب لوٹ آئے تو میں ان کو دس گنا انعام دوں گی۔"

دورانِ گفتگو اس کا ہاتھ باربار اپنے بالوں کی طرف جاتا تھا اور وہ ایک ہیئر کلپ کو ٹھیک کرتی تھی حالانکہ اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ مجھے شک ہوا کہ ہیئر کلپ میں خفیہ مائکروفون نہ ہو۔ مردوں کے لیے ایسے مائکروفون کو چھپانا کچھ مشکل ہوتا ہے۔ انہیں قمیص کے بٹن یا ٹائی پن استعمال کرنے پڑتے ہیں جس کے ساتھ تار منسلک ہو تو چھپانا آسان نہیں ہوتا مگر عورتیں لمبے کالے بالوں میں جتنے تار چاہیں چھپالیں۔ چوٹی کے ساتھ گوندھ لیں یا جوڑے میں باندھ لیں۔ جوڑے میں تار، بیٹری ٹرانس میٹر کیا پورا ریڈیو اسٹیشن قائم ہوسکتا ہے۔

میں نے خادم حسین کو اس طرف متوجہ کیا "یہ عورت جھوٹ بول رہی ہے۔ یہ اکیلی نہیں آئی۔ اس کے ساتھ جو بھی آیا ہے وہ کہیں قریب میں موجود ہے اور ساری گفتگو سُن رہا ہے۔ شاید ریکارڈ بھی کررہا ہو۔"

"میں دوڑ کے جاؤں اور پکڑلوں رنگے ہاتھوں؟"

میں نے حیرانی سے کہا "دوڑ کے کہاں جاؤگے اور کس کو پکڑوگے۔"

"جو بھی مجھے یہ گفتگو سُنتا اور ٹیپ کرتا نظر آئے گا جی۔ ہوگا تو کہیں آس پاس ہی۔"

"ہاں۔ زیادہ دور تو خیر وہ نہیں ہوسکتا۔ اور وہ بیٹھا ہوگا کسی کار میں جس کا ایریل نکلا ہوا ہوگا۔"

خادم نے دلاور کی بیوی سے کہا "وکیل صاحب فرماتے ہیں اب آپ مطمئن ہوجائیں۔ جیسے ہی سکندر بخت سے رابطہ ہو... آپ کی سفارش کریں گے اور آپ کو اس ٹیلی فون نمبر پر بتادیں... جو آپ نے کل دیا تھا۔"

میں نے کہا "اس سے پوچھو کہ دن میں بات کرنی ہو تو کہاں... جائے اور وہ فون صرف رات کو کیوں دستیاب ہوتا ہے۔"

دلاور کی بیوی نے کہا "دراصل دن میں وہ آفس فون ہوتا ہے لیکن مجھے پیغام مل جائے گا۔"

نادانستگی میں اس نے ایک ایسی بات بتادی تھی جو میرے پوچھنے پر وہ کبھی نہ بتاتی۔ اس کی بات سے اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ... بی ڈی انٹرپرائز کا آفس ہے وہی آج کل دلاور فیملی کی رہائش... بھی ہے اور باہر لگا ہوا سائن بورڈ صرف ظاہر کا پردہ ہے۔ یا پھر... جگہ بیک وقت آفس اور رہائش گاہ کے طور پر استعمال ہورہی تھی... سامنے والے حصّے میں ایک دو کمرے آفس کے لیے وقف کردیے گئے ہوں گے اور فون اسی حصّے میں لگا ہوا تھا۔ رات کو آفس بند ہوتا تھا تو دلاور کی بیوی اس فون کو استعمال کرسکتی تھی۔

یہ ایک اور اہم انکشاف تھا۔ اب یہ معلوم کرنا باقی تھا... حسینہ نام کی کوئی لڑکی وہاں رات کو صرف ٹیلی فون کال وصول کرنے پر مامور ہے یا دلاور کی اپنی فیملی میں سے کوئی بزنس کال وصول کرتا ہے۔ اس نمبر کو صرف کاروباری مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہوگا۔ پرائیویٹ نمبر کچھ اور ہوگا جو انتہائی محدود حلقے میں بہت قریب کے لوگ جانتے ہوں گے۔

میں نے کہا "تم جاکے بیگم صاحب کو نیچے گاڑی تک چھوڑ آؤ۔ اس کے انکار کی پروا مت کرنا۔ خوش اخلاقی اور ادب آداب کے مظاہرے سے تمہیں کون روک سکتا ہے۔"

دلاور کی بیوی جانے کے لیے اُٹھی تو مولوی خادم حسین ساتھ ہوگیا اور پھر یہ صورتِ حال ہوگئی کہ وہ کمبل کو چھوڑتی مگر کمبل اسے نہیں چھوڑتا تھا۔ بڑی مشکل سے اس نے کمبل کو یعنی مولوی خادم حسین کو سڑک تک ساتھ دینے کی اجازت دی۔ ان کے نیچے اُترتے ہی میں نے گیلری میں پوزیشن سنبھال لی۔

خادم حسین سڑک تک گیا۔ پھر دلاور کی بیوی نے اس سے یوں جان چھڑائی کہ وہ ایک رکشا میں بیٹھ گئی۔ یہ مجھے کچھ عجیب سا لگا لیکن اِدھر خادم حسین مایوس شکل بنا کے واپس ہوا اُدھر وہ رکشا روک کے اُتری اور ایک نئی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ یہ گاڑی اس سے پہلے مجھے نظر نہیں آئی تھی یہ ٹوٹون یعنی دو رنگ کی مرسیڈیز تھی۔ اس کا نچلا آدھا حصّہ گرے تھا اور اوپر سے اس کا رنگ کچھ آسمانی نیلا تھا۔ اس گاڑی کے ریڈیو کا ایریل بھی بہت لمبا تھا اور ہوا سے جھول رہا تھا۔ پھر اندر سے کوئی بٹن دبا کے اس الیکٹرانک ایریل کو سمیٹ لیا گیا اور گاڑی روانہ ہوگئی۔ اس کا رُخ مخالف سمت میں تھا چنانچہ میں ڈرائیور کو نہیں دیکھ سکا مگر اس کے سر کی ایک جھلک

... تھی کہ میں نے وعدہ خلافی کی تھی۔"

... بیچے تی ... وعدہ خلافی کی تھی؟"

"کیا وعدہ خلافی کی تھی؟"

... کوئی ایک ہو تو بتاؤں جی" اس نے آہ بھری "سب ہی کرتے ہیں ایسی باتیں۔ سبز باغ دکھاتے ہیں بیویوں کو کہ تمہیں سونے میں پیلا کردوں گا اور تم کہوگی تو چاند تارے بھی توڑ لاؤں گا تمہارے لیے۔ عید بقرعید ایک ریشمی جوڑا تو لا نہیں سکا اس کے لیے... کا ایک سیٹ منہ دکھائی میں دیا تھا۔ وہ بھی بک گیا تھا..."

میں نے کہا "چلو پھر آج پہلے شاپنگ کریں۔ ایک تو گاڑی نہیں ہے ہمارے پاس۔ اچھا نہیں لگتا ہر وقت کسی سے گاڑی مانگنا رکشا ٹیکسی میں پھرنا۔ اپنی بیوی کے لیے پورا انارکلی بازار خرید لو آج۔ آج ہم بہت خوش ہیں۔"

خادم حسین کو یقین نہیں تھا کہ میں نے جو کہا ہے اس پر عمل کی نوبت بھی آئے گی۔ اب دس بجنے والے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ وقار یوسف اور منظر کورٹ جاچکے ہوں گے۔ رابعہ کو زبردستی روک لیا گیا۔ وہ بضد تھی کہ اب وہ بالکل ٹھیک ہے اور اسے آرام سے زیادہ ضروری کام ہیں مگر نگی نے وڈی کی ایک نہیں سُنی تاہم اس نے رابعہ کو میرے ساتھ جانے کی اجازت دے دی۔

باہر آکے رابعہ نے چابی مجھے تھمانے کی کوشش کی "تم چلاؤ گاڑی۔"

میں نے چابی واپس کرکے گاڑی کو ایک لات ماری "اس نامعقول چیز کو تم گاڑی سمجھتی ہو۔ ہم بیٹھیں گے اس میں؟ اس سے تو بہتر ہے منہ کالا کرکے گدھے پر بیٹھ جائیں۔ کم بے عزتی ہوگی۔"

رابعہ بگڑی "دماغ کیوں خراب ہورہا ہے؟ لات کیوں ماری گاڑی کو؟"

"ہم تو اس کو بھی لات مار سکتے ہیں جو اس کھٹارے پر بیٹھنے اور اسے چلانے کی بات کرے۔ معلوم نہیں یہ جانور کس طرف چلتا ہے۔ آگے یا پیچھے۔ اس کا منہ کدھر ہے خادم حسین۔"

خادم حسین بولا "عام طور پر جدھر انجن ہو گاڑی اُدھر ہی جاتی ہے جی۔ اس کا پتا نہیں.... غالباً اُلٹی چلتی ہے۔"

رابعہ چراغ پا ہوگئی "مولوی۔ تم بھی بولنے لگے ہو۔ چیونٹی کے بھی پر نکل آئے ہیں۔ بھاڑ میں جاؤ تم دونوں۔"

"ضرور جائیں گے مگر اس مشین میں نہیں جس کا انجن پیچھے ہے اور یہ جاتی آگے ہے۔ یہ لال رنگ کا چار کوہانوں والا اونٹ ہے۔ گاڑی آج ہم خریدیں گے تو تمہیں یہ فرق پتا چلے گا۔"

"پھر یہاں کیوں آئے ہو۔" رابعہ منہ پھلا کے اندر جانے لگی۔

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا "وہ دراصل۔ مولوی خادم حسین کو اپنی بیگم کے لیے کچھ خریداری کرنی تھی۔ ہم نے سوچا کہ اپنی بیگم کو بھی ساتھ لے لیں۔"

رابعہ نے ہاتھ چھڑا لیا "بدتمیزی مت کرو۔"

"بھئی میرا مطلب تھا ہونے والی بیگم۔ دیکھو تمہیں ہماری ... سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ دلاور کا ولی عہد فیصل تھا۔

کوئی بات نہیں بیٹے۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ ایک لاکھ تو میں نے وصول کرلیے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ تم باپ کی جگہ کیا وصول کرتے ہو؟ تمہارا باپ تو برابر کا حریف تھا۔ تم جیسے بچّے جو کل تک کھلونا بندوق سے کھیلتے تھے آج ہمارے سامنے شکاری ثابت کرنا چاہتے ہیں خود کو۔ کیا زمانہ آگیا ہے۔ دور سے میں گاڑی کا نمبر نہیں نوٹ کرسکتا تھا مگر یہ عام گاڑی نہیں تھی۔ اسے تلاش کرنا بھی آسان تھا۔

صبح کے اخبارات میں غالب کے اور ماضی کے اخبارات نے ڈاکٹر شیلی قتل کیس کو بہت نمایاں جگہ دی تھی۔ یہ شہ سُرخی تو نہیں بن سکتی تھی لیکن ایک نے درمیان میں چار کالمی سُرخی باکس بنا کے لگائی تھی "برطانوی لیڈی ڈاکٹر کے قتل کا معمّا پولیس سرجن کے قتل سے زیادہ پُراسرار ہوگیا۔" دوسرے نے تین کالم کی سُرخی یوں بنائی تھی "برطانوی نژاد پاکستانی لیڈی ڈاکٹر کو قتل کیا گیا تھا۔ عدالت کے حکم پر لاش کو قبر سے نکال کے پوسٹ مارٹم کرنے والے ڈاکٹر کا بیان" اسی اخبار نے پولیس سرجن کے قتل کی خبر کو الگ جگہ دی تھی اور اسی کے ساتھ تفتیش کرنے والی پُرانی ٹیم کے ارکان کی گرفتاری کی خبر تصویروں کے ساتھ لگائی تھی۔

میں نے کہا "خادم حسین آج یونہی اچھی ہوئی ہے۔ اچانک ہم لکھ پتی ہوگئے ہیں۔"

اس نے ایک آہ بھری "پھر ہمیں کیا جی؟"

"چلو یار، تم لے لو۔ ہم کہیں گے مالِ حرام بود بجائے حرام رفت۔"

"میں لعنت بھیجتا ہوں جی مالِ حرام پر۔ اور یہ آپ نے کیسے کہہ دیا جی کہ بجائے حرام رفت۔"

میں نے کہا "مولوی صاحب، کیا واقعی یہ حرام ہے۔ ہم نے ایک کام کا معاوضہ طے کیا تھا۔ نہ شرط لگائی تھی اور نہ لاٹری میں جیتے ہیں، نہ جُوا کھیلا ہے اور نہ ڈاکا ڈالا ہے۔ اس عورت نے برضا ورغبت ہنسی خوشی یہ سودا کیا ہے۔ اب ہم کام نہ کریں اس کا تو واقعی حرام ہوگا ورنہ یہ حقِ محنت ہے۔ کیا فرماتے ہیں آپ بیچ اس مسئلے کے؟"

خادم حسین نے سوچ کے کہا "آپ کی بات دل کو لگتی ہے جی۔ سکندر بخت سے بات کرانے کے بعد آپ کی ذمّے داری ختم۔ وہ مانے نہ مانے۔ اس کی مرضی، مسز دلاور کے اور اس کے درمیان معاملات طے نہ ہوں تو آپ بری الذمہ۔"

"گویا مالِ غنیمت حلال ہے؟"

"اگر واقعی آپ اپنی پیش کش میں سنجیدہ تھے جی۔ تو حلال ہے مجھ پر۔ مگر میں کیا کروں گا جی ایک لاکھ کا؟"

"یار، دو تین شادیاں کرلینا۔"

"نہیں جناب۔ ایک ہی کافی ہے۔ چار مل کے تو بہت ماریں گی مجھے" اس نے خوش دلی سے کہا "یہ ایک بھی اس لیے روٹھ

قسم۔ غصے میں تم بالکل اپنی فاکس ویگن جیسی لال ہو چکی ہو۔ اب مسکرا کے بجلی گراؤ ذرا۔"

رابعہ ہنس پڑی "اپنی صحبت میں تم مولوی خادم حسین کو بھی ڈھیٹ بنا دوگے۔"

جیب میں مال ہو تو خریداری ایک دلچسپ شغل بن جاتا ہے لیکن میرا اصل مقصد ایک تو رابعہ کو گزشتہ رات کی کہانی سنانا تھا۔ اس میں واقعات کا تھوڑا سا ردوبدل ضرور تھا۔ میں نے یہ نہیں بتایا کہ ہم مردہ خانے بھی گئے تھے۔ میں نے کہا کہ دلاور کی بیوی کے لیے یہ دھمکی بھی کافی ہوئی تھی کہ آج اسے تھوڑا سا دلاور مل جائے گا۔ اس کے ناک یا کان۔ بال یا کھال۔ وہ صبح دوڑی چلی آئی تھی اور فرنچ وکیل کو ایک لاکھ دے گئی تھی کہ جی سکندر بخت سے بات کرا دو۔

جب میں نے ایک شوروم میں اتفاق سے بالکل ویسی ہی سرخ رنگ کی فاکس ویگن دیکھی جیسی رابعہ کے پاس تھی تو میں نے اسے خریدنے کا فیصلہ کرلیا۔ دل ہی دل میں خوش ہونے کے باوجود رابعہ نے خفگی کا اظہار کیا۔

"تم تو گاڑی خریدنے آئے تھے۔ اس نامعقول چیز کو گاڑی سمجھتے ہو تم۔ اس سے تو بہتر ہے تم اور خادم حسین منہ کالا کرا کے گدھے پر بیٹھ جاتے۔ ایک کا منہ ادھر دوسرے کا ادھر۔"

میں نے ہنس کے کہا "ارے جانم۔ جب تم ہمیں پسند ہو تو پھر تمہاری ہر ادا ہمیں پسند ہے۔ ہر چیز پسند ہے جو تمہیں پسند ہے۔ اگر تم لال رنگ کی فاکس ویگن چلاؤگی تو میں بھی چلاؤں گا۔ تم لال جوڑا پہنوگی تو میں بھی پہنوں گا۔ تم لپ اسٹک سے ہونٹ لال کروگی تو میں بھی کروں گا۔"

اب میری اور رابعہ کی گاڑیاں حد درجہ مشابہ ہوگئی تھیں اور میں نے عمداً یہ مشابہت پیدا کرنا بہتر سمجھا تھا۔ جو تھوڑا بہت فرق تھا وہ میں نے ایک جیسے سیٹ کور چڑھا کے اور ویسے ہی وھیل کیپ لگا کے مٹا دیا تھا۔ اب یہ ہو سکتا تھا کہ ہم دشمنوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنا چاہیں تو دونوں کی نمبر پلیٹ ادھر سے ادھر کردیں۔ یا دونوں پر ایک ہی نمبر کی پلیٹ لگا کے کنفیوژن پھیلا دیں۔ ایک ہی وقت میں دو گواہ حلف اٹھالیں۔ ایک کہے کہ میں نے گاڑی کو مشرق میں دیکھا تھا تو دوسرا کہے مغرب میں۔ اس کے علاوہ فی الحال اس نئی گاڑی میں دشمن کی طرف سے گڑبڑ کا امکان نہیں تھا۔

دوپہر کے وقت میں نے مولوی خادم حسین کو رخصت کردیا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ میں نے مذاق کیا تھا مگر میں نے رابعہ سے کہا کہ اب خادم حسین کی بیوی کے لیے کچھ تحائف خریدنے ہیں تو وہ پریشان ہوگیا اور انکار کرنے لگا کہ یہ نہیں ہو سکتا۔ بالآخر رابعہ نے اسے دس ہزار روپے قبول کرنے پر مجبور کردیا۔ یہ بھی اس کے لیے اتنی بڑی رقم تھی کہ وہ بدحواس ہوگیا۔ اس کا خیال تھا کہ ایک ہزار کافی ہوں گے مگر رابعہ کے اصرار کے آگے اس کی ایک نہ چلی۔ اس کے ساتھ جا کے ایک ایک چیز دلواتا اور ادائیگی کرتے جاتا

زیادہ مشکل تھا۔ اکیلا وہ آزادانہ طور پر خود ہر چیز اپنی پسند سے خریدتا تو زیادہ خوش ہوتا۔ پھر اس کے ساتھ خود ہم بھی کچھ UNEASY محسوس کررہے تھے۔ کباب میں ہڈی کون پسند کرتا ہے۔

وہ شام کو رابعہ کے آفس پہنچنے کا وعدہ کرکے چلا گیا تو ہم کھانے کے لیے ایک چینی ریستوران میں چلے گئے۔ فرصت اور سکون کے یہ لمحات بہت عرصے بعد میسر آئے تھے مگر تفکرات ہمارے ذہن پر سوار تھے۔ غالب اور نازو کی طرف سے مجھے وقتی طور پر یہ اطمینان حاصل ہوگیا تھا کہ ان پر جو بیت گئی سو بیت گئی۔ اب مزید ان کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔ ہم نے دشمنوں کا چیلنج قبول کرلیا تھا اور انہیں جواب میں چیلنج دے کر واضح کردیا تھا کہ دلاور ہماری قید میں ہے۔ اس بارے میں شکوک کی گنجائش نہیں کہ جہاں دلاور ہے وہیں سکندر بھی ہے اور دلاور کی رہائی کی واحد صورت یہ ہے کہ سکندر بخت سے غیر مشروط بات کی جائے۔ ترپ کے سارے پتے ہمارے ہاتھ میں تھے۔ دلاور کی دولت، اس کی بدمعاشی، اس کے شکاری کتوں کی فوج، پولیس اور خصوصی تفتیشی ٹیم سب مل کے بھی دلاور کا سراغ نہیں لگا سکتے تھے اور نہ سکندر بخت پر ہاتھ ڈال سکے تھے۔

رابعہ نے کہا "تم کب بات کروگے دلاور کی بیوی سے؟"

میں نے کہا "میرے ذہن میں کچھ اور تھا۔ کیوں نہ میں کراچی جا کے کال کروں۔"

"کراچی جاؤگے؟ صرف کال کرنے کے لیے؟"

"کراچی کیا ہے۔ دو گھنٹے کی مسافت۔" میں نے کہا "میں ابھی جاؤں تو کل صبح پھر تمہارے ساتھ ناشتا کرسکتا ہوں۔ ابھی ساڑھے تین بجے ہیں۔"

"مگر اس کا فائدہ؟"

میں نے کہا "ایک تو مجھے یہ ڈر ہے کہ کال ٹریس کی جائے گی۔ یہاں خطرہ زیادہ ہے۔ کراچی میں دس پندرہ منٹ تک بات کی جاسکتی ہے۔ کراچی کا نمبر معلوم کرنا اور پھر کراچی کی پولیس سے رابطہ کرکے انہیں کسی نمبر کے پتے پر پہنچنے کے لیے کہنا لمبا کام ہے۔ زیادہ دیر بات کرنی ہوگی تو میں دوسری کال دوسرے نمبر سے کرلوں گا۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوجائے گا کہ سکندر تو کراچی میں ہے۔ یہاں شکاری خاصے مایوس ہوں گے کہ ان کی معلومات کتنی ناقص اور نامکمل ہیں۔ اچھا ہے سکندر بخت کو تلاش کرنے والے کراچی میں ٹامک ٹوئیاں مارتے پھریں۔ میں کل ہی واپس آجاؤں گا۔ میرا ارادہ یہ بھی ہے کہ محسن اور گل سے ملوں۔"

"فوزیہ سے نہیں ملوگے؟" رابعہ نے کہا۔

"نہیں۔ محسن سے کہوں گا وہ مل لے۔"

"شرم آنی چاہیے تمہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ تم اس پر مرتے تھے۔ آج اس کی اتنی بھی پروا نہیں۔ یہ کیسی محبت تھی۔ وہ کسی کی بیوی بن گئی تو تمہارے جذبات بھی بدل گئے۔ کیا تم ڈرتے ہو

کیا تھا یا نہیں؟ مگر خیر، میں اس کے گھر جاؤں گا۔ آخر وہ بہن تھی محسن کی اور بچپن سے ہم کزن ہی تھے۔ میری ایک بات سنو، تم بھی چلو۔"

"نہیں... نہیں تم جاؤ۔ یہاں کے معاملات....."

"یہاں کے معاملات جوں کے توں رہنے دو..... دلاور کی بیوی اب خود کوئی ایسی بات نہیں ہونے دے گی جس سے اس کی بات خراب ہو اور دلاور کو نقصان پہنچے۔ وہ تلاش کرتی پھرے گی فرنچ وکیل کو۔"

"وہ سمجھے گی کہ بدمعاش ایک لاکھ لے کر بھاگ گیا۔"

"ایک دو دن میں کچھ نہیں ہوگا۔ منظر اور وقار یوسف اسے سمجھا سکتے ہیں کہ وکیل صاحب کا پتا ٹھکانا کسی کو معلوم نہیں مگر وہ کہیں جا نہیں سکتے، وہ لندن سے خاص طور پر اس کیس کی تفتیش میں شامل ہونے آئے تھے اور اب تفتیش آگے بڑھی ہے تو ان کے واپس جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ خادم حسین کے پیچھے پھرے گی۔ میں خادم حسین سے کہہ دوں گا کہ وہ بھی غائب ہوجائے۔"

"دو دن کے لیے چلا جائے بیوی کے میکے۔ اسے واپس لانے کے لیے۔ اب تو وہ خوشی خوشی آئے گی" رابعہ ہنسی۔

"رائٹ۔ سمجھا یہی جائے گا کہ میں اپنے مترجم کے ساتھ کسی کام سے اسلام آباد چلا گیا یا کہیں اور۔ دو دن میں ہم پھر واپس آجائیں گے۔"

"منظر کو بتانا ضروری ہے۔"

میں نے کہا "ائرپورٹ سے فون کردیں گے۔"

رابعہ نے سر ہلا کے اور مسکرا کے تائید کردی "ٹھیک ہے، چلو۔"

ہم ریسٹورنٹ سے نکلے تو ائرپورٹ پہنچ گئے۔ ہم نے کوئی تیاری نہیں کی تھی اور کوئی پروگرام نہیں بنایا تھا چنانچہ ہمیں تو فلائٹ کا ٹائم بھی معلوم نہیں تھا اور نہ یہ یقین تھا کہ فلائٹ پر ٹکٹ دستیاب ہوں گے یا نہیں۔ کار کو پارکنگ ایریا میں چھوڑتے ہوئے میں نے ٹکٹ دینے والے ملازم کو بتا دیا کہ شاید میں دو تین دن بعد آؤں گا اور وہ میری کار کا خیال رکھے۔ اسے لاوارث سمجھ کے پولیس کے حوالے نہ کرے۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ اکثر وہ لوگ جو کاروباری دوروں پر آتے جاتے رہتے تھے گھروں سے گاڑی لاتے تھے اور پھر واپسی میں ساتھ لے جاتے تھے۔ اس طرح وہ ٹیکسی کے چکر سے بچ جاتے تھے۔ ٹیکسی والے منہ پھاڑ کے اصل سے دس گناہ کرایہ مانگنے کے عادی تھے۔ ان کا موقف ہمیشہ یہ ہوتا تھا کہ ہم کیا کریں، ٹھیکے دار الگ بھتہ لیتا ہے اور پولیس الگ منتھلی۔

کراچی کی فلائٹ اسلام آباد سے آرہی تھی اور اس میں ابھی دو گھنٹے باقی تھے۔ ویسے تو بکنگ پوری تھی مگر دو سیٹیں چانس پر تھیں اور اس کے لیے انتظار کرنے کا فائدہ ہوا۔ ڈھائی گھنٹے بعد ہم پرواز

اس کے سامنے جانے سے؟"

"نہیں۔ ڈرنے کی اب کیا بات ہے؟" میں نے کہا۔

"پھر اور یہ کیا ہے۔ اس سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ عشق صرف طلب کا نام ہے اور طلب پوری نہ ہو تو کچھ نہیں۔ قصور فوزیہ کا ہوتا، بے وفائی اس نے کی ہوتی تو تمہارا اس سے نفرت کرنا بھی ایک فطری ردعمل سمجھا جاتا۔"

میں نے خفت سے کہا "سچ تو یہ ہے کہ میں خود کو قصوروار سمجھتا ہوں مگر بعد میں جو کچھ ہوا تقدیر کا کھیل تھا۔ میں وہ نہیں چاہتا تھا جو ہوا مگر ہونے والی بات تھی، ہوگئی۔ اس کا گلہ بھی جائز ہے۔"

"لڑکیاں بڑی صابر و شاکر ہوتی ہیں۔ نوشتہ تقدیر کو قبول کرلیتی ہیں۔ رو دھو کے چپ ہوجاتی ہیں۔ مردوں کی طرح انتقام کے جذبات کی پرورش نہیں کرتیں۔ میں سمجھتی ہوں، وہ تم سے نفرت نہیں کرتی۔"

"کرنی تو چاہیے۔" میں نے نظریں میز پر جما کے کہا۔

"اس کے خط سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اب بھی تم سے توقعات رکھتی ہے کہ تم اس کی خوشی کو مقدم سمجھوگے۔ اس کے لیے کچھ کروگے جس سے اس کا گھر برباد ہونے سے بچ جائے۔ جا کے اس کو یقین دلاؤ کہ آج بھی تم اس کی خوشی کے لیے سب کچھ کرسکتے ہو۔ کیا اس کے شوہر کو معلوم ہے کہ پہلے تم منسوب تھے؟"

"پتا نہیں۔ ہوسکتا ہے معلوم ہو۔ فوزیہ نے خود بتا دیا ہو۔ یہ تو کوئی ایسی بات نہیں۔ پڑھے لکھے روشن خیال اور مہذب لوگ ہیں ہم دونوں۔" میں نے کہا "کیا پتا پہلے خود وہ کسی اور کو چاہتا ہو۔ شادی ہوگئی فوزیہ سے۔ ماضی پیچھے رہ گیا۔ آج وہ خوش ہیں اور اپنے مستقبل کی تعمیر کے لیے کوشاں ہیں۔ خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ۔"

"ایسا ہی ہونا چاہیے۔ کیا تم نے کبھی رقابت اور حسد کے جذبات محسوس کیے تھے؟"

"کس کے لیے؟ فوزیہ کے شوہر کے لیے!"

"نہیں، اس شخص کے لیے جو پہلے میرا شوہر تھا۔"

میں نے حیرانی سے کہا "نہیں۔ اس کا تو خیال ہی نہیں آتا میرے ذہن میں۔ وہ ایک حادثہ تھا۔"

"مجھے بھی معلوم نہیں اب وہ کہاں ہے۔ اگر وہ شادی کے لائق نہیں تھا تو یہ ایک جسمانی معذوری تھی۔ ذہنی طور پر وہ کمزور تھا کہ شادی سے انکار نہ کرسکا مگر وہ تھا شریف آدمی۔ اس نے میری زندگی کو جہنم نہیں بنایا۔ کیا تم حسد محسوس کرتے ہو جب میں ایسا کہتی ہوں؟"

"ہرگز نہیں۔ اگر وہ کبھی ملا تو میں اس سے دوستوں کی طرح ہاتھ ملاؤں گا۔ اسے مدعو کروں گا کہ ہمارے گھر آئے۔"

"اتنا بڑا دل رکھنے کے باوجود تم فوزیہ کا سامنا کرتے ہوئے ڈرتے ہو۔ جاؤ اس سے ملو، موقع ملے تو اس سے معافی مانگ لینا۔"

"معافی تو بہت پہلے مانگ چکا تھا میں۔ پتا نہیں اس نے معاف

کرچکے تھے۔ زندگی کے بیزار کن اور اعصاب شکن ماحول سے فرار ہو کے ہم دونوں خوش تھے۔

رابعہ نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا "ایک دن آئے گا جب ہم بلا خوف وخطر کراچی اور لاہور کے درمیان سفر کریں گے۔"

"صرف کراچی ہی کیوں۔ ہم لندن' پیرس اور دنیا بھر میں ہر جگہ جائیں گے۔"

رابعہ نے اداسی سے کہا "آخر کب۔ یہ روز و شب کا سلسلہ ایسے ہی کب تک رہے گا۔"

میں نے فوراً موضوع بدل دیا "کتنا حیران ہوگا محسن ہمیں اچانک سامنے دیکھ کر۔"

رابعہ ہنسی "گل تو بے ہوش ہو جائے گی خوشی کے مارے۔ اکرام شیخ اور کاجل کو یقین نہیں آئے گا اپنی آنکھوں پر۔"

میں نے کہا "مزہ تو آئے گا اس وقت جب میں منظر کو کراچی سے فون کروں گا۔ وہ سمجھے گا مذاق کر رہا ہوں میں۔ یقین آئے گا اسے محسن سے بات کرکے۔"

"اور جب یقین آئے گا تو ایسی سنائے گا تمہیں...؟"

میں ہنس پڑا "میں تو کہہ دوں گا کہ مجھے رابعہ ورغلا کے لے گئی...."

"ہاں۔ ایسے بھولے بھالے معصوم بچے ہو نا تم۔"

"سب سے زیادہ لطف آئے گا مولوی خادم حسین کی بات کا۔ وہ بھونچکاں رہ جائے گا۔ "ہیں جی۔ کراچی چلے گئے آپ؟ بس ایسے ہی جہاز میں بیٹھ گئے؟ جب آدمی ارادے کے بغیر کام کرنے لگے اور ارادے پر اختیار نہ ہو تو یہ بڑی خطرناک بات ہوتی ہے جی۔ میرے ایک چچا تھے.... بالآخر پاگل خانے پہنچے..."

ہم بچوں کی طرح باتیں کرتے رہے اور ہنستے رہے یہاں تک کہ جہاز کے کراچی لینڈ کرنے کا اعلان ہوگیا۔ فلائٹ کے دوران میں نے صرف کافی پی تھی اور رابعہ نے چائے۔ ہم ائرپورٹ سے باہر آئے تو سورج غروب ہو چکا تھا۔ میرے ہاتھ میں صرف ایک بریف کیس تھا جسے میں فرنچ وکیل کے حلئے میں ہر جگہ اٹھائے پھرنے کا عادی ہوگیا تھا۔

پہلا مسئلہ اکرام شیخ کے گھر پہنچنے کا تھا۔ اس کا پتا جس ڈائری میں لکھا ہوا تھا وہ رابعہ کے آفس میں تھی لیکن میرا خیال تھا کہ اسے تلاش کیا جاسکتا ہے۔ وہ گولیمار کے علاقے میں رہتا تھا اور اس کی ایک ٹیکسی کا نمبر بھی مجھے یاد تھا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ کاجل اسی علاقے میں کوئی پرائمری اسکول چلا رہی تھی۔ اتنے عرصے میں اسکول یقیناً ترقی کر گیا ہوگا اور گمنام نہیں رہا ہوگا۔ کم سے کم گولیمار کے رہنے والے اس سے ضرور واقف ہوں گے۔

باہر آکے میں نے قطار میں کھڑی ہوئی ہر ٹیکسی کے ڈرائیور سے پوچھا مگر اکرام شیخ کی ٹیکسی کا مالک اب کوئی اور تھا۔ یہ تو معلوم ہوگیا کہ اس نمبر کی ایک ٹیکسی ہے مگر وہ ٹیکسی جس شخص کی تھی اُس کا حلیہ اکرام شیخ سے ذرا بھی نہیں ملتا تھا۔ وہ ایک پٹھان تھا۔ کسی کو اس کا پتا ٹھکانا معلوم نہیں تھا اور یہ کوئی بھی نہیں بتاسکتا تھا کہ اس وقت وہ کہاں ہوگا۔ وہ اتنے بڑے شہر میں کہیں بھی ہوسکتا تھا۔

اب گولیمار جائے بنا چارہ نہ تھا۔ میں نے اپنی یادداشت پر بھروسہ کیا اور اندازے سے ایک جگہ اتر گیا جو مجھے کچھ دیکھی ہوئی لگتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ پہلے اکرام اس گلی میں رہتا تھا اور میرا خیال کچھ اتنا زیادہ غلط بھی نہیں تھا۔ ایک شخص نے مجھے میں اُس دروازے پر پہنچادیا جہاں پہلے ٹیکسی ڈرائیور اکرام رہتا تھا۔ اندر سے ایک بزرگوار برآمد ہوئے۔ مشکل یہ تھی کہ وہ اونچا سنتے تھے اور ان کے آلہ سماعت کی بیٹری ختم ہو چکی تھی۔ چلا چلا کے میرا گلا بیٹھنے لگا تو انہوں نے بتادیا کہ میں اسکول کے چوکیدار سے رجوع کروں۔ اس کی بیوی اسکول کی ہیڈ مسٹریس تھی اور اسکول قریب ہی تھا۔ "کیا زمانہ آگیا ہے۔ ٹیکسی ڈرائیوروں کی بیویاں اسکول کی پرنسپل.... توبہ..."

میں اسے کیا بتاتا کہ کاجل پہلے کیا تھی۔ کس کی بیٹی تھی اور کتنی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی۔ وقت بدل گیا تھا اور حالات بدل گئے تھے۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے سانحے پر صرف اخباروں میں لکھا جارہا تھا۔ ایک دوسرے کو موردِ الزام ٹھہرانے والے سیاست داں بیانات دے رہے تھے اور کالم لکھنے والے سیاسی تجزیے کررہے تھے۔ عام آدمی کے لیے یہ سب لاحاصل تھا جو پہلے ہی صبح سے شام تک نون تیل لکڑی کے چکر میں پڑا رہتا تھا اور اب بھی اس کے معمولات میں فرق نہیں پڑا تھا۔

اسکول کا گیٹ بند تھا۔ اندر ایک لائٹ بھی جل رہی تھی مگر چوکیدار غائب تھا۔ آس پاس کے ایک دو لوگوں نے یہ ضرور بتادیا کہ شاید وہ نماز پڑھنے یا روٹی کھانے گیا ہوگا۔ اسکول کے مالکان کا کسی کو پتا نہیں تھا مگر وہ اتنا جانتے تھے کہ پرنسپل روز ایک ٹیکسی میں آتی تھیں۔ پرنسپل کا ناک نقشہ وہی تھا جو کاجل کا۔ ایک پان سگریٹ والے نے کہا "اجی ہم سے پوچھو۔ بہاری ہے نا وہ۔ ناظم آباد چلی گئی ہے اب تو۔ جس ٹیکسی میں وہ آتی ہے نا جی۔ ایک پنجابی کی ہے۔ کہتے ہیں اُس کا گھر والا ہے۔ اللہ ہی جانے۔"

بہاری' پنجابی۔ مجھے یہ سب سن کے افسوس ہوا۔ مشرقی پاکستان سے آنے والے کیا پاکستانی نہیں تھے؟ یہ تو دوسری بار پاکستان کی خاطر گھربار لٹانے والے لوگ تھے مگر اہلِ وطن نے ان پر "بہاری" کی چھاپ لگادی تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے اپنی مرضی سے پاکستان آنے والوں پر مہاجر کا ٹھپا لگادیا گیا تھا۔ وہ تقسیم پرانی بات ہوگئی تھی۔ نئی تقسیم نے دلوں کو تقسیم کردیا تھا۔ کاجل بہاری ہوگئی تھی' اکرام شیخ پنجابی تھا۔

چوکیدار نو بجے نمودار ہوا۔ وہ اپنی ڈیوٹی چھوڑ کے غائب ہو جانے پر ذرا شرمندہ نہیں تھا "اب کیا آدمی روزہ نماز چھوڑ دے۔ نوکری کی خاطر کھانا پینا چھوڑ دے۔"

"میرا خیال تھا کہ ہمارے اچانک پہنچنے سے تم لوگ خوشی کے مارے پاگل ہو جاؤ گے لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ تم تو ظاہری اخلاق کا مظاہرہ بھی نہیں کر رہے ہو۔ کیا بات ہے؟"

کاجل اور اکرام نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا "تم دونوں کیسے آئے ہو؟"

میں نے غصے سے کہا "کیا مطلب۔ پوری برات کے ساتھ آنے تھے؟"

"ناز و نہیں آئی.... اور غالب...؟"

"لاحول ولا قوۃ۔ ہم سے یہ بن بلائے مہمانوں کا سلوک ہو رہا ہے۔ وہ بھی آجاتے تو کیا ہوتا۔ اتنی مشکل سے تمہارا گھر تلاش کیا۔ گولیمار میں جھک مارتے رہے۔ گھنٹا بھر سے یہاں پھر رہے تھے۔"

"پہلے ٹیکسی والوں سے پوچھتے رہے۔ پھر چوکیدار سے تمہارے گھر کا نمبر لیا۔ فون نمبر اس نے دیا نہیں ورنہ تمہیں بلا لیتے کہ اپنے ساتھ لے جاؤ مگر تم تو واقعی پریشان ہو گئے ہو ہمیں دیکھ کے" رابعہ نے دل زدہ لہجے میں کہا "ایسی ہی بات ہے تو ہم چلے جاتے ہیں۔"

"ہاں۔ تم پتا بتادو گل اور محسن کا" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

اکرام نے آگے بڑھ کے میرا بریف کیس پکڑ لیا "سوری یار۔ تم بھی غلط سمجھے۔ اور ہم بھی۔ اب جانے کا کیا سوال؟"

کاجل نے رابعہ کے گلے لگ کے کہا "ایسا لگتا ہے کہ آپ کو کچھ پتا نہیں۔ آپ لوگ ایسے ہی آگئے ہو۔"

میں نے پریشانی سے کہا "یار کس بات کا پتا نہیں؟"

اکرام نے اسے گھورا "کاجل۔ آرام سے تو بیٹھنے دو انہیں ذرا۔ تم جاؤ کھانے کا انتظام کرو۔"

میں نے کہا "نہیں۔ پہلے بتاؤ بات کیا ہے؟"

ہم ان کے مختصر سے ڈرائنگ روم میں صوفوں پر بیٹھ گئے۔ رابعہ کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگی تھیں۔ ان میاں بیوی کے رویئے سے صاف پتا چلتا تھا کہ وہ کچھ چھپا رہے ہیں۔

بالآخر اکرام نے کہا "تمہیں واقعی پتا نہیں۔"

"کس بات کا یار۔ ہم تو ایسے ہی اچانک جہاز میں بیٹھے اور پہنچ گئے کسی کو بتائے بغیر۔"

اکرام نے کہا "یار میں ابھی واپس آیا ہوں۔ قبرستان سے۔"

میرا دل ڈوبنے لگا "قبرستان....!"

رابعہ چلائی "اکرام۔ کیا ہوا ہے' بتاتے کیوں نہیں؟"

"وہ ایک حادثے میں.... اُن دونوں کا انتقال ہوگیا۔"

"کس کا۔ محسن اور گل..."

"نہیں۔ فوزیہ اور اُس کا شوہر۔" اکرام شیخ بولا "فوزیہ کو ہسپتال جانا تھا۔ وہ پھر امید سے تھی۔ اس کے شوہر کا ایوننگ کالج نزدیک تھا۔ تھوڑا سا آگے۔ دونوں رکشا میں تھے۔ دس نمبر لالوکھیت

میں نے کہا "نماز یہاں بھی پڑھ سکتے ہو تم اور کھانا..."

رابعہ نے میری بات کاٹ دی "تم کو معلوم ہے پرنسپل کہاں رہتی ہیں؟"

"معلوم ہے جی۔ بچے کو داخل کرانا ہے تو صبح آفس میں ملو۔ گھر پر جاؤ گے تو بے عزتی کراؤ گے اپنی بھی اور میری بھی۔"

میں نے غصے کو ضبط کرکے کہا "ہمیں کسی کو داخل نہیں کرانا ہے۔ تم ہمیں اُن کے گھر پہنچادو۔ گھر معلوم ہے نا؟"

"گھر تو معلوم ہے مگر میں کیسے جاسکتا ہوں ڈیوٹی چھوڑ کے؟"

اس نے طنز سے کہا "نمبر لے لو۔ پوچھ لینا لوگوں سے۔"

"ان کے گھر پر فون تو ہوگا۔ تم فون کرکے انہیں بتاؤ کہ لاہور سے رابعہ اور سکندر آئے ہیں۔"

"میں کہاں سے فون کروں۔ فون اندر بند ہے اور ان کے گھر کا فون نمبر دینے کا آرڈر نہیں ہے۔ ہر ایرے غیرے کو۔"

"ہم ایرے غیرے نہیں ہیں" رابعہ نے خفگی سے کہا "اپنے لوگ ہیں۔"

"اس لیے نہ گھر کا پتا ہے نہ فون نمبر معلوم ہے" اس نے طنز جاری رکھا۔

اُس کے دیئے ہوئے پتے کو تلاش کرتے کرتے ہمارا تھکن سے برا حال ہوگیا۔ رابعہ خفا تھی کہ میں نے چوکیدار کو فرض شناسی پر لیکچر دے کر ناراض نہ کیا ہوتا تو وہ ہمارے ساتھ آجاتا۔ میرا خیال تھا کہ سارا قصور نمبر لگانے والوں کا ہے۔ خواہ مخواہ بلاک نمبر سیکٹر نمبر اور اے پی سی ڈی لگا کے آسان پتے کو مشکل بنادیا ہے۔ مکان نمبر اور گلی نمبر کافی ہوتا۔ خود وہ ہماری رہنمائی نہ کرسکے جن سے ہم نے پتا پوچھا۔ یا تو وہ بھی ہماری طرح اجنبی تھے یا پھر واقعی انہیں گرد و پیش کی خبر نہیں تھی۔

رات کے دس بجنے والے تھے جب اچانک گھر مل گیا۔ ہم نے دیکھا تو نمبر بھی وہی تھا۔ رابعہ نے فوراً کال بیل دبادی۔ ایک منٹ بعد خود کاجل دروازے پر آئی اور کچھ دیر ہمیں یوں دیکھتی رہی جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔

رابعہ نے کہا "ارے کاجل۔ میں رابعہ ہوں' کیا ہوگیا ہے تمہیں؟"

اُس نے سر ہلایا اور دروازہ کھول دیا "آئیں' اندر آجائیں۔"

اُس کا بجھا بجھا چہرہ اور سرد مہری کا رویّہ دیکھ کے مجھے حیرانی ہونے لگی "کیا بات ہے؟ تم خوش نہیں ہوئیں ہمیں دیکھ کے؟"

وہ زبردستی مسکرائی "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

رابعہ نے کہا "اکرام کہاں ہے؟"

"وہ.... اندر ہیں۔"

اندر سے اکرام کی آواز آئی "کون ہے کاجل؟" پھر وہ خود تولیے سے ہاتھ صاف کرتا نمودار ہوا اور ہمیں دیکھ کے ٹھٹک گیا۔

"تم....!"

پر ایک ٹرک نے پیچھے سے ٹکر ماری۔ فوزیہ تو وہیں مرگئی تھی۔ اس کا شوہر اسپتال پہنچ کے مرا۔"

"او مائی گاڈ۔ کس وقت ہوا یہ...؟"

"ساڑھے تین بجے۔ ٹرک ڈرائیور پکڑا نہیں گیا" وہ بولتا گیا۔

مگر میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔ اس وقت بھی ساڑھے تین ہی بجے تھے جب مجھے اچانک کراچی جانے کا خیال آیا تھا۔ کیا یہ محض اتفاق تھا یا دنیا سے رخصت ہوتے وقت فوزیہ کی آواز نے میرے دل کو آخری بار پکارا تھا۔ یہ زندگی تم سے چاہت کے جرم کی سزا تھی جو میں نے ہنسی خوشی کاٹ دی۔ وہ جو قرض رکھتے تھے جان کا وہی قرض آج چکادیا۔ اب نہ تم سے گلہ ہے نہ فریاد۔ مجھے اس کا آخری خط یاد آرہا تھا۔

روتے روتے رابعہ نے کہا "یہ حادثہ نہیں ہوسکتا۔"

اکرام شیخ نے سرہلایا "عینی شاہدین کا یہی کہنا ہے۔ ٹرک نے انہیں جان بوجھ کے ٹکر ماری تھی۔ رکشا بالکل بائیں کنارے پر تھا اور سڑک خالی تھی۔ ٹرک بہت دور تک رکشا کو گھسیٹتا ہوا لے گیا تھا۔ دوبارہ پیچھے سے ٹکر ماری تھی مگر اس کے بریک فیل نہیں ہوئے تھے۔ اپنا کام ختم کرنے کے بعد ٹرک آگے گیا اور درمیان کے ایک کٹ سے گھوم کے واپس چلا گیا۔"

"آپ کو کیسے معلوم ہوا؟ کیا محسن نے فون کیا تھا؟" کاجل بولی۔

میں نے نفی میں سرہلایا "ہمیں کسی نے فون نہیں کیا تھا؟"

"اب محسن کہاں ہے اور گل؟" رابعہ نے کہا۔

"وہ دونوں وہیں ہیں۔ گل اور محسن دونوں فوزیہ کے گھر میں ہیں۔ ہم بھی واپس جانے والے تھے۔ آئے تھے کہ کچھ کھانے کے لیے لے جائیں۔"

"آخر ان سے کسی کو کیا دشمنی ہوسکتی تھی؟" کاجل نے کہا۔

"دشمن تو وہ ہمارے تھے" میں نے کہا "ہمیں ماردیتے اگر ان کا بس چلتا مگر انہوں نے فوزیہ کا گھر تاڑلیا۔ افسوس کہ فوزیہ نے بھی بہت دیر سے بتایا۔ ورنہ شاید ہم کچھ کرتے۔"

کاجل نے آنسو پونچھ کے کہا "دو سال کا ایک بچہ بھی ساتھ تھا مگر خدا نے اسے محفوظ رکھا۔ وہ پہلی ٹکر میں اچھل کے باہر جاگرا تھا۔ یہ بھی معجزہ ہے قدرت کا۔"

"مرجاتا وہ بھی ماں باپ کے ساتھ ہی تو اچھا تھا" میں نے تلخی سے کہا۔

"وہ محسن کے پاس ہے۔ کیسی عجیب بات ہے۔ گل اور محسن چند دن پہلے ہی تو کسی بچے کو گود لینے کی بات کررہے تھے..."

"وہ کیوں؟" میں نے سوالیہ نظروں سے اکرام کو دیکھا "ابھی تو شادی ہوئی ہے ان کی۔"

"ہاں۔ مگر گل ماں نہیں بن سکتی تھی۔ محسن کو پہلے سے معلوم تھا۔"

میں دم بخود رہ گیا "محسن کو کیسے معلوم تھا؟"

"اسے گل نے بتادیا تھا۔ شادی سے پہلے ہی جب وہ بھائی ڈاکو شیش ناگ کے ساتھ تھی تو ایک بار حادثہ پیش آ... ناگ منی... میرا مطلب ہے گل بانو کو گولی لگ گئی تھی... آپریشن ہوا تھا کسی اسپتال میں۔ جان تو بچ گئی تھی... ڈاکٹروں نے اسی وقت بتادیا تھا کہ اب یہ ساری عمر ماں نہ بن سکے گی۔ ڈاکٹرز رحم نکالنے پر مجبور ہوگئے تھے۔ دونوں کسی یتیم بچے کو گود لینا چاہتے تھے اور دیکھو قسمت کی ستم ظریفی۔ انہیں ایک بچہ مل گیا جس سے ان کا خون کا رشتہ بھی ہے۔"

یہ محسن کی بدقسمتی کی انتہا تھی تو اس کی کشادہ دلی... اور کردار کی مضبوطی کا قابل رشک پہلو کہ وہ دوستی اور محبت... ہمیشہ اپنے آپ کو قربان کرتا آیا تھا۔ وہ مانگنا جانتا ہی نہیں تھا... صرف دینا جانتا تھا۔ اس نے پہلے شہلا جیسی لڑکی کو سہارا دیا... جس کے گنہگار ماضی کی دلدل میں کوئی جھانکتا بھی تو اپنا دامن... بچاکے نکل جاتا۔ محسن نے اسے شریک حیات بناکے عزت بھی... اور محبت بھی۔ پھر جب دوستی کے تقاضے پورے کرنے کا وقت... اس نے اپنی بیوی اور بچے کو ایک عظیم تر مقصد پر قربان کردیا... اب مجھ پر انکشاف ہوا تھا کہ اس نے ڈاکو شیش ناگ کی بہن... منی کو اپنی زندگی دے دی تھی۔ محبت اور صرف محبت کی خاطر... میں سمجھتا تھا کہ وہ اپنا گھر آباد کرنے بیٹھ گیا مگر اس گھر میں کیا... سوائے حسرت تعمیر کے۔ اس نے وہ چمن قبول کیا تھا جس کی... بھی بے ثمر تھی اور خزاں بے نمو۔ اب اس نے اپنی بہن کی زندگی... بھی گنوادی تھی اور میں جانتا تھا کہ محسن کا مجرم میں ہوں مگر... محسن کو مجھ سے کوئی گلہ نہیں تھا۔

جب رات گیارہ بجے ہم نے کاجل اور اکرام کے ساتھ اس گھر میں قدم رکھا جہاں سوگوار فضا میں موت کا بوجھل پن تھا تو مجھے یہ سب ایک بھیانک خواب کی طرح لگا۔ یہ گھر فوزیہ کا تھا۔ اس فوزیہ کا جس کے بغیر میں سمجھتا تھا کہ زندہ رہنا ہی ناممکن ہے۔ اس گھر میں فوزیہ نہیں تھی۔ صرف اس کی یادوں کا عکس ہر طرف اپنے وجود اور عدم کا احساس دلاتا تھا۔ اس کا گھر وہ بھی تو جہاں میں دھڑکتے دل اور حسرت دید کے ارمان لے کر جاتا تھا... گھر سے رخصت ہوجانے کے بعد میں نے فوزیہ کو نہیں دیکھا تھا اور اس کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ اس کی خوش و خرم زندگی پر بھی میرے حالات کا منحوس سایہ پڑنے لگا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ براہ راست مجھ سے اپنے گھر کی سلامتی کی بھیک مانگنے پر مجبور ہوگئی۔

یہاں آتے ہوئے ہم کتنے خوش تھے مگر کسے معلوم تھا کہ تقدیر ہم پر ہنس رہی ہے۔ اب اس اجنبی گھر میں قدم رکھتے ہوئے میرا سر احساس جرم وندامت سے جھکا ہوا تھا لیکن محسن وہی محسن تھا۔ مجھ سے گلے مل کے بہت رویا "یار، تو نے اچھا کیا کہ آگیا۔ آج سب بہت یاد آئے جو یہاں نہیں تھے۔ نازو اور غالب کیوں نہیں آئے۔"

منظر کو معلوم تھا؟"

"ہاں۔ اس سے میری بات ہوجاتی تھی۔ تمہاری خیر خبر بھی ملتی رہتی تھی۔"

"اس نے کبھی مجھ سے تذکرہ نہیں کیا۔"

"ہاں۔ وہ چاہتا تھا کہ اب ان معاملات سے میں دور رہوں اور تمہیں کچھ پتا نہ چلے۔ تیرے لیے ویسے ہی کم پریشانیاں تھیں؟"

"زیادہ پریشانیاں میری وجہ سے دوسروں کے لیے ہیں۔ اتنا ساتھ دیا ہے تم سب نے میرا کہ میں احسان کے بوجھ تلے دب کررہ گیا ہوں۔ اتنی قربانیوں کا قرض ہے مجھ پر۔"

"فضول باتیں کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ رشتے اور کس لیے ہوتے ہیں۔ دعوتوں اور تقریبات میں بلانے سے تو سب ہی آجاتے ہیں۔ خلوص اور محبت کی کسوٹی ہوتا ہے برا وقت۔ برا وقت کسی پر بھی آسکتا ہے۔ آج تجھ پر ہے۔ کل مجھ پر آجائے تو کیا میرا ساتھ کوئی نہیں دے گا؟"

میں نے کہا "محسن۔ اس میں تو شک کی گنجائش ہی نہیں کہ وہ مارا مجھے دینا چاہتے تھے اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہے۔ میں تمام عمر اپنے آپ سے شرمسار رہوں گا کہ فوزیہ کا ہنستا بستا گھر میری وجہ سے اجڑا۔ شکاری اس کے پیچھے لگ گئے تھے اور بالآخر انہوں نے اسے شکار کرلیا۔ انہیں دوڑا دوڑا کے ماردیا..."

"قتل تو یہ ہے مگر جب تک ثبوت نہ ہو..."

"کیا تو نے خود معلوم کیا تھا؟ کسی نے تو ڈرائیور کو دیکھا ہوگا۔ ٹرک کا نمبر نوٹ کیا ہوگا۔ وہ ٹرک کیسا تھا؟"

میں نے تو نہیں مگر اکرام نے پوچھا تھا۔ ٹیکسی چلانے والوں کی برادری سے اپیل کی تھی کہ حادثے کے وقت کوئی ٹیکسی وہاں سے گزر رہی تھی تو کسی ڈرائیور نے کچھ دیکھا تھا۔ ٹیکسی والوں نے رکشا چلانے والوں کی یونین سے رابطہ کیا۔ وہ اپنے ایک ساتھی کی موت پر پہلے ہی مشتعل تھے۔ سنا ہے پولیس کو کسی نے گمنام اطلاع دی تھی مگر انہوں نے اہمیت نہیں دی۔ لالو کھیت کے تھانے میں کسی نے فون پر حادثے کی اطلاع دی تو وہاں ایک رکشا والا حوالات میں بند تھا اور ایک کو تھانے دار نے مرغا بناکے کان پکڑوا رکھے تھے۔ اس نے تھانے دار کی بیوی سے پیسے مانگ لیے تھے کرائے کے۔ اس نے کچھ سنا تھا۔ تھانے دار بہت گرمی دکھا رہا تھا۔ حلیہ دیکھ لیا ڈرائیور کا، ٹرک کا نمبر نہیں دیکھا۔ یہ بھی نہیں دیکھا کہ کس کمپنی کا ٹرک ہے۔ کالا رنگ، گھنگھریالے بال، موٹے ہونٹ تو کسی بھی مکرانی کے ہوسکتے ہیں۔ اور وہ کانوں میں سونے کی مندریاں بھی پہن سکتے ہیں۔"

میں نے چونک کے کہا "یہ بھی بات ہوئی تھی؟"

"ہاں۔ اور اس سے مجھے شک پڑتا ہے کہ وہ استاد پیڈرو نہ ہو۔"

"وہی حرام زادہ ہوگا محسن۔ وہ پچھلے دنوں کراچی آیا ہوا تھا۔

...نے نظر ملائے بغیر کہا "انہیں معلوم ہی نہیں۔ ہم بھی کسی وجہ کے بغیر اچانک ہی ٹکٹ لے کر جہاز میں بیٹھ گئے۔ دوپہر کو کھانا کھانے کے بعد میں نے رابعہ سے کہا کہ چلو کراچی چلتے ہیں۔ اس نے کہا چلو، ٹکٹ بھی مل گئے۔ پتا نہیں یہ سب کیسے ہوا؟"

"مجھے بھی یقین تھا۔ ایسے میں دل چاہتا تھا کہ تو بھی ہوتا تو ہم فوزیہ کی باتیں کرتے۔ تجھ سے اور مجھ سے زیادہ اسے کون جانتا تھا۔ ہم تو جب پیدا ہوئے تب سے ساتھ تھے...." وہ روتے روتے پرانے وقتوں کی یادوں میں کھوگیا۔ ہم کہاں کہاں ایک ساتھ تھے۔ کس شہر میں ہمارا گھر کہاں تھا؟ ہم کیسے اکٹھے کھیلتے تھے۔ کیسے لڑتے تھے۔ کیسے روٹھ جاتے تھے۔ انکل شیروانی، وزیر خان کیسے دوست تھے۔ یادیں، باتیں، پچھتاوے، مایوسیاں۔ ٹھیک ساڑھے تین بجے حادثہ پیش آیا اور فوزیہ نے کہا خدا حافظ۔ میں نے ٹھیک ساڑھے تین بجے کہا کیوں نہ میں کراچی ہو آؤں۔ یہ کیا تھا؟ اتفاق... ٹیلی پیتھی... اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ کریدتے ہو جواب راکھ جستجو کیا ہے؟

فوزیہ کا بیٹا ہو بہو اس کی شکل کا تھا۔ اس کے شوہر سے میں کبھی نہیں ملا تھا۔ میں نے اس کی تصویر پہلی بار دیکھی۔ پھر رات کو ہم پرانے البم دیکھتے رہے۔ کاجل اور گل رو دھو کے سوگئی تھیں۔

"تو نے مجھے اطلاع تک نہیں دی" میں نے کہا۔

"مجھے گل نے روک دیا تھا۔ پھر اکرام نے بھی کہا کہ کیا فائدہ۔ چند گھنٹے میں تو سب کچھ ختم ہوگیا..."

"مجھے کچھ روز پہلے فوزیہ کا ایک خط ملا تھا" میں نے کہا۔

"اچھا۔ کیا لکھا تھا اس نے؟"

میں نے جیب میں سے خط نکال کے اسے دے دیا۔ اس کا چہرہ تاریک ہوگیا۔ اس کی نظریں خط کے الفاظ پر جم کے رہ گئی تھیں۔ شاید کئی بار پڑھنے کے بعد اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور خط مجھے واپس کردیا۔ میں نے اسے اکرام شیخ کی طرف بڑھادیا۔

میں نے کہا "محسن۔ میرے دل پر بڑا بوجھ ہے۔ میں کیا کروں؟ یہ سب میری وجہ سے ہوا؟"

"چھوڑ یار۔ تقدیر سے لڑسکتا ہے کوئی۔ چچا وزیر خان کا قتل کیوں ہوا تھا؟ میری ماں کو کینسر کیوں ہوا تھا۔ انکل ضامن رضوی، استاد نیڈی، شہلا، یہ سب ہی اچھے لوگ تھے۔ انہیں کس کے جرم کی سزا ملی۔ اصل سزا تو زندہ بچ جانے والوں کے لیے ہوتی ہے۔ جو احساس کے عذاب سے گزرتے ہیں..."

میں نے کہا "تو فوزیہ سے کیوں نہیں ملتا تھا۔ ایک ہی شہر میں تھے تم اور اسے تمہاری خبر نہیں تھی؟"

"میں جان بوجھ کے اس سے دور رہا۔ میں چاہتا تھا کہ اسے میری بہن ہونے کی سزا نہ ملے لیکن میں اس سے بے خبر نہیں تھا۔ میں اس کے شوہر سے کالج میں مل لیتا تھا۔ وہ بھی پریشان تھا لیکن وہ حوصلہ مند آدمی تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ باہر چلے جائیں۔ منظر نے کچھ بندوبست کردیا تھا۔ میں پوری حفاظت کررہا تھا فوزیہ کی۔"

اور اُس کا اصل مقصد تجھے اغوا کرنا یا نقصان پہنچانا تھا۔ وہ گل کو بھی پکڑوانا چاہتے تھے کہ یہ ناگ منی ہے جو روپوشی کی زندگی گزار رہی ہے۔"

محسن سوچ میں پڑ گیا "ایک بات اور بھی ہے۔ یہاں زیادہ تر ٹرک ڈرائیور پٹھان ہیں۔ سرحد' بلوچستان کے رہنے والے۔ پنجابی کم ہیں۔ مکرانی تو نہ ہونے کے برابر ہیں۔ کم سے کم میں نے اس علاقے کا کوئی ٹرک ڈرائیور آج تک نہیں دیکھا۔"

"یہ بات جس رکشا والے نے سنی تھی۔ وہ کون ہے؟"

"ابھی کچھ معلوم نہیں لیکن پتا چل جائے گا کل پرسوں میں۔"

"جس تھانے دار نے فون ریسیو کیا تھا کیا وہ خود جائے واردات پر گیا تھا؟"

"نہیں۔ اس نے تو فون کرنے والے کو ڈانٹ کے فون بند کردیا تھا کہ جب پتا نہیں ساری بات کا تو وقت کیوں ضائع کرتے ہو۔ ایسے فون پر رپورٹ نہیں لکھی جاتی۔"

"اس تھانے دار اور اس رکشے والے کا پتا چلانا ضروری ہے جو وہاں مرغا بنا ہوا تھا..."

"کچھ نہیں ہوگا اس سے سکندر۔ فرض کرو وہ استاد پیڈرو ہی تھا پھر؟ کیا ہوگا اگر یہ معلوم ہوگیا۔ اول تو پولیس بہانے تلاش کرتی ہے کوئی کارروائی نہ کرنے کے۔ معلوم ہے رپورٹ کیا لکھی گئی ہے حادثے کے بارے میں؟ تفتیشی افسر صاحب کا کہنا ہے کہ رکشا غلط سائیڈ پر تھا۔ اس کا اگلا ٹائر بہت پرانا ہونے کی وجہ سے پھٹ گیا تھا اور غالباً اسی وجہ سے رکشا بے قابو ہوکے ٹرک کے سامنے آگیا۔ ٹرک ڈرائیور جان بچانے کے لیے فرار ہوا ورنہ مجمع اسے آگ لگادیتا۔ اس کے علاوہ اگر یہ کام استاد پیڈرو کا تھا تو وہ اسی وقت لاہور چلا گیا ہوگا۔ پہلی فلائٹ سے۔ اور دو گھنٹے بعد لاہور میں ہوگا۔ وہاں ایک نہیں دس گواہ ہوں گے یہ ثابت کرنے والے کہ وہ تو لاہور سے کہیں گیا ہی نہیں تھا۔"

میں نے کہا "خیر۔ ہم خود پیڈرو سے پوچھ لیں گے۔ لیکن اب تیرا یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔ ان کا ٹارگٹ تو تھا۔ تیرا سراغ نہیں لگاسکے وہ۔ اگر تو نے سامنے آکے تفتیش شروع کی تو انہیں آسانی ہوجائے گی۔"

اکرام شیخ زیادہ قریب ہی رہا تھا۔ اس نے میری تائید کی۔

"محسن کو تو جنازے میں ہی دیکھ لیا گیا ہوگا۔ وہاں کم لوگ تھے۔ ابھی ہمارے زیادہ جاننے والے نہیں ہیں یہاں۔"

میں نے کہا "تم ہمارے ساتھ چلو۔"

اکرام نے کہا "ہاں۔ ان حالات میں ان دونوں کا یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ ایک ذمّے داری بھی قبول کرلی ہے تم نے۔ کہیں ایسا نہ ہو..."

"نہیں یار۔ ایسا مت کہو۔ گل مرجائے گی اگر اس بچّے کو کچھ ہوا۔"

"پھر تم کو یہاں ایک دن بھی نہیں رکنا چاہیے۔" میں...

"وہاں ہم سب ہیں۔"

"تم سب مل کے بھی کیا کرسکتے ہو۔ ہونے والی بات تو بھی ہوسکتی ہے۔" محسن بولا "خیر صبح بات کریں گے۔"

میں نے کہا "تم سو جاؤ۔ مجھے ایک فون کرنا ہے لاہور۔"

"یہاں تو فون نہیں ہے" محسن بولا۔

"فون اسکول میں ہے" اکرام نے کہا "ابھی ضرورت ہے تو چلو۔"

جب ہم باہر کھڑی ہوئی ٹیکسی میں بیٹھے تو گلیوں میں رات سناٹا تھا۔ ہمیں اسکول پہنچنے میں دس منٹ بھی نہیں لگے... سویا پڑا تھا۔ اکرام شیخ نے اسے جگایا تو مجھے دیکھ کے وہ... بولا نہیں۔ اس نے پرنسپل کے کمرے کا تالا کھول دیا۔ اکرام... کا نمبر ملانے لگا۔ رات کے وقت لائنیں بھی خالی تھیں... کال دس منٹ میں ملادی گئی۔ یہ پی پی کال تھی' دوسری طرف خادم حسین بول رہا تھا۔

میں نے کہا "مولوی خادم حسین۔ کیا حال ہے تمہارا؟"

"اب حال پوچھتے ہو جی" وہ ایک دم پھٹ پڑا "مجھے مصیبت میں ڈال کے خود غائب ہوگئے۔"

میں نے تشویش سے کہا "آخر کیا ہوا؟ کچھ بتاؤ تو سہی۔"

وہ دھاڑیں مار مار کے رونے لگا "وہ آئی تھی جناب۔ دلاور گھروالی۔ اپنی حرام کی اولاد کے ساتھ۔ ماں بیٹا دونوں کے ہاتھ... خطرناک اسلحہ تھا۔ زبردستی مجھے لے گئے..."

"کہاں لے گئے؟" میں نے چلّا کے کہا "خادم... ہیلو' ہیلو!"

لیکن لائن کٹ گئی تھی یا کاٹ دی گئی تھی۔

...والی کے' دیکھ رہا تھا کہ وہ لال جوڑے میں کیسی لگے گی اور ...آہ... اور وہ گوٹے والا پراندہ... سوچ رہا تھا کہ ...کیا میں جاؤں... بس جی اتنے میں ہوا کھٹکا اور آگئی اندر ...کی غیر منکوحہ بیوی... ہاتھ میں اس کے تھا اتنا بڑا ...دو ہاتھ کا۔"

...ہنس کے کہا "تو یہ کہو نا کہ توپ لے کر آئی تھی۔"

...توپ کا گولا اور ریوالور کی گولی... تھوڑا سا چھوٹے بڑے کا ...کام تو ایک ہی ہے دونوں کا۔ بس جی اس نے رخ میری ...اس کا اور کہنے لگی کہ مولوی' اٹھو اور شرافت سے ...ساتھ چلو... میں نے کہا کہ دیکھو میں شادی شدہ اور بڑا ...ہوں مگر یہ گناہ نہیں کرسکتا میں... پیچھے سے آگیا وہ نطفہ ...جس کی ولدیت کے خانے میں بلاوجہ چوہدری دلاور کا نام ...ہوا ہے۔ اس نے ہاتھ ماردیا جی میرے۔ منہ میں سارے ...گئے تھے۔ لونڈا نظر آتا ہے مگر بڑا کرارا جوان ہے ...حرامی نے گردن دبوچ لی میری اور مجھے باہر دھکیل دیا کہ چلو ...ساتھ اور بتاؤ کہ ڈیڈی کہاں ہیں... میں نے کہا کہ... کون ...ڈیڈی۔ تو اس نے پھر دھکا دیا مجھے کہ چوہدری دلاور صاحب... ...اس کی ماں... وہ بیٹے کو روکنے کے بجائے کہہ رہی تھی کہ ایک ...اور مار اس کے فیصل پھر اسے یاد آجائے گا سب۔ ورنہ یہ ...پوچھے گا کہ کون سے چوہدری دلاور صاحب؟ میں نے... میں ...کہا... کیا وہ ہیں اس کے ڈیڈی... پکا پتا ہے تمہیں؟ یہ کون ...بات پوچھی تھی میں نے جی؟ وہ تو ٹوٹ پڑی مجھ پر جناب۔ وہ ...اور اس کا بیٹا... دونوں نے آہ... آملیٹ بنادیا میرا ...بلڈنگ خالی تھی... میری سننے والا کوئی بھی نہیں تھا" وہ پھر ...رونے لگا۔

میں نے کہا "خادم حسین۔ یہ کیا بات ہوئی تم مرد ہوکے روتے ہو' شرم آنی چاہیے تمہیں۔ تم نے مقابلہ نہیں کیا ان کا۔ ...مار کھاتے رہے۔"

"حد کرتے ہیں آپ جی۔ ساتواں... اور چوبیسواں... پھر غالباً ...نمبر مکا میں نے مارا تھا۔ وہ دو تھے جناب' انہوں نے مل کے ...کل ارتیس ضربات خفیف و شدید لگائی تھیں۔"

میں نے ہنس کے کہا "یعنی تم گنتے بھی جارہے تھے؟"

"ہاں جی۔ ایک ایک کا بدلہ جو لینا ہے آپ کو۔ ورنہ یومِ حشر ...پورا حساب ہوگا جی... میں نے بھی کمی نہیں رکھی۔ چن چن کے ...ایسی گالیاں دیں انہیں... کہ پہلے نہیں سنی ہوں گی... آہ۔"

میں نے کہا "وہ سمجھے ہی نہیں ہوں گے تمہاری فارسی۔ اردو ...پنجابی کیا بسماٹ گالیاں ہوتی ہیں خادم حسین۔"

"توبہ کریں جی۔ میں اپنی زبان ناپاک کرتا... اور پھر عورت کے سامنے تو نظر بھی جھک جاتی ہے میری۔ وہ بک رہی تھی اول فول۔ ...شرم تو عورت کا زیور ہے..."

تھوڑی سی کوشش کے بعد لائن پھر مل گئی اور خادم حسین نے بھیں بھیں روتے ہوئے کہا "ہیلو' ہائے۔"

میں نے کہا "خادم حسین۔ یہ کیا تم گوروں کی طرح ہیلو اور ہائے کررہے ہو۔ مجھے سخت تشویش ہورہی ہے۔ تم ٹھیک تو ہونا؟"

"کمال ہے جی... میں کوئی ایکٹنگ تو نہیں کررہا ہوں... بے شک خوشی میں بھی بندہ روتا ہے مگر ایسے نہیں... آہ۔ دماغ ٹھیک کردیا ہے اس نے میرا۔ اوئے... مگر باقی سب کچھ ختم۔ کچھ نہیں چھوڑا۔"

"کس نے... اور تم اتنا چلّا کیوں رہے ہو؟"

"لو جی اب کیا چلّانے پر بھی پابندی ہے۔ یہ تو وہی بات ہوگئی... جو کسی شاعر نے کہا ہے۔ نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی... آہ..! گھٹ کے مرجاؤں یہ مرضی میرے صیاد کی ہے... ہائے۔"

مجھے غصہ بھی آیا اور ہنسی بھی۔ شعر کے آخر میں آہ اور ہائے کا اضافہ مولوی خادم حسین نے کیا تھا "دیکھو' حوصلہ رکھو۔ کیا تم خدانخواستہ بہت زخمی ہو۔ دلاور کی بیوی تمہیں کہاں لے گئی تھی اور کیوں' پوری بات بتاؤ۔"

"کیا بتاؤں جی... مجھے وہ نہیں۔ قضا لے گئی تھی... اور سچی بات تو یہ ہے کہ قضا پہلے مجھے آپ کے پاس لے آئی تھی۔ گھروالی کی بددعا لگی ہے مجھے۔ ظالم نے بڑی جلدی کی بددعا میں بھی۔ کل تک انتظار کرلیتی۔ سارے گلے شکوے دور کردیتا اس کے... آہ... کتنے ارمانوں سے یہ ریشمی سوٹ... سونے کے زیورات۔ جوتیاں' پراندے' ہائے کیا کچھ نہیں لیا تھا اس کے لیے مگر توبہ... توبہ رب جی۔ میری دعا بڑی دیر میں سنی۔ اس کی بددعا فوراً سن لی۔"

میں نے جھنجلاہٹ اور کوفت پر بڑی مشکل سے قابو پایا "کوئی بات نہیں خادم حسین۔ یہ سب دو گے اسے تو وہ خوش ہوجائے گی۔ اب ذرا آرام سے مجھے بتاؤ۔"

"آرام سے۔ آہ' آرام اب کہاں مقدر میں جی۔ سیدھا بیٹھ نہیں سکتا۔ نہ لیٹ سکتا ہوں۔ نہ کھڑا ہوسکتا ہوں۔ ہر طرف سے... ساری ہڈیاں ہل گئی ہیں... دو سو بیالیس ہڈیاں ہوتی ہیں جناب آدمی کے جسم میں... میری شاید ڈھائی تین سو بن گئی ہیں۔"

"کیا ہڈیاں ٹوٹ گئی ہیں... کیسے...؟"

"آپ سامنے ہوتے جی... پھر بتاتا کوئی ہڈی توڑ کے... کہ ایسے... ہڈی کیسے ٹوٹتی ہے جناب۔ سینے کی سب پسلیاں گوڈے گٹے' ریڑھ کی ہڈی' گردن کا منکا... سب ٹوٹے ہیں غالباً۔"

"غالباً' کیا فضول بکواس ہے یہ۔ مجھے تو لگتا ہے کہ کچھ بھی نہیں ہوا ہے' سیدھی طرح بتاؤ۔"

"ہائے۔ سیدھا ہوا نہیں جاتا۔ سیدھی طرح کیا بتاؤں۔ وہ آئی تھی۔ فلاں فلاں کی غیر منکوحہ بیوی۔ ناپاک جانوروں کا نام کیسے لوں جی۔ وہی دلاور کی منکوحہ۔ میں بیٹھا تھا اس کے تصور میں گم۔

"اچھا بات مختصر کرو۔ پھر وہ کہاں لے گئے تمہیں؟"
"وہ تو پہنچا دیتے اوپر لیکن میں جان بچانے کے لیے خود ہی نیچے چلا گیا... اب دیکھیے جی' یہ سب آپ کی غفلت اور نااہلی کے باعث ہوا۔ گیٹ اگر مقفل ہوتا تو وہ خاموشی سے اوپر کیسے آتے۔"
"یہ تو ٹھیک ہے۔ وہ مجھ سے پوچھ کے اوپر آتے۔ تم بھی احمق ہو خادم حسین۔ تم آفس کا دروازہ کیوں موے بیٹھے تھے؟"
"میں کچھ استغراق کی کیفیت میں تھا جی۔ نیچے گاڑی موجود تھی ان کی... وہ آگے بیٹھ گئی اور مجھے اس کی اولاد نے پیچھے گدے کی طرح بچھا دیا جناب اور میرے اوپر بیٹھ گیا۔ اسی سے ریڑھ کی ہڈی کے منکے ٹوٹے..."
"ڈراما مت کرو مولوی خادم حسین۔ تمہیں کچھ نہیں ہوا ہے۔ مجھے معلوم ہے' ورنہ تم اسپتال میں ہوتے یا قبرستان میں۔"
"افسوس۔ صد افسوس۔ کوئی قدر نہیں آپ کی نظر میں خادم کی وفا... کی۔ میں نے بہت پوچھا کہ ایسے غیر قانونی اور غیر اخلاقی طریقے پر مجھے کہاں لے جا رہے ہو۔ میں رپورٹ لکھوا دوں گا پولیس کو۔ اس خبیث الدہر کے ہاتھ میں ایک خنجر تھا۔ وہ لہرانے لگا میری ناک کے سامنے اور بولا کہ تمہیں آپریشن کے لیے لے جا رہے ہیں۔ تمہارے اعضائے رئیسہ کاٹ کے دیکھیں گے کہ آخر تم چیز کیا ہو۔ سر کاٹیں گے اور مغز چیک کرائیں گے کہ اس میں گوبر کتنے فیصد ہے اور بھوسا کتنا۔ عقل کون سی ہے۔ مردانہ زنانہ یا درمیانہ۔ اس کی ماں تو نہال ہو رہی تھی بیٹے کی باتوں پر۔ توبہ توبہ' حیا اور شرافت تو اٹھ گئی ہے زمانے سے۔"
"تمہیں بالکل اندازہ نہیں کہ وہ تمہیں کہاں لے گئے تھے؟"
"اندازہ تو مجھے صرف اس کے وزن کا ہو رہا تھا اور سانس رکنے سے نزع کا عالم تھا۔ یہی لگتا تھا جی کہ سفر آخرت ہے۔ بس کلمہ پڑھتا رہا میں۔ ان کا گھر ہی ہو گا وہ جہاں مجھے گھسیٹ کے نیچے ڈال دیا گیا تھا پھر منکر نکیر جیسے دو جلاد صفت ملازم مجھے اٹھا کے اندر لے گئے اور جناب وہاں مجھ پر بہت تشدد ہوا۔"
"کیا پوچھ رہے تھے وہ تم سے؟"
"پہلے تو چوہدری دلاور کے بارے میں پوچھتے رہے۔ ایک غالباً خانساماں تھا جی۔ کبھی میری آنکھوں میں مرچیں ڈالتا تھا۔ کبھی ناک میں گرم مسالا۔ ایک چمچہ بھر کے نمک بھی کھلا دیا اس نے۔ زبردستی' اس کا ارادہ کان میں خوب گرم سرسوں کا تیل بھر کے بتی ڈالنے کا بھی تھا۔ کہتا تھا کہ کان میں دیا جلاؤں گا تو مولوی کے دماغ میں روشنی ہو گی۔ دوسرا زیادہ بے رحم تھا جناب۔ اس نے مجھے الٹا لٹکا دیا پنکھے سے۔"
"واقعی۔ آئی ایم ویری سوری خادم حسین۔"
"ابھی کیا جی۔ آگے سنیں گے تو کلیجا منہ کو آ جائے گا۔" مولوی خادم حسین پر رقت طاری ہو گئی "رسی اس کے ہاتھ میں تھی۔ بار بار ڈھیلی چھوڑتا تھا اور پھر کھینچ لیتا تھا۔ وہ اولاد ابلیس۔ فیصل کہتا تھا کہ مولوی کا سر فرش پر لگے گا اور پاش پاش ہو جائے گا۔ میرے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا تھا اس نے۔ جب میں بے ہوش ہو گیا تو انہوں نے مجھے اتار لیا نیچے اور فرش پر ڈال دیا۔"
"تم واقعی بے ہوش ہو گئے تھے؟"
"نہیں جی۔ کچھ ڈراما تو کرنا ہی تھا جان بچانے کے لیے۔ ان کو پتا چل گیا۔ ایک بدمعاش سائیکل میں ہوا بھرنے کا پمپ لے آیا اور کہنے لگا کہ مولوی کو اوپر سے ائرٹائٹ کر دو اور ہوا بھرتے ہیں۔ ٹیوب کی طرح پھولے گا اور پھر پھٹ جائے گا۔ میں نے بھی جناب اللہ پر بھروسا کیا۔ میں نے کہا کہ تم مجھے شہید کر سکتے ہو مگر جو بات مجھے نہیں معلوم وہ کیسے پوچھ سکتے ہو مجھ سے۔ اس کی ماں بار بار کہتی رہی کہ دیکھو مار پیٹ اور تشدد ایسے مت کرو کہ الزام ثابت ہو جائے مگر اس کا نافرمان بیٹا ماں کی کہاں سنتا تھا۔ پھر وہ تنخواہ دار جلاد۔ اس کے ملازم' دونوں مجھے قتل کرنے کے بے حد شوقین نظر آتے تھے۔ انہیں یہ ڈر بھی تھا کہ زیادہ دیر ہوئی تو وکیلوں کے ٹولے کو پتا چل جائے گا۔ وہ گمشدگی یا اغوا کی رپورٹ والوں کو جگا دیں گے اور کہیں گے کہ ابھی تلاش کرو مولوی خادم حسین کو۔"
میں نے کہا "مجھے یہ بتاؤ کہ نتیجہ کیا نکلا؟"
"آپ کو ابھی تک یہ پتا نہیں چلا جی؟ افسوس' صد افسوس۔ میرا وہ حال ہو گیا ہے جناب جو رکشے کا ڈبل ڈیکر بس کی ٹکر سے ہوتا ہے یا شیر پر گولی چلانے کے بجائے توپ کا گولا داغنے سے ہو سکتا ہے۔ آپ پوچھتے ہیں نتیجہ کیا نکلا۔ میں خود نکل آیا وہاں سے۔ میرا جنازہ نہیں نکلا اور بدن سے جان نہیں نکلی۔ ورنہ انہوں نے کون سی کسر چھوڑی تھی؟"
"مجھے بہت افسوس ہے خادم حسین۔ واقعی بہت دکھ ہوا لیکن کیا تم نے کچھ بتایا؟"
"لاحول ولا قوۃ۔ اتنا بودا سمجھتے ہیں جی آپ مجھے۔ تم خدا... یہ تو کوئی آزمائش ہی نہیں تھی۔ اگر وہ مجھے ذبح کرتے' پھر بہ... کھال اتارتے۔ میری بوٹیاں بنا کے قیمہ کرنے والی مشین سے گزارتے پھر اس قیمے کو مرچ مسالے کے ساتھ پیس کے... کباب بنا دیتے اور کباب تیز آنچ پر ڈیزل آئل میں تل کے... کھلا دیتے تب بھی خادم کی زبان خاموش رہتی' مجھ سے ایک... اگلوانے کے لیے ان جیسے دس ہوتے اور دس دن تک دس... روز مشقت کرتے تو آخر میں خود ہی تھک کے ہار جاتے جی۔"
"آفرین ہے تم پر خادم حسین۔ مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ تم اندر سے اتنے سخت جان ہو اور اتنے بہادر ہو۔ اور کیا... انہوں نے؟"
"بس جی پہلے تو وہ اپنے مبینہ والد کا پوچھتا رہا پھر مجھے... بارے میں تو خود اس کی ماں فلاں فلاں کی غیر منکوحہ بیوی... غصہ آتا ہے جی۔ کیس ناپاک جانوروں کا تا...

زبان پر۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ آپ کہاں روپوش ہیں اور آپ کے بارے میں رابعہ بی بی کو اور ان کے دوستوں کو علم ہے یا نہیں؟ انہیں وہ وکیلوں کا ٹولہ کہتے ہیں۔ وکیلوں کے ٹولے کی باتوں سے کیا پتا چلتا ہے۔ کیا وہ آپ سے کہیں ملتے ہیں؟ کبھی بات کرتے ہیں آپ سے فون پر؟ میں نے کچھ نہیں بتایا جی۔ یہی کہا کہ مجھے معلوم نہیں۔ میرے سامنے کوئی بات نہیں ہوتی اور نہ میں نے کبھی آپ کو دیکھا ہے آتے جاتے۔ وہ آسانی سے ماننے والے لوگ نہیں تھے۔ اپنی کارروائی بھی کرتے رہے۔ ایک بار مجھ سے کہا کہ اچھا اب کلمہ پڑھو پھر وہ خانساماں جو کھا کھا کے بلڈوزر ہوگیا ہے۔ میرے منہ پر تکیہ دبا کے بیٹھ گیا۔ میری سانس رک گئی تھی۔ غالباً آخری سانس تھی وہ جناب کہ اس نے تکیہ ہٹالیا۔ اچانک فیصل کی ماں نے شور مچادیا کہ مولوی مرجائے گا پھر مجھے ایک اسٹول پر کھڑا کیا گیا۔ میرے منہ پر تکیے کا غلاف چڑھادیا۔ میرے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈالا اور رسی کو پنکھے کے ہُک سے باندھ دیا۔ ایک بار پھر دلاور کی بیوی آگئی اور بہت گرم ہوئی کہ جلاّدو یہ کیا کرتے ہو' یہ گھر ہے' پھانسی گھر نہیں ہے۔"

"یعنی سب مل کے ڈراما کررہے تھے؟"

"ہاں جی۔ اب تو ڈراما ہی لگتا ہے مگر اس وقت مجھے کیا معلوم تھا۔ وہ بیچ بچ لات مار کے اسٹول گرادیتا' میں دہشت سے بھی فوت ہوسکتا تھا۔ یا میرا ہارٹ فیل ہوجاتا فٹ سے۔"

میں نے کہا "خادم حسین۔ کتنی دیر مشقِ ستم کی انہوں نے تم پر؟"

"دو دن جناب.... آہ...."

میں نے کہا "بہت دیر بعد آہ کی تم نے۔ کیا بھول گئے تھے کہ تم ایک دردناک بیان دے رہے ہو۔"

"لو جی۔ کوئی مکا مار کے آپ کی ناک توڑ دے یا منہ میں ایک چمچہ نمک ڈال دے۔ نسوار کی طرح گرم مسالا سنگھائے اور سرمے کی طرح لال مرچیں آنکھوں میں ڈالے۔ تو کیا آپ بھول سکتے ہو۔ بس میں ضبط سے کام لے رہا تھا۔"

"خادم حسین۔ دو دن کہا تھا تم نے یا دو گھنٹے؟"

"کمال ہے جی۔ وہ مجھے منگل کو اغوا کرکے لے گئے تھے۔ بدھ کو رہائی ملی۔"

میں اس کی چالاکی سمجھ گیا "وقت بتاؤ۔"

"وقت... گیارہ بجے اغوا ہوا تھا میرا۔ رات ڈیڑھ بجے میں واپس پہنچا... اگلی تاریخ تو آگئی تھی جناب۔"

میں نے ہنس کے کہا "میرا اندازہ ٹھیک ہی تھا' دو گھنٹے۔"

"آپ کے ساتھ دو گھنٹے ایسا ہو... تو آپ کو لگے گا کہ دو دن آپ کی جان سولی پر اٹکی رہی۔ وہ تو بس اللہ کو منظور نہیں تھا کہ میری گھروالی عقد ثانی کرے۔"

"یہ کیا بے تکی بات ہے؟"

"بے تکی بات مت کہیں جی۔ یہی ہوتا ہے اس کمینی میں۔ عین عالمِ شباب میں بیوہ ہونے والی تو عدت کا زمانہ بھی مشکل سے گزارتی ہے اور یہ وقت بھی بر تلاش کرنے میں ہی گزارتی ہے۔ عورت کی ذات ہی بے وفا ہوتی ہے جناب۔ اگلی ششماہی میں کسی اور کی زوجہ ہوتی۔"

"مولوی خادم حسین۔ سب کو تو مت کہو اور کیا مرد ایسا نہیں کرتے مگر خیر... یہ وقت اس بحث کا نہیں ہے۔ تم بتاؤ کہ بالآخر جان کیسے چھوٹی تمہاری؟"

"بس جی۔ وہ مایوس ہوگئے تھے کہ میں کچھ جانتا نہیں یا بتاؤں گا نہیں۔ فیصل کہنے لگا کہ میں تھک گیا ہوں اور نیند بھی آرہی ہے مجھے۔ مولوی کو فریزر میں ڈال کے رکھوا دو ورنہ صبح تک خراب ہوجائے گا اور جناب اس کے بدمعاش ملازموں نے مجھے ڈالا بھی تھا فریزر میں مگر پھر نکال لیا۔ ایک کہنے لگا کہ چھوٹے چوہدری صاحب' کل تک رکھ کے کیا کریں گے اس حرام گوشت کو۔ دوسرا بولا کہ ہاں جی' ختم کریں اور گاڑ دیں کہیں پھر وہ آپس میں بات کرنے لگے کہ کہاں گاڑا جائے مجھے۔ ایک کہتا تھا کہ گاڑنے کے لیے گڑھا کھودنا پڑے گا۔ خواہ مخواہ محنت کرنے سے کیا فائدہ راوی میں ڈال آتے ہیں۔ دوسرا بولا کہ اتنی دور جانے کی کیا ضرورت ہے کسی بھی سڑک پر ڈال دو بوری میں بند کرکے۔ وہ بوری لے آئے' ایک بدمعاش نے کہا کہ کپڑے تو اتارلو اس کے۔ کسی کے کام آجائیں گے۔ دوسرے نے کہا کہ یہ ٹھیک ہے۔ اور جناب ایسی ذلت اٹھائی میں نے کہ اب بھی سوچ کے شرم سے پانی پانی ہوجاتا ہوں۔ میں نے بہت شور کیا مگر انہوں نے مجھے لباسِ فطرت میں کردیا۔ یہی کہا تھا نا آپ نے اور اسی وقت پھر وہ آگئی۔"

میں نے ہنسی کو ضبط کرکے کہا "فلاں فلاں کی غیر منکوحہ زوجہ؟"

"ہاں جی۔ اس کے سامنے مولوی خادم حسین کی کیا حالت ہوئی۔ میں تو واقعی چاہتا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور میں سما جاؤں اس میں مگر وہ بے حیا' وہ ہنس ہنس کے دہری ہوگئی۔ کہنے لگی کہ یہ کیا بے ہودگی ہے۔ مولوی خادم حسین کی حالت دیکھو' کنواری لڑکی سے زیادہ شرما رہا ہے۔ ایسی شرارت ٹھیک نہیں۔ ذرا ستم ظریفی دیکھیں جی۔ یہ شرارت تھی!"

"یہ سب ملی بھگت تھی ان کی خادم حسین۔ ڈراما تھا۔"

"ہاں جی۔ میں سمجھ گیا تھا۔ ماں نے سب کو اشارہ کردیا ہوگا کہ بیٹا اتنا کافی ہے۔ اب تم جاؤ' باقی کام میرا اور اس نے بڑے افسوس کا اظہار کیا اور کچھ برا بھلا بھی کہا فیصل کو۔ کہ نوجوان ہے کچھ سرکشی ہے مزاج میں اور کچھ باپ کی وجہ سے غصے پر قابو نہیں ہے۔ اب تمہارا کیا قصور ہے بھلا۔ تم تو بس ایک مترجم ہو اور شاید غلطی سے یا مجبوری کے باعث پھنس گئے ہو۔ پیسے کی ضرورت ہوگی اس لیے یہ کام قبول کرلیا ہوگا؟ میں نے کہا کہ پیسے کی ضرورت

میں نے کہا "خادم حسین۔ ہم کام سے آئے ہیں' صرف ایک دو دن کے لیے اچانک آنا پڑا۔ یہاں ہوگئی تھی کچھ ایسی بات کہ ہمیں کسی کو بھی بتانے کا موقع ہی نہیں ملا۔ تم جلدی جلدی باقی بات بتاؤ۔"

"بس جی دلاور کی بیوی نے پہلے مجھے ایک لاکھ کا لالچ دیا۔"

"کس کام کے لیے؟"

"اس نے کہا کہ تم اس فرنچ وکیل کے ساتھ رہو اور غور سے ان سب کی باتیں سنتے رہو۔ ان کی نقل و حرکت دیکھتے رہو۔ اگر کبھی چوہدری دلاور صاحب یا سکندر بخت کا حوالہ آئے' کوئی ایسی بات پتا چلے جس سے ان کی روپوشی کا معمّا حل ہونے میں مدد مل سکتی ہو تو فوراً مجھے فون پر بتاؤ۔ ان کی پلاننگ کیا ہے۔ وہ کیا سوچ رہے ہیں۔ انہیں کیا معلوم ہے جو مجھے نہیں معلوم۔ یہ سب بتاتے رہو۔ میں نے کہا کہ صاف بات کریں نا جی کہ مجھے مخبری کرنی ہے اور نمک حرامی کرنی ہے۔ آپ مجھ سے میرا فرض' ایمان اور ضمیر خریدنا چاہتی ہیں صرف ایک لاکھ میں۔ اس نے کہا کہ تم پھر جذباتی ہورہے ہو۔ پیسہ تمہاری ضرورت ہے اور میں تمہاری ضرورت سے بہت زیادہ دے رہی ہوں۔ میں تم کو مستقل آمدنی کی گارنٹی بھی دے سکتی ہوں جس سے تمہاری زندگی عیش کے ساتھ گزر جائے۔ مجھے اپنا شوہر چاہیے۔ زندہ سلامت اور اس کا دشمن چاہیے۔ زندہ یا مردہ۔ تم صرف اطلاع دو گے۔ باقی کام میرا ہے اس میں کون سی غلط بات ہے؟ اتنی آسانی سے اتنی دولت کمانے کا موقع ہر ایک کو نہیں ملتا۔ ایک لاکھ کم ہیں تو بڑھائے بھی جاسکتے ہیں۔ اس نے بہت لالچ دیا اور بالآخر مجھے بلینک چیک دے دیا دستخط کرکے۔ کیا خیال ہے جی' اس پر ایک کروڑ لکھ لوں؟"

میں نے حیرانی سے کہا "ایک کروڑ۔ تمہارے ضمیر اور ایمان کی بس اتنی ہی قیمت ہے۔ ایک بات اور سمجھ لو۔ خالی چیک دینے والا بے وقوف نہیں ہوتا' دلاور کی بیوی نے بینک والوں سے کہہ دیا ہوگا کہ میری چیک بُک پوری ہوگئی ہے۔ ذرا ایک کروڑ کا چیک لکھ کے پیش کرو۔ سب پتا چل جائے گا۔ کسی کے اکاؤنٹ سے اتنی بڑی نقد رقم نکلوانا تقریباً ناممکن ہے۔"

"میں مذاق کررہا تھا جی۔ ایک کروڑ نہ ایک ارب۔ میں نے چیک تو جان چھڑانے کے لیے لے لیا تھا۔ وہ سمجھی کہ میں بک گیا۔ اس کی باتوں سے قائل ہو کے میں نے چیک لے لیا ہے۔ ایک کے دو لکھ لوں گا۔ اس سے زیادہ کسی غریب آدمی کا حوصلہ کہاں ہوتا ہے۔ دو لاکھ کے تصور سے بھی اسے پسینہ آجاتا ہے۔ خفقان ہونے لگتا ہے۔ سچ مچ مل جائیں تو خوشی سے پاگل ہوجائے یا مر بھی جائے تو حیرت کی بات نہیں۔ میں ایسا ظاہر نہ کرتا تو شاید رہائی مشکل ہوجاتی۔ دس ہزار اس نے مجھے وہیں دے دیے۔ اس تکلیف کے جو میں نے اٹھائی۔ علاج معالجے کے لیے اور کچھ بطور ہرجانہ۔"

آپ کو بھی ہے جی۔ دنیا کا سب سے دولت مند آدمی بھی نہیں کہتا کہ مجھے پیسے کی ضرورت نہیں۔ میں تو ویسے ہی غریب آدمی ہوں۔ وہ کہنے لگی کہ تمہارا وہ گورا وکیل اب کیا کررہا ہے؟ میں نے کہا کہ مجھے کیا معلوم جی اس کے ساتھ کیا ہورہا ہے۔ آدمی خود کچھ نہیں کرتا' جو کچھ کراتی ہے تقدیر کراتی ہے۔ وہ کہنے لگی کہ خادم حسین تم تو ٹھیک اور شریف آدمی ہو۔ تم اس چکر میں مت پڑو۔ بعض اوقات تم جذباتی ہوجاتے ہو۔ یہ گورا وکیل تو چلا جائے گا واپس۔ تم اس کی حمایت میں کسی سے دشمنی مول مت لو۔ رابعہ یا منظر اور وقار یوسف تمہارے کام نہیں آئیں گے۔ پولیس مخالف ہوگئی تو تمہارا جینا عذاب کردے گی۔ میں نے کہا کہ اس وقت تو میں آپ کی وجہ سے عذاب میں ہوں۔ وہ بولی کہ میں تمہیں ایک آفر کرنا چاہتی تھی۔ تم کو کام کرنا ہے تو میرے لیے کرو کوئی غلط کام نہیں ہوگا لیکن پیسہ بہت ملے گا۔ اتنا کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ میں نے کہا کہ میں غلط آدمی کے لیے صحیح کام بھی نہیں کرسکتا۔ بالکل اسی طرح جیسے صحیح آدمی کے لیے غلط کام نہیں کرسکتا۔"

"مولوی خادم حسین۔ تم گفتگو میں اختصار سے کام نہیں لے سکتے۔ ہم ٹیلی فون پر بات کررہے ہیں یار۔ ٹرنک کال کے چارجز معلوم ہیں؟"

"ٹرنک کال!" وہ شاید اچھل پڑا ہوگا "کہاں سے بات کررہے ہیں آپ؟"

"کراچی سے۔"

"شاید غلط سنا میں نے۔ کیا کراچی کہا تھا آپ نے؟"

"ہاں۔ کراچی میں بیٹھا ہوں میں اس وقت۔ اکرام شیخ کے ساتھ۔"

"کون اکرام شیخ؟"

"تم نہیں جانتے۔ نازو کا بھائی ہے۔ میں اسی کے گھر سے بات کررہا ہوں؟"

مولوی نے بے یقینی سے کہا "میں اس مذاق کا مقصد نہیں سمجھا جی؟"

"مذاق' یہ مذاق نہیں ہے یار...."

"آپ... آپ واقعی کراچی فرار ہوگئے ہیں' یا میرے مولا۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا جی کہ اچانک کراچی کیسے چلے گئے آپ۔ خدانخواستہ یہ حرکت نشے میں تو سرزد نہیں ہوگئی تھی... کہیں آپ نے...؟"

"بے وقوفی کی بات مت کرو۔ میرے ساتھ رابعہ بھی ہے۔"

وہ دم بخود رہ گیا۔ "یعنی... گویا کہ... آپ دونوں گھر سے بھاگ گئے ہیں۔ مرض کی شدت اچانک بڑھ گئی ہوگی۔ واقعی مرضِ عشق بری بلا ہے۔ غنیمت ہے کہ آپ نے ایک ساتھ مرنے کا طے نہیں کیا... یہ سب ڈپریشن کی وجہ سے ہوا... مگر اب میرا کیا بنے گا؟"

"افسوس مولوی۔ یہ رقم لے کر تم نے دشمن کا نمک کھالیا۔"

"حد کرتے ہو جی آپ بھی۔ یہ مالِ غنیمت ہے جو حلال ہوتا ہے۔ اتنی سخت ایمان کی آزمائش اور اتنے جبرو تشدد کا مقابلہ کرنا کیا کسی جہاد سے کم تھا۔ ذہنی اور جسمانی اذیت کا معاوضہ تو قانونی طور پر بھی ملتا ہے... آخر آپ نے بھی تو ایک لاکھ وصول کئے تھے اس سے پھر میرے دس ہزار پر اعتراض کیوں جی؟"

میں نے کہا "میں چھیڑ رہا تھا تمہیں خادم حسین۔ میں تو کہتا ہوں کہ تم ایک لاکھ ہی وصول کرلیتے اور اسے غلط اطلاعات فراہم کرتے رہتے' کبھی کہہ دیتے کہ سنا ہے سکندر بخت قطب شمالی پر چلّہ کاٹ رہا ہے یا یہ کہ وہ چوہدری صاحب کو افریقہ لے گیا اور وہاں کے آدم خوروں کو ان کے چربی والے گوشت کی بریانی پکا کے کھلائے گا۔ خیر' ابھی تم محفوظ ہو۔ کسی کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ جب تک میں نہ آؤں صبح شام بلڈنگ کو لاک کردیا کرو اور کھول دیا کرو۔ رات کو آفس بند کرکے سونا ورنہ کوئی اور اٹھالے گا۔"

"کیا منظر صاحب کو معلوم ہے جی.... اور وقار صاحب کو؟"

"نہیں۔ انہیں میں بتادوں گا۔ تم فکر مت کرو۔ بہتر ہوگا کہ تم صبح ہوتے ہی اپنی گھر والی کے آستانے پر حاضر ہوجاؤ۔ ریشمی چادر' میرا مطلب ہے کہ ریشمی جوڑے اور زیورات چڑھانے کے لیے۔ رات تک لوٹ آنا۔ کل بھی یہی کرنا۔"

"مطلب یہ کہ دن سسرال میں گزاروں ظالم ساس کی قید میں۔" مولوی خادم حسین نے آہ بھری "رات دفتر کے ویرانے میں قید رہوں' اکیلا۔"

میں نے ہنس کے کہا "تم ایسا کیوں نہیں کرتے۔ اسے بھی آفس میں لے آؤ۔ فی الحال اندر والا کمرا تو خالی ہے۔ رابعہ کی طرف سے میں اجازت دیتا ہوں۔"

"یہ تو بڑی اچھی بات کہی جی آپ نے" خادم حسین خوش ہوگیا۔

"اور ہاں۔ سب سے ضروری بات تو رہ گئی۔ اپنے چوہدری صاحب کی گھر والی کا فون آئے یا وہ خود آئے تو اسے بتادینا کہ سکندر بخت اس سے "سی ڈی انٹرپرائز" کے فون پر بات کرے گا' کراچی سے۔"

"آپ واقعی کراچی میں ہو جی؟ مجھے تو لگتا ہے بے وقوف بنا رہے ہو۔ بیٹھے ہوگے یہیں کسی ہوٹل میں۔ یقین نہیں آتا...."

میں نے کہا "اچھا نہیں یقین آتا تو نہ سہی۔ بہت لمبی بات ہوگئی ہے بل دینے والے کا خانہ خراب ہوجائے گا۔"

"رات گیارہ بجے سے صبح پانچ بجے تک چوتھائی ریٹ ہوتے ہیں جی ٹرنک کال کے۔ پانچ بجنے والے ہیں' آہ۔"

"پھر یاد آگیا تمہیں کہ تم زخمی ہو۔ اچھا خدا حافظ۔"

کچھ اکرام نے اندازہ کرلیا تھا' کچھ میں نے اسے مختصراً بتادیا کہ دلاور کی بیوی اور چھوٹے چوہدری صاحب نے خادم سے بزورِ بازو اور بزورِ زر میرے بارے میں اور چوہدری دلاور کے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کی تھی مگر خادم حسین نے کمال کردیا۔ اتنے تشدد پھر لالچ کے باوجود کچھ نہیں بتایا۔ وہ بزدل اور کمزور نظر آنے کے باوجود انتہائی بہادر ثابت ہوا۔

اکرام متفکر ہوگیا "فون پر یہ سب باتیں کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"اور تو کوئی ذریعہ نہیں تھا" میں نے کہا۔

اکرام بولا "یہ ہوسکتا ہے کہ تمہارے آفس کا نمبر ٹیپ کیا جارہا ہو۔ سننے والوں نے ساری گفتگو سن لی ہوگی۔ اتنی دیر میں یہ بھی معلوم کیا جاسکتا ہے کہ کراچی کے کس فون سے بات ہورہی تھی؟"

"تمہیں ڈر ہے کہ کہیں....؟"

"یار مجھے اپنی نہیں' تمہاری فکر ہے۔" اکرام نے خفگی سے کہا "کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ یہاں پہنچ جائیں۔ تمہاری آواز پہچان کے۔"

میں نے سوچ کے کہا "اپنے چوکیدار کو سمجھادو کہ کوئی پوچھے تو کچھ نہ بتائے۔ نہ میرے بارے میں اور نہ یہ کہ ہم نے یہاں سے فون کیا تھا۔ وہ یہی کہے گا کہ یہاں کوئی بھی نہیں آیا تھا۔ وہ سمجھیں گے کہ میں نے اسکول کے باہر ہی سے ٹیلی فون لائن استعمال کی ہوگی۔ جیسے ہم پہلے کرتے تھے۔ کسی بھی کھمبے پر چڑھ کے فون جوڑ لیتے تھے۔"

"فکر مت کرو۔ چوکیدار بھروسے کے قابل ہے۔"

"مجھے تو بہت ٹیڑھی چیز لگا۔"

اکرام ہنسنے لگا "جو سیدھے اور معصوم بنتے ہیں نا وہ اندر سے بڑے عیار اور فریبی ہوتے ہیں۔ چوکیدار کا ظاہر اور باطن ایک ہے لیکن اس کے بات کرنے کا انداز واقعی کچھ ایسا ہے کہ میری بھی جھڑپ ہوجاتی ہے کبھی کبھی۔ اس سے نمٹتی ہے کاجل۔"

"چلو پھر کاجل کو بتادیں گے۔ ایک دو دن کی بات ہے۔ شاید آج کل میں کوئی کچھ معلوم کرنے آئے گا۔ چالاکی سے باتوں باتوں میں پوچھنے کی کوشش کرے گا کہ اسکول کس کا ہے۔ مالک کون ہے؟ اور ان کے ساتھ کون رہتا ہے۔ ممکن ہے چوکیدار کو رشوت بھی دے۔ پیسے میں بڑی طاقت ہوتی ہے دوست اور غریب آدمی کی قوتِ مزاحمت بہت کم۔"

ہم اسکول کے گیٹ سے باہر آئے تو آمدِ صبح کا نقیب ہلکا سا اجالا پھیلنے لگا تھا۔ ویسے تو ہر ساحلی شہر کی طرح کراچی میں رات کا اندھیرا اتنا کالا نہیں ہوتا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے اور اگر رونق کو دیکھا جائے تو شاید کراچی میں رات نہیں ہوتی۔ بیشتر علاقوں میں ہوٹل اور ریسٹورنٹ ساری رات کھلے نظر آتے تھے اور وہاں بیٹھے ہوئے گپ شپ میں مصروف لوگوں کو دیکھ کے اندازہ یہی ہوتا تھا کہ یہاں کے رہنے والے رات کو بھی نہیں سوتے۔ سڑک پر ٹریفک میں کمی آجاتی تھی مگر بہت سے علاقے ایسے تھے جہاں دن رات زندگی کے ہنگامے ایک ہی انداز میں جاری رہتے تھے۔

واپس گھر پہنچ کے میں سویا تو چار پانچ گھنٹے بعد اٹھا۔ اکرام اور رابعہ ناشتے کی میز پر بیٹھے باتیں کررہے تھے۔ رابعہ کی توجہ سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اکرام سے میری اور خادم حسین کی گفتگو سن رہی ہے۔ کاجل اسکول جاچکی تھی۔

میں نے گھڑی دیکھ کے کہا "دس بج گئے۔"

"سوا دس۔ گھڑی ٹھیک کرلو یا نظر ٹیسٹ کراؤ" رابعہ بولی۔

"کیا تم لوگ ناشتے سے فارغ ہوگئے؟"

"ہم گل اور محسن کے انتظار میں بھوکے بیٹھے ہیں۔ تمہاری وجہ سے نہیں" رابعہ نے کہا "وہ آتے ہی ہوں گے اور انہوں نے کہا تھا کہ وہ ناشتا لے کر آئیں گے۔"

میں غسل سے فارغ ہوکے نکلا تو گھنٹی بجی۔ محسن ایک ناشتے دان اٹھائے اندر آیا پھر گل دو سال کے ایک بچے کو گود میں اٹھائے نمودار ہوئی۔ مجھے کسی سے پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں محسوس ہوئی۔ وہ فوزیہ کا بچہ تھا۔ ہو بہو اسی جیسا۔ میں نے اسے گل سے لے لیا۔ وہ مجھے اپنی معصوم حیرانی سے دیکھتا رہا۔ میرے ذہن میں ایک عجیب سا بے چین اور شرمسار کرنے والا خیال آیا۔ اگر تقدیر کی لائن مین کی طرح پٹری نہ بدلتی تو زندگی کے سفر میں فوزیہ ہی میری ہم سفر ہوتی اور یہ بچہ میرا ہوتا۔ آدمی یہی سوچتا رہتا ہے۔ جو یوں ہوتا تو کیا ہوتا نہ ہوتا یوں تو کیا ہوتا؟ میں اگر رابعہ سے نہ ملا ہوتا تو آج رابعہ کہاں ہوتی پھر میں کہاں ہوتا۔ اس کی مدد نے ہی مجھے جیل سے باہر نکالا تھا ورنہ شاید مجھے پھانسی ہوجاتی اور میں اگر نہ ہوتا تو فوزیہ کہاں ہوتی۔ قسمت اسی کا نام ہے کہ آدمی اگر' شاید اور کاش جیسے الفاظ کے کھیل میں الجھ کے اپنی مجبوری اور بے اختیاری کے احساس کو کم کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر حقیقت اتنی ہی اٹل رہتی ہے۔

رابعہ نے کہا "کیا نام ہے اس کا؟"

میں نے چونک کے کہا "ہاں بھئی۔ رات کو تو بیٹا سو رہا تھا۔ ہم سے کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ اب بتاؤ ہمیں اپنا نام؟" میں نے اسے میز پر بٹھادیا۔

محسن نے آنکھوں میں آجانے والے آنسو رومال سے صاف کرلیے اور کرسی پر بیٹھ کے اپنی بہن کے بچپن کی تصویر کو دیکھتا رہا۔ گل کے چہرے کی اداسی میں پل بھر کے لیے ممتا کے جذبات کی دلکشی شامل ہوگئی "ابھی یہ بولتا کہاں ہے۔"

"ایسے ہی دو چار الفاظ بولنے لگا ہے" محسن بولا "فوزیہ کو ممی کہتا تھا۔ باپ کو پا۔ ممی اور پاپا نہیں کہہ سکتا تھا۔"

گل نے مجھے مزید بتایا "بھوک لگتی تھی تو چلانے لگتا تھا۔ دو اور دو کا مطلب تھا دودھ کی بوتل۔ کاھی مچھر چیونٹی سب کے لیے ایک ہی لفظ تھا ہا' چڑیا کے لیے ہو۔"

میں نے اسے حیرانی سے دیکھا "یہ سب تمہیں کیسے معلوم ہوا۔ تم اور محسن تو فوزیہ کے گھر نہیں جاتے تھے۔"

محسن نے کہا "میں نے بتایا تھا نا۔ میں فوزیہ کے شوہر سے ملتا رہتا تھا۔ کبھی وہ بچے کو بھی لے آتا تھا اپنے ساتھ۔ وہی بتاتا تھا اس کے بارے میں۔"

گل نے کہا "فوزیہ اسے بوبی کہتی تھی۔ نام تو بابر سلطان تھا۔ ہم بھی بوبی ہی کہیں گے نا محسن؟"

"ظاہر ہے" محسن نے کہا "چلو تم بوبی کو لے لو یا پھر ناشتا لگاؤ۔ پہلے ہی بہت دیر ہوگئی ہے۔"

رابعہ نے کہا "لاؤ بوبی کو مجھے دے دو۔"

میں نے کہا "جی نہیں۔ بوبی ہمارا بیٹا ہے۔ کسی کے پاس نہیں جائے گا کیوں بوبی؟"

بوبی نے اس سوال کا جواب یوں دیا کہ پہلے میری ناک پکڑی۔ ایک ہاتھ مار کے کپ نیچے گرایا اور پھر میز کو گیلا کردیا۔ وہ بہت خوب صورت اور پیارا بچہ تھا۔ کسی تکلف کے بغیر وہ رابعہ کی گود میں چلا گیا اور وہ اسے دھلانے کے لیے باتھ روم میں لے گئی۔

"یار کتنے محبت کرنے والے ہیں بوبی سے مگر ماں باپ کا پیار کون دے سکتا ہے۔" محسن نے کہا "یتیم تو ہوگیا اتنی سی عمر میں۔"

گل ایک دم بکھر گئی "خبردار جو کسی نے اسے یتیم کہا۔ یہ لفظ میں سننا بھی نہیں چاہتی۔ جب پیار میں فرق ہوتا ہے تو بچہ بھی محسوس کرتا ہے۔ ہم اس کے ماں باپ ہیں تو پھر ہمارا پیار وہی ہونا چاہیے بوبی کے لیے۔ جو اس کو ماں باپ سے ملا تھا۔ کیوں کمی ہوگی آخر اس میں؟ میرا دل تو ممتا کے جذبات سے خالی نہیں ہے۔"

محسن نے اسے بڑی مشکل سے چپ کرایا "سوری گل۔ مجھے معاف کردو۔ میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔ وہ ہمارا بیٹا ہے' اسے کبھی احساس نہیں ہوگا کہ اس کو ماں باپ کا پیار نہیں ملا۔ ہم اس سے بھی زیادہ پیار دیں گے اسے۔ تم سے اچھی ماں کون ہوگی اس کے لیے اور میرے لیے تو یہ سب کچھ ہے۔ میرا تو ایک ہی گھر تھا۔ نہ ماں باپ رہے نہ بہن کا گھر بچا..."

گل بڑی مشکل سے خاموش ہوئی۔ ساری بات خیال اور احساس کے زخموں کی ہے۔ گھاؤ جتنے گہرے ہوں درد اتنا ہی آزار دیتا ہے۔ کبھی ہوا کا جھونکا ٹیس کو بیدار کردیتا ہے تو کبھی قطرۂ شبنم بھی تڑپاتا ہے۔ ایک حادثے نے گل سے وہ صلاحیت چھین لی تھی جو شاید خالقِ کائنات کے نزدیک اس کی وجۂ تخلیق تھی۔ جو عورت ماں نہ بن سکے وہ خود کو ہرے بھرے شاداب اور برگ وبار سے لدے ہوئے زندگی کے گلشن میں کسی ٹنڈ منڈ بے نمو سوکھی شاخوں والے درخت کی طرح محسوس کرتی ہے اور جسے خندۂ گل میں بھی تحقیر و تذلیل کا انداز نظر آتا ہے۔

گل نے بلاوجہ یہ محسوس کیا کہ محسن نے اس کو طعنہ دیا ہے۔

وہ ماں بننے کی جسمانی صلاحیت سے محروم ہوئی تھی۔ اس کے جذبات کا سرچشمہ خشک نہیں ہوا تھا نہ محسن نے یہ کہا تھا کہ تم ماں نہیں بن سکیں تو تمہیں کیا معلوم کہ ماں کا پیار کیا ہوتا ہے اور نہ اس کی بات کا یہ مطلب تھا کہ اصلی اور نقلی ماتا کے فرق کے باعث بچے کو یتیمی کا احساس ہوگا مگر گل کچھ زیادہ ہی حساس ہو رہی تھی۔ شاید یہ ایک لاشعوری خوف کا نتیجہ تھا کہ دنیا کو اس کے پیار میں ہمیشہ کھوٹ نظر آئے گا اور اس کی محبت میں مصنوعی پن تلاش کرنے والے یہی کہیں گے کہ ماں تو ماں ہی ہوتی ہے۔ اس کا نعم البدل کون ہو سکتا ہے۔ ماں دس بار مارے تو دنیا کہے گی کہ بچے کی اصلاح کے لیے ایسا کرتی ہے۔ کوئی دوسری عورت غلطی سے بھی جھڑک بیٹھے تو موردِ الزام ٹھہرتی ہے کہ اپنا بچہ نہیں ہے نا۔ بے شک عموماً ایسا ہی ہوتا ہے مگر مستثنیات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ایسی مثالوں کی کمی نہیں جہاں سوتیلے کہلانے والے سگوں سے زیادہ رشتوں کا حق ادا کر دیتے ہیں۔

رابعہ اور گل کو بہت سی باتیں کرنی تھیں اور ربولی کی شکل میں ان کو ایک کھلونا مل گیا تھا۔ اکرام شیخ کی ٹیکسی میں محسن کو ساتھ لے کر میں دوپہر سے کچھ پہلے باہر نکلا۔ ہم فوزیہ کے گھر گئے۔ کرائے کے اس گھر میں آئے فوزیہ کو زیادہ دن نہیں ہوئے تھے پھر بھی محلے کے دو چار گھروں سے لوگ رسمی تعزیت کے لیے آ گئے۔ انہیں شکایت تھی کہ ہم نے روایت کے مطابق کسی ہمسائے کو ایک وقت کا کھانا لانے کا موقع بھی نہیں دیا۔

"سوئم سے پہلے ہی گھر بند کر گئے آپ تو بھائی صاحب۔" ایک بولا۔

"ہاں جی۔ قل ہو جائیں تو بے شک تالا ڈال دیں..."

"ہم تو رات بھی کھانا لائے تھے اور صبح کا ناشتا..."

محسن نے کہا "میں آپ سب کے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔ مجبوری یہ تھی کہ میرا بھانجا دو سال کا ہے۔ وہ ماں کو یاد کر رہا تھا اور یہاں رہتا تو زیادہ پریشان ہوتا۔ گھر میں اور کوئی عورت نہیں تھی اس لیے بھی ہم چلے گئے تھے۔"

پہلے والے نے کہا "قل تو ہونے چاہئیں یہاں۔"

دوسرے نے اتفاق کیا "چنے تو وہیں پڑھے جاتے ہیں جہاں سے جنازہ اٹھے۔"

میں نے محسن کو اشارے سے منع کر دیا کہ وہ اس "شرعی بحث" میں نہ پڑے۔ "بالکل صحیح فرماتے ہیں آپ مگر ہمیں تو آج جانا ہے لاہور۔" محسن بولا "ہم آج ہی گھر خالی کر دیں گے۔"

دوسرے نے افسوس سے زیادہ ملامت بھری نظریں گھمائیں۔ "اتنی جلدی ٹھیک نہیں ہوتی بھائی صاحب۔ ویسے تو زمانہ ایسا آ گیا ہے کہ اب لوگ قل اور چہلم کو بھی فضول رسم کہنے لگے ہیں۔"

"مغفرت کی دعا لاہور میں بھی کی جا سکتی ہے اور ایک دن کیا ساری عمر مانگی جا سکتی ہے۔" محسن باز نہ رہ سکا "پلاؤ زردے اور قورمے کے بغیر بھی قرآن خوانی ہو جاتی ہے۔"

وہ لوگ برا مان کے چلے گئے۔ خود انہیں بہانے کی تلاش تھی جو محسن کے رویے نے فراہم کر دیا۔ ورنہ فرصت کے تھے ... خواری کرے۔ ان کے جاتے ہی میں نے سی ڈی انٹرپرائز ... ملانے کی کوشش کی۔ محسن اور اکرام گھر کے سامان کا جائزہ ... لگے کہ اس میں سے کتنا چھوڑا جا سکتا ہے۔ کتنا غیر ضروری ... بیچ دینا چاہیے اور کیا ساتھ لے جانا ضروری ہوگا۔ کچھ ... اکرام شیخ اپنے گھر میں رکھنا چاہتا تھا۔ بعد میں انتخاب اور ... کے مسائل کا حتمی فیصلہ خواتین پر چھوڑ دیا گیا۔

دوپہر کے وقت کراچی سے لاہور کی لائنیں خالی نہیں ... تھیں اور ایس ٹی ڈی کوڈ ملاتے ہی انگیج کی ٹون آ جاتی تھی ... نے اپنی کوشش جاری رکھی۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی اور پھر کسی نے کال بیل بجائی۔

آنے والا ایک سب انسپکٹر تھا اور اس کے ساتھ تھا ... کوئی سپاہی۔ اس نے سوالیہ اور مشتبہ نظروں سے ہم تینوں کا جائزہ لیا۔

میں نے محسن سے فرنچ میں کہا "اسے واضح الفاظ میں سمجھا دینا کہ میں بہت بڑا وکیل ہوں بلکہ فرانس میں مجھ سے بڑا وکیل کوئی بھی نہیں ہے اور میں جو کیس ہاتھ میں لیتا ہوں اس میں ... اور مدعی دونوں صاف بچ جاتے ہیں لیکن تفتیشی افسر ضرور ... ہو جاتا ہے۔"

سب انسپکٹر نے کہا "یہ کیا باتیں کر رہے ہو تم لوگ؟"

محسن نے کہا "آپ حکم کریں کیسے تکلیف کی؟"

"پہلے میری بات کا جواب دو" وہ سخت لہجے میں بولا اور ایک صوفے پر بیٹھ گیا "جب تم اردو میں بات کر سکتے ہو تو پھر...؟"

محسن نے مسکرا کے کہا "میں تو اردو جانتا ہوں مگر یہ وکیل صاحب لندن سے ایک قتل کی خصوصی تفتیش کے لیے پاکستان آئے ہیں۔ انہیں برطانوی حکومت نے خاص طور پر فرنچ گورنمنٹ سے درخواست کر کے طلب کیا تھا اور یہ برطانوی ہائی کمشنر کے ساتھ ہی لندن سے لاہور پہنچے تھے۔ برطانیہ کے وزیر امور ... مشترکہ بھی اسی فلائٹ سے آئے تھے اور وہ وفاقی وزیر داخلہ سے میٹنگ کرنے چلے گئے تھے۔ یہ وکیل صاحب نہ انگلش جانتے ہیں اور نہ اردو پنجابی۔"

سب انسپکٹر مرعوب نظر آنے لگا تھا پھر اسے یاد آ گیا کہ وہ ... تھانے دار ہے اور اسے کسی غیر ملکی لاٹ صاحب سے متاثر ہونے کی کیا ضرورت ہے "تمہارا یہ گورا وکیل یہاں کیا کر رہا ہے؟"

یہ ذہنی جہالت ہے یا ہم کالوں کا کمپلکس ہے کہ ہمارے ... یورپ امریکا سے تعلق رکھنے والا ہر شخص گورا ہے اور ہر عورت میم۔

محسن نے کہا "میں کہہ چکا ہوں کہ یہ قتل کی خصوصی تفتیش ... کر رہے ہیں۔"

"مگر یہاں۔ اس گھر میں تو کوئی قتل نہیں ہوا ہے" سب انسپکٹر بگڑ گیا۔

اب میں نے مسکرا کے ہاتھ آگے بڑھایا "یہ تو ابھی پتا چل جائے گا تمہیں بیٹا کہ وہ حادثہ تھا یا قتل؟"

محسن نے اس کا ترجمہ کیا "وکیل صاحب تعارف چاہتے ہیں اور پوچھ رہے ہیں کہ آپ کو غصہ کیوں آ رہا ہے؟"

"میں سب انسپکٹر رشید پراچہ ہوں۔ لالوکھیت تھانے سے کل کے حادثے کی تفتیش کے لیے آیا ہوں۔"

اکرام نے کہا "سب انسپکٹر صاحب' لالوکھیت کو لیاقت آباد کہا جاتا ہے۔"

"فضول باتیں مت کرو مجھ سے ورنہ..." وہ بھڑک اٹھا۔

"ورنہ کیا اندر کر دو گے مجھے؟" اکرام نے سکون سے کہا "ایک بات بتا دوں تمہیں پراچہ صاحب۔ میں بھی سب انسپکٹر تھا پولیس میں اور میں ڈائریکٹ بھرتی ہوا تھا۔ ایل ایل بی کرنے کے بعد۔ ایس ایس پی ضامن رضوی مرحوم کے ساتھ تھا۔ تم جانتے ہو انہیں؟"

پراچہ ٹھنڈا پڑ گیا "نہیں۔ کبھی ادھر رہے ہیں ایس ایس پی صاحب؟"

اکرام نے نفی میں سر ہلایا "اب تو وہ دنیا میں ہی نہیں رہے۔ لیکن اپنے کسی سینئر سے پوچھنا۔ کسی ڈی آئی جی یا آئی جی سے کہ وہ کیسے آدمی تھے۔"

"آخر تم نے کیا غلطی کی تھی کہ پولیس کی نوکری گئی۔"

اکرام مسکرانے لگا "شاید پولیس کی نوکری کرنا ہی میری غلطی تھی۔ میرا مزاج ہی نوکری کا نہیں تھا اور پولیس میں میرا پیسے گزارہ ہونا۔ میں حرام نہیں کھاتا تھا اور بہت زیادہ فرض شناسی دکھاتا تھا۔ قانون پڑھا تھا اس لیے کوئی غیر قانونی اختیار استعمال نہیں کرتا تھا۔ اس کے باوجود مجھے نکالا نہیں گیا تھا۔ میں نے استعفیٰ دے دیا تھا۔ ورنہ انجام یہی ہوتا۔"

پراچہ کا موڈ پھر بدلنے لگا "اب کیا کرتے ہو؟ ٹیکسی چلاتے ہو۔"

"جی ہاں مگر یہ سب تمہیں بتانے کا مقصد کچھ اور تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم یہاں اپنی تھانے داری کی اکڑفوں مت دکھاؤ۔ شرافت سے بات کرو اور خیال رکھو یہاں ایک سابق تھانے دار ہے تو ایک بہت بڑا وکیل اور تیسرا مشہور صحافی... غالب۔"

محسن نے مسکرا کے اکرام کی طرف دیکھا مگر یہ جھوٹ چل سکتا تھا۔ اس نے پراچہ سے مصافحہ کیا "مجھے ارباب ہدایت اللہ صاحب نے بھیجا یاد کیا تھا۔"

"اچھے... آئی جی صاحب نے؟" پراچہ بولا۔

"ہاں۔ میں وکیل صاحب کے ساتھ آیا ہوں۔ کسی مترجم کی ضرورت بھی پوری کر سکتا ہوں اور اس کیس کی رپورٹنگ بھی۔ ویسے ارباب ہدایت اللہ صاحب سے پرانے مراسم ہیں۔"

ایک سب انسپکٹر کے لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ محسن کی بات کو غلط سمجھے یا آئی جی صاحب سے تصدیق کر سکے "پھر تو جناب عالی بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کے" اس نے اٹھ کے بڑے ادب سے مصافحہ کیا اور گھور کے کانسٹیبل کی طرف دیکھا۔ کانسٹیبل فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے سب کے ہاتھ تھام کے بطور عقیدت سینے پر رکھے۔

"خیر سے مرحوم کا آپ سے کیا رشتہ تھا؟" پراچہ نے گویا تفتیش کا آغاز کیا۔

محسن یعنی غالب نے کہا "مرنے والی میری بہن تھی۔ حقیقی بہن اور دوسرا اس کا شوہر تھا۔"

"اوہو ہو۔ بڑا افسوس ہوا جی" پراچہ نے کہا "بڑے حرامی ہیں یہ ٹرک والے جی۔ سب سے زیادہ بندے یہی مارتے ہیں سڑکوں پر اور پھر ذرا شرافت انسانیت نہیں ان میں۔ بھاگ جاتے ہیں واردات کر کے..."

"اچھا؟ کہاں چلے جاتے ہیں؟" محسن نے طنز سے کہا "ملک چھوڑ کے ٹمبکٹو پہنچ جاتے ہیں یا ڈرائیوری چھوڑ کے حلیہ بدل لیتے ہیں اور روپوشی کے لیے کسی گاؤں کی مسجد میں پیش امام بن جاتے ہیں کہ سراغ ہی نہیں ملتا۔"

وہ ڈھٹائی سے مسکرانے لگا "آپ تو جانتے ہیں جناب سب کچھ' مالکان انہیں بچاتے ہیں۔ سیدھے افسروں تک پہنچ جاتے ہیں پھر کوئی گواہی نہیں دیتا۔ پکڑ لیں تو ضمانت ہو جاتی ہے اور کیس بنتا ہے زیادہ سے زیادہ تین سو چار اے کا..."

"غیر ارادی قتل" اکرام نے سر ہلایا "مگر پراچہ صاحب۔ اس کیس میں تو قتل عمد کے شواہد ملتے ہیں۔ بہت سے لوگوں نے دیکھا تھا کہ ٹرک نے کیسے پیچھا کر کے رکشے کو ٹکر ماری تھی دو مرتبہ اور کتنی دور تک اسے گھسیٹتا ہوا لے گیا تھا۔"

"اچھا جی!" پراچہ نے سخت حیرانی کا اظہار کیا "آپ بتائیں مجھے کس نے دیکھا تھا۔ دو گواہ مل جائیں تو ہم قتلِ عمد کا پرچا کاٹ دیں گے۔"

"کس کے خلاف؟" محسن نے کہا "کیا ڈرائیور کا پتا چل گیا ہے' کوئی سراغ ملا ہے؟"

"نہیں جی۔ یہی تو ساری مصیبت ہے۔ خیر انشاء اللہ کوئی سراغ ضرور ملے گا.... کا" اس نے نامعلوم قاتل کو ایک گالی سے نوازا۔

محسن نے کہا "میں آج ارباب صاحب سے کہوں گا کہ وہ اس کیس کی تفتیش کے لیے خصوصی ٹیم بنا دیں۔ کم سے کم کوئی ڈی ایس پی ہو۔"

پراچہ کا چہرہ اتر گیا "ہاں جی۔ وہ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ بادشاہ

لوگ ہیں وہ اور آپ کی اپروچ ہے۔ اپروچ سے ہوتا ہے سب کچھ جناب عالی۔ ہم تو خانہ پری کرسکتے ہیں۔ زیادہ اختیار ہی نہیں ہے ہمارا۔ کیا آپ صرف اس کام کے لیے آئے ہو؟"

"نہیں پراچہ صاحب۔ میں تو موسیو آندرے کے ساتھ لاہور میں سخت مصروف تھا۔ وہ بہت اہم کیس ہے۔ لیکن بہن کے ساتھ حادثہ پیش آنے کی خبر سن کے میں کیسے نہ آتا۔ یہ وکیل صاحب ہمدردی میں ساتھ آگئے۔ ہم کل تک واپس چلے جائیں گے۔ یہاں اکرام شیخ اس کیس کی تفتیش میں ساتھ رہے گا۔"

پراچہ نے اطمینان کا سانس لیا "آپ فکر ہی مت کروجی۔"

اب محسن نے براہ راست اور میں نے اس کی معرفت سوال جواب کا سلسلہ شروع کیا تو صورت حال ایسی ہوگئی جیسے تفتیش سب انسپکٹر پراچہ نہیں کررہا ہے ہم کررہے ہیں۔ اس نے سوچا ہوگا کہ تھانے داری کا رعب جھاڑ کے تفتیش کے بہانے لواحقین کو ڈرائے گا دھمکائے گا کہ وہ حادثے کو قتل قرار دینے کی کوشش چھوڑ دیں ورنہ..... ہر تھانے دار کا جملہ اگر ورنہ پر ختم ہو تو آگے سمجھنے والے کی سمجھ پر منحصر ہے کہ وہ ظلم اور ناانصافی کو نوشتہ تقدیر سمجھ کے قبول کرتا ہے یا سوپیاز اور سو جوتے کھانا چاہتا ہے۔

میں نے کہا "کیا پولیس نے جائے واردات کا معائنہ کرلیا؟"

محسن بولا "اور روقوعہ کا نقشہ تیار کرلیا؟"

اس نے ادھر ادھر دیکھ کے کہا "وہ..... ہاں جی۔ یہ تو کرنا ہی پڑتا ہے لیکن اس کا فائدہ کوئی نہیں۔"

میں نے کہا "کیا وہاں عینی گواہ نہیں ملا؟"

محسن بولا "ٹرنک بازار کے دکان دار تو وہیں باہر بیٹھے رہتے ہیں۔ ان میں سے کسی کے بیان سے کوئی سراغ ملا؟"

"نہیں جی۔ دکان دار تو سب عام طور پر موجود رہتے ہیں مگر اتفاق سے اس وقت....."

"سب نماز پڑھنے گئے ہوئے تھے" محسن بولا۔

"ہاں جی۔ بالکل یہی بات کہی سب نے۔"

"اور تم نے مان لی۔ ساڑھے تین بجے کون سی نماز پڑھ رہے تھے باجماعت؟" محسن نے کہا۔

"ایسے ہی جی۔ بکواس کرتے ہیں سارے۔ ایسے کدھر کے نمازی ہیں؟" پراچہ نے فوراً پینترا بدل لیا۔ "روٹی شوٹی کھارہے ہوں گے۔"

"سب اتنی دیر سے کھانا کھاتے ہیں۔ پراچہ' یہ تو ہم ابھی جاکے دیکھ سکتے ہیں کہ کون کتنے بجے نماز کے لیے جاتا ہے اور کتنے بجے کھانا کھاتا ہے۔ سیدھی صاف بات کرو کہ تم نے کسی کا بیان لینے کی زحمت ہی نہیں کی۔"

"کدھر بیان دیتے ہیں جی یہ لوگ۔ سارے بے ایمان ہیں۔ بہانے بازی کرتے ہیں۔ کسی کے دل میں خدا کا خوف نہیں ہے۔"

میں نے کہا "تمہارا خوف تو ہوگا۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ تم چاہو اور کوئی بیان نہ دے۔"

پراچہ نے مردہ لہجے میں کہا "اچھا جی بلالیتے ہیں آج سب کو۔"

میں نے کہا "سب کو نہیں۔ صرف انہی کو جن کی دکان کے سامنے یہ حادثہ پیش آیا تھا۔ ان سے پوچھو کہ اس وقت گاہک کون تھے؟ انہوں نے کسی کو پانی کی ٹنکی فروخت کی تھی تو کیش میمو بنا تھا؟ ٹنکی کون لے کر گیا تھا؟ سوزوکی والا گیا تھا تو اس نے ٹنکی کہاں پہنچائی تھی۔ کوئی ٹنکی فٹ کرنے گیا تھا تو اس نے بھی گاہک کا مکان یا فلیٹ دیکھا ہوگا۔ اس گاہک کو طلب کرلو۔"

"وہ کس لیے جی؟ اتنا فالتو ٹائم نہیں ہے ہمارے پاس۔"

محسن نے اسے غور سے دیکھا "اچھا ٹھیک ہے۔ تمہاری بات میں آج ہی آئی جی صاحب کو بتادوں گا کہ تم حد سے زیادہ مصروف ہو۔ ہوسکتا ہے وہ تمہیں فارغ کردیں۔ لائن حاضر ہوجاؤ گے تو بہت ٹائم ملے گا۔"

پراچہ پریشان ہوگیا "نہیں جی۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ وہ گاہک کیا بتائے گا؟"

اکرام نے کہا "ہوسکتا ہے گاہک کوئی سمجھ دار آدمی ہو۔ اس نے ٹرک کا نمبر نوٹ کرلیا ہو یا ٹرک ڈرائیور کو دیکھ لیا ہو۔ آٹھ دس دکانوں میں سے کسی پر بھی گاہک نہ ہو یہ ناممکن ہے۔ وہاں بہت خریداری ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ وہاں بس پر سوار ہونے والے بھی کھڑے رہتے ہیں۔"

پراچہ نے طنز سے کہا "ان سب کو بھی بلالوں جو اس وقت وہاں سے کسی بھی بس میں سوار ہوئے تھے۔ ڈرائیور کنڈکٹر۔"

محسن نے کہا "ہاں۔ انہیں بھی طلب کرلو۔"

ظاہر ہے یہ ناممکن تھا مگر محسن نے طنز کا بہت مناسب جواب دیا تھا اور تھانے دار صاحب کے بس میں نہ تھا ورنہ وہ محسن کا سر پھاڑ دیتا یا اپنا سر پھوڑ لیتا۔

"اچھا اب تم جاؤ۔ ہم آتے ہیں کچھ دیر بعد تھانے۔ واپس جاتے ہوئے ان سب دکان داروں کو دعوت نامہ دے جاؤ جن کی دکانیں جائے واردات پر ہیں۔ جہاں ٹرک نے رکشا کو ٹکر ماری تھی۔ وہاں سے لے کر اس جگہ تک جہاں دوسری ٹکر ہوئی تھی اور جہاں تک ٹرک رکشا کو گھسیٹ کر لے گیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ پندرہ بیس دکانوں کے سامنے یہ سب ہوا ہوگا" محسن نے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا "تم کہو تو میں آئی جی صاحب سے تمہاری بات کرادوں؟"

وہ حواس باختہ ہوگیا "نہیں جی۔ اس کی کیا ضرورت ہے۔"

"بھئی ممکن ہے تمہیں میری باتیں بری لگ رہی ہوں۔ میں کون ہوتا ہوں تمہیں حکم دینے والا۔ آئی جی صاحب تو خیر مالک ہیں صوبے کے....."

"ہمارے لیے آپ کا حکم بھی حکم ہے سر۔" پراچہ اٹھ گیا "آپ کتنی دیر میں تشریف لاؤ گے؟"

میں نے کہا "ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد۔"

"ٹھیک ہے جی۔ گواہان حاضر ہوں گے۔ آپ خود جو پوچھنا چاہیں پوچھ لیں" اس نے ہاتھ ملایا اور بڑی عجلت میں روانہ ہوگیا۔

"دیکھا تم نے۔ یہ کیس فائل کرنے کے موڈ میں تھا" اکرام بولا "یہاں تو سیر کو سوا سیر مل گیا ورنہ ان کا تو اصول ہے کہ جو فریاد کرے اسی کو ملزم بنادو۔ مجھے ایک ایسا ہی کیس یاد ہے۔ کوئی شخص لاہور میں ٹیکسی کے نیچے آکے مرگیا تھا۔ اس کی بیوی نے شوہر کے بزنس پارٹنر پر قتل کا شبہ ظاہر کیا تو پولیس نے بیوی کو پکڑلیا کہ وہ بھی شریک جرم ہے۔ اس کے بزنس پارٹنر سے ناجائز مراسم تھے۔ وہ ایک ناجائز بچے کی ماں بننے والی تھی۔ شوہر کو اس کے چال چلن پر پہلے ہی شک تھا۔ اس نے آشنا سے مل کے اسے ٹھکانے لگایا اور اب آشنا اس سے شادی کرنے پر تیار نہیں تو وہ انتقام لینے کے لیے اسے پھنسا رہی ہے۔ پولیس نے عورت کا بھی ریمانڈ لے لیا اور بزنس پارٹنر کا بھی۔ ان سے پوچھتے رہے کہ وہ ٹیکسی والا کون تھا اور انہوں نے اسے کتنے پیسے دیئے تھے حادثہ کرنے کے۔ بزنس پارٹنر تو پیسے دے کے چھوٹ گیا۔ عورت پر کیا بیتی' یہ بڑی افسوس ناک کہانی ہے۔"

محسن نے کہا "مجھے غالب نے بھی ایک واقعہ سنایا تھا کہ کوئی چور ایک گھر میں گھسا تھا۔ وہاں صرف ایک لڑکی تھی۔ اس نے شور مچایا تو چور اسے قتل کرکے بھاگ گیا۔ بعد میں بھائی آیا تو اس نے تھانے جاکے رپورٹ کی۔ پولیس نے بھائی کو دھرلیا کہ چور کا نام کیوں لیتے ہو۔ کیا چوری ہوا ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ اصل بات بتاؤ کہ اس کا وہ آشنا کون تھا جس کے ساتھ تم نے بہن کو قابلِ اعتراض حالت میں دیکھا اور مشتعل ہوکے قتل کردیا۔ ریمانڈ انہیں مل گیا اور وہ بھائی سے یہ تفتیش کرتے رہے کہ کیا اس نے آشنا کو قتل کرکے کہیں اور دفنا دیا ہے یا دریا میں پھینک دیا ہے؟ چور والی کہانی تو جھوٹ ہے۔ آبروریزی ہوئی ہے لڑکی کی۔ میڈیکل میں سب آجائے گا۔ اندازہ کرو اس بھائی کی ذہنی کیفیت کا۔ غالب نے اس کی گلو خلاصی کرائی تھی پانچ ہزار میں۔"

میں نے افسوس سے کہا "جس کا کوئی نہ ہو اسے کسی بھی کیس میں اندر کیا جاسکتا ہے۔ کہانی اور واقعات بدل کے یہ لوگ کسی بھی واردات کو کچھ بھی بناسکتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اب تک یہ ٹرک کا سراغ لگاچکے ہوں گے اور شاید ٹرک کے مالکوں سے کیس دبانے کا معاوضہ بھی جیب میں ڈال چکے ہوں گے۔ جہاں ان کا فائدہ ہو وہاں یہ بہت مستعد اور ذہین ہوجاتے ہیں اور اسامی کو قبر میں سے نکال لاتے ہیں۔"

اکرام شیخ اور محسن بے مکیں ہوجانے والے گھر کے اسباب کی منتقلی اور دیگر انتظامی نوعیت کے مسائل کا جائزہ لینے لگے۔ میں نے کی ڈی انٹرپرائز کا نمبر ملایا اور خلافِ توقع اس بار لائن جلد ہی مل گئی۔

"ہیلو" کہنے والی وہی حسینہ تھی جسے میں اپنے چوہدری دلاور صاحب کی پہلی قسط کا تحفہ دے کر بھاگ آیا تھا۔

میں نے کہا "مجھے پہچانا بلبل بغداد۔"

"کون..... تم..." اس نے چند سیکنڈ میں مجھے شناخت کرلیا۔

"ہاں میں۔ بغداد کا چور۔ بغداد سے بول رہا ہوں۔ تحفہ کیسا رہا؟"

"تم بہت خطرناک آدمی ہو" اس کی آواز کانپ رہی تھی "کیا بات ہے اب۔ کیوں پریشان کررہے ہو؟"

میں نے کہا "دیکھو لڑکی۔ تم اتنی چالاک نہیں ہو جتنا بننے کی کوشش کررہی ہو اور میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں جتنا تم مجھے سمجھتی ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ اس وقت لائن پر میری آواز اور کون کون سن رہا ہے۔ شاید ہر لفظ ریکارڈ کیا جارہا ہوگا۔ یہ نمبر بھی یقیناً آبزرویشن پر ہوگا اور چوہدری دلاور کی بیوہ..... میرا مطلب ہے ہونے والی بیوہ دوسرے فون پر ایکس چینج سے پوچھ رہی ہوگی کہ فون کال کہاں سے موصول ہوئی ہے۔ اسے کہو تکلیف نہ کرے۔ میں بتادیتا ہوں کہ یہ کال کراچی سے کی گئی ہے اور میں سکندر بخت بات کررہا ہوں۔ یہ بھی بتادو اسے کہ میرے پاس فالتو وقت نہیں ہے فالتو باتوں کے لیے۔"

"جی..... جی میں بتاتی ہوں" اس کی آواز سے گھبراہٹ اور بوکھلاہٹ ظاہر تھی۔

دوسرے لمحے دلاور کی بیوی لائن پر آگئی "تم سکندر بخت ہی ہو نا؟"

میں نے کہا "تم پہچانتی نہیں ہو میری آواز؟ جانتے بوجھتے انجان بن کے فضول سوالات کروگی' محض وقت گزارنے کے لیے تو میں فون بند کردوں گا۔ میرے پاس صرف پندرہ منٹ ہیں۔"

"پندرہ منٹ... سکندر میری بات تو پوری سنو گے نا...؟"

"اظہارِ عشق یا اعتراف سب پندرہ منٹ میں کیا جاسکتا ہے۔ اس سے زیادہ وقت دینا میرے لیے خطرناک بھی ثابت ہوسکتا ہے۔ پولیس میری کال کو ٹریس کرکے یہاں پہنچ جائے گی۔ مجھے پاکستانی پولیس سے اتنی تیزی اور مستعدی کی امید تو نہیں کہ آدھے گھنٹے سے پہلے کوئی تھانے دار کرسی سے ہل بھی سکے خواہ معاملہ کتنا ہی سنگین کیوں نہ ہو لیکن میں خطرہ مول نہیں لے سکتا۔"

"سکندر۔ میرا کوئی ارادہ نہیں ہے پولیس کو درمیان میں لانے کا' یقین کرو۔"

"سوری مسز دلاور۔ یقین اور اعتبار کے لفظ تمہاری زبان سے اچھے نہیں لگتے اور میرے لیے بھی بے معنی ہوگئے ہیں۔ شکارگاہ میں ہم بیک وقت شکاری بھی ہیں اور شکار بھی۔ موسیو آندرے نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ تم سے بات کروں' تم کچھ کہنا چاہتی ہو۔"

"میں صرف یہ چاہتی تھی کہ کیا یہ خطرناک کھیل ختم نہیں کیا جاسکتا سکندر۔" وہ بولی "ورنہ سب تباہ ہوجائیں گے۔"
"سب نہیں۔ میرا مقصد تو دلاور کو تباہ کرنا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے اس نے میرے باپ کو تباہ کیا تھا۔ اب دلاور کی باری ہے۔"
"دیکھو۔ وہ سب واقعی بہت برا ہوا۔ سارا قصور دلاور کا تھا۔ میں مانتی ہوں لیکن کوئی صورت ہے اس جرم کا کفارہ ادا کرنے کی۔ تمہارے نقصان کی تلافی ہوسکتی ہے کسی طرح؟"
"ہاں۔ مجھے وزیر خان لادو۔ زندہ سلامت اسی حالت میں جیسے میں نے اسے لندن جاتے وقت آخری بار دیکھا تھا۔ آج تمہیں اندازہ ہورہا ہے کہ تمہیں صرف ایک مرد کی نہیں بچوں کے باپ کی ضرورت ہے اور دلاور کا ولی عہد دولت یا طاقت سے باپ کو حاصل نہیں کرسکتا۔"
"سکندر۔ میں سمجھتی ہوں تمہارے جذبات کو لیکن کیا تم معاف نہیں کرسکتے اسے۔ میں تم سے ہاتھ جوڑ کے معافی مانگ سکتی ہوں۔ رحم کی بھیک مانگ سکتی ہوں۔ تم اتنے سنگدل اور سفاک تو نہیں ہوسکتے کہ ایک بیوی اور ایک ماں کے آنسوؤں اور التجاؤں کو ٹھکرادو۔ تم جہاں کہو میں سب کے سامنے تمہارے قدموں میں سر رکھ سکتی ہوں۔ میں تمہارا باپ تو تمہیں واپس نہیں کرسکتی لیکن اس کے علاوہ سب کچھ دے سکتی ہوں۔ وہ سب جو تمہارا حق تھا اور اس کے علاوہ جو میرا ہے، سب لے لو۔"
میں نے کہا "مسز دلاور۔ تم جذباتی باتیں کررہی ہو۔ اسی طرح جیسے لوگ دل دینے کی بات کرتے ہیں۔ صرف تمہارے کہنے سے مجھے سب کچھ نہیں مل جائے گا۔ کیا واقعی یہ تمہارے لیے ممکن ہے کہ چوہدری دلاور کے سارے اثاثے میرے نام کرسکو۔ اس کے نام پر جتنی کوٹھیاں ہیں۔ اس کا سارا بینک بیلنس اور کاروبار۔ تمہاری خاموشی ہی تمہاری بے بسی کا اعتراف ہے۔"
"میں دلاور کو راضی کرسکتی ہوں کہ وہ تم سے صلح کرلے۔"
میں نے ہنس کے کہا "ایسا تو وہ خود مجھ سے کئی بار کہہ چکا ہے۔ وہ میرے مالی نقصانات کی تلافی کرنے کے علاوہ بھی بہت کچھ دینے پر تیار ہے۔ میری ذہنی و جسمانی اذیت کا کفارہ۔ ہرجانہ یا جرمانہ۔"
"پھر تم کیا چاہتے ہو۔ کیوں جاری رکھنا چاہتے ہو یہ کھیل جس میں تم خود بھی بے گھر اور بے سکون ہو۔ تمہارے ساتھ کتنے لوگ عذاب میں مبتلا ہیں....."
میں نے کہا "یہ عورتوں کے سمجھنے کی باتیں نہیں ہیں۔ مردوں کے کھیل ہیں۔ تم صرف اپنی بات کرو کہ تم کیا چاہتی ہو۔ تمہیں چوہدری دلاور کی دوسری قسط ملی یا نہیں؟"
"دوسری قسط!" وہ چلائی۔
میں نے کہا "ہاں۔ جمع کرتی رہو ان ٹکڑوں کو پھر سارے پارسل جوڑ کے سالم چوہدری دلاور بنالینا۔ بس ایک جان ہی تو نہیں ہوگی اس میں...."
"نہیں، نہیں۔ خدا کے لیے۔ ایسا مت کرو، دلاور کو تو مت کرو، تمہیں رسول ﷺ کا واسطہ۔ قسم ہے قرآن پاک کی۔"
میں نے کہا "کیا فائدہ ایسی قسموں کا۔ کسی قاتل کی بیوی یا ماں عدالت میں چلا چلا کے جج سے چاہے کہ وہ انصاف نہ کرے تو یہ ناممکن ہے۔"
وہ زاروقطار رونے لگی "مجھے بتاؤ سکندر تمہیں کیا چاہیے آخر؟"
میں نے کہا "میری چند شرائط ایسی ہیں کہ تم پوری کرنا چاہو تو کرسکتی ہو۔ اس کے بعد میں دیکھوں گا کہ تم کیا کرسکتی ہو اور تمہارے سامنے میں کیا کرسکتا ہوں۔"
"وہ کیا شرائط ہیں، بولو" اس نے سنبھل کے کہا۔
"پہلی بات تو یہ کہ غالب اور نازو کو چوہدری دلاور کے شکاری کتے اغوا کرکے لے گئے ہیں۔ مجھے ان کی مکمل سلامتی کی ضمانت چاہیے۔"
"مجھے.... مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہیں۔"
"تم معلوم کرسکتی ہو۔ تمہارے پاس وسائل ہیں اور طاقت ہے۔"
"ٹھیک ہے۔ میں پتا چلالوں گی۔"
"بات صرف زبانی ضمانت کی نہیں ہے۔ لاہور میں رابعہ ہے۔ میرا دوست عبدالودود منظر ہے اور وقار یوسف ہے۔ ان میں سے کوئی تصدیق بھی کرے گا کہ وہ خیریت سے ہیں۔ اس کے بدلے میں تم کو چوہدری دلاور کے تحفظ کی پوری ضمانت ملے گی۔ تم یا تمہارا کوئی نمائندہ اپنی آنکھوں سے دلاور کو دیکھے گا۔ اس سے بات کرے گا اور یہ ملاقات مکمل رازداری کے وعدے پر ہوگی۔ ہم ایک آدمی کو دلاور سے ملوانے لے جائیں گے۔"
"میں خود ملوں گی اس سے... کب ملواؤ گے مجھے....."
"اتنی بے تابی کی ضرورت نہیں۔ پہلے تم غالب اور نازو سے ملاقات کا بندوبست کرو۔ تم جیسے چاہو جہاں چاہو جب چاہو خادم حسین کو لے جاؤ۔ آنکھوں پر پٹی باندھ کے۔ مسلح محافظوں کے ساتھ۔ آدھی رات کے وقت وہ جائے گا اور واپس آکے رپورٹ دے گا۔ اس رپورٹ پر ہمارے جوابی ردِعمل کا انحصار ہوگا۔ پھر تمہیں مطلع کیا جائے گا کہ تم کو کب کہاں اور کیسے دلاور سے ملاقات کے لیے لے جایا جائے گا۔ یہ بات ختم ہوئی۔"
"اس کے بعد....."
"اس کے بعد مرحلہ آئے گا چوہدری دلاور کے مستقبل کا۔ اگر غالب اور نازو کو کچھ نہ ہوا تو دلاور کو بھی کچھ نہیں ہوگا۔ اس خوش فہمی کو دل سے نکال دینا کہ پولیس یا تمہارے شکاری کتے دلاور کا سراغ لگاسکتے ہیں۔ ایسی احمقانہ کوشش کی سزا تم سے زیادہ دلاور کو ملے گی۔ تمہاری ہر غلطی کا نقصان اسے ہوگا۔ ہمارے جیل مینوئل میں بھی کچھ سزائیں ہیں۔ مثلاً اسے چوبیس گھنٹے کے لیے الٹا لٹکا دیا جائے۔ اس کا کھانا پینا دو دن کے لیے بند کردیا جائے۔ کہیں سے اس کی ایک انچ کھال اتارلی جائے اور اس پر دن میں تین بار نمک کا پانی ڈالا جائے۔ اسے زبردستی گوبر کھلایا جائے یا کتے کا پیشاب پلایا جائے۔ یا اس کا اپنا خون۔"

وہ دہشت زدہ ہوکے چیخنے لگی "مت کرو ایسی باتیں خدا کے لیے؟"
"تم کہہ سکتی ہو کہ پھر یہ سب تو غالب اور نازو کے ساتھ بھی ہوگا مگر ایک فرق ہے ان میں اور دلاور میں۔ وہ ایک ساتھ جینا ہی نہیں مرنا بھی چاہتے ہیں اور ان کی موت بھی شہادت ہوگی۔ جو بذات خود ایک انعام ہے۔ ان کے نہ والدین ہیں نہ بھائی بہنیں اور بچے۔ ہمارے لیے وہ کبھی نہیں مریں گے لیکن دلاور نہ رہا تو تم بیوہ کہلاؤ گی اور فیصل یتیم۔"
"میں.... میں وعدہ کرتی ہوں.... انہیں کچھ نہیں ہوگا۔"
"ابھی چوہدری دلاور کی رہائی کے موضوع پر بات نہیں ہوسکتی۔ ہاں تمہیں یہ بتایا جاسکتا ہے کہ اس کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ دلاور خود کو قانون کے حوالے کردے اور اپنے سب جرائم کا اعتراف کرلے۔"
"یہ ضمانت میں کیسے دے سکتی ہوں" وہ مایوسی سے بولی۔
"دوسری صورت یہ ہے کہ تم استاد پیڈرو کو غیر مشروط طور پر ہمارے حوالے کردو۔"
"یہ ہوسکتا ہے۔ یہ کرسکتی ہوں میں۔"
"مسز دلاور۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ [illegible] گفتگو دوسرے نہیں سن سکتے اور کیا ان میں استاد پیڈرو شامل [illegible] یہ بات خود بھی سمجھ لو، پیڈرو کو بھی سمجھادو اور اسے کہو کہ پولیس کو بتادے۔ میں اس وقت کراچی میں ہوں مگر دو گھنٹے بعد میں لاہور یا حیدر آباد میں بھی ہوسکتا ہوں۔ دبئی یا اسلام آباد میں بھی اور چوہدری دلاور کو میں اپنی جیب میں ساتھ ہی رکھتا ہوں، جب میں کسی کو نظر نہیں آتا تو دلاور کیسے نظر آسکتا ہے۔"
میں نے گھڑی دیکھی اور ریسیور رکھ دیا۔ دوسری طرف دلاور کی بیوی کو یوں لگا ہوگا جیسے لائن کٹ گئی ہے اور وہ ہیلو ہیلو کہتی رہ گئی ہوگی۔
محسن اور اکرام میرے قریب خاموش کھڑے تھے۔ میری گفتگو سے کوئی بھی سمجھ سکتا تھا کہ میں کس سے کیا بات کررہا ہوں۔
"بیٹے، اب نکل چلو یہاں سے فوراً۔ کہیں سچ مچ یہیں نہ دھر لیے جاؤ" محسن بولا "پولیس کی کارکردگی کو ناقص فرض کرکے اتنا بڑا رسک نہیں لینا چاہیے۔"
اکرام نے کہا "وہ بعد میں ضرور آئیں گے۔"
ابھی اس کی بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ کال بیل بجی پھر کسی نے دروازہ توڑنے کی کوشش کی۔ پولیس والے دروازے پر لاتیں اور مکے ماررہے تھے اور چلارہے تھے "دروازہ کھولو۔ جو بھی اندر ہے۔"
میں نے محسن اور اکرام کی طرف دیکھا "گھبرانے کی بات نہیں۔ وہی فرنچ ڈراما چلے گا۔"
محسن نے دروازہ کھول دیا۔ ایک ساتھ تین پولیس والے اندر آگئے۔ ان میں سے دو افسر تھے یعنی اے ایس آئی اور ایس آئی۔ تیسرا ہیڈ کانسٹیبل تھا۔ ریوالور ان سب کے ہاتھ میں تھے۔ توند صرف حوالدار کے پاس تھی۔
سب انسپکٹر چلایا "ہینڈز اپ۔ منہ دیوار کی طرف کرلو ورنہ میں گولی ماردوں گا۔"
میں نے محسن سے کہا "ان اُلو کے پٹھوں سے بات کر۔ جیسے پہلے کی تھی۔"
اس نے کہا "وکیل صاحب پوچھ رہے ہیں کہ اس طرح اسلحہ لے کر وارنٹ دکھائے بغیر گھر میں گھس آنے کا کیا مطلب ہے؟"
"کون وکیل صاحب؟" سب انسپکٹر نے غرّا کے کہا "فراڈ کرتے ہو میرے ساتھ۔ میں گولی ماردوں گا۔"
"ماردو۔ باربار اعلان کیوں کررہے ہو۔ چلاؤ گولی اگر اختیار ہے۔ تمہیں معلوم ہے میں کون ہوں۔" محسن نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔
"پہلے تو سارے ٹنڈے لاٹ کے سالے ہی بنتے ہیں۔"
"میں مشہور جرنلسٹ غالب ہوں" محسن نے بے خوفی سے کہا اور پھر فرنچ وکیل والی پوری کہانی دہرادی جس نے کچھ دیر پہلے سب انسپکٹر پراچہ کی اکڑفوں نکال دی تھی۔
"سکندر بخت کون ہے تم میں سے؟" سب انسپکٹر نے ظاہر یہ کیا کہ وہ متاثر نہیں ہوا۔
"سکندر بخت تو کوئی نہیں۔ یہ موسیو آندرے ہیں۔ میں غالب ہوں اور یہ ٹیکسی ڈرائیور جو ہمیں یہاں لایا تھا۔ تم اس کے کاغذات سے تصدیق کرسکتے ہو۔ یہ کراچی میں ہی ٹیکسی چلاتا ہے۔ سب ٹیکسی ڈرائیور اسے جانتے ہیں، مجھے لیاقت آباد کا سب انسپکٹر پراچہ پہچانتا ہے۔ وہ ابھی کچھ دیر پہلے آیا تھا۔ یہ میری بہن کا گھر ہے جس کا انتقال کل ایک حادثے میں ہوگیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میرا بہنوئی بھی ہلاک ہوا تھا۔ میں یہاں آئی جی ارباب ہدایت اللہ صاحب سے مل کے تفتیش کے احکامات جاری کرانے کے لیے آیا ہوں۔ مجھے شک بلکہ یقین ہے کہ وہ حادثہ نہیں قتل تھا۔"
سب انسپکٹر روایتی قسم کا پولیس مین تھا۔ اختیارات، وردی اور ریوالور کے بل پر خود کو فرعون اور تارزن سمجھنے والا مگر اندر سے ڈرپوک اور حکم کا غلام جس کی نوکری کے بنیادی اصول تین ہوتے ہیں۔ طاقتور کو سلام، کمزور کو تڑی اور تمام صلاحیت کا استعمال

مولوی خادم حسین نے بتا ہی دیا ہوگا۔ گالیاں بقلم خود لاہور جا کے کھالینا۔" محسن بولا۔

اکرام شیخ اور اس کی ٹیکسی کا دم غنیمت تھا ورنہ میں تو کراچی میں پردیسی تھا اور ایسا غیر ملکی جو یہاں کے حاکموں کی زبان بھی نہیں سمجھتا تھا۔ محسن سے بہتر مترجم بھی مجھے کہاں میسر آسکتا تھا۔ خادم حسین کے مخلص ہونے میں شک نہیں لیکن وہ محسن کی طرح میرے دل کی بات نہیں سمجھ سکتا تھا اور اس کی ذاتی عقل کا محسن کی معاملہ فہمی سے کوئی مقابلہ نہ تھا۔

لالو کھیت اب بھی لالو کھیت تھا۔ جیسے راولپنڈی کے کمپنی باغ کو لیاقت علی خاں کی شہادت لیاقت باغ نہ کرسکی تھی ایسے ہی لیاقت آباد ابھی تک لوگوں کی زبان پر نہیں چڑھا تھا۔ ایم اے جناح روڈ کو بھی اکثریت بندر روڈ ہی کہتی تھی۔ معاشرتی سوچ اور خیالات کی جذبات کی اور ارادوں کی ہم آہنگی اور قول و فعل سے ایک زندہ قوم کا وجود ثابت کرنے کی اجتماعی خواہش ابھی تک مفقود تھی۔ جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹادو۔ اب ہم پاکستانی ہیں' یہ جذبہ کہیں نہ تھا اور مشرقی پاکستان کی علیحدگی اسی کا شاخسانہ تھی۔

سب انسپکٹر پراچہ نے تقریباً ایک درجن افراد کو برآمدے میں فرش پر دیوار کے ساتھ بٹھا رکھا تھا۔ ان سب کو ابھی تک علم نہ تھا کہ آخر انہیں کس جرم میں تھانے بلا کے روک لیا گیا ہے۔ عام آدمی تھانے پہنچ کے یہ سوال کرنے کی جرات نہیں رکھتا۔ وہ جانتا ہے کہ جرم سرزد نہ ہونے سے کوئی بے قصور نہیں ثابت ہوتا اور ضروری نہیں کہ جو جرم کرے وہی مجرم کہلائے۔ یہ تو پولیس والوں کی مرضی اور اختیار کا مسئلہ ہے جسے چیلنج نہیں کیا جاسکتا۔

مختلف کمروں میں لوگوں کی آمدورفت معمول کے مطابق جاری تھی۔ ایس ایچ او صاحب اپنی گاڑی میں گشت کے لیے روانہ ہو رہے تھے۔ آس پاس سب اٹین شن تھے اور فضا میں وہی دہشت تھی جو شیر کی کچھار سے برآمد ہوتے وقت جنگل پر طاری ہوجاتی ہے۔ انہوں نے جاہ و جلال کی ایک نگاہ غلط انداز سے ہمیں دیکھا مگر رکنا ان کی شان کے خلاف تھا۔

ایک خوشامدی ماتحت نے فرض شناسی کا مظاہرہ کرنے کے لیے اکرام کو گالی دی۔ "اوئے... یہ ٹیکسی کدھر کھڑی کردی ہے راستے میں۔"

اکرام نے پلٹ کے کہا "اور بھی گاڑیاں کھڑی ہیں وہاں۔"

"ایس ایچ او صاحب کی گاڑی کا راستہ روک رکھا ہے اور اوپر سے بکواس کرتا ہے..." اس نے دوسری گالی دی۔

"گاڑی تو نکل گئی۔ اور بس میں ہوتے ایس ایچ او صاحب تو سائیں گزر جاتی۔" اکرام شیخ نے کہا "تم پہلے کہتے تو میں...."

کانسٹیبل نے اس کی بک بک بند کرنے کے لیے مروجہ طریقے کے مطابق اسے ہاتھ مارنے کی کوشش کی تو محسن درمیان میں آگیا "کیا بات ہے؟ یہ تم اپنی مادری زبان کیوں استعمال کر رہے ہو۔ تمہیں تو پبلک کے ساتھ اخلاق سے بات کرنے کی ہدایت ہے۔" محسن نے کانسٹیبل سے کہا۔

پراچہ نے صورت حال کی نزاکت کو سمجھ لیا اور کانسٹیبل کو لتاڑنا بہتر سمجھا "اوئے موٹی عقل والے کھوتے۔ ٹھیک فرماتے ہیں صحافی صاحب۔ چل دفع ہو ادھر سے اور کچھ چائے پانی کا بندوبست کر۔"

موٹے کانسٹیبل کی عقل ہی نہیں کھال بھی موٹی تھی۔ ایک لمحے میں غرانے والا کتا دم ہلانے لگا۔ بے عزتی کرنا اور بے عزتی کرانا ایک ایسا معمول تھا جس کے وہ عادی تھے۔

پراچہ نے ہمیں اپنے کمرے میں بٹھادیا جو درحقیقت ہیڈ محرر کا دفتر تھا مگر اسے وقتی طور پر کہیں اور بھیج دیا گیا تھا۔

"تو سرجی۔ سب گواہان حاضر ہیں۔ آپ خود پوچھ لو ان سے جو بھی پوچھنا ہے۔"

محسن نے کہا "پہلے مجھے آپ سے معلوم کرنا ہے۔"

"پوچھیں جناب" اس نے بہت اعلیٰ قسم کے غیر ملکی سگریٹ آگے بڑھائے۔

"ہم میں سے کوئی نشہ نہیں کرتا" محسن بولا "کل جس وقت حادثہ پیش آیا تھا تو یہاں ڈیوٹی افسر کون تھا؟"

"آپ کا یہ خادم تھا جناب۔"

"تمہیں حادثے کا علم کب ہوا تھا؟"

"تھوڑی دیر بعد۔ کسی نے فون کیا تھا" وہ بولا۔

"پھر تم نے کیا کارروائی کی تھی؟"

"میں نے جناب کانسٹیبل کو روانہ کردیا تھا فوراً۔ آپ اس سے پوچھ سکتے ہیں۔" اس نے گھنٹی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"ابھی مت بلاؤ اسے۔ کیا اس وقت یہاں کوئی رکشا والا تھا؟"

وہ چونکا "رکشا والا؟"

"ہاں۔ اسے تم نے مرغا بنا رکھا تھا۔ کیا جرم ہوا تھا اس سے؟"

"اس نے..... جناب ایک بڈھے کو ٹکر ماردی تھی۔ رانگ سائڈ سے سامنے آکے۔"

"پھر تم نے چالان کیا اس کا۔ یہ تو خاصا سنگین معاملہ تھا۔ دو جرم تو ثابت تھے۔ رانگ سائڈ اور مجرمانہ غفلت..."

"اوجی ایسے چھوٹے چھوٹے معاملات پر ہم کیس بنانے لگیں تو ہوچکا کام۔ نفری پہلے ہی کم ہے پھر عدالتوں کا کام کتنا بڑھ جاتا ہے۔ بڑے بڑے چوری ڈکیتی قتل اور اغوا کے کیس برسوں سے پڑے ہیں۔"

"چنانچہ تم نے خود ہی عدالت کا کام بھی کیا اور اسے سزا دے کے چھوڑ دیا۔ ویری گڈ" محسن نے طنز سے کہا "پھر کتنا جرمانہ لگایا اس پر؟"

"میں سمجھا نہیں جی' یہ رکشا والا بیچ میں کدھر سے آگیا؟"

"وہ رکشا والا کہاں ہے؟" محسن نے اس کی بات کو نظرانداز کردیا۔

"پتا نہیں جی۔ صلح صفائی کرادی تھی۔ بے شک غلطی بابا جی کی تھی مگر رکشے والے کا بھی تو فرض بنتا ہے کچھ..."

محسن نے کہا "تم میرے سوال کا جواب کیوں نہیں دیتے۔ رکشا کس کا تھا۔ رکشا کا نمبر کیا تھا۔ وہ بابا کہاں ہے۔ تم نے اسے گھر پہنچایا تھا یا اسپتال بھیجا تھا؟"

تھانے دار کچھ نروس ہوا "وہ جی۔ صلح صفائی ہوگئی۔ بابا اتنا زیادہ زخمی بھی نہیں تھا۔ رکشا والا خود ہی ان کو اسپتال لے گیا تھا۔"

محسن بولا "کیا یہ صحیح ہے کہ جب وہ رکشا والا یہاں مرغا بنا ہوا تھا تو اسی وقت کسی نے تمہیں حادثے کی اطلاع دی تھی؟"

تھانے دار نے مجبوراً اعتراف کیا "ہاں جی۔ ٹائم تو وہی تھا۔"

"رکشا والے نے تمہاری باتیں سنی تھیں۔ فون کرنے والے نے تمہیں ٹرک کا نمبر بھی بتایا تھا اور ٹرک ڈرائیور کا حلیہ بھی۔"

"بکواس کرتا ہے وہ..." تھانے دار گرم ہوگیا "لاؤ اسے میرے سامنے۔"

"کیا واقعی تمہیں اس ٹرک کا نمبر معلوم نہیں؟" محسن نے آگے جھک کے دوستانہ رازداری سے سوال کیا۔

"کمال ہے جی..."

محسن نے اس کی بات کاٹ دی "نمبر ایک دکان دار نے بھی بتایا ہوگا۔ وہ وہیں اسٹول پر بیٹھا ہوا تھا اور اس نے سب دیکھا تھا۔ ٹرک کا نمبر بھی اور اس رکشا کا نمبر بھی جس کو ٹرک نے دوبار ٹکر ماری تھی اور دور تک گھسیٹتا ہوا لے گیا تھا۔ اس دکان دار نے ہی بچے کو اٹھایا تھا جو ماں کی گود سے اچھل کے رکشا سے باہر سڑک پر جاگرا تھا۔ تمہیں کچھ یاد آیا؟"

محسن نے اندھیرے میں تیر چلایا تھا مگر خاصے اعتماد کے ساتھ۔ تھانے دار کی صورت پر ہوائیاں اڑنے لگیں مگر وہ ڈھیٹ آدمی تھا "باہر بیٹھے ہیں سارے دکان دار جناب۔ ان میں سے کون ہے؟"

"ان میں وہ نہیں ہوگا۔ میں شرط لگا سکتا ہوں۔"

"آپ کو کیسے معلوم...؟"

"پراچہ صاحب۔ ہم اخبار والے بال کی کھال نکالنا آخر کس سے سیکھتے ہیں؟ تم ہی جیسے لوگوں سے...."

"کیا مطلب ہے جی اس فضول بات کا آخر۔"

"مطلب یہ کہ گرو کو چیلا پہچانتا ہے اور چیلے کو گرو۔ ہم چور کے دھندوں سے بھی واقف ہیں اور کوتوال کے کرتوت بھی جانتے ہیں۔ میں نے اس گواہ کو آئی جی صاحب کے آفس پہنچ کر انتظار کرنے کو کہا ہے۔ اب تم اس کو منحرف نہیں کرسکتے۔ اس کی زبان بند نہیں کرسکتے اور غائب نہیں کرسکتے۔ ابھی معاملہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ مجھے بتادو کہ ٹرک والے سے تم نے کتنے پیسے وصول کیے ہیں۔"

پراچہ کو پسینہ آگیا "پیسہ' توبہ جی..."

"ٹرک کہاں ہے؟" محسن نے سپاٹ لہجے میں کہا "نمبر کیا ہے اس کا اور مالک کون ہے؟ مجھے دو ٹوک جواب چاہیے ورنہ میں جارہا ہوں۔"

سب انسپکٹر پراچہ کو ایک لمحے کے لیے سکتہ سا ہوگیا۔ وہ کچھ دیر خلا میں گھورتا رہا "ٹھیک ہے سرجی۔ شام کو مالک حاضر ہوجائے گا۔ جہاں آپ بولوگے۔ وہ خود آپ سے بات کرلے گا۔"

محسن نے کہا "ہاں۔ مرنے والی میری ایک ہی بہن تھی' تم اس کے قاتل کو بچانے کی کوشش کروگے تو خود بھی مارے جاؤگے۔ یہ کسی ایرے غیرے کا نہیں' میرا ذاتی مسئلہ ہے۔ باقی لوگوں کو چھوڑدو۔"

پراچہ نے سہلایا "آپ کل ہی تھانے آجاتے تو اتنی لمبی بات نہ ہوتی۔ ہمیں کیا پتا جی کہ وہ آپ کی ہمشیرہ تھیں۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ میں جنازے میں شریک نہ ہوتا۔ یہاں آجاتا۔ اب آگیا ہوں میں۔" محسن نے برہمی سے کہا "مجھے بتاؤ کس کا ٹرک تھا۔ کیا نمبر تھا اس کا؟"

"ٹرک تو جناب رانا گڈز کیریرز والوں کا تھا۔ نمبر بھی لکھ لیں۔"

محسن نے فاتحانہ نظروں سے میری طرف دیکھا "مجھے نمبر لکھ کے کیا کرنا ہے۔ اب تم میری طرف سے ایف آئی آر لکھو۔ اس ٹرک کے ڈرائیور کے خلاف' تم مالک کو جانتے ہو تو ڈرائیور کو بھی جانتے ہوگے۔"

پراچہ نے خشک لبوں پر زبان پھیری "مالک.... مالک تو سر لاہور میں رہتے ہیں.... ڈرائیور مفرور ہے.... کمپنی کا منشی آیا تھا۔"

محسن کھڑا ہوگیا "سب انسپکٹر پراچہ۔ تم ذرا اپنے جرائم کی فہرست دیکھو۔ تم نے حادثے کی رپورٹ کو اہمیت نہیں دی۔ جائے واردات پر جانے سے گریز کیا۔ جانتے بوجھتے گواہی بدلی۔ اعانت مجرمانہ کے مرتکب ہوئے۔ رشوت لے کر ڈرائیور کو فرار ہونے میں مدد دی۔"

"آپ کچھ ثابت نہیں کرسکتے جی۔"

"ثابت ہوجائے گا پراچہ صاحب اور ثبوت تمہارے سامنے آئیں گے تو تم خود اندر ہوجاؤ گے۔ تم اس وقت بھی ایف آئی آر لکھنے سے انکاری ہو۔ ایک بین الاقوامی شہرت رکھنے والا وکیل میرے ساتھ ہے۔"

سب انسپکٹر پراچہ نے دھڑ سے گھنٹی پر ہاتھ مارا "اوئے موٹی عقل والے کھوتے۔ بلا اپنے اس باپ کو" اس نے کانسٹیبل سے کہا جو گھنٹی کی آواز پر چراغ الہ دین کے جن کی طرح نمودار ہوتا

صرف مال یا کھال کھینچنے کے لیے۔ محسن کی بات نے اس کو سنبھلنے پر مجبور کردیا۔

"یہ سکندر بخت کون ہے؟" میں نے کہا "اس سے پوچھو ذرا۔"

محسن کے سوال نے سب انسپکٹر کو پریشان کردیا "مجھے کچھ نہیں معلوم جی۔ ادھر سے ایس پی نے فون کرکے حکم دیا تھا کہ فوراً اس پتے پر جاؤ۔ یہاں سے ابھی ابھی کسی سکندر بخت نے لاہور فون کیا ہے' اسے پکڑلو۔"

"کس جرم میں؟ کیا فون کرنا بھی جرم ہے۔ فرض کرو یہاں سے کسی سکندر بخت نے لاہور کال کی ہوتی تو کیا صرف کال کرنے پر اسے پکڑا جاسکتا تھا اور تم لوگ محض افسر کے حکم پر کسی کے گھر میں ایسے داخل ہوسکتے ہو؟ پوری پولیس فورس کے ساتھ چڑھائی کرنے کا کوئی قانونی جواز تو ہونا چاہیے۔ تمہارے ساتھ نہ ایس ڈی ایم ہے نہ لیڈی پولیس اور نہ وارنٹ۔"

سب انسپکٹر نے مردہ لہجے میں کہا "کیا کریں جی۔ یہ نوکری ہی ایسی ہے۔ افسر تو افسر ہی ہوتا ہے۔ اس کا حکم ماننا پڑتا ہے۔"

"اگر افسر کہے کہ جاؤ اپنے باپ کو گولی ماردو تو تم ایسا ہی کروگے؟"

"صاحب' آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ ہم سے کہا گیا تھا کہ اس گھر میں ایک مجرم نے پناہ لے رکھی ہے۔ دیر کی تو وہ فرار ہوجائے گا۔ پتا نہیں افسر صاحب نے غلط سنایا ہم نے۔ پتا بالکل ٹھیک ہے اور ٹیلی فون نمبر بھی یہی اگر آپ برا نہ مانیں سر تو میں اندر بھی دیکھ لوں۔"

"کیا مطلب؟ کیا ہم نے چھپادیا ہے اسے اندر" محسن نے برہمی سے کہا "ہم پناہ دیتے ہیں مجرموں کو۔ تمہارا یہ جرم کیا کم ہے کہ تم وارنٹ کے بغیر اس گھر میں گھسے ہو... اوپر سے خانہ تلاشی کی اجازت مانگ رہے ہو۔"

"آپ ہماری مجبوری کو سمجھتے تو اجازت دے دیتے جناب عالی۔ ہم ایک نظر ڈال کے مطمئن ہوجاتے تو ایس پی کو رپورٹ دیتے کہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ کسی نے غلط اطلاع دی تھی۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ میری عزت بچ جائے گی صحافی صاحب۔ آپ بادشاہ لوگ ہوتے ہو۔ آئی جی صاحب کو بتادوگے یا اخبار میں چھاپ دوگے تو ہماری پیٹی اتر جائے گی۔"

محسن نے کہا "اچھا جاؤ دیکھ لو اور پھر اپنی ساری فورس کے ساتھ دفع ہوجاؤ۔"

سب انسپکٹر نے محسن کے لہجے اور رویّے کا بالکل برا نہیں مانا اور اچھی طرح گھر کو کھنگال ڈالا "کمال ہے۔ ایس پی صاحب نے سکندر بخت کا نام کیسے لیا۔"

"یہاں سکندر بخت نام کا کوئی شخص پہلے ہی نہیں تھا لیکن ایک بات ہے تھانے دار صاحب۔ تم دیکھ رہے ہو کہ ٹیلی فون کے کھمبے سے ایک تار اس گھر تک آرہا ہے۔ اب کوئی باہر ہی اس تار سے ٹیلی فون جوڑے تو معلوم یہی ہوگا کہ کسی نے اسی نمبر سے کال کی تھی۔"

"یہ تو ٹھیک فرمایا آپ نے۔ یہ تار تو ایکس چینج تک جاتا ہے۔"

"ویسے کال کسے کی گئی تھی؟ اور ایسی کیا بات کہہ دی تھی اس نے۔ کیا نام اس کا سکندر بخت نے؟"

"ہمیں کیا پتا جی۔ افسر لوگ پورا کیس نہیں بتاتے۔ بس حکم دیتے ہیں اور ہماری کیا مجال جو ان سے کچھ پوچھیں۔ یہاں تو کہانی ہی دوسری ہے۔ ابھی الٹا ہمیں وخت پڑجاتا۔ غلطی معاف جناب عالی" وہ ہاتھ ملا کے اپنے دونوں ماتحتوں کے ساتھ باہر نکل گیا۔ دونوں ماتحت اپنے افسر کی اس بزدلانہ اور حد درجہ خوشامدانہ روش پر خوش نظر نہیں آتے تھے۔

میں نے باہر جھانک کے دیکھا تو پولیس کی ایک گاڑی میں چار جوان سوار ہورہے تھے۔ شاید انہوں نے ہر طرف سے مکان کو گھیرے میں لے رکھا تھا۔ کچھ اہل محلّہ اس کارروائی کو بڑی مشکوک دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ پولیس کے جاتے ہی انہوں نے ہم سے رجوع کیا اور ہم نے انہیں آسانی سے مطمئن کردیا۔ پولیس کو اطلاع ملی تھی کہ حادثے کا ذمے دار ڈرائیور ہم سے معاملہ طے کرنے کے لیے یہاں موجود ہے۔ وہ اسے گرفتار کرنا چاہتے تھے مگر یہ اطلاع بے بنیاد تھی۔

"تم نے دیکھا۔ بعض اوقات پولیس والے کارکردگی دکھاجاتے ہیں۔ یہ لوگ کتنی جلدی آپہنچے۔" اکرام نے کہا۔

محسن نے سہلایا "مگر اس کے پیچھے بھی دباؤ تھا۔ لاہور سے دباؤ کراچی منتقل ہوا اور سر پر پاؤں رکھ کے دوڑنا پڑا ایک نچلے درجے کے ماتحت کو۔ قانون کے مطابق کارروائی اتنے کم وقت میں کیسے ہوسکتی تھی۔ ایس ڈی ایم' لیڈی پولیس اور وارنٹ سب ساتھ لانے کے لیے تو ضابطے کی لمبی کارروائی ضروری تھی۔ ابھی کوئی لاوارث آدمی ہوتا تو پکڑ کے لے جاتے۔ یہاں الٹے لینے کے دینے پڑگئے تھے تو اپنی جان بچا کے نکل گئے۔"

"اس اُلّو کی پٹھی نے خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار لی۔ دلاور کی بیوی اب سر پر ہاتھ رکھ کے روئے گی" میں نے کہا۔

"یہ بندوبست اس نے پہلے سے کر رکھا ہوگا" محسن نے کہا۔

"ہاں۔ مگر اب یقین اور اعتبار کی گنجائش تو نہیں رہی نا" میں نے کہا۔

"ہاں۔ تم اس غلطی سے مزید فائدہ اٹھاسکتے ہو۔ ابھی تو خدا کا شکر ادا کرو کہ بال بال بچے۔ وہ بھی میرے جھوٹ کی وجہ سے" اکرام شیخ نے کہا۔

"میں ایک کال اور نہ کرلوں' منظر کو؟"

"نہیں۔ اب یہ فون آبزرویشن پر ہوگا۔ منظر کو تمہارے

نوا۔

"کون سے باپ... کو سر؟" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"اوئے اس ہیڈ محرر کو۔ ایف آئی آر لکھنی ہے پکی۔" پراچہ نے دہاڑ کے کہا۔

ایف آئی آر کی نقل جیب میں ڈال کے ہم باہر آئے تو میں دل ہی دل میں محسن کی ذہانت کا معترف ہوچکا تھا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی جب تک وہ میرے ساتھ تھا مجھے یہ احساس تقویت پہنچاتا تھا کہ سکندر بخت بھی ایک نہیں دو ہیں اور محسن بھی ایک نہیں۔ اس کا اور میرا ذہن' خیالات' احساس اور جذبات اس حد تک مطابقت رکھتے تھے کہ مجھے کچھ کہنے سننے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ محسن سب کچھ ویسے ہی کرلیتا تھا جیسے میں چاہتا تھا۔ ایسا ہی ابھی ہوا تھا جب میں بالکل خاموش رہا تھا اور محسن نے وہی کیا تھا جو میں کرتا۔ غالب اس کا بہترین نعم البدل ثابت ہوا تھا مگر آج محسن نے پھر مجھے احساس دلادیا تھا کہ اس کا وجود میری اصل طاقت ہے۔ ایک جسم کو دو ٹانگیں سہارا دیتی ہیں منزل تک پہنچاتی ہیں۔ خطرات سے بچاتی ہیں اور حرکت کی بھرپور توانائی فراہم کرتی ہیں۔ ایک ٹانگ نہ رہے تو مصنوعی ٹانگ سے کام چل جاتا ہے مگر آدمی کی قوت اور اس کے اعتماد میں اور کارکردگی میں کتنا فرق پڑجاتا ہے۔

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا "تو نے کمال کردیا محسن۔ ایسا گھیرا اس بدمعاش کو۔"

محسن اداس ہوگیا "یار میں کوئی بہت اچھا مثالی قسم کا اور قابل رشک بھائی نہیں تھا مگر اب ایسا بھی نہیں کہ میری بہن کو سفاک قاتل سرعام مار ڈالیں اور ان کا کوئی کچھ نہ بگاڑ سکے۔ وہ ثبوت گواہ اور سراغ سب غائب کردیں اور پولیس کی دسترس سے محفوظ ہوجائیں۔"

میں نے اسے تسلی دی "اب شک کی کوئی بات نہیں رہی۔ یہ رانا گڈز کیریئرز بھی دلاور کے پارٹنر رانا کی کمپنی ہوگی۔ ابھی اس سے ملاقات نہیں ہوئی مگر اس کا چرچا بہت سنا ہے۔ ٹرک اس کا تھا تو ڈرائیور یقیناً استاد پیڈرو ہوگا۔"

اکرام نے گاڑی چلاتے ہوئے کہا "اگر کوئی چشم دید گواہ مل جاتا تو اچھا تھا۔"

"گواہ مل جائے گا۔" میں نے کہا "جائے حادثہ پر کوئی ایسا شخص یقیناً ہوگا جو لالچ اور خوف کے بغیر بتادے گا کہ اس نے کیا دیکھا تھا۔ سب بزدل اور بے کردار نہیں ہوتے۔ وردِ دل اور خوفِ خدا رکھنے والے بھی ہیں جو سامنے نہیں آتے مگر تلاش کرنے سے مل جاتے ہیں۔ یہاں جو لوگ بیٹھے ہوئے تھے ان میں سے ایک خدا کا بندہ ایسا ضرور ہوگا جو پیڈرو کو شناخت کرے گا۔"

اکرام شیخ بولا "اب یہ آئی جی صاحب کا ڈراما...."

میں نے اس کی بات کاٹ دی "ڈراما کیسا.... چلو ان سے بھی ملاقات کرلیتے ہیں۔"

محسن بولا "پبلک سے ملاقات کا وقت تو گزر گیا مگر خیر۔ ہم پبلک نہیں ہیں۔ ایف آئی آر کے حوالے سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کیس میں ماتحت عملہ جانب داری برت رہا ہے۔ کیس کی خصوصی تحقیقات کسی اور کے سپرد کی جائیں۔"

"وہ ایک بین الاقوامی شہرت کے حامل وکیل کی بات نہیں ٹالے گا۔" میں نے مسکرا کے کہا۔

میرا خیال درست ثابت ہوا۔ آئی جی ارباب ہدایت اللہ انتہائی مہذب اور شریف آدمی تھا۔ اس نے بڑے تحمل سے ہماری بات سنی اور کیس فوراً سی آئی اے کے سپرد کرنے کے احکامات صادر کردیے۔ میں فرنچ بولتا رہا اور محسن میرا مترجم بنا رہا۔ میں نے اسے بتادیا کہ میں لاہور میں کس کیس کے لیے لندن سے آیا ہوں۔ شیلی مرڈر کیس کا ذکر اس نے بھی سنا تھا مگر اسے زیادہ تفصیلات کا علم نہیں تھا۔ اس نے ہمیں لنچ پر بھی مدعو کیا مگر ہم نے معذرت کرلی۔ رسماً اس نے محسن سے تعزیت بھی کی اور اسے پھر یقین دلایا کہ اس کیس میں ٹرک کے مالک اور ڈرائیور کو قانون کے مطابق سخت ترین سزا دی جائے گی۔

ہم تیسرے پہر واپس اکرام شیخ کے گھر پہنچے تو کاجل واپس آگئی تھی۔ اس کی عدم موجودگی میں رابعہ اور گل نے کھانا تیار کرلیا تھا۔ ان کا وقت باتوں میں اور ربولی کے ساتھ کھیلتے ہوئے گزرا تھا۔

"صبح دو مشکوک قسم کے آدمی آئے تھے" کاجل نے بتایا "وہ پوچھ رہے تھے کہ اسکول کس کا ہے اور فون نمبر کیا ہے۔ چوکیدار انہیں میرے پاس لے آیا۔ انہیں معلوم تھا کہ کسی نے رات کو اس فون سے لاہور کال کی تھی مگر چوکیدار نے انہیں یقین دلادیا کہ ساری رات وہ اسی کمرے میں اندر سے دروازے بند کرکے سورہا تھا۔ میں نے بھی کہا کہ کسی نے باہر سے کنکشن ملا کے بات کی ہوگی۔ پول سے اسکول تک تار بہت لمبا ہے۔ ٹیلی فون پول سے کیبنٹ اور پھر ایکس چینج تک یا ایکس چینج سے بھی کال ہوسکتی ہے۔ گمنام کال کرنے والے ایسا ہی کرتے ہیں اور ظاہر ہے کسی نہ کسی کا فون نمبر استعمال ہوتا ہے۔"

"انہوں نے نام نہیں بتایا کہ کال کس نے کی تھی اور کسے کی تھی؟"

"نہیں حالانکہ میں نے پوچھا بھی تھا۔ ایک نے کہا کہ ہے ایک بدمعاش لاہور فون کرتا ہے اور ہماری بہن کو پریشان کرتا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کائیاں لوگ تھے۔ تمہیں یقین ہے کہ وہ اسکول سے تمہارے پیچھے نہیں آئے ہوں گے؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ چوکیدار نے انہیں موٹر سائیکل پر جاتے دیکھ لیا تھا۔ انہوں نے ایک بار بھی پلٹ کے نہیں دیکھا تھا۔ میں بھی بنگالی آمیز اردو بول رہی تھی تاکہ تمہارے اور میرے درمیان کسی تعلق کا

انہیں خیال ہی نہ آئے۔ میں نے کہا کہ میں اور میرا شوہر ڈھاکا سے آئے تھے اور اب یہ اسکول چلا رہے ہیں۔"

صرف چوبیس گھنٹے پہلے میں نے رابعہ سے کراچی جانے کی بات کی تھی اور اچانک ہم کراچی روانہ ہوگئے تھے۔ صرف چوبیس گھنٹے پہلے فوزیہ زندہ تھی اور اس کا شوہر اس کے ساتھ تھا۔ صرف چوبیس گھنٹے بعد ان کے لہو میں غرق شکستہ بدن اپنے اپنے مدفن خاک میں روپوش ہوچکے تھے۔ وہ فکر فردا اور غم دوش سے بیگانہ ہوگئے تھے۔ سارے دکھ اندیشے اور پچھتاوے ان کے لیے رہ گئے تھے جو زندہ تھے۔ جینا چاہتے تھے یا جینے کی مجبوری کو قبول کرتے تھے۔

کراچی آتے وقت میرے ذہن میں ایک خیال یہ تھا کہ یکلخت غائب ہوجانے والے سکندر بخت کا وجود کراچی میں ثابت کردیا جائے اور دشمنوں کی یہ غلط فہمی رفع کردی جائے کہ خدانخواستہ سکندر بخت اللہ کو پیارا ہوگیا یا بھاگ کے سات سمندر پار چلا گیا۔ اس غلط فہمی سے ان کے حوصلے بلند ہونے لگے ہوں گے اور وہ زیادہ پُرامید ہوں گے کہ شاید اب انہیں اپنے مذموم عزائم کی تکمیل کے لیے سازگار حالات میسر آجائیں گے۔ ان کی راہ کا اصل کانٹا میں ہی تھا۔ وہ یہ فرض کرنے میں حق بجانب تھے کہ سکندر بخت نہ رہا تو شاید کوئی ان کے خلاف زیادہ عرصہ محاذ آرائی جاری نہ رکھ سکے۔ باقی سب لوگ میرا ساتھ دے رہے تھے مگر ان کی پیشہ ورانہ مصروفیات بھی تھیں۔ غالب صحافی تھا تو منظر وقار یوسف اور رابعہ وکالت کررہے تھے۔ اس وقت بھی جب میں نہیں تھا اور جب میں نہ رہا تو وہ پھر خود کو اپنے اپنے کام کے لیے وقف کردیں گے۔ محسن میرا دستِ راست تھا تو وہ پہلے ہی الگ ہوچکا تھا۔

چنانچہ میرے کراچی آنے کا دوسرا اہم مقصد یہ تھا کہ محسن کو پھر اپنی مدد کے لیے آمادہ کروں۔ غالب اور نازو کی عدم موجودگی میں عملاً میں بے دست وپا ہوکے رہ گیا تھا اور مجھے صرف مورل سپورٹ ہی کی نہیں کسی حقیقی مددگار کی ضرورت بھی محسوس ہورہی تھی۔ رابعہ اپنے جذبات اور خلوص نیت میں سب سے بڑھ کر تھی مگر وہ نازو یا گل کی طرح میدانِ عمل اور میرے شانہ بشانہ معرکہ آرائی میں کوئی نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کرسکتی تھی۔ یہی صورت حال منظر یا وقار یوسف کی تائید وحمایت کی تھی۔ وہ میرے دفاع کی جنگ میں برابر شریک تھے لیکن میرے جارحانہ عزائم کا ساتھ دینے سے قاصر تھے۔ غالب اور نازو ہی میری وہ طاقت تھے جن پر میں ہر محاذ پر کامیابی کے لیے انحصار کرتا تھا۔ ان کے ساتھ نہ ہونے سے میری جدوجہد ایک بند گلی میں پہنچ کے رک گئی تھی۔ اس بند گلی سے باہر آنے کے لیے غالب اور نازو کی بازیابی ضروری تھی اور یہ کام میں اکیلا نہیں کرسکتا تھا۔

دوسری طرف دلاور کے نہ ہونے سے اس کے خاندان کو سب سے زیادہ فرق پڑتا تھا۔ استاد پیڈرو' رانا اور ڈاکٹر شاہ جیسے تو شاید یہ سوچتے ہوں گے کہ اب اس گروہ کی قیادت انہی کے حصے میں آئے گی۔ استاد پیڈرو کے بارے میں تو مجھے معلوم تھا کہ نہ جانے کب سے وہ دلاور کا نمبر ٹو تھا اور نمبر ون کہلانا اس کا پرانا خواب تھا۔ دلاور کی زندگی میں یہ ممکن نہیں تھا اور نہ پیڈرو میں اتنی ہمت تھی کہ وہ دلاور کو اپنے راستے سے ہٹا سکے۔ اب اسے اپنے خواب کی تعبیر اپنی دسترس میں نظر آرہی تھی۔

جب اس موضوع پر میری محسن سے بات ہوئی تو اس نے کہا۔ "میں خود بھی اب یہاں رہنا نہیں چاہتا۔ وہ وقت اور تھا جب گل مجھے اپنی مرضی سے یہاں لائی تھی۔ میری مرضی جانے بغیر۔"

میں نے کہا "اچھا ہی کیا تھا اس نے۔"

"عورت اپنی محبت کے معاملے میں بڑی خودغرض ہوجاتی ہے۔" محسن بولا "لیکن میری اپنی وہ حالت تھی کہ مردہ بدست زندہ۔ اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"شاید گل یہ نہیں چاہے گی کہ تیری حالت پھر بگڑے۔"

"نہیں۔ وقت نے وہ زخم مندمل کردئے ہیں اور گل بھی مطمئن ہے کہ اس کی محنت بار آور ہوئی۔ میں یہاں فوزیہ کی وجہ سے رکا ہوا تھا لیکن کیا فائدہ ہوا اس سے۔ میں اس کے لیے کچھ بھی تو نہ کرسکا۔ پہلے گل نے اس لیے مجھے سب سے دور رکھا کہ میری حالت ایسی نہ تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی میری حالت پر ترس کھائے یا میں دوسروں کے لیے تماشا بنوں۔"

"کوئی پتھر نہ مارے میرے دیوانے کو" میں نے کہا۔

"یہ سمجھ لے۔ بعد میں خود میں نے فوزیہ کو محفوظ رکھنے کے لیے اس کے گھر کا رخ نہیں کیا۔ یہ میری خام خیالی تھی کہ اس طرح فوزیہ کو کچھ نہیں ہوگا۔ میری وجہ سے اس پر آفت نہیں آئے گی۔ شاید معاملہ اس کے برعکس تھا۔ دشمن مسلسل اس کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ وہ خود بھی یہ جانتی تھی کہ اس طرح کوئی ہمیشہ نہیں بھاگ سکتا اور مسلسل فرار کا انجام بالآخر یہ ہوتا ہے کہ سارے راستے بند ہوجاتے ہیں پھر آدمی بھاگ بھی نہیں سکتا۔"

"کیا تیرے خیال میں اسے معلوم تھا کہ تم دونوں بھی یہاں ہو؟"

"ہاں۔ مجھے شک ہے کہ اسے پتا چل گیا تھا۔ کیا پتا اس کے شوہر نے ہی بتادیا ہو اسے مگر اس نے نہیں چاہا کہ جو دشمن اس کے پیچھے لگے ہوئے ہیں وہ میرے پیچھے لگ جائیں۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کی سلامتی کے خیال سے الگ الگ اور دور دور رہے مگر کیا حاصل ہوا اس سے۔"

"پھر اب کیا سوچا ہے تُو نے؟"

"اب میں یہاں کیوں رہوں گا۔ کیا کروں گا اپنے آپ کو بچا کے۔ مارنے والے تو یہاں بھی مجھے مار سکتے ہیں۔ میں تیرے ساتھ لاہور چلوں گا۔ اکرام شیخ اور کاجل کی پُرسکون زندگی میں اپنے خطرات کا زہر گھولنے کا الزام ہم پر نہیں آنا چاہیے۔"

"خطرہ تو گل کو اور ببلی کو بھی لاحق ہے۔" میں نے کہا۔

"ہم سب مل کے ان کی حفاظت بہتر طور پر کرسکتے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ ہم آج ہی نکل جائیں۔ اس طرح کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ سکندر بخت کا وجود کراچی میں ثابت ہوتے ہی وہ کراچی سے غائب ہوجائے۔ یہاں پولیس کے معاملات سے اکرام شیخ نمٹ لے گا۔ ورنہ اس کی بھی ضرورت نہیں۔ جو ہونا تھا ہوگیا۔ ہمیں یہ تو پتا چل گیا ہے کہ ببلی کو یتیم کرنے والا بھی استاد پیڈرو ہی تھا۔ ثبوت ایف آئی آر کی نقل ہے جو ہمارے پاس ہے۔"

میں نے کہا "یہ محض کاغذ کا ایک پرزہ ہے۔ ہمارے جانے کے بعد اس کی حیثیت صفر ہوجائے گی۔ اکرام شیخ کو ہم نے ایک ٹیکسی ڈرائیور کی حیثیت سے متعارف کروایا تھا۔ وہ اس کیس میں دلچسپی لے گا تو پولیس اسی کے لیے مشکلات پیدا کردے گی۔ اسے آزمائش میں ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ وہ اور کاجل ان معاملات سے الگ ہی رہیں تو اچھا ہے۔ استاد پیڈرو کے خلاف ایک اور فرد جرم ہمارے ہاتھ لگ گئی ہے۔ اس میں ٹرک کا نمبر بھی ہے اور کمپنی کا نام بھی۔ ڈرائیور کو شناخت کرنے والے چشم دید گواہ بھی ہیں۔"

"مگر ان میں سے کوئی سامنے آکے بیان نہیں دے گا۔"

"دیکھ یار۔ ایک تو سچائی ویسے تو کسی ثبوت کی محتاج نہیں ہوتی مگر کیا کریں۔ قانون کے تقاضے بھی پورے کرنے پڑتے ہیں۔ اگر ایک سچا گواہ جھوٹ بول کے جان بچاتا ہے تو ہم ایک جھوٹا گواہ پیش کردیں گے جو سچ بولنے سے نہیں ڈرے گا اور سچ تو سچ ہی ہے خواہ کوئی بھی بولے۔"

گل اور محسن بھی کرائے کے چھوٹے سے مکان میں رہتے تھے جو درحقیقت ایک کوٹھی کا سرونٹ کوارٹر تھا۔ انہوں نے ضروریاتِ زندگی کو محدود رکھا تھا چنانچہ ذاتی استعمال کے کپڑوں کے علاوہ ان کے پاس کچھ برتن تھے اور تھوڑا بہت فرنیچر۔ برتن انہوں نے کاجل کے حوالے کردئے اور فرنیچر وہیں چھوڑ دیا۔ اس کے لیے کاجل کے گھر میں بھی جگہ نہیں تھی۔

محسن نے کہا "فوزیہ کے سامان میں سے کچھ ہم لیے جارہے ہیں۔ چند ذاتی چیزیں۔ تصویریں اور کچھ اس کے شوق کا کھیل۔ وہ بچپن میں ڈاک کے ٹکٹ جمع کرتی تھی۔ کالج میں آٹوگراف لینے کا شوق ہوا۔ ٹیبل ٹینس بھی کھیلتی تھی۔ ریکٹ ساتھ رکھتی تھی اب بھی حالانکہ کھیلنا چھوڑ چکی تھی۔ اس کے کپڑے اور گھر کا سب سامان کسی خیراتی ادارے کو پہنچادینا۔ اس نے مکان کرائے پر لیتے وقت مالکِ مکان کو ایڈوانس دیا ہوگا۔ اس ماہ کا کرایہ...."

"یار وہ میں کرالوں گا" اکرام نے محسوس کیا کہ محسن پر دکھ کے جذبات غالب آرہے ہیں۔

"اکرام بھائی.... کبھی وقت ملے نا.... تو اس کی قبر پر چلے جانا" گل نے کہا۔

محسن رونے لگا "نہیں یار۔ مٹی تو مٹی ہے۔ کسے معلوم تھا کہ فوزیہ کی مٹی یہاں پہنچے گی۔ مٹی کے ڈھیر پر آنسو بہانے سے کچھ نہیں ملتا۔ اصل چیز تو یاد ہے۔ جب وہ دل سے محو ہوجاتی ہے تو پھر...."

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا "مت کر ایسی باتیں۔ یہ تو ہم سب کا انجام ہے۔ آج یا کل۔ یہاں یا وہاں۔"

رابعہ کا براہ راست فوزیہ سے کوئی تعلق نہیں رہا تھا اور دیکھا جائے تو ان کے درمیان رقابت کے جذبات کا رشتہ تھا مگر زندگی کے حقائق سے رابعہ نے بھی اتنی ہی فراخ دلی سے سمجھوتا کرلیا تھا جیسے فوزیہ نے۔ وہ بھی فوزیہ کے لیے رو رہی تھی اور گل بھی۔

شام کو میں اکرام اور محسن قبرستان گئے۔ یہ عزیز آباد کا قبرستان کہلاتا تھا اور اس کے مین گیٹ سے کچھ فاصلے پر دائیں جانب فوزیہ اور اس کے شوہر کی قبریں تھیں۔ محسن کے جذبات ایک بھائی کے جذبات تھے۔ ہم نے اسے دل کی بھڑاس نکالنے سے نہیں روکا۔ اکرام شیخ اس کے ساتھ بیٹھا رہا اور میں فوزیہ کی قبر کے سرہانے کھڑا ماضی کے دریچوں میں جھانکتا رہا۔ میرا دل پُر آزار یادوں سے بوجھل تھا۔ گزرا ہوا وقت میرے تصور کی البم میں کبھی نہ مٹنے والے نقش کی طرح موجود تھا۔ میں نے اسے کہاں کہاں دیکھا تھا۔ کیسے دیکھا تھا اور کیسے چاہا تھا۔ اس سے کیا کہا تھا اور کیا سنا تھا۔ الفاظ 'کھوکھلے' بے معنی بے وجود الفاظ۔ زندگی کا دریا خشک ہوگیا تھا اور یہ الفاظ اس کی تہ میں بچھے ہوئے سنگ ریزوں کی طرح باقی رہ گئے تھے۔ ندامتوں کی کڑی دھوپ میں ان پر چلنے سے تلوے جلتے تھے۔

شہرِ خموشاں کے گونجتے سناٹے میں جھینگر رو رہے تھے اور ہوا درختوں میں سسکیاں لے رہی تھی۔ مٹی کے ڈھیر کے نیچے میں نے فوزیہ کا تصور کیا۔ وہ خاموش تھی اور اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اس نے مجھ سے گلہ نہ کرنے کی قسم کھائی تھی اور مجھے نہ دیکھنے کا عہد کرلیا تھا۔ اس کے آخری خط کے ہر لفظ کی بازگشت خیال کے ویرانے میں بھٹک رہی تھی۔ مٹی پر پڑے ہوئے تازہ پھول 'اگربتی کا بل کھاتا ہوا دھواں' تازہ مٹی سے اٹھنے والے پانی کے بخارات کی مہک۔ فوزیہ کو کون سی خوشبو پسند تھی۔

محسن نے میرے کندھے کو ہلایا "چل یار سکندر۔ رات ہوگئی۔"

میں نے اس کے شانے پر سر رکھ کے روتے ہوئے کہا "یار محسن۔ مجھے تُو معاف کرسکتا ہے؟ میں نے بہت دکھ پہنچایا تجھے۔ میں بڑا کمینہ دوست تھا تیرا۔ بہت ذلیل آدمی تھا۔ آخر ایسا کیوں کیا میں نے؟"

محسن نے کہا "اپنی مرضی سے کچھ نہیں کیا تھا تُو نے۔ یہ سب تو بس ہوگیا۔ پتا نہیں کیسے' تیرا کیا قصور تھا اس میں۔ یہ تقدیر تھی۔"

اگلے دن رابعہ اور گل کی خواہش پر فوزیہ کے گھر پر قل کا اہتمام کیا گیا۔ اس وقت تک گھر خالی ہو چکا تھا۔ چند پڑوسیوں کے ساتھ ہم نے بھی کرائے کی دری چاندنی پر بیٹھ کے قرآن خوانی کی۔ شام کو ہم نے اس کی چابی مالکِ مکان کے حوالے کردی۔

رات کو کاجل اور اکرام ہمیں کینٹ اسٹیشن پر چھوڑنے آئے' دس بجے خیبر میل نے دوسری سیٹی دی تو کاجل نے بوبی کو پیار کیا اور نیچے اتر گئی۔

اکرام نے کہا "ہم آئیں گے لاہور۔ اپنا خیال رکھنا تم سب لوگ۔"

ایک تاریک رات مخالف سمت میں بھاگنے لگی۔ اندھیرے کی دیوار قائم رہی۔ ٹھوس اور منجمد خلا کی طرح۔ کبھی کبھی اس پر سے روشنی کے دیے تیرتے ہوئے نکل جاتے تھے جیسے شہابِ ثاقب۔ صرف پہیوں کے فولادی پٹڑی پر دوڑنے کی صدا سے حرکت کا تاثر قائم ہوتا ورنہ لگتا تھا کہ ٹرین اپنی جگہ پر کھڑی ہے اور یہ رات ہے جو پیچھے کی طرف دوڑ رہی ہے۔ بالآخر حصارِ شب ٹوٹنے لگا اور دھندلکا ایک اور دن کی آمد کا اعلان کرنے لگا پھر منظر روشن ہوتا گیا۔ شجر حجر' کھیت کھلیان' ندی نالے ایک متحرک تصویر کا حصہ بن گئے۔ کچے پکے مکانوں سے اٹھتا دھواں۔ ہل چلاتے کسان۔ گلے میں بستے ڈالے اسکول جانے والے بچے۔ سائیکلوں پر ریل کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ سفر کرنے والے۔ زندگی کے ان گنت روپ میں نمودار ہوئے تو فوزیہ کا خیال پس منظر میں چلا گیا۔ گزرے ہوئے دن پر آنے والا دن یوں غالب آگیا جیسے خواب پر حقیقت غالب آتی ہے۔ کل جو گزر گیا ماضی ہو گیا۔ آنے والا کل ہنوز ایک تصور ہے۔

شام ہوئی تو ہم پھر لاہور میں تھے۔ وہ تین دن جو گزر گئے تھے یادوں میں شامل ہو گئے تھے۔ عمرِ گزشتہ کے قبرستان میں ہزاروں دن دفن تھے۔ کچھ کے آثار تک نہ تھے۔ کچھ تلاش کرنے سے مل جاتے تھے مگر آدمی سے زیادہ قبروں کے کتبے تک صاف پڑھے جاتے تھے ان پر تاریخ تک واضح تھی۔ تین دن' تین نئی قبروں کی طرح تھے جن کی مٹی تک خشک نہ ہوئی تھی۔

رات بارہ بجے تک ہم وقار یوسف کے گھر میں تازہ ترین واردات پر اپنے اپنے ردِ عمل کا اظہار کرتے رہے اور جذبات کی آگ کو ٹھنڈا کرتے رہے پھر منظر گھر جانے کے لیے اٹھا تو رابعہ کو بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ وہ گل اور محسن کو بھی لے جانا چاہتا تھا مگر محسن کو میں نے روک لیا اور نگی نے دو ٹوک لہجے میں اعلان کردیا کہ باقی سب جہاں چاہیں جائیں مگر بوبی کہیں نہیں جائے گا۔ ظاہر ہے اس کے بعد گل کہاں جاتی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ بوبی کی مامتا جس کے جملہ حقوق گل نے اپنے نام یک طرفہ طور پر محفوظ کرائے تھے اس پر اب رابعہ اور نگی بھی اپنا حق جتائیں گی۔ رابعہ کا رویہ ذرا مصالحانہ تھا مگر نگی نے تو بالکل لحاظ نہیں کیا "ٹھیک ہے تم کو پہلے اس کی ماں بننے کا حق حاصل ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم کچھ نہیں۔"

گل نے فوراً یہ حق تسلیم کرلیا "بوبی سب کا ہے۔ آخر چچی پھوپی اور خالہ کی ضرورت بھی تو ہے بوبی کو۔"

بڑی خوب صورتی سے گل نے بھی نگی پر واضح کردیا تھا کہ ماں تو وہی کہلائے گی۔ وہ اپنی اس حیثیت کا تحفظ بھی کرے گی اور خون کے رشتوں کا احترام بھی۔ ظاہر ہے رابعہ اور نگی بھی گل کو اس کے مقام سے محروم نہیں کرسکتی تھیں اور نہ ایسا کوئی ارادہ رکھتی تھیں۔

میں نے بھی منظر کے جاتے ہی گھڑی دیکھی "میں تو آفس جاؤں گا۔"

نگی نے کہا "آج تو آرام کرلو۔"

میں نے کہا "وہاں مجھے کون سا پہاڑ کھودنا ہے رات بھر میں۔ چوکیدار تین دن سے غائب تھا۔ اسے ڈیوٹی پر حاضر ہوجانا چاہیے۔"

محسن نے کہا "میں بھی تیرے ساتھ چلوں گا۔"

گل نے اسے ڈانٹا "آتے ہی چل پڑے منکر نکیر ایک ساتھ۔ ایک دن تو آرام سے گزار لیتے۔"

میں نے کہا "گل۔ ہم آرام ہی کریں گے' تم فکر مت کرو۔"

"فکر کیسے نہ کروں۔ میں جانتی ہوں تم مل جاؤ تو آرام حرام ہوجاتا ہے۔"

نگی نے اس کی حمایت کی "بیویاں بے چاری فکر ہی کرسکتی ہیں۔"

"فکر ضرور کرو مگر قید مت کرو اپنے شوہروں کو۔" میں نے کہا "ان کی نصف بہتر بنو مگر انہیں نصف بدتر ہونے کا احساس مت دلاؤ۔"

"یہ تقریر کرنا رابعہ کے سامنے۔ ہمارے شوہروں کو خراب مت کرو" نگی نے احتجاج کیا۔

"اگر اچھے شوہر ملے ہوتے تمہیں تو پھر میں یہ بات مان لیتا۔ ابھی تو خطرہ مجھے ہے۔ شریف آدمی میں ہی تو رہ گیا ہوں۔ عقد نے ان کو نکما کردیا۔ ورنہ یہ بھی آدمی تھے کام کے۔"

محسن اور وقار یوسف نے میرے مؤقف کی تائید میں سہلا کے انہیں مزید خفا کیا۔ میں اور محسن پیدل ہی روانہ ہونے کے موڈ میں تھے لیکن وقار نے گاڑی نکال لی۔ یہ اس کے سسر نقوی صاحب مرحوم کی وہ عالی شان کار تھی جس میں بیٹھنے کا اعزاز ہم پہلے بھی حاصل کرچکے تھے۔ اس جیسی گاڑیاں لاہور میں گنی چنی تھیں اور امرا کا ایک خاص طبقہ ہی انہیں افورڈ کرسکتا تھا۔ اس خاص طبقے میں بہت بڑے صنعتکار شامل تھے۔ بہت بڑے اسمگلر یا بہت بڑے عہدے پر فائز بہت بڑے ہاتھوں سے مال جمع کرنے والے نقوی صاحب کا شمار آخری قسم کے لوگوں میں تھا۔ وہ زندگی میں بڑی توپ کہلاتے تھے۔ سن پینسٹھ کی جنگ میں ایک بڑی توپ تھی رانی اور دوسری شیرنی۔ جب یہ دہاڑتی گرجتی تھیں تو لاہور والوں کے دل جذبۂ ایمانی اور یقینی فتح کے احساس سے معمور ہوجاتے تھے۔ چھ سال بعد بڑی توپ کا مفہوم بدل گیا۔ ہر بڑی توپ کا نشانہ خود اہلِ وطن ہونے لگے۔ کرپشن' اقربا پروری' لاقانونیت' رشوت ستانی اور بدعنوانی کے گولے اسی ملک کے عوام پر اور نظام پر گرنے لگے تو قوم کا شیرازہ بکھر گیا۔ ملک دو ٹکڑے ہوگیا۔

محسن اور میں آفس سے کچھ دور ہی اتر گئے۔ وقار گاڑی کو موڑ کے واپس چلا گیا اور ہم خراماں خراماں مال کی روش پر چلنے لگے۔ نصف شب کے بعد کا سکوت اِکا دُکا گاڑی کے گزرنے سے مجروح ہوجاتا تھا یا کسی موٹر سائیکل کے شور سے۔

اچانک محسن بولا "یار' کیا ملا مجھے کراچی جاکے آخر۔ میں سوچتا ہوں کہ میں یہیں تم سب کے ساتھ رہتا تو..."

میں نے کہا "چھوڑ ایسی باتیں۔ تو ہی مجھ سے کہہ رہا تھا کہ ہم خود کچھ نہیں کرتے' تقدیر سب کراتی ہے۔"

اس نے ایک گہری سانس لی "ہاں۔ اپنی تقدیر سے بھاگ کے کوئی کہاں جاسکتا ہے۔ فوزیہ اور اس کے شوہر کو تقدیر کراچی لے گئی تھی کیونکہ اجل وہیں ان کے انتظار میں تھی۔ کیا فیصل آباد میں رہنا اس کے بس کی بات تھی؟ نہیں' خود میں وہاں صرف اس کی خون آلود لاش اٹھانے اور اس اجنبی شہر کی مٹی میں دفن کرنے گیا تھا۔ اجنبی اس لیے کہ نہ فوزیہ وہاں پیدا ہوئی تھی نہ کبھی اس نے کراچی جانے کا سوچا تھا۔ ویسے لوگ لندن' نیویارک' دوبئی اور سعودی عرب چلے جاتے ہیں اور برسوں لوٹ کر نہیں آتے۔ کراچی تو پھر بھی اپنے پاکستان کا عروس البلاد ہے مگر پشاور بھی کسی کراچی کے رہنے والے کے لیے اجنبی شہر ہی ہوگا۔ یہ تو غنیمت ہے کہ اکرام اور کاجل وہاں پہلے سے موجود تھے ورنہ پچاس ساٹھ لاکھ انسانوں کے شہر میں اس کو جاننے والا کون تھا اور میرا بھی کیا پتا میں پھر کبھی کراچی جاؤں یا نہ جاؤں۔ گیا تب بھی کیا مجھے ان دو قبروں کا سراغ ملے گا؟"

میں نے کہا "مل بھی گیا تو کیا ہوگا؟ اسلام آباد میں تیرے ماں باپ دفن ہیں۔ یہاں میرے والد وزیر خان کی قبر ہے اور رابعہ کی ماں دفن ہے۔ ہم کب جاتے ہیں وہاں باقاعدگی سے۔ اپنے اپنے عقیدے کی بات ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یاد رکھنے کا سب سے مستحسن طریقہ ہے مغفرت کی دعا اور ایصالِ ثواب۔"

رابعہ کے آفس کی بلڈنگ کا مین گیٹ مقفل تھا۔ میں نے ہی مولوی خادم حسین کو سختی سے تاکید کی تھی کہ وہ صبح شام عمارت کو تالا لگادے اور کھول دے۔ اب وہ اوپر آفس کے اندر والے کمرے میں سو رہا تھا۔ میں نیچے سے لاؤڈ اسپیکر پر چلاتا رہتا تب بھی میری آواز دو دروازوں سے گزر کے خادم حسین کے کانوں تک نہ پہنچتی جو گھوڑے گدھے بیچ کے سوتا تھا۔

"اب کیا کریں؟" میں نے کہا "اوپر کیسے جائیں؟"

"یہاں کوئی کال بیل نہیں ہے؟"

"بھائی صاحب' یہ گھر نہیں ہے کسی کا۔ یہاں سب دفاتر ہیں۔ جو آتا ہے سیدھا اندر چلا جاتا ہے۔"

"پچھلی طرف سے بھی کوئی راستہ نہیں؟"

"ضرور ہوگا۔ ایک کے پیچھے دوسری عمارت ہے جو آپس میں ملی ہوئی ہیں۔ کیا خیال ہے سب میں گھس کے دیکھیں۔ شاید کسی کا گیٹ بھی کھلا مل جائے۔ چوکیدار بھی نہ ہو اور زینہ سیدھا چھت تک پہنچادے۔ تو ہم کوٹھے چڑھتے پھلانگتے صبح تک اس عمارت کی چھت پر پہنچ ہی جائیں گے۔ اس وقت تک گیٹ ویسے بھی کھل جائے گا..."

محسن نے اوپر دیکھا "آفس کے باہر والا گیٹ وہی ہے جو پہلے تھا یا بدلا ہے کچھ؟"

"گیٹ وہی ہے۔ رنگ بدلا ہے۔"

"میں کوشش کرتا ہوں۔ آپ بھی آجائیں مقابلے پر۔ دیکھتے ہیں کس کا نشانہ اچھا ہے" محسن نے کہا "ایک سیر پتھر لائیے۔ ایک ایک چھٹانک کے سولہ' یا آدھا پاؤ کے آٹھ..."

"بہت بہتر۔ ترازو اور باٹ عنایت فرمائیے۔ یہ بھی بتادیں کہ پتھر کس رنگ کے ہوں۔ گول ہوں تکونے یا چوکور۔"

محسن نے چند قدم دائیں بائیں دیکھ کے مایوسی سے سر ہلایا۔ ظاہر ہے مال روڈ پر پتھروں کا کیا کام۔ تاہم ایک عمارت کی بغلی گلی میں اسے پتھر مل گئے جو مطلوبہ سائز سے کہیں بڑے تھے اور انہیں اوپر نشانے پر مارنا خاصا مشکل کام تھا۔ خطرہ یہ بھی تھا کہ دور سے بھی کسی چوکیدار یا پولیس والے نے دیکھ لیا تو شور مچادے گا۔ محسن نے پہلا پتھر اوپر پھینکا۔ پتھر بڑے دھماکے سے دروازے پر لگا۔

میں نے کہا "یہ رابعہ کے ساتھ والے آفس کا دروازہ تھا۔ نشانہ غلط ہوگیا۔"

"یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟"

"وہ دروازہ ٹھوس لکڑی کا ہے۔ فلیش ڈور۔ اس میں شیشہ نہیں ہے۔ اب میری باری" میں نے ہاتھ گھما کے پتھر اندازے سے ایسی جگہ پھینکا جو کھڑکی اور دروازے کے درمیان تھی۔ نشانہ چوک جانے کے باوجود دائیں بائیں تین تین فٹ تک پتھر کسی بھی شیشے پر لگ سکتا تھا۔ میری اسکیم کامیاب رہی۔ ایک زبردست چھناکے سے شیشہ ٹوٹا۔

میں نے متانت سے کہا "یہ کھڑکی کا شیشہ تھا۔"

"یعنی دروازے کا نشانہ کھڑکی پر جالگا؟"

"جی نہیں۔ میں نے کھڑکی کو نشانہ بنایا تھا۔ بائیں جانب کے پٹ کا سب سے اوپر والا شیشہ ٹوٹ گیا ہے۔"

"یہاں سے کیسے معلوم ہوسکتا ہے..."

"آدمی میں فرق محسوس کرنے کی صلاحیت ہونی چاہیے۔

دروازے اور کھڑکی کے شیشے ٹوٹنے کی آوازیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتی ہیں۔"

"تم تو مولوی خادم حسین کے سر کا نشانہ بھی لے سکتے ہو۔ ایسا ہی ہے تمہارا نشانہ" محسن نے ہنس کے کہا اور مجھے دوسرا پتھر پکڑا دیا۔

میں نے کہا "ایسا ہی کرنا پڑے گا۔ غور فرمایئے کس قدر غافل شخص ہے یہ مولوی خادم حسین۔ کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ گیا' اس کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی کوئی اندر گھس جائے تب بھی یہ سوتا رہے گا' کھوتا... خیر' میں اسے ایک آخری چانس اور دیتا ہوں۔"

"اس کے بعد کیا ہوگا؟ تم اسے گولی ماردو گے اوپر جاکے؟"

"بالکل۔ صبح ٹھیک ساڑھے چھ بجے" میں نے دوسرا پتھر گھما کے پھینکا اور رات کی خاموشی میں دوسری بار شیشہ بکھرنے کا چھناکا سنائی دیا مگر اس کے ساتھ ہی نہ جانے کدھر سے ایک گشتی چوکیدار سائیکل پر سیٹی بجاتا آگیا۔

"اوئے' اوئے تمہارا بیڑا غرق۔ خانہ خراب" وہ سائیکل ایک طرف پھینک کے ہماری طرف دوڑا "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

میں نے بڑی مسرت سے اسے مطلع کیا "ہم اپنے آفس کے شیشے توڑ رہے ہیں۔"

وہ رک کے مجھے اور محسن کو دیکھنے لگا "مگر کیوں؟"

"یار' نئے شیشے لگوانے ہیں' اس لیے" میں نے کہا "کیوں جناب' شیروانی صاحب۔ ہم ہر روز ایسا کرسکتے ہیں۔"

"سچ کہا آپ نے اچکن صاحب۔ ہم دن میں دوبار ایسا کرسکتے ہیں۔ ایک دفعہ آپ ایک دفعہ ہم۔ کس کی مجال ہے جو ہمیں روکے۔"

"آخر شیشے ہمارے ہیں' ہم شیشے کے نہیں ہیں۔"

"کیا سب شیشے ٹوٹ گئے؟" محسن بولا۔

"بس ایک رہ گیا ہے۔ وہ بھی ٹوٹ جائے تو واپس چلتے ہیں گھر۔"

"توبہ توبہ" چوکیدار پھر سائیکل پر سوار ہوگیا "تم دونوں نے تو رج کے پی ہے۔ اوئے مجھے کیا۔ ایک دوسرے کا سر توڑو۔"

اوپر سے مولوی خادم حسین کی خوف سے کانپتی منمناتی آواز سنائی دی "یہ... کون سنگ زنی کر رہا ہے جی... اور مدعا کیا ہے آخر۔ ہمیں سنگسار کرنا مطلوب ہے؟ بخدا وہ گھر والی ہے ہمارے ساتھ۔ ہماری ذاتی منکوحہ..."

میں نے کہا "مولوی خادم حسین۔ نیچے آکے دروازہ کھولو۔"

اب اس نے گیلری سے جھانک کے دیکھا اور شاید کچھ دیر میری صورت دیکھ کے دم بخود کھڑا رہا پھر وہ نیچے دوڑا۔ ایک منٹ بعد ہم اندر تھے۔

میں نے اسے ڈانٹا "ایسے سوئے ہو جیسے مردے کفن بیچ کے سوتے ہیں۔"

"کفن اوڑھ کے" محسن نے میری تصحیح کی۔

"آپ بھی حد کرتے ہو جی۔ بھلا یہ بھی کوئی وقت ہے کسی شریف آدمی کو جگانے کا؟" خادم حسین نے خفگی سے کہا "جو شادی شدہ بھی ہو..."

"یعنی تم بیک وقت شریف آدمی بھی ہو اور شادی شدہ بھی۔ خیر' دنیا میں کیا نہیں ہوتا" میں نے کہا۔

"میں تو سمجھا کہ بھارت نے پھر حملہ کردیا جی اور بم گر رہے ہیں آفس میں۔ آپ نے چیخ سنی تھی' کیا دل دہلانے والی چیخ تھی۔"

"تم نے چیخ بھی ماری تھی' ویری گڈ۔"

"میں نے نہیں جی' میری گھر والی نے۔ وایاں کان ابھی تک بند ہے۔ وہ خدانخواستہ دہشت سے بے ہوش ہوجاتی یا ہارٹ فیل ہوجاتا اس کا جناب تو میرا کیا ہوتا' ذرا سوچیے۔"

"عقدِ ثانی" میں نے کہا "سوچنے کی کیا بات ہے اس میں مگر خادم حسین کیا جائے واردات پر تمہاری گھر والی بھی موجود ہے؟"

اس نے شرما کے کہا "وہ جی بموجب آپ کی خواہش' ہدایت اور مشورے کے۔ ناچیز اس کو یہاں لے آیا تھا۔"

"اچھا؟ ہم ملاحظہ کریں گے کہ تم جیسے چمن کی بہار کیسی ہے۔"

وہ دوڑ کے میری راہ میں حائل ہوگیا "نہیں جی۔ یہ نہیں ہوسکتا۔ مولوی خادم حسین کی منکوحہ پر کسی نامحرم کی نگاہ پڑے۔"

میں نے کہا "یار کیا ہم اس پر بری نظر ڈال سکتے ہیں۔ خیر' ہم تمہیں مجبور نہیں کریں گے۔ ہم آفس میں سو جاتے ہیں۔"

اچانک اندر سے چنگھاڑنے کی آواز آئی "خادم' کہاں مرگیا؟ کون آیا ہے اس وقت کم بخت!"

خادم کا چہرہ فق ہوگیا پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا اس کی منکوحہ دروازے میں نمودار ہوئی۔ وہ بلا مبالغہ خادم حسین سے ایک بالشت اونچی اور وزن میں اس جیسے چار کے برابر ہوگی۔ وہ اپنی کمرے جیسی کمر پر پہلوانوں کی طرح ہاتھ رکھے کھڑی تھی اور ہمیں خونخوار نظروں سے گھور رہی تھی۔

"بولتا کیوں نہیں۔ زبان کو تالے کیوں پڑ گئے ہیں آخر۔ کون ہیں یہ دونوں آوارہ گرد مشٹنڈے..."

خادم حسین کی حالت غیر ہوگئی "بیگم۔ یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔"

"ارے جو دیکھ رہی ہوں وہی کہہ رہی ہوں۔ تیری جان کیوں نکل جارہی ہے؟ یہ چور ڈاکو ہیں کیا؟ صورت سے تو نہیں لگتے مگر یہ آدھی رات کو پتھر مار کے شیشے کیوں توڑ رہے تھے؟ تم بولو جی' کیا لینے آئے تھے یہاں؟ سیدھی طرح نہیں بتاؤ گے تو ابھی پولیس کو بلالوں گی۔ یہ وکیلوں کا دفتر ہے۔ اتنے جوتے پڑیں گے تھانے میں کہ نانی یاد آجائے گی۔"

میں اور محسن اس صورتِ حال سے بہت لطف اندوز ہورہے تھے۔ خادم حسین کی گھر والی میری توقعات کے بالکل برعکس بڑی

جناتی اور مردمار قسم کی چیز تھی جبکہ میرے تصور میں ایک باحیا اور باپردہ' حلیم النفس اور شریف الطبع قسم کی بے زبان مخلوق تھی۔ خادم حسین کی سٹی گم تھی اور وہ کوشش کے باوجود حلق میں پھنس جانے والی آواز نکالنے سے قاصر تھا۔ اس آدھی رات کو بھی وہ زرق برق کپڑے پہنے ہوئے تھی جو مولوی خادم حسین نے اسی کے لیے بڑے چاؤ سے خریدے تھے۔ اس کے گلے اور کانوں میں سونے کا دمکتا ہوا زیور بھی نیا ہونے کی گواہی دے رہا تھا۔ ایسی بدصورت اور بدخو اور بدزبان عورت کو خوش رکھنا مولوی خادم حسین ہی کیا کسی بھی شریف آدمی کے لیے ممکن نہ تھا۔

"اوئے خادم۔ دیکھ ذرا اس نَدیدے کو۔ کیسے گھور گھور کے دیکھ رہا ہے مجھے جیسے گردن کاٹ کے زیور اتار لے گا۔ اس کی نیت ٹھیک نہیں لگتی مجھے۔ یہاں تو کوئی سننے والا بھی نہیں ہے کم بخت۔ تو کہاں لے آیا مجھے..." اس نے واویلا شروع کیا۔

اب خادم نے ہمت کرکے کہا "خدا کے لیے خاموش ہوجاؤ بیگم' ارے یہی تو مالک ہیں اس دفتر کے۔ یہ منظر صاحب وکیل ہیں اور یہ وقار یوسف صاحب۔ یہ بھی وکیل ہیں۔"

خادم کی منکوحہ ایک دم "اوئی اللہ" کہہ کے غائب ہوگئی۔ جارحانہ لہجے میں آتش فشانی کا مظاہرہ کرتے کرتے اس نے ایک دم لجانے شرمانے اور شتر غمزے دکھانے کا بھونڈا ڈراما کیا اور پھر اندر سے خادم کو برا بھلا کہنے لگی کہ اس نے پہلے کیوں نہیں بتایا تھا کہ سامنے مالک کھڑے ہیں۔

مجھے افسوس ہوا کہ مولوی خادم حسین جیسے خلیق اور مسکین مزاج شخص کے پلے کیسی بدخصلت بیوی پڑگئی۔ یہ واقعی اس کی محبت تھی کہ وہ گزارہ کر رہا تھا اور اسے خوش رکھنے کی کوشش بھی کرتا تھا۔

صبح ہم سو کے اٹھے تو وہ جاچکی تھی لیکن خادم حسین موجود تھا۔ وہ ہمارے سامنے آتے ہوئے شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔

"آپ صوفے پر سوتے رہے جی۔ بڑی تکلیف اٹھانی پڑی آپ کو میری وجہ سے۔"

میں نے کہا "معافی تو ہمیں مانگنی چاہیے۔ ہماری وجہ سے تمہاری بے عزتی خراب ہوئی۔ اور ایک رات کی کوئی بات نہیں۔ تمہاری تو زندگی بڑے عذاب میں ہے۔ رات دن کا واسطہ ہے تمہارا اس سے۔"

"بس جی۔ زبان ذرا خراب ہے۔ ویسے دل کی بہت اچھی ہے۔ بڑی خوبیاں ہیں اس میں۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا "ہاں۔ آدم خور شیرنی' بھینس اور بھوتنی کی تمام خوبیاں اس میں کوٹ کوٹ کر بھری گئی ہیں اس سے زیادہ بھری جاتیں تو وہ پھٹ جاتی۔"

خادم حسین آزردہ ہوگیا "ایسا مت کہیں جی۔ میری شریکِ حیات ہے وہ۔ پہلی اور آخری۔"

"ایسا ہی تمہارے ساتھ بھی ہو تو اچھا ہے۔ تم اس کے پہلے اور آخری شوہر کہلاؤ' آمین" میں نے ہاتھ منہ پر پھیرا "کیا وہ چلی گئی؟"

محسن بولا "یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔ کتنی خاموشی ہے اور ماحول بھی آسیب زدہ نہیں لگتا۔"

مولوی خادم حسین نے خفگی سے کہا "دیکھیں جی۔ ان کی بات اور ہے۔ آپ کا مجھ سے کوئی مذاق نہیں ہے۔ میں تو جانتا بھی نہیں آپ کو' پہلے کبھی دیکھا نہیں۔ اندازہ کرسکتا ہوں کہ آپ محسن ہوں گے۔"

محسن نے اس سے ہاتھ ملایا "بالکل ٹھیک۔ واقعی تمہیں جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا۔ آج سے ہم بھی تمہارے دوست ہیں۔"

میں نے کہا "بھئی ان کو تم سکندر بخت ثانی سمجھو یا مجھے دوسرا محسن بات ایک ہی ہے۔"

خادم حسین نے فرنچ میں کہا "ایسے بے ہودہ اور بدتمیز شخص کو میں اپنا دوست کیسے سمجھ لوں۔ کہاں آپ کہاں یہ کم ظرف' کمینہ اور بندر جیسا شخص۔"

محسن نے ترکی بہ ترکی جواب دیا "اچھا تو پھر آج سے میں اور تم پکے دشمن۔ تم بھی مجھے کیلے سے فرار ہونے والے خصی بکرے لگتے ہو جس کی دُم قصائی کے ہاتھ میں رہ گئی ہو۔ بیوی بھی خادم کہتی ہے تم کو۔ حکم کے غلام ابن غلام۔"

مولوی خادم حسین پر بجلی گر پڑی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ محسن ایسی فراٹے دار فرنچ میں اینٹ کا جواب پتھر سے دے گا۔ میں نے بڑی مشکل سے سیز فائر کرایا اور ان کی غلط فہمی دور کرکے گلے ملوادیا۔

"چلو اب اس خوشی میں ایک ناشتا پارٹی ہوجائے" میں نے کہا "تمہاری طرف سے۔"

مولوی کی خوشی ماند پڑگئی "ہیں جی۔ میری تو جیب خالی ہے۔"

"کیوں۔ تم نے دس ہزار کمائے تھے۔ دلاور کی بیوی سے؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا "اس نے... میری گھر والی نے۔ ایک ایک پیسہ وصول کرلیا۔ سب لے گئی جی۔"

ناشتا کرتے ہوئے ہم نے اس سے دوبارہ اغوا کی سنسنی خیز کہانی سنی۔ یہ داستانِ ظلم و ستم سناتے ہوئے اس پر بارہا رقت طاری ہوئی مگر اس کی بھوک اور خوش خوراکی کے مظاہرے میں فرق نہیں آیا۔

"میں نے سکندر بخت بن کے اسے کراچی سے فون کیا تھا۔ کیا اس کے بعد دلاور کی بیوی نے کسی کو پوچھا؟"

"ہاں جی۔ دوبار اس نے فون کرکے پوچھا کہ وہ گورا وکیل کہاں ہے۔ رابعہ بی بی کے لیے اس نے منظر صاحب سے بھی بات کی تھی۔ اس کا دماغ درست کردیا آپ نے جناب۔ اب تو مجھ سے بھی شرافت سے بات کرتی ہے اور تھینک یو بھی کہتی ہے۔"

میں نے اِدھراُدھر دیکھ کے کہا "تم اس خبیث الزماں کو بھی دیکھنے گئے تھے اس دوران یا نہیں۔ وہ زندہ بھی ہے......؟"

خادم حسین نے بھی اِدھراُدھر دیکھ کے کہا "کل رات ہی گیا تھا جی..... ابھی تک زندہ ہے مردود۔ پاگل ہونے میں کوئی کسر نہیں رہی۔ میں نیچے نہیں اترا تھا۔ اوپر ہی سے اس پر لعنت بھیج کے آگیا تھا۔"

"اچھا۔ تمہیں کچھ یاد ہے۔ دلاور کی بیوی تمہیں اپنے ساتھ لے گئی تھی تو گاڑی کون سی تھی؟"

"گاڑی وہی تھی جناب۔ مرسڈیز' جو اوپر سے نیلی ہے اور نیچے سے سرمئی۔"

"کیا تم نے غور کیا تھا کہ گاڑی نے دائیں بائیں کتنے موڑ کاٹے تھے۔ اندازاً وہ جگہ کتنی دور تھی؟"

"دس پندرہ منٹ لگے تھے جی وہاں پہنچنے میں مگر اس چالاک عورت نے کچھ پتا نہیں چلنے دیا۔ پہلے تو گاڑی مسلسل دائیں جانب موڑ کاٹتی رہی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ گھوم پھر کے واپس وہیں آگئی ہے۔ اس کے بعد مجھے یاد نہیں..."

"اچھا' وہ جگہ تم دوبارہ دیکھو گے تو پہچان لو گے؟"

"کیوں نہیں جناب۔ میرے لیے تو وہ کمرا نہیں حوالات تھی۔ ایک ایک چیز میرے ذہن میں ہے۔ توبہ توبہ' وہاں تو ننگے مجسمے بھی رکھے ہوئے تھے۔ بُت ایک مسلمان کے گھر میں۔ وہ بھی عورت کے اور عورت بھی..."

خادم حسین کے ساتھ ہم وقار یوسف کے گھر گئے تو گل پنجے جھاڑ کے محسن کے پیچھے پڑ گئی۔ "بہت خوب۔ ناشتا بھی کر آئے آپ۔ شروع ہوگئی آوارہ گردی۔ لائسنس مل گیا آپ کو خوار ہونے کا۔ بیوی بچے جائیں بھاڑ میں۔ بھوکے بیٹھے ہیں انتظار میں تو بیٹھے رہیں۔"

خادم حسین بہت خوش ہوا "اب کچھ بولیں تاجی۔ وہاں تو مجھے کہہ رہے تھے۔ بیوی کے حکم کا غلام ابن غلام۔"

محسن نے کہا "گل۔ تم میرے ساتھ وہی سلوک کر رہی ہو جو سکندر نے رابعہ..... سوری پورس کے ساتھ کیا تھا اور شاہ جنات کی بیٹی نے مولوی خادم حسین کے ساتھ۔"

میں نے کہا "اسی لیے تو میں شادی نہیں کرتا دوست۔ محبوبہ جب بیوی بنتی ہے نا تو عاشق بن جاتا ہے کاٹھ کا اُلو عرف زن مرید۔ دیکھ تیری خودی ذرا بھی بلند نہیں رہی بلکہ منہ کے بل گر پڑی ہے۔ تف ہے تجھ پر اگر میری بیوی ایسا سلوک کرتی میرے ساتھ..."

"تو آپ کیا کرتے؟" وقار کی بیوی بولی۔

"ہم صبر کرتے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔"

وقار آفس جا چکا تھا اور اس کی بیوی نے بتایا کہ رابعہ اور منظر بھی صبح ادھر اس لیے آئے تھے کہ ہم سے ملاقات ہو جائے مگر انتظار کر کے وہ بھی کورٹ چلے گئے۔

محسن نے کہا "سب ایک ہی گاڑی میں گئے ہیں؟"

"نہیں۔ وقار اپنی گاڑی لے گئے ہیں۔ منظر بھائی بعد میں رابعہ کے ساتھ گئے تھے۔"

"رابعہ کی گاڑی تو یہاں کھڑی ہے" محسن بولا۔

میں نے اسے ڈانٹا "کیا ہوگیا ہے تیری نظر کو اور عقل کو۔ گاڑی اور گدھا گاڑی میں فرق محسوس نہیں کر سکتا۔ یہ میری گاڑی ہے۔ رابعہ کے کھٹارے کا اس سے کیا مقابلہ۔"

"مگر یہ بھی اسی نسل کا جانور ہے۔ بالکل وہی رنگ۔"

میں نے کہا "مولوی خادم حسین اور چوہدری دلاور کی نسل بھی ایک ہے۔ نسلِ انسانی' رنگ بھی ایک ہے دونوں کا اور اندر باہر کے پارٹس بھی وہی ہیں مگر مولوی اپنا یار ہے اور دلاور دشمن۔ اس کی چابی کیا آپ کے پاس ہے مسماۃ نگی زوجہ وقار یوسف؟"

نگی نے چابی مجھے پیش کر دی "یک نہ شد دو شد والی بات ہے۔ ایک جیسی دو کاریں۔ ایک جیسے دو آپ لوگ۔"

گاڑی میں نے محسن کے حوالے کی "آفس میں ایک ریڈیو فون رکھا ہوا ہے جو میں نے دلاور کی گاڑی میں سے نکالا تھا۔ وہ اس میں فٹ کرانا ہے تاکہ چلتے پھرتے بات ہو سکے۔ ایک ہی جگہ سے بات کرنے میں بہرحال خطرہ لاحق رہتا ہے کہ شکاری آواز کی لہروں کا سراغ لگاتے ہوئے پہنچ نہ جائیں۔"

"یہ مواصلاتی رابطہ ابھی تک قائم ہے۔"

"ہاں۔ ایسا لگتا ہے کہ دلاور نے اور بعد میں مسز دلاور نے خود ہی یہ رابطہ ختم نہیں کیا۔ اب تو اس کی ضرورت اور اہمیت بڑھ گئی ہے" میں نے کہا "یہ کام ختم ہو جائے تو آپ دو نمبر پلیٹیں بنوائیں۔ ایک پر رابعہ کی گاڑی کا نمبر ہو اور دوسری پر اس گاڑی کا۔ رابعہ کی گاڑی میں بھی ایک اضافی نمبر پلیٹ رہے گی اور ہماری گاڑی میں بھی۔ جب ضرورت پڑی بدل لی۔ یہ سیکیورٹی کے نقطۂ نظر سے بھی مفید ہے اور اس سے دشمنوں کو کنفیوز بھی کیا جا سکتا ہے۔"

محسن نے سرہلایا "اچھا خیال ہے۔"

"میرا دوسرا اچھا خیال یہ ہے کہ تو بھی محسن سے کچھ اور بن جا۔ جیسے میں موسیو آندرے بنا پھر رہا ہوں اور کسی کو ذرا بھی شک نہیں کہ میں سکندر بخت ہو سکتا ہوں۔ اب تو کوئی غور سے دیکھتا ہی نہیں۔ ابھی تک کسی کو علم نہیں کہ تو پھر میدانِ عمل میں کود پڑا ہے۔"

"یہ خوش فہمی ہے آپ کی" گل نے کہا "میں اس کی اجازت ہرگز نہیں دے سکتی۔"

"کوئی بات نہیں۔ یہ بلا اجازت کود پڑے گا۔ نافرمان شوہر تم اخبارات میں اس قسم کے بیانات پڑھتی رہتی ہوگی۔ کسی کو عوام کے جذبات سے کھیلنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ کھیلنے والے کھیلتے رہتے ہیں یا یہ کہ کسی کو قانون اپنے ہاتھ میں لینے کی اجازت نہیں مگر دلاور جیسے قانون کو ہمیشہ ہاتھ میں ہی رکھتے ہیں۔"

جائے۔"

"تھینک یو مادام" محسن نے سر جھکا کے کہا۔

میں کچھ دیر بوبی کے ساتھ کھیلتا رہا۔ وہ ایک بے بی کاٹ کے اندر اچھل رہا تھا جس میں ربر کے چوں چوں کرنے والے رنگین کھلونے پڑے ہوئے تھے۔ اس نے بہت اچھے کپڑے پہن رکھے تھے اور گل یا نگی میں سے کسی نے اس کو نظرِبد سے بچانے کے لیے اس کے گالوں پر کالا تل بھی بنا دیا تھا۔ وہ حلق سے بے معنی آوازیں نکال رہا تھا اور یہ چاہتا تھا کہ میں اسے اٹھالوں تو وہ اپنی کارروائی کرے۔ میری گود میں آتے ہی اس نے میرے کپڑے گیلے کر دیے۔

"اُلو کا پٹھا" میں نے اسے ڈانٹا۔ "پتا نہیں میں کون ہوں؟ فرنچ وکیل۔ یہ سب اپنے باپ محسن کے ساتھ کرو۔"

وہ رونے لگا تو نگی بھاگی بھاگی آئی "کیا ہوا؟ کیا کیا ہے بوبی نے؟"

"وہی جو اس عمر میں تمہارا شوہر کرتا تھا" میں نے کہا۔

نگی ہنسی "آج ہم بوبی کے لیے نئے کپڑے لائیں گے۔ نئے کھلونے لائیں گے۔ کیوں بوبی' بوبی بڑا اچھا بیٹا ہے۔ چچا کے کپڑے دھودیے؟ شاباش! کل منہ بھی دھودینا۔ جیسے وقار ماموں کا سر دھویا تھا۔ بہت جوئیں تھیں سر میں۔ سب مرگئی ہوں گی۔"

گل ہنستی رہی اور میں نے مجبوراً وقار یوسف کی قمیص اور کوٹ پہن کے اسی کی ٹائی باندھی۔

"خوشبو تو اب بھی آرہی ہے" نگی نے ناک سے سوں سوں کر کے کہا "بوبی نے پرفیوم لگادی ہے۔"

ساڑھے دس بجے مولوی خادم حسین کے ساتھ میں "سی ڈی انٹرپرائز" پہنچا تو گیٹ کھلا ہوا تھا۔ دروازے پر وہی چوکیدار کرسی ڈالے بیٹھا ہوا تھا جس سے پہلے فون پر بات ہوئی تھی۔

"کس سے ملنا ہے" اس نے مولوی خادم حسین کو اور مجھے غور سے دیکھا۔

خادم حسین نے کہا "یہ تو اندر جا کے ہی پتا چلے گا کہ کون ملتا ہے۔"

"کیا نام ہے آخر' یہ دفتر ہے..."

میں نے فرنچ میں کہا "خادم حسین۔ اسے کہو کہ ہم بزنس مین ہیں اور ہمارے پرانے کاروباری مراسم ہیں۔ میں یہ بتانے آیا ہوں کہ گزشتہ بار ہمیں جو تربوز بھیجے گئے تھے ان کا ذائقہ کریلے کی کھیر جیسا تھا۔"

آدھی بات سن کے چوکیدار صاحب نے سرہلایا اور ہمیں اندر جانے کی اجازت دے دی۔ پورچ کے بعد پہلا کمرا ویٹنگ روم جیسا تھا۔ اس میں ملاقاتیوں کے لیے ایک کارنر میں بہت قیمتی صوفہ سیٹ لگا ہوا تھا۔ ایرانی قالین پر خوب صورت گلاس ٹاپ ٹیبل تھی اور جرمن ائرلائن کی ایش ٹرے رکھی ہوئی تھی۔

گل نے خفگی سے کہا "محسن۔ میرا نہیں تو بوبی کا ہی کچھ خیال کرو۔"

محسن نے برہم ہو کے کہا "کیا خیال کروں؟ دن بھر تمہارے ساتھ اس کو کھلاؤں؟ اس کے پوتڑے دھو کر ڈالوں۔ اسے دودھ پلاؤں؟ آج تک بزدلی اور خود غرضی کا الزام نہیں لیا میں نے۔ اب شادی کر لی ہے تو میں سب کچھ چھوڑ دوں۔ دوستوں پر لعنت بھیج دوں۔ سب رشتوں سے منہ موڑ لوں؟ یہی تو مصیبت ہے تم عورتوں کی۔ تم قبضہ چاہتی ہو مکمل۔ سب سے کاٹ کے..."

گل کا رنگ زرد پڑ گیا۔ میں خود حیران تھا کہ محسن اس سے کس لہجے میں بات کر رہا ہے۔

گل نے بڑی مشکل سے کہا "تم..... ایسا سمجھتے ہو مجھے؟ کیا یہ سسرال ہے میرا؟ میں غیروں میں ہوں جہاں کوئی میری نند ہے تو کوئی میرا جیٹھ ہے۔ کیا میں تم سب میں شامل نہیں؟"

میں نے کہا "ویری گڈ۔ کیا جواب دیا ہے تم نے گل۔ دانت کھٹے کر دیے۔ اب بول بیٹا۔"

نگی نے سمجھ لیا کہ میں بات کو مذاق میں ختم کرنا چاہتا ہوں "ہاں' اب آپ کی باری ہے۔ بولیے محسن صاحب۔"

"بڑا مزہ آرہا ہے میاں بیوی کی لڑائی دیکھ کے" میں کرسی پر بیٹھ گیا "تم بھی ادھر بیٹھو نگی۔ لڑائی تو اب ہوگی ایسی زبردست کہ مزہ آجائے گا۔ جیسی تمہاری وقار سے ہوتی ہے۔"

"میری وقار سے کوئی لڑائی نہیں ہوتی" نگی نے احتجاج کیا۔

"اچھا؟ یعنی تم اسے ڈانٹ دیتی ہو اور وہ دبک کے خاموش ہو جاتا ہے؟ وہ دہاڑتا ہے شیر کی طرح تو تمہاری سٹی گم ہو جاتی ہے؟ ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ میاں بیوی میں اختلاف ہی نہ ہو اور گھر میں جمہوریت ہو تو اختلاف کا اظہار لڑائی کی صورت میں نہ ہو۔"

محسن نے بھی اندازہ کر لیا تھا کہ ہم اس کی غلطی کو نباہ رہے ہیں۔ "آئی ایم سوری گل۔ نہ تم ایسی ہو نہ میں ویسا اور تم سے بہتر کون جان سکتا ہے کہ میرا اعصابی نظام کتنی ٹوٹ پھوٹ کا شکار رہا ہے' سب کچھ کرنے والی تم ہی تو تھیں۔"

"اور اب تمہیں موقع ملا ہے اس کا صلہ دینے کا" گل رونے پر آمادہ تھی۔

محسن نے اسے منالیا "تمہیں تو معلوم ہے کہ میں کتنی ٹینشن کا شکار تھا۔ مجھے کنٹرول نہیں رہا اپنے آپ پر۔ مجھے تم سے اس لہجے میں بات نہیں کرنا چاہیے تھی۔"

"پھر بھی جذبات کیا ہیں تمہارے' یہ تو ظاہر ہوگیا۔"

"جذبات کی گواہ تو ساری دنیا ہے۔ ساری خدائی ہے۔ اور میں تمہیں منانے کے دوسرے طریقے بھی جانتا ہوں۔" محسن آگے بڑھا۔

گل پیچھے ہٹ گئی "چلو بدتمیزی مت کرو سب کے سامنے'

ائرکنڈیشنڈ کمرے میں بڑی دلفریب خوشبو تھی جس کا سرچشمہ دوسری طرف کاؤنٹر جیسی ٹیبل کے پیچھے بجی سجائی گڑیا کی طرح بیٹھی ہوئی حسینہ تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کا نام بھی حسینہ ہے۔ وہ کوئی انگلش میگزین دیکھے جا رہی تھی' جو اس نے فوراً نیچے رکھ دیا۔

"میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں؟" اس نے مسکرا کے کہا۔

میں نے خادم سے کہا "خادم' اچھا موقع ہے اس وقت یہ انکار نہیں کر سکتی کیونکہ خود اس نے پوچھا ہے تم سے۔ آج رات....."

"دیکھیں جی ایسی بے شرمی کی باتیں مجھے اچھی نہیں لگتیں۔"

"اسے تو اچھی لگتی ہیں۔ دیکھو کیسے مسکرا کے دیکھ رہی ہے تمہیں۔ لگتا ہے تم پر فریفتہ ہو گئی ہے۔ عقدِ ثانی پر فوراً راضی ہو جائے گی.... اچھا تمہاری مرضی' نہیں تو نہ سہی۔ اس سے کہو کہ ہم مسز دلاور سے ملنا چاہتے ہیں۔"

حسینہ اب تک ہماری گفتگو کا ایک لفظ بھی نہیں سمجھی تھی مگر مسز دلاور کے نام پر وہ چونکی "کون مسز دلاور؟" اس نے خادم حسین کی بات پر کہا۔

میں نے کہا "خادم حسین' اسے بتاؤ کہ وہی جن کے نام ایک تحفہ تم نے وصول کیا تھا۔ اگر اس نے انجان بننے کا ڈراما جاری رکھا تو ہم چلے جائیں گے اور مسز دلاور اس سے خود نمٹ لیں گی۔ جب ان کے نام دوسرا تحفہ لائے گا کوئی۔"

حسینہ کا رنگ فق ہو گیا۔ اس نے مشکوک انداز میں مجھے اور مولوی خادم حسین کو دیکھا اور پھر آہستہ سے سرہلایا "آپ لوگ تشریف رکھیں' میں دیکھتی ہوں۔"

وہ ایک دروازہ کھول کے اندر غائب ہو گئی۔ اندر والے کمروں میں مکمل خاموشی تھی۔ غالباً آفس میں کام کرنے والوں کی تعداد محدود تھی اور سب کے اپنے اپنے کمرے تھے ورنہ دفتر کے لوگ ایک جگہ بیٹھتے ہیں تو آپس میں بات بھی کرتے ہیں۔ کسی ٹائپ رائٹر کی' ٹیلی فون کی گھنٹی یا دروازے کھلنے بند ہونے کی آوازوں سے آفس کا ماحول پیدا ہوتا ہے۔ کاروباری اداروں میں لوگوں کا آنا جانا بھی لگا رہتا ہے مگر یہاں تو ایسا لگتا تھا کہ ایک حسینہ تھی سو وہ بھی ہماری بات سن کے بھاگ گئی اور اب ایک گوشے میں خادم حسین کے ساتھ میں اکیلا رہ گیا ہوں' ابھی اچانک سارے دروازے کھلیں گے اور ہر طرف سے لوگ ریوالور اور بندوقیں تانے نمودار ہوں گے اور ہمیں ہینڈز اپ کرا لیں گے۔ پھر استاد پیڈرو فلمی ولن کی طرح آئے گا اور قہقہہ لگا کے کہے گا...

"آپ اندر آئیں پلیز" حسینہ کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

میں نے کہا "خادم' جاؤ تمہیں بلا رہی ہیں۔ اکیلے میں کچھ کہنا چاہتی ہیں غالباً۔ جاؤ یار' آخر تم مرد ہو۔"

خادم نے منہ بنا کے کہا "کیا اپنے آپ کو مرد نہیں سمجھتے آپ؟"

میں نے جیب میں ریوالور کو محسوس کر کے تقویت حاصل کی اور اس دروازے سے اندر چلا گیا جو حسینہ کھولے کھڑی تھی۔ کمرے میں میز پر سر جھکا کے کچھ لکھنے والے نے ہم پر ایک نظر ڈالی اور پھر اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گیا۔ حسینہ آگے چلنے لگی۔ اس نے بہت چست لباس کے ساتھ بہت اونچی ایڑی کی سینڈل پہن رکھی تھی چنانچہ پیچھے سے اس کے جسم کے سارے پیچ و خم اور نشیب و فراز کا تلاطم کسی رقص سے کم دلفریب نہ تھا پھر اس نے جو قمیص پہن رکھی تھی اس کا کٹاؤ پشت کی جانب خاصا کشادہ تھا اور اس کے سنہرے جسم کی آب و تاب پوری طرح عیاں تھی اور خود مولوی خادم حسین کی نظریں جھکنا بھول گئی تھیں۔ اس کے وجود

سے پھوٹنے والی خوشبو بھی بہت ہیجان انگیز تھی۔

"ایسی ہی عورتیں ترغیبِ گناہ دیتی ہیں جی۔ اور نام بدنام ہوتا ہے مردوں کا" خادم حسین بولا۔

"میں اتفاق کرتا ہوں تم سے۔ مجھے بھی شیطان ورغلا رہا ہے۔ کیا خیال ہے اسے اغوا کر لیں؟ ریوالور تو ہے میرے پاس۔"

"بھلا ایسی عورتوں کا دفتر میں کیا کام جناب" خادم حسین نے میری بات کو نظر انداز کر دیا۔

"ہاں۔ اس کی جگہ کسی پردہ نشین کو بٹھانا چاہیے۔ شٹل کاک برقع میں۔ تمہاری گھر والی بغیر برقع کے بھی بیٹھے تو تمہارے سوا کون آئے گا یہاں۔ جو آئے گا وہ ڈر کے بھاگ جائے گا۔"

حسینہ نے ایک دروازہ کھولا اور خود باہر رک گئی "آپ یہاں انتظار کریں۔"

"کس کا انتظار کریں۔ تمہاری واپسی کا؟" میں نے کہا۔

وہ مسکرائی "آپ مجھ سے ملنے تو نہیں آئے تھے۔"

یہ کمرا بھی عام آفس کا کمرا تھا۔ ایک بیش قیمت ٹیبل خالی پڑی تھی۔ اس پر ایک فون تھا اور ایک ٹیبل کیلنڈر۔ میز کے پیچھے سبز مخمل کی گھومنے والی کرسی تھی اور سامنے چار کرسیاں۔ دو عین مقابل ایک دائیں جانب دوسری بائیں جانب۔ پیچھے دیوار کے ساتھ ایک صوفہ سیٹ لگا ہوا تھا۔ میں اور خادم اسی پر بیٹھ گئے۔

میرے سامنے ایک دروازہ تھا اور پیچھے ایک کھڑکی۔ دوسرا دروازہ چھوٹا تھا اور غالباً باتھ روم میں کھلتا تھا۔ میں کوشش کر رہا تھا کہ مطمئن اور پُراعتماد نظر آؤں مگر خادم حسین پر گھبراہٹ سوار تھی۔

"مجھے تو ایسا لگتا ہے جی کہ ہم چوہے دان میں پھنس گئے ہیں۔ کسی کو بتا کے بھی نہیں آئے تھے ہم..."

اس کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی دروازہ کھلا اور ایک شخص اندر آگیا جس کو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ چالیس کے لگ بھگ تھا اور بے داغ سفید سوٹ میں ملبوس تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی ایک سفید چھڑی تھی اور اس نے گہرے رنگ کے شیشوں والا چشمہ لگا رکھا تھا۔ ظاہر ہے وہ اندھا تھا مگر ماضی کے تجربات نے مجھے ظاہر کی حقیقت پر اعتبار نہ کرنا سکھا دیا تھا۔

"السلام علیکم! اور خوش آمدید موسیو آندرے۔ میں شوکت علی رانا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ آپ کے ساتھ بطور مترجم مولوی خادم حسین صاحب بھی تشریف لائے ہوں گے۔"

اس کے مہذب اور ملنسار لہجے نے خادم حسین کو متاثر کیا۔ "جی میں' موسیو آندرے کے ساتھ ہوں اور ان کی طرف سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔"

رانا پورے اعتماد کے ساتھ کرسی کی طرف گیا اور چھڑی میز پر رکھ کے بیٹھ گیا "آپ لوگ میرے سامنے تشریف لے آئیں تو مناسب ہوگا۔"

میں نے کہا "اس ایکٹر سے کہہ دو کہ ہم مسز دلاور کے سوا کسی اور سے بات کر کے وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھتے۔"

رانا نے میری بات سن کے سرہلایا "آپ مجھ پر اعتبار کر سکتے ہیں۔ جو بات آپ کہیں گے وہ مسز دلاور تک پہنچ جائے گی۔ مجھے انہوں نے اختیار دیا ہے۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا "خدا حافظ مسٹر رانا۔ ہم اس اختیار کو تسلیم نہیں کر سکتے۔ کیا مسز دلاور ذہنی یا جسمانی طور پر معذور ہیں۔ طویل عرصے کے لیے ملک سے باہر گئی ہیں یا انہیں بے اختیار کر دیا گیا ہے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں۔ دراصل وہ یہاں رہتی نہیں ہیں۔ یہ آفس ہے اور میں یہاں جنرل منیجر ہوں۔ چوہدری دلاور میرے بزنس پارٹنر ہیں۔ ان کی پراسرار گمشدگی کے بعد ہم مناسب نہیں سمجھتے کہ ان کی فیملی ہر جگہ مناسب حفاظتی انتظامات کے بغیر جائے۔"

مناسب کا لفظ اسے بہت پسند تھا۔ میں نے کہا "ٹھیک ہے مسٹر رانا۔ جب مناسب حفاظتی انتظامات کر لیں آپ تو مجھے بلا لیں۔ ویسے میں خود بہت مصروف آدمی ہوں اور مسز دلاور خود ہی مجھ سے ملنے آئی تھیں۔ انہی کے اصرار پر میں نے کوشش کی تھی کہ ان کے درمیان کوئی قابلِ عمل سمجھوتا طے پا جائے لیکن ایسا لگتا ہے کہ آپ کی سوچ اس کے برعکس ہے۔"

اس نے میرے آگے بڑھے ہوئے ہاتھ کو تھامنے کی غلطی نہیں کی "مجھے افسوس ہے کہ آپ نے میرے بارے میں ایسی رائے قائم کی۔ آپ خود بھی تو کسی اور کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ مناسب تو یہ ہوتا کہ وہ براہِ راست مذاکرات کرتے۔"

"مسز دلاور کی براہِ راست بات چیت ہو گئی ہے۔ ملاقات بھی ہو سکتی ہے مگر اس کے لیے وہ خود مجھ سے بات کریں گی جیسے کہ پہلے کرتی رہی ہیں۔ وہ ہر وقت ہر جگہ پہنچ جاتی تھیں۔ کسی قسم کے حفاظتی انتظامات کی انہوں نے کبھی پروا نہیں کی مگر اب غالباً آپ کی کلیرنس کے بغیر وہ کہیں آجا نہیں سکتیں۔ بالفاظِ دیگر کیا وہ آپ کی قید میں ہیں؟"

"ہرگز نہیں" وہ ایسے بولا جیسے میرے الفاظ سے اس کو سخت صدمہ ہوا ہے "ہم ان کے دوست ہیں اور موجودہ حالات میں یہ ضروری ہو گیا ہے کہ ان کو مناسب تحفظ فراہم کیا جائے۔"

میں نے کہا "مسٹر رانا سے پوچھو کہ کیا رانا گڈز کیریئرز انہی کی ملکیت ہے؟"

خادم کے بولنے سے پہلے ہی وہ چونک پڑا تھا "ہاں۔ میرے ٹرک پاکستان میں ہر جگہ آتے جاتے ہیں۔"

میں نے خادم کو اس ٹرک کا نمبر بتایا جس نے فوزیہ اور اس کے شوہر کو مار ڈالا تھا "کیا رانا صاحب بتا سکتے ہیں کہ اس وقت یہ ٹرک کہاں ہے؟"

"یہ میں کیسے بتا سکتا ہوں۔ منشی اور ٹائم کیپر ٹرکوں کے آنے

جانے کا مناسب انتظام چلاتے ہیں۔ شاہدرے میں آفس ہے۔"
خادم نے پوچھا "کیا رانا صاحب کو معلوم ہے کہ اس ٹرک نے تین دن قبل کراچی میں ایک رکشا کو ٹکر ماری تھی۔ اس حادثے میں رکشا والا بھی ہلاک ہوگیا تھا اور دونوں سواریاں بھی۔"

"مناسب حد تک مجھے یقین ہے کہ ایسا کوئی حادثہ پیش آتا تو مجھے ضرور معلوم ہوتا۔ کوئی ایسی ویسی بات ہو تو مجھے اسی دن بتادی جاتی ہے۔"

میں نے کہا "پھر تو رانا صاحب کو ماتحت عملے سے پوچھنا چاہیے کہ یہ خبر انہوں نے کس مصلحت کے تحت چھپائی تھی۔"

رانا کا چہرہ متغیر ہوا "آپ کیسے جانتے ہیں۔ مناسب ہوگا اگر آپ......"

میں نے کہا "رانا صاحب یقیناً بصارت سے محرومی کے باعث خسارے میں ہیں۔ اگر یہ دیکھ سکتے تو میں انہیں ایک ایف آئی آر کی نقل دکھاتا جو اسی ٹرک کے خلاف درج کرائی گئی تھی۔ تاہم یہ معلوم کرسکتے ہیں کہ اس ٹرک کو حادثے کے وقت کون چلا رہا تھا؟"

"یہ ایف آئی آر... کہاں ہے۔ لاؤ مجھے دو۔ یہ تمہارے پاس کیسے پہنچی؟"

میں نے کہا "افسوس کہ نقل اس وقت میری جیب میں نہیں ہے۔ مجھے یہ نقل سکندر بخت نے کراچی سے ارسال کی ہے۔ ڈرائیور کے خلاف قتلِ عمد کا مقدمہ درج کیا گیا ہے۔ آئی جی صاحب کی ہدایت پر۔ عینی شاہدوں کے بیان کے مطابق قاتل کا حلیہ استاد پیڈرو نام کے ایک شخص سے بہت ملتا ہے جو چوہدری دلاور کا دستِ راست ہے۔ مجھے خاتون ایڈووکیٹ رابعہ قاری نے بتایا ہے کہ یہی استاد پیڈرو ہی درحقیقت چوہدری دلاور کا اصل آلۂ کار ہے۔ اس نے بہت سے قتل کیے ہیں جن میں ڈاکٹر شیلی کا قتل بھی شامل ہے اور آپ یقیناً جانتے ہوں گے کہ میں اسی کی تفتیش کے لیے لندن سے آیا ہوں۔"

اب وہ پُرسکون اور بااعتماد رہنے کی کوشش میں ناکام ہوچکا تھا اور اضطرابی کیفیت میں انگلیاں چٹخا رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کے بات کرنے کا انداز اور لہجہ دونوں مصنوعی تھے۔ شاید وہ اندھا بھی نہیں تھا اور یہ اس کی شخصیت کا اصل روپ ہرگز نہیں تھا۔

میں اور مولوی خادم حسین ایک ساتھ کھڑے ہوگئے تھے۔ میں نے کہا "رانا صاحب' میں آپ کا اور اپنا وقت برباد کرنا نہیں چاہتا۔ آپ اپنے ذاتی اور کاروباری مسائل سے خود بہتر طور پر نمٹ سکتے ہیں۔ مسز دلاور کو میرا سلام کہئے گا۔"

"ضرور کہہ دوں گا لیکن موسیو آندرے یہاں کے آداب مختلف ہیں۔ یہاں کسی اور کی بیوی کو ایسے سلام بھی نہیں کہا جاتا" اس نے سرد مہری سے کہا اور میں سمجھ گیا کہ اس بات کا مطلب کیا ہے۔ مجھ سے واضح الفاظ میں کہہ دیا گیا تھا کہ میں آئندہ مسز دلاور سے رابطہ نہ رکھوں۔ میں وہاں سے نکلا تو بہت غصے میں تھا۔

رانا سے میں بھی ملنا چاہتا تھا مگر مجھے یہ امید نہیں تھی کہ وہ ایسے ظالم سماج کی طرح سکندر بخت اور مسز دلاور کے درمیان حائل ہو کے حالات کا رخ پلٹنے کی کوشش بھی کرسکتا ہے۔ اس کے تیور بتاتے تھے کہ اب تک پس منظر میں رہنے والے رانا کی اہمیت کسی طرح بھی استاد پیڈرو سے کم نہیں۔ شاید زیادہ ہی ہے۔ پیڈرو اس وقت بھی ملازم تھا جب دلاور کے ساتھ ایک پارٹنر میر شرافت علی تھا اور دوسرے میرے والد وزیر خان مرحوم تھے۔ جب وزیر خان اور میر شرافت علی کو یکے بعد دیگرے کاروباری شراکت سے الگ کرنے کے لیے اس دنیا سے رخصت کرنا ضروری ہوا تو یہ کام استاد پیڈرو کے سپرد کیا گیا تھا۔ تب سے استاد پیڈرو نے چوہدری دلاور کے لیے انتہائی اہمیت حاصل کرلی تھی۔ چوہدری دلاور کا پرانا وفادار مینیجر ڈی سلوا میرے ہاتھوں مارا گیا تھا اور بعد میں نواب جمشید کو بھی ایم آر ایس نے جہنم رسید کردیا تھا حالانکہ وہ اپنی حفاظت کے لیے اپنے جیسا ہی دوسرا بھی ساتھ رکھتا تھا۔ یہ سب دلاور کے برابر کے لوگ تھے اور بزنس پارٹنر تھے مگر استاد پیڈرو ہمیشہ ماتحت اور ملازم ہی رہا تھا۔ دلاور نے اس سے ہر جائز اور ناجائز کام لیا تھا۔ وہ ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہوگئے تھے۔ نہ پیڈرو کے لیے دلاور کو چھوڑ کے کہیں جانا ممکن تھا۔ کسی اور کے ساتھ نہ اسے اتنی اہمیت حاصل رہتی اور نہ اتنا مالی فائدہ حاصل ہوتا۔ دلاور نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا تھا تو پیڈرو بھی گھاٹے میں نہیں رہا تھا مگر اب دلاور کے لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ پیڈرو سے جان چھڑا سکے۔ پیڈرو اسے بلیک میل بھی کرسکتا تھا۔ وہ اس کے ماضی کے ہر تاریک پہلو کا چشم دید گواہ تھا اور شاید ابھی تک اسی لیے محفوظ تھا کہ اس کے پاس چوہدری دلاور کے خلاف ایسے ثبوت تھے جو ضائع نہیں کیے جاسکتے تھے ورنہ مطلب نکل جانے کے بعد دلاور اسے بھی کُتّے کی موت مروا دیتا۔ تاہم دلاور جیسا شخص کبھی یہ گوارا نہیں کرسکتا تھا کہ اس کا کتا اسی پر بھونکے اور اس کا ملازم اس کا آقا بننے کی کوشش کرے۔ غالباً اس نے اب رانا کو بزنس پارٹنر بنا کے پیڈرو کو پیچھے کردیا تھا۔ اس طرح کہ اسے اپنی اہمیت کم ہونے کا احساس بھی نہ ہو۔ اس کا تیسرا بزنس پارٹنر ڈاکٹر شاہ بھی ہوسکتا تھا۔ پیڈرو کی پوزیشن پھر وہی تھی جو میر شرافت علی اور وزیر خان کے زمانے میں تھی لیکن پرانے پارٹنر شریف اور وضع دار لوگ تھے۔ رانا جیسے پارٹنر خطرناک تھے۔ وہ دلاور کے ہم پلہ اور اسی جیسی مجرمانہ صلاحیت بھی رکھتے تھے۔ استاد پیڈرو سب سمجھنے کے باوجود چوہدری دلاور کو روک نہیں سکتا تھا کہ وہ کاروبار میں کسی کو شریک نہ کرے۔

اگر صورتِ حال... ایسی ہی تھی جیسی کہ میں فرض کررہا تھا تو پھر شطرنج کی نئی بازی شروع ہوچکی تھی۔ چوہدری دلاور نے اپنی

پوزیشن مضبوط کرنے کے لیے رانا اور ڈاکٹر شاہ جیسے لوگوں کا سہارا لیا تھا جو کسی طرح بھی اس سے کم نہ تھے۔ اس نے سوچا ہوگا کہ ان نئے شکاری دوستوں کی مدد سے وہ پرانے جھگڑے ختم کرنے میں کامیاب ہوجائے گا۔ وہ مل کے ہم سے بھی نمٹ لیں گے اور استاد جیسے لوگوں سے بھی چھٹکارا حاصل ہوجائے گا لیکن نئے پیڈرو ساتھی اتنے آزمودہ نہیں تھے کہ سوفیصد دلاور کی توقعات پر پورے اتریں۔ اس نے نئے دوستوں کو بتادیا ہوگا کہ اس کے پرانے دشمن کون ہیں۔ وہ خود اپنے مستقبل کے بارے میں کیا عزائم رکھتا ہے اور اس کے دشمن کیسے ان عزائم کو خاک میں ملانے پر کمربستہ ہیں۔ زر' زور' زن اور زمین سے انہیں خریدنے اور شکست دینے کے سب حربے بے کار ثابت ہوئے ہیں۔ ایک باعزت' خوش حال اور کامیاب مستقبل کا خواب اس وقت تک پورا نہیں ہوسکتا جب تک وہ اپنے ماضی کی کتاب سے نامۂ اعمال کی ہر سیاہ تحریر کو نکال کے اس کا نام ونشان تک نہ مٹادے لیکن جب تک پرانے دوست اور پرانے دشمن اور گھر کے بھیدی اپنی زبان بند رکھنے پر رضامند نہ ہوں' تاریخ کو کیسے بدلا جاسکتا ہے اور اس میں کالے کرتوتوں کی جگہ سنہرے حروف سے لکھے جانے کے قابل واقعات کو کیسے شامل کیا جاسکتا ہے۔ اور نئے ساتھیوں نے چٹکی بجا کے کہا ہوگا کہ اپنے چوہدری دلاور صاحب' یہ کیا مشکل کام ہے۔ آپ سب کچھ ہم پر چھوڑ دیں۔ سیاست کا میدان آپ کا ہے۔ ایم آر ایس کا جلوس تو نکل ہی گیا ہے۔ سکندر بخت اکیلا کیا بگاڑ سکتا ہے آپ کا۔ رہا استاد پیڈرو تو اس کی اوقات ہی کیا۔ بادشاہ لڑتے تھے بادشاہوں سے۔ اپنی سلطنت بچانے کے لیے یا ان کی سلطنت پر قبضہ کرنے کے لیے۔ غلام کے تو زن وبچہ کولھو میں پلوائے جاسکتے ہیں۔ کنیزوں کو دیواروں میں چُنا جاسکتا ہے اور چھوٹے موٹے باغیوں کی سرکوبی کی جاسکتی ہے۔

اگر دلاور پکڑا نہ جاتا تو شاید تین بڑے کوئی مؤثر حکمتِ عملی مرتب کرلیتے لیکن اچانک قسمت کے ایک دھولی پنجے نے کامیابی کے خوابوں کا ملبہ کردیا۔ دلاور ایسا غائب ہوا کہ نمک خوار حکم کے غلام' شکاری کُتّے اور زر خرید جاں نثار سب نے شہر کے کونے کونے کی خاک چھان لی مگر اپنے آقا' ان داتا اور مالک کا سراغ نہ لگا سکے۔ دلاور نے اپنی حفاظت کے لیے جو انتظامات کررکھے تھے سب دھرے رہ گئے تھے یہاں تک کہ وہ الیکٹرانک آلہ بھی دغا دے گیا تھا جو ہر لحظہ ہر جگہ سے دلاور کے بارے میں اطلاع فراہم کرتا رہتا تھا کہ وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔ مزید خرابی یہ ہوئی کہ دلاور نے ڈاکٹر شیلی کی لاش کا پوسٹ مارٹم رکوانے کی جو کوششیں کی تھیں وہ ناکام ہوگئیں۔ اس کے لیے ڈاکٹر شیلی کی لاش کو غائب کرنا اس لیے ممکن نہ تھا کہ ہم نے اس کی قبر کا پتا ہی نہیں چلنے دیا تھا۔ دلاور نے نہ جانے کتنے جتن کرکے اور کتنا پیسہ لٹا کے اس کیس کی تفتیش کرنے والی پولیس ٹیم کی طرف سے حمایت کا وعدہ حاصل کیا ہوگا۔ پولیس سرجن کو اور میڈیکل بورڈ کے سربراہ کو صحیح رپورٹ دینے سے روکنے اور بالآخر راستے سے ہٹانے کے لیے کتنے پاپڑ بیلے ہوں گے مگر اس کی تمام جدوجہد رائیگاں گئی تھی۔ پرانی ٹیم کو معطلی کے بعد گرفتاری اور اعانتِ مجرمانہ کے الزام میں مقدمات کا سامنا تھا۔ نئی ٹیم کے اراکین پولیس اور وکیلوں کے اتحاد سے اور سابقہ ٹیم کے انجام کو دیکھ کر محتاط تھے اور میڈیکل رپورٹ نے ڈاکٹر شیلی کے قتل کی نشاندہی بھی کردی تھی۔ ایف آئی آر میں دلاور کا نام آگیا تھا اور اسے مفرور بھی قرار دیا جاچکا تھا۔

ان حالات میں پیڈرو کو امید کی ایک کرن نظر آئی ہوگی کہ وہ دلاور کی جگہ لے سکے۔ اس نے دلاور کے نئے ساتھیوں سے سازباز کی ہوگی اور انہیں اچھی طرح سمجھادیا ہوگا کہ دلاور اور سکندر بخت کے درمیان ایک خاندانی تنازع ہے جس میں انہیں فریق بننے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ سکندر بخت کو دلاور سے ان مظالم کا بدلہ لینا ہے جو اس کے والد کے ساتھ روا رکھے گئے تھے۔ اس وقت وہ لندن میں تعلیم حاصل کررہا تھا۔ چوہدری دلاور نے اس کے ساتھ فراڈ کیا اور اس کا سب کچھ ہتھیا کے اسے پیسے پیسے کا محتاج کردیا تھا۔ جب افشائے راز کا وقت آیا تو چوہدری دلاور کے ایما پر ہی پہلے سکندر بخت کے والد کو قتل کرادیا گیا تھا۔ بعد میں دوسرے پارٹنر میر شرافت علی کو بھی اسی لیے اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے تھے کہ وہ چوہدری دلاور کے کاروباری نقطۂ نظر سے اختلاف رکھتا تھا اور اسے ڈر تھا کہ وہ سکندر بخت کو اس کے والد کی موت کے اصل اسباب سے آگاہ کردے گا۔ میر شرافت علی کے قتل کا الزام سکندر بخت پر عائد کرانے کے بعد چوہدری دلاور نے اسے خریدنے اور اپنی راہ سے ہٹانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگالیا مگر سکندر بخت تو انتقام کے جنون میں مبتلا تھا۔ اس نے اپنا حقِ وراثت اور باپ کے خون کا بدلہ لینے کے لیے چوہدری دلاور کو تباہ کردینے اور تختۂ دار تک پہنچانے کی جو قسم کھائی تھی وہ آج تک اس پر قائم ہے اور اب تو ایسا لگتا ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت دلاور کو اس انجام سے نہیں بچاسکے گی۔

ظاہر ہے دلاور کے نئے ساتھی اس پرانے کھیل میں شریک ہوکے اپنی جان ومال کو داؤ پر لگانے والے نہیں تھے۔ نہ وہ پرانے دوست تھے کہ دلاور کا ساتھ دیتے نہ ان کا خون کا رشتہ تھا۔ انہیں تو الٹا اس جھگڑے میں نقصان ہی نقصان نظر آیا ہوگا اور وہ کاروبار میں منافع کمانے کے لیے شریک ہوئے تھے گھاٹا اٹھانے کے لیے نہیں۔ انہیں استاد پیڈرو جیسے پرانے محرمِ راز درونِ خانہ کی باتیں سن کے محسوس ہوا ہوگا کہ بے تاج وتخت بادشاہ کے ساتھ وفادار رہنے کی حماقت تو پرانے وقتوں کے لوگ بھی نہیں کرتے تھے۔ خدا نے انہیں موقع دیا ہے کہ چوہدری دلاور کی سلطنت پر وہ قابض ہوجائیں تو اس موقع سے فائدہ نہ اٹھانا کوئی عقل مندی نہیں۔ استاد پیڈرو جیسے مشیر میر جعفر اور صادق بھی تھے لیکن انگریز

نے انہی کی مدد سے ہندوستان پر قبضہ حاصل کیا تھا۔ کاروباری مفادات کی جنگ میں ایسے میر جعفروں کی بڑی اہمیت تھی جو ہوا کا رخ دیکھ کے وفاداری بدل لیتے ہوں اور نئے آقاؤں کو سلام کرنے میں اولیت حاصل کرنا جانتے ہوں۔ پرانے شاہ کے نمک خواروں سے رموزِ سلطنت کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ ممکن ہے نئے بزنس پارٹنرز نے پیڈرو کو دس بیس فیصد کا شریک بنالیا ہو۔ اس شرط پر کہ وہ دلاور کے کاروبار پر ان کے مکمل اختیار کی راہ ہموار کرے گا۔ یہ اختیار انہیں چوہدری دلاور کی زندگی میں کبھی حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ شاید دلاور کے ساتھ وہ خود دس بیس فیصد کے شریک ہوں۔ استاد پیڈرو کا تجربہ وسیع تھا۔ وہ اندر کی ہر بات جانتا تھا اور اس کے انڈر گراؤنڈ رابطے تھے جن سے نوارو رانا اور ڈاکٹر شاہ ابھی ناواقف تھے۔ یہی انڈر گراؤنڈ راستے اور رابطے دولت کی ریل پیل کے راستے تھے۔ دن دونی اور رات چوگنی خوش حالی کے راستے تھے اور سونے کی خفیہ کانوں کے راستے تھے۔ چوہدری دلاور کے بعد استاد پیڈرو ان کا پتا بتا سکتا تھا۔ دلاور نے جن کو اپنی طاقت میں اضافے اور سہارے کی ضرورت سمجھا تھا وہی شاید اس کے حریف بن گئے تھے۔ بیساکھی چھین لی جائے تو پہلے سے مفلوج آدمی تو کھڑا بھی نہیں رہ سکتا۔ اس کے ساتھ چلنے کا کیا سوال۔

اور شاید استاد پیڈرو ہی تھا جس نے رانا کو اور ڈاکٹر شاہ کو پٹی پڑھائی ہوگی کہ دلاور تو شاید اب کبھی واپس نہ آئے۔ وہ ایسے دشمنوں کے قبضے میں ہے جو اس کی جان لینے پر ویسے ہی ادھار کھائے بیٹھے ہیں اگر وہ سامنے آیا بھی تو ایک مجرم کی حیثیت سے لایا جائے گا جس کے سامنے صرف ایک ہی راستہ ہوگا جو تختۂ دار تک جاتا ہے۔ اس کے دشمن تو پہلے ہی اسے وہاں پہنچانے کا پورا انتظام کر چکے ہیں۔ کیوں نہ ہم بھی ان کی مدد کرتے ہوئے دلاور کو اور آگے دھکیل دیں لیکن اس کے ساتھ ہی وہ ہاتھ بھی کاٹنے ضروری ہوں گے جو دلاور کی مدد کر رہے ہیں۔ یہ ہاتھ ہیں اس کی بیوی اور اس کا ولی عہد فیصل۔ وہ خود کو اپنے باپ کی کاروباری سلطنت کا واحد قانونی وارث سمجھتا ہے اور اس کی ماں وہی رول ادا کرنا چاہتی ہے جو انگریزوں کے ہندوستان پر قبضے کی سازش کو ناکام بنانے کے لیے نواب زینت محل نے ادا کیا تھا۔ بہادر شاہ ظفر آخری تاجدار دہلی کی اسیری کے بعد اس نے جنرل بخت خان کے ساتھ مل کر فوج کی کمان سنبھال لی تھی۔ یہاں جنرل بخت خان کے روپ میں استاد پیڈرو تھا جو خود غاصبوں سے مل گیا تھا۔ اکیلی ملکہ عالیہ کیا کریں گی اپنے ولی عہد کے لیے۔ بے شک وہ بہت دوڑ دھوپ کر رہی ہے اور بہت ہاتھ پاؤں مار رہی ہے مگر ایسا انتظام کیا جا سکتا ہے کہ نہ وہ اس فرنچ وکیل سے مل پائے اور نہ براہِ راست سکندر بخت سے دلاور کی رہائی کے لیے اور مفاہمت یا مصالحت کے فارمولے پر مذاکرات کر سکے۔ فیصل نوجوان اور جوشیلا ہے۔ اس سے کوئی خطرہ نہیں لیکن اس عورت کا بندوبست کرنا ضروری ہے جو بیک وقت اپنے سہاگ، اپنی بقا اور اپنے مستقبل کی جنگ لڑ رہی ہے اور شکست کو ناگزیر دیکھ کے دشمن سے باعزت سمجھوتے پر آمادہ ہوئی ہے یہاں تک کہ اس کو خراج تک دینے پر تیار ہے۔ اس کی اطاعت قبول کرنے اور تاوان ادا کرنے پر بھی راضی ہے۔

بعد کے حالات نے ثابت کیا کہ میری قیاس آرائی محض پرواز تخیل نہیں تھی۔ نمک حرام پیڈرو نے موقع پاتے ہی دلاور کے خلاف سازش کا ایسا جال پھیلا دیا تھا کہ دلاور اس سے بچ کے نکل ہی نہیں سکتا تھا اور اگر نکل آتا تو یہ الزام آنے سے پہلے ہی اس کی زبان ہمیشہ کے لیے بند کر دی جاتی۔ اس کی حکومت کا تختہ الٹا جا چکا تھا۔ اگر وہ اعلیٰ عدالتوں سے غاصبوں کو غاصب قرار دلوا کے دوبارہ آئینی اور قانونی حقوق حاصل کر لیتا اور سزائے موت سے بچ کے باعزت طور پر رہا ہو جاتا تو کسی پیشہ ور قاتل کی ایک گولی وہ کام کر سکتی تھی جو قانون کے طریقۂ کار کے مطابق نہیں ہو پایا تھا۔

میں جب وہاں سے رخصت ہوا تو میرے ذہن میں ایک ہی سوال تھا۔ کیا تاریخ اپنے آپ کو خود دہرا رہی ہے۔ آج فیصل کے ساتھ بھی وہی ہونے والا ہے جو کل میرے ساتھ ہوا تھا؟ واقعات وہی ہیں۔ صرف نام بدل گئے ہیں اور وقت بدل گیا ہے۔ کل وزیر خان سے اس کی ساری عمر کی کمائی چھینی گئی تھی۔ آج یہ چوہدری دلاور کے ساتھ ہو رہا ہے۔ کل بے کسی کی موت مرنے والا وزیر خان تھا جس کا ایک ہی بیٹا تھا مگر وہ اس کے لیے کچھ نہ کر سکا تھا۔ آج دلاور کی باری ہے اور فیصل خود کو یتیم اور ماں کو بیوہ ہونے سے نہیں بچا سکتا۔ اس کی لاٹھی بے آواز ہے۔ وہ دیر کر سکتا ہے اندھیر نہیں کر سکتا۔ دنیا کی ہر عدالت کو بے بس کر دینے والا اس کی عدالت میں خود کتنا بے بس ہوتا ہے۔ شاید دلاور نے تقدیر سے وہ بازی ہار دی ہے جو میری تدبیر سے نہیں ہاری تھی۔ مگر اس سے مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔ جب چوہدری دلاور سے حساب بے باق کرنے کا وقت آئے گا تو استاد پیڈرو کا کھاتا بھی کھولا جائے گا اور یہ بھی پتا چل جائے گا کہ نئے شکاری کتنے پانی میں ہیں؟

مولوی خادم حسین مجھے خاموش دیکھ کے خود بھی خاموش تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں کسی گہری سوچ میں ہوں اور شاید میری صورت سے تشویش اور مایوسی کا اظہار بھی ہو رہا تھا۔ ہم نے شملہ پہاڑی تک کا فاصلہ پیدل ہی طے کر لیا۔ دوپہر کے وقت اچھی خاصی گرمی تھی اور سوٹ میں میرا پسینہ سارے جسم پر بہہ رہا تھا۔

بالآخر خادم حسین کی قوتِ برداشت جواب دے گئی "میں پوچھ سکتا ہوں جناب کہ آخر ہم کہاں جا رہے ہیں اور کیوں؟"

میں نے ایک فلسفیانہ جواب دیا "رات دن گردش میں ہیں سات آسمان۔ چاند سورج، ستارے سب ہی مسافر ہیں۔ کیا کسی کو اپنی منزل کا پتا ہے؟"

خادم حسین نے کہا "ان کا حال تو خدا جانے مگر آپ کا مجھے
ہے کہ کچھ بھول گئے ہیں۔"

میں رک گیا "کیا بھول گیا ہوں اور کہاں؟"

"آپ بھول گئے ہیں جی کہ بندہ بشر کوئی پودا یا درخت نہیں ہے کہ ہوا کھا کے زندہ رہے۔ جو تھوڑی بہت چربی تھی جسم میں وہ تو تیل بن کے بہہ گئی۔ اب کچھ رہا نہیں جناب، اندر کہ گاڑی چلتی رہے۔"

"گاڑی، کون سی گاڑی؟" میں نے کہا "گاڑی تو محسن لے گیا تھا، ہم ٹیکسی میں آئے تھے۔"

"ٹھیک ہے جی۔ آپ جانتے بوجھتے انجان بن رہے ہیں۔ میری دو ٹانگوں کی جگہ دو پہیے ہوتے موٹر سائیکل کی طرح اور پیٹ کی جگہ پیٹرول کی ٹنکی ہوتی تو اس وقت آپ میرے اعصاب پر سوار ہونے کے بجائے کھڑے ہوتے کسی سڑک کے کنارے یا موٹر سائیکل آپ کو چلا رہی ہوتی۔"

مجھے ہنسی آگئی "یار مولوی خادم حسین، پہیلیوں میں باتیں مت کیا کرو۔ صاف کہو نا کہ بھوک سے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں اور آنتیں قل ھو اللہ پڑھ رہی ہیں۔"

"کیا جی۔ چوہے کب کے فوت ہو چکے بھوک سے اور آنتیں ان کے لیے انا للہ پڑھ کے خاموش ہو گئیں۔" اس نے نظریں یوں آسمان کی طرف گھمائیں جیسے اس پر نزع کا عالم ہو۔

الفلاح بلڈنگ تک اسے بہرحال میرے ساتھ پیدل ہی جانا پڑا۔ وہاں الفلاح ریسٹورنٹ کے خنک نیم تاریک ماحول میں سکون سے بیٹھ کے میرا پسینہ خشک ہو گیا تو مجھے بھی احساس ہوا کہ بھوک نے میری عقل ماؤف کر دی ہے اور میں ویسے بھی سوچ سوچ کے تھک چکا ہوں۔

ایک شاندار دعوت جیسے لنچ کے بعد مولوی خادم حسین نے خمار کی کیفیت میں کہا "ایک بات کہوں جی، وہ خبیث الدہر رانا ہرگز نابینا نہیں تھا۔"

"بالکل ٹھیک۔ اب دوسری بات کہو۔"

"دوسری بات؟" خادم حسین نے سر کھجایا "ہے تو سہی مگر آپ کہیں گے جی کہ خادم کا دماغ چل گیا ہے۔"

"یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے، تم بتاؤ..."

"میں نے اس آنکھوں والے اندھے کو دیکھا ہے پہلے بھی۔ اور شاید اس نے خود کو مجھ سے چھپانے کے لیے ہی یہ بھیس بدلا ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ میرے منہ میں کپڑا ٹھونس کے مجھ پنکھے سے الٹا لٹکانے والا یہی شخص تھا۔ یہی مجھے پھانسی دینا چاہتا تھا۔ اس نے کالا چشمہ لگا کے آدھا چہرہ چھپا لیا تھا ورنہ میں اس کی آنکھوں کے نیچے دیکھ لیتا۔ ایک کے نیچے زخم کا نشان ہے اور یہ آنکھ مصنوعی ہے۔ پتھر کی ہے۔ اس دن حلیہ بہت خراب تھا۔ آج سوٹ بوٹ میں تھا اور آواز بدل کے بات کر رہا تھا۔"

میں نے کہا "رائٹ۔ یہی تو میں نے بھی محسوس کیا تھا کہ یہ اس کی اصل آواز نہیں ہے۔"

"آپ خود سوچیں جناب کہ ایک اندھا کسی کمپنی کا منیجر کیسے ہو سکتا ہے۔ جسے نظر ہی کچھ نہ آتا ہو جی وہ کسی پر کیا نظر رکھے گا۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ ساری دنیا کو ایک آنکھ سے دیکھتا ہے۔"

"ایسے شخص کو تو بڑا انصاف پسند اور عادل کہا جاتا ہے۔"

"آپ تو محاورے کی طرف چلے گئے جی۔ آپ شرط لگا لیں مجھ سے اس کی بائیں آنکھ نہیں ہے۔"

میں نے کہا "مولوی ہو کے شرط لگاتے ہو۔ شرعاً یہ حرام ہے۔ ذرا سوچو، جتنا بھی اور جیسا بھی دماغ ہے تمہارا۔ اس پر زور دو۔ کیا تم کو اسی آفس میں لایا گیا تھا؟ کیا وہ جگہ یہی تھی جہاں تم پر تشدد ہوا تھا۔ تم نے کانے جلاد کو پہچان لیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تمہارا مشاہدہ اچھا ہے۔"

مولوی نے نفی میں سر ہلایا "وہ تو ڈرائنگ روم تھا کسی کوٹھی کا۔ ہاں جب یہ کانا دجال اندر آیا تھا تو ایک لمحے کے لیے میں نے کھلے دروازے سے اندر کی جھلک دیکھی تھی۔ میرا خیال ہے کہ اندر کوئی چیز تھی، کیا تھا آخر...؟ ہاں جی، یاد آگیا... وہ فانوس، فانوس وہی تھا۔ جب میں الٹا لٹکا ہوا تھا تو میں نے دو چیزیں نوٹ کی تھیں۔ ایک تو اس کی آنکھ میرے اتنے قریب تھی کہ میں نے زخم بھی دیکھ لیا تھا اور پتھر کے رنگ کو بھی۔ دوسری چیز وہ فانوس تھا۔ میں خود بھی فانوس کی طرح لٹکا ہوا تھا جی۔ اور جب وہ مجھے اوپر کھینچتا تھا تو میں فانوس کے قریب پہنچ جاتا تھا۔"

میں نے چٹکی بجا کے کہا "بس خادم حسین، معمہ حل ہو گیا۔ یہی ہے وہ جگہ جہاں تم کو لایا گیا تھا۔ چوہدری دلاور کی بیوہ یہیں رہتی ہے اور اسی آفس کے فون پر اس سے بات ہوتی ہے لیکن آج اسے ہم سے نہیں ملنے دیا گیا اور شاید آئندہ بھی ایسا ہی ہوگا۔ نہ وہ بات کر سکے گی اور نہ کسی سے ملاقات۔"

تیسرے پہر میری ملاقات رابعہ کے آفس میں منظر سے ہوئی۔ رابعہ نے اسے کراچی میں پیش آنے والے افسوس ناک واقعات سنا دیے تھے چنانچہ وہ خاصا آزردہ تھا۔ اس کی طبعی شوخی میں مایوسی کا رنگ غالب تھا۔

"کچھ نہیں بیٹا۔ تم سارے جہاں میں طرم خاں بنے پھرو۔ اپنی ایم آر ایس کو پی ایل او کی طرح تسلیم کرا لو اور خود یاسر عرفات ہو جاؤ تب بھی دلاور اسرائیل کی طرح من مانی کرتا رہے گا۔ فوزیہ کے بعد کسی دن باری آجائے گی کاجل اور اکرام شیخ کی..."

میں نے کہا "مایوسی کی باتیں مت کر۔ یہ بتا مقدمے میں کیا پیش رفت ہوئی؟"

"کچھ نہیں۔ ابھی تو چالان پیش ہوا ہے وہ بھی نامکمل۔ وکیل صفائی نے اعتراض کر دیا ہے کہ اس پوسٹ مارٹم رپورٹ کی قانونی حیثیت نہیں ہے کیونکہ بورڈ کے سب ارکان نے اس پر دستخط نہیں کیے ہیں۔ میڈیکل بورڈ کا چیئرمین خود ایم ایس تھا۔ دوسرا ممبر پولیس

سرجن تو قتل ہو چکا تھا۔ وہ کہاں سے دستخط کرتا مگر اعتراض درست ہے۔ قانونی طور پر میڈیکل بورڈ دوبارہ تشکیل ہونا ضروری تھا۔ جس بورڈ کا نوٹیفیکیشن جاری ہوا تھا وہ ٹوٹ چکا تھا۔"

"پھر اب کیا ہوگا؟"

"ایس ایس پی جاوید نے وعدہ کیا ہے کہ آج ہی بورڈ کے نئے ارکان نامزد ہو جائیں گے اور اپنے طور پر اس نے مجھے یقین دلایا ہے کہ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے تبدیل ہونے کا امکان نہیں ہے۔ نیا پولیس سرجن خود ایم ایس نے نامزد کیا ہے اور راس کا سالا ہے۔ وہ اس سے رپورٹ پر دستخط کرالے گا۔ مجسٹریٹ دستخط کر ہی چکا ہے۔ اگلی پیشی پر گواہوں کی فہرست دی جائے گی۔"

"دلاور کی طرف سے ضمانت کی درخواست دائر نہیں کی گئی۔"

"ابے قانون کا پتا نہیں تو ایسے سوالات سے خود کو جاہل کیوں ثابت کرتا ہے۔ ضمانت کی درخواست کے ساتھ دلاور کا پیش ہونا ضروری ہے۔ قبل از گرفتاری ضمانت کی درخواست تو پہلے ہی مسترد ہو چکی ہے۔ اب ہماری کوشش ہوگی کہ اسے اشتہاری مجرم قرار دلوا دیں۔ اس کی تصویر اخبار میں شائع ہو جائے۔"

رابعہ نے کہا "آخر ہم اسے کب تک قید میں رکھیں گے۔ اب تو غالب اور نازو کے تحفظ کی ضمانت حاصل ہوگئی ہے۔"

"کس نے دی ہے یہ ضمانت؟ اور کیا ہمیں صرف اس ضمانت پر قناعت کر کے بیٹھ جانا چاہیے۔ غالب اور نازو کو بھول جانا چاہیے؟ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ جس نے یہ ضمانت دی تھی کہ غالب اور نازو کو کچھ نہیں ہوگا وہ خود اس پوزیشن میں نہیں کہ اپنے لیے بھی کچھ کر سکے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ دلاور کی بیوی جو پہلے مذاکرات کے لیے اتنی بے چین تھی، اور دلاور کا بیٹا دونوں بے بس ہوگئے ہیں۔ معاملات اب شوکت علی رانا کے ہاتھ میں ہیں۔ شاید اس نے ڈاکٹر شاہ اور استاد پیڈرو کے ساتھ مل کے ایک ایسا کاروباری اتحاد قائم کر لیا ہے جس میں چوہدری دلاور کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ وہ جیل جاتا ہے تب بھی ان کی بلا سے اور پھانسی چڑھتا ہے تو انہیں غم نہیں۔ ہر صورت میں دلاور کا نہ ہونا ہی ان کے لیے باعثِ نجات ہوگا۔ اب وہ نہیں چاہتے کہ دلاور دوبارہ کاروبار کو کنٹرول کرے چنانچہ انہوں نے دلاور کی بیوی کو بھی مذاکرات سے روک دیا ہے۔"

منظر اور وقار یوسف مجھے یوں دیکھ رہے تھے جیسے میں نشے میں اول فول بک رہا ہوں۔ رابعہ بھی اس صورتِ حال کو سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ میں نے رانا سے ملاقات کے بعد اپنے ذہن میں پیدا ہونے والے شکوک کی وضاحت کی تو رابعہ اور وقار یوسف نے مجھ سے اختلاف نہیں کیا۔

"ایسا ہو سکتا ہے" رابعہ نے کہا۔

"ایسا بھی ہو سکتا ہے" وقار یوسف نے بھی۔۔ زور دے کے کہا۔

منظر نے بھی سر ہلایا "یہ ایک خیال ہے۔ خیال غلط بھی ہو سکتا ہے۔ ثبوت ملنے تک اس کی صداقت مشکوک رہے گی جیسے تیرا کردار مشکوک ہے۔ خواہ رابعہ تجھے ولی کہے۔ بھوتنی کے۔"

"اور سولہ بچوں کی ولدیت کے باوجود بحیثیت شوہر تیرا کردار مشکوک ہی رہے گا۔ خواہ بیوی کچھ بھی کہے۔" میں نے کہا "رہی بات ثبوت کی تو بیٹا ہم آج ہی ثابت بھی کر دیں گے۔"

"ہم کون۔ تم اور تمہارا وہ عم زاد ہم زاد شیروانی۔ تم دونوں تو پہلے ہی بہت کچھ ثابت کر چکے ہو۔ وہ ہے کہاں آخر۔ میں نے ابھی تک اس کی نئی شکل نہیں دیکھی۔ ابھی تک ویسا ہی ہے یا کچھ انسان کا بچہ نظر آنے لگا ہے شادی کے بعد؟"

میں نے کہا "منظر، ایسا لگتا ہے کہ وہ ہم سب کی بلائیں اپنے سر لے لیتا ہے۔ ورنہ ایسا کیوں ہے کہ تقدیر سارے زخم اسے دیتی ہے۔"

رابعہ نے کہا "اور کمال یہ ہے کہ اس کے دل میں بال نہیں آتا۔ کسی سے گلہ نہیں ہے اسے۔ آج بھی اس کا حوصلہ دیکھ رہا ہے۔"

اچانک منظر نے کہا "مولوی خادم حسین۔ تم بڑے حرامی ہو۔"

خادم حسین یوں اچھلا جیسے منظر نے بے خبری میں اس کو انگارے سے داغ دیا ہو۔ "یہ... یہ کیا ہے منظر صاحب۔ آپ حد سے بڑھ رہے ہیں، شرافت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔"

"ہاں ہوتی ہے مگر تمہیں کیا۔ جو کچھ تم اس آفس میں کرتے رہے ہو اس پر شرم آنی چاہیے تمہیں۔"

"کیا.... کیا برا کام کیا ہے میں نے؟" خادم حسین گھبرایا۔

"تم کسے لائے تھے آفس میں؟ مجھے سب پتا چل گیا ہے۔ کون تھی وہ چھنال چھیل چھبیلی چھمک چھلو؟ مشتری بائی یا زہرہ بائی۔ جس کی چوڑیاں پڑی ہیں یہاں اور.... بس میرا منہ مت کھلواؤ۔ مجھے رپورٹ مل گئی ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ منظر صاحب، آپ بہت واہیات آدمی ہیں۔"

"میں واہیات آدمی سہی مگر بیوی کے ہوتے میں بھی آفس میں ایسی ویسی عورت کے ساتھ..."

"آپ... زبان سنبھال کے بات کریں جی۔"

"جوانی تم سے نہیں سنبھالی جاتی۔ مولوی ہم تو بیوی سے وفاداری کے سولہ ثبوت پیش کر چکے ہیں دنیا کے سامنے۔ تمہارا چال چلن پہلے ہی مشکوک تھا۔ ابھی تک چوہے کا بچہ پیدا نہیں کیا تم نے، اوپر سے...."

"دیکھیے، دیکھیے حد ہوتی ہے برداشت کی۔ میں رابعہ بی بی کی وجہ سے خاموش ہوں۔"

"رابعہ بی بی کی آڑ مت لو۔ سب بتا دیا ہے سکندر نے اور بس نے کہ رات تین بجے یہاں کیا اندر سبھا جمی ہوئی تھی۔ تم نے میں دھت کون سا گانا گا رہے تھے۔ کیا تھا وہ گانا سکندر۔ ہاں... مت مست بن پیے۔ اور وہ تمہارے ساتھ گا رہی زنانیاں یہ بتاؤ۔"

خادم حسین ایک دم اٹھا "میں لعنت بھیجتا ہوں اس نوکری پر سکندر صاحب.."

"کیوں۔ مرچیں لگ گئیں سچ سن کے۔ مولوی خادم حسین۔ ہم نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ تم واقعی بہت حرامی ہو۔ سچ بتاؤ کون تھی وہ؟"

"وہ میری گھر والی تھی۔" خادم حسین چیخ کے بولا "اور حرامی آپ خود۔ آپ کے والد اور جدِ امجد۔"

ہنس ہنس کے منظر کا برا حال ہوگیا۔ اس نے مولوی کو گلے لگالیا۔ "ارے میرے چاند۔ میرے بھولے بھالے پیارے پیارے مولوی خادم حسین۔ اب تم نے کی نا صحیح بات۔ ارے جاؤ ہم دل لگی کرتے ہیں تم سے۔ تم جتنی گالیاں چاہو دے لو۔ تم تو میرے بھائی ہو۔ میرے باپ ہو۔"

"نہیں جی۔ مجھے معاف کریں" خادم حسین نے خود کو چھڑا لیا۔

"دیکھو، عورتیں دوپٹہ بدل بہنیں بن جاتی ہیں۔ آؤ ہم پتلون بدل بھائی بن جاتے ہیں۔ سب کے سامنے" منظر نے اپنا ہاتھ پتلون کی طرف بڑھایا۔

"لاحول ولا قوۃ۔" مولوی خادم حسین کا چہرہ شرم سے سرخ ہوگیا "تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود اتنی بے شرمی آپ کو زیب نہیں دیتی۔"

"چلو پتلون نہ سہی۔ بیوی بدل بھائی بن جاؤ۔ ویسے بھی تمہاری اور میری بیوی اگر بہنیں ہوں تو میری بیوی تمہاری سالی اور تمہاری بیوی میری سالی۔ جو ویسے ہی ہوتی ہے آدھی گھر والی۔"

خادم حسین باہر بھاگ گیا کیونکہ اب منظر کے ساتھ میں اور رابعہ بھی ہنس رہے تھے اور وہ اتنا شریف آدمی تھا کہ مذاق بھی برداشت نہیں کرتا تھا۔ اسی وقت محسن آگیا اور ہم سب ایسے ایک دم خاموش ہوگئے جیسے کوئی چوری کرتے ہوئے پکڑے گئے ہوں۔ اس کے لیے ابھی بہن کی موت کا صدمہ تازہ تھا اور ہم سب قہقہے لگا رہے تھے۔ یہ حقیقت تلخ اور ناقابلِ تردید ہے کہ آپ ہنسیں تو دنیا آپ کے ساتھ ہنستی ہے مگر آپ روئیں تو دنیا آپ کے ساتھ نہیں روتی۔ منظر نے رسماً اس سے تعزیت کی۔ پھر آفس میں فراغت آنے لگی اور ہم اندر والے کمرے میں چلے گئے۔

میں نے کہا "محسن۔ آج ہی موقع ہے۔"

"کیسا موقع؟" وہ بیڈ پر دراز ہوگیا۔

میں نے اسے آج دن میں رانا سے ہونے والی ملاقات کے بارے میں بتایا "مولوی خادم حسین کو اسی گھر میں تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ وہ ہمت والا آدمی ہے۔ اس نے کچھ بتایا نہیں ورنہ آج میرا کام تمام ہو جاتا۔ دلاور اینڈ کمپنی کی جگہ رانا اینڈ کمپنی آگئی تو ہماری فتح ایک دم شکست میں بدل جائے گی۔"

"وہ کیسے؟"

"رانا اور ڈاکٹر شاہ نے استاد پیڈرو کی حمایت سے اس کا تختہ الٹ دیا تو بڑا خونی انقلاب آئے گا۔ وہ سب کا قصہ پاک کر دیں گے۔ چوہدری دلاور کے سارے خاندان کو اڑا دیں گے اور ساتھ ہم سب کو۔ سارے جھگڑے ختم، کاروباری رقابت، وراثت کا مسئلہ، عدالت میں پرانے تصفیہ طلب مقدمات اور الزامات سب ختم۔ سمجھا اور کہا یہی جائے گا کہ پرانے دشمنوں نے ایک دوسرے کو ختم کر دیا۔ رانا اینڈ کمپنی کو کسی سے نہ شکایت تھی نہ کسی سے دشمنی۔ وہ سارے کاروبار کے مالک..."

"یار، یہ اتنا آسان بھی نہیں ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ چوہدری دلاور اور اس کے خاندان کو ختم کر دیں مگر ادھر تو سلسلہ بہت لمبا ہے۔ تیرے اور رابعہ کے بعد میں اور گل ہیں، غالب اور نازو ہیں۔ وقار اور نگی ہیں۔ منظر ہے اور یہ سب لوگ ان کی جان آسانی سے چھوڑنے والے نہیں ہیں۔ استاد پیڈرو یقیناً یہ بات سمجھتا ہے۔"

"ہمارا بھی بہت نقصان ہو جائے گا۔ اس کے بعد شاید یہ بات ان کی سمجھ میں آجائے گی۔"

"آخر تو کیا چاہتا ہے؟"

"سی ڈی انٹرپرائز کے لیے ایک سرپرائز۔ میں اچانک وہاں پہنچ کے رانا سے ملنا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ رات کے وقت وہاں ہماری ملاقات مسز دلاور سے ہوگی۔ اگر ہم پہرے پر مامور محافظوں کے حصار کو توڑ کر اندر داخل ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ وہاں قید میں ہے۔"

"تو کیا اب آپ کو دشمن کے خاندان سے ہمدردی ہوگئی ہے۔"

"یار، تو سمجھنے کی کوشش کر۔ اگر چوہدری دلاور کے بیوی بچے محفوظ رہیں گے تو استاد پیڈرو کی یا رانا کی کوئی سازش کامیاب نہیں ہوگی۔ وہ کبھی اس کے کاروبار پر قابض نہیں ہو سکیں گے اور یہ سب کچھ دلاور کا رہے گا۔ مجھے اپنا حق دلاور سے واپس لینا ہے۔ جب اس کے پاس کچھ نہیں ہوگا یا وہ خود نہیں ہوگا اور اس کے وارث نہیں ہوں گے تو میں کس کے خلاف دعوے کروں گا۔ رانا اور ڈاکٹر شاہ سے تو میرا کوئی تعلق نہیں۔ نہ وہ مجھے جانتے ہیں اور نہ میں نے انہیں دیکھا ہے۔ اس سازش کو ناکام بنانے کے لیے ہمیں چوہدری دلاور کا ساتھ دینا پڑے گا۔ اسے یہ موقع فراہم کرنا پڑے گا کہ وہ پہلے پیٹھ میں خنجر گھونپنے والے دغاباز یاروں سے نمٹ لے۔ اس کے بعد ہمارے مقابل آئے۔ ہم سامنے آکے لڑتے

ہیں چھپ کے وار نہیں کرتے۔"

"دشمن دلاور بھی تھا۔ دشمن رانا ہو جائے تو ہمیں کیا فرق پڑتا ہے؟"

"انگریزی کا ایک مقولہ ہے کہ

THE DEVIL YOU KNOW
IS BETTER THAN
THE DEVIL YOU DONT KNOW

"وہ شیطان بہتر ہے جسے آپ جانتے ہیں' اس شیطان سے جس کو آپ جانتے ہی نہیں" محسن بولا۔

"ہاں۔ ہم دلاور کی بیوی اور بیٹے کو بچا کے خود بھی محفوظ ہو جائیں گے۔ رانا اینڈ کمپنی اور پیڈرو کو پتا چل جائے گا کہ کامیاب ہونے سے پہلے ہی ان کے عزائم کو شکست ہو گئی ہے اور ان کی حیثیت آج بھی وہی ہے جو کل تھی۔ جب تک دلاور زندہ ہے اور اس کے وارث موجود ہیں وہ کچھ نہیں کر سکتے۔ قتل ہی کرنا ہوتا تو میں بہت پہلے دلاور اور اس کے سارے خاندان کو نیست و نابود کر دیتا۔ اب میں یا رابعہ' غالب یا نازو۔ ہم میں سے کوئی بھی ان کے ہاتھوں مارا جاتا ہے تو یہ حرام موت ہو گی۔ چلو مانا کچھ بچ جائیں گے اور وہ ان ہوس پرست قاتلوں کے خلاف قانونی یا غیر قانونی کارروائی کریں گے مگر اس سے نقصان کی تلافی کیسے ہو گی؟ نہیں محسن' اس مرحلے پر جب معاملات ہمارے کنٹرول میں ہیں ہم جیتی ہوئی بازی ہار جائیں؟ یہ تو بڑی حماقت کی بات ہو گی۔"

"او کے۔ مجھے بتا کیا کرنا ہے۔ کہاں جانا ہے؟"

میں نے کہا "سی ڈی انٹرپرائز کے آفس۔ کسی کو بتائے بغیر مگر پوری طرح مسلح ہو کے۔ مولوی خادم حسین بعد میں آئے گا۔ جب ہم اندر پہنچ جائیں گے۔ سب سے پہلے میں جاؤں گا۔ اس کے بعد آپ تشریف لائیں گے۔ ہم اندھیرا ہونے کے بعد کارروائی کریں گے۔ میں یہ لباس بدل کے چوکیدار کی وردی پہن لوں۔ رات کے وقت میں اپنی اوقات میں آجاتا ہوں۔"

"وہ زیادہ جچتی ہو گی تجھے۔"

میں نے کہا "تو بیڈ کے نیچے سے ریوالور نکال لے اور خاموشی سے نکل جا۔ مولوی خادم حسین کو ساتھ لے جا۔ کسی کو پتا نہ چلے یہاں ورنہ مشکل ہو جائے گی۔"

محسن نے بیڈ کے نیچے سے باکس نکالا جس میں اب بھی بہت سا کارآمد اسلحہ ایسی ہی ضرورت کے لیے محفوظ تھا۔ اس نے اپنے لیے اعشاریہ چار پانچ کا ریوالور منتخب کیا جس پر سائلنسر لگا ہوا تھا۔ ایسا ہی دوسرا ریوالور میرے پاس بھی رہتا تھا۔

باہر والے آفس میں منظر' رابعہ اور وقار اپنے اپنے کیبن میں مؤکلوں سے نمٹ رہے تھے۔ ان کی فائلیں دیکھ رہے تھے اور انہیں قانونی معاملات کے اسرار و رموز سمجھا رہے تھے۔ ضخیم P.L.D کی کتابوں سے حوالے تلاش کر رہے تھے اور ماتحت وکیلوں کو ہدایات دے رہے تھے۔

محسن اور مولوی خادم حسین ٹہلتے ہوئے باہر گیلری تک گئے۔ کچھ دیر اوپر سے مال کی شام کا نظارہ کرتے رہے اور پھر اتر گئے۔ چند منٹ بعد میں چوکیدار کی وردی میں باہر آیا تو منظر نے کہا

"چوکیدار۔ کہاں جا رہا ہے بھوتنی کے؟"

میں نے مسکینی سے کہا "آپ کے گھر جناب۔ بیگم صاحبہ نے پیغام بھجوایا تھا کہ آج رات آپ تو ہوں گے نہیں۔"

"اچھا اچھا۔ جاؤ' بس ذرا قینچی سے ہوشیار رہنا۔ بات نہیں وہ بات کرنے والے کی کوئی بھی چیز کاٹ دیتی ہے۔" منظر نے کہا "ناک کان وغیرہ وغیرہ۔"

قینچی وہ اپنی بیوی کی زبان کو کہہ رہا تھا۔ باقی بات تحت اعتراض تھی جس پر رابعہ نے بھی اسے گھور کے دیکھا مگر منظر ڈھیٹ چیز تھا۔ میں سیڑھیاں اتر کے نیچے پہنچا تو محسن اور خادم حسین میری گاڑی میں بیٹھ چکے تھے۔ آدھے راستے میں محسن نے اس کی نمبر پلیٹ بدل دی۔ اب یہ رابعہ کی گاڑی نظر آتی تھی اور اس وقت رابعہ اپنے آفس میں تھی۔ اس کی گاڑی بھی نیچے کھڑی تھی اور اس بات کے گواہ بھی کم نہ تھے۔

گاڑی کو ڈیوس روڈ کے موڑ سے کچھ آگے روک کے محسن نے مجھے اتار دیا۔ میں وہاں سے دلاور کے آفس کا گیٹ دیکھ سکتا تھا۔

"ٹھیک پانچ منٹ بعد تم آجانا" میں نے محسن سے کہا اور پھر مولوی خادم حسین سے مخاطب ہو گیا "میں سیٹی بجا کے تم کو طلب کر لوں گا۔ جب تک سیٹی کی آواز نہ سنائی دے اندر آنے کی ضرورت نہیں۔"

"اچھا جی۔ مگر یہ تو آپ لوگوں نے مجھے مروانے کا سوچا ہے۔ آپ دونوں کے پاس بھرے ہوئے ریوالور ہیں' خالی ہاتھ تو صرف میں ہوں۔"

میں نے کہا "مومن ہو تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی۔"

گیٹ بند تھا لیکن کال بیل بجانے پر اندر سے وہی چوکیدار نمودار ہوا۔ میری وردی کو غور سے دیکھ کے اس نے کہا "کیا بات ہے' کس سے ملنا ہے؟"

میں نے کہا "رانا صاحب کے لیے خاص پیغام ہے۔ تمہیں نہیں بتا سکتا۔"

"مگر رانا صاحب تو نہیں ہیں یہاں۔"

اس اطلاع پر خوشی کا اظہار میں نے اس کے سر پر ریوالور کا دستہ مار کے کیا۔ وہ گرنے ہی والا تھا کہ میں نے اسے سنبھال لیا اور اندر گیٹ کے ساتھ بنے ہوئے کیبن میں ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ بیرونی کمرے کا جالی والا دروازہ کھول کے میں اندر داخل ہوا تو ریسپشن پر بیٹھی ہوئی حسینہ کی جگہ خالی تھی۔ میں سیدھا گزر گیا۔ ان کمروں میں جہاں دن کے وقت مختلف افراد اپنی اپنی میزوں پر دفتری امور سرانجام دیتے تھے اس وقت کوئی بھی نہیں تھا۔ اوپر

کرے بھائیں بھائیں کر رہے تھے۔ مجھے مایوسی ہونے لگی۔ کیا اندازہ غلط تھا یا رانا نے دلاور کی بیوی کو کہیں اور منتقل کر دیا کوٹھی کا ایک کمرا بیڈ روم کے طور پر بھی استعمال ہوتا تھا۔ مجھے زنانہ استعمال کی بہت سی چیزیں نظر آئیں۔ ڈریسنگ ٹیبل پر میک اپ کا سامان تھا۔ قالین پر سینڈل الٹے پڑے ہوئے تھے۔ وارڈروب میں کپڑے دیکھ کے میرے لیے شک کی کوئی گنجائش نہ رہی کہ یہ دلاور کی بیوی کا بیڈ روم تھا۔ یہ اس کی مستقل رہائش گاہ نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے بچوں کا یہاں کوئی بیڈ روم نہیں تھا اور ان کے استعمال کی کوئی چیز نظر آ رہی تھی۔ غالباً وہ عارضی قیام رکھتی تھی۔

ابھی میں اس کمرے سے نکلنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے کہا "ہاتھ اوپر اٹھا کے سیدھے کھڑے ہو جاؤ۔"

میں نے تعمیل کی۔ آواز سے میں اسے شناخت نہیں کر سکا

"اب دھیان سے آہستہ آہستہ یہ چہرہ میری طرف کرو۔"

میں گھوم گیا "چہرہ تم سے اچھا تو نہیں ہے۔" میں نے سرائیکی کہا۔

"بکواس بند کرو۔ کون ہو تم۔ یہاں کیا کر رہے ہو؟" سوال کرنے والے کے ہاتھ میں بھی ریوالور تھا اور وہ شکل سے ہی خونی نظر آ رہا تھا۔

"میں رانا صاحب کے لیے خاص پیغام لایا تھا۔ ایک امریکی ڈاکٹر آج کل ٹیکسلا کے اسپتال میں آیا ہوا ہے۔ وہ مصنوعی آنکھ کی بجائے اصلی آنکھ لگا سکتا ہے۔ پھر رانا صاحب کا دوسرا بازار بھی کھل جائے گا۔"

"دوسرا بازار؟"

"ہاں۔ تم نے لطیفہ نہیں سنا۔ ایک بندہ تھا ایسا ہی۔ ایک آنکھ والا' وہ بازار سے گزرتا تھا تو کہتا تھا۔ عجیب شہر ہے۔ جب دیکھو ایک طرف کا بازار کھلا ہوتا ہے۔ دوسری طرف کا بند۔ آتے جاتے کی تماشا ہوتا ہے.... ایک لنگڑے نے کہا کہ یار میرے ساتھ تو اس سے بھی عجیب بات ہوتی ہے۔ جاتے ہوئے دونوں پاؤں برابر ہو جاتے ہیں واپس آتے ہوئے پھر چھوٹے بڑے ہو جاتے ہیں۔ دراصل اس وقت وہ ایک پاؤں فٹ پاتھ پر اور دوسرا سڑک پر رکھ کے چل رہا تھا۔"

"مجھے ہنسی نہیں آئی" وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

میں نے بھی لطیفہ اسے ہنسانے کے لیے نہیں وقت گزارنے کے لیے سنایا تھا۔ ٹھیک پانچ منٹ بعد محسن نے پیچھے سے اس کی گردن پر ریوالور رکھ دیا "کوئی ہمارے لطیفے پر نہ ہنسے تو یہ گستاخی ہوتی ہے اور گستاخی کرنے والے کو ہم دوسرا لطیفہ ایسے سناتے ہیں۔ ریوالور نیچے ڈال دو بیٹے۔"

اس نے مزاحمت نہیں کی اور خاموشی سے ریوالور گرا دیا لیکن یہ اس کی چالاکی تھی۔ جیسے ہی میں اس کا ریوالور اٹھانے کے لیے جھکا اس نے ایک دم جھک کے میری کمر میں ہاتھ ڈال دیا اور مجھے گھما کے اپنے سامنے ڈھال بنا لیا۔ موٹا ہونے کے باوجود وہ بہت پھرتیلا تھا۔ تاہم اس کی گرفت پہلوانوں والی تھی۔

میں نے کہا "واہ پہلوان۔ کیا داؤ لگایا ہے۔ کہاں زور کرتے رہے ہو۔"

اس نے ہانپتے ہوئے کہا "اب بھی تم جیسے چار۔۔۔"

میں نے دونوں کہنیاں اس کی پسلیوں میں ماریں۔ پھر ایک لات پیچھے کی طرف رسید کی جو اس کی رانوں کے درمیان لگی۔ وہ بلبلا کے دہرا ہو گیا اور اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ میں نے ایک جھٹکے سے خود کو چھڑایا اور گھوم کے پہلوان کے بال پکڑ لیے۔ اس کا سر اوپر اٹھا کے میں نے دو انگلیاں اس کی آنکھوں میں گھسیڑ دیں۔ وہ پاگلوں کی طرح چلانے لگا۔ میں نے اسے چھوڑ دیا اور دروازے کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ دروازے کے دوسری طرف محسن پہلے ہی پوزیشن لے چکا تھا۔ پہلوان آنکھوں پر ہاتھ رکھے فرش پر لوٹ رہا تھا اور دہائی دے رہا تھا "اوئے مار دیا ظالموں نے۔ اندھا کر دیا۔۔۔"

ایک اور شخص ریوالور کے ساتھ دوڑتا ہوا آیا "اوئے کیا ہوا۔ کیوں گدھے کی طرح۔۔۔"

میں نے سائڈ سے ایک ٹانگ آگے بڑھائی اور وہ اپنے ہی زور میں منہ کے بل گر گیا۔ وہ عام قسم کے چوکیدار تھے جن کا واسطہ چوروں سے پڑے تو وہ انہیں گولی چلا کے فرار ہونے پر مجبور کر سکتے تھے مگر یہاں انہیں کبھی اس قسم کی صورتِ حال کا سامنا نہیں ہوا تھا۔

میں نے دوسرے شخص کو اٹھنے کا موقع نہیں دیا اور آگے بڑھ کے اس کی گردن پر پیر رکھ دیا "حرکت کی تو گردن توڑ دوں گا۔ سیدھے پڑے رہو اور یہ ریوالور دور پھینک دو۔"

اس کا منہ دوسری طرف تھا اس لیے وہ مجھے دیکھ نہیں سکتا تھا مگر اس نے نشانہ لیے بغیر ہاتھ اٹھا کے مجھ پر گولی چلانے کی حماقت کی۔ گولی چھت کی طرف نکل گئی مگر اس کے ساتھ ہی میں نے ریوالور والا ہاتھ پکڑ کے پاؤں کو جھٹکا دیا تو اس کی گردن ٹوٹ گئی۔ وہ تھوڑی دیر تڑپا اور پھر ساکت ہو گیا۔ اس وقت تک پہلوان آنکھیں کھول کر دیکھنے کے قابل ہو گیا تھا۔

اس نے بے یقینی سے مرنے والے کو دیکھا "یہ.... یہ تم نے کیا ظلم کیا۔ اس غریب کو مار دیا۔"

"غریب نے منع کرنے کے باوجود مجھ پر گولی چلائی تھی" میں نے پہلوان کو پھر بالوں سے پکڑ کے کھینچا اور سیدھا کھڑا کر لیا "بیگم صاحبہ کہاں ہیں؟"

اس نے انجان بننے کی کوشش کی "چوہدری دلاور کی گھر والی۔ کہاں قید کیا ہے اسے رانا نے۔ بتا دو گے تو تمہیں چھوڑ دوں گا ورنہ۔۔۔"

"وہ... نیچے... تہ خانہ" وہ ہکلانے لگا۔

عمارت میں ایک کمرا زیرِ زمین بھی تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کا راستہ پچھلی طرف سے تھا۔ پہلوان اب بڑی فرمانبرداری دکھا رہا تھا اور بار بار درخواست کر رہا تھا کہ اس کی گردن نہ توڑی جائے۔ اس نے خود ہی نیچے جانے والے راستے کی لائٹ جلائی۔ خود ہی چابی لگا کے دروازے کا قفل کھولا۔ دروازے کے پیچھے روشنی تھی۔ اچانک میں نے دلاور کی بیوی کو دیکھا۔ وہ بیڈ پر بیٹھی رو رہی تھی مگر اب کھڑی ہوگئی تھی۔ اس سجے سجائے کمرے میں اسے قیدِ تنہائی کے سوا کوئی تکلیف نہیں تھی۔ میں اسے اوپر بیڈ روم میں لے آیا۔

پھر میں نے کہا "چلو۔ ہم تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آئے ہیں۔"

اس نے پُرخوف نظروں سے مجھے اور محسن کو دیکھا۔ "تم... کون ہو؟"

میں نے کہا "تمہاری سکندر بخت سے بات ہوگئی تھی؟"

اس نے کچھ دیر سوچ کے سر ہلایا "کراچی سے فون کیا تھا اس نے۔"

"اور تم نے پولیس کو پیچھے لگا کے اسے پکڑوانے کی کوشش کی تھی۔ دغاباز عورت۔ تُو نے جھوٹی قسم بھی کھائی تھی۔"

"وہ... میں نے۔ میں نے کچھ نہیں کیا تھا... میں مجبور تھی۔"

"وہ رانا کی حرکت تھی؟"

"ہاں۔ رانا نے ہی مجھے یہاں قید کر رکھا ہے۔ تین دن سے میں نے اپنے بچوں کو نہیں دیکھا۔ معلوم نہیں ان کے ساتھ کیا سلوک کیا ہوگا ان نمک حراموں نے" وہ پھر رونے لگی۔

"رانا کو اکسانے والا کون ہے؟ استاد پیڈرو؟"

اس نے چونک کے مجھے دیکھا "تم سب جانتے ہو۔ کیا تم... سکندر بخت تو نہیں ہو۔ وہ بھیس بدلنے کا ماہر ہے۔"

میں نے کہا "آج کل وہ ٹارزن کا بھیس بدل کے افریقہ کے جنگلوں میں چھلانگیں لگا رہا ہے۔ اس نے ہمیں بھیجا ہے کہ تمہیں بھی وہیں پہنچا دیا جائے۔"

"کہاں... میں اپنے گھر جاؤں گی۔"

"اپنے چوہدری دلاور صاحب سے نہیں ملوگی پہلے" میں نے کہا "ذرا دیکھ لو ان کو بھی ایک نظر۔ تمہارے ہجر نے ان کی کیا حالت کردی ہے۔"

"تم ضرور سکندر بخت ہو" وہ بولی "تمہاری باتیں..."

"خاتون۔ باتوں کے لیے وقت نہیں ہے" میں نے کہا "تم چاہو تو منہ دھولو۔"

اس نے تیار ہونے میں دو منٹ لگائے۔ باہر آتے ہی میں نے منہ میں انگلی ڈال کے سیٹی بجائی تو مولوی خادم حسین گاڑی دوڑاتا ہوا گیٹ تک لے آیا۔ میں نے دلاور کی بیوی کو درمیان میں بٹھا لیا۔ اس کے ایک طرف میں تھا اور دوسری طرف محسن۔ وہ بہت خوف زدہ تھی مگر ہمارا رویّہ ابھی تک شریفانہ تھا۔

خادم حسین نے کہا "یہ کس بلا کو پکڑ لائے ہیں جی آپ۔ ہزار آفات کا مجموعہ ہے یہ عورت۔"

میں نے کہا "یہ اپنے چوہدری دلاور صاحب کی منکوحہ ہیں۔ ان سے ملنا چاہتی ہیں۔ کہتی ہیں دل بہت اداس ہے ان کے بغیر۔"

خادم سمجھ گیا "چلیں جی بڑے ثواب کا ہے یہ کام۔ بچھڑے ہودں کو ملوانا۔ لیکن یہ کچھ اور نہ دیکھیں تو اچھا ہے۔ آنکھیں کھلیں تو سامنے وہ ہوں۔"

خادم نے بڑی عقلمندی کی بات کی تھی۔ محسن نے دلاور کی بیوی کی آنکھوں پر اسی کے دوپٹے کو پٹی کی طرح باندھ دیا۔

پندرہ منٹ بعد گاڑی رکی تو میں نے کہا "مسز دلاور، ہم دشمن ہونے کے باوجود آپ کی مدد کر رہے ہیں۔ اگر ہم تمہیں اس قید خانے سے نہ نکالتے تو شاید تمہاری کبھی دلاور سے ملاقات نہ ہوتی۔ تمہارے بچے اور تم، سب مارے جاتے۔"

"اب میں اس کمینے رانا سے بھی نمٹ لوں گی۔ اور پیڈرو کو تو میں ایسا سبق دوں گی... مگر تم نے ایسا کیوں کیا؟" شدتِ جذبات سے اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

میں نے کہا "اس سوال کا جواب وقت آنے پر دیا جائے گا۔ ابھی تم ہم سے تعاون کروگی تو فائدے میں رہوگی۔ تم دلاور سے ملنا چاہتی ہو نا۔"

"کیا تم... واقعی چوہدری صاحب سے ملاؤ گے مجھے... نہیں... تم مجھے قتل کردوگے۔ اس دنیا میں نہیں ہوگی یہ ملاقات۔"

میں نے کہا "خاموشی سے جیسا ہم کہیں ویسا کرتی رہو۔ چند منٹ بعد تم چوہدری دلاور کو دیکھ سکوگی۔ زندہ سلامت اسی دنیا میں۔"

اچانک وہ بے ہوش ہوگئی۔ یہ جذباتی کمزوری تھی یا جسمانی۔ اس کا بدن سرد پڑ گیا تھا اور وہ اب بھی سسکیاں لے رہی تھی۔ میں نے اسے کندھے پر اٹھایا اور خیمے کے اندر لے گیا۔ پھر محسن نے مجھے کلیرنس دی اور میں نے اسے لکڑی کے باکس میں منتقل کردیا۔ اب مجھے اس کو نیچے تہ خانے میں اتارنا تھا۔ اور یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ کسی نے بھی ہمیں نہیں دیکھا ہے۔ میں نے محسن کو اوپر ہی نگرانی کے لیے چھوڑ دیا۔ دلاور کی بیوی ایک ڈھیر کی صورت میں میرے ساتھ ہی بے سدھ پڑی ہوئی تھی۔ میں نے اندھیرے میں ٹٹول کر اسکریو ڈرائیور کی مدد سے پیچ کھولے اور وہ تختہ ہٹا دیا جو عین فرش کے شگاف پر تھا۔

نیچے گھپ اندھیرا تھا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی ڈالی تو دلاور کسی وحشی درندے کی طرح بھاگا جیسے ڈر ہو کہ یہ روشنی موت کا نامہ بر ہے۔ شکاری کی بندوق سے نکلنے والی گولی کو راستہ دکھانے والی۔ دلاور نے اپنے سارے کپڑے پھاڑ ڈالے تھے اور وہ مادر زاد برہنہ روشنی سے بچنے کے لیے اِدھر اُدھر دوڑ رہا تھا اور چلّا رہا تھا۔ "مجھے مت مارو۔ مجھے مت مارو" وہ اپنے چہرے کو روشنی سے بچانے کے لیے ہاتھوں کی آڑ کر رہا تھا۔

میں نے دلاور کی بیوی کو آہستہ آہستہ نیچے لٹکایا اور اس کے ہاتھوں کو پکڑے رکھا۔ اس کے پاؤں فرش سے دو تین فٹ اوپر رہ گئے تھے اور وہ میرے ہاتھوں میں جھول رہی تھی۔ میں نے اسے چھوڑا اور اس کے ساتھ ہی خود بھی اندر کود گیا۔ ٹارچ میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔

اسی وقت اچانک دلاور کی بیوی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی تلاشی نہ لے کر میں نے بہت بڑی غلطی کی تھی۔ اس سے بھی بڑی غلطی ہم نے اس پر بھروسا کرکے کی تھی۔ وہ بے ہوش نہیں ہوئی تھی صرف اداکاری کر رہی تھی۔ تریا چلتر سے بڑے بڑے مردانگی کے دعوے رکھنے والے مار کھا جاتے ہیں۔ اس عورت نے ثابت کردیا تھا کہ دلاور کی بیوی کوئی عام عورت نہیں ہوسکتی۔ نہ جانے کب اس نے ریوالور اٹھا لیا تھا اور ہمیں پتا نہیں چلنے دیا تھا۔ پھر مجھے یاد آیا کہ تہ خانے سے باہر آکے اس نے بیڈ روم میں رک کے آئینے میں اپنی صورت دیکھی تھی۔ میک اپ درست کیا تھا اور ایک منٹ میں بیگ اٹھا کے ہمارے ساتھ چل پڑی تھی۔ ریوالور یقیناً بیگ میں تھا جو اس نے موقع ملتے ہی ہماری نظر بچا کے گریبان کے سیف ڈیپازٹ والٹ میں منتقل کردیا جو قدرت نے صرف خواتین کو فراہم کیا ہے۔

اب وہ ریوالور کا رخ میری طرف کیے کھڑی تھی اور اس کی فاتحانہ مسکراہٹ کے جواب میں اپنی شکست کی کھسیانی ہنسی پیش کرنے کے سوا میں کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ چشمِ تصور سے میں ننگ دھڑنگ بکھرے بالوں اور جھاڑ جھنکاڑ داڑھی والے دیوانے چوہدری دلاور کی جگہ خود کو دیکھ رہا تھا۔ ٹارچ فرش پر آڑی ترچھی پڑی تھی لیکن روشن تھی۔

ریوالور میرے پاس بھی تھا لیکن میری جیب میں تھا اور دلاور کی بیوی کے ہاتھ میں تھا۔ میری زندگی اور موت کے درمیان بھی یہی فاصلہ تھا۔ جتنی دور یہ ریوالور تھا اتنی ہی دور موت کی سرحد تھی۔

میں رسک لے کر کوشش کرسکتا تھا کہ دائیں بائیں یا سامنے غوطہ مار جاؤں اور اس کے ساتھ ریوالور نکالتے ہوئے نشانہ لیے بغیر فائر کردوں۔ گولی دلاور کی بیوی کے اس بازو پر لگے جس میں ریوالور تھا یا کہیں اور... ہر صورت میں اس کا نشانہ چوک جانے کے امکانات زیادہ تھے مگر عجلت میں نقصان بھی ہوسکتا تھا اور مجھے کوئی جلدی نہیں تھی۔

دلاور اب ایک کونے میں سمٹ کے کھڑا ہوگیا تھا جہاں تاریکی تھی۔ شاید وہ اس صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی بیوی کا اس زنداں میں نظر آنا دلاور کے لیے ایک ذہنی شاک سے کم نہیں تھا اور بعض اوقات بجلی کے شاک سے ذہن کی بھٹکی ہوئی دماغ راہِ راست پر آجاتی ہے۔

میں نے رضاکارانہ طور پر اپنے ہاتھ اوپر اُٹھا لیے۔ "ویری گڈ مسز دلاور، تمہاری اداکاری واقعی قابلِ تعریف تھی۔ اگر مجھے جیوری میں شامل کیا جاتا اور یہاں کوئی مقابلہ ہوتا تو میں پہلا انعام تمہیں ہی دیتا۔"

"فضول باتیں مت کرو" اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا اور ریوالور کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔

"یہ تم کیا کر رہی ہو۔ کیا فائدہ اس سے؟"

"مجھے فائدے یا نقصان کی پروا نہیں۔ آج تک میں نے کسی پر گولی نہیں چلائی مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ مجھے... ریوالور چلانا نہیں آتا..."

"تمہارا ہاتھ کانپ رہا ہے مسز دلاور... ایسا نہ ہو گولی چل جائے" میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

"دیکھو سکندر بخت۔ میں تمہیں مارنا نہیں چاہتی۔"

"پھر کیا چاہتی ہو تم...؟"

"میں... میں بس اپنے گھر جانا چاہتی ہوں۔ دلاور کے ساتھ یہاں سے نکلنا چاہتی ہوں... اور کچھ نہیں۔ اگر تم نے چالاکی دکھائی یا بہادر بننے کی کوشش کی..."

"تمہارا مطلب ہے کہ ویسے میں چالاک ہوں اور نہ بہادر؟"

"نہیں۔ تم بہت چالاک اور بہادر ہو۔ بڑے جواں مرد ہو۔ جوڈو کراٹے سب جانتے ہو لیکن اس ریوالور کی گولی کا مقابلہ تم نہیں کرسکتے۔ تم یہ مت سمجھنا کہ تمہارے مقابلے پر ایک کمزور اور بےوقوف عورت ہے۔"

"میں نے کبھی تمہیں بے وقوف نہیں سمجھا تھا لیکن اس وقت جو کچھ تم کر رہی ہو..." میں نے افسوس سے سر ہلایا۔

"مجھے باتوں میں لگانے کی کوشش مت کرو" وہ چلّائی "میں لحاظ نہیں کروں گی سکندر۔"

"ایزی... ایزی مسز دلاور۔ آرام سے سکون سے بات کرو۔ دماغ کو ٹھنڈا رکھو۔ ذرا سوچو کہ مجھے مار کے تم یہاں سے کیسے نکلوگی؟ باہر میرے ساتھی بھی ہیں۔"

"مجھے کسی کی پروا نہیں، جو میرے سامنے آئے گا مارا جائے گا۔ اس ریوالور میں چھ گولیاں ہیں۔"

"کسی کو سامنے آنے کی ضرورت بھی نہیں۔ وہ تمہیں اوپر سے گولی ماردیں گے" میں نے کہا "فائر کی آواز باہر سُنائی دے گی... کیا فائدہ اس حماقت سے۔ کیا اس لیے میں نے تمہیں رانا کی قید سے رہائی دلائی تھی۔"

"تم مجھے اپنی قید میں رکھنا چاہتے تھے۔ جیسے تم نے دلاور کو قید کر رکھا تھا۔"

"کیا تمہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں ہے؟"

"میں نے اندازہ کرلیا تھا۔ میں تم سے بات کرنا چاہتی تھی۔"

اس لئے مجھے اس فرنچ وکیل کو ایک لاکھ روپے دینے پڑے مگر میرا اندازہ درست ثابت ہوگیا۔ تم نے مجھے لاہور سے فون کیا اور کہا کراچی سے بول رہے ہو۔ میں نے اس جھوٹ پر اعتبار نہیں کیا تھا.... مگر...."

"مگر پولیس کو میرے پیچھے لگادیا۔ تم نے تو قسم کھائی تھی...؟"

"میں.... میں بتا چکی ہوں' وہ سب رانا نے کیا تھا۔ میں چاہتی تھی کہ تم مجھ سے ملو۔"

"میں تم سے ملنے آیا تھا مسز دلاور۔ آج ہی دوپہر کے وقت۔"

"جھوٹ۔ تم آتے تو تمہاری لاش ہی واپس جاتی۔"

میں نے کہا "میں بھی جانتا تھا یہ بات' اس لئے میں خود سامنے نہیں آیا تھا۔ میں نے پہلے فرنچ وکیل کو بھیجا تھا۔ میں تو جانتا تھا کہ تم یہاں ہوگی مگر رانا نے اس وکیل کو صاف انکار کردیا۔ اس کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔ کچھ اور باتیں بھی معلوم ہوئی تھیں مجھے' جن سے مجھے شک ہوا تھا کہ باقی پارٹنر اب دلاور کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر باہر پھینکنا چاہتے ہیں تاکہ وہ کاروبار کے مالک ہوجائیں۔ ظاہر ہے انہیں اس کام پر صرف استاد پیڈرو نے ہی اکسایا ہوگا۔ اپنی جان بچانے کے لئے اس نے یہ صلاح بھی دی ہوگی کہ دلاور کی بیوی پر اور فیصل پر نظر رکھو۔ وہ دشمنوں سے ساز باز کررہے ہیں اور دلاور کی رہائی کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ وہ دشمنوں کی ہر شرط مان لیں گے۔ اگر دلاور بچ گیا تو ہم مارے جائیں گے۔"

"مجھے ان کی نیت کی خرابی کا علم دیر سے ہوا۔"

"اپنے اندازے کی بنیاد پر میں اس وقت وہاں پہنچ گیا تھا مسز دلاور۔ بہت بڑا خطرہ مول لیا تھا میں نے۔ اس نیکی کا اچھا صلہ دے نے میرے شوہر کا۔ کیا میں اندازہ نہیں کرسکتی کہ تم نے اس کے ساتھ جانوروں سے بدتر سلوک کیا ہوگا۔ پاگل کردیا ہے اسے تمہارے تشدّد نے۔ اسے نیکی کہتے ہو تم؟ اور جتنی اذیت میں تم نے ہم سب کو جتلا رکھا۔ مجھے اور اس کے بچّوں کو' کیا یہی نیکی تھی!"

میں نے اسے شدتِ جذبات سے کانپتے اور پھوٹ پھوٹ کے روتے دیکھا۔ ہسٹریا کی اس کیفیت میں وہ اچانک مجھ پر ریوالور خالی بھی کرسکتی تھی۔

"دیکھو.... اب تم اس کے پاس ہو۔ تم اس کی دیکھ بھال کروگی تو وہ بہت جلد نارمل ہوجائے گا۔ تمہیں یہاں لانے والا میں ہی ہوں اور آج اگر دلاور زندہ ہے تو میری وجہ سے ہے۔ رانا کی قید سے تمہیں کون نکال سکتا تھا.... کسی کو علم ہی نہیں تھا اس سازش کا جو تمہارے اور دلاور کے خلاف ان سب نے کی تھی' دلاور کے ساتھیوں نے۔ اس کا نمک کھانے والے پیڈرو نے۔ کیا تھا پیڈرو پہلے۔ ایک معمولی بدمعاش۔ دو ٹکے کا ملازم۔ دلاور کے ساتھ رہ کے وہ استاد پیڈرو ہوگیا تھا۔ اس نے میرے والد کو قتل کیا تھا۔ وہی میر شرافت علی کا قاتل تھا۔ وہی دلاور کو بھی مروا دیتا۔ تمہیں اور تمہارے بچّوں کو' سب کو ختم کردیتا تاکہ کوئی حقِ وراثت مانگنے والا ہی نہ رہے۔ یہ الزام بھی مجھ پر آجاتا۔ ان پر کون شک کرسکتا تھا۔ وہ آسانی سے مالک ہوجاتے۔ میں نے تمہیں اور تمہارے پورے خاندان کو بچالیا۔ میں نے رانا کے عزائم کو خاک میں ملادیا۔ ان کی سازش کو ناکام کردیا۔ سوچو اگر میں تمہیں نکال کے نہ لاتا تو تمہیں کون بچا سکتا تھا۔ بے شک مارنے اور بچانے والا اللہ ہے۔ مگر کیسے اس نے دشمن کو وسیلہ بنادیا۔"

وہ میری باتوں کے جال میں اُلجھ گئی۔ آہستہ آہستہ الفاظ کا جادو اس کے سر چڑھ کے بولنے لگا۔ میں نے نرمی سے' شرافت سے' دلیل سے اور منطقی جواز سے اسے قائل کرلیا اور اس کی عقل پر اپنی سوچ کو حاوی کردیا۔ یہ میرا یقین تھا جس نے اس کو چپ کرادیا اور یہ سمجھنے پر مجبور کیا کہ میں اس کا دشمن نہیں ہمدرد ہوں۔ جذباتی پہلو کا رُخ بدل گیا اور اس کی جارحیت کمزور پڑتی گئی۔ عین اس وقت جب میں سوچ رہا تھا کہ اب آگے بڑھ کے اس کے ہاتھ سے ریوالور اسی طرح لے لوں جیسے روتے روتے سوجانے والے بچے کے منہ سے ربر کی مصنوعی نپل الگ کردی جاتی ہے' اس نے چونک کے ریوالور کا رُخ میری طرف کردیا۔

"وہیں کھڑے رہو۔ تمہاری باتوں کا میٹھا زہر مجھ پر اثر نہیں کرسکتا۔ میں مانتی ہوں تمہارے احسان کو لیکن اس کا بدلہ میں اسی وقت چکادوں گی۔ میں تمہیں زندہ رہنے کا موقع دوں گی۔ بس تم میرے راستے میں مت آنا' مجھے روکنے کی کوشش مت کرنا۔"

میں نے کہا "کیسی باتیں کرتی ہو تم۔ میری مدد کے بغیر تم کیسے نکل سکتی ہو یہاں سے؟"

"تم.... تم ان سے کہو گے کہ وہ بھی میری راہ میں حائل نہ ہوں۔"

میں نے ہنس کے کہا "اور میں تمہاری بات نہ مانوں تو۔ تم گولی ماردوگی مجھے؟ کیا اس کے بعد تم نکل سکوگی؟ اس کے علاوہ.... ذرا چوہدری صاحب کی حالت دیکھو۔ اس طرح تم لے جاسکتی ہو اپنے شوہر کو؟ اس کے پاس تو کپڑے بھی نہیں ہیں اور کپڑے باہر سے منگوانے ہوں گے.... کون لائے گا کپڑے؟ اور کپڑوں کے بغیر تم اس کے ساتھ ٹیکسی میں بھی جاؤگی تو تمہارے پیچھے مجمع لگ جائے گا۔ سب تماشا دیکھنے والے ہوں گے۔ چوہدری دلاور کی طرف دیکھو ایک نظر۔ یہ پاگل ہی نہیں' ایک وحشی جانور نظر آتا ہے۔ اس کو تم کیسے کنٹرول کروگی۔ چلو مانا کہ پیار سے تم اپنے شوہر کو قابو میں کرلوگی لیکن اس کے بعد کیا ہوگا؟ فرض کرو تم اسی حالت میں دلاور کے ساتھ اپنے گھر پہنچ گئیں پھر؟ صبح ہونے سے پہلے ہی پولیس آجائے گی۔ خود پیڈرو اور ڈاکٹر شاہ یا رانا انہیں اطلاع کردیں گے کہ آپ کا مجرم گھر میں ہے۔ خود اس کی بیوی نے اسے کہیں چھپا رکھا تھا۔ ابھی ابھی لے کر آئی ہے۔ تمہیں تو معلوم ہوگا کہ ڈاکٹر شبلی کے قتل کے الزام میں...."

میں.... کیسے اعتبار کرلوں تم پر؟"

میں نے اچانک چلّا کے کہا "نہیں دلاور۔"

اس کی بیوی نے چونک کر پیچھے دیکھا اور اسی لمحے میں نے اس کا ریوالور دبوچ لیا۔ اس نے واجبی سی مزاحمت کی مگر میں نے اس کا ریوالور چھین کے اسے پھر چھوڑ دیا۔ میں نے اس کی توجہ دوسری طرف منعطف کرانے کا پُرانا طریقہ اختیار کیا تھا اور باتوں کے دوران وہ ایک دم پلٹ کر دیکھنے پر مجبور ہوگئی تھی۔ اسے یہ خیال ہوا کہ دلاور نے اس پر حملہ کردیا ہے یا وہ اس پر کوئی چیز پھینکنے والا ہے جب کہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اُلٹا میرے چلّانے سے دلاور سہم گیا تھا اور جس کونے میں دبک کے کھڑا ہوا تھا وہاں گھٹنوں میں سر دے کے بیٹھ گیا تھا۔

"مکّار... دھوکے باز" دلاور کی بیوی نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"سوری مسز دلاور" میں نے کہا "جاؤ اب اپنے شوہر کو سنبھالو۔ اسے تمہاری توجہ کی ضرورت ہے۔ جاؤ ڈرو نہیں۔ یہ وہی ہے تمہارا جس کے ساتھ تم نے اتنی عمر گزاری ہے۔ وہ تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔"

دلاور کی بیوی اس کی طرف بڑھی۔ چند قدم چل کے اس نے میری طرف خوف زدہ نظروں سے دیکھا۔

میں نے کہا "میں موجود ہوں یہاں۔ اگر اس نے تم پر حملہ کیا تو میں بچالوں گا تمہیں۔"

دلاور کی بیوی اس کے بالکل قریب پہنچ گئی "چوہدری صاحب!"

دلاور نے اسے غور سے دیکھا "تم۔ یہاں آگئی ہو؟ تم بھی...!"

وہ کچھ اور قریب جاکے گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی "میں تمہیں اپنے ساتھ لے جانے آئی ہوں۔"

اس نے زور زور سے انکار میں سر ہلایا "بے وقوف عورت یہاں سے کون واپس جاسکتا ہے' یہ دوسری دنیا ہے۔"

"نہیں دلاور۔ تم اسی دنیا میں ہو۔ جہاں تمہارا گھر تھا۔ تمہارے بیوی بچے تھے۔ میں بیوی ہوں تمہاری" وہ رونے لگی۔

"رلاتی کیوں ہے۔ کب تک روئے گی مرنے والوں کو۔ تو بھی کوئی خصم کرلے۔ جیسے میں نے دوسری شادی کی تھی۔ تو بھی دھوکا دیتی رہی تھی میرے اعتماد کو۔ حرام زادی' کیا تو سمجھتی ہے کہ مجھے معلوم نہیں ہے.... لیکن میں نے تجھے اس لئے قتل نہیں کیا تھا.... تو میرے بچّوں کی ماں تھی ورنہ.... تیرے ایک ایک آشنا کا پتا تھا مجھے۔ ایک ایک کو ٹھکانے لگادیا تھا میں نے۔ سوائے اس کے' وہ بچ گیا تھا۔ اسی نے ٹھکانے لگادیا مجھے۔ مجھے یہاں لا کے ڈال دیا۔ یہ مقبرہ میں نے اپنے لئے خود ہی بنایا تھا' کیسا ہے؟"

وہ دلاور سے لپٹ گئی "ایسی باتیں مت کرو۔ خدا کے لئے ہوش میں آؤ۔ تم زندہ ہو' ٹھیک ہوجاؤ گے تم۔"

یہ خاصا رقت انگیز جذباتی منظر تھا۔ پہلے میں نے سوچا کہ میں

"مجھے معلوم ہے۔ یہ نیکی بھی تم نے کی ہے" وہ تلخی سے بولی۔

اوپر سے محسن نے جھانک کے کہا "کیا بات ہے؟ میں نیچے آؤں؟"

میں نے کہا "نہیں' تم اوپر ہی رہو۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

دلاور کی بیوی تذبذب کا شکار ہوگئی تھی "میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ میں کیا کروں؟"

میں نے کہا "ان حالات میں اس کے سوا چارہ نہیں کہ تم مجھ پر بھروسا کرو۔"

"تم پر بھروسا کروں....؟" اس نے میری بات دُہرائی۔

"ہاں۔ ورنہ تمہارے دشمن تم سے سب کچھ چھین لیں گے۔ تمہارا شوہر' تمہارے بچّے' تمہاری زندگی' گھربار' کاروبار۔ وہ کچھ نہیں چھوڑیں گے تمہارے پاس۔ ابھی وہ بہت پریشان ہوں گے جب وہ دیکھیں گے کہ تم ان کی قید سے نکل بھاگی ہو۔ ان کی سمجھ میں نہیں آئے گا کہ تمہاری مدد کرنے والا کون ہوسکتا ہے۔ ظاہر ہے بھولے سے بھی ان کے ذہن میں میرا خیال نہیں آسکتا۔ وہ ایک دوسرے پر شک کریں گے کہ شاید کسی نے غداری کی۔ کسی نے دلاور کی بیوی کو سب کچھ بتا کے ان کی زندگی کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ کوئی ڈر گیا یا کسی کو ضمیر کی خلش نے پریشان کردیا۔ وہ ایک دوسرے سے پوچھیں گے۔ سوچیں گے کہ ایسا کون ہوسکتا ہے؟ ان کے درمیان اعتماد کی جگہ بے اعتمادی' شک اور خوف کا احساس حائل ہوجائے گا۔ اس صورتِ حال سے تم پورا فائدہ اُٹھاسکوگی مگر آج نہیں.... کل.... اپنی پوزیشن کو مستحکم بنانے کے بعد۔ اپنی حفاظت کا پورا بندوبست کرنے کے بعد۔"

وہ خلا میں دیکھ رہی تھی "مگر.... محفوظ تو میں یہاں بھی نہیں ہوں اور پھر میرے بچّے' وہ ان کو یرغمال بنالیں گے۔"

میں نے کہا "یہی وہ جگہ ہے جہاں تم اور تمہارا شوہر فی الحال خود کو محفوظ سمجھ سکتے ہیں۔ جب خونی قاتل سڑک پر دندنا رہے ہوں' حوالات میں یا جیل ہی زیادہ محفوظ رہتی ہے۔ تمہیں یہیں رہنا چاہئے مسز دلاور۔ اپنے شوہر کے ساتھ۔ باہر پولیس' غدار اور نمک حرام تمہارے خون کے پیاسے پھر رہے ہیں مگر یہاں کوئی خطرہ نہیں۔"

"یہ تم کیسی باتیں کررہے ہو۔"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ لاؤ یہ ریوالور مجھے دے دو۔ میں جاکے تمہارے شوہر کے لئے کپڑے لاتا ہوں۔ کھانے پینے کا انتظام کرتا ہوں۔ ویسے تم دیکھ سکتی ہو کہ یہاں سب کچھ تھا۔ تمہیں بسکٹوں کے خالی پیکٹ نظر آرہے ہیں۔ یہ دیکھو' یہ دوائیں بھی دلاور کے لئے ہم ہی لائے تھے ورنہ یہ مرجاتا۔ ایک ڈاکٹر ہر روز اسے دیکھنے آتا ہے۔ قید میں گھر کا آرام تو نہیں ملتا لیکن ہم اس کی دیکھ بھال کرتے رہے۔ ہم دلاور کو مارنا چاہتے تو تہ خانے میں ڈال کے بھول جاتے۔ آج یہاں اس کا ڈھانچا نظر آتا۔"

باہر نکل جاؤں لیکن دلاور کسی وقت بھی مشتعل ہو سکتا تھا۔ پاگل پن میں وہ ایسی باتیں کررہا تھا جو سچ ہوں گی مگر اس نے ہوش میں کبھی اپنی بیوی کے منہ پر نہیں کی تھیں۔
"مسز دلاور، میرا خیال ہے کہ میں ڈاکٹر کو لے کر آتا ہوں..."
وہ ایک دم کھڑی ہوگئی "نہیں..... چوہدری صاحب کو لے چلو۔ ان کو کسی اسپتال میں داخل کرادو۔"
"مجھے بہت افسوس ہے..... کہ فی الحال ان کا باہر جانا ممکن نہیں..... اور نہ تمہارا۔ سب کچھ یہاں آسکتا ہے۔ ڈاکٹر، دوائیں، کپڑے اور جو کچھ تم کہو۔"
وہ سخت اعصابی کشیدگی میں اپنے ہونٹ کاٹتی رہی۔ "ٹھیک ہی کہا تھا میں نے۔ یہاں بھی قید ہی ہے میرے لئے۔"
"لیکن یہاں تمہاری زندگی کو کسی سے فوری خطرہ نہیں۔ تم کو تو خوش ہونا چاہئے۔ آج کتنے عرصے کے بعد تم کو پھر تمہارا شوہر مل گیا ہے۔ کتنی کوشش کی تھی تم نے اس کے لئے....."
"اس کی آزادی کے لیے کوشش کی تھی میں نے۔" وہ تلخی سے بولی۔ "اب شوہر مل گیا ہے تو بچے بچھڑ گئے ہیں۔ ہم دونوں قیدی ہیں پہلے کم سے کم میں تو ان کی دیکھ بھال کرسکتی تھی۔"
"ابھی وہ کہاں ہیں؟"
"وہ جہاں بھی ہیں۔ وہیں رہنے دو انہیں" وہ تیز لہجے میں بولی۔

میں نے کہا "میرا ارادہ ہرگز یہ نہیں تھا کہ ان کو بھی یہاں لاؤں۔"
"میں سب سمجھتی ہوں سکندر بخت۔ انہیں تم کہیں اور لے جاکے قید کردو گے۔ پہلے شوہر کی مجبوری تھی۔ اب اولاد کی وجہ سے بے بس ہوجاؤں گی میں، ہم دونوں....."
میں نے کہا "کیا شوکت علی رانا اور ڈاکٹر شاہ کو معلوم ہے کہ بچے کہاں ہیں؟"
اس کا چہرہ فق ہوگیا۔ "کیا وہ..... نہیں..... وہ تو بچے ہیں۔"
میں نے کہا "وہ تمہارے بچے ہیں۔ اُن کے ہاتھ میں وہ ایک لیور ہوں گے۔ ذریعہ ہوں گے تم پر دباؤ ڈال کے تم سے اپنی ہر بات منوانے کا۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارے فرار سے وہ مشتعل ہوجائیں، انہیں کیسے معلوم ہوسکتا ہے کہ تم خود ان کی قید سے نہیں نکلیں اور تمہیں فرار میں مدد دینے والے ہم تھے۔ جیسے ہی انہیں پتا چلے گا کہ تم وہاں نہیں ہو، وہ سیدھے تمہارے گھر جائیں گے، ہم تمہارے بچوں کو محفوظ مقام پر منتقل کرسکتے ہیں۔"
"نہیں۔ میں نہیں بتاؤں گی کہ وہ کہاں ہیں۔ تم اتنے ہی مخلص ہو اور اچانک تمہارے دل میں اپنے دشمن کی اولاد کے لئے ہمدردی کے جذبات بیدار ہوگئے ہیں تو مجھے بھی ساتھ لے چلو۔"
"میں نے بتادیا ہے کہ دلاور یہاں سے نہیں جاسکتا۔"
"میں دلاور کی نہیں، اپنی بات کررہی ہوں" وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر میرے مقابل آگئی "تم رکھو اس قیدی کو۔"
"کیا مطلب۔ تم اپنے شوہر کو چھوڑ رہی ہو؟"
وہ طنز سے بولی "ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ یہاں سب کچھ آجائے گا۔ ڈاکٹر بھی، دوائیں بھی اور کپڑے بھی۔ کیا اس کے لئے میرا یہاں موجود رہنا ضروری ہے؟ یہ شرط ہے کہ میں بھی تمہاری قید میں رہوں؟"
میں نے ایک لمحہ سوچ کے کہا "نہیں۔ ایسی کوئی شرط نہیں، مگر باہر تم کو انہی سے خطرہ تھا۔"
"میں اپنی حفاظت کرسکتی ہوں۔ میری حفاظت کے لئے پولیس بھی ہے۔ میں پوری فوج ملازم رکھ سکتی ہوں محافظوں کی۔ تم ذمّے داری کیوں لینا چاہتے ہو اپنے سر۔ بس مجھے میرے بچوں کے پاس پہنچادو۔ اس کے بعد میں جانوں، میرا کام۔ مجھے نہیں معلوم کون سی جگہ ہے۔ کسی کو کیا بتاسکتی ہوں میں۔ مجھے اطمینان ہوگیا ہے کہ دلاور زندہ ہے۔ تم نے مجھے اس سے ملوادیا۔ یہی احسان کافی ہے تمہارا۔"
"او کے مسز دلاور۔ جیسی تمہاری مرضی" میں نے کہا "چلو۔"
دلاور کی بیوی کے لئے یہ بھی حیرانی کی بات تھی۔ اس کا خیال ہوگا کہ میں اس کی خواہش کو مسترد کردوں گا۔ میرا تو مقصد ہی اسے یہاں لا کے قید کرنا تھا اور شاید اس کے بعد کسی بہانے سے بچوں کو بھی حفاظت کے نام پر کہیں ایسی جگہ لے جانا تھا جہاں وہ اکیلے رہ جائیں۔
اب اس نے شرمسار اور مجرمانہ نظروں سے شوہر کی طرف دیکھا "چوہدری صاحب، میں جاؤں؟"
دلاور چلّانے لگا "نہیں، نہیں۔ مجھے چھوڑ کے مت جاؤ۔ مجھے بھی لے چلو اپنے ساتھ۔"
اس نے ضبط سے کام لیا "میں، پھر آجاؤں گی۔ میں تمہارے لئے کپڑے لاؤں گی۔ دوائیں لاؤں گی..... مجھے بچوں کے پاس جانا ہے۔ ان کی دیکھ بھال کرنے والا بھی تو ہونا چاہئے کوئی۔"
"ہاں۔ یہ تو ٹھیک ہے۔ مجھے یہاں کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ میں تو مرچکا ہوں نا۔ بچوں کو ماں کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیا بچوں کو باپ کی ضرورت نہیں ہوتی؟"
میں نے کہا "اب وقت ضائع مت کرو باتوں میں۔ دیر کی تو بچے ہاتھ سے جائیں گے۔"
"تم..... ان کا خیال رکھو گے نا؟" وہ اپنے آنسو پونچھنے لگی۔
"ہاں۔ جس حد تک ایک قیدی کا جیل میں خیال رکھا جاتا ہے۔ اس سے زیادہ ہی خیال رکھا ہے اب تک۔"
"تم انہیں چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟"
"اس مسئلے پر یہاں بات نہیں ہوسکتی۔ میں نے کچھ شرائط پیش کی تھیں۔ تم نے کسی کا جواب نہیں دیا۔"
"میں سب کچھ کرسکتی ہوں۔"

"ابھی تم اس پوزیشن میں نہیں ہو۔ تم سے بعد میں بات کریں گے مسز دلاور۔ جب حالات پر تمہاری گرفت مضبوط ہوجائے گی۔"
"میں سب ٹھیک کرلوں گی۔" اس نے بڑے عزم سے کہا اور ایک دم پلٹ گئی۔ میں نے پھر اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔
دلاور اس کے پیچھے دوڑا "کہاں جارہی ہو؟"
میں نے اسے پیچھے دھکیل دیا "جا کے چپ چاپ وہیں بیٹھ جاؤ۔"
وہ رُک گیا اور مجھے خوف زدہ نظروں سے دیکھتا رہا۔ "دیکھو۔ اس کو کچھ مت کہنا۔ یہ ماں ہے میرے بچوں کی۔"
دلاور کی بیوی نے ایک سسکی لی اور میری مدد سے سیڑھیاں چڑھ کے باہر نکل گئی۔ میں نے اوپر پہنچ کے محسن کو دیکھا۔ وہ بڑی بے چینی سے خیمے کے قریب ٹہل رہا تھا۔ میرے ساتھ دلاور کی بیوی کو واپس آتا دیکھ کے اسے حیرانی ہوئی "کیا بات ہے۔ اتنی دیر کیوں ہوگئی؟"
میں نے کہا "اتنی زیادہ دیر بھی نہیں ہوئی۔ گاڑی کہاں ہے۔ خاتون کو اپنے گھر جانا ہے۔"
اس بار محسن نے سیٹی بجائی اور مولوی خادم حسین جو سائڈ کی ایک گلی میں کار لئے اشارے کا منتظر تھا فوراً نمودار ہوگیا۔
"آپ کہاں جائیں گی؟" محسن نے پوچھا۔
"مجھے۔ ریگل بس اسٹاپ پر اُتار دو۔ آگے میں خود ہی چلی جاؤں گی۔ کوئی ٹیکسی لے لوں گی یا گھر فون کرکے گاڑی منگوالوں گی۔" وہ ہمیں اپنے گھر کا راستہ بھی دکھانا نہیں چاہتی تھی۔
"مجھے اُمید ہے کہ ریگل پر تم موقعے سے فائدہ اُٹھانے کے لئے ہنگامہ نہیں کروگی۔ کوئی فائدہ نہیں ہوگا اس سے" میں نے کہا۔

وہ دلاور کے خیال سے بہت ملول تھی۔ اس کا وجود متضاد اور مخالف جذبات کی رسا کشی میں دو نیم ہورہا تھا۔ ایک طرف شوہر تھا جس کی حالت بیوی کی مکمل توجہ اور نگہداشت کا تقاضا کرتی تھی۔ دوسری طرف اولاد تھی جس کے تحفظ کی ذمّے داری اس پر آگئی تھی۔ خود اس کی جان تائیدِ ایزدی کے باعث بچ گئی تھی۔ قدرت کے کھیل نرالے ہیں۔ مجھے ان گنت مواقع یاد تھے جب میں اپنی زندگی سے بالکل مایوس ہوگیا تھا مگر پھر غیب سے کوئی حکم صادر ہوگیا تھا۔ کوئی انتظام، کوئی کرشمہ، کسی معجزے کا ظہور ہوگیا تھا اور میری جان بچ گئی تھی۔ آج اسی دستِ غیب نے یہ کام مجھ سے لیا تھا۔ میرے ذہن میں ایک خیال نے امکان کی اور امکان نے یقین کی صورت اختیار کرلی تو میں دلاور کی بیوی کو قید سے نکال لایا۔ اس قید سے دلاور کی بیوی کو صرف موت رہائی دلاسکتی تھی اور اس کے خواب و خیال میں بھی نہ ہوگا کہ اسے بچانے کے لئے خود سکندر بخت آجائے گا۔ ایسے وقت میں جب دوست ہی دغا دے چکے ہوں، دشمن سے کوئی کیا توقع رکھ سکتا ہے مگر یہی اس رب العالمین کی قدرت کاملہ کی دلیل ہے کہ مارنا یا زندہ رکھنا اس کے اختیار میں ہے کسی بندے کا فیصلہ کوئی معنی نہیں رکھتا۔
گاڑی کے روانہ ہوتے ہی میں نے کہا "مسز دلاور۔ اگر خدانخواستہ تمہیں بچے گھر پر نہ ملے.....؟"
"نہیں نہیں۔ ایسا مت کہو، یہ نہیں ہوسکتا۔"
میں نے کہا "جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا تھا۔ یا ہونے والا تھا، کیا وہ ہوسکتا تھا؟ کبھی تم نے سوچا تھا کہ ایسا بھی ممکن ہے کہ دلاور جن پر سب سے زیادہ بھروسا کرتا تھا وہی تمہاری جان کے درپے ہوجائیں اور تمہیں دلاور کا سب سے بڑا دشمن بچانے آجائے۔"
اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔
میں نے کہا "گھر جانے سے پہلے پولیس کو بُلالینا۔ دلاور کے تعلقات تمہارے کام آسکتے ہیں۔ صاف بتادینا کہ تمہیں اپنی اور بچوں کی زندگی خطرے میں محسوس ہوتی ہے۔ پولیس اگر تم سے پہلے ہی پہنچ جائے تو اچھا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ گھر میں موجود ہوں۔ بچوں کو یرغمال بناچکے ہوں اور تمہارے منتظر ہوں۔ پورے اعتماد کے ساتھ گھر میں بیٹھے ہوں کہ فرار ہوکے تم کہاں جاسکتی ہو۔ تم بہرحال اپنے گھر جاؤ گی۔ وہ تمہیں پھر پکڑلیں گے اور اس بار بچوں کو بھی۔"
"ہاں..... یہ ہوسکتا ہے" اس نے پریشانی سے کہا۔
"تم ایس ایس پی جاوید پر بھروسا کرسکتی ہو۔"
"نہیں۔ میری حفاظت کرنے والے بہت ہیں۔ وہ فوراً آجائیں گے اور ان سب کو پکڑلیں گے۔"
میں نے ہنس کے کہا "کس جرم میں؟"
"یہ میں بتاؤں گی انہیں۔"
میں نے کہا "کون مانے گا تمہاری بات؟ کون یقین کرے گا تم پہ۔ کوئی ثبوت ہے تمہارے پاس، کوئی گواہ، ہمارے سوا؟"
وہ سوچ میں پڑ گئی "مگر وہ سمجھ جائیں گے۔"
"انہیں سمجھنے دو۔ پولیس کے سامنے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کہ تمہارے ساتھ رانا اور پیڈرو نے کیا کیا تھا۔ نہ انہیں بتانا ضروری ہے کہ تم وہاں سے نکلنے میں کیسے کامیاب ہوئیں۔ ہماری طرف تو کسی کا وہم و گمان نہیں جاسکتا۔ تم کہہ سکتی ہو کہ کچھ مارِ آستین، پشت میں خنجر گھونپنے والے اور نمک حرام ہیں، تو تمہارے جانثار بھی ہیں اور انہوں نے جان پر کھیل کے تمہیں بچالیا۔"
"میں تمہارا نام نہیں لوں گی۔ فکر مت کرو۔"
"مجھے کیا ضرورت ہے فکر کرنے کی۔ تم سو بار نام لو میرا۔ تمہاری مانے گا کون۔ زخم خوردہ سانپ زیادہ خطرناک ہوتا ہے مسز دلاور۔ اپنی پہلی چال کے غلط ہوجانے سے پیڈرو اور رانا سخت تلملائیں گے لیکن وہ کچھ کر نہیں سکتے آئندہ کے لئے تمہیں زیادہ محتاط رہنا ہوگا۔ اگلی بار وہ کیا بندوبست کریں گے۔ وہ شرمندہ ہونے، گھبرانے یا ہمت ہارنے والے لوگ نہیں ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔ وہ ڈھیٹ بن کے اپنی صفائی پیش کریں گے اور خود کو بے قصور ثابت کرنے کے لئے دس جھوٹ بولیں گے مگر میں ان کو صاف بتادوں گی کہ اب ان پر اعتبار کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"کاروباری معاملات میں تم دلاور کی جگہ فیصلے نہیں کرسکو گی مگر فی الحال ان مسائل سے خود کو الگ کرلو۔ ان پر واضح کردو کہ جب دلاور آئے گا تو خود ہی ان سے نمٹ لے گا اور وہ ابھی مرا نہیں۔ زندہ ہے۔ اگر وہ مجرم ہے تو پولیس کی نظر میں۔ اس کے روپوش رہنے سے یا گرفتار ہونے سے اس کی کاروباری حیثیت میں فرق نہیں پڑتا۔ تم ایک ترپ کا پتا پھینک کے ان کے جارحانہ عزائم کی راہ میں دیوار کھڑی کرسکتی ہو۔ تم کہہ سکتی ہو کہ شاید بہت جلد دلاور کی طرف سے تم کو کاروباری معاملات میں جنرل پاور آف اٹارنی حاصل ہوجائے گی۔ اس کے بعد تمہارے فیصلوں کو بھی قانونی حیثیت حاصل ہوجائے گی۔ تمہیں وہی اختیارات حاصل ہوجائیں گے جو دلاور کو حاصل تھے۔ ان کی توانائی مرجائے گی یہ سُن کے۔ وہ سمجھیں گے کہ تمہارا دلاور سے رابطہ ہے اور اس کا مطلب خود نکال لیں گے کہ یہ رابطہ تمہاری اپنی کوششوں کا نتیجہ ہے جو تم دشمنوں سے مل کے مسائل کو حل کرنے کے لئے کررہی تھیں۔"

محسن اور مولوی خادم حسین بالکل خاموش رہے تھے۔ خادم نے بولنا خلافِ مصلحت سمجھا تھا اور محسن نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ گاڑی ریگل چوک سے گزری تو میں نے اس کی پٹی کھول دی۔ دلاور کی بیوی نے ایک گہری سانس لی اور دائیں بائیں دیکھا۔

"تھینک یو سکندر بخت۔ تمہارے اس احسان کا قرض باقی رہے گا" اس نے اپنا ٹھنڈا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔

میں نے کہا "میں نے کوئی احسان نہیں کیا۔ نہ یہ میرا اخلاقی فرض تھا اور نہ انسانیت کا تقاضا۔"

"پھر تم نے یہ سب کیوں کیا تھا؟"

"مسز دلاور۔ جب میں نے تم سے بات کی تھی۔ اس وقت میں واقعی کراچی میں تھا اور کل پھر کراچی چلا جاؤں گا۔"

"اور چوہدری صاحب کا کیا ہوگا؟"

دلاور قانون کا مجرم ہے۔ اس پر قتل کا الزام ہے۔ اس کے خلاف ثبوت اور گواہی کا مسئلہ حل ہوگیا ہے۔ ابھی تک وہ مفرور تھا۔ بہت جلد وہ گرفتار کرلیا جائے گا پھر قانون اسے جو سزا چاہے دے۔ میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ کسی کو دلاور سے ملنے کا موقع فراہم کیا جائے گا۔ اب تم خود اس سے مل آئی ہو لیکن خود تمہارے حق میں یہ بہتر ہے کہ تم کسی سے بھی اس ملاقات کا ذکر نہ کرو۔"

"میں کسی کو نہیں بتاؤں گی۔ یہی کہوں گی کہ وہاں سے سیدھی گھر آئی ہوں۔ اگر وہ نہ ملے۔ میرا مطلب ہے رانا اور پیڈرو میں سے کوئی بھی نہ ملا تو میں فوراً گھر سے نکل جاؤں گی۔ ایک بہت محفوظ ٹھکانا ہے میرے پاس اور اب میں حفاظت کا مؤثر بندوبست بھی کرلوں گی۔"

"میں نے تمہارے سامنے چند شرائط رکھی تھیں؟"

"ہاں۔ مجھے یاد ہے۔ میں نے کوشش کی تھی غالب اور نازو کے بارے میں معلوم کرنے کی لیکن اس کا خمیازہ بھگتنا پڑا مجھے...... رانا نے بدتمیزی کی میرے ساتھ اور پیڈرو نے کہا کہ تم کیوں پوچھ رہی ہو۔ تمہارا کیا تعلق ان معاملات سے۔ اگر ہم نے تمہیں بتادیا تو تم انہیں بتادوگی۔ سکندر بخت کو یا اس کے حواریوں کو۔ آج کل تم اور تمہارا بیٹا ان سے بہت فری ہورہے ہو۔ یہ مت بھولو کہ وہ تمہارے شوہر کو پھانسی پر لٹکانا چاہتے ہیں۔ وہ تمہیں بے وقوف بنا کے ہر بات معلوم کرلیں گے اور تمہارا خیال ہے کہ تم پر رحم کھاتے ہوئے دلاور کو چھوڑ دیں گے تو یہ تمہاری احمقانہ بھول ہے۔"

میں نے کہا "میں نے یہ بھی کہا تھا کہ استاد پیڈرو کو غیر مشروط طور پر میرے حوالے کردیا جائے۔"

"میں...... یہ میں کیسے کرسکتی ہوں۔ تم خود ہی سوچو...... نہ یہ ممکن ہے کہ میرے کہنے سے دلاور اپنے جرائم کا اعتراف کرلے گا۔ ابھی تو وہ تمہاری قید میں ہے مگر وہ آزاد ہوتا تب بھی یہ ناممکن تھا کہ خود کو قانون کے حوالے کردیتا۔ تم جانتے ہو وہ ایسا آدمی نہیں ہے۔ اپنی مرضی سے گلے میں پھانسی کا پھندا کون قبول کرتا ہے؟"

"ٹھیک ہے۔ آئندہ ہمارے درمیان اس مسئلے پر بات نہیں ہوگی" میں نیچے اتر گیا اور دلاور کی بیوی کو راستہ دے دیا۔ "اب تم جاسکتی ہو۔"

گاڑی اسے بس اسٹاپ پر چھوڑ کے آگے بڑھ گئی۔ اس وقت رات کے نو بج کر بیس منٹ ہوئے تھے پھر تقریباً پونے دو گھنٹے بعد واپس پہنچے تو آفس میں رابعہ منظر اور وقار کے سوا کوئی نہیں تھا۔

"السلام علیکم۔ حضرات اور خاتون۔" میں نے کہا۔

"کہاں سے تشریف لائی ہیں شاہی سواریاں؟" رابعہ بولی۔

میں نے کہا "بس ایسے ہی ذرا دل پشاوری کے لئے گئے تھے اپنے مولوی خادم حسین کے ساتھ۔"

منظر کو موقع مل گیا "میں نے ٹھیک کہا تھا نا۔ مولوی خادم حسین تم واقعی بڑے حرامی ہو۔ اسی چھنال چھبیل چھبیلی چھمک چھلو کے پاس گئے تھے؟"

خادم بھڑک اُٹھا "پھر وہی خرافات۔ منظر صاحب اس قدر غیر شائستہ زبان بازاری لوگ بولتے ہیں۔"

"تم بھی تو بازار سے ہی آئے ہو' اُس بازار سے۔"

"اُس بازار سے؟ کیا مطلب ہے جی... خدا کا خوف کریں

"وہ...... دراصل نگی سب کا کھانے پر انتظار کررہی ہے۔"

"ہم سب میں شامل نہیں ہیں رابعہ بی بی۔ ہم چلیں اپنے گھر" منظر بولا۔

"نہیں آپ بھی چلیں۔"

"میں نہیں جاسکتا۔ میرے سولہ لختِ جگر قطار میں بھوکے بیٹھے ہوں گے اور ان کی اکلوتی ماں لنگر خانے کی انچارج انہیں کنٹرول کررہی ہوگی بڑی مشکل سے۔ آج اس نے بھی کہا تھا کہ ساتھ کھانا کھائیں گے۔"

"کیا کوئی خاص بات ہے آج؟" رابعہ بولی۔

"ہاں۔ کوئی بات ضرور ہوگی۔ کسی کی سالگرہ ہوگی شاید۔ مجھے زیادہ بھی نہیں رہتا۔ ہر ہفتے کسی بچّے کی سالگرہ ہو تو آدمی کیسے یاد رکھے۔" منظر سوچتے ہوئے بولا "ارے ہاں' آج تو اسکول کے سالانہ امتحان کا نتیجہ تھا۔ سب اپنی اپنی رپورٹ لئے بیٹھے ہوں گے۔ رابعہ تم جاؤ ان کے ساتھ۔"

وہ ایک دم بریف کیس اُٹھا کے بھاگ گیا۔ مجھے اپنی چوکیدار کی وردی بدلنی پڑی۔ رابعہ مجھے اپنی گاڑی میں لے جانا چاہتی تھی مگر اس سے دروازہ نہیں کھلا پھر میں نے چابی لگا کے دروازہ کھول دیا۔

"اب یہ چابی نہیں لگ رہی ہے" رابعہ نے اگنیشن سوئچ میں چابی گھما کے گاڑی اسٹارٹ کرنے کی ناکام کوشش کی۔

"لگے گی بھی نہیں" میں نے کہا "یہ میری گاڑی ہے۔"

"کیا؟" اس نے خفگی سے کہا "یہ کیا بدمعاشی ہے۔ اس کا نمبر۔"

میں نے اسے ٹالا "نمبر سے کیا ہوتا ہے۔ تم میری گاڑی کا نمبر لگالو۔ ایک اضافی نمبر پلیٹ ہے میرے پاس' یہ لو۔"

"اچھا۔ یہ بات ہے؟"

میں نے کہا "مگر تمہارے لئے لمحۂ فکریہ ہے۔ کل کو کسی نے اپنے ماتھے پر لکھ لیا سکندر بخت تو تم اس کے ساتھ چل پڑو گی۔ جیسے نمبر دیکھ کے گاڑی کو اپنا سمجھ لیا تھا۔ فرق محسوس نہیں ہوتا؟ پہچان نہیں ہے گدھے گھوڑے کی؟ چلو ہٹو یہاں سے۔ یہ گاڑی تم سے نہیں چلے گی۔"

"تمہاری طرح اس کا بھی دماغ درست کرنا پڑے گا" رابعہ اُتر کے دوسری طرف سے میرے ساتھ آبیٹھی "جیسا سوار ویسی سواری ہے۔"

"سوار تمہارا ہے۔ اسے جو چاہو کہو۔ سواری کو کچھ مت کہنا۔ بگڑ گئی تو بے قابو ہوجائے گی۔" میں نے کہا "اس کے جذبات بہت جلد مجروح ہوجاتے ہیں۔ خاندانی چیز ہے۔"

"ذرا چابک استعمال کرو تاکہ یہ چلے۔ دیکھو دوسری گاڑیاں کتنا آگے نکل گئی ہیں" اس نے کہا اور پھر اچانک سوال کردیا "تم بھی کہاں گئے تھے تم لوگ؟"

کچھ۔"

"دل پشاوری کے لئے کہاں لے گئے تھے ان معصوم نوجوانوں کو۔ تمہیں تو اس حُلیے میں دیکھ کے سب سمجھتے ہوں گے کہ شاہی مسجد سے نکلا ہے۔"

میں نے محسن سے کہا "یار' ہم نے تو سمجھایا ہی تھا کہ اُدھر جانا ٹھیک نہیں' کوئی دیکھ لے گا۔"

محسن نے سرہلایا "خادم حسین نے کہا کہ میں تو آتا رہتا ہوں مجھے آج تک کسی نے نہیں دیکھا اور ایک راستہ ہے وہ بھی!"

"خادم نے کہا تھا کہ میری تو ایک رشتے کی پھوپی کا گھر اسی طرف ہے۔ شاہی محلّے میں شرفا بھی رہتے ہیں۔"

"لوگ پائے کھانے بھی جاتے ہیں۔"

خادم حسین رنجیدہ ہوگیا "بس جی سکندر صاحب۔ ایسا مذاق مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ اب آپ اجازت دیں مجھے۔ محسن صاحب کو فرنچ آتی ہے۔ میری کوئی ضرورت نہیں رہی۔"

رابعہ نے مجھے اور محسن کو گھورا "خادم۔ اتنا عرصہ ہوگیا تمہیں ان لوگوں کے ساتھ رہتے ہوئے۔ ابھی تک تم سمجھے نہیں کہ ان لوگوں کی زبان قابو میں نہیں ہے اور تم چِڑتے ہو تو یہ چِڑا کے مزہ لیتے ہیں۔ کیوں جان جلاتے ہو اپنی۔"

منظر نے ایک دم اُٹھ کے خادم حسین کا منہ چوم لیا۔ "ارے میری جان۔ اب تمہیں جانے کون دے گا۔ ہم تو مرتے ہیں تمہاری انہی اداؤں پر۔ اسی نورانی چہرے پر۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ چھوڑیں منظر صاحب۔ میرا گزارا نہیں ہوسکتا آپ جیسے...... بے ہودہ شخص کے ساتھ" خادم حسین کا رنگ لال ہوگیا۔

"اور تمہارے بغیر میرا گزارا نہیں ہوسکتا۔ میں بیوی کو چھوڑ سکتا ہوں تمہیں نہیں۔"

"کسی دن میں خنجر گھونپ دوں گا جی آپ کے اور خود بھی مرجاؤں گا۔" خادم حسین پر رابعہ کی بات کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

"گھونپ دینا خنجر بھی۔ میری تو وصیت ہے کہ مجھے اور تمہیں ایک ہی کفن میں ایک ساتھ دفن کیا جائے۔ قیامت تک ہم جدا نہ ہوں" منظر نے گلا پھاڑ کے ہنسنا شروع کیا تو اس کا سارا بدن ہلنے لگا۔

وقار نے کہا "اب چلیں جی۔ کتنی بار فون آچکا ہے گھر سے۔"

"ابے یار جب نئی شادی ہوتی ہے نا' تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ بیویاں فون پر ادائیں دکھاتی ہیں اور ورغلاتی ہیں۔ آدمی بھوتنی کا سب کام چھوڑ کے دوڑتا ہے اور جب ہوجاتے ہیں سولہ بچّے۔" اس نے ایک آہ بھری "پھر آدمی کسی کام کا نہیں رہتا۔ سوائے مولوی خادم حسین کے کام کے۔"

میں نے کہا "دل پشاوری کا مطلب سمجھتی ہو تم؟ بقول غالب — نہ سہی وصل تو حسرت ہی سہی۔"

"کسی نے تمہاری بات کا یقین نہیں کیا تھا۔"

"تم نے بھی نہیں۔ افسوس مس رابعہ' بیسویں صدی میں ایسا بھی ہوگا یہ کسی نے سوچا تھا۔ لیلیٰ کبھی کہہ سکتی تھی مجنوں سے کہ جھوٹ مت بولو۔ تم صحرا نوردی کر کے نہیں فلم دیکھ کے آ رہے ہو' اور کہتی تو مجنوں....."

"کیا کرتا مجنوں۔ شرم سے ڈوب مرتا۔"

"نہیں' میرا خیال ہے وہ جھوٹ نبھانے کے لئے دس جھوٹ اور بولتا۔ اچھا جھوٹ بولنے کی پریکٹس کرتا۔"

"تم اب کیا کہتے ہو؟ کہاں گئے تھے؟"

"ہم... ہم یعنی میں اور محسن۔ ایک ٹارزن اور دوسرا رستم۔ یہاں سے پہنچے سیدھے ایک تہ خانے میں۔ وہ تہ خانہ تھا ایک انتہائی خطرناک مقام پر۔ جہاں خونخوار مسلح پہرے دار توپ اور ٹینک لئے کھڑے تھے۔ ہم نے ایک ایک کو خالی ہاتھوں سے ٹھکانے لگا دیا۔ بلکہ جہنم رسید کیا اور تہ خانے کی قید سے دلاور کی بیوی کو یوں نکال کر لے گئے جیسے ..... جیسے جیب کترا پرس نکال کر لے جاتا ہے۔ معاف کرنا اس وقت کوئی اچھی مثال ذہن میں نہیں آئی۔ مطلب یہ کہ بڑی صفائی سے۔ ایسے کہ کسی کو پتا بھی نہیں چلا اور ہم نے اسے پہنچا دیا اپنے چوہدری دلاور صاحب کے پاس۔ ٹھیک کیا نا' نیکی کا کام تھا اللہ اجر دے گا۔"

"نہیں بتانا چاہتے تو مت بتاؤ۔"

اب اسے بتانا ضروری ہو گیا تھا۔ پونے دو گھنٹے کی روداد کو میں نے اختصار کا ہنر استعمال کرتے ہوئے دس منٹ میں سمیٹ لیا اور گھر پہنچنے سے پہلے رابعہ کا موڈ بھی ٹھیک ہو گیا۔

"اب مجھے تشویش ہے کہ بعد میں کیا ہوا؟"

"تم اسے گھر پہنچا کے آتے۔"

"یہ تم طنز کر رہی ہو نا؟" میں نے مسرت سے کہا "جل بھن کے؟"

"جی نہیں۔ میں عقل کی بات کر رہی ہوں۔"

"اچھا!" میں نے سخت حیرانی کا اظہار کیا "اگر تم ایسا سمجھتی ہو تو کرو ہم روکنے والے کون ورنہ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوا اعلان کرے کہ ناظرین' اب میں آپ کو ہنس کی چال چل کے دکھاتا ہوں۔ یا اونٹ کہے کہ میں سوئی کے ناکے سے گزرنے کا مظاہرہ کروں گا۔"

"ایسے تو بات نہیں ہو سکتی" رابعہ بگڑ کے باہر دیکھنے لگی۔

"بھئی سوری۔ میرا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا کہ تم غلطی سے بھی عقل کی بات کرنے کی اہل نہیں ہو۔ تھوڑی بہت عقل تو اللہ تعالیٰ نے چرند پرند کو بھی دی ہے اور آخر میں تم کو بھی بچی کچی میں سے اپنا حصہ ضرور ملا ہو گا۔ میں تو تمہیں چھیڑ رہا تھا۔ یہ دیکھ رہا تھا کہ تم سچ سن سکتی ہو یا نہیں۔ اب دیکھو نا اس وقت تم صرف ایک حسین لڑکی لگ رہی ہو' وکیل نہیں۔"

"وکیل تو میں عقل کے بغیر ہی بن گئی تھی۔ تمہاری سفارش سے۔"

"افسوس کہ میں اس وقت تمہارے آفتابِ حسن کے دائرے سے بہت دور گردش کر رہا تھا۔" میں نے کہا "ورنہ وکیل کیا میں تمہیں جج بنا دیتا۔"

"آپ تو لندن کے آسمان کی کہکشاں میں بہت اونچے اُڑ رہے تھے۔"

میں نے کہا "لندن اور پیرس لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس وقت تم کو گھاس ڈالنے والا کوئی نہیں تھا۔ عین ممکن ہے کہ کوئی احمق امتحان لینے والا خود امتحان میں پڑ گیا ہو اور اس نے نمبر تمہاری صورت دیکھ کے لگا دیے ہوں۔ پرچہ دیکھا ہی نہ ہو گر خیر تو تم ایک بات کر رہی تھیں۔ غالباً عقل کی بات۔ میں سُن رہا ہوں اخلاقاً اور مجبوراً۔"

رابعہ جھنجلا کے بولی "نہیں مت سُنو۔ تم بولتے رہو میں اپنے کان بند کر لیتی ہوں۔"

"اوکے... میں چُپ' بالکل چُپ۔"

"یہ بتاؤ کہ دلاور کی بیوی گھر نہ پہنچی تو کیا ہو گا؟ یا گھر پہنچ کر اسے پتا چلا کہ پھر گرفتار کرنے والے وہاں پہلے سے موجود ہیں؟"

میں نے کہا "اس امکان پر ہم نے غور فرمایا تھا مگر ایک تو ہمیں دیر ہو رہی تھی۔ اس کے ساتھ یا اس کے پیچھے جاتے تو مزید دیر ہوتی۔"

"اسے دوبارہ پکڑ لیا رانا نے پھر؟ تمہاری ساری محنت رائیگاں جائے گی۔"

"وہ خود ہی نہیں چاہتی تھی کہ ہم اس کا گھر دیکھیں۔ اس نے ضرور اپنے گھر سے گاڑی منگوائی ہو گی۔ یا ممکن ہے فون پر ہی کہلایا ہو ڈرائیور سے کہ اپنے ساتھ بچوں کو بھی لے آؤ اور خود یہاں سے کہیں اور چلی گئی ہو۔ اس کی جگہ میں ہوتا تو یہی کرتا۔ جو ہو گا چل جائے گا۔ دلاور نہ سہی رانا سہی۔ نمٹ لیں گے اس سے بھی۔"

میں نے گاڑی کو وقار یوسف کی گاڑی کے پیچھے روکا ہی تھا کہ محسن اندر سے بوبی کو گود میں اُٹھائے باہر نکلا "بہت پیچھے رہ گئے تم۔"

میں نے آہ بھری "ہاں دوست۔ راہِ عشق میں لیلیٰ مجنوں سے بہت پیچھے ہیں ہم۔ شرم کی بات یہ ہے کہ تم سے بھی پیچھے ہیں۔"

نگی اور گل نے دن بھر میں یہ کیا تھا کہ ایک کمرے کا سارا سامان نکال کے اسے نئے سرے سے صرف بوبی کے لئے سجایا تھا۔ وہ نیا فرنیچر خرید کے لائی تھیں اور کمرے کو نئے کپڑوں اور کھلونوں سے بھر دیا تھا۔ ظاہر ہے بوبی بے حد خوش تھا مگر اس سے زیادہ خوش

میں نے سرہلایا "ہاں۔ وہاں کھانا کھایا اور باتیں کرتے رہے۔"

محسن نے کہا "اور باتوں باتوں میں بھول گئے۔"

وقار بولا "جیسے تم خریداری میں بھول گئی تھیں....."

"اچھا۔ تو آپ نے بدلہ لیا ہے....." نگی چلائی۔

رابعہ نے کہا "نگی۔ پہلے گاڑی میں دیکھ لو۔ ایسے ہی تنگ کر رہے ہیں یہ لوگ تمہیں۔"

گل نے بھی کہا "ہاں۔ کھانا کھا کے لانا کیسے بھول سکتے ہیں یہ لوگ۔"

میں نے کہا "اچھا بھئی دیکھ لو گاڑی میں۔ مل جائے تو کھا لینا۔ ہم تو اب چلتے ہیں۔"

گل نے محسن کا راستہ روک لیا "تم ایسے نہیں جا سکتے۔"

نگی نے چند منٹ کے بعد سخت مایوسی اور اشتعال کی کیفیت میں اپنی ناکامی کا اعتراف کیا "گاڑی میں تو کچھ نہیں ہے۔ وقار' کیا تم واقعی کھانا نہیں لائے؟"

"نہیں۔ اب تو یقین آ جانا چاہئے تمہیں۔"

"مگر کیوں؟ خود کھا لیا اور ہمارا بالکل خیال نہیں آیا۔ نہیں' تم نے جان بوجھ کے یہ حرکت کی ہے۔" نگی نے ہنگامہ شروع کیا۔

"ضرور انہوں نے پٹی پڑھائی ہو گی" رابعہ بولی۔

گل فوراً اس کے ساتھ ہو گئی "ہاں۔ ان دونوں نے کہا ہو گا۔"

نگی نے یہ عذر قبول نہیں کیا "کسی کے کہے سے کچھ نہیں ہوتا۔ ان کی اپنی عقل بھی تو ہے۔ یہ بچے تو نہیں ہیں۔ وقار یہ بہت گھٹیا حرکت کی ہے تم نے۔"

"اور جو تم نے کیا تھا... وہ بڑی قابلِ تعریف بات تھی۔ میرے مہمانوں کی سخت بے عزتی ہوئی۔"

"او یس" محسن بولا "بہت بے عزتی ہوئی' میں تو شرم سے ڈوب کر مرنے جا رہا تھا راوی کی طرف۔ سکندر کے ساتھ۔"

میں نے کہا "یار وقار کی کتنی سُبکی ہوئی۔ دعوت دے دی گھر پر کھانے کی اور گھر میں کھانا نہیں۔ یہ بھی راوی کی طرف جانا چاہتا تھا' محسن کے ساتھ۔"

"تو چلے جاتے۔" نگی کا غصے سے بُرا حال تھا "اب ہم کیا کریں؟"

"صبر یا فاقہ ایک رات کا" وقار بولا۔

"یا پھر وہی جو ہم نے کیا تھا۔ ہم تو اب چلتے ہیں۔ اچھا کھا کے نیند بھی اچھی آتی ہے۔" میں نے کہا۔

محسن نے سرہلایا "تم لوگ بھی سونے کی کوشش کرو۔ ویسے بھوک میں نیند نہیں آتی' گولی کھا کے دیکھو۔"

رابعہ نے سمجھ لیا کہ غصہ کرنے اور شور مچانے سے کچھ نہیں

وہ دونوں تھیں جو ماتا کے جذبات نچھاور کرنے میں ایک دوسرے سے بازی لے جانا چاہتی تھیں۔ رابعہ دن بھر مصروف رہی تھی۔ اب اس نے بوبی کو لے لیا اور وہ تینوں اس کے کمرے میں جا کے ایسی مگن ہوئیں کہ سب کچھ بھول گئیں۔

میں نے کہا "یار محسن۔ آخر ہم کب تک اس خالی میز کو دیکھتے رہیں گے؟"

"نگی!" اب وقار نے میز پر ہاتھ مار کے اور چلا کے کہا "اے نگی!"

نگی نے دروازے سے جھانک کے کہا "کیا ہے...؟"

"گل! میں پوچھتا ہوں' کیا ہم گدھے ہیں؟" محسن نے بھی گرج کے کہا۔

"وقار یا سکندر سے پوچھ لو نا۔ گلا کیوں پھاڑ رہے ہو؟"

میں نے کہا "اب ہم کپڑے پھاڑ کے باہر نکل جائیں گے۔ ہاتھوں میں پیالے لے کر صدا لگائیں گے کہ ہے کوئی اُلو کا پٹھا' جو بِل دیے بغیر اچھا کھانا کھلائے' تین بھوکوں کو۔"

وقار نے کہا "نگی۔ ہم ہوٹل جا رہے ہیں کھانا کھانے۔"

نگی نے کہا "اچھا۔ ہمارے لئے بھی لے آنا جو خود کھاؤ۔ ہم نہیں جا سکتے۔"

"یہ کیا مصیبت ہے۔ تم نے تو سب کو یہاں بُلایا تھا؟"

نگی دانت نکالتی باہر آئی "بلایا تو تھا.... مگر...."

"مگر کیا.... تم نے واقعی کھانے کا انتظام نہیں کیا... حد ہے۔"

"اس میں گرم ہونے کی کون سی بات ہے۔ بازار گئے تھے' ذرا دیر ہو گئی وہاں۔ خریداری میں یاد ہی نہیں رہا مگر تم دوڑ کے جاؤ' گاڑی میں اور لے آؤ سب کے لئے کھانا۔"

میں نے ہمدردی سے وقار کو دیکھا "آج پہلا دن تھا۔ کل نگی' یہ بھی بھول جائے گی کہ گھر میں وقار نام کی کوئی بے وقار چیز بھی ہے۔"

محسن نے سرہلایا "ہم سب کی اوقات دو کوڑی کی ہو گئی ہے۔"

میں نے کہا "ایک کام ہم بھی کر سکتے ہیں۔"

کام ہم نے یہ کیا کہ ایک ساتھ گئے اور ایک گھنٹے بعد کھا پی کے لوٹ آئے۔ واپسی پر نقشہ بدلا ہوا تھا۔ خواتین بوبی سے کھیل کے تھک چکی تھیں اور اب بھوک میں بے تابی سے ہماری واپسی کا انتظار کر رہی تھیں۔

پروگرام کے مطابق وقار سیدھا بیڈ روم میں گیا اور لائٹ آف کر کے لیٹ گیا۔ نگی نے شور مچایا "وقار۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"بھئی کیوں گلا پھاڑ رہی ہو؟" وقار نے کہا۔

"کھانا کہاں ہے؟ تم کھانا لینے گئے تھے" نگی نے کہا۔

"ہاں گئے تھے مگر اس میں گرم ہونے کی کون سی بات ہے؟"

وقار نے اُسی کے الفاظ دُہرائے۔

ہوگا۔ اس نے گاڑی کی چابی اُٹھائی "ٹھیک ہے۔ جائیں آپ لوگ۔ وقار تم بھی سو جاؤ۔ ہم کیا اکیلے نہیں جاسکتے کھانا کھانے۔"

نگی نے بڑے جوش سے کہا "ہاں۔ ابھی زیادہ رات تو نہیں ہوئی۔"

"اچھا بھئی شب بخیر۔ اُمید ہے صبح تک تم لوٹ ہی آؤ گی۔" میں نے کہا۔

محسن نے کہا "کسی اچھے ریسٹورنٹ میں کھانا نہ ملے تو ریلوے اسٹیشن چلی جانا وہاں رات بھر مسافر خانے کھلے رہتے ہیں... خدا حافظ۔"

ہم باہر نکلے اور ایک طرف کھڑے ہوگئے۔ میرا بھی خیال یہی تھا کہ اتنی رات کو خواتین اکیلی کسی ریسٹورنٹ کی تلاش میں جانے کی ہمت نہیں کریں گی اور یہی بہتر سمجھیں گی کہ آملیٹ وغیرہ بنا کے گزارا کرلیں۔ ممکن ہے کچھ سالن فریج میں بھی بچا ہوا رکھا ہو۔ روٹیاں پکانا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اپنے گھر میں کسی کے لئے ہنگامی حالات میں جو ملے کھالینا واقعی مسئلہ نہیں ہوتا مگر فی الحال نگی کا مسئلہ یہ تھا کہ اس نے سب کو کھانے پر مدعو کرلیا تھا اور پھر دوسری مصروفیت میں ایسی اُلجھ گئی تھی کہ اسے کچھ تیار کرنا یاد نہیں رہا تھا یا اس کا خیال بہت دیر سے آیا تھا جب کچھ بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم سب گھر کے ہی لوگ تھے مگر گھر والوں کو بھی کوئی دعوت کا کہہ کے روکھی سوکھی نہیں کھلاتا۔

میں نے کہا "یار' اس وقت کھانا کہاں ملے گا انہیں؟"

محسن بولا "شاید روبینہ میں مل جائے۔ وہ چوبیس گھنٹے کھلا رہتا ہے اور بھی ایک دو مقامات ہیں۔"

"کیا یہ نگی کے علم میں ہے؟"

"شاید۔ کیا رابعہ کو نہیں معلوم؟"

"رابعہ کے بارے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ گل کو یقیناً کچھ پتا نہیں ہوگا۔ ہم کبھی آدھی رات کے بعد کھانے کی تلاش میں نہیں نکلے۔"

"نگی کو شادی سے پہلے بھی گھومنے پھرنے کا شوق تھا اور تھی ماں باپ کی اکلوتی۔"

میں نے کہا "بات نہ شوق کی ہوتی ہے میرے بھائی نہ اکلوتے ہونے سے فرق پڑتا ہے۔ نہ جانے ایسی کتنی نگی وڑی ہوں گی۔ سیکڑوں ہزاروں جو ماں باپ کی اکلوتی ہیں اور انہیں بھی گھومنے پھرنے کا شوق ہوگا۔ یہ شوق کس کو نہیں ہوتا مگر ان کے پاس شوق کی تسکین کے اسباب نہیں ہوتے۔ کسی نگی کا باپ راج مزدور ہوگا تو کسی کا کلرک یا پھیری لگا کے غبارے اور گول گپے بیچنے والا۔ اس نگی کا باپ بڑی توپ چیز تھا۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔ ایک چھوڑ دو دو کاریں تھیں۔ کوٹھیاں تھیں اور خرچ کرنے کے لئے منہ مانگے پیسے مل جاتے ہوں گے۔"

میں نے کہا "اس کے باوجود یار' یہ لڑکی بگڑی نہیں۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ اتنا لاڈ پیار اور پیسہ ہو' روک ٹوک نہ ہو اور اوپر سے خدا نے صورت بھی اچھی دی ہو تو لڑکی کا دماغ ساتویں آسمان پر ہوتا ہے۔ اب یہ سو فیصد ایک فلمی شادی ہے۔ چاہنے والا معمولی وکیل۔ لڑکی انتہائی دولت مند اور مغرور اور ہٹلر ٹائپ باپ کی اکلوتی بیٹی۔ ان کی محبت اور لڑکی کا باپ کی ساری دولت کو ٹھکرا کے محبت کی لاج رکھنا۔ اپنا محل چھوڑ کے ایک چھوٹے سے غریبانہ گھر کو قبول کرنا' ہے نا کمال۔"

محسن نے ہنس کے کہا "یار کیا سین پاٹ ہوا ہوگا۔ محبت کرنے والا باپ اچانک ظالم سماج کا روپ دھار کے دو پیار کرنے والوں کے درمیان حائل ہونا چاہتا ہے۔ وہ گرجتا یا برستا ہے۔ وہی پرانے ڈائیلاگ بولتا ہے۔ وہ تم سے نہیں تمہاری دولت سے شادی کررہا ہے۔ ایک دو کوڑی کے وکیل کی اوقات ہی کیا کہ میری بیٹی کا رشتہ مانگے۔ نہیں' ہرگز نہیں۔ یہ شادی کبھی نہیں ہوسکتی۔ وقار ایسا نہیں ہے ابا جی۔ اچپ گستاخ لڑکی' ہم تیری شادی کریں گے اپنے جیسے کسی اونچے خاندان میں۔ اس کے بعد لڑکی کے ڈائیلاگ۔ میری شادی کسی اور سے ہوگی تو میری ڈولی نہیں جنازہ اُٹھے گا اس گھر سے اور باپ کی دھمکی۔ میں عاق کردوں گا تمہیں۔ اس ساری دولت جائیداد سے محروم کردوں گا۔ کردیں ابا جی' پیار سب سے بڑی دولت ہے۔ وقار کے پاس محبت ہے۔ کیا کہا ہے فلمی شاعر نے۔ محبت ایسی دولت ہے جو ٹھکرائی نہیں جاتی۔ میں جارہی ہوں' اور باپ کا دہاڑنا' گڑگڑانا اور منت سماجت کرنا۔ پھر دل پر ہاتھ رکھ کر جھکنا۔"

محسن نے خوب اداکاری کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ دونوں طرف کے ڈائیلاگ آواز بنا کے بولتا رہا تھا اور آواز بدلنے کے ساتھ لہجہ بھی بدل کے بول رہا تھا۔ ہم خوب ہنستے رہے۔

اچانک میں نے ایک گاڑی کو آتے دیکھا۔ گاڑی بہت آہستہ آہستہ آرہی تھی اور اس کی ہیڈ لائٹس جو پہلے روشن تھیں موڑ کاٹنے کے بعد بند کردی گئی تھیں۔ محسن کی نظر بھی گاڑی پر تھی۔

"یہ کون لوگ ہیں؟ کیا چاہتے ہیں آخر؟"

"شاید کسی کا گھر تلاش کررہے ہیں۔"

"گھر تلاش کرنے والے لائٹس بجھا کے یہ کام نہیں کرتے" محسن بولا۔

میں نے کہا "میرا مطلب تھا۔ شاید کسی دشمن کا گھر تلاش کررہے ہیں۔ آپ کو سمجھنا چاہئے شیروانی صاحب۔"

"ضروری نہیں کہ دشمن ہی ہو۔ چور ڈاکو بھی اندھیرے میں خدمتِ خلق کرتے ہیں۔"

میں نے محسن کو پیچھے کھینچ لیا اگر وہ لائٹ جلادیتے تو ہم سامنے نظر آتے۔ گیٹ کے پیچھے پڑوس کی کوٹھی کے احاطے کی دیوار تھی جو کچھ آگے بڑھا کے بنائی گئی تھی۔ ظاہر ہے مالک نے اپنی حدود سے تجاوز کرکے سڑک کی تھوڑی سی زمین کو اپنے علاقے میں شامل کرلیا تھا۔ اس طرح کی دو دیواروں کے سنگم پر ایک کونا نکل آیا تھا۔ اس کونے کے مقابل ایک پیڑ تھا اور پیڑ کے پھیلاؤ نے اس کونے کو

اس طرح ڈھک لیا تھا کہ اسٹریٹ لائٹ کا اُجالا بھی محدود ہوگیا تھا۔ اگر ہم ساکت وصامت اس تاریک کونے میں کھڑے رہتے تو وقار کے گیٹ پر آنے والا بھی ہمیں دیکھ نہیں سکتا تھا۔

ہم دیوار سے لگ کے کھڑے ہوئے ہی تھے کہ اندر کار اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔

میں نے کہا "یہ تو واقعی جا رہی ہیں۔"

محسن بولا "یار ہم سے کچھ زیادتی ہوگئی مذاق میں۔"

"ہاں۔ اچھا تھا کہ ہم کھانا لا کے کہیں چھپا دیتے اور تھوڑی دیر پریشان کرنے کے بعد بتا دیتے۔ یہ جیسے ہی گاڑی میں روانہ ہوتیں ہم سامنے آکے کہتے کہ لیجیے 'ما حضر تناول فرمایئے۔"

گاڑی ریورس گیئر میں گیٹ سے باہر آئی۔ اسے نگی چلا رہی تھی اور صاف ظاہر تھا کہ وہ غصّے میں ہے۔ اس وقت سڑک پر کوئی گاڑی اتنی ہی تیز رفتاری سے آرہی ہوتی تو تصادم ناگزیر ہو جاتا۔ ہم پیچھے تھے اس لئے کسی کی نظر بھی ہم پر نہیں پڑی اور گاڑی ایک دم مخالف سمت میں روانہ ہوگئی۔ پیچھے سے مجھے گل کا سائڈ پوز نظر آیا تھا اور ایک لمحے کے لئے میں نے یہ بھی سوچا تھا کہ انہیں روک لوں۔ وہ اپنے ساتھ محسن کو لے جاسکتی تھیں لیکن اب موقع ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ اگر میں چلاّتا ہوا ان کے پیچھے دوڑتا تو شاید انہیں متوجہ کرنے میں بھی کامیاب ہو جاتا لیکن اس طرح ہمارے چھپنے کا مقصد فوت ہو جاتا۔ بہت آہستہ آہستہ آگے بڑھتی ہوئی گاڑی نے مجھے تجسّس اور شکوک میں مبتلا کردیا تھا اور اب میں رفتہ رفتہ چھٹی حِس کو بیدار ہوتا محسوس کر رہا تھا جو مجھے خطرے سے خبردار کر رہی تھی۔

میں نے محسن سے سرگوشی میں کہا "تم نے دیکھا کچھ؟"

"کیا؟"

"گاڑی میں سے ایک آدمی اُترتا ہے۔ گیٹ تک جاتا ہے اور پھر گاڑی میں بیٹھ جاتا ہے۔ گاڑی آگے کھسکتی ہے اور اگلے گیٹ پر رُک جاتی ہے۔ یہ نمبر اور مکان میں رہنے والے کی نیم پلیٹ پڑھ رہے ہیں۔"

"ایسا ہی لگتا ہے... مگر..."

"مگر کیا؟"

"یہ خواتین کیا بوبی کو گھر میں ہی چھوڑ گئی ہیں؟" محسن بولا۔

"بوبی کو اکیلا گھر میں چھوڑ کے کیسے جاسکتی ہیں؟"

"وہ تو سو رہا تھا۔"

"یار 'اُٹھا لیا ہوگا گود میں۔ گُل پیچھے تھی' اس کی گود میں لیٹا ہوا ہوگا یا سیٹ پر۔ نظر تو نہیں آسکتا تھا یہاں سے۔"

محسن نے سہلایا "میں دیکھ آؤں اندر جا کے؟"

"دیکھ لے۔ ویسے اندر بوبی اکیلا نہیں ہے۔ وقار بھی ہے۔ اسے وقار کے پاس سُلا دیا ہوگا" میں نے کہا۔

محسن مطمئن تو شاید نہیں ہوا تھا مگر اس وقت تک ہر دروازے پر رُکنے والے وقار یوسف کے گھر تک آپہنچے تھے۔ وہ لوگ ایک جیپ میں سوار تھے۔ جیپ چلانے والا شیشے کے پیچھے ایک تاریک سایہ سا نظر آتا تھا اور بالکل ساکت تھا۔ جیپ فرسٹ گیئر میں پیدل کی رفتار سے بڑھتی آرہی تھی۔ اس کے ساتھ سامنے والی سیٹ پر غالباً وہی شخص ہوگا جو اب جیپ کے پیچھے چل رہا تھا اور ہر بند گیٹ پر رُک کے نمبر یا نیم پلیٹ کی تصدیق کرتا جا رہا تھا۔ غالباً ہر چالیس پچاس فٹ کے بعد رینگتی ہوئی جیپ میں چڑھنے اُترنے سے اس نے یہ بہتر سمجھا تھا کہ تھوڑی سی چہل قدمی کی جائے۔ اصولاً رات کے بارہ بجے کے بعد اگلا دن شروع ہوگیا تھا۔ چنانچہ یہ مارننگ واک تھی۔

جیپ بہت قریب آگئی تو میں نے پچھلی سیٹوں پر بھی دو افراد کو دیکھا جو بظاہر کچھ نہیں کر رہے تھے مگر وہ حفاظت کر رہے تھے اور شکاری کُتّوں کی طرح تھوتھنی اُٹھا کے ہر طرف خطرے کی بو سونگھنے میں مصروف تھے۔ رات کے وقت سامنے سے آنے والے کو ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی اندھا کر دیتی ہے اور ونڈ اسکرین کے پیچھے اندھیرا ہو تو کسی کی صورت واضح نہیں ہوتی۔ جیپ پیچھے سے کھلی ہوئی تھی۔ محافظ پیچھے سے آنے والی ہر گاڑی پر نظر رکھ سکتے تھے اور خطرے کی صورت میں فوراً چھلانگ لگا کے میدانِ عمل میں کود سکتے تھے لیکن اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ زیادہ سے زیادہ گشت پر مامور کوئی چوکیدار ان سے پوچھ سکتا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے تو آسان جواب یہ تھا کہ پتا تلاش کر رہے ہیں اور مشکل جواب یہ کہ جو کچھ بھی کر رہے ہیں تمہیں کیا۔ چلو اپنا راستہ پکڑو۔ آدھی رات کے وقت مکانوں کے نمبر یا نیم پلیٹ پڑھنا کس قانون کے تحت جرم ہے۔ ہماری مرضی ہم آدھی رات کو ہر درخت پر چڑھ کے پتے گنیں یا سڑک پر پڑے ہوئے پتھر شمار کریں۔ عاشقوں کے شیوۂ اختر شماری پر آج تک کسی نے اعتراض نہیں کیا۔

قریب سے میں نے اس کی شکل دیکھی تو کچھ جانی پہچانی سی لگی۔ میں نے ذہن پر زور دیا تو مجھے یاد آگیا۔ یہ وزیر خان اسپتال کا وہی چوکیدار تھا جس نے مجھے اور رابعہ کو غلط فہمی اور لالچ میں کسی مخبوط الحواس پروفیسر سے ملوا دیا تھا۔ پروفیسر کو اس کی ناخلف اولاد وہاں جمع کر گئی تھی کہ ابّا جی کا دماغ درست کر دیا جائے اور جب تک یہ مقصد حاصل نہ ہو ان کو کسی سے ملاقات کی اجازت نہ ملے۔ غالباً وہ جائداد پر ابّا جان کی زندگی میں ہی قبضہ چاہتے تھے لیکن یہ نہیں چاہتے تھے کہ قبل از وقت ہی ابّا جان کو دوسری دنیا میں بھیج دیا جائے چنانچہ دماغ کے کل پُرزے ڈھیلے ہونے کے بعد لواحقین کو ازروئے قانون یہ اختیار حاصل ہو جاتا تھا کہ ابّا جان کی عمر بھر کی کمائی کو جیسے چاہیں اُڑائیں۔ وہ گُڑ سے مرنے والے کو زہر دینے کے قائل نہیں تھے اور باپ کے قاتل کہلانا نہیں چاہتے تھے۔

یہ سب یاد آتے ہی میرا شک یقین میں بدل گیا کہ یہاں وہ کس کو تلاش کر رہے ہیں۔ وہ رانا کے آدمی تھے اور نئے شکاری تھے۔ ابھی تک رانا نے ہم سے براہِ راست پنگا لینے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ وہ دلاور کا بزنس پارٹنر تھا۔ اس کی عداوتوں اور ذاتی

بالآخر اس نے ہم سے چند قدم کے فاصلے پر آکے گیٹ سے اندر جھانکا اور اطمینان کے انداز میں سہلایا۔ پھر آہستہ سے کراہا۔ دوسرے نے قریب آکے سرگوشی میں کہا "تجھے کیا ہوگیا؟"

"تجھے نہیں پتا" اس نے بُرا مان کے اپنے سر کو چھوا "اس...نے اتنی زور سے مارا تھا...ہائے..."

"چل بس کر۔ زنانیوں والی باتیں مت کر۔"

وہ بھڑک اُٹھا "تو بڑا مرد ہے نا۔ لگتی تیرے سر پر تو ابھی تک مرا پڑا ہوتا۔" جیپ میں بیٹھے ہوئے دونوں محافظ بھی چھلانگ لگا کے نیچے اُتر آئے تھے اور خاصے مشکوک انداز میں اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ اگر ہم ذرا بھی حرکت کرتے تو شاید ان کی نظر سے پوشیدہ نہ رہتے۔ گرد وپیش کی ہر چیز ساکت تھی اور ہم اندھیرے کی پناہ میں دیوار یا گیٹ پوسٹ اور جامد درخت کی طرح ماحول کے سکوت کا حصہ بن کے ہی محفوظ تھے۔ ایسے وقت میں ہمیشہ مجھے یہ ڈر محسوس ہوتا تھا کہ کہیں شامت اعمال سے اچانک چھینک نہ آجائے۔ کہیں سے اُڑتا ہوا کوئی مچھر آکے ناک میں نہ گھس جائے یا کوئی چیونٹا پاؤں سے اوپر کی جانب سفر کا آغاز نہ کردے اور کاٹ نہ لے۔

"مکان تو یہی ہے...." ایک نے تصدیق کی۔

"اسی میں سے گاڑی ابھی باہر نکلی تھی نا۔ لال رنگ کی؟"

"ہاں۔ تو نے کچھ دیکھا تھا 'کتنے بندے تھے اس میں؟"

دوسرے نے غور فرما کے کہا "چار پانچ تو ضرور تھے۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ وہ نکل گئے۔ لال گاڑی تو اسی.... کی ہے" پہلے نے رابعہ کے لیے عادتاً گالی استعمال کی۔

"مگر استاد۔ ایک لال گاڑی اندر بھی ہے 'دیکھو۔"

استاد نے گیٹ کے اوپر سے جھانکا۔ "یہ کیا چکر ہے۔ نمبر بھی وہی ہے جو مجھے رانا صاحب نے بتایا تھا۔ وہ گاڑی کسی اور گیٹ سے نکلی ہوگی۔"

"استاد 'میں قسم کھا سکتا ہوں۔"

"قسم مت کھا اور میرا سر مت کھا۔ ابھی گیٹ سے نکلی تھی تو پھر گاڑی کا رنگ لال نہیں ہوگا۔ کالا یا سفید ہوگا۔"

دوسرا ملول ہوگیا "کیسی باتیں کرتے ہو استاد۔ اب میں اندھا تو نہیں ہوں کہ کالا اور نیلا مجھے لال نظر آئے۔"

"ہوتا ہے پتر ہوتا ہے۔ اندھیرے میں پتا نہیں چلتا اور تو نے چلنے سے پہلے بھی سوٹا لیا تھا۔" استاد نے کہا۔

"سوٹے کا کوئی اثر نہیں ہے مجھ پر" دوسرے نے احتجاج کیا مگر اس کی بات قابلِ غور نہیں سمجھی گئی۔

"وہ اندر ہی ہیں" استاد نے فیصلہ صادر کیا "ذرا ہوشیاری سے۔"

معلوم نہیں ان چاروں کو کس مشن پر بھیجا گیا تھا لیکن ذہنی وجسمانی اعتبار سے وہ کوئی بڑا کارنامہ سرانجام دینے کے اہل نہیں لگتے تھے۔ اگر مقصد ہم میں سے کسی کا اغوا یا قتل ہوتا تو رانا ایسے مسائل سے رانا کو کیا دلچسپی ہوسکتی تھی۔ اس نے تو یہی بہتر جانا ہوگا کہ اپنا دامن 'اپنی توانائی اور اپنی زندگی بچائے۔ شراکت کو صرف مالی نفع نقصان تک محدود رکھے لیکن اب ہم نے خود آگے بڑھ کے اس سے پنگا لیا تھا اور اس کے مفادات کی جنگ کا پانسہ پلٹ دیا تھا۔ وہ حیران بھی ہوا ہوگا اور پریشان بھی کہ آخر ہم نے دلاور جیسے دشمن کی حمایت میں اس کی بیوی اور بچّوں کی حفاظت کا بیڑا کیوں اُٹھایا۔ ہمیں تو خوش ہونا چاہیے تھا کہ رانا نے اس کا بیڑا غرق کردیا۔

رانا یہ بات نہیں سمجھ سکتا تھا کہ ذاتی دشمنی اور جنگ میں بھی کچھ وضع داری کے آداب ہوتے ہیں۔ دلاور غاصب اور قاتل تھا۔ میں نے اپنا قانونی حق اور انصاف حاصل کرنے کے لیے اس کے خلاف محاذ آرائی کو اپنا فرض عین سمجھا تھا۔ آج اگر کوئی اور شخص وہ سب کچھ دلاور کے ساتھ کرے جو کل وزیر خان کے ساتھ ہوا تھا تو اس کو جائز سمجھنا میرے لیے ناممکن تھا۔ دُہرے معیار کسی بھی معاشرے میں صرف عدل وانصاف کا خون کرتے ہیں۔ جو غلط ہے وہ سب کے لیے غلط ہے۔ یہ نہیں کہ کوئی میرے باپ کو قتل کردے تو واجب تعزیر اور میرے دشمن کو قتل کردے تو واجب تعریف۔ دنیا تو یہی کہتی ہے کہ جو جیسا کرے گا ویسا بھرے گا۔ مگر یہ میرے لیے ممکن نہیں تھا کہ اس معاملے میں آنکھیں اور کان بند کرلوں۔ اگر دلاور سے سب کچھ چھن جاتا تو پھر میں اپنا حق کس سے وصول کرتا اور انصاف کے تقاضے کیسے پورے ہوتے۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے سزائے موت پانے والے قیدی کو مرنے نہیں دیا جاتا۔ اسے اچھی خوراک اور دوا علاج سے صحت مند رکھنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔

پیدل چلنے والا اس وقت بالکل مختلف حُلیئے میں تھا۔ اسی لیے میں اسے فوراً نہ پہچان سکا۔ اس نے عام شریف لوگوں کی طرح قمیص پتلون پہن رکھی تھی۔ اس کا چہرہ کلین شیو تھا اور غالباً معتبر نظر آنے کے لیے اس نے عینک بھی لگالی تھی۔ اس سے بھی صورت خاصی بدلی ہوئی لگتی تھی مگر اس کی شناخت میں شبے کی قطعی گنجائش نہیں تھی۔ وہ سی ڈی انٹرپرائز کا وہی نااہل اور کاہل چوکیدار تھا جو اس سے پہلے ریڈیو ٹیلی فون پر پیغامات وصول کرتا تھا۔ دونوں جگہ اس کی کارکردگی مایوس کن تھی۔ نہ جانے دلاور یا شوکت رانا نے اسے کس خوبی کی بنا پر اپنے نمک خواروں میں شامل کرلیا تھا۔ شاید وفاداری ہی اس کا سب سے بڑا وصف ہوگی۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی میں نے اسے اپنے راستے سے ہٹانے کے لیے اس کا سر توڑنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ اس ملاقات کی نشانی یقیناً ایک عظیم گومڑ کی شکل میں اس کے سر پر موجود ہوگی۔ افسوس ناک بات یہ تھی کہ وہ اندرونی ضرب سے فوت یا پاگل تک نہیں ہوا تھا۔ اگر میں اس کے سامنے آجاتا تو وہ مجھے کبھی معاف نہ کرتا اور اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کے فارمولے پر عمل کرتا۔ میں نے اس کے سر پر ریوالور مارا تھا 'وہ میرے سر پر توپ مارتا۔

اناڑی اور ناتجربہ کار افراد کا انتخاب نہ کرتا جو ذرا بھی محتاط نہ تھے۔ وہ جو کچھ کر رہے تھے سرِعام کر رہے تھے اور کسی بھی گھر سے اچانک نکل آنے والا یا گشت پر مامور چوکیدار ان سے پوچھ سکتا تھا کہ وہ کون ہیں اور یہاں کیا کر رہے ہیں۔ رانا صاحب یقیناً یہ جانتے تھے کہ وقار یوسف ایک وکیل ہے اور اس کی پشت پناہی کرنے والے منظر اور خود رابعہ جیسے نامور وکیل ہیں۔ اس گھر میں کسی قسم کی مجرمانہ کارروائی کا ردِّعمل رانا کے لیے سنگین مسائل پیدا کر سکتا تھا۔ اگر رانا کو یہ معلوم ہوگیا تھا کہ میرے ساتھ محسن بھی اسی گھر میں موجود ہے تو ایسے ناتجربہ کار افراد کو یہاں بھیجنا انہیں موت کے منہ میں بھیجنے کے مترادف تھا۔ ان جیسے دس بھی ہوتے تو مقابلے کے لیے ناکافی تھے۔ وہ مارے جاتے یا پکڑے جاتے اور ہم خود یا مصنوعی تفتیشی ٹیم کے ارکان ان سے سب اُگلوا لیتے کہ ان کی تشریف آوری کا مقصد کیا تھا۔

قدرت کے اشارے سمجھنا آدمی کے بس کی بات نہیں۔ بعض اوقات خسارے کا سودا ہی نفع بخش ثابت ہوتا ہے۔ نادانستہ غلطی ہی صحیح فیصلے کا موجب بنتی ہے اور قابلِ ندامت محسوس ہونے والی کوئی لغزش غیر متوقع طور پر کسی مصیبت کا شکار ہونے سے بچالیتی ہے۔ ایسا ہمارے ساتھ ہوا تھا۔ ہم شرمندہ تھے کہ خود پیٹ بھر کے آگئے مگر خواتین کے لیے کچھ نہ لا کے زیادتی کی۔ اب یہی زیادتی خواتین کے حق میں بہتری ثابت ہو رہی تھی۔ ہماری غلطی نے ان کو بچالیا تھا اور مجھے ان کی طرف سے بے فکر کردیا تھا۔ فی الحال ایک گھنٹے تک ان کی واپسی کا امکان نہیں تھا اور مجھے یقین تھا کہ اس سے بہت پہلے رانا صاحب کے سفیروں کی آمد کا مقصد معلوم ہوجائے گا اور خدا نے چاہا تو ان کے شایانِ شان استقبال' خاطر تواضع اور رخصتی کا مرحلہ بھی تمام ہوجائے گا۔

پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق ان سب کو واپس جانا تھا۔ ان کو صرف یہ ذمّے داری سونپی گئی تھی کہ وہ وقار یوسف کے گھر کا پتا چلائیں۔ یہ معلوم کریں کہ وہاں سب موجود ہیں اور خطرے کی کوئی بات نہیں۔ تاہم اس کا علم مجھے کچھ دیر بعد ہوا۔ میرے سامنے تو وہ جیسے آئے تھے ویسے ہی لوٹ گئے۔

محسن نے گاڑی کو جاتا دیکھا "یار یہ کیا بات ہوئی؟"

اب میں سامنے آگیا "کتنی اچھی بات ہے کہ کوئی بات نہیں ہوئی۔"

"نہیں یار۔ اصل بات کچھ اور ہوگی۔ یہ صرف جائزہ لینے والی ٹیم تھی۔ اصل کارروائی ان کی رپورٹ پر ہوگی۔"

"چونکہ آپ غیب کا حال جانتے ہیں شیردانی صاحب' اس لیے یہ ارشاد فرمائیے کہ رپورٹ کسے دی جائے گی۔ کارروائی کیا ہوگی اور کون کرے گا۔"

محسن نے سرہلایا۔ "میری چھٹی حس کہتی ہے۔"

"آپ بھول گئے چھٹی حس میری ہے۔ آپ کی ساتویں حس ہے۔"

"او کے۔ میری ساتویں حس کہتی ہے کہ اب شوکت علی رانا کی طرف سے ہمیں دخل در معقولات کی سزا دی جائے گی۔ ہم نے مسز دلاور کو اس کی قید سے رہائی دلا کے رانا کے مستقبل کو تاریک کردیا ہے۔ اس نے تو سوچا ہوگا کہ دلاور کا کام تو تقریباً تمام ہوا۔ اگر خود سکندر نے اسے نہ مارا تو رابعہ منظر اینڈ کمپنی اسے تختۂ دار تک یقیناً پہنچادے گی۔ مسز دلاور کا اور اس کی اولاد کا وجود مٹا دیا جائے تو اس کا راستہ خود بخود صاف ہوجائے گا۔ اس واردات کو بھی منسوب کیا جائے گا ایم آر ایس کے انتقام پسندوں سے۔ رانا صاحب پر انگلی اُٹھانے والا کون ہوگا۔ مگر مسز دلاور کے بچ نکلنے سے اس پر چودہ طبق روشن ہوگئے ہوں گے۔ وہ سخت پریشان ہوگا کہ اب خود کو مسز دلاور جیسی زخم خوردہ ناگن کے انتقام سے کیسے بچائے گا۔ وہ تو ساری سازش کو سمجھ چکی ہے اور اب کچھ بھی کرے کم ہے۔"

میں نے اس سے ہاتھ ملایا "بالکل یہی بیان میری چھٹی حس نے دیا تھا لیکن سوال یہ ہے کہ رانا کیا کرسکتا ہے؟"

"اس سوال کا جواب نہیں ہے آپ کی چھٹی حس کے پاس؟"

"میری چھٹی حس فرماتی ہے کہ رانا جوش سے نہیں ہوش سے کام لے گا۔ وہ ایسا نہیں کرے گا کہ ہم سے جنگ چھیڑے۔ وہ جنگ میں دلاور کا انجام دیکھ چکا ہے۔ وہ دوستی اور تعاون کا ہاتھ بڑھائے گا۔"

محسن بولا "دوستی کا ہاتھ تو چوہدری دلاور نے کئی بار بڑھایا تھا۔"

"مگر اس کے ساتھ دوستی اتنی ہی ناممکن تھی جتنا آگ پانی کا ملاپ۔ رانا کہہ سکتا ہے کہ تم نے دلاور کے ساتھ جو کچھ کیا بالکل ٹھیک تھا۔ تمہاری جگہ میں ہوتا تو یہی کرتا لیکن میرے ساتھ تمہاری کوئی دشمنی نہیں۔ تمہیں مجھ سے کوئی شکایت ہے تو بتاؤ۔ میں تلافی کے لیے تیار ہوں۔ میں تمہارا حق بھی تسلیم کرتا ہوں اور ہر مطالبہ پورا کرسکتا ہوں۔ دلاور کی بیوی کو میرے حوالے کردو۔ میں استاد پیڈرو کو حاضر کرتا ہوں۔"

محسن نے کہا "پھر ہم کیا کریں گے؟ فرض کرو ایسا ہی ہوا؟"

"ہم سر کھجا کے کہیں گے کہ سوری رانا صاحب۔ یہ بات ہماری عقلِ شریف میں نہیں آئی ورنہ ہم اس وقت آپ سے رابطہ کرلیتے جب وہ فلاں فلاں کی غیر منکوحہ بیوی ہمارے قبضے میں تھی۔ وہ تو ہمیں نچادے کر نکل گئی۔"

محسن ہنس پڑا "مولوی خادم حسین نے کیا گالی ایجاد کی ہے مگر یہ تو غلط ہے کہ دلاور کی بیوی ہمیں نچادے گئی۔"

"یہ سو فیصد صحیح ہے۔ اب وہ ہمارے ہاتھ بھی نہیں آئے گی۔ اس نے اندازہ کرلیا ہے کہ ہم کسی قیمت پر اس کے شوہر کو معاف کرنے والے نہیں ہیں۔ اس کے لیے تشویش کی بات صرف یہ تھی کہ دلاور زندہ بھی ہے یا نہیں۔ دلاور سے مل کے اس کی یہ تشویش تو رفع ہوگئی۔ ہمارے عزائم کا بھی اسے علم ہوگیا۔ ہم دلاور

میں نے کہا "تو ٹھیک کہتا ہے۔ جو کچھ فوزیہ کے اور اس کے شوہر کے ساتھ ہوا۔ وہ اسی تعلق کا شاخسانہ تھا۔ اگلی باری اکرام اور کاجل کی بھی ہوسکتی ہے اور یہاں وقار یوسف کی۔ ہمیں اس سے پہلے ہی اپنا ٹھکانا کہیں اور کرلینا چاہیے۔ ہم جہاں جاتے ہیں شامتِ اعمال ساتھ جاتی ہے۔ کیا ضرورت ہے اپنے ساتھ انہیں تباہ کرنے کی جن کا جرم صرف ان کا خلوص ہے یا ان کی وفا ہے۔"

"ہاں۔ اس گھر کو آباد رہنا چاہیے۔ میں کل ہی گل کو کہیں شفٹ کردوں گا۔ میرا خیال ہے کہ میرے ساتھ گل اور ببلی ہمیشہ خطرے میں رہیں گے۔ انہیں کسی بھی گمنام سی جگہ پر رکھا جاسکتا ہے جہاں وہ محفوظ ہوں۔"

"گل شاید نہ مانے۔"

"میں اسے منالوں گا۔ مجھ سے زیادہ ببلی کو اس کی ضرورت ہے۔ مرد بڑا غرض پرست اور بے وفا ہوتا ہے یار۔ دیکھ نا شہلا کو کتنی جلدی بھلا دیا میں نے اور اس کا نعم البدل بھی مل گیا مجھے۔"

میں نے اس کے خیالات کا رُخ بدلنے کی کوشش کی "دنیا میں مرنے والوں کے ساتھ کوئی نہیں مرتا۔ زندگی اسی کا نام ہے۔"

"ہاں" محسن نے ایک آہ بھری "یہ بھی اچھا ہی ہوا یار کہ وہ اپنے بیٹے کو اپنے ساتھ ہی لے گئی۔ اسے میرے جیسے غیر ذمّے دار اور خود غرض شخص کے حوالے نہیں کیا ورنہ۔"

"ورنہ کیا۔ تو کیا سمجھتا ہے کہ وہ لاوارث رہ جاتا۔ دنیا کی ٹھوکریں کھاتا۔ تُو دوسری شادی کرلیتا تو اس کے ساتھ گھر میں سوتیلوں جیسا سلوک ہوتا۔ گل اس کی سوتیلی ماں ثابت ہوتی" میں نے برہمی سے کہا۔

"میں گل کی بات نہیں کر رہا تھا۔۔۔"

"تو بکواس کر رہا تھا۔ اوّل تو یہ ناممکن تھا۔ اس کے لیے بھی گل کے جذبات وہی ہوتے جو ببلی کے لیے ہیں اور بفرضِ محال ایسا نہ ہوتا تو بھی فرق نہ پڑتا۔ رابعہ اور نازو یا نکی اسے اپنا سکتی تھیں۔ ہم سب کے ساتھ اس کا وہی جذباتی رشتہ ہوتا جو تیرے ساتھ ہے۔ کیا تُو نے دیکھا نہیں کہ ببلی کے معاملے میں گل کتنی حاسد ہوگئی ہے۔ وہ نہیں چاہتی کہ ببلی کو اور کوئی اتنا چاہے جتنا وہ چاہتی ہے۔"

"یہ پاگل پن ہے۔"

"بالکل نہیں' ہر عورت کی محبت کا یہی انداز ہے۔ خواہ وہ ماں ہو یا بہن۔ بیوی ہو یا بیٹی۔ وہ محبت میں شرکت کو ایک حد تک برداشت کرسکتی ہیں۔ کوئی اس کے بیٹے کو یا شوہر کو اس سے زیادہ چاہے' اس سے زیادہ اپنا سمجھے۔ یہ وہ برداشت نہیں کرتی۔ گل کو قطعی اعتراض نہیں ہوگا اگر نازو یا رابعہ یا نکی خود کو چچی ممانی اور خالہ کہیں اور اپنی اس حیثیت میں ببلی سے جتنا چاہیں پیار کریں لیکن ماں کے رتبے پر وہ اکیلی فائز رہنا چاہے گی۔ ببلی صرف اس کا بیٹا ہوگا۔ اس کی ماں صرف وہ کہلائے گی۔ اب یہ ایک ایسا جذباتی مسئلہ بھی بن سکتا ہے جو ان عورتوں کے درمیان کشیدگی کا سبب بن کو انتقام لینے کے لیے خود قتل نہیں کریں گے۔ ہم اسے انصاف اور قانون کے تقاضے پورے کرتے ہوئے پھانسی کے تختے تک پہنچائیں گے۔ وہ اب قانونی جنگ لڑنے کی تیاری کرے گی۔ وہ اپنی دولت کی طاقت پر اور بڑے بڑے وکیلوں کی مدد پر انحصار کرے گی۔ اس کے لیے ہم اور رانا ایک جیسے دشمن ہیں۔ وہ دوبارہ کسی کو ہمدرد سمجھنے کی غلطی نہیں کرسکتی۔ وہ بے وقوف عورت نہیں ہے۔ فی الحال وہ روپوشی اختیار کرے گی اور دیکھے گی کہ اب ہم کیا کرتے ہیں اور شوکت رانا کیا کرتا ہے۔ اس کی ناقص عقل میں بھی یہ بات آسکتی ہے کہ رانا شاید ہم سے مل جائے۔"

اب ایک طرف ہم رابعہ' گل اور نکی کی واپسی کے منتظر تھے تو دوسری طرف ایک فکر یہ بھی لاحق ہوگئی تھی کہ نہ جانے وقار یوسف کے گھر کا سراغ لگانے والے اور اس کے گھر میں ہماری موجودگی کا یقین حاصل کرکے جانے والے اگلا قدم کیا اُٹھاتے ہیں اور وہ آج رات ہی کچھ کریں گے یا اس کے لیے مناسب وقت اور موقع کا انتظار کریں گے۔ مذاق کی بات اور تھی۔ میری چھٹی اور محسن کی ساتویں حس محض ہماری قیاس آرائی تھی جو غلط بھی ثابت ہوسکتی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ رانا کا ردِّعمل ہماری توقعات کے برعکس ہو۔

میں اور محسن چھت پر ٹہلتے رہے۔ آس پاس کے بیشتر مکانوں میں لوگ سوچکے تھے۔ کچھ گھروں کے پورچ یا برآمدے میں لائٹ جلتی چھوڑ دی گئی تھی یا پھر گیٹ لائٹس آن تھیں۔ پیچھے کی طرف کچھ فاصلے پر کوئی ناہید اختر کی آواز پر جان دینے والا ٹیپ ریکارڈر پر ایک ہی کیسٹ کا ایک ہی گانا باربار لگا رہا تھا۔ گیت کے بول بھی اسے تڑپا رہے تھے اور شاید ناہید اختر کا تصور بھی۔ ہربار مکھڑے کے بیچ میں وہ بہ آواز بلند نعرہ لگاتا تھا "ہائے او ظالم' مار چھڈیا" اسے قطعی پروا نہیں تھی کہ ٹیپ ریکارڈر کی اور اس کے اپنے مجروح دل کی پکار سونے والوں کے آرام میں کس حد تک مخل ہو رہی ہوگی۔

محسن نے اچانک کہا "یار' یہ ہے پریشانی کی بات۔"

میں نے کہا "حضرت کچھ وضاحت کریں کیونکہ یہاں تو سوائے پریشانی کے کوئی بات ہی نہیں ہے۔"

"یہ لوگ وقار یوسف کے گھر کیوں آئے تھے۔ کیا اب اس کا گھر بھی محفوظ نہیں رہے گا۔ اس نے کسی کا کیا بگاڑا ہے۔ وہ نہ کسی کے لینے میں نہ دینے میں۔ بس رابعہ کی وجہ سے تعلق نبھاتا ہے اور طبعاً بھی اتنا شریف اور خلیق ہے کہ اپنے بدترین دشمن کو بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میرے گھر سے چلے جاؤ۔۔۔"

"لیکن ہمارا اخلاقی فرض تو بنتا ہے کہ اسے مہمان نوازی کی سزا ملنے سے پہلے ہی اپنا بوریا بستر یہاں سے سمیٹ لیں۔ کینہ پرور اور بے اصول دشمن کے لیے تو وقار یوسف کی دوست داری اور فراخ دلی بھی جرم ہے۔ یہ بھی جرم ہے کہ اس نے ہمیں گھر میں پناہ دے رکھی ہے۔"

جائے۔ سب محبت کی انتہا میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کریں اور بلاوجہ ایک دوسرے کی حریف ہو جائیں۔"

"میں گل کو سمجھادوں گا....."

میں نے کہا "نہیں۔ یہ بات گل کو سمجھانے والی نہیں۔ وہ سمجھنے سے انکار کردے گی۔ میں رابعہ کو سمجھا سکتا ہوں اور وقار اپنی بیوی سے کہہ سکتا ہے لیکن ابھی نہیں۔ اگر کبھی اس کی ضرورت محسوس ہو۔ ویسے تو مجھے امید ہے کہ وہ فراخ دلی کا ثبوت دیتے ہوئے خود ہی گل کو یہ حق دے دیں گی.... مگر ابھی ہم بات کررہے تھے گل اور بوبی کو بحفاظت کہیں منتقل کرنے کی۔ تو یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ دیکھ لیں گے کہیں کرائے کا کوئی گھر لیکن اس کے بعد یہ بھی ضروری ہوگا کہ تیرا مجھ سے تعلق نہ رہے.... کسی بھی معاملے سے...."

محسن بھڑک اُٹھا "بکواس مت کر۔ یہ ناممکن ہے۔"

"یار، اس کے بغیر گل اور بوبی کیسے محفوظ ہوں گے۔"

"یعنی ان کے ساتھ میں بھی کہیں چُھپ کے بیٹھ جاؤں۔ لعنت مجھ پر اگر میں ایسے جینا قبول کروں اور لعنت تجھ پر کہ تُو نے ایسی بات کہی۔ آپ زیادہ تردّد مت فرمائیں۔ میں سب کرلوں گا۔ ان کی حفاظت بھی میری ذمے داری ہے اور سب کا ساتھ نبھانا بھی۔"

"یار، تُو ناراض ہوگیا۔"

"تو نے بات ہی ایسی کی ہے۔ میں تو حیران ہوں کہ غالب اور نازو کی کوئی بات ہی نہیں کرتا۔ کسی کو خیال ہی نہیں کہ وہ کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔"

اب مجھے غصّہ آگیا "دیکھ محسن، ایسی بات مت کر۔ یہ الزام نہیں گالی ہے ہم سب کے لیے۔ بات نہ کرنے کا مطلب یہ کیسے ہوگیا کہ ہم انہیں بھول گئے ہیں یا ان کے لیے کچھ نہیں کررہے ہیں۔ میں جانتا ہوں وہ کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔"

"وہ بات تو پُرانی ہوگئی جب رابعہ کے ساتھ تم وزیر خان اسپتال گئے تھے۔ صرف اندازہ تھا تمہارا کہ انہیں وہاں رکھا گیا ہوگا۔ کوئی ثبوت نہیں دیکھا تم نے اپنی آنکھوں سے۔"

"وہ جہاں بھی ہوں گے۔ بالآخر واپس آجائیں گے۔ بہت جلد۔"

"بہت جلد!" محسن نے تلخی سے کہا "ان پر ایک ایک لمحہ بھاری ہوگا۔ وہ منتظر ہوں گے کہ ایم آر ایس کے سربہ کف مجاہد اچانک یلغار کریں گے اور دشمنوں کو تہس نہس کردیں گے، انہیں چُھڑالیں گے۔ اور کتنی مایوسی کا شکار ہوں گے وہ کہ ابھی تک کچھ بھی نہیں ہوا۔ معلوم نہیں ان پر کیا بیت رہی ہے۔"

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا "دیکھ یار۔ قید کبھی خوش گوار نہیں ہوتی خواہ اپنے ہی محل میں قید تنہائی ہو۔ دشمن کی قید میں خیر کی توقع نہیں رکھی جاسکتی مگر ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔ میں نے دلاور کو ان کے تحفظ کی ضمانت بنا کے رکھا تھا۔ انہیں خبردار کردیا تھا کہ غالب یا نازو کو خراش بھی آئی تو دلاور کے جسم پر چیرا لگے گا۔ انہوں نے ہمیں ڈرانے کی کوشش کی تھی۔ وہ نازو کی انگلی نہیں تھی لیکن ہم نے یہ نہیں کیا کہ مطمئن ہوکے بیٹھ جاتے یا انہیں بتاتے کہ اس جعلی کارروائی کو ہم نے ایک احمقانہ حرکت سمجھ کے نظرانداز کردیا ہے۔ نہیں، ہم نے فوراً جواب ارسال کیا کہ دلاور کی انگلی سنبھال کے رکھو۔ ہم نے تو زنانہ مردانہ ہاتھ کے فرق کو نوٹ کرلیا تھا۔ وہ تو تصدیق بھی نہیں کرسکتے تھے کہ انگلی دلاور کے ہاتھ کی ہے یا کسی اور کے ہاتھ کی۔ اب دلاور کی بیوی نے اپنے شوہر کو زندہ سلامت دیکھ لیا ہے تو اسے یقیناً اطمینان ہوا ہوگا مگر اس سے غالب یا نازو کے لیے خطرہ نہیں بڑھا۔ دلاور اب بھی ہمارے قبضے میں ہے اور اسے تلاش کرنے والے تھک ہار کے بیٹھ گئے ہیں۔ یہ بالکل واضح ہے کہ غالب یا نازو کے ساتھ جو کچھ ہوگا اس سے بدتر دلاور کے ساتھ ہوجائے گا۔ دلاور کی بیوی بھی اپنے شوہر کی بے بسی کی حالت دیکھ گئی ہے۔ اب وہ خود غالب اور نازو کی حفاظت کرے گی۔"

"مگر کیا یہ اس کے اختیار میں ہے؟"

"ہاں۔ وہ اختیار حاصل کرسکتی ہے۔ شوکت رانا نے اسے بے اختیار کرنے کی ناکام کوشش کی تھی مگر اس نے خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارلی۔ ناکام بغاوت کے مجرم کو سزائے موت ہی ملتی ہے۔ شوکت رانا کو اب اپنی جان کی فکر ہوگی کیونکہ دلاور کے نمک خوار ابھی تک اس کے ساتھ ہیں۔ اگر بے یقینی کے باعث کسی نے نمک حرامی کرنے کا سوچا ہوگا تو دلاور کی بیوی ان سے نمٹ لے گی۔ ملکۂ عالیہ کا یہ اعلان کہ بادشاہ سلامت زندہ ہیں اس کے اقتدار کو بحال کردے گا۔ پھر شوکت رانا کا ساتھ دینے والے بہت کم ہوں گے اور میں سمجھتا ہوں کہ دلاور کی بیوی کو حالات پر پورا کنٹرول حاصل ہوجائے گا۔ ہاں وہ سازش کا شکار ہوجاتی تو پھر شوکت رانا اور پیڈرو یا ڈاکٹر شاہ خود مختار ہوجاتے۔ اب تو ان کی قانونی حیثیت انتہائی غیر مستحکم ہوچکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم سب کچھ مطمئن ہیں۔ بے شک قید کی اذیت کم نہیں لیکن غالب اور نازو کی جان کو خطرہ کسی سے لاحق نہیں ہوسکتا جب تک دلاور ہماری تحویل میں ہے۔"

نیچے اپنے بیڈ روم میں وقار یوسف ان تمام معاملات سے بے خبر سو رہا تھا۔ بوبی اس کے ساتھ تھا اور اسی کی طرح سکون کی گہری نیند میں تھا۔ مجھے ان دونوں پر رشک آیا۔ بوبی تو خیر ابھی بچہ تھا اور فکر کا مطلب بھی نہیں سمجھ سکتا تھا مگر وقار یوسف کی زندگی میں بھی تفکرات کا دخل صرف روزمرہ کے معمولات کی حد تک تھا۔ اپنے مؤکلوں کے عدالتی معاملات سے ہٹ کے اس کی نجی زندگی میں بڑا ٹھہراؤ تھا۔ نہ اسے آنے والے کل کا خوف تھا اور نہ گزرے ہوئے کل پر کوئی احساس رنج وندامت۔ خدا نے اسے سب کچھ دے رکھا تھا۔ صحت اور عزت اور پُرآسائش زندگی کی ہر نعمت اور فکر فردا سے بے نیاز کردینے والی بہت سی دولت جو ایک محبت کرنے والی بیوی اپنے ساتھ لائی تھی۔ اس کا گھر، اس کی بیوی اور اس کا مستقبل سب شاندار تھے اور وہ اتنا صابر و قانع شخص تھا کہ مزید کی ہوس سے بے نیاز تھا چنانچہ اسے اطمینانِ قلب کی وہ دولت حاصل تھی جس کے بغیر دنیا کی ہر دولت بے کار ہوجاتی ہے۔

میرے لیے وقار یوسف اور بوبی کی بے فکری کی نیند بھی فکر کا سبب بنی ہوئی تھی۔ اپنے اندازوں پر یقین ہونے کے باوجود میرے دل میں ایک خلش سی تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو وہ سوتے رہ جائیں اور تباہی و بربادی کا سیلاب انہیں بے خبری میں اسی طرح بہالے جائے جیسے ہیروشیما کے لاکھوں شہریوں کو ایک ایٹم بم کی ہلاکت خیز تابکاری نے ہوش میں آنے سے پہلے موت کی آغوش میں پہنچادیا تھا۔ میں وقار کو کسی ممکنہ خطرے سے خبردار کرنا چاہتا تھا تاکہ وہ بوبی کے ساتھ بحفاظت نکل جائے۔ گھر کا کوئی کیا بگاڑے گا۔ صرف ہم ہوں گے تو ان اخوان الشیاطین کی یلغار کا مقابلہ کرلیں گے۔

محسن نے میری رائے سے اتفاق نہیں کیا "قبل از مرگ واویلا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"اسے پیش بندی بھی کہتے ہیں۔"

"اوّل تو یہاں کوئی جنگ عظیم ہوگی نہیں۔ ہوئی تو ہم غافل نہیں ہیں۔ وقار کو اتنی مہلت ضرور ملے گی کہ وہ بوبی کو اٹھا کے پیچھے سے نکل جائے اور ساتھ والے کسی گھر سے پولیس کو مطلع کردے۔"

"پولیس کو پہلے ہی بُلایا جاسکتا ہے۔"

محسن نے حیرانی سے مجھے دیکھا "صرف اپنی قیاس آرائی کی بنیاد پر کہ کچھ ہوسکتا ہے بلکہ ہونے والا ہے۔ وہ پوچھیں گے نہیں کہ اندیشہ کس سے ہے اور کیوں؟ اتنی مستعد تو باہر کی پولیس بھی نہیں ہوسکتی کہ ہر شہری کو محض اندیشے کی بنا پر تحفظ فراہم کردے۔"

دائیں جانب سڑک کے موڑ پر کسی گاڑی نے ٹرن لیا اور میں نے خاموشی میں فاکس ویگن کے انجن کی غراہٹ سُنی۔ نکی، رابعہ اور گل لوٹ آئی تھیں اور اچانک یہ سوال اہم ہوگیا تھا کہ انہیں گھر میں داخل ہونے سے قبل ہی خبردار کردیا جائے اور کہا جائے کہ وہ آج رات منظر کے گھر میں گزارلیں کیونکہ یہاں ہم خطرہ محسوس کررہے ہیں۔ اس دلیل سے رابعہ اور گل کو قائل کیا جاسکتا تھا مگر وہ بھی بوبی کو ساتھ لے جاتیں۔ نکی اپنا گھر اور اپنے شوہر کو چھوڑ کر جانے پر کبھی رضامند نہ ہوتی۔

"کچھ دیر بعد انہیں اصل بات بتائی جاسکتی ہے۔ یعنی یہ کہ ہم نے کیا دیکھا تھا اور سُنا تھا" میں نے کہا۔

"PANIC میں پڑجائیں گی سب" محسن بولا۔

"نہیں یار۔ رابعہ اور گل ہر تجربے سے گزر چکی ہیں۔ نکی شاید گھبرائے..."

"وہ بھی ناواقف حالات نہیں ہے۔ اسے ہم سب سمجھاسکتے ہیں کہ ڈرنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ مقابلہ ہم کریں گے۔ وہ بوبی اور ...ے ساتھ جان بچا کے نکل جائے۔"

...ان سے کہو گاڑی کو پیچھے لے جائیں۔ پورچ میں ایک جیسی ...نظر نہیں آنی چاہئیں۔"

...محسن نیچے اُتر گیا "میں کرتا ہوں کچھ بندوبست۔"

محسن نے گاڑی کو باہر ہی روک لیا اور چابی رابعہ سے لے لی۔ ...بڑے خوش گوار موڈ میں تھیں اور محسن کے لیے بیک وقت ...کے تند و تیز جملوں کا اور حملوں کا تین طرف سے سامنا کرنا ...تھا چنانچہ اس نے ڈھٹائی سے کام لیتے ہوئے صرف مسکراتا ...رکھا اور کسی کو جواب دیے بغیر گاڑی میں بیٹھ گیا۔

"بڑے آئے تھے ہمیں بھوکا مارنے والے۔" نکی نے ہاتھ ...کہا "ہم ایسی زبردست دعوت اُڑا کے آئے ہیں۔"

"اور کیا" گل نے اس کی تائید کی "مگر اب تم کہاں جارہے ہو ...؟"

محسن نے کہا "شرم سے ڈوب مرنے جارہا ہوں۔ کوئی ...اعتراض؟"

رابعہ ہنسی "کوئی اعتراض نہیں لیکن اکیلے کیوں جارہے ہو۔ ...دوست کو بھی ساتھ لے جاؤ۔"

محسن نے انگلی سے اشارہ کیا "وہ اوپر سے کود کے جان دینے ...کے لیے تیار کھڑا ہے۔ انتظار کررہا ہے کہ زمین پھٹ جائے تو اس ...سما جائے۔"

ان تینوں نے ہنستے ہوئے ہاتھ ملایا "بڑی دیر سے شرم آئی۔ ...ت تو کافی ملا تھا ہمارے جانے کے بعد۔"

میں نے اوپر سے چلّا کے کہا "بہتر ہوگا اگر تم ہمیں معاف ...کردو۔ آخر ہم محبت کرتے ہیں تم سے۔ ہم میں سے دو تہائی کی ...غربت تمہارے مجازی خداؤں کی ہے۔ ایسے نمونے تمہیں پھر ...کہاں ملیں گے۔"

"اچھا جاؤ معاف کیا۔" نکی ہنس کے بولی۔

محسن گاڑی کو آگے لے گیا اور پھر گھما کے پچھلی گلی میں لے ...خواتین اپنے ساتھ آئس کریم لائی تھیں اور ان کا موڈ اتنا ...وار تھا کہ وہ سب بیک وقت بول رہی تھیں اور مسلسل کھی ...کررہی تھیں۔ ظاہر ہے اس شور میں وقار یوسف کیسے سوسکتا ...یہ رنگ محفل دیکھ کے میں نے بھی کوئی خوف زدہ کرنے والی ...پریشان کن بات کہنے سے گریز کیا اور محسن نے بھی کچھ نہیں کہا ...سب سے پہلے گل نے اور پھر رابعہ نے تاڑلیا کہ ہم زبردستی ...ہنس رہے ہیں اور اخلاقاً مذاق میں بھی شریک ہیں ورنہ اندر سے ہمیں ...کوئی فکر کھائے جارہی ہے۔ "تم کچھ چُھپا رہے ہو؟" گل ...نے بالآخر پوچھا۔

رابعہ نے کہا "ہاں کیا بعد میں ایسی کوئی بات ہوئی تھی؟"

...نکی نے کہا "بات، بات تو کچھ بھی نہیں۔"

...محسن بولا "اور ہوگی تو ہم تم سے چُھپائیں گے؟"

"جھوٹ بول رہے ہو تم دونوں" نکی نے دوٹوک لہجے میں کہا

اور پھر وقار کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

وقار نے جماہی لی "ایمان سے نکی' میں تو سو رہا تھا۔ تم نے ہی زبردستی جگا دیا ورنہ یہ کوئی وقت ہے آئس کریم کھانے کا۔"

اسی وقت کسی نے کال بیل بجائی اور ایک ساتھ میں اور محسن اُچھل پڑے۔ اب جھوٹ بولنے کی نہ گنجائش رہی تھی اور نہ اس کا کوئی فائدہ تھا۔ ہمارا رویہ خود ہمارے خوف اور اضطراب کی چغلی کھا رہا تھا۔

میں نے ایک دم ریوالور نکال لیا اور کھڑا ہو گیا "تم ٹھہرو۔"

رابعہ نے ڈر کے کہا "کون آسکتا ہے اس وقت۔"

محسن نے گل کو ڈانٹا "یہ سوال جواب بعد میں کرنا۔ نکی تم جاؤ اندر روبی کے پاس۔ وقار تم بھی چلو۔"

وقار نے کہا "آخر بات کیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ تمہیں پہلے سے اندازہ تھا۔ کون آنے والا تھا؟"

میں نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کے دیکھا "ایک گاڑی ہے۔ پہلے کبھی دیکھی نہیں۔"

وقار اور محسن نے بھی جھانک کے دیکھا پھر میں ریوالور جیب میں ڈال کے اور اس پر اپنی گرفت رکھتے ہوئے باہر گیا۔ محسن نے مجھے کور کیا اور دس فٹ پیچھے ڈرائنگ روم کے دروازے پر ہی رُک گیا۔

گیٹ کے باہر صرف ایک شخص کھڑا ہوا تھا جو میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ اسے میں نے صرف ایک بار پہلے دیکھا تھا مگر اب میں اسے تاریکی میں بھی شناخت کر سکتا تھا۔ وہ شوکت علی رانا تھا مگر اس کا حلیہ بدلا ہوا تھا۔ اس وقت وہ نابینا نہیں تھا۔ بیش قیمت کار میں شوفر کے سوا کوئی نہیں تھا۔ اور وہ نیوی بلیو وردی میں اپنی جگہ منجمد بیٹھا ہوا تھا۔

میں نے چوکیدار کی طرح سلام کیا "کس سے ملنا ہے جناب؟"

اس نے بالکل بدلی ہوئی' بارعب اور بھاری آواز میں کہا "چوکیدار' ہم شوکت علی رانا ہیں۔ ایم این اے۔"

میں نے سر ہلایا اور پھر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"وہ خاتون وکیل' مس رابعہ قاری گھر پر ہیں" اس نے جیب سے ایک کارڈ نکال کے آگے بڑھایا۔

میں نے کارڈ لینے کی کوشش نہیں کی "آپ گھر بھول گئے ہیں شاید۔ یہاں وقار یوسف ایڈووکیٹ رہتے ہیں۔"

"ہم جانتے ہیں۔ لیکن مس رابعہ قاری یہاں بھی ہوتی ہیں۔۔۔"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "وہ اپنے آفس میں ہوتی ہیں یا پھر منظر ایڈووکیٹ کے گھر۔"

"تم کیوں فضول بحث کر رہے ہو ہم سے۔ ہمیں معلوم ہے کہ وہ اس وقت یہاں ہیں" اس نے رابعہ کی گاڑی کی طرف دیکھا "جا کے کارڈ دو انہیں اور کہو کہ ہم زیادہ وقت نہیں لیں گے۔ معاملہ اہم تھا اس لیے ہم آنا پڑا۔"

میں نے کارڈ لے لیا۔ "رانا صاحب۔ میں کارڈ وقار یوسف صاحب کو جگا کے دے دیتا ہوں۔ آپ ان سے بات کر لیں۔ یہ [illegible] آپ مانتے نہیں کہ مس رابعہ یہاں نہیں ہیں۔ یوسف صاحب بہت ناراض ہوں گے مجھ پر۔۔۔"

شوکت رانا گیٹ کے باہر کھڑا ہوا خود کو بے عزت محسوس کر رہا تھا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ ایم این اے کا [illegible] مرعوب کرنے کے لیے کافی ہوگا اور میں اسے بصد احترام اندر لے جا کے ڈرائنگ روم میں بٹھاؤں گا مگر میں نے ایک فرض شناس چوکیدار کی حیثیت سے گیٹ کو مقفل ہی رکھا تھا جیسے مجھے اس کے ممبر نیشنل اسمبلی ہونے پر شک ہے۔

چند منٹ کی کانفرنس میں ہم نے طے کر لیا کہ شوکت رانا کے ساتھ کیا سلوک ہونا چاہیے۔

میں نے واپس جا کے کارڈ اسے واپس کر دیا "میری چھٹی کرادی آپ نے سر۔"

اس نے چیں بہ جبیں ہو کے کہا "کیوں" "کیا بات ہے؟"

"صاحب نے نوکری سے نکال دیا مجھے کہ تمہیں چوکیداری نہیں آتی۔ ہر ایرے غیرے کے لیے مجھے آدھی رات کو جگاتے ہو۔"

شوکت رانا کا چہرہ سُرخ ہو گیا "کیا!۔۔۔۔ میں ایرا غیرا ہوں؟"

"مجھے کیا معلوم جی آپ کیا ہو۔ میں تو ایک معمولی چوکیدار ہوں۔ میں نے تو کہا تھا کہ وہ بگڑ جائیں گے۔"

شوکت رانا آپے سے باہر ہو گیا "آخر کیا سمجھتا ہے وہ خود کو۔ کیا وہ گورنر سے بھی بڑی چیز ہے۔ ایک معمولی وکیل کی یہ مجال کہ رکن قومی اسمبلی سے بات تک نہ کرے جو خود چل کے اس کے دروازے تک آیا ہو۔ گیٹ تک نہ کھولا جائے اس کے لیے۔ میں سمجھ لوں گا اس سے۔"

میں نے رونی شکل بنا کے کہا "انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ مس رابعہ سے ملنا ہو تو آفس میں ملیں۔ شریف اور مہذب لوگ آدھی رات کے وقت کسی کے گھر ویسے بھی نہیں جاتے۔"

غصے میں شوکت رانا کا سانس اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ وہ غالباً بلڈ پریشر کا مریض تھا "سنو چوکیدار کیا یہ گاڑی اس کی نہیں ہے؟ رابعہ کی' ڈرو نہیں' تمہاری نوکری پکی۔ تم صبح میری کوٹھی پر آجاؤ۔" اس نے کارڈ پھر مجھے دے دیا۔

میں نے ڈرتے ڈرتے سر ہلایا "گاڑی تو۔۔۔ انہی کی ہے۔"

"اور وہ اندر بھی ہے؟" رانا نے رازداری سے پوچھا۔

میں نے اندر دیکھا اور پھر اقرار میں سر ہلا دیا۔ رانا نے احساس ذلت کو ختم کرنے کے لیے دانت پیس کے رابعہ کو ایک غلیظ گالی دی۔ "میں اسی کے فائدے کی بات کرنے آیا تھا مگر اس نے شاید مجھے چوہدری دلاور سمجھ رکھا ہے۔"

اس نے مزید بہت کچھ کہا کہ وہ کیا کر سکتا ہے اور ایک ایک کے ساتھ کیا کرے گا۔ ظاہر ہے اس کی یہ بکواس ڈرائنگ روم

کھڑکی کے پیچھے کھڑے ہوئے دوسرے سب لوگوں نے سنی۔ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس نے ایک بار پھر مجھ سے کہا کہ اگر صبح بھی وکیل صاحب اپنا فیصلہ نہ بدلیں تو میں بے جھجک ان کی کوٹھی پر پہنچ جاؤں۔ مجھے زیادہ بہتر تنخواہ ملے گی اور نوکری پکی ہوگی۔

میں رانا کی پیش کش پر سنجیدگی سے غور کررہا تھا کہ کیوں نہ کچھ دن اس کے ساتھ رہ کے دیکھا جائے مگر رابعہ متفکر تھی "یہ آدمی خطرناک ہے۔"

میں نے کہا "وہ بات یاد رکھو کہ جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں۔ دلاور اس کے برعکس انتہائی بے ضرر اور بے وقوف نظر آتا تھا۔ خود کو جاہل اور لاعلم تسلیم کرتا تھا اور اپنی حیثیت کا اظہار نہ لہجے سے ہونے دیتا تھا اور نہ رویئے سے۔"

"مگر وہ ایم این اے بہرحال ہے۔"

"پھر کیا ہوا؟ یہ اس کا حلقۂ انتخاب یا کوئی گاؤں دیہات نہیں ہے جہاں وہ من مانی کرتا پھرے۔ زبانی دھمکی دینا اور بات ہے' کیا وہ جانتا نہیں کہ اس کا واسطہ کن لوگوں سے ہے۔"

رابعہ قائل نہیں ہوئی "تم نے وقار یوسف کے لیے پریشانی کا سبب تو پیدا کردیا۔ کیا حرج تھا اگر میں اس سے مل کے بات کرلیتی۔ پتا چل جاتا کہ وہ کیا بات تھی جس نے اسے آدھی رات کو یہاں آنے پر مجبور کردیا تھا۔"

"بات اور کچھ نہیں ہوسکتی۔ مجھ سے شرط لگالو۔ وہ تم سے پوچھتا سکندر کے بارے میں اور یہ کہتا کہ میں سکندر سے معاملات طے کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے دلاور کو قتل کردیا ہے تو ٹھیک ورنہ اب قتل کردے۔ قانون کے چکر میں نہ پڑے۔ دلاور قانون کی گرفت سے صاف بچ نکلے گا۔"

محسن نے میری تائید کی "اصل فکر اسے یہ لاحق ہوگی کہ سکندر نے ہی دلاور کی بیوی کو قید سے رہائی دلائی ہے یا یہ کسی اور کا کام تھا۔ اگر سکندر نے ایسا کیا ہے تو سودا ہوسکتا ہے۔ وہ دلاور کی بیوی کو اس کے حوالے کردے یا بتادے کہ وہ کہاں ہے؟ اور بدلے میں پیڈرو کے علاوہ کاروبار میں برابر کی شراکت قبول کرلے۔ اپنے باپ کے حصّے کا مالک بن جائے۔"

میں نے کہا "جو حق مجھے قانونی طور پر مل سکتا ہے وہ میں غیر قانونی حربے استعمال کرکے کیوں لوں۔ دلاور کو مارنا تو اتنا ہی آسان ہے جتنا چوہے دان میں پھنس جانے والے چوہے کو ہلاک کرنا مگر میرا نام بھی سکندر نہیں اگر میں نے اسے قانون کے ہاتھوں تختۂ دار تک نہ پہنچایا۔"

اچانک وقار یوسف بولا "یہ تو کوئی جعلساز تھا۔"

میں نے چونک کراسے دیکھا "میں اسے پہچانتا ہوں' وہ رانا ہی تھا۔"

وقار نے کارڈ میری طرف پھینک دیا "مگر وہ ایم این اے نہیں ہے' یہ کارڈ دیکھو' اس پر لکھا ہوا ہے ایم شوکت رانا۔ اس کا نام تو شوکت اے رانا ہو سکتا تھا۔"

"حرام زادہ" میں نے بے اختیار کہا "ہم سے جعلسازی۔"

محسن نے کارڈ دیکھ کے کہا "واقعی۔ یہ کارڈ شوکت علی رانا کا نہیں ہوسکتا اگر اس کا یہی نام ہے۔"

"اب تو میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ایم شوکت رانا بھی کسی ایم این اے کا نام نہیں ہوگا۔" وقار یوسف بولا "اس نے ایک احمقانہ کوشش کی تھی ہمیں مرعوب کرکے اپنا مطلب نکالنے کی۔ ناکامی نے اسے مشتعل کردیا اور وہ اپنی اوقات پر آگیا۔ اب ایک کل وہ صاف انکار کردے گا کہ وہ یہاں آیا تھا۔"

میں نے کہا "میں اس کا گیم سمجھ گیا۔ پہلے اس کے آدمی جائزہ لے کر یہی رپورٹ دینے آئے تھے کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ رانا صاحب بات کرسکتے ہیں اور کوشش کرنے میں حرج ہی کیا ہے۔ اس عورت کا پتا لگانا بہت ضروری ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی خطرہ بنے۔"

"یہ رانا تو میری توقع سے کہیں زیادہ بودا ثابت ہوا۔ اس نے مایوس کیا مجھے بھلا ایسی حرکتوں سے ہم متاثر ہوسکتے ہیں۔ دلاور نے کبھی ایسی اوچھی حرکت نہیں کی جب وہ ڈراما کرتا ہے تو کمال کرتا ہے۔ خیر' ابھی تو ہم چلتے ہیں۔"

"کہاں چلتے ہیں؟" نکی نے کہا۔

"ڈیوٹی پر جانا ہے بھائی' چوکیدار ہوں میں ایک بلڈنگ کا۔"

"ایک رات نہیں جاؤ گے تو بلڈنگ چُرا کے اپنے گھر نہیں لے جائے گا کوئی۔" نکی نے کہا "ذرا دیکھو گھڑی میں کیا وقت ہوا ہے؟"

"میری گھڑی میں ایک بجا ہے" میں نے کہا۔

محسن بولا "میری گھڑی میں ایک نہیں بجا ہے۔ ہے نا کمال کی بات۔"

ہم نے سب کے احتجاج کو مسترد کردیا اور گلی کے پچھلے حصے میں کھڑی ہوئی گاڑی لے کر روانہ بھی ہوجاتے لیکن نکی نے ہاتھ کی صفائی دکھائی اور اچانک معلوم ہوا کہ کسی بھی گاڑی کی چابی نہیں مل رہی ہے۔ اس نے رابعہ اور گل کو شاید بتادیا تھا کہ چابیاں اس نے کہاں چھپائی ہیں۔ وہ سب بالکل انجان بن گئی تھیں لیکن ان کی ہنسی رو کے نہیں رکتی تھی۔

میں نے کہا "رابعہ' تمہاری گاڑی تو یہیں کھڑی ہوئی تھی۔"

"پتا نہیں۔ گاڑی سے پوچھ لو۔ میں تو ابھی ان سب کے ساتھ ہی آئی ہوں" رابعہ بولی۔

"چابی کہاں رکھتی ہو تم یار" میں نے جھلا کے کہا۔

"جہاں میرا جی چاہے رکھ دیتی ہوں۔ کل رات چائے کی پتی والے ڈبے میں رکھی تھی۔ پرسوں منظر کے پرانے جوتے میں جو ماگھر کی چھت پر بنے ہوئے پانی کے ٹینک پر رکھ دیا تھا۔"

نکی نے کہا "میں بھی ایسا ہی کرتی ہوں۔ چابی سامنے ہی رکھی جائے نا تو خطرہ ہوتا ہے کہ چور کو آسانی سے مل جائے گی۔"

"اچھا۔ آج اپنی گاڑی کی چابی تم نے کہاں رکھی ہے جاؤ

شاباش نکال لاؤ وہیں سے۔" میں نے نکی سے کہا۔

اس نے سر کھجا کے سوچا "کبھی بھول بھی جاتی ہوں میں۔"

"جیسے اس وقت بھول گئی ہو" رابعہ نے کہا "کوئی بات نہیں' صبح ڈھونڈ لینا' مل جائے گی۔"

"ہاں ملے گی کیوں نہیں۔ اس گھر میں آج تک ایک سوئی گم نہیں ہوئی مجھ سے۔ سکندر' تم اطمینان سے چابیاں تلاش کرو۔"

"ہاں۔ ہم تو سونے جارہے ہیں بھئی" گل نے کہا۔

"جاتے وقت دروازہ باہر سے لاک کرجانا" رابعہ بولی۔

میں نے محسن کو گھور کے دیکھا "تو نے گاڑی پیچھے کھڑی کی تھی۔ کہاں لا کے رکھی تھیں چابیاں۔"

"تیرے سامنے ہی تھیں مگر اب نہیں ہیں تو کیا ہوسکتا ہے۔" محسن نے ٹھنڈی سانس لی "یہاں بھوت کوئی نہیں مگر چڑیلیں ہیں۔ جو چیز وہ غائب کردیں وہ کہاں مل سکتی ہے۔"

میں نے بے بسی سے کہا "خادم حسین انتظار کررہا ہوگا۔"

نکی نے اپنی بے سری آواز میں گایا "ساری رات ترا تکنی آں راہ....."

رابعہ ہنسی "ہائے بے چارہ مولوی خادم حسین۔ کتنا خیال ہے تمہیں اس کا۔ ہے بھی تو اتنا پیارا سا بھولا بھالا کاٹھ کا الو۔"

"رابعہ۔ مجھے صبح اٹھ کے بھاگنا پڑے گا۔ اور یہ چوکیدار کی وردی پہن کے سونا پڑے گا۔"

نکی نے فوراً مسئلے کا حل پیش کردیا "وقار کے کپڑے ہیں نا۔ ویسے اگر تم صبح صبح بھاگنا چاہو تو اسپورٹس شوز بھی مل جائیں گے۔"

"اب رہنے دو۔ زیادہ نخرے مت دکھاؤ" رابعہ نے کہا "مجھے پتا ہے مولوی خادم حسین کیسے گھوڑے بیچ کے سوتا ہے۔ ایک رات تم نے پتھر مار مار کے دفتر کے سارے شیشے توڑ دیے تھے تو وہ اُٹھا تھا۔ کیا وہ اتنا بھی نہیں کرسکتا کہ ایک دن صبح اٹھ کے مین گیٹ کا تالا کھول دے۔"

"لیں.... اٹھتا تو وہ علی الصباح ہوگا نماز کے لیے" گل نے کہا۔

ظاہر ہے اس کے بعد مزید دلائل اور ضد کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ وقار پہلے ہی سونے چلا گیا تھا۔ میں نے اور محسن نے ڈرائنگ روم کے صوفوں پر ڈیرا ڈال لیا۔ کچھ میرا ذہن منتشر خیالات کی آماج گاہ بنا ہوا تھا۔ کچھ صوفے کی محدود چوڑائی پر سونا ریلوے برتھ پر لیٹنے کے مترادف تھا۔ میں نے کپڑے بھی نہیں بدلے تھے اور چوکیدار کی وردی میں بالکل ایزی نہیں تھا۔ اوپر سے مچھر مسلسل یلغار کررہے تھے۔ ان کے کاٹنے پر مجھے اعتراض نہ ہوتا مگر وہ ایک ساتھ میرے کان میں بین بجانا چاہتے تھے۔ پھر محسن نیند میں کروٹ لینے سے فرش پر گرا' اٹھ کے پھر لیٹا اور دس منٹ بعد پھر بھد سے نیچے۔

میں نے ہنس کے کہا "یہ اچھا ہے بیٹے۔ بیک وقت صوفے پر اور قالین پر سونے کا مزہ لو۔ دس منٹ اوپر دس منٹ نیچے۔"

اس نے زیر لب کچھ کہا اور کشن سر کے نیچے لگا کے قالین پر ہی لیٹ گیا "کون اُلو کا پٹھا سو رہا ہے۔ اسے سونا کہتے ہیں' پھر یہ مچھر....."

"ہم میں سے ایک سو سکتا ہے۔ اگر دوسرا مچھر مارتا رہے۔ مچھر جہاں بھی بیٹھے اور میں تیری خاطر یہ کرسکتا ہوں دوست" میں نے اٹھ کے لائٹ جلادی "ہوشیار محسن۔ مچھر تیرے گال پر بیٹھا ہوا ہے۔"

"جوتے پڑنے چاہئیں ان مچھروں کو۔ ایسا کریں آپ سو جائیں آرام سے۔ میں جوتے مار مار کے....."

اس کی بات درمیان میں ہی رہ گئی۔ اچانک باہر سے کسی گاڑی کا دروازہ بند ہونے کی آواز آئی۔ گاڑی کا دروازہ بند ہونے کی ایک مخصوص آواز ہوتی ہے اور ہر گاڑی چلانے والا اپنی گاڑی کے دروازے کی آواز کو پہچان سکتا ہے حالانکہ فرق بہت معمولی ہوتا ہے۔ یہ آواز بھی پورچ میں کھڑی ہوئی گاڑی کے دروازے کی نہیں تھی۔ یہ بہت ہلکی سی مگر واضح آواز تھی جو سڑک کی طرف سے آئی تھی۔

"کون آیا ہے اس وقت" میں نے لائٹ بجھائے بغیر پردے کا ایک کونا ہٹا کے باہر دیکھا۔ خود بخود میرا ہاتھ ریوالور پر چلا گیا تھا۔

"انجن کی آواز تو سنائی نہیں دی تھی" محسن میرے قریب آگیا۔

"انجن انہوں نے پہلے ہی بند کردیا ہوگا۔ یہ تو وہی چاروں ہیں۔"

"لائٹ بجھادوں میں؟"

"نہیں۔ اب نہیں۔ وہ محتاط ہوجائیں گے کہ کوئی جاگ رہا تھا۔"

میں نے دو افراد کو گیٹ کے اوپر سے کود کے اندر آتے دیکھا۔ باقی دو نے دیوار پر سے ایک سلنڈر انہیں تھمایا۔ یہ چھ سات فٹ لمبا ویسا ہی گیس سلنڈر تھا جیسا کہ ویلڈنگ کرنے والے استعمال کرتے ہیں۔ ان کے عزائم خطرناک معلوم ہوتے تھے۔

محسن نے دوسری کھڑکی سے جھانکتے ہوئے کہا "یہ زہریلی گیس لائے ہیں۔ ہم سب کو ہلاک کرنے کے لیے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "زہریلی گیس ہوتی تو یہ خود بھی ماسک پہن کر آتے۔ اور زہریلی گیس امونیا ہو یا کلورین ہو' سلفر ڈائی آکسائڈ ہو تو اس کی بہت تیز بو ہوتی ہے۔ ایک دم پتا چل جاتا ہے... زیادہ خطرناک قسم کی بغیر بو والی گیس آسانی سے ملتی بھی نہیں اور بنتی بھی نہیں۔"

"پھر یہ کیا..... اوہ' میں سمجھ گیا۔ یہ ہائیڈروجن گیس کا سلنڈر ہوگا" محسن بولا "ایک چنگاری کافی ہوگی دھماکے کے لیے۔ پورا گھر اُڑ جائے گا۔"

"اب دیکھو یہ سلنڈر کہاں رکھتے ہیں" میں نے کہا۔

پورچ لائٹ کی روشنی میں غور سے دیکھنے پر مجھے اندازہ ہوا کہ ان چاروں میں سے دو چہرے نئے تھے۔ ریوالور ان سب کے ہاتھوں میں تھے اور وہ بڑی بے خوفی سے اندر آگئے تھے۔ میں نے اور محسن نے انہیں سائڈ کی گیلری سے سلنڈر اُٹھا کے پیچھے جاتے دیکھا۔ میں نے محسن کو سامنے نظر رکھنے کی ہدایت کی اور خود لاؤنج سے گزر کے کچن کی طرف چلا گیا۔ کچن کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں نے آواز کیے بغیر اس کی کنڈی کھول دی اور اندھیرے میں پوری احتیاط سے چلتا ہوا واپس آگیا۔ میری توقع کے مطابق وہ کچن سے گزر کے لاؤنج میں آگئے۔ تینوں بیڈ روم لاؤنج کے آس پاس تھے اور سب کے دروازے بند تھے۔ لاؤنج ہی وہ مرکزی جگہ تھی جہاں سلنڈر رکھ کے گیس چھوڑی جاسکتی تھی۔ اندر سونے والوں کو پتا بھی نہ چلتا کیونکہ یہ گیس ہوا سے بہت ہلکی ہے اور اوپر اُٹھتی ہے۔

دو افراد سلنڈر پہنچا کے واپس باہر لوٹ گئے تھے۔ باقی دو میں سے ایک بجلی کے دو تار پلگ میں لگا رہا تھا اور تاروں کے لچھے کو کھڑکی سے گزار کے باہر تک پھیلا رہا تھا۔ تار یقیناً اتنا لمبا تھا کہ سڑک تک پہنچ جائے۔ گیس کھول کے وہ باہر نکل جاتے اور گاڑی اسٹارٹ کرکے دونوں تاروں کو صرف ایک بار آپس میں ملاتے تو اندر اسپارک ہوتا اور لاؤنج میں بھری ہوئی ہائیڈروجن گیس دھماکے سے آگ پکڑلیتی۔ اس کے ساتھ ہی گیس سلنڈر بم کی طرح پھٹ جاتا اور اس گھر کے مکین شعلوں کے ساتھ جل کے اسی گھر کی دیواروں کے ملبے میں دفن ہوجاتے۔ صبح کون کہے بتاتا کہ اس واردات کے پیچھے کس کا ہاتھ تھا۔ غالب اور تازو خود قید میں مجبور اور بے بس تھے۔ اکیلا منظر کس کس پر ہمارے قتل کی فرد جرم عائد کرتا۔

میں ایک پردے کے پیچھے ساکت کھڑا ہوا موقع کے انتظار میں تھا۔ تار لگانے والا اندازے سے تار کو ایک جگہ باندھ کے واپس کچن کی طرف گیا تھا اور اب شاید تار کو گیلری سے گیٹ تک پھیلا رہا تھا۔ گیس سلنڈر درمیان میں رکھنے والے نے اس کا والو چیک کیا اور سلنڈر کو فرش پر لمبا لٹانے لگا۔

یہی وہ موقع تھا جب میں اس پر جست لگا سکتا تھا۔ میرے اور اس کے درمیان دس فٹ کا فاصلہ تھا اور مجھے خود کو ان چیزوں سے بھی بچانا تھا جو بیچ میں رکھی ہوئی تھیں۔ یہ بھی انتہائی ضروری تھا کہ اسے حلق سے آواز نکالنے کا موقع بھی نہ ملے۔ یہ سب کارروائی مشکل سے دس منٹ کی تھی اور وہ جس رفتار سے کام کررہے تھے اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ شاید دس منٹ سے پہلے ہی وہ بہت دور نکل جاتے۔ اس وقت تک وقار یوسف کا گھر آگ اور ملبے کے ڈھیر میں تبدیل ہوچکا ہوتا اور کوئی بتانے والا نہ ہوتا کہ یہ سب کس نے کیا تھا؟

میں نے خدا کا نام لے کر اور سانس روک کے چھلانگ لگائی۔ میں تقریباً اُڑتا ہوا گیا تھا لیکن ایک مشینی مہارت کے ساتھ اس پر گرتے ہی میرے ہاتھوں نے اس کے گلے کو جکڑلیا تھا اور اس کا جسم میری ٹانگوں کے شکنجے میں آگیا تھا۔ اسے سانس لینے کی مہلت بھی نہیں ملی اور میں نے اس کی گردن توڑدی۔ پھر میں اس کی لاش کو دبوچ کے صوفے کے پیچھے لے گیا۔ میرا ارادہ ہرگز اسے قتل کرنے کا... نہیں تھا مگر جلدی میں اس کی گردن پر ذرا سخت ہاتھ پڑگیا۔ دیکھنے میں وہ اچھا صحت مند نظر آتا تھا اور اس کی گردن بھی اتنی کمزور نہیں لگتی تھی۔

بجلی کے تار لگانے والا بھی فوراً ہی نمودار ہوگیا۔ لگتا تھا کہ وہ خود بھی بجلی سے چلتا ہے۔ وہ بے حد پھرتیلا اور پارے کی طرح مضطرب تھا۔ اس کے اندر بھی کسی مرغ بسمل کی روح ہوگی۔ دو تاروں کو کاٹ کر چھیلتے ہوئے اس نے ادھر اُدھر دیکھا۔

"ابے کدھر چلا گیا۔ کلو، کالی رات تو نہیں کھا گئی تجھے۔ جلدی کر بیٹے جلدی۔ میرا کام تو تمام ہوگیا۔ ابے بولتا کیوں نہیں کدھر ہے۔ کیا سلنڈر میں گھس گیا؟ گیس کے ساتھ نکلے گا غبارے کی طرح پھول کے۔ اُڑ کر چھت سے لگ جائے گا سالے۔"

میرا اندازہ درست تھا۔ اس میں ہائیڈروجن گیس ہی تھی جو اوپر اُڑنے والے غباروں میں بھری جاتی ہے۔ اس گیس میں نہ بو ہوتی ہے اور نہ اس کے کوئی مضر اثرات ہیں لیکن سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ خفیف سا شعلہ بھی ملے تو دھماکا۔ اس لیے اب ہیلیم گیس کو زیادہ محفوظ اور قابلِ ترجیح سمجھا جاتا ہے۔

الیکٹریشن بہت آہستہ بول رہا تھا مگر اس کے الفاظ میرے کانوں تک صاف پہنچ رہے تھے۔ تینوں بیڈ روم اس لیے بھی بند تھے کہ اندر ائرکنڈیشنرز چل رہے تھے۔ ایک میں وقار اور اس کی بیوی تھے۔ دوسرے میں گل اور بوبی۔ تیسرے میں رابعہ اکیلی تھی۔ محسن میری وجہ سے گل کے بیڈ روم میں نہیں تھا اور میں اس بیڈ روم میں نہیں سونا چاہتا تھا جہاں اکیلی رابعہ ہو۔ یہ خیال ہم میں سے کسی کو نہیں آیا کہ گل کے ساتھ ہی رابعہ سوجاتی تو ہم دونوں ڈرائنگ روم میں خوار نہ ہوتے، صوفے پر سے قالین پر نہ لڑھکتے اور مچھروں کی سمع خراشی سے محفوظ رہتے مگر بات وہی ہے کہ بعض اوقات خرابی میں چھپی ہوئی اچھائی کو انسان کی نظر نہیں دیکھ سکتی۔ یہ سب نہ ہوتا تو ہمیں ہائیڈروجن بم سے اُڑانے والوں کی آمد کا پتا بھی نہ چلتا، پتا چلتا اچانک خود کو دوسری دنیا میں پانے کے بعد۔

بجلی والے کو میں نے مرغی کے چوزے کی طرح پکڑلیا۔ وہ تھا بھی مختصر سا اور چوں چوں کرنے والا۔ وہ تھوڑا سا پھڑپھڑایا مگر میری گرفت سے نہ نکل سکا۔ میں نے ایک ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا تھا تاکہ اس کی آواز نہ نکل سکے۔ اس ہاتھ کے حلقے میں اس کی گردن بھی تھی۔ دوسرا ہاتھ میں نے اس کے شانے پر گردن کے قریب مارا تو وہ آخری بار تڑپ کے ساکت ہوگیا۔ میں نے اسے کلو کے قریب ڈال دیا اور ڈرائنگ روم سے گزر کے ٹیرس میں آگیا جہاں محسن مورچہ بند تھا۔

باہر کھڑے ہوئے دونوں مسلح افراد کے ہاتھوں میں خطرناک قسم کا خود کار اسلحہ تھا۔ ان میں سے ایک پورچ میں آگیا تھا اور باربار گیلری کی طرف جھانک کر گھڑی دیکھ رہا تھا۔ شاید اس کو یہ پریشانی لاحق ہونے لگی تھی کہ اندر جانے والے ابھی تک لوٹ کر نہیں آئے تھے۔ اسے معلوم ہوگا کہ یہ کام چند منٹ کا ہے۔ اس نے تار نصب کرنے والے الیکٹریشن کی پھرتی بھی دیکھی ہوگی لیکن اس کے بعد غیر معمولی تاخیر ہورہی تھی۔

دوسرا محافظ گاڑی کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ اس نے شک سے بچنے کے لیے بونٹ اُٹھادیا تھا اور بظاہر وہ انجن میں کوئی خرابی تلاش کررہا تھا لیکن اس کی نظر بھی مسلسل اندر کی طرف تھی۔ اس کا اسلحہ یقیناً سامنے ہوگا مگر مجھے نظر نہیں آرہا تھا۔ ابھی تک اندر مکمل خاموشی تھی چنانچہ باہر والے مطمئن تھے کہ سب کام ٹھیک ہورہا ہے۔

میں بھی اب تک کی کامیابی سے مطمئن تھا اور یہی چاہتا تھا کہ باقی دو کو بھی اسی طرح پکڑلیا جائے۔ اندر کام کرنے والے تخریب کار جو اپنی حفاظت کرنا نہیں جانتے تھے مگر وہ اپنے کام کے ماہر سمجھے جاتے ہوں گے۔ رانا کے علم میں ایسے تمام افراد کے نام پتے ہوں گے جو وقت اور حالات کی ضرورت کے مطابق تخریب کاری، دہشت گردی، قتل اور خونریزی، ڈکیتی اور اغوا جعلسازی اور دھوکے بازی اور ہر طرح کی مجرمانہ سرگرمیوں کے لیے اپنی ماہرانہ خدمات پیش کرنے کے لیے تیار ہوجائیں۔ ایسے لوگ ہر دور میں ہر ملک اور قوم میں ہر جگہ اور ہر زمانے میں صرف سکہ رائج الوقت میں فروخت کے لیے دستیاب رہتے ہیں۔ ان کا ضمیر، ایمان، اخلاق اور مذہب، اصول اور قانون صرف پیسہ ہوتا ہے اور سب رشتے صرف پیسے کے رشتے ہوتے ہیں۔ خون کے رشتے، ہمسائیگی اور خاندان کے رشتے، گلی محلے اور شہر کے رشتے، وطن کی مٹی کے رشتے اور انسان ہونے کے ناتے انسانیت کے رشتے ان کے لیے بے معنی ہوجاتے ہیں۔ ان شیطانی ماہرین کی حفاظت کے ذمّے دار بھی شیطان ہی تھے۔ وہ زیادہ خطرناک اس لیے تھے کہ ان کے ہاتھوں میں خطرناک اسلحہ تھا۔

میں نے کم سے کم الفاظ میں محسن کو اندر کے واقعات سے آگاہ کردیا۔ ہم تاریکی میں دیوار سے لگ کر کھڑے ہوئے تھے اور سرگوشی میں بات کرسکتے تھے۔

"ان کا منصوبہ یقیناً حیرت انگیز شیطانی ذہانت کا ثبوت ہے۔ کم خرچ آسان لیکن انتہائی تباہ کن مگر یہ لوگ خاصے بے وقوف ہیں۔ کتنی بے خوفی سے انہوں نے عین گھر کے سامنے گاڑی کھڑی کی اور دندناتے ہوئے اندر آگئے۔" میں نے کہا "گھر میں اتنے لوگ ہیں کوئی بھی جاگ رہا ہوتا تو انہیں دیکھ لیتا۔"

محسن نے کہا "میرا خیال ہے کہ یہ پہلے ہی سب کے معمولات کا مشاہدہ کرچکے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ اس وقت کوئی بھی بیڈ روم سے باہر نہیں ہوتا۔ گیٹ پر کوئی چوکیدار نہیں۔ اندر کوئی ملازم نہیں۔ ائرکنڈیشنرز کی وجہ سے کمروں کے دروازے کھڑکیاں مکمل طور پر بند رہتے ہیں اور لاؤنج میں وہ کسی کی دخل اندازی کے خطرے سے بے نیاز ہوکے اپنا کام کرسکتے ہیں۔ دس پندرہ منٹ کیا اس میں ایک گھنٹا بھی صرف ہوجائے تو کچھ نہیں ہوگا۔"

میں نے کہا "وقار کو گیٹ پر ایک مسلح گارڈ ضرور رکھ لینا چاہیے۔ اپنی حفاظت کے لیے چار پانچ سو روپے ہر مہینے خرچ کرنا اس کے لیے کیا مشکل ہے۔"

"آج گیٹ پر چوکیدار ہوتا تو سب سے پہلے وہی مارا جاتا۔ گاڑی بالکل سامنے لاکے روکنا ان کی مجبوری تھی۔ یہ گیس کا بھاری سلنڈر اُٹھا کے زیادہ فاصلہ طے نہیں کرسکتے تھے" محسن نے کہا۔

لاؤنج میں کھڑا ہوا گارڈ وہی شخص تھا جسے میں وزیر خان اسپتال میں بھی دیکھ چکا تھا۔ وہاں اس کا رویّہ بالکل مختلف تھا۔ اس نے خود کو ایک احمق، لالچی اور ڈرپوک آدمی کے روپ میں پیش کیا تھا جبکہ یہاں وہ ایک جری، سفاک اور خوں آشام قاتل کا کردار ادا کررہا تھا اور یقیناً اس کا اہل ہوگا ورنہ اسے یہ ذمے داری ہی نہ سونپی جاتی۔

تقریباً یہی صورت حال دوسرے شخص کی تھی جو باہر گاڑی پر جھکا ہوا تھا۔ جب وہ ریڈیو ٹیلی فون پر میری آواز سن کے پوچھتا تھا کہ "کون؟" اور میں جواب دیتا تھا کہ "تمہارا باپ" تو اس کی آواز میں کاہلی اور غنودگی ہوتی تھی۔ وہ مجھے اس طرح شناخت کرتا تھا اور پھر میری بات دلاور سے کرادیتا تھا۔ افیونی اور کاہل نظر آنے والا یہ شخص مجھے "سی ڈی انٹرپرائز" میں بھی ملا تھا اور وہاں بھی اس کی شخصیت کا تاثر کچھ مختلف نہیں تھا۔ میں نے اسے بہ آسانی ناک آؤٹ کردیا تھا مگر یہاں اسے ایک خاص مشن پر بھیجا گیا تھا تو اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ بھی ہلاکو خاں سے کم نہیں۔

ان دونوں نے آتشیں اسلحہ محض نمائش کے لیے نہیں اُٹھا رکھا تھا۔ وہ اس کو ضرورت کے وقت پوری مہارت کے ساتھ استعمال کرنا یقیناً جانتے ہوں گے۔ پیشہ ور قاتل اور دہشت گرد اور تربیت یافتہ کمانڈوز کی کامیابی کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ انتہائی پُرسکون رہتے ہیں اور صورت سے ذرا بھی خطرناک نظر نہیں آتے۔ انہیں قتل عام بھی کرنا پڑے تو ان کے اعصاب یا ذہن پر کوئی ناخوش گوار ردِ عمل اثر انداز نہیں ہوتا۔ وہ سو آدمی مار کے سکون سے سوسکتے ہیں اور پیٹ بھر کے کھانا کھاسکتے ہیں۔ ہنسی مذاق کرسکتے ہیں اور موسیقی سے لطف اندوز ہوسکتے ہیں۔

باہر والے گارڈ نے گیٹ کے قریب آکے اندر والے سے کچھ کہا۔ ان کی بے چینی میں ہر لمحہ اضافہ ہورہا تھا۔ وہ پریشان ہونے لگے تھے کہ اندر اتنی خاموشی ہے اس کے باوجود وہ دونوں ابھی تک واپس نہیں آئے جو کہتے تھے کہ کام تو مشکل سے پانچ منٹ کا ہے۔ پانچ کے دس منٹ ہوسکتے تھے مگر انہیں تو اندر گئے ہوئے پندرہ منٹ سے بھی زیادہ گزر چکے تھے۔

بالآخر انہوں نے میری توقع کے مطابق وہ غلطی کی جو ناگزیر ہو چکی تھی۔ باہر والا محافظ لاؤنج میں آگیا اور جو لاؤنج میں پہرا دے رہا تھا وہ گیلری کی طرف بڑھا۔

میں نے محسن سے کہا "میں ذرا ان سے بھی ملاقات کرلوں۔"

میں دوبارہ ڈرائنگ روم سے گزر کے لاؤنج میں پہنچا اور کچن کے طرف سے آنے والے راستے پر انتظار کرنے لگا۔ کچن کی کھڑکی کے شیشے پر مجھے اس کا دھندلا سا سایہ دکھائی دیا اور چند سیکنڈ بعد اس کا ہیولا کچن کے کھلے دروازے میں نمودار ہوا۔ پس منظر کی ہلکی سی روشنی میں اس کی حرکات وسکنات خاصی واضح تھیں۔ وہ عملاً پھونک پھونک کے قدم رکھتا آرہا تھا۔ آدمی کی چھٹی حس بھی ایسی صورت حال میں پوری طرح بیدار ہو جاتی ہے۔ مجھے وہ سب اُلو کے قبیلے والے لگتے تھے۔ کسی نے لائٹ جلانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی اور نہ کوئی اپنے ساتھ ٹارچ لایا تھا۔ پین ٹارچ کی روشنی اتنی محدود ہوتی ہے کہ قدموں میں ایک فٹ کا دائرہ بنتا ہے لیکن ان کی نظر اتنی تیز تھی یا انہیں سخت ہدایات [illegible] اپنا اپنا کام اندھیرے میں کر رہے تھے۔ اصل بات یہ تھی [illegible] اندر گھپ اندھیرا نہیں تھا۔ باہر پورچ میں روشنی تھی۔ پچھلی طرف کی گیلری روشن تھی اور آس پاس کے گھروں کا اجالا بھی منعکس ہو کے اندر پہنچ رہا تھا۔ باہر سے آنے والا ایک منٹ بعد تاریکی میں اس حد تک دیکھنے کے قابل ہو جاتا تھا کہ کسی چیز سے نہ ٹکرائے۔

وہ آگے بڑھا اور لاؤنج میں واش روم کے دروازے پر ٹھہر گیا "کلو" اس نے آہستہ سے کہا "کہاں ہو تم دونوں....."

اس نے ایک قدم اور آگے بڑھایا ہی تھا کہ میں نے اسے دبوچ لیا۔ یہ کام آسان نہیں تھا۔ وہ جاندار آدمی تھا اور اس نے مزاحمت بھی کی' دوبار اس نے پیچھے کی طرف کہنی ماری۔ ایک دفعہ تو میری پسلیوں میں ایسی ٹیس اٹھی کہ میرا سانس لینا دشوار ہو گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے اندھیرا زیادہ گہرا ہو گیا ہے اور میری گرفت اس پر ڈھیلی پڑ رہی ہے مگر یہ صرف ایک لمحے کا احساس تھا۔ میرا خوف تھا یا وہم تھا۔ دوسرے لمحے میں نے اپنی کہنی اس کی کمر پر ماری اور اسی کو آگے جھکنے پر مجبور کر دیا۔ وہ کوشش کر رہا تھا کہ پیچھے کی طرف دولتی جھاڑے اور میری ٹانگوں کے درمیان اپنے بوٹ کی ایڑی مارے۔ یہ چوٹ فیصلہ کن ثابت ہو سکتی تھی چنانچہ میں اس سے بھوت کی طرح چمٹا رہا اور اسے اپنے ساتھ چمٹائے رکھا۔ میری تمام تر جدوجہد کا مقصد خاموشی کے وجود کو برقرار رکھنا تھا۔ اب تک جو کچھ ہوا تھا اس کا علم نہ اندر سونے والوں کو ہوا تھا اور نہ باہر کھلی آنکھوں اور کانوں سے پہرے داری کرنے والوں کو۔

جب وہ رکوع کی حالت میں تھا تو میں نے اسے گھما دیا لیکن اس کی گردن قابو میں رکھی۔ ایسے بل کھانے سے اس کی گردن ٹوٹ سکتی تھی مگر مجھے گردن سے زیادہ خاموشی کے ٹوٹنے کا خیال تھا۔ اس نے کرب سے ایک بل کھایا اور درد کی شدت سے نیم جان ہو کے ڈھیلا پڑ گیا۔ میرا ایک ہاتھ اب بھی اس کے منہ پر مضبوطی سے جما ہوا تھا۔ اگر میں اس ہاتھ کو جھٹکا دیتا تو اس کا منکا ٹوٹ جاتا۔ میں نے دوسرے ہاتھ سے اس کی پتلون کو بیلٹ پر سے پکڑا اور اسے آگے دھکیلا۔ وہ آگے نہ بڑھتا تو وہیں الٹ جاتا اور اس کا سر فرش پر لگتا۔ آگے صوفہ تھا۔ وہ اس پر اوندھے منہ گرا اور میں نے اس کی کمر پر سوار ہو کے اس کا سر کونے میں گھسیڑ دیا۔ اس کا منہ پہلے ہی بند تھا۔ ناک سے ہوا جانے کا راستہ بھی بند ہو گیا تو وہ تڑپا اور میں اس کی گدی پر سر نہ مارتا تو وہ آزاد ہو جاتا۔ چوٹ میری پیشانی پر بھی آئی مگر اس کا ہلنا جلنا موقوف ہو گیا۔

میں نے ایک گہری سانس لی اور اسے چھوڑ دیا۔ یہ تیسرا شکار ذرا مشکل ثابت ہوا تھا لیکن خاموشی سے ہو گیا تھا۔ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ سونے والے ڈسٹرب نہ ہوں اور یہ کام ایسے ہو جائے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ صبح سب ٹھیک نظر آئے۔ کوئی یہ سوال بھی نہ کرے کہ کیا رات کو تم نے کچھ سنا تھا؟ کوئی آہٹ۔ کسی قسم کی کھٹ پٹ' کوئی آواز۔

میرا سانس پھول گیا تھا لیکن میں اس کامیابی پر بے حد خوش تھا جس میں میری کوشش سے زیادہ تائید ایزدی شامل تھی۔ یہ ہو سکتا تھا کہ ان میں سے کوئی چیخ مار دیتا یا کسی کی لات لگنے سے کوئی میز الٹ جاتی۔ مقابلے میں کوئی ڈیکوریشن پیس شہید ہو جاتا یا اس خبیث کے ہاتھ میں کوئی چیز آجاتی جو وہ دروازے پر کھینچ مارتا۔ پھر ایک ہنگامہ برپا ہوتا۔ نکی گل رابعہ میں سے صرف گل ہی لڑ بھڑ سکتی تھی مگر وہ بوبی کو سنبھالتی۔ نکی صرف چلاتی اور مس رابعہ زیادہ سے زیادہ پولیس کو طلب کرنے کے لیے فون گھماتیں۔ یہ کام وقار یوسف بھی کر سکتا تھا مگر پولیس کے آنے تک نہ جانے کیا ہو جاتا۔ وہ اپنے خود کار ہتھیاروں کا بے دریغ استعمال کرتے۔ انہیں یقیناً سختی سے منع کیا گیا ہو گا کہ وہ گولی نہ چلائیں لیکن یہ نہیں کہا گیا ہو گا کہ پکڑے جاؤ تب بھی ان ہتھیاروں کا استعمال نہ کرنا بلکہ خاموشی سے ہتھیار ڈال دینا۔

جب میں کچن کی طرف سے باہر آرہا تھا تو مجھے محسن ملا۔

"سب خلاص؟"

میں نے ہاتھ جھاڑ کے کہا "الحمدللہ۔ باہر کی کیا رپورٹ ہے؟"

محسن نے مجھے ریوالور دکھایا "یہ اسی کی جامہ تلاشی میں ملا ہے۔ وہ خود گاڑی میں لیٹا ہوا ہے۔"

"زندہ یا مُردہ؟"

"پتا نہیں۔ مجھے طبی معائنے کا خیال نہیں آیا۔ میں نے کپڑے دھونے والا ڈنڈا مارا تھا۔ کپڑا لپیٹ کے۔"

"وہ کہاں سے مل گیا؟"

"بس مل گیا۔ کہتے ہیں ڈھونڈنے سے خدا بھی مل جاتا ہے۔ بالکل صحیح جگہ پر لگا تھا۔ میں نے رسک نہیں لیا۔ پوری قوت سے وار کیا تھا۔"

"یہ خطرناک کام تھا۔ اس نے آواز نہیں نکالی؟"

اچانک محسن نے کہا "یار وہ تار تو رہ گیا۔"

میں نے سر پر ہاتھ مارا "اف۔ کیسی غلطی ہو جاتی۔ صبح کیا [illegible]نے کہ یہ تار کہاں سے آیا۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

[illegible] تار سمیٹ کر میں نے ڈرائنگ روم کی لائٹ بھی آف کی اور [illegible] بار پھر لاؤنج کی حالت پر غور کیا۔ کہیں کوئی چیز اپنی جگہ سے ہٹی [illegible] نہیں تھی کچن کا دروازہ بند کر کے میں ڈرائنگ روم کی طرف [illegible] باہر آگیا۔ جہاں محسن گیٹ بند کرنے کے لیے تیار تھا۔ چند [illegible] بعد ہم اس شاندار گاڑی میں سواری کا لطف اُٹھا رہے تھے۔ [illegible] ہوا کے دوش پر سرسراتی ہوئی بلکہ تیرتی ہوئی محسوس ہوتی [illegible] کاغذات کا معائنہ کر کے مجھ پر انکشاف ہوا کہ یہ ڈائریکٹر وزیر [illegible] اسپتال کے نام پر رجسٹر ہوئی ہے۔

میں نے محسن سے کچھ نہیں کہا تھا کہ ہمیں کہاں جانا ہے مگر وہ [illegible] گیا تھا کہ اس سامان کے ساتھ ہم کہاں جا سکتے ہیں۔ رات کے [illegible] تمام سڑکیں خالی تھیں اور محسن گاڑی کو خطرناک حد تک تیز [illegible] اڑا رہا تھا۔

میں نے اسے ٹوکا "گاڑی پرائی ہے مگر زندگی تو اپنی ہے۔"

اس نے رفتار دیکھ کے کہا "یار رفتار زیادہ تو نہیں۔ ایک سو [illegible] پاس کلومیٹر پر محسوس بھی نہیں ہوتا۔ ونڈر فل کار....."

"مگر یہ لاہور کی سڑکیں ہیں شیروانی صاحب' لندن کی نہیں۔ [illegible] اچانک کوئی کھلا مین ہول آجائے گا۔"

میری بات منہ سے نکلی اور سچ ہو گئی۔ گاڑی ایک دم اُچھلی۔ [illegible] ایک زبردست جھٹکے سے سلنڈر نے چھت کا کپڑا پھاڑ دیا اور غالباً [illegible] چھت کو بھی نقصان پہنچایا ہو گا۔ اوپر چھت میں گومڑ نمودار ہو گیا ہو گا۔ میرا سر ڈیش بورڈ پر لگا۔

محسن نے دانت نکال کے کہا "مین ہول تھا' گزر گیا۔"

"یہ کہو گُل کے میاں کہ تم نہیں گزرے۔ وہ ہوتی بیوہ' تیرا کیا جاتا؟" میں نے سر سہلا کے کہا۔

"بڑی کالی زبان ہے تیری۔ اچھا ہوا تُو نے پہاڑ یا ہاتھی نہیں کہا تھا ورنہ وہ بھی آجاتا سڑک کے بیچ میں۔ حد ہے یار' اتنی صاف سڑک پر کوئی سوچ سکتا ہے کہ گٹر کھلا پڑا ہو گا۔ بالکل بیچ میں۔"

"ہاں' میں سوچ سکتا ہوں۔ گٹر بیچ میں اسی لیے بنائے جاتے [illegible] اور اسی لیے کھلے رکھے جاتے ہیں کہ لوگ گاڑی آہستہ [illegible] یہ۔ اگر کنارے پر بناتے تو سائیکل والے غریب لوگ گرتے اور ان کے دانت ٹوٹتے تو نقلی دانت بھی وہ کیسے بنواتے۔ فٹ پاتھ [illegible] ہوتے تو پیدل چلنے والے ان میں گرتے۔ ہڈیوں کے وارڈ تو ویسے [illegible] بھرے پڑے ہیں۔"

محسن نے گاڑی کو سائڈ کی گلی میں روک دیا۔ رات کے تین [illegible] میں نے اس تہ خانے میں اتر کے دیکھا جہاں چوہدری دلاور قید [illegible] سو رہا تھا۔ میں ڈرا کہ کہیں وہ مر نہ گیا ہو مگر اس کی حالت [illegible] محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے پاس کھانے پینے کی چیزیں [illegible] تھیں۔ بوتل میں پانی بھی نہیں تھا۔ غالباً اس نے قید کو

"نکالی تھی۔ تو نے نہیں سُنی؟"

اگلے آدھے گھنٹے میں ہم نے اندر سے ایک لاش کو اور دو نیم مُردہ حملہ آوروں کو باہر پہنچایا۔ محسن کا شکار بھی اللہ کو پیارا ہو گیا تھا۔ اس طرح گاڑی کی ڈکی میں دو لاشیں سما گئیں اور دو قیدی پچھلی سیٹ پر ڈال دیے گئے۔ ہم نے ان کو اس طرح بنڈل بنا دیا تھا کہ وہ ہوش میں آنے کے بعد بھی حرکت نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے منہ ٹیپ سے سیل کر دیے گئے تھے جو وہ اپنے ساتھ ہی لائے تھے۔ گاڑی کے ایک خانے سے مجھے کسی بے رنگ محلول کی ایک شیشی بھی ملی جسے میں سونگھنے کی حماقت کرنے ہی والا تھا کہ محسن نے شیشی مجھ سے چھین لی۔

"ابھی پٹ سے گرے گا بے ہوش ہو کے۔ تیرہ طبق روشن ہو جاتے۔"

میں نے معصومیت سے کہا "یہ کیا ہے؟"

"یہ کلوروفارم بھی ہو سکتی ہے۔"

"اچھا۔ ڈیری فارم میں مویشی ہوتے ہیں اور پولٹری فارم میں مرغیاں۔ کلو کے فارم میں کیا ہوتا ہے۔"

"یہ لوگ پوری تیاری سے آئے تھے۔ اگر ضرورت پڑتی تو کلوروفارم سنگھا کے جاگنے والے کو سُلا دیتے اور منہ پر ٹیپ چپکا دیتے۔"

میں نے کہا "ہمیں مچھروں کا شکر گزار ہونا چاہیے جنہوں نے ہمیں سونے نہیں دیا اور مسلسل ہمارے کان میں گاتے رہے۔ جاگتے رہو' شکر تو نکی کو بھی ادا کرنا چاہیے کہ وہ صبح اٹھے گی تو اسے اپنا گھر اپنا سنسار سب اپنی جگہ ویسا ہی ملے گا جیسا گزشتہ شب تھا اس کے سونے سے پہلے۔ اور خدا کے بعد اسے ہمارا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ ہم نے اس کی مان لی تھی اور یہاں رُک گئے تھے۔"

"ہم کہاں مانے تھے" محسن ہنسا "اس نے منوالی تھی اپنی بات۔ اس کی قسمت بہت اچھی ہے یار۔"

میں نے کہا "ہاں۔ ابھی تک تو خوش قسمتی کا کوٹا چل رہا ہے۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔ جو آج نہیں ہوا وہ کل پھر نہ ہو تو اچھا ہے۔"

"اس لیے ضروری ہے کہ ہم فوراً اپنا کیمپ کہیں اور منتقل کردیں بلکہ کیمپ تو کہیں ہونا بھی نہیں چاہیے۔ آج یہاں کل وہاں' اس سے پہلے کہ دشمن ایک ٹھکانے کا سراغ لگائے ٹھکانا بدل دینا چاہیے۔"

"اب کیا خیال ہے' چلیں؟" میں نے گیس کے سلنڈر کو پچھلی سیٹ پر ترچھا ڈال دیا۔ سیدھے رُخ سیٹ کی چوڑائی اتنی نہیں تھی۔ سلنڈر کا اُٹھا ہوا حصہ چھت سے جا لگا۔ یہ بھی صرف اس لیے ممکن ہوا کہ وہ گاڑی "ڈاج ڈارٹ" تھی۔ بالکل نئی امریکن ماڈل ۱۹۷۱ء جس کے ڈیزائن نے شائقین کو دم بخود کر دیا تھا۔ یہ گاڑی اس وقت اکتیس ہزار کی تھی اور ظاہر ہے اسے خریدنا صرف رئیسوں کے بس کی بات تھی۔

ناگزیر حقیقت کے طور پر قبول کرنا سیکھ لیا تھا اور اپنی تقدیر پر قانع ہوگیا تھا۔ کمرے میں پیشاب پاخانے کی بو ناقابل برداشت تھی لیکن دلاور شاید اس کا بھی عادی ہوگیا تھا۔ میں نے موم بتی جلائی تو اس نے آنکھیں کھول کے مجھے دیکھا اور پھر سوگیا۔ اس کی داڑھی کے بال بہت بڑھ گئے تھے اور سر کے بال بھی مٹی کے رنگ کے ہورہے تھے۔ اس کے بدن پر ابھی تک وہی لباس تھا جو اس نے اسیری کے پہلے دن پہن رکھا تھا ظاہر ہے اس کی حالت بھی قابل رحم تھی لیکن دلاور کسی رحم کا مستحق نہیں تھا۔

نئے قیدیوں کی یہاں منتقلی انتہائی دشوار کام ثابت ہوا۔ وہ بے ہوش تھے انہیں میں نے اور محسن نے کندھوں پر ڈالا اور گاڑی سے اُٹھا کے اس خیمے تک لائے جو رابعہ کی پُرانی کوٹھی کے پلاٹ پر لگادیا گیا تھا۔ یہ شاید سو گز سے زیادہ فاصلہ تھا۔ مجھے سب سے زیادہ ڈر اس بات کا تھا کہ اگر کسی نے دیکھ لیا تو ہم کیا صفائی پیش کریں گے کہ یہ کون ہیں اور ہم انہیں اس طرح کہاں لے جارہے ہیں۔ ان کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے اور منہ میں بھی کپڑا ٹھنسا ہوا تھا ورنہ ہم کہہ سکتے تھے کہ وہ بیمار ہیں۔ حادثے کا شکار ہوئے ہیں یا کرنٹ لگنے سے بے ہوش ہوگئے ہیں اور ہم دیر نہیں کرسکتے تھے اس لیے سڑک تک خود ہی اُٹھا کے لے جارہے ہیں۔ وہاں سے کسی گاڑی میں ڈال کے اسپتال لے جائیں گے وغیرہ وغیرہ۔ یہ بات بھی اتنی قابل قبول نہ ہوتی کیونکہ اس علاقے میں ایمرجنسی کی صورت میں سب اپنی گاڑی استعمال کرتے تھے ورنہ پڑوس کے لوگ اپنی گاڑی دے سکتے تھے یا خود اسپتال پہنچا سکتے تھے۔

خیمے تک پہنچ کے میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ہماری پوزیشن مشکوک نہیں ہوئی ورنہ آج دلاور کے قید خانے کا راز بھی فاش ہوجاتا۔ اس وقت اگرچہ لوگ سوئے پڑے تھے مگر گشت کرنے والے چوکیدار، پولیس مین اور آوارہ گرد بہرحال جاگ رہے تھے۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ بے خوابی کا کوئی مریض یا اتفاقیہ راہ گیر ہمیں دیکھ لیتا۔

خیمے سے انہیں لکڑی کے باکس نما کیبن میں اور پھر خفیہ راستے سے زیرِ زمین قید خانے تک لے جانا بھی مشکل کام تھا مگر پُرخطر نہیں تھا۔ اوپر والا راستہ بند کرنے کے بعد میں نے اپنے آپ کو محفوظ تصور کیا اور ایک بار پھر ایمان لایا کہ یہ سب محض اتفاق نہیں تھا۔ نہ جانے کیوں مجھ گنہگار کو اس پروردگار کی تائید و حمایت حاصل تھی جس کے سامنے مجھے اپنی بندگی کا اعتراف کرتے ہوئے بھی شرم آتی تھی۔

محسن نے غور سے دلاور کو دیکھا جو اس کارروائی کے دوران جاگ اٹھا۔ اس نے کوئی سوال نہیں کیا تھا اور کسی دیوانگی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ وہ کچھ حیرت اور کچھ خوف کے ساتھ اپنی آنکھوں کی ویرانی میں سوال لئے بیٹھا تھا۔

"لوجی اپنے چوہدری صاحب" محسن نے اسی کے لہجے کی نقل کی "بہت دن اکیلے رہے تھے۔ اب کچھ اور خاص بندے آگئے ہیں تمہارے۔ انہیں پہچانتے ہوناں۔"

میں نے ان دونوں کے ہاتھ پیر کھول کے منہ سے کپڑا بھی نکال دیا تھا۔ اور کوشش کررہا تھا کہ وہ ہوش میں آجائیں "لوجی اپنے شیروانی صاحب، آپ بھی کمال کرتے ہو۔ چوہدری صاحب انہیں کیوں نہیں پہچانیں گے۔"

"بھئی ان کی آنکھ میں ہے وہ۔ کیا کہتے ہیں اسے۔ ہاں، سؤر کا بال" محسن بولا "پہچانتے صرف اُسے ہیں جس سے غرض ہو ورنہ اپنے باپ کو گدھا تک نہیں مانتے۔"

میں نے کہا "یہ کون ہیں دلاور۔ ان کے نام جانتے ہوناں؟"

اس نے اقرار میں سرہلایا اور سپاٹ لہجے میں بولا "یہ قادر شاہ ہے 'قادرا' کہتے ہیں اسے۔"

"اور یہ دوسرا؟" میں نے حیران ہوکے پوچھا۔

"یہ فضل ہے۔" اس نے مختصراً جواب دیا۔

شاید دلاور نے انکار کو اپنے حق میں اچھا نہیں سمجھا ہوگا۔ یہ اس کے خاص آدمی تھے۔ وہ ان کو پہچاننے سے انکار کرتا تو یہ بہت بڑا جھوٹ ہوتا اور پھر سچ اگلوانے کے لیے ہم دوسرے طریقے اختیار کرتے۔ اس نے بہتری اسی میں جانی کہ جو بات اسے معلوم ہے اور جسے چھپانے کا کوئی فائدہ بھی نہیں ہے وہ بتادے۔ تاہم اس سے یہ ثابت ہوگیا کہ دلاور کا ذہن سوچنے سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور وہ غلط اور صحیح میں تمیز کرسکتا ہے۔

"فضل کیا کرتا ہے؟" میں نے کہا۔

"سب کچھ۔ جو بھی اس سے کرنے کو کہا جائے۔" دلاور بولا۔

"اور قادر؟"

دلاور نے نفی میں سرہلایا "اسے میں نے رانا کے ساتھ اکثر دیکھا تھا مگر اس کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں۔"

دلاور کی بات پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ وہ اس وقت جھوٹ بولنے سے گریز کررہا تھا۔ الیکٹریشن قادر کے بارے میں مجھے زیادہ تجسس بھی نہیں تھا۔ وہ رانا کا ملازم خاص ہوگا جو اِدھر اُدھر کے سب جائز اور ناجائز کام کرلیتا ہوگا مگر وہ کوئی خطرناک مجرم یا رانا جیسے بدمعاش کا دست راست نہیں ہوسکتا تھا۔

زیادہ جرح اور سوال جواب کے لیے وقت نہیں تھا۔ میں نے دلاور سے کہا "یہ دو بندے بھی یہیں رہیں گے دلاور لیکن ان کو باندھ کے رکھنا ضروری ہے۔ تم ان کو آزاد تو نہیں کروگے؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میرا سوال ہی فضول تھا۔

محسن نے کہا "اس سے پوچھنے کا فائدہ۔ بس دلاور کو الگ کردیتے ہیں۔"

میں نے سرہلایا "دلاور کو باتھ روم میں بند کیا جاسکتا ہے اور انہیں الگ الگ باندھا جاسکتا ہے۔ یہ اب ہوش میں آرہے ہیں۔ پوری طرح ہوش آگیا تو یہ ہنگامہ کریں گے۔"

ہنگامہ دلاور نے بھی کیا مگر ہم نے اسے زبردستی پکڑ کے باتھ روم میں بند کردیا اور باہر سے کنڈی لگادی۔ ان دونوں کو ہم نے ایک دوسرے سے اتنے فاصلے پر باندھ دیا کہ نہ وہ ہوش میں آنے کے بعد امدادِ باہمی کے اصولوں پر عمل کرپائیں اور نہ دلاور کی مدد حاصل کرنے کے لیے اسے آزاد کرسکیں۔ وہ تینوں آزاد ہوجاتے تو پھر انہیں کوئی اسیر نہیں کرسکتا تھا چنانچہ ہم قادر شاہ اور فضل کو باندھتے ہوئے بہت محتاط رہے۔

میں چاہتا تھا کہ صبح کا اجالا پھیلنے سے قبل ہی ہم فارغ ہوکے گھر لوٹ جائیں اور صبح سب کو ایسے سوتے ہوئے ملیں جیسے رات کے دوران ہم نے خواب تک نہیں دیکھا مگر محسن نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔

"ایسا نہ ہو ہم چوروں کی طرح اپنے ہی گھر میں داخل ہوتے وقت پکڑے جائیں۔ کیا کہیں گے کہ ہم کہاں گئے تھے۔"

"کون پکڑے گا ہمیں، سب سو رہے ہوں گے۔"

"فرض کرو کوئی جاگ اٹھا اور اس نے ڈرائنگ روم میں جھانک کر دیکھا تو سب کو پتا چل جائے گا۔"

میں نے کہا۔ "ہم کہہ سکتے ہیں کہ نیند نہیں آرہی تھی اس لیے ذرا باہر ٹہلنے کے لیے گئے تھے۔"

محسن ہنسا۔ "اب ہماری ایسی باتوں پر یقین کرنے والا کوئی نہیں رہا دوست۔ سمجھا یہی جائے گا کہ ہم کوئی گل کھلانے گئے تھے۔"

"گُل آپ کی منکوحہ اور میری بھابی محترمہ ہیں۔ ہم انہیں کھلانے جاسکتے ہیں۔ بچے کھلانے کے لیے لوگ آیا رکھتے ہیں....."

"یار ہم اپنے آفس جاکے سو جاتے ہیں۔ پکڑے جانے کا کوئی ڈر ہی نہیں۔ صبح تلاش ہوگی تو پہلے آفس ہی فون گھمایا جائے گا اور ہم وہاں موجود ہوں گے، یہ کہنے کے لیے کہ سب تو ائرکنڈیشنڈ کمرے بند کرکے سو گئے تھے، ہم کیا ساری رات پتھر مارتے۔ آفس آکے سکون سے سونا نصیب ہوا۔ الٹا سوال کرنے والا شرمندہ....."

میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔ "تو ایک کامیاب شوہر بھی ثابت ہوگا۔ تجھے جھوٹ بولنے کا فن آتا ہے۔"

"حق ہے استاد۔ سچ بولنے سے زندگی میں بڑے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ میاں بیوی میں سے ایک میں بھی صلاحیت ہو دوسرے کو اُلو بنانے کی تو گاڑی چلتی رہتی ہے۔ دونوں فنکار ہوں تو دیکھنے والوں کو رشک آتا ہے ان کی ازدواجی زندگی پر۔"

میں نے کہا۔ "مجھے امید ہے گُل کے سامنے بھی آپ اسی بیان پر قائم رہیں گے۔"

"یہ مت بھول کہ بالآخر تجھے بھی شوہر بننا ہے۔"

میں نے کہا۔ "اب ہم جائیں گے ڈیوس روڈ..... براستہ شاہدرہ۔"

"براستہ شاہدرہ؟"

"ہاں۔ دو سواریاں اتارنی ہیں وہاں پھر واپس۔"

راوی کے پُل پر گاڑیاں چیک ہو رہی تھیں مگر ان میں بیشتر عام قسم کی کاریں تھیں۔ ہم اُس وقت خواص کی گاڑی میں تھے۔ اس سے پہلے کہ سنتری بادشاہ ہمیں روکتے، میں نے گاڑی کو خود اس کے آگے لے جاکر روکا اور اس کے کوئی سوال کرنے سے پہلے پوچھا۔ "کیا ڈپٹی کمشنر صاحب کی گاڑی نکل گئی ہے؟"

بوکھلا کر اس نے سلیوٹ کیا۔ "پتا نہیں سر۔"

محسن نے فوراً گاڑی آگے بڑھادی۔ اگرچہ امکان بہت کم تھا کہ پولیس ہم سے اترنے کو کہے اور ڈکی کھول کر تلاشی لے مگر ہم رسک نہیں لے سکتے تھے۔ دس منٹ میں ہمیں واپس بھی آنا تھا اور سنتری اس گاڑی کو بھول نہیں سکتا تھا۔ مجھے امید تھی کہ واپسی میں وہ پھر ہمیں سلیوٹ کرے گا۔

جی ٹی روڈ پر گوجرانوالا کی طرف سے آنے والی بس اور ویگن سروس میں صبح پانچ چھ بجے کے بعد اضافہ ہوتا تھا۔ اس وقت ٹرک زیادہ تھے جو دن رات اسی طرح رواں دواں رہتے تھے۔ وہ رات کو خالی سڑک پر ریس لگاتے تھے اور خطرناک انداز میں ایک دوسرے کے ساتھ چلتے تھے۔ میں نے سنا تھا کہ کچھ ٹرک ڈرائیور نشہ بھی کرتے ہیں جس کا مقصد جسمانی و ذہنی تکان کے احساس کو مٹانا ہوتا ہے چنانچہ ان کی طبیعت کی جولانی حادثات کا سبب بنتی ہے۔ سامنے سے ان کی چندھیا دینے والی ہیڈ لائٹس میں کار والوں کو اندھیری سڑک پر اپنے سامنے کچھ نظر نہیں آتا کیونکہ ٹرک ڈرائیور کے مقابلے میں وہ بہت نیچے بیٹھے ہوتے ہیں۔ ایک جگہ محسن نے گاڑی کو اس وقت حادثے سے بچایا جب میں کلمۂ شہادت پڑھ چکا تھا۔ بھوت کے ایک ٹرک نے تقریباً پوری سڑک گھیر رکھی تھی مگر اس کی رفتار کم تھی۔ پیچھے سے دوسرے ٹرک نے اسے اندھادھند اوور ٹیک کیا تو بالکل ہمارے سامنے آگیا۔ روشنی میری آنکھوں پر پڑی تو مجھے یوں لگا جیسے ٹرک اوپر آچکا ہے اور درمیان میں چند فٹ کا فاصلہ بھی نہیں رہا لیکن ہر ڈرائیور میں ایک جبلت (INSTINCT) ہوتی ہے جو ایسے موقعوں پر معجزے دکھاتی ہے۔ انتہائی برق رفتاری سے دماغ کا کمپیوٹر صورتِ حال کو سمجھتا ہے اور یہ سب سیکنڈ کے سویں یا ہزارویں حصے میں ہوجاتا ہے۔

جب گاڑی کچی سڑک سے نیچے اتر گئی اور ایک گڑھے میں سے بھی گزر گئی تو میں نے محسن کو اسٹیئرنگ وہیل سے لڑتے دیکھا۔ اب ہمارے بالکل سامنے ایک درخت کا خشک تنا تھا جس کی شاخیں ایندھن کے طور پر استعمال کرنے والے کاٹ کر لے جا چکے تھے۔ میں تصادم کے لیے بالکل تیار ہوگیا۔ سر کو ڈیش بورڈ پر ٹکرا کے مجروح ہونے سے بچانے کے لیے میں نے اپنے ہاتھ غیر ارادی طور پر چہرے کے سامنے کرلیے تھے مگر یہ نہیں ہوا۔ گاڑی کی جست لگانے والے خونی درندے کی طرح ایک دم پلٹ گئی۔ ... میں ہی رخ بدل لیتا ہے۔ یہ محسن کی آخری بھرپور کوشش تھی ... جس میں اس نے حاضر دماغی کا پورا ثبوت دیتے ہوئے ذہنی صلاحیتوں پر مکمل کنٹرول رکھا اور دوسرے ... گاڑی رک گئی۔ مجھے ایسا لگا جیسے کائنات زلزلے کی زد میں تھی کہ اچانک زمین

کے سائن بورڈ پر سے وزیر خاں کا نام کھرچ ڈالوں۔ وہ ایک ایمان دار، شریف النفس اور خدا ترس آدمی تھا جس نے یہ جگہ ایک ایسے صنعتی منصوبے کے لیے خریدی تھی جس سے مزدور کو مزدوری ملے تو کسان کو فصل کا ثمر۔ کھیتوں کی ہریالی بڑھے اور ملک کی زرعی پیداوار۔ یہاں زرعی مشینری کے پرزے بنتے تھے۔ انسانوں کے خون کا بیوپار کرنے والوں نے اسے اس جگہ سے اور پھر اس دنیا سے ہی رخصت کردیا۔ یہاں وہ اسلحہ بننے لگا جس سے بھائی نے بھائی کا خون کیا، ہم وطنوں کو قتل کیا اور ملک کے دو ٹکڑے کیے۔ پھر انہی زر پرست شیاطین نے انسان دوستی کا لبادہ اوڑھ کر مرحوم وزیر خاں کے نام کو استعمال کیا اور خدمت خلق کے لیے اسپتال قائم کر کے یہاں ایک عقوبت خانہ قائم کردیا۔ جو کچھ ان دیواروں کے پیچھے ہوتا تھا اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وزیر خاں کی روح بھی اس ظلم پر کرب میں مبتلا ہوگی اور شاید مجھ سے خفا بھی کہ میں سب کچھ جاننے کے باوجود اس کے نام سے ہونے والے اس انسانیت سوز کھیل کو ختم کیوں نہیں کرتا۔ میں اس کے لیے کوشش کررہا تھا مگر ابھی تک ناکام تھا۔ مجھے اپنی بے بسی پر شرمندگی بھی تھی۔

ہم نے ادھر ادھر دیکھ کر دونوں لاشوں کو ڈکی سے نکالا اور گیٹ کے سامنے ڈال دیا۔ اچانک گیٹ لائٹ روشن ہوئی اور کسی نے فولادی گیٹ میں بنی ہوئی چھوٹی سی کھڑکی کھول کر باہر جھانکا۔

"اوئے! یہ کیا ہو رہا ہے؟" اس نے چیخ کر کہا۔

خطرہ یہ تھا کہ اب وہ گیٹ کھول کر باہر آجائے گا اور ہنگامہ کھڑا کردے گا۔ میں نے قریب جا کر ریوالور نکال لیا۔ اس کا چہرہ کھڑکی کے فریم میں خوف کی تصویر بن گیا۔ "اب دیکھو، کیا ہو رہا ہے۔ ریوالور کی نال کے اندر جھانک کر دیکھو۔ کچھ نظر آیا؟"

اس نے بڑی مشکل سے نفی میں سر ہلایا۔

"بس تو پھر کچھ نہیں ہو رہا ہے۔ کھڑکی اور منہ بند کر کے بیٹھ جاؤ۔ بہتر ہوگا کہ آنکھیں اور کان بھی بند کرلو ورنہ تم فوت ہو جاؤ گے۔ کبھی پہلے فوت ہوئے ہو؟"

"نہیں۔" اس نے بدحواسی میں کہا اور فوراً کھڑکی بند کرلی۔

میں نے دوڑ لگائی اور گاڑی میں جا بیٹھا۔ کار کا انجن چل رہا تھا۔ میں نے گاڑی کو گیئر میں ڈال کر اس طرح بھگایا جیسے فلمی ہیرو چھلانگ مار کے گھوڑے پر بیٹھنے کے بعد چابک مار کے اسے دوڑاتا ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ فوری طور پر گیٹ کیپر کی عقل اسے ہرگز کوئی ایسا قدم نہیں اٹھانے دے گی جس کے نتیجے میں اسے علی الصبح فوت ہونا پڑے۔ موت اگر ناک کو چھو کر گزر جائے تو آدمی ساری بہادری بھول جاتا ہے۔

"خیر یہ بھی اچھا ہی ہوا۔" محسن نے پلٹ کے دیکھا۔ "اب چاہے وہ فوت شدگان کو سمیٹ لے اور بتادے رانا صاحب کو۔"

"ہاں۔ گاڑی کو وہ ضرور پہچان گیا ہوگا۔"

"ہمیں بھی پہچان لے گا میدان حشر میں۔" محسن نے قہقہہ

و آسمان پُرسکون ہو گئے۔ میں نے محسن کو دیکھا۔ وہ اسٹیئرنگ پر سر رکھے لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔

اگر گاڑی کا ٹرک سے تصادم ہو جاتا تو پھر یہ فکر ہی نہ رہتی کہ بعد میں دنیا نے کیا دیکھا، کیا سمجھا اور کیا کہا۔ دو نامعلوم افراد کے ساتھ دو لاشوں کی دریافت کا معمّا حل کرنے والا شوکت علی رانا کبھی لب نہ کھولتا۔ اگر آگ لگنے کے بعد ہائیڈروجن کا سلنڈر پھٹ جاتا تو یہ بھی معلوم نہ ہوتا کہ ریزہ ریزہ ہو کے بکھر جانے والی گاڑی میں کتنے لوگ سوار تھے۔ وہ کون لوگ تھے اور کیا تھے۔

درخت سے ٹکرانے کی صورت میں ہم زخمی یا بے ہوش ہو جاتے پھر ہمیں اسپتال یا تھانے پہنچایا جاتا کیونکہ مدد کے لیے آنے والے گاڑی میں سے ہائیڈروجن گیس کا ایک سلنڈر اور ڈکی میں سے دو لاشیں بھی برآمد کرلیتے۔ ہمارے لواحقین اور وکلا کبھی نہ سمجھ پاتے کہ یہ سب کیوں ہوا اور کیسے ہوا۔ ہم جھوٹ بول رہے ہیں یا سچ اور جو کچھ فرما رہے ہیں وہ دماغ کی چوٹ کا نتیجہ تو نہیں۔

میں نے محسن کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ "کمال کردیا تو نے اس وقت۔"

محسن نے سر اٹھایا۔ "ہم زندہ ہیں نا، مجھے یقین نہیں آتا۔"

"چل تو ادھر آجا۔ گاڑی اب میں چلاؤں گا۔"

سڑک کی طرف سے کچھ لوگ بھی ہماری خیریت دریافت کرنے پہنچ گئے تھے۔ ان میں زیادہ تعداد اُس ویگن کے مسافروں کی تھی جو ہم سے کچھ پیچھے تھی۔ اس کے ڈرائیور نے سارا واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ایک کار بھی رک گئی تھی۔ اس میں سے اتر کر آنے والا کوئی ایڈیشنل سٹی مجسٹریٹ تھا۔ ویگن ڈرائیور نے اسے بتایا کہ ڈرائیور نے تو ان کے اوپر سے ٹرک گزارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی مگر اللہ نے بچالیا۔ اے سی ایم خود بھی سب دیکھ چکا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہم ٹرک ڈرائیور کی رپورٹ کریں مگر یہ بے معنی اور فضول سی بات تھی۔ نہ کسی نے ٹرک کا نمبر دیکھا تھا اور نہ ڈرائیور کو۔ وہ پکڑا بھی جاتا تو گواہ اور ثبوت فراہم ہونے کے باوجود زیادہ سے زیادہ غلط ڈرائیونگ کا مجرم ہوتا۔

ہم نے سب کی ہمدردی کا شکریہ ادا کیا اور وہاں سے روانہ ہو گئے۔ سڑک پر آکے میں نے چیک کرنے کے بہانے گاڑی کو روکا۔ اصل مقصد ویگن کے مسافروں اور اے سی ایم صاحب سے نجات حاصل کرنا تھا جو سب ہمدردی میں چشم دید گواہ بن گئے تھے۔ ویگن کے مسافروں کی مجھے فکر نہیں تھی۔ وہ منزل تک پہنچنے سے پہلے ہی یہ معمولی واقعہ بھول جائیں گے۔ حادثہ ہو جاتا تب بھی وہ یاد نہ رکھتے۔ اے سی ایم کا کچھ پتا نہ تھا کہ اس نے گاڑی کا نمبر نوٹ کرلیا ہو اور بعد میں یاد رکھے۔ یہ بات تو یقینی تھی کہ شوکت علی رانا کی طرف سے بعد میں کوئی رپورٹ ضرور لکھوائی جائے گی۔

وزیر خاں اسپتال کا گیٹ بند تھا اور اوپر نیچے دونوں حصوں میں تاریکی تھی۔ جب میں یہ سوچتا تھا کہ یہ جگہ کیا ہے اور کس مقصد کے لیے استعمال ہو رہی ہے تو میرا دل چاہتا تھا کہ میں اس

نا میں کام کرنے والوں کے کمرے خالی پڑے ہوئے تھے۔ جو شخص ن پر چوکیداری کرتا تھا اس کی لاش وزیر خاں اسپتال کے اندر تھی۔ وہ سب بھی نہیں تھے جن کو شوکت رانا نے تہ خانے میں دلاور کی بیوی کا داروغہ زنداں مقرر کیا تھا۔ شوکت رانا شاید گھر میں کسی پیغام کا انتظار کررہا تھا یا ان سب کی واپسی کا جو سمجھانے گئے تھے کہ ہم رانا کو دلاور سمجھنے کی غلطی نہ کریں۔ وہ سخت مضطرب ہوگا یہ جاننے کے لیے کہ اس کے جاں نثاروں نے ہمارا کام تمام کردیا ہے۔ یہ اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ رانا کس حد تک عجلت پسند اور سوچے سمجھے بغیر انتہائی قدم اٹھانے کا عادی ہے۔ اس نے شدید طیش کے عالم میں ایک فیصلہ کیا تھا۔ ممکن ہے بعد میں اسے احساس ہوا ہو کہ ہر صورت میں اس نے خود اپنی موت کا سامان کیا ہے۔ اگر ہم میں سے ایک بھی بچ جاتا تو اس کے سارے خاندان کا نام و نشان مٹا دیتا اور ناکامی کی صورت میں تو اس کے لیے بھی وہی طویل پُرعذاب زندگی کی سزا تھی جو دلاور کا مقدر ہو گئی تھی اور جس کا انجام بالآخر دنیا کے لیے تماشائے عبرت بننے والی موت تھی۔ اگر وہ شکست میں دلاور کے ساتھ فریق بننا قبول کرتا ہے تو اس کی مرضی۔

میں نے محسن کی مدد سے ہائیڈروجن سلنڈر کو تہ خانے میں پہنچایا۔ اس عمارت کو منہدم کرنے کے لیے زیر زمین کمرے سے زیادہ موزوں جگہ کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کمرے میں ہوا کی نکاسی کا انتظام بھی پنکھوں کے بغیر کام نہیں کرتا تھا۔ اس میں نہ روشن دان تھے اور نہ کھڑکیاں۔ ہوا باہر پھینکنے والے پنکھوں کے علاوہ یہاں دو ائرکنڈیشنر نصب تھے جو اس وقت بند تھے چنانچہ نیچے سخت گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔

میں نے تار کے سرے گیس سلنڈر کے ہینڈل سے جوڑے اور بجلی کے تار کو اوپر لے گیا۔ تار بہت لمبا تھا۔ میں نے اس کے ایک سرے کو باہر گاڑی تک پہنچا دیا۔ دوسرے تار کو میں نے درمیان سے کاٹا۔ اس کا ایک حصہ سلنڈر کے ہینڈل پر تھا، دوسرا میں نے بہت احتیاط سے پلگ میں لگا دیا۔ پلگ کے دوسرے سوراخ میں دوسرا حصہ پھنسا کے اسے بھی میں نے گاڑی تک پہنچا دیا۔ یہ کام انتہائی خطرناک تھا۔ معمولی سی غلطی یا بے احتیاطی سے ہم خود بھی دھماکے سے اڑ جاتے۔ دفتر سے گلی کے آخری کونے تک زیادہ فاصلہ نہیں تھا اس لیے یہ ضروری تھا کہ ہم اسپارک دیتے ہی گاڑی دوڑا دیتے۔

میں نے محسن کو گاڑی میں بٹھا کر دونوں تار اُسے تھما دیے۔ "بابا اگر یہ آپس میں مل گئے نا تو ہم بچھڑ جائیں گے ہمیشہ کے لیے۔"

"یہ بھی اچھا ہی ہے کہ تو دنیا میں کوئی حسین بیوہ چھوڑ کے نہیں جائے گا۔" محسن نے رقت زدہ لہجے میں کہا۔ "رابعہ کی فکر نہ کر دوست۔ آخر تجھ میں اور مجھ میں کیا فرق ہے۔"

نیچے جانے سے پہلے میں نے احتیاطاً کلمہ پڑھا اور آہستہ آہستہ

مارا۔ "شوکت رانا نے جتنی جلدی کی تھی یہ ثابت کرنے میں کہ وہ دلاور نہیں ہے، اس سے بھی کم وقت میں ہم نے ثابت کردیا کہ ہم دلاور کے باپ سے نہیں ڈرتے۔ اس کی اینٹ کے جواب میں بڑا پتھر مارنے کا مطلب ہے اعلان جنگ۔"

"ہاں یار۔ لڑنا ہے تو کھل کے لڑو۔ خالی دھمکی سے تو بات نہیں بنتی اور ہم کسی رانا کے نانا کو بھی خاطر میں لانے والے نہیں۔ اب یا تو وہ پتھر کے جواب میں چٹان لڑھکائے گا اور ہم ارسال کریں گے کوئی پہاڑ۔ یا پھر رانا صاحب کا وہی انجام ہوگا جو ایٹم بم گرنے سے جاپان کا ہوا تھا۔"

گاڑی پھریرل پر سے گزری تو میں نے اس سنتری کو دیکھ کر بریک لگائے۔ وہ فوراً قریب آگیا۔

"ڈپٹی کمشنر صاحب تو نہیں مگر اے سی ایم صاحب گزرے تھے۔"

میں نے اسے ڈانٹ کر کہا۔ "بے وقوف! وہ کل تک اے سی ایم تھے، آج ڈپٹی کمشنر ہیں۔ تم ابھی تک کانسٹبل ہی ہو۔"

اُس کا منہ حیرت اور بے وقوفی سے کھلا رہ گیا۔ اب صبح کے چار بج چکے تھے۔ میں نے آخری مرحلے کی تکمیل کے لیے گاڑی کا رخ ڈیوس روڈ کی طرف کرلیا۔ شیش محل ہوزری کے پاس ایک ہوٹل کھلا دیکھ کر محسن نے منہ پھاڑا اور جماہی لی۔

"کیا حرج ہے اگر ایک لیٹر چائے ڈال لی جائے؟"

میں نے غرا کر کہا۔ "ینگ مین! ڈیوٹی کے وقت نو ڈرنک۔ وقت کم ہے اور کام بہت۔"

"یہ کام ہے؟" محسن نے جھلا کے کہا۔ "اس سے تو بہتر ہے کہ ہم کوئی کام نہ کریں۔"

میں نے کسی فلسفی کی طرح کہا۔ "عزیزم، کام کے بغیر اس کائنات میں کچھ نہیں ہے۔ انسان، شیطان، فرشتے، حشرات الارض سے جنات تک سب اپنا کام کررہے ہیں۔ ستارے اور سیارے، پودے اور درخت یہاں تک کہ سنگ و خار کے لیے بھی کوئی نہ کوئی کام ہے۔ سونا، عشق کرنا سب کام ہیں۔"

"جیسے بکواس فرمانا آپ کا کام ہے جو آپ اس وقت کررہے ہیں اور یہ سب سن کر برداشت کرنا میرا کام ہے۔"

میں نے ہنس کر کہا۔ "بس یار، اب اڈے پر چل کر اپنی مرضی اور پسند کی چائے پییں گے۔ یہ آخری کام ہے۔"

"ابھی کام باقی ہے۔ اُف!" محسن نے سر پکڑ لیا۔ "یار کل کیا کریں گے ہم؟ سارے کام آج ہی کرلئے تو....."

"کل کچھ نہیں۔ مگر کچھ نہ کرنا بھی ایک کام ہے۔ میرے اقوال زریں نوٹ کرتا جا بے عقل۔" میں نے کہا۔

"مسٹر عاقل، پرانے اقوال زریں بہت ہیں، آپ مزید ایجاد نہ کریں۔" محسن آنکھیں بند کر کے اور سیٹ سے سر ٹکا کر بیٹھ گیا۔

میں نے گاڑی ڈیوس روڈ پر "سی ڈی انٹر پرائز" کے دفتر کے سامنے روکی۔ دفتر گلی میں تھا اور حسب توقع لاوارث پڑا ہوا تھا۔

گیس سلنڈر کا والو کھول دیا۔ گیس بڑی آواز کے ساتھ نکلنے لگی۔ میں تیزی سے باہر نکلنے کے لیے بھاگا اور اپنے پیچھے دروازہ بند کردیا۔ میں حیران تھا کہ وقار یوسف کے گھر میں سلنڈر کھولنے کے بعد مسٹر کلو اس آواز کو کیسے بند کرتے جو اتنے پریشر سے گیس نکلنے کے باعث پیدا ہورہی تھی۔ یا تو ان کے پاس اس کا بھی علاج ہوگا یا انہوں نے سوچا ہوگا کہ گیس نکلنے کے شور پر بھی سونے والے فوراً جاگ کر تو باہر نہیں آجائیں گے۔ اگر کوئی یہ آواز سن کر جاگا تو پہلے غور کرے گا کہ یہ آواز کہاں سے آرہی ہے۔ یہ کون تصور کرسکتا ہے کہ لاؤنج میں سے آنے والی یہ آواز موت کی پکار ہے۔ جب تک کوئی تصدیق کے لیے باہر آئے گا، لاؤنج میں خاصی گیس جمع ہو چکی ہوگی اور اتنی دیر میں دو تار ملا کے سارا کھیل ختم کرنے والے نکل جائیں گے۔

میں نے گاڑی اسٹارٹ کر کے کلچ دبایا اور گیئر میں ڈال کر ریس دی۔ محسن نے میری طرف دیکھا۔ خوف اس کی صورت پر بھی اپنا سایہ ڈال رہا تھا اور میں بھی اندر سے بہت ڈرا ہوا تھا۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ دھماکا کتنا شدید ہوگا۔ میں گاڑی کو نکال لے جانے میں کامیاب ہو جاؤں گا یا گاڑی دھماکے کے ساتھ ہی بے قابو ہو کے الٹ جائے گی۔

جب محسن نے دوبارہ میری طرف دیکھا تو میں نے اس جیلر کی طرح سر ہلا دیا جو جلاد کو تختہ کھول دینے کا اشارہ کرتا ہے اور پھانسی پانے والا اس اشارے کے ساتھ ہی دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔ ہمیشہ کے لیے۔

محسن نے تار ملائے۔ میں نے اسٹیئرنگ سنبھال کے کلچ چھوڑا۔ دھماکا ہوا تو گاڑی بے قابو ہو کے فٹ پاتھ کی طرف چلی گئی۔ مجھے پیچھے دیکھنے کا ہوش نہیں تھا مگر چھت پر دھماکے ہوئے تو مجھے اندازہ ہوگیا کہ یہ عمارت کا ملبہ ہے جو اڑ کر گاڑی پر گر رہا ہے۔ گاڑی کا پچھلا شیشہ ایک دم بکھر گیا۔ میں نے اور محسن نے ایک ہاتھ سامنے کرلیا کہ اگلا شیشہ ٹوٹے تو ذرات اڑ کر ہماری آنکھوں کو بے نور نہ کردیں مگر اتنی دیر میں گاڑی فٹ پاتھ سے ٹکرا کے گھوم چکی تھی۔ میں نے اسٹیئرنگ کاٹ کے بریک لگائے تو ہم دوبارہ اسی گیٹ کے قریب پہنچ چکے تھے۔

اب ملبے کی بارش ختم ہو چکی تھی اور سی ڈی انٹرپرائز کی عمارت ایک کھنڈر ہو گئی تھی۔ سلنڈر تہ خانے میں نہ ہوتا تو آگ سے پوری عمارت آتش فشاں بن جاتی اور اس کے ساتھ والی عمارات کو بھی خطرہ لاحق ہوتا۔ ممکن ہے دوسری عمارتوں کے شیشے ٹوٹ گئے ہوں یا ان کی دیواروں میں دراڑیں پڑ گئی ہوں مگر چھت گرنے سے وہ آگ خود بخود بجھ گئی تھی جو تہ خانے میں دھماکے سے لگی تھی۔ گرد کا طوفان دھوئیں کی طرح اوپر اٹھ رہا تھا۔

میں اور محسن گاڑی سے اتر کر فٹ پاتھ پر کھڑے ہو گئے۔ آس پاس کی عمارتوں سے لوگ دوڑے چلے آرہے تھے اور ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ کیا ہوا مگر کسی کو معلوم نہ تھا کہ کیا ہوا۔ جب وہاں کافی لوگ جمع ہو گئے تو میرے اور محسن کے لیے خاموشی سے نکل جانا آسان ہوگیا۔ ریلوے اسٹیشن تک پیدل چلنے کے بعد ہم نے ایک رکشا لیا اور جب اپنے آفس کے سامنے اترے تو صبح کی اذان ہو رہی تھی۔

پنج وقتہ پابند نماز مولوی خادم حسین اس وقت جاگ اٹھا تھا۔ ہم نے کچھ دیر انتظار کیا۔ جب اوپر آفس میں روشنی ہوئی تو میں نے اسے آواز دی۔ چند لمحوں کے بعد خادم حسین بیرونی برآمدے کے کٹہرے پر نمودار ہوا اور فوراً ہی غائب ہوگیا۔ چند سیکنڈ کے بعد وہ ایسے دوڑتا ہوا آیا جیسے کوئی بدروح اس کے تعاقب میں ہو۔ آخری سیڑھی پر سے اس کا پیر پھسلا اور وہ رکوع کی حالت میں پہنچ کے سنبھل گیا۔

”ایسی بدحواسی بھی کیا خادم حسین۔ ہم اور تم برسوں کے بعد تو نہیں مل رہے ہیں۔“ میں نے کہا۔

خادم حسین نے تالا کھول دیا۔ ”بڑا اچھا ہوا جی آپ آگئے۔ یہاں تو کچھ عجیب سا معاملہ ہوگیا تھا۔“

”کیا کسی نے زیادتی کرنے کی کوشش کی تھی تمہارے ساتھ؟“ محسن بولا۔

خادم حسین نے اسے خفگی سے دیکھا۔ ”صبح صبح منہ سے کلمۂ خیر نکالنا چاہیے۔ میں تو مخاطب بھی نہیں تھا آپ سے۔“

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اوپر چلنے لگا۔ ”چلو یہی سوال میں کرتا ہوں، کیا کسی نے تمہاری عزت پر ہاتھ ڈالا ہے؟ سوں رب دی۔ میں ٹوٹے کردیاں گا جس نے بھی تمہاری کافر جوانی کو بری نظر سے دیکھا ہو۔“

اس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ ”میں محسوس کرتا ہوں سکندر صاحب کہ آپ بھی منظر صاحب اور محسن صاحب کی صحبت بد میں ایسی باتیں کرنے لگے ہیں۔“

”صحیح کہتے ہو خادم حسین۔ میں کتنا شریف، معصوم اور بھولا بھالا نوجوان تھا۔“ میں نے آہ بھر کر کہا۔ ”گواہ رہنا روزِ قیامت کہ مجھے صراط مستقیم سے بھٹکانے والے کون تھے اور اب بتاؤ اتنے پریشان کیوں ہو؟“

”پریشانی تو اس خرزاد نے پیدا کی ہے جی۔ کل سے براجمان ہے اپنے اہل و عیال کے ساتھ۔ زبان بھی عجیب جناتی بولتا ہے۔ بڑی مشکل ہے۔“

”کس کی بات کررہے ہو تم؟“ میں نے اندر پہنچ کر کہا۔

”دیکھ لیں آپ خود۔ یہ جلوس گزشتہ رات پہنچا تھا۔ سات مرد لیں پورے چھ.... پھر ناپ لیں، تین تین انچ کا فرق ہے۔ نمبر ون تین فٹ کا ہے۔ نمبر چھ اکیس انچ کا۔“

میں نے اور محسن نے دیکھا تو ہر طرف بچے بکھرے پڑے تھے۔ وہ صوفوں پر دراز تھے، قالین پر لیٹے ہوئے تھے اور میز پر موجود تھے۔ ان کے پروڈیوسر آفس کے ریٹائرنگ روم میں محو استراحت تھے اور ایک نظر میں ہی اندازہ ہوگیا تھا کہ

”ابھی ہم جنت میں ہیں۔ میرا مطلب ہے اپنے آفس میں۔ تم جہنم میں جھونک کر مزے سے سوگئی تھیں۔“

”تمہیں کیا پریشانی لاحق تھی یہاں۔ محسن بھی تمہارے ساتھ ہے؟“

”ہاں۔ ایک ہزار ایک، مچھراس نے ہلاک کیے ہیں۔ میں نے بھی اتنے ہی مچھروں کا صدقہ دیا تمہارے نام پر۔ کالے بکرے نہ سہی کالے مچھر ہی سہی۔ پھر مزید کمک پہنچ گئی مچھروں کی تو ہم فرار ہوگئے۔ یہاں بڑے سکھ سے اے سی چلایا اور سو گئے جیسے تم وہاں سو رہی تھیں۔ میں طعنہ دے رہا ہوں تمہیں۔“

”فون پر طعنہ دینے کے بجائے تم جانے سے پہلے دستک دے کر تا دیتے یہ بات تو یہاں بھی انتظام ہو جاتا۔“

”انتظام تو بڑا زبردست ہوا تھا۔ ایسا سوتے کہ..... خیر تم پھر سو جاؤ۔“

”ابھی کیا کہا تھا تم نے؟“ رابعہ چونکی۔

”وہی جو تم نے سنا تھا۔ فون اس لیے کیا کہ صبح صبح ہمیں نہ پا کر تم رونے پیٹنے نہ لگو کہ..... چھوڑ گئے بالم مجھے ہائے اکیلا چھوڑ گئے۔“

میری سریلی آواز میں گیت کا مکھڑا سنے بغیر ہی رابعہ نے ریسیور رکھ دیا۔

محسن نے سڑپ سڑپ کر کے پرچ سے چائے حلق میں انڈیلنے کا عمل دوسری بار شروع کیا۔ ”سمجھ میں آگئی بات؟“

”ہاں فضول بات تھی اور بے مقصد۔ سمجھ میں کیسے نہ آتی۔“ میں نے کہا۔ ”کیا خیال ہے اپنے رانا صاحب.....“

خادم حسین نے مجھے چائے پیش کی۔ ”سکندر صاحب، برا نہ مانیں تو عرض کروں۔ یہ جو مخرب اخلاق فلمی گانا ابھی آپ گا رہے تھے.....“

”اس سے تمہارا اخلاق خراب ہوگیا؟“ میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ ”اخلاق اتنا کمزور ہے تمہارا مولوی۔ ہمارا اخلاق تو لندن میں رہ کے خراب نہیں ہوا جہاں ایسی ایسی بے شرم و بے حیا فرنگی حسینائیں ہوتی ہیں کہ تم دیکھتے تو ہر قدم پر کہتے سبحان اللہ ماشاء اللہ۔“

محسن نے قہقہہ مارا۔ ”اور اپنے ساتھ نہ رکھ لیتے۔“

”لاحول ولا قوۃ۔ حد ہوتی ہے محسن صاحب۔ زبان سے پچر ...“ خادم حسین کا چہرہ سرخ پڑ گیا اور وہ احتجاجاً واک آؤٹ کر گیا۔

محسن نے قہقہہ مارا اور ٹیلی فون ڈائریکٹری اٹھالی۔ اس میں وزیر خان اسپتال کا نمبر تلاش کرنا مشکل نہیں تھا۔ وہاں دو لاشوں کے موصول ہونے کے بعد افراتفری کا ہونا لازمی تھا۔ کسی نے ریسیور اٹھا کے ہیلو کہا تو پس منظر میں بہت سی آوازیں سنائی دیں۔ میں نے آواز بنا کے کہا۔ ”ڈاکٹر شاہ یا شوکت رانا میں سے کوئی ہے یہاں تو بلاؤ۔“

یہ آفس ساتویں کا زچہ خانہ ہو جائے گا۔ یہ سابق چوکیدار اور اس کی اکلوتی منکوحہ تھے جو اتنے عرصے بعد اچانک وارد ہو گئے تھے۔

میں نے اسے ویسے ہی اٹھایا جیسے پولیس گورنر ہاؤس کے سامنے سے دھرنا دینے والوں کو اٹھاتی ہے۔ اس کے باوجود سابق چوکیدار نے مجھ سے گلے ملنے کی کوشش کی پھر میرے اور اس کے درمیان ٹھیٹ سرائیکی میں جو مکالمہ ہوا اس کے نتیجے میں وہ بصد حسرت و یاس اپنے جگر کے ٹکڑوں کو سمیٹ کر روانہ ہونے پر مجبور ہوگیا۔ وہ مصر تھا کہ یہ رعایت میں نے ہی اسے دی تھی کہ کبھی کبھار آجایا کرے اور چاہے تو اپنی فیملی کے ساتھ یہاں قیام بھی کرلیا کرے۔ میں نے واضح کیا کہ کبھی کبھار کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ وہ ہر مہینے آئے اور تنخواہ لے جائے۔ آفس کو ہوٹل سمجھے اور مجھے ویٹر۔ اس کی چھٹی ہو چکی ہے اور اس کے خلاف پولیس میں پرچہ بھی درج ہے کہ وہ آفس کا بہت سا سامان لے گیا ہے۔ اگر وہ خیریت چاہتا ہے تو فوراً دفع ہو جائے ورنہ نور کا تڑکا اور ساتواں لڑکا حوالات میں ہوگا۔

خادم حسین اتنی دیر میں نماز سے فارغ ہو چکا تھا۔ ”بخدا اس لشکر کی یلغار کے سامنے میں بے بس تھا۔ وہ سب مجھے ماموں کہتے تھے اور ان کی ماں بار بار مجھے ویر کہہ کے مخاطب کرتی تھی۔ اس نے تو ویر کو گھوڑی چڑھانے کے لیے اپنی چار بہنوں میں سے ایک کے انتخاب کا حق بھی دے دیا تھا مجھے اور جناب میرے سمجھانے کے باوجود کہ میں شادی شدہ ہوں، وہ بضد تھی کہ پھر کیا ہوا، شرع میں چار کی گنجائش ہے۔ ہمارے گاؤں کے مولوی صاحب پابند شرع ہیں۔“

میں اس کی باتیں سنتا رہا اور ہنستا رہا۔ خادم حسین نے از خود چائے بنانے کی تیاری شروع کردی تھی۔ محسن نے وقار یوسف کے گھر کا نمبر ملا کے ریسیور مجھے تھما دیا۔ ”لو بات کرو رابعہ سے۔“

میں نے کہا۔ ”رابعہ۔ کیا حال ہے بلبل بغداد؟“

جواب میں وقار یوسف کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز آئی۔ ”بلبل اور الو کی آواز میں فرق ہوتا ہے غالباً۔“

میں نے ہڑبڑا کر کہا۔ ”معاف کرنا وقار۔ یہ حرکت محسن کی تھی۔“

”آواز تو مجھے آپ کی لگ رہی ہے۔“ وہ بولا۔ ”کہاں سے بول رہے ہیں؟“

”میری آواز سے تو ظاہر ہے کہ میں اپنے منہ سے بول رہا ہوں۔“

”اچھا میں رابعہ کو فون دیتا ہوں دوسرے کمرے میں۔“ وہ بولا۔

کچھ دیر بعد رابعہ کی حیران آواز آئی۔ ”کہاں ہو تم؟“

”یہ کیا اطوار ہیں عزیزہ۔ نہ سلام نہ دعا۔ نہ حال احوال۔“

”یہ کیا پریشان کر رہے ہو صبح صبح۔ بتاتے کیوں نہیں کہاں ہو؟“

"کون؟ آپ اپنا نام بتائیں۔"

"نام کے بچے۔ جو کام کہا جائے وہ کرو۔" میں نے غرّا کے کہا۔

"رانا...... رانا صاحب کو بلاتا ہوں...... وہ نیچے ہیں۔"

میں نے ریسیور پر ہاتھ رکھ کے محسن سے کہا۔ "لے بھئی' رانا کو ایک خبر تو مل گئی۔"

دوسری طرف سے رانا نے کہا۔ "کون ہو تم؟"

میں نے فلمی ولن کی طرح کہا۔ "تحفہ مل گیا رانا۔ میں ہوں تمہارا نانا۔ تم نے کہا کہ مجھے دلاور مت سمجھنا۔ ایم این اے کی اولاد۔"

"یہ...... یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔" وہ چیخ کر بولا اور مجھے گالی دی۔

میں نے قہقہہ لگایا۔ "میں برے لوگوں کے ساتھ برا کام ہی کرتا ہوں۔ ابھی تو دو بندے میرے پاس ہیں۔ تم ان کی آواز سنو گے؟" میں نے کہا۔

"میری بات سنو۔" اس کا لہجہ ایک دم بدل گیا۔

"نہیں' تم ایک پیغام سنو۔ فرشتۂ اجل کی طرف سے۔ جو حشر تمہارے آفس کا ہوا ہے' وہ تمہارے گھر کا بھی ہو سکتا تھا لیکن ایک غلطی کے بعد میں خبردار کرتا ہوں۔ دوسری غلطی نہیں ہونی چاہئے ورنہ وہ آخری ہو گی۔"

"تم...... سکندر بخت ہو...... دیکھو...... میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"مگر میں تم سے بات نہیں کرنا چاہتا رانا۔" میں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

محسن بھی ریسیور سے کان لگائے ہوئے تھا۔ "اس کی تو حالت پتلی ہے۔"

"میں نے کہا تھا نا پھر کہتا ہوں کہ خالی برتن زیادہ شور کرتے ہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ اب چوہدری دلاور کو قید رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ایسا نہ ہو کسی دن کوئی دیکھ لے اور تیری سب محنت رائگاں جائے۔ اسے پولیس کے حوالے کر دیتے ہیں۔" محسن کچھ دیر بعد بولا۔ "اس کے خلاف چالان تو مکمل ہو گیا ہے نا!"

"ہاں۔ اے ایس پی تو سخت بے چین ہے اپنی کارکردگی کا مظاہرہ کرنے پر۔ اسے اشارہ ملنے کی دیر ہے۔ ثبوت شہادت سب فراہم ہو گئے ہیں۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ مل گئی ہے۔ فوری طور پر اس کی ضمانت منظور ہونے کا بھی کوئی امکان نہیں۔ اسے سیشن کورٹ سے ہائی کورٹ میں اپیل کرنے تک دو چار ہفتے تو لگ ہی جائیں گے۔ اس دوران میں لندن سے اس چشم دید گواہ کو بلوانے کا بندوبست کیا جا سکتا ہے جو دلاور کے جرم کی سزا کاٹ رہا ہے۔"

"وہ نیگرو۔ دلاور کی ماں کا تیسرا یا چوتھا خصم۔"

"ہاں۔ اس نے دلاور کو دہرے قتل کا ارتکاب کرتے دیکھا تھا۔ دلاور نے اس کی بیوی کو قتل کیا تھا اور اس کی گرل فرینڈ کو یہ سمجھ کے مار دیا تھا کہ وہ ڈاکٹر شیلی ہے۔ دلاور کی سوتیلی بہن۔ اس وقت تک دلاور نے اسے دیکھا نہیں تھا۔ وہ جائے واردات سے فرار ہو گیا تھا اور پکڑا گیا تھا۔ وہ سیاہ فام جسے حالات و واقعات کی شہادت نے مجرم بنا دیا تھا۔ وہ استغاثہ کا سب سے اہم گواہ ہو گا۔"

"بس تو پھر آج اپنے چوہدری دلاور صاحب کی رخصتی کا انتظام کرویں۔ اب تک ہماری جیل میں تھا۔ اب سرکار کی جیل کا نظارہ بھی کرے۔ تو ذرا غالب کی صحافی برادری سے رابطہ کر۔ میں بطور فرنچ وکیل اے ایس پی سے ملتا ہوں۔"

آٹھ بجے میں نے اس مسئلے پر رابعہ اور منظر سے بات کی تو انہوں نے بھی مجھ سے اتفاق کیا۔ دلاور کی گرفتاری کو لازمی بنانے کے لیے خصوصی تفتیشی ٹیم نے اس کے خلاف خاصا مواد اکٹھا کر لیا تھا۔ اس کے ناقابل ضمانت وارنٹ تو پہلے ہی جاری ہو چکے تھے۔ سیشن کورٹ میں اسے مفرور قرار دینے کی درخواست بھی منظور ہو چکی تھی اور چند دن میں وہ اشتہاری مزم کے عہدے پر فائز ہونے والا تھا۔ یہ میری دیرینہ آرزو تھی کہ اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں دیکھوں اور قانون کے رکھوالے جو کل تک اس کے حکم کے غلام تھے اس کے ساتھ وہی سلوک کریں جو کل تک میرے ساتھ روا رکھا گیا تھا۔

رابعہ نے کہا۔ "تم ناشتہ کرنے گھر نہیں آؤ گے؟"

میں نے آہ بھر کے کہا۔ "کس کے گھر! وقار یوسف کے گھر۔ یا جس دن تم خود اپنے ہاتھوں سے ناشتہ بناؤ گی' میرے گھر۔"

اس نے ہنس کے کہا۔ "رات مجھے بتائے بغیر ہی غائب ہو گئے تھے۔"

میں نے اسی لہجے میں کہا۔ "ایک دن آئے گا جب فرشتۂ اجل بھی مجھے رات کے وقت لے جانا چاہے گا تو میں کہوں گا کہ حضرت شب وصل کی سحر تو ہونے دیجئے۔ ہجر تو ویسے ہی موت ہے۔"

وہ پھر ہنسی اور فون رکھ دیا۔

محسن نے مجھے پر ملامت نظروں سے دیکھا۔ "خادم حسین بھی تمہیں ٹھیک نہیں کر سکتا۔ اتنا بگڑ گیا ہے تمہارا اخلاق۔"

"یہ بھی مولوی خادم حسین کی صحبت کا اثر ہے۔" میں نے کہا۔ "منظر جانتا ہے کہ یہ یہاں ہماری عدم موجودگی میں کیا رنگ رلیاں مناتا ہے اور مجھے دل پشاوری کرنے کے لیے کہاں کہاں لے جاتا ہے۔"

خادم حسین نے شکایتی لہجے میں کہا۔ "ایسی باتیں آپ نے میری گھر والی کے سامنے شروع کر دیں جناب تو بہت مارے گی وہ مجھے۔"

"وہ...... مارتی ہے تم کو! اور تم مار کھاتے ہو؟"

خادم حسین نے مجرمانہ خاموشی سے سر جھکا کے اعتراف کیا۔ "کیا کریں جی۔ والدین کی نافرمانی نہیں کر سکتا تھا اس لیے عقد پر راضی ہونا پڑا۔ حرام نہ ہوتا یوں مرنا تو خودکشی کر لیتا۔ عین نکاح کے وقت۔"

وقار بولا "بیوی ہے نا۔ چوکیدار کیا جیلر......"

نگی چلائی "دیکھا۔ اب ان کی زبان بھی چلنے لگی ہے۔"

محسن نے کہا "ہاں تو بے چارہ کب تک خاموشی سے ظلم برداشت کرے گا میری طرح۔ سب تو جورو کے غلام نہیں ہوتے۔ کیوں خادم حسین؟"

خادم حسین جھینپ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ میں نے موقع پاتے ہی محسن کو بریف کر دیا کہ اسے آج دن میں کیا کرنا ہو گا۔

"میں تو رہوں گا رابعہ کے ساتھ۔ ہم تیسرے پہر چھاپا مار پارٹی کے ساتھ دلاور کی گرفتاری کے ڈرامے کا آخری سین پیش کریں گے اس وقت تک صحافی برادری کو وہاں موجود ہونا چاہئے۔ غالب کا وہ خبطی دوست' تم بھی جانتے ہو اسے۔"

محسن نے سر ہلایا۔ "یہ سب معاملات تو فون پر ہی طے ہو جائیں گے مگر پہلے یہ پتا چلے کہ آج کارروائی یقینی ہے یا نہیں۔"

"یہ تو پولیس ہیڈ آفس جا کے ہی معلوم ہو گا۔ اس وقت تک تمہیں ایک کام اور کرنا ہے۔ دلاور کے ساتھ ہم نے صبح جو قیدی رکھے تھے ان سے تھوڑی سی تفتیش ضروری ہے۔"

"تفتیش؟" محسن نے سر کھجایا۔ "یہ کام اتنا آسان نہیں ہو گا۔"

"ان سے اعترافِ جرم حاصل نہیں کرنا ہے۔ ایسے کسی اعتراف جرم کی کوئی قانونی حیثیت ہی نہیں ہو گی۔ میرا خیال ہے کہ انہیں دفعہ پر کانوے ضابطۂ فوجداری کے تحت اتنا خوف زدہ کر دیا جائے کہ وہ جان بچانے کے لیے وعدہ معاف گواہ بننا قبول کر لیں۔"

"دفعہ پر کانوے" محسن ہنسا۔ "کیا وہ اتنے کچے مجرم ہیں......"

"میرا خیال ہے کہ وہ معمولی کارندے ہیں۔ جرم میں مدد کرتے ہیں اور حکم کی تعمیل پر مجبور ہیں۔ اگر انہیں یقین دلا دیا جائے کہ گزشتہ شب کی ساری کارروائی کا قصہ پولیس کو پہلے سے معلوم تھا اور ان کے آنے جانے تک جو کچھ ہوا اس کے چشم دید گواہ بھی معتبر لوگ ہیں اور اندھیرے میں چھپے ہوئے کیمروں سے ان سب کی عکس بندی بھی کی گئی ہے۔ شوکت علی رانا کو صبح فجر کے وقت گھر سے اُٹھا لیا گیا ہے اور اس کی نشاندہی پر وزیر خاں اسپتال سے ڈاکٹر شاہ پکڑا جا چکا ہے۔"

"وہ میرے کہنے سے مان جائیں گے؟"

"نہیں۔ لیکن وہ دلاور کو وہاں قید میں دیکھ کر مان جائیں گے کہ بڑا شکاری پکڑا جا سکتا ہے تو چھوٹے کس شمار و قطار میں ہیں۔ انہیں بتا دیا جائے کہ کچھ دیر بعد دلاور کو بھی پولیس گرفتار کر لے گی۔ اس وقت صحافی بھی ہوں گے۔ اگر وہ سب کے سامنے یہ بتا دیں گے کہ انہوں نے اپنی مرضی سے کچھ نہیں کیا تھا بلکہ وہ صرف حکم کے غلام تھے اور انہوں نے جو کچھ کیا شوکت رانا یا دلاور کے کہنے

محسن بولا۔ "تو اب کر لو...... میرا مطلب ہے اپنی مرضی سے عقد۔"

"خیال تو کئی بار آیا مگر ڈر لگتا ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ' کیسے مرد ہو تم یار! عورت تو ہوتی ہے پاؤں کی جوتی اور تم اس کے مجازی خدا۔ ایسی عورت ہرگز تمہارے لائق نہیں ہے۔"

"بجا فرماتے ہیں آپ۔ لیکن میرے جو برادران نسبتی ہیں یعنی اس کے چار بھائی۔ ایک سے ایک مسٹنڈا ہے۔ چھٹا ہوا بدمعاش۔ عقد ثانی کا خیال ہی ظاہر کیا تو وہ بارات کی جگہ میرا جنازہ پہنچا دیں گے قبرستان۔ خود اٹھا کے لے جائیں گے۔ دو بار اسپتال پہنچا چکے ہیں جناب۔" اس کی آواز میں اتنا درد اتر آیا کہ لگتا تھا اب وہ رو پڑے گا۔

میں نے اسے تسلی دی۔ "فکر مت کرو' اس مسئلے کا حل بھی نکالیں گے۔ ویسے تو تم بھی کم نہیں ہو۔ وہ مارتی ہے تمہیں اور تم اس پر مرتے ہو پھر بھی۔"

"بس جی۔ دل کا معاملہ ہے" اس نے آہ بھر کر کہا۔ "مجبوری ہے۔"

میں نے فرنچ وکیل کا حلیہ بنا کے خادم حسین کو ساتھ لیا۔ محسن نے باہر ناشتہ کرنے کی تجویز مسترد کر دی۔

"بیوی مارے گی یار۔ یہ لچھن ہوتے ہیں اچھے شوہروں کے۔"

"ایک اچھا مثالی شوہر بننے کے لئے میں تیرے اور مولوی خادم حسین کے نقشِ قدم پر چلنے کی پوری کوشش کروں گا۔" میں نے کہا۔ "ویسے تو رابعہ نے بھی بڑے پیار سے کہا تھا کہ ناشتہ گھر پر کرنا۔"

"سالے گھر ہے کہاں تیرا اور ابھی وہ بیوی نہیں' محبوبہ ہے اس لیے تجھے بڑا پیار محسوس ہوتا ہے اس کے بُلاوے میں۔ بیوی کہے گی تو ایسے سر کے بل نہیں' مجبوراً جاؤ گے۔"

ہم عین اس وقت پہنچے جب ناشتہ لگایا جا رہا تھا۔ نگی نے بڑی خوشی کا اظہار کیا۔ ببلی اِدھر سے اُدھر ٹیبل پر ہاتھ مار رہا تھا۔ ایک مگ اور ایک کپ توڑ چکا تھا۔ نمک دانی اُلٹ چکا تھا اور ڈبل روٹی کے سلائس پر نمک بچھانے میں مصروف تھا۔ اس کے باوجود سب نہال ہوئے جا رہے تھے۔ "بڑا شریر بچّہ ہے۔" محبت میں سب ایک ہی بات کر رہے تھے۔ کسی اور کا بچّہ ہوتا تو بدتمیز کہلاتا۔

میں نے کہا "آج اپنے منظر صاحب نہیں آئیں گے کیا؟"

"نہیں' وہ کورٹ چلا گیا ہو گا۔ میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔" رابعہ بولی۔

"میں نے وقار یوسف کو مخاطب کیا۔ "اللہ کا دیا سب کچھ ہے تمہارے گھر میں' بھانت بھانت کی مخلوق ہے۔ ایک چوکیدار بھی ہونا چاہئے۔"

پر کیا تھا تو ان کی مظلومیت اور مجبوری سب کے سامنے آجائے گی اور بعد میں عدالت سے انہیں سلطانی گواہ بننے کی صورت میں معافی بھی حاصل ہوگی۔ وہ بے وقوف قسم کے لوگ ہیں۔ میرا مطلب ہے بہت زیادہ چالاک اور ذہین نہیں ہیں۔ تو انہیں ایسا چکر دے کہ وہ تیری باتوں میں آجائیں اور قائل ہوجائیں کہ صرف تیرے مشورے پر عمل کرکے ہی وہ بچ سکتے ہیں۔ یہ کام ہوشیاری سے کرنے کا ہے' انہیں قابو میں کرنے کا۔ اگر وہ مان گئے تو سب کے سامنے دیا ہوا بیان بڑا ٹھوس ثبوت ہوگا۔ وہ بعد میں اس بیان سے مکر نہیں سکتے اور یہ نہیں کہہ سکتے کہ انہوں نے جبر کے تحت یہ بیان دیا تھا۔ پولیس فوراً انہیں وعدہ معاف گواہ بنالے گی۔"

"مگر کیا اس طرح ان کی زندگی خطرے میں نہیں پڑ جائے گی؟ انہیں کون زندہ رہنے دے گا کہ وہ بعد میں عدالت کے سامنے دلاور اینڈ کمپنی کے سارے راز فاش کریں اور ان کے تمام جرائم کا ریکارڈ عدالت کے سامنے پیش کردیں۔"

میں نے کہا "یہ خطرہ تو ہر گواہ کو لاحق ہوتا ہے۔ ہم پوری کوشش کریں گے کہ انہیں تحفظ ملے۔ ہم پولیس پر دباؤ رکھیں گے' اخبار پہلے سے پولیس کو خبردار کرسکتے ہیں اور ساری ذمے داری ان پر عائد کرسکتے ہیں۔"

"پولیس کسی کو نہیں بچا سکتی۔" محسن بولا "وہ خرید و فروخت کرتے ہیں۔ بیان' ثبوت' گواہ سب کی قیمت لیتے ہیں۔ اب یہ حالات پر منحصر ہے اور خریدار پر کہ معاملہ معمولی ہے یا غیر معمولی۔ خود ان کے لئے خطرہ کم ہے یا زیادہ اور خریدار چھوٹا ہے یا بڑا۔ اسی کے حساب سے سودا ہوجاتا ہے۔"

"ہم خود اس کا انتظام کرلیں گے یار۔ اگر ہم دلاور کو قید میں رکھ سکتے ہیں تو کیا کسی وعدہ معاف گواہ کو غائب نہیں کرسکتے۔ تو انہیں وہاں سے نکال کر آفس لے جا۔ جب پولیس پارٹی دلاور کو گرفتار کرے گی تو لازمی بات ہے کہ اسے سیدھا ہیڈ آفس لے جایا جائے گا اور وہاں پریس کانفرنس میں جو مجھے کہنا ہے میں کہوں گا' جو رابعہ کو کہنا ہے وہ رابعہ کہے گی۔ اس وقت اگر تو ان دونوں کے ساتھ پہنچ جائے تو بہت بڑا دھماکا ہوجائے گا۔"

"میں کوشش کروں گا اور مجھے اُمید ہے کہ انہیں وہاں لے آؤں گا لیکن یہ وعدہ نہیں کرسکتا کہ وہاں جاکے بھی وہ اپنے بیان پر قائم رہیں گے۔ کیا پتا عین وقت پر وہ بدل جائیں' دلاور کے سامنے بول نہ پائیں۔ خود دلاور بھی پولیس کی تحویل میں بہت زیادہ مطمئن اور پُر اعتماد ہوگا۔ وہ کوئی معمولی مجرم نہیں ہے جو گرفتاری سے ڈر جائے گا۔ وہ بہت گرجے گا' برسے گا۔ پولیس کو' وکیلوں کو اور صحافیوں کو بتائے گا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا اور جب یہ معاملہ عدالت میں پیش ہوگا تو کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ دشمنوں کی یہ سازش ناکام ہوجائے گی۔ وہ بڑے سے بڑا وکیل کرے گا اور ملک کی اعلیٰ ترین عدالت تک جائے گا۔ اس کا یہ حوصلہ دیکھ کے وعدہ معاف گواہ منحرف ہوسکتے ہیں۔"

میں نے کہا "یہ رسک تو لینا پڑے گا۔"

"کیوں نہ انہیں بعد میں پیش کیا جائے پولیس کے سامنے جب انہیں یہ معلوم ہوجائے کہ دلاور کو بھی پولیس نے گرفتار کرلیا ہے۔"

میں نے کہا "یہ ٹھیک ہے' انہیں کل بھی پیش کیا جاسکتا ہے۔ فی الحال تو انہیں وہاں سے نکال کرلے جا۔ جب پولیس وہاں پہنچے تو صرف دلاور ہی گرفتار ہو۔"

"کیا پولیس سوال نہیں کرے گی کہ دلاور کی اس پناہ گاہ کا علم آپ لوگوں کو کیسے ہوا؟"

"اس کا جواب ہم دے دیں گے۔ رابعہ یہاں آتی جاتی رہتی ہے۔ اسے باکس دیکھ کر شک ہوا تھا۔ اس نے ایک آدمی نگرانی پر مامور کیا تو اس نے رپورٹ دی کہ آدھی رات کے وقت کچھ لوگ باکس میں داخل ہوتے ہیں اور پتا نہیں اندر گھس کر کیا کرتے ہیں۔ رابعہ کہے گی کہ اس نے خیمہ لگوا کے ایک چوکیدار رکھا تھا۔ وہ بہت ہوشیار اور فرض شناس آدمی ہے۔ میری آفس بلڈنگ میں بھی چوکیداری کرتا ہے۔ اس نے حقیقت حال دریافت کرلی اور مجھے بتادی۔"

"پولیس بیان لے گی چوکیدار کا تو آپ پیش ہوجائیں گے؟ لیکن بعد میں کیا ہوگا ... یہ ڈبل رول کیسے چلے گا؟"

"یہ ہوسکتا ہے کہ چوکیدار غائب ہوجائے۔ اس کا الزام بھی دلاور اینڈ کمپنی پر عائد کردیا جائے کہ انہوں نے اسے اغوا کرنے کے بعد ماردیا ہوگا۔ فرنچ وکیل بہرحال ابھی رہے گا پاکستان میں۔ تم نکل جاؤ وقار کے ساتھ۔"

"ہاں" پیچھے سے وقار یوسف نے کہا "میں کورٹ جاتے ہوئے راستے میں ڈراپ کردوں گا۔ آپ کیا کہہ رہے تھے؟ میں چوکیدار رکھ لوں!"

"ہاں۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں بھی اپنی حفاظت کی طرف سے اتنا بے فکر نہیں ہونا چاہئے۔ یہ بھی تو دیکھو کہ تمہارے مہمان کون ہیں۔" "سب دوست ہیں......"

"مگر دوستوں کے دشمن کون ہیں۔ محسن نے توگل کو اور روبی کو یہاں سے شفٹ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔"

"کہاں؟"

"فی الحال تو منظر کے گھر۔ اس کے بعد کوئی مکان تلاش کریں گے جہاں یہ گمنام رہیں۔"

وقار یوسف نے سرہلایا۔ "میرے خیال میں یہ ضروری ہے ٹھیک سوچا ہے آپ نے مگر یہ مت سمجھئے گا کہ میں ڈرتا ہوں۔"

"نہیں یار تم ڈرنے والے ہوتے تو بہت پہلے ہم سے کہہ دیتے کہ میں باز آیا محبت سے اُٹھالو پان دان اپنا۔ نگی اپنے والد نقوی صاحب کے قتل کے بعد ہم سے برگشتہ ہوجاتی مگر تم نے تو دوستی کی لاج رکھ لی۔ رابعہ تم پر واقعی فخر کرتی ہے کہ تم جیسا چھوٹا بھائی ملا اسے۔"

محسوس ہوتا تھا۔ یہ سب گزشتہ شب کی فوری جوابی کارروائی کا تھا۔ بزرگوں کا قول صحیح ہے کہ گربہ کشتن روزِ اوّل۔ سانپ کا پھن اُٹھانے سے پہلے ہی کچل دو۔ دفاعی جنگ لڑنے سے پہلے بھرپور جارحانہ اقدام ہی بعض اوقات فیصلہ کن ثابت ہوتا ہے اور دشمن کی غلط فہمی یا خوش فہمی دور ہوجاتی ہے۔ شوکت رانا بہت جلدی میں کئے گئے ایک فیصلے کے بعد بہت جلد یہ معلوم ہوگیا تھا کہ اس نے جس ایم آر ایس کے چرچے سُنے تھے وہ کتنی موثر' منظم' سریع الحرکت اور تباہ کن قوت ہے۔

"آج دلاور کی گرفتاری کے بعد دیکھیں گے کہ شوکت رانا صاحب کیا فرماتے ہیں۔" رابعہ بولی۔ "ابھی صورتِ حال مختلف ہے۔"

"ہاں۔ شام کو نہ یہ بساط ہوگی نہ یہ کھلاڑی۔ کھیل کا نقشہ کچھ اور ہوگا۔" میں نے کہا اور گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔ ایک بار پھر گھنٹی بجی۔ رابعہ اس وقت اندر بیٹھ چکی تھی۔ "کیا پھر فون کردیا رانا نے۔"

"میں نگی سے کہہ دیتا ہوں کہ انکار کردے۔ کہہ دے کہ وہ جا چکی ہیں۔"

لیکن اس سے پہلے ہی نگی نے پھر چلا کر رابعہ کو آواز دی۔ "رابعہ باجی۔"

"کیا مصیبت ہے۔"

رابعہ دوبارہ اندر گئی۔ میں اس کے ساتھ تھا۔

"دلاور کی بیوی ہے۔" نگی نے ریسیور پر ہاتھ رکھ کے سرگوشی میں کہا "سکندر بھائی سے بات کرنا چاہتی تھی۔ میں نے کہہ دیا کہ یہاں تو کوئی سکندر بخت نہیں ہے۔ اب کہتی ہے کہ اچھا رابعہ قاری سے بات کرادو۔"

میں نے اسے اشارے سے سمجھایا کہ کہہ دو نہیں ہیں۔

"سوری مسز دلاور وہ ابھی ابھی نکل گئی ہیں۔ میں باہر گئی تو گاڑی جا چکی تھی۔ آپ شام کو آفس میں بات کرلیں۔ جی..... جی ابھی تو راستے میں ہوں گی۔ آپ بار روم کے فون پر بات کرلیں آدھے گھنٹے کے بعد۔ اب یہ مجھے معلوم نہیں کہ انہیں کس کورٹ میں جانا تھا۔ ممکن ہے وہ ہائی کورٹ جائیں۔ ہاں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کورٹ نہ جائیں اور بھی کام ہوتے ہیں۔ جی' میں آپ سے کہہ رہی ہوں تو کیا جھوٹ بول رہی ہوں۔ سکندر بخت ان کے ساتھ کیسے جاسکتا ہے جب وہ یہاں ہے ہی نہیں۔ کراچی۔ آپ کہتی ہیں کراچی چلا گیا ہوگا۔ مجھے کیا معلوم رابعہ کے پاس کراچی کا فون نمبر ہے یا نہیں۔" نگی نے ریسیور رکھ دیا۔

"کیا مسئلہ تھا؟"

"مسئلہ تو پتا نہیں۔ بار بار کہہ رہی تھی کہ بہت ضروری بات ہے۔ اپنا فون نمبر بتانے پر تیار نہیں تھی۔"

میں نے کہا "چلو اس کی پریشانی سے ہمیں کیا۔ بات کرنی ہوگی تو کرلے گی آفس کے فون پر۔"

"بس یہ تو خلوص ہے آپ سب کا ورنہ ہمارا اپنا اور کون ہے اس دنیا میں۔" یوسف بولا۔ "چلیں محسن صاحب۔"

اندر مولوی خادم حسین چغل خوری میں مصروف تھا اور نگی سے شکایت کررہا تھا کہ "منظر صاحب تو خیر شریف آدمی ہی نہیں ہیں مگر یہ محسن صاحب بھی کم نہیں اور ان کے ساتھ سکندر صاحب کی زبان بھی خرافات بکنے لگی ہے۔" نگی بڑی دلچسپی سے پوچھ رہی تھی "آخر کیا کہتے ہیں یہ لوگ تم سے...... مجھے بھی تو بتاؤ۔"

رابعہ فون کرکے فارغ ہوئی تو اس نے خادم حسین کو ڈانٹا۔ "پیٹھ پیچھے باتیں کرتے ہو۔ جو کہنا ہو سب کے سامنے کہنا۔"

"کہہ دوں گا جی۔ ڈرتا نہیں ہوں میں کسی سے۔" مولوی خادم حسین بولا۔

"سوائے اپنی بیوی کے۔" میں نے کہا "بتادوں وہ کیا سلوک کرتی ہے تمہارے ساتھ؟"

مولوی خادم حسین کا رنگ اُڑ گیا "یہ تو بلیک میلنگ ہے جی" رابعہ نے ہنس کے کہا "اچھا اب چلو۔ وہ اے ایس پی اپنی پوری ٹیم کے ساتھ تمہارا انتظار کررہا ہے۔"

ابھی ہم باہر نکلے بھی نہیں تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اندر سے نگی نے آواز دے کر کہا "رابعہ باجی ایک منٹ۔"

"کیا میرا فون ہے۔" رابعہ بولی "کون ہے؟"

"کوئی شوکت علی رانا ہے۔" نگی نے کہا۔

میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ "شوکت علی رانا۔ وہی جعل ساز جو کل رات آیا تھا۔"

"میرا خیال ہے کہ وہ بات کرنا چاہتا ہے تو بات کیوں نہ کرلی جائے اس سے۔" رابعہ نے ریسیور نگی سے لے لیا۔ میں نے لاؤنج میں اسی فون کے ایکس ٹینشن کا ریسیور اُٹھالیا۔ "ہیلو!" رابعہ نے کہا۔

"مس رابعہ! میں آپ سے کچھ خاص اور اہم مسائل پر بات کرنا چاہتا تھا۔ میں شوکت علی رانا ہوں۔"

"مگر میں تو آپ کو نہیں جانتی۔ کل رات ایک ایم این اے آئے تھے مگر ان کا نام تو ایم شوکت رانا تھا۔"

"اچھا! ہوگا کوئی۔ میں چوہدری دلاور کا پارٹنر ہوں اور باتیں ایسی ہیں کہ جو فون پر کرنا مناسب نہیں۔"

"تو آپ میرے آفس آجایئے۔" رابعہ بولی "آج شاید مجھے دیر ہوجائے گی۔ چھ سات بجے آفس پہنچ جاؤں شاید۔"

"دیکھیں جی' مجھے پتا چلا ہے کہ کل رات کچھ لوگ......"

"مسٹر رانا' باقی باتیں ملاقات پر۔ مجھے دیر ہورہی ہے۔" رابعہ نے ریسیور رکھ دیا تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا ورنہ گزشتہ شب کا راز فاش ہونے ہی والا تھا۔

ایک بات میں نے خاص طور پر نوٹ کی کہ شوکت رانا کا لہجہ بہت بدلا ہوا تھا۔ اس کی اکڑ فوں غائب ہوگئی تھی۔ وہ بہت خوف

ہم واپس جانے کے لئے پلٹے ہی تھے کہ تیسری بار فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے رابعہ سے کہا "بس اب نکلو۔" اور اسے بازو سے پکڑ کے باہر کھینچ لیا۔

تکی نے کہا "کون۔ چوہدری دلاور۔ کون چوہدری دلاور۔" میرے قدم رُک گئے۔ میں نے رابعہ کو اشارہ کیا کہ وہ بات کرے مگر خود ریسیور لے لیا۔

میرے کانوں نے واضح طور پر چوہدری دلاور کی آواز سُنی۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے بھائی کہ آپ نے میرا نام ہی نہ سُنا ہو۔ شیطان کی طرح ذکر کیا جاتا ہوگا میرا تو۔ وہ اپنے سکندر اعظم کہاں ہیں۔ اللہ اس سے بچائے۔ کیا کہتے ہیں اُسے۔ نظرید۔ نظرِبد سے بچائے۔ بڑی فتوحات مل رہی ہیں آج کل۔ ہیں جی۔"

شک کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی' نہ کوئی اس کی آواز کی اتنی اچھی نقل اُتار سکتا تھا اور نہ اس کے لہجے کی ایسی کاپی کر سکتا تھا۔ وہ چوہدری دلاور ہی تھا۔

مجھے یوں لگا جیسے میری فتوحات کا فلک بوس مینار کسی ریت کے کچے گھروندے کی طرح مسمار ہوگیا ہو۔ محسن ابھی راہ میں تھا اور اگر دلاور قید سے رہائی حاصل کر چکا تھا تو پھر محسن کے قیدی بننے کی باری آچکی تھی۔ چوہدری دلاور کو گرفتار کرانے اور ہتھکڑی کے ساتھ حوالات میں دیکھنے کی خواہش ایک بار پھر فریبِ خیال ہوگئی تھی۔ تاہم میرے دل میں ایک موہوم سی اُمید کی روشنی تھی جو مجھے یقین کا راستہ دکھاتی تھی کہ ممکن ہے یہ مذاق ہو۔ ڈراما ہو۔ کوئی بہت اچھا ایکٹر یقینا دلاور کی آواز اور لہجے کی مشق کرکے مجھے دھوکا دے سکتا تھا۔

رابعہ نے محتاط انداز میں سوال کیا "کون ہو تم؟"

دوسری طرف سے دلاور نے قہقہہ لگایا "لوجی۔ اب آپ کو بھی بتانا پڑے گا کہ ہم کون ہیں؟"

"تم دلاور نہیں ہو' مجھے معلوم ہے۔"

"اچھا جی۔ پھر پوچھا کیوں تھا؟"

"صرف یہ جاننے کے لیے کہ آخر خود کو دلاور ظاہر کرکے تم کیا مقصد حاصل کرنا چاہتے ہو" رابعہ نے برہمی سے کہا۔

اس نے دوسری بار قہقہہ لگایا تو میں نے اس کی جعلسازی کو پکڑ لیا۔ وہ ہرگز دلاور نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے دلاور کی آواز اور لب ولہجہ بڑی مہارت سے اپنایا تھا مگر نقل کے لیے عقل کی ضرورت تو پڑتی ہے مگر اس کے باوجود نقل کبھی اصل کے مطابق نہیں ہو سکتی۔ تاڑنے والے بھی قیامت کی نظر رکھتے ہیں اور فرق بہرحال نظر آجاتا ہے۔

دلاور کو میں نے کبھی اس طرح قہقہہ لگاتے نہیں دیکھا تھا اور نہ کبھی وہ ٹیلی فون پر بات کرتے ہوئے فلمی ولن کا اسٹائل اختیار کرتا تھا۔ غالباً یہ فرق خود رابعہ نے بھی نوٹ کر لیا تھا۔

"دیکھو مسٹر ایکٹر۔ آج تو میں تمہیں معاف کرتی ہوں۔ دوبارہ یہ حرکت مت کرنا۔ تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو۔ یہ فون آبزرویشن پر ہے۔ مجھے معلوم ہو جائے گا کہ تم نے کہاں سے بات کی تھی....."

"آپ تو ایسے ہی ناراض ہو رہی ہو جی۔ ایسی تو کوئی بات نہیں کی میں نے..." وہ کچھ نروس ہوا۔

"تم نے کیا سمجھ کے فون کیا تھا یہاں؟" رابعہ کا اعتماد ایک دم بڑھ گیا "اگر یہ مذاق تھا تو کیا تمہیں اندازہ ہے کہ اس کا تمہیں کیا نقصان ہوگا؟ تم مجھے خوفزدہ کرنا چاہتے تھے؟ بلیک میل کرنے کا ارادہ رکھتے تھے یا..."

"دیکھیں جی۔ خدا کی قسم ایسی کوئی بات نہیں۔"

"تمہیں معلوم ہے تم کس سے مخاطب ہو...؟" رابعہ نے طیش میں کہا۔

"جی.... آپ رابعہ ہو" وہ بولا۔

"تمیز تہذیب تو تمہارے باپ کے پاس نہیں تو تم سے کوئی یہ توقع کیسے رکھ سکتا ہے فیصل کہ تم اپنے سے بڑی عمر کی معزز خواتین سے بات کرتے ہوئے رابعہ باجی یا رابعہ آنٹی کہو گے۔ جس دولت نے تمہیں انگلش میڈیم اسکول تک پہنچا دیا تھا وہ ایسی ہی تھی بیٹا۔ کوئی کیچڑ سے نہا کے پاک نہیں ہو سکتا۔"

رابعہ نے مجھ سے پہلے سمجھ لیا تھا کہ وہ دلاور کا بیٹا ہے۔ وہ ابھی جوان ہو رہا تھا مگر یہ عمر اور ماحول کا اثر تھا کہ وہ خود کو اپنے باپ سے بھی بڑا سمجھنے لگا تھا اور ان معاملات کو اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کرتا تھا جو صرف عمر یا تعلیم سے حل نہیں ہوتے۔ تجربے اور مشاہدے کی بالغ نظری اور زندگی کو ہر پہلو سے دیکھنے' سمجھنے اور پرکھنے کی بھرپور صلاحیت اور اپنی تمام ذہنی و جسمانی توانائی کا اندازہ کرتے ہوئے اسے شاطرانہ ذہانت کے ساتھ بروئے کار لانا صرف اٹھارہ سال کی عمر میں نہیں آجاتا۔ دلاور کا بیٹا اپنے باپ کا نقشِ ثانی بننے کے لیے اسی کے نقشِ قدم پر چل رہا تھا۔ آثار بتاتے تھے کہ بنیاد وہی ہے' نقشہ بھی وہی ہے تو تعمیر بھی ویسی ہی ہوگی مگر فیصل کے لیے دلاور کی زندگی کا تجربہ حاصل کر لینا یا اس کی خواہش کرنا بھی اتنا ہی ناممکن تھا جتنا شاہین کے بچے کا انڈے کے خول سے باہر آتے ہی بلندی افلاک تک پرواز کی کوشش کرنا یا خود اپنے پنجوں سے اپنے شکار کو ہلاک کرنے کی سوچنا۔ ابھی وہ نو آموز شکاری تھا جس کو شکار گاہ میں قدم رکھے جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے مگر فیصل ان سے چھیڑ خانی کر رہا تھا جن سے نمٹنا اس کے باپ کو بھی نہیں آیا تھا۔ یہ ایک طفلانہ اور مضحکہ خیز حرکت تھی۔

رابعہ نے غصے میں فون ایک طرف رکھ دیا تھا۔ دوسری طرف شاید فیصل اب بھی "ہیلو ہیلو" کر رہا ہوگا۔

"اتنی لال پیلی کیوں ہو رہی ہو آخر تم۔ ایک بے وقوف بچے کی بات پر؟"

"بے وقوف بچہ خود کو بچہ کب سمجھتا ہے" رابعہ نے کہا "وہ تو اُلٹا ہمیں بے وقوف بنانا چاہتا ہے۔"

"وہ قلم ہوتی ہے۔" رابعہ بولی "اب چلو ورنہ اور کچھ ہوجائے گا۔"

"اب ہونے کو کیا رہ گیا ہے" میں نے آہ بھر کے کہا "سوائے منسوخ کے۔ آج کسی نجومی کے طوطے سے پوچھوں گا کہ میری بگڑی تقدیر کب بنے گی۔ شادی کی لکیر بھی ہے ہاتھ میں یا نہیں؟"

رابعہ نے گاڑی اسٹارٹ کی "پہلے طوطے سے یہ معلوم کرلینا کہ اس کی اپنی شادی ہو چکی ہے یا زندگی ایسے ہی فٹ پاتھ پر قسمت کے کارڈ نکالتے گزر رہی ہے۔"

پیچھے سے مولوی خادم حسین نے کہا "دخل در معقولات نہ سمجھا جائے جی تو میں کچھ عرض کروں؟"

میں نے کہا "کرو۔ میرا مطلب ہے دخل در معقولات۔"

"خیر سے دست شناسی کا علم میں نے بھی سیکھا تھا جناب اور کیا عرض کروں' استاد مکرم ہاتھ کی لکیروں کو یوں پڑھتے تھے جیسے آئینے میں نوشتۂ تقدیر پڑھ رہے ہوں۔"

"مگر آئینے میں تحریر تو اُلٹی نظر آتی ہے خادم حسین۔"

"اب یہ تو کمال تھا ان کا جی کہ وہ ہاتھ کے آئینے میں تقدیر کا عکس دیکھ کے جو کچھ بتاتے تھے بس پتھر پر لکیر ہو جاتا تھا جناب! اور انہوں نے تو چیلنج لکھ کے رکھ دیا تھا کہ پیش گوئی غلط ثابت کرنے والے کو دس ہزار انعام۔ بورڈ پر صاف لکھا ہوا تھا..."

رابعہ بولی "مگر دس ہزار کیا؟ روپے' ڈالر یا پاؤنڈ؟"

میں نے کہا "دس ہزار گالیاں یا جوتے بھی تو سمجھے جا سکتے ہیں۔"

خادم حسین سوچ میں پڑ گیا "یہ تو پتا نہیں جی۔ آپ نے چکر میں ڈال دیا ہے مجھے۔ میں نے کبھی غور نہیں کیا تھا مگر روپے واقعی نہیں لکھے ہوئے تھے مگر ساری بات نیت کی ہوتی ہے جی۔ ظاہر ہے انعام میں روپے ہی دیتے وہ اگر کوئی آجاتا۔"

میں نے کہا "بھئی وہ کہہ سکتے تھے کہ جاؤ شہر کے دس ہزار پرندے تمہارے۔ باغ جناح کے دس ہزار پھول تمہارے۔ دس ہزار بجلی کے کھمبے یا میرے دس ہزار گُناہ تمہارے۔"

"آپ کیسی باتیں کرتے ہیں جناب...."

"اچھا یہ بتاؤ کبھی تم نے ان سے اپنی تقدیر کا حال پوچھا تھا۔ یہ سوال کیا تھا کہ استادِ محترم آخر آپ کے دن کب پھریں گے۔"

اس نے پھر آہ بھری "پوچھا تھا جی.... ان پر رقت طاری ہوگئی' بولے کہ بیٹا' نصیب میں جو لکھا ہے وہی ہو رہا ہے۔ ملکہ الزبتھ کی تقدیر میں برطانیہ کے تخت پر بیٹھنا لکھا تھا۔ اس پر کوئی اور نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ ہمارے مقدر میں یہ جگہ تھی جہاں ہم ہیں۔ تقدیر کے لکھے کو بھلا کون بدل سکتا ہے۔"

رابعہ نے مسکرا کے کہا "خود اپنے بارے میں بھی ضرور پوچھا ہوگا تم نے۔ یہ تو سب ہی جاننا چاہتے ہیں کہ شادی کہاں ہوگی؟"

"ہاں جی۔ اور انہوں نے بڑے دکھ سے کہا تھا کہ بیٹا یہ مت

میں نے کہا "ماں کوشش کرکے ناکام ہو چکی تھی۔ اس نے شاید سوچا ہوگا کہ کسی طرح بات ہو جائے سکندر سے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ نادانی کے باوجود ہمیں شاک دینے میں تقریباً کامیاب ہوگیا تھا۔ کچھ تو اس کے انداز واطوار اور لب ولہجہ اپنے باپ جیسا ہے۔ باقی کمی اس نے صداکاری اور اداکاری سے پوری کرلی تھی اور چند منٹ کے لیے تو میرے ہاتھوں کے طوطے بھی اُڑ گئے تھے۔ یہ لڑکا بہت خطرناک ہوتا جا رہا ہے رابعہ۔"

"خطرناک کیوں نہیں ہوگا۔ پرورش کرنے والے والدین کیا کم خطرناک ہیں۔ باپ تو جیسا تھا سو تھا' ماں شریف اور اولاد کی خیر خواہ ہوتی تو شاید بیٹے کی زندگی پر باپ کے کالے کرتوتوں کا سایہ نہ پڑتا مگر مسز دلاور ثابت کر چکی ہے کہ وہ ہر طرح سے اپنے شوہر کی رفاقت کا حق ادا کر سکتی ہے۔"

میں نے کہا "یہ تو قابل تعریف بات ہے۔ اسی لیے ان دونوں کی نبھ گئی۔ زندگی کی گاڑی کے دونوں پہیے ایک جیسے تھے۔"

"عورت مجبور ہوتی ہے۔ شوہر کے سانچے میں نہ ڈھلے تو ساتھ دینا مشکل ہو جاتا ہے۔"

"اچھا!" میں نے سخت حیرت کا اظہار کیا "یعنی شرابی کی بیوی شراب پینے لگتی ہے اور جُواری کی بیوی جُوا کھیلتی ہے۔ یہ جو ہماری سوشل فلمیں ہوتی ہیں اس میں تو اُلٹا دکھایا جاتا ہے کہ نیک پروین ٹائپ بیوی شوہر کی کایا پلٹ دیتی ہے۔ گھر کو جنت بنا دیتی ہے اور فلم ختم ہونے تک سب ٹھیک کر دیتی ہے۔"

پوچھ تو اچھا ہے مگر میں نے اصرار کیا تو انہوں نے سب صاف صاف بتادیا۔ میں نے کہا استاد جی' میں باز آیا ایسی شادی سے تو بولے کہ نامعقول۔ کیا تُو لڑ سکتا ہے تقدیر سے۔ قسمت میں تیرے لیے وہ لکھ دی گئی اور اس کے لیے تُو۔ اب تم دونوں بھاگ کے کہیں نہیں جاسکتے۔ سچ ہی فرمایا تھا جی انہوں نے۔ یہ نکاح تو موت سے زیادہ اٹل ثابت ہوا۔"

میں نے پلٹ کے کہا "اچھا زیادہ دُکھی ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ دنیا میں آدمی کو جو بھی ملتا ہے اعمال کے بدلے ملتا ہے۔"

"ہاں۔ اب ذرا ان کے اعمال دیکھو اور بتاؤ انہیں اور کیا ملے گا؟" رابعہ بولی۔

"ان کا مطلب ہے اس ذلت کے علاوہ جو میں اُٹھا چکا اور ان دھکوں کے سوا جو میں کھا رہا ہوں۔"

خادم حسین نے میرے ہاتھ کو اپنی گرفت میں لے کے یوں پڑھنا شروع کیا جیسے مڈل فیل اپنے ذہنِ رسا کی مدد سے انگریزی کے اخبار کی سب سے اہم خبر کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ چند منٹ کے بعد اس نے افسوس ناک انداز میں سرہلا کے ہاتھ چھوڑ دیا۔

"کوئی فائدہ نہیں جی۔"

"کیا ہوا؟" میں نے کہا "لکیریں کیا کہتی ہیں؟"

"چھوڑیں جناب۔ سچ بولوں گا تو آپ سے زیادہ رابعہ بی بی خفا ہوں گی۔"

"یار وہ پہلے ہی خوش نہیں ہیں۔ تم ان کی پروا مت کرو۔"

مولوی خادم حسین کا سر دائیں بائیں ہلتا رہا "نہیں جی۔ آپ کو بھی خوشی نہیں ہوگی۔ ماشاء اللہ دولت کی کوئی کمی نہیں۔ صحت بھی اچھی رہے گی اور عمر بھی لمبی ہوگی۔ دیکھیں جناب یہ ہے دل کی لکیر۔"

"اس میں تو خاصی خرابی ہے۔ مجھے معلوم ہے۔"

رابعہ نے کہا "دماغ کی لکیر سے بھی زیادہ؟"

خادم حسین نے کہا "دماغ۔ دماغ کی لکیر میں بہت گڑبڑ ہے جناب۔"

"وہ تو پیدائشی ہے خادم حسین۔" رابعہ ہنسی "اور تم دیکھ بھی رہے ہو اپنی آنکھوں سے۔ ڈرو نہیں' بتادو کہ پاگل خانے جانے کی نوبت کب آئے گی۔"

"وہ تو بس آنے ہی والی ہے۔ کیوں خادم حسین؟" میں نے کہا "چھ مہینے سال میں جس دن بھی دشمنوں نے پکڑ کے قاضی کے سامنے بٹھادیا۔ کیا خیال ہے کب تک پیش آئے گا یہ سانحہ؟"

"کون سا سانحہ جی؟"

"یہی۔ شادی پاگل خانہ آبادی کا۔ ویسے تو سچ کہتی ہیں۔ مس رابعہ کہ دماغ کی خرابی تو پیدائشی ہے۔ دماغ خراب نہ ہوتا تو ہم ولایت سے لوٹ کر یہاں آتے جھک مارنے کے لیے؟ اپنے ایمان سے کہنا مولوی خادم حسین۔ میری جگہ تم ہوتے' تمہارے چاروں طرف ایک سے بڑھ کر ایک پری جمال میم ہوتی۔ اصلی ولایتی حسینہ۔ گلاب اور سنگِ مرمر سے تراشی ہوئی۔ اور وہ سب ناز انداز سے بجلیاں گراتیں۔ تم پر ہزار جان سے فریفتہ ہوتیں۔ تو تم آتے یہاں کی گنوار ٹائپ کالی کلوٹی' بدتمیز اور بے ہنگم لڑکیوں میں سے زبردستی کسی کو اپنی منکوحہ بنانے کے لیے؟"

خادم حسین کی آنکھوں میں جیسے خواب اُتر آئے "ایمان کی بات کی ہے جی آپ نے۔ تو سچ بات یہ ہے کہ میں تو وہیں مرجاتا۔ اللہ مجھے معاف کرے۔ بشر بڑا کمزور اور شیطان قوی ہے مگر اپنے نصیب ایسے کہاں تھے سکندر صاحب۔۔۔"

رابعہ نے منہ پھلا کے کہا "سکندر صاحب کو روکا کس نے ہے۔ یہ اب جانا چاہیں تو ولایت میں بہت ہوں گی ان کی راہ دیکھنے والی۔"

"دیکھیں رابعہ بی بی۔ آپ تو ابھی سے خفا ہونے لگیں۔ ابھی تو میں نے یہ بتایا ہی نہیں کہ سکندر صاحب کے ہاتھ میں شادی کی دو لکیریں ہیں اور کیا ضرورت ہے مجھے بتانے کی۔۔۔"

میں نے کہا "صرف دو خادم حسین۔ ذرا غور سے دیکھو۔ شاید تیسری بھی ہو' نظر نہ آرہی ہو۔ اصولاً تو چار ہونی چاہئیں اور مجھے دوسری کے بارے میں ذرا تفصیل سے بتاؤ۔"

"آپ اسے مذاق نہ سمجھیں جناب۔ ہاتھ کی لکیریں جھوٹ نہیں بولتیں۔ ایک شادی تو آپ کی ہوگئی تھی۔"

"اچھا! کمال ہے میری شادی ہوگئی اور مجھے پتا ہی نہیں چلا۔ کب ہوئی تھی یہ شادی اور کس سے؟"

خادم حسین نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا "آپ جانتے ہیں جناب۔ میں مرحومہ کا نام اب کیوں لاؤں اپنی زبان پر۔ اس سے آپ کی نسبت طے تھی اور جناب ذہنی طور پر آپ ایک دوسرے کو قبول بھی کرچکے تھے۔ نکاح کی کسر رہ گئی تھی بس۔ مرحومہ کا ہاتھ تو میں نے نہیں دیکھا جی مگر اس میں بھی ایسی ہی دو لکیریں ہوں گی۔ ایک ادھوری اور دوسری مکمل۔ ایک ہلکی اور دوسری گہری۔"

مولوی خادم حسین نے سچ بول دیا تھا اور مذاق کی بات اچانک انتہائی دل آزار موضوع بن گئی تھی۔ میری ساری شوخی ختم ہوگئی تھی اور میں سیدھا ہو کے خلا میں دیکھنے پر مجبور ہوگیا تھا۔ میں خادم حسین کو غلط بھی نہیں کہہ سکتا تھا اور اسے یہ الزام بھی نہیں دے سکتا تھا کہ اپنی دست شناسی کا بھرم رکھنے کے لیے اس نے میرے حالات سے آگاہی پر انحصار کیا۔ وہ کوئی چالاک اور عیار آدمی نہیں تھا کہ مجھے متاثر کرنے کے لیے اور اپنی علمیت اور قابلیت کا رعب جمانے کے لیے ایسی بات کرتا جو کسی طرح بھی کہی جاتی ایک تلخ ناقابلِ تردید حقیقت رہتی۔ اس نے اپنے محدود کتابی علم سے جو نتیجہ اخذ کیا تھا وہ بتادیا اور ہاتھ کی لکیروں پر اعتقاد نہ رکھنے کے باوجود میں اسے تسلیم کرنے پر مجبور تھا۔

میں نے دوسری طرف سے اُتر کے کہا "ہاں۔ اس کا تعلق بھی شادی سے ہی ہوتا ہے۔ یوں سمجھ لو کہ ایک ہی سوال کے دو حصے ہوتے ہیں۔ شادی سے پہلے اور شادی کے بعد۔۔۔"

رابعہ نے خادم حسین کو کھینچ لیا "چھوڑو خادم حسین' تم جیسے باکمال آدمی کو فضول لوگوں کے فضول سوالات کا جواب دینا ہی نہیں چاہیے۔ ایک بات نہ جانے کس نے کہی تھی فارسی میں جو مجھے یاد رہ گئی۔ جوابِ جاہلاں باشد خموشی۔"

"یہ بات میں نے کہی تھی۔ عقلمندی کی باتیں میرے سوا کون کرسکتا ہے؟"

خادم حسین نے بے بسی سے مجھے دیکھا "حیرت ہے کہ آپ خاموش ہیں جناب اور آپ کی رگ حمیت نہیں پھڑک رہی ہے۔ آپ کی غیرت جوش میں نہیں آئی۔ بخدا آپ کی جگہ میں ہوتا تو۔۔۔ خون کردیتا۔"

"کس کا خون کردیتے؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"اپنا۔۔۔ اپنی گھر والی کا۔ یا اس کا۔۔۔ جس کا ہاتھ وہ ایسے سرِعام پکڑتی۔" خادم حسین نے افسوس سے سرہلایا "یہ ایک نامحرم کا ہاتھ ہے مس رابعہ۔ مجھے اپنے ساتھ گناہگار مت کریں۔"

رابعہ ہنسی "تم نامحرم کہاں ہو مولوی خادم حسین۔ تم تو میرے بھولے بھالے پیارے پیارے معصوم اور نیک بھائی ہو۔ میں تو سب کے سامنے تمہیں گلے لگا کے پیار بھی کرسکتی ہوں۔ بتاؤں کیسے۔۔۔؟"

"اُف۔۔۔ مس رابعہ۔۔۔ خدا کے لیے ایسا مت کریں" خادم حسین نے اپنا ہاتھ چھڑایا "مجھے آپ۔۔۔ آپ سے ایسی اُمید نہیں تھی۔ باقی سب تو خیر شرم وحیا سے عاری ہیں لیکن آپ۔۔۔"

"ایک اور بات خادم حسین۔ یہ میری گھر والی نہیں ہے جس نے تمہارا ہاتھ تھام لیا ہے۔ اس لیے میرے غیرت میں آکے کسی کو قتل کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میری طرف سے تمہیں اجازت ہے کہ چاہو تو خود رابعہ کا ہاتھ تھام لو۔ تم دست درازی کرسکتے ہو' اگر ہمت ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ۔" خادم حسین ناراض ہوگیا "ایسے بے ہودہ الفاظ آخر آپ کی زبان پر کیسے آئے؟ اور وہ بھی میرے لیے؟"

"بھئی دست درازی کا مطلب ہے ہاتھ لمبا کرنا' ہاتھ بڑھانا۔ تو ہاتھ بڑھائے بغیر تم ہاتھ پکڑ کیسے سکتے ہو؟"

اوپر محسن نے گزشتہ شب کے دو اسیروں کو فرش پر اوندھا لٹا رکھا تھا مگر ان کے ہاتھ پاؤں آزاد تھے۔

خادم حسین اندر داخل ہوتے وقت بھی بڑبڑا رہا تھا "یہ کہاں پھنسادیا تقدیر نے خادم حسین کو۔ منظر صاحب' محسن صاحب' سکندر صاحب۔ ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ سب ننگے ہیں اس حمام میں۔"

رابعہ نے گاڑی اپنے آفس کے سامنے روک کے اچانک اپنا ہاتھ پیچھے سے خادم حسین کی طرف بڑھادیا۔

"میرا ہاتھ بھی دیکھو۔"

خادم حسین پہلے ہی نروس تھا "جی۔۔۔ ابھی۔۔۔ یہاں۔۔۔"

"ہاں۔۔۔ ابھی۔۔۔ یہاں۔۔۔" رابعہ نے قطعی لہجے میں کہا "مجھے بھی بتاؤ کہ میرے ہاتھ میں شادی کی کتنی لکیریں ہیں؟"

خادم حسین کا رنگ اُڑنے لگا "دیکھیں جی۔ میں۔۔۔ مجھے تو معاف ہی رکھیں آپ۔"

"نہیں خادم۔۔۔ تمہیں بتانا پڑے گا۔ جو بھی سچ ہے' بالکل اسی طرح جیسے تم نے سکندر صاحب کو بتادیا۔ ڈرنے یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میرے ہاتھ کی لکیریں جو بھی کہتی ہیں صاف صاف بتادو۔ خدا کو حاضر ناظر جان کے۔"

میں رابعہ کا مقصد سمجھ گیا تھا مگر اس وقت مداخلت کا جواز نہیں تھا۔ رابعہ دیکھنا چاہتی تھی کہ اس کی اپنی پہلی شادی کے بارے میں خادم حسین کا علم کیا کہتا ہے۔ اس کی پہلی شادی ایک ایسے شخص سے ہوگئی تھی جو شادی کے قابل ہی نہیں تھا مگر اس میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں تھی کہ یہ بات وہ کسی اور کو بتا سکتا مگر وہ اتنا شریف آدمی تھا کہ اس نے رابعہ کو ہاتھ لگائے بغیر اعترافِ جرم کرلیا اور وہ باعزت طور پر الگ ہوگئے۔ اب وہ حکومت میں بہت اونچے درجے پر فائز تھا مگر اس نے شادی کی غلطی دوبارہ نہیں کی تھی اور رابعہ کے معاملے میں انتہائی وسیع القلبی کا اور عالی ظرفی کا ثبوت دیا تھا۔ یہ بات رابعہ کے سوا صرف میں جانتا تھا اور مجھے اس نے یہ بات بہت پہلے اس وقت بتادی تھی جب میں نے اظہارِ محبت کے بعد اس سے زندگی بھر کی رفاقت مانگی تھی۔

خادم حسین نے مجبوراً رابعہ کا ہاتھ دیکھا اور سپاٹ لہجے میں بولا "دو شادیاں آپ کی بھی ہیں جناب لیکن آپ کے ہاتھ میں دونوں لکیریں گہری ہیں۔ ادھوری لکیر جیسی سکندر صاحب کے ہاتھ میں ہے ایسی لکیر نہیں ہے یہ۔۔۔"

رابعہ مسکرائی "تم واقعی ہاتھ دیکھنا جانتے ہو خادم حسین۔ کمال کے دست شناس ہو تم۔ مجھے اور سکندر کو قائل کرلیا تم نے۔ اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا تمہاری دست شناسی کی صلاحیت کا۔ تم تو بہت بڑے پامسٹ بن سکتے تھے۔ ہزاروں کما سکتے تھے۔"

خادم حسین نے نفی میں سرہلایا "نہیں جناب۔ ہزاروں وہ کماتے ہیں جو جھوٹ بولتے ہیں۔ سنہرے خواب دکھاتے ہیں۔ مستقبل میں دولت عزت شہرت کی بات کرتے ہیں۔ یہ تو لاکھوں میں کسی ایک کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ باقی سب میری طرح ہوتے ہیں جی۔ ایسے نصیب کا حال کون جاننا چاہتا ہے جس میں خوشی ہی نہ ملے۔"

رابعہ نے گاڑی کا دروازہ لاک کیا۔ "ایک سوال اور پوچھوں؟"

"پھر تو بہتر ہے کہ تم بھی کپڑے اُتار دو اپنے کیونکہ تم اسی حمام میں ہو" میں نے اسے چھیڑنا جاری رکھا "ویسے معاف کرنا مولوی خادم حسین۔ کم تم بھی نہیں ہو۔ تمہارا نام ایک پردہ ہے دنیا کو دھوکا دینے کے لیے۔ اندر سے تم اتنے رنگین مزاج ہو کہ منظر کو تمہارے مقابلے میں شریف سمجھا جاسکتا ہے۔"

"یہ۔۔۔ یہ بڑی زیادتی ہے۔ بڑا رکیک حملہ ہے میری ذات پر سکندر صاحب۔ تہمت ہے مجھ پر۔"

"کیوں۔ ابھی جب میں لندن کی رنگینی کا ذکر کر رہا تھا تو کیا کہا تھا تم نے۔ رال ٹپک رہی تھی تمہاری۔"

خادم حسین میں بہت سی خوبیاں تھیں۔ ایک خوبی یہ تھی کہ وہ جتنی جلدی بُرا مانتا تھا اتنی ہی جلدی سب کچھ بھول بھی جاتا تھا۔ اس کا دل ایک ایسا آئینہ تھا جس پر غبار آتا تھا اور مٹ جاتا تھا۔ وہ بات دل میں رکھنے والا اور کینہ پرور نہیں تھا۔ اگر وہ سچ مچ خفا ہوتا تو ہمیں چھوڑ کے چلا جاتا مگر ہماری "غیر شریفانہ" صحبت میں رہنا بھی اس کی مجبوری بن چکا تھا۔ ہمارے "بے ہودہ" مذاق سے وہ رنجیدہ اور کبیدہ خاطر ہوتا تھا مگر ذرا سی دیر کے لیے۔ یہ اس کی بے وقوفی تھی یا سادگی کہ وہ خاموش نہیں رہ سکتا تھا۔ کوئی بات اسے ناگوار محسوس ہوتی تھی تو ناگواری کا اظہار وہ لحاظ کیے بغیر فوراً کردیتا تھا اور ہمیں اس کو مزید تنگ کرنے کا موقع مل جاتا تھا۔

رابعہ نے اپنی سیٹ پر بیٹھ کے دونوں جنگی قیدیوں کو غور سے دیکھا "یہ کون ہیں اور یہ کیا ڈراما چل رہا ہے؟"

میں نے فرنچ میں کہا "یہ مسٹر قادر ہیں۔ قادر بجلی والا۔ یہ بجلی سے چلتا ہے۔" مترجم کا کردار خادم حسین کو ادا کرنا پڑا۔

محسن نے سرہلایا "دو بار بجلی کے جھٹکے بھی کھاچکا ہے ناشتے میں۔ اس کے اندر الارم بھی لگا ہوا ہے جو بجلی لگاتے ہی بولتا ہے' آواز سُنو گے؟"

میں نے کہا "کیسی آواز ہے؟"

"بہت عجیب۔ بالکل یوں لگتا ہے جیسے بلبل اور بھینس ایک ساتھ مل کے رو رہی ہوں۔ جیسے کسی نے انہیں تیز مرچوں والے پکوڑے کھلادیے ہوں" محسن نے بجلی کے ایک تار کی نوک قادر کی ناک کے قریب لا کے کہا۔

قادر چلّانے لگا "میں مرجاؤں گا جی۔ میرا دل کمزور ہے۔"

"یہ ٹھیک کہہ رہا ہے یار۔ خود بھی تو کمزور ہے بے چارا۔ ناشتے میں دو جھٹکے کافی ہیں۔ تیسرے سے بدہضمی نہ ہوجائے" میں نے کہا۔

محسن نے رابعہ کی طرف دیکھا "یہ فضل داد ہے۔ حویلیاں میں رہتا تھا۔"

"حویلیوں میں کہو۔"

"حویلیاں ایک جگہ ہے۔ ایبٹ آباد کی طرف۔ وہاں گھر کسی کا نہیں ہوتا غالباً۔ سب حویلیاں ہوتی ہیں" محسن بولا "اس کے خون میں جتنا نمک ہے سب چوہدری دلاور کا ہے۔ اس نمک کو خون سے نکالے بغیر بات نہیں بنے گی مگر طریقہ بڑا مشکل ہے۔ پہلے اسے الٹا لٹکا کے کہیں ایک سوراخ کرنا پڑے گا جہاں سے تمام خون نکالا جاسکے پھر ایک کیمیائی طریقے سے اس خون کو صاف کیا جائے گا۔ اس میں سے نمک الگ کرنے کے علاوہ کچھ دوسری غلاظتوں کو بھی دور کرنا پڑے گا۔ پھر یہ پاک وصاف شریفانہ خون دوبارہ اس کی رگوں میں ڈال کے دیکھیں گے۔"

"مگر یار ایسے تو یہ مرجائے گا۔"

محسن نے سخت حیرانی کا اظہار کیا "اچھا! یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا پھر کیا کریں۔ جب تک دلاور کے نمک کا اثر رہے گا یہ اس کی آواز میں بھونکتا رہے گا۔"

میں نے سوچ کے کہا "اسے انجکشن دو۔ پہلے نمک کے ہلکے تیزاب کا۔ نمک اس تیزاب میں مل جائے گا پھر شورے کا تیزاب پلاؤ اسے۔ ایک چائے کا چمچہ دن میں تین بار۔ شورے کے تیزاب سے شوریدہ سری ختم ہوجاتی ہے۔ شور کرتا ہے مریض مگر بالآخر چُپ ہوجاتا ہے۔"

فضل نے سر اُٹھایا "تم جو چاہو کرو۔ میں تمہاری مرضی کا بیان نہیں دوں گا۔"

میں نے سوچ کے کہا "ہوں۔ چلو کوئی بات نہیں فضل۔ تمہاری بیوی بھی پہلے بہت اکڑ رہی تھی۔ بعد میں مان گئی۔"

"جھوٹ بولتے ہو تم۔ بکواس کرتے ہو۔"

میں نے کہا "تم نے اپنے آقا اور ان داتا کی حالت دیکھی ہوگی فضل' اس کے مقابلے میں تم کیا چیز ہو۔ چوہدری دلاور کی بیوی نے کل اس سے قید خانے میں ملاقات کی تھی۔ اس کے بعد وہ بھی رضامند ہوگئی۔ ہم سے تعاون پر۔ دراصل اس کی بھی وہی مجبوری تھی جو تمہاری ہے۔ دلاور جیسے اور تم جیسے پُرانے بڈھے شوہروں کی اب انہیں اتنی ضرورت بھی نہیں رہی مگر ایک بیٹی دلاور کی ہے۔ جیسے تمہاری بیٹی ہے۔ بھولی بھالی اور معصوم۔ ظاہر ہے کوئی ماں یہ برداشت نہیں کرسکتی کہ باپ کی سزا بیٹی کو ملے۔" مترجم خادم حسین ہی تھا۔

اندھیرے میں چلایا ہوا تیر نشانے پر لگا۔ فضل کی صورت پر ایک دم شکست کے آثار نمودار ہوگئے۔ بہن یا بیٹی کا رشتہ انسان کی سب سے بڑی کمزوری بن جاتا ہے۔ مجھے علم نہیں تھا کہ فضل شادی شدہ ہے تو اس کی کتنی بیٹیاں ہیں اور کتنے بچے؟

وہ زمین پر سر مار کے رونے لگا "مجھے مار ڈالو۔ میرے ٹکڑے کردو۔ لیکن اس کو کچھ مت کہو۔"

میں نے کہا "ابھی تک ہم نے اس سے کوئی بات ہی نہیں کی ہے فضل' اسے تمہارے بارے میں بھی کچھ معلوم نہیں۔ وہ بہت آرام سے اور بالکل محفوظ ہے۔ تمہارے اپنے گھر میں ہے مگر تم ملنا چاہو تو ہم اسے بھی یہاں لاسکتے ہیں۔"

محسن نے اپنی گھڑی دیکھی۔ "ساڑھے دس بجے ہم تمہاری بیوی کو اور بیٹی کو دوسری دنیا میں۔۔۔ میرا مطلب ہے دوسری جگہ پہنچادیں گے۔"

وہ چلّایا "نہیں۔ انہیں وہیں رہنے دو۔"

"تھوڑی سی دیر کے لیے انہیں تم سے ملوانے کے بہانے کہیں لے جانا پڑے گا فضل۔ چند گھنٹے وہ ایک ایسے گھر میں گزاریں گی جہاں ان کے آرام اور آسائش کی ہر چیز ہوگی۔ وہ اتنی ہی محفوظ ہوں گی جتنی اپنے گھر میں تھیں۔ وہاں انہیں تمہارا بیان براہِ راست سننے کو ملے گا۔ جو کچھ تم کہو گے سب ان کے کانوں تک پہنچ جائے گا۔ اگر تم نے اپنے بیان کو حقائق تک محدود رکھا' وہی کہا جو سچ ہے تو انہیں کچھ نہیں ہوگا۔ وہ شام کو واپس اپنے گھر میں ہوں گی۔"

"خدا کے لیے ایسا مت کرو۔ انہیں کچھ معلوم نہیں کہ۔۔۔ کہ میں باہر کیا کرتا ہوں" وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

میں نے محسن کی طرف دیکھا "یار اس شخص کو تھوڑی سی رعایت دے سکتے ہیں ہم۔ جو بیان یہ پولیس کے سامنے دے گا وہ ٹھیک ہوگا تو بس وہی سُنیں گے جو وہاں موجود ہوں گے۔ اگر یہ بھٹک گیا اور اس نے پٹڑی سے اُترنے کی کوشش کی تو پھر اس کی آواز انہیں بھی سنوادیں گے۔ اس کی بیوی اور بیٹی کو' کیا خیال ہے؟"

"میرا خیال کیا پوچھتے ہو' یہ تو فضل داد حویلیاں والا کی مرضی ہے۔ اس نے دلاور سے وفاداری کو ترجیح دی تو دنیا میں اکیلا رہ جائے گا۔ ہمیں تو اچھے خاصے پیسے مل جائیں گے ان کے۔ لڑکی تو خیر ہے ابھی نوعمر مگر ماں بھی تو بوڑھی تو نہیں ہوئی ہے۔"

میں نے کہا "بات ہوگئی ہے کسی سے؟"

"ہاں۔ ایک پارٹی ہے جو مال ایکسپورٹ کرتی ہے۔ مڈل ایسٹ میں اچھی مارکیٹ ہے۔ بنکاک سے بھی ایک فون آیا تھا۔"

فضل کا رنگ لاش کی طرح سفید ہوگیا "تم انہیں بیچ دوگے۔ تمہاری اپنی ماں بہن نہیں ہے؟"

میں نے نفی میں سرہلایا "نہیں۔ اور ہوتیں تو ہم کوئی غلط کام نہ کرتے۔"

محسن بولا "بے گناہ ہونے کے باوجود میری بہن اور میرا بہنوئی کراچی میں قتل کردیے گئے۔ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔"

"مگر میں۔۔۔ میں دلاور کے خلاف نہیں بول سکتا۔ وہ مار ڈالے گا مجھے۔"

"اپنی زندگی اس شخص کو اپنی بیوی اور بیٹی کی عزت سے زیادہ پیاری ہے" میں نے محسن سے کہا۔

"چھوڑیں گے تو ہم بھی نہیں تمہیں فضل۔ اگر تم نے وہ سب نہ کیا جو میں نے بتایا ہے تو بعد میں دلاور تمہیں نہیں بچاسکے گا۔ وہ تو خود کال کوٹھری میں ہوگا۔ سو پیاز کھالو یا سو جوتے۔ جان کا خطرہ مول لے کر بیوی اور بیٹی کی عزت تو بچالو۔"

محسن نے کہا "ہم کوشش کریں گے تمہیں بچانے کی۔ پولیس پر ہم بھروسا نہیں کرسکتے لیکن خود تمہیں تحفظ فراہم کرسکتے ہیں۔ ولاور کی دلاوری کا دور گزر گیا۔ آنے والا وقت ان سب کے لیے زیادہ بُرا ثابت ہوگا جو سمجھتے تھے کہ دلاور کا سایہ آسمان کی طرح ہے جو ہمیشہ رہے گا۔ اگر دلاور کا ساتھ دوگے تو یہ سوفیصد گھاٹے کا سودا ہوگا۔ ہمارا ساتھ دینے میں ففٹی ففٹی کا چانس ہے۔ فیصلہ خود کرلو۔"

"میں..... میں یہ چانس لوں گا" فضل نے سرزمین پر ڈال دیا اور سسکیاں لینے لگا۔

قادر بجلی کا کردار زیادہ اہم نہیں تھا۔ وہ اب تک رانا کے لیے چھوٹے موٹے کام کرکے ہی خوش تھا کیونکہ اسے معاوضے سے زیادہ بڑا انعام مل جاتا تھا۔ وہ اپنی طرف سے پوری کوشش کررہا تھا کہ رانا کا خاص آدمی بن جائے اور کسی حد تک اس کوشش میں کامیاب بھی ہوا تھا لیکن اس نے تصویر کا دوسرا رُخ آج پہلی بار دیکھا تھا تو اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ محنت کے معاوضے اور غلامی کے طوق کی قیمت میں کیا فرق ہوتا ہے۔

رابعہ نے مجھے آنکھوں ہی آنکھوں میں اندر چلنے کا اشارہ کیا تو میں نے خادم حسین سے کہا "خادم حسین۔ یہ حسین اور نوجوان عورت مجھے کیسی بے شرمی سے ورغلا کے اندر لے جانا چاہتی ہے۔ اس سے کہو کہ میں....."

خادم نے غصّے سے کہا "ایسی خرافات کے لیے آپ اپنی زبان ہی استعمال کریں۔"

"کہیں یہ تمہیں تو اشارے نہیں کررہی ہے؟" میں نے کہا "تم بھی کم پُرکشش نہیں ہو۔"

محسن نے کہا "مولوی خادم حسین میں سیکس اپیل کُوٹ کُوٹ کے بھری ہوئی ہے۔ میں خود ڈرتا ہوں کہ کہیں کُل پر ڈورے نہ ڈالے یا وہ خود اس پر لٹو نہ ہوجائے۔"

خادم حسین واک آؤٹ کرگیا اور گیلری میں کھڑا ہوکے مال روڈ کی ٹریفک کو دیکھنے لگا مگر اس کے دل ودماغ سے غصے کا دُھواں ایسے اُٹھ رہا تھا جیسے تندور میں جلنے والی گیلی لکڑی سے۔

رابعہ نے کہا "محسن، تم شرافت سے بتاؤ گے کہ یہ کیا چکر ہے۔ سکندر نے اور تم نے یہ سرپرائز کیوں دیا ہے مجھے؟"

محسن نے سر کھجایا "کیوں کا جواب میں کیا دوں۔ بس یہ سمجھ لیں وکیل صاحب کہ یہ دلاور کے خلاف سلطانی گواہ کسی کا تحفہ ہیں۔"

"اور اس سے زیادہ جاننا تمہارے لیے ضروری نہیں۔ یہ بھی بتادو تم خاتون کو" میں نے فرنچ میں کہا "محدود عقل کے گھوڑے کو لامحدود تفکرات کے میدان میں مت دوڑائیں۔ ورنہ گھوڑا پاگل ہوجائے گا۔"

رابعہ نے مجھے گھور کے دیکھا "صورت سے چغد اور حلیے سے کارٹون نظر آنے والے اس فرنچ وکیل کو بتادو کہ....."

محسن نے ہاتھ اُٹھا کے کہا "میرا خیال ہے کہ ایسی باتیں بعد میں بھی کی جاسکتی ہیں۔ اس وقت کام کی بات کی جائے۔"

اب میں نے کہا "تم ان حسین نازنین سے کہو کہ ہم خلوت میں کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔ بلکہ وہی عرض کریں گے جو خاتون سُننا چاہتی ہیں۔"

اندر جاتے ہی میں نے رابعہ کے لبوں پر مہرِ خموشی ثبت کردی اور ظاہر ہے اس کے بعد وہ کیا کہتی، سوائے مجھے بدتمیز کہنے کے۔

میں نے کہا "میں ایک نظر اپنے چوہدری دلاور صاحب کو دیکھ کے آتا ہوں۔"

"کوئی ضرورت نہیں۔ ابھی تو محسن دیکھ کے آیا ہے۔"

"بھئی، مجھے پردہ اُٹھنے سے پہلے ڈرامے کے اسٹیج کا جائزہ بھی لینا ہے۔ ڈائریکشن کی معمولی سی غلطی بھی ہوگئی تو ڈراما فلاپ ہوجائے گا۔ ہمیں ثابت یہ کرنا ہے کہ دلاور کو وہاں رانا نے قید کررکھا تھا۔ ہماری وہاں موجودگی کا کوئی سُراغ نہیں ملنا چاہیے۔ دلاور چالاک آدمی ہے۔ وہ الزام عائد کرے گا ایم آر ایس پر۔ سکندر بخت، غالب اور محسن کے خلاف زہرافشانی کرے گا مگر وہ سچ کو سچ ثابت نہیں کرسکے گا اور ہم جھوٹ کو سچ بنادیں گے۔ یہ کام اتنا آسان بھی نہیں۔ دلاور کو جب پولیس اور پریس کے سامنے بولنے کی آزادی حاصل ہوگی تو وہ کھل کر گرجے گا اور برسے گا معلوم نہیں کیا ثبوت پیش کردے وہ جس سے بازی پلٹ جائے۔"

"بازی اب نہیں پلٹ سکتی۔ ڈاکٹر شبلی کے قتل کے الزام سے اس کو کون بچا سکتا ہے۔" رابعہ بولی "اگر وہ تم پر یا محسن پر اغوا کا الزام لگاتا ہے یا حبسِ بے جا کا کیس کرتا ہے تو اس کے کہنے سے جرم ثابت نہیں ہوتا۔ غالب اور نازو کی گمشدگی کے معاملے پر تو پہلے ہی اخبارات نے آسمان سر پر اُٹھا رکھا ہے۔ سکندر کو دلاور نے ایک چوکیدار کے روپ میں دیکھا تھا۔ وہ چوکیدار دوبارہ نظر آیا تو پولیس اسے پکڑ لے گی۔ سکندر بخت پہلے ہی غائب تھا۔ اب بھی غائب ہے۔"

"اور ناچیز ہے ایک فرنچ وکیل۔ علاوہ تمہارا دیوانہ ہونے کے۔"

"صرف دیوانہ کہو خود کو تو کافی ہے" رابعہ بولی۔

"گویا اب مجھے اجازت ہے جانے کی؟" میں نے کہا۔

"میں نے تو اجازت نہیں دی" وہ مسکرائی۔

"یوں مسکرانے کا مطلب تو یہی ہے۔ خیر اب تم ذرا باہر جا کے ان دونوں کی دلجوئی کرو۔ انہیں کچھ حوصلہ اور تسلی دو۔ کچھ خاطر تواضع کرو ان کی لیکن اس طرح کہ وہ کوئی ناجائز فائدہ نہ اُٹھائیں۔ ریوالور تمہارے ہاتھ میں اسی طرح رہنا چاہیے جیسے شہنشاہ اکبر کے ہاتھ میں گلاب کا پھول رہتا تھا۔"

"مثال غلط ہوگئی۔ وہ پھول کو ہتھیار کے طور پر نہیں رکھتے تھے۔"

میں نے کہا "او کے۔ جیسے گینڈے کے سر پر سینگ۔ اپنے دفاع اور حملے کے لیے ہر وقت تیار۔"

"تم کتنی دیر میں آؤ گے؟"

"جانے سے پہلے میں آنے کا وقت کیسے بتا سکتا ہوں اور اتنے پیار سے پوچھو گی تو میں جاؤں گا ہی نہیں۔"

"اچھا بابا میں چلی جاتی ہوں؟" رابعہ ہنسی۔

"بابا! پھر بابا؟" میں نے سر پر ہاتھ مارا "کچھ دیر ضرور ہوگئی ہے شہری بابو کو بارات لانے میں مگر اب اتنا اندھیر بھی نہیں ہے کہ اسے بابو سے بابا بنا دیا جائے۔ باباجی سکندر بخت..."

محسن نے اندر آکے کہا "باباجی، آپ کی تو مت ماری گئی ہے۔ سٹھیا گئے ہیں آپ۔"

میں نے کہا "بڈھے کھوسٹ۔ کیا بک رہا ہے۔"

"میں کیا بک رہا ہوں۔ آپ کی ساری بک بک باہر اتنی صاف سُنائی دے رہی تھی جیسے بی بی سی کی نشریات۔"

میں نے خفت سے کہا "یعنی بھانڈا پھوٹ گیا ہمارا۔ کہ ہم فرنچ نہیں ہیں۔ یہ تو اچھا نہیں ہوا۔"

"اگر عین وقت پر سلطانی گواہوں نے انگلی اُٹھا کے کہہ دیا کہ یہ جعلساز سکندر بخت ہے جو فرنچ وکیل بنا ہوا ہے۔"

میں نے کہا "شیروانی صاحب۔ آپ جانتے ہیں کہ ملزمان زیر تحویل ہماری مرضی کے خلاف نہیں بول سکتے۔ یہ بات بھی ان کو سمجھائی جاسکتی ہے کہ فرنچ وکیل کے معاملے میں اپنی زبان بند رکھیں۔"

"وہ تو میں نے سمجھا دیا ہے مگر تجھے بھی احتیاط کرنی چاہیے کبیر داس تاکہ تیرا یہ رول چلتا رہے۔ ابھی بہت سے قانونی اور عدالتی معاملات درپیش ہوں گے۔ یہ راز فاش ہوگیا تو ہمارا سارا کھیل چوپٹ ہوجائے گا۔"

میں نے کہا "سوری یار۔ میں آئندہ خیال رکھوں گا۔ یہ بتا کہ اخبار والوں سے رابطہ ہوا؟"

"ہاں۔ غازی سے بات ہوگئی تھی۔ اس نے کہا کہ ویسے تو یہ اپنی اسٹوری بنتی۔ بالکل EXCLUSIVE مگر معاملہ ہے اپنے ہم پیشہ برادر غالب ثانی کا۔ اس لیے کوریج کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دو۔ تم کہو تو خصوصی ضمیمے شائع کرادوں۔ چوہدری دلاور کی رنگین تصاویر کے ساتھ۔ میں نے کہا کہ اس کی ضرورت نہیں۔ بس کوریج مکمل ہونی چاہیے اور سب اخبارات میں ایک ہی VERSION ہونا چاہیے۔ یہ نہ ہو ایک کچھ لکھے دوسرا کچھ۔ یہ خبر غالب کے اینگل سے شائع ہوگی۔"

میں نے کہا "تُونے آمدِ بارات کا کیا وقت دیا ہے؟"

"سہ پہر کے بعد۔ غازی کو آدھے گھنٹے کا نوٹس چاہیے۔ ہم پولیس ہیڈ کوارٹر سے روانہ ہوتے وقت اسے فون کردیں گے۔ منظر کورٹ سے سیدھا پولیس ہیڈ آفس پہنچے گا۔ ایک بات تو میں بھول ہی گیا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے دلاور کی بیوی کا فون آیا تھا۔"

"اس نے وقار یوسف کے گھر بھی فون کیا تھا۔"

"پھر بات ہوئی؟"

"میں کیسے بات کرسکتا تھا۔ وہ سکندر کو پوچھ رہی تھی۔ رابعہ کے لیے تکی نے کہہ دیا کہ کورٹ چلی گئی ہیں۔ وہ رابعہ سے سکندر بخت کا کراچی کا ٹیلی فون نمبر معلوم کرنا چاہتی تھی۔"

"یہی اس نے مجھ سے پوچھا تھا۔"

"پھر تُونے کیا کہا؟"

"میں نے کہا کہ کراچی میں اس کا کوئی ایک ٹھکانا نہیں ہے۔ وہ خود ہی فون کرتا رہتا ہے۔ اگر ضرورت محسوس ہو۔"

میں نے کہا "وقار کے گھر تو اس فلاں فلاں کی غیر منکوحہ بیوی کی اولاد نے بھی فون کیا تھا۔ سالا نطفۂ ناتحقیق۔ دلاور بن کے بات کررہا تھا۔ رابعہ نے خوب ذلیل کیا۔"

محسن نے تعجب سے کہا "فیصل۔ اس نے دلاور بن کے فون کیا تھا، اس کی یہ ہمت؟"

"وہ بڑا حرامی ہے یار۔ ایسی آواز اور لہجے کی نقل اُتاری تھی اس نے کہ پہلے تو میں بھی چکرا گیا تھا۔"

"پھر پہچانا؟"

"بچہ ہے نا، غلطی ہوگئی" میں نے کہا "ولن کی طرح قہقہہ لگایا تو بھید کُھل گیا۔ ویسے بھی ہم اتنی آسانی سے دھوکا کھانے والے نہیں ہیں۔ ہاں کوئی اور ہوتا تو اس کے لیے فرق محسوس کرنا مشکل تھا۔ وہ لونڈا اپنے باپ کا ڈبل رول کرسکتا ہے۔ دوبارہ فون آئے اس کی ماں کا تو کہہ دینا کہ رات کو وقار یوسف کے گھر پہنچ جائے۔ سکندر شاید فون کرے گا۔"

"اس پر اعتبار ہے تمہیں؟"

"وہ کیا کرے گی؟ ان حالات میں؟"

محسن نے کہا "جس عورت کا شوہر تمہاری قید میں ہے اور اس کی حالت بھی وہ دیکھ چکی ہے۔ کیا وہ تمہیں گرفتار نہیں کرا سکتی۔"

"ٹیلی فون پر؟"

"یار وہ ہوشیار عورت ہے۔ ادھر وہ تم سے بات کررہی ہوگی۔ اُدھر وقار یوسف کے فون پر آبزرویشن لگانے والے جان لیں گے کہ تم کہاں سے بول رہے ہو۔ اگر تم کراچی میں ہوتے تب بھی یہ ہوسکتا تھا کہ ایک کال کرکے وہاں کی پولیس کو مطلع کردیا جاتا اور..."

"میں سمجھ گیا مگر ایک تو میں اس سے بھی بات نہیں کروں گا۔ دوسرے یہ بھی ضروری نہیں کہ آج رات ہی بات کرنا ضروری ہو۔ خود کو محفوظ رکھنے کے لیے اسے کل کہیں اور بُلایا جاسکتا ہے۔ پرسوں کوئی اور نمبر دیا جاسکتا ہے۔ کہاں کہاں آبزرویشن لگوائے گی وہ۔ میں نے اس کی مدد بھی کی تھی۔"

"یہ توقع مت رکھو کہ وہ تمہاری احسان مند رہے گی تمام عمر.... وہ رانا کے چنگل سے بچ نکلی۔ اسے وہ اپنی خوش قسمتی سمجھے گی کہ خدا کو بچانا منظور تھا چنانچہ وہ بے وقوف سکندر آگیا۔ وہ نہ آتا کوئی اور آجاتا۔"

میں نے کہا "لیکن اس کا دوسرا مسئلہ بھی ہے شیروانی صاحب۔ کوئی اور نہیں جانتا کہ دلاور کہاں قید ہے۔ ابھی وہ خود بھی نہیں جانتی کہ ہم نے دلاور کو پولیس کے حوالے کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔"

اچانک فون کی گھنٹی بجنے لگی' محسن نے کہا "شاید پھر اسی کا فون آیا ہو۔"

پہلے خادم حسین نے ریسیور اُٹھا کے ہیلو کہا اور پھر میں نے رابعہ کی آواز سُنی "غازی۔ کون غازی؟"

میں نے کہا "لاؤ ریسیور' مجھے دو۔ یہ غازی وہی ہے گفتار کا غازی۔ جو کردار کا غازی نہیں تھا۔ اتنی جلدی بھول گئیں۔"

"وہ.... وہ بلیک میلر....؟"

میں نے ریسیور پر ہاتھ رکھ کے کہا "شش.... آہستہ۔ وہ سُن لے گا۔ ہمیں اس کی مدد کی سخت ضرورت ہے۔"

دوسری طرف سے غازی نے کہا "ہم نے سُن لیا دوست لیکن ہم لفظوں کے تیروں سے گھائل ہونے والے نہیں ہیں۔"

باالفاظ دیگر چکنے گھڑے اور ڈھیٹ ہیں۔ میں نے دل میں کہا۔

"ہم تو بس یاروں کے یار ہیں۔ تم غالب کے یار تو ہمارے بھی یار۔ سگے نہ سہی سوتیلے سہی۔" وہ قہقہہ مار کے بولا۔

میں نے کہا "خیریت ہے نا اس وقت کیسے یاد کیا؟"

"بس یار ہم ... بقول شاعر۔ کفن باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں۔ رپورٹر بھی اور فوٹو گرافر بھی۔"

میں نے کہا "ابھی تو کچھ دیر ہے شو شروع ہونے میں۔"

"ہاں۔ مگر اس درمیان میں ایک اور شو کے لیے بُلاوا آگیا تو ہم نے سوچا کہ تم سے پوچھ لیں۔ آخر یہ سلسلہ کیا ہے۔ میاں کا ڈراما ایک طرف اور بیوی کا دوسری طرف۔ دونوں میں کوئی کنکشن ضرور ہوگا۔"

میں نے ہنس کے کہا "بیوی کا ڈراما!"

اس نے قہقہہ مارا "بھئی ویسے تو ہر بیوی ہر وقت ڈراما کرتی رہتی ہے مگر میری مراد تھی مسز دلاور کی پریس کانفرنس سے۔"

میں اپنی حیرت پر قابو نہ رکھ سکا "مسز دلاور۔ اس نے بُلائی ہے کوئی پریس کانفرنس؟ کہاں؟"

"ایک بہت بڑے ہوٹل میں۔ ظاہر ہے لنچ بھی زوردار ہوگا۔ اور ہم ایسے ڈراموں کو بہت پسند کرتے ہیں بھائی جہاں پیٹ پوجا کا بندوبست بھی زبردست ہو۔ صرف خبر ہی زبردست نہ ہو۔ ظاہر ہے وہاں ہاؤس فل جائے گا' ہر ایرا غیرا صحافی بھی پہنچے گا اور ہم جیسا پھنے خاں صحافی بھی جو بڑا احسان کرتے ہیں اگر کسی ایرے غیرے کا بیان اور تصویر چھاپ دیں۔ تو برادر کیا کنکشن ہے ان دونوں ڈراموں میں؟"

میں نے کہا "مجھے معلوم نہیں۔"

"کہیں اسے پہلے سے علم تو نہیں ہوگیا کہ تم لوگ آج کیا کرنے والے ہو؟"

"اگر تم نے ڈھنڈورا پیٹ دیا ہو تو الگ بات ہے ورنہ ابھی تک تو خود پولیس کو بھی معلوم نہیں کہ انہیں آج کیا کارروائی کرنی ہے۔ یقین نہیں تو ایس ایس پی جاوید صدیقی یا اے ایس پی آفتاب سے پوچھ لو۔"

"ہم پوچھ چکے ہیں حضرت۔ انہیں واقعی کچھ خبر نہیں۔ نہ دلاور کی نہ مسز دلاور کی۔ پریس کانفرنس کا مقصد ان کی سمجھ میں بھی نہیں آیا تھا مگر وہ آئیں گے۔"

"کیا انہیں بھی مدعو کیا گیا ہے؟"

"ہاں' مسز دلاور نے سنسنی خیز انکشافات کی یقین دہانی کرائی ہے۔ وہ خود اسی ہوٹل میں مقیم ہے مگر اس سے رابطہ نہیں ہوا۔ ہوٹل میں زبردست سیکورٹی ہے اور ہوٹل کی انتظامیہ کچھ بتانے کے لیے تیار نہیں کہ وہ کس کمرے میں مقیم ہے۔ نہ اس سے کوئی مل سکتا ہے نہ فون پر بات کرسکتا ہے۔ عجیب پُراسرار معاملہ ہوگیا ہے۔ کچھ روشنی ڈالو اس پر بھائی۔"

میں نے سب کچھ جانتے ہوئے انجان بن کے کہا "جو خود اندھیرے میں ہو وہ کیا روشنی ڈالے گا کسی پر؟"

"خیر تم ذرا ہوشیار ہوجاؤ۔ یہ عورت خود ایٹم بم سے زیادہ خطرناک ہے۔"

"تم کیسے جانتے ہو؟"

"ارے یار۔ ہر حسین اور خطرناک عورت محبوبہ ہے غازی کی۔ موت بھی تو ایک عشوہ طراز حسینہ سے کم نہیں۔ آتی ہے اور جھلک دکھا کے چلی جاتی ہے اکثر۔ دل اور جان ہتھیلی پر لیے پھرتے ہیں ہم لوگ۔ تم ذرا بچ کے رہنا۔ شریف آدمی مارے جاتے ہیں بے خبری میں۔"

"تم مجھے شریف آدمی سمجھتے ہو۔ تھینک یو' میں خیال رکھوں گا۔ اور سب کو خبردار کردوں گا۔"

"آؤ گے پریس کانفرنس میں؟"

"میں صحافی نہیں ہوں بھائی۔"

"اماں چھوڑو۔ کون پوچھے گا وہاں۔ آؤ کھاؤ اور جاؤ۔ ہاں ڈرتے ہو تو اور بات ہے۔"

"ڈرتا بھی ہوں" میں نے کہا "خود نہ آیا تو اپنے کسی نمائندے کو ضرور بھیج دوں گا۔"

ریسیور رکھ کے میں نے محسن کو بتایا کہ غازی نے کیوں فون کیا تھا۔ رابعہ کے لیے بھی یہ اطلاع پریشان کن تھی۔

"کیا کہے گی وہ عورت اخبار والوں سے۔ ہمارے خلاف زہر اگلے گی؟"

"کہیں اس نے پتا تو نہیں چلالیا کہ دلاور سے ملنے کے لیے وہ کہاں گئی تھی؟" محسن بولا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا "ناممکن۔"

"ایسا مت کہو۔ دلاور کے ہاتھ بہت لمبے تھے۔"

"مگر اس کے باوجود وہ زمین سے صرف دس فٹ نیچے قید ہے۔ اس کے ہاتھ آزادی تک رسائی حاصل نہیں کرسکتے۔ میرا خیال ہے کہ مسز دلاور ہمارے خلاف بیان دینے کا رسک نہیں لے گی۔ وہ ہماری احسان مند ہو یا نہ ہو۔ یہ بات اچھی طرح سمجھتی ہے کہ دلاور کی زندگی اور موت کی جنگ وہ ہم سے لڑ کے نہیں جیت سکتی۔ پولیس اس کی کوئی مدد نہیں کرسکی۔ دلاور کے نمک خوار ناکام ہوگئے۔ اس کی حفاظت کرنے والے شکاری کُتے اسے نہیں بچا سکے۔ اس کی دولت اور طاقت اس کے کام نہیں آئی۔ وہ شوکت رانا کی سازش کا بھانڈا پھوڑے گی۔ یہ بتائے گی کہ اس نے کیسے حالات سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے دلاور کے پورے خاندان کو نیست و نابود کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔

"اور کیا کہے گی کہ اس منصوبے کو ناکام بنانے والا کون تھا؟ اگر تمہیں خوش فہمی ہے کہ اس کا کریڈٹ وہ تمہیں دے گی' یہ کہے گی کہ اس بے ضمیر دوست سے وہ باضمیر دشمن سکندر لاکھ درجے بہتر ہے جس نے جان پر کھیل کے اسے موت کے منہ سے بچالیا..."

"مجھے ایسی کوئی خوش فہمی نہیں" میں نے کہا "لیکن عورت جذباتی ہو کے ایسی بات کہہ دے تو ناممکن بھی نہیں۔"

"اس سے ہمارے لیے ہی نہیں خود اس کے لیے مسائل پیدا ہوجائیں گے" محسن بولا۔

میں نے کہا "مسائل کی دلدل میں تو وہ اُتر چکی ہے۔ یہ اس سے نکلنے کی کوشش ہے۔"

"چلو پھر ایسا کرتے ہیں کہ ایس ایس پی جاوید سے مل لیں۔ ورنہ وہ بھی نکل جائے گا۔" رابعہ گھڑی دیکھ کے بولی۔

"تمہارے انتظامات مکمل ہیں؟"

"ہاں۔ لیکن اب وقت شاید تھوڑا سا آگے کرنا پڑے گا۔ ہم چار بجے چھاپا مارنے کا بندوبست کریں گے۔"

"غازی سے وہیں کہہ دیں گے' لنچ کے بعد" میں نے کہا۔

رابعہ نے چلتے چلتے محسن کو خبردار کیا "تم ان کا معاملہ پکّا کرلینا۔ ایسا نہ ہو...."

"ایسا نہیں ہوگا...." محسن نے اس کی بات کاٹ دی "تم جاؤ۔ میں ان کے ساتھ بعد میں آؤں گا۔ دلاور کی گرفتاری کے بعد۔"

"نہیں۔ ان کا بیان پہلے ہوگا۔ پولیس ہیڈ آفس میں جہاں دلاور سامنے نہیں ہوگا پھر ہم اپنے ساتھ انہیں بھی لے جائیں گے۔"

اچانک میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا "یار اپنے شیروانی صاحب۔ ایک زبردست آئیڈیا ہے۔ کیوں نہ مسز دلاور کی پریس کانفرنس کے فوراً بعد یہ دو سلطانی گواہ بھی پیش ہوجائیں۔"

محسن بولا "کیا میں اُچھل پڑوں؟"

رابعہ نے سر ہلایا "بات بڑی زبردست کی ہے سکندر نے۔ پولیس ہیڈ آفس کے مقابلے میں وہ جگہ یقیناً بہت بہتر ہے۔ انہیں ڈرامائی انداز میں پولیس اور پریس دونوں کے سامنے پیش کیا جائے تو یہ الزام نہیں آسکتا کہ جو کچھ انہوں نے کہا وہ جبر کے تحت یا خوف سے کہا تھا۔"

"تمہارا مطلب ہے پولیس کو بھی نہ بتایا جائے؟" محسن بولا۔

"تم کیسی وکیل ہو؟" میں نے کہا "اقبالی بیان کسی مجسٹریٹ کے سامنے دیا جائے تو مستند مانا جاتا ہے۔"

"اور وہ جو سیکڑوں لوگ وہاں ایک ایک لفظ سُنیں گے اور گواہ ہوں گے کیا وہ کافی نہیں۔" رابعہ بولی "مجسٹریٹ کے ساتھ بھی پولیس اپنی مرضی کا بیان حاصل کرلیتی ہے مگر پبلک اور پریس کے سامنے دیا ہوا بیان اگر بعد میں بدلا جائے تو سمجھا جاتا ہے کہ ایسا دباؤ کے تحت کیا گیا ہوگا۔"

"کیا حرج ہے اگر وہاں ایک مجسٹریٹ بھی موجود ہو۔"

"مجسٹریٹ پریس کانفرنس میں نہیں جاتے۔"

"ایس ایس پی جاوید صدیقی مجسٹریٹ کو بھی لا سکتا ہے۔ اگر اسے صرف اتنا بتادیا جائے کہ وہاں اس کی ضرورت ہوگی۔"

"یہ میں کیسے بتاؤں ایس پی کو۔ پریس کانفرنس تو مسز دلاور کی ہے اور میں نہ اس کی مشیر ہوں نہ ترجمان لیکن ایک صورت ہوسکتی ہے۔ اگر میں اور منظر اسے یقین دلادیں کہ وہاں دلاور کو چھپا کر رکھنے والے اور اس کو قانون کی گرفت سے بچانے کے ذمّے دار بھی ہوں گے اور اگر انہیں وہیں پکڑلیا جائے تو یہ چھاپا مارنے والی ٹیم کی پہلی کامیابی ہوگی۔ اس کے بعد وہ ہوٹل سے سیدھے وہاں جاسکتے ہیں جہاں ہماری اطلاع کے مطابق دلاور کو تحفظ فراہم کیا گیا ہے۔ دلاور کو برآمد کرنے سے پہلے ہی اس کے مدد گار مجرم ہاتھ آجائیں تو پولیس کا کام بہت آسان ہوجائے گا۔ ورنہ دلاور تو مل جائے گا' وہ گرفتار نہیں ہوں گے جن پر قانون کے خلاف مجرم کو پناہ دینے' قانون کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے اور اعانتِ مجرمانہ جیسے سنگین الزامات ہوں گے۔ خود دلاور کبھی نہیں بتائے گا کہ اس نے اتنا عرصہ روپوش رہ کے کیسے گزارا۔"

"چلو تم جیسے چاہو کرو۔ لیکن اب تم جاؤ پولیس ہیڈ آفس۔ وہاں منظر بھی آئے گا۔ ایس پی جاوید صدیقی کو بتادو کہ چار بجے پولیس فورس کو الرٹ رکھے۔ ہمارا اشارہ ملتے ہی وہ حرکت میں آجائیں۔ اس وقت تک ہم مزید تصدیق کرلیں گے کہ دلاور واقعی وہاں موجود ہے اور اسے کسی دوسری جگہ شفٹ نہیں کیا گیا ہے۔"

"کیوں تم نہیں چلو گے میرے ساتھ؟" رابعہ نے کہا۔

"میں جارہا ہوں دلاور کا حال دیکھنے۔"

"اس میں رسک ہے۔ ایسا نہ ہو آخری وقت میں کسی کو شک ہو جائے۔ وہ ہوگا وہیں۔"

"ایک نظر دیکھنے میں کیا حرج ہے۔ ہم بہت بڑا قدم اُٹھانے والے ہیں' ناکامی کے ایک فیصد امکان کا خوف بھی نہیں ہونا چاہیے ورنہ یہ سمجھ لو کہ سب کے سامنے کتنی بے عزتی ہوگی ان سب کی جو پولیس سے زیادہ مستعد اور فرض شناس بن رہے ہیں۔ تمہاری وکیل برادری کے لوگ اور صحافی حضرات۔ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا کوئی اگر یہ خانہ خالی ملا۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو تم۔ یہ ناممکن ہے۔ کیسے نکل سکتا ہے دلاور۔"

"ناممکن کچھ نہیں ہوتا اس لیے۔"

"اوکے' چلو" رابعہ نے کہا اور خادم کو آواز دی۔

میں نے محسن سے کہا "تم سمجھ گئے نا کہ یہ کام کیسے ہوگا؟"

"میری فکر مت کرو۔ سلطانی گواہ میری جیب میں ہوں گے۔ جب کہو گے نکال کے سامنے پیش کردوں گا" محسن بولا۔

گاڑی رابعہ کی تھی مگر اس پر نمبر پلیٹ بدلی ہوئی تھی اور اسے چلانے والا میں تھا یعنی ایک فرنچ وکیل۔ ابھی میں گاڑی میں بیٹھ ہی رہا تھا کہ میلے کپڑوں میں ایک داڑھی والا مجہول سا شخص ہماری طرف لپکا۔

"بیگم صاحب جی۔ بیگم صاحب جی۔" اس نے رابعہ کو آواز دی اور ہاتھ میں پکڑا ہوا میلا کپڑا ہلانے لگا۔

"یہ کون ہے؟" میں نے کہا "پاگل لگتا ہے مجھے تو۔"

"ایسے ہی غریب لاوارث ہے کوئی۔ نشہ کرتا ہے اور یہاں پڑا رہتا ہے۔ بلاوجہ گاڑیوں پر کپڑا مار کے مٹی دھول صاف کردیتا ہے اور چار آٹھ آنے جو ملیں لے لیتا ہے۔ ایک طرح سے حفاظت بھی کرتا ہے ان گاڑیوں کی جن کے مالکوں کو پہچانتا ہے اور جن سے کچھ ملنے کی اُمید ہو۔"

وہ شخص ہانپتا ہوا قریب آ کے رُک گیا "بیگم صاحب جی....."

"کیا بات ہے' آج تو گاڑی بھی صاف نہیں کی تم نے" رابعہ بولی "پیسے لینے آگئے۔ کیا کرتے ہو پیسے کا تم۔ زہر پی پی کے مرجاؤ گے کسی دن۔"

وہ دانت نکالنے لگا "کدھر بیگم صاحب جی۔ مرتے بھی تو نہیں ہم جیسے بے غیرت۔ یہ گاڑی آپ کی ہے ناجی۔" اس نے رازداری سے پوچھا۔

"اور کس کی ہے۔ تم ہوش میں نہیں ہو کیا؟"

"ہوش میں ہوں بیگم صاحب جی اسی لیے تو پوچھا ہے۔ یہ نمبر آپ کی گاڑی کا ہرگز نہیں ہے۔ ہم جانتے ہیں۔"

"اوہ..... خیر' گاڑی میری ہی ہے۔ میں کسی اور کی گاڑی چوری کرکے نہیں لے جارہی ہوں" رابعہ نے کہا۔

"یہ مطلب نہیں تھا جی ہمارا۔ نمبر تو ہم نے بعد میں دیکھا تھا..... ہم تو آپ کی گاڑی کو ایسے پہچانتے ہیں بیگم صاحب جی جیسے آپ کو..... یہ آپ کی گاڑی پر سامنے انگریزی میں لکھا ہے وکیل۔ ترازو بنی ہوئی ہے..... اور سامنے بمپر کے اوپر ڈینٹ ہے۔ ایک لائٹ جینوئن ہے۔ مونوگرام دیسی ہے۔"

"اچھا جلدی بتاؤ' جو بھی بتانا ہے" رابعہ نے گھڑی دیکھی۔

اس کی نظر بنک کے سڑک کی طرف چلی گئی "وہ جی..... ابھی دو مشٹنڈے آپ کی گاڑی میں کچھ گڑبڑ کررہے تھے۔"

رابعہ چونکی "کیا کررہے تھے؟"

"ہمیں کیا معلوم جی۔ ہم نے دور سے دیکھا تھا۔"

"کون لوگ تھے وہ.....؟" رابعہ ڈر گئی۔

"بدمعاش لگتے تھے جی۔ ہمارے آنے تک وہ بھاگ گئے۔ ایک سفید رنگ کی گاڑی میں بہت دیر سے بیٹھے ہوئے تھے۔ ہمیں کیا معلوم تھا کیوں بیٹھے ہیں۔ ہم سے سگریٹ بھی منگوائی تھی انھوں نے اور پانچ کا نوٹ دے کر بولا تھا کہ باقی رکھ لینا۔ اب ہم سمجھے کہ وہ ہم کو اُدھر سے دور رکھنا چاہتے تھے۔"

"تم نے کیسے اندازہ کیا کہ وہ گڑبڑ کررہے ہیں؟"

"بیگم صاحب جی۔ پیچھے سے گاڑی کھول کے اندر جھانک رہے تھے پھر ایک دم بند کرکے گاڑی میں بیٹھے اور چلے گئے۔ ہم دوڑے ان کے پیچھے' ان کو آواز بھی دی کہ سگریٹ لے جاؤ۔"

اس نے جیب میں سے سگریٹ کا پیکٹ اور ساڑھے تین روپے کی رقم دکھائی "آپ انجن دیکھ لیں۔"

رابعہ نے میری طرف دیکھا اور شش و پنج میں پڑ گئی پھر اس نے بیگ سے دس روپے کا نوٹ نکال کے اسے دیا۔ "یہ لو تمہارا انعام۔"

"اللہ خوش رکھے جی آپ کو۔ جوڑی سلامت رہے۔ بچّے جئیں آپ کے" اس نے رٹی رٹائی دعا دُہرادی۔

"چلو اب زیادہ مت بولو" رابعہ نے اسے ڈانٹا "جاؤ۔"

میں نے کہا "دس روپے میں اتنی دعائیں دے گیا۔ پھر بھی ڈانٹ رہی ہو اسے۔"

"سکندر۔ یہ کیا کہہ رہا تھا۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ کہیں وہ گاڑی میں ٹائم بم تو نہیں لگا گئے ہیں؟"

میں نے آگے بونٹ کھول کے دیکھا مگر وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ پیچھے انجن پر غور کرنے سے مجھے ایک اضافی تار کی موجودگی کا احساس ہوا جو کوائل اور کنڈینسر کے درمیان لگا ہوا تھا۔ باقی تار پُرانے تھے اور میلے نظر آتے تھے۔ ان پر مٹی اور تیل کی چکنائی تھی۔ یہ تار نیا تھا اور چمک رہا تھا۔ میں نے احتیاط سے اس کو کھینچا مگر جس چیز سے بھی یہ تار منسلک تھا وہ بھاری تھی۔

رابعہ نے پھر کہا "سکندر ٹائم بم ہوا تو.....؟"

"اگر ہمارا ٹائم پورا نہیں ہوا ہے تو ایٹم بم بھی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ذرا مجھے اپنی تفتیش مکمل کرنے دو۔ کچھ دال میں کالا ضرور ہے مگر ڈرو نہیں' ٹائم بم کی آواز سُنائی نہیں دے رہی ہے۔ کلاک کی ٹک ٹک ہو تو ٹائم بم کا شک ہوتا ہے۔ غالباً دوسرے قسم کا بم فٹ کیا گیا ہے اس میں۔ الیکٹرک شارٹ سرکٹ سے پھٹنے والا۔"

رابعہ کی آواز کانپنے لگی "پھر تم کیوں چھیڑخانی کررہے ہو بلاوجہ؟"

میں نے اسے گھورا "کیوں الزام لگارہی ہو مجھ پر ایسا۔ میں نے کب چھیڑخانی کی ہے تم سے سڑک پر۔"

اس نے مجھے کھینچ لیا "مت چھیڑو تاروں کو۔"

"پھر کسے چھیڑوں؟" میں نے مسکرا کے کہا "اور کوئی تو ہے نہیں یہاں۔ یہ لو' صدقہ دینا آج کالے بکرے کا۔ اللہ نے تمہیں اور تمہارے سہاگ کو بچالیا۔" میں نے تار کو الگ کرلیا۔

رابعہ نے تار کے ٹکڑے کو بھی ڈرتے ڈرتے پکڑا "یہ..... یہ کیا ہے؟"

"تمہیں کیا نظر آرہا ہے؟" میں نے ہنس کے کہا "بم کو ناکارہ بنادیا ہے میں نے۔ تار الگ کرکے۔"

"کہاں ہے بم؟"

"اتنا وقت نہیں ہے کہ تمہیں نکال کے دکھاؤں' چلو بیٹھو۔"

اس نے صاف انکار کردیا "نہیں۔ اس گاڑی کو یہیں چھوڑ دو۔"

"یعنی اب تم اس میں کبھی نہیں بیٹھو گی۔ کیا خیال ہے کسی ضرورت مند کو دے دوں تمہاری طرف سے؟"

"جب تک یہ بم نکالا نہیں جائے گا۔"

"بے وقوف لڑکی۔ بم خود بخود نہیں پھٹتا۔ اس کا فیوز ناکارہ کردیا ہے میں نے۔ تار نکال دیے ہیں۔ اگر میں انجن اسٹارٹ کرتا تو....."

"تم یہ سب نہیں سمجھتی۔ ابھی میں نہیں بیٹھوں گی اس گاڑی میں اور نہ تمہیں بیٹھنے دوں گی۔ میں پولیس کو رپورٹ کروں گی۔ بم ڈسپوزل والے خود آ کے اسے نکالیں گے اور مجھے کلیرنس دیں گے کہ اب کوئی خطرہ نہیں پھر دیکھی جائے گی۔"

"تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں؟"

"کیسا اعتماد؟ کیا تم الیکٹریشن ہو' آتشیں اسلحے کے ماہر ہو؟ تم نے سول ڈیفنس یا بم ڈسپوزل کی ٹریننگ لی ہے؟" وہ بگڑ گئی۔

"اچھا بیگم صاحب جی" میں نے ہاتھ جوڑ کے کہا "اب یہ بتاؤ کہ پیدل چلنا ہے یا دو ٹانگوں پر؟"

وہ ہنس پڑی "ایک تانگا کافی رہے گا ہمیں۔"

"ہاں۔ جیسے ایک بیڈروم کافی رہتا ہے میاں بیوی کو۔"

رابعہ نے غصّے اور مسکراہٹ کو دباتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا۔

"یہ خادم کدھر گیا۔ اُترا تو ہمارے ساتھ ہی تھا۔"

"واقعی۔ مجھے بھی خیال نہیں آیا۔ کہیں اندر تو نہیں رکا ہوا ہے" میں نے اندر جھانکا "مولوی خادم حسین!"

نہ جانے کہاں سے آواز آئی "میں..... میں یہاں ہوں جی..... بڑی محفوظ جگہ پر' کیا بم پھٹ گیا۔"

مجھے غصے کے ساتھ ہنسی بھی آئی "ہاں پھٹ گیا۔ میں عالمِ بالا سے پکار رہا ہوں تمہیں۔ احمق آدمی' باہر نکلو۔"

وہ ایک دم گاڑی کے نیچے سے نکل آیا۔ خوف سے اس کا بُرا حال ہورہا تھا۔ زمین پر لیٹنے سے اس کے کپڑے بھی خراب ہوئے تھے اور بال بھی۔ اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور ہاتھوں میں رعشہ تھا۔

"حد ہوگئی مولوی خادم حسین۔ اتنا ڈرتے ہو تم.....؟"

"آپ بھی عجب..... بات کرتے ہیں جی۔ بھلا بم سے کون نہیں ڈرتا۔ بم کیا لحاظ کرتا ہے کسی شریف آدمی کا۔ ہم تو فوراً لیٹ گئے تھے بم کا نام سُنتے ہی۔ جل تو جلال تو کا وظیفہ کررہے تھے اور کلمہ پڑھ رہے تھے۔"

رابعہ نے بے اختیار ہنستے ہوئے کہا "اور..... اور کچھ بھی کررہے تھے تم مولوی خادم حسین' یہ دیکھو۔"

اب میں نے رابعہ کی ہنسی اور خادم حسین کی حالت پر غور کیا تو مجھے بھی ایک دم ہنسی آئی۔ خادم حسین اوپر بھاگا۔ اس کی پتلون گھٹنوں سے نیچے گیلی نظر آرہی تھی۔ وہ کپڑے بدلنے گیا تھا مگر اوپر گیلری میں نمودار ہو کے اس نے کہا "آپ چلیں جی۔ میں آجاؤں گا' سیدھا پولیس ہیڈ آفس۔"

"ہمارے ساتھ کیوں نہیں چلتے؟" رابعہ نے پیچھے سے کہا۔

"وہ..... ذرا مجھے غسل بھی کرنا ہوگا" اس نے جھینپ کے کہا اور غائب ہوگیا۔

رابعہ نے گاڑی کو مقفل کردیا اور ہم ٹیکسی کے انتظار میں فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کے آتی جاتی گاڑیوں کو دیکھنے لگے۔

وہ مجہول شخص پھر نمودار ہوا جس نے ہمیں بروقت ایک ایسی بات بتادی تھی جو خود ہمیں دوسری دنیا میں پہنچ کے ہی معلوم ہوتی۔ اس نے ہماری جان بچائی تھی۔ کوئی اور ہوتا تو میں اسے ہزار روپے انعام کے دیتا اور پھر بھی سمجھتا کہ میں نے اسے کچھ نہیں دیا مگر اس شخص کو سو روپے دینے کا مطلب بھی یہ ہوتا کہ اسے زیادہ نشہ کرکے جلدی مرنے کا موقع فراہم کیا جائے۔

"بیگم صاحب جی۔ وہ گاڑی ابھی گزری تھی۔" اس نے سرگوشی میں کہا۔

"اور وہ دونوں بھی بیٹھے ہوئے تھے اس میں؟" میں نے کہا۔

"ہاں جی۔ دو بار چکر لگا گئے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ پھر آئیں گے" میں نے کہا۔

رابعہ نے کہا "تم نے میری گاڑی کے نمبر کا فرق تو دیکھ لیا تھا

اس گاڑی کا نمبر نہیں دیکھا تھا۔"

"نہیں بیگم صاحب جی، مگر تیسرا پھیرا کیا انہوں نے تو میں دیکھ لوں گا آپ فکر مت کریں۔ میری نظر بالکل ٹھیک ہے۔ میں کھڑا ہوں یہاں پر یہ دیکھنے کے لیے' آپ جاؤ۔"

لیکن ہم جاتے تو کیسے جاتے۔ کوئی ٹیکسی خالی نہیں آرہی تھی اور ادھر مس رابعہ کو مجھ پر اعتبار ہونے کے باوجود بم پر اعتبار نہیں تھا۔ اس کا کیا بھروسا۔ بغیر وجہ کے پھٹ جائے۔ وہ گاڑی میں بیٹھنے پر تیار نہ تھی' مجھے بہت کوفت اور جھنجلاہٹ ہو رہی تھی۔

"ہم نہ ادھر کے رہیں گے اور نہ ادھر کے۔ نہ دلاور کو دیکھنے کے لیے ٹائم ملے گا اور نہ وقت پر پولیس ہیڈ آفس پہنچ پائیں گے۔ تم ایسا کرو' مجھے یہ گاڑی لے جانے دو۔ تم ٹیکسی میں خادم حسین کے ساتھ سیدھی پولیس آفس پہنچ جاؤ۔"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ میں تم کو اس گاڑی کی چابی دوں۔ میرا تو خیال ہے کہ دلاور پر لعنت بھیجو۔ وہ اسی تہ خانے میں پڑا ہوگا۔ ہم چلتے ہیں ٹیکسی لے کر پولیس ہیڈ آفس۔ دلاور کہیں نہیں جاسکتا۔"

خادم حسین نہا دھوکے اور لباس بدل کے اُترا تو شرمندگی سے نڈھال تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے رابعہ کی گاڑی کو دیکھا اور اس نشے باز کو پھر ہمارے قریب پا کے چونکا۔

"صورت سے یہ آدمی مشکوک لگتا ہے جی مجھے" اس نے میرے کانوں میں کہا۔

"یہی بات اس نے تمہارے بارے میں کہی ہے۔ ابھی ابھی" میں نے جھلّا کے کہا۔

"میری صورت کیا ایسی ہے؟"

"جا کے آئینہ دیکھو۔ معلوم ہو جائے گا کیسی ہے؟"

میری نگاہیں ٹیکسی کی تلاش میں سرگرداں تھیں اور میں ایک طرف رابعہ کی ضد سے عاجز تھا تو دوسری طرف خادم حسین کی باتوں سے۔ اچانک میری نظروں کے سامنے ایک گاڑی بُری طرح لہرائی پھر اس کا ایک آگے والا پہیہ الگ ہوگیا اور باقی تین کا ساتھ چھوڑ کے دائیں طرف روانہ ہوگیا۔ ظاہر ہے گاڑی تین پہیوں پر نہیں چل سکتی تھی لیکن اپنی رفتار کے باعث گاڑی اوندھے منہ سڑک پر گرنے کے بعد بھی کچھ دور گئی۔ اسٹیئرنگ پر کنٹرول نہ رہنے سے بائیں طرف گئی اور سڑک کے کنارے پارک گاڑیوں میں گھس گئی۔ اس کا ساتھ چھوڑ دینے والا باغی پہیہ سڑک کے وسط میں دو کاروں کے تصادم کا سبب بنا۔ ان میں سے ایک پولیس کی گاڑی تھی۔

مجہول نشے باز نے نعرہ لگایا "یہ۔۔۔ یہ تو وہی گاڑی ہے۔ واہ واہ۔۔۔ مزہ آگیا۔ جیسی کرنی ویسی بھرنی۔"

میں نے چونک کے کہا "کیا۔۔۔ یہ وہی گاڑی ہے۔ تمہیں یقین ہے' اچھی طرح دیکھو۔"

"میں تو ان دونوں کو بھی صاف دیکھ رہا ہوں جی۔ مرے پڑے ہیں شاید" وہ بہت خوش تھا "دوسروں کے لیے گڑھا کھودنے والا خود گرتا ہے اس میں۔ اچھی سزا دی ہے خدا نے۔"

میں نے کہا "دیکھو بابا۔ یہ مرے نہیں ہوں گے۔ زخمی ہوں گے۔ جن کی گاڑیوں کا نقصان ہوا ہے وہ بھی ان کو آسانی سے معاف نہیں کریں گے اور پیچھے آرہی تھی پولیس کی گاڑی۔ وہ ان سے نمٹ لیں گے۔ اب تم ایک کام کرو۔ ذرا قریب جا کے دیکھو۔ بہت سے لوگ جمع ہو رہے ہیں۔ تمہیں صرف یہ پتا کرنا ہے کہ پولیس انہیں کس اسپتال میں علاج کے لیے لے جاتی ہے۔"

"میں تو سب بتا دوں گا پولیس کو بھی۔۔۔"

"خبردار۔ کوئی بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارا کوئی نقصان نہیں ہوا۔ بلاوجہ ہم کسی جھگڑے میں کیوں پڑیں۔"

وہ حیران نظر آنے لگا "آپ کا کوئی نقصان نہیں ہوا؟ آخر کیا کر رہے تھے وہ انجن میں۔"

میں نے کہا "ایک پُرزہ نکالنے کی کوشش کی تھی مگر نکال نہیں سکے۔"

"انجن کا پُرزہ؟" اس نے سر کھجایا۔

"ہاں۔ ایک تار لے گئے۔"

"کون سا تار۔ ڈسٹری بیوٹر کیپ کا۔ درمیان والا؟"

میں بھونچکا رہ گیا "تم۔۔۔۔"

"میں پہلے موٹر مکینک تھا جی؟" وہ نظر جھکا کے بولا۔

مجھے اس کی حالت پر افسوس ہوا "خیر اب تم وہی کرو جو میں نے کہا ہے۔ خاموشی سے ضروری معلومات حاصل کر کے واپس آجاؤ۔ ہم تم سے شام کو ملیں گے تو پوچھ لیں گے۔"

"کیا پھر اسپتال جائیں گے آپ؟"

"ہاں۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ آخر ایک معمولی سی چیز چُرانے کی کوشش کیوں کی تھی انہوں نے۔ جو وہ خرید بھی سکتے تھے۔ اور پھر ایسی جگہ جہاں ان کے پکڑے جانے کا امکان بہت زیادہ تھا۔ یہ لو دس روپے۔"

اس نے خوش ہو کے مجھے سلام کیا اور پھر دعائیں دینے والا تھا کہ رابعہ نے اسے گھورا اور وہ بھاگ گیا۔

"جانتے بوجھتے بدمعاشی کر رہا ہے۔ اچھی طرح جانتا ہے"

"کہ تمہاری شادی نہیں ہوئی" میں نے کہا "خانہ آبادی کی دعا ہی دے رہا ہے نا۔ شاید میری تمہاری جوڑی اچھی لگی ہوگی اسے۔"

"جوڑی تو ماشاء اللہ چاند سورج کی ہے۔" مولوی خادم حسین نے پیچھے سے عرض کی۔

رابعہ نے غرا کے کہا "تم سے پوچھا ہے کسی نے؟"

خادم حسین نے لپک کے ایک ٹیکسی کو روک لیا اور کوئی بات کیے بغیر آگے بیٹھ کے اس نے ہمیں آواز دی "آجائیں سر!"

ٹیکسی ڈرائیور ہنسنے لگا "چلے گی یا نہیں؟"

"یار سلور جوبلی کرے گی اور گولڈن جوبلی۔" میں نے کہا۔

رابعہ کا چہرہ گلابی ہوا۔ وہ مسکرا کے باہر دیکھنے لگی۔

منظر ہم سے پہلے پولیس ہیڈ آفس میں موجود تھا اور نہ جانے کس بات پر گلا پھاڑ کے ہنس رہا تھا۔ ایس ایس پی جاوید صدیقی غور سے اس کی عظیم توند کو ہنسی کے زلزلے سے متلاطم دیکھ کے حیران تھا۔

"آپ لوگ اتفاق سے نہیں آئے" وہ بولا۔

میں نے خادم کی معرفت جواب دیا "اتفاق سے تو تم بھی وجود میں نہیں آئے ایس ایس پی۔ اگر تمہاری والدہ نے یا والد نے بوقت نکاح انکار کر دیا ہوتا۔۔۔ یا شب عروسی کو جنس بدل جاتی۔۔۔"

خادم حسین نے اس کا ترجمہ کیا "ہمارا آنا پہلے سے طے تھا" مگر اس کے اندر سے پُرملامت آوازوں کا شور اسی طرح سُنائی دے رہا تھا جیسے بند کیتلی میں سے پانی اُبلنے کی آواز بھاپ کے ساتھ نکلتی ہے۔

منظر نے کہا "تو ایس پی صاحب۔ اس بھوتنی والے کی بات کر رہا تھا میں۔ بڑے عیاش ہوتے ہیں فرانسیسی۔ دیکھ لیں اس کے اعمال کی پھٹکار صورت پر برس رہی ہے۔ ہر وقت شراب کے نشے میں دھت رہتا ہے اور مس رابعہ نہ ہوتیں تو میں بتاتا اس کی عیاشی کے قصے۔۔۔۔"

"یہ جھوٹ ہے منظر صاحب!" مولوی خادم حسین سے برداشت نہ ہو سکا۔

"لو۔۔۔ ان کو دیکھو۔ مولوی خادم حسین تم نے تو اپنی عاقبت بگاڑلی اس بھوتنی والے کی غلامی کر کے۔ صحبت کا اثر ضرور ہوتا ہے۔ تم بھی چسکی تو لگاتے ہو گے ولایتی شراب کی۔"

خادم حسین گرم ہو گیا "منظر صاحب' آپ حد سے بڑھ رہے ہیں۔"

منظر پھر ہو ہو ہو کر کے ہنسنے لگا "سچ کڑوا لگا مولوی خادم حسین مگر بیٹے ہم تو تمہاری چال دیکھ کے تاڑ گئے تھے اس دن۔ جس دن تم ٹوپی کشکول کی طرح لیے اس کے پیچھے پیچھے جا رہے تھے۔ وہ جو صفائی کرنے آتی ہے نا رابعہ تمہارے آفس میں' کیا نام ہے اس کا؟"

"منظر صاحب' میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔"

"اور مولوی بار بار کہہ رہا تھا۔ میری ملکہ الزبتھ۔ اس میں اپنے حُسن و شباب کی دولت مشترکہ ڈال دو" منظر نے قہقہہ مارا۔

جاوید صدیقی کے ساتھ رابعہ بھی ہنسنے پر مجبور تھی۔ مشکل میرے لیے تھی اور مجھے ہنسی ضبط کرنے کے علاوہ منظر کو روکنا بھی ضروری تھا مگر میں فرنچ وکیل تھا اور یہ ظاہر کرنے پر مجبور تھا کہ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے۔ میں تو سب کو دیکھ کے ہنس رہا ہوں۔ منظر نے بیک وقت مجھے اور خادم حسین کو مذاق کا نشانہ بنالیا

ٹیکسی ڈرائیور نے گرم ہو کے کہا "پوچھے بغیر بیٹھ گئے ہو؟"

"کیا مطلب ہے اس فضول بات کا آخر۔ یہ ٹیکسی ہے' تمہاری پرائیویٹ کار نہیں ہے کہ تم سے اجازت لیں ہم۔"

"ٹیکسی تمہارے باپ کی نہیں ہے۔"

"ٹیکسی تمہارے باپ کی بھی نہیں ہے۔ ٹیکسی کا مالک ہوتا ہے وہ مسافر جو اس میں بیٹھ جائے۔ وہ تمہیں اپنی مرضی سے کہیں بھی لے جا سکتا ہے۔ تم کو اپنی مرضی سے پھرنا ہے تو کار خرید لو۔ گھر اور دُکان میں بہت فرق ہوتا ہے۔ گھر میں کوئی بغیر اجازت کے نہیں آسکتا۔ دُکان میں کوئی کسی کو داخل ہونے سے نہیں روک سکتا' کیا سمجھے؟"

"زیادہ قانون مت پڑھاؤ مجھے۔ زنانہ سواری ہے اس لیے لحاظ کر رہا ہوں ورنہ اُٹھا کے باہر پھینک دیتا' کدھر جانا ہے؟" ڈرائیور نے کہا۔

میں نے پچھلی سیٹ پر بیٹھ کے کہا "پولیس ہیڈ آفس۔"

ٹیکسی ڈرائیور کی بولتی بند ہو گئی۔ خادم حسین نے اسے فاتحانہ اور طنزیہ نظروں سے دیکھا "وکیل صاحب بڑے بھائی ہیں ایس ایس پی جاوید صدیقی کے۔"

ڈرائیور پریشان ہو گیا "سوری۔ غلطی معاف' آپ نے شکایت کی تو پولیس پکڑ لے گی مجھے۔"

میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا۔ تاہم خادم حسین نے اسے معاف کر دیا مگر خاصی نصیحت فرمانے کے بعد۔

میں نے رابعہ سے کہا "یہ نشے باز' سابق موٹر مکینک' کیا نام ہے اس کا؟"

"اصل نام تو میں نے کبھی پوچھا نہیں۔ اُستاد بادل کے نام سے مشہور تھا پہلے۔ اس کی اپنی ورکشاپ تھی۔ بیوی بچے تھے سب کو نشے کی لت پر قربان کر دیا۔"

"بادل کیا نام ہوا۔۔۔۔ ایک فلم ضرور آئی تھی اس نام کی بہت پہلے اور اس کا ایک گانا بھی بہت چلا تھا۔ میں راہی بھٹکنے والا ہوں کوئی کیا جانے متوالا ہوں۔"

رابعہ نے کہا "تم تو بڑے فالم ہو۔ علم سے عالم تو فلم سے فالم۔ مجھے یہ بات معلوم نہیں تھی۔ یہ گانا اکثر گاتا پھرتا ہے۔"

"بادل ڈاکو کا رول غالباً پریم ناتھ نے کیا تھا۔ خود میں بہت متاثر ہوا تھا اس کردار سے اور محسن نے تو اپنا نام ہی متوالا رکھ لیا تھا۔ محسن متوالا۔ کیسی کیسی حماقتیں کرتے تھے ہم۔"

"یعنی اب نہیں کرتے؟" رابعہ ہنسی۔

"اگر تم محبت کو حماقت کہتی ہو تو ٹھیک ہے" میں نے آہ بھر کے کہا "یہ ایک حماقت نہیں' لاتعداد لامحدود حماقتوں کا نام ہے جو ہم کر چکے یا کریں گے اور ہم سے پہلے۔۔۔۔"

خادم حسین نے کہا "لیلیٰ مجنوں' شیریں فرہاد' ہیر رانجھا سب نے کی۔ ایک دن آپ کی بھی فلم بنے گی جی۔ رابعہ سکندر۔"

تھا لیکن احتجاج کرنے والا صرف خادم حسین تھا اور منظر جیسے شخص کے سامنے احتجاج کرنا ایسا ہی تھا جیسے بھینس کے آگے بین بجانا۔

خادم اُٹھا ہی تھا کہ منظر نے اسے پکڑلیا۔ "تم کو آتا ہے پیار پر غصہ۔ ہم کو غصے پر پیار آتا ہے۔ روٹھ کے کہاں جارہے ہو میری جان۔ ابھی تو بہت کچھ کہنا ہے مجھے۔"

رابعہ نے سنجیدگی سے کہا "منظر صاحب۔ کیا آپ نے وہ بات کرلی ہے جس کے لیے ہم سب آئے تھے۔"

صدیقی نے سرہلایا۔ "جی۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آج آپ لوگ چوہدری دلاور کو سرکاری مہمان بنانے کی درخواست لے کر آئے ہیں۔"

"آپ حاکم ہیں حجور' رعایا حکم تو دے نہیں سکتی" منظر بولا۔

صدیقی نے کہا "سوری۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ خادم تو ہم ہیں سب کے۔ خدمت بھی کرتے ہیں' مرتے بھی ہیں اور سب کی سنتے بھی ہیں۔"

"بجا ارشاد۔ تمام نیکیاں پولیس والوں کے نامۂ اعمال میں لکھی جاچکی ہیں۔ ماشاء اللہ بڑا جنتی محکمہ ہے۔" منظر بولا "اب یہ فرمایئے کہ آپ کچھ کریں گے باتوں کے علاوہ۔۔۔"

"کیوں نہیں بھئی۔ ہم آپ کی خاطر تواضع کریں گے۔ اور اس کے بعد آپ کے ساتھ چلیں گے وہاں۔" اس نے گھنٹی کا بٹن دبایا اور اندر آنے والے کو چائے لانے کا حکم دیا "ایسا کھیل میں نے پہلے نہیں دیکھا کہ ایک طرف شوہر نہایت ڈرامائی انداز میں گرفتار ہونے والا ہو اور دوسری طرف اس کی بیوی نے پریس کانفرنس طلب کرلی ہو۔ آخر یہ چکر کیا ہے؟"

"چکر ہی چکر ہیں دنیا میں ہر طرف ایس ایس پی صاحب" منظر بولا۔

"کیا مسز دلاور کو پہلے سے معلوم ہوگیا ہے؟"

"ابھی تو خود ہم بھی نہیں جانتے کہ دلاور کہاں ملے گا۔ جب ہمارے پاس اطلاع آئے گی تو ہم آپ کو بتائیں گے۔"

صدیقی نے نفی میں سرہلایا "میں نہیں مانتا۔ یہ اتفاق نہیں ہوسکتا۔ آپ لوگ ویسے تو وکیل ہیں اور صحافی ہیں مگر آپ سب کی سرگرمیاں اتنی پُراسرار ہیں۔ پلیز ڈونٹ مائنڈ۔ یہ میرا امپریشن ہے۔ جو کام پولیس اپنے تمام وسائل' تربیت اور تجربے کے ساتھ نہیں کرسکی وہ آپ نے کیسے کیا؟"

منظر بولا "کہا ہے کسی شاعر نے کہ۔ وہ کون سا عقدہ ہے جو وا ہو نہیں سکتا۔ کوشش کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا۔"

"شعر اچھا ہے مگر۔۔۔"

"مگر اس میں تو پولیس کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ انسان کے لیے کہا گیا ہے" منظر نے اس کی بات کاٹ کے قہقہہ مارا۔

صدیقی نے برا سا منہ بنایا "آپ لوگ تو جاسوسی کررہے ہیں۔ پرائیویٹ ڈی ٹیکٹو کا جو تصور انگلش فلموں اور ناولوں میں ہے کچھ ایسا ہی کردار ادا کیا ہے آپ سب نے۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کیونکہ پاکستان میں کبھی پہلے وکیلوں اور صحافیوں نے مل کے نہ کسی مجرم کا سراغ لگایا اور نہ اسے پکڑوایا۔"

"بس جی آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔ اس سے زیادہ بھی کریں گے ہم اگر ضرورت پڑی۔ اور کسی نے کچھ نہ کیا تو" منظر نے کہا۔

صدیقی بولا "آپ لوگ واقعی کچھ نہیں جانتے کہ دلاور کی بیوی نے یہ پریس کانفرنس کا ڈراما کیوں رچایا ہے اور وہ اتنی سخت سیکیورٹی میں کیوں ہے۔ میں نے اس سے بات کرنے کی کوشش کی تھی مگر اس کے کسی سیکریٹری نے مجھے بھی ٹرخادیا کہ میڈم اس وقت تو کہیں گئی ہیں۔ جب آئیں گی تو میں آپ کا پیغام دے دوں گی۔ خیر معلوم ہوجائے گا کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ آپ لوگ چائے پئیں۔"

"اور آپ اپنی فورس تیار کریں" رابعہ بولی۔

"میری فورس میری کمانڈ میں ہے میڈم۔ ابھی تو خود آپ کے پاس کوئی انفارمیشن نہیں ہے' یا ہے تو آپ لوگ مجھے بھی اعتماد کے قابل نہیں سمجھتے اور قبل از وقت بتانا نہیں چاہتے۔"

"پولیس کے ساتھ کا تجربہ زیادہ خوش گوار نہیں ہے ایس پی صاحب۔ اندر کی بات باہر نہ پہنچے تو چھاپے ناکام نہ ہوں۔ اسمگلر اتنی آسانی سے فرار نہ ہوں اور۔۔۔۔ خیر چھوڑیئے' یہ لمبی اور متنازع بات ہے' آپ یوں سمجھ لیں کہ ایک ایمرجنسی کال پر آپ کو فوراً پہنچنا ہے اور معاملہ ہے زندگی یا موت کا۔ اب دیکھنا ہے' آپ کی مستعدی اور کارکردگی کو" منظر نے سنجیدہ ہوکے کہا "ہم تو صرف مدد کررہے ہیں آپ کی۔"

ہمارے چائے پی کر فارغ ہونے تک ایک بج گیا تھا اور خصوصی تفتیشی ٹیم کے دیگر ارکان کا ابھی تک کہیں پتا نہ تھا۔ جاوید صدیقی سب کو مطمئن کرنے کی کوشش میں لگا رہا کہ وہ بھی بعد میں پہنچ جائیں گے۔ ابھی تو مسز دلاور کا شو ہے اور اگر دلاور کی گرفتاری کا وقت چار بجے ہی ہوا تو اگلے تین گھنٹوں میں صرف پولیس ہی نہیں بری' بحری اور فضائی افواج کو بھی طلب کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ اسے اپنے خصوصی اختیارات کے معاملے میں خاصی غرور آمیز خوش فہمی تھی مگر وہ ڈرتا بھی تھا کہ وکیل صحافی اتحاد اس کے خلاف قائم ہوگیا تو اس کا انجام بھی اپنے پیشرو سے مختلف نہیں ہوگا۔ وہ ایک نالائق' نااہل اور کرپٹ افسر کی معطلی اور گرفتاری کے بعد یہ ثابت کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا کہ پولیس کا سارا محکمہ کالی بھیڑوں سے بھرا ہوا نہیں ہے۔ جاوید صدیقی کو محکمے سے زیادہ ذاتی گڈول بنانے کی فکر تھی جس پر اس کے مستقبل کا دارومدار تھا۔ محکمے کا کیا ہے۔ بقول شاعر۔ یہ چمن یوں ہی رہے گا اور ہزاروں جانور۔

انٹر کام کا بزر سُن کے ایس ایس پی نے فون اُٹھایا "ہاں کیا بات ہے۔ اچھا۔ ٹھیک ہے۔ کال یہاں دے دو۔"

منظر نے گھڑی دیکھی "کیا خیال ہے اب چلنا نہیں چاہیے؟"

ایس ایس پی نے ریسیور رکھا اور مجھے دیکھا "اس کی فون کال ہے لندن سے۔ کوئی مسٹر ایم کے اچکن یا اشکن بات کریں گے۔"

رابعہ کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی مگر مجھے ہنسی کو ضبط کرنا پڑا۔ یہ محسن خاں شیروانی تھے جو کسی ناگہانی ضرورت کے تحت ایم کے اچکن بن گئے تھے۔ اسے شیروانی کی جگہ اچکن صرف میں کہتا تھا جیسے وہ میرے بچپن کے نام کبیر خان کی مناسبت سے مجھے کبیر داس کہتا تھا۔

گھنٹی دوبارہ بجی تو صدیقی نے ریسیور اُٹھایا اور میری طرف بڑھادیا۔ میں نے کسی خاص حیرانی کا اظہار نہیں کیا۔

محسن نے فرنچ میں کہا "اپنے چیف کے ٹو عرف کبیر داس عرض کررہے ہو؟ خادم کو شیروانی کہتے ہیں۔"

"خادم کو ملازم تو کہا جاسکتا ہے۔ ہمارے مولوی خادم حسین کے سوا۔۔۔ کیا تکلیف ہے آپ کو آخر۔۔۔؟"

"ابھی تو نہیں ہے لیکن ہوسکتی تھی چنانچہ میں نے تم سے مشورہ بہتر سمجھا۔ یہ جو وعدہ معاف گواہوں کی جوڑی ہے ہمارے پاس' انہیں میں کیسے لاؤں گا وہاں؟"

"جیسے تم مناسب سمجھو۔ چاہو تو سالم لے آؤ یا ٹکڑے کرکے پیک کرو' یہاں پھر جوڑلینا۔"

"یار قانونی پیچیدگی ہے۔ وہاں سوال کیا جائے گا کہ آخر آپ نے یہ وعدہ معاف گواہ کہاں سے حاصل کیے۔ خریدے تو کس سے اور منگوائے تو کیوں؟"

میں نے سوچ کے کہا "یہ سوال تو ہوگا۔ جواب کیا ہوگا اس کا؟"

"جواب صرف پولیس دے سکتی ہے کہ ہم نے فلاں جگہ سے انہیں پکڑا اور پھر رات بھر تفتیش کے شکنجے میں رکھ کے ان سے جو کچھ اگلوایا وہ آپ بقلم خود سُنئے۔ صرف وہی اختیار رکھتے ہیں ریکارڈ بجانے کا۔ ہم کسی کو پریس یا پبلک کے سامنے ملزم بنا کے پیش نہیں کرسکتے۔ اگر کوئی ملزم ہے تو ہمارا کام ہے اسے پولیس کے حوالے کرنا۔"

"پھر اب کیا ہوگا۔ میں تو حیران ہوں مسٹر اچکن کہ ایسی باتیں ان قانون داں خاتون کی کھوپڑی میں کیوں نہیں آئیں۔ ہم پہلے سے انتظام کرلیتے" میں نے کہا۔

"ابھی تین گھنٹے ہیں۔ میں نے غازی سے مشورہ کیا تھا۔ اس کا کوئی نیا سالا ہے۔ ہونے والا سالا۔ غازی کا اصول ہے کہ کسی منگیتر کو سال بھر سے زیادہ ہونے والی بیوی کی پوسٹ پر نہیں رکھتا۔ ظاہر ہے ہونے والے سب سالے بھی بدلتے رہتے ہیں۔ یہ نیا سالا نیا پولیس افسر بھی ہے اور اضافی خوبی یہ ہے کہ بے وقوف بھی ہے۔ وہ آرہا ہے اس مسئلے کو بطریق احسن حل کرنے کے لیے۔"

"احسن طریقہ کیا ہے اچکن صاحب؟"

"غالباً وہ ان کے خلاف اپنے تھانے میں کوئی رپورٹ لکھے گا اور ان کی گرفتاری بھی ظاہر کردے گا۔ وقار یوسف ان سے وکالت نامے پر دستخط کروالے گا اور ان کے وعدہ معاف گواہ بن جانے کے بعد وکیلِ صفائی کے طور پر ان کا کیس لڑے گا مگر یہ تو بعد کی بات ہے۔ ابھی وکیل صفائی کے کہنے پر ہی غازی کا مذکورہ بے وقوف نیا سالا اور نیا تھانے دار ان ملزمان کو پریس اور پبلک کے سامنے لائے گا کہ یہ شریف لوگ حالات کی مجبوری کے باعث پھنس گئے۔ رانا نے ان کی خدمات حاصل کرلیں اور انہیں بہت بڑا معاوضہ پیش کیا۔ مالی مشکلات کی وجہ سے یہ انکار نہ کرسکے مگر پھر ضمیر نے ان کو شرمندہ کیا۔۔۔۔ پوری کہانی وہیں سُن لینا۔"

"اگر وقار یوسف بھی اس پلان سے متفق ہے تو ٹھیک ہے۔ یہ قانونی معاملہ ہے۔ وہی بہتر سمجھ سکتا ہے۔ تو نے گواہی پکی کرلی ہے نا؟"

"گواہی اتنی ہی پکی ہے جتنی دلاور سے ہماری دشمنی۔ ایسا برین واش کیا ہے میں نے کہ دونوں اپنی مرضی سے بولنا ہی بھول گئے ہیں۔ ریکارڈ کی طرح بجنے لگتے ہیں اور ہر بار وہی دہراتے ہیں جو میں نے ریکارڈ کیا ہے۔ تم لوگ ابھی تک یہاں کیوں براجمان ہو؟ جاتے کیوں نہیں لنچ پر؟"

"بس جارہے ہیں۔ بڑا سسپنس ہے کہ بیک وقت دو دھماکا خیز ڈرامے ہورہے ہیں۔ ایک طرف نامی گرامی شوہر نامدار کی گرفتاری۔ اس سے پہلے اس کی منکوحہ کا قوم سے خطاب۔ معما کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔"

"تیری سمجھ میں آیا؟"

"ہاں۔ وہ رانا کے خلاف بیان دے گی۔ اپنی پوزیشن مستحکم کرے گی۔ اس سے کچھ بعید نہیں کہ اس نے رانا کو پہلے ہی بے دست و پا اور تنہا کردیا ہو۔ حکومت کا تختہ اُلٹنے والے آخری کارروائی کرنے سے پہلے مواصلاتی رابطے منقطع کردیتے ہیں۔ ریڈیو' ٹیلی وژن اور ٹیلی فون کے دفاتر پر قبضہ کرلیتے ہیں اور ہوائی اڈے بند کردیتے ہیں۔ سربراہ کے ٹیلی فون اور بجلی کے تار تک کاٹ دیتے ہیں اور محاصرہ کرلیتے ہیں تمام اہم مقامات کا۔"

صدیقی نے گھڑی دیکھی "اس کی فرنچ کب ختم ہوگی۔ ہمیں دیر ہورہی ہے۔"

منظر نے خادم سے کہا "تم ہی کچھ سمجھاؤ اسے۔ اتنی بے شرمی کی باتیں سب کے سامنے نہیں کرتے' یہ پاکستان ہے۔"

"آپ ایک لفظ بھی جانتے ہیں فرنچ کا۔" خادم نے کہا۔

"ہاں۔ ایک پورا جملہ بول سکتا ہوں میں مگر تم سن کے کاٹ کھانے کو دوڑو گے پاگل کتے کی طرح۔ ایک دوست نے سکھایا تھا کہ خواتین کے سامنے جھک کرانہیں آداب کہنے کا یہی طریقہ ہے۔"

صدیقی ہنسا "آخر کیا تھا وہ جملہ؟"

"ایس پی صاحب' ایک دعوت میں فرنچ کونسلیٹ کے آفس کا کوئی عہدے دار اپنی بیوی کے ساتھ آیا ہوا تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے سر جھکا کے کہہ دیا۔ کیا آپ میرے بچّے کی ماں بننا پسند کریں گی۔ اب اگر مولوی خادم حسین سے میں یہ بات کہہ دوں...؟"

کمرے میں قہقہوں کا طوفان آگیا۔ خود مولوی خادم حسین پیٹ پکڑ کے ہنس رہا تھا اور ہر قہقہے کا آغاز حلق سے نکلنے والی "کھی" کی آواز سے ہوتا تھا اور بس۔ پھر اسے دوسری "کھی" تک جھٹکے لگتے رہتے تھے۔ رابعہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

صدیقی نے ہنسی پر قابو پا کے کہا "اس کے بعد کیا ہوا منظر صاحب؟"

"بس یہ مت پوچھیں۔ آپ خود اندازہ کرسکتے ہیں" منظر اُٹھ کھڑا ہوا۔

میں رابعہ کے ساتھ منظر کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ "تم لوگ پیدل کیوں ہو؟"

میں نے آہ بھر کے کہا "بُرے دن ہوں بھائی تو کار والے بے کار ہوجاتے ہیں۔ اللہ کسی کو کسی کا محتاج نہ کرے۔"

خادم نے کہا "مس رابعہ کی کار میں کسی نے بم لگادیا تھا۔"

"ویری گڈ۔ پھر کیا ہوا؟... دھماکا؟"

"نہیں۔ مگر مولوی خادم حسین گاڑی کے نیچے گھس گیا اور گیلی پتلون کے ساتھ باہر نکلا" میں نے کہا۔

"دیکھیں جی۔ آپ غلط فہمی پیدا کررہے ہیں۔ گاڑی کے نیچے پانی تھا" خادم حسین نے احتجاج کیا "گاڑی عین گٹر کے ڈھکن پر کھڑی ہوئی تھی۔ میں اتنا ڈرپوک نہیں ہوں۔"

"یار پتلون تو گیلی ہوئی نا۔ اب پانی کہیں سے بھی آیا ہو' کیا فرق پڑتا ہے۔" منظر نے کہا "یہ بتاؤ تم لوگ فوت کیوں نہیں ہوئے؟"

میں نے اسے مختصراً سب بتادیا "مجھے رانا پر شک ہے کہ یہ اس کی جوابی کارروائی تھی۔ معلوم کرلیں گے رات کو۔"

"کس سے؟"

"اس کے دونوں غلام کسی اسپتال میں مل جائیں گے۔ استاد بادل نے انہیں پہچان لیا تھا" میں نے کہا۔

"اسے اپنا ہوش نہیں ہوتا۔ آئینے میں اپنی شکل دیکھ کے نہیں پہچان سکتا۔ سالا نشے باز۔"

"وہ اس وقت ہوش میں تھا۔"

"مگر تم نے اسے بیس روپے دیے تھے۔ بیس گھنٹے کا بندوبست کردیا تھا اب وہ کل ہی آنکھیں کھولے گا" منظر نے کہا۔

"نہ دیتے تو کیا کرتے۔ اسی اُمید پر تو نیکی کرتا ہے وہ۔"

"کہ جواب میں اس کے لیے برائی کے اسباب ہوں۔ اس نے تمہاری جان بچائی۔ تم نے اسے کچھ اور موت کی سرحد کے قریب کردیا۔ بہتر ہوتا اگر تم اسے کچھ نہ دیتے..."

منظر کی بات غلط نہیں تھی۔ بعض اوقات ہم جانتے بوجھتے غلطی کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں کیونکہ اس وقت اور کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ عقل پر جذبات حاوی آجاتے ہیں۔ دیوانہ کسی کو مارے تو مشتعل ہوکے اسے مارنا کوئی عقلمندی نہیں مگر غصے کے جذبات کا ردِعمل ایسا ہی ہوتا ہے۔ استاد بادل کو بھی لوگ یہ سمجھ کے پیسے دے دیتے تھے کہ اب اس کے لیے کوئی کچھ نہیں کرسکتا۔ نشے کی لت سے مجبور ہوکے یہ چوری بھی کرسکتا ہے۔ بہتر ہے اس کو حق محنت کے طور پر ہی کچھ دے دیا جائے۔ اتنی فرصت کسے کہ استاد بادل کی زندگی کے لیے کچھ کرے۔

گاڑی کو ہم نے پارکنگ ایریا میں چھوڑ دیا۔ اس وقت تک ایس ایس پی جاوید صدیقی اپنے ماتحت اے ایس پی کے ساتھ ہوٹل کے مین انٹرنس سے اندر جاچکا تھا۔ وہ دونوں پوری وردی میں تھے۔ انہیں دربان کیسے روک سکتا تھا مگر ہمیں بھی اس نے چیک نہیں کیا تو مجھے تعجب ہوا کہ مسٹر دلاور کی سیکیورٹی کے انتظامات اتنے غیر اطمینان بخش کیوں ہیں۔ ایسے تو کوئی بھی اندر پہنچ سکتا تھا۔ میری غلط فہمی فوراً ہی رفع ہوگئی۔

ہال میں کوئی نہیں تھا اور نہ وہاں کسی تقریب کے آثار تھے۔ وقت تقریباً ہوگیا تھا مگر اسٹیج یا روسٹرم اور مائکروفون کہیں نظر نہیں آتے تھے۔ ایک گوشے کے کاؤنٹر پر ریسپشن والے بڑے مطمئن بیٹھے تھے اور یہی بات مجھے کچھ عجیب لگی کہ اعلیٰ پولیس افسروں کے ساتھ آنے والوں کو وہ ایسے نظر انداز کیوں کررہے ہیں جیسے یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ وہ تو ہال میں سوالیہ نشان بن کے کھڑے ہونے والے عام آدمی سے بھی فوراً بڑے اخلاق سے سوال کرلیتے

ہا کہ فرمایئے' ہم آپ کی کیا خدمت کریں۔

صدیقی نے کاؤنٹر پر جا کے کہا "واٹ از آل دس؟"

کلرک نے پلکیں جھپکا کے کہا "سر؟"

"ایک پریس کانفرنس تھی یہاں ڈیڑھ بجے' لنچ کے بعد؟"

منظر نے مجھے دیکھ کے آنکھ ماری۔ "یہ کسی نے مذاق کیا ہے۔ آج یکم اپریل ہے نا' کسی کو خیال نہیں آیا۔"

صدیقی ایک دم پلٹا "یو آر رائٹ۔ اپریل فول ہیں ہم سب۔"

رابعہ بھی پریشان ہوگئی "ایسا نہیں ہوسکتا۔"

"ایسا ہوگیا ہے میڈم۔" صدیقی نے طنز اور تلخی سے کہا "یہ اطلاع کس کے ذریعے ملی تھی آپ کو؟"

"آپ کو کس نے بتایا تھا صدیقی صاحب!" منظر بولا "آپ نے بھی تصدیق نہیں کی۔"

اتنی دیر میں کاؤنٹر کے پیچھے منیجر ایک فہرست لے کر آگیا تھا۔ اس نے کہا "پلیز آپ نام بتایئے اپنے۔"

ایس ایس پی جاوید صدیقی نے خاصی ناگواری سے اپنا اور پھر ہم سب کا نام بتادیا "اب کیا تم شناخت کے لیے ثبوت بھی مانگو گے۔"

"یس سر۔ آئی ایم سوری مگر مجھے یہی ہدایات ہیں۔"

"یہ ہوٹل ہے یا... آرمی ہیڈ کوارٹر؟ یا پرائم منسٹر کا سیکریٹریٹ؟"

منیجر نے اسی شائستگی سے کہا "اگر آپ ہوٹل کے مہمان ہیں تو پلیز تشریف رکھیے۔ ہم ہر خدمت کے لیے حاضر ہیں لیکن آپ نے پریس کانفرنس کی بات کی تھی۔ وہاں انہی کو جانے کی اجازت ہے جو مدعو کیے گئے ہیں۔ اور جعلی مہمانوں کو روکنے کے لیے شناخت کی کارروائی کے لیے سب ذمے داری ہم پر عائد کردی گئی ہے۔"

"اوکے' اوکے۔ یہ دیکھو میرا شناختی کارڈ" ایس ایس پی نے ناگواری سے اپنا کارڈ اس کے سامنے رکھ دیا۔

"آپ باقی سب کو جانتے ہیں سر۔ آپ مطمئن ہیں نا کہ انہیں بھی بلایا گیا ہے؟" منیجر نے کارڈ اسے واپس کردیا۔

"آف کورس۔ ان کی ذمے داری میں لے سکتا ہوں۔"

منیجر نے ایک ویٹر کو اشارے سے بلایا "یہ آپ کو لے جائے گا اوپر ایک کانفرنس روم ہے۔"

کانفرنس روم تھرڈ فلور پر تھا اور بزنس ایگزیکٹوز کی میٹنگ یا فیملی ڈنر جیسی محدود تقریبات کے لیے استعمال ہوسکتا تھا۔ اس میں دونوں جانب دیوار کے ساتھ ساتھ کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ ان کی بیٹ الگ تھی مگر بیک مشترک تھی۔ دو فٹ چوڑے بلیک لیدر کے کُشن کی صورت میں ایک پٹی سی چاروں طرف فکس کردی گئی تھی۔ اس سے اوپر کی دیواریں پلائی وڈ کی تھیں جن پر پالش چمک رہی تھی۔ یہ شاید تیس فٹ لمبا اور پندرہ فٹ چوڑا ہال تھا جس کی کولنگ کے لیے چار اے سی نصب تھے۔ فرش پر ریڈ کارپٹ تھا اور کرسیوں کے سامنے ایک ہی ٹیبل تھی جس کی چوڑائی شاید دس فٹ ہوگی۔ اس کے چاروں کناروں پر دو فٹ کی پٹی پر فارمیکا تھا۔ درمیان میں سفید ٹیبل کور پر گلاس پلیٹیں اور چمچے سجے ہوئے تھے۔ نیپکن کے پھول بنا کے گلاسوں میں لگادیے گئے تھے بالکل وسط کی پٹی پر تازہ رنگین پھولوں کے گلدستے ایک قطار میں رکھے ہوئے تھے۔ یہ ترتیب سادگی اور خوبصورتی کا پُروقار امتزاج تھی۔

چوتھی سمت میں جو داخلے کے دروازے سے انتہائی فاصلے پر تھی دیوار پر ایک بہت وسیع اور خوب صورت میورل تھا اور اس کے نیچے وہ میز جس کے پیچھے تین کرسیاں نظر آرہی تھیں۔ یہ سنہرے حاشئے اور نقش و نگار والی کرسیاں تھیں جن کے وسط میں سُرخ مخمل تھا۔ بیچ والی کرسی کی گولائی کچھ زیادہ اٹھی ہوئی تھی۔ ظاہر ہے یہ کسی میٹنگ کا فارمل سیٹ اپ تھا۔ یہاں تین کرسیوں پر میزبان۔ میٹنگ بُلانے والے اور کمپنی ڈائریکٹرز وغیرہ بیٹھ سکتے تھے۔ درمیان والی اونچی کرسی چیئرمین صدر یا مہمان خصوصی کو دی جاسکتی تھی۔ میز پر صرف ایک مائکروفون تھا اور ایک گلدستہ۔

نصف سے زائد کرسیوں پر مہمان پہلے سے موجود تھے مگران پر اس پُرتکلف یا SOPHISTICATED ماحول کا اثر تھا کہ وہ سلام دعا بھی سہلا کے کررہے تھے اور مہذب لوگوں کی طرح آہستہ آہستہ بول رہے تھے۔ میں صرف غازی کو پہچانتا تھا مگر بعد میں کچھ اور شناسا چہرے بھی نمودار ہوئے جو غالب کے ساتھی تھے۔ میں ان کے لیے اجنبی تھا مگر انہوں نے رابعہ اور منظر کو دیکھ کے ہاتھ ہلایا اور ایس ایس پی جاوید صدیقی کو دیکھ کے حیران ہوئے۔ ان میں غازی ہی زیادہ منہ پھٹ تھا "آپ کا آنا خالی از علت نہیں ہوسکتا۔ آپ تو بڑے باخبر لوگ ہو...؟"

صدیقی نے اس کی بات کاٹ دی "مگر ہمیں باخبر رکھنے والے تو آپ لوگ ہیں۔"

"یہ چکر کیا ہے؟" دوسرے نے کہا "آپ کچھ روشنی ڈالیے؟"

صدیقی نے چھت کی طرف دیکھا "کیا ان فانوسوں کی روشنی کم ہے؟"

اچانک پیچھے والے دروازے کا پردہ ہٹا کے دلاور کی بیوی نمودار ہوئی۔ میں ہی نہیں' ایک لمحے کے لیے سب دم بخود رہ گئے۔ سب کو توقع تھی کہ آج کی میزبان اتنے بڑے صنعتکار کی بیوی ہے۔ وہ بڑے کروفر اور چمک دمک کے ساتھ نمودار ہوگی۔ جو اسے جانتے تھے انہیں معلوم تھا کہ اس کی عمر بھی اتنی زیادہ نہیں اور جب اتنا زیادہ پیسہ ہو تو عمر کے دس بیس سال تو ساٹھ سال کی عورت بھی پیچھے دھکیل دیتی ہے۔ وہ بلاشبہ حسین تھی۔ کسی نوخیز حسینہ سے اس کا موازنہ نہیں کیا جاسکتا تھا مگر عمر کے ساتھ عورت کے انداز و اطوار میں جو رعنائی آتی ہے اس کا تاثر بالکل جدا ہوتا ہے۔ پہاڑی ندی کے پُرشور بہاؤ کا حسن اپنی جگہ مگر گہری جھیلوں کا

پُرسکون ٹھہراؤ بھی کم نظرنواز نہیں ہوتا۔ اگر وہ پورے میک اپ اور نظروں کو خیرہ کرنے والے لباس میں نمودار ہوتی تو شاید ایک مسکراہٹ سے سب کو مسحور کردیتی۔ وہ شوہر سے جدائی کے غم کی تصویر بن کے آتی۔ سیاہ ماتمی لباس میں زلفیں بکھرا کے اور کاجل کی لکیر کو آنسوؤں کی نمی سے پھیلا کے نمودار ہوتی تو سب کو اُداس کردیتی مگر وہ دلاور کی بیوی تھی جو عام قسم کے ڈرامے نہیں کرتا تھا۔

دلاور کی بیوی ایسے آئی جیسے ابھی ابھی کسی پُرہوس بھیڑیے کے چنگل سے آزاد ہوکے‘ اپنی آبرو لٹا کے اور جان بچا کے بڑی مشکل سے گرتی پڑتی یہاں پہنچی ہو۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ چہرہ اُجاڑ تھا اور اس پر گہرے نیل صاف نظر آتے تھے۔ اس کے چہرے پر لمبی لمبی خراشیں تھیں اور اس کا عام سا لباس جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ اس کے گداز شانوں کی سفیدی پر بھی خراشوں کی سُرخی تھی اور ان مقامات پر بھی جن کو نظر بھر کے دیکھنے والے بھی نظر چُرانے پر مجبور تھے۔

وہ چند لمحے خالی خالی فریاد کناں نظروں سے سب کو دیکھتی رہی اور پھر دھڑام سے کرسی پر گر گئی۔ اس کے ساتھ ہی جیسے سکوت کا وہ طلسم ٹوٹ گیا جو شاک کا نتیجہ تھا۔ بہت سے لوگوں کی ملی جلی آوازیں اُبھریں۔

"یہ کیا ہے مسز دلاور؟"

"کیا ہوا ہے آپ کے ساتھ؟"

"کس نے بنائی ہے آپ کی یہ حالت؟"

میں نے رابعہ کے کان میں کہا "ڈرامے کا پہلا سین زبردست رہا۔"

دلاور کی بیوی نے سر اُٹھا کے کہا "پلیز جنٹلمین۔ آپ سب کو میں نے یہی بتانے کے لیے بُلایا ہے۔ جب کوئی واردات ہوتی ہے تو کسی چیز کو چھیڑا نہیں جاتا۔ میں نے بھی اسی حالت میں سب کے سامنے آنا بہتر سمجھا۔"

"مسز دلاور۔ اگر آپ کے ساتھ کوئی واردات ہوئی تھی تو آپ کو پولیس اسٹیشن جانا چاہیے تھا۔" ایس ایس پی جاوید صدیقی نے سخت لہجے میں کہا "کب ہوئی تھی یہ واردات آخر اور آپ نے اس صورتِ حال کو ایسے EXPLOIT کرنے کے لیے یہ پریس کانفرنس کا ڈراما کیوں کیا ہے؟"

غازی نے کہا "ہاں۔ کب سے یہ حالت بنائے پھر رہی ہیں آپ؟"

رابعہ بولی "آپ کو میڈیکو لیگل رپورٹ کے لیے پیش ہونا چاہیے تھا۔"

وہ خاموش بیٹھی رہی۔ کچھ لوگوں نے اس کے حق میں اور کچھ نے خلاف بولنا شروع کیا۔ ایک شوخ قسم کے فوٹوگرافر نے تو یہ بھی کہا کہ "میک اپ کس سے کرایا تھا آپ نے۔ شوٹنگ کے لیے۔"

"میں سب کچھ بتاؤں گی۔ سب کے سوالات کا جواب ...
گی۔"

"صبح سے سارے شہر کو معلوم ہے کہ مسز دلاور نے ایک عالی شان ہوٹل میں پریس کانفرنس بُلائی ہے۔ صرف یہ بتانے کے لیے کہ کسی نے اسے مارا پیٹا ہے یا اس کے ساتھ زبردستی کی ہے؟"

"مظلومیت کے اس پبلسٹی اسٹنٹ کے بعد آپ توقع رکھیں گی کہ پولیس فوراً مجرم کو پکڑ لے" اے ایس پی آفتاب نے کہا "گھنٹوں بعد یہ انکشاف فرمائیں گی آپ کہ آپ پر ASSAULT ہوا ہے۔"

"میں پولیس کو کوئی رپورٹ نہیں کررہی ہوں۔ میں پبلک کو بتانا چاہتی ہوں۔"

"یہ غلط ہے۔"

"مگر جرم نہیں ہے" اس نے پلٹ کے جواب دیا "اور ہے تو گرفتار کرلینا تم مجھے۔"

"اس طرح پولیس بدنام ہوتی ہے۔"

"پولیس نیک نام کب تھی؟" غازی نے کہا "میرا خیال ہے ایس ایس پی صاحب کہ اب آپ یہاں آگئے ہیں اور ہم بھی۔ تو پھر موقع دیں مسز دلاور کو‘ پہلے ان کی سُن لیں۔"

مولوی خادم حسین نے فرنچ میں کہا "کوئی نہیں کہتا کہ پہلے کھانا کھالیں۔ باتوں سے پیٹ بھر جائے گا کیا؟"

اللہ نے اس کے پیٹ سے نکلی ہوئی فریاد بھی سُن لی۔ ویٹر کھانے کی ڈشیں اُٹھائے ہوئے نمودار ہوئے اور بیچ میں رکھنے لگے۔

رابعہ نے کہا "ڈرامے کا پہلا سین فلاپ ہوگیا۔"

"جاوید صدیقی نے سب چوپٹ کردیا۔ اب بات بنے گی نہیں خواہ یہ کتنی ہی دردناک ایکٹنگ کیوں نہ کرے۔" غازی بولا۔

میں نے رابعہ کے کان میں کہا "بے وقوف عورت نے اپنا کیس خراب کرلیا۔ ایسے ڈراموں سے کسی کی ہمدردی حاصل نہیں ہوسکتی۔"

مسز دلاور معذرت کرکے پھر پردے کے پیچھے غائب ہوگئی "آپ سب نے مجھے دیکھ لیا اور اپنی اپنی رائے کا اظہار بھی کردیا۔ اب آپ اطمینان سے لنچ کریں۔ میں ابھی کچھ دیر میں آتی ہوں۔"

جاوید صدیقی کا موڈ خراب ہوگیا تھا مگر سب نے کھانا شروع کیا تو وہ بھی مجبور ہوگیا "میرا دل تو نہیں چاہتا۔"

مولوی خادم حسین نے کہا "سر۔ کیا آپ کھانا دل میں ڈالتے ہیں۔ ہمارا تو معدہ بالکل دل کی نہیں مانتا جی۔"

"تمہارے پاس معدے کے سوا ہے کیا؟" منظر بولا۔

خادم کو سب کی ہنسی نے مشتعل کردیا "آپ۔۔۔ پڑھے لکھے جاہل ہیں منظر صاحب۔ ایسا پھکڑپن زیب نہیں دیتا آپ کو۔"

"ہم پیدائشی پھکڑ ہیں مولوی خادم حسین۔ چلو غصہ تھوک دو ... کھانا کھاؤ۔" منظر نے اسے چمکارا "کبھی سچ سُن بھی لینا ... ہے۔"

... میرا ذہن الجھن کا شکار تھا اور خود رابعہ بھی یہی سوچ رہی تھی ... دلاور کی بیوی نے یہ غیر ضروری سوانگ کیوں بھرا۔ اور اگر ... اس کے ساتھ رانا نے زیادتی کی تھی تو صبح سے اب تک ... لیس کو رپورٹ نہ کرنے اور اسی حالت میں سب کے سامنے ... نے سے اسے کیا فائدہ ہوگا۔

دو بجے مسز دلاور نے پھر انٹری دی۔ اس وقت تک سب ... ھانے سے فارغ ہوچکے تھے۔ ویٹر برتن سمیٹ رہے تھے اور ... ئے کے لیے کراکری لگا رہے تھے۔ پچیس منٹ میں مسز دلاور نے ... ری بار حاضرین اور ناظرین کو صدمے سے دوچار کیا۔ اب اس ... لاپ وہی تھا جس میں سب اسے دیکھنے کی اُمید لگائے بیٹھے تھے۔ ... وہ پہلی بار اس طرح آتی تو شاید اثر اتنا نہ ہوتا مگر چند منٹ پہلے ... مسز دلاور کے بعد اس کا بالکل بدلا ہوا انداز دیکھ کے سب پھر دم ... بخود رہ گئے۔

اس نے کالی قمیص پہن لی تھی‘ شانوں تک جالی میں سے جلد ... کے گورے پن کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں اور قمیص کمر پر سے جتنی ... تھی اوپر سے اتنا ہی گلا کشادہ تھا۔ بظاہر اس نے بالوں کو کنگھی ... سے سُلجھالیا تھا مگر شانوں پر ان کی بے ترتیبی بھی کسی ماہر میک اپ آرٹسٹ کے فن کا نمونہ تھی۔ کنٹراسٹ میں زرد شلوار اور دوپٹہ ... کمرے کے ماحول میں اسے بہت نمایاں کررہے تھے۔ اس نے ... چہرے کے میک اپ سے نیل کے نشانوں کو چھُپالیا تھا لیکن ... خراشوں کو چھپانا مشکل تھا۔ اب اس کے ساتھ دائیں ہاتھ پر ... بھی اس کا بیٹا تھا اور بائیں جانب ایک خونخوار گوریلا ٹائپ باڈی گارڈ۔

کچھ لوگوں نے پھر زیرِ لب میک اپ کی تعریف کی "کوئی اسٹیج کا میک اپ مین ہوگا۔"

"اس کے بعد تیسرے سین کے لیے بھی وہی میک اپ کرے ... گا۔"

دلاور کی بیوی نے اپنی بات شروع کی تو سب غیر سنجیدہ تھے اور ... محسوس کررہے تھے کہ انہوں نے یہاں آکے اپنا وقت ضائع کیا ... بس تسلی کے لیے صرف یہ خیال تھا کہ چلو لنچ تو اچھا رہا۔ غیر معمولی ... تھا۔

"آپ سب مجھے جانتے ہیں۔ نہیں جانتے تو میں بتادوں۔ میں ... چوہدری دلاور کی بیوی۔ اب کچھ یاد آیا آپ کو؟ یہ نام تو اجنبی ... نہیں رہا کسی کے لیے۔ اتنا عرصہ ہوگیا ہر روز کسی نہ کسی حوالے سے کوئی خبر مل ہی جاتی ہے اخباروں کو۔ چوہدری دلاور کے بارے میں آپ اپنی اپنی رائے قائم کرنے کے لیے آزاد ہیں۔ وہ اچھا تھا یا بُرا۔"

"آپ ماضی کا صیغہ کیوں استعمال کررہی ہیں۔ تھا کس لیے؟ کہیں وہ خدانخواستہ۔۔۔"

"خدا نہ کرے۔ وہ زندہ ہیں لیکن لاپتا ہیں۔ چوہدری صاحب کے بارے میں ہزار باتیں ہیں۔ کوئی کہتا ہے وہ مفرور ہیں۔ کوئی کہتا ہے وہ پولیس کی تحویل میں ہیں۔ یہ سب خیال آرائیاں ہیں۔ چوہدری صاحب کو ان کے دشمنوں نے قید کررکھا ہے۔"

"یہ آپ یقین کے ساتھ کیسے کہہ سکتی ہیں؟"

"وہ دشمن کون ہیں؟ یہ بھی بتادیں۔۔۔"

"سب بتاؤں گی میں۔ مگر کیا آپ سب لوگ جانتے نہیں کہ ان کے اصل دشمن کون ہیں۔ کس نے ان کے نام کو رُسوا کیا‘ انہیں اسمگلر‘ وطن دشمن‘ غدار‘ بے ضمیر شیطان۔ انسانوں کے لہو کا تاجر۔ قاتل اور خونی کیا کچھ نہیں کہا۔ کس نے ان کے لیے مسائل پیدا کیے۔ ان کے خلاف سازش کی۔ انہیں بدنام کیا اور ان کا جینا مشکل کردیا۔ میں ان کا نام نہیں لوں گی۔ مگر سب جانتے ہیں انہیں۔ وہ خود مجرم ہیں اور قاتل ہیں۔"

"مسز دلاور۔ اگر یہی سب کہنا تھا آپ کو۔۔۔"

"نہیں۔۔۔ یہ سب کہنے کا کوئی فائدہ نہیں" اس نے جلدی سے کہا۔ "میں تو یہ بتانا چاہتی تھی کہ میرے شوہر کے اغوا۔۔۔"

صدیقی بولا "کوئی ثبوت نہیں آپ کے پاس کہ انہیں اغوا کیا گیا تھا۔"

غازی نے کہا "ممکن ہے وہ پردے میں بیٹھے ہوں۔"

"نہیں۔۔۔ آپ لوگ وہ سب نہیں جانتے جو میں جانتی ہوں۔" دلاور کی بیوی نے چلّا کے کہا "میں مل کے آئی ہوں اپنے شوہر سے۔ اس قید خانے میں جہاں ان کو۔۔۔ کسی جنگلی جانور سے بدتر طریقے پر رکھا گیا ہے۔ میں بتا رہی ہوں آپ کو کہ مجھے چوہدری دلاور سے ملوانے کے لیے وہی لوگ لے گئے تھے جن کا میں ذکر کررہی تھی۔ چوہدری دلاور کے دشمن‘ میں کیوں نام لوں ان کا۔ کیا آپ سب میں ہمت نہیں ہے؟"

غازی نے کہا "کیا آپ کو سکندر بخت لے گیا تھا وہاں؟"

ایک لمحے کے لیے خاموشی چھاگئی پھر دلاور کی بیوی نے کہا "ہاں۔ مجھے خود سکندر بخت نے یہ موقع فراہم کیا تھا۔"

جب اس نے رو رو کے بتانا شروع کیا کہ اس نے تہ خانے میں چوہدری دلاور کو کس حال میں دیکھا تھا اور وہ کتنی اذیت دہ حالات میں زندہ تھا۔ تو ماحول یکلخت گمبھیر ہوگیا۔

صدیقی نے میز پر ہاتھ مار کے کہا "اسٹاپ دس رونا دھونا۔"

فیصل نے چیخ کے کہا "ایس پی صاحب‘ یہ آپ کا تھانہ نہیں ہے اور نہ ہم مجرم ہیں۔"

"شٹ اپ۔ میں ابھی اور اسی وقت گرفتار کرسکتا ہوں تمہاری ماں کو ایڈیٹ۔" صدیقی بھڑک اُٹھا۔

"کس جرم میں؟" فیصل کچھ دب گیا۔

"جرم؟ یہ جرم کیا کم ہے کہ اس عورت نے ایک مفرور مجرم

سے ملاقات کی۔ جو قاتل ہے اور میں اس قتل کا سراغ لگانے کے لیے خاص طور پر اسلام آباد سے یہاں آیا ہوں۔"

اب دلاور کی بیوی نے کہا "اس پر قتل کا الزام لگانے والے آپ ہیں مگر فیصلہ کرنے کا اختیار آپ کو نہیں ہے۔ آپ نے اسے کس طرح قاتل کہہ دیا سب کے سامنے۔ اور میرے لیے وہ شوہر ہے۔ جیسے اپنی بیوی کے لیے آپ ایس ایس پی نہیں ہیں۔"

"ٹھیک ہے مسز دلاور۔ میرا کام ہے تفتیش کرنا اور میرے لیے رشتوں کی کوئی اہمیت نہیں۔ میں آپ سے بھی پوچھوں گا کہ آپ نے کیسے ملاقات کی تھی۔ آپ کو سکندر کہاں ملا تھا۔ کیا وہ آپ کو گھر سے لے جانے کے لیے پہلے سے ملاقات کا وقت طے کر کے آیا تھا یا زبردستی راہ چلتے آپ کو گاڑی میں ڈال کے لے گیا تھا۔ آپ کی پوزیشن بہت مشکوک ہو گئی ہے اس کہانی سے۔"

"مگر میں کیا کر سکتی تھی۔۔۔" وہ بے بسی سے بولی۔

"اگر اس نے پہلے سے بتا دیا تھا کہ وہ آپ کو دلاور سے ملوائے گا۔ تو آپ کسی نہ کسی طرح پولیس کو مطلع کر سکتی تھیں۔ آپ کوئی جاہل اور بے وقوف عورت نہیں ہیں۔ بیٹا بھی آپ کا اتنا ہوشیار ہے۔ آپ خود مل کے سکندر کو ٹریپ کر سکتے تھے۔ کوئی آپ کا تعاقب ایسے کرتا کہ سکندر کے باپ کو پتا نہ چلتا' لیکن آپ نے کچھ نہیں کیا۔"

"اگر میں ایسا کرتی۔ تو دلاور سے نہیں مل سکتی تھی۔"

"مسز دلاور۔ آپ کے شوہر کا جانی دشمن ہے سکندر۔ آپ نے کیوں اعتبار کر لیا تھا اس پر۔ اگر وہ آپ کو بھی وہیں بند کر دیتا۔ جہاں بقول آپ کے دلاور کسی جنگلی جانور کی طرح بند ہے۔ تو کیا ہوتا' آپ سوچے سمجھے بغیر اس کے ساتھ چل پڑیں۔ کسی کو بتائے بغیر کسی کو ساتھ لیے بغیر۔ آپ کو ڈر نہیں لگا۔ آپ کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ آپ کی لاش کسی سڑک پر ملتی۔"

"میں نے کب کہا ہے کہ وہ پہلے سے بتا کے آیا تھا اور میں ہنسی خوشی اس کے ساتھ چلی گئی تھی۔"

"پھر کیا اس نے آپ کو گن پوائنٹ پر گھر سے اٹھایا تھا یا باہر ہی سے اغوا کر لیا تھا۔ کون سی جگہ تھی وہ۔ کس دن اور کس وقت کی بات ہے یہ' آپ نے شور کیوں نہیں کیا تھا۔ سیکڑوں سوالات کا جواب دینا پڑے گا آپ کو مسز دلاور اور مجھے یقین ہے کہ آپ قتل کے اس ملزم کی گرفتاری کے لیے مفید معلومات فراہم کریں گی۔ شاید آپ ۔۔۔ راستہ اور وہ جگہ بھی یاد آ جائے۔"

"ایس ۔ صاحب۔ آپ سب کچھ کر سکتے ہیں" غازی نے اسے ٹوکا "پھر ۔ کا اعلان کرنے کی کیا ضرورت ہے سب کے سامنے۔ کون چیلنج کر رہا ہے آپ کے اختیار کو؟"

دوسرے صحافی نے کہا "آپ کھلی دھمکی دے رہے ہیں۔ ہراساں کر رہے ہیں اس عورت کو جو اپنے ساتھ ہونے والے ظلم کی بات بتانا چاہتی ہے۔"

"ظلم۔۔۔ مائی فٹ۔ یہ عورت ڈراما کر رہی ہے۔ میں شرط لگا سکتا ہوں کہ سب جھوٹ ہے اور آپ لوگ مجھے موقع دیں تو میں ابھی اس کا جھوٹ پکڑ کے دکھا سکتا ہوں۔ مجھے یہ بتائیں خاتون کہ آخر آپ کے شوہر کے اس جانی دشمن نے ایسا کیوں کیا تھا؟ دلاور اگر اس کے قبضے میں ہے۔ تو وہ دلاور کو مار کیوں نہیں دیتا۔ اسے قید رکھنے میں سکندر کا فائدہ کیا ہے؟ اور اس کا کیا انٹرسٹ تھا آپ کو دلاور سے ملوانے میں؟ کیوں یہ نیکی کی اس نے آپ کے ساتھ آخر؟ کیا اس کی خواہش آپ نے کی تھی؟ اسے پیغام دیا تھا تو کیسے اور کہاں؟ اور اس نے انسانی ہمدردی یا وسیع القلبی سے کام لیتے ہوئے خود آپ کو دلاور سے ملاقات کا موقع فراہم کیا تھا تو کیوں؟"

"میں آپ کو سب بتا دوں گی بعد میں۔"

"آپ کو بتانا پڑے گا سب کہ وہ آپ کو کیسے لے گیا تھا اور کب۔۔۔ اور اس کی اطلاع آج تک پولیس کو کیوں نہیں دی تھی آپ نے۔ آپ خود کو زیر حراست سمجھیں۔ اس پریس کانفرنس کے بعد میں آپ کا مفصل بیان لوں گا۔"

"اگر تھانے میں STATEMENT لی جائے گی تو۔۔۔"

"نہیں۔ میں آپ سب کی موجودگی میں بات کروں گا۔ انہی کے گھر پر یا اسی ہوٹل میں۔" اس نے گھڑی دیکھی "رات آٹھ بجے یہ ایک مجسٹریٹ کی موجودگی میں اپنا بیان دیں گی۔ اس وقت تک یہاں ان کو کمرے سے باہر جانے کی اجازت نہیں ہوگی اور نہ کوئی ان کے کمرے میں جائے گا۔"

"فیصل میرے ساتھ رہے گا۔"

"آپ کے ساتھ صرف ایک لیڈی کانسٹیبل ہوگی۔ فیصل کا بیان ہم الگ لیں گے اب آپ اپنی بات جاری رکھیں۔" جاوید صدیقی نے فیصلہ صادر کر دیا۔

ایس ایس پی کا موقف غلط نہیں تھا اس لیے صحافی حضرات بھی کچھ نہیں بولے۔ دلاور کی بیوی نے سب کی ہمدردی حاصل کرنے کی جو کوشش کی تھی وہ ناکام ہو گئی تھی۔ ایک مظلوم کی بیوی کی حیثیت سے وہ اخبار والوں کو گھر پر بلا کے یہ سب کچھ بتاتی تو شاید ردعمل مختلف ہوتا مگر اس عالی شان ہوٹل میں اس کا یہ ڈراما فیل ہو گیا تھا۔ پولیس کی موجودگی نے مسز دلاور کی پوزیشن مزید خراب کی تھی۔ اس کے بیان سے صدیقی کی پوزیشن خراب ہوئی تھی۔

"دیکھیے۔ اپنے شوہر سے ملنے کے لیے جانا میرا ذاتی معاملہ تھا۔ میں ایک بیوی کی حیثیت سے مجبور تھی کہ سکندر جیسے دشمن پر بھی اعتبار کروں۔ آپ اسے میری بے وقوفی کہیں یا اسے میرا جرم سمجھیں۔ اگر وہ مجھے قید کر لیتا یا مار ڈالتا تو یہ میرا رسک تھا جو میں نے لیا۔ سکندر کی دلاور سے دشمنی ضرور ہے اور اس کی وجہ بھی ہے۔ جس سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ میں یہ جانتی ہوں کہ ایک انسان کی حیثیت سے وہ بدمعاش یا بدکردار نہیں ہے۔ کم ظرف اور کینہ دشمن نہیں ہے۔ اس کی قانونی پوزیشن کچھ بھی ہو۔ خود چوہدری دلاور اسے بہادر اور بااصول دشمن کہتا تھا۔ اس کا بھی یہی خیال تھا کہ دلاور جیسا دشمن ان بہت سے دوستوں سے بہتر ہے جو مار آستین تھے۔ وہ سامنے آ کے وار کرنے والا دشمن تھا۔ پیٹھ میں خنجر گھونپنے والا دوست نہیں۔ مجھے اپنے شوہر سے ملنا تھا اور اس کے لیے میں نے سکندر سے خود رابطہ کیا تھا۔ اسے پیغام پہنچایا تھا کہ اگر چوہدری دلاور زندہ ہے تو مجھے ایک نظر دکھا دے۔ میں صرف اپنے شوہر کی زندگی کا یقین چاہتی تھی۔ اس نے میری بات مان لی۔ میرے دل کو سکون حاصل ہو گیا کہ وہ جہاں بھی ہے جس حال میں بھی ہے زندہ تو ہے۔ میں بیوہ تو نہیں ہوئی۔ میرا بیٹا یتیم تو نہیں ہوا اور سکندر خود مجھے ساتھ لے کر نہیں گیا تھا۔ اس نے یہ بندوبست کر دیا تھا کہ کوئی مجھے دلاور سے ملوا دے۔ وہ مجھے چونگی کراس سے گاڑی میں بٹھا کے لے گئے تھے۔ میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی تھی اور گاڑی گھنٹا بھر چلتی رہی تھی۔ آدھے گھنٹے کی ملاقات کے بعد وہ پھر مجھے وہیں چھوڑ گئے تھے۔ اگر میں نے پولیس کو اطلاع نہیں دی اور جرم کیا تو میں اس کی سزا بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔ کیونکہ میں پولیس کو بتا دیتی تو پھر میں دلاور سے مل نہیں سکتی تھی۔ میں سکندر کے سامنے بھی اپنا اعتبار کھو دیتی۔"

"کیا آپ اسے اتنا ضروری سمجھتی ہیں" صدیقی کے ماتحت اے ایس پی آفتاب نے طنز سے کہا "بڑا احترام ہے آپ کے دل میں سکندر بخت کے لیے۔"

اچانک مسز دلاور کا لہجہ بدل گیا "احترام کیوں نہ ہو۔ وہ دشمن ہے تو دشمن ہے۔ دلاور کے دوستوں کی اصلیت بھی جانتی ہوں میں۔ کون کون اس کے در پر آتا تھا۔ کتے کی طرح دُم ہلاتا ہوا۔ ایسی ہی وردیوں والے کتنے لوگ اس کی خیرات پر پلتے تھے اور کتنے معزز صحافی تھے جو اس کی چاکری کے لیے تیار تھے۔ جب سے اس نے پبلک لائف میں قدم رکھا تھا کتنے گفتار کے غازی اس کے پی آر او کی حیثیت سے کام کرنا چاہتے تھے۔ اس کا امیج بنانے کے لیے اپنی صلاحیت اور قابلیت اور اپنا زور قلم صرف کرنے کے لیے بے تاب تھے۔ میں ان سب کے نام بتا سکتی ہوں جو صبح و شام حاضری دیتے تھے اور سلام کرنے کے بہانے تلاش کرتے تھے۔ جھوٹے خوشامدی چمچے۔ جو اسے یقین دلاتے تھے کہ چوہدری صاحب' ضمنی انتخابات میں جگہ خالی ہوئی تو سمجھو آپ کی ممبری پکی۔ ایک بار آپ اسمبلی میں پہنچ گئے تو وزیر بننے سے کون روک سکتا ہے آپ کو اور گاڑی پر جھنڈا لگ گیا تو پھر آپ کا راستہ روکنے والا کون ہوگا۔ وزیراعلیٰ سے وزیراعظم تک بن سکتے ہیں آپ مگر چوہدری دلاور ایسے لوگوں کو پہچانتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ یہ سب بانس پر چڑھانے والے ہی مروائیں گے مجھے۔ جھوٹ اور سچ کے فرق کو سمجھتا تھا وہ۔ دوستوں اور دشمنوں میں تمیز کر سکتا تھا۔ اسے افسوس تھا کہ سکندر اس کا ساتھ دینے پر تیار نہیں۔ اس سے صلح نہیں کرتا۔ وہ بڑا کھرا اور جی دار بندہ ہے۔ دشمن ہے تو کیا ہوا۔ دوستوں میں اس جیسا کسی کا کردار نظر نہیں آتا ہے۔ میں نام نہیں لوں گی کسی کا مگر میں ان سب کو جانتی ہوں۔ جو قانون اور انصاف کے رکھوالے کہلاتے تھے مگر خود لٹیرے تھے۔ وہ نوٹوں کی ایک گڈی کے عوض بک جاتے تھے۔ اگر دلاور نے وہ سب کچھ کیا تھا جس کا اس پر الزام ہے تو کیا اکیلے کیا تھا؟ کسی کی مدد کے بغیر کیا تھا؟ نہیں' ایسے ہی مددگار تھے اس کے۔ جیسے آپ لوگ ہیں' آپ ہی میں سے تھے جو اس کو راستے دکھاتے تھے اور اس کے لیے بند راستے کھولتے تھے۔ ایک بہت بڑا پولیس افسر اب ریٹائر ہونے والا ہے۔ اگر میں اس کا نام لوں تو اس کا کچھ بھی نہیں بگڑے گا۔ الٹا مجھے نقصان ہوگا۔ وہ تو کہہ دے گا کہ کتیا بھونکتی ہے بھونکنے دو مگر اس کے ماتحت جو انسانوں کی زبان گدی سے کھینچ لیتے ہیں کسی کتیا کو کہاں بھونکنے دیں گے۔ اس افسر نے ایک رات چوہدری صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کے کہا تھا کہ فلاں علاقے کا ایم پی اے بیمار ہے اور اسے علاج کے لیے آج رات ایمبولینس میں لاہور پہنچایا جائے گا۔ آپ حکم دیں تو ایمبولینس کا حادثہ ہو جائے گا۔ سیٹ خالی ہو جائے گی اور ضمنی انتخابات میں آپ کو ٹکٹ مل جائے گا۔ یہ خود میں نے سنا تھا اپنے کانوں سے۔"

"اور چوہدری صاحب نے کیا حکم دیا تھا؟"

"چوہدری دلاور کی جگہ تم ہوتے تو کیا کہتے؟ اصول پرستی کی باتیں کرنا بہت آسان ہے مسٹر صحافی۔ جب تک موقع نہ ملے سب کتابی باتیں کرتے ہیں۔ کہ عاقبت خراب کر کے قارون کا خزانہ بھی میں نہ لوں مگر موقع ملتا ہے تو وہی لوگ بڑی کم قیمت لگاتے ہیں اپنی۔ دس بیس ہزار یا لاکھ دو لاکھ۔ اسمبلی کے رکن تو تم کیا بنو گے لیکن آج اگر تمہیں موقع ملے کہ سازش کر کے ایڈیٹر کو نکلوا سکو اور خود اس کی جگہ لے سکو تو تم موقع ہاتھ سے جانے نہیں دو گے۔"

"آپ کسی پر ذاتی حملہ مت کریں" غازی نے کہا۔

"میں عام بات کر رہی تھی۔ کردار کے غازی بننا بہت مشکل کام ہے۔"

صدیقی نے پہلو بدل کے کہا "چلیں آپ سکندر کی مدد سے اپنے شوہر سے مل آئیں۔ بڑی نیکی کی اس نے آپ کے ساتھ۔ اور کچھ؟"

"آپ میرے مہمان ہیں اور مجھے اپنا مہمان بنا چکے ہیں۔ مجھے ڈر نہیں کہ کل کیا ہوگا۔ میں نے دوستوں اور دشمنوں کے چہرے اچھی طرح پہچان لیے ہیں۔" دلاور کی بیوی اب شیرنی کی طرح دھاڑ رہی تھی "کیا تیر مارا آپ نے یا دلاور کے دوستوں نے۔ وہ اسی شہر میں ہے۔ زمین سے چند فٹ نیچے قید ہے۔ لاہور شہر کے کسی علاقے میں۔ کتنا رقبہ ہے لاہور کا۔ یہ کوئی ملک یا براعظم تو نہیں ہے۔ سنا ہے اب جہاز آسمان میں پرواز کرتا ہے اور آلات زیر زمین خزانوں کا سراغ بتا دیتے ہیں۔ کہاں سونا ہے' کہاں یورینیم۔

کہاں تیل ہے اور کہاں پانی۔ ہمارے یہ بڑی بڑی تنخواہیں لینے والے' مقابلے کے امتحان میں پاس ہو کے شاندار کمروں تک پہنچ جانے والے ذہین پولیس افسران اور ان کے تجربہ کار ماتحتوں کی فوج چوہدری دلاور کو تلاش نہیں کر سکی۔ کیا اس پر مجھے شرم آنی چاہیے۔ اس کے محافظ اسے بچا نہیں سکے اس کے دوست اسے بھول گئے۔ اس کا نمک کھانے والے' اس کے گن گانے والے۔ اس کے پالتو کتے۔ وفادار ملازم اور شہر میں دندنانے والے شکاری۔ سب مل کے کچھ نہیں کر سکے۔ پھر میں کیا کرتی۔ کب تک انتظار کرتی۔ کب تک اس کرب میں مبتلا رہتی جو ایک بیوی اور ایک ماں اُٹھاتی ہے۔ جو بیٹے اور بیٹیاں جھیلتے ہیں۔ کوئی نہیں تھا یہ خبر لانے والا کہ چوہدری دلاور زندہ ہے یا مر گیا۔ ایسے میں اگر مجھے اُمید کی کرن نظر آئی تو کیا میں پولیس کو یا چوہدری دلاور کے دوست نما دشمنوں کو بتا کے اسے بھی بُجھا دیتی؟ چوہدری دلاور کے کاروباری معاملات سے میرا کبھی کوئی تعلق نہیں رہا۔ اس کی اولاد کا تعلق نہیں رہا مگر ان حالات میں کیا یہ ممکن تھا کہ میں گھر میں بیٹھی رہوں۔ صرف آنسو بہاتی رہوں۔ میلاد اور ختم کراتی رہوں اور دعائیں مانگتی رہوں۔ مجھے گھر سے نکلنا پڑا اور آج یہاں آپ سب کو بلا کے یہ بتاتے ہوئے مجھے کوئی ندامت نہیں کہ میں نے دشمن کا سہارا لیا مگر اپنے شوہر کا سُراغ لگا لیا۔ جو کام آپ سب اور اس کے دوست ساتھی و مددگار وظیفہ خوار نہ کر سکے وہ میں نے کیا۔ میں بتاتی ہوں آپ کو کہ چوہدری دلاور زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔ اب آپ کتنی بھی تفتیش کر لیں ایس پی صاحب اور ایک بار نہیں دس بار STATEMENT لیں تھانے میں۔ جو بات مجھے معلوم ہی نہیں وہ میں آپ کو نہیں بتا سکتی کہ چوہدری دلاور کہاں ہے۔ جتنا مجھے معلوم تھا میں نے سب کے سامنے بتا دیا۔ اب باقی کام آپ کریں۔"

ایس ایس پی صدیقی کے لیے ناممکن ہو گیا تھا کہ وہ پورے پولیس کے محکمے پر آنے والے نالائقی کے الزام کا دفاع کرتا "مسز دلاور۔ کیا آپ کی بات ختم ہو گئی۔ ابھی تک آپ نے اس واردات کا حوالہ نہیں دیا جس کے نتیجے میں آپ پر جسمانی تشدد ہوا تھا۔ جس حالت میں آپ سب کے سامنے آئی تھیں۔"

"اس کا سکندر بخت سے یا چوہدری دلاور کے دشمنوں سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ مہربانی تھی اس کے دستِ راست کی۔ اس شخص کی جس پر وہ سب سے زیادہ اعتماد کرتا تھا۔ جسے اس نے کاروبار میں حصے دار بنا رکھا تھا۔ جو دلاور کا پارٹنر تھا' رازدار تھا' دوست اور ساتھی تھا۔"

صدیقی نے طنز سے کہا "اس کا نام بھی نہیں لیں گی آپ؟"

"اس کا نام ہے شوکت رانا" وہ چیخ کے بولی "سن لیا آپ نے۔ وہ احسان فراموش کتا جو کل تک چوہدری دلاور کو دیکھ کے دبک جاتا تھا اور میرے سامنے خوشامدانہ انداز میں دُم ہلاتا تھا جس کے پاس صرف پیسہ تھا۔ حوصلہ اور دم خم نہیں تھا۔ مجھے نہیں معلوم وہ پیسہ کس کا تھا لیکن پیسے کے سوا اس کے پاس اپنا کچھ نہیں تھا۔ نہ خاندان' نہ حوالہ۔ نہ کردار نہ شخصیت۔ دلاور نے اسے سہارا دیا۔ اسے اہمیت دی۔"

نہ جانے کس نے کہا "اللہ نیکی کا اجر دے جی چوہدری دلاور صاحب کو۔"

سب کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی مگر دلاور کی بیوی نے اس طنز کو نظرانداز کر دیا "مجھے اس کے بیک گراؤنڈ سے کوئی غرض نہیں اور اس سے بھی کہ وہ چوہدری دلاور کے ساتھ مل کے کیا کرتا تھا۔ مگر چوہدری دلاور کے غائب ہوتے ہی اس کمینہ خصلت انسان کے اندر چُھپا ہوا شیطان باہر آ گیا۔ اس وقت جب دلاور کے بیوی بچے پریشان تھے کیا یہ اس کا فرض نہیں بنتا تھا کہ وہ ان سے ہمدردی کرتا اور ان کو تسلی دیتا لیکن اس نے تو سمجھ لیا کہ چوہدری دلاور نہیں رہا تو سب کچھ اس کا ہو گیا ہے۔ اللہ انہیں سلامت رکھے۔ چوہدری صاحب کی زندگی ہی میں ان کے دوستوں کا اصلی چہرہ سامنے آ گیا۔ ان نمک حراموں نے مل کے سازش کی اور شوکت رانا کو یقین دلایا کہ دلاور کا قصہ تو ختم سمجھو۔ اب کاروبار کی باگ ڈور تمہارے ہاتھ میں ہے لیکن دلاور کی بیوی تمہاری راہ میں روڑے اٹکائے گی۔ اس کا بیٹا ابھی بالغ تو نہیں مگر بچہ بھی نہیں۔ ان کو ختم کر دو تو کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔ کل رات اس نے مجھے ایک اہم کاروباری معاملے پر بات کرنے کے لیے بلایا۔ کاروبار سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا مگر اس نے کہا کہ ایسے کب تک چلے گا۔ چوہدری دلاور کا کچھ پتا نہیں اور ایک پارٹنر کے نہ ہونے سے بہت سے کاروباری اور قانونی مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ میں نے وکیل کو بلایا ہے جو چوہدری دلاور کی طرف سے تمہارے نام جنرل پاور آف اٹارنی تیار کرا دے گا اور اس کے بعد تم چوہدری دلاور کی جگہ تمام معاملات طے کرنے کی مجاز ہو جاؤ گی۔ شک کی کوئی بات ہی نہیں تھی۔"

"شک کی بات کیوں نہیں تھی مسز دلاور۔" رابعہ نے کہا "آپ اتنا تو جانتی ہوں گی کہ پاور آف اٹارنی دینے والے کو موجود ہونا چاہیے۔ کسی کی عدم موجودگی میں یا فوت ہو جانے کی صورت میں پاور آف اٹارنی کیسے مل سکتی ہے۔"

"تم نے ٹھیک کہا۔ یہ بات مجھے معلوم تھی مگر وکیل صاحب آپ کو عدالتوں کا تجربہ ہے۔ میں آپ سے پوچھتی ہوں کہ کیا وہاں سب کچھ قانون کے عین مطابق ہوتا ہے؟ کیا واقعی رجسٹرار کے سامنے مختار نامے پر دستخط کرنے والا وہی شخص ہوتا ہے جو مختار نامہ دیتا ہے۔ اسے ایک وکیل شناخت کرتا ہے۔ وکیل اپنا ہو تو کیا چوہدری دلاور کے دستخط کوئی اور نہیں کر سکتا اور اگر رجسٹرار کو سب پہلے سے سمجھا دیا جائے کہ ایسا ہو گا تو کیا وہ خاموشی کی قیمت وصول کر کے مختار نامہ رجسٹر نہیں کرتا؟ میں یہ نہیں کہتی کہ سب کرتے ہیں لیکن ایسا بھی ہوتا ہے۔ رجسٹرار کو صرف یہ یقین ہونا چاہیے کہ وہ شخص زندہ ہے اور اس کی گردن کسی فراڈ میں نہیں پھنسے گی۔"

"آپ تو خاصا قانون کو سمجھتی ہیں...؟"

"یہ سب میں جانتی نہیں تھی۔ مجھے سمجھا دیا گیا۔ وکیل نے مجھ سے کہا کہ اس کے لیے پچھلی تاریخ کا اسٹامپ پیپر حاصل کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ چوہدری صاحب کو لاپتا ہوئے ابھی ایک مہینہ بھی نہیں ہوا یہاں تو ایک سال پُرانی تاریخ کے اسٹامپ پیپر مل جاتے ہیں۔ بس ان کی قیمت خریدار کی ضرورت کے مطابق سوگنا یا ہزار گنا وصول کی جاتی ہے۔ رکھنے والے ہر تاریخ کے اسٹامپ پیپر خرید کے محفوظ رکھتے ہیں اور بعد میں فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ کون چیلنج کر سکتا تھا اس مختار نامے کو جس پر دو مہینے پہلے کی تاریخ ہو اور چوہدری دلاور کے دستخط ہوں۔ وہ دستاویز میں نے ایک اور وکیل کو بھی دکھائی تھی اور اس نے کہا کہ بے شک اس کی رو سے تمام اختیارات آپ کو حاصل ہو جائیں گے۔ اس میں کوئی بات غیر قانونی نہیں۔ چوہدری صاحب کسی کو بھی اپنا اٹارنی بنا سکتے ہیں۔ آپ تو بیوی ہیں ان کی۔ لوگ ملک سے باہر ہوتے ہیں یہاں ان کے نام سے پراپرٹی خریدی اور بیچی جاتی ہے۔ ٹیلی فون لگ جاتے ہیں' گاڑیاں ٹرانسفر ہوتی ہیں۔ دستخط کوئی بھی کر دیتا ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟"

"یہ سب ہوتا ہے۔ یو آر رائٹ" غازی نے کہا جواب اپنی پوزیشن ٹھیک کرنا چاہتا تھا کیونکہ مسز دلاور نے دوبارا اسے گفتار کا غازی کہہ دیا تھا۔

"شوکت رانا نے مجھے اس دستاویز پر دستخط کرنے کے لیے آفس بلایا تھا" مسز دلاور نے کہا "اس آفس میں ایک کمرا میرا بھی تھا۔ یوں سمجھ لیں کہ وہ چوہدری دلاور کا پرائیویٹ روم تھا جہاں میں اکثر چلی جاتی تھی۔"

"اور کون جاتا تھا" پیچھے سے کسی نے کہا تو لوگ پھر مسکرائے۔

"میں جانتی ہوں کہ چوہدری دلاور کوئی شریف اور پاکباز آدمی نہیں تھا۔ جب پیسہ آتا ہے تو کتنے لوگ ہیں جو شرافت کے پُرانے اصولوں پر اسی طرح قائم رہتے ہیں اور اسی صراطِ مستقیم پر چلتے رہتے ہیں جس پر چلنا کسی عام آدمی کے لیے بھی آسان نہیں ہوتا۔ مگر میں اپنے شوہر کی جیلر نہیں تھی۔ میرے لیے یہ اطمینان کافی تھا کہ شوہر وہ صرف میرا ہے اور باپ صرف میرے بچوں کا ہے۔ پلیز مجھے اِدھر اُدھر کی باتوں میں مت اُلجھائیں۔ جو ہے وہ آپ سب کے علم میں ہے۔ وہ سُن لیں جو آپ نہیں جانتے' شوکت رانا نے مجھے آفس کے تہ خانے میں قید کر دیا تھا۔ وہاں وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ وکیل بھی تھا۔ اوپر چوکیدار بھی تھا مگر وہ سب اسی کے ساتھی تھے۔ سب غدار نمک حرام اور ضمیر فروش بک چکے تھے۔

چند منٹ کے بعد وکیل اُٹھ گیا کہ میں ابھی آتا ہوں اوپر سے ایک فون کال کر کے۔ فون نیچے بھی تھا مگر ڈیڈ کر دیا گیا تھا۔ اس کے جاتے ہی شوکت رانا نے پہلے مجھے قائل کرنا چاہا کہ میں چوہدری دلاور کا خیال چھوڑ دوں۔ وہ اب واپس نہیں آئے گا۔ کسی دن اس کی لاش مل جائے گی یا ممکن ہے کسی گمنام قبر سے ڈھانچا برآمد ہو جائے۔ اُسے سکندر بخت یا اس کے ساتھیوں نے قتل کر دیا ہو گا۔ جب میں نے اسے گالیاں دیں اور شرمندہ کرنے کی کوشش کی تو وہ کھل کے سامنے آ گیا۔ اس نے مجھ پر دست درازی کی کوشش کی۔ اگر وہ کامیاب ہو جاتا تو مجھے بلیک میل کر سکتا تھا۔ اس نے پورا بندوبست کر لیا تھا کہ میری تصویریں اُتار لی جائیں اور فلم بنا لی جائے مگر میں نے اس کا مقابلہ کیا۔ وہ مرد ہے اور بہت توانا ہے مگر آپ لوگ دیکھ رہے ہیں۔ میں بھی اتنی گئی گزری نہیں ہوں۔ جان بچانے کے لیے تو بلّی بھی شیر کا مقابلہ کرتی ہے۔ میں عزت بچانے کے لیے جان دے بھی سکتی تھی اور لے بھی سکتی تھی۔ ناکامی نے اسے پاگل کر دیا۔ میں نے اپنی تمام جسمانی طاقت کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا اور اس مزاحمت کے نتیجے میں میرا جو حال ہوا آپ سب نے دیکھا۔ میں نے کسی سے میک اپ نہیں کرایا تھا۔ میں جانتی ہوں کہ اخبار والوں کو اور پولیس کو ڈراما کر کے دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔ اب میں میڈیکل چیک اپ کے لیے بھی تیار ہوں۔ پولیس سرجن کے سامنے پیش ہو سکتی ہوں۔ وہ مجھ پر دست درازی اور میری جسمانی حالت کے بارے میں پوری رپورٹ دے سکتا ہے اور یہ بھی بتا سکتا ہے کہ میں کس حد تک اپنی عزت کی حفاظت کرنے میں کامیاب رہی۔ وہ شیطان شوکت رانا بھی زخمی ہوا تھا مگر چیخ پکار سُن کے چوکیدار ڈر گیا اور اس نے نیچے آ کے شوکت رانا کی مدد کی۔ وہ جاتے جاتے مجھے تہ خانے میں مقفل کر گیا۔ تہ خانے میں ہوا کا کوئی گزر نہیں۔ اس کے ہوا باہر پھینکنے والے پنکھے اور ایئرکنڈیشنر سب کا کنکشن کاٹ دیا گیا تھا۔ میں بالآخر وہاں دم گھٹ کے یا بھوک پیاس سے تڑپ تڑپ کے مر جاتی مگر باہر کسی کے کانوں تک میری فریاد نہ جاتی۔ کوئی بھی میری مدد کو نہ آتا لیکن خدا کو شاید یہ منظور نہیں تھا کہ میرے بچے یتیم ہوں۔ شوکت رانا کے جاتے ہی چوکیدار نے مجھے آزاد کر دیا۔ وہ بہت ڈر گیا تھا۔ اس نے میرے پاؤں پکڑ کے مجھ سے معافی مانگی کہ وہ لالچ کی وجہ سے شوکت رانا کی باتوں میں آ گیا تھا۔ میں نے اسے معاف کر دیا کیونکہ اس نے بہرحال میری زندگی بچائی تھی۔ میں نے اسے کہا کہ اب تم دفع ہو جاؤ۔ دوبارہ مجھے اپنی شکل مت دکھانا اگر شوکت رانا نے پھر تمہیں دیکھا تو گولی مار دے گا۔ میرا خیال ہے کہ وہ چوکیدار اب کسی کو نظر نہیں آئے گا۔"

صدیقی نے کہا "مسز دلاور۔ وہی ایک گواہ تھا اس ساری کہانی کا جسے آپ نے فرار کرا دیا۔"

غازی بولا "وہ وکیل بھی تو ہے۔"

"وکیل کے خلاف آپ رپورٹ لکھوادیں۔ ایکشن میں لوں گا مگر یہ سوچ لیں کہ اس کے خلاف جرم ثابت کیسے ہوگا؟"

"وہ مختار نامہ کہاں ہے مسز دلاور؟" غازی بولا۔

"وہ اسی وکیل کے پاس تھا۔ اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں لیکن شوکت رانا اصل مجرم ہے۔ آپ بے گناہوں سے اعتراف جرم کرا لیتے ہیں ایس پی صاحب تو مجرم سے نہیں پوچھ سکتے۔"

"کسی کے کہنے سے کوئی مجرم نہیں ہو جاتا مسز دلاور۔ لیکن آپ مطمئن رہیں۔ میں انکار نہیں کر رہا ہوں۔"

دلاور کی بیوی نے کہا "آزادی ملتے ہی میں سیدھی اپنے گھر گئی مجھے ڈر تھا کہ جیسے ہی شوکت رانا کو معلوم ہوگا کہ میں قید سے رہائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی ہوں وہ میرے گھر پہنچے گا اور مجھے قتل کر کے اپنے جرم پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرے گا۔ مجھے یہ خطرہ بھی تھا کہ وہ میرے بچوں کی زندگی کا دشمن نہ ہو جائے۔ میں سب کو اپنے ساتھ لے کر یہاں آ گئی اور رات میں نے اس ہوٹل میں گزاری۔ میں نے اپنی حفاظت کا پورا بندوبست کر لیا ہے مگر ایس پی صاحب، میں آپ سے بھی تحفظ مانگتی ہوں۔ میں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ شوکت رانا کے عزائم کیا تھے۔ وہ چوہدری دلاور کے کاروبار پر قابض ہونا چاہتا تھا۔ چوہدری دلاور زندہ ہے اور اللہ نہ کرے کچھ ہوتا ہے تو جو کچھ ان کا ہے وہ میرا ہے اور میرے بچوں کا ہے۔ میرے حق کی اور میری زندگی کی حفاظت کرنا قانون کا فرض ہے۔ شوکت رانا کو گرفتار کرنا بھی آپ کا کام ہے۔"

"مجھے یہ مت بتائیں کہ میرے فرائض کیا ہیں۔ میں صرف ایک کیس کی تفتیش کر رہا ہوں مسز دلاور۔ مجھے ڈاکٹر شبلی کے قاتل کو گرفتار کرنا ہے اور اسے مقامی حکام کے حوالے کر کے واپس لوٹ جانا ہے۔ یہاں جو کچھ ہوتا ہے یا نہیں ہوتا ہے۔ اس کا ذمے دار میں نہیں ہوں۔ آپ اپنا کیس مقامی پولیس کے پاس لے جائیں اور جو کہنا ہے ان سے کہیں۔"

رابعہ نے کہا "یہ کیس بھی دلاور سے RELATED ہے۔"

"RELATED؟ اگر دلاور کے گھر میں چوری ہو جائے یا ڈاکا پڑے، کوئی اس کی بیوی کو اغوا کر لے یا اس کی گاڑی کو آگ لگا دے۔ ان معاملات کا ڈاکٹر شبلی کے قتل سے کیا تعلق؟ اگر ہے تو مجھے بتائیں۔ میں اسے بھی تفتیش کے دائرے میں شامل کر لوں گا۔ فی الحال تو مجھے براہ راست شہادت یہ ملی ہے کہ مبینہ قاتل کی بیوی نے چھپ کر اس سے ملاقات کی تھی اور اس کا دعویٰ ہے کہ وہ اسی شہر کے کسی مکان کے تہ خانے میں قید ہے۔ مجھے دیکھنا ہے کہ یہ کہانی کس حد تک قابل قبول ہے اور اگر یہ ٹھیک ہے تو مسز دلاور پر بھی اعانت مجرمانہ کا الزام ہے اور قانون سب کے لیے ایک ہے خواہ کوئی ملزم کا دوست ہو یا رشتے دار۔ ملزم کی مدد کرنا اور اسے روپوشی میں مدد دینا، اس کے بارے میں حقائق کو پوشیدہ رکھنا۔ سب جرم کے دائرے میں آتے ہیں اور اسی لیے میں آپ کو حراست میں لینے پر مجبور ہوں مسز دلاور۔ تاہم اس سے آپ کے دیگر حقوق متاثر نہیں ہوتے۔ میں اتنا کر سکتا ہوں کہ متعلقہ ایس ایچ او خود یہاں آئے۔ آپ کی رپورٹ لکھے اور شوکت رانا کی گرفتاری کے لیے ضابطے کی کارروائی کرے۔"

"آپ اپنا اثر و رسوخ استعمال نہیں کر سکتے؟" غازی بولا۔

"میرا خیال ہے کہ مسز دلاور کا اثر و رسوخ مقامی پولیس کی حد تک کم نہیں ہے۔" صدیقی نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا "ان کی بات کون ٹال سکتا ہے۔ کس کی مجال کہ ان کو وی آئی پی ٹریٹمنٹ نہ دے۔ میں ان کے مراسم کی نوعیت سے واقف ہوں۔ اتنا ہی جتنا آپ جانتے ہیں۔ رہی حفاظت کی بات تو یہ ذاتی محافظوں کی فوج رکھ سکتی ہیں اور یہ نہ چاہیں تو پرندہ ان کے قریب پر نہیں مار سکتا۔ اس کا تجربہ بھی آپ سب کو کل سے آج تک ہوا ہوگا۔"

"آپ بہت بول چکے ایس ایس پی صاحب" دلاور کی بیوی کے بجائے فیصل نے اچانک بلند آواز میں کہا "دس بار آپ نے میرے باپ کو قاتل کہا۔ جرم ثابت ہونے سے پہلے ہی۔ میں پوچھتا ہوں کیا ملزم کے کوئی قانونی حقوق نہیں ہوتے۔ کیا اسے انصاف فراہم کرنا آپ کی ذمے داری نہیں ہے۔"

"ٹیک اٹ ایزی بوائے۔" صدیقی نے نرمی سے کہا "میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔"

"مجھے بتائیں کہ آج کچھ لوگ آپ کو انتقام لینے کے لیے اُٹھا کر لے جائیں۔ دشمنی ان کی ہو آپ سے۔ سزا کسے ملے گی؟ آپ کو اور آپ کی بیوی کو؟ اگر اسی طرح آپ کو جانوروں کی طرح کسی تہ خانے میں ڈال دیا جائے۔ جہاں انسان تو کیا روشنی کا گزر بھی نہ ہو۔ جہاں آپ کو دن رات تشدد کا نشانہ بنایا جائے۔ آپ کو ننگا بھوکا رکھا جائے۔ آپ اسی کوٹھری میں پیشاب پاخانہ کرتے اور اسی غلاظت میں اٹھنے بیٹھنے اور سونے پر مجبور ہوں اور پھر یہ نظارہ آپ کی بیوی کو دکھا دیا جائے۔ تو مجھے بتائیں ان پر کیا گزرے گی؟ اگر وہ مجرم ہے تو اسے گرفتار کرو۔ عدالت میں لاؤ، اور جرم ثابت ہو جائے تو جیل میں ڈال دو۔ پھانسی دے دو مگر جو کچھ میرے باپ کے ساتھ ہو رہا ہے۔ وہ کس کھاتے میں جائے گا۔ کیا عدالت اسے سزا میں شمار کرے گی۔ کوئی رعایت دے گی اسے کہ اس نے جیل سے زیادہ سخت جیل کاٹی؟ میں آپ سب سے مطالبہ کرتا ہوں کہ میرے باپ کے ساتھ یہ انسانیت سوز سلوک کرنے والوں کو پکڑا جائے۔ میرے باپ کو عدالت میں پیش کیا جائے تاکہ اسے انصاف ملے۔ اسے ملک کے قانون کے مطابق اپنی صفائی پیش کرنے کا حق ملے ایک عام شہری کی طرح۔ جو کچھ اس کے ساتھ ہو رہا ہے وہ تو تھانوں میں بھی نہیں ہوتا۔ آخر کب تک ہوگا اس پر یہ تشدد۔ کب تک ہم یہ سوچ سوچ کے پاگل ہوتے رہیں گے۔ اگر وہ وہیں مر گیا تو کون ذمے دار ہوگا اس کی موت کا؟ پولیس کا اتنا بڑا محکمہ۔ سراغ رساں ادارے، سی آئی اے ایف آئی اے، خفیہ پولیس اسپیشل

ٹیم، یہ سب کس کام کے اگر اس شہر میں ایک آدمی انصاف انصاف چلاتا مر گیا۔ کون ہیں اسے یہ سزا دینے والے۔ کیا قانونی اختیار حاصل ہے انہیں کہ وہ خود کسی کو گرفتار کریں اور خود سزا دیں۔ وہ کون ہیں اور کیوں پکڑے نہیں جاتے۔ کیا یہاں جنگل کا قانون ہے۔ ہر شخص جسے ملزم سمجھے اسے خود سزا دے سکتا ہے۔ اپنی جیل بنا سکتا ہے۔ خود اسے پھانسی دینے کا اختیار رکھتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر پولیس کا محکمہ توڑ دینا چاہیے۔ عدالتوں کو ختم کر دینا چاہیے۔ ضابطوں اور تعزیرات کی قانونی کتابیں جلا دینی چاہئیں۔ اگر میرا باپ اسی تہ خانے میں مر گیا تو میں آج آپ سب کو بتا رہا ہوں کہ پھر میں بھی یہی کروں گا۔ میں خود ان سب کو چن چن کے مار ڈالوں گا جو اس کی موت کے ذمے دار ہوں گے۔ میرا اپنا قانون ہوگا اور اپنا نظام انصاف۔ میں ان سب سے نمٹ لوں گا آج نہ سہی کل۔ یہ اور بات ہے کہ اس سے پہلے ہی وہ مجھے بھی مار دیں اور آپ کا کام آسان ہو جائے۔ آپ کو کسی دن دلاور کی لاش مل جائے ایس ایس پی صاحب تو آپ کا خصوصی تفتیش کا یہ کام ہی ختم ہو جائے جس کے لیے آپ نے اسلام آباد سے لاہور تشریف لانے کی زحمت گوارا کی ہے۔ شاید اسی کا انتظار کر رہے ہیں آپ بھی۔ اپنا ٹی اے ڈی اے لے رہے ہیں اور بس۔ آپ کا کام صرف ایک جملے پر ختم ہو جائے گا کہ ملزم کی ہلاکت کے بعد کیس داخل دفتر سمجھا جائے۔ یہی ہے آپ کی خصوصی تفتیشی ٹیم کا مقصد اور کمال.... آئی سے.... ٹو ہیل ود یو آل....." وہ ایک دم کرسی پر گرا اور پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔ "لعنت بھیجتا ہوں میں تم سب پر۔"

چلّانے سے اس کا سانس پھول گیا تھا مگر اپنی ماں سے زیادہ فیصل نے اپنی بات سے سب کو احساس دلا دیا تھا کہ قانون اور انصاف کا یہ فرسودہ نظام کتنا بے حس اور بے مصرف ہے اور وہ سب ادارے جو معاشرے میں عدل و انصاف کے ٹھیکے دار بنے ہوئے ہیں کتنے بے بس ہیں۔ اس حقیقت کی سفاکی آج چوہدری دلاور کا بیٹا محسوس کر رہا تھا۔ جو کل وزیر خاں کے بیٹے نے محسوس کی تھی۔ وقت کا پہیہ الٹا چلنے لگا تھا اور جہاں کل میں تھا وہاں آج فیصل اتنا ہی دکھی بے بس اور مشتعل تھا جتنا میں۔ اس کے سچ کو سب نے اپنے منہ پر پڑنے والے طمانچے کی طرح محسوس کیا تھا۔

خود میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ اب یہ قصہ تمام ہو جانا چاہیے۔ مجھے دلاور کو قانون کے حوالے کر دینا چاہیے۔ اچھی بات یہ تھی کہ اس کا فیصلہ ہم پہلے ہی کر چکے تھے۔

"تھینک یو جنٹلمین۔ آپ تشریف لائے، بڑی مہربانی آپ کی۔ دیکھنا یہ ہے کہ اب آپ لوگ کیا کرتے ہیں۔ آپ سب نے جو چاہا دلاور کو لکھا اور کہا۔ آج وہ مظلوم ہے اور اس کا خاندان ناانصافی کا شکار ہے۔ اسے انصاف دلانے کے لیے انہیں عزت آبرو سے زندہ رہنے کے مواقع فراہم کرنے کے لیے بھی کچھ کریں۔ اگر وہ مجرم تھا تو اسے سزا دلوا دیں۔ ہم تو مجرم نہیں ہیں۔"

لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔ کچھ لوگ مسز دلاور کے گرد جمع ہو گئے اور اسے تسلی دینے لگے کہ وہ فکر نہ کرے۔ کوئی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا اور دلاور کو بھی قانون کے مطابق عدالت میں خود کو بے گناہ ثابت کرنے کا موقع ضرور ملے گا۔ پریس اس معاملے میں ان کا ساتھ دے گا۔

مسز دلاور اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اس نے میری ذات کو ہدف نہیں بنایا تھا اور میرے کردار کی خوبیوں کا اعتراف کر کے بالواسطہ طور پر سب کی ہمدردی حاصل کر لی تھی۔ اگر وہ جاہل عورتوں کی طرح مجھے گالیاں اور کوسنے دیتی تو کچھ حاصل نہ ہوتا۔ اس نے شوکت رانا کا بھی خانہ خراب کر دیا تھا اور اپنی پوزیشن اتنی مستحکم کر لی تھی کہ عام لوگوں کی نظر میں چوہدری دلاور جیسے شخص کو بھی مظلوم کا درجہ حاصل ہو گیا تھا۔

خود صدیقی خاموش تھا اور اس پر فیصل کی بات کا اثر کچھ زیادہ ہی ہوا تھا "منظر صاحب۔ آپ ابھی تک خاموش ہیں۔ اور آپ مس رابعہ۔ کچھ بتائیے کہ دلاور کے بارے میں کوئی اطلاع دی ہے آپ کے پرائیویٹ سراغ رسانوں نے؟"

محسن ابھی تک نہیں پہنچا تھا اور ظاہر ہے اس کے آنے تک کوئی بھی قدم نہیں اُٹھایا جا سکتا تھا۔ مجھے یہ احساس بھی ہو رہا تھا کہ اس پریس کانفرنس کے فوراً بعد چوہدری دلاور کے گرفتار ہونے کا رائے عامہ پر بہت بُرا اثر پڑے گا۔ سمجھا یہی جائے گا کہ پولیس بھی شوکت رانا سے ملی ہوئی تھی خصوصی تفتیشی ٹیم نمبرون کی معطلی اور گرفتاری میں بھی پریس کے دباؤ کا ہاتھ تھا اور یہ دوسری ٹیم بھی مختلف نہیں تھی۔ یہ بھی اس وقت حرکت میں آئی جب اس پر اخبارات کا دباؤ پڑا۔ مسز دلاور کی پریس کانفرنس نہ ہوتی تو دلاور شاید گرفتار ہی نہ ہوتا۔ وہ پولیس کی تحویل میں رہتا جس نے اسے کسی تہ خانے میں ڈال رکھا تھا لیکن پبلک کے سامنے وہ ظاہر کر دیتے کہ انہیں کچھ معلوم نہیں۔ شاید شوکت رانا نے انہیں اس کام کی بہت بڑی قیمت ادا کی ہوگی کہ جب تک وہ دلاور کے کاروباری معاملات پر پوری طرح قابض نہ ہو جائے اسے کسی عدالت میں نہ پیش کیا جائے۔ شوکت رانا نے دلاور کے کاروبار پر قبضہ کرنے کی سازش ہی نہیں کی تھی۔ یہ بھی طے کر لیا تھا کہ دلاور کے خاندان کو نیست و نابود کر دے۔ اس کا الزام سکندر بخت پر آتا اور شوکت رانا کے لیے کسی قسم کے قانونی مسائل پیدا نہ ہوتے۔

ہم نے ہوٹل کے لاؤنج میں بیٹھ کے چائے پینے اور محسن کا انتظار کرنے کا فیصلہ کیا۔ چار بجنے میں ابھی دس منٹ باقی تھے۔ صدیقی نے اے ایس پی آفتاب کو ہدایت کی تھی کہ وہ مسز دلاور کی حفاظت کا انتظام کرے اور اسے ہر سہولت فراہم کرے۔ اگر وہ رپورٹ لکھوانا چاہے تو متعلقہ تھانے کے ایس پی یا ڈی ایس پی سے کہے کہ ایک گھنٹے میں فوراً ایس ایچ او یہاں ایف آئی آر لکھنے کے

لیے پہنچ جائے۔

وہ خود ہمارے ساتھ رہا "واٹ ناؤ ڈیئر لائرز۔ مجھے بتایئے میں کیا کروں؟ میں خود کو بہت بے بس محسوس کر رہا ہوں۔ صرف آپ لوگوں کی وجہ سے۔ عام لوگ ہوتے آپ تو میں آپ سب کو آج رات کسی تھانے میں بلاتا اور پوچھ لیتا کہ چوہدری دلاور کہاں ہے؟"

"اور اسے برآمد بھی کر لیتے صبح تک؟"

اس نے دھڑ سے میز پر ہاتھ مارا "میں اسے شرطیہ برآمد کر لیتا مگر میرے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ آپ سب مدعی ہیں اور بہت بڑے اور نامور وکیل ہیں۔ میں آپ کی بات ماننے پر مجبور ہوں کہ آپ کی پرائیویٹ سُراغ رساں ایجنسی کی اطلاع ملے گی تو دلاور کی گرفتاری عمل میں آئے گی۔ ورنہ کچھ نہیں ہو سکتا۔ خود کو اتنا احمق اور بے بس میں نے پہلے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔"

منظر نے خوش دلی سے کہا "ابھی سے مایوس ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ زندگی میں بہت مواقع آئیں گے۔"

اس نے مشتعل ہو کے کہا "سیدھی طرح بتاؤ مجھے۔ چوہدری دلاور کہاں ہے۔ میں اسے قانون کے مطابق گرفتار کر کے عدالت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ میری پوزیشن کلیئر ہو۔ الزام مجھ پر آ رہا ہے کہ میں شاید شوکت رانا سے ملا ہوا ہوں۔"

"کس نے روکا ہے آپ کو اپنی پوزیشن کلیئر کرنے سے ایس ایس پی صاحب۔ اگر آپ کو ہمارے تعاون کی ضرورت نہیں تو ٹھیک ہے۔ ہم کیا بتائیں کہ چوہدری دلاور کہاں ہے۔ ہم تو خود اس کیس میں مدعی ہیں اور یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ اسے گرفتار کیا جائے" رابعہ نے کہا۔ "اگر پولیس کے روایتی طریقے کے مطابق اسی کو پکڑنا ہے جو شکایت کرے تو پھر دیر کیسی؟ ہمیں لے چلیں اپنے ساتھ اور آج رات تفتیش کا شوق بھی پورا کر لیں۔ کل جو ہوگا دیکھا جائے گا۔"

صدیقی ٹھنڈا پڑ گیا۔ "پلیز جنٹلمین۔ میری مدد کریں، مس رابعہ! بُرا مت مانیں۔ آپ کا...." اچانک وہ رُک گیا۔ "نہیں۔ یہ بات نہیں کہنی چاہیے مجھے۔ ورنہ آپ میری زبان پکڑ لیں گے۔ زبانِ خلق کی بات اور ہے۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کہنا چاہتا تھا۔ وہ رابعہ سے پوچھنا چاہتا تھا کہ آپ کا تو سکندر سے ہر وقت ہر جگہ اور ہر حال میں رابطہ ہوگا۔ نہ وہ آپ سے جدا ہے نہ آپ اس سے دور۔ کون نہیں جانتا رابعہ اور سکندر کے درمیان کیسا اٹوٹ رشتہ ہے۔

لیکن اس نے احتیاط کو ملحوظ رکھا یا احترام کو۔ یہی بات وہ منظر سے بھی کہہ سکتا تھا کہ تمہارا تو وہ جگری یار ہے اور کون نہیں جانتا کہ تم اس کی پشت پناہی میں سب سے آگے ہو۔ وہ یقیناً ایم آر ایس کے وجود اور اس کے اغراض و مقاصد کے حصول کی جدوجہد میں شامل تمام افراد کے بارے میں مکمل معلومات رکھتا ہوگا مگر اس کے سامنے سکندر کا دوست اور سکندر کی جان تمنا نہیں دونامور اور نیک نام وکیل تھے جو قانون کی زبان میں بات کرتے تھے۔

"آج دلاور کو گرفتار کرنا مناسب نہیں رہے گا" صدیقی نے یوں کہا جیسے خود سے ہم کلام ہو۔

"میں متفق ہوں آپ سے۔ اس سے مسز دلاور کے الزامات کی تائید اور توثیق ہو جائے گی۔ زبانِ خلق کہے گی کہ ادھر مسز دلاور نے دہائی دی اور پولیس نے گھبرا کے دلاور کو پیش کر دیا۔ ایک دو دن گزر جائیں تو کیا فرق پڑے گا۔ درمیان میں آپ بھی وضاحت جاری کر سکتے ہیں کہ مسز دلاور نے غصے میں پولیس کی کوششوں کو یکسر نظر انداز کر دیا۔ ہم اپنی کوشش میں تقریباً کامیاب ہو چکے ہیں اور چند دن یا چند گھنٹے میں چوہدری دلاور کو برآمد کر لیا جائے گا۔"

صدیقی نے کچھ اطمینان کا سانس لیا "ایک بات بہت عجیب ہے۔ ابھی تک کسی نے بھی اس بات کا ذکر ہی نہیں کیا۔ حالانکہ یہ عام بات نہیں ہے۔"

رابعہ نے کہا "معموں میں بات نہ کریں آپ۔"

"گزشتہ شب چوہدری دلاور کے آفس۔ "سی ڈی انٹرپرائز" کو دھماکے سے اُڑا دیا گیا۔ عمارت بالکل تباہ ہو گئی۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں مسز دلاور کے کہنے کے مطابق انہیں قید رکھا گیا تھا۔"

"میں نے آج کا اخبار نہیں دیکھا" رابعہ بولی۔

"صبح کے اخبارات میں یہ خبر نہیں چھپی۔ واقعہ آخر شب کا ہے۔" صدیقی نے کہا "لیکن مسز دلاور نے بھی کچھ نہیں کہا۔"

"ممکن ہے اسے معلوم ہی نہ ہو۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"وہ کل رات سے ہوٹل میں چھپی ہوئی تھی۔ اپنے بچوں کے ساتھ اسے وہاں یہ خبر سُنانے والا کون تھا۔"

صدیقی نے سر ہلایا "ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ مگر کیا یہ بھی ان شوکت رانا کی حرکت ہو سکتی ہے۔ کیا اس نے یہ فرض کرتے ہوئے کہ مسز دلاور ابھی تک وہیں قید ہے۔ اس جگہ پہلے سے نصب بم کا دھماکا کیا۔ وہ کوئی چانس نہیں لینا چاہتا ہوگا۔ مسز دلاور کو دم گھٹنے سے یا بھوک پیاس سے مرنے میں دو تین دن بھی لگ سکتے تھے۔ ایک ہفتہ بھی گزار لیتی وہ تو ناممکن نہیں تھا۔ اور اتنے عرصے میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ مسز دلاور کو شاید پتا نہیں تھا کہ شوکت رانا کا بندوبست مکمل ہے۔"

"یو آر ویری رائٹ۔ شوکت رانا چانس کیسے لے سکتا تھا۔ یہ کارروائی خود اسی نے کی ہوگی مگر الزام آئے گا پھر سکندر بخت پر حالانکہ وہ کراچی میں ہے۔"

"آپ کو معلوم ہے؟" صدیقی بولا۔

"ہاں۔ وہ کبھی کبھی فون کرتا ہے۔ مسز دلاور سے بھی اس کی بات فون پر ہوئی تھی۔"

"میرا خیال ہے کہ اب ہمیں چلنا چاہیے۔ ابھی تک کوئی

تسلی دی "غازی سے بھی نمٹ لیں گے بعد میں اور اس تھانے دار سے بھی۔"

"تم لوگ ابھی تک یہاں بیٹھے ہو۔ چوہدری دلاور کے معاملے کیا ہوا۔ پولیس نے اسے اپنی تحویل میں نہیں لیا۔"

"نہیں۔ ناگزیر وجوہ کی بنا پر یہ معاملہ مؤخر کرنا پڑا۔"

"لیکن یار اب تو ہمارے لیے مسائل بڑھ جائیں گے۔ اگر ... اور فضل نے بیان دے دیا کہ چوہدری دلاور ہماری قید میں ہے ... اور وہ خود اس سے مل چکے ہیں۔ اسے قید میں رکھنے والے سکندر اور محسن ہیں۔ وہی ہمیں بھی وہاں لے گئے تھے اور وہ ہمیں دلاور کے خلاف وعدہ معاف گواہ بنانا چاہتے تھے۔ مجبوراً ہم نے ان کی ... مانی ورنہ ہم بھی اسی تہ خانے میں پڑے رہتے۔ باہر آ کے جیسے ہی ہمیں موقع ملا ہم فرار ہو گئے۔ میں نے اسی لیے اپنا حُلیہ فوراً ... بدل دیا اور تو بھی اب چوکیدار کی وردی مت پہننا۔ بس یہی حُلیہ ٹھیک ہے۔"

"مگر تیرا یہ حُلیہ اطمینان بخش نہیں ہے۔"

"مجھے زیادہ وقت نہیں ملا تھا۔ آج رات تک کچھ اور وضع ... بنالوں گا۔ تم لوگ اب یہاں کیوں بیٹھے ہو۔ جب کرنا کچھ نہیں۔"

"ہم تیرا انتظار کر رہے تھے۔" میں نے کہا اور خادم حسین کی ... طرف صدیقی سے مخاطب ہوا "جس اطلاع کا انتظار تھا وہ مل گئی ہے۔ اگر آپ چاہیں تو اسی وقت چوہدری دلاور کو گرفتار کر سکتے ہیں۔"

صدیقی نے محسن کو غور سے دیکھا "یہ شخص اطلاع لایا ہے؟ ... کون ہے یہ؟" اس نے بھی خادم حسین سے پوچھا۔

میں نے کہا "ایک ہم وطن ہے۔ دوست بھی ہے۔"

"مجھے تو ایسا لگا جیسے تم بہت عرصے بعد ملے ہو۔"

میں نے کہا "بالکل ٹھیک لگا تمہیں۔ ہم دو سال بعد ملے ہیں اور وہ بھی اتفاق سے۔ اسے علم نہیں تھا کہ میں یہاں بیٹھا ہوں۔"

"پھر یہ اطلاع کیسے لایا تمہارا دوست؟"

میں نے کہا "وہ خود حیران تھا۔ ہوٹل کے گیٹ پر کسی نے ... اسے روک کے میرا نام لیا اور کہا کہ انہیں ایک پیغام دینا ہے۔ موسیو آندرے ٹھیک چار بجے اپنا مال اُٹھانے آ جائیں۔ میرے ... دوست نے کہا کہ یہ کیا بکواس ہے۔ موسیو آندرے کون؟ اس نام کا ... ایک دوست تھا میرا مگر اس سے میری ملاقات دو سال سے نہیں ... ہوئی۔ اس نے کہا کہ آپ اندر جائیں تو ملاقات بھی ہو جائے گی۔ ... وہ چلا گیا اور میرا دوست مجھے اندر موجود پا کے مزید حیران ہوا۔ ... مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ یہ کیا پُراسرار کھیل ہے۔ میں نے اسے ٹال ... دیا۔"

"تمہارے دوست نے حُلیہ تو دیکھا ہوگا پیغام دینے والے ... کا؟"

"... کوئی موٹا، پستہ قد گنجے سر اور بڑی بڑی مونچھوں والا

انفارمیشن تو ہے نہیں۔" صدیقی بولا۔

اچانک محسن کو ہال کے دروازے سے اندر آتا دیکھ کر میرا دل دھڑکنے لگا۔ وہ دیر سے آیا تھا اور اس کے ساتھ کوئی نہیں تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس کے ہمراہ وہ پولیس آفیسر بھی ہوگا جس کی تحویل میں دونوں وعدہ معاف گواہ تھے۔ شاید وہ چند منٹ کے وقفے سے بعد میں آئے، میں نے سوچا۔

محسن نے اپنا حُلیہ بھی خاصا بدل لیا تھا۔ ایک نظر میں اسے پُرانے دوستوں کے سوا کوئی پہچان نہیں سکتا تھا۔ اس کے بالوں کا رنگ براؤن ہو گیا تھا۔ اس نے چشمہ لگا لیا تھا جس کا نمبر صفر ہوگا۔ اس کے سر پر فرنچ کیپ تھی اور اس نے براؤن چیک کا کوٹ اور گرے نیلی کی پینٹ کے ساتھ مضحکہ خیز حد تک چوڑی ٹائی لگا رکھی تھی۔

میرے پاس آ کے اس نے چونکنے کی بہترین اداکاری کی اور پھر ایک نعرہ لگا کے مجھ سے یوں گلے ملا جیسے برسوں بعد ملنے والے دوست ملتے ہیں۔ ظاہر ہے مجھے بھی اس کے ساتھ یہی رویّہ اختیار کرنا پڑا۔ ہم فرنچ بول رہے تھے جسے مولوی خادم حسین کے سوا کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا۔

"یار، ایک تو تم پہنچے ہو شو ختم ہونے کے بعد...."

محسن نے کہا "بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے یار۔ غازی کے اس نئے سالے نے حرامی پن کیا۔ اس نے رابعہ کے آفس پہنچ کے دونوں ملزمان کا بیان لیا اور انہیں حراست میں لے کر چلا گیا۔ مجھ سے اس نے کہا تھا کہ وہ تین بجے ہوٹل کے گیٹ پر ہوگا۔ تین بجے سے میں گیٹ پر اس کی راہ دیکھ رہا تھا۔ ساڑھے تین بجے میں نے ہوٹل کے کاؤنٹر سے اسے فون کیا تو پتا چلا کہ ہمارے ساتھ دھوکا ہو گیا۔"

"کیا وہ جعلی تھانے دار تھا؟ جو انہیں لے گیا تھا۔"

"نہیں، تھانے دار تو ہے وہ۔ مگر حرامی نمبر ون۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ غازی پر بھروسا کرنا ہی نہیں چاہیے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ وہ سب سے بڑا مہا حرامی ہے۔ آج مسز دلاور نے بھی اسے ذلیل کر دیا۔ گفتار کا غازی کہہ دیا دوبار۔ سمجھنے والے سب سمجھ گئے۔ اس نے چوہدری دلاور کی بہت جی حضوری کی تھی اور جب وہ سیاست کی دُکان چمکانے کی فکر میں تھا تو غازی اس کے لیے پبلک ریلیشنگ کرنا چاہتا تھا۔ اس کا پی آر او بننے کے لیے بہت ہاتھ پاؤں مارے تھے اس نے۔ بعد میں وہ شاخ ہی نہ رہی جس پر آشیانہ تھا۔ تو ممکن ہے یہ شوکت رانا سے مل گیا ہو۔"

"یہی ہوا ہے دوست۔ فون پر اس نے جواب دیا کہ کون قادر اور کیسا فضل۔ میں کسی کو نہیں جانتا۔ نہ میں نے کسی کو گرفتار کیا ہے اور نہ ساتھ لایا ہوں۔ تم کون ہو، کہاں سے بول رہے ہو۔ میں نے اسے گالیاں دیں کہ میں تمہارا ناجائز باپ ہوں اور جہنم سے بول رہا ہوں سُور کے بچے۔ اپنی ماں کو بتا دینا۔ اور کیا کرتا میں۔"

"چل کوئی بات نہیں۔ کبھی دھوکا بھی ہو جاتا ہے" میں نے

تھا۔"

صدیقی بہت کائیاں ثابت ہوا "ان کے درمیان گفتگو کیسے ہوئی؟ کیا پیغام دینے والا فرنچ جانتا تھا۔"

"نہیں۔ میرا دوست انگلش سمجھ لیتا ہے" میں نے بات بنائی۔

"اور اس حُلیے کا آدمی کون ہو سکتا ہے۔ جس نے چوہدری دلاور کا سراغ لگا لیا تھا۔ وہ کوئی عام آدمی تو نہیں ہو سکتا۔ تم جانتے ہو گے۔"

"میں تو نہیں جانتا۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ منظر یا رابعہ جانتے ہوں۔ میرے ذریعے انہیں پیغام پہنچانا مقصد ہو۔"

صدیقی نے رابعہ اور منظر سے تصدیق چاہی لیکن انہوں نے مجھ سے زیادہ لاعلمی کا اظہار کیا۔

صدیقی کا حوصلہ جواب دے گیا "تم لوگ ایک خطرناک کھیل کھیل رہے ہو میرے ساتھ۔ مجھے بتاؤ کہ اس انفارمیشن پر تم پولیس کو وہاں کیسے لے جاتے جہاں دلاور قید ہے۔ کون راہنمائی کرتا تمہاری؟ یو نو دیٹ باسٹرڈ۔"

منظر نے غرا کے کہا "ایس ایس پی صاحب۔ دماغ کو ٹھنڈا رکھو۔ تمہیں آم کھانے سے غرض ہے یا پیڑ گننے سے۔ تم چوہدری دلاور کو گرفتار کرنا چاہتے ہو یا نہیں؟ یہ مت بھولو کہ ہم مدعی ہیں اور ہمارے ساتھ پولیس کا روایتی طریقہ اختیار کرو گے تو پچھتاؤ گے۔ تمہارے خلاف ایک مشترکہ درخواست دی جا سکتی ہے کہ تم ناکامی کے پیشِ نظر ہم پر دباؤ ڈال رہے ہو کہ ہم کیس واپس لے لیں۔ بے عزت ہو کے واپس اسلام آباد جانے سے بہتر ہے کہ کچھ کر کے عزت کے ساتھ جاؤ۔ جس سے تمہارا سروس ریکارڈ بہتر ہو۔ تمہیں پروموشن ملے۔ اگر ہم تعاون کر رہے ہیں تم سے تو ضابطے کا پنگا مت لو ہم سے سمجھے؟"

صدیقی کا چہرہ احساسِ ذلت سے سُرخ پڑ گیا۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ ایک ڈوز دے کر منظر نے اس کی اکڑ فوں کے غبارے سے ساری ہوا نکال دی تھی۔

"ہم پھر کبھی بتائیں گے تمہیں کہ چوہدری دلاور کہاں ہے" منظر بولا۔

"یعنی۔ تم اعتراف کر رہے ہو کہ تمہیں معلوم ہے؟"

"جب ہمارے سُراغ رسانوں کو معلوم ہے تو ہمیں معلوم ہے۔ اور وہ اتنے زبردست سُراغ رساں ہیں کہ شرلاک ہومز ہوتا تو ان کے جوتے پالش کرتا۔" منظر نے قریب جا کے رازداری سے کہا "وہ انسان نہیں ہیں ایس ایس پی صاحب۔ جنات ہیں۔ کسی سے ذکر مت کرنا ورنہ لوگ ہنسیں گے تم پر مگر یہ حقیقت ہے۔"

صدیقی ایک دم اٹھا اور اندر چلا گیا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہاں اس کی دال نہیں گلے گی۔ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر ہم مخالف سمت میں رواں ہو گئے۔ چند منٹ بعد منظر کی گاڑی ہوٹل کے گیٹ سے باہر تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں صدیقی مشتعل ہو کے خفیہ پولیس کے ارکان کو ہمارے پیچھے نہ لگا دے کہ ہماری چوبیس گھنٹے نگرانی کی جائے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہم تعاقب کرنے والوں کو ایسا چکر دیتے کہ وہ خود چکر میں آ جاتے مگر بلاوجہ مصیبت کو پیچھے لگانے اور پھر اس سے جان چھڑانے میں وقت اور توانائی کا زیاں تھا۔

رابعہ نے پریس کانفرنس کا خلاصہ محسن کے گوش گزار کیا اور پھر منظر کے ساتھ اپنے آفس چلی گئی۔ میں خادم اور محسن مال روڈ کے چوراہے پر اُتر گئے۔ خادم حسین بار بار ٹھنڈی سانس لیتا تھا۔

میں نے کہا "کیا بات ہے۔ تم اس کوّے کی طرح اداس ہو جس کی محبوبہ نے فرمائش کر دی ہو کہ ہنس کی چال چل کے دکھاؤ۔"

اس نے پھر آہ بھری "بائیں آنکھ پھڑک رہی ہے جی۔ دوپہر کو کھانے کے وقت ہچکیاں بھی بہت آئیں۔"

"جلدی جلدی زیادہ کھانے سے ایسا ہو جاتا ہے۔"

"نہیں جی۔ میرا دل کہتا ہے وہ یاد کر رہی ہو گی، میری گھر والی۔ اس کی صورت نظر میں پھر رہی ہے۔"

"یعنی اس کے تصور سے تم پر کپکپی طاری ہے۔ حوصلہ رکھو خادم حسین اللہ تمہاری مشکل آسان کرے گا۔"

محسن بولا "کوئی وظیفہ یاد نہیں تمہیں۔ اس بلا سے چھٹکارے کا۔"

"آپ پڑھیں جی وہ وظیفہ گل بانو سے نجات کے لیے۔ وہ ہو گی بلا آپ کے لیے۔ میرے لیے تو گھر والی سے بڑھ کے اس دنیا میں کوئی نعمت نہیں" وہ خفگی سے بولا۔

"اب گلے میں ڈھول پڑا ہے تو بجانا ہی پڑے گا لیکن اس پھٹے ڈھول جیسی چیز کے گن گانا ضروری نہیں ہمارے سامنے۔"

"اب آپ کو کیا پتا جی دل کتنا اداس ہے دوپہر سے۔ مچھلی کھانے کے بعد" وہ بولا "اسے بڑا شوق ہے مچھلی تل کے کھانے کا۔ ایک بار راوی کے کنارے تازہ مچھلی تلی تھی ہم نے۔ کہنے لگی خادم حسین، مچھلی اچھی بنا لیتے ہو مگر کاش تم مچھیرے ہوتے۔ مچھلی پکڑ سکتے۔ میں کنارے پر بیٹھی تازہ مچھلی کھاتی جاتی۔ صبح سے شام تک۔"

"یا پھر تم ایک بغیر کانٹے والی مچھلی ہوتے" محسن نے رومانٹک لہجے میں کہا "میں اپنے ہاتھوں سے تمہیں فرائی کرتی۔ تمہیں پیار سے راوی کا ہدکا کہتی۔ ابھی تو تم صرف مولوی خادم حسین ہو۔"

مگر یہ بات سُن کے بھی مولوی خادم حسین خفا نہیں ہوا تو میں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ چاہے تو گھر جا کے آج رات تجدید عہدِ وفا کر آئے۔ صبح تک ہم اس کی جدائی برداشت کر سکتے ہیں۔ میں نے اسے ایک ہزار روپے بھی دیے کہ بیوی میکے میں ہو تو خالی ہاتھ آنے والے جنوائی کو ایسے ہی دیکھا جاتا ہے جیسے بارات میں پیدل آنے والے دولہا کو۔"

نہیں پوچھتے۔ بیوی آتی ہے تو میں سب اسے دے دیتا ہوں۔ جو بھی بادل کی جیب میں سے ملتا ہے میرے پاس جمع رہتا ہے۔"

میں نے افسوس سے کہا "بیوی اسے ساتھ کیوں نہیں لے جاتی؟"

"اجی چھوڑو وکیل صاحب۔ ہمیں پتا ہے وہ کیوں آتی ہے۔ ایک تو اسے پیسہ ملتا ہے جو آپ جیسے بادل کو دیتے ہیں اور بادل کے پاس تو وہ اپنی دکانداری کرتی ہے۔ بادل سے کوئی ہمدردی نہیں اسے۔ آ جاتی ہے شام ہوتے ہی بن سنور کے۔ کنجری۔۔۔ وہی وقت ہوتا ہے شوقین مزاج لوگوں کے سیر سپاٹے کا۔ کوئی اس کی جوانی کا مول بھی لگا ہی دیتا ہے۔ وہ خیال کرنے والی ہوتی تو بادل کا یہ حال کیوں ہوتا۔۔۔"

"بہت دکھ ہوا یہ جان کے" میں نے رسماً کہا۔

"کس کس کا دکھ اٹھائیں گے جی آپ۔ یہاں تو ہر فٹ پاتھ پر کوئی بادل ہے یا کوئی بدلی۔"

اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ آدمی کو اپنے غم سمیٹنے کی فرصت نہیں۔ سارے جہاں کے لیے دکھی ہونے کی فرصت کہاں سے لائے۔ میں نے بھی بادل کو بُھلا دیا اور اس کے دیے ہوئے کاغذ کے پُرزے پر غور کرنے لگا۔ اس وقت تک میں محسن کو رابعہ کی گاڑی کے بارے میں سب بتا چکا تھا اور وہ گاڑی اس وقت بھی وہیں کھڑی ہوئی تھی۔ وہ بم بھی یقیناً وہیں نصب ہوتا جس کی نشاندہی استاد بادل نے کی تھی۔ دنیا کے لیے بادل کا وجود سنگِ راہ سے بھی زیادہ بے مصرف اور باعثِ آزار تھا مگر قدرت کے کارخانے کی رواں دواں مشینری میں ہر ناکارہ نظر آنے والا پُرانا گھسا پٹا اور حقیر پُرزہ بھی اپنی افادیت کا جواز رکھتا ہے۔ مال روڈ پر دوڑتی چمکتی دمکتی کاروں اور بے فکروں کے ہجوم میں کون جانتا تھا کہ ایک طرف کوڑے کے ڈھیر کی طرح پڑا ہوا استاد بادل آج ایک نہیں دو انسانوں کی زندگی بچانے کا وسیلہ بنا تھا۔

میو اسپتال کے شعبۂ حادثات کے بیڈ نمبر سات پر ایک عورت کی لاش رکھی ہوئی تھی۔ ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹروں میں سے ایک نے بمشکل تمام ایک منٹ کی فرصت میں ہمیں رجسٹر دیکھ کے یہ بتا دیا کہ دوپہر سے پہلے جو شخص اس بیڈ پر تھا وہ اب میڈیکل وارڈ کے کس بیڈ پر ہے۔

میں نے کہا "ڈاکٹر۔ اس حادثے میں دو افراد زخمی ہوئے تھے۔"

"او یس۔ ون واز ڈیڈ آن ارائیول" اس نے مختصراً کہا اور پھر کسی نئے کیس کی طرف چلا گیا۔ وہاں مسلسل حادثات کا شکار ہونے والے یا لڑائی جھگڑوں میں زخمی ہونے والے۔ پولیس کیس آ رہے تھے، کچھ مُردہ کچھ قریب المرگ۔ لہولہان اور شکستہ۔ ایمبولینس کے سائرن اور ساتھ آنے والوں کی چیخ پکار۔ زخمیوں کی آہ و بکا۔ یہ سب یہاں چوبیس گھنٹے کا معمول تھا۔

تلاش تھی۔ وہ مجھے زیدی فوٹو گرافر کی دُکان کے سامنے فٹ پاتھ کے ساتھ ہی لیٹا ہوا نظر آیا۔ میرے ہلانے جُلانے پر اس نے آنکھیں کھول کے دیکھا اور نشے میں ہنسا "گاڑی نہیں چلتی۔۔۔؟ دھکا لگاؤ۔۔۔ زور لگا کے۔ ہاں، کبھی آدمی چلاتا ہے گاڑی کو، کبھی۔۔۔ گاڑی چلاتی ہے آدمی کو۔"

میں نے کہا "استاد بادل۔ میری گاڑی ٹھیک ہے۔"

"گاڑی ٹھیک ہے تو پھر سب ٹھیک ہے۔ گاڑی۔۔۔ چلنی چاہیے۔۔۔ جیسی بھی ہو۔ اپنی زندگی کو دیکھو، چل رہی ہے نا۔۔۔ پُرانے ماڈل کی کار۔"

اس سے بات کرنا بے سود تھا۔ وہ نشے میں دھت تھا۔ ایسے میں وہ کیا بتاتا کہ دوپہر کو میں نے اس سے کیا کہا تھا۔ میں مایوس ہو کے چلنے ہی والا تھا کہ ایک بچے نے میرے کوٹ کو کھینچا۔

"صاحب جی، وہ بُلاتا ہے۔۔۔ پان والا" بچے نے کہا۔

میں نے پلٹ کے دیکھا تو سگریٹ پان کے کھوکے میں بیٹھا ہوا شخص مجھے ہاتھ کے اشارے سے قریب آنے کا کہہ رہا تھا۔ اس نے مجھے غور سے دیکھ کے سر ہلایا "حلیہ تو ٹھیک بتایا تھا بادل نے۔ آپ اور پر وکیل صاحب کے آفس میں ہو؟"

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔

"بادل نے کہا تھا۔۔۔ یہ آپ کو دے دوں۔۔۔" اس نے اپنی گدی کے نیچے نوٹوں کے درمیان سے کاغذ کا ایک پُرزہ نکالا اور مجھے تھما دیا۔

اس پُرزے پر گاڑی کے نمبر کے علاوہ میو اسپتال کے شعبۂ حادثات کا ایک نمبر لکھا ہوا تھا جو بیڈ نمبر ہی ہو سکتا تھا۔

"وہ کیا بتائے گا اس حالت میں آپ کو۔ اس نے مجھے یہ کاغذ دیا تھا اور کہا تھا کہ وکیل صاحب آئیں گے۔ اس وقت پتا نہیں میں کچھ بتا سکوں یا نہیں، تم انہیں یہ دے دینا۔"

"اپنی ساس کے لیے بھی کچھ لے جانا۔ مثلاً نیلا تھوتھا، دھتورا وغیرہ" محسن بولا "سسر کے لیے چرس افیون کا تحفہ مناسب رہے گا۔"

"کیوں جی! ایسا کیا بُرا کیا ہے انہوں نے میرے ساتھ؟"

"کمال ہے۔ ایسی بیٹی پیدا کی اور تمہارے سر منڈھ دی۔ یہ کم خطا ہے ان کی؟" محسن بولا۔

جب وہ چلا گیا تو میں نے رابعہ کے آفس تک پیدل مارچ کیا اور کاروں کی قطاروں کے درمیان دیکھتا گیا۔ مجھے استاد بادل کی

میں نے افسوس سے بادل کو دیکھا "تم بہت خیال رکھتے ہو اس کا۔"

اس نے تلخی سے کہا "جو اپنا خیال خود نہ رکھے اس کا خیال دوسرا کیسے رکھ سکتا ہے جی۔ کس کے پاس ہے اتنا ٹائم۔ بس رات کو کمبل ڈال دیتے ہیں اس پر۔ بیمار پڑ جائے تو دوا دارو کر دیتے ہیں۔ مر جائے گا تو کفن دے کے گاڑ دیں گے۔ اب تو گھر والے بھی

میڈیکل وارڈ میں بھی ملاقات کا وقت تھا اور ہر بیڈ کے گرد مریض کے عزیز واقارب جمع تھے لیکن اس بیڈ کو سب سے الگ کردیا گیا تھا۔ وہاں ایک پولیس مین کرسی ڈالے اور گن تھامے بیٹھا تھا۔ بیڈ پر لیٹے ہوئے مریض کی حالت بھی تشویشناک ہی لگتی تھی۔ اس کے بازو میں بیک وقت خون اور گلوکوز کی نلکیاں لگی ہوئی تھیں اور اس کے خون آلود پٹیوں سے لپٹے ہوئے چہرے پر آکسیجن ماسک تھا۔

سو کے صرف ایک نوٹ نے ہمارے راستے سے قانون کی دیوار ہٹادی "آپ رانا صاحب ہو؟" پہرے پر مامور سپاہی نے کہا۔

میں نے اقرار میں سرہلا دیا "تم سے کچھ کہا اس نے؟"

"بس جناب دو منٹ کے لیے ہوش آیا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ شوکت رانا صاحب کو بُلا دو۔ یہ فون نمبر بھی دیا تھا" اس نے جیب میں سے ایک بجلی کا بل نکالا اور اس کا کونا پھاڑ کے مجھے دے دیا۔

"یہ تو میرا ہی فون نمبر ہے۔" میں نے کہا "اس وقت تو یہ بے ہوش ہے 'کیا کہتے ہیں ڈاکٹر؟"

"کہنا کیا ہے سر کسی نے۔ میں بھی انتظار کررہا ہوں۔ اس کی جان چھوٹے تو میری بھی چھوٹے۔ اپنے اے ایس آئی اشرف صاحب تو گھر چلے گئے ہیں مجھے پھنسا کے۔ افسر لوگوں کے عیش ہیں جی..."

میں نے مریض کے سرہانے رکھا ہوا چارٹ اُٹھا کے دیکھا اُس پر بہت کچھ لکھا ہوا تھا جو میرے لیے ناقابلِ فہم تھا مگر اس کا نام صاف پڑھا جاتا تھا۔ وحید قریشی ولد رشید قریشی۔ کیس نمبر سات سو گیارہ۔ پتا نامعلوم۔

اچانک مریض نے کرب میں ہاتھ پاؤں ہلانے شروع کیے۔ کانسٹیبل نے چلّا کے نرس کو پکارا "اجی سسٹر صاحب۔ اس کو دیکھو ذرا۔ بندہ مرچلا ہے 'ڈاکٹر صاحب کو بلاؤ۔"

شاید وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا مگر اس کو مرتا دیکھنے کے لیے وہاں رکنے کی ہمت ہم میں نہیں تھی۔ ہم واپس ہوئے 'اس وقت تک دو نرسوں کے ساتھ ایک ڈاکٹر نے طبّی امداد کی رسمی کارروائی شروع کردی تھی۔ وہ بھی جانتے تو ہوں گے کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں مگر آخری سانس تک زندگی کے لیے موت سے لڑنا ان کا اخلاقی فرض تھا۔ کام تھا اور پیشہ تھا۔

باہر آکے میں نے کینٹین کا فون استعمال کیا اور نمبر ملایا "رانا صاحب سے بات کرنی ہے مجھے" میں نے کہا۔

کسی نوکرانی ٹائپ عورت نے تذبذب کے ساتھ کہا "آپ کون ہو جی؟"

"پیر غیاث الدین بلبن سمرقندی رحمتہ اللہ علیہ" میں نے بارعب لہجے میں کہا۔

"وہ جی۔ رانا صاحب تو ابھی کہیں گئے ہیں۔ نئے گھر گئے ہوں گے۔ شاید نئی بیوی کے پاس۔ نئی گڈی میں۔ آپ ایک منٹ ٹھہریں۔ میں ذرا چھوٹی بی بی سے علوم کرلوں۔"

چند منٹ بعد کسی لڑکی کے چلّانے کی آواز آئی "سوچے سمجھے بغیر ہر ایک کے سامنے زبان چلانے لگتی ہو۔ کیا ضرورت تھی کا یہ سب کہنے کی۔ اتنا کافی تھا کہ اباجی نہیں ہیں۔"

"وہ جی۔ پیر صاحب ناراض ہوجاتے۔"

"بے وقوف عورت۔ پتا نہیں وہ پیر ہے یا کوئی دھوکے باز" اس نے دبے دبے لہجے میں کہا مگر میرے کانوں نے سُن لیا پھر وہ بولی "ہیلو!"

"تم شوکت رانا کی بیٹی ہو نا؟... ماشاءاللہ" میں نے کہا۔

"جی... اباجی کچھ بتا کے نہیں گئے" اس نے رکھائی سے کہا۔

"چلو کوئی بات نہیں۔ بس اس کو یہ بتانا تھا کہ وحید کا انتقال ہوگیا ہے اسپتال میں" میں نے ریسیور رکھ دیا۔

"ٹیلی فون نمبر شوکت رانا کے گھر کا ہی ہے۔ تصدیق ہوگئی" میں نے محسن کو مطلع کیا "ایک بے وقوف نوکرانی نے ایک سوال کے جواب میں تین کارآمد باتیں بتادیں۔ رانا نے نئی شادی کی ہے' نئی کوٹھی بنائی ہے اور نئی گاڑی لی ہے۔"

"رانا جیسے لوگوں کے ایسے ہی شوق ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا "کیا اس فون نمبر سے رانا کے گھر کا پتا نہیں مل سکتا؟"

"مل تو سکتا ہے بشرطیکہ نمبر ڈائریکٹری میں ہو۔ کچھ لوگ اپنے پیرائیویٹ نمبر رجسٹر نہیں کراتے۔" محسن بولا "نیو میریکل ڈائریکٹری میں سب نمبر ترتیب وار لکھے جاتے ہیں اور ان کے سامنے پتا ہوتا ہے۔"

"ایکس چینج والے بتادیں گے۔" میں نے کہا اور کینٹین والے کی اجازت سے دوسرا نمبر ملایا۔ یہ نمبر مجھے انکوائری نے دیا تھا اور ڈیوٹی افسر کا نمبر تھا۔

"کون صاحب بول رہے ہیں؟"

"نام کو چھوڑیں' میں ڈیوٹی افسر ہوں 'کام بتائیں۔"

"میں روزنامہ جلال کا چیف ایڈیٹر تبریز فاروقی بول رہا ہوں۔" ڈیوٹی افسر کا لہجہ ایک دم بدل گیا "فاروقی صاحب۔ کیا حکم ہے؟"

میں نے کہا "ہمارے ایک کالم نویس ہیں۔ ابوبکر مشہدی۔ ان کا فون نمبر تو ہمارے پاس ہے۔ ان کے گھر سے کالم منگوانا تھا۔ ان کے گھر پر صرف ایک جاہل نوکر بیٹھا ہے اس وقت جو پتا بھی نہیں سمجھا سکتا۔"

"ایک منٹ پلیز..." ڈیوٹی افسر بولا "ہاں جی۔ لکھ لیں اور فاروقی صاحب اگر مجھے تصویر لگوانی ہو بچی کی سالگرہ کی؟"

"کوئی مسئلہ نہیں۔ آپ میرے نام لفافے میں ڈال کے کاؤنٹر پر دے جائیں۔" میں نے کہا۔

...کچھ سکتا تھا یا نیچے آکے پوچھ سکتا تھا کہ یہ کیا ہورہا ہے۔ جب ...اپنے ہی گھر میں چوری کرتا ہوا پکڑا جائے تو اس سوال کا ...نہیں دے سکتا۔

...بم کو نٹ بولٹ سے کسنا غیر ضروری تھا۔ لگانے والے اسے ...کے آسرے پر چھوڑ گئے تھے۔ میں نے اسے ڈسٹری بیوٹر ...کے نیچے سے نکال لیا اور ایک بار پھر اس کے کنکشن چیک ... دو تاروں میں سے ایک کو مین کوائل سے ملایا گیا تھا اور ...کو کنڈنسر سے۔ یہ بم سائز میں بھی مین کوائل کے برابر ہی ...تقریباً چھ انچ لمبا اور تین انچ موٹا۔ سیاہ رنگ کا یہ سلنڈر اپنی ...ت سے ہی غیر ملکی لگتا تھا۔ جب میں نے اسے کچھ دور جا کے ...نی میں دیکھا تو اس پر ہندی کے الفاظ کندہ نظر آئے جن کو ...کی ضرورت کسی نے محسوس نہیں کی تھی۔

ٹیلی فون ایکس چینج سے جو پتا معلوم ہوا تھا اسے تلاش کرنا ...مشکل کام ثابت نہیں ہوا۔ وہ ملتان روڈ کی طرف ایک نئی ...کا تھا اور وہاں شوکت رانا صاحب جانی پہچانی شخصیت تھے۔

میں اور محسن پرانی کہلانے والی اس کوٹھی کے سامنے زیرِ تعمیر ...ارت کے سائے میں کھڑے رہے۔ یہ کوٹھی دو تین سال پہلے ہی ...ہوگی مگر اب رانا صاحب نے نئی بیوی کے لیے اس سے بھی بہتر ...کوٹھی خرید لی تھی۔ ابھی رات کے نو بجے تھے اور ہم یقین سے ...کہہ سکتے تھے کہ رانا واپس آیا تو کس وقت آئے گا اور اس ...کے واپس آجانے کے بعد ہمارے لیے کامیابی کے امکانات کیا ہوں گے۔

رانا دس بجے آیا جب ہم تقریباً مایوس اور انتظار کی کوفت سے ...بیزار ہونے کے علاوہ تھکن اور بھوک سے بھی پریشان تھے۔ ...نئی گاڑی کو ایک شوفر چلا رہا تھا۔ رانا پچھلی سیٹ پر تھا۔ شوفر ...گاڑی گیٹ کے سامنے روک کے پچھلا دروازہ کھولا تو رانا نے ...باہر رکھا۔ اس کے لیے خود ہینڈل سے دروازہ کھولنا شان کے ...خلاف تھا۔

میں اور محسن دیوار کی اوٹ سے سر نکالے دیکھتے رہے۔ رانا ...شوفر کو کچھ ہدایات دیں اور وہ سر ہلاتا رہا۔ سنتری نے بڑا پھاٹک ...تو ڈرائیور نے گاڑی کا دروازہ بند کیا مگر لاک نہیں کیا اور اندر ...گیا۔ شاید اسے کچھ دیر بعد کہیں جانا تھا اور یہاں کار کو کسی چور ...خطرہ لاحق نہیں تھا۔

ہم نے چند منٹ کی مہلت سے فائدہ اُٹھایا۔ کوٹھی کا گیٹ ...ہوتے ہی میں اور محسن ایک جست میں پتلی سی سڑک پار کرگئے۔ ...نے محسن کو بتادیا کہ بم کے دونوں کناروں سے دو تار کیسے ...جائیں گے۔ اس نے بونٹ کھولا اور اندر سر ڈال کے اپنے ...میں مصروف ہوگیا۔ میں نے گیٹ لائٹ سے بچتے ہوئے خود کو ...کے لیے تیار رکھا۔ اس وقت اگر اچانک ڈرائیور نمودار ...ہوجاتا تو مارا جاتا اور میں مجبور ہوجاتا کہ اس کی لاش کو وہیں

جب میں نے ٹیلی فون کال کے پیسے دینے کی کوشش کی تو کینٹین کے مالک نے بڑی انکساری سے کہا "بادشاہو۔ اخبار والوں کے تو غلام ہیں ہم۔ میرا بچہ گم ہوگیا تھا۔ اخبار میں تصویر لگوائی۔ اگلے دن مل گیا۔ کسی نے اخبار کے دفتر پہنچادیا۔ ایڈیٹر صاحب خود گھر چھوڑ کے گئے۔ آپ سے ہم پیسے نہیں لے سکتے جی۔ بیٹھو کوئی چائے شائے۔ ٹھنڈی بوتل۔"

کبھی ایک جھوٹ سے کام تو نکل آتا ہے مگر وہی جھوٹ آدمی کو شرمندہ بھی کردیتا ہے۔ ہم اس کا شکریہ ادا کرکے نکل آئے۔

اب مغرب کے بعد کا اندھیرا گہرا ہونے لگا تھا۔ میں نے اور محسن نے مال روڈ تک پیدل سفر کیا اور شیزان میں داخل ہوکے کونے والی میز پر براجمان ہوگئے۔ اندر چائے کافی کی مہک۔ خوشبوؤں اور قہقہوں سے معمور فضا تھی۔

محسن نے کچھ سوچ کے کہا "یار یہ شوکت رانا کیوں نہیں آیا آخر اس پریس کانفرنس میں۔"

میں نے کہا "اسے مدعو نہیں کیا گیا تھا۔ ایک طرح سے یہ انتہائی خفیہ پریس کانفرنس تھی۔ اسے رات کو پتا چلے گا کسی سے۔ یا صبح کے اخبار سے۔"

"آج کا پروگرام گڑبڑ ہوگیا۔ اگر ہم پہلے ہی ولاور کو پولیس کے حوالے کردیتے تو اچھا تھا۔"

"میں سوچ رہا ہوں آج رانا کا گھر دیکھ لیا جائے۔ کچھ دیر بعد وہ نئی گاڑی میں لوٹ کر آئے گا۔"

"نئے گھر اور نئی بیوی کو چھوڑ کر؟ مشکل ہے" محسن بولا "مگر کام کیا ہے؟"

"کام معمولی ہے۔ اس کا تحفہ واپس کرنا ہے۔ جو بم اس نے رابعہ کی گاڑی میں نصب کیا تھا وہ اس کی نئی گاڑی میں لگانا ہے۔"

"یہ معمولی کام ہے؟"

"ہاں۔ میں نے جب تار الگ کیے تھے تو دیکھ لیا تھا کہ کس تار کو کہاں جوڑا گیا تھا۔ مشکل یہ ہے کہ رابعہ گاڑی کی چابی تک دینے پر تیار نہیں تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ خود بم ڈسپوزل والے بم نکالیں۔"

"بونٹ تو چابی کے بغیر بھی کھولا جاسکتا ہے یار" محسن بولا۔

اس نے غلط نہیں کہا تھا۔ ہم چائے پی کے تازہ دم ہوگئے تو ایک بار پھر رابعہ کے آفس تک گئے۔ اس کی فاکس ویگن ابھی اسی حالت میں کھڑی ہوئی تھی۔ محسن نے یہ ظاہر کیا کہ اس کی چابیاں گم ہوگئی ہیں اور ایک دو کار والوں سے ان کی چابی لے کر...... بونٹ میں لگائی۔ ایک چابی نے مسئلہ حل کردیا۔

بم نکالنے کی کارروائی کے دوران مجھے اور کسی کا ڈر نہیں تھا۔ وہاں سب ہی مجھے صورت سے پہچانتے تھے اور کوئی یہ شک نہیں کرسکتا تھا کہ میں گاڑی کی چوری کررہا ہوں۔ خطرہ مجھے رابعہ کی طرف سے تھا۔ منظر اور وقار یوسف میں سے کوئی اوپر سے جھانک

اندھیرے میں کہیں ڈال دوں۔

محسن نے اپنا کام پانچ منٹ سے بھی کم وقت میں مکمل کرلیا۔ ہم ایک بار پھر نامکمل مکان کے کھنڈر جیسی عمارت میں روپوش ہوگئے۔ میری دلی خواہش تھی کہ رانا خود گاڑی اسٹارٹ کرے مگر اس کا امکان بہت کم تھا۔ ہر صورت میں مرنا ڈرائیور ہی کو تھا۔ گیہوں کے ساتھ گھن ایسے ہی پستے ہیں۔ رابعہ کے ساتھ میں بھی مارا جاسکتا تھا اور منظریا مولوی خادم حسین بھی جس کا ہمارے کسی معاملے سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔

اچانک گیٹ کھلا اور ایک شخص آہستہ آہستہ چلتا ہوا گاڑی کی طرف بڑھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے یوں لگا جیسے میرا دل دھڑکنا بھول گیا ہے۔ میں نے اپنی آنکھیں ملیں۔

محسن نے میرا شانہ ہلایا "یہ.... یہ تو غالب ہے۔"

"میں.... میں سمجھا تھا.... دھوکا ہو رہا ہے میری آنکھوں کو۔"

میں نے اسے روکنے کے لیے آواز دی "غالب!"

غالب کے قدم ایک لمحے کے لیے رکے۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ میں اور محسن اس پناہ گاہ سے نکل کر دوڑے مگر ہمیں اندازہ تھا کہ یہ کوشش بے سود ہے۔ ہمیں بہت دیر ہوگئی تھی۔

میں نے حلق کی پوری قوت سے غالب کو آواز دی تھی اور پھر محسن نے اسے چیخ کے پکارا تھا۔ بے شک ہمارے درمیان سڑک حائل تھی مگر یہ ناممکن تھا کہ اس پرسکوت ماحول میں ہمارے دل کی گہرائی سے نکلنے والی پرکرب چیخ غالب نے نہ سنی ہو۔ اس وقت تمام خطرات کا وجود میرے لیے بے معنی ہوگیا تھا اور میرے لیے ایک ہی احساس کی ناقابل برداشت اذیت باقی رہ گئی تھی کہ میں نے خود اپنی تدبیر سے اپنی بدقسمتی سے اور اپنی بدخواہی سے خود اپنے عزیز ترین دوست کی ہلاکت کا سامان کردیا تھا۔ میری حالت اس شخص کی طرح تھی جس نے دشمن کے سینے میں اُتاری جانے والی گولی اپنے ہی بھائی کی پشت کی جانب سے اس کے دل میں پیوست کردی تھی۔ مجھے اس وقت وہ سب یاد آیا جو ازلی وابدی سچائی کی طرح تسلیم کیا جاتا ہے کہ جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ جو دوسروں کے لیے گڑھا کھودتا ہے خود اس میں گرتا ہے۔

جیسے آج صبح شوکت کے بچھائے ہوئے دام اجل کو ایک نشے باز نیم پاگل شخص کی آنکھوں نے دیکھ لیا تھا اور موت نے مجھے یا رابعہ کی طرف نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھا تھا ایسے ہی اس وقت موت نے شوکت رانا کو سلامتی اور تحفظ کے ساتھ نظرانداز کردیا تھا۔ اجل غالب کو وہاں لے آئی تھی۔ یہ اختیار قدرت نے کسی فانی انسان کو نہ دیا ہے نہ دے گی کہ وہ کسی دوسرے انسان کو زندگی دے سکے یا اس کی زندگی لے سکے۔ یہ انتخاب قضا کا ہے کہ جس کو جہاں چاہے لے جا کر مارے اور جس طرح چاہے مروا دے۔

میرے ساتھ محسن نے بھی غالب کو روکنا چاہا تھا مگر یہی لگتا تھا جیسے وقت آجائے تو اسے ٹالنے کی تدبیر بھی آدمی کی بے بسی کا مذاق اڑاتی ہے۔ غالب تو جیسے بہرا ہوگیا تھا۔ اس نے ایک بار ٹھٹک کے دیکھا ضرور تھا مگر اس کے بعد تو جیسے ہماری آواز کے لیے اس کے کان بند ہوگئے تھے یا تقدیر نے اس آواز کو بھی سماعت کی حدود پار کرنے سے پہلے ہی روک دیا تھا۔

وہاں ہم ذرا بلند آواز میں بھی اسے پکارتے تو وہ سُن سکتا تھا اور نہ جانے کیوں مجھے یقین تھا کہ اس کے قدم بلاوجہ نہیں رُکے تھے۔ اس نے اپنا نام پکارنے والی میری آواز پہچان بھی لی ہوگی۔

اس کے باوجود وہ گاڑی کا دروازہ کھول کے اندر بیٹھ گیا۔ میں اور محسن دیوانہ وار چلّاتے ہوئے اس کی طرف دوڑے۔ "غالب رک جاؤ، آگے مت بڑھو۔ غالب.... غالب گاڑی مت اسٹارٹ کرنا...."

لیکن غالب نے دروازہ بند کرتے ہی گاڑی اسٹارٹ کی۔ مجھے یوں لگا جیسے قیامت آگئی ہے۔ میں کسی آتش فشاں کے دہانے پر کھڑا تھا مگر مجھے معلوم نہیں تھا اور اچانک وہ آتش فشاں پھٹ گیا ہے۔ زمین آسمان کے درمیان جو کچھ تھا دہکتے سلگتے سنگ ریزوں کے غبار میں تحلیل گیا تھا اور میں، محسن غالب ہمارا احساس اور وجود، سب وقت کی بیکراں حدود میں تحلیل ہو کے مٹ گیا تھا۔ ختم ہوگیا تھا، ماضی کا حوالہ بن گیا تھا۔

لیکن ایسا نہیں تھا۔ یہ میرے تصور کا فریب تھا۔ بے یقینی یقین کی وہ انتہا تھی جہاں آدمی رسی کو سانپ سمجھ لیتا ہے مارگزیدہ کی طرح خوف سے ہلاک ہوجاتا ہے۔ مفروضے پر اعتبار اس درجہ راسخ ہوجائے تو آدمی کو وہ سب نظر آتا ہے اور محسوس ہوتا ہے جس کا وجود ہی نہیں ہوتا۔ دنیا اسے پاگل کہتی ہے۔

میں بھی پاگل ہوگیا تھا اور میرا پاگل ہوجانا برحق تھا۔ اگر غالب سچ مچ میرے بچھائے ہوئے موت کے جال میں گرفتار ہو کے مرجاتا تو اسی پاگل پن کی حالت میں میری موت بھی ہوتی مگر وقت کا وہ مختصر ترین لمحہ جسے بیان تو کیا محسوس بھی نہیں کیا جاسکتا گزر گیا اور اچانک میں پھر ہوش میں آگیا۔ مجھے صرف اپنی ذہنی کیفیت کا علم ہے اور یہ معلوم ہے کہ زندگی اور موت کے بیچ اس پل صراط پر سے میں کیسے گزرا تھا۔ شاید ایسی ہی کچھ محسن پر بیتی ہوگی۔

ہم تو ایک ساتھ چلّا کے دوڑے تھے پھر شاید رُک گئے تھے یا رُکے بغیر پھر دوڑے تھے کیونکہ غالب نے کار اسٹارٹ کردی تھی اور کوئی دھماکا نہیں ہوا تھا۔ گاڑی آگے سرکنے لگی تھی اور ہم دیوانوں کی طرح اس کے پیچھے بھاگنے لگے تھے۔ پچاس گز سے بھی کم فاصلے پر گاڑی بائیں جانب گھوم گئی۔ میں نے چیخ کے کہا "محسن.... محسن اسے روک، یہ غالب ہے۔"

محسن نے چلّا کے کہا "یار غالب کو کچھ نہیں ہوگا۔ وہ زندہ ہے نا؟"

میں نے کہا "ہاں ہاں۔ وہ زندہ ہے، مگر اسے روکو۔ وہ سُنتا

پانچ مزدوروں کی ٹولی بڑے انہماک سے فلمی گانے سُننے میں مصروف تھی۔ ان سب نے ہماری دیوانگی کو بھی دیکھا مگر کسی نے ہم سے دیوانگی کا سبب نہیں پوچھا اور نہ دخل در معقولات ضروری سمجھا۔ وہ دن بھر کے تھکے ہارے اس وقت آرام کے موڈ میں تھے۔

تنگ سڑکوں کے کناروں پر جھاڑیاں اور گھاس پھوس اور خودرو پودے تھے۔ اس علاقے کے گھروں تک بجلی گئی تھی۔ سڑک پر بجلی اور ٹیلی فون کے کھمبے بھی نظر آرہے تھے مگر اسٹریٹ لائٹس لگانے کا مرحلہ ابھی نہیں آیا تھا۔ اندھیرے میں سڑک کو صرف کار کی ہیڈ لائٹ روشن کررہی تھی اور ہم اس کے تعاقب میں دوڑتے ہوئے کئی بار ٹھوکر کھاچکے تھے۔ میرا سانس بُری طرح پھول گیا تھا مگر کار کے اور اپنے درمیان بتدریج کم ہونے والا فاصلہ میری ہمت کے لیے مہمیز کا کام کرتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس مرحلے پر میں ست پڑگیا یا رک گیا تو وقت ہاتھ سے نکل جائے گا۔ بہت سے سوال تشنہ جواب رہ جائیں گے اور اس کوتاہی سے ہونے والے نقصان کی تلافی کبھی نہ ہوسکے گی۔

رانا کے گھر سے ہم دو سو گز دور آگئے تھے۔ ابھی تک ہم گاڑی سے دس بیس گز پیچھے تھے اور گاڑی کے چوڑی سڑک پر پہنچ جانے کے بعد میری مایوسی بڑھنے لگی۔ اب تک غالب محتاط تھا کیونکہ ان نیم پختہ اور تنگ و تاریک سڑکوں پر گاڑی کو تیز دوڑانے کی گنجائش نہیں تھی لیکن اب کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ کار کی رفتار میں اضافہ نہ کرے۔ چند سیکنڈ میں کار ہمیں اتنا پیچھے چھوڑ سکتی تھی کہ ہم اس کی گرد کو بھی نہ پہنچ پاتے۔

مجھے تعجب تھا کہ پچھلا شیشہ ٹوٹنے کے باوجود غالب نے گاڑی کیوں نہیں روکی۔ اس کے کانوں تک ہماری آواز کے نہ پہنچنے کا بھی کوئی سبب نہیں تھا لیکن بفرض محال وہ سماعت سے محروم ہوچکا تھا تب بھی پچھلے.... شیشے پر پتھر لگنے کے بعد دھماکا ہوتے ہی اس کے ذرات ہر طرف اڑ کر گئے تھے۔ کچھ ذرات یقیناً غالب کے سر، پشت اور گردن سے بھی ٹکرائے ہوں گے۔ کیا وہ پاگل ہوگیا تھا، سچ مچ پاگل کردیا گیا تھا کہ اب نہ ہمیں پہچان رہا تھا نہ ہماری آواز پر دھیان دے رہا تھا یا وہ خوف زدہ تھا اور ہم سے بھاگ رہا تھا۔ نہیں، اسے بھاگنا ہوتا تو وہ ایکسیلریٹر پر ذرا سا پاؤں کا دباؤ بڑھاتا اور برق رفتار گاڑی اسے اُڑا کے لے جاتی۔

عین اسی وقت جب گاڑی کی رفتار بڑھ چکی تھی اور میں غصے، بے بسی اور شکست کے احساس میں مبتلا مایوس ہو کے رفتار کم کرچکا تھا، قدرت کو ہم پر رحم آگیا۔ اچانک گاڑی کی چال بدل گئی۔ اس کا ایک پہیہ لڑکھڑانے لگا اور گاڑی کی رفتار پھر کم ہوئی۔ اس کا پیچھے والا ٹائر پنکچر ہوگیا تھا اور غالب نے گاڑی کو روک لیا تھا۔

ایک منٹ میں ہم نے گاڑی کو جالیا اور دروازہ کھول کے باہر نکلنے والے غالب کو دبوچ لیا۔ اب تک ہمارے ذہن میں کوئی شک تھا کہ ہم نے غالب کو پہچاننے میں غلطی تو نہیں کی تھی یا تو وہ غالب کیوں نہیں ہماری، غالب!"

محسن چلایا "غالب، سنتا کیوں نہیں سور کے بچے۔"

میں نے پیچھے دوڑتے ہوئے پتھر اٹھا کے گاڑی پر مارا۔ اس غیر آباد علاقے کی سنسان اور تاریک سڑکوں پر پتھر بہت تھے۔ دوسرا پتھر محسن نے مارا۔ ہم چیختے ہوئے گاڑی کے پیچھے دوڑتے رہے۔ وہ نئی گاڑی تھی اور اتنی دیر میں ہمیں بہت پیچھے چھوڑ سکتی تھی لیکن غالب اسے بہت کم رفتار سے چلا رہا تھا، معلوم نہیں کیوں؟

جب گاڑی پر پتھر لگے تو گاڑی کی رفتار کم ہوئی۔ اس سے پہلے کہ گاڑی رکتی میرے ہاتھوں سے نکلنے والا دوسرا پتھر اس کے پچھلے شیشے پر لگا۔ شیشہ ایک دھماکے سے ریزہ ریزہ ہوگیا۔ گاڑی نے دوسرا موڑ کاٹا اور پتلی سڑک سے نسبتاً چوڑی سڑک پر آگئی۔ یہاں پر سڑک کے کنارے بنے ہوئے گھر تعداد میں بہت کم تھے۔ عام طور پر ہر مکان الگ تھا اور کہیں کہیں ان کے درمیان فاصلہ سو گز سے بھی زیادہ تھا۔ کچھ مکان مکمل نظر آتے تھے مگر آباد نہیں تھے اور جو تعمیر کے مختلف مراحل سے گزر رہے تھے وہاں صرف خانہ ویرانی تھی۔ جگہ جگہ روڑی، کنکر اور ریت کے ڈھیر تھے اور اینٹوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ انہی کے درمیان کسی چارپائی پر یا فرش خاک پر کوئی چوکیدار سو رہا تھا یا اکیلا بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ ایک جگہ چار

کے گرفت میں آتے ہی دور ہوگیا۔
غالب بہت سہما ہوا تھا اور ہمیں بڑی اجنبی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ "تم.... کون ہو تم لوگ.... کیا چاہتے ہو....؟"
میں نے اسے جھنجوڑ کے کہا "کیا تو نشے میں ہے؟"
اس نے محسن کی طرف دیکھا "مجھے.... چھوڑو۔ میں نے تمہارا کچھ نہیں بگاڑا ہے۔ ایسے کیوں پکڑ رکھا ہے تم نے مجھے۔"
میں نے اور محسن نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ غالب کا سپاٹ لہجہ اور اس کی ویران آنکھوں میں نا آشنائی کے جذبات کو اداکاری نہیں سمجھا جاسکتا تھا۔ نہ وہ ہم سے مذاق کررہا تھا اور نہ اس کا مقصد ہمیں پریشان کرنا تھا۔
میں نے اسے چھوڑ دیا "غالب۔ کیا ہوگیا ہے تجھے یار۔ دیکھ میں سکندر ہوں۔ تو شاید میرے بدلے ہوئے حلیے سے دھوکا کھا گیا لیکن میری آواز بھی تُو نے نہیں سنی۔"
محسن نے کہا "آج تو میرا حلیہ بھی بدلا ہوا ہے غالب لیکن تو ہماری آواز پر رکا کیوں نہیں تھا۔ کان تو ٹھیک ہیں تیرے۔"
اس نے ہم دونوں کو دیکھا "میں تمہیں نہیں جانتا۔ پھر تم کیوں میرا پیچھا کررہے تھے۔ کیوں پتھر مار رہے تھے میری گاڑی پر۔ یہ شیشہ بھی توڑ دیا تم نے میری گاڑی کا۔"
میں نے کہا "اب میں ایک جھانپڑ مار کے تیرا دماغ درست کردوں گا۔"
محسن نے کہا "باربار میری گاڑی میری گاڑی... کہہ رہا ہے تیرے باپ کی گاڑی ہے کیا۔"
"گاڑی کا ٹائر پنکچر ہوگیا ہے۔" اس نے کھوکھلے لہجے میں کہا "مجھے پہیہ بدلنا ہے۔ میرا راستہ چھوڑو۔"
اب مجھے تشویش ہونے لگی "غالب۔ کیا واقعی تُو نے ہمیں نہیں پہچانا؟ سکندر بخت اور محسن کو نہیں جانتا تو؟"
اس نے نفی میں سر ہلایا "یہ نام سُنے ہوئے لگتے ہیں۔"
اب مجھے یقین آنے لگا کہ اس کا ذہن اور یادداشت متاثر ہوچکی ہے۔ شاید وزیر خان اسپتال میں اس کا ادویات' برقی آلات اور تشدد کے ذریعے برین واش کیا گیا تھا۔ وہ غالب ہونے کے باوجود غالب نہیں رہا تھا۔ اس کی شخصیت بدل دی گئی تھی۔
میں نے غالب کو چھوڑ دیا۔ وہ ڈکی کھول کے جیک اور اسپیئر وہیل نکال رہا تھا اور ہماری طرف بالکل متوجہ نہیں تھا۔ اس کا رویّہ بالکل متوازن نہیں تھا۔ اگر ہم اس کے لیے اجنبی تھے تو پھر وہ مشتعل کیوں نہیں تھا کہ ہم نے اس کی گاڑی پر پتھر مارے اور اس کا اچھا خاصا مہنگا ونڈ اسکرین توڑ دیا۔ اگر وہ سمجھتا تھا کہ ہم اسے نقصان پہنچانے کے لیے اس کا پیچھا کررہے تھے تو وہ اسپیڈ بڑھا کے بھاگ کیوں نہیں گیا تھا۔ یقیناً اس کے ذہن میں بھی خلفشار تھا اور بے یقینی کی اُلجھن تھی۔ اس کی سوچ واضح اور پُراعتماد نہیں تھی اور شاید وہ خود بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ کیا کررہا ہے اور کیوں کررہا ہے۔ اگر وہ جانتا تھا تو یہ نہیں سمجھتا تھا کہ کیا غلط ہے اور کیا صحیح۔
وہ اصل غالب اور اس کی بدلی ہوئی شخصیت کے درمیان کہیں بے اعتباری کے خلا میں معلق تھا۔ اس کے شعور میں بہت کچھ بھر دیا گیا تھا مثلاً یہ کہ تم غالب نہیں ہو۔ تم کسی سکندر بخت' محسن یا رابعہ کو نہیں جانتے' نہ تم صحافی تھے اور نہ ایم آر ایس کے رکن۔ اور وہ سب باتیں جو اس کے اور ہمارے مشترک ماضی کا حصہ تھیں اس کی یادداشت سے کھرچ دی گئی تھیں مگر شعور کے نہاں خانوں میں' لاشعور میں بہت کچھ تھا جسے آسانی سے مٹایا نہیں جاسکتا تھا اور شخصیت کی انتہائی گہری تہ میں تحت الشعور کا وہ حصہ تھا جس میں محفوظ یادوں کے عکس تک خود غالب کی رسائی نہیں تھی تو کوئی اور اس خزانے کو کیسے چھیڑ سکتا تھا۔ بدلنے والے صرف شعور پر قابو حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ لاشعور میں سب کچھ وہی تھا اور اسے دوبارہ شعور کی سطح تک لانا مشکل ضرور تھا مگر ناممکن نہیں تھا۔
میں نے محسن سے کہا "یار۔ یہ کیا حال کردیا ہے انہوں نے غالب کا۔"
محسن نے افسوس سے اسے دیکھا "بہت وقت مل گیا انہیں سکندر۔ انہوں نے غالب کو جیتے جی ماردیا۔ نازو کو بھی ماردیا ہوگا۔ وہ بھی اب ہمیں نہیں پہچانے گی۔"
"مایوس مت ہو یار۔ دیکھ قدرت کو منظور تھا کہ غالب زندہ رہے۔ اسے نہ دشمنوں نے مارا اور نہ یہ ہماری غلطی سے ہلاک ہوا۔ کیا یہ اشارہ کافی نہیں؟ یہ ہمیں کہاں اور کیسے ملا۔ کیا نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے اس اتفاق سے؟ یہی کہ غالب کو کچھ نہیں ہوگا۔"
"اب کیا رہ گیا ہے ہونے کو؟"
"نہیں محسن۔ یہ ہوسکتا تھا کہ ہمیں غالب کبھی نہ ملتا۔ یا ملتا تو صرف اس کا بے جان جسم ملتا۔ وہ جسمانی معذوری کے ساتھ کسی فٹ پاتھ پر پڑا نظر آتا یا کسی پاگل خانے کی سلاخوں کے پیچھے ہوتا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ ہمیں زندہ سلامت اور صحت مند حالت میں ملا ہے۔ اسے پاگل بھی نہیں سمجھا جاسکتا۔ یہ ایک ذہنی مسئلہ ہے' عارضی اور وقتی خرابی ہے۔ بہت معمولی' اسے ہم ٹھیک کرلیں گے۔"
غالب پہیہ بدلنے میں مصروف تھا لیکن باربار ایسی نظروں سے ہماری طرف دیکھتا تھا جیسے ہم سے پوچھنا چاہتا ہو کہ اب کیا ہے۔ یہاں کیوں کھڑے ہو تم اور کیا باتیں کررہے ہو۔ شاید کوئی خلش اس کے ذہن میں بھی تھی کہ ہم وہاں بے سبب نہیں کھڑے ہیں اور نا آشنا ہونے کے باوجود اس کے دشمن نہیں ہیں۔ شاید وہ بھی سوچ رہا تھا مگر اس کی سوچ بے یقینی کے خلا میں گردش کررہی تھی۔ ایک دائرے میں جس کی کوئی سمت نہیں ہوتی۔ کوئی انتہا نہیں ہوتی۔
محسن نے کہا "آخر یہ شوکت رانا کے گھر میں کیا کررہا تھا؟ اب اس کی گاڑی لے کر کہاں جارہا ہے؟"

"پورا نام بتاؤ۔ فیروز دین' فیروز احمد یا محمد فیروز؟"
"بس.... فیروز.... ایسے ہی پکارتے ہیں سب۔"
میں نے کہا "اپنے باپ کا نام یاد ہے تمہیں؟"
وہ خلا میں دیکھنے لگا "یاد تو تھا.... بھول گیا مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"
میں نے کہا "رانا صاحب کے پاس تم کب سے ہو؟"
وہ سوچنے لگا "بہت دن سے۔ میں ڈرائیور ہوں ان کا۔"
"اچھا۔ کیا وہ پوچھیں گے نہیں تم سے کہ یہ شیشہ کیسے ٹوٹا؟ خفا نہیں ہوں گے تم پر۔ ماریں گے نہیں تم کو؟"
اس نے نفی میں سر ہلایا "وہ بہت اچھے ہیں۔ مجھ سے کہتے ہیں کہ فیروز۔ کسی سے مت ڈرو۔ کوئی تمہیں کچھ کہے تو مجھے بتانا۔ بس کبھی جھوٹ مت بولنا مجھ سے۔ باہر کچھ بھی ہوجائے' مجھے بتادینا۔"
"تم کیا بتاؤ گے انہیں؟ شیشہ کیسے ٹوٹ گیا؟"
"سچ سچ بتادوں گا کہ تم نے توڑ دیا پتھر مار کے۔"
"وہ پوچھیں گے نہیں ہمارے بارے میں.... کہ وہ کون تھے۔ ان کا حلیہ کیا تھا آخر انہوں نے پتھر کیوں مارا تھا اور پھر تم نے کیا کیا تھا؟"
وہ اُلجھن میں پڑ گیا "معلوم نہیں۔"
"کیا معلوم نہیں؟" محسن بولا۔
"کچھ معلوم نہیں کہ وہ کیا پوچھیں گے..... اور.... میں کیا بتاؤں گا۔ تم بتاؤ نا مجھے۔ میں کیا کہوں اگر وہ مجھ سے پوچھیں۔"
اس کی حالت افسوس ناک اور قابل رحم تھی۔ میرا دل بیک وقت متضاد جذبات کی کشمکش کا شکار تھا۔ مجھے اپنی کوتاہی پر صدمہ تھا کہ میں نے اس کی بازیابی کے لیے سنجیدگی سے کوشش نہیں کی اور صرف جوابی کارروائی کرتا رہا تھا کہ غالب اور نازو کی زندگی محفوظ رہے۔ انہیں جسمانی گزند نہیں پہنچا تھا مگر شکاری بہت چالاک تھے۔ انہوں نے زیر دام آنے والے کے جسم کو نہیں ذہن کو اسیر کرلیا تھا۔ مجھے خوشی بھی تھی کہ غالب جس حال میں بھی ملا زندہ سلامت مل گیا اور خود ہمارے ہاتھوں نہیں مارا گیا ورنہ اس گناہ کا ہم کیا کفارہ ادا کرتے۔
غالب کے ہلاک نہ ہونے کی وجہ اس کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتی تھی کہ محسن نے بم کے کنکشن غلط کردیے تھے یا پھر تار ٹھیک سے نہیں جوڑے تھے کہ بونٹ بند کرتے ہی کوئی جوڑ کھل گیا۔ بات غلطی کی نہیں قدرت کے اشارے کی تھی جس کے بغیر دستِ اجل بے اختیار ہے۔ گولی کا نشانہ خطا ہوجاتا ہے۔ قضا کا تیر ہدف تک نہیں پہنچتا۔ سر بفلک عمارت منہدم ہوجاتی ہے اور ملبے سے تین ہفتے بعد کوئی زندہ نکال لیا جاتا ہے۔ ہوائی جہاز کریش ہوجاتا ہے اور سمندروں یا برف پوش پہاڑوں پر گرنے والا کوئی بچہ محفوظ رہتا ہے۔ ایسے واقعات منظرِ عام پر آتے ہی رہتے ہیں۔
"ہم اس کے ساتھ جاکے دیکھ لیں گے۔"
"لیکن کیا یہ ہمیں لے جائے گا اپنے ساتھ! اور اگر ہم زبردستی بیٹھ گئے تو وہیں جائے گا جہاں پہلے جارہا تھا۔"
میں نے کہا "میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ آخر ہماری اتنی چیخ پکار کے باوجود شوکت رانا کی کوٹھی میں سے کوئی باہر کیوں نہیں آیا؟ اتنا شور سن کے چوکیدار نے بھی نہیں دیکھا۔"
محسن نے سوچ کے کہا "یہ ہوسکتا ہے کہ شوکت رانا اندر ہو۔ کسی ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں جہاں باہر کی آواز نہ پہنچتی ہو۔"
"لیکن چوکیدار تو گیٹ پر موجود تھا۔ اس نے کار کے ہارن پر گیٹ کھولا تھا.... جب ہم نے چیخ کر غالب کو آواز دی تھی تو اس نے ضرور سُنی ہوگی۔ اس نے باہر جھانکا تک نہیں۔ اس کی ایک ہی وجہ ہوسکتی ہے۔"
"وہ کیا؟" محسن نے بے خیالی میں کہا۔
"شاید غالب کا نام اب کچھ اور ہے" میں نے کہا۔
محسن چونکا "رائٹ۔ اس لیے خود غالب بھی متوجہ نہیں ہوا تھا کہ اب وہ خود کو غالب نہیں سمجھتا۔ یہ لفظ اس کے لیے بے معنی ہے۔"
"وہ چونکا ضرور تھا ایک بار۔ اور یہ ایک غیر ارادی حرکت تھی۔ ایک لاشعوری ردِعمل تھا۔ ہم غالب کو پکارتے رہے اور اس کے ذہن نے یہ پکار نہیں سنی مگر لاشعور میں اس نام کی بازگشت نے تحریک پیدا کی تھی۔ رہا چوکیدار تو غالباً اس لیے وہ بھی باہر نہیں آیا کہ کوئی غالب کو آواز دے رہا ہے تو مجھے کیا۔ وہ کسی غالب کو نہیں جانتا اگر اسے ذرا بھی شک ہوجاتا تو وہ فوراً فائرنگ کرتا یا شوکت رانا کو اطلاع دیتا کہ نہ جانے کون پاگل کے بچے ہیں جو آپ کی گاڑی کے پیچھے چلاتے ہوئے دوڑ رہے ہیں اور راستے پتھر بھی مار رہے ہیں پھر شوکت رانا یقیناً تعاقب میں آتا۔ اس کے پاس پرانی گاڑی تو ہے۔"
بظاہر یہ توضیح سمجھ میں آتی تھی اور ان حالات کے پس منظر میں قابلِ قبول محسوس ہوتی تھی مگر اصل حقائق کا علم اس وقت تک نہیں ہوسکتا تھا جب تک غالب خود نہ بتاتا کہ ماجرا کیا ہے۔ وہ پہیہ بدلنے سے فارغ ہوچکا تھا اور ڈکی بند کرکے پھر کار میں بیٹھنے ہی والا تھا کہ میں نے کہا "بات سُنو۔"
وہ رُک گیا اور مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔
"کیا تمہارا نام غالب نہیں ہے؟"
اس نے نفی میں سر ہلایا "غالب کون ہے؟"
بے اختیار مجھے غالب ہی کا شعر یاد آیا۔

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

محسن بولا "اچھا تمہارا نام کیا ہے؟"
اس نے سوچ کے جواب دیا "فیروز۔"

میں نے کہا "غالب۔۔۔ میرا مطلب ہے فیروز۔ اب تم کہاں جاؤ گے؟"

"رانا صاحب کی نئی کوٹھی۔۔۔۔ چھوٹی بیگم صاحبہ آج گھر پر نہیں ہیں نا۔ مجھے رات کو وہیں رہنا ہے۔ مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

محسن بولا "کیا ہم بھی تمہارے ساتھ چلیں؟"

"تم میرے ساتھ نہیں جاسکتے۔ تم بدمعاش ہو' پھر پتھر مارو گے۔۔۔"

"نہیں۔ ہم رات کو تمہارے ساتھ رہیں گے۔ تم اکیلے ہوگے نئی کوٹھی میں تو تمہیں ڈر لگے گا۔"

"میں اکیلا نہیں ہوں وہاں۔"

"اچھا۔ اور کون ہے وہاں؟"

"اور۔۔۔۔ چوکیدار ہے۔ خادمہ ہے۔۔۔ مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

یہ بڑی عجیب بات تھی کہ وہ ہمارے سوالات کا جواب بھی دے رہا تھا اور باربار یہ سوال بھی کررہا تھا کہ تم کیوں پوچھ رہے ہو۔ ایک طرف اسے ہم سے کوئی خوف محسوس نہیں ہوتا تھا تو دوسری طرف ذہن میں یہ خوف رکاوٹ بنا ہوا تھا کہ اسے رانا صاحب کے بارے میں کسی اجنبی سے کوئی بات نہیں کرنی چاہیے۔ یہ بات اسے سمجھائی گئی تھی۔ اس کے ذہن میں بٹھادی گئی تھی لیکن وہ برسوں پرانی باتیں لاشعور کے دفینے سے نکالنا ناممکن تھا جو اس کے اور ہمارے تعلق کی بنیاد تھیں۔ اسے سمجھایا گیا تھا کہ کوئی روکے تو مت رُکنا چنانچہ ہمارے چیخنے چلانے اور پتھر مارنے کے باوجود اس نے گاڑی نہیں روکی تھی۔ وہ ہمیں بدمعاش ہی کہہ رہا تھا اور ہم سے باتیں کرتے ہوئے پریشان یا خوف زدہ بھی نہیں تھا۔ اگر اسے اپنی حفاظت اور دشمن کے خلاف استعمال کرنے کے لیے اسلحہ دیا گیا تھا تو اس نے ابھی تک نکالا نہیں تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ غالب کے ذہن کی سلیٹ پر لکھے ہوئے ناموں کی ترتیب بدل دی گئی تھی۔ دوستوں کے نام کی جگہ دشمنوں کے اور دشمنوں کے نام کی جگہ دوستوں کے نام لکھ دیے گئے تھے اور غالب کو یہ سبق ایسے پڑھایا گیا تھا کہ اس کے ذہن میں ہر نقش کندہ ہوجائے۔ تاہم وقت کے ہاتھ جو تحریر ماہ وسال کے ساتھ لکھتے ہیں وہ ایسی ناپائیدار نہیں ہوتی کہ کوئی چند لمحوں میں یا پھر دو چار دن میں اسے مٹادے۔ یہی خیال میرے لیے امید کی وہ کرن تھا جس پر مجھے بھروسا تھا اور میں سمجھتا تھا کہ غالب اگر آج غالب نہیں ہے تو کل پھر غالب ہوگا۔ اس کی شخصیت کا یہ بدلا ہوا رنگ بہت کچا ہے اصل رنگ کو اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچا ہے۔ تھوڑی سی محنت درکار ہوگی اور آہستہ آہستہ ہم سب کی متفقہ کوشش سے غالب کی اصل شخصیت دوبارہ ابھر کے سامنے آجائے گی۔

فوری مسئلہ یہ تھا کہ ہم غالب کے ساتھ زبردستی کریں اور اسے اپنے ساتھ لے جائیں یا کسی طرح اسے منالیں کہ وہ ہمیں اپنے ساتھ لے جانے پر راضی ہوجائے۔

محسن نے کہا "آخر تم کیوں ڈرتے ہو ہم سے؟"

غالب نے دفاعی انداز میں کہا "اس لیے کہ تم مجھے فیروز نہیں کہتے۔ غالب کہتے ہو۔ رانا صاحب نے کہا تھا کہ جو بھی تم کو غالب کہے وہ تمہارا دوست نہیں' دشمن ہے۔ تم نے پتھر مار کے شیشہ توڑا تھا۔"

میں نے کہا "وہ۔۔۔ غلطی سے لگ گیا تھا۔ ہم تمہارا نقصان پورا کردیں گے۔"

محسن نے کہا "رانا صاحب کو معلوم بھی نہیں ہوگا کہ کسی نے شیشہ توڑا تھا۔ ہم صبح اسے بدلوادیں گے۔"

میں نے کہا "ہم تمہارے دشمن نہیں ہیں۔"

"نہیں۔ تم مجھے غالب کہتے ہو۔ تم دشمن ہو" غالب کا فیصلہ اٹل تھا۔

"بھئی فیروز' مجھے غلط فہمی ہوگئی تھی پھر اب ہم دوست ہیں تمہارے۔ ملاؤ ہاتھ اسی بات پر" محسن نے ایک چال چلی۔

خلافِ توقع یہ چال کامیاب رہی۔ غالب نے ہاتھ بڑھایا "پھر تو میں بھی تمہارا دوست ہوں۔ مجھے غالب مت سمجھنا۔"

"مجھ سے بھی دوستی کرلو" میں نے ہاتھ بڑھایا "مجھ سے غلط فہمی ہوگئی تھی کہ تمہیں غالب سمجھا۔ تو تم فیروز ہو؟"

وہ ایسے مسکرانے لگا کہ مجھے مزید دکھ ہوا "ہاں میں فیروز ہوں۔"

محسن نے کہا "اب ہم تمہارے ساتھ چلیں۔ تم بتادینا چوکیدار کو کہ ہم تمہارے دوست ہیں۔ ہم رات بھر باتیں کریں گے۔"

اس نے نفی میں سرہلایا "رانا صاحب کا حکم ہے کہ کوئی اندر نہیں جائے گا۔ جب تک خود چوکیدار اسے نہ پہچانے یا رانا صاحب کی اجازت نہ ملے۔ خیر میں پوچھ لوں گا رانا صاحب سے۔"

"کیا پوچھو گے؟"

"یہی۔۔۔ کہ میں اپنے ساتھ دو دوستوں کو اندر لے جاؤں مگر رات بھر کیا باتیں کریں گے ہم؟"

میں نے کہا "۔۔۔۔ رات بھر کیا باتیں کریں گے ہم۔ چھوڑو' رانا صاحب سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ بس ہم تمہارے ساتھ چلتے ہیں۔ جہاں رانا صاحب کی نئی کوٹھی ہے نا۔ وہیں میرے بڑے بھائی رہتے ہیں۔ عبدالودود منظر۔"

یہ نام سن کر وہ چونکا نہیں مگر اس کی آنکھیں سوچ میں ڈوبی ہوئی نظر آنے لگیں۔ "عبدالودود منظر۔ کیا وہ۔۔۔ وکیل ہیں۔"

میں۔۔۔ خوش ہوکے کہا "ہاں ہاں کیا تم جانتے ہو انہیں؟"

اس نے۔۔۔ "ہاں۔ اُدھر ہی کہیں رہتے ہیں وہ۔"

"میرے دوست بھی ہیں وہاں۔۔۔۔ وقار یوسف' اسی علاقے میں۔"

ردِعمل کے نتیجے میں غالب وحشت یا جنون میں مبتلا ہوجائے جارحانہ انداز اختیار کرے۔ وہ بھی رانا کا دشمن تھا اور یہ سب کچھ بلکہ اس سے کہیں زیادہ غالب کے ساتھ بھی ہوا ہوتا اور نازو کے ساتھ بھی۔

میں نے فوراً موضوع بدل دیا "اچھا فیروز۔ اب تو ہم دوست ہیں لیکن تم نے ابھی تک اپنے دوستوں کے نام نہیں پوچھے۔"

محسن نے بھی کہا "کیا تمہیں ہمارے نام پہلے سے معلوم ہیں؟"

غالب نے بے یقینی سے کہا "نہیں۔۔۔ کیا نام ہیں تمہارے؟"

میں نے کہا "میرا نام ہے استاد پیڈرو۔"

محسن بولا "میں چوہدری دلاور ہوں۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو" غالب نے کہا "وہ تو رانا صاحب کے دوست ہیں' میرے نہیں۔"

میں نے کہا "ہم مذاق کررہے تھے یار۔ میرا نام ہے اکرام شیخ۔"

وہ چونکا "اکرام شیخ کیا تم پولیس میں تھے پہلے؟"

"بالکل ٹھیک۔ اب میں ٹیکسی چلاتا ہوں' بتاؤ کہاں؟"

"کراچی میں" غالب بولا اور پھر اپنی بات پر خوش ہوا۔

اب محسن نے اس کی یادداشت کو ایک اور جھٹکا دیا "میرا نام غازی ہے۔ بتاؤ میں کیا کرتا ہوں؟"

غالب پھر چونکا "تم۔۔۔ تم صحافی ہو۔۔۔ اخبار والے۔"

"رائٹ۔ یہ بتاؤ کس اخبار میں کام کرتا ہوں میں؟"

غالب نے اپنے اخبار کا نام بتادیا۔ اسے بہت کچھ یاد تھا۔ اس کے ذہن سے صرف وہ باتیں محو ہوئی تھیں جن کا تعلق براہِ راست شوکت رانا یا چوہدری دلاور کے معاملات سے تھا اور جو بہت زیادہ پرانی نہیں تھیں۔ ظاہر ہے اتنے کم عرصے میں تمام عمر کی یادوں کے نقوش مٹانا عملاً ناممکن تھا۔

اس وقت تک میں طے کرچکا تھا کہ آج رات ہمارا لائحہ عمل کیا ہوگا۔ میں نے محسن سے فرنچ میں کہا "ابھی اتنا کافی ہے۔ اس کے سامنے اور کسی کا نام لینے کی ضرورت نہیں۔ ایسا نہ ہو زیادہ دباؤ کا الٹا اثر ہوجائے۔"

"تم جس نام سے ڈر رہے ہونا۔ وہ میں بھی نہیں لوں گا" محسن نے نازو کا نام لیے بغیر کہا۔

میں نے کہا "ہم آج رات ہی کارروائی کریں گے۔"

"کسی تیاری کے بغیر؟"

"تیاری کی ضرورت نہیں۔ جیسا کہ اس نے بتایا۔ اندر ایک خادمہ ہے اور ایک چوکیدار۔ ان سے نمٹا جاسکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"تمہارا کیا خیال ہے وہ خادمہ وہی ہے؟"

"وہ ہوسکتی ہے" میں نے بھی نازو کا نام لینے سے گریز کیا۔

غالب نے پھر اقرار میں سرہلایا "رانا صاحب ذکر کررہے تھے۔"

"تم ہمیں رانا صاحب کی کوٹھی کے دروازے پر اُتار دینا۔ تم اندر چلے جانا۔ ہم اپنے بھائی کے گھر پیدل چلے جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے" غالب مان گیا۔

اگلی سیٹ پر غالب کے ساتھ میں اور پیچھے محسن بیٹھ گیا۔ غالب بالکل کسی ڈمی یا روبوٹ کی طرح ہوگیا تھا۔ اس کا چہرہ بے جان اور سپاٹ ہر احساس سے عاری لگتا تھا لیکن اب میں بہت زیادہ پُرامید تھا۔ منظر اور وقار یوسف کے نام سن کے غالب کو یاد آگیا تھا کہ وہ وکیل ہیں۔ یادوں کا سلسلہ ایک زنجیر کی طرح ہوتا ہے جو حلقہ درحلقہ پیوست ہوں اگر درمیان کی کڑی ٹوٹ جائے تو یادداشت ادھوری رہ جاتی ہے اور کسی بھی شخص کو دوبارہ اپنے ماضی سے جوڑنے کے لیے تمام ٹوٹی ہوئی کڑیوں کو آپس میں جوڑنا ضروری ہوتا ہے۔ اب مجھے یہ کام بہت آسان محسوس ہونے لگا تھا۔ غالب دوبارہ ہمارے درمیان ہوگا اور اسے پھر وہی جانا پہچانا اور پُرخلوص رشتوں کا محبت بھرا ماحول ملے گا تو بحالی کا عمل تیز سے تیز تر ہوجائے گا۔

محسن نے شیشے کے ذرات کو کپڑے سے جھاڑ کر اپنے لیے جگہ بنائی تو غالب کی صورت پر پھر پریشانی کے آثار عیاں ہوئے "تم نیا شیشہ لگوادو گے نا۔ تم نے کہا تھا۔"

"ہاں۔ فیروز ہم دوست ہیں۔ دوست جھوٹ نہیں بولتے۔"

"اچھا تو پھر لگوادو۔"

"ابھی؟ اس وقت۔۔۔!" محسن نے حیرانی سے کہا "اس وقت تو سب دکانیں بند ہوں گی فیروز۔ یہ کام تو صبح ہی ہوگا۔"

"اچھا۔ پھر تو رانا صاحب کو معلوم ہوجائے گا۔" غالب نے گاڑی چلاتے ہوئے کہا "ابھی چوکیدار دیکھ لے گا۔"

"تم جھوٹ نہیں بول سکتے؟"

"میں جھوٹ نہیں بول سکتا" غالب نے قطعی لہجے میں محسن کی بات کاٹ دی۔

میں نے کہا "فیروز۔ کیا تم اپنے دوستوں کو بچانے کے لئے کچھ نہیں کرسکتے۔ تمہارے دوستوں کو ماریں گے رانا صاحب۔ بجلی کے جھٹکے دیں گے۔"

غالب کا ہاتھ ایک دم اسٹیئرنگ پر سخت ہوگیا اور وہ خوف زدہ نظر آنے لگا "بجلی کے جھٹکے دیں گے۔ ننگا کرکے۔"

"ہاں ننگا کرکے" میں نے کہا "تمہیں معلوم ہے نا وہ دشمنوں کے ساتھ کیسا سلوک کرتے ہیں۔ انہیں کہاں رکھتے ہیں۔"

اس نے اقرار میں سرہلایا "ان کو۔۔۔ نیچے رکھتے ہیں۔ ہال میں جہاں بہت تیز روشنی ہوتی ہے۔ اور سونے نہیں دیتے کسی کو۔"

ظاہر ہے غالب وہ سب بتارہا تھا جو اس پر بیتی تھی مگر میں نہیں چاہتا تھا کہ اس وقت یادوں کا یہ سلسلہ دراز ہو اور کسی ناخوش گوار

"گھر پر سب ہمارے لیے متفکر ہوں گے۔ انہیں بتادینا چاہیے کہیں سے فون کرکے۔"

میں نے کہا "اگر موقع ملا تو بتادیں گے۔"

غالب اچانک بولا ... رہے ہو۔"

میں نے کہا "تم ... چلا؟ کیا تم فرنچ جانتے ہو۔"

محسن نے کہا "کیا پہلے کسی کو فرنچ بولتے سُنا ہے تم نے۔"

"ہاں۔ مگر یاد نہیں آتا کہ کون بولتا تھا۔ یہ رانا صاحب کی کوٹھی آگئی۔" اس نے گلبرگ کے علاقے میں پہنچ کے کہا "اگلے موڑ پر ہے۔"

"اچھا۔ تو پھر ہمیں اُتار دو یہاں۔ ہمیں ادھر جانا ہے" میں نے دائیں جانب اشارہ کیا اور گاڑی رک گئی۔

ہمارے اُترتے ہی غالب نے گاڑی آگے بڑھادی۔ موڑ پر سے ہم نے اسے چھٹی یا ساتویں کوٹھی کے سامنے رکتے دیکھا۔ یہ گلبرگ کا نیا اور جدید ترین علاقہ تھا جہاں رہنے والوں کے لیے صرف دولت مند ہونے کی شرط پوری کرنا کافی نہیں تھا۔ ان کا انتہائی دولت مند ہونا ضروری تھا۔ وضع قطع طرزِ تعمیر اور زیبائش و آرائش میں ہر کوٹھی اپنی مثال آپ تھی۔ ان میں رہنے والے بھی بہت قیمتی لوگ تھے چنانچہ ان کی حفاظت کے لیے فصیل جیسی دیواریں تھیں اور الیکٹرانک لاک والے فولادی دروازے تھے۔ مسلح دربان تھے اور ہر گوشے کو منور کرنے والی سرچ لائٹس میں خوں خوار کتے آزادانہ پھرتے تھے جو اپنے پرائے کا فرق سونگھ کے جان لیتے تھے۔

میں اور محسن ویران سڑک پر سے گزرے تو غالب کی کار کوٹھی کے اندر جاچکی تھی اور گیٹ بند ہو جانے کے بعد اندر کا منظر کسی درز سے بھی نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔ ہم اس کے سامنے سے سیدھے گزرے۔

میں نے سست رفتاری سے چلتے ہوئے دونوں طرف سے متصل کوٹھیوں کا جائزہ لیا "کیا چوکیدار نے دیکھ لیا ہوگا کہ نئی کار کا پچھلا شیشہ غائب ہے؟"

محسن بولا "شوکت رانا کے چوکیدار کی کوئی چیز خراب نہیں ہوسکتی' نہ آنکھیں۔ نہ صحت' نہ بندوق اور نہ اس کا نشانہ۔"

"بعض اوقات بالکل صاف اور شفاف شیشہ دکھائی نہیں دیتا۔ اس کی موجودگی کا احساس دلانے کے لیے کوئی اسٹکر لگادیا جاتا ہے یا اس پر کچھ لکھ دیتے ہیں۔ ایسا اکثر ہوتا ہے کہ رات کے وقت کار کی کھڑکی کا کوئی شیشہ کھلا رہ جاتا ہے مگر پتا نہیں چلتا۔"

"بات اگر امکان کی ہے۔ تو میں اسے ناممکن نہیں سمجھتا کہ گاڑی چوکیدار کے پاس سے گزر گئی ہو اور اس کو پتا نہ چلا ہو کہ نئی گاڑی کے پیچھے والا شیشہ تو ہے ہی نہیں۔ ایک تو اس کی نظر کا دھوکا پھر عقل کے لیے یہ غیر متوقع مگر اس سے زیادہ حقیقت سے بے خبری کا سبب یہ ہوگا کہ گاڑی کے اندر داخل ہو جانے کے بعد چوکیدار کو خیال ہوگا گیٹ پھر بند کرنے کا۔ سامنے والا ونڈ اسکرین نہ ہوتا تو وہ گاڑی کو دیکھتے ہی تاڑ جاتا مگر پچھلے شیشے کو شاید اس نے دیکھا ہی نہ ہو۔ وہ گاڑی کے گزرتے ہی پلٹ گیا ہوگا۔"

"کیا غالب اسے بتائے گا' ہمارے بارے میں؟"

"میرا خیال ہے کہ نہیں۔ وہ اب پہلے سے زیادہ کنفیوژن کا شکار ہے۔ اسے برین واش کرنے والوں نے بہت اچھی طرح دوست اور دشمن کا فرق سمجھایا ہوگا مگر ہم سے مل کے ہماری صورتیں دیکھ کے اور ہماری باتوں سے غالب ڈانواڈول ہو رہا ہے۔ اس کے لاشعور میں ہمارے لیے دوستی اور خلوص' ہمدردی اور رفاقت کے جو جذبات دبادیے گئے تھے وہ پھر جاگ چکے ہیں۔ وہ بے یقینی میں مبتلا ہے۔ اگر آج رات ہی شوکت رانا اس کے سامنے آجائے اور اپنے طریقے سے پوچھے تو شاید وہ سب سچ بتادے۔ وہ شوکت رانا کے نفسیاتی خوف کے حلقۂ اثر سے نکلنا تو چاہتا ہے مگر ایسی کوشش کرتے ہوئے ڈرتا بھی ہے۔ ہر قیدی اپنی زنجیر چھپ کے کاٹتا ہے۔ اس وقت جب جیلر سامنے نہ ہو۔ جیلر کے سامنے تو وہ ذہنی اور جسمانی طور پر مغلوب اور مظلوم رہتا ہے۔ ذہنی و جسمانی طور پر مفلوج ہو جاتا ہے۔"

"آج رات شاید غالب اور شوکت رانا کی ملاقات نہیں ہوگی۔ اس کا مطلب ہے غالب پر ہماری باتوں کا اثر باقی رہے گا۔ اس کا لاشعور کروٹیں بدلتا رہے گا اور اسے سوچنے پر یاد کرنے پر مجبور کرتا رہے گا۔"

"ہاں۔ اور اگر ہم نے اسے آج رات ہی یہاں سے نہ نکالا تو صبح وہ ہمارے بارے میں رانا کو تفصیل سے ہر بات بتادے گا۔ یہ تو ناممکن ہے کہ رانا صبح شیشہ ٹوٹا ہوا دیکھے اور غالب سے کچھ نہ پوچھے۔ ویسے بھی آج موقع اچھا ہے۔ نئی بیگم صاحبہ بھی موجود نہیں ہیں۔ چوکیدار بھی زیادہ بے فکر ہوگا اور خادمہ بھی چین سے سوئے گی۔ یار تو نازو کی بات کر رہا ہے' وہ خادمہ نازو ہو سکتی ہے۔"

میں نے کہا "نہیں یار۔ نہ جانے کیوں میرا ذہن یہ تسلیم نہیں کرتا کہ نازو اس کوٹھی میں شوکت رانا کی خادمہ بن کے رہ سکتی ہے۔ وہ آسانی سے زیر ہونے والی چیز نہیں ہے۔ اس کو جسمانی طور پر شکست دینا بھی آسان نہیں تھا مگر ایک عورت بہرحال عورت ہوتی ہے۔ نازو کو بھی مغلوب کیا جاسکتا ہے مگر اس کی قوتِ ارادی بھی بہت زبردست ہے محسن۔ وہ انتہائی ذہین اور چالاک بھی ہے۔"

"لیکن انتہائی حسین عورت ہے" محسن بولا۔

"ہاں۔ حسین جوان اور پُرکشش" میں نے کہا "وہ شوکت رانا جیسے شخص کے گھر میں ہوگی تو خادمہ نہیں ہوگی۔ اگر ذہنی طور پر اس کی حالت بھی ویسی ہی فرض کرلی جائے جیسی ہم نے غالب کی دیکھی ہے تو پھر وہ شوکت رانا کے بیڈ روم میں ہوگی۔ خادمہ کے طور پر نہیں۔ داشتہ کے طور پر...یا...."

تھا۔ ہر گیٹ بند تھا اور چوکیدار بھی باہر نظر نہیں آرہے تھے۔ ...ڑے ہوئے چوکیدار کو قابو کرنا آسان ہوتا ہے اور اس کے ...چور ڈاکو بے خوفی سے گھر میں داخل ہو کے اپنی کارروائی جاری ...رکھتے ہیں مگر تجربے نے لوگوں کو سیانا بنادیا تھا۔ اب چوکیدار ...گیٹ کی آنکھ جیسی کھڑکی سے جھانک کر آنے والوں کی ...بہت پہلے دیکھتے تھے اور ذرا بھی شک ہو تو الارم آن کردیتے ...

اتنی دیر میں دو کاریں ہمارے پاس سے گزری تھیں مگر ہم چلتے ...مشکوک نظر نہیں آتے تھے چنانچہ کسی نے ہماری چہل قدمی پر ...اعتراض کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی۔ اصل مسئلہ ...شوکت رانا صاحب کی کوٹھی کے اندر داخل ہونے کا تھا۔ باقی سب ...خدشات اور امکانات تھے جن پر ہم کافی بحث کرچکے تھے۔

تیسرے چکر میں ہم اس کوٹھی سے چند قدم ہی آگے گئے تھے ...میرے کانوں نے ایک چیخ کی آواز سُنی۔ یہ آواز محسن نے بھی ...سُنی تھی۔ چیخ کسی عورت کی تھی۔ ہم دونوں کے قدم خود بخود رک ...گئے۔

دوسری بار چیخ زیادہ واضح تھی۔ وہ عورت مدد کے لیے پکار رہی ...تھی مگر اس کی آواز جیسے اچانک دبادی گئی۔ وہ پھر چلائی اور شاید پھر ...کسی نے اس کا منہ بند کردیا۔ اس چیخ میں دکھ اور کرب کے ساتھ ...اپنے بے بس اور کمزور ہونے کا اعتراف تھا اور یہ ناامیدی کی انتہا ...تھی۔ اسے علم نہیں تھا کہ خدا نے اس کی دعا نہیں سنی اور ہو بھی ...سکتا تھا۔ اب وہ خدا کے بندوں سے فریاد کر رہی تھی کہ عرش ...تک تو میری آواز نہیں پہنچی۔ کیا کوئی فرش کا مکیں میری مدد کے لیے ...آئے گا۔ مگر اوپر سے حکم نہ ہوتا تو شاید عین اس وقت ہم یہاں ...موجود ہی نہ ہوتے جب اس عورت نے چیخ ماری تھی اور یہ حکم ...بہرحال اس عورت کی دعا پر ہی صادر ہوا تھا۔

میں نے کہا "محسن۔ اس بنگلے میں کیا ہو رہا ہے آخر؟"

محسن نے کہا "جو کچھ بھی ہو رہا ہے۔ اچھا تو نہیں ہو رہا ہے ...لیکن ہم کیا کریں؟"

"یار۔ یہ تو بڑی.... افسوسناک بے حسی ہوگی.... اگر ہم نے ...کچھ بھی نہ کیا۔ سُنا نہیں وہ کیسے چیخ رہی تھی۔"

"آس پاس اور لوگ بھی رہتے ہیں۔ انہوں نے بھی سُنا ہوگا۔ ...یا ہمارا روز سُنتے ہوں۔ شرابی شوہر بیوی کو مارتا ہو...."

"اگر ہم پوچھ لیں تو اس میں کوئی غیر اخلاقی یا غیر قانونی بات ...زیادہ سے زیادہ شوہر کہے گا کہ دفع ہو جاؤ۔ یہ میری بیوی ہے ...ہماری۔ اور بیوی بھی اس کی تائید کرے گی کہ ہاں جی' ہمارا ...میاں بیوی کا معاملہ ہے۔ تم بھلا کون ہوتے ہو دخل دینے والے۔ پھر ہم ...بے عزت ہو کے لوٹ جائیں گے۔"

"بے عزتی کرانے کے بہتر طریقے بھی ہیں۔ اور یہ شوق کسی ...اور موقع پر پورا کرلیں آپ۔"

محسن سمجھ گیا "یا نئی بیگم کے روپ میں۔ یہی کہنا چاہتا ہے تو؟"

"ہاں۔ اس تلخ حقیقت کو نگلنے یا اُگلنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ ایسا ہو سکتا ہے محسن۔ یہ ناممکن نہیں ہے۔ خدا اسے بُرے وقت سے بچائے۔"

"او مائی گاڈ!" محسن نے ایک ہاتھ پیشانی پر رکھا "بے چارا غالب اتنا لاچار اور مجبور بھی ہو سکتا ہے۔ نہیں یار' اگر ایسا ہوتا تو غالب بالکل پاگل ہو جاتا۔ اس حد تک کہ خود کو ہلاک کرلیتا۔ یا شوکت رانا کی جان لے لیتا۔"

"اسی لیے تو میں بھی یہ سمجھتا ہوں کہ خادمہ کوئی عام عورت ہوگی۔ نازو نہیں' اگر میری اور تیری صورت سے۔ منظر یا وقار یوسف اور اکرام شیخ کے نام سے غالب کے ذہن کو جھٹکا لگتا ہے تو نازو سے اس کی مکمل جذباتی بے نیازی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ شوکت رانا اتنا بے وقوف نہیں کہ نازو کو غالب کے سامنے لانے کا رسک لے۔ نازو سے اس کی محبت کا جذبہ نہ اسیر کیا جاسکتا ہے اور نہ مجبور۔ اسے صرف موت آسکتی ہے۔ نازو نہ رہے یا غالب مرجائے تو یہ محبت ختم ہو سکتی ہے۔ اس سے پہلے کوئی شوکت رانا یا چوہدری دلاور کچھ بھی نہیں کرسکتا۔ نازو جب بھی سامنے آئے گی غالب کے وجود میں بھڑکنے والا اس کی محبت کا آتش فشاں پھر روشن ہو جائے گا۔ اتنی ہی شدت کے ساتھ۔"

محسن نے کہا "میں یہ بات مانتا ہوں مگر نازو کو ذریعہ تو بنایا جاسکتا ہے۔ غالب کی کمزوری ہے نازو تو نازو کی کمزوری بھی غالب ہی ہے۔ کیا نازو کی زندگی کی ضمانت پر غالب کو غلامی کا طوق پہننے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا اور کیا اسی طرح غالب کو ظلم و تشدد سے بچانے کے لیے نازو بھی شوکت رانا کی ہر جائز ناجائز بات ماننے پر راضی نہیں ہو سکتی؟ اس کے ہر مطالبے پر سرِ تسلیم خم نہیں کرسکتی۔"

میں نے کمزور لہجے میں کہا "ایسا تو ہوتا ہے۔ ایسی محبت ہر قربانی دے سکتی ہے۔ جان و مال کی بھی' آبرو کی بھی۔ اپنے لیے نہیں صرف اپنے محبوب کی خاطر۔"

محسن تلخی سے بولا "اگر شوکت رانا غالب سے جان نہیں مانگتا تو آخر کیوں؟ صرف اس لیے کہ پھر وہ سودا کرنے کی پوزیشن میں نہیں رہتا۔ غالب کی زندگی کے بدلے میں نازو سے وہ کیا سودا کرسکتا ہے۔"

"نہیں یار!" میں نے کہا "خدا نہ کرے۔ خدا نہ کرے کہ اس قسم کی صورتِ حال درپیش ہو۔ ایسی صورت میں نازو کوئی سودا نہیں کرے گی۔ وہ اپنی جان کی بازی لگادے گی مگر غالب کو خود پہلے مار ڈالے گی۔"

ہم اس مختصر سی سڑک پر تیسرا چکر لگا رہے تھے جس کے دونوں طرف شاید دس دس کوٹھیاں تھیں مگر ہمیں دیکھنے والا کوئی بھی

میں نے اس کی بات کاٹ دی "محسن۔ اس امکان پر غور فرماکہ شاید ایسے ہمیں اندر جانے کا موقع مل جائے اور اندر جا کے ہم پڑوس والے شوکت رانا صاحب کے بارے میں معلومات حاصل کر سکیں یا کوئی راستہ نکل آئے ساتھ والے گھر میں داخل ہونے کا۔"

محسن نے میری بات کو اہمیت نہیں دی تھی اور میں بھی یہ سوچ کے خاموش ہو گیا تھا کہ شاید عملاً یہ ممکن نہیں۔ دو دو کنال کی ان کوٹھیوں میں عام لوگ نہیں رہتے کہ راہ چلتے جس کا جی چاہے اندر داخل ہو جائے اور ان کے نجی معاملات میں ٹانگ اڑانے لگے۔ ایسی کوٹھیوں میں کیا نہیں ہوتا۔ بیوی کی تو بات ہی اور ہے۔ جاہل اور پڑھے لکھے۔ نچلے طبقے کے اور طبقہ اشراف سے تعلق رکھنے والے۔ مشرق کے غیر مہذب اور مغرب کی روشن خیال سوسائٹی کے جمہوری مزاج رکھنے والے۔ ہر قسم کے شوہر بیویوں کو مارتے ہیں۔ وہ چیختی چلاتی ہیں اور اس کے باوجود انہی کے ساتھ زندگی گزار دیتی ہیں لیکن بیوی کے علاوہ بھی نہ جانے کتنی مجبور اور کمزور عورتیں ایسے ہی چیخ چیخ کر ساری دنیا کے عشرت کدوں، قحبہ خانوں سے، کوٹھوں سے اور کوٹھیوں سے۔ تھانوں سے اور عقوبت خانوں سے مردوں کی مردانگی کے خلاف فریاد کرتی ہیں۔ اپنے جسم اور اپنی روح پر ہونے والے تشدد پر چلاتی ہیں، اپنی آبرو پر ڈاکا ڈالنے والوں سے بچانے والے دست غیب کو پکارتی ہیں۔ معاشرے کے سورماؤں کو اور فلمی ہیرو کو آواز دیتی ہیں مگر ان کی مدد کے لیے کوئی نہیں آتا۔

میں نے قدم آگے بڑھایا ہی تھا کہ عورت نے پھر چیخ ماری "خدا کے لیے، رسول کے لیے، مجھے جانے دو، مجھے چھوڑ دو۔"

اس بار یہ آواز گیٹ کے پیچھے بہت قریب سے آئی تھی لیکن پھر کسی نے آواز کو دبا دیا۔ وہ چیخ گھٹ کر رہ گئی۔

"حرام زادی" کسی مردنے کتے کی طرح غرا کے کہا۔

عورت شاید پھر آزاد ہو گئی۔ اس نے چیخ کے کہا "کوئی بچاؤ" مگر اب یہ آواز اندر کچھ فاصلے سے آئی تھی۔ کوئی دروازہ بند ہوا اور آواز بھی بند ہو گئی۔

میں نے چشم تصور میں دیکھا کہ ایک مجبور و مظلوم عورت جان یا عزت بچانے کی جدوجہد میں تنہا ہے۔ اس کے مقابل خونخوار بھیڑیئے جیسی سفاک فطرت والا طاقتور مرد ہے۔ یا ہوس کے شیطانی جذبات سے مغلوب شیطانی ٹولہ ہے اور وہ اکیلی ہی ان سے لڑ رہی ہے۔ ایک ایسی لڑائی جس میں کوئی اس کے ساتھ نہیں اور جو بالآخر اسے ہارنی ہے۔ وہ ایک بار ان کے چنگل سے نکل آئی تھی لیکن وہ پھر اسے پکڑ کر اندر لے گئے ہیں۔

یہ صرف چند سیکنڈ کی بات تھی پھر میں نے اور محسن نے ایک ساتھ گیٹ کا رخ کیا۔ وہاں کال بیل کوئی نہیں تھی۔ کال بیل چھوٹے لوگ لگاتے ہیں جن کے دروازے پر آکے سیلز مین۔ فقیر اور غریب رشتے دار قرض خواہ کوئی بھی بٹن پر انگلی رکھ دیتا ہے تو انہیں دروازے تک آنا پڑتا ہے۔ بھی بھری دوپہر میں کبھی آدھی رات کو۔ بڑے لوگ ایسے ناپسندیدہ ملاقاتیوں سے محفوظ رہنے کے لیے گیٹ پر چوکیدار بٹھاتے ہیں جو آنے والے کی صورت دیکھ کے اور موقع محل دیکھ کے دروازہ کھولتا ہے یا انٹر کام پر اندر صاحب اور بیگم صاحبہ سے اجازت طلب کرتا ہے کہ اس حلیے کے اور اس نام کے ملاقاتی سے کیا کہا جائے۔ یہ کہ دفع ہو جاؤ، یا یہ کہ صاحب سو رہے ہیں، بیگم صاحبہ کے ساتھ باہر گئے ہیں۔ گھر سے باہر گئے ہیں۔ شہر سے باہر یا ملک سے باہر؟ یہ کچھ پتا نہیں۔ پرانے چوکیدار تو ایسے صورت شناس ہو جاتے ہیں کہ فوراً ہی طے کر لیتے ہیں کہ کون ملاقاتی اس قابل ہے کہ اسے اندر جانے دیا جائے اور کسے دروازے کے باہر ہی سے لوٹا دیا جائے۔

یہاں بھی ایسا ہی معاملہ تھا۔ میں نے دروازہ بجایا مگر نہ کسی نے اندر سے جھانک کے دیکھا اور نہ یہ پوچھا کہ کون دروازہ توڑ رہا ہے۔ ہمارے دروازہ بجانے کا انداز ہی ایسا تھا۔

میں نے کہا "میاں محسن شیروانی۔ یاد کرو محمد بن قاسم کو۔ وہ کہاں سے ایک لڑکی کی فریاد سن کے آیا تھا۔ اس کی راہ میں سمندر نہیں حائل ہوا تھا۔ ہم کیا یہ گیٹ بند دیکھ کے لوٹ جائیں گے۔"

محسن نے کہا "ویسے تو ہم محمد بن قاسم نہیں ہیں مگر اس وقت میری جذباتی کیفیت وہی ہے۔"

میں نے دوبارہ گیٹ پر لات ماری مگر اندر خاموشی رہی۔ مجھے حیرانی تھی کہ پڑوس کی کوٹھی کا چوکیدار بھی نہ عورت کی چیخ پر باہر آیا تھا اور نہ آس پاس کی کسی کوٹھی سے کوئی نکلا تھا۔ چوکیدار شاید مجبور تھے۔ ان کو حکم ہو گا کہ باہر قیامت آجائے تب بھی وہ اپنی جگہ سے نہ ہلیں۔ یا پھر محسن کی بات ٹھیک تھی کہ لوگ ایسی چیخوں کے عادی تھے۔

"اگر ہم گیٹ کے اوپر سے اندر کود جائیں، تو کیا ہوگا؟"

محسن بولا "شاید ایک فائر۔ ویسے یہ جرم ہے زیر دفعہ ض ف ۴۴۹....."

میں نے کہا "لعنت تجھ پر اور تیرے ضابطہ فوجداری پر" اور گیٹ پر چڑھ گیا۔

گیٹ آٹھ نو فٹ اونچا تھا مگر اس کے آہنی فریم پر بنے ہوئے نقش و نگار اور گرل کے ڈیزائن پر قدم جمانا آسان تھا۔ اوپر والے حصے پر نوکدار سلاخوں نے تھوڑی سی مشکل پیدا کی مگر اندر جھانکنے کے بعد جب مجھے یہ اطمینان حاصل ہو گیا کہ فائر کرنے والا چوکیدار کوئی نہیں تو میرا حوصلہ بڑھ گیا۔ میں سرکس کے بازیگر کی مشاقی کے ساتھ اندر اترا۔ سلاخوں میں الجھ کر میرا کوٹ اور پتلون دونوں پھٹ گئے۔ محسن کو پہلے سے اندر موجود پا کے مجھے حیرانی ہوئی "آپ کیا ہائی ائر تشریف لائے ہیں۔" میں نے کہا "ہیلی کوپٹر میں؟"

محسن نے دیوار کی طرف اشارہ کیا "یہ شارٹ کٹ ہے۔ آپ نے مشکل راستہ چنا تھا۔"

ہمارے سامنے وسیع لان پھیلا ہوا تھا جس پر گارڈن چیئر رکھی گئی تھیں مگر ان میں سے دو الٹی ہوئی تھیں۔ بائیں جانب ڈرائیووے پر ایک ہی لمبی سی بیش قیمت کار چم چم کر رہی تھی۔ پورچ لائٹ کے سوا باہر کی کوئی لائٹ نہیں جل رہی تھی حالانکہ مجھے سرچ لائٹس اور گارڈن لائٹس صاف نظر آرہی تھیں۔ اس بلیک آؤٹ نے ماحول کو زیادہ پُراسرار اور مجرمانہ بنا دیا تھا۔

میں اور محسن آگے بڑھتے ہوئے بہت محتاط تھے۔ ٹریس پاس کرنے یعنی کسی کی ذاتی حدود میں بلا قانونی جواز کے مداخلت کرنے کا جرم ہم کر چکے تھے۔ اگر ہم پکڑے جاتے تو یہ عذر قانون کی نظر میں فضول بہانہ سمجھا جاتا کہ ایک درد بھری فریاد سن کے ہمارے ضمیر نے ہمیں مجبور کر دیا تھا کہ ہم اپنا انسانی اور اخلاقی فرض ادا کریں۔ اب ہمیں اپنا دفاع بھی خود ہی کرنا تھا۔

ابھی ہم پورچ تک بھی نہیں پہنچے تھے کہ ایک ساتھ دو کتے بھونکتے ہوئے ہم پر حملہ آور ہوئے اگر ہم پرانے محاورے پر بھروسا کرتے تو بھونکنے والے کتے کاٹ بھی لیتے۔ وہ سائز میں گدھے سے کچھ ہی کم تھے اور ان کے بھونکنے کی آواز بھی دل دہلاتی تھی۔ خوں آشامی ان کے تیور سے عیاں تھی۔

محسن تو چلایا "یار مروا دیا نا" اور سرپٹ سیدھا دوڑا۔ مجھے بس اتنی ہی مہلت ملی کہ میں ایک کتے کو فٹ بال سمجھ کے ایسی کک ماروں جیسی گول کیپر مارتے ہیں تو بال کو گراؤنڈ کے دوسرے حصے میں پہنچا دیتے ہیں۔ کتا خود ہی بوٹ کی ٹو پر آگیا اور ٹھوکر اس کی تھوتھنی پر لگی۔ ایک دم اس کی آواز بدل گئی۔ اس کا سارا غصہ ختم ہو گیا اور وہ درد سے چلانے لگا۔ میری کک جان لیوا ثابت ہوئی۔ کتا وہیں گر کے لوٹنے لگا اور بھیانک آوازیں نکالنے لگا۔

دوسرا کتا محسن کی طرف لپکا تھا مگر محسن پورچ کے گول ستون کی آڑ میں اس کے ساتھ ڈانس کر رہا تھا۔ کتا اس کی طرف آتا تو وہ گھوم کے دوسری طرف چلا جاتا۔ وہ دو فٹ قطر کے اس ستون کے چاروں طرف چکر لگا رہے تھے۔ محسن اسے گالیاں دے رہا تھا "ابے جان چھوڑ میری۔ کتے کے بچے۔ مجھے کاٹے گا تو خود پاگل ہو جائے گا۔ تیری تو ایسی کی تیسی۔ تیرا باپ بھی مجھے نہیں پکڑ سکتا۔ دیکھ..... وہ دیکھ۔ مارا گیا تیرا بھائی۔ اب تیری باری ہے۔"

اس وقت تک میں بھی اس کی مدد کے لیے تیار تھا مگر شور سن کے اندر سے ایک شخص عجیب و غریب حلیے میں برآمد ہو چکا تھا۔ صرف انڈر ویئر میں اپنے بھاری بھرکم بالوں بھرے جسم کے ساتھ وہ انسان کم اور بھالو زیادہ لگتا تھا۔ اندر کہیں وہ عورت پھر شور مچا رہی تھی اور کسی بند دروازے کو کوٹ رہی تھی۔ بھالو اس کی طرف سے بھی پریشان تھا۔

"کون..... کون ہو تم۔ یہ کیا کر رہے ہو....." اس نے گرجنے کی کوشش کی مگر لکنت کے باعث اس کی آواز میں ہچکی آگئی۔

میں نے دوسرے کتے کو لات ماری، غالباً وہ پہلے ہی میدان چھوڑنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ لات اس کی دم کے نیچے پڑی تھی۔ وہ دم دبا کے بھاگ گیا۔

محسن نے کہا "تم بتاؤ یہاں کیا ہو رہا ہے؟"

اس نے ہچکی لی "بدمعاش۔ تو مجھ سے پوچھتا ہے۔ میرے گھر میں گھس کے یہ پوچھتا ہے۔ چور، اچکے، تو اندر کیسے آیا آخر؟"

میں سمجھ گیا کہ وہ نشے میں ہے۔ "ہم چور اچکے نہیں ہیں۔"

"پھر..... پھر کیا ہو۔ یہ تمہارے باپ کا گھر ہے کیا؟ ایسے..... ایسے اندر آکے، میرے سالے کو..... سالے کو مار دیا" اس نے مردہ کتے کی طرف دیکھ کے افسوس سے سرہلایا "یہی سالا تو..... مجھے دیکھ کے دم ہلاتا تھا۔"

میں نے کہا "اندر سے یہ کس کے چیخنے کی آواز آرہی ہے؟"

محسن نے کہا "کوئی عورت مدد کے لیے بلا رہی تھی۔ ہم نے سڑک پر سے گزرتے ہوئے اس کی آواز سنی تھی۔"

بھالو نے کہا "ارے بھائی۔ سڑک پر سے گزر رہے تھے..... تو گزر جاتے۔ سڑک کسی کے باپ کی نہیں..... مگر یہ کوٹھی میرے باپ کی ہے۔"

اب میں نے آگے بڑھ کے اسے دھکا دیا "آخر کون ہے یہ عورت۔ کیوں چلا رہی ہے؟"

وہ لڑکھڑا کے پیچھے دیوار سے جا لگا "مجھے..... میرے ہی گھر میں..... دھکا دیا۔ یہ جرأت تمہاری..... خیر میں سمجھ لوں گا۔"

"تم نے بہت پی رکھی ہے۔ ہم خود اندر جا کے دیکھیں گے۔"

اس نے ہمارے سامنے یوں ہاتھ پھیلا دیے جیسے وہ سچ مچ ہمیں روک لے گا "دیکھو..... شراب بھی میری ہے۔ عورت بھی میری۔ کیونکہ..... کیونکہ وہ پیسہ بھی میرا تھا۔"

"جس سے تم نے یہ دونوں چیزیں خریدی تھیں" میں نے نفرت سے کہا۔

"تم..... سمجھ دار آدمی ہو۔ مگر تم میرے سالے کے قاتل ہو۔ پھر بھی میں تم کو معاف کرتا ہوں۔ جاؤ، اپنا کام کرو.....ورنہ....."

محسن نے دروازہ کھولا اور میں اسے گردن سے دبوچ کے اندر لے گیا۔ صورتِ حال مجھ پر پوری طرح واضح ہو چکی تھی اور میرا خوف دور ہو گیا تھا۔ "تمہارا نشہ بھی اُتر جائے گا۔ تم کتے کو اپنا سالا کہتے ہو؟"

"ہاں۔ وہ کُتا ہے اور اس کی بہن..... وہ کُتیا ہے۔ اچھا کیا تم نے اس کی..... پر لات ماری۔ مگر تم مجھے نہیں جانتے..... میں کتا نہیں ہوں۔ میں انیس احمد..... کلکٹر کسٹم" وہ لڑکھڑا کے ایک صوفے پر گر گیا۔

دروازے سے داخل ہوتے ہی اس کا ڈرائنگ روم آگیا تھا۔ جس کی آرائش کے انداز میں مالِ حرام کی شان و شوکت پوری طرح عیاں تھی۔ اندر کہیں وہ بیڈ روم تھا جس میں کوئی عورت قید

تھی اور انسانی آواز بس نن کے پہلے سے زیادہ دردناک انداز میں مدد کے لیے پکار رہی تھی۔ چند منٹ بعد محسن اسے اپنے ساتھ لے کر آیا تو اس کی حالت خود اس پر ہونے والے ظلم کی گواہی دے رہی تھی۔

وہ کوئی نوعمر لڑکی نہیں تھی۔ میرے اندازے کے مطابق پینتیس سال کی عورت تھی لیکن پچیس سال کی لگتی تھی۔ اس نے اپنی عمر کی پیش قدمی کی رفتار کو قابو میں رکھا تھا۔ وہ بلاشبہ حسین عورت تھی اور اس کے جسمانی خدوخال بھی پُرکشش تھے۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ اس نے شوخ رنگ کی ساری کو جسم پر چادر کی طرح لپیٹ لیا تھا۔ نیچے کا بلاؤز اور چیٹی کوٹ شاید بھالو نے نوچ کے پھاڑ دیا تھا۔

عورت کو دیکھتے ہی انیس نے اٹھنے کی کوشش کی "میرے ساتھ... دھوکا... مکار عورت... کہاں سے آگئے تیرے یار..."

میں نے اسے پھر صوفے پر گرادیا "چپ چاپ بیٹھے رہو اگر خیریت چاہتے ہو۔"

وہ گرم ہو کے پھر اٹھا "تم جانتے نہیں مجھے..."

میں نے اس کو الٹے ہاتھ سے تھپڑ مارا "بہت اچھی طرح جانتا ہوں میں تم جیسے حرام خور ہوس پرست شیطانوں کو۔ لیکن تم مجھے نہیں جانتے۔"

وہ ڈر گیا "تم... تم ایف آئی اے... والے ہو... اس عورت نے بلایا ہوگا تمہیں... مجھے دھوکا دیا اس نے... میں بتاتا ہوں۔"

محسن نے اسے روک دیا "تمہاری بعد میں سُنیں گے۔ خاتون' آپ بتائیں یہ کیا معاملہ ہے؟"

عورت اب کچھ فاصلے پر بیٹھی آنچل سے آنسو صاف کررہی تھی اور بال سنوار رہی تھی۔ اس کا جسم اور بھی کانپ رہا تھا۔ "میں ایک شریف عورت ہوں' آپ یقین کریں..."

"چلو مان لیا تم شریف عورت ہو" میں نے کہا "آگے بولو۔"

"میرا شوہر۔ ایک بزنس مین ہے... دوبئی میں رہتا ہے۔ اس کا مال آتا جاتا رہتا ہے۔"

"میں سمجھ گیا۔ وہ اسمگلر ہے اور کلکٹر کسٹم اس کا مددگار۔"

"اس کی بیوی... میری سہیلی تھی۔ ہم ایک ساتھ پڑھتے تھے۔ مجھ سے میرے شوہر نے کہا' اپنی سہیلی سے بات کرو۔ ہم اس کے شوہر کو حصے دار بنالیں گے۔ جتنا مال کلیئر ہوگا... اس کا پچیس فیصد..."

"یہ... جھوٹ بولتی ہے یہ عورت۔ یہ ایک بدکار اور بدچلن عورت ہے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں' اس کا شوہر اسے کہاں کہاں بھیجتا ہے..."

صورتِ حال کچھ دیر میں واضح ہوگئی۔ وہ عورت واقعی کوئی شریف زادی نہیں تھی اور اس کا شوہر جو دوبئی کے علاوہ سنگاپور بنکاک اور ہانگ کانگ سے بھی ہر قسم کا مال ادھر اُدھر کرتا تھا اپنے کاروبار کو چمکانے اور راستے کی رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے تمام حربے استعمال کرنا ایک کاروباری ضرورت سمجھتا تھا۔ جہاں خوشامد سے کام چل جائے وہاں خوشامد۔ کہیں شراب کی ایک بوتل کافی ہو وہاں دو بوتلیں۔ نقد کی بات ہو تو سکہ رائج الوقت پیش اور مانگنے والا شراب کے ساتھ شباب بھی مانگے تو حاضر' رشوت میں اپنی پرائی عورت کی کیا تخصیص۔ اس کا کوئی کام رُکتا نہیں تھا۔ مال کلیئر ہوتا جاتا تھا' بیک وقت سب کے بینک بیلنس میں بھی اضافہ ہورہا تھا اور اس انجمنِ مفادِ باہمی کے تمام معاملات خوش اسلوبی سے طے ہونے سے سب خوش تھے۔ کسٹم افسر کی بیوی اس کے لیے مسئلہ بنی ہوئی تھی۔ ایک تو وہ حرام حلال کے چکر میں پڑی رہتی تھی۔ اسے دنیا سے زیادہ عاقبت کی فکر تھی اور مزید یہ کہ وہ اپنے شوہر کو راہِ راست پر لانے کی کوشش سے باز نہیں آتی تھی۔ دن رات جوتے کھانے اور گھر سے نکالے جانے کے باوجود۔ مشکل یہ تھی کہ اس عورت کا باپ ایک ہسٹری شیٹر تھا اور بڑا نامی گرامی بدمعاش۔ یہ بڑی عجیب بات تھی کہ اس کی بیٹی برعکس تھی۔ شاید یہ ماحول سے نفرت کا ردِعمل تھا۔ اس عورت کے دو بھائی بھی اچھی پوزیشن کے مالک تھے چنانچہ شوہر نہ اسے طلاق دے سکتا تھا اور نہ ہمیشہ کے لیے گھر سے نکال سکتا تھا۔

یہ سہیلی جب انیس کی بیوی سے معاملے کی بات کرنے گئی تو اسے علم نہیں تھا کہ ایسے راشی افسر کی بیوی اتنی ایماندار بھی ہوسکتی ہے۔ وہ اس کے باپ کے کرتوتوں سے واقف تھی اور یہ سمجھے ہوئے تھی کہ اس ماحول کی پروردہ لڑکی جب انیس جیسے شخص کی بیوی بنی ہوگی تو کڑوا کریلا نیم چڑھا ہوگا۔ شادی کے بعد وہ اس سے ملی ہی نہیں تھی۔ جب اتفاق سے ان کی ملاقات ہوئی تو پرانے رشتے پھر استوار ہوئے۔

انیس کی بیوی نے کاروباری معاملے پر شدید غم و غصے کا اظہار کیا اور اپنی بچپن کی سہیلی کو بے عزت کرکے رخصت کردیا۔ اس وارننگ کے ساتھ کہ دوبارہ مجھے اس گھر میں اپنی صورت نہ دکھانا۔ انیس کے علم میں یہ بات آئی تو اس نے اپنی بیوی کو بُرا بھلا کہا اور اس مسئلے پر بات چیت کے لیے بیوی کی سہیلی کو پھر بلایا۔

انیس احمد کلکٹر کسٹم کی اپنی بیوی بھی حسن و جمال میں کم تر نہ تھی اور دس سال میں صرف دو بچوں کی ماں بنی تھی چنانچہ ابھی تک جوان نظر آتی تھی۔ یہ اس کا اپنا حُسنِ انتظام نہیں تھا بلکہ ایک حادثے کے باعث دو بچوں کی پیدائش کے بعد وہ ماں بننے کی صلاحیت سے محروم ہوگئی تھی۔ وہ نیک خو اور وفا شعار عورت اگر شوہر پرست نہ ہوتی تو انیس احمد کو کب کا چھوڑ چکی ہوتی' اسے جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچادیتی یا اس کی ہڈی پسلی ایک کرادیتی مگر انیس احمد کے لیے اس کی یہ وفا پرستی بھی عذاب جان تھی۔

بیوی کی سہیلی نے اسے پہلی نظر میں گھائل کردیا۔ وہ اس کے بھرپور شباب کی جھلک دیکھ کے دیوانہ ہوگیا۔ وہ لباس ہی ایسا پہن کے آئی تھی جو چُھپانے سے زیادہ دکھائے۔ کسی بھی محاذ پر فتح حاصل کرنے کے لیے یہ تو ضروری ہوتا ہے کہ دشمن کی قوتِ مزاحمت کے مطابق اسلحے کا انتخاب اور استعمال کیا جائے۔ اس کی ہنسی ناز و ادا اور میٹھی میٹھی باتوں نے انیس احمد کو اس کے سامنے سربہ سجود کردیا۔ تم ایک بار آکے مجھے حکم تو دو' تمہارا حکم سر آنکھوں پر۔ جو تم کہو گی جو تم چاہو گی ویسا ہی ہوگا۔

انیس احمد نے اپنی بیوی کو بڑے پیار سے میکے بھیج دیا۔ تمام ملازموں کو انعام و اکرام سے نواز کے رخصت کردیا۔ چوکیدار کی ڈیوٹی آفس میں لگادی اور بڑے اشتیاق و انتظام کے ساتھ بیوی کی سہیلی کا انتظار کرنے لگا۔ جب وہ آئی تو اس نے دیکھا اور اس نے فتح کرلیا۔ اس نے ایک کے بعد ایک فائل انیس احمد کے سامنے رکھی اور وہ دیکھے بغیر ان پر دستخط کرتا چلاگیا۔ شراب نے اس کی آتشِ شوق کو مزید بھڑکادیا تھا اور بیوی کی سہیلی بھی نادان بچی نہیں تھی جسے معلوم نہ ہوتا کہ ہر دستخط کی قیمت اسے کیسے چکانی ہے۔ یہ اس کے لیے پہلا تجربہ نہیں تھا اور نہ کوئی معیوب بات تھی مگر اچانک اسے پتا چل گیا کہ کمرے میں ایک مووی کیمرا نصب ہے۔ انیس احمد اسے بعد میں بلیک میل کرنا چاہتا تھا اور شاید اس پر اپنا تسلط برقرار رکھنا چاہتا تھا۔ انیس احمد کا موقف اس کے برعکس تھا۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ مووی کیمرا چھپانا اس عورت کی سازش تھی۔ جب وہ ڈرائنگ روم میں اس کے شوہر کا مال کلیئر کرنے کے احکامات جاری کررہا تھا تو اس کے ساتھ آنے والے شوفر نے یہ کیمرا فٹ کیا تھا اور اس کا مقصد انیس احمد کو بلیک میل کرکے آئندہ ہمیشہ کے لیے تابع فرمان بنانا تھا۔

یہ طے کرنا بہت مشکل تھا کہ ان دونوں میں سے سچا کون ہے اور جھوٹا کون۔ بدکردار اور بدچلن دونوں تھے اور دونوں کا جرم اتنا سنگین تھا کہ انہیں سرِعام سنگسار کردیا جاتا۔ رشوت اور بدعنوانی سے اس ملک کے خزانے کو نقصان پہنچانے کے جرم کی سزا الگ تھی لیکن مشکل یہ تھی کہ نہ ہم ان کے خلاف مدعی ہوسکتے تھے اور نہ اس معاملے کی پولیس کو رپورٹ کرسکتے تھے۔ عام حالات میں تو ایسے مجرم قانون کے شکنجے سے بھی نکل جاتے ہیں۔ بقول شاعر۔

لے کے رشوت پھنس گیا ہے
دے کے رشوت چُھوٹ جا

لیکن یہاں ہمارے پاس وہ فائلیں بھی تھیں جن پر انیس احمد نے اپنے اختیارات سے تجاوز کرتے ہوئے غیر قانونی احکامات جاری کردیے تھے۔ اس کے باوجود ہم نے پہلے تو خاتون کو لعنت ملامت کرکے رخصت کیا اور مووی کیمرا بھی اس کے سامنے ہی توڑ پھوڑ دیا۔ اس کی صورت کے ردِعمل کو غور سے دیکھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ بلیک میلنگ کی حد تک مرد کا الزام درست تھا۔ کیمرا وہ عورت ہی لائی تھی کیونکہ اسے اپنی اسکیم کے فیل ہوجانے کا دکھ تھا اور کیمرا توڑنے پر اس نے برہمی کے جذبات پر بڑی مشکل سے قابو پایا تھا۔ یقیناً یہ اس کے چالاک شوہر کی اسکیم تھی کہ انیس احمد کو پچیس فیصد کا شریک کرنے سے بہتر ہے کہ اس کی ایک فلم بنالی جائے تاکہ سند رہے اور ہمیشہ کام آئے۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں اس بے غیرت عورت کو قتل کردوں جو کسی اور کی بیوی ہونے کے باوجود ایک غیر مرد کے ساتھ اس قسم کی فلم بندی پر بھی تیار ہوگئی تھی۔ ممکن ہے شوہر نے اسے یقین دلایا ہو کہ فلم کوئی عام نمائش کے لئے پیش نہیں کی جائے گی بلکہ صرف انیس احمد کو ایک بار دکھا کے کسی محفوظ مقام پر رکھوادی جائے گی مگر اس کے باوجود یہ بے شرمی اور بے حیائی کی انتہا تھی۔ میرے اختیار میں ہوتا تو میں اس کے شوہر کو پہلے قتل کرتا۔ یہ میاں بیوی زیادہ بڑے مجرم تھے جو بدعنوانی اور بدمعاشی کو ہر جائز اور ناجائز طریقے سے فروغ دے رہے تھے۔ انیس احمد جیسے کرپٹ مرد تو ہر جگہ ہیں لیکن انہیں کرپٹ بنانے والے نہ ہوں تو وہ کیا کرسکتے ہیں۔

انیس احمد بولا "اللہ تیرا شکر ہے۔"

میں نے کہا "ذلیل آدمی۔ کس منہ سے اللہ کا شکر ادا کرتے ہو اور کس بات پر؟"

اس نے ڈھٹائی سے دانت نکالے "اللہ نے بچالیا بڑی خیریت سے۔ میری تو زندگی تباہ ہوجاتی۔"

میں نے کہا "زندگی تباہ کرنے میں کون سی کسر چھوڑی ہے تم نے۔ اپنے ساتھ ایک فرشتہ سیرت بیوی کی زندگی بھی برباد کی اور تمہارے بچے کیا وہ کچھ نہیں جانتے اپنے باپ کے بارے میں؟"

اس نے سر جھکا کے کہا "جانتے ہوں گے۔ ان کی ماں جو ہر وقت مجھے بُرا بھلا کہتی رہتی ہے۔ ان کے سامنے بھی وعظ جاری رہتا ہے اس کا۔ وہ مجھے اپنے ہی بچوں کی نظر میں شیطان سے بھی زیادہ گنہگار ثابت کرچکی ہے۔"

"کیا یہ حقیقت نہیں ہے اور بچے جب خود دیکھتے ہوں تو کسی کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔"

"آج تو تم نے مجھے بچالیا۔ نوکری بھی جاتی' اور میں جیل بھی جاتا۔"

میں نے کہا "بڑے خوش ہو تم کہ جیل جانے سے بچ گئے مگر جہنم میں جانے سے تمہیں کون بچائے گا۔ جیل کی سزا زیادہ سخت ہے یا عذابِ دوزخ مگر بات ہے تمہارے سمجھنے کی۔ ابھی تم مطمئن ہو کہ نوکری نہیں گئی مگر عاقبت تو گئی۔"

وہ ڈھیٹ آدمی ہنسنے لگا "یار تم بھی مولوی ہو... ورنہ..."

"ورنہ کیا ہوتا۔ تم ہمیں شکر گزاری کے طور پر دعوت ناؤنوش دیتے؟ اعلیٰ قسم کی ولایتی شراب سے ہماری تواضع کرتے۔ ہمارا جام صحت تجویز کرتے اور جاتے وقت ہماری جیبوں میں وہ نوٹ بھردیتے جو جہنم کے انگارے ہیں۔ حرام کو حرام سمجھنے کی حد تک ہم ضرور مولوی ہیں مگر درحقیقت ہم بھی بڑے گنہگار ہیں" میں نے

کہا۔

محسن بولا "افسوس کی بات صرف یہ ہے کہ ہم تمہیں کوئی سزا نہیں دے سکتے۔ حالانکہ بات اختیار کی نہیں۔ ٹائم نہیں ہے ہمارے پاس۔"

اس کا نشہ اب ہرن ہوچکا تھا۔ "آخر تم ہو کون؟"

محسن نے کہا "ہم' ہم خدائی فوجدار ہیں۔ ایسے ہی اچانک نازل ہوتے ہیں' جہاں بھی ہماری ضرورت ہو۔"

اس نے شراب کی آدھی بوتل کو سنبھال کے الماری میں رکھ دیا "مطلب یہ کہ تم مجھے بھی نہیں پینے دوگے۔ اس کو کہتے ہیں رنگ میں بھنگ۔ پہلے اس سالی نے اپنے ہاتھ سے پلائی۔ میری آنکھوں پر کیا عقل پر پٹی باندھ دی۔ میں نے دیکھا ہی نہیں کہ اس نے ایسا جال پھیلایا ہے کہ... ساری عمر نہیں نکل سکتا تھا میں۔ خیر اب بتاؤ تم کیا چاہتے ہو؟"

محسن نے کہا "اس مووی کیمرے سے یہ فلم نکال لی تھی میں نے۔"

اس نے بے تابی سے ہاتھ بڑھایا "یہ... یہ مجھے دو۔ تمہارے لئے یہ بے کار ہے۔"

"بے کار چیز کے لئے ایسی بے تابی کیوں؟" محسن نے ہاتھ پیچھے کرلیا "یہ تو دیکھنے سے پتا چلے گا کہ فلم کیسی ہے؟"

اس کا چہرہ اتر گیا "اس کا مطلب ہے... تم بھی بلیک میل کروگے مجھے۔ سچ بتاؤ کیا تم اسی کے ساتھی ہو؟"

میں نے مناسب سمجھا کہ انیس احمد کی تھوڑی سی گوشمالی کردی جائے تاکہ اسے ہمارے بارے میں غلط فہمی نہ رہے۔ میں نے اسے گردن دبوچ کے اوپر اُٹھالیا۔ چٹری سے پکڑ کے اونچا کیا اور سر کے اوپر گھما کے صوفے پر دے مارا۔ ابھی اس نے سانس بھی نہیں لیا تھا کہ میں نے اس کی ٹانگ پکڑلی اور اسے ایسے چکر دیا جیسے بچے رسی سے پتھر باندھ کے گھماتے ہیں۔ اگر میں اسے چھوڑ دیتا تو وہ گوپھن کی طرح اُڑتا ہوا جاتا اور کسی دیوار سے ٹکرا کے اللہ کو پیارا ہوجاتا۔ وہ حلق سے بھیانک آوازیں نکالتا رہا اور چلاّتا رہا۔ "ہائے۔ آہ' ارے میں مرگیا۔ میں مرجاؤں گا۔ خدا کے لئے مجھے معاف کردو۔ چھوڑدو مجھے۔"

میں نے اسے خوب اچھی طرح اوپر نیچے اور دائیں بائیں گھمانے اٹھانے پٹخنے اور دھنکنے کے بعد گوشت کے بدوضع بے حس وحرکت ڈھیر کی طرح فرش پر ڈال دیا۔ وہ ہوش میں تھا مگر اس کو دنیا گھومتی ہوئی اور آسمان زمین کے ساتھ کمرے کی دیواریں اور فرنیچر سب اتھل پتھل ہوتے لگ رہے ہوں گے۔

میں نے کہا "اب سیدھی طرح اُٹھ کے بیٹھ جاؤ۔ ڈراما نہیں چلے گا انیس احمد۔"

وہ کراہتا ہوا اُٹھا "میں معافی مانگتا ہوں۔ ہاتھ جوڑ کے بھائی صاحب۔ میں... سے لات ماری "میں کسی شیطان کا بھائی نہیں ہوں۔"

محسن نے اسے یاد دلایا "ہم خدائی فوج دار ہیں۔ تمہاری شامت اعمال ہمیں لائی ہے پھر بھی تمہیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ ہم ہی آئے۔ پولیس نہیں آئی یا سی آئی اے والے نہیں آئے۔"

وہ اسی مضحکہ خیز حلئے میں کراہتا ہوا اُٹھا اور بھد سے صوفے پر گر کے لمبے لمبے سانس لینے لگا "مجھے بتاؤ۔ میں کیا کروں۔ تم جو کہو گے وہی ہوگا۔ میں تمہارا غلام۔ یہ گھر تمہارا۔ یہاں کی ہر چیز تمہاری۔ جو چاہے لے جاؤ۔ لیکن یہ فلم دے دو مجھے۔"

میں نے کہا "آخر کیا ہے اس فلم میں۔ ابھی تو کیمرے نے اپنا کام بھی شروع نہیں کیا ہوگا۔"

وہ ہانپنے لگا "نہیں۔ کیمرا کام کررہا تھا۔"

محسن بولا "ٹریلر ہوں گے۔ اصل فلم تو شروع ہی نہیں ہوئی تھی۔"

اس نے کہا "وہ... تم سمجھتے کیوں نہیں۔ اس حرافہ نے... پہلے آگ لگادی تھی مگر ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں دے رہی تھی۔ کہتی تھی پہلے ان فائلوں پر دستخط کرو۔ میں پہلے سے پی رہا تھا۔ پھر اس نے پلادی۔ اور آہستہ آہستہ کھل کر سامنے آئی تھی۔ مجھے پاگل کرنے کے لئے اس نے ایک ایک کرکے اپنے اور میرے کپڑے... اُف۔ وہ عورت فتنہ ہے۔ قیامت ہے۔ اس وقت وہ مجھ سے کچھ بھی منوا سکتی تھی۔ میں اس کی طرف بڑھتا تھا اور وہ... مچھلی کی طرح تڑپ کے میرے ہاتھوں سے پھسل جاتی تھی۔"

"اور یہ سب ہے فلم میں۔"

اس نے اقرار میں سرہلایا "آخر کار... میں نے اس کی مان لی اور فائلوں پر دستخط کردیئے۔ وہ میرے دفتر کی فائلیں تھیں۔ معلوم نہیں اس کے ہاتھ کیسے لگیں۔ دس لاکھ' کم سے کم دس لاکھ کے دستخط تھے وہ۔ کوئی اور ہوتا تو میں ڈھائی لاکھ نقد لیتا۔ ڈھائی لاکھ میں... اس جیسی ڈھائی سو عورتیں مل جاتیں مگر ساری بات ہے طلب کی۔ اور وقت کی۔ بادشاہوں نے تاج اور تخت لٹادیے ہیں ایک عورت کی ایک ادا پر۔ میں نے ڈھائی لاکھ بخش دیے اس کو۔ اور ساڑھے سات لاکھ اس کے شوہر کو۔ اور پھر بھی۔ کیا ملا مجھے۔"

میں نے کہا "دیکھو انیس احمد۔ ہمارا نہ تمہاری زندگی سے کوئی تعلق ہے نہ تمہارے اعمال سے۔ نہ تمہارے جرائم سے اور نہ گناہوں سے۔ سزا تمہیں کبھی ملی تو قانون دے گا یا پھر تمہارا عذاب شروع ہوگا قبر سے۔ ہم نہ مجرم ہیں نہ بلیک میلر۔ یہ فلم ہمارے پاس اسی طرح محفوظ رہے گی جیسے تم خود رکھتے۔"

"میں کیوں رکھتا ایسی چیز کو حفاظت سے۔"

"مگر ہم رکھیں گے۔ ہمیں تم سے کچھ کام لینا ہے۔ اگر تم نے شرافت سے تعاون کیا تو یہ فلم تمہیں واپس مل جائے گی۔"

وہ پریشان ہوگیا "ایسا کون سا کام ہے؟ دیکھو میں شرابی جواری اور راشی ہوں۔ مگر میں قتل نہیں کرسکتا کسی کو۔"

میں نے اسے تسلی دی "یہ کوئی غیرقانونی کام نہیں ہے۔ یہ بڑی اچھی بات ہے کہ آج رات تم اکیلے ہو۔ یہ بتاؤ فون کہاں ہے؟"

وہ حیران ہوا "فون۔ ویسے تو ہر کمرے میں ہے۔ دو نمبر ہیں اور چار ایکسٹینشن۔ جہاں سے چاہو کرلو۔ جہاں چاہو کرلو۔ امریکا آسٹریلیا۔"

مجھے ایک لوکل کال کرنی ہے۔" میں نے کہا اور اُٹھ کے اندر چلا گیا۔

کوٹھی کے دو بیڈ روم زیر استعمال تھے۔ ایک میں بچّوں کے کھلونے ان کی کتابیں اور شوق کے سب اسباب فراہم کیے گئے تھے۔ دوسرا انیس اور اس کی بیوی کا تھا۔ تیسرا پوری طرح آراستہ بیڈ روم آتے جاتے مہمانوں کے لئے وقف تھا۔ ایسی ہی ایک خاص مہمان وہ عورت تھی جو کچھ دیر پہلے اس جگہ قید چلاّ رہی تھی۔ اس کے باقی ماندہ کپڑے جو وہ گھبراہٹ میں بے کار سمجھ کے یہاں چھوڑ گئی تھی۔ بیڈ کی پُرشکن بے ترتیب چادر۔ کچھ فرش پر گری ہوئی چیزیں۔ اس کمرے میں پیش آنے والے واقعات کی منہ بولتی تصویر پیش کررہے تھے۔

میں نے اسی کمرے میں رکھا ہوا فون اُٹھالیا اور وقار یوسف کے گھر کا نمبر ملایا۔ گھنٹی بجتے ہی وقار نے کہا "ہیلو"

میں نے کہا "وقار شور مت کرنا۔"

اس نافرمان نے چلاّ کے کہا "کیوں جی شور کیوں نہ کروں۔ مصیبت تو مجھے پڑی ہوئی ہے۔ میں اکیلا اور وہ تین۔"

"کون تین؟"

"خواتین اور کون۔ اب یہ مت پوچھنا کہ کون خواتین۔ آخر آپ ہیں کہاں جناب اور......"

اس سے پہلے کہ میں جواب دیتا رابعہ کی آواز آئی "سکندر......"

میں نے کہا "السّلام علیکم۔ کہئے مزاج کیسے ہیں آپ کے۔"

"میں کہتی ہوں تم دونوں......"

"ابھی تم دونوں کی نہیں۔ ہم دونوں کی بات کرو بلبلِ بغداد۔"

"تمہیں کیا پتا گل کتنی پریشان ہے۔"

"کیا تم نہیں ہو میرے لئے؟" میں نے اُداس آواز بنا کے کہا "آہ!"

"ہم نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ کسی نے بھی۔ تم بھی حد کرتے ہو۔" رابعہ بہت خفا تھی۔

"ہاں۔ ابھی میں حد کا خیال رکھتا ہوں۔ حد سے آگے نہیں بڑھتا مگر کسی دن......"

"حکومت۔ فوراً آجاؤ۔ جہاں بھی ہو۔ ابھی۔ اسی وقت۔"

"معاف کرنا یہ نہیں بتا سکتا میں کہ اس وقت کہاں ہوں۔ اور تم ابھی سے ایسے ڈانٹ رہی ہو مجھے۔ ایسے حکم چلا رہی ہو مجھ پر جیسے میں محسن ہوں۔ بعد میں کیا بنے گا میرا۔ مجھے سوچنا پڑے گا خاتون اپنے مستقبل کے بارے میں۔"

"اچھا سوچتے رہو پھر۔"

میں نے کہا "ارے بھائی بندمت کردینا غصّے میں۔ بتانا صرف یہ تھا کہ......"

"آگے بھی بولو کچھ۔" رابعہ نے کچھ دیر انتظار کے بعد کہا۔

"اب کیا بتاؤں۔ بڑی شرم آتی ہے۔ تمہیں معلوم ہے اس وقت میں کہاں ہوں؟"

"اب بتا ہی دو شرمیلے صاحب۔"

"نہیں... کچھ زنانہ استعمال کی اشیا ہیں اس بیڈ روم میں۔ ایک خاتون کی جو ابھی باہر گئی ہیں۔" میں نے کہا "اور یہ بے حد پرائیویٹ چیزیں ہیں۔ مثلاً یہ بلاؤز ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے نوچ کھسوٹ میں پھٹ گیا تھا۔ اور یہ پیٹی کوٹ ہے۔ عجلت میں چھوڑ گئیں خاتون۔ یہ تکیے پر ہیئر کلپ بھی رکھا ہوا ہے۔ اور بہت کچھ۔ میں خود بھی اسی بیڈ پر ہوں ویسے تو... اور وہ خاتون۔ ان کے حُسن و شباب کا کیا بیان کروں۔"

"کیوں فضول بولتے جارہے ہو۔" رابعہ پریشان سی ہوگئی۔

"تمہاری جان کی قسم۔ اس میں ایک لفظ جھوٹ نہیں ہے۔"

رابعہ کے لئے اب یقین نہ کرنے کی وجہ کوئی نہیں تھی "سکندر بتاتے کیوں نہیں کہاں ہو تم۔ کون ہے وہ خاتون۔ تمہیں کیوں لے گئی تھی اپنے ساتھ۔"

میں نے خوش ہوکے کہا "وہ کہاں لے گئی تھی۔ میں خود ہی چلا آیا۔"

رابعہ نے آہستہ سے کہا "آخر کیوں؟"

"بھئی گھوڑا گھاس کھاتا ہے۔ گھاس دیکھ کے جائے گا نہیں؟ اور تم تو ہمیں گھاس ڈالتی نہیں ہو۔" میں نے کہا۔

"پھر... کھالی گھاس... جی بھر کے۔" اس نے طنز کیا۔

میں نے آہ بھری "یہ جو گدھا تم نے پال رکھا ہے نا اور کوئی گھاس اس کے من کو بھاتی ہی نہیں۔ خواہ کوہِ قاف کی گھاس ہو یا جنّت کی۔ جل بھن کے کوئلہ ہوگئیں نا؟ بو آرہی ہے جلنے کی فون میں سے۔"

وہ ہنسی "جلتی ہے میری جوتی۔"

"اچھا تو چمڑا جلنے کی بو ہوگی۔ فکر مت کرو۔ بقول شاعر میں تم کو پہلے سے نئی گرگابی لاکے دوں گا۔ جس کو پہن کے تم مورنی کی چال چلو گی اور مورنی کے پیچھے گدھا دیکھ کے لوگ کہیں گے کیا جوڑی ہے' اچھا اب زیادہ مت ہنسو۔ کام کی بات سُنو۔ اتفاق سے آج غالب مل گیا۔"

بیلن اور سینڈل جیسے زنانہ اسلحے کے ساتھ۔ بنا بنایا کام بگاڑ دگی اور مصیبت ہوگی ہمارے لئے۔ اسے بچائیں گے، خود کو یا تمہیں۔"

میں نے اسے ڈانٹا۔

گل نے کہا "محسن کہاں ہے؟"

میں نے کہا "محسن؟ کون محسن۔ یہ کس جانور کا نام ہے۔"

"ارے بھئی صاف پوچھوتا۔ اب ڈر کیسا۔ کہو کہ میرا گھر والا۔ میرا میاں، میرے سر کا تاج میرا مجازی خدا کہاں ہے۔ میں بلاتا ہوں اسے۔ تم کوئی اچھا سا گانا سوچ لو جو ہیروئن گاتی ہے جدائی میں۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کے۔"

میں نے واپس جا کے محسن کو بھیج دیا۔ اس وقت تک انیس اور محسن کے درمیان خاصی گفتگو ہو چکی تھی۔ اس کا اندازہ مجھے انیس کے موڈ سے ہوا۔ وہ اب خاصا مطمئن نظر آرہا تھا۔

"ساتھ والی کوٹھی حال ہی میں کسی نے خریدی ہے۔ مہینہ بھر پہلے۔" اس نے مجھے بتایا "ایسے ہی ایک بار آتے جاتے شکل دیکھی ہے اس کی۔ فیملی نہیں ہے غالباً۔ ورنہ میری بیوی ضرور بتاتی کہ اس کی بیوی کیسی ہے۔"

میں نے کہا "ہم اس کوٹھی میں کیسے داخل ہو سکتے ہیں؟"

"یہی آپ کے دوست پوچھ رہے تھے۔ میں نے کہا کہ طریقے تو بہت ہیں مگر سب مشکل ہیں اور خطرناک بھی۔ چوکیدار بھی بڑا خونخوار ہے۔ میرے چوکیدار نے بتایا کہ وہ تو بلاوجہ پھاڑ کھانے کو دوڑتا ہے۔ انسانوں والی کوئی بات ہی نہیں سؤر کے بچے میں۔ اس نے میرے چوکیدار سے کہا تھا کہ مجھ سے بے تکلف ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں تم جیسوں کو منہ نہیں لگاتا۔ جواب میں اس نے بھی کہا کہ لعنت تیری منحوس شکل پر۔ میں تو تیرے جنازے میں بھی نہیں آؤں گا۔ اس کے علاوہ دو کتے ہیں۔ میرے سالے جیسے نہیں شکاری کتے ہیں۔"

"یہ تم اپنے کتوں کو سالا کیوں کہتے ہو؟"

"وہ بھونکتے جو رہتے ہیں اپنی بہن کی طرح مجھ پر۔ کچھ بگاڑ تو سکتا نہیں ان کا۔ دل کی بھڑاس نکالتا ہوں انہیں سالا کہہ کے۔ بیوی بہت ہنگامہ کرتی تھی پہلے۔ میں نے کہا کہ کتے کی یہی اوقات ہوتی ہے۔ اسے بھائی تو کہنے سے رہا میں۔ گالی دے کر بات کرتا ہوں۔ چل سالے اِدھر آ۔ تم کیوں بُرا مانتی ہو۔ اگر تمہارے بھائی کتے نہیں ہیں۔ میں انہیں سالا کہتا ہوں تو یہ ایک رشتہ ہے گالی نہیں۔ گالی ہے صرف کتے کے لئے۔ ایم آئی رائٹ؟"

میں نے کہا "چوکیدار اور کتے۔ ان سے ہم نمٹ لیں گے۔ مسئلہ اندر داخل ہونے کا ہے۔ کیا تمہاری کوٹھی کی دیوار کہیں سے نیچی ہے یا چھت ملتی ہے۔"

"تمہارے دوست کے ذہن میں تو کچھ اور تھا۔" انیس بولا "وہ پوچھ رہے تھے کہ تمہاری بیوی دبلی پتلی ہے یا بھاری بھرکم۔ اس کے کپڑے تو ہوں گے۔ کیا میرے جسم پر فٹ آسکتے ہیں۔ میں نے

ظاہر ہے وہ دوسری طرف اُچھل پڑی ہوگی "کیا غالب مل گیا؟"

پس منظر میں ایک دم کئی آوازیں سنائی دیں۔ "غالب مل گیا۔ کہاں، کب۔"

میں نے کہا "ہم تو گئے تھے شوکت رانا کو قتل کرنے۔ میں اور محسن۔ کوئی کام نہیں تھا۔ سوچا یہ کام کرلیں۔ اچانک اس کی کوٹھی میں سے غالب نکل آیا مگر وہ ہمیں پہچانتا نہیں۔"

"کیوں مذاق کرتے ہو۔"

"مذاق نہیں۔ یہ حقیقت ہے۔ اس کا کچھ ایسا برین واش کیا گیا ہے کہ وہ خود کو غالب نہیں فیروز کہتا ہے اور شوکت رانا کا ڈرائیور سمجھتا ہے۔ ہم کسی نہ کسی طرح اس کے ساتھ کار میں بیٹھ کے یہاں آ گئے۔"

"کہاں۔ شوکت رانا کی کوٹھی میں؟"

"ہاں۔ اندر تو ہم جا نہیں سکتے تھے۔" میں نے کہا "یہ اس کی نئی کوٹھی کہلاتی ہے۔ کار بھی نئی تھی اور سُنا ہے یہاں اس کی نئی بیوی رہتی ہے۔ کیا خوش قسمت آدمی ہے۔ ہر سال بیوی کا ماڈل بھی بدل لیتا ہے۔ اور ظاہر ہے اتنی اچھی گاڑی ہے تو بیوی بھی اچھی ہی ہوگی۔ تم جیسی نہیں۔ تم سے میری مراد ہے وہ سب خواتین جو بڑی بے تابی سے ریسیور کے ساتھ کان لگائے کھڑی ہیں۔"

"تم سب کی قسمت ہی خراب ہے تو ہم کیا کریں۔" یہ جواب وقار کی بیوی نے دیا تھا جو شاید دوسرے کمرے میں دوسرا ریسیور اُٹھائے بیٹھی تھی۔

"چھپ چھپ کے باتیں سُنتی ہوں۔" میں نے اسے ڈانٹا "میاں بیوی.... میرا مطلب ہے ہونے والے میاں بیوی کی۔"

غالباً گل نے اس سے ریسیور لے لیا "بتاؤ نا غالب کہاں ہے؟"

میں نے کہا "ساتھ والی کوٹھی میں۔"

"اور نازو؟" رابعہ بولی "وہ بھی ساتھ تھی؟"

"نہیں۔ ابھی تک نازو کے بارے میں معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ بھی غالب کے ساتھ ہے یا کہیں اور ہے لیکن تم فکر مت کرو۔"

"تم کہہ رہے تھے غالب نے پہچانا نہیں تھا تمہیں۔"

"ہاں مگر یہ بہت معمولی سا مسئلہ ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم اسے اپنے ساتھ ہی لے کر آئیں گے۔"

رابعہ بولی "کوئی خطرے کی بات تو نہیں ہے نا؟"

"تم اب بھی یہ سوال کرتی ہو۔ خطرہ تو ہر بچے کے ساتھ ہی دنیا میں آتا ہے اور ہم تو وہ ہیں جو خطرے کے بغیر رہ ہی نہیں سکتے۔ اس کا بھی نشہ ہوتا ہے جس کے ہم عادی ہو چکے ہیں۔"

"ہمیں بتادو تم کہاں ہو۔"

"اس سے کیا ہوگا۔ تمہاری زنانہ فوج چڑھائی کرے گی چڑھے

بتادیا کہ تم میری بیوی بننا چاہتے ہو تو اس کا سارا میک اپ کا سامان استعمال کر سکتے ہو۔ اس کے باوجود تم میں نسوانیت اس حد تک آئے گی جتنی تالی بجانے والوں میں ہوتی ہے۔"

میں نے مسکرا کے کہا "دروازہ کھلوانے کے لئے نسوانیت پیدا کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔ بس عورت نظر آنی چاہئے۔ رات کے وقت تو تالی بجانے والا بھی چلے گا۔"

محسن آیا تو اس کا موڈ آف تھا "اُلو کی پٹھی۔"

میں نے غرا کے کہا "خبردار جو رابعہ کو کچھ کہا۔"

"لاحول ولا قوہ۔ میں گل کو کہہ رہا تھا بھائی۔"

"بھائی صاحب۔ میری بہن کے بارے میں بھی ذرا منہ سنبھال کے۔ ہم نے دیکھ لیا تھا کہ لڑکا زن مرید ٹائپ ہے۔ جورو کا غلام بن کے رہے گا۔ اب آنکھیں دکھاتے ہو۔"

"اور کیا دکھاؤں؟" محسن نے ایسے کہا کہ انیس بھی ہنس پڑا۔

محسن کی ترکیب مجھے بھی پسند آئی تھی۔ انیس کی طرف سے تو اب کوئی اندیشہ ہی نہیں تھا کہ وہ تعاون نہ کرے یا کسی کو کچھ بتادے۔ ایک فلم کی وجہ سے اس کا کنٹرول ہمارے ہاتھ میں آگیا تھا۔ کوٹھی میں دخل اندازی کرنے والا اور کوئی نہیں تھا اور ہمیں جلدی بھی نہیں تھی۔ محسن نے انیس کے بیڈ روم میں میک اپ کیا اور اس کی بیوی کے کپڑوں میں سے چھانٹ کے ساری باندھی۔ آنچل سر پر لینے کے بعد اس کے مردانہ بالوں پر بھی پردہ پڑ گیا۔ وہ بڑی ادا کے ساتھ لچکاتا اور مٹکتا ہوا کمرے سے برآمد ہوا تو انیس کی حالت ہنستے ہنستے خراب ہوگئی۔ وہ پیٹ پکڑ کے صوفے پر لوٹنے لگا۔

"قسم خدا کی۔ نشہ اُتر گیا ورنہ تمہیں نہ چھوڑتا میں۔"

محسن نے سینے پر ہاتھ رکھ کے کہا "ہائے میں مرگئی۔ کیسی بے شری کی باتیں کرتا ہے یہ ریچھ کا بچہ۔"

میں نے کہا "میں بھی بُری نظر ڈال رہا ہوں تجھ پر۔"

محسن نے کمر پر ہاتھ رکھ کے کہا "کیا میں بھی شور مچاؤں؟ جیسے وہ مچا رہی تھی کہ لو یک نہ شد دو شد۔ ہائے کہاں لے جاؤں اس حُسن اور جوانی کو۔"

میں نے کہا "باہر ساتھ والی کوٹھی کے گیٹ پر جا کے دکھانا یہ نخرے۔ اصل آزمائش تب ہوگی۔"

انیس بولا "ویسے چوکیدار کا بھروسا نہیں۔ بدمست آدمی ہے۔ پٹڑی بدل بھی سکتا ہے۔ عورت نہ سہی عورت جیسی چیز تو ہو۔"

"پٹڑی بدلنے سے پہلے اس کا پڑا ہو جائے گا۔ انیس احمد۔ قلم میرے پاس ہے اس لئے یہ مت سمجھنا کہ ہم نے تمہاری جان چھوڑ دی۔ جاؤ اتنی دیر میں اپنے بیڈ روم کی حالت ٹھیک کرو ورنہ بیوی آتے ہی شور مچا دے گی کہ میرے جوتے کپڑے کس نے نکالے تھے۔ کون آئی تھی یہاں میک اپ کرنے والی اور ہاں اس گیسٹ بیڈ سے اپنی مہمان اپنی بیوی کی سہیلی کی قابلِ اعتراض چیزیں بھی ہٹادو۔"

"ورنہ بیوی سب سمجھ جائے گی۔ تیری صبح کہہ رہی ہے تیری رات کا فسانہ۔ عام عورت بھی فوراً تاڑ جاتی ہے۔ تم تو پہلے سے مشکوک شوہر ہو۔"

اب مجھ سے آگے محسن گیا اور اس نے باہر نکل کے پہلے سڑک پر اِدھر اُدھر دیکھا مگر ہر سمت وہی ویرانی تھی۔ اس نے ساتھ والی کوٹھی کے دروازے پر دستک دی تو اس کے ہاتھوں کی چوڑیاں بج اٹھیں۔

اندر سے کسی نے کہا "او کون اے؟"

محسن نے زنانہ آواز بنا کے کہا "اے چوکیدار۔ دروازہ کھولو۔"

میں اس کے بالکل پیچھے تھا مگر دروازہ کھولے بغیر چوکیدار مجھے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اس نے کچھ حیران پریشان ہو کے کہا "خوب بیگم صاحب۔ اس وقت۔" اور پورا یقین نہ ہونے کے باوجود اس نے دروازہ کھول کے دیکھنے میں کوئی حرج نہ سمجھا۔ ایک تنومند پٹھان چوکیدار کے لئے جو مسلح بھی ہو اتنی رات گئے آنے والی عورت سے ڈرنے کی کوئی بات بھی نہ تھی۔

"او کون اے تم؟" اس نے محسن کو دیکھ کر کہا اور ایک قدم پیچھے ہٹ گیا "کس سے ملنا اے؟"

"شوکت رانا سے۔" محسن نے خاصی بھونڈی ادا سے کہا۔

"وہ... وہ تو نئیں اے اور....."

"میں سالی ہوں ان کی۔ نئی بیگم کی بڑی بہن۔" محسن اندر گھستا چلا گیا "ایسے کیا دیکھتا ہے اُلو کی طرح۔ باگڑ بلے۔"

وہ اچھل پڑا "گالی۔ گالی دیتا اے ام کو۔ کیسا عورت ہے۔ چلو نکلو ادر سے۔ ابھی بیگم صاحب بھی نئیں اے۔ ام نئیں جانتا تم کو۔"

"ہائے تو جاننے میں کتنی دیر لگتی ہے۔" محسن بانہیں پھیلا کے آگے بڑھا "رات بھر میں ایسی جان پہچان ہو جائے گی کہ....."

چوکیدار بدحواس ہو کے پیچھے ہٹا "اوئے۔ اوئے تم کیسا بے شرم عورت ہے۔ پیچھے ہٹو۔ ام... ام ایسا.... مرد نہیں اے۔"

محسن نے سینے پر ہاتھ رکھ کے کہا "ہائے میں مرگئی۔ کیا کہا مرد نہیں ہے؟ دیکھنے میں تو مرد ہی لگتا ہے۔ ہٹا کٹا۔ اُلو کا پٹھا۔"

وہ پھر اچھلا "اوئے اوئے تم پھر گالی نکالا۔ ام گولی مار دے گا تم کو۔"

اب محسن نے چیخ ماری "اجی منّے کے ابّا۔"

میں دوڑتا ہوا اندر گیا "کیا.... کیا... ہوا.... بے بے گم۔" میں نے ہکلاتے ہوئے اور ہانپتے ہوئے کہا۔

"دیکھو جی یہ موا مشٹنڈا کیسے بندوق تان رہا ہے مجھ پر اور مجھ سے زبردستی....."

میں نے چوکیدار کی بندوق پکڑ لی "کیوں بے۔ تا تا.... تا...

ناہنجار۔۔۔ تے۔۔تے۔۔۔ تیری یہ جرأت ۔ زبردس۔۔۔ دس۔۔دس ۔۔تی۔۔۔ ہماری۔۔۔ اہلیہ کے۔۔۔ سا۔۔۔سا۔۔۔ساتھ۔۔۔ ہم تیری وہ۔۔۔ کردیں۔۔۔ دیں ۔۔۔دیں گے۔۔۔ ک۔۔۔ک۔۔کیا بیگم۔۔۔ ہم کیا۔۔۔ک۔۔۔ک کرتے ہیں۔۔۔"

ابھی ایسی کی تیسی اور کیا۔" محسن نے کہا۔

"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ ایے ایے۔۔۔ سی سی۔۔۔ کی تیسی۔۔۔" میں نے چوکیدار سے بندوق چھیننے کی کوشش کی۔

چوکیدار ابھی تک اس ڈرامے کو سمجھ نہیں پایا تھا "اوئے چلو۔ تم بھی باہر جاؤ۔ خانہ خراب کا بچہ۔ ام تم کو بھی گولی مار دے گا۔"

"آہ۔۔۔ بے۔۔۔ بے گم۔۔۔ یہ نا۔۔۔نا۔ناہنجار۔۔۔ تو ہم۔۔۔ہم کو بھی۔۔۔ یعنی۔۔۔ دو۔۔۔ قتل کرنا چاہتا ہے۔" میں نے بدحواسی میں کہا اور محسن کا ہاتھ پکڑ کے اندر بھاگا۔

محسن زنانہ سلیپر کو گھسیٹتا اور ساری سنبھالتا دوڑا۔ چوکیدار نے ہمارا پیچھا کیا۔ "اوئے ٹھہرو۔۔۔۔ ابی ٹھہر جاؤ۔ ام بوت ظالم ہے۔ بوت گولی مارے گا تم کو۔"

ہمارا مقصد اندر پہنچنا تھا اور وہ پورا ہوگیا تھا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ ابھی تک چوکیدار نے رائفل پر سے سیفٹی کیچ بھی نہیں ہٹایا تھا۔ وہ صرف ہمیں بندوق دکھا کے ڈرانا چاہتا تھا۔ اگر اس کا ارادہ سچ مچ گولی چلانے کا ہوتا تو وہ ہمارے پیچھے نہ دوڑتا۔ وہیں سے نشانہ لے کر فائر کرتا اور گولی ہمارے سر کے اوپر سے جاتی یا ہماری ٹانگ میں لگتی مگر وہ فائر کرنے سے گریز کررہا تھا۔ اس کو یقین تھا کہ مجھ جیسے احمق شوہر اور محسن جیسی بے حیا بیوی سے وہ ویسے ہی نمٹ سکتا ہے۔

اندر پہنچتے ہی میں نے محسن کو آگے نکلنے کا موقع دیا اور جیسے ہی چوکیدار دوڑتا ہوا میرے پاس آیا میں ایک دم نیچے بیٹھ گیا۔ چوکیدار سنبھل نہ سکا اور میرے اوپر سے گزرا تو میں نے اس کی کلائی پکڑ کے جھٹکا دیا۔ اس کی بندوق اب میرے ہاتھ میں تھی اور وہ میرے سامنے چت پڑا ہوا تھا۔ سیمنٹ کے فرش پر گرنے سے اس کی کمر میں چوٹ آئی تھی۔

"ہم نے ک۔۔۔ ک۔۔۔ کہا تھا۔۔۔ نا۔ ہم ایسی کی تی۔۔۔ ت۔۔۔ تیسی کردیتے ہیں۔" میں نے بندوق کے کندے سے اس کا پیٹ دبا کے کہا۔

وہ چلّایا "اوئے ظالم کا بچّہ۔ ام نئیں چوڑے گا تم کو۔"

میں نے بندوق کا میگزین خالی کرکے گولیاں اپنی جیب میں ڈالیں اور پھر بندوق اسے پکڑادی "لو یہ لاٹھی استعمال کرو۔ اٹھو شاباش۔"

محسن نے کہا "اندر آؤ نا میری جان۔ بیڈ روم میں۔"

اب پٹھان کی آنکھوں میں خوف تجسس اور الجھن کے آثار پیدا ہوئے "تو۔۔۔ تم کون اے۔" وہ اُٹھ کے کھڑا ہوگیا "کیوں تنگ کرتی اے ام کو۔"

میں نے اسے اندر دھکیلا۔ اس نے مزاحمت کی تو میں نے اس کے پیٹ میں اپنے سر سے ٹکرماری اور اسے اوپر اُٹھا کے اندر پھینک دیا۔ محسن اندر نہ جانے کہاں غائب ہوگیا تھا۔ میں نے چوکیدار کو دوبارہ پیروں پر کھڑا کیا اور ایک کمرے کا دروازہ کھول کے اسے بھی اندر دھکیل دیا۔ یہ ایک پرتعیش بیڈ روم تھا۔ چوکیدار نے خالی بندوق گھما کے میرے سر پر وار کرنے کی کوشش کی مگر میں نے سر نیچا کرلیا پھر ناپ تول کے چوکیدار کے جبڑوں پر ایک مکّا رسید کیا۔ وہ لڑکھڑا کے بیڈ پر گرا۔

"اوئے۔۔۔ خانہ خراب۔۔ ام کو کیوں مارتی اے۔ ام غریب چوکیدار اے۔ ام تمہارا کیا بگاڑا۔"

میں نے کہا "چوکیدار۔۔۔ تم شوکت رانا کی نئی کوٹھی میں کب سے ہو؟"

وہ میرا بدلا ہوا لہجہ اور آواز سُن کے بھونچکا رہ گیا "دو مہینہ سے۔"

میں نے کہا "یعنی جب سے رانا صاحب نے یہ کوٹھی خریدی ہے اپنی نئی بیگم کے لئے۔ نئی بیگم صاحبہ آج کہاں ہیں؟"

"اپنے گھر گئی ہے۔ اپنا ماں باپ کا گھر۔ ام نئیں جانتا۔"

میں نے کہا "اچھا۔ اس وقت گھر میں تمہارے علاوہ کون ہے۔"

"ایک پی روز ہے۔ ڈرے ور۔ ایک چوٹا بیگم میب کا نوکرانی اے۔ نرس اے۔"

اچانک میری نظر بیڈ سائیڈ ٹیبل کی تصویر پر جم گئی۔ یہ نازو کی تصویر تھی۔ میرے ذہن میں دھماکا ہوا اور میں نے لباسِ عروسی میں بنی سجائی نازو کو دیکھا "یہ۔۔۔ یہ کون ہے؟"

"یہ چوٹا بیگم میب اے۔ نیا بی بی۔۔۔" چوکیدار کا جواب سُن کے میرے خدشات کی تصدیق ہوگئی۔ ایک موہوم سے اندیشے نے حقیقت کا روپ دھار لیا تھا۔ ایک بار پھر احساسِ شکست کی ذلت کے جذبات نے میرے دل کا لہو نچوڑ لیا تھا۔ آزمائشوں کے سفر کی خون رُلانے والی داستان کا آخری باب فوزیہ نے اپنے لہو سے لکھا تھا۔ اس سے پہلے بھی بہت نام تھے جو کل تک ہماری زندگی کا حصّہ تھے مگر آج دل پر ایک مندمل ہوجانے والے زخم کا نشان بن گئے تھے لیکن ان سب کو ہم سے دستِ اجل نے جدا کیا تھا۔ ہم نے ان کی موت کو مشیتِ ایزدی سمجھ کے صبر اختیار کیا تھا اور اپنی بے بسی پر آنسو بہا کے خاموش ہوگئے تھے۔ نازو جیتے جی ہم سے چھین لی گئی تھی۔ یہ طمانچہ مارنے والے ہاتھ ہمارے دشمنوں کے تھے اور یہ وار ہماری غیرت پر ہوا تھا۔

تصویر میں دلہن بنی ہوئی سُرخ عروسی جوڑے والی نازو کی وہ تصویر میرے احساس پر ایک تازیانہ تھی جس کی اذیت نے مجھے تڑپا دیا۔ اس روپ میں اپنے محبوب کو کس کی آنکھیں نہیں دیکھتیں؟

کبھی تصور میں تو کبھی خواب میں اور کٹتے کٹتے جب ہجر کے دشت کا سفر تمام ہوتا ہے اور اس خواب کو تعبیر ملتی ہے تو کون اپنی خوش بختی پر ناز نہیں کرتا۔ ایسی ہی کوئی خیالی تصویر غالب کے ذہن میں ہوگی مگر بقولِ شاعر

نیرنگیٔ سیاستِ دوراں تو دیکھئے
منزل انہیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے

اس خواب کی تعبیر ملی بھی تو کسے۔ شوکت رانا جیسے دشمن کو۔ جس نے ہم سے غالب کو چھینا تھا' اس نے غالب کی متاعِ حیات پر شب خوں مارا تھا اور اس کی زندگی کو لاحاصل کردیا تھا۔ معلوم نہیں یہ سب کیسے ہوگیا اور کیوں ہوگیا تھا۔ اگر نازو مرجاتی اور اس کی مسخ شدہ بدصورت لاش دیکھ لیتا تب بھی اتنی اذیت نہ ہوتی جتنی اسے سولہ سنگھار کئے ایک نو بیاہتا لڑکی کے روپ میں دیکھ کے ہوئی۔

جب میں نے اس تصویر پر غور کیا تو ظلم کا یہ احساس شدید تر ہوگیا۔ وہ خوشی جس میں منزلِ حیات پالینے کا اُجالا ہوتا ہے۔ وہ حیا جس میں ارمان جاگتے ہیں اور وہ دبی دبی مسکراہٹ جس میں عورت کی تکمیل کا غرور بولتا ہے۔ اس تصویر میں یہ سب نہیں تھا۔ نازو کا چہرہ احساس اور تمام جذبات سے عاری ایک ایسی تصویر کی طرح تھا جس کا ہر رنگ بے بسی اور مجبوری کا آئینہ دار تھا۔

میں اس تصویر کو دیکھتے ہوئے خود تصویر بن گیا تھا۔ میرے ذہن میں ایک طوفان بپا تھا اور خیالات کے گرداب میں ان گنت سوالوں کے بدصورت چہرے رقصاں تھے۔ اب غالب کا کیا ہوگا؟ آج تک وہ کسی کے لئے جیتا تھا اور آج کے بعد وہ کیوں جینا چاہے گا۔ کیا یہ دل فگار اور سفاک حقیقت اس کا ذہن قبول کرپائے گا کہ اس کی نازو اب کسی اور کے پہلو کی زینت ہے؟ اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو۔

پھر مجھے خیال آیا کہ کہیں غالب کی موجودہ ذہنی کیفیت کا سبب یہی تو نہیں۔ مگر اس خیال کو میری عقل نے مسترد کردیا۔ نازو کے بغیر غالب نہ فیروز ہوتا نہ کسی شوکت رانا کا ڈرائیور۔ وہ پاگل ہو کے گلی کوچوں میں نازو کو پکارتا نظر آتا یا کہیں تہِ خاک اپنے ارمانوں کے ساتھ سوتا نظر آتا۔

چوکیدار میری صورت کو غور سے دیکھ رہا تھا اور اس نے میری محویت سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش بھی کی مگر میں نے اسے لات مار کے پھر گرادیا۔ اس کے ساتھ ہی میرے ہاتھوں نے وہ فریم کی ہوئی تصویر اُٹھالی اور اسے دیوار پر دے مارا۔

"تم جھوٹ بولتے ہو۔ یہ تمہاری نئی بیگم صاحب نہیں ہوسکتی۔" میں نے دھاڑ کے کہا۔

چوکیدار کراہنے لگا "ام۔۔۔ ام جوٹ نئیں بولتا صاب۔ آپ مالوم کرلو۔ نوکرانی سے۔"

دروازے کے فریم میں مجھے محسن کسی بُت کی طرح استادہ نظر آیا۔ وہ نہ جانے کب سے وہاں کھڑا ہوا تھا۔ اس نے تصویر کو اور میری ذہنی کیفیت کو بھی دیکھ لیا تھا۔ اس کا چہرہ تاریک ہورہا تھا۔

"اس سے کیا ہوگا۔" محسن نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا "جو ہونا تھا وہ ہوگیا۔"

"نہیں۔" میں نے چلّا کے کہا "میں نہیں مانتا۔ نازو جان دے سکتی ہے مگر اپنے آپ کو کسی اور کے سپرد نہیں کرسکتی۔"

"ہم نہیں جانتے اس کی مجبوری کیا تھی۔" محسن بولا۔

میں نے کہا "کیا۔۔۔۔ غالب اسے بھی معلوم ہے!"

محسن نے نفی میں سرہلایا "میں نے گاڑی میں پوچھا تھا۔ وہ کہنے لگا کہ نازو تو میرے ساتھ ہے۔ میرے گھر میں۔ میں نے پوچھا کہ تمہارا گھر کہاں ہے تو بولا کہ وہی جہاں نازو رہتی ہے۔ اس نے اپنے خوابوں میں کوئی گھر بسا رکھا ہے۔ جہاں نازو شادی کے بعد رخصت ہوکے گئی تھی۔ اس دیوانے کو میں کیا سمجھاؤں۔ اور کیسے سمجھاؤں۔ جسے خبر ہی نہیں کہ۔۔۔۔۔"

میں نے کچھ دیر بعد کہا "وہ خود ہے کہاں؟"

"وہ اور خادمہ اندر ایک ساتھ سو رہے ہیں۔ ایک ہی بیڈ روم میں۔" محسن نے یہ اعتراف کرتے ہوئے بھی دکھ اور شرمندگی محسوس کی۔

"وہ خادمہ ایک نرس ہے۔ چوکیدار نے بتایا ہے۔"

"اچھا۔ پھر اس سے بہت کچھ معلوم کیا جاسکتا ہے۔ میں نے دوسرے سب کمروں میں گھوم پھر کے دیکھا۔ یہ تصویر کہیں اور نظر نہیں آئی۔ جو یہاں تھی شاید یہی شوکت رانا کا بیڈ روم ہوگا۔"

"اور ان کی نئی بیگم کا۔" میں نے تلخی سے کہا "جہاں غالب کا داخلہ ممنوع ہوگا۔"

چوکیدار پر محسن کی مردانہ آواز سے بجلی سی گر پڑی تھی "خو یارا ام کو بولو۔ تم کون اے۔ کیا ڈراما کرتی اے۔"

میں نے کہا "چوکیدار۔ میں شوکت رانا کی پہلی بیوی کا بڑا بھائی ہوں۔ میجر عبدالرحیم بھٹی۔ اور زنانہ حلیے میں میرا دوست ہے خفیہ پولیس کا انسپکٹر رحمانی۔ ہم تو آئے تھے رانا کو اٹھانے کے لئے۔ اس نے دھوکا کیا ہے میری بہن کے ساتھ دوسری شادی رچا کے۔ وہ مجھ سے چھپتا پھر رہا ہے۔ گھر جاتا ہوں تو پتا چلتا ہے وہ یہاں ہے۔ یہاں فون کرتا ہوں تو کوئی کہتا ہے وہ چلا گیا۔ ایک بار وہ ہاتھ آجائے تو میں اسے مزہ چکھادوں ایسے چوری چھپے شادی رچانے کا۔"

چوکیدار کی حالت مزید خراب ہوگئی "خو میجر صاحب جی۔ ام بوت غریب چوکیدار ہے۔ ام کو مانی دو۔ امارا ڈیوٹی ادر گیٹ پر ہوتا۔ ام کو اندر کا معاملہ نئیں مالوم۔ رانا صاحب ہم کو مار ڈالے گا۔"

میں نے اسے تسلی دی "فکر مت کرو۔ تم پر الزام نہیں آئے گا۔ ہم رانا کی گرفتاری کا وارنٹ لے کر آئے تھے۔ تم کو کچھ

بعد میں اس اطلاع پر اتنا ہی پریشان ہوا کہ کوئی عورت اور مرد کسی طرح فیروز اور رضیہ کو لے گئے ہیں۔ میں فون کی ایکسٹینشن پر اس کے چیخنے چلّانے کی آواز سُنتا رہا۔ وہ چوکیدار کو گالیاں دے رہا تھا۔ "میں شوٹ کردوں گا تمہیں۔ یہ سب تمہاری غفلت کا نتیجہ ہے۔ اندر کیسے آگئے تھے وہ۔ تم نے دروازہ کیوں کھولا تھا۔ حرام خور۔ نمک حرام۔ تم سو رہے ہوگے۔ تمہارے پاس بھری ہوئی بندوق تھی۔ تم نے گولی کیوں نہیں ماردی انہیں۔"

چوکیدار نے میری مرضی کے مطابق بیان دیا تھا۔ خود اس کی جان اسی طرح بچ سکتی تھی کہ وہ اپنے ساتھ ہونے والے دھوکے اور جبر کا اقرار کرلے۔ میری ہدایت پر چوکیدار نے کہا تھا کہ وہ ضرور کسی گاڑی میں آئے ہوں گے اور فیروز کے ساتھ رضیہ کو بھی اسی گاڑی میں ڈال کے لے گئے ہوں گے مگر اس نے کوٹھی کے سامنے کسی گاڑی کے رُکنے کی آواز نہیں سُنی تھی۔ شاید وہ گاڑی دور چھوڑ کر آئے تھے۔

رانا نے غصّے میں اسے مزید گالیاں اور دھمکیاں دے کے کہا "اچھا میں آتا ہوں۔ پتا چل جائے گا کہ یہ کس کا حرامی پن تھا۔"

چوکیدار نے ریسیور رکھا تو میں نے کہا "تم نے ثابت کردیا تھا کہ تم فرض شناس بھی ہو اور شریف بھی۔ تم اس عورت کے چکر میں نہیں پڑے تھے اور تم نے اپنی طرف سے ہمارا راستہ روکنے کی پوری کوشش بھی کی تھی۔ تمہیں کوئی شرمندگی نہیں ہونی چاہئے۔ اصل بات یہ ہے کہ تم ہمارا مقابلہ کرہی نہیں سکتے تھے۔ اب آخری بات غور سے سُن لو اور سمجھ لو۔ جب رانا یہاں آئے گا تو تم اسے بے ہوش ملوگے۔ ہوش میں آنے کے بعد کہنا کہ تم نے انہی کے کہنے پر فون کیا تھا۔ وہ ریوالور لئے کھڑے تھے اور تم ان کی نہ مانتے تو وہ تمہیں گولی ماردیتے۔ وہ تم سے فون کرانے کے بعد تمہیں ناک آؤٹ کرگئے تھے۔"

چوکیدار نے اپنی ناک کو چُھوا "امارا ناک آؤٹ کیسے؟"

میں نے اس کی کنپٹی پر ریوالور کا دستہ مارا "ایسے" میں نے کہا اور اسے وہیں فرش پر چھوڑ دیا۔

اس کے بعد ہم نے غالب کے بیڈ روم کا دروازہ بجایا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ کھڑکی کے نیچے بھی پردہ تھا مگر اس کی جھری میں سے وہ بیڈ نظر آتا تھا جس پر غالب سو رہا تھا۔ دستک پر عورت نے کروٹ لی اور سر اُٹھا کے پوچھا "کون ہے؟"

محسن نے پھر دروازہ بجایا تو وہ اٹھی۔ اس نے تقریباً شفاف کپڑے کا نائٹ سوٹ پہن رکھا تھا۔ اندر ہلکی نیلگوں روشنی میں اس کا گہرا سانولا رنگ تقریباً کالا محسوس ہوتا تھا۔

دروازہ کھلتے ہی محسن اندر داخل ہوگیا تو اس نے چیخ ماری "ہو... ہو آر یو۔ کون ہے تم؟"

"ہائے مجھے نہیں پہچانا مارگریٹ۔" محسن نے اسے چمٹا کے چوم لیا "میں تمہاری بہن ہوں۔ الزبتھ۔"

چُھپانے کی ضرورت نہیں۔ تم اسے بتاسکتے ہو کہ ہم کس طرح تمہیں دھوکا دے کر اندر آگئے تھے اور تمہیں بے بس کردیا تھا۔ تم نے ہمارا مقابلہ کیا تھا مگر ہم نے تم سے بندوق بھی چھین لی تھی۔ یہ سب جھوٹ تو نہیں۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "وہ بولے گا۔ ام کو بتایا کیوں نہیں۔ ٹیلی فون کیوں نہیں کیا۔"

میں نے کہا "اٹھاؤ فون اور اسے بتادو۔ یہ بولو کہ ایک مرد اور عورت زبردستی گھر میں گھس آئے ہیں۔ انہوں نے مجھے بہت مارا ہے اور جاتے وقت فیروز کو بھی اپنے ساتھ لے گئے ہیں اور خادمہ کو بھی۔ کیا نام ہے اس نرس کا۔"

"مارگریٹ... کرسٹان اے میجر صاب۔ پی روز پاگل کا بچہ اس کے ساتھ شادی بنایا۔ ام بوت روکا۔"

"کیا فیروز نے شادی کرلی ہے اس سے؟"

"آہو کانا۔ بولتا ام کرسٹان کو مسلمان کیا۔ نکاح بنایا اسلام کا طریقہ سے۔ اس کا نام رضیہ رکھا۔ خو سب جھوٹ بولتا اے۔ ام اس کو کرسٹان کا طریقہ سے ایسا کرتا دیکھتا۔" چوکیدار نے اپنے سینے پر صلیب بنا کے دکھایا۔

یہ اطلاع مزید دکھ کا سبب بنی کہ ذہنی خود فراموشی کی اس کیفیت میں غالب نے کسی کرسچن نرس سے شادی تک کرلی ہے۔ یا شاید کسی اور نے اس کو باور کرایا ہے کہ مارگریٹ مسلمان ہونے کے بعد رضیہ کے نام سے اس کی بیوی بن چکی ہے۔ غالب نے خود کو فیروز تسلیم کرلیا ہے تو پھر مارگریٹ کو بھی رضیہ مان لیا ہوگا لیکن کہیں ایسا تو نہیں کہ اس کی چشمِ تصور مارگریٹ کے روپ میں نازو کو دیکھتی ہو۔ دیوانے کو ہر چہرے میں محبوب کا جلوہ نظر آتا ہے۔ جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تو ہی تو ہے۔

یہ محض جذباتی یا اخلاقی مسائل ہی نہیں تھے۔ ان کا ایک قانونی پہلو بھی تھا۔ کیا نازو کی شوکت رانا سے اور غالب کی مارگریٹ سے شادی جائز تسلیم کی جائے گی؟ اس میں رضامندی جبر سے حاصل کی گئی تھی یا ایسی ذہنی کیفیت میں جسے پاگل پن کے سوا کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ایسا کوئی معاہدہ کوئی قانونی حیثیت نہیں رکھتا جو "بقائمی ہوش و حواس" نہ کیا جائے یا برضا و رغبت نہ ہو۔ نشے میں کسی دوا کے زیرِ اثر۔ تنویمی حالت میں یا ذہنی عدم توازن کی کیفیت میں سرزد ہونے والے کسی فعل کو دنیا کی کوئی عدالت جائز اور درست قرار نہیں دے سکتی۔

میں نے محسن سے فرنچ میں بات کی اور باہمی صلاح و مشورے سے ہم نے طے کیا کہ پہلے تو رانا کو فون کرکے یہاں بُلوایا جائے اور اس کے آنے سے پہلے غالب کو مارگریٹ کے ساتھ انیس کے بنگلے میں پہنچادیا جائے۔

چوکیدار نے کانپتے ہوئے فون اُٹھا کے رانا سے بات کی۔ وہ آدھی رات کے وقت موصول ہونے والے اس فون پر جتنا برہم تھا

اس نے بڑی مشکل سے خود کو چھڑایا "واٹ نان سنس... ہمارا کوئی سسٹر نہیں ہوتا۔"

"ہائے میں مرگئی۔" محسن نے پھر سینے پر ہاتھ رکھا "ساری دنیا کو معلوم ہے یہ بات کہ ملکہ الزبتھ کی بہن ہے پرنسس مارگریٹ۔"

"شٹ اپ" وہ چلائی "پھیروز... پھیروز... اٹھو مین۔ یہ کون آگیا ہے ادھر۔ چوکیدار۔ اے چوکیدار۔ یو باسٹرڈ۔"

فیروز یعنی غالب اس چیخ پکار پر اٹھ بیٹھا تھا۔ اس نے خالی خالی نظروں سے محسن کو اور پھر مجھے دیکھا پھر وہ مجھے پہچان گیا مگر میں نے اسے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے چُپ رہنے کا اشارہ کیا تو وہ کچھ بولتے بولتے خاموش ہوگیا۔ مجھے اس کے تعاون سے خوشی ہوئی۔ لاشعوری طور پر وہ ہمارے ساتھ تھا۔

مجھے دیکھتے ہی مارگریٹ نے چلّا چلّا کے چوکیدار کو پکارا تھا مگر میں نے اس کے ایک جھانپڑ رسید کیا تو وہ پلٹ کے پیچھے گری اور دیوانہ وار چیخنے لگی۔ میں نے اس کو اٹھا کے دوسرا تھپڑ زیادہ قوت سے رسید کیا تو اس کی آواز بالکل بند ہوگئی۔ میرے ہاتھ کی انگلیوں کے نشان اس کے گال پر اُبھر آئے۔ میں نے محسن کو غالب کے ساتھ چھوڑا اور اسے دوسرے کمرے میں لے گیا۔

وہ اٹھائیس تیس سال کی یا شاید کچھ زیادہ عمر کی عورت تھی جس کے سوکھے جسم میں شباب یا نسوانیت کی دلکشی نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اس کے اطوار ہی گواہی دیتے تھے کہ وہ کوئی شریف عورت نہیں تھی۔

میں نے کہا "جتنا چاہو چلاؤ مارگریٹ عرف رضیہ۔ نہ کوئی چوکیدار آئے گا تمہاری مدد کے لئے نہ شوکت رانا۔ فیروز سے کیا رشتہ ہے تمہارا؟"

اس نے انگریزی میں کہا "پلیز مجھے مت مارو۔ میرا کوئی قصور نہیں ہے مجھے تو رانا نے..." اس کی آواز بھرا گئی۔

"پیسہ دیا تھا۔ کتنا پیسہ دیا تھا؟" میں نے کہا۔

"دس ہزار..." وہ رونے لگی "میں انکار نہیں کرسکتی تھی۔ اس نے جو کہا میں نے کیا۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا "فیروز تمہارا شوہر نہیں ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "نہ میں رضیہ ہوں۔ یہ... یہ تو پاگل ہے کوئی... مجھے نازو کہتا ہے۔ نازو کون ہے؟"

میں نے کہا "شٹ اپ۔ تمہیں سوال کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ تم نے اس پاگل کو اپنا شوہر کیسے مان لیا۔"

"میں نے بتایا۔ میں مجبور تھی۔ اتنا پیسہ کون دیتا ہے۔ میں تو ہر رات سو سو روپے میں بیوی بننے والی عورت ہوں اور میرا اصل شوہر تو سو کا نوٹ ہوتا ہے۔ وہ مرد مسلمان ہو یا عیسائی۔ مجھے اس کے نام سے کیا لینا۔ فیروز پاگل ضرور تھا مگر وہ پاگل نہیں جو مجھے سوتے میں مار ڈالے۔ اس نے تو... مجھے ہاتھ تک نہیں لگایا۔ یہ تو کسی بچے کی طرح مجھ سے چمٹ کے سوجاتا تھا۔ اور بس... مجھ سے بہتر کون جانتا ہے آدمی کے اندر کے حیوان کو۔ اور سو روپے میں ملنے والی عورت کے سامنے تو وہ بھی اپنی مردانگی کے جوہر دکھاتے ہیں جو اندر سے مرد ہی نہیں ہوتے لیکن غالب کے وجود میں مجھے بڑی تلاش اور کوشش کے باوجود ایک آدمی ہی ملا۔ ڈرا ہوا اور سہما ہوا۔ کسی پناہ کی تلاش میں سرگرداں۔ کسی سہارے کا متلاشی۔ بے چین اور بے قرار زخمی روح والا..."

میں نے اسے حیرانی سے دیکھا "یہ تم نے کیسے جان لیا؟"

وہ اب خلا میں دیکھ رہی تھی "میں نے کہا نا میں ہر رات ایک تجربے سے گزرتی آئی ہوں۔ کب سے؟ یہ مجھے یاد نہیں۔ شاید تیرہ برس کی تھی میں جب میں نے مرد کو ایک الگ روپ میں دیکھا تھا۔ اس سے پہلے وہ صرف باپ تھا یا بھائی۔ تب مجھے پتا چلا کہ وہ بھی دو ٹانگوں والے جانور ہی ہوں گے اور تب سے آج رات تک کتنی راتیں آئی ہیں۔ بیس برس تو ہوگئے مجھے ایک ہی تجربہ کرتے پھر یہ سوال کیوں۔ میں تو مرد کو اس کی ایک نظر... ہاتھوں کے لمس... چہرے کی تحریر اور اندازِ محبت ہی سے سمجھ لیتی ہوں۔ ننانوے فیصد مرد ایک رات میں ایسے سامنے آجاتے ہیں جیسے کھلی کتاب۔ ہاں ایک فیصد کسی طرح خود کو ظاہر نہیں ہونے دیتے۔ مجھے اندازہ بلکہ یقین ہے کہ تمہارا دوست بڑے عذاب میں ہے۔ مجھے اس نے کچھ نہیں بتایا کہ اس پر کیا واردات گزری ہے لیکن وہ بہت دُکھی ہے اور کسی سے اپنا دکھ کہہ بھی نہیں سکتا۔ اس لئے وہ بھٹکا ہوا ہے۔ میں نے اس کے ساتھ ویسا ہی سلوک کیا جیسا کسی گھر کا راستہ بھول جانے والے کے ساتھ کرنا چاہئے اور اس لئے وہ میرا ہاتھ پکڑ کے میرے ساتھ چلنے پر راضی ہوگیا۔ اسے تو شاید خود بھی معلوم نہیں ہوتا کہ جو کچھ وہ کررہا ہے یا کہہ رہا ہے وہ کیوں کہہ رہا ہے اور کیوں کررہا ہے۔ شاید اسے یاد بھی نہ ہو کہ اس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا مگر پھر بھی بہت کچھ کہہ دیا۔ وہ کئی بار رات کے وقت سسکیاں لے کر روتا رہا۔ کئی بار اس نے کہا کہ نازو تم نازو ہونا۔ یہ ہمارا گھر ہے نا۔ میرا اور تمہارا اور میں نے اس سے جھوٹ بولنے کا گناہ کیا۔ اسے یقین دلانے کی کوشش کی کہ میں نازو ہوں اور یہ ہمارا ہی گھر ہے۔ میں جانتی ہوں وہ اس جھوٹ کو تسلیم کرنے والا نہیں تھا۔ اور اس نے سوتے میں جو کہا وہ جاگتی آنکھوں کا خواب تھا۔"

میں نے اسے مارا تھا۔ اب مجھے شرمندگی ہورہی تھی۔ بدکردار ہونے کے باوجود وہ بُری عورت نہیں تھی۔ وہ ان شرافت کی نقاب اوڑھے رکھنے والوں جیسی نہیں تھی جو کسی مجبوری کے بغیر خود کو بیچتے ہیں۔

میں نے کہا "آئی ایم سوری۔ تمہارا شکریہ ادا کرنے کے بجائے میں نے تمہارے ساتھ بے رحمی کا سلوک کیا۔"

"مجھے ایسی بے رحمی اچھی لگتی ہے۔ سو روپے والی چاہت کے اظہار سے..."

"تم پڑھی لکھی اور حسّاس عورت ہو۔"

میں تم کو بھی آزماؤں گی۔ کیا ہو گا اگر ایک بار پھر میرے ساتھ دھوکا ہوا۔ پہلے بھی میں ہر بار کو آخری بار سمجھنے کی بے وقوفی کر چکی ہوں۔"

میں نے کہا "تم نرس ہو؟"

"میں نرس تھی۔ اس سے پہلے میں ٹیچر تھی۔ اور اس سے پہلے بھی بہت کچھ تھی لیکن میں نے ہر نام کو رُسوا کیا۔ نرس یا ٹیچر کا لیبل لگانے سے نہ میں اپنی نظر میں معتبر ہوئی اور نہ دنیا کی نظر میں معزز۔"

یوں لگتا تھا جیسے وہ مسلسل بولتی رہے گی اور میں اس سے کوئی بھی بات کروں جواب میں وہ اپنے وجود میں جمع ہو جانے والا زہر اُگلے گی۔ اس کی زبان سے پھول جھڑ بھی نہیں سکتے تھے۔ وہ تو بالکل ....تو ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز۔ کی تفسیر تھی اور میرے پاس فی الحال اتنا وقت نہیں تھا کہ اس سے عمرِ رفتہ کے ہر لمحے کے عذاب کی کہانی سُنوں۔

"چلو تم غالب کے ساتھ نکل جاؤ۔" میں نے کہا۔

"نکل کے کہاں جاؤں؟"

"ساتھ والی کوٹھی میں۔ انیس احمد نام کا ایک شخص وہاں تمہیں خوش آمدید کہے گا۔ ویسے تو وہ بھی اسی جنس سے تعلق رکھتا ہے جن کو تم دو ٹانگوں والا حیوان کہتی ہو لیکن ہم نے اس حیوان کو اپنے اشاروں پر چلنا سکھا دیا ہے۔ بالکل اسی طرح سرکس والے جنگل کے بادشاہ کو سدھا کر سیدھا کر دیتے ہیں اور وہ پالتو کتّے کی طرح ہو جاتا ہے۔ غالب کو تم سنبھال سکتی ہو۔ ہمیں تمہاری ضرورت پڑے گی۔ اسے اپنے ساتھ لے جاؤ۔"

اس نے میری بات مان لی اور غالب کو ساتھ لے گئی۔ انیس احمد گیٹ کے قریب ہی ٹہل رہا تھا۔ میں نے اسے سمجھا دیا کہ یہ ہمارے دوست اور معزز مہمان ہیں۔ انہیں کوئی تکلیف نہ ہو۔ ورنہ!

اس نے آہ بھری "آج کی رات تو بلاؤں کا نزول ہے۔ غریب خانہ ہے موجود ہر بلا کے لئے اور بھی جسے چاہے لے آؤ۔"

میں نے کہا "ان سے کوئی فضول بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ نہ اپنے بارے میں نہ ہمارے بارے میں۔ بس انہیں کسی بیڈ روم میں جگہ دے دو اور اگر یہ کچھ کھانا پینا چاہیں۔"

"میں تو چائے بھی نہیں بنا سکتا۔ انڈا دے سکتا ہوں اُبال نہیں سکتا۔ کچن کا راستہ دکھا دوں گا۔" وہ اندر جاتے ہوئے بولا۔

میں نے اور محسن نے ایک طرف سے مطمئن ہو جانے کے بعد شوکت رانا کی کوٹھی کے ہر بیڈ روم کی تلاشی لی۔ الماریوں اور میزوں کی درازوں کو کھنگالا۔ مجموعی طور پر ہمیں ایک لاکھ سے زائد نقد رقم، اس سے دگنی تگنی رقم کے زیورات اور کچھ ہیرے جواہرات ملے جن کی مالیت کا اندازہ ہم کر ہی نہیں سکتے تھے۔ ہمیں تو یہ بھی پتا نہیں چلا کہ وہ اصلی ہیں یا نقلی مگر ہم نے انہیں بھی مالِ غنیمت

"اسی کا تو دکھ اور رونا ہے۔ میں ایک عام عورت ہوتی۔ ان جیسی جو کوٹھوں سے گلیوں بازاروں اور سات پردوں کے پیچھے بھی یہی دھندا کرتی ہیں۔ پیسہ پہلے مجبوری تھا پھر شوق بن گیا۔ اب نشہ ہے جسے میں چھوڑنا بھی چاہوں تو چھوڑ نہیں سکتی اور چھوڑ کے مجھے ملے گا بھی کیا۔ میں لوٹ کر بھی کہاں جاؤں گی۔ اب پیسہ ہی تو میرا سہارا ہے میرا سب کچھ ہے۔"

میں نے کہا "اچھا تم ہمارے ساتھ چلو۔ یہاں زیادہ باتیں کرنے کا وقت نہیں ہے۔ شوکت رانا آتا ہی ہو گا۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "اب میں کسی کے ساتھ نہیں جا سکتی۔ مجھے رانا نے خرید لیا ہے ہمیشہ کے لئے۔ جیسے پہلے لوگ غلام خریدتے تھے۔ اگر غلام کبھی آزادی حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا تو اسے ہمیشہ کے لئے آزادی مل جاتی تھی قیدِ حیات سے۔"

میں نے کہا "ڈرو نہیں۔ ہمارے ساتھ رانا تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ تم خود کو اتنا ہی محفوظ سمجھو گی جتنا اپنے گھر میں تھیں۔ اپنے باپ کے گھر میں۔ آج سے بیس سال پہلے... رہی دس ہزار کی بات تو تم جب چاہو اس کی ادا کی ہوئی قیمت اس کے منہ پر مار دینا۔ ہم سے لے لینا۔"

وہ تلخی سے مسکرائی "تم سے بھی پیسہ لوں؟ نہیں پیسہ تو بہت ہے میرے پاس۔ غلیظ بدبودار اور ناپاک پیسہ۔ پتا نہیں کیوں جمع کرتی جا رہی ہوں میں غلاظت کا یہ ڈھیر۔ کیا اس سے میں خداوند یسوع مسیح کی رضا حاصل کر سکتی ہوں۔ خدا کی مہربانی اور بخشش کا سودا کر سکتی ہوں۔ ایک بار میں اعتراف کرنے چرچ گئی تھی۔ پادری نے بڑی ناگواری سے میری باتیں سُنیں اور پھر ایسے مجھے دعا دے کر ٹال دیا جیسے کوڑھی کو خیرات دیتے ہیں۔ جاؤ ہمارے دروازے سے دور۔ ہم سے دور۔"

میں نے اس کو سہارا دے کر اُٹھا لیا "سمجھو کہ وہ سب تم نے پا لیا جو چاہا تھا۔ جس کے لئے تم چرچ گئی تھیں۔ یسوع کی رضا اور خدا کی مہربانی۔ سب حاصل ہو گئی ہے تمہیں۔ بخشش کے دروازے کھل گئے ہیں تمہارے لئے۔ اب تم بالکل محفوظ ہو۔"

"ایسا میں نہیں سمجھ سکتی۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"تمہیں سمجھنا چاہئے کہ ہر دعا بھی اپنے وقت پر قبول ہوتی ہے۔ اس کے بعد سب تم پر منحصر ہے۔ تمہارے ارادے اور تمہاری ہمت پر۔ شوکت رانا سے ڈرنا چھوڑ دو۔ یہ بتاؤ کہ وہ کیا کر سکتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ تمہیں قتل کر سکتا ہے نا تو ایسا بھی خدا کے حکم پر ہی ہو گا۔ رانا کے چاہنے سے نہیں اور مارنے والے ہاتھ سے بچانے والا ہاتھ زیادہ زبردست ہے۔ ہمیشہ سے۔ لیکن خدا بھی انہی کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔ یہ بات تو سچ ہے۔"

"سچ بہت کچھ ہے۔ لیکن سچ بولنے والوں پر سے میرا اعتبار اُٹھ گیا ہے۔ پتا نہیں تم بھی کتنا سچ بول رہے ہو اور کس غرض سے۔ خیر

میں شامل کر لیا۔ درازوں میں سے ایک کارآمد ڈائری ملی جس میں کچھ نام اور پتے درج تھے۔ اس میں چار چیک بھی تھے جو ابھی کیش نہیں کرائے گئے تھے ان پر چند دن پہلے کی تاریخ تھی۔ محسن نے ایک رجسٹر جیسی ڈائری دیکھی جس کے ہر صفحے پر ایک ہی نام تھا اور نیچے تاریخ وار چیک نمبر اور رقوم درج تھیں۔ یہ چار چیک بھی چار مختلف صفحات کے اکاؤنٹ میں موصول ہوئے تھے۔ ہزار روپے کا ایک چیک محمد یعقوب نام کے کھاتے میں شامل تھا۔ اس سے پہلے والے چیک سیریل نمبر میں تھے جس سے ثابت ہوا کہ وہ ایک ہی چیک بک سے نکالے گئے تھے اور یہ ایک ہزار ماہانہ کی رقم پہلے سات ماہ سے بڑی باقاعدگی سے وصول ہو رہی تھی۔ جلدی جلدی میں نے شوکت رانا کی گاڑی میں بم کے کنکشن صحیح طرح سے جوڑے۔ میرے اور محسن کے لئے شوکت رانا کی آمد کسی بھی لمحہ متوقع تھی اور ابھی ہم تلاشی کے عمل میں مصروف ہی تھے کہ کوئی گاڑی اندر آ گئی۔ میں اور محسن پچھلی طرف چلے گئے۔ سامنے سے شوکت رانا چنگھاڑتا ہوا آ رہا تھا۔

"چوکیدار.... کہاں مر گیا۔ باہر آ حرام زادے۔" وہ سخت غصّے میں تھا اور شاید نشے میں بھی۔

میں نے اور محسن نے سائیڈ کی گیلری سے جھانک کے دیکھا تو اس کی گاڑی سے دو خطرناک قسم کے گوریلے بھی باہر آ چکے تھے۔ ان کے ہاتھ میں "سب مشین گن" تھی اور ان کے تیور بتاتے تھے کہ وہ اپنی راہ میں مزاحم ہونے والے کسی بھی شخص کو چھلنی کر دیں گے۔

شوکت رانا اچانک چیخنے لگا "یہ... یہ گاڑی کا شیشہ کیسے ٹوٹا ہے۔ میری نئی گاڑی برباد کر دی۔ کہاں ہے وہ.... فیروز؟"

اتنی گالیوں کے جواب میں بھی خاموشی رہی تو اس نے گوریلوں کو اندر جا کے صورتِ حال کا جائزہ لینے کا حکم دیا "شکل دیکھ رہے ہو میری؟ دل آ گیا ہے کیا مجھ پر؟ یا سینگ نکل آئے ہیں میرے۔ اندر جاؤ۔ دیکھو وہ... کہاں مر گئے ہیں۔"

گوریلے بُرا مانے بغیر اندر چلے گئے۔ وہ اس طرزِ تخاطب کے عادی تھے۔ کچھ دیر بعد ہی ان کی اندر سے چلّانے کی آواز آئی "رانا صاحب اندر آئیں جی یہ چوکیدار تو مر گیا شاید۔ فیروز بھی غائب ہے اور وہ کنجری بھی نہیں ہے۔"

شوکت رانا کے اندر جاتے ہی میں اور محسن باہر نکل گئے۔ گیٹ سے نکلتے ہوئے میں نے اس گاڑی کی چابی نکال لی جس میں شوکت رانا آیا تھا پھر محسن نے ایک عقل مندی اور کی۔ اس نے گیٹ کے قریب ٹیلی فون کا کھمبا دیکھا۔ اس کے اوپر سے دو تار شوکت رانا کی کوٹھی میں بھی جا رہے تھے۔ محسن پہلے انیس احمد کی کوٹھی کے گیٹ پر چڑھا اور پھر دیوار پر۔ وہاں سے ٹیلی فون کے تار محسن کی دسترس میں تھے۔ اس نے دونوں تار کھینچ کے الگ کر دیے اور خود پول سے نیچے اُتر آیا۔

انیس احمد اندر تھا اور پھر پی رہا تھا "معاف کرنا۔ اس کے بغیر میرے اعصاب ساتھ نہیں دیتے۔ میں ذرا نروس ہوں۔ پتا نہیں تم کیا کرتے پھر رہے ہو اور میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔"

میں نے کہا "ابھی تک تو کچھ ہوا نہیں۔"

"ہاں" وہ آہ بھر کے بولا "تم کو غلط کیسے کہوں میں۔"

"اس میں غلط کیا ہے۔ جو ہوا ہمارے آنے سے پہلے ہو چکا تھا۔ ہم نے تمہاری گلو خلاصی کرا دی اس عورت سے۔ اگر وہ قلم لے جاتی۔"

"قلم، مجھے تو نہیں ملی۔"

میں نے کہا "مل جائے گی۔ فکر مت کرو۔ بہت جلد۔"

محسن بولا "ہاں تم بس وہی کرو جو تم سے کہا جائے۔ باتیں کم کرو۔"

"یہ تم کیا سمیٹ لائے ہو۔ اُف۔ تم نے تو ڈکیتی کی ہے۔ اور چوری کا مال میرے گھر میں۔"

میں نے اس کے ایک مکّا رسید کیا "ابھی کہا تھا میرے دوست نے کہ باتیں کم کرو۔ مالِ غنیمت کو چوری کا مال نہیں کہا جاتا۔ مالِ غنیمت حلال ہوتا ہے۔ ہم نے یہ سب اپنے دشمن سے چھینا ہے۔ تمہاری طرح قومی خزانے میں نقب نہیں لگائی ہے۔ چور ہو تم.... ٹیکس اور کسٹم ڈیوٹی چُرانے والوں کے ساتھی، تم کو اختیار دے کر حکومت تم پر اعتماد کرتی ہے مگر تم ڈاکا ڈالتے ہو اسی حکومت کے محاصل پر۔ پھر اس دولت سے مجبور عورتوں کی عصمتوں کو لوٹتے ہو۔ تم سے بڑا چور ڈاکو بھلا کون ہو گا۔ یہ کوٹھی اور جو کچھ اس کوٹھی میں ہے سب چوری کا مال ہے۔ اپنی تنخواہ میں تو صرف کرائے کا چھوٹا سا مکان لے کر ہی رہتے اور مشکل سے تمہاری دال روٹی چلتی۔ یہ ٹھاٹ باٹ کہاں سے آئے۔"

وہ جبڑا پکڑ کر کرسی پر بیٹھ گیا "جس کا مال ہے۔ وہ چوری کی رپورٹ تو لکھوائے گا۔ اگر اسے معلوم ہو گیا....." وہ دوسرا جام بھرنے لگا۔

"اگر مگر کی اولاد۔ اسے کیا فرشتے بتانے جائیں گے۔" میں نے اس کے ہاتھ پر کک ماری۔ جام شراب اچھل کے چھت تک گیا اور چکنا چور ہو گیا۔ شراب کے چھینٹے اس کے اپنے منہ پر گرے۔

محسن بولا "ابھی وہ فون کرنے آئے گا یہاں۔"

"فون تو اس کے گھر میں بھی ہے۔ دو ہیں شاید۔"

"وہ خراب ہیں۔" محسن نے جھنجلا کے کہا "تم باہر جا کے ٹہلو۔ ذرا سکون سے۔ وہ فون کرنے آئے تو کہنا کہ میرا اپنا فون خراب ہے۔ سارے فون خراب ہیں۔ بیوی میکے گئی تھی۔ شام تک آنا تھا۔ ابھی تک نہیں آئی۔ اکیلا پریشان ہو رہا ہوں گھر میں۔ لفظ بہ لفظ یہی کہنا ہے تمہیں۔ سمجھے۔"

"سمجھ گیا۔ اگر وہ اور کوئی بات پوچھے؟"

اس نے فریادی نظروں سے آسمان کی طرف دیکھا "یا میرے مولا۔ اب میں کس کی مانوں کس کی نہ مانوں۔ آگے کھائی پیچھے خندق، کہاں جاؤں۔"

محسن بولا "تم جہاں کھڑے ہو وہیں کھڑے رہو۔ حقیقت ایک دن تمہارے سامنے آجائے گی۔ ابھی تم پر آنچ نہیں آسکتی۔ تمہارا پڑوسی یہ تو کہنے سے رہا کہ ڈاکا بھی انیس احمد نے ڈالا تھا اور قاتل بھی وہی ہے لیکن تم نے غلطی سے بھی ہمارا نام لیا تا تو یہ فلم بہت سے لوگ دیکھیں گے۔ تمہارے سسرال والے اور محلے والے۔"

"خدا کے لئے یہ غضب مت کرنا۔ میں تمہارا غلام۔ تمہارے باپ کا غلام جو کہو گے کروں گا۔" وہ ہاتھ جوڑ کے بولا۔

اسی وقت پڑوس کے بنگلے میں زبردست دھماکا ہوا۔ میں اور محسن بھی اُچھل پڑے۔

انیس احمد نے گھبرا کے کہا "یہ.... یہ کیا ہوا؟"

میں نے کہا "شاید بیک فائر کیا ہے کسی گاڑی نے۔"

محسن بولا "نہیں یار۔ ٹائر برسٹ ہوا ہوگا۔"

"یہ بم کا دھماکا تھا۔" انیس بولا "دیکھو مجھے سچ سچ بتادو۔ تم کیا کرکے آئے تھے۔ تمہاری کیا دشمنی ہے رانا سے۔"

میں نے کہا "انیس احمد۔ بعض اوقات زیادہ جاننا خطرناک ہوتا ہے۔"

"اور زیادہ بولنا بھی۔" محسن نے کہا۔

"تمہاری بھلائی اور سلامتی اسی میں ہے کہ تم اندھے گونگے اور بہرے بن جاؤ۔ تم نے کچھ نہیں دیکھا۔ کچھ نہیں سنا۔ تمہیں کچھ معلوم نہیں۔ آج نہ ہم یہاں آئے نہ ایسی ویسی کوئی بات ہوئی۔ تم اکیلے تھے جب تم اکیلے ہوتے ہو تو کیا کرتے ہو؟"

"بد معاشی" محسن بولا "ہم تو چشم دید گواہ ہیں۔"

"میرا مطلب تھا بد معاشی کے علاوہ۔ فرض کرو اپنی بیوی کو بتانا پڑے کہ تم نے یہ وقت کیسے گزارا۔ تو کیا کہو گے؟"

اس نے سوچ کے کہا "وہی جو اکثر کہتا ہوں۔ کہ بہت اداس تھا۔ کچھ دیر ٹی وی دیکھا۔ گانے سنے۔ ایک رسالہ یا کتاب پڑھنے کی بھی کوشش کی مگر دل نہیں لگا۔ جو فرج میں چھوڑ گئی تھیں تم وہی کھایا۔ بھوک بھی نہیں تھی۔ گرم کیا اور ٹھنڈا کیا۔ بس اس کے بعد سو گیا۔"

"ویری گڈ۔ یہی بیان چلے گا۔"

"مگر میری بیوی اس پر یقین کہاں کرتی ہے۔"

محسن بولا "نہ کرے۔ اس کی مرضی....."

رانا پھر چیختا چلاتا انیس کے دروازے پر آیا "انیس صاحب۔ یہ آواز سنی آپ نے۔ اچھے پڑوسی ہیں آپ۔ باہر آکے پوچھا تک نہیں۔"

"وہ دراصل" انیس نے جماہی لے کر آنکھیں ملیں "میں سو رہا تھا۔"

میں نے کہا "ہاں اگر وہ سوال کرے کہ تم نے کچھ سُنا۔ یا میری کوٹھی میں کسی کو آتے جاتے دیکھا۔ کوئی گاڑی دیکھی جس میں ایک مرد اور ایک عورت آئے تھے۔ تو ذرا سوچ کے کہنا کہ ہاں ایک سفید رنگ کی گاڑی آپ کے دروازے پر کھڑی ہوئی ہے۔ یہ تو دیکھا تھا میں نے لیکن جاتے وقت اس میں ایک نہیں دو مرد اور دو عورتیں تھیں۔ میں یہیں ٹہل رہا تھا اس لئے نظر پڑ گئی۔ زیادہ غور سے نہیں دیکھا۔ پہچان نہیں سکتا دوبارہ دیکھوں تو۔ اتنی دور سے کیا پتا چلتا ہے۔ روشنی بھی کم ہے یہاں۔ اس سے تمہاری جان چُھوٹ جائے گی۔"

"مگر بعد میں پولیس میرا بیان ضرور لے گی۔"

"تم ایک معزز آدمی ہو۔ میرا مطلب ہے سمجھے جاتے ہو۔ پولیس سے کیوں ڈرتے ہو۔ بے خوفی سے یہی بات کہہ دینا کہ مجھے کیا معلوم وہ کون تھے اور کس نیت سے آئے تھے۔ میں تو سمجھا ہوں گے ان کے مہمان۔ ابھی تو میں انہیں بھی پوری طرح نہیں جانتا۔ یہ نئے آئے ہیں۔ ان کے مہمانوں کے بارے میں کیسے جان سکتا ہوں۔ خدا کا شکر ہے وہ میرے گھر نہیں آئے۔ میں تو بالکل اکیلا تھا چوکیدار تک نہیں تھا یہاں۔"

گھنٹی کی آواز پر محسن نے کہا "لو آگئے تمہارے پڑوسی۔ اُمید ہے تم حرامی پن نہیں کرو گے۔ کوئی غلط بات کی تو بہت گھاٹے میں رہو گے۔ یہ سمجھ لینا۔"

انیس احمد کی لگام پوری طرح ہمارے ہاتھ میں تھی۔ اس نے وہی کیا جو ہم نے سمجھا دیا تھا۔ میں اور محسن ڈرائنگ روم کی کھڑکی سے لگے کھڑے رہے۔ رات کی خاموشی میں گیٹ پر ہونے والی گفتگو کا ہر لفظ صاف سُنائی دے رہا تھا۔ شوکت رانا بہت مشتعل تھا۔

"پتا نہیں کون تھے۔ خیر پولیس پتا چلالے گی۔ چوکیدار کو جان سے ماردیا۔ میری گاڑی تباہ کردی۔ گھر میں سے لاکھوں نقد اور میری بیوی کے سارے زیورات چُرا کے لے گئے۔ ہیروں کے سیٹ بھی لاکھوں کے تھے۔ خادمہ کو اور ڈرائیور کو اغوا کرلیا۔ میں تو اینٹ سے اینٹ بجادوں گا پولیس والوں کی اگر انہوں نے مجرموں کا سُراغ نہ لگایا۔"

انیس احمد نے عقل مندی کی اور پُرسکون رہتے ہوئے اسے تسلی دیتا رہا "ہاں جی یہ تو بات ہی ایسی ہے۔ آج آپ کے ساتھ ہوا۔ کل میرے ساتھ ہو سکتا ہے۔ یہاں رہنے والوں کو مل کے کچھ کرنا چاہئے۔ اوپر سے یہ فون ہمیشہ ڈیڈ رہتے ہیں کوئی پوچھنے والا نہیں۔"

وہ واپس آیا تو بہت گھبرایا ہوا تھا "تم تو قتل بھی کر آئے ہو ایک چوکیدار کو....."

میں نے کہا "بکتا ہے وہ حرام زادہ۔ خود اس نے ماردیا ہوگا چوکیدار کو غصے میں...."

"آپ بھی حد کرتے ہیں۔ بم کا دھماکا ہوگیا اور آپ کو پتا نہیں چلا نیند میں۔"

"بم... کس نے ماردیا آپ پر...."

"مجھ پر نہیں۔ میری گاڑی تباہ کردی۔ میرے دو باڈی گارڈ مارے گئے۔ وہ پولیس اسٹیشن جارہے تھے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ میں خود گاڑی لے کر نہیں گیا۔" شوکت رانا کی حالت خراب تھی۔

میں نے محسن کی طرف دیکھا "یہ تو بہت بُرا ہوا۔"

محسن نے سرہلایا "رانا کے مقدر میں زیادہ ذلت کے ساتھ مرنا لکھا ہے۔"

اب انیس گرم ہوگیا "اجی تو میں کیا کروں اب۔ ضرور کسی سے دشمنی ہوگی آپ کی ورنہ ایسا تو پہلے یہاں کبھی کسی کے ساتھ نہیں ہوا۔ بار بار مجھے پریشان کرنے آجاتے ہیں آپ۔ میں کلکٹر کسٹم ہوں۔ کوئی چوکیدار نہیں ہوں آپ کا۔ آخر دوسرے پڑوسی بھی تو ہیں۔"

ظاہر ہے اس کے بعد شوکت رانا سے اس کے تعلقات خراب ہوگئے اور اس نے جاتے جاتے کہا "اچھا اچھا آپ جا کے سوجائیں آرام سے۔ مجھے پولیس اسٹیشن جانا تھا۔ اب آپ سے کیا کہوں کہ ذرا خیال رکھیے۔ گھر میں کوئی نہیں ہے۔"

"میرے گھر میں بھی کوئی نہیں ہے۔ مجھے اپنے گھر کا خیال رکھنا ہے اور اب آپ جیسے لوگ آگئے ہیں یہاں تو سب کو ہی خیال رکھنا پڑے گا اپنے اپنے گھر کا۔" انیس اسے مزید مشتعل کرکے لوٹ آیا۔

رانا کی گاڑی کے شعلے اوپر تک اُٹھ رہے تھے اور آس پاس کی دوسری کوٹھیوں سے بھی چوکیدار یہ معلوم کرنے آگئے تھے کہ کیا ہوا ہے۔ انہیں مالکوں نے بھیجا تھا جن کی نیند ڈسٹرب ہوئی تھی۔ ان میں سے ایک نے فائر بریگیڈ والوں کو فون کرنے کی پیشکش بھی کی مگر رانا نے کہا کہ وہ اب کیا کریں گے آکے۔ گاڑی تو جل کے ختم ہوگئی۔

وہ خود اپنی گاڑی میں پولیس اسٹیشن گیا تو میں نے اور محسن نے بھی یہاں سے نکل جانے کا فیصلہ کیا۔

میں نے انیس سے کہا "تم ہمیں اپنی گاڑی میں چھوڑ کے آسکتے ہو۔"

"کہاں تک۔ اور میرے گھر کا کیا ہوگا؟"

"تمہارا گھر تمہیں واپسی پر یہیں ملے گا۔ تم ہمیں وہاں ڈراپ کردینا جہاں سے ٹیکسی مل جائے۔"

محسن نے کہا "ایک بات اور۔ تم انکار کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہو۔ ہم تم سے پوچھے بغیر بھی تمہاری گاڑی لے جاسکتے ہیں۔"

میں نے اس کی تائید میں سرہلایا "مگر اس صورت میں تمہیں زیادہ پریشانی ہوگی۔ فلم کی بالکل فکر مت کرو۔ تمہارا یہ راز ایک امانت ہے۔"

انیس احمد نے ہمیں دو میل سے زیادہ دور لے جا کے اُتار دیا۔ وہاں ایک ٹیکسی والا اپنا ٹائر بدل رہا تھا۔ شاید وہ کسی کو چھوڑ کے آیا تھا کہ ٹائر پنکچر ہوگیا۔ دُگنے معاوضے پر وہ ہمارے ساتھ جہنم میں بھی جانے پر تیار رہتا۔ ہم اسے وقار یوسف کے گھر لے گئے۔

حسبِ توقع وہاں سب لوگ جاگ رہے تھے اور باقاعدہ فکر مند ہو رہے تھے مگر غالب کو دیکھ کے سب کچھ بھول گئے۔ رابعہ نے، گل نے اور نگی نے کورس میں چیخ ماری اور غالب سے چمٹ کے کورس میں ہی سوال بھی کر ڈالا "تازو کہاں ہے؟"

غالب نے مارگریٹ کی طرف دیکھا "تازو۔ تم تازو ہونا۔"

وہ دم بخود کھڑے تھے کہ میں اور محسن موقع پا کے پھر فرار ہوگئے۔ میں نے راستے میں محسن کو اپنی اسکیم سمجھا دی تھی۔ ٹیکسی کو محسن نے کراؤن سنیما کے سامنے روک دیا "میں آتا ہوں ایک فون کر کے۔"

میں نے کہا "ہم اِدھر گلی میں انتظار کر رہے ہیں۔ مجھے ذرا وہ..."

محسن نے میرے ہاتھ کی چھوٹی انگلی اُٹھی ہوئی دیکھی "شوشو ٹھیک ہے۔"

ٹیکسی ڈرائیور گاڑی کو گلی میں لے گیا۔ وہاں اندھیرا تھا اور ایسی ہر سنسان جگہ رات کے وقت پبلک ٹائلٹ کے طور پر استعمال کی جاسکتی ہے۔ خود ڈرائیور ایک دیوار کی طرف منہ کر کے بیٹھ گیا۔ میں رابعہ کی کوٹھی کے خالی پلاٹ پر گیا اور پھر غائب ہوگیا۔

باکس کے اندر سے نیچے اُترنے میں مجھے دو منٹ ہی لگے ہوں گے۔ ماچس جلا کے میں نے دلاور کو دیکھا۔ وہ ایک کونے میں سمٹا پڑا تھا۔ میں نے اسے ہلایا جلایا مگر اس پر بے ہوشی طاری تھی۔ چوبیس گھنٹے میں کسی نے اس کی خبر نہیں لی تھی اور وہ کچھ کھائے پیئے بغیر وہاں کسمپرسی کی حالت میں پڑا تھا۔ اس کو دیکھ کر اب واقعی رحم آتا تھا۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچا ہوگیا تھا۔ اس کے سر اور چہرے کے بال اتنے بڑھ گئے تھے اور ایسے بکھرے ہوئے تھے کہ وہ دیوانہ لگتا تھا۔ اس کی آنکھیں اندر دھنس گئی تھیں اور گالوں کی ہڈیاں اُبھر آئی تھیں۔ اس کے جسم سے بدبو کے بھبکے اُٹھ رہے تھے۔

میں اسے کندھے پر ڈال کے اوپر پہنچا تو پریشان ٹیکسی ڈرائیور ہر سمت میں مجھے یا محسن کو تلاش کر چکا تھا اور یہ سمجھ رہا تھا کہ ہم لوگ اسے کرایہ ادا کئے بغیر چکر دے کر غائب ہوگئے ہیں۔ مجھے دیکھ کر اس کی پریشانی بڑھ گئی۔

"یہ کسے اٹھا لائے ہو جی۔"

میں نے کہا "یار میں تو ادھر پیشاب کرنے گیا تھا۔ وہاں یہ پڑا ہوا تھا۔ پتا نہیں کون ہے۔"

اس نے نفرت اور حقارت سے کہا "نشے باز ہے کوئی۔ چھوڑیں اسے ورنہ آپ مشکل میں پڑیں گے۔"

میں نے کہا "یار یہ مر جائے گا۔ تم ہمیں اسپتال کے گیٹ تک لے جاؤ آگے ہم نمٹ لیں گے۔"

جب محسن نمودار ہوا تو ہمارے درمیان پھر یہ ڈائیلاگ دُہرائے گئے۔ میں نے اسے بھی وہی کہانی سنائی جو ٹیکسی ڈرائیور کو سُنائی تھی۔ اس نے فرنچ کا ایک لفظ بول کے کہا "کام ہوگیا" اور میں نے سمجھ لیا کہ اخبار والوں کو خبر مل گئی ہے۔

آدھے راستے میں ایک پرائیویٹ اسپتال کے سامنے ہم نے دلاور کو ٹیکسی سے اُتار لیا اور ٹیکسی کو سو روپے دے کے رخصت کر دیا۔ وہاں ایک اور ٹیکسی موجود تھی۔ ہم نے دلاور کو اس میں منتقل کیا تو ٹیکسی والا شک میں پڑ گیا۔ میں نے اسے مطمئن کرنے کے لئے کہا "یہ پولیس کیس ہے۔ وہ ٹیکسی ڈرائیور میو اسپتال جانے پر راضی نہیں تھا۔"

"راضی تو میں بھی نہیں ہوں۔"

میں نے سو کا نوٹ اس کو دکھایا "اب کیا خیال ہے؟"

"راضی کرنے کا طریقہ آتا ہے جی آپ کو۔" اس نے ڈھٹائی سے اپنی بتیسی کی نمائش کی۔

ٹیکسی ابھی روانہ ہو کے سو گز دور ہی گئی ہوگی کہ محسن نے اسے روک لیا اور میں نے اسے پیچھے سے ہاتھ مار کے ناک آؤٹ کر دیا۔ اسے میں نے پچھلی سیٹ پر دلاور کے ساتھ ڈال دیا اور خود اس کی جگہ بیٹھ گیا۔

حسبِ توقع ابھی تک نہ شوکت رانا واپس پہنچا تھا اور نہ پولیس آئی تھی۔ قتل جیسی سنگین واردات کی اطلاع ملنے پر بھی ان کی فرض شناسی کی حس زیادہ متاثر نہیں ہوتی۔ یہ ان کے موڈ، مدعی کی حیثیت اور "دباؤ" کی قوت پر منحصر ہے کہ وہ جائے واردات پر پہنچنے میں چند منٹ لگاتے ہیں، چند گھنٹے یا چند دن۔ وہ شوکت رانا کی بات سُن کے اور اس کی مالی حیثیت کا یقین کر کے حرکت میں برکت دیکھیں گے تو آئیں گے۔ ورنہ ضابطے کے مطابق کارروائی ہو تو پھر دیر لازمی ہے۔

میں نے محسن کو دروازے پر کھڑا کیا اور خود چوہدری دلاور کو کندھے پر ڈال کے اندر دوڑا۔ دلاور پہلے جتنا صحت مند تھا اب اس کا نصف بھی نہیں رہا تھا چنانچہ یہ مشکل کام بھی آسان ہوگیا۔ اس وقت میں اور محسن ایک انتہائی خطرناک کھیل کا آغاز کر چکے تھے۔ اس میں ہماری کامیابی کا انحصار سو فیصد تقدیر پر تھا۔ ہماری تدبیر اس کے بغیر ایک احمقانہ فعل اور خود کشی کے مترادف سمجھی جاتی۔ ہماری جرأت مندی اور ذہانت بھی ہمیں تختۂ دار تک پہنچانے کا سبب بن جاتی، دیکھنا اب یہ تھا کہ تقدیر ہمیں چند منٹ کی مہلت عطا کرتی ہے یا نہیں۔ پولیس ابھی تک تو آئی نہیں تھی مگر وہ یا شوکت رانا عین اس وقت بھی آسکتے تھے جب ہم نے ٹیکسی اس کوٹھی کے دروازے پر روکی تھی۔

آس پاس رہنے والے گواہی سے بچنے کے لئے روپوش تھے اور ان کے پاس معقول عذر تھا کہ آدھی رات کے وقت کون شریف آدمی جاگتا ہے اور کون اپنے پڑوس کے گھر پر نظر رکھتا ہے۔ ہمیں کیا معلوم کہ ہماری خواب گاہ اور ہمارے اپنے گھر سے باہر کی دنیا میں کیا ہوا اور کیوں ہوا۔ رہے چوکیدار تو ان کا کام گیٹ پر پہرا دینا ہے۔ سراغرسانی نہیں۔

لیکن ہم پکڑے جاتے تو ہمارے پاس اپنی صفائی میں کہنے کے لئے کچھ بھی نہ ہوتا۔ حالات اور واقعات کی کڑیاں خود بخود مل جاتیں۔ میرے فرنچ وکیل ہونے کا راز فاش ہو جاتا۔ فرنچ وکیل آخر دلاور کو اٹھا کے کیوں لایا تھا۔ شوکت رانا کی کوٹھی تک۔ پھر اس کے ساتھ محسن تھا۔ ظاہر ہے اس کا ساتھی سکندر بخت کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔ دونوں کا مشترکہ دشمن شوکت رانا تھا۔ اس کے گھر میں لوٹ مار آتش زنی اور قتل کی وارداتوں کا مقصد رانا کو پھنسانا تھا مگر خود پھنس گئے۔ بڑے سیانے اور جی دار بنے پھرتے تھے۔ ایم آر ایس کے کمانڈر انچیف آخر کار پکڑے گئے۔

جب میں دلاور کو اندر چوکیدار کی لاش کے قریب فرش پر ڈال رہا تھا تب بھی میرا دل خوف سے ڈوبا جا رہا تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے موت سائے کی طرح میرا تعاقب کر رہی ہے اور میں اس سائے سے بچنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ دستِ اجل میرے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈالنا چاہتا ہے اور میں اپنی گردن بچا رہا ہوں۔ یہ پاگل پن تھا۔ بے وقوفی کی انتہا تھی۔ میرے کانوں میں رابعہ کے چلّانے کی آواز آرہی تھی۔ سکندر، خدا کے لئے سوچو تم کیا کر رہے ہو۔ تمہیں میرا بھی خیال نہیں سکندر۔ اگر تم پکڑے گئے تو کوئی تمہیں کیسے بچائے گا۔ گل کے رونے کی آواز مجھے پریشان کر رہی تھی۔ تم نے مجھے بھی نہیں بتایا۔ کسی کو بھی اس قابل نہیں سمجھا کہ مشورہ کرتے۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ میرا کیا ہوگا، بولی کا کیا ہوگا۔

ایک آواز مسلسل مجھے پکار رہی تھی۔ بھاگو۔ بھاگو۔ جلدی کرو۔ پولیس آنے والی ہے۔ رانا پہنچ جائے گا۔ اخباری نمائندے آجائیں گے۔ تم کیا بتاؤ گے کیا کہو گے اپنی صفائی میں۔ تمہارا ڈراما فیل ہو جائے گا۔ تمہارا بھانڈا پھوٹ جائے گا کہ تم فرنچ وکیل نہیں سکندر بخت ہو پھر تمہارے سچ پر بھی کون اعتبار کرے گا۔ جلدی جلدی نکلو یہاں سے۔

میں پلٹ کے بھاگا تو میرے جسم سے پسینہ پھوٹ رہا تھا اور میرے ہاتھ پاؤں میرے قابو میں نہیں تھے۔ یہ زندگی سے پیار تھا جو مجھے موت سے فرار کی ہمت دے رہا تھا۔ شاید یہ میری زندگی کا سب سے خطرناک جُوا تھا جب میں نے پھانسی کا پھندا خود اپنی حماقت سے اپنے گلے میں ڈالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

محسن کی حالت مجھ سے بھی زیادہ ابتر تھی۔ ایک ایک سیکنڈ کا انتظار اس کے لئے ایک صدی کاٹنے کے برابر تھا۔ سامنے سے، پیچھے سے پولیس کہیں سے بھی آسکتی تھی۔ وہ بھاگنا چاہتا تب بھی بھاگ نہیں سکتا تھا۔ وہ مجھے چھوڑ کے نہیں جا سکتا تھا اور پولیس اسے بھاگنے بھی نہ دیتی۔ اس کی نظریں مسلسل دائیں بائیں اور آگے پیچھے دیکھ رہی تھیں اور اس کی اضطرابی کیفیت اس کی حرکات و سکنات سے عیاں تھی۔

مجھے دیکھتے ہی وہ بے اختیار چلّایا اور زور زور سے ہاتھ ہلانے لگا "جلدی۔ کرو" اس نے ڈرائیور کی جگہ بیٹھ کے ٹیکسی کو اسٹارٹ کیا۔

میں صرف گھبراہٹ کے باعث ایک جگہ ٹھوکر کھا کے گرتے گرتے بچا۔ وہ گٹر لائن کا ڈھکنا تھا جو میرا پیر پڑنے سے ہل گیا تھا۔ اس کا ایک کونا اندر چلا گیا تھا جس سے میرا پاؤں کنارے میں اُلجھا تھا۔ میرا دل اس وقت ایسے دھڑک رہا تھا کہ میرے کان اس کی دھمک سُن سکتے تھے۔

محسن نے ٹیکسی کا دروازہ کُھلا رکھا تھا۔ میں ہانپتا کانپتا اندر جا گرا۔ محسن نے ایک دم ٹیکسی چلا دی۔ ابھی میرا ایک پاؤں باہر ہی تھا، دروازہ جھٹکے سے پیچھے گیا اور پھر لوٹ کر آیا تو میری ٹانگ پر لگا۔

محسن نے دانت پیس کے کہا "اسے بند کر۔ اُلّو کے پٹھے۔ گر جائے گا باہر۔"

میں نے بڑی مشکل سے کہا "نہیں نہیں۔ تُو گاڑی چلا۔ میں نہیں گروں گا۔ ہم نکل آئے۔ اب کچھ نہیں ہوگا۔"

وہ آخری چند سیکنڈ بھی کم خطرناک نہیں تھے۔ میں نے دروازہ کھینچ کے بند کیا اور پلٹ کے دیکھا۔ ابھی تک ویران سڑک پر کوئی نہیں نظر آرہا تھا۔ اگر وہ عین وقت پر ہی پہنچ جاتے تو ہمیں فرار نہ ہونے دیتے۔ جل تُو جلال تو۔ تُو نے ہر بلا سے سکندر کو بچایا۔ بس آج اور بچا لے میرے معبود۔

جب ٹیکسی نے موڑ کاٹا تو میں نے سر پیچھے ٹکا کے آنکھیں بند کرلیں۔ میرے خدا نے مجھے مایوس نہیں کیا تھا۔ خود کو بہت چالاک بہت ذہین، بہادر اور نڈر سمجھنے والے ایم آر ایس کے چیف کے ٹو۔ تم کچھ بھی نہیں ہو۔ احمق اور گدھے ہو اور پاگل ہو۔ اپنی تقدیر سے کھیلتے ہو۔ یہ سوچے بغیر کہ تمہاری تقدیر اور زندگی پر کسی اور کا بھی حق ہے۔ دلدل میں آنکھ بند کر کے کود جاتے ہو اور پھر خدا سے زندگی کی دعا مانگتے ہو۔ اپنے قول سے اپنے فعل سے۔ عمل سے اور فکر سے۔ تم کب تک ناشکرے پن کا اظہار کرو گے۔ اور تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔

اچانک میں نے محسوس کیا کہ ٹیکسی رُکی ہوئی ہے۔ میں نے آنکھیں کھول کے دیکھا تو محسن اسٹیئرنگ پر سر رکھے لمبی لمبی سانسیں لے رہا تھا۔

میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا "سب ٹھیک ہوگیا محسن۔"

اس نے سر اُٹھایا "ہاں.... مگر ذرا سوچ یار۔ کتنی بڑی نادانی تھی یہ.... ہم نے اپنی زندگی کو داؤ پر لگا دیا تھا۔ بڑے خود غرض ہیں ہم۔ کسی اور کے بارے میں سوچتے ہی نہیں۔ ہم خود غرض نہیں۔

پاگل ہیں۔"

"ٹھیک کہتا ہے تو۔ رابعہ اور گُل بھی یہی کہیں گی۔ سب یہی کہیں گے جب انہیں معلوم ہوگا۔ مگر خیر۔ اصل چیز کامیابی ہے جو سب سے بڑی سند ہے۔ اب ہم بہادر اور وہ... ذہین اور باصلاحیت ہونے کا دعویٰ کرسکتے ہیں۔

ALL IS WELL THAT ENDS WELL"

محسن نے پلٹ کے دیکھا "یہ ابھی تک اتنا غُنیل ہے۔"

"چل اسے بھی کہیں چھوڑ دیں۔ ہمیں لوٹ کر بھی آنا ہے۔ ڈرامے کا ڈراپ سین دیکھنے کے لئے۔"

محسن نے پھر گاڑی اسٹارٹ کی۔ اب ہم بہت پُرسکون اور پُر اعتماد تھے "دوسرے لوگ بھی وقت پر پہنچ جائیں تو بات ہے۔"

"کس کس کو مدعو کیا تھا تونے؟"

"میں نے غازی کو فون کیا تھا۔ ایس ایس پی جاوید صدیقی کو اور منظر کو۔ اب دیکھو کون کون آتا ہے۔"

ٹیکسی ڈرائیور ابھی تک ہوش میں نہیں تھا۔ ہم نے اسے پچھلی سیٹ پر آرام سے لٹایا اور ٹیکسی کو ایک مسجد کے دروازے کے عین سامنے کھڑا کردیا۔ مجھے یقین تھا کہ نمازِ فجر سے پہلے ہی وہ ہوش میں آجائے گا اور نہ آیا تو نماز پڑھنے کے لئے منہ اندھیرے آنے والے خدا کے نیک بندوں میں سے کوئی اس کی مدد ضرور کرے گا۔ چلنے سے پہلے میں نے اس کی جیب میں پانچ سو روپے بھی ٹھونس دیے۔ یہاں اس بات کا امکان نہیں تھا کہ کوئی موقع پا کے اس کی جیب پر ہاتھ صاف کردے گا۔

ایک بار پھر ہم انیس احمد کے دروازے پر پہنچے تو وہاں خاصی گہما گہمی دیکھنے میں آئی۔ ایک گاڑی پولیس کی تھی اور ایک شوکت رانا کی۔ پولیس کی گاڑی میں صرف ایک ڈرائیور مخالف سمت میں منہ کئے بیٹھا ہوا تھا۔ پھر تیسری گاڑی ہمارے پاس سے گزری۔ یہ منظر کی کار تھی۔ ہم فوراً انیس کے بنگلے میں داخل ہوگئے۔

وہ سونے کی کوشش کررہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر اس کی آنکھوں سے نیند کے آثار ہی غائب ہوگئے "پھر آگئے تم لوگ۔" وہ منہ بسور کے بولا۔

میں نے کہا "اب گھر دیکھ لیا ہے تمہارا۔ تم سے مل لئے تو آنا جانا لگا رہے گا۔ ہم تمہاری عاقبت سُدھارنے کا سوچ رہے ہیں۔"

محسن نے کہا "ایک تمہارا سسر، دو سالے اور ایک بیوی۔ ہم اب ان کے ساتھ ہیں۔ ہم تمہیں کتّے کی دُم سے زیادہ سیدھا کردیں گے۔"

"دیکھو۔ مجھے جانے دو جہنم میں۔" اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "اب تو یہ دنیا بھی میرے لئے جہنم ہوگئی ہے۔ تم ایسا کرو کہ وہ فلم نمائش کے لئے پیش کردو۔ جو ہم پہ گزرنی ہے اک بار گزر جائے۔"

میں نے کہا "تم کو مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ ہم پر بھروسا رکھو۔ فلم کی حد تک تمہارا راز ہمارا راز۔ ابھی تو ہم بس ذرا ہاتھ منہ دھو کے اپنا حُلیہ ٹھیک کرنے آئے ہیں اور یہ یاد دلانے کہ تم نے ہمیں پہلے کبھی نہیں دیکھا... تمہیں کچھ معلوم ہی نہیں۔"

"مجھے اپنا سبق یاد ہے۔" وہ بولا۔

ہم پانچ منٹ بعد حُلیہ درست کرکے باہر گئے تو وہاں دو گاڑیاں اور نظر آئیں۔ پولیس کی دوسری جیپ کے اوپر گھومنے والی لائٹ اور سائرن یہ ظاہر کرتے تھے کہ ایس ایس پی جاوید صدیقی بھی پہنچ گیا ہے۔ دوسری گاڑی رابعہ کی تھی۔ غالباً منظر نے اسے مطلع کیا ہوگا۔ غازی کی پھٹیچر موٹر سائیکل وہیں دیوار کے ساتھ پڑی تھی۔

میں اور محسن بڑی بے نیازی اور احساسِ اجنبیت کے ساتھ رابعہ اور منظر سے ملے۔ ترجمانی کے فرائض محسن کو ادا کرنے تھے مگر وہاں مولوی خادم حسین بھی موجود تھا۔ وہ رابعہ کے ساتھ آیا تھا۔

میں نے اس سے فرنچ میں پوچھا "کیا بیوی نے لات مار کے حجلۂ عروسی سے خارج کردیا؟"

اس نے کہا "حجلۂ عروسی تو خواب کی بات ہوگئی۔"

"میری مراد تھی اس دڑبے سے جس کو تم اپنا بیڈ روم کہتے ہو۔ اگر اس نے حقوقِ زوجیت کی ادائیگی سے انکار کیا ہے تو مجھے بتاؤ۔ میں...."

"یہاں سب کے سامنے یہ باتیں مناسب نہیں ہیں جی۔"

"ایسی کی تیسی سب کی۔ تم تو بڑے چاؤ سے گئے تھے۔ پھر لوٹ کیوں آئے۔"

محسن بولا "میں بتاتا ہوں اس کے ساتھ کیا ہوا۔ اس نے دروازے پر دستک دے کے شرافت سے پوچھا ہوگا۔ باجی میں اندر آجاؤں۔ اور اندر سے اس نے کہا ہوگا کہ دفع ہوجاؤ۔ پھر کبھی آنا۔ اس وقت اندر تمہارے جیجا جی ہیں۔ تمہیں خیال رکھنا چاہئے۔ جب جی چاہتا ہے مُنہ اُٹھا کے چلے آتے ہو۔"

خادم حسین سخت جز بز ہوا اور میں نے بھی بڑی مشکل سے ہنسی کو ضبط کیا "آپ ناجائز فائدہ اُٹھا رہے ہیں جی فرنچ کا۔ مجھے گالی دی ہے آپ نے۔ گھروالی کو بہن بنا کے۔ اور اسے بھی گالی دی ہے....."

ایس ایس پی جاوید صدیقی نے میری طرف دیکھا "یہ گورا وکیل بھی آگیا آدھی رات کو۔ اسے ہم سے زیادہ تکلیف ہے۔"

محسن نے کہا "مجھے تو آپ کو یہاں دیکھ کے تعجب ہورہا ہے۔ واقعی نوکری بڑی بُری چیز ہے۔ غلامی ہے پبلک کی۔ ورنہ آپ جیسے افسر تو بادشاہ لوگ ہیں۔ خود کہاں تکلیف کرتے ہیں۔ نوکری خطرے میں پڑی تو آدھی رات کو بھی اُٹھ کے آنا پڑا۔"

"یہ محض خوش فہمی ہے تمہاری۔ ایسی کچی نوکری نہیں ہوتی کسی پولیس افسر کی۔" صدیقی نے برہمی سے کہا۔

منظر نے فوراً مداخلت کی "اب کیا آتے ہی بک بک شروع کردی۔ کس کے منہ لگ رہا ہے۔"

صدیقی نے مزید بُرا منایا "کیا مقصد ہے آخر اس فضول بات کا۔"

اب غازی سامنے آگیا "یہ سب فضول لوگ ہیں جی۔ سب کو ذِک دیں ہتھکڑی لگوادیں۔ بڑے اختیارات ہیں آپ کے۔ کیا ہوگا اگر ایک خبر آ بھی گئی۔ نوکری تو پکی ہے۔ ان سب کا دماغ درست کردیں۔"

"آپ لوگ بہت زیادتی کرتے ہیں۔" صدیقی نے افسوس سے کہا "کیا میں نے ایک ٹیلی فون کال پر یہاں آکے کوئی غلطی کی ہے۔ آپ لوگوں کو کبھی تعریف بھی کرنی چاہئے۔ اتنا تعصب اور کینہ ہے آپ کے دل میں کہ سب پولیس والے آپ کے نزدیک گولی ماردینے کے قابل ہیں۔ ان میں سرے سے کوئی اچھائی ہے ہی نہیں۔"

رابعہ نے کہا "صدیقی صاحب۔ جانے دیں۔ یہ لوگ منہ پھٹ ہیں۔ مذاق میں حد سے بڑھ جاتے ہیں۔"

غازی نے بھی کہا "یار آپ بُرا مت مانیں۔ وقت آنے پر اندازہ ہوگا آپ کو کہ ہم کتنے فراخدل لوگ ہیں۔"

اب دوسرے کمرے سے شوکت رانا کے دہاڑنے کی آواز آئی "آخر یہ کیا ہورہا ہے۔ آپ لوگ سمجھتے کیوں نہیں کہ میرے خلاف کتنی بڑی سازش کی گئی ہے۔ پولیس کو رپورٹ میں نے کی تھی۔ ڈکیتی میرے گھر میں ہوئی۔ گاڑی میری تباہ ہوئی۔ قتل میرے چوکیدار کا ہوا اور گرفتار بھی مجھے کیا جارہا ہے۔ آخر کس جرم میں؟"

"زیادہ ڈراما مت کرو۔ یہ چوہدری دلاور یہاں کیسے آیا؟" کسی نے دہاڑ کے کہا "اس بات کا کیا جواب ہے تمہارے پاس۔"

"میں کہہ چکا ہوں کہ مجھے معلوم نہیں۔ جب میں گیا تھا تو یہ یہاں نہیں تھا۔" رانا نے چیخ کر کہا۔

کسی نے اس کے تھپڑ مارا "زیادہ بھونکنے کی ضرورت نہیں کُتّے۔ جب تفتیش ہوگی تو سب پتا چل جائے گا۔ یہ تیرا پارٹنر تھا یا نہیں؟ تو جانتا ہے اسے یا نہیں؟ بول۔ کیا تجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ مفرور مجرم ہے؟ اس کی بیوی نے تیرے خلاف جو الزامات لگائے ہیں....؟

چوری، ڈکیتی، آتش زنی اور چوکیدار کے قتل کے معاملے سے نہ ایس ایس پی جاوید صدیقی کا تعلق تھا نہ رابعہ یا منظر کا۔ وہ سب شوکت رانا کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے اور انتظار کررہے تھے کہ مقامی تھانے والے اپنی تفتیش مکمل کرلیں تو چوہدری دلاور کو سامنے لایا جائے۔ میں اور محسن بھی تمام معاملات سے لاتعلق معصوم صورت بنائے بیٹھے رہے۔ رابعہ کا موڈ بتاتا تھا کہ وہ مجھ سے کتنی خفا ہے مگر بس اوہ بھی کبھی مجھے خوں خوار نظروں سے گھورنے کے سوا کچھ نہیں کرسکتی تھی۔ میں اور محسن جانتے تھے کہ واپس گھر جا کے کیا ہوگا۔ رابعہ اور گل ہمیں کتنی باتیں سُنائیں گی۔

صدیقی نے رابعہ کو مخاطب کیا "اس ڈرامے نے میری عقل ضبط کردی ہے خاتون۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ یہ کیس ہاتھ میں لے کر میں نے اپنے حق میں اچھا نہیں کیا۔ میں صرف بے وقوف بنا یہاں آکے۔"

منظر بولا "چلو دیر سے سہی۔ اپنے بارے میں صحیح بات تو پتا چل گئی۔ کچھ لوگ تمام عمر خود کو عقل مند سمجھتے رہتے ہیں۔"

"منظر صاحب۔ آپ کو بھی گمنام کال موصول ہوئی ہوگی اور جناب صحافی صاحب۔ آپ کو بھی۔"

غازی نے کہا "ہم تو عادی ہیں جی۔ سارے شہر کی فکر رہتی ہے۔ جیسے باپ کہیں بھی ہو اسے بچّوں کی فکر رہتی ہے، کہیں کچھ بھی ہو ہمیں تو جانا ہی پڑتا ہے۔"

"کیا یہ عجیب بات نہیں ہے۔" صدیقی بولا "آج ہی آپ صحافی اور وکلا برادری نے دعویٰ کیا تھا کہ دلاور کو گرفتار کرادیا جائے گا۔ مگر عین وقت پر تماشا ملتوی ہوگیا۔ کہا یہ گیا کہ صحیح اطلاع نہیں ملی۔ مصدقہ خبر نہیں آئی۔ میں کیا کرتا اگر یقین نہ کرتا۔ دلاور کی بیوی نے بھی بڑی تفصیل سے بتایا تھا کہ اس نے اپنے شوہر سے کہاں ملاقات کی تھی۔ اور وہ کیا دیکھ کے گئی تھی۔ وہ بہت چالاک عورت ہے۔ اس نے ان کو صاف بچالیا جو اسے ساتھ لے گئے تھے۔ میں نے اس کا بیان لیا اور بڑی جرح کی مگر وہ یہی کہتی رہی کہ مجھے معلوم نہیں وہ کون لوگ تھے۔ انہوں نے مجھے فون کرکے ریگل پر بلایا تھا اور میری آنکھوں پر پٹی باندھ کے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ دلاور سے ملا کے واپس وہیں چھوڑ گئے۔ اب آپ لوگ ہی بتائیں۔ یہ بات ماننے والی ہے۔ ایک عورت کیسے چلی گئی اپنے دشمنوں کے ساتھ۔ کیسے یقین کرلیا اس نے کہ فون کرنے والے مذاق نہیں کررہے ہیں اور ریگل چوک پر ضرور ملیں گے پھر اس نے ان کو کیسے پہچانا۔ اور اگر اسے لے جاتے کہیں اور۔"

"صدیقی صاحب۔ پولیس تو سچ اُگلوالیتی ہے۔"

"ہاں۔ میں بھی اُگلوالیتا۔ مگر اس ڈرامے میں وہ عورت بھی شریک ہے۔ آپ سب کے ساتھ۔ ایک طوفان کھڑا ہوجاتا اگر میں اس پر انگلی بھی اُٹھا دیتا۔ وہ تو مظلوم بنی ہوئی تھی۔ ہمیں ملزم ٹھہرانے کے بعد۔ ہم پر نااہلی کا الزام لگانے کے بعد۔ میں مجبور تھا اس کے جھوٹ کو ماننے پر۔"

غازی بولا "آپ اتنے یقین کے ساتھ اسے جھوٹا کہہ رہے ہیں۔"

صدیقی نے چیخ کے کہا "اور کیا ثبوت چاہئے اس کے جھوٹ کا۔ دلاور تو یہاں ملا ہے۔ کہاں ہے وہ تہ خانہ جس کی اس نے منظر کشی کی تھی۔ اچانک آدھی رات کو فون آگیا کہ دلاور فلاں جگہ ہے۔ اُٹھالو۔ ایک ہی شخص نے سب کو فون کرکے بلالیا۔ وکیلوں کو

بھی، پولیس کو بھی اور صحافیوں کو بھی۔ کون ہے وہ شخص آخر؟ ظاہر ہے وہ جو سب جانتا ہے اور سب کچھ ایک منصوبے کے تحت کرتا ہے صحیح وقت پر۔ پوری تیاری کے بعد۔ خود کو بچاتے ہوئے۔"

"آپ پکڑ کیوں نہیں لیتے اس شخص کو۔" منظر بولا۔

"آپ سب سے معذرت کے ساتھ۔ وہ آپ ہی میں سے کوئی ہے۔ اس بات پر میرا یقین ایسا ہی ہے جیسا اپنے ایس ایس پی ہونے پر مگر جب تک میں پولیس کے مروجہ طریقے سے تفتیش نہ کروں مجھے کچھ معلوم نہیں ہوگا۔ میرا ایک انسپکٹر صبح تک مجھے اس کا نام پتا بتا سکتا ہے۔ بشرطیکہ اسے میری طرف سے تفتیش کی اجازت ملے۔ اور یہ ناممکن ہے۔"

اس کی بات کا کسی نے جواب نہیں دیا۔ کسی نے اس سے اختلاف بھی نہیں کیا۔ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا ٹھیک تھا۔ اس بات کو ہم سے بہتر کون سمجھ سکتا تھا۔ خادم اور محسن، رابعہ اور میں اور منظر۔ سب جانتے تھے کہ یہ سچ ہے۔

"آدھی رات کے وقت یہ میلہ لگانے کا مطلب بھی جانتا ہوں میں۔ مدعی اور اخبار والے یہاں صرف اس لئے آئے ہیں کہ انہیں مجھ پر اعتبار نہیں تھا۔ یہ ڈر تھا کہ کہیں میں رشوت لے کر چوہدری دلاور کو آزاد نہ کردوں اور اسے بحفاظت ملک سے باہر نہ بھجوا دوں۔ آپ سب محض چشم دید گواہ بننے کے لئے تشریف لائے ہیں۔ گرفتار تو میں اکیلا بھی کرسکتا تھا دلاور کو۔ لیکن آپ سب کو یا مجھے فون کرکے بُلانے والے کے دل میں یہ خیال ضرور تھا کہ پولیس کا کیا ہے۔ صبح صاف مکر جائے نہیں۔ دلاور ابھی کہاں گرفتار ہوا ہے۔ اس کا پیسہ، اس کی فیملی کا اثر و رسوخ کام کر جائے اور دلاور نظر آئے انگلینڈ میں۔ یہ سب آف دی ریکارڈ ہے جنٹلمین۔ اسے آپ میری پریس کانفرنس نہ سمجھیں۔ میں ذرا کھل کے بات کر رہا ہوں۔"

"چلیں پھر یہ بھی بتا دیں کہ آپ کو کس پر شک ہے؟"

"مجھے شک ہے کہ یہ سازش شوکت رانا کے خلاف ہوئی ہے۔ اسے پھنسایا گیا ہے۔"

"لیکن اس کی بیوی نے جو شوکت رانا پر جو الزامات عائد کئے ہیں۔"

"وہ اپنی جگہ درست ہیں۔ میرا مطلب ہے وہ ٹھیک ہوسکتے ہیں۔ غالباً اس نے ہی بدلہ لیا ہے شوکت رانا سے اور وہ بھی اس سازش میں شریک ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ اس کی مدد کرنے والے وہی ہوں جو اس کو دلاور سے ملوانے لے گئے تھے۔ وہ دلاور کے دوست تو نہیں ہوسکتے پھر دلاور کی بیوی نے ان پر کیسے اعتبار کرلیا۔ کیوں ان کے ساتھ چلی گئی۔ یہی بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ مگر ابھی تو ابتدا ہے آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔"

اسی وقت انسپکٹر نے اندر آکے سیلوٹ کیا "ہمارا کام ختم ہوگیا سر۔ ہم کو اجازت ہے ملزم شوکت رانا کو ساتھ لے جانے کی ہے؟"

ایس ایس پی نے اقرار میں سر ہلایا "انسپکٹر اس بات کا خاص خیال رکھنا کہ یہ کوئی عام کیس نہیں ہے۔ حوالات کے اندر ملزم کی پوری حفاظت کا بندوبست تمہاری ذمے داری ہے۔ اگر اسے تمہاری تحویل میں کوئی نقصان پہنچا تو تمہاری خیر نہیں۔"

"آپ فکر ہی مت کریں سر۔ پرندہ پر نہیں مار سکتا۔"

"پرندے کو چھوڑو۔ تمہارا اپنا کوئی بندہ نہ بِک جائے۔ خریدار بڑے ہیں اور قیمت بھی بہت بڑی لگائیں گے۔ یہ نہ ہو کہ کوئی اسے خنجر بلیڈ پہنچاوے یا کسی حوالاتی سے اس کا گلا کٹوا دے۔ اسے کھانے میں زہر دے دیا جائے۔ یہ حوالات میں خودکشی کا کیس نہیں بنے گا۔ زیرِ دفعہ تین سو دو تمہارے خلاف ایف آئی آر درج ہوگی۔ سمجھ آگئی ہے نا میری بات کی!"

"یس سر۔" انسپکٹر بولا۔

"ایمبولینس کیوں نہیں آئی ابھی تک؟"

"آگئی ہے سر۔"

"پھر مجھے بتایا کیوں نہیں۔" صدیقی نے گرج کے کہا "میں جھک مار رہا ہوں یہاں آخر کس لئے۔ چوہدری دلاور کو فوراً اسپتال شفٹ کرنا ہے۔"

"وہ... سر جی۔ اضافی نفری آنے والی ہے۔ ایمبولینس کے ساتھ جائے گی۔" انسپکٹر نے کہا۔

صدیقی نے سر ہلا کے اسے جانے کی اجازت دی۔ تھانے والے چوکیدار کی لاش اُٹھا کے لے گئے اور اپنے ساتھ چیختے چلّاتے شوکت رانا کو بھی۔ انہوں نے شوکت رانا کو مارا بھی تھا اور اسے کہیں فون کرنے کی اجازت بھی نہیں دی تھی۔ ویسے بھی وہاں کوئی فون کام نہیں کر رہا تھا۔ تھانے کے کچھ لوگ اس گاڑی کا معائنہ کرتے رہے جس میں بم کے دھماکے سے شوکت رانا کے دو باڈی گارڈ ہلاک ہوئے تھے۔

صدیقی نے کہا "اس وقت آپ لوگ چوہدری دلاور کو صرف دیکھ سکتے ہیں۔ اس کی تصویر بھی بنا سکتے ہیں مگر اس سے بات نہیں کرسکتے۔"

"کیا وہ بے ہوش ہے؟" غازی بولا۔

"یس... اس پر... بہت تشدد ہوا ہے۔ ہم اسے سخت حفاظتی انتظام کے ساتھ اسپتال میں رکھیں گے۔ اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں۔ وہ مرے گا نہیں۔ نہ مارا جائے گا۔ چوبیس گھنٹے میں ہم اس کا جوڈیشل ریمانڈ لینے کے پابند ہیں۔ آپ مجھ پر بھروسا کرسکتے ہیں کہ تفتیش اور چالان مکمل ہونے تک دلاور کی سلامتی کا ذمے دار میں ہوں۔ وہ میری تحویل میں ہے اور بہت جلد میں پریس کانفرنس میں آپ کو سب بتا دوں گا۔ جو کچھ میں معلوم کرسکا۔ اور میرا خیال ہے کہ وہ خود یا اس کے وکیل بھی بہت کچھ بتائیں گے آپ کو۔ جیسے ہی وہ اس قابل ہوا۔ فی الحال آپ کے لئے میرے پاس اس خبر کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ڈاکٹر شبلی کے مفرور قاتل چوہدری دلاور کو

گرفتار کرلیا گیا ہے۔ ڈرامائی انداز میں لکھ سکتے ہیں اخبار والے اسے اگر چاہیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

اس کے بعد کی کارروائی بہت مختصر رہی۔ غازی کے ساتھ آنے والے فوٹوگرافر نے چوہدری دلاور کی تصاویر بنائیں۔ وہ آئے ہی اس شرط پر تھے کہ اب یہ خبر ان کی ایکس کلیو سو اسٹوری ہوگی یعنی وہ خبر جو کسی اور کے پاس نہیں ہوگی۔ غازی اس کے لئے بالکل تیار تھا۔ وہ آخری کاپی روک آیا تھا اور اب اسے واپس جانے کی جلدی تھی جب ایس ایس پی کے حکم پر چوہدری دلاور کو ہتھکڑی لگائی گئی تو میرے وجود میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ یہ وہ لمحہ تھا جس کا خواب میری آنکھیں نہ جانے کب سے دیکھ رہی تھیں مگر اسے تعبیر آج میسّر آئی تھی۔ یہی کیفیت رابعہ منظر اور محسن کے دلی جذبات کی تھی۔ ان کے چہرے ایک بہت بڑی کامیابی کی خوشی سے کھلے ہوئے تھے۔

موقع پاتے ہی میں نے رابعہ کے کان میں کہا "مبارک ہو خدا نے یہ دن بھی دکھایا۔"

وہ مسکرائی۔ غالباً یہی بات اس کے دوسرے کان میں محسن نے کہی۔

میں نے کہا "اس تقریبِ سعید پر یہ مسکراہٹ کا تمغا ظاہر کرتا ہے کہ اب تم خفا نہیں ہو۔"

"تم معافی مانگ رہے ہو تو جاؤ معاف کیا۔"

پولیس نے دلاور کے ساتھ ایک خطرناک مجرم کا سلوک کیا تھا۔ ایمبولینس میں بھی اس کے ساتھ دو مسلح گارڈ بٹھائے گئے اور آگے پیچھے پولیس کی گاڑیاں اس کے ساتھ ہی روانہ ہوئیں۔ اگلی گاڑی میں خود جاوید صدیقی تھا اور ہم سے بدگمان ہونے کے باوجود وہ اس کامیابی پر خوش تھا کہ اسے جس مشن پر اسلام آباد سے بھیجا گیا تھا وہ پورا ہوا۔ اس کے پیش رو کے حصّے میں صرف شرمندگی رُسوائی اور برطرفی آئی تھی۔

"دیکھو راستے میں آنکھیں کُھلی رکھنا۔" اس نے اسکواڈ کو حکم دیا "کوئی بھی بیچ میں آنے کی کوشش کرے یا حملہ کرکے قیدی کو چھڑانا چاہے تو اسے فوراً گولی مار دو۔ سب الرٹ رہیں اوکے۔"

اس نے ہاتھ ہلایا اور چوہدری دلاور کو ایک قاتل کی حیثیت سے وہی پولیس سخت ترین حفاظتی انتظامات کے ساتھ لے گئی۔ جن کو وہ اپنے زرخرید نمک خوار اور وفادار ذاتی ملازم سمجھتا تھا۔ یہ اس کے غرور کی شکست اور قانون کی بالادستی کی پہلی فتح تھی کہ شکاری خود زیرِ دام آگیا تھا اور اس کے لئے کسی حلقۂ دام کو توڑنا ناممکن ثابت ہوا تھا۔ اس کی دولت اور طاقت کا نشہ اُتر گیا تھا اور اب وہ ایک تصویرِ عبرت تھا جس کا عنوان صاف پڑھا جاتا تھا۔ دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو۔

انیس احمد اپنے دروازے پر ہکّا بکّا کھڑا ہوا تھا۔ اسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ جن کو وہ بلیک میلر چور ڈاکو اور دہشت گرد سمجھنے پر مجبور تھا وہ اتنے معزز اور معتبر ہیں کہ خود پولیس کا ایس ایس پی ان سے ہاتھ ملا کے رخصت ہو رہا تھا۔ مجھے اور محسن کو فرنچ بولتا دیکھ کے بھی اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا ہوگا۔ ابھی کچھ دیر پہلے جو کچھ ہوا تھا اس کا وہ عینی شاہد تھا اور اب جو کچھ ہو رہا تھا وہ اس کے برعکس تھا۔ وہ اُلجھ رہا تھا کہ ہم بالکل بے فکری سے ہنس رہے ہیں اور ایک بہت حسین لڑکی میرے ساتھ ہے۔ پھٹ پھٹ کرتی موٹر سائیکل پر غازی اور اس کے ساتھ آنے والا فوٹوگرافر دونوں ہی کارٹون لگتے تھے مگر انیس نے باتوں سے سمجھ لیا ہوگا کہ وہ پریس کے نمائندے تھے۔ انہوں نے بھی ہم سے ہاتھ ملایا اور جاتے جاتے بہ آوازِ بلند اعلان کیا "دیکھنا کیا دھانسو سُرخی جماتا ہوں میں، صبح صبح سارے شہر کے لئے ایک دھماکا ہوگا۔"

منظر نے کہا "بھوتنی کے۔ تصویریں بھی اُتاری ہیں نا؟ فلم تھی کیمرے میں؟"

غازی اس اندازِ تخاطب پر دم بخود رہ گیا پھر اس نے قہقہہ مارا اور بولا "ابے بھوت۔ چند گھنٹے کی بات ہے اخبار بے شک دیر سے آئے گا مگر پہلے صفحے پر باکس میں ہوں گی تصویریں۔ گرفتاری سے پہلے۔ گرفتاری کے بعد۔ خود دیکھ لینا۔ میرے پاس پُرانی تصویر بھی ہے اس کی۔ جس میں وہ واقعی ببر شیر نظر آتا ہے۔ اب تو تھیلے کی بلی ہوگیا ہے۔"

منظر نے ہو ہو ہو کرکے ہنسنا شروع کیا اور غازی کے ایک دھپ رسید کرنے کی کوشش کی مگر وہ موٹر سائیکل کو بھگا کرلے گیا۔ موٹر سائیکل کی چال بالکل لکڑ بھگّے جیسی تھی۔

محسن کو منظر نے اپنی گاڑی میں بٹھالیا۔ مولوی خادم حسین رابعہ کی گاڑی کی طرف بڑھا ہی تھا کہ منظر نے اسے آواز دی "مولوی صاحب اِدھر آؤ نا یار۔ ہم سے خفا ہوگیا۔"

"نہیں جی۔ مجھے تو معاف ہی رکھیں آپ۔ دونوں۔"

"ابے بھوتنی کے۔ کیوں کباب میں ہڈی بن رہا ہے۔" منظر نے اسے ڈانٹا "داڑھی اتنی بڑی ہوگئی عقل پھر بھی نہیں آئی۔"

"یہ بھوتنی کا کس کو کہا ہے آپ نے ہیں جی!"

"ہیں جی کے بچّے۔ تیرے حجلۂ عروسی میں اگر ایسے ہی آجاتا کوئی بکرا۔ سینگوں سمیت۔ خیر تمہارے مقابلے میں تو بیوی اس کو ترجیح دیتی۔"

منظر مجھے اور رابعہ کو تھوڑا سا تخلیہ فراہم کرنا چاہتا تھا مگر اس کے بعد خادم حسین کے اس کی گاڑی میں بیٹھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا "یعنی کس قدر غلیظ زبان ہے جی اس شخص کی۔ اور اس کے دماغ میں فحاشی اور بے حیائی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ معلوم نہیں آپ لوگ اسے کیسے برداشت کرلیتے ہیں جی۔ بخدا کسی دن یہ گناہ بھی سرزد ہوجائے گا مجھ سے۔"

میں نے کہا "کون سا گناہ؟" اور گاڑی اسٹارٹ کی۔

"بس جی۔ سولہ بچّوں کی یتیمی کا خیال آجاتا ہے۔ ایک دو کی

بات نہیں ہے۔" وہ بولا "میدانِ حشر میں اتنی بڑی پلٹن سے جان چھڑانا مشکل ہوگا۔"

رابعہ ہنسی "بھئی گناہ تو ایک ہی ہے۔"

"تو جی۔ آپ بھی کمال کی بات کرتی ہو۔ یہ تو سیدھا سا حساب کا سوال ہے۔ ایک کے مقابلے میں سولہ گنا بار ہوگا۔ اور جو ہوتیں ان کی چار بیویاں اور چونسٹھ بچے تو۔"

"مولوی خادم حسین تم دیکھتے جاؤ۔ یہ کام ہم کرکے دکھائیں گے انشاء اللہ۔ کوئی شرعی قباحت تو نہیں ہے نا اس میں؟"

"آپ کے لئے نہیں ہے جی۔" وہ دانت نکالنے لگا۔

رابعہ نے اسے گھورا "ان کو خصوصی اجازت نامہ دے رہے ہو۔"

"وہ جی چار میں انصاف کی شرط اپنے سکندر صاحب ہی پوری کرسکتے ہیں۔ ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔"

"اللہ تمہیں خوش رکھے۔ تم نے منہ پر کلمۂ حق کہہ دیا۔"

رابعہ نے جل کے کہا "یہ کارِ خیر تم ہی کرو خادم حسین۔ ابھی سے تلاش کرکے رکھو باقی تین بھی۔"

میں نے زور سے کہا "بات چار کی ہو رہی ہے۔ تین کی نہیں۔ ابھی تو ایک بھی نہیں کی ہم نے۔ زیرِ غور ہے ایک نام لیکن ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں۔ ابھی تک تو تھرڈ ڈویژن میں پاس ہوتی آئی ہے وہ سفارش سے۔"

"سمجھو وہ فیل ہوگئی۔" رابعہ باہر دیکھنے لگی۔

"بھئی مولوی خادم حسین۔ آدمی کو مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ ایک سے ایک چیز پیدا کی ہے اللہ نے۔ پھر آدمی خوب سے خوب تر کی تلاش کیوں نہ کرے۔ اب اپنے ایمان سے کہو۔ کیا تمہارا دل نہیں چاہتا کہ عقدِ ثانی تمہارا ہو جائے نیلو سے۔"

"نیلو سے؟" وہ سوچ میں پڑ گیا "مگر وہ تو کرسچن ہے جی۔"

"چلو چھوڑو اسے۔ زیبا کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"سبحان اللہ۔ کیا رُخِ زیبا عطا کیا ہے اسے خدا نے۔ مگر وہ مجھ سے کیوں عقدِ ثانی کرنا چاہے گی جی۔"

"بھئی مایوسی کفر ہے۔ اللہ مسبب الاسباب ہے اور پتھر دل محبوب کے لئے خصوصی وظیفہ ہے میرے پاس۔ بڑا آزمودہ۔"

"اچھا جی؟" خادم حسین چوکنا ہوگیا "ایک عمل مجھے بھی بتایا تھا ایک بڑے پہنچے ہوئے پیر صاحب نے۔ مسرت نذیر پہ آزمایا تھا۔"

رابعہ ہنس پڑی "مولوی۔ کچھ شرم کرو۔ تمہاری بیوی کو بتا دوں گی میں یہ ساری باتیں۔"

"ایسا غضب مت کرنا جی۔ آج ہی بڑا کہرام مچایا اس نیک بخت نے حالانکہ بات کچھ بھی نہیں تھی۔ خود ہی تعریف کر رہی تھی۔ فلم تکیے والی دیکھ کے آئی تھی۔ میں نے کہہ دیا کہ مسرت نذیر تو آتش فشاں ہے حُسن و شباب کا۔ تو جل کر بولی کہ اچھا میں؟ میں نے جھوٹ نہیں بولا تو کیا غلطی کی؟ میں نے کہا کہ پہاڑ تو تم بھی ہو۔ سنگِ خارا کا۔ پہلے خوش ہوئی۔ جب میں نے بتایا کہ سنگ خارا بہت سخت پتھر ہوتا ہے سیاہ رنگ کا۔ تو جی غصے میں چڑھ دوڑی مجھ پر بیلن لے کر۔ پراٹھے پکا رہی تھی مولی بھرے۔ اللہ معاف کرے اسے۔ جو منہ میں آیا بکا اپنے مجازی خدا کو۔ یہ بھی کہا کہ جاؤ اسی حُسن کے آتش فشاں میں۔ نہیں تو کسی تنور میں جا کر مرو۔ بس جی میں تو جان بچا کے بھاگ آیا۔ ایک بیلن پھر بھی اس نے مار ہی دیا۔ ادھر شانے پر۔ اور ایک بعد میں پھینک کے مارا تو یہاں لگا تھا۔ کمر کے زیریں حصے پر۔ آپ مجھے [illegible] ہی دیں اب سکندر صاحب۔ کچھ کام اس عمل نے کیا ہوتا۔ ہاں اللہ کو منظور ہوا تو یہ وظیفہ کرے گا۔ آپ کہہ رہے تھے کہ آزمودہ ہے۔"

جب میں نے وقار یوسف کے گھر کے سامنے گاڑی روکی تو رابعہ کا بھی ہنس ہنس کے بُرا حال تھا اور خود میں ہنسی ضبط کرنے میں ناکام تھا لیکن مولوی خادم حسین کی سنجیدگی میں فرق نہیں آیا تھا۔

اس وقت تین بجے تھے۔ صرف وقار یوسف تھا جو سب فکروں سے بے نیاز سویا پڑا تھا۔ گل کے ساتھ نکّی جاگ رہی تھی اور وہ دونوں بوبی کے پاس سر جوڑے خاصی سنجیدہ بلکہ تشویش میں مبتلا نظر آتی تھیں۔ ان کے نقطۂ نظر سے غالب اور مارگریٹ کا عقد ہی سب سے سنگین اور سنسنی خیز مسئلہ تھا اور جیسا کہ بعد میں پتا چلا وہ اس کے شرعی قانونی اور اخلاقی پہلو کا جائزہ لینے کی کوشش کر رہی تھیں۔

نکّی نے سب سے پہلے پوچھا "کیا ہوا؟"

منظر بولا "ابھی نہیں ہوا۔ چار ماہ باقی ہیں۔ ویسے لڑکا ہوگا یا لڑکی۔"

"تم سے کس نے پوچھا تھا۔" نکّی نے کہا۔

میں نے اس کی تائید کی "ہاں کبھی تم پوچھتے ہو نکّی سے۔ کہ کیا ہونا چاہئے۔"

"وہ بھوتنی کا کہاں ہے۔" منظر قہقہہ مار کے بولا "سو رہا ہے؟ اس کی تو ایسی کی تیسی۔ ابے اُٹھ۔" منظر نے اسے ٹانگ پکڑ کے کھینچ لیا۔

وقار یوسف ہڑبڑا کے اُٹھ بیٹھا "کیا... کیا ہوا۔"

"تو یہ بھی وہی پوچھ رہا ہے۔ ابے پھر کیا بتائیں۔ تو بتا کہ کیوں نہیں ہوا اب تک۔ جھک مار رہے ہو کب سے سالے۔ مولوی خادم حسین کی طرح۔ یہ بھوتنی کا بھی اندھیرے میں تیر چلا رہا ہے کوئی جا رہا ہے زیبا کی طرف کوئی تکیے والی کی طرف......"

"منظر صاحب۔ آپ ذرا زبان کو لگام دیں۔" خادم حسین بولا۔

"ابے میں زبان کی بات نہیں کر رہا تھا۔ سولہ بچے زبانی جمع خرچ سے پیدا نہیں کئے ہیں۔ چل جا کے پانی لا میرے لئے۔"

"کتنا چلو بھر۔ کیا ڈوب مرنے کا خیال ہے؟"

"ڈوب کے مریں میرے دشمن کسی گٹر میں۔ بھوتنی کے پانی پلانا کارِ ثواب ہے پھر ایک وظیفہ میں بھی سکھا دوں گا تجھے۔ دو تو لازمی ہیں مگر چوکا بھی لگ جائے تو کچھ بعید نہیں۔ گھر بھر جائے گا بچوں سے۔"

"جی تو چاہتا ہے کہ زہر دے دوں پانی میں ملا کے۔ آپ کی زبان کس قدر حیا سوز۔ اور آپ کا اخلاق کتنا گرا ہوا ہے۔ یعنی خواتین کی موجودگی میں بھی آپ ایسی بازاری گفتگو کرتے ہیں جی۔"

منظر نے اس کی نقل اُتاری "بازاری گفتگو کرتے ہیں جی۔ ابے چل اُلّو کے پٹھے۔ ہم نے بہت دیکھے ہیں تیرے جیسے شرفا۔ ہمت نہیں ہے ورنہ بیٹھ جائیں [illegible] تکیے والی کی گود میں۔ ابھی تو بس خوابوں پر گزارا ہے۔"

وہ بھڑک اٹھا "گالی گلوچ پر اُتر آئے ہیں آپ اور صرف آپ کی وجہ سے بلڈ پریشر بڑھتا جا رہا ہے میرا۔"

"بیٹے ہارٹ فیل بھی میری وجہ سے ہی ہوگا تمہارا۔"

اس وقت وقار یوسف کے گھر میں دو محاذ کھلے ہوئے تھے۔ دوسرے محاذ پر گل اور محسن کی جنگ جاری تھی۔ نکی بھی وقار یوسف کو ڈانٹ رہی تھی کہ کیا ہر وقت گھوڑے بیچ کر سوتے رہتے ہیں۔ سب جاگ رہے ہیں اتنا شور ہو رہا ہے اور جناب کو فکر ہی نہیں کسی کی۔

"اچھی نیند بے فکری سے ہی آتی ہے باقی سب تو پاگل ہیں۔" وہ پھر لمبی تان کر سو گیا۔

"وقار۔ تمہیں پتا ہے آج کیا ہوا۔" نکّی چائے بنانے میں مصروف تھی۔

"جو بھی ہوا۔ صبح بتانا۔ مجھے کوئی جلدی نہیں۔" وقار بولا۔

"میں یہ کھولتا ہوا پانی ڈال دوں گی سر پر۔ غالب واپس آگیا اور چوہدری دلاور پکڑا گیا۔"

"چلو بہت اچھا ہوا۔ اب مجھے سونے دو۔"

"اور غالب کی شادی بھی ہوگئی ہے۔ ایک کرسچن لڑکی سے۔"

"چار میں بھی کر لوں گا۔ اتنی جلدی کیا ہے۔" وقار بولا اور پھر اُٹھ کے سب کے درمیان آ بیٹھا۔ اسے معلوم تھا کہ اب نکی سچ مچ اس پر چائے کا پانی ڈال دے گی۔

میں نے دوسرے کمرے میں جا کے دیکھ لیا تھا۔ غالب سو رہا تھا اور مارگریٹ ایک کرسی پر گم صم بیٹھی تھی۔

"تم کیوں اکیلی بیٹھی ہو۔" میں نے کہا۔

"غالب سو رہا ہے نا۔" اس نے یوں کہا جیسے وہ وہاں بیٹھ کے غالب کی حفاظت کر رہی ہے۔ کسی ماں کی طرح جسے فکر ہو کہ وہ اٹھی تو بچہ جاگ جائے گا۔

میں نے کہا "اسے سونے دو۔ اب وہ اپنے گھر میں ہے۔ وہ نیند میں نہیں ڈرے گا۔"

"ڈر تو مجھے لگ رہا ہے۔ مجھے نہیں آنا چاہئے تھا یہاں۔"

میں نے کہا "تمہیں آنا ہی چاہئے تھا یہاں۔ جب تم یہاں رہو گی تو خود تمہیں احساس ہو جائے گا اس بات کا۔ آؤ میں تم کو دوسرے لوگوں سے ملوا دوں۔"

وہ تامل اور تذبذب میں مبتلا ہوگئی "مجھے... اکیلا رہنے دو۔ مجھے شرم آتی ہے ان سب کے سامنے جاتے ہوئے۔ میں اس قابل نہیں ہوں۔"

میں ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ سب ایک دم خاموش ہوگئے۔ گل اور محسن کے روٹھنے منانے کا ڈراما ختم ہوگیا۔ خادم حسین اور منظر جیسے بھی چُپ تھے۔ خادم حسین کی خاموشی میں احتجاج کا انداز تھا جب کہ منظر شاید اس سے پھر پنگا لینے کے لئے نیا بہانہ سوچ رہا تھا۔ صرف رابعہ اور وقار چپکے چپکے باتیں کر رہے تھے اور وقار کی دلچسپی سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ رابعہ کی زبانی دلاور کی گرفتاری کا قصہ سُن رہا ہے۔ نکی نے چائے دم ہونے کے لئے رکھ دی تھی اور اب ہر ایک کی پسند کے مطابق مگ میں چینی ڈال رہی تھی۔

میں نے انگریزی میں کہا "لیڈیز اینڈ جنٹلمین۔ یہ مارگریٹ ہے۔"

خواتین کی نظروں میں تجسس سے زیادہ ناپسندیدگی کے جذبات تھے اور ایک سوالیہ نشان تھا کہ اچھا ہے تو پھر؟ ہم کیا کریں؟

میں نے کہا "یہ بڑی اچھی لڑکی ہے۔ اس نے غالب کا بہت خیال رکھا۔ بالکل اسی طرح جیسے آپ میں سے کوئی رکھتا۔ یہ اردو سمجھتی ہے لیکن روانی سے بول نہیں سکتی۔"

مارگریٹ ایک صوفے پر ٹک گئی "وہ... جھوٹ بولا تھا میں نے۔ میں اردو اسی طرح بولتی ہوں جیسے سب بولتے ہیں۔"

میں نے کہا "خیر کوئی بات نہیں بلکہ یہ تو بہت اچھی بات ہے مارگریٹ۔ ان لوگوں سے ملو۔ یہ چائے بنانے والی خادمہ ٹائپ لڑکی دراصل اس عظیم الشان گھر اور اس مظلوم شخص دونوں کی مالک ہے۔"

"بھائی سکندر۔ میں نمک ڈال دوں گی آپ کی چائے میں۔"

"ضرور ڈالو۔ میں وہ چائے وقار کو دے دوں گا ایسی چالاکی سے کہ اسے پتا بھی نہیں چلے گا۔" میں نے کہا "اور وہ اُف تک نہیں کرے گا۔ مسکراتے ہوئے پی جائے گا۔ بڑا فرمانبردار شوہر ہے اور مارگریٹ۔ وقار یوسف ایک زبردست وکیل ہے جس کی زبان اور وکالت عدالت میں خوب چلتی ہے مگر گھر میں.... خیر چھوڑو یہ دردناک قصہ۔ یہ محسن ہے۔ پہلے میرا دوست تھا اب یہ بھی صرف شوہر ہے۔ روایتی قسم کا بزدل اور بیوی سے ڈرنے والا۔ بیوی کو جھوٹ اور خوشامد سے خوش رکھنا جانتا ہے' اس کی بیوی توبہ توبہ۔ ذرا سی بات پہ گولی مارنا تو اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے اور گولہ

ایک مشنری اسکول میں پڑھا جہاں اسے وظیفے کے نام پر خیرات ملتی تھی۔ اس کی ایک بڑی بہن تھی جو ہیروئن بننے کے لئے لاہور بھاگ گئی تھی۔ ایکسٹرا سپلائی کرنے والے ایک شخص نے اسے سبز باغ دکھائے اور کہا کہ وہ بھی نیلو بن سکتی ہے بلکہ ایک وقت آئے گا جب نیلو کا چراغ نہیں جلے گا اس کے سامنے۔ اس چکر میں وہ کہاں کہاں گئی۔ یہ بڑی لمبی کہانی ہے۔ انجام وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا۔ تاہم اس نے اپنے گھر والوں کو اور جاننے والوں کو کبھی حقیقت نہیں بتائی اور ہمیشہ یہی کہا کہ وہ عیش کر رہی ہے۔ اس کی باتوں سے گمراہ ہو کے مارگریٹ بھی گھر سے نکلی۔ اسے اپنے ساتھ لے جانے والا ایک لڑکا تھا جو چرچ میں آرگن بجاتا تھا۔ وہ میوزک ڈائریکٹر بننا چاہتا تھا اور اسے ایک حسین سہارے کی ضرورت تھی۔ جب اسے سہارے کی ضرورت نہیں رہی تو اس نے مارگریٹ کو بے سہارا چھوڑ دیا اور وہ اِدھر سے اُدھر بھٹکتی رہی۔ سو روپے کے نوٹ کے پیچھے بھاگتی رہی یہاں تک کہ ایک دن وزیر خاں اسپتال پہنچ گئی جہاں اسے ایک ٹھکانا مل گیا۔ رہنے کے لئے جگہ اور تین سو روپے ماہانہ۔ دن میں کام رات کی چھٹی۔ تنخواہ اس کی تین دن کی کمائی کے برابر تھی۔ اس کا معمول وہی رہا مگر وہ دوسروں کی نظر میں معتبر ہو گئی۔ نرس کو لوگ بڑے احترام سے سسٹر کہتے ہیں۔ اس پیشے اور اس نام کی تقدس کو اس نے جتنا رسوا کیا شاید کسی اور نے نہیں کیا ہوگا۔ خدا اس کے سارے گناہ معاف کردے گا مگر یہ گناہ ایسا نہیں جس کی معافی ہو۔

زارو قطار روتے ہوئے اس نے بتایا کہ کس طرح اس کو شوکت رانا نے دس ہزار کا لالچ دے کر بڑی رازداری سے ایک کام کرنے کو کہا تھا۔ وہ کام تھا خود کو رضیہ بنا کے غالب کی بیوی ظاہر کرنا اور غالب کو یقین دلانا کہ ان کی شادی ہو چکی ہے۔ صرف زبانی نہیں۔ اسے عملاً غالب کی بیوی بن کے رہنا تھا۔ وہیں جہاں اسے تین سو روپے ماہانہ ملتے تھے۔ اسی کمرے میں اور اس نے یہ ذمّے داری اس لئے قبول کرلی کہ یہ کام بہت معمولی تھا۔ ہر رات باہر جا کے کسی اجنبی کو شوہر بنانے اور صبح سو روپے لے کر لوٹنے سے یہ کہیں زیادہ آسان کام تھا۔ تاہم اپنی انتہائی کوشش کے باوجود وہ غالب کی بیوی نہ بن سکی۔ اس ڈر سے کہ کہیں شوکت رانا دس ہزار واپس نہ مانگ لے۔ اس لئے یہ جھوٹ بھی بولا کہ غالب واقعی اس کا شوہر بن گیا ہے اور وہ میاں بیوی کی حیثیت سے ہی رہتے ہیں۔

مارگریٹ نے سب کی ہمدردی حاصل کرلی تھی۔ اس کے سچ نے سب کا دل جیت لیا تھا۔ اس کی مظلومیت نے خواتین کو اس حد تک جذباتی کردیا تھا کہ اس کے ساتھ وہ بھی رونے لگی تھیں۔ اب اس کے ایک طرف رابعہ بیٹھی ہوئی تھی اور دوسری طرف گل۔ گل بار بار اسے تسلی دیتی تھی اور پانی پلاتی تھی "مت رو میری بہن اب کچھ نہیں ہوگا۔" وہ بار بار کہہ رہی تھی۔

مارنا دائیں ہاتھ کا۔"

گل ہنسنے لگی "آپ کا تعارف میں کراؤں گی۔"

منظر نے مولوی خادم حسین کے کندھے پر ہاتھ مارا جو بڑی دلچسپی سے میری بات سُننے میں مگن تھا "اور اس کا سارا کچا چٹھا میں بیان کروں گا۔ بڑا حرامی ہے یہ۔ بیوی سے جوتے کھاتا ہے مگر پھر بھی باز نہیں آتا۔"

خادم حسین نے خلافِ معمول برہمی کا اظہار نہیں کیا "آپ سے بڑا حرامی کون ہوگا منظر صاحب۔ اب ہاتھ مارا تا آپ نے میرے کندھے پر تو میں آپ کو لات مار دوں گا۔"

"ہاں گدھے کا بچّہ دولتی ہی جھاڑے گا۔"

"یہ... یہ پھر آپ حد سے بڑھ گئے۔ والد صاحب تک جا رہے ہیں آپ؟ پھر میں نے کچھ کہا تو....."

منظر نے اسے چوم لیا "ارے مری جان۔ تم کچھ کہو تو سہی۔ جو بُرا مانے وہ کافر۔ ہم تو ویسے بھی گدھے کو باپ بنانے والے لوگ ہیں۔ ضرورت پڑنے پر۔ تمہیں اپنا باپ کہہ سکتے ہیں علی الاعلان۔"

مارگریٹ ہنسنے لگی "سب بڑے دلچسپ لوگ ہیں۔"

میں نے کہا "یہ ڈھول جیسے پیٹ والا ہم سب سے زیادہ خوش قسمت ہے یہ سولہ بچّوں کا باپ ہے۔"

"ساڑھے سولہ یار۔" منظر نے چائے پیتے پیتے کہا۔

"اور اس کے باوجود تفکرات سے اتنی دور ہے۔ ہر وقت ہنستا رہتا ہے یا ہنساتا رہتا ہے۔ یہ یاروں کا ہی نہیں دشمنوں کا بھی یار ہے۔ اس کی بات کا کبھی بُرا مت ماننا۔ یہ ایک شریر اور معصوم بچہ ہے خود بھی۔"

منظر ہنسنے لگا "بھوتنی کے اب میں بتاتا ہوں تیرے بارے میں۔"

میں نے جلدی سے کہا "مس مارگریٹ جانتی ہیں مجھے۔ میں سکندر ہوں اور..... یہ رابعہ ہے۔ چاند سورج کی جوڑی۔"

"مس مارگریٹ یا رضیہ۔" محسن نے طنز سے کہا "مسز غالب!"

میں اس کا مطلب سمجھ گیا "نہیں۔ یہ نہ مسز غالب ہے اور نہ رضیہ۔"

اب مارگریٹ نے سر اُٹھایا "سچ کیا ہے۔ یہ میں آپ کو بتاتی ہوں۔"

اور اس نے سچ بتا دیا۔ اپنے بارے میں کچھ بھی نہیں چھپایا۔ وہ ایک بہت غریب اور رزیل سمجھے جانے والے ماں باپ کی بیٹی تھی۔ اس کا باپ بھی کارپوریشن میں ملازم تھا اور ماں بھی۔ وہ دونوں سیالکوٹ کی سڑکوں پر جھاڑو دیتے تھے۔ وہ محنت اور حق حلال کی روزی کماتے تھے۔ ہر اتوار کو باقاعدگی سے چرچ بھی جاتے تھے لیکن معاشرے میں ان کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ اس نے

اسے غالب کے ساتھ ہونے والے سلوک کا بھی علم تھا۔ اس کا بڑے سائنٹیفک انداز میں برین واش کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر شاہ نے اسے پہلے مختلف دوائیں دی تھیں اور اس کی مزاحمت ختم کردی تھی۔ وہاں اور بھی لوگ تھے جو غالب کو یہ یقین دلانے کی پوری کوشش کرتے رہے کہ وہ غالب نہیں فیروز ہے۔ ہم اس کے دوست نہیں دشمن ہیں اور وہ سب اس کے ہمدرد اور ساتھی ہیں۔ غالب پر تشدّد بھی بہت ہوا۔ اس کو بجلی کے جھٹکے بھی دیے گئے یہاں تک کہ وہ ذہنی طور پر بالکل ختم ہو گیا۔ انہوں نے نئے سرے سے اس کو اپنی مرضی کے مطابق فیروز کی شخصیت میں ڈھال دیا اور اس کے دماغ میں سے پُرانی باتیں نکال کے نئی باتیں بھر دیں۔

صبح کا سورج نکل آیا تھا مگر سب اپنی اپنی جگہ دم بخود بیٹھے تھے۔ یہ دکھ بھری کہانی اختتام کو پہنچنے کے بعد بھی پُر آزار تھی۔ ابھی مارگریٹ وہی پُرانی مارگریٹ تھی۔ غالب اب بھی غالب نہیں تھا اور سب سے زیادہ دکھی کرنے والی بات یہ تھی کہ کسی کو بھی نازو کے بارے میں معلوم نہیں تھا۔

ہم سب رات بھر کے جاگے ہوئے اور بہت تھکے ہوئے تھے مگر اتوار کی صبح کسی کو کام پر جانے کی فکر نہیں تھی۔ چھٹی والے دن سب دیر سے سو کے اُٹھتے تھے مگر آج کسی کو سونا ہی نصیب نہیں ہوا تھا۔

آٹھ بجے میں نے بہتر سمجھا کہ تھوڑی دیر کے لئے ماحول اور موضوع بدل دیا جائے۔ میری تجویز کی تائید محسن نے کی اور وقار گاڑی لے کر ناشتے کے لئے پوری چھولے اور حلوہ لینے نکل گیا۔ میں نے زبردستی مارگریٹ کو نہا دھو کے کپڑے بدلنے کے لئے بھیجا اور خود بھی دوسرے باتھ روم میں گھس گیا۔ گل پھر چائے بنانے کے لئے برتن سمیٹنے لگی۔ منظر کو بیوی بچوں کی یاد ستا رہی تھی۔ وہ ناشتے کے لئے بھی نہیں رکا اور وقار یوسف کے ساتھ ہی روانہ ہو گیا۔

ناشتے کی میز پر مارگریٹ کی حالت بہت بہتر تھی۔ وہ کچھ ترو تازہ اور مطمئن بھی نظر آرہی تھی۔

اس نے اِدھر اُدھر دیکھ کے کہا "غالب.... سو رہا ہے۔"

غالب نے بڑے ڈرامائی انداز میں انٹری دی "مجھے بھوک لگی ہے۔"

"فیروز" میں نے اسے ہاتھ پکڑ کے اپنی جگہ بٹھا دیا "آؤ ہمارے ساتھ بیٹھو۔"

وہ اِدھر اُدھر نظریں گھماتا رہا پھر اس کی نظر مارگریٹ پر رک گئی۔ اس کی آنکھوں میں وہی اُلجھن اور پریشانی تھی۔ ایک مستقل سوال کی کیفیت تھی اور بے یقینی تھی "نازو نازو کہاں ہے؟"

"میں ہوں نا یہاں۔" مارگریٹ بولی۔

غالب ایک دم مشتعل ہو کے اُٹھا "سؤر کی بچّی۔ حرام زادی' جھوٹ بکتی ہے تو۔ بتا دے مجھے نازو کہاں ہے ورنہ میں تجھے جان سے مار ڈالوں گا۔" اس نے عالمِ وحشت میں مارگریٹ پر حملہ کرنے کی کوشش کی مگر میں نے اسے روک لیا۔

میں نے کہا "یہ تم کیا کر رہے ہو فیروز۔"

اس نے مجھے دھکا دے کر گرا دیا "میں فیروز نہیں ہوں۔"

ناشتے کی میز پر بیٹھے ہوئے سب افراد کے چہرے غالب کی اس دیوانگی کے مظاہرے پر اُمید اور خوشی کی روشنی سے منور ہو گئے تھے۔ اس کا مطلب تھا غالب اپنی شخصیت کی جانب لوٹ رہا تھا اور خلافِ توقع اس کی ذہنی صحت کی بحالی کا یہ عمل بہت تیز تھا۔ شاید یہ ماحول کا اثر تھا۔

میں نے خود کو سنبھال کے کہا "تم کون ہو پھر؟"

اس نے کہا "میں؟ پتا نہیں۔ تم کیوں نہیں بتاتے مجھے؟"

میں نے کہا "تم غالب ہو۔"

رابعہ نے بھی کہا "ہاں تم غالب ہو۔ میں رابعہ ہوں۔"

"میں محسن اور یہ گل۔"

غالب نے سب کو دیکھا اور پھر کچھ سوچنے لگا۔ اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں فون کے قریب تھا۔ ریسیور میں نے اُٹھایا۔ ٹیلی فون دلاور کی بیوی کا تھا۔ وہ رابعہ سے بات کرنا چاہتی تھی۔ میں نے ریسیور اس کی طرف بڑھا دیا۔

رابعہ نے کہا۔ ہیلو۔ پھر اس کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا "تم جھوٹ بول رہی ہو۔ دلاور پولیس کی تحویل میں ہے اور شوکت رانا بھی۔ ان کے سوا کوئی نازو کے بارے میں نہیں جانتا۔"

اس کا ہاتھ کانپنے لگا اور ریسیور اس کے ہاتھ سے گر گیا۔

نازو کا نام آگیا تھا۔ وہ بھول گیا تھا کہ اس بات کا غالب پر کیا اثر ہوگا جس کا ذہن پہلے ہی خیالات کی اُلجھنوں سے ماؤف تھا۔ اس کے ماضی و حال کے درمیان شکوک کی دھند تھی اور بے یقینی کے جالے تھے۔ خود اپنی نفی کرنے والے حقائق کا خلا تھا اور جھوٹ کا کھوکھلا پن تھا۔

اب غالب کی نئی شخصیت کا مصنوعی خول بکھر رہا تھا۔ پرانے رشتے استوار ہوتے ہی اسے وہ سازگار ماحول میسر آگیا تھا جو اس کی خود اعتمادی کی بحالی میں معاون و مددگار تھا۔ اسے ایک اندھے کنوئیں کی گہرائی میں دھکیل دیا گیا تھا جہاں سے اس کا اپنی کوشش سے نکلنا محال تھا لیکن اب ہم سب نے اس کی دستگیری کے لئے ہاتھ بڑھا دیے تھے۔ حالات کے بدلتے ہی اس کے قدم روشنی کی جانب لے جانے والی سیڑھی پر جم رہے تھے اور اس کے ہاتھ یقین کے سہاروں کو تھام رہے تھے۔ اس کا اندازہ ہم نے صرف ایک رات میں رونما ہو جانے والی تبدیلی سے کرلیا تھا۔

غالب کی نظریں محسن پر جم گئیں "کس نے دھمکی دی ہے نازو کو۔ مجھے بتاؤ۔"

محسن نے مسکرا کے کہا "یار اتنا سیریس ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ میں مذاق کررہا تھا۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو مجھ سے۔ یہ...... پھر یہ اتنی پریشان کیوں ہے۔" اس نے رابعہ کی طرف دیکھا۔

میں نے کہا "یہ کون؟"

اس نے ذہن پر زور دیا "یہ.... رابعہ۔ یہی نام بتایا تھا نا تم نے ابھی مجھے۔"

"کیا تم بھول گئے تھے؟" رابعہ مسکرانے لگی۔

غالب کے لبوں پر پہلی بار ایک حوصلہ افزا مسکراہٹ آئی "میں تو اپنا نام بھی بھول گیا تھا۔ ہے نا عجیب بات۔ ایسا ہوتا ہے کہیں لیکن ابھی تم نے رانا صاحب کی بات کی تھی۔ اور دلاور کا ذکر بھی کیا تھا۔ بالکل ٹھیک کہا تھا تم نے۔ نازو کے بارے میں ان کے سوا کوئی بھی نہیں جانتا۔"

"تم بھی نہیں؟" رابعہ بولی۔

غالب نے افسردگی سے انکار میں سر ہلایا "معلوم نہیں وہ مجھے ایسے چھوڑ کے کہاں غائب ہوگئی ہے۔ بغیر کچھ بتائے۔ الو کی پٹھی۔ کیا اسے نہیں معلوم کہ میں اکیلا رہ جاتا ہوں تو مجھے کتنا ڈر لگتا ہے۔"

"کس سے ڈر لگتا ہے؟"

وہ سوچ میں پڑ گیا "پتا نہیں۔ ڈرنے کی کون سی بات ہے میرے لئے۔ وہ عورت ہے۔ ڈرنا اسے چاہئے۔ بھیڑیا بہت مکار اور سفاک ہوتا ہے۔ شوکت رانا بھیڑیا ہے۔"

میں نے اسے تسلی دی "فکر مت کرو۔ نازو کو کچھ نہیں ہوگا۔ اللہ اس کا محافظ ہے اور وہ خود بھی اپنی حفاظت کرنا جانتی ہے۔"

میں نے پہلے رابعہ کو اور پھر ریسیور کو سنبھالا۔ رابعہ کو میں نے دایاں ہاتھ کمر کے گرد حمائل کرکے سہارا دیا اور بائیں ہاتھ سے ریسیور پکڑ لیا اس امید میں کہ شاید دوسری طرف دلاور کی بیوی اب بھی لائن پر ہو اور ہیلو ہیلو کررہی ہو مگر ریسیور میں ڈائل ٹون کی سائرن جیسی آواز کے سوا کچھ نہیں تھا اور اس کا مطلب یہ تھا کہ اپنی بات کہتے ہی اس نے فون بند کردیا تھا۔ وہ ہوشیار عورت تھی۔ اسے علم ہوگا کہ لمبی بات کرنے سے کال کرنے والے کا پتا چلایا جاسکتا ہے۔

رابعہ نے خود کو میری رومانٹک گرفت سے آزاد کیا اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے سہمی ہوئی ویران آنکھوں سے مجھے دیکھا

میں نے ریسیور کو احتیاط سے کریڈل پر رکھ دیا "میری رائے تو یہ ہے کہ ہر عورت جھوٹ بولتی ہے۔"

نگی نے فوراً احتجاج کیا "اپنے الفاظ فوراً واپس لیں۔"

میں نے کہا "میرا مطلب یہ نہیں تھا کہ ہر عورت ہر وقت اور ہر جگہ صرف جھوٹ بولتی ہے۔ سچ بھی نکل جاتا ہے بعض اوقات منہ سے اور کبھی مجبوراً سچ بولنا پڑتا ہے۔"

اب گل چراغ پا ہوگئی "اور اگر میں کہوں کہ عورتوں سے زیادہ یہ بات مردوں کے لئے سچ ہے۔"

محسن بولا "تو ہم اسے بھی ایک جھوٹ سمجھ کے مسکراتے

"یہ.... یہ عورت جھوٹ بولتی ہے۔"

ہوئے نظرانداز کردیں گے۔ سچ سُن کر چراغ پا نہیں ہوں گے تمہاری طرح۔"

وقار نے کہا "یار حد ہوگئی۔ رابعہ کی بات کا جواب کسی نے نہیں دیا۔ کسی نے نہیں پوچھا کہ یہ کون عورت تھی اور اس نے کیا جھوٹ بولا تھا۔"

میں نے کہا "یہ دلاور کی بیوی تھی جو صرف جھوٹ بولتی ہے اس لئے پوچھنے اور پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ بات تو رابعہ بھی جانتی ہے۔"

میرا مقصد صرف یہ تھا کہ پہلے رابعہ کے دل سے اس خوف کو دور کردوں جو اس کی صورت پر نقش ہو کے رہ گیا تھا اور اسے ایک نفسیاتی سہارا فراہم کرنے کے بعد کوئی سوال کروں۔

رابعہ نے سر ہلا کے مجھے دیکھا "میں بلاوجہ ہی گھبرا گئی تھی۔"

میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا "اب کیا فرما رہی تھیں مسز دلاور؟ وہ تو بھاڑ میں جھونکی جانے والی خشک لکڑی کی طرح چیخ رہی ہوگی۔ تم نے اس کے گھر والے کو بڑے گھر جو پہنچادیا ہے۔"

محسن نے کہا "اب اور کیا دھمکی دے سکتی ہے وہ اس کے سوا کہ نازو کی خیر مناؤ۔"

رابعہ نے اور میں نے ایک ساتھ محسن کی طرف دیکھا لیکن اب تنبیہہ کا فائدہ نہیں تھا۔ غیر ارادی طور پر محسن کے لبوں پر

غالب مسکرانے لگا "وہ ایسی کی تیسی کردے گی شوکت رانا کی۔ ابھی رانا کو معلوم نہیں کہ نازو کیا چیز ہے۔ ہے تو بڑی نازک سی شاخِ گُل جیسی مگر وہ مچلے تو شعلہ ہے اور کڑکے تو بجلی ہے۔ پتا ہے اس کے ہاتھ کیسے چلتے ہیں۔ شوں شوں۔ بڑی کاٹ دار شمشیر آبدار۔ جو اس کی زد میں آگیا وہ گیا کام سے۔ کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا۔ اس دل کے ٹکڑے ہزار ہوئے کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا۔"

ہم سب اسے دیکھتے رہے۔ وہ نازو کے بارے میں بتاتے ہوئے اتنا پُرجوش اور جذباتی ہوگیا تھا کہ تصور میں نازو تھی مگر ہاتھ خود غالب کے چل رہے تھے۔ وہ بھول گیا تھا کہ ہم بھی وہاں ہیں۔ وہ نازو کی طرح پورے ایکشن سے دشمنوں کو گرا رہا تھا۔ پھر وہ ہنسنے لگا اور اپنی بے سُری آواز میں گانے لگا۔ یہ محمد رفیع کا بہت پرانا اور بہت مشہور گانا تھا۔

موقع پاکے میں نے رابعہ کو اشارہ کیا اور وہ چپکے سے کھسکنے ہی والی تھی کہ غالب نے لپک کے اس کا راستہ روک لیا "میں تم کو ایسے نہیں جانے دوں گا۔ پہلے بتاؤ نازو کی کیا بات تھی۔"

رابعہ ڈر گئی "نازو کی.... کون سی بات؟"

غالب اسے گھورنے لگا "وہی جو تم فون پر کہہ رہی تھیں۔ کس سے بات کررہی تھیں۔ بتاؤ نہیں تو۔"

رابعہ ایک دم پیچھے ہٹی "غالب....."

میں تیزی سے آگے بڑھا کیونکہ مجھے غالب کی آنکھوں میں وحشت کے آثار نظر آگئے تھے اور اس کے ہاتھ رابعہ کی طرف بڑھنے لگے۔

"غالب یہ کیا کررہے ہو۔" میں نے درمیان میں آکے اسے پیچھے دھکیل دیا "ہوش میں آؤ۔"

وہ سہم گیا اور سمٹ کے دیوار سے لگ گیا "مجھے.... مت مارو۔ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میں کسی سکندر کو نہیں جانتا رانا صاحب۔ مجھے نہیں معلوم وہ کہاں ہے۔"

اچانک اس کی حالت میں رونما ہونے والی یہ تبدیلی بڑی ڈرامائی تھی۔ جیسے اچانک کیمرا ٹرک سے سنیما کے پردے پر کوئی کردار اپنا روپ بدل لیتا ہے۔ فرشتہ صفت اور شریف صورت ڈاکٹر کے خدوخال مسخ ہو کے مکروہ اور شیطانی کردار والے مسٹر ہائڈ میں ڈھل جائیں۔

غالب کی صورت پر جسمانی اذیت اور کرب کے آثار نظر آرہے تھے اور چند لمحے قبل جو غالب خوش و خرم تھا وہ اب سخت عذاب میں مبتلا نظر آتا تھا۔ میری ذرا سی سختی نے اس کی زخم خوردہ شخصیت کو پھر اسی جہنم میں دھکیل دیا تھا جس سے وہ پوری طرح نکلا بھی نہیں تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ خود کو شوکت رانا کے عقوبت خانے میں محسوس کررہا ہے جہاں غالب سے میرا پتا پوچھنے والے اس کے جسم کو تشدد کا نشانہ بنا رہے ہیں۔ وہ کراہ رہا تھا اور چیخ رہا تھا۔ خود کو بچا رہا تھا اور ایسے جھٹکے لے رہا تھا جیسے کوئی الیکٹرک شاک دے رہا ہو۔

اس کی حالت نے ہم سب کو ہی دُکھی کردیا تھا۔ میں سخت پشیمان تھا کہ اس کے ساتھ زیادتی کی۔ میں اسے پیار سے بھی تو روک سکتا تھا۔

مارگریٹ ایک دم آگے بڑھی اور اس نے غالب کو اپنے ساتھ چمٹالیا "او ڈیئر۔ یہ کیا ہوگیا ہے تمہیں۔ تم پھر ڈر گئے ہو بلاوجہ۔ دیکھو میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اور کون ہے یہاں۔"

غالب نے اس کے بازوؤں میں سر چھپالیا تھا "وہ...... شوکت رانا...."

"کدھر ہے شوکت رانا؟ دیکھو یہ سب دوست ہیں تمہارے شوکت رانا یہاں کیسے آسکتا ہے۔"

"آسکتا ہے۔ وہ آسکتا ہے ہر جگہ....."

"نہیں فیروز۔ یہ دوسری جگہ ہے۔ تم اپنے گھر میں ہو۔"

"اپنے گھر میں؟ یہ میرا گھر ہے؟ نہیں، یہ میرا گھر ہوتا تو نازو بھی یہاں ہوتی۔" اس نے سر اُٹھا کے مارگریٹ کو دیکھا "تم کون ہو؟"

"تم.... تم مجھے نہیں پہچانتے۔" مارگریٹ نے افسردگی سے کہا۔

"پہچانتا ہوں۔ تم، تم وہی ہو۔ تم خود کو نازو کہتی تھیں۔ جھوٹ بولتی تھیں مجھ سے۔ بدشکل چڑیل... اپنی صورت دیکھی ہے آئینے میں۔"

مارگریٹ رونے لگی "ایسا مت کہو فیروز۔"

غالب نے اسے دھکیل دیا "کون ہے فیروز۔ میں غالب ہوں۔ میرے سامنے آنسو بہانے کی ضرورت نہیں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں تم جیسی عورتوں کو.... تم شوکت رانا کی زر خرید ہو۔ تم مارگریٹ ہو۔"

"ہاں... مگر میں نے تم کو اس سے بچایا تھا۔ یاد کرو۔"

غالب سوچنے لگا "تم نے بچایا تھا؟ اچھا۔ مجھے معاف کردو پلیز، میں نے تمہارا دل دکھایا۔ میں احسان فراموش اور کمینہ ہوں۔ میں بھول گیا تھا۔"

غالب کا موڈ اور اس کی ذہنی کیفیت ہر پل بدل رہی تھی۔ وہ گھر کا راستہ بھول جانے والا مسافر تھا۔ اب اسے واپسی کا راستہ یاد آیا تھا تو اس کے قدم بار بار بہک جاتے تھے۔ وہ بھٹک جاتا تھا لیکن پھر بہت جلد اپنے راستے پر لوٹ آتا تھا۔

مارگریٹ نے غالب کو کسی بچے کی طرح منالیا جو ضد میں بگڑ کے سرکشی پر آمادہ ہو "او کے او کے.... اب چلو میرے ساتھ۔"

وہ غالب کو دوسرے کمرے میں لے گئی۔ ایک نرس کی حیثیت سے وہ غالب کی دیکھ بھال کرتی رہی تھی اور اسے معلوم تھا کہ اس قسم کی کیفیت ہو تو کون سی دوا کارگر ہوگی۔ اس نے ہم سب کو وہیں

روک دیا تھا۔

"بے چارہ" نگی نے سب سے پہلے رقت انگیز لہجے میں کہا "کیا حالت ہوگئی ہے اس کی۔ آخر کیا بنے گا اس کا۔"

"بابا کچھ نہیں بنے گا۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔" وقار بولا۔

"کیسے ٹھیک ہوجائے گا۔ یہ ٹھیک ہوگا اور اسے پتا چلے گا کہ نازو کا کچھ پتا نہیں تو پھر اس کی حالت بگڑ جائے گی۔ ابھی تو اسے ہوش ہی نہیں ہے۔" نگی نے کہا۔

وقار بگڑ گیا "تم کسی اور کو بھی کوئی کام کی... بات کرنے کا موقع دو گی یا نہیں۔ تم ایسی کون سی ماہرِ نفسیات ہو کہ تمہاری ہر پیش گوئی تسلیم کرلی جائے۔ آخر ہم بھی کچھ کر رہے ہیں۔ سب مل کے۔"

گل نے دبے دبے لہجے میں کہا "نگی ٹھیک ہی تو کہتی ہے۔"

اب محسن کی باری تھی "نگی اور تم یا رابعہ۔ سب ہو ایک ہی ٹائپ کی جذباتی مخلوق۔ میں لحاظ کرتے ہوئے ناقص العقل نہیں کہتا۔ غالب کا مل جانا بہت بڑی کامیابی ہے۔ اس کو ہم اپنے ساتھ رکھیں گے لیکن علاج ہوگا کسی ماہر نیورولوجسٹ کا۔ اور ضرورت پڑی تو ہم اسے کسی بہترین نفسیاتی کلینک میں داخل کرادیں گے۔"

"پاگل خانے میں؟" گل نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

"وہاں تمہیں داخل کرائیں گے۔ جو نفسیاتی کلینک کو پاگل خانہ سمجھے اس کا ٹھکانا وہیں ہونا چاہیے۔"

میں نے کہا "گل، نازو بھی مل جائے گی۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ اور اب تو حالات پوری طرح ہمارے قابو میں ہیں۔ دلاور گرفتار ہوچکا ہے اور شوکت رانا بھی۔ صرف ڈاکٹر شاہ رہ گیا ہے۔"

"اور استاد پیڈرو؟" گُل نے کہا۔

"اس سے بھی نمٹ لیں گے۔" میں نے کہا "جب یہ بڑے بڑے شکاری زیرِ دام آگئے ہیں تو پیڈرو جیسے چمچے کس شمار قطار میں ہیں۔"

"تم لوگ مارے جاؤ گے خوش فہمی میں۔" نگی نے منہ پھُلا کے کہا "خطرناک صرف شیر چیتے اور بھیڑیے ہی نہیں ہوتے۔"

"سچ فرمایا آپ نے۔" وقار بولا "تم جیسی معصوم بھیڑیں زیادہ خطرناک ہوتی ہیں۔"

محسن بولا "بھیڑیں نہیں۔ اللہ کی گائے کہلانے والی مخلوق۔ آدمی انہیں بے ضرر سمجھتا ہے اور وہ ٹکر مار کے کردیتی ہیں چت۔"

میں نے کہا "رابعہ، یہ تو آپس میں طے کرلیں گے کہ کون زیادہ بے وقوف ہے اور کون زیادہ خطرناک۔ تم بتاؤ کہ فون پر دلاور کی بیوی نے کیا کہا تھا۔"

"وہ... وہ بہت بکواس کررہی تھی۔"

"گالیاں دے رہی ہوگی تمہیں۔ کوئی بات نہیں۔ اس کا حق بنتا ہے۔ آخر تم نے اس کے عظیم شکاری شوہر کو شکار کرکے اسے زبردست شکست کی ذلت سے دوچار کیا ہے۔"

"یہ بات نہیں۔" رابعہ نے ہونٹوں پر زبان پھیری "وہ کہہ رہی تھی کہ... نازو میرے پاس ہے۔"

"اگر ہے تو شرافت سے لوٹا دے ورنہ ہم خود آکے لے جائیں گے۔"

"وہ... اس نے کہا کہ نازو مل جائے گی تمہیں۔ ابھی کچھ دیر میں اس کی... اس کی لاش..." رابعہ کا حوصلہ جواب دے گیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی "میں دُہرا نہیں سکتی اس کے الفاظ..."

"یہ کیا بے وقوفی ہے۔ تم جاہل عورتوں کی طرح رو رہی ہو۔" میں نے کہا "اس عورت کے یا کسی بھی بدخواہ کے کچھ کہنے سے نازو کو کیا ہوسکتا ہے؟ ایسے فون کرکے کوئی میرے یا تمہارے بارے میں جو چاہے کہے۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے ہوگا وہی جو خدا کو منظور ہوگا۔"

گُل اور نگی کے چہرے بھی حزن و ملال کی تصویر بنے ہوئے تھے۔ ایک بہت بڑی کامیابی کی خوشی بھی اس لئے بے معنی ہوکے رہ گئی تھی کہ اکیلی نازو دشمنوں کے قبضے میں تھی اور ہم سب اسے انتقامی ردِ عمل کے عذاب سے نہیں بچا سکتے تھے۔ چوہدری دلاور جب تک ہماری قید میں تھا اس کا نازو سے تبادلہ ہمارے اختیار کی بات تھی مگر اب ہم خود اسے قانون کی تحویل میں دے چکے تھے اور اس کے ساتھ ہی شوکت رانا بھی پکڑا گیا تھا۔ اب ان کی رہائی صرف عدالت کے حکم سے ضمانت پر ہوسکتی تھی مگر اس کے لئے ضابطے کی کارروائی لازمی تھی۔ محاورے کے مطابق قانون اندھا ہوتا ہے اور اس کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ قانون امیر غریب یا اپنے پرائے میں تمیز نہیں کرسکتا مگر یہ کتابی بات عملی زندگی میں کچھ اور نظر آتی ہے۔ قانون کو اندھا کردیا جاتا ہے۔ کچھ لوگ قانون کی آنکھوں پر دھن، دھونس یا دھاندلی کی پٹی باندھ دیتے ہیں۔ پھر قانون کی نظر حقائق کو نہیں دیکھ سکتی اور شہادت دستیاب ہو تو سیاہ کو سفید یا دن کو رات ثابت کردیا جاتا ہے۔ شہادت حسبِ ضرورت اور استطاعت مل جاتی ہے۔ پیشہ ور گواہ ایک ہاتھ سے اپنے ضمیر کی قیمت وصول کرتے ہیں اور دوسرے ہاتھ سے مقدس کتاب تھام کے اور خدا کو حاضر و ناظر جان کے حلفیہ بیان دیتے ہیں کہ جسے قاتل سمجھ لیا گیا ہے وہ تو وقوعہ کی شب اس کے ساتھ محفلِ سماع کے روح پرور اجتماع میں موجود تھا۔ جہاں فلاں فلاں بھی تھے۔ آدھی رات کے وقت بیمار بچے کی دوا لینے کے لئے نکلنے والا آوارہ گردی کے الزام میں دھرلیا جاتا ہے اور آخر کار اصل قاتل کی حیثیت سے چشم دید گواہ اسے شناخت کرلیتے ہیں۔

ایسے اندھے قانون سے بہت زیادہ توقعات وابستہ نہیں کی جاسکتی تھیں کہ وہاں جو کچھ ہوگا عین انصاف ہوگا۔ زیادہ اُمید یہی تھی کہ اب چوہدری دلاور کی بیوی شہر کے نامور ترین فوجداری مقدمات کے وکیلوں کی خدمات حاصل کرے گی۔ ابھی ان کی ساری تگ و دو ضمانت پر رہائی کے لئے ہوگی۔ پیسہ پانی کی طرح بہانے والے ملک کی اعلیٰ ترین عدالت تک بھی جاسکتے ہیں لیکن ان کی کوشش ہوگی کہ سیشن کورٹ ہی ضمانت منظور کرلے۔ پھر سرکار کو اس فیصلے کے خلاف اپیل نہ کرنے دینا نسبتاً آسان ہوجاتا ہے۔ اور اگر ضمانت کی منسوخی کے لئے استغاثہ ہائی کورٹ میں اپیل دائر کردے تب بھی ایڈووکیٹ جنرل سے یہ کہلوانا مشکل نہیں رہتا کہ ان حالات میں حکومت کو اعتراض نہیں اگر عدالت مطمئن ہونے کے بعد ملزم کی ضمانت کی توثیق کردے۔ اعلیٰ عدالتوں سے ضمانت کی درخواست مسترد ہوجائے تو پھر سپریم کورٹ سے فیصلہ بدلوانا کسی کے بس کی بات نہیں رہتی۔

دلاور اینڈ کمپنی کو اب ہم سے نہیں قانون سے جنگ لڑنا تھی اور اس جنگ میں ان کے ساتھ ناانصافیوں کے سارے وسیلے تھے اور ضمانت پر رہائی کے بعد مہلت حاصل کرنے کے لامحدود ذرائع تھے۔ ایک ایک نکتے پر مہینوں بحث اور اعتراضات کرنے اور تاخیری حربوں سے ایک ہی عدالت میں سماعت کو برسوں تک کھینچ لے جانا کوئی مشکل کام نہیں تھا اور اپیل پر اپیل دائر کرکے کیس کو اتنا لمبا بھی کیا جاسکتا تھا کہ سزائے موت ہونے سے پہلے دلاور کی عمرِ طبعی تمام ہوجائے اور سرکاری جلاد سے پہلے ہی فرشتۂ اجل اس مقدمے کو داخلِ دفتر کردے۔ اس طویل عرصے میں اور بھی بہت کچھ ہوسکتا تھا۔ حالات اور واقعات ثبوت یا گواہ سب بدل سکتے تھے۔

یہ سب جانتے ہوئے بھی میں نااُمیدی کو کفر سمجھتا تھا۔ میں نے تہیہ کرلیا تھا کہ دلاور کے لئے فرار کے سب راستے بند کردوں گا۔ اگر یہ جنگ وکیلوں کے درمیان ہوگی تو ادھر بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دینے والے وکیل تھے۔ اس معاملے میں دیر کا امکان تھا۔ اندھیر کا نہیں۔

نازو کا معاملہ اس لئے مختلف تھا کہ اس میں قانون ہماری کوئی مدد نہیں کرسکتا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے قانون چوہدری دلاور کو بازیاب کرانے میں ناکام رہا تھا ہم ابھی تک نازو کا سُراغ نہیں پاسکے تھے۔ غالب کا مل جانا ایک اتفاق تھا۔ وہ ہمیں ایسی جگہ ملا تھا جہاں اس کی موجودگی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا اور وہ جس حال میں ملا تھا وہ سب کے سامنے تھا۔ ان حالات میں یہ بات یقینی تھی کہ نازو تک رسائی پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ مشکل ہوجائے گی۔ میں یہ بات کسی کے سامنے نہیں کہنا چاہتا تھا مگر یہ خیال میرے ذہن سے نکلتا نہیں تھا کہ شاید اب نازو کبھی نہ ملے یا ملے تو بس سپردِ خاک کرنے کے لئے۔ مایوسی اور اشتعال کی انتہائی کیفیت میں دلاور کی بیوی وہی کرسکتی تھی جس کی اس نے فون پر رابعہ کو دھمکی دی تھی۔ اب ہمارے پاس سودا کرنے کے لئے کیا تھا۔ وہ ہمیں سزا دے سکتی تھی کہ تم بازی ہار گئے۔ تم نے نازو کی زندگی کو داؤ پر لگا کے اپنی ضد پوری کی۔ تم نے سودا کرنے کا موقع کھودیا۔ اب تمہارے پاس مجھے دینے کے لئے کچھ نہیں مگر میرے پاس ایک چیز تھی۔ آج حساب برابر ہوا۔

جب رابعہ خاموش ہوئی تو ہم سب بھی خاموش بیٹھے تھے اور شاید وہی سوچ رہے تھے جو میں سوچ رہا تھا۔ مسئلہ صرف نازو کا ہی نہیں تھا۔ اصولی طور پر یہ محسن نے بھی طے کرلیا تھا کہ وہ گُل اور بوبی کو کسی محفوظ مقام پر شفٹ کردے گا۔ خود ہم یہ محسوس کرتے تھے کہ ہم سب کا وقار یوسف کے گھر میں اکٹھا رہنا ٹھیک نہیں۔ اس میں خطرہ سب کے لئے تھا اور آسانی صرف ہم سب کے دشمنوں کے لئے۔ وہ ایک ہی ٹھکانے کو نگاہ میں رکھتے ہوئے پھر کوئی ویسی ہی کارروائی کرسکتے تھے جیسی ایک رات میں نے اور محسن نے ناکام بنادی تھی لیکن وہ اتفاق تھا کہ ہم جاگ رہے تھے اور ہم نے حملہ آوروں کو پہلے دیکھ لیا تھا۔ اگر ہم بھی سو رہے ہوتے تو پھر سوتے ہی رہ جاتے۔ ہمارے جسموں کے منتشر اجزا سمیٹنے والے صرف قیاس کی بنیاد پر بتاتے کہ اس حادثے میں ہلاک ہونے والوں میں غالباً تین مرد تھے اور تین خواتین۔ حادثے کا سبب یہ بتایا جاتا کہ گھر میں گیس کھلی رہ گئی تھی اور کھڑکی دروازے بند تھے چنانچہ گیس اندر ہی جمع ہوتی رہی۔ پھر شاید کسی نے غلطی سے سگریٹ جلائی یا کوئی الیکٹرک اسپارک ہوا اور نتیجے میں دھماکا۔

ایک بار اپنی کوشش میں ناکام ہوجانے والے دوسری بار بہتر منصوبہ بندی کے ساتھ کامیاب بھی ہوسکتے تھے۔ غالب کے آجانے کے بعد اس جگہ سے منتقلی ناگزیر ہوگئی تھی۔

یہ سوال رابعہ نے کیا "کیا غالب یہیں رہے گا؟"

میں نے کہا "وقار اس کو انکساری میں غریب خانہ کہتا ہے لیکن یہ پاگل خانہ بن گیا ہے۔"

گل نے خفگی سے کہا "ابھی آپ نے کیا فرمایا تھا۔"

"وہ بھی صحیح تھا۔ پاگل غالب نہیں ہم سب ہیں۔" میں نے کہا "وقار پاگل ہے کہ اس نے ابھی تک ہمیں ہاتھ جوڑ کے یا کان پکڑ کے گھر سے نہیں نکالا کہ بھائیو اور بہنو۔ اپنے ساتھ مجھے مت مرواؤ۔ جاؤ کہیں اور جاکے مرو۔"

اب نگی نے برا مانا "وقار کا دل اتنا چھوٹا نہیں ہے۔"

وقار نے کہا "میرا دل بہت چھوٹا ہے۔ اس میں صرف تم رہتی ہو۔ کسی اور کی گنجائش نہیں ہے۔"

"بات گھر کی ہورہی ہے۔ دل کی نہیں۔"

"ویسے بھی سکندر کی بات غلط نہیں۔ تمہارے ابّا جان مرحوم اکثر کہتے تھے کہ تم پاگل ہو۔ کس کنگال وکیل سے شادی کررہی ہو۔ اور میں تو خیر پاگل تھا ہی تمہارے لئے۔"

محسن ہنس پڑا "میں تو سچ مچ پاگل تھا۔ جیسے آج غالب ہے۔ میری حالت تو اس سے زیادہ خراب تھی۔ میں ایک سند یافتہ پاگل ہوں۔ گُل کے بارے میں بھی میری رائے وہی ہے جو سکندر کی۔

جس طرح اس نے میرے جیسے شخص کو اپنا بنالیا۔ میں تو اسے پاگل پن ہی کہوں گا۔"
ظاہر ہے گل اس بات سے خوش ہوئی "کہتے رہو۔ مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"
میں نے کہا "دلاور کے نزدیک تو سب سے بڑا پاگل میں ہوں کہ حق اور انصاف کے چکر میں خود کو بھی تباہ کیا اور اسے بھی۔ لیکن یہ سب مذاق کی بات تھی۔ اصل بات یہ ہے کہ ہمیں الگ الگ رہنا چاہئے۔ اپنے ٹھکانے بدلتے رہنا چاہئے۔"
رابعہ نے میری تائید کی "وقار یوسف کے گھر کو محفوظ رکھنے کے لئے بھی یہ ضروری ہے۔ ورنہ ہمارے ساتھ یہ بھی مارے جائیں گے۔"
"میں کسی سے نہیں ڈرتی۔" گل نے اعلان کیا۔
وقار نے آنکھیں نکال کے کہا "کیوں کفر بکتی ہو۔ خدا سے ڈرنا چاہئے تمہیں اور اس کے بعد اپنے مجازی خدا سے۔"
"تم سے میں کیوں ڈروں آخر؟"
"تم چوہے سے ڈرتی ہو۔ چھپکلی اور کاکروچ سے ڈرتی ہو۔ میک اپ کئے بغیر باہر جانے سے ڈرتی ہو۔ بڑھاپے کی ان علامات سے ڈرتی ہو جو ابھی سے نمودار ہو گئی ہیں۔ اور بتاؤں؟ تم چکر والے جھولے میں بیٹھنے سے ڈرتی ہو۔"
محسن نے مجھ سے کہا "غالب کہاں رہے گا؟"
"بڑا اچھا سوال کیا تم نے شیروانی صاحب۔ میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔ ایک جگہ تو ہو سکتی ہے سائیکاٹرک کلینک۔ لیکن میری نظر میں ایسی کوئی جگہ نہیں جو موزوں ہو۔ دیکھنا پڑے گا کہ اسے کس جگہ چھوڑا جائے۔"
رابعہ نے کہا "کیا یہ ضروری ہے کہ غالب کسی نفسیاتی اسپتال میں رہے؟"
میں نے کہا "تم نے بھی بڑا اچھا سوال کیا ہے عزیزہ۔ یہ واقعی ضروری نہیں۔ غالب کی حالت ایسی نہیں ہے کہ اسے ہر وقت ڈاکٹر اور نرس کی توجہ درکار ہو۔ اگر اسے پُرسکون ماحول میسر آجائے تو ہم سب بھی اس کی مدد کر سکتے ہیں لیکن سب سے بڑھ کر خود مارگریٹ اس کام میں معاون ثابت ہو سکتی ہے۔"
"جو کچھ میں کر سکتی ہوں۔ ضرور کروں گی۔" مارگریٹ کمرے میں واپس آگئی تھی
"ایک نرس بھی آدھی نہ سہی چوتھائی ڈاکٹر ضرور ہوتی ہے۔ اور تم کو غالب کا اعتماد بھی حاصل ہے۔ سابقہ تجربے کی بنا پر تم اس کی بہتر دیکھ بھال کر سکتی ہو۔"
"لیکن آپ سب کا ساتھ ہونا بھی ضروری ہے۔ آپ لوگ ہی غالب کی اصل پہچان ہیں۔ آپ کے ساتھ اس کی یادوں کے پُرانے حوالے منسوب ہیں۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا میری بات۔ غالب آپ سے بچھڑ گیا تھا۔ اب اسے واپس اسی راستے پر جانا ہے جہاں سے وہ جدا ہوا تھا۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اسے پُرانی نشانیاں نظر آئیں۔ محسوس ہوں۔ چہرے اور مقام۔ پُرانی باتیں اور واقعات کی یادیں۔ یہ سب اس کی مدد کریں گی اور اس کے ذہن کی اُلجھن دور ہوتی جائے گی۔ اس کا یقین بحال ہو جائے گا کہ وہ فیروز نہیں غالب ہے۔ ابھی اس نے مان تو لیا ہے کہ وہ غالب ہے۔ لیکن وہ غالب بنا نہیں ہے۔ اس کے لاشعور میں پھر غالب بننے کی آرزو بڑی شدید ہے۔ اسے شعور تک پہنچانا آپ سب کا کام ہے۔"
ہم اسے حیرانی سے دیکھ رہے تھے۔ وہ بظاہر عام قسم کی اور معمولی سمجھ بوجھ رکھنے والی لڑکی بڑی دانائی کا مظاہرہ کر رہی تھی اور اس کی باتوں میں اتنی گہرائی تھی کہ ہم سب متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔
میں نے کہا "مارگریٹ۔ بعض اوقات بدبختی کے بطن سے خوش بختی جنم لیتی ہے اور جب راہ گم کردہ مسافر مایوسی کے اندھیرے میں بھٹک رہا ہو تو اچانک کوئی دستِ غیب اس کی صحیح سمت میں راہنمائی کرتا ہے۔ ساتھ ہی اسے کوئی اتنا بڑا اور غیر متوقع انعام بخش دیتا ہے کہ اس کی تمام تکالیف اور آزمائشوں کی تلافی ہو جاتی ہے۔"
"ہاں' اسی دستِ غیب نے مجھے یہاں پہنچادیا ہے۔ آخر کار......"
میں نے کہا "میں تو غالب کی بات کر رہا تھا جس کو تم جیسا چارہ گر مل گیا۔ جو کام ڈاکٹر نہیں کر سکتے وہ تم کر سکتی ہو۔ کیا تم یہ ذمے داری قبول کرو گی؟"
اس نے حیرانی سے مجھے دیکھا "میں؟"
محسن نے کہا "بے شک ہم تمہیں مجبور نہیں کر سکتے کہ تم اس کے ساتھ رہو اور چوبیس گھنٹے اس کی دیکھ بھال کرو۔ یہ تمہارا اپنا فیصلہ ہوگا۔ اگر تم جانا چاہو تو ہم تمہیں روک نہیں سکتے۔"
رابعہ نے کہا "ہاں' تمہاری اپنی زندگی ہے لیکن تم غالب کے ساتھ رہنا چاہو تو ہمیں خوشی ہوگی۔ یہ تمہارا احسان ہوگا ہم پر۔"
گل نے کہا "اور ہم تمہیں منہ مانگا معاوضہ بھی دیں گے۔"
مارگریٹ کو گل کی بات نے رنجیدہ کردیا "اگر معاوضے کی بات ہے تو پھر مجھے جانے دیں۔ ایک سے ایک اچھی نرس مل سکتی ہے آپ کو۔ پیسہ دے کر تو آپ چوبیس گھنٹے کسی سند یافتہ ڈاکٹر اور نرس کو بھی ملازم رکھ سکتے ہیں۔"
میں نے گل کو گھورا "گل کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔"
"ایک طرف آپ احسان کی بات کرتے ہیں۔ دوسری طرف معاوضے کی۔ کیا احسان کا بدلہ قیمت سے چکایا جاتا ہے؟"
محسن نے کہا "میں اس احمق لڑکی کا شوہر تم سے معافی مانگتا ہوں۔ اس کے الفاظ پر مت جاؤ۔"
گل نے بھی کہا "مجھے ایسا نہیں کہنا چاہئے تھا۔ میرا مطلب یہ تھا کہ تمہاری تمام ضروریات کی ذمے داری ہم سب پر ہوگی۔ بالکل

اسی طرح جیسے ہم ایک خاندان کے فرد ہیں تو سب کی ذمّے داریاں بھی مشترک ہیں۔ خوشیاں اور غم بھی۔ جیسے ہم رہتے ہیں ویسے تم رہو گی۔ جو ہمارا ہے وہ تمہارا ہوگا۔ معاوضہ نہیں حق سمجھ کے تم سب کچھ مانگ سکتی ہو۔ بلکہ خود لے سکتی ہو۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا "اس وضاحت سے تمہیں مطمئن ہو جانا چاہئے۔ اب صرف ایک بات اور ہے۔ وہ بھی صاف ہو جائے تو اچھا ہے۔ تم نے اندازہ کرلیا ہوگا کہ ہم سب چوہدری ولاور، شوکت رانا اور ڈاکٹر شاہ کے دشمنوں میں شامل ہیں۔ ان کے اور ہمارے درمیان عداوت کا یہ رشتہ بہت پُرانا ہے اور اگر اس کے اسباب بیان کریں تو صبح سے شام ہو جائے گی مگر بات ختم نہیں ہوگی۔ مختصریوں سمجھ لو کہ ہمارے درمیان حق و باطل کی جنگ ہے۔ اب تک تم دوسری طرف تھیں۔ اپنی مرضی سے نہ سہی مجبوراً سہی۔ ادھر آ کے تمہیں مشکلات کا سامنا ہوگا۔ خطرات بھی درپیش ہوں گے لیکن یہ زندگی تمہاری سابقہ زندگی سے بہت مختلف ہوگی۔ یہاں تمہیں عزتِ نفس احترام اور شرافت ملے گی۔ اپنائیت اور خلوص ملے گا اور بے غرض رشتوں کا تحفظ ملے گا۔ اگر تم میں آبرومندی کے ساتھ جینے کی خواہش ابھی تک زندہ ہے اگر تم چاہتی ہو کہ اپنے مجبور ماضی کی تاریکی سے نکل کے آزادانہ ایک روشن مستقبل کی طرف بڑھو۔ اگر تم مایوسی اور پشیمانی کی دلدل کو چھوڑ کے ہم سب کی طرح اُمیدوں، خوابوں اور خوشیوں کے خوب صورت سفر کا آغاز کرنا چاہتی ہو تو پھر ہم تمہارے ساتھ ہیں اور تم ہمارے ساتھ ہو۔"

وہ رونے لگی "کیا اب بھی یہ ممکن ہے۔ اب بھی ایسا ہو سکتا ہے؟"

"کیوں نہیں ہو سکتا مارگریٹ؟"

"نہیں، اب تو بہت دیر ہو گئی ہے۔ میں سر تا پا غلاظت میں لتھڑی ہوئی ہوں۔ میرا وجود مجسم تعفن اور کراہیت ہے۔ نفرت کے قابل ہے۔"

میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا "ہم سب بھی تم جیسے ہی ہیں۔ خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ کس کے اعمال کا گناہ بڑا ہے اور کون گناہ گار نظر آنے والا اس کی رحمت کا حق دار ہوگا۔ وہی نیت کا حال جانتا ہے چنانچہ توبہ کے دروازے آخری وقت تک کھلے رکھتا ہے۔ تم نے کیسے فرض کرلیا کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔"

"کاش پہلے مجھے یہ موقع ملتا۔"

میں نے کہا "موقع تقدیر فراہم کرتی ہے۔ اس میں دیر ہو سکتی ہے اندھیر ممکن نہیں۔ آج تمہاری زندگی پھر ایک ایسے موڑ پر آگئی ہے جہاں فیصلہ تمہارے اختیار میں ہے۔"

"مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"کس سے، شوکت رانا سے؟"

"نہیں، اپنے آپ سے۔ کہیں میں پھر غلط فیصلہ نہ کرلوں۔ آخر پہلے بھی تو اپنی زندگی کو خود میں نے گزارا تھا۔"

"پہلے تم نے حالات کے جبر کے تحت فیصلے کئے تھے۔ آج تم پر کوئی دباؤ نہیں۔ سب تمہاری ہمت پر منحصر ہے۔"

"پتا نہیں مجھ میں اتنی ہمت ہے یا نہیں۔" وہ جیسے اپنے آپ سے بولی۔

میں نے کہا "آزما کے دیکھ لو۔ میرا خیال ہے کہ تم میں اس سے کہیں زیادہ حوصلہ ہے جتنا تم سمجھتی ہو اور یہ کوئی انوکھی بات نہیں۔ آدمی پہلا قدم اٹھاتے ہوئے ڈرتا ہے۔ پھر ہر قدم کے ساتھ حوصلے اور اعتماد میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اتنی تیزی سے کہ آدمی حیران رہ جاتا ہے۔"

"تم۔۔۔ آپ سب لوگ ایسا ہی سمجھتے ہیں۔" اس نے رابعہ، گل محسن، وقار اور نکی کو دیکھا۔

"ڈر کو دل سے نکال دو مارگریٹ۔" رابعہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

گل نے کہا "خدا بھی ان کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔"

"واہ۔۔۔ کیا زبردست اور نئی بات کی ہے میری گھر والی نے۔ علم و دانش اور فہم و فراست سے بھرپور، کتابوں میں بھی یہی لکھا ہے۔"

گل نے خفگی سے کہا "کیا یہ غلط ہے کہ مذاق اُڑا رہے ہو۔"

"بھلا تم غلط کہہ سکتی ہو۔ یوں سمجھو کہ تم نے نہیں میں نے کہی ہے یہ بات اور مارگریٹ، گل کبھی مذاق نہیں کرتی بلکہ مذاق کو سمجھتی ہی نہیں۔"

اس سے پہلے کہ گل مزید بُرا مانتی، عالمِ خواب سے مولوی خادم حسین نمودار ہوئے "کچھ ایسا ہی المیہ اپنا بھی ہے جی۔" وہ آہ بھر کے بولا "اس نیک بخت کی سمجھ میں کوئی لطیفہ نہیں آتا۔ پورا لطیفہ سُن کے پوچھتی ہے پھر کیا ہوا؟"

محسن نے کہا "تمہارے لطیفے پر روتی نہیں۔ بڑا حوصلہ ہے اس کا؟"

"اسے تو ہنسنا آتا ہی نہیں جی۔" خادم نے کہا۔

محسن بولا "تمہاری صورت دیکھ کے بھی؟ کمال ہے۔"

"محسن صاحب۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ منظر صاحب کی وجہ سے آپ بھی بے لگام ہو رہے ہیں۔" خادم خفا ہو گیا "اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی صورت کا مذاق اُڑانا بھی کفر ہے۔ اور پھر میری صورت تو ماشاء اللہ لاکھوں میں ایک ہے۔"

"انسانوں کی بات کر رہے ہیں؟" محسن نے اسے مزید مشتعل کیا "تمہارے والد ماجد کیا تھے؟"

خادم حسین بھڑک اٹھا "دیکھیں جی۔ گالی برداشت نہیں ہوتی مجھ سے خالی پیٹ۔ میں کیا گدھے کی طرح دولتی جھاڑتا ہوں یا گھوڑے کی طرح ہنہناتا ہوں۔ سینگ ہیں میرے سر پر بیل جیسے۔۔۔۔۔"

میں نے ہنس کے کہا "یار خادم حسین۔ تم بلاوجہ ناراض ہو رہے ہو۔ محسن کا مطلب تھا کہ تمہارے والد آخر کیا چیز تھے۔ ٹیلر تھے یا جیلر۔۔۔۔ وزیر تھے یا فقیر۔۔۔۔"

"خدا نہ کرے جی۔۔۔۔"

محسن نے کہا "یار ذرا مولوی خادم حسین کی صورت پر تفصیل سے غور کرو۔ اس کے کان ہیں نا بالکل ویسے ہی۔ خر۔ گوش جیسے۔"

"میں جانتا ہوں۔ گوش کہتے ہیں کان کو۔ اور خر گدھے کو۔ فارسی پڑی ہے میں نے۔" خادم حسین نے چہک کے کہا۔

"اور آنکھیں" محسن نے اپنی بات جاری رکھی "وہ جو ہم پچھلی عید پر بکرا لائے تھے۔ ہیں نا وہی آنکھیں۔ سُرمے کے بغیر ذرا گول لگتی ہیں۔ اُلو جیسی اور چال شتر مرغ جیسی ہے تو ڈھال شتر جیسی۔ آواز جیسے مینڈکی کو زکام ہو گیا ہو۔ چلتا پھرتا چڑیا گھر ہے اپنا خادم حسین۔"

خادم حسین میں اتنا سُننے کی تاب کہاں تھی۔ وہ زچ ہو جاتا تھا تو پھر "جوابِ جاہلاں باشد خموشی" کہہ کے واک آؤٹ کر جاتا تھا۔

نکی نے محسن کو ڈانٹا "یہ کیا بدتمیزی ہے۔ آتے ہی اس کے پیچھے پڑ گئے۔ حد ہوتی ہے ہر بات کی۔"

"ہاں جیسے ایک حد ہے تمہاری عقل کی۔ مگر بے وقوفی کی حد نہیں ہے۔" وقار بولا۔

"کیا کہا؟" نکی جاتے جاتے پلٹ گئی۔

"کچھ نہیں۔ میں کہہ رہا تھا کہ غصّے میں تم کتنی حسین لگتی ہو۔" وقار نے دانت نکال کے کہا "مولوی خادم حسین سے بھی زیادہ۔"

"وقار۔۔۔ وقار ذرا ہوش میں رہو ورنہ ابھی سب کے سامنے۔۔۔۔۔"

"ابھی سب کے سامنے؟ نہیں نہیں۔ اب اتنے بے شرم بھی نہیں ہیں ہم مانا کہ بڑی محبت ہے ہم میں۔" وقار نے گھبرانے کی اداکاری کی "جی تو میرا بھی چاہ رہا ہے لیکن۔۔۔۔۔"

نکی نے غصے میں کُشن مارا جو وقار کے بجائے میرے لگا "ذرا دیکھ کے مسز وقار۔ یہ کسی اور کی پراپرٹی ہے اور خاتون وکیل ہیں۔ کیس کر دیں گی۔"

"چلو جاؤ تم اس بیچارے مولوی خادم حسین کو ناشتا کراؤ۔ ہم تو ویسے ہی کشتۂ تیغِ ستم ہیں۔ وہ مر جائے گا بھوک سے۔" وقار نے ہنس کے کہا۔

اچانک مارگریٹ نے کہا "میں رہوں گی تم سب کے ساتھ۔"

میں نے کہا "ویری گڈ۔ ہم آج ہی تمہارے لئے رہائش کا انتظام کرتے ہیں۔"

"کیا میں یہاں نہیں رہ سکتی۔ سب کے ساتھ؟" مارگریٹ نے بُجھے ہوئے لہجے میں کہا "اس لئے کہ میں۔۔۔ مسلمان نہیں ہوں؟"

میں نے سنجیدگی سے کہا "فضول بات مت کرو۔ ہم سب ساتھ ہی ہیں مگر یہ فیصلہ تو پہلے ہی کر چکے تھے کہ ایک جگہ نہیں رہیں گے۔ تمہارے ساتھ اس گھر میں غالب اور گل ہوں گے۔ محسن ہوگا اور بوبی۔۔۔۔"

"بوبی کون ہے؟ وہ بچّہ۔"

"ہاں، ہمارا بیٹا۔" گل نے کہا "تم نے دیکھا نہیں؟ کتنا پیارا ہے۔ ابھی سو کے اٹھے گا تو دیکھنا۔ اتنی شرارتیں کرتا ہے، اتنا ہنساتا ہے سب کو۔"

گل کا چہرہ ممتا کی روشن تصویر ہو گیا تھا۔ اب نہ مجھے یہ بتانے کی ضرورت تھی کہ وہ فوزیہ کا بیٹا ہے اور نہ محسن کو یہ بتانے کی کہ بوبی اس کا بھانجا ہے۔ اس کے ماں باپ کو قتل کرنے والے بھی وہی ہیں جو ہمارے دشمن ہیں اور تقدیر نے بوبی پر یہ ستم کیوں کیا تھا۔

اب تک مسئلہ صرف گل کا تھا جسے ہم بوبی کی وجہ سے دور رکھنا چاہتے تھے مگر اب غالب کے لئے بھی ایک گوشۂ عافیت ضروری ہو گیا تھا جہاں وہ مارگریٹ کی نگرانی میں رہے اور خود مارگریٹ کو بھی تحفظ ملے۔ ابھی تک تو ہم نے سنجیدگی سے مکان کی تلاش بھی شروع نہیں کی تھی۔

مجھے خیال آیا کہ اتوار کی صبح شائع ہونے والے اخباروں میں ہر قسم کے اشتہارات شائع ہوتے ہیں اور شاید کرائے کے لئے خالی مکانوں میں سے کوئی ہمیں مل جائے۔ لیکن اخبار ابھی تک نہیں آیا تھا۔

وقار نے کہا "اتوار کو کچھ دیر سے آتا ہے۔ لیکن جس اخبار کا تمہیں انتظار ہے وہ نہیں آئے گا۔"

محسن بولا "کیوں؟ اس کی اشاعت پر پابندی لگ گئی ہے؟"

"میں انگریزی کا اخبار لیتا ہوں۔ میرا اسٹینڈرڈ اونچا ہے۔"

"اخبار والا تو آئے گا۔" میں نے گھڑی دیکھی "دیکھنا یہ ہے کہ اپنے لنگڑے صحافی نے خبر پوری لگائی ہے یا نہیں۔ اس نے کہا تھا کہ صفحۂ اوّل پر باکس میں سہ کالمی سُرخی اور تصاویر ہوں گی۔"

اسی وقت باہر ایک دھماکا ہوا۔ وقار ایک دم اُٹھا "وہ آیا۔ اور گیا۔"

"کون آیا اور گیا؟" محسن نے کہا۔

"اخبار والا۔" وقار بولا "ہم پہلے سے دروازے پر موجود ہوتے تو اسے روک سکتے تھے۔ اب تو وہ پہنچ گیا ایک فرلانگ دور۔"

"یعنی اب بازار جا کے اخبار لانا پڑے گا؟"

"نہیں۔ میں باہر ہی انتظار کرتا ہوں۔ اور اخبار والے آئیں گے اس کے بعد بھی۔ کسی کو پکڑتا ہوں۔" وقار بولا اور باہر نکل گیا۔ مارگریٹ غالب کو دیکھنے چلی گئی۔ وہ اس کی طرف سے اتنی ہی متفکر رہتی تھی جتنی بوبی کے لئے گل۔ بچّوں کا دیر تک سوتے رہنا

اچھی بات ہے مگر گل کو فکر تھی کہ ہر روز بوبی نو بجے تک اُٹھ جاتا ہے تو آج ساڑھے نو تک کیوں سویا ہوا ہے۔

میں اور محسن تھکن اور نیند کے مارے ہوئے صوفوں پر دراز تھے۔ میں ابھی تک گزشتہ رات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

"محسن۔ وہ قلم کہاں ہے؟ انیس احمد کی خرمستیوں کی؟"

محسن نے کہا "مالِ غنیمت کے بنڈل میں باندھی تھی میں نے۔"

"اور مالِ غنیمت کیا ٹیکسی میں رہ گیا؟ چلتے وقت انیس کے گھر میں تو نہیں چھوڑ دیا تھا سب کچھ۔"

"نہیں یار۔ اتنا بدحواس بھی نہیں تھا میں۔" محسن بولا "ہم غالب کو اُتار کے واپس گئے تھے تو میں نے وہ گٹھری بھی اُتاری تھی۔ وہیں گیراج میں ڈال دی تھی۔"

"ایک لاکھ سے زیادہ تو نقد تھے اور لاکھوں کے زیورات تھے۔"

"سب وہیں پڑے ہوں گے۔ وہاں سے کون اُٹھائے گا لیکن سر... ہم کیا بتائیں گے افسرانِ بالا کو۔"

"افسرانِ بالا؟"

"میرا مطلب تھا گل سے اور رابعہ سے۔ ان کے سوا کون جواب طلبی کر سکتا ہے ہم سے۔" محسن ہنسا "نقد کی تو خیر کوئی بات نہیں مگر زیورات کے بارے میں مجھے بھی علم نہیں کہ اصل ہیں یا ایمی ٹیشن۔ اصل ہیں تو کتنی مالیت کے۔"

"زیادہ اہم وہ نوٹ بک ہے۔ ڈائری اور رجسٹر ہیں۔"

"چار چیک میری جیب میں ہیں۔" محسن نے چیک نکالے "یہ تو صرف ایک ہزار کا ہے۔ یہ دوسرا سترہ ہزار کا۔ پھر ایک اور سترہ ہزار کا۔"

"کیا یہ دونوں ایک ہی بک سے پھاڑے گئے ہیں؟ ایک ہی شخص کے دستخط ہیں دونوں پر؟ ایک پر اس ماہ کی تاریخ ہے دوسرے پر گزشتہ ماہ کی؟"

"واقعی۔ آپ کی نظر نے وہ دیکھ لیا جو میری نگاہ نہ دیکھ سکی۔ حالانکہ چیک میرے سامنے ہیں۔"

"ہزار کے دوسرے چیک پر غور کرو۔ دونوں کی رقم اور دستخط ایک ہیں۔ دونوں ایک ہی چیک بک سے جاری ہوئے ہیں۔"

محسن دنگ رہ گیا "آپ بڑے پہنچے ہوئے ہیں یا پیرو مرشد۔ آپ نے کیسے جانا۔"

"ابھی ایسے بہت سے انکشافات ہوں گے۔ حیران ہونا چھوڑ دے۔ یہ رانا کا پارٹ ٹائم دھندا لگتا ہے۔ وہ لوگوں کو بلیک میل کرکے ہر ماہ ایک لگی بندھی رقم وصول کرتا ہوگا۔ جب سارے چیک وصول ہو جاتے ہوں گے تو ایک دن میں کیش کرا لیتا ہوگا۔ خود یا کسی کو بھیج کے۔ نوٹ بک اور ڈائری میں اور بھی نام ملیں گے۔"

"کیا یہ رانا کی بے وقوفی نہیں تھی۔ وہ چیک لیتا رہا۔"

"اس سے کیا ثابت کیا جا سکتا ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ مثال کے طور پر یعقوب صاحب ہیں جو ہر ماہ صرف ایک ہزار دیتے ہیں۔ ممکن ہے ایک بار ہی ان سے رسید لے لی گئی ہو کہ انہوں نے شوکت رانا سے ایک لاکھ روپے اُدھار لئے ہیں اور ایک معاہدے کے تحت یہ قرض وہ ایک ہزار روپے ماہانہ ادا کریں گے۔ سود کے ساتھ یہ رقم ڈیڑھ لاکھ ہوگی۔ بارہ سال چھ مہینے میں قرض ادا ہو جائے گا۔ اس میں کون سی بات خلافِ قانون ہے؟"

"اور یعقوب صاحب کے بلیک میل ہونے کی وجہ؟"

"وجہ کچھ بھی ہو سکتی ہے۔ دنیا میں ہر شخص کوئی غلطی کرتا ہے یا جرم جو اس کی کمزوری بن جاتا ہے۔ وہ خاموشی سے اس کا کفارہ نہ ادا کرے تو بدنامی اور سزا سے نہیں بچ سکتا۔ میرا خیال ہے کہ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے کسی عزیز کو مینٹل کیس بنانے کے لئے یا پاگل بنا کے ان لوگوں کی تحویل میں دے رکھا ہے۔ اپنے کسی فائدے کے لئے وہ خرچہ ادا کرتے ہیں یا پھر راز کو راز رکھنے کا معاوضہ۔ میں ایک رات رابعہ کے ساتھ وزیر خان ٹرسٹ اسپتال کے اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہاں چوکیدار نے لالچ اور غلط فہمی میں ہمارے سامنے ایک پروفیسر کو پیش کر دیا۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ ہم ہی اس کے لواحقین ہیں جو اس کو وہاں چھوڑ گئے تھے۔ بظاہر علاج معالجے کے لئے لیکن درحقیقت ان کو ذہنی طور پر ناکارہ کرکے عضوِ معطل بنانے کے لئے۔ چوکیدار ہمیں پروفیسر کا بیٹا اور بہو سمجھ بیٹھا تھا۔

"خود بیٹے نے باپ کو وہاں بند کرا دیا تھا؟"

"ہاں جائیداد ہتھیانے کے لئے۔ جس پر ابا جی سانپ بنے بیٹھے تھے۔"

"تو مار دیتا سانپ کو۔" محسن تلخی سے بولا۔

میں نے کہا "اتنی ہمت نہیں تھی۔ اور قتل جرم ہے۔ پروفیسر کا بیٹا مجرم نہیں شریف آدمی ہوگا۔"

"کیا کہنے اس کی شرافت کے۔" محسن نے کہا "ضرور یہ بہو کی سازش ہوگی۔"

"یار یہی تو خرابی ہے ہم میں۔ الزام سے بچنے کا آسان طریقہ ہے کہ خود معصوم بن جاؤ۔ میں کہتا ہوں بہو تو ہوتی ہے پرائی۔ بیٹا اپنا خون ہوتا ہے۔ وہ کیسے مان لیتا ہے بیوی کی ہر بات۔ جائز ناجائز کی تمیز کئے بغیر۔ وہ کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں ہوگا کہ ایک عورت اس سے کچھ بھی کرا لے۔ مگر اس کے اعصاب پر عورت سوار ہوتی ہے تو دماغ بھی ماؤف ہو جاتا ہے۔ اور پیسہ تو چیز ہی ایسی ہے۔ مجھے سخت رنج ہوا تھا وزیر خان ٹرسٹ اسپتال کے اندر کا حال جان کے وہاں شاید پہلے شفا ملتی ہو۔ اب وہاں موت کا سامان ہوتا ہے۔ وہ جگہ پاگل خانے سے بھی زیادہ عذاب ناک ہے۔ پاگل خانوں میں لوگ اپنے عزیز و اقارب کو مجبوراً چھوڑتے ہیں۔ وہ بھی اس امید میں کہ وہاں ان کا علاج ہوگا تو کسی دن وہ نارمل انسانوں کی دنیا میں واپس لوٹ آئیں گے۔"

"ایسا کہاں ہوتا ہے دوست۔ جو ایک بار دیوانوں کی دنیا میں گیا وہ واپس نہیں آیا۔"

"نہیں یار۔ بہت سے لوگ ٹھیک بھی ہو جاتے ہیں۔ وقتی صدمے سے پاگل ہونے والے یا عارضی حالات سے متاثر ہونے والے لیکن وزیر خان ٹرسٹ اسپتال میں شاید ایسا نہیں ہوتا۔ وہاں دیوانے نہیں آتے۔ دیوانے بنائے جاتے ہیں۔ کچھ لوگ جو خود کو ہوشیار سمجھتے ہیں وہ اپنے سے زیادہ ہوشیار انسانوں کے شکاری ذہن سے مار کھا جاتے ہیں۔ شکار ہونے والے اور شکاری اپنے اپنے رشتوں کی پہچان اور حوالے بھی رکھتے ہیں۔ شاید اسی لئے شکاری رحم دلی سے کام لیتے ہیں اور انہیں جینے کی رعایت دیتے ہیں۔ انہیں مارتے نہیں اور مرواتے نہیں۔"

"قفس میں جینے کی آزادی کیا رعایت اور رحمدلی ہے؟" محسن بولا۔

ان سے پوچھو تو وہ یہیں کہیں گے کہ گوشے میں قفس کے انہیں آرام بہت ہے۔ کون سی تکلیف ہے یہاں۔ علاج آرام اور ضرورت کی ہر چیز میسر ہے اور کیا چاہئے۔ باقی سب بھی آرام سے ہیں اب۔"

اندر سے گل، رابعہ اور تکّی کے ہنسنے کی آواز آ رہی تھی۔ بوبی جاگ اُٹھا تھا اور وہ سب اس کے ساتھ کھیلتے ہوئے بچہ بن گئی تھیں۔ سب اپنی اپنی آوازیں نکال رہی تھیں اور اس کی طفلانہ معصومیت پر صدقے واری ہو رہی تھیں۔ اس کے حلق سے نکلنے والی بے معنی آوازوں پر وہ خوشی سے بے حال تھیں۔ میں نے دروازے کی اوٹ سے دیکھا تو ہنسی کی اصل وجہ معلوم ہوگئی۔ رابعہ گھوڑا بن کر اسے سیر کرا رہی تھی اور گل نے بوبی کو اس کی پیٹھ پر بٹھا رکھا تھا۔ ابھی اُس نے خود بیٹھنا نہیں سیکھا تھا۔ تکّی نے دوپٹے کو بل دے کر چابک بنا لیا تھا اور گھوڑے کو ہانک رہی تھی۔ سوار نے اظہارِ تشکر کے طور پر رات بھر کے جمع شدہ پانی سے گھوڑے کو دھو دیا تھا اور مس رابعہ قاری ایڈووکیٹ کے سب کپڑے پاک ہوگئے تھے۔

"شاباش بیٹا۔ ایک بار اور..." تکّی نے ہنستے ہنستے کہا۔

رابعہ اُٹھ کھڑی ہوئی "بدتمیز... یہ کیا حرکت ہے۔" اس نے پیار سے بوبی کو ڈانٹا۔

"کہو بیٹا تھینک یو پھوپی جان۔ ہم تو ایسا ہی کرتے ہیں اور پھر کریں گے۔" تکّی نے دوپٹا کھول لیا "پہلے چھوٹی شوشو... پھر بڑی شوشو۔"

رابعہ نے اب زور سے ڈانٹا "بوبی یہ کیا کیا ہے؟ بہت ماروں گی۔"

بوبی بسورنے لگا۔ گل نے اسے سینے سے لگا لیا "ہائے ہائے۔ پرایا ہے نا اس لئے مار مار کے بچے کا برا حال کر دیا۔" گل نے کہا۔

تکّی ہنسی "جب اپنے ہوں گے نا پھر پتا چلے گا۔ تھوڑے دن کی بات ہے۔"

گل نے اب رابعہ کی سائیڈ لی "پہلے تو بتا تیرے کتنے ہیں۔"

تکّی شرمائی "پہلے میں بتاؤں؟ نہیں رابعہ باجی پہلے آپ۔"

رابعہ نے اسے گھورا "پہلے آپ کی بچی۔ ابھی سے میرا نمبر کیسے آ گیا۔"

"اچھا کان لاؤ اِدھر۔" تکّی نے رابعہ کے کان میں کچھ کہا۔

رابعہ نے چیخ ماری۔ تکّی نے اس کا کان کاٹ لیا تھا مگر بات کہنے کے بعد "سچ" رابعہ کی آنکھیں چمکنے لگیں "وقار کو بتایا؟"

"یار مجھے بھی تو بتاؤ کچھ۔" گل نے کہا "تکّی....."

تکّی نے پھر وہی حرکت کی اور اب گل چلّائی "کیا واقعی۔ میں بتاتی ہوں سب کو۔" وہ کان ملنے لگی۔

"ارے گل۔ ابھی نہیں" تکّی کا رنگ لال ہو رہا تھا "ایسے نہیں۔"

"پھر کیا ڈھول تاشے کے ساتھ اعلان ہوگا۔ ٹی وی ریڈیو پر بتایا جائے گا۔" رابعہ بولی۔

"وہ... وہ خود بتا دیں گے۔ پہلے میں انہیں بتا دوں۔" تکّی خوشی سے بے قابو ہو رہی تھی مگر پھر بھی منہ چھپا رہی تھی "کل سالگرہ ہے نا ہماری شادی کی۔ یہ خبر ایک تحفہ ہوگی میری طرف سے۔ ایک سرپرائز۔"

رابعہ اور گل کو اسی دلیل نے قائل کر لیا۔ میں نے محسن کو دیکھا جو میرے تجسس کو دیکھتے ہوئے ساتھ آ کے کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے گردن لمبی کرکے بلند آواز میں کہا "بھئی مبارک ہو سب کو۔"

میں نے بھی سر نکال کے کہا "خیر مبارک شیروانی صاحب۔"

خواتین پہلے اچھل پڑیں۔ پھر چلّانے لگیں "شرم نہیں آتی۔" گل نے محسن کو ڈانٹا۔

محسن نے دانتوں کی نمائش کی "نہیں جی بالکل نہیں۔"

رابعہ نے شور مچایا "چھُپ چھُپ کے عورتوں کی پرائیویٹ باتیں سُننا بہت بری بات ہے۔"

"کیا کریں" میں نے مسکینی سے کہا "ساری عادتیں ہی ایسی ہیں جی ہماری۔ بلکہ کچھ تو اس سے بھی بُری ہیں۔ بچپن میں ہی بگڑ گئے تھے ہم۔"

محسن بولا "آپ لوگوں نے بالکل ہی چوپٹ کر دیا۔ اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی۔"

مارگریٹ ایک طرف بیٹھی مسکرا رہی تھی۔ ہماری آپس کی بے تکلفی، اپنائیت اور خلوص کے رشتے نے اسے حیران کر دیا تھا۔ شاید کبھی اس نے ایسے ہی ہنستے کھیلتے خوشیوں سے معمور گھر کے خواب دیکھے ہوں گے لیکن ان کی تعبیر اُلٹی نکلی۔ پھر وہی خواب اس کا عذاب بن گئے تھے۔

اس نے بوبی کو گل سے لے لیا "لاؤ میں اسے واش کردوں۔"

گل نے کہا "اپنا منہ بھی دھولینا۔"

"اور دوبارہ مت رونا۔" رابعہ نے کہا "رونے سے کچھ نہیں ہوتا۔ آنسو کبھی تقدیر کے لکھے کو نہیں مٹاتے۔ جینا سیکھو مارگریٹ۔ موت بھی آئے تو مسکراتے ہوئے استقبال کرو۔"

نگی نے کہا "ہاں روئیں تمہارے دشمن۔ کوشش یہی کرو۔"

پیچھے سے وقار نے اخبار کا گولا میزائل کی طرح داغا جو محسن کی کمر پر لگا۔ وہ اچھل کے پلٹا۔ پھر ہم ایک ساتھ اخبار کی طرف جھپٹے۔ اس کا آدھا حصّہ میرے ہاتھ آیا۔ آدھا محسن کو ملا۔

"پہلا صفحہ یہ ہے۔" میں نے چھلانگ لگائی اور صوفے پر جا بیٹھا۔

وقار نے کہا "کچھ نہیں ہے پہلے صفحے پر۔"

"کیا مطلب؟" میں نے شہ سُرخی سے ہر ذیلی خبر کی سُرخی تک نظر دوڑائی۔ محسن صوفے کی پشت سے آگے جھک کر دیکھتا رہا۔ اس پر واقعی دلاور کی گرفتاری کے بارے میں ایک سطر کی خبر بھی نہیں تھی۔

"واٹ از دس۔ اس حرام زادے نے تو کہا تھا کہ سہ کالمی سُرخی ہوگی باکس میں۔" میں نے برہمی سے کہا "نہ خبر نہ تصویر۔"

محسن بولا "یار صفحہ پلٹ کے دیکھو۔"

وقار نے مایوسی سے سرہلایا "میں نے اخبار خریدتے ہی دیکھ لیا تھا۔ اندر باہر کہیں کچھ بھی نہیں ہے۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے۔" محسن نے اپنے حصّے کے اخبار کو کھنگالتے ہوئے کہا "اتنا بڑا واقعہ......"

"جو واقعہ پیش ہی نہیں آیا اس کی خبر کہاں سے آئے گی جناب۔" وقار نے اس کی بات کاٹ دی "کوئی خواب دیکھا ہوگا تم نے۔"

"اور خواب میں سے نکل کے غالب اور مارگریٹ یہاں پہنچ گئے۔" محسن نے بگڑ کے کہا۔

"یہ دوسری اسٹوری ہے۔" وقار نے کہا "اس کا بھلا دلاور کی گرفتاری سے کیا تعلق۔"

"اور وہ جو انیس احمد کلکٹر کسٹم کے پڑوس میں ہوا۔ شوکت رانا کی نئی کوٹھی میں!"

"وہ بھی دوسری اسٹوری ہے۔" وقار بولا۔

"بکواس کرتے ہو تم۔" محسن نے غصے میں کہا "کوئی دوسری تیسری اسٹوری نہیں۔"

"اچھا تو دیکھ لو خود اپنی آنکھوں سے۔ پڑھ لو۔" وقار بولا "پہلے اردو میں پڑھو۔ پھر اس کا ترجمہ انگریزی میں۔"

وقار مذاق نہیں کررہا تھا۔ اردو کے اخبار میں مجھے پانچویں صفحے پر جہاں شہر کی غیر اہم خبریں ہوتی ہیں دو مختصر خبریں ملیں۔ ایک خبر میں یہ بتایا گیا تھا کہ ڈاکوؤں نے چوکیدار کو قتل کر کے کوٹھی کا صفایا کردیا۔ یہ کوٹھی مشہور سماجی کارکن اور بزنس مین شوکت رانا کی ہے۔ عین وقت پر جب ڈاکو اس کارروائی میں مصروف تھے شوکت رانا اپنے محافظوں کے ساتھ پہنچ گئے مگر ڈاکوؤں نے مقابلہ کیا اور شوکت رانا کے محافظ بھی ہلاک ہوگئے۔ ڈاکو جاتے جاتے گاڑی کو بھی آگ لگا گئے۔" اس خبر کا عنوان تھا "جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے" خود شوکت رانا اس لئے بچ گئے کہ اُن پر ڈاکوؤں کی نظر نہ پڑسکی۔

دوسری خبر کا تعلق ایک حادثے سے تھا۔ اس میں اخبار کے سینئر رپورٹر اور بے باک نامور صحافی کے ساتھ پریس فوٹوگرافر کی المناک موت کا ذکر تھا جو نصف شب کے قریب موٹر سائیکل پر اخبار کے دفتر لوٹتے ہوئے کسی نامعلوم تیز رفتار ٹرک کی ٹکر سے ہلاک ہوگئے تھے۔ غازی کی موت پر قتل کا شبہ تک ظاہر نہیں کیا گیا تھا لیکن کہا گیا تھا کہ پولیس تندہی سے تفتیش کررہی ہے اور ڈی آئی جی نے کہا ہے کہ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر ٹرک ڈرائیور کو گرفتار کرلیا جائے گا۔

عالمِ اشتعال میں محسن نے اور میں نے غازی کو جتنی گالیاں دی تھیں وہ دوسری خبر پڑھنے کے بعد ہمارا گناہ بن گئی تھیں۔ وہ مرچکا تھا بلکہ مارا جاچکا تھا۔ کل تک ہم جس کو گفتار کا غازی کہتے تھے وہ غازی آج شہید ہوگیا تھا۔

یہی خبر انگریزی کے اخبار میں بھی تھی جسے ہم نے صبح سے اب تک کھول کے نہیں دیکھا تھا۔ صرف اس لئے کہ چوہدری دلاور کی گرفتاری کی خبر صرف اور صرف غازی کی خصوصی خبر یا EXCLUSIVE اسٹوری تھی۔ وہ خبر جو کسی اور اخبار میں نہیں مل سکتی تھی۔

میں اور محسن سخت صدمے کی کیفیت میں تھے اور ہمیں اس سے سنبھلنے میں کچھ وقت لگا۔

"یہ کوئی بہت بڑا گھپلا ہوا ہے محسن۔" میں نے کہا "آخر یہ خبر دوسرے اخبارات تک کیسے پہنچی؟ وہاں صرف غازی تھا اور اسی کے ساتھ آنے والا ایک فوٹوگرافر۔ یہ ناممکن تھا کہ وہ اتنی بڑی اسٹوری کے لئے آدھی رات کے بعد آئے اور خبر اس کے ہاتھ سے نکل جائے۔ LEAK کرجائے۔"

"خبر غازی نے نہیں ان لوگوں نے پہنچادی۔ جنہوں نے غازی کو اپنے اخبار کے دفتر پہنچنے سے پہلے ہی ماردیا۔" محسن سخت مشتعل تھا۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات انیسویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں

جاسوسی ڈائجسٹ کا منفرد و مقبول سلسلہ
شکاری
انیسواں حصہ

شکاری

معاشرے کے اُن ناسوروں کی رُوداد جو گوشت و پوست سے گزر کر انسانی ہڈیوں میں اُتر رہے تھے۔ ایک کفن بردوش نوجوان کی کہانی جس کے شب و روز موت کی بستی میں گزر رہے تھے۔ جلتے دن سُلگتی راتیں آس و یاس، خوف و ہراس، تلخ حقائق، شیریں خواب

ہیں۔ وہ لب نہیں کھول سکتے۔ اصل حقیقت وہی ہوگی جو ایس ایس پی صاحب بتائیں گے اگر وہ صاف انکار کر دے کہ گزشتہ رات وہ کہیں بھی نہیں گیا۔ نہ اس نے دلاور کو گرفتار کیا نہ شوکت رانا کو۔ تو اسے جھوٹا کون کہہ سکتا ہے۔ شاید خود ڈی آئی جی صاحب گواہی دیں کہ وہ رات بھران کے ساتھ تھا۔ تو کسی اور کی بات کون مانے گا۔"

"لیکن اتنا بڑا جھوٹ وہ بول نہیں سکتا۔" وقار نے پھر کہا۔

"اس کی تصدیق ہو جائے گی۔ تم فون کرلو۔" میں نے کہا۔

محسن بولا "لیکن آج وہ آفس میں نہیں ملے گا۔ آج چھٹی ہے۔"

"اگر اسے دلاور کو گرفتار کرنے کے لئے اتوار کو بلایا جاتا تو کیا وہ چھٹی کا عذر پیش کر سکتا تھا۔ وہ چوبیس گھنٹے ڈیوٹی پر ہے۔ آفس میں نہیں تو گھر پر ملے گا۔"

"اس کا گھر کہاں ہے؟" وقار نے کہا "وہ اسلام آباد سے آیا تھا۔ شاید کسی ہوٹل یا میس میں ٹھہرا ہوگا۔ میں پتا کر لیتا ہوں۔"

"تم کیا پوچھو گے اس سے۔" میں نے ریسیور پر ہاتھ رکھ دیا "بہتر ہے کہ رابطہ فون کرے۔ تم اس سے پہلے اپنا بندوبست کرلو۔"

"اپنا بندوبست۔ میں سمجھا نہیں"

میں نے کہا "میں اچانک ہر طرف خطرہ محسوس کر رہا ہوں۔ غالب اور مارگریٹ کو یہاں سے لے جاؤ۔"

اچانک محسن نے کہا "یار سکندر۔ کیا مارگریٹ؟"

میں ایک لمحے کے لئے سکتے میں آ گیا "یہ مشکل لگتا ہے۔"

"وہاں ہم تھے اور پولیس والے۔ یقیناً انہی میں سے کسی نے حق نمک ادا کیا۔ چوہدری دلاور اور شوکت رانا کے کسی زر خرید نے راز فاش کر دیا۔ دلاور اینڈ کمپنی کے شکاری کتے ہوشیار کر دیے گئے۔ یقیناً انہوں نے راستے میں ہی چوہدری دلاور کو بھی آزاد کرا لیا ہوگا۔ اور شوکت رانا کو بھی۔"

وقار یوسف نے کہا "ایس ایس پی جاوید صدیقی ایسا آدمی ہے کیا؟"

"ایسا ویسا کچھ نہیں۔ بس پیسہ ہے وقار۔ جو آدمی کو خریدتا اور بیچتا ہے۔ اس کے ضمیر، ایمان، فرض شناسی اور اصول پرستی کے سارے دعوؤں کے ساتھ۔ وہ بھی بہت دعوے کر رہا تھا اور اپنے ماتحتوں پر بہت رعب جھاڑ رہا تھا۔ حفاظتی انتظامات بھی بہت زبردست تھے بظاہر۔ مگر یہ سب ڈراما ہی تھا نا۔" میں نے افسوس سے سر ہلایا۔

محسن سخت پریشان تھا "اب کیا ہوگا یار۔ یہ صورت حال تو پہلے سے زیادہ خطرناک ہو گئی۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ ہم تو کچھ ثابت نہیں کر سکتے۔ گرفتاری کے گواہ تھے نازی اور اس کے ساتھ آنے والا پریس فوٹو گرافر۔"

"اور وہ سب جو صدیقی کے ساتھ آئے تھے۔ ڈاکٹر۔ ایمبولینس والے۔ تھانے کے لوگ۔"

"وہ ہر جگہ پہنچتے ہیں۔ جہاں بھی ان سے کہا جائے۔ وہ کسی کو کیا بتا سکتے ہیں؟" میں نے کہا "جاوید صدیقی کے ماتحت بھی مجبور

"مگر نا ممکن نہیں ہے۔"

"ہم اس کے ساتھ تھے۔ اسے کوئی موقع نہیں ملا تھا۔ خیر ابھی تم جاؤ' اپنے ساتھ گل اور ربولی کو بھی لے جاؤ۔"

"مگر کہاں۔ کہاں لے جاؤں؟" وقار گھبرا گیا۔

میں نے کہا "وقار۔ آج کا اخبار دیکھو۔ کتنے مکان خالی پڑے ہیں۔ کرائے کے لئے۔ کوئی سا بھی لے لو۔ گیراج میں ایک گٹھری پڑی ہے۔ اس میں ایک لاکھ سے زیادہ نقد ہیں۔ اس کے علاوہ زیورات ہیں۔ وہ ساتھ لے جاؤ اور جو مکان محفوظ ہو جو تمہیں ٹھیک لگے اس کا ایڈوانس دے کر مکان کا قبضہ لے لو۔ سب کو وہیں چھوڑ دو اور واپس آ کے سامان لے جاؤ۔ تھوڑا بہت یہاں سے اٹھا لو۔ کچھ بازار سے لے لو تاکہ کسی کو شک نہ ہو۔"

گل یا رابعہ میں سے کسی نے پوری بات نہیں سنی تھی لیکن میرا موڈ دیکھتے ہوئے کسی نے بھی مجھ سے اختلاف نہیں کیا۔

رابعہ نے کہا "میں یہیں رہوں گی۔"

نکی نے کہا "میں گھر چھوڑ کے نہیں جاؤں گی۔ مارگریٹ جائے غالب کے ساتھ۔ گل کا ربولی کے ساتھ رہنا ضروری ہے۔"

گل نے کہا "اور تم.... بعد میں آؤ گے؟ باقی سب لوگ؟"

میں نے کہا "ہاں وقار تمہیں چھوڑ کے آئے گا تو ہمیں لے جائے گا۔ چند دن ہم سب وہیں گزاریں گے۔"

نکی نے پھر کہا "مگر میں اپنے گھر کو چھوڑ کے ایسے ہی چلی جاؤں۔"

وقار نے کہا "اچھا گھر کو بھی سر پر اٹھا لینا۔ ایسا نہ ہو بعد میں چور لے جائیں۔ ... وہیں آئیں تو یہاں خالی پلاٹ ہو۔ ہو سکے تو پلاٹ کو بھی ... "

میں نے کہا "نکی ڈیئر۔ تمہارے گھر کو کچھ نہیں ہوگا لیکن تمہیں کچھ ہو گیا تو وقار کا کیا بنے گا۔ ایک دو دن کی بات ہے۔"

محسن بولا "یہ سمجھ لو کہ تم ہمارے گھر میں رہو گی۔ جیسے ہم یہاں رہتے ہیں۔"

"کیا یہ بہت ضروری ہے؟" نکی نے سر جھکا لیا۔

"ہاں۔ ہمارے خلاف ایک بہت بڑی سازش ہو گئی ہے۔ اتنی محنت سے اور ہوشیاری سے ہم نے دلاور کو گرفتار کرا دیا تھا اور ساتھ ہی شوکت رانا کو۔ لیکن کسی نے ہماری کامیابی کو ناکامی میں بدل دیا ہے۔ چوہدری دلاور اور شوکت رانا کو خود پولیس نے چھوڑ دیا ہے یا ان کے ساتھی انہیں رہا کرا کے لے گئے ہیں۔ ابھی تو خیر دلاور کی حالت ایسی نہیں کہ وہ فوراً کچھ کر سکے۔ بیوی نے اسے غائب کر دیا ہوگا۔ ... پتے ہی وہ شوکت رانا کے ساتھ مل کر کوئی کارروائی ... گا اور ہم سے اپنی اسیری کے ہر لمحے کا حساب لے گا۔ تم جانتی ہو وہ کتنا کینہ پرور آدمی ہے۔ اس مرتبہ وہ کسی کو نہیں بخشے گا۔"

وقار یوسف نے کہا "میں اس سے کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتا۔"

محسن نے بھی کہا "تمہارا گھر تباہ کرنے میں کون سی کسر چھوڑی تھی اس نے۔"

میں نے کہا "وہ کارروائی ہمارے خلاف تھی۔ ہم یہاں نہ ہوتے تو شاید وہ ادھر کا رخ نہ کرتے۔"

"میری ان سے کوئی دشمنی نہیں۔" وقار نے کہا "اور میرا کوئی قصور بھی نہیں۔ میں رابعہ کے ساتھ کام کرتا ہوں۔ وہاں تو اور بھی بہت سے لوگ ہیں۔"

محسن نے کہا "لیکن تم نے ہمیں پناہ دی۔ یہ قصور کیا کم ہے؟"

"لیکن میں نے ان کے خلاف کبھی کسی کارروائی میں عملی حصہ نہیں لیا اور نہ ان میں سے کسی کا براہ راست مجھ سے اختلاف ہوا۔ آخر منظر صاحب بھی تو دوست ہیں سب کے۔ یہ شکاری ان کے پیچھے کیوں نہیں پڑے؟ میرا تعلق تو ملازمت کی حد تک ہے۔"

"وقار۔ تم ملازم نہیں ہو کسی کے۔" رابعہ نے کہا۔

"چلیں پارٹنر شپ کہہ لیں۔ میں قانونی معاملات میں آپ کا ساتھ دیتا ہوں اور بس۔ اگر آپ لوگ یہاں رہتے ہیں تو ... دوستی کی وجہ سے۔ چوہدری دلاور کے بھی بہت دوست ہوں گے مگر وہ سب آپ کے دشمن نہیں ہیں۔ شاید اسی لئے دلاور اینڈ کمپنی نے آج تک مجھے براہ راست ملوث نہیں کیا اور میں ہمیشہ محفوظ رہا۔"

اب نکی بھی شوہر کے ساتھ دلائل میں شریک ... "ہم ... کا ایک ساتھ بھاگ جانا یہ ثابت کر دے گا کہ ہم بھی ڈرتے ہیں اور ہم نے کوئی ایسا کام کیا ہے۔"

"اچھا بھئی۔ تمہارا دل نہیں چاہتا تو تم مت جاؤ۔" میں نے کہا۔

"یہ دل کی بات نہیں سکندر بھائی۔ آپ خود ہی تو کہہ رہے ہیں کہ یہاں خطرہ آپ کی موجودگی کے باعث ہے۔ آپ لوگ چلے جائیں گے تو پھر خطرہ کہاں رہے گا لیکن ہم خطرے کے ساتھ رہے اور آپ کے ساتھ گئے تو پھر محفوظ کیسے رہیں گے۔"

میں نے مسکرا کے کہا "وقار۔ تمہاری بیوی بھی وکیل ہو گئی ہے۔"

"قاضی کے گھر کی چوہیا بھی سیانی ہوتی ہے۔" وقار بولا۔

"قاضی اب نکاح پڑھوا رہے ہیں۔" نکی بولی "تم قاضی نہیں ہو۔"

"میں نے کب تمہیں چوہیا کہا ہے۔" وقار بولا "سیانی تم پہلے ہی تھیں۔ ایسا جال پھینکا کہ پھانس لیا مجھے۔ بھولا بھالا... شریف خوبرو اور فرمانبردار۔ ایک ہی تو تھا لاہور میں مثالی شوہر۔"

"اوہو... ذرا صورت ملاحظہ فرمائیں سب مثالی شوہر کی۔" نکی نے کہا "تمہیں تو سجدے سے سر نہیں اٹھانا چاہئے کہ میرے جیسی

میں نے کہا "رابعہ' کیا ہمارا گھر قابل رہائش ہوگا؟ میرا مطلب تھا اتنا عرصہ ہو گیا۔"

"ہم صاف کر لیں گے اسے۔ اس بہانے جھاڑ پونچھ ہو جائے گی ورنہ ادھر جانے کا کسی کو خیال بھی کہاں آتا ہے۔"

گل نے شرارت سے کہا "خیر ایسی بات بھی نہیں۔ سکندر کی زندگی کا اور کوئی مقصد اس سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا کہ وہاں جا کے رہے مگر اکیلا نہیں۔ اپنی دلہن کی ڈولی لے کر جائے۔ بینڈ باجے کے ساتھ۔"

رابعہ نے جھینپ کے کہا "گل' تو بہت بولنے لگی ہے۔"

محسن نے سنجیدگی سے کہا "آخر مسئلہ کیا ہے۔ دلہن دستیاب نہیں ہے یا ڈولی۔"

"فی الحال دلہا دستیاب نہیں ہے۔" نکی نے کہا۔

جان چھڑانے کے لئے میں نے کہا "اچھا چلو تم لوگ نکلو یہاں سے' رابعہ ٹھیک کہتی ہے۔ ہمارا اپنا گھر ہے تو ہم کرائے کے مکان میں کیوں رہیں۔"

"پھر تو میں بھی جاؤں گی۔" نکی نے جوش سے کہا۔

میں نے اوپر جا کے گرد و پیش کا غور سے جائزہ لیا مگر مجھے آس پاس کہیں کسی مشتبہ شخص کی نقل و حرکت محسوس نہیں ہوئی۔ صبح سویرے دلاور کی بیوی کے فون نے رابعہ کو دہشت زدہ کیا تھا تو پریشان مجھے بھی کیا تھا۔ دلاور کی بیوی نے ہمیں ایک چیلنج دیا تھا۔ اچانک اور غیر متوقع طور پر اس کو چوہدری دلاور کے کسی وفادار نے اطلاع دے دی تھی کہ شوکت رانا کی کوٹھی میں ... رانا ... رہا ہے اور اسے اتنی مہلت مل گئی تھی کہ وہ اپنے تمام وسائل کو بروئے کار لا سکے۔ اس نے سب قابل اعتماد شکاری جمع کئے۔ اس جانثار فورس کو تفصیل سے ہر بات سمجھائی اور اسلحہ فراہم کیا۔ دولت کی طاقت آزمانے کے لئے اپنے خزانوں کے منہ کھول دیے اور کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ ضمیر فروش تلاش کر لئے۔ جائے واردات پر پولیس کے پہنچنے اور روانہ ہونے تک اس نے سارے انتظامات اپنے اطمینان کے مطابق کر لئے تھے۔ شاید کسی خون خرابے کے بغیر وہ اپنا شوہر حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہو گئی۔ اس باہمت اور چالاک عورت کا ساتھ دینے والا اس کا نوجوان بیٹا فیصل بھی ہوگا جو وقت سے بہت پہلے خود کو دلاور کا صحیح جانشین ثابت کرنے پر تلا ہوا تھا۔ اب شاید انہوں نے دلاور کو ایسی جگہ رکھا ہوگا جہاں پولیس کیا ایم آر ایس کے فرشتوں کا گمان بھی نہیں جا سکتا۔ وہاں اسے زبردست حفاظتی انتظامات کے ساتھ زیر علاج رکھا جائے گا اور بہت جلد دوبارہ اقتدار حاصل کر لینے والے بادشاہ کی طرح چوہدری دلاور پھر سامنے آئے گا تو پہلے سے زیادہ خطرناک عزائم کے ساتھ اپنی طاقت کا بھرپور مظاہرہ کرنے کے لئے اور یہ ثابت کرنے کے لئے کہ کیا قانون اور کیا پولیس! سکندر جیسے دس ہوں یا رابعہ جیسے وکیل۔ اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ

مثالی بیوی اتنی آسانی سے مل گئی۔ مل جاتی کوئی مولوی خادم حسین کی گھر والی جیسی تو ٹھیک رہتا۔"

سب ہنسنے لگے۔ میں نے کہا "چلو تم دونوں ہی مثالی ہو مان لیا مگر اب کام کی بات کرو۔"

"سکندر بھائی۔ آپ خفا تو نہیں ہوں گے۔ میں ڈرتی نہیں۔"

وقار بولا "سب جانتے ہیں کہ تم اپنے باپ سے نہیں ڈری تھیں حالانکہ میرے سسر مرحوم نقوی صاحب بڑی توپ چیز تھے۔"

"مگر تم ڈرتے تھے ان سے۔"

"میں تو تم سے بھی ڈرتا ہوں توپ کی بچی۔" وقار بولا۔

رابعہ نے کہا "سکندر ہمارا گھر بھی تو مدت سے خالی ہے۔"

میں نے چونک کے اسے دیکھا۔ وہ میرے آبائی گھر کی بات کر رہی تھی۔ وہ گھر جس میں وزیر خاں رہتا تھا۔ ماڈل ٹاؤن کی وہ حویلی جو اس نے بڑے چاؤ سے اور ارمانوں سے اپنی حق حلال کی کمائی سے خریدی تھی۔ جہاں اس نے مجھے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے لندن بھیجا تھا لیکن بعد میں یہ حویلی بھی اس سے چھن گئی تھی۔ اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا تھا کہ آخر وہ اچانک مفلس و قلاش کیسے ہوا تھا۔ کیسے اس کے سارے اثاثے دشمنوں کی تحویل میں چلے گئے تھے اور وہ دربدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہو گیا تھا۔ مجھے تو اس کے انتقال کے بعد معلوم ہوا تھا کہ اس کی موت بھی اپنے ہی ایک ملازم کے گھر میں ہوئی تھی جہاں وہ ملازم کی حیثیت سے رہتا تھا۔ اسے سرکاری اسپتالوں کی دوا بھی میسر نہ تھی اور وہ شخص جس نے ایک معمولی دکان سے کارخانہ بنا لیا تھا اور جو ذاتی محنت سے ترقی کرتے کرتے لاکھوں کا مالک ہو گیا تھا۔ جس نے کرائے کے معمولی مکان کی جگہ ذاتی کوٹھی بنالی تھی وہ اس بے سروسامانی کے عالم میں کیسے مرا تھا۔ اس نے لندن میں مجھے کیوں نہیں بتایا تھا کہ اس کے خلاف کیا سازش ہو رہی ہے اور سازش کرنے والے کون ہیں۔ اسے قتل کرنے والوں نے اس کی جائیداد پر بھی قبضہ کر لیا تھا' بعد میں رابعہ نے بہت بھاری قیمت ادا کر کے میرے والد کی نشانی اس حویلی کو پھر حاصل کرا لیا تھا۔ مگر اس کے بعد سے یہ گھر خالی اور غیر آباد تھا۔ رابعہ نے کبھی اسے غلطی سے بھی اپنا گھر نہیں کہا تھا۔ اسے وہ ہمارا گھر کہتی تھی۔ خود اس کا گھر تباہ ہو چکا تھا اور ایک کھنڈر کا ملبہ رہ گیا تھا۔ میں نے اسے کبھی ہمارا گھر نہیں کہا تھا۔ ہمیشہ رابعہ کا گھر سمجھا تھا۔

"کس سوچ میں پڑ گئے؟" رابعہ نے کہا۔

"سوچ کی بات مت کرو۔ صاف پوچھو کہ مجھے کیوں دیکھے جا رہے ہو اتنی دیر سے۔" محسن نے ہنس کے کہا۔

میں نے چونک کے سر کھجایا "اب دیکھنے پر بھی اعتراض ہے آپ کو۔ حضرات و خواتین۔"

"دیکھو مگر نظر مت لگا دینا۔" نکی بولی "ایسے ندیدوں کی طرح مت دیکھو۔"

سکتا۔

میں نیچے آیا تو گل اور بوبی کے ساتھ وقار کی گاڑی میں پچھلی سیٹ پر مارگریٹ بیٹھ چکی تھی پھر کچھ سوچ کے گل اور بوبی اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے اور غالب کو درمیان میں بٹھا کے ایک طرف نکی نے پوزیشن سنبھالی تو دوسری طرف مارگریٹ نے۔ شاید انہیں اندیشہ تھا کہ غالب راستے میں دروازے کھول کے باہر چھلانگ نہ لگا دے۔

غالب کو نیند سے جگایا گیا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں لیکن ذہن ابھی تک خوابیدہ تھا۔ ایک مدت سے وہ دوسروں کی مرضی کے مطابق جی رہا تھا اور اپنی مرضی سے کچھ کرنا بھولا ہوا تھا۔ وہ ایک بے جان کٹھ پتلی تھا یا روبوٹ ... جو کہا جائے کر لیتا تھا۔ جو سمجھایا جائے مان لیتا تھا۔ کوئی سوال نہیں کرتا تھا اور مزاحمت نہیں کرتا تھا۔ سوچتا نہیں تھا اور سمجھتا نہیں تھا۔ اسے بتایا گیا تھا کہ سوچنا ... کا کام ہے۔ اس کا کام صرف تعمیل کرنا ہے۔ اگرچہ حالات بدل گئے تھے اور وہ دیکھ سکتا تھا کہ اس کے ساتھ اب وہ لوگ نہیں جو اس پر تشدد کرتے تھے۔ وہ ذہنی و جسمانی اذیت کے خوف سے ان کی غلامی کرتا تھا اب وہ دوستوں اور ہمدردوں کے درمیان تھا۔ اس کا ذہن اس تبدیلی کا اثر قبول کرنے میں بہت سست روی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اس کی عادات و اطوار میں خود اعتمادی کا فقدان تھا۔ وہ اب بھی مردہ بدست زندہ نظر آتا تھا۔ یہ رویہ خاصا حوصلہ شکن اور مایوس کن تھا مگر صرف ایک رات میں کسی بہت بڑی تبدیلی کی توقع رکھنا بھی غلط تھا۔ مارگریٹ نے ٹھیک کہا تھا۔ ہم سب مل کے اسے سہارا دیں گے۔ چونکہ خواہش اس کے لاشعور میں موجود ہے اس لئے آہستہ آہستہ وہ پھر پرانا غالب بن جائے گا۔ اس کے لئے وقت درکار تھا اور یہ ہم سب کی مستقل مزاجی اور حوصلے کی آزمائش تھی۔

میں نے گیراج کے اس حصے کی طرف دیکھا جہاں ہم نے جلدی میں ایک بنڈل پھینک دیا تھا "یہ تو تم یہیں چھوڑے جا رہے ہو؟"

نکی نے دلچسپی سے کہا "اس میں کیا ہے؟"

"زادِ راہ۔ راستے کے لئے کھانا۔" وقار بولا "پراٹھے قیمہ۔"

میں نے وہ بنڈل نکی کو پکڑا دیا "تم خود ہی دیکھ لینا۔ اور ہو سکے تو آپس میں پیار و محبت سے اور انصاف سے تقسیم کر لینا۔"

"ایسی کیا چیز ہے اس میں؟" گل نے کہا۔

"ہے آپ لوگوں کے مطلب کا مال۔ ہمارے لئے بے کار ہے۔"

رابعہ بولی "ہمارا گھر کس نے دیکھا ہے آپ سب میں سے؟"

سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ غالب نے وہ گھر دیکھا تھا مگر اس کی راہنمائی پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا تھا۔

وقار بولا "میں تلاش کر لوں گا۔ تلاش کرنے سے خدا تو کیا اچھا رشتہ تک مل جاتا ہے۔ مجھے نہیں ملا تو کیا ہوا۔"

"اچھی نوکری بھی مل جاتی ہے۔ جیسے تمہیں مل گئی گھر کے کام کاج کے لئے۔" محسن بولا۔

میں نے پتا سمجھا دیا تو دوسرا سوال پھر رابعہ نے کیا "چابی دی ہے انہیں؟"

محسن بولا "یہ چابی سے چلنے والے کھلونے تو نہیں ہیں۔ چابی دینے کی کیا ضرورت ہے۔"

"چابی کے بغیر گھر میں کیسے داخل ہوں گے یہ لوگ۔" رابعہ نے کہا۔

"تو دے دو نا چابی۔ چابی کیا میرے پاس ہے؟"

"مانتے کیوں نہیں کہ گم کر دی ہے۔ لاپروا آدمی۔"

میں نے کہا "گھر کی مالکن تم ہو اور چابیاں سنبھال کے رکھنا تمہاری ذمے داری ہے پھوہڑ لڑکی۔ گھر میں وکالت نہیں چلتی۔"

"آپ لوگ تسلی سے لڑیں۔ ہم تالے توڑ کے داخل ہو جائیں گے۔ تمہارے گھر میں۔" وقار بولا "سامان کی ضرورت تو نہیں پڑے گی وہاں۔"

"ہر چیز مل جائے گی تمہیں۔ شاید فرج میں مہینوں پرانا منجمد دودھ ہو گا۔ انڈے ڈبل روٹی بھی ہوں۔" میں نے کہا۔

محسن نے کہا "انڈوں میں سے جو چوزے نکلے ہوں گے اب تو وہ بھی انڈے دے رہے ہوں گے۔"

ان کے جاتے ہی میں نے کہا "رابعہ ڈارلنگ۔ آج موسم کتنا سہانا ہے۔ تم بھی خاصی حسین لگ رہی ہو۔"

محسن نے کہا "یار تمہید مت باندھو۔ ہمت کر کے کہہ دو کہ چائے چاہئے۔"

میں نے سر کھجا کے کہا "کیسے کہوں۔ ابھی تو پھوہڑ لڑکی کہا تھا میں نے رابعہ کو۔ بس سچ نکل گیا تھا منہ سے۔ اب جھوٹ بولتے ہوئے شرم آتی ہے کہ رابعہ تمہارے ہاتھ کی چائے میں تو کافی کا مزہ ہے اور کافی میں ساری مستی شراب کی سی ہے۔"

"میری مانو تو جھوٹ بولنے کی پریکٹس شروع کر دو۔ ایسے ڈائیلاگ تو چلتے رہتے ہیں اور آدمی کو ایک منٹ میں قلابازی کھانی پڑتی ہے۔ کہہ دو کہ میں نے مذاق کیا تھا۔" محسن بولا۔

رابعہ ہنسنے لگی "کسے پٹی پڑھا رہے ہو۔ استادوں کے استاد کو۔ تم بچے ہو ان کے سامنے۔"

"میں تو آپ کے سامنے بھی بچہ ہوں خالہ۔" محسن معصومیت سے بولا۔

جب رابعہ چائے بنانے میں مصروف تھی تو میں اور محسن پورچ میں کرسیاں ڈال کے بیٹھے رہے۔

میں نے کہا "آج مولوی خادم حسین منظر سے غائب ہے۔"

"صبح وہ دیر تک سوتا رہا پھر دیر تک ناشتا کرتا رہا اور اس کے بعد دیر تک مارگریٹ کو مشرف بہ اسلام کرنے کی ناکام کوشش کرتا رہا اب بہت دیر سے نظر نہیں آیا۔"

میں نے کہا "لو وہ آ گیا۔ تھا جس کا انتظار وہ شہکار آ گیا۔"

محسن نے کہا "انگریزی کا مقولہ زیادہ درست ہے کہ شیطان کی بات کرو اور شیطان حاضر۔"

خادم حسین وہیں سیڑھیوں پر براجمان ہو گیا "پھر یوں کہیں نا جی کہ شیطان نے یاد کیا اور شیطان حاضر۔"

"ہم کہہ رہے تھے کہ کل سے تمہارے رُخِ پُرنور کی زیارت بہت کم ہوئی۔ تم نے زیادہ وقت زنان خانے میں ہی گزارا۔ یہ تم نے کیا چکر چلا دیا ہے پرنسس مارگریٹ کے ساتھ۔" محسن بولا۔

"چکر کیسا جی۔" خادم حسین چمک کے بولا "میں تبلیغ دین کے فریضے میں مصروف تھا۔"

"بہانے بازی مت کرو۔ تمہاری آنکھوں میں جو چمک پیدا ہو جاتی ہے مارگریٹ کو دیکھ کے اور سفلی جذبات جیسے تمہاری صورت پر ظاہر ہوتے ہیں۔ وہ سب دیکھ رہے ہیں۔"

"بہتان تراشی مت کریں محسن صاحب۔ آپ جیسے لوگ ہی کسی بھی نیک کام کرنے والے پر کیچڑ اُچھالتے ہیں۔"

"تم کون سا نیک کام کر رہے ہو۔ ڈرامے باز مولوی۔"

"میں اسے دینِ اسلام کی طرف لا رہا ہوں۔"

"عقد ثانی کے لئے؟" محسن نے کہا "میں سب سمجھتا ہوں۔ تم ڈورے ڈال رہے ہو اس پر بڑی چالاکی سے۔"

"کیسی جی۔ فضول باتیں مت کریں۔"

"تمہاری فضول باتیں بھی سنی ہیں میں نے۔ نکی نے بتایا ہے کہ تم نیند میں کیا بول رہے تھے۔ مائی ڈارلنگ مارگریٹ۔ آئی لو یو۔" محسن نے آہ بھر کے اور سینے پر ہاتھ رکھ کے کہا "میں تمہارے لئے سب کچھ چھوڑ سکتا ہوں۔ اپنی بیوی کو، اپنے گھر کو۔ اپنے عقیدے کو۔"

"محسن صاحب۔ آپ حد سے بڑھ رہے ہیں۔" خادم حسین چلایا۔

"حد تم کرتے ہو خادم حسین۔ پوچھ لیتا نکی سے۔ اس نے بھی سنا تھا اور دوسروں نے بھی۔ مارگریٹ نے بھی۔ اتنے بوالہوس ہو تم۔"

خادم حسین کا رنگ اُڑ گیا "کیا یہ سچ ہے جی؟ اور کیا سنا تھا؟"

"اور رابعہ سے پوچھ لو۔" محسن نے رابعہ کو چائے لاتا دیکھ کے کہا۔

رابعہ نے بات کو سمجھے بغیر کہہ دیا "بھئی مجھ سے کیا پوچھنا۔ تم ہی بتاؤ۔"

خادم حسین کی حالت غیر ہو گئی "وہ دراصل محسن صاحب یہ کوئی اپنے اختیار کی بات ہوتی ہے۔ خواب میں جو نظر آتا ہے۔"

"خواب میں وہی نظر آتا ہے جو لاشعور میں ہوتا ہے۔" محسن نے کسی فلسفی کی طرح کہا "اور تمہارے شعور میں ہے وہ بیوی جس

کا خوف تمہارے اعصاب پر سوار رہتا ہے۔ لاشعور میں ہے مارگریٹ کی خواہش۔"

خادم حسین بڑی سنجیدگی سے اس کی بات سُن رہا تھا اور اس کی مظلوم صورت پر اعتراف جرم کی تحریر پڑھ کے مجھے ہنسی آرہی تھی۔

"یہ مارگریٹ کہاں سے آگئی مولوی خادم حسین کے لاشعور میں گڑبڑ پھیلانے۔" رابعہ نے کہا۔

محسن نے آہ بھری "بس رابعہ۔ آدمی کا مقدر بڑی ظالم چیز ہے۔ شامتِ اعمال کو آدمی نہ بلائے تو وہ خود آجاتی ہے مارگریٹ بن کے۔ اب جیسا کہ تم نے بھی خود سن کے بتایا۔ خادم حسین خواب میں کیسی شرمناک باتیں کررہا تھا۔"

رابعہ چائے بناتے بناتے مڑی "کیا کہہ رہے ہو۔"

"وہی جو تم نے کہا تھا۔ تم نے اور نگی نے۔" محسن جلدی سے بولا "یہ کہہ رہا تھا کہ مارگریٹ۔ تمہاری خاطر میں یہ حُلیہ بھی بدل لوں گا۔ میں شیو کراؤں گا۔ سوٹ پہنوں گا اور ٹائی باندھوں گا۔ تم کہو گی تو اپنا نام بھی جارج رکھ لوں گا۔ چرچ جاؤں گا تمہارے ساتھ۔"

رابعہ ہنسی تو خادم حسین کو احساس ہوا کہ محسن جھوٹ بول رہا تھا اور اس نے سادگی میں بہت کچھ تسلیم کرلیا۔ اس کے دل کا چور بڑی آسانی سے پکڑا گیا تھا۔

"آپ..... بے ہودہ آدمی ہیں جی۔ بدنام کرنا چاہتے ہیں مجھے۔ میری کردار کشی مت کریں۔" وہ خفا ہونے لگا "میری نیت بالکل صاف تھی۔ میں تو چاہتا تھا کہ وہ میری کوشش سے مشرف بہ اسلام ہوجاتیں۔"

"یار مولوی۔ بے وقوف کسی اور کو بنانا۔ مارگریٹ کو دیکھتے ہی یہ خیال کیوں آیا تمہیں۔ اس سے پہلے بھی تو غیر مسلموں سے واسطہ پڑا تھا تمہارا۔ ایک تو وہ جو آفس میں صفائی کرنے آتی ہے اور جھاڑو پھیر جاتی ہے تمہارے دل پر۔"

خادم حسین اچھلا "لعنت اس پر جو....."

"کیوں سچ کڑوا لگا۔ تم نے ہی پڑھا تھا نا وہ شعر اس کو دیکھ کے۔ جب اس کے سر پر ٹوکری تھی اور ہاتھ میں جھاڑو۔ وہ دیکھو چلا آتا ہے معشوق ہمارا۔ ہے سر پر فلک ہاتھ میں ددار ستارا۔"

"وہ منظر صاحب کی بکواس تھی۔" خادم حسین چلانے لگا۔

"خیر ہوگی۔ مگر تم نے کبھی اسے دعوتِ اسلام نہیں دی۔ اور اس کا [illegible] شوہر ہے۔ [illegible] بڑی بڑی مونچھوں والا۔ اسے مسلمان ہونے کا نہیں کہا۔ اصل [illegible] ت یہ ہے مولوی کہ مارگریٹ تمہیں اپنی دسترس میں محسوس ہوئی ہے۔ تم لیکے والی مسرت نذیر اور "چھٹی لے کے آجا بالما" والی نیلو سے تو عقدِ ثانی نہیں کرسکے۔ جو بیوی ملی ہے وہ تمہارے خوابوں کی الٹی تعبیر ہے۔ ایک ڈراؤنا خواب ہے۔ مارگریٹ کی شکل میں تم کو....."

رابعہ نے اسے ڈانٹا "بس کرو محسن۔ کیا بلاوجہ بولے چلے جارہے ہو۔ پیچھے ہی پڑگئے اس بیچارے کے۔"

"بیچارہ!" محسن بولا "بیچارے کی صورت تو دیکھو۔"

خادم حسین نے سرجھکا کے کہا "یہ ٹھیک کہتے ہیں جی۔ اللہ مجھے معاف کرے۔ یہ خیال ضرور آیا تھا میرے دل میں لیکن کوئی گناہ کی بات نہیں ہے یہ۔ اگر وہ میری ذاتی دلچسپی اور کوشش سے دائرۂ اسلام میں آجاتی ہے جی تو اس کا ثواب ہے۔"

"ہم خُرما و ہم ثواب" محسن بولا "ثواب پہلے لوگے خُرما بعد میں کھاؤ گے۔ خُرما کسی اور کو کیوں نہیں بخش دیتے۔"

رابعہ نے کہا "خادم حسین۔ تمہاری بیوی ہے ایک؟"

"جی۔ لیکن عقد ثانی بھی مباح ہے جی۔ اور کسی کی دستگیری کے لئے جس کا دنیا میں کوئی سہارا نہ ہو۔ اصلاح کے لئے۔"

"تم واقعی سیریس ہو۔" رابعہ نے اسے غور سے دیکھا "کیا تم پاگل ہوگئے ہو۔ اتنا مارے گی تمہاری بیوی مارگریٹ کے ساتھ مل کے۔"

خادم حسین نے ٹھنڈی سانس لی "یہی تو اصل مشکل ہے جی کہ دنیا کسی کے ساتھ کسی کو نیکی کرتا بھی نہیں دیکھ سکتی۔"

وہ رابعہ کے موڈ کا اندازہ کرکے وہاں سے کھسک گیا۔

محسن نے مذاق ہی مذاق میں اس سے سب قبول کروالیا تھا اور اب مولوی خادم حسین میں ہمت نہیں تھی کہ ہم سے بھی نظر ملا سکے۔

میں نے گھڑی دیکھ کے کہا "اب تم فون کرو ایس ایس پی کو۔"

رابعہ نے کہا "وہ ملے گا نہیں۔ شرط لگالو۔"

محسن نے کہا "یار کیا یہ بات عجیب نہیں ہے کہ رپورٹر اور فوٹو گرافر تو راستے میں ہی ماردیے گئے مگر خبر لگ گئی۔ بے شک اصل خبر کو بدل دیا گیا۔"

"کیا پتا کسی نے فون کردیا ہو اخبار کے دفتر۔"

محسن نے نفی میں سرہلایا "غازی کا کہنا تھا کہ یہ خبر اسٹاپ پریس ہے۔ یعنی اخبار کی آخری کاپی روک کے لگائی جائے گی۔ اس کا مطلب ہے آخری وقت تک کسی کو پتا نہیں چل سکتا تھا۔ عام خبر ہوتی اور وقت پر مل جاتی تو سب لگادیتے۔ غازی نے اپنا اخبار لیٹ کروایا تھا مگر سوال یہ ہے کہ خبر انگریزی اخبار میں کیسے آئی۔ کیا انہوں نے بھی آخری کاپی روک لی تھی' یہ معاملہ ناقابل فہم ہے۔"

"یہ بھی ناممکن ہے کہ کسی کو ہمارے پروگرام کا پہلے سے علم ہو۔"

"مگر اس کی اطلاع فوراً ہوگئی۔ شاید ایس ایس پی جاوید صدیقی اور غازی کے ساتھ ہی یہ خبر کسی تیسرے شخص کو ملی اور اس نے ایک کام تو یہ کیا کہ دلاور اینڈ کمپنی کو ہوشیار کردیا۔ دوسرا کام یہ کیا کہ دیگر تمام اخبار والوں کو بھی خبر پہنچادی۔ ابھی ہم نے صرف ایک انگریزی کا اخبار دیکھا ہے۔ باقی ہم نے دیکھے ہی کہاں ہیں۔

اگر یہ خبر ان میں بھی لگی تو صاف ظاہر ہے کہ آخری کاپی پریس میں جانے سے پہلے یہ خبر سب کے پاس پہنچ گئی تھی اور ایسا تب ہی ممکن ہے جب کارروائی کا آغاز ہوتے ہی خبر دی جاتی۔ اس وقت ٹائم تھا جب کارروائی ختم ہوئی تو سب اخبارات زیرِ اشاعت تھے۔ غازی جس خبر پر اپنی اجارہ داری رکھنا چاہتا تھا وہ باقی نہیں رہی تھی۔ اس لئے خود غازی ایسی حرکت نہیں کرسکتا۔"

"گویا شک صرف ایس ایس پی جاوید صدیقی پر ہی جاتا ہے۔"

"بالکل' یہ اطلاع سب سے پہلے اس کو دی گئی۔" میں نے کہا "کیا فون خود اس نے ریسیو کیا تھا؟"

"ہاں' ریسیور اس نے اُٹھایا تھا۔" محسن بولا۔

"پھر یہ ہوسکتا ہے کہ اس کا فون ٹیپ ہورہا ہو۔ یہ جاننے کے لئے کہ تفتیش کس رخ پر جارہی ہے اور کہاں تک پہنچی ہے۔ دلاور اینڈ کمپنی کو تازہ ترین صورت حال کا علم رہتا تھا۔ اس اطلاع پر وہ فوراً حرکت میں آگئے اور انہوں نے دونوں بندوبست کرلئے۔ دلاور کو پولیس کی تحویل سے چھڑالے جانے کا۔ اس کے لئے زر کے ساتھ زور بھی استعمال کرنے کا پکا انتظام ہوگا۔ دوسرا خبر رد کرنے کا۔ انہوں نے خصوصی خبر اور خصوصی تصاویر بنانے والے رپورٹر اور فوٹو گرافر کا کام تمام کردیا اور اخبارات کو بالکل بدلی ہوئی خبر جاری کردی۔ اس سے معاملے کی نوعیت یکسر بدل گئی اور پولیس پر بھی نااہلی کا الزام نہیں آیا۔ شوکت رانا کی کوٹھی میں قتل اور آتش زنی و ڈکیتی کا رنگ دے دیا گیا اور ساتھ ہی ایک صحافی اور فوٹو گرافر کے ساتھ پیش آنے والے حادثے کی خبر کے بعد کوئی ثبوت باقی نہیں چھوڑا گیا کہ وہ کہاں سے آرہے تھے اور کہاں جارہے تھے۔ کیمرا فلم اور خبر سب غائب۔ شوکت رانا کی کوٹھی کے فون خود ہم نے بے کار کردیے تھے۔ وہاں سے کوئی تصدیق کرتا بھی تو کیسے اور کرنے والوں نے پکا بندوبست کیا تھا کہ خبر ایسے ہی چھپے جیسے وہ چاہتے ہیں۔"

"نہ جانے کیوں مجھے یقین نہیں آتا کہ خود ایس ایس پی جاوید صدیقی یہ حرکت کرسکتا ہے۔" محسن بولا "وہ بہت صاف گو آدمی ہے اور اس معاملے میں اپنی نیک نامی کو بالکل داؤ پر لگانے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اس نے ہم سے پورا تعاون کیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ صحافی اور وکیل مل کے کوئی چکر چلا رہے ہیں اور پولیس سے زیادہ پولیس کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ رات بھی اس نے کہا تھا کہ مجھے لگتا ہے شوکت رانا کے خلاف سازش ہوئی ہے۔"

"چلو پھر اسی سے پوچھتے ہیں۔ خبر اس نے بھی پڑھی ہوگی۔ دیکھیں وہ کیا کہتا ہے۔"

رابعہ نے پولیس ہیڈ آفس سے اس کی رہائش کا نمبر پوچھا تھا مگر وہ آفس ہی میں مل گیا۔ میں اور محسن دوسرے کمرے میں ہینڈ فری فون پر ان کی گفتگو سننے کے لئے تیار بیٹھے تھے۔ ٹیلی فون کا چھوٹا سا اسپیکر دونوں طرف کی آواز سنا رہا تھا۔

"مس رابعہ۔ غالباً ابھی سو کے اٹھی ہیں آپ۔" وہ بولا۔

"اب تو دوپہر ہونے والی ہے۔"

"ہاں۔ مگر رات بھر کی جاگی ہوئی تھیں آپ بھی۔ میں سمجھا کہ دیر سے آنکھ کھلی ہوگی۔ اس لئے فون نہیں آیا۔"

رابعہ بولی "آپ انتظار کررہے تھے میرے فون کا؟"

"میں تو صبح سے آپ کو فون کررہا ہوں۔" جاوید صدیقی نے کہا "لیکن آپ سے کہیں بھی رابطہ نہیں ہوا۔"

"میں یہاں وقار یوسف صاحب کے گھر میں تھی۔"

"وہاں گھنٹی مسلسل بج رہی تھی مگر ریسیور کسی نے نہیں اُٹھایا۔ اس سے اندازہ ہوا مجھے کہ سب سو رہے ہیں۔"

"لیکن یہاں تو گھنٹی نہیں بجی۔ ایک بار بھی..... اور فون ٹھیک نہ ہوتا تو آپ سے بات بھی نہ ہوتی۔"

"آپ کا فون ون وے تو نہیں چل رہا ہے۔ ایسا ہوتا ہے بعض اوقات۔ کال صرف آتی ہے یا صرف جاتی ہے۔"

"میں چیک کرلیتی ہوں۔" رابعہ نے کہا "آپ نمبر ملایئے۔"

رابعہ نے ریسیور رکھا اور انتظار کرتی رہی۔ دو منٹ کے بعد اس نے دوبارہ ایس ایس پی کا نمبر ملایا "کال کی تھی آپ نے؟"

"کم از کم چار مرتبہ۔ مجھے گھنٹی کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔"

رابعہ نے کہا "پھر آپ کی بات ٹھیک ہے۔ یہ فون کی خرابی ہے۔ صبح سے نہ جانے کس کس نے کال کیا ہوگا۔"

"مجھے منظر صاحب نے کال کیا تھا۔ ابھی دس منٹ پہلے۔ وہ واقعی سو کے اٹھے تھے اور سونے سے پہلے انہوں نے ریسیور نیچے رکھ دیا تھا تاکہ نیند ڈسٹرب نہ ہو۔ وہاں بھی کوشش کی تھی میں نے آپ سے رابطہ کرنے کی مگر فون مسلسل [illegible] ملا۔ تیسری جگہ آپ کا آفس ہوسکتی تھی مگر آپ ہماری طرح چوبیس گھنٹے کی پبلک سرونٹ تو نہیں ہیں نا کہ اتوار کو بھی موجود رہیں۔ آزادی بھی حاصل ہے آپ کو اور عزت بھی۔ خدا نظرِ بد سے بچائے۔ آپ کے پاس تو سب کچھ ہے۔ دولت بھی اور شہرت بھی اور برا نہ مانیں تو عرض کروں کہ دولتِ حُسن بھی۔ جو شاید کسی وکیل کے پاس نہیں۔"

"تھینک یو۔" رابعہ نے کہا "اب اصل بات کی طرف آیئے۔ کیا آپ نے اخبار دیکھا ہے؟"

"جی نہیں۔"

"کیسے پولیس افسر ہیں آپ۔ حالات سے اتنی بے خبری۔"

"اُفوہ۔ ذرا مجھے بھی عرض کرنے دیں کچھ۔ آپ نے اخبار پوچھا تھا تو میں نے کہا کہ نہیں۔ میں نے اخبارات دیکھے ہیں سب اور اسی لئے مجھے انتظار تھا آپ کے فون کا۔ بڑی شدت سے۔ مجھے حیرت تھی کہ آپ نے مجھے یاد نہیں کیا۔ کیا ہماری گفتگو کوئی اور بھی

سن رہا ہے؟"

رابعہ چونکی "جی... جی نہیں۔ یہ شک کیوں ہوا آپ کو؟"

"دیکھیں جی ہمارے کان بڑے تیز ہوتے ہیں۔ ہمیں پتا چل جاتا ہے کہ ایک شخص بات کر رہا ہے یا دو ریسیور استعمال ہو رہے ہیں۔ آپ کی آواز کے ساتھ ہلکی سی گونج ہے اور سرسراہٹ ہے۔ ویسے کوئی حرج نہیں اگر ایکس ٹینشن پر وقار یوسف یا وہ فرنچ وکیل بھی کان لگائے بیٹھے ہوں۔"

"میرا شک اس کے برعکس ہے ایس ایس پی صاحب۔ غالباً آپ کا فون ٹیپ ہو رہا ہے۔ کوئی اور ہماری گفتگو سن رہا ہے جس کا آپ کو علم نہیں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"یہ ایسے ہوتا ہے سر کہ جو ٹیلی فون لائن یہاں سے وہاں تک جا رہی ہے وہ جنکشن باکس اور کیبنٹ سے گزرتی ہے اور پھر ایکسچینج سے۔ اتنے لمبے راستے پر کوئی بھی فون ٹیپ کرنا چاہے تو اسے کون روک سکتا ہے۔ آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ یہ فون پہلے سے ٹیپ ہو رہا تھا اور آپ اسی خوش فہمی کا شکار تھے کہ کسی ایس ایس پی کا فون ٹیپ کرنے کی جرات بھلا کون کر سکتا ہے۔"

"دیکھیں۔ آپ کی خفگی بجا ہے۔ میں مانتا ہوں کہ ایسا ہو سکتا ہے۔"

"ایسا ہوا ہے صدیقی صاحب۔" رابعہ نے اس کی بات کاٹ کے تیز لہجے ... ورنہ یہ سب ممکن نہیں تھا۔ میں قصوروار آپ کو نہیں سمجھتی مگر کوتاہی ضرور ہوئی آپ سے۔ ذمے دار آپ ہی کو سمجھا جائے ... ہم وہی ہوگا جو آپ کے پیشرو کا ہوا تھا۔ یہ معاملہ دبنے والا نہیں ہے۔"

"آپ فضول بولتی جا رہی ہیں مس رابعہ۔ ایسی کون سی کوتاہی ہوئی ہے مجھ سے آخر۔ کس معاملے کو دبانے کی کوشش کی ہے میں نے۔" صدیقی گرم ہو گیا "میں نے جتنا تعاون کیا ہے اتنا کوئی اور پولیس آفیسر نہیں کر سکتا تھا۔"

"مگر اس تعاون کا نتیجہ کیا رہا۔ صفر جمع صفر مساوی ہے صفر۔"

"کیوں؟ کیا دلاور گرفتار نہیں ہوا؟ آپ کی اطلاع ملتے ہی میں پہنچ گیا تھا۔"

"اور اس کے بعد؟" رابعہ نے طنز سے کہا۔

"اس کے بعد کیا؟"

"وہ کیسے نکل گیا آپ کی تحویل سے۔ زور یا زر؟"

"یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ۔" صدیقی ایک دم بگڑ گیا "کس الو کے پٹھے نے دی ہے یہ خبر۔ کوئی اور ہوتا تو میں پوچھتا کہ تم نشے میں تو نہیں ہو یا دماغ تو نہیں چل گیا ہے تمہارا۔"

رابعہ نے کہا "دلاور کہاں ہے پھر؟"

"دلاور اسپتال میں ہے۔ پولیس کے پہرے میں۔ پرندہ پر نہیں مار سکتا وہاں خاتون۔ چنڈو خانے کی خبروں پر اعتبار مت کریں۔"

"کس اسپتال میں ہے وہ؟"

"یہ میں آپ کو نہیں بتاؤں گا اور نہ کوئی معلوم کر سکتا ہے۔ ایسا سیکیورٹی کی خاطر کیا گیا ہے۔"

رابعہ الجھن میں پڑ گئی "میں کیسے مان لوں کہ......"

"دیکھیے۔ آپ ایک ذمے دار خاتون ہیں۔ بہت سینئر ایڈووکیٹ ہیں۔ آپ کوئی عام قسم کی گھریلو عورت نہیں ہیں جس کو بات کرنے کے آداب نہ آتے ہوں۔ آپ ایک ایس ایس پی سے مخاطب ہیں۔ یہ خیال رکھیں بالکل اسی طرح جیسے آپ کسی جج سے بات کرتے ہوئے اس کے عہدے اور مرتبے کا لحاظ کرتی ہیں۔ میرے عہدے کی بھی ایک PRESTIGE ہے۔ آپ جھوٹا کہہ سکتی ہیں ایک نچلے درجے کے اہلکار کو۔"

"آئی ایم سوری۔" رابعہ نے کہا "میں ہرگز آپ کو جھوٹا نہیں سمجھتی۔ میں صرف یہ جاننا چاہتی ہوں کہ آپ کے یقین کی بنیاد کیا ہے؟"

"یقین کی بنیاد ہے میرا فول پروف بندوبست۔ جب تک چوہدری دلاور میری تحویل میں ہے اس کی روح پر تو ہمارا اختیار نہیں مگر جسم سلامت رہے گا اور ہم اسے مرنے بھی نہیں دیں گے۔ میرے علاوہ صرف شہر کے ڈی آئی جی کو علم ہے کہ اسے کہاں رکھا گیا ہے۔ جو لوگ اس کی حفاظت پر مامور ہیں انتہائی ذمے دار اور مستعد ہیں۔ پھر بھی انہیں بتا دیا گیا ہے کہ کوتاہی پر بخشش نہیں ہے۔ دلاور کے بارے میں کوئی انفارمیشن لیک آؤٹ ہوئی یا میری تحریری اجازت کے بغیر کوئی اس سے ملا تو انہیں فوراً برخواست کر دیا جائے گا۔ گرفتاری بھی ہو سکتی ہے ان کی۔ وہ اسپتال ایک پرائیویٹ کوٹھی ہے جس کو سب جیل قرار دے دیا گیا ہے۔ اس کے گرد دوہرا حفاظتی انتظام ہے۔ اندر تربیت یافتہ کمانڈوز ہیں۔ باہر سادہ لباس والے مسلح محافظ پھر کوٹھی کے احاطے کو مسلح پولیس فورس نے گھیرے میں لے رکھا ہے۔ مجھے بتائیے اس سے زیادہ سیکیورٹی ممکن ہے؟ اور یہ سب میں دلاور کی وجہ سے نہیں کر رہا ہوں۔ اپنی گڈول بچانے کے لئے کر رہا ہوں مس رابعہ۔ اس مرحلے پر جب میرا ایک مشن پورا ہو گیا ہے میں بدنامی کا داغ کیوں مول لوں؟ جب ملزم کو ریمانڈ کے لئے مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا جائے گا تو میری ذمے داری ختم ہو جائے گی۔"

رابعہ کے ساتھ ہم بھی اس اطلاع پر حیران تھے مگر اب شک و شبے کی گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔

رابعہ نے کہا "اچھا شوکت رانا کہاں ہے؟"

"ٹو بمل ود ہم۔ وہ میرا سر درد نہیں ہے۔ مقامی پولیس کی تحویل میں ہوگا۔" صدیقی نے کہا "لیکن دلاور کے بارے میں آپ کو کس نے یہ بے بنیاد اطلاع دی تھی کہ وہ فرار ہو گیا یا کرا دیا گیا۔ زور یا زر والی لغو بات کس نے کہی آپ سے؟"

"وہ دراصل۔ خبر سے مجھے مغالطہ ہوا۔" رابعہ نے اپنی صفائی پیش کی "ایک تو اس کی گرفتاری کا سرے سے کوئی تذکرہ نہیں۔"

"اس کی جواب طلبی کے لئے میں ہی رہ گیا تھا خاتون؟ یہ کام ہے آپ کے ساتھ گٹھ جوڑ کرنے والے صحافیوں کا۔ ان سے پوچھا آپ نے؟"

رابعہ نے کہا "ان سے کیسے پوچھ سکتی تھی میں۔ انہیں تو مار دیا گیا ہے۔ غازی کے ساتھ جو فوٹو گرافر تھا۔"

"ویری گڈ۔ آپ کو مجھ پر یا پولیس پر شک ہے کہ یہ کارنامہ بھی ہم نے سرانجام دیا ہے؟" صدیقی نے تلخی سے کہا "یہ گفتگو آن ریکارڈ ہوتی یا کسی کے سامنے ہوتی تو میں آپ پر ہتک عزت کا کیس کر دیتا۔"

"انہیں قتل تو کیا گیا ہے۔"

"یہ ثابت کر سکتی ہیں آپ؟ میں آپ کی طرف سے رپورٹ لکھوا دیتا ہوں ابھی دو منٹ میں۔" صدیقی نے کہا۔

"یہ تو صاف ظاہر ہے سر۔ کون سی ڈھکی چھپی بات ہے۔"

"کیوں صحافی صرف قتل ہوتے ہیں۔ حادثے کا شکار کبھی نہیں ہو سکتے۔ کوئی گارنٹی ملتی ہے انہیں فرشتۂ اجل کی طرف سے؟ ہم ادائے فرض میں بھی مارے جائیں تو پبلک کہتی ہے کتے کی موت مارے گئے۔ صحافی کیا آسمانی مخلوق ہیں کہ ان کا مقدر شہادت ہو؟"

"اس اتفاق سے آپ کیا نتیجہ نکالتے۔ صرف وہی دو افراد جانتے تھے گزشتہ رات کی کارروائی کے بارے میں۔"

"یہ بھی مفروضہ ہے آپ کا۔ ہر اخبار میں یہ خبر ہے۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ انہیں یہ خبر دینے والا کون تھا؟"

رابعہ پھر چونکی "نہیں۔ آپ جانتے ہیں؟"

"جی مگر آپ کہیں گی کہ مرنے والا تو غازی سے شہید ہو گیا۔ اب آپ جو الزام چاہیں عائد کریں۔ وہ تردید کرنے کے لئے نہیں آئے گا۔"

"یہ... یہ خبر غازی نے خود فراہم کی تھی؟"

"فراہم نہیں کی تھی۔ فروخت کی تھی۔ صرف ... مسز دلاور سے بھی اس اطلاع کا معاوضہ وصول کر لیا تھا اس نے۔ اور دلاور کی بیوی نے پورا بندوبست بھی کر لیا تھا پولیس کی تحویل سے اپنے شوہر کو چھیننے کا مگر ایک تو یہ ممکن نہیں تھا۔ اتنی زیادہ مسلح گارڈ ساتھ رکھی تھی میں نے کہ اس کا مقابلہ دلاور کی غنڈا فورس نہیں کر سکتی تھی۔ واپسی پر میں نے راستہ بھی بدل دیا تھا اور دلاور کو لے جانا تھا میو اسپتال۔ میں لے گیا کہیں اور۔ اس کے علاوہ خود غازی نے اسے منع کر دیا تھا کہ ایسی حماقت نہ کرے۔ اس سے دلاور کا کیس زیادہ خراب ہو جائے گا۔ قانونی طور پر اس کی ضمانت کے لئے کوشش کرنا بہتر ہوگا۔"

"یہ مشورہ غازی نے دیا تھا؟"

"یس میڈم۔ غازی ایک طرح سے دلاور کا پی آر او تھا۔ وہ ڈبل ایجنٹ تھا۔ کالی بھیڑیں صحافیوں میں بھی ہوتی ہیں۔"

"یہ تو خیر ٹھیک کہا آپ نے۔ لیکن آپ کو یہ سب کس نے بتایا؟"

"وکیل صاحب۔ میرے وسائل اور ...ئع کو چیلنج مت کریں۔ اگر میں صورت سے بے وقوف لگتا ہوں تو الگ بات ہے لیکن میرا آئی کیو سو سے اوپر ہی ہے۔ صحافی نے قیمت وصول کی تھی تصاویر شائع نہ کرنے کی۔ تصویریں صرف اس کے پاس تھیں۔ گرفتاری کے وقت ایک ہی فوٹو گرافر تھا جسے وہ خود لایا تھا۔ مسز دلاور کو گرفتاری پر اعتراض نہیں تھا۔ وہ باعزت گرفتاری کی خبر دینا چاہتی تھی۔ ہتھکڑی اور حوالات کے بغیر۔ اگر وہ دلاور کو اغوا کرنے میں کامیاب ہو جاتی تو بعد میں دلاور خود تھانے آ کے گرفتاری پیش کرتا۔ ضمانت قبل از گرفتاری لینے کے بعد۔ آئی بات سمجھ میں!"

ایس ایس پی نے غصے سے فون بند کر دیا تھا اور اب رابعہ خفت زدہ سی بیٹھی تھی۔

میں نے کہا "یہ معاملہ تو کچھ اور نکلا۔ ساری کارستانی غازی کی تھی۔"

"ایسا بھی ہوتا ہے بھائی۔ مگر ایسے لوگوں کا انجام بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ غازی کے بارے میں ہم شروع سے جانتے تھے کہ وہ کس قماش کا آدمی ہے۔ وہ بلیک میلر تھا اور بے کردار۔"

رابعہ نے کہا "آخر مارا گیا۔ جو پیسہ لیا تھا وہ کس کام آیا؟ کفن تک تو لے گا نہیں اس سے۔"

میں نے کہا "تم جذباتی ہو رہی ہو۔ ہمیں سوچنا چاہئے کہ ان حالات میں دلاور کی بیوی کا ردعمل کیا ہوگا۔ صبح اس نے دھمکی دی تھی کہ اب نازو کی خیر نہیں۔ اس وقت وہ ناکامی کی جھلاہٹ میں مبتلا تھی اور اس کے سوا کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اول تو اس کی ساری جدوجہد دلاور کا سراغ لگانے کے لئے ہوگی۔ اسے معلوم ہو گیا ہے کہ دلاور کو پولیس نے گرفتار کیا تھا مگر یہ نہیں معلوم کہ پولیس اسے کہاں لے گئی۔ ظاہر ہے وہ ہر تھانے سے ہر ذریعے سے افسران اعلیٰ سے پتا چلانے کی کوشش کرے گی۔ وہ اسپتالوں سے معلوم کرے گی اور جیل میں دیکھے گی۔ مجھے ڈر ہے کہ ایس ایس پی صاحب کا فول پروف سیکیورٹی نظام زیادہ موثر ثابت نہیں ہوگا۔"

محسن بولا "بات صرف چوبیس گھنٹے کی ہے۔ آج چھٹی تھی۔ کل لازمی طور پر پولیس اس کو مجسٹریٹ کے سامنے پیش کرے گی اور اس کا جسمانی ریمانڈ لے گی۔"

میں نے کہا "اس کیس میں ایسا نہیں ہوگا۔ ملزم کی جسمانی حالت اس قابل ہی نہیں کہ اسے عدالت میں پیش کیا جائے۔ عدالت تو خود اس کے پاس جائے گی۔ مجسٹریٹ وہیں جا کے ریمانڈ دے گا جہاں دلاور کو علاج کے لئے رکھا گیا ہے۔"

محسن بولا "لیکن اس کا وکیل مل سکتا ہے دلاور سے۔"

"اگر خود دلاور یہ درخواست کرے تو" رابعہ نے کہا "بصورت

دیگر اس کی بیوی اپنے شوہر کی طرف سے درخواست دے گی کہ وہ پولیس کی تحویل میں ہے۔ اس کو خطرہ ہے کہ پولیس تفتیش میں تشدد کرے گی۔ اس کا شوہر بیمار ہے۔ اس کی جان جاسکتی ہے۔ اس کا طبی معائنہ کرائے' اس کی ضمانت منظور کرانے اور دلاور کے وکیل کو اس سے ملنے کی اجازت دلوانے کے لئے بہت سی درخواستیں دائر ہوں گی اور ان پر قانون کے مطابق نوٹس جاری ہوگا۔ سرکاری وکیل کو جواب داخل کرنے اور عدالت کے احکامات ہونے میں کچھ وقت بہرحال لگے گا۔ پھر یہ ایس ایس پی جاوید صدیقی بھی بہت گھاگ ہے۔ وہ تاخیری حربے استعمال کرے گا۔ ہفتہ دس دن گزار دے گا اور اس عرصے میں دلاور اس قابل ہوجائے گا کہ عدالت میں پیش ہونے یا وکیل کی ملاقات سے پہلے اس کا بیان ریکارڈ کرلے۔"

فی الحال ہم بھی ایس ایس پی کی بات پر یقین کرنے پر مجبور تھے۔ ہمارے پاس تصدیق کے ذرائع نہیں تھے اور دلاور کا سراغ لگانا آسان نہیں تھا۔ شوکت رانا کا پتا چلایا جاسکتا تھا کہ وہ کس تھانے میں ہے لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ غالب کی بازیابی اور مارگریٹ کے ساتھ آجانے سے وہ مسئلہ باقی نہیں رہا تھا جس کا تعلق شوکت رانا سے تھا۔

ہمیں اب صرف نازو کی فکر تھی۔ ہمارے سر سے یہ بوجھ تو اُتر گیا تھا کہ غالب نے مارگریٹ سے شادی کرلی ہے مگر یہ خلش اپنی جگہ موجود تھی کہ کیا شوکت رانا نے نازو کو زبردستی اپنی بیوی بنالیا تھا۔ یہ ایک ایسی بات تھی جو دل نہیں مانتا تھا لیکن عقل کو اندیشوں سے دور رکھنا محال تھا۔

رابعہ نے کچھ دیر بعد کہا "آخر دلاور کی گرفتاری کی خبر چھپائی کیوں گئی ہے۔ چلو مان لیا کہ دلاور کی بیوی نے تذلیل سے بچنے کے لئے فوٹو گرافر' رپورٹر کو خرید لیا تھا مگر پھر انہیں مروانے کی کیا ضرورت تھی۔"

"غازی کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ممکن ہے اس کے دل میں بے ایمانی آگئی ہو۔ پہلے اس نے وعدہ کرلیا ہو کہ وہ دلاور کی گرفتاری کے بارے میں کوئی خبر صبح کے اخبار میں نہیں دے گا اور نہ تصویر۔ خبر چھپائی نہیں جاسکتی مگر تصویر کسی اور کے پاس تھی ہی نہیں۔ غازی نے سوچا ہوگا کہ بعد میں مسز دلاور سے کچھ اور رقم اینٹھی جائے۔ اس نے تصوروں کے ساتھ جتنے بھی مانگے ہوں گے جو غازی کو منظور نہیں ہوگا۔ دلاور اس کے لئے موٹی آسامی تھا۔ خود دلاور سے بعد میں اس کی عزت کا سودا کیا جاسکتا تھا۔" محسن بولا۔

"شاید مسز دلاور بھی یہ سمجھتی ہوگی کہ صرف غازی کا وعدہ کافی نہیں۔ وہ فلم ملنی چاہئے تاکہ اسے ضائع کردیا جائے اور آئندہ کا خطرہ باقی نہ رہے۔ اب آدھی رات کے وقت کیا ہوا۔ یہ کوئی نہیں جان سکتا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اسی فلم کی وجہ سے ان کی جان گئی۔ ممکن ہے انہوں نے فرار ہونے کی کوشش کی ہو اور فلم واپس لینے کے لئے ان کا تعاقب کرنے والے مجبور ہوگئے ہوں کہ انہیں ٹکر مار کے گرادیں۔ وہ موٹر سائیکل پر ہوں گے پیچھا کرنے والے گاڑی میں۔ یہ ٹرک والی بات فضول ہے۔ صرف زیبِ داستان کے لئے۔ یہ کوئی کیسے بتا سکتا ہے کہ ٹکر کار نے ماری تھی جیپ نے۔ ویگن بس یا ٹرک نے۔" میں نے کہا۔

محسن نے کہا "وہ خود گرفتاری پیش کرتا۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"سمجھ میں تو میری بھی نہیں آئی تھی۔" رابعہ نے کہا۔

"پھر ایس ایس پی صاحب سے پوچھا کیوں نہیں تھا؟"

رابعہ نے کہا "موقع ہی کہاں دیا اس نے۔ فون بند کردیا۔ وہ اپنی بے عزتی کے احساس سے مشتعل تھا۔"

"تم نے کیا بے عزتی کی تھی اس کی؟"

"اس کا خیال ہے کہ ہم اس کے عہدے اور مرتبے کا لحاظ نہیں کرتے۔ اسے غیر ذمے دار سمجھتے ہیں۔ اور بے وقوف۔ اسی لئے تو کہہ رہا تھا کہ میری ذہانت کا معیار سو سے اوپر ہے۔" رابعہ بولی۔

میں نے کہا "اس سے پوچھو کہ آخر وہ گرفتاری کی خبر کتنے دن چھپائے گا۔ اور جب بھی دلاور کو عدالت میں پیش کیا جائے گا تو اخبار والے ہوں گے' ایک نہیں دس ہوں گے۔ تصویریں بنائیں گے اور دلاور کے ہاتھوں میں ہتھکڑی بھی لازمی ہوگی۔"

رابعہ نے کہا "دلاور کی بیوی کل ہی ہائی کورٹ میں حبس بے جا کی درخواست دائر کردے گی کہ پولیس نے اس کے شوہر کو پکڑ لیا ہے لیکن کسی عدالت میں پیش نہیں کیا اور اس کے وکیل یا لواحقین کو اطلاع نہیں۔ پولیس سے پوچھا جائے کہ اسے کہاں رکھا گیا ہے پھر کیا ایس ایس پی صاحب یہ حلف نامہ داخل کرنے کی پوزیشن میں ہوں گے کہ دلاور پولیس کی تحویل میں نہیں ہے۔"

اچانک مجھے ایک اور خیال آیا "محسن صاحب آپ اسے ناممکن کیوں سمجھتے ہیں؟"

"کیا مطلب؟"

"کیا پولیس والے جھوٹ نہیں بولتے؟ کیا وہ عدالت میں حلفیہ بیان داخل نہیں کرسکتے کہ دلاور ان کی تحویل میں نہیں ہے اور انہوں نے دلاور کو گرفتار ہی نہیں کیا۔ وہ دلاور کا سودا اس کی بیوی سے کرلیں اور اس سے کہہ دیں کہ اپنے شوہر کی وہ خود ذمے دار ہے۔ اب تک وہ لاپتا تھا۔ آئندہ بھی لاپتا رہے ورنہ پولیس اسے گرفتار کرنے پر مجبور ہوگی۔ دلاور کی بیوی اسے چپکے سے باہر نکال دے گی۔ ملک سے باہر۔"

رابعہ پریشان نظر آنے لگی "یہ ہو تو سکتا ہے مگر...."

"مگر کیا۔ تم سمجھتی ہو جھوٹا بیان حلفی داخل نہیں کیا جاسکتا۔"

"نہیں۔ اتنا عرصہ پریکٹس کرنے کے بعد مجھے یہ خوش فہمی نہیں رہی کہ جھوٹا حلف کوئی نہیں اٹھاتا۔ پولیس کی بات چھوڑو عام آدمی بھی بڑا گناہ گار ہوتا ہے۔ میں نے تو بڑی بڑی داڑھی والوں' شرعی حلئے اور صوفیانہ وضع رکھنے والوں کو ایسا سفید جھوٹ بولتے اور جانتے بوجھتے جھوٹا حلف اٹھاتے دیکھا ہے کہ میں بتا نہیں سکتی اور کمال یہ ہے کہ ایسے لوگ بڑی ڈھٹائی سے اپنا دفاع بھی کرتے ہیں کہ اشد ضرورت میں جب سوال زندگی اور موت کا ہو تو حرام بھی حلال ہوجاتا ہے۔ کسی بے گناہ کی جان بچانے کے لئے جھوٹا حلف اٹھانا جائز ہے۔ کیا عجیب منطق ہے۔"

"پھر تمہیں کیوں خوش فہمی ہے کہ دلاور کے کیس میں ایسا نہیں ہوسکتا۔" محسن بولا۔

میں نے کہا "ایک تو مجھے یہ ایس ایس پی ذرا مختلف قسم کا آدمی لگتا ہے۔"

"ایک شعر مرزا غالب نے سو سال پہلے آج کے لئے کہا تھا اور آج سے سو سال بعد بھی لاگو ہوگا۔

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

محسن بولا "جو جیسا لگتا ہے ویسا ہو۔ یہ ضروری تو نہیں اور صدیقی کیا ہے ایک ایس ایس پی جسے کسی بھی وقت اس کیس کی تفتیش سے الگ کیا جاسکتا ہے۔ اوپر سے احکامات صادر ہوجائیں گے۔ فلاں کو چارج دو اور ہیڈ آفس میں رپورٹ کرو۔ اس کے [illegible] نہیں ہے تو صدیقی کو باعزت طور پر او ایس ڈی بنایا [illegible] ہیڈ آفس میں کسی فضول سے شعبے کا نگراں بنا کے بٹھایا [illegible] نامہ کوئی اور داخل کرنے آجائے گا۔"

[illegible] "محسن کی بات میں بہت وزن ہے مس رابعہ۔ اگر [illegible] اوپر تک ڈوری ہلانے میں کامیاب رہی تو ایک دو دن میں ایسا ہوگا۔ صدیقی اتنا بے وقوف بھی نہیں ہے کہ دلاور کی خاطر اپنے کیریر کو داؤ پر لگادے اور اوپر سے حکم آئے کہ شٹ اپ تو شٹ اپ نہ ہو۔"

"مرحوم انکل محسن رضوی کو یاد کرو۔ وہ ہوتے تو کیا ان کی آواز کو دبا سکتا تھا کوئی۔ وہ عدالت میں پہنچ جاتے بیان دینے کے لئے کہ جناب والا میں نے گرفتار کیا تھا دلاور کو فلاں دن اتنے بجے رات کو اور فلاں فلاں کی موجودگی میں اور پھر فلاں جگہ پہنچایا تھا۔ پولیس نے جھوٹا حلف نامہ داخل کیا ہے۔ انہوں نے اسے فرار کرادیا ہے۔ فرض کرو یہ صدیقی بھی ایسا ہی ثابت ہوا۔"

میں نے کہا "او کے ہم فرض کرلیتے ہیں کہ صدیقی [illegible] فرض شناس ہے اور اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہے گا۔ کوئی افسر لاکھ دھمکیاں دے وہ اپنے ضمیر کی آواز دنیا کو سنوائے گا۔ نوکری گنوائے گا اور نقصان اٹھائے گا۔ پچھتائے گا مگر اس سے فرق کیا پڑے گا پولیس کو یا دلاور کو۔ پولیس کا محکمہ ایسے ہی رہے گا۔ دلاور باہر جاچکا ہوگا آپ جتنا چاہیں واویلا کریں۔"

محسن بولا "آخر منظر اور اپنی رابعہ چشم دید گواہ ہیں۔"

"ہم پارٹی ہیں' ایک فریق ہیں۔" رابعہ نے کہا "ہماری کیسی گواہی۔"

"اپنے فرنچ وکیل صاحب ہیں۔"

"مجھے مت مروا یار۔ عدالت میں گیا تو بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ میں ان سرکاری اور قانونی معاملات سے دور ہی محفوظ ہوں۔ کہیں میری شناخت مانگ لی گئی تو جو پکڑا جائے گا وہ سکندر بخت ہوگا۔ رہ گئے تم اور مولوی خادم حسین۔ تمہیں پولیس بند کردے گی تو تمہاری زبان بھی بند ہوجائے گی۔ تم پر درجنوں مقدمات قائم ہوجائیں گے۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ ابھی تک آزاد پھر رہے ہو۔"

دوپہر ہوگئی تھی۔ ابھی تک وقار یوسف لوٹ کر نہیں آیا تھا اور رابعہ کو خانہ دار خاتون کی حیثیت سے دوپہر کے کھانے کی فکر لاحق ہورہی تھی۔ یہ کچھ معلوم نہیں تھا کہ انتظار کا وقفہ کتنا طویل ہوگا۔

محسن نے کہا "وقار نے حد کردی۔ دو گھنٹے اور بیس منٹ ہوگئے۔"

"جانے اور آنے میں ہی ایک گھنٹا لگ جاتا ہے۔ وہاں پہنچ کے ہی وقار فوراً واپس نہیں آسکتا۔ تین عورتوں کے ساتھ وہ ایک مرد ہے سب ذمے داری اس کی ہے۔" میں نے کہا۔

"اسے فون کرکے بتادینا چاہئے۔"

رابعہ ہنسنے لگی "وہاں فون کب کا کٹ چکا ہوگا۔ سارے بل اندر پڑے رہے ہوں گے۔ یہ بھی پتا نہیں کہ بجلی والوں نے بھی بجلی کاٹنے میں اپنی کارکردگی کا مظاہرہ تو نہیں کیا۔"

"ہاں۔ فراہمی کے معاملے میں وہ اتنے مستعد نہیں ہوتے۔"

"ٹیلی فون سب سے پہلے کٹ جاتا ہے۔" رابعہ نے کہا۔

"اور اگر وہ کہیں سے فون کرے گا تو ہمیں کیسے پتا چلے گا۔ یہاں تو فون یک طرفہ ہورہا ہے۔ وقار یوسف پریشان ہوتا رہے گا کہ گھنٹی مسلسل بج رہی ہے مگر ریسیور کوئی نہیں اٹھاتا۔"

محسن نے کہا "تمہیں یاد ہے پہلے کیا نمبر تھا تمہاری حویلی کا۔"

"اسے حویلی کیوں کہتا ہے یار۔" میں نے کہا۔

"پھر کیا غریب خانہ کہوں۔ اتنے عالی شان محل کو۔"

"یہ حویلیاں اور محل اب کہاں رہے ہیں۔ جو ہیں وہ آسیب زدہ لگتے ہیں اور آثار قدیمہ ہیں۔ یاد ایام عشرت فانی۔ محل اور مقبروں کی ایک ہی فضا لگتی ہے۔ لوگوں نے عبرت پکڑنا بھی چھوڑ دیا ہے۔ ہمارا گھر تو بس گھر ہے اور گھر کے چھوٹا [illegible] ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

محسن نے کہا "میں نے نمبر پوچھا تھا۔ ٹیلی فون [illegible]۔ آپ قنوطی اور فلسفی ہوگئے۔"

میں نے کہا "نمبر رابعہ ملا سکتی ہے۔"

رابعہ نے کوشش کی مگر حسب توقع وہاں بھی گھنٹی بجتی رہی "لائن کٹ چکی ہے۔" اس نے مایوسی سے کہا۔

"آخر ہم کب تک انتظار کریں گے۔ میں تو سونے جارہا ہوں۔ کل رات بھی ایسے ہی گزری۔" محسن نے کہا اور اٹھ کے اندر چلا گیا۔

رابعہ نے کہا "اب ہم کیا کریں۔"

"ہم بہت کچھ کرسکتے ہیں مل کے۔" میں نے کہا۔

"تم آلو چھیلو اور پیاز کاٹو۔ میں آٹا گوندھ کے روٹی ڈالوں۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ میں سخت رومانٹک ہو رہا تھا۔" میں نے کہا "تم بیچ میں آلو پیاز لے آئیں۔ ہم محبت بھی تو کرسکتے ہیں۔"

"وہ تو ہو جاتی ہے کی نہیں جاتی اور پہلے سے ہے۔"

"اچھا" میں نے اس کا ایک ہاتھ تھام کے کہا "ہم ایک جذباتی فلمی سین کی ریہرسل کرسکتے ہیں فلم زہر عشق کے اس سین کی۔"

"جس میں ہیروئن زہر دیتی ہے ہیرو کو اور ولن کے ساتھ چلی جاتی ہے۔" رابعہ ہنسی۔

"اف۔ تم کس قدر جاہل اور بدذوق ہو۔ فلم کے معاملے میں۔ ایسی فلم بن سکتی ہے بھلا۔" میں نے کہا "اچھا فرض کرو یہ سورج نہیں چودھویں کا چاند ہے مس رابعہ اور ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی ہے۔ میں اور تم ہمالیہ کی سب سے بلند چوٹی پر تنہا ہیں۔ دوپہر کا وقت ہے۔ ہر طرف دھول اڑ رہی ہے اور ہم پسینے میں شرابور ہیں۔ دھوپ اتنی تیز ہے۔"

رابعہ کھلکھلا کے ہنسی "کیا زبردست ڈائریکشن ہے۔ چاند سورج۔ برفانی چوٹی اور دھول۔ چاندنی' پھوار اور دھوپ سب کو ایک ساتھ کردیا ہے۔"

"ایسی ہی فلمیں کامیاب ہو رہی ہیں تو میں کیا کروں۔ آرٹ فلم بناؤں اور حقیقت پسندی کے چکر میں دیوالیہ ہو جاؤں۔" میں نے اونگھتے ہوئے کہا۔

"تمہیں بھی نیند آرہی ہے؟"

"ہاں۔ کیا تم میری خاطر ظالم سماج سے ٹکرا سکتی ہو۔"

"ہاں ظالم سماج کو سامنے لا کے کھڑا کرو۔ میں تمہاری کھٹارا کار کے ساتھ اس سے ٹکرا سکتی ہوں۔"

"اس کار کی توہین مت کرو۔ وہ کار ایک گھوڑا ہے جس پر سوار ہو کے تمہارے خوابوں کا شہزادہ ایک دن تمہارے گھر آئے گا۔ ... اڑا لے۔ وہ کار ڈولی ہے جس میں بیٹھ کے تم پیا گھر سدھارو گی۔ پس منظر میں گانا چل رہا ہوگا۔ چھوڑ بابل کا گھر۔"

"اور آدھے راستے میں پہلے ٹائر پنکچر ہوگا۔ پھر تم ا... وہیل بدلو گے جس کا ٹائر پھٹا ہوا ہے۔ گاڑی اچھلتی ہوئی چلے گی تو سنتری روک لے گا کیونکہ اس کی ایک آنکھ بے نور ہوگی۔ تمہارا چالان ہو جائے گا اور گاڑی دوبارہ اسٹارٹ ہونے سے انکار کردے گی۔ تم دھکا لگاؤ گے۔ سہرے کے ساتھ۔ کیسا زبردست رومانٹک سین ہوگا۔"

میں نے خفگی سے کہا "تم بہت سنگدل حسینہ ہو۔ ایسی دل توڑنے والی باتیں آج تک کسی ہیروئن نے نہیں کی ہوں گی۔ میں جارہا ہوں سونے۔"

"کھانا نہیں کھاؤ گے؟"

"نہیں۔ میں بہت تھکا ہوا ہوں۔" میں نے کہا۔

"اچھا پھر میں جاتی ہوں خادم حسین کے ساتھ۔ تم دروازے بند کرکے سوتے رہو شام تک۔" رابعہ بولی۔

"مولوی سے ہوشیار رہنا۔ اس کا کوئی بھروسا نہیں۔ تمہیں ہی بھگا کے لے جائے۔" میں نے کہا "وظیفہ بھی ہے اس کے پاس کوئی۔"

"ہر وقت اس کے پیچھے مت پڑے رہا کرو۔"

"اس نے بھی حد کردی۔ فوراً ہی مارگریٹ پر لٹو ہوگیا۔ اور جواز دیکھو ذرا۔" میں نے کہا "ویسے تم کہاں جاؤ گی؟"

"وہیں۔ جہاں سب گئے ہیں۔"

میں نے کہا "خدا حافظ۔ جاتے ہوئے باہر سے تالا ڈال جانا گیٹ میں بلکہ لکھ جانا کہ اندر کوئی نہیں ہے۔ حملہ آور قاتل اور اغوا کرنے والے زحمت نہ کریں۔ اور ذرا خیال رکھنا۔ اپنی گدھا گاڑی لے جانا دیکھنے میں وہ بھی گاڑی ہی لگتی ہے۔ میری لال پری کو ہاتھ مت لگانا۔"

رابعہ ہنسی "میں نمبر دیکھ کے لے جاؤں گی۔ مجھے معلوم ہے میری رولز رائس کا نمبر کیا ہے۔"

نمبر پلیٹ خود ہم نے بدل رکھی تھی۔ رابعہ میری گاڑی لے گئی۔ اس کے جاتے ہی میں بستر پر گر کے سوگیا۔ ساتھ والے بیڈ پر محسن پہلے ہی بے سدھ پڑا ہوا تھا۔

میری آنکھ کھلی تو رات ہو چکی تھی۔ باہر لائٹ جل رہی تھی اور کسی کے باتیں کرنے کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ میں نے دوسرے بیڈ کی طرف دیکھا۔ محسن مجھ سے پہلے اٹھ گیا تھا۔

"کیا بات ہے۔ صور اسرافیل سے پہلے اٹھ گئے ہو؟" محسن مجھے دیکھ کے بولا۔

وقار اور نکی واپس آگئے تھے۔ نکی کچن میں تھی۔ اس نے وہیں سے چلا کے کہا "وقار۔ سکندر بھائی کو بھی جگا دو نا۔ میں بار بار چائے نہیں بناؤں گی۔"

میں نے ڈانٹ کے کہا "مت بناؤ۔ ہم نہیں اٹھیں ... "

وقار نے کہا "آج دن میں تم لوگوں نے کچھ ... دیا۔"

محسن بولا "ہم نے ایک دوسرے ... در بھا... تمہارے غریب خانے میں۔ تقوی صاحب مر... روح ... تکلیف ہوتی ہوگی کہ ان کی شہزادی بیٹی کس فقیر کے ساتھ انتہائی عسرت کی زندگی گزار رہی ہے۔ بھرے گھر میں کھانے کو کچھ نہیں ہے۔"

"فریج میں دیکھنے کی تکلیف کرتے آپ تو بہت کچھ مل جاتا۔" نکی نے کہا "دس بھوکے کھا لیتے۔"

"لیکن اس سے میرے مرحوم سسر کی روح کو زیادہ تکلیف ہوتی۔ خیر سے وہ اتنے کنجوس تھے کہ مہمان آجاتے تو خود بھی سارا دن اور ساری رات بھوکے بیٹھے رہتے تھے۔" وقار نے کہا "تم نے دیکھا تھا انہیں۔ فاقہ زدہ لگتے تھے مگر خود کو اسمارٹ کہتے تھے۔ دن میں ایک بار کھاتے تھے مجبوراً۔"

"وقار۔ بس کرو۔ جھوٹ کی حد ہوتی ہے۔" نکی نے کہا۔

میں نے کہا "باتوں سے میرا پیٹ نہیں بھرے گا نکی۔ میں فریج میں گھس گیا تو سب کچھ کھا جاؤں گا۔ فریج سمیت۔"

"تم تو گھوڑے بیچ کے ایسے سوئے کہ ہمارے آنے کا بھی پتا نہیں چلا۔" نکی نے کہا "ہم وہاں سے بھی فون کرتے رہے۔ فون کاٹا نہیں گیا تھا۔ یہاں کوئی اٹھا نہیں رہا تھا۔ اس وقت بھی سو رہے تھے کیا؟"

"نہیں" میں نے کہا "تمہارا یہ فون تمہارے شوہر سے زیادہ ناقابل اعتبار ہوگیا ہے اور جیسے تمہارے شوہر کی تمہارے سامنے آواز نہیں نکلتی۔ ایسے ہی اس کی گھنٹی نہیں بجتی۔ دونوں کو باہر پھینک دو۔"

"ہاں نکی۔ فون کے ساتھ مجھے بھی باہر پھینک دو۔ سڑک پر۔ میں ان کے قدموں میں جا گروں گا۔" وقار نے دانت نکالے "جان دینے کے لئے۔"

"کس کے قدموں میں جان دینا چاہتا ہے آخر۔" میں نے افسوسناک لہجے میں کہا۔

"ارے سکندر بھائی۔ ہمارے ساتھ والے گھر میں دو ولایتی چیزیں آئی ہیں۔ ہیں تو میڈ ان پاکستان مگر ساری عمر لندن میں رہی ہیں تو اب رات کو یہاں ایسے ٹہلنے نکلتی ہیں جیسے یہ بھی لندن کی سڑک ہے۔ سب مرد کسی نہ کسی بہانے پورچ یا لاؤنج میں بیٹھ کے مطالعہ کرنے لگتے ہیں اور کچھ تو باقاعدہ چہل قدمی کے عادی ہوگئے ہیں۔"

میں نے محسن کی طرف دیکھا "لندن سے آئی ہیں تو پھر ہمیں ضرور جانتی ہوں گی۔ یا ہم انہیں ضرور جانتے ہوں گے۔"

"... ت ہے۔" نکی مسکرائی۔

"... کی بات ہے۔" میں نے کہا "ہماری ایسی دھوم تھی لندن میں بلکہ پورے انگلستان میں کہ جب ہم واپس وطن لوٹے....."

"یعنی برطانیہ سے نکالے گئے۔ باقاعدہ ڈی پورٹ کیا تھا پولیس نے پورے سرکاری اعزاز کے ساتھ۔" محسن بولا۔

"لندن کی نصف لڑکیاں میرے لئے زاروقطار رو رہی تھیں اور باقی نصف محسن کے لئے۔" میں نے کہا "کیا خیال ہے اگر ہم ایک نظر دیکھ لیں۔"

"ایک نظر کیوں۔ رابعہ تو ہے نہیں جی بھر کے دیکھو۔ کل بھی نہیں ہے۔"

وقار مسکینی سے بولا "آپ اجازت دیں جی تو میں بھی....."

"خبردار جو گھر سے قدم بھی نکالا۔ ٹانگیں توڑ دوں گی۔" نکی نے کہا۔

صرف نکی کو تنگ کرنے کے لئے ہم چائے پینے کے بعد باہر نکل گئے۔ آٹھ بجے کے بعد بھی یہ سڑک جسے اسٹریٹ کہنا مناسب تھا خالی پڑی تھی۔ سوائے یہاں رہنے والوں کے یہاں سے گزرتا بھی کوئی نہیں تھا۔ دو لڑکیاں بڑے بے باک انداز میں سڑک پر ٹہل رہی تھیں۔ یہ ٹہلنا بھی نہیں تھا ایک طرح کی واک تھی۔ وہ صرف نیکر اور مردانہ قسم کے بغیر آستینوں اور کھلے گلے والے بنیان پہنے تیز تیز قدموں سے آجا رہی تھیں پھر انہوں نے کچھ جوگنگ کی اور اسی دوران کم سے کم چھ بار ہمارے پاس سے گزریں مگر انہوں نے ایک بار بھی نظر اٹھا کے ہمیں نہیں دیکھا۔ میں ان کی باتیں سن رہا تھا۔ یہ عام باتیں تھیں۔ وہ یہاں کے موسم سے' یہاں کی معاشرتی اور اخلاقی پابندیوں سے' لوگوں کے رویے سے خاص طور پر خاندان والوں کی سازشوں سے نالاں تھیں جس پر بزرگ حاوی تھے اور خود کو ان ... معاملات کا نگراں اور ٹھیکے دار سمجھتے تھے جو لندن کی پروردہ ان لڑکیوں کے نزدیک سو فیصد ان کے ذاتی مسائل تھے۔ ان کے بالغ اور خود مختار ہونے کے حق کو یہاں تسلیم نہیں کیا جاتا تھا اور ہر دلیل کی تان اس بات پر ٹوٹتی تھی کہ ہم بڑے ہیں اور تمہارا برا بھلا بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔

میں نے اندازہ کیا کہ وہ لندن کے کس علاقے کی رہنے والی تھیں اور ان کی گفتگو میں کس علاقے کا مقامی اثر تھا۔ درمیان میں ایک نے فرنچ کا محاورہ بھی استعمال کیا اور میں نے اسٹریٹ لائٹ کے نیچے اس کو غور سے دیکھا تو میرا یہ شک بھی یقین میں بدل گیا کہ میں اس کو جانتا ہوں۔ بس مجھے یاد نہیں آتا تھا کہ لندن میں اس سے میری ملاقات کس تقریب میں اور کہاں ہوئی تھی لیکن یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

میں نے محسن کو اندر بھیج دیا اور جب وہ جوگنگ کے بعد ہانپتی ہوئی میرے قریب سے گزریں تو میں نے اسے مخاطب کیا جو میرے خیال میں فرنچ جانتی تھی۔

وہ فرنچ سن کے ایک دم پلٹی اور اس کی صورت پر حیرت کے آثار نمودار ہوئے "تم نے مجھ سے کچھ کہا؟" وہ فرنچ میں بولی۔

"ظاہر ہے تمہارے سوا کسی نے میری بات نہ سنی نہ سمجھی۔" میں نے کہا "یہ تمہاری دوست....."

"یہ میری بڑی بہن ہے روشی۔ اور میں میری۔" اس نے بے تکلفی سے ہاتھ بڑھا کے مصافحہ کیا (بعد میں پتا چلا کہ ایک روشن

آرا تھی اور دوسری مہرالنساء)

میں نے کہا "میں کبیر ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میری تم سے لندن میں ملاقات ہوئی تھی۔"

اس کا چہرہ مسرت سے دمکنے لگا "ریئلی؟ تم لندن میں ہو۔"

میں نے دوسری بہن سے ہاتھ ملایا مگر توجہ میری پر ہی مرکوز رکھی "میں سوفیصد لندن میں ہوں لیکن میری انتہائی بے وقوفی اور بدقسمتی یہ ہے کہ مجھے اتنا حسین چہرہ یاد رہا مگر نام یاد نہیں رہا۔"

وہ مزید خوش ہوئی "ہم بھی لندن سے ہی آئے ہیں دو مہینے کے لئے یہاں سزا بھگتنے۔ اپنے والدین کے ساتھ۔ وہ وطن اور پاکستان کی محبت' خاندان اور رشتوں کے بارے میں انتہائی جذباتی رویہ رکھتے ہیں۔"

اب روشی نے کہا "انتہا یہ ہے بے وقوفی کی کہ ہم سے بھی توقع رکھتے ہیں کہ ہم بھی انہی جیسے جذبات کا اظہار کریں۔ بھلا یہ ممکن ہے۔ ہمارا کیا تعلق ان سب خرافات سے۔ ہم نے صرف یہاں پیدا ہونے کی غلطی کی تھی مگر کیا وہ ہماری غلطی سمجھی جاسکتی ہے؟"

"ہمارا کیا اختیار تھا یہاں یا لندن میں پیدا ہونے پر۔ چوائس ہمارا ہوتا تو ہم لندن کو ترجیح دیتے اس فضول سے نام والے گاؤں پر۔ کیا نام ہے اس کا روشی۔ ڈسکہ۔ ادھر ہے سیالکوٹ میں کہیں۔ وہاں ہمارے کچھ آباؤ اجداد ابھی تک زمانہ قبل از تاریخ کی دنیا میں رہتے ہیں۔"

میں نے کہا "میں بھی کئی سال سے لندن میں ہوں۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے گیا تھا۔ اب ایک طرح سے خود اپنے کاروبار کا مالک ہوں۔ میری فرم ہے ساؤتھ ایسٹ ایشین میڈیا فاؤنڈیشن۔ تم نے نام سنا ہوگا؟"

یہ ایک فرضی کمپنی کا نام نہ ہوتا تب بھی اس کی سمجھ میں نہ آتا مگر اس نے عمدہ اداکاری کی "آف کورس۔ کہیں دیکھا تھا میں نے یہ سائن۔ بھلا کہاں روشی۔ اور اب مجھے بھی یاد آرہا ہے کچھ کہ ہم مل چکے ہیں۔"

اس کے بعد مراحل نسبتاً آسان ہوگئے۔ میں نے کہا کہ میرا تو کوئی بڑا بوڑھا ہے نہیں جو میرے معاملات میں ٹانگ اڑائے۔ میں ایک کاروباری دورے پر آیا ہوں اور بہت جلد واپس چلا جاؤں گا۔ قیام دوست کے ساتھ ہے۔ ابھی تک شادی کے چکر میں نہیں پڑا کیونکہ اب تک میری جیسی کوئی لڑکی میری زندگی میں آئی بھی نہیں۔

... کے اس ذومعنی جملے نے میری کو نہال کردیا۔ وہ سمجھی کہ ... اور اب روشی کے لئے کوئی چانس نہیں۔ روشی ویسے بھی فرنچ نہیں سمجھتی تھی۔ میری نے اس کو لینگویج کے طور پر پڑھا تھا اور وہ بولتی بھی کتابی فرنچ تھی۔ میں نے اسے چائے کی دعوت دینے کا سوچا اور پھر ڈنر کی دعوت دے ڈالی جو اس نے تھوڑے سے سوچ بچار کے بعد قبول کرلی۔ اس نے کہا کہ مسئلہ روشی کا ہوگا۔ ہم ایک ساتھ کہیں بھی جاسکتے ہیں' یہاں ہماری ایک دقیانوسی خیالات والی چچی ہے اسے چکر دینا کوئی مشکل نہیں اور اس کی بک بک سنتا کون ہے۔ میں نے کہا کہ میرے ساتھ ایک دوست ہوگا جو فرنچ نہیں جانتا مگر لندن میں میرے ساتھ ہی ہے۔ وہ روشی کو کمپنی فراہم کرے گا۔ انہوں نے آدھے گھنٹے میں تیار ہوکے آنے کا وعدہ کیا۔

میں نے فوراً اپنی کارگزاری کی رپورٹ محسن کو دی "دیکھ یار یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اس لڑکی سے لندن میں کہاں ملاقات ہوئی تھی۔ اور کیوں؟"

محسن نے اس دلیل کو مسترد کردیا "لندن میں ایک سو ایک لڑکیاں ہوں گی جن کے ساتھ آپ نے چکر چلایا تھا۔ نوجوانی کی غلطیاں۔"

میں نے کہا "اس لڑکی سے ایک کام ہے مجھے۔ اگر یہ وہی ہے جو میرا دل کہتا ہے کہ ہے۔ تو پھر یہ ہمارا مسئلہ حل کردے گی۔"

"یار نکی کیا ہے۔ اس نے اپنے شوہر کو دھمکی دی تھی کہ باہر نکلے تو ٹانگیں توڑ دوں گی۔"

"وہ بزدل اور جورو کا غلام ہے۔" میں نے کہا۔

وقار نے کہا "میں شرط لگاتا ہوں کہ جب نکی رابعہ اور گل کو بتائے گی تو وہ بھی میری ٹانگیں توڑ دیں گی۔"

"بھلا کیا ضرورت ہے نکی کو ایسی خطرناک بات بتانے کی۔ اس سے کہیں گے کہ ہم جارہے ہیں ماڈل ٹاؤن اور انہیں پک کرکے ڈنر کے لئے لے جائیں گے۔ دس گیارہ بجے تک واپس چھوڑ دیں گے پھر گھر جاکے رابعہ اور گل کو ایسی دردناک کہانی سنائیں گے کہ ان پر رقت طاری ہوجائے گی۔ اگر انہوں نے پوچھا کہ اتنی دیر کیوں کی۔"

"تمہاری مرضی بھیا۔ اللہ تمہارا حامی وناصر ہو۔" وقار بولا۔

نکی چاہتی تھی کہ میں اور محسن کھانے کے بعد جائیں مگر میں نے کہا کہ دوپہر سے اب تک رابعہ اور گل کے پاس غالب تھا یا اب مولوی خادم حسین ہے۔ مجھے اور محسن کو ان کی خبرگیری ضرور کرنا چاہئے۔ میرے اپنے کپڑے میلے اور بغیر استری کے تھے۔ محسن نے بھی مجھ سے اتفاق کیا کہ ان میڈان انگلینڈ پاکستانی لڑکیوں کے ساتھ ڈنر پر جانے کے لئے ہمارا ڈریس قطعی غیرموزوں بلکہ باعث شرم تھا۔ اگر ہم بہت زیادہ تیاری کے ساتھ سج بن کے نکلتے تو نکی کی ناک فوراً خطرے کی بُو سونگھ لیتی۔ زنانہ تجسس اور شکی فطرت سے مجبور ہوکے وہ فوراً رابعہ اور گل کو مطلع کرتی کہ دال میں کچھ کالا ہے۔

اس مشکل میں وقار نے ہماری مدد کی۔ اس نے چائے منگائی تھی۔ جب نکی ٹرے لارہی تھی تو اس نے لے لی اور بڑی مہارت اور احتیاط کے ساتھ ہم پر گرادی۔ ہم نے شور مچایا اور اس نے معذرت کی مگر اس کے بعد ہمارے لئے کپڑے بدلنے کا جواز پیدا ہوگیا۔ ہم نے وقار کے سوٹ پہن لئے۔ اس کی قمیص اور ٹائی لے لی۔ نکی کو ذرا شک نہیں ہوا۔

میں نے اپنی گاڑی نکالی جس پر رابعہ کی گاڑی کا نمبر تھا۔ دونوں لڑکیاں بھی بالکل تیار کھڑی ہمارا ہی انتظار کررہی تھیں۔ معلوم نہیں انہوں نے اپنی چچی کو کیا بہانہ کرکے مطمئن کردیا تھا۔ میری نے ہاتھ کے اشارے سے ہمیں آگے نکل جانے کے لئے کہا اور پھر اپنی گاڑی میں ہمارے پیچھے آئیں۔ مجھے یہ سب بڑا عجیب سا لگا۔

"بڑی شرم کی بات ہے۔ شیروانی صاحب۔ بھلا یہ عمر ہے آپ کی کسی لڑکی کو ایسے چوری چھپے ساتھ لے جانے کی۔"

"میری تو شادی ہوگئی۔ تم سوچ لو کہ رابعہ کو پتا چلا تو۔"

میں نے کہا "وہ آرہی ہیں پیچھے؟"

"ہاں لیکن ان کے ساتھ کم سے کم وقت میں کام کی بات کرلینا۔ رابعہ اور گل پریشان ہوں گی وہاں۔ اس کے علاوہ نکی نے مجھے ایک بات بتائی تھی۔ آج رابعہ کی منظر سے بات ہوئی۔ پہلے اس نے گلہ کیا کہ وقار کے گھر میں سب مرگئے تھے کیا۔ کوئی فون نہیں اٹھا رہا تھا۔ رابعہ نے بتایا کہ فون میں کچھ خرابی تھی جس کی وجہ سے بات نہ ہوسکی۔ دوپہر کے بعد منظر کی بیوی کے میکے والوں کی ایک فوج نے بغیر بتائے یلغار کی اور منظر پھنس گیا میزبانی کے چکر میں۔ اس نے رابعہ سے کہا بی بی۔ تم کو دلاور کی بیوی سے بات کرنی چاہئے تھی۔"

"وہ کس لئے؟"

"بھئی اس نے خاص طور پر نازو کا نام لے کر ہمیں شاک دینے کی کوشش کی تھی۔ ہم نے یہ ظاہر کیا کہ ہم شاک پروف ہیں اور اس کی دھمکی رائگاں گئی۔ غالباً دلاور کی بیوی یہ بتانا چاہتی تھی کہ مجھے نازو کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ کہاں ہے۔ تم مجھے دلاور کے بارے میں بتادو کہ اسے کہاں رکھا گیا ہے کیونکہ تم نے ہی اسے گرفتار کرایا تھا۔ تم وہیں موجود تھے اور تم پولیس کے ساتھ ہی روانہ ہوئے تھے۔"

"مگر ہم نہیں جانتے۔"

"دلاور کی بیوی نہیں جانتی کہ ہم نہیں جانتے۔ ہم کہہ سکتے تھے کہ ہاں ہمیں علم ہے اور صورتِ حال سے فائدہ اٹھاسکتے تھے۔ دلاور کی بیوی کو خوب EXPLOIT کرسکتے تھے۔ وہ بتادیتی کہ نازو کہاں ہے۔"

"وہ اتنی بے وقوف نہیں ہے۔"

"معلومات کا تبادلہ کرنے کے بہانے اس سے ملاقات کرنے میں کیا نقصان تھا۔ وہ اپنی شرائط رکھتی۔ ہم اپنی شرائط رکھتے۔ کیا پتا اس سے کوئی کام کی بات اُگلوا لیتے۔ پیچھے مڑ مڑ کے مت دیکھو۔ ان کی گاڑی ہمارا تعاقب کررہی ہے۔"

"ہم دلاور کی بیوی سے دوبارہ خود رابطہ کرسکتے ہیں۔"

"منظر نے ایک بات کی جو قابل غور ہے۔ دلاور کی بیوی اگر یہ کہتی ہے کہ مجھے معلوم ہے نازو کہاں ہے تو سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا نازو اس کے گھر میں ہے؟ اپنے گھر میں تو وہ خود بھی نہیں ہے۔ وہ شوکت رانا کے ڈر سے بچوں کے ساتھ روپوشی کی زندگی گزار رہی تھی۔ اگر پھر بھی اسے دعویٰ ہے کہ وہ نازو کے بارے میں جانتی ہے اور دھمکی دیتی ہے کہ اس کی لاش ارسال کردی جائے گی تو غور طلب بات یہ ہے کہ نازو کہاں ہوسکتی ہے کیا وہیں جہاں پہلے تھی؟"

"یعنی وزیر خان ٹرسٹ اسپتال میں؟"

"وہ ان کا تھانہ ہے جہاں وہ سب کا دماغ درست کردیتے ہیں۔ غالب کا کردیا۔ کیا پتا نازو کا ابھی تک نہ ہوا ہو۔"

"رائٹ..... یہ ہوسکتا ہے۔ اس امکان کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ ہم آج ہی چیک کریں گے۔"

"بالکل۔ ہم آج رات ہی خود ملاحظہ فرمائیں گے۔ ہم وقت ضائع نہیں کرسکتے۔"

"وقت ہے کہاں ضائع کرنے کے لئے۔"

"اس کے باوجود آپ نے یہ دو بلائیں پیچھے لگالیں۔"

"یہ بھی ضروری تھا۔" میں نے کہا "میری چھٹی حس کہتی ہے کہ یہ وقت ضائع نہیں ہوگا۔ کوئی بات ہے جو مجھے یاد نہیں آرہی ہے لیکن اہم ہے۔"

محسن نے کہا "میری ساتویں حس کہتی ہے کہ آپ کی عقل گھاس کھا گئی ہے۔"

میں نے اپنی گاڑی مال پر "لا روز" کے باہر کھڑی کی اور کچھ فاصلے پر انہیں کار پارک کرتے دیکھا۔ روشن آرا عرف روشی نسبتاً سنجیدہ مزاج اور کم شوخ تھی۔ اس کے لباس کا انتخاب بھی کم عامیانہ تھا مگر مہرالنساء عرف میری مزاج اور لباس کے معاملے میں حد سے زیادہ فرنچ بن گئی تھی۔ اس کے انداز و اطوار میں بھی اتنی بے تکلفی تھی کہ جب ہر نظر ہماری طرف اٹھی تو مجھے پسینہ آگیا۔ ایسے میں کوئی جاننے والا مجھے دیکھ لیتا تو میری ساکھ بہت متاثر ہوتی۔ رابعہ دیکھتی تو اس کا دل ٹوٹ جاتا اور مولوی خادم حسین دیکھتا تو اسے دل کا دورہ پڑجاتا۔

روشی خودبخود محسن کے ساتھ نتھی ہوگئی تھی لیکن وہ اتنا پریشان نہیں تھا۔ مینیو دیکھ کے بھی میری نے برا سا منہ بنایا اور مجھ سے بہت سے فضول سوالات کئے مثلاً یہ کہ کیا یہاں شمپئن نہیں ملے گی۔ مجھے اس کو یاد دلانا پڑا کہ وہ لندن میں نہیں لاہور میں ہے۔

آہستہ آہستہ باتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ میں بہت محتاط تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ لندن میں میرا قیام کہاں کہاں تھا اور میرے حلقۂ احباب میں کون لوگ تھے۔ ان میں لڑکیاں کتنی تھیں اور کیسی تھیں اور میں صرف ڈیٹ لیتا رہا یا کبھی کسی کے بارے میں سیریس ہوا؟ میں نے عمداً الزبتھ کے ذکر سے گریز کیا جو ایک متعصب انگریز

لارڈ کی نور نظر تھی۔ اگر وہ کمینہ اور کالوں سے نفرت کرنے والا لارڈ میرا دشمن نہ ہوتا تو شاید مجھے اتنی بے عزتی کے ساتھ ڈی پورٹ نہ کیا جاتا۔ میں الزبتھ سے شادی کرلیتا اور لندن میں خوش و خرم رہتا۔ وہ بلاشبہ محبت کرنے والی لڑکی تھی اور اس کی محبت میں بھی مشرق کی روایتی وفا کا انداز شامل تھا۔

میں نے ایک آہ بھری۔ یادِ ماضی عذاب ہے یارب۔ میں پرانی یادوں میں کھو گیا تھا اور اب میری مجھے اپنے بارے میں بتا رہی تھی۔ میں بہت کم سن رہا تھا کیونکہ اس کی گفتگو کا محور اس کی اپنی ذات تھی اور وہ ثابت کرنا چاہتی تھی کہ لندن کا سارا حُسن اسی کے دم سے تھا اور اب وہ لندن میں نہیں ہے تو لندن کیا اور گوجر خان کیا۔ ایک طویل فہرست ان عشاق کی تھی جو خودکشی کرنا چاہتے تھے مگر وہ کسی کو مایوس کرنے کی قائل نہیں۔

الو کی پٹھی۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ کاش اس وقت میری جگہ ہوتا مولوی خادم حسین تو بھول جاتی ساری الف لیلہ۔ اچانک اس نے ایک نام لیا تو میں چونکا۔

"کیتھرین۔ کون کیتھرین؟" میں نے کہا۔

وہ ہنسی "جب اس کا قتل ہوا تو وہ کیتھرین خان تھی۔ خان دی کارپینٹر۔"

میں نے کہا "کارپینٹر سے اس کی ایک بیٹی تھی؟"

"لیں وہ ڈاکٹر تھی۔ البرٹ وکٹر ہوسپٹل میں لیکن میری اس سے کبھی نہیں بنی۔ وہ خود کو پتا نہیں کیا سمجھتی تھی۔ کسی سے سیدھے منہ بات نہیں کرتی تھی۔ ویری ریزرو ٹائپ۔"

"یہ کیتھرین خان۔" میں نے کہا "کیا کرتی تھی؟"

"وہ ہمارے گھر میں ملازمہ تھی۔" اس نے بڑے غرور سے کہا "اس کا آخری شوہر ہمارا شوفر تھا۔ ایک نیگرو تھا۔"

آہستہ آہستہ بات میری سمجھ میں آنے لگی۔ میری بھی اسی اسکول میں پڑھتی تھی جس میں الزبتھ۔ کیتھرین کا شوہر اسے لینے آتا تھا۔ جو گاڑی الزبتھ کے لئے آتی تھی اس کا شوفر بھی نیگرو تھا۔ وہ دونوں دوست تھے اور اسکول کے باہر ایک ساتھ کھڑے باتیں کرتے رہتے تھے۔ میں وہاں الزبتھ کو دیکھنے اور اسے اشارے کرکے یہ بتانے کے لئے کھڑا ہوتا تھا کہ رات کو ہماری ملاقات کہاں اور کتنے بجے ہوگی۔ یہ اشاروں کی زبان خود ہم نے ایجاد کی تھی جسے اس کا بدتمیز شوفر نہیں سمجھ سکتا تھا۔ اسے سخت ہدایت تھی کہ الزبتھ کو اسکول کے باہر کسی سے نہ ملنے دے۔ خصوصاً کسی ایشیائی سے۔

میری کو میں نے اکثر الزبتھ کے ساتھ اسکول سے باہر آتے دیکھا تھا۔ وہ ایک ساتھ اس لئے آتی تھیں کہ ان کی گاڑیاں ساتھ ساتھ کھڑی ہوتی تھیں اور شوفر ایک ہی جگہ انتظار کرتے تھے۔ مجھے یہ بھی یاد آگیا کہ الزبتھ لمبی چوڑی چم چم کرتی سیاہ کیڈلک میں جاتی تھی اور میری ایک عام ہلمین کار میں۔

میں نے اس کی بات کاٹ دی "تمہاری خادمہ کو اس کے شوہر نے قتل کیا تھا اور غلطی سے اپنی گرل فرینڈ کو بھی مار دیا تھا۔"

"ہاں وہ اس کی سوتیلی بیٹی کو مارنا چاہتا تھا کاؤنٹی جیل میں ہے وہ۔" میری نے بتایا۔

"یہ ڈبل مرڈر کیس تھا۔" میں نے کہا "میں نے اخبار میں پڑھا تھا۔ کیا نام تھا تمہارے اس شوفر کا؟"

"اینڈریو ا۔۔۔ میں ایک بار پاپا کے ساتھ اس سے ملنے گئی تھی۔ وہ کہتا تھا کہ وہ بے قصور ہے۔ قتل کسی اور نے کیا تھا لیکن ایسا تو سب ہی کہتے ہیں۔"

میں نے کہا "نہیں میری۔ وہ ٹھیک کہتا تھا۔"

"کمال ہے۔ پاپا بھی یہی کہتے تھے۔ ا۔۔۔ کا کیس لڑنے کے اخراجات بھی انہوں نے برداشت کئے تھے مگر انہیں افسوس تھا کہ وہ اسے بچا نہیں سکے۔"

"میری میں تمہارے پاپا سے ملنا چاہتا ہوں۔"

خوشی سے اس کا چہرہ دمکنے لگا "اوہ ریئلی۔ کیا کہو گے تم ان سے؟"

"یہ میں ابھی تم کو نہیں بتا سکتا؟" میں نے دل ہی دل میں اس نادان لڑکی کی غلط فہمی پر افسوس کیا جو سمجھ رہی تھی کہ شاید اتنی جلدی میں اس کے باپ سے ملنا چاہتا ہوں تو اس کا ہاتھ مانگنے کے لئے۔

"پاپا کراچی گئے ہوئے ہیں؟" اس نے کہا "اگلے ہفتے۔۔۔ آجائیں گے پھر ہم واپس چلے جائیں گے۔ تم کب آؤ گے؟"

میں نے کہا "میری۔ تمہارے پاپا سے مجھے آج ہی بات۔۔۔ تو؟"

"ان کا فون نمبر ہے لیکن اتنے بے تاب کیوں ہو تم۔" وہ ہنسی۔

"پلیز مجھے نمبر بتاؤ۔"

"نمبر ایک ہوٹل کا ہے۔ کراچی کے میٹروپول میں سوئٹ نمبر ایک سو ایک۔ اے کیو ڈسکوی۔" وہ تقریباً مجھ سے چمٹ کے بولی۔

"خدا کے لئے میری۔ ہوش میں رہو۔ لوگ دیکھ رہے ہیں۔"

"دیکھنے دو۔ میں صرف تمہیں دیکھ رہی ہوں۔ تم صرف مجھے دیکھو اور بس۔ ناؤ آئی وانٹ ٹو کس یو۔ مجھے کسی کی پروا نہیں۔"

میں فوراً اٹھ کھڑا ہوا "ویٹر۔" میں نے چٹکی بجائی۔

روشی نے اپنی بہن کو گھورا "آج بغیر پئے یہ کیسا نشہ ہے؟"

"یہ محبت کا نشہ ہے روشی۔ تم کیا جانو۔" وہ بولی۔

"میں جانتی ہوں۔ یہ نشہ چڑھتا اترتا رہتا ہے بدلتے موسموں کی طرح۔" روشی نے کہا "ناؤ بی ہیو یور سیلف۔"

"شٹ اپ۔ کیا میں تمہارے درمیان حائل ہو رہی ہوں۔ مائنڈ یور اون بزنس روشی۔"

میں نے کہا "میری۔ میں شاید کل خود تمہارے پاپا سے ملنے

کراچی چلا جاؤں۔" میں نے کہا "یہ معاملہ بہت اہم ہے۔"

"اوہ ڈیئر۔ یو آر سو سوئٹ۔ تم بالکل پاگل ہو گئے ہو۔ ایک ہفتہ بھی انتظار نہیں کر سکتے۔" وہ خوشی کے مارے آپے سے باہر ہونے لگی "کیا حرج ہے اگر میں بھی تمہارے ساتھ چلوں۔ میں خود ملوادوں گی تمہیں پاپا سے۔ وہ بہت لبرل ہیں۔ ممی کی طرح پرانے خیالات نہیں رکھتے۔ وہ بہت خوش ہوں گے اور اس کے علاوہ پاپا سے ہم دو چار دن بعد بھی مل سکتے ہیں۔ دو چار دن ہم اکیلے رہ سکتے ہیں کہیں بھی۔ بڑے اچھے ہوٹل ہیں کراچی میں اور بڑے اچھے ساحل ہیں۔ بڑا مزہ آئے گا۔ وی شل ہیو اے منی ہنی مون بی فور دی ریئل ون۔" اس نے مجھے آنکھ ماری۔

میں بری طرح پھنس گیا تھا۔ روشی کو میری کا رویہ پسند نہیں تھا اور محسن اس صورت حال سے مزہ لے رہا تھا۔ اگر میں اس آوارہ مزاج بلکہ فاحشہ لڑکی سے کہتا کہ وہ غلط سمجھ رہی ہے اور اس کی غلط فہمی رفع کرنے کی کوشش کرتا تو مایوسی' احساسِ ذلت اور غصے میں اس کا طوفانی ردِ عمل نہ جانے کتنا رُسوا کن ہو جاتا۔

"اب تم جاؤ۔" میں نے باہر آکے اسے گاڑی میں بٹھایا لیکن اس نے بیٹھتے بیٹھتے بھی میرا منہ چوم لیا اور میں نے گھبرا کے ادھر اُدھر دیکھا مگر سائیڈ میں ہونے کی وجہ سے یہ سنسنی خیز منظر کسی نے دیکھا نہیں تھا۔

"کل ملو گے؟"

"شاید۔ میں نے بتایا نا کہ مجھے کراچی جانا ہوگا۔ میں کال کروں گا تمہیں مگر دیکھو۔ ابھی تم اپنے پاپا کو کچھ مت بتانا۔"

"تم مجھے ساتھ لے جاتے۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔ یہاں تمہاری اولڈ فیشن چاچی ہے۔"

"اب تو میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہہ سکتی ہوں کہ جہنم میں جا منحوس بُڑھیا۔ میں جا رہی ہوں۔"

"کہاں جہنم میں؟" روشی نے کہا۔

میری کھلکھلا کے ہنس پڑی "اپنی جنت میں۔ آخر کار۔"

"کتنی بار آباد کر چکی ہو تم اپنی خیالی جنتیں اور کتنی بار کرو گی۔ ہر خواب کو حقیقت کیوں سمجھ لیتی ہو بے وقوف۔" روشی نے کہا۔

"تم جلتی ہو مجھ سے۔ تمہاری زبان کالی ہے۔ او کے ڈارلنگ۔ سی یو۔ بائی۔" اس نے گاڑی چلاتے ہوئے میری طرف مسلسل ہوائی بوسے پھینکے۔

میں نے ایک گہری سانس لی "اف۔ یہ کس عذاب میں پڑ گیا تھا میں۔ توبہ میرے باپ کی بھی توبہ۔"

محسن نے میرے مُکا رسید کیا "اب توبہ سے فائدہ۔ اُلو کے پٹھے۔۔۔ وقار کے گھر چکر لگانا شروع کر دے گی اور نکی کو خود۔۔۔"

میں۔۔۔ "میں ادھر لوٹ کر نہیں آؤں گا۔ جب تک یہ ولایتی بلا دفع نہیں ہو جاتی۔"

"اس سے کیا ہوگا۔ رابعہ کو معلوم ہو جائے گا۔"

"اسے میں ابھی جا کے سب بتاتا ہوں۔ چھپانے کا سوال پیدا نہیں ہوتا لیکن کچھ مناظر میں سنسر کردوں گا۔ میرے پیارے دوست۔ جھوٹے ہی سہی مگر عورت کی آنکھ ایسے مناظر نہیں دیکھ سکتی۔ جو وہاں سب دیکھ رہے تھے۔"

"میں یہ ٹوٹے نکال سکتا ہوں۔ بشرطیکہ آپ اسٹوری میں سے روشی کو خارج کردیں۔ کل مجھے خنجر گھونپ دے گی یا طمنچہ چلا دے گی۔ اندر سے وہ ناگ منی ہے اب بھی۔ کوئی اس کے حق پر ڈاکا ڈالے۔ یہ برداشت کرنا اس کے لئے ناممکن ہے۔"

ہم نے ہاتھ ملائے اور ماڈل ٹاؤن جاتے ہوئے ایک ایسی کہانی پر متفق ہوگئے جو خاصی بے ضرر اور پاکیزہ تھی۔ ہم نے نظریۂ ضرورت کا جواز بھی سامنے رکھا تاکہ ثابت ہو جائے کہ ہم نے ایک مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے ایسا کیا تھا اور کامیابی حاصل کی تھی۔

رات کے گیارہ بجے ماڈل ٹاؤن کی سڑکوں پر خاموشی اور سکون تھا۔ یہاں آکے ہمیشہ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میدان کارزار کے اعصاب شکن پُرخطر اور اجل گزیدہ ماحول سے بچ کے میں اپنے شہر کی دوست دار فضا کے محفوظ حصار میں داخل ہو گیا ہوں۔ یہاں کے شجر حجر۔ راستے اور موڑ۔ دکانیں اور گھر۔ دیوار و در یہاں تک کہ ہوائی خوشبو اور آسمان کی وسعت' دن کی نیلاہٹ اور رات کے ستاروں سمیت میرے اپنے اور بچپن کے جانے پہچانے ہوئے تھے۔ گھروں میں پہلے کی طرح بند دریچوں کے پیچھے روشنیاں تھیں۔ ایک گھر اور خاندان کے رشتوں کے حصار میں مطمئن رہنے والے اکٹھے بیٹھ کے ٹی وی دیکھ رہے تھے یا مونگ پھلی کھا رہے تھے یا آنے والی عید پر بننے والے نئے کپڑوں کا حساب کر رہے تھے یا لڑ رہے تھے یا روٹھ کر منا رہے تھے۔ خوب صورت زندگی کے یہ سارے عکس ان کے اپنے تھے۔

وزیر خان مرحوم کی کوٹھی کے گیٹ کی ایک لائٹ جل رہی تھی۔ میں نے اندر داخل ہو کے ویران پڑے ہوئے لان کو دیکھا۔ اس کی ہریالی باقی نہیں رہی تھی۔ پہلے باقاعدگی سے تراشی جانے والی گھاس بے ترتیبی سے بڑھ گئی تھی۔ بدرنگ کرسیوں پر لگی ہوئی رنگین چھتری بھی پھٹ گئی تھی۔ باغ کے پھول اور ان کے سارے رنگ خزاں سے پہلے ہی عدم توجہی کی نذر ہو گئے تھے۔ میں نے شرمندگی سے کہا بس اور کچھ دن۔ فرصت کشاکشِ غمِ دوراں سے گر ملے تو میں سیدھا یہاں آؤں گا اور سب کچھ ویسے ہی ہوگا جیسا کہ تھا۔

گھر میں فرنیچر تو پہلے ہی بدل دیا گیا تھا۔ وزیر خان مرحوم کے پرانے کمرے کو اصلی حالت میں رکھنے کی خواہش اس لئے پوری نہ ہو سکی تھی کہ درمیان میں مالک بدل گئے تھے۔ میرے اپنے کمرے کی ہر چیز نئی تھی جہاں پرانی ڈیسک ٹاپ میز تھی وہاں جدید وضع کی

بہت خوب صورت اور قیمتی رائٹنگ ٹیبل آگئی تھی۔ چنیوٹی بیڈ کی جگہ بری ٹیک ووڈ کا فارمیکا والا بیڈ لگا ہوا تھا۔

رابعہ اور گل کے ساتھ نکی نے بھی جھاڑ پونچھ کی مہم میں بھرپور حصہ لیا تھا اور مارگریٹ کو دن بھر میں ہم سب کے خاندانی اور جذباتی معاملات کے بارے میں مفصل معلومات حاصل ہوگئی تھیں۔ اس کو حسبِ توفیق سب نے ہی بریفنگ دی تھی۔

حیرت اور خوشی مجھے یہ جان کر ہوئی کہ اس گھر میں پہنچتے ہی غالب کی حالت میں بڑی خوشگوار تبدیلی آئی تھی۔ وہ اکیلا سارے گھر میں پھرتا رہا تھا اور اس نے رابعہ سے بہت سے سوالات ایسے کئے تھے جس کا تعلق میرے ماضی سے تھا۔

"اس وقت وہ کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

"اوپر چھت پر ٹہل رہا ہے۔ کچھ دیر پہلے باہر نکل گیا تھا۔ ہم بہت پریشان ہوئے مگر مولوی خادم حسین نے اسے تلاش کرلیا۔ وہ نواب خسرو جمشید کی پرانی کوٹھی کے سامنے کھڑا تھا۔"

میں نے کہا "وہ تو جل کے کھنڈر ہوگئی تھی۔"

"اب وہاں ایک بالکل نئی وضع کی کوٹھی بن چکی ہے۔ غالب نے مولوی خادم حسین کو بتایا کہ یہاں ایک نواب صاحب رہتے تھے مگر وہ ایک نہیں دو تھے۔ ایک جیسے دو۔ خادم حسین اس سے ہمزاد کے مسئلے پر بحث کرتا رہا اور وہ سمجھاتا رہا کہ نہ وہ ہمزاد تھے اور نہ جڑواں بھائی۔ بس وہ ایک نہیں دو تھے۔ بالکل ایک جیسی۔ بڑی بڑی مونچھیں۔ سیاہ شیروانی۔ سر پر کلف لگے شملے والی سفید پگڑی۔"

"بالکل ٹھیک بتا رہا تھا وہ۔"

"ایک مزے کی بات سنو۔ نواب خسرو کے محل میں اس کے باپ اور دادا کی قبریں تھیں۔ ایک گوشے میں۔"

"ہاں۔ ان پر گنبد والی چھت تھی۔ سنگ مرمر کا سارا کام تھا۔"

رابعہ نے کہا "اب وہ مزار شریف بن گیا ہے۔ کسی نے موقع پا کے قبضہ کرلیا اور مجاور بن بیٹھا۔ ساتھ ہی مسجد بنا کے جگہ گھیرلی۔ عرس کرنے لگا اور ہر جمعرات کو قوالی۔ کتبہ تک بدل ڈالا ہے اس نے۔ جاہلوں کی کمی نہیں۔ اب اچھی خاصی دکانداری ہے۔"

"یہاں کے پرانے رہنے والوں نے روکا نہیں؟"

"یہی تو خرابی ہے۔ لوگ برائی ہوتی دیکھتے رہتے ہیں اور بولتے نہیں کہ ہمیں کیا ضرورت ہے۔ جس کی جگہ ہے اسے اعتراض نہیں تو ہم کیوں بلاوجہ پھڈے میں پڑ کے وقت ضائع کریں۔"

محسن نے کہا "تم باتیں ہی کرو گی۔ کھانے کو نہیں پوچھو گی۔"

گل نے کہا "زیادہ بننے کی ضرورت نہیں۔ تم کھا کے آئے ہو۔ کسی کے ساتھ گئے تھے۔ بلکہ کسی کو ساتھ لے گئے تھے۔"

میں نے محسن کی طرف دیکھا "اگر اس وقت زمین پھٹ جائے تو میں شرم سے سما جاؤں مگر بڑا مضبوط فرش ہے۔"

"اسے جوانی کی لغزش سمجھ کے بھول جاؤ دوست۔" محسن بولا "اور تم بھی یہ سمجھو گل کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ شام کا بھولا رات کو گھر آجائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔"

"ہاں۔ اسے بدمعاش آوارہ اور ہرجائی کہتے ہیں۔" گل نے آستین چڑھائی۔

رابعہ نے کہا "ولایتی عادتیں چھٹی نہیں ہیں ابھی تک۔"

میں نے کہا "کیا کہہ رہی ہو تم؟"

"وہی جو نکی نے ہمیں بتایا ہے۔" گل نے کہا "زیادہ ایکٹنگ مت کرو۔"

میں نے کہا "یہ نکی ہے بڑی مصیبت۔ ڈبل گیم کھیلتی ہے۔ پہلے ہمیں ان سے ملوایا کہ میری سہیلیاں ہیں۔ لندن سے آئی ہیں اور بہت بور ہو رہی ہیں۔ ان کو ذرا گھما لاؤ پلیز۔ میری خاطر۔ ڈنر پر لے جاؤ۔"

"یہ نکی نے کہا؟" گل شک میں پڑ گئی۔

رابعہ نے کہا "گل۔ بڑے ڈھیٹ لوگ ہیں یہ۔ جھوٹ پر جھوٹ بول رہے ہیں۔"

ظاہر ہے اس کے بعد ہم نے ان کو وہ سب بتا دیا جو سچ تھا مگر طے شدہ پالیسی کے مطابق بے حیائی کے مناظر سنسر کردیے اور شرمناک سین کاٹ دیے۔ مخرب اخلاق گفتگو بھی حذف کردی۔ ساری ملاقات ایک پاکیزہ ماحول اور شریفانہ گفتگو تک محدود رہی۔

"میں نے تو اسے دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اسمتھ ان کا شوفر تھا۔" میں نے کہا۔

"اسمتھ کون؟"

"وہی نیگرو جو اپنی بیوی اور گرل فرینڈ کو قتل کرنے کے دہرے جرم میں طویل قید کاٹ رہا ہے۔ ہمارا سب سے اہم گواہ۔ جو اصل قاتل کی حیثیت سے دلاور کو پہچانے گا۔"

رابعہ نے کہا "حد ہوگئی۔ پتا نہیں میرا ذہن ادھر کیوں نہیں گیا۔"

"تمہارا ذہن شک اور حسد کی تمازت سے بخار میں مبتلا ہے۔" محسن بولا۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔" گل نے کہا "ہم تھوڑی سی تفریح لے رہے تھے۔"

میں نے کہا "یہ مہرالنسا عرف میری آج کل وقار کے پڑوس میں اپنی چچی کے ساتھ مقیم ہے۔ وہ الزبتھ کے ساتھ پڑھتی تھی۔"

"کوئین الزبتھ یا الزبتھ ٹیلر؟ یہ بھی وضاحت کردو۔"

"رابعہ جانتی ہے اسے۔ میں سب بتا چکا ہوں۔" میں نے کہا "میری نے بھی مجھے پہچان لیا تھا۔ باتوں باتوں میں اسمتھ کا ذکر آیا اور مجھے پتا چلا کہ یہ وہی اینڈریو اسمتھ ہے۔ شیلی کی ماں کا تیسرا شوہر۔ تو یہ ضروری ہوگیا کہ میں اور معلومات حاصل کروں۔ اتفاق کہو یا دلاور کی شامت اعمال۔ میری کی فیملی پاکستان آئی ہوئی ہے عرف میری کو شدید غلط فہمی ہوگئی ہے۔"

"کیسی غلط فہمی۔ تم نے کی ہوگی ایسی بات۔" رابعہ بولی۔

"ہاں چور چوری سے جائے۔ ہیرا پھیری سے کیسے جائے۔" گل نے کہا۔

"گل بانو۔ کیا دوبارہ کبھی تمہارے دل میں خیال آیا ناگ منی بننے کا۔ یا ڈاکا ڈالنے کا۔ نہیں تو پھر ایسی بات کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"یہ سچ نہیں ہے تو کڑوا کیوں لگ رہا ہے؟" رابعہ ہنسی۔

"وہ لڑکی احمق ہے۔ تم خود مل کے اندازہ کرلینا۔" میں نے کہا "میں نے کہا کہ مجھے اس کے باپ سے ملنا ہے تو وہ سمجھی کہ میں اس کا رشتہ مانگنا چاہتا ہوں۔ اہم اور پرائیویٹ بات کا اس نے یہ مطلب نکالا تو میں کیا کروں۔"

"تم اسے بتا سکتے تھے کہ میں منگنی شدہ ہوں۔" محسن نے کہا۔

میں نے اسے گھورا "نہ میں منگنی شدہ ہوں اور نہ تمہاری طرح شادی شدہ۔ تم نے کیوں نہیں بتا دیا تھا روشی کو۔"

"وہ..... دراصل۔ یہ غلطی واقعی ہوئی ہم سے۔" محسن نے سر کھجا کے کہا "بندہ بشر خطا کا پتلا ہے۔ اور وہ تھی خطا کی پتلی۔ لیکن اصل چیز ہے نیت اور وہ بالکل صاف تھی۔"

میں نے کہا "اب مجھے اپنا یہ فرنچ وکیل کا رول ختم کرنا پڑے گا۔ ورنہ اس کا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ وقار کے گھر تو خیر اب میں جا ہی نہیں سکتا۔ وہاں وقار کو اور نکی کو سمجھانا پڑے گا کہ اسے کچھ نہ بتائیں۔"

"کچھ تو بتانا پڑے گا۔"

"میں کراچی سے واپس آجاؤں پھر بتایا جا سکتا ہے کہ وہ تو فراڈ تھا کوئی اور اس نے جو بھی کہا سب جھوٹ کہا۔ ایک دوست کے حوالے سے یہاں آیا تھا مگر وہ دوست لندن میں ہے۔ اس کا پتا نہیں معلوم۔ ایسی ہی کوئی بات کرکے اسے ٹالنا ہوگا۔ میں یہاں رہتے ہوئے بھی غائب ہوجاؤں گا اور تم فرنچ وکیل کے بارے میں کہہ سکتی ہو کہ تفتیش مکمل ہوگئی۔ قاتل گرفتار ہوگیا اس لئے وہ واپس چلا گیا۔ اب اینڈریو اسمتھ کے ساتھ آئے گا۔ اگر ضروری ہوا۔ ورنہ دلاور سے نمٹنے کے لئے ہم کافی ہیں۔ میرا وجود پھر کراچی میں ثابت ہوجائے گا۔ میں سکندر بخت کے نام سے میٹروپول میں قیام کروں گا اور وہیں سے ایس ایس پی صدیقی کو فون کروں گا۔ کال ٹریس ہوجائے گی۔ پولیس کے آنے سے پہلے میں ائرپورٹ روانہ ہوجاؤں گا۔ ریکارڈ سے مسٹر اے کیو ڈسکوی اور منیجر وغیرہ کے بیان سے ثبوت بھی مل جائے گا کہ وہ خاکسار یہی تھا۔ فہوالمطلوب۔"

"عربی میں کچھ فرمایا آپ نے....."

"اس کا مطلب ہے۔ یہی چاہئے۔" میں نے کہا۔

اور بہت جلد واپس جا رہی ہے۔ میں نے بہتر سمجھا کہ باقی بات اس کے باپ سے کروں۔ مسٹر اے کیو ڈسکوی۔"

"تم جانتے ہو میری کے باپ کو؟"

"نہیں۔ میری اس سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی لیکن میری نے بتایا کہ وہ بھی اسمتھ کو بے گناہ سمجھتے تھے اور اس کے مقدمے میں قانونی اخراجات بھی انہوں نے ہی برداشت کئے تھے لیکن انہیں افسوس ہے کہ وہ اسمتھ کو نہیں بچا سکے تھے۔ میں نے میری سے پوچھا تو پتا چلا کہ وہ کراچی میں ہیں اور مزید ایک ہفتہ وہیں رہیں گے۔ ان کا قیام ہے سوئٹ نمبر ایک سو ایک۔ ہوٹل میٹروپول میں۔"

"تم ان سے فون پر بات کرلو۔"

"فون پر اتنی لمبی بات نہیں ہوسکتی اور ایسا کرنا ٹھیک بھی نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ جب وہ واپس لندن جائیں تو دلاور کی تازہ ترین تصویر ان کے پاس ہو۔ وہ کاؤنٹی جیل جا کے اینڈریو اسمتھ سے ملیں اور اسے یہ تصویر دکھائیں۔ امید ہے وہ چوہدری دلاور کو پہچان جائے گا۔ مسٹر اے کیو ڈسکوی بتادیں گے کہ یہ ہے اصل قاتل۔ وہ اپنی سوتیلی ماں اور سوتیلی بہن کو قتل کرنے آیا تھا۔ ماں تو مرگئی مگر بہن کی جگہ غلطی سے اس کے شوہر کی ایک گرل فرینڈ کا قتل ہوگیا جو فلیٹ میں موجود تھی۔ اس گرل فرینڈ کے مسئلے پر ہی شیلی کی ماں اور اس کے نیگرو شوہر میں زبردست جنگ چل رہی تھی۔ ایسے میں دلاور نے پہنچ کے فائرنگ کی۔ نیگرو نے چھپ کے جان بچالی مگر اس کی بیوی ماری گئی اور شیلی کی غلط فہمی میں گرل فرینڈ۔ نیگرو اینڈریو اسمتھ نے قاتل کو اچھی طرح دیکھا تھا مگر وہ بھاگ گیا اور پکڑا گیا اسمتھ۔ آس پاس والوں نے گواہی دی کہ وہاں سے بہت چیخنے چلانے کی آوازیں آرہی تھیں پھر دو فائر ہوئے اور اسمتھ پکڑا گیا آلۂ قتل سمیت۔ مگر اس پر انگلیوں کے نشان اسمتھ کے نہیں تھے۔ یہ فرض کیا گیا کہ اس نے دستانے پہن رکھے ہوں گے اور ایک متعصب جیوری نے اسے شک کا فائدہ دیتے ہوئے چودہ سال قید کی سزا سنادی۔ کسی نے اس کی نہیں سنی کہ قاتل کوئی اور تھا۔ وہ کیسے بتاتا کہ قاتل کون تھا لیکن تصویر دیکھنے کے بعد وہ پہچان جائے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ جب اسے یہاں گواہی کے لئے بلایا جائے تو وہ پورے یقین کے ساتھ چوہدری دلاور کو شناخت کرے۔ اس نے دلاور کی ایک جھلک دیکھی تھی ذرا سی دیر کے لئے۔ وہ بھی انتہائی بدحواسی اور دہشت کے عالم میں۔ اب وہ تصویر کو اچھی طرح دیکھ لے۔ یہ تصویر اسے صرف مسٹر اے کیو ڈسکوی دکھا سکتے ہیں۔"

"یہ اے کیو کیا بات ہوئی۔ اور ڈسکوی؟"

میں نے کہا "بھئی عبدالقیوم یا عبدالقادر ہوگا۔ ڈسکہ ایک تحصیل ہے۔ سیالکوٹ میں۔ بڑی مشکل یہ ہے رابعہ ڈیئر کہ مہرالنسا"

رابعہ اپنی اور منظر کی ... بارے میں بتارہی تھی کہ میری آنکھوں نے ایک بھیانک منظر دیکھا۔ باہر کال بیل بجی تھی اور اس سے پہلے کہ مولوی خادم حسین دروازہ کھولنے جاتا کوئی چیز کچن سے نکلی اور اس نے بڑے جارحانہ لہجے میں کہا "میں دیکھتی ہوں جاکے۔ آدھی رات کو آخر کون آیا ہے نامراد۔"

"یہ.... خادم حسین کی گھروالی۔" میں نے کہا "یہ یہاں....."

رابعہ ہنسی "اب یہ یہیں رہے گی ہمارے ساتھ۔ یہ کچن کی انچارج ہے اور پوری طرح بااختیار ہاؤس میڈ۔ اس کا ماتحت اور معاون ہے مولوی خادم حسین۔"

"اف... یک نہ شد دو شد۔ یہ بلا یہاں کیوں نازل ہوگئی اور اس کی تقرری کس نے کردی کچن انچارج کے طور پر۔"

"میں نے۔ کھانا بہترین پکاتی ہے۔ بہترین ایڈمنسٹریٹر ہے۔ اس کے ہوتے کسی کو کوئی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔"

میں نے کہا "مگر یہ خود مجموعہ افکار ہے۔ ایک نیام میں دو تلواریں رہ سکتی ہیں مگر اس گھر میں مولوی خادم حسین۔ اس کی گھر والی اور مارگریٹ۔ اف۔ میری آنکھیں صرف خانہ جنگی کے مناظر دیکھ رہی ہیں۔ میرے کان ابھی سے جنگ و جدل کی گھن گرج سن رہے ہیں۔"

خادم حسین کی بیوی اندر آئی تو غصے میں تھی "تھا وہ کمینہ چوکیدار، کہتا ہے میں رات بھر گشت کرتا ہوں۔ سب پیسے دیتے ہیں۔ میں نے کہا کہ ابھی ہمیں آئے ہوئے ایک دن نہیں ہوا اور تو ... چل دفع ہو ورنہ مار مار کے بوتھا سجا دوں گی۔ خادم او خادم کہاں مرگیا۔"

خادم حسین اوپر سے دوڑتا ہوا آیا "کیا ہوا جی۔ ایسے کیوں چلا رہی ہو جیسے موت کا فرشتہ چمٹ گیا ہو۔"

"تو جو چمٹ گیا ہے میری جان کو۔ تو کم ہے کسی موت کے فرشتے سے۔ گھنٹی بجی تھی باہر۔ تو نے نہیں سنی تھی کیا؟ کان بند ہوگئے ہیں تو لا میں گرم تیل کا تڑکا لگادوں۔ مجھے جانا پڑا دروازہ کھولنے۔"

میں نے اپنا سر پکڑلیا "کیا اب ہر روز ہر وقت یہی ہوگا۔"

"دیکھو جی۔ میں پھر کہہ رہا ہوں کہ اپنے گلے کا یہ لاؤڈ اسپیکر نکلوا دو ورنہ۔" خادم حسین نے کہا۔

"ورنہ کیا۔ بول گلا دبادے گا میرا ؟"

"کٹوا دوں گا سیدھے لے جاکے یا سیمنٹ ڈال کے بند کردوں گا اگر پھر اونچی آواز میں بات کی۔" خادم حسین ایک دم شوہر بن کے گرجنے لگا "ایسے تو یہاں کے کتے بھی نہیں بھونکتے۔"

اس کی بیوی دم بخود رہ گئی۔ شاید پہلے کبھی اس نے خادم حسین کو ایسے بات کرتے نہیں سنا تھا۔ خود ہمارے لئے اس کا یہ انداز نیا تھا مگر اس سے صورت حال ایک دم بدل گئی۔ خادم حسین کی بیوی خاموشی سے کچن میں چلی گئی۔

خادم حسین نے کہا "میں اوپر غالب صاحب کے ساتھ ہوں جی۔"

"اس وقت تو خادم حسین نے لاج رکھ لی سارے شوہروں کی۔" میں نے کہا "مولوی جلال میں آگیا تھا۔"

اچانک فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے گل سے کہا "ذرا تم دیکھو۔ مگر اس سے پہلے ہی محسن اس گوشے کی طرف چلا گیا جہاں فون رکھا ہوا تھا۔"

میں نے کہا "رابعہ میں اور محسن آج رات چھاپا ماریں گے۔ صبح ہونے سے پہلے نازو کو ساتھ لے آئیں گے۔ وہ وہیں ہوگی۔ منظر ٹھیک کہتا ہے۔"

محسن نے چلا کے کہا "وقار کیا ہوا۔ بات کر ٹھیک طرح سے۔ اچھا اچھا ہم آتے ہیں۔"

میں نے پریشانی سے کہا "خیریت تو ہے!"

"وقار نے کچھ بتایا نہیں۔ سخت بدحواس تھا۔ یہی کہتا رہا کہ تم دونوں فوراً آجاؤ۔" محسن بولا "خدا خیر کرے۔"

چند منٹ کے بعد میں اور محسن وقار کے گھر کی طرف روانہ ہوچکے تھے۔ ہماری فاکس ویگن خالی سڑک پر طوفانی انداز میں گرجتی ہوئی دوڑ رہی تھی۔

"کیا واقعی اس نے کچھ نہیں بتایا تھا؟" میں نے کہا "یا خواتین کی وجہ سے؟"

"نہیں یار۔ اس نے بتایا ہی نہیں۔ ... خراب تھی اس کی۔"

وقار اپنے گھر کے گیٹ پر اکیلا کھڑا ہوا تھا۔

میں نے کہا "کیا بات ہے۔ نکی کہاں ہے؟"

"وہ اندر ہے۔ سو رہی ہے۔" وقار نے کہا "ابھی کچھ دیر پہلے کسی نے گھنٹی بجائی۔ میں باہر آیا تو... یہاں یہ رکھا تھا۔"

میں نے اس کے اشارے پر وہ تابوت دیکھا جو لان پر رکھا ہوا تھا۔

"باہر کوئی نہیں تھا۔ نہ جانے کون یہ تابوت چھوڑ گیا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے کھینچ کے اندر رکھا۔"

"کیا ہے اس میں؟"

"میں نے کھول کے نہیں دیکھا۔ تابوت میں لاش ہی ہوسکتی ہے۔ تم دیکھو۔" وقار نے کہا۔

اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔

یہ کوئی پرانا اور استعمال شدہ تابوت تھا۔ اس کی بیرونی سطح پر مٹی کا رنگ غالب تھا اور اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا تھا کہ تابوت کسی قبرستان سے کوئی قبر کھود کے نکالا گیا تھا۔

اس قسم کے تابوت مسلمان ناگزیر حالات میں استعمال کرتے ہیں۔ دیارِ غیر میں مرنے والوں کی میت وطن ارسال کرنی پڑے تو انٹرنیشنل ... قواعد و ضوابط کے مطابق لاش کو محفوظ کرانے کے مروجہ طریقے کے بعد ائر ٹائٹ تابوت میں بند کرنا ضروری ہوتا ہے ورنہ سفرِ آخرت کے لیے تو کورے لٹھے کا کفن ہی کافی ہوتا ہے۔ عیسائی لکڑی کے تابوت ہی کو کفن کہتے ہیں۔

لاہور کی عیسائی آبادی بہت کم تھی مگر وہ بھی تابوت بنواتے تھے یا خریدتے تھے۔ اس وقت مجھے یاد نہیں آرہا تھا کہ لاہور میں تابوت کہاں ملتے تھے۔ میں نے کہیں ایک دکان دیکھی ضرور تھی۔ یورپ میں مجھے ہر جگہ کفن دفن کے انتظامات کرنے والے اداروں کے اشتہار بھی نظر آتے تھے اور میں نے لندن کے takers care بھی دیکھے تھے۔ وہاں تابوت اور جنازے کی شان و شوکت سے مرنے والے کی حیثیت کا بھی تعین ہوتا تھا اور لواحقین کی اس سے محبت کا بھی۔ غریب آدمی معمولی لکڑی کے تابوت میں سپردِ خاک یا راکھ کردیا جاتا تھا۔ باقی سب استطاعت کی بات تھی۔ انتہائی قیمتی لکڑی کے منقش تابوت سیکڑوں پاؤنڈ کے بھی تھے اور ہزاروں پاؤنڈ کے بھی۔ اس کاروبار میں کیئر ٹیکرز کی چاندی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ سب کچھ ہم پر چھوڑ دیں۔ بس یہ بتادیں کہ مرنے والے کے لیے آپ کی جیب میں کتنی رقم ہے۔ اسی حساب سے تدفین کا بندوبست ہوجائے گا۔

جب محسن نے کہا "بھائی صاحب۔ کیا ہم اس تابوت سے کسی مُردے کے برآمد ہونے کا انتظار کررہے ہیں۔"

میں چونکا "مُردہ تو مُردہ ہوتا ہے۔"

"یہ مُردہ بدست زندہ کا کیس ہے۔ کون ہے اس تابوت میں آخر اور یہاں کیوں آیا ہے؟" محسن نے کہا۔

"حضور مُردہ جواب دے سکتا تو یہ شعر پڑھتا کہ

تری محفل میں اے جانِ تمنا
میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں"

وقار سخت نروس تھا "یار، آپ لوگ کیسی نان سیریس گفتگو کررہے ہیں۔ میرا حال خراب ہے وحشت سے اور وحشت سے۔"

میں نے کہا "ہاں، ہے تو خاصا ڈراؤنا سین۔ آدھی رات کے وقت ایک پُراسرار تابوت اور نامعلوم مُردہ۔"

"مُردہ دیکھا کس نے ہے ابھی۔" وقار بولا۔

"کیا مطلب۔ تم نے ایسے ہی فرض کرلیا کہ تابوت ہے تو مُردہ بھی ہوگا اس کے اندر" محسن نے کہا۔

"اگر انڈا دیکھ کے آدمی فرض کرے کہ اس میں سفیدی اور زردی بھی ہوگی، تو کیا یہ غلط ہے۔"

"یہ انڈا نہیں۔ تابوت ہے۔ کیا تم میں اتنی ہمت بھی نہیں وقار کہ کھول کے اندر جھانک سکو۔ تف ہے تم پر۔" محسن بولا۔

"ہاں۔ تف ہے مجھ پر" وقار بولا "یہ کام تم کرو ورنہ تم پر دوبار تف۔"

"... نہ ... میں نے کبھی بہادری کا دعویٰ نہیں کیا۔ میں ایک انتہائی ... شخص ہوں۔ کیوں نہ سکندرِ اعظم یہ کارنامہ سرانجام دے۔"

میں نے کہا "میں سوچ رہا ہوں کہ... اسے کھولا جائے یا ویسے ہی پولیس کو اطلاع کردی جائے۔"

محسن نے سرہلایا "ہاں۔ اس سے پہلے کہ پولیس خود آکے ہم سے پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے۔ یا مُردہ تنگ آکے ڈھکنا اٹھائے اور خود باہر آکے ہمیں ڈانٹے کہ فیصلہ کیوں نہیں کرتے۔"

میں نے تابوت کے ڈھکنے کو ایک خشک ٹہنی سے اٹھانے کی کوشش کی مگر وہ ٹوٹ گئی۔ ڈھکن بھاری تھا یا کیلوں سے جڑا ہوا تھا۔ اصل خوف جو ہم سب کے دل میں بیٹھا ہوا تھا وہ یہ نہیں تھا کہ ہم کسی قانونی الجھن میں پڑجائیں گے یا یہ مُردہ ہمارے گلے پڑجائے گا۔ خود میرے ذہن میں ایک سوال کا آسیب تھا۔ ... اس کے اندر وہ دھمکی نہ ہو جو چوہدری دلاور کی بیوی نے ... مجھ میں اس سوال کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہ تھی چنانچہ میں بھی اسے ناممکن قرار دے کے جھٹک دیتا تھا۔ نازو کو کچھ نہیں ہوسکتا۔ اس کی زندگی محفوظ ہے۔ دلاور کی بیوی نے بکواس کی تھی۔ تابوت کے اندر نازو ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ حرکت کسی نے.... مگر کس نے.... اور کیوں...؟

بالآخر میں نے اپنے خوف پر قابو پالیا اور دل کو قائل کیا کہ زندگی یا موت سب منجانب اللہ ہے اور کسی کے چاہنے یا نہ چاہنے سے حقائق تبدیل نہیں ہوسکتے۔ ہم سب راضی برضا رہنے پر مجبور ہیں اور صرف ڈرنے یا سوچتے رہنے سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔

میں نے دل کڑا کرکے کہا "محسن.... میں تابوت کھولنے لگا ہوں۔" محسن اور وقار چپ کھڑے تابوت کو گھورتے رہے۔ اب سوال ان کی صورت پر صاف نظر آتا تھا۔ ایک تاریک اور مہیب سایہ ان کے خیالوں کا عفریت بن گیا تھا جس سے وہ نظر نہیں ملاسکتے تھے۔ اندر سے ان کے وجود میں خوف منجمد ہونے لگا تھا۔

میں نے کہا "اس میں نازو بھی ہوسکتی ہے۔"

محسن نے بڑے دکھ سے مجھے دیکھا۔ اس کی خاموشی بھی فریاد بن گئی تھی ... کے لیے اتنے ظالم نہ بنو سکندر۔ ایسے الفاظ تو منہ سے مت نکالو۔ اگر ایسا ہوا تو...

تو کیا ہوگا؟ کیا ہم مرجائیں گے۔ صدمے سے ہماری حرکتِ قلب بند ہوجائے گی یا ہم ہوش سے بیگانہ ہوکے خودکشی کرلیں گے۔ یہ صدمہ ہماری جان لے لے گا۔ نہیں، ایسا نہ ہوا نہ ہوگا۔ ہم سے پہلے ہمارے پیارے اور ہمارے اپنے وجود کا حصہ بن کر رہنے والے کتنے ہی چہرے بے جان ہوئے اور پتھرائی آنکھوں سے ہم نے ان کو رزقِ خاک ہونے کے لیے اپنے ہاتھوں میں اٹھایا اور انہیں لحد میں اتار کے ان پر منوں مٹی ڈال دی۔ لیکن ہم جو یہ

سمجھتے تھے کہ اب نہ جی پائیں گے آج بھی زندگی کی بھرپور لگن اور توانائی کے ساتھ جیتے ہیں۔

تو پھر کچھ نہیں ہوگا اگر نازو بھی نہیں ہوگی اور جب تابوت کا ڈھکن اٹھایا جائے گا تو اس کا بے حس وحرکت سراپا مجسم فریاد نظر آئے گا۔ لہو پکارے گا کہ اس کا حساب لو۔ دیوانگی چلّائے گی کہ انتقام لو۔ اندر کی آگ دل کو جلائے گی۔

لیکن اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔

میں نے خود اپنی آواز سنی جو مجھے اجنبی لگی۔ "بے شک ہم سب اللہ کے لیے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔"

پھر میں نے ڈھکنا زور لگا کے اٹھایا۔ اندر کوئی یوم حشر کے انتظار میں محوِ خواب تھا۔ گیٹ لائٹ کی مدھم روشنی میں اچانک میں نے وہ چہرہ دیکھا۔ ایک پُرآسیب خوشبو کا جھونکا آیا جس نے میرے لہو کو سرد کردیا۔ معلوم نہیں وہ ایک لمحہ تھا یا ایک قیامت کی گھڑی تھی جب میں خود بھی کہیں وجود اور عدم کے درمیان کھو گیا تھا۔ میرا احساس خلا میں تھا اور میں مکمل سکوت کا ایک حصہ بن گیا تھا۔ شاید میرے دل نے دھڑکنا چھوڑ دیا تھا۔ میں سانس بھی نہیں لے رہا تھا۔ میری آنکھیں کچھ نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ سوائے اس کے جو نہیں تھا۔

کیا وہ چہرہ نازو کا نہیں تھا؟

میں نے آنکھیں مل کے دیکھا۔ نہیں، میں دیکھ سکتا ہوں۔ محسن بھی دیکھ رہا ہے۔ وقار بھی۔۔۔ یہ تو نازو ہی ہے۔ نازو کے سوا بھلا کون ہو سکتا ہے اس جیسا۔

نازو سیدھی ساکت لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں

اجل کی نیند آجاتی ہے آخر سننے والوں کو
قیامت کا اثر پاتا ہوں دنیا کی کہانی میں

وہ سو رہی تھی۔ حُسنِ معصوم خوابِ ناز میں ہے۔ کتنا سکون ہے اس کے چہرے پر۔ گناہ گار نظر کو حجاب آتا ہے۔ گیٹ لائٹ کی مدھم روشنی میں اس کا چہرہ یوں روشن ہے جیسے اس پر چاند کی کرنیں نثار ہو رہی ہوں۔ کیا نازو مر گئی ہے؟ ایسا کون کہتا ہے؟ جو کہتا ہے وہ بکواس کرتا ہے۔

میرے سامنے وقار جھکا اور اس نے نازو کا ہاتھ تھام لیا۔ نازو کی بے زبانی نے کہا "میرا ہاتھ غالب نے تھاما تھا۔ اب کہاں ہے وہ میرا دیوانہ۔ کیا اس کے دل کو ابھی تک خبر نہیں ملی۔ بے وجود ماورائی خیال کی لہروں نے اس کے احساس کو مرتعش نہیں کیا۔ کوئی جا کے اسے کہے 'نازو آگئی ہے' نازو لوٹ آئی ہے۔

وقار نے پلٹ کے کہا "یہ۔۔۔۔ یہ تو زندہ ہے۔"

ایک دھماکا ہوا۔ اس کی بازگشت فضا میں پھیل گئی جیسے ساکت پانی کی سطح پر شہابِ ثاقب گرا ہو۔ پھر آہستہ آہستہ بالکل غیر محسوس انداز میں کائنات کا سینہ دھڑکنے لگا۔ زمین و آسمان کے درمیان ہر چیز اپنے ازلی و ابدی معمول کی جانب لوٹنے لگی۔ زمین اپنے مدار پر اور محور پر گردش پزیر ہوگئی۔ میرا رکا ہوا دل پھر پورے جسم میں انگلیوں کی آخری پور تک خون پمپ کرنے میں مصروف ہوگیا۔ میری سانس چلنے لگی۔ میرے جسم کے ہر مسام سے پھوٹنے والا پسینہ یوں بہنے لگا جیسے یخ بستہ پانی سے بھرے ہوئے جگ کی بیرونی سطح پر ہوا کے بخارات کا غبار پانی کا دھارا بن جائے۔

میں نے ایک گہری لمبی سانس لی۔

محسن نے کہا "او مائی گاڈ۔"

او مائی گاڈ۔ خدا وندا، تو بڑا رحمان اور مہربان ہے۔ تیری عنایت اور تیرا کرم کہ تو نے مایوسی کے اندھیرے کو روشنی میں بدلا۔ ہم خود کچھ بھی نہیں تیری تائید کے بغیر۔ کس منہ سے ہم تیرا شکر ادا کریں؟

محسن نے مجھے جھنجوڑا "سکندر۔ نازو زندہ ہے۔"

میں اس سے لپٹ گیا "نازو زندہ ہے، نازو واپس آگئی ہے۔"

محسن کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے "نازو ہمارے ساتھ رہے گی۔ اب نازو کہیں نہیں جائے گی ہمیں چھوڑ کے۔"

وقار نے کہا "خدا کے لیے۔ سکندر صاحب، محسن۔۔۔"

میں نے آنسو صاف کردیے "سوری یار، چلو نازو کو اٹھاؤ۔"

محسن نے بھی کہا "ہاں ہاں، اندر لے چلو اسے۔ نازو، اے نازو کی بچی، یہ کیا ڈراما ہے، چل اٹھ۔"

وقار نے کہا "محسن، تم پاگل ہو گئے ہو۔ ہسٹریا کے دورے میں نے عورتوں پر دیکھے تھے۔ تم پر کیسے پڑ گیا۔ نازو بے ہوش ہے۔"

میں نے جھک کے غور سے دیکھا "ہاں۔ نازو بے ہوش ہے۔ چلو ہم اس کو اٹھا کے اندر لے جائیں۔"

محسن نے کہا "ایسے ہی، تابوت سمیت۔"

وقار نے اس وقت اپنے اعصاب پر قابو پا کے صورتِ حال کو سنبھالے رکھا اگرچہ وہ ہم سے بدتمیزی نہیں کرتا تھا مگر اس وقت وہ بگڑ گیا "ابھی ایک جھانپڑ ماردوں گا تو تمہاری عقل ٹھکانے آجائے گی۔ اندر تکی ہے اس کا تو خیال کرو۔"

میں نے سر کو جھٹکا اور ایک دم مجھے صورتِ حال کی سنگینی کا احساس ہوگیا۔ میں نے نیچے جھک کے نازو کا ایک ہاتھ تھاما اور اپنا ایک ہاتھ اس کی گردن کے نیچے ڈال دیا۔ نازو کا جسم ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ میں نے سہارا دے کے اسے اوپر اٹھایا۔ وقار نے اس کے پاؤں پکڑے۔ پھر محسن جھکا اور اس نے درمیان سے نازو کو سہارا دیا۔

وہ سیدھی اوپر اٹھ گئی۔ تابوت سے نکلتے ہی وہ مجھے پرانی نازو محسوس ہوئی۔ زندگی کی حرارت سے معمور، جیتی جاگتی۔

میں نے اسے اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور اندر کی جانب چل پڑا۔ وقار نے دوڑ کے دروازہ کھولا "سیدھے ہاتھ والے بیڈ روم میں لے جاؤ۔"

ہوتا ہے۔

"تابوت کا کیا ہوا؟"

محسن نے کہا "ہم نے باہر رکھ دیا۔"

"باہر کہاں۔ اپنے گیٹ کے سامنے؟"

محسن مسکرایا "تمہاری مس میری کے گیٹ پر۔"

"کسی نے دیکھا تو نہیں؟"

"دیکھتا تو پوچھتا ضرور کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ درمیان میں ایک کوٹھی کا چوکیدار ہے۔ وہ بھی غالباً سو رہا تھا۔"

وقار نے فون رکھ دیا۔ "ایک لیڈی ڈاکٹر ہے۔ فاطمہ جعفری۔"

"کوئی بھی ہو۔ بس ہماری مدد کر دے۔ اعتبار کیا جا سکتا ہے نا اس پر؟"

وقار نے کہا "تکی اسے اپنی سوکن سمجھتی تھی، بلکہ سمجھتی ہے۔"

"اچھا۔ کیا بہت حسین ہے؟" محسن بولا۔

"حسین؟ ہاں کسی حد تک۔ لیکن اصل مصیبت ہے اس کی زبان۔ حد سے زیادہ بے باک اور منہ پھٹ ہے۔ مردانہ لطیفے سنانے سے نہیں چوکتی۔ ایسے کہ مردوں کو سن کے پسینہ آجاتا تھا مگر وہ قہقہے لگاتی رہتی تھی۔ غالباً اسے ہر عورت اپنی ہونے والی سوکن سمجھ سکتی ہے جس کے شوہر سے وہ ملتی ہو۔ اس کا رویّہ خطرے کی جھنڈی نظر آنے لگتا ہے حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں۔ وہ کوئی آوارہ مزاج یا بدکردار عورت نہیں ہے۔"

"آپ اسے شریف زادی کیسے سمجھتے ہیں؟"

"وہ کچھ عجیب سی چیز ہے۔ سائی کک کیس سمجھ لو۔ مردوں کی بالادستی کو تسلیم نہیں کرتی اور ثابت کرنا چاہتی ہے کہ وہ مردوں کی اس دنیا میں اسی طرح رہ سکتی ہے جیسے مرد رہتے ہیں۔ عورت ہونے کے باوجود، ایک ضد ہے یا بغاوت ہے یہ۔ کسی کو غلط فہمی ہو جائے تو وہ مارا جاتا ہے۔ میں نے بڑے بڑے شو سا لیڈی کلرز کی مٹی پلید ہوتے دیکھی ہے جو یہ سمجھتے تھے کہ ایسی عورت تو بہت آسان حاصل ہوگی۔"

محسن بولا "مٹی پلید کرانے والوں میں آپ بھی شامل ہیں؟"

وقار نے سر کھجا کے کہا "جی۔ آپ کے سامنے جھوٹ نہیں بول سکتا۔ بیوی کے سامنے بولنا پڑتا ہے۔ اُلو کی پٹھی نے ایسا ذلیل کیا تھا مجھے بھری محفل میں کہ کیا بتاؤں؟"

محسن نے ہنس کے کہا "سناؤ یار، کیا ہوا تھا؟"

"ہونا کیا تھا، میں بھی غلط سمجھا تھا۔ اس نے بھی لفٹ دی اور ایک رات بلا لیا اپنے گھر۔ میں بڑے شوق سے دھڑکتے دل اور کانپتی ٹانگوں کے ساتھ گیا اور اس کی ہدایات کے مطابق تین بار پچھلی طرف سے اس کے بیڈ روم کی کھڑکی پر دستک دی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ جاگ رہی ہوگی مگر اندر اندھیرا تھا۔ میں نے یہ سوچے

میں نے کہا "تم دونوں اس تابوت کا کچھ کرو۔"

وقار نے میرے اندر داخل ہوتے ہی دروازہ چھوڑ دیا اور واپس چلا گیا۔ میں نے نازو کو گیسٹ بیڈ روم میں بستر پر لٹایا اور اس پر کمبل پھیلا دیا۔ وہ بہت آہستہ آہستہ سانس لے رہی تھی۔ اس کے بالوں کی ایک شوخ لٹ عادت کے مطابق چہرے پر آرہی تھی۔ میں نے اسے بڑے پیار سے پیچھے کردیا اور پھر بے اختیار اس کی پیشانی کو چُوما۔ شریر لڑکی، کتنا ستایا تم نے ہم سب کو۔ کتنا رُلایا ہمیں۔ خیر، اب تم آگئی ہو تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم بھی ٹھیک ہو جاؤ گی۔ غالب بھی ٹھیک ہو جائے گا۔

میرے جذبات اس وقت وہی تھے جو کسی باپ کے ہو سکتے ہیں جس کا اکلوتا لختِ جگر برسوں بعد اچانک مل جائے یا اس بڑے بھائی کے جس نے اپنی گم شدہ ننھی منی سی بہن کو پھر پا لیا ہو۔ اس وقت جب اُمید دم توڑ چکی ہو اور یاد کا زخم دل کا ناسور بن گیا ہو۔

وقار اور محسن اندر آئے تو میں اسی طرح نازو کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ نازو کے چہرے پر تھکن اور نقاہت کی زردی تھی۔ اس کے گالوں کے گلاب پژمردہ تھے۔ آنکھوں کے گرد حلقے تھے اور اس کے بال بھی اُلجھے اُلجھے سے تھے مگر پھر بھی وہ نازو تھی۔ اس نے نہ جانے کس کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ وہ بہت قیمتی کپڑے تھے۔

اچانک اس خیال سے میرے دل میں ٹیس اٹھی کہ یہ نازو کون ہے۔ غالب کی جانِ تمنا یا شوکت رانا کی بیوی؟

محسن نے کہا "وقار۔ کسی ڈاکٹر کو بلاؤ۔ جو بھروسے کے قابل ہو۔"

وقار سوچ میں پڑ گیا "کیا بتائیں گے ہم ڈاکٹر کو؟"

"کیا ڈاکٹر خود اندازہ نہیں کرسکتا۔"

"پہلے تو ہم سے ہی سوال کرے گا نا۔ ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں کیا معلوم۔ تم دیکھو اور بتاؤ۔"

محسن نے کہا "ہم کہہ سکتے ہیں کہ۔۔۔۔ ہم تو باہر تھے۔ ابھی آکے دیکھا تو یہ اسی طرح سوتی ہوئی ملی۔ لیکن ہمیں شک ہوا۔۔۔۔ کیونکہ ہم نے لائٹ جلائی، پھر یہاں باتیں کرتے رہے اور اچھا خاصا شور ہوا مگر یہ نہیں جاگی۔ اس کی نیند ایسی نہیں ہوتی۔ یہ تو آہٹ پر اٹھ کے بیٹھ جاتی ہے۔"

میں نے اس بیان کی منظوری دی "یہ بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن تم پہلے تکی کو جگا دو۔"

"ابھی سونے دو اسے یار۔ پہلے نازو کو سنبھال لیں" وقار نے کہا۔

"وہ خود اٹھ کے آگئی پھر؟"

"وہ گھوڑے بیچ کر سوتی ہے۔ چور اٹھا کے لے جائیں اسے تو پتا نہ چلے۔" وقار نے کہا اور ایک نمبر ملانے لگا۔

میں نے دوبارہ نازو کی نبض چیک کی۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی رفتار نارمل سے کچھ کم تھی لیکن ایسا تو نیند میں بھی

ہوئے کہ کیا پتا انتظار کرتے کرتے سوگئی ہو دوبارہ زیادہ واضح طور پر دستک دی۔ اس کے بعد اچانک کھڑکی کھلی اور میں نے اپنے سامنے بندوق کی نال دیکھی اور پیچھے ایک خوفناک مونچھوں والا چہرہ۔ اس کے ... ڈیڈی کا۔ وہ تو بس زندگی تھی کہ میں ایک دم بیٹھ گیا اور پھر ... جو بھاگا تو مت پوچھو کیا حال تھا۔ اس نے تو چلا دی تھی گولی اور ساتھ ہی لاؤڈ اسپیکر کی طرح چلا رہا تھا۔ "چور کی اولاد' ڈاکو کے بچے' تیری اتنی ہمت کہ پہلے دستک دے کر جگاتا ہے۔ کیا سمجھ رکھا تھا یہاں کرنل چوڑیاں پہنے بیٹھا ہوگا۔"

میں اور محسن ہنستے رہے۔ "کیا کرنل نے بھی ڈراما کیا تھا؟"

"ہوسکتا ہے ورنہ کیسے ممکن ہے کہ گولی مجھے نہ لگتی۔ پہلے فائر کے وقت تو میں بالکل سامنے تھا۔ دوسرا فائر ہوا تو میں پندرہ بیس قدم ہی دوڑا تھا۔ کسی ریٹائرڈ کرنل کا نشانہ بھی اتنا خراب نہیں ہوسکتا۔ مزید ظلم یہ ہوا کہ میرے پیچھے پولیس لگ گئی۔ وہ سمجھے کہ میں کچھ چرا کے یا کوئی واردات کر کے بھاگ رہا ہوں۔ انہوں نے سیٹی بجا کے مجھے رکنے کا اشارہ کیا تو میں گھس گیا ایک گلی میں۔ بدقسمتی اس دن ہر قدم پر ساتھ تھی۔ آگے جا کے وہ گلی ہی بند ہوگئی۔ اس کے بعد کیا ہوسکتا تھا۔ پولیس والے مجھے پکڑ کر تھانے لے گئے۔ وہاں مجھے سچ بولنا پڑا کہ یہ سب عشق خانہ خراب کی کرامت ہے۔ اس کے باوجود انہوں نے پکڑنے کا نذرانہ وصول کیا۔"

"اگلے دن ملاقات تو ہوئی ہوگی۔"

"ہاں۔ سؤر کی بچی صاف مکر گئی۔ کہنے لگی کہ تم تو پاگل ... میں نے دائیں طرف والا کمرا کہا تھا۔ تم بائیں طرف مرنے چلے گئے تو میرا کیا قصور۔ خیر قسمت بہت اچھی ہے تمہاری کہ اس وقت ... خانے میں نہیں لیٹے ہو۔ ڈیڈی کا نشانہ تو غضب کا ہے۔ پہلے لوگ ایک تیر سے دو شکار کرتے تھے۔ ڈیڈی ایک گولی سے کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ مجھے موقع ملا تو میں دو گولیوں سے ایک شکار کروں گا۔ تمہارے ڈیڈی کو۔ لیکن پاگل پن ملاحظہ ہو کہ اس نے پھر مجھے بلایا اور میں پھر پہنچ گیا۔"

محسن نے کہا "عشق میں ایسا ہوتا ہے۔"

"دوسری بار کیا اس کی اماں نے سر پر بیلن مارا؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ وہ خود تھی۔ مجھے اندر بلالیا۔ ابھی میرے حواس بھی بحال نہیں ہوئے تھے کہ دروازے پر کسی نے دستک دی اور اس نے گھبرا کے مجھے باتھ روم میں چھپادیا۔ اور بس..... اس کے بعد بھول گئی۔ میں کیا کرتا' شور مچاتا تو خود کرنل صاحب آجاتے' کہتے

جوتی سمجھنے والا۔ یہ کہاں اس کے قابو میں آنے والی تھی۔ ایک دن اسے کچھ کھلادیا اور اس کے کپڑے پھاڑ کے مال روڈ پر اتار دیا۔ خود بھاگ کے باپ کے گھر آگئی۔ اس کے شوہر نے نشے میں مال روڈ پر خاصی سنسنی پھیلائی اور بالآخر پکڑا گیا۔ عدالت میں اس کی نہیں سنی گئی۔ کرنل صاحب بیٹی کے گواہ بن گئے کہ اس دن تو وہ گھر میں تھی اور گھر میں فلاں فلاں مہمان مدعو تھے۔ یہ سب نام ایسے تھے کہ کوئی ان کی گواہی کو جھوٹا نہیں کہہ سکتا تھا۔ شوہر صاحب کو چھ ماہ جیل کی ہوا کھانی پڑی۔ وہیں سے اس نے طلاق بھیج دی۔"

"ایسی کیا غلطی کی تھی اس نے؟"

"میں تو کہتا ہوں کہ شادی ہی اس کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ اسے تو کسی سیدھی سادی ان پڑھ یا میٹرک پاس گھریلو قسم کی لڑکی سے شادی کرنی چاہیے تھی۔ یہ بلا اس کے قابو میں آنے والی نہیں تھی۔"

جب دروازے پر دستک ہوئی تو وقار گیا اور اپنے ساتھ ایک چھ فٹ کی بے حد صحت مند اور گوری چٹی عورت کو اندر لے آیا۔ اس عورت کی صورت کے نقوش میں نسوانیت کا حسن کم تھا۔ رنگ صاف ہونے اور متناسب جسم کے باوجود اس کی سیکس اپیل نہ ہونے کے برابر تھی۔ شاید یہ ایک نفسیاتی ردِعمل کا نتیجہ تھا۔ وقار کی بات سن کے وہ عورت ہمیں مردوں سے زیادہ خطرناک نظر آنے لگی تھی۔

اس نے مجھے اور محسن کو غور سے دیکھا اور پھر وقار کے شانے پر ہاتھ مارا "وکی۔ یہ کیا حرامی پن ہے۔ وہی ڈراما تو نہیں ہے؟"

وقار نے کندھا ہلایا "مائی پھاتاں۔ تم ڈاکٹری چھوڑو پہلوانی شروع کردو۔ ہاتھ مار کے کسی کا کندھا اتار دیا۔ کسی کی پسلی توڑ دی۔ پھر اس سے علاج کی فیس وصول کرلی۔ یہ بہن ہے میری۔"

مائی پھاتاں یعنی فاطمہ جعفری نے ایک بلند بانگ قہقہہ مارا "مجھ سے جھوٹ بولتے ہو۔" اس نے انگریزی میں کہا۔

میں نے اور محسن نے دہل کے اندر دیکھا جہاں نگی سو رہی تھی۔

"یار' جھوٹ کیسا...؟"

"اتنی معصوم اور حسین لڑکی تم جیسے بانگڑو کی بہن ہو ہی نہیں سکتی۔ اور کیا حرامی پن کیا ہے تم نے؟ مجھے سچ سچ بتاؤ۔ مجھے پھر تم تین نظر آرہے ہو اور ایک لڑکی۔ کیا اس نے بھی تمہیں دو دن تک باتھ روم میں بند رکھا تھا؟"

"فاطمہ۔ پلیز بی سیریس۔ یہ بے ہوش ہے۔ مجھے تمہاری مدد کی سخت ضرورت ہے۔ باتیں مت کرو اسے دیکھو" وقار نے کہا "یہ دونوں میرے معزز دوست ہیں۔ لندن سے آئے ہوئے ہیں۔ صرف فرنچ سمجھتے ہیں یا اردو۔"

وہ کچھ متاثر ہوئی اور اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھادیا "تم کو میں نے پہلے کہیں دیکھا ہے۔ تم کہیں خاص فلموں

اچھا..... چور کی اولاد' ڈاکو کے بچے' تیری اتنی جرأت کہ آج پھر آگیا۔"

"تم رات بھر باتھ روم میں بند رہے؟"

"رات بھر نہیں۔ اگلے دن بھی۔ دوپہر دو بجے وہ آئی تو مجھے رہائی ملی مگر اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا کرنل صاحب کی آواز آئی اور اس نے مجھے کھڑکی کے راستے فرار ہونے کا مشورہ دیا۔ رات بھر کا جاگا ہوا۔ تھکن اور بھوک سے بے حال۔ میں کھڑکی سے کودا تو پاؤں مڑ گیا۔ ایسی موچ آئی کہ ہفتہ بھر لنگڑاتا رہا۔ میں کسی سے کیا کہتا۔ خود بھی تماشا بنتا۔ اس الو کی پٹھی سے بھی بات نہیں کی۔ مگر میں سمجھ گیا تھا کہ اس نے جانتے بوجھتے میرے ساتھ یہ سلوک کیا تھا۔ اس کا بدلہ میں نے بعد میں لیا۔ میرے جیسے دو اور مل گئے جو اس پر عاشق ہوئے تھے اور اس کے بعد عشق کے لفظ سے الرجک تھے۔ ہم سب نے مل کے..... چھوڑو یار بڑی پرانی بات ہے۔ ہم نے بڑی شرمناک حرکت کی تھی۔"

"اب ہم سے کیا شرمانا یار۔ تمہاری حرکتیں تو اب بھی شرمناک ہی ہیں۔" محسن بولا۔

"ہم نے اسے اٹھالیا۔ ایک گاڑی میں ڈال کے لے گئے۔ وہ سڑک پر اکیلی جارہی تھی۔ ہم نے پیچھے سے جا کے کھینچ لیا اور بالکل اغوا کے انداز میں دبوچ لیا۔ ظاہر ہے ہم سب دل جلے تھے۔ سب نے اسے خوب سنائیں۔ اس کا برا حال ہوگیا۔ ہاتھ جوڑنے لگی اور رونے لگی کہ مجھے معاف کردو۔ ہم نے کہا کہ آج رات بھر تمہیں معاف کریں گے۔ غلطی کا تاوان ادا کرکے تمہاری جان چھوٹ جائے گی۔ بڑی فحش کلامی کرتے رہے ہم کہ یہ ہوگا اور وہ ہوگا اور ہم نے مووی کیمرے کا بندوبست بھی کیا ہے۔ کرنل صاحب کو فلم کی ایک کاپی ارسال کریں گے۔ ہم اسے آنکھوں پر پٹی باندھ کے گھماتے رہے اور پھر ایک دوست کے گھر میں لے گئے جو اس زمانے میں خالی تھا۔ وہ بہت چیخی چلائی۔ روئی پیٹی' دھمکیاں دیں کہ یہ کردوں گی اور وہ کردوں گی۔ ہم نے کہا کہ یہ سب بعد کی بات ہے۔ پہلے یہ دیکھو کہ ہم کیا کرتے ہیں۔"

میں نے کہا "اور تم نے' وہ سب کیا؟"

"نہیں سکندر۔ اتنے ذلیل ہم بہرحال نہیں تھے۔ اس نے مجھے رات بھر اور اگلے دن تک باتھ روم میں بند رکھا تھا۔ ہم نے تو اسے خوب دہشت زدہ کیا اور ایک گھنٹے بعد چھوڑ دیا۔ وارننگ دے کر کہ آئندہ کے لیے خبردار جو ایک بار نہیں ہوا وہ دوسری بار ہو بھی سکتا ہے۔ وہ ڈری نہیں تھی مگر قائل ہوگئی ہماری شرافت کی۔ ظاہر ہے اس وقت وہ انتہائی بے بس تھی اور ہم شریف نہ ہوتے تو اسے اصل حالت میں واپس نہ جانے دیتے۔ بس اس کے بعد سے دوستی ہے ہماری۔ اس کا رویہ تو وہی ہے' اس وقت ڈاکٹری پڑھ رہی تھی۔ اب ڈاکٹر بنے بھی چار سال ہوگئے۔ شادی کردی تھی کرنل صاحب نے مگر شوہر تھا روایتی قسم کا۔ بیوی کو پاؤں کی

میں کام تو نہیں کرتے؟"

مجھے واقعی پسینہ آگیا۔ لیکن میں نے بھی دل کڑا کرکے اس سے یوں ہاتھ ملایا کہ بعد میں وہ ہاتھ جھٹکتی رہ گئی "اگر تم ہیروئن ہوتیں تو میں ایسا ضرور کرتا لیکن جیسے تم ڈاکٹر ہو میں بیرسٹر ہوں۔ اور یہ دونوں شریفانہ پیشے ہیں۔"

اس نے محسن سے ہاتھ ملاتے وقت احتیاط سے کام لیا "یقیناً تم بھی وکیل ہوگے؟"

"جی نہیں۔ میں گھاس کھودتا ہوں" محسن نے سنجیدگی سے کہا "میری فرم یہی کام کرتی ہے۔"

فاطمہ نے پھر قہقہہ مارا "یو آر اے رنگیل باسٹرڈ۔ وکی یہ تمہارا معاملہ ہے۔ لیکن مجھے چکر مت دو۔ کوئی لندن میں رہتا ہو اور بولتا ہو صرف فرنچ یا اردو۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی پاکستان میں رہتا ہو مگر صرف روسی زبان جانتا ہو یا فارسی۔ نہ انگریز کبھی فرنچ بولتا ہے نہ فرانس کا رہنے والا انگلش۔ یہ تو پاکستان کے انگلش میڈیم اسکولوں میں پڑھے ہوئے لگ رہے ہیں۔ تم کچھ چھپا رہے ہو۔ خیر کیا ہوا ہے اس لڑکی کو؟"

وقار نے ایک فاش غلطی کی تھی اور اس مردمار عورت نے تاڑ لیا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ اس کی نظر بھی بہت تیز تھی کہ مجھے اس نے میک اپ کے باوجود پہچان لیا تھا۔ حافظہ ساتھ دیتا تو شاید وہ بتا دیتی کہ جناب آپ ہیں سکندر بخت۔ آپ کی تصویریں تو اخبار اور اشتہار میں دیکھی ہیں میں نے اور کارناموں کا شہرہ تو ہر جگہ ہے۔

فاطمہ جعفری نے روایتی طریقے سے نازو کا معائنہ شروع ہی کیا تھا کہ دروازے میں نکی نمودار ہوئی۔ وہ سوتے سے اٹھ کے آئی تھی اور غالباً اسے فاطمہ کے لرزہ خیز قہقہوں کی آواز نے بیدار کیا تھا۔ نکی نے پہلے قہر آلود نظروں سے وقار کو اور پھر فاطمہ کو دیکھا مگر ہماری موجودگی کے خیال سے خاموش رہی ورنہ شاید پوچھتی کہ اتنی رات گئے یہ بے حیا یہاں کیا لینے آئی ہے۔

فاطمہ نے پلٹ کے دیکھا اور مسکرائی "ہائے نکی۔ لگتا ہے تم کوئی بُرا خواب دیکھ رہی تھیں۔"

"ہاں، وہ تو ابھی تک دیکھ رہی ہوں" نکی نے کہا۔ پھر اس کی نظر نازو پر گئی اور وہ ایک چیخ مار کے لپکی مگر وقار نے اسے روک لیا۔

"نازو کب آئی، کیسے آئی" نکی نے مچل کے کہا "مجھے کیوں نہیں بتایا تم نے؟"

وقار نے کہا "شور مت کرو۔ ابھی سب پتا چل جائے گا۔"

"کیا ہوا ہے نازو کو سکندر بھائی؟" وہ مجھ سے مخاطب ہوگئی۔

میں نے کہا "کچھ نہیں۔"

"کچھ نہیں تو پھر یہ ڈاکٹر کیا دیکھ رہی ہے؟"

میں نے کہا "یہی دیکھ رہی ہے کہ نازو کو کچھ ہوا تو نہیں ہے۔"

فاطمہ نے سرسری معائینے سے فارغ ہو کے اعلان کیا "اس کی کنڈیشن شاک جیسی ہے۔ کیا ہوا تھا؟"

"کچھ نہیں ہوا تھا۔ اگر باہر ہوا ہو تو ہمیں معلوم نہیں۔ یہ آئی اور لیٹ گئی۔ اس نے کچھ کھا تو نہیں لیا؟"

"تمہاری بہن ہے، تم بتاؤ کہ اس نے کیا کھایا ہوگا اور کیوں۔ کسی سے عشق کا چکر تھا، شادی ہوئی ہے اس کی؟"

"ہاں..... نہیں، میرا مطلب ہے طے تو ہو چکی ہے" وقار نے کہا۔

"یہی تو مصیبت ہے تم لوگوں کی۔ لڑکا لڑکی کو منسوب کرکے بیٹھ جاتے ہو۔ شادی کرتے نہیں۔ وہ جذبات کی آگ میں اندر ہی اندر جلتے ہیں، بھوکے آدمی کی بھوک تو روٹی سے ہی ختم ہوتی ہے نا۔ تم ڈش سامنے رکھ کے انہیں ترساتے ہو....."

اس نے بعد میں جو کچھ فرمایا وہ فحاشی کے زمرے میں آتا تھا۔ اس نے بتایا کہ لڑکے جو جنسی تشنگی یا محرومی کے احساس کا شکار ہوں وہ کیا کرتے ہیں اور لڑکیاں کیا کرتی ہیں۔ یہ سب سچ تھا مگر اتنا ننگا سچ ہم سب کے سامنے نہیں بولتے۔ خصوصاً اس وقت جب قریبی رشتے رکھنے والے حضرات و خواتین ایک ہی جگہ موجود ہوں۔

نکی سخت کنٹرول کرنے کے باوجود اس بے ہودہ گفتگو پر چراغ پا تھی اور اس کی صورت سے نفرت، کراہیت اور غصے کا اظہار ہو رہا تھا۔

"اچھا اب یہ بتاؤ کہ نازو کب تک ٹھیک ہو جائے گی۔" نکی نے بالآخر برہمی سے کہا "یہ کون سا وقت ہے نفسیاتی الجھنوں کے اسباب پر لیکچر دینے کا۔ جو تم کرتی رہی ہو وہ ہر لڑکی نہیں کرتی۔"

"ہاں۔ اور اسی کا نتیجہ ہوتے ہیں ہسٹریا کے دورے۔ خیر اس کا بی پی ٹھیک ہے۔ نبض بھی ٹھیک ہے اور نظامِ تنفس بھی۔ جس کا مطلب ہے اس نے کوئی خطرناک زہر نہیں نگلا ہے۔ اور اگر خواب آور گولیاں کھائی ہیں تو ان کی مقدار کم تھی۔"

"یہ کب تک ہوش میں آجائے گی؟"

"صبح تک امید کی جاسکتی ہے لیکن صبح مجھ سے لڑنے مت آجانا۔ یہ وقفہ ایک دن سے بڑھ کر ایک مہینے کا بھی ہو سکتا ہے۔ یہ ابھی آبزرویشن کا پیریڈ ہے۔ صحیح رائے تمام ٹیسٹ لینے کے بعد دوں گی۔ وکی، تمہاری بیوی تو بہت خوب صورت ہے، تمہارے مقابلے میں۔"

"تھینک یُو۔ نازو کے لیے خطرے کی بات تو نہیں؟"

"نہیں۔ کیا تم نے اپنی بیوی کو وہ بات بتائی تھی؟"

وقار گھبرا گیا "تم بھی حد کرتی ہو....."

"تمہارا شوہر بڑا لفنگا تھا۔ پھر کبھی بتاؤں گی، اس نے میرے ساتھ کیا بدمعاشی کی تھی۔" وہ نکی سے مخاطب ہوئی "اچھا میری جان، میں چلتی ہوں۔"

میں نے کہا "میرا نام سکندر بخت ہے۔"

فاطمہ نے چٹکی بجا کے کہا "رائٹ۔ تم تو سچ مچ کے ہیرو ہو۔ میں تمہارے کارنامے سن سن کے عاشق تھی تم پر۔ جی چاہتا تھا کہ ے ساتھ شامل ہو کے سب کی..... کردوں۔ تم سب ــ ل ے اس لی..... وہ..... کیا نام تھا اس کا، چوہدری دلاور....."

اس نے بڑے فراٹے سے مردانہ گالیاں دی تھیں۔ میں اور محسن دم بخود بیٹھے تھے اور اگر وقار نے اس کا تفصیلی تعارف نہ کرادیا ہوتا تو پتا نہیں کیا سمجھتے۔

"تم بالکل ویسی ہی ثابت ہو رہی ہو جیسا وقار نے بتایا تھا۔"

وہ اپنے بیگ میں کچھ تلاش کر رہی تھی "یعنی بالکل بے مہار۔ تمام اخلاقی قدروں کی ایسی تیسی کرنے والی۔ تم مرد سمجھتے ہو کہ زبان گندی ہو تو دماغ کے اندر بھی گندگی ہوتی ہے۔ عورت کو تو بالکل آپ جناب اور حضور پرنور، شکریہ تسلیمات یا اوئی اللہ اور ہائے میں مرگئی کے سوا کچھ بولنا ہی نہیں چاہیے، لو سگریٹ پیو۔"

"میں چھوڑ چکا ہوں" میں نے کہا۔

"کینسر کا ڈر تھا؟" وہ ہنسی "یا معیوب سمجھتے تھے۔ دونوں باتیں غلط۔ مجھ سے پوچھو، میں ڈاکٹر ہوں کہ کینسر کے بیشتر کیس نان اسموکرز میں ملتے ہیں۔ اور یہ جو بے شرمی اور گندگی کا مسئلہ ہے نا، یہ بھی الٹا ہے۔ میں سب نکال دیتی ہوں۔ وہ جو شرمیلے اور خاموش رہنے والے شریف زادے اور شریف زادیاں ہوتی ہیں نا۔ ان کی حقیقت جانتی ہوں میں۔ ان کے اندر گندگی جمع ہوتی رہتی ہے۔ ان کو اکیلے میں دیکھو۔ چھپ چھپ کے وہ کیا کرتے ہیں۔ آنکھوں سے اور زبان سے یا محض خواہش سے وہ کیا نہیں کرتے؟"

میں نے کہا "کبھی تم نے غور کیا کہ تم جیسی عورت ابنارمل کیوں بن گئی، ننانوے فیصد لیڈی ڈاکٹرز اور عورتیں ایک رویّہ رکھتی ہیں۔ تم اس کے برعکس ہو۔ یہ کیسے ہوا؟ ظاہر ہے اس کے بھی عوامل ہوں گے۔ ایک شعر سنو گی۔

وقت کرتا ہے پرورش برسوں
حادثہ ایک دم نہیں ہوتا"

اس نے کش لیتے ہوئے مجھے دھوئیں کی اوٹ سے دیکھا "تمہارا کیا خیال ہے؟"

میں نے کہا "تمہارے والدین۔ کیا وہ نارمل لوگ تھے اور آپس میں ایسے ہی رہتے تھے۔ جیسے سب میاں بیوی رہتے ہیں۔ تمہارے ساتھ کیسے پیش آتے تھے، کوئی محبت کرتا تھا تم سے؟"

میں نے محسوس کیا کہ تیر نشانے پر لگا ہے اور میں نے اس کی دُکھتی رگ پر انگلی رکھ دی ہے۔ وہ اب سیریس ہو کے مجھے گھور رہی تھی۔

میں نے کہا "کیا تم ان کی جائز اولاد تھیں؟ تم لوگ انتہائی غریب تھے۔ باپ کوئی کام نہیں کرتا تھا اور گھر میں غیر متعلقہ لوگ آتے تھے۔ غیر مرد....."

وقار نے سکون کا سانس لیا "تم صبح تک رک کیوں نہیں جاتیں؟"

وہ قہقہہ مار کے ہنسی "رک سکتی ہوں ایک شرط پر۔ تمہارے ساتھ سونے کی اجازت مل جائے تو، تمہارے بیڈ پر۔"

نکی کو جیسے آگ لگ گئی "تم تو انتہائی بے شرم عورت ہو، ایسی باتیں کرتی ہو۔"

"بس باتیں ہی کرتی ہوں..... اور کچھ نہیں۔ میری جان ساتھ سونے کا مطلب تم پتا نہیں کیا لے رہی ہو۔ وکی تمہارا شوہر ہے میرا نہیں۔ اور یہ بڑا بدمعاش ہے اس لیے اپنا تو بس یار ہے۔ ہمیں اس سے کیا لینا دینا۔"

"مجھے ایسی باتیں بالکل پسند نہیں۔"

"مگر مجھے پسند ہیں" اس نے نکی کے گالوں پر چٹکی لی "یار وکی، یہ بیوی کہاں سے ماری ظالم۔ خیال رکھنا بیٹے کوئی بھگا کے نہ لے جائے۔ پہلوئے حور میں لنگور، خدا کی قدرت۔ اچھی چیز دیکھ کے سب کی رال ٹپکتی ہے۔ چلو میں یہاں صوفے پر سو جاتی ہوں مگر یار....."

"مگر کیا.....؟" وقار نے سر پکڑ کے کہا۔

"جب میں اکیلی ہوتی ہوں نا۔ تو ذرا پرائیوسی ہونی چاہیے، یہ کپڑوں کا کچھ نفسیاتی مسئلہ ہے۔ جسم آزاد ہو تو نیند آتی ہے اچھی ورنہ عجیب سی الجھن ہوتی ہے۔" وہ قہقہہ مار کے ہنسی اور پھر ایک دم میری طرف پلٹ گئی "مجھے یاد آگیا۔ میں نے تمہاری تصویر دیکھی تھی، تم کچھ بدلے ہوئے ضرور لگ رہے ہو۔ کیا میک اپ کر رکھا ہے؟"

میں نے نارمل نظر آنے کی ناکام کوشش کی "میک اپ کرتی ہیں خواتین۔"

اس نے مجھے غور سے دیکھا "میری جان، ڈاکٹر کرتے ہیں پوسٹ مارٹم یعنی لاش سے پوچھ لیتے ہیں کہ سچ کیا ہے۔ ایک ہڈی قبر سے نکال کے بتا سکتے ہیں کہ وہ مرد تھا یا عورت تھی۔ اس کی کیا عمر تھی اور اس کی موت کب اور کیسے ہوئی تھی۔ تم تو میرے سامنے ہو پورے کے پورے۔"

میں نے کہا "اوکے۔ تم بیٹھ جاؤ آرام سے۔ میں بتاتا ہوں۔"

نکی سخت طیش کے عالم میں وقار کو بازو سے پکڑ کر لے گئی "تم نے بلایا تھا اس فاحشہ کو؟ میں کہتی ہوں اب کیوں ملتے ہو تم ایسی عورت سے۔ یہ تو جنسی مریضہ ہے۔ بے شرمی کی بھی حد ہوتی ہے۔"

"بابا وہ ڈاکٹر ہے" وقار باہر اسے آہستہ آہستہ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا "اس وقت میں اور کسے بلاتا۔ معاملہ رازداری کا بھی تھا۔ تم تو سو رہی تھیں۔ تمہیں کیا معلوم یہاں کیا ہوا۔ چلو غصہ چھوڑو۔ چائے بناتے ہیں ہم کچن میں چل کے" پھر ان کی آواز دور ہوگئی۔

"مرد نہیں" اس نے سگریٹ کو پاؤں سے مسل دیا "وہ جانور تھے۔"

میں نے کہا "بس اتنا کافی ہے۔ میں سمجھ گیا۔ میرے سامنے پوز بھی مت کرنا۔ میں امپریس نہیں ہو سکتا۔ میرے نزدیک تم قابلِ رحم ہو۔ تمہارے نزدیک یہ معیوب بات نہیں اگر مرد عورت شادی کے بغیر جائنٹ فیملی بنا کے رہیں؟ تم کو خاندان کی روایتی قدریں بھی ایسی ہی لگتی ہوں گی جیسے یہ کپڑے جو تم نے پہن رکھے ہیں۔ میرا مشورہ ہے کہ تم باہر چلی جاؤ۔ یہاں کے معاشرے میں تم مس فٹ ہو۔"

اس نے سرہلایا "تم بہت چالاک آدمی ہو۔ ذہین اور خطرناک بھی۔ آئی لائک یو۔"

"تمہیں سخت مایوسی ہوگی۔ میں حد درجہ دقیانوسی خیالات رکھتا ہوں۔ تم اگر مغرب ہو تو میں مشرق۔ میری ایک منگیتر ہے جس کے سوا کسی اور کی طرف نظر اٹھا کے دیکھنا بھی میں گناہ سمجھتا ہوں اور شادی سے پہلے اپنی منگیتر کو اپنی بیوی سمجھ لینا میرے نزدیک جرم ہے۔"

"میں نے اپنی ماں کو قتل کر دیا تھا" وہ بولی "میں بچوں کی جیل میں رہی۔ اس وقت میں دس سال کی تھی۔ ایک وکیل نے مجھے جھوٹی گواہیوں کی مدد سے بچالیا۔ بورسٹل جیل کے تجربات اپنی جگہ بہت تلخ یادیں رکھتے ہیں۔ اس وکیل نے مجھے کرنل حامد کی تحویل میں دے دیا۔ کرنل میرا باپ نہیں ہے مگر ان لاکھوں سے بہتر ہے جن کا نام ولدیت کے خانے میں لکھا جاتا ہے۔ اس نے مجھے بچالیا ورنہ میں گلیوں بازاروں میں بکنے والی لڑکی ہوتی۔ اب تک مر کھپ چکی ہوتی۔"

"میں حیران ہوں کہ تمہارا یہ رویہ کرنل صاحب اور تمہارے مریض کیسے برداشت کرتے ہیں؟"

وہ ہنسی "ان کے سامنے میں ایکٹنگ کرتی ہوں۔ شرافت اور معصومیت کی۔ بالکل بے زبان اور احمق نظر آتی ہوں۔ مریضوں سے کاروباری بات ہوتی ہے۔ وہ بولتے ہیں اور میں سنتی ہوں۔ یہ تو ایک میرا یار وکی ہے اور اس کے ساتھی ہیں جن کے سامنے میں پوز نہیں کرتی۔ یہ نہ ہوں تو میں پاگل ہو جاؤں۔"

وقار چائے لے کر اندر آگیا "مائی بھاتاں۔ تم کو سب معلوم ہو گیا؟"

"نہیں۔ تمہارے دوست کو سب معلوم ہو گیا میرے بارے میں" وہ ہنسی۔

وقار نے کہا "تم نازو کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ جب تک یہ ٹھیک نہ ہو جائے اسے اپنے پاس رکھو۔ یہاں اس کا رہنا ٹھیک نہیں۔"

"کیوں' کیا مسئلہ ہے' وکی یار تم بتاؤ۔"

میں نے کہا "یہ ٹھیک ہے۔ وقار تمہیں سب کچھ بتا سکتا ہے۔ ہماری یہاں موجودگی ضروری نہیں۔"

میں نے وقار کے کمرے سے فون کیا۔ وہاں نکی آگ بگولا ہو بیٹھی تھی۔ "قسم خدا کی سکندر بھائی۔ اس عورت کو میں ... دوں گی' پتا نہیں وقار اسے کیوں برداشت کرتے ہیں۔ ایسی بے شرم عورت ہے کہ توبہ' ضرور وقار اور اس کے درمیان کوئی گڑبڑ ہے۔"

میں نے اسے ڈانٹا "بلاوجہ شک کا روگ مت پالو۔ تمہارا میاں صرف تمہارا ہے اور اس میں ہمت ہی نہیں ہے گڑبڑ کرنے کی۔"

"اس عورت میں تو ہے۔"

"نہیں۔ وہ تھوڑی سی ذہنی مریض ہے لیکن بے ضرر ہے۔ کم سے کم تمہیں کوئی خطرہ نہیں اس سے" میں نے کہا۔

"میں کیا کروں؟"

"تم سو جاؤ بس۔" میں نے کہا اور اپنے گھر کا نمبر ملانے لگا۔

رابعہ نے ریسیور اٹھا کے کہا "جی' کیا خبر ہے؟"

"خبر یہ ہے کہ ٹنڈو باگو میں ٹنڈوں کا باغ برائے فروخت ہے۔ کل کی ہیڈ لائن یہی ہوگی" میں نے کہا "یہ تم نے کیسے فرض کر لیا کہ فون کسی اخبار کے دفتر سے کسی رپورٹر نے کیا ہے؟"

"تمہارے لہجے سے لگتا ہے کہ خبر اچھی ہے۔ حالانکہ بھاگے تم ایسے تھے جیسے تم نے دیر کی تو قیامت آجائے گی۔"

"قیامت تو آگئی ہے۔" میں نے سرگوشی میں کہا "یہ بتاؤ کہ اس وقت تم کھڑی ہو یا بیٹھی ہو۔ تمہارے آس پاس کیا ہے ... ایسی خطرناک چیز تو نہیں ہے جس پر دھڑام سے ... تم خدانخواستہ... خدانخواستہ... وہ ہو جاؤ۔ جس کے لیے ارشاد فرمایا ہے کہ... حسرت اس غنچے پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئی۔"

"میں آرام سے بیٹھی ہوں صوفے پر۔ اور میرے ساتھ گل بھی ہے خبر گیری کے لیے۔"

"وعدہ کرو تم چیخ نہیں مارو گی۔ بے ہوش ہونے کا ڈراما نہیں کرو گی اور جب میں واپس آؤں گا تو میرا منہ چوم لو گی۔ اچھی بات کہے کوئی تو انعام یہی ملتا ہے۔"

"اب کچھ بولو بھی۔"

"ایسے نہیں' انعام کی بات گول مت کرو۔"

"بابا انعام ملتا نہیں لیا جاتا ہے۔" اس نے گول مول جواب دیا۔

"اوکے۔ میں لے لوں گا۔ مگر بابا کہتی ہو تم مجھے تو میرے رومانٹک موڈ کی ایسی تیسی ہو جاتی ہے۔ مجھے بابائے اردو مولوی عبدالحق اور بابائے قوم یاد آنے لگتے ہیں۔ خبر یہ ہے.... پانی پالو تھوڑا سا۔"

"اف.... میں فون بند کر دوں گی۔"

"کر دو۔ مجھے کیا پڑی ہے جو تمہیں بتاؤں کہ نازو آگئی ہے"

ساتھ کہا۔

"اچھا اچھا لیکن یہاں مت آنا۔"

"ہم ابھی اور اسی وقت آرہے ہیں" یہ آواز پھر رابعہ کی تھی "تم روک سکتے ہو تو روک لو۔"

میرے کچھ کہنے سے پہلے اس نے ریسیور رکھ دیا اور پھر میں نے بہت کوشش کی مگر نمبر نہیں ملا۔ مجھے افسوس ہونے لگا کہ میں نے انہیں یہ خبر دی۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ آدھے گھنٹے میں ان کا پہنچ جانا یقینی تھا۔

"نکی ڈیئر۔ اب تمہیں نیند تو آئے گی نہیں۔ تمہارا خون جل رہا ہے یہاں بیٹھے بیٹھے۔ چلو ڈرائنگ روم میں۔ رابعہ اور گل بھی آرہی ہیں۔"

گھنٹی پھر بجی تو میں جاتے جاتے رک گیا۔ میں نے اس خیال سے ریسیور اٹھایا تھا کہ رابعہ ہوگی مگر دوسری طرف سے دلاور کی بیوی نے کہا "کیا یہ مسٹر وقار کا گھر ہے؟"

میں نے آواز بنا کے کہا "ابھی تک تو ہے جناب۔"

"مس رابعہ ایڈووکیٹ سے بات ہو سکتی ہے؟"

"ابھی تو نہیں ہو سکتی' آپ نمبر دے دو یا پیغام۔"

"تم کون ہو؟" اس نے محتاط لہجے میں پوچھا۔

"میں ان کا ماموں۔ چوہدری لال دین کتھا والا آف چونا منڈی۔"

وہ سمجھ گئی کہ اس قسم کی بات کرنے والا کون ہو سکتا ہے "تم سکندر نہیں ہو تو پھر محسن ہو۔"

"وہ دونوں ... ماموں ہیں جی" میں نے کہا "آپ اپنے بارے میں کچھ فرمائیے۔ اتنی میٹھی آواز ہے کہ لگتا ہے مٹھایاں کھا کے بول رہی ہو۔"

"میں مسز دلاور ہوں۔ تحفہ مل گیا میرا۔ شکریہ تو کہہ دو۔"

میں نے کہا "آپ نے تو کچھ اور فرمایا تھا۔ رابعہ کا ہارٹ فیل ہو جاتا پھر؟"

"پھر کیا۔ تمہیں دوسری کوئی رابعہ مل جاتی' سال چھ مہینے میں۔"

میں نے کہا "میں محسن ہوں۔ سکندر کراچی میں ہے اور شاید کل آپ سے بات بھی کرے گا۔ مسز دلاور اس عنایت کا سبب...؟"

"سبب کچھ نہیں۔ میں نے اپنا قرض چکا دیا۔ تم نے مجھے میرا شوہر زندہ سلامت واپس کر دیا۔ اس کے بدلے میں اور کیا دیتی میں۔ پہلے تو صرف شکریہ ہی ادا کیا تھا۔ تم نے مجھے ملوایا تھا اس سے۔ اس وقت جب میں سمجھ رہی تھی کہ شاید میں بیوہ ہو چکی۔ تم اسے مار بھی سکتے تھے لیکن تم نے اسے زندہ رکھا۔"

میں نے کہا "اب میں کیا کہوں۔ تمہارا شوہر دشمنی نبھانے کے معاملے میں اتنا بااصول کبھی ثابت ہوا تھا۔"

میں نے ریسیور رکھ دیا۔

نکی دانت نکالنے لگی "آپ کیوں تنگ کرتے ہیں رابعہ باجی کو؟"

میں نے آہ بھر کے کہا "اس لیے کہ ابھی میرا وقت ہے۔ باقی زندگی وہ مجھے تنگ کرے گی جیسے تم کر رہی ہو وقار کو۔"

"میں تنگ کر رہی ہوں اسے یا وہ مجھے ستا رہا ہے۔ اس وقت بھی دیکھ لو جا کے کیسی باتیں کر رہے ہوں گے دونوں۔ اور وقار کیا کم ہیں۔"

میں نے کہا "تم وقار کو وکی کیوں نہیں کہتیں۔ مجھے تو افسوس ہے کہ یہ خیال تم کو پہلے کیوں نہیں آیا۔"

"اچھا تو لگتا ہے مگر اس عورت سے کہو کہ پہلے وہ وقار کو وکی کہنا چھوڑے۔ اسے کیا حق حاصل ہے کہ..."

"تم بھی کیا بات کرتی ہو۔ ساری دنیا اسے وکی کہے گی تو تم پابندی لگوا دو گی کہ خبردار' اس نام کے جملہ حقوق محفوظ ہیں کاپی رائٹ ایکٹ کے تحت۔ وکی اور نکی کیا زبردست جوڑی بنتی ہے۔ لیلیٰ مجنوں اور شیریں فرہاد بھی کچھ نہیں اس کے مقابلے میں اور مستقبل پر نظر رکھو تو بعد میں وکی نکی اینڈ سنز بھی زبردست کاروباری ٹائٹل ہو گا۔ سن کے بجائے سنز بھی ہو سکتے ہیں اگر تم کچھ ہمت کرو۔"

نکی شرمانے لگی۔ فون کی گھنٹی بجی تو میں اچھل پڑا۔ میرا خیال تھا کہ فون ابھی تک ون وے ہو گا اور جب تک میں خود نمبر نہیں ملاؤں گا رابعہ اور گل سخت سسپنس میں مبتلا رہیں گی۔

ریسیور اٹھا کے میں نے کہا "ہاں جی' چوہدری لال دین کتھا والا بول رہا ہوں چونا منڈی سے۔ کیسا بندر.... اچھا اچھا.... سکھ اندر ہے.... پھر ہم کیا کریں جی" میں نے فون بند کر دیا۔

گھنٹی پھر بولی تو میں نے ریسیور اٹھاتے ہی رابعہ کی آواز سنی "کیا مجھے خود آنا پڑے گا تمہارا دماغ درست کرنے کے لیے۔"

"آجاؤ بلبل' دماغ خراب بھی تم نے ہی کیا ہے۔ وہ کیا خوب گا کے فرمایا ہے اپنے محمد رفیع صاحب نے۔

تم ہی نے درد دیا ہے تم ہی دوا دینا"

غالباً جھلا کے رابعہ نے ریسیور گل کو دے دیا تھا "سکندر۔ کیوں پریشان کرتے ہو۔ سچ بتاؤ' نازو آگئی ہے' تمہیں رابعہ کی قسم۔"

"گل کی بچی۔ یہ فاؤل ہے" میں نے چلا کے کہا "قسم دے کے تم نے پابند کر دیا' نازو واقعی آگئی ہے۔"

"بات کرائیں میری۔ وہ ٹھیک ہے نا؟"

"نہیں۔ وہ بات نہیں کر سکتی۔ وہ بے ہوش ہے مگر ہم نے ایک ڈاکٹر کو بلا لیا ہے۔ اس نے یقین دلایا ہے کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ ہم اسے اسپتال شفٹ کر رہے ہیں۔"

"ابھی نہیں۔ ہم دیکھیں گے اسے" رابعہ اور گل نے ایک

"براہِ راست میری اور تمہاری کوئی دشمنی نہیں لیکن تم میرے شوہر کے دشمن ہو تو میرے بھی ہو" وہ بولی۔

"تھینک یُو ویری مچ۔ تم نے واقعی احسان کیا ہم پر۔ اب یہ بھی بتادو کہ نازو تمہیں کہاں سے ملی؟"

"چھوڑو یہ سب باتیں۔ تمہارے لیے ناممکن ہوتا اس کا سراغ لگانا۔ جیسے میں دلاور کو تلاش کرنے میں ناکام ہوگئی تھی۔"

"نازو بے ہوش کیوں ہے؟ اور اسے تابوت میں بھیجنے کا مقصد کیا تھا؟"

"مقصد صرف ایک پیغام دینا تھا۔ وہ ویسے بھی آسکتی تھی کہ تم اسے دفن کرنے کے سوا کچھ نہ کرپاتے۔ میرا خیال تھا کہ تم سمجھ جاؤگے۔ عقلمند کو اشارہ کافی ہوتا ہے محسن!"

"میں عقلمند نہیں ہوں۔ عقل ہوتی مجھ میں تو جذباتی ہو کے سکندر کا ساتھ نہ دیتا اور خود سکندر میں عقل ہوتی تو آج وہ دلاور کا دشمن نہیں بزنس پارٹنر ہوتا۔ ہم ایسے خوار نہ ہوتے۔ یورپ اور امریکا میں عیش کررہے ہوتے۔"

"یہ تم آج بھی کرسکتے ہو۔"

"نہیں۔ سو پیاز کھاکے، اب سو جوتے کھانے سے فائدہ نہیں، ہم خود کو مزید بے وقوف ثابت کرنا نہیں چاہتے۔ کیا تم بتاسکتی ہو کہ نازو کی بے ہوشی کس قسم کی ہے؟"

"میں کیا ڈاکٹر ہوں؟"

"نازو کو تم وزیر خان اسپتال سے لائی تھیں نا؟"

"اگر یہ اندازہ ہے تو سمجھو بالکل ٹھیک ہے۔ غالب بھی پڑے وہیں تھا۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر شاہ نے نازو کو آسانی سے تمہارے حوالے کردیا؟"

"آسانی سے کوئی کام نہیں ہوتا مسٹر محسن۔ لیکن مشکل کام بہت کیے ہیں میں نے۔ یہ بھی مشکل تھا مگر ڈاکٹر شاہ کو موقع بھی نہیں ملا کچھ کرنے کا۔ اسے مجھ پر کیسے شک ہوسکتا تھا۔ میں بھی اکیلی نہیں گئی تھی۔ میں نے صرف ڈاکٹر شاہ کو کمرے میں روکے رکھا، نازو کو میرے وفادار ملازم نکال کرلے گئے۔ پھر میں بھی نکل آئی۔ میں اس سے پوچھ نہیں سکی کہ نازو کیسی ہے؟ میں نے تو نازو کو بعد میں دیکھا۔"

"اس وقت وہ تابوت میں یقیناً نہیں تھی۔ یہ بندوبست تم نے پہلے سے کرلیا تھا۔"

"یہ خیال مجھے اچانک آیا۔ ایک تابوت دیکھ کے۔ مجھے معلوم نہیں وہ کس نے کس کے لیے بنوایا تھا۔"

"وہ تابوت نیا نہیں تھا۔ اسے کسی کی قبر کھود کے نکالا گیا تھا۔ کیونکہ اس پر مٹی بہت تھی۔ بائی دا وے، تابوت تمہیں اچانک کہاں نظر آگیا تھا۔ گھر میں اچانک نہیں آسکتا اور سڑک پر رکھا ہوا بھی اچانک نظر نہیں آتا۔"

"تابوت وزیر خان اسپتال کے احاطے میں رکھا ہوا تھا۔ تمہیں ڈاکٹر شاہ بتائے گا کہ کیوں رکھا ہوا تھا" وہ جھنجلا کے بولی "اس سے پوچھ لو اگر بہت شوق ہے سراغ رسانی کا اور بال کی کھال نکالنے کا۔ کیا اضافہ ہوگا تمہاری معلومات میں اگر تابوت پر ریسرچ کرتے رہے..."

میں نے کہا "یہ میں وقت آنے پر بتاؤں گا۔ ابھی تو خیر مسئلہ ہے نازو۔ جب تک وہ ہوش میں نہیں آجاتی، ایک سوال اور..."

"ایک نہیں دو پوچھو۔ پھر کچھ مجھے بھی پوچھنا ہے۔"

"کیا نازو کی واقعی شوکت رانا سے شادی ہوئی تھی؟"

اس نے کہا "اس کا جواب نازو دے سکتی ہے یا پھر تم خود شوکت رانا سے پوچھ سکتے ہو۔ میں کچھ نہیں جانتی، مجھے صرف یہ پتا تھا کہ وہ کہاں ہے اور میں نے اسے وہاں سے نکال کے تمہارے پاس پہنچادیا لیکن تم نے رانا کو مقامی پولیس کے حوالے کرکے غلطی کی۔"

"پھر ہم کیا کرتے؟"

"تم چوہدری دلاور کو قید میں رکھ سکتے ہو تو شوکت رانا کیا چیز ہے مسٹر محسن۔ پولیس اور وہ الگ نہیں ہیں۔ اگر ڈاکو کسی چور کو پکڑے گا تو کیا عدالت میں پیش کرے گا؟ ان کے درمیان سمجھوتہ پہلے سے ہے، تمہارے سامنے گرفتاری کا ڈراما ایک مجبوری تھی۔ اب تک وہ رہا ہوچکا ہوگا یا اس کی کوشش کامیابی کے قریب ہوگی۔ صرف تمہارے لیے ہی نہیں وہ میرے اور بچوں کے لیے بھی خطرہ ہے۔"

"تم نے خطروں سے کھیلنا سیکھ لیا ہے۔"

"دیکھو۔ مجھے غلط مت سمجھو۔ دلاور کی خاطر جو کچھ میں نے کیا وہ مجھے کرنا ہی تھا۔ آئندہ بھی جو مجھ سے بن پڑا وہ ضرور کروں گی۔"

"اتنی محبت ہے اس سے؟"

"وہ میرے بچوں کا باپ ہے۔ یہ بات کتنی دفعہ بتاچکی ہوں میں کہ تمہارے لیے اور دنیا کے لیے وہ کچھ بھی ہو۔ میری نظر میں وہ صرف میرا شوہر ہے اور ویسے بھی اس میں اور شوکت رانا میں بہت فرق ہے۔ شوکت رانا اور پیڈرو جرائم پیشہ گھٹیا ذہنیت رکھنے والے چھوٹے لوگ ہیں۔ وہ کچھ بھی کرسکتے ہیں۔ پیسے کے لیے یا صرف اپنی بدمعاشی کا بھرم رکھنے کے لیے۔"

میں نے ہنس کے کہا "اور دلاور شریف آدمی ہے؟"

وہ چیخ کے بولی "مجھے بتاؤ وہ کیا کرتا ہے۔ کیا وہ شرابی ہے؟ جُواری ہے؟ رنڈی باز ہے یا عورتوں کی عصمتوں سے کھیلتا ہے۔ بس اس کا یہ کاروبار غیر قانونی ہے۔ ایسے تو نہ جانے کتنے لوگ ہیں جو غیر قانونی کام کرکے ہی بنے ہیں مگر شریف اور معزز سمجھے جاتے ہیں۔"

"لمبی بحث کا وقت نہیں ہے۔ اور پھر تم سے کیا بحث کرنی، تم ایک بیوی کی طرح سوچتی ہو۔" میں نے کہا "یہ بتاؤ کیا نازو تمہیں

"او خدایا! کیا ان تجربات کا ریکارڈ رکھا جاتا ہے۔ فلم بناکر؟"

"یہ تو مجھے معلوم نہیں۔"

"شوکت رانا ایک بلیک میلر ہے۔"

"ضرور ہوگا۔"

"اور اس کے پاس بلیک میلنگ کا ذریعہ یہی فلمیں ہوں گی۔"

"اگر تم جانتے ہو تو مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"مجھے افسوس ہے کہ تم کو سب معلوم تھا۔ لیکن آج تک تم نے کچھ نہیں کیا...؟"

"تم میری جگہ ہوتے تو کیا کرسکتے تھے۔ میں کوئی مجاہد نہیں تمہاری طرح۔ میں چوہدری دلاور کی بیوی تھی۔ ڈاکٹر شاہ اس کا بزنس پارٹنر تھا۔ لیکن اب حالات اس کے برعکس ہیں۔ وہ دلاور کا جانی دشمن ہے اور اس کا بس چلے تو وہ دلاور کے خاندان کا نام ونشان مٹادے۔ کون سی کسر چھوڑی تھی اس نے مجھے اور میرے بچوں کو مار کے سارے کاروبار پر قابض ہونے میں۔ وہ تو سمجھ رہا تھا کہ دلاور کا کانٹا راستے سے نکل گیا۔ اب وہ زخمی سانپ ہے۔ اس کی وجہ سے میں چھپ کر رہنے پر مجبور ہوں۔"

"اور اسی لیے تم یہ سب کچھ بتارہی ہو۔"

"ہاں۔ یہ دشمنی کا رشتہ کچھ ایسے ہی چل رہا ہے۔ پہلے تم نے میری مدد کی تھی۔ میری زندگی بچالی تھی اور مجھے دلاور سے بھی ملوادیا تھا۔ میں نے بدلے میں نازو کی زندگی بچائی اور اسے تم سے ملادیا۔ اب میں تم سے کہہ رہی ہوں کہ شوکت رانا کو ختم کردو۔ وہ میرا اور تمہارا دونوں کا دشمن ہے۔ میں یہ کام نہیں کرسکتی۔ تم کرسکتے ہو۔ تم نے بہت بڑے بڑے کام کیے ہیں۔ شوکت رانا کے معاملے میں پولیس پر یا قانون پر بھروسا مت کرو۔ تمہاری ایم آر الیس اسے ٹھکانے لگاسکتی ہے..."

میں حیران تھا کہ دلاور کی بیوی کس قسم کی گفتگو کررہی ہے۔ اس کی کوئی بات غلط نہیں تھی لیکن مجھے ایسا لگا جیسے وہ چالاک عورت مجھے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہتی ہے۔

میں نے کہا "تمہیں دلاور کے معاملے میں کوئی تشویش نہیں؟"

وہ بولی "اب دلاور کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

"کیا تم ملی ہو اس سے؟"

"ابھی تک مجھے کامیابی نہیں ہوئی۔ پولیس اس کی گرفتاری سے بھی لاعلمی ظاہر کررہی ہے لیکن میں سب سمجھتی ہوں۔ میں معلوم کرلوں گی اور اس کی ضمانت پر رہائی بھی ہوجائے گی۔"

فاطمہ جعفری کے بارے میں دلاور کی بیوی کے انکشافات نے میرے ذہن کو غیر متوقع الیکٹرک شاک کی طرح جھنجوڑ کے رکھ دیا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ نادانستگی میں ہم سے کیسی خوفناک غلطی سرزد ہوگئی تھی۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے بھیڑ کو حفاظت کے لیے خونی بھیڑیے کی تحویل میں دے دیا جائے۔ یہ ساری باتیں وقار کے علم میں بھی نہیں تھیں جو مجھے دلاور کی بیوی نے بتادی

اسی حالت میں ملی تھی۔ یا تمہیں علم تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہورہا ہے؟"

"کیا غالب سے مل کے تم نے اندازہ نہیں کیا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟"

میں نے کہا "گویا تمہیں غالب کی واپسی کا بھی علم ہے اور اس کی حالت کا بھی۔ تم جانتی ہو کہ وزیر خان اسپتال میں کیا ہوتا ہے؟"

"میں دنیا میں رہ کے دنیا سے اتنی بے خبر بھی نہیں۔ ایک نام سنا ہے تم نے؟ ڈاکٹر فاطمہ جعفری۔ بڑی عجیب چیز ہے وہ۔ اسے عورت تو میں نہیں کہوں گی۔"

میرے ذہن میں ایک دھماکا سا ہوا "کیا نام لیا تم نے؟ فاطمہ جعفری؟"

"ہاں۔ مجھے تو وہ بھی نفسیاتی کیس ہی لگتی ہے۔ کہتے ہیں کہ باقاعدہ ڈاکٹری پاس ہے۔ ایم بی بی ایس ہے۔"

میں نے خود کو سنبھال کے کہا "تم ملی ہو اس سے؟"

"ملے بغیر یہ سب کیسے بتاسکتی تھی۔"

"اور کیا جانتی ہو اس کے بارے میں؟" میں نے کہا۔

وہ بولی "اس نے اپنی ماں کو قتل کردیا تھا۔ باپ کا کچھ پتا نہیں۔ کوئی کرنل ہے جس نے اس کو پالا مگر یہ بھی سنا ہے کہ آج کل وہی اس کا شوہر بنا ہوا ہے۔ جس سے اس کی شادی ہوئی تھی وہ شریف آدمی تھا اور کوئی ڈاکٹر ہی تھا جو پھنس گیا تھا۔ اس کی دوسری بیوی کو میں جانتی ہوں۔ اسی نے مجھے بتایا ہے کہ فاطمہ جعفری اپنے شوہر کے ساتھ صرف تین مہینے رہی تھی اور اس عرصے میں جو کچھ ہوا وہ بیان نہیں کیا جاسکتا۔ ڈاکٹر تو پاگل ہوجاتا، یہ عورت وہ ہے..."

میں نے کہا "NYMPHOMENIAC؟"

"ارے۔ تم نے کیسے جان لیا۔ مجھے تو یاد نہیں آرہا تھا یہ لفظ۔ خیر تم سمجھ گئے ہوگے۔"

میں نے کہا "جیسے مرد جنسی جنونی ہوتے ہیں ایسے ہی کچھ عورتیں ہوجاتی ہیں۔"

"یہ عورت ڈاکٹر شاہ کی خاص معاون ہے۔"

یہ دوسرا شاک زیادہ شدید تھا "تمہیں یقین ہے؟"

"کیا تم مجھ سے زیادہ جانتے ہو اس کے بارے میں؟"

میں نے کہا "نہیں۔ میں تو کبھی نہیں ملا اس سے۔ تم سے ہی نام بھی سنا ہے اس کا۔"

"وہاں ڈاکٹر شاہ کی اور اس کی جوڑی مل کے کیا کرتی ہوگی۔ اس کا اندازہ بھی کرلینا چاہیے تمہیں۔ وہاں مرد بھی داخل ہیں اور عورتیں بھی۔ ان پر جسمانی تشدد بھی ہوتا ہے مگر ذہنی تشدد بہت برا کیا جاتا ہے۔ تم یہ سمجھ لو کہ مرد عورت کو وہاں جانور سمجھا جاتا ہے اور ان پر ایسے جنسی تجربات بھی کیے جاتے ہیں جن کا تصور کوئی نہیں کرسکتا۔"

تھیں۔ دولاکھ بنی سسی اور دلاور کی بیوی ہوتا اس کا ج... جیسے برے سے برے آدمی کے اندر نیکی مرتی نہیں۔ دنیا میں سیاہ خانے میں انسانیت کی ایک کرن ہمیشہ روشن رہتی ہے۔ دلاور کی بیوی کے وجود میں شرافت باقی تھی۔ اس کے لیے دلاور سی بھی دوسری عورت کے شوہر سے کم اہم نہ تھا۔ سوفیصد باوفا دلاور نہیں تھا تو اس کی بیوی بھی بے خطا نہ تھی مگر اس کے باوجود معاشرے اور خاندان کے روایتی بندھن میں دونوں ہنسی خوشی بندھے ہوئے تھے اور اپنے گھر کی حفاظت ایک ہی طرح کرتے تھے۔

دلاور کی بیوی کا احسان مند ہونا بھی غنیمت تھا۔ کہتے ہیں نیکی کبھی رائگاں نہیں جاتی۔ دلاور کی بیوی نے ایسے وقت میں کیا نیکی کا بدلہ چکایا تھا جب ہم بے بس تھے اور یہ حساب ایسے برابر کیا تھا کہ شاید کچھ ہم ہی زیادہ مقروض ہو گئے تھے۔

میں واپس اس کمرے میں پہنچا جہاں وقار محسن اور فاطمہ فراغت سے قالین پر پاؤں پھیلائے بیٹھے ہوئے تھے۔ محسن نے فاطمہ کو اعتبار کے قابل سمجھتے ہوئے وہ سب بتا دیا تھا۔ جو دشمن کے مخبر پر اپنا ہر راز افشا کرنے کے مترادف تھا۔ دوست بن کے آنے والے دشمن کو اپنی کمزوری سے آگاہ کرنے اور اس کے سامنے اپنی جنگی حکمت عملی کی وضاحت کرنے کے مترادف تھا۔

فاطمہ یقیناً دل ہی دل میں ساری صورت حال سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ نازو اسی کی کشتہ تیغ ستم تھی جسے مسیحائی کے لیے اسی کے سپرد کیا جا رہا تھا۔ یہ اتفاق بھی کیا بے رحمانہ تھا۔ دلاور کی بیوی فون نہ کرتی تو نازو پھر اسی زنداں میں پہنچ جاتی اور الزام ہم پر آتا کہ دوسری بار خود ہم نے اسے عذاب دینے والوں کے حوالے کیا۔

میرے ذہن میں اب بہت سے سوالات تھے اور الجھنیں تھیں۔ مگر میں مطمئن اور پُرسکون تھا۔ مجھے صبح تک مہلت مل گئی تھی اور موقع ملتے ہی میں محسن کو بھی شریک راز کر سکتا تھا۔ ان حالات میں فاطمہ جعفری کی واپسی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مجھے تو یہ تشویش بھی لاحق ہو رہی تھی کہ اس نے نازو کو کیا دوا انجکشن کی صورت میں دی تھی۔ کیا یہ نازو کی بے ہوشی کو طویل تر کرنے والی دوا تھی؟ خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔ اس نے بے ہوشی کو ختم کرنے کے بجائے زندگی کو ختم کرنے کا فیصلہ نہ کیا ہو۔ وہ اچھی ایکٹریس بھی تھی۔ اس نے نازو کو دیکھ کر کسی حیرانی کا اظہار نہیں کیا تھا اور پریشان نہیں ہوئی تھی۔ شاید اسی لیے نازو کی زندگی محفوظ تھی کہ فاطمہ جعفری کو افشائے راز کا ڈر نہیں تھا۔ وہ مطمئن تھی کہ قید سے فرار ہونے والے قیدی کو اس کی ... نے پھر جیلر کے سامنے پہنچا دیا اور اب فکر کی کوئی بات نہیں رہی۔ اس کے ہوش میں آنے سے پہلے وہی جیل خانہ ہوگا اور وہی قید کی اذیت۔ وہ نازو کو اپنے ساتھ لے جائے گی۔ اس بار سختی زیادہ ہوگی تو وہ خود بتا دے گی کہ اس کو زنداں سے نکالنے والا کون تھا؟

دلاور کی بیوی سے میری گفتگو نگی نے بھی سنی تھی اور وہ میرے پیچھے آگئی تھی۔ میں نے اسے ڈانٹ کے رخصت کر دیا۔ "چلو باقی باتیں صبح۔"

"مگر مجھے نیند نہیں آرہی ہے۔"

"آرہی ہے" میں نے ڈانٹ کے کہا "تم کو اپنی صحت کا خیال رکھنا چاہیے۔"

وقار نے کہا "یہی میں بھی کہتا ہوں۔"

محسن بولا "مگر ویسے خیال نہیں کرتے جیسے مولوی خادم حسین خیال رکھتا ہے اپنی بیوی کا۔"

وقار نے کہا "بیوی کو دیکھو۔ کتنی مامتا ہے اس کے پیار میں۔"

نگی کے جاتے ہی میں نے دروازہ بند کر دیا "ڈاکٹر فاطمہ جعفری۔ آج کل تم کہاں پریکٹس کرتی ہو' کلینک کہاں ہے؟"

"کلینک گھر میں ہی ہے۔ جو مریض آجائیں دیکھ لیتی ہوں۔"

میں نے کہا "گویا آمدنی کا کوئی مسئلہ نہیں۔ ٹھیک ہے' کیا ضرورت ہے تمہیں زیادہ مغز ماری کرنے کی۔ تمہارے شوہر کی جائیداد ہی کافی ہوگی آمدنی بھی۔"

"کس شوہر کی بات کر رہے ہو تم؟ میرا کوئی شوہر نہیں۔"

میں نے حیرانی سے کہا "اچھا! یہ کرنل صاحب کون ہیں؟"

"انہی نے پالا ہے مجھے" وہ بگڑ کے بولی۔

"مگر لوگ تو کچھ اور کہتے ہیں۔"

اس نے چند مردانہ گالیاں دیں "غلیظ لوگ۔"

"گٹر اگر پرنالے کو کہے کہ تو گندا۔۔۔"

اس نے غرا کے میری بات کاٹ دی "کیا مطلب؟"

"غلاظت تو تمہارے اپنے اندر اتنی بھری ہوئی ہے کہ اُبل اُبل کے باہر آرہی ہے۔ میں نے کہا تھا کہ میرے سامنے پوز مت کرنا۔ تم منٹو کا افسانہ نہیں کوئی فحش ناول ہو۔"

وہ بھڑک کے اٹھی "وقار۔۔۔ ایسے۔۔۔۔دوست ہیں تمہارے۔۔۔"

میں نے اس کی کلائی پکڑ کے جھٹکا دیا اور وہ پھر بیٹھنے پر مجبور ہو گئی۔

میں نے کہا "بیٹھو جان من۔ ہم سے آج ہی ملی ہو اور اتنی جلدی روٹھ کے جا رہی ہو۔ ابھی تو کچھ کہا نہیں ابھی تو کچھ سنا نہیں۔"

"مجھے کچھ نہیں سننا سنانا۔"

میں نے جواب میں ایسی بات کہی جو یہاں لکھی نہیں جا سکتی۔

"یہ تو تمہارا فیلڈ ہے۔ ذہنی مریضوں کا علاج تم کیسے کرتی ہو آخر؟" میں نے کہا "ذرا تفصیل سے بتاؤ کہ ڈاکٹر شاہ اور تم مل کے کس قسم کے تجربات کرتے ہو۔ میں اس سے ملا تو نہیں مگر میں نے سنا ہے کہ وہ بھی ایک سیکس MENIAC ہے۔ SADIST قسم کا۔"

کر سکا۔ اس نے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیے اور وہیں گر گئی۔ ایک دفاعی انداز اختیار کر کے اس نے سر کو پاش پاش ہونے سے ضرور بچالیا تھا۔

میں نے زمین پر قدم جماتے ہی پھر جوابی وار کے لیے خود کو تیار کر لیا۔

محسن بولا "بس بھائی۔ تم مقابلہ جیت گئے ایک عورت سے۔ مبارک ہو۔"

وقار بھونچکا کھڑا تھا۔ شور سن کر نگی بھی کمرے میں آگئی تھی۔ نگی نے اسے ہلایا "کیا ہے یہ سب؟"

وقار نے نفی میں سر ہلایا جس کا مطلب تھا کہ مجھے کچھ معلوم نہیں۔

میں نے کہا "پیچھے رہو نگی۔ ہو سکتا ہے یہ مکر کر رہی ہو۔ ایسا نہ ہو تم کو دبوچ لے۔"

نگی دوڑ کے وقار کے پیچھے ہو گئی "یہ تو مر گئی ہے شاید۔"

میں گھوم کے گیا اور سر کی طرف سے اس کے بالوں کو مٹھی میں لے کر ایک جھٹکا دیا۔ وہ چیخ مار کے اٹھ گئی۔ اس کے منہ سے وہ گالیاں نکلیں جو عام حالات میں مرد نہیں دیتے۔ اب میں نے روایتی انداز میں اس کے منہ پر الٹے ہاتھ کا بھرپور تھپڑ رسید کیا۔ اس کا منہ گھوم گیا اور جلد پر چار انگلیوں کے نشانات واضح ہو گئے۔

"بند کرو اپنی بکواس۔ آس پاس کے لوگ سنیں گے تو بدنامی میری ہوگی۔" نگی نے موقع غنیمت جانتے ہوئے اپنا پچھلا غصہ بھی نکال لیا اور اس کے دوسرے گال پر تھپڑ مار دیا۔ بدقسمتی سے اس کا چہرہ نگی کے سامنے بالکل صحیح زاویے پر آگیا تھا۔

اس نے نگی کو بہت بری گالی دی۔ نگی کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ پاؤں سے سلیپر اتار کے اس کی مرمت کرنے کے لیے آگے بڑھی "حرام زادی۔"

وقار ہنس پڑا "بس" اور نگی کو روک لیا۔

محسن نے کہا "میں یاد دلاؤں۔ کمینی' چڑیل۔۔۔۔۔"

میں نے اسے پیچھے کھینچ کے صوفے پر ڈال دیا اور ایک گھٹنے سے نیچے دبا لیا "کوئی فائدہ نہیں مقابلے کا مائی ڈیئر۔ تمہاری اصلیت مجھے معلوم ہو چکی ہے۔ وقار کے گھر تمہیں شامت اعمال لائی تھی۔"

وقار سخت بدحواس تھا "یار۔۔۔۔ مجھے تو کچھ پتا نہیں تھا۔۔۔ آخر معاملہ کیا ہے؟"

فاطمہ جعفری کے دونوں ہاتھ پھیلے ہوئے تھے اور وہ سانس لینے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی شعلہ فشاں آنکھیں جیسے حلقوں سے ابل آئی تھیں۔ اس نے اپنی شکست تسلیم کر لی تھی ورنہ اس حالت میں بھی مقابلہ جاری رکھتی۔ یہ اس کے حق میں اچھا ہوا۔ وہ ہاتھ اٹھاتی تو میں لحاظ نہ کرتا اور اس کا بازو اتر جاتا یا ٹوٹ جاتا۔

اس وقت مولوی خادم حسین بہ آواز بلند "لاحول ولا قوۃ" کا

اس کی شخصیت میں نمایاں ہونے والی تبدیلی اتنی واضح تھی کہ وقار اور محسن جو پہلے میری باتوں پر حیران تھے اب اس کو یوں دیکھ رہے تھے جیسے وہ کوئی انسان نہیں بلکہ انسانی روپ میں چڑیل یا بھوت ہے جس کو میرے منتر نے اصلی چہرہ دکھانے پر مجبور کر دیا ہو۔

وہ ایک دم اٹھ کے مجھ پر جھپٹی مگر میں اس کے لیے بالکل تیار تھا۔ میں نے خود کو دائیں ہتھیلی زمین پر رکھ کے ایک طرف جھکا لیا اور میرے پیر اٹھے تو اس کے سینے پر لگے۔ وہ اس کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس کے حلق سے ایک کراہ نکلی مگر پھر اس کا جسم اکڑ گیا اور یہ اشارہ میرے لیے کافی تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ جوڈو کراٹے جانتی ہے۔ بس اسے یہ علم نہیں تھا کہ میں اس کا بھی استاد ہوں۔

وہ زخم خوردہ شیرنی کی طرح دہاڑی اور پیچھے ہٹتے ہی پھر پلٹ کے آئی۔ اس وقت تک میں آدھا اٹھ گیا تھا۔ میں نے اس کی کمر کے پاس سے کپڑوں کو گرفت میں لیا اور جھٹکا دے کر اسے تھوڑا سا اوپر اٹھایا۔ میرے دوسرے ہاتھ نے اسے پیچھے سے دھکیلا۔ وہ میرے اوپر سے گزر گئی اور منہ کے بل صوفے کے پیچھے والی دیوار سے ٹکرائی۔

وہ بھرے بدن والی لمبی چوڑی عورت تھی۔ دیوار اس تصادم سے لرز گئی اور خود اس نے ایک بھیانک چیخ بلند کی۔ وقار نے ایک دوبار دبے دبے لہجے میں کہا کہ بھئی یہ کیا ہو رہا ہے تو محسن نے اسے یہ کہہ کے خاموش کر دیا کہ تمہیں کیا۔ مفت کی فائٹ دیکھو آرام سے بیٹھ کے۔

فاطمہ جعفری صوفے پر پڑی ہانپ رہی تھی۔ اس کی شکل غصے اور نفرت کے جذبات سے مکروہ نظر آنے لگی تھی۔ وہ مجھے اور وقار کو غلیظ گالیوں سے نواز رہی تھی اور خطرناک دھمکیاں دے رہی تھی۔

اب میں پوری طرح مستعد کھڑا ہوا اسے بلا رہا تھا۔ "کم آن مائی بے بی۔ دیکھتے ہیں تم کس حد تک مرد ہو۔"

وہ پینترا بدل کے حملہ آور ہوئی۔ اس کے بال بکھر گئے تھے اور آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ خون اس کے ہونٹوں کے کنارے سے بھی بہہ رہا تھا۔ غالباً اس کا منہ صوفے کی لکڑی پر لگ گیا تھا۔

اس نے خالص پیشہ ورانہ انداز میں مجھے فلائنگ کک مارنے کی کوشش کی۔ یہ کک کسی عام آدمی کے پڑ جاتی تو اس کی پسلیاں ٹوٹ جاتیں یا اس کا سانس رک جاتا۔ میں نے اس کا جواب اپنی فلائنگ کک سے دیا۔ ہمارے پاؤں فضا میں پرواز کرنے والے جہازوں کی طرح ٹکرائے۔ مہارت کے اعتبار سے ہماری کارکردگی کا معیار برابر تھا مگر وہ جسمانی طاقت سے مار کھا گئی۔ اگر آسمان کی وسعت میں شکاری باز کا تصادم چیل سے ہو جائے تو چیل کہاں جائے گی۔

وہ بھی کریش کرنے والے جہاز کی طرح واپس گئی اور ریورس گیئر میں دیوار سے ٹکرائی تو اس کا سر ضرب کی شدت برداشت نہ

ورد کرتے اور تقریباً دوڑتے ہوئے نازل ہوئے۔ ان کی نصف بہتر ان کے پیچھے لڑھکتی چلی آرہی تھی اور چلاّ چلاّ کے کہہ رہی تھی "ارے رک جا کم بخت۔"

میں نے کہا "تم لوگ کیسے آگئے یہاں؟ اور تم کیوں مار رہی ہو اسے آدھی رات کو؟"

"توحی۔ آپ بھی کیا بات کرتے ہو۔ ہاتھ ٹوٹ جائیں میرے جو میرے دل میں ایسا خیال بھی آیا ہو۔ ہمیں رابعہ بی بی نے بھیجا زبردستی..."

مولوی خادم حسین نے کانپتی آواز میں کہا "سکندر صاحب، کچھ تو خدا کا خوف کیجئے جی۔ یہ سخت غیر شرعی دنگل ہے۔ توبہ توبہ، عورت کے ساتھ آدھی رات کو دھینگا مشتی، ہم تو خیریت معلوم کرنے آئے تھے۔"

وقار نے کہا "یہ عورت نہیں۔ بلا ہے بلا۔ تمہیں نہ چمٹ جائے۔"

خادم حسین نے فوراً آیت الکرسی پڑھ کے پھونک ماری "مجھ سے ایک تو پہلے ہی چمٹی ہوئی ہے جی" اس نے زیرِ لب کہا۔

میں نے فاطمہ جعفری کو بیٹھنے کا موقع فراہم کیا۔ اس نے وقار سے کہا "میں گھر جانا چاہتی ہوں۔"

"اب تم بڑے گھر جاؤ گی۔ تمہارا اپنا گھر تو ہے نہیں" میں نے کہا۔

وہ میری طرف دیکھے بغیر بولی "وقار۔ یہ سب کچھ تمہارے گھر میں ہوا ہے میرے ساتھ، یاد رکھنا۔"

جواب میں نے دیا "ابھی تو بہت کچھ ہونا باقی ہے جو تم یاد رکھو گی ساری عمر۔ نکی ریوالور لاؤ۔"

نکی نے لرزتی آواز میں کہا "سکندر بھائی.... یہاں خون کرو گے اس کا.... نہیں.... اسے باہر لے جاؤ کہیں۔ گولی چلنے کی آواز سب سنیں گے اور... خون نہیں دیکھ سکتی میں۔"

میں نے سوچ کے کہا "اچھا۔ پھر اسے پھانسی دے دیں یا گلا دبا کے ہلاک کر دیں۔"

وقار نے کہا "تم نکی کو موقع کیوں نہیں دیتے۔ اس کے دل میں بڑی تمنا تھی اس عورت کو قتل کرنے کی۔"

میں نے کہا "ہاں۔ مجھ سے بھی کہہ رہی تھی کہ میرا بس چلے تو

اسے زہر دے دوں۔ تم قسم دے کے پوچھ لو کہ کیا میری بات غلط ہے؟"

محسن نے کہا "یہ ٹھیک ہے۔ کم آن نکی، ارمان پورے کر لو اپنے۔"

مولوی خادم حسین ایسے ہل رہا تھا جیسے اسے جاڑا بخار چڑھ رہا ہو "اجی کیسی بھیانک باتیں کر رہے ہیں آپ لوگ۔ میری گھر والی کا دل بہت کمزور ہے۔"

"یہ تو ڈاکٹر صاحبہ بتا سکتی ہیں کہ دل کی کیا حالت ہے۔ تم بھی چیک کرا لو مولوی خادم حسین اچھا موقع ہے۔ دماغی امراض کی ماہر ہیں یہ..."

خادم نے پھر لاحول پڑھی "میرے دماغ کو کیا ہوا ہے جی۔"

"ہاں۔ جو چیز موجود ہی نہ ہو اس کو کیا ہو گا۔ خیر، اب تم سب خواتین کو یہاں سے لے جاؤ۔ اور دیکھو اگر کوئی دروازے پر آکے سوال کرے کہ یہ کیسا ہنگامہ ہے تو کہہ دینا..."

محسن نے کہا "کہ کچھ نہیں۔ ہم میاں بیوی پیار محبت کی باتیں کر رہے تھے۔"

جب کمرے میں میرے ساتھ محسن اور وقار رہ گئے تو میں نے کہا "مائی ڈ ... ...اں۔ یہاں سے زندہ سلامت اور خیر و عافیت کے ساتھ واپس جانا صرف ایک صورت میں ممکن ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ ... کیوں بے ہوش ہے اور کب تک رہے گی۔ اس کی ذہنی کیفیت ... ہے اور..."

اس نے میری بات کاٹ دی "میں تمہیں کچھ نہیں بتاؤں گی۔"

میں نے ایک گہری سانس لی "یعنی اپنے لیے بھی مشکل پیدا کرو گی اور ہمارے لیے بھی۔"

محسن نے کہا "پوچھ گچھ کے وہ سب طریقے آتے ہیں ہمیں جو پولیس والے استعمال کرتے ہیں۔"

میں نے کہا "تم نے غالب پر بھی کیے ہوں گے۔"

اس نے چیلنج کرنے والے انداز میں میری طرف دیکھا "آزما کے دیکھو۔ تم نے مجھے عام عورت سمجھ رکھا ہے، میں ڈاکٹر ہوں۔"

"تم اس پیشے کے نام پر دھبا ہو۔"

"اور میں لاوارث بھی نہیں ہوں۔ جب ڈاکٹر شاہ کو معلوم ہو گا اور کرنل کو پتا چلے گا..."

میں نے کہا "کیسے پتا چلے گا؟"

اس نے کچھ سوچ کے کہا "میں کرنل کو بتا کے آئی تھی.... یہاں۔"

اس کے لہجے کا کھوکھلا پن ہی اس کے دعوے کی نفی کر رہا تھا۔ "چلو پھر انتظار کرتے ہیں اس کی کال کا۔ آخر کب تک تمہاری واپسی کی راہ دیکھے گا وہ؟"

میں نے وقار کو سونے کے لیے بھیج دیا "تم جا کے ذرا نکی کو

تسلی دو۔ محسن شیروانی، تم اگر خود ہمت کرو کچن تک جانے کی تو چائے بنا لاؤ۔"

"میں خادم حسین کی بیوی سے کہہ دیتا ہوں۔" وہ مجھے اکیلا چھوڑنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

چند منٹ کے لئے تنہائی میسر آئی تو میں نے فاطمہ جعفری کے قریب بیٹھ کے اطمینان سے پاؤں پھیلائے۔ ایک جماہی لی اور یہ ظاہر کیا کہ تکان اور بے خوابی سے میرا جسم ٹوٹ رہا ہے۔ میں اسے کچھ کرنے کا موقع فراہم کر رہا تھا اور وہ اس چال کو نہیں سمجھ سکی۔ وہ سمجھی مجھ پر غنودگی کا اثر ہے اور میں اس کی طرف سے غافل ہوں۔

وہ تڑپ کر اٹھی اور ایک دم میرے اوپر آگئی۔ اس کا ہاتھ ایک مہلک وار کرنے کے لیے اٹھ چکا تھا۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ مجھے جان سے مار دے گی اور کسی کے واپس آنے سے پہلے فرار ہو جائے گی۔ اس وار سے کسی کی جان لینا گولی مارنے سے زیادہ آسان ہوتا ہے۔ ایک ہلکی سی آواز کے ساتھ ہی گردن کی ہڈی ٹوٹ جاتی ہے جو دماغ اور نچلے جسم کے درمیان زندگی کے احساس کا رشتہ قائم رکھتی ہے۔ یہ ٹوٹ جائے تو جسم کا سر سے تعلق ہی نہیں رہتا اور حلق سے کوئی آواز نکالے بغیر آدمی موت سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔

میں نے حرکت محسوس کرتے ہی آنکھیں کھول دی تھیں۔ خود کو بچانے کے لیے میں پلٹ کر صوفے سے فرش پر گر گیا اور میں نے دائیں ٹانگ کو سمیٹ کر ایک جھٹکے سے دراز کیا۔ لات اس کے پیٹ پر لگی اور وہ درد کی شدت سے کراہ کے دُہری ہو گئی۔ میں نے دوسرا پاؤں ایسے ہی اس کے گھٹنے پر مارا تو وہ بُری طرح لڑکھڑا کے گری۔ میں نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اپنی کھڑی ہتھیلی سے اس کے کان پر وار کیا، وہ فرش پر گرتے ہی بے حس ہو گئی۔

جب وہ پوری طرح مستعد تھی تو اس پر حملہ کر کے اسے ناک آؤٹ کرنا مشکل کام تھا۔ وہ اپنا دفاع کرتی اور اگر میں کامیاب ہوتا تو خاصی جدوجہد کے بعد۔ مجھے بے خبر سمجھنے کی غلطی اس کو مہنگی پڑی۔

محسن نے اندر آکے دیکھا "کیا خلاص کر دیا اسے؟"

میں نے ہاتھ جھاڑ کے کہا "نہیں۔ اسے یہاں سے منتقل کرنا ضروری تھا۔ اور یہ کام ایسے ہی ہو سکتا تھا۔"

"کہاں لے جائیں گے اس وقت ہم اسے؟"

میں نے کہا "آج رات اپنے گھر میں رکھیں گے۔ کل وہیں پہنچا دیں گے جہاں دلاور تھا۔"

میں نے اور محسن نے مل کے اسے اٹھایا اور گاڑی کی ڈکی میں ڈال دیا۔ دروازے کی آواز پر خادم حسین دوڑتا ہوا آیا "کون ہے؟ اچھا آپ...."

میں نے کہا "ہم جا رہے ہیں مولوی خادم حسین۔ اپنے گھر۔"

"اور وہ... جو بلا چپٹی ہوئی تھی آپ سے...."

میں نے کہا "وہ دفع ہو گئی' وقار کہاں ہے؟"

"وہ تو لڑ رہے ہیں جی اپنی بیگم صاحبہ سے۔ بلکہ بیگم صاحبہ لڑ رہی ہیں اور وہ سن رہے ہیں۔ میری طرح۔"

"اچھا یہاں کسی کا فون آئے اور کوئی پوچھے ڈاکٹر فاطمہ جعفری کو تو کہنا رانگ نمبر اور فون بند کر دینا۔ دوسری بار بھی یہی ظاہر کرنا کہ یہاں کوئی فاطمہ جعفری کو نہیں جانتا۔ اور نہ اس نام کی کوئی خاتون کبھی یہاں آئیں۔"

"میں سمجھ گیا جی۔ میں تو کہوں گا کہ یہ نام ہی پہلی بار سنا ہے میں نے تو... اور اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنی گھر والی کو دے دوں جی ریسیور اگر تیسری بار بھی فون آئے۔ وہ سمجھائے گی صحیح طرح۔"

میں نے کہا "تم جیسا مناسب سمجھو کرو مگر خیال رہے۔ نہ میں اور محسن یہاں آئے نہ کوئی اور آیا۔ سب معمول کے مطابق سوتے رہے۔"

میں نے راستے میں محسن کو دلاور کی بیوی سے فون پر ہونے والی تمام گفتگو سنا دی۔ "اسی لیے فرمایا ہے بزرگوں نے کہ نادان دوست سے دانا دشمن بہتر ہے۔"

"سچ کہا تم نے نادان دوست۔ مگر اب اس عورت کو چھوڑنا تو بہت خطرناک بات ہے۔"

"کس نے کہا ہے کہ چھوڑو ہے؟"

"اسے معلوم ہو گیا ہے کہ تم سکندر ہو۔"

"میں صبح ہوتے ہی لاہور سے بھاگ جاؤں گا۔ مجھے فوراً شرفِ ملاقات بخشنا ہوگا میری کے والد کو۔"

رابعہ اور گل اس انتظار میں تھیں کہ مولوی خادم حسین انہیں فون کر کے کچھ بتائے گا اور پھر یہ جان کر سخت پریشان ہو گئیں کہ آدھی رات کو ان کا فون بھی مر گیا یعنی ڈیڈ ہو گیا تھا۔

ابھی میں نے گاڑی روکی ہی تھی کہ وہ باہر آ گئیں۔ انہوں نے ہم دونوں کو دیکھا تو خاصی مایوس ہوئیں "نازو کہاں ہے؟"

میں نے کہا "نازو' کون نازو؟"

محسن نے کہا "سوتے سوتے اٹھی ہیں اس لیے بہکی بہکی باتیں کر رہی ہیں۔"

گل نے کہا "کیوں تنگ کر رہے ہو' بلاوجہ۔"

میں نے کہا "بھئی معاف کرنا۔ ہم نے مذاق کیا تھا۔ مانا کہ بہت بے ہودہ تھا یہ مذاق۔ مگر سچ یہی ہے کہ نازو نہیں آئی۔"

رابعہ نے آگے آ کے کہا "کھاؤ میری قسم۔"

"اف!" میں نے سر پکڑ لیا "آئندہ تم قسم نہیں دو گی مجھے۔ تمہیں میری قسم۔"

محسن بہت خوش ہوا۔ "اور گل تم بھی قسم کا غلط استعمال نہیں کرو گی۔ تمہیں میری قسم۔"

"اب آپ لوگ پابند ہیں اس قسم کے۔" رابعہ بولی۔

میں نے کہا۔ "تمہارے سر کی قسم رابعہ... نازو نہیں آئی۔"

محسن نے آہستہ سے کہا "ہمارے ساتھ" اور میں نے سہلایا۔

گل چونکی "پھر کہاں گئے تھے تم لوگ ایسی افراتفری میں؟"

"یار کیا ساری پوچھ گچھ یہیں ہو گی۔ اندر تو جانے دو" محسن نے کہا۔

رابعہ کا موڈ سخت خراب تھا۔ اسے یقین تھا کہ میں نے جھوٹی قسم کھائی ہے یا پھر قسم کھانے کا ڈراما کیا ہے۔

"ہم نے مولوی خادم حسین کو بھی بھیجا تھا" گل بولی۔

میں نے حیرانی سے کہا "کہاں بھیجا تھا؟"

"وقار کے گھر اور کہاں' تم کہاں گئے تھے آخر؟"

"ہم... ہم وہاں ضرور گئے تھے۔ لیکن مولوی وہاں نہیں پہنچا۔ کتنی دیر ہوئی اسے روانہ ہوئے؟"

"تمہارے پیچھے پیچھے گئے تھے وہ میاں بیوی۔ ایک گھنٹے سے زیادہ ہو گیا۔" گل نے بتایا۔

رابعہ سخت خفا تھی "ابھی سے یہ اوقات ہو گئی ہے ہماری۔ جھوٹی قسم بھی کھانے لگے ہیں لوگ۔"

میں نے کہا "لوگ کیا کریں گل۔ ابھی دھکے کھا کے آئے ہیں۔"

محسن نے میری تائید کی "اور ایسی شاندار گالیاں بھی کہ تم سنو تو اش اش کرو لیکن لوٹ کر آئے ہیں تو جھاڑ کھانے کو مل رہی ہے۔"

"آخر کچھ تو کھائیں گے ہم۔ جھوٹی قسم ہی سہی۔"

"بس آپ دونوں خبطی جھکی اور جھوٹے ہیں" گل نے کہا "فراڈ بھی۔"

"بالکل ٹھیک پہچانا تم نے۔ لیکن ہماری تمہاری جوڑی تو اللہ میاں نے آسمان پر بنائی تھی۔ جب باٹا والے جوتوں کی جوڑی ایک جیسی بناتے ہیں تو ظاہر ہے اللہ میاں نے تمہیں بھی ہمارے سانچے میں ڈھالا ہو گا۔" میں نے کہا "چنانچہ آپ نے ہماری نہیں اپنی تعریف کی۔"

لیکن انجام کار ہمیں سب کچھ بتانا ہی پڑا۔ گل اور رابعہ کا شوق اضطراب' تجسس اور بے چینی کے جذبات سے برا حال تھا۔ ایک بار میں باہر یہ دیکھنے گیا کہ ہماری مہمان کا کیا حال ہے۔ ان دونوں نے پیچھے پیچھے آ کے اس خوفناک چیز کو خود ملاحظہ کیا جس کے بارے میں ہم انتہائی سنسنی خیز بیانات دے چکے تھے۔

رابعہ نے کہا "یقین نہیں آتا۔ یہ ڈاکٹر بھی ہے...."

میں نے کہا "مت کرو یقین۔ تمہیں دیکھ کر کون مانے گا کہ تم ایسی توپ قسم کی وکیل ہو۔ دیکھنے میں لگتی ہو میٹرک فیل گاؤدی قسم کی لڑکی۔"

گل نے کہا "اگر یہ اچانک اٹھ کھڑی ہوئی اور چلانے لگی...؟"

رابعہ نے سہلایا "اس کو ڈکی میں کب تک رکھا جا سکتا ہے۔ مر ہی نہ جائے کہیں۔"

"اچھا ہے۔ خود ہی مر جائے۔ ہم پر الزام نہ آئے" محسن بولا۔

"ایسے نہیں بھائی۔ پہلے اس کا اعترافِ جرم تو مل جائے۔ اور میرا خیال یہ ہے محسن کہ اس مصیبت کو گھر سے دور ہی رکھنا بہتر ہے۔ چل اسے ابھی وہاں چھوڑ آئیں۔ بعد میں تو اکیلا کیسے قابو پائے گا اس بلا پر۔"

محسن نے مجھ سے اتفاق کیا "دن کے اُجالے میں یہ کام مشکل ہی ہو گا۔"

میرا تھکن اور نیند سے بُرا حال ہو رہا تھا لیکن یہ کام ٹالا نہیں جا سکتا تھا۔ ادھر رابعہ اور گل نے پریشانی کے متعدد اسباب پیدا کر لیے تھے۔ فون پہلے ٹھیک کام کر رہا تھا اور وہ مسلسل وقار کا نمبر ملاتی رہیں مگر وہاں میری اور مسز دلاور کی گفتگو طویل ہو گئی اور ادھر فون کا حوصلہ جواب دے گیا۔ پھر انہوں نے مولوی خادم حسین کو گاڑی میں روانہ کر دیا۔ اس کی گھر والی رضاکارانہ طور پر ساتھ گئی۔ اب ہم لوٹ آئے تھے مگر مسٹر اور مسز خادم حسین کو کسی نے روک لیا تھا کہ یہاں نازو کی دیکھ بھال کے لیے کوئی ہونا چاہیے۔ نتیجہ یہ کہ اتنے بڑے گھر میں گل اور رابعہ کا خوف سے بُرا حال تھا۔ انہیں شک تھا کہ فون کی لائن کسی نے کاٹ دی ہے اور ہمارے جاتے ہی فاطمہ جعفری کی بُو سونگھتے ہوئے شکاری کتے وہاں پہنچ جائیں گے۔

میں نے کہا "یار اتنی بزدل ہو تم...؟"

"ہاں میں بزدل اور میٹرک فیل گاؤدی نظر آنے والی لڑکی ہوں" رابعہ نے چلا کے کہا "تم افلاطون ہو اور سپرمین ہو۔ کہو تو لکھ کے دے دوں۔"

"فریج میں لکھنا تاکہ میں سمجھ سکوں" میں نے کہا۔

"گل۔ اپنے شاندار ماضی کو یاد کرو۔" محسن بولا "کیسے تم سنسان راتوں میں گھوڑے پر جنگلوں میں پھرتی تھیں۔ دنادن گولیاں چلاتی تھیں اور ناگ منی کے نام سے بڑے بڑے سورما کانپتے تھے' اب تم اتنا ڈرنے لگی ہو۔"

"ڈرتی ہوں میں بوبی کی وجہ سے یا تمہاری وجہ سے۔ جب بوبی نہیں تھا تو کیا میں تمہارا ساتھ نہیں دیتی تھی ہر جگہ" گل نے خفگی سے کہا۔

"چلو دروازے بند کر لو اور ہاتھ میں ریوالور پکڑ کے بیٹھ جاؤ۔ کوئی بھی آئے اسے گولی مار دینا۔ بس پہلے پوچھ لینا کہ ایمان سے کہو تم محسن شیروانی یا سکندر بخت تو نہیں ہو۔"

"کوئی کہے ہاں' تو کہنا اچھا کھاؤ میری قسم" میں نے کہا۔

انہیں چھوڑ کر جائے بنا چارہ نہ تھا۔ رات کے ڈھائی بج چکے تھے اور اس وقت ہم انہیں اپنے ساتھ رکھتے تو زیادہ پریشانی ہوتی۔ صبح کے تین بجے ہم پھر وہیں پہنچے جہاں اسی طرح دلاور کی اسیری کے دوران بھی آتے رہے تھے۔ اس جگہ نے ہماری جدوجہد کے باب میں ایک تاریخی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ یہیں میں رابعہ سے ملا تھا... یکھی یہیں مرے دِل کا فرنے بندگی۔ مجھ سے تعلق کے جرم کی سزا میں پہلے رابعہ کی ماں کی جان گئی اور پھر اس گھر کو ایک دھماکے نے نیست و نابود کر دیا۔ چوہدری دلاور نے ایک خاص مقصد کے تحت اس جگہ پر غاصبانہ قبضہ کیا اور یہاں ایک قصرِ عالی شان بنوایا۔ یہیں ہم مشہور طوائف چاندنی بیگم اور اس کے پرستار گولو پہلوان سے ملے تھے جو یہاں ایسے رہتے تھے جیسے یہ ان کے باپ کی جاگیر ہو۔ ان کے قتل کے بعد یہ حویلی کسی قانونی جنگ کے بغیر رابعہ کو مل گئی تھی مگر ایک رات پھر خوفناک آگ اور دھماکوں کے ساتھ یہ جگہ کھنڈر بن گئی۔ ہم خوبیِ قسمت سے بچ گئے تھے ورنہ محل کے ساتھ ہی ہمارے بھی پرخچے اڑ جاتے۔ محل کا پُراسرار تہ خانہ ملبے کے نیچے سلامت رہا تھا اور ہمارے بہت کام آیا تھا۔

چوہدری دلاور نے اس تہ خانے میں اسیری کے دن یوں گزارے تھے کہ صرف پولیس ہی نہیں اس کی غنڈا فورس اور شکاری کتے مل کر بھی اس کا سراغ نہ لگا سکے تھے۔ عین شہر کے درمیان یہ خفیہ قید خانہ کسی کی نظر میں آ ہی نہیں سکتا تھا۔

تہ خانے کا راستہ بھی وہی تھا۔ پہلے محسن نے کیبن جیسے باکس کا ڈھکنا کھولا اور اندر غائب ہو گیا۔ ہم بہت سی چیزیں گھر سے ہی ساتھ لے کر چلے تھے مثلاً ٹارچ' موم بتی اور ماچس۔ پینے کے پانی کا پلاسٹک کین اور کھانے کے لیے فریج میں ملنے والی ڈبل روٹی' بسکٹ کے دو ڈبے اور کچن میں بچا کھچا کھانا یہاں تک کہ باسی روٹیاں تک تھیلے میں بھر لی تھیں۔

محسن نے دس منٹ میں تہ خانے کے اندر اتر کے موم بتی روشن کر دی اور باہر آ گیا۔ پلاٹ پر لگا ہوا خیمہ اپنی جگہ موجود تھا۔ میں اسی میں فاطمہ جعفری کے ساتھ اشارے کا منتظر تھا۔ محسن نے آس پاس کسی کو موجود نہ پا کے سیٹی بجائی اور میں نے خیمے سے باکس تک پہنچنے میں دیر نہیں لگائی۔ فاطمہ جعفری کو میں نے اوپر سے ہی باکس میں لڑھکا دیا اور خود آرام سے اترا۔ پھر محسن نے اندر آ کے باکس کا ڈھکنا اوپر بند کر دیا۔

باکس کے فرش کا وہ سوراخ جو عین فرش کے سوراخ پر تھا اندھیرے میں ایک روشن مستطیل کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ محسن لٹک کر نیچے گیا پھر میں نے فاطمہ جعفری کو ہاتھوں سے تھام کے لٹکایا اور محسن نے نیچے سے اس کی ٹانگیں پکڑ لیں۔ میں نے تہ خانے میں اُتر کے اوپر والے چوکور سوراخ کا تختہ برابر کر دیا۔ اب کوئی ڈھکن اٹھا کے بھی دیکھتا تو اسے باکس میں کچھ نظر نہ آتا۔

دُھندلی روشنی میں ہمارے سائے دیواروں پر لرزاں تھے۔

اس ہال جیسے کمرے میں آرام و آسائش کے جتنے لوازمات موجود تھے سب بے مصرف اور ناکارہ ہوگئے تھے۔ بجلی کے بغیر وال لائٹس بے نور تھیں۔ اے سی پر گرد اور جالے تھے۔ رابعہ نے یہاں میری و بستگی کے لیے جو ریڈیو گرام گراموفون ریکارڈ اور کتابیں جمع کر رکھی تھیں۔ سب آثارِ قدیمہ کی طرح ایک شاندار ماضی کی تصویرِ عبرت بنی ہوئی تھیں۔ فرش پر اتنا گرد و غبار اور کوڑا جمع تھا کہ فرش غائب ہوگیا تھا۔

دلاور جتنا عرصہ یہاں رہا تھا۔ شاید ایک مہینے سے زیادہ۔ تقریباً چالیس دن۔ اس کے لیے یہی قید خانہ ساری دنیا تھی۔ اس کی نقل و حرکت محدود تھی۔ وہ ہاتھ اور پیر استعمال کرسکتا تھا مگر ان زنجیروں سے نجات حاصل نہیں کرسکتا تھا جو ناقابلِ شکست تھیں۔ اٹھنا بیٹھنا اور سونا جاگنا۔ سب ان زنجیروں کے ساتھ تھا۔ اس کے لیے جائے رہائش کو جائے اجابت کے طور پر استعمال کیے بنا چارہ نہ تھا۔ ایک گوشہ اس کا بیڈ روم بھی تھا اور لیٹرین بھی۔ یہیں اس کے کھانے پینے کی چیزیں کوڑا کرکٹ کے ساتھ پڑی رہتی تھیں۔ نتیجہ یہ کہ تہ خانے کی محبوس فضا میں ایک ناقابلِ برداشت بدبو بس گئی تھی اور اس پُرتعفن ہوا میں سانس لینا بھی مشکل تھا۔

ہم نے دلاور کی جگہ فاطمہ جعفری کو دست وبستہ چھوڑا اور کھانے پینے کا سامان اس کے قریب چھوڑ کے باہر آگئے۔ میں نے کچھ بڑے بڑے چوہے بھی دیکھے جو ہماری شکل دیکھتے ہی نہ جانے کہاں غائب ہوئے تھے۔ غالباً انہوں نے دھول مٹی سے اٹے ہوئے بیڈ یا بدوضع ہوجانے والی الماری کے پیچھے اپنی کالونی آباد کرلی تھی۔

میں نے کہا "اب دیکھتے ہیں اس ماحول میں مائی بھاتاں کا حوصلہ کب تک ساتھ دیتا ہے؟"

محسن بولا "مجھے یقین ہے کہ وہ چوبیس گھنٹے بھی نہیں گزار سکے گی یہاں۔"

ہم صبح ساڑھے تین بجے واپس پہنچے اور پڑ کے ایسے سوئے کہ صبح بیت گئی اور دوپہر آگئی۔ گیارہ بجے کے قریب مجھے یوں لگا جیسے زلزلہ آگیا ہو اور کوئی ڈائنوسارس قسم کا دیوہیکل جانور مجھے لقمۂ تر بنانے کے لیے ٹانگ پکڑ کے گھسیٹتا ہوا لے جارہا ہے۔ میرا سر زمین پر لگا تو خواب کی یہ کیفیت ختم ہوئی اور میں نے عبدالودود منظر کو دیکھا جس نے مجھے سوتے میں صوفے پر سے گھسیٹ کر نیچے ڈال دیا تھا۔ اور اب ہو ہو ہو کرکے ہنس رہا تھا۔ ہنسی کے ساتھ اس کی عظیم توند کا سارا گوشت اچھل پھدک ہو رہا تھا۔

"یہ تو زندہ ہے بھئی رابعہ' مبارک ہو۔"

میں نے سر جھٹک کے آنکھیں ملیں اور اٹھ کر بیٹھ گیا "اُلّو کے پٹھے۔ کیا بیوی اسی طرح جگاتی ہے تجھے ہر صبح؟"

"ابے ہم تو ایسے حکم کے غلام تھے کہ بیوی نے ایک آواز لگائی اور ہم اٹھ کر دوڑے سر کے بل۔ اب تو ماشاء اللہ اس کی اُمّت ایسا واویلا کرتی ہے۔ ناشتے کے وقت سیاسی جلسۂ عام کا سماں ہوتا ہے جس میں اپوزیشن والے بھی شامل ہوں۔" منظر صوفے پر بیٹھ گیا "دراصل مجھے جگہ نہیں مل رہی تھی بیٹھنے کے لیے۔ تو نیچے پڑا ہوتا تو پڑا رہتا۔"

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا "محسن کہاں ہے؟"

"حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا" منظر نے آہ بھری "بیوی کو پیارا ہوگیا۔ وہ رات کو ہی لے گئی تھی یہاں سے اٹھا کے تیری کوئی بیوی ہوتی تو بیٹے یہاں ایسے اکیلا نہ پڑا ہوتا بے گوروکفن۔ بھوتنی کے' رابعہ بھی گئی وقار کے ساتھ کورٹ۔ میں وہیں سے آرہا ہوں۔"

میں سنبھل کے بیٹھ گیا۔ "یعنی وہاں اب نازو کے ساتھ صرف نگی ہے۔"

"نگی میرے ساتھ یہاں آگئی ہے۔ نازو کو میں نے ایک پرائیویٹ کلینک کے پرائیویٹ روم میں شفٹ کرادیا ہے۔" اس نے مجھے ایک کارڈ دیا "یہ ہے نام اور پتا۔ ڈاکٹر میری بیوی کا ماموں ہے۔ اسپیشلسٹ ہے۔"

"کیا کہتا ہے وہ؟ نازو کے بارے میں۔"

"فکر کی کوئی بات نہیں۔ لیکن دلاور کی بیوی نے رٹ دائر کردی ہے پولیس کے خلاف حبسِ بے جا کی۔ وکیل اور اہلِ خانہ سے ملاقات اور طبّی معائنے کی درخواست کی ہے۔"

میں قالین پر پاؤں پھیلا کے بیٹھ گیا "یہ بھی پوچھا ہوگا کہ اس کا جُرم بتایا جائے۔"

"نہیں۔ اس نے کہا ہے کہ اسے اپنے وکیل سے اور اہلِ خانہ سے ملنے کا اور اپنا دفاع کرنے کا موقع فراہم کیا جائے۔ دوسری درخواست میں اس نے دلاور کے پرانے معالج کی رپورٹ کے حوالے سے کہا ہے کہ پولیس کی تحویل میں اس کی جان کو خطرہ ہے اور یہ اندیشہ ظاہر کیا ہے کہ تفتیش کے نام پر تشدد کیا گیا تو دلاور کی موت بھی واقع ہوجائے گی۔ عدالت اس کے طبّی معائنے اور مناسب علاج کی سہولت فراہم کرنے کا حکم دے۔"

"یہ تو متوقع تھا۔" میں نے کہا۔

"آج نوٹس جاری ہوجائے گا صوبائی سیکریٹری داخلہ کو اور عدالت شاید چوبیس گھنٹے میں آئی جی کو پیش ہو کے اپنا موقف بیان کرنے کی ہدایت کرے گی۔"

"آئی جی صاحب کیا کہیں گے وہ ایس ایس پی صدیقی کو اپنا نمائندہ بنا کے بھیج دیں گے۔"

"صدیقی نے پتا نہیں کہاں غائب کردیا ہے اس کو۔"

"وہ کہتا ہے کہ سیکیورٹی کے نقطۂ نظر سے اس کو ایک محفوظ مقام پر رکھا گیا ہے۔ مگر عدالت میں اسے حلف نامہ تو داخل کرنا ہی پڑے گا کہ دلاور ان کی تحویل میں ہے۔ پھر عدالت جو کہے' طبّی معائنے کے لیے یا وکیل اور اہلِ خانہ سے ملاقات کے لیے۔"

"بھائی۔ سب کچھ آدمی کی نیت پر منحصر ہے۔ کیا تُو جانتا نہیں ان پولیس والوں کو؟ صدیقی کہہ سکتا ہے کہ جناب والا' دلاور تو مفرور ہے اور ابھی تک پکڑا ہی نہیں گیا۔"

"صدیقی ایسا نہیں کرے گا۔"

"دلاور کی بیوی اسے ایک لاکھ سے دس لاکھ تک کسی بھی قیمت پر خریدے گی۔ راتوں رات اسے نکال دیا جائے گا۔ اور میرا خیال ہے یہ درخواست عدالت میں پیش کرنے سے پہلے ہی معاملات طے کرلیے گئے ہوں گے۔ تجھے کیا معلوم بھوتنی کے وہ اس وقت لاہور میں ہے یا بمبئی میں بیٹھا ہوا ہے یا لندن کی فلائٹ میں پرواز کررہا ہے۔"

میں نے کہا "میں پھر کہتا ہوں صدیقی جھوٹا حلف نامہ داخل نہیں کرے گا۔ وہ گرفتاری ظاہر کردے گا۔ رات میری بات ہوئی تھی دلاور کی بیوی سے۔ اس نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔"

"اسے کیا ضرورت تھی تجھ سے بات کرنے کی۔ ابے وہ پریشان ہوتی تو پوچھتی کہ دلاور کہاں ہے؟ اسے تو سب معلوم تھا اور وہ اتنی مطمئن تھی کہ اس نے احسان کا بدلہ چکایا اور اس طرح اپنی جان چھڑالی ہم سے۔ نازو نہ ملتی تو تم آرام سے کہاں بیٹھتے۔ خواہ مخواہ اس کے لیے بھی مسائل پیدا کرتے۔ کتے پیچھے لگے ہوئے ہوں تو آدمی بڈی پھینک کے ان کی پیش قدمی روک دیتا ہے۔ اب دلاور کی رہائی کے لیے اس کو قانون سے نمٹنا ہے اور قانون بھی تو سونے کی زنجیر سے بے بس ہوجاتا ہے یا پھر وکیل لمبی اور ست جنگ کی منصوبہ بندی کرتے ہیں جس میں ہر دلیل اور ہر قانونی نکتے سے نکتہ پیدا کرکے اور اعتراضات اٹھا کے غیر ضروری درخواستیں دائر کرکے اصل معاملے کو زیرِ بحث آنے ہی دیتے اور اس طرح جو مہلت ملتی ہے وہ گواہوں کو توڑنے اور شہادتوں کو بدلنے یا حقائق کو مسخ کرنے کے لیے کافی ہوتی ہے۔"

"تیرا کیا خیال ہے کہ دلاور کی بیوی کیا کرے گی؟"

"میں اس کا وکیل ہوتا تو اسے مشورہ دیتا کہ دلاور کو فرار کرانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ کتنا عرصہ روپوش رہ سکتا ہے۔ دو چار مہینے یا سال دو سال۔ یہی وقت مقدمات کو ختم کرنے میں استعمال کرنے میں فائدہ ہے۔ ایک اچھا وکیل چھ مہینے میں اس کو ضمانت پر رہائی دلوا سکتا ہے۔ پولیس یا جوڈیشل ریمانڈ کے دوران اس کو ہر قسم کی سہولت حاصل رہے گی۔ یہ عدالت کے حکم سے زیادہ پیسے کا کھیل ہے۔ قانونی طور پر تو وہ بی کلاس کی درخواست بھی کرے تو نامنظور ہوجائے گی مگر ویسے وہ ٹھاٹ سے رہے گا۔ ضمانت پر رہائی کے بعد دلاور جو چاہے کرے۔ کیس کا فیصلہ سالوں بعد ہوگا۔ پھر اپیل ہائی کورٹ میں اور سپریم کورٹ میں۔"

میں نے مایوسی سے کہا "پھر تو ہوجا اس کا وکیل بھوتنی کے۔"

"خیال تو اچھا ہے۔ سالے کا مال کیوں چھوڑا جائے۔"

"وہ تیرا سالا ہے؟"

منظر آہ بھر کے بولا "کاش کہ ہوتا۔ سالے بھی ملے تو تم جیسے کنگلے۔ پھکڑ خاں کی اولاد۔ میں نے سنا ہے کہ بڑی زبردست چیز پکڑی ہے کوئی تم نے۔ اندھے کے ہاتھ بٹیر۔"

"ہم ایسے ویسے شکاری نہیں ہیں بیٹا" پھر میں نے چلّا کے نگی کو آواز دی "نگی مسزو کی۔"

وہ بھاگی ہوئی آئی "کیا ہوا؟ کیوں چلّا رہے ہو؟"

"جو شخص بھوک پیاس سے دم توڑ رہا ہو کیا اس کا چلّانا بھی جرم ہے اس گھر میں" میں نے اور چلّا کے کہا۔

"ناشتا تو کب سے میز پر رکھا ہے۔ گل اور محسن کرچکے۔"

"آہ۔ مجھ لاوارث کو پوچھنے والا کوئی نہیں" میں نے کہا۔

نگی ہنسی "اسی لیے تو کہتی ہوں کہ اب گھر بسالو اپنا۔ ہر شکایت رفع ہوجائے گی۔"

"ارے چھوڑو مس نگی" میں نے کہا "ہم جانتے ہیں ہمارے گھر میں کیا ہوگا۔ رات کو بیوی مطالعہ کرتی رہے گی پی ایل ڈی کی دس دس سیروزن والی کتابوں کا۔ رومانٹک ہونے کی کوشش کی تو بتائے گی کہ تعزیراتِ پاکستان کی کون سی دفعہ کے تحت تحریری رضامندی حاصل کیے بغیر بیوی کو ہاتھ لگانا بھی HARASSMENT ہے۔"

منظر ہو ہو ہو کرکے ہنسا "اسے چھوڑو اس کے حال پر عزیزہ نگی۔ گدھا تو شادی کے بعد بھی گدھا ہی رہتا ہے۔ جیسے تمہارے ابّا مرحوم۔ ماشاء اللہ بڑی توپ چیز تھے مگر جتنے کنجوس شادی سے پہلے تھے اتنے ہی بعد میں رہے۔"

نگی نے برا مان کے کہا "یہ سب وقار نے بدنام کیا ہے ان کو۔"

"ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ ابا تمہارے کنجوس نہ ہوتے تو کم سے کم ایک سالی ہی چھوڑ جاتے وقار کے لیے۔ آدھی گھر والی اور مل جاتی بے چارے کو۔"

نگی نے چراغ پا ہو کے کہا "ہر شخص آپ جتنا فراخ دل تو ہونے سے رہا کہ بچے بھی ہوں تو درجن کے حساب سے" اور واک آؤٹ کرگئی۔

"بچے تو ماشاء اللہ رحمتِ خداوندی ہوتے ہیں جی" مولوی خادم حسین نے اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔

"دیکھا۔ خادم حسین جیسا کمینہ دشمن اور کم ظرف شخص بھی اس معاملے میں میری تائید کررہا ہے۔" منظر نے کہا۔

"میں حق بات کررہا ہوں جی۔ آپ جیسے بدزبان اور حیا سے عاری شخص کی حمایت نہیں۔"

"دیکھو ناملاجی۔ یہ نگی آخر ہے تو نگی۔ بڑی باتیں کیوں کرتی ہے پھر ہمارے سامنے۔ کتنا عرصہ ہوگیا شادی کو۔ وقار بے چارہ ہر جتن کرچکا کہ کچھ تو دے۔ بچے نہ سہی انڈے سہی۔"

"لاحول ولا قوۃ.... آگئے نا آپ اپنی اوقات پر۔"

منظر نے بے تکلفی سے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا "ابے اوقات سے ...ڑے۔ آدمی گھر میں مرغی بھی پالتا ہے اور اسے دانہ کھلاتا ہے تو کیا ...ید میں۔"

"... ...بھی شروع کردی آپ نے۔" خادم حسین اپنا سدھا سہلانے لگا۔

"م ...بی تو ایک خطرناک قسم کی بھینس پال رکھی ہے بلاوجہ۔"

"وہ تو اللہ میاں کی گائے ہے یا..." میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"یار گائے ہی سہی۔ مگر اس بکرے کے ساتھ اس کا کیا جوڑ۔ گائے بھینس کم سے کم دودھ تو دیتی ہے۔"

"بھینس غالباً انڈے بھی دے سکتی ہے۔ کسی نے مرزا غالب سے ایک شعر منسوب کیا ہے۔ پہلے تو روغن گل بھینس کے انڈے سے نکال۔"

خادم حسین نے سخت خفگی سے کہا "دیکھیں جی۔ گھر کی عزت ہوتی ہے گھر والی۔ میں ایسی بے ہودہ گفتگو کروں آپ کی زوجہ محترمہ کے بارے میں تو آپ کو کیسا لگے گا۔"

"اگر ہمت ہے مولوی تو میری طرف سے اجازت ہے۔ کہو جو کہنا ہے بلکہ اس کے منہ پر کہو کہ تم عورت نہیں بچے بنانے والی مشین ہو۔"

میں نے کہا "یار کیوں پٹوانا چاہتا ہے شریف آدمی کو۔"

"جھوٹ کیا ہے اس میں۔ ایمان سے ملا جی۔ اب تو بس تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ تم ہی کچھ کرو۔ کوئی تعویذ یا وظیفہ ہو جس سے آبادی میں اضافہ رک جائے۔ خاندانی منصوبہ بندی والے تو ناکام ہو گئے۔"

"توبہ کریں جی۔ یہ گناہ ہے۔"

"یہ حقیقت ہے مولوی صاحب۔ میں تو اسے ہاتھ بھی لگاتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ بلکہ ایک فٹ دور رہوں تب بھی کچھ ہو جاتا ہے۔ لڑکا یا لڑکی۔"

میں نے کہا "یار اپنی بیوی کو قصوروار کیوں ٹھہراتا ہے۔"

"تو آزما لے یار۔ بڑی زرخیز اور زود اثر چیز ہے وہ۔ صرف ایک بار خادم حسین پیار سے اس کو چھو کر دیکھے شرطیہ اب جو بچہ ہوگا نا وہ بالکل یہی ڈیزائن ہوگا۔" منظر نے خادم حسین کے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔

اوپر سے خادم حسین کی بیوی نے چلانا شروع کیا "ارے کہاں جا کے بیٹھ گیا کم بخت۔ جھاڑو لینے بھیجا تھا تجھے جھاڑو پھرے۔ صبح سے ایک کمرے کی صفائی پوری نہیں ہوئی۔ شام تک سارا گھر کیا میرے سسرال والے صاف کرنے آئیں گے۔ دوپہر کا کھانا کیا جنات پکائیں گے؟"

"ابھی آرہا ہوں" خادم حسین لپکا "بازار بھیجا تھا مجھے جھاڑو لانے کے لیے اور کچھ سبزی وغیرہ۔ فضول باتوں میں الجھا لیا آپ نے۔"

منظر نے کہا "ذرا پتلی اور کمزور سی جھاڑو لانا۔ بعد میں اسی سے تمہیں مارے گی مولوی صاحب۔ خواہ پیار سے مارے۔"

منظر کو رابعہ اور گل نے نازو کی واپسی کے بارے میں بتا دیا تھا۔ فاطمہ جعفری کے بارے میں محسن سب بتا چکا تھا۔ جب میں ناشتا کرنے بیٹھا تو گل اور نکی نے مجھے مطلع کیا کہ وہ نازو کو دیکھنے جا رہی ہیں۔

"رابعہ باجی تو صبح آٹھ بجے ہی نکل گئی تھیں" نکی نے کہا "وقار ان کے ساتھ چلے گئے اور میں منظر بھائی کے ساتھ نازو کو لے گئی تھی۔ بڑا اچھا اسپتال ہے لیکن وہ ڈاکٹر جس نے نازو کو دیکھا۔ وہ عجیب سا لگا مجھے۔ صورت سے بھی وہ ڈاکٹر لگتا ہی نہیں تھا۔ گوالا نظر آتا تھا۔ باتیں بھی ایسی ہی کر رہا تھا۔"

میں نے ہنس کے کہا "وہ منظر کا ماموں سسر ہے۔ اس کی بیوی کے سامنے ایسا مت کہنا۔"

"نکی ٹھیک ہی کہہ رہی ہے۔ پتا نہیں کس نے اسے اتنا بڑا اسپیشلسٹ بنا دیا۔ معائنہ کرنے کے بعد مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ اسے کیا ہوا ہے اور ابھی تک یہ ہوش میں کیوں نہیں آئی 'بھوتنی کا۔"

نکی نے کہا "اسے خود کلامی کی عادت ہے۔ جو سوچتا ہے وہ بولتا ہے۔ بعد میں کہنے لگا کہ ایسی تو کوئی بات نہیں۔ خیر چھوڑ جاؤ اسے۔ میں ٹھیک کردوں گا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی مکینک ...ور گاڑی کی بات کر رہا ہے۔" نکی نے کہا۔ "میں نے پوچھ لیا کہ ڈاکٹر صاحب کوئی پریشانی کی بات تو نہیں ہے 'لو جی' وہ میرے پیچھے پڑ گیا۔ کہ پریشانی تو دنیا میں ہے اور پریشان تو مُردے بھی رہتے ہوں گے قبر میں کہ میدان حشر میں کیا ہوگا۔ کون ہے جو پریشان نہیں ہے اور آدمی پریشانی ہوتی ہے تو اسے تم دگنا کر لیتی ہو۔ عورتیں کرتی کیا ہیں خود پریشان ہونے اور مردوں کو پریشان کرنے کے سوا۔ جب میں کہہ رہا ہوں کہ میں ٹھیک کردوں گا تو پھر مجھے کیوں پریشان کر رہی ہو۔ توبہ توبہ' ایسا خبطی اور جھکی آدمی۔"

مجھے بہت ہنسی آئی "اسے تو بھڑا دینا چاہیے منظر کی بیوی سے۔"

منظر بولا "ابے مت پوچھ کیا ہوتا ہے جب وہ ہمارے گھر آتا ہے کبھی۔ ماموں بھانجی ایک ساتھ بولتے ہیں۔ سنتا کوئی نہیں اور کسی کو پتا نہیں چلتا کہ کیا بول رہے ہیں اور کیوں بول رہے ہیں۔ لیکن آخر میں خاموش اسے ہی ہونا پڑتا ہے۔ وہ سیر ہے تو میری بیوی سوا سیر۔"

مجھے معلوم ہوا کہ آج صبح مہرالنسا عرف میری کے میزبانوں کو اپنے دروازے پر ایک خالی تابوت ملا اور اس سے بڑی سنسنی پھیلی۔ میزبان یعنی صاحب خانہ کی کیفیت اختلاجی ہوگئی اور ان کی منکوحہ پٹ سے گر کے بے ہوش ہوگئیں پھر پولیس کو بلایا گیا اور اس وقت تک بہت سے لوگ دور دور کھڑے چہ میگوئیاں کرتے رہے اور خیال کے گھوڑے دوڑاتے رہے کہ تابوت میں سے لاش برآمد ہوئی یا ڈھانچا۔ عورت کی لاش ہوگی یا مرد کی۔ لیکن پولیس نے خالی تابوت دیکھا تو انہیں سخت مایوسی ہوئی اور پھر انہوں نے ...ت شکوہ کیا کہ جب لاش نہیں تھی تو پھر انہیں کیوں طلب کیا گیا تھا۔ اور اگر لاش تھی تو کہاں گئی؟ اس دوسرے نکتے کو بنیاد بنا کے انہوں نے بہت سے مفروضے قائم کیے کہ آس پاس رہنے والوں میں سے کسی بیوی نے بے وفا شوہر کو یا شوہر نے بے حیا بیوی کو مار کے تابوت اس کے آشنا کو ارسال کرنے کا پروگرام بنایا ہوگا مگر عملی دشواری کے باعث ملتوی کردیا اور لاش کہیں اپنے ہی باغیچے میں گاڑ دی۔ تفتیش کے نتیجے میں جب شوہر بھی پورے نکلے اور بیویوں کا ٹوٹل بھی ٹھیک ثابت ہوا تو وہ تابوت لے گئے۔ دروغ برگردن راوی۔ عقلمندوں کے مشورے پر تابوت میں نامعلوم روح کے سوئم چہلم کے اخراجات کی رقم رکھ دی گئی تھی۔

منظر میرے ساتھ ایک کپ چائے پی کے چلا گیا۔ محسن اور گل اس وقت تک بوبی کے ساتھ کھیل رہے تھے اور ایسی حرکات فرما رہے تھے جن پر بوبی کو ہنسی آئے۔ وہ اخلاقاً ہنس رہا تھا یا شاید ان کی احمقانہ کوشش پر۔

بالآخر محسن اس کھیل سے اکتا گیا "گل نے وہ ساری رقم شمار کی ہے جو ہم شوکت رانا سے بطور تاوان لائے تھے۔"

"مالِ غنیمت بھی حرام نہیں ہوتا" میں نے کہا "ٹوٹل کیا ہوا؟"

"ایک لاکھ اٹھارہ ہزار چھ سو پاؤنڈ۔ زیورات بہت قیمتی ہیں۔ خود رابعہ اور گل میں مالیت پر اختلاف ہے۔ ڈھائی سے ساڑھے تین لاکھ کے درمیان ہوگی۔"

میں نے کہا "میں اب پہلی فلائٹ سے کراچی فرار ہونے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ میری کے ابا سے ملنا ہے۔"

"ولایتی ابا کو ڈیڈی کہتے ہیں۔ مسٹر اے کیو ڈسکوی پیدائشی انگریز نہ سہی 'وہاں کے پروردہ تو ہیں۔"

میں نے کہا "مجھے تعجب ہے ابھی تک میری نے وقار کے گھر فون نہیں کیا..."

"دراصل صبح صبح ان کے گھر کے مقابل تابوت ملنے سے بڑی نحوست پھیل گئی۔ پولیس کے جانے کے بعد ڈاکٹر آئے۔ پھر کچھ روحانی ...بلائے گئے ہیں جو وہاں اپنے عمل سے بد روح کو بھگانے میں مصروف ہیں۔"

"کس کی بد روح؟" میں نے کہا۔

"پتا نہیں۔ تابوت میں سے نکلی ہوگی اور سیدھی ان کے گھر میں داخل ہوئی ذرا بتا لیا ہوگا۔ کیا معلوم کسی کے ...م میں حلول کر جائے۔ اس ...میں ساس بہو کا ایک جوڑا بھی ...مصروف پیکار رہتا ہے۔ وہ ایک دوسرے کو پہلے ہی بد روح سمجھتی ہیں۔ میں سوچ رہا ہوں کہ غالب اور مارگریٹ کو بھی وہیں پہنچا دوں جہاں نازو زیر علاج ہے۔"

میں نے کہا "وہ منظر کا ماموں۔ کیا نام ہے اس کا...ہد کو خان کا۔"

محسن نے کہا "اچھے کے چنگیزی نام ہے۔ حشمت خاں چنگیزی لیکن کہنے والے ہلاکو خاں چنگیزی کہنے لگے ہیں۔ اس کی صورت دیکھ کے ٹھیک لگتا ہے۔"

"منظر نے ہم سے مشورہ کیے بغیر نازو کا کیس اس کو دے دیا ہے تو ظاہر ہے اسے اپنے ماموں سسر پر بھروسا ہوگا۔" میں نے کہا "یہ تو بہت اچھی بات ہوگی اگر غالب بھی وہیں رہے۔ اسے نازو سے اور نازو کو اس سے جذباتی رفاقت کا احساس ہوگا۔ یہ شاید دوا سے بہتر دوا ثابت ہو۔" میں نے مزید کہا "اگر ڈاکٹر ہلاکو خاں چنگیزی اجازت دے گا تو غالب کو شاید بطور مریض قبول کرے گا لیکن مارگریٹ کو ہرگز اس کے ساتھ نہیں رہنے دے گا۔ تیمارداروں کو اسپتال میں کون رہنے دیتا ہے۔ خصوصاً ایسی جگہ۔ جہاں دیکھ بھال کرنے والے بھی خصوصی تربیت یافتہ افراد ہوں۔"

محسن نے کہا "بات تو ٹھیک ہے آپ کی مگر سفارش چلتی ہے ہر جگہ۔ یہاں بھی چلے گی۔ اس کی بھانجی کی۔ اور منظر کی بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی بیوی کی زبان کے سامنے چنگیزی کو خاموش ہونا پڑتا ہے۔"

"یہاں کے معاملات کو تم لوگ جیسے چاہو سنبھالو۔ میں تو چلا" میں نے کہا "مہرالنسا کا فون آئے' میرا مطلب ہے میری کا تو اسے دلاسا دینا کہ وہ واقعی کراچی گیا ہے تمہارے پاپا سے ملنے۔"

"رابعہ سے کیا کہوں؟"

"اسے پتہ بھی کو فرق نہیں پڑتا۔" میں نے کہا۔

میں نے ایک سوٹ کیس سے چھوٹا بریف کیس کافی سمجھا۔ یہ وقار کے سسر مرحوم کی نشانی تھا اور وہ اس میں سرکاری فائلیں اٹھائے پھرتے تھے۔ ٹاپ سیکرٹ قسم کی فائلیں یا پھر منافع بخش فائلیں جن پر ان کے ہر دستخط کی قیمت کا تعین ضرورت مند کی حیثیت سے مطابق ہوتا تھا۔ وہ واقعی بڑی توپ چیز تھے مگر ان جیسی ہر توپ نے ملک کے مفاد کا دفاع نہیں کیا تھا۔ ایک نظام کو' قانون کی ساکھ کو۔ پبلک سرونٹ کے امیج کو اور ایک ترقی پذیر قوم کی اجتماعی جدوجہد کے مقصد کو برباد کر کے رکھ دیا تھا۔

سوٹ پہننا میرے لیے مجبوری بن گیا تھا کیونکہ میں دیسی آدمی نہیں تھا۔ میں ایک فرنچ وکیل تھا اور وکیل بھی بہت بڑا۔ برٹش گورنمنٹ سے مراسم اور وزارت دولت مشترکہ کے حوالے سے یا محکمہ اطلا... کے حکام کے ذکر سے میں اپنا اعتبار قائم کر چکا تھا اور ...سے او... تک میری رسائی مشکل نہ تھی۔ میک اپ سے زیادہ فرنچ بول کے میں سب کی آنکھوں میں دھول جھونک چکا تھا اور اب ہر بات اتنی پرانی ہوگئی تھی کہ مجھے دیکھ کے کسی کا ذہن خواب میں بھی سکندر بخت کی طرف نہیں جاتا تھا۔ یہ انتہائی حیرت انگیز اور

خطرناک بات تھی کہ ڈاکٹر فاطمہ جعفری کی نظر نے مجھے شناخت کرلیا تھا۔

مجھے احساس ہوا کہ میرے پاس کپڑے بہت کم ہیں۔ دو سوٹ میں وقار کے استعمال کرچکا تھا۔ ایک میں نے پہن رکھا تھا اور دوسرا میں نے بریف کیس میں ڈال لیا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ کراچی سے دو چار سوٹ ریڈی میڈ خرید لوں گا۔ لاہور میں سوٹ صرف سلوائے جاسکتے تھے مگر کراچی کے بارے میں سنا تھا کہ وہاں ایسے ماہر ہیں جو چند گھنٹوں میں کسی بھی سوٹ کو آپ پرفٹ کرسکتے ہیں اور وہ سوٹ کسی کو ریڈی میڈ نہیں لگتا۔

ابھی میں پیکنگ میں مصروف ہی تھا کہ گل آگئی "کراچی جارہے ہو تو اکرام شیخ سے ملوگے؟"

"ہرگز نہیں۔ ایک ٹیکسی ڈرائیور سے ملنے کے لیے میں لاہور سے بائی ائر کراچی جاؤں۔ اتنا احمق سمجھتی ہو تم مجھے۔"

گل نے کہا "کاجل کو سلام کہنا اور کہنا کہ اس سال گرمیوں کی چھٹیوں میں لاہور آجائے۔"

اور نکی نے بولنا شروع کیا "ان سب کی تصویریں لانا مت بھولنا۔ اور میں تمہیں اپنی تصویریں دیتی ہوں جمع کرکے۔ یہ اکرام شیخ کو دے دینا۔ اسے نازو کے بارے میں کچھ مت بتانا۔"

میں نے ہنسا کے کہا "جہاز کی کھڑکی کھول کے باہر مت جھانکنا چلتے جہاز سے اترنے کی کوشش مت کرنا۔ جہاز شہر پر سے گزر رہا ہو تو باتھ روم استعمال مت کرنا۔ خالہ اماں کی طرح بول رہی ہو تم نکی' جو سفر سے پہلے نصیحت کی پوٹلی ساتھ کردیتی تھیں۔ پانی کی سراہی' لوٹا' قیمہ پراٹھا الگ۔"

"کیا تم واقعی نہیں ملوگے ان سے؟" گل نے کہا۔

"میں جارہا ہوں اپنے ہونے والے میڈ ان انگلینڈ سسر سے ملنے۔ میری میری کے ڈیئر ڈیڈ سے۔"

اسی وقت باہر کوئی گاڑی آکے رکی۔ "کون آیا ہے اس وقت۔"

پھر محسن کی آواز آئی "آپ.... صدیقی صاحب!"

میں نے کہا "جاوید صدیقی.... ایس ایس پی' خدا خیر کرے۔"

جب میں ڈرائنگ روم میں گیا تو جاوید صدیقی صوفے پر بیٹھ چکا تھا مگر مجھے دیکھ کے پھر اٹھا "ہیلو!"

میں نے بھی مسکرا کے کہا "ہیلو۔ کیا حال ہے؟"

وہ مسکرایا "اردو سیکھ رہے ہو' کیا فائدہ' انگلش سیکھتے تو زیادہ کام آتی۔"

محسن نے کہا "صدیقی صاحب۔ آپ کا آنا خالی از علت نہیں ہوسکتا۔"

اس نے بجھی بجھی مسکراہٹ کے ساتھ کہا "غالباً میں رخصت ہونے آیا ہوں۔ عین ممکن ہے کل تک مجھے او ایس ڈی بنادیا جائے۔"

محسن نے میری طرف دیکھا "کوئی جرم سرزد ہوا ہے آپ سے؟"

"ہوا تو نہیں۔ مگر ہوجائے گا۔ جو مجھ سے کہا گیا ہے۔ وہ شاید میں کر نہیں سکتا۔ کم از کم ابھی تک میرا یہی خیال ہے۔"

میں نے اب محسن کی معرفت گفتگو شروع کی "تمہاری اس آزمائش کا تعلق چوہدری دلاور کی گرفتاری سے ہوگا؟"

اس نے اقرار میں سرہلایا "مجھے آج آئی جی صاحب نے طلب فرمایا تھا۔ شک مجھے اسی وقت ہوگیا تھا کہ میرے جیسے چھوٹے افسر سے براہِ راست آئی جی صاحب کو کیا کہنا ہوگا۔ ہم تو اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ ہم کوئی غیر معمولی کارنامہ سرانجام دیں یا کوئی غیر معمولی کوتاہی سرزد ہوجائے تو پھر بڑی سرکار بھی یاد کرلیتی ہے۔ میں یہ طے کرنے سے قاصر تھا کہ میں نے کیا کیا ہے؟"

"اور انسپکٹر جنرل صاحب بہادر نے اسے کیا قرار دیا؟"

"انہوں نے کچھ بھی نہیں کہا۔ نہ تعریف کی نہ خفگی کا اظہار کیا۔ صرف یہ پوچھا کہ چوہدری دلاور کون ہے۔ میں نے بتادیا۔"

"کیا بتادیا؟"

"وہی جو میری معلومات کے اور یقین کے مطابق سچ ہے۔ میں نے کہا کہ ویسے تو چوہدری دلاور پر ایک ہی الزام ہے۔ ڈاکٹر شبلی کے قتل کا اور اس میں تمام ثبوت اور شواہد اس کے خلاف ہیں۔ لیکن مستند ذرائع سے اس کا اسمگلر ہونا بھی ثابت ہے اور وہ گن رننگ میں ملوث رہا ہے۔ GUN RUNNING جدید دنیا میں دہشت گردی کا سب سے زیادہ منافع بخش کاروبار ہے۔ جہاں بھی کسی ملک میں شورش ہو۔ بغاوت ہو' آزادی یا علیحدگی کی تحریک ہو وہاں حکومت کے مخالف لڑنے والوں کو اسلحہ فراہم کرو۔ یہ سوچے بغیر کہ وہ کون ہیں اور ان کے مقاصد کیا ہیں۔ چوہدری دلاور نے مشرقی پاکستان میں علیحدگی پسند عناصر کو اسلحہ فراہم کرکے کروڑوں کمائے تھے اور میری نظر میں جو باغیوں کا حامی ہو وہ غدار وطن ہے۔"

میں نے کہا "دیگر الزامات کی تحقیق تو آپ کے دائرہ اختیار سے باہر ہے۔ یہی کہا ہوگا آئی جی صاحب نے۔"

"وہ کیا کہتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے۔ کیا دائرہ اختیار سے باہر ہے اور کیا نہیں ہے؟ یہ آپ کی اپنی نظر اور فرض شناسی پر منحصر ہے۔ اگر میں راہ چلتے کسی کو چوری کرتے دیکھ لوں یا کوئی میری نظروں کے سامنے قتل کردے تو میں صرف نظر نہیں کرسکتا۔ یہ عذر نہیں پیش کرسکتا کہ میں تو یہاں صرف ڈاکٹر شبلی کے قتل کی تحقیق کے لیے آیا ہوں۔ مجھے کیا' دیگر جرائم کی ذمے دار مقامی پولیس ہے۔"

محسن بولا "آپ کو یہ کس نے بتایا کہ چوہدری دلاور اسلحہ اسمگل کرتا تھا اور مشرقی پاکستان کے باغیوں کو فراہم کرتا تھا؟"

وہ ہنسا "اگر پولیس کی نوکری میں مجھے یہ بھی علم نہ ہو کہ میں یہاں نہیں رہوں گا۔ چارج مجھے دینا ہوگا لیکن چارج دینے کے بعد کیا ہوگا۔ یہ میرے رویے پر منحصر ہے۔ مجھے لاکھوں روپے ہی نہیں ملیں گے' ترقی بھی ملے گی۔ اے ڈی آئی جی کے عہدے پر۔ تبادلہ میں پولیس ہیڈ آفس میں وائرلیس سیکشن کا انچارج ہوجاؤں گا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ مجھے او ایس ڈی بنادیا جائے یا وی آئی پی پروٹوکول کی ذمے داری سونپ دی جائے۔ صدرِ مملکت یا وزیراعظم کے بیرون ملک جاتے اور آتے وقت حفاظتی انتظام کرنا اور کوئی گڑبڑ نہ ہونے دینا۔ گڑبڑ کوئی شخص خود بھی کرسکتا ہے کہ اچانک راستے میں کوئی درخواست لے کر کھڑا ہوجائے اور جلوس کا راستہ روکنے کی کوشش کرے۔ اور یہ حرکت کروائی بھی جاسکتی ہے۔ اس کے بعد چیف پروٹوکول معطل۔"

میں نے کہا "پھر تم نے کیا سوچا ہے؟"

"سوچنے کو کیا ہے میرے لیے۔ میں یہ حلف نامہ داخل نہیں کرسکتا۔ جب میں نے چوہدری دلاور کو گرفتار کیا ہے تو اسے عدالت میں پیش بھی کروں گا۔ آگے عدالت کی مرضی۔"

"یعنی تم حلف نامہ داخل نہیں کروگے۔"

"ہرگز نہیں۔ اتنا بڑا جھوٹ بولنا میرے لیے ممکن بھی نہیں۔ میری نوکری کیا جان بھی چلی جائے' مجھے پروا نہیں۔"

میں نے اسے تعریفی نظر سے دیکھا "کیا تم نے یہ بات صاف صاف کہہ دی آئی جی صاحب سے۔"

وہ ہنسنے لگا "شاید میں یہ بے وقوفی کر بیٹھتا۔ اگر جذباتی ہوجاتا مگر عین وقت پر عقل نے مجھے ہوش سے کام لینے کا مشورہ دیا۔ میں نے کہا کہ سر ہم تو حکم کے غلام ہیں۔ جیسی آپ کی مرضی۔ اور آئی جی صاحب مطمئن ہوگئے مگر میں سوچنے اور فیصلہ کرنے کے لیے وقت چاہتا تھا۔"

"یعنی آپ کے نزدیک یہ فیصلہ تبدیل بھی ہوسکتا تھا..."

"نہیں۔ میرا فیصلہ تو ایک ہی تھا۔ مجھے عدالت میں حاضر ہوکے ایک ہی بیان دینا ہے جو مبنی بر حقیقت ہوگا۔ جو میں نے سنا' دیکھا اور کیا۔ وہی میرا بیان ہوگا لیکن قبل از وقت میں اپنے ارادے کا اظہار کردیتا تو میری ساری محنت رائگاں جاتی۔ آئی جی صاحب اسی وقت چائے منگواتے اور جتنی دیر میں چائے پیتا ان کے اسٹینو میری فوری تبدیلی یا معطلی کے احکامات ٹائپ کرلاتا اور میرے سامنے رکھ دیتا۔"

میں نے کہا "معطلی کس بات پر؟"

"اوپر والوں کے لیے جواز پیدا کرنا مسئلہ نہیں ہوتا۔ صرف یہ کہہ دینا بھی کافی ہے کہ تمہارے خلاف بدعنوانی کی شکایات موصول ہوئی ہیں جو بہت سنگین نوعیت کی ہیں تفتیش مکمل ہونے تک تم معطل کیے جاتے ہو۔ اگر بے گناہ ثابت ہوئے تو دو چار دن سے دو چار ہفتے' دو چار ماہ سے دو چار سال میں تم بحال کردیے جاؤگے ورنہ جیتے رہو اپنے گھر آرام سے۔ ہر روز حاضری لگانے آؤ اور پاکستان میں کون گیا کررہا ہے تو پھر لعنت اس نوکری پر۔ جتنا بڑا عہدہ ہوتا ہے اتنی ہی ذمے داری بڑھ جاتی ہے۔ آئی جی صاحب کا نقطہ نظر مختلف تھا۔ انہوں نے فرمایا کہ مجھے سنی سنائی باتوں پر یقین نہیں کرنا چاہیے' ہر آدمی کے دشمن ہوتے ہیں جو اس پر کوئی بھی الزام عائد کرسکتے ہیں۔ پھر آئی جی صاحب اصل معاملے کی طرف آئے۔ انہوں نے کہا کہ چوہدری دلاور کی بیوی نے پولیس کے خلاف جو استغاثہ دائر کیا ہے' حبس بے جا کا۔ اس کے بارے میں میری رائے کیا ہے؟ میں نے کہا کہ وہ کچھ بھی کہے' ہم نے اسے ایف آئی آر کے حوالے سے گرفتار کیا ہے اور یہ قانونی گرفتاری ہے۔ ہم اسے عدالت میں پیش کریں گے اور اس کا ریمانڈ لیں گے۔"

"اور آئی جی صاحب نے کہا کہ بند کرو اپنی قانونی بکواس۔ ہم نے چوہدری دلاور کو گرفتار نہیں کیا۔"

وہ کچھ حیران ہوا۔ "رائٹ۔ انہوں نے بالکل یہی کہا مگر بہت شرافت سے۔ انہوں نے کہا کہ بہتر ہے ہم اس معاملے میں نہ پڑیں۔ چوہدری دلاور ایک بااثر سیاسی شخصیت ہے اور وہ اگلے انتخابات میں اپنے حلقے کا نمائندہ بھی ہوگا۔ اس کے تعلقات بہت اوپر تک ہیں۔"

محسن بولا "آپ نے پوچھا نہیں کہ اس کے بارے میں یہ نیک خیالات رکھنے کا مطلب سکہ رائج الوقت میں کیا ہے؟"

صدیقی مسکرایا "کیا تم سمجھ نہیں سکتے؟"

میں نے کہا "کتنی رشوت کی پیش کش ہوئی ہے تمہیں؟"

وہ سوچنے لگا "مجھے تو ایک طرح سے بلینک چیک ملا ہے۔ یعنی میں منہ مانگی رقم لکھ سکتا ہوں اس پر۔ ہے نا کمال کی بات۔ ایک کاغذ کا پرزہ مجھے دستخط کرکے دینا ہوگا اور اس کے بدلے میں مجھے بہت چھوٹا سا کاغذ کا پرزہ ملے گا لیکن سرکاری حلف نامے کی مالیت بہت کم ہوگی اور اس کے بدلے میں ملنے والے کی لاکھوں میں۔ مجھے صرف یہ بیان حلفی دینا ہوگا کہ میں نے چوہدری دلاور کو گرفتار نہیں کیا اور ایڈووکیٹ جنرل میرے بیان کی بنیاد پر آئی جی صاحب کی جانب سے عدالت میں بیان دے گا کہ چوہدری دلاور اس وقت پولیس کی تحویل میں نہیں ہے چنانچہ اس سے وکیل یا اہلِ خانہ کی ملاقات کرانے یا اسے طبی معائنے کے لیے پیش کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"اس بیان کے بعد مسز دلاور کی درخواست غیر مؤثر ہونے کی بنا پر خارج ہوجائے گی۔" میں نے کہا۔

محسن بولا "تم لاکھوں سمیٹ کر خیر و عافیت کے ساتھ واپس اسلام آباد چلے جاؤگے۔ یا یہیں نام نہاد تفتیش میں مصروف رہوگے؟"

تنخواہ ایک چوتھائی تنخواہ لیتے رہو۔ تبدیلی تو لازمی تھی۔ وہیں ہیڈ آفس سے کوئی میری جگہ چلا جاتا اور میں اس کی جگہ بیٹھ جاتا۔"

"اور اب تم کیا کرو گے؟"

"میں آئی جی صاحب کو یہی تاثر دوں گا کہ ... عدالت میں حاضر ہو کے وہی بیان دینا ہے جو سرکار کی مرضی۔ پھر ایڈووکیٹ جنرل صاحب کیس خارج کرنے کی درخواست کرسکتے ہیں ...لیکن..."

"لیکن کیا...؟" میں نے کہا۔

"کیا یہ بات مجھے بتا دینی چاہیے؟"

میں نے کہا "ہم تمہیں کیسے مجبور کرسکتے ہیں کہ ہم پر اعتبار کرو لیکن ایک ایماندار، فرض شناس اور باضمیر افسر خود فیصلہ کرسکتا ہے کہ اس جنگ میں اصولی طور پر کون فریق حق پر ہے اور قانون کو کس کا ساتھ دینا چاہیے۔ یہ ذاتی دشمنی کا مسئلہ ہے یا مجرم کو پہچاننے اور بے گناہ کو تحفظ فراہم کرنے کا۔"

محسن بولا "بے شک تمہارا دائرۂ کار بہت محدود کردیا گیا ہے۔ لیکن جو کچھ تم جانتے ہو اسے نظرانداز کیسے کرسکتے ہو۔ ڈاکٹر شبلی کا قاتل تو دلاور یقیناً ہے لیکن اس کے دیگر جرائم...."

"افسوس تو یہی ہے کہ میں صرف ایک معاملے میں بیان دے سکتا ہوں جس کی تفتیش میرے سپرد تھی۔ دیگر معاملات کا نہ مجھ سے تعلق ہے نہ میرے پاس کوئی ثبوت ہے کہ میں اس پر رائے بھی دے سکوں۔ لیکن اسے ڈاکٹر شبلی کے قاتل کی حیثیت سے گرفتار کرلینے کا اقرار بھی کافی ہے۔ اس کے بعد جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ عدالت کی مرضی وہ جو حکم دے مگر پولیس دلاور کو پیش کرنے کی پابند ہوگی۔"

"تم جانتے ہو کہ تم کتنا بڑا رسک لے رہے ہو؟ تم لاکھوں روپے کی کھلی غیر مشروط پیش کش کو ٹھکرا رہے ہو" محسن بولا۔

"ہاں۔ میں سارے رسک لوں گا۔"

"شاید یہ نقصان تمہارا نہ ہو۔ تمہارے خاندان کا ہو۔ تمہاری بیوی کو بھی صدمہ ہو اور تمہارے بچے..."

"وہ میں جانتا ہوں۔ میری بیوی پہلے ہی مجھ سے خوش نہیں ہے۔ وہ ایک اعلیٰ سرکاری افسر کی بہن ہے جس نے میرے عہدے سے شادی کی تھی مگر محبت کے نام پر۔ اسے بعد میں اپنے فیصلے پر پچھتانا پڑا۔ میں راولپنڈی میں کرائے کے مکان میں رہتا ہوں اور میرے پاس ایک پرانی گاڑی ہے۔ میرا گھر صرف اور صرف تنخواہ میں چلتا ہے۔ اگر میرے گھر میں ٹھاٹ باٹ کا جو سامان نظر آتا ہے تو وہ سب میری بیوی جہیز میں لائی تھی۔ رشوت کی ہر پیش کش کو میں نے آج تک ٹھکرایا ہے اور میری بیوی نے صبر یا جبر کے تحت سیکھ لیا ہے لیکن وہ خوش بالکل نہیں ہے۔ میں تو اس کے باپ کی ملنے والی مالی امداد بھی قبول نہیں کرتا حالانکہ وہ ... اصرار بڑھا مجھے قائل کرنے کے لیے دلیل یہ دیتا ہے کہ میں اپنا ... نہ دینے کا پابند نہیں۔ کون سی شرع میں یہ پابندی ہے کہ شادی کے بعد باپ اپنی بیٹی کے لیے کچھ نہ کرے۔ میں نے کہا کہ شرع یہ کہتی ہے کہ بیوی وہی کرے جو شوہر چاہے اور میں چاہتا ہوں کہ وہ میری آمدنی میں چلائے۔ سادگی قناعت اور کفایت شعاری اسلامی شعائر ہیں اور بیوی کے سلیقے کو ظاہر کرتے ہیں۔ باپ دے تو انکار نہ کرے مگر کسی خیراتی ادارے یا ریڈ کراس کو دے دے۔ دنیا کے لیے میں کماتا ہوں۔ آخرت کے لیے اس طرف سے بندوبست ہو جائے۔ اس سے اچھی کیا بات ہے؟"

محسن ہنسنے لگا "گویا تمہارے پاس ہر دلیل کا جواب ہے"

"دلائل دونوں طرح دیے جاسکتے ہیں اور لوگ دیتے ہیں۔ چور ڈاکو، نشہ کرنے والے، جواری۔ بدقماش اور بدعنوان قسم کے لوگ اپنا دفاع کرتے ہیں۔ اپنی غلطی نہیں مانتے۔ معاشرے کو کبھی مجبوری کو آڑ بناتے ہیں مگر دلیل ایک ہی ہوسکتی ہے۔ کوئی بھی چیز بیک وقت سیاہ اور سفید نہیں ہو سکتی۔"

صدیقی بولا "جب میری بیوی کو معلوم ہوگا کہ میں نے دس لاکھ اصول پرستی پر قربان کردیے ہیں اور نوکری کو بھی خطرے میں ڈال دیا ہے تو وہ بہت ہنگامہ کرے گی کہ اس رقم سے ہم کوٹھی بنا سکتے اور کار خرید سکتے تھے۔ ہمارے بچے اچھے ماحول میں رہتے۔ اسکول میں جاتے، کسی کمپلیکس کا شکار نہ ہوتے۔ دشمنی تم نے اولاد سے کی ہے۔ ان کا مستقبل تاریک کیا ہے۔ باپ کیا کچھ نہیں کرتے بچوں کے لیے۔ ڈاکے تک ڈالتے ہیں، جیل جاتے ہیں، ہر طرح کی مصیبت اٹھاتے ہیں۔ تم نے تو جیب میں پڑے دس لاکھ کے چیک کو پھاڑ پھینکا حالانکہ تمہیں کچھ بھی نہیں کرنا تھا۔ ایسی باتیں میں سنتا رہتا ہوں۔ شاید اس مرتبہ زیادہ ہوگا۔ ممکن ہے وہ میکے جاکر بیٹھ جائے۔ اس کا باپ مجھے ... کرے اور پھر خود بے عزت ہو" وہ خاموش ہوگیا۔

کچھ دیر بعد محسن نے کہا "تم واقعی عجیب آدمی ہو۔"

"کیا تم نے پولیس کے بارے میں اپنی رائے بدل دی؟ میرے جیسا کوئی اور بھی ملا ہے تمہیں؟"

"ہاں۔ ہمارے ایک بزرگ تھے۔ انکل ضامن رضا مرحوم۔ وہ بھی ایس ایس پی تھے۔ ان کے اور تمہارے خیالات میں ایک فیصد کا فرق نہیں۔ مگر وہ جیسے تیسے ملازمت پوری کرکے ریٹائر ہوگئے۔ ان کی عزت بہت تھی پولیس ڈیپارٹمنٹ میں بھی۔"

"اب وہ حالات نہیں رہے۔ پہلے ایماندار آدمی ... نارمل نہیں ہوتا تھا۔ اسے چھوڑ دیا جاتا تھا اس کے حال پر۔ اب ایمانداری اس کا جرم بن جاتی ہے۔"

"تمہارا بیان کب ہوگا؟"

"غالباً کل۔" صدیقی نے کہا۔

"ڈی آئی جی صاحب کا باپ بھی میری مرضی کے بغیر ایسا نہیں کرسکتا۔ جب میں نہیں ملوں گا تو شک انہیں بہرحال ہو جائے گا۔ جیسے جیسے وقت گزرے گا میری تلاش اور ان کی پریشانی بڑھتی جائے گی۔ آئی جی صاحب بھی سمجھ جائیں گے کہ میں انہیں چکر دے کے نکل گیا۔ بدنام تو پہلے ہی ہوں میں۔ وہ دلاور کی رہائی کا رسک کیسے لے سکتے ہیں مجھے راستے سے ہٹائے بغیر۔ وہ مجھے ٹرانسفر کردیتے یا معطل۔ پھر سب کچھ ہوسکتا تھا۔ سمجھانے والے انہیں بتادیں گے کہ صدیقی پاگل ہے۔ وہ نوکری اور جان کی بازی لگا کے بھی اپنے موقف پر قائم رہے گا اور عدالت میں وہی بیان دے گا جو سچ ہوگا۔ وہ آپ کے سامنے جھوٹ بول کے نکل گیا۔ میں کل عین وقت پر عدالت پہنچ جاؤں گا اور وہاں مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ نہ ڈرا دھمکا سکتا ہے اور نہ زبردستی بیان دلوا سکتا ہے اپنی مرضی کا۔"

"تم جانتے ہو کہ تمہارا واسطہ کس قسم کے لوگوں سے ہے؟ اپنے محکمے کو چھوڑو۔ دلاور ایک طاقت کا نام ہے۔ بدی کی طاقت۔ تمہیں راستے سے ہٹانا کوئی مشکل کام نہیں ایس ایس پی صاحب!" محسن نے کہا۔

"میں خدا پر بھروسا رکھتے ہوئے یہ رسک لوں گا۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا "ایک منٹ۔ کہاں جارہے ہو تم؟ میرا خیال ہے کہ تم کو کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ یہ تمہارے لیے سب سے محفوظ جگہ ہے جہاں تم پہنچ گئے ہو۔ تم کل رابعہ کے یا میرے ساتھ کورٹ جاسکتے ہو۔"

وہ بیٹھ گیا۔ "یہ جگہ محفوظ ہے؟"

"ہمارے لیے نہ سہی۔ تمہارے لیے ہے" محسن نے کہا "کون شک کرسکتا ہے کہ تم یہاں ہو؟"

اس نے سوچ کے کہا "اسلام آباد جانے اور آنے میں کیا حرج ہے۔ پانچ گھنٹے جانے میں اور پانچ آنے میں صرف ہوں گے۔ آج رات اپنے گھر میں گزار کے میں صبح چار بجے نکلوں تو نو بجے کورٹ میں۔"

"لیکن تلاش کرنے والے اسلام آباد میں تمہارے گھر میں پہنچ سکتے ہیں۔" محسن بولا "بہتر ہے کہ تم یہاں سے فون کرواپنے گھر اور بیوی سے کہو کہ بچوں کے ساتھ کہیں چلی جائے۔ کسی کو کچھ بتائے بغیر۔ آج کی رات کسی دوست کے گھر میں یا ہوٹل میں گزار لے۔ باپ کے گھر بھی نہ جائے۔"

"اس انتہا تک بات جاسکتی ہے؟"

"دشمن کے لیے انتہا کچھ نہیں اور تمہارے اپنے محکمے کے لوگ اب تمہارے ساتھی نہیں دشمن ہو ... آئی جی صاحب کے حکم پر سب کچھ ہوسکتا ہے۔ اس نے کتنی رشوت لی ہوگی؟"

صدیقی ہنسنے لگا "یہ کون بتا سکتا ہے۔ اوپر کی سطح پر رشوت سے

"اور تب تک تم دلاور کو اپنی تحویل میں رکھو گے؟"

"ظاہر ہے۔"

"اگر آج ہی تم سے کہا گیا کہ دلاور کو جانے دو؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ آج کا دن اور یہ رات گزارنی ہے مجھے۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ بس مجھے ملنا نہیں چاہیے اپنے آفس میں یا اپنے کمرے میں جہاں میری رہائش ہے۔" وہ بولا۔

"اس لیے تم یہاں بیٹھے ہوئے ہو؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا "اور تم شاید کہیں جارہے ہو؟"

میں نے بریف کیس کی طرف دیکھا "اسلام آباد!"

"کوئی نجی کام ہے؟"

میں نے کہا "نہیں۔ اسی مسئلے پر برٹش کونسلیٹ سے ہدایات لینی ہیں۔ یہ بتانا ہے کہ ڈاکٹر شبلی کا مبینہ قاتل گرفتار ہوگیا ہے اور اب اس کے خلاف واحد عینی شاہد کو لندن سے بلوانے کا انتظام کیا جائے۔ اس پر لندن میں دہرے قتل کی واردات کا الزام بھی تھا جو ثابت نہیں ہوسکا تھا۔"

"مجھے معلوم ہے۔ لیکن برا نہ مانو تو ایک بات پوچھوں؟"

"میں برا مان کے تمہارا کیا بگاڑ سکتا ہوں؟"

صدیقی نے کہا "تم وکیل ہو ڈاکٹر شبلی کے لواحقین کے نامزد کیے ہوئے۔ وہ ... میں رہتی تھی۔ تم انگلش بالکل نہیں جانتے۔ صرف فرنچ بول اور سمجھ سکتے ہو۔ یہ کیا چکر ہے؟"

"کوئی چکر نہیں۔ میں فرنچ ہوں۔ فرنچ اگر انگریزی جانتے ہوں تب بھی انگریزی نہیں بولتے۔ میں بھی انگریزی سمجھ لیتا ہوں اور ٹوٹی پھوٹی بول سکتا ہوں لیکن میں ایسا کیوں کروں؟ رہا یہ سوال کہ مجھے ہی کیوں نامزد کیا ڈاکٹر شبلی کے لواحقین نے؟ تو جواب یہ کہ ان کی مرضی۔ وہ دنیا ... کی خدمات حاصل کرنے کے لیے آزاد تھے ... عدالت کا تعلق نہ فرانس کی عدالت کا۔ وہ ایران سے فارسی بولنے والا وکیل بھی لے سکتے تھے یا جاپانی۔ برٹش کونسلیٹ اس لیے بیچ میں آتا ہے کہ مقتولہ برطانوی شہری تھی۔ اور کوئی کنفیوژن ہے تو بتاؤ؟"

"نہیں۔ کنفیوژن کوئی نہیں" صدیقی نے کہا "کیا حرج ہے اگر تم میرے ساتھ اسلام آباد چلو۔"

"تم اسلام آباد جاؤ—"

"خیال تو ہے۔ جب سارا دن غائب رہنا ہے تو کیوں نہ ایک چکر اسی کام کا لگاؤں۔ اپنی کار میں۔"

مجھے شک ہوا کہ وہ اس بہانے مجھ پر نظر رکھنا چاہتا ہے یا پھر تصدیق کرنا چاہتا ہے کہ میں نے جھوٹ تو نہیں بولا۔

محسن نے کہا "اگر تمہاری عدم موجودگی میں ڈی آئی جی صاحب نے خود یا کسی نے دلاور کی رہائی کے احکامات صادر کردیے اور دلاور کو اس کی بیوی کے حوالے کردیا.... پھر؟"

زیادہ دباؤ چلتا ہے۔ ٹیلی فون پر احکامات دیے جاتے ہیں۔ تعمیل پر صلہ بعد میں ملتا ہے۔ کوئی پلاٹ یا لائسنس۔ حکم عدولی پر زیادہ بھگتنا پڑتا ہے۔ مجھے کیا معلوم کہ مسز ولا ور نے ڈوری کہاں سے ہلائی ہے اور کس کی۔ لیکن میں تم سے اتفاق کرتا ہوں۔ مجھے فون پر بات کرلینی چاہیے۔"

"اچھا مسٹر صدیقی۔ اب ہمارا ساتھ نہیں رہا۔ مجھے اجازت دیں" میں نے کہا "میری فلائٹ کا ٹائم ہے۔"

صدیقی نے گھڑی دیکھی "لیں۔ تمہیں نکل جانا چاہیے۔ دو بجے والی فلائٹ ہے نا؟"

میں نے سرہلایا "ہاں۔ صبح کورٹ میں ملاقات ہوگی۔ نائٹ کوچ سے واپسی ہولی میری۔"

میں نے بریف کیس اٹھایا اور باہر نکل گیا۔ صدیقی نے اچانک ہمارے کیمپ میں پناہ لے کر صورتِ حال کو ڈرامائی موڑ دے دیا تھا۔ اس سے مجھے بہت خوشی اور اطمینان حاصل ہوگیا تھا۔

گل نے مجھے ائرپورٹ ڈراپ کیا اور میں نے اسے بتایا کہ صدیقی کیوں آیا تھا۔ وہ خود بھی چھپ کے ہماری باتیں سن رہی تھی۔

"اب کل تک کا معرکہ درپیش ہے۔ ولاور کو قید کرنے اور کرانے والے ایک طرف ہیں۔ اسے چھڑانے والے دوسری طرف جن کے ساتھ پولیس بھی ہے۔ محسن بھی صورتِ حال کو سمجھتا ہے۔ غالب اور مارگریٹ کو سب سے پہلے نکال دو یہاں سے۔ رابعہ محسن اور گل آج رات رہیں منظر کے گھر میں۔ تم اور وقار بھی اپنے گھر میں نہ رہو تو اچھا ہے۔"

"پھر کہاں رہیں ہم؟"

"ایک رات کی تو بات ہے۔ چلے جاؤ کسی ہوٹل میں۔"

میرے پاس کراچی کا ٹکٹ تک نہیں تھا۔ چانس پر دو مسافر تھے جو پہلے سے موجود تھے یعنی میرا نمبر تیسرا تھا لیکن عین وقت پر چار سیٹوں کی گنجائش نکل آئی۔ میں نے شجاعت علی بغدادی کے نام سے سفر کیا۔ میرے ساتھ والی سیٹ پر ایک باتونی اور جاہل شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے بڑے تجسس کا مظاہرہ کیا۔

"کیا آپ بغداد کے رہنے والے ہو بغدادی صاحب!"

میں نے کہا "نہیں۔ تم نے الف لیلہ کی کہانیاں پڑھی ہیں۔"

"ہاں۔ الہ دین کا چراغ اور....."

میں نے کہا "اس میں ایک حجام کی کہانی ہے۔ خلیفہ ہارون رشید اور اس کی بیوی زبیدہ کو بے وقوف بنا کے انعام بھی حاصل کرلیا تھا اس نے۔ وہ میرے پردادا کے پرنانا تھے۔ میں بھی نائی ہوں۔"

"میرا نام سعید احمد کرمانی ہے۔ کریانہ کی دکان ہے۔"

"یعنی تم کرمان کے رہنے والے ہو۔"

اس نے برا مان کے کہا "یہ تو ذات ہے میری۔"

میں نے کہا "کرمان ایک شہر ہے ایران کا۔ اگر تمہیں معلوم نہیں تو اپنا نام بدل کے سعید احمد کریانی کرلو۔ یا سعید احمد پنساری۔"

اس کے بعد ہمارے درمیان بات چیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ویسے بھی میں انگریزی کا اخبار پڑھنے لگا تھا اور وہ کھانے پینے میں مصروف ہوگیا تھا۔ وہ ان مسافروں میں سے تھا جو صرف اس لیے جہاز سے جاتے ہیں کہ کھانا مفت ملتا ہے اور ائرہوسٹس مذاق پر خفا نہیں ہوتی بلکہ مسکراتی ہے۔

کراچی ائرپورٹ سے میں سیدھا میٹروپول گیا اور اس بار کمرا حاصل کیا۔ میں نے اپنا پتا بھی غلط لکھا مگر میرے جیسے خوش صورت آدمی پر شک کون کرسکتا تھا۔ مجھے تین سو دو نمبر کمرا دیا تو میں نے انکار کردیا۔

"میں ذرا وہمی ہوں' یہ خطرناک نمبر ہے۔"

"وہ کیسے سر! اس میں تیرہ کا ہندسہ نہیں ہے" کلرک بولا۔

"یہ قتلِ عمد کی دفعہ ہے۔ جس میں پھانسی ہو جاتی ہے۔"

"اوہ۔ وکیل ہیں آپ" وہ مسکرایا اور مجھے سیکنڈ فلور پر دو سو دو دے دیا۔ "اس کا ویو ویسا نہیں ہے۔"

میں نے کہا "میں یہاں کھڑکی سے کراچی شہر کا نظارہ کرنے نہیں آیا ہوں۔ مجھے مسٹر اے کیوڈسکوی سے ملنا ہے۔ کیا وہ اپنے سوئٹ میں موجود ہوں گے؟"

اس نے پلٹ کے دیکھا اور نفی میں سرہلایا "چابیاں موجود ہیں وہ رات کے وقت واپس آنے کا کہہ گئے تھے۔"

ابھی شام کے پانچ بجے تھے۔ میں نے غسل کیا اور چائے طلب کی۔ دو گھنٹے میں یقیناً فارغ تھا۔ میں رات نو بجے ہی میرزا بابا سے مل سکتا تھا۔ اس مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے لباس بدلا اور باہر نکل گیا۔ دوبارہ اکرام شیخ کے گھر جانے کے بارے میں براہ راست اس کے گھر نہیں پہنچ سکتا تھا۔ ٹیکسی میں ناظم آباد پہنچ جانے کے بعد میں نے کچھ دیر پتا تلاش کرنے کی ناکام کوشش کی اور بالآخر اسکول پہنچا۔ وہاں پرانا خبطی چوکیدار نہیں تھا۔ اس کی جگہ مجھے ایک مہذب نوجوان ملا جو اپنے حلیے سے بھی چوکیدار نہیں لگتا تھا۔ اس کے بال بڑے بڑے تھے۔ آنکھوں میں سرمہ تھا۔ ہونٹوں پر پان کی لالی۔ اس نے رنگین ریشمی قمیص اور تنگ پتلون پہن رکھی تھی۔ ٹیکسی والے کو پتا سمجھانے کے بجائے وہ میرے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ گیا اور مجھے سیدھا کاجل کے گھر لے گیا۔

میں گھر کو باہر سے دیکھ کے دنگ رہ گیا۔ یہ گھر تین چار سو گز سے زیادہ پر بنی ہوئی کوٹھی تھی جس کے پورچ میں بالکل نئی گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔

"یہ میڈم کی گاڑی ہے۔ ابھی لی ہے دو مہینے پہلے۔"

کال بیل بجی تو ایک بنگالی ملازمہ نمودار ہوئی "آپ کون مانگتا جی۔"

وہ مجھے اندر لے گئی۔ اکرام شیخ باتھ روم میں سے تولیا لپیٹے برآمد ہوا اور ایک اجنبی کو دیکھ کے سخت جھینپا جو اس کی بیوی کو چنائے کھڑا تھا۔ کاجل عینک اتار کے رو رہی تھی۔

"کاجل..... یہ کیا ہے..... کون ہے؟"

میں اس کی طرف لپکا "ابھی بتاتا ہوں تجھے الو کے پٹھے۔ مجھ سے پوچھتا ہے کہ میں کون ہوں؟"

وہ واپس باتھ روم کی طرف بھاگا۔ میرے ہاتھوں میں تولیا رہ گیا۔ اس کی حالت غیر ہوگئی۔ مجھے بے اختیار ہنسی آئی۔ کاجل بھی ہنسنے لگی۔ اکرام شیخ نے باتھ روم کا دروازہ بند کرلیا اور پھر ایک پرانی پتلون پہن کے برآمد ہوا۔ ہم گلے ملے اور ہنس ہنس کے ایک دوسرے کو مکے مارتے رہے۔

جب یہ طوفان بدتمیزی تھما تو ڈھنگ سے بیٹھ کے باتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ کاجل فوراً ہنگامی بنیادوں پر خاطر مدارات میں لگ گئی۔ میں نے انہیں وہ تصاویر پیش کردیں جو گل نے دی تھیں۔ انہوں نے ایک ایک تصویر کو دس دس بار دیکھا اور سب کے بارے میں ان گنت سوالات کیے اور اپنی رائے دی۔

کاجل نے حیرت انگیز ترقی کی تھی۔ اب وہ گولیمار کے ایک اسکول کی نہیں دو اسکولوں کی مالک تھی۔ دوسرا انگلش میڈیم اسکول تھا جو سوسائٹی کے فیشن ایبل علاقے میں بڑی کامیابی سے چل رہا تھا۔ سابق پولیس سب انسپکٹر اکرام شیخ اور سابق ٹیکسی ڈرائیور اکرام شیخ اب ان اسکولوں کا ایڈمنسٹریٹر تھا۔ وہ بلاشبہ بہت معزز اور دولت مند ہو گئے تھے۔

رات نو بجے میں اگلے دن آنے کا جھوٹا وعدہ کرکے رخصت ہوا تو میرا پیٹ حلق تک بھرا ہوا تھا اور اس میں کاجل نے مرغن کھانے' روسٹ' میٹھا' ٹھنڈا اور گرم۔ چائے کافی سب کچھ ٹھونس دیا تھا۔

"آج رات ہی مجھے ہیضہ ہو جائے گا۔ کھایا پیا اور کہا سنا معاف کردینا" میں نے ہچکی لے کے کہا "اچھی دشمنی نکالی تم نے۔"

ڈرائیونگ کرتے ہوئے اکرام شیخ ہنسا "مجھے نہیں دیکھا تو نے کتنا پیٹ نکل آیا ہے۔"

"اچھا یہ زیادہ کھانے سے نکلا ہے؟"

"اور کیا' اچھا کھانا اور بیٹھے رہنا۔ دو قدم پیدل نہ چلنا۔"

میں نے کہا "میں تو کچھ اور سمجھا تھا۔ شاید تو بھی کاجل کی طرح....."

کاجل نے شرما کے کہا "بے شرم بھی ہوگئے ہو تم۔"

"ہوگئے ہو کیا مطلب۔ شروع سے ہیں ہم۔ ابھی دیکھا نہیں اپنے میاں کو کیسے ننگ دھڑنگ کھڑا ہوا تھا ڈرائنگ روم میں۔"

میں نے کہا "یار یہ بنگالن بالکل ٹھیک جارہی ہے۔ ہر سال کیلنڈر چھاپ دے گی۔"

میں نے کہا "ہم تمہاری میڈم کا ماموں ہے۔" اور اندر داخل ہوگیا۔ بنگالی ملازمہ میرے پیچھے پیچھے آئی۔

"ادھر کدھر زاتا۔ بیگوم شاب ہوم پر ناراج ہوتا۔ ڈرائنگ روم کھولے گا ابھی..... تم....."

میں نے کہا "تمہاری بیگم صاحب اور اس کے صاحب۔ دونوں کی ایسی تیسی۔"

شور سن کے کاجل باہر آئی تو میں پھر بھونچکا رہ گیا۔ وہ واقعی میڈم ہوگئی تھی۔ اس نے اپنے بال پرم کرا کے سیٹ کرالیے تھے۔ اس کی آنکھوں پر سنہرے فریم والا نازک سا چشمہ تھا اور وہ بہت خوب صورت ساری میں تھی۔ بدلے ہوئے حلیے میں وہ مجھے کیسے پہچان سکتی تھی۔

"کون ہو تم۔ ایسے اندر گھسے چلے آرہے ہو۔ ماسی' تمہارا دماغ خراب ہے کیا۔ اور چوکیدار تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" وہ بگڑ گئی۔

ملازمہ نے اپنی صفائی میں کچھ کہا جو میری سمجھ میں نہیں آیا۔

میرے ساتھ آنے والے اسکول کے چوکیدار نے بدحواس ہو کے وضاحت کی "یہ تو ماموں ہیں آپ کے۔"

"ماموں کا بچہ" کاجل کا لہجہ بھی بدل گیا تھا "تو وہاں سے یہاں کیوں آیا۔ فون کرکے پوچھ نہیں سکتا تھا۔"

میں نے آواز بدل کے کہا "ارے بٹیا۔ یہ کا کہت ہو۔ ہم اصل ماما ہیں تمہار۔ سجاعت علی بغدادی۔"

"شٹ اپ۔ تم غلط جگہ آگئے ہو۔ خیریت چاہتے ہو تو نکل جاؤ ورنہ میں پولیس کو بلالوں گی۔ چوکیدار..... چوکیدار.....!" وہ چلانے لگی۔

نہ جانے کہاں سے اس کے گھر کا پٹھان چوکیدار دوڑتا ہوا آیا۔ اس کی مونچھیں ہی اسے چوکیدار ثابت کرتی تھیں "کیا اے بیگم صیب جی۔"

"دیکھو یہ کون گھس آیا ہے گھر میں۔ تم دونوں مل کے اسے باہر نکالو۔"

اب میں نے اپنی اصلی آواز میں کہا "ارے کاجل۔ کیوں ان بے چاروں کی ہڈی پسلی ایک کراتی ہو۔ کیا اتنی کمزور ہوگئی ہے تمہاری نظر؟"

اب وہ چونکی "کون..... سکندر..... سکندر بھائی۔"

میں نے کہا "کدھر ہے وہ ٹیکسی ڈرائیور؟ تمہارا خصم.....!"

کاجل نے گھبرا کے کہا "چلو تم دونوں جاؤ۔ یہ واقعی میرے ماموں ہیں۔ میں پہچان نہیں سکی تھی۔" پھر وہ مجھ سے انگریزی میں مخاطب ہوئی "خدا کے لیے ان کے سامنے تو عزت رکھ لو میری۔ یہ ملازم ہیں۔"

میں نے کہا "اب فکر پڑی ہے اپنی عزت کی۔ ہماری بے عزتی کیوں خراب کرا رہی تھیں' خیر ہم نے معاف کیا۔"

"اور وہ جو تمہارا دوست ہے' چودہ بچوں والا۔"

"کاجل۔ اپنی معلومات اَپ ٹو ڈیٹ کرلو۔ اس کے ساڑھے ... بچے ہیں۔"

جیسے تیسے انہوں نے مجھے میٹرو پول کے گیٹ پر اُتار دیا "کل کس وقت آؤ گے۔ مجھے بتادو' میں خود آؤں گی اور اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔"

"یار تکلف میں مت پڑو۔ میرا کچھ پتا نہیں۔ بس میں پہنچ جاؤں گا خود ہی۔ جیسے آج پہنچا تھا" میں نے کہا۔

اس ملاقات نے مجھے تازہ دم کردیا تھا۔ میں نے کاجل اور اکرام شیخ کو سب بتادیا تھا۔ سوائے ایک بات کے۔ میں نے کہا تھا کہ نازو بالکل خیریت سے ہے اور بس اب تھوڑے دن کی بات ہے۔ پھر سب کے گھر آباد ہوجائیں گے۔ غالب اور نازو کا' میرا اور رابعہ کا۔ انہوں نے کہا کہ ہم آج رات ہی فون پر بات کرلیں گے۔

مجھے معلوم تھا کہ رات کو شاید انہیں کوئی بھی نہیں ملے گا۔ گھنٹی بجتی رہے گی مگر فون کوئی نہیں اٹھائے گا۔ اگلے دن میرا ارادہ خاموشی سے لوٹ جانے کا تھا۔ میں اکرام شیخ اور کاجل کی مطمئن' پُرسکون اور مصروف زندگی میں کوئی رخنہ ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔

رات ساڑھے نو بجے میری ملاقات مسٹر اے کیو ڈسکوی سے ہوئی۔ اسے ہوٹل کلرک نے پہلے ہی بتادیا تھا کہ مسٹر شجاعت علی بغدادی اس سے ملنے کے لیے لاہور سے آئے ہیں۔ اس کا حیران ہونا برحق تھا۔ وہ اس نام کے کسی آدمی کو نہیں جانتا تھا لیکن میرا انتظار کررہا تھا۔

خلاف توقع وہ شریف اور وضع دار آدمی ثابت ہوا۔ اس کے گھنے بال بالکل سفید تھے اور اس کے مزاج میں نہ رعونت تھی نہ ولایت کی جعلی چھاپ۔

میں نے کہا "آپ یقیناً مجھے نہیں جانتے لیکن آپ کی بیٹی میری لندن کے جس اسکول میں پڑھتی تھی اس میں میری ایک گرل فرینڈ تھی۔ اس کا نام الزبتھ تھا۔ وہ ایک مغرور اور متعصب انگریز لارڈ کی بیٹی تھی جس نے مجھے اس جرم میں برطانیہ سے ڈی پورٹ کروادیا تھا کہ میں الزبتھ سے شادی کا ارادہ رکھتا تھا۔"

"انگریز سے زیادہ تنگ نظر اور متعصب قوم کوئی نہیں" وہ بولا۔

میں نے کہا "آپ کا ایک شوفر تھا۔ ایک نیگرو جس کا نام جارج تھا۔"

وہ چونکا "وہ.....وہ تو جیل میں ہے بے چارہ۔"

میں نے کہا "وہ دُہرے قتل کے جرم میں عمر قید کاٹ رہا ہے حالانکہ قتل اس نے نہیں کیے تھے۔"

"رائٹ۔ مگر تم کیسے جانتے ہو۔ ضرور میری نے بتایا ہوگا۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "میری سے اتفاقیہ ملاقات ہوگئی تھی لاہور میں۔ اس کیس کے حقائق پہلے سے میرے علم میں تھے۔

میری نے مجھے بتایا کہ آپ نے جارج کو بچانے کی کوشش کی تھی۔ قانونی خرابات آپ نے برداشت کیے تھے۔"

اس نے مایوسی سے کہا "بعض اوقات سو فیصد سچ کو بھی ثابت کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔"

میں نے کہا "میں اصل قاتل کو جانتا ہوں۔"

اس نے چونک کے مجھے دیکھا "تم جانتے ہو؟ کب سے؟"

"بہت عرصے سے..."

"پھر اب تک تم کیوں خاموش تھے اور اب اچانک بتانے کا خیال کیسے آگیا تمہیں۔" اس نے ناگواری سے کہا۔ "... فائدہ۔"

میں نے کہا "خدا نے ہر وقت کے لیے ایک کام اور ہر کام کے لیے ایک وقت مقرر کیا ہے۔ وقت اب آیا ہے کہ میں آپ کو بتاؤں اور آپ جارج کے لیے نئے سرے سے کوشش کریں۔"

"اب مشکل ہے' بلکہ ناممکن...!"

"ناممکن کچھ نہیں ہوتا۔ نیک نیتی سے جو کام کیا جائے اس میں خدا کی رضا بھی شامل ہوتی ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو میری ملاقات آپ کی بیٹی سے نہ ہوتی اور مجھے کبھی پتا نہ چلتا کہ جارج آپ کا شوفر تھا۔ میں نے مناسب سمجھا کہ فوراً کراچی پہنچ کے آپ سے رابطہ کروں۔ یہاں اصل قاتل گرفتار کرلیا گیا ہے۔"

وہ حیران ہوا "یہاں؟"

میں نے کہا "اس نے یہاں ایک لیڈی ڈاکٹر کو قتل کیا۔ ڈاکٹر شیلی کو۔ یہ نام ضرور سنا ہوگا آپ نے؟"

"آف کورس۔ جارج پر ڈاکٹر شیلی کی ماں کو قتل کرنے کا الزام تھا اور اپنی گرل فرینڈ کو۔"

میں نے کہا "وہ آیا تھا ڈاکٹر شیلی کو قتل کرنے کے لیے مگر اس کو پہچانتا نہیں تھا۔ اس نے جارج کی گرل فرینڈ کو ہی شیلی سمجھ کر شوٹ کردیا۔ پھر جارج کی بیوی کو ماردیا۔"

"لیکن کیوں' کیا مقصد تھا اس قتل کا؟"

"جارج کی بیوی اصل قاتل کی سوتیلی ماں تھی۔ اور اس طرح ڈاکٹر شیلی اس کی سوتیلی بہن۔ وہ دونوں کا قصہ پاک کرنے کے لیے لندن پہنچا تھا۔ کچھ جائداد ہتھیانے کا چکر تھا کچھ بدنامی کا۔ شیلی کی ماں کے اطوار اچھے نہیں تھے۔ بدقسمتی سے ادھر قاتل جائے واردات سے فرار ہوا ادھر جارج پہنچ گیا اور پکڑا گیا۔ اس نے قاتل کی ایک جھلک دیکھی تھی مگر قاتل صرف ایک دن کے لیے لندن گیا تھا۔ واپسی کی فلائٹ پر اس کی سیٹ کنفرم تھی۔ اگلے دن وہ پھر کراچی میں تھا۔ جارج نے اس کا جو حُلیہ بتایا اس نام کا کوئی شخص لندن میں مل بھی نہیں سکتا تھا۔"

"کون ہے آخر وہ؟"

میں نے جیب میں سے دلاور کی ایک تصویر نکالی "یہ اصل قاتل ہے۔ اس کا نام ہے چوہدری دلاور۔"

وہ دلاور کی صورت کو غور سے دیکھتا رہا "تم کہتے ہو کہ یہ ڈاکٹر شیلی کا سوتیلا بھائی ہے؟"

"ہیں۔ اب وہ ڈاکٹر شیلی کے قتل کے جرم میں پکڑا جاچکا ہے اور اس کو پھانسی ہونا یقینی ہے۔"

"کیا شیلی اس سے انتقام لینے آئی تھی؟"

"نہیں۔ اسے قاتل نے دھوکے سے بلایا تھا۔ مگر آپ کو..."

"دیکھو مسٹر بغدادی۔ میں یہاں کسی قانونی چکر میں پڑنے نہیں آیا تھا' آئی ایم سوری!"

میں نے کہا "آپ کو کچھ بھی نہیں کرنا ہے۔ یہاں برٹش کونسیٹ کی معرفت جارج کو بلانے کا بندوبست کرلیا گیا ہے۔"

"پھر میں کیا کرسکتا ہوں۔"

میں نے کہا "آپ جارج سے ملیں اور اسے یہ تصویر دکھائیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ دلاور کو پہچان جائے گا۔"

"اس سے کیا فائدہ ہوگا؟"

میں نے کہا "میں چاہتا ہوں کہ وہ دلاور کی صورت ذہن نشین کرلے اچھی طرح دیکھ لے۔ اس نے پہلے قاتل کی صرف ایک جھلک دیکھی تھی۔ یہ پرانی بات ہے۔ ہوسکتا ہے اب وہ دلاور کو شناخت نہ کرپائے مگر یہ تصویر دیکھنے کے بعد اس کے لیے کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ پولیس جب دلاور کو شناختی پریڈ کے لیے کھڑا کرے گی تو وہ دلاور کو پہچاننے میں غلطی نہیں کرے گا' یہ حالیہ تصویر ہے۔"

"میں سمجھ گیا" اس نے تصویر جیب میں رکھ لی "یہ بہت اچھا کیا تم نے۔ غلطی کا امکان نہیں رہنے دیا۔ میں یہ تصویر جارج کو دکھاؤں گا۔ لندن پہنچتے ہی۔"

"مجھے یقین ہے کہ اس سے جارج کی رہائی میں مدد ملے گی۔"

"لیکن جارج کے کیس پر نظرِثانی کے لیے وزارتِ انصاف کے پاس ٹھوس مواد ہونا چاہیے۔"

میں نے کہا "کیا چوہدری دلاور کا اعترافِ جرم کافی نہیں ہوگا۔"

"تمہیں یقین ہے وہ اتنے پرانے قتل کا الزام بھی اپنے سر لے گا جس میں مجرم کسی اور کو قرار دیا جاچکا ہے۔"

میں نے کہا "اے کیو صاحب' آپ تو پاکستانی ہیں۔ پاکستان کی پولیس کے طریقۂ تفتیش سے واقف ہوں گے۔ وہ ہر بے گناہ سے ہر جرم کا اعتراف کراسکتے ہیں لیکن دلاور کے خلاف اہم ثبوت ہوگا اس کا پاسپورٹ جس پر لندن آنے جانے کی تاریخ کا اندراج ہوگا۔"

وہ اُچھل پڑا "اور قتل انہی تاریخوں میں ہوا تھا۔"

"ہاں۔ دلاور کیا کہے گا کہ وہ ایک دن کے لیے لندن کیوں گیا تھا ریٹرن ٹکٹ پر؟"

"کیا پتا وہ فرضی نام سے کسی جعلی پاسپورٹ پر گیا ہو۔ یہاں لوگ دو پاسپورٹ بنا سکتے ہیں۔"

"دو کیا چار بنوا سکتے ہیں مگر میرا خیال ہے دلاور کے ذہن میں یہ بات نہیں ہوگی۔ لندن میں ہونے والے قتل کا سراغ پاکستان تک بھی لگایا جاسکتا تھا۔ اور ان سب معاملات کے لیے آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ صرف اتنا کریں کہ جارج کو یہ تصویر دکھادیں۔ اس کو سنبھال کر رکھیں لیکن خدانخواستہ یہ گم ہوجائے تو کوئی بات نہیں۔ آپ مجھے لندن کا فون نمبر دے دیں۔ میں تصدیق کرلوں گا اور ضرورت پڑی تو دوسری تصویر روانہ کردوں گا۔"

"تم مطمئن رہو' میں اپنی ذمے داری پوری کروں گا۔ یہ ایک نیک مقصد ہے۔ ایک بے گناہ سیاہ فام کی رہائی کے لیے تو میں برطانیہ میں تحریک چلا سکتا ہوں۔ اب حالات پہلے جیسے نہیں ہیں۔ میں اس تصویر کو پوسٹر بنا کے شائع کردوں گا۔ ہم پلے کارڈ پر پوسٹر لگا کے وزارت انصاف کے سامنے مظاہرے کا انتظام کرسکتے ہیں کہ یہ ہے اصل قاتل۔ بے گناہ جارج کو رہا کیا جائے۔"

"اس سے یقیناً فائدہ ہوگا" میں نے کہا "وِش یو گُڈ لک۔"

اس نے مجھے روکنے کی کوشش کی اور اگلے دن لنچ پر مدعو کیا مگر میں نے معذرت کرلی۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ میں لاہور میں کہاں رہتا ہوں اور کیا کرتا ہوں۔ میں مسلسل جھوٹ بولتا رہا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ جارج کی رہائی کے لیے چلائی جانے والی تحریک سے میرا کوئی تعلق ثابت ہو۔ اصل قاتل کی تصویر فراہم کرنے والے شجاعت علی بغدادی کا کسی کو پتا ہی نہ چلے کہ کون تھا۔

رات دس بجے میں نے وقار کے گھر فون کیا اور پھر اپنے گھر۔ دونوں جگہ گھنٹی بجتی رہی مگر ریسیور کسی نے نہیں اٹھایا۔ اس کا مطلب تھا کہ نکی نے میری ہدایات آگے پہنچادی تھیں اور محسن نے ان پر عمل بھی کیا تھا۔ نکی اور وقار کہیں بھی جاسکتے تھے۔ گل' رابعہ اور محسن کے لیے بھی منظر کا گھر محفوظ جگہ تھا مگر ایس ایس پی جاوید صدیقی کہاں گیا ہوگا؟ کیا وہ بھی منظر کے گھر میں ملے گا۔

رات کے بارہ بجنے والے تھے جب میں نے منظر کے گھر کا نمبر آپریٹر کو دیا مگر کچھ دیر بعد جواب ملا کہ نمبر انگیج ہے۔ میں نے کال کینسل کرادی اور آرام سے سوگیا۔ چوہدری دلاور کے گرد شامتِ اعمال اپنا گھیرا تنگ کرتی جارہی تھی۔ جاوید صدیقی کا انقلابی فیصلہ سب سے زیادہ اہمیت کا حامل تھا۔ اگر وہ ڈر جاتا یا بِک جاتا تو چوہدری دلاور کو اس کی بیوی سیکیورٹی کے تمام انتظامات کو شکست دے کر اپنے ساتھ لے جاتی۔ قانون کے محافظ خود قانون کی فصیل گرادیتے اور انصاف کے راستے میں دیوار بن جاتے۔ مسز اے کیو ڈسکوی کا ملنا دوسرا اتفاق تھا جس نے دلاور کے انجام پر مُہرِ عبرت ثبت کردی تھی۔ فاطمہ جعفری کی گرفتاری بھی ہماری ایک اہم کامیابی تھی۔

صبح سات بجے میری ہدایات کے مطابق بیڈ ٹی لانے والے ویٹر نے دستک دی۔ میں نے ہاتھ منہ دھو کے چائے پی اور آپریٹر کو منظر

کے گھر کا فون نمبر دیا۔ کال فوراً مل گئی۔

منظر نے کہا "ابے بھوتنی کے۔ بغداد کے چور۔"

میں نے کہا "یار یہ کوئی طریقہ ہے شرفا کے سلام دعا کا۔"

"یہ شرفا کون ہے ہم میں سے؟" منظر نے کہا "سب سالے ایک سے ایک چھٹے ہوئے بدمعاش۔"

میں نے کہا "میری وہ ہیں؟ نام لیتے ہوئے شرم آتی ہے مجھے۔"

"ایک وہ کیا۔ رات تو ایسی یلغار ہوئی ہر طرف سے کہ گھر بنا ہوا ہے مہاجر کیمپ۔ وہ میری بیوی کی مدد کر رہی ہے کچن میں۔ گل بھی وہیں ہے۔ میرا خیال ہے میں بیوی کو بھیج دوں میکے اور بچوں کو داخل کرا دوں یتیم خانے میں۔ زیادہ آرام سے رہیں گے۔"

میں نے کہا "ایک دن میں مرا جا رہا ہے۔ مہمان تو اللہ کی رحمت ہوتے ہیں۔ اب ذرا محسن کو بلا۔"

"وہ یہاں کہاں۔ رات اس نے گزاری ہے اس کے ساتھ۔ اکیلے ایک تہ خانے میں۔ محسن اور وہ طرحہ جعفری۔ توبہ توبہ' میں نے گل کو خاصا بھڑکایا ہے۔ انشاء اللہ اچھی خاصی ہوگی ان کے درمیان جب محسن واپس آئے گا۔ سالا تفتیش کا بچہ" وہ قہقہہ مار کے ہنسا۔

میں نے کہا "غالب اور مارگریٹ کو انہوں نے پہنچا دیا تھا تیرے وہ سُسر کے اسپتال۔"

"ہاں غالب کو اجازت مل گئی تھی وہاں قیام کی مگر مارگریٹ کو نکال دیا تھا باہر۔ پھر محسن نے میری گھر والی سے فون کے لئے کہا تو وہ خود ساتھ چلی گئی۔ ماموں کی...." اس نے ایک بے ہودہ بات کی۔

"یعنی مارگریٹ بھی اب وہیں ہے۔ نازو کا کیا حال ہے؟"

"نازو ہوش میں ہے۔ غالب کو ابھی تک اس سے دور رکھا گیا ہے۔ اب یہ ڈاکٹر ہلاکو خاں چنگیزی کا کام ہے یار۔ ہمیں ٹانگ اڑانے کی کیا ضرورت ہے۔"

میں نے کہا "ایس ایس پی جاوید صدیقی کی کچھ خبر ہے۔"

"وہ بھی چلا گیا تھا محسن کے ساتھ ہی۔ دونوں نے مل کے....."

میں نے کہا "یار کیا ہر وقت فضول بکواس کرتا رہتا ہے۔"

"میری معلومات کے مطابق تو وہ عورت ایسی ہی ہے۔ اور تیری کیا لگتی ہے بھوتنی کے جو تو برا مانتا ہے۔ نو بجے صدیقی ہمارے ساتھ ہی جائے گا۔ میرے اور رابعہ کے ساتھ۔"

اس سے پہلے کہ میں مزید بات کرتا دروازہ دھڑ سے کھلا اور ایک پولیس انسپکٹر اندر آ گیا۔ اس کے پیچھے ہوٹل کا منیجر تھا۔

"آئی ایم سوری سر۔ انہوں نے میری بات ہی نہیں سنی۔"

میں نے ریسیور رکھ دیا اور سب انسپکٹر کو دیکھا "کیا مطلب ہے اس طرح میرے کمرے میں گھسنے کا' وارنٹ ہے؟"

"وارنٹ بھی آ جائے گا وکیل صاحب۔ لیکن مجھے کچھ [illegible] کرنے تھے آپ سے۔" وہ اکھڑ لہجے میں بولا۔

میں نے کہا "بیٹھو اور آرام سے بات کرو۔"

"مسٹر شجاعت علی بغدادی؟"

میں نے کہا "یس؟"

"آپ مسٹر اے کیوڈسکوی کو کیسے جانتے ہیں؟"

میں نے کہا "میں ان سے کل پہلی بار ملا تھا۔"

سب انسپکٹر نے کہا "کل کس وقت؟"

"رات گیارہ۔ ساڑھے گیارہ بجے تک میں ان کے [illegible] تھا۔"

سب انسپکٹر کے لبوں پر عجیب سی مسکراہٹ نمودار ہوئی "آپ ان کو زندہ دیکھنے والے آخری آدمی تھے۔"

میرا دل ڈوبنے لگا "کیا مطلب؟"

"مطلب بھی سمجھ میں آ جائے گا۔ میں آپ کو ان کے [illegible] کے شبے میں گرفتار کر رہا ہوں۔" سب انسپکٹر نے کہا۔

کمرا میری نظروں کے سامنے گھومنے لگا۔ میں نے تو ہوٹل [illegible] اپنا نام بھی غلط لکھوایا تھا۔ میری اپنی شناخت بھی میرا [illegible] تھی۔

"یہ کوئی غلط فہمی معلوم ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔

منیجر نے معذرت آمیز لہجے میں کہا "میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی تھی سر۔"

سب انسپکٹر نے اسے گھور کے دیکھا "تمہارا کیا نام ہے؟"

"میں پہلے بتا چکا ہوں۔" منیجر نے دفاعی انداز اختیار [illegible]

"ایک بات کا خیال رکھنا انسپکٹر۔ میں نے تمہیں صرف [illegible] کارروائی کے لئے یہاں تک آنے کی اجازت دی ہے۔"

"کسی قانونی کارروائی کے لئے مجھے تم سے اجازت [illegible] ضرورت نہیں ہے۔"

"لیکن غیر قانونی کارروائی کی یہاں کوئی گنجائش نہیں۔ [illegible] عام ہوٹل نہیں ہے۔" منیجر بولا۔

میں نے کہا "قتل کا الزام معمولی بات نہیں ہے۔ کیا کسی نے رپورٹ کی ہے میری....."

"ہمیں معلوم ہوا ہے کہ کل جب آپ ہوٹل آئے [illegible] نے مسٹر اے کیوڈسکوی کو پوچھا تھا۔" سب انسپکٹر بولا اور [illegible] طرف دیکھنے لگا۔

منیجر نے اقرار میں سر ہلایا "یہاں ہر روز لوگ کسی نہ کسی سے ملنے کے لئے آتے ہیں۔ بزنس مین میٹنگ کرتے ہیں۔"

میں نے کہا "پہلے تو مجھے یہ بتایا جائے کہ مسٹر اے کیوڈسکوی کا قتل کب ہوا؟"

"رات بارہ بجے کے بعد۔"

"کیا میں ان کی لاش دیکھ سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔

میرے آفس میں آ جائیں۔ ایک ضروری بات کرنی ہے۔"

انسپکٹر نے مطلب کی بات منیجر کی نگاہ میں اور لہجے میں پڑھ لی تھی مگر اس نے اپنی خودی کو بلند رکھا "ایسی کون سی بات ہے جو یہاں نہیں ہو سکتی۔ اگر ملزم فرار ہو گیا پھر؟"

منیجر نے خوشامدانہ انداز اختیار کر لیا "نہیں سر۔ یہ تو خود قانون کی مدد کرنے والے اتنے نامور وکیل ہیں۔ ملک کے سارے مشہور وکیل اور جج تک انہیں جانتے ہوں گے۔"

میں نے اکڑ کے کہا "اگر اخبار پڑھتے انسپکٹر صاحب تو یہ بھی میرے نام سے واقف ہوتے۔ خیر یہ اپنے محکمے کے کسی سینئر افسر سے تصدیق کر سکتے ہیں۔ یہاں ڈی آئی جی کرائمز کون ہیں آج کل۔"

سب انسپکٹر نے میری بات کا جواب نہیں دیا "یہ بڑی مشکل ہے جی۔ اگر ہم فرض شناسی کا مظاہرہ کریں تو بیچ میں آ جاتے ہیں آپ جیسے لوگ۔ اور ملزم بھی تڑی دینے لگتے ہیں۔"

منیجر نے کہا "نہیں سر۔ آپ کو تڑی کون دے سکتا ہے۔ دراصل ابھی ابھی ہوٹل کے ڈاکٹر نے معائنہ کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ مسٹر ڈسکوی کا ہارٹ فیل ہوا ہے۔"

میرا حوصلہ دوچند ہو گیا "یہ قتل کی بات آخر کس نے پہنچائی تھی پولیس کو؟ تم منیجر ہو۔ یہ ذمے داری صرف تمہاری ہے۔"

"میں نے کسی کو فون نہیں کیا سر؟"

میں نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا "اوہ آئی سی۔ پھر یہ خود ہی آ گئے۔ ان کی چھٹی حس نے انہیں بتا دیا ہو گا کہ یہاں چانس ہے۔"

"کیسا چانس؟" سب انسپکٹر گرم ہو کے بولا۔

"بلاوجہ معصوم مت بنو۔ مال کی خوشبو سونگھنے میں تمہارے حواس بہت تیز ہوتے ہیں۔ راڈار کی طرح خبر مل جاتی ہے تمہیں کہ کہاں سے پیدا کی جا سکتی ہے؟"

"میرے ساتھ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں۔"

"اپنی اوقات میں رہو انسپکٹر۔ یہ پٹی کچھ نہیں۔ تمہاری وردی تک اتروا سکتا ہوں میں۔ یوں؟" میں نے چٹکی بجا کے کہا "کیسے فرض کر لیا تم نے آخر کہ یہ قتل کی واردات تھی اور الزام میں کیا تم ان سب کو پکڑو گے جو اے کیوڈسکوی سے ملے تھے؟ میں نے شرافت سے اعتراف کر لیا تو میں ملزم ہو گیا۔ اب میں بتاتا ہوں کہ میرے بعد اور کون وہاں گیا تھا۔"

"کون گیا تھا؟ کیا تم نے دیکھا تھا کسی کو وہاں سے نکلتے ہوئے؟"

"ہاں۔ دس افراد باری باری ملے تھے۔ سب اسی ہوٹل میں مقیم ہیں۔ اسے میرا بیان سمجھو اور گرفتار کر لو ان دس افراد کو۔ میں ان سب کو شناخت کروں گا۔ شناخت کے لئے ہوٹل میں مقیم تمام افراد کو ایک جگہ اکٹھا کرنا تمہارا کام ہے۔"

ہو سکتا ہے کہ وہ کوئی اور ہو۔"

سب انسپکٹر کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ نمودار ہوئی "آپ بھی لاش کو دیکھ لیں۔"

میں انسپکٹر کے ساتھ اے کیوڈسکوی کے کمرے میں گیا۔ اس کی لاش سفید چادر سے ڈھکی ہوئی پڑی تھی۔ بظاہر یوں لگتا تھا جیسے وہ سو رہا ہو۔ میں نے چادر ہٹا کر اس کا چہرہ دیکھا اور پھر ڈھک دیا۔

"یس۔ رات کو میری اس شخص سے پہلی بار ملاقات ہوئی تھی۔"

"اور دوسری ملاقات میں تم نے اسے قتل کر دیا۔" سب انسپکٹر نے کہا۔

اگر میں گھبرا جاتا تو وہ سب انسپکٹر شاید مجھے ہتھکڑی پہنا دیتا۔ میں نے کہا "اس میں کوئی شک نہیں کہ میں رات کو گیارہ ساڑھے گیارہ بجے تک مسٹر اے کیوڈسکوی کے پاس تھا۔ لیکن یہ تم نے کیسے فرض کر لیا کہ میرے بعد ان سے کوئی نہیں ملا اور میں ہی وہ آخری آدمی ہوں جس نے انہیں زندہ دیکھا تھا۔"

سب انسپکٹر نے کہا "اگر تمہیں معلوم ہے اور [illegible] کا نام تو بتا دو۔"

وہ عام پولیس انسپکٹروں کے مقابلے میں مہذب تھا یا پھر اسے احساس تھا کہ وہ ایک ایسے ہوٹل میں ہے جہاں [illegible] تمام نہیں کرتے۔

میں نے کہا "دیکھو میں ایک مشہور وکیل ہوں۔ مجھ سے غیر قانونی بات کرو گے تو....."

وہ کچھ تیز ہو کے بولا "ابھی تک ایسی کون سی بات کی ہے میں نے۔"

"سب سے پہلی بات تو یہ کہ تم میرے کمرے میں کسی وارنٹ کے بغیر داخل ہوئے ہو۔ پھر تم نے کچھ بتائے بغیر مجھ پر قتل کا الزام عائد کر دیا۔ مجھے گرفتار کرنے کی دھمکی دے دی۔ صرف چھ سات گھنٹے میں یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ یہ واردات قتل کی ہے اور اس میں میرا ہی ہاتھ ہے۔"

اس کا اعتماد متزلزل ہو گیا "ابھی یہ شُبہ ہے ہمارا۔"

"کیا پوسٹ مارٹم رپورٹ مل گئی ہے؟ اس میں موت کی کیا وجہ بتائی گئی ہے۔" میں نے کہا۔

"دیکھیں جی بحث مت کریں۔ شبے میں ہم کسی کو بھی تھانے لے جا سکتے ہیں۔ پوچھ گچھ کے بعد چھوڑ بھی سکتے ہیں۔ ہمیں تو صبح صبح کسی نے فون پر اطلاع دی تھی کہ اس ہوٹل میں مسٹر اے کیوڈسکوی کا قتل ہو گیا ہے۔"

"کسی نے کیا مطلب؟ ہوٹل کا منیجر ہی یہ اطلاع دے سکتا ہے۔ لاش اگر سب سے پہلے کسی ویٹر نے دیکھی ہو تب ہی....."

"منیجر کو بھی معلوم نہیں تھا۔"

منیجر پھر کمرے میں داخل ہوا "انسپکٹر صاحب۔ آپ ذرا

منیجر نے پیچھے سے مجھے اشاروں میں سمجھایا کہ میں غصہ نہ کروں۔ وہ سب ٹھیک کرلے گا "انسپکٹر صاحب۔ آپ آئیں میرے ساتھ۔ آپ کو بلاوجہ زحمت ہوئی۔ کسی نے شرارت سے فون کیا ہوگا۔"

"شرارت کرنے والوں کی اطلاع غلط ثابت ہوتی ہے۔ یہ بات تو خود تمہیں معلوم نہیں تھی کہ ایک مسافر کمرے میں مرا پڑا ہے۔"

"اب کیا پتا جی۔ کسی ویٹر نے دیکھا ہو۔ ویٹر بھی بعض اوقات پریشان کرتے ہیں ہمیں۔ آپ آئیں تو سہی؟" وہ انسپکٹر کو گھسیٹ کر لے گیا "یہ کوئی ایسا معاملہ نہیں سر۔ میں پوری ذمے داری سے بتا رہا ہوں۔"

جب وہ چلے گئے تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ جان بچی۔ منیجر دخل اندازی نہ کرتا تو مجھے پولیس کے ساتھ جانا پڑتا اور جب یہ پتا چلتا کہ میرا نام اور پتا دونوں کا اندراج غلط ہے تو پھر میرے قاتل ہونے میں شک و شبے کی کوئی بات ہی نہ رہتی۔

میں نے ریسیور اٹھا کے آپریٹر کو کاجل کا نمبر دیا۔ وہ مجھے ساتھ لے جانے کے لئے روانہ ہونے ہی والی تھی "میں تمہاری طرف ہی آرہی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ تم کہیں فرار نہ ہو جاؤ۔"

"تم سے فرار ہو کے کہاں جاؤں گا میں؟"

"عادت پڑ گئی ہے نا فرار ہونے کی۔ پتا نہیں رابعہ نے باندھ کے رکھے گی کہ نہیں۔"

میں نے کہا "بہت مشکل ہے۔ میں اسے بھی بھگا لے جاؤں گا۔ خیر کاجل ایک بات سن لو دھیان سے۔ یہاں بلاوجہ ایک مسئلہ پیدا ہو گیا ہے صبح صبح۔ پولیس مجھے قتل کے الزام میں گرفتار کرنا چاہتی ہے۔"

"کیا؟ تم مذاق تو نہیں کر رہے ہو۔" وہ گھبرا گئی۔

"بالکل نہیں۔ شیخ صاحب کہاں ہیں؟"

"یہ کھڑے ہیں میرے ساتھ۔ مجھے بتاؤ......"

"تمہیں نہیں اکرام شیخ کو بتاؤں گا۔" میں نے کہا۔

شیخ نے میری بات سنی اور بولا "جلدی میں کوئی حماقت مت کر بیٹھنا۔ ہم پہنچ رہے ہیں۔ نام کیا بتایا تم نے۔"

"شجاعت علی بغدادی۔"

"میں فون کراتا ہوں۔ ایک ایس پی سے۔ اس کے بچے ہمارے اسکول میں پڑھتے ہیں۔"

ایس پی کا فون موصول ہوتے ہی سب ٹھیک ہو گیا۔ ہوٹل کا منیجر اس سے پہلے ہی سب ٹھیک کر چکا تھا۔ سب انسپکٹر دوبارہ میرے پاس آیا تو اس کا لہجہ اور اندازِ گفتگو بدلا ہوا تھا۔ اب وہ صفائی پیش کر رہا تھا اور مجھے بار بار سر کہہ رہا تھا۔ میں نے غور کیا تو مجھے اس کی ایک جیب پہلے کی نسبت کچھ پھولی ہوئی نظر آئی۔ یہ میرا شک اور وہم بھی ہو سکتا تھا۔

پولیس کے جانے سے پہلے ہی کاجل اور اکرام شیخ پہنچ گئے۔ کاجل نے خوب اداکاری کی "ارے شجاعت۔ یہ کیا چکر ہے۔"

میں نے کہا "اب کوئی چکر نہیں۔ تمہارے بھیا ایس پی صاحب نے فون کر دیا تھا۔"

"اف۔ میں تو پریشان ہو گئی تھی۔ میں نے اسلام آباد فون کر کے ڈیڈی کو جگا دیا۔ وہ کہنے لگے کہ میں ابھی بات کرتا ہوں کمشنر سے۔"

سب انسپکٹر نے فوراً مجھ سے ہاتھ ملایا "اچھا سر۔ غلطی معاف مجھے اجازت دیں۔"

دروازہ بند ہوتے ہی شیخ نے مجھے پکڑ لیا "یہ کیا ہے سر۔ آپ کو کھانا ہضم نہیں ہوتا اگر کوئی چکر نہ چلائیں۔"

میں نے کہا "یار خدا نے تقدیر ہی ایسی بنا دی ہے۔ میں کیا گلہ کروں۔ اس میں چکر ہی چکر ہیں۔ اب بتاؤ یہ کوئی موقع تھا ڈسکوی صاحب کے مرنے کا۔ ایسا لگتا ہے کہ بس میرا ہی انتظار کر رہے تھے۔ فرشتۂ اجل دروازے کے باہر کھڑا ہوا تھا کہ میں نکلوں تو وہ اندر جائے۔"

شیخ نے کہا "تمہارے نقش قدم پر ہی کیوں چل رہا تھا موت کا فرشتہ۔"

میں نے کہا "مجھے تو سخت شکایت ہے اس سے۔ چند دن کی مہلت اور مل جاتی تو ڈسکوی صاحب اپنے چوہدری دلاور کی تصویر ولایت لے جاتے۔"

"موت کا ایک دن معین ہے۔" شیخ نے کہا "اب تم یہاں سے نکلو ورنہ کچھ اور ہو جائے گا۔ تصویر تم اس کی بیٹی کو بھی دے سکتے ہو۔"

"مہرالنساء عرف میری کو؟" میں نے کہا "واقعی۔ یہ خیال تو مجھے آیا ہی نہیں تھا۔ ابھی تو میں اسے کچھ نہیں بتاؤں گا۔ یہی کہوں گا کہ مجھے کراچی جانے کا موقع نہیں ملا۔ ایس ایس پی صدیقی کے ساتھ اسلام آباد چلا گیا تھا۔"

"تعزیت اور ہمدردی تو کرو گے اس سے۔ دل ٹوٹ جائے گا بیچاری کا۔" کاجل بولی "اس سے پہلے کہ تم ڈیڈی سے اس کا ہاتھ مانگتے ڈیڈی کا ہاتھ اجل نے تھام لیا۔"

منیجر نے پانچ ہزار میں معاملہ طے کر لیا تھا "پولیس کا کیا کام سر شرفا کے ہوٹل میں۔ بس یہ حیرانی ہے مجھے کہ فون کس نے کیا تھا۔ آپ کو کچھ معلوم ہے مسٹر اے کیو ڈسکوی کے بارے میں۔ کہاں رہتے ہیں۔ لواحقین کہاں ہیں؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا "مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ یہ لندن میں قیام پذیر ہیں اور آج کل فیملی کے ساتھ پاکستان آئے ہوئے تھے۔"

میں بل ادا کر کے نکل رہا تھا جب میں نے منیجر کو کسی سے فون پر باتیں کرتے سنا اور سمجھ گیا کہ وہ کس سے مخاطب ہے۔ میری کو بھی پتا ہو گا۔ کیا تم یہی تصویر اس کی بیٹی کو نہیں دے سکتے۔ یا میری کے ذریعے لندن نہیں بھیج سکتے۔"

میں نے کہا "شیخ۔ میں کاجل کے ساتھ انتظار کروں گا لیکن تو جا کے ذرا دیکھ کہ پیڈرو یہاں کیوں نظر آیا تھا۔"

"او کے۔ میں دیکھ لیتا ہوں۔ لیکن مجھ سے وعدہ کرو کہ واپسی تم مجھے یہیں ملو گے۔ کاجل کو غچا دے کر غائب نہیں ہو جاؤ گے۔"

میں نے کہا "میں قسم کھانے کا قائل نہیں لیکن تم کہو تو......"

"نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔ کاجل۔ گاڑی واپس لے چلو۔"

کاجل نے خفگی سے کہا "آگئے نا تم بھی ان کی باتوں میں۔"

"تم بالکل فکر مت کرو۔ میں کسی چکر میں پڑنے والا نہیں ہوں۔"

کاجل نے گاڑی کو پیلس سینما کی طرف سے موڑا اور میٹروپول کے دوسرے گیٹ سے گھوم کے ہم پھر واپس آگئے۔ دس منٹ اور پھر پندرہ منٹ گزر گئے۔ کاجل مجھ سے بہت کچھ پوچھتی رہی۔ اس کے تمام سوالات کا تعلق مستقبل سے تھا۔ میں کب تک گھر بساؤں گا۔ نازو اب کیا کر رہی ہے۔ غالب اور نازو کب شادی کریں گے۔ وقار کب باپ بنے گا۔ سب کا میں نے ایک ہی جواب دیا "غیب کا حال صرف خدا جانتا ہے۔ میں کوئی دعوے نہیں کر سکتا۔"

"ٹالنا چاہتے ہو مجھے؟ نیر سمجھنے لگے ہو۔"

میں نے کہا "میڈم۔ یہ حقیقت ہے۔ بندہ کچھ نہیں جانتا۔ سامان سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں۔ عین ممکن ہے واپس پہنچتے ہی مجھ پر پاگل پن کا دورہ پڑے اور میں دو گھنٹے میں چار شادیاں کر لوں۔ کم سے کم ایک رابعہ سے ہو گی۔ باقی تین کا بندوبست اللہ کرے گا۔ اسی طرح غالب اور نازو کا پتا نہیں۔ وہ لیلیٰ مجنوں سے زیادہ دردناک عشق کی داستان لکھ جائیں یا شادی کریں ننانوے سال کی عمر کو پہنچ کے۔ یہ بھی ایک ریکارڈ ہو گا۔"

کاجل کا منہ سوج گیا۔ وہ باہر دیکھنے لگی۔

میں نے کہا "اب رہا تمہارے آخری سوال کا جواب تو بی بی یہ ہو سکتا ہے کہ وقار کو پتا ہی نہ چلے اور نکی ماں بن جائے۔ دیکھو نا۔ کہیں کہیں ایسا بھی ہوتا ہے۔ کوئی آ کے کہتا ہے کہ مبارک ہو آپ ایک بیٹی یا بیٹے کے باپ بن گئے۔ تب کہیں بیچارے باپ کو پتا چلتا ہے۔ اور اس سوال کا جواب تو نکی بھی نہیں دے سکتی کہ وہ کب ماں بنے گی۔ کس دن، کہاں اور کتنے بجے۔"

کاجل ہنس پڑی "تم بالکل نہیں بدلے۔"

میں نے کہا "مگر تم بہت بدل گئی ہو۔ بالکل یقین نہیں آتا کہ تم وہی کاجل ہو۔ خدا نظرِ بد سے بچائے۔ بہت ترقی کی ہے تم نے۔ میم صاحب بن گئی ہو بالکل، بس یہ بدقسمتی کہ تمہیں شوہر بھی ملا تو معلوم تھا کہ اس کے ڈیڈی کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ یہ اسی کی کال تھی۔ اب اسے باپ کے انتقال کی خبر سنانا منیجر کا کام تھا۔ میں نے قدم کچھ تیز کئے اور باہر کھڑی ہوئی کار میں جا بیٹھا۔

کاجل نے ڈرائیونگ سنبھالی۔ شیخ میرے ساتھ پیچھے بیٹھ گیا۔ کار آگے بڑھی اور میں نے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے میٹروپول کے مین گیٹ پر نظر ڈالی۔ رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت۔ لیکن پھر میرا اوپر کا سانس اوپر ہی رہ گیا۔ مین گیٹ سے ایک شخص اندر جا رہا تھا۔ اچانک اس نے بھی پلٹ کے دیکھا اور ایک لمحے کے لئے ہماری نظریں چار ہوئیں۔ میرے ذہن کو زبردست جھٹکا لگا۔ میٹروپول میں داخل ہونے والا بھی اپنی جگہ پر منجمد ہو گیا۔ یہ استاد پیڈرو تھا۔

میں نے کہا "شیخ۔ اُدھر دیکھو۔ وہ کون ہے؟"

اکرام شیخ نے بے اختیار کہا "استاد پیڈرو۔ یہ کیا کر رہا ہے یہاں؟"

میں نے کہا "شاید یہی فرشتۂ اجل ہے۔ یہی میرے پیچھے پیچھے تھا اور یہ جانتا تھا کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں۔ تم مجھے اُتار دو۔"

شیخ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا "شرافت سے بیٹھے رہو شجاعت علی بغدادی اور خدا کا شکر ادا کرو کہ ہم پہلے پہنچ گئے تھے۔"

میں نے کہا "یار شیخ۔ مجھے معلوم تو کر لینا چاہئے کہ اس حرام زادے کو میرے پیچھے لگانے والا کون تھا۔ یہ یہاں پہنچا کیسے اور اس کو کیا معلوم ہے میری اور اے کیو ڈسکوی کی ملاقات کے بارے میں۔"

شیخ نے میری کلائی پر اپنی گرفت زیادہ مضبوط کر لی۔۔ سابق پولیس مین تھا اور اس سے ہاتھ چھڑانا آسان نہیں تھا۔ ہماری گفتگو کی بھنک پڑتے ہی کاجل نے صرف ایک بار پلٹ کے دیکھا تھا اور پھر کار کی رفتار بڑھا دی تھی۔

"اس نے یقیناً اے کیو ڈسکوی سے وہ تصویر حاصل کر لی ہو گی۔ اور شاید یہ بھی پوچھ لیا ہو کہ میں نے اسے تصویر کیوں دی تھی مگر اس سے بھی زیادہ خطرناک بات یہ ہے شیخ کہ پیڈرو نے مجھے اس حلئے میں بھی پہچان لیا تھا۔ یا کسی اور کو معلوم ہے کہ فرنچ وکیل کے بھیس میں سکندر بجنت ہے۔ کوئی لاہور میں میری نقل و حرکت کی نگرانی کر رہا تھا اور اس گفتگو کا ہر لفظ سن رہا تھا جو میں نے یہاں آنے سے پہلے محسن یا وقار سے کی۔ یا ہم سب نے آپس میں کی۔" میں نے کہا۔

"آپ گدھے ہیں۔" شیخ نے کہا "پیڈرو کا نظر آنا ایک اتفاق بھی تو ہو سکتا ہے۔ تم نے آخری بار اسے کب دیکھا تھا اور کہاں؟"

میں نے تسلیم کیا "دیکھا تو مدت سے نہیں اور یہ بھی پتا نہیں کہ اتنا عرصہ وہ کہاں غائب رہا۔"

"وہ ہو گا کراچی میں۔ چوہدری دلاور کی ایک تصویر حاصل کرنے کے لئے اسے قتل کرنا ضروری نہیں تھا۔ اور اس سے فائدہ

اکرام شیخ جیسا پولیس والا۔ محبت بھی کرتا ہوگا تو رشوت پہلے مانگتا ہوگا۔ لو وہ آگیا۔"

اکرام شیخ میرے ساتھ آبیٹھا۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور کابس کو اشارہ کیا کہ گاڑی چلائے "اچھا ہوا جو ہم نے تصدیق کرلی ورنہ وہم میں مبتلا ہو کے آپ خودکشی فرمالیتے۔ سامنے جاکے کہتے کہ آ بیل مجھے مار اور مارے جاتے۔"

میں نے کہا "ذرا اس کا مطلب سلیس اردو میں بتایئے۔"

"پیڈرو کا کوئی پارٹنر ہے یہاں۔ ایس کے قاسم اینڈ سنز۔ وہ کچھ امپورٹ ایکسپورٹ کا دھندا کرتے ہیں۔"

"یعنی اسمگلر ہیں۔"

"ہوں گے۔ ہمیں کیا۔ استاد پیڈرو بھی قاسم اینڈ سنز کا پارٹنر ہے اور صبح نو بجے سے شام پانچ بجے تک اسی آفس میں بیٹھتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ چوہدری دلاور اینڈ کمپنی سے الگ ہوچکا ہے۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ تائب ہوگیا ہے۔ اس نے اپنے ماضی کو پیچھے چھوڑ دیا ہے اور ظاہر ہے ایسا تمہارے ڈر سے کیا ہے یا دلاور سے جان چھڑانے کے لئے۔"

میں نے سوچ کے کہا "دلاور سے تو جان چھوٹ جائے گی اس کی۔ لیکن میرا حساب بے باق کئے بغیر وہ اپنے ماضی سے کیسے دامن چھڑا سکتا ہے۔ کیا اس نے مجھے دیکھا تھا۔"

"ایسے ہی دیکھا ہوگا جیسے ہوٹل کے دروازے سے اندر جاتے ہوئے بہت سے لوگوں کو دیکھا ہوگا یا سامنے سے گزرنے والی کاروں میں بہت سے چہرے دیکھے ہوں گے۔ اس نے تمہیں پہچانا نہیں۔ پہچان بھی کیسے سکتا تھا جب کاجل تمہیں اپنے سامنے دیکھ کے ڈر گئی تھی۔"

میں نے کہا "چلو یہ بھی اچھا ہوا۔ میرا یہاں آنا بے مقصد نہیں رہا۔"

"ہاں۔ ایک کارِ خیر تو یہ کیا کہ میری کے باپ کو ہی راستے سے ہٹادیا۔ ورنہ کیا پتا وہ سچ مچ تمہارا سسر بن جاتا۔ اب میں تمہیں بلیک میل بھی کرسکتا ہوں۔ میری کو بتادوں گا کہ شجاعت علی بغدادی کون تھا۔ اگر......"

"اگر کیا۔ اپنا مطالبہ پیش کرو۔"

"اگر تم نے کاجل سے این او سی حاصل کئے بغیر واپسی کا قصد کیا۔"

"نامنظور" میں نے کہا "مجھے جیل جانا منظور ہے۔ چلو تھانے۔"

کاجل ہنسنے لگی "باقی مطالبات تو سُنے ہی نہیں تم نے۔"

وہ سارا دن بڑا اچھا گزرا۔ کاجل اور شیخ مجھے پتا نہیں کہاں کہاں ساتھ لے کے پھرتے رہے۔ میں نے پوچھا کہ پرنسپل صاحبہ اور ایڈمنسٹریٹر صاحب کے بغیر اسکول کیسے چل رہے ہوں گے تو انہوں نے کہا کہ پڑھانے والے ہیں ٹیچر اور پڑھنے والے ہیں بچے اور انتظامی امور سے نمٹنے کے لئے وائس پرنسپل اور منیجر بھی ہیں۔ میرے اصرار پر انہوں نے مجھے سوسائٹی کے نئے انگلش میڈیم اسکول کا دورہ بھی کرایا۔ اسکول کی عمارت' بچوں کی تعداد اور ڈسپلن دیکھ کے میں حیران رہ گیا۔ وہاں فیس بھی بہت زیادہ تھی اور سارے بچے شہر کے اعلیٰ ترین گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ کاجل کی کامیابی واقعی قابلِ رشک تھی۔ وہ شہر کی اہم شخصیات میں شامل ہونے کی جدوجہد میں کامیابی کی منزل کے بہت قریب تھی۔

شام کو میں نے بہت منت سماجت اور جھوٹے وعدوں کے بعد ان میاں بیوی کی مہمان نوازی سے جان چھڑائی اور وہ مجھے ائرپورٹ چھوڑنے بھی آئے۔ میں نے ٹکٹ خریدا اور انہیں مطلع کیا کہ میری سیٹ بھی کنفرم ہوگئی ہے۔ فلائٹ انفارمیشن بورڈ پر دی جانے والی اطلاع کے مطابق اسلام آباد براستہ لاہور جانے والی فلائٹ تیار تھی اور اسپیکر پر مسافروں سے درخواست کی جارہی تھی کہ وہ بورڈنگ کارڈ حاصل کرلیں۔

بظاہر کاجل اور شیخ کا ارادہ جہاز کی پرواز سے پہلے رخصت ہونے کا نہیں تھا۔ اور میں دل ہی دل میں پریشان تھا کہ جب میرا جھوٹ پکڑا جائے گا تو میں وضاحت کیا کروں گا۔ نہ میری سیٹ کنفرم ہوئی تھی اور نہ مجھے اس فلائٹ سے لاہور جانا تھا۔

عین وقت پر کاجل کو یاد آگیا کہ انہیں ساڑھے سات بجے کہیں پہنچنا تھا اور وہ مجھ سے گلے مل کے رخصت ہوگئے تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ جب ان کی گاڑی نظر سے اوجھل ہوگئی تو میں باہر کھڑی ہوئی ایک ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ یہ شہر میرے لئے اجنبی تھا اور میں یہ نہیں جانتا تھا کہ یہاں میری مدد کون کرسکتا ہے لیکن ٹیکسی ڈرائیور نے پلٹ کے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا تو میں نے اچانک کہہ دیا "ٹی وی اسٹیشن۔"

ٹی وی اسٹیشن کے گیٹ سے استقبالیہ تک پہنچتے ہوئے میں طے کرچکا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ ٹی وی اسٹیشن کے اندر داخل ہونے کے لئے کوئی حوالہ یا بہانہ ضروری تھا۔ اچھے خاصے شریف صورت اور معزز لوگ بھی سیکورٹی والوں کے توہین آمیز رویّے سے دل برداشتہ تھے۔

میں نے فرنچ سے آغاز کیا۔ کاؤنٹر پر داخلے کی سلپ بنانے والی اسمارٹ سی لڑکی نے مجھے غور سے دیکھا اور انگریزی میں کہا "پلیز انگلش میں بتایئے۔"

میں نے بے بسی سے سر ہلایا "نو انگلش۔ فرنچ۔"

اب وہاں ایک غیر متوقع اور دلچسپ صورتِ حال پیدا ہوگئی۔ میں کھڑکی سے ہٹنے پر آمادہ نہ تھا اور بہ آوازِ بلند اعلان کررہا تھا کہ کسی فرنچ سمجھنے والے کو بلایا جائے مگر یہ بات بھی کون سمجھتا۔ آخرکار ایک وردی پوش مجھے غیر ملکی سمجھ کے اندر لے گیا۔ مجھے عزت کے ساتھ لاؤنج میں بٹھادیا گیا۔ دس پندرہ منٹ بعد ایک شخص دستیاب ہوا جو واجبی حد تک فرنچ سمجھ سکتا تھا مگر بولنے سے قاصر تھا۔ اس نے اندازہ کرلیا کہ میں کسی ٹی وی میک اپ آرٹسٹ کی تلاش میں تھا جس کا نام میں بھول گیا ہوں جس سے فرانس کی کسی تقریب میں ملاقات ہوئی تھی۔ میں ایک ڈاکومنٹری فلم کی تیاری کے سلسلے میں پاکستان آیا ہوا ہوں۔

اس نے اندر جاکے پروگرام منیجر سے بات کی اور مجھے ایک فرنچ فلم پروڈیوسر کی حیثیت سے اسٹیشن منیجر کے کمرے میں باعزت طور پر لے جایا گیا۔ میں دل ہی دل میں ڈر رہا تھا کہ کہیں کوئی فرنچ کا ماہر پروڈیوسر نہ آجائے جس کے سامنے میری قلعی کھل جائے۔ فلم پروڈکشن اور اس کی ٹیکنک کے بارے میں میری معلومات نہ ہونے کے برابر تھیں لیکن اس آدمی ادھوری فرنچ جاننے والے کے سوا کوئی مترجم دستیاب نہ ہوا۔ بہت معقول خاطرمدارات کے بعد میک اپ کے شعبے سے تعلق رکھنے والی ایک خاتون کو مجھ سے ملوایا گیا۔

پروگرام منیجر نے کہا "بھئی یہ فرانس سے آیا ہے کوئی فلم بنانے کے چکر میں۔ میک اپ کرانا چاہتا ہے غالباً۔ نہ انگریزی سمجھتا ہے اور نہ اردو۔"

میں نے مترجم کے ذریعے اپنی بات کہی "میرا کام زیادہ لمبا نہیں ہے ایک گھنٹے میں فارغ کردوں گا۔ معاوضہ بہت اچھا دوں گا۔"

مترجم نے جو بات اردو میں کہی وہ ذو معنی ہوگئی تھی اور اس کا دوسرا مطلب انتہائی غلط نکلتا تھا۔ خفت اور شرم سے اس کا چہرہ سرخ پڑگیا۔ اس نے صاف انکار کردیا۔ مجھے درمیانی شخص پر سخت غصہ آیا مگر میں نے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں دس ہزار تک دے سکتا تھا۔" میں نے گویا ترپ کا پتا پھینکا اور انتظار کیا کہ شاید جواب مثبت ہوجائے مگر وہاں موجود لوگوں کی نظریں اس عورت پر یوں پڑ رہی تھیں جیسے میں دس ہزار میں ایک رات کے لئے اسے اپنے ہوٹل کے کمرے میں لے جانے والا خریدار تھا۔ کام ایک گھنٹے کا ہو یا ایک رات کا۔ وہ عورت طوائف نہیں تھی کہ ہاں کہہ دیتی۔

باہر آکے میں نے اسے فون کیا۔ آپریٹر کے ذریعے مجھے اس سے براہِ راست بات کرنے کا موقع ملا تو میں نے کہا "خاتون۔ آپ سے ابھی میرے ایک دوست نے ملاقات کی تھی۔ وہ فرانس سے یہاں ایک فلم بنانے آئے ہوئے ہیں۔ آپ نے انکار کیوں کردیا؟"

اس نے کہا "دراصل...... مجھے پتا نہیں وہ کیسے آدمی ہیں۔ اور آپ کون ہیں۔ یہ بھی میں نہیں جانتی۔"

میں نے کہا "سارا شہر مجھے جانتا ہے۔ میں نثار مراد ہوں۔ وحید مراد کا باپ لیکن تم کو کسی کے نام سے کیا لینا دینا۔ اس کا کام کردو اور پیسہ لو۔"

"آپ...... والد ہیں وحید مراد کے۔" خوشی سے اس کا بُرا حال ہوگیا "آپ مجھے کیسے جانتے ہیں سر۔"

"کسی نے تمہارے کام کی تعریف کی تھی۔ اور تمہاری بھی۔"

"پھر تو سر میں انکار کرہی نہیں سکتی۔ کہاں ملیں گے وہ اب؟"

"وہ میرے سامنے بیٹھا ہوا ہے سخت مایوس۔ میں اسے پھر بھیج رہا ہوں۔ تمہارا کام کب ختم ہوگا؟"

"ساڑھے آٹھ بجے سر۔"

"نو بجے وہ تمہیں ٹی وی اسٹیشن کے باہر ملے گا۔" میں نے فون بند کردیا۔

جھوٹ بولنا مشکل کام تھا مگر یہ بے ضرر جھوٹ تھا اور ناگزیر تھا۔ ٹھیک نو بجے میں نے اسے ٹی وی اسٹیشن سے باہر آتے دیکھا اور اس سے ہاتھ ملایا۔ اس کا خیال تھا کہ میرے پاس گاڑی ضرور ہوگی مگر میں نے ٹیکسی روک لی اور پھر ہمارے درمیان اشاروں کے علاوہ انگریزی کے ٹوٹے پھوٹے جملوں میں بات ہوئی۔ وہ سمجھ گئی کہ میں اپنا میک اپ کرکے حُلیہ بدلنا چاہتا ہوں لیکن ہوٹل میں جہاں میں مقیم ہوں اس کا میرے ساتھ جانا مناسب نہیں۔ وہ مجھے ایک بیوٹی پارلر لے گئی جہاں وہ پارٹ ٹائم جاب کرتی تھی۔ رقم اس نے مجھ سے پہلے ہی لے لی تھی اور شاید اس میں سے ایک ہزار اس نے پارلر کے مالک کو دیئے۔ ایک گھنٹے بعد میں وہاں سے نکلا تو بدلا ہوا آدمی تھا۔

ایک رات کے لئے میں پھر میٹروپول گیا اور وہاں مرزا سلیم بیگ کے نام سے قیام کیا۔ اپنے کمرے میں پہنچتے ہی میں نے شیخ کو فون کیا۔

"پہنچ گئے خیر سے۔ لوٹ کے بدھو اپنے گھر۔"

میں نے کہا "شیخ جی۔ مجھے صبح تمہاری کار چاہئے۔ ہوٹل میٹروپول کے گیٹ پر۔ ٹھیک دس بجے۔"

وہ چلانے لگا "کیا؟ تم یہیں ہو؟ اُلّو کے پٹھے ہمیں اُلّو بناتے ہو۔"

میں نے کہا "اللہ نے تمہیں جو چاہا بنادیا۔ میں نے تو سیدھا سادہ سوال کیا تھا۔ مجھے ہاں یا نہ میں جواب چاہئے۔"

"لیکن چکر کیا ہے؟"

میں نے کہا "دیکھو یار۔ میں یہاں رینٹ اے کار والوں سے گاڑی خریدنا چاہوں تو مل جائے گی لیکن میں نہیں چاہتا کہ شک پیدا کرنے والی کوئی بھی بات ہو۔"

"سکندر۔ یار کسی مصیبت میں پڑنے سے پہلے مجھے بتادو۔"

میں نے کہا "تمہاری کار کے کاغذات مکمل ہیں نا؟ اس کا ٹرانسفر لیٹر بنادو۔ اوپن لیٹر۔ میں نقد قیمت ادا کردوں گا۔ تم دوسری نئی کار بعد میں خرید لینا۔ مجھے کل بائی روڈ لاہور جانا ہے۔ ایک لڑکی کے ساتھ۔"

"بکواس کرنے کی ضرورت نہیں۔" شیخ نے کہا "کون ہے وہ لڑکی؟"

میں نے کہا "میرے جہاز میں قدم رنجہ فرمانے تک وہ

ائرہوسٹس تھی۔ پھر اچانک بقول شاعر۔ نین سے نین ہوئے چار۔ کیوپڈ نے تیر چلایا اور بس۔ پہلی نظر میں پیار ہوگیا۔ اس نے نوکری چھوڑی اور میں نے رابعہ کو چھوڑا۔ عشق ایسی ہی خانہ خراب چیز ہے شیخ صاحب۔ اب ہم شادی کرکے ہنی مون کے لئے جارہے ہیں ٹنڈو آدم۔"

شیخ نے مجھے ایک سو ایک گالیاں دینی شروع کی ہی تھیں کہ میں نے قہقہہ مارا اور فون بند کردیا۔ رات میں بڑے سکون سے سویا۔

صبح ٹھیک پونے دس بجے میں نے قاسم اینڈ سنز کے آفس میں قدم رکھا۔ شیشے کی دیوار والے ایک کیبن کے پیچھے مجھے استاد پیڈرو کا خبیث چہرہ نظر آرہا تھا۔ اس نے کھڑے ہوکے میرا استقبال کیا۔ لوڈڈ ریوالور اس کے ہاتھ میں تھا۔

اگر اس وقت میں معمولی سے خوف اور تذبذب کا مظاہرہ کرتا یا ایک خطرناک دشمن کے ریوالور کا رُخ اپنی طرف پاکے وہشت زدہ ہوجاتا... جان بچانے کے لئے چھپنے یا فرار ہونے کی کوشش کرتا یا جان کی بازی لگاتے ہوئے پیڈرو سے ریوالور چھیننے کی کوشش کرتا تو یہ میری فاش غلطی ہوتی۔

کوئی عام آدمی قاسم اینڈ سنز کے آفس میں صرف کاروباری معاملے کی بات کرنے ہی جائے گا۔ اس کے ذہن کے کسی گوشے میں یہ خیال نہیں ہوگا کہ اندر قدم رنجہ فرماتے ہی اس کا استقبال فرشتۂ اجل کرے گا اور آفس میں داخل ہوتے ہی اسے گولی ماردی جائے گی۔ اگر وہ کسی کے ہاتھ میں ریوالور دیکھے گا تو یہی سمجھے گا کہ ریوالور رکھنا بھی ہر کاروباری ادارے میں حفاظتی انتظامات کی ضرورت ہے۔

میں بھی چونک کے سنبھل گیا اور پھر مسکراتے ہوئے آگے بڑھا "میرا خیال ہے کہ میں نے اسلحے کی کسی دکان میں آنے کی غلطی نہیں کی ہے۔ یہ ایس کے قاسم اینڈ سنز کا آفس ہے؟"

پیڈرو بھی اخلاقاً مسکرایا "اگر آپ کی ضرورت اسلحہ ہے تو پھر آپ نے کوئی غلطی نہیں کی۔"

"میرا نام سلیم بیگ ہے۔" میں نے ہاتھ بڑھا کر اس شخص سے مصافحہ کیا جس کے ہاتھ میرے باپ کے خون سے رنگے ہوئے تھے۔

پیڈرو نے ریوالور اپنی دراز میں رکھ لیا "فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں۔"

میں نے اِدھر اُدھر دیکھ کے کہا "کیا واقعی۔ آپ اسلحہ بھی فروخت کرتے ہیں؟"

پیڈرو ہنسا "میں نے مذاق کیا تھا۔ دراصل یہ ہی ہمارا بزنس موٹو ہے کہ "ہم سب کچھ لاسکتے ہیں اور لے جاسکتے ہیں۔ ہر جگہ ہر وقت۔"

"اور سب کچھ میں تو اسلحہ بھی آجاتا ہے۔ میں سمجھ گیا لیکن پھر بھی آپ کا دعویٰ بہت بڑا ہے۔ حد درجہ مبالغہ آمیز۔ کاروباری آدمی کو حقیقت پسندی سے کام لینا چاہئے۔"

اس نے مجھے غور سے دیکھا "آپ آزما کے دیکھ لیں۔ ہم ہمالیہ کی برف سے افریقہ کے گینڈے تک... سب کچھ لاسکتے ہیں۔"

"اور یہاں سے کیا لے جاسکتے ہیں؟" میں نے کہا "بحری جہاز کوہ ہمالیہ پر اور مینار پاکستان کو زمبابوے؟"

اس کے چہرے پر ناگواری کے اثرات نمایاں ہوگئے "مسٹر سلیم بیگ ہم صرف ہوش مند انسانوں سے ڈیل کرتے ہیں۔"

میں نے ایک مضبوط قہقہہ بلند کیا "اور آپ کا خیال ہے، میں نشے میں ہوں یا پھر... پاگل ہوں۔"

پیڈرو سنجیدہ رہا "ابھی تک آپ کے آنے کا مقصد واضح نہیں ہوا۔"

میں نے میز پر کہنی ٹکا کے کہا "میں کسی ذمے دار شخص سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ رازداری کے ساتھ۔ تم کون ہو؟"

"میں مسٹر قاسم کا بزنس پارٹنر ہوں۔"

"قاسم نے کبھی تمہارا ذکر نہیں کیا۔ خیر... قاسم کہاں ہے؟"

پیڈرو کی نظر مجھ پر جمی رہی "وہ باہر گیا ہوا ہے۔ کاروباری دورے پر۔ تم مجھ سے بات کرسکتے ہو۔"

"مگر میں تو تمہیں جانتا بھی نہیں۔ اور یہ بات....."

"میرا نام شیخ مختار ہے۔" پیڈرو نے کہا "میری حیثیت کسی طرح سے بھی کم نہیں اور جو لوگ قاسم سے ڈیل کرتے ہیں وہ مجھ پر بھی بھروسا کرتے ہیں۔ تم کو بھروسا نہیں ہے مجھ پر تو تمہاری مرضی۔ قاسم شاید دو ہفتے نہ آئے۔"

"دو ہفتے۔" میں نے گویا سخت پریشانی کا اظہار کیا "یہ تو بڑی ہی غلط بات ہے۔ اس نے مجھ سے تذکرہ تک نہیں کیا تھا کہ وہ اتنا عرصہ ملک سے باہر رہے گا۔ اب میں کیا کروں؟"

"تم مجھ سے بات کرسکتے ہو" پیڈرو نے پھر کہا۔

"لیکن وہ بات ایسی ہے....."

"میں ہر طرح کی بات سمجھ لیتا ہوں۔" وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

میں سوچ میں پڑگیا "اگرچہ وہ ایک مذاق تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مذاق نہیں تھا۔"

پیڈرو نے مجھے کنکھیوں سے دیکھا "یعنی وہ اسلحے والی بات؟"

میں نے اسے حیرانی سے دیکھا "ذہین آدمی ہو تم۔ خطرناک حد تک۔"

"تمہیں مجھ سے کوئی خطرہ محسوس نہیں کرنا چاہئے۔"

میں نے کہا "اچھا پھر نکالو دراز سے وہی ریوالور۔ جو تم ابھی دیکھ رہے تھے۔"

میری کامیابی کا بہت کچھ انحصار میری اداکاری پر تھا۔ پیڈرو اس میدان کا پُرانا کھلاڑی تھا اور شاید صورت دیکھ کے یا باتوں

"نہیں۔"

"پہلے کیا خریدا تھا۔ اور کس سے؟"

میں نے کہا "کیا یہ سب بتانا ضروری ہے؟"

"ہاں کسی حوالے کے بغیر ہم کوئی ڈیل نہیں کرتے۔" پیڈرو نے ریوالور اپنے ہاتھ میں ہی رکھا اور اس کا معائنہ کرتا رہا۔

میں نے کہا "خواہ حوالہ غلط ہی کیوں نہ ہو۔ نام تو میں کسی کا بھی لے سکتا ہوں۔"

"تمہیں میرے پاس کس نے بھیجا ہے آخر؟"

میں صرف موقع کے انتظار میں تھا اور پیڈرو نے ابھی تک بہت ہوشیاری کا ثبوت دیا تھا "یہ بھی معلوم ہوجائے گا۔ پہلے یہ تو اندازہ ہوجائے کہ تمہاری پوزیشن کیا ہے۔"

"پوزیشن سے تمہاری مراد کیا ہے؟"

"تم کتنے بڑے دکاندار ہو۔ اور کس حد تک قابلِ اعتبار۔ میرے لئے ٹائم شیڈول کی اہمیت ہے۔ پیسے کی نہیں۔" میں نے بے نیازی سے کہا۔

"ادائیگی کہاں ہوگی؟"

میں نے کہا "پاناما یا برازیل۔"

پیڈرو نے نفی میں سر ہلا دیا "صرف سوئزرلینڈ' جرمن مارک۔"

میں اُٹھ کھڑا ہوا "مجھے دیکھنا پڑے گا۔"

"جرمن مارک کے بجائے ڈالر بھی چلیں گے۔" وہ ریوالور کو چیک کرتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا "پھر ٹھیک ہے میرے ساتھ چلو۔"

"کہاں؟" پیڈرو چونک کر بولا۔

میں نے کہا "ڈیل کو باس فائنل کرے گا۔"

"باس کون ہے؟" اس نے مجھے دکھانے کے لئے ہر چیمبر سے گولی نکال کے دیکھی اور مطمئن انداز میں سرہلایا۔

"باس کا نام کچھ نہیں ہوتا۔ وہ صرف باس ہوتا ہے۔"

اس نے مجھ سے اتفاق کیا "لیکن میں آفس چھوڑ کے کہیں نہیں جاسکتا۔ تمہارا باس یہاں آتے ہوئے ڈرتا کیوں ہے۔"

میں ہنسا "ڈرنے والے کبھی باس نہیں ہوتے۔ لیکن ہر ڈیل آفس میں فائنل نہیں کی جاسکتی۔ تمہیں بھی محتاط رہنا چاہئے۔"

ظاہری بے نیازی اور اعتماد کے مظاہرے کے... باوجود پیڈرو دل ہی دل میں میری حیثیت کا اندازہ کرنے میں مصروف تھا اور نفع نقصان سے زیادہ اس معاملے میں رسک کے امکانات پر غور کررہا تھا۔ وہ بھی سمجھتا تو ہوگا کہ ناجائز اسلحے کی کھیپ کے سودے کسی آفس میں بیٹھ کے یوں نہیں کئے جاسکتے جیسے آلو پیاز کی سپلائی کے ٹھیکے دیئے جاتے ہیں۔

"تمہارے باس سے ملنے کے لئے مجھے کہاں جانا ہوگا؟" پیڈرو نے ریوالور کو جیب میں رکھ لیا۔

سے اندازہ کرسکتا تھا کہ کون اسلحے کا اصلی خریدار ہے اور کون باتوں باتوں میں ان سے کاروبار کا بھید لینا چاہتا ہے۔ عام آدمی لائسنس کے تحت ایک ریوالور یا شکاری بندوق خریدنے کے لئے ان کے پاس نہیں آتا۔ لائسنس کے بغیر بھی ذاتی استعمال کا اسلحہ خریدنے والے صوبہ سرحد کے قبائلی علاقوں کا رُخ کرتے ہیں جہاں سے ایران اور افغانستان کے راستے پہنچنے والا غیر ملکی اسلحہ بھی دستیاب ہوتا ہے۔

استاد پیڈرو نے چوہدری دلاور کے ساتھ جو کاروبار کیا تھا وہ ایک طرح سے ہول سیل بزنس تھا۔ ساری دنیا میں ایسے بہت سے افراد اور گروہ ہیں جو دنیا کے کسی بھی ملک کا بنا ہوا جدید ترین اسلحہ کسی بھی مقدار میں ہر جگہ فراہم کرسکتے ہیں۔ ان کے ایجنٹ ہر ملک میں موجود رہتے ہیں لیکن کبھی خود کو ظاہر نہیں کرتے اور نہ کسی سے براہِ راست رابطہ رکھتے ہیں۔ وہ پُرامن اور بے ضرر شہریوں کی طرح پردہ داری کے لئے کوئی عام قسم کا کاروبار کرتے نظر آتے ہیں لیکن ان کی نظر ملک کے حالات پر رہتی ہے جہاں بھی علیٰحدگی پسندی کے عوامل ہوں۔ لاقانونیت ہو یا خانہ جنگی کے امکانات محسوس ہوں وہاں وہ فعال ہوجاتے ہیں۔ دشمن ممالک کی سیکرٹ سروس کے اشارے پر وہ باغیوں یا نام نہاد آزادی کے متوالوں سمیت تخریب کاروں تک کے کام آتے ہیں اور اگر کوئی سُپرپاور چاہے تو حکومت کا تختہ اُلٹنے والوں کی مدد بھی کرتے ہیں۔ روایتی اسلحہ بنانے والے مغربی ممالک انہیں اپنے سیلزمین کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ وہ ایک طرف سے بھاری کمیشن لیتے ہیں اور دوسری طرف سے منہ مانگی قیمت۔ ہر ملک کے بدعنوان اور زرپرست سرکاری حکّام انہیں پروانۂ راہداری ہی نہیں تحفظ بھی فراہم کرتے ہیں اور ان کا راستہ کوئی نہیں روک سکتا۔

پیڈرو نے چوہدری دلاور کے دستِ راست کی حیثیت سے جو اسلحہ مشرقی پاکستان کے باغیوں کو فراہم کیا تھا وہ بھی دنیا کے دور دراز علاقوں کا سفر کرکے یہاں پہنچا تھا۔ یہ بات میں نہیں جانتا تھا مگر استاد پیڈرو کو یقیناً معلوم تھی کہ اس طویل راستے میں رکاوٹ کہاں کہاں ہے اور ان رکاوٹوں کو دور کرنے والے کون ہیں؟ کیسا اسلحہ کہاں سے ملتا ہے اور کس کس ملک سے ہوکے کہاں پہنچایا جاسکتا ہے۔ اس پورے نیٹ ورک میں دوست اور دشمن کو پہچاننا بھی اتنا ہی ضروری تھا جتنا کہ اصل خریدار کو پرکھنا۔

استاد پیڈرو کچھ دیر میری صورت دیکھتا رہا اور میں کامل اعتماد کے ساتھ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مسکراتا رہا۔ میرا حُلیہ ایسا تھا کہ وہ مجھے ہرگز نہیں پہچان سکتا تھا اور کچھ بھی سمجھ سکتا تھا۔

آخر کار اس نے دراز میں سے ریوالور نکالا "یہ بہت مہنگا ریوالور ہے۔"

میں نے کہا "سستی چیز کیا ہے؟ آدمی کی زندگی۔"

"یہ تمہارا پہلا سودا ہوگا؟"

"چند قدم۔ سڑک کے اُس پار۔" میں نے کہا "ایک کار تک۔"

پیڈرو نے پھر میری صورت کو غور سے دیکھا کہ میں کس حد تک سنجیدہ ہوں اور پھر کھڑکی کا پردہ ہٹا کے باہر جھانکا لیکن سڑک کے دوسرے کنارے پر درجنوں کاریں صف بستہ تھیں پھر اس نے یہ سمجھتے ہوئے کہ ایک مصروف ترین شاہراہ پر اس کے لئے کسی سے بات کرنے میں خطرے کی کوئی بات نہیں۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ریوالور کو اس نے پھر جیب میں رکھ لیا تھا۔

"چلو مسٹر سلیم بیگ۔ تمہارے باس کو بھی دیکھ لیتے ہیں۔" اس نے یوں کہا جیسے میرا چیلنج قبول کرلیا ہو۔

"اٹ از اے بگ ڈیل مسٹر مختار شیخ۔" میں نے کہا۔

آفس کے نصف حصے میں دو کیبن تھے۔ ایک میں پیڈرو کا آفس تھا لیکن اس کے باہر نام کی کوئی تختی نہیں تھی۔ دوسرا کیبن یقیناً ایس کے قاسم کا ہی ہوگا بقیہ نصف حصے میں چار میزوں پر تین کلرک اور ایک سپروائزر قسم کا شخص کام میں مصروف تھا۔ اس کے عین پیچھے ریک میں فائلیں بڑی ترتیب سے ترچھی کھڑی ہوئی تھیں۔ سانولی رنگت اور کٹے ہوئے بالوں والی ایک عورت ٹائپ رائٹر پر بڑی تیزی سے انگلیاں چلا رہی تھی۔ اس کی عمر کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ جسمانی ساخت سے اس کی طبعی عمر تیس سال تھی تو تجربات کے پیمانے سے چالیس بھی ہوسکتی تھی مگر میک اپ سے وہ خود کو بیس برس کا دکھانا چاہتی تھی۔ اس کا گداز بدن مائل بہ فربہی تھا اور جامے سے باہر ہوا جارہا تھا۔ اس نے مجھے قطعی لفٹ نہیں دی اور اپنے کام میں مصروف رہی۔

سپروائزر ٹائپ خشک مزاج اور گنجے شخص نے نوکیلی ناک پر رکھی ہوئی عینک کے اوپر سے مجھے دیکھا "ایک فائل پر سائن کرنے کو ہے سر۔"

پیڈرو نے سرہلایا "میں کہیں دور نہیں جارہا ہوں۔ فائل میز پر رکھ دو۔"

وہ مطمئن تھا۔ میں بھی مطمئن تھا۔ شک اس کے دل میں ہوتا تو وہ میرے ساتھ ہرگز نہ جاتا اور مجھے اس کی نیت پر ذرا بھی شک ہوتا تو میں اسے اتنی مہلت نہ دیتا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ مسلح ہے اور ایک جینوئن گاہک سے ڈرنے کی کوئی وجہ بھی نہیں تھی۔ جینوئن گاہک اگر کاروباری معاملہ کرنے آئے تو آفس میں اس کی تلاشی بھی کوئی نہیں لیتا خواہ وہ ہاضمے کی گولیاں خریدنے آیا ہو یا مشین گن کی۔ میں بھی جلدی میں کام خراب کرنا نہیں چاہتا تھا۔

میں نے شیخ کو دس بجے کا وقت دیا تھا اور اب سوا دس ہوچکے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ سابق سب انسپکٹر سید اکرام شیخ جسے ہم سب مذاق میں ڈبل ایس آئی شیخ کہتے تھے تن آسانی اور بے فکری کی زندگی کا عادی ہوجانے کے باوجود وقت کی پابندی کرنا نہیں بھولا ہوگا۔ آدمی کی عادت بدل سکتی ہے فطرت نہیں۔ اکرام شیخ کو میری فطرت کا بھی علم تھا اور میری ضرورت کا بھی۔ میں نے اسے کچھ نہیں بتایا تھا مگر اس نے سمجھ لیا ہوگا کہ میرا بھیس بدل کے کراچی آنا خالی از علت نہیں ہوسکتا۔

اکرام شیخ کی گاڑی سندھ کلب کے گیٹ سے ذرا ہٹ کر "ایم پی" ریسٹورنٹ کے عین مقابل موجود تھی۔ سڑک عبور کرتے ہوئے میں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو اکرام شیخ مجھے پچاس گز دور ایک بک شاپ کے سامنے نظر آیا۔ اس نے مجھے دیکھا تو مٹھی بند کر کے انگوٹھا دکھایا جس کا مطلب یہ تھا کہ سب ٹھیک ہے اور میں نے جواب میں دو انگلیوں سے وی کا نشان بنا کے فتح اور کامیابی کا اشارہ دیا۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ بدلے ہوئے حلئے میں اکرام شیخ نے مجھے کیسے پہچان لیا۔ جواب بھی فوراً ہی میری سمجھ میں آگیا۔ پیڈرو کے ساتھ آفس سے برآمد ہوکے کار کی جانب جانے والا میرے سوا اور کون ہوسکتا تھا۔ میرے جوابی اشارے نے اسے مطمئن کردیا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا آگے آیا۔ پیڈرو نے اس اشارے بازی پر غور نہیں کیا تھا۔ اس کی زیادہ توجہ ٹریفک پر تھی جو بہت تیزی سے دونوں طرف سے آرہی تھی۔ خود میں اس رش سے پریشان تھا۔ میٹروپول اور صدر کی جانب سے آنے والی کاروں کا سلسلہ ختم ہونے میں ہی نہیں آتا تھا۔ میں انتظار کرتا رہتا تو شام تک سڑک پار نہ کرپاتا۔ یہاں ون وے ٹریفک تھی چنانچہ دونوں طرف کا ریلا یہاں ایک ہوجاتا تھا۔ کراچی کے رہنے والے اس تیز رفتار ٹریفک سے گزرنے کا فن جانتے تھے۔ کچھ وہ اللہ پر بھروسہ کرتے تھے، کچھ کار ڈرائیور پر کہ وہ خود بریک لگا کے انہیں بچائے گا اور ننانوے فیصد صورتوں میں وہ صاف بچ کے نکل جاتے تھے۔

میں نے کار کا دروازہ کھول کے پیڈرو سے کہا "بیٹھو۔"

پیڈرو نے جھجک کا مظاہرہ کیا "کدھر ہے وہ تمہارا باس؟"

میں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا "پریشان کیوں ہو۔ آجائے گا وہ بھی۔ ایسے وہ گاڑی چھوڑ کے دور تو نہیں جاسکتا۔"

پیڈرو مطمئن ہوگیا "مجھے کیا ضرورت ہے پریشان ہونے کی۔"

"باس بہت زیادہ احتیاط پسند ہے۔"

پیڈرو میرے ساتھ بیٹھ گیا "تم اور تمہارا باس۔ کس کے نمائندے ہو؟ میرا مطلب ہے کس تنظیم کے؟"

میں نے پُرسکون رہتے ہوئے کہا "ایم آر ایس کے۔"

میری آواز پہچان کے اور یہ نام سُن کے پیڈرو یوں اچھلا جیسے اس کی سیٹ کے نیچے اسپارک ہوا ہو۔ اس کا ردِ عمل غیر اختیاری تھا۔ اس کا ایک ہاتھ دروازے کے ہینڈل کی طرف اور دوسرا جیب کی طرف بڑھا مگر میں نے کندھا ملا کے اسے بند دروازے اور اپنے درمیان دبالیا۔

"آرام سے بیٹھے رہو پیڈرو۔ اب کچھ نہیں ہوسکتا۔"

پیڈرو نے زور لگا کے خود کو چھڑانے کی کوشش جاری رکھی۔

بیٹھے تھے۔ تم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ سکندر بخت تمہارے تعاقب میں یہاں بھی پہنچ جائے گا۔ تم نے اپنی دانست میں بڑی عقلمندی کا ثبوت دیا تھا کہ اپنا نام شیخ مختار رکھ لیا تھا مگر مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ شیخ مختار ایک انڈین ایکٹر تھا اور اس فلم کا ہیرو بھی جس کا نام تھا "استاد پیڈرو" فلم کی ہیروئن تھی بیگم پارہ اور یہ فلم میں نے راولپنڈی کے امپیریل سنیما میں دیکھی تھی۔ شیخ مختار بنا تھا استاد پیڈرو اور تم استاد پیڈرو سے بن گئے شیخ مختار۔ کیا بات ہے!"

کراچی کے چند راستے میرے دیکھے بھالے تھے۔ ڈرگ روڈ کے علاوہ میں بندر روڈ، صدر بازار کی وکٹوریہ روڈ اور ایلفنسٹن اسٹریٹ سے واقف تھا۔ اکرام شیخ نے گفتگو کی نوعیت کو سمجھتے ہوئے کسی رہائشی علاقے کی سڑکوں کو ترجیح دی تھی۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ سوسائٹی کا علاقہ تھا۔ بڑی بڑی عالی شان کوٹھیوں کے درمیان پھیلی ہوئی سڑکوں کا سلسلہ کسی جال کی طرح تھا۔ کہیں تنگ اور کہیں کشادہ، خاصی خستہ حال اور ویران سڑکوں پر اِکّا دُکّا گاڑیوں کے سوا کوئی ٹریفک نہیں تھی۔

ابھی تک اکرام شیخ نے پیڈرو کو اپنا چہرہ دکھانے سے گریز کیا تھا اور گفتگو میں بھی دخل نہیں دیا تھا۔ یہ بھی دور اندیشی کی بات تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کراچی میں دوبارہ استاد پیڈرو سے آمنا سامنا بھی ہو تو اس کے لئے بلاوجہ پریشانی کے اسباب پیدا ہوں۔ وہ اور کاجل بڑے سکون سے زیادہ خوش حال اور بہتر مستقبل کی راہ پر گامزن تھے اور ابھی زیادہ مشہور نہیں تھے تو اتنے غیر معروف بھی نہیں رہے تھے۔ یہ ہوسکتا تھا کہ آج وہ دو اسکول چلا رہے ہیں تو کل چار کے مالک ہوں اور ان اسکولوں کے کسی فنکشن کی تصویر شائع ہو تو پیڈرو کی نظر اسے شناخت کرلے۔

اکرام شیخ کو میں نے کچھ نہیں بتایا تھا کہ میرا پروگرام کیا ہوگا۔ اس نے ایسا ہی کیا تھا جیسا میں نے چاہا تھا۔ مجھے منع کرنا اس کا فرض تھا کہ میں کسی مصیبت میں نہ پڑوں مگر مصیبت میں ساتھ نہ دینا بھی اس کے نزدیک دوستی کی رسوائی کے مترادف ہوتا چنانچہ وہ خاموشی سے ساتھ نبھا رہا تھا۔

پیڈرو نے سمجھ لیا تھا کہ مزاحمت بے کار ہے اور مقابلہ بے سود۔ اگر وہ مسلح ہوتا تب بھی شاید ہار اسی کا مقدر ہوتی۔ خالی ہاتھ تو اس جیسے چار بھی میرے مقابل نہیں ٹھہر سکتے تھے۔ اس نے خود کو سنبھال لیا اور کچھ پُراعتماد نظر آنے لگا۔ وہ بزدل یا بے وقوف آدمی بہرحال نہیں تھا اور زندگی اس کی بھی خطرات سے کھیلتے ہی گزری تھی۔

اس نے اپنا ہاتھ جیب کی طرف بڑھایا "مجھے رومال چاہئے۔ ناک صاف کرنے کے لئے۔"

میں نے کہا "ناک میں صاف کروں؟ چاقو ہے میرے پاس۔"

"مجھے جانے دو سکندر بخت۔"

"ورنہ؟" میں نے سوال کیا "تم کیا کروگے؟ شور مچاؤ گے، قانون کو مدد کے لئے آواز دوگے یا مجھے گولی ماردوگے؟"

پیڈرو چلّانے لگا "تم مجھے اغوا کرکے کہاں لے جارہے ہو۔"

میں نے کہا "تمہارے سسرال۔ اب یہ تمہاری مرضی ہے کہ تم وہاں صحیح سالم پہنچنا چاہتے ہو یا ٹوٹے ہوئے؟"

اکرام شیخ تیزی سے آگے آیا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ یہ میں نے بھی نہیں دیکھا تھا کہ چابی پہلے سے اگنیشن سوئچ میں موجود تھی۔ اکرام شیخ نے عقلمندی سے کام لیا تھا۔ اس نے گاڑی میرے لئے چھوڑدی تھی کہ جہاں چاہوں لے جاؤں مگر اس نے مجھے پچھلی سیٹ پر پیڈرو کے ساتھ بیٹھتے دیکھا تو فوراً میری مدد کے لئے پہنچ گیا۔

پیڈرو نے آخری کوشش کی اور مجھ سے گتھم گتھا ہوگیا مگر میں نے کہنی اس کے سینے پر ماری تو اس کا منہ کھل گیا اور سانس رک گیا۔

"تم اچھی طرح جانتے ہو مجھے پیڈرو۔" میں نے اس کی ناک پر اور پھر پریشانی پر کہنی ماری۔

پیڈرو کی ناک سے خون ٹپکنے لگا۔ وہ کراہ کے پیچھے گرگیا۔ وہ میرے دائیں جانب تھا اور اکرام شیخ کے عین پیچھے۔ گاڑی اس وقت تک ڈرگ روڈ پر گورا قبرستان کی طرف آدھا فاصلہ طے کرچکی تھی۔

"سکندر۔ تم میری بات سُنو؟" پیڈرو نے بڑی مشکل سے کہا۔

"اور کیا میں تمہاری بہن کا رشتہ مانگنے آیا ہوں یہاں۔" میں نے اس کی جیب میں ہاتھ ڈال کے ریوالور نکال لیا "میں تمہاری سب باتیں سنوں گا، بہت سی باتیں ہیں جو تم نے آج تک مجھے نہیں بتائیں۔ کبھی تم مصروف تھے یا میں مفرور تھا۔ کبھی معاملہ اس کے برعکس تھا۔ اگر ہم ملے بھی تو کام کی بات نہیں ہوئی۔ تم نے مجھے فضول باتوں میں اُلجھا کے بڑی ہوشیاری سے وقت کو ٹال دیا اور مجھے وہ بات نہیں بتائی جو میں جاننا چاہتا تھا۔ دراصل ہر کام اور ہر بات کے لئے مناسب موقع اور وقت کا انتظار کرنا ہی پڑتا ہے۔ تم غور کرو میری بات پر۔ کیا آج صبح تمہارے ذہن میں سکندر بخت کا خیال بھی آیا تھا۔ تم نے سوچا تھا کہ ہماری یوں ملاقات ہوگی؟ تمہارے لئے آج کا دن بالکل اس طرح شروع ہوا تھا جیسے گزرا ہوا دن۔ تم نے سب کچھ معمول کے مطابق کیا ہوگا اور یہ فرض کررکھا ہوگا کہ باقی دن بھی معمول کے مطابق کاروباری امور نمٹاتے گزر جائے گا۔ پونے دس بجے میں نے تمہارے آفس میں قدم رکھا تھا۔ اس وقت بھی تمہارے فرشتوں کو خبر نہ تھی کہ شامت اعمال کس کو تمہارے مقابل لے آئی ہے۔ تم کیسے اندازہ کرسکتے تھے کہ اس حلئے میں اچانک سکندر بخت نمودار ہوجائے گا۔ تم تو اس کو بھول چکے تھے۔ تم نے اپنے ماضی سے دامن چھڑالیا تھا۔ تم ایس کے قاسم اینڈ سنز کے آفس میں لاہور سے ایک ہزار میل دور شیخ مختار بنے

"یہ خون جو ناک سے بہہ رہا ہے؟"

میں نے کہا "بہت خون ہے تمہارے جسم میں اور گندا خون ہے شاید خود تمہیں بھی علم نہ ہو کہ یہ کس کا خون ہے۔ چند قطرے بہہ جانے سے تم مر نہیں جاؤ گے۔"

اس نے سر پیچھے نکالیا "تم کیا چاہتے ہو مجھ سے سکندر۔"

"چاہتا تو میں بہت کچھ ہوں اور جب میں سوچتا ہوں کہ تمہاری ذات کی خباثت نے مجھے کیسے کیسے عذاب دیے تھے تو میرا دل چاہتا ہے کہ تم کو طویل ترین اور بدترین عذاب کے ساتھ تڑپا تڑپا کے ہلاک کروں اور تمہاری اذیت کے ہر لمحے کی فلم بناؤں۔ میرے ذہن میں اَن گنت طریقے تھے۔ میں تم کو ہفتوں یا مہینوں ایسے تشدد کا نشانہ بنا سکتا ہوں کہ جینے کی سزا پر مرنے کی خواہش غالب آجائے۔ تم مرنا چاہو مگر مر نہ سکو۔ تم مجھ سے رو کے گڑگڑا کے موت مانگو مگر میں تمہاری رحم کی درخواست کو زیادہ بے رحمی سے مسترد کرتا رہوں۔ لیکن یہ سب میں نہیں کر سکتا۔ فطرت اور مزاج کے اعتبار سے میں کوئی سفّاک درندہ نہیں۔ ایک با اصول' قانون پرست اور مہذب انسان ہوں۔"

"قانون کی نظر میں تم ایک مفرور مجرم ہو اور جتنے جرائم تم سے منسوب ہیں......"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "منسوب ہیں۔ یہ ٹھیک کہا تم نے۔ جرم میں نے کوئی نہیں کیا مگر مجھ سے اتنے جرائم منسوب ہوگئے کہ میں فرار پر مجبور ہوگیا۔ میں نے اپنا حق مانگا یا انصاف تو یہ کوئی جرم نہیں۔ میں نے اپنا دفاع کیا اور میرے قتل کی نیت کرنے والا میرے ہاتھوں مارا گیا تو یہ جرم نہیں۔ اگر میں نے کسی ملک دشمن غدار کو ٹھکانے لگایا تو یہ بھی جرم نہیں۔"

پیڈرو تلخی سے مسکرایا "واقعی۔ بڑے معصوم فرشتے ہو تم۔ لیکن اپنے بارے میں تمہاری رائے کی کیا اہمیت ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ بے گناہ وہ جسے عدالت بے گناہ قرار دے اور مجرم وہ جس کا جرم ثابت کیا جاسکے۔ دنیا میں ایسا ہی ہوتا ہے۔"

"ہاں۔ اسی لئے تو میں نے کبھی تمہیں یا چوہدری دلاور کو قتل نہیں کیا۔ یہ بات نہیں کہ مجھے کسی کا ڈر تھا یا موقع نہیں ملا تھا۔ مواقع بہت ملے اور تمہیں مار کے تمہاری لاشیں غائب کردینا تو بہت ہی آسان تھا۔ ایم آر ایس کا تجربہ اور اس کے وسائل کم نہ تھے مگر میں خود بھی یہی چاہتا تھا کہ اسی دنیا کی عدالت تمہیں مجرم اور مجھے بے گناہ تسلیم کرے۔ تم اپنی ساری دولت اور بدمعاشی کی طاقت استعمال کرو اور نظامِ انصاف کی راہ میں جھوٹ مکروفریب رشوت اور بدعنوانی کی مدد سے جتنے روڑے چاہو اٹکاؤ۔ حالات و واقعات کی شہادت کو مسخ کرو۔ ثبوت اور گواہ باقی نہ رہنے دو۔ دن کو رات اور سیاہ کو سفید ثابت کردینے والے قابل ترین وکیل کرلو۔ مگر میں تمہیں مجرم کی حیثیت سے تختۂ دار تک پہنچا کے دم لوں گا۔ یومِ حشر کی آخری عدالت کی بات چھوڑو۔ اسی دنیا میں ایسا ہوگا۔ قانون اندھا ضرور ہے مگر اس کی آنکھوں پر پٹی نہیں باندھی جاسکتی۔"

"تمہاری زندگی میں شاید وہ دن کبھی نہ آئے۔"

"لیکن تمہاری زندگی میں آئے گا جب تم سورج کو طلوع ہوتا نہ دیکھ سکو گے اور نہ اس اشارے کو جو تمہارے قدموں کے نیچے سے زمین کھینچ لے گا کیونکہ تمہارے چہرے پر سیاہ نقاب ہوگا۔ زندگی کے اس آخری لمحے میں جب تمہارا جسم پھانسی کے تختے سے موت کے اندھے کنوئیں کی جانب سفر کرے گا تمہیں خدا بھی یاد آئے گا اور شاید سکندر بخت کی یہ بات بھی یاد آئے گی لیکن ابھی...... آج میں کیا چاہتا ہوں۔" میں نے ایک گہری سانس لی "اس سوال کا جواب یہ ہے پیڈرو کہ میں تم سے اس جگہ کا پتا معلوم کرنا چاہتا ہوں جہاں تم نے میرے والد وزیر خان کی ہڈیوں کو دفن کیا تھا۔ تم مجھے اس مقام تک لے جاؤ گے جہاں اب وزیر خان کی قبر ہے۔ تم نے ہی وزیر خان کو اس کے اصل مدفن سے بے دخل کیا تھا۔"

پیڈرو نے خشک لبوں پر زبان پھیری "یہ...... یہ تو بہت پُرانی بات ہے۔"

"کتنی پُرانی؟ صدیاں تو نہیں بیت گئی ہیں پیڈرو۔" میں نے کہا۔

"یہ ڈیڑھ سال پہلے کی بات ہے۔"

"ڈیڑھ سال کچھ نہیں ہوتا۔ زمین کا چہرہ اتنی جلدی نہیں بدلتا۔ اس علاقے میں تو سیلاب یا زلزلے تک نہیں آتے۔ انسانی آبادی بھی وہاں سے بہت دور ہے ابھی۔" میں نے کہا۔

"یہ تم کیسے جانتے ہو؟"

"ایک بار تم نے ہی اعتراف کیا تھا کہ تم نے وزیر خان کی لاش کو قبر کھود کے نکالا تھا تو کہاں لے گئے تھے۔" میں نے عیاری سے کہا۔

پیڈرو سوچ میں پڑ گیا "میں نے بتایا تھا تمہیں؟ کہ میں لاش کو اسلام آباد لے گیا تھا۔"

میرا اندھیرے میں چلایا ہوا تیر نشانے پر لگا تھا "ہاں تم نے اسے کہیں نورپان اور سید پور کی پہاڑیوں پر دوبارہ دفن کردیا تھا۔"

پیڈرو نے اقرار میں سرہلایا "لیکن میں نے کوئی نشانی نہیں چھوڑی تھی۔ زمین برابر کردی تھی۔"

"زمین کی نشانیاں مل جائیں گی تمہیں۔" میں نے کہا۔

"وہاں تو بارش بھی بہت ہوتی ہے۔ سردی میں برف بھی پڑجاتی ہے۔ یہ ناممکن ہے۔"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "ناممکن کو ممکن بنانا تمہارا کام ہے۔ جب تم وہاں جاؤ گے تو تمہیں بہت کچھ یاد آجائے گا۔ تمہیں راستہ تو یاد ہوگا۔ اندازے سے تم اس جگہ پہنچ سکتے ہو۔ اگر وہاں پہنچ کے بھی تمہیں کچھ پتا نہ چلا تو باقی کام میرا۔ تم نزدیک ترین مقام کی نشاندہی کرسکتے ہو۔"

"شاید ......" پیڈرو نے کہا "مگر اس کے بعد؟ تم چھوڑ دو گے مجھے یا اسی قبر میں گاڑ دو گے؟"

میں نے مسکرا کے کہا "میں بتا چکا ہوں تاکہ اپنے ہاتھوں سے میرا تم کو قتل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ اس کے علاوہ بہت کچھ تمہارے رویے پر منحصر ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تم مجبور تھے۔ تم نے جو کیا دلاور کے حکم پر کیا۔ ذاتی طور پر تمہاری مجھ سے یا میرے والد وزیر خان سے کوئی عداوت نہیں تھی۔ یہ ہوسکتا ہے کہ تم میرے سامنے اعترافِ جرم کرلو۔ سب کچھ سچ سچ بتادو۔ جو بھی میری عدم موجودگی میں وزیر خان کے ساتھ ہوا تھا۔"

"تحریری طور پر؟" وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

"نہیں صرف میرے سامنے۔"

"تاکہ تم اسے ریکارڈ کرلو۔"

میں نے کہا "یہ میرا وعدہ ہے کہ تمہارے بیان کو ریکارڈ نہیں کیا جائے گا۔ وہ سچ صرف میری ذات تک محدود رہے گا۔ تم جیسے چاہو اپنا اطمینان کرنے کے بعد اکیلے میں مجھے سب بتا سکتے ہو۔ ظاہر ہے اس سچ کی کوئی بھی قانونی حیثیت نہیں ہوتی جس کا نہ گواہ ہو نہ ثبوت۔ لیکن اس کے بعد میں شاید تمہاری مجبوری کو مدِنظر رکھتے ہوئے تم کو تھوڑی بہت رعایت دینے پر غور کروں۔"

"کیا مطلب۔ تم... تم مجھے معاف کردو گے؟"

"ابھی سے میں کوئی وعدہ کیسے کرسکتا ہوں۔" میں نے کہا۔

اکرام شیخ ساری باتیں سن رہا تھا اور گاڑی کو ایک ہی رفتار سے سوسائٹی کی سڑکوں پر چلا رہا تھا۔ اس کا سر اور چہرہ ہیڈ ریسٹ والی سیٹ کے پیچھے نظر نہیں آتے تھے۔ شیخ نے عقب نما آئینے کا زاویہ بھی بدل دیا تھا اور گاڑی کے سائیڈ میں لگے ہوئے شیشوں سے پیچھے کی ٹریفک کو دیکھ رہا تھا۔ جب اس نے ڈرائیور کی جگہ سنبھالی تھی تو پیڈرو اپنی رہائی کی جدوجہد کررہا تھا اور اکرام شیخ نے بیٹھتے ہی گاڑی چلادی تھی لیکن وہ سارا دن مجھے سوسائٹی کی سڑکوں پر سیر کرانے کے لئے نہیں آیا تھا۔ میں نے اسے فارغ کرنے کا فیصلہ کیا۔

پیڈرو خاموش اور متفکر بیٹھا ہوا شاید یہی سوچ رہا تھا کہ کیا آج تقدیر اسے کوئی موقع فراہم کرے گی جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ فرار کی کوشش میں کامیاب ہوجائے۔ بظاہر یہ بہت مشکل تھا اور مایوسی اس کی صورت سے عیاں تھی۔ میں انتہائی مستعد تھا اور اس کی خفیف سی حرکت بھی میری نظر سے پوشیدہ نہ تھی۔ اگر وہ دروازے کا ہینڈل گھما کے چلتی گاڑی سے سڑک پر چھلانگ مارنے کا فیصلہ کرتا تو اس کے ہاتھ کی جنبش ہی مجھے خبردار کردیتی کہ اس کے عزائم کیا ہیں۔ اگر وہ دروازہ کھولنے میں کامیاب ہوجاتا تو باہر کودنے میں ناکام رہتا۔ میں اس کی ٹانگ پکڑ لیتا تو وہ آدھا باہر لٹکا رہ جاتا اور اس کا دھڑ گاڑی کے ساتھ ساتھ سڑک پر رگڑتا اُچھلتا یا اس کا سر پچھلے پہیوں کے نیچے آجاتا۔ بفرضِ محال وہ نکلنے میں کامیاب ہوجاتا تب بھی فرار ہوکے کہاں جاتا۔ ریوالور میرے پاس تھا۔ میں اس کو ویسے ہی تعاقب کرکے پکڑ سکتا تھا یا ٹانگ پر گولی مار کے اسے گرا سکتا تھا۔ ان سنسان سڑکوں پر اس فل آف ایکشن ڈرامے کو دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ یہاں مجمع لگنے کا امکان نہیں تھا۔ اگر اتفاق سے کوئی راہ گیر یہ تماشا دیکھتا تو اپنی جان بچانے کی فکر کرتا۔

مایوسی کی انتہا میں آدمی کچھ بھی کرسکتا ہے۔ پیڈرو نے بھی سمجھ لیا کہ عقل کی بازی گری اور تدبیر کی مشکل کشائی سے جب یہ کچھ نہیں ہوگا تو اس نے تقدیر پر بھروسا کرتے ہوئے ایک جوا کھیلنے کا فیصلہ کیا وہ بیٹھے بیٹھے ایک دم اوپر اچھلا۔ اس کے دونوں ہاتھ ذرا سی دیر کے لئے آزاد ہوگئے۔ اس نے بائیں ہاتھ کا مکاّ بنا کے میرے جبڑے پر مارا اور اسی وقت دائیں ہاتھ سے دروازے کا ہینڈل گھمادیا۔

میرا سر سائیڈ کی کھڑکی سے ٹکرایا اور میں بائیں جانب جھک گیا۔ جھکتے جھکتے ہی میں نے گاڑی کا دروازہ کھلتے اور پیڈرو کو جست لگانے کے لئے لپکتے دیکھا اور میں یوں اس کے پیچھے گیا جیسے ربر کی گیند دیوار سے ٹکرا کے واپس آتی ہے۔ میرا ہاتھ اسے گرفت میں لینے کے لئے بڑھا اور میری انگلیاں اس کی کمر پر پتلون کی بیلٹ میں جم گئیں۔ اس نے اپنا سر آگے بڑھایا تھا۔ سر کے بعد دھڑ گزرتا اور پھر وہ ٹانگوں کے زور پر جمپ لگا کے سڑک پر اتر جاتا مگر میری انگلیوں کی گرفت بہت مضبوط تھی اور میرے ہاتھ نے جھٹکا دے کر اسے پیچھے کھینچا تو اس کا سر دروازے پر لگا اور وہ کمر کے بل پیچھے گرا تو مجھ پر آیا۔

کار کا دروازہ کھلنے کے بعد ایک دھماکے سے خود ہی بند ہوچکا تھا۔ پیڈرو کی کوشش ناکام ہوگئی تھی۔ میرا دایاں ہاتھ اوپر اُٹھا اور ریوالور کی ضرب پیڈرو کی گدی سے ذرا اوپر پڑی۔ پیڈرو اٹھتے اٹھتے پھر گر گیا۔ اب وہ بے ہوش ہوچکا تھا۔

میں نے خود کو اس کے بوجھ سے آزاد کیا اور پیڈرو کو ایک طرف دھکیل کے باہر دیکھا۔ بہت پیچھے ایک سائیکل سوار پاؤں زمین پر ٹکائے ہکا بکا کھڑا ہوا تھا اور بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک موٹر سائیکل والے کو بھی کچھ بتا رہا تھا جو سامنے سے آیا تھا اور ہمارے قریب سے گزرا تھا مگر عملی زندگی میں کوئی ہیرو بننے کی کوشش نہیں کرتا۔ اتنی فرصت اور ہمت کس کے پاس ہے کہ راہ چلتے کہیں ارتکابِ جرم ہوتا دیکھے تو مجرموں کو چیلنج کرے اور مقابلے پر سینہ سپر ہوجائے۔ سب کے لئے اپنے اپنے روزمرہ زندگی کے مسائل زیادہ اہمیت رکھتے ہیں اور ایسے معاملات میں پڑنے کا وقت کسی کے پاس نہیں جن میں تھانے کچہری کے چکر ہوں یا جرائم پیشہ افراد سے دشمنی مول لینی پڑے۔

سائیکل والا اور موٹر سائیکل والا بھی عام لوگ تھے۔ ہیرو

نہیں تھے۔ اگر انہوں نے اسے اغوا کی واردات سمجھا ہوگا تو بڑھتی ہوئی لاقانونیت پر تبصرہ کرکے اپنی اپنی راہ لی ہوگی۔ یہ ایک سنسنی خیز واقعہ تھا جو انہوں نے بعد میں چشم دید گواہ کی حیثیت سے نہ جانے کتنی بار لوگوں کو سنایا ہوگا۔

اکرام شیخ نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی اور پوچھا "سب ٹھیک ہے نا؟"

میں نے سکون کی سانس لے کر کہا "آپ کی دعا ہے۔"

"اب کیا حکم ہے میرے لئے۔ کلفٹن کے ساحل پر چلوں یا نیٹی جیٹی کے پُل پر؟"

"وہ کس لئے؟"

"اس لاش کو پھینکنے کے لئے بحیرہ عرب سے بہتر کوئی جگہ نہیں۔"

میں نے کہا "کون سی لاش۔ پیڈرو زندہ ہے۔"

"چل چھوڑ یار۔ زندہ مُردہ کی تصدیق مت کر۔ جان چھڑا اپنی اس مصیبت سے۔ خیر سے لوٹ کے گھر جا بدھو۔"

میں نے کہا "اسے میں اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔"

اکرام شیخ نے گاڑی روک دی "یار یہ تو نے بلاوجہ کا پنگا لیا۔ تو یہاں کس کام سے آیا تھا اور کیا کرکے جا رہا ہے۔"

"میں نے کچھ نہیں کیا شیخ صاحب۔ میری کے پاپا مسٹر قیوم کو ان کے دل نے بڑے غلط وقت پر دھوکا دیا۔ ان کا ہارٹ فیل میں نے نہیں کرایا تھا۔ پیڈرو سے میں نے نہیں کہا تھا کہ اچانک نظر آجائے۔ یہ قسمت کے کھیل ہیں۔ میری نظر نہ پڑتی اس پر تو میں خاموشی سے لوٹ جاتا لیکن اسے دیکھنے کے بعد نظر چرا کے جانا بھی ممکن نہیں تھا۔"

"تمہاری مرضی بھیا۔ میں کیسے روک سکتا ہوں تمہیں۔ تمہیں تو مشورہ دینے والا بھی الّو کا پٹھا۔"

"تم تو الّو کے پٹھے نہیں ہو۔"

"میں ہوں اور اسی لئے میں کہتا ہوں سکندر کہ اب بھی کچھ نہیں گیا۔ یہ سارے دھندے چھوڑ دو۔ لعنت بھیجو دلاور اینڈ کمپنی پر۔ ختم کرو سارے پرانے جھگڑے۔ دیکھو محسن اور گل نے اپنی زندگی کی راہ متعین کرلی ہے۔ میری اور کاجل کی مثال تمہارے سامنے ہے۔ غالب اور نازو بھی صرف تمہاری وجہ سے رُکے ہوئے ہیں۔"

"میں نے کسی کو مجبور نہیں کیا؟"

"اور مجبوری کیا ہوتی ہے۔" اکرام شیخ نے کہا "اگر تم بھی فیصلہ کرلو رابعہ سے شادی کا۔ دلاور سے کوئی تصفیہ کرلو تو کوئی مسئلہ ہی باقی نہیں رہتا۔ تم بھی پُرسکون اور خوش حال زندگی کا راستہ اختیار کرسکتے ہو۔"

"چھوڑ یار۔ بہت سن چکا ہوں میں ایسی باتیں۔ تیرا کیا خیال ہے کہ میں عقل سے بالکل پیدل ہوں؟ یہ سب مجھے نظر نہیں آتا؟ میں نہیں سمجھ سکتا ان باتوں کو؟ میرا دل نہیں چاہتا؟"

"بُرا مت مان یار۔" شیخ نے کہا "وہی لوگ تجھے مشورہ دیتے ہیں جو تیرے اپنے ہیں۔ غیروں کو کیا پڑی ہے کہ کسی کے لئے پریشان ہوں۔ تو کہہ دے سب سے کہ بھاڑ میں جاؤ۔ میں کسی کی نہیں سنوں گا اور کسی کی نہیں مانوں گا۔ وہی کروں گا جو میرا دل چاہے گا۔ نہ میں کسی کا دوست ہوں نہ کوئی میرا دوست ہے۔"

"اب یہ ناراضگی بلاوجہ ہے کہ نہیں۔" میں نے مسکرا کے کہا۔

"نہیں میں ناراض کیسے ہوسکتا ہوں اور پھر فرق کیا پڑتا ہے کسی کے ناراض ہونے سے۔ یہ تیرے مسائل ہیں۔ میرے نہیں۔"

"یہ بات نازو کا بھائی کہہ رہا ہے؟"

"نازو کا بھائی اب کاجل کا شوہر بھی ہے۔ جس کے بیوی بچے ہوں وہ اپنے مسائل میں اتنا الجھ جاتا ہے کہ دوسروں کے لئے کچھ بھی نہیں کرسکتا۔ وہ بزدل اور خودغرض ہوجاتا ہے۔ مجھے شرم آتی ہے یہ اعتراف کرتے ہوئے مگر حقیقت یہی ہے کہ اب میں تیرا ساتھ نہیں دے سکتا۔ میں وہ پہلے والا اکرام شیخ نہیں ہوں۔ رہن سہن کے ساتھ ہی میری سوچ بھی بدل گئی ہے۔ تن آسانی نے میرے خیالات کا رخ موڑ دیا ہے۔ اب میں صرف پیسہ اور شہرت کمانے کے چکر میں ہوں۔ میں سیاسی معاشی یا معاشرتی مسائل وغیرہ کے بارے میں سوچتا بھی نہیں ہوں۔ گھر۔ بیوی' بچے اور کاروبار۔ یہی محور ہیں میری زندگی کا۔ اس کے بعد دوست آتے ہیں۔"

میں نے کہا "ایسا ہی ہوتا ہے دنیا میں دوست مگر مجھے خوشی ہے کہ تُو نے جھوٹ نہیں بولا۔ منافقت سے کام نہیں لیا۔"

"اس گاڑی کی کوئی بات نہیں تُو لے جا۔"

"میں اس کی قیمت ادا کروں گا۔" میں نے کہا۔

"میں نہیں لوں گا۔"

"پھر میں گاڑی نہیں لے جاؤں گا۔ صاف بات ہے۔ بازار میں گاڑیوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔"

"وہ تیری مرضی لیکن میں اپنی گاڑی تجھے بیچ نہیں سکتا۔ خدا کا شکر ہے کہ مجھے پیسے کی کمی نہیں۔ میں دوسری گاڑی خرید لوں گا لیکن اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کروں گا۔ میں اب کوئی رسک نہیں لوں گا۔ جس سے میری زندگی کا شیرازہ بکھر جائے۔ اسی لئے میں پیڈرو کے سامنے بھی آنا نہیں چاہتا تھا۔"

"پیڈرو نے تجھے نہیں دیکھا۔ فکر مت کر۔" میں نے کہا "اب تُو یہ گاڑی شام تک کے لئے میرے پاس چھوڑ دے۔ شام کو گاڑی تیرے گھر پہنچ جائے گی۔"

"مطلب یہ کہ الوداع۔"

"نہیں شام کو میں خود آؤں گا۔ کاجل سے ملنا بھی ضروری ہے؟

لیکن میں رکوں گا نہیں۔ آج رات ہی واپس لوٹ جاؤں گا۔"

اکرام شیخ کچھ شرمسار تھا مگر میں اس کی مجبوری کو سمجھتا تھا۔ میں نے اسے دوپہر تک اپنے ساتھ رکھا۔ اس نے مجھے ایک رسّی فراہم کی اور پیڈرو کو باندھنے اور بنڈل بنا کے پیچھے ڈکی میں ڈالنے میں میری مدد کی پھر اس نے مجھے ایک ایسی سڑک پر چھوڑا جس پر کاروں کے بہت سے شوروم تھے۔ وہ خود ٹیکسی میں بیٹھ کے رخصت ہوگیا تو میں نے ایک گھنٹے تک پُرانی کاروں میں سے اپنے مطلب کی گاڑی کا انتخاب کیا۔ یہ سفید رنگ کی "واکس ہال" تھی۔ وکٹر سپر ایک سو ایک ماڈل ستر۔ اس کے سابق پارسی مالک نے گاڑی کو ایسے سنبھال کے رکھا تھا کہ یہ ابھی تک نئی نظر آتی تھی۔

سیلزمین خود منیجر اور مالک بھی تھا۔ وہ مہذب آدمی تھا اور مجھ سے اس لئے بھی خوش تھا کہ میں نے اس کے مخلصانہ مشورے کو مسترد نہیں کیا تھا اور قیمت کے معاملے میں بھی زیادہ بحث نہیں کی تھی۔ قیمت اور اس کا کمیشن ادا کرنے کے بعد میں نے کہا کہ وہ گاڑی کی سروس کرادے۔

"میں بائی روڈ یورپ جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔" میں نے کہا "کیا یہ گاڑی دو گھنٹے میں اس قابل ہوجائے گی۔"

"دو گھنٹے میں؟" وہ بوکھلا گیا۔

"ہاں۔ سروس اور ٹیوننگ کے لئے دو گھنٹے بہت ہیں۔ میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ تم اس کے پانچوں ٹائر بدل دو۔ بالکل نئے ڈال دو۔"

"رائٹ سر۔ آپ بالکل مطمئن ہوجائیں۔"

"ایک بات اور۔ گاڑی میرے نام پر ٹرانسفر ہوگی۔ آج۔"

وہ بوکھلا گیا "آج۔ اب تو آفس بند ہونے والا ہے۔"

"ایسے ارجنٹ کام آفس بند ہوجانے کے بعد ہی کئے جاتے ہیں۔ آخر تمہارے بھی تو مراسم ہوں گے۔ تمہارے لئے یہ کام مشکل نہیں ہوسکتا۔ دو چار سو روپے کی کوئی بات نہیں۔"

وہ مسکرانے لگا "یہاں تو سارا کھیل پیسے کا ہے سر۔ آپ آدھی رات کو آفس کھلوا سکتے ہیں۔ ای ٹی او کو گھر سے اٹھا کے لا سکتے ہیں۔ بیوی کے پہلو سے۔"

میں نے کہا "یہاں کی بات نہیں۔ ساری دنیا میں یہی ہو رہا ہے۔"

پہلے میرا خیال تھا کہ رسید پر منظر یا وقار یوسف کا نام لکھوالوں مگر یہ سوچتے ہوئے کہ واپسی کے سفر میں کوئی غیر متوقع حادثہ پیش آگیا تو وہ بلاوجہ مشکل میں پڑیں گے میں نے اپنا نام شجاعت علی بغدادی بتا دیا اور پتا بھی میٹروپول کے ہوٹل کے اسی کمرے کا دیا جس میں پہلی بار قیام کیا تھا۔ اگر کوئی گڑبڑ ہوجاتی تو خاصا کنفیوژن پھیلتا۔ نام پتے کی تصدیق تو ہوجاتی مگر یہ بیان خود شوروم کا مالک دیتا کہ بغدادی صاحب تو بائی روڈ یورپ کے سفر پر روانہ ہوگئے تھے۔

دو گھنٹے میں نے تھوڑی سی تاخیر کے امکان کو مدِّنظر رکھتے ہوئے دیئے تھے ورنہ گاڑی مجھے شام تک درکار تھی۔ میں چاہتا تھا

کہ اس کے کاغذات مکمل ہوں اور اس میں ایک ہزار میل کا سفر آسانی سے کٹ جائے۔ ویسے ایک ہزار میل کچھ بھی نہیں ہوتے اور شہر کے اندر ہی گھر سے آفس آتے جاتے لوگ اس سے زیادہ فاصلہ ہر ماہ طے کرتے ہیں۔ شہر کے مقابلے میں شہر سے باہر کی شاہراہوں پر ڈرائیونگ آسان بھی ہو جاتی ہے اور محفوظ بھی۔ نہ بار بار کلچ دبا کے گیر بدلنا پڑتا ہے اور نہ بریک لگانا پڑتا ہے۔ گاڑی ٹاپ گیر میں خود ہی چلتی جاتی ہے۔

ڈکی کھول کے میں نے پیڈرو کا حال دیکھا۔ وہ ہوش میں آچکا تھا۔ آنکھیں کھول کے اس نے مجھے دیکھا تو مجھے یوں لگا جیسے بے بسی کی خاموش زبان میں وہ اپنے کئے پر ندامت کا اظہار کر رہا ہے اور وعدہ کر رہا ہے کہ اگر اسے رہا کر دیا جائے تو وہ مجھ سے تعاون کرے گا لیکن میں اس کے کسی وعدے پر اعتبار کرنے والا نہیں تھا خواہ وہ اشامپ پیپر پر اپنے دستخط کے ساتھ لکھتا۔

گاڑی کی سیٹ کے پچھلے حصے میں دونوں طرف ہک سے بنے ہوئے تھے اور درمیانی حصے میں پشت کو سہارا دینے والی فولادی پٹیاں تھیں۔ جو ڈکی میں بھی نظر آتی تھیں۔ میں نے پیڈرو کے ہاتھوں کو نائلون کی مضبوط رسّی سے دائیں جانب کے ہک اور فولادی پٹی سے ملا کے باندھا تھا اور اسی طرح پیروں کو بائیں جانب فکس کر دیا تھا۔ وہ اپنے درمیان کے دھڑ کو اوپر نیچے کر سکتا تھا اور اس طرح ہاتھوں پیروں کو سن ہونے سے بھی بچا سکتا تھا اور کمر ہاتھوں یا پیروں کے اکڑ جانے کی اذیت کو چند سیکنڈ کے لئے کم کر سکتا تھا مگر اس کے لئے رہائی ناممکن تھی۔ وہ کمر کو زور زور سے گاڑی کے فرش پر مارتا تو اس سے بھی آواز پیدا نہ ہوتی۔ گاڑی کے فرش پر موٹا قالین تھا اور اس کے نیچے پیٹرول ٹینک تھا جو نٹ بولٹ کے ساتھ ڈکی کے فرش میں نصب تھا۔ یہ نٹ بولٹ اُبھرے ہوئے تھے اور پیڈرو کی کمر کو زخمی کر سکتے تھے۔

اس کا منہ بند کرنے کے لئے میں نے سختی سے چپکنے والا میڈیکل ٹیپ استعمال کیا تھا۔ وہ اپنے سر کو چار چھ انچ اوپر اٹھا سکتا تھا' سر کے بالکل نیچے ایک مڈگارڈ کی نصف گولائی تھی۔ وہ اس پر اپنا سر مارتا تو یقیناً آواز ہوتی مگر ایسا وہ کتنی بار کر سکتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ دو چار مرتبہ۔ پہلے ہی اس کا سر پیچھے کی چوٹ سے درد کر رہا ہو گا' یہ تقریباً ناممکن تھا کہ وہ اتنی زور سے مڈگارڈ کی موٹی چادر پر اپنا سر مارے کہ باہر بھی آواز سنائی دے۔ اوّل تو ٹریفک کے شور میں ایک بار یہ آواز کسی کو بھی متوجہ نہ کرتی اور مسلسل دھما دھم کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔

میں نے احتیاطاً گاڑی ایک سائیڈ اسٹریٹ میں پارک کی تھی جہاں قریب کوئی... دوسری گاڑی نہیں تھی۔ اس گلی میں دونوں طرف پرانے بنگلے تھے اور بنگلوں میں رہنے والوں کی گاڑیاں اندر کھڑی ہوئی تھیں یا پھر اپنے اپنے گیٹ کے سامنے ورنہ اس راستے سے گاڑیوں کا گزر ہی کم تھا۔

ڈکی بند کرتے ہوئے میں نے پیڈرو سے کہا "کمال ہے یار۔ تم ابھی تک موجود ہو۔ میں تو اسی لئے چلا گیا تھا کہ تم موقع سے فائدہ اٹھاؤ گے اور بھاگ جاؤ گے۔ خیر تم نے میرا ساتھ دینے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو تمہاری مرضی۔ بھوک لگی ہے یا پیاس؟"

پیڈرو نے نفی میں سر ہلایا۔

میں نے کہا "بس پھر عیش کرو۔ تمہاری خلوت میں کوئی دخل اندازی نہیں کرے گا۔"

لوٹ کے میں میٹروپول کی طرف آیا تو مجھے پھر ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں میری گاڑی کے قرب و جوار میں کسی دوسری گاڑی کے پارک ہونے کا امکان نہ رہے۔ یہ جگہ مجھے فاطمہ جناح روڈ پر فلیگ اسٹاف ہاؤس کے مقابل نظر آئی۔ مادرِ ملت کی یہ رہائش گاہ کسمپرسی کے باعث ویران پڑی تھی اور ادھر آنے والا کوئی نہ رہا تھا۔ اس سڑک پر ٹریفک کم نہ تھی۔ یہ سڑک کینٹ اسٹیشن کی طرف جاتی تھی اور اس پر دونوں جانب قدیم وضع کی وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی شاندار کوٹھیاں تھیں جن میں سے کچھ سفارت خانوں کی تحویل میں تھیں۔

ایس کے قاسم اینڈ سنز کا آفس اس گیٹ کی طرف تھا جو سندھ کلب کے مقابل پڑتا تھا۔ میں پیلس سینما کی طرف سے پیدل چلتا ہوا دوسرے گیٹ سے اندر گیا۔ مجھے یقین تھا کہ قاسم اینڈ سنز کے دفتر میں مسٹر مختار شیخ کا بے چینی سے انتظار کیا جا رہا ہو گا۔ وہ کہہ کر گیا تھا کہ زیادہ دور نہیں جا رہا ہے۔ کسی فائل پر اس کے دستخط بھی ارجنٹ درکار تھے اور اس نے دو گھنٹے پہلے کہا تھا کہ فائل میرے کمرے میں رکھ دو۔ اس کے دفتر میں کام کرنے والے سب ہی لوگوں نے مجھے دیکھا تھا۔ گنجا سپروائزر اور ٹائپسٹ لڑکی میرا حُلیہ تفصیل سے بیان کر سکتے تھے مگر دو گھنٹے اتنے زیادہ بھی نہیں ہوتے کہ ماتحت عملہ تشویش میں مبتلا ہو کے پولیس سے رجوع کرے۔ باس قسم کے لوگ خود مختار اور مرضی کے مالک ہوتے ہیں کہ کلائنٹس کے ساتھ جب اور جہاں چاہیں جائیں۔ ضروری ہو تو ان کے ساتھ لنچ باہر کریں اور پھر لوٹ کے آفس ہی نہ آئیں۔ کم سے کم چوبیس گھنٹے تک شیخ مختار عرف استاد پیڈرو کی گمشدگی کا خیال کسی کو نہیں آسکتا تھا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کے میں نے روم سروس سے لنچ منگوایا اور یہ کہا کہ میں شام تک چیک آؤٹ کروں گا چنانچہ میرا بل پانچ بجے تیار رکھا جائے پھر میں نے آپریٹر کو وقار یوسف کے گھر کا نمبر دیا۔

حسبِ توقع نگی نے چیخ ماری "حد کر دی آپ نے۔ یہ کیا نام رکھ لیا تھا۔ شجاعت علی بغدادی۔"

"مجھے معلوم تھا۔" میں نے کہا "کہ تمہیں پسند نہیں آئے گا اس لئے میں نے سلیم بیگ رکھ لیا خیر چھوڑو۔ نام میں کیا رکھا ہے۔ تمہارا نام نگی ہو یا وڈی۔ رہو گی تم وہی بدتمیز بدشکل بدبخت بد ردا جو ہمارے وقار یوسف سے چمٹ گئی ہے۔"

وہ ہنسنے لگی "کب آ رہے ہو واپس۔ اور ہاں مُیری کا فون آیا

میں نے کہا "اجی محاورہ کیا۔ بات کا بتنگڑ بن جاتا ہے۔ بگڑی ہوئی تقدیر بن جاتی ہے۔ نہیں بنی تو ہماری تمہاری بات۔ بقول شاعر

ایک بس آپ ہی ہمارے نہ ہوئے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا"

"ایک منٹ ٹھہرو۔ میں اندر والے کمرے سے بات کروں گی۔" رابعہ نے کہا اور تھوڑی دیر بعد بولی "ہاں اب کہو۔"

میں نے آہ بھر کے کہا "بہت کچھ کہہ دیا ہم نے تو۔ تم کم سے کم الفاظ میں ہی کہہ دو کہ سکندر آئی لو یو۔"

وہ ہنسی "ایسی بات تو زیادہ سے زیادہ الفاظ میں کہی جائے پھر بھی کم ہو گی۔ اور کہے بغیر بھی بہت ہے' کہاں سے بول رہے ہو؟"

میں نے کہا "کراچی سے اور کہاں سے۔ اس وقت ہوٹل میٹروپول میں ہوں۔"

مجھے شک تھا کہ رابعہ کے آفس کا فون پولیس آبزرویشن پر ہو گا اور اسی لئے میں نے اپنا نام ہی نہیں پتا ٹھکانا بھی بتا دیا تھا۔ رابعہ بھی سمجھ گئی تھی کہ اس طرح میں اپنے کراچی میں موجود ہونے کا ثبوت فراہم کرنا چاہتا ہوں۔

"کیا؟ تم میٹروپول میں ہو؟" رابعہ نے سخت حیرت کا اظہار کیا۔

"فکر مت کرو۔ تمہارا باپ بھی... میرا مطلب ہے کسی کا باپ بھی مجھے پہچان نہیں سکتا۔"

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ چوہدری دلاور پکڑا گیا؟"

"ہاں مجھے خبر مل گئی تھی۔"

"دلاور کی بیوی نے حبسِ بے جا کی درخواست دائر کی تھی۔ آج پیشی تھی مگر ایڈووکیٹ جنرل نے دو دن کی مہلت مانگ لی۔ پولیس کی طرف سے جوابِ حلفی اب اتوار کے بعد داخل کیا جائے گا۔ دراصل جس ایس ایس پی نے چوہدری دلاور کو پکڑا تھا وہ لاپتا ہے۔"

"کون۔ ایس ایس پی جاوید صدیقی؟"

"ہاں اسلام آباد میں اس کے گھر کو بھی تالا لگا ہوا تھا۔ صرف وہی بتا سکتا تھا کہ چوہدری دلاور کہاں ہے۔"

میں نے ہنس کے کہا "اب تو شاید معاملہ اُلٹا ہو گیا۔ اب چوہدری دلاور ہی بتائیں گے کہ ایس ایس پی کہاں ہے۔"

"جاوید صدیقی کی جگہ دوسرا ایس ایس پی چارج لینے پہنچ گیا ہے۔ ارشد کریم ربانی۔ مگر وہ چارج کس سے لے اور دلاور کو گرفتار کرنے والا تو جاوید صدیقی تھا۔ عدالت صرف اسی کے بیان کو تسلیم کرے گی۔"

"تمہیں دلاور کی بیوی کے بارے میں کچھ معلوم ہے؟"

"وہ روپوش ہے۔ چوہدری دلاور کے شریکِ کار کے ڈر سے۔ تم جانتے ہو گے اسے؟"

"ڈاکٹر شاہ یا رانا شوکت؟"

"میں رانا کی بات کر رہی تھی۔ رانا اس کی جان کا دشمن ہو رہا تھا' تم ملے اس کے پاپا سے۔ پاپا نے فرزندی میں قبول کیا یا نہیں؟"

میں نے اداس اور افسردہ لہجے میں کہا "نہیں۔ ان کے دل کو اتنا شدید صدمہ ہوا کہ وہ فوراً مر گئے۔"

"مذاق مت کرو۔ کیا بات ہوئی ان سے؟"

میں نے کہا "باتیں تو خیر بہت ہوئیں مگر رات کو ان کا ہارٹ فیل ہو گیا۔ مُیری کو شاید اب تک اطلاع مل چکی ہو گی۔ اگر نہیں ملی تو تم جا کے بتا دو۔"

نگی نے کہا "نا بابا۔ میں نہیں پڑتی اس چکر میں۔ تمہارا کیا بھروسا مذاق میں مجھے مروا دو گے۔"

"یار نگی۔ تمہاری جانِ عزیز کی قسم۔ تمہارے اکلوتے سرتاج کی قسم۔ اس کی قسم جس کے مقدر میں تم جیسے فضول ممی پاپا لکھے گئے۔"

"اچھا اچھا۔ میں نے مان لیا مگر میں پھر بھی یہ کام نہیں کروں گی۔ خود پتا چل جائے گا اسے۔ یا تم فون کر کے بتا دو۔ واپس کب آ رہے ہو۔"

"بہت جلد کل یا پرسوں تک۔ ایک بات تو یہ کہ میں آ رہا ہوں بائی روڈ۔ اپنی کار میں۔ اور دوسری یہ کہ تمہارے لئے ایک تحفہ لا رہا ہوں۔"

وہ خوش ہو گئی "سچ! کیا تحفہ ہے؟"

"بہت زبردست۔ مگر بتاؤں گا نہیں۔ سرپرائز میں زیادہ مزہ ہے۔ میں لمبی بات نہیں کر سکتا۔ وہاں کی صورتِ حال بتاؤ مختصر الفاظ میں۔"

"سب ٹھیک ہے۔ ویسے تو... مگر تم رابعہ سے بات کر لو۔"

"کہاں؟ گھر پر یا آفس میں؟"

"آفس بہتر رہے گا۔ وہاں سب مل جائیں گے۔"

"یعنی میری یہ کال ضائع ہوئی۔ خدا حافظ۔"

نگی نے خفگی سے کہا "خدا حافظ۔ مجھے بھی خوشی نہیں ہوئی آپ سے بات کر کے۔"

آفس میں فون کسی کلرک نے اُٹھایا اور رابعہ کو دے دیا "کوئی سلیم بیگ گھوڑے والے ہیں۔" کلرک نے اسے بتایا۔

رابعہ نے محتاط لہجے میں کہا "ہیلو۔"

میں نے آواز بنا کے کہا "بھئی ہم سلیم بیگ ہیں۔ گھوڑے والے۔"

رابعہ نے کہا "معاف کیجئے گا۔ میں نے پہچانا نہیں۔"

"بھئی پہچانو گی کیسے؟" میں نے پوپلی آواز میں کہا "تمہارے دادا کی بارات جس گھوڑے پر گئی تھی وہ ہم لائے تھے پھر تمہارے ابّا اسی گھوڑے پر بیٹھے تھے۔ سہرا باندھ کے۔ وہی گھوڑا لائیں گے جب تمہاری بارات آئے گی۔ ہم سے زیادہ بوڑھا ہو گیا ہے ذرا خیال رکھنا۔ دولہا ذرا ہلکا پھلکا ہو۔"

رابعہ ہنسنے لگی "کتنا؟ سیر سوا سیر کا۔ ویسے سلیم صاحب یہ آپ ہی تھے جو گھوڑے بیچ کر سو گئے تھے تو محاورہ بن گیا تھا؟"

ہے' اس نے دلاور کی بیوی کو قتل کرنے کی کوشش کی تھی اور سنا ہے دلاور کو بھی اسی نے اغوا کیا تھا۔"

"پولیس نے دلاور کو رانا کے بنگلے سے برآمد کیا تھا۔ تم مجھے پُرانی خبریں مت سناؤ۔" میں نے کہا "رانا اب کہاں ہے؟"

"یہ تو کسی کو بھی معلوم نہیں۔ اگر ایس ایس پی جاوید صدیقی نے عدالت میں بیان دے دیا کہ اس نے چوہدری دلاور کو کب اور کہاں سے گرفتار کیا تھا اور کس حالت میں۔ تو رانا بھی پھنس جائے گا اور پولیس مکر گئی تو رانا بھی چھوٹ جائے گا جب اس پر الزام کوئی نہیں تو گرفتاری کیسی۔"

"دلاور کی بیوی سے رابطے کی کوئی صورت نہیں؟"

رابعہ نے کہا "ایک نمبر ہے۔ کوشش کرکے دیکھ لو۔ لکھو۔"

"غالب اور نازو کیسے ہیں؟" میں نے نمبر لکھتے ہوئے کہا۔

"بالکل خیریت سے ہیں۔ مگر میں بتا نہیں سکتی کہ کہاں ہیں۔"

"مت بتاؤ۔ میں خود معلوم کرلوں گا۔ میں نے سُنا ہے کہ ڈاکٹر شاہ کی ایک شریکِ جرم فاطمہ جعفری......"

"ہاں وہ ماری گئی۔ بڑے پراسرار طریقے سے۔ اس کی لاش کسی نے تابوت میں ڈال کے وزیر خاں اسپتال بھیج دی تھی۔ ڈاکٹر شاہ کے نام۔ آج صبح منہ اندھیرے چوکیدار نے تابوت دروازے پر رکھا ہوا دیکھا تو پولیس کو اطلاع دی۔ ابھی پوسٹ مارٹم رپورٹ نہیں ملی۔"

میں نے کہا "کون قتل کرسکتا ہے اسے؟"

"دیکھو سکندر۔ تم کو احتیاط کرنی چاہئے۔ اتنی لمبی کال کروگے تو ٹریس ہوجاؤ گے۔"

"کیا تمہارا فون بھی آبزرویشن پر ہے؟"

"ہوسکتا ہے۔ میں زیادہ بات نہیں کرسکتی۔ آفس ٹائم ہے ویسے بھی۔" رابعہ نے کہا۔

"اچھا بلبلِ بغداد عرف جنت کی حور۔ خدا کرے تم سدا یوں ہی چہکتی مہکتی رہو۔ دل تو بہت چاہتا ہے تمہارے دیدار کو۔"

"خبردار ابھی لاہور آنے کی کوشش نہ کرنا۔ جب تک ہم تمہارے معاملات ٹھیک نہ کرلیں۔ امید ہے دلاور کی گرفتاری کے بعد بہتری کی صورت نکل آئے گی۔ اگر اس کی ضمانت منظور کی گئی تو ہم تمہاری ضمانت کی درخواست بھی دائر کردیں گے۔ اور وہ بھی قبول کرلی جائے گی۔"

"تم نے پہلے سے فرض کرلیا ہے۔"

"نہیں۔ دراصل ڈاکٹر شیلی مرڈر کیس میں دلاور کا سزائے موت سے بچنا محال ہے۔ وہ جو فرنچ وکیل ہے نا۔ اس نے برطانوی کونسلیٹ کی معرفت لندن سے ایک چشم دید گواہ کو بھی یہاں کی عدالت میں پیشی کے لئے طلب کیا ہے۔"

"تم اس نیگرو جارج کی بات کررہی ہو نا۔ جس پر دُہرے قتل کا الزام تھا۔"

رابعہ نے کہا "ہاں اصل قاتل تو چوہدری دلاور تھا۔ جارج اسے یہاں شناخت کرلے گا۔ پھر شاید دلاور کو لندن لے جایا جائے۔ وہ کیس دوبارہ سماعت کے لئے پیش ہوگا۔ ایک بے گناہ کو کیسے جیل میں رکھا جاسکتا ہے۔"

میں نے کہا "اچھا باقی باتیں پھر....."

"سکندر۔ تم مجھے فون مت کیا کرو۔ میں کسی کو کیا بتاؤں کہ تم سے میرا کوئی رابطہ نہیں۔ ہمیشہ تم مجھے فون کرتے ہو۔ کبھی ایک جگہ سے تو کبھی دوسری جگہ سے۔ تمہارا نیا ٹھکانا فون نمبر مجھے کچھ معلوم نہیں۔"

"وہ تو کسی کو بھی معلوم نہیں ہوسکتا۔" میں نے کہا اور فون بند کردیا۔

میرے اندازے کے مطابق کراچی سے کی جانے والی کال کا سراغ لگانے کے لئے آدھے گھنٹے کی مہلت کافی تھی۔ اگر رابعہ کے آفس کا فون نمبر آبزرویشن پر ہوگا تو لاہور کی پولیس کراچی کی پولیس سے رابطہ کرے گی اور انہیں میٹروپول سے سکندر بخت کو گرفتار کرنے کے لئے چھاپا مارنے کا کہے گی مگر ایک تو پولیس کی مستعدی اور کارکردگی اتنی قابلِ رشک ہے کہ جہاں برطانوی پولیس صرف تین منٹ میں پہنچ سکتی ہے وہاں ہماری پولیس تین گھنٹے سے پہلے نہیں پہنچ سکتی۔ اس کے علاوہ میٹروپول جیسے ہوٹل میں چھاپا مارنے والے قانونی کارروائی مکمل کئے بغیر داخل نہیں ہوسکتے۔ وارنٹ کے ساتھ مجسٹریٹ خود بھی ہو اور اس کے ساتھ پولیس کی نفری کے علاوہ لیڈی پولیس سرچر بھی ہو۔ یہ چٹکی بجاتے ہی ہونے والا کام نہیں تھا۔ بفرضِ محال یہ سب ایک گھنٹے میں ہوجاتا تب بھی مجھے فرق نہیں پڑتا تھا۔ یہ ناممکن تھا کہ میٹروپول ہوٹل کے ہر کمرے کی تلاشی لی جاسکے یا وہاں قیام کرنے والے سب مہمانوں کو شناخت کے لئے لائن اپ کردیا جائے۔

میں نے اطمینان سے دوسری کال اس نمبر پر کی جو رابعہ نے لکھوایا تھا مگر وہاں گھنٹی بجتی رہی۔ ریسیور کسی نے نہیں اٹھایا۔ پھر میں نے آپریٹر کو نئے ایس ایس پی ارشد کریم ربانی کا نمبر دیا۔

کسی نے کرخت لہجے میں کہا "ڈیوٹی افسر خداداد' اے ایس آئی۔"

میں نے کہا "خداداد۔ مجھے ایس ایس پی جاوید صدیقی سے بات کرنی ہے۔"

اس نے کہا "کون بول رہے ہو آپ؟"

میں نے کہا "کہو کراچی سے سکندر بخت بات کرنا چاہتا ہے۔"

"کون سکندر بخت؟"

"تمہارا باپ سکندر بخت۔" میں نے غرا کے کہا۔

"وہ تو سر چلے گئے۔ نئے ایس ایس پی ارشد کریم ربانی ہیں۔" اے ایس آئی خداداد بھی نیا تھا اور یقیناً میرے نام سے ناواقف تھا۔

وہ انکار نہیں کرتے اور سزا پاتے لئے میرا ساتھ دے رہے ہیں۔ ہیں۔ یہ میری کوتاہی نہیں تھی کہ میں پیڈرو کو گاڑی میں چھوڑ گیا تھا۔ یہ میری حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی بھی نہیں تھی۔ میری غلطی یہ تھی کہ میں نے اس معاملے میں شیخ کو ملوث کیا۔ مجھے کیا ضرورت تھی اس سے گاڑی منگوانے کی۔ مجھے کرائے کی گاڑی بھی مل جاتی۔ مروت میں اکرام شیخ انکار نہ کرسکا اور مارا گیا۔

میں پریشانی اور پشیمانی سے نروس ہونے لگا تھا۔ میں سخت PANIC کا شکار ہوگیا تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے پیڈرو کہیں آس پاس ہی موجود ہے۔ وہ چُھپ کر میری واپسی کا انتظار کررہا ہوگا۔ جو کچھ میں نے اس کے ساتھ کیا اس سے بدتر میرے ساتھ ہونے والا ہے۔ پیڈرو ایک گولی سے میرا کام تمام کرسکتا ہے مگر وہ مجھے اسی طرح پکڑے گا جیسے میں نے اس کو پکڑا تھا۔

یہ خیال آتے ہی میں نے سوچا کہ اب میرا یہاں کھڑے رہنا بے کار ہی نہیں حماقت ہے۔ مجھے خود کو اتنی آسانی سے کسی شکاری کے جال میں نہیں گرفتار ہونا چاہئے۔ چُھپ کر تو کوئی بھی مجھے گولی کا نشانہ بنا سکتا ہے مگر مجھے پکڑنے کے لئے پیڈرو کو سامنے آنا ہوگا۔ وہ اکیلا آئے یا اپنے ساتھ بدمعاشوں کی فوج لے آئے۔ میں مقابلہ کئے بغیر ان کے ہاتھ نہیں آؤں گا۔ اور اس سے پہلے کہ وہ مجھے پکڑنے آئیں مجھے بھاگ جانا چاہئے۔ جہاں مقابلے کی گنجائش نہ ہو وہاں فرار ہی بہترین دفاع ہے۔ مجھے جان بچانے کی کوشش ضرور کرنی چاہئے۔

اب خوف نے میرے اعصاب پر غلبہ حاصل کرلیا تھا تو مجھے اس پُرہجوم شہر میں ہر اجنبی چہرہ ایک شکاری دکھائی دینے لگا تھا۔ نہ جانے پیڈرو نے آزادی حاصل کرتے ہی انتقامی جذبات سے مغلوب ہوکے کیا فیصلہ کیا ہوگا۔ اس کا آفس بہت قریب تھا۔ وہ سب سے پہلے پولیس کو اطلاع بھی کرسکتا تھا کہ ہوٹل میٹروپول سے اس کو اغوا کرکے لے جانے والا سکندر بخت تھا۔ پولیس وہاں پہلے ہی موجود تھی۔ پیڈرو انہیں میرا حُلیہ بتا سکتا تھا اور پھر ہوٹل والے بتاسکتے تھے کہ ہاں۔ وہ شخص اگر میک اپ میں تھا تو سلیم بیگ کے نام سے یہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ ڈی ایس پی تو غصے سے پاگل ہوجائے گا کہ وہ اس کی نظروں کے سامنے اس کی آنکھوں میں دھول جھونک کے نکل گیا۔

میں چاروں طرف محتاط نظروں سے دیکھتا ہوا واپس ہوا پھر مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ مجھے واپس نہیں آگے جانا چاہئے۔ واپس گیا تو میٹروپول کے چاروں طرف موجود پولیس کے اہلکار دوسری مرتبہ مجھے نکلنے کا موقع نہیں دیں گے۔ وہ تو فوراً مجھے دبوچ لیں گے کہ چلو کیا ہوا خیر سے تم خود ہی لوٹ آئے شامتِ اعمال کے ساتھ۔ اب تمہاری کھال کھینچ کر دیکھیں گے کہ تم کیا ہو۔ شجاعت علی بغدادی' سلیم بیگ یا سکندر بخت۔ مجھے کچھ تو عقل سے کام لینا چاہئے۔

"اچھا انہیں بتادو۔"

"وہ تو سر میٹنگ میں ہیں۔" وہ بولا۔

"اچھا جب وہ فارغ ہوں تو بتادینا کہ میٹروپول ہوٹل میں مجھ سے بات کرلیں۔" میں نے کہا اور فون بند کردیا۔

جب میں نیچے اُترا تو سب ٹھیک تھا مگر میں نے جتنی دیر میں اپنے بِل کی ادائیگی کی۔ ٹھیک نہیں رہا۔ میں نے مین گیٹ سے ایک

ڈی ایس پی کو تیزی سے اندر آتے دیکھا۔ اس کے ساتھ ایک انسپکٹر بھی تھا۔ وہ متجسس نظروں سے ہر شخص کی صورت دیکھ رہے تھے۔ میں صرف یہ دیکھنے کے لئے رکا کہ کیا میرے شبہات درست ہیں۔

ڈی ایس پی نے کاؤنٹر پر آکے کلرک کو میری ایک پُرانی تصویر دکھاتے ہوئے کہا "اسے غور سے دیکھو۔ کیا یہ شخص ہوٹل میں موجود ہے؟"

کلرک نے تصویر ہاتھ میں لے کر اس پر سرسری نظر ڈالی اور بولا "یہ کون صاحب ہیں؟"

"صاحب نہیں۔ یہ ایک خطرناک مجرم ہے۔ ہم اسے گرفتار کرنے آئے ہیں۔" ڈی ایس پی نے کہا۔

کلرک نے تصویر واپس کردی "یہ آپ کو کس نے کہہ دیا....."

"اوئے فضول بک بک مت کر۔ ہم بے وقوف نہیں ہیں۔ ہمیں معلوم ہے وہ یہاں ہے۔ اس نے کالیں کی ہیں یہاں سے۔ اپنے منیجر کو بلاؤ۔"

کلرک یوں متاثر ہونے والا نہیں تھا "چھاپا مارنے کے لئے مجسٹریٹ کا وارنٹ کے ساتھ ہونا ضروری ہے۔"

ڈی ایس پی غرایا "مجسٹریٹ صاحب باہر گاڑی میں موجود ہیں۔"

کلرک نے بے نیازی سے کہا "ان سے کہیں منیجر سے مل لیں۔ وہ ہے ان کا کمرا۔"

تصویر میں میری دلچسپی دیکھ کے ڈی ایس پی نے پوچھ لیا "آپ بڑے غور سے دیکھ رہے ہیں۔"

میں نے سر ہلایا "مجھے بھی شک ہوتا ہے کچھ.... اسے دیکھا ہے۔ میں نے کچھ دیر پہلے... ممکن ہے وہم ہو میرا۔"

"وہم نہیں جی۔ پکی بات ہے۔" اس نے جوش سے کہا اور مجسٹریٹ کو یہ اطلاع دینے کے لئے واپس ہوگیا۔

میں نے انسپکٹر سے کہا "ہوٹل سے باہر جانے کے اور بھی راستے ہیں۔"

اس نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیا "ہر طرف پولیس کی نفری موجود ہے جی۔ ہم کچا کام نہیں کرتے۔"

"اچھا گڈ لک۔" میں نے گھڑی دیکھی "میری تو فلائٹ کا ٹائم ہو رہا ہے۔"

انسپکٹر نے مجھ سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ نہ وہ ہوٹل کی ناکا بندی کرسکتے تھے اور نہ اس کا محاصرہ کرسکتے تھے۔ یہاں وی آئی پی قسم کے مہمان ٹھہرتے تھے جن کے ساتھ بدتمیزی سے بات کرنے میں پیٹی اُتر جانے کا خطرہ لاحق رہتا تھا۔ میں اطمینان سے چلتا ہوا سامنے والے گیٹ سے نکلا۔ مجھے گیٹ کے مقابل ایک جیپ نظر آئی۔ ڈی ایس پی اب ایک بھاری بھرکم' صورت سے کاہل اور جاہل نظر آنے والے شخص سے بات کررہا تھا۔ میں نے اسے سنانے کے لئے ایک ٹیکسی ڈرائیور سے بہ آواز بلند کہا "ائرپورٹ جانا ہے" اور جواب سنے بغیر دروازہ کھول کے بیٹھ گیا۔

مجسٹریٹ اور ڈی ایس پی اندر جارہے تھے جب ٹیکسی ڈرائیور نے مؤدبانہ کہا "سر میں فارغ نہیں ہوں۔"

"اوہ۔ تم انتظار کررہے ہو کسی کا؟ سوری۔" میں نے کہا اور اُتر کے پیدل چل پڑا۔ "ولیج" ریسٹورنٹ کی طرف سے میں نے چوراہے کو عبور کیا تو میری نگاہ اس طرف گئی جہاں میں نے گاڑی پارک کی تھی۔

گاڑی وہاں موجود نہیں تھی۔ ایک لمحے کے لئے مجھے اپنی آنکھوں پر یقین کرنا مشکل ہوا۔ پھر میں نے سوچا کہ شاید میں نے گاڑی دوسری سڑک پر کھڑی کی ہوگی۔ اس چوراہے پر متعدد سڑکیں ملتی تھیں مگر شک کی کوئی بات نہیں تھی۔ فاطمہ جناح روڈ کا بورڈ میرے سامنے تھا اور فلیگ اسٹاف ہاؤس کی تاریخی عمارت بھی۔

قدرتی طور پر مجھے یہ خیال سب سے پہلے آیا کہ پیڈرو کسی طرح خود کو رہا کرانے میں کامیاب ہوگیا اور رہائی پاتے ہی گاڑی سمیت فرار ہوگیا۔ مجھے یہ ناممکن لگتا تھا کہ وہ اپنے ہاتھ پاؤں رسّی کی بند سے آزاد کراسکے مگر ناممکن تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔

یہ خیال آتے ہی میرا دل ڈوبنے لگا۔ گاڑی کے اندر وہ کاغذات بھی تھے جن سے گاڑی کی ملکیت کا پتا چلتا ہے۔ اکرام شیخ اور کاجل نے گاڑی حال ہی میں خریدی تھی۔ اس کی رجسٹریشن بک دیکھنے کا مجھے موقع بھی نہیں ملا تھا۔ میں نے گزشتہ شب اکرام شیخ سے کہا تھا کہ وہ میرے نام اوپن لیٹر بنا لائے۔ جب اس نے قیمت لینے سے انکار کیا تو میں نے گاڑی لینے سے انکار کردیا تھا مگر ٹرانسفر لیٹر بھی کاغذات میں مل جائے گا۔ معلوم نہیں اس کے پیچھے کس نے دستخط کئے تھے۔ اکرام شیخ نے یا کاجل نے۔ بہرصورت پیڈرو ان کا سُراغ لگالے گا۔

اکرام شیخ نے آج ہی مجھ پر واضح کردیا تھا کہ اب وہ میری وجہ سے کسی مصیبت میں پڑنا نہیں چاہتا مگر اب اس کو مصیبت سے کون بچا سکتا ہے۔ استاد پیڈرو جیسے بدمعاش کو خود میں نے اس کے پیچھے لگادیا تھا۔ وہ اکرام شیخ سے پوچھے گا کہ بتاؤ سکندر بخت کہاں ہے۔ وہ تمہاری گاڑی میں مجھے ڈال کے پھر رہا تھا۔ ضرور تم نے اسے پناہ دے رکھی ہے اور تم ہی اس سے پرانی دوستی کا رشتہ نبھا رہے ہو۔

کیا کہے گا شیخ اپنی صفائی میں اور کیوں مانے گا پیڈرو اس کی بات۔ شیخ کا گھربار۔ بیوی بچے' اسکول۔ اس کی نیک نامی اور عزت۔ زندگی کا سکون اور مستقبل۔ سب اچانک غیر محفوظ ہوگئے ہیں۔ صرف میری وجہ سے۔ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے۔ بار بار وہی نقصان اُٹھاتے ہیں جو مجھ سے خلوص اور دوستی کا رشتہ نبھانے کے

آگے جانے کے خیال سے میں نے قدم بڑھائے ہی تھے کہ کسی نے میرے پیچھے سے چلّا کے کہا "بابو جی...." اور میری آستین کھینچی۔

میں اُچھل پڑا اور ایسے پلٹا جیسے میرے کوٹ کی آستین کو کھینچنے والا کوئی پاگل کتا تھا یا کوئی دشمن۔ لیکن وہ ایک مسکین صورت شخص تھا۔

"ہیں... کیا... کیا بات ہے؟" میں نے کہا۔

"گاڑی کو دیکھ رہے ہو بابو جی؟" اس پھٹے پرانے کپڑوں والے عمر رسیدہ اور کمزور شخص نے کہا جس کے سر اور داڑھی کے بالوں میں سفیدی نمایاں تھی۔

"ہاں' ہاں تم نے دیکھی تھی۔"

"ہاں جی۔ جب آپ ادھر چھوڑ کے گئے تھے اس وقت بھی دیکھی تھی۔" اس نے کچھ فاصلے پر موجود ریڑھی کی طرف اشارہ کیا جس پر ایک بچہ بھٹے بھون رہا تھا۔

"پھر کہاں گئی وہ گاڑی؟" میں نے کہا۔

"پولیس لے گئی۔ غلط جگہ کھڑی تھی نا۔" وہ بولا "غلط نہ ہو پھر بھی وہ اٹھا لیتے ہیں۔"

میں نے خود کو سنبھالا "اب کہاں سے ملے گی وہ گاڑی؟"

"پہلے ادھر دیکھ لیں۔ یہ ٹریفک والوں کی چوکی ہے۔ ورنہ صدر تھانے جائیں۔ سو دو سو جرمانہ بھرنا پڑے گا۔"

"اچھا کیا تم نے بتادیا۔ میں تو پریشان ہوگیا تھا کہ گاڑی چوری ہوگئی۔" میں نے جیب سے ایک دس کا نوٹ نکال کے اسے دے دیا۔

"بابو جی" اس نے مجھے سلام کیا "اب ایک بات اور بتادوں آپ پہلے جاؤ پولیس ہیڈ آفس۔"

"وہ کیوں؟"

"دراصل۔ میں نے دیکھا تھا۔ سب انسپکٹر نذیر لے گیا ہے وہ گاڑی۔ اس نے منع کیا تھا مجھے کہ میں کسی کو نہ بتاؤں۔ لیکن آپ ہو شریف آدمی۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا "اور تم کون ہو؟ پولیس کے مخبر؟"

وہ دانت نکالنے لگا "کیا کریں بابو جی۔ ایسے ادھر کوئی کھڑا بھی نہیں ہونے دیتا۔"

میں فوراً ایک ٹیکسی میں بیٹھ گیا لیکن میں نے اسے پولیس ہیڈ آفس جانے کو نہیں کہا۔ مجھے معلوم تھا کہ اب میں گاڑی لینے گیا تو لینے کے دینے پڑجائیں گے۔ صورتِ حال میرے قابو سے باہر ہوگئی تھی لیکن اس مخبر کی اطلاع نے میرے اعتماد کو کسی حد تک بحال کردیا تھا۔ شاید ابھی کچھ وقت تھا جس سے فائدہ اٹھایا جاسکتا تھا۔

ریکس سنیما کے چوراہے پر پیٹرول پمپ سے میں نے شیخ کے گھر فون کیا۔ کیشنز کا آفس خالی تھا اور ٹیکسی ڈرائیور گاڑی کا ٹینک فُل کرا رہا تھا۔

شیخ کی آواز سنتے ہی میں نے کہا "شیخ یار گڑبڑ ہوگئی۔"

"پھر پریشان کیوں ہو بھائی۔ تمہارے ساتھ گڑبڑ نہ ہو تو تم گڑبڑ کے ساتھ ہوتے ہو۔"

میں نے کہا "شیخ۔ وہ گاڑی کس کے نام پر تھی؟"

"تھی کیا مطلب۔ بم دھماکے سے اُڑ گئی۔ کاجل کے نام پر تھی۔"

میں نے کہا "فوراً کاجل سے کہہ دے کہ گاڑی چوری ہوگئی ہے۔ اگر تعلقات سے کام لے کر یا پیسہ دے کر رپورٹ کے اندراج کا وقت آج صبح کا ہوجائے تو بہتر ہے۔"

"آخر ہوا کیا ہے۔ پتا تو چلے۔"

"یار میں نے پیڈرو کو اس میں بند کیا تھا۔ میں اسے اپنے ساتھ لے جاتا دوسری گاڑی میں۔"

"پھر کیا وہ بھاگ گیا؟"

"نہیں۔ میں نے گاڑی غلط جگہ پارک کی تھی۔ پولیس اٹھا کے لے گئی اور اب ظاہر ہے وہ پیڈرو کو برآمد کرلیں گے۔ پولیس پہلے ہی میٹروپول پہنچ گئی تھی سکندر بخت کی گرفتاری کے لئے۔ کاجل رپورٹ لکھوادے کہ کسی نے اس سے گاڑی چھین لی۔ حُلیہ وہی بتائے جو میرا تھا۔ تو خود سامنے مت آنا۔ اس طرح تم بچ جاؤ گے ورنہ پیڈرو تمہارے پیچھے پڑجائے گا۔"

اکرام شیخ نے کہا "لیکن گاڑی تُو نے کہاں چھینی تھی۔ گاڑی تو میٹروپول کے سامنے موجود تھی۔ اسے میں چلاتا رہا تھا۔"

"یار کہہ دینا کہ وہ دو تھے۔ میرا حُلیہ بالکل ٹھیک بتانا۔ دوسرا غلط سلط بیان کردینا۔ میں اب جارہا ہوں واپس۔ بائی روڈ۔"

"تو فکر مت کر۔ ایسا نہ ہو راستے میں ہی ایکسیڈنٹ کر بیٹھے۔" اکرام شیخ بولا۔

میں نے کہا "یار شیخ۔ مجھے واقعی بہت افسوس ہے۔"

"یار تیرا کیا قصور ہے اس میں۔ ہونے والی بات تھی ہوگئی۔ کاجل سب ٹھیک کرلے گی۔ پیڈرو اسے نہیں جانتا۔ کاجل کے لئے کوئی خطرہ نہیں۔ وہ حسبِ منشا رپورٹ درج کراسکتی ہے۔ لیکن اس کے بعد خطرہ تجھے درپیش ہوگا۔ اپنا میک اپ بدل لینا ورنہ پولیس دھر لے گی ڈکیتی اور اغوا کے جرم میں۔"

"یہ اچھا یاد دلایا تُو نے یار۔ تھینک یو۔ کاجل کو سمجھا دینا کہ میں نے ایسا نہیں چاہا تھا لیکن ہوگیا۔"

"کاجل کے لئے تم سب نے اس سے کہیں زیادہ کیا تھا۔ تم لوگ اسے مشرقی پاکستان سے نکال کر اپنے ساتھ نہ لاتے تو اس کے ساتھ نہ جانے کیا ہوتا۔ شاید وہ بھی کسی کیمپ میں پڑی ہوتی۔ وہ تم سب کی بہت احسان مند ہے۔ اسے کوئی گلہ نہیں ہوگا۔"

اکرام شیخ کو خدا حافظ کہنے کے بعد میں نے سیدھا شوروم کا رُخ کیا۔ گاڑی میری حسبِ منشا دُھلی دُھلائی تیار کھڑی تھی۔ اس

کے پانچوں ٹائر بھی بدل دیے گئے تھے۔ شوروم کے مالک نے مجھے یقین دلایا کہ انشاء اللہ یورپ تک سفر میں مجھے گاڑی میں پیٹرول ڈلوانے کے سوا کچھ نہیں کرنا پڑے گا۔ گاڑی کے کاغذات میں شجاعت علی بغدادی کا نام بھی درج ہوگیا تھا۔ میں نے ڈیلر کو باقی رقم ادا کی اور چابی لے لی۔

گاڑی میں بیٹھنے کے بعد میں نے خود کو زیادہ محفوظ اور پُرسکون محسوس کیا۔ میک اپ بدلنا آسان کام نہیں تھا۔ جو میں گاڑی میں بیٹھے ہوئے کرلیتا۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ ایک رات کسی عام سے ہوٹل میں گزار لوں لیکن عقل کی دلیل اس کے خلاف تھی۔ ابھی کسی پولیس چیک پوسٹ کو میرے فرضی نام اور حلئے سے آگاہ نہیں کیا گیا ہوگا کہ یہ شخص جہاں بھی نظر آئے اسے گرفتار کرلیا جائے۔ پولیس نے ڈکی میں سے استاد پیڈرو کو برآمد کرلیا ہوگا تو پولیس کو کچھ وقت تفتیش کے لئے درکار ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ استاد پیڈرو شاید خود بھی پولیس کے چکر میں نہ پڑے۔ اگر وہ سکندر بخت کا نام لے گا تو پھر یہ معاملہ بہت لمبا ہوجائے گا اور اسے بھی بتانا پڑے گا کہ وہ شیخ مختار ہے یا استاد پیڈرو۔ وہ اپنی جان چھڑانے کے لئے یہی کہہ سکتا ہے کہ اسے کچھ معلوم نہیں۔ وہ کون لوگ تھے اور کیا چاہتے تھے۔ اس نے اغوا کرنے والوں کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اور وہ کسی پر شک بھی ظاہر نہیں کرسکتا۔ اس کا دشمن بھی کوئی نہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

یہ بڑا حوصلہ افزا خیال تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ پولیس کو کسی شجاعت علی بغدادی یا سلیم بیگ کی تلاش نہیں ہوگی جو ایک بزنس مین شیخ مختار کے اغوا میں ملوث تھا اور درحقیقت سکندر بخت تھا۔ میٹروپول ہوٹل میں سکندر بخت کو پکڑنے کے لئے چھاپا مارنے والے تو باہر ہی سے لوٹا دیے گئے ہوں گے کہ اس نام اور حلئے کا کوئی شخص نہ یہاں تھا اور نہ ہے۔ ہوٹل کے ریکارڈ سے اس کی تصدیق بھی ہوجائے گی اور پولیس رسمی کارروائی کے بعد رپورٹ دے دے گی کہ لاہور کالیس کرنے والا کوئی سلیم بیگ تھا جو جاچکا تھا۔

میرے خلاف دوسری رپورٹ کاجل کی ہوگی لیکن وہ ابھی لکھی بھی نہیں گئی ہوگی یا شاید لکھی جارہی ہوگی۔ شام پانچ بجے لکھوائی جانے والی اس رپورٹ کے اندراج کا وقت کیا ہوگا۔ یہ میں نہیں جان سکتا تھا۔ اس کا انحصار حالات پر تھا۔ اگر آخری اندراج گزشتہ رات کا ہوا تو پولیس صبح کا وقت ڈال دے گی لیکن خدانخواستہ صبح سے دوپہر یا شام تک دوسرے جرم کی رپورٹیں ہوئیں تو پھر پچھلا وقت ڈالنا ممکن نہیں رہے گا۔ یہ رپورٹ لکھنے کے بعد بھی راوی کے پُل پر سے گزرنے والی وہی گاڑیاں چیک کی جائیں گی جو اکرام شیخ کی گاڑی جیسی ہوگی مگر اصل گاڑی تو پولیس ہیڈ آفس میں ہی ہے۔ وہ کل تک کہیں نہ کہیں مل جائے گی۔

یہ اطمینان ہوجانے کے بعد میرا سب خوف دور ہوگیا۔ میں نے ایس کے قاسم اینڈ سنز کا ٹیلی فون نمبر ڈائریکٹری میں تلاش کیا۔ اس کے سامنے امپورٹر ایکسپورٹر لکھا ہوا تھا جو بڑی عام سی اصطلاح تھی اور اس کی آڑ میں ہر جائز و ناجائز کام کیا جاسکتا تھا۔ اس کے ساتھ ایس کے قاسم کے گھر کا پتا اور رہائشی نمبر بھی دیا ہوا تھا۔

کاروباری ادارے عام طور پر پانچ چھ بجے بند ہوجاتے ہیں۔ میں نے گاڑی کے رنگ دار شیشے چڑھائے اور ایس کے قاسم اینڈ سنز کے دفتر سے کچھ فاصلے پر گاڑی روک لی۔ آفس ابھی کھلا ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد میں نے باری باری عملے کے چاروں ارکان کو روانہ ہوتے دیکھا۔ خاتون اسٹینو سب سے پہلے گئی۔ گنجا سپروائزر وہاں سے نکلنے والا آخری شخص تھا مگر آفس اب بھی کھلا ہوا تھا۔ شاید اکیلا سیٹھ قاسم ابھی آفس میں موجود تھا اور اپنے پارٹنر شیخ مختار کی واپسی کا انتظار کررہا تھا یا اس کی تلاش میں اِدھر اُدھر فون گھما رہا تھا اس کا مطلب تھا کہ سیٹھ قاسم باہر نہیں گیا تھا۔ میں اگر چاہتا تو آفس میں ہی اس سے ملاقات کرسکتا تھا۔ وہ سب لوگ جاچکے تھے جنھوں نے شیخ مختار کو میرے ساتھ جاتا دیکھا تھا۔ مجھے شناخت کرنے میں سیٹھ قاسم کو دیر لگتی اور جتنی دیر میں وہ اسٹاف کے بتائے ہوئے حلئے سے میری صورت کا موازنہ کرتا میں اسے گن پوائنٹ پر باہر لے آتا لیکن ایسا کرنے میں رسک تھا۔ قاسم شور مچاتا تو سب سے پہلے ہوٹل میٹروپول میں سیکیورٹی کے ذمّے دار متوجہ ہوتے اور وہ اس سلیم بیگ کو ضرور پہچان لیتے جو درحقیقت سکندر بخت تھا اور جس کی تلاش میں پولیس کچھ دیر پہلے ہی وہاں آئی تھی۔

میں باہر انتظار کرتا رہا۔ میں یہ بھی دیکھنا چاہتا تھا کہ اکرام شیخ کی گاڑی میں مقید استاد پیڈرو رہائی پاکے اپنے آفس پہنچتا ہے یا نہیں۔ رات کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا کہ آخری شخص آفس میں سے برآمد ہوا۔ اس نے شیشے کے پٹ والے دروازے کو مقفل کیا۔ پھر فولادی جالی کے شٹر کو اوپر سے نیچے کھینچا اور اس میں نیچے بیٹھ کے چابی والے دو قفل لگائے۔ وہ دبلا پتلا اور لمبا شخص تھا جس نے سر کے تھوڑے سے بالوں کو کسی ماہر ہیئر ڈریسر کی مدد سے یوں پھیلایا اور پھیلایا تھا کہ وہ گنجا نظر نہ آئے۔ اس نے اپنی پتلون پر شاید کبھی استری کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ کبھی دھل کے آتی ہوگی تو سیٹھ قاسم ایک دن میں کریز کا ستیاناس کردیتا ہوگا۔ غالبًا وہ گھٹنے کرسی پر اٹھا کے بیٹھنے کا عادی تھا اس کے لئے پتلون ایک ولایتی پاجامہ تھا۔ کوٹ کے ساتھ اس نے ٹائی نہیں باندھی تھی۔ درمیانی درجے کے بزنس مین ایسے ہی حلئے میں پھرتے تھے۔ جب تک وہ صنعتکار یا چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری کے رکن نہ بن جائیں ان کے نزدیک لباس سے زیادہ اہم پیسہ رہتا تھا۔ یہ تو صاف ظاہر تھا کہ سیٹھ قاسم نے اپنا آفس میٹروپول جیسے شاندار ہوٹل میں کھولا ہے تو اس کا بزنس بھی بڑا ہوگا۔ وہ گاڑی خرید سکتا تھا مگر وہ ٹیپ ٹاپ

رہنے کے لئے فضول خرچی کا قائل معلوم نہیں ہوتا تھا۔ جب رکشا ٹیکسی ہیں تو اتنا پیسہ اپنی گاڑی میں پھنسانے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ پیسہ کاروبار میں لگایا جائے تو منافع دیتا ہے۔ رکشا ٹیکسی کے کرائے سے دس گنا۔ پھر ذاتی کار صرف شو مارنے کے لئے۔ فالتو خرچ کرنے والی بات ہے نا!

سیٹھ قاسم چند قدم ہی چلا تھا کہ میں نے اسے جالیا "قاسم بھائی" وہ ٹھٹک کے رک گیا "کیا بات ہے کون ہے تم؟"

میں نے کہا "تم نہیں پہچانا ہم کو؟ ہم غلام علی لوٹا والا۔ سیٹھ ابراہیم لوٹا والا کا بھائی۔ تم کو شیخ مختار بلاتا پڑا ہے۔"

شیخ مختار کے نام پر وہ چونکا "کدھر بلاتا پڑا ہے؟"

میں نے کہا "ابھی بیٹھو میرے ساتھ۔ اس کا بڑا [illegible] ہوگیا ہے ایسا نہ ہو تم بھی پھنس جائے۔"

وہ میرے ساتھ بیٹھ گیا "بابا جلدی بولو کیا [illegible] ہے۔ ابھی اپنا ہارٹ فیل ہوجائے گا۔ بہت کمزور دل ہے اپنا۔"

میں نے کہا "ایسا کرتے ہیں ادھر بیٹھ کے ایک کپ چائے پیتے ہیں۔ دلیج ریسٹورنٹ میں۔"

اس نے نفی میں سرہلایا "ادھر بہت شور ہوئیں گا۔ یہ لوگ اپنا بینڈ بجاتا ہے۔ اپن کو میوزک سے الرجی ہے۔"

"پھر تم بتاؤ۔ بات بہت ضروری ہے اور تمہارے فائدے کی ہے۔"

اس نے سوچ کے کہا "ابھی گاڑی کو گھماؤ۔ پیچھے چلو۔ ادھر کیفے گرینڈ ہے۔ ایک دم ڈارک اور خاموش جگہ ہے۔"

اس نے ٹھیک کہا تھا۔ کیفے گرینڈ میں وال لائٹس اتنی مدھم تھیں کہ باہر سے آنے والے کو کچھ دیر تو اندھیرا ہی محسوس ہوتا تھا۔ قاسم مجھے اوپر لے گیا۔ وہاں دیواروں پر سرخ مخمل جیسا وال پیپر ماحول کو مزید تاریک کرتا تھا۔ لوگ الگ الگ کیبن میں بیٹھے سرگوشیوں میں باتیں کررہے تھے۔ موم بتی کی شکل والی لائٹس میں دور سے کسی کا چہرہ پہچانا نہیں جاتا تھا۔ مجھے اس کی فضا بہت اچھی لگی۔ بعد میں چائے اور کنفکشنری نے بھی بڑا مزہ دیا۔

ایک گوشے میں قیام کرتے ہی سیٹھ قاسم نے بے چینی سے کہا "تم کیا بولا کون سالوٹا والا؟"

"غلام علی لوٹا والا۔" میں نے کہا "شیخ مختار کے ساتھ ہم نے پہلے ایک ڈیل کیا تھا اور پھنس گیا تھا مشکل میں۔ ابھی ہمارا بھائی پھنس گیا ہے ہم دس ہزار دے کے بچ گیا تھا لیکن ابراہیم۔"

"کون ابراہیم؟"

"سیٹھ ابراہیم لوٹا والا۔ ہمارا بڑا بھائی۔ اس کا ایک لاکھ مانگتا ہے ایف آئی اے والا۔ ادھر شیخ مختار بولتا ہے کہ سیٹھ قاسم سے بات کرو۔"

وہ اُچھل پڑا "ہم... ہم ایک لاکھ دے گا ایسا بات مت کرو بابا۔ اپنا ہارٹ فیل ہوجائیں گے۔ سالا دل بڑا کمزور ہے۔"

میں نے کہا "سیٹھ قاسم۔ تم شریف آدمی ہو۔ شریفانہ بزنس کرتے تھے۔ یہ تم نے شیخ مختار کو اپنے ساتھ کیوں شامل کرلیا۔ اس کے کہنے پر تم نے غلط دھندا شروع کیا ہوگا۔"

"کیسا غلط دھندا؟" وہ ڈر کے بولا "اپنا دہی دھندا ہے ادھر سے گارمنٹ اور ہینڈ کرافٹ بھیجتا ہے۔ چپل اور اونیکس کا ڈیکوریشن پیس۔ کبھی لیدر گڈز یا گارمنٹ۔"

"اور ادھر سے کیا منگواتا ہے؟"

"کیا تم کو نہیں معلوم۔ کاسمیٹک اور پرفیوم۔ الیکٹرانکس۔"

"لیکن قاسم بھائی۔ تمہارا پارٹنر تم کو ڈبل کراس کرتا ہے۔ وہ ادھر سے امونیشن اسمگل کررہا ہے۔"

سیٹھ قاسم اچھل پڑا۔ اس کا رنگ اُڑ گیا تھا "یہ... ایسا مت بولو۔"

میں نے کہا "ہاں۔ تمہارا دل بہت کمزور ہے۔ ہارٹ فیل ہوجائے گا لیکن یہ سوچو سیٹھ قاسم کہ تم کو ایف آئی اے نے پکڑلیا پھر کیا ہوگا؟ تم بھی پارٹنر ہے۔ تم نے شاید کبھی دیکھا نہیں کہ ادھر سے جو مال آتا ہے اس میں کیا ہوتا ہے، اس بار شاید تم بچ جاؤ ایک لاکھ دے کر۔"

"ہم کیوں دے گا۔ وہ سالا شیخ مختار دے گا۔"

"ہاں وہی دے گا۔ لیکن تم سنبھل جاؤ۔ اس سے بات کرو گے تو وہ انکار کرے گا۔ اگلی بار خود مال چیک کرو۔ تمہیں پتا چل جائے گا۔ ہم تم کو بتاتا ہے شیخ مختار بہت خطرناک چیز ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تم اس کا سیکرٹ آؤٹ کرے اور وہ تم کو بزنس سے آؤٹ کردے یا دنیا سے آؤٹ کردے۔"

"اف۔ ابھی ہم کیا کریں گا۔" اس نے کانپتے ہاتھوں سے پانی پیا۔

میں نے کہا "چائے پیو۔ دل کو مضبوط کرو۔ اگر شیخ مختار ایک لاکھ مانگے تو خاموشی سے دے دو۔ نہیں مانگے تو خاموش ہوجاؤ۔ اس سے کوئی بات نہیں کرو۔ جب موقع ملے۔ مال پکڑو اور اس کو پکڑا دو۔"

اس نے اقرار میں سرہلایا۔ اندر ائرکنڈیشنر کی ٹھنڈک تھی مگر سیٹھ قاسم کے ماتھے پر پسینہ چمک رہا تھا "ہم... ایسا ہی کرے گا۔"

میں نے کہا "پولیس اور ایف آئی اے والوں کو پہلے بتادینا۔ ان کی موجودگی میں اور شیخ مختار کے سامنے مال پکڑنا۔ وہ بچ کے نہ نکل سکے۔ تمہاری تو بہت اچھی گڈول ہے۔ رپورٹ بھی تم کرو گے۔ شیخ مختار اندر ہوجائے گا۔ اس کے بعد پارٹنرشپ خلاص۔"

"ایک دم خلاص۔" سیٹھ قاسم نے وہیں فیصلہ کرلیا۔

بلاشبہ سیٹھ قاسم ایک ایماندار بزنس مین تھا اور استاد پیڈرو دھوکے سے اس کا پارٹنر بن گیا تھا۔ پیڈرو کے پاس پیسہ ہوگا مگر وہ خود کوئی کاروبار چلانے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا۔ سوائے بدمعاشی کے کاروبار کے۔ ہر جائز کاروبار میں لگایا ہوا سرمایہ دن دونی اور

رات چوگنی ترقی نہیں کرتا۔ شرح منافع محدود رہتی ہے اور سرمایہ آہستہ آہستہ بڑھتا ہے۔ اسمگلنگ' گن رننگ' منشیات یا بردہ فروشی جیسے دھندے میں لکھ پتی کو کروڑ پتی بنتے دیر نہیں لگتی مگر یہ کام صرف استاد پیڈرو جیسے لوگ ہی کر سکتے ہیں۔ وہ نہ سائن بورڈ لگا کے دکان کھولتے ہیں اور نہ اپنا اشتہار دیتے ہیں۔ وہ سیٹھ قاسم جیسے کسی شریف کاروباری کے کندھے پر رکھ کے بندوق چلاتے ہیں۔ ایک سو فیصد قانونی کام کرنے والے کی گڈول کے پردے میں اپنا دھندا شروع کرتے ہیں اور کبھی بُرا وقت آتا ہے تو خود غائب ہوجاتے ہیں۔ پکڑا جاتا ہے لاعلمی میں سیٹھ قاسم جیسا مخص۔

ایک گھنٹے بعد میں نے سیٹھ قاسم کو اس کے گھر سے کچھ دور ڈراپ کردیا۔ وہ کمزور دل اور کمزور سا آدمی میرا بے حد شکر گزار تھا اور بار بار کہہ رہا تھا "غلام علی لوٹا والا۔ تم نے بچالیا ہم کو۔"

میں نے رخصت ہوتے ہوئے کہا "اب تم مجھے مت مروا دینا۔ میرا نام مت لینا شیخ مختار کے سامنے۔ میرا کام تمہیں خبردار کرنا تھا۔ اب تم خاموشی سے ایسا ہاتھ ڈالو شیخ مختار پر کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔"

"بابا ہم لاٹھی بھی توڑ دے گا اس سالا سانپ پر۔ ابھی وہ جانتا نہیں ہم کو۔ ہم ایسا پکڑے گا اس کو جیسا بلی پکڑتا ہے چوہے کو۔" اس نے پنجہ مار کے بلی کے ایکشن کو واضح کیا "یہ ہم پارٹنر بنانے میں دوسرا غلطی کیا ہے۔"

میں نے کہا "پہلی غلطی کب کی تھی؟"

"بہت ٹائم ہوگیا۔ اٹھائیس سال پہلے لائف پارٹنر بنایا تھا۔ وہ بھی ہم کو دھوکا دیا۔ سالا ایک دم لائٹ ویٹ تھا زیبا کے مافک۔ ابھی سو پاؤنڈ سے بڑھ کر تین سو پاؤنڈ ہیوی ویٹ ہوگیا ہے۔ ابھی تم کو ایک ایڈوانس دیتا ہے۔ شادی بناؤ تو لڑکی دیکھو لیکن لڑکی کی ماں کو بھی دیکھو کہ لڑکی کا فیوچر کیا ہوئیں گا۔ یہ ایک دم تجربے کا بات ہے۔"

میں نے ہنستے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا اور چل پڑا۔ اس کے مشورے کی روشنی میں رابعہ کو شریکِ حیات بنانے میں کوئی رسک نہیں تھا۔ میں نے رابعہ کی ماں کو بھی دیکھا تھا۔ پچاس سال کی عمر میں جب اس کا انتقال ہوا تھا تو اس میں اور رابعہ میں صرف عمر کا فرق تھا۔ اگر وہ خود پر بیوگی کا غم۔ رابعہ کی فکر اور بڑھاپا مسلط نہ کرتی۔ چہرے اور جسم کو عمر کی یلغار سے بچانے کے لئے میک اپ اور افزائشِ حسن کے اسباب کا سہارا لیتی تو سب اسے رابعہ کی بڑی بہن سمجھتے

لاہور تک ایک ہزار میل کا سفر بہت زیادہ نہیں تھا مگر میں اکیلا تھکن اور بے زاری کا شکار رہا۔ کوئی شریکِ سفر ہوتا تو باری باری ڈرائیو کرتے اور باتیں کرنے میں سفر کی طوالت کا احساس بھی نہ ہوتا۔ میں نے گاڑی کا سودا نہ کیا ہوتا تو دو گھنٹے میں اُڑ کر لاہور پہنچ جاتا۔ گاڑی میں نے جس مقصد کے لئے خریدی تھی وہ ناکامی کی نذر ہوگیا تھا۔ بہتر ہوتا اگر یہ گاڑی میں اکرام شیخ کو دے آتا۔ اس کے نام کرادیتا۔ اس کو میری وجہ سے جو پریشانی ہوئی کچھ اس کی تلافی ہوجاتی۔

رات بھر سفر جاری رکھنا زیادہ مشکل کام تھا۔ اندھیرے میں فاصلہ طے ہونے کا احساس بھی کم ہوجاتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے میں خلا میں سفر کررہا ہوں پھر نیند اور تھکن کا احساس بڑھتا گیا اور میں نے وہ رات حیدر آباد کے ایک ہوٹل میں گزاری۔ اس سے اگلے دن بستر رہا۔ میں رات کو ملتان پہنچ گیا۔ اب لاہور چار پانچ گھنٹے کی مسافت تھی مگر مجھ میں ہمت باقی نہ رہی تھی۔ میں نے ملتان میں چھ گھنٹے قیام کیا اور صبح چھ بجے لاہور کے لئے نکل کھڑا ہوا۔

دس بجے میں لاہور میں تھا۔ اس وقت رابعہ یا وقار یوسف کے ملنے کی امید نہیں تھی۔ ماڈل ٹاؤن والے گھر کو مقفل دیکھ کے مجھے کچھ مایوسی ہوئی۔ میں نے وقار یوسف کے گھر کا رخ کیا۔ وہاں صرف نکی تھی جو ایک ڈھیلا ڈھالا نائٹ گاؤن پہنے پھر رہی تھی۔ یہ دراصل میٹرنٹی ڈریس تھا۔ اس نے مجھے شرماتے ہوئے بتایا۔

"باقی لوگ کیا اللہ کو پیارے ہوگئے؟" میں نے بوٹ کے تسمے کھولتے ہوئے کہا "وہاں تو تالا پڑا ہوا تھا۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو تم۔ سب ٹھیک ٹھاک ہیں۔" نکی نے کہا۔

"مگر ہیں کہاں؟" میں نے کہا۔

"محسن نے گل کو شفٹ کردیا ہے اندرونِ شہر۔ لاہوری یا موچی دروازے کے اندر۔" نکی نے مجھے مطلع کیا "ابھی میں نے دیکھا تو نہیں مگر سنا ہے کسی پرانی عمارت کی سب سے اوپر والی منزل پر جہاں کبوتر رہتے ہیں وہیں ایک خانہ انہیں بھی مل گیا ہے۔"

"ایک خانہ یعنی صرف ایک کمرا؟"

"کہنے کو دو کمرے ہیں۔ ایک وہ جس میں پہلے کبوتر تھے دوسرے میں مالکِ مکان کا کبوتر باز بیٹا رہائش پزیر تھا۔ انہوں نے سب کو عاق کردیا۔ نیچے کی تین منزلوں پر تین بھائیوں کے خاندان بستے ہیں۔ سب سے اوپر اکیلے ابا میاں ہیں اور ان کی خودی بہت بلند ہے۔ پنشن میں گزارا ہوتا نہیں۔ اب کرایہ بھی ملے گا۔ بیٹوں سے کچھ لینے کے روادار نہیں۔"

میں نے کہا "یہ بھی اچھا کیا محسن نے۔ کم سے کم گل اور رابعہ کو محفوظ کردیا۔"

"مولوی خادم حسین اور اس کی گھر والی پاگل ہوگئے۔" نکی نے ایسے کہا جیسے یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں۔

"پاگل ہوگئے؟"

"کچھ تو وہ پہلے سے تھے۔" نکی نے کہا "پھر خادم حسین کی بیوی کو تمہارے گھر میں آسیب کا سایہ نظر آنے لگا۔"

"کیسا آسیب؟ جن بھوت یا چڑیل۔"

"اس نے رات کے وقت آوازیں سُنی تھیں اور باہر نکل کے دیکھا تو کچھ لوگ سبز چرے پہنے ہاتھوں میں مشعل روشن کئے باغ میں پھر رہے تھے۔ ہر ایک کی گود میں بچہ تھا۔ سب نے اس سے پوچھا کہ بتاؤ کون سا بچہ چاہئے جو اچھا لگے وہ لے لو۔ پھر اس نے ایک بچے کو دیکھا جو گھٹنوں کے بل چلتا ہوا اس کی جانب آرہا تھا۔ اس نے اسی بچے کو اٹھالیا۔"

"اور پھر اس کی آنکھ کھل گئی۔" میں نے کہا۔

"آنکھ ہم سب کی کھلی۔ اس کی چیخ سے۔ جا کے دیکھا تو وہ پورچ میں بے ہوش پڑی تھی۔"

میں نے افسوس سے کہا "بیچاری۔ ماتا کی پیاسی عورت کے خیالوں کا عذاب۔"

"کمال کی بات یہ ہے کہ اسی رات مولوی خادم حسین کو خواب میں اپنے دادا مرحوم نظر آئے۔ وہ بھی سبز لباس میں تھے۔"

"ہاتھ میں مشعل لئے ہوئے؟"

"یہ پتا نہیں۔ انہوں نے خادم حسین کو بہت ڈانٹا کہ وہ ابھی تک حاضری دینے کیوں نہیں گیا۔ بدبخت' کرسیوا کھا میوہ۔ یہی کہتے رہے۔"

"کون سا میوہ؟ ڈرائی فروٹ۔"

نکی ہنسی "مولوی خادم حسین کے دادا اور پھر والد گجرات میں کسی پیر کے آستانے پر ہر سال چادر اور دیگ چڑھاتے تھے۔ خادم حسین نے اس خاندانی روایت پر عمل کرنے میں کوتاہی سے کام لیا تھا۔ اس نے یہ خواب دیکھا اور پھر کسی ماہرِ علوم روحانی کے پاس گیا اسے اپنے خواب اور بیوی کے بارے میں بتایا۔"

میں نے کہا "کسی ڈاکٹر سے مشورہ نہیں کیا؟"

"نہیں۔ وہ کچھ دیر بعد ہوش میں آگئی تھی اور اس نے خود ہی انکار کردیا تھا کہ ڈاکٹر کی ضرورت نہیں۔ کل شام وہ بیوی کے ساتھ اسی پیر کی درگاہ پر چادر اور دیگ چڑھانے چلا گیا۔"

"کسی نے اسے روکا بھی نہیں۔ سمجھایا بھی نہیں؟"

"محسن اور وقار نے کہا کہ کوئی فائدہ نہیں۔ ان کے دل کو ایسے سکون ملتا ہے تو ٹھیک ہے۔ انہیں جانے دو۔ آجائیں گے کل پرسوں تک۔"

"غالب اور نازو کی طرف بھی گیا تھا کوئی؟"

"منظر بھائی نے سب کو منع کردیا ہے۔ ارے ہاں۔" اس نے ایک دم چیخ ماری "آپ نے کہا تھا کہ ایک تحفہ ہے میرے لئے۔"

میں گڑبڑا گیا "تحفہ... ہاں کہا تو تھا۔"

"پھر کہاں ہے وہ تحفہ؟"

میں اسے کیا بتاتا کہ میری مراد پیڈرو سے تھی جو میرے جال میں گرفتار ہو کے نکل گیا تھا اور ٹیلی فون پر میں نے اسی کو تحفہ کہا تھا۔

نکی نے منہ پھلا کے کہا "جھوٹ بولا تھا مجھ سے۔ اُلو بنایا تھا۔"

اچانک میرے ذہن میں گاڑی کا خیال آگیا۔ میں نے قہقہہ مار کے کہا "اُلو تو ہو تم۔ وہ ایسا تحفہ تو ہے نہیں کہ یہاں لا کے تمہارے ہاتھ پر رکھ دوں۔"

وہ کنفیوز نظر آنے لگی "بتائیں نا کیا ہے؟"

میں اسے ہاتھ پکڑ کے باہر لے گیا "یہ... یہ گاڑی... یہ ہے تمہارا تحفہ۔"

اس نے مجھے بے یقینی سے دیکھا "یہ گاڑی... میرے لئے۔"

میں نے کہا "کیوں۔ پسند نہیں آئی کیا؟"

اس کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا "یہ تو بہت خوب صورت ہے۔ بہت اچھی ہے۔ یہ آپ نے سچ مچ میرے لئے خریدی تھی؟"

نکی کے لئے گاڑی کوئی انوکھی چیز نہیں تھی۔ اس کے باپ کے گھر میں ایک نہیں دو کاریں تھیں جو اس سے کہیں زیادہ قیمتی تھیں۔ بعد میں وہ نکی کی ملکیت ہوگئی تھیں۔ نکی کے شوہر کے پاس بھی ایک گاڑی تھی مگر ساری خوشی تحفے کی تھی۔ اسے زندگی میں مختلف مواقع پر ہر طرح کے تحفے ملے ہوں گے۔ کبھی سالگرہ پر۔ کبھی سال نو پر تو کبھی عید پر لیکن اتنا قیمتی تحفہ کسی وجہ کے بغیر اسے کسی نے نہیں دیا تھا۔ کسی نے اسے کار تحفے میں نہیں دی تھی۔ ورثے میں ملنے والی گاڑیاں بک چکی تھیں صرف ایک شوہر کی تھی اور اب یہ کار اس کی ہوگئی تھی۔ وہ خوشی سے پاگل ہوگئی۔ اس نے کار کو اندر سے باہر سے دیکھا۔ اس پر پیار سے ہاتھ پھیر کے دیکھا۔ اندر بیٹھ کے دیکھا اور پھر باہر آ کے میرا ہاتھ پکڑلیا۔

"تھینک یو... تھینک یو ویری مچ۔" وہ سخت جذباتی ہو رہی تھی "لیکن......"

"لیکن کیا....؟" میں نے مسکرا کے کہا۔

"یہ تحفہ صرف میرے لئے ہی کیوں؟ اور لوگ بھی ہیں۔"

"تم یہ سمجھ لو کہ تحفہ ہم سب کی طرف سے ہے۔" میں نے کہا۔

"لیکن کیوں؟ ایسی کیا بات تھی؟"

میں نے کہا "جو کچھ تم نے ہم سب کے لئے کیا ہے نکی۔ اس کے بدلے میں تو یہ کچھ بھی نہیں۔ میں نے سوچا کہ ویسے تو خدا نے سب کچھ دیا ہے تمہیں۔ کوٹھیوں اور کاروں کی تمہیں کمی نہیں۔ مگر یہ کار مجھے پسند آگئی تھی تمہارے لئے۔ بس میں لے آیا۔"

نکی رونے کے قریب ہوگئی "سکندر بھائی۔ وہ سب کوٹھیاں اور کاریں مجھے ورثے میں مل گئیں ورنہ میں نے تو انہیں ٹھکرا دیا تھا۔ یہ کون نہیں جانتا کہ ڈیڈی نے اتنی دولت کیسے اکٹھی کی تھی۔ اس کار کی بات کچھ اور ہے۔ یہ میری ہے۔ آپ نے خلوص اور محبت کے ساتھ دی ہے مجھے۔ یہ تو اصل کار ہے۔ اگر کھلونا کار بھی ہوتی تو میں اسے سنبھال کے رکھتی اور کہتی تھینک یو۔"

"اچھا اب تم اچھی بچی کی طرح اندر جا کے اچھی سی چائے بناؤ میرے لئے اور اچھی اچھی چیزیں کھانے کے لئے لاؤ۔"

"آپ نہا دھولیں۔ ابھی تک جوتے بھی نہیں اُتارے۔"
میں نے کہا "مجھے جانا ہے۔ پہلے محسن کی طرف۔ پھر غالب اور نازو کو دیکھنے کے لئے اور بھی بہت سے کام ہیں۔"
"محسن کے گھر پہنچنا کوئی آسان کام ہے؟ وہ خود ہی لے جا سکتا ہے ان گلیوں میں۔" نکی نے اندر جاتے ہوئے کہا۔
اسی وقت محسن گیٹ پر نمودار ہوا۔ اس کی نظر دھوکا نہیں کھا سکتی تھی "آپ کی تعریف؟" وہ ہاتھ ملا کے بولا "کس سرکس کے مسخرے ہیں آپ؟ یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟"
میں نے کہا "ہم شجاعت علی بغدادی ہیں۔"
"ایک فلم تھی بغداد کا چور۔ کیا وہ آپ کی زندگی پر بنی تھی؟" وہ گاڑی کو غور سے دیکھ کے بولا "اور یہ کیا چیز ہے۔ دیکھنے میں تو کار لگتی ہے۔"
"اس سوال کا صحیح جواب تمہیں نکی دے گی۔" میں نے کہا "تُو جواب دے کہ اکیلا کیوں آیا ہے۔ گل کہاں ہے؟"
"گھر والی گھر میں۔" محسن بولا "تو بھی اب آجا اپنے فرنچ وکیل والے روپ میں۔ ہمیں جانا ہے۔"
"کہاں جانا ہے۔ میں تو تجھ سے ملنا چاہتا تھا۔ بہت سی باتیں کرنی تھیں۔" میں نے کہا۔
"باتیں ہوتی رہیں گی۔ ٹھیک دو بجے پولیس ہیڈ آفس پہنچنا ہے۔"
"میں نے گھڑی دیکھی "ڈیڑھ گھنٹا ہے ابھی۔ پروگرام کیا ہے؟"
"ایس ایس پی جاوید صدیقی ایک سنسنی خیز ڈرامے کا ڈراپ سین کرے گا۔" محسن نے کہا۔
"میں نے سُنا ہے کہ نیا ایس ایس پی آگیا ہے۔"
"بالکل ٹھیک سنا ہے آپ نے۔ جاوید صدیقی آج چارج اس کے حوالے کرے گا۔ لیکن اس سے پہلے وہ ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرے گا اور اس میں ہوگا دھماکا۔"
"پولیس ہیڈ آفس میں دھماکا؟"
"ہاں۔ اس نے پریس کانفرنس بلانے کی ذمّے داری مجھے سونپی تھی۔ ارشد کریم سے اس نے صرف یہ کہا ہے کہ وہ دو بجے چارج دینے آئے گا۔ وہ کئی دن سے روپوش تھا۔ اس کے آنے سے پہلے ہی صحافی وہاں پہنچ جائیں گے۔ جاوید صدیقی اعلان کرے گا کہ اس نے چوہدری دلاور کو کہاں سے کب اور کیسے گرفتار کیا تھا۔ اسے پولیس کی تحویل میں کہاں رکھا گیا ہے۔"
"اسے یہ بیان دینے کی اجازت کون دے گا؟"
"ابھی تک ایس ایس پی کا چارج اسی کے پاس ہے۔ چارج کے بغیر ارشد کریم اس کی جگہ نہیں لے سکتا۔ اجازت کی ضرورت جاوید صدیقی کو نہیں۔ ارشد کریم کو ہوگی کہ وہ اس کے کمرے میں اس کی سیٹ پر بیٹھ جائے۔ دلاور کی گرفتاری کا اعلان کرنے کے بعد جاوید صدیقی بتائے گا کہ اس پر اوپر سے کس قسم کا دباؤ تھا۔ وہ نام لئے بغیر یہ بات کہے گا کہ افسرانِ بالا اس سے کیا توقع رکھتے تھے؟ جھوٹا حلف نامہ عدالت میں داخل کرنا اس کے لئے ناممکن تھا۔ اس نے سارے حقائق عام کردیے ہیں اور یہ سرکاری قواعد و ضوابط کی خلاف ورزی ہے تو وہ ہر سزا بھگتنے کے لئے تیار ہے اور چونکہ وہ حق پر ہے اس لئے وہ چارج نہیں دے گا۔ استعفیٰ دے گا۔ احتجاجاً۔"
"اس حد تک جائے گا وہ؟"
"جاوید صدیقی سخت مشتعل ہے۔ اور دل شکستہ۔ اس نے ایمانداری اور فرض شناسی کا ثبوت دیا ہے تو اس کے ساتھ مجرموں جیسا سلوک کیا جارہا ہے۔ محکمہ اسے اعلیٰ کارکردگی دکھانے پر انعام دینے کے بجائے سزا دینا چاہتا ہے۔ اس کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے وہ پریس کانفرنس میں استعفیٰ دے گا۔"
"ابھی وہ کہاں ہے؟"
"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم۔ وہ ٹھیک وقت پر نمودار ہوگا۔"
"فرض کرو ارشد کریم نے پریس کانفرنس کی اجازت نہ دی۔"
"وہ کون ہوتا ہے اجازت نہ دینے والا۔ ابھی تو اس نے جاوید صدیقی کی جگہ ہی نہیں لی ہے لیکن میں نے اس کا بھی بندوبست کرلیا ہے۔ وہ چند سرکردہ صحافی ہوں گے جنہیں ارشد کریم کی طرف سے ہی مدعو کیا گیا ہے۔ ان سے پنگا لے کر ارشد کریم اپنے حق میں بُرا کرے گا۔ صحافیوں میں جاوید صدیقی کے بیان اور استعفیٰ کی نقول تقسیم کردی جائیں گی۔ کیا بگاڑ سکتا ہے کوئی اس شخص کا جو اپنا مستقبل داؤ پر لگانے کا فیصلہ کرچکا ہو۔"
میں نے کہا "اگر آپ اجازت دیں تو میں آدھے گھنٹے میں شجاعت علی بغدادی سے پھر فرنچ وکیل کا روپ دھار لوں۔"
"اس کے لئے آدھا گھنٹا درکار ہے؟"
میں نے کہا "فرنچ وکیل کا حُلیہ تو میں پانچ منٹ میں بنالیتا ہوں۔ کافی پریکٹس ہوگئی ہے مگر جو میک اپ اس وقت میں نے کر رکھا ہے۔ یہ ذرا مشکل سے اُترے گا۔ نکی چائے بنا رہی ہے آپ اس سے براہ راست کچن میں جا کے اس گاڑی کے بارے میں وہی سوال کریں جو مجھ سے کیا تھا۔ اگر ہمت ہے؟"
"ہاں ہاں پھر بولیں گے۔ ہم کوئی ڈرتے ہیں کسی سے؟"
جب میں باتھ روم میں چہرہ صاف کررہا تھا اور شیو بنا رہا تھا تو کچن سے محسن اور نکی کے چیخ چیخ کرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔
"نکی۔ یہ باہر کیا چیز کھڑی ہوئی ہے؟"
"کون سی چیز۔ باہر تو بہت کچھ کھڑا ہوا ہے۔ پودے درخت بجلی کا کھمبا اور خود آپ کھڑے ہوئے تھے۔"
"وہ جس کے چار پہیے ہیں۔ تقریباً گول۔ اس پراٹھے کی شکل کے جو تم بناتی ہو۔ اوپر ایک ڈبا سافٹ ہے۔"
"وہ گاڑی مجھے سکندر نے تحفے میں دی ہے۔"
محسن نے قہقہہ مارا "بہت بدمعاش ہے یہ سکندر بھی۔ ہر فضول اور ناکارہ چیز کسی کو تحفے میں پیش کردیتا ہے۔ آدمی مروت میں انکار بھی نہیں کرسکتا احسان خواہ مخواہ کا۔ چلتی ہے یہ گاڑی؟ اور چلتی ہے تو سیدھی یا اُلٹی۔"
"آپ جل کر کوئلہ ہوچکے ہیں اس لئے ایسی باتیں کررہے ہیں۔ ایسی شاندار کار ہے۔"
"کار؟" محسن پھر ہنسا "خیر تم کہتی ہو تو مان لیتا ہوں مگر نکی۔ اس پر سوار ہو کے باہر مت جانا۔ لوگ ہنسیں گے اور کتے بھونکتے ہوئے دوڑیں گے تمہاری طرف۔ بڑی بے عزتی کی بات ہے تمہارے لئے ایسی گاڑی میں جانا۔"
"آپ کو کیا معلوم گاڑی کیا ہوتی ہے۔"
"مگر تمہیں تو معلوم ہے۔ ماشاء اللہ سے تمہارے والد ماجد کے پاس کیا شاندار گاڑیاں تھیں۔ تم نے جذباتی ہو کے بیچ ڈالیں ورنہ یہ نوبت نہ آتی۔ آج تم ایسی پھٹیچر گاڑیاں تحفے میں قبول کرنے پر مجبور نہ ہوتیں جن کے مقابلے میں گدھا گاڑی بہت ویلیو رکھتی ہے۔"
"تمہیں تو آج تک کسی نے گدھا گاڑی بھی نہیں دی تحفے میں۔"
میں نے غسل خانے سے منہ نکال کے کہا "میں دے سکتا ہوں مگر پھر گل اسے آگے باندھ دے گی۔"
کچھ دیر بعد ہمیں یہی گاڑی لے جانی پڑی۔ میری اپنی فاکس ویگن تو ماڈل ٹاؤن کے گھر "وزیر منزل" میں کھڑی ہوئی تھی۔ رابعہ اور وقار اپنی اپنی گاڑی میں کورٹ گئے تھے۔ نکی نے کہا "محسن اب تم مت بیٹھنا اس گاڑی میں۔ بڑی بے عزتی ہوگی۔ کُتے پیچھے لگ جائیں گے۔"
محسن نے خوش ہو کے کہا "اس کا مطلب ہے تم نے کافی برا مانا ہے۔ میری بات تمہارے دل میں یا کلیجے میں تیر کی طرح لگی ہے۔ تم اگر رشوت دو مجھے۔ شام کو مرغ مسلّم کھلانے کا وعدہ کرو تو میں اس گاڑی کی تعریف کرسکتا ہوں بلکہ اسے مرسڈیز سے بہتر ثابت کرسکتا ہوں۔"
"کوئی ضرورت نہیں۔" نکی نے خفگی سے کہا۔
"پھر میں مجبوراً اس میں بیٹھتا ہوں۔ حالانکہ یہ میرے لئے باعث شرم ہے۔" محسن نے گاڑی کو لات ماری اور میرے ساتھ بیٹھ گیا۔
"بدتمیز۔" نکی نے چلّا کے کہا "اللہ کرے پاؤں ٹوٹ جائے تمہارا۔"
باہر آنے کے بعد محسن بولا "یار گاڑی واقعی شاندار ہے لیکن نکی کو تحفے میں دینے کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔ موقع بھی کوئی نہیں......"
میں نے اسے وجہ بتادی کہ اصل تحفہ تو استاد پیڈرو تھا مگر وہ ہاتھ سے نکل گیا تو مجھے یہ گاڑی ہی نکی کو دینی پڑی۔ ہوٹل میٹروپول میں میری کے ڈیڈی قیوم ڈسکوی سے استاد پیڈرو کے پارٹنر سیٹھ قاسم سے ملاقات تک تمام واقعات محسن نے بڑی دلچسپی سے سُنے۔
"تو یہ ہے وجہ استاد پیڈرو کے نظر نہ آنے کی۔ میری بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس ڈرامے کا اتنا اہم کردار اچانک غائب کیسے ہوگیا۔ وہاں وہ شیخ مختار بنا ہوا ہے۔" محسن بولا۔
"ہاں۔ یہ معلوم کرنے کا تو موقع ہی نہیں ملا کہ آخر وہ یہاں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے کراچی کیوں چلا گیا۔ اس نے پٹڑی بدل لی یہ دیکھتے ہوئے اب کھیل ختم ہونے کو ہے یا دلاور نے رانا اور ڈاکٹر شاہ جیسے پارٹنر بنائے تو پیڈرو کی اہمیت نہیں رہی اور اس نے عزت اسی میں دیکھی کہ دودھ کی مکھی کی طرح نکالے جانے سے پہلے خود چلا جائے۔"
محسن نے سرہلایا "دھندا تو اب بھی اس کا وہی ہے جو پہلے تھا۔ ناجائز اسلحے کی فروخت۔"
"اور وہ کر بھی کیا سکتا ہے۔ میں نے سیٹھ قاسم کو خبردار کرنا اس لئے ضروری سمجھا کہ وہ شریف آدمی بے خبری میں مارا جاتا۔"
محسن بولا "خیر شریف آدمی تو اب بھی مارا جائے گا اگر اس نے پیڈرو کو پھنسایا۔"
میں نے کہا "وہ پُرانا جہاں دیدہ بڈھا ہے۔ اس کے وسیع تعلقات ہیں اور دیکھنے میں وہ سیدھا سادہ لگتا ہے مگر بے وقوف نہیں ہے۔ بے وقوف ہوتا تو اتنی ترقی نہیں کرسکتا تھا۔ پیڈرو کو وہاں کون جانتا ہے۔ یہاں تو اسے دلاور اینڈ کمپنی کی حمایت حاصل تھی چنانچہ وہ کچھ بھی کرے اس پر حرف نہیں آتا تھا۔
"مجھے شک گزرتا ہے کہ اس نے بھی دلاور کے دشمنوں کا ساتھ دیا ہوگا۔ رانا نے تو فرض کرلیا تھا کہ دلاور کی ملکِ عدم سے واپسی کا کوئی امکان ہی نہیں۔ اس نے دلاور کی بیوی اور اس کے بچّوں کا قصہ پاک کرنے کا پلان بھی بنالیا تھا۔ قسمت نے دلاور کی بیوی کو بچالیا۔ انہونی ہوگئی یعنی اسے بچایا بھی تو وسیلہ بنایا ہمیں۔ یہ قدرت کے کھیل ہیں۔ دلاور کے دشمن یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ بازی ایسے پلٹ جائے گی اور ان کی یقینی فتح کو ہم شکست میں بدل دیں گے۔ دلاور کی بیوی نے سازشی عناصر کو پہچان لیا تھا اور اپنی پریس کانفرنس میں سب کا بھانڈا پھوڑ دیا تھا۔ دلاور اس سے پہلے ہی فرار ہوگیا ہوگا۔"
"اتنی جلدی وہ کراچی پہنچ کے سیٹھ قاسم کا پارٹنر بھی بن گیا؟" محسن نے کہا۔
"یہ ہوسکتا ہے کہ اپنے کاروبار کی بنیاد اس نے پہلے ہی رکھ دی ہو۔ اس کے ذہن میں یہ بات ہوگی کہ ایک نہ ایک دن چوہدری دلاور اس کی چھٹی کردے گا۔ وہ ویسے بھی دلاور کا ماتحت تھا۔ بزنس

پارٹنر نہیں تھا۔ وہ دلاور کی برابری کا دعویٰ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ دلاور کے پارٹنر تھے میرے والد وزیر خان اور میر شرافت علی مرحوم۔ اور اب ان کی جگہ لے چکے ہیں شوکت رانا اور ڈاکٹر شاہ جیسے لوگ مگر دلاور کی حیثیت پھر بھی وہی ہے جو پہلے تھی۔ خود دلاور کے سامنے سیاست کے میدان میں طبع آزمائی کے بلند ارادے تھے اور اسے اپنے ماضی سے دامن چھڑانے کے لئے پیڈرو جیسے لوگوں کی ضرورت نہیں تھی۔ ان سے وہ پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔ یہ سب دیکھتے ہوئے پیڈرو نے پہلے سے اپنا بندوبست کرلیا تھا۔ نہ جانے کب سے وہ سیٹھ قاسم پر ڈورے ڈال رہا ہوگا اور شیخ مختار کی حیثیت سے اس کا پارٹنر بننے کی کوشش میں مصروف ہوگا۔ اس نے یقیناً سیٹھ قاسم کو سرمایہ فراہم کیا ہوگا اور اصل آمدنی ہوگی ناجائز اسلحہ بیچ کے مگر اس نے ظاہر کیا ہوگا کہ اس کے شامل ہونے سے کاروبار چمک اُٹھا ہے اور منافع بڑھ گیا ہے۔"

محسن نے کہا "افسوس کہ قسمت نے اسے بھی بچالیا۔"

"خدا کی مصلحت خدا ہی جانے۔" میں نے کہا "جب وقت آئے گا تو شامتِ اعمال پیڈرو کو ضرور گھیر کر ہمارے پاس لے آئے گی۔" میں نے کہا "مجھے تھوڑی سی فکر ہے اکرام شیخ کی۔"

"مجھے اس کی بات سن کے افسوس ہوا۔ اتنا خودغرض اور کمینہ ہوگیا ہے وہ۔ اس نے صاف کہہ دیا کہ ہمارا ساتھ نہیں دے سکتا۔ بہن کے بارے میں بھی کسی تشویش کا اظہار نہیں کیا۔"

میں نے کہا "تشویش اسے تب ہوتی جب میں نازو کے بارے میں حقیقتِ حال بتاتا۔ میں نے تو کہہ دیا کہ سب ٹھیک ہیں پھر وہ کیوں پریشان ہوتا۔ اس نے اچھا کیا کہ منافقت نہیں کی۔ اپنی مجبوری کا اعتراف کرلیا۔ ہم اس سے توقعات وابستہ کرلیتے تو مایوسی ہوتی۔"

"کیا تُو نے واقعی محسوس نہیں کیا کہ وہ بدل گیا ہے؟"

میں نے کہا "تبدیلی یقیناً آگئی ہے۔ وہ پہلے جیسا پُرجوش نہیں تھا۔ اس نے اور کاجل نے تم سب کے بارے میں پوچھا ضرور۔ لیکن ایسے ہی جیسے کوئی اپنے پنڈ ہو کے آئے تو دور دراز کے رشتے دار پوچھتے ہیں کہ ہاں بھئی سنا کیا حال ہے ماے فضل دین کا اور چاچا کرم دین ابھی تک زندہ ہے یا مرگیا۔ اور نمبردار کے پتر کا کیا ہوا جس نے بھوری بھینس کی چوری کرنے پر ایک مزارع کو قتل کردیا تھا۔ جس کی بھوری آنکھوں والی بہن اسے پسند آگئی تھی۔"

محسن نے افسوس سے سر ہلایا "ایسا ہی ہوتا ہے کبیر خان' آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔ سامنے ہو کوئی تو رشتہ کمزور نہیں پڑتا اور جذبات سرد نہیں پڑتے۔"

میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا "چھوڑ یار۔ سب تیری طرح نہیں ہوسکتے۔ ہر آدمی کبھی نہ کبھی کسی کمزوری سے مار کھاجاتا ہے۔ اور اکرام شیخ تو اپنی گاڑی دے رہا تھا۔"

"چھوڑ یار۔ یہ پیسہ ہی ہے جس نے اس کو بزدل بنادیا ہے۔ تو نے اچھا کیا جو اس کی گاڑی نہیں لی۔ زیادہ اچھا ہوتا اگر ابھی اسے دے آتا اپنی طرف سے کہ لے بیٹا۔ وہ گاڑی تو تحفہ کی ہے نا یہ ہماری طرف سے تیرے لئے۔ جوتا پڑتا منہ پر۔"

"بس مجھے خیال نہیں آیا ورنہ میں ایسا ہی کرتا۔ خیر ہوائی جہاز سے۔ خیر گئی خوش ہوگئی۔ اکرام شیخ صرف شریف اور ہمیں کیا ضرورت ہے کسی کے منہ پر جوتا مارنے کی۔ وہ نازو کا بھائی ہے اور دوست بھی رہے گا۔ کل ہم سب لاہور سیٹل ہوجائیں گے تو ایک ہوجائیں گے۔" میں نے کہا۔

ڈیڑھ بجے میں نے گاڑی کو پولیس ہیڈ آفس کے پارکنگ میں کھڑا کردیا پھر میں اور محسن ٹہلتے ہوئے گیٹ پر آگئے۔ ابھی کسی اخبار کا کوئی نمائندہ نہیں پہنچا تھا۔ محسن نے بتایا کہ ٹھیک دو بجے ایس ایس پی جاوید صدیقی کے ساتھ ہی آئے گا۔ دو چار منٹ کے فرق سے۔

مجھے کچھ شک ہوا "کیا نئے ایس ایس پی کو علم ہے کہ کوئی پریس کانفرنس بھی ہوگی۔"

"نہیں مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ دعوت خود اس کی طرف سے ملی ہے سب کو' اس نے بُلایا ہے صحافیوں کو۔"

"اسے معلوم نہیں مگر بُلایا اس نے ہے۔ یہ کیا بات ہوئی؟"

محسن ہنسا "یہ ڈراما ہم نے کیا ہے۔ صحافیوں کو شک اس لیے نہیں ہوا کہ جب کوئی ایسی ویسی بات ہوتی ہے تو انہیں آفس سے فون ریسیو ہوتا ہے۔ پی آر او کی طرف سے۔ پی آر او ہے ایک ریٹائرڈ بڈھا ڈی ایس پی۔ اس کی آواز کی نقل میں نے اتاری تھی۔"

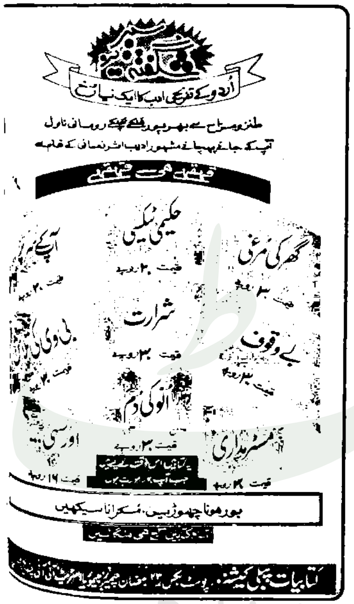

اور خیالی ہے۔ وہ غالباً شوکت رانا یا ڈاکٹر شاہ کی قید میں تھا جہاں اس پر تشدد کیا گیا اور اس کے ذہن کو بدلنے کے لیے دوائیں دی گئیں جن کے زیرِ اثر وہ یہ سب کچھ کہہ رہا ہے۔ یہ سب اس کے دماغ میں ڈالا گیا تھا جو اس کے بیان میں شامل ہے ورنہ درحقیقت نہ کہیں ایسا تہ خانہ ہے اور نہ دلاور کے ساتھ وہ سب ہوا ہے جو وہ کہتا رہا ہے۔"

میں نے کہا "اتنا بڑا جھوٹ بول سکیں گے ہم؟"

"اس جھوٹ کے بغیر تو گزارا ہی نہیں ہمارا۔ چوہدری دلاور جیسے لوگوں کے ساتھ سچ بول کے کون جیت سکتا ہے۔ عیاری مکاری اور بے ایمانی' دھوکا فریب' کون سا عیب ان کی شرع میں جائز نہیں۔ اسی لیے آج تک قانون ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکا کہ نظامِ انصاف کو ان کے خلاف ثبوت اور شہادت نہیں ملی۔ لاقانونیت کا توڑ لاقانونیت ہی رہ گیا ہے تو پھر ٹھیک ہے۔ ایم آر ایس کا اصول بھی یہی تھا کہ اینٹ کا جواب پتھر۔ دشمن کو اسی کے سکّوں میں ادائیگی کرو۔ جیسے کو تیسا۔"

"یہ تو انگریزی محاورے کی بات ہے مگر میرا خیال ہے کہ اب ہمیں اس تہ خانے کا وجود مٹانا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ چوہدری دلاور کا ذہن رابعہ کے گھر کی طرف چلا جائے۔ وہاں ایک محل جیسی عمارت اسی نے بنوائی تھی اور اسی نے تباہ کرادی تھی مگر نقشہ تو نہیں بھولا ہوگا وہ۔ وہ چالاک آدمی ابھی تک خاموش ہے۔ اس نے بھری عدالت میں نشاندہی کردی کہ وہ تہ خانہ کہاں ہے تو عدالت خود معائنہ کرکے تصدیق کرلے گی۔"

محسن مسکرایا "یہ سب بھی کرلیا ہے میں نے۔ اب جاکے ملاحظہ کروگے تو وہاں کچھ نہیں ملے گا۔ رابعہ کے گھر کا خالی پلاٹ بالکل خالی ہے۔ نہ وہاں کوئی خیمہ ہے اور نہ کوئی باکس۔ تہ خانہ میں نے بالکل صاف کرادیا تھا۔ ہر چیز کباڑی خود سمیٹ کرلے گیا پھر راتوں رات مزدوروں نے فرش کھود ڈالا تو سارا ملبہ نیچے گرا اور تہ خانہ بھر گیا۔ وہاں بلڈوزر کام کررہے ہیں۔ رابعہ نیا مکان بنوا رہی ہے۔ دلاور کا بیان ہونے تک بھرائی مکمل ہوجائے گی۔ شاید بنیادیں بھی نظر آنے لگیں گی۔ کیسا تہ خانہ اور کہاں کا تہ خانہ۔ چوہدری دلاور نے تو ہمیں مروانے کا انتظام کیا تھا مگر دھماکا ہوا تو ہم یہاں نہیں تھے۔ مکان اسی دن ملبے کا ڈھیر بن گیا تھا۔ کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ جس کا دل چاہے جاکے سائٹ کا معائنہ کرلے۔ اسی پرانے نقشے پر نئی عمارت تعمیر ہورہی ہے مگر تہ خانہ نہیں ہے اس میں۔ تصدیق ہوجائے گی۔"

"ویری گڈ۔ دو دن میں بہت کام کیا تُو نے۔ گل کو بھی شفٹ کروایا۔"

"گل کو میں نے نہیں وقار نے شفٹ کیا ہے۔ مجھے تو ابھی خود بھی علم نہیں کہ میرے بیوی بچے کہاں ہیں۔" محسن ہنسا "میں آرہا ہوں سیدھا سائٹ سے۔ ایک ٹھیکیدار دن رات کام کررہا ہے یہ

میں نے کہا "اس کا مطلب ہے اچھا خاصا تماشا ہوگا۔ خیر ابھی کچھ دیر ہے۔ تو بتا کہ جاوید صدیقی کہاں روپوش تھا۔ میں تو اسے تیرے ساتھ چھوڑ کر گیا تھا۔ مجھے رابعہ نے بتایا کہ تم دونوں رات بھر اس خونخوار لیڈی ڈاکٹر فاطمہ جعفری سے تفتیش کرتے رہے تھے؟ وہ مرگئی تھی؟"

"جاوید صدیقی میرے ساتھ تھا مگر میں خود اسے وہاں لے جانا نہیں چاہتا تھا جہاں فاطمہ جعفری تھی۔ وہ بہت ذہین آدمی ہے۔ فوراً سمجھ جاتا کہ اسی تہ خانے میں ہم نے چوہدری دلاور کو بھی قید کررکھا تھا اور چوہدری دلاور کی بیوی نے غلط نہیں کہا تھا کہ وہ اپنے شوہر سے ایک تہ خانے میں ملی تھی۔ اسے ملوانے کے لیے خود سکندر بخت لے گیا تھا اور وہاں چوہدری دلاور انتہائی قابلِ رحم اور غیرانسانی حالت میں پابندِ سلاسل تھا۔ جاوید صدیقی کو پہلے بھی شک تھا کہ دلاور کے اغوا کا الزام سازش کے تحت شوکت رانا پر عائد کیا گیا ہے۔ جب اس نے یہ بات کہی تھی تو اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔ وہ تہ خانہ دیکھ لیتا تو یہ بھی پتا چل جاتا کہ وہ جگہ رابعہ کی ملکیت ہے۔ جاوید صدیقی نہ دلاور کا دشمن ہے اور نہ ہمارا دوست۔ وہ صاف گو' ایماندار اور فرض شناس آدمی ہے۔ اس سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ فاطمہ جعفری کو غیرقانونی قید سے رہائی دلانے کے لیے مجھ پر دباؤ ڈالتا۔ وہ کوئی غیرقانونی کام پسند نہیں کرتا۔ وہ مجھ پر حبسِ بے جا اور اغوا کا مقدمہ کردیتا اور شاید مجھے گرفتار کرادیتا۔ اس کے بعد وہ خود چوہدری دلاور کی بیوی کے بیان کی تائید کرتا اور چوہدری دلاور جب ہم پر یہ الزام لگاتا کہ ہم نے اس کو کس طرح قید میں رکھ کے اذیت دی تو جاوید صدیقی خود اس ظلم کا چشم دید گواہ بن جاتا۔ وہ عدالت کو بتاتا کہ میں نے خود وہ جگہ دیکھی ہے اور ان انسانیت سوز حالات کا بھی مشاہدہ کیا ہے جہاں سکندر بخت اور محسن نے چوہدری دلاور کو زنجیروں میں باندھ کے رکھا تھا۔ جب وہ مرنے کے قریب ہوگیا تو وہ اسے اُٹھا کے شوکت رانا کے گھر میں ڈال آئے۔ خود ہی پولیس اور اخبار والوں کو بلالیا اور اسے گرفتار کرادیا۔ شوکت رانا کے گھر میں جو کچھ ہوا اس کے ذمے دار وہی دونوں ہیں۔ شوکت رانا تو صاف بچ جاتا۔ قتل ڈکیتی اور آتش زنی کے سارے الزامات ہم پر آجاتے۔ دلاور کے سابقہ جرائم کی نوعیت تو نہ بدلتی مگر اس صورتِ حال کے سامنے آتے ہی ہم ظالم بن جاتے اور وہ مظلوم کہلاتا۔"

میں نے اس کے کندھے پر تھپکی دی "تم نے دوراندیشی سے کام لیا برخوردار۔ ہم خوش ہوئے تمہاری دانائی اور فہم و فراست پر۔"

محسن نے اپنی بات جاری رکھی "اب تو ہم ڈٹ کے جھوٹ بول سکتے ہیں اور سچ بتانے والوں کو بھی جھوٹا کرسکتے ہیں۔ چوہدری دلاور کی بیوی کہتی ہے تو بتائے کہ وہ تہ خانہ ہے کہاں۔ چوہدری دلاور نے اسیری کے حالات کا جو دردناک نقشہ کھینچا ہے وہ فرضی

ثابت کرنے کے لیے کہ کام تو دو ہفتے سے چل رہا ہے۔ وہ بھی اپنا ہی آدمی ہے۔ منظر نے کسی کیس میں اس کی پیروی کی تھی اور اسے سزائے موت سے بچا کے صاف بری کرالیا تھا۔ وہ لاہور کارپوریشن کا پرانا ٹھیکے دار ہے۔ اس نے بیک ڈیٹ میں نقشہ وغیرہ پاس کرا کے کام شروع کردیا۔ کہہ رہا تھا کہ تہ خانے کو تو میں کنکریٹ سے ایسا بھروں گا کہ کوئی پھر کھود کے دکھادے۔ وقار نے آفس کے کسی چپراسی سے مکان کی بات کی تھی۔ یہ نہیں بتایا تھا کہ کس کے لیے چاہیے۔ یہ کہا تھا کہ جگہ کچھ محفوظ ہونی چاہیے۔ وہ چپراسی خود لے گیا گل کو اور ربولی کو۔"

"کہاں سے لے گیا؟"

"گل آفس میں آگئی تھی برقعہ اوڑھ کے۔" محسن نے کہا۔

اب دو بجنے والے تھے۔ فاطمہ جعفری کے بارے میں کوئی بات کرنے کے لیے وقت ہی نہیں رہا تھا۔ ٹھیک دو بجے ایک کار گولی کی طرح اندر آئی۔ اس میں چھ سات افراد ٹھنسے ہوئے تھے۔

محسن نے کہا "اخبار والے تو آگئے۔"

"ہم ان کے ساتھ چلیں یا انتظار کریں جاوید صدیقی کا۔"

محسن نے مجھے آنکھ ماری "پہلے ہم سب مل لیں نئے ایس ایس پی سے، جاوید صدیقی اپنے کمرے میں خود پہنچ جائے گا۔"

اندر آنے والی دوسری گاڑی منظر کی تھی جس میں اس کے ساتھ رابعہ بیٹھی ہوئی تھی۔ محسن اس سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔

منظر نے سر نکال کے کہا "بھوتنی کے۔ پیچھے بھی دو آنکھیں لگوالے۔"

محسن نے کہا "تو اپنی آنکھیں عطیہ کرکے مرجا۔ میں لگوالوں گا۔"

پانچ اخبار والے اور ایک فوٹوگرافر ایک ہی گاڑی میں سے برآمد ہوچکے تھے۔ انہوں نے باری باری سب سے مصافحہ کیا۔ وہ سب پولیس ہیڈ آفس کے راستوں سے واقف تھے اور جانے پہچانے لوگ تھے۔ منظر نے اس جلوس کی قیادت کی اور ہم سیڑھیوں کے راستے اوپر جاوید صدیقی کے کمرے میں پہنچ گئے جہاں اب "ارشد کریم ربانی" کی نیم پلیٹ آویزاں تھی۔

ارشد کریم ربانی کو ابھی ابھی وکیلوں اور صحافیوں کی یلغار کی اطلاع ملی تھی اور وہ فیصلہ نہیں کرپایا تھا کہ انہیں کیسے روکے۔ وہ صرف جاوید صدیقی کا انتظار کررہا تھا جو ٹھیک دو بجے اسے چارج دینے کے لیے آنے والا تھا۔

اس کے دروازے پر کھڑے ہوئے کانسٹیبل نے منظر کو روکنے کی ناکام کوشش کی۔ منظر اکیلا نہیں تھا۔ ایک کمزور سا کانسٹیبل اس کی راہ میں حائل ہوکے کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ منظر نے حسب عادت اسے بھی بھوتنی کا کہا اور اندر گھس گیا "اب ہم ملنے آئے ہیں جاوید صدیقی سے۔ ہمارا اس کا معاملہ کچھ اور ہے۔ ایس ایس پی ہوگا وہ تمہارا۔"

ارشد کریم گڑبڑا کے کھڑا ہوگیا۔ وہ حلیے اور صورت سے روایتی قسم کے پرانے پولیس مین کی تصویر تھا۔ اس کی عمر پچپاس کے قریب تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ اس نے اپنے کیریر کا ایک کانسٹیبل کی حیثیت سے کیا ہوگا۔ بیس پچیس سال میں رینگ کر ترقی کرتے ہوئے اس نے ایس پی کا عہدہ حاصل کر اور اسے عارضی طور پر ایس ایس پی کا عہدہ ملا تھا۔ ایسے لوگ ڈی ایس پی بن کے ریٹائر ہوجاتے ہیں مگر کچھ خوش قسمت ہیں جن کو ذاتی اوصاف کی بنا پر آگے بھی ترقی مل جاتی ہے۔ اوصاف میں ذہانت، کارکردگی کا اعلیٰ ریکارڈ یا تجربہ ہی شمار نہ ہوتا۔ سفارش، سازشی ذہن اور خوشامد پرستی کے عناصر کا دخل ہوتا ہے۔

براہِ راست افسر بننے والے نوجوان نسبتاً کشادہ دل مہذب بھی ہوتے ہیں۔ ارشد کریم کی صورت پر اس کی عمر گز کے سارے تجربات کی تحریر نے ایک ایسی کرختگی پیدا کردی جس میں تھانوں کے ماحول کا عکس نظر آتا تھا۔ اس کے چہرے نقوش میں بے حسی آمیز سفاکی جھلکتی تھی اور صاف ظاہر تھا نفرت اس کی شخصیت میں یوں رچ بس گئی ہے کہ وہ وکیلوں صحافیوں جیسے معزز لوگوں کو بھی مجرم کی نظر سے دیکھنے پر مجبور ہے۔

اس نے میز پر ہاتھ مار کے کہا "واٹ از دس؟"

منظر نے بہترین اداکاری کی "یہ؟ اسے میز کہتے ہیں سرا پر زور سے ہاتھ مت ماریں۔ ٹوٹ جائے گی۔ قدیم چیز ہے اور پرانی ہوگی۔"

باقی لوگ ہنسے اور کرسیوں پر قابض ہوگئے۔ ارشد کریم بے بسی اور غصے سے ہونٹ کاٹتا رہا "کس نے اجازت دی ہے آپ سب کو میرے کمرے میں آنے کی۔"

"ہم بدتمیز لوگ ہیں۔ بلا اجازت ہر جگہ گھس جاتے ہیں۔" ایک صحافی بولا۔

"مگر اس وقت تو مہمان ہیں آپ کے۔ آپ نے ہی بلایا ہمیں۔" دوسرا بولا۔

"میں نے؟" ارشد کریم بگڑ کے بولا "یہ کیا بکواس ہے؟"

اب منظر نے اسے آڑے ہاتھوں لیا "اے مسٹر۔ تم جو ہو۔ زیادہ شور مچانے کی ضرورت نہیں۔ یہ ایس ایس پی جاوید صدیقی کا کمرا ہے۔ سمجھے!"

"یہ میرا کمرا ہے۔ میں ایس ایس پی ارشد کریم ربانی ہوں مجھے جاوید صدیقی کی جگہ پوسٹ کیا گیا ہے۔" ارشد کریم کچھ سنبھل گیا۔

"کب چارج لیا تم نے اس سے؟" یہ سوال میں نے محسن کی معرفت کیا۔

اس نے مجھے گھورا "تو تم ہو وہ چیز؟ دیکھو اس کو ایک بات سمجھا دو میری طرف سے۔ میں جاوید صدیقی نہیں ہوں۔ کہ

ساتھ بیگانہ لے ورنہ میں اس کی ساری فرنچ نکال دوں گا۔"

محسن نے براہِ راست کہا "وہ طریقہ بھی بتادیں مجھے کہ آپ کسی کی فرنچ کیسے نکالتے ہیں تاکہ میں اسے سمجھادوں۔"

اب منظر نے کہا "تم پہلے مجھے یہ سمجھاؤ کہ چارج لیے بغیر تم کیسے نئے ایس ایس پی ہوگئے۔ ویسے تو خاصی پرانی چیز ہو تم بھی۔ مگر جاوید صدیقی کی جگہ بیٹھنے کا اختیار خود تم نے کیسے لے لیا۔"

اچانک جاوید صدیقی چق ہٹا کے اندر آگیا "ہیلو ایوری باڈی۔ ہیلو ارشد؟" اس نے مسکرا کے سب سے مصافحہ کیا اور فرداً فرداً نام لے کے سب کی خیریت دریافت کی۔

ارشد کریم نے اندازہ کرلیا کہ جاوید صدیقی کے سب سے ذاتی سطح پر اچھے مراسم ہیں اور وہ جاوید صدیقی کی عزت کرتے ہیں۔

"سنا ہے آپ جارہے ہیں چارج دے کر؟" ایک صحافی نے کہا۔

"ہاں میں چارج دینے کے لیے ہی آیا تھا مگر آپ لوگ یہاں کیسے؟ سب ایک ساتھ؟"

"ہمیں پریس کانفرنس کے لئے بلایا گیا تھا۔"

ارشد کریم نے زبردستی مسکرا کے کہا "عجیب بات ہے۔ میں نے کسی کو بھی نہیں بلایا تھا مگر یہ لوگ بضد ہیں....."

جاوید صدیقی نے کہا "ارشد کریم۔ اگر تم برا نہ مانو تو ادھر آجاؤ۔ مجھے اپنی درازیں خالی کرنی ہوں گی۔ چارج رپورٹ بنانے کے بعد تم دستخط کردو گے تو میں سیٹ تمہارے لیے خالی کردوں گا۔"

ارشد کریم کو ان سب کے چہروں پر تمسخر آمیز طنزیہ مسکراہٹ نظر آئی جو ابھی چند منٹ پہلے اس کی پوسٹ اور اختیار کو چیلنج کرچکے تھے مگر جاوید صدیقی کو انکار کرنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ اس نے کرسی چھوڑتے ہوئے خود کو سخت بے عزت محسوس کیا اور خون کے گھونٹ پی کے دائیں طرف والی کرسی پر آگیا۔

میں نے محسن سے فرنچ میں کہا "ذرا اس اکڑ فوں خاں سے پھر پوچھ کہ یہ کیا کرے گا میرے ساتھ۔ اسے تھوڑا سا مرچ مسالا لگا۔"

محسن نے کہا "وکیل صاحب پوچھ رہے ہیں کہ نئے ایس ایس پی پولیس کے عام سپاہی جتنی عقل بھی نہیں رکھتے؟ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ان کے الفاظ کو دھمکی سمجھ کے برٹش کونسلیٹ کے پاس رپورٹ ارسال کی گئی تو شاید ان کی وردی اُتر جائے۔"

"کون..... میری وردی اُتروا سکتا ہے۔" اس نے بھڑک کے ایک گالی دی۔

جاوید صدیقی نے بگڑ کے کہا "ارشد کریم۔ زبان کو لگام دو۔ تم ابھی میرے آفس میں بیٹھے ہوئے ہو اور یہاں ایک خاتون وکیل بھی موجود ہیں۔"

"آپ چارج رپورٹ بنائیں....."

"مجھے سر کہو۔ تم بہت جونیئر ہو مجھ سے اور ایس پی ہو ابھی۔ اگر میں چارج رپورٹ بنانے سے انکار کردوں تو تم کیا کرو گے؟"

"یہ تو ڈسپلن کی بات ہے سر۔ آپ کو آرڈر مل چکے ہیں۔"

"فرض کرو میں آرڈر پھاڑ کے پھینک دیتا ہوں۔ ایسے۔" جاوید صدیقی نے سچ مچ پوسٹنگ آرڈر کے پرزے کرکے ردی کی ٹوکری میں ڈال دیے "اب تم جاؤ اور ڈی آئی جی کو رپورٹ کرو۔ وہ میرے خلاف ڈسپلن کی خلاف ورزی پر جو ایکشن لینا چاہیں لے سکتے ہیں۔ وہ مجھے معطل کرسکتے ہیں زیادہ سے زیادہ۔ پھر انکوائری ہوگی اور چارج شیٹ۔ میری ایک سال کی ترقی روک لی جائے گی۔ اس سے زیادہ کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ نہ کوئی مجھے گرفتار کرسکتا ہے اور نہ پھانسی چڑھا سکتا ہے۔"

ارشد کریم کا رنگ فق ہوگیا۔ سب کی نظریں اس کا مذاق اُڑا رہی تھیں اور وہ سخت ذلت محسوس کررہا تھا۔

"تم نے سنا نہیں میں نے کیا کہا۔" جاوید صدیقی بولا "میں نے تم سے کہا ہے کہ میرے آفس سے جاؤ۔ میں چارج نہیں دے رہا ہوں۔ جا کے کہہ دو ڈی آئی جی صاحب سے۔ ان کو یہ بھی بتادینا کہ میں استعفیٰ دے رہا ہوں لیکن اس سے پہلے یہ جو صحافی اور وکیل یہاں آئے ہوئے ہیں۔ میں ان کے سامنے سارے حقائق رکھوں گا۔ تم نے انہیں بلایا ہوگا چارج رپورٹ کی تقریب میں۔ شاندار کوریج کے لیے۔"

"میں..... میں نے کسی کو نہیں بلایا سر۔"

"یہ تم بعد میں وضاحت کرتے رہنا۔ یہ لوگ بہرحال اپنی بات پر قائم ہیں کہ تم نے انہیں مدعو کیا تھا۔ اب میں اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک پریس کانفرنس سے خطاب کررہا ہوں۔ یہ بھی ڈسپلن کی خلاف ورزی ہے لیکن اس کے بعد استعفیٰ دے کر میں ہر ذمے داری سے سبکدوش ہوجاؤں گا۔ آگے جو ڈی آئی جی صاحب کی مرضی۔ وہ میری جگہ تمہیں بٹھادیں یا خود بیٹھ جائیں۔"

ارشد کریم بڑی مشکل سے اٹھا "آپ غلطی کررہے ہیں سر۔"

"شٹ اپ اینڈ گیٹ آؤٹ۔" جاوید صدیقی نے دہاڑ کے کہا۔

غصے سے ارشد کریم کا چہرہ سرخ پڑگیا "میں سمجھ لوں گا تم سے۔" اس نے تپتے ہوئے زیرِ لب کہا۔

"ایک منٹ رکو۔" جاوید صدیقی بولا "اگر میں چاہوں تو تمہیں گرفتار کراسکتا ہوں۔ تم نے دھمکی دی ہے مجھے اور سب نے سنی ہے۔ بیٹھ جاؤ۔"

ارشد کریم بیٹھ گیا "میں فون پر بات کرنا چاہتا ہوں ڈی آئی جی صاحب سے۔"

"کرلینا بعد میں۔" جاوید صدیقی بولا "یہ بتاؤ کہ تم نے میری عدم موجودگی میں کوئی احکامات تو جاری نہیں کیے تھے۔"

"احکامات..... جاری کیے تھے۔ ابھی آؤٹ نہیں ہوئے۔ اسٹینو

کے پاس ہیں۔"

جاوید صدیقی نے انٹرکام پر اسٹینو کو حکم دیا "ارشد کریم صاحب نے جو احکامات دیے ہیں ٹائپ ہونے کے لیے۔ ان پر کس کا نام ہے۔ کیوں؟ کیا وہ چارج لے چکے ہیں مجھ سے؟ ابھی میں انچارج ہوں ایڈیٹ؟" پھر وہ ارشد کریم سے مخاطب ہوا "ابھی تمہیں یہ اختیار نہیں ملا ہے ارشد کریم کہ تم میرے آفس کے معاملات چلانے لگو۔"

سب صحافی اور وکیل خاموش بیٹھے ہوئے قدرے افسوس کے ساتھ یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ حقیقت سے سب آگاہ تھے مگر انتظامی امور میں دخل اندازی کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔

جاوید صدیقی نے اپنے پی اے کو چائے کے لیے کہا اور بولا "آئی ایم سوری جنٹلمین۔ یہ غیر رسمی اور غیر متوقع پریس کانفرنس ہے جس کے لیے شاید آپ بھی تیار نہیں تھے اور میں بھی تیار نہیں ہوں۔ آج آپ کی خاطر تواضع کچھ ادھوری رہے گی لیکن خبر آپ کو بھرپور ملے گی۔ ویسی ہی جیسی آپ لوگ پسند کرتے ہیں۔"

کسی نے کہا "خبر تو صرف خبر ہوتی ہے سر۔ پسند یا ناپسند کا کیا سوال۔"

"میرا مطلب تھا ایک اچھی سنسنی خیز سُرخی کے لیے۔ آپ سب لوگ ایک دوسرے سے واقف ہیں۔ یہاں ایک طرف وکلا ہیں۔ یہ سب مدعی ہیں ڈاکٹر شبلی مرڈر کیس میں۔ جس کی تفتیش کے لیے مجھے بطورِ خاص اسلام آباد سے یہاں بھیجا گیا تھا۔ میرے آنے سے پہلے اس کیس میں جو پیش رفت ہوئی تھی وہ آپ جانتے ہیں۔"

پیش رفت کے لفظ پر کچھ لوگ مسکرائے۔ اس کے آنے سے پہلے تفتیشی ٹیم مع سربراہ بدعنوانی کے الزام میں اندر ہو گئی تھی۔

جاوید صدیقی نے پھر کہنا شروع کیا "جب میں نے تفتیش کے معاملات کو اپنے ہاتھ میں لیا تو مجھے متعدد مسائل کا سامنا تھا۔ یہ کیس مشکل تھا مگر بہت سے کیس مشکل ہوتے ہیں اور میں طبعاً مشکل پسند ہوں۔ شاید اسی لیے یہ چیلنج مجھے دیا گیا تھا جو میں نے قبول کرلیا لیکن دوسری مشکل تھی عدم اعتماد کی فضا کو ختم کرنا۔ کچھ تو ویسے ہی عوام کا پولیس کے رویّے کے باعث یہ خیال ہے کہ سب پولیس والے حرام خور گدھ ہوتے ہیں اور کام اس لیے نہیں کرتے کہ یہ ان کا فرض ہے بلکہ اس لیے کہ ہر کیس میں انہیں مال ملتا ہے اور وہ زیادہ محنت کرتے ہیں زیادہ مالی فائدے کے لیے۔ میں نے اس تاثر کو غلط ثابت کیا۔ جیسے سب صحافی بلیک میلر نہیں ہوتے ایسے ہی سب پولیس والے کرپٹ نہیں ہوتے۔"

ایک صحافی نے کہا "فرق صرف تناسب کا ہے۔ صحافیوں میں ایک فیصد بلیک میلر ہیں پولیس میں ایک فیصد جاوید صدیقی۔"

دوسرے لوگ ہنس پڑے۔ ارشد کریم کا موڈ مزید خراب ہو گیا۔

"اس وقت میں اعداد و شمار سے اس بات کو غلط ثابت کر[illegible] میں وقت ضائع نہیں کروں گا۔" جاوید صدیقی بولا "رائے عا[illegible] خلاف کرنے میں بھی کچھ کردار پولیس کا ہے تو کچھ اخبارات کا[illegible] تعصب کی بنا پر۔ یا اس لیے کہ لوگ ایسا ہی پڑھنا چاہتے ہ[illegible] پولیس کے کردار کو ہر معاملے میں مشکوک بنانے کی کوشش کر[illegible] کرتے ہیں۔ تعریف کرتے ہوئے بھی کچھ صحافی ڈنڈی مار دیتے[illegible] کہ بلاشبہ یہ پولیس کی بڑی کامیابی سمجھی جاسکتی ہے مگر۔۔۔ اس[illegible] کے بعد۔ خیر مجھے اپنی بات کرنی چاہیے۔ میں نے آپ سب سے[illegible] تعاون مانگا اور کچھ عرصے بعد مجھے کامیابی ہوئی۔ اس کیس [illegible] تیسری مشکل یہ تھی کہ مدعی بیک وقت بارہ سینئر وکلا ہیں جو بعد[illegible] گیارہ رہ گئے۔ ایک اکیلا اور دو گیارہ والی بات سنی ہوگی آپ[illegible] اکیلا میں تھا گیارہ کے مقابلے میں۔ میرے سامنے ہر وقت قانون[illegible] تلوار رہتی تھی اور میں سخت دباؤ میں تھا۔ افسوس کی بات یہ ہے[illegible] وکلا نے مجھے اپنا حریف سمجھا۔ حالانکہ ہم حلیف تھے۔"

منظر نے کہا "یہ رشتہ تو سوکنوں جیسا ہے۔ قانون دونوں[illegible] خصم ہے۔ ہماری آپس میں کیسے بن سکتی ہے۔"

سب لوگ ہنس پڑے۔ اسی وقت چائے آگئی۔ جاوید صد[illegible] کی معذرت کے باوجود کہ کچھ ہو نہیں سکا ضیافت کا پورا اہتما[illegible] تھا۔

"اور جناب سب سے بڑی مشکل تھی میرے اپنے محکم[illegible] رویّہ۔" جاوید صدیقی نے چائے پیتے ہوئے کہنا شروع کیا "سب سے زیادہ عدم تعاون کا مظاہرہ خود پولیس نے کیا۔ میں اسباب ک[illegible] وضاحت کرکے اختلاف کو ہوا نہیں دوں گا۔ یہ آپ سب لوگ سمجھ سکتے ہیں کہ وہ کون لوگ تھے جو چاہتے تھے کہ یہ کیس داخل[illegible] ہو جائے۔ مجھ پر بہت دباؤ ڈالا گیا۔ ٹیلی فون کروائے گئے۔ مجھے بلینک چیک آفر ہوا۔ دھمکیاں دی گئیں کہ میں شر[illegible] بنوں اور گڑے مُردے نہ اکھاڑوں لیکن ایک تو حقائق کی پردہ پو[illegible] میرے مزاج اور فطرت کے خلاف ہے کوئی مجھے خرید نہیں سکتا۔"

"کہا یہ جاتا ہے کہ ہر آدمی کی ایک قیمت ہوتی ہے اور[illegible] دعوے کرتا ہے کہ وہ بک نہیں سکتا وہ صرف اپنا مول بڑھا[illegible] ہے۔" ایک صحافی بولا۔

"مول کہاں تک بڑھ سکتا ہے آخر؟" جاوید صدیقی نے[illegible] مانے بغیر کہا "بلینک چیک میں مول تول نہیں ہوتا۔ یہ اختیار[illegible] دے دیا گیا تھا کہ اس پر میں جو رقم چاہوں لکھ لوں۔ وہ چیک تو[illegible] نے واپس کردیا مگر اس کی فوٹو کاپی میرے پاس ہے۔ اس سے[illegible] ثابت نہیں ہوتا کہ وہ چیک مجھے دیا گیا تھا۔ وہ بیئرر چیک تھا۔ لیکن آپ لوگ یہ تو معلوم کرسکتے ہیں کہ وہ اکاؤنٹ کس کا تھا۔ چیک دینے والا کون تھا۔"

اس انکشاف نے تھوڑی سی ہلچل پیدا کی۔ صحافی ایک د[illegible] مستعد ہو گئے۔ کسی نے کہا "وہ فوٹو کاپی دے سکتے ہیں آپ اشاعت[illegible]

کے لیے۔"

"جب میں نے کشتیاں جلانے کا فیصلہ کرلیا ہے تو میں کچھ بھی نہیں چھپاؤں گا۔ حالانکہ اس سے میرے لیے دشواریاں پیدا ہوں گی اور خطرات بڑھ جائیں گے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جو صحیح پولیس مین ہے وہ اس فیلڈ میں قدم رکھتا ہے تو دشواریوں سے نمٹنے کے لیے اور خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے۔ یہ کلرکی نہیں ہے یا ٹھیکے داری نہیں ہے۔ یہاں واسطہ پڑتا ہے مجرموں سے اور مجرموں کے بڑے بڑے گروہوں سے۔ ایسے طاقتور قانون شکن عناصر سے جو ایک ہاتھ میں مال و زر کے خزانوں کی چابی رکھتے ہیں تو دوسرے ہاتھ میں وہ گولی جس پر آپ کا نام لکھا ہوتا ہے اور اگر آپ پہلے ہاتھ کو جھٹکنے کی گستاخی کریں تو دوسرے ہاتھ کی گولی آپ کے سینے میں اُتر جاتی ہے۔ اللہ کا احسان ہے کہ ابھی تک میں کامیاب ہوں اور زندہ بھی ہوں۔ کوئی مجھے فرض کی راہ سے نہیں ہٹا سکا اور میرا ایمان نہیں خرید سکا۔ آگے بھی وہی ہوگا جو خدا چاہے گا لیکن ابھی جو کچھ ہو رہا ہے وہ بہت افسوس ناک ہے۔"

جاوید صدیقی نے ایک گہری سانس لی۔ رومال سے چہرہ صاف کیا اور خاموشی کے ایک ڈرامائی وقفے میں جائزہ لیا کہ وہ کس حد تک صحیح تاثر پیش کرنے میں کامیاب رہا ہے۔

"مجھے آپ سب کو یہ اطلاع دیتے ہوئے خوشی محسوس ہوتی ہے کہ میں نے ڈاکٹر شبلی مرڈر کیس میں قاتل کا سراغ لگالیا ہے اور چوہدری دلاور کو گرفتار کرلیا ہے۔"

یہ اعلان گویا وہ دھماکا تھا جس کے لیے اس نے خاصی تمہید باندھی تھی۔ میں نے منظر، رابعہ اور محسن کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے دلی مسرت کے آئینہ دار تھے۔ ہماری جدوجہد رائگاں نہیں گئی تھی۔ آخرکار قانون کا شکنجہ دلاور کو گرفت میں لے چکا تھا اور اسے چھڑانے کی کوشش کرنے والے ناکام ہو گئے تھے۔ اس کا سارا کریڈٹ جاوید صدیقی کو جاتا تھا جس نے اپنا کیریر اور اپنی زندگی دونوں کو داؤ پر لگا کے یہ اعلان کیا تھا۔

سب سے پہلے خود رابعہ نے کہا "آپ کو یہ کامیابی مبارک ہو۔"

جاوید صدیقی مسکرایا "اور آپ کو بھی۔ آپ کی مدد کے بغیر میری کامیابی ممکن نہیں تھی۔"

ایک صحافی نے کہا "آپ کو یقین ہے کہ ڈاکٹر شبلی کو چوہدری دلاور نے ہی قتل کیا تھا۔"

"اس یقین کے بغیر میں یہ الزام کیسے عائد کرسکتا تھا۔ ظاہر ہے میرے پاس ثبوت ہیں۔ شہادت ہے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ ہے اور گواہ ہیں۔ میں نے سب کچھ ایک رپورٹ میں لکھ کے آئی جی صاحب کو بھیج دیا ہے اور اب آگے عدالت کی مرضی۔ انصاف کے دروازے سب کے لیے کھلے ہیں اور میں اس نظام انصاف پر پورا اعتماد کرتا ہوں۔ آپ سب بھی جانتے ہیں کہ یہاں انصاف کا خون کیسے ہوتا ہے، کس طرح حقائق کو مسخ کیا جاتا ہے۔ شہادتیں ضائع ہوتی ہیں۔ گواہ توڑے جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود ہماری اعلیٰ عدالتوں میں جو فاضل جج صاحبان بیٹھے ہیں ان کی نظر حقیقت کی گہرائی تک دیکھ لیتی ہے۔ وہ بھی اسی نظام کا حصہ ہیں اور مجھ سے یا آپ سے بہتر طور پر ساری خرابیوں کو سمجھتے ہیں۔ وکیلوں کی دلیل بازی کے مقابلے کو وہ بڑی غیر جانبداری سے دیکھتے ہیں اور کوئی انہیں کنفیوژ نہیں کرسکتا۔ گمراہ نہیں کرسکتا اور ان کے فیصلے پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کوئی مجرم شک کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بچ جائے اور ایسا شاید کبھی نہیں ہوتا کہ بے گناہ کو پھانسی دے دی جائے۔ میرا کام تو ختم ہوا۔ اب آپ لوگوں کا کام شروع ہوتا ہے۔ اس کیس میں آپ انصاف حاصل کرسکتے ہیں۔ جہاں سے بھی ملے۔"

بہت سے سوالات کے بعد جاوید صدیقی نے بتادیا کہ اس نے چوہدری دلاور کو کب کہاں اور کیسے گرفتار کیا تھا۔

"افسوس کی بات یہ ہے کہ اس خبر کو دبادیا گیا۔ حالانکہ چوہدری دلاور کی گرفتاری کے وقت ایک رپورٹر اور فوٹو گرافر موجود تھے۔ آپ سب نے یہ خبر ضرور پڑھی ہوگی کہ غازی اور اس کے ساتھی کو ایک ٹرک نے کچل کر ہلاک کردیا مگر یہ شاید آپ نہیں جانتے کہ اس وقت وہ چوہدری دلاور کی گرفتاری کی رپورٹ اور تصاویر بنا کے اپنے اخبار کے دفتر جا رہے تھے۔"

ایک دم کئی لوگوں نے کہا "کیا آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ انہیں خاموش رکھنے کے لیے قتل کرادیا گیا تھا؟"

"یہ تو آپ کہہ رہے ہیں۔" جاوید صدیقی مسکرایا "میں نے ایسی کوئی بات نہیں کہی۔ صرف حقائق بیان کیے ہیں۔ مطلب نکالنا ہے تو آپ کھوج لگا کے نکالیں۔ میں نے انتہائی سخت حفاظتی اقدامات کے ساتھ چوہدری دلاور کو ایک ایسی جگہ منتقل کیا جہاں کسی کی رسائی نہ ہو۔ اگر میں محتاط نہ ہوتا اور اپنا راستہ نہ بدلتا تو شاید چوہدری دلاور کو پولیس کی تحویل سے چھڑانے کی کوشش بھی کامیاب ہو جاتی۔ جیسا کہ آپ سب لوگ جانتے ہیں وہ تقریباً پینتالیس دن غائب رہنے کے بعد گرفتار ہوا تھا۔ اس کی حالت بہت خراب تھی مگر اب ٹھیک ہے۔"

"کیا اسے اغوا کرکے قید میں رکھنے والا اسی کا پارٹنر شوکت رانا تھا؟" ایک صحافی نے سوال کیا۔

"حالات اور واقعات کی شہادت سے یہی ثابت ہوتا ہے مگر میری ذاتی رائے ہے کہ نہیں۔"

"کیا گرفتاری کے بعد آپ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر اسے کسی مجسٹریٹ کے سامنے پیش کرنے کے پابند نہیں تھے؟"

"مجسٹریٹ سے اس کا ریمانڈ لے لیا گیا تھا۔" جاوید صدیقی بولا "سات دن کا فزیکل ریمانڈ دیا گیا جہاں چوہدری دلاور کو علاج کے لیے رکھا گیا تھا۔ باقاعدہ علاج سے اس کی حالت بہت بہتر

ہوگئی ہے۔ کل مسز دلاور کی حبس بے جا کی درخواست کے جواب میں ایڈووکیٹ جنرل کا بیان ہوگا۔ اصولاً حلف نامہ مجھے داخل کرنا تھا کیونکہ تفتیش بھی میں نے کی تھی اور گرفتاری بھی مگر جیسا کہ آپ سب دیکھ رہے ہیں۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ اس فرض کی ادائیگی سے سبکدوش ہوجاؤں۔ یہ کام اب مسٹر ارشد کریم ربانی کریں گے۔ اب آپ لوگ سوال کریں گے کہ اس مرحلے پر تبدیلی کی ضرورت کیوں محسوس کی گئی۔ اس کا ایک سیدھا سادہ جواب یہ ہوسکتا ہے کہ میرا کام تفتیش کرنا تھا۔ وہ میں نے کرلیا۔ اب مقدمے کی پیروی کون کرتا ہے۔ یہ سوچنا میرا کام نہیں ہے لیکن کاش جواب اتنا ہی سیدھا سادہ اور منطقی ہوتا۔ اصل بات یہ ہے کہ افسران بالا میری کارکردگی کے نتائج سے خوش نہیں ہیں۔ یہ تو برطانوی حکومت کا دباؤ تھا جس کی وجہ سے تفتیش کو ادھورا نہیں چھوڑا جاسکتا تھا ورنہ کیس تو داخلِ دفتر کردیا گیا تھا۔ مانا کہ مدعی بھی بہت بڑے گیارہ وکیل تھے مگر معذرت کے ساتھ ڈاکٹر شیلی اگر برطانوی شہری نہ ہوتی پاکستانی ڈاکٹر ہوتی تو آپ سب کچھ بھی نہیں کرسکتے تھے۔ عدالت میں ثبوت اور شہادت پیش کرنا پولیس کا کام ہے اور پولیس کے کچھ بدعنوان افسر ملزموں کا ساتھ دینے کے جرم میں گرفتار بھی ہوئے مگران کے علاوہ ملزموں کے بہت ساتھی اور حمایتی ہیں۔ ملزم چوہدری دلاور کا اثر رسوخ اور اس کے تعلقات کا سلسلہ بہت لمبا ہے۔ میں صحیح سمت میں تفتیش کرکے اور تفتیش کے نتیجے میں ہی چوہدری دلاور کو گرفتار کرکے مشکل میں پڑ گیا ہوں۔ یہ خبر کسی اخبار کو فراہم نہیں کی گئی۔ گرفتاری ایسے وقت میں ہوئی جب وہاں پریس کے دو ہی ارکان تھے مگر وہ مارے گئے۔ یا مار دیے گئے' باقی تھے یہ سب لوگ جو اس وقت یہاں موجود ہیں مگر یہ ایک پارٹی ہیں۔ ان کی گواہی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ مجھ سے افسران اعلیٰ نے مطالبہ کیا کہ میں چوہدری دلاور کو چھوڑ دوں جب میں نے اس سے انکار کیا تو مجھے لالچ اور پھر دھمکی سے یہ سمجھانے کی کوشش کی گئی کہ میں جھوٹ بولوں۔ مسز دلاور نے عدالت میں جو درخواست دائر کی ہے اس کے جواب میں یہ حلف نامہ داخل کردوں کہ میں نے چوہدری دلاور کو گرفتار ہی نہیں کیا۔ اس کے بعد اٹارنی جنرل حکومت کی طرف سے بیان دے گا کہ چوہدری دلاور پولیس کی تحویل میں نہیں ہے۔ آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ اس کے بعد کیا ہوتا۔ چوہدری دلاور ابھی کڑے پہرے میں ہے۔ پہرا ہٹالیا جاتا اور چوہدری دلاور کو آزاد کردیا جاتا کہ اب تم جہاں چاہو جاؤ۔ وہ مجرم ہے۔ اسے گرفتار کرکے چھوڑنے کا کیا مقصد ہے آخر؟ یہی کہ وہ ملک سے فرار ہوجائے اور پھر ہاتھ نہ آئے۔ لیکن میں اتنا بڑا جھوٹ کیسے بول سکتا تھا۔ وہ بھی عدالت میں۔ سب کچھ میرے بیان پر منحصر تھا اور مجھے بیان بدلنے کے لیے کس قسم کے دباؤ کا سامنا کرنا پڑا یہ میں بتا نہیں سکتا۔ میں تین دن روپوش رہا تاکہ مجھ سے چارج نہ لیا جاسکے۔ میں نے اپنے بیوی بچوں کو بھی گھر سے بے گھر کردیا۔ میری تلاش میں کچھ لوگ اسلام آباد پہنچے اور انہوں نے میرے گھر کے بند دروازے کھول کے مجھے اندر تلاش کیا۔ یہ کے لیے کہ میں اندھیرا کرکے گھر میں تو چھپا ہوا نہیں ہوں۔ زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ اگر میں گو مل جاتا تو شاید اب تک میری تدفین عمل میں آچکی ہوتی۔ میں فیصلہ کرچکا تھا کہ جان جاتی ہے تو جائے۔ میں جانتے بوجھتے اپنے میں ضمیر فروش نہیں بنوں گا۔ مجھے عاقبت میں سرخرو ہونا ہے رو نہیں۔ اب میں آپ سب کو بتا رہا ہوں کہ چوہدری دلاور کو نے گرفتار کیا تھا۔ میں آپ کی اس سے ملاقات کرادوں گا۔ دیکھ لیں گے کہ وہ حفاظتی تحویل میں ہے۔ ایڈووکیٹ جنرل یہ نہ کہہ سکتا کہ وہ پولیس کو مطلوب ضرور ہے مگر پولیس کی تحویل میں نہیں۔ حکومت اسے عدالت میں پیش کرنے کی پابند ہے۔ اس خلاف مکمل تفتیشی رپورٹ میں نے انسپکٹر جنرل کو ارسال کردی ہے۔ اس کی ایک نقل میں نے چیف جسٹس کو بھی بھیج دی ہے۔ یہ تمام حقائق بیان کردیے ہیں۔ میں نے گورنر' صدر اور چیف جسٹس سے درخواست کی ہے کہ میری اور میرے خاندان کی زندگی کو تحفظ فراہم کیا جائے۔ یہ سب ڈسپلن کی خلاف ورزی ہے۔ زیر قواعد و ضوابط کے مطابق ہر سزا بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔ یہ برطرفی بھی منظور ہے۔ میں تو استعفیٰ اپنے ساتھ لے کر آیا ہوں۔ اس میں بھی میں نے استعفیٰ دینے کی وجوہات بیان کردی ہیں۔ آپ سب کو اس کی نقل مل جائے گی۔ میرا جو انجام ہو سو ہو مگر میں آپ سے امید رکھتا ہوں کہ اگر میں نے کوئی غلطی نہیں کی تو میرا ساتھ دیں۔ بالکل اسی طرح جیسے غلطی کرنے پر آپ سب میرا احتساب کرتے تھے۔ خدا کے سوا میں کسی سے نہیں ڈرتا مگر میں صاحب ضمیر لوگوں سے حمایت کی توقع رکھتا ہوں۔ صرف انصاف کی خاطر۔"

خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا جس میں جاوید صدیقی نے پانی پیا۔ وہ بے حد جذباتی ہوگیا تھا اور اس کا بیان کسی سیاسی مقرر کا خطاب بن گیا تھا مگر یہ فطری بات تھی جس کے ساتھ ناانصافی ہو وہ فریاد تو کرتا ہے اور جسے جان کا خطرہ ہو وہ مدد کے لیے پکارتا ضرور ہے۔

سب سے پہلے منظر نے آگے بڑھ کے جاوید صدیقی سے ہاتھ ملایا "تم فکر مت کرو ایس ایس پی صاحب۔ یہ سارے وکیل تمہارا کیس سپریم کورٹ تک لڑیں گے۔ جو آج مدعی ہیں۔"

رابعہ نے کہا "میں تمہاری جرأت اور ہمت کی داد دیتی ہوں۔ تم واقعی بہادر آدمی ہو۔"

ایک صحافی نے کہا "اب آپ ہم پر چھوڑ دیں۔ ہم سب باجا بجادیں گے۔"

"دیکھتے ہیں کون مائی کا لال تمہاری اس پوزیشن اور حیثیت کو خراب کرتا ہے۔" دوسرا بولا۔

"اس کیس کا پورا کریڈٹ تمہیں ملے گا۔" تیسرے نے کہا۔ "خواہ تم یہاں رہو یا نہ رہو۔"

جاوید صدیقی اٹھ کھڑا ہوا "تھینک یو۔ اب آپ لوگ میرے ساتھ چلیں لیکن پہلے یہ لیں میرے استعفیٰ کی نقل۔"

منظر نے کہا "اتنی کیا جلدی ہے یار استعفیٰ دینے کی۔"

"منظر صاحب۔ میں جانتا ہوں کہ اب نوکری جاری رکھنا میرے لیے عملاً ناممکن ہے۔ میں نے خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری ہے۔"

رابعہ نے استعفیٰ کی نقل کو دیکھا "اس میں وضاحت ہے کہ تم کیوں استعفیٰ دینے پر مجبور ہوئے۔"

"سب تفصیل ہے اس میں۔"

"پھر ہم کل ہی بار کی میٹنگ کال کرتے ہیں۔ یہ قرارداد پاس کرنے کے لیے کہ جاوید صدیقی کا استعفیٰ نامنظور کیا جائے۔"

"وفد آئے گا تم سے مطالبہ کرنے کہ استعفیٰ واپس لو۔"

"یہ سب بے کار ہے۔ ملازمت میں سیاست کرنا بھی جرم ہے۔ ملازمت کے قاعدے قانون بدلے نہیں جاسکتے۔ اعلیٰ افسران کے پاس جو انتظامی اختیارات ہیں ان کو چیلنج نہیں کیا جاسکتا۔ مجھے کہیں بھی ٹرانسفر کرسکتے ہیں یا غیر معینہ مدت کے لیے معطل کرسکتے ہیں۔ جب تک محکمہ مجھے سزا نہ سنادے میں اپیل نہیں کرسکتا اور جب تک اپیل مسترد نہ ہوجائے کسی عدالت میں نہیں جاسکتا۔ یہ سب ایسے ہی ہے' مجھے نوکری کی فکر نہیں ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس قسم کی غلامی کیے بغیر بھی میں عزت سے گھر بیٹھ کے دو وقت کی روٹی کما سکتا ہوں۔ ہر شریف آدمی کی طرح میں بھی لاقانونیت سے ڈرتا ہوں۔ جس کا نشانہ میں بھی ہوسکتا ہوں اور میرے بیوی بچے بھی۔"

ارشد کریم کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ وہ شاید تھانہ انچارجی کے زمانے سے بہت سفاک اور منہ زور افسر مشہور ہوگا جو کسی کو خاطر میں نہیں لاتا ہوگا۔ اپنے اختیارات سے بھرپور تجاوز کرتے ہوئے عیاری اور مکاری سے خود کو محفوظ رکھتا ہوگا مگر یہاں پہنچ کے اچانک اسے احساس ہوا کہ تیر کر ندی پار کرلینے والا سمندر پار نہیں کرسکتا۔ اس کے مقابل وہ صحافی تھے جو مملکت کے چوتھے ستون کی حیثیت رکھتے تھے اور وہ وکیل تھے جو نظامِ انصاف کے تحفظ کے ذمے دار اور قانون کے رکھوالے تھے۔ یہ عام لوگ نہیں تھے۔ بہت خاص' بہت طاقتور اور مضبوط لوگ تھے۔

جاوید صدیقی نے کہا "ارشد کریم۔ اگر تم چاہو تو ہمارے ساتھ چلو۔ طرم کا چارج پہلے لے لو۔ یا تم چاہو تو یہاں ٹھہرو۔ اتنی دیر میں ڈی آئی جی صاحب سے باتیں کرلو۔"

"ٹھیک ہے۔ یہاں رکنا پسند کروں گا سر۔" ارشد کریم نے مُردہ لہجے میں کہا "آپ واپس آکے چارج رپورٹ بنالیں۔"

صورت حال سنگین ہوگئی تھی۔ میں اور محسن جاوید صدیقی کے لیے فکرمند تھے جس کا مستقبل مخدوش ہوگیا تھا اور ہم فرنچ میں باتیں کررہے تھے۔ میرا خیال تھا کہ جاوید صدیقی نے انتہائی قدم اٹھا کے ولاور اینڈ کمپنی کی دشمنی مول لے لی ہے اور اپنے محکمے کے گندے تالاب کے مگرمچھوں سے بیر کے بعد وہ اس تالاب سے باہر بھی محفوظ نہیں۔ مشکل یہ تھی کہ ہم اس کے لیے کچھ بھی نہیں کرسکتے تھے۔

جاوید صدیقی نے یہی سمجھا کہ محسن اب مجھے پریس کانفرنس کے بارے میں بتا رہا ہے۔ میری تجویز پر تین گاڑیوں کے مسافروں کو اس طرح تقسیم کیا گیا کہ منظر کی گاڑی میں رابعہ کے ساتھ میں خود بیٹھا اور ہم نے اپنے ساتھ جاوید صدیقی کو رکھا۔ دوسری گاڑی میں ایک صحافی اور ایک فوٹوگرافر کے علاوہ جاوید صدیقی کے ڈرائیور کو رکھا گیا۔ جو اس کا ذاتی گن مین بھی تھا۔ یہ گاڑی پائلٹ کار کے طور پر آگے رہی۔ تیسری گاڑی جس میں سارے صحافی بھر کے آئے تھے پیچھے ہوگئی' اس میں اب چار ہی افراد تھے جن میں ایک محسن تھا۔

ریوالور میرے پاس بھی تھا اور یہ وہی ریوالور تھا جو میں نے شیخ مختار عرف استاد پیڈرو سے چھینا تھا۔ یہ ریوالور میں نے محسن کے حوالے کردیا۔ اس طرح ہر کار میں کم سے کم ایک مسلح شخص ہوگیا اور یہ کارواں مین گیٹ سے باہر آیا تو پیچھے پولیس ہیڈ آفس میں افراتفری پھیل چکی تھی۔ جاوید صدیقی کی بغاوت نے صورتِ حال کو ڈی آئی جی صاحب کے قابو سے بھی باہر کردیا تھا۔ شاید ارشد کریم خود ان کو بتانے کے لیے دوڑا ہوگا کہ چارج دینے کے لیے آنے والے جاوید صدیقی نے پریس کانفرنس کرڈالی ہے اور سب کا بیڑا غرق کردیا ہے۔ ڈی آئی جی صاحب اس وقت تک مطمئن ہوں گے کہ جاوید صدیقی کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں رہا۔ اس کا دماغ ٹھکانے پر نہ آیا ہوتا تو وہ چارج دینے کیوں آتا۔ انہیں شک ہوتا کہ وہ دھماکا کرنے آیا ہے تو وہ اس کا کچھ بندوبست کرتے۔

آدھے گھنٹے تک گاڑیاں آگے پیچھے چلتی رہیں۔ پھر کوٹ لکھپت کا علاقہ آگیا جہاں جیل بھی تھی۔ جاوید صدیقی نے بیرونی احاطے میں داخل ہوکے گاڑیاں اس حصے میں روک دیں جہاں جیل حکام اور وی آئی پی قسم کے لوگوں کی گاڑیاں ہی کھڑی ہوسکتی تھیں۔

"آپ نے چوہدری دلاور کو یہاں پہنچادیا تھا۔ سزا سے پہلے۔" رابعہ نے کہا۔

"مس رابعہ۔ اس کو جیل کے اسپتال میں رکھا گیا تھا۔" جاوید صدیقی نے کہا۔

"مگر پہلے آپ نے کچھ اور بتایا تھا۔"

"مصلحت اور ضرورت کے تحت تھوڑی بہت غلط بیانی کرنی پڑتی ہے۔ ورنہ سراغ لگانے والے ہر جگہ پہنچ جاتے ہیں۔ اصل مقصد تھا اس کی سیکیورٹی۔" جاوید صدیقی نے باہر کے آفس سے

جیلر کا نمبر ملایا۔

"دلاور کو یہاں رکھنے کے لیے آپ کو متعلقہ حکام نے اجازت بھی دی ہوگی۔" منظر بولا۔

"ہاں جیل میں تو میرا حکم نہیں چلتا نا۔ ویسے جیلر دوست ہے میرا۔ ہم ایک ساتھ سول سروس میں آئے تھے۔ ہاں کون؟ خورشید۔ یار میں جاوید ہوں۔ یہاں باہر اور کہاں۔ ہاں او کے مگر کتنی دیر میں؟ سولہ منٹ نہیں ہونے چاہئیں۔"

ہم سب ایک آفس جیسے ویٹنگ روم میں کرسیوں پر بیٹھے رہے۔ عام قیدیوں کے ملاقاتیوں کو کسی انتظار گاہ کی سہولت میسر نہیں تھی مگر یہ اے اور بی کلاس قیدیوں سے ملنے والوں کا ویٹنگ روم تھا۔ مجھے عجیب سی بے چینی محسوس ہو رہی تھی۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا مجھے جاوید صدیقی کے ڈرامے کی ناکامی کا خیال زیادہ پریشان کر رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ عین وقت پر کچھ ہو جائے گا اور ہم سب ٹھنڈے ٹھنڈے واپس لوٹ جائیں گے۔

خورشید پندرہ منٹ گزرنے سے پہلے ہی آگیا۔ وہ لمبا تڑنگا اور ایتھلیٹ قسم کا جوان تھا جو ذرا بھی جیلر نہیں لگتا تھا۔ جاوید صدیقی نے ہم سب کا تعارف کرایا۔ خورشید کچھ پریشان نظر آرہا تھا۔

"یہ صحافی اور وکیل کیوں آگئے یہاں؟"

کسی وجہ کے بغیر میں نے محسن سے کہا "یار میں باہر انتظار کرتا ہوں۔ مجھے یہاں کچھ گھٹن محسوس ہو رہی ہے۔ یہ کمرا ہر طرف سے بند ہے۔"

میں نے باہر آ کے ایک گہری سانس لی۔ یہ میری چھٹی حس تھی یا میرا وہم تھا۔ میں نے باہر آ کے سوچا۔

اچانک خورشید اور جاوید صدیقی باہر آگئے "کیا بات ہے؟"

خورشید نے میری طرف دیکھا "آپ اندر جائیں پلیز۔"

جاوید صدیقی نے کہا "یہ فرنچ کے سوا کچھ نہیں جانتا۔ اس کی فکر مت کر۔"

"میں بڑی مشکل میں پڑ گیا ہوں۔"

"کیسی مشکل؟"

"انسپکٹر جنرل پرزن کا فون آیا تھا۔ اس نے مجھے بہت لتاڑا کہ تم نے ایک ایسے ملزم کو اسپتال میں کیوں رکھا جس کا چالان بھی ابھی تک پیش نہیں ہوا تھا۔ اور سنا ہے مجسٹریٹ نے تمہارے اسپتال میں آ کے اس کا ریمانڈ دیا تھا۔"

"اس میں کون سی بات خلافِ قانون تھی؟"

"تفتیش کے نتیجے میں اس کی حالت بگڑ گئی ہے۔ ابھی وہ اس قابل نہیں تھا کہ اس پر تھرڈ ڈگری......"

"کس نے جسمانی تشدد کیا ہے اس پر؟ کس کے حکم سے اور کس کی اجازت سے؟" جاوید صدیقی بگڑ گیا۔

"یہ تو مجھے نہیں معلوم۔ تمہارے اپنے آدمی اس کی حفاظت پر مامور تھے۔ اس کا بچنا مشکل ہو گیا ہے۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔" جاوید صدیقی بولا۔

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ وہ کچھ دیر کا مہمان ہے۔"

"یہ جھوٹ ہے۔"

"یار میں تم سے جھوٹ بول سکتا ہوں۔" خورشید نے اس سے نظریں چُراتے ہوئے کہا۔

"خورشید۔ میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ وہ جیسا بھی ہے۔"

خورشید نے نفی میں سر ہلایا "تمہارے ساتھ تو جلوس ہے۔"

"میں صرف ایک وکیل اور ایک صحافی کو دکھانا چاہتا ہوں کہ میں نے واقعی چوہدری دلاور کو گرفتار کیا تھا۔"

"کیا یہ لوگ یقین نہیں کرتے تمہاری بات کا۔ جیل میں صحافی یا فوٹو گرافر تو صرف ہوم سیکریٹری کی تحریری اجازت سے جاتے ہیں۔"

"اچھا تم مجھے اس کے پاس لے چلو۔ ممکن ہے میں مرنے سے پہلے اس کا اعترافِ جرم حاصل کرلوں۔"

"سوری یار۔ وہ.... دراصل.... وہ مر چکا ہے۔"

"تو بکواس کرتا ہے اُلو کے پٹھے۔" جاوید نے اس کا گریبان تھام لیا "سچ بتا دے مجھے۔ میں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔"

خورشید نے خود کو چھڑایا اور میری طرف دیکھا مگر میں مسکرا رہا تھا اور قطعی بے نیاز کھڑا تھا۔

"جاوید یہ کہا گیا ہے مجھ سے کہ اس کی لاش وارثوں کے حوالے کر دی جائے۔ ڈیتھ سرٹیفکیٹ کے ساتھ۔"

"جھوٹے ڈیتھ سرٹیفکیٹ کے ساتھ؟"

"پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی ہوگی۔" خورشید نے سر جھکا کے کہا۔

"لیکن چوہدری دلاور زندہ سلامت ہوگا۔ کون لے جائے گا اسے اپنے ساتھ؟ اس کی بیوی؟" جاوید نے تلخ لہجے میں کہا۔

"غالباً۔ اپنا وعدہ مت بھولنا۔ میں نے دوست سمجھ کے سب بتایا ہے تجھے۔" خورشید بولا۔

جاوید صدیقی کچھ دیر سکتے کی کیفیت میں کھڑا رہا "خورشید۔ تُو یہ سب کیوں کر رہا ہے؟"

"میں کیا کروں یار۔ نوکری تو نوکری ہے۔"

"اتنی عزیز ہے تجھے نوکری۔"

"سب تیرے جیسے کھاتے پیتے لوگ تو نہیں ہیں۔ تو شوقیہ پولیس سروس میں گیا تھا۔ خدمتِ خلق اور معاشرے کی اصلاح کے لیے۔ دماغ ٹھکانے آگئے کہ نہیں؟ مجھ پر تو ذمّے داریوں کا بوجھ بھی ہے۔ میرا باپ دو سال سے مفلوج پڑا ہے۔ ماں کو موتیا کے آپریشن سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اپنے گھر کے بجائے ہم اب کرائے کے مکان میں ہیں اور مجھے دو بہنوں کی شادی کرنی ہے یہاں رہ کے میں سب کچھ کرلوں گا ایک دو سال ہی میں۔"

لیکن جاوید صدیقی کچھ نہیں سُن رہا تھا۔ اس نے کہا "میں نے جو گارڈ مقرر کی تھی یہاں۔"

"وہ سب بدل دیے گئے تھے۔ کوئی تیرا حکم نہیں مانے گا۔"

"خورشید۔ جب میں نے چوہدری دلاور کو تیری تحویل میں دیا تھا تو ایک رسید لی تھی۔ تُو نے دستخط کیے تھے اس پر۔"

"ہاں مگر میں اسے پہچانتا نہیں تھا۔ چوہدری دلاور کو۔ میں نے تیرے کہنے سے مان لیا تھا۔"

جاوید صدیقی اسے حقارت سے دیکھتا رہا "کتنا پیسہ ملا ہے تجھے یہ سب کہنے کا؟"

"رہنے دے ایسی باتیں جاوید۔ دوستی نہ خراب ہو ہماری تو اچھا ہے۔ تو میری مجبوری کو سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتا۔"

جاوید صدیقی کچھ دیر خاموش کھڑا رہا اور پھر اندر چلا گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اب وہ کیا وضاحت پیش کرے گا۔ جتنی دیر میں ہم پولیس ہیڈ آفس سے کوٹ لکھپت جیل پہنچے تھے ڈی آئی جی یا آئی جی صاحب نے انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات سے رابطہ کرلیا تھا اور دلاور کی رہائی کے متبادل انتظامات کر دیے گئے تھے۔ یہ ٹھیک ہے کہ جاوید صدیقی نے چوہدری دلاور کو گرفتار کرلیا تھا۔ اس کی حالت خراب تھی چنانچہ اسے کوٹ لکھپت جیل کے اسپتال میں رکھا گیا تھا مگر جاوید صدیقی نے انتظار کیے بغیر تفتیش کی اور اس پر تشدد کیا گیا جس کے نتیجے میں چوہدری دلاور ہلاک ہو گیا۔ یہی ڈیتھ سرٹیفکیٹ میں درج کیا جائے گا۔ یہی پوسٹ مارٹم رپورٹ میں ہوگا لیکن چوہدری دلاور کو اس کی بیوی زندہ سلامت نکال کرلے جائے گی۔ کل تک اس کی تدفین بھی ہو جائے گی۔ کتبہ بھی لگ جائے گا۔ اصل چوہدری دلاور اس وقت تک کسی فلائٹ سے باہر نکل چکا ہوگا۔ کل جب عدالت میں بیانِ حلفی داخل کرنے کا وقت آئے گا تو ڈیتھ سرٹیفکیٹ اور پوسٹ مارٹم رپورٹ داخل کی جائے گی۔ جاوید صدیقی پر ایک اور فردِ جرم عائد ہوگی۔ غیر ارادی قتل۔ اسی کی تحقیقات کے لیے کوئی کمیشن بٹھایا جائے گا کہ زیرِ حراست ملزم کی موت کیسے ہوئی اور اس کا ذمّے دار کون ہے۔ رابعہ یا منظر کچھ نہیں کرسکتے۔ وہ عدالت میں درخواست دائر کرسکتے ہیں کہ لاش کا دوبارہ پوسٹ مارٹم کرایا جائے مگر اوّل تو یہ درخواست منظور نہیں ہوگی اور ہوگئی تو دوسری رپورٹ دینے والے بھی تو وہی ہوں گے۔ سرکار کے حکم کے غلام۔ جو نوکری کو سچ پر قربان نہیں کرسکتے۔ چھ مہینے سال بعد کیا ہوگا۔ چوہدری دلاور دوبارہ نمودار ہو جائے گا تو صرف کنفیوژن پھیلے گا۔ دلاور زندہ ہے تو وہ کون تھا جو مر گیا تھا۔ خورشید کہے گا کہ میں تو دلاور کو نہیں پہچانتا تھا۔ جو قیدی میرے حوالے کیا گیا تھا وہ یقیناً مر گیا تھا۔ میں اس کا نام چوہدری دلاور نہ لکھتا تو کیا کرتا۔ مجھے جاوید صدیقی نے یہی نام بتایا تھا۔ ایک بار پھر داخلِ دفتر ہو جانے والا کیس کھولنے کے لیے رابعہ اور منظر کو نئے سرے سے درخواست دینی پڑے گی پھر نوٹس اور سمن جاری ہوں گے۔ دلاور کی بیوی حاضر ہو کر بتائے کہ کیا اس نے اپنے شوہر کو شناخت کیا تھا؟ تدفین سے پہلے دیکھا تھا؟ وہ کہے گی کہ سر میں تو بے ہوش پڑی تھی صدمے سے۔ فیصل کہے گا کہ یور آنر ہمیں تو ماں نے پہلے ہی گھر سے دور بھیج دیا تھا پھر تدفین کرنے والے کون تھے؟ انہیں بُلاؤ۔ کوئی سامنے نہیں آئے گا اس وقت کچھ پتا نہیں چلے گا۔ صرف کنفیوژن پھیلے گا۔ جاوید صدیقی کی تفتیش کی رپورٹ ضائع کر دی جائے گی اور دلاور خود کو عدالت کے سپرد کر دے گا۔ اسے نہیں معلوم کہ اتنا عرصہ وہ کہاں رہا۔ اس کی یادداشت کھو گئی تھی۔

سب لوگ جاوید صدیقی کے ساتھ باہر آئے اور گاڑیوں میں بیٹھ گئے۔ وہ کچھ مایوس تھے۔ خبر اپنی جگہ مکمل تھی مگر وہ چوہدری دلاور کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکے۔ حراست میں اس کی تصویر نہ بنا سکے۔ چوہدری دلاور پھر کامیاب ہو گیا تھا۔ اسے ہتھکڑی لگا کے عدالت میں پیش کرنے کی خواہش رکھنے والے پھر ہار گئے تھے۔ جھوٹ اور فریب سے ہر قانونی مسئلے کو اس حد تک اُلجھا دینا کہ اس کا کوئی حل نہ نکل سکے یہی اس کا کمال تھا۔ اس کے پیسے کی طاقت کا کمال تھا۔ میں نے اتفاق سے جو کچھ سنا تھا وہ صرف مجھے معلوم تھا لیکن جاوید صدیقی کے بجھے بجھے چہرے سے بھی بہت کچھ اندازہ ہو جاتا تھا کہ قانون کی پاسداری کرنے والے اور تاویل کرنے والے۔ فرض شناسی کے دعویدار ایم آر ایس کے خدائی فوجدار۔ وکیل صحافی سب منہ دیکھتے رہ گئے تھے اور دلاور نکل گیا تھا۔

واپسی کا سفر ایک اینٹی کلائمکس تھا۔ صحافی حضرات کی بات اور تھی۔ ان کے لیے چوہدری دلاور کی گرفتاری کی خبر بھی سنسنی خیز تھی اور کوٹ لکھپت جیل میں اس کی زیرِ حراست موت کی خبر میں بھی ڈرامائی عنصر تھا۔ وہ اس سے کچھ بددل تھے کہ چوہدری دلاور کی تصویریں نہ بنا سکے۔ نہ پسِ دیوارِ زنداں اس کی زندگی میں اور نہ اس کی موت کے بعد۔ زیادہ جوشیلے صحافی اب یہ پروگرام بنا رہے تھے کہ کسی طرح چوہدری دلاور کی لاش اس کے لواحقین کے حوالے کیے جانے کی اور بعد میں اس کی تدفین کے موقع کی تصویر حاصل کرلیں مگر یہ کام مشکل تھا۔ ان کو یہ علم نہیں تھا کہ ورثا کب لاش لینے آئیں گے اور اس وقت انہیں جیل خانے کے اندر کوئی جانے دے گا یا نہیں۔ اسی طرح یہ بھی غیر یقینی تھا کہ چوہدری دلاور کے اہلِ خانہ میں سے کون آئے گا۔ لاش کو لے کر کہاں جائے گا اور تدفین کب ہوگی؟

پولیس ہیڈ آفس واپس پہنچنے تک ہم سب مایوسی کا شکار تھے۔ محسن یا رابعہ اور منظر یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ حقیقت کیا ہے۔ حقیقت میں نے حادثاتی طور پر جان لی تھی۔ ایس ایس پی جاوید صدیقی اور اس کے جیلر دوست نے یہ سمجھتے ہوئے کہ میں کچھ نہیں سمجھ سکتا آپس میں جو گفتگو کی تھی وہ میں نے سُن لی تھی لیکن جیسے جاوید صدیقی کسی کو سچ نہ بتانے کا پابند تھا ایسے ہی میں بھی خاموش

رہنے پر مجبور تھا۔ جاوید صدیقی نے صرف اتنا کہا تھا کہ جیل کے اسپتال میں چوہدری دلاور مرگیا تھا۔ غالباً ہارٹ فیل ہونے سے۔ وہ دل کا پرانا مریض تھا۔ اس نے دلاور کی موت پر کسی قسم کی قیاس آرائی سے انکار کردیا تھا۔

جب... صحافیوں کو پولیس ہیڈ آفس کے باہر اُتارا گیا تو یہ سوال بھی کیا گیا کہ دلاور کی موت کے پراسرار حالات کی عدالتی تحقیقات ہوں گی؟ جاوید صدیقی کے لیے جانتے بوجھتے سچ کو چھُپائے رکھنا ایک صبر آزما کام تھا۔ وہ ایک دوست سے شریفانہ وعدے کا پابند تھا ورنہ ابھی اصل بات بتا دیتا کہ یہ سب جھوٹ ہے۔

اس نے کہا "جنٹلمین۔ اوّل تو یہ موت پراسرار نہیں ہے مگر آپ لوگ چاہیں تو بنا سکتے ہیں۔ وہ زیرِ علاج تھا۔ ابھی تفتیش کا مرحلہ آیا ہی نہیں تھا کہ تشدد کی ضرورت پیش آتی۔"

ایک صحافی نے کہا "مگر آپ لوگ اتنے بااصول اور بامروت کہاں ہوتے ہیں کہ کسی بیمار کو بخش دیں۔ پولیس کی تحویل میں زیرِ تفتیش ملزم ہلاک ہوجاتے ہیں تو کہا جاتا ہے کہ وہ پہلے سے بیمار تھے یا انہوں نے خودکشی کرلی۔"

دوسرا بولا "پھر عدالتی تحقیقات کا ڈراما ہوتا ہے اور کوئی بے چارہ ایس ڈی ایم یہ ڈراما اوپر والوں کی حسبِ منشا کرتا ہے۔ اس کا کبھی کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ کبھی کسی پر الزام نہیں آتا۔ ثابت صرف یہ ہوتا ہے کہ پولیس کا مؤقف درست تھا۔"

"کیا اس معاملے میں بھی ایسا ہی ہوگا؟"

"مجھے نہیں معلوم۔" صدیقی نے چلّا کے کہا "نہ وہ میری تحویل میں تھا۔ نہ میں تفتیش کررہا تھا اور نہ میں نے اس کو مرتے دیکھا۔ آج میں چارج دے دوں گا۔ کل کیا ہوگا' یہ وہ بتا سکتے ہیں جو کل اس کیس کے ذمّے دار ہوں گے یا آپ ڈی آئی جی صاحب سے معلوم کرسکتے ہیں۔ آپ صحافی حضرات ویسے تو بال کی کھال نکالتے ہیں۔ سراغ رساں بھی ثابت کردیتے ہیں خود کو۔ خیال کے گھوڑے دوڑاتے ہیں تو ہر سچ کا سراغ لگا لیتے ہیں۔ پھر سب کچھ ابھی اسی وقت صرف مجھ سے کیوں معلوم کرنا چاہتے ہیں؟"

وہ اندر چلا گیا اور صحافی اپنی اپنی قیاس آرائی اور اپنے اپنے تبصرے کرتے ہوئے واپس اسی گاڑی میں بیٹھ گئے جس میں بھر کے وہ پولیس ہیڈ آفس آئے تھے۔

صرف ہم لوگ جو وکیل سمجھے جاتے تھے اندر اس کے ساتھ گئے اور ہم نے جاوید صدیقی جیسے بااصول' فرض شناس اور نڈر افسر کی بے عزتی کے ساتھ معطلی کے ڈرامے کا آخری سین دیکھا۔ اس کا چارج عدم موجودگی میں ہی ارشد کریم نے لے لیا تھا اور ڈی آئی جی صاحب کے حکم سے اس کو آفس میں داخل ہونے سے روک دیا گیا تھا۔ استعفیٰ منظور ہونے تک وہ معطل سمجھا جائے گا اور خود ڈی آئی جی صاحب اعلیٰ حکّام کو اس کے باغیانہ رویے' اس کے ناپسندیدہ کردار اور پولیس کو بدنام کرنے کے لیے سستی شہرت حاصل کرنے کے طریقے کے بارے میں رپورٹ دیں گے اور پھر فیصلہ ہوگا کہ اسے برطرف کیا جائے یا خاموشی سے اس کا استعفیٰ منظور کرلیا جائے کہ تم روٹھے ہم چھُوٹے۔

جاوید صدیقی سخت دل شکستہ اور مشتعل تھا لیکن اس نے خاموشی سے معطلی کے احکامات وصول کیے۔ ڈی آئی جی صاحب احکامات جاری فرما کے رخصت ہوگئے تھے ورنہ صحافیوں کے ہجوم سے سوالات کا جواب دینا مشکل ہوتا۔ ہم سے بھی ان کی ملاقات نہیں ہوئی۔

منظر نے بڑے چبھتے ہوئے لہجے میں ارشد کریم کو مبارک باد دی "ہوگئی آپ نے بھی قبضہ کرہی لیا ایس ایس پی کی سیٹ پر جیسے بھارتی فوج نے مقبوضہ کشمیر میں ڈیرا ڈال رکھا ہے۔"

وہ بگڑ گیا "آپ اپنے الفاظ واپس لیں۔ میری پوسٹنگ قاعدے قانون کے مطابق ہوئی ہے۔"

منظر نے مزید آگ لگائی "اجی سر۔ مذاق تو مت کریں ہم سے۔ بیس سال میں ہم نے تو دیکھا نہیں پولیس کو قاعدے قانون پر عمل کرتے۔"

رابعہ نے کہا "البتہ قاعدے قانون کا غلط استعمال کرتے ضرور دیکھا ہے۔ اندھے کے ہاتھوں میں لاٹھی۔"

منظر نے کہا "الفاظ کوئی رشوت کے نوٹ تو ہیں نہیں کہ جنہیں دے کر واپس لے لوں۔ منہ سے نکل گئے تو فضا میں تحلیل ہوگئے۔"

"آپ کا جی چاہے تو کیس کردیں ہم پر۔ میرا مطلب ہے اگر ہمت ہے تو" رابعہ بولی "ہم قائم ہیں اپنے الفاظ پر۔"

"سب دیکھا ہے ہم نے اپنی آنکھوں سے۔" محسن نے بھی کہا "اور اب آپ بہت کچھ دیکھیں گے۔ ایس ایس پی صاحب"

"دیکھ لوں گا میں بھی تم سب کو۔ اب اس سے پہلے کہ میں کچھ کرکے آپ سب کو نکلوا دوں' میں ڈرتا نہیں۔"

منظر پھر ہنسا "آپ سختی چھوڑیں۔ نرمی سے ہم سب کو ڈال دیں۔ حوالات تو ہوگی یہاں۔ ڈر کس کا بھلا آپ کو۔ سیّاں بھئے کوتوال۔"

جاوید صدیقی پہلے ہی جاچکا تھا۔ رابعہ نے منظر کو کھینچ لیا اور محسن سے بھی کہا کہ کیا ضرورت ہے کسی... کے منہ لگنے کی۔ جاتے جاتے کے درمیان اس نے کچھ کہا تھا۔ کمینہ یا کتا' مگر ایسے کہ خود بھی نہیں سن پایا تو ارشد کریم کیا سمجھتا مگر اس نے اندازہ کرلیا کہ رابعہ جاتے جاتے بھی اس کو ذلیل کرگئی ہے۔

ہم دو الگ الگ گاڑیوں میں باہر آئے تو خلافِ توقع میں نے جاوید صدیقی کو منتظر پایا۔ رابعہ اب میرے ساتھ تھی اور وقار نے منظر کے ساتھ محسن کو اپنی گاڑی میں بٹھالیا تھا۔ میری حالت اس بم جیسی تھی جو پھٹنے کے قریب ہو۔ اصل حقائق کسی کو نہ بتانے کا پابند جاوید صدیقی تھا۔ میں نہیں تھا۔ میں باہر آتے ہی سب

وہ ہوٹل جہاں جاوید صدیقی مقیم تھا لوئر مال پر واقع تھا۔ ہم نیچے ڈائننگ ہال میں بیٹھ گئے جہاں اس وقت بہت لوگ تھے۔ شام کے پانچ بجے سب ہی چائے کافی پینے والے تھے۔

آرڈر دیتے ہوئے جاوید صدیقی نے اِدھر اُدھر نگاہ ڈالی اور مطمئن ہوکے بولا "میرا خیال ہے کہ ابھی تک میں محفوظ ہوں۔ صرف معطل ہوں' معتوب نہیں۔ کوئی میرا پیچھا نہیں کررہا تھا۔ پھر بھی احتیاط ضروری ہے۔ دریا میں رہ کے مگرمچھ سے بیر کرنے کا انجام کبھی اچھا نہیں ہوتا لیکن مجھے کارنر کردیا گیا ہے۔ میں کیا کروں' تنگ آمد بجنگ آمد والی صورتِ حال ہے۔ میں ایک کشمکش سے دوچار تھا لیکن خدا کا شکر ہے کہ مستعفی ہونے کے بعد میں اپنے ضمیر کے مطابق ہر فیصلہ کرنے کے لیے آزاد ہوں۔"

رابعہ نے حوصلہ افزائی کے لیے مسکراتے ہوئے کہا "ایک فیصلہ تو آپ کرچکے۔ اب کون سا فیصلہ باقی ہے؟"

"مس رابعہ۔ کچھ باتیں ہیں جو میں آپ کو بتانا چاہتا تھا" اس نے اضطرابی کیفیت میں کہا "جیلر خورشید میرا دوست ہے۔ اس نے مجھے پابند کردیا تھا کہ میں سچ کسی کو نہ بتاؤں۔ جو اس نے مجھے بتادیا تھا۔ یہ فرض اور دوستی کی کشمکش کا پرانا کیس ہے۔ اس میں جیت بالآخر میرے فرض کی ہوئی۔ میں دوستی کو قربان کردوں گا۔ ایسا ہی ہونا چاہیے ورنہ انصاف نہیں ہوگا۔"

رابعہ اور محسن بھی حیران تھے کہ وہ کیا بتانا چاہتا ہے مگر جب اس نے وہ سب بتایا جو مجھے پہلے سے معلوم تھا تو اس انکشاف نے انہیں سن کردیا۔ محسن نے فرنچ میں مجھے بتانے کی کوشش کی تو میں نے اس سے کہا کہ میں تو سب سن چکا ہوں لیکن اب ہم طے کرسکتے ہیں کہ ان حالات میں ہمیں کیا کرنا ہوگا۔ سب سے پہلے تو یہ بات منظر کو اور وقار یوسف کو بتانا ضروری ہے لیکن یہ بھی معلوم ہوجائے تو اچھا ہے کہ کیا جاوید صدیقی ہمارا ساتھ دے سکتا ہے۔ اگر وہ ہماری مدد کرے تو ہم آج رات ہی چوہدری دلاور کی موت کا ڈراما کرنے والوں کی کوشش کو ناکام بنا سکتے ہیں۔

جاوید صدیقی نے محسن کی بات سنی تو مسکرایا "اور آخر کس لیے میں تم سب کو یہاں لایا تھا۔ اسی لیے یہ بات بتائی تھی میں نے کہ مجھے تمہاری مدد درکار تھی۔ میں اکیلا شاید کچھ نہیں کرسکتا۔ تمہارے وہ سب ساتھی کہاں ہیں' ایم آر ایس کی تنظیم کے ارکان؟"

محسن نے میری طرف دیکھا۔ "وہ سب تو نہیں آسکتے۔ ان میں سے دو جسمانی طور پر اس قابل نہیں کہ کسی کارروائی میں حصّہ لے سکیں۔"

"تمہارا دوست سکندر بخت تو ہے" جاوید صدیقی بولا۔

محسن نے سکون سے کہا "ہاں مگر..."

"وہ اکیلا ہی چار کے برابر ہوگا" جاوید صدیقی نے مسکراتے ہوئے کہا "کیوں مس رابعہ!"

بتادینا چاہتا تھا کہ دلاور کو فرار کرانے کے لیے اور کیس کو فی الحال داخلِ دفتر کرانے کے لیے اس کی موت کا ڈراما رچایا گیا ہے اور غلط ڈیتھ سرٹیفکیٹ اور جعلی پوسٹ مارٹم رپورٹ کے ساتھ زندہ دلاور کو جیل خانے سے نکال دیا جائے گا یا کسی لاوارث بندے کی لاش دلاور کے ورثا کے حوالے کردی جائے گی جو اسے خاموشی سے دفن بھی کرادیں گے مگر دفن ہونے والا دلاور نہیں ہوگا۔ یہ سب گھپلا ہونے سے قبل ہی ہمیں کچھ کرنا ہوگا۔

اب میرے لیے نئی مشکل پیدا ہوگئی۔ رابعہ نے مجھ سے کہا "گاڑی روکو۔ جاوید صدیقی کو ساتھ بٹھالیتے ہیں۔"

میں نے کہا "دوسری گاڑی بھی ہے۔"

رابعہ نے کہا "بھئی مجھے کچھ بات کرنی ہے اس سے۔"

میں مجبور ہوگیا۔ جاوید صدیقی نے پیچھے بیٹھتے ہی رابعہ کا شکریہ ادا کیا "بڑے بے آبرو ہوکر ترے کوچے سے ہم نکلے۔ آپ نے دیکھا' آیا تھا میں سرکاری گاڑی میں۔ واپس پیدل جارہا تھا۔"

رابعہ نے کہا "صدیقی صاحب۔ عزت آبرو ایسی باتوں سے کم نہیں۔ زیادہ ہوتی ہے۔ آپ جیسے لوگ ہی تو مثال قائم کرتے ہیں۔"

"جی نہیں۔ درسِ عبرت بنتے ہیں دوسروں کے لیے۔"

میں بڑی مشکل میں پھنس گیا۔ محسن میرے ساتھ ہوتا تو میں بھی گفتگو میں حصہ لیتا۔ صدیقی ساتھ نہ بیٹھتا تو میں رابعہ کو بتادیتا کہ میں نے اس کی اور خورشید کی ساری گفتگو سن لی تھی۔ میں کوئی غلط جذباتی فیصلہ کرنا نہیں چاہتا تھا کہ صدیقی کے سامنے اپنے بہروپ کو ظاہر کردوں۔ ابھی اس نے پولیس کی نوکری کو لات ماری تھی اور وہ انتہائی بددل بھی تھا مگر اس کا یہ مطلب نہیں نکالا جاسکتا تھا کہ اب وہ ہمارے ساتھ ہے۔

میری یہ مشکل خود جاوید صدیقی نے آسان کردی۔ اس نے رابعہ سے کہا "مس رابعہ۔ میں آپ سے اور آپ کے دوستوں سے کچھ مشورہ کرنا چاہتا تھا۔ کیوں نہ ہم کہیں بیٹھ کے ایک کپ چائے پی لیں۔"

"کیوں نہیں۔ کیا آپ میرے آفس چلنا پسند کریں گے؟"

"دیکھیے۔ میرا گھر تو ہے اسلام آباد میں۔ یہاں میں سرکاری خرچ پر ایک ہوٹل میں مقیم تھا۔ شاید اب وہاں سے میرا بوریا بستر گول ہوجائے گا لیکن اس سے فرق نہیں پڑتا۔ میں اپنی جیب سے خرچ کرکے بھی وہاں ٹھہر سکتا ہوں اور اپنا سارا بِل خود دینے کی پوزیشن میں ہوں۔ آپ کے آفس جانا کچھ مناسب نہیں۔ کیا پتا میرا تعاقب کیا جارہا ہو۔"

رابعہ نے اس سے اتفاق کیا اور وقار کو گاڑی روکنے کا اشارہ کیا "وقار۔ تم اور منظر جاؤ آفس۔ محسن کو ادھر بھیج دو۔ ہم کچھ دیر میں آتے ہیں۔"

محسن ہماری گاڑی میں آگیا اور میرا ترجم کا مسئلہ حل ہوگیا۔

رابعہ نے پہلو بدلا "صحیح کہا آپ نے۔ لیکن وہ ہے کہاں؟"

"میری معلومات کے مطابق۔ وہ یہیں ہے" جاوید صدیقی اپنے لیے کافی کا دوسرا کپ بنانے لگا۔

"یہاں.... کس نے بتایا آپ کو؟"

"مس رابعہ۔ ایک ہوتی ہے ظاہر کی آنکھ۔ وہ دھوکا کھا جاتی ہے اور زیادہ تر لوگ اس پر بھروسا کرتے ہیں۔ ایک ہوتی ہے عقل کی آنکھ جو باطن کا حال جان لیتی ہے اور چھٹی حس کی مدد سے یا تجربے کی کسوٹی پر پرکھ کے وہ پردہ ہٹا سکتی ہے۔ جو حقیقت کو جان لیتی ہے اور ثبوت کی محتاج نہیں ہوتی۔ کیا یقین کسی ثبوت کا محتاج ہوتا ہے؟"

رابعہ نے چونک کے کہا "جی.... پتا نہیں۔"

محسن نے کہا "شاید ہاں۔ ایسا بھی ہوتا ہے۔ مگر آپ یہ بات کس حوالے سے کر رہے ہیں۔"

اس نے کہا "مس رابعہ۔ مجھے معلوم ہے کہ سکندر بخت کہاں ہے۔ بہت عرصے پہلے میں یہ بات جان چکا تھا۔ میرے پاس ثبوت نہیں تھا۔ صرف یقین تھا کہ وہ کون ہے لیکن میں نے جانتے بوجھتے اس کو پہچاننے سے گریز کیا۔ اس کی شناخت پر پڑا ہوا پردہ نہیں ہٹایا۔ آپ جانتی ہی ہیں۔"

رابعہ نے کہا "نہیں۔ میں نہیں جانتی۔"

"میں اس مقصد کی شکست نہیں چاہتا تھا جس کی خاطر سکندر بخت اور آپ جدوجہد کر رہے تھے۔ ایک رابن ہڈ کی بات سناؤں آپ کو؟ ایک ڈاکو تھا جو مصیبت زدہ افراد کی مدد کرتا تھا اور ڈاکے ڈالتا تھا دولت مندوں کے گھر میں۔ مجھے مخبروں کے ذریعے دوبار پتا چلا کہ وہ فلاں وقت فلاں کی مدد کرنے کے لیے جائے گا۔ ایک موقع تھا شادی کا۔ اس کی مدد اور سرپرستی سے ایک لڑکی رخصت ہوئی تھی جس کی ماں کینسر میں مر چکی تھی۔ میں اسے راستے میں گرفتار کر سکتا تھا مگر میں نے اسے رخصتی کا موقع دیا اور وہ فرار ہو گیا۔ شادی کے بعد نہ جانے کیسے نکل گیا۔ دوسرا موقع بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ میں نے جانتے بوجھتے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ میں چاہتا تھا کہ ایک مجرم کو ارتکابِ جرم کے وقت پکڑوں۔ ایسے وقت میں نہیں جب اس کے پکڑنے سے نیکی کا راستہ رکتا ہو اور نقصان ان کا ہو جو اس سے فیض پا رہے تھے۔ ان کے لیے نہ میں کچھ کر سکتا تھا اور نہ کوئی اور۔ میں نے اسے بعد میں گرفتار کیا لیکن عجیب بات یہ ہوئی کہ اس نے میرا شکریہ ادا کیا کہ میں نے اسے کچھ مواقع فراہم کیے تھے۔ وہ جانتا تھا، جب وہ جیل میں تھا تو اس نے کئی بار مجھ سے کچھ کام کہے۔ وہ بھی میں نے کیے۔ ان کا ذکر میں نہیں کروں گا۔ وہ پھانسی کے وقت بھی کچھ ذمے داریاں مجھے سونپ گیا تھا۔ وہ میں پوری کر رہا ہوں۔ اس کی طرف سے" وہ ایک دم کھڑا ہو گیا "میں چاہتا ہوں مس رابعہ۔ ایک گھنٹے بعد آپ مجھے کوٹ لکھپت جیل کے باہر ملیں اور ممکن ہو تو سکندر بخت کو بھی ساتھ لے آئیں۔"

"آخر کس لیے؟"

اس نے سپاٹ لہجے میں کہا "میں ایک بار پھر دلاور کو گرفتار کر سکوں گا۔ آپ سب لوگوں کے سامنے۔ آپ کی مدد سے۔"

محسن نے کہا "مگر کیسے؟"

"یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ میں بھی اکیلا نہیں آؤں گا۔ ... گاڑی میں چار آدمی ہوں گے۔ وہ آپ کی مدد کریں گے۔ مس رابعہ صرف آپ میرے ساتھ جیل کے اندر جائیں گی۔ باقی سب باہر انتظار کریں گے۔ ہم دلاور کو ایسے فرار نہیں ہونے دیں گے ... نے نوکری پر لات ماری ہے ان سب سے نمٹنے کے لیے جو دلاور کا ساتھ دے رہے ہیں۔"

وہ پلٹ کے ڈائننگ ہال کے آخری حصے کی طرف چلا ... جہاں سے زینہ اوپر جا رہا تھا۔

ہم نے اسے زینے پر گھوم کے اوپر غائب ہوتے دیکھا اور کچھ دیر وہیں بیٹھے رہے پھر رابعہ نے کہا "صدیقی سب کچھ جانتا ہے۔"

محسن نے آہستہ سے سر ہلایا "اس نے بس نام نہیں لیا، باقی سب کچھ تو کہہ دیا۔"

میں نے کہا "میرے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ میں کیا کروں۔"

"فیصلہ تو اب بھی ہمیں ہی کرنا ہے۔ اور یہ آسان فیصلہ نہیں ہے۔" رابعہ نے کہا۔

"میں سمجھتا ہوں کہ جاوید صدیقی پر بھروسا کیا جا سکتا ہے" محسن نے کہا۔

"اگر وہ میرا راز فاش کرنا چاہتا۔ تو بہت پہلے خود مجھے گرفتار کر لیتا۔ آج ابھی ہم پولیس ہیڈ آفس سے آئے ہیں۔ اس نے اب بھی فیصلہ ہم پر چھوڑ دیا ہے کہ چاہو تو یہ کھیل جاری رکھو۔ سکندر بخت روپوش رہنا چاہے تو اس کی مرضی۔"

"اور سکندر بخت کی مرضی کیا ہے؟"

"جو سرکار کی مرضی" میں نے رابعہ کی طرف دیکھ کے کہا۔

ایک گھنٹے کی مہلت زیادہ نہیں تھی۔ ہمیں کوٹ لکھپت پہنچنے میں کم سے کم بھی آدھا گھنٹا درکار تھا۔ وہ بھی سڑک صاف ملنے کی صورت میں اور راستہ انتہائی تیز رفتاری سے طے کر کے۔ میں نے وہیں سے منظر کو فون کیا کہ ہمارے گھر کہہ دے کہ ہم کچھ دیر سے آئیں گے۔ وقار یوسف یہ پیغام گل تک بھی پہنچا دے۔"

"مگر تم ہو کہاں؟" منظر بولا۔

"ہم جاوید صدیقی کے ساتھ ہیں۔ اور کوٹ لکھپت جیل جا رہے ہیں۔"

"ابے بھوتنی کے۔ اس کے چکر میں مت پڑ۔ وہ بہت ہی کائیاں شخص ہے۔ ایک بار جیل کے باہر سے لوٹ آیا ہے، اگلی بار اندر ہو گا۔"

میں نے کہا "رابعہ اور محسن بھی ہیں میرے ساتھ یار۔" اور

فون بند کر دیا۔

مجھے کچھ اندازہ نہ تھا کہ صدیقی نے ایک گھنٹے کا وقفہ کیوں دیا ہے؟ شاید اسے معلوم تھا کہ چوہدری دلاور کو کب جیل سے نکالا جائے گا یا اس نے اپنے دوست خورشید کی دوستی کو بھلا کے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اپنی ناکامی کو کامیابی میں بدل کے رہے گا خواہ اس کا نقصان خورشید کو ہی اٹھانا پڑے۔ اس کے نزدیک فرض کی ادائیگی مقدم تھی۔

میں نے جو ریوالور محسن کو دیا تھا وہ رابعہ کو دے دیا گیا اور محسن تو پہلے ہی مسلح ہو کے آیا تھا۔

رابعہ نے کہا "اس کا فائدہ کچھ نہیں۔ اگر میں جیل کے اندر جاؤں گی۔ تو میری تلاشی میں سب کچھ باہر ہی رکھوا لیا جائے گا۔"

"اس وقت تم یہ امانت مجھے لوٹا دینا" میں نے کہا "ابھی کیا پتا باہر کیا صورتِ حال درپیش ہو۔"

"صورتِ حال کچھ بھی ہو۔ ہم وہاں فائرنگ نہیں کر سکتے۔ یہ بات طے ہے" رابعہ نے کہا "اپنے دفاع میں بھی نہیں۔"

"یعنی ہم پر جس کا دل چاہے گولی چلائے۔"

"کون گولی چلا سکتا ہے وہاں۔ کوٹ لکھپت جیل کے اندر اور باہر بہت سخت حفاظتی انتظامات ہیں" رابعہ نے کہا۔

"میں تو یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ تم اندر جا کے کیا کرو گی اور ہم باہر رہ کے کیا کریں گے" محسن بولا "اگر چوہدری دلاور زندہ ہے۔"

"وہ زندہ ہے۔ اس میں شک کی بات ہی نہیں۔"

"ایسی صورت میں خورشید کبھی اس کو رابعہ کے سامنے پیش نہیں کرے گا اور اگر وہ مر چکا ہے...."

"لاحول ولا قوۃ۔ جو آدمی زندہ ہے وہ کیسے مر چکا ہے" میں نے کہا۔

"یار فرض کر کوئی ڈراما رچایا گیا، کسی کی لاش دکھا دی گئی کہ یہ ہے چوہدری دلاور۔" محسن بولا "رابعہ کہے گی کہ غلط، یہ دلاور نہیں ہے۔ تو خورشید کو موقع ملے گا اپنی پوزیشن مضبوط کرنے کا۔ وہ کہے گا کہ مجھے تو پہچان تھی نہیں لیکن یہی تھا وہ شخص جس کو ایس ایس پی صاحب میرے حوالے کر گئے تھے۔ جیلر کو جو پیسہ ملا ہے یہ کام کرنے کا۔ اس نے دوستی کے رشتے کا تو خون کر دیا ہے اور دوستی کی لاش تو پیسے کے ڈھیر میں دفن ہو گئی ہے۔ اب صدیقی فیصلہ کر چکا ہے کہ جب جنگ ہے تو پھر سب کچھ جائز ہے۔ وہ خورشید کے جرم میں شریک نہیں ہو گا اور خاموش رہ کے اس کی نوکری کو بچائے گا نہیں۔ جیلر خورشید اگر کسی مجرم کو فرار کرانے کی بھاری رشوت لے چکا ہے تو صدیقی کے نزدیک وہ بھی مجرم ہے۔"

میں نے کہا "او کے۔ ہم سب کچھ قسمت پر چھوڑ کے دیکھتے ہیں اور انتظار کرتے ہیں۔"

محسن نے گاڑی کو کوٹ لکھپت جیل کے بیرونی احاطے میں گیٹ سے کافی فاصلے پر روک دیا۔ میں گاڑی سے اُتر کے ایک پیڑ کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ رابعہ گاڑی سے باہر نکل کے کھڑی ہو گئی۔ محسن گاڑی میں بیٹھا رہا۔

اب رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ جیل کی بلند و بالا فصیل پر سرچ لائٹس جل اٹھی تھیں اور باہر بھی ہر طرف روشنی کم نہ تھی۔ بیرونی دروازے سے لوگوں کی آمدورفت جاری تھی۔ ان میں بیشتر لوگ احاطے کے اندر بنے ہوئے رہائشی کوارٹروں میں رہنے والے جیل کے عملے کے لیے تھے مگر بہت سے ملاقاتی اور غیر متعلقہ لوگ بھی تھے جو اپنے اپنے معاملات نمٹانے کے لیے باہر اور اندر کی دنیا کے درمیان رابطے رکھنے والے ایجنٹوں سے بات کر رہے تھے۔ جیل کے اندر مختلف قسم کے قیدی تھے۔ ایسے بھی جو برسوں سے کوئی جرم کیے بغیر یا کسی اور کے جرم کی پاداش میں وہاں بند تھے اور انہیں کبھی عدالت میں پیش تک نہیں کیا گیا تھا۔ اور ایسے بھی تھے جو سنگین جرائم میں ملوث تھے لیکن جیل کے اندر ہر سہولت حاصل کر لیتے تھے۔ باہر سے ہر چیز ان کو پہنچا دی جاتی تھی۔ گھر کے کھانے اور آرام دہ بستر سے اور اخبار تک۔ یہ کاروبار ہر جیل میں بلا روک ٹوک فروغ پر تھا۔

سات بجے میں نے گھڑی دیکھی۔ صدیقی نے چھ بجے ہم سے کہا تھا کہ کوٹ لکھپت جیل کے باہر پہنچ جائیں لیکن وہ خود ابھی تک غائب تھا۔ اچانک باہر کی طرف سے ایک کار آئی اور میرے سامنے سے گزر کے مین گیٹ کی طرف گئی۔ میں نے اس کے بند شیشوں کے پیچھے فیصل کے چہرے کی ایک جھلک دیکھی۔ یہ گاڑی دلاور کی تھی اور اسے چلانے والا اس کا بیٹا تھا۔

رابعہ نے کہا "یہ تو دلاور کی گاڑی ہے۔"

محسن بولا "میں نے تو اسے بھی دیکھ لیا۔ جو گاڑی چلا رہا تھا۔ تم نے پیچھے کچھ دیکھا؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا "اندھیرے میں کچھ دکھائی نہیں دیا۔"

دلاور کی گاڑی گیٹ سے دائیں جانب مڑ کے وہیں رک گئی تھی جہاں سہ پہر کے بعد ہم سب ایک ویٹنگ روم میں بیٹھے تھے۔ اب وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ برآمدے میں روشنی تھی مگر کمرا تاریک تھا.... پھر کوئی شخص سائے کی طرح چلتا ہوا نمودار ہوا اور اس نے مقفل دروازہ کھول کے اندر کی لائٹ جلا دی۔ گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کے دلاور کی بیوی اُتری اور کمرے میں داخل ہو گئی۔

میں نے رابعہ کو گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ محسن نے گاڑی کو آگے بڑھایا اور دلاور کی گاڑی کے برابر لگا دیا۔

اس وقت جیل کے احاطے کی طرف سے ایک گاڑی اندر آئی جسے خود جاوید صدیقی ڈرائیو کر رہا تھا۔ میں نے دوسری طرف دیکھا تو جیل کی فصیل کے فولادی دروازے سے بھی ایک گاڑی باہر

آرہی تھی۔ دونوں گاڑیاں مخالف سمت سے ایک دوسرے کی طرف بڑھتی جارہی تھیں۔ شاید زنداں کے اندر سے نکلنے والی گاڑی کے ڈرائیور کو امید تھی کہ مقابل سے نمودار ہونے والی گاڑی خود ہی ایک طرف ہوجائے گی اور اسے نکل جانے کا راستہ مل جائے گا۔ اس سڑک پر اتنی جگہ تھی کہ دو ٹرک ایک دوسرے کے پاس سے گزر سکتے تھے لیکن جاوید صدیقی نے ہیڈلائٹس کو فل بیم پر رکھتے ہوئے سڑک کو بلاک کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اصولاً اسے اپنے بائیں ہاتھ پر رہنا چاہیے تھا مگر وہ دائیں جانب آگیا تھا لیکن دونوں گاڑیوں میں تصادم کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ ان کی رفتار کم تھی۔

میری نظر ایک طرف تھی اور میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ جب گاڑیاں رُک جائیں گی تو کیا ہوگا؟ جیل کے اندر سے آنے والی گاڑی میں کون ہوگا۔

جب رابعہ نے چلّا کے مجھے دوسری طرف متوجہ کیا تو میں اُچھل پڑا۔ محسن مجھ سے پہلے ادھر دوڑ لگا چکا تھا پھر رابعہ بھی ویٹنگ روم کی طرف لپکی... فیصل نے اس کا راستہ روک لیا۔ رابعہ کے مقابلے میں پورا مرد تھا اور ایک تندرست و توانا نوجوان۔ گاڑی کا دروازہ پہلے سے کھلا ہوا تھا۔ اس نے رابعہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔

محسن کچھ آگے برآمدے میں تھا۔ اس نے پلٹ کے دیکھا۔ میرے لیے فیصلہ کرنا ضروری ہوگیا کہ مجھے کدھر جانا چاہیے؟

بائیں طرف دونوں گاڑیاں سڑک پر یوں آمنے سامنے رک گئی تھیں کہ چوڑائی کے رخ سڑک بلاک ہوچکی تھی اور دائیں بائیں کسی طرف سے کوئی سائیکل بھی نہیں گزر سکتی تھی۔

جیل کے اندر سے آنے والی گاڑی ہر طرف سے بند فولادی وین تھی۔ اس کا اگلا حصہ تو عام ٹرک جیسا کیبن تھا جس میں دو افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک ڈرائیور تھا۔ قیدیوں کو جیل خانے سے پیشی کے لیے عدالت لے جانے والی وین بھی جیل خانہ ہی تھی۔ فولادی دیواروں والے اس ڈبے میں صرف ہوا کے گزرنے کے لیے اوپر چھت کے ساتھ چھ انچ چوڑا جالی والا روشن دان تھا۔ پیچھے سے یہ کیبن بند تھا اور اس میں دُہرے دروازے تھے۔ پہلا دروازہ مقفل کرنے کے بعد باہر کے حصے میں جو جگہ بچی تھی اس میں دو مسلح محافظ بیٹھے تھے اور وہ دروازے کو اندر سے بند کرلیتے تھے۔

جیل کی وین میں رات کے وقت کسی قیدی کو کہیں پیشی کے لیے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ تاہم جیل کی گاڑیاں جیل حکام کی ذاتی ملکیت ہوتی ہیں۔ کوئی جیلر بازار سے پنسل منگوانے کے لیے وین کے ساتھ ڈرائیور کو بازار بھیج سکتا تھا تو اس کی بیوی بھی یہ گاڑی سبزی لانے کے لیے استعمال کرسکتی تھی۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ آتے جاتے پولیس کی گاڑی کو روک سکے۔ ظاہر ہے وین کے ڈرائیور نے یہی سمجھا ہوگا کہ سامنے سے آنے والی گاڑی کا ڈرائیور نشے میں ہے۔ اس نے گاڑی کو دائیں طرف سے نکالنے کی کوشش کی تو سامنے والی کار بھی دائیں طرف ہوگئی اور پھر یہ لگا کے دونوں گاڑیاں ترچھی کھڑی ہوگئیں۔

کار میں سے اترنے والا پہلا شخص خود ایس ایس پی جاوید صدیقی تھا جس نے پوری یونیفارم پہن رکھی تھی۔ اس کے ساتھ اُترنے والے بھی پولیس کی وردی میں تھے اور ان کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں۔

میں اتنی دیر میں ویٹنگ روم کی طرف قدم بڑھا چکا تھا مگر مجھ سے پہلے محسن وہاں پہنچ چکا تھا۔

رابعہ نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی "فیصل...! ہاتھ چھوڑو میرا... ورنہ..."

فیصل نے اسے ایک جھٹکا دیا "ورنہ کیا...؟"

"ورنہ کی اولاد" محسن نے پیچھے سے اس کے سر پر مکّا مارا۔

فیصل کی ماں اندر سے چلّائی "فیصل۔ جان سے ماردے اس حرام زادی کو۔ ہڈیاں توڑدے اس کی، جلدی کر۔"

کمرے کے اندر سے ایک شخص آہستہ آہستہ چلتا ہوا آیا۔ وہ وہاں پہلے سے موجود ہوگا۔ کمرے کا قفل کھولے جانے کے بعد میں نے کسی کو باہر سے اندر جاتے نہیں دیکھا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ مقفل اور اندھیرے کمرے میں چھپا ہوا تھا۔ جب وہ روشنی میں آیا تو میں نے اسے دیکھا۔ وہ چوہدری دلاور تھا۔

ماں کی آواز فیصل کے کانوں تک ضرور پہنچی ہوگی مگر اس سے پہلے ہی محسن کا مُکّا اس کے سر میں مغز کو ہلا چکا تھا۔ شاید اسے رات کو سورج نظر آگیا ہوگا۔ جیسے دن میں تارے نظر آجاتے ہیں۔

فیصل نے سر جھٹکا اور پھر رابعہ کو چھوڑ کے محسن کی طرف پلٹا۔ محسن دوسرا مُکّا گھما چکا تھا۔ یہ مُکّا فیصل کے چہرے پر سامنے سے عین ناک پر لگا لیکن وہ اچھی کاٹھی والا مضبوط نوجوان تھا۔ نازو نعم میں پلنے کے باوجود وہ نازک نہیں تھا۔ وہ محسن سے چمٹ گیا۔

چوہدری دلاور کو دیکھتے ہی میں نے فیصل اور محسن کی دست بدست جنگ میں دخل دینے کا خیال ترک کردیا۔ اوّل تو محسن اس لونڈے سے خود ہی نمٹ سکتا تھا مگر جیل کے احاطے میں اور گیٹ کے سامنے اس قسم کی لڑائی زیادہ دیر جاری نہیں رہ سکتی تھی۔ آس پاس کے لوگ جمع ہوجاتے تو فرار کے راستے بند ہوجاتے پھر جیل کے محافظ پہنچ جاتے اور فریقین کو گرفتار کرلیتے۔ مجھے اس سے پہلے ہی چوہدری دلاور کو نکال کرلے جانا تھا۔

رابعہ نے کہا تھا کہ ہم وہاں اپنے دفاع میں بھی فائرنگ نہیں کرسکتے۔ وہ ریوالور اپنے پاس رکھنے کے موڈ میں ہی نہیں تھی مگر اچانک اس نے بھی محسوس کیا کہ یہ دنگل فوراً ختم کرانے کے لیے اسے آتشیں اسلحے کی قوت کا مظاہرہ کرنا ہی پڑے گا۔

اس نے ریوالور نکال کے کہا "فیصل۔ رُک جاؤ ورنہ میں گولی

ماردوں گی" لیکن یہ صرف دھمکی رہی۔

... کے قریب تھا۔ میں نے اسے ... دھکیل دیا۔ دلاور کی بیوی نے چیخ ماری۔ اس نے دلاور کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا۔ "جلدی کرو دلاور۔ ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ مگر خیر... تم بیٹھو، میں چلاؤں گی گاڑی، فیصل!"

دلاور کی نظر مجھ پر تھی اور وہ منجمد ہوگیا تھا "نہیں، تم جاؤ۔ فیصل کے ساتھ نکل جاؤ۔ چھوڑو مجھے۔"

"یہ مصیبت کہاں سے نازل ہوگئی یا میرے خدا" دلاور کی بیوی چلّانے لگی۔ پھر اس نے مجھے دیکھ لیا "یہ وکیل کیا کررہا ہے یہاں؟"

"بے وقوف عورت!" دلاور نے کہا "فضول سوالات مت کرو۔ تم جاؤ، ورنہ تم بھی پھنس جاؤگی۔"

"اور تم...؟" وہ کانپتے ہوئے بولی "تم کیا کروگے؟"

"میں واپس اندر چلا جاؤں گا۔" دلاور نے کہا "مجھے کچھ نہیں ہوگا۔"

میں اب کسی ایکشن کی ضرورت محسوس نہیں کررہا تھا۔ دلاور کو جیل سے لے جانے کی کوشش ناکام ہوچکی تھی۔ فیصل کے سر پر رابعہ نے ریوالور کا دستہ مارا تھا۔ محسن نے اسے گرنے سے پہلے ہی گاڑی کے کھلے دروازے سے اندر دھکیل دیا تھا اور وہ سیٹ پر گرا تھا۔ صورتِ حال کسی حد تک ہمارے حق میں تھی پھر دلاور کی بیوی نے اپنا ہینڈ بیگ کھول کے ریوالور نکالنے کی کوشش کی تو میں نے اس کا ہاتھ تھام کے فرنچ میں کہا "اب کوئی فائدہ نہیں۔"

دلاور نے مجھے گالی دی "چھوڑ اسے کتّے" وہ مجھ پر حملہ آور ہوا۔ میں نے دلاور کی بیوی کو پیچھے دھکیل دیا اور دلاور کو ایک ہاتھ پر روک کے محسن کی طرف پھینک دیا۔ میں اس کو مارنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی جسمانی حالت ابھی اتنی اچھی نہیں ہوئی تھی کہ وہ میرا مقابلہ کرسکتا یا مار کھا سکتا۔

محسن نے اسے دبوچ کے اپنے ساتھ کھینچا۔ پیچھے سے میں نے دلاور کو لات ماری۔ وہ دوسری طرف سے گاڑی کی پچھلی والی سیٹ پر گرا۔ وہاں اس کا بیٹا پہلے ہی اوندھا پڑا ہوا تھا۔ اس پر گرتے ہی دلاور نے اٹھنے کی کوشش کی مگر میں ایک سیکنڈ ضائع کیے بغیر پیچھے کا دروازہ بند کرکے سیٹ پر بیٹھ کر اس کو دبا چکا تھا۔

دلاور کی بیوی سمجھ گئی کہ وہ اپنے شوہر کو حاصل کرنے کی کوشش میں اُلٹا اسے گنوا بیٹھی ہے۔ اس نے مدد کے لیے چلّانا شروع کیا ہی تھا کہ میں نے گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی۔ پھر دھمادھم دونوں دروازے بند ہوئے۔ محسن نے گاڑی کو پوری ریس دے کے اُٹھایا۔ رابعہ اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ چکی تھی۔ گاڑی زخم خوردہ جانور کی طرح دیوانہ وار بھاگی۔

رابعہ نے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ کہا "سیدھے چلو۔ سیدھے مگر ادھر سے گھوم کے۔"

محسن نے گاڑی کو پورا دائرے میں گھمادیا اور گاڑی پودوں کو روندتی ہوئی ویٹنگ روم کے پچھلے حصے میں آگئی۔ دلاور کی بیوی نے ریوالور سے اندھا دھند فائر کیے۔ آس پاس افراتفری پھیل گئی۔ میں نے جیل کے محافظوں کی سیٹی کی آواز سنی اور اپنا سر نیچے رکھا۔ دلاور کی بیوی غصّے، مایوسی اور صدمے سے پاگل ہورہی تھی۔ جب میں نے اسے دھکا دیا تھا تو وہ بری طرح دیوار سے ٹکرائی تھی۔ ایسی حالت میں وہ نشانہ لے کر کیسے فائر کرسکتی تھی۔ اس کی یہ دیوانہ وار کوشش رائگاں گئی۔ رات بھی کسی حد تک ہماری محافظ بنی۔ گاڑی اندھیرے اجالے میں درختوں کے درمیان سے لہراتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔

محسن صرف ڈرائیونگ کررہا تھا۔ اس علاقے کے جغرافیے سے رابعہ واقف تھی۔ وہ محسن کو ہدایات دے رہی تھی۔ محسن بھی گاڑی کو سیدھا چلانے کے بجائے لہراتا ہوا آگے بڑھا رہا تھا۔ سڑک جو سیدھی باہر لے جاسکتی تھی کچھ دور رہ گئی تھی۔ اب ہم عملے کے رہائشی کوارٹروں والے علاقے سے گزر رہے تھے اور وقتی طور پر کچھ محفوظ ہوگئے تھے۔

ہمارے پیچھے جیل کے دروازے پر ایک ہنگامہ جیسا تھا جس کا شور ہمارے کانوں تک پہنچ رہا تھا۔ اس شور میں چیخ پکار کی آوازوں کے ساتھ سیٹیاں بھی شامل تھیں۔ جیل کی فصیل پر سے محافظ ہوائی فائرنگ کررہے تھے اور اضافی سرچ لائٹس جلادی گئی تھیں۔

جیل میں اس قسم کے ہنگامے کا مطلب یہی سمجھا جاتا ہے کہ شاید کوئی قیدی فرار ہو گیا ہے یا کسی کو نکال کرلے جانے کی کوشش ہوئی ہے۔ دور سے دیکھنے والوں کو اصل واقعے کا علم کیسے ہو سکتا تھا۔ ہم سبزی کے کھیت سے گزرے پھر اچانک ہمارے سامنے دیوار آگئی۔ یہ دیوار شاید چھ سات فٹ اونچی تھی اور اس کے پیچھے کوئی بازار تھا۔ کوارٹروں میں رہنے والوں نے اپنی آسانی کے لیے اس دیوار کی کچھ اینٹیں نکال کے ایک تنگ سا راستہ بنالیا تھا۔ یہ بے ہنگم سوراخ تین ساڑھے تین فٹ لمبا چوڑا ہوگا اور اس میں سے کوئی بھی تھوڑی سی کوشش سے سر جھکا کے گزر سکتا تھا۔ بازار تک پہنچنے کا صحیح راستہ تو وہی گیٹ تھا جس سے ہم گزر کے آئے تھے اور یہ راستہ عام پبلک بھی استعمال کرتی تھی مگر کوارٹروں میں رہنے والے بچے عورتیں اگر اس راستے سے بازار جاتے تو انہیں ہر چکر ایک میل کا پڑتا۔ ایسے شارٹ کٹ ہر جگہ لوگ خود بنالیتے ہیں۔

محسن نے مجھ سے فرنچ میں سوال کیا "گاڑی اس شگاف میں سے گزار دوں؟"

میں نے کہا "پاگل ہو گئے ہیں آپ؟"

"دیوار گر جائے گی۔ راستہ نہیں بند ہوگا" محسن نے یقین دلایا۔

"لیکن دیوار کی دوسری طرف کیا ہوگا؟ نہ جانے کون ملبے میں دب جائے گا یا کوئی دیوار سے برآمد ہونے والی کار سے کچلا جائے گا۔ تو گاڑی اسی جگہ روک لے۔" میں نے کہا۔

محسن نے گاڑی روک لی "اب کیا ہم ان کا انتظار کریں جو ہمارے پیچھے آرہے ہیں۔"

میں نے کہا "رابعہ سے کہہ کہ نکل جائے۔"

محسن نے کہا "مس رابعہ۔ آپ کے لیے حکم ہے کہ اس شگاف سے نکل جائیں۔"

"مگر...؟"

"اگر مگر نہیں چلے گی" محسن دہاڑا "جاؤ...!"

رابعہ نے احتجاجاً دروازہ کھولا اور باہر نکل گئی۔ جاتے جاتے وہ ریوالور محسن کی طرف اُچھال گئی۔ میں نے اسے دیوار کے خلا سے غائب ہوتے دیکھا۔ میرے دماغ کا کمپیوٹر تیزی سے کام کر رہا تھا۔

"تو مخالف سمت میں دوڑ لگا۔ اس دیوار کے ساتھ ساتھ جہاں تک جا سکتا ہے۔"

"دیوار کے ساتھ ساتھ تو میں گیٹ تک پہنچ سکتا ہوں۔"

"سو گز دور جا کے دو تین فائر کر دے" میں نے کہا "پھر دیوار کے اوپر سے باہر کود جا۔ اور موقع نہ ملے تو واپس ادھر آجانا۔"

محسن سمجھ گیا کہ میں دھوکے سے دشمن کی توجہ دوسری طرف کرنے کی حکمتِ عملی اختیار کروں گا۔ میں اپنے پیچھے آنے والوں کی آوازیں بھی سن سکتا تھا۔ وہ پولیس کی گاڑی میں، موٹر سائیکلوں پر اور پیدل دوڑتے ہوئے آرہے تھے۔

محسن دیوار کے ساتھ ساتھ بھاگنے لگا۔ یہ دیوار جیل کی آخری حد تھی۔ اس کے اور کوارٹروں کے درمیان وہ کھیت تھے جن میں قیدی کام کرتے تھے۔ قیدِ بامشقت کاٹنے والوں کو یہاں سارا سال ایسے ہی کاموں میں مصروف رکھا جاتا تھا۔ وہ زمین کھودتے تھے گھاس صاف کرتے تھے اور سبزی کاشت کرتے تھے پھر تازہ سبزی جیل کے عملے کو مفت مل جاتی تھی۔ قاعدے قانون کے مطابق قیدیوں سے لی جانے والی مشقت کی پیداوار کو فروخت کرکے انہی کی فلاح و بہبود پر خرچ کرنا ضروری تھا۔ لیکن اس قانون پر عمل کرنا ضروری ہے۔ یہ شاید کہیں نہیں لکھا گیا تھا چنانچہ جیل کے اندر بھی قیدی جو کپڑا بُنتے تھے یا دریاں اور قالین بناتے تھے اس کی آمدنی کا حساب کوئی نہیں رکھتا تھا۔ نمائشی طور پر کہیں ایک شوکیس میں کچھ چیزیں ضرور سجادی جاتی ہیں جو کبھی جیل کے معائنے کے لیے آنے والے کسی وی آئی پی کو دکھائی جاتی ہیں کہ یہ قیدیوں نے بنائی ہیں۔ وی آئی پی مسکرا کے کہتا ہے "وری گڈ" اور آگے بڑھ جاتا ہے۔

ہم اپنی مشقتی قیدیوں کی محنت کو برباد کرتے ہوئے سبزیوں کے پودوں کو گاڑی سے روندتے دیوار تک پہنچے تھے۔ ہم کوارٹروں کے بالکل پیچھے سے گزرے تھے اور اب بالکل اندھیرے میں تھے۔ محسن نے گاڑی کی لائٹس بھی بجھادی تھیں۔ کافی فاصلے پر مجھے کچھ لوگ ہاتھ سے اشارے کرتے نظر آرہے تھے۔

محسن نے چند منٹ کے بعد فائر کیے تو ہمارے پیچھے دوڑنے والے ایک دم رک گئے۔ کسی نے چلّا کے کہا "ادھر گئے ہیں وہ۔"

کسی اور نے کہا "گاڑی تو ادھر نظر آرہی ہے؟"

"وہ گاڑی چھوڑ کے بھاگے ہیں۔"

"وہ... وہ دیکھو، وہ کوئی دیوار پھاند کے گیا ہے" کئی آوازیں آئیں اور پھر ایک فائر ہوا۔ تعاقب کرنے والی جیپ کا رخ بدل گیا۔

میں نے محسوس کیا کہ چوہدری دلاور بے حس و حرکت پڑا ہوا ہے۔ اگر وہ مکر نہیں کر رہا تھا تو میرے وزن کے نیچے دب کے اس کا دم گھٹ گیا تھا۔ میں نے جیب سے رومال نکال کے اس کا کونا ایک بتی کی طرح دلاور کی ناک میں گھمایا۔ اگر وہ سچ مچ بے ہوش نہ ہوتا تو ضرور سر جھٹکتا یا ہاتھ ہلاتا۔

پیچھا کرنے والے اب واضح طور پر دو حصوں میں بٹ گئے تھے۔ ایک ٹولی ادھر گئی تھی جہاں سے محسن نے فائرنگ کی تھی اور پھر دیوار پھاند کے فرار ہو گیا تھا۔ اس ٹولی میں ایک جیپ کے ساتھ کچھ لوگ سائیکل پر اور پیدل بھی دوڑ رہے تھے۔

دوسری ٹولی سیدھی کار کی جانب آرہی تھی۔ اس کی قیادت کوئی موٹر سائیکل والا کر رہا تھا لیکن موٹر سائیکل اندھی تھی۔ اس کی ہیڈ لائٹ کام نہیں کر رہی تھی۔ جیپ کے لیے سبزی کے کھیتوں کی نرم مٹی کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ جیپ فور دھیل ڈرائیو ہوتی

لاور کو بھی کھینچ کر چار فٹ اونچی دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ باہر کی آوازوں سے میں اندازہ کر چکا تھا کہ تعاقب کرنے والے کار تک پہنچ چکے ہیں۔ ان سب کو یقین تھا کہ ہم دیوار کے شگاف سے نکل کے فرار ہو گئے اور گاڑی چھوڑ گئے۔

میں نے جو سوٹ پہنا تھا اس کے گھٹنے زمین پر چلنے سے پھٹ گئے تھے اور مٹی دھول کے ساتھ جھاڑ جھنکاڑ نے کوٹ پتلون کے ساتھ ٹائی کو میلا اور مضحکہ خیز بنا دیا تھا۔ میں فرنچ وکیل سے زیادہ کسی سرکس کا مسخرا لگتا تھا۔ میں نے چوہدری دلاور کی اور اپنی حالت پر غور کیا۔ گردشِ حالات نے ہمیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔ میں ایک صنعت کار کا بیٹا لندن میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ چوہدری دلاور خود صنعت کار تھا۔ اس وقت ہم دونوں...... جیل کے کچرا خانے میں پڑے ہوئے تھے۔ ایک شکاری دلاور تھا جو میرے پیچھے لگا ہوا تھا پھر بازی پلٹ گئی اور میں شکاری بن کے دلاور کا تعاقب کرنے لگا لیکن اصل شکاری وقت تھا، تقدیر تھی اور ہمارے مقاصد و عزائم تھے۔ دلاور مجھے اپنی راہ سے ہٹانا چاہتا تھا تو میں دلاور کو اس کے اعمال کی سزا میں تختۂ دار پر دیکھنے کا آرزومند تھا۔ شوکت رانا سارے کاروبار پر قابض ہونے کے لیے دلاور کو ختم کرنا چاہتا تھا تو دلاور کی بیوی مجھ سے کہہ چکی تھی کہ شوکت رانا کو مار دو۔ نہ جانے کتنے لوگ تھے جو انجام سے بے خبر اس شکارگاہ میں ایک دوسرے سے چھپتے پھر رہے تھے اور ایک دوسرے کی تلاش میں بھی تھے۔

چند افراد دیوار کے ساتھ ساتھ کوڑے خانے تک بھی آئے۔ اگر دن کا اجالا ہوتا تو ان کی کھوجی نظریں فرشِ خاک پر وہ نشانات دیکھ سکتی تھیں جو میرے ہاتھوں پیروں کے بل گھسٹنے سے نمایاں ہو گئے تھے۔ ان کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مایوس ہو گئے ہیں۔ ان کو یقین تھا کہ ہم دیوار کے شگاف سے نکل گئے اور اب ہمارے اندر کہیں ملنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ لطف کی بات یہ تھی کہ ان میں سے کسی کو ہمارے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ ایک کا خیال تھا کہ گاڑی میں دو مرد تھے اور دو عورتیں تھیں۔ دوسرے نے ایک عورت کے ساتھ تین مرد دیکھے تھے۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ جیل سے قیدی فرار ہوئے ہیں تو کسی کا خیال تھا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوئے اور محافظوں کی فائرنگ نے قیدی چھڑانے والوں کو جان بچا کے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔

رابعہ سب سے پہلے باہر گئی تھی۔ محسن کے بارے میں بھی مجھے شک نہیں تھا کہ پیچھا کرنے والوں کو گمراہ کرکے وہ بھی دیوار کے اوپر سے باہر کود گیا اور بازار میں عام لوگوں کے ساتھ مل گیا۔ صرف جاوید صدیقی کا پتا نہیں تھا کہ اس نے جیل کی وین کا راستہ کیوں روکا تھا اور اسے کس حد تک اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہوئی۔ اس کی تمام تر کارروائی غیر قانونی اور بلاجواز تھی۔ معطل کیے جانے کے بعد وہ اپنی ایس ایس پی کی وردی پہن کے کسی کو بھی

ہے۔ ہم تو کار میں اس راستے سے رُکے بغیر گزر گئے تھے۔ کھیت میں چھوٹی بڑی کیاریاں بنی ہوئی تھیں اور کہیں پانی اتنا زیادہ دیا گیا تھا کہ مٹی بھی کیچڑ بن گئی تھی مگر تقریباً نئی کار کے انجن کی ٹیوننگ بھی بہترین ہوئی تھی اور اس کے ٹائر بھی بالکل نئے تھے چنانچہ تیز رفتاری میں گاڑی نرم زمین پر سے کیچڑ اُچھالتی نکل گئی تھی۔

موٹر سائیکل کے لیے یہ راستہ انتہائی ناموزوں تھا مگر موٹر سائیکل والا بھی ہوشیار تھا۔ وہ شاید یہیں کا رہنے والا تھا اور اس کچے صاف راستے سے واقف تھا جو بازار جانے والے شگاف تک پہنچنے کے لیے استعمال کرتے ہوں گے۔ وہ اسی راستے پر موٹر سائیکل چلا رہا تھا۔ قسمت ساتھ دیتی یا وہ جلدی میں نہ ہوتا تو ناکام ہی نہ ہوتا۔ رات کے اندھیرے میں وہ منڈیر پر سے اُتر گیا اور اس کی موٹر سائیکل پالک یا مولی کے کھیت میں بند ہو گئی۔ سوار اپنی سواری سمیت کیچڑ میں گر گیا۔ جیسے کہہ۔ جُھمکا گرا رے بریلی کے بازار میں۔

اس سے پہلے کہ لوگ گرا ہوا جُھمکا اٹھاتے، میں نے چوہدری دلاور کو کندھے پر اٹھایا اور دیوار کے ساتھ ساتھ رینگتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ چوہدری دلاور میری پیٹھ پر تھا اور اس بوجھ کا توازن برقرار رکھتے ہوئے میں چاروں ہاتھوں پیروں پر چل رہا تھا۔ دلاور کے دونوں ہاتھ میرے دونوں بازوؤں کے ساتھ لٹک رہے تھے اور اس کے پاؤں میرے پاؤں سے ٹکرا رہے تھے مگر میں نے پیش قدمی جاری رکھی۔

دیوار کی جڑ میں مکمل اندھیرا تھا۔ یہاں سخت مٹی تھی اور کنکر تھے جو میری ہتھیلیوں میں گڑ رہے تھے۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر دیوار میں ایک برجی سی آتی تھی۔ میں مشکل سے سو قدم ہی گیا تھا کہ کھلے گٹر میں گر گیا۔ یہ گٹر دیوار کے نیچے سے گزرنے والی سیوریج لائن کا تھا اور اس پر ڈھکن کا نہ ہونا کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ ہم تو مصروف شاہراہوں پر کھلے منہ والے مین ہول دیکھ کے بھی حیران نہیں ہوتے۔

مکمل تاریکی میں کھلے مین ہول کا اندھیرا مجھے دکھائی ہی نہیں دیا۔ جب میں اندر گرا تو میرے ہاتھ پہلے خلا میں اُترے۔ میں منہ کے بل غلاظت کے سیاہ ملغوبے میں اتر جاتا تو پھر باہر نکل کے دنیا کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔ ایک خود کار اور فوری ردِعمل کے ساتھ میرا جسم اکڑ گیا اور میں نے دلاور کے بوجھ سمیت خود کو اتنا اوپر اٹھا لیا کہ میرے ہاتھ گٹر کے دوسرے کنارے پر جم گئے۔

میں نے ایک گہری سانس لی اور خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے گٹر کی سائیڈ سے گزر گیا۔ اس کے فوراً بعد وہ مختصر سا احاطہ تھا جس میں کوڑا کچرا جلایا جاتا تھا۔ ایک لمحے کا توقف کیے بغیر میں نے پہلے دلاور کو اندر ڈالا اور پھر خود بھی اندر اتر گیا۔

گٹر کی اور کوڑے کرکٹ کی بدبو میرا دماغ خراب کر رہی تھی لیکن میں دم سادھے اس کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ میں نے

کوئی حکم نہیں دے سکتا تھا۔ معلوم نہیں وہ چار مسلح سپاہی کیسے ساتھ لایا تھا۔ اس کی وجہ یہی ہوسکتی تھی کہ ابھی تک اس کے معطل ہونے کی خبر عام نہیں ہوئی تھی۔ خود اس کے دوست جیلر خورشید کو علم نہیں ہوگا کہ جاوید صدیقی کی فرسٹریشن اس انتہا کو پہنچ جائے گی کہ وہ اپنے ساتھ اس کی نوکری کو بھی داؤ پر لگادے گا۔ ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے۔

اس تاریک متعفن احاطے سے نکلنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ دیوار کے شگاف تک راستہ صاف ہوجائے۔ میں نے سر کو دیوار سے اوپر اٹھاکے جھانکا تو مجھے گاڑی کے پاس دو مسلح گارڈ نظر آئے۔ یہ گاڑی نہیں بھاگتے چور کی لنگوٹی تھی اور اب تفتیش کرنے والے اس لنگوٹی کا خردبینی معائنہ فرماکے پتا چلانے کی کوشش کریں گے کہ چور کون تھا۔ گاڑی میں دستیاب فنگر پرنٹس کے فوٹو بنائے جائیں گے۔ کاغذات کی مدد سے شجاعت علی بغدادی کا سراغ لگایا جائے گا اور بات پہنچے گی ایک ہزار میل دور کراچی کے میٹروپول ہوٹل تک اور اس شوروم تک جہاں سے میں نے گاڑی خریدی تھی۔ بہت جھک مارنے کے بعد ماہرین رپورٹ دیں گے کہ شجاعت علی بغدادی نام کا کوئی شخص نہیں، وہ غالباً چوہدری دلاور کا پرانا دشمن سکندر بخت تھا جس نے یہ گاڑی فرضی نام سے اسی لیے خریدی تھی کہ دلاور کو اغوا کرلے۔ اس خیال کی تائید گاڑی میں رابعہ اور محسن کی موجودگی سے بھی ہوجائے گی۔ تاہم یہ اندازے اندھیرے میں تیر چلانے کے مترادف ہوں گے کہ آخر دلاور کے کوٹ لکھپت جیل میں زندہ پائے جانے کی خبر عام کیسے ہوئی جب کہ اسے تو مردہ قرار دیا جاچکا تھا۔

ہم سب جو یہاں ایک ہی مقصد لے کر آئے تھے حادثاتی طور پر افراتفری کا شکار ہوئے تھے۔ اور اب ایک کو دوسرے کی خبر نہ تھی۔ ابھی یہ کہنا بھی قبل از وقت تھا کہ وہ مقصد حاصل ہوگیا۔ مقصد میرے سامنے کچرے کے ساتھ پڑا ہوا تھا لیکن اس کے ڈسپوزل کا مسئلہ حل ہونا باقی تھا۔

جیل خانے کی حدود سے نکل جانے والے یعنی رابعہ اور محسن تو یقیناً باہر ایک دوسرے سے مل چکے ہوں گے۔ رابعہ دیوار کے بیچ ہی سے گزر گئی تھی تو محسن دیوار کے اوپر سے گزرا تھا اور میں بال بال بچ گیا تھا ورنہ گٹر لائن میں سوئمنگ کرتا ہوا دیوار کے نیچے سے گزر جاتا۔ جتنی فکر مجھے اپنے گم شدہ لواحقین کی تھی اتنی ہی ان کو میری ہوگی اور مجھ سے زیادہ مال غنیمت یعنی اپنے چوہدری صاحب کی۔ ایس ایس پی جاوید صدیقی کا محاذ الگ تھا لیکن اسے روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ تو شاید دو چار کو ہمراہ ہی لے گیا ہوگا مگر یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں گیا اور ہم سے پھر کہاں ملے گا۔ صورتِ حال وہی ہوگئی تھی کہ میں تو کمبل کو چھوڑتا ہوں کمبل مجھے نہیں چھوڑتا۔ بڑی مشکل سے ہم نے دلاور کو پولیس کے حوالے کیا تھا مگر وہ پھر ہمارے ساتھ بلائے بے درماں کی طرح چمٹا ہوا تھا۔ گاڑی میں اس کا ہونہار سپوت جب ہوش میں آئے گا تو چلّائے گا ابّا یا شاید ابّا کو یاد کرے گا اور پوچھے گا میں کہاں ہوں؟

چوہدری دلاور نے اچانک کراہ کے کہا "او نیک بخت... میں نے... چپ کرکے پڑا رہ بدبخت... ورنہ..."

اب نیک بخت کے بجائے سکندر بخت کی آواز سن کے وہ بے ہوش ہوگیا۔ اس کی خاموشی کو بے ہوشی سمجھ کر مطمئن ہونا بھی غلط تھا۔ اس کے حواس بحال ہورہے تھے اور شاید اسے یاد آنے لگا تھا کہ جیل خانے سے فرار کا عظیم الشان منصوبہ کیسے اچانک ناکامی کی نذر ہوگیا تھا۔ اسپتال کے ریکارڈ میں فوت ہوجانے والا چوہدری دلاور یہاں کچرا خانے میں پڑا تھا۔ نہ جانے اس کارِ خیر پر چوہدری دلاور کے وارثوں نے کتنا پیسہ خرچ کیا تھا۔ اگر بیچ میں ہم نہ کودتے تو بیک وقت دو مقاصد حاصل ہوتے۔ چوہدری دلاور کی گرفتاری کی بات غلط ہوجاتی۔ یہ ہوائی کسی دشمن نے اُڑائی ہوگی۔ دلاور چھ مہینے، سال ولایت کے صحت افزا اور ایمان پرور ماحول میں گزار کے لوٹتا اور اچانک اعلان کردیتا کہ میں دوسری دنیا میں نہیں لندن اور پیرس میں تھا۔ کون کہتا ہے کہ میں اللہ کو پیارا ہوگیا تھا۔ وہ کوئی اور دلاور ہوگا اور اگر وہ چوہدری دلاور ہی تھا تو کیا ہوا۔ ایک نام کے کئی لوگ ہوتے ہی ہیں۔ میری شناخت تو کسی ثبوت کی محتاج نہیں اور چوہدری دلاور کی عدم موجودگی میں دوسرا مقصد یہ پورا ہوتا کہ زیرِ حراست بیمار ملزم کو تفتیش کے دوران تشدد سے ہلاک کردینے پر ایس ایس پی جاوید صدیقی کو سزا ہوجاتی۔ نوکری اور عزت تو لازمی جاتی۔ جیل جانے کی نوبت بھی آجاتی۔ چوہدری دلاور کے دوسرا جنم لیتے ہی گویا پنڈورا باکس کھل جاتا اور نئے سرے سے تفتیش ہوتی کہ آخر یہ سب کس نے کیا تھا، کیسے کیا تھا اور کیوں؟ لیکن گڑے مُردے اکھاڑ کے پرانے سوالات کا جواب حاصل کرنا آسان نہ ہوتا۔

معلوم نہیں چوہدری دلاور کے ذہن میں ایسا ہی کوئی منصوبہ تھا یا کچھ اور۔ میرے ذہن میں اس وقت ایک ہی منصوبہ تھا کہ چوہدری دلاور کو کندھے پر بٹھاکے الٰہ دین کے چراغ کے جن کی طرح پرواز کرجاؤں۔ سیدھا جاکے اُتروں ایس ایس پی جاوید صدیقی کی گاڑی میں اور سر جھکاکے کہوں کہ غلام حاضر ہے۔ اور چوہدری دلاور کو سامنے رکھ دوں۔ مگر اس سے زیادہ مشکل مجھے چھ فٹ اونچی دیوار عبور کرنا لگ رہا تھا۔

میرے کانوں میں اب ایک نئی آواز گونج رہی تھی۔ یہ اسی نیک بخت کی آواز تھی جسے اپنے چوہدری صاحب نے نیم بے ہوشی کے عالم میں یاد فرمایا تھا۔ ایک ماں کو اپنا لختِ جگر مل گیا تھا اور وہ فرطِ جذبات میں چلّا رہی تھی "ہائے ہائے فیصل، کیا ہوا ہے تجھے اللہ بیڑا غرق کرے ان کا۔ جنہوں نے تیرا یہ حال کیا ہے" اس عورت کے جگر کا ٹکڑا تو مل گیا تھا مگر دل کا ٹکڑا یہاں کچرے میں پڑا ہوا تھا۔ اس کی مجبوری یہ تھی کہ وہ چوہدری دلاور کے اغوا پر واویلا

... لگے تھے اور پکڑے جانے کے خوف کی ٹینشن ختم ہوگئی تھی۔ میں نے کچرا خانے سے نکل کے تازہ ہوا کھانے کا سوچا اور پھر خود کو صبر کی تلقین کی۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ مجھے دریافت کرنے کے بعد محسن اور رابعہ مجھے جلد از جلد یہاں سے نکال کرلے جانے کی تدبیر میں مصروف ہوں گے۔ انتظار فرمایئے۔

میں نے مزید دس منٹ انتظار فرمایا اور اس وقفے میں کم سے کم بیس بار گھڑی دیکھی اور دس بار دیوار کے اوپر سے سر نکال کے دیکھا مگر اس سارے علاقے میں اندھیرے کا راج تھا اور ہر طرف سول بلاک کے سوا کچھ نہ تھا۔ ان سے آگے عملے کے رہائشی کوارٹر اور جیل کی سرچ لائٹس سے منور علاقہ تھا۔ یہ ایک الگ دنیا تھی۔

محسن نے کچرے خانے کی دیوار کے اوپر سے کہا "ہیلو کچرا بابا۔ "تو میں بھی اُٹھ رہا تھا۔ میں اوپر سے جھانکنا چاہتا تھا۔ میرا سر اس کی ٹھوڑی پر لگا "تو اکیلا آیا ہے؟"

"اور کیا ہاتھی گھوڑے ساتھ لاتا؟" وہ بولا "خود بھی بڑی مشکل سے پہنچا ہوں۔ رابعہ باہر کھڑی ہے۔ میں بھی جارہا ہوں۔"

میں نے کہا "اپنے چوہدری صاحب کا جنازہ کیسے جائے گا؟"

محسن نے ہاتھ بڑھاکے کہا "اسے اٹھاکے دیوار پر رکھ۔ میں دوسری طرف سے اٹھالوں گا۔ اس کے بعد آپ خود جیسے چاہیں تشریف لے آئیں، دیوار میں سے یا دیوار کے اوپر سے۔"

اس نے عملی مظاہرے کے لیے چھ فٹ کی دیوار پر ہاتھ رکھے اور خود کو اوپر اُٹھایا۔ پھر جمناسٹک کا نمونہ پیش کرتے ہوئے دوسری طرف غائب ہوگیا۔ میں نے بلاتوقف چوہدری دلاور کو کچرا خانے کی دیوار پر لمبا لٹایا اور خود باہر نکل آیا۔ یہاں سے بیرونی دیوار تک کا فاصلہ چند قدم تھا جسے عبور کرنا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ میں نے چوہدری دلاور کو لٹایا تو وہ فوراً ہی غائب ہوگیا۔ دوسری طرف محسن مستعد کھڑا تھا اور صاف ظاہر تھا کہ ہم سب کے لیے سواری بھی دستیاب تھی۔ وہ گاڑی جو کراچی میں شجاعت علی بغدادی نے خریدی تھی اور لاہور میں سکندر بخت نے بڑی محبت سے نگی کو تحفے میں دی تھی پولیس کے قبضے میں پہنچ چکی تھی اور اب اسے بھول جانا ہی بہتر تھا۔ یار زندہ صحبت باقی۔ تمہیں ہم اس سے بھی زیادہ عالی شان کار کا تحفہ دیں گے نگی، انشاءاللہ۔

میں نے محسن کی طرح جمپ لگاکے دیوار کو عبور کیا تو عین محسن کے اوپر اُترا۔ اس میں قصور میرا نہیں تھا۔ محسن کو کسی اور جگہ کھڑے ہونا چاہیے تھا۔ وہ بہت خفا ہوا۔

"بے بلائے ناگہانی کی طرح نازل ہونا ضروری تھا؟"

میں نے اسے تسلی دی "نیوٹن کے سر پر سیب گرا تھا تو اس نے خدا کا شکر ادا کیا تھا کہ وہ تربوز کے درخت کے نیچے نہیں بیٹھا تھا۔ اگر میرے بجائے تجھ پر مولوی خادم حسین کی گھروالی چھلانگ لگاتی پھر؟"

نہیں کرسکتی تھی اور اس کی لاش کے غائب ہوجانے کا ماتم کرنے سے بھی قاصر تھی۔ وہ شور کررہی تھی کہ آخر وہ کمینہ محسن، وہ لفنگا گورا وکیل اور وہ حرافہ رابعہ نکل کیسے گئے۔ اتنے لوگ دیکھ رہے تھے۔ اتنے لوگ دوڑ رہے تھے۔ سیٹیاں بجارہے تھے اور گولیاں چلارہے تھے۔

جو سوال اس کے ذہن میں ہوگا لیکن وہ پوچھ نہیں سکتی تھی، یہ تھا کہ آخر وہ سب عین اس وقت یہاں وارد کیسے ہوئے جب اپنے چوہدری صاحب کی رخصتی ہورہی تھی۔ دلن تو صرف اعلان کرتا ہے کہ ٹھہو یہ شادی نہیں ہوسکتی... وہ تو دولہا کو ہی لے گئے۔

مسز دلاور کے ہنگامے کا مقصد کچھ نہیں تھا۔ میں نے دوبارہ سر اُٹھاکے دیکھا تو مجھے دیوار کے شگاف کے پاس آٹھ دس افراد نظر آئے۔ ان میں سے کچھ باہر جاکے بھی مایوس لوٹے ہوں گے۔ دلاور کی بیوی کو غالباً اس کا بیٹا ہی وہاں سے لے جانے پر آمادہ کررہا تھا۔ اس نے ہاتھ پکڑ کر ماں کو گاڑی میں بٹھایا اور گاڑی اسٹارٹ کی۔ ہیڈ لائٹس روشن ہوئیں تو میں نے اپنا سر نیچے کرلیا۔ لائٹ ایک نصف دائرے میں گھوم گئی اور میں نے گاڑی کو واپس جاتا دیکھ کے خدا کا شکر ادا کیا۔

اچانک میرے کانوں میں ایک نئی آواز آئی "کبیر داس۔ کہاں ہو تم؟" مگر میرے بگڑے ہوئے نام کے سوا باقی سب الفاظ فرنچ کے تھے۔ کبیر خان کو کبیر داس کہنے والا بھی محسن کے سوا کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ باہر دیوار کے پاس سے گزر رہا تھا۔

میں نے جواب میں ہانک لگائی "شیروانی ہے کہ اچکن۔"

ظاہر ہے یہ دونوں سوالات اتنے بے سروپا تھے کہ کوئی اور متوجہ نہیں ہوسکتا تھا مگر میری آواز محسن کے کانوں تک پہنچی تو وہ رُک گیا۔ اس کا علم مجھے یوں ہوا کہ محسن کی کھوپڑی دیوار پر نمودار ہوئی۔

اس نے آہستہ سے کہا "کہاں ہو تم کبیر داس؟"

میں نے کہا "یہاں کچرے میں پڑا ہوں۔ مال سمیت۔"

اس نے کہا "اچھا دوست۔ جہاں رہو خوش رہو۔" اور غائب ہوگیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ پھر آئے گا۔ اس نے میرا سراغ لگالیا تھا اور اب اس کے لیے مجھے باہر لے جانے کا مسئلہ تھا جو شاید وہ رابعہ کی مدد سے حل کرلے گا۔ میں نے پھر سر اٹھاکے باہر نگاہ ڈالی تو مطلع صاف ہوچکا تھا۔ دیوار کے شگاف کو گھورنے والا واحد شخص بھی میری نظروں کے سامنے واپس روانہ ہوگیا۔

دلاور نے سر اٹھاکے نقاہت سے سوال کیا "میں کہاں ہوں، تم کون ہو؟"

میں نے کہا "میں تمہارا باپ ہوں اور تم جہنم میں ہو" اور اسے پھر ناک آؤٹ کردیا ورنہ وہ مزید سوالات کرتا۔ شاید میرا نام پکارتا۔ ابھی اس کو چُپ رکھنا ضروری تھا۔

اب مجھے محسن کا انتظار تھا۔ میرے اعصاب پُرسکون ہونے

محسن نے کہا "جلدی سے بیٹھو گاڑی میں۔"

میں نے کہا "یہ تو وہی پولیس کی گاڑی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اندر ایس ایس پی جاوید صدیقی صاحب بھی ہوں گے۔"

محسن نے چوہدری دلاور کو جیپ میں ڈال دیا تھا۔ اس کی اگلی سیٹ پر خود جاوید صدیقی موجود تھا اور اس کے ساتھ رابعہ بیٹھی ہوئی تھی۔ میں اور محسن پیچھے سوار ہوگئے۔ جیپ نصف دائرے میں گھوم کے واپس ہوئی تو میں نے دیکھا کہ وہ دیوار جس پر سے ہم کودے تھے ایک گیراج کے مقابل تھی لیکن گیراج بند تھا اور اس کے باہر بہت سی مرمت طلب گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ اس کارروائی کو کسی نے نہیں دیکھا۔ ویسے بھی پولیس کی جیپ پر شک کی نظر ڈالنے کی گستاخی کوئی نہیں کرتا۔

میں نے کہا "آخر ہم سب کیسے اکٹھے ہوگئے۔ جو بچھڑ چکے تھے۔" میں نے فرنچ میں بات چیت شروع کی۔

محسن بولا "رابعہ نے باہر نکلتے ہی ٹیکسی پکڑی اور احاطے کے مین گیٹ کی طرف سے دوبارہ اندر پہنچ گئی۔ وہاں جاوید صدیقی کی جیپ موجود تھی۔ رابعہ اس میں جاکے بیٹھ گئی۔"

"اور خود صدیقی صاحب کہاں تھے؟"

"وہ جیل کے اندر سے آنے والی وین چیک کرا رہے تھے۔ ان کے ساتھ آنے والی فوج نے وین پر قبضہ کرلیا تھا۔ اس میں ڈرائیور کے علاوہ بھی ایک زندہ شخص تھا اور ایک لاش تھی۔ وین باہر چلی گئی تو رابعہ ہی صدیقی صاحب کو ادھر لے آئی۔"

"لاش کس کی تھی؟"

"چوہدری دلاور کی" محسن نے جواب دیا "پوسٹ مارٹم رپورٹ کے ساتھ قبضے میں لے لی گئی۔"

"بھئی واہ۔ کیا بات ہے" میں نے کہا "بیک وقت دو عدد چوہدری دلاور۔ ایک زندہ ایک مُردہ۔"

"ظاہر ہے وہ چوہدری دلاور نہیں تھا۔"

میں نے بُرا مان کے کہا "میں شرط لگا سکتا ہوں کہ جسے میں کوڑا خانے سے اٹھا کے لایا ہوں وہ چوہدری دلاور ہے۔"

محسن مسکرایا "میں دوسرے کی بات کررہا ہوں جو فوت ہوچکا تھا۔ اس کی صورت کافی حد تک چوہدری دلاور سے ملتی تھی۔ وہی ڈیل ڈول بھی تھا۔ باقی کمی اسے دلاور کے کپڑے پہنا کے ویسا ہی ہیئر اسٹائل بنا کے اور میک اپ سے پوری کی گئی تھی۔"

"آخر وہ تھا کون جسے چوہدری دلاور کی لاش کہلانے کا شرف حاصل ہوا؟"

"یہ تو میں نے اس سے نہیں پوچھا" محسن بولا۔

"بے وقوف۔ ایسے تم کبھی سراغ رساں نہیں بن سکتے۔" میں نے اسے ڈانٹا "اب وہ کہاں ہے؟"

"وہ قیدیوں کو عدالت میں پیشی کے لیے لے جانے والی وین تھی۔ آج رات ہائی کورٹ کے احاطے کے پیچھے کھڑی رہے گی۔ اس کے اوپر ترپال ڈال دی جائے گی تاکہ اسے شناخت نہ کیا جاسکے۔ جعلی چوہدری دلاور کی لاش ڈیتھ سرٹیفکیٹ اور پوسٹ مارٹم رپورٹ کے ساتھ باہر نکالنے والوں کی تو نیند حرام ہو گی۔ اس خیال سے کہ لاش ہی نہیں جھوٹا موت کا سرٹیفکیٹ اور پوسٹ مارٹم رپورٹ عدالت میں پیش کردی گئیں تو وہ کیا کریں گے کہ مرنے والا درحقیقت کون تھا، کیسے مرا تھا اور اسے چوہدری دلاور بنانے کا مقصد کیا تھا؟"

"ایس ایس پی جاوید صدیقی نے تو اپنے دوست جیلر کو مروا دیا۔ اس حد تک فرض شناس آدمی پر کبھی بھروسا کرنا چاہیے۔" میں نے کہا "اچھا ہوا جو اس کی باتوں میں آکے اپنے سکندر بخت ہونے کا اعتراف نہیں کیا۔"

"جیلر خورشید بہت گالیاں دے رہا ہوگا اپنے دوست کو ... نے رپورٹ بھی دے دی ہوگی ڈی آئی جی صاحب کو کہ ... سب تتربتر ہوگیا۔ دونوں چوہدری دلاور چوری ہوگئے اور ... والا ہے پولیس کا باغی سپاہی جاوید صدیقی۔ وہ ہمارے مخالف ... میں شامل ہوگیا ہے اور اب یا تو رات بھر میں چوری کا ... کرلیا جائے یا پھر اپنی اپنی نوکری کی خیر منالی جائے" ... کہا۔

"پولیس رات بھر اس وین کو تلاش کرے گی۔ اگر ... سے کامیاب ہوگئے..."

"صدیقی نے ایسے اتفاق کا امکان باقی نہیں رہنے دیا ... جاوید صدیقی کی بقا کا انحصار ہے کہ وہ پولیس کے چند ... افسروں کی ضمیر فروشی کا بھانڈا پھوڑ دے۔ ساری سازش ... عدالت میں بیان کردے تو خود بھی بچ جائے گا اور چوہدری ... بھی گرفتار کرادے گا۔ وہ سب وکیلوں کے ساتھ ہائی کورٹ ... بیان دینے حاضر ہوگا۔ بیان دینے کے لیے عدالتِ عالیہ ... مانگے گا۔ صبح کے اخبارات پیش کیے جائیں گے جس میں گزشتہ ... کی پریس کانفرنس کی روداد چھپی ہوگی اور اس کے استعفے کی ...

میں نے کہا "آج کی رات بہت اہم ہے۔ یہ خیریت ... جائے اور ہم خیریت کے ساتھ ہائی کورٹ پہنچنے میں کامیاب ہوجائیں۔"

"تم رابعہ کے ساتھ رہو۔ وقار یوسف اور اس کی بیوی ... ہی غائب ہوگئے ہیں۔ تمہارے لیے نہ رابعہ کا آفس محفوظ ... اور نہ منظر کا گھر۔"

"پھر میں کہاں جاؤں۔ میری تو کوئی سسرال بھی نہیں" ... میں نے کہا۔

"تم کو مولوی خادم حسین کے ساتھ جانا ہے۔ اس کی ... سسرال" محسن نے کہا۔ "میں رہوں گا اپنے بیوی بچوں کے ... اندرون لوہاری دروازہ۔"

"اور اپنے چوہدری دلاور صاحب ... ایس ایس پی صاحب ..."

"جاوید صدیقی نے اپنا کوئی بندوبست کیا ہے جو اس نے ہمیں بھی نہیں بتایا۔ وہ چوہدری دلاور کو ساتھ ہی لے جائے گا اور صبح ٹھیک نو بجے ہائی کورٹ پہنچے گا۔"

میں نے پوچھا "اخبار والے حسبِ معمول ہوں گے؟"

"نہیں۔ صدیقی نے منع کردیا ہے۔ دراصل وہ اس معاملے میں کسی پر بھروسا کرکے کوئی رسک لینے کے موڈ میں نہیں ہے۔ سوال صرف اس کی زندگی یا نوکری کا نہیں۔ اس کے بیوی بچوں کے مستقبل کا بھی ہے۔ اس نے فیصلہ کرلیا ہے کہ جنگ ہے تو پھر سب کچھ جائز ہے۔"

"جنگ بھی ہے اپنے ہی محکمے کے شہ زوروں سے۔ بدمعاشوں سے اور ان کی سرپرستی کرنے والوں سے۔ معرکہ سخت ہے اور جان عزیز۔"

جیپ اچانک رک گئی۔ محسن نے کہا "پلیز گیٹ آؤٹ۔"

میں نے کہا "کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ آپ شرافت سے جاتے ہیں یا آپ کو اٹھا کے پھینکا جائے باہر۔"

میں نے فٹ پاتھ پر خادم حسین کا چہرہ اور پھر رابعہ کو اُترتے دیکھا تو سمجھ گیا کہ یہاں سے ہمارے راستے جدا ہوں گے۔ "مجھے کس کے حوالے کرکے جارہے ہو دوست؟" میں نے آواز میں رقت پیدا کرکے خادم حسین کو دیکھا "اگر اس نے رابعہ کو ورغلا کے اس سے نکاح پڑھوالیا تو میرا کیا ہوگا۔ یہ مولوی سخت ناقابلِ اعتبار چیز ہے۔ ہر ایک پر اس کی رال ٹپک پڑتی ہے۔"

جیپ آگے بڑھ گئی تھی۔ خادم حسین نے افسوس سے سرہلایا "ایسی لغو باتیں کرنے لگے ہیں آپ بھی۔ رابعہ میرے لیے ہمشیرہ صاحبہ کی طرح ہیں۔"

"ہمشیرہ کی طرح" میں نے طنز سے کہا "ہمشیرہ کیوں نہیں۔ مولوی خادم حسین، میں تم کو تمہاری سسرال پہنچتے ہی قتل کردوں گا۔ اس کے بعد ہی میں خود کو محفوظ سمجھ سکتا ہوں۔"

رابعہ نے مجھے ڈانٹا "کیا فضول بولتے جارہے ہو۔ روکو کسی ٹیکسی کو۔"

خادم حسین نے کہا "اس کی ضرورت نہیں۔ ناچیز کی منکوحہ کا آبائی غریب خانہ چند قدم کی مسافت پر ہے۔ اس گلی میں، تشریف لائیے۔"

وہ چند قدم چند سو گز ثابت ہوئے اور خادم حسین مختلف گلیوں سے گزر کے ایک ذیلی سڑک پر طلوع ہوا۔ پھر گلیوں کا دوسرا سلسلہ شروع ہوا تو اس نے واضح کیا کہ یہ شارٹ کٹ ہے۔ وہ عام سی گلیاں تھیں جن میں عام سے لوگ رہتے تھے۔ عام گھروں میں ٹی وی چل رہے تھے، بچوں کی لڑائی چل رہی تھی یا میاں بیوی کی۔ ایک جگہ کسی سلیقہ منداور مہذب خاتون نے کھڑکی کھول کے کچن کا تمام کچرا گلی میں پھینک دیا جو عین میرے سامنے گرا۔

"کیا بدتمیزی ہے۔ یہ تو دیکھنا چاہیے کہ گلی سے کون گزر رہا ہے" رابعہ نے خفگی کا اظہار کیا۔

میں نے کہا "کمال ہے۔ یہی تو مہارت ہے، کچرا دیکھ کے پھینکا گیا تھا۔ اسی لیے تو میرے سر پر نہیں گرا۔"

اچانک رابعہ کا پاؤں لڑکھڑایا اور وہ گرتے گرتے بچی "یہ گڑھا کس نے کھود رکھا ہے؟"

میں نے کہا "جو دوسروں کے لیے گڑھا کھودتا ہے۔ دوسرے ہی اس میں گرتے ہیں۔ ویسے یہ گلیاں اونچی ایڑی کے جوتے پہن کر نخرے سے چلنے والوں کے لیے نہیں بنائی گئی ہیں۔ دیکھو بھینس آرہی ہے سامنے سے۔ اب یا تو اس کے اوپر سے گزر جاؤ یا پھر ٹانگوں میں سے۔"

"پھر کیا جوتے ہاتھ میں لے کر چلوں۔ خادم حسین، تمہارے چند قدم ابھی پورے نہیں ہوئے؟" رابعہ گھبرا کے بولی۔

خادم حسین نے فوراً ایک دروازے پر دستک دے دی "لو جی ہوگئے۔ بات یہ ہے جی کہ گلی میں رکشا ٹیکسی تو آنہیں سکتے۔ بھینس آسکتی ہے۔ کیا حرج ہے اگر بھینس ٹیکسی چلادی جائے نازک مزاج مسافروں کے لیے۔ دو مسافر تو بیٹھ سکتے ہیں اس پر۔"

گلی اس بھینس سے کچھ زیادہ ہی چوڑی تھی۔ رابعہ اور میں دیوار سے لگ کے کھڑے ہوگئے تھے لیکن گھر کا دروازہ بروقت کھل گیا اور ہم فوراً اندر داخل ہوگئے۔ اگر بھینس مجھ سے فرنچ میں تھینک یو کہہ کے گزر جاتی تب بھی میں اتنا حیران نہ ہوتا جتنا خادم حسین کے گھر میں مارگریٹ کو دیکھ کے ہوا۔ وہ شلوار قمیص کے ساتھ دوپٹہ سر پر رکھے مسکرا رہی تھی۔ بظاہر اس چھوٹے سے گھر میں کوئی اور نظر نہیں آتا تھا۔

رابعہ نے سخت حیرانی سے کہا "مارگریٹ۔ تم یہاں۔؟"

مارگریٹ نے مسکرا کے کہا "مارگریٹ نہیں۔ اب میں مریم ہوں، یہ میرا اسلامی نام ہے۔"

"اچھا؟ تو تم مسلمان ہوگئی ہو" رابعہ نے بے حد مسرت کا اظہار کیا۔

"ہاں جی۔ اور مجھ سے نکاح بھی پڑھوالیا ہے مریم نے" خادم حسین نے دانت نکالتے ہوئے شرما کے کہا "بڑا ثواب ہے جی اس کا۔"

میں بھونچکا رہ گیا "کیا! تم نے شادی کرلی ہے مارگریٹ.... میرا مطلب ہے مریم سے... کب... اور کیوں؟"

"بس جی اللہ کی مرضی یہی تھی۔ اور جب اس کا حکم ہوتا ہے تو وقت آنے پر سب ہوجاتا ہے جی۔ میں نے تو عرض کی تھی جناب سے بھی۔"

رابعہ کا صدمے سے بُرا حال تھا "خادم حسین۔ شرم آنی چاہیے تمہیں، دوسری شادی..."

"لوجی شرع میں کیسی شرم" خادم حسین بولا "مریم نے برضا ورغبت میرے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اور میں نے اس سے عقد کرلیا۔"

"اور وہ پہلے والی' اسے نکال باہر کیا تم نے؟"

"نہیں جی۔ وہ بھی ہے۔ شرط صرف عدل وانصاف کی ہے نکاحِ ثانی کے لیے۔ وہ اپنے گھر میں خوش ہے۔ مریم اپنے گھر میں۔"

"اور تم۔ تمہارا گھر کون سا ہے خادم حسین؟" رابعہ نے کہا "یہ تو مجھے معلوم ہے کہ انصاف تم کتنا کروگے۔ تمہیں موقع ملا تو دو اور نکاح کروگے تم ثواب کی خاطر۔ گھر کا کوئی مسئلہ نہیں۔ ان کے گھر تمہارے گھر۔ آخر تمہاری عقل کو کیا ہوگیا تھا مریم کہ تم نے خادم حسین جیسے شخص سے شادی کرلی؟"

مریم کا چہرہ بجھ گیا "کیوں؟ پھر کس سے شادی کرتی؟ سکندر بخت جیسے کسی گبرو جوان سے۔ ویسے تو بہت آئے میری زندگی میں اور گئے۔ سب سچا عشق کرنے والے اور خود کو دوسروں سے مختلف ثابت کرنے والے تھے مگر شادی کس نے کی مارگریٹ سے۔ خدا کا شکر ادا کرو مس رابعہ کہ تم نے زندگی کا صرف روشن پہلو دیکھا ہے۔ تم میری جگہ ہوتیں' ہر آنے جانے والے سے آس لگاتیں کہ وہ تمہیں ایک گھر اور ایک محفوظ مستقبل کے خواب کی تعبیر دے لیکن خواب دکھانے والا تمہیں صرف احساسِ گناہ یا اس کی نشانی دے کر چلا جاتا۔ جس سے پیچھا چھڑانے کے لیے تمہیں قتل کرنا پڑتا۔ اپنی ماتا کو مارنا پڑتا۔ پھر شاید تمہیں مولوی خادم حسین کی قدر ہوتی۔ جو آدمی کے روپ میں انسان ہے۔ میں اسے فرشتہ نہیں سمجھتی۔"

رابعہ کو شاید زندگی میں اتنی شرمندگی کبھی نہیں اُٹھانی پڑی تھی۔ وہ مجرم بنی سر جھکائے کھڑی تھی۔ میں خود اپنے آپ سے شرمسار تھا۔ لوگ تو کہتے ہیں کہ لیلیٰ کو مجنوں کی آنکھ سے دیکھنا چاہیے۔ مجنوں کو بھی تو لیلیٰ کی نظر سے دیکھنا چاہیے۔ میرے نزدیک خادم حسین مضحکہ خیز حلیے والا ایک بے وقوف سا شخص تھا جس میں کوئی غیر معمولی صلاحیت نہیں تھی ہم اس سے ہر طرح کا مذاق کرلیتے تھے اور اس کی باتوں کا تمسخر اُڑاتے تھے مگر وہ برا نہیں مانتا تھا۔ اس میں بہت سی خامیاں تھیں' مریم نے اسے فرشتہ نہیں کہا تھا۔ خادم حسین نے خود کو انسان ثابت کردیا تھا۔ اس نے جو کہا تھا وہ کردکھایا۔ اس نے واقعی ایک غیر مسلم کو مسلمان کرلیا تھا اور پھر اس سے شادی کرلی تھی۔ اس نے صرف اپنا مطلب پورا کرنے کا نہیں سوچا تھا۔ اس نے ایک بے سہارا لڑکی کو سہارا دیا تھا۔ ایک ایسی لڑکی کو شریکِ حیات بنالیا تھا جو معاشرے کے روایتی معیار سے آبرو باختہ تھی اور جس کا ماضی اس حد تک شرمناک تھا کہ دوسرے اس کو دیکھ کے اپنا منہ نفرت سے پھیر لیتے تھے۔

مریم نے کہا "آپ لوگ کھڑے کیوں ہیں' اندر آیئے۔"

میں نے کہا "آئی ایم سوری خادم حسین' تم واقعی عظیم ہو۔ تم نے بہت بڑا کام کیا ہے۔ تمہیں شادی مبارک ہو۔"

رابعہ نے بھی کہا "مجھے معاف کردو مریم۔ میں نے غلط سمجھا تھا۔"

مریم نے کہا "آپ ہمارے گھر آنے والے پہلے مہمان ہیں۔ مہمان خدا کی رحمت ہوتے ہیں۔"

میں نے مزید شرمندہ ہو کے کہا "مولوی خادم حسین تم پہلے بتادیتے تو ہم خالی ہاتھ نہ آتے' کم سے کم مٹھائی ضرور لاتے۔"

خادم حسین کے چہرے پر خوشی کی روشنی پھیل گئی۔ "تکلف والی بات مت کریں جی۔ یہ آپ کا اپنا گھر ہے۔ بتایا میں نے کسی کو نہیں ابھی تک۔ محسن صاحب سے اور منظر صاحب سے ڈر لگتا ہے مجھے۔ ان کی زبان بڑی بے لگام ہے۔"

میں نے کہا "تم فکر مت کرو۔ میں سمجھادوں گا انہیں۔ دل کے وہ بھی کتنے اچھے ہیں' یہ تم بھی جانتے ہو۔"

مولوی خادم حسین ہنسنے لگا "لوجی۔ یہ بات کیا مجھے نہیں معلوم؟ آپ سب کا دل تو ہیرا ہے جی ہیرا اس پتھر دل زمانے میں۔"

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا "شاید اس سے زیادہ اچھے الفاظ میں کسی نے ہمیں یاد نہیں کیا تھا۔"

وہ گھر مارگریٹ کا تھا جو اب مریم خادم حسین ہوچکی تھی۔ اس گھر کے بارے میں رات کو مجھے پتا چلا کہ کسی زمانے میں اس کے ماں باپ کا گھر تھا۔ اس وقت کی بات ہے جب مارگریٹ کی ماں اپنے شوہر کے ساتھ سائیکل کے کیریئر پر بیٹھ کے جاتی تھی اور ان کی حاضری نیلا گنبد پر ہوتی تھی۔ پھر وہ سارا دن لاہور کی گلیوں اور سڑکوں پر سے کوڑا کرکٹ سمیٹ کر شہر کو اُجلا اور صاف ستھرا اور خوب صورت بنانے والوں کی اس فوج میں شامل ہوجاتے تھے جس کا ہر سپاہی گندا تھا اور گندا سمجھا جاتا تھا۔ ان کا لباس اور حلیہ ہی نہیں ان کا پیشہ بھی ان کے نزدیک قابلِ نفرت تھا۔ جو قلم اور فیشن کے اس مرکز اور کالجوں کا شہر کہلانے والے لاہور کی رونق تھے۔ جو اس شہر دلنواز میں رنگ ونور' خوشبو اور قہقہے بکھیرتے تھے لیکن لاہور کی جگمگ کرتی مہکتی لہکتی شام کا جوبن نکھارنے والے جب تھکے ہارے اپنے تاریک گھروندوں کا رخ کرتے تھے تو یہ بھی نہیں سوچتے تھے کہ ان کے نصیب میں صرف اندھیرا اور بدصورتی اور نفرت کیوں ہے۔ یہ نوشتۂ تقدیر تھا اور ان کو ملنے والا جدی پشتی غربت کا ورثہ۔ اس سیدھی سادی حقیقت کو تسلیم کرلینے کی وجہ سے ہی وہ سکون اور قناعت کی زندگی گزارتے تھے مگر جب وقت بدلا اور گردوپیش کا ماحول زیادہ زہرناک ہوگیا تو دکھ کا احساس جاگ اُٹھا۔ پاکستان بننے کے بعد اور اسلامی جمہوریہ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد بھی معاشرے نے ان کو اسلامی مساوات کے تحت نہیں

اپنایا۔ صدیوں تک ہندوؤں کے ساتھ رہنے سے وہ ملت بھی ذات پات اور حسب نسب کے اعتبار سے انسانوں میں ادنیٰ اور اعلیٰ کا فرق کرتی تھی جس میں غلام اور آقا ایک تھے اور جس میں برتری صرف تقویٰ کی بنیاد پر تھی۔ جس کو آخری نبیؐ نے آخری خطبے میں واضح طور پر بتادیا تھا کہ گورے کو کالے پر اور عربی کو عجمی پر کوئی فوقیت نہیں۔

کمتر سمجھے جانے والے بلحاظ پیشہ نیچ ذات کے سمجھے جانے لگے۔ ان میں جاروب کش' نائی' موچی' جلاہے' مزدور اور کاشتکار سب ہی شامل تھے۔ مارگریٹ کے خاندان کی اگلی نسل نے جاروب کشی ترک کردی اور تعلیم حاصل کی مگر ان کے حسب نسب کی ذلالت کا لیبل پھر بھی نہ اُترا۔ جہاں وہ رہتے تھے وہاں بھنگی ہی کہلائے تو انہوں نے بغاوت کے طور پر آباواجداد کی سکونت ترک کردی۔ ایک ایک کرکے مارگریٹ سے پہلے اور اس کے بعد سب بھائی بہن اس گھر سے نکل گئے۔ ماں باپ مرکھپ گئے اور وہ چھوٹا سا گھر برسوں غیر آباد اور مقفل پڑا رہا۔ اب برسوں بعد اسے خادم حسین اور مریم نے آباد کیا تھا۔ یہ پرانی نسل کا عہدِ نو تھا۔

صاف ستھرے گھر میں سامان کم تھا اور سلیقہ زیادہ۔ تکلف کم تھا اور خلوص زیادہ۔ مریم نے خود کھانا پکا کے ہمارے سامنے رکھا۔ اس کی کوشش تھی کہ ہم کھائیں اور وہ کھلائے مگر ہم نے اسے اپنے ساتھ بٹھالیا۔ وہ کچھ معذرت خواہانہ انداز میں بتاتی رہی کہ ابھی گھر میں کچھ بھی نہیں ہے۔ بہت جلد رنگ روغن ہوگا اور نیا سامان آجائے گا۔ ان کا ایک خیال یہ بھی تھا کہ اس گھر کو بیچ کے وہ کسی اور آبادی میں کوئی نسبتاً بڑا گھر لے لیں۔ پیسہ مریم کے پاس بھی تھا اور اب اس کے ارمان پورے ہونے کا وقت آیا تھا۔ وہ ایک گرہستن بن کے ایسا گھر بنانا چاہتی تھی کہ جو دیکھے تعریف کرے۔ اس نے یہ بھی تسلیم کیا کہ اس محلے میں اب بھی پرانے کم ظرف اور متعصب لوگ باقی ہیں یا ان کی اولادیں ہیں جو مریم کو وہی مارگریٹ سمجھتے ہیں۔ وہ ایک بھنگی کی بیٹی تھی اور گھر سے بھاگ گئی تھی۔ وہ اسے اپنے برابر عزت دینے پر کبھی آمادہ نہ ہونے والے لوگ تھے۔ میں نے بھی اس خیال سے اتفاق کیا کہ نئی زندگی کا آغاز نئے ماحول میں کیا جائے تو بہتر ہوگا جہاں کوئی ان کے ماضی کی بنیاد پر ان کے مستقبل میں نفرت کا زہر نہ گھولے۔

اس مکان میں دو ہی کمرے تھے جو اتنے چھوٹے تھے کہ ان میں ایک چارپائی ہی لگ سکتی تھی۔ دراصل الگ الگ بیڈ روم تو کیا الگ الگ چارپائی پر سونے کا تصور بھی ان کے نزدیک عیاشی تھی جو وہ افورڈ نہیں کرسکتے تھے۔ وہ سب بہن بھائی فرش پر پہلو بہ پہلو سمٹ سمٹا کے سوجاتے تھے۔ اب بھی یہاں فرش پر دری بچھی ہوئی تھی جو بالکل نئی تھی۔ ایک کمرے میں مریم کے ساتھ رابعہ نے ڈیرا جمالیا اور دوسرے میں خادم حسین نے میرے ساتھ۔

میں نے کہا "یار مولوی خادم حسین۔ تم تو بڑے چھپے رستم نکلے۔ چپکے چپکے ہی سارا کام کرلیا۔"

وہ ہنسنے لگا "بس جی۔ اللہ نے توفیق دی۔"

میں نے کہا "سخت عاشق مزاج مولوی ہو تم۔ پہلے دن ہی فریفتہ ہوگئے تھے مارگریٹ پر۔"

"مریم کہیں جی" وہ بولا "میرے فریفتہ ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ فریفتہ تو اس پر نہ جانے کتنے ہوئے۔ اصل بات تو یہ ہے جی کہ اللہ نے اس کو ہدایت دی۔ بے شک وسیلہ مجھے بنایا کہ میں اسے صراطِ مستقیم دکھاؤں مگر قلب کو اس نے بدلا۔"

"میں مانتا ہوں کہ تم نے بڑی اخلاقی جرأت کا ثبوت دیا۔ یہ بہت ہمت کا کام تھا اور تم نے کارِ ثواب بھی کیا لیکن مولوی خادم حسین' سچ سچ بتاؤ' تم اب زیادہ خوش ہو یا پہلے بھی خوش تھے؟"

وہ خاموش ہوگیا۔ "آپ تو جانتے ہیں جی۔ میں اپنا فرض ضرور نبھاتا تھا۔ اس عورت کی تلخ ترش بھی سنتا تھا اور صبر شکر سے کام لیتا تھا۔ کوشش کرتا تھا اور دعا کرتا تھا کہ خدا اسے عقل اور ہدایت دے۔ وہ مجازی خدا کی طرح میری پرستش نہ کرے لیکن مجھے اتنی عزت تو دے جتنی ایک شوہر مانگتا ہے۔ جتنی میں اسے دیتا تھا۔ اس کی تلخ کلامی اور بدزبانی کا علاج کوئی نہیں تھا جی۔ میری زندگی جہنم بنا رکھی تھی اس نے۔ پھر ظلم یہ کہ وہ ماں بننے کے لائق بھی نہیں تھی۔ اولاد کی خواہش کی وجہ سے ہی آدمی شادی کرتا ہے مگر وہاں تو یہ اُمید بھی نہیں تھی۔"

میں نے کہا "یعنی تم اس سے جان چھڑانا چاہتے تھے؟"

وہ تذبذب کا شکار ہوگیا "بس جی۔ خیال ضرور آتا تھا مگر میں سوچتا تھا کہ نبھاؤں جب تک ممکن ہو۔ چھوڑا تو نہیں ہے میں نے اسے۔"

"کیا اسے معلوم ہے کہ تم نے دوسری شادی کرلی ہے؟"

خادم حسین نے نفی میں سر ہلایا "یہی سوچ کے ڈر لگتا ہے۔ وہ عورت تو بڑا ہنگامہ کرے گی۔ یوں بھی ہاتھ اٹھاتی تھی مجھ پر۔ اب کیا پتا خنجر اٹھالے۔ اس کے بھائی تو مجھے جان سے مار ڈالیں گے۔ لیکن میں نے کوئی غلطی نہیں کی۔ کوئی گناہ نہیں کیا جی۔ گھر بسانا خوشی پانے کے لیے کوئی جرم نہیں۔"

"یہ سب تو ٹھیک ہے۔ مگر وہ بات تو غلط ہوگئی ناکہ تم شرطِ انصاف پوری کرنے کے اہل تھے۔"

اس نے سر جھکالیا "ہاں جی۔ انصاف اس نے میرے ساتھ نہیں کیا تو پھر میں کیا کروں۔ وہ کبھی مجھے خوش نہ رکھ سکی تو میں کیسے رکھوں۔ میں نے تو سارے جتن کیے جی پر خوشی نصیب سے ملتی ہے۔ اس کے نصیب میں نہیں تھی۔"

میں نے کہا "تم بڑے عذاب میں پڑجاؤ گے۔ کہتے ہیں ناکہ دو کشتیوں کا مسافر ڈوب جاتا ہے جب یہ دونوں کشتیاں مخالف سمت میں چلیں گی تو تم کدھر جاؤ گے۔ کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے۔"

وہ ہنسنے لگا "اب تو کلیسا کی بات نہ کریں جی۔ وہ مسلمان ہو گئی ہے۔ مگر آپ کی بات ٹھیک ہے۔ میں نے مریم سے پوچھا تھا تو وہ مجھے منع کرنے لگی کہ اسے میری وجہ سے مت چھوڑو۔ میری طرف سے اجازت ہے کہ تم اس کو بھی ساتھ رکھ لو۔ مگر ایسا تو ناممکن ہے جی۔ اپنے پاؤں پر میں خود کلہاڑی مارلوں۔ ایک گھر تو برباد ہوا ہی تھا۔ یہ دوسرا گھر بھی وہ برباد کردے یہاں آکے۔ اس سے تو بہتر ہے کہ اسے طلاق دے دوں تاکہ مجھ پر بار نہ رہے۔ اللہ کا بڑا احسان ہے کہ اس نے مجھ گنہگار کو یہ توفیق دی کہ میں کسی کا سہارا بنوں مگر اس سے زیادہ شکر کا مقام ہے جی کہ اس نے میرے جیسے عاجز اور گنہگار بندے پر آزمائش کا سلسلہ موقوف کیا اور مجھے صبر و شکر کے انعام سے نوازا۔ اس کی ذات بڑی بے نیاز ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ اب انشاء اللہ میں صاحبِ اولاد بھی ہو جاؤں گا مگر اس مصیبت کا کیا کروں جو پہلے سے گلے پڑی ہوئی ہے۔"

میں اسے حیرانی سے دیکھتا رہا۔ اس کا یقین قابلِ رشک تھا اور اس کا ایمان کامل۔ ہم سب جو اس کا تمسخر اڑاتے تھے کنارے سے دریا کی گہرائی کا اندازہ لگانے والوں کی طرح تھے۔ جب اس نے مارگریٹ کو مشرف بہ اسلام کرنے کی اور اس سے عقد ثانی کی بات کی تھی یا جب اس نے مجھ سے وظیفہ مانگا تھا کہ وہ مسرت نذیر یا نیلو کا دل جیتنا چاہتا ہے تو ہم بہت ہنسے تھے۔ ہم سمجھتے تھے کہ اس چغد صورت احمقانہ انداز میں باتیں کرنے والے مسکین اور مولوی ٹائپ شخص کو بھلا کوئی عورت کیسے پسند کر سکتی ہے جس میں ہیرو والی کوئی بات ہی نہیں مگر اس میں کوئی بات ضرور تھی۔ مارگریٹ نے اس کی خاطر اسلام قبول کرلیا تھا۔ اس سے نکاح ثانی کے لیے مسلمان ہو گئی تھی۔ وہ عو ت :و راہ گم کردہ مسافر کی طرح بھٹک رہی تھی اور جس کا ایمان آدمی کی انسانیت پر سے اٹھ چکا تھا' جس کے لیے دین مذہب دنیا و آخرت' نیکی و بدی کا تصور بے معنی ہو چکا تھا اور جس کا اعتبار صرف پیسے پر تھا' اس نے مولوی خادم حسین پر اعتبار کرلیا تھا۔ وہ تہ دل سے اس کی ہو گئی تھی۔ اس نے اپنا آبائی دین چھوڑ دیا تھا اور وہ اس گھر میں بہت خوش تھی جہاں مولوی خادم حسین اس کا سب کچھ تھا۔ شوہر بھی' محافظ بھی' پرستار بھی اور قابلِ پرستش مجازی خدا بھی۔ واقعی عورت کو کس نے سمجھا ہے؟

سونے کا ارادہ کرنے سے پہلے میں نے کہا "خادم حسین۔ کیا سو گئے؟"

"نہیں جی۔ میں تو آپ کے جواب اور مشورے کا انتظار کر رہا تھا۔"

میں نے حیرانی سے کہا "کیسا جواب اور مشورہ؟"

"میں نے پوچھا تھا جی کہ اس مصیبت کا کیا کروں جو پہلے سے گلے پڑی ہوئی ہے۔ آپ غور فرما رہے تھے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ اس کا جواب ہم مزید غور فرما کے دیں گے اور سب سے مشورہ کرنے کے بعد۔ صبح تمہیں ایک کام کرنا ہے۔"

"صبح تو بہت سے کام کرنے ہیں' آپ حکم کریں۔"

"حکم نہیں خادم حسین۔ درخواست ہے" میں نے کہا "تم میرے کپڑوں کی حالت دیکھ رہے ہو نا' پتلون کے گھٹنے تک پھٹ گئے ہیں۔ اس حلیے میں یہاں تک پہنچنا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ عدالتِ عالیہ میں کیسے پہنچ سکتا ہوں میں۔"

وہ ایک دم اٹھ بیٹھا "مجھے تو خیال ہی نہیں آیا جی۔ آپ نے وہی پتلون پہن رکھی ہے۔ سوتے وقت تو بدل ڈالیں یہ کافرانہ لباس۔ میرا پاجامہ پہن لیں۔"

میں نے ہنس کے کہا "اور تم کیا کرو گے' ایسے ہی سو جاؤ گے صرف بنیان پہن کے۔"

"نہیں جی۔" وہ جھینپ کر بولا "دوسرا پاجامہ یا شلوار لا دیتا ہوں میں۔"

"اچھا لا دو" میں نے کہا "صبح تمہیں وقار کے گھر سے مجھے کپڑے اور جوتے لا کر دینے ہوں گے۔ ٹیکسی رکشا میں جانا۔"

"آپ فکر ہی نہ کریں جی۔"

صبح نو بجے ہم سب کو ہائی کورٹ پہنچنا تھا اور میرے نقطہ نظر سے یہ انتہائی اہم اور فیصلہ کن معرکہ تھا۔ دلاور کو ایک مجرم کی حیثیت سے عدالت میں پیش کرنا پولیس کی ذمّے داری تھی مگر چوہدری دلاور نے' اس کی دولت کی طاقت نے اور اس کے وارثوں نے پولیس کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا اور لاقانونیت کی انتہا کردی تھی۔ یہ ہم سب کے اور ان کے درمیان حق و باطل کی جنگ بن گئی تھی اور یہ اصولی جنگ اب کسی اصول کے مطابق نہیں لڑی جارہی تھی۔ ایس ایس پی جاوید صدیقی جیسے شخص نے بھی مجبور ہو کے مان لیا تھا کہ جنگ میں سب کچھ جائز ہے۔

○☆○

مجھے آٹھ بجے رابعہ نے نیند سے بیدار کیا۔ میں یہ دیکھ کے حیران رہ گیا کہ وہ نہا دھو کے کپڑے بدل چکی ہے۔

"وقت دیکھو۔ مجھے کیا دیکھ رہے ہو؟"

"وقت... وقت سے کہو رک جائے۔ اس وقت تم جتنی حسین نظر آرہی ہو بس اسی لمحے پر وقت کو ٹھہر جانا چاہیے۔ میں تمہیں دیکھتا رہوں' دیکھتا رہوں..."

وہ شرما کے مسکرائی "وقت رک گیا تو چوہدری دلاور کو عدالت میں کون پیش کرے گا؟"

"اُف۔ کتنا سوچ کے ایک انتہائی جذباتی رومانٹک ڈائیلاگ بولا تھا میں نے۔ کوئی اور ہوتی تو آنکھوں میں خواب سمیٹ کر میرا ہاتھ تھام لیتی اور کہتی سکندر اس لمحے کے ساتھ مجھے اپنی بانہوں میں قید کرلو۔" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے اداکاری کی۔ "مگر تم تو ہو صرف وکیل۔"

"مسٹر مجنوں" اس نے اپنا ہاتھ چھڑایا "فرصت میں بولنا یہ ڈائیلاگ تو میں لیلیٰ کی طرح جواب دوں گی۔"

میں نے کہا "یہ کس کے کپڑے مانگ کے پہنے ہیں؟"

"مریم کے ہیں۔ تم نے بھی تو مولوی خادم حسین کی ٹخنوں سے اونچی شلوار پہن رکھی ہے۔ تمہارے تو گھٹنوں تک آئی ہو گی۔"

"تم دیکھ رہی ہو رابعہ۔ مولوی خادم حسین نے دوبارہ گھر بسا لیا" میں نے آہ بھر کے کہا "ایک ہم ہیں کہ ابھی تک گردش میں ہیں۔ چاند زمین کے گرد گھوم رہا ہے۔ زمین سورج کے گرد گھوم رہی ہے۔ خاک چاند سورج کی جوڑی ہے ہماری۔"

مریم نے آواز لگائی "ناشتا تیار ہے۔ جلدی سے نہا لیں۔ وہ بھی آتے ہی ہوں گے آپ کے کپڑے لے کر۔"

"وہ..." میں نے کہا "وہ کون... تمہارا خادم؟"

رابعہ ہنسی "نام لینے سے نکاح ٹوٹ جائے گا۔"

خادم حسین کے آتے ہی میں نے شیو اور غسل سے فراغت حاصل کی۔ گھر کا غسل خانہ اتنا چھوٹا تھا کہ اس میں ایک بالٹی کے علاوہ ایک اوسط قسم کے آدمی کی جگہ بھی مشکل سے نکلتی تھی۔ ابھی تک اس میں دروازے کے بجائے پردہ لٹکا ہوا تھا۔ میں شاور کا عادی تھا۔ ایک مدت کے بعد میں نے بالٹی سے مگ بھر کے نہانے کا تجربہ کیا۔ ناشتے کے لیے بھی فرش پر دسترخوان بچھایا گیا اور مریم نے گرم گرم پراٹھے اُتارے۔ سب گھر ایک سے ہوتے ہیں۔ چھوٹے ہوں یا بڑے۔ گھر آدمی کو اپناتے ہیں' خلوت کی آزادی عطا کرتے ہیں۔ راحت اور سکون دیتے ہیں۔ ایک دوسرے کو خوشی فراہم کرنے کا سلیقہ سکھاتے ہیں۔ یہ سب نہ ہو تو پھر ہزاروں گز پر محیط شاہانہ تعیش کے اسباب رکھنے والے محل بھی صرف مکان ہوتے ہیں۔

مولوی خادم حسین کے کپڑے مریم نے خود دھوئے تھے اور ان پر بڑی محنت سے استری پھیری تھی۔ میں اس کی خدمت گزاری میں عیاں پرستاری کے جذبات کی تحریر کو صاف صاف پڑھ سکتا تھا۔ شاید ہر عورت بیک وقت پرستش بھی کرانا چاہتی ہے اور کرنا بھی۔ مگر اس کے اختیار میں کچھ نہیں ہوتا۔ مریم کو یہ اختیار کی منزل بڑے پُر آزار اور جان لیوا تجربات کی کٹھن راہوں پر چل کے ملی تھی۔ وہ برسوں کے احساسِ محرومی کا ازالہ کرنا چاہتی تھی۔ یہ گھر اس کا تھا' شوہر اس کا تھا۔ یہاں جو کچھ بھی تھا اس کا تھا۔ اس خیال کی آسودگی بھی مریم کے لیے متاعِ بے بہا تھی۔

جب مولوی خادم حسین زلفیں سنوار کے سرمہ لگا کے ٹوپی کو بڑی نزاکت سے سر پر جما کے اور داڑھی میں عطر لگا کے میرے ساتھ جانے کے لیے روانہ ہوا تو اس کی خوشی دیدنی تھی۔ مریم اسے بڑے پیار سے دیکھ رہی تھی اور وہ ایک ناز اُٹھانے والی بیوی کے اس اندازِ دلربا پر فریفتہ تھا۔ وہ نئے شادی شدہ نوجوان لڑکے اور لڑکی بنے ہوئے تھے حالانکہ دونوں کی عمر زندگی کے تجربات اور حادثات کے اعتبار سے کہیں زیادہ تھی۔ اصل میں تو جذبات ہی آدمی کو جوان رکھتے ہیں۔

اس محلّے کے بہت سے لوگوں نے رابعہ کو اور مجھے تجسّس، تعجب اور حیرانی کے ساتھ دیکھا۔ گلی میں بچے کھیل رہے تھے۔ کھڑکیوں اور بالکونیوں پر عورتیں کپڑے سکھاتے یا بال بناتے ہوئے سامنے والی سے یا پڑوسن سے اظہارِ خیال کررہی تھیں۔ دکانوں کے تھڑے پر، حجام کی اور حلوائی کی دکان پر فارغ بوڑھے اخبار پڑھتے اور بدلے ہوئے وقت کا اپنے زمانے سے موازنہ کرکے آہیں بھرنے میں مصروف تھے۔

ایک خمیدہ کمر بوڑھے نے واضح الفاظ میں کہا "اوئے یار۔ ایہہ صوفی اوسے کڑی دا گھروالا ہے نا۔"

دودھ کو کفگیر سے کڑاہی میں متحرک رکھنے والے حلوائی نے کہا "آہو جی۔ اوجُوڑا نئیں سی گا کرامت مسیح۔ اودی کڑی مارگریٹ۔ نس گئی سی گھروں۔ آندرے نے ویاہ کرلیا اے، بلے بلے۔"

مجھے افسوس بھی ہوا اور غصہ بھی آیا۔ یہ پرانے عمر رسیدہ لوگ جن کے پاس عقل بھی تھی اور زندگی کا تجربہ بھی۔ مولوی خادم حسین کو سنانے کے لیے انہوں نے عمداً بلند آواز میں بات کی تھی اور مارگریٹ کو بھنگی کی لڑکی بتانے کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا تھا کہ وہ گھر سے بھاگ گئی تھی۔ اب شادی کرلی ہے۔ واہ جی واہ۔ ان کے الفاظ میں طنز کے نشتر تھے اور تذلیل کا پُرآزار انداز بھی۔ میں نے مولوی خادم حسین کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر سکون تھا۔ یوں جیسے اس نے کچھ نہیں سنا۔

ٹیکسی میں رابعہ پیچھے میرے ساتھ بیٹھی۔ مولوی خادم حسین نے ڈرائیور سے کہا "ہائی کورٹ" تو جیسے ان جادوئی الفاظ نے ایک دم میرے خیالات کی سمت بدل دی۔ میں چوہدری دلاور کے بارے میں اور ایس ایس پی جاوید صدیقی کے بارے میں سوچنے لگا۔ کیا آج ہم کامیاب ہوں گے یا شکاری پھر ہماری راہ میں رکاوٹوں کا نیا جال پھیلادیں گے... مرزا نے کہا تھا۔

ہم تو سمجھے تھے کہ غالب کے اُڑیں گے پُرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے، پہ تماشا نہ ہوا

تو کیا آج یہ تماشا ہوگا؟ جیسے جیسے ٹیکسی ہائی کورٹ کی طرف بڑھ رہی تھی میری اور رابعہ کی بے چینی بھی بڑھ رہی تھی۔

ہم باہر اُترے اور پھر پیدل اندر گئے۔ میری نظریں ہر طرف تھیں اور میں سوچ رہا تھا کہ کیا دلاور کی بیوی یا اس کا بیٹا فیصل بھی یہاں نظر آسکتے ہیں؟ کیا گزشتہ شب کے واقعات کی روشنی میں انہوں نے اندازہ کرلیا ہوگا کہ ہمارا اگلا قدم کیا ہوگا؟ رات بھر میں انہوں نے کیا پیش بندی کی ہوگی؟

رابعہ نے چپکے سے کہا "ڈرو نہیں۔ ہم ہائی کورٹ کے اندر ہیں۔ یہاں کوئی کچھ نہیں کرسکتا۔"

میں نے سرہلایا "ابھی ہم کورٹ کے باہر ہیں۔"

میرے الفاظ لبوں پر ہی تھے کہ میری نظر نے ارشد کریم کو دیکھ لیا۔ وہ زخمی شیر کی طرح برآمدے میں ٹہل رہا تھا۔ وہ سخت پریشان اور نروس تھا۔ رابعہ کو دیکھتے ہی وہ ہماری طرف لپکا۔

"مس رابعہ۔ مجھے آپ سے ہی بات کرنی ہے۔ اور اس گورے وکیل سے بھی۔"

رابعہ نے متانت سے کہا "سوری۔ ٹائم نہیں ہے میرے پاس۔"

وہ پھر سامنے آگیا "آپ کو سُننی پڑے گی میری بات۔"

"ہٹ جاؤ میرے سامنے سے۔ مجھے اندر جانا ہے۔" رابعہ نے برہمی سے کہا "ایک کیس ہے میرا ٹھیک نو بجے۔"

"کون سا کیس ہے مجھے بتائیں۔"

"میں تمہیں بتاؤں؟ تم کون ہوتے ہو مجھ سے پوچھنے والے میں رپورٹ کرسکتی ہوں تمہاری جج کو۔ یہ توہینِ عدالت ہے کہ تم کسی وکیل کو عدالتِ عالیہ میں پیش ہونے سے روکو۔"

میں نے دوسری طرف سے منظر اور وقار یوسف کو عدالت کے برآمدے سے گزر کے اندر جاتے دیکھا۔ رابعہ میرے ساتھ تھی اس لئے یہ فرض کرنا غلط نہ تھا کہ اس کیس میں جاوید صدیقی کی طرف سے وکالت نامہ منظر داخل کرے گا اور وہی بیان کی درخواست بھی پیش کرے گا۔

میں انجان بننے کے باوجود اپنی تشویش کا اظہار یوں کرتا رہا کہ رابعہ کو ایس ایس پی کی جارحانہ پیش قدمی سے بچاتا رہا اور بیچ بچاؤ کرنے والے کا کردار ادا کرتے ہوئے فرنچ میں مولوی خادم حسین سے کہتا رہا کہ وہ میری طرف سے بولے۔ اس خر دماغ پولیس افسر کا مزاج درست کرنا ہی پڑے گا۔

خادم حسین نے چِلّانا شروع کردیا۔ "آپ ذرا ہوش کے ناخن لیں جی۔ یہ تھانہ نہیں ہے۔ ہائی کورٹ ہے اور آپ کے سامنے ملکی وغیر ملکی وکیل ہیں۔ کوئی ہسٹری شیٹر نہیں۔"

"تم اپنی بکواس بند کرتے ہو یا نہیں" ارشد کریم نے دہاڑ کے کہا۔

میں فوراً اس کے سامنے آگیا اور غصے میں زور زور سے بولنے لگا۔ موقع پاتے ہی رابعہ نکل گئی۔

مولوی خادم حسین نے میرے پیچھے سے ترجمانی جاری رکھی "موسیو آندرے بہت سخت ناراض ہیں اور اب تمہاری خیر نہیں۔ یہ ابھی فون کریں گے اسلام آباد اور تمہاری چھٹی کرادیں گے ایس ایس پی صاحب۔ یہ براہِ راست ہوم سیکریٹری سے بات کرتے ہیں۔ ابھی وزارتِ خارجہ میں پہنچ جائے گا برٹش کونسلیٹ۔"

"تم سے بھی نمٹ لوں گا مولوی۔"

"مجھ سے تم کیا نمٹو گے... میں ان کے ساتھ ہوں اور انہی کے ساتھ لندن چلا جاؤں گا۔"

"دیکھو۔ مجھے صرف یہ پوچھنا تھا کہ کل رات یہ کوٹ لکھپت جیل کے باہر کیا کررہا تھا۔ اس کے ساتھ رابعہ قاری تھی۔"

"ضرور تم نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہوگا۔" میں نے کہا "اس سے کہو کہ کل رات ہم فرانس کے تجارتی وفد کے اعزاز میں لاہور کے چیمبر آف کامرس کے ڈنر میں شریک تھے اور وہاں فرانسیسی اور برطانوی کونسلیٹ سفارت خانوں کے ٹریڈ کمشنر، پولیس اتاشی اور صوبائی کابینہ کے ارکان سب موجود تھے۔ رابعہ ہمارے ساتھ تھی۔"

مولوی خادم حسین نے مجھ سے کہا "لیکن۔ کل شام تو۔"

میں نے کہا "تم ترجمہ کرو۔ اسے کیا پتا جھوٹ سچ کا۔ ایسے بہت سے ڈنر ہوتے ہیں ہر روز، یہ کس سے تصدیق کرے گا اور کیا پوچھے گا۔"

خادم حسین نے میری بات فرفر دُہرادی۔ اس نے اتنی تیزی سے ان اعلیٰ عہدوں کے نام لیے جن کا پولیس سے دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا۔

ارشد کریم کی صورت پر جھلاہٹ اور مایوسی پھیل گئی "بہت حرامی چیز ہے یہ گورا وکیل بھی۔ اس نے پکا انتظام کیا ہوگا لیکن بتا دینا اسے کہ میں بھی اس کا باپ ہوں۔"

"اگر کسی نے سُن لیا کہ تم کسی حرامی کے باپ ہو" مولوی خادم حسین بولا "تو سوچ لو جی بدنامی کس کی ہوگی بعد میں۔ بچے کتنے ہیں تمہارے؟"

ارشد کریم نے جاتے جاتے اسے پلٹ کے چند شاندار گالیوں سے نوازا اور یہ اعلان بھی کیا کہ وہ ہمارے ساتھ کیا کرے گا۔ یہ سب قابلِ اشاعت نہیں۔

میں آرام سے باوقار انداز میں آگے بڑھا۔ مولوی خادم حسین سینہ آگے نکال کے اس مرغ کے مالک کی طرح چلنے لگا جس نے بازی جیت لی ہو۔

"ابھی تک ایس ایس پی صاحب غائب ہیں" میں نے اِدھراُدھر نگاہ دوڑائی تو مجھے مختلف راستوں پر سادہ کپڑوں والے نظر آئے جو اپنے حلئے سے بھی پولیس والے نہیں لگتے تھے اور بھوکے شکاری کتوں کی طرح شکار کو دبوچ لینے کے لیے بے چینی سے ہر طرف منڈلارہے تھے۔ آخر جاوید صدیقی کس طرف سے آئے گا اور وہ چوہدری دلاور کو کیسے اندر لائے گا۔ مجھے تشویش لاحق ہونے لگی تھی۔

ایک کورٹ سے منظر برآمد ہوا اور سیدھا میری طرف آیا "کیا بات ہے۔ تو یہاں کس کا انتظار کررہا ہے آخر۔"

میں نے کہا "یار یہ دیکھو۔ پولیس والوں نے کیسا جال پھیلا رکھا ہے ہر طرف۔"

مولوی خادم حسین نے کہا "وہ نیا ایس ایس پی ابھی بہت گرمی دکھا رہا تھا جی۔ سخت نازیبا کلمات کہے جی اس نے۔"

منظر نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا "ابے تو تمہارے منہ میں زبان کی جگہ کیا وہ ہے... پھر تم بُرا مانو گے۔"

"بات ہی ایسی بے ہودہ کرتے ہیں آپ، اور یہ ہاتھا پائی..."

"کیا پان تھا تمہارے منہ میں۔ تم نہیں بول سکتے تھے؟ اس نے گالیاں دی تھیں تو جواب میں تم کیا تسلیمات بجالاتے رہے؟ اس کی تو ایسی تیسی کردیتے۔ سارے شجرۂ نسب میں آباواجداد کی جگہ ناپاک جانوروں کو شامل کردیتے۔ خواتین کے رشتے اِدھر سے اُدھر کردیتے۔"

"لاحول ولا قوۃ جی۔ میں اپنی زبان گندی کرتا۔ اور وہ تو تھانے بُلا کے میرا وہی حشر کرتا جو قسائی عید والے دن بکرے کا کرتا ہے۔ کھال الگ، سری پائے الگ۔"

"ابے مولوی۔ کیوں ڈرتا ہے تُو اتنا۔ سالے ہم ہیں تو پھر تجھے کیا غم ہے بھوتنی کے۔ کوئی تیری طرف آنکھ اٹھاکے تو دیکھے۔ تھانے بلانا تو دور کی بات ہے۔ تم لوگ چلو اندر جاکے بیٹھو۔"

"ابھی اندر کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"اگلا کیس ہے ہمارا۔ میں نے درخواست لگادی ہے۔ دوسری درخواست رابعہ کی ہے" منظر نے کہا۔ "سات وکلا اور بھی موجود ہیں جو ڈاکٹر شیلی مرڈر کیس میں مدعی ہیں۔"

"لیکن خود جاوید صدیقی کہاں ہے۔ وہ کیسے اندر آئے گا؟ یہ تو اسے باہر ہی گرفتار کرلیں گے۔"

منظر نے ایک قہقہہ مارا "ان کی تو... جھک مارنے دے سالوں کو۔ وہ پہنچ چکا ہے اندر... یہ مت پوچھ کیسے؟"

میں نے کہا "اس راستے سے جو ججوں کے لیے مخصوص ہے؟"

منظر نے اقرار میں سرہلایا "ایک جج کی گاڑی میں۔"

"اور چوہدری صاحب کی سواری کیسے آئے گی؟"

"اندر چل کے تماشا دیکھو۔ ہم نے کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں بیٹا۔ رات بھر ہم اپنی کارروائی میں مصروف رہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم قانون سے ہٹ کے کام نہیں کرتے لیکن چور دروازے اور خفیہ راستے جتنے ہم جانتے ہیں" اس نے مجھے آنکھ ماری "ان کا اب کوئی وار نہیں چل سکتا۔ کھیل ختم ہوگیا۔"

اتنی واضح یقین دہانی کے باوجود میرا دل مطمئن نہیں تھا۔ اندر ایک خلش سی تھی کہ پھر کچھ ہوجائے گا۔ پہلے بھی ہم بہت پُراعتماد تھے اور ہمیں یقین تھا کہ ہم نے بڑا پکا کام کیا ہے لیکن دلاور اینڈ کمپنی نے ثابت کردیا تھا کہ وہ ہم سے بڑے شکاری ہیں۔

عدالت میں مکمل خاموشی تھی اور جج کسی کیس میں فائل پر احکامات صادر کررہا تھا۔ رابعہ اور چند سینئر وکلا جن کو میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا اگلی صف کی پہلی بینچ پر موجود تھے۔ ان کے پیچھے والی بینچ پر دو اخبار والے تھے اور محسن تھا۔ میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ دوسری طرف میں نے چوہدری دلاور کی بیوی کو اور اس کے بیٹے فیصل کو دیکھا جو اپنے وکیلوں کے پورے پینل کے ساتھ ہونے کے

باوجود سخت مضطرب اور پریشان نظر آتے تھے۔ وہ بار بار آپس میں باتیں کرنے لگتے تھے۔ ان کے ساتھ کچھ اجنبی چہرے بھی تھے جن کو میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔

بالآخر "مسز چوہدری دلاور حسین مدعی بنام سرکار" کی آواز لگی اور اس کے وکیل نے حبسِ بے جا کے کیس میں اپنا مختصر بیان دیا۔

"جنابِ والا۔ میری مؤکلہ مسز چوہدری دلاور حسین نے اپنی درخواست میں اس اندیشے کا اظہار کیا تھا کہ پولیس نے اس کے شوہر کو گرفتار کرلیا ہے مگر اسے غیر قانونی طور پر کسی نامعلوم جگہ حراست میں رکھا ہے۔ اسے کسی مجسٹریٹ کے سامنے نہیں پیش کیا گیا اور اس پر جسمانی تشدد کیا جارہا ہے۔ چونکہ دلاور حسین پہلے سے امراضِ قلب میں مبتلا ہے اس لیے میری مؤکلہ کو ڈر ہے کہ وہ پولیس کی غیر قانونی حراست میں ہلاک بھی ہوسکتا ہے۔ یہ انتہائی ضروری ہے کہ فاضل عدالت کے روبرو پولیس اپنی پوزیشن کی وضاحت کرے اور دلاور حسین کی ذہنی و جسمانی صحت کے بارے میں مجاز افسر کی رپورٹ دے۔ عدالت عالیہ اس کیس میں پہلے ہی ایس ایس پی جاوید صدیقی کو بیانِ حلفی داخل کرنے کے لیے طلب کرچکی ہے لیکن مصدقہ اطلاعات کے مطابق پولیس افسر عمداً ٹال مٹول سے کام لے رہا ہے اور بیانِ حلفی نہ داخل کرنے کی نیت سے روپوشی اختیار کیے ہوئے ہے۔"

منظر نے فوراً اعتراض دائر کردیا "فاضل وکیلِ استغاثہ کی معلومات انتہائی ناقص ہیں اور غلط ہیں۔ میرا ان کو مشورہ ہے کہ چنڈو خانے کی خبریں سن کے یقین کرنا چھوڑ دیں۔"

کچھ لوگ ہنسے۔ عدالت نے دوبار "آرڈر... آرڈر" کہا۔

"حقیقت یہ ہے جناب والا کہ ایس ایس پی جاوید صدیقی عدالت کے روبرو اپنا بیان دینے کے لیے حاضر ہونے کی اجازت چاہتے ہیں۔ انہیں خود پولیس کے اعلیٰ حکام نے اپنے اختیارات سے تجاوز کرتے ہوئے عدالتِ عالیہ میں حاضر ہونے سے روکا تھا اور بیانِ حلفی نہ داخل کرنے کی تاکید کی تھی مگر ایس ایس پی جاوید صدیقی نے جو 'اب میرے مؤکل بھی ہیں' ان غیر قانونی احکامات کو تسلیم کرنے سے انکار کیا تو انہیں معطل کردیا گیا اور ان کے چارج چھوڑنے سے قبل ہی دوسرے افسر ارشد کریم ربانی کو ان کی جگہ بٹھادیا گیا۔ جناب والا' ایس ایس پی جاوید صدیقی نے ڈاکٹر شبلی مرڈر کیس میں خصوصی تفتیش مکمل کرلی تھی۔ ایک ایماندار' فرض شناس اور باضمیر پولیس افسر کی حیثیت سے انہوں نے ملزم چوہدری دلاور حسین کا سراغ بھی لگالیا تھا اور ان کو گرفتار بھی کرلیا تھا۔"

عدالت میں ایک دم سنسنی پھیل گئی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہاں کافی تعداد میں دوسرے لوگ بھی موجود ہیں۔ ان میں اخبار والے بھی ہوسکتے تھے اور چوہدری دلاور کے اپنے حمایتی بھی۔ جج نے پھر "آرڈر آرڈر" کہا۔

"ایس ایس پی جاوید صدیقی کو عدالت میں پیش ہون[e]
لیے کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں تھی" جج نے کہا۔

"یس سر۔ لیکن ان کے اعلیٰ افسران نے پیشہ ورانہ ...
سے کام لیتے ہوئے جاوید صدیقی کو ادائے فرض سے روکا او[ر]
پر اسے معطل کردیا۔ اسے دھمکیاں دی گئیں یہاں تک کہ ...
آباد میں اس کے بیوی بچوں کو ہراساں کیا گیا۔ اس سے کہا ...
اس عدالتِ عالیہ کے روبرو جھوٹا بیانِ حلفی داخل کرے کہ ا...
چوہدری دلاور کو گرفتار نہیں کیا تھا۔ اور اگر ایسا نہیں کر ...
خاموشی اختیار کرے تاکہ اس کی جگہ لینے والا یہ کام کرسکے
جناب والا اس بدمعاشی کا مقصد تھا چوہدری دلاور حسین کو پو...
کی تحویل سے فرار ہونے کا موقع فراہم کرنا۔"

"آخر کیوں...؟ پولیس ایسا غیر قانونی کام کس لیے کرے ...

"حضور والا۔ اس سوال کا جواب تو متعلقہ افسران ہی ...
سکتے ہیں مگر کیا ایک عام آدمی بھی یہ نہیں سمجھتا کہ پولیس مجر...
کیسے تحفظ فراہم کرتی ہے اور کس طرح انصاف کی راہ میں ر...
کی دیوار کھڑی کی جاتی ہے۔ میرے مؤکل نے صرف اس ...
روپوشی اختیار کی تھی کہ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو اسے جان سے ...
جاتا۔ اس نے گزشتہ روز ایک پریس کانفرنس میں یہ سب بتا...
اور وہ اپنی رپورٹ محترم چیف جسٹس صاحب کو بھی ارسال ...
ہے۔ اس وقت بھی عدالت کے باہر سادہ کپڑوں والے پولیس
اہلکار موجود ہیں جو جاوید صدیقی کو عدالت میں حاضر ہونے سے ...
گرفتار کرکے ساتھ لے جانے پر مامور ہیں مگر میرے مؤکل
گزشتہ شب ہی اس عدالت میں پناہ حاصل کرلی تھی۔ وہ اب ...
بھی عدالت کے کمرے میں موجود ہے۔"

ایس ایس پی جاوید صدیقی نے بڑے ڈرامائی انداز میں ...
عدالت کے سامنے پیش کیا۔ میں نے دوسری طرف سے ایک ...
پوش عورت کو آتا دیکھا۔ اس تسل کاک ٹائپ برقعے کو ہٹا...
جاوید صدیقی نے جج کو تعظیم دی۔

عدالت میں جیسے بھونچال آگیا۔ پیچھے بیٹھے ہوئے لوگ
اٹھ کے آگے دیکھنے لگے۔ بہت سے لوگ جو پہلے باہر تھے ا...
اندر آگئے اور میں نے بہت سے چہروں کو شناخت کرلیا۔ یہ ...
واچ ڈاگ تھے جو باہر جاوید صدیقی کے نظر آتے ہی اسے ہر ...
سے گھیر کر گرفتار کرلیتے۔ جاوید صدیقی کی تلاش میں ناکامی ...
سخت مشتعل تھے۔ اس شخص نے اپنا مستقبل تو داؤ پر لگایا ...
اب وہ ان کی نوکری کے لیے بھی خطرہ بن گیا تھا۔ اسے بھونکنے ...
پہلے خاموش کردینے کی ضرورت تھی۔

یہ ناکام شکاری سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان کا شکار ...
کی آنکھوں میں دھول جھونک کے نکل جائے گا۔ ایس ایس ...
جاوید صدیقی جیسا سینئر پولیس افسر کورے لٹھے کے خیمہ نما ...
میں چہرہ چھپاکے کسی پرانی بڑھیا کی طرح کمر جھکا کے چلتا ہوا ان ...

... معطل کردیا تھا۔ ان اسباب کی نشاندہی متعلقہ حکام
... افسرانِ بالا نے ... مگر جیسا کہ آج کے اخبارات کہتے ہیں' مسٹر جاوید
... ی کرسکتے ہیں ...
صدیقی نے استعفیٰ دے دیا ہے۔ اس کی ایک نقل میں عدالت کے
ریکارڈ پر رکھنا چاہتا ہوں۔"

"ابھی عدالت صرف یہ جاننا چاہتی ہے کہ چوہدری دلاور کو
گرفتار کیا گیا ہے یا نہیں؟" جج نے اسے ٹوک دیا "اگر گرفتار کیا
ہے تو اسے کہاں رکھا گیا ہے اور اسے اب تک ریمانڈ کے لیے
علاقہ مجسٹریٹ کے سامنے کیوں پیش نہیں کیا گیا؟"

ایڈووکیٹ جنرل نے کہا "مجھے کچھ مہلت دی جائے تاکہ میں
پولیس کے محکمے سے بدلی ہوئی صورت حال میں حقائق دریافت
کرسکوں۔"

"عدالت مزید مہلت نہیں دے سکتی۔ کیا ایڈووکیٹ جنرل
اس سیدھے سادے سوال کا جواب ہاں یا نہ میں نہیں دے سکتے کہ
چوہدری دلاور کو پولیس نے گرفتار کیا ہے یا نہیں؟ اس سوال کا کسی
ماتحت افسر کی معطلی سے یا اس کے استعفے سے کوئی تعلق نہیں" جج
نے کہا۔

"اس کا جواب میرے مؤکل جاوید صدیقی کے پاس ہے
یور آنر۔ اگر وہ عدالت عالیہ کے روبرو اپنا بیان حلفی پیش کردے تو
ایڈووکیٹ جنرل صاحب کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔" منظر نے
کہا "جناب والا جیسے طلاق کے مقدمے میں شوہر کے مؤقف کو
بیوی کے مؤقف سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ ایسے ہی جاوید صدیقی
کی معطلی کے معاملے کو چوہدری دلاور کی گرفتاری کے معاملے سے
الگ نہیں سمجھا جاسکتا۔ میرے مؤکل نے اس کیس میں کی جانے
والی ناانصافی کے خلاف احتجاجاً استعفے دیا ہے اور ان اسباب کی
وضاحت اپنے استعفے میں بھی کردی ہے۔ میں پھر درخواست کروں
گا کہ جاوید صدیقی کو اپنا بیانِ حلفی داخل کرنے کی اجازت دی
جائے۔"

ایڈووکیٹ جنرل نے کہا "مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

"تھینک یو لیکن ایڈووکیٹ جنرل صاحب' کیا یہ بات عجیب
نہیں کہ آج عدالت میں آپ کی معاونت کے لیے ارشد کریم ربانی
موجود نہیں جس کو ایس ایس پی کے عہدے پر عارضی ترقی دے کر
جاوید صدیقی کی جگہ لایا گیا تھا۔ سنا ہے ہمارے کسی چڑیا گھر کا زیبرا
فوت ہوگیا تھا تو جلدی میں ایک خچر پر کالے سفید رنگ کی پٹیاں ڈال
کے کھڑا کردیا گیا تھا۔ پینٹ تو اچھا تھا مگر جب اس نے معائنے کے
لیے آنے والے افسر کے سامنے اپنی مادری زبان میں خوشی سے بے
قابو ہوکے گانا شروع کیا۔"

ایڈووکیٹ جنرل بھی مسکرانے لگا "آپ چڑیا گھر کے منتظم
ہوتے تو آپ کو بھی نوکری بچانے کے لیے کچھ ایسا ہی کرنا پڑتا۔"

عدالت میں ایک قہقہہ پڑا تھا۔ جج نے مسکراتے ہوئے
تنبیہ کی نظروں سے لوگوں کو دیکھا اور ایڈووکیٹ جنرل سے سوال

سامنے سے گزر جائے گا اور وہ آنکھیں کھلی رکھنے کے باوجود اسے دیکھ نہ پائیں گے۔

ایک دروازے میں مجھے ذرا سی دیر کے لیے ارشد کریم ربانی بھی نظر آیا مگر اس سے پہلے کہ کوئی عدالت میں پولیس کی موجودگی پر اعتراض اٹھاتا وہ غائب بھی ہوگیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کی نہیں چلی۔ ذہانت نے طاقت کو ہمیشہ کی طرح آج بھی رسوا کیا تھا۔

جاوید صدیقی کی آمد سے وقتی طور پر جو ہلچل پیدا ہوئی تھی وہ جج کے متعدد بار "آرڈر... آرڈر" پکارنے سے ختم ہوچکی تھی۔ جاوید صدیقی کو پہلی قطار میں بیٹھنے کی جگہ مل گئی۔ وہ بہترین سوٹ میں بہت وجیہہ اور پُراعتماد لگ رہا تھا۔ چوہدری دلاور کی بیوی کی حالت غیر تھی اور فیصل اسے بڑی خوں خوار نظروں سے گھور رہا تھا۔ غالباً ان کو بھی جاوید صدیقی سے پہلے کوئی ایسا شخص نہیں ملا تھا جس نے ان کی دولت کو یوں حقارت سے ٹھوکر ماردی ہو۔ اس دور میں جب پیسہ ہی سب کچھ ہے۔ یہ شرافت اور نجابت کا پیمانہ ہے۔ عزت اور طاقت دیتا ہے۔ ساری دنیا کی خوشیوں کو آدمی کی دسترس اور قوتِ خرید میں کردیتا ہے۔ اخلاق اور انصاف کی قدریں بدل سکتا ہے اور ہر سپر پاور سے بڑی سپر پاور ہے۔ ایسے سرپھرے بھی کہیں ہوتے ہیں جو پولیس کی وردی پہن لیں اور پھر سچ مچ انصاف اور قانون کے رکھوالے بن کر ثابت کردیں کہ یہ وردی اپنے اختیارات کو کیش کرانے کے لیے نہیں' مظلوموں کو ظالموں سے تحفظ فراہم کرانے اور مجرم کو قانون کے مطابق سزا دلوانے کے لیے پہنی جاتی ہے۔

منظر نے اپنا بیان یوں شروع کیا "حضور والا۔ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ میرا مؤکل عدالت میں کیسے چھپ کر آنے پر مجبور کردیا گیا تھا ورنہ وہ ایک سینئر پولیس افسر ہے۔ میں درخواست کروں گا کہ اسے عدالتِ عالیہ کے روبرو اپنا بیان اور مؤقف پیش کرنے کی اجازت دی جائے۔"

وکیلِ صفائی فوراً کھڑا ہوگیا "آبجکشن یور آنر۔ عدالت چوہدری دلاور حسین کی گرفتاری اور مسز دلاور کی درخواست کی سماعت کررہی ہے جس کا ایس ایس پی جاوید صدیقی کے معاملات سے کوئی تعلق نہیں۔"

"تعلق تو ہے جناب والا۔ چوہدری دلاور کو جاوید صدیقی نے ہی گرفتار کیا تھا۔" منظر نے کہا۔

"مگر اس قانونی معاملے میں سرکاری مؤقف کی وضاحت صرف ایڈووکیٹ جنرل کرسکتا ہے۔ جاوید صدیقی کو معطل کیا جاچکا ہے۔"

جج نے اعتراض منظور کرتے ہوئے ایڈووکیٹ جنرل کو طلب کیا "آپ اس معاملے میں کیا کہتے ہیں؟"

ایڈووکیٹ جنرل مشکل میں پڑگیا تھا مگر اس نے حالات کے پیشِ نظر اپنا بیان بدل دیا "یہ ٹھیک ہے یور آنر کہ جاوید صدیقی کو

کیا "مسٹر منظر نے آپ سے ایک سوال کیا تھا؟"

"یور آنر۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کیوں حاضر نہیں ہو سکا۔"

منظر نے کہا "ابھی کچھ دیر پہلے وہ عدالت کے باہر موجود تھا۔ متعدد وکلا اور صحافیوں نے اسے دیکھا تھا۔"

رابعہ نے اُٹھ کے کہا "اس نے مجھے عدالت میں داخل ہونے سے روکنے کی کوشش بھی کی تھی یور آنر۔ فزیکلی۔"

ایک اور وکیل نے کہا "میں نے اسے عدالت میں آتے دیکھا تھا۔"

اب میں نے اٹھ کے کہا "وہ غالباً جاوید صدیقی کی صورت دیکھتے ہی فرار ہو گیا۔"

مولوی خادم حسین نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا "اس کے دل میں چور نہ ہوتا تو وہ دُم دبا کے نہ بھاگتا۔"

جج نے مجھے غور سے دیکھا "آپ کی تعریف؟"

منظر نے میرا تعارف کرایا "یہ فاضل وکیل مقتولہ لیڈی ڈاکٹر شیلی کے لواحقین کی طرف سے تفتیش میں شامل ہیں۔ بحیثیت غیر جانبدار مبصر۔"

دلاور کے وکیل نے کہا "اس کو عدالتی کارروائی میں حصہ لینے یا رخنہ اندازی کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔"

منظر نے کہا "یہ صرف گواہ ہیں اور وہی بتائیں گے جو انہوں نے دیکھا ہے۔"

جج نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا "ابھی گواہی کا مرحلہ نہیں آیا۔"

ایڈووکیٹ جنرل نے کہا "اتنے سینئر وکلا غلط بیانی نہیں کر سکتے۔ میں معلوم کروں گا کہ ارشد کریم ربانی کی غیر حاضری کا سبب کیا ہے؟"

"ایسی صورت میں جاوید صدیقی کو بیان جاری رکھنے کی اجازت ہے۔" جج نے کہا۔

"تھینکس یور آنر۔" منظر نے سر خم کر کے کہا "مسٹر جاوید صدیقی، کیا آپ نے ملزم دلاور حسین کو گرفتار کیا تھا؟"

"یس۔ میں نے اسے متعدد افراد کے سامنے گرفتار کیا تھا۔ ان میں آپ بھی شامل تھے۔"

"میرے علاوہ کون تھا؟"

"مس رابعہ قاری ایڈووکیٹ۔ موسیو آندرے، ان کا مترجم.... ایک اخبار کا چیف رپورٹر جس کا نام غازی تھا اور ایک فوٹو گرافر جو غازی کے ساتھ ہی آیا تھا۔ میں اس کے نام سے واقف نہیں۔"

"ملزم دلاور کو آپ نے کہاں سے گرفتار کیا تھا؟"

"میں نے اسے شوکت رانا کی کوٹھی سے گرفتار کیا تھا۔ تقریباً بارہ بجے شب مجھے یہ اطلاع ملی کہ ملزم دلاور حسین وہاں موجود ہے۔ میں پولیس کی مسلح نفری کے ساتھ وہاں پہنچا۔ میں نے علاقے کے تھانے فون کر کے ایس ایچ او کو بھی طلب کر لیا تھا۔ وہاں آتشزنی اور ڈکیتی کی واردات بھی ہوئی تھی۔ لیکن وہ میری تفتیش میں شامل نہیں۔"

"قتل کس کا ہوا تھا؟"

"ایک چوکیدار اور دو گارڈ۔ شوکت رانا انہیں اپنے رکھتا تھا۔ آگ اس کی گاڑی میں دھماکے سے لگی تھی، اس دونوں گارڈ بھی ہلاک ہو گئے تھے لیکن چوکیدار کو خود شوکت نے قتل کیا تھا۔ میں نے اسے مقامی پولیس کی تحویل میں دے دیا تھا۔"

"آپ وہاں صرف چوہدری دلاور کی گرفتاری کے لیے گئے تھے؟"

"جی ہاں۔ چوہدری دلاور قتل کی ایک ایف آئی آر میں پولیس کو مطلوب تھا۔ اس نے لندن سے آنے والی ڈاکٹر شیلی کو قتل کیا مگر اسے حادثاتی موت بتا دیا گیا تھا۔ مقتولہ برطانوی شہری تھی چنانچہ برٹش کونسلیٹ نے اس کیس میں خصوصی تفتیش کی درخواست کی۔ پہلے تشکیل دی جانے والی ٹیم کے ارکان مجرمانہ چشم پوشی اور بدعنوانی کے الزام میں پہلے معطل، پھر گرفتار اور بالآخر برطرف کر دیے گئے تھے۔ اس کے بعد مجھے اسلام آباد سے نئی ٹیم کے سربراہ کی ذمّے داری سونپی گئی تھی۔"

"کیا آپ نے اپنی تفتیش مکمل کر لی تھی؟"

"یس۔ یہ انتہائی دشوار اور خطرناک کام تھا کیونکہ بادی النظر میں قتل کا الزام چوہدری دلاور حسین پر ہی آتا تھا اور وہ انتہائی بااثر اور طاقتور شخص سمجھا جاتا ہے۔ اس نے مختلف طریقوں سے تفتیش کے کام کو روکنے یا غلط سمت میں موڑنے کی پوری کوشش کی۔ ناجائز طور پر اس نے مجھے بھی لالچ اور دھمکیوں سے متاثر کرنے کے لیے مختلف حربے استعمال کیے۔ اس کی طرف سے متعدد افراد نے یہ پیغام مجھ تک پہنچایا کہ اگر میں...."

جج نے اسے ٹوک دیا "مسٹر جاوید صدیقی۔ جواب کو مختصر رکھیں ابھی یہ عدالت قتل کے کیس کی تفصیلات سے دلچسپی نہیں رکھتی۔"

منظر نے پھر کہا "مختصر یہ کہ آپ نے تفتیش مکمل کر لی تھی؟"

"یس، مکمل رپورٹ افسرانِ بالا کو بھی دے چکا ہوں اور اسلام آباد بھی ارسال کر چکا ہوں۔"

منظر نے کہا "آپ کے خیال میں ملزم چوہدری دلاور ہی ہے؟"

"مگر اس کا آخری فیصلہ عدالت کرے گی۔"

"ملزم چوہدری دلاور حسین کو اس کیس میں مفرور قرار دے دیا گیا تھا؟"

"ہاں۔ لیکن اس کے وارثوں نے یہ رپورٹ درج کرائی تھی کہ اسے اغوا کر لیا گیا ہے۔"

"اس کے اغوا کا شبہ کس پر ظاہر کیا گیا تھا؟"

"پہلے ملزم کی بیوی نے جو رپورٹ لکھوائی تھی اس میں سکندر بخت اور اس کے ساتھیوں پر یہ الزام عائد کیا گیا تھا مگر بعد میں اس نے ایک پریس کانفرنس میں اس الزام کی خود ہی نفی کر دی اور کہا کہ چوہدری دلاور کو اس کے شریکِ کاروبار شوکت رانا نے اغوا کیا ہے۔ وہ سارے کاروبار پر قابض ہونا چاہتا ہے اور اسی مقصد کے لیے اس نے دلاور کی بیوی کو اور اس کے بچّوں کو بھی قتل کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔"

"اور چوہدری دلاور آپ کو شوکت رانا کی کوٹھی کے اندر ہی ملا۔ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اسے اغوا کرنے والا شوکت رانا ہی تھا۔"

"حالات اور واقعات کی شہادت یہی ہے۔"

"چوہدری دلاور آپ کو کس حال میں ملا تھا؟"

"اس کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے۔ منہ پر ٹیپ تھا اور وہ انتہائی بُری حالت میں تھا۔"

"اغوا کی رپورٹ کے کتنے عرصے بعد چوہدری دلاور کی بازیابی ہوئی تھی؟" منظر نے سوال کیا۔

"پینتالیس دن بعد۔ اور اس عرصے میں اس پر خاصا جسمانی اور ذہنی تشدّد کیا گیا ہوگا ورنہ اس کی حالت تشویش ناک حد تک خراب نہ ہوتی۔ اسے فوری طبّی امداد اور انتہائی نگہداشت کی ضرورت تھی۔"

جج نے کہا "یہ کتنا عرصہ پہلے کی بات ہے؟"

"آج سے ٹھیک پانچ دن پہلے کی۔ میں نے اسے آٹھ تاریخ کی رات بارہ بجے گرفتار کیا تھا۔ روزنامچے میں گرفتاری کے وقت اور تاریخ کا اندراج خود میں نے کیا تھا۔"

"پھر اسے چوبیس گھنٹے کے اندر اندر مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیوں نہیں کیا گیا؟" جج نے کہا۔

"یور آنر۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا۔ اگر اسے فوراً طبّی امداد نہ ملتی تو شاید وہ مر جاتا۔ میں نے اسے انتہائی سخت حفاظتی اقدامات کے تحت کوٹ لکھپت جیل کے اسپتال منتقل کر دیا تھا۔ میں نے اسے جیلر خورشید عالم کی تحویل میں دیا تھا اور اسپتال کے ریکارڈ سے اس کے داخل کیے جانے کی تاریخ اور وقت کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔ اس کا علاج ڈاکٹر شفاعت علی نے کیا تھا اور اگلے دن ملزم کا ریمانڈ ایس ڈی ایم مشاہد حسین زبیری نے اسپتال جا کے دیا تھا۔"

منظر نے کہا "کیا ملزم کی حفاظت کے لیے آپ نے بھی وہاں پولیس رکھی تھی؟"

"یس۔ میں نے چار افراد کو اس کام پر مامور کیا تھا۔ بعد میں انہیں میرے افسرانِ بالا نے واپس بلا لیا۔"

"کیا ملزم دلاور حسین سے تفتیش کی گئی تھی؟"

"ملزم کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ کسی سوال کا جواب دے سکتا۔ میں نے سختی سے تاکید کی تھی کہ میری تحریری اجازت کے بغیر کسی کو ملزم سے نہ ملنے دیا جائے۔"

منظر نے کہا "مگر اس کے باوجود ملزم دلاور پر تفتیش میں تشدّد کیا گیا تھا۔"

"یہ غلط ہے۔"

"اس سے پوچھ گچھ کرنے والے وہی تھے جن کو آپ نے وہاں ملزم کی حفاظت کے لیے چھوڑا تھا۔ اور آپ ہی نے حکم دیا تھا۔"

"یہ بھی جھوٹ ہے۔ وہ عام سپاہی تھے۔ تفتیش کرنا ان کے فرائض میں شامل نہیں تھا اور وہ جانتے بھی نہیں تھے۔ پھر اس کیس میں تفتیش کا اختیار صرف اس خصوصی ٹیم کو حاصل تھا جو اسلام آباد میں وزارتِ داخلہ کے حکم پر تشکیل دی گئی تھی۔"

"لیکن آپ پر الزام ہے کہ زیرِ حراست ملزم آپ کی تفتیش کے نتیجے میں ہلاک ہو گیا۔"

"یہ شاید اس صدی کا سب سے بڑا جھوٹ ہے۔"

جج نے کہا "آپ کا مطلب ہے چوہدری دلاور زندہ ہے؟"

"یس یور آنر۔"

منظر نے ایک پوسٹ مارٹم رپورٹ جج کے سامنے رکھی "حضور والا۔ یہ ہے وہ پوسٹ مارٹم رپورٹ جس میں بتایا گیا ہے کہ ملزم دلاور حسین کی موت تفتیش کے دوران کیے جانے والے تشدّد کے باعث واقع ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اسپتال سے جاری ہونے والا سرٹیفکیٹ آف ڈیتھ ہے جس پر ڈاکٹر شفاعت علی نے دستخط کیے ہیں۔"

جج نے دونوں دستاویزات کا معائنہ کیا۔ عدالت میں ایک ایسی اعصاب شکن، پُرآسیب اور سنسنی خیز فضا پیدا ہو گئی جس میں عام آدمی کے لیے تجسّس اور دلچسپی کا اضطراب تھا۔ دلاور کی بیوی اور اس کے حمایتی اپنی شکست کی آواز سن سکتے تھے اور ہم سب جو دلاور کی گرفتاری کے ذمّے دار تھے دل ہی دل میں ایک دوسرے کو اس کامیابی پر مبارک باد دے رہے تھے۔

آہستہ آہستہ بڑی فنکاری کے ساتھ اور پیشہ ورانہ مہارت سے منظر جال پھیلا رہا تھا اور حلقۂ دام کو تنگ کرتا جا رہا تھا۔

جج نے کہا "اس سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ ملزم دلاور حسین کی موت واقع ہو گئی ہے۔"

جاوید صدیقی نے مسکراتے ہوئے کہا "یور آنر۔ میں نے بھی اسی لیے کہا تھا کہ شاید یہ اس صدی کا سب سے بڑا جھوٹ ہے۔ یہ دونوں دستاویزات غلط اور جھوٹی ہیں۔ مرنے والا چوہدری دلاور حسین وہ ملزم نہیں تھا جس کو میں نے گرفتار کیا تھا۔"

جج نے کہا "کیا یہ چوہدری دلاور حسین کوئی اور تھا؟"

"مجھے نہیں معلوم جناب والا کہ اس شخص کا نام کیا تھا اور وہ کس جرم میں کوٹ لکھپت جیل میں بند تھا" جاوید صدیقی نے کہا

"لیکن یہ حقیقت ہے کہ ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت اس کی شناخت بدل دی گئی۔ یہ کہا گیا کہ وہ چوہدری دلاور حسین ہے۔ یہ عدالت اس معاملے کی تفتیش کے لیے احکامات جاری کرسکتی ہے۔"

منظر نے کہا "اس جعلی دلاور حسین کی لاش کہاں ہے؟"

جاوید صدیقی نے کہا "اگر معزز عدالت ایک بیلف کو تصدیق کے لیے ساتھ روانہ کرے تو ایک شخص بتا سکتا ہے وہ جگہ..."

جج نے کہا "آخر آپ معاملے کو اتنا پُراسرار کیوں بنا رہے ہیں؟ آپ زبانی بتا سکتے ہیں کہ لاش کہاں ہے؟"

"یور آنر۔ میں معافی چاہتا ہوں۔ اگر میں نے جگہ کی نشاندہی کی تو مجھے ڈر ہے کہ بیلف کے پہنچنے سے قبل ہی لاش وہاں سے غائب کردی جائے گی۔"

"ٹھیک ہے۔ عدالت بعد میں بیلف کو بھیج سکتی ہے۔ فی الحال زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ اصل چوہدری دلاور حسین زندہ ہے تو کہاں ہے؟" جج نے کہا۔

"میں اس معزز عدالت سے تھوڑی سی رعایت کی درخواست کروں گا۔ مجھے اجازت دی جائے کہ پہلے میں اپنا بیان مکمل کرلوں اور پھر چوہدری دلاور کو عدالت میں پیش کروں۔"

"اگر یہ انتہائی ناگزیر ہے تو عدالت آپ کو پندرہ منٹ میں اپنا بیان مکمل کرنے کی اجازت دے سکتی ہے۔"

"تھینکس یور آنر۔" جاوید صدیقی نے کہا "یہ آٹھ تاریخ کی رات کی بات ہے جب مجھے کسی نے فون پر مطلع کیا کہ ڈاکٹر شبلی مرڈر کیس کا نامزد ملزم ایک شخص شوکت رانا کی نئی تعمیر شدہ کوٹھی میں موجود ہے۔"

"کیا اطلاع دینے والے نے اپنے متعلق کچھ بتایا تھا؟" منظر نے کہا۔

"جی نہیں۔ اس نے اپنا نام پوشیدہ رکھا تھا" جاوید صدیقی بولا "عموماً ہم کسی گمنام کال پر ایکشن نہیں لیتے لیکن بعض اوقات ایسا کرنا ناگزیر ہوجاتا ہے مثلاً کوئی شخص فون پر اپنا نام نہ بتائے مگر یہ کہے کہ اس کے گھر کے پاس فلاں جگہ قتل کی واردات ہوئی ہے اور قاتل ابھی وہیں موجود ہے تو ہم کو جانا پڑتا ہے خواہ بعد میں جھوٹ یا کسی احمق کالج اسٹوڈنٹ کا مذاق ہی کیوں نہ ثابت ہو۔ ویسے بھی پولیس کو گمنام کال پر ایکشن لینے سے منع نہیں کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے پولیس کی مسلح نفری کے ساتھ فوراً چھاپا مارنے کا فیصلہ کیا اور ملزم چوہدری دلاور حسین کو گرفتار کرلیا۔"

عدالت میں بیان وکیل دلواتے ہیں۔ وہ سوال کرتے جاتے ہیں اور اپنے موکل کو پہلے سے تاکید کردیتے ہیں کہ جتنا اس سے پوچھا جائے اتنا ہی بتائے اس طرح وہ اپنے موکل کی قانونی پوزیشن کا دفاع کرتے ہیں۔ اس کو ایسی بات منہ سے نہیں نکالنے دیتے جو کسی طرح بھی اس کی قانونی پوزیشن کو متاثر کرے اور دوسری طرف وہ تمام جزئیات کو سامنے لاتے ہیں جن کا تعلق کیس سے ہو۔

منظر نے جاوید صدیقی کو ٹوک دیا "ایک منٹ جاوید صاحب، یہ گمنام فون کال کتنے بجے موصول ہوئی تھی؟"

"تقریباً ساڑھے گیارہ بجے رات۔"

"اور اس کے کتنی دیر بعد آپ اس پتے پر پہنچے جو آپ کو بتایا گیا تھا؟"

"مجھے پتا پہلے سے معلوم تھا۔ میں وہاں بارہ بجنے میں پانچ منٹ پر پہنچا تھا۔"

"کیا آپ شوکت رانا کو جانتے تھے؟"

"جی نہیں۔ وہ ملزم چوہدری دلاور حسین کا دوست اور پارٹنر تھا۔" جاوید صدیقی نے کہا "اس کیس کی تفتیش کے سلسلے میں میری اس سے بھی کئی بار ملاقات ہوچکی تھی۔"

"یہ وہی شوکت رانا ہے جس پر ملزم دلاور حسین کی بیوی نے ایک پریس کانفرنس میں سنگین نوعیت کے الزامات عائد کیے تھے۔"

"جی۔"

"کیا آپ عدالت کو بتا سکتے ہیں کہ وہ الزامات کیا تھے؟"

"چوہدری دلاور کی بیوی نے شوکت رانا پر دو سنگین الزامات لگائے تھے۔ ایک یہ کہ چوہدری دلاور کو اغوا کرنے والا وہی ہے۔ دوسرا یہ کہ شوکت رانا یہ فرض کرچکا ہے کہ شاید چوہدری دلاور زندہ نہیں ہے۔"

"اس نے ایسا کیوں فرض کیا تھا؟"

"اس لیے کہ چوہدری دلاور پینتالیس دن سے بے پتا تھا۔ اس دوران نہ اس نے کسی سے رابطہ کیا تھا اور نہ اس کے بارے میں کوئی اطلاع تھی حالانکہ پولیس نے اس کی تلاش میں اپنے تمام ذرائع استعمال کیے تھے۔ خود چوہدری دلاور کی بیوی نے اپنے طور پر کم کوشش نہیں کی تھی۔ اس کے ذاتی وسائل کم نہیں مگر چوہدری دلاور کا سراغ لگانے میں سب ناکام رہے تھے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ناامید ہوچکے تھے۔"

"ٹھیک ہے۔ آگے بتائیے۔"

"شوکت رانا پر الزام لگانے والی چوہدری دلاور کی بیوی تھی۔ اس نے کہا کہ غالباً میرے شوہر کا بزنس پارٹنر سارے کاروبار پر قابض ہونے کی سازش کررہا ہے۔ یہ فرض کرتے ہوئے کہ چوہدری دلاور کے زندہ ملنے کے امکانات معدوم ہوگئے ہیں اس نے چوہدری دلاور کے قانونی وارثوں کو بھی ٹھکانے لگانے کا فیصلہ کیا۔ اس نے مسز دلاور اور اس کے بچوں کے قتل کی سازش کی۔"

"صرف سازش کی جاوید صدیقی یا کوشش بھی کی؟"

"مسز دلاور نے تو کہا تھا کہ اسے قتل کرنے کی کوشش بھی کی گئی تھی۔ ایک دن شوکت رانا نے بہانے سے اس کو آفس میں بلایا اور پھر تہ خانے میں بند کردیا، اس نے گیس کھلی چھوڑ دی اور تازہ ہوا کی آمدورفت کے تمام راستے بند کردیے۔ ہوا باہر پھینکنے والے پنکھے اور ائر کنڈیشنر کے کنکشن منقطع کردیے تاکہ وہ دم گھٹنے سے ہلاک ہوجائے۔ یا گیس میں دھماکے سے آگ لگ جائے۔"

"پھر وہ کیسے بچ گئی؟"

"اس کے بیان کے مطابق اسے بچانے والا وہی شخص تھا جو اس کے شوہر کا جانی دشمن سمجھا جاتا ہے یعنی سکندر بخت۔"

"کیا سکندر بخت کا وہاں پہنچ جانا ایک اتفاق تھا؟"

"اس کو اور کیا سمجھا جاسکتا ہے۔ چوہدری دلاور کی بیوی نے یہ انکشاف اپنی پریس کانفرنس میں کیا تھا۔ اس نے اعتراف کیا تھا کہ سکندر بخت ایک شریف النفس اور فراخ دل شخص ثابت ہوا۔"

"آخر اس نے اپنے دشمن کی بیوی کو زندہ بچانا کیوں ضروری سمجھا؟"

"ایک اخلاقی فرض کے طور پر۔ مسز دلاور کا بیان یہی تھا کہ سکندر بخت نے اس کی بحفاظت نکلنے میں مدد کی۔ چند منٹ بعد ہی وہ عمارت دھماکے سے تباہ ہوگئی جس کے تہ خانے میں مسز دلاور قید تھی۔ اس میں گیس بھرچکی تھی اور آگ بجلی کے تاروں کے شارٹ سرکٹ ہونے سے لگی تھی۔ سکندر بخت نے ہی مسز دلاور کو گھر پہنچایا اور کہا کہ اس کی قانونی جنگ چوہدری دلاور سے ہے۔ اس کے بیوی بچوں سے نہیں۔"

جج نے اسے ٹوکا "آپ بیان کو چوہدری دلاور کی گرفتاری تک محدود رکھیں۔"

"آئی ایم سوری یور آنر" جاوید صدیقی بولا "میں رات بارہ بجنے میں پانچ منٹ پر شوکت رانا کی کوٹھی پر پہنچا۔"

"کیا شوکت رانا بھی وہاں موجود تھا؟" منظر نے کہا۔

"جی ہاں۔ وہ وہاں موجود تھا۔"

"اس کے علاوہ آپ نے کسے دیکھا؟"

"میں نے کوٹھی کے باہر آپ کو دیکھا تھا۔ آپ کے ساتھ خاتون وکیل مس رابعہ قاری تھیں اور غالباً آپ کے ساتھی وکیل وقار یوسف بھی تھے۔ یہ فرنچ وکیل اپنے مترجم کے ساتھ تھے اور دو صحافی تھے۔ ایک اخبار کا چیف رپورٹر غازی تھا جو اس رات حادثے میں ہلاک ہوگیا۔ دوسرا شخص فوٹوگرافر تھا۔"

"کیا انہیں بھی کسی نے گمنام فون کرکے اطلاع دی تھی؟"

"جی ہاں۔ مجھے انہوں نے یہی بتایا تھا" جاوید صدیقی نے کہا "میں نے ہر طرف سے کوٹھی کا محاصرہ کرلیا۔ روانگی سے پہلے میں نے اسی علاقے کے ایس ایچ او کو بھی طلب کرلیا تھا۔ وہ بھی اپنی پوری فورس کے ساتھ موجود تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ کچھ دیر پہلے ہی یہاں ایک دھماکا ہوچکا ہے۔ اس دھماکے میں ملزم شوکت رانا کی نئی گاڑی مکمل طور پر تباہ ہوگئی تھی اور اس کے دو بندے ہلاک ہوئے تھے۔ ایک اس کا پرسنل باڈی گارڈ تھا اور دوسرا ڈرائیور۔ ان کی جلی ہوئی لاشیں وہیں پڑی تھیں۔"

"آپ نے شوکت رانا کے لیے ملزم کا لفظ کیوں استعمال کیا ہے مسٹر جاوید صدیقی؟"

"جب میں اندر پہنچا تو میں نے ایک اور لاش دیکھی۔ یہ کوٹھی کے پٹھان چوکیدار کی لاش تھی جس کو شوکت رانا نے گولی ماردی تھی۔"

"وہ کس لیے؟"

"اس کی نااہلی پر مشتعل ہوکے۔ آلۂ قتل اس کے ہاتھ میں تھا اور اس میں اتنی ہی گولیاں کم تھیں جتنی چوکیدار پر چلائی گئی تھیں۔"

"آپ نے اسے آلۂ قتل کیسے تسلیم کرلیا؟"

"واقعاتی شہادت کی بنا پر۔ میرا تجربہ یہی کہتا تھا اور ان گولیوں کا کیلی بر یعنی سائز اور ساخت ایک تھی۔ پھر میں نے شوکت رانا کی گفتگو سے بھی یہ نتیجہ اخذ کیا کہ وہی چوکیدار کا قاتل ہے۔ میں نے اس ایس ایچ او کو ہدایت کی کہ وہ ملزم کو اپنی تحویل میں لے کر اس کے خلاف ایف آئی آر درج کرے اور آلۂ قتل پر اس کے فنگر پرنٹس کی رپورٹ حاصل کرے۔"

جج نے کہا "کیا چوہدری دلاور وہاں موجود تھا؟"

"یس سر۔ چوہدری دلاور وہیں تھا۔" جاوید صدیقی نے کہا "اس کے ہاتھ پاؤں سختی سے بندھے ہوئے تھے اور اس کے منہ پر ٹیپ چپکا دیا گیا تھا۔ اس کی حالت بہت خراب تھی۔"

"خراب سے آپ کی کیا مراد ہے مسٹر جاوید صدیقی؟"

"ایسا لگتا تھا کہ چوہدری دلاور پر تشدد کیا گیا تھا۔ اس کو زنجیر سے باندھ کے رکھا گیا تھا۔ اس کے ہاتھوں اور پیروں کے زخم اس [illegible] تھے کہ وہ کافی عرصہ شکنجے کے ساتھ گزار چکا تھا۔ وہ [illegible] کا شکار تھا اور اس کا وزن کافی کم ہوگیا تھا۔"

"کیا آپ کو معلوم ہے کہ پہلے چوہدری دلاور کا وزن کیا تھا؟" منظر بولا۔

"جی نہیں، جب کسی صحت مند یا فربہ بدن شخص کو بھوکا رہنا پڑے اور ایک لمبے عرصے تک اس کی خوراک میں کمی آجائے تو اس کے بدن کی چربی گھل جاتی ہے۔ وزن کم ہونے سے اس کے جسم کی کھال ڈھیلی پڑجاتی ہے اور اس میں خشک شکنوں کے علاوہ رنگت کی تبدیلی نظر آتی ہے۔ ملزم چوہدری دلاور کی آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ حلقے تھے اور وہ اتنا کمزور تھا کہ اپنے پیروں پر کھڑا ہی نہیں ہوسکتا تھا۔ درحقیقت اس پر بے ہوشی طاری تھی۔ میں نے اس کی نبض اور دل کی دھڑکن کی رفتار چیک کی تو مجھے اندازہ ہوا کہ اس کی جسمانی حالت تشویش ناک ہے اور اس کو فوراً اسپتال منتقل کرنا ضروری ہے ورنہ اس کی ہلاکت یقینی ہے۔ میں نے اسے مسلح حفاظتی دستے کے ساتھ روانہ کردیا۔"

"آپ نے ایک رپورٹر اور ایک فوٹوگرافر کا ذکر کیا تھا۔ کیا یہ سب کارروائی انہوں نے دیکھی تھی؟"

"ہاں۔ اس رپورٹر کا نام غازی تھا۔ اس کے ساتھ آنے والے فوٹوگرافر نے جائے واردات کی تصاویر بھی بنائی تھیں۔ رپورٹر نے کہا تھا کہ وہ اپنے اخبار کی آخری کاپی روک چکا ہے اور صبح یہ خبر اور تصویریں شائع ہوں گی۔ وہ اس خصوصی یعنی EXCLUSIVE اسٹوری پر بہت خوش تھا۔"

"لیکن صبح کے اخبار میں نہ خبر تھی اور نہ تصویر۔"

"ہاں۔ جیسا کہ مجھے صبح پتا چلا۔ اس کے اخبار کی خبر سے۔ غازی اور اس کا ساتھی فوٹوگرافر واپس جاتے ہوئے حادثے کا شکار ہوئے۔ ان کی موٹر سائیکل کو کسی ٹرک نے ٹکر ماردی تھی۔"

"کیا آپ کے خیال میں انہیں صرف خبر کی اشاعت روکنے کے لیے ہلاک کیا گیا تھا؟"

"ایسا بھی ہوسکتا ہے مگر اس بارے میں تفتیشی افسر ہی قطعی رائے دے سکتا ہے۔ جس تھانے کی حدود میں یہ حادثہ پیش آیا تھا تفتیش کی رپورٹ اسی تھانے میں ہوگی۔"

"آپ نے چوہدری دلاور کو کس اسپتال میں بھیجا تھا؟"

"میں نے بہت سوچ سمجھ کے کوٹ لکھپت جیل کے اسپتال کا انتخاب کیا تھا کیونکہ وہاں کا جیلر میرے لیے قابلِ اعتماد تھا۔ اس نے میرے ساتھ ہی پی سی ایس کے امتحان میں کامیابی حاصل کی تھی اور ہم کورس میٹ تھے۔ ہمارے کمرے ایک تھے اور تربیت کے دوران ہم ایک دوسرے کے دوست بن چکے تھے۔ بعد میں اس نے جیل سروس جوائن کی اور میں نے پولیس سروس۔"

"آپ نے ملزم چوہدری دلاور حسین کو متعلقہ تھانے کے ایس ایچ او کی تحویل میں کیوں نہیں دیا تھا؟"

"دراصل مجھے یہ اندیشہ لاحق تھا کہ ملزم چوہدری دلاور حسین کو غیر قانونی طور پر پولیس کی حراست سے چھڑانے کی کوشش کی جائے گی۔ یہ ہوسکتا تھا کہ اسے تھانے لے جانے والے راستے پر کہیں روک لیا جائے اور مسلح افراد اسے پولیس کی تحویل سے چھین کرلے جائیں۔"

"آخر اس اندیشے کی وجہ؟"

"ملزم چوہدری دلاور کی خراب REPUTATION۔ میری خصوصی تفتیش کے دوران جو حقائق میرے سامنے آئے ان سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ وہ صرف اپنی سوتیلی بہن ڈاکٹر شیلی کے قتل میں ہی ملوث نہیں۔ اسی نے لندن میں اپنی سوتیلی ماں اور اس کے تیسرے شوہر کی گرل فرینڈ کو بھی قتل کیا تھا اور فرار ہوگیا تھا۔"

"قتل کا مجرم کون ثابت ہوا تھا۔ جو اب جیل کاٹ رہا ہے؟"

"وہ نیگرو جو وہاں موجود تھا اور چھپ کر اپنی جان بچانے میں کامیاب ہوگیا تھا یعنی ڈاکٹر شیلی کی ماں کا تیسرا شوہر۔ جارج۔"

"اس کا دوسرا شوہر کون تھا مسٹر جاوید صدیقی؟"

"چوہدری دلاور کا باپ۔"

جج نے منظر کو وارننگ دی "آپ غیر متعلقہ واقعات تفصیلات سے بیان کو طول مت دیں۔"

"یہ تفصیلات غیر متعلقہ نہیں ہیں یور آنر۔ ان کا براہِ راست تعلق چوہدری دلاور سے ہے۔" منظر نے کہا۔

جاوید صدیقی نے اپنا بیان پھر شروع کیا "مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ ملزم چوہدری دلاور کے ماضی کا ریکارڈ بہت خراب ہے۔ مختلف نوعیت کے غیر قانونی کاروبار کرتا تھا۔ اس کے ساتھ ایسے افراد تھے جو ہسٹری شیٹر تھے اور باقاعدہ اس گروہ میں شامل تھے جس کا سرغنہ چوہدری دلاور تھا۔"

جاوید صدیقی نے مختصراً ان حالات کا حوالہ بھی دیا جن کا نو... میرے والد وزیر خان اور میر شرافت علی کی پُراسرار موت ... اور یہ بھی بتایا کہ بعد میں وزیر خان کے بیٹے سکندر بخت کے ... دشمنی کا آغاز حقِ وراثت کا جھگڑا تھا۔ جاوید صدیقی نے ال... پاکستان میں چوہدری دلاور کے وطن دشمن کردار کا ذکر بھی کیا ... اس کے انسانیت کش کاروبار کا بھی۔

"مجھے ڈر تھا کہ پولیس دین پر چوہدری دلاور کے گروہ کے ارکان حملہ نہ کردیں یا اسے تھانے کی حوالات سے چھڑا کے نہ لے جائیں۔ اس کے بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ وہ اپنی دولت طاقت کا بھرپور استعمال کرنا جانتا ہے اور اسے نچلے درجے کے پولیس افسران کی تائید وحمایت بھی حاصل رہی ہے۔ میں نے اپنی حکمتِ عملی کو صرف اپنی ذات تک محدود رکھا اور آخری وقت تک کسی کو نہیں بتایا کہ میں نے ملزم چوہدری دلاور حسین کو کہاں رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ جیسا کہ میں نے بعد میں سُنا۔ چوہدری دلاور کے مسلح ساتھی تھانے کی طرف جانے والے راستے پر تیار بیٹھے تھے لیکن وہ انتظار کرتے رہ گئے اور میں نے مسلح محافظوں کے ساتھ ملزم کو لے جانے والی گاڑی کا رخ کوٹ لکھپت جیل کی جانب کرایا۔ جیلر خورشید عالم نے میری خواہش پر ملزم کی تحویل میں لیے جانے کا اندراج کیا اور اسے جیل اسپتال منتقل کرنے کے احکامات جاری کیے۔ اسپتال میں اسے ایک الگ کمرے میں رکھا گیا تھا۔ اس کے علاج کے لیے ڈاکٹر شفاعت علی کو میں نے خصوصی ہدایات دی تھیں۔ یہ بات کون نہیں جانتا کہ جیلوں کے اسپتالوں کی کیا حالت ہے اور وہاں علاج کے نام پر قیدیوں کو جو سہولت حاصل ہے اس سے کسی عام مریض کو بھی شفا حاصل نہیں ہوسکتی۔ چوہدری دلاور کے لیے میں نے کہا تھا کہ اس کی صحت کی بحالی کے لیے ضروری ادویات خریدی جائیں خواہ وہ کتنی بھی مہنگی کیوں نہ ہوں۔ میں اس کا بل بھی ادا کرنے پر تیار تھا مگر خورشید عالم نے مجھے یقین دلایا کہ سرکاری خرچ پر ہی چوہدری دلاور کو ہر دوا فراہم کی جائے گی۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو چوہدری دلاور کی موت بھی واقع ہوسکتی تھی۔ میں نے ملزم کی حفاظت کی ذمّے داری جیلر خورشید عالم کو سونپی۔

لیکن اپنے طور پر بھی وہاں کچھ افراد کو مامور کیا تھا جو میرے نزدیک انتہائی قابلِ اعتماد تھے۔ ان میں سے ایک کمرے کے اندر اور دوسرا باہر دیوار سے پر بھی موجود رہتا تھا۔ میں نے سختی سے تاکید کی تھی کہ میری تحریری اجازت کے بغیر اور پھر مجھ سے تصدیق کیے بغیر کسی کو بھی ملزم سے ملنے کی اجازت نہ دی جائے۔ نہ اس کے وکیل کو نہ ورثا کو اور نہ اخبار والوں کو۔ جناب والا' ایسی حالت میں ملزم سے تفتیش کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور نہ میں نے کسی کو اجازت دی تھی کہ وہ پوچھ گچھ کرے۔ حفاظت پر مامور کانسٹیبل اس کے اہل بھی نہ تھے اور انہیں طریقۂ تفتیش کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔"

"لیکن آپ پر الزام ہے کہ آپ کے حکم پر ملزم دلاور حسین پر تفتیش کے دوران تشدّد کیا گیا جس سے وہ ہلاک ہوگیا" منظر نے کہا۔

"یہ جھوٹ ہے" جاوید صدیقی نے کہا "نہ میں نے ایسا کوئی حکم دیا تھا اور نہ چوہدری دلاور تشدّد سے ہلاک ہوا۔ اصل حقیقت یہ ہے جناب والا کہ جب میں نے ملزم چوہدری دلاور حسین کو گرفتار کرلیا تو اس کے اہلِ خانہ نے ذاتی اثر ورسوخ استعمال کرتے ہوئے اور دولت کو پانی کی طرح بہاتے ہوئے میرے محکمے کے افسرانِ اعلیٰ تک رسائی حاصل کی تاکہ چوہدری دلاور کو یہ خبر عام ہونے سے قبل ہی چھڑالیا جائے۔ خبر کس طرح دبادی گئی تھی۔ اس کا اندازہ اُن اخباری رپورٹر اور فوٹوگرافر کی موت کے پراسرار حالات سے بھی لگایا جاسکتا ہے جو گرفتاری کے وقت موجود تھے۔ تاہم کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ ملزم کس تھانے کی حوالات میں ہے اس لیے وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہوسکے۔ تیسرے دن مجھے میرے ایک افسرِ اعلیٰ نے طلب کیا اور مجھے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ چوہدری دلاور کی گرفتاری ظاہر نہ کرکے میں کس قسم کے فوائد حاصل کرسکتا ہوں۔ شاید میں لاکھوں کمالیتا اور مجھے ترقی بھی مل جاتی لیکن جناب والا یہ میرے بس کی بات نہیں تھی۔ یہ ناممکن تھا کہ میں عدالت میں جھوٹا بیانِ حلفی داخل کردوں کہ میں نے تو کسی چوہدری دلاور کو گرفتار ہی نہیں کیا تھا۔ جو ایسا کہتا ہے۔ وہ جھوٹ بولتا ہے۔ اس واقعے کے دو غیر جانبدار گواہ وہی دونوں رپورٹر اور فوٹوگرافر تھے جو ہلاک ہوچکے تھے۔ یا کیے جاچکے تھے۔ باقی سب یہ وکلا تھے جو مدعی ہیں اور اس کیس میں ایک فریق ہیں۔ ظاہر ہے ان کی گواہی کی کوئی اہمیت نہیں" اس نے ہم سب کی طرف اشارہ کیا "لیکن جناب والا اپنے ضمیر کا گلا گھونٹ کے اتنا بڑا جھوٹ میں کسی قیمت پر نہیں بول سکتا تھا۔ دیدہ ودانستہ حقائق سے چشم پوشی کرنا بھی جرم ہے۔ میں نے صاف انکار کردیا تو مجھ سے کہا گیا کہ میں اسلام آباد واپس جاکے خاموش بیٹھ جاؤں۔ میری جگہ لینے والا افسر خود اس کیس سے نمٹ لے گا۔ اسلام آباد جاکے خاموش بیٹھ جانے میں بھی میرا کوئی نقصان بہرحال نہیں تھا۔ اپنے آپ کو بھی میں مطمئن کرسکتا تھا کہ میں نے تو جھوٹ نہیں بولا۔ بعد میں میری جگہ آنے والا جو چاہے کرے۔ میں کسی اور کے قول وفعل اور گناہ و ثواب کا ذمّے دار نہیں لیکن یور آنر۔ اس کیس میں مجھے اسلام آباد سے ایک چیلنج دے کر بھیجا گیا تھا۔ مجھ سے پہلے آنے والے رشوت ستانی' بدعنوانی اور مجرمانہ غفلت کے باعث پہلے معطل پھر برطرف اور بالآخر گرفتار ہوچکے تھے۔ شاید مجھے یہ چیلنج دینے والوں کا خیال تھا کہ میرا انجام بھی مختلف نہیں ہوگا یا پھر میں ناکامی کا داغ چہرے پر سجا کے لوٹ آؤں گا لیکن اللہ کا بڑا کرم ہے کہ اس نے مجھے سرخرو کیا۔ بے شمار مشکلات پر قابو پا کے اور ان گنت رکاوٹوں کو دور کرکے میں ڈاکٹر شیلی کے قتل کا سراغ لگانے میں کامیاب ہوگیا۔ افسوس یہ ہے جناب والا کہ میری کامیابی پر مجھے انعام نہیں سزا ملی۔ یہ میرا جرم اور میری غلطی بن گئی۔ میں نے بڑی محنت سے دن رات ایک کرکے رپورٹ مرتب کی تھی جو میں اسلام آباد بھی ارسال کرچکا ہوں۔ اس کی ایک نقل میرے پاس بھی ہے۔ ایک میں اس عدالت کی تحویل میں دینا چاہتا ہوں۔ میں یہ نہیں دیکھ سکتا کہ اس رپورٹ کو سردخانے میں ڈال دیا جائے اور بالآخر قاتل کو قانون کے شکنجے سے نکل جانے کا موقع مل جائے۔ یہی وجہ تھی یور آنر کہ میں نے صاف انکار کردیا تھا اور کہہ دیا تھا کہ اب میری نوکری جائے یا زندگی۔ جب میں نے چوہدری دلاور کو گرفتار کیا ہے اور اس کا ریکارڈ بھی موجود ہے تو پھر اسے عدالت میں بھی پیش کیا جائے گا۔ عدالت چاہے تو اسے چھوڑ دے لیکن میں یہ بیان ضرور دوں گا کہ میں نے چوہدری دلاور کو گرفتار کیا تھا۔ میں نے اس کا ریمانڈ لیا تھا۔ میں نے اسے کوٹ لکھپت جیل اسپتال میں رکھا تھا۔ میں نے اس کا علاج کرایا تھا ورنہ وہ مرجاتا۔ وہ مجسٹریٹ جس نے ریمانڈ دیا تھا۔ وہ ڈاکٹر جس نے علاج کیا تھا' جیلر خورشید عالم یہاں آئیں اور کتابِ مقدس پر ہاتھ رکھ کے اور خدا کو حاضر وناظر جان کے کہیں کہ کیا یہ جھوٹ ہے؟ میں نے تہیہ کرلیا تھا کہ میں حقائق کو منظرِ عام پر ضرور لاؤں گا۔ میری نیت کو بھانپتے ہوئے میری عدم موجودگی میں افسرانِ بالا نے میری معطلی کے احکامات صادر کیے۔ ان سے پوچھا جائے کہ میرا قصور کیا تھا؟ میں دو دن روپوش رہا تھا کہ افسرانِ بالا کو میرے عزائم کی خبر نہ ہو۔ مجھے یہ ڈر بھی تھا کہ کہیں میرے بیوی بچوں کو پریشان نہ کیا جائے۔ میری تلاش میں میرے گھر پر اسلام آباد میں چھاپا نہ مارا جائے۔ میں اس وقت کا اور آج کے دن کا انتظار کررہا تھا۔ میری جگہ ایک ایس ایس پی کو بٹھادیا گیا تھا۔ میں نے اسے چارج دینے سے انکار کردیا اور معطلی کے احکامات بھی وصول نہیں کیے۔ ٹھیک ہے میں نے سروس رولز کی خلاف ورزی کی اور ڈسپلن توڑا۔ اس کی پاداش میں زیادہ سے زیادہ مجھے برطرف کیا جاسکتا تھا سو میں نے اپنا استعفیٰ پیش کردیا ہے۔ احتجاجاً۔ اس استعفے کی نقل میں نے اخبار والوں کو بھی فراہم کردی کیونکہ اس میں وہ تمام اسباب تفصیل سے لکھ دیے گئے ہیں

جن کی بنا پر میں استعفیٰ دینے پر مجبور ہوا تھا۔"

عدالت میں مکمل خاموشی تھی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ چوہدری دلاور کے کیمپ پر سکتہ طاری ہے۔ اس کی بیوی سخت مایوس بیٹھی ہوئی تھی لیکن اس کا نوجوان اور سرکش بیٹا سخت مشتعل تھا۔

جج نے کہا "کیا آپ کو اور کچھ کہنا ہے؟"

منظر فوراً کھڑا ہوگیا "اپنے مؤکل کی طرف سے میری استدعا ہے کہ اس کے ساتھ ہونے والی ناانصافی کا نوٹس لیا جائے اور پولیس کے افسرانِ بالا کو عدالت میں طلب کرکے ان سے وضاحت طلب کی جائے کہ انہوں نے میرے مؤکل کو کس جرم میں معطل کیا تھا؟"

جج نے کہا "یہ کیس الگ ساعت کے لیے پیش کیا جانا چاہیے پھر اس پر میرٹ کے مطابق قانونی کارروائی ہوگی۔ مسٹر جاوید صدیقی، کیا اب آپ عدالت کو بتائیں گے کہ چوہدری دلاور کہاں ہے؟"

منظر نے کہا "میں معافی چاہتا ہوں یور آنر۔ اس سے پہلے کہ میرا مؤکل اس سوال کا جواب دے۔ میں اس سے صرف ایک سوال کروں گا۔"

جج نے مسکرا کے کہا "سوال اور جواب دونوں مختصر ہونے چاہئیں۔"

منظر نے کہا "تھینک یو سر۔ مسٹر جاوید صدیقی، اصلی اور نقلی چوہدری دلاور کے بارے میں حقائق کا علم آپ کو کیسے ہوا اور یہ دستاویزات یعنی ڈیتھ سرٹیفکیٹ اور پوسٹ مارٹم رپورٹ آپ نے کیسے حاصل کرلیں؟"

جاوید صدیقی نے کہا "کوٹ لکھپت جیل کے اندر کچھ فرض شناس ماتحت افسروں نے میری مدد کی۔ ان کی اطلاع پر میں نے بروقت چھاپا مارا اور سب کچھ اپنے قبضے میں کرلیا۔ جیل کی وین جس میں چوہدری دلاور سے ملتے جلتے ایک شخص کو میک اپ سے چوہدری دلاور بنا کے اُس کی لاش روانہ کی گئی تھی، یہ ڈیتھ سرٹیفکیٹ اور پوسٹ مارٹم رپورٹ۔ اصل چوہدری دلاور کو میں نے اس وقت گرفتار کیا جب وہ جیل کے عملے کے رہائشی کوارٹرز کی طرف سے ایک دیوار کے شگاف سے نکل کے فرار ہو رہا تھا۔"

اچانک ایڈووکیٹ جنرل نے کھڑے ہو کے کہا "جنابِ والا، مجھے ابھی ابھی ایک اطلاع ملی ہے ڈی آئی جی صاحب کی طرف سے۔ غلط فہمی کی بنا پر ایس ایس پی جاوید صدیقی کی معطلی کے احکامات منسوخ کردیے گئے ہیں اور ان کا ٹرانسفر بھی روک دیا گیا ہے۔ وہ بدستور اپنی جگہ پر کام کرتے رہیں گے۔"

رابعہ اور منظر کی طرف سے کچھ وکیلوں نے ایک ساتھ زور سے ہنس کے کہا "ہیئر ہیئر" کچھ نے بہ آوازِ بلند جاوید صدیقی کو مبارک باد دی۔ ایک نے زور سے بینچ پر ہاتھ مارا اور بولا "واہ بھئی واہ" اور دوسرے نے قہقہہ مار کے کہا "بڑی جلدی پڑ گئی اوپر والوں کو" منظر نے مسکرا کے شعر پڑھا

ہائے اس زودِ پشیماں کا پشیماں ہونا

جج نے اپنی متانت برقرار رکھی اور باتیں کرنے والوں [illegible] "آرڈر۔۔۔ آرڈر" پکار کے کہا "آپ سب خیال رکھیں کہ یہ عدالت [illegible] ہے" اور پھر جاوید صدیقی سے مخاطب ہوا "ایس ایس پی صاحب۔۔۔ غالباً اب آپ پوری طرح بااختیار ہیں۔"

"یس یور آنر۔" جاوید صدیقی نے مسکرا کے کہا "اور [illegible] اپنے بیان پر پوری طرح قائم ہوں۔"

ایڈووکیٹ جنرل اٹھ کر جاوید صدیقی کے پاس آیا اور [illegible] جج سے مشورے کی اجازت کے بعد جاوید صدیقی سے کوئی [illegible] پوچھی جس کا جواب اس نے سر ہلا کے دیا۔

"یور آنر۔ میں پوری طرح مطمئن ہوں" ایڈووکیٹ جنرل [illegible] کہا "اور ایس ایس پی جاوید صدیقی کی یقین دہانی کے بعد یہ کہنے [illegible] پوزیشن میں بھی ہوں کہ چوہدری دلاور حسین پولیس کی تحویل [illegible] ہے۔ ملزم کی بیوی کی طرف سے دائر کردہ حبسِ بے جا کی رٹ [illegible] مؤثر سمجھی جائے۔"

جج نے اپنے آرڈر میں کہا "حبسِ بے جا کے کیس میں [illegible] دلاور حسین کی درخواست غیر مؤثر ہونے کی بنا پر خارج کی جاتی [illegible] تاہم عدالت یہ حکم بھی دیتی ہے کہ ملزم کو اپنے وکیل سے اور [illegible] خانہ سے ملنے کا موقع فراہم کیا جائے اور اس کی صحت کے بارے [illegible] میں میڈیکل رپورٹ متعلقہ سیشن کورٹ کو پیش کی جائے۔ عدالت [illegible] اعانتِ مجرمانہ کے الزام میں جیلر خورشید عالم کے خلاف مقدمہ [illegible] درج کرنے کا حکم بھی دیتی ہے۔ ایس ایس پی جاوید صدیقی کے [illegible] کردہ الزامات کی تفتیش کے لیے سیشن جج کی عدالت میں [illegible] درخواست دی جاسکتی ہے۔ تاہم ایس ایس پی جاوید صدیقی [illegible] کے افسرانِ بالا کے غیر قانونی طرزِ عمل کے خلاف ترمیم [illegible] درخواست پر مبنی رٹ دائر کرنا چاہیں تو انہیں اس کا اختیار ہے۔"

جج کے چیمبر میں جاتے ہی عدالت کے کمرے میں ہلچل [illegible] بیک وقت بہت سے لوگ جاوید صدیقی سے ہاتھ ملانے کے [illegible] لپکے۔ وہ مسکرا کے سب سے ہاتھ ملاتا رہا اور ان کا شکریہ ادا [illegible] رہا۔ وہ سب وکیل جو بحیثیت مدعی وہاں موجود تھے منظر کو جاوید صدیقی کی شاندار طریقے پر پیروی کرنے پر مبارک باد دے رہے تھے۔ ظاہر ہے ان میں رابعہ اور محسن کے ساتھ میں بھی تھا [illegible] سب سے زیادہ جوش اور جذبے کا مظاہرہ مولوی خادم حسین کی طرف سے دیکھنے میں آرہا تھا۔ وہ اچھل اچھل کر منظر کو تھپکی دے رہا تھا "آفرین ہے آپ پر۔ آپ نے تو ناطقہ بند کردیا۔"

منظر نے اس کے ایک دھپ مارا "ابے بھوتنی کے [illegible] طرح کہہ۔۔۔" منظر کا اگلا جملہ قابلِ اشاعت نہیں تھا۔

مولوی جھینپ گیا کیونکہ اس کے ساتھ ہی رابعہ بھی موجود تھی اور منظر جوش میں سنسرشپ کی اخلاقیات بھی بھول گیا تھا۔

[illegible] نے دوسری طرف دیکھا تو میدان خالی تھا۔ چوہدری دلاور کی بیوی اس وقت فیصل کے ساتھ باہر چلی گئی تھی جب اٹارنی جنرل نے اس کی درخواست کو غیر مؤثر قرار دینے کی استدعا کی تھی۔ اس کو اندازہ ہوگیا تھا کہ اب عدالت کا فیصلہ کچھ اور نہیں ہوسکتا۔ اس کی پیروی کرنے والے پانچ وکیل بھی اس کے ساتھ چلے گئے تھے۔ شاید اسے کچھ تسلی دینے کے لیے کہ عدالت نے چوہدری دلاور کو قانونی مشیر مقرر کرنے کا اختیار بھی دے دیا ہے اور گھر والوں سے ملاقات کرانے کا بھی۔ اب کوئی مسئلہ نہیں۔ ہم چٹکی بجاتے ہی ضمانت منظور کرالیں گے۔ عدالت نے فیصلہ ہمارے حق میں دیا ہے۔ پولیس کو بتانا پڑا کہ چوہدری دلاور ان کے پاس ہے۔

دل کی تسلی کے لیے وہ ایسی ہی باتیں کرسکتے تھے ورنہ چوہدری دلاور کی بیوی کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اس نے جو منصوبہ بنایا تھا وہ ناکام ہوگیا ہے۔ چوہدری دلاور کو جیل سے نکال کے فرار کرانے کی اسکیم یقیناً بہت شاندار تھی اور شاید اس کو عملی جامہ پہنانے میں چوہدری دلاور کی بیوی نے لاکھوں خرچ کرڈالے ہوں گے۔ جیلر خورشید عالم نے اس کے حسبِ منشا سب کچھ کردیا تھا۔ ایک لاش فراہم کردی تھی۔ معلوم نہیں وہ کون لاوارث قیدی تھا اور اس کی موت کے کیا اسباب تھے۔ اس کی بدقسمتی کہ قد و قامت اور چہرے مہرے سے وہ چوہدری دلاور جیسا تھا۔

اس خیال کے ساتھ ہی میرے ذہن میں دوسرا خیال آگیا۔ کیا یہ محض اتفاق تھا کہ مرنے والے کی لاش کو چوہدری دلاور کی لاش بنادیا گیا یا عمداً ایسا کیا گیا تھا؟ جب آدمی پیسے کی خاطر اس حد تک گر جائے تو پھر وہ کچھ بھی کرسکتا ہے۔ یہ ناممکن نہیں سمجھا جاسکتا کہ قیدیوں میں سے ایسے شخص کا انتخاب کیا گیا جس کی صورت چوہدری دلاور سے ملتی جلتی ہو پھر اس کی لاش دے دی گئی۔ اور قیدیوں پر کیا منحصر۔ یہ بھی بعید از قیاس نہیں کہ کہیں سے اس حلیے کے شخص کو لانے کی فرمائش کی گئی ہو اور تھانے والوں نے لاک اپ میں سے کسی لاوارث کو بھیج دیا ہو یا کہیں سے مطلوبہ حلیے کا بندہ اٹھا لائے ہوں۔ یہ خیال بڑا ہی لرزہ خیز تھا جس نے میری ہڈیوں میں بھی خوف کی سنسنی پھیلادی۔ میں نے طے کیا کہ بعد میں تفتیش کے دوران جاوید صدیقی کو یہ نکتہ اٹھانے کے لیے کہوں گا۔

چوہدری دلاور کی بیوی مجھے عدالت سے باہر بھی دکھائی نہ دی۔ شاید اس کو اپنی شکست کا صدمہ بہت زیادہ ہوا تھا۔ اس نے تو ایک خواب کی تعبیر کو اپنی دسترس میں دیکھ لیا تھا۔ وہ لمحہ جب چوہدری دلاور ہوائی جہاز سے پرواز کرکے اس ملک کی حدود سے نکل جائے گا اس کی بیوی کے تصور سے نکل کے حقیقت کا روپ دھار چکا ہوگا۔ اس نے ٹکٹ خرید لیے ہوں گے اور سیٹ کنفرم کرلی ہوگی اور اس خیال سے بہت لطف لے رہی ہوگی کہ کل ہم جھک مارتے رہ جائیں گے اور چوہدری دلاور کی تلاش میں دیواروں سے سر ٹکراتے پھر رہے ہوں گے۔ فرض شناس اور ایماندار بننے والا ایس ایس پی معطل ہی نہیں گرفتار ہوچکا ہوگا اور اس پر زیرِ حراست ملزم کو ہلاک کرنے کا الزام ہوگا۔ ڈیتھ سرٹیفکیٹ اور پوسٹ مارٹم رپورٹ سے ثابت ہوجائے گا کہ مرنے والا چوہدری دلاور ہی تھا تو پھر قبر میں سے نکل کے مُردہ تو کہنے سے رہا کہ یہ جھوٹ ہے۔ وارث رونے دھونے کی تھوڑی سی اداکاری کریں گے اور چوہدری دلاور کہیں لندن نیویارک، ٹوکیو میں ہوگا۔ اس کا سب کاروبار اسی طرح چلتا رہے گا۔ اس کی بیوی کم ہوشیار نہیں اور اب تو ماشاءاللہ اس کا بیٹا فیصل بھی جوان ہوگیا ہے۔ پھر چوہدری دلاور کو کیا غم ہے۔ وہ باہر عیش کرے گا اور آتا جاتا بھی رہے گا تو کسی کو کیسے معلوم ہوگا۔ اسے تختۂ دار تک پہنچانے کے دعوے دار خود چڑھ جائیں گے پھانسی۔

لیکن یہ سب ایک خواب ثابت ہوا تھا جو ادھورا رہ گیا تھا۔ اب چوہدری دلاور گرفتار تھا اور اس کی رہائی کا امکان بھی کم تھا۔ تاہم نہ چوہدری دلاور کی بیوی ہمت ہارنے والی عورت تھی اور نہ اس کا ولی عہد اس شکست کو تسلیم کرسکتا تھا۔ اب وہ عدالتِ عالیہ تک اور سپریم کورٹ تک ضمانت پر رہائی کے لیے قانونی جنگ لڑیں گے اور اس مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چوہدری دلاور کے طریقِ جنگ پر عمل بھی جاری رکھیں گے یعنی لاقانونیت کے داؤ پیچ اور شیطانی ہتھکنڈے آزما کے سکندر بخت کو زیرِ دام لانے والے شکاری اپنا کھیل ختم نہیں کریں گے۔ بازی وہی ہوگی بس کچھ کھلاڑی پسِ پردہ رہ کے چال چلیں گے اور کچھ نئے شکاری سامنے آجائیں گے۔

جاوید صدیقی کے بحال ہونے کی خبر بہت تیزی سے باہر تک پہنچ گئی تھی۔ وہ سب پولیس فورس جس کی کمان صبح سے اب تک ارشد کریم ربانی کررہا تھا ایک دم الرٹ ہوچکی تھی۔ ایک افسر گیا دوسرا آیا۔ دوسرا گیا پھر پہلا آگیا۔ اباؤٹ ٹرن۔۔۔ سلیوٹ۔۔۔ بادشاہ مرگیا۔۔۔ بادشاہ زندہ باد۔

درجنوں گاڑیوں میں موجود سیکڑوں کی تعداد میں پولیس کے ماتحت اور نائب افسران آگے بڑھ چڑھ کے ایس ایس پی جاوید صدیقی کو سلیوٹ مارنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کررہے تھے۔ کانسٹیبل اور ہیڈ کانسٹیبل قسم کے پیادے اپنی جگہ سے حرکت بھی نہیں کرسکتے تھے۔ لیکن سب انسپکٹر اور انسپکٹر حضرات میں اتنی ہمت (یعنی بے غیرتی) تھی کہ کچھ دیر پہلے وہ جس شخص پر شکاری کتوں کی طرح جھپٹنے کے لیے مستعد تھے اور اب اس سے خوشامدانہ انداز میں ہاتھ ملا کے مبارک باد دے سکیں۔

جاوید صدیقی کے لیے یہ کوئی نیا سین نہیں تھا۔ نہ یہ کوئی غیر متوقع رویّہ تھا۔ دنیا میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہر جگہ، ہر محکمے میں، ہر ادارے اور معاشرے میں۔ جو پکڑا جائے وہ چور ہے۔ جو اوپر ہے وہ افسر ہے۔ جس کے پاس طاقت اور اختیار ہے وہ حاکم ہے۔ نیچے والے کمزور اور بے بس ہوتے ہیں۔ ان سے اصول پرستی اور

وفاداری کی توقع رکھنا بھی اتنا ہی بے فائدہ ہے جتنا ان سے شکایت کرنا لاحاصل۔

اے ایس پی آفتاب اور خصوصی تفتیشی ٹیم کا تیسرا فریق انسپکٹر ساجد اب تک سامنے نہیں آئے تھے۔ ان کا اس معاملے میں کوئی اہم کردار نہیں تھا اور مجھے یہ بھی علم نہیں تھا کہ انہیں بھی واپس کردیا گیا ہے یا ارشد کریم کی کمان میں دے دیا گیا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ بلاچوں وچرا تعمیل کرتے تاہم میں نے ان کو آگے بڑھ کے ارشد کریم ربانی کے ساتھ تعاون کرتے بھی نہیں دیکھا تھا۔

اب اچانک وہ جاوید صدیقی کے سامنے آئے تو ان کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے اور میں یہ اندازہ کرسکتا تھا کہ ان کے دلی جذبات کی عکاسی میں کوئی تصنع نہیں۔ وہ واقعی خوش تھے۔ اگر انہیں ارشد کریم ربانی کے ساتھ کام کرنا پڑتا تو وہ اپنا فرض نباہتے مگر خوش ہو کے نہیں۔

"مجھے معلوم تھا سر کہ آپ کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا" اے ایس پی آفتاب نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

"وہ کیسے بھئی' کیا تم نے کسی نجومی سے پوچھا تھا؟" جاوید صدیقی مسکرایا۔

"نہیں سر۔ میرا دل گواہی دیتا تھا۔"

"خیال رکھنا۔ یہ دل کی گواہی صرف دل کے معاملات میں چلتی ہے' عدالتی معاملات میں نہیں۔"

انسپکٹر ساجد نے کہا "بڑا اچھا ہوا سر جی۔ سچی بات ہے میں تو بڑا مایوس تھا۔ ہم نے بہت محنت کی تھی۔"

"ابھی اور محنت کرنی ہے ساجد۔ ہمت ہے؟" جاوید صدیقی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"ہمت' ہمت بڑی جناب عالی" اس نے سینہ تان کے کہا۔

"اچھا تو پھر تم یوں کرو... آفتاب' تم مسلح گارڈ لے کر جاؤ تھانہ انار کلی اور ملزم چوہدری دلاور کو اپنی حوالات میں منتقل کرو۔"

"رائٹ سر۔"

"کوئی مزاحمت کرے یا گڑبڑ کا خطرہ ہو تو تمہیں پورا اختیار ہے کہ اپنے اور قانون کے دفاع میں گولی چلانے کا حکم دو۔"

"یس سر۔" آفتاب نے کہا اور سلیوٹ کرکے پلٹ گیا۔

"انسپکٹر" اس نے کہا پھر اسے ہمارا خیال آیا "سوری جنٹلمین۔ میں ابھی کچھ مصروف ہوں' شام تک۔"

"کیا شام کو آپ کے آفس میں بات ہوگی؟" ایک اخبار نویس نے پوچھا۔

اس نے پلٹ کے دیکھا "میں وعدہ نہیں کرسکتا۔"

"آپ ملزم چوہدری دلاور کو اخبار والوں سے بات کرنے کا موقع دیں گے" دوسرے صحافی نے کہا۔

"سوری۔ یہ میرے اختیار میں نہیں۔ یہ ایک عام قتل کا کیس ہے۔ میں اس کو شہرت حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں بنا سکتا۔ کسی قاتل کو پریس کانفرنس کی اجازت نہ پہلے تھی اور نہ اب ہوگی...
ہے۔"

"ہم اس شخص کی تصویر تو بنا سکتے ہیں جس کو چوہدری... بنا دیا گیا تھا اور جس کے بارے میں جھوٹا ڈ۔تھ سرٹیفکیٹ... جاری ہوگیا تھا۔"

"اور پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی دے دی گئی تھی۔"

"آخر وہ کون تھا؟"

جاوید صدیقی بھی مسکرانے لگا "ایک دم اتنے سوالات... جواب دینا تو مشکل ہے۔ ہاں تصویر بنانے کے لیے آپ میرے ساتھ میو اسپتال کے مُردہ خانے چل سکتے ہیں جہاں وہ لاش... ہے۔ اس کے فنگر پرنٹس بنانے' موت کے اصل اسباب معلوم کرنے کے علاوہ اس کی شناخت ضروری ہے اور آپ لوگ اس کام میں یقیناً پولیس کی مدد کرسکتے ہیں۔ تصویر کی اشاعت سے... کا کوئی وارث سامنے آسکتا ہے۔"

"آپ مجھ سے کچھ کہہ رہے تھے سر۔" انسپکٹر ساجد بولا۔

"ہاں۔ میری جیپ لاؤ۔ تم میرے ساتھ ہوگے" جاوید صدیقی نے کہا۔

میو اسپتال یا پاکستان کے کسی بھی سرکاری اسپتال میں... سلوک علاج کے نام پر بیمار انسانوں کے ساتھ ہوتا ہے وہ کم افسوس ناک نہیں مگر مُردوں کی حالت پر تو انسانوں کا سر بھی شرم سے جھک جاتا ہے کہ یہ ملک اتنا غریب تو نہیں اور اس مملکتِ خداداد کے وسائل اتنے کم تو نہیں کہ ہم مُردہ خانے کو کمیلے سے بدتر جگہ بنا رکھنے پر مجبور ہوں۔ سارا قصور اور فتور نیت کا ہے۔ کچھ کرتا دھرتا بیماروں اور مُردوں کی دیکھ بھال کے لیے ملنے والا فنڈ اپنی کوٹھیوں اور کاروں کی دیکھ بھال پر صرف کردیتے ہیں۔

میو اسپتال کے مُردہ خانے کی حالت میں نے پہلے بھی دیکھی تھی اور ایک بار پھر دیکھی تو مجھے یہ منظر غیر انسانی سا لگا۔ دنیا میں ایسا نہیں ہوتا۔ ہم مرجانے والوں کو احترام دیتے ہیں۔ ان کو بڑے اہتمام سے سفرِ آخرت پر روانہ کرتے ہیں اور پھر بڑی عقیدت کے ساتھ ان کی مغفرت کے لیے وہ سب کچھ کرتے ہیں جو ہمارے اختیار میں ہے۔ لیکن یہاں انسانوں کی لاشیں ایسے پڑی تھیں جیسے قسائی کی دکان پر بکرے۔ یہاں ویسی ہی بو تھی اور وہی رویّہ۔

مُردہ خانے کے نگراں کا آفس سرے سے کوئی آفس ہی نہیں تھا۔ وہ ایک اسٹور جیسا کمرا تھا جس میں دواؤں کی بو بسی ہوئی تھی۔ یہ پوسٹ مارٹم میں اور لاشوں کو بحفاظت رکھنے کے لیے استعمال ہونے والی دوائیں تھیں چنانچہ ان کی بو بھی عجیب تھی۔ اعصاب پر دہشت طاری کرنے والی اور پُرآسیب۔

ہم سب برآمدے میں آگئے۔ رابعہ کا یہاں نہ آنا ہی بہتر تھا۔ میں نے اسے منظر کے اور وقار یوسف کے ساتھ ان کے آفس... دیا تھا اور وہیں اپنا انتظار کرنے کو کہا تھا۔ میرے ساتھ صرف محسن تھا اور ایک وکیل جو بحیثیت مدعی ہمارے ساتھ تھا۔ اس کو سب ہاشمی صاحب کہتے تھے۔ اور وہ ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کا کوئی عہدے دار بھی تھا۔ چار صحافی کورٹ سے اسی جیپ میں لد کر آئے تھے جس میں خود جاوید صدیقی آیا تھا اور جسے انسپکٹر ساجد چلا کے لایا تھا۔ انہی میں سے دو کے پاس کیمرے تھے۔

تمام گاڑیاں پارکنگ ایریا میں کھڑی تھیں۔ ان میں جاوید صدیقی کی سرکاری جیپ بھی تھی جس کے اوپر لائٹ گھومتی تھی اور ایک سائرن بھی نصب تھا۔ سائرن وہی کام کرتا تھا جو گئے وقتوں میں شاہی سواری کے آگے دوڑنے والا کرتا تھا کہ ہٹو' بچو... باادب باملاحظہ ہوشیار۔ ایک وی آئی پی کی گاڑی آرہی ہے۔ حشرات الارض کی طرح رینگنے والو' راستہ دو ورنہ مارے جاؤ گے۔ ایمبولینس کو سائرن کی واقعی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ کسی کی زندگی بچانے کے لیے چند سیکنڈ بھی راستہ بنانے میں ضائع نہیں کیے جاسکتے۔ پولیس بھی کسی مجرم کے تعاقب میں ہو تو راستہ مانگنے کے لیے سائرن بجانا کسی حد تک جائز سمجھا جاسکتا ہے مگر یہاں تو بزعم خود ہر وی آئی پی سائرن کا بے دریغ استعمال کرنا اپنی شان سمجھتا ہے۔ جاوید صدیقی کو میں نے کبھی ایسا کرتے نہیں دیکھا تھا۔ اس وقت بھی وہ انسپکٹر ساجد کی جیپ میں بیٹھا تھا اور خود اس کی جیپ میں صرف ایک ڈرائیور تھا یا اس کے ساتھ رہنے والا گارڈ۔

"لاش کے آنے میں نہ جانے کیوں دیر ہو رہی تھی۔ اچانک جاوید صدیقی کا ڈرائیور دوڑتا ہوا آیا اور سلیوٹ مار کر کھڑا ہوگیا۔

"کیا بات ہے؟"

"سر جی... اہم پیغام ہے۔ اے ایس پی صاحب وائرلیس پر ہیں" اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

جاوید صدیقی نے سرہلایا "میں ابھی آتا ہوں۔" اس نے کہا اور چل پڑا۔ اس سے اجازت لیے بغیر صحافی حضرات بھی تجسس سے مجبور ہو کے پیچھے روانہ ہوگئے۔ پھر میں اور محسن کیوں پیچھے رہتے۔ یہ میں بھی جاننا چاہتا تھا کہ ایسی کیا خاص بات ہوگئی آدھے گھنٹے میں کہ اے ایس پی کو وائرلیس پر رابطہ کرنا ضروری ہوگیا۔

جب میں نے سُنا تو جاوید صدیقی چلّا رہا تھا "کیا بک رہے ہو تم' آر یو میڈ؟"

"نہیں سر' میں پاگل نہیں ہوا ہوں" وائرلیس کے اسپیکر سے آواز آئی "یہ حقیقت ہے۔"

"لیکن یہ کیسے ہوسکتا ہے آفتاب! فار گاڈ سیک..."

"مجھے خود معلوم نہیں سر۔ ابھی زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے پہلے وہ تھانے میں موجود تھا۔ میں نے خود دیکھا تھا۔"

"پھر کیا وہ جن بھوت بن کے غائب ہوگیا؟ ہی واز ڈیڈ آفتاب اور مُردے فرار نہیں ہوسکتے" جاوید صدیقی سخت برہم تھا۔

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں سر۔ لیکن میں وہی بتا رہا ہوں جو یہاں ہوا ہے" اسپیکر سے آفتاب کی آواز سنائی دی "ڈیڈ باڈی تھانے میں نہیں ہے۔ اس کے کپڑے موجود ہیں۔"

"کیا؟ کپڑے چھوڑ گیا مُردہ اور بھاگ گیا۔ تم مجھے پاگل بنادوگے۔"

"میری عقل خود حیران ہے سر۔ آخر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ کپڑوں کے نکل گیا ہو یا کپڑے بدل کے بھاگ گیا ہو۔"

"دیکھو۔ مجھ سے بے وقوفی کی بات مت کرو۔ مُردے نہ بھاگ سکتے ہیں اور نہ کپڑے بدل سکتے ہیں" جاوید صدیقی نے دہاڑ کے کہا "ضرور کسی نے لاش غائب کی ہے۔ ان سب کو گرفتار کرلو جو وہاں پوسٹ کیے گئے تھے۔ میں ان سب کو جان سے ماردوں گا۔"

"میں نے سب کو گرفتار کرلیا ہے سر۔ ایک سب انسپکٹر' ایک ہیڈ کانسٹیبل اور دو کانسٹیبل وہاں ڈیوٹی پر تھے۔"

"آفتاب! آر یو شیور کہ تم نے اسے ایک گھنٹا پہلے دیکھا تھا؟" جاوید صدیقی کی آواز میں شکست بولنے لگی۔

"یس سر۔ آئی ایم کوائٹ شیور۔ میں خود وقفے وقفے سے ہر طرف دیکھ رہا تھا۔ خود سب انسپکٹر خدا رسول اور قرآن کی قسم کھا کے کہتا ہے کہ ایک گھنٹے پہلے لاش تھانے میں تھی۔ پھر ہم کورٹ آگئے تھے۔"

"اوکے... تم جہاں ہو وہیں رہو۔ اس بات کو سیکرٹ رکھو۔ تمہیں چاہیے تھا کہ مجھے وائرلیس کو ڈ میں پیغام دیتے یا بتا دیتے کہ میرے سوا کوئی نہ سُنے۔"

"اور کون سُن رہا ہے سر؟"

"ایڈیٹ۔ میرے سامنے پوری فوج ہے وکیل اور صحافی برادری کی۔ اب بتاؤ میں اسے کیسے سیکرٹ رکھ سکتا ہوں۔ تم نے مجھے تباہ کردیا۔"

"میں... میں نے سر!"

"ناؤ شٹ اپ۔ میں آتا ہوں یہاں سے فارغ ہوتے ہی" جاوید صدیقی نے ریسیور رکھ کے لگا کے ہم سب کی طرف دیکھا۔

میں نے محسن سے کہا "شیروانی صاحب' یہ کیا ہوگیا؟"

"یہ قربِ قیامت کے آثار ہیں کبیر داس۔ مُردہ کپڑے بدل کے بھاگ گیا۔ شاید اپنی گرل فرینڈ مُردی سے ملنے۔ اچھا ڈراما ہے جاوید صدیقی کا۔"

"مُردی بھی میک اپ کرکے کہیں سے بھاگی ہوگی۔"

جاوید صدیقی نے کہا "جنٹلمین۔ اندازہ تو آپ لوگوں نے کر ہی لیا ہوگا کہ حادثہ ناقابلِ یقین ہے۔"

"یعنی وہ جو نقلی چوہدری دلاور تھا۔ وہ غائب ہوگیا" ایک صحافی نے کہا "لاش کا فرار!"

دوسرا بولا "اور آپ نے جو اسٹوری کورٹ میں سنائی تھی اس کی صداقت مشکوک ہوگئی۔"

"ڈونٹ سے دیٹ" جاوید صدیقی نے سختی سے کہا "جو کچھ میں نے بتایا تھا حقیقت پر مبنی تھا۔"

"لیکن سر۔ ثبوت اور شہادت کے بغیر کوئی اسٹوری نہیں بنتی۔ حقیقت کیسے تسلیم کرے گا کوئی؟"

"اور اب قانونی پوزیشن کیا ہوگی آپ کے بیان کی؟"

جاوید صدیقی پھر گرم ہوگیا "لک ہیئر۔ لاش غائب نہیں ہوئی۔ چوری کی گئی ہوگی۔"

"پولیس گارڈ کی موجودگی میں چوری!" ایک صحافی نے مسکرا کے کہا۔

"یس۔ آپ اسے ڈکیتی کہہ سکتے ہیں۔ پولیس گارڈ اس جرم میں برابر کے شریک ہیں۔ ان کی مرضی کے بغیر کوئی ایسی حرکت ناممکن تھی۔ انہیں رشوت دی گئی یا ان پر ناجائز دباؤ ڈالا گیا۔"

"کیسا ناجائز دباؤ....؟"

"یہ ایک مفروضہ ہے۔ کیا پتا کسی نے ان کے بیوی بچّوں کو پکڑلیا ہو کہ پہلے مُردے کو چھوڑو ورنہ تم گھر لوٹو گے تو مُردے ہی ملیں گے۔ یہ مشکل ہے مگر ناممکن نہیں ہے۔ دباؤ ڈالنے کے ہزار طریقے ہیں مگر میں رشوت کے امکان کو زیادہ قابلِ غور سمجھتا ہوں۔ اگر خریدنے والوں نے پولیس گارڈ کو خریدا تھا..."

"آپ کے خیال میں خریدار کون ہوسکتے ہیں؟"

جاوید صدیقی نے پلٹ کے جواب دیا "کیا یہ بات آپ نہیں سمجھتے؟ آخر خدا نے آپ کو بھی عقل دی ہے۔ ہر بات میری زبان سے کیوں کہلوانا چاہتے ہیں۔ جعلی ڈیتھ سرٹیفکیٹ بنوانے اور بنانے والے کون تھے؟ غلط پوسٹ مارٹم رپورٹ کس نے حاصل کی ہوگی؟ کس کا مفاد وابستہ تھا اس سے اور اب فردِ جرم کس پر عائد ہوتی تھی.... خیر اس کی بھی تفتیش ہوگی۔"

"صرف تفتیش سر!" ایک صحافی نے طنز سے کہا۔

"نہیں۔ تفتیش میں خود کروں گا۔ نتائج آپ کے سامنے آجائیں گے۔ چوبیس گھنٹے کے اندر۔" جاوید صدیقی نے کہا "لیکن میری آپ سے ایک گزارش ہے... پلیز، ہیلپ می۔ آپ لوگوں نے مدد نہ کی تو میں واقعی تباہ ہوجاؤں گا۔ میرا کیریئر نہیں میری گڈول داؤ پر لگادی گئی ہے۔"

ایک صحافی نے کہا "آپ فکر نہ کریں۔ چوبیس گھنٹے تک ہم کسی کو کچھ نہیں بتائیں گے۔"

باقی سب نے تائید میں سر ہلایا۔ اس وقت میں کچھ اور سوچ رہا تھا اور میرا اندازہ تھا کہ محسن کے ذہن میں بھی وہی بات تھی۔ ہمارے اندیشے فوراً ہی درست ثابت ہوگئے۔

ہم واپس مُردہ خانے کے برآمدے میں پہنچے تو اچانک ایک صحافی نے کہا "جاوید صدیقی صاحب، یہ کیا ہے آخر؟"

"کیا ہے؟"

"آپ اتنی دیر سے ہم سب کو بے وقوف بنا رہے تھے۔ آپ نے تو ہمارے سامنے اے ایس پی آفتاب کو تھانہ انارکلی بھیجا تھا۔ ملزم دلاور حسین کو حوالات سے شفٹ کرنے کے لیے۔"

اب دوسرے لوگ بھی چونکے "واقعی..."

ایک رپورٹر نے کہا "کیا تھانہ انارکلی کی حوالات میں ایک مُردہ بند تھا؟"

جاوید صدیقی طنز سے مسکرایا "بہت دیر میں خیال آیا آپ سب کو؟"

"یہ کیا گڑبڑ ہے؟"

"ابھی سب معلوم ہوجائے گا۔ گڑبڑ کوئی نہیں" جاوید صدیقی نے کہا۔

محسن نے مجھ سے کہا "میں تو سمجھ گیا تھا۔"

میں نے کہا "آپ سے پہلے میں نے اندازہ کرلیا تھا۔ جاوید صدیقی نے چالاکی سے کام لیتے ہوئے لاش کو وہاں رکھوادیا تھا اور دلاور کو یہاں۔ لیکن جناب شیروانی صاحب، گڑبڑ اب بھی ہے کہیں۔ میری چھٹی حس کہتی ہے۔"

"یس۔ میری ساتویں حس سو فیصد متفق ہے۔ گڑبڑ کہاں ہے آخر؟"

"اس کا بھی پتا چل جائے گا۔" میں نے کہا۔

جاوید صدیقی نے سب کو مطمئن کرنے کے لیے کہا "دراصل یہ میرے پلان کا ایک حصہ تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ کچھ لوگ لاش غائب کرنے کی کوشش کریں گے تو کچھ چوہدری دلاور کو چھڑانے کی۔ لاش کی تلاش میں وہ کہاں جاسکتے تھے، یہاں لاشیں کہاں محفوظ رکھی جاتی ہیں؟ وہ شہر کے مُردہ خانوں کو کھنگالتے اور اگر وہ لاش یہاں ہوتی تو چوری ہوجاتی یا بدل دی جاتی۔ میں نے لاش تھانہ انارکلی کے انچارج کے سپرد کردیا۔"

"مگر وہ اس کے باوجود غائب ہوگئی" ایک صحافی بولا۔

"ثابت یہ ہوا کہ ہونی کو انہونی کرنا کسی کے بس میں نہیں" دوسرے نے کہا۔

جاوید صدیقی نے خفت سے کہا "یس۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے۔ وہ نہیں ہوتا جو آدمی چاہتا ہے۔ سیکیورٹی پلان فیل ہوجاتے ہیں تو تجربہ کار جنرل جنگ ہار جاتے ہیں۔ چوہدری دلاور کو بچانے کے لیے میں نے یہاں پہنچادیا تھا۔ کسی زندہ آدمی کی تلاش میں یہاں کوئی نہیں آسکتا تھا۔ چوہدری دلاور یہاں محفوظ رہا۔"

ایک رپورٹر نے کہا "آپ کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ آپ کا سیکیورٹی پلان یہاں فیل نہیں ہوا۔"

"ورنہ مُردہ فرار ہوسکتا ہے تو زندہ بھی ہوجاتا۔"

تیسرے نے سوال کیا "جاوید صدیقی صاحب۔ کیا رات کو کسی نے یہاں سے لاش لے جانے کی کوشش کی تھی؟ کوئی یہاں آیا تھا لاش کی تلاش میں؟"

"آئی ڈونٹ نو..." جاوید صدیقی بولا۔

"کیا یہ غلطی نہیں کہلائے گی۔ اگر آپ اپنے آدمی مُردہ خانے میں پوسٹ کردیتے تو وہ ان کو گرفتار کرسکتے تھے جو یہاں کوئی

دلیل سے کہا جائے گا کہ اس نے جو کچھ کہا تھا سچ تھا۔ کہاں ہے وہ لاش جس کا ڈیتھ سرٹیفکیٹ اور پوسٹ مارٹم رپورٹ اس نے عدالت میں پیش کی تھی؟ لاش غائب ہوگی تو کیا اس مجرمانہ غفلت کی ذمے داری سب سے پہلے براہِ راست اس پر عائد نہیں ہوتی؟ کیا وہ بتا سکتا ہے کہ لاش لے جانے والے کون تھے؟

جاوید صدیقی خود بھی سمجھ رہا تھا کہ وہ کتنی مشکل میں پڑ گیا ہے۔ اس نے افسرانِ بالا سے اپنے جیلر دوست خورشید عالم تک سب کو لوٹ کرکے اپنی فرض شناسی اور ایمانداری ثابت کی تھی اور جب وہ بحال ہوا تھا تو یہ اس کے حق پر ہونے کا ثبوت تھا۔ ذلت کے عارضی دور کے بعد بہت جلد اسے اپنی کھوئی ہوئی عزت واپس مل گئی تھی مگر کتنا مختصر ثابت ہورہا تھا۔ کامیابی کی خوشی کا یہ وقفہ۔ آگے زیادہ کٹھن آزمائش تھی اور شاید پہلے سے زیادہ رسوائی کا اندیشہ تھا۔ وہ سخت پریشان تھا۔ اس کا سارا اعتماد متزلزل ہوگیا تھا۔

جب پولیس کی ایک جیپ آگے روانہ ہوئی تو اس میں مسلح محافظ کسی بھی مداخلت سے نمٹنے کے لئے تیار کھڑے تھے۔ ایس ایس پی کی جیپ پر لائٹ گھومنے لگی تھی اور اس کا سائرن گونج رہا تھا۔ جاوید صدیقی اب کوئی رسک لیتے ہوئے ڈرتا تھا۔ ورنہ وہ چوہدری دلاور کو انسپکٹر ساجد کی نگرانی میں ہیڈ آفس روانہ کردیتا اور خود تھانہ انارکلی جاتا جہاں اے ایس پی آفتاب بے چینی سے اس کی آمد کا انتظار کررہا تھا۔

آدھے راستے میں صحافیوں نے مطالبہ کیا کہ انہیں اُتار دیا جائے۔ وہ ٹیکسی لے کر چلے جائیں گے۔

"کہاں جائیں گے آپ لوگ؟" جاوید صدیقی نے کہا۔

"تھانہ انارکلی۔" ایک رپورٹر نے کہا۔

"میں بھی وہیں جاؤں گا۔ ہیڈ آفس میں چوہدری دلاور کو چھوڑ کر۔"

"تھینک یو۔ ہمیں ذرا جلدی ہے۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ سب اب اے ایس پی آفتاب پر یلغار کرنا چاہتے ہیں اور جو بات جاوید صدیقی بھی نہیں جانتا وہ اس سے پہلے پوچھنے کے موڈ میں ہیں۔ مجبوراً جاوید صدیقی نے انہیں ڈراپ کردیا۔

"کیا وکیل صاحب ہمارے ساتھ نہیں جائیں گے؟" ان میں سے ایک نے محسن سے سوال کیا۔

محسن نے میری طرف دیکھا "میرا خیال ہے ان کے ساتھ اچھا ڈراما دیکھنے کو ملے گا۔ اے ایس پی کی ایسی تیسی کردیں گے یہ لوگ۔"

میں نے کہا "مگر میرا خیال ہے کہ پولیس ہیڈ آفس میں زیادہ سنسنی خیز ڈراما ہوگا۔"

"مجھے اُمید نہیں کہ جاوید صدیقی ہمیں چوہدری دلاور سے

لاوارث لاش لینے آتے۔ رشوت دے کر مُردہ خانے میں چوہدری دلاور جیسے جانے کے کسی آدمی کی لاش کو تلاش کرتے۔" ایک رپورٹر نے کہا۔

"جب آپ کو شک تھا کہ ایسا ہونا ممکن ہے تو پھر یہ خیال کیوں نہیں آیا آپ کو؟"

"اور ایسے ہی کیا کسی نے تھانہ انارکلی یا دوسرے تھانوں کی حوالات میں چوہدری دلاور کو تلاش کیا؟"

"ابھی مجھے یہ بھی معلوم نہیں۔ ہر تھانے کی رپورٹ نہیں ہے میرے پاس" جاوید صدیقی نے جھلا کے کہا "میرے ذہن میں صرف ایک خیال تھا۔ چوہدری دلاور اور ایک لاش کو رات بھر محفوظ رکھنے کا۔ اس کے لیے میں نے جو مناسب سمجھا کیا تھا۔"

"مگر تھانہ انارکلی مناسب جگہ نہیں تھی۔" ایک رپورٹر بولا۔

"آپ نے کہا تھا کہ وہاں کا انچارج بھروسے کے قابل ہے۔ آپ کا اندازہ غلط ہوگیا۔"

جاوید صدیقی اب مشتعل ہونے لگا تھا "انچارج کے بارے میں میری رائے نہیں بدلی۔ یہ بدمعاشی نچلی سطح پر ہوئی ہے۔ آپ مجھے تھوڑا سا وقت دیں۔ میں اس وقت ہر بات کا صحیح جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ میں معلوم کروں گا کہ تھانے میں ایک لاش کی موجودگی کا راز کس نے فاش کیا اور اس لاش کا سودا کرنے والے کو کیا ملا؟ اس نے بہت گھاٹے کا سودا کیا تھا۔ یہ اسے معلوم ہوجائے گا۔"

چوہدری دلاور کو ایس ایس پی نے اپنی گاڑی میں بٹھانے کا حکم دیا۔ اس وقت تک فوٹوگرافر اس کی تصویریں لے چکے تھے لیکن ابھی تک کسی کو بھی چوہدری دلاور سے سوال جواب کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ جب اسے ہتھکڑی لگا کے پولیس نے گاڑی میں بٹھایا تو فوٹوگرافرز کے ساتھ رپورٹر بھی آگے بڑھے۔

جاوید صدیقی نے انہیں روک دیا "میں نے بتادیا تھا کہ چوہدری دلاور ایک قاتل ہے۔ عدالت نے صرف اس کے وکیل کو اور گھر والوں کو اس سے ملاقات کی اجازت دی ہے۔"

صحافی خاصے مایوس تھے اور نقلی چوہدری دلاور کی لاش کے غائب ہوجانے سے اچانک جاوید صدیقی کی ساری نیک نامی مشکوک ہوگئی تھی۔ اس نے غیر ضروری ذہانت کا مظاہرہ کرکے حماقت کی تھی۔ اس کے سب اندازے اور اقدامات غلط ہوگئے تھے۔ چوبیس گھنٹے خاموش رہنے کا وعدہ کرنے والے صحافی جانتے تھے کہ اب لاش واپس نہیں مل سکتی اور خواہ اس لاش کو غائب کرنے والوں کی مدد کے جرم میں پولیس کے ایک سب انسپکٹر، ایک ہیڈ کانسٹیبل اور دو کانسٹیبل برطرف کردیے جائیں گرفتار ہوجائیں یا جیل چلے جائیں۔ جو داغ جاوید صدیقی کے کردار پر آگیا تھا وہ ختم ہونے والا نہیں تھا۔ نہ جانے اسے افسرانِ بالا کے سامنے اور عدالت کے روبرو اپنے دفاع میں کتنے دلائل دینے پڑیں گے مگر

بات بھی کرنے دے" محسن بولا۔
"ہم کوشش ضرور کریں گے کہ اپنے چوہدری دلاور صاحب سے تنہائی میں کچھ باتیں ہو جائیں۔"

محسن نے اخبار والوں سے معذرت کرلی۔ پولیس کا قافلہ پھر چل پڑا۔ سہ پہر ڈھل چکی تھی لیکن ابھی تک نہ کسی کو کھانے کا ہوش تھا اور نہ پینے کا۔ سارا راستہ میں آگے پیچھے دیکھتا رہا۔ ہر گاڑی میں جھانکتا رہا کہ شاید کسی میں چوہدری دلاور کی بیوی کا چہرہ نظر آجائے یا فیصل کا۔ کیا پتا وہ کورٹ سے ہی ہمارے پیچھے لگ گئے ہوں۔

سائرن کی وجہ سے راستہ صاف مل رہا تھا اور گاڑیاں بہت تیز رفتاری سے آگے بڑھتی جارہی تھیں۔ دس منٹ بعد ہم پولیس ہیڈ آفس پہنچے تو ایک دم ہلچل مچ گئی۔ ہر طرف سے جاوید صدیقی کو سیلوٹ ملا اور جوان اٹن شن ہوگئے۔ اس کی جیپ عین اپنے آفس کے سامنے جارکی۔

جاوید صدیقی نے نیچے اُتر کے چوہدری دلاور کی منتقلی کے احکامات صادر کیے اور پھر ہماری طرف متوجہ ہوا "کیا بات ہے، تم لوگ.... میرا مطلب ہے یہ فرنچ وکیل کیا چاہتا ہے؟"

میں نے محسن سے کہا "اس سے کہو کہ ہم ایک اہم مسئلے پر بات کرنا چاہتے ہیں۔ اپنے ساتھیوں کی موجودگی میں۔"
"کون سے ساتھی؟"
میں نے کہا "رابعہ اور منظر کو فوراً یہاں پہنچنے کی تاکید کرے۔ ہم ایس ایس پی کے آفس سے فون کرسکتے ہیں۔"
محسن نے یہ بات ایس ایس پی کو سمجھادی۔ اس نے صاف انکار کردیا "سوری۔ میں نے شام کو بات کرنے کا وعدہ کیا تھا لیکن اب یہ ممکن نہیں۔ میں سخت مصروف ہوں۔"
"اس کو بتادے کہ انکار کرکے اپنے لیے مزید پریشانی کے اسباب پیدا نہ کرے" میں نے کہا۔
"یہ سمجھے گا کہ ہم دھمکی دے رہے ہیں۔"
"ہم سے بات کرنے میں اسی کا فائدہ ہے" میں نے کہا "اس کو یہ سمجھ لینا چاہیے ورنہ مارا جائے گا۔"
محسن نے اسے پھر قائل کرنا چاہا مگر وہ بہت جلدی میں تھا اور کچھ نروس بھی "مجھے تھانہ انارکلی جانا ہے۔ تم اسے سمجھاتے کیوں نہیں۔ میں یہاں بیٹھ کے اس سے باتیں کرنے میں وقت ضائع کیسے کرسکتا ہوں۔"

اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ ہم اس کے پیچھے پیچھے تھانہ انارکلی جائیں۔ میں نے محسن کو چلنے کا اشارہ کیا اور ہم ایس ایس پی سے پہلے ہی نکل آئے۔
محسن نے کہا "یار آخر ایسی کیا بات تھی؟"
میں نے کہا "اب تو سب کے سامنے ہی بات ہوگی۔ وقت کم ہے، ہمیں راستے میں رابعہ اور منظر کو بھی آفس سے اُٹھانا ہوگا،

زبردستی...."
"یہ اغوا کا کیس ہوگا" محسن بولا "کیا ہم یہ کار خیر گن پوا[...] پر کریں گے؟"
"گن کیا ہم توپ بھی استعمال کریں گے۔ اگر ضروری [...]" میں نے کہا۔

رابعہ اور منظر مصروف تھے۔ یہ وقت ان کے لیے معمول [...] مطابق اپنے مؤکلوں کے مقدمات پر مشورے کا تھا۔ عام فو[...] دیوانی اور فوج داری مقدمات سے ان کے ماتحت وکلا نمٹ[...] تھے۔ رابعہ اور منظر کے پاس ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ کے کیس [...] جاتے تھے یا پھر وہ پیچیدہ قسم کے قانونی مسائل میں ماتحت وکی[...] ہدایات دیتے تھے اور ان کی راہنمائی کرتے تھے۔ تجربے کے با[...] رابعہ یا منظر کی عدم موجودگی میں وقار یوسف یہ کام بڑی [...] اسلوبی سے سرانجام دیتا تھا اور یہ ثابت بھی کرچکا تھا کہ وہ ا[...] لیگل فرم کے سب مسائل کو سنبھالنے کا اہل ہے اور ا[...] صلاحیت رکھتا ہے۔

اس وقت بھی چند مؤکل مختلف نوعیت کے قانونی مشو[...] حاصل کرنے کے لیے موجود تھے۔ ہر وکیل کے لیے ایک کیبن [...] تاکہ وہ رازداری اور سکون کے ساتھ کیس کو سمجھ اور سمجھا[...] دائیں بائیں ایک سے تین تین کیبن تھے۔ ان میں سے ایک [...] ٹائپسٹ بیٹھتے تھے۔ باقی میں وقار یوسف سمیت پانچ ماتحت وک[...] سامنے کے رخ پر تین نسبتاً بڑے کمرے تھے۔ درمیان والا راب[...] آفس تھا۔ دائیں جانب منظر کا اور بائیں طرف کے کونے کو [...] کے لیے ریٹائرنگ روم بنادیا گیا تھا جہاں آرام کرنے کے لیے [...] بیڈ اور صوفہ سیٹ تھے۔ باتھ روم تھا اور چھوٹا سا کچن جس [...] چائے کافی بنائی جاتی تھی۔ درمیانی حصے کو انتظار گار کا درجہ حا[...] تھا اور یہاں ایک قالین پر تین طرف صوفے لگے ہوئے تھے [...] درمیان میں گلاس ٹاپ ٹیبل پر وقت گزاری کے لیے رسالے [...] اخبار پڑے رہتے تھے۔

محسن نے منظر کے آفس کا اور میں نے رابعہ کے کمرے کا [...] کیا۔ اندر وہ کسی سے اس کے کیس پر بحث کررہی تھی۔ اس [...] مجھے نظر اٹھا کے دیکھا اور میں واپس باہر آکے اس کے فارغ ہ[...] کا انتظار کرنے لگا۔ تقریباً دس منٹ بعد مؤکل رخصت ہوا تو [...] نے اندر قدم رکھا۔

"ایسے بیل کی طرح منہ اٹھائے اندر آجانے پر مجھے [...] شرمندگی نہیں" میں نے کہا۔
رابعہ نے کہا "کوئی بات نہیں، بیل کے لیے شرمندگی [...] جذبات نام کی چیز ہوتی بھی نہیں۔"

[...] غور کرو تو میری بات میں تمہارے لیے بھی تعریف کا پہلو نکلتا [...] تم جانتی ہو کہ مسز بیل کو گائے کہا جاتا ہے۔ تم اللہ میاں کی [...] کی طرح بھولی بھالی بلکہ احمق بھی ہو۔ گائے دودھ دیتی ہے۔ [...] مجھے کافی دے سکتی ہو۔"
رابعہ ہنسی "اگر کافی بھی نہیں بنا سکتے تم تو پھر بیل بھی نہیں، [...] نچلے درجے کی مخلوق ہو گھوڑے جیسی، مگر یہ بتاؤ کہ...."
"[...] ہمیں کچھ بتانے نہیں۔ تمہیں ساتھ لے جانے کے لیے آیا [...]" میں نے چلّا کے کہا۔
رابعہ گھبرا گئی "آہستہ بولو، باہر لوگ بیٹھے ہیں۔"
میں نے میز پر مُکا مارا "میں کسی کے باپ سے نہیں ڈرتا، آخر [...] میری.... ہونے والی بیوی.... ہو اور میں تم کو اپنے ساتھ کہیں [...] بھی لے جاسکتا ہوں۔"
ہونے والی بیوی کے الفاظ میں نے عمداً آہستہ کہے تھے۔
"کچھ پتا تو چلے کہ کہاں جارہے ہو تم؟"
"جہنم میں۔ میرا مطلب ہے تھانہ انارکلی۔ وہاں سے ایک مُردہ فرار ہوگیا ہے اپنے کپڑے چھوڑ کے۔ چنانچہ حسبِ حال ایک شعر ہے کہ، کفن پھاڑ کے مُردہ بولا ہم تو چلے سسرال۔ ہمت ہے تو روک کے دیکھے کوئی مائی کا لال۔"
"دیکھو۔ یہ میرے.... کام کا وقت ہے۔ میں فضول باتوں پر نہیں ہنس سکتی۔"
اتنی دیر میں محسن نے سنجیدگی سے منظر کو ساری بات بتادی تھی۔ اس نے دروازے سے جھانک کے کہا "اب چلو یار۔ دیر آخر کس لیے بھوتنی کے۔"
میں نے اُٹھتے ہوئے کہا "میں رابعہ کو قائل کررہا تھا کہ ہم سب کو لوٹ کر وہیں جانا ہے۔"
رابعہ سمجھ گئی کہ اصل بات کچھ اور ہے۔ باہر آکے اس نے وقار یوسف سے اشاروں کی زبان میں کہا کہ مجھے جانا ہے اور وہ معاملات کو سنبھال لے۔ وقار یوسف نے سر ہلا کے معاملہ فہمی کا ثبوت دیا۔ خادم حسین خود ساتھ ہولیا۔
"یہ کیا اشارے بازی ہورہی تھی سب کے سامنے" میں نے باہر آکے اسے ڈانٹا۔
رابعہ نے کہا "یہ میرا اور وقار یوسف کا معاملہ ہے۔"
"آئی سی۔ یعنی تمہارا اس سے بھی معاملہ ہے۔ معاملہ یعنی افیئر۔ جیسے ہی میری غیرت جوش میں آئی میں کچھ کروں گا۔"
"مثلاً کیا کروگے؟" رابعہ مسکرائی۔
"مثلاً نکاح" میں نے کہا۔
"میں آج بتاؤں گی نگی کو کہ تم وقار یوسف کا نکاح کرانے والے ہو۔" رابعہ ہنسی "وہ خود نمٹ لے گی تم سے۔"
میں نے آہ بھری "میں سیریس ہوں رابعہ۔ نکاح ہوتا ہے دو عاقل و بالغ گواہوں کے سامنے ایجاب و قبول۔ منظر اور محسن گواہ

ہیں۔ ہم تھانہ انارکلی پہنچنے سے پہلے ہی یہ کام نمٹا سکتے ہیں۔ [...] خادم حسین بھی ساتھ ہے۔"
"گواہ ہیں تو.... لیکن عاقل و بالغ بھی ہیں یا نہیں....؟" رابعہ نے سوچ کے کہا۔
منظر نے خفگی سے کہا "دیکھ سالے کس طرح خراماں خراماں چلے آرہے ہیں راز و نیاز کرتے ہوئے۔ ابے کوئی وقت ہوتا ہے رومانس کا۔"
میں نے پیچھے بیٹھ کے کہا "یہ بات تُو سمجھا رہا ہے مجھے۔ تُو نے سمجھی ہوتی یہ بات تو آج سولہ بچے نہ ہوتے تیرے۔"
منظر نے گاڑی چلادی "اب تو ساڑھے سولہ ہیں۔ ایک مثال قائم کرنی تھی تم سب کے لیے کہ کامیاب ازدواجی زندگی کیا ہوتی ہے۔ ہمارے نقشِ قدم پر چلوگے بیٹا تو پتا چلے گا کہ کتنے فائدے ہیں کثرتِ اولاد کے۔ سارا محلّہ ویسے ہی ڈرے گا اس لشکر سے۔ ایک سال میں بیس بار بچوں کی سالگرہ کرکے تحفے تحائف لوگے مگر تمہیں کوئی نہیں بُلائے گا اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی میں بھی کہ بارات کا کھانا کم نہ پڑجائے۔ پھر ایک جلوس ہے اپنے گھر کا۔ جب چاہو کسی کے خلاف احتجاجی مظاہرہ کرالو، محاصرہ کرلو۔"
محسن نے ہنس کے کہا "گویا بیس کا ٹارگٹ ہے۔"
"ٹارگٹ کی مت پوچھ۔ باہمی تعاون کا یہی جذبۂ عشق سلامت ہے تو ہم دیکھیں گے، درجن کا حساب چلے گا بلکہ گرس کا۔ سو سال کی عمر میں آٹھ دس درجن اولادیں کیا مشکل ہیں۔ ہمتِ مرداں مددِ خدا۔ ابے پرانے ماڈل کی گاڑی جیسی ساتھ نبھانے والی بیوی ہے۔ تمہاری اور خادم حسین جیسی نہیں کہ اب تک تم دو سے ڈھائی نہیں ہوئے سالے۔ اور ہاں، سنا ہے اس بھوتنی والے نے شادی کرلی ہے پرنسس مارگریٹ سے بھی۔"
"وہ اب مریم ہے" میں نے کہا۔
"بڑی چیز ہے یہ مولوی بھی۔ آج کرسچن کو پھانسا ہے۔ کل کسی ہندو، سکھ، یہودی یا بدھ مذہب کی پکڑے گا اور انہیں بھی داخلِ حرم کرے گا، حرامی!"
خادم حسین بگڑ گیا "افسوسناک حد تک گھٹیا سوچ ہے آپ کی منظر صاحب، یہ کارِ ثواب تھا جی...."
"اسے کہتے ہیں ہم خرما و ہم ثواب۔" منظر گلا پھاڑ کے ہنسا "ابے مولوی ہم نے تو پہلے ہی تاڑ لیا تھا کہ تیری نیت میں فتور ہے۔ میں تو سب سے کہتا ہوں کہ اپنی اپنی بیویوں کو بچا کے رکھو اس کی نظر سے۔"
"لاحول ولا قوۃ۔ سب مثلِ ہمشیرہ ہیں میرے لیے جی۔"
"ابے کسی اور کو اُلّو بنانا۔ میں نے تو پہلے ہی خبردار کردیا ہے اپنی بیوی کو۔ کہ مولوی خادم حسین کے جال سے بچنا۔ خواب میں بھی دیکھ لیا نا اسے تو پاؤں بھاری ہوجائے گا تمہارا اور اگلے بچے کا ڈیزائن یہی ہوگا۔ بارِیش پیدا ہوگا۔ بالکل یہی نورانی چہرہ۔"

خادم حسین کا چہرہ غصے اور شرم سے لال ہوگیا "اُف۔ منظر صاحب یہ بے شرمی نہیں بے غیرتی ہے جی۔ آپ اپنی منکوحہ کے بارے میں کیا خرافات بک رہے ہیں سب کے سامنے۔"

"خبردار کررہا ہوں سب کو۔ بھوتنی کے۔ کسی دن پتا چلے گا اچانک کہ نکی رابعہ اور گل۔ تینوں کے نام نہاد شوہر بیٹھے ہیں چھڑے چھانٹ۔ لاوارث گدھے کی طرح۔ اور سب کے چہیتے مولوی خادم حسین ہیں تینوں کے مجازی خدا....."

"آپ گاڑی روکیں جی۔ منظر صاحب مجھے سخت غصہ آرہا ہے۔ میں کچھ کر بیٹھوں گا۔" خادم حسین نے دروازے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"چھوڑو اسے رابعہ۔ چھلانگ مارنے دو سالے کو۔ چار ماہ دس دن بعد ٹاس کرلیں گے کہ مریم کس کی۔"

رابعہ کا اور میرا ہنس ہنس کے بُرا حال ہوگیا تھا۔ مولوی خادم حسین ہم سے بھی خفا تھا کہ اس بے ہودہ گفتگو پر ہنس رہے ہیں۔ اس سے پہلے کہ بات زیادہ بڑھتی' منظر نے گاڑی کو تھانہ انارکلی کے باہر روک دیا۔

میں نے کہا "خادم حسین۔ تم بھی بے وقوف ہو۔ مذاق کو نہیں سمجھتے۔"

"لاحول ولا قوۃ جی۔ میں لعنت بھیجتا ہوں ایسے مذاق پر بھی۔"

وہ اسی طرح خفا رہا۔

جاوید صدیقی کی جیپ اندر موجود تھی۔ اس نے یہاں پہنچنے میں دیر نہیں کی تھی۔ اسے یہ بھی احساس تھا کہ اے ایس پی آفتاب کو اخبار والوں اور وکیلوں نے گھیرلیا تو نوعمری اور ناتجربہ کاری کے باعث وہ گھبرا جائے گا اور بات بگڑگئی تو بنے گی نہیں۔ تاہم اے ایس پی اس کی توقع سے زیادہ سمجھ دار ثابت ہوا۔ اس نے چُپ سادھ لی اور ہر سوال کے جواب میں کہا کہ میں کچھ نہیں کہوں گا۔ جو پوچھنا ہے ایس ایس پی صاحب سے پوچھیں۔

وہ ایس ایچ او انارکلی کا کمرا تھا لیکن وسعت اور آرائش کی شان و شوکت سے کسی وزیر کا کمرا لگتا تھا۔ جاوید صدیقی اس کرسی پر بیٹھا ہوا تھا جس پر ایس ایچ او بدلتے رہتے تھے مگر اس کرسی کا اقتدار و اختیار باقی رہتا تھا۔ اے ایس پی آفتاب اور انسپکٹر ساجد کے چہروں پر ہوائیاں اُڑرہی تھیں اور وہ کسی سے نظر نہیں ملارہے تھے۔ ایک دیوار کے ساتھ وہ سب ملزم بنے کھڑے تھے جن پر ایک مُردے کے فرار کی ذمے داری عائد ہوتی تھی۔ ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں نہیں تھیں مگر وہ زیرِ حراست تھے۔ باقی صحافی اور وکیل میز کے گرد کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور ماحول سخت کشیدہ تھا۔

آخری شخص ہمارے بعد وہاں پہنچا۔ وہ جوان اور وجیہہ شخص تھا۔ اس نے کوئی بات کیے بغیر وہ کپڑے میز پر رکھ دیے جو اس کے ہاتھ میں تھے۔ وہاں موجود ہر شخص نے کپڑوں کو ایسے دیکھا جیسے وہ کسی مقتول کے لہو سے آلودہ ہوں۔

جاوید صدیقی نے کہا "یہی ہیں وہ کپڑے جو اس شخص نے پہن رکھے تھے۔"

"جسے آپ نے مُردہ فرض کرلیا تھا؟" ایک صحافی بولا۔

"مُردہ ہی نہیں۔ ملزم چوہدری دلاور حسین بھی فرض کرلیا تھا" دوسرے نے پُرتمسخر لہجے میں کہا۔

"اور یہ ہیں وہ ایس ایچ او صاحب' جن کو آپ نے بے حد قابلِ اعتماد فرض کرلیا تھا" تیسرے نے گرہ لگائی۔

جاوید صدیقی نے خاموشی سے سب کچھ سنا "لیں۔ میں نے بہت کچھ فرض کرلیا تھا۔ میں اپنی غلطی کو تسلیم کرتا ہوں لیکن یہ غلطی نتیجہ تھی میری خود اعتمادی کا۔ حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی کہہ سکتے ہیں آپ لیکن ایسا ہوتا ہے ہر جگہ اور ہر پیشے میں ہوتا ہے۔ آج کوئی بھی احمق مجھے احمق کہہ سکتا ہے۔ جس کے ریکارڈ پر کوئی معمولی سی قابلِ ذکر کامیابی نہیں۔ جس نے تمام سروس میں صرف حاضری لگائی ہے۔ وردی پہن کے مٹرگشت کی ہے' افسروں کو سلیوٹ مارے ہیں اور ملزموں سے سودے کیے ہیں۔ وہ بھی مجھ پر یہ الزام عائد کرسکتا ہے کہ کیا میری عقل ماری گئی تھی کہ میں نے جیتے جاگتے زندہ آدمی کو مُردہ مان لیا۔ لیکن میرا سروس ریکارڈ بہت شاندار ہے۔ یہ میں نہیں کہتا' وہ سب جانتے ہیں اور مانتے ہیں جنھوں نے میرے ساتھ کام کیا تھا۔ اس کا تازہ ترین ثبوت ڈاکٹر شیلی مرڈر کیس میں میری کارکردگی ہے۔ میں نے قاتل کا سراغ لگایا تھا۔ یہ آسان کام بہرحال نہیں تھا اور پہلے بھی میں نے ایسے بہت سے کارنامے سرانجام دیے تھے۔ میں ناتجربہ کار یا بے وقوف نہیں ہوں لیکن وہ حالات ہی ایسے تھے کہ میں نے حقیقت کو ایسے تسلیم کرلیا۔ تصدیق کی ضرورت محسوس کیے بغیر' جیسے آپ کسی سے وقت پوچھیں اور وہ گھڑی دیکھ کر کہے کہ سات بجے ہیں تو آپ اس کی کلائی پکڑ کے خود گھڑی نہیں دیکھتے۔ مان لیتے ہیں کہ سات ہی بجے ہوں گے۔ مجھے میرے مخبروں نے یہ اطلاع دی تھی کہ چوہدری دلاور کو فرار کرانے کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا جائے گا۔ اس کا اندیشہ پہلے سے موجود تھا۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ ملزم چوہدری دلاور کو کوٹ لکھپت جیل اسپتال میں ہونے کی خبر بھی باہر پہنچ گئی تھی' یہ چوہدری دلاور کے مخبروں کی کامیابی تھی یا ہمارے اپنے لوگوں کی ضمیر فروشی۔ یہ میں نہیں جانتا' چوہدری دلاور کے ہاتھ بھی بہت لمبے تھے۔ اس کے پاس ہر سطح کے کارکن تھے جو مختلف وقتوں میں اس سے مالی فوائد حاصل کرچکے تھے اور اپنی دولت سے وہ لوگوں کا ایمان اور ان کی وفاداری خریدنے پر پورا یقین رکھتا تھا۔ وہ بھی کہتا تھا کہ ہر آدمی بدعنوان ہوتا ہے لیکن ہر شخص میں مزاحمت کرنے کی قوت کم زیادہ ہوتی ہے۔ اسی حساب سے ان کی قیمت کا تعین ہوتا ہے۔ کم مزاحمت کرنے والے کم قیمت ہوتے ہیں جو بہت زیادہ مزاحمت کرتے ہیں وہ بھی بالآخر بک جاتے ہیں۔ ایک حد ایسی آجاتی ہے جب وہ سوچنے پر مجبور ہوجاتے ہیں کہ قارون کا خزانہ زیادہ کام آئے گا یا ان کے اصول۔ پھر بیوی بچوں کا مستقبل اور دنیا کی مادی خوشیوں کا خیال ان کے اصولوں کی دیوار گرادیتا ہے اور وہ قارون کا خزانہ قبول کرکے ضمیر کی شکست قبول کرلیتے ہیں۔"

"کہیں آپ کے ساتھ بھی تو ایسا ہی نہیں ہوا تھا؟" ایک رپورٹر نے سپاٹ لہجے میں پوچھ لیا۔

جاوید صدیقی کا چہرہ صدمے کی شدت اور احساسِ ذلت سے تاریک ہوگیا مگر وہ مشتعل نہیں ہوا۔ اب اس نے یہ سمجھ لیا تھا کہ سنگ زنی کرنے والے ہاتھ بہت زیادہ ہوں گے۔ دشنام طرازی کرنے والی زبانیں بہت ہوں گی۔ توصیف و تحسین کے پھول پیش کرنے والے ہاتھ ہمیشہ بہت کم ہوتے ہیں۔ دوسروں کی خوبی کا اعتراف کرنے میں آدمی ہمیشہ تنگ دلی اور کنجوسی کا مظاہرہ کرتا ہے۔

"آپ مجھے براہِ راست بھی گالی دے سکتے ہیں" جاوید صدیقی نے کہا "لیکن میں نے خود کو کبھی کسی اور کی نظر سے نہیں دیکھا۔ اپنا منصف ہمیشہ میں خود رہا۔ اور میں مطمئن ہوں کہ میرا دامن صاف ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ مجھے ایک ناکردہ گناہ کی سزا مل جائے۔ نظامِ انصاف دنیا میں کہیں بھی سو فیصد فول پروف نہیں ہے۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے لیکن ہوتا ہے۔ کہ بے گناہ پکڑے جاتے ہیں اور مجرم بھی ثابت ہوجاتے ہیں۔ مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میں کیا ہوں۔ میں نے ایک غلطی کی۔ ایک بشری غلطی' جس سے کوئی انسان مبرّیٰ نہیں۔ جب میں نے وین میں لاش دیکھی تو اس کی نبض دیکھنے اور دل کی دھڑکن کو محسوس کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ لاش کو لے جانے والی وین جیل کے اندر سے آئی تھی۔ اس میں دو محافظ موجود تھے۔ انھوں نے بھی بتایا کہ اس لاش کو لے کر وہ کہاں جارہے تھے۔ میں نے ان کے قبضے سے ڈیتھ سرٹیفکیٹ بھی برآمد کرلیا اور مجھے پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی مل گئی۔ اس پر ڈاکٹروں کے دستخط بھی تھے اور مُہر بھی تھی۔ میں کیوں شک کرتا اور کیسے شک کرتا کہ جو شخص لاش بنا پڑا ہے وہ زندہ ہے۔"

میں نے محسن کی طرف دیکھ کے سرہلایا اور اس نے مسکرا کے سرہلاتے ہوئے خاموشی کی زبان میں جواب دیا۔ لیں۔ یہی میرا بھی خیال تھا۔

رابعہ نے کہا "کیا اب آپ نے یہ تصدیق کرلی ہے کہ وہ ڈاکٹر کون تھے۔ ڈیتھ سرٹیفکیٹ پر اور پوسٹ مارٹم رپورٹ پر دستخط کرنے والے۔"

"بس مس رابعہ۔ وہ دستخط کسی کے بھی نہیں تھے۔ دستخط پڑھے نہیں جاتے تھے۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں۔ اکثر لوگوں کے دستخط سے ان کا نام پتا نہیں چلتا۔ دستخط کے نیچے مُہر بھی تھی۔ مُہر چوری بھی کی جاسکتی ہے بنوائی بھی جاسکتی ہے مگر اس کی ضرورت نہیں تھی۔ کسی نے آفس سے ڈیتھ سرٹیفکیٹ کا ایک سادہ فارم چوری کیا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کا فارم حاصل کیا اور اس کی خانہ پری کرکے مُہر لگادی۔ اوپر والے دستخط کون پہچان سکتا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ اس معاملے میں تفتیش کا کوئی نتیجہ سامنے نہیں آسکتا۔ کسی پر شک نہیں کیا جاسکتا اور سب پر شک کیا جاسکتا ہے۔ کوئی ڈاکٹر نہیں مانتا کہ یہ اس کے دستخط ہیں اور وہ ٹھیک کہتے ہیں۔ لیکن میں نے تو دستاویزی شہادت اور گواہوں کے بیان پر یقین کرتے ہوئے مان لیا تھا کہ وہ واقعی ایک لاش ہے۔"

"مگر وہ لاش نہیں تھی" رابعہ بولی۔

"کوئی کیریکٹر ایکٹر تھا جو لاش بن کے دم سادھے پڑا تھا" منظر نے کہا "کیا پتا سانس بھی لے رہا ہو۔"

"ہاں۔ شام کے وقت اور وین کے اندر اندھیرے میں کوئی خفیف سی حرکت نظر نہیں آسکتی تھی۔ خصوصاً اس وقت جب کہ غور سے کوئی نہ دیکھے۔ اب دونوں سپاہی جو لاش کے ساتھ تھے وہ بھی کہتے ہیں کہ ہمیں کیا معلوم وہ بندہ تھا کہ لاش تھی۔ ہم سے کہا گیا کہ لاش کے ساتھ جاؤ۔ ہم گاڑی میں بیٹھ گئے۔ یہی بیان ڈرائیور کا ہے۔ اسے گیٹ پاس بنا کے دیا گیا تھا کہ ایک ڈیڈ باڈی باہر جائے گی۔"

"کیا گیٹ پاس بھی بوگس تھا؟"

"ہاں۔ گیٹ پاس پر جیلر کے دستخط ہوتے ہیں۔ گیٹ پر محافظ چیک کرتے ہیں مگر پاس پر ڈیڈ باڈی کبھی ہو تو زیادہ غور نہیں کرتے۔ وین جیل کی تھی۔ ساتھی محافظ جیل کے تھے۔ انھوں نے پاس رکھ لیا اور اینٹری کرکے گاڑی کو گزر جانے دیا۔"

"آپ نے یہ بھی مان لیا کہ وہ لاش ملزم چوہدری دلاور کی نہیں ہے؟" میں نے محسن کی معرفت سوال کیا۔

"نہ ماننے کی وجہ کوئی نہیں تھی۔"

"چونکہ ڈیتھ سرٹیفکیٹ اور پوسٹ مارٹم رپورٹ پر ملزم چوہدری دلاور حسین لکھا ہوا تھا۔ اس لیے وہ اور کوئی نہیں ہوسکتا تھا؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ میں ملزم کو پہچانتا بھی ہوں۔"

"اس کے باوجود آپ دھوکا کھا گئے۔ وہ لاش تو کسی اور کی تھی؟"

"یہ غلط ہے۔ مجھے کوئی دھوکا نہیں ہوا تھا۔ لاش کو میک اپ کرکے چوہدری دلاور بنادیا گیا تھا۔" جاوید صدیقی نے کہا۔

"اس کی صورت چوہدری دلاور سے ملتی جلتی تھی۔ باقی کام میک اپ کا تھا۔ پھر آپ نے کیسے پہچانا۔ کیسے معلوم ہوا آپ کو کہ وہ اصل چوہدری دلاور نہیں ہے۔"

رابعہ نے میری تائید کی "ہاں۔ کیا فرق دیکھ کے آپ نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا۔"

اب منظر بولا "آپ تسلیم کرچکے ہیں کہ آپ نے لاش کو غور

سے نہیں دیکھا تھا۔ آپ کو تو زندہ یا مُردہ کے فرق کا پتا نہیں چلا تھا پھر شناخت میں فرق کا علم آپ کو کیسے ہوا؟"

جاوید صدیقی نے کہا "میں مانتا ہوں کہ میں نے اس پر سرسری نگاہ ڈالی تھی۔ مجھے پہلے سے معلوم تھا کہ وہ چوہدری دلاور نہیں ہے۔"

"چنانچہ آپ نے تسلیم کرلیا کہ وہ چوہدری دلاور نہیں ہے؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔"

"مگر وہ چوہدری دلاور تھا" میں نے کہا۔

ایک لمحے کے لیے جاوید صدیقی میرے سوال سے کنفیوز ہوگیا۔ باقی سب نے بھی میرے سوال کو دیر میں سمجھا جو درحقیقت سوال تھا ہی نہیں۔ یہ ایک بیان تھا۔ ایک انکشاف' حقیقت کی طرح۔

"آپ نے کیا کہا؟"

"میں نے کہا ہے کہ وہ چوہدری دلاور ہی تھا۔"

"چوہدری دلاور ہماری تحویل میں ہے زندہ سلامت۔ آپ سب دیکھ چکے ہیں۔"

"وہ چوہدری دلاور نہیں ہے" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

جاوید صدیقی نے محسن سے کہا "کیا یہ نشے میں ہے؟"

محسن نے متانت سے کہا "موسیو آندرے پینے پلانے کے معاملے میں مسلمانوں سے کم نہیں۔ یہ شراب کو چھوتے تک نہیں۔"

"پھر اس احمقانہ سوال کا مطلب اور مقصد کیا ہے؟"

"آپ اس سوال کو کس طرح احمقانہ قرار دے سکتے ہیں؟ جب تک یہ ثابت نہ ہوجائے" محسن نے اردو میں بھی کہا۔

"مجھے یقین ہے..."

"آپ کا یقین ایک بے معنی چیز ہے۔ اس یقین کی بنیاد پر آپ بہت دھوکے کھا چکے ہیں۔ بہت نقصان اٹھا چکے ہیں۔ آپ نے زندہ کو مُردہ مان لیا تھا۔ آپ کی نگاہ اور آپ کے حواس ناقابلِ اعتبار ہیں۔ جو غلط ہے اسے سب کے سامنے غلط ثابت کرکے دکھائیں ایس ایس پی صاحب۔ میں اپنی بات پر قائم ہوں۔ وہ چوہدری دلاور ہی تھا" میں نے کہا۔

پہلے سب مجھے یوں دیکھ رہے تھے جیسے میں واقعی پاگل ہوں یا میں نے اتنی پی لی ہے کہ میری عقل ماری گئی ہے مگر میرے مدلل جواب نے اچانک سب کو اپنا رویّہ بدلنے پر مجبور کردیا۔

جاوید صدیقی نے جھنجلا کے کہا "واٹ نان سنس۔ جو شخص دھوکے باز تھا اور فرار ہوگیا۔ اسے میں کیسے آپ سب کے سامنے پیش کرکے ثابت کرسکتا ہوں کہ وہ چوہدری دلاور نہیں تھا۔"

میں نے کہا "اس کا دوسرا آسان طریقہ بھی ہے۔ اگر بھینس گُم جائے اور ثابت کرنا ہو کہ وہ دودھ دینے والا چار ٹانگوں اور سینگوں اور ایک دُم والا جانور بھینس ہی تھا تو آپ گائے کو پیش کرسکتے ہیں کہ وہ گائے نہیں تھی۔ گائے تو ایسی ہوتی ہے" میں نے کہا۔

لوگ مسکرانے لگے۔ محسن سمجھ گیا کہ میں نے کس دعا کا ذکر کیا تھا۔ رابعہ اور منظر نے بھی میرے سوال کا مقصد سمجھ لیا اور اب مجھے رابعہ کی نظر میں قابلِ فخر ستائش کے جذبات نظر آرہے تھے۔ اس کے چہرے پر وہ خوشی تھی جس میں اعلان تھا' اعتراف تھا کہ دیکھا۔ اتنی ذہانت کی بات صرف سکندر ہی کرسکتا تھا۔ میرا سکندر۔

"وکیل صاحب سے کہو کہ وہ ... بتادیا کہ وہ ملزم چوہدری دلاور حسین ہی تھا۔" جاوید صد...

"آپ چوہدری دلاور حسین کو پیش کردیں" میں نے کہا "اور یہاں سب کے سامنے ثابت ہوجاتا ہے کہ وہ چوہدری دلاور حسین نہیں ہے تو ازخود یہ ثابت ہوجائے گا کہ چوہدری دلاور حسین وہ تھا جو فرار ہوگیا۔"

"آپ اچھی طرح سوچ لیں۔ اگر یہ غلط ہوا؟"

"میں جوا نہیں کھیل رہا ہوں ایس ایس پی صاحب۔ یہ غلط ہوا تو میں اس کیس سے الگ ہوجاؤں گا اور واپس چلا جاؤں گا۔ جانے سے پہلے میں آپ کو تحریر دے کر جاؤں گا کہ میں پرلے درجے کا بے وقوف تھا اور میں نے آپ پر ایک ایسا احمقانہ الزام عائد کیا تھا جس کی سزا میں اصولاً مجھے پاگل خانے جانا چاہیے تھا۔"

ایک دم وہاں خاموشی چھاگئی۔ میں نے ایک ناقابلِ یقین چیلنج دیا تھا اور اتنا ہی ناقابلِ یقین چیلنج قبول کرلیا تھا۔ انگریزی محاورے کے مطابق گیند اب جاوید صدیقی کے کورٹ میں تھی اور وہ کھیلنے پر مجبور تھا۔ یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ 'یہ بے ایمانی ہے' میں نہیں کھیلتا۔

میں نے اس ڈرامائی لمحے سے فائدہ اٹھایا "لیکن سر۔ یہ سچ ہوا... پھر؟ آپ کیا کریں گے۔"

جاوید صدیقی زبردستی مسکرایا "میں مستعفی ہوجاؤں گا۔"

"آپ تو پہلے بھی استعفیٰ دے چکے تھے" کسی اور نے کہا۔

"یہ ڈراما تو چلتا رہتا ہے۔ ڈی آئی جی صاحب اسے پھر نامنظور کردیں گے" دوسرا بے باک رپورٹر بولا۔

"شٹ اپ" جاوید صدیقی بھڑک اٹھا "یہ ڈراما نہیں تھا اور پہلے میں نے احتجاجاً استعفیٰ دیا تھا۔ تو اب اپنی نالائقی' نااہلی' ایک مجرمانہ غفلت کا اعتراف کرتے ہوئے استعفیٰ دوں گا۔ خود کو گرفتاری کے لیے پیش کردوں گا۔ اس وقت جذبات کا دھارا میرے خلاف ہے۔ آپ سب لوگ ہر بے بنیاد بات پر یقین کرنے کے لیے تیار ہیں۔ آپ سب کا رویّہ جارحانہ ہے۔ لیکن کوئی بات نہیں۔ میں چوہدری دلاور کو آپ کے سامنے پیش کررہا ہوں۔ آپ ذرا اس سے سوال کرلیں۔ جو پوچھنا چاہیں پوچھ لیں۔ اس کی شناخت کے بارے میں اور کچھ نہیں۔"

جاوید صدیقی نے بیک وقت دو احکامات جاری کیے۔ وہ سخت جلال میں تھا۔ اس نے فون اٹھا کے کہا کہ چوہدری دلاور کو ایک گھنٹے بعد پریس کے نمائندوں اور وکیلوں کے سامنے شناخت کے لیے پیش کیا جائے گا۔ دوسرا حکم اس نے تھانہ انچارج کو دیا کہ وہ لاش کے غائب ہوجانے کے واقعے کی تفصیل خود بتائے۔

اس نے کہا "کل رات میں گشت پر تھا جب مجھے ایس ایس پی صاحب کا پیغام ملا اور میں دس منٹ بعد تھانے پہنچ گیا۔ یہاں باہر تھانے کے احاطے میں پولیس کی ایک وین کھڑی ہوئی تھی۔ اس میں ایک لاش تھی' یہ کپڑے اسی لاش کے ہیں۔ ایس ایس پی صاحب نے کہا کہ وہ لاش کو ایک رات کے لیے تھانے میں چھوڑنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ جناب لاش کو مُردہ خانے میں رکھوادیں تو انہوں نے کہا کہ مجھے یہ سب مت بتاؤ۔ میں بھی جانتا ہوں مُردہ خانہ کہاں ہے۔ تم سے جو کہا جارہا ہے وہ کرو۔ میں نے عرض کی کہ جناب مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے مگر لاش خراب نہ ہوجائے۔ انہوں نے کہا کہ لاش زیادہ پرانی نہیں اور صبح تک خراب نہیں ہوگی۔ بس اسے الگ کمرے میں رکھوا اور بہتر ہے وہاں ٹھنڈک ہو۔ پھر جناب میں نے لاش اسی کمرے میں رکھوادی۔ اس میں ایک اے سی لگا ہوا ہے۔ لاش ادھر تھی عین اے سی کے سامنے والی بینچ پر۔"

سب نے بینچ کی طرف دیکھا۔ کمرے کی مشرقی دیوار والی کھڑکی کے نیچے اے سی نصب تھا۔ لکڑی کی بینچ اس کے بالکل سامنے تھی۔ کھڑکی پر بھاری پردے تھے جو اس وقت ہٹادیے گئے تھے۔

"میں نے تاکید کردی تھی کہ کسی کو بھی کمرے میں جانے کی اجازت نہیں ہوگی۔ دروازے کی چابی میں نے اے ایس پی صاحب کے حوالے کردی تھی۔ وہ رات کو ایک بجے چکر لگا گئے تھے۔ صبح پھر آئے' انسپکٹر ساجد صاحب نے بھی دوبار چیک کیا۔"

"تالے کی ڈپلی کیٹ چابی...؟"

"کوئی نہیں۔ پہلے تھی میرے پاس مگر کھوگئی تھی۔"

"یعنی اس بات کا امکان نہیں کہ کوئی اور اندر گیا ہو۔"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جی۔ اصل میں ہوا یہ چکر کہ وہ بندہ ادھر لاش بن کے پڑا رہا۔ جب کسی نے اسے اٹھایا تو اس نے سانس روک لیا اور جسم کو اکڑا کے لاش کی طرح کرلیا۔"

"لیکن لاش کا جسم ٹھنڈا ہوتا ہے" ایک رپورٹر نے کہا۔

"فوراً تو ٹھنڈا نہیں ہوتا جی۔ اور اس نے پہنے ہوئے تھے کپڑے کسی کا ہاتھ جسم سے لگا بھی نہیں ہوگا۔ وہ ادھر چپ کرکے لیٹ گیا اور مکر کرتا رہا۔ اس نے ڈبل کپڑے پہن رکھے ہوں گے۔ اوپر والے کپڑے اس نے ادھر ہی اتار دیے۔ اندر والے کپڑوں میں وہ اس کھڑکی سے نکل گیا۔ باہر نکل کے اس نے کھڑکی پھر بند کردی۔"

"اس کھڑکی کے پیچھے کیا ہے؟... سڑک...؟"

"نہیں جی۔ دوسرا کمرا ہے۔ وہ بھی باہر سے بند تھا لیکن وہ کھڑکی کھول کے اس میں سے بھی گزر گیا۔ اس کمرے میں کچھ نہیں ہے۔ پہلے برآمدہ تھا' ادھر انچارج صاحب کے کمرے میں لگا ہوا اے سی گرم ہوا نکالتا تھا مگر بعد میں ایک بندے نے پیچھے دیوار بنا کے دروازہ لگالیا اور ایک کھڑکی۔"

"کون تھا وہ بندہ؟"

"پہلے والے انچارج صاحب کا آدمی تھا۔ رات کو ادھر سوجاتا تھا۔ دن میں گھر پر کام کرتا تھا۔ کھڑکی دروازے دن میں کھلے رہتے ہیں۔ رات کو بند کردیے جاتے ہیں۔ وہ کھڑکی سے باہر گیا اور فرار ہوگیا۔"

منظر نے کہا "کیسے فرار ہوگیا' احاطے سے گزرا ہوگا۔ کیا کسی کو نظر نہیں آیا؟"

انچارج نے سر کھجایا "نظر تو ضرور آیا ہوگا جی لیکن... یہ خیال کس کو آسکتا تھا کہ یہ وہی مُردہ ہے جو اب فرار ہورہا ہے۔ اس کی شکل پر بھی غور نہیں کیا کسی نے اور کرتا تو اس کے کپڑے اندر سے پتا نہیں کیسے تھے۔"

"یہ واقعہ کس وقت پیش آیا ہوگا... اندازاً۔"

"آج صبح گیارہ سے بارہ کے درمیان ایسا ہوا۔ گیارہ بجے خود اپنے انسپکٹر ساجد نے دیکھا تھا۔ اس سے پہلے دس بجے اے ایس پی صاحب بھی راؤنڈ لگا گئے تھے۔"

"انہوں نے تو دو بجے فون کرکے بتایا تھا" میں نے کہا۔

"ادھر بارہ بجے کے بعد سب انسپکٹر نے دیکھ لیا تھا کہ بینچ خالی ہے۔ اس پر صرف کپڑے پڑے تھے۔ پھر اس نے دیکھا تو کھڑکی اندر سے کھلی ہوئی تھی۔ پٹ ایسے ہی بند تھے۔ اس نے انچارج کو اطلاع کی اور میں نے فوراً آکے ایکشن لیا۔"

"کیا ایکشن لیا؟ مُردہ بھاگ گیا تھا۔ زندہ محافظوں کو پکڑلیا۔"

منظر نے کہا "یا آپ خود مُردے کی تلاش میں نکل گئے تھے؟"

رابعہ نے کہا "کل رات سے آج دوپہر تک وہ سیدھا لیٹا رہا' ہلے جلے بغیر... اس نے کچھ کھایا پیا نہیں؟"

انچارج نے جاوید صدیقی کی طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھا مگر جاوید صدیقی نے خود ہی بات شروع کردی۔ "اس کیس میں پولیس کے ساتھ بڑا دھوکا ہوا۔ مجرم حد سے زیادہ چالاک تھا۔"

"مجرم ہمیشہ پولیس کے مقابلے میں زیادہ ذہین ثابت ہوتے ہیں۔ ہمارے ملک میں" منظر بولا۔

"وہ مکر کیے پڑا رہا اور اس نے سب کو یقین دلادیا کہ وہ مُردہ ہے۔ یہ اداکاری زیادہ مشکل نہیں تھی مگر اس نے خطرناک جوا کھیلا تھا۔ اگر اس کا راز فاش ہوجاتا...؟"

"تو آپ کو عقلمندی کی ایک اور سند مل جاتی" منظر نے آہ

بھری۔

جاوید صدیقی اس طعنے کو پی گیا "ایک تو وہ ڈبل کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ یہ سب سوچا سمجھا منصوبہ تھا اور جس نے بھی بنایا تھا اس کی تعریف نہ کرنا بھی زیادتی ہوگی۔"

"تعریف اس خدا کی جس نے تمہیں بنایا" ایک رپورٹر بولا۔

"دُہرے کپڑوں میں نیچے والا لباس یقیناً بالکل مختلف ہوگا۔ رنگ اور وضع قطع ہر اعتبار سے۔ دم سادھ کے جسم کو لاش کی طرح سخت کرنا چند منٹ کی بات تھی۔ باقی وقت وہ آرام سے لیٹا رہا اور سانس بھی لیتا رہا۔ اس نے اندر کہیں کھانے کے لیے بسکٹ بھی چھپا رکھے تھے۔ یہ بسکٹ وہ رات کے وقت کھاتا رہا۔ ہمیں بسکٹوں کا چورا ملا ہے کپڑوں کے ساتھ۔"

صحافی ہنسنے لگے "وہ تو شاید چائے کافی بنانے کا سامان بھی لایا ہوگا کہ رات کو ضرورت پڑے گی تو بنا لیں گے۔"

رابعہ بولی "سوال یہ ہے جاوید صاحب کہ اگر اسے مُردہ خانے میں رکھ دیا جاتا..... پھر؟"

"وہ وہاں سے بھاگ جاتا۔ وہاں سے فرار ہونا تو بہت آسان کام تھا" جاوید صدیقی بولا "مُردوں کی حفاظت کے لیے کوئی بھی موجود نہیں ہوتا۔"

"اسے باتھ روم جانے کی ضرورت پیش نہیں آئی؟" منظر بولا۔

انچارج نے کہا "باتھ روم تو تھا مگر وہ اُٹھا نہیں۔ اس نے بینچ پر لیٹے لیٹے ہی فراغت حاصل کی۔ اس کے کپڑے گیلے تھے۔"

محسن نے کہا "آخر وہ رات بھر کیوں لیٹا رہا؟"

"دراصل رات کو ادھر ایک بندہ سوتا ہے۔ باہر والے کمرے میں۔ اور رات کو آنے جانے والے بھی کم ہوتے ہیں۔ کوئی اندھیرے میں اس سے پوچھ لیتا کہ تم کون ہو اور کہاں جا رہے ہو۔ کہاں سے آ رہے ہو۔ تو اس کو مشکل پڑتی۔ وہ صبح تک پڑا رہا۔"

"اطمینان سے لمبی تان کے سوتا رہا" منظر بولا۔

"دن میں آنے جانے والے بہت ہوتے ہیں۔ کسی نے اس کی طرف دھیان نہیں دیا۔"

منظر نے کہا "میرا خیال ہے وہ نقلی مونچھیں داڑھی، رنگین چشمہ یا ٹوپی۔ سب لایا ہوگا اپنے ساتھ۔ خیر اب دفع کریں اس مُردے کو جو آپ جیسے سیانے زندہ انسانوں کو اُلو بنا کے نکل گیا۔ ذرا اپنے چوہدری دلاور حسین کو چل کے دیکھتے ہیں۔"

"او کے، او کے" جاوید صدیقی نے ہاتھ اٹھا کے کہا "لگتا ہے کہ اب مجھے ہر جائز ناجائز بات کے لیے خود کو تیار کرنا ہوگا۔ اس نوکری کی تو مجھے پروا کبھی نہ تھی اور خدا کے سوا میں کسی سے ڈرتا بھی نہیں مگر یہ سوال ہے میری INTEGRITY کا۔ میں کسی کے سامنے جواب دہ ہوں تو وہ میرے افسرانِ بالا ہیں لیکن آپ لوگ ایک رائی کی تلاش میں ہیں جس کو پہاڑ بنا دیں۔"

"رائی کیا جناب، اچھا بھلا بھاری پتھر ہے ہمارے پاس۔ ابھی لڑھکا سکتے ہیں۔" ایک رپورٹر نے کہا جو حد سے زیادہ اور بے مروت تھا "آپ کی جگہ وہ ہوتا، ارشد کریم ربانی تو اب تک یہ خبر ارسال کر چکے ہوتے کہ آپ نے بہت زیادہ عقل بننے کے چکر میں کیا عظیم الشان حماقت کی تھی۔"

"شٹ اپ۔ تم کیا مجھے بلیک میل کرنا چاہتے ہو۔ میں نے جو کچھ کیا تھا نیک نیتی سے کیا تھا" جاوید پھٹ پڑا۔

"بہت مہنگی پڑی ان سب کو آپ کی یہ نیک نیتی" رپورٹر ترکی بہ ترکی جواب دیا "یہ سب جو یہاں مجرم بنے کھڑے ہیں آپ کی حماقت کا شاہکار ہیں۔"

"یہ مجرمانہ غفلت کے مرتکب ہوئے ہیں۔"

"میں ایسا نہیں سمجھتا۔ یہ آپ کی بے وقوفی کا خمیازہ بھگت رہے ہیں" رپورٹر لڑنے پر آمادہ تھا "کون اُلو کا پٹھا اسے ٹھیک سمجھ سکتا ہے کہ حوالات میں مُردہ ہو اور مردہ خانے میں مجرم کو جائے۔"

"زبان سنبھال کے بات کرو" جاوید صدیقی دہاڑ کے بولا جس نے سیکیورٹی کو مدِ نظر رکھا تھا۔

"جب یہ معاملہ عدالت کے سامنے جائے گا تو اسے سیکیورٹی نہیں حماقت ہی سمجھا جائے گا۔ تمہاری غلط بیانی عدالت کے ریکارڈ پر ہے۔ تم نے کہا تھا کہ چوہدری دلاور انارکلی تھانے کی حوالات میں ہے۔"

میں نے محسن سے کہا "یہ تو شاید ٹھیک ہی ہوگا۔"

محسن نے آہستہ سے کہا "یار کیوں بلاوجہ یہ شوشا چھوڑ دیا۔"

جاوید صدیقی نے کہا "میں خود عدالت کو بتا سکتا ہوں کہ میں نے عمداً ایسا کیا تھا۔ اور عدالت مجھے مجرم سمجھے گی تو سزا دے گی۔ کون ہوتے ہو مجھے چارج کرنے والے؟"

دوسرے صحافیوں نے اپنے ساتھی کو بڑی مشکل سے روکا۔ نوجوان زیادہ جوشیلا تھا اور کسی کی سننے پر آمادہ نہ تھا۔ "میں یہ اسٹوری لگاؤں گا آج کے اخبار میں۔ میں کسی وعدے کا پابند نہیں ہوں۔"

"ضرور لگاؤ۔ آئی ڈیم کیئر" جاوید صدیقی اُٹھ کھڑا ہوا۔

میں نے کہا "کیا ہم چوہدری دلاور سے ملنے....."

"فارگیٹ دلاور..... میں کسی کو بھی پریس کے، آپ کے سامنے پیش کرنے کا پابند نہیں۔ ایک مجرم ہے میری تحویل میں۔ میں جانوں اور عدالت جانے۔ تھینک یو ویری مچ۔" وہ ایک دم لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر نکل گیا۔

بنا بنایا کھیل بگڑ گیا تھا۔ کچھ اس رپورٹر کے رویے کی وجہ سے اور کچھ جاوید صدیقی کے غصے کی وجہ سے۔ صحافی اس کیس کی مزید تفصیلات جاننا چاہتے تھے اور اپنے ساتھی پر گرم ہو رہے تھے کہ اگر اس نے برداشت سے کام لیا ہوتا تو صرف جو ہمیں کھٹنے کی بات تھی۔ ان کے پاس چھاپنے کے لیے اس سے کہیں زیادہ دھماکا خیز مواد ہوتا جتنا اس وقت ہے۔

اے ایس پی آفتاب نے ان سب صحافیوں کو معذرت کے ساتھ باہر نکال دیا۔ تھانہ انچارج سے اور دیگر مجرمانہ غفلت کے مرتکب ہونے والے ملزموں سے مزید سوالات کرنا چاہتے تھے۔

محسن نے آہستہ سے کہا "ہمیں موقع سے فائدہ اُٹھانا چاہیے۔ یہاں رہنے سے بہتر ہے ہم پولیس ہیڈ آفس چلیں۔ جاوید صدیقی ہمیں بند کر دے گا وہیں۔"

میں نے کہا "اس کی تو ایسی تیسی۔ ہم صرف چوہدری دلاور سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"کیوں ملنا چاہتے ہیں آخر۔ آپ اس کے وکیل ہیں یا رشتہ دار؟" محسن بولا "عدالت نے انہی کو اجازت دی تھی۔"

رابعہ نے کہا "لیکن یہ تو پتا چلے کہ وہ واقعی چوہدری دلاور ہے۔"

منظر نے سوچ کے کہا "ہاں یار۔ اس بھوتنی والے کی بات نے مجھے بھی تشویش میں مبتلا کر دیا ہے۔ وہ گائے تھی یا بھینس؟"

مولوی خادم حسین اب تک خاموش تھا اور منظر کی طرف تو دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔ جب ہم باہر آئے تو اس نے رابعہ سے کہا "میں اس بدتمیز شخص کے ساتھ نہیں جاؤں گا جی۔"

اس کی بدقسمتی کہ منظر نے سُن لیا "ابے میں کب تیرے جیسے لنگور کو ساتھ بٹھانا چاہتا ہوں۔ وہ تو پتا نہیں کیسے پال رہی تھی ایک بوڑھا اس ریچھ کے بچے کو جس کے منہ کا ہی پتا نہیں چلتا کدھر ہے۔"

خادم حسین خون کے گھونٹ پی کے بھی خاموش رہا۔

محسن بولا "ایسا مت کہو یار۔ اب دیکھو نا مارگریٹ..... میرا مطلب ہے مریم نے بھی تو اسے پسند کر لیا آخر۔"

"عورتوں کو شوہر نہیں کاٹھ کے اُلو زیادہ پسند آتے ہیں۔ شوہر کی ضرورت تھی اسے۔ ایک جوکر بھی مل گیا اور نوکر بھی۔"

مولوی خادم حسین بڑبڑاتا ہوا رابعہ کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ "بس جی ہر بار یہ شخص اس لیے بچ جاتا ہے کہ میرے پاس ریوالور نہیں ہوتا۔ کسی دن آپ کے دفتر میں ہی خون ہو جائے گا اس کا۔"

رابعہ نے گاڑی اسٹارٹ کی "ریوالور خریدو گے اس کے لیے؟"

"نہیں باجی۔ مجھے تو ایسی چیزوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بھی ڈر محسوس ہوتا ہے ورنہ مانگ لیتا آپ سے یا سکندر صاحب سے۔"

"پھر کیا کرو گے؟" میں نے کہا "اس کو تم نے قتل نہ کیا تو یہ تمہیں جلا جلا کے مار ڈالے گا۔ اپنی باتوں سے ہلاک کر دے گا۔"

"نہیں باجی۔ میرے پاس ہے ایک طریقہ۔ اس کی زبان بند ہو جائے گی ہمیشہ کے لیے۔ مسلمان کا قتل ویسے بھی ناجائز ہے اور اس کے بچوں کا خیال آ جاتا ہے۔ ورنہ میں تو بہت پہلے یہ کام کر دیتا۔ وظیفہ ہے میرے پاس زباں بندی کا۔"

"اچھا؟ اس سے آدمی کی زبان بند ہو جاتی ہے ہمیشہ کے لیے؟ گونگا ہو جاتا ہے" رابعہ نے کہا "کہاں سے ملا یہ وظیفہ؟"

"بس جی۔ ایک درویش کا تحفہ ہے۔ میں بہت عاجز تھا اپنی پہلی منکوحہ کی زہریلی قینچی جیسی زبان سے۔ ایک ہزار تو کچھ نہیں ہوتے جی سکون کی خاطر۔"

"درویش نے ایک ہزار ٹھگ لیے تھے تم سے، بے وقوف!"

"ایسا مت کہیں جی۔ درویش نے کچھ نہیں لیا تھا" وہ بولا "اس نے ایک پیسہ نہیں مانگا تھا۔ مجھ سے کہا تھا کہ جس دن شہر میں کوئی گونگا مر جائے ہمیں فوراً بتاؤ اور اس کی قبر کی مٹی لا دو۔ آدھی رات کو جب پورا چاند نکلے گا تو ٹھیک بارہ بجے اس کے سرہانے کی طرف سے ایک تعویذ ملے گا۔ اس پر پانچ تولہ سونے کا خول چڑھاؤ اور اس میں ایک چٹکی اس مٹی کی ڈال دو جو ہم تمہیں پڑھ کر دیں گے۔"

"پھر تم نے یہ سب کیا؟"

"ہاں جی۔ کمال دیکھیں درویش کا۔ نو دن بعد چودھویں رات کا چاند نکلا تو میں نے سرہانے کی طرف سے کھودا۔"

"کس کی قبر تھی، کون تھا وہ گونگا؟"

"اپنے محلے کا ہی آدمی تھا جی۔ کہتے ہیں پہلے منظر صاحب کی طرح بدزبان تھا۔ پھر کسی کی بددعا ایسے لگی کہ زبان بند ہو گئی۔ میں قبر کی مٹی دے آیا تھا۔ پھر سونے کے خول والا تعویذ بھی دے دیا اور اگلے دن انہوں نے تعویذ واپس کر دیا۔ ایک چٹکی مٹی کے ساتھ۔"

میں نے کہا "اور وہ تم واپس وہیں گاڑ آئے تھے۔"

"نہیں جی۔ وہ میرے پاس ہے۔ اس کے استعمال کا طریقہ ہے لیکن میں نے ابھی تک آزمایا نہیں تھا۔ بس میرا دل نہیں مانتا تھا۔"

میں نے کہا "اور اب دل مان رہا ہے؟ منظر کی زبان بند کر دو گے؟"

"ہاں جی۔ گندی زبان کا بند ہو جانا ہی بہتر ہے۔"

رابعہ نے کہا "اچھا پہلے مجھے دکھانا وہ تعویذ، مجھے شک ہے کہ اس درویش نے تمہیں ٹھگ لیا ہوگا۔"

میں نے بھی اس کی تائید کی "اگلے دن اسے پیتل کے خول والا تعویذ دے دیا ہوگا۔"

اس سے پہلے کہ مولوی خادم حسین درویش پر عائد کردہ الزام کی تردید کرتا رابعہ نے گاڑی کو پولیس ہیڈ کوارٹر کے باہر ہی روک لیا۔ ہم پیدل اندر گئے اور ایس ایس پی جاوید صدیقی کے کمرے کی جانب بڑھے۔ اس کی جیپ برآمدے کے سامنے موجود تھی لیکن دروازے پر کھڑے ہوئے کانسٹیبل نے بتایا کہ ایس پی صاحب اندر کسی سے ملنے گئے ہیں۔

ہم انتظار کر سکتے تھے۔ میں چق ہٹا کے اندر داخل ہوا تو میرا خیال تھا کہ اندر کوئی بھی نہیں ہوگا۔ پہلا شاک مجھے لگا۔ پھر میرے بعد آنے والے سب وہاں دلاور کی بیوی' اس کے جواں بیٹے فیصل اور ایک وکیل کو دیکھ کر چونکے جو پہلے سے اندر موجود تھے۔

انہوں نے رابعہ' محسن اور منظر کے سلام کا جواب تک نہیں دیا' ان کے نفرت آمیز رویّے کا اظہار ان کے ماتھے کی ہر شکن سے ہوتا تھا۔ کوئی اور جگہ ہوتی تو وہ ہم پر لعنت بھیج کے چلے جاتے یا سلام کے جواب میں ہمیں گالیاں دیتے لیکن یہاں وہ خون کے گھونٹ پی کر خاموش رہنے پر مجبور تھے صرف وکیل نے اخلاقاً سرہلایا۔ کسی مؤکل کی خاطر وکیل آپس میں نہیں لڑتے۔

جاوید صدیقی تھوڑی دیر بعد آگیا۔ ہمیں دیکھتے ہی اس کا موڈ بگڑ گیا "آپ لوگ یہاں کیوں آئے ہیں؟"

"کیا آپ سے ملنے پر پابندی لگ گئی ہے۔ ناراض ہیں آپ صحافیوں سے اور غصہ وکیلوں پر اُتار رہے ہیں۔" منظر نے کہا۔

"ہمارا تو آپ سے تعلق ختم نہیں ہو سکتا" رابعہ نے کہا۔

جاوید صدیقی نے ناگواری سے کہا "مس رابعہ۔ آپ سے مجھے کوئی شکایت نہیں' اس امپورٹ کیے ہوئے ولایتی وکیل کو سمجھادیں کہ اب یہاں گوروں کی حکومت نہیں ہے۔ یہ کیا سمجھتا ہے آخر خود کو۔"

محسن نے کہا "وہی جو اس نے کہا تھا۔ ہم یہاں چوہدری دلاور کو دیکھنے آئے ہیں۔"

"سوری۔ اس کی اجازت صرف انہیں ہے" جاوید صدیقی نے دوسری طرف اشارہ کیا "آپ لوگ جاسکتے ہیں۔"

میں نے کہا "اس سے کہو کہ جب چوہدری دلاور تمہارے پاس ہے ہی نہیں تو ان سے تم کس کو ملواؤ گے؟"

محسن نے اس کا ترجمہ کیا تو دلاور کی بیوی' بیٹا اور وکیل چونکے "کہاں گیا چوہدری دلاور؟" دلاور کا وکیل بولا۔

"یہ انہی سے پوچھو۔ لیکن یہ وہ دلاور نہیں ہے جس سے تم ملنے آئے ہو۔"

"پھر کون ہے۔ دلاور کہاں ہے؟"

منظر نے کہا "یہ میں تم سے پوچھتا ہوں۔"

"مسٹر منظر۔ اسٹاپ دس نان سنس" جاوید صدیقی نے میز پر مُکا مارا "ورنہ میں....؟"

"ورنہ آپ کیا کریں گے۔" منظر بدستور غیر سنجیدہ رہا "مجھے دھکّے دے کر نکلوادیں گے یا دلاور کے سامنے لے جاکے کھڑا کردیں گے کہ دیکھو یہ کون ہے' تمہارا باپ؟"

فیصل نے غصے سے کہا "اور اگر وہ تمہارا باپ ہوا؟"

"تو میں اس سے کہہ دوں گا کہ میں بن باپ کے ہی بھلا۔ بڑے بڑے حرامی دیکھے ہیں ہم نے جو وقت پڑنے پر گدھے کو بھی باپ بنالیتے ہیں۔ کچھ واقعی گدھے کے بچے ہوتے ہیں۔ رہتے ہیں انسانوں کے درمیان" اس نے غور سے فیصل کو اوپر سے نیچے تک دیکھ کے کہا۔

اس نوجوان لڑکے فیصل میں منظر جیسے شخص کی زبان کا ساتھ دینے کی صلاحیت کہاں تھی۔ مگر اس کا خون گرم تھا اور جوانی کا جوش اس کے جسم میں ایسے بھرا ہوا تھا جیسے کولڈ ڈرنک کی بوتل میں پانی کے ساتھ گیس بھری رہتی ہے۔ وہ مشتعل ہو کے اُٹھا ہی تھا کہ ماں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے بٹھالیا۔

"فیصل! کیا کہا تھا میں نے۔ کوئی کُتّا بھونکے تو اس کو کاٹنا نہیں ہے" اس کی ماں نے کہا۔

میں نے اشارے سے منظر کو روک دیا کہ بات بڑھانے کی ضرورت نہیں۔ اسی وقت کمرے کا پیچھے والا دروازہ کھلا اور ایک کانسٹیبل نے سلیوٹ کرکے کہا "قیدی حاضر ہے سر۔"

جاوید صدیقی اُٹھا "آیئے مسز دلاور۔ آپ بھی آئیں وکیل صاحب۔"

اس نے جانتے بوجھتے ہم سب کو نظر انداز کیا تھا۔ یہ واضح اشارہ تھا کہ ملاقات کی اجازت صرف انہی کو ہے یعنی لواحقین اور قانونی مشیر کو۔ میں شش وپنج میں مبتلا ہوگیا۔ اگر میرا شک وشبہ غلط نہیں تھا تو چوہدری دلاور کی بیوی' اس کا بیٹا اور قانونی مشیر سب سازش میں شریک تھے اور اس ملاقات سے زیادہ توقعات وابستہ کرنا عبث تھا۔

جب وہ اندر چلے گئے تو منظر اور محسن نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ میں نے اشارے سے ان کو صبر کرنے کے لیے کہا۔ ویٹ اینڈ سی۔ رابعہ بے چینی سے کرسی پر پہلو بدل رہی تھی اور بار بار اس بند دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی جس کے پیچھے چوہدری دلاور تھا۔ اس کے بیوی بچے تھے اور ایک وکیل تھا۔ شاید وہ سوچ رہی تھی کہ اچانک دلاور کی بیوی چیخ مارے گی۔ فیصل چلانے لگے گا اور اپنے وکیل کے ساتھ وہ غصے میں پاؤں پٹختے برآمد ہوگا اور جاوید صدیقی سے پوچھے گا کہ کیا ہے یہ سب۔ یہ ہم سے کس قسم کا مذاق کیا گیا ہے۔ یہ تو چوہدری دلاور نہیں ہے جس سے ہمیں ملوایا گیا۔

لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ آدھا گھنٹا گزر گیا۔ پھر دروازہ کھلا اور وہ تینوں بڑے مطمئن انداز میں ایک فاتحانہ مسکراہٹ چہروں پر سجائے نمودار ہوئے۔ جاوید صدیقی ان کے پیچھے تھا۔

"تھینک یو مسٹر صدیقی!" چوہدری دلاور کی بیوی نے کہا۔

"یو آر ویلکم۔" جاوید صدیقی نے خوش اخلاقی سے کہا "عدالت کا حکم تھا اور میں اس کا پابند تھا۔"

وکیل نے کہا "کل کسی وقت میں پھر آؤں گا۔"

"سوری خلیل صاحب۔ اس کے لیے آپ کو پھر عدالت سے رجوع کرنا ہوگا۔"

"کیا مطلب! ہر ملاقات کے لیے مجھے عدالت کے احکامات کی ضرورت ہوگی؟" وکیل نے خفگی سے کہا۔

"ظاہر ہے۔ یہ تو عدالت نے اپنے حکم میں واضح نہیں کیا کہ آپ سب کو ہر روز ملنے دیا جائے۔ آپ نے ملاقات کی درخواست کی تھی۔ وہ منظور ہوگئی۔ آپ نے ملاقات کرلی' میں نے عدالت کا حکم مانا۔"

"آپ خود یہ مطلب نکال رہے ہیں۔"

"اگر مجھے مطلب نکالنا ہوتا تو میں پانچ منٹ دیتا اور یہی کہتا کہ عدالت نے اپنے حکم میں کچھ نہیں کہا کہ کتنی دیر کے لیے ملوایا جائے۔ اس کے برعکس آپ یہ مطلب نکال سکتے ہیں کہ ملاقات کا وقت مقرر نہیں ہے اس لیے ہم رات بھر بیٹھے رہیں گے۔ یہ سب مجھ پر چھوڑ دیا گیا ہے اور میں نے سہولت کے علاوہ معقولیت کے ساتھ آپ کو موقع فراہم کردیا۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم پھر درخواست لگادیں گے۔ یہ بھی طے ہوجائے گا کہ ہم ہفتے میں کتنی بار مل سکتے ہیں اور کتنی دیر کے لیے" وکیل نے کہا "آیئے مسز دلاور۔"

چوہدری دلاور کی بیوی کے ساتھ ہی میں اور محسن باہر نکل آئے کیونکہ منظر پھر جاوید صدیقی سے قانونی بحث میں اُلجھ گیا تھا کہ اب اس کیس میں شناختی پریڈ ضروری ہوگئی ہے۔ یہ طے کرنے کے لیے کہ اصل چوہدری دلاور وہ تھا جو لاش بن کے پڑا ہوا تھا اور فرار ہوگیا یا یہ ہے جو پولیس کی تحویل میں ہے۔

میں نے محسن کی معرفت کہا "مسز دلاور۔ کیا آپ اس ملاقات سے مطمئن ہیں؟"

اس نے تیکھے لہجے میں کہا "میں اس فضول سوال کا مطلب نہیں سمجھی۔"

میں نے کہا "مطلب یہ آپ کو یقین ہے کہ وہ آپ کا شوہر ہی تھا جس سے آپ کو ملوایا گیا تھا؟"

چوہدری دلاور کی بیوی بگڑ گئی "اس گورے وکیل سے کہو کہ اپنے دماغ کا علاج کرائے۔ اور یہاں کس سے ملنے آئی تھی میں آخر۔ اپنے یار سے؟"

فیصل نے لال پیلا ہوکے کہا "دیکھو۔ اس ولایتی کُتّے کو لے جاؤ یہاں سے۔ ورنہ میں اس کی ہڈیاں توڑ دوں گا۔ جان سے ماردوں گا اسے۔"

محسن نے اسے غور سے دیکھا "بیٹا۔ ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔ ابھی سے اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چلنے لگے تو زیادہ دن نہیں جیو گے۔ ایک ہڈی تمہاری گردن میں بھی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ ٹوٹ جائے۔"

"تمہارے منہ میں خاک" فیصل کی ماں نے گھبرا کے کہا۔

"ایسا ہوتا ہے مسز دلاور۔ جب پیروں کے نیچے سے زمین کھینچ لی جاتی ہے اور گلے میں پھندا ہوتا ہے تو گردن کی ہڈی ٹوٹ جاتی ہے۔ آخر کب تک لوگوں کی ہڈیاں توڑے گا یہ شہہ زور۔ کتنے لوگوں کو جان سے مارے گا؟"

فیصل کی ماں اسے کھینچ کر لے گئی۔ وکیل نے محسن سے کہا "یار کیا تم بھی خواہ مخواہ اس بچّے سے اُلجھتے ہو۔"

میں نے کہا "اس سے پھر پوچھ لو۔ کیا یہ چوہدری دلاور سے ملا تھا؟"

اس نے محسن کی بات پر غصے سے کہا "تمہارا دماغ واقعی خراب ہے۔"

ہم جب لوٹ کر جاوید صدیقی کے کمرے میں گئے تو وہاں صرف رابعہ اور منظر تھے۔ ان کے موڈ سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کی جاوید صدیقی سے جھڑپ ہوئی ہوگی۔ خود جاوید صدیقی موجود نہیں تھا۔

اچانک اندر کے کمرے میں کوئی ہنسنے لگا۔ بلند آواز میں قہقہے لگانے لگا۔ یہ ہنسی ہمارے لیے اجنبی تھی۔ پھر ایک فائر ہوا۔

سب سے پہلے میں دوڑا۔ میرے پیچھے محسن اور منظر لپکے۔ ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک فاصلہ ہی کتنا تھا۔ درمیانی دروازے کو عبور کرتے ہی میرے ذہن کو شدید جھٹکا لگا اور میرے قدم ایک لمحے کے لئے رُکے۔ اس منظر نے میری رگوں میں لہو کو منجمد کردیا تھا اور میرے جسم کو مفلوج۔

جاوید صدیقی فرش پر گرا ہوا تھا اور اس کے سر سے اُبلنے والا خون کا سرخ فوارہ ہر طرف چھینٹے اُڑا رہا تھا۔ اس نے خود کو اپنے ہی ریوالور سے گولی مارلی تھی۔

گولی مارنے کی وجہ وہ شخص تھا جو ایک کرسی پر دہشت زدہ بیٹھا تھا۔ وہ دلاور کا ہم شکل ضرور تھا مگر دلاور نہیں تھا۔

یہ صدمے کی شدت کا اثر تھا کہ میں اداکاری بھول گیا اور میں نے بے اختیار گھٹنوں کے بل بیٹھ کے گلوگیر آواز میں کہا "صدیقی۔ یہ تم نے کیا کیا؟"

صدیقی نے مسکرانے کی کوشش کی اور میرا ہاتھ دبایا "سکندر.... ٹیک کیئر۔ خیال رکھو اپنا۔ وِش... وِش یو۔ گڈ لک۔"

یہ آخری الفاظ اس نے رازدارانہ سرگوشی میں بڑی مشکل سے ادا کئے تھے۔ میرے لئے نیک خواہشات کا اظہار کرنے۔ مجھے دُعا دینے اور ایک نذرانۂ خلوص کے طور پر مجھے میرا مقصد یاد دلا کے وہ شخص ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگیا۔ جسے نہ کبھی میں نے اپنا دوست سمجھا تھا اور نہ کہا تھا۔ زندگی کے آخری لمحے میں اس نے پھر ثابت کردیا تھا کہ انسان کی سطحی نگاہ صرف چہرے دیکھتی ہے۔ آدمی کی پہچان نہیں رکھتی۔ کبھی اجنبی جو دوست نظر نہیں آتے۔ دوستی کے لازوال جذبے کی وہ روشنی بن جاتے ہیں جو نگاہوں کو خیرہ کرجاتی ہے اور پھر یوں رخصت ہوجاتے ہیں جیسے ویران اور تاریک اُفق پر شہاب ثاقب پل بھر کے لئے اجالے کی لکیر بناتے اور پھر اندھیرے میں گم ہوجاتے ہیں۔

زندگی کے آخری لمحے میں صدیقی نے مجھے بتادیا کہ سکندر بخت۔ کچھ لوگ دھوکا نہیں کھاتے مگر دوستوں کا دل رکھنے کے لئے ان کے جھوٹ کو بھی سچ مان لیتے ہیں۔ میری وردی اور میرا عہدہ میری شناخت نہیں تھے مگر میرے اور تمہارے درمیان قانونی مجبوری کی یہ خلیج ہمیشہ حائل رہی۔ اسے پاٹنا نہ تمہارے لئے ممکن تھا اور نہ میرے اختیار کی بات تھی۔ شاید یہاں مجھ سے ایک ایسی غلطی اور کوتاہی سرزد ہوگئی جو پیشہ ورانہ بددیانتی اور جرم بھی سمجھی جاسکتی ہے کہ میں نے جانتے بوجھتے ایک ملزم کو گرفتار نہیں کیا جو بھیس بدل کے میرے سامنے موجود تھا لیکن اس کا کفارہ میں نے ادا کردیا ہے۔ اللہ مجھے معاف کرے۔

چند سیکنڈ میں جیتا جاگتا ایس ایس پی جاوید صدیقی اپنے ہی ندامت زدہ لہو میں غرق ایک لاش رہ گیا تھا۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کا وقت پورا ہوگیا تھا چنانچہ اسے ایسے ہی اچانک مرنا تھا اور کسی کے مرنے یا جینے کے انداز میں کیا مصلحت تھی یہ بھی خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ میرے نزدیک نہ وہ مجرم تھا اور نہ گناہ گار۔ خطاکار ہم سب فانی انسان ہیں۔

اس کی مرگِ ناگہاں کا ایک سبب تو یہی تھا کہ وہ بے ضمیر اور بے اصول۔ سازشی اور لالچی۔ سفاک اور دوغلا نہیں تھا۔ جیسے کہ اس کے آس پاس والے دوسرے ماتحت اور افسران تھے۔ وہ اس محکمے میں مس فٹ تھا۔ اس کے مقدر کی دوسری خرابی یہ تھی کہ وہ عام لوگوں سے زیادہ حساس اور خوددار تھا۔ وہ بدنامی کی گرد سے بھی ڈرتا تھا اور رُسوائی کے غبار کو بھی برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ جب کہ لوگ سنگِ دشنام و تیرِالزام سب کچھ ہنس کے جھیل جاتے تھے۔ ایسے بھی تھے کہ ان پر ذلت کا پہاڑ ٹوٹ پڑے تب بھی نہ ان کا سر ندامت سے جھکتا تھا اور نہ آنکھیں۔

جاوید صدیقی کے اور میرے درمیان ہونے والی گفتگو کا گواہ محسن یا منظر کے سوا کوئی نہیں تھا۔ رابعہ ذرا دیر بعد آئی جب ایک ایس ایس پی ایک ملزم پر احسان کا قرض چھوڑ کے اس دنیا سے بھی جاچکا تھا۔ جہاں اب اس کے لئے ہر کس و ناکس کے عائد کردہ نااہلی کے الزامات کی شرمندگی تھی۔ احتساب اور جواب طلبی کی ذلت تھی۔ محکمہ جاتی اور قانونی کارروائی کے عذاب ناک مرحلے تھے اور آخر کار برطرفی تھی یا گرفتاری تھی۔ حق پر ہونے کے باوجود ایسی شکست کا تصور بھی اس کے لئے تماشائے عبرت بن جانے والی موت سے کم نہ تھا چنانچہ اس نے فوراً بلا تذبذب آبرو مندی کے ساتھ مرجانے کا فیصلہ کرلیا۔ اس کا سب سے اچھا دوست اور سب سے بڑا دشمن خود اس کا ضمیر ہی تھا۔

پولیس ہیڈ آفس میں ایک ایس ایس پی کی خودکشی نے کھلبلی مچادی تھی۔ ہمارے بعد وہاں اور نہ جانے کتنے لوگ گھس آئے تھے۔ وہ سب دُکھی تھے اور مشتعل تھے۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ جاوید صدیقی کو کس نے مارا اور کسی نے نہیں مارا تو پھر اچانک اس نے اپنے آفس میں خودکشی کیوں کرلی۔ اب تو وہ باعزت طور پر بحال ہوچکا تھا۔

ہمارے پاس ہر سوال کا جواب تھا مگر ہم خاموش رہے اور اس شخص کو دیکھتے رہے جو چوہدری دلاور بنا بیٹھا تھا مگر چوہدری دلاور نہیں تھا۔ غصے کے جذبات سے مشتعل ہوکے کچھ لوگوں نے اس کی دُھنائی بھی کرڈالی تھی لیکن وہ حلق سے عجیب و غریب آوازیں نکالتا رہا اور چلاتا رہا۔ ہم نے اسے نہ بچایا ہوتا تو شاید اسے بھی مار دیا جاتا۔ جیسے لیاقت باغ کے جلسۂ عام میں قائدِ ملت لیاقت علی خان کو شہید کرنے والے قاتل سیّد اکبر کو خود پولیس کے ایک افسر نے گولی مار کے ہلاک کردیا تھا حالانکہ اس کا فرض بنتا تھا کہ وہ اسے عوام کے غیظ و غضب سے بچاتا۔ اس سے تفتیش کے دوران بہت کچھ معلوم ہوسکتا تھا مگر لیاقت علی خاں کو شہید کرانے والے نہیں چاہتے تھے کہ کسی کو کچھ بھی پتا چلے۔ بے وقوف اور لالچی سیّد اکبر کا کام پورا ہوگیا تو اس کا کام بھی تمام کردیا گیا اور ادائے فرض کے اس شاندار کارنامے پر اس پولیس افسر کو بعد میں ترقی بھی دی گئی۔

نہ جانے کیوں مجھے اس وقت اتنی پُرانی بات یاد آگئی۔ میں نے محسوس کیا کہ نقلی چوہدری دلاور بھی سیّد اکبر کی طرح احمق ہے جو لالچ میں وہ ایک ایسی سازش میں شریک ہوگیا تھا جس کی سنگینی کا خود اسے بھی کوئی اندازہ نہیں تھا۔ چوہدری دلاور کو پولیس کی تحویل سے نکالنے کا منصوبہ انتہائی چالاکی سے بنایا گیا تھا اور اس میں پولیس کے نچلے درجے کے اہلکاروں سے افسر تک سب شریک تھے۔ جیل کے ماتحت عملے کے ساتھ خود جیلر خورشید عالم نے سازش کرنے والوں کا ساتھ دیا تھا اور صاف ظاہر ہے کہ سب نے اپنا اپنا حصہ اپنی اپنی حیثیت کے مطابق وصول کیا تھا۔

نقلی چوہدری دلاور سے تفتیش کی جاتی تو شاید وہ بہت کچھ بتادیتا۔ افشائے راز کے خطرے سے بچنے کا سب سے مؤثر طریقہ یہی تھا کہ اس کھیل میں کلیدی کردار ادا کرنے والے کو ہی ختم کردیا جائے۔ ہم نے اسے وقتی طور پر بچالیا تھا مگر وہ اب بھی پولیس کی تحویل میں ہی تھا۔

چند منٹ بعد ڈی آئی جی آصف جاہ بڑے وقار کے ساتھ اور انتہائی پُرسکون انداز میں وارد ہوا۔ اس کے چہرے پر مصنوعی پریشانی یا ظاہری تشویش کے آثار تک نہ تھے۔ وہ دراز قد اور دلکش شخصیت کا مالک تھا۔

اس نے آتے ہی سب کو باہر نکال دیا۔ سب میں ایس ایس پی ارشد کریم ربانی شامل نہیں تھا جو ضرورت سے زیادہ رنجیدہ اور سنجیدہ نظر آنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ یہ ہم چند لوگ جانتے تھے کہ اس کی یہ اداکاری بھی کتنی بھونڈی اور قابلِ نفرت ہے۔ دل ہی دل میں اس سے زیادہ خوش کون ہوسکتا تھا کہ تاج و تخت کی اس لڑائی میں اسے پسپا کردینے والے کو موت نے پسپا کردیا تھا۔ شاید ربانی کی نظر میں وہ بہت بے وقوف تھا جس نے خواہ مخواہ اصولی

"...ہیں کیا معلوم مرتے مرتے وہ ہم سے کیا کہہ گئے تھے۔"

ڈی آئی جی کے چہرے کا تاثر بدل گیا "کچھ کہا تھا صدیقی ...؟"

"جی ہیں، جو انہوں نے کہا تھا وہ میں نے ہی نہیں، منظر صاحب نے بھی سُنا تھا اور مس رابعہ قاری نے بھی۔" محسن بولا۔

"کیا کہا تھا انہوں نے؟" ارشد کریم ربانی محتاط ہوگیا۔

"انہوں نے کہا تھا۔ یہ سب ربانی کا کیا دھرا ہے۔" محسن نے ...رے اعتماد کے ساتھ بڑے مضبوط لہجے میں جھوٹ بولا۔

ارشد کریم ربانی کا رنگ فق ہوگیا "یہ.... کیسے ہوسکتا ہے ...ب سی بات ہے۔"

منظر نے کہا "جو واقعہ ہوجائے اس کے بارے میں یہ کہنا کہ ...یا کیسے ہوسکتا ہے۔ بے وقوفی ہے۔"

"جو ہم نے سُنا ہے وہ ہم جانتے ہیں۔" رابعہ بولی "اور بہت ...بلد سب جان لیں گے۔ تفتیش کرنا واقعی ہمارا کام نہیں ہے۔ ڈی ...آئی جی صاحب فرما چکے ہیں۔"

منظر نے سرہلایا "ویسے تو آپ لوگ بادشاہ ہو۔ چاہو تو اس سیدھے سادے خودکشی کے کیس کو قتل بنادو۔ الزام انہی پر لگادو جو گواہ ہیں یا اپنے جعلی چوہدری دلاور پر۔"

"اپنے سے کیا مطلب ہے آخر آپ کا۔" ربانی گرم ہوگیا۔

"اسے کہتے ہیں چور کی داڑھی میں بانس۔ تنکا تو بہت چھوٹا ہوتا ہے۔" منظر بولا "کیا تم اسے اپنا سمجھتے ہو؟"

"نہیں سمجھتے تو پھر اس لفظ پر خفگی کیوں؟" محسن بولا۔

"یہ تو چوہدری دلاور کے بات کرنے کا انداز ہے۔ وہ آپ کے سامنے ہوگا تو اسی طرح کہے گا کہ اپنے ربانی صاحب۔" منظر بولا۔

"او کے۔ او کے ہم فضول باتوں میں وقت ضائع کررہے ہیں۔ چلیں اُدھر دوسرے کمرے میں بیٹھ کے بات کرتے ہیں۔ یہ جو کچھ ہوا۔ انتہائی غیر متوقع اور افسوس ناک ہے۔ صدیقی ہمارے محکمے کا قابلِ فخر افسر تھا۔" ڈی آئی جی اٹھ کھڑا ہوا۔

"اسی لئے معطل بھی آپ نے ہی کیا تھا۔" رابعہ بولی۔

"مس رابعہ۔ طنز کرنے کی ضرورت نہیں۔ غلطی ہر آدمی سے ہوتی ہے اور غلط فہمی میں غلط فیصلے بھی ہوجاتے ہیں۔" ڈی آئی جی نے خود کو خفت سے بچایا "مجموعی طور پر وہ بہت محنتی اور ایماندار افسر تھا۔"

"شاید اب اس جیسا کوئی نہیں رہا۔" منظر نے کہا۔

ڈی آئی جی نے وہی سیٹ سنبھال لی جس پر کچھ دیر پہلے جاوید صدیقی بیٹھا ہوا تھا "ون مین شو کبھی نہیں ہوتا مسٹر منظر۔ کم علمی یا لاعلمی کے باعث کوئی ایسا سمجھتا ہے تو یہ اس کی مرضی۔ اب پلیز۔ مجھے بتائیں کہ یہ حادثہ اچانک کیسے ہوا؟ کس نے سب سے پہلے دیکھا اور کیا دیکھا؟"

محسن نے میری طرف اشارہ کیا "گولی چلنے کی آواز پر یہ سب بات پر افسروں سے بھی ٹکر لی۔ اپنا نقصان بھی کیا۔ پریشانی بھی اُٹھائی اور پھر ایک معمولی سی بات پر خود اپنے ہاتھوں اپنی جان لے لی۔ ایسے معاملات تو پیش آتے ہی رہتے ہیں۔ ایس ایس پی کی نوکری پکی ہوتی ہے اس کا کچھ نہیں بگڑتا اگر وہ خود سارے زمانے سے نہ بگاڑے۔

"ربانی۔ سب کو باہر نکال کے پہرے پر مسلح گارڈ لگادو۔"

"یس سر۔"

"کوئی... اندر آئے گا نہ باہر جائے گا۔"

"یس سر۔"

"باہر جانے والے سب راستے بند کردو۔ دوسرے سب راستوں کو بھی دیکھو۔"

"یس سر۔" ربانی ہر بار اٹن شن ہوجاتا تھا۔

"ہمارے ایکسچینج کو بلاک کرادو۔ نہ کوئی کال باہر جائے گی نہ ریسیو ہوگی۔"

"یس سر۔"

منظر نے سنجیدگی سے کہا "کیا ان حفاظتی انتظامات کا مقصد قاتل کو فرار ہونے سے روکنا ہے؟"

"آپ کو سنجیدہ ہوجانا چاہئے منظر صاحب۔" ڈی آئی جی نے ناگواری سے کہا۔

"اس سے زیادہ سنجیدہ میں کبھی نہیں ہوا۔ اور میرے سوال میں آپ کو بھلا کون سی بات مضحکہ خیز لگی ہے؟"

اب رابعہ نے کہا "یہ قتل کا کیس تو ہے نہیں۔"

"ویری گڈ۔ آپ نے تفتیش مکمل کرلی اور نتیجہ بھی اخذ کرلیا۔ مس رابعہ میں آپ کے قانونی طریق کار میں دخل نہیں دیتا۔ آپ پولیس کے طریقِ کار میں دخل اندازی مت کریں۔ پلیز۔"

منظر بولا "ٹھیک ہے۔ آپ کریں ضابطے کی کارروائی۔ ہم بیٹھے ہیں۔"

"آپ بھی چلیں باہر۔" ارشد کریم ربانی نے توہین آمیز انداز میں انگلی ہلا کے منظر کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔

منظر نے متاثر ہوئے بغیر کہا "میرا خیال ہے کہ تم باہر چلو۔ مجھے کچھ خاص بات کرنی ہے ڈی آئی جی سے۔"

محسن نے کہا "ہاں چشم دید گواہ تو ہم ہی ہیں۔"

"یعنی ایس ایس پی صاحب نے آپ کے سامنے خودکشی کرلی تھی۔" ارشد کریم ربانی بولا "اور آپ دیکھتے رہے۔"

"ایسی باتیں کرکے خود کو ایک نااہل پولیس افسر مت ثابت کرو ربانی صاحب۔ اور سوچ سمجھ کے بولو۔" منظر نے کہا "تمہاری زبان سے نکلنے والے ہر لفظ کو اور لوگ بھی سُن رہے ہیں۔"

محسن نے کہا "فائر کی آواز پر سب سے پہلے ہم اندر پہنچے تھے اور اس وقت صدیقی صاحب زندہ تھے۔ تم تو بہت دیر بعد پہنچے تھے۔

سے پہلے اندر پہنچے تھے نگران کے ساتھ ہی میں بھی اندر گیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ پانچ سیکنڈ میں ہم سب اندر تھے۔ جو ایک نے دیکھا وہ سب نے دیکھا اور جو ایک نے سُنا وہ سب نے سُنا۔"

"اور سُنا وہی جو مرحوم جاوید صدیقی نے کہا تھا۔" منظر بولا۔

رابعہ بولی "رہی یہ بات کہ حادثہ کیسے ہوا تو ڈی آئی جی صاحب عام آدمی کے نزدیک حادثہ وہی ہوتا ہے جو اچانک پیش آتا ہے' جس کو غیر متوقع سمجھا جاتا ہے اور جس سے بچاؤ کے لئے پیش بندی ممکن نہیں ہوتی۔ ایسا نہ ہو تو وہ افسوس ناک واقعہ کہلائے گا یا سانحہ۔ لیکن ایک خیال اور بھی ہے۔ قدرے فلسفیانہ۔ کہ۔

وقت کرتا ہے پرورش برسوں
حادثہ ایک دم نہیں ہوتا"

ڈی آئی جی مسکرایا "میں فلسفہ ذرا کم ہی سمجھتا ہوں۔"

"میں سمجھاتی ہوں آپ کو۔ دیکھنے میں یہ حادثہ تھا۔ اچانک اور غیر متوقع پیش آنے والا دردناک واقعہ۔ کہا جاسکتا ہے کہ اس کے بارے میں پہلے سے اندازہ کرنا مشکل تھا لیکن ایسا نہیں ہے۔ اس کے اسباب پہلے سے پیدا کردیے گئے تھے۔ وہ باہمت تھا اور آسانی سے ہار ماننے والا نہیں تھا۔ گزشتہ چند دن کے واقعات پر غور فرمایئے۔ کس کس طرح اس کو محصور کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ میں کسی ایک کا نام کیا لوں اسے تو خود اس کے دوستوں نے دھوکا دیا۔ وہ اپنے استعفیٰ میں سب لکھ چکا تھا اور اس نے عدالت میں بھی ہر بات بتادی تھی۔ نتائج کی پروا کئے بغیر۔ وہ ڈرتا نہیں تھا نوکری جانے سے۔ انتہا یہ ہے کہ وہ بیوی بچوں والا تھا مگر پھر بھی دشمنوں کے عزائم اس کے ارادوں کو نہ بدل سکے۔"

"مس رابعہ۔ خودکشی کرنے والے بزدل ہوتے ہیں۔"

"غیرت مند بھی خودکشی کرلیتے ہیں۔ اور وہ بھی جو اتنے حساس ہوتے ہیں کہ اپنے ضمیر کو نہیں مار سکتے۔ جو ذلت اور رسوائی کے ساتھ جینے پر مرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔" منظر نے برہمی سے کہا "اس کے خلاف سب ایک ہوگئے تھے۔ چوہدری دلاور کے سب حمایتی۔ زرخرید اور دشمن۔ ان سب نے آخرکار اسے مار ڈالا۔ میں اسے خودکشی نہیں قتل قرار دیتا ہوں۔ ڈی آئی جی صاحب جس میں آپ بھی شریک ہیں۔"

"اتنا جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں مسٹر منظر۔"

"یہ جذباتی بات نہیں حقیقت ہے۔ کیا آپ انکار کرسکتے ہیں اس بات سے کہ آپ نے اس پر کتنا دباؤ ڈالا تھا کہ وہ عدالت میں جھوٹ بولے۔ جھوٹا بیانِ حلفی داخل کرے۔ اس کے انکار پر کسی قانونی جواز کے بغیر ارشد کریم ربانی کو اس کی جگہ لایا گیا۔ صدیقی کو مجبور کردیا گیا کہ وہ جان بچانے کے لئے روپوش ہوجائے۔ اس کے بیوی بچّوں کو بھی نہیں بخشا گیا اور وہ انہیں ان کی جان بچانے کے لئے گھر سے بے گھر کرنے پر مجبور رہا۔ کیا یہ سب جھوٹ ہے۔ اس کو بحال کیا تھا آپ نے خود کو بچانے کے لئے۔ اس سے پہلے کہ صدیقی کے بیان کا عدالت نوٹس لیتی اور غیر قانونی اختیارات کا ناجائز استعمال کرنے والے زیرِ عتاب آتے۔"

"ناؤ دِل یو پلیز شٹ اَپ۔" ڈی آئی جی نے دہاڑ کے کہا۔

"نہیں۔ تم ایسے مجھے خاموش نہیں کرسکتے۔" منظر نے جواب میں زیادہ بلند آواز کے ساتھ میز پر مُکا مارا "ہمت ہے تو بند کرا دو میری زبان۔ مجھے بند کرادو۔ لیکن باقی سب کے ساتھ تم کیا کرو گے؟ ان کی اور میری زبان ایک ہی بات کہے گی۔ ایس ایس پی جاوید صدیقی کو قتل کیا گیا ہے۔"

"جاؤ پھر میرے خلاف ایف آئی آر درج کرادو۔"

"صرف تمہارے خلاف کیوں۔ اس کے قاتلوں میں خورشید عالم جیلر بھی شامل ہے۔ جو اس کا دوست تھا۔ جس پر وہ اعتماد کرتا تھا۔ وہ سب جنہوں نے مل کے چوہدری دلاور کو پولیس کی تحویل سے نکل جانے کا موقع فراہم کیا تھا۔ اس کے لئے ایک ایسی اسکیم بنائی تھی جو شیطانی ذہانت کا شاہکار تھی۔ تم جسے محنتی اور ایماندار افسر کہہ رہے ہو اسے تم سب نے مجرم بنادیا تھا۔ دلاور کو فرار کرانے کا منصوبہ تم سب کی کوشش سے کامیاب ہوا مگر الزام آیا ایس ایس پی جاوید صدیقی پر۔ آج اس کے منہ پر کہا گیا کہ وہ بے وقوف ہے۔ ایک لاش میں اور زندہ انسان میں فرق محسوس نہیں کرسکا۔ اصلی اور جعلی دلاور کو نہ پہچان سکا۔ اس نے بڑی محنت سے چوہدری دلاور کو گرفتار کیا تھا۔ بہت سے خطرات مول لے کر اسے اپنی ذمّے داری پر جیل میں رکھا تھا۔ اس نے رشوت کی طاقت کا اپنے ایمان کی قوت سے مقابلہ کیا تھا۔ اس نے ہر دھمکی کو نظرانداز کردیا تھا۔ محکمے کے دباؤ میں نہیں آیا تھا۔ اس نے بڑی ذہانت سے کام لیا تھا اور بالکل صحیح پیش بندی کی تھی کہ زندہ دلاور کو مُردہ خانے میں رکھا تھا اور ایک جعلی دلاور کی لاش تھانے میں رکھوادی تھی۔ مگر آخرکار ہوا کیا؟ وہ سب جیت گئے جو اس کے خلاف متحد ہوچکے تھے۔ جو بِک چکے تھے۔ جو ناممکن تھا وہ ممکن ہوگیا۔ مکاری عیاری اور فریب کے سامنے اس کی ذہانت ناکام ہوگئی۔ اب کہا جارہا تھا کہ اس نے حماقت کی تھی۔ جانتے بوجھتے ایسا کیا تھا کیونکہ اس کی ہمت جواب دے گئی تھی اور اس کا ایمان کمزور پڑ گیا تھا۔ اچانک اس پر انکشاف ہوا کہ اصل چوہدری دلاور تو نکل گیا ہے اور اس کے پاس جعلی دلاور رہ گیا ہے۔ جسے نہ وہ عدالت میں پیش کرسکتا ہے اور نہ پبلک کے سامنے۔ وہ اچانک مجرم بن گیا ہے کہ اس نے دلاور کو گرفتار کرنے کے بعد فرار کرادیا۔ اس کا دوسرا جرم یہ ہوتا کہ اس نے ایک ہم شکل شخص کو بِلاوجہ گرفتار کرکے غیر قانونی حراست میں رکھا۔ کون یقین کرتا اس کی بات پر کہ اصل دلاور ایک لاش تھی اور وہ لاش تھانے سے فرار ہوگئی۔ کل سارا زمانہ اس پر ہنستا۔ سب اسے جھوٹا کہتے۔ اس پر الزام آتا کہ اپنی قیمت بڑھانے کے لئے اس نے ایمانداری اور فرض شناسی کا ڈراما کیا تھا۔ دلاور نے اسے خرید ہی لیا آخرکار۔

رابعہ نے فوراً صورتِ حال کو مزید خراب ہونے سے بچالیا "خیر آپ اس شخص کو بُلا کے پوچھتے کیوں نہیں کہ وہ کون ہے؟"

"کیا یہ ضروری ہے کہ تفتیش آپ کے سامنے ہو۔" ڈی آئی جی نے کہا۔

"ہم اس جعلی دلاور سے ملنا چاہتے ہیں۔" محسن نے کہا "اس سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ اس کی کس بات نے اچانک صدیقی کو خودکشی پر مجبور کردیا تھا۔"

"یہ بات بھی معلوم ہوجائے گی آپ کو۔"

"لیکن آپ کی معرفت؟" رابعہ نے کہا۔

منظر بولا "یا اس وقت جب وہ آپ کی مرضی کا بیان دینے کے قابل ہوجائے گا۔"

میں نے محسن سے کہا "ان سے کہہ دو کہ ہم صرف اس کی ذہنی جسمانی کیفیت کے بارے میں اپنا اطمینان چاہتے ہیں اور صرف ایک ایک سوال کریں گے جس کا تعلق نہ چوہدری دلاور سے ہوگا اور نہ صدیقی کی موت سے۔"

محسن نے میری بات دُہرادی اور ڈی آئی جی نے کچھ سوچ کے رضامندی کا اظہار کردیا۔ اس نے گھنٹی بجا کے ارشد کریم ربانی کو طلب کیا۔

"ربانی کیا کررہے ہو تم؟ لاش اُٹھوانے کا بندوبست کیا ہے یا نہیں؟"

"ہوگیا ہے سر۔"

"ورثا حسین کو مطلع کردو۔ ان سے پوچھ لینا کہ تدفین کب اور کہاں ہوگی۔"

"یس سر۔"

"وہ ملزم کہاں ہے؟"

"اندر حوالات میں ہے سر۔" ربانی نے مشکوک نظروں سے ہمیں دیکھا۔

ڈی آئی جی نے کہا "اسے یہاں لاؤ۔"

"وہ کس لئے سر؟"

"یہ لوگ اس سے ملنا چاہتے ہیں۔" ڈی آئی جی نے کہا۔

"لیکن اس سے تفتیش جاری ہے۔"

"ربانی۔ اپنے لئے مشکلات میں اضافہ مت کرو۔ اسے لے آؤ۔"

کچھ دیر بعد جعلی دلاور کو پیش کیا گیا تو اس کی حالت سے ہی تفتیش کی نوعیت کا اندازہ ہوتا تھا۔ اس کے چہرے اور جسم پر مار پیٹ کے نشانات نمایاں تھے۔ وہ درد سے کراہ رہا تھا۔ کانپ رہا تھا اور رو رہا تھا۔

"اچھی خاصی تفتیش کرڈالی تم نے ایس ایس پی صاحب۔" منظر بولا۔

رابعہ نے کہا "آخر کیا معلوم ہوا؟"

جب اس نے خود اپنی آنکھوں سے اس جعلی دلاور کو دیکھ لیا اور اس سے مل کے یقین کرلیا کہ ذلت و رسوائی اس کا مقدر ہوچکی ہے اور اب کوئی اسے تباہی سے نہیں بچا سکتا تو اس کے لئے مرجانے کے سوا چارہ نہ رہا۔ میں تم سب کو مبارکباد دیتا ہوں کہ تم آخرکار اسے کارنر کرنے میں کامیاب ہوگئے اور تمہارے راستے کا سب سے بڑا پتھر ہٹ گیا۔"

ڈی آئی جی نے خلافِ توقع بہت صبروسکون کے ساتھ منظر کی بات سُنی تھی۔ شاید اس نے اندازہ کرلیا تھا کہ وہ اپنا دفاع نہیں کرسکتا۔ صدیقی کے معاملے میں پولیس کا مؤقف پہلے ہی کمزور تھا اور اس نے خودکشی بھی ایسے وقت میں کی تھی کہ اس واردات کے عینی گواہ نہ بنائے جاسکتے تھے اور نہ بدلے جاسکتے تھے۔ پھر محسن نے جو بیان صدیقی سے منسوب کردیا تھا وہ بھی کم پریشان کُن نہ تھا مگر خود ڈی آئی جی صاحب کی ذات ان معاملات سے بالاتر تھی۔ اس نے صدیقی کو معطل ضرور کیا تھا مگر پھر بحال بھی کردیا تھا۔ ایسا غلط فہمی کی بنا پر ہوا تھا اور غلط فہمی پیدا کی تھی نیچے والوں نے۔ اب اس نے مرتے مرتے کہہ دیا تھا کہ یہ سب ارشد کریم ربانی کا کیا دھرا ہے۔ تو اسے کیا۔ وہ تحقیقات کا حکم دے سکتا ہے۔ اس بیان کی بنیاد پر ارشد کریم ربانی کے خلاف کوئی قانونی کارروائی نہیں ہوسکتی۔ بعد میں تحقیقات کی رپورٹ اسی کے سامنے آئے گی تو دیکھا جائے گا۔ یہ تو معمولی سا خودکشی کا کیس ہے۔ یہاں بڑے بڑے تفتیشی ٹریبونل اور عدالتی کمیشن بنائے گئے اور انہوں نے مہینوں یا برسوں وقت اور پیسہ ضائع کرکے رپورٹ بھی مرتب کی مگر ایسی درجنوں رپورٹیں حکومت کے سرد خانے میں پڑی ہیں اور ان کی اشاعت کے لئے چیخ پکار مچانے والے بھی تھک ہار کے پُرانی باتوں کو بھول گئے ہیں۔

"آپ کے دل کا غبار نکل گیا یا کچھ باقی ہے منظر صاحب۔" ڈی آئی جی نے پُرسکون لہجے میں کہا "آپ میں سے اور کوئی بولنا چاہتا ہے تو ضرور بولے۔ میری طرف سے اجازت ہے۔"

"بڑی مہربانی ہے جناب کی۔ میں نے بھی اپنی گلی کے کُتّوں کو بھونکنے کی اجازت دے رکھی ہے۔" منظر نے تلخی سے کہا "پھر بھی ڈر لگتا ہے کہ کہیں کاٹ نہ لیں۔"

"میں نہ بھونکنے والے کُتّوں سے ڈرتا ہوں نہ کاٹنے والے کُتّوں سے۔"

"میں نے یہ بھی دیکھا ہے ڈی آئی جی صاحب کہ گلی کے کُتّے ایک دوسرے سے بالکل نہیں ڈرتے۔" منظر بولا۔

ڈی آئی جی کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا "آپ حد سے بڑھ رہے ہیں منظر صاحب۔"

"کون سی حد۔ مجھے تو اپنی حد کا بھی علم نہیں۔ شرافت اور انسانیت کی تو حد ہوتی ہے۔ بدمعاشی کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ آپ کے قانونی اختیارات کی کوئی حد نہیں ہے۔"

ڈی آئی جی نے کہا "اب آپ لوگ ایک ایک سوال کرلیں تو ہم بھی اپنا کام کریں۔"

اس شخص میں اور دلاور میں حیرت انگیز مماثلت تھی۔ پینتالیس دن ہماری قید میں اور ایک ہفتہ جیل میں گزارنے کے دوران دلاور نے شیو نہیں بنائی تھی۔ اس کی داڑھی بہت بڑھ گئی تھی اور ویسی ہی داڑھی اس شخص کی تھی۔ داڑھی نے چہرے کے نچلے حصّے کے نقوش کا فرق چھپالیا تھا لیکن یکسانیت کے تاثر میں اضافہ کردیا تھا۔ دونوں کی داڑھی مشت بھر اور ناہموار تھی اور داڑھی کے بال بھی آدھے سے زیادہ سفید تھے۔ یہی کیفیت سر کے بالوں کی تھی جو ایک جیسے تھے۔ چوہدری دلاور پچاس سال کا ہونے کے باوجود کہیں سے بھی گنجا نظر نہیں آتا تھا۔ اس دوسرے شخص کے بال عمداً اسی طرح بنائے گئے تھے جیسے چوہدری دلاور رکھتا تھا۔

فرق غور سے دیکھنے پر آنکھوں میں نظر آتا تھا۔ چوہدری دلاور کی آنکھوں میں اعتماد اور غرور کی جارحانہ کیفیت نظر آتی تھی، اس شخص کی آنکھوں میں دُکھ بھری مظلومیت تھی اور خوف تھا۔ چوہدری دلاور اتنی دیر بولے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ یہ شخص بالکل خاموش تھا۔

رابعہ نے پہلا سوال کیا "اپنا نام پیشہ اور پتا بتاؤ۔"

"علیم الدین ولد چراغ دین ساکن داروغہ والا۔ عقب مسلم گرلز اسکول معرفت شاہ جی ٹیلر ماسٹر۔" اس نے ایک سانس میں یوں کہا جیسے وہ اس بات کے لئے پہلے سے تیار تھا۔

شاید پولیس نے اس سے یہ سوال اتنی بار کیا تھا کہ اب وہ ادھورا جواب دینے کی غلطی نہیں کرتا تھا یا پھر خود پولیس نے اسے یہ شناخت دی تھی اور اسے یہ جواب رٹا دیا تھا۔

محسن نے کہا "تم کو عدالت سے کس جرم میں جیل کی سزا ہوئی تھی؟"

اس نے ڈی آئی جی کی طرف بے بسی سے دیکھا "میں... میں نے چوری کی تھی۔"

ربانی نے غرا کے کہا "پورا جواب دے۔"

"ہاں جی.... بتاتا ہوں جی۔ میں نے کبوتر چوری کئے تھے۔" وہ خلا میں دیکھتے ہوئے کچھ یاد کرنے کی کوشش کرتا رہا "اور.... جوتے چُرائے تھے مسجد سے اور.... اور ہاں جی ایک ریڈیو۔ ٹھیک ہے نا جی۔"

ربانی نے اس کی گُدّی پر جھانپڑ مارا "مجھ سے کیوں پوچھتا ہے کُتے؟"

منظر نے کہا "ربانی صاحب اگر آپ کے ہاتھوں میں کُھجلی ہورہی ہے تفتیش کی تو آپ اندر جا کے حوالات میں اس تکلیف کا علاج کرلیں۔ ورنہ مجھے ڈر ہے کہ میرے کسی سوال پر زیادہ گرمی آگئی تو آپ مجھے ہاتھ ماردیں گے۔ یہ تو پہلے ہی آپ کا پڑھایا ہوا سبق دُہرا رہا ہے مگر ابھی نیا اور کچا شاگرد ہے اس لئے پوچھ لیتا ہے کہ میں نے غلطی تو نہیں کی۔"

ڈی آئی جی نے ناگواری سے کہا "ربانی تم دخل مت دو۔ بیٹھ جاؤ آرام سے۔"

"ویسے بھی اس ماحول میں جہاں آپ فرشتۂ اجل کی طر[ح] پر سوار ہوں گے یہ کیسے سچ بولے گا لیکن کوئی بات نہیں۔ [ڈی آئی] جی صاحب نے ایک ایک سوال کی اجازت دی ہے تو میں بھی ضرور کروں گا۔ اتنا تجربہ ہوگیا ہے میرا اس پیشے میں کہ جھو[ٹ کے] سات پردوں میں بھی سچ نظر آجاتا ہے سمجھے آپ ربانی صاح[ب]" منظر بولا پھر وہ ملزم سے مخاطب ہوگیا "دیکھو بیٹا۔ ہم جانتے ہ[یں] پولیس کے چُنگل میں ہو اس لئے اپنی مرضی سے جھوٹ بھی بول سکتے۔ لیکن ہمت ہے تو اس موقع سے فائدہ اُٹھالو۔ ہم بہت بڑے وکیل ہیں۔ کسی کو بھی اپنا وکیل بنالو۔"

ڈی آئی جی نے اعتراض کیا "یہ آپ کیا کررہے ہیں۔"

"میں ایک ملزم کو قانونی مشورہ دے رہا ہوں۔" منظر...

"کیا یہ بھی غیرقانونی کام ہے؟ یہ ٹھیک ہے کہ بعد میں یہ تم[ہاری] کھال میں بھس بھردیں گے اگر تم نے سچ بولا۔ لیکن تم لاوا[رث] نہیں رہو گے۔ اگر خدا کے بعد کوئی تمہیں بچا سکتا ہے تو ہم۔ ابھی پولیس تم کو استعمال کررہی ہے۔ جب تمہارا مصرف کوئی رہے گا تو شاید تم بھی نہیں رہو گے۔ ایسے غائب ہوجاؤ گے کبھی تھے ہی نہیں۔"

ڈی آئی جی اُٹھ کھڑا ہوا "ربانی۔ اسے اندر لے جاؤ۔"

منظر نے کہا "ایک منٹ سر۔ میں ایک سوال تو کرلوں؟"

"نہیں آپ نے ناجائز فائدہ اُٹھایا۔"

"علیم کتنی سزا ہوئی تھی تمہیں اور کس عدالت سے؟"

ربانی بڑی پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ لیکن علیم الدین پہنچنے کے لئے اسے ہمارے پیچھے سے گھوم کے جاتا تھا۔ منظر بھاری بھرکم آدمی تھا اور کرسی پر بیٹھتا نہیں تھا اس میں دھنس فٹ ہوجاتا تھا۔ اسے پاؤں پھیلانے کے لئے بھی زیادہ جگہ ضرورت پڑتی تھی۔ اس نے اپنی کرسی میز سے کچھ دور کرلی ربانی کے لئے دیوار اور کرسی کے درمیانی فاصلے سے گزرنا ہوگیا۔ کوئی ہلکا پھلکا آدمی ہوتا تو وہ پشت کو آگے دھکیل کر نکل مگر منظر کو ہلانا کسی پہاڑ کو ہلانے سے کم مشکل کام نہ تھا۔

علیم سخت مشکل میں پڑگیا تھا۔ اسے فوراً فیصلہ کرنا تھا ردِعمل میں ہونے والے پولیس کے تشدد سے بھی خائف تھا موقع بھی کھونا نہیں چاہتا تھا۔ آخر کار اس نے ہکلاتے ہو[ئے] "کسی... کسی عدالت سے نہیں جی۔ کوئی سزا نہیں ہوئی تھی مجھے۔"

ربانی نے برہمی سے کہا "وکیل صاحب راستہ دیں مجھے۔"

منظر نے متاثر ہوئے بغیر کہا "تمہارا راستہ کون روک سکتا ہے ربانی صاحب۔ شیطان کے سوا۔" اور کرسی کو تھوڑا سا [آگے] کرلیا۔

[انہو]ں نے سب کا حوصلہ چھین لیا تھا۔ لگتا تھا اب کرنے کو کچھ بھی نہیں رہا۔ ہم ایک جیتی ہوئی بازی پھر ہار گئے تھے اور فوری طور پر خود مجھے بھی کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ چوہدری دلاور کے خلاف میری آئندہ کیا حکمتِ عملی ہوگی۔ قانونی اور غیرقانونی۔ دونوں طریقوں سے ابھی تک اس کی دولت نے اور فطانت نے ہم سب کی متحدہ کوششوں کو ناکام کردیا تھا۔ وہ ابھی تک آزاد تھا اور اس کے خلاف سارے جرائم کا ثبوت مہیا ہونے کے باوجود وہ قانون کی گرفت میں نہیں آیا تھا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ خود قانون کے لمبے ہاتھ چھوٹے ہوگئے تھے اور ڈھیلے پڑگئے تھے۔ یہی سب سے بڑی خرابی تھی کہ لاوارث اور بے زر پکڑے جارہے تھے خواہ انہوں نے کچھ بھی نہ کیا ہو اور جو بڑے بڑے مجرم تھے وہ سب کچھ کرنے کے باوجود قانون کے خوف سے بے نیاز گھوم رہے تھے۔ وہ جو محنت کرکے آدھی رات تک گلی گلی صدا لگا کے مونگ پھلی بیچتا تھا اور محنت سے رزقِ حلال کماتا تھا بے عزت تھا اور جو ایک ٹیلی فون کال پر ملک کے خزانے سے لاکھوں چُرالیتا تھا عزت دار کہلاتا تھا۔

منظر کو اتنا تلخ اور سنجیدہ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ میرے ساتھ ہی باہر نکلا تھا مگر اس کا موڈ بہت خراب تھا۔

میں نے کہا "آپ کا کہاں کا ارادہ ہے۔"

"جہنم میں جانے کا۔ بھوتنی کے" وہ چڑ کے بولا "لیکن تمہارے ساتھ نہیں۔"

"یار دوست تو ہر جگہ ساتھ ہی جاتے ہیں" میں نے اس کا موڈ ٹھیک کرنے کے لئے کہا۔

"بھاڑ میں گئی دوستی۔ جو خود کو تمہارا دوست سمجھتا ہے وہ دنیا کا سب سے بڑا اُلو کا پٹھا ہے۔"

"مثلاً تم۔" میں نے کہا۔

"دیکھو یار۔ خدا کے لئے تم کہیں چلے جاؤ۔ رابعہ اور تم اس شہر سے ہی نہیں اس ملک سے بھی چلے جاؤ۔ مت کرو شادی وادی بس جتنا پیسہ ملے سمیٹ کر دفع ہوجاؤ۔ وہ جو تمہارے باپ کا خاندانی محل ہے نا اور جو رابعہ کے آبائی گھر کی منحوس زمین ہے۔ یہ سب بیچ کے بھاگ جاؤ اگر زندہ رہنا چاہتے ہو۔ ورنہ کسی دن ہم سب بھی ایسے ہی مارے جائیں گے جیسے آج صدیقی مارا گیا۔"

میں نے برا نہیں مانا کیونکہ منظر کا غصے میں ہونا برحق تھا "صدیقی تو غیرت مند تھا اور آدمی تھا۔"

"ٹھیک ہے میں گدھا ہوں اور بے غیرت ہوں۔ لیکن تم بھی کھانا جان چھوڑو۔ چھوڑو سارے جھگڑے۔ عیش کرو بھوتنی کے۔ دنیا عیش کررہی ہے۔ اور تم یہ زندگی ایسے گزار رہے ہو کہ اس جینے سے نہ جینا اچھا۔ اگر دلاور کے ہاتھوں کتے کی موت نہ مارے گئے تو ذرا ہوکے مروگے بیٹا ان دونوں کی طرح۔ غالب اور ناز[و] کی طرح۔"

ربانی کو اس کے باوجود بڑی مشکل سے گزرنے کی جگہ ملی۔

منظر نے کہا "ہاں بھئی علیم الدین مجھے وکیل کرو گے اپنا۔"

"کروں گا جی۔" اس نے اچانک چلّا کے کہا "ورنہ یہ تو مار ڈالیں گے مجھے۔ آپ بچالو مجھے وکیل صاحب۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں ایک غریب آدمی ہوں۔"

ربانی نے اس کی گردن دبوچ لی "غریب کی اولاد۔ کہتا ہے تُو نے کچھ نہیں کیا؟ کل پھر پوچھیں گے یہی لوگ تجھ سے 'پھر سچ بولے گا تُو۔"

وہ چیخنے لگا "یہ لوگ ماریں گے مجھے......"

منظر نے کہا "پہلے کیا سوچ کے پولیس کا ساتھ دیا تھا؟ اب مار تو کھانی پڑے گی۔ یہ لوگ قورمہ بریانی نہیں کھلاتے مگر پھر بھی تم اب محفوظ ہو۔ یہ تم کو جان سے نہیں مار سکتے۔"

میں نے محسن سے کہا "میری طرف سے ڈی آئی جی صاحب کو بتادے کہ میں مدعی نہیں ہوں صرف غیرجانبدار مبصر ہوں۔ سب کچھ دیکھ رہا ہوں۔ میں عدالت کو بتادوں گا کہ میں نے علیم الدین کو کس حال میں دیکھا تھا۔ اس کی ذہنی اور جسمانی حالت کیا تھی۔"

محسن نے میری بات دُہرادی "موسیو آندرے کا کہنا ہے کہ وہ کوئی سوال کرنے کا حق نہیں رکھتے مگر جو کچھ انہوں نے دیکھا ہے اسے نظرانداز بھی نہیں کرسکتے۔ اس ملزم کی ذہنی و جسمانی صحت بحال رہنی چاہئے جیسی اس وقت ہے۔"

منظر نے چلّا کے کہا "علیم الدین کل میں وکالت نامہ لے کر آؤں گا۔ اس پر دستخط کردینا۔"

ڈی آئی جی نے برہمی سے کہا "آئندہ میں آپ پر اعتبار نہیں کرسکتا آپ نے مجھے دھوکا دے کر صورتِ حال کو EXPLOIT کیا۔"

"یہ EXPLOITATION کا زمانہ ہے ڈی آئی جی صاحب لیکن دھوکا دینے والی بات غلط ہے۔"

"میں نے ایک سوال کی اجازت دی تھی۔"

منظر بولا "بُرا نہ مانیں تو عرض کروں کہ آپ نے غلطی کی تھی۔ اب میں کل آؤں گا وکالت نامے کا فارم لے کر۔ کل کا مطلب ہے رات کے بارہ بجے کے بعد کسی وقت۔"

رابعہ نے کہا "مرحوم صدیقی صاحب کی خودکشی کے معاملے میں ہم اپنا اپنا تحریری بیان داخل کردیں گے۔"

ہم باہر آئے تو ریڈ کراس والوں کی ایک ایمبولینس مین گیٹ سے اندر آرہی تھی۔ ایس ایس پی جاوید صدیقی کے جسدِ خاکی کی آخری منزل کے سفر کا پہلا مرحلہ شروع ہونے والا تھا۔ ہم سب کے دل دکھ سے بوجھل تھے۔ صدیقی کی موت ایک مقصد کی موت تھی۔ ایک جذبے کی موت تھی۔ ہم سب دل شکستہ اور مایوس تھے۔ یہ ایک طویل جدوجہد تھی جس میں ہم کامیابی کے اتنے قریب تھے کہ ناکامی کے خیال کو بھی بھول گئے تھے۔ اچانک شکست

میں نے کہا "مگر یار اپنا سب کچھ بیچ کے بھی ہمیں جو رقم ملے گی اس سے زندگی تو نہیں گزر سکتی۔ عیش خاک ہوگا۔"

"تو سالے اپنا ضمیر بیچ دو۔ ایمان بیچ دو اور اصول بیچ دو۔ چوہدری دلاور جیسا خریدار بھی ہے۔ جو کروڑوں کا خریدار ہے۔ سودا کرلو اس سے۔ اس کے پاؤں پکڑ ... کے معافی مانگ لو۔ اپنے چوہدری صاحب۔ آپ بڑے اور ہم چھوٹے۔ تسی ڈاڈے تے اسی لسے۔ ہار مان لو اپنی۔ ناک اور مونچھیں نیچی کرلو اپنی۔ فائدے میں رہو گے۔" اس نے اپنی گاڑی کا دروازہ دھڑ سے بند کیا۔ محسن اور مولوی خادم حسین پہلے ہی اس کی گاڑی میں بیٹھ چکے تھے۔

میں نے رابعہ کو دیکھا تو اس کی شکل ایسے ہو رہی تھی۔ جیسے وہ بات کرتے ہی رو دے گی۔ میں نے منظر کی باتوں کو ڈھٹائی سے ہنس کے ٹال دیا تھا۔ یہ باتیں نہ جانے کتنے لوگ کتنی بار کہہ چکے تھے اور ہر شکست کے بعد جب ڈیپریشن کا عارضی وقفہ آتا تھا تو یہ محسوس ہوتا تھا کہ واقعی جدوجہد لا حاصل ہے۔ ابھی تک مجھے کچھ بھی تو نہیں ملا۔ نہ اپنا حق اور نہ انصاف۔ شاید ملے گا بھی نہیں۔ آنے والا ہر دن گزرے ہوئے ہر دن کے مقابلے میں اُمید کی روشنی کو کم کرتا ہے۔ یہ توقع رکھنا عبث ہے کہ وقت کی چال اُلٹی ہو جائے گی اور حق گوئی و بے باکی۔ اصول پرستی اور ایمانداری۔ خلق کی شرم اور خدا کا خوف۔ قانون کی پاسداری اور شرافت' اخلاق کی اعلیٰ قدروں پر فخر کا عہدِ زریں لوٹ آئے گا۔ دنیا اب دولت اور صرف دولت کے مدار پر گھوم رہی تھی۔ دولت ہے تو دنیا تمہاری ہے۔ کل کس نے دیکھا ہے۔ جو کچھ ہے یہی آج کا دن ہے۔

لیکن ڈیپریشن کا یہ دورہ ختم ہوتا تھا تو اپنی کم بختی اور مایوسی پر افسوس ہوتا تھا۔ نیکی آج بھی دنیا پر غالب ہے۔ سچ آج بھی سچ مانا جاتا ہے۔ دنیا صرف شیطان کی آماجگاہ ہوتی تو انسان اور انسانیت کا وجود کب کا مٹ گیا ہوتا۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ پتھر کے زمانے کا انسان مسلسل ارتقا کی منازل طے کر رہا ہے۔ تعلیم اور تہذیب کی روشنی افریقہ کے تاریک براعظم تک پھیل چکی ہے۔ فاصلے سمٹ رہے ہیں اور انسان قریب سے قریب تر ہوتے جا رہے ہیں۔ غلامی کا دور کہیں نہیں رہا۔ پہلے کے مقابلے میں انسان زیادہ لمبی عمر پاتے ہیں۔ کہیں اوسط عمر دُگنی ہو گئی ہے تو جاپان جیسے ممالک میں سو سال سے پہلے کوئی مرتا ہی نہیں کیونکہ انسان پہلے سے زیادہ خوش' خوش حال اور صحت مند ہے۔ شیطان کی ساری تباہ کاری اور قدرتی آفات کے نزول کے باوجود۔

"آؤ ہم بھی چلیں رابعہ" میں نے کہا۔

اس نے اپنی گاڑی کی چابی مجھے دے دی۔

"اگر تمہارا دل رونے کو چاہتا ہے تو میرا کندھا حاضر ہے لیکن ذرا باہر نکل جائیں" میں نے گاڑی میں بیٹھ کے دروازہ اس کے لئے کھول دیا۔

"میرا دل واقعی پھوٹ پھوٹ کے رونے کو چاہتا ہے۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے بھئی۔ رو لو۔ زیادہ سے زیادہ دیکھنے والے یہی سمجھیں گے نا کہ میرے سسر کا انتقال ہو گیا ہے یا مرحوم نے لاکھوں کروڑوں کی جائداد میں سے تمہیں پھوٹی کوڑی نہیں دی۔ سب اپنی نوبیاہتا نوخیز اور نوعمر جو تھی منکوحہ کو دے گئے ہیں۔ یا میں کوئی بہت ہی ظالم سنگدل اور بدتمیز شوہر ہوں جس کے دل پر ایسی حسین بیوی کی اتنی خوبصورت آنکھوں سے بہنے والے اتنے قیمتی موتیوں جیسے آنسوؤں کا بھی کوئی اثر نہیں ہوتا۔"

رابعہ اس کے باوجود نہیں مسکرائی "منظر کی باتوں نے مجھے ڈیپریس کر دیا ہے۔"

"منظر تو پاگل ہے اور تم اس سے بڑی پاگل ہو۔ دیکھ لینا صبح وہ آئے گا تو سب بھول چکا ہوگا اور پھر یہی کہے گا کہ اب چوہدری دلاور صاحب کی تو ایسی کی تیسی۔ بھوتنی کا ڈرامے باز ہم سے بچ کے کہاں جائے گا۔ ہم سالے کو قبر سے کھود کے نکال لیں گے اگر ہم سے چھپنے کے لئے سچ مچ مر گیا۔ تم بھی دل پر مت لو اس کی باتوں کو۔"

رابعہ نے افسردگی سے کہا "صدیقی کی موت نے مجھے اندر سے توڑ پھوڑ دیا ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے وہی منظر ہے ابھی تک۔"

میں نے کہا "بُرا مت ماننا مس رابعہ۔ تم جذباتی ہو کے سوچ رہی ہو ابھی۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ خود صدیقی ایک بزدل اور بے وقوف آدمی تھا۔"

"سکندر۔ مت کرو ایسی باتیں۔" رابعہ چلائی۔

"تمہیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ اپنی جان لے کر اس نے کسی کا بھلا نہیں کیا۔ اسی لئے خودکشی کو حرام موت سمجھا جاتا ہے۔ وہ چوہدری دلاور کا مقابلہ کرتے ہوئے مارا جاتا تو میں اسے شہید کہتا مگر جو شخص بدنامی کے خیال سے ڈر جائے۔ جس میں شکست تسلیم کرنے کا حوصلہ ہی نہ ہو۔ جو زندگی میں صرف فتح اور کامیابی مانگتا ہو۔ جسے احساس نہ ہو کہ اس کے مرنے کے بعد بیوی بچوں کا کیا ہوگا۔ ان سب پر کیا بیتے گی جو اس پر انحصار کرتے تھے۔ جو اتنا یاسیت زدہ ہو کہ اسے آنے والے کل کی اچھائی پر بھروسا نہ ہو اسے اور کیا کہا جائے گا؟ کیا ایک شکست اور ناکامی کے بعد آدمی کو جدوجہد ترک کر کے قبر میں سو جانا چاہئے۔ ہار تو آزمائش ہوتی ہے کیا خدا آزمائش میں پورا اُترنے والوں کو اس کا صلہ نہیں دیتا؟ وہ کوئی عام آدمی نہیں تھا۔ بہت بڑا عہدہ تھا اس کا۔ بے اختیارات تھے۔ اسے فکرِ معاش نہیں تھی۔ اگر وہ معطل یا برطرف ہو جاتا تو کیا فرق پڑتا اسے۔ وہ لڑ سکتا تھا۔ اپنا دفاع کر سکتا تھا۔ اور بفرضِ محال اسے جیل بھی جانا پڑ جاتا تو کیا تھا۔ اس نے کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ اس کے ضمیر پر کوئی بوجھ نہ ہوتا۔ وہ جیل سے نکل کے بھی وہی جاوید صدیقی ہوتا۔ اس کا وہی گھر ہوتا۔ وہی بیوی بچے ہوتے۔ وہ نئے سرے سے زندگی کا آغاز کر سکتا تھا۔

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "اچھا جی۔ جیسے آپ کی مرضی۔ ڈرائیور ایک کپ چائے تو پی لے اگر اجازت ہو۔"

رابعہ کا موڈ ٹھیک کرنے کے لئے میں اسے مال پر آرٹس کونسل لے گیا جو ایک پُرانی کوٹھی تھی۔ اس کے وسیع احاطے یا باغ کے ایک جانب قطار میں کیبن بنے ہوئے تھے۔ یہ کیبن بڑے فنکارانہ انداز میں سرکنڈوں اور بانس سے بنائے گئے تھے لیکن یہاں بیٹھ کے چائے پینے کا اصل لطف دھیمے سُروں میں بجنے والی موسیقی تھی جو کسی چھوٹے سے پوشیدہ اسپیکر سے نشر ہوتی رہتی تھی اور گفتگو میں مخل نہیں ہوتی تھی۔ عام طور پر یہاں کلاسیکی موسیقی کے ریکارڈ چلتے تھے۔ روی شنکر کا ستار یا علی اکبر خان کا سرود۔ عبدالکریم خان کی ٹھمریاں اور دادرے۔ ظاہر ہے اس کا لطف اٹھانے والے خوش ذوق افراد ہی یہاں آتے تھے۔

کیبن ایک طرف سے کُھلا ہوا تھا اور اس طرح خلوت کے ساتھ صحن چمن کا نظارہ بھی میسر آتا تھا۔ اس رومان پرور فضا میں آپ آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ایک دوسرے کو تکتے رہیں اور چائے پڑی ٹھنڈی ہوتی رہے یا فلموں کے منتخب رومانی مکالمے بولیں تو کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا تھا مگر عملاً عشق کی وارفتگی کے مظاہرے کی یہاں قطعی گنجائش نہیں تھی۔

رابعہ نے ہینڈ بیگ یوں اُتار کے سائیڈ میں رکھا۔ جیسے ریلوے اسٹیشن کا قلی پلیٹ فارم سے اٹھا کر لانے والا سامان باہر رکھ کے سکون کا سانس لیتا ہے۔ "اُف۔ بہت تھک گئی ہوں میں' سکندر۔"

میں نے کسی فلسفی کی طرح فرمایا "تھکن ایک نفسیاتی مسئلہ ہے مجھے تو تم صبح کی پہلی کرن سے زیادہ تابناک اور تر و تازہ لگ رہی ہو۔ ہر گزر جانے والا دن تمہاری عمر کو ایک دن کم کرتا جا رہا ہے۔"

"ایسی باتوں سے کوئی فائدہ نہیں۔"

"معاف کرنا۔ میں عاشق ہوں۔ بنیا نہیں کہ محبت میں بھی فائدہ نقصان دیکھ کے بات کروں۔"

وہ مسکرائی "آخر کیا چاہتے ہو تم۔"

"میں چاہتا ہوں جواب میں تم بھی اپنی آواز میں سوات کے اصلی شہد کی مٹھاس اور اوکاڑہ کے خالص دیسی گھی کی خوشبو بھر کے نسیم صبا کی طرح سرگوشی میں کہو کہ سکندر۔ تم بھی مال پر لگے ہوئے بجلی کے کھمبے سے زیادہ شاندار لگ رہے ہو جس کے مرکری بلب کی روشنی ہر گزرتے ہوئے لمحے کے ساتھ بڑھتی جا رہی ہو۔"

رابعہ ہنسی "اس سے خوشی ہوگی تمہیں؟"

"بس میں خوش ہو گیا۔ تمہارے چہرے پر ہنسی آ گئی۔ اب بولو چائے پیو گی۔ یا کچھ اور۔ کافی۔ لسی۔ شربت روح افزا۔ بیئر یا سب ملا کے۔"

ویٹر عین وقت پر نمودار ہوا تو میں نے کہا "بھائی صاحب۔ پینے

رابعہ نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا "شاید تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔ صدیقی بہت جلد میدان چھوڑ گیا۔ ہم اس کے ساتھ تھے۔"

"وہ ہم سب کو بے سہارا کر گیا اور میدان ارشد کریم ربانی جیسے لوگوں کے لئے خالی کر گیا۔ اس کا نقصان کسے ہوا اور فائدہ کس کو ہوا۔ صرف ربانی یا ڈی آئی جی صاحب ہی نہیں۔ چوہدری دلاور بھی خدا کا شکر ادا کرے گا کہ اس بلا سے جان چھوٹی۔ ایسا دوسرا افسر اب کہاں سے آئے گا۔ لیکن سچا اور اچھا آدمی ہمیشہ جذباتی ہوتا ہے اور جذبات کی رو میں بہہ کے ایسے ہی جان لیوا فیصلے کر بیٹھتا ہے۔ اگر وہ چوہدری دلاور کی طرح ٹھنڈے دماغ سے کام لینے والا شاطر اور عیار آدمی ہوتا جسے نہ زمانے کی پروا ہے نہ کسی کے اچھا بُرا کہنے کی۔ جس کے لئے شرم و حیا اور خوفِ خدا نام کی کوئی چیز نہیں۔ جو دنیا کو جوتے کی نوک پر رکھتا ہے۔ جو دولت کمانے اور ترقی کرنے کے لئے جائز اور ناجائز کے فرق کو اہمیت ہی نہیں دیتا۔ تو صدیقی بھی زندہ رہتا اور سینے پر ہاتھ مار کے کہتا کہ بیٹا تم چوہدری دلاور ہو تو میں بھی ایس ایس پی ہوں۔ آج بچ کے نکل گئے تو کیا ہوا۔ کل میں نے ہی تمہیں کُتے کی موت نہ مارا تو میرا نام بھی جاوید صدیقی نہیں۔ چلو چھوڑو جان۔ کوئی اور بات کرتے ہیں۔"

"اب ہم کیا کریں گے سکندر۔"

میں نے ہنس کے ایک ہاتھ اس کے شانے کے گرد حمائل کر دیا اور اسے اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کی "ہم محبت کریں گے۔ پہلے سے بھی زیادہ۔"

اس نے خود کو چُھڑا لیا "کیا کرتے ہو۔"

"جو میرا دل چاہتا ہے۔"

"دل کو سمجھاؤ یہ سڑک ہے۔"

میں نے کہا "دل پوچھتا ہے کہ کیا سڑک پر محبت کرنا منع ہے۔"

رابعہ مسکرانے لگی "ہاں منع ہے۔"

"تو پھر وہیں چلتے ہیں۔ جہاں محبت کرنا منع نہ ہو۔ کیا خیال ہے فلم دیکھنے چلیں؟"

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "میں کب دیکھتی ہوں فلم۔"

"اچھا لکشمی چوک چلیں۔ چکن تکہ۔ چرغا...."

"مجھے بھوک نہیں ہے۔"

"تو پھر شملہ پہاڑی پر چل کے چاند کو گھورتے ہیں۔ کسی بینچ پر بیٹھ کے۔ اُداس اُلوؤں کا جوڑا۔"

"نہیں۔ گھر چلو۔ سب انتظار کر رہے ہوں گے ہمارا۔"

میں نے بھنا کے کہا "چولہے میں ڈالو سب کو۔ سمجھ لو کہ آج کوئی نہیں بس ہم دونوں ہیں۔ آج پہلی بار چوری چوری ملے ہیں۔"

"سکندر چلو غالب اور تازو کو دیکھ آئیں" رابعہ کا موڈ ذرا بھی رومانٹک نہیں ہوا تھا۔

کو کیا ملے گا۔"

"جو آپ حکم کریں جناب۔"

"اچھا تو ہمارا حکم یہ ہے کہ ایک جگ میں ایک گلاس لسی۔ ایک بوتل کوکا کولا۔ ایک گلاس شربت روح افزا۔ ایک کپ چائے اور ایک کپ پانی ڈال کے لے آؤ۔ ہم اپنے آنسو اور خونِ جگر ملا کے پی لیں گے۔"

ویٹر دانت نکالنے لگا "آپ ڈرامے لکھتے ہیں نا جی اپنے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ مل کے۔ ڈاکٹر انور سجاد کے دوست ہیں نا۔"

میں نے کہا "یار تم مروا دو گے۔ ان سے کہہ دیا تو وہ سیدھا پاگل خانے بجھوا دیں گے۔"

رابعہ نے کہا "بس چائے لے آؤ۔"

"بس ڈبل ڈیکر نہ ہو" میں نے کہا "لیکن کھانے پینے کے سامان سے بھری ہوئی ہو۔ تمہارے آنے تک میں قوم کا غم کھاتا ہوں یا ان کا سر۔"

رابعہ نے مجھے گھورا "کیا سوچتا ہوگا ویٹر بھی۔"

"یہاں ایسے خبطی بھی آتے ہیں" میں نے ہنس کے کہا "تم نے دیکھا نہیں ایسی باتوں پر وہ مجھے پاگل نہیں ڈاکٹر انور سجاد کا دوست سمجھا۔ آرٹس کونسل کی روح رواں ہے وہ۔ وہ ایک شخص نہیں واقعی انجمن ہے۔ بیک وقت افسانہ نگار۔ مصور۔ ڈانسر۔ ایکٹر۔ ڈراما رائٹر اور ڈاکٹر۔ زندگی نے فرصت دی تو میں بھی یہاں کچھ کروں گا۔"

"ہاں۔ گھاس خراب ہو رہی ہے' پھر جھاڑ پونچھ کا بھی کام ہوگا۔ ڈرامے ہوتے ہیں تو ٹکٹ دینے والا بھی چاہئے۔"

"بی بی۔ بڑے نصیبوں والے ہوں گے جو یہ کام کرتے ہیں۔ سارے لاہور کے منتخب لوگ آتے ہیں یہاں۔ جو ہمارا قومی سرمایہ افتخار ہیں۔ ان کو قریب سے دیکھ لینا۔ ان سے ہاتھ ملا لینا یا بات کرلینا بھی کم عزت کی بات نہیں۔ اب یہی دیکھ لو کہ سارے لاہور میں ایک ہی رابعہ تھی اور اس کی چاہت میں مرنے والے بھی بہت ہوں گے مگر سرکاری طور پر اسنادِ عاشقی قبول ہوئیں صرف اس ناچیز ہیچ مدان کی۔"

وہ پھر ہنسی "یہ ہیچ مدان کیا ہوتا ہے۔"

میں نے سر پکڑ کے کہا "ایک افریقی ساز ہوتا ہے۔ ایک طرف سے بجاؤ تو نالۂ بلبل کی صدا سنائی دیتی ہے' دوسری طرف سے فغانِ درویش۔ جنگل میں ہتھیار کے طور پر استعمال ہوتا ہے اور گھر میں فالودہ کھانے کے لئے۔"

جب ہم چائے پی کر نکلے تو رابعہ کا موڈ بہت اچھا ہو گیا تھا۔ اس پر شام کے واقعات کا ڈیپریشن باقی نہیں رہا تھا۔ مایوسی اور دکھ کے جذبات سے میرا دل بھی بوجھل تھا مگر رابعہ کو اُداس دیکھ کے میں نے زبردستی مزاج میں شگفتگی پیدا کی۔ یہ ادب آداب کی روایات کا تقاضا تھا۔ مرد ہونے کی حیثیت سے میری اخلاقی ذمے داری تھی۔ عورت رو کے دل کا بوجھ ہلکا کرلیتی ہے اور اسے آنسو پونچھنے والا بھی مل جاتا ہے اور غمگسار بھی۔ مرد خاموشی سے سب کچھ برداشت کرنے پر مجبور ہوتا ہے یہاں تک کہ میری طرح ایوسی اور ناامیدی کا شکار ہونے کے باوجود زبردستی ہنسنے ہنسانے پر مجبور۔ اگر میں روتی شکل بنا کے حوصلہ شکن باتیں شروع کردیتا تو رابعہ آنسوؤں کے دریا بہا دیتی اور اسے سنبھالنا مشکل ہوجاتا۔ جان بوجھتے میں نے ان معاملات سے پہلو تہی کی جس پر میں اظہارِ خیال اور صلاح مشورے کی اشد ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ کچھ دیر بعد یا کل تک رابعہ بھی صدمے سے سنبھل جائے گی اور ہم سب پہلے کی طرح اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لئے حکمتِ عملی اختیار کرنے کی پوزیشن میں ہوں گے۔ ابھی تو خود منظر کا موڈ اتنا خراب تھا کہ وہ مجھے اور رابعہ کو بُرا بھلا کہہ کے اور اپنا سارا غصہ ہم پر اتار کے چلا گیا تھا حالانکہ وہ ایسا شخص تھا جس کو غصہ آتا ہی نہیں تھا اور جو آلام و مصائب کی سخت ترین گھڑی میں بھی ہنسنا جانتا تھا۔

محسن اور مولوی خادم حسین نے اچھا ہی کیا تھا کہ اس کے ساتھ چلے گئے تھے۔ منظر نے باقی غبار ان پر چیخ چلا کے نکالا ہوگا اور پھر محسن نے بھی اس کو سمجھا بجھا کے ٹھنڈا کیا ہوگا۔ محسن نے رابعہ کی حالت کا بھی اندازہ کرلیا تھا اور مجھے موقع فراہم کیا تھا کہ میں جذباتی رفاقت کا حق ادا کرتے ہوئے اس کی دلجوئی کروں۔

گاڑی میں بیٹھنے کے بعد میں نے کہا "اب ہم کہاں جا رہے ہیں۔"

"نازو اور غالب کو دیکھنے۔ اور کہاں۔"

میں نے کہا "ویری گڈ۔ یہ نمونے عجائب خانے میں دیکھے جاسکتے ہیں یا چڑیا گھر میں۔ یا ان کی نمائش کہیں اور ہو رہی ہے۔"

"وہ وہیں ہیں جہاں تم مجھے دیکھنے آئے تھے۔ کچھ یاد ہے؟" رابعہ بولی۔

میں نے کہا "کب کی بات ہے۔"

"جب... صدمے سے میری ایسی حالت ہوگئی تھی کہ شاید میں پاگل ہوجاتی۔"

"وہ تو خیر تم آج بھی ہو۔ لیکن تمہاری مراد اس خبطی ڈاکٹر سے تو نہیں ہے۔ جو شاید غالب کے باپ کا دوست تھا۔ اس کی ایک بڑی نیک دل بیوی تھی۔"

"بیویاں نیک دل ہی ہوتی ہیں۔" رابعہ نے کہا۔

"اور شوہر؟" میں نے احتجاج کیا۔

"شادی سے پہلے وہ بھی ہوتے ہیں۔ بڑے جانثار۔ خاکسار۔ وفا شعار۔ اور خدمت گزار۔ ایکٹر کہیں کے۔ اصلیت بعد میں ظاہر ہوتی ہے۔"

میں نے کہا "بالکل ٹھیک کہا تم نے۔ یہ وہی بات ہے جو کسی نے رخصتی کے وقت دلہن کو روتا دیکھ کے کہی تھی۔ دولہا کو

مسکراتا دیکھ کے اس کی کسی سہیلی نے کہا تھا کہ دیکھو تو ذرا اسے۔ کیسا ڈھیٹ ہے تو دولہا کے کسی دوست نے جواب دیا تھا کہ بی بی۔ تمہاری سہیلی تو ابھی کچھ دیر میں چُپ ہوجائے گی۔ اس بے چارے کو تو ساری عمر رونا ہے۔ تو اداکاری کا بھی یہی ہے کہ لڑکیاں شادی کے بعد ساری عمر کرتی ہیں۔ اپنی اصلیت بھول جاتی ہیں۔"

اس سے پہلے کہ یہ بحث لڑائی میں بدل جاتی رابعہ نے چلّا کے کہا "سیدھے کہاں جا رہے ہو۔ دائیں طرف چلو۔ راستہ بھول گئے کیا؟"

میں نے جذباتی لہجے میں کہا "راستہ تو میں اسی دن بھول گیا تھا رابعہ جس دن تمہیں پہلی بار دیکھا تھا۔ میں تو سب کچھ بھول گیا تھا۔ تمہارے سوا۔"

"دیکھا۔ یہ ہوتی ہے ایکٹنگ" رابعہ ہنسی "بعد میں رابعہ کو بھول جاؤ گے۔ اور سب کچھ یاد رہے گا۔"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا" میں نے کہا "تمہیں سامنے بٹھا کے تمہارے نام کی مالا جپتا رہوں گا۔ تارک الدنیا ہوجاؤں گا۔ سب کو چھوڑ دوں گا۔ سب دنیا سے رشتے توڑ لوں گا۔ کوئی کام نہیں کروں گا۔ پیسہ خدا چھپر پھاڑ کے دے گا۔ رزق آسمان سے اترے گا۔ ہمارے سارے کام نوکر کریں گے۔ ہم صرف محبت کریں گے۔ دن رات چوبیں گھنٹے۔ ایک لمحے کے لئے بھی ہم ایک دوسرے کی نظر سے اوجھل نہیں ہوں گے چنانچہ کھانا پینا نہانا دھونا سب وہیں ہوگا۔ وہی ہمارا حجلۂ عروسی ہوگا۔ وہی ٹوائلٹ۔ بالآخر وہیں سے ایک ساتھ۔"

رابعہ نے ہنستے ہوئے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "بس۔ بہت بول چکے اس سے آگے کچھ نہیں۔"

میں نے گاڑی اس پرانی کوٹھی کے سامنے روک دی جو اپنی خستہ حالی کے باعث آج بھی ویران اور آسیب زدہ لگتی تھی۔ اس کا گیٹ نہ جانے کب سے پورا کھلا ہوا تھا۔ اندر جانے والے اینٹوں کے بنے ہوئے راستے پر بھی گھاس پھوٹ رہی تھی۔ دائیں بائیں سبزہ و گل کی فراوانی دیکھ کر صاحب خانہ کے شوقِ باغبانی کا پتا چلتا تھا۔

ایک چھوٹا سا سفید اون کا بنا ہوا کھلونے جیسا کُتا بڑی نرمی سے بھونکتا ہوا ہماری طرف لپکا اور چند قدم کے فاصلے پر رک کے سوالیہ انداز میں بھونکتا رہا۔ اتنے مختصر کتے کا انداز جارحانہ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ ایک طرح سے کال بیل کا کام کرتا تھا۔ اندر فوراً اطلاع مل جاتی تھی کہ باہر کوئی ہے۔

"کم آن ریٹو۔ کون ہے۔ ابھی شٹ اپ کرو۔" کسی نے کہا۔

میں نے رابعہ سے کہا "یہ ریٹو ہے' یعنی گینڈا۔ غضب خدا کا۔ گینڈے کا تو سینگ بھی اس سے بڑا ہوگا۔"

"آہستہ بولو۔ کسی نے سن لیا تو بُرا مانے گا۔" رابعہ نے مجھے گھورا۔

"گینڈے نے سن لیا تو اس کے جذبات کتنے مجروح ہوں گے۔ وہ بہت بے عزتی محسوس کرے گا۔" میں نے کہا۔

ایک شخص گیلس والی پرانی پتلون پہنے باہر آیا۔ پتلون کے گھٹنے نکلے ہوئے تھے اور اسے وہ شاید سوتے وقت بھی نہیں بدلتا تھا۔ گول شیشوں والی عینک اور سفید خشخشی داڑھی والے اس ڈاکٹر کو میں نے دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔ وہ ستر سال سے زیادہ کا تھا مگر بالکل سیدھا کھڑا ہوا تھا۔

میں نے اس سے ہاتھ ملایا "آپ نے شاید مجھے نہیں پہچانا۔"

"آف کورس پہچانا۔ تم کبیر ہے" اس نے رابعہ کی طرف دیکھا "کبیر خاں۔ تم اس سوئٹ گرل کے ساتھ آیا تھا۔ ابھی کیوں آیا ہے؟ شی لکس آل رائٹ۔ تم اس کا ساتھ میرج بنایا کہ نہیں؟"

"شادی بنائے گا انکل۔" میں نے اس سے مصافحہ کیا "لیکن آپ یہ بتائیں کہ آپ نے کبیر داس کو کیسے پہچان لیا۔ بہت پہلے ملا تھا میں آپ سے اور اب تو میری صورت ہی بدلی ہوئی ہے..."

وہ ڈھیلی پتلون کو سنبھالنے والے لچکدار گیلس پر انگوٹھے اوپر نیچے چلاتا رہا۔ "نمبر ون۔ تمہارا وائس۔ آواز تم نہیں بدلا۔ نمبر ٹو۔ تمہارا ہونے والا وائف۔ یہ بھی نہیں بدلا تم۔ اس سوئٹ گرل کو کیسے بھول سکتا ہے جو بھی دیکھے... ہمارے جیسا اولڈ مین بھی..."

میں نے رابعہ کی طرف دیکھا وہ ہنس بھی رہی تھی اور شرما بھی رہی تھی۔ "اور نمبر تین انکل...؟"

"نمبر تین۔ تمہارا فرینڈ غالب۔ اس کا واسطے کبیر خان کے سوا کون آئے گا۔ ایسا دوستی ہمارا اور غالب کا فادر میں تھا۔ ابھی ہم کو بہت دکھ ہوتا۔ دس بوائے" اس نے افسوس سے سر ہلایا۔ "اس کا تو باپ بھی اتنا بڑا ڈاکٹر تھا۔ اس نے سب کو مایوس کیا۔ بہت ٹیلنٹ تھا اس میں لیکن..... خیر ابھی اندر آؤ۔"

میں نے کہا۔ "کیا حال ہے اس کا؟"

"اوہ۔ دی باسٹرڈ از آل رائٹ۔" اس نے شفقت سے گالی دے کر کہا۔ "لیکن اس کا فیانسی۔ گرل فرینڈ۔ واٹ از شی؟"

"سب کچھ۔" میں نے کہا۔ "جیسے رابعہ میرے لیے سب کچھ ہے۔"

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "ہم سمجھ گیا تھا۔ تم ابھی کیا دونوں کو ادھر ایک ساتھ لایا۔ یو سی۔ یہ کوانفیکشن نہیں تھا... لائک ٹی بی..."

میں نے کہا۔ "عشق کا روگ بھی کم تو نہیں ہوتا۔"

وہ ہنسا۔ "ایک دم ٹھیک بولا تم... عشق کا وائرس اِدھر اثر کرتا ہے" اس نے اپنی کھوپڑی پر انگلی ماری۔ "لوگ ہارٹ کو بولتا۔ اس سے دماغ میں سیریس پرابلم ہوتا۔ لیکن ابھی ہم میڈیکل ٹرم استعمال کرتا ہے۔ تمہارا فرینڈ اور اس کا سوئیٹ ہارٹ کو فزیکل پرابلم نہیں تھا۔ کیا بولتا سائیکالوجیکل کو؟"

"نفسیاتی۔" میں نے کہا۔

"یس۔ ایسا مسئلہ ہو تو دوا بھی کم کام کرتا۔" اس نے ہمیں اندر لے جا کے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔ "دوا کم کام کرتا۔ تھوڑا سکون دیتا۔ دماغ کا ٹمپریچر کول ڈاؤن کرتا لیکن ایسا گولی یا انجکشن کوئی نہیں جو اس کا علاج کرے۔ یہ تم بہت اچھا کیا کہ دونوں کو ساتھ لایا۔ ایک سے دوسرے کا علاج کیا۔ غالب کا کنڈیشن اچھا تھا۔ اس نے نازو کو سپورٹ کیا اور نازو کو بہت کنسول کیا۔ CONSOLE سمجھتا۔"

میں نے کہا۔ "ہمدردی اور غمگساری کی۔"

"او گاڈ۔ اتنا مشکل اردو ہم نہیں جانتا۔ غالب اس کو بہت لَو اور اٹینشن۔ توجہ دیا۔ جو ہم نہیں دے سکتا تھا۔ ہمارا میڈیکل اسٹور میں لَو اور توجہ SYMPATHY اور DEVOTION یہ سب نہیں ملتا۔"

میں بھی غالب اور نازو سے ملنے کے لیے اتنا ہی بے چین تھا جتنا رابعہ تھی مگر ہم اس نیک دل اور شفیق مگر باتونی ڈاکٹر سے یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ فضول باتیں چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہ وہ دونوں کہاں ہیں۔ وہ بے مقصد بات نہیں کررہا تھا چنانچہ میں تہذیب کے دائرے میں رہتے ہوئے سُنتا رہا۔

"یہ جو پیار کا ریلیشن ہوتا ہے۔ یہ میوچل ہوتا ہے۔ نیوٹن کا فارمولا کے مطابق ایکشن اور ری ایکشن برابر ہوتا اور ایک جیسا ہوتا۔ محبت کے ری ایکشن میں محبت پیدا ہوتا۔ اسی نے ان کا علاج کیا۔ جادو کی طرح۔ غالب نے جب نازو کا حالت دیکھا تو اس نے خود کو سنبھالا۔ یہ محسوس کیا کہ ابھی ہمارا ذمّے داری ہے۔ نازو کو ایک دم نارمل ہونا چاہیے۔ یہ اس کا خواہش تھا۔ اس کا مقصد تھا اور یقین تھا۔ اس نے کوشش کیا۔ دل سے کوشش کیا۔ اس کا دل بہت دکھی تھا۔ اس نے گاڈ سے بہت دعا مانگا۔ بولا 'او گاڈ۔ نازو ہم کو واپس کرو' نہیں تو ہم بھی مرجائے گا۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "آپ نے اس کے دل کی آواز بھی سُن لی؟"

"اوہ یس۔ اس کی جگہ ہم ہوتا تو ایسا دعا مانگتا۔ وہ سب کرتا جو اس نے کیا۔" ڈاکٹر بولا "اور پھر نازو نے اس کو دیکھا۔ اس کا لَو کو فیل کیا۔ محسوس کیا۔ اس کا DEVOTION کو دیکھا۔ تو اس کے ہارٹ میں ایک ری ایکشن ہوا۔ بہت پاور فل۔ کہ ابھی ہم کو اس آدمی کا واسطے جینا مانگتا اور ٹھیک ہونا مانگتا۔ نازو نے غالب کے SENTIMENTS۔ کیا بولتا اس کو۔؟"

"جذبات" رابعہ نے کہا۔

"یس۔ جذبات کی فورس کو فیل کیا۔ غالب کا جذبات اتنا اسٹرانگ تھا کہ نازو کو ہپناٹائز کردیا۔ اس کے دماغ میں جو گڑبڑ تھا۔ سب کو ٹھیک کردیا۔ FEELING ایسا ہی میجک۔ جادو کرتا ہے۔ ابھی تم ہے۔ تمہارا گھر ہے۔ بیوٹی فل اینڈ نائس۔ تم صاف کیا اور سجایا۔ ڈیکوریٹ کیا۔ فرض کرو کوئی چور۔ یا کوئی پاگل اندر گھس کے سب خراب کرتا ہے۔ دیوار کا پینٹ۔ کارپٹ سب ڈرٹی کرتا ہے۔ سامان خراب کرتا ہے۔ چیزیں گراتا ہے۔ ڈیکوریشن پیس توڑ ڈالتا ہے۔ تم دیکھے گا تو کیا کرے گا۔ تم روئے گا نہیں۔ تم ایک دم لگ جائے گا سب ٹھیک کرنے میں۔ سب اُٹھائے گا۔ سب صاف کرے گا۔ ری ڈیکوریٹ کرے گا۔ جو چیز جیسا تھا ویسا بنائے گا۔ جہاں تھا وہاں رکھے گا۔ رائٹ؟ تو ایسا ہی غالب نے کیا۔ اس کا لَو نے کیا۔ اس نے نازو کو اسی طرح ڈے اینڈ نائٹ محنت کر کے RESTORE کیا۔ اس کا اوریجنل بیوٹی کو۔"

میں بوڑھے ڈاکٹر کی مثال پر پھڑک اُٹھا۔ "اور اب وہ بالکل ٹھیک ہے۔"

"یس۔ شی اِز واٹ شی واز۔ لولی اینڈ لویبل۔ اس میں جتنا کریڈٹ غالب کا ہے اتنا ہی نازو کا ہے کہ اس نے RESPOND کیا۔ تعاون کیا۔ وہ بولا کہ تم چاہتا ہے تو ہم پھر ویسا ہی بنے گا۔ زبان سے نہیں بولا۔ دل سے بولا۔ دل کا ایک خاموش زبان ہوتا ہے۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا۔ "بالکل ہوتی ہے۔ ہر دل کی زبان الگ ہوتی ہے۔"

ڈاکٹر مسکرایا۔ "یہ کام ہم نہیں کرسکتا تھا۔ ہم کیا دنیا کا سارا ڈاکٹر لوگ مل کے نہیں کرسکتا تھا۔ ایک پاگل کا دماغ ٹھیک کرنا آسان ہے لیکن دل میں لائف کا واسطے لَو پیدا کرنا۔ ناممکن۔ سوئے ہوئے جذبات کو لائف دینا۔ ناممکن۔ ابھی تم یہ بولے گا کہ ڈاکٹر کریک۔"

میں نے کہا "یہ آپ کیسی بات کرتے ہیں سر۔ آپ ہمارے بزرگ ہیں۔"

"بزرگ تو ہم سب کا واسطے ہے لیکن یہ نام ہے ہمارا۔ ابھی پبلک لوگ ہم کو ڈاکٹر کریک بولتا۔ ہم کو اچھا لگتا۔ یہ یو سی۔ کریڈٹ ہے۔ تعریف ہے۔ لوگ ایڈیسن کو کریک بولا۔ ٹیلی فون والا گراہم بیل کو کریک بولا۔"

میں نے کہا "ہر جینئس ہاف میڈ ہوتا ہے۔"

"اوہ نو۔ ہم کدھر جینئس ہے۔ ہم ڈاکٹر کریک ہے۔ ایسا ہی ہم کو اچھا لگتا۔ ابھی ہم اتنی دیر سے باتیں کرتا۔ تم اپنا دوست سے ملنا چاہتا ہے نا۔ آئی نو لیکن وہ سب تھوڑا گھومنے کے واسطے گیا ہے۔ اپنا آنٹی لوگ کے ساتھ۔"

یہ بہت پُرانی کوٹھی اس تاریخی کوٹھی کے ساتھ ہی تھی جس میں سب سے پہلے ریڈیو پاکستان لاہور کا براڈ کاسٹنگ اسٹیشن تھا۔ یہ کسی معروف سیاست داں کی کوٹھی تھی جو غالباً مرحوم نے اس مقصد کے لیے وقف کردی تھی۔ ڈاکٹر کریک بھی تاریخی چیز تھا اور اس کے گھر کی فضا میں قدامت یوں رچ بس گئی تھی کہ میں خود کو کسی میوزیم میں محسوس کررہا تھا۔ اس اینگلو انڈین ڈاکٹر کے آباد اجداد کی بڑی بڑی تصاویر دیوار پر آویزاں تھیں جن کے فریم چوکور

پھر دروازہ کُھلا اور ڈاکٹر کی بیوی اندر آئی۔ اس کے پیچھے نازو ابھی اس کا جملہ پورا ہوا ہی تھا۔ ایک چیخ مار کے وہ رابعہ کی طرف لپکی اور اس سے چمٹ گئی۔

غالب میری طرف مڑا تو میں نے کہا۔ "مجھے پہچانے۔"

غالب نے کہا "تم۔ سکندر۔ یہ تم ہو؟" اور پھر میرے گلے لگ

بوڑھا ڈاکٹر اور اس کی بیوی شفقت بھری مسکراہٹ کے ساتھ ہمیں یوں دیکھتے رہے جیسے ہم سب ان کے بچھڑے ہوئے برسوں بعد ملے ہوں۔

نازو میری طرف بڑھی۔ "سکندر بھائی۔ کہاں چلے گئے تھے"

نازو کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ خود رابعہ رو رہی تھی۔ میں نے منہ پھیر کے دوپٹے کے کونے سے آنکھیں صاف کرتے

نازو میرے پاس پہنچ کے رُک گئی اور بڑے غور سے دیکھنے

"نہیں۔ تم سکندر تو نہیں ہو۔"

غالب نے کہا۔ "یہ سکندر ہی ہے نازو۔"

اس نے پلٹ کے کہا۔ "کیا میں سکندر کو نہیں پہچانتی۔ تم مجھے پاگل سمجھتے ہو نا۔ میں پاگل ہوں؟"

میں نے کہا۔ "نازو۔ جو تمہیں پاگل کہے وہ خود پاگل۔ میرا چہرہ مت دیکھو۔ کیا تم آواز سے نہیں پہچان رہی ہو مجھے۔"

"آواز سے؟" وہ سوچ میں پڑ گئی۔

"اور کیا یہ سب لوگ تم سے جھوٹ بول سکتے ہیں؟ غالب تم سے غلط کہہ سکتا ہے۔ تم رابعہ سے پوچھو۔"

رابعہ نے سر ہلایا۔ "انہوں نے میک اپ کر رکھا ہے نازو۔ یہ

تھے مگر بلیک اینڈ وائٹ تصاویر بیضوی تھیں۔ مردوں کے سر پر لمبے فلیٹ ہیٹ تھے اور خواتین نے اسکارف باندھ رکھے تھے یا ان کے سر کے بالوں میں درمیان سے مانگ نکلی ہوئی تھی۔ فرنیچر۔ قالین، بڑے بڑے لیمپ اور فانوس۔ ڈیکوریشن پیس سب کا شمار نوادرات میں کیا جاسکتا تھا تاہم اس قدامت میں بھی سلیقہ اور حُسن تھا۔ کوئی چیز گرد آلود یا خراب نظر نہیں آتی تھی۔

پاکٹ سائز کُتا جو ڈاکٹر کی گود میں سکون سے بیٹھا ہوا تھا ایک دم چھلانگ مار کے اُترا اور باہر دوڑ گیا۔

"ابھی وہ لوگ آگیا۔"

میں نے کہا۔ "کیا پیدل گھومنے گئے تھے سب لوگ۔"

"نہیں۔ گاڑی ابھی چلتا ہے ہمارا۔" وہ ہنسا۔

میں نے حیرانی سے کہا۔ "مگر میں نے تو کسی گاڑی کی آواز نہیں سُنی۔"

"ابھی سُنے گا۔ اسپائی کو پہلے پتا چل جاتا ہے۔ بہت دور سے سونگھ لیتا ہے۔"

"اسپائی۔ یعنی جاسوس۔" رابعہ نے کہا۔

"ہاں۔ یہ کُتا۔ اس کا نام spy ہے۔ یہ سب پتا چلا سکتا ہے۔ صبح اخبار ڈھونڈ لیتا ہے کہ کدھر گرا ہے۔ گاڑی کے نیچے ہے یا گملے کے پیچھے۔ گھر میں گاڑی کا چابی گم ہوا۔ یہ پتا نہیں کدھر سے لایا۔"

ڈاکٹر کریک نے غلط نہیں کہا تھا۔ کُتّے کے جانے کے تقریباً ایک منٹ بعد میں نے گاڑی کے انجن کی اور پھر دروازے بند ہونے کی آواز سُنی۔ پھر باہر سے کسی عورت نے کہا۔ "ابھی کون آیا ہے اس ٹائم؟"

نازو نے کہا "رابعہ۔ رابعہ بھابی ہوں گی۔ یہ۔ یہ جو باہر گاڑی کھڑی تھی نا۔ انہی کی تھی۔ کیوں غالب؟"

سکندر رہی ہیں۔"

وہ ایک قدم آگے بڑھی "میک اپ کر کے کیوں آئے ہو میرے پاس۔"

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "مجبوری تھی نازو۔ کچھ لوگ میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ تم تو جانتی ہو انہیں۔ چوہدری دلاور کو اور استاد پیڈرو کو؟"

اس نے سرہلایا "میں سمجھ گئی۔ مجھے تو پہلے ہی سمجھ جانا چاہیے تھا۔"

وہ پھر رونے لگی۔ میں نے اسے گلے لگا کے اس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا "اب کیوں رو رہی ہو؟"

"میں بہت ناراض ہوں سب سے۔ کہاں چلے گئے تھے سب مجھے اکیلا چھوڑ کے۔" اس نے آنسو پونچھ کے گلہ کیا۔

"اکیلا کہاں چھوڑا تھا۔" میں نے کہا "غالب بھی تو تمہارے ساتھ تھا۔"

"مگر آپ شادی میں بھی نہیں آئے۔"

"شادی.... کس کی شادی میں...؟" رابعہ نے کہا۔

"میری شادی اور کس کی شادی۔ رابعہ باجی آپ بھی ایسی باتیں کر رہی ہیں جیسے آپ کو پتا ہی نہیں۔"

"تمہاری شادی ہوگئی؟ کس سے.... اور کب؟" میں نے کہا۔

نازو خفا ہونے لگی "یہ کیسا مذاق ہے؟"

میں ہنس پڑا "میں چھیڑ رہا تھا تمہیں؟"

غالب نے مجھے آنکھ ماری "پچھلے مہینے تھی نا ہماری شادی!"

میں نے کہا "ہاں لیکن پچھلے مہینے ہم تو یہاں تھے ہی نہیں۔"

غالب بولا "میں نے یہی بتایا تھا اسے۔ بھلا یہ ہو سکتا تھا کہ تم لوگ لاہور میں ہوتے اور ہماری شادی میں شریک نہ ہوتے۔"

"وہ گل اور محسن بھی نہیں آئے تھے۔" نازو نے شکایت کی۔

"ان کی بھی مجبوری تھی" غالب نے میرے کچھ کہنے سے پہلے کہا "محسن کی بہن اور اس کا بہنوئی حادثے میں ہلاک ہوگئے تھے۔ وہ کراچی گئے ہوئے تھے۔ ابھی آئے تو نہیں ہ؟"

میں نے کہا "نہیں، لیکن ایک دو دن میں آنے والے ہیں۔"

"آرام سے بیٹھ جاؤ ..... میں چائے بھجواتی ہوں" ڈاکٹر کی بیوی نے انگریزی میں کہا۔

ڈاکٹر بولا "ہاں۔ تاکہ تم چائے پی کے جاؤ۔ کھانے کا ٹائم ہے پہلے۔"

"کیسا بات کرتا ہے یہ ڈاکٹر۔" اس کی بیوی بولی "بابا کچھ ٹائم لگے گا کھانے میں۔ اتنی دیر چائے پیو، باتیں کرو۔"

"چائے پی کے کھانا کم کھائے گا۔ باتوں سے بھی پیٹ بھر جائے گا۔ میری بیوی بہت چالاک ہے" ڈاکٹر ہنسنے لگا۔

"چالاک ہوں، کریک نہیں۔" وہ اندر چلی گئی۔ ڈاکٹر بھی اس کے پیچھے تھا۔ وہ ہمیں تنہائی میں باتیں کرنے کا موقع فراہم کرنا چاہتے تھے۔

میں نے محسوس کیا کہ غالب سو فیصد نارمل ہوگیا تھا۔ ... کی تمام فکر اور سوچ کا مرکز و محور نازو کی ذات تھی۔ ... اپنی جگہ تھی مگر وہ ہمارے دیگر مسائل سے بے نیاز ... جیسے وہ برسوں پُرانے مسائل تھے۔

نازو کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ سو فیصد ... ہو چکی تھی۔ اسے بہت کچھ یاد آگیا تھا جو پہلے اس کی یادداشت ... محو ہوگیا تھا لیکن اس سے گفتگو کے بعد میں نے اندازہ لگایا ... کے ذہن کا وہ حصہ تاریک ہے جس کا تعلق ماضی کے ... اور تلخ تجربات سے تھا۔ اسے بالکل معلوم نہیں تھا کہ اغوا ... کے بعد اس نے کیا اذیت برداشت کی تھی ڈاکٹر شاہ کے ... خانے میں اس پر کیا ذہنی و جسمانی تشدد ہوا تھا۔ وہ کتنا عرصہ ... رہی تھی اور اس نے کیا دیکھا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ ... اپنی شوکت رانا کے ساتھ شادی کے بارے میں کچھ یاد نہیں ... یاد نہیں تھا کہ وہ دلہن بنی تھی یا اس نے دلہن کے کپڑے پہن کر ... تصویر بنوائی تھی۔ وہ شوکت رانا کی نئی حویلی میں رہی تھی ... حیثیت سے۔

یہ سب مجھے غالب نے خاموشی سے بتا دیا تھا۔ ہم ... صوفے پر ساتھ ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ رابعہ اور نازو بھی ... صوفے پر تھیں مگر ہم سے کچھ دور۔ حیرت اور دکھ کے ... جذبات کے ساتھ رابعہ بھی نازو کی بہت سی باتیں خاموشی ... پر مجبور تھی۔ غالب نے رابعہ کو بھی خاموش رہنے کا اشارہ ... تھا۔ نازو اسے بتا رہی تھی کہ ان کی شادی کیسی دھوم دھام ... ہوئی تھی۔ اس نے کیسے کپڑے پہنے تھے اور غالب نے کیسے ... انکل نے سارا انتظام خود کیا تھا۔ وہ غالب کے والد کی جگہ ... اس کے والد اور انکل ڈاکٹر بہت گہرے دوست تھے۔

نازو کے ذہن نے تصورات کو حقیقت کا روپ دے دیا ... یہ حقیقت جو محض افسانہ تھی نازو کے الفاظ میں ڈھل کر ... زبان پر آگئی تھی۔ اس نے دیوانگی اور اذیت کے ایک ... آشوب پر تصوراتی خوشی کا ایک پردہ ڈال دیا تھا۔ یہ حقیقت ... فرار تھا یا بزدلی تھی لیکن یہ ضروری تھا۔ ابھی اس کے حق ... بہتر تھا کہ وہ اپنے سفاک اور پُرعذاب ماضی کی آسیب زدہ ... سے بھی دور رہے۔

ہم سب کے لیے ہی اسے خوش رکھنا ضروری تھا۔ وہ ... مل کے بہت خوش ہوئی تھی اور اب باتیں کرنے کے ... وہ مسلسل بولتی رہی اور ہنستی رہی۔ اس نے اپنے بھائی اور ... کے بارے میں بھی پوچھا۔

میں نے کہا "تمہارا بھائی بہت بڑا آدمی ہوگیا ہے ... کوٹھی ہے اس کی اور ایسی زبردست گاڑی ہے۔"

"اچھا؟ لیکن وہ تو ٹیکسی چلاتے تھے۔"

"وہ پُرانی بات ہے۔ کاجل نے اسکول کھولا تھا۔ اسکول نے ... ترقی کی۔ اب دو انگلش میڈیم اسکول ہیں ان کے۔ کراچی کے ... مشہور اسکول ہیں جہاں بڑے بڑے لوگوں کے بچے پڑھتے ... کاجل پرنسپل ہے اور اکرام شیخ ایڈمنسٹریٹر۔ ان کا شمار شہر کے ... رئیسوں میں ہوتا ہے۔"

"اچھا کیا اکرام بھائی نے پولیس کی نوکری چھوڑ دی تھی۔ اس ... کوئی عزت نہیں تھی۔ ٹیکسی چلانے میں کوئی بے عزتی نہیں۔ ... اور حق حلال کی کمائی تھی اور دیکھ لو خدا نے اس کا صلہ دیا۔ ... بھی خدا نے کیسی دی۔"

غالب نے کہا "خیر سب سے اچھی تو مجھے دی ہے۔"

بہت رات گئے ہم کھانے کے بعد رخصت ہونا چاہتے تھے مگر ... پیچھے پڑ گئی۔ "آج رک جائیں نا یہاں۔"

میں نے کہا "بھئی رکنے کا کیا ہے۔ کہیں بھی سو سکتے ہیں لیکن ... یہ ڈاکٹر صاحب کا گھر ہے۔"

رابعہ نے بھی کہا "ہاں۔ تمہارا اپنا گھر ہوتا تو کوئی بات نہیں ... تھی۔"

"یہاں جگہ کی کمی تو نہیں ہے۔" غالب نے نازو کی حمایت کی ... ہمارا گھر بھی بن جائے گا بہت جلد۔"

"ہاں۔ زمین تو خرید لی ہے ہم نے" نازو نے کسی گھریلو بیوی کی طرح فخر کا اظہار کیا "بہت اچھی جگہ ہے۔ انگوری باغ اسکیم۔"

میں نے کہا "انگوری باغ۔ یہ تو غالباً شالیمار باغ کے سامنے ہے۔"

"بالکل وہی۔" نازو خوش ہو کے بولی "دس مرلہ زمین لی ہے ہم نے۔ اس کی قیمت ادا کر رہے ہیں ابھی۔ بعد میں گھر بنائیں گے۔ بہت شاندار۔"

ان کے اصرار کے سامنے میری ایک نہیں چلی۔ ڈاکٹر کریک اور اس کی بیوی نے ہمیں اپنے گیسٹ بیڈ کی آفر کی تھی۔ میں نے بتا دیا کہ کسی تکلف کی کوئی ضرورت نہیں۔ اول تو ہم سوئیں گے کہاں۔ باتیں ہی کرتے رہیں گے اور ضرورت پڑی تو نازو اور غالب ... کا کمرا کافی ہے۔

بوڑھا ڈاکٹر اب سرکاری طور پر ریٹائر ہو چکا تھا۔ وہ لاہور مینٹل ہاسپٹل کا ڈائریکٹر بھی رہا تھا مگر اس کا مسئلہ بھی ایمانداری اور فرض شناسی بن گیا۔ وہ بدعنوانی، غفلت یا مریضوں کے ساتھ غیر ہمدردانہ سلوک برداشت نہیں کرتا تھا۔ شاید اس سے بھی اتنا فرق نہ پڑتا۔ جب وہاں ذہنی طور پر سو فیصد صحت مند لوگوں کو داخل کرانے کی کوشش کی گئی اور ڈاکٹر کریک نے معائنے کے بعد کہا کہ ... پاگل ... نہیں لیکن انہیں وہاں لانے والے یقیناً پاگل خانے ... داخل ... کیے جانے چاہئیں تو معاملات خراب سے خراب تر ... ہونے لگے۔ کچھ لوگوں نے اسے بھاری رشوت پیش کی۔ پہلا کیس ... دولت مند اور بوڑھے شخص کا تھا جو مرنا تو دور کی بات ہے بیمار

تک پڑنے کا نام نہیں لیتا تھا اور اپنی ساری عمر کی کمائی کے خزانے پر سانپ بن بیٹھا تھا۔ اس کے وارث کہلانے کے انتظار میں دو بیٹے مر چکے تھے اور دو بیویاں اللہ کو پیاری ہوگئی تھیں۔ وہ تیسری کے چکر میں پڑا تو لواحقین یعنی دو بیٹوں اور دو دامادوں نے سنجیدگی سے اس فیصلے پر میٹنگ کی اور فیصلہ کیا کہ بزرگوار نے بہت دنیا دیکھ لی اور بہت عیش کر لیا۔ اب خود دوسری دنیا کو سدھار جائیں تو فبہا ورنہ ان کی رخصتی عمل میں لائی جائے۔ بعد میں بیٹیوں کو پتا چلا کہ دولت کے چکر میں ان کے لالچی شوہر ہی نہیں کمینے بیٹے بھی پیارے ابا جان کو مرحوم کرنے پر متفق ہوگئے ہیں تو انہوں نے رحم کی اپیل داخل کی اور سزائے موت کا حکم صادر کرنے والوں کو قائل کر لیا کہ انہیں زندہ رہنے دیا جائے بشرطیکہ وہ اپنی ساری دولت جائداد سے رضاکارانہ دستبرداری اور اسے منصفانہ طور پر تقسیم کے لیے راضی ہو جائیں۔ ابا جان کے سامنے کئی متبادل بھی رکھے گئے۔ وہ باری باری سب بیٹوں اور بیٹیوں کے ساتھ رہیں۔ انہوں نے صاف انکار کر دیا کہ جس گھر میں میری عمر گزری اور جہاں سے میری دو بیویوں کے جنازے اُٹھے' اسے میں کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ اس بات کا مطلب کچھ یوں بھی نکلتا تھا کہ اللہ نے چاہا تو ابھی مزید دو بیویاں آئیں گی اور چلی جائیں گی کیونکہ ابھی تو میں جوان ہوں۔ میں خود تو کہیں بھی رہ سکتا تھا مگر ساس بہو کے ساتھ امن و سکون کہاں رہے گا۔ داماد کے گھر میں رہنا ان کی غیرت کو گوارا نہیں تھا۔ انہوں نے کرائے پر کوئی ایک کمرے کا چھوٹا سا مکان لینے' ماہانہ گزارے کے لیے مناسب رقم قبول کرنے اور مستقل آمدنی کے لیے چھوٹی موٹی پرچون کی دُکان پر بیٹھنے سے بھی انکار کر دیا۔ ساری عمر افسرانہ شان کے ساتھ سیکڑوں ہزاروں یومیہ رشوت لینے والے ہاتھ اب مسور کی دال اور مرچ مسالا تولیں' چوّنی اٹھنی کے سودے کریں' ناممکن۔

ایسے ضدی شخص کا انجام صاف ظاہر تھا۔ بیٹوں نے ان کے بارے میں افواہیں پھیلائیں اور ان سے بے بنیاد باتیں منسوب کرنے کی باقاعدہ مہم چلائی یہاں تک کہ خود بزرگوار پریشان ہوگئے اور انہیں یقین آنے لگا کہ انہیں یاد نہیں رہتا لیکن وہ سب افسوس ناک حرکات ان سے یقیناً سرزد ہوئیں جن کی وجہ سے اولاد کو شرمندگی اٹھانی پڑی۔ جب وہ ڈاکٹر کے پاس جانے کے لیے تیار ہوگئے تو کام آسان ہوگیا لیکن تدبیر کند بندہ' تقدیر کند خندہ۔ "ہمدردوں" کو کیا معلوم تھا کہ آگے ابا جان سے بھی بڑے پاگل سے واسطہ پڑے گا۔ ڈاکٹر کریک نے تاڑ لیا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ اس نے پہلے تیمارداروں سے اور پھر بیمار سے الگ الگ بات کی تو حقیقت کھل کے سامنے آگئی' پہلے اس نے بیٹوں اور دامادوں کو اخلاقیات پر لیکچر سے قائل اور شرمندہ کرنے کی کوشش کی۔ والدین کے حقوق اور ان کے فرائض پر لیکچر دیا مگر وہ کہاں ماننے والے تھے۔ اُلٹا انہوں نے ڈاکٹر کریک کو رشوت کی پیشکش کر کے

اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری۔ ڈاکٹر کریک نے پولیس کو طلب کرلیا اور سارے معاملے کی رپورٹ کردی۔ اس خدشے کا اظہار بھی کردیا کہ بزرگوار کی زندگی کو خطرہ لاحق ہے اور جب بھی ان کی وفات حسرت آیات ہو تو پوسٹ مارٹم رپورٹ ضرور حاصل کی جائے۔

بعد میں ایسے چند کیس اور بھی آئے جہاں لوگ کسی ناپسندیدہ شخص کو قتل کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے تھے تو پاگل خانے میں چھوڑ آنے کا فیصلہ کرلیتے تھے تاکہ وہ اپنی باقی زندگی پاگلوں کے درمیان گزارے اور وہیں مرجائے۔ ایسے سب لوگ مایوس ہوئے مگر ڈاکٹر کریک کے لیے اس وقت سنگین مسائل پیدا ہوئے جب خود حکومت نے ایک سیاسی حریف کو جیل خانے سے شاہی قلعے اور پھر پاگل خانے پہنچانے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر کریک نے اسے داخل تو کرلیا مگر بعد میں اس نے تفصیل سے حقائق کا جائزہ لیا تو مریض کو سو فیصد نارمل قرار دے کر ڈسچارج کردیا۔ اگلے ہفتے اس کا تبادلہ وزارتِ صحت میں کردیا گیا جہاں وہ کچھ عرصہ او ایس ڈی بنا مکھیاں مارتا رہا۔ پھر ایڈیشنل سیکریٹری بنادیا گیا کیونکہ حکومت بدل گئی تھی اور وہ شخص جسے پاگل قرار دینے کی سرکاری کوشش ناکام ہوگئی تھی اب وزیرِ باتدبیر تھا۔ وہ ڈاکٹر کا احسان بھولا نہیں تھا مگر اس کی فطرت کو بخوبی سمجھ گیا تھا۔ یہ عین ممکن تھا کہ اب نئی حکومت کسی پرانے سیاسی حریف کو انتقاماً پاگل خانے بھیجے تو وہ پھر اڑ جائے۔ ایسے شخص کو پاگل خانے کا ڈائریکٹر بنانا کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ ترقی پانے کے باوجود ڈاکٹر کریک بے کار ہوگیا۔ وزارتِ صحت میں وہ ڈاکٹر نہیں صرف افسر تھا۔ کرپٹ بیوروکریسی کا ایک بے مصرف پرزہ۔ اس نے استعفیٰ دے دیا اور اپنا سائیکاٹرک کلینک کھول لیا اور اسے بڑی خوش گوار حیرت ہوئی جب اسے ایک لاکھ کا عطیہ پیش کرنے کے لیے سب سے پہلے وہی بزرگوار تشریف لائے جن کو ان کی اپنی اولاد نے پاگل خانے میں مرنے کے لیے چھوڑ جانے کی پوری کوشش کی تھی۔ بزرگوار کے ساتھ ان کی شریکِ حیات نمبر تین تھیں اور بظاہر یہ سفر اتنا لمبا نظر آرہا تھا کہ تیسری کا بھی راستے میں تھک کے ساتھ چھوڑ جانا بعید از قیاس نہ تھا۔ ڈاکٹر کریک کی مہربانی سے وہ ذہنی و جسمانی طور پر صحت مند بھی تھے اور زندہ بھی۔ اس کے بعد تین نامعلوم افراد کی طرف سے عطیات موصول ہوئے اور نیک خواہشات کے پیغامات بھی۔ ان سب نے ڈاکٹر کا پھر شکریہ ادا کیا تھا جس کی وجہ سے وہ آج بھی پاگل نہیں سمجھے جاتے۔ ظاہر ہے یہ سب پرانے لوگوں میں سے تھے۔ نیکی کبھی رائگاں نہیں جاتی۔ اس کا عملی ثبوت ڈاکٹر کو اب ملا تھا جب اسے واقعی مالی معاونت کی ضرورت تھی۔ اس کا سائیکاٹرک کلینک آسانی سے بن گیا اور اس کی توقعات سے بڑھ کے وسیع پیمانے پر کامیاب ہوا۔ اب وہاں دن رات درجنوں ڈاکٹر اور نرسیں کام کرتی تھیں مگر ان سب پر ڈاکٹر کریک اور اس کی بیوی نگراں تھے۔ وہ خدا کا شکر ادا کرتے تھے۔ "گاڈ کا مرضی کہ اس نے ہم کو اولاد نہیں دیا۔ ہم خوش ہے۔ ایسا اولاد ہوتا جو اولڈ ہو کے ہم کو بے کار چیز سمجھتا اور ہمارا ڈسپوزل ایسے کرتا جیسے ٹوٹا پھوٹا آؤٹ آف ڈیٹ فرنیچر نکالتا یا ہم کو اتنا تنگ کرتا کہ ہم ڈیتھ کا وش کرتا۔ اس سے بے اولاد ہونا اچھا۔ ابھی دیکھو، میں ہر چیز بہت اولڈ ہے۔ کچھ ہمارا فادر کا زمانے کا ہے۔ کچھ گرینڈ فادر کا ہے۔ اولڈ از گولڈ۔ لیکن یہ بات آدمی کا واسطے نہیں۔ اولڈ مین تو مصیبت ہوتا۔ اس کا بات سنو، پرانی باتیں، اس کو ٹائم دو، اس کا خدمت کرو۔ اس کا بیماری کا خرچہ اٹھاؤ۔ اس کا کھانسنا اور چیخ پکار سنو۔ معذور ہوجائے تو اس کو اٹھا کے لے جاؤ، ہر جگہ کبھی وہیل چیئر پر تو کبھی اسٹریچر پر ڈال کے۔ اس کا ڈرامہ کرو۔ صرف اس لیے کہ لوگ بولے۔ کتنا اچھا اولاد ہے۔ ڈیم لوگ۔ اس سے زیادہ آسان ہے کہ اس کا ڈسپوزل کرو۔ خود آرام کرے۔ ہم کو بھی آرام سے جینے دے۔ ادھر اولڈ ہوم ہے۔ لوگ پاگل خانے لے جاتا۔ اور پتا نہیں کتنا ہے جو قبر میں لے جاتا۔ لوگ سمجھتا کہ بڈھا مرگیا۔ کون سا عجیب بات ہے۔ اس عمر میں زکام بھی بہانہ بن جاتا ہے۔ کوئی شک نہیں کرتا۔ کوئی تفتیش کا بات نہیں کرتا۔ سب ڈیتھ کو نیچرل سمجھتا لیکن ہم جانتا ہے کہ کتنا ڈیتھ کا سبب نیچرل نہیں ہوگا۔ تھوڑا سا ہمت کا کام ہے۔ بڈھا کو دوا مت دو، غلط دوا دے دو، کسی جلاد کمپونڈر یا نرس کو رشوت دو کہ ایک انجکشن لگادے۔ ورنہ انجکشن لگانا کون سا مشکل کام ہے۔ ضمیر کا ایسی تیسی، تھوڑا دن تنگ کرے گا پھر چپ ہوجائے گا۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ ہم نے دنیا دیکھا ہے۔ اس دنیا کا گاڈ پیسہ ہے۔ ابھی پرانی کتابوں میں کیا لکھا ہے، ہولی بک میں کیا ہے۔ اچھا کیا ہے، آل نان سنس۔ ہمارا عمر سیونٹی فائیو ہے، پورا ہاف سنچری ہم اس پروفیشن میں گزارا۔"

میں اور غالب ہی نہیں رابعہ اور نازو بھی دم بخود بیٹھے انسانی فطرت کے اس غیرانسانی مشاہدے کی داستان عبرت سن رہے تھے اور خود اپنے بڑھاپے کے تصور سے ہم پر لرزہ طاری ہورہا تھا۔ جوان زندگی بہت حسین تھی جس میں خواہشات کے ساتھ توانائی تھی۔ عزائم کے ساتھ قوت تھی۔ ہم اپنے ارادوں پر اپنی کوشش کا اختیار ضرور رکھتے تھے اور کسی پر بار نہ تھے۔ مگر کیا ایسا وقت آئے گا؟

میں نے ذہن سے ان دہشت زدہ کرنے والے خیالوں کو جھٹک دیا۔ نہیں، ڈاکٹر نے زندگی کا تاریک پہلو دیکھا ہے اور اس تاریکی کو زندگی سمجھ لیا ہے۔ ایسا ہمارے معاشرے میں ہوتا بھی ہوگا تو اس کا تناسب نہ ہونے کے برابر ہے۔ سو کیا ہزار میں ایک بھی ایسا ناخلف بیٹا نہیں ہوگا جو باپ کی دولت ہتھیانے کے لیے اسے مروادے یا پاگل خانے میں پہنچادے۔ ایسا تو ابھی یورپ امریکا میں نہیں ہوتا۔ ان کے اولڈ ہوم ہمارے لاکھوں گھروں سے کہیں زیادہ آرام دہ اور پرآسائش ہیں جہاں انسان ریٹائرمنٹ

بعد اپنی قلیل پنشن میں روکھی سوکھی کھا کے بمشکل تمام زندگی کے دن پورے کرتا ہے۔ ناخلف یہاں بھی ہیں مگر بہت کم۔ بیشتر ماں باپ کی خدمت کو اپنا فرض سمجھتے ہیں اور اس فرض کو عبادت کی طرح ادا کرتے ہیں۔ جہاں مرنے کے بعد بھی کم سے کم دو نسلیں باپ اور دادا کی برسی پر انہیں ضرور یاد کرتی ہیں اور لوگ باقاعدگی سے شبِ برات یا عید بقر عید اور برسی کے موقع پر ان کی مغفرت کے لیے فاتحہ خوانی کرنے قبرستان بھی جاتے ہیں۔

جب ڈاکٹر کریک سونے چلا گیا تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اس عمر میں آدمی کتنا ہی نارمل رہنے کی کوشش کرے اس کا تھوڑا سا خبطی اور قنوطی ہو جانا عین فطری ہے۔ مجموعی طور پر وہ فرشتہ سیرت ڈاکٹر انتہائی شریف اور قابلِ تعظیم تھا۔

رابعہ اور نازو کو باتوں میں مصروف چھوڑ کے میں اور غالب باہر نکل آئے۔ شملہ پہاڑی کے گردونواح میں دن کے مقابلے میں کم ٹریفک تھی مگر لاہور پریس کلب کی سائیڈ پر سکون تھا اور خاموشی تھی۔ ہم ایک بینچ پر بیٹھ گئے جو سڑک سے کچھ فاصلے پر لگی ہوئی تھی۔ ایسی ہی دوسری بینچ پر جو بیس بائیس گز دور تھی ایک عورت اور مرد چپ بیٹھے رات کی خاموش رفاقت سے لطف اندوز ہو رہے تھے یا شاید اُداس تھے اور تنہائی میں ان کے لیے سکون تھا۔

میں نے غالب سے کہا "کیا بات ہے۔ تُو نے اور کوئی بات نہیں کی۔"

"اور بات ؟"

"ہاں۔ میرے بارے میں، ہمارے معاملات کے بارے میں۔ کیا میں تجھے یاد دلاؤں کہ وہ معاملات کیا تھے؟"

اس نے سوچ کے کہا "یاد دلانے والی تو کوئی بات نہیں۔ اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ سب یاد ہے مجھے۔"

"پھر کیا تو عمداً گریز کر رہا تھا؟"

"دراصل.... تم سب سے اتنا عرصہ دور اور لاتعلق رہنے کے بعد.... ابھی تک میرے ذہن میں کنفیوژن ہے۔ بعض اوقات پرانے واقعات پر شک ہوتا ہے کہ وہ کسی ڈراؤنے خواب کا حصہ تھے یا حقیقت۔ کبھی سارے واقعات کی کڑیاں مل جاتی ہیں تو کوئی شک نہیں رہتا اور گزرے ہوئے وقت کی ساری تاریخ پر اپنی آپ بیتی ہونے کا یقین آجاتا ہے۔ پہلے جو کچھ ہوا وہ سب تو تجھے یاد ہے لیکن درمیان میں کچھ وقت ایسا گزرا جو واقعی ایک بھیانک خواب تھا لیکن یہ خواب بھی مجھے پوری طرح یاد نہیں۔ اس خواب کی منتشر یادیں اچانک ذہن پر یلغار کرتی ہیں۔ میں کہاں رہا۔ کس کے ساتھ رہا اور کتنا عرصہ تم سب سے دور رہا۔ یہ سب تم ہی بتاؤ گے۔ مجھے بتانے والا کون تھا۔ میں خود ذہنی خود فراموشی کے خلا میں سرگرداں تھا۔ جب آہستہ آہستہ پھر اپنی دنیا کی طرف لوٹا تو میں نازو کے خوف میں مبتلا ہو گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے کوئی نامعلوم شیطانی طاقت مجھے نازو سے دور کر دینا چاہتی ہے اور میں بالکل اکیلا ہوں۔

بے بس ہوں، پہلے اس طاقت نے مجھے جہنم میں دھکیل دیا تھا۔ جہنم کی اذیت کو جھیلنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ میں نازو کے لیے زندہ رہنے پر مجبور تھا اس لیے وہ سب کچھ برداشت کرلیا۔ اس جہنم سے نکل کے میں نہ جانے کس دنیا میں چلا گیا تھا جہاں مجھے اپنے پرائے کسی کی شناخت نہیں رہی تھی۔ یہ بھی بھول گیا تھا کہ میں کون ہوں لیکن اس حالت میں بھی نازو کی جستجو کر رہا تھا۔ اچانک نازو مجھے مل گئی لیکن اب معاملہ ہو گیا تھا۔ نازو وہ نازو نہیں تھی۔ لگتا تھا وہ کسی دوسری دنیا کی ہے۔ کسی اور سیارے سے اُتری ہے۔ وہ مجھے نہیں جانتی تھی کو بھی نہیں پہچانتی تھی۔ میرا یقین زیادہ پختہ ہو گیا کہ یہ وہی شیطانی قوت ہے۔ پہلے اس نے مجھے نازو سے دور کر دیا تھا اب نازو کو مجھ سے دور کر دیا ہے۔ لیکن میں نے بھی تہیہ کرلیا تھا کہ نازو کو واپس حاصل کر کے رہوں گا۔ اس کے بعد حالات بہتر ہونے لگے۔ رفتہ رفتہ اس شیطانی قوت کی گرفت کمزور پڑنے لگی۔ اگر وہ جادو تھا ہم اس کے اثر سے آزاد ہوتے گئے۔ کسی نے سفلی عمل کرایا تھا اس کی نحوست کے اثرات زائل ہونے لگے۔ اندھیرا اور دھند چھٹتی گئی اور صورتِ حال واضح ہونے لگی۔ ڈاکٹر انکل فرشتہ خیر کی طرح ہماری راہنمائی کرنے لگے اور ہم دنیا کو پہچاننے لگے۔ مسائل کو سمجھنے لگے۔ ایک دوسرے کے قریب آتے گئے۔ جذبات کی ہم آہنگی نے ہمیں ایک دوسرے کا سہارا بنا دیا اور اب تم رہے ہو۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ نازو بھی ٹھیک ہے بس وہ ماضی سے گریزپا ہے۔ وہ صرف حال میں زندہ رہنا چاہتی ہے اور مستقبل کی بات کرتی ہے۔"

"کیا تم نے کبھی اس سے گزرے ہوئے وقت کی کوئی بات کی تھی جو کسی پُرآزار تلخ یاد سے وابستہ ہو۔"

"ہاں۔ میں نے اس سے پوچھا تھا کہ اتنے دن تم کہاں تھیں۔ اس نے حیرانی سے کہا "یہ تم مجھ سے پوچھ رہے ہو؟ تم خود کہاں تھے۔ میں نے کہا کہ تمہیں تو اغوا کرلیا گیا تھا۔ وہ خفا ہو گئی کہ کیا پاگل ہو گئے ہو۔ مجھے کون اغوا کر سکتا ہے۔ کس میں ہے اتنی ہمت؟" میں نے ہنس کے کہا کہ بھئی یہ تو ٹھیک ہے کہ تم ٹارزن بچّی ہو مگر چوہدری دلاور، شوکت رانا اور ڈاکٹر شاہ کی تگڈم بھی تو کم نہیں ہے۔"

"پھر؟ کیا ردِ عمل ہوا اس پر۔"

"کچھ نہیں۔ وہ ایک دم بلینک ہو گئی۔ اس کا چہرہ سپاٹ ہو گیا۔ اس نے کہا کہ یہ کون لوگ ہیں۔ میں کسی کو نہیں جانتی۔ میں نے کچھ نام اور بھی لیے مگر اس نے تو جیسے حافظے کے دروازے بند کر دیے تھے۔"

"تم نے ہمارے بارے میں پوچھا ہوتا ؟"

"میں نے پوچھا تھا۔ تمہارا، محسن، گل، رابعہ اور مظہر کے نام اسے یاد تھے۔ وہ مجھ سے پوچھتی رہی کہ آخر یہ سب لوگ کہاں چلے

گئے ہیں ہمیں چھوڑ کے۔ کئی سال ہو گئے۔ ہم سے کوئی ملنے نہیں آیا۔ کسی نے فون نہیں کیا۔ خط نہیں لکھا۔ میں نے کہا کہ یہ سالوں کی بات نہیں تو کہنے لگی کہ اچھا مہینوں کی ہوگی۔ کتنے مہینے سے میں نے انہیں نہیں دیکھا۔ میں نے پھر اسے یاد دلانے کے لیے کہا کہ یہ مہینوں کی نہیں چند ہفتوں کی بات ہے۔"

"اس نے مان لی تمہاری بات؟"

"ہاں۔ بس میرا دل رکھنے کے لیے مان لی کہ اچھا تم کہتے ہو تو چند ہفتے ہی ہوں گے مگر وہ لوگ ہیں کہاں۔ ایسی کیا مصروفیت ہے کہ وہ ہمیں دیکھنے تک نہیں آئے۔ اکیلے تم ہو جو میری تیمارداری میں دن رات ایک کر رہے ہو۔"

"یعنی اسے احساس تھا کہ وہ بیمار ہے؟"

"ہاں۔ وہ سمجھتی تھی کہ یہ اسپتال ہے۔ لیکن اسے اپنی بیماری کی نوعیت کا علم نہیں تھا۔"

"اس نے کبھی تم سے نہیں پوچھا کہ مجھے کیا بیماری ہے؟ میں یہاں کیسے پہنچ گئی؟"

"اس نے ڈاکٹر انکل سے پوچھا تھا۔ انہوں نے بڑی ہوشیاری سے کہا کہ بے بی سوچو، ذہن پر زور دو کہ کیا ہوا تھا۔ نازو نے بہت کہا کہ مجھے کچھ یاد نہیں تو ڈاکٹر انکل نے کہا کہ بس یہی تمہاری بیماری ہے۔ جس دن تمہیں یاد آگیا اس دن تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔ میں نے غالب کو بھی کچھ بتانے سے منع کر دیا ہے۔ ٹھیک ہونے کے لیے تمہیں خود کوشش کرنی ہوگی۔ نازو نے بعد میں مجھ سے کہا کہ آخر میری یادداشت کو کیا ہو گیا ہے۔ کیا میرے سر میں کوئی چوٹ آئی تھی؟ کوئی شدید ذہنی صدمہ ہوا تھا مجھے؟ میں نے بھی کہا کہ یہ تمہیں خود سوچنا ہوگا۔ تاکہ تمہارا یہ مسئلہ یا مرض ختم ہو۔ اس کا علاج خود تمہارے ہاتھ میں ہے اور میں ڈاکٹر انکل کے احکامات کی خلاف ورزی کر کے کیس خراب کرنا نہیں چاہتا۔ بعض اوقات اس پر جھنجلاہٹ سوار ہو جاتی تھی۔ وہ مجھ پر بگڑتی تھی اور خفا ہوتی تھی کہ تم میری مدد نہیں کر رہے ہو۔ پھر میں کہتا تھا کہ اور کیا میں یہاں پکنک منا رہا ہوں تمہارے ساتھ۔ دن بھر تمہارے ساتھ رہتا ہوں اور رات بھر تمہارا خیال رکھتا ہوں۔ پھر وہ شرمندہ اور جذباتی ہو جاتی تھی کہ غالب، شاید اتنا میں کبھی تمہارے لیے نہ کر سکوں۔ میں نے کہا کہ خدا نہ کرے کہ اس کی ضرورت پیش آئے۔ وہ میرے لیے پاگل پن کی حد تک جذباتی تھی۔ کہتی تھی کہ تم نے مجھے بچا لیا۔ میں نے کہا کہ بچانے والا تو خدا ہے یا پھر ڈاکٹر انکل کی کوشش ہے تو وہ کہتی تھی کہ نہیں، تم نہ ہوتے تو ڈاکٹر انکل بھی کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ میں تمہارے لیے زندہ رہنا چاہتی تھی۔ زندگی بھر تمہارے ساتھ رہنے کے لیے زندہ رہنے کی آرزو تھی جس نے مجھے مرنے نہیں دیا۔ تم محبت کی وہ زمین ہو جس کی انتہائی گہرائی تک میرے وجود کی جڑیں اُتری ہوئی ہیں۔ اسی کے سہارے پر میں زندہ ہوں۔ زمین کے ساتھ جڑوں کا رشتہ ٹوٹ جائے تو پودے اور درخت بھی سوکھ کے مرجاتے ہیں۔ خدا نہ کرے، خدا نہ کرے۔ کبھی تم نہ رہے تو میں کہاں رہوں گی۔ بس ایسی ہی باتیں کرتی رہتی تھی وہ۔"

"اسے بالکل یاد نہیں کہ ڈاکٹر شاہ نے اس پر کیا ظلم اور تشدد کیا تھا۔"

"نہیں۔ اسے ڈاکٹر شاہ کا نام بھی یاد نہیں۔"

"پھر تو یہ بھی یاد نہیں ہوگا کہ ڈاکٹر شاہ سے اس کی شادی ہوئی تھی۔"

غالب ایک دم بھڑک اُٹھا "یہ کیا فضول بات ہے۔"

میں نے کہا "یہ واقعی ایک فضول بات ہے جو ڈاکٹر شاہ نے مشہور کی تھی۔"

"پھر اس کا حوالہ دینے کی بھی کیا ضرورت ہے۔"

"غالب۔ کیا تم نے نازو سے شادی کرلی ہے ؟"

"نہیں۔"

"پھر نازو ایسا کیوں سمجھتی ہے؟"

"اس کی وجہ میں کیسے بتاؤں۔ بس اس کی خواہش ہے یا ایک خیال ہے جو اس کے دماغ میں بیٹھ گیا ہے۔ ظاہر ہے میں انکار نہیں کر سکتا۔ بحث کر کے اور دلائل دے کے اسے قائل نہیں کر سکتا کہ یہ سب مفروضات ہیں۔"

"پھر بھی۔ یہ خیال اچانک حقیقت کیسے بن گیا۔"

"پھر وہی نامعقول بات۔ کیسے کا جواب تو ڈاکٹر انکل بھی نہیں دے سکتے۔ نازو نے خود ہی ایسا سمجھ لیا ہے۔ کیونکہ وہ ایسا چاہتی تھی۔"

"میرا مطلب تھا یہ کب ہوا؟ چاہنے والی بات سے مجھے انکار نہیں۔"

"بس ایک صبح وہ اُٹھی تو ایسی ہی باتیں کرنے لگی۔ جیسے ہماری شادی ہو چکی ہے۔ وہ سب باتیں جو اس نے سُنی تھیں یا دیکھی تھیں اس نے اپنی اور میری شادی سے منسوب کرلیں۔ شادی کے سین جو فلموں میں، ڈراموں میں، ناولوں میں اور گھروں میں نظر آتے ہیں۔ ان سب کو نازو نے جوڑ کے اپنی اور میری شادی کی پوری فلم بنا لی اور ظاہر ہے، اس میں سارا کمال اس کے مشاہدے، حافظے اور تصور کا ہے۔ یہ ہوا تھا، وہ ہوا تھا۔ تم نے یہ کہا تھا۔ فلاں نے یہ کہا تھا۔ کس نے کون سے کپڑے پہنے تھے۔ کون کون شریک ہوا تھا۔ وہ ایسی تفصیل سے بتاتی ہے کہ کوئی سنے تو سچ مان لے۔ غالباً یہ خواب تھا۔"

"نازو کا کیا خیال ہے۔ شادی کو کتنا عرصہ ہو گیا ہے؟"

"پتا نہیں۔ اس سے پوچھا بھی تھا میں نے تو وہ ہنسنے لگی کہ ایسا تو برسوں بعد ہوتا ہے کہ شوہروں کو شادی کا دن یاد نہیں رہتا۔ مذاق سمجھی وہ میری بات کو۔ اس کے ذہن میں یہ ہے کہ شادی کو زیادہ دن نہیں گزرے۔ غنیمت ہے کہ وہ سب باتیں خود کرتی ہے۔

مجھ سے کچھ نہیں پوچھتی۔"

"جب سے تم یہاں ہو" میں نے قدرے تذبذب کے ساتھ کہا "اور جب سے نازو یہ سمجھنے لگی ہے کہ تم میاں بیوی ہو' تب سے تمہارے تعلقات کی نوعیت میں کوئی فرق پڑا ہے؟"

میرا سوال بہت گول مول تھا مگر غالب سمجھ گیا "تیرا مطلب ہے کہ کیا میں بھی خود کو اس کا شوہر سمجھنے لگا ہوں؟"

"یار' یہاں تُو ہی اس کا تیماردار تھا۔ تم ایک ہی کمرے میں تھے۔ ایک عورت اگر اپنے شوہر کے ساتھ تنہا ہو.... تو...."

"صاف پوچھ لے یار کہ کیا تمہارے درمیان ازدواجی تعلقات ہیں؟"

میں نے ایک گہری سانس لی "کیا نازو نے کبھی کوشش نہیں کی.... میرا مطلب ہے یہ تو ایک فطری سی بات ہوتی۔ تُو لاکھ اجتناب کرتا۔"

"ہاں۔ مجھے خاصی مشکل پیش آتی تھی۔ میں نے ڈاکٹر انکل سے مدد مانگی۔ انہوں نے کہا کہ نو پرابلم۔ وہ تم سے پہلے سوجائے گی۔ تم دونوں کھانا تو ایک ساتھ ہی کھاتے ہونا۔ کھانے کے بعد آدھا گھنٹا اس کے ساتھ گزارنا تو کوئی مشکل نہیں۔ وہ مطمئن ہوکے سوجائے گی۔ صبح تم اس سے پہلے اُٹھ جاؤ گے۔ لیکن اس پر یہی ظاہر کرنا کہ اس کے ساتھ ہی تھے۔ اسے تمہارا بیڈ بالکل صاف نظر آئے۔ ایک شکن بھی نہ ہو چادر میں۔"

میں نے ہنس کے کہا "اور یہ ڈراما چلتا رہا۔"

"مجبوری تھی یار۔ ایک طرف وہ میرے اتنے قریب تھی' میری دسترس میں تھی اور خود کو میرے سپرد کرچکی تھی۔ اس کے ذہن میں احساسِ جرم وگناہ بھی نہیں تھا۔ اس کا دل رکھنے کے لیے بلکہ اس کو ذہنی طور پر مطمئن رکھنے اور احساسِ تحفظ عطا کرنے کے لیے شوہر کا کردار ادا کرنا بھی لازمی تھا۔ دوسری طرف احتیاط کے تقاضے تھے۔ ڈر تھا کہ کہیں جذبات کی شدید رو مجھے تنکے کی طرح نہ بہالے جائے۔ مجھ سے شجرِ ممنوعہ کو چکھ لینے کا گناہِ آدم نہ سرزد ہوجائے۔ اور اس کی پاداش میں اپنی محبت کی جنت سے نکل کے میں ندامتوں کی پستی میں گرجاؤں۔ اب میں تجھ سے کیا چھپاؤں' کسی اور کے سامنے تو میں ایسی بات بھی نہیں کرسکتا۔ بعض اوقات مجھے اس کے ساتھ سونا پڑتا تھا۔ وہ مجھ سے چمٹ کے سوجاتی تھی۔ میں دل ہی دل میں ڈرتا رہتا تھا۔ خدا سے امان مانگتا رہتا تھا کہ مجھ سے قبل ازوقت کوئی غلطی سرزد نہ ہوجائے۔ مجبوری کا عذر اپنی جگہ' غلطی تو غلطی ہی رہتی ہے۔ اگر کوئی کسی سے گن پوائنٹ پر زیادتی کرے تب بھی احساسِ ندامت تو ختم نہیں ہوتا خواہ دنیا کی نظر میں یا قانون کی نظر میں یہ مجبوری ہو۔ اس کی باتیں' اس کا رویّہ' بالکل بیویوں جیسا ہوتا تھا مگر میں ٹالتا تھا۔ بہانے کرتا تھا۔ کبھی اچانک اُٹھ جاتا تھا۔ ایک بار اس نے کھانا نہیں کھایا۔ کہنے لگی بھوک نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ بیٹا غالب' آج تم مارے گئے' آج یہ خود بھی نہیں سوئے گی اور تمہیں بھی نہیں سونے دے گی۔ خیر اس وقت میں نے طے کرلیا تھا کہ نازو کے ذہن سے یہ خوش فہمی دور کرنے کے لیے سچ کی کڑوی گولی اس کے حلق سے اتارنی پڑی تو میں ایسا ہی کروں گا۔ اس کا ذہن اور خراب ہوتا ہے تو ہوجائے۔ میں شادی سے پہلے اس کا شوہر نہیں ہوسکتا۔ میں اسے بتادوں گا کہ یہ سب اس کے ذہن کی اختراع ہے اور دماغ کا فتور ہے۔ لیکن پھر مجھے ایک بہانہ سوجھا۔ میں کھانے کے بعد پیٹ پکڑ کے ہائے ہائے کرنے لگا اور ڈاکٹر انکل نے مجھے ہاضمے کی دوا دی جو میں نے بڑے شوق سے پی لی کہ وہ رات بھر جاگتی رہی اور میں بھی جب آنکھ کھلتی کراہنے لگتا۔"

مجھے غالب کی حالت کا تصور کرکے بہت ہنسی آئی "اب بات چھڑ گئی ہے تو ایک دو سوال اور کرلوں۔ آپس کی بات ہے یار' ہم میں کون سا پردہ ہے شرم کا۔"

"ہوگی کوئی بے شرمی کی بات۔"

"ہاں اگر تم سمجھو۔ ورنہ یہ ایک بیمار عورت کی ذہنی کیفیت کا حال ہے۔ وہ تم سے زیادہ مجبور تھی۔ تمہیں اپنے ذہن پر اختیار تھا۔ اسے نہیں تھا۔ اس پر ایک لطیفہ عرض ہے۔ اُمید ہے تم نے سُنا ہوگا۔ کسی خاتون نے ڈاکٹر سے کہا کہ میں بہت پریشان ہوں۔ میرے شوہر خود کو چوہا سمجھنے لگے ہیں۔ بلی کو اور چوہے دار دیکھتے ہی کانپنے لگتے ہیں۔ ڈاکٹر نے کہا پریشانی کی کوئی بات نہیں آپ انہیں محبت سے یقین دلائیں کہ وہ مرد ہیں اور آپ کے شوہر۔ بیوی نے کہا۔ میں نے تو بہت سمجھایا۔ مگر ڈاکٹر صاحب' بلی میری بات نہیں سمجھتی نا۔"

غالب نے کہا "اس لطیفے میں مجھے کیا سمجھا جاسکتا ہے؟ شوہر' بیوی یا بلی؟"

میں نے کہا "تیرے ذہن میں تو بیوی کی سوچ نہیں تھی نا۔"

"لاحول ولاقوۃ۔ اتنا عرصہ تو رابعہ کے ساتھ رہا۔ کہاں کہاں بھٹکتے پھرے تم دونوں۔ جہاں کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔ کبھی نہ دماغ بھٹکا تھا؟"

"نہیں۔ دراصل ہم دونوں کے دماغ صحیح تھے۔ یہاں نازو کا بالکل ٹھیک نہیں تھا اور تیرا کچھ کچھ خراب تھا۔ کیا کبھی نازو نے تیری بے التفاتی کا شکوہ نہیں کیا۔ یہ نہیں کہا کہ.... روزمنہ پھیر کے سوجاتے ہو۔"

"نہیں۔"

"صبح افسوس یا معذرت بھی نہیں کرتی تھی کہ وہ خود اتنی جلدی سوگئی تھی۔"

"یار اب کیا میں سارے ڈائیلاگ سُناؤں۔ وہ سب منظر کی میں آتے ہیں۔ نو بیاہتا میاں بیوی کی گفتگو بہت پرائیوٹ ہوتی ہے۔ بس میں نے اسے کسی نہ کسی طرح مطمئن رکھا کہ ہم میاں بیوی ہیں اور ہمارے ویسے ہی تعلقات بھی ہیں۔"

"میں نہیں مانتا.... کہ وہ مان گئی ہو۔"

"معلوم ہے اس نے ایک دن کیا پاگل پن کیا؟" غالب ہنس پڑا "میرا خیال ہے کچھ بدہضمی تھی یا شاید ہچکی آئی۔ اس نے ڈاکٹر انکل کی وائف سے کہا کہ غالباً میں اُمید سے ہوں۔"

افسوس کی بات تھی مگر مجھے بھی بے ساختہ ہنسی آئی "یار غالب' تو اب اس سے شادی کرہی لے۔"

"اب تو زیادہ مشکل ہوگیا ہے؟"

"وہ کیوں؟"

"یار پہلے اسے یقین دلاؤں کہ شادی وادی کچھ نہیں ہوئی تھی اور ابھی تک یہ سب ڈراما تھا۔ میں اسے بے وقوف بنا رہا تھا۔ وہ تو جان سے مار ڈالے گی مجھے یا پھر پاگل ہوجائے گی۔"

میں نے کہا "ہاں۔ یہ مشکل تو ہے۔ خیر اس کا بھی کوئی حل تلاش کرلیں گے۔"

"اتنا عرصہ میں اس پریشانی میں مبتلا رہا۔ صبح سے شام تک شوہر کا رول کرنا اور ساتھ ہی خود کو شوہر بننے سے بچانا۔"

"یہ ڈاکٹر انکل کو معلوم تھا؟"

"ہاں۔ انہوں نے میری مدد نہ کی ہوتی تو میں بھاگ جاتا نازو کو چھوڑ کے۔"

"اس مشکل سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں بتایا؟"

"ان کا بھی یہی کہنا تھا کہ سب خود ہی ٹھیک ہوجائے گا۔ جب اس کا رابطہ پھر زندگی کے حقائق سے ہوگا تو نازو خود سمجھ جائے گی کہ خواب اور خیال کو اس کے تصور نے حقیقت بنا رکھا تھا۔ جیسے آدمی فلم دیکھتے ہوئے بھول جاتا ہے کہ وہ فلم دیکھ رہا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ وہ کہاں ہے۔ اندھیرے میں اس کے سامنے اسکرین پر جو کچھ ہے محض ایک عکس ہے۔ اس کے باوجود لوگ تالیاں اور سیٹیاں بجاتے ہیں۔ جب ہیرو کے ہاتھوں ولن کی درگت بنتی ہے اور خواتین خوب آنسو بہاتی ہیں جب ظالم شوہر یا سوتیلی ماں کے مظالم کے المناک مناظر سامنے آتے ہیں۔ جذبات کا کھیل ایسا ہی ہوتا ہے۔ آدمی جب تین گھنٹے بعد ہال سے باہر آتا ہے تو نارمل ہوجاتا ہے۔ ایسے ہی اچانک نازو بھی نارمل ہوجائے گی۔"

"مطلب یہ کہ اسے سنیما ہال سے نکالا جائے۔"

"ہاں۔ یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے۔"

"اوکے۔ صبح ہم ڈاکٹر انکل سے اجازت لیں گے اور تم دونوں کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔" میں نے کہا۔

"شاید وہ اتنی جلدی اجازت نہ دیں۔"

"ہم ان سے کب اجازت مانگ رہے ہیں۔ ہم تو بس شکریہ ادا کریں گے اور کہیں گے کہ خدا حافظ۔ نازو بھی ٹھیک ہے اور غالب بھی۔ جو ایک دو فیصد خرابی ہے کہیں تو ہم سب مل کے ٹھیک کرلیں گے۔"

غالب نے کہا "تم سب نے بھی ہماری کوئی خبر نہیں لی۔"

"خبر کیا لیتے۔ ہم خود خبر بنے ہوئے تھے۔ خبروں کی زینت تھے۔"

غالب نے معذرت کی "میں نے تو اخبار بھی نہیں دیکھا عرصے سے۔"

"ہاں۔ آپ تو دوسری دنیا میں تھے۔ آدم وحوا کی حیثیت میں۔"

"شجرِ ممنوعہ اور شیطان کے ساتھ۔ خیر چھوڑ اب اس ذکر کو۔ یہ بتا خبریں کیا تھیں؟" غالب بولا۔

میں نے گھڑی دیکھی "ایک بج رہا ہے بیٹے۔"

"بجنے دے۔"

"بیوی مارے گی۔ پوچھے گی کہاں آوارہ گردی کررہے تھے۔ یہ بیویاں بہت چڑتی ہیں ایسے لنگوٹیے یاروں سے جن کی صحبت میں وہ گھر کا راستہ بھول جائیں۔"

غالب نے کہا "میں مار کھالوں گا۔ پہلے بھی کھاتا تھا۔ اور زندگی بھر کھاؤں گا شاید۔ بیوی ہی قسمت سے ایسی ملی ہے' مار دھاڑ سے بھرپور۔"

میں نے خاصے اختصار سے کام لیا اور اسے تازہ ترین صورت حالات سے آگاہ کردیا۔ ہم ٹہلتے ہوئے واپس پہنچے تو رابعہ اور نازو مختصر سے باغ میں کرسیوں پر بیٹھی باتوں میں مصروف تھیں۔ میرا خیال تھا کہ اب وہ طنز سے کہیں گی کہ آگئے خیر سے لوٹ کے گھر۔ اور ہم بدھو کی طرح سر جھکا کے کہیں گے کہ جی کچھ دیر ہوگئی مگر انہوں نے تو ہمارے آنے کا نوٹس ہی نہیں لیا۔ وہ اپنی باتوں میں اتنی منہمک تھیں کہ انہیں ہمارے اندر جانے کی خبر بھی نہیں ہوئی۔ کچھ دیر بعد ہم نے باہر آکے انہیں ڈانٹا کہ کیا بک بک لگا رکھی ہے۔ پتا ہے کیا بجا ہے؟"

رابعہ نے کہا "معلوم ہے۔"

"خود سونے کا ارادہ نہیں ہے تو ہمیں سونے دو۔" غالب بولا۔

"سو رہے تھے تو اُٹھ کے کیوں آئے۔ ہمیں چکر دیتے ہو؟" رابعہ بولی۔

"ہمارے پاس اب کچھ نہیں ہے تمہیں دینے کو.... چکر شکر۔" میں نے کہا۔

"ویسے بھی ہم کچھ لے تو نہیں رہے ہیں تم سے اگر چکر دے رہے ہیں تو تمہیں کہنا چاہیے تھینک یو۔" غالب نے کہا۔

میں نے اور غالب نے ڈرائنگ روم کے قالین پر کشن ڈال کے ڈیرا جمایا اور لیٹتے ہی سوگئے۔ غالب نے لیٹتے ہوئے کہا "اللہ کا شکر ہے۔ آج تو چین سے سونا نصیب ہوگا۔"

میں نے کہا "بیٹے۔ تمہاری عادت تو نہیں بگڑ گئی۔ مجھ سے ذرا دور رہنا ورنہ ایسی لات ماروں گا کہ فٹ بال کی طرح کھڑکی سے باہر جاکے گرے گا۔"

صبح ناشتے کی میز پر پہنچنے سے پہلے رابعہ نے مجھے پکڑلیا۔ وہ سخت تشویش میں مبتلا تھی۔ "یہ نازو کا کیس تو بہت سیریس ہوگیا ہے۔"

میں نے کہا "میرا اور تمہارا کیس بھی خاصا سیریس ہے۔"

"وہ... پاگل لڑکی کہہ رہی تھی کہ... وہ اُمید سے ہے۔"

"اللہ مبارک کرے۔" میں نے کہا "کیا تم نہیں ہو؟"

"سکندر۔ یہ بدتمیزی ہے۔"

"وہ کیسے؟ میں نے پوچھا ہے کہ کیا مستقبل کے بارے میں تم پُرامید بھی نہیں ہو" میں نے معصومیت سے کہا "وہ تو میں بھی ہوں۔"

وہ ہنس پڑی "مگر آخر ہوگا کیا......؟"

"لڑکا یا لڑکی" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"بے ہودہ' بکواسی" اس نے مجھے تکیے سے مارنا شروع کیا۔

"اُفوہ۔ آخر تم پر بھی اثر ہوگیا نا" میں نے اپنا دفاع کیا "پورا جملہ سُنا نہیں گالی گلوچ شروع کردی۔ میں کہنے والا تھا کہ لڑکا یا لڑکی کچھ نہیں ہوگا تم بالکل فکر مت کرو۔ میں کچھ نہیں ہونے دوں گا۔"

وہ ہنسنے لگی "پاگل ہوگئے ہو' تم کچھ نہیں ہونے دوگے' وہ کیسے؟"

میں نے کہا "یہ میں شادی کے بعد بتاؤں گا۔ اتنا بے وقوف بھی نہیں ہوں جتنا کہ نظر آتا ہوں۔ ہماری حکومت خود چاہتی ہے......"

"سکندر...... سکندر۔ میں قتل کردوں گی تمہیں" وہ دانت پیس کے بولی "میں نازو کی بات کررہی تھی۔"

"میں بھی نازو کی بات ہی کررہا تھا" میں نے کہا "اپنی نہیں۔ ہمارے تو سال میں دو ہوں گے۔ ربیع کی فصل اپریل میں اور پھر خریف کی نومبر میں۔"

وہ ضبط کی کوشش کے باوجود ہنس پڑی "سخت ڈھیٹ اور بے شرم چیز ہو۔"

"دیکھو ڈارلنگ۔ جو بھی نازو نے تمہیں بتایا ہے نا کل رات' وہ سب غلط ہے۔ بے بنیاد ہے' بکواس ہے۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"جب تمہارے راز و نیاز جاری تھے نا۔ تو میں نے تمہاری صورت بھی ملاحظہ فرمالی تھی اور تمہاری نازو کی شکل بھی۔ وہ تو خیر ہے ہی پاگل۔ تم اس سے زیادہ پاگل ہورہی تھیں۔ جیسے دلہن شبِ عروسی کے بعد میکے لوٹتی ہے تو سہیلیاں گھیرلیتی ہیں اسے اور پھر انتہائی سنسنی خیز مگر سنسر کے قابل آپ بیتی بڑے خشوع و خضوع سے سنتی ہیں' ایسے ہی تم بھی سن رہی تھیں۔ نازو نے تمہیں جو بتایا' سب تصوراتی ہے' غیر حقیقی ہے۔ اس کی خواہشات کا عکس ہے جسے اس نے حقیقت بنالیا ہے اور اس کو تسلیم بھی کرلیا ہے۔"

"غلط خیال ہے آپ کا۔ اس نے اتنی تفصیل سے......"

"اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ میں آپ کو سنا سکتا ہوں۔ میرے دماغ میں بھی سارے ٹوٹے ہیں۔ کچھ فلموں کے' کچھ ناولوں کے۔ کچھ اپنے مشاہدے کی بات ہے۔ بے وقوف لڑکی' میں تمہیں ملکہ الزبتھ کے ساتھ بکنگھم پیلس کے اندر اس کی خواب گاہ کا حال سنا سکتا ہوں۔ یہ بتا سکتا ہوں کہ اس نے مجھے کیسے چوری چھپے بلایا۔ کیسے میں اندر پہنچا اور پھر صبح تک ملکہ عالیہ نے کیا کہا اور کیا کیا۔ صبح مجھے کیسے نکالا گیا۔ باعزت طور پر۔ کون سی شاہی گاڑی مجھے چھوڑ کے گئی۔ اور یہ سب اتنا سچ ہوگا کہ تمہاری عقل چکرا جائے گی۔ کوئی بھی تصدیق کرلے۔ اگر ایک لفظ غلط ثابت ہوجائے تو میں مجرم۔ میں نے ملکہ کو دیکھا ہے۔ اس کے بیڈ روم کی تصاویر دیکھی ہیں۔ لندن میں تھا تو شاہی گاڑیاں آتے جاتے دیکھی ہیں۔ بکنگھم پیلس کے باہر کھڑے ہوئے سیکڑوں سیاح ہر روز آتے جاتے لوگوں کو دیکھتے ہیں۔ شاہی محل کے خدام خاص اور عملے کے حوالے سے محل کے اندر کی ایسی ایسی کہانیاں وہاں کے ان اخباروں میں شائع ہوتی ہیں جو بے پر کی اڑانے میں مشہور ہیں اور جنہیں ہم چیتھڑے کہتے ہیں۔ وہاں TABLOIDS کہا جاتا ہے۔"

رابعہ میری بات نہیں سُن رہی تھی بلکہ اس جھوٹ پر غور کررہی تھی جو گزشتہ شب نازو نے بڑی تفصیل سے اور پورے اعتماد کے ساتھ بولا تھا۔

"ساری بات تمہیں پھر بتاؤں گا۔ غالباً کوئی ہمیں پکار رہا ہے۔"

"ناشتے کے لیے آوازیں دے رہا ہوگا۔ کچھ معلوم ہے' کیا وقت ہوا ہے؟"

"یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا" میں نے اس کے گالوں پر چٹکی لینے کی کوشش کی۔

اس نے میرے ہاتھ پر ہاتھ مارا اور کھڑی ہوگئی "گیارہ بج رہے ہیں۔ غالب تو عادی ہوگیا ہے صبح سویرے اٹھ جانے کا۔ نازو نے مجھے دس بجے اُٹھایا۔"

"مگر تم نے مجھے کیوں اُٹھایا۔ میں ایک خواب دیکھ رہا تھا سُنوگی؟"

"جی نہیں' ایک خواب کل رات تین گھنٹے سُن لیا۔ وہ کافی ہے اب چلو۔ ہم یہاں رہنے نہیں آئے ہیں۔"

میں اُٹھ کھڑا ہوا "رائٹ۔ ہم غالب اور نازو کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ ڈاکٹر کریک کدھر ہے؟"

"شرم کرو کچھ۔ ڈاکٹر انکل نہیں کہہ سکتے۔ وہ گئے اپنے کلینک۔ گھر میں صرف ان کی ہاؤس کیپر ہے۔"

"ہم کلینک جاکے ان سے مل لیں گے۔ اور اخلاقاً اجازت بھی لے لیں گے" میں نے کہا۔

"لیکن اس حالت میں۔"

بیٹھنے والا آدمی نہیں تھا۔ ایڈمنسٹریٹر اس کی بیوی تھی جو اسٹور میں تھی ہوئی نہ جانے کیا چیک کررہی تھی۔ اس نے کہا کہ مجھے تو زحمت نہیں ہے۔ تم خود تلاش کرلو اسے۔ وہ اندر ہی کہیں ہوگا۔

ہم اس کے تعاقب میں تین مختلف وارڈز سے گزرے۔ پہلا وارڈ ابنارمل مریضوں کا تھا۔ یہ لوگ دیکھنے میں بالکل نارمل نظر آتے تھے اور ان کے آپس میں ملنے جلنے یا باہر جانے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ وہ سب اپنے اپنے گھر کے کپڑوں میں تھے' ان میں سے کچھ اخبار پڑھ چکے تھے اور فضول خبروں پر بے سروپا بحث میں مصروف تھے۔ یہی ان کے ابنارمل ہونے کا ثبوت تھا۔ ایک بیڈ پر چار افراد لطیفے سنا کے ایک دوسرے کو ہنسانے کی ناکام کوشش کررہے تھے لیکن لطیفہ سننے کے بعد سب سیریس بیٹھے رہتے تھے اور سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے تھے کہ یہ کیا بات ہوئی؟ ہم سے کچھ لوگوں نے پُرتپاک مصافحہ کیا اور ہماری خیریت یوں پوچھی جیسے ان سے ہمارے پرانے مراسم تھے۔

ڈاکٹر پہلے وارڈ کا دورہ کرکے دوسرے میں جاچکا تھا۔ دوسرے وارڈ کے مریض واقعی پاگل نظر آتے تھے لیکن وہ سب بے ضرر لوگ تھے۔ ایک شخص اپنے تکیے کو سامنے بٹھا کے اس سے باتوں میں مصروف تھا۔ اس کے خیال میں وہ تکیہ اس کا نالائق بچّہ تھا جو پھر حساب میں فیل ہوگیا تھا۔ وہ اس سے بہت خفا تھا۔ دوسرے بھی ایسی حرکتیں کررہے تھے۔ ایک شخص بلاوجہ ہنس ہنس کے دُہرا ہورہا تھا۔ دوسرا اسے بڑی اداسی سے دیکھ رہا تھا۔ تیسرا اپنے بیڈ پر سر کے بل کھڑا ہونے کی کوشش میں باربار گرتا تھا۔ کچھ لوگ یہ تماشا بڑے شوق سے دیکھ رہے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ آج تک وہ دنیا کو الٹا دیکھتا رہا۔ آسمان نیچے ہے اور زمین اوپر۔ ایک شخص باربار اسے سمجھانے میں مصروف تھا کہ وہ ٹانگیں نیچے لگوالے اور سر اوپر۔ ورنہ ایسے وہ دنیا کو ہمیشہ اُلٹا دیکھے گا۔ آخر باقی سب نے بھی تو ایسا ہی کیا تھا تب جاکے یہ دنیا سیدھی نظر آئی تھی۔ ڈاکٹر اس وارڈ سے بھی رخصت ہوگیا تھا۔ تیسرے وارڈ میں ہم نے اسے پکڑلیا۔

اس وارڈ میں وہ ذہنی مریض تھے جو دورے کی کیفیت میں خطرناک ہوجاتے تھے اور کچھ بھی کرسکتے تھے۔ وہ کپڑے پھاڑ سکتے تھے یا دیوار سے ٹکرا کے سر۔ کسی پر حملہ کرسکتے تھے یا ہاتھ میں خنجر آجائے تو اپنا ہی گلا بھی کاٹ سکتے تھے۔ ظاہر ہے ان کو خصوصی توجہ کی ضرورت تھی۔ یہ کسی اسپتال کے انتہائی نگہداشت کے شعبے یا I.C.U کی طرح تھا۔ دورے کے آثار نمودار ہوتے ہی صحت مند وارڈ بوائے اور ڈاکٹر مریض کو دبوچ لیتے تھے اور اسے انجکشن دے کر سُلادیتے تھے یا بے بس کردیتے تھے۔

ایسا ہی ایک اسپتال وزیر خان ٹرسٹ اسپتال تھا لیکن جو سلوک مریضوں کے ساتھ وہاں ہوتا تھا یہاں اس کے برعکس تھا۔ یہاں مریضوں کو محبت' ہمدردی اور توجہ بھی ملتی تھی اور ان کا علاج بھی ہوتا تھا۔ یہاں ذہنی صحت کی نعمت سے محروم ہوجانے والے

میں نے کہا "اگر نازو یہاں رہے گی تو اپنی خیالی دنیا سے باہر نہیں آئے گی۔ اسے ہمارے ساتھ رہ کے اندازہ ہوگا کہ حقیقت وہ نہیں تھی جو اس کے خیالوں کی دنیا میں نظر آرہی تھی۔ یہ ضروری ہے کہ وہ اصل حقیقت کا سامنا کرے' اسے خود دیکھے اور محسوس کرے۔ اس کا دواؤں سے جس حد تک علاج ممکن تھا اور ضروری تھا' وہ سب ہوگیا۔ اب اسے شاک ٹریٹمنٹ کی ضرورت ہے۔ فی الحال اتنا ہی کافی ہے۔ میں اور غالب کل ساری صورتِ حال کو پوری طرح ڈسکس کرچکے ہیں۔"

میرا اور غالب کا خیال بہت جلد حقیقت کا کرشمہ بن کے سب کو حیران کرنے والا تھا مگر اس کے اوّلین آثار میں نے فوراً ہی محسوس کرلیے۔ ناشتے کی میز پر غالب کی کوشش تھی کہ وہ نازو سے اداسی اور خاموشی کا سبب پوچھے اور اسے ہنسائے مگر وہ نہ جانے کیوں خاموش تھی اور نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ نظر اٹھا کے یوں رابعہ کو دیکھتی تھی جیسے اس سے کچھ کہنا چاہتی ہو مگر اس میں کہنے کی ہمت نہیں ہے یا اس کے پاس وہ الفاظ نہیں ہیں جن سے وہ اپنا مافی الضمیر پوری طرح بیان کرسکے۔

بالآخر رابعہ کے پوچھنے پر اس نے کہا "رابعہ باجی۔ کیا میں جھوٹ بولتی ہوں؟"

رابعہ نے کہا "نہیں۔ یہ خیال کیوں آیا تمہیں؟"

"ایسے ہی۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے کل رات میں نے آپ کے سامنے بہت جھوٹ بولا۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں۔"

"اس وہم کو دل سے نکال دو۔ تم ہم سے کیسے جھوٹ بول سکتی ہو بھلا" رابعہ نے کہا۔

اس نے قدرے تذبذب کے ساتھ سرہلایا "یہی میں سوچ رہی تھی کہ مجھے ایسا خیال کیوں آیا۔ آپ سے تو کچھ پوشیدہ نہیں۔ آپ میں اور مجھ میں کیا فرق ہے۔ ہم سب ایک ہیں۔"

میں نے کہا "چلو' اب فٹافٹ ناشتا ختم کرو۔ ہمیں جانا ہے۔"

"کہاں جانا ہے؟" نازو کا سوالیہ چہرہ پُرامید خوشی کی تصویر بن گیا۔

میں نے ہنس کے کہا "کیا ساری عمر رہنے کے لیے آئی تھیں یہاں۔ بھئی بہت ہوگیا بیماری کا ڈراما۔ اب چلو ہمارے ساتھ۔ تمہارے بغیر سب بہت اداس رہتے ہیں۔ بہت مِس کرتے ہیں تمہیں۔"

"سچ سکندر۔" وہ بچّوں کی طرح خوش ہوگئی "سب یاد کرتے ہیں مجھے۔ میں بھی بہت تنہا تھی تم سب کے بغیر۔ پلیز' مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔"

"یہ پلیز کہنے کی کیا ضرورت تھی خاتون جب ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ تمہیں ہمارے ساتھ جانا ہے۔ ہم اسی لیے آئے تھے" میں نے کہا۔

ڈاکٹر ہمیں اپنے اسپتال میں دیکھ کے حیران ہوا۔ وہ آفس میں

انسان جب لوٹ کر اپنی دنیا میں جاتے تھے تو زندگی کی ساری خوشیاں انہیں منتظر ملتی تھیں۔ ڈاکٹر شاہ کے پاگل خانے میں وہ آتے تھے جن سے زندگی کی خوشیاں چھین لی جاتی تھیں اور انہیں وہاں اس لیے چھوڑا جاتا تھا کہ وہ پھر لوٹ کے اپنی دنیا میں جانے کے قابل نہ رہیں۔ ایک ڈاکٹر اور دوسرے ڈاکٹر کے مقصدِ حیات میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ایک ڈاکٹری کے مقدس پیشے کے نام پر بدنما داغ تھا۔ دوسرا اس پیشے کی تقدیس کا رکھوالا۔

اس نے مجھے اور غالب کو دیکھا تو حیران ہوا "تم ادھر! کیا داخل ہونے کا واسطے آیا ہے؟"

میں نے کہا "یس انکل۔ اب میرا دماغ خراب ہوگیا ہے۔"

"جس آدمی کو یہ معلوم ہو۔ وہ ٹھیک ہے۔ جو دنیا کو پاگل سمجھتا ہے۔ وہی پاگل ہوتا ہے۔"

غالب نے کہا "اکثریت میں وہ ہیں جو آپ کو کریک سمجھتے ہیں۔"

وہ ہنسا "یاد رکھو' پہلے اکثریت ہمیشہ غلطی پر ہوتی ہے۔ حقیقت تو بہت کڑوی چیز ہے۔ اسے آدمی آہستہ آہستہ قبول کرتا ہے۔ بڑی مشکل سے اور بہت مزاحمت کے بعد۔ میں نے بتایا تھا تمہیں کہ پرافٹ یعنی پیغمبروں اور موجدوں کو لوگوں کی اکثریت نے کیا کہا تھا اور کتنا پریشان کیا تھا لیکن سچ بالآخر غالب آجاتا ہے۔ کبھی اس میں سیکڑوں سال بھی لگ جاتے ہیں۔"

"ہم اس لیے آئے تھے کہ اب آپ ہمیں اجازت دیں۔"

"کس بات کی اجازت" وہ مریضوں کو بھی دیکھتا رہا۔

"جانے کی۔ ہم سب جانا چاہتے ہیں۔"

"تو جاؤ بابا۔ کس نے روکا ہے۔ اپنی مرضی سے آیا تھا تم۔ ابھی میری مرضی سے کیوں جانا چاہتا ہے۔"

"اس لئے کہ ڈاکٹر آپ ہیں" غالب نے کہا۔

"ڈاکٹر کی ضرورت ہوتی ہے مریض کو۔ بیمار کو" وہ مسکرایا۔

مطلب خود ہم نے سمجھ لیا۔ اس کی طرف سے این او سی مل گیا تھا۔ نازو اور غالب کو اب کسی دوا علاج کی ضرورت نہیں۔ غالب کچھ نروس نظر آرہا تھا مگر نازو پر تو وحشت سوار تھی۔

"جلدی چلیں یہاں سے" نازو نے کہا۔ "یہ تو وہی جگہ ہے۔"

میں نے کہا "کونسی جگہ؟"

"جہاں..... انہوں نے مجھے باندھ کے رکھا تھا۔ مجھ پر تشدد کیا تھا۔ بجلی کے جھٹکے دیے تھے مجھے۔ ڈاکٹر شاہ نے۔"

غالب نے اس کی تائید میں سرہلایا "یہ ویسی جگہ نہیں ہے نازو۔ یہاں تو ڈاکٹر انکل ہیں۔"

"نہیں۔ لیکن باقی سب تو وہی ہیں" وہ چلّانے لگی "یہ پاگل نہیں ہیں۔ انہیں پاگل بنایا جارہا ہے۔"

غالب نے کہا "نہیں نازو۔ ان سب کا علاج ہورہا ہے۔"

"جھوٹ۔ وہ بھی ایسا ہی ظاہر کرتے تھے۔ یہی کہتے تھے۔ خدا کے لیے یہاں سے چلو۔ ورنہ میں بھاگ جاؤں گی۔ میرا دل گھبرا رہا ہے یہاں۔ پتا نہیں کیا ہورہا ہے مجھے۔"

میں نے محسوس کیا کہ اس ماحول کا اثر نازو کے اعصاب پر ضرور پڑا ہے مگر اس کا فائدہ بھی ہوا ہے۔ اس نے حقیقت کو تسلیم کیا ہے۔ اس کے ذہن کے نہاں خانے کھل گئے ہیں۔ اسے ڈاکٹر شاہ یاد آگیا۔ اور وہ سلوک جو اس کے ساتھ وزیر خان ٹرسٹ اسپتال میں ہوا تھا۔ تاہم اس کے اعصاب فی الحال اتنی ہی سچائی کا دباؤ برداشت کرسکتے تھے۔ میں اور غالب فوراً اسے وہاں سے لے کر نکل آئے۔ نازو اب بھی نروس تھی۔ اس نفسیاتی شفاخانے کے لوگوں کو دیکھ کر وہ سب یادیں اس کے شعور تک رسائی حاصل کرنے کے لیے کلبلانے لگی تھیں جن کو اس نے ابھی تک اپنے خوف کے باعث ذہن کی تاریک گہرائی میں یعنی تحت الشعور میں دبا رکھا تھا۔ اگر ہم وہاں زیادہ دیر قیام کرتے اور اس کے سامنے کوئی مریض چیخنے چلّانے لگتا تو شاید نازو کی قوتِ برداشت بھی جواب دے جاتی۔

غالب نے بھی باہر آکے خود کو زیادہ پُراعتماد محسوس کیا تھا۔ نازو نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا تھا۔ اس بچے کی طرح جس نے اجنبی شہر کی بھیڑ میں گم ہوجانے کے ڈر سے والدین کی انگلی کو تحفظ کی ضمانت سمجھ لیا ہو۔

رابعہ کی گاڑی میں بیٹھ کے نازو پر وحشت کا اثر تو کم ہوگیا مگر وہ کچھ خائف اور خاموش ہوگئی۔ وہ گاڑی سے باہر دیکھتی رہی اور متعدد مقامات پر اس نے بہت سی پرانی باتیں ... جو سب سچ تھیں۔ اس کے حافظے کا انتشار ختم ہونے لگا تھا اور اس کی سوچ پرانے راستوں پر آرہی تھی۔

ہم وقار یوسف کے گھر پہنچے تو وہاں گُل اور محسن ہم سے پہلے پہنچ چکے تھے اور ہماری پُراسرار گمشدگی کے مضمرات پر غور کرنے کے لیے ایک ہنگامی اجلاس میں خاصا ہنگامہ ہورہا تھا۔ پہلے رابعہ کو اور مجھے اور پھر ہمارے ساتھ غالب اور نازو کو دیکھ کے تو ہڑبونگ مچ گئی۔

نکی سب سے پہلے چیخ مار کے بھاگی اور اس نے راہ میں حائل پانی کا ایک جگ گرادیا۔ بوبی کو پھلانگ گئی۔ بوبی ڈر کے رونے لگا۔ وقار صوفے سے پیٹھ لگائے اور قالین پر ٹانگیں پھیلائے بیٹھا ہوا تھا۔ نکی ٹھوکر کھا کے گرتے گرتے بچی۔

"نازو۔ نازو تم! اُف..... کتنی خوشی ہورہی ہے مجھے" وہ نازو سے لپٹ گئی۔

پھر گُل نے دوڑ لگائی اور بوبی جو پہلے بچ گیا تھا اپنی مجازی والدہ کی یلغار سے نہ بچ سکا۔ وہ گرا تو اسے وقار یوسف نے سنبھالا۔

"یا وحشت..... تیرا ہی آسرا" وقار نے بوبی کو خاموش کراتے ہوئے کہا "نازو آئی ہے کہ قیامت آگئی ہے۔"

محسن بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔ "ان سب کا ایک ساتھ آنا قیامت

... ہم دلاور کے یوں چکمہ دے کر نکل جانے کا نہیں تھا۔ ... نے اسے انا کا مسئلہ بنا کے جان دے دی" رابعہ نے افسوس ... سرہلایا۔

"بہت زیادہ جذباتی اور حساس آدمی تھا" محسن بولا "زمانہ ایسا ہے ... آدمی چوہدری دلاور کی طرح بے حس بلکہ بے غیرت ... کسی اچھائی برائی کو اہمیت نہ دیتا ہو۔ زبانِ خلق اور نقارۂ خدا ... کو سنتا ہی نہ ہو۔ عزت کو دولت کی طرح آنی جانی اور خرچ ہو جانے والی' مٹ جانے والی اور چھینی جانے والی چیز سمجھتا ہو۔ ... زندہ رہ سکتا ہے۔"

"اور صدیقی ایسا آدمی نہیں تھا۔ شاید دلاور اسے بے وقوف ...

... غالب بولا "سکندر اس معاملے میں چوہدری دلاور کا ہم خیال ہے۔"

میں نے اس کی تردید نہیں کی "ہاں۔ مرنے والے میں سو خوبیاں تھیں جن کا میں اعتراف کرتا ہوں مگر یہ خامی سب سے بڑی تھی کہ جذبات پر کنٹرول نہیں تھا اور مزاج میں انا پرستی یا خودداری حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ ایسا نہ ہوتا تو ایک ناکامی پر زندگی قربان نہ کرتا۔ زندگی بہرحال خدا کی امانت ہے اور ایسی ہزار ناکامیوں پر بھی ٹھکرائی نہیں جاسکتی۔"

وقار نے کہا "یہ تو سولہ آنے سچ کہا آپ نے۔ مرحوم ہمارا ابھی سہارا تھے۔ ہمارے ... بھی ساتھ دے سکتے تھے۔ رات کو منظر نے فون کیا تھا تو وہ بھی یہی کہہ رہا تھا۔ اس کے اپنے الفاظ میں۔ بھوتنی کا جلدی میں مرگیا۔ کم سے کم ہم سے تو مشورہ کرلیتا۔"

"اب نمٹنا پڑے گا ارشد کریم ربانی سے" محسن بولا۔

میں نے کہا "نمٹ لیں گے یار۔ جب شیطان سے نمٹ لیتے ہیں اور اب چوہدری دلاور سے نمٹنے آئے ہیں تو یہ نیا شیطان کیا چیز ہے۔"

"برادر۔ انگریزی کا محاورہ مت بھولو کہ وہ شیطان زیادہ خطرناک ہے جسے آپ نہیں جانتے۔"

نکی اور گل کی مشترکہ کوشش سے نازو پھر ہوش میں آگئی تھی اور اب وہ تینوں پھر رورہی تھیں لیکن اس بار طوفان کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ یہ بعد میں محسوس ہونے والی ہوا تھی۔ ہم اٹھ کے ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ وقار نے خالص شوہرانہ وقار کے ساتھ نکی کو حکم دیا تھا کہ چائے حاضر کرے لیکن اس باغی حسینہ نے حکم عدولی کی اور وقار کو بے وقار کرتے ہوئے ٹکا سا جواب دے دیا کہ خود بنالو۔

ہم کچن میں تشریف لے گئے۔ وقار نے چائے بنانے کا عمل شروع کیا "منظر صاحب بھی کم جذباتی نہیں ہیں۔ اس وقت تمہیں بُرا بھلا کہہ کے چلے گئے۔ رات کو تم سے فون پر بات کرنا چاہتے تھے کچھ پشیمان تھے اور کچھ پریشان۔ میں نے کہا کہ وہ دونوں تو پتا

کے آنے سے کم بھی نہیں۔"

نازو اتنی محبت کا اظہار برداشت نہ کرسکی۔ اس نے دشمنوں کے درمیان ایک انتہائی عذاب ناک اور پُرتشدد ذلت کی بھی سزا کاٹی تھی اور کسی حد تک وہ سب سے بچھڑ کے اپنا یقین بھی کھو بیٹھی تھی کہ ان سے پھر ملاقات ہوگی۔ وہ آنسوؤں کی سیلابی یلغار میں بہہ گئی اور بُری طرح پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ خود نکی اور گل کی پوری کوشش تھی کہ آنسو بہانے کے اس مظاہرے یا مقابلے میں بھرپور شرکت کریں حالانکہ ان کا فرض تھا نازو کو تسلی دے کر پُرسکون کرنا۔

نازو روتے روتے بے ہوش ہوگئی تو نکی اور گل کو اپنا فرض یاد آیا۔ انہوں نے اسے فوراً بستر پر لٹا دیا۔ ایک پانی لینے دوڑی دوسری اسے پنکھا جھلنے لگی۔ ان کا رونا کچھ کم ہوگیا۔

وقار یوسف اور محسن کو نازو سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ وہ پھر بیٹھ گئے اور نکی نے نازو پر پانی کے چھینٹے مارتے ہوئے وقار کو ڈانٹا "کم سے کم ڈاکٹر ہی کو فون کردو۔"

"کیا مطلب۔ جو کم سے کم ڈاکٹر ہو۔ یعنی کمپوڈر ہو یا کیمسٹ ہو۔" وقار نے کہا "ویسے تو میں بھی ڈاکٹری کرلیتا ہوں۔"

"مجھے تو محبت کرنے سے زیادہ علاج کرنا آتا ہے۔ خصوصاً ان بیویوں کا جن کے دماغ میں خرابی ہو" محسن بولا

"بیویوں کے پاس دماغ ہوتا کہاں ہے جس کا آپ علاج کریں۔ یہ کہو کہ ان کا مزاج درست کرسکتے ہو۔" وقار بولا۔

"یہی سمجھ لو۔ اب دیکھو میری بیوی رورہی ہے۔ کتنے اچھے لگ رہے ہیں اس کی بادامی آنکھوں میں پستئی آنسو۔" محسن ...

وقار نے کہا "اور میری گھروالی کی اخروٹی آنکھوں میں کشمشی آنسو"

میں نے کہا "رونے سے آنکھیں دُھل کے صاف ہوجاتی ہیں۔"

محسن بولا "اچھا۔ تو آپ بھی ہیں یہاں؟ آپ کو بھول ہی گیا تھا میں۔ اور خیر سے مس رابعہ قاری بھی ساتھ ہیں۔"

وقار نے کہا "اب پوچھو نا ان سے۔ ڈرتے کیوں ہو۔ پہلے تو بہت بول رہے تھے کہ آجائیں ذرا دونوں آوارہ گرد۔"

"میں نے آوارہ گرد نہیں کہا تھا۔ بدمعاش اور لوفر کہا تھا" محسن بولا "میں تھا اتنے غصے میں کہ سکندر کو گنجا کرادیتا اور رابعہ کا نکاح پڑھوا دیتا اس سے۔ مگر یہ نازو اور غالب کو ساتھ لے آئے ہیں اس لیے معاف کیا۔"

رابعہ ہنسی "کل شام تو منظر اتنا مشتعل تھا کہ ہماری ہمت نہیں پڑی گھر آنے کی۔ اب کیا حال ہے اس کے غصے کا۔"

"یہ غصہ نہیں' دکھ تھا۔ ناکامی کا ملال تھا" محسن بولا۔

"ملال تو ہمیں بھی تھا' ناکامی سے ہم بھی دل برداشتہ تھے لیکن آدمی تقدیر سے نہیں لڑسکتا" میں نے کہا۔

نہیں کدھر بھاگ گئے۔ اور کیا پتا لوٹ کے ہی نہ آئیں۔ ممکن ہے دلاور کے گھر پہنچ چکے ہیں ہاتھ جوڑ کے معافی مانگنے اور اب اسی کے سایۂ عاطفت میں باقی زندگی سکھ چین سے بسر کریں۔ اس پر بگڑ گئے کہ وقار تم بھی کسی دن بہت مار کھاؤ گے مجھ سے بھوتنی کے۔ اب وہ سکندر بڑی ڈھیٹ چیز ہے۔ ہم سے بھی زیادہ۔ ہم جانتے ہیں وہ پھر دلاور کو پکڑنے کے لیے نکل گیا ہوگا۔ ابی اس چھمک چھلو۔ سوری دُم چھلو کہا تھا اس نے۔ دُم چھلا محسن کو کہا تھا۔"

محسن نے سہلایا "دلاور اب آسانی سے ہاتھ نہیں آئے گا۔"

میں نے کہا "پہلے وہ کب آسانی سے پکڑا گیا ہے دوست۔ اسے پھر مشکل سے پکڑلیں گے۔ بچ کے جائے گا کہاں۔ دنیا تو بہت چھوٹی سی جگہ ہے۔"

وقار، غالب کی طرف متوجہ ہوا۔ "اب کیا حال ہے آپ کے اس نام نہاد دماغ کا۔ جس میں نازو کے عشق سے خلل واقع ہوگیا تھا۔"

غالب نے کہا "بچّہ بہت بولنے لگا ہے۔"

"میں شادی شدہ اور اب بالغ بھی ہوں" وقار بولا۔

"ہم ذہنی بلوغت کی بات کر رہے تھے۔"

"نازو بھی ٹھیک ہی لگتی ہے اب تو" محسن نے کہا۔

"ہاں لیکن پوری طرح فٹ وہ یہاں ہم سب کے ساتھ رہ کے ہوگی۔ یہ میری نہیں، ایک مستند ڈاکٹر کی رائے ہے جو اس کا معالج بھی تھا۔"

کچن میں ایک ہی اسٹول تھا جس پر خود صاحبِ خانہ تشریف فرما تھے۔ میں اور محسن کچن کے سلیب پر پاؤں لٹکا کے بیٹھے رہے اور چائے بن گئی تو مگ لے کر پورچ میں چلے گئے جہاں گارڈن چیئرز پڑی ہوئی تھیں۔

"مجھے رات ہی کو سکندر نے وہ سب بتایا جو میری عدم موجودگی میں ہوا" غالب نے کہا۔

"رات ہی کو نازو نے بھی رابعہ کو بہت کچھ بتایا۔" میں نے کہا "جو بتانے کے قابل نہیں۔"

غالب بولا "لیکن رابعہ نے تمہیں بتا دیا۔ بے شرمی کی بھی حد ہوتی ہے۔"

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ صدیقی کے جسدِ خاکی کو اسلام آباد روانہ کردیا گیا ہے۔ تدفین وہیں ہوگی۔"

"حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا" میں نے افسوس سے کہا۔

"چوہدری دلاور نے اس طرح فرار ہو کے خود اپنے پاؤں پر ایک اور کلہاڑی مار لی ہے۔ وہ پہلے ہی مفرور اشتہاری مجرم تھا" محسن بولا۔

"اسے کسی بات سے فرق نہیں پڑتا۔ ممکن ہے اس وقت جب ہم اس کو پھر گرفتار کرنے کے خیالی منصوبے بنا رہے ہیں کسی جہاز میں لندن کی طرف پرواز کر رہا ہو" میں نے کہا "لندن کون سا دور ہے۔ تم آگے اور ہم پیچھے۔"

محسن بولا "میرا خیال ہے کہ وہ ملک سے فرار نہیں ہوگا۔ اس کے کچھ سیاسی عزائم ہیں۔ وہ اپنا مجرمانہ ریکارڈ ختم کرنا چاہے گا۔ کیس وغیرہ کچھ نہیں۔ اس سے کہیں زیادہ سنگین جرائم [illegible] جاتے ہیں اور لوگ بھی انہیں بھول جاتے ہیں۔ جو کل [illegible] کہلاتے تھے اور جن کے خلاف مُردہ باد کے نعرے لگوائے جاتے تھے۔ وہی بعد میں شرافت کی سند پا کے قوم کی قیادت کرتے ہیں [illegible] جھنڈے والی گاڑی میں پھرتے ہیں تو لوگ بھی زندہ باد کہنے لگتے ہیں۔ مرحوم فضل حق، کل تک شیرِ پاکستان تھے پھر غدار کہلائے۔ بعد میں سب بھول گئے کہ وہ کیا تھے یا کیا ہیں؟ لیکن چوہدری دلاور اس وقت تک بے بس ہے جب تک وہ ہم سے یعنی ایم آر [illegible] کے بااصول اور محبِ وطن ارکان کے ساتھ کوئی باعزت تصفیہ کرے۔"

"بے عزت آدمی کے ساتھ باعزت سمجھوتا کیسے ہوتا ہے؟" میں نے کہا۔

"وہ کوشش ضرور کرے گا۔ تم شرط لگا لو مجھ سے۔ نہ وہ ملک چھوڑ کے کہیں جائے گا اور نہ دشمنی میں پہل کرے گا۔"

"میں لگاتا ہوں شرط۔ اس کے ساتھ جو سلوک ہم نے [illegible] ہے۔ وہ چوہدری دلاور جیسے شخص کو انتقام کے جذبات میں اندھا کردینے کے لیے کافی ہے۔" میں نے کہا "وہ ایک زخم خوردہ سانپ ہے۔"

"وہ سانپ نہیں، انسان ہے۔ سانپ سوچتا نہیں اور [illegible] نہیں کہ ایک بار تو زخم پر ٹل گئی۔ غنیم اتنا طاقتور ہے۔ کہیں اگلی بار ہی نہ ڈالے۔ یہ جیت چوہدری دلاور کو بہت مہنگی پڑی ہے۔ اس نے پینتالیس دن موت اور زندگی کی کشمکش میں انتہائی ذلت کو برداشت کرتے ہوئے گزارے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ ایسی [illegible] تھی جو اس کی توقع سے کہیں زیادہ عبرت ناک تھی۔ وہ جب [illegible] سوچے گا کہ وہ یہاں تھا اور کس حال میں تھا [illegible] ہو جائے [illegible] اور وہ عقل رکھتا ہے تو سمجھے گا کہ اسے نئی زندگی [illegible] ہے۔ ایسا دوسرا چانس اسے شاید نہیں ملے گا۔ دوسری طرف [illegible] مایوس ہو کے ہار ماننے والے نہیں ہیں، ہم تو اس کے نزدیک پاگل ہیں، جیسے کوئی جنونی ہوتا ہے کہ اسے اپنی جان کی اور دنیاوی زندگی کی پروا ہی نہیں ہوتی۔ وہ شہادت کو منصبِ اعلیٰ سمجھتا ہے اور [illegible] کرتا ہے خدا کی رضا کے لیے کرتا ہے۔ ایسا ہی جذبہ ہمارا ہے۔ [illegible] بھی مرنے سے نہیں ڈرتے۔ جنونی ہم بھی ہیں۔ دنیاوی فائدہ ہم بھی نہیں دیکھتے اور مقصد ہمارے نزدیک بھی زیادہ اہم ہے۔ اس کے برعکس دلاور کو [illegible] گی، اپنا کاروبار، اقتدار اور دولت کا نشہ سب حاصل کرنے کی خواہش ہے۔ وہ مرنا نہیں چاہتا، یہ تب ہی ممکن

حسین اور منظر کی جوڑی۔ ولن اپنے چوہدری دلاور اور بوی خادم اغوا اور تشدد کے مناظر۔ بموں کے دھماکے، جنگ ستاد پیڑرو۔

بدلہ"

شیروانی صاحب، آپ رضاکارانہ طور پر خاموش ہونا پسند رمائیں گے۔"

"چلیں جی، آپ بولیں۔ دنیا میں بے وقوف ہی زیادہ بولتے ہیں"محسن نے کہا۔

"ابھی ہمارے پاس دلاور سے رابطے کا ذریعہ کوئی نہیں۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کہاں روپوش ہوگا۔ اس کے منظرِ عام پر آجانے کے بعد اس کی بیوی اور بیٹا، دونوں پیچھے ہٹ جائیں گے۔ دلاور یقیناً بہت ... ہو گا کہ اس کی شریک حیات نے عملاً ثابت کردیا کہ وہ چوہدری دلاور جیسے شخص کے لیے ہی بنائی گئی تھی۔ اس کا خون تو پھر اس کا خون ہے۔ قابل فخر فرزند نے بھی اپنی عمر سے بڑے کارنامے سرانجام دیے مگر اب دلاور انہیں بھی بچائے گا۔ اسے کوئی جلدی نہیں۔ وہ دو چار ہفتے یا دو چار مہینے بالکل خاموشی سے بھی گزار سکتا ہے لیکن ہم اسے باہر لاسکتے ہیں۔ شوکت رانا اور ڈاکٹر شاہ۔ یہ دو دروازے ہیں۔"

"چور دروازے" غالب نے میری تصیح کی۔

"ٹھیک کہا تم نے۔ ایک چور دروازے کو ہم نے اکھاڑ پھینکا تھا۔ اس کے خلاف قتل کا الزام تھا اور چوہدری دلاور کے اغوا کا۔ اب معلوم نہیں کہ بات صرف الزامات تک محدود رہی یا اس کے خلاف کسی نے ایف آئی آر بھی لکھی۔ وہ اپنے اثرورسوخ اور پیسے کی طاقت استعمال کرکے بچ گیا تھا۔ چوہدری دلاور کی بیوی نے اس پر نمک حرام ہونے کا الزام عائد کیا تھا۔"

"اور بھی بہت سے الزامات تھے۔"

"ہاں۔ اور ایسی صورت میں یہ بھی ممکن ہے کہ چوہدری دلاور دوبارہ اقتدار سنبھالنے کے بعد اس کے ساتھ وہی سلوک کرے جو محمد علی نے ندیم کے ساتھ فلم بشیرا میں کیا تھا۔"

"مولا جٹ میں نہ محمد علی تھا نہ ندیم۔"

"اچھا؟ معاف کرنا میں نے بھی فلم دیکھی نہیں تھی" میں نے کہا "اب تم دو کوئی مثال۔"

"جو امریکا اپنے حلیف اور اتحادی دوست ممالک کے ساتھ کرتا ہے" محسن نے سوچ کے کہا "کیسی ہے؟"

"فلمی ہوتی تو اچھا تھا مگر خیر۔ سیاسی بھی چلے گی" میں نے کہا "ہم کیوں نہ شوکت رانا کی مزاج پرسی کریں اور اسے چوہدری دلاور کے خلاف تحفظ کے لیے مشروط امداد کی پیشکش کریں۔ وہ ہمیں چوہدری دلاور یا اس کے بیوی بچوں کے بارے میں باخبر رکھے کہ وہ کہاں ہیں؟"

"اور ہم اس کے لیے کیا کریں گے؟ دروازے پر مورچہ بند ہوکے بیٹھ جائیں گے یا توپ لے کر ساتھ پھریں گے۔ نو سر، اگر ہے جب اس کے مقابلے پر ہم نہ ہوں۔ یہ اس صورت میں ممکن ہے کہ ہمارا وجود ہی نہ رہے۔ اس کے لیے وہ پوری کوشش کرکے ناکام ہوچکا ہے۔ یا یہ کہ ہم اس سے صلح کرلیں یا ہار مان جائیں۔ یہ سب ناممکن ہے۔ اس لیے میں دوبارہ شرط لگانے کے لیے تیار ہوں کہ چوہدری دلاور خود ہم سے رابطہ کرے گا۔ اس بار وہ ٹھنڈے دماغ سے بہت سوچ سمجھ کے قدم اُٹھائے گا۔"

"پہلے بھی وہ ایسا ہی کرتا تھا۔"

"میرا مطلب ہے کہ وہ مقابلہ نہیں کرے گا۔ ہمارے خلاف سازش کا نیا جال نہیں پھیلائے گا۔ چالاکی اور عیاری سے ہمیں مات دینے کی کوشش نہیں کرے گا۔"

"پھر کیا کرے گا؟ ہاتھ جوڑ کے سامنے آجائے گا اور سر جھکا کے کھڑا ہوجائے گا کہ میں تمہارا مجرم۔ جتنے جوتے چاہو مارو۔ تلوار ہمارے ہاتھ میں تھمادے گا کہ میری گردن اُڑادو۔"

"رائٹ" محسن نے چٹکی بجاکے کہا "میری چھٹی حس کہتی ہے۔"

"گستاخی معاف۔ چھٹی حس میری ہے۔"

"سوری۔ میری ساتویں حس کہتی ہے کہ اس بار کچھ ایسا ہی ہوگا۔ کیسے ہوگا، یہ آنے والا وقت ہی بتائے گا۔"

غالب نے سوال کیا "ایسی صورت میں آپ کیا کریں گے۔ جوتے ماریں گے اس کے سر پر مجمع عام میں یا اس کا سر تن سے جدا فرماکے نعرہ لگائیں گے، وہ مارا پاپڑ والے کو۔"

"یہ ہم اس وقت بتائیں گے جب وقت آئے گا۔ ابھی تو آپ فرمائیں کہ آپ کب تک دیوانے بن کے پھرتے رہیں گے۔"

"جب تک دیوانگی باقی ہے۔"

"یہ حرام خوری کا بہانہ ہے۔ مرزا غالب کے گھوڑے۔ تم پھر آجاؤ میدانِ صحافت میں ہنہنانے کے لیے۔ ایک غازی تھا، وہ بھی شہید ہوگیا۔ اب تم ہی ہو ایم آر ایس کی مملکت کا چوتھا ستون۔ تلوار ہمارے ہاتھ میں ہے، تم قلم اُٹھالو۔"

"کیا قلم تلوار سے زیادہ طاقتور ہے" محسن نے ایک فلسفیانہ نکتہ اُٹھایا۔

"دونوں کی اپنی طاقت ہے۔ تلوار کی نوک سے غزل نہیں لکھی جاسکتی اور قلم کی نوک سے ہینڈز اَپ نہیں کرائے جاسکتے۔"

"میرا بھی دل چاہتا ہے کہ پھر اپنے اخبار میں جاکے صحافت کی دنیا میں جھنڈے گاڑدوں۔"

"ہمیں جھنڈے سے زیادہ ڈنڈے کی ضرورت ہے اور اخبار والوں کے ڈنڈے سے دنیا ڈرتی ہے" میں نے کہا "اس کے علاوہ۔ ایک انوکھا خیال میرے ذہن میں آیا ہے۔ حسبِ معمول۔"

محسن بولا "یعنی کیوں نہ ایک فلم بنائی جائے بارہ مسالے والی۔ اس میں سب کچھ ہوگا جو ہم نے کیا۔ عشق و محبت، ہنسی مذاق، مار دھاڑ۔ بیک وقت تین مجنوں اور تین لیلائیں۔ کامیڈین

چوہدری دلاور نے اسے سزائے موت دینے کا ارادہ کرلیا تو ہم شوکت رانا کو نہیں بچا سکیں گے۔ یہ بات وہ خود بھی سمجھتا ہوگا۔ اس کے سامنے تو اب ایک ہی راستہ ہے کہ دلاور کے قدموں میں گر جائے اور اس سے جان کی امان طلب کرے کہ حضور والا مجھے شیطان نے بہکا دیا تھا۔ مجھے ایک موقع اور دیا جائے اپنی وفاداری اور جاں نثاری ثابت کرنے کا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ حالات میں چوہدری دلاور اس کی خطا کو معاف کرکے اسے خرید سکتا ہے۔ دلاور کو بھی دوستوں اور سہاروں کی ضرورت ہے۔ وہ اپنوں کو اپنائے گا۔ دشمن نہیں بنائے گا۔" محسن بولا۔

میں نے کہا "۔ہم ملیں گے ڈاکٹر شاہ سے۔"

محسن نے غالب سے کہا "یار۔ اس بات کا کچھ پتا چلا۔"

"کس بات کا؟" غالب چونکا۔

"وہی۔ شوکت رانا کی نازو سے شادی والا معاملہ۔"

"وہ جھوٹ ہے" غالب تیز ہو کے بولا "کیا تم اسے سچ سمجھے ہو۔ صرف ایک تصویر کی وجہ سے۔"

"تصویر نازو کی تھی یا نہیں؟" محسن نے کہا۔

غالب کا چہرہ تاریک ہوگیا "کیا تصویریں جھوٹی نہیں ہوتیں؟"

میں نے محسن کو اشارے سے روک دیا کہ غالب کی اس جذباتی کمزوری پر بات کرنے سے گریز کرے "شوکت رانا ہمارے قابو میں آئے گا تو خود اعتراف کرلے گا کہ اس نے جعلسازی اور فراڈ سے وہ تصویر بنوائی تھی۔"

غالب اٹھ کے اندر چلا گیا اور نازو کے پاس جا بیٹھا۔ محسن کی بات نے اسے پریشانی اور جھنجلاہٹ میں مبتلا کردیا تھا۔ خود محسن کو اپنی غلطی کا احساس ہوگیا تھا۔ ہم اندر گئے تو نازو سو رہی تھی۔ ڈاکٹر نے اسے جو سکون آور دوائیں دی تھیں یہ ان کا اثر تھا مگر نازو کے حق میں نیند بھی دوا سے کم نہ تھی۔ وہ ذہنی طور پر سخت ڈسٹرب ہوچکی تھی۔ اسے اب احساس ہونے لگا تھا کہ وہ حقائق کی دنیا سے دور تھی۔ اسی لیے نازو نے رابعہ سے سوال کیا تھا کہ کیا میں نے آپ سے جھوٹ بولا تھا۔ اسے یاد تھا کہ رابعہ سے اس نے کس قسم کی باتیں کی تھیں لیکن ساتھ ہی اس کا یقین متزلزل ہو رہا تھا اور وہ سمجھنے لگی تھی کہ غالب سے شادی کی بات صرف فریب خیال تھی۔ شاید اس نے سب کچھ خواب میں دیکھا تھا یا تصویر میں اور سچ مان لیا تھا۔ ظاہر ہے اس خیال کی شرمندگی کا آزار بھی کم نہ تھا۔

نگی نے گل کے ساتھ کچن میں دوپہر کے کھانے کا اہتمام شروع کردیا تھا اور مس رابعہ وہیں بوبی کے ساتھ کھیل میں مصروف تھیں۔ میں صبح کے اخبارات دیکھتا رہا جن میں ایس ایس پی جاوید صدیقی کی خودکشی کی خبر کوئی شہ سرخی نہیں بنی تھی۔ انگریزی کے اخبار نے تو اندر یہ خبر دی تھی کہ ایک [illegible] مجرم کے دھوکا دے کر فرار ہوجانے سے جاوید صدیقی کی نیک نامی کو شدید دھچکا پہنچا تھا۔ وہ کچھ عرصہ معطل رہنے کے بعد بحال ہوا تھا اور اس کا ریکارڈ بہت صاف تھا۔ رسوائی کے ڈر سے اس گولی مار کے ہلاک کرلیا۔ اردو کے اخبارات نے زیادہ تھی اور جاوید صدیقی کی خودکشی کا سبب اس کی اپنی غلطی جس کی وجہ سے دہرے قتل کا ایک زبردست مجرم پہلے جیل پھر پولیس کی تحویل سے نکل بھاگا۔ ایک الگ باکس میں کہ جاوید صدیقی نے کس طرح زندہ آدمی کو لاش سمجھ لیا اور جیسے ہی موقع ملا وہ فرار ہوگیا۔ اصل مجرم کا ایک ہم شکل الحواس قسم کے شخص کو پولیس نے بلاوجہ پکڑ رکھا ہے۔

یہ سب خبریں ہمارے لیے پرانی ہوگئی تھیں۔ ہم دیکھا تھا اور ہم اخبار والوں سے زیادہ حقائق کو جانتے تھے طرف سے آنے والی آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ بوبی کا ڈول الٹ کے رابعہ کو دودھ سے نہلا دیا۔ اب نگی ہنس رہی اور دعائیں دے رہی تھی "دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو" پھر ایک دھماکا ہوا اور نگی ساری دعائیں بھول کے چلانے لگی "اے گل لے جاؤ یہاں سے اپنے اس شیطانی چرخے کو۔ دیکھو کیا توڑا اس نے... ٹی سیٹ۔"

"ابھی بچہ ہے نا۔ ذرا بڑا ہوجائے گا تو ڈنر سیٹ توڑے گا" گل نے معذرت کے ساتھ کہا۔

"یہ کیتلی بچی ہے نا۔ اس سے کہو اپنے باپ کے سر پر توڑے" نگی نے کہا۔

میں رابعہ کو ملک باتھ کی حالت میں دیکھنے گیا تو محسن نے گل کی آواز پر کہا "ابھی حاضر ہوا جی۔"

"نگی چاہتی ہے کہ بوبی یہ کیتلی تمہارے سر پر توڑے" گل کہا۔

"اور تم بھی گویا یہی چاہتی ہو۔"

"ہاں۔ کیتلی فالتو ہے۔ بچہ بھی خوش ہوجائے گا۔"

"مگر میرا سر فالتو نہیں ہے" محسن چلا کے بولا "نگی سے کہو وقار کا سر منگوالے نا۔ اس کے سر پر کیتلی کیا ہانڈی توڑے۔ مٹکا پھوڑے۔"

وقار نے پیچھے سے کہا "بے وقوف نہیں ہے میری بیوی۔ دل توڑ سکتی ہے میرا، سر نہیں۔ ایک ہی تو سر ہے ہمارے گھر کا مغزوالا۔"

اندر فون کی گھنٹی بجنے لگی اور وقار کو کھسکنے کا موقع مل گیا۔ اس نے کہا "کون مولوی خادم حسین۔ ہاں بھئی، یہیں ہیں اور کہاں ہوں گے۔ ہاں، بالکل زندہ ہیں۔ تمہیں یقین نہیں تو خود بات کرلو۔"

میں نے ریسیور لے لیا "کیوں خادم حسین۔ خیریت تو ہے نا۔"

"بس جی۔ اللہ کا نام لے کر ڈرتے ڈرتے فون کیا تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ آپ بالکل زندہ سلامت ہیں۔ رابعہ بی بی کے بارے میں بھی... بتادیں... تاکہ... دل... کو... تسلی ہوجائے... خدا...

سال کے لیے۔ خلوص اور دوستی کا جذبہ ہوتا تو تم کہتے کہ مجھے قتل کردیں جناب۔"

"وہ جی.... میں تو کہہ دیتا.... لیکن بڑا فرق ہے جی میرے 'اور' آپ کے دنیا سے جانے میں اور میری وفات حسرت آیات میں۔ وہ بیوہ بیوائیں کس کے آسرے پر چھوڑ سکتا ہوں میں۔"

"بھئی خدا کے بعد ہم سب ہیں۔ اور وہ منظر تو ہے اُلّو کا پٹھا۔ اس کا نام منظر کہاں ہے جو اس نے تمہارے سامنے قسم کھالی۔ نام تو اس کا ہے عبدالودود۔"

"شاید اسی لیے بچ گئے جی آپ۔"

"مگر تم کیسے بچ گئے اس کے ساتھ جاکے بھی۔"

"میں تو جناب ورد کرتا رہا آیت الکرسی کا اور ایسی کوئی بات بھی نہیں کی میں نے جی کہ ان کا غصہ میری قضا بن جاتا۔ انہوں نے پوچھا جی کہ کیسے قتل کروں انہیں۔ گولی ماردوں یا تلوار سے سر اڑادوں۔ دادا جان مرحوم کی تیغ آبدار بھی ہے۔ تو جی میں نے کہا کہ شمشیر اسلاف کو ترجیح دیں۔ ویسے بھی اسلامی ہتھیار ہے۔"

میں نے کہا "حیرت ہے کہ تم کو بخش دیا اس نے حالانکہ دشمنوں کی فہرست میں سب سے پہلا نام تمہارا ہے۔"

"بس جی یہ تو حسن ظن ہے آپ کا ورنہ کل رات وہ اتنے غصے میں تھے کہ انہوں نے بہت سے خطرناک اعلانات کیے تھے۔ یہ کہ ابھی اس اُلّو کی پٹھی کو بیوہ کرتا ہوں۔ ان کی مراد اپنی اکلوتی منکوحہ سے تھی۔ اور جہنم رسید کرتا ہوں اس کی ساری پیداوار کو۔ جب انہوں نے مجھے گھر کے قریب چھوڑا اس وقت البتہ کہا تھا کہ مولوی خادم حسین، فکر مت کرو۔ ہم واہی تباہی بک رہے تھے۔ اس کے سوا ہم سب کریں گے جو ہم نے ابھی کہا تھا۔"

مجھے بے ساختہ ہنسی آئی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ منظر کا غصہ بھی چند منٹ میں ختم ہوگیا تھا اور باقی راستے وہ صرف مولوی خادم حسین کو ڈراتا رہا اور اس کے ساتھ ڈراما کرتا رہا۔

"عرض مجھے یہ کرنا تھی جناب کہ اس ہفتے شاید میں خدمت کے لیے حاضر نہ ہوسکوں۔ محسن صاحب کی موجودگی میں خادم کی چنداں ضرورت بھی نہیں رہتی اور ناچیز کی منکوحہ نے اپنے آبائی گھر کا سودا کرلیا ہے۔ اچھی قیمت مل گئی ہے جی۔ پڑوس کے ہی دو گاہک آپس میں مقابلے پر آگئے۔ ایک دائیں طرف والا اور دوسرا بائیں طرف والا۔ دونوں کو اپنے پرانے گھر چھوٹے پڑتے تھے۔ ہمارا گھر ملانے سے ان کا مسئلہ حل ہوجاتا تھا۔ بس جی ایک نے جتنی قیمت لگائی دوسرے نے اس میں دس ہزار کا اضافہ کردیا۔ پہلے کو معلوم ہوا تو اس نے مزید دس بڑھادیے اور میں تو جناب ادھر کی بات ادھر پہنچاتا رہا کہ حاجی صاحب۔ اب آپ فرمائیں' حاجی صاحب دس بڑھادیتے تھے تو میں سردار صاحب کو بتادیتا تھا جی کہ حاجی صاحب تو آپ سے بڑھ گئے۔ ان کی آپس میں ٹھن گئی جی اور وہ کھلم کھلا مقابلے پر آگئے۔ بالآخر حاجی صاحب نے میدان مار لیا

نخواستہ... خدانخواستہ... وہ فوت تو نہیں ہوئیں؟" اس نے اٹکتے ہوئے کہا۔
میں نے کہا "کیا بک رہے ہو؟"

"بک نہیں رہا ہوں جی۔ یہی کہا تھا اپنے منظر صاحب نے۔ میں تو شامت کا مارا غلطی سے ان کی گاڑی میں بیٹھ گیا تھا۔ وہ سخت غصے میں بالکل پاگل ہوگئے تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ مولوی خادم حسین۔ دونوں کو قتل نہ کردیا تو میرا نام منظر نہیں۔ کسے پہلے ٹھکانے لگاؤں' کون..... کا زیادہ واجب القتل ہے دونوں میں سے' سکندر یا رابعہ؟"

میں نے ہنسی ضبط کرکے کہا "پھر تم نے کیا کہا؟"

"میں نے جی۔ بُرا مت مانیں آپ' پہلے آپ ہی کا نام لیا تھا میں نے' یہ لیڈیز فرسٹ تو فرنگیوں کی روایت ہے۔ ویسے بھی جناب رابعہ بی بی کا بھلا کیا قصور ہے اس میں۔ وہ تو برات لے کر آنے سے رہیں بغرض نکاح۔ اور آپ ان کو صرف باتوں سے بہلا رہے ہیں جی۔ بلکہ اُلو بنا رہے ہیں۔"

"خادم حسین اُلّو نذر ہوتا ہے لیکن یہ بتاؤ کیا تم منظر کو سمجھا نہیں سکتے تھے کہ فوراً قتل نہ کرے۔ یہ ارادہ ملتوی کردے پچاس

جی۔ ہمیں جتنی قیمت کی اُمید تھی' اس سے دُگنی مل گئی۔"
"بھئی مبارک ہو۔ تمہاری لگائی بجھائی کا کچھ تو فائدہ ہوا۔"
"لو جی۔ لگائی بجھائی تو عورتوں کا کام ہے۔ یہ کاروباری معاملہ تھا اور ہوشیاری تھی میری" وہ بولا "اس کے علاوہ جناب۔ حاجی کو اس کے ایک دوست نما دشمن نے بانس پر چڑھادیا تھا کہ حاجی صاحب' ہار گئے تو مونچھیں نیچی ہو جائیں گی۔ زمانہ کیا کہے گا۔ اب حاجی روتا ہے مگر بیعانہ دے چکا ہے اور ایک مہینے میں باقی سب رقم دینی ہے۔"
"تو کیا اس کے پاس ہے نہیں؟"
"ہے تو سہی مگر اس کے گھر میں خانہ جنگی کا سماں ہے جی۔ ادھر اس کی دونوں بیویاں لڑ رہی ہیں کہ تم سٹھیا گئے تھے۔ اتنی قیمت کا ہے یہ مکان؟ دوسری طرف جوان اولاد خفا ہے کہ ابا جی نے گھاٹے کا سودا کرلیا اور سردار جی سمجھ دار تھا کہ اس نے اپنی مونچھیں نیچی کرلیں کہ چلو جی آپ جیتے ہم ہارے۔ حاجی صاحب کو تباہ کرنے کے بعد۔ خیر جی' ہم نے نہ دھوکا کیا نہ زبردستی۔"
"ظاہر ہے تمہاری تو لاٹری نکل آئی۔"
"اب دوسرا اچھا سا گھر تلاش کرنا ہے جی۔ عقدِ ثانی کے برکات وفیوض اب سامنے آرہے ہیں۔ پہلا تجربہ تو میری بدبختی کی سزا تھی جناب یا بس میرے گناہوں کی سزا تھی منجانب اللہ۔"
"چلو تم خوش ہو تو ہم بھی خوش ہیں" میں نے کہا اور فون بند کردیا کیونکہ کھانے کی ٹیبل پر بیٹھے ہوئے باقی سب لوگ مجھے چلا چلا کے پکار رہے تھے اور محسن مجھ پر ایک نمک دانی اور دو چمچے پھینک کے مار چکا تھا اور اعلان کرچکا تھا کہ میں نے فون نہ رکھا تو چمچوں کے بعد کانٹے اور پھر چھریاں ماری جائیں گی۔
غالب کوشش کرکے نازو کو میز پر لے آیا تھا مگر وہ سخت نڈھال اور افسردہ سی چُپ چاپ بیٹھی تھی اور ایک ہی بات دُہرا رہی تھی۔ "مجھے بھوک نہیں ہے" اس کی آنکھیں خلا میں دیکھتی محسوس ہوتی تھیں اور مجھے یہ اندیشہ لاحق تھا کہ اچانک حقائق کی دنیا میں لوٹ آنے کا ردِعمل زیادہ شدید نہ ہو جائے۔
کھانے کے بعد میں نے غالب سے کہا کہ وہ نازو کو سیر کرانے لے جائے۔ اس نے ہم سب کے ساتھ جانے کی شرط عائد کردی۔ اتوار کی چھٹی کی وجہ سے سب ہی تفریح کے موڈ میں تھے اور چوہدری دلاور کیس کے اینٹی کلائمکس نے اچانک سب کو بے عملی کے احساس میں مبتلا کردیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اب کرنے کو کچھ بھی نہیں رہا۔ جدوجہد ختم ہوگئی۔ جدوجہد ختم نہیں ہوئی تھی۔ اس میں ایک نیا موڑ آگیا تھا اور اس بلائنڈ کارنر سے آگے فی الحال کسی کی نظر کچھ دیکھنے سے قاصر تھی۔
رابعہ کی گاڑی میں میرے علاوہ غالب اور نازو بھی بیٹھ گئے۔ دوسری گاڑی وقار کی تھی۔ اس میں گل اور محسن ہمارے پیچھے رہے۔ ابھی ہم روانہ بھی نہیں ہوئے تھے کہ مہرالنسا عرف

میری نمودار ہوئی۔ وہ چاہتی تھی کہ میں اسے کمپنی دوں کیونکہ رات کی فلائٹ سے وہ واپس لندن جارہی تھی۔ اپنے پاپا کی موت نے اسے سخت دل برداشتہ کردیا تھا۔ وہ مجھ سے توقع رکھتی تھی کہ میں ایسے وقت میں اس کی غمگساری کروں مگر خدا نے مجھے بال بال بچالیا۔ میں نے کہا "ہم تو اسپتال جارہے ہیں۔ محسن کے فادر ان لا کا انتقال ہوگیا ہے۔"
"واپس کتنی دیر میں آؤ گے؟"
میں نے کہا "شام تک یا آٹھ بجے تک زیادہ سے زیادہ۔"
"ٹھیک ہے مجھے ائرپورٹ سی آف کرنے ضرور چلنا۔ میں انتظار کروں گی تمہارا لندن میں۔ کب تک آؤ گے؟"
میں نے کہا "لندن۔ شاید اب نہ آسکوں۔ دراصل میں نے شادی کرلی ہے یہاں۔ میٹ مائی وائف' مسز رابعہ..."
اس کے لیے یہ پاپا کی موت کی خبر سے بھی بڑا صدمہ تھا۔ اس نے رابعہ کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو نظرانداز کردیا۔ کچھ دیر مجھے غصے سے گھورتی رہی اور پھر چیخ کر بولی "یو چیٹ۔ ٹو ہیل ود یو۔ تم کیا سمجھتے تھے میں مرتی ہوں تم پہ.... آخر نکلے نا تم بھی ویسے ہی مرد..."
اس سے پہلے کہ میں "ویسے ہی مرد" کی وضاحت مانگتا وہ پلٹ کر روتی ہوئی بھاگ گئی۔
"اُلو کی پٹھی" میں نے برہمی سے کہا۔
رابعہ نے افسوس سے کہا "تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"
"کیا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔"
"کیا ضرورت تھی اس کو دکھ پہنچانے کی۔ آج کی تو بات تھی۔ رات کو اسے چھوڑ آتے ائرپورٹ۔ بعد میں بات خود بخود ختم ہو جاتی۔ وہ لندن میں کتنے دن انتظار کرتی۔ کچھ دن بعد بھول جاتی۔"
غالب نے کہا "آخر آپ نے ایسا غلط تاثر دیا ہی کیوں تھا۔ جیسے آپ اس پر فریفتہ ہیں۔"
"قسم خدا کی میں نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی تھی۔ وہ تو بس خود ہی میرے پیچھے پڑ گئی تھی۔ محسن جانتا ہے سب کچھ۔ یہ یہاں کسی کو منہ نہیں لگاتی تھی۔ میں نے اور محسن نے وقار سے شرط لگائی اور مشکل میں پڑ گئے۔ فرنچ بول کے۔ بعد میں پتا چلا کہ اس نیگرو' کیا نام ہے اس کا۔ جارج یا رابرٹ۔ وہ جو دلاور کے بدلے میں دُہرے قتل کی سزا کاٹ رہا ہے۔ وہ ان کا شوفر تھا۔"
"مذاق میں تم نے اس کے جذبات سے کھیلنے کی کوشش کی اور پھر یہ کھیل اچانک ختم کردیا۔ ایسا ہی کوئی تمہارے ساتھ کرے پھر...." رابعہ نے کہا۔
"لاحول ولا قوۃ۔" میں نے کہا "کون سی شریف زادی ہے کہ پہلی بار کسی سے دل لگایا ہو۔ اس کے لیے بھی یہ دل لگی تھی۔"
"ایسا ہوتا تو وہ روتی کیوں؟"

"رونا شوق ہے لڑکیوں کا۔ خوشی ہو یا غم۔ اور تمہیں اتنی ہمدردی کیوں ہو رہی ہے اس سے۔ میرے جیسے ایک سو ایک وہ پہلے شکار کرچکی ہوگی۔"
"ایسی شکاری لڑکی کے سامنے دل نشانہ رکھنے کی حماقت بھی کیوں فرمائی تھی آپ نے۔ اگر یہ سب پہلے سے جانتے تھے آپ۔"
میں نے کہا "رابعہ۔ تم لڑنے کے موڈ میں ہو تو واپس چلتے ہیں گھر۔"
"یہاں لڑنے میں بھی کوئی حرج نہیں" غالب نے پیچھے سے کہا "ہم یہ سمجھ لیں گے کہ شادی کے بعد کی زندگی کا منظر ہے۔ ڈراما چل رہا ہے۔"
"ڈراما کرنے کے لیے اب ان کو ریہرسل کی ضرورت بھی نہیں رہی۔ دیکھا نہیں کیسی روانی سے اتنا بڑا جھوٹ بول دیا۔ میں نے شادی کرلی ہے یہاں۔ میٹ مائی وائف۔" رابعہ نے میری نقل اُتاری۔
"اور تم نے فوراً ہاتھ آگے بڑھادیا کہ وہ میں ہوں۔"
اچانک نازو نے کہا "رابعہ باجی۔ میں نے بھی تو ایسا ہی جھوٹ بولا تھا۔ بڑی روانی سے۔ مجھے معاف کردیں پلیز۔"
"ارے نازو۔ چھوڑو یہ باتیں۔"
"نہیں۔ میں واقعی پاگل تھی۔ خیال کو حقیقت سمجھ کے آپ سے پتا نہیں کیا کچھ کہتی رہی" وہ دُکھی لہجے میں بولی۔
"آج کا خیال ہی کل کی حقیقت ہوتا ہے اور کوئی کہہ سکتا تھا اس قسم کی بات۔" غالب نے کہا۔
"ہاں۔ جیسے پاکستان پہلے ایک خیال یا تصور تھا۔ آج حقیقت ہے مگر اس کے وجود میں آنے سے پہلے ہی کیا ہر مسلمان پاکستان زندہ باد کے نعرے نہیں لگاتا پھرتا تھا" میں نے کہا۔
"مجھے شرم آتی ہے یہ سوچ کے..."
میں نے کہا "اچھا؟ تمہیں شرم بھی آتی ہے۔ بھئی ہمیں تو نہیں آتی کیوں غالب۔"
"بالکل نہیں۔ شرع میں کیسی شرم۔ آپس کی بات ہے نا" غالب نے کہا "اگر ہم بات کریں زینت امان یا ہیما مالنی سے شادی کی۔ تو یہ شرم کی بات ہے۔"
"لیکن وہ ایسی بات کریں ہمارے بارے میں تو خوشی کی۔" میں نے کہا۔
اسی وقت اچانک نازو نے کہا "غالب۔ وہ.... وہ گاڑی۔"
غالب نے پلٹ کے دیکھا "کیا ہوا۔ کون تھا اس میں؟"
"وہی۔ استاد پیڈرو۔"
"اس سفید رنگ کی گاڑی میں؟" غالب نے کہا "تمہیں یقین ہے۔"
"یہ کیسی فضول بات ہے۔ کیا میں استاد پیڈرو کو پہچاننے میں

غلطی کرسکتی ہوں۔ کل کو تم کہہ دوگے کہ چوہدری دلاور کو پہچان کے بتاؤ۔ اتنی پاگل نہیں ہوں میں۔" وہ بگڑ گئی۔
"ارے.... بھئی نازو... یہ مطلب نہیں تھا میرا۔ گزرتی ہوئی کار میں کسی کو دیکھ کے مجھے بھی دھوکا ہوسکتا ہے" غالب بولا۔
میں نے بھی اس کی تائید کی "ملتی جلتی شکلوں والے لوگ نظر آجاتے ہیں.... پیڈرو تو کراچی میں ہے۔"
نازو مجھ سے بھی خفا ہوگئی "تم تو ایسے بات کررہے ہو جیسے کراچی سے کوئی لاہور آ ہی نہیں سکتا۔"
میں نے کہا "آتو سکتا ہے.... لیکن اس کا وہاں کاروبار ہے۔"
وہ اپنی بات پر قائم رہی "کاروبار کے سلسلے میں کسی کے کراچی سے لاہور آنے پر پابندی ہے کیا؟ تم نہیں جاتے کراچی؟ اور یہ غلط فہمی کی بات نہیں ہے۔ نہ میری نظر کو دھوکا ہوا تھا۔ میں نے اسے بالکل صاف دیکھا تھا۔ تم ڈرائیونگ کررہے ہو۔ غالب اور رابعہ دوسری طرف بیٹھے ہیں۔ یہ نہیں دیکھ سکتے تھے۔ گاڑی میرے پاس سے گزری تھی۔ پیڈرو نے بھی دیکھا تھا مجھے۔ بلکہ.... آنکھ ماری تھی اس بدمعاش نے مجھے۔"
"آنکھ ماری تھی؟" غالب نے مصنوعی غصے سے کہا "سکندر۔ واپس چلو' اس کار کا پیچھا کرو۔ جب تک ہم اس ناہنجار کی اس گستاخی پر اس کی آنکھ نہیں نکال لیں گے اس کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔"
نازو کی بات نے مجھے سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور کردیا تھا۔ اگر وہ استاد پیڈرو ہی تھا جو کراچی میں شیخ مختار ہوگیا تھا تو اس کا لاہور آنا خالی از علت نہیں ہوسکتا تھا۔ کاروباری ضرورت کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا تھا مگر میرے اپنے خیال کے مطابق اس کے اور چوہدری دلاور کے درمیان اختلاف کے باعث یا شوکت رانا کا ساتھ دینے کی غلطی کرنے کے بعد ہی استاد پیڈرو لاہور سے فرار ہوکے کراچی گیا تھا۔ یہ مفروضہ غلط بھی ہوسکتا تھا۔ چوہدری دلاور کو اب استاد پیڈرو کی ضرورت نہیں رہی تھی اور وہ خود اس سے جان چھڑانا چاہتا تھا۔ ممکن ہے وہ کسی جھگڑے کے بغیر الگ ہوگئے ہوں۔ چوہدری دلاور نے اس کی سابقہ جانثاری کے بدلے میں اس کی جاں بخشی کردی ہو اور نئی زندگی کے آغاز کے لیے دعاؤں کے ساتھ اور بھی بہت کچھ دے دیا ہو۔ خود چوہدری دلاور کی خواہش یہی تھی کہ وہ اپنے ماضی سے دامن چھڑا کے ایک باعزت مستقبل کی اُمید رکھتے ہوئے نئی زندگی شروع کرے۔ مشکل یہ تھی کہ اس کا ماضی ہم تھے۔ اب وہ کمبل کو چھوڑتا تھا مگر کمبل اسے نہیں چھوڑتا تھا۔
میں کبھی کبھی عقب نما آئینے میں دیکھ لیتا تھا کہ وقار یوسف کی گاڑی ہمارے پیچھے آرہی ہے۔ ٹریفک کے رش میں ساتھ رہنا مشکل بھی ہوجاتا ہے۔ بعض اوقات تیز رو اور عجلت پسند ڈرائیور بیچ میں آجاتے ہیں۔ کبھی ایک گاڑی سگنل کراس کرجاتی ہے مگر دوسری کے لیے لائٹ سُرخ ہوجاتی ہے۔ ہم کوئی باقاعدہ پروگرام

بنا کے نہیں روانہ ہوئے لیکن میرے ذہن میں رابعہ کی بات تھی۔ وہ اپنا نیا گھر تعمیر ہوتا دیکھنا چاہتی تھی۔ اس نے وقار کے سامنے ہی محسن سے کہا تھا کہ ٹھیکے دار صاحب۔ کتنا کام ہوگیا ہے اور محسن نے خالص ٹھیکیداری کے انداز میں کہا تھا "بی بی جی۔ آپ بقلم خود چل کے دیکھیں۔"

میرا خیال تھا کہ یہ بات محسن کو بھی یاد رہے گی۔ اب وقار کی گاڑی پیچھے نظر نہیں آرہی تھی۔ رُکنے کے بجائے میں آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہا۔ رابعہ کے زیرِ تعمیر گھر تک پہنچنے تک وقار کی گاڑی مجھے نظر نہیں آئی تھی۔

رابعہ نے بھی کہا "وہ لوگ کہاں رہ گئے؟"

میں نے کہا "آرہے ہوں گے پیچھے۔ کیا پتا ٹائر پنکچر ہوگیا ہو وقار کا۔ میرا مطلب ہے اس کی گاڑی کا۔"

"یا اس کی بھی نگی سے لڑائی ہوگئی ہو اور جیسے تم نے کہا تھا کہ لڑنا ہے تو واپس گھر چلتے ہیں۔ ایسے ہی وقار نے کہا ہو اور نگی نے کہا ہو کہ چلو۔"

"لڑنے کے معاملے میں وہ نگی نہیں وڈی ہے" میں نے کہا "وقار بھی کم نہیں' خاموشی سے کوئی بات کہہ کے معصوم بن جاتا ہے اور چپ چاپ سنتا رہتا ہے۔ نگی کو عادت ہے شور کرنے کی۔ وہ خاموش ہوتی ہے تو وقار پھر چھیڑ دیتا ہے۔ اسے بھی مزہ آتا ہے پنگا لے کے۔"

"پنگا لیے بغیر ازدواجی زندگی کی گاڑی چلتی بھی نہیں" میں نے کار سے اُترتے ہوئے کہا "جتنا بولنا ہوتا ہے شادی سے پہلے بول لیتے ہیں مرد تو۔"

"ہاں۔ خوب ڈائیلاگ مارتے ہیں" رابعہ نے کہا۔

"شادی کے بعد باری آتی ہے بیوی کی" غالب نے کہا "پھر شوہر کی بولتی بند ہو جاتی ہے۔"

"یہ ذرا بازاری سی بات کہی آپ نے مگر خوب کہی۔ دراصل یہ لڑکیاں بہت چالاک ہوتی ہیں۔ شادی سے پہلے ایسی بھولی اور شرمیلی بنی رہتی ہیں جیسے منہ میں زبان ہی نہیں۔"

"سب ایکٹنگ ہوتی ہے۔"

"اور ڈر ہوتا ہے کہ زیادہ بولنے سے بات نہ بگڑ جائے۔ کاٹھ کا اُلو ڈر کے بھاگ نہ جائے۔ جب بعد میں یہ خوف دل سے نکل جاتا ہے تو پھر اللہ دے اور بندہ لے۔ شادی سے پہلے کی خاموشی کی ساری کسر نکال لیتی ہیں۔"

رابعہ نے طنز سے کہا "اُفوہ۔ کیا زبردست اور پُر مغز عاقلانہ گفتگو ہو رہی ہے۔"

نازو بولی "ہاں۔ جیسے بہت تجربہ ہے شادیوں کا۔"

"اچھا ایمان سے کہو کیا ایسا نہیں ہوتا۔ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ جہاں محبت ہوگی میاں بیوی میں وہاں لڑائی ضرور ہوگی۔ لڑائی نہ ہو تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ایک کو دوسرے کی نہ پروا ہے نہ فکر۔"

غالب نے کہا "ہاں۔ اختلافِ رائے تو وہیں ہوگا جہاں دونوں کی دلچسپی ہوگی گھر کے معاملات میں۔ ورنہ شوہر کی ساری دلچسپیوں کا مرکز ہو گھر سے باہر تو وہ کہتا ہے کہ مجھے کیا۔ بیوی جو چاہے کرے اور بیوی خود گھر سے بیزار ہو یا سمجھتی ہو کہ شوہر کو پروا نہیں تو مجھے کیا۔ نتیجہ یہ کہ زندگی کی گاڑی ایسے چلتی رہتی ہے جیسے بلندی سے ڈھلوان کی طرف خود بخود چلتی جا رہی ہو۔"

رابعہ نے گھڑی دیکھ کے کہا "کہاں رہ گئے وقار اور محسن!"

میں نے کہا "چلو' ہم اتنی دیر میں نقشہ تو پاس کر دیں۔ محسن کا تو دیکھا ہوا ہے۔"

چھٹی کا دن ہونے کی وجہ سے محسن کا وہ دوست ٹھیکے دار بھی موجود نہیں تھا جس نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ تہ خانے کو ایسے بھروے گا کہ ماہرِ تعمیرات و آثارِ قدیمہ بھی اس کا وجود ثابت کرنے میں ناکام ہو جائیں گے۔ معلوم نہیں اس نے اتنے وسیع تہ خانے میں کتنا ملبا بھرا تھا اور وہاں اب خلا تھا یا نہیں۔ اوپر سے یہ ایک جدید طرز کی کوٹھی کا مکمل نقشہ نظر آتا تھا۔ بنیاد کے اوپر فرش اور ستون بھی ظاہر کرتے تھے کہ تعمیراتی کام کتنی تیز رفتاری سے کیا گیا تھا۔

وقار کی گاڑی ابھی تک نہیں پہنچی تھی چنانچہ مجوزہ عمارت میں دلچسپی لینے کے باوجود رابعہ کا اور میرا دھیان بٹا ہوا تھا۔ مجھے اب تشویش ہونے لگی تھی۔ ٹائر فلیٹ ہو جائے تو اسے بدلنے میں دس منٹ سے زیادہ صرف نہیں ہوتے۔ نازو کی بات نے مجھے اور پریشان کر دیا تھا۔ اس نے پیڈرو کو مخالف سمت میں جاتے دیکھا تھا۔ اگر یہ اتفاق ہوتا تو شاید پیڈرو بھی ہمیں دیکھے بغیر گزر جاتا مگر اس کا نازو کو آنکھ مارنا محض ایک گھٹیا حرکت نہیں سمجھی جا سکتی تھی۔ اس کا مقصد کچھ اور بھی ہو سکتا تھا۔ اس نے جانتے بوجھتے اپنی موجودگی کا اور اپنے شرپسندانہ عزائم کا احساس دلانے کی کوشش کی تھی۔

مزید دس منٹ گزر گئے تو ہم نے واپس اسی راستے پر جا کے دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ ان کی گاڑی میں کوئی خرابی پیدا ہو جائے۔ اچانک فین بیلٹ کا ٹوٹ جانا یا ریڈیٹر ہوز پائپ کا لیک کر جانا کوئی خرابی نہیں ہوتی مگر اس کو ٹھیک کیے بغیر گاڑی نہیں چل سکتی۔ کسی حادثے کے امکان کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔

ہماری اپنی گاڑی سائڈ کی گلی میں موڑ سے کچھ آگے کھڑی ہوئی تھی۔ عین موڑ پر گاڑی پارک کرنے میں یہ رسک رہتا ہے کہ کوئی تیزی سے گلی میں داخل ہو اور گاڑی سے گاڑی ٹکرا دے تاہم اس سے دوسرا نقصان ہوا۔ گاڑی نظر کے سامنے ہوتی تو کچھ نہ ہوتا۔ ہمارا یہاں قیام بھی چند منٹ سے زیادہ کا نہ تھا۔ بس گزرتے ہوئے ہم سب رابعہ کی نئی کوٹھی کا نقشہ دیکھنا چاہتے تھے اسی لیے میں نے گاڑی کو لاک بھی نہیں کیا تھا۔ یہ دوسری غلطی تھی جس کا ہم نے خمیازہ بھگتا مگر یہ خیال بھی دل کو خوش رکھنے والی بات تھی کہ گاڑی سامنے ہوتی اور لاک ہوتی تو کچھ اور ہوتا۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی میں نے اپنی سیٹ پر ایک ریڈیو رکھا ہوا دیکھ لیا۔ اس کے نیچے ایک رقعہ دبا دیا گیا تھا۔ رقعے پر لکھا ہوا تھا "اس ریڈیو کو اپنی گاڑی کے ریڈیو کی جگہ لگالو۔ پھر ایف ایم ایک سو دو کی نشریات سنو۔"

میں سمجھ گیا کہ یہ کسی خرابی کا اشارہ ہے۔ رابعہ کی گاڑی میں پہلے ایک بینڈ کا میڈیم ویو ریسیور تھا جو بعد میں چوری ہو گیا تھا اور رابعہ نے دوسرا ریڈیو لگوانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔ اس ریڈیو کی جگہ خالی تھی مگر بونٹ پر جو انٹینا نصب تھا وہ اپنی جگہ موجود تھا اور ریڈیو چُرا کر لے جانے والے نے جب تار کھینچے تھے تو وہ فور پن ساکٹ الگ ہو گیا تھا جس کے چار سوراخوں میں ریڈیو کی چار پنوں کو داخل کرنے سے کنکشن مکمل ہو جاتا تھا۔ یہ کام ایک بچہ بھی کر سکتا تھا۔ اگر وہ ریڈیو کے پیچھے بنے ہوئے نشانات پر غور کرے کہ کس رنگ کا تار کہاں جوڑا جائے گا۔ اسپیکر اور بیٹری کے ہر ٹرمنل کے تار کا رنگ الگ تھا۔ انٹینا کی لیڈ والی موٹی پن کا سوراخ سب سے الگ تھا۔ یہ کام میں نے پانچ منٹ میں ختم کر لیا۔

رابعہ نے دوبارہ سوال کیا "یہ کیا ہے؟"

میں نے جھنجلا کے کہا "تمہارے خیال میں کیا ہے؟ بم یا گلاب جامن؟ یار ریڈیو ہے اور کیا ہے۔"

غالب نے وہ رقعہ اسے تھما دیا "سوال یہ ہے بڑے بھائی کہ یہ حرکت آخر کس نے کی؟ اور کب؟"

"چھوٹے بھائی' یہ بھی پوچھ لو کہ کیوں کی؟"

رابعہ نے ڈرتے ڈرتے کہا "دیکھو سکندر۔ نظر تو مجھے بھی آرہا تھا کہ یہ ریڈیو ہے مگر یہ.... کچھ اور بھی تو ہو سکتا ہے۔"

غالب نے سرہلایا "گلاب جامن ہے تو چکھ کے معلوم ہو جائے گا بم ہوا تو پتا نہیں چلے گا۔"

"کیسے پتا نہیں چلے گا' دھماکا ہوگا" نازو بولی۔

"میرا مطلب تھا کہ ہمیں پتا نہیں چلے گا' دوسروں کو یقیناً پتا چلے گا۔"

میں نے نفی میں سرہلایا "کوئی ہمیں ہلاک کرنا چاہتا تو ریڈیو یوں سیٹ پر چھوڑ کے نہ جاتا۔ پرچہ ترکیبِ استعمال کے ساتھ۔ گاڑی میں بم رکھ جاتا۔ ٹائم بم سب سے آسان چیز ہے۔"

غالب نے میری تائید کی "یہ اپنے چوہدری دلاور کی طرف سے پہلا رابطہ ہے۔ وہ بات کرنا چاہتے ہیں کوئی۔ ہمارے فائدے کی۔"

"بے چارے بڑے نیک اور مخلص آدمی ہیں" میں نے کہا "اب میں ریڈیو آن کرنے والا ہوں' کلمہ پڑھ لیں سب لوگ۔"

رابعہ نے دہشت زدہ ہو کے کہا "کیوں منحوس باتیں کرتے ہو۔"

"اچھا بھئی آپ سب کو شہادت مبارک ہو۔" میں نے ریڈیو آن کر دیا۔ اسپیکر میں سرسراہٹ سنائی دینے لگی۔

میں نے فخر سے رابعہ کی طرف دیکھا "پس ثابت ہوا کہ میں ایک ریڈیو انجینئر بھی ہوں۔ اور یہ نہ بم تھا نہ گلاب جامن۔"

رابعہ نے گاڑی کو واپس کیا اور ہم سڑک پر آگئے۔ وقار کی گاڑی ابھی تک لاپتا تھی اور ریڈیو خاموش تھا۔

"کیا مصیبت ہے' کدھر چلے گئے وہ لوگ" رابعہ نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ وہ سیدھے نکل گئے" میں نے کہا۔

"تمہارا خیال غلط ہے سکندر بخت" ریڈیو میں سے آواز آئی۔

ہم سب بُری طرح چونکے۔ نازو تو واقعی اچھل پڑی "یہ.... یہ تو۔"

غالب نے اسے تھپکی دی "یہ استاد پیڈرو کی آواز ہے۔ صرف آواز' وہ خود نہیں ہے۔"

ریڈیو نے کہا "مگر اس کی آواز بھی عالمِ بالا سے نہیں آرہی ہے۔ وہ خود بھی تم سے زیادہ دور نہیں ہے غالب صاحب۔"

"دور ہی رہو تو اچھا ہے۔ سامنے آئے تو مرد کیا عورتیں ہی تمہاری ہڈی پسلی ایک کر دیں گی۔"

"تم جیسے مرد اپنی مردانگی پر نہیں۔ نازو جیسی عورت کی طاقت پر ناز نہ کریں تو کیا کریں۔" پیڈرو نے کہا "پاگل کے بچے۔"

غالب سخت خفیف ہوا مگر اس نے کہا "سؤر کے بچّے۔"

میں نے اسے روک دیا "پیڈرو۔ کام کی بات کرو۔"

"ایک بات تو عقل شریف میں اچھی طرح آگئی ہوگی تمہاری کہ میں کراچی سے لاہور کیوں آیا ہوں؟ دوسری بھی تمہیں سمجھ لینی چاہئے کہ میں نے تم کو اس بھیس میں پہچان لیا ہے بالآخر۔ اور صرف تمہاری اپنی غلطی کے باعث۔ تم تو مجھے اکرام شیخ کی گاڑی کی ڈکی میں ڈال کے چھوڑ گئے تھے۔ خدا بھلا کرے پولیس والوں کا۔ وہ مجھے گاڑی سمیت اٹھا لے گئے اور میری جان بچالی مگر تم ڈرو نہیں' میں نے کچھ نہیں بتایا ان کو تمہارے متعلق۔ اور نہ میں نے اکرام شیخ سے کچھ کہا۔ میں اس کے گھر گیا تھا گاڑی واپس کرنے کے لئے۔ اس سے ملا بھی تھا۔ وہ بہت پریشان ہوا مگر میں نے اسے بھی تسلی دی کہ مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں اور نہ میرا ارادہ اسے نقصان پہنچانے کا ہے۔ اس نے سکندر بخت کا ساتھ دے کے کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ دوست ہی کام آتے ہیں دوستوں کے۔"

بالآخر وہی ہوا تھا جس کا مجھے ڈر تھا اور میں انکار نہیں کر سکتا تھا کہ ایسا میری اپنی کوتاہی سے ہوا تھا۔ اسے اتفاق یا پیڈرو کی خوش قسمتی بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ کراچی کی سڑکوں سے ناواقف ہونے کی وجہ سے میں نے گاڑی غلط جگہ پارک کر دی تھی اور نو پارکنگ ایریا سے پولیس نے اکرام شیخ کی گاڑی اٹھانے میں بڑی مستعدی کا مظاہرہ کیا تھا۔ گاڑی وہاں نہ کھڑی ہوتی یا پولیس کچھ دیر سے نوٹس لیتی یا وہ میری واپسی کا انتظار کرتے کہ کچھ لک مکا ہو جائے تو پیڈرو کو یہ سب کہنے کا موقع کیسے ملتا۔

میں نے کہا "پیڈرو۔ ٹھیک ہے تم کو قسمت نے بچالیا۔"

"اور تمہیں بدقسمتی نے مروادیا۔ گیدڑ کی موت آتی ہے تا تو وہ شہر کا رُخ کرتا ہے۔ تم بلاوجہ مجھ سے پنگا لینے کراچی آئے۔ میں تو بھول گیا تھا سب کچھ۔"

"لیکن میں نہیں بھولا تھا پیڈرو! اور نہ بھولوں گا۔"

اس نے آہ بھری "مگر لوگ تمہیں بھول جائیں گے۔ کبیر خان کے دوست سکندر بخت کی محبوبہ' چیف کے ٹو کے جانثار۔ ایم آر ایس کے مجاہد۔ مجھے مجبورًا لاہور آنا پڑا۔ میں استاد پیڈرو سے شیخ مختار بن گیا تھا اور ایک نئی زندگی کا آغاز کرچکا تھا جس کا تعلق میری پہلے والی زندگی سے نہیں تھا مگر شاید تم نہ خود جینا چاہتے ہو اور نہ مجھے جیتا دیکھ سکتے ہو۔"

"یہ تم نے ٹھیک کہا۔ میں تو بس تمہاری لاش کو تختۂ دار پر جھولتا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"یہ حسرت نہ تو پوری ہوئی ہے نہ ہوگی۔ اب مجھے ہی کچھ کرنا پڑے گا۔ بہتر ہوتا کہ تم مجھے بھول جاتے۔"

"یعنی یہ بھول جاتا کہ تم میرے باپ کے قاتل ہو؟"

"اچھا مت بھولو۔ تمہیں بھی پہنچادیتے ہیں ابا جی کے پاس۔ جہنم میں۔ وہ بھی شاید چاہتے ہیں کہ تم جلد از جلد آجاؤ۔"

"ایسی باتوں اور دھمکیوں سے نہ میں مشتعل ہوتا ہوں اور نہ ڈرتا ہوں۔ یہ بتاؤ کیا تم نے روک لیا ہے وقار یوسف کی گاڑی کو۔"

"صرف گاڑی کو نہیں۔ اس میں سوار چار افراد بھی تھے۔ وقار کی نئی سی بیوی' محسن کی ناگ منی اور تمہاری سابق محبوبہ اور منگیتر کی آخری نشانی۔" اس نے ایک شیطانی قہقہہ مارا۔

میرے منہ سے اس کے لئے بے اختیار ایک گالی نکلی۔

"نہیں۔ بُری بات۔" اس نے کسی بزرگ کی طرح کہا "ابھی کیا کہا تھا تم نے؟ اتنی جلدی بھول گئے۔ غصے میں آدمی کی عقل کام نہیں کرتی۔ میں تم سے زیادہ دور نہیں ہوں لیکن تم مجھے دیکھ نہیں سکتے۔"

"نازو نے دیکھ لیا تھا تمہیں خبیث۔"

وہ ہنسا "اچھا۔ اس پاگل نے پہچان لیا تھا مجھے۔ خیر' اب صورتِ حال یہ ہے کہ وقار یوسف کی گاڑی واپس گھر کی طرف جارہی ہے۔ ابھی تک سب خیریت سے ہیں۔ میرا مطلب ہے زندہ ہیں۔ ان کی گاڑی سگنل پر رُکی تو ہم نے ایک معمولی سا کام کیا تھا۔ ہاتھ کی صفائی تھی۔ ایک لڑکے نے بچے کو غبارا تھمادیا تھا۔ وہ غبارے بیچنے والا ہی تھا۔ کسی نے اسے پیسے بھی دیے تھے۔ مگر گاڑی کے چلتے ہی وہ غبارا پھٹ گیا۔ غبارے بیچنے والے لڑکے نے ہی اس میں ایک پن چبھودی تھی۔ کسی نے دیکھا نہیں' غبارے میں عام ہوا یا گیس نہیں تھی۔ سگنل کراس کرتے ہی وقار نے بھی چکر محسوس کیے اور گاڑی ایک طرف روک لی۔ اس وقت تک پیچھے والے بے ہوش ہوگئے تھے۔ وقار باہر نکل کے تازہ ہوا میں سانس لینا چاہتا تھا۔ مگر وہ باہر ہی لیٹ گیا۔ کچھ لوگوں نے فورًا اسے سنبھالا اور فٹ پاتھ پر ایک طرف لٹادیا۔ ہمارا ایک آدمی کار چلاکے لے گیا۔ اسے کسی نے بھی نہیں دیکھا۔ اس وقت تک کوئی بھی شور مچانے کے قابل نہیں رہی تھی۔ وہ اب تک گھر پہنچ چکے ہوں گے۔"

ہم سب نے ساری بات سانس روک کے سُنی۔ پیڈرو پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔

میں نے بڑی مشکل سے کہا "وقار اب کہاں ہے؟"

"ابھی تو وہیں لیٹا ہوا ہوگا۔ ممکن ہے ہوش میں آگیا ہو۔ غبارے میں تھوڑی سی گیس ہوتی ہے۔ محسن اور گل پر زیادہ دیر اثر رہے گا۔ تازہ ہوا میں خود بخود آدھے گھنٹے بعد ہوش آجاتا ہے لیکن اس وقت تک وہ گھر پہنچ جائیں گے۔ ہمارے آدمی نے شیشے چڑھادیے ہوں گے۔ جو کار کے اندر ہیں وہ اتنی جلدی ہوش میں نہیں آسکتے۔ وقار کو اگر کسی نے اسپتال پہنچادیا تب بھی کوئی فکر کی بات نہیں۔ وہ پولیس کو فون کرے گا۔ یہ بتائے گا کہ اس کی بیوی اور گاڑی' دونوں کو نہ جانے کون لے گیا ہے۔ گاڑی میں اس کے ایک دوست کی فیملی بھی تھی۔ پولیس شاید رپورٹ لکھے گی اور وکیل صاحب کو تسلی دے گی کہ ہم ابھی سب جگہ اطلاع کردیتے ہیں اور ناکابندی کرادیتے ہیں تمام راستوں پر۔ وہ گاڑی کہیں سے بھی گزرے' پکڑی جائے گی۔ ویسے آپ کو شک کس پر ہے؟ اور سکندر بخت' وہ میرا نام تو لے گا نہیں۔ وہ نام لے گا چوہدری دلاور کا۔ وقار کی پوزیشن خاصی خراب ہوگی کیونکہ بالآخر وہ گھر پہنچے گا تو اسے معلوم ہوگا کہ گھر والے تو گھر میں ہیں اور اس عرصے میں ایک رپورٹ بیوی بھی لکھوا چکی ہے۔ یا فون کرکے پولیس کو گھر پر بُلاکے یہ بات بتا چکی ہے۔ پولیس والے بڑے.... ہوتے ہیں۔ وہ ہنسیں گے کہ لو جی' لینی ایک نہ دینی دو۔ گھر والے سب گھر پر مزے سے بیٹھے ہیں اور وکیل صاحب پتا نہیں کیا اسٹوری سُناتے پھر رہے ہیں۔ خود وکیل صاحب اسپتال میں آرام سے لیٹے تھے اور بیوی نے گھر پر پولیس کو بُلالیا...... یہ کیسا اغوا ہے کہ اغوا کرنے والے نے سب کو خیریت کے ساتھ گھر پہنچادیا یا اسپتال... لیکن... یہ سب کچھ ہوگا کم سے کم ایک گھنٹے بعد۔ اس میں دو گھنٹے بھی لگ سکتے ہیں۔ اگر تم نے میری ہدایات پر عمل کیا تو انہیں کچھ بھی نہیں ہوگا۔ وکیل صاحب بھی خیروعافیت کے ساتھ گھر پہنچ جائیں گے۔ سب بچھڑے ہوئے مل جائیں گے۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ ورنہ بہت کچھ ہوجائے گا۔"

"تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" میں نے کہا۔

"پہلی بات تو یہ کہ تم چاروں میں سے کوئی بھی گاڑی سے باہر قدم نہیں رکھے گا۔ رابعہ ڈرائیونگ سیٹ پر ہے۔ اسے ڈرائیونگ کرنے دو۔ میری نظر میں ہے تمہاری گاڑی۔ کوشش کرکے تم بھی

یہ اطلاع مل گئی ہے۔"

رابعہ نے کہا "دیکھو ان کے ساتھ ایک چھوٹا بچہ ہے۔"

"ہم کیوں پریشان ہوں اس کے لئے۔ ایک طرح سے سوکن تھی ساری.... جس کا بچہ ہے۔"

"اپنی گھٹیا سوچ اپنے پاس رکھو۔ بڑوں کے مقابلے میں اس پر گیس کا اثر زیادہ ہوگا۔"

غالب نے کہا "وہ کون سی گیس تھی؟"

"یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں۔" پیڈرو بولا "لیکن میں نے سختی سے تاکید کی تھی کہ کسی کی جان کو خطرہ لاحق نہ ہو۔"

"مگر ممکن ہو تو اس بچے کے لئے کسی ڈاکٹر کو بُلانے کی اجازت دے دو۔"

"ٹھیک ہے میں اپنے ساتھیوں سے کہہ دیتا ہوں۔" پیڈرو نے بڑی شرافت سے کہا "تم اب دیر مت کرو۔"

رابعہ نے میری طرف بے بسی سے دیکھا اور میں نے سرہلا کے پیڈرو کے حکم کی تعمیل کے لئے کہا۔ تعمیل نہ کرنا ہمارے اختیار کی بات نہیں رہی تھی۔ اگر پیڈرو جھوٹ نہیں بول رہا تھا تو ہم مجبور تھے۔ اس نے وقار یوسف اور نگی کے ساتھ محسن اور گل کو بھی یرغمال بنالیا تھا۔ پانچواں بوبی تھا اور پیڈرو جیسے ذلیل آدمی سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ سب کو کسی نامعلوم مقام پر لے جاکے قید کردے۔ ہم بچ جائیں لیکن وہ عذاب میں مرجائیں۔

خود میرے لئے افشائے راز کی دھمکی بہت بڑا خطرہ تھی۔ میری معمولی سی غلطی نے ایک ایسے دشمن کو اپنے پیچھے لگالیا تھا جس سے فوری طور پر ہمیں کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا بلکہ جو خود ہم سے پیچھا چھڑا کے روپوشی اختیار کرچکا تھا۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے کوئی راہ چلتے کسی پاگل کتے کو پتھر ماردے اور خاموش سونے والا کتا اٹھ کے پتھر مارنے والے کے پیچھے دوڑے۔ اب پیڈرو حکم دے رہا تھا اور ہم بلا چون وچرا تعمیل کررہے تھے۔

گاڑی کا ریڈیو خاموش ضرور ہوگیا تھا مگر اس کی سرسراہٹ سے اندازہ ہوتا تھا کہ رابطہ ختم نہیں ہوا۔ واکی ٹاکی قسم کا دوسرا ریڈیو ریسیور ہم سے زیادہ دور نہیں تھا اور پیڈرو واقعی کسی گاڑی میں ہمارے پیچھے آرہا تھا۔ فاصلہ زیادہ ہوتا تو سرسراہٹ کم ہوجاتی یا ختم ہوجاتی مگر اس کے اور ہمارے درمیان مواصلاتی رابطہ برقرار رہنے کا مطلب یہ تھا کہ ہم نے آپس میں کوئی بات کی تو استاد پیڈرو بھی سُنے گا۔

مال روڈ تک میں نے کئی بار پلٹ کے دیکھا مگر ہمارے پیچھے ایک نہیں درجنوں گاڑیاں تھیں۔ رابعہ نے مجھے اشاروں کی زبان میں سمجھایا کہ میں سر گھمانے کی تکلیف نہ کروں۔ وہ بیک مرر میں گاڑیوں پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ پھر میں نے اشاروں کی زبان میں نازو کو یہ کہنا چاہا کہ وہ اس کار کو پہچانے جس میں پیڈرو نظر آیا تھا مگر

مجھے دیکھ سکو گے مگر اس کا فائدہ کچھ نہیں۔ اگر تم نے راستے میں کسی سے مدد مانگی۔ پولیس کو کچھ بتایا یا میری ہدایات پر عمل کرنے میں چالاکی اور بہادری سے کام لیا۔ تو نقصان انہیں ہوگا جو ایک گھنٹا تو ہماری تحویل میں ہیں۔ تم خود بھی پکڑے جاؤ گے اور ایک غیر ملکی وکیل کا ڈراما آج حوالات میں ختم ہوجائے گا۔ یہ کتنی بڑی رعایت دے رہا ہوں میں تمہیں کہ ابھی تک تمہارا راز میرے سینے میں دفن ہے۔ اس سے پہلے کہ تم خود کچھ کرسکو میں تو پھر غائب ہوجاؤں گا لیکن پھر وقار یوسف کے گھر میں بھی تمہیں کوئی نہیں ملے گا۔ ایک گھنٹے تک میرے آدمی وہاں موجود رہیں گے۔ پھر وہ انہیں اپنے ساتھ ہی لے جائیں گے لیکن تم نے شرافت سے کام لیا اور وہی کیا جو میں کہوں گا تو آدھے گھنٹے بعد وہ آزاد ہوں گے۔ میرے ساتھی... رخصت ہوجائیں گے۔ میں خود انہیں حکم دوں گا کہ اب کوئی خطرہ نہیں' وہ جائیں۔"

"اور تمہارے یہ آدمی آخر ہیں کون؟ کیا تم نے بھی کوئی گروہ بنالیا ہے؟"

"کیا کروگے یہ جان کے" پیڈرو بولا۔ "گروہ تو سب ہی بناتے ہیں کبھی وہ یونین کہلاتی ہے۔ کبھی اسے ٹیم یا کلب کہتے ہیں' کبھی مافیا اور سنڈیکیٹ جیسے الفاظ بھی استعمال ہوتے ہیں۔ تجارت پیشہ افراد کی بھی انجمن ہوتی ہے۔ چیمبر آف کامرس بھی ایک گروہ ہوتا ہے۔"

"بڑی اونچی باتیں کرنے لگے ہو تم پیڈرو۔ ایک گھٹیا بدمعاش....."

"کیا یہ غلط ہے۔ تمہارا بھی ایک گروہ تھا۔ ایم آر ایس۔ دراصل سب کا مشترکہ مفاد ہو تو لوگ آپس میں مل جاتے ہیں۔ متحد ہوجاتے ہیں۔ رہا اچھے بُرے مقاصد کا فرق تو اس کا فیصلہ کرنے والے تم کون۔ بڑی اونچی سطح پر اسمگلر اور ذخیرہ اندوز تاجر بھی گروہ بناکے ملک اور قوم کی ایسی تیسی کرواتے ہیں۔ بیوروکریسی ایک گروہ ہے مگر وہ بڑے معزز کہلاتے ہیں۔ کچھ میرے ساتھی ہیں۔ نہ ہوتے تب بھی کیا فرق پڑتا۔ ساتھی کرائے پر بہت ملتے ہیں۔ آج کل تو کرائے کی فوج مل جاتی ہے۔ کرائے کے فوجی' دنیا کے بہت سے ممالک حاصل کرتے ہیں۔"

میں نے کہا "بند کرو یہ فضول بکواس اور یہ بتاؤ کہ اب کہاں جانا ہے؟"

"یہاں سے چلو ملتان روڈ کی طرف۔ چوبرجی سے سیدھے نکلو۔ وہاں تک تمہیں رہنمائی کی ضرورت نہیں۔ اپنے لاہور کی سڑکوں سے تم اچھی طرح واقف ہو۔ بس یہ مت بھولنا کہ میں تم پر نظر رکھوں گا۔ بہت زیادہ تیز رفتاری کا مظاہرہ کرکے یا اُلٹا سیدھا راستہ اختیار کرکے تم مجھے چکما دے سکتے ہو مگر ایسا کرنے سے پہلے ان سب کے بارے میں سوچ لینا جو صرف ایک گھنٹے کے لئے ہماری تحویل میں ہیں اور ابھی اپنے ہی گھر میں ہیں۔ لو وہ گھر پہنچ گئے۔

نازو نہیں سمجھی تو میں نے پیچھے جھک کے سرگوشی میں یہ بات کہہ دی۔ نازو نے سرہلایا اور پلٹ کے دیکھا۔ شاید ہماری یہ حرکت بھی پیڈرو کی نظر سے پوشیدہ نہ رہی ہو مگر مجھے پروا نہیں تھی۔

اپر مال تک نازو کو اور مجھے کئی گاڑیوں پر شک ہوا کہ اس میں پیڈرو ہوگا مگر وہ سب گاڑیاں آگے نکل گئیں۔ رابعہ نے احتیاط سے کام لیتے ہوئے رفتار کو تیس چالیس میل سے بڑھنے نہیں دیا تھا تاکہ پیڈرو کو شک نہ ہو۔ وہ چالاک آدمی یقیناً کافی پیچھے تھا۔ وہ سو گز پیچھے رہ کے آرام سے تعاقب جاری رکھ سکتا تھا۔ درمیانی فاصلے میں گاڑیاں حائل ہوتی رہتی تھیں چنانچہ وہ محفوظ تھا۔

اپر مال سے چوبرجی تک کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا مگر ملتان روڈ پر بھی ٹریفک کا رش کم نہ تھا۔ رابعہ نے ایک ہی رفتار سے سفر جاری رکھا۔ ریڈیو کی خاموشی میرے اعصاب پر اثرانداز ہو رہی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ پیڈرو اور کچھ کہے۔ اگر اس نے رابعہ کی درخواست کو شرفِ قبولیت بخشتے ہوئے ببلی کے لئے کسی ڈاکٹر کو بلانے کے لئے کہا تھا تو ہم نے اس کی آواز نہیں سنی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ دو طرفہ مواصلاتی نظام استعمال کر رہا تھا۔ وہ ہم سے کسی اور فریکوئنسی پر بات کر رہا تھا اور اپنے ساتھیوں سے دوسری فریکوئنسی پر ورنہ اس کی آواز ہم بھی سنتے۔

ہمیں مسلسل چلتے ہوئے بیس منٹ سے زیادہ ہوگئے تھے۔ پیڈرو نے آدھے گھنٹے بعد سب کی رہائی کا وعدہ کیا تھا۔ ہم نے وہی کیا تھا جو پیڈرو نے چاہا تھا اس کے باوجود پیڈرو جیسے شخص کے وعدے پر اعتبار وہی کرسکتا تھا جو اسے نہ جانتا ہو۔ میرے ذہن میں یہ خیال بھی تھا کہ کہیں یہ سب جھوٹ نہ ہو۔ رابعہ اور نازو اس خیال سے سہمی بیٹھی ہوئی تھیں کہ نہ جانے باقی سب کس حال میں ہوں گے۔ خود پیڈرو کو علم نہیں تھا کہ وہ کون سی گیس تھی۔ معمولی سی زہریلی گیس بھی زیادہ مقدار میں استعمال کرلی جائے تو مہلک بن جاتی ہے۔ بہت سی عام استعمال کی زہریلی چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو بڑوں کی غلطی سے بچے کھا جاتے ہیں یا پی لیتے ہیں مگر معمولی مقدار ہو تو بچے کو بھی نقصان نہیں ہوتا۔ غبارا ببلی کے ہاتھ میں دیا گیا تھا اور اسی کے ہاتھ میں پھٹ گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ سب سے زیادہ گیس کی مقدار اسی کے سانسوں میں شامل ہوئی ہوگی۔

اندر سے میرا خون بھی تیزاب کی طرح کھول رہا تھا۔ پیڈرو جیسے حقیر شخص نے سامنے آئے بغیر وہ کام کر دکھایا تھا جو دس مسلح افراد سامنے آکے نہیں کرسکتے تھے۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ دشمن کو کبھی حقیر مت جانو۔ اس حقیقت سے انکار بھی ناممکن تھا کہ پنگا لینے والا میں خود تھا کہ ایک محاذ پر لڑتے لڑتے اچانک دوسرے دشمن کو چھیڑ دیا تھا۔ اسے بدقسمتی بھی سمجھا جاسکتا تھا۔ میں ایسا چاہتا نہیں تھا۔ میں تو کسی اور کام سے کراچی گیا تھا۔ وہاں مجھے پیڈرو نظر آگیا تو میرے جذبات بھڑک اٹھے۔ یہی میری غلطی تھی۔ جنگ کبھی جذبات سے نہیں جیتی جاتی۔ میں نے جذبات پر قابو رکھا ہوتا۔ صرف یہ معلوم کرلیتا کہ استاد پیڈرو آج کل شیخ مختار بن کے کاروباری آدمی بن گیا ہے اور معزز بننے کے چکر میں ہے۔ اس کو معلوم بھی نہ ہوتا کہ مجھے اس کے نئے بدلے ہوئے اندازِ زندگی کے بارے میں پتا چل گیا ہے۔ ولاور سے نمٹنے کے بعد اس سے نمٹنا آسان تھا۔ وہ بے خبری میں مارا جاتا۔

ابھی تو ہم ایک ہی سطح پر ایک دوسرے کے مقابل تھے۔ مجھے یہ علم تھا کہ وہ شیخ مختار بنا ہوا ہے تو وہ جان گیا تھا کہ میں نے ایک فرنچ وکیل کا بھیس بدل رکھا ہے۔ یہ خطرہ تو ہروقت تھا۔ لاہور میں کوئی بھی وکیل، پولیس افسر یا جج مجھ سے شناختی دستاویزات طلب کرلیتا تو میں پکڑا جاتا۔ یہ صرف رابعہ، عبدالودود منظر، وقار یوسف جیسے وکیلوں اور کچھ صحافیوں کا ساتھ تھا جس نے میری شناخت کو شک و شبے سے بالاتر کردیا تھا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میری یہ حیثیت مستحکم ہوتی گئی تھی۔

شہر کی رونق ختم ہونے لگی اور پیچھے اِکّا دُکّا گاڑیاں رہ گئیں تو مجھے کچھ شک ہونے لگا۔ رابعہ کی نظر بھی عقب نما آئینے پر تھی اور شک کی یہ پرچھائیں اس کی صورت پر بھی نظر آرہی تھی۔ اس نے ہاتھ ہلا کے اشارے سے مجھ پر واضح کیا کہ پیچھے تو کوئی بھی نہیں ہے۔

میں نے دیکھا تو پیچھے صرف ایک ٹرک تھا۔ ایسے بہت سے ٹرک دن رات ایک قطار میں اس سڑک پر چلتے رہتے تھے۔ ہم نہ جانے کتنے ٹرکوں کو اوور ٹیک کر آئے تھے۔ ہم سے آگے بھی ٹرک جاتے نظر آرہے تھے اور ان کی رفتار بھی تقریباً وہی تھی جو ہماری۔ عام حالات میں کاریں بہت زیادہ تیز رفتاری سے نکل جاتی ہیں اور وقفے وقفے سے کوئی کار ہماری سست رفتاری کا مذاق اڑاتی گزر جاتی تھی مگر ہم کسی کو کیا بتاتے اور کیسے بتاتے کہ تیز رفتاری میں شہرۂ آفاق یہ جرمن کار کیوں خراماں خراماں جا رہی ہے۔ اس میں مبالغے کی کوئی بات نہیں۔ ہٹلر نے جنگِ عظیم دوم سے قبل فاکس ویگن بنانے کا حکم دیا تھا کہ ایک عوامی کار بنائی جائے جس کا خرچ کم سے کم ہو، لاگت کم سے کم ہو اور جس میں خرابی کم سے کم ہو اور جسے ایک عام آدمی کم سے کم قیمت میں خرید سکے چنانچہ انیس سو اڑتیس میں جب یہ کار بنی تھی تو ایک جرمن مزدور اسے اپنی تین ہفتے کی تنخواہ میں خرید سکتا تھا۔ چالیس سال بعد بھی اس کی شکل صورت وہی تھی اور یہ ہر سال گاڑی کی شکل اور ماڈل بدلنے والوں کے لئے ناقابلِ یقین سی بات تھی کہ ابھی تک ساری دنیا میں اس گاڑی کی مقبولیت کم نہیں ہوئی۔ یہ آج بھی دنیا کی سب سے زیادہ ری سیل یعنی بار بار خریدی جانے والی گاڑی ہے اور دنیا بھر میں کروڑوں کی تعداد میں چل رہی ہے۔

رابعہ نے اچانک سوال کیا "آخر کب تک چلتے رہیں گے ہم ایسے ہی۔ بیس تیس میل دور تو آگئے ہیں۔"

نازو نے بھی کہا "مجھے تو پیچھے کوئی بھی نظر نہیں آرہا ہے۔"

غالب نے بھی اقرار میں سرہلایا "پیڈرو کی بدمعاشی لگتی ہے مجھے۔"

مجھ سے پہلے کار کے ریڈیو کا اسپیکر بولا "پیڈرو شریف آدمی ہے ہی نہیں۔ لیکن اب سو پیاز کھانے کے بعد سو جوتے کھانے کی بے وقوفی مت کرنا۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارے ساتھ وہ بھی مارے جائیں۔"

"آخر ہمیں جانا کہاں ہے؟" میں نے کہا "گاڑی میں پیٹرول ختم ہوگیا ہے۔ ہم زیادہ سے زیادہ دو چار میل آگے جاسکتے ہیں۔"

رابعہ نے مجھے تعریفی نظروں سے دیکھا "مجھے تو یاد نہیں پڑتا کہ اس سڑک پر آگے بیس پچیس میل تک کوئی پیٹرول پمپ ہو۔ یہ لو گاڑی جھٹکے لینے لگی ہے۔ دو چار میل کیا اب تو دو فرلانگ بھی نہیں جائے گی۔"

میں نے کہا "بیچ میں مت چلو۔ ورنہ دھکا لگا کے ایک طرف کرنا پڑے گا۔ دیکھا ہوگئی بند۔"

رابعہ نے کہا "میں کرلوں گی ایک سائیڈ پر۔"

اس سے پہلے کہ رابعہ گاڑی کو سائیڈ پر لگاتی، ہمارے پیچھے آنے والا گھاس سے اوپر تک لدا ہوا ٹرک بھی رُک گیا اور اس میں سے تین افراد کود کے اُتر آئے۔ ایک آگے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور دو پیچھے کہیں گھاس کے انبار میں تھے یا اس کے اوپر لیٹے ہوئے تھے۔ ٹرک ڈرائیور نے ذرا سی دیر کے لئے رفتار کم کی تھی اور ممکن ہے چند سیکنڈ کے لئے ٹرک رُکا بھی ہو۔ وہ تینوں اس سے پہلے ہی ہمیں گھیر چکے تھے۔ ٹرک ڈرائیور دوبارہ روانہ ہوگیا تھا۔

قریب آنے والے تینوں افراد ہم جیسے ہی تھے۔ ان میں ایک عورت کو دیکھ کے میں حیران رہ گیا۔ وہ رابعہ اور نازو کی طرح ہی نظر آتی تھی۔ جوان اور خوب صورت ہونے کے علاوہ وہ فیشن ایبل بھی تھی اور کسی طرح بھی بدمعاش یا بدمعاشوں کی ساتھی نظر نہیں آتی تھی۔

اس کے دو ساتھی بھی پینٹ شرٹ والے میرے اور غالب جیسے تھے۔ یہ ان کی چالاکی تھی۔ اس طرح سڑک پر سے گزرنے والے یہی سمجھتے کہ ہم ساتھ ہیں۔ ان کے اور ہمارے ایک سے حلئے اور انداز دیکھ کے کوئی بھی ہمیں ایک ہی خاندان کے فرد یا دوست سمجھ سکتا تھا۔

ریوالور ان سب کے پاس تھے جو صرف ہم دیکھ سکتے تھے۔ ان کے چہروں پر تو بڑی دوستانہ شریفانہ مسکراہٹ تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ ہمیں کوئی حکم دیتے یا ہم ان سے کچھ پوچھتے۔ پیچھے آنے والی ایک سفید کار ہمارے قریب آکے ٹھہر گئی۔ یہ وہی گاڑی تھی جس میں نازو نے پیڈرو کو اپنے پاس سے گزرتے دیکھا تھا۔

ایک شخص نے ہم سے کہا "خواتین نیچے اتر آئیں اور دوسری کار میں چلیں۔ اس میں پیٹرول ہے۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا "ہم جہنم میں بھی جائیں گے تو ساتھ۔"

غالب نے کہا "خواتین کو حضرات سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔"

"ہم کرسکتے ہیں۔" وہ بولا۔

میں نے کہا "وہ کیسے۔ سڑک پر اتنا ٹریفک ہے۔ زبردستی کرو گے دیکھیں گے۔"

"ہوٹل تو وہاں بھی دیکھ رہے تھے۔ جہاں ہم نے ایک پیارے بچے کو ایک رنگین غبارا دیا تھا۔" وہ بولا۔

"وہ بچہ تھا۔ ہمارے ساتھ زبردستی کرکے دیکھو۔" میں نے

"بلکہ میرا مشورہ ہے کہ گولی مار کے دیکھو۔" غالب نے کہا۔

"میرے ریوالور میں گولی ہوتی تو میں تمہاری فرمائش ضرور پوری کرتا مگر افسوس کہ یہ گیس گن ہے۔" اس نے کہا "بے آواز اور مؤثر۔"

دوسرے نے کہا "اس میں وہی گیس ہے جو غبارے میں تھی مگر یہ زیادہ تیز ہے۔"

ظاہر ہے اس کے بعد مقابلے کی گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔ وہ پیڈرو کے تربیت یافتہ لوگ تھے۔ انہیں یقیناً معلوم ہوگا کہ ہم میں سے کون کم خطرناک ہے اور کون خالی ہاتھ بھی زیادہ خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔

میں نے کہا "کیا یہ رعایت نہیں دو گے کہ ایک مرد اور ایک عورت ساتھ رہیں۔"

اس نے سوچ کے کہا "ہاں ایسا ہوسکتا ہے کہ تم اُتر کے پیچھے چلے جاؤ اور پیچھے والی گاڑی چلاؤ۔ اور جو تمہاری گاڑی میں پیچھے بیٹھے ہیں وہ تمہاری جگہ آگے آجائیں۔ لیکن گاڑی عورت چلائے گی۔ مرد اسی طرح تمہاری جگہ بیٹھ جائے گا۔ چلو جلدی کرو۔ زیادہ وقت نہیں ہمارے پاس۔"

میں سمجھ گیا کہ انہیں چکما دینا مشکل ہوگا۔ ان کا ہوم ورک مکمل تھا۔ انہیں یہ معلوم تھا کہ اصلی خطرہ مجھ سے لاحق ہوگا یا نازو سے۔ جب ہم دونوں ہی ڈرائیونگ کر رہے ہوں گے تو اور کچھ بھی نہیں کرپائیں گے۔

پھر بھی میں نے ایک کوشش کی "یہ لڑکی گاڑی چلانا نہیں جانتی۔"

اس نے اپنے ریوالور کا رُخ میری طرف کردیا "ہم جانتے ہیں کہ کون کیا ہے؟"

چند منٹ بعد دونوں کاریں پھر روانہ ہوگئیں۔ وہ چالاک لوگ تھے انہوں نے اندازہ کرلیا تھا کہ پیٹرول ختم ہونے کا بہانہ ہماری چال ہے۔ ویسے بھی اگلا پیٹرول پمپ اب سامنے ہی نظر آرہا تھا۔

تقریباً دو میل جانے کے بعد پیچھے والے نے کہا "گاڑی کو بائیں جانب موڑلو۔ وہ جو نیلی سفید دھاریوں والا مکان نظر آرہا ہے وہیں جانا ہے۔"

"اگر میں ایسا نہ کروں پھر؟ اب تو تم بھی ہمارے ساتھ ہو۔"
"ہاں مگر ہم جیب میں گیلے رومال رکھ کے لائے ہیں۔ ہم پر گیس کا اثر نہیں ہوگا۔" وہ بولا۔

میں نے گاڑی کا رُخ موڑ دیا۔ وہ کوٹھی سڑک سے ایک فرلانگ دور بھی نہیں تھی اور بالکل نئی بنی ہوئی تھی۔ اس علاقے میں فلم اسٹوڈیوز بھی تھے اور بہت سے نامور اداکار بھی کوٹھیاں بنوا چکے تھے۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی فلم کے کسی منظر میں یہ کوٹھی میں دیکھ چکا ہوں۔ ہمارے نزدیک پہنچتے ہی گیٹ کھل گیا اور دونوں گاڑیوں کے اندر داخل ہوتے ہی بند بھی ہوگیا۔ استاد پیڈرو نے ہمارا استقبال پورچ میں ہی کیا۔

میں نے کہا "پیڈرو کیا تمہارے ساتھیوں نے انہیں چھوڑ دیا ہے؟"

وہ ہنسا "ہم نے کسی کو بھی نہیں پکڑا تھا۔ گیس کے غبارے والی کہانی تو ایک مذاق تھی۔ خیر تم نے اچھا کیا کہ ہمارے لئے کوئی مشکل پیدا نہیں کی۔"

میں نے کہا "ہوسکتا ہے کہ تم اب جھوٹ بول رہے ہو۔"

اس نے مسکرا کے ہمیں اندر آنے کی دعوت دی "یہاں فون بھی ہے۔ تم خود بات کرلو ان سے۔"

"پیڈرو اگر ان میں سے کسی کو کچھ ہوا تو؟"

"تو کیا؟" اس نے طنز سے کہا "سکندر بخت۔ تم کیا بگاڑ سکتے ہو میرا۔ میں ان سب کو بھی مروا سکتا ہوں اور تم سب کی لاشیں بھی یہاں چھوڑ کے جاسکتا ہوں۔ لیکن میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ میں نے تو آخری بار تمہیں اس لئے بلایا ہے کہ خیرسگالی کے طور پر تمہارے ایک دشمن کو تمہارے حوالے کردوں۔ اور تمہیں یقین دلادوں کہ میرے دل میں تمہارے خلاف کچھ نہیں۔ تمہارے دل میں ہے تو بھول جاؤ۔"

میں نے کہا "تم کس دشمن کی بات کررہے تھے؟"

اس نے حیرانی سے کہا "ایک ہی تو دشمن ہے تمہارا۔ اصل دشمن۔ چوہدری دلاور۔"

"تم اسے میرے حوالے کردو گے؟" میں نے پُرتمسخر اور تلخ لہجے میں کہا۔

"ہاں۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ اندر آؤ۔"

میں بے یقینی اور تذبذب کی کیفیت میں پیڈرو کی صورت کو دیکھتا رہا۔ پھر میں نے اندر سے کسی کے چلّانے کی آواز سُنی۔ وہ پیڈرو کو گالیاں دے رہا تھا۔

اُستاد پیڈرو کا رنگ اچانک متغیر ہوگیا۔

جب کوئی اپنے بدترین دشمن کے چُنگل میں اتنا ہی بے بس ہو جتنے ہم تھے۔ فرار کے راستے مسدود ہوں، مقابلے کا حوصلہ اور اُمید کے رشتے ٹوٹتے محسوس ہوتے ہوں۔ دل کو جھوٹا دینے کا بہانہ بھی نہ ہو تو پھر ایسا ہی ہوتا ہے کہ عقل کام نہیں کرتی اور کوئی دُعا تک یاد نہیں آتی۔

ابھی تک استاد پیڈرو کی کیفیت اس کے برعکس تھی۔ ہم مجبور تھے اور وہ تماشائی۔ کامیابی اور فتح مندی کی خوشی اس کے انداز واطوار سے چھلکی پڑتی تھی۔

وہ ایک جاہل، بدکردار اور کم ظرف شخص تھا مگر خود کو سمندر جیسا وسیع القلب اور ہم سے برتر و اعلیٰ ثابت کرنے کی بھونڈی کوشش میں اس فلمی مسخرے کی طرح نظر آتا تھا جو فلم اسکرین پر ہمیشہ اپنی چھچھوری حرکتوں سے لوگوں کو ہنسانے کی کوشش کرتا ہو مگر خود اپنی بنائی ہوئی فلم میں وحید مراد کی طرح پُرالم رومانٹک ہیرو بننے کی کوشش کرے۔

پیڈرو بہت خوش تھا۔ اس خوشی کا اظہار اس کی زبان کی شوخی سے بھی ہوتا تھا اور اس کی مکروہ صورت پر نظر آنے والی پُرخباثت مسکراہٹ سے بھی۔ وہ فخروغرور سے خود کو رستم اور ٹارزن سے بھی بڑا سورما سمجھ رہا تھا اور جم کاربٹ سے بھی بڑا شکاری جو سیکڑوں انسانوں کو چٹ کرجانے والے آدم خور شیر کو خالی ہاتھ جنگل میں جاکے کان سے پکڑلایا ہو۔

اب اچانک وہ اپنا مصنوعی کردار بھول گیا تھا۔ اس کی شوخی اور خوداعتمادی کافور ہوگئی تھی اور مسکراہٹ غائب ہوچکی تھی۔ وہ پریشان اور خوف زدہ نظر آنے لگا تھا۔

اس کی حالت میں یہ تبدیلی کسی کی بھی نگاہ سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھی۔ خواہ اس کی وجہ کچھ بھی ہو مگر اچانک اس کی فتح کے غرور کو شکست کے احساس سے دوچار دیکھ کے مجھے خوشی ہورہی تھی۔ کسی غیرمتوقع تبدیلیٔ حالات کے خیال نے میرے لیے ناامیدی کے اندھیرے میں امید کا دھندلا سا اُجالا پھیلا دیا تھا۔

جب پیڈرو نے ریوالور نکالا تو میں نے کہا "شیخ مختار۔ یہ کیا ہے؟"

اس نے غرا کے کہا "یہ اصلی ریوالور ہے۔ گولیوں والا۔"

میں نے سر کھجایا "کیا معاملہ کچھ گڑبڑ ہوگیا ہے؟"

غالب نے کہا "کیا تم غلط جگہ لے آئے ہو ہمیں؟ راستہ بھول کے۔"

پیڈرو نے کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ اس کے تین ساتھیوں میں سے دو نے ہمیں اپنی گیس گن کی زد پر رکھا۔ کھلی جگہ پر گیس گن اتنی کارگر نہیں رہتی۔ اگر میں چاہتا تو ڈاج کرکے ان سے گن چھین سکتا تھا لیکن میں نے مزاحمت اور مقابلے کا ارادہ صورتِ حال کے واضح ہونے تک ملتوی کردیا تھا۔

پیڈرو کے ایک سینئر نائب نے بھی ریوالور نکال لیا اور پیڈرو کی طرف یوں دیکھا جیسے اس سے توپ چلانے کی اجازت کا طلب گار ہو۔

نائب نے افسوس سے سر ہلایا "یہ کون بدتمیز ہے جو تمہارے جانثار کو گالیاں دے رہا ہے۔ اندر جا کے ریوالور خالی کردو اس پر۔"

میں نے کہا "یار اس سے بھی بُری گالیاں ہم دے رہے ہیں اپنے دل میں۔"

"یہ بکواس بند کرو ورنہ دل کو چھلنی کردوں گا" گیس گن والے ایک چھوٹے بدمعاش نے سوچ کے کہا۔

شاید ہماری باتوں کی آواز اندر پہنچ گئی تھی۔ گالیوں کی فائرنگ بند ہوگئی۔ اب سنسنی خیز خاموشی کا سسپنس تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کے بعد کیا ہوگا۔

میرے لیے یہ صورتِ حال ایسی تھی جیسے چور کسی شریف آدمی کو لوٹ رہے ہوں کہ پولیس والے بھی پہنچ جائیں اور معاملہ گڑبڑ ہوجائے۔ نہ چور کو یقین ہو کہ اس مالِ غنیمت میں سے پولیس کتنا لے گی اور سب لینے کے بعد بھی انہیں خاطر تواضع کے لیے سرکاری مہمان خانے لے جائے گی یا نہیں۔ لٹنے والا فریادی الگ پریشان ہو کہ اب نہ جانے قانون کے لمبے ہاتھ کس کی گردن پکڑیں گے۔ اس کی یا چور کی۔

پھر آناً فاناً سب کچھ ہوگیا۔ پیڈرو کے اشارے پر اس کے دو جاںنثاروں نے ایک دم دروازے پر یلغار کی۔ انہیں یقین ہوگا کہ دروازہ مضبوطی سے بند ہے اور وہ کندھے ملا کے اپنی متحدہ قوت سے ٹکر ماریں گے تو دیوار میں سے اکھڑ کے دروازہ دور جاگرے گا اور پھر اس سے پہلے کہ اندر والے دشمن کے حواس بجا ہوں وہ ریوالور تان کے کہیں گے۔ ہینڈز اپ!

لیکن ہوا یہ کہ عین تصادم کے وقت دروازے کے دونوں پٹ پورے کھل گئے۔ یہ کسی خودکار نظام کا کمال نہیں تھا۔ اندر کوئی دروازے کی جھری سے آنکھ لگائے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اسی نے یہ حرکت کی تھی اور پھر فوراً دہیں لمبا لیٹ گیا تھا۔

پاگل بیلوں کی جوڑی کی طرح دوڑنے والے جب دروازے سے سیدھے گزر گئے تو انہیں بریک لگانے کی مہلت ہی نہ ملی۔ راستے میں کھمبے کی طرح پڑے ہوئے شخص سے ٹھوکر کھا کے سنبھلنا ان کے لیے ناممکن ثابت ہوا۔ وہ ایک نعرۂ مستانہ کے ساتھ منہ کے بل فرش پر سجدہ ریز ہوگئے۔ میں نے دو خطرناک قسم کے دیوہیکل افراد کو آگے بڑھ کے ان کا استقبال کرتے دیکھا۔ انہوں نے بھاری بوٹ مار کے دو ہاتھ کچل دیے جن میں ریوالور تھے۔ پھر پیٹ کمر اور سر پر ٹھوکریں مار کے دونوں جانبازوں کو اُٹھنے کے ناقابل بنادیا۔ ایک چیخ چیخ کے اپنی اماں کو اور دوسرا ابا کو آوازیں دیتا ہوا بے حس و حرکت اور بے ہوش ہوگیا۔ انہیں مُردہ کتوں کی لاش کی طرح

گھسیٹ کر اندر لے جایا گیا۔

باہر بھی جنگ و جدل اور مقابلے کی نوبت نہیں آئی۔ نہ جانے کس سمت سے دو گولیاں آئیں، پیڈرو کا ریوالور طوطے کی طرح ہاتھ سے اُڑ گیا۔ ایک درخت پر سے کوئی بولا "اب مردانہ وار آگے بڑھو۔"

دوسرے درخت پر سے.... کہا گیا "مگر رکوع کی حالت میں اپنے دونوں ہاتھوں کو گھٹنوں پر رکھو اور سر جھکا کے قدم بڑھاؤ... ورنہ...."

"ورنہ اگلی گولی سے تمہارے چہرے پر یہ ناک نہیں رہے گی" پہلے درخت میں کہیں لنگور کی طرح چُھپے ہوئے کسی شخص نے کہا۔

میں نے پیڈرو کو اشارہ کیا "ان کی بات مان لو شیخ جی۔ ناک بچ بچ نہ کٹ جائے۔ ان کا نشانہ اچھا ہے۔"

غالب نے اپنی ناک کو چُھوا "ناک نہ پھر جوڑی جا سکتی ہے نہ کسی اور کی لگائی جا سکتی ہے۔"

پیڈرو نے مجھے اور غالب کو خونی نظروں سے دیکھا اور آگے بڑھا۔ اس کے قدم بڑھاتے ہی فائر ہوا اور میں نے پیڈرو کی ناک سے خون ٹپکتا دیکھا۔ گولی اس کی ناک کو چاٹتی ہوئی گزر گئی تھی۔ اس کی ناک عبرت ناک ہو چکی تھی۔

پیڈرو فوراً حالت رکوع میں چلا گیا۔ اس کے معاون خاص نے فوراً اپنی ناک کی سلامتی کی خاطر اپنے باس کے ساتھ آگے بڑھنا شروع کیا۔ باس کی ناک سے ٹپکنے والا قطرہ قطرہ خون فرش پر سرخ چھینٹے بنا رہا تھا اور وہ اسی کو دیکھتا ہوا غالباً یہ سوچ رہا تھا کہ ایسی حالت میں کوئی بھی اپنی خودی بلند نہیں رکھ سکتا۔

میں نے بہ آواز بلند کہا "کیا خیال ہے اب ہم بھی اندر چلیں۔ یہاں کب تک کھڑے رہیں گے۔"

"ہاں" غالب نے بہادری کا ثبوت دیتے ہوئے قدم آگے بڑھایا "اب یہاں تک آگئے ہیں تو صاحبِ خانہ سے بھی مل لیں۔"

نازو نے اس کو روکنے کی کوشش کی۔ خوف سے رابعہ کی حالت بھی غیر تھی مگر میں اور غالب بے خوفی کا مظاہرہ کرنے میں کامیاب رہے اور جب کسی بھی سمت سے نہ کوئی گولی آئی اور نہ کسی نے ہمیں روکا تو ہمارے حوصلے میں اضافہ ہوا "یہ لڑکیاں ذرا ڈر رہی ہیں" میں نے کہا۔

غالب نے مسکرانے کی بہترین اداکاری کی "بھئی، ہم نے تو کوئی غلطی نہیں کی ہے یہاں آکے۔ ہماری ناک محفوظ ہے۔"

ہمارے تبصرے پر کسی نے تبصرہ نہیں کیا۔ ہم نے اندر قدم رنجہ فرمایا تو دروازہ ہمارے پیچھے خود بخود بند ہو گیا۔ پُرسکون اور پُراعتماد نظر آنے کا ڈراما کرنے کے باوجود ہمارے اعصاب اتنے کشیدہ تھے کہ دروازہ بند ہونے کی آواز پر ہم سب اچھل پڑے۔ خواتین نے غالباً اوئی یا ہائے اللہ بھی کہا تھا۔

میں نے پلٹ کر دیکھا تو بس دیکھتا رہ گیا۔ شاید الکی...

کاشکار دوسرے بھی ہوں گے مگر میں انہیں دیکھ ہی کب رہا تھا۔

میرے سامنے دلاور کی بیوی بڑے وقار اور تمکنت سے کھڑی تھی۔ اس عورت کے میں نے کئی روپ دیکھے تھے۔ ... سال کی عمر میں بھی وہ حسین اور پُرکشش جسم کی مالک تھی ... میں ذہانت اور جرأت کی بھی کمی نہ تھی۔ وہ بہترین اداکارہ تھی ... ایک ہی پریس کانفرنس میں دو مختلف کردار بڑی کامیابی سے ... کر چکی تھی۔ میں نے اسے اپنے بچوں کی حفاظت کے لیے ... بازی لگاتے بھی دیکھا تھا۔ زمین دوز تہ خانے میں موت کا ... کرتے بھی دیکھا تھا اور پھر دیوانہ وار اپنے قیدی شوہر سے ... محبت کرتے بھی۔ دلاور شاید اس کا مثالی شوہر نہیں تھا لیکن وہ ... شوہر کی صحیح شریک حیات تھی۔ اس کے گھر اور کاروباری معاملات ... کی حفاظت کرنا جانتی تھی اور اس کے ساتھ ہی جب وہ ... انتقامی جذبے سے مغلوب ہو جاتی تھی تو شوہر سے بے وفائی ... مرتکب ہو کے بھی شرمندہ نہیں ہوتی تھی۔ عجیب عورت تھی ... شاید ہر عورت ہی عجیب ہوتی ہے۔

جب اس نے کہا "بہت حیران ہو مجھے دیکھ کے سکندر ..." تو میں نے چونک کے کہا "ہاں۔ لیکن اس سے پہلے بھی تم ... بار مجھے حیران کر چکی ہو۔"

رابعہ نے کہا "تم واقعی حیران کن صلاحیتوں کی مالک ہو۔ واقعی کمال ہے کہ تم نے چوہدری دلاور کو بچا لیا۔"

حیرت کا دوسرا جھٹکا ہمیں چوہدری دلاور کی آواز سے پہنچا "... تو سب تقدیر کے کھیل ہیں۔ اپنے سکندر صاحب، ہیں جی! ... پکڑے گئے۔"

ہم سب پُتلیوں کی طرح گھوم گئے۔ چوہدری دلاور ہم سے ... قدم کے فاصلے پر ایک آرام کرسی پر نیم دراز تھا۔ قید و بند ... صعوبت کے اثرات اتنی جلدی زائل نہیں ہو سکتے تھے۔ وہ ... کے مقابلے میں بہت کمزور ہو گیا تھا۔ مگر وزن کم ہو جانے کے باعث ... پہلے سے زیادہ جوان نظر آنے لگا تھا۔ اس کا چہرہ پھر کلین شیو تھا ... اس کے ہیر کلر سے سیاہ نظر آنے والے بال سلیقے سے بنے ہوئے ... تھے۔ اسے پینٹ اور اسپورٹس شرٹ میں دیکھ کے مجھے تعجب ہوا ... وہ ایک بالکل مختلف چوہدری دلاور نظر آ رہا تھا۔

"اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" چوہدری دلاور نے ... مسکرا کے کہا "پلیز آرام سے بیٹھ جائیں۔ مس رابعہ، آپ ... مایوس ہوں گی مجھے یہاں دیکھ کے۔ آپ کی تو بڑی خواہش تھی ... کوشش کی تھی آپ نے مجھے وہاں پہنچانے کی۔ ہیں جی، کیا کہتے ... اسے.... تختۂ دار پر۔"

رابعہ میرے ساتھ ہی صوفے پر بیٹھ گئی "میں نے اپنی کوشش ... ابھی چھوڑی نہیں ہے دلاور۔"

وہ قہقہہ مار کے ہنسا "ٹھیک ہے جی۔ جاری رکھو اپنی کوشش ...

اس مکڑی کی طرح۔ ہیں جی، جس کی وہ کہانی ہے ٹرائی، ٹرائی اگین۔"

"آخری جیت ہماری ہوگی دلاور۔"

اس نے ایک اور قہقہہ مارا "آخری جیت۔ واہ جی واہ، ابھی پہلی جیت ہوئی نہیں۔ تم آخری کی آس لگائے بیٹھے ہو۔ ایک جیسے پاگل دے پتر ہو تم سب۔ بڑے بڑے وکیل اور صحافی۔ اور پھر خیر سے اپنے فرنچ وکیل صاحب۔ کیا بات ہے جی ان کے ڈرامے کی۔ بڑے اچھے ایکٹر ہیں اور سارے زمانے کو کب سے بے وقوف بنا رہے ہیں۔ کیسا کیسا سوانگ بھرتے ہیں ماشاء اللہ.... مگر فائدہ؟ میں تو کہتا ہوں اپنے سکندر صاحب، تم چلے جاؤ فلموں میں ہیرو۔"

"اس وقت تم کچھ بھی کہو جائز ہے۔ میں بُرا نہیں مانوں گا۔"

"یار ایک بات بتاؤ مجھے" وہ کچھ آگے جھکا "تم ویسے تو اچھے خاصے سیانے اور پڑھے لکھے بندے ہو۔ ہم تو مانتے ہیں جی کہ دس جماعت فیل ہیں مگر تم خیر سے ولایت بھی ہو آئے ہو۔ اور اپنی رابعہ بی بی ماشاء اللہ سے اتنی بڑی وکیل ہیں۔ تمہاری عقل خراب ہو گئی ہے کہ ایک معمولی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آتی۔"

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "یہی تو مشکل ہے۔ ہم غیر معمولی بات ہی سمجھتے ہیں۔ تم جیسے معمولی لوگوں کی بات سُنتے بھی نہیں اور...."

اس نے میری بات کاٹ دی "مجھے یہ بتاؤ کہ اتنی جھک ماری تم سب نے مل کے... ہیں جی، خوار پھرے سارے زمانے میں۔ دہائی مچائی انصاف کی۔ کیا ملا تمہیں اس سے؟ کچھ نہیں بگاڑ سکے تم چوہدری دلاور کا۔ خود تباہ ہو گئے، بے گھر ہو گئے، پاگل ہو گئے۔ تم کیا سمجھتے ہو مجھے پتا نہیں، سب سے پہلے یہ پاگل ہوئی تھی۔ رابعہ قاری بار ایٹ لا۔ پھر محسن پاگل ہوا۔ وہ کیا نام ہے اکرام شیخ کی بیوی کا.... وہی جس کو تم ڈھاکا سے ساتھ لائے تھے۔ ہاں، کاجل! وہ پاگل تھی.... پھر غالب پاگل ہوا.... نازو پاگل ہوئی۔"

میں نے کہا "چلو چھوڑو جی، لمبی بات کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم مان لیتے ہیں کہ سب پاگل ہیں۔ پورا قبیلہ ہے دیوانوں کا۔"

غالب بولا "لیکن خیر سے ہم وہ نہیں ہیں جو آپ ہیں۔ کیا کہتے ہیں اسے اپنے سکندر صاحب... ہاں، نطفۂ نا تحقیق!"

اس نے غالب کی گالی کو اہمیت ہی نہیں دی "اتنی مشکل فارسی کی کیا ضرورت ہے... ہیں جی، اپنی ماں کی.... میرا مطلب ہے مادری زبان میں حرامی کہہ دو۔ ہم تو خود مانتے ہیں کہ حرامی ہیں۔ بلکہ مہا حرامی ہوں میں اور پتا نہیں جی ہزار حرامی مرے ہوں گے تو ایک چوہدری دلاور نے جنم لیا ہوگا۔ مگر آج کون پوچھتا ہے... ہیں جی کہ آپ کا وہ کیا ہے.... کیا کہتے ہیں اسے، شجرۂ نسب۔ اور کون تحقیق کرتا ہے۔ اگر تم چھاپ دو اپنے اخبار میں کہ چوہدری دلاور وہی ہے جو تم نے ابھی کہا تھا۔ نطفۂ نا تحقیق۔ اور اس کا تو باپ بھی یہی تھا تو کون پڑھے گا اور کون یقین کرے گا۔ ہیں جی، لطیفہ سمجھ کے مسکرائیں گے بھی نہیں پڑھنے والے۔ الٹا یہ سمجھیں گے کہ لکھنے والا پاگل ہے۔ یہ بات غلط نہیں ہوگی البتہ...."

"آخر کب تک سنیں گے ہم تمہاری یہ بکواس؟" میں نے کہا "چائے کہاں ہے؟"

اس نے کرسی کے ہتھے پر مُکا مارا "تم سنو گے جب تک میں چاہوں گا۔ اور تم کر کیا سکتے ہو سننے کے سوا.... بکواس کے بچے۔"

دلاور کی بیوی نے آہستہ سے کہا "چوہدری صاحب۔ چھوڑیں نا... کام کی بات کریں۔ میں چائے کے لیے کہتی ہوں۔"

چوہدری دلاور نے بیوی کی طرف دیکھ کے گہری سانس لی "میں غصے میں آ جاتا ہوں۔ ابھی اعصاب پر قابو نہیں ہے پوری طرح۔ خیر جی، تم لوگ آرام سے اور تسلی سے بیٹھو۔ یہ مت سمجھنا کہ تم میری قید میں ہو۔ تم مہمان ہو۔"

میں نے کہا "کیا تم اپنے مہمانوں کو اسی طرح بُلاتے ہو؟ گن پوائنٹ پر انہیں اغوا کرا کے یہ عزت دیتے ہو؟"

"دیکھو سکندر۔ یہ کوئی بہت پرانی بات نہیں ہے کہ تمہیں یاد نہ ہو۔" وہ پھر مشتعل ہو گیا "جو تم نے میرے ساتھ کیا تھا اس کا بدلہ لے سکتا ہوں میں۔ حق پہنچتا ہے مجھے کہ پینتالیس دن جس طرح تم نے مجھے ذلیل کیا تھا اور جو سلوک میرے ساتھ ہوا تھا اس کے بدلے نوّے دن تمہاری...."

اس کی بیوی نے پھر اسے کنٹرول کیا "چلیں جی چوہدری صاحب۔ مٹی ڈالیں پرانی باتوں پر۔"

چوہدری دلاور نے کچھ دیر خاموش رہ کے سر ہلایا "قسم خدا کی۔ اتنا مجبور چوہدری دلاور کبھی نہیں تھا... اور نہ اتنی شرافت تھی اس میں۔ بہت بدذات اور کینہ پرور ہوں میں۔ ہیں جی، دشمن کو رعایت دینا یا معاف کرنا میں نے نہیں سیکھا تھا۔"

غالب نے آہ بھری "وقت سب کچھ سکھا دیتا ہے چوہدری دلاور۔"

چوہدری دلاور کی بیوی نے طنز سے کہا "مگر صرف انہیں جو سیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ وقت نے تمہیں کچھ نہیں سکھایا۔ آج بھی تم بولنے سے پہلے سوچتے نہیں۔"

دلاور بیوی کی بات سے خوش ہوا "یہ ٹھیک کہا تو نے۔ دل تو آج بھی چاہتا ہے میرا کہ ان.... کو ننگا کر کے الٹا لٹکا دوں۔ اور ان کو اس وقت تک کوڑے مارتا رہوں۔ جب تک کہ ان کی ہڈیوں پر سے چمڑی اور گوشت کا ایک ایک ریشہ نہ اُتر جائے۔ یہ جو بڑی ہائی کورٹ کی وکیل بنی پھرتی ہے اور یہ چھپکلی جو خود کو ہیروئن سمجھتی ہے۔ ان پر تو میں وہی کتے چھوڑ دیتا.... ان کے یار بھی دیکھتے... خاص کتے ہیں وہ۔"

دلاور کی بیوی نے نظریں جھکا کے کہا "غصہ مت کریں نا چوہدری صاحب۔ آج تو یہ مہمان ہیں نا ہمارے۔ سن لیں ان کی۔"

ولاور نے سرہلایا "ہاں۔ یاد ہے مجھے۔ تُو فکر نہ کر جھلی۔ ابھی میں ان کو دکھاؤں وہ جگہ جہاں ایک دن ان کو باری باری آنا ہوگا۔ وہ جگہ بھی تہ خانہ ہے۔ اسی کے نیچے" ولاور نے فرش پر پاؤں مارا۔

"اور وہاں ہمارے ساتھ ویسا ہی سلوک ہوگا۔" میں نے اسے مزید اشتعال دلایا۔

"نہیں اپنے سکندر صاحب۔ وہ تو کچھ بھی نہیں تھا۔ چوہدری ولاور جب وہ قرض چکائے گا تو اصل سے زیادہ سود ادا کرے گا۔ پھر تمہیں خیال آئے گا کہ وہ کمرا تو بہت آرام دہ تھا۔ جہاں تم نے مجھے زنجیریں ڈال کے رکھا تھا۔ وہاں تم مجھے کھانے کے لیے بسکٹ کے ڈبے لا دیتے تھے اور پینے کے لیے صاف پانی تھا۔ تم نے تو میرے لئے دوا علاج کا بندوبست بھی کیا تھا۔"

"اور تم کیا کرو گے؟" میں نے کہا "لاہور ہوٹل سے سب کچھ سپلائی کرو گے؟"

ولاور کی بیوی نے کرسی کے پیچھے سے اشارہ کیا کہ ہم اشتعال انگیز باتیں نہ کریں اور بولی "جب وقت آئے گا تو تمہیں پتا چل جائے گا۔"

ولاور نے سرہلایا "ہاں۔ مگر ان کو بتا دینے میں کیا حرج ہے کہ اس قید خانے میں سے گٹر لائن گزرتی ہے۔ سارے شہر کا گند ایک طرف سے بہہ کر آتا ہے اور دوسری طرف سے نکل جاتا ہے۔ یہ پانچ فٹ کی لائن ہے۔ ہیں جی' خیر سے تم ہو چھ فٹے اور یہ تمہاری... وکیل زادی... ساڑھے پانچ سے کم یہ بھی نہیں۔ کوئی بھی اس میں سیدھا تو کھڑا نہیں ہو سکتا۔ پر یہ جو کمرا ہے نا۔ یہ ہے کوئی اٹھارہ فٹ۔ تو اپنے سکندر صاحب' نو فٹ جگہ ہوگی تمہارے پاس... اور نو فٹ مس رابعہ کے لیے۔ درمیان میں ہیں سلاخیں۔ تمہارے قدموں کے نیچے فرش بھی نہیں ہوگا۔ پانچ فٹ قطر کی پائپ لائن میں کوئی جگہ سیدھی نہیں ہوتی۔ نہ اوپر نہ نیچے۔ نہ دائیں بائیں' تم اس میں بہنے والے گندے کالے رنگ کے بدبودار کیچڑ میں کھڑے رہ سکتے ہو' جھک کے دوڑ لگا سکتے ہو۔ چہل قدمی کرسکتے ہو لیکن اس کی گول دیوار سے پیٹھ لگا کے بیٹھ ہی نہیں سکتے۔ دور دور سے ایک دوسرے کا نظارہ کرسکتے ہو۔ جب تک ہمت ساتھ دے تسلی دے سکتے ہو اور پیار بھرے فلمی ڈائیلاگ بول سکتے ہو مگر قریب نہیں آسکتے۔ لوہے کی سلاخیں ڈبل ہیں۔ درمیان میں تین فٹ کا فاصلہ ہے۔ یہ تو تمہیں معلوم ہی ہوگا اپنے سکندر صاحب کہ لوگ گٹر لائن میں کیا کچھ بہاتے ہیں۔ لاہور ہوٹل کا کھانا تمہیں پسند ہے۔ لوگ خوب کھاتے ہیں اور پھر باتھ روم کے راستے یہاں پہنچا دیتے ہیں۔ ہیں جی' جب بھوک برداشت نہ ہو تو اسی پانی میں ہاتھ مارنا۔ شاید کوئی روٹی کا ٹکڑا بہتا ہوا آجائے۔ پینے کے لیے بھی وہی پانی ہوگا۔ جب تک پیاس برداشت ہو مت پینا۔ مگر بالآخر تم وہ پانی پیو گے۔"

ولاور کی بیوی مسلسل ہونٹوں پر انگلی رکھ کے ہمیں خاموش رہنے کا اشارہ کررہی تھی اور اس کی صورت پر اتنی لجاجت تھی کہ کسی نے بھی ولاور کی بات نہیں کاٹی۔ وہ خود اپنی بات سے بہت لطف اندوز ہورہا تھا اور شاید تصور میں وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا جو بیان کررہا تھا۔

"... گٹر لائن میں کیڑے مکوڑے ہوتے ہی ہیں۔ کاکروچ تو رہتے ہی اندھیرے میں اور ٹھنڈی جگہ پر ہیں۔ ہزاروں ہوں گے مگر چوہے بھی بہت ہیں۔ بڑے بڑے' کیا کہتے ہیں اسے... گھوس یا چھچھوندر۔ بڑے ظالم دانت ہوتے ہیں اس کے۔ اور وہ تیر بھی سکتا ہے۔ اس کے علاوہ چھپکلیاں ہیں۔ زیرو واٹ کے بلب لگوا دیے ہیں میں نے تاکہ تم ایک دوسرے کی صورت تو دیکھ سکو۔ اور ایک دوسرے کو مرتا ہوا دیکھ سکو۔ سوچو ذرا اپنے سکندر صاحب اگر تم نے شادی کرلی ہوتی تو خیر سے اپنی رابعہ بی بی کا یہ خوب صورت جسم ایسے ضائع نہ ہوتا... ہیں جی' اسے تو چوہے کھا جائیں گے۔ یہ گل سڑ جائے گا تمہارے سامنے۔ یہ پاگل ہو کے کیسے مرے گی۔ ذرا تصور تو کرو اس جگہ کا۔ اس حجلۂ عروسی کا جہاں دولہا دلہن ایک دوسرے کو بے لباس دیکھیں گے مگر دور دور سے..." وہ قہقہہ مار کے ہنسا۔

اس کی باتیں بہت ننگی تھیں۔ شرم سے رابعہ کے لیے نظر اُٹھانا دشوار ہورہا تھا۔ وہ غصے سے لال ہورہی تھی اور خود میرے دل سے اُٹھنے والا دھواں اب دماغ میں خرابی پیدا کررہا تھا۔ میں اس لیے ضبط سے کام لے رہا تھا کہ شاید ولاور کی بیوی اپنے شوہر کی اس جنونی کیفیت پر قابو پالے مگر ابھی تک اس کی کوشش پوری طرح کامیاب نہیں ہوئی تھی۔

پھر اچانک وہ بات ہوگئی جس کی طرف میرا دھیان بھی نہیں گیا تھا حالانکہ یہ بھولنے والی بات نہیں تھی کہ اس وقت ذہنی واعصابی طور پر سب سے کمزور شخصیت نازو کی ہے۔ ولاور ہمیں جس عذاب سے ڈرا رہا تھا وہ نازو جھیل چکی تھی۔ جب اس نے ہمیں نفسیاتی خوف میں مبتلا کرنے کے لیے اپنے انتقام کے جذبات کی تصویر کشی بے رحم الفاظ میں کی تو نازو کی روح کا ہر ناسور درد کے انگاروں سے کرب کی ایک چیخ بن گیا۔

میں نے نازو کے لبوں کو ہمیشہ گل فشاں دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رقصاں دیکھی تھی یا شرارت کی شوخ ادا۔ اچانک وہ اس آتش فشاں کی طرح پھٹ گئی جس کی سرسبز بلندیاں اور گل بداماں چوٹیاں ہمیشہ ذوقِ حُسن کو دعوتِ دید دیتی ہوں۔ اس میں سے جو غلیظ' بدبودار اور تباہ کن لاوا پھوٹ کے نکلا وہ ایسا گالیوں کی صورت میں تھا جو شاید پولیس کے تفتیش پر مامور اہل زبان کے سوا کوئی مرد بھی نہیں دے سکتا۔

وہ ایک چیخ مار کے مغلظات بکتی ہوئی ولاور پر ایسے جھپٹی کہ اسے سنبھلنے کا موقع بھی نہ ملا۔ "ایسا کرے گا تُو... بول تیری تو... کیا سمجھ کے ایسی بات کی تھی تُو نے... اس سے پہلے ہی میں

نیچی۔"

دلاور کرسی سمیت اُلٹ گیا۔ بالکل پیچھے کھڑی ہوئی اس کی بیوی بھی دلاور کی مدد نہ کر سکی۔ جب دلاور گرا تو نازو اس کے اوپر تھی۔ دلاور کی بیوی کے پاؤں پر کرسی ان دونوں کے وزن کے ساتھ گری تھی۔ اس نے ایک چیخ مار کے اپنا پنجہ پکڑ لیا اور وہیں بیٹھ گئی۔

دلاور چلّانے لگا "کیا دیکھ رہے ہو تم سب۔ ہٹاؤ اس پاگل کُتیا کو۔"

مشکل یہ تھی کہ مستعد کھڑے ہوئے مسلح محافظ بھی نازو پر نہ گولی چلا سکتے تھے اور نہ اس پر گیس گن فائر کرسکتے تھے۔ نازو کے ساتھ دلاور کے نشانہ بن جانے کے امکانات بہت زیادہ تھے اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ نازو بچ جائے۔ صرف دلاور مارا جائے۔ دلاور کی ہنگامہ آرائی پر وہ جسمانی طور پر نازو کو قابو کرنے کے لیے آگے بڑھے مگر اس وقت تک نازو نے دلاور کا حشر نشر کردیا تھا۔ وہ دلاور کو اپنے سر کے اوپر سے اٹھا کے فرش پر دھوبی پٹخا دے چکی تھی اور اسے ایک ہاتھ سے پکڑ کے پورا چکر دینے کے بعد چھوڑنے ہی والی تھی کہ دلاور کے مددگار بیچ میں آگئے ورنہ دلاور توپ سے نکلے ہوئے گولے کی طرح دیوار پر لگتا تو چپٹا ہو جاتا اور دیوار کے پلستر کے ساتھ فرش پر گرتا۔

محافظ حائل ہوئے تو دلاور کے تصادم سے دو کے قدم اکھڑ گئے۔ اس وقت کمرے میں یہی دو محافظ تھے۔ باقی نہ جانے کب پیڈرو کو اندر لے گئے تھے۔ نازو پر جنون سوار تھا۔ مارشل آرٹ میں اس کی مہارت کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ غصے کے پاگل پن کی آگ نے اسے زیادہ خطرناک اور ناقابلِ تسخیر بنا دیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اب وہ کسی کے قابو میں آنے والی نہیں ہے اور اگر میں نے مداخلت نہ کی تو دلاور مارا جائے گا یا نازو ہلاک ہو جائے گی۔ دونوں صورتوں میں باقی تین کے لیے بھی زندگی کے امکانات معدوم ہو جاتے تھے۔

ابھی تک دلاور کی اشتعال انگیز گفتگو کے باوجود امید باقی تھی۔ اس نے ہمیں مہمان کہا تھا اور اس کی بیوی مسلسل اشارے کرکے ہمیں ضبط سے کام لینے کی اہمیت کا احساس دلا رہی تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ چوہدری دلاور نے بھی انتقام کے جنون پر قابو پانے کی مجبوری کو سمجھ لیا ہے اور شاید صورتِ حال اتنی مایوس کن نہیں جتنی ہم سمجھ رہے تھے۔ ابھی بہت کچھ غیر واضح تھا مثلاً یہ کہ استاد پیڈرو کی پوزیشن کیا ہے۔ وہ ہمیں دھوکے سے یہاں لایا تھا یا خود دھوکے میں مارا گیا تھا۔ یہ سارا پلان چوہدری دلاور کا تھا یا اس نے استاد پیڈرو کے کسی منصوبے کو غیر متوقع طور پر ناکام کردیا تھا۔ وہ ہمارے ساتھ ضرور آیا تھا مگر پھر اندر کہیں غائب ہوگیا تھا۔

نازو پر دورہ پڑ جانے کے بعد بہت سے سوالات ادھورے اور جواب طلب رہ گئے تھے اور اس کی دہشت کا یہ انداز اجتماعی خودکشی کے مترادف تھا جب کہ ہم عقل سے کام لے کے یہ امید ضرور کرسکتے تھے کہ شاید پھر قسمت ساتھ دے تو کوئی معجزہ رونما ہو۔ تائید ایزدی سے صورتِ حال پلٹ جائے اور ہم موت کی وادی میں اُتر جانے کے بعد پھر زندگی کی گم گشتہ راہ تلاش کرلیں۔

چند سیکنڈ کے وقفے سے میں نے نازو کو دبوچ لیا۔ میری اس حرکت میں بھی زندگی کو داؤ پر لگانے کا پورا رسک تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ جو نازو پر گولی نہیں چلا سکتے تھے وہ غلط فہمی میں مجھے شوٹ کردیتے۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ میں بھی نازو کے ساتھ مل کے دلاور کی ہڈی پسلی ایک کرنا چاہتا ہوں اور اسے یرغمال بنا کے اپنی آزادی کا سودا کروں۔

میں نے چلّا کے کہا "نازو۔ اسے چھوڑ دو بے وقوف۔" اور پھر اسے پیچھے سے آرام لاک لگا کے بے بس کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ وہ کسی جنگلی بلّی کی طرح غراتی رہی اور لاتیں چلاتی رہی لیکن میں نے اسے پیچھے گھسیٹ لیا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ کسی نے سوچے سمجھے بغیر ہمارا کام تمام نہیں کیا۔ غالباً انہیں پہلے سے یہ ہدایت تھی کہ جب تک کہا نہ جائے وہ ایسی کوئی حرکت نہ کریں۔

میں نے نازو کو بڑی مشکل سے اپنی گرفت میں رکھا "نازو... نازو' ہوش میں آؤ۔"

"نہیں۔ مجھے چھوڑ دو۔ میں اس... کا خون پیوں گی۔ میں اسے... تو... کچا چبا جاؤں گی میں اسے... یہ بھیڑیئے کا جنا ہے تو میں آدم خور شیرنی ہوں..."

چوہدری دلاور کی بیوی الگ چلّا رہی تھی "جلدی کرو۔ ڈاکٹر کہاں مرگیا ہے۔ اتنی دیر کیوں لگا رہا ہے۔ اندر لے جاؤ چوہدری صاحب کو۔"

دونوں محافظوں کو بہت گالیاں پڑ چکی تھیں اور دلاور کی بیوی اتنی مشتعل تھی کہ ہنٹر ہاتھ میں ہوتا تو وہ ان کی کھال اُدھیڑ دیتی۔ انہوں نے بے ہوش دلاور کو احتیاط سے اٹھایا اور دوسرے کمرے میں لے گئے۔

دلاور کی بیوی نے جاتے جاتے مجھ سے پلٹ کے کہا "سکندر۔ اس پاگل کو قابو میں رکھنا۔ میں ابھی آتی ہوں۔ اور دیکھو' کوئی بے وقوفی مت کرنا۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔"

میں نے صرف سرہلایا اور نازو کو سنبھالنے لگا جو اب میرے ہاتھوں میں جھول رہی تھی "وہ... مسز دلاور..."

وہ غصے میں پلٹی "کیا ہے؟"

میں نے کہا "یہ... بے ہوش ہوگئی ہے۔"

"پھر میں کیا کروں' مرنے دو اسے.."

میں نے نرمی اور لجاجت سے کہا "اگر اسے بھی... ڈاکٹر دیکھ لے تو..."

دلاور کی بیوی میری بات سُنے بغیر ہی غائب ہوگئی تھی۔ اسے نازو کی زندگی سے زیادہ اپنے شوہر کی فکر تھی اور شاید یہ پریشانی تھی

کہ نہ جانے ہوش میں آنے کے بعد اس کا موڈ کیسا ہوگا۔ وہ اس کے اشتعال کو قابو میں رکھ سکے گی یا نہیں۔

غالب نے افسوس سے سرہلایا "اب نہ جانے کیا ہوگا؟"

رابعہ نے اسے تسلی دی "کچھ نہیں ہوگا۔"

"ہوگا کیسے نہیں" غالب بھڑک اٹھا "تم بچہ سمجھتی ہو مجھے کہ میں بہل جاؤں گا۔ ابھی نازو پوری طرح ٹھیک کہاں ہوئی تھی۔ اس حرام زادے نے جانتے بوجھتے اپنی باتوں سے نازو کو پہلے سے زیادہ پاگل کردیا ہے۔"

میں نے کہا "غالب۔ بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ اگر یہ پہلے سے زیادہ پاگل ہوگئی تب بھی ٹھیک ہوجائے گی۔ لیکن اس کے لیے ہم سب کا زندہ رہنا ضروری ہے۔ ہم مل کے اسے ٹھیک کرسکتے ہیں۔"

رابعہ نے کہا "ہاں۔ اگر دلاور نے اپنا ارادہ نہ بدلا۔ ابھی تک وہ زبان سے ضرور کہہ رہا تھا کہ ہم مہمان ہیں۔"

"اور تم کو اس کتے کی زبان پر اعتبار ہے۔"

"اعتبار نہ کریں تو کیا کریں" میں نے کہا "دلاور کی بیوی کے رویے سے بھی اندازہ یہی ہوتا ہے کہ وہ انتقام ضرور لے گا۔ مگر ابھی نہیں۔ شاید وہ ہمیں ایک چانس دینا چاہتا تھا۔ اس لیے کہ ہم نے اس کے بیوی بچوں کو مرنے سے بچایا تھا۔ ہم مدد نہ کرتے تو شوکت رانا انہیں قتل کرکے دلاور کے کاروبار پر قابض ہوجاتا۔"

"غلط فہمی ہے تمہاری۔" غالب نے کہا "سانپ اور بچھو کسی کے احسان مند نہیں ہوتے۔ شیطان نیکی نہیں کرسکتا۔"

"دلاور کے بارے میں تمہاری رائے درست ہے۔ مگر ہمیں یہ موقع فراہم کرنے والی اس کی بیوی ہے۔"

"دلاور پاؤں کی جوتی سمجھتا ہے بیوی کو۔"

میں نے کہا "سمجھتا تھا لیکن اس کی رہائی میں اور اسیری کے دوران میں جو کردار بیوی نے ادا کیا پھر جس طرح اس نے دلاور کو جیل سے نکالا۔ اس کے بعد دلاور کے خیالات یقیناً بدل چکے ہوں گے۔ تم نے دیکھا نہیں' وہ کس طرح بیوی کے سمجھانے سے خود کو کنٹرول کرلیتا تھا۔"

غالب نے کہا "اب یہ مشکل ہوگا۔"

اس کی زبان سے نکلی ہوئی بات فوراً ہی سچ ہوگئی۔ استاد پیڈرو اندر آیا تو اس کی صورت پر برہمی کے آثار تھے۔ "تم سب واقعی پاگل ہو۔ اس لیے لایا تھا میں تمہیں یہاں؟"

میں نے کہا "یہ تم خود بھی نہیں جانتے تھے اور شاید اب بھی تمہاری پوزیشن ہم سے مختلف نہ ہو۔"

"سب معلوم ہوجائے گا بیٹا۔"

میں نے کہا "کہاں ہے ہمارا وہ سب سے بڑا دشمن جسے تم ہمارے حوالے کرنا چاہتے تھے؟ اور کون تھا وہ دشمن؟"

غالب نے سرہلایا "ہاں۔ یہ اعزاز تو تمہیں بھی حاصل ہے کہ خود کو ہمارا سب سے بڑا دشمن کہہ سکو۔"

میں نے اپنی بات جاری رکھی "مجھے کوئی خوش فہمی نہ پہلے تھی اور نہ اب ہے پیڈرو۔ میں یہ نہیں مان سکتا کہ تم کراچی سے لاہور ہمارے ساتھ کوئی نیکی کرنے آئے تھے اور ہم سے ملنے کا نیک مقصد لے کر آئے تھے۔ تمہارے نام سے نیکی کا تصور اتنا ہی دور ہے جتنا شیطان لعین کے نام سے۔ اور تم نے جس طرح یہ کارنامہ سرانجام دیا اس سے اور کچھ ثابت نہیں ہوتا کہ تم پیڈرو سے شیخ مختار بن جاؤ یا کچھ اور۔ کینچلی بدلنے سے سانپ کی فطرت نہیں بدلتی۔ تم یہاں پُرامن سہ فریقی مذاکرات کے مشن پر نہیں اپنا انتقام لینے آئے تھے پیڈرو۔"

"یہ نہ ماننے سے مجھے فرق نہیں پڑتا' تمہیں ضرور پڑے گا۔"

میں نے کہا "تمہارے دماغ میں بدمعاشی کے خانے میں بہت عقل ہوگی مگر شرافت اور انسانیت تو تمہارے باپ کے خون میں بھی نہیں تھی۔ ہوتی تو اس کا تھوڑا بہت اثر تمہاری ذات میں بھی نظر آتا۔ جس طرح تم ہمیں یہاں لائے تھے کیا وہ شریفانہ طریقہ تھا؟ وہ تمہارا پُرانا اسٹائل تھا پیڈرو۔ تم آئے تھے مجھ سے اپنا بدلہ لینے۔ اس ذلت کا انتقام لینے جس کا شکار تم کراچی میں ہوئے تھے۔ مجھ سے بھول ہوگئی کہ تمہیں وہیں مار کے کسی گٹر لائن میں کیوں نہیں ڈال دیا تھا۔ یہاں آکے تمہیں خیال آیا کہ کیوں نہ دلاور کے کندھے پر بندوق رکھی جائے۔ اگر تم بچھو ہو تو وہ کوبرا سانپ ہے۔ دشمن کو مارنے کے لیے بچھو کا ڈنک کافی نہیں۔ اسے زخم خوردہ سانپ کے حوالے کردینا بہتر ہے۔ اب تم استاد پیڈرو نہیں شیخ مختار ہو۔ سکندر سے انتقام تو چوہدری دلاور بھی لے سکتا ہے اور بہتر طریقے سے لے سکتا ہے۔ تم نے سوچا کہ اب شیخ مختار کی کاروباری گُڈول کیوں متاثر ہو۔ کیوں نہ سکندر کے خطرے کا بھی علاج ہوجائے اور دلاور پر بھی احسان کردیا جائے۔ ہم سے تم نے کہا کہ چلو دلاور کو پھر پکڑلو اور دلاور سے کہا کہ باس' ابھی لاتا ہوں ان سب... کو جو بڑے ایم آر ایس کے سورما بنے پھرتے ہیں۔ میں نے پہچان لیا ہے سکندر کو اس کے بدلے ہوئے روپ میں بھی۔ ختم کرو ان کا قصہ ورنہ یہ پھر تمہیں نقصان پہنچائیں گے۔ جو کچھ انہوں نے تمہارے ساتھ کیا اس کے بعد بھی کیا یہ کسی رعایت کے مستحق رہ جاتے ہیں؟ باس کتنا ویل ڈن پیڈرو۔ یہ کام کیا نا تم نے۔ اب ان سے تو میں نمٹ لوں گا۔ تم جاؤ کراچی شیخ مختار۔ اپنا دھندا کرو۔ دلاور سے ڈرنے کی اب کوئی وجہ نہیں۔ یہ احسان کرکے تم نے دلاور کو خرید لیا ہے۔ اور دلاور کی طرف سے مطمئن ہوجانے کے بعد تم ہم سے کہتے کہ سوری سکندر' دلاور مجھ سے وعدہ کرکے مکر گیا' تم تو جانتے ہو اس کی فطرت کو۔ مجھ سے تو یہی کہا تھا اس نے کہ سکندر کو اور اس کے سارے دوستوں کو لے آؤ۔ میں ان سے صلح کی بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"اور ممکن ہے ایسا ہی ہوا ہو" غالب نے میری بات کی تائید

تم نے ایسا ہی سوچا ہو اور دلاور نے یہی کہا ہو مگر آثار بتاتے ہیں یہاں تمہاری پوزیشن بھی ہم سے مختلف نہیں۔ دلاور بہت شکاری ہے۔ اس نے جال بچھایا دشمنوں کے لیے لیکن تمہیں دوستی کا جھانسا دے کے پھانس لیا۔"

استاد پیڈرو کی خاموشی ہی اس تلخ حقیقت کا اعتراف تھی۔ اس کے اندر کا بدمعاش ہمارے سامنے ہار ماننے پر تیار نہ تھا۔ اس نے سرکس کے شیر کی طرح دہاڑ کے کہا "افلاطون کی ... جو دلاور کرسکتا ہے اس سے بُرا میں کرسکتا ہوں تمہارے ساتھ یہاں' اسی جگہ۔ رتی بھی جل جائے گی اور اس کے بل بھی جائیں گے۔"

اس نے ناقابل اشاعت زبان میں بہت کچھ کہا کہ وہ کیا کرسکتا ہے مگر اس کا کسی پر کیا اثر ہوتا۔ میں اسے چڑانے کے لیے یوں مسکراتا رہا جیسے میرے سامنے کوئی مسخرا اپنی احمقانہ باتوں کو مذاق کے طور پر پیش کررہا ہو یا گھسے پٹے تھرڈ کلاس لطیفے سنا رہا ہو۔ ایسا ہی غالب نے بھی کیا۔ وہ بھی اپنی بتیسی کی نمائش کرتا رہا۔

جب چوہدری دلاور کی بیوی اندر آئی تو پیڈرو ایسے سٹک گیا جیسے مالکن کے آتے ہی بھونکنے والا کتا چپ ہوجائے اور نظر کا اشارہ سمجھ کے روپوش ہوجائے۔

وہ بہت پریشان' افسردہ اور تھکی ہوئی نظر آرہی تھی "تم نے مجھے بہت مایوس کیا سکندر۔"

میں نے کہا "غلطی آپ کی ہے میڈم۔ کہ آپ نے مجھ سے توقعات وابستہ کرلی تھیں۔"

"تم نے میرے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا" اس نے دکھی انداز میں سرہلایا۔

"تمہیں کچھ کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی" رابعہ نے کہا "یہ معاملہ تھا ہمارے اور دلاور کے درمیان یا دلاور کے اور قانون کے درمیان۔"

وہ ایک دم بھڑک اُٹھی "قانون کی بات مت کرو وکیل کی اولاد۔ یہ عدالت نہیں ہے۔ اور جو کچھ تم کرتے پھر رہے تھے کیا وہ قانون کے مطابق تھا؟ تم نے تو قانون کو اپنے ہاتھوں میں لے رکھا تھا۔ کیا تھی یہ تمہاری ایم آر ایس آخر۔ مائٹ از رائٹ سوسائٹی۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا فلسفہ۔ جنگل کے قانون کو تم نے اپنا دستور بنالیا تھا۔ کیا نہیں کیا تم نے قانون اور انصاف کے نام پر؟ کون سا جرم نہیں کیا تم سب نے۔ ڈاکے تم نے ڈالے' قتل تم نے کیے' گاڑیاں تم نے چھینیں' اغوا تم نے کیے۔ کہاں کہاں بم رکھے۔ کہاں کہاں آگ لگائی۔ کیسے کیسے بھیس بدلے' بات کرتے ہو قانون کی۔ ذرا حلیہ دیکھو اپنے ایم آر ایس کے چیف' اپنے ہیرو سکندر اعظم کا۔ یہ کیوں فرنچ وکیل بنے پھر رہے ہیں۔ اس جعلسازی میں تم سب ایک دوسرے سے بڑھ کر ہو۔ تم نے دلاور ہی کو نہیں' ڈیلروں کو' پولیس کو' یہاں تک کہ عدالت کو دھوکا دیا۔ کیا تمہارا یہ جرم کم سنگین ہے؟ باقی سب نے تو قانون نہیں پڑھا مگر مس رابعہ قاری' تم تو بہت بڑی اور معزز وکیل سمجھی جاتی ہو۔ کس منہ سے قانون کی بات کرسکتی ہو تم میرے سامنے۔ مجرم پیڈرو ہے' دلاور ہے' تو تم بھی ہو۔ قانون کا اتنا ہی احترام کرتے ہو سکندر تو پہلے خود کو قانون کے حوالے کرو۔ قانون کی نظر میں آج بھی تم ایک مفرور مجرم ہو۔ اگر میں چاہوں تو ابھی اور اسی وقت ایک ٹیلی فون کرکے پولیس کو طلب کرسکتی ہوں کہ آؤ اور اپنے مجرم کو لے جاؤ۔"

"اور وہ جو سب سے بڑا مجرم ہے...؟"

وہ ہنسی "ہاں وہ سب سے بڑا مجرم ہے مگر وہ میرا شوہر ہے۔ اور وہ خود کو شریف آدمی بھی نہیں کہتا۔ جب تک میں زندہ ہوں اسے میں بھی اسی طرح بچاؤں گی جیسے ہر بیوی بچاتی ہے۔ تم بیوی نہیں ہو مس رابعہ' محبوبہ ہو بلکہ داشتہ ہو۔ ابھی تم ماں نہیں بنی ہو سکندر کے بچوں کی۔ تم نے میری طرح اولاد کو پال پوس کر بڑا نہیں کیا ہے۔ اس کے باوجود تم سکندر کی خاطر جان دے سکتی ہو تو میں کیوں نہ بچاؤں اپنے گھر کو۔ اپنے شوہر' اپنے بچوں کے باپ کو۔"

ہم سب خاموش تھے۔ کسی کے پاس دلاور کی بیوی کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ بلاشبہ یہ قانونی جنگ نہیں تھی۔ یہ لاقانونیت کے خلاف لاقانونیت کی جنگ تھی۔ ہم نے تو اس جنگ کی ابتدا قانونی طریقے سے کی تھی مگر بہت جلد ہمیں اندازہ ہوگیا تھا کہ جن سے ہمارا مقابلہ ہے وہ تو قانون کو تسلیم ہی نہیں کرتے۔ اس کے وجود کو نہیں مانتے۔ الٹا وہ قانون کی تذلیل یوں کرتے ہیں کہ اسے اپنی قوت خرید میں سمجھتے ہیں۔ وہ ایسے فرعون ہیں جو اپنی دولت اور بدمعاشی کی طاقت کے سامنے نعوذباللہ خدا کی خدائی کو کچھ نہیں سمجھتے۔ ایسے مردود شیطانوں کا مقابلہ ہم قانون کی مدد سے کیسے کرسکتے تھے۔ ویسے بھی قانون حفاظت کرتا ہے انسانوں کی۔ کسی سانپ کا سر کچلنے والے کو قانون کچھ نہیں کہتا۔ پاگل کتے کو گولی مارنے والے کے لیے کوئی سزا نہیں۔ آدم خور درندے کو ہلاک کرنے کے لیے قانون سے اجازت نہیں لینی پڑتی۔

دلاور کی بیوی نے پھر خاموشی کو توڑا "میں نے بڑی کوشش سے چوہدری صاحب کو قائل کیا تھا کہ صرف ایک بار میری خاطر اور میرے بچوں کی خاطر ان سے بات کرلو۔ شاید یہ آگ اور خون کا انتقامی سلسلہ ختم ہوجائے۔ اور یہ سفارش میں پہلے کرتی تو چوہدری صاحب خود مجھے گولی مار دیتے کہ تو میری جان کے دشمنوں کی حمایت کرتی ہے حرام زادی... لیکن..."

میں نے کہا "لیکن تم نے کہا کہ سکندر نے میری جان بچائی تھی۔ وہ مدد نہ کرتا تو شاید ہم سب بھی مارے جاتے اور تم بھی۔ تمہارے کاروبار پر تمہارے اپنے پارٹنر شوکت رانا اور ڈاکٹر شاہ قابض ہوجاتے۔ اور جب تم نے اس احسان کا واسطہ دیا تو دلاور مان گیا کہ اچھا بلواؤ انہیں۔"

اس نے ایک گہری سانس لی "مگر اب کیا فائدہ؟"

میں نے کہا "اب وہ احسان کوئی احسان نہیں رہا؟"

"مجھے نہیں معلوم کہ چوہدری صاحب جب ہوش میں آئیں گے اور ان کا غصہ اُترے گا تو وہ کیا کریں گے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ میں پھر ان کو منالوں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ میری ایک نہ مانیں۔ اس پاگل کا دماغ تو میں بھی درست کروں گی۔ اگر چوہدری صاحب نے اسے زندہ چھوڑا۔"

غالب نے کہا "جاؤ بی بی! ایسی باتوں سے نہ ہم پہلے ڈرے ہیں نہ ڈریں گے۔ ہم جانتے ہیں تمہارے چوہدری صاحب کو۔"

"اور وہ بھی جانتے ہیں اچھی طرح کہ ہم مسلمان ہیں۔ کوئی مسلمان موت سے نہیں ڈرتا۔ ہر مسلمان جانتا ہے کہ موت ایک ہی بار آتی ہے۔ کب آتی ہے اور کیسے آتی ہے، یہ کوئی نہیں جانتا۔" میں نے کہا۔

وہ بیزار صورت بنا کے اُٹھ گئی۔ شاید یہ گفتگو اسے کتابی لگی تھی اور اس کی مشکلات کا حل کسی کتاب میں نہیں تھا۔

میں نے کہا "مسز دلاور...!"

وہ رک گئی "اب کیا ہے؟"

میں نے کہا "اگر تم واقعی کچھ کرنا چاہتی ہو اور کر سکتی ہو تو ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دو یا کم از کم ان کو چھوڑ دو۔"

میرا اشارہ نازو کی طرف تھا جو بدستور بے ہوش تھی اور غالب کی طرف بھی۔ "تم جانتی ہو یہ پاگل تھی۔ اور اسے پاگل کرنے والا بھی کون تھا۔ اسے اپنا ہوش نہیں۔"

غالب نے برہمی سے کہا "کوئی ضرورت نہیں اس سفارش کی۔"

میں نے غالب کے احتجاج کو نظر انداز کر دیا "اگر تمہیں احسان کا قرض اُتارنے کا خیال ہے تو ان کی جاں بخشی کرا دو۔"

غالب نے چیخ کے کہا "لعنت اس پر جو دلاور سے جاں بخشی کی درخواست کرے۔"

میں نے کہا "اس کی باتوں پر مت جاؤ۔ اس کے حصے کی سزا میں بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔"

رابعہ نے کہا "نازو کے بدلے مجھے ہر سزا منظور ہوگی۔"

غالب نے رابعہ کو شعلہ بار نظروں سے دیکھا "رابعہ۔ نہیں چاہیے مجھے تمہارا یہ احسان۔ مجھے خدا پر بھروسا ہے۔ وہ ہمارا محافظ ہے۔"

دلاور کی بیوی نے کسی ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا۔ اس نے باری باری ہم سب کے چہروں کو دیکھا اور پھر سرہلا کے اندر چلی گئی۔

میں نے کہا "دیکھ غالب۔ اچھا مجھے بھی نہیں لگتا بھیک مانگنا اور پھر دلاور جیسے دشمن سے رعایت طلب کرنا..."

غالب نے تلخی سے کہا "آخر کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں آپ؟ یہی کہ آپ بڑے مخلص دوست ہیں اور دوستی میں جان بھی قربان کر سکتے ہیں۔"

"یہ ثابت کرنے والی کوئی بات نہیں۔ جیسے دن کے اجالے میں سورج کا وجود کسی ثبوت کا محتاج نہیں ایسے ہی ہماری دوستی، ہمارا خلوص اور ہمارے جذبات ہیں، زندہ حقائق ہیں۔"

"پھر آپ نے مجھ پر یہ احسان کیوں کیا؟"

"پھر وہی احمقانہ بات۔ ہم ایک دوسرے کے لیے جو کرتے ہیں کیا وہ احسان ہوتا ہے؟" میں نے کہا "اس کو یوں سمجھو مرزا غالب کہ وقت کی مصلحت کو سمجھنا ہی عقل مندی ہے۔"

"یعنی ضرورت پڑنے پر گدھے کو باپ بنا لینا۔"

"نہیں۔ آبرو مندی کے ساتھ حالات سے سمجھوتا کرنا بھی جنگ کی حکمتِ عملی میں شامل ہے۔ اگر دلاور کی بیوی یہ سمجھتی ہے اور خود چوہدری دلاور تسلیم کرتا ہے کہ ہم نے اس پر کوئی احسان کیا تھا۔ حالانکہ ہم نے تو بس اپنا اخلاقی فرض پورا کیا تھا اور وہ اس احسان کا بدلہ بھی چکانا چاہتے ہیں تو ہم موقع سے فائدہ کیوں نہ اٹھائیں۔ ہم اس سے اپنا ادھار وصول کر لیں اور وہ بھی اشد ضرورت کی مجبوری میں تو اس میں کون سی معیوب اور غیر اخلاقی بات ہے۔ اگر نازو پوری طرح فٹ ہوتی تو میں اس کی سفارش نہ کرتا۔ ابھی جو کچھ ہوا اسے ایک وقتی دورہ ہی سمجھنا چاہیے ورنہ وہ میرے نزدیک نوّے فیصد ٹھیک ہے۔ دس فیصد پاگل تو سب ہوتے ہیں۔"

رابعہ مسکرائی "ہم شاید دس فیصد پاگل نہیں ہیں۔ دس فیصد ہی ٹھیک ہیں۔"

میں نے کہا "ایسی حالت میں نازو کا دوبارہ ان حالات سے دوچار ہونا جو اس کے ذہنی عدم توازن کا سبب بنے تھے۔ زیادہ خطرناک اور نقصان دہ ثابت ہوتا۔ اس کے ساتھ تمہارا ہونا بھی اس لیے بہتر ہے کہ..."

"کہ ایک مسئلہ ہے دماغ کا تو دوسرا دل کا" رابعہ بولی۔

میں نے کہا "رائٹ۔ لیکن تیسرا مسئلہ ہے ہم سب کی بقا کا۔ ایک ساتھ پکڑے گئے تو کیا کریں گے۔ اچھا ہے کسی بہانے دو نکل جائیں اس سے ہماری امید کا رشتہ قائم رہے گا۔ خواہ حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ امید رہے گی کہ تم ضرور کچھ کرو گے کوئی راستہ تلاش کر لو گے۔ کوئی وسیلہ بنا لو گے۔ کوئی تو ہے جسے معلوم ہے کہ رابعہ اور میں سختیِ حالات سے گھبرا کے یا عشق کے پاگل پن میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے فرار نہیں ہوئے ہیں۔"

"اور کسی خانے میں بھی نہیں ہیں" رابعہ بولی۔

"خانے میں؟" غالب بولا۔

رابعہ نے کہا "ہاں۔ پاگل خانے، جیل خانے، عجائب خانے اور مُردہ خانے یا... مے خانے میں نہیں ہیں۔"

"رابعہ کی مراد مے خانہ عشق سے ہے۔" میں نے کہا۔

غالب بھی اب قائل ہو چکا تھا "سب سے اچھے غم خانے ہوتے ہیں۔"

رابعہ نے حیرانی سے کہا "پہلے والے تین خانے؟"

"نہیں۔ ایک اپنا غریب خانہ، اس کے اندر غسل خانہ اور باورچی خانہ۔ بس یہی اپنے نصیب میں نہیں۔"

"نصیب میں تو ہوں گے یار۔ بس آگے پیچھے کی بات ہے۔ بہت کو مل گئے یہاں تک کہ مولوی خادم حسین کو مل گئے۔"

رابعہ بولی "مولوی خادم حسین کو دوبار مل گئے۔"

میں نے ہنس کے کہا "بقول شاعر۔ کمر باندھے ہوئے چلنے کو سب یار بیٹھے ہیں۔ بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں۔"

غالب بولا "آج انکشاف ہوا کہ انشاء اللہ خاں انشاء نے یہ شعر شادی سے پہلے کسی کی بارات دیکھ کے کہا ہوگا۔"

دلاور کی بیوی دوسری بار کسی فاتح کمانڈر کی طرح چلتی ہوئی آئی جو محافظوں کی معیت میں پہلی بار جنگی قیدیوں کا معائنہ کرنے نکلا ہو۔ اس کے ساتھ چار حکم کے غلام تھے جن کے چہرے ہمارے لیے اجنبی نہیں تھے۔ وہ بڑے تندرست و توانا ظالم اور خونخوار قسم کے مشینی انسان لگتے تھے جو احساس سے نا آشنا ہوں اور صرف اشارے پر حرکت کرتے ہوں۔

"دیکھو۔ یہ جو لڑکی پڑی ہوئی ہے۔ اسے بھی لے جاؤ اور اس کے خصم کو بھی۔" اس نے بڑی بدخوئی سے غالب کی طرف اشارہ کیا "گاڑی باہر کھڑی ہے۔ ان کو کہیں چھوڑ آؤ۔ جہاں یہ کہیں۔"

غالب نے ایک آہ بھری "نیک دل خاتون۔ اللہ آپ کا بھلا کرے۔ بس یہ لوگ ہمیں گے مدینے پہنچا دیں۔"

دلاور کی بیوی نے برہمی سے کہا "بکواس بند کرو۔"

غالب مسکینی سے بولا "ناراض کیوں ہوتی ہیں جی۔ چلیں گولی مار پہنچا دیں۔"

"گولی مار!"

"کراچی کا ایک علاقہ ہے جی۔ اپنا ماموں رہتا ہے وہاں" غالب نے کہا۔

حکم کی تعمیل کرنے والے نازو کی طرف بڑھے تو غالب کھڑا ہو گیا "آپ مت تکلیف کریں۔ میں اُٹھا لیتا ہوں اس مصیبت کو۔ ساری عمر کی مصیبت ہے میرے لیے تو۔"

دلاور کی بیوی نے مسکراہٹ کو دبالیا۔ غالب نے نازو کو اُٹھا کے کندھے پر ڈالا اور بولا "اچھا جی۔ اجازت ہے!" اس نے مجھ سے اور رابعہ سے رخصت کے انداز میں مصافحہ کیا۔

میں نے ہاتھ ملا کے کہا "رب راکھا۔ آتے جاتے رہنا۔"

رابعہ نے کہا "ہاں۔ جب بھی موقع ملے۔"

دلاور کی بیوی ہمارے غیر سنجیدہ رویے پر حیران تھی۔ جب دو محافظوں کے ساتھ غالب چلا گیا تو اس نے سرہلا کے خود کلامی کے انداز میں کہا "واقعی ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔"

میں نے کہا "سچ فرمایا آپ نے۔ پیڈرو سے بڑھ کے دلاور اور دلاور سے بڑھ کے آپ... باقی جملہ پھر کبھی۔"

دلاور کی بیوی کے ساتھ رہ جانے والے دونوں شکاری کتّے ہم پر جھپٹ پڑنے کے لیے تیار تھے۔ اس نے اپنے گریبان میں ہاتھ ڈالا اور ایک ریوالور نکال کے گویا ثابت کر دیا کہ ابھی تو میں جوان ہوں۔ وہ کوئی رسک لینا نہیں چاہتی تھی اور یہ بات میں بھی سمجھتا تھا کہ دوسری غلطی کی گنجائش نہیں۔ نہ جانے کیوں اور کیسے دلاور کی بیوی نے غالب اور نازو کو رہا کرانے کی کوشش میں کامیابی حاصل کر لی تھی۔ اس نے دلاور سے منظوری لی تھی یا خود فیصلہ کرنے کا رسک لیا تھا۔ غالب اور نازو کو واقعی رہا کیا گیا تھا یا کسی دوسری جگہ منتقل کر دیا گیا تھا۔ ان سب سوالات کا جواب وقت کے پاس تھا۔ محافظوں نے میری تلاشی لی اور پھر ہمیں دوسرے کمرے میں لے گئے۔

"دیکھو سکندر۔" دلاور کی بیوی نے دروازے میں رک کے کہا۔

میں نے پلٹ کے کہا "دیکھ لیا جی۔ اچھی لگ رہی ہیں آپ۔"

وہ زیادہ سیریس ہو گئی "خودکشی کرنا چاہو تو تمہیں کوئی روک نہیں سکتا لیکن جس طرح تم نے غالب اور نازو کی زندگی بچانے کے لیے عقل سے کام لیا ایسے ہی خود کو بچا سکتے ہو۔ تم زندگی کا سودا کر سکتے ہو۔ زندہ رہنے کا حق مانگ سکتے ہو لیکن چھین نہیں سکتے۔ سمجھے؟"

میں نے کہا "یہ بات اسے سمجھاؤ جو سمجھتا ہو کہ انسانوں کی زندگی اور موت پر اس کا اختیار ہے۔ خدا سے دعا مانگی جا سکتی ہے۔ نہ سودا کیا جا سکتا ہے اور نہ کچھ چھینا جا سکتا ہے۔"

"پھر بھی۔ جذبات کے جوش میں مت آنا۔ تم نوجوان ہو ابھی۔ لیکن میرے فیصل کی طرح نوعمر لڑکے نہیں رہے۔ دلاور بھی جب تمہاری عمر کا تھا تو بہت جوشیلا تھا۔ اب عمر کا تقاضا یہ تھا کہ وہ زیادہ بردبار ہوتا لیکن اس کے اعصاب پہلے جیسے مضبوط نہیں رہے۔ پھر ابھی ابھی بڑے سخت امتحان سے گزرا ہے وہ اور اس کے دل میں تمہارے خلاف نفرت کی آگ بھڑک رہی ہے۔ بس اس پر تیل مت چھڑکنا۔" وہ اپنے پیچھے دروازے کو مقفل کر کے چلی گئی۔

رابعہ نے اس کے جانے کے بعد کہا "آخر اسے اتنی ہمدردی کیوں ہو رہی ہے ہم سے؟"

"یہ جذباتی ہمدردی ہے" میں نے کہا "بلکہ جذباتی وابستگی۔"

"جذباتی وابستگی..... کس سے؟"

"ظاہر ہے مجھ سے" میں نے کہا "تم سے تو دلاور کو ہو سکتی تھی.. اور کیا پتا ہو۔"

وہ ہنس پڑی "یعنی یہ خوش فہمی ہے جناب کو۔ کہ وہ فریفتہ ہے آپ پر۔"

میں نے عاجزی سے کہا "وہ... دراصل۔ قصور میری نیت کا نہیں..... بلکہ کچھ شخصیت ہی ایسی عطا کی ہے خدا نے... آخر تم بھی

تو مرتی ہو مجھ پر۔"

"یہ اطلاع بھی غلط ہے۔ اپنی صورت ملاحظہ کی ہے کبھی آئینے میں؟" رابعہ نے کہا "اونہہ۔۔۔۔ مرتی ہو مجھ پر!"

"اب کیا عرض کروں۔ یہ رقابت اور حسد کے جذبات بول رہے ہیں ورنہ تم خود جانتی ہو کہ شخصیت کے طلسم کا صورت کے حُسن سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ یہ سیکس اپیل کچھ اور ہی چیز ہے۔ دیکھو نا اب لوہے جیسی فضول اور بدصورت دھات میں کشش ہے مقناطیس کے لیے۔ سونے چاندی میں نہیں ہے۔"

"تو آپ مقناطیس ہیں یا لوہا؟"

"پتا نہیں۔" میں نے سر کھجا کے کہا "تمہارا کیا خیال ہے۔ کیوں نہ ہم ٹاس کرلیں آپس میں کہ کون لوہا ہے اور کون مقناطیس۔"

یہ دوسرا کمرا نسبتاً چھوٹا تھا اور غالباً اس کوٹھی میں اسٹور کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اس میں کوئی کھڑکی نہیں تھی اور نہ کوئی روشندان تھا۔ اندر فرش پر گرد تھی اور مختلف چیزوں کی ملی جلی بو جو یہاں پڑی رہتی ہوں گی۔ فرش پر تیل کے داغ نمایاں تھے اور بہت بلندی پر روشن چالیس واٹ کے بلب کی روشنی میں دیواروں کا بوسیدہ رنگ۔ کونوں میں مکڑیوں کے جالے اور کہیں کہیں سے اکھڑا ہوا پلستر دیکھ کے اندازہ ہوجاتا تھا کہ ہمارے لیے قید و بند کا پہلا مرحلہ شروع ہوگیا ہے۔

میں نے رابعہ سے غیر سنجیدہ لہجے میں جتنی باتیں کی تھیں ان کا مقصد ہی خوف کے نفسیاتی دباؤ کو کم کرنا تھا۔ خود رابعہ نے ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی کہ اس کے ذہن پر ماحول کا کوئی اثر نہیں اور وہ دلاور کی قید میں میرے ساتھ ہر قسم کی سختی برداشت کرنے کے لیے تیار تھی۔ حقیقت اس کے برعکس تھی۔

میں نے کہا "رابعہ۔ تمہیں ڈر لگ رہا ہے نا؟"

وہ مجھ سے چمٹ گئی "ہاں۔" اس نے سرہلا کے میرے کانوں میں سرگوشی کی "بہت بزدل ہوں میں۔"

میں نے اسے بانہوں میں سمیٹ لیا "نہیں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم کتنی بہادر ہو۔ ڈر تو مجھے بھی لگ رہا ہے۔"

ہم دیوار سے ٹیک لگا کے فرش پر بیٹھ گئے۔ رابعہ نے اپنا سر میرے کندھے پر رکھ دیا "پتا ہے میں کیا چاہتی ہوں اس وقت؟"

"دیکھو۔ بانو بازار کے دہی بھلوں کی فرمائش مت کردینا۔"

وہ مسکرائی "اگر تقدیر مجھے موقع دے۔ ایک خواہش کی تکمیل کا۔"

"میں بتاؤں۔ تم خواہش کرنا کہ جو میں مانگوں وہ مل جائے۔ ایک خواہش کے کوزے میں خواہشات کا سمندر بند کردینا۔"

اس نے اپنی بات جاری رکھی "میں مرجانا چاہوں گی، ابھی اور اسی وقت۔"

میں نے اس کی آنکھوں کو، اس کے لبوں کو، اس کے بالوں کو اور گردن پر ستارۂ سحری کی طرح جگمگاتے تل کو چوما "جانِ۔۔۔ فضول بات ہے۔"

"نہیں سکندر۔ یہ خواہش ہے اور خواہشات پا خواب۔۔۔ ذہن کا کنٹرول نہیں ہوتا۔ یہ تو اس وقت اور اس لمحے کی بات۔۔۔ میرا جی چاہتا ہے کہ اچانک فرشتۂ اجل ہم دونوں کی روح۔۔۔ کرلے۔ ایسے کہ ہمیں پتا بھی نہ چلے۔ اچانک دلاور اندر آ۔۔۔ ہم دونوں کو گولی ماردے۔"

"مس رابعہ قاری۔ آپ کی خواہش آپ کو مبارک۔۔۔ اس نیت سے آیا تو میں اسے صاف بتادوں گا کہ خاتون کی یہ۔۔۔ تھی۔ آپ اچھی طرح نشانہ لے کر بسم اللہ کریں۔ مجھے قطعی شکایت نہیں ہوگی بلکہ میں کہوں گا کہ تھینک یو۔ تم نے۔۔۔ اکلوتی محبوبہ کی وہ تمنا پوری کی جو میں نہیں کرسکتا تھا۔ اب اجازت دیں۔"

رابعہ نے ہنستے ہوئے میرے سینے پر مُکّا مارا "کمینے۔"

میں نے سینے پر ہاتھ رکھ کے کہا "آہ۔ دل توڑ دیا ناظالم۔ بھرپور پنچ مارا ہے محمد علی کلے والا۔ عین دل کے مقام پر۔"

رابعہ نے میرے کان کھینچ کے کہا "اچھا اگر میں مرگئی تو۔۔۔ کروگے؟"

"تم سے ہوجاتی تو میں جواب دیتا کہ دوسری شادی۔ دیکھ۔۔۔ جھوٹ بولنے سے کیا فائدہ۔ مرد کی ذات میں وفا تو ہے نہیں۔۔۔ یا چہلم تک اللہ صبرِ جمیل بھی عطا کردیتا ہے اور جمیل صورت۔۔۔ البدل بھی۔ ویسے ایک بات طے ہے، تم جیسی۔۔۔۔" میں اے۔۔۔ سے دیکھ کے چپ ہوگیا۔

"مجھ جیسی کیا۔۔۔؟"

"برا مت ماننا۔ تمہارا خیال ہوگا کہ میں حسین کہوں گا۔۔۔ احمق کہنا چاہتا تھا۔ تم جیسی احمق واقعی دوسری نہ ملتی۔"

"چلو کچھ تو ہے مجھ میں ایسی بات۔ جو کسی اور میں نہیں" افسردگی سے بولی۔

"ظاہر ہے۔ رابعہ تو ایک ہی تھی۔ وہ مل گئی مجھے۔"

دوسرے رومانٹک سین میں روایتی فلمی ولن سے زیا۔۔۔ خبیث قسم کے ایک شخص نے مداخلت کی۔ اس کا سر بالکل صا۔۔۔ تھا۔ غالباً وہ چہرے کے ساتھ ہر روز سر کو بھی شیو کرتا تھا۔ بل۔۔۔ کی طرح۔ چہرے کے کرخت نقوش اور کلف دار مونچھوں۔۔۔ کسی پہلوان کے سے پھڑکتی مچھلیوں والے بازو، مضحکہ خیز حد۔۔۔ چوڑے صاف پُرگوشت سینے اور فولادی ستون نظر آنے والی ٹانگو۔۔۔ سے اس کی شخصیت کی ہیبت ناکی کا تاثر زیادہ ڈرامائی محسوس ہو۔۔۔ تھا۔

میرا مشاہدہ اور تجربہ یہ تھا کہ ایسے شو پیس محض دکھانے او۔۔۔ ڈرانے کے ہوتے ہیں۔ جو واقعی خطرناک ہوتے ہیں وہ صورت۔۔۔ سے بے ضرر اور غیر متاثر کن شخص۔۔۔ لگتے ہیں۔۔۔

۔۔۔ہاتھ میں ایک فولادی زنجیر تھی۔ اس نے پاؤں پھیلا کے اور جھٹک کے کہا "چلو۔"

۔۔۔میں نے اسے غور سے دیکھا "بظاہر تم مرد ہو لیکن اوپر تمہیں کچھ پہن لینا چاہیے۔ نام کیا ہے تمہارا؟"

رابعہ نے مجھے ٹہوکا دیا جس کا مطلب یہ تھا کہ بے شرمی کی بات کرو۔ "کہاں چلیں؟"

"میرے ساتھ" وہ غرا کے ایک قدم آگے آیا۔

میں نے کہا "میرا دل چاہتا ہے کہ۔۔۔ گدگدی کروں تمہارے۔"

اس نے زنجیر کو بڑے وحشیانہ انداز میں گھمایا۔ وہ بھینس۔۔۔ باندھنے والی موٹی زنجیر تھی۔ اگر میرا جسم اس کی زد میں آجاتا تو میرا گوشت ادھڑ جاتا مگر مجھے پہلے سے اندازہ تھا کہ وہ اس ہتھیار کو کیسے استعمال کرے گا۔

میں نے رابعہ کو بچاتے ہوئے غوطہ مارا اور زنجیر کو ایسے پکڑ لیا جیسے کیچ کرنے والا اس گیند کو پکڑ لیتا ہے جو کرکٹ کے گراؤنڈ کی باؤنڈری عبور کرنے کے لیے گولی کی طرح جارہی ہو۔ ساری بات۔۔۔ کی مہارت اور ٹائمنگ کی ہوتی ہے۔

زنجیر میری گرفت میں آئی تو اسے ایک جھٹکا لگا۔ اپنے وزن کی وجہ سے وہ منہ کے بل نہیں گرا مگر زنجیر اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔

"یہ لو۔ پھر کوشش کرو" میں نے زنجیر اس کی طرف پھینک دی۔

رابعہ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا "سکندر۔ دلاور کی بیوی نے کیا کہا تھا؟"

میں نے کہا "اسی لیے تو مقابلہ نہیں کررہا ہوں۔ پھر کتنی محبت سے کہا تھا اس دشمنِ جاں۔۔۔۔ میرا مطلب ہے دشمن کی ہونے والی حسین بیوہ نے۔"

رابعہ نے کہا "چلو پہلوان۔ ہم لڑنا نہیں چاہتے۔"

پہلوان نے زنجیر پھر اُٹھالی تھی مگر وہ جتنا حیران تھا اتنا ہی رابعہ کی بات سے پریشان ہوا "میرے پاس۔۔۔ ریوالور بھی ہے۔"

میں نے کہا "اچھا؟ ذرا دکھاؤ تو۔ گولیاں بھی ہیں اس میں؟"

اس نے اقرار میں سرہلایا "اصل گولیاں ہیں۔"

"چلانا آتا ہے تمہیں؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ چلا کے دکھاؤں؟" وہ بولا۔

رابعہ نے گھبرا کے کہا "نہیں نہیں۔ اسے جیب میں ہی رہنے دو۔ کہیں اُلٹا نہ چل جائے۔"

وہ ذہنی طور پر پسماندہ تھا۔ اس کے پاس صرف جسم بڑا تھا۔ دماغ بہت چھوٹے بچے کا تھا۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا کہ میں اس سے ریوالور بھی چھین لوں مگر مسلح ہوجانے کے باوجود لڑ بھڑ کے اس جگہ سے زندہ سلامت نکل جانا عملاً ناممکن تھا۔ اس لیے دلاور کی بیوی مجھے وارننگ دے گئی تھی کہ خودکشی کی کوشش مت کرنا۔

مجھ پر اس وقت چودہ طبق روشن ہوگئے جب دروازے سے باہر آتے ہی میرے سر پر کسی نامعلوم ہاتھ نے ڈنڈا دے مارا اور دوسرے لمحے میرا وجود تاریکی اور خلا میں گم ہوگیا۔

دوبارہ میری آنکھ کھلی تو مجھے ویسا ہی لگا جیسا کہ ہر بار ہوش میں آنے کے بعد لگتا تھا۔ زمین گھوم رہی تھی۔ اس کے ساتھ میں بھی گردش میں تھا اور میرے سر کے اندر دھم دھم ہتھوڑے چل رہے تھے۔ مجھے متلی محسوس ہورہی تھی۔ ایسی حالت میں یہ خیال آنا بھی فطری سی بات تھی کہ یہ عالمِ نزع ہے اور میں فوت ہورہا ہوں۔

چند سیکنڈ یا چند منٹ کے بعد صورتِ حال کچھ واضح ہوئی تو مجھے سب سے پہلے تاریکی، ٹھنڈک اور نمی کا احساس ہوا۔ میرے جسم پر کپڑے بھی نہیں تھے۔ اوہ میرے خدا، میں فوت نہیں ہورہا ہوں، فوت ہوچکا ہوں۔ کسی زبردست غلط فہمی کی بنا پر لواحقین مجھے مُردہ سمجھ کے دفن کرگئے حالانکہ میں زندہ تھا۔

دوسرے ہی لمحے میں نے اس احمقانہ خیال کو بھی مسترد کردیا۔ یہ ماحول کا اثر تھا کہ میں خود کو قبر میں محسوس کررہا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ میں زندہ تھا۔ ایک دم مجھے یاد آگیا کہ یہ کیا جگہ ہوسکتی ہے اور میں کہاں ہوں۔ چوہدری دلاور نے اسی جگہ کا ذکر کیا تھا۔ الفاظ میں تصویر کشی کی تھی اور یہ بالکل وہی منظر تھا۔

میں نے آنکھیں پوری طرح کھول کے گردوپیش کا جائزہ لیا۔ میں ایک سرنگ میں نیم دراز تھا۔ گندا بدبودار پانی میرے بے لباس جسم کو چھوتا ہوا گزر رہا تھا۔ یہ پانی دائیں طرف سے آرہا تھا جہاں فولادی سلاخوں والی جالی تھی۔ اس جالی کے پیچھے کافی فاصلے پر ایک بلب جل رہا تھا۔ اب مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ سر گھما کے دوسری طرف دیکھوں۔ مجھے معلوم تھا کہ دوسری طرف کیا نظر آئے گا۔

میں نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھاما اور اُٹھ کر بیٹھنے میں کامیاب ہوگیا۔ اب بھی میرا سر کسی چٹان کی طرح ہورہا تھا جو زلزلے کی زد میں ہو۔ درد کے دریا کا ایک سیلاب تھا جس کا ریلا سر کی ہر دیوار سے ٹکرا رہا تھا۔ اس کا اثر میری آنکھوں پر بھی پڑا تھا۔ مجھے سارا منظر کچھ دھندلا سا نظر آرہا تھا۔ ہر چیز یوں دکھائی دے رہی تھی جیسے ایک حقیقی وجود کے ساتھ اس کا سایہ بھی ہے۔ یہ بڑی خطرناک بات تھی۔ یہ ہوسکتا تھا کہ کچھ دیر بعد مجھے دو کی جگہ ایک چیز نظر آنے لگے۔ چوٹ نے سر کے اس حصے کو متاثر کیا تھا جس کا براہ راست تعلق بصارت سے تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اندھا ہونے سے بال بال بچ گیا تھا۔

چوہدری دلاور نے وہی کیا تھا جو کہا تھا۔ شاید یہ سزا فوراً نہ ملتی۔ اس نے ایک موقع فراہم کرنے کا وعدہ بھی کیا تھا لیکن نازو کی جُرات نے جو اس کے نزدیک گستاخی تھی چوہدری دلاور کو اپنا ارادہ بدلنے پر مجبور کردیا تھا۔

سیوریج لائن واقعی پانچ فٹ قطر کی تھی مگر لائن کے تناسب سے اس میں پانی بہت کم تھا۔ نکاسیِ آب کا نظام بھی ایک اصول کے تحت بچھایا جاتا ہے۔ گھر کے اندر سے گلی میں آنے والی لائن چھ انچ کی ہو تو گلی کی لائن ایک فٹ کی ہوتی ہے۔ پھر ایک فٹ کی بہت سی لائنوں کا سلسلہ دو فٹ کی ایک لائن سے جا ملتا ہے۔ دو فٹ کی ہر لائن مزید آگے جا کے تین یا چار فٹ کی لائن میں شامل ہوتی ہے۔ استعمال شدہ پانی اور اس کے ساتھ بہہ کر آنے والی غلاظت کا تناسب اسی حساب سے بڑھتا جاتا ہے۔ ایک فٹ کی لائن میں سو گھروں کی نکاسی ہوتی ہے تو دو فٹ والی میں ہزار دو ہزار گھروں کی۔ علیٰ ہذا القیاس۔

حساب کے اس اندازے سے پانچ فٹ کی سیوریج لائن سے پانچ دس ہزار گھروں کا پانی اور غلاظت کا ریلا گزرتا تو میں اس کے فرش پر بیٹھ نہیں سکتا تھا اور پانی کی سطح صرف ایک فٹ نہیں ہو سکتی تھی۔ عام طور پر شہر کی گٹر لائنیں اُبلتی نظر آتی ہیں۔ صاف ہوں تب بھی پانچ فٹ کی لائن میں تین چار فٹ تک سیاہ بدبودار کیچڑ اور ہزاروں گھروں میں بسنے والے لاکھوں انسانوں کی گندگی بھری ہوئی نظر آتی ہے۔

یہ نتیجہ اخذ کر کے مجھے کچھ مایوسی ہوئی کہ جہاں ہم قید تھے وہاں آبادی نہ ہونے کے برابر تھی۔ یہ پانچ دس ہزار گھروں کا نہیں سو پچاس گھروں کا پانی تھا۔ اس علاقے میں مستقبل کی منصوبہ بندی کرتے ہوئے پانچ دس ہزار مکانوں کے لیے سیوریج لائن پہلے سے بچھادی گئی تھی مگر ابھی بہت کم گھر آباد ہوئے تھے۔ یہ کوئی ترقیاتی اسکیم تھی یا نئی آبادی جس میں زیادہ پلاٹ خریدے جا چکے ہوں گے مگر شہر سے فاصلے اور دیگر سہولیات کی عدم دستیابی کے باعث ابھی ہر شخص کو یہاں گھر بنانے کی جلدی نہیں تھی جو شہر کے وسط میں اور آبادی میں بازار کے نزدیک رہتے تھے۔ خواہ وہ اپنے مکان میں ہوں یا کرائے کے۔ انہیں اتنی دور آنے کی مجبوری نہیں تھی۔ ہاں مجبور لوگ مکانوں کے بڑھتے ہوئے کرایوں سے گھبرا کر یا اپنا مکان اپنی زندگی میں بنانے کی خواہش کے باعث دوری کی مجبوری بھی قبول کر لیتے ہیں۔ ہر جگہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ شہر پھیلتا ہے اور جو باہر کی آبادی 'نیا شہر' سیٹلائٹ ٹاؤن اور مضافات ہوتے ہیں وہ بھی بالآخر شہر کا حصہ بن جاتے ہیں۔ مضافات اور آگے نکل جاتے ہیں۔

مجھے یاد آیا کہ گرفتار کرنے والے ہمیں ملتان روڈ پر لائے تھے اور جس مکان میں ہم کو "مہمان" بنایا گیا تھا وہ سڑک سے بہت کم فاصلے پر تھا۔ وہ مکان الگ ضرور تھا مگر وہاں آبادی کم نہیں تھی۔ اس کے پیچھے سیکڑوں مکان نظر آ رہے تھے۔ کسی بھی مین روڈ کے ساتھ عموماً کمرشل پلاٹ ہوتے ہیں جو بڑے بھی ہوتے ہیں اور مہنگے بھی۔ پھر مین سیوریج لائن بھی سڑک سے کچھ فاصلے پر مگر اس کے متوازی اور نشیب کی جانب چلتی ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہم اس مکان میں بہرحال نہیں تھے جس کے فرش پر پاؤں مار کے دلاور نے کہا تھا کہ اس کے نیچے وہ زمین دوز زنداں ہے جہاں ہم کو لے جائے گا۔ اس نے الفاظ سے جو نقشہ کھینچا تھا یہ جگہ اس سے مطابقت رکھتی تھی مگر اس گھر کا حصہ بہرحال نہیں تھی۔ یہ دلاور کی عیاری نہیں بے وقوفی تھی کہ اس نے غلط بیانی کی۔ یہ فرض کرنا غلط تھا کہ ہم اس کی بات کا یقین کر لیں گے۔ ایسی غلطی دلاور تو کیا کوئی معمولی مجرم بھی نہیں کرتا کہ چار افراد کو اغوا کرے اور انہیں کھلی آنکھوں سے وہ جگہ دیکھنے کا موقع فراہم کرے جہاں ان کو غیر قانونی طور پر قید رکھا جائے گا اور پھر ان میں سے دو کو آزادانہ واپسی کی اجازت بھی دے کہ وہ سیدھے پولیس اسٹیشن جائیں اور اس جگہ کی نشاندہی کر دیں۔ نازو اور غالب پولیس سے مدد نہ لیتے تو بھی اپنے وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے اور ہماری رہائی کے لیے اس جگہ پہنچنے میں دیر نہ لگاتے۔ خواہ وہ سرنگ بنا کے ہم تک رسائی حاصل کرتے یا توپ خانہ لے کر چڑھائی کرتے مگر وہ آتے تو ہم کو صاف نکال لے جاتے اور اس قید خانے کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتے۔

یہ سب سوچ کے میری مایوسی بڑھ گئی۔ اگر غالب اور نازو کو واقعی چھوڑ دیا گیا تھا تب بھی یہ آس رکھنا بے سود تھا کہ وہ ہماری رہائی کی کوشش میں کامیاب ہوں گے۔ شاید وہ دوبارہ اس گھر میں داخل ہوں گے تو وہاں نقشہ ہی بدلا ہوا ملے گا۔ کوئی بوڑھا ریٹائرڈ کرنل یا سول سرونٹ انہیں اپنے آراستہ ڈرائنگ روم میں بٹھا کے پوچھے گا کہ آخر یہ معاملہ کیا ہے۔ کچھ مجھے بھی بتائیں۔ یہاں تو میں ایک سال سے اپنی فیملی کے ساتھ رہتا ہوں۔ یا اس مکان میں چادریں، کھیس اور تولیے بنانے کی دیسی کھڈی پر کاریگر مصروف ہوں گے اور مالک یا منیجر کو غالب اور نازو ہی مشکوک نظر آئیں گے۔ اگر آپ نشے میں نہیں ہیں تو پھر کچھ اور بات ہے۔ آپ غلط گھر میں۔ غلط سڑک پر یا غلط شہر میں آگئے ہیں۔ کیا کہیں گے خفت کے مارے غالب اور نازو اس کے جواب میں۔ بے سمجھائیں گے کہ جب واسطہ چوہدری دلاور جیسے حریف سے ہو تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ دن میں تارے نظر آ سکتے ہیں۔ جو سچ تھا وہ جھوٹ ہو سکتا ہے۔ دو اور دو پانچ بن سکتے ہیں۔

پہلے دلاور ہمارے رحم و کرم پر تھا۔ صرف ہم جانتے تھے کہ وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔ ایسے ہی اب ہم چوہدری دلاور کے "مہمان" تھے اور اس کی خاطر تواضع کا اپنا انداز تھا۔ بہت کچھ اس نے جوشِ جذبات میں بتا دیا تھا۔ وہ نہ بتاتا تب بھی ہم اندازہ کر سکتے تھے کہ ہماری سزا کئی گنا سخت اور زیادہ عبرت ناک ہوگی۔ کھیل وہی تھا۔ مہرے بدل گئے تھے۔ پہلی بازی دلاور کے وضع کیے ہوئے اصولوں پر ہوتی تو دوسری بازی کے لیے ہم اپنے اصول وضع کرتے ہوئے اینٹ کا جواب پتھر سے دیتے۔

جہاں دلاور قید تھا وہاں ہمیں یہ خطرہ ہر وقت لاحق رہتا تھا کہ کوئی ہمیں آتا جاتا نہ دیکھ لے۔ کوئی تعاقب کرتا ہوا ہمارے پیچھے اس قید خانے تک نہ پہنچ جائے جو عین شہر میں ایک پُرہجوم زین اور ہر وقت آباد رہنے والی جگہ پر واقع تھا۔ یہاں دلاور کے لیے کوئی خطرے کی بات نہیں تھی۔ یہ جگہ چوہدری کی تھی اور آنے جانے والوں کو دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔ اگر کوئی یہاں تک پیچھا کرتا تو خود بھی پکڑا جاتا۔ غالب اور نازو کا ہم تک پہنچ جانا کسی فلمی فارمولے کے اتفاقات کا نتیجہ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ حقیقی زندگی میں بھی کوئی بات غیر منطقی نہیں ہوتی۔ اس خیال سے دل کو بہلانا پاگل پن کہلاتا کہ غیب سے کوئی فرشتہ نمودار ہوگا اور ہمیں یوں نکال کر لے جائے گا جیسے الٰہ دین کو چراغ کا جن غار سے نکال لے گیا تھا۔ اگر کچھ امید کی جا سکتی تھی تو چوہدری دلاور کی بیوی سے۔ شاید وہ ہمت کرے اور کوشش کرتی رہے کہ اس کے شوہر کا غصہ ٹھنڈا پڑ جائے۔ وہ پھر چوہدری دلاور کے دل میں یہ احساس پیدا کرے کہ احسان کا بدلہ ضرور چُکانا چاہیے۔ خود دلاور کے مسلک میں دشمن کے لیے رعایت کا تصور نہیں تھا۔ یہ حیرت کی بات تھی کہ بیوی نے اسے اپنے اصول بدلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ انتقام کے ایک آتش فشاں کو تنہا اپنی ذاتی کوشش سے اس حد تک سرد کر دیا تھا کہ اس نے ہمیں جلا کے راکھ نہیں کیا۔ عورت بڑی پاور ہے۔ جس نے آدم کو جنت سے نکلوا دیا۔ ہٹلر جیسے ڈکٹیٹر کے دل پر حکمرانی کی اور اسے اپنے ساتھ ہی دنیا سے لے گئی۔ جس نے ایڈورڈ ہشتم کو مجبور کر دیا کہ تاجِ برطانیہ کو ٹھکرا دے۔ ایسی ہی کوئی عورت چوہدری دلاور جیسے پتھر کے انسان کو موم کا پتلا بنا سکتی تھی اور بلاشبہ وہ ایسی ہی عورت تھی۔ اسے اپنی ذہانت اور بدن کی طاقت کے ساتھ ہی دلاور کی ذات کے حصار کی ہر کمزوری کا بھرپور ادراک تھا۔ وہ جانتی تھی کہ کب مفتوح اور مغلوب کنیز بن کے مرد کی انا کے سامنے سر جھکا دینا چاہیے اور اپنا سب کچھ اس کے حوالے کر کے سب کچھ برداشت کر لینا چاہیے اور کب کسی لمحے کی کمزوری کو اپنی شہ زوری کا ایٹم بم بنا کے استعمال کر لینا چاہیے کہ انا مرد ہیروشیما کی طرح ڈھیر ہو جائے۔ جیسے ہر مرد انتھونی، ہٹلر یا ایڈورڈ ہشتم نہیں ہوتا ایسے ہی ہر عورت بھی کلوپیٹرا، ایوا براؤن یا مسز سمپسن نہیں ہو سکتی۔ تاہم چوہدری دلاور کے لیے اس کی بیوی کو اسی طرح دستِ قدرت نے بطورِ خاص بنایا تھا۔ جس طرح میرے لیے رابعہ کو یا غالب کے لیے نازو کو۔

میں گھٹنوں میں سر رکھے سمٹا سمٹایا اپنے خیالات میں گم اور دنیا سے بےنیاز بیٹھا ہوا تھا۔ غلاظت اور بدبو کا احساس مجھے ابھی تک نہیں ہوا تھا۔ بڑے عذاب میں مبتلا آدمی کے لیے چھوٹی سی تکلیف بے وزن ہو جاتی ہے۔ جو کینسر میں مبتلا ہو اس کو ایک پھنسی کا پتا بھی نہیں چلتا۔ مجھے بھی سب سے زیادہ تکلیف اپنی بے لباسی پر تھی۔ قیدی میں ہونے کی اذیت کا خیال اس کے بعد تھا۔ مجھے یہ بھی علم تھا کہ کچھ فاصلے پر رابعہ کے لیے یہی عذاب کا سامان ہے مگر میں اس کی طرف کیسے دیکھتا۔ مجھ میں تو خود کو دیکھنے کی ہمت نہیں تھی۔

لائن کی دیواروں پر کاکروچ پھر رہے تھے۔ گندے پانی میں کیڑے کلبلا رہے تھے اور اوپر چڑھنے کی کوشش میں بار بار نیچے گر رہے تھے۔ میں نے مکڑیاں اور چیونٹے بھی دیکھے۔ پھر اچانک میرے پاؤں کے انگوٹھے کو جیسے کسی نے خنجر کی تیز نوک سے اُدھیڑ دیا۔ تکلیف سے تڑپ کر میں نے پاؤں کو پیچھے کیا اور بڑی مشکل سے اپنی چیخ کو دبایا۔

بلی کے سائز کا ایک چوہے جیسا جانور تیزی سے بھاگتا ہوا جال کے پیچھے غائب ہو گیا۔ خوف سے میرا رُواں رُواں کھڑا ہو گیا۔ کیا یہ گوشت خور جانور مجھے لاش سمجھ کے میرے بدن کو کھانے آیا تھا؟ چوہے بلی کیا شیر تک انسان سے ڈرتا ہے اور جب تک مجبور نہ ہو جائے حملہ نہیں کرتا۔ لاش پر تو چیل کوّے بھی بھیڑیوں کے ساتھ آ جاتے ہیں۔

میرے انگوٹھے سے خون بہہ رہا تھا۔ میں نے زخم کو انگلی اور انگوٹھے کی مدد سے دبا کے روکا۔ صاف پانی ہوتا تو میں زخم کو دھو کے صاف کرتا مگر اس پانی سے تو الٹا سیپٹک ہو جانے کا ڈر تھا۔ سردی کے باوجود مجھے پسینہ آ گیا تھا۔ یہ خطرناک اور سفاک چوہا اس جال سے نکل کے فرار ہوا تھا جدھر سے بلب کی روشنی آ رہی تھی۔ اس محدود روشنی میں سرنگ جیسی لائن سو دو سو گز تک بھی مشکل سے نظر آتی تھی۔ اس کے بعد اندھیرا تھا جو ٹھوس سیاہ دیوار کی طرح ہمارے اور زندہ انسانوں کی دنیا کے درمیان حائل تھا۔ یہ اندازہ کرنا محال تھا کہ اس سرنگ میں کوئی موڑ کہاں آتا ہے اور زمین کی سطح کے اوپر طلوع ہونے کے لیے مین ہول کتنی دور ہے۔ مین ہول اگر ایک گز دور ہوتا تب بھی بے کار تھا۔ کیونکہ درمیان میں لوہے کی سلاخوں کی مضبوط جالی تھی جس سے صرف میرا ہاتھ گزر سکتا تھا۔ یہ سلاخیں آدھا انچ موٹی تھیں اور صاف ظاہر تھا کہ خصوصی انتظام کے طور پر نصب کی گئی ہیں ورنہ کسی گٹر لائن میں ایسا پنجرہ نہیں ہوتا۔ یہ پنجرہ بنانے والوں کو فوری طور پر یہ اندیشہ بھی لاحق نہیں تھا کہ اس سے سیوریج کا فلو متاثر ہوگا اور لائن چوک ہو جائے گی۔ چھوٹا موٹا کچرا چھ انچ مربع جالی سے نکل سکتا تھا اور بالفرض کوئی بڑی چیز اَڑ جاتی تو وہ نیچے آ کے اس کو ہٹا بھی سکتے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق بلب لٹکانے کے لیے مین ہول ہی کا انتخاب کیا گیا ہوگا اور کوئی نیچے آئے گا تو ڈھکنا ہٹا کے ہی اُترے گا۔

رابعہ نے چیخ ماری تو میں اچھل پڑا اور گھبرا کے اٹھا تو میرا سر اوپر کی مدور چھت سے لگا۔ اس چیخ کی گونج کسی اسٹیم انجن سے زیادہ بھیانک اور سمع خراش تھی۔

میں نے چلّا کے کہا "رابعہ۔" اور پھر اس کی طرف دیکھا تو میری آنکھیں خود ہی بند ہو گئیں۔

میری طرف اس کی پشت تھی اور وہ بھی میری طرح گھٹنوں میں

سر دیے اور دونوں ہاتھوں سے جسم سمیٹے یوں بیٹھی ہوئی تھی کہ خود کو بھی نہ دیکھ سکے۔

وہ چلانے لگی "سکندر۔ سکندر، میری طرف مت دیکھو۔ میں چیخ چیخ کر مرجاؤں تب بھی مجھے مت دیکھنا۔"

میں نے کہا "جان۔ میری آنکھیں بند ہیں لیکن میں اندھا تو نہیں ہوسکتا۔ پردہ ہوتا ہے نظر کا اور نیت کا۔"

وہ چلائی "نہیں، نہیں۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔ میں نے غلطی کی جو چیخ ماری۔"

"کیا تم مرنے سے ڈرتی ہو؟"

"مجھ سے یہ ذلت کی موت برداشت نہیں ہوتی سکندر۔" وہ زاروقطار رو رہی تھی "دلاور سے کہو ہمیں گولی مار دے۔ زہر دے دے۔ جیسے چاہے مار ڈالے۔ ہماری لاشوں کو یہاں پڑا رہنے دے لیکن ایسے زندہ نہ رکھے۔"

"وہ ایسے ہی زندہ رکھنا چاہتا ہے ہمیں رابعہ۔ اور موت اپنے وقت پر آئے گی" میں نے اسے تسلی دی "اگر یہ آزمائش ہے تو اسے برداشت کرنا ہوگا۔ ہمارے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے۔"

"یہاں چوہے بھی ہیں سکندر۔ آدم خور چوہے۔"

"ہاں۔ ایک چوہے نے میرے پاؤں کے انگوٹھے پر کاٹا تھا۔"

وہ بولی "میرے بھی انگوٹھے کا گوشت نوچ لیا تھا اس نے۔ میں خون دیکھ کے دہشت زدہ ہوگئی تھی۔"

میں نے کہا "دیکھو رابعہ۔ تم بھی اپنی آنکھیں بند کرلو۔ اور پھر اُٹھ کے آہستہ آہستہ میری طرف آؤ۔"

"نہیں، نہیں سکندر۔"

"حوصلہ رکھو جان۔ یہاں کون ہے ہمارے سوا اور جب ہم ایک دوسرے کی طرف دیکھ ہی نہیں رہے تو پھر قریب آکے بات کرنے میں کیا حرج ہے۔ سمجھ لو تم بھی باتھ روم میں ہو، اور میں دوسرے باتھ روم میں ہوں لیکن ہم ایک دوسرے کی آواز سُن سکتے ہیں۔"

"سکندر۔ تم کچھ نہیں کرسکتے، خدا کے لیے کچھ کرو۔"

میں نے کہا "مجھے بتاؤ، میں کیا کروں؟ یہاں کرنے کو کچھ بھی نہیں ہے۔ میں خالی ہاتھوں سے ان سلاخوں کو نہیں اُدھیڑ سکتا۔ میں دائیں بائیں اوپر نیچے کہیں بھی اس سرنگ میں سوراخ تک نہیں کرسکتا۔ ایک درز تک نہیں بنا سکتا۔ یہ سیمنٹ اور جال کی طرح لپٹے ہوئے فولادی تاروں سے بنی ہوئی لائن ہے۔ میرے ہاتھ میں ہتھوڑا ہوتا تب بھی میں اس کے اوپر کئی فٹ مٹی نہیں کھود سکتا تھا۔"

"میں نے کہا تھا نا۔ میں مرجانا چاہتی ہوں تمہارے ساتھ۔ کتنا اچھا وقت تھا وہ۔ وہ کتنی اچھی موت ہوتی" اس کی آواز اب زیادہ نزدیک آگئی تھی۔

"کیا تمہیں معلوم ہے... یہ جگہ کہاں ہوگی؟"

"دلاور نے کہا تھا..."

"دلاور نے جھوٹ بولا تھا" میں نے اسے اپنے انداز... بارے میں بتایا۔

وہ قائل ہوگئی "ایسے کتنے دن زندہ رہیں گے ہم سکندر..."

"جب تک خدا کو منظور ہوگا۔ لیکن ہم حوصلہ نہیں ہاریں... رابعہ۔ آخری سانس تک، وعدہ کرو۔"

"پہلے مجھے مرنے دینا سکندر۔"

"ایسی باتیں مت کرو۔ ہم زندہ رہیں گے۔ مجھے خدا... بھروسا ہے۔"

"بھروسا تو مجھے بھی ہے... لیکن... لیکن میں اکیلی رہ گئی تو..."

"ایسا نہیں ہوگا۔ اس سے پہلے ہی کوئی بچا لے گا ہمیں۔"

اس نے کہا "کون؟ یہاں تو غالب اور نازو بھی نہیں پہنچ... تم نے ہی کہا ہے۔"

مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ رابعہ کو پرامید رکھنے کے... مجھے اپنی اخذ کردہ معلومات کو اپنی ذات تک محدود رکھنا چاہیے تھا... یہ امید اس کا بہت بڑا سہارا رہتی کہ ہم اسی گھر کے تہ خانے... ہیں جہاں غالب اور نازو کا کسی وقت بھی پہنچ کے ہمیں ساتھ... جانا عین ممکن ہے۔ میں نے اس امید کی بنیاد ہی نہیں رہنے دی... تھی۔ احمق... احمق... میں نے خود سے کہا۔

میں نے کہا "رونا بند کرو جاناں۔ میں اتنا مجبور ہوں... تمہارے آنسو پونچھ بھی نہیں سکتا۔ میں نہ دیکھنے کے باوجود تمہاری... آنکھوں میں آنسو دیکھ رہا ہوں۔ رونے سے کچھ فائدہ نہیں ہوا... یہ ٹھیک ہے کہ غالب اور نازو کا یہاں پہنچ... شاید ممکن نہ ہو... اس لیے کہ جو کچھ میں نے تم کو بتایا وہ غلط بھی ہوسکتا ہے۔"

"نہیں۔ تمہارا ذہن کام کر رہا ہے۔ بالکل ٹھیک نتائج اخذ... تھے تم نے۔"

میں نے اپنی بات جاری رکھی "لیکن میں سمجھتا ہوں کہ دلاور... کی بیوی کی کوشش سے ہم بچ جائیں گے۔ اس عورت کے دل... احسان مندی کے جذبات ہیں۔ ہم نے اسے بچایا، اس کے گھر... کو، شوہر کو اور بچوں کو اور دیکھا جائے تو ان کا سب کچھ ہم نے... بچایا تھا۔ میں اور محسن اسے نہ نکالتے تو وہ بھی آفس میں لگنے... آگ میں جل کے خاک ہوجاتی یا اس سے پہلے ہی دم گھٹ... ہلاک ہوجاتی۔ پھر شوکت رانا اس کے بچوں کو بھی ٹھکانے لگا... اس کے کاروبار پر قابض ہوجاتا اور پھر دلاور ملتا تو اسے کیا ملتا..."

"یہ تو ٹھیک ہے مگر دلاور..."

میں نے کہا "ہاں دلاور، کمینہ اور احسان فراموش ہے... اس میں ایک تبدیلی نوٹ کی تم نے۔ پہلے وہ بیوی کو کچھ نہیں... تھا لیکن اب وہ اسے کتنی اہمیت دینے لگا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ... کی شریکِ حیات نے اس کی عدم موجودگی میں حالات کا مردانہ... مقابلہ کیا۔ عورت ہونے کے باوجود ہار نہیں مانی۔ شوکت رانا... دشمنوں سے خود کو بھی بچایا اور بچوں کو بھی۔ پریس کانفرنس میں ان دشمنوں کے عزائم کا پردہ چاک کردیا اور انہیں کاروبار پر قابض نہیں ہونے دیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ دلاور کو بھی تلاش کرتی رہی اور اس تلاش میں کامیاب بھی ہوگئی۔ جو کام چوہدری دلاور کے نمک خوار اور پولیس کے وظیفہ خوار نہیں کرسکتے تھے وہ ایک عورت نے کیا۔ اس لیے اب وہ بیوی کی قدر کرتا ہے اور اس کی بات مانتا ہے۔ ابھی غصے میں اس نے ایک قدم اٹھایا ہے۔ مگر دیکھو بیوی نے ایک بات تو فوراً ہی منوالی تھی اس سے۔ غالب اور نازو کو چھوڑ دیا گیا۔"

رابعہ نے بالکل بدلے ہوئے لہجے میں کہا "تمہیں امید ہے کہ وہ چوہدری دلاور سے ہماری سفارش کرے گی تو... دلاور ہمیں چھوڑ دے گا۔"

"امید ہی نہیں۔ یقین ہے" میں نے رابعہ کا حوصلہ بڑھانے کے لیے کہا "دلاور نے کہا تھا کہ احسان کا بدلہ اُتارنے کے لیے وہ ہمیں ایک چانس دے گا۔ آخر کیا مطلب تھا اس بات کا؟ یہی کہ وہ ہم سے بدلہ نہیں لے گا۔ وہ بدلہ لے سکتا ہے مگر ایک بار ہم نے اس کی زندگی بچائی..."

"ہم نے اس کی زندگی نہیں بچائی۔"

"یار، ایک ہی بات ہے۔ ہم نے بیوی کو بچایا اور بیوی نے چالاکی سے اور ہمت سے کام لے کر شوہر کو بچالیا۔ اب بیوی کے کہنے پر ہی وہ ہمیں چھوڑے گا کہ جاؤ، یار زندہ صحبت باقی۔ اگلے راؤنڈ میں ہم پھر ملیں گے تو دشمنی کا سلسلہ پھر وہیں سے شروع کریں گے جہاں سے ٹوٹا تھا۔ احسان برابر۔ لیکن میرا دل یہ بھی کہتا ہے کہ دلاور احسان کو بہانہ بنا کے اپنی جان چھڑانا چاہتا ہے۔ وہ تھک گیا ہے یا اس کا حوصلہ جواب دے رہا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اب ہر قیمت پر صلح ہوجائے۔ وہ تاوانِ جنگ ادا کرنے کی بات پہلے بھی کرچکا ہے۔ ہوسکتا ہے اب وہ کہے کہ چلو شرائط تم بتاؤ، میں ہر شرط منظور کرتا ہوں۔"

"سوائے ایک شرط کے۔ مجھے تختۂ دار تک پہنچانے کی ضد چھوڑ دو۔"

"ہاں۔ بالکل ٹھیک سمجھا تم نے۔"

"پھر ہم کیا کریں گے سکندر! اگر اس نے واقعی ہر بات مان لی؟"

"قانون داں تم ہو۔ تم بتاؤ... اور دیکھو، میں مزید آنکھیں بند نہیں رکھ سکتا۔"

"نہیں سکندر۔ میں مرجاؤں گی شرم سے۔"

"بھئی میں منہ پھیر کے کھڑا ہوجاتا ہوں۔ تم بھی میری طرف پیٹھ کرلو۔ بلکہ جہاں کھڑی ہو وہیں بیٹھ جاؤ۔" میں نے کہا۔

"یہاں... یہاں تو کاکروچ بہت ہیں۔"

"کاکروچ کاٹتے ہیں؟"

"مگر مجھے ڈر لگتا ہے۔"

میں نے کہا "لگنے دو۔ میرے تمہارے درمیان چھ فٹ کا فاصلہ ہے اور دُہری جالی ہے۔ اسے توڑ کے میں تمہارا خوف دور کرنے آسکتا تب بھی اس حالت میں نہ آتا۔"

"یہاں تو... چھپکلیاں بھی ہوں گی۔"

"ایک تو تم خود ہو" میں نے کہا۔

"کیڑے رینگ رہے ہیں دیواروں پر، چیونٹے ہیں۔"

"اب یہی دیکھتی رہوگی آنکھیں بند کرلو۔ سب غائب ہوجائیں گے۔ حیرت ہے ابھی تک تم نے بدبو پر ناگواری کا اظہار نہیں کیا۔"

"سکندر۔ کھائے پیے بغیر آدمی کب تک زندہ رہ سکتا ہے؟"

میں نے کہا "آدمی؟ کون سا آدمی۔ اپنا یار منظر شاید ایک دن بعد اللہ کو پیارا ہوجائے گا۔ میں نے کبھی اس کا تجربہ نہیں کیا۔ ہر آدمی کی قوتِ برداشت الگ ہوتی ہے۔ ایک ہفتہ جی سکتے ہیں ہم۔"

"پھر تڑپ تڑپ کر مرجائیں گے" وہ سہم کے بولی۔

"پھر وہی بے وقوفی کی بات۔ اس سے پہلے ہمیں نکال لیا جائے گا" میں نے کہا۔

میں بہت پُراعتماد لہجے میں بات کر رہا تھا مگر اندر سے میری اپنی بھی وہی حالت تھی جو رابعہ کی تھی۔ جتنا میں اس تصور کو ذہن سے دور رکھنے کی کوشش کرتا تھا اتنا ہی اپنے انجام کا خوف میرے اعصاب پر مسلط ہوتا جاتا تھا اور میرے لیے آنے والے وقت کی بھیانک تصویر زیادہ واضح ہونے لگتی تھی۔ ابھی چند گھنٹے گزرے تھے۔ باہر کی دنیا میں نہ جانے کیا وقت ہوا تھا لیکن اندر وقت تھم سا گیا تھا اور تاریکی جو رات کی علامت ہوتی ہے منجمد ہو کے ٹھہر چکی تھی۔ ایک بلب تھا جو تھوڑی سی روشنی فراہم کر رہا تھا۔ روشنی بھی زندگی کی علامت ہوتی ہے۔ جب سورج طلوع ہوتا ہے اور دن کی مسافت طے کرکے غروب ہوتا ہے تو چاند نکل آتا ہے اور تاروں کا سفر شروع ہوجاتا ہے۔ اس حرکت سے روز و شب اور ماہ و سال کا اور زندگی کے سفر میں پیش رفت کا احساس باقی رہتا ہے۔ مسلسل ایک ہی جگہ ایک ہی انداز میں جلنے والا بلب جمود کی علامت بن گیا تھا۔ اگر میری کلائی پر گھڑی ہوتی تو اس کی متحرک سوئیاں دیکھ کے بھی وقت کے ساتھ رشتہ استوار رکھا جاسکتا تھا۔ مگر انہوں نے میرے پاس کچھ بھی نہیں چھوڑا تھا جو آج کے وقت کے فیصلے کی رو سے بااختیار تھے۔

قید میں ایک عذاب اپنی بے بسی کے احساس کا ہوتا ہے تو دوسرا اپنے ہی خیالات کے غولِ بیابانی کا جو اکیلا پا کے ہر سمت سے یلغار کرتے ہیں جیسے جنگل میں تنہا مسافر کو رات کے وقت بھیڑیے ہر طرف سے گھیراؤ کرکے ڈراتے ہوں۔ کوئی ان سے بھاگ کے جا بھی کہاں سکتا ہے۔

ابھی سارا دن اور پھر آنے والی رات ہے۔ میں نے سوچا۔ لیکن مجھے کیا معلوم کہ باہر رات ہے یا دن باقی ہے۔ میں کتنی دیر بے ہوش رہا تھا۔ اس کا میرے پاس کوئی حساب نہیں۔

رابعہ نے کہا "تمہارے سر پر پیڈرو نے ریوالور کا بٹ مارا تھا۔"

میں نے چونک کے کہا "تم نے دیکھا تھا؟"

"ہاں۔ تم دروازے سے بائیں طرف مڑے تھے۔ اس نے دائیں جانب سے آکے وار کیا تھا۔ میں پیچھے تھی اس لیے میں نے دیکھ لیا تھا۔"

"کیا تمہارے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا؟"

"نہیں۔ میں نے خود ہی کہہ دیا تھا کہ میں.... کچھ نہیں کروں گی...."

میں نے کہا "تم کر بھی کیا سکتی تھیں۔ خطرہ انہیں صرف مجھ سے تھا۔"

رابعہ نے شرمندگی سے کہا "واقعی۔ میں بالکل بے کار ہوں۔ کچھ بھی نہیں آتا مجھے قانونی دلائل دینے کے سوا۔ وہ کون سنتا ہے یہاں۔"

میں نے کہا "جو تم نے کیا وہ کوئی اور نہیں کر سکتا تھا۔ صرف میرے لیے نہیں، دلاور کے خلاف قانونی جنگ میں ہمارا سب سے مؤثر ہتھیار تم تھیں۔ قانون کی زنجیر میں تم نے ہی دلاور کو جکڑا تھا۔"

"کیا فرق پڑا اس سے.... وہ زنجیریں اسے روک نہیں سکتی تھیں، کتنی آسانی سے نکل گیا وہ اور ہم...."

میں نے کہا "ہر مجرم موقع ملنے پر قید سے فرار ہو جاتا ہے مگر موت سے فرار ہو کے کوئی کہاں جا سکتا ہے۔ چوہدری دلاور کو گولی مارنا تو ایک معمولی بدمعاش کے لیے بھی آسان تھا مگر اسے تختۂ دار تک پہنچانے کی طاقت تمہارے پاس ہے۔"

"یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔"

میں نے کہا "کیا یہ بھی غلط ہے کہ میرے لیے جینے کا سہارا بھی تم ہو اور بہانہ بھی۔ میری زندگی کی تمنا بھی تم ہو اور حاصلِ تمنا بھی۔"

"یہاں بھی۔ اس حالت میں بھی رومانٹک شاعری سوجھ رہی ہے تمہیں" رابعہ نے بدمزگی سے کہا۔

میں نے کہا "اچھا یہ بتاؤ" کتنی دیر ہو چکی ہے ہمیں یہاں آئے۔ تم تو ہوش میں تھیں۔"

"میرا خیال ہے تین چار گھنٹے۔"

"یعنی دو گھنٹے سے زیادہ بے ہوش پڑا رہا میں۔"

رابعہ نے کہا "ابھی نہ جانے کتنا وقت اور گزرے گا ایسے ہی۔ میں نے سُنا ہے... اور پڑھا بھی ہے کہ بھوک اور پیاس جب ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے تو آدمی بالکل جانور ہو جاتا ہے۔"

میں نے فلسفیانہ انداز میں کہا "آدمی بہرحال جانور ہے۔ حیوان ناطق۔ دو ٹانگوں پر چلنے والا، بندر کی طرح۔"

رابعہ بولتی رہی "وہ سب کچھ کھا جاتا ہے۔ گھاس پھوس، کوڑا کچرا، حرام اور مردار... اور... ایسا پانی تک پینے لگتا ہے۔"

میں نے درشتی سے کہا "دیکھو رابعہ۔ یہ سب میں بھی جانتا ہوں لیکن ہم پر خدا نہ کرے ایسا وقت آئے۔ ایسی مایوسی کی باتیں کرنے سے فائدہ؟ میں مانتا ہوں کہ ذہن میں مایوسی کا غلبہ ہو تو ایسے خیالات پریشان کرتے ہیں مگر ان کا اظہار زبان سے کر کے آدمی دوسروں کو بھی پریشان کرتا ہے۔ خود اپنی پریشانی کم نہیں ہوتی۔ فریاد اور واویلے سے بہتر تو خاموشی ہے۔ اچھی باتیں کرو، حوصلہ بڑھانے والی۔ یقین رکھو کہ خدا ظالم نہیں ہے، وہ رحمان اور رحیم ہے۔ وہ عدل کرتا ہے، دنیا و آخرت میں اس کی سزا و جزا کا پیمانہ وہ نہیں جو چوہدری دلاور کا ہے۔ اسی لیے ناامیدی کو کفر سمجھا جاتا ہے۔"

وہ رونے لگی "آئی ایم سوری سکندر۔ بتاؤ، میں کیا کروں۔ مجھ میں تمہارے برابر حوصلہ نہیں ہے۔ مجھے لگتا ہے میں پاگل ہو جاؤں گی۔ یا شاید ہو گئی ہوں ابھی سے۔ تم ٹھیک کہتے ہو، تمہاری ہر بات میرے دل کو لگتی ہے۔ میں نے بچپن میں ایک نظم پڑھی تھی۔ کیونکہ میرا خدا ہے میرے ساتھ، یہی ایک مصرع یاد رہ گیا ہے..."

وہ بولتی رہی۔ میں سنتا رہا۔ پھر وہ بھی خاموش ہو گئی اور میں بھی خاموشی میں بہت کچھ سوچتا رہا اور سنتا رہا۔ وہ آوازیں جو خیالوں میں دلاسا دیتی تھیں اور وہ آوازیں جو امید کو سراب کہتی تھیں۔ غالب اور نازو کی آواز۔ وقار یوسف اور نکی۔ محسن اور گل، منظر اور مولوی خادم حسین۔ ہر آواز کا ایک روپ تھا۔ یہ جیتی جاگتی آوازیں تھیں جن کا راستہ دیواریں نہیں روک سکتی تھیں۔ مولوی خادم حسین کا خیال آیا تو میں مسکرانے لگا۔ پھر تصور مجھے بہت دور لاہور سے کراچی لے گیا۔ جہاں اکرام شیخ تھا اور کاجل تھی۔ جہاں سے ساری خرابی شروع ہوئی تھی۔

ایک بار پھر رابعہ نے مجھے حقائق کی سنگین دنیا میں کھینچ لیا۔ اس نے کہا "جب رات ہو گی، تو کیا نیند آئے گی؟"

میں نے بے خیالی میں کہا "نیند تو سولی پر بھی آ جاتی ہے۔"

"یہ محاورہ ہے۔ وہ ہمیشہ کی نیند ہوتی ہے۔ یہاں تو میرا کھڑا ہونا بھی مشکل ہے۔ تم کیسے بیٹھے ہو۔ کمر سیدھی کرنے کی جگہ بھی نہیں ہے۔ میرے پاؤں سن ہو گئے ہیں اس پانی میں۔ ٹانگیں اکڑ گئی ہیں۔ تم کہتے ہو ایسی حالت میں نیند آ جائے گی؟ چوبیس گھنٹے جاگنے کا تجربہ ہے مجھے۔ یہاں شاید اس سے پہلے ہی میں تھک کے گر جاؤں گی، اسی پانی میں۔"

میں نے سپاٹ لہجے میں کہا "کوشش کرنا کہ سر پانی سے اوپر رہے ورنہ ڈوب کے مر جاؤ گی چلو بھر پانی میں۔ اور پانی بھی ایسا۔ میں کہتا ہوں تم چپ نہیں بیٹھ سکتیں؟ کچھ دیر بعد پھر بولنے لگو گی۔ مجھے

بھوک لگی ہے۔ سردی لگ رہی ہے، نیند آ رہی ہے۔ پیاس لگی ہے۔ بتاؤ میں کیا کروں، اور کیسے کروں پھر شروع کر دیا رونا۔ ٹھیک ہے۔ بہا دو سارے آنسو اس غلیظ پانی میں..."

میری بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ بلب جھولنے لگا۔ پھر عین بلب کی جگہ روشنی کا ایک دائرہ نمودار ہوا۔ یہ اوپر کی دنیا سے آنے والی سورج کی روشنی تھی۔

میں نے کہا "رابعہ۔ کوئی آیا ہے۔"

"میں پلٹ کے نہیں دیکھوں گی، تم بتاتے رہنا کون آیا ہے۔"

میں نے کہا "یہ گٹر کا ڈھکن تھا۔ اسے کھول کے اُترے گا کوئی۔ رسی کی سیڑھی لٹکائی ہے کسی نے۔ ایک حکم کا غلام اُترا ہے۔ اس کا مطلب ہے.... نہیں، یہ تو خالی ہاتھ آیا ہے۔ ایک طرف کھڑا ہو گیا ہے سر جھکا کے۔ اب کسی نے اوپر سے کرسی پکڑا دی ہے۔ اس نے سیڑھی کے پاس فولڈنگ کرسی کو کھول دیا ہے۔ جیسی معذوروں والی وہیل چیئر ہوتی ہے۔ یہ کچھ ایسی ہی کرسی ہے۔ اس میں نیچے پہیے لگے ہوئے ہیں۔ بہت چھوٹے چھوٹے۔ میرا خیال ہے کہ اب دلاور آئے گا۔ وہ سیدھا چل نہیں سکتا اس جگہ اور کھڑا بھی نہیں رہ سکتا۔ وہ کرسی پر بیٹھ کے آگے آئے گا۔ اس کے پاؤں بھی پانی سے اوپر رہیں گے۔ میرا خیال درست تھا رابعہ۔"

رابعہ نے کہا "چوہدری دلاور آیا ہے... اکیلا؟"

"ہاں۔ اس نے محافظ کو واپس اوپر بھیج دیا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک ہاکی ہے۔ اس ہاکی سے وہ اپنی کرسی کو آگے بڑھانے میں مدد دے رہا ہے۔ کرسی خاص طور پر بنوائی گئی ہو گی۔ اس کے دو پہیے دائیں جانب کی دیوار پر ہیں۔ دو بائیں جانب۔ کرسی پھسلتی آ رہی ہے۔"

"میں کیا کروں سکندر۔ وہ کمینہ مجھے اس طرح دیکھے گا۔"

"اپنی آنکھیں بند کر لو۔ کان کھلے رکھو۔ آخر میں بھی تو اس کا سامنا کروں گا۔ بے شرمی کے ساتھ۔"

دلاور جالی کے دوسری طرف مجھ سے دس فٹ کے فاصلے پر رُک گیا تھا۔ اس کی آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں اور اس کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اس کی ہر بات پر مشتعل ہونے سے گریز کروں گا۔ وہ کچھ بھی کہے، میں بہرا بن جاؤں گا اور اس کے کسی سوال کا جواب دینا ہی پڑا تو اشتعال انگیزی سے کام نہیں لوں گا۔ زندہ رہنے کی کوشش کرنا میرا فرض تھا۔ مصلحت اور مصالحت کی ڈپلومیسی بھی اس فرض کا حصہ تھی۔

"تم دونوں تو روٹھے بیٹھے ہو" دلاور نے کہا "ایک دوسرے کی طرف دیکھ بھی نہیں رہے۔ ہیں جی، اچھا... شرم آ رہی ہے میرے سامنے۔ ویسے تو اپنے سکندر اعظم نے مس رابعہ کی ساری دنیا فتح کر لی ہو گی نہ جانے کتنی بار۔ فتح کے جھنڈے گاڑ دیے ہوں گے ہر جگہ۔ خیر سے کیسا لگ رہا ہے میرا بندوبست؟ میں نے سوچا کہ مہمان ہیں۔ کہیں خاطرداری میں کمی نہ رہ جائے۔ ہیں جی، خود چل کے دیکھنا چاہیے۔ کیسی خوب صورت جگہ ہے۔ مہکتی فضا ہے اور سمجھ لو کہ نہر بہہ رہی ہے درمیان میں۔ یہ بلب نہیں چودھویں کا چاند ہے اور چاندنی بڑی رومانٹک ہوتی ہے۔ تنہائی البتہ ادھوری ہے۔ خیر میں اس دوری کو بھی مٹانے کی سوچ رہا ہوں۔ جذبات کا خیال تو کرنا ہی پڑے گا۔ یہ جالی ہٹوا دیتا ہوں میں تاکہ رات تو اچھی گزرے۔"

"بڑی مہربانی ہے آپ کی چوہدری صاحب" میں نے کہا۔

وہ ہنسا "سچ بتاؤ یار۔ بھوک تو نہیں لگی، دراصل مرغ روسٹ ہو رہے تھے۔ کھانا آتا ہی ہو گا۔ خوب ڈٹ کے کھانا۔ اور تکلف بالکل مت کرنا۔ جس چیز کی ضرورت ہو بتا دینا۔ ہیں جی، آخر تم چوہدری دلاور کے مہمان ہو اپنے سکندر صاحب۔ خیر سے اپنی مس رابعہ گٹھڑی بنی بیٹھی ہے۔ لاج کی ماری ہائے ہائے۔ کیسی مجبوری ہے۔ ہیرو کچھ بھی تو نہیں کر سکتا ہیروئن کے لیے۔"

میں نے کہا "دلاور۔ میں نے فرض کر لیا ہے کہ میں بہرا ہو گیا ہوں۔"

"وری گڈ۔ وہ میں نے تین بندر خریدے تھے پیرس میں۔ یا شاید جنیوا کی کسی دکان سے۔ بہت بڑی آرٹ کی دکان تھی۔ ہیں جی، میرے جیسے جاہل ہی وہاں جاتے تھے۔ جاہل اور دولت مند۔ اب یہ آرٹ وارٹ سمجھتا کون ہے آرٹسٹ کے سوا مگر وہ کیا کہتے ہیں اسے.... ہاں، سرپرست... سرپرست بنتے ہیں بس اور نمائش کرتے ہیں اپنے اعلیٰ ذوق کی۔ ہیں جی، تو خیر میں نے جو بندر خریدے تھے بڑے بدشکل اور ایویں تھے، اپنے گھگو گھوڑے بیچنے والے اس سے اچھے بنا سکتے ہیں مگر وہ تھے فن کا نمونہ۔ ایک بندر کان میں انگلی دیے بیٹھا تھا۔ دوسرا آنکھیں بند کر کے اور تیسرا ہونٹوں پر انگلی رکھ کے۔ دکان دار نے مجھے سمجھایا تو بات اچھی لگی مجھے۔ بُرا مت سنو، بُرا مت دیکھو، بُرا مت کہو۔"

"برائی کو سمجھتے ہو تم کہ کیا ہوتی ہے؟"

وہ ہنسا "لو جی۔ اب تم جو کچھ میرے خلاف کر رہے ہو یہ برائی ہے میرے لیے۔ اور یہ جو تم.... خیر چھوڑو، بحث کا کیا فائدہ۔ ہیں جی، تم اگر اس بندر کی طرح دیکھنا بھی چھوڑ دو اور منہ بھی بند رکھو تو واہ واہ۔ مگر یہ ہے بہت مشکل کام۔ یہ اپنی رابعہ ہے اچھی چیز۔ باہر سے دیکھا ہے ہم نے تو مگر خیال ہے کہ آج اندر سے بھی دیکھیں۔ یہ بھی آرٹ کا نمونہ تو ہے۔ یہاں ضائع ہو گا۔ اس کی جگہ تو ہے کوئی خوب صورت ڈرائنگ روم.... میرا بیڈ روم بھی اچھا ہے اس جیتی جاگتی حُسن کی مورت کے لیے۔"

ضبط کے باوجود میرے وجود میں آگ بھڑکنے لگی۔ "اگر تم نے ایسا کیا۔"

وہ قہقہہ مار کے ہنسا "تو کیا؟ تم گولی مار دو گے مجھے یا اس سے پہلے ہی رابعہ کے ساتھ وہ کر لو گے.... کیا کہتے ہیں اسے۔ اجتماعی

خودکشی... ہائے ہائے... اخبار میں خبر آئے گی کہ دو محبت کے متوالوں نے کیسے جان دی۔ تو آنکھوں میں آنسو آجائیں گے پڑھنے والوں کے۔ اوئے پاگل دے پُتر۔ تو خود تو مر سکتا ہے ان دیواروں سے سر ٹکرا کے۔ میرا کیا بگاڑ سکتا ہے... جتنا چاہے شور کر۔ چلا چلا کے بُلا اپنے ان ایم آر ایس کے سورماؤں کو...“

اس کا لہجہ ایک دم بدل گیا تھا۔ وہ غصے میں گالیاں بک رہا تھا لیکن ابھی تک میں نے ایسی بات نہیں کی تھی جو مزید اشتعال انگیزی کا سبب ہوتی۔ اس کا نقصان بھی ہمیں ہوتا۔

میں نے ایک گہری سانس لی ”تم نے ٹھیک کہا دلاور۔ میں واقعی کچھ نہیں کرسکتا۔“

”ابھی اور بھی بہت کچھ ہوگا جو ٹھیک ہوگا۔ سمجھ آئی‘ پہلی بازی تم نے جیت لی۔ دلاور کو کتا بنا دیا۔ اب دلاور کی بازی ہے۔ دیکھو یہ کتا کیسے کتا ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔ ہیں جی‘ آنکھیں اور کان بند کرنے سے کچھ نہیں ہوگا اپنے سکندر صاحب۔ اس کتیا کے ساتھ جو ہونے والا ہے وہ تم دیکھوگے‘ سنوگے‘ کیا پھر بھی خاموش رہوگے؟ تت۔ تت... تت... ولن تو ہر فلم میں ہیروئن پر بُری نیت رکھتا ہے۔ اور دست درازی کی تھوڑی سی کوشش بھی کرتا ہے۔ جتنی اجازت ملے سنسر والوں سے... ہیں جی‘ لیکن جو فلم ہم بنائیں گے اس میں سنسر کا دخل نہیں ہوگا۔ شوقین بڑے مزے لیں گے اسے دیکھ کر۔ اچھا بزنس کرے گی مارکیٹ میں۔ جتنی شہرت قانون کی پریکٹس سے نہیں ملی تھی اپنی رابعہ کو‘ اتنی اس فلم سے مل جائے گی سارے ملک میں۔“

میں نے غصے پر قابو رکھنے کے پرانے نسخے پر عمل کرتے ہوئے گنتی شروع کی۔ ایک سے سو تک گننے کے باوجود میں اپنا دھیان دلاور کی باتوں سے نہ ہٹا سکا۔

میں نے کہا ”چوہدری دلاور۔ میں نے کبھی تم سے کوئی درخواست نہیں کی اور توقع نہیں رکھی۔“

”رکھنی بھی نہیں چاہیے‘ دشمنی ہے تو پھر پکی۔“

”جب تمہاری بیوی میرے قبضے میں تھی...“

”تو یہ سب تم بھی کرسکتے تھے۔ ہیں جی“ اس نے میری بات کاٹ دی ”یہی کہنا چاہتے ہو نا لیکن تم نے بڑی شرافت کا ثبوت دیا۔ بہن بنا کے رکھا اسے۔“

”ہمارے جھگڑے میں آج تک کسی عورت کی عزت کو نہیں گھسیٹا گیا۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔“

”اوبابا ہونا تو بہت کچھ نہیں چاہیے اس دنیا میں مگر ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں یہ نہیں ہونا چاہیے‘ تم کہتے ہو وہ نہیں ہونا چاہیے۔ تم ہو شریف زادے اور میں وہ... کیا مشکل لفظ ہے... ہاں‘ نطفہ‘ تحقیق۔ پھر فرق تو ہوگا جی ہمارے اور تمہارے رویے میں۔ اور ہے... ہمارے دھندے خراب ہیں۔ تمہارے سب اعمال اچھے ہیں۔ ہم جاہل‘ تم ولایت کے پڑھے ہوئے۔ میں تو کہتا ہوں غلط کیا تھا تم نے۔ اس عمر میں کیا فرق پڑتا ہے اسے۔ کوئی کنواری لڑکی تو تھی نہیں کہ عزت لُٹ جاتی تو وہ آکے مجھے بتاتی اور دہائی دیتی۔ مجھے خاک پتا نہ چلتا۔“

”دلاور۔ وہ ماں ہے تمہارے بچوں کی۔“

وہ مسکرانے لگا ”ہاں۔ کہتی تو یہی ہے۔ میں بھی مان لیتا ہوں ورنہ کیا اس بات کا پتا عورت کے سوا کسی کو ہوتا ہے؟ ہیں جی کہ وہ کس کی اولاد کو جنم دے رہی ہے۔ میرا باپ بھی پتا نہیں میرا باپ تھا یا نہیں اور تم بھی خوش رہو وزیر خان کی ولدیت پر۔ اس عمر بھلا ہے دنیا کا کہ جسے ماں کہے اسے باپ مان لے۔“

مجھے اس کی بے غیرتی پر تعجب ہوا۔ یہ جاننے کے باوجود کہ دلاور سے زیادہ بے کردار اور بے ضمیر انسان تو ہو نہیں سکتا۔ شیطان ہوسکتا ہے۔ اس کی سوچ اور اس کی ذہنیت کی ساری غلاظت اس کے خیالات کی تمام عفونت اور شخصیت کی ساری بدصورتی اس وقت میرے لیے ناقابل برداشت ہوتی جارہی تھی۔ ایسی ذلالت کا اعتراف کسی تھرڈ ریٹ طوائف کا حرامی بیٹا بھی نہیں کرسکتا تھا جو خود اپنی ماں کا دلال ہو۔

”اچھا جی‘ اپنے سکندر صاحب۔ ہم تو چلتے ہیں۔ تم بتا دینا کہ رات یہاں بسر کرنی ہے یا اوپر میرے مہمان خانے میں۔ ہیں جی‘ ادھر بڑی سخت جسمانی تکلیف ہوگی۔ اوپر ذہنی اذیت ہوگی کیونکہ اپنی رابعہ بی بی تو آج رات ہوں گی میرے ساتھ۔ اور تم کو دیکھنا پڑے گا سب کچھ۔“

رابعہ نے اچانک چیخ کے کہا ”میں مرجاؤں گی کتے مگر تجھے اس مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔“

دلاور نے پھر قہقہہ مارا ”اچھا جی۔ جو تمہارا جی چاہے کرنا۔ ہم بھی وہی کریں گے جو ہمارا جی چاہے گا۔ شیر جب شکار کرتا ہے تو پہلے خود کھاتا ہے۔ یہی سنا ہے ہم نے۔ ہم شکاری تو ہیں نہیں۔ بعد میں آجاتے ہیں بھیڑیے اور پھر دوسرے جانور۔ آخر میں گِدھ اور چیل کوّے۔ اپنے سکندر صاحب تو... کیا کہتے ہیں اسے... ہاں‘ بقلم خود۔ بقلم خود ملاحظہ کریں گے۔ آپ کے جو لواحقین ہیں نا جی‘ لواحقین اس لیے کہ مرتو جانا ہے آپ نے۔ ہمیں کیا بعد میں آپ کچھ بھی کرو۔ لواحقین فلم دیکھ لیں گے‘ آخری یادگار سین۔“

رابعہ چیخ چیخ کے اسے گالیاں دے رہی تھی اور زاروقطار رورہی تھی۔ وہ ساری احتیاط اور شرم وحیا بھول گئی تھی۔ خوف نے اسے ہر احساس سے بے گانہ کردیا تھا۔ وہ جالی سے سر ٹکرا رہی تھی... اور سامنے ایسے کھڑی تھی جیسے وہ پوری طرح مستور ہے۔ میں اسے سمجھا رہا تھا۔ تسلی دے رہا تھا کہ دلاور کو بھونکنے دو۔ اسے کچھ نہیں ہوگا مگر خود مجھے اپنی بات کا یقین نہیں تھا تو وہ کیسے مان لیتی کہ کچھ نہیں ہوگا۔

اچانک چوہدری دلاور نے اپنی جیب سے گیس گن نکال لی ”یہ کیا ہے؟ معلوم تو ہوگا تمہیں مگر نہیں پتا تو میں بتا دیتا ہوں۔ اگر اس

کا فائر کردیا میں نے تو تم مروگے نہیں۔ اس میں سے کوئی گولی نہیں نکلے گی۔ بس شوں کر کے گیس نکلے گی اور تمہارا سارا شور شرابا ختم ہوجائے گا۔ تم نزدیک ہو‘ پہلے تم لیٹ جاؤ گے پھر رابعہ پر اثر ہوگا۔ جب تمہاری آنکھ کھلے گی...“ اس نے گن کو واپس جیب میں رکھتے ہوئے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

حالات ایسے خطرناک موڑ پر آگئے تھے کہ اپنی شکست تسلیم کرلینا میرے لیے ناگزیر ہونے لگا۔ میں اپنی انا پر‘ اپنی انتقام کی آگ پر‘ اپنے اصولوں پر۔ اپنے حق کے لیے‘ انصاف کے لیے‘ کسی نیت پر رابعہ کی عزت کو داؤ پر نہیں لگا سکتا تھا۔ سب سے بڑا ترپ کا پتا چوہدری دلاور کے ہاتھ میں تھا اور میرے لیے اس کھیل کو جاری رکھنا ناممکن ہوگیا تھا۔ میں سب کچھ چھوڑنے پر تیار تھا۔ دلاور کی ہر بات مان سکتا تھا۔

میں نے کہا ”چوہدری دلاور۔ یہ ٹھیک ہے کہ تم سب کچھ کرسکتے ہو مگر سب کچھ کرنے کے بعد بھی تم کچھ حاصل نہیں کرسکتے۔ یہ مسئلہ جس کا ہم ایک قانونی حل چاہتے تھے ختم نہیں ہوگا۔ رابعہ خود مرجائے گی ورنہ میں اسے گولی ماردوں گا۔ اس کے بعد تمہیں مار کے خود بھی مرجاؤں گا۔“

وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا ”حل تو اچھا ہے۔ نہ رہے گا بانس‘ نہ بانسری اور نہ اسے بجانے والا۔ ہیں جی‘ محاورے میں ہم سب فٹ ہوگئے۔ بانس میں‘ بانسری اپنی مس رابعہ اور بجانے والا...“

جملہ مکمل کرنے سے پہلے اس نے قہقہہ لگایا اور پھر اچانک وہ کیا جس کی مجھے اس وقت اُمید نہیں تھی۔ دلاور ہر صورتِ حال کو ڈرامائی موڑ دینے کا عادی تھا۔ اس نے ایک دم جیب سے ریوالور نکالا اور فائر کردیا۔ گن سے دُھواں سا نکلا اور اس کی سرمئی سی لکیر میری طرف آئی۔ پھر یہ دُھواں غبار بن کے پھیلنے لگا۔ میں نے خود کو اس کی براہِ راست زد سے تو بچا لیا تھا مگر اس کے زہریلے اثرات سے بچنا ناممکن تھا۔ وہاں نہ بھاگنے کی جگہ تھی نہ پناہ لینے کی۔ پانچ فٹ قطر کے اس گول کمرے میں گیس پھیلتی جارہی تھی۔

میرا خیال ہے کہ میں اس وقت اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا تھا۔ میں بیک وقت دلاور کو گالیاں دے رہا تھا جن کا اس پر کوئی اثر نہیں تھا۔ دھمکیاں دے رہا تھا جو بے مقصد تھیں۔ چلا چلا کر رابعہ کو کہہ رہا تھا کہ وہ حوصلہ نہ ہارے حالانکہ اس سے زیادہ فضول کوئی بات نہیں ہوسکتی تھی۔ خود رابعہ کا رویّہ بھی ایسا ہی تھا۔ وہ چیخ چیخ کے دلاور کو بتا رہی تھی کہ وہ اس کے شیطانی عزائم پورے ہونے سے پہلے جان دے دے گی۔ اسے قتل کردے گی۔ وہ مجھے مدد کے لیے پکار رہی تھی‘ خدا سے فریاد کررہی تھی۔ جالیوں سے لڑ رہی تھی جیسے انہیں گرا دے گی۔

آہستہ آہستہ میرے جسم سے جان نکلنے لگی۔ مجھ میں اپنے پیروں پر کھڑے رہنے کی سکت باقی نہ رہی۔ اندھیرا گہرا ہوگیا جس میں رابعہ اور دلاور تحلیل ہوگئے۔ بلب بجھ گیا۔ میرے کانوں میں پہنچنے والی آوازیں دور ہوتے ہوتے معدوم ہوگئیں۔

غفلت اور بے ہوشی کے ایک اور وقفے سے گزر جانے کے بعد میں پھر ہوش کی دنیا میں لوٹا تو دنیا بدل چکی تھی۔ ہمیشہ کی طرح حقیقت کے ادراک تک میرے ذہن کا سفر بے یقینی کے پُرسراب صحرا میں رہا اور آنکھوں نے جو پہلے پہل دیکھا یا کانوں نے جو سب سے پہلے سنا اسے دل نے نہیں مانا یا عقل نے تسلیم نہیں کیا۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا۔ یہ میری نظر کا فریب ہے۔ دھوکا ہے‘ ایسی باتیں سوچتے‘ زندگی کے احساس کو یقینی بنانے کے لیے میں نے آنکھیں مل کے اِدھر اُدھر دیکھا اور سوچا کہ شاید جھوٹ اور سچ کا فرق واضح ہوتے ہی حقیقت سامنے آئے تو منظر کچھ اور ہو لیکن ایک سین تھا جو کسی تصویر کی طرح میری نظر کے فریم میں فٹ ہوگیا تھا۔

پھر میں نے رابعہ کی آواز سُنی اور اس کے ہاتھ کا لمس اپنی پیشانی پر محسوس کیا ”سکندر۔ میری طرف دیکھو سکندر۔“

میں پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا ”رابعہ... مجھے معاف کردو۔ یہ سب... میری وجہ سے ہوا۔“

اس نے کہا ”کچھ نہیں ہوا سکندر۔ ہوش میں آؤ...“

”نہیں۔ نہیں رابعہ۔ میں نظریں نہیں ملا سکتا تم سے... میں تمہارا مجرم ہوں۔“

”پلیز سکندر۔ رونے کی کوئی بات نہیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

میں اپنی کہتا گیا ”مجھے... مجھے کوئی حق نہیں... زندہ رہنے کا... میں نے تمہاری زندگی برباد کردی۔ اپنے ساتھ... سب کی زندگی برباد کی... لیکن رابعہ... مرنے سے پہلے... میں اس شیطان‘ اس درندے کا خون پیوں گا... تم دیکھ لینا... میں اسے ذبح کروں گا اور اس کے خون سے اپنی پیاس بجھاؤں گا... میں مرنے سے پہلے... ایسا ضرور کروں گا... جس نے...“

”سکندر۔ پاگل پن کی بات مت کرو۔ دیکھو میری طرف۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ اور تمہارے پاس ہوں“ اس نے پیار سے کہا اور پھر میری پیشانی کو چوم لیا۔ اس کے ساتھ ہی گرم پانی کا ایک قطرہ میرے چہرے پر گرا۔ پھر دوسرا۔

میں نے آنکھیں کھول کے دیکھا۔ رابعہ مجھ پر جھکی ہوئی تھی۔ اس کے بدن کی خوشبو وہی تھی۔ اس کی زلفوں کا مہکتا سایہ مجھ پر مہرباں رات کے طلسماتی اندھیرے کی طرح پھیلا ہوا تھا جس میں رنگ بھرے خواب جنم لیتے ہیں اور جذبات کی کیف آفریں مدہوشی میں خوابوں کو تعبیر ملتی ہے۔

میں نے اپنے بازو اس کی گردن میں حمائل کردیے اور اسے اپنے زیادہ قریب کرلیا ”رابعہ... میری جان‘ یہ تم ہو... میرے قریب۔“ اور پھر آنکھیں بند کرلیں۔

اس نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی ”سکندر۔ خدا کے لیے

"اسے موت نہیں قتل کہو دلاور۔"

"اچھا قتل سہی۔ ان کو کسی نے قتل کردیا تھا۔"

"کسی نے نہیں' تم نے۔"

"نہیں' یہ غلط ہے۔ میں نے ان کو قتل نہیں کیا تھا۔"

"تم نے اپنے ہاتھوں سے قتل نہیں کیا تھا۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ تم ذمّے دار ہو ان کے قتل کے۔ قتل تمہاری مرضی سے' تمہارے حکم پر' تمہارے کسی زر خرید نے کیا تھا۔ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ قاتل وہ نہیں تھا جس نے گولی چلائی تھی۔ قاتل تم تھے جس نے ایک شخص کے ہاتھ میں ریوالور دے کر کہا تھا کہ وزیر خان کو ماردو۔ تمہارے دوسرے ہاتھوں میں نوٹوں کی گڈی تھی یا وہ شخص تمہارے سامنے بے بس تھا۔"

اس نے قدرے تامل سے کہا "ہاں۔ یہ کہہ سکتے ہو تم مگر دیکھو۔ جیسے تم دشمن ہو اپنی جان کے۔ ایسے ہی وہ بھی ضدی تھا۔ حالات سے سمجھوتا کرنے پر راضی نہیں ہوتا تھا۔ تم خود کب سے اس جنون میں مبتلا ہو۔ پتا نہیں ایسے کتنے مواقع آئے جب تم بال بال بچ گئے۔ تم نے ہر جگہ پنگا لیا۔ میں تو کہتا ہوں خودکشی کی پوری کوشش کی۔ ایم آر ایس کے چکر میں تم نے جان کی بازی لگا کے بڑے کارنامے سرانجام دیے۔ یہ قسمت تھی تمہاری کہ محفوظ رہے اور آج بھی زندہ ہو۔ مرجاتے تو کیا اس موت کو بھی قتل کہا جاتا۔ کون مانتا کہ یہ قتل میں نے کیا تھا؟ یا کرایا تھا؟ قتل کراتا ہوتا تو میں کسی سے بھی کہتا کہ جاؤ سکندر کو اور اس کے ایک ایک بندے کو مار کے شام تک سب کی لاشیں ٹھکانے لگادو۔ پچھلی بات چھوڑو۔ کل تمہارے کہنے پر میں نے نازو اور غالب کو چھوڑ دیا۔ تم کو مہمان کا درجہ دے رکھا ہے۔ کیا مشکل تھا میرے لیے تم چاروں کو اس سرنگ میں بند کرکے گیس گن سے ہلاک کردیتا۔ کس پوسٹ مارٹم میں ثابت ہوتا کہ یہ قتل تھا۔ گٹر لائنوں میں زہریلی گیس سے لوگ ہلاک ہوتے ہی رہتے ہیں۔ یہ سمجھا جاتا کہ ایک مفرور مجرم سکندر بخت وہاں چھپا ہوا تھا اور اس سے ملنے کے لیے دوست وہاں گئے تھے مگر سب زہریلی گیس کا شکار ہوگئے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے اپنے سکندر صاحب کہ تمہارے باپ نے ایسے حالات پیدا کرلیے تھے... خود اپنے لیے کہ وہ زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ اس ایک آدمی کی بے وقوفی سے دس دوسرے آدمی مارے جاتے۔ جیسے تمہاری بے وقوفی سے اتنے لوگ مارے گئے۔ میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ اسے زہر دے دیا جائے یا گولی ماردی جائے۔ نہ میں نے کسی کو ایسا حکم دیا تھا۔ ہاں یہ ضرور کہا تھا کہ یہ آدمی خطرناک ہوگیا ہے۔ یہ زندہ رہا تو ہم سب مارے جائیں گے۔ میں نے اسے کاروبار سے الگ کردیا تھا۔ اپنے ایک نمک خوار کے گھر میں قید کردیا تھا۔ یہ احساس دلانے کے لیے کہ چوہدری دلاور سے ٹکر لینے میں نقصان ہی نقصان ہے۔ اس کے پاس اپنے فائدے کی بات سمجھنے کی عقل نہیں رہی تھی تو میں کیا کرتا۔"

میرے ضبط کا حوصلہ جواب دینے لگا تھا "تم کو وزیر خان کی موت کو خودکشی ثابت کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ حقیقت اپنی جگہ رہے گی کہ اسے قتل کیا گیا تھا۔"

"یہ بالکل ٹھیک ہے۔ اسے قتل کیا گیا تھا۔ ایسا کرنا ضروری بھی ہوگیا تھا۔ میرا بھی یہی خیال تھا مگر نہ میں نے کسی سے کہا کہ اس کا قصہ پاک کردو۔ نہ خود میں نے اس کو قتل کیا لیکن میں جانتا ہوں کہ اس کو قتل کرنے والا کون تھا۔"

رابعہ نے حیرانی سے کہا "تم جانتے ہو؟"

"ہاں جی۔ ہم تو سب کچھ جانتے ہیں اپنے بارے میں بھی اپنے بندوں کے بارے میں بھی۔ یہ سب یار نہیں ہیں اپنے' کہہ سکتے ہیں' نمک خوار ہیں یا غلام ہیں۔ اپنے آقا کی خوشنودی کے لیے بہت کچھ کرتے ہیں۔ مجھے کسی سے کچھ کہنا نہیں پڑتا۔ وہ خود سمجھ لیتے ہیں کہ میں کیا چاہتا ہوں اور آگے بڑھ کے وہ کام کرتے ہیں جس سے میں خوش ہو جاؤں۔ ان کی قدرو منزلت بڑھ جائے میری نظر میں۔ ظاہر ہے میں ان کو صرف پیسہ دیتا ہوں۔ میڈل یا انعام انہیں بھی ضرورت نہیں۔ صرف تعریف سے بھی کام نہیں چلتا۔ ان میں سے جس نے میری خوشی کے لیے خود یہ کام کیا' جانتے ہو کون تھا؟"

میں نے سوچے سمجھے بغیر کہا "استاد پیڈرو۔"

وہ ہنسا "مانتے ہیں اپنے سکندر صاحب' تمہاری جاسوسی کو۔ بالکل ٹھیک بندے کا نام لیا تم نے۔ وزیر خان کو مارنے والا پیڈرو ہی تھا۔ میں یہ چاہتا ضرور تھا کہ وزیر خان میرے راستے میں روڑے نہ اٹکائے۔ اس نے مجھے وخت ڈالا ہوا تھا۔ یہ بھی کہا تھا غصے میں کہ وہ باز نہ آیا تو میں گولی ماردوں گا اسے۔ اور بھی بہت کچھ کہا تھا۔ وہ سب دُہرا کے میں تمہارے جذبات کو مجروح کرنا نہیں چاہتا۔ مگر اسے قتل کرانے کی کوئی سازش نہیں کی تھی میں نے۔ سازش کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ کمزور سا بڈھا بندہ تھا۔ الگ کرکے بٹھادیا تھا میں نے اور خبردار کردیا تھا کہ اپنی زبان بند رکھے ورنہ زبان ہمیشہ کے لیے بند کردی جائے گی۔ وہ بھی ترکی بہ ترکی طرح ڈائیلاگ بولتا تھا کہ دلاور' خدا کی لاٹھی بے آواز ہے۔ انجام سے ڈر۔ زندگی اور موت تیرے ہاتھ میں نہیں ہے' فراموش۔ جب پیڈرو نے اسے قتل کردیا اور مجھے بتایا تو میں نے کہا کہ... یہ تو نے بُرا کیا۔ اوئے وہ تو ویسے ہی مرنے والا تھا۔ ا... دن جینا تھا اس نے۔ زندگی کے سارے راستے تو اس نے بند کرلیے تھے۔ پھر پیڈرو نے بتایا کہ اس نے ایسا کیوں کیا تھا اور میں نے کہا کہ چلو جو ہونا تھا ہوگیا۔ خس کم جہاں پاک۔ میرا ایک پارٹنر تھا۔ ڈی سوزا' اس نے بھی کہا کہ چوہدری صاحب جان چھٹی۔ شکر کرو' اسے پیڈرو نہ مارتا تو میں ماردیتا۔ ڈی سوزا اور پیڈرو میرے ساتھی تھے۔ ان کے بغیر میرا کام نہیں چلتا تھا اور ہوتا تو میں اسے وہیں گولی ماردیتا اور خود تمہیں مطلع کرتا۔

...اس کے جذبات کا اور باتوں سے نیت کا اندازہ کیا ہی نہیں جاسکتا تھا۔

"کیا حال ہے اپنے سکندر صاحب۔ خیر سے بھلے چنگے لگتے ہو۔ ...ہم تو ایویں مذاق کرلیتے ہیں کبھی تم سے۔ شکر کرو یہ بھی ...ہی تھا۔"

میں نے کہا "شکر میں صرف خدا کا ادا کرسکتا ہوں۔ آگے بھی ...ہوگا جو اس کی رضا ہوگی۔"

اس نے طنز سے کہا "کیا شک ہے جی اس میں۔ ایک نیکی کام ...تمہارے...."

"نیکی کبھی رائگاں نہیں جاتی..."

"ہاں پرانے لوگ یہی کہتے تھے اور کتابوں میں بھی یہی لکھا ...ہیں جی' مگر ذرا آنکھیں کھول کر دیکھو اس دنیا کو۔ اپنے ...طرف دیکھو۔ کیا ایسا ہو رہا ہے؟ نیکوکار فائدے میں ہیں؟ بڑی ...ہے ان کی اور ساری دنیا پر حکومت ہے۔ زندگی کا صحیح لطف ...خدا کے نیک بندے ہی اٹھا رہے ہیں...؟"

میں نے کہا "دلاور۔ خدا کے نیک بندوں کا دنیا سے اور ...کاروباری کے نفع و نقصان سے کیا تعلق۔ زندگی کی کامیابی کو جس ...نے سے تم دیکھتے ہو وہ بالکل اس کے برعکس ہے۔"

"اچھا جی دفع کرو۔ ہمیں کیا ملے گا اس بحث سے" اس نے بے زاری سے کہا "میں تو ایک چھوٹا سا سبق دینا چاہتا تھا تمہیں۔ ...بتانا تھا کہ سو فیصد بُرا کوئی نہیں ہوتا۔ دشمنی کے جذبات میں تم نہ ...تو تمہاری مرضی مگر دیکھ لو' میں نے تمہیں صرف ٹریلر دکھایا۔ تم پوری فلم دیکھتے تو اندازہ ہوتا کہ چوہدری دلاور کیا چیز ہے۔"

"اس کا اندازہ بہت پہلے سے ہے مجھے۔"

"نہیں۔ نہیں اپنے سکندر صاحب' دلاور بہت بڑی چیز ہے اور تم نے اس کا ایک چھوٹا سا حصہ دیکھا ہے۔ لندن' پیرس یا کراچی' لاہور دیکھ کے تم دعویٰ نہیں کرسکتے کہ تم نے ساری دنیا دیکھ لی۔ ابھی بہت کچھ دیکھنا باقی ہے اور تم دیکھوگے۔ ہیں جی' لیکن پھر بھی۔ ہم ایک دوسرے کے ہاتھوں مارے جائیں' وہ الگ بات ہے۔ ورنہ تم بھی بہت دن جیوگے اور مجھے بھی کوئی خاص جلدی نہیں ہے مرنے کی۔ ایک آخری موقع اور دینا چاہتا ہوں میں۔ ...گھر والی ہے نا۔ اس نے مجبور کردیا ہے مجھے۔ وہ بھی بڑی چیز ہے۔ آخر دلاور کی بیوی ہے۔ تم نے اسے بچایا اور دیکھو اس نے ...کیسے تمہارے جال سے نکال لیا۔ بڑے شکاری تھے تم بھی' مار ...کھائے ایک عورت سے۔ اسی لیے سیانے کہتے ہیں کہ سانپ کو ...پینی کو بھی مت چھوڑو۔ سنپولیوں کو بھی ماردو۔ تم نے نیکی کی ...کمایا۔ تم تو کہوگے وہی بات کہ جی یہ تو ہمارا اخلاقی فرض ...تھا" وہ طنز سے ہنسا۔

"ہاں۔ مگر تم یہ بات نہیں سمجھوگے۔"

"اوئے پاگل دے پتر۔ یہ بات نہ سمجھتا تو تم پڑے ہوتے وہیں۔ اسی حالت میں" دلاور کے چہرے پر غصے کے آثار نمودار ہوگئے۔

رابعہ نے مجھے آنکھ کے اشارے سے منع کیا کہ میں مصلحت کو سمجھتے ہوئے اشتعال انگیزی نہ کروں اور خاموش رہوں۔ یہ بات اس کی آنکھوں میں چھپے ہوئے لجاجت کے جذبات سے عیاں تھی۔

"اگر مجھ میں سمجھ نہ ہوتی نا اپنے سکندر صاحب۔ اور میں ایسا ہی دشمن ہوتا تو کہتا کہ لعنت میرے ساتھ نیکی کرنے والے پر اور مجھ پر بھی اگر میں اس نیکی کے بدلے سر جھکادوں اور کہوں کہ تھینک یو۔ میں اپنی بیوی کو قتل کردیتا کہ اُلو کی پٹھی' تعریف کرتی ہے میرے دشمن کی۔ جا اس سے نکاح پڑھوالے۔ اور اتنا کمینہ ہوتا میں تو اب تک وہ سب ہوجاتا جو میں نے تمہیں ڈرانے کے لیے کہا تھا۔ دیکھ لو یہ تمہاری مس رابعہ تمہارے سامنے ٹھیک ٹھاک بیٹھی ہے اور پوچھ لو اس سے کہ چوہدری دلاور نے غلط نہیں کہا تھا۔ جب تم مہمان ہو تو کوئی بُری نظر سے نہیں دیکھ سکتا تم کو۔ دیکھا ہے تو مجھے بتاؤ' میں اس کی آنکھیں نکلوادوں گا۔ تم بھی مزے سے لیٹے ہو یہاں پر۔"

"آخر کیوں کررہے ہو تم یہ سب کچھ' کس اُمید میں؟"

"میں نے بتایا نا۔ ایک تو میری بیوی بچے بے وقوف ہیں۔ جذباتی ہیں' کہتے ہیں ایک بار ان کی وجہ سے ہم سب کی جان بچ گئی تھی۔ ہم سب برباد ہونے سے بچ گئے تھے" دلاور ہنسا "انھوں نے مجبور کردیا مجھے کہ اس احسان کا بدلہ چکادو۔ ہم کسی دشمن کے مقروض نہیں رہنا چاہتے۔ بس میں نے ان کی یہ بات مان لی۔ اس کا مطلب غلط مت سمجھنا۔ یہ بات برابر ہوجائے گی تو اگلی بار وہ بھی لحاظ نہیں کریں گے۔ یہ حساب ختم' دوسرا کھاتا ہے دشمنی کا۔ وہ بند نہیں ہوا۔ خود میں بھی ایک آخری موقع دینا چاہتا تھا تمہیں کہ چلو جو ہوا سو ہوا۔ بہت نقصان کرلیا تم نے اپنا بھی اور مجھے بھی برباد کیا۔"

میرے لبوں پر اس کی بات سے مسکراہٹ آگئی۔ کم سے کم اتنا ضرور ہوا تھا کہ دلاور جیسا نمرود کی خدائی کا دعوے دار بھی میرے جیسے حقیر انسان کے سامنے یہ اعتراف کررہا تھا کہ وہ برباد ہوگیا۔

"ابھی ساری زندگی پڑی ہے تمہارے سامنے۔ اپنے ساتھ اس بے چاری کو اور اپنے دوستوں کو برباد مت کرو۔ یہ دوستی نہیں دشمنی ہے ان کے ساتھ کہ تم ان کی زندگی کو بھی حرام کررہے ہو۔ ضائع کررہے ہو۔ ان سے بھی مشورہ کرو۔ ٹھنڈے دل سے سوچو۔ کیا دلاور سے لڑنے میں یہ عمر گنوادوگے؟ ہیں جی' اس زندگی کی قدر کرو۔ بہت کچھ کرسکتے ہو تم اپنے لیے اور دوسروں کے لیے۔ یہ جنگ لاحاصل ہے۔ تم کو بھی وہ کامیابی نہ پہلے حاصل ہوئی ہے... جو تم چاہتے تھے نہ آئندہ ہوگی۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ بات ختم کرو۔ میرے تمہارے درمیان ذاتی دشمنی کی بنیاد تھی تمہارے والد کی موت۔"

مجھے چھوڑو' میں تمہارے پاس ہوں۔ کہیں جانہیں رہی ہوں کہ ایسے پکڑلیا ہے..... ابھی کوئی اندر آجائے گا۔"

میں نے ایک دم آنکھیں کھول دیں اور اسے چھوڑ کے اِدھراُدھر دیکھا۔ یہ بڑا پر آسائش کمرا تھا۔ کوئی خواب گاہ جس میں ایک آرام دہ بیڈ پر میں وہی کپڑے پہنے ہوئے لیٹا تھا جو میرے اپنے تھے۔ میرے ساتھ لگی ہوئی رابعہ بیٹھی تھی اور اس کے کپڑے بھی وہی تھے جو اس نے آخری بار پہن رکھے تھے۔

میرا ذہن الجھن میں پڑگیا۔ کیا وہ ایک بھیانک خواب تھا یا خواب یہ ہے جو میں اب دیکھ رہا ہوں۔

میں نے رابعہ کا ہاتھ پکڑلیا "رابعہ..... یہ..... آخر یہ سب کیا ہے؟"

اس نے کہا "میں کافی لاتی ہوں تمہارے لیے' ڈاکٹر نے کہا تھا..." اور اپنا ہاتھ چھڑایا۔

میں نے اس کا ہاتھ پھر پکڑلیا "کس ڈاکٹر نے...؟"

"جس نے تمہیں دیکھا تھا۔ میں اس کا نام نہیں جانتی" رابعہ بولی "اس نے انجکشن بھی لگایا تھا اور کہا تھا کہ جب یہ ہوش میں آئیں تو ان کو بہت اسٹرانگ بلیک کافی دینا۔"

"اسٹرانگ بلیک کافی؟" میں نے حیرانی سے دُہرایا "کہاں سے لاؤگی تم..... کس کا گھر ہے یہ..... ہم کہاں ہیں؟"

"ہم دلاور کے مہمان ہیں" وہ مسکرائی "اور ظاہر ہے یہ ہمارا گھر نہیں ہے۔ دلاور کا کوئی گھر ہے۔"

میں اُٹھ کے بیٹھ گیا "وہ..... وہ خود کہاں ہے؟"

"ابھی بتاتی ہوں..... میرا ہاتھ تو چھوڑو جنگلی۔ اتنی سختی سے پکڑ رکھا ہے۔" اس نے جھٹکا دے کے اپنی کلائی چھڑائی اور ان نشانات کو ملنے لگی جو اس کی نازک مرمریں جلد پر نمودار ہوگئے تھے۔

رابعہ نے قریب ہی ایک میز پر رکھے ہوئے تھرموس سے کافی کا مگ بھر کے مجھے دیا "یہ لو۔ تم بھی کیا یاد کروگے۔"

میں نے کہا "رابعہ۔ پلیز مجھے بتاؤ یہ سب کیا ہے۔"

"وہی۔ دلاور کا ڈراما۔" رابعہ بولی "وہ صرف ہمیں ڈرا رہا تھا جو اس نے کہا تھا وہ کیا نہیں۔ نہ اس کا ارادہ تھا۔"

"اس کا مطلب ہے..."

"ہاں۔ اس کی بیوی دوبار آچکی ہے۔"

"ہمیں یہاں آئے کتنی دیر ہوئی ہے؟"

"صرف ایک گھنٹا۔ تم پر گیس کا اثر زیادہ تھا۔ میں نو دس منٹ کے بعد ہوش میں آگئی تھی اور اس وقت ہم دونوں کے علاوہ یہاں ایک ڈاکٹر تھا اور دلاور کی بیوی تھی۔"

"اور ہم اسی حالت میں تھے؟"

"ہاں۔ جس حالت میں لائے گئے تھے" رابعہ نظر جھکا کے بولی۔

میں نے گرم گرم کافی پیتے ہوئے اس کو غور سے دیکھا "دلاور چاہتا کیا ہے ہم سے؟"

"جلدی کیسی' معلوم ہوجائے گا یہ بھی۔ جہاں تک دلاور کی بیوی کا تعلق ہے' تو اس کے بارے میں تمہارا اندازہ تھا۔ اس کے کہنے سے ہی دلاور نے ہماری جاں بخشی کی۔ اس کے ارادے کو بدلنے والی وہی ہے جس کو بقول تمہارے جذباتی وابستگی ہوگئی ہے۔" وہ مسکرائی۔

"اب تو مجھے بھی محسوس ہورہی ہے" میں نے کہا "دل کی اچھی ہے یہ عورت۔"

"صرف دل کی؟" رابعہ نے شریر لہجے میں کہا "دل جسم کا حصہ ہے' اس کے بارے میں بھی ایسے ہی خیالات کا اظہار فرمایا تھا آپ نے۔"

میں نے مسکرانے کی کوشش کی "حسد سے تمہارا دل جل رہا ہے۔ جلنے کی بو آرہی ہے مجھے۔"

"دل ہی کہاں ہے میرے پاس۔ ہاں حسد محسوس ہوتا ہے جب تم میرے علاوہ کسی کو دیکھتے ہو۔"

"بڑی اُلو کی پٹھی ہو تم بھی۔ نظر کا فرق محسوس نہیں ہوا تمہیں؟"

"مرد کی نظر کیا دیکھتی ہے' یہ نظر آجاتا ہے۔"

"ایک جھانپڑ رسید کروں گا تو ہوش ٹھکانے آجائیں گے۔ دیکھتا تو میں بہت کچھ ہوں۔ جو سامنے آئے' کتا' بلی۔ دریا' پہاڑ' آسمان زمین۔ مگر تم کو دیکھنے والی نظر دوسری ہے۔"

اس نے میرا ہاتھ پکڑلیا "مجھے کس نظر سے دیکھتے ہو؟"

"سچ بتاؤں؟ بُری نظر سے" میں نے کہا "شاعر نے سچ کہا ہے اچھی صورت بھی کیا بُری شے ہے۔ جس نے ڈالی بُری نظر ڈالی۔"

"کیسی گھٹیا باتیں کرنے لگتے ہو تم بھی۔ یہ کوئی شعر ہے؟"

"یہ ببر شیر ہے۔" میں نے کہا "کھا جائے گا تمہیں۔"

دلاور نے اچانک اس رومانٹک سین میں انٹری دی "سچی بات ہے۔ مزہ بہت آرہا تھا لیکن ٹائم کم تھا اس لیے مجھے دخل دینا پڑی' کیا کہتے ہیں' دخل اندازی۔"

"تم چھپ کر دیکھ رہے تھے اور سُن رہے تھے؟"

وہ میرے قریب بیٹھ گیا۔ جس دروازے سے وہ اندر آیا تھا اس کے پردے کی حرکت بتاتی تھی کہ پیچھے کوئی اور بھی ہے۔ دلاور کے محافظ کے سوا کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ اتنی بے خوفی اور بے تکلفی سے اندر آیا تھا مگر اپنی حفاظت کے خیال سے غافل نہیں تھا۔ میں نے دوسرے پردوں کی طرف دیکھا تو مجھے شک ہوا کہ ان کے پیچھے سے بھی خفیہ آنکھیں میری ہر حرکت کا بغور مشاہدہ کررہی ہیں۔

رابعہ سمٹ کے کچھ دور ہوگئی۔ چوہدری دلاور مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر بیٹھ گیا۔ وہ آدمی انتہائی خطرناک تھا۔ اس کی صورت

اس کے بغیر دنیا کے کام نہیں چلتے۔ میں تو اس سے زیادہ رشوت پیش کرچکا ہوں۔ تم کو لینے سے انکار ہے تو تمہاری مرضی۔ میرے لیے پیڈرو کی افادیت ختم ہوچکی ہے۔ میں نے اسے سمجھادیا تھا کہ اس کا اور میرا راستہ الگ ہے۔ ویسے تو ہم جیسے لوگ اتنی شرافت سے کسی کو رخصت نہیں کرتے۔ راستہ بدلنا ہو تو پُرانے راستوں کے ہرہم سفر کو دوسری دنیا کا راستہ دکھادیتے ہیں تاکہ کسی کو ڈر نہ رہے۔ پیڈرو بھی شیخ مختار بن گیا تھا اور کراچی میں پتا نہیں کیا کررہا تھا کہ تم نے وہاں جاکے اس سے پنگا لیا۔ وہ بہت مشتعل تھا اور اس نے سوچا کہ خود کچھ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ سابق باس یہ کام زیادہ خوش ہوکے اور بہتر طور کرسکتا ہے۔ وہ تم کو میرے پاس لے آیا۔ ویسے تو بڑا کام کیا اس نے مگر ایک تو اس نے چالاک بن کے بندوق میرے کندھے پر رکھی' جان اپنی بچائی۔ احسان مجھ پر کیا۔ دوسری غلطی اس کی یہ تھی کہ اس نے ماضی کے حوالے سے مجھ سے رابطہ کیا۔ میں نے اسے خبردار کردیا تھا کہ جاؤ۔ اتنی بڑی دنیا پڑی ہے اپنی شکل گم کرو۔ پھر میرے سامنے مت آنا اور آؤ تو پہچاننے کی کوشش کبھی مت کرنا ورنہ نقصان میں رہوگے۔ پیڈرو نے میری وارننگ کو نظرانداز کردیا اور دوبارہ میرے سامنے آگیا۔ پھر اس کی بدقسمتی کہ وہ غلط وقت پر آیا۔ اسے یہاں کے حالات کا علم نہیں تھا۔ یہ معلوم نہیں تھا کہ میری بیوی اور میرا بیٹا یہ چاہتے ہیں کہ دشمن کا قرض فوراً ادا کردیا جائے۔ عورت کی ذات تو خیر ہوتی ہی جذباتی ہے مگر فیصل بھی نوجوان ہے۔ جنگ میں عقل سے کام لینا چاہیے جذبات کو دور رکھنا چاہیے۔ مگر خیر' ہم نے ان کی مان لی اور کہا کہ چلو ایک کوشش کرکے دیکھتے ہیں۔ شاید بات بن جائے۔ جنگ جاری رکھنی ہے تو شوق سے رکھو۔ نہ ہم بھاگنے والے ہیں اور نہ تم بھاگ کے کہیں جاسکتے ہو۔ چوہدری دلاور بھی مرتے دم تک ہار ماننے والوں میں سے نہیں ہے۔ اسی لیے میں تم کو چھوڑ رہا ہوں اور پیڈرو کو تمہارے حوالے کررہا ہوں۔ چاہو تو اسے جان سے مار کے وہیں گاڑ دینا جہاں اس نے وزیر خان کی ہڈیوں کو قبرستان سے لے جاکر دفن کیا تھا۔ مجھے کیا پتا وہ جگہ کدھر ہے اور کہاں ہے؟ پیڈرو کا وجود تو میرے لیے پہلے ہی صفر ہوگیا تھا۔ اسے میں خود ماردوں گا مگر اس کے ساتھ ہی تمہارے لیے حقیقت کی تہ تک پہنچنے کے سارے امکانات ختم ہوجائیں گے۔ وہ معلومات جو تمہارے لیے اہم ہیں کسی اور ذریعے سے حاصل نہیں ہوں گی۔ مجھے معلوم ہے تم جاننا چاہتے ہو کہ وزیر خان کی موت کا ذمے دار کون تھا اور اس کی موت کیسے اور کب ہوئی تھی۔ یہ تمہیں پیڈرو کے سوا کوئی بھی نہیں بتاسکتا۔ جاؤ اس کو ساتھ لے کر کہیں بھی چلے جاؤ۔ اپنے دوستوں ساتھیوں سے مشورہ کرلو اور جب یہ پیڈرو والا معاملہ ختم ہوجائے تو پھر مجھ سے رابطہ کرلینا۔ یا میں تم سے بات کرلوں گا۔ اگر تمہیں اعتبار آجائے کہ میری یہ پیش کش جسے تم رشوت کہہ رہے ہو تمہارے حق میں نیکی تھی تو پھر دیگر

ایک نمک حرام نے ایسا کیا تھا۔ میں نے اسے خود ماردیا۔ تم بھی مطمئن ہوجاتے مگر استاد پیڈرو کو میں بُرا بھلا کہنے کے سوا کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ میں یہ بھی سمجھتا تھا کہ وزیر خان کا مرجانا ہی میرے حق میں بہتر تھا۔ مجھے پیڈرو کی ضرورت تھی' میں نے اسے بچالیا۔ اب مجھے اس کی ضرورت نہیں تو یہ سب تمہیں بتارہا ہوں۔ تمہارا مجرم وہ ہے۔ اسے اپنے ساتھ لے جاؤ۔ میں خود اسے تمہارے حوالے کررہا ہوں۔ باقی باتیں تم خود پوچھ سکتے ہو اس سے۔ اس کام کے تم بھی ماہر ہو۔ میرا مطلب ہے سچ اگلوانے کے..."

میں نے کہا "تم مجھے رشوت دے رہے ہو۔ قربانی کا بکرا پیش کررہے ہو کہ صدقے میں اسے مارڈالو۔ میری جان بخشی کردو۔"

"دیکھو سکندر۔ یہ موقع گنوا کے تمہیں کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا۔ تم انکار کرسکتے ہو۔ اس کا نقصان مجھے نہیں ہوگا۔ پیڈرو اگر تمہارے ساتھ مل جائے تب بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا اور تم ایم آر ایس کیا بین الاقوامی دہشت گردوں کی کسی تنظیم کو ساتھ ملالو تب بھی دلاور کا بال بیکا نہیں کرسکوگے۔ تم کہوگے میں شیخی ماررہا ہوں۔ یہ بڑا بول ہے۔ ہاں ہے' آج جو کچھ ہے تمہارے سامنے ہے۔ تمہارا قانون' پولیس انصاف کے ٹھیکے دار۔ بڑے بڑے وکیل اور عدالتیں۔ جیل اور تھانے' کیا کوئی مجھے قید کرسکا؟ آج میں آزاد ہوں اور تم میری قید میں ہو۔ تم حق کا بول بالا رکھو۔ انصاف کے علمبردار بن کے نعرے لگاتے پھرو۔ عالمی پریس یا سلامتی کونسل سے اپیل کرو۔ کوئی بھی کسی چوہدری دلاور کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور۔ بنیادی آئینی حقوق۔ شخصی آزادی' جمہوریت۔ عالمی عدالتِ انصاف۔ اور ہزاروں ایسے ہی ادارے سب ڈرامے ہیں۔"

"یہ تمہاری اور تم جیسوں کی وجہ سے ہے۔ اور تم کو ہر آئینے میں اپنا عکس نظر آتا ہے تو قصوروار آئینہ نہیں۔"

"پیڈرو سے پوچھو کہ اس نے وزیر خان کو کیسے اور کب قتل کیا تھا پھر اس کی لاش کو مدفن سے نکال کے کہاں لے گیا تھا۔ وہ تمہیں سب بتادے گا۔ میں تمہیں ایک ٹیپ دوں گا جس میں اس کی اور میری گفتگو ہے۔ میں نے جانتے بوجھتے اسے باتوں میں اُلجھا کے ایسے سوالات کیے ہیں کہ جواب میں اس نے ہر بات بتادی ہے۔ بڑے فخر اور غرور کے ساتھ۔ میرا رویّہ بھی حوصلہ افزائی اور شاباشی کا تھا اس لیے وہ بولتا گیا۔ یہ جانے بغیر کہ سب کچھ ریکارڈ ہورہا ہے۔ پہلے اس سے سب کچھ پوچھنا' وہ آسانی سے سچ نہیں بولے گا۔ جو وہ پہلی بار خود بتائے وہ بھی ریکارڈ کرلینا۔ پھر ایسے پوچھنا جیسے پولیس تھانوں میں پوچھتی ہے اور آہستہ آہستہ جھوٹ میں سے سچ ایسے نکال لیتی ہے جیسے دہی کو بلو کے خالص مکھن نکالا جاسکتا ہے۔ جب خالص مکھن حاصل ہوجائے تو وہ ٹیپ سن لینا جو میں دوں گا۔ دونوں کا موازنہ کرلینا فرق ہو تو مجھے بتانا۔ سچ تو ایک ہی ہوگا نا۔ رہی بات رشوت دینے کی تو اپنے سکندر صاحب'

امور پر بات کریں گے۔"

"کون سے دیگر امور؟"

"وہی.... کیا کہتے ہیں... تصفیہ طلب۔"

میں نے کہا "ان پر تصفیہ ناممکن ہے۔"

وہ ہنسا "سب وقت اور حالات پر منحصر ہے۔ تصفیہ کرنا پڑجاتا ہے اپنے سکندر صاحب۔ ہم جیسا بندہ بھی مجبور ہو جاتا ہے۔ اب میں بتاؤں کہ میں تمہارے ساتھ یہ سلوک کرنے پر کیوں مجبور ہوا تھا؟"

"تم بتا چکے ہو۔"

اس نے نفی میں سرہلایا "میری بیوی میرا فیصلہ نہیں بدل سکتی تھی۔ نہ میں نے اسے کبھی اجازت دی کہ میرے معاملات میں بولے۔ نہ یہ اس کا کام تھا۔ وہ بھی سمجھتی تھی۔ پھر ایسا ہوا کہ مردوں والے کام اسے کرنے پڑے۔ مگر وہ اکیلی نہیں تھی۔ بیٹا اس کے ساتھ تھا۔ دلاور جونیئر۔ جس طرح میری بیوی نے تمہاری سفارش کی اور تعریف کی۔ وہ شاید میں برداشت نہ کرتا۔ طلاق دے کے کہتا کہ بے غیرت جا اسی سے نکاح پڑھوا لے یا اسی کے ساتھ رہ جس کا کلمہ پڑھ رہی ہے۔ مگر ماں کے ساتھ جب اس سے ایک بالشت زیادہ قد کا بیٹا کھڑا ہو۔ جو تمہارے برابر آتا ہو اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتا ہو۔ تو پھر کچھ نہیں کرسکتا چوہدری دلاور بھی۔ فیصل نے بھی کہا کہ ابا جی' اماں ٹھیک کہتی ہے۔ منہ پر مارو اس کمینے کا احسان تاکہ ہم آزاد ہو جائیں۔ پھر میں سمجھ لوں گا اس سے۔ اور میں نے کہا کہ اچھا بیٹا' تم کہتے ہو تو ٹھیک ہے۔ فیصل وہی زبان بول رہا تھا جو میری زبان تھی۔ وہ کل کا چوہدری دلاور ہے۔ میرا مستقبل ہے۔ اس راستے پر چل رہا ہے جس پر میں چل رہا ہوں اور اپنے سکندر صاحب' اس سے اچھی بات کیا ہوسکتی ہے کہ جب آپ کمزور پڑنے لگیں تو جوان بیٹا آپ کے کندھے سے کندھا ملا کے کھڑا ہو جائے اور کہے ابا جی' اب آپ چھوڑیں' میں نمٹ لوں گا آپ کے دشمنوں سے۔ تو چوہدری دلاور بھی مجبور ہوگیا۔"

"یعنی تم اپنی بیوی کی محنت' لگن اور جدوجہد۔ اس کی محبت اور خلوص کی قدر نہیں کرسکتے۔ اس لیے کہ وہ بیوی ہے۔" رابعہ نے کہا "بیوی دوسری بھی مل جاتی ہے۔ تیسری چوتھی بھی مگر فیصل جیسا جوان بیٹا نہیں ملتا۔"

"ٹھیک کہا تم نے۔ فیصل کی ماں کو بھی تم سے زیادہ میں جانتا ہوں مس رابعہ" اس نے تلخی سے کہا اور ایک دم اُٹھ کے باہر چلا گیا۔

ہم کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔ کمرے میں ہمارے سامنے کوئی بھی نہیں تھا۔ شاید کسی پردے کے پیچھے بھی نہیں تھا مگر یہ خیال اپنی جگہ تھا کہ کہیں دیوار میں یا کسی خفیہ گوشے میں نصب کیمرے کی آنکھ سب کچھ دیکھ رہی ہوگی اور کسی کمرے کے ٹی وی اسکرین پر دیواروں کے اندر کا پورا منظر نہ جانے کتنے لوگوں کی نظر میں ہوگا۔ گلدان یا ٹیبل لیپ اور کسی بھی ڈیکوریشن پیس میں چھپا ہوا مائکرو فون ہماری گفتگو کے ہر لفظ کو واضح طور پر سنوا رہا ہوگا۔

میں نے رابعہ کی طرف دیکھا "میرا ذہن کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر ہے' تم کیا کہتی ہو؟"

"ہم فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں کہاں ہیں؟"

"ہم اعتبار بھی نہیں کرسکتے۔ دلاور کی بات کا مطلب کبھی ایسا نہیں ہوتا جو سمجھ میں آجائے۔"

"ہاں۔ اس کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔"

میں نے ایک کونے میں رکھے ہوئے ٹیلی فون کی طرف دیکھ "کیا یہ فون کام کرتا ہے؟"

"میں دیکھ کے بتاتی ہوں۔ کسے فون کروگے؟"

"وقار یوسف کو" میں نے کہا۔

رابعہ نے مجھے حیرانی سے دیکھا "اس سے کیا کہوگے؟"

"یہ معلوم کروں گا کہ غالب اور نازو پہنچ گئے ہیں یا نہیں؟"

رابعہ نے تھوڑے سے تذبذب کا مظاہرہ کیا۔ پھر وہ سمجھ گئی کہ میں صرف تصدیق کرنا چاہتا ہوں۔ ان تمام باتوں کی جو دلاور نے کی ہیں۔ کیا ہم واقعی آزاد ہیں۔ ہم قیدی نہیں ہیں۔ ہم فون پر کسی سے بھی بات کرسکتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فون پر ہماری گفتگو سنی جائے گی مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ نہ ہم پولیس کو یہاں بلا سکتے تھے نہ کسی مددگار کو۔ ہمیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ کون سی جگہ ہے یا اس فون کا نمبر کیا ہے۔ کال سے فون نمبر کا پتا لگایا جاسکتا ہے اور فون نمبر سے ایڈریس معلوم ہوجاتا ہے لیکن اس میں بہت وقت لگتا ہے۔ غالب کیا کرسکتا ہے اور پولیس کیا کرسکتی ہے۔ ان کے پہنچنے سے پہلے تو دلاور ہمیں دوسری جگہ شفٹ کرادے گا۔

رابعہ نے کہا "فون تو کام کررہا ہے۔"

میں نے کہا "نمبر ملاؤ کسی کا بھی۔"

"میرا خیال ہے کہ منظر سے بات کرلو" اس نے ریسیور مجھے تھمادیا۔

ریسیور اس کے کسی بچے نے اٹھایا "کون ہے....؟" وہ بدتمیزی سے بولا۔

"تمہارا اصل ابا گھر میں ہے؟" میں نے کہا۔

"اصل ابا اشارے سے پوچھ رہا ہے کہ معلوم کرو' کون ہے؟"

"اس کو بتاؤ کہ میں اس کا ہونے والا قاتل ہوں۔"

میں نے بچے کی آواز سنی "ابا۔ تمہارا ہونے والا قاتل ہے۔"

پس منظر میں منظر کی غصے سے بھری ہوئی آواز اُبھری "یہ کون بھوتنی کا ہے' سالے کو میں نہ قتل کرآؤں پہلے۔"

اس کی بیوی نے دور سے کہا "کیوں جی۔ سالے نے کیا بگاڑا تمہارا یا کوئی اور سالا بھی ہے تمہارا۔ کون ہے یہ نیا سالا آخر اور کب سے ہے؟"

اس کی زبان کی قینچی ایسے ہی چلتی تھی۔ منظر نے اسے ایک شاندار گالی سے نواز کے خاموش کیا اور فون میں دہاڑا "کون اُلو کا پٹھا ہے؟"

"بتایا ہے نا ابھی" میں نے غرا کے کہا "سمجھ میں نہیں آئی بات؟ کیا فارسی بولی تھی میں نے۔"

وہ صدمے اور حیرت سے ایک سیکنڈ خاموش رہا' پھر چلّایا "ابے تو بھوتنی والے.... ابے کہاں سے بول رہا ہے۔"

"پھر وہی احمقانہ سوال۔ ابے میں اپنے منہ سے بول رہا ہوں۔ تو کہاں سے بول رہا ہے۔"

"تیری تو بیوی کی.... اُلو کے پٹھے۔ اتنا بڑا مجمع ہے میرے سامنے۔ اس جلسۂ عام میں گالیاں کھائے گا مجھ سے.... ایسی تشویشناک اطلاعات ملی تھیں تیرے بارے میں کہ رات کو نیند بھی نہیں آئی۔ بھوک بھی کھل گئی اور باقی پوچھ لے اپنی بھابی سے...."

میں نے کہا "ایسی کون سی خوش خبری تھی ہمارے بارے میں؟"

"معلوم ہوا تھا کہ تم دونوں۔ یعنی تم اور تمہاری غیر ممکنہ زوجہ۔ مہمان ہوا اپنے چوہدری دلاور صاحب کے۔ ہم نے کہا چلو جو اللہ کو منظور۔ ایک دن یہ تو ہونا ہی تھا۔ ہم تو کب سے دعائیں مانگ رہے تھے کہ خس کم جہاں پاک ہو۔ تمہارے زندہ رہنے سے ہماری زندگی حرام تھی۔"

میں نے کہا "اور تم نے یقین کرلیا تھا...."

"یقین.... ابے سارا بندوبست کرلیا تھا۔ غائبانہ نماز جنازہ کا بھی۔ اور میں تو شکرانے کے دو نفل پڑھتا۔ کہ اپنے چوہدری صاحب نے بڑا احسان کیا ورنہ تم ایسے کہاں تھے بھوتنی کے۔ آسانی سے ہماری جان چھوڑنے والے۔ بس وہ اتنی نیکی اور کرتے کہ خود ہی کہیں گاڑ بھی دیں۔"

"بکواس کیے جارہا ہے کب سے۔ کس اُلو کے پٹھے نے ایسی بے پر کی اڑائی تھی" میں نے کہا۔

"اور کون ہے اپنے جاننے والوں میں۔ چنڈو خانے کی خبریں لانے والا نامی گرامی صحافی' مرزا غالب کا وہ.... اب میں کیا کہوں' صرف وہ ہی نہیں اس کی وہ قاتل حسینہ.... جس کا نام نکاح نامے میں نہیں ایف آئی آر میں لکھا جانا چاہیے کہ اس نے غالب کو زوجیت میں قبول کیا تھا زیرِ دفعہ تین سو سات ارادۂ قتل کے تحت... وہ بھی یہی کہہ رہی تھی۔"

"تم نے یقین نہیں کیا ان پر تو ان کا کیا قصور؟" میں نے سکون کا سانس لیا۔

"کیا! یہ تم.... واقعی تم وہیں ہو۔ اس کے گھر میں.... اور زندہ بھی ہو" وہ چلانے لگا "یہ تیری روح تو ہم کلام نہیں ہے نا فون پر؟"

"ابے ہم بالکل خیریت سے ہیں۔ غالب اور نازو نے جو بتایا سو فیصد سچ تھا۔" میں نے کہا۔

"اچھا بھئی۔ جہاں رہو خوش رہو۔ ہم تو ہمیشہ یہی دعا دیتے ہیں اور ہم سب کی فلاح اسی میں ہے کہ وہیں رہو" منظر بولا "اچھا کیا تم نے کہ اسے ماموں بنالیا۔ گلے مل لئے اور سارے گلے شکوے تمام ہوئے۔"

"یہ کون کہہ رہا ہے۔ ابے ہم جھگڑے بڑھانے کے لیے خود یہاں اپنی مرضی سے قیام پزیر ہیں۔ جلتی پر تیل چھڑک رہے ہیں اور ایک معاہدہ کررہے ہیں کہ جنگ میں کچھ مزہ نہیں آرہا ہے' نئے اسباب تلاش کیے جائیں اور کچھ سنسنی پیدا کی جائے۔ دشمنی میں اضافے اور خونریزی کی رفتار بڑھانے کے اقدامات پر غور کررہے ہیں۔"

منظر نے آہ بھری "کھلا دیا نا اس نے کچھ؟ پاگل کُتّے کے گوشت کی بریانی وغیرہ۔ فون کہاں سے کررہا ہے تو آخر۔"

"یار بتایا تو ہے۔ اس کے گھر سے جس کے مہمان ہیں۔"

"دیکھ اس وقت میں ذرا مصروف ہوں۔ میرا ساتواں' گیارہواں اور تیرہواں بچہ۔ نہیں' تیرہویں تو بچی ہے شاید۔ خیر ان کو ہے بخار۔ تیسرا اور چودہواں ہمیشہ کی طرح ڈائریا میں مبتلا ہیں۔ میری بیوی اگلے بچے کے وارد ہونے کی تاریخ کا اعلان کرنے ہی والی تھی یعنی سترہویں کا اور ہم اٹھارہویں کی منصوبہ بندی کررہے تھے۔ اس لیے سوری" اس نے فون رکھ دیا۔

رابعہ نے کچھ میری باتوں سے اندازہ کرلیا تھا کہ منظر سے گفتگو کی نوعیت کسی حد تک شریفانہ ہے۔ وہ ہنس رہی تھی اور میرے کان سے اپنا گال لگائے کچھ سننے کی کوشش میں مصروف تھی۔

میں نے ریسیور رکھ کے کہا "کسی کو یقین نہیں آرہا تھا غالب اور نازو کی بات پر۔"

"یقین کیسے آسکتا تھا۔ مجھے بھی لگتا ہے کہ یہ بھی کوئی ڈراما ہے جو اچانک ختم ہوجائے گا" رابعہ بولی۔

"ویسے دلاور کو اتنا سیریس میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ اشتعال کی حالت میں دیکھا ہے اور بدمعاشی کے زعم میں دیکھا ہے۔ آج تو عجیب باتیں کررہا تھا وہ... یہ بھی حیرت ہے کہ غالب اور نازو کو انہوں نے واقعی چھوڑ دیا۔ کسی نے فون ٹیپ بھی نہیں کیا۔ لائن نہیں کاٹی۔"

"تم نے ایسی کوئی بات جو نہیں کی۔ ویسے وہ سب سن رہے ہوں گے اسی گھر کے کسی کمرے میں۔"

اب میرا خوف ختم ہوگیا تھا "رابعہ۔ اگر دلاور نے ہمیں بھی رہا کردیا اور پیڈرو کو ہمارے حوالے کردیا۔"

رابعہ بھی بے یقینی کا شکار تھی "ہاں۔ کیا کریں گے ہم؟"

میں نے افسوس سے سرہلایا "دلاور سے یہ بھی پوچھ لیتے تو اچھا تھا۔ اتنا مشکل ہے اس سوال کا جواب کہ افلاطون سے کیا

جاتا تو وہ بھی سر پھوڑ لیتا۔"

رابعہ خفا ہو گئی "تم پاگل سمجھتے ہو مجھے؟"

"اس سوال کے بعد تو ثابت ہو گیا۔ میرے سمجھنے کی بات نہیں رہی۔ بے وقوف لڑکی ہم یہاں سے چلے جائیں گے اور کیا کریں گے۔ استاد پیڈرو کے ساتھ۔"

"میرا مطلب تھا کہ دلاور کے ساتھ ہمارے معاملات..."

"ان کا پیڈرو سے کیا تعلق۔ حیرت ہے کہ تم وکیل ہو کے اتنا نہیں سمجھتی ہو۔ پیڈرو کا جرم الگ ہے اور سزا بھی اسے ملے گی۔ دلاور کے جرائم کی فہرست دوسری ہے۔ کیا دنیا میں ایسا ہو سکتا ہے۔ کسی عدالت کے نظام انصاف میں یہ ممکن ہے کہ ایک قاتل کہے جناب والا۔ میں دوسرے کیس میں مطلوب ایک قاتل آپ کے حوالے کر دیتا ہوں۔ اسے شوق سے پھانسی دیں اور مجھے اجازت۔ اس نیکی کے بدلے میرا جرم معاف کر دیا جائے۔"

"میں دنیا اور قانون کی بات نہیں کر رہی تھی" رابعہ نے خفت سے کہا "اس دلدل سے نکلنے کا کوئی طریقہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ قانون اور عدالت کے معاملات ہی نہیں ہیں۔ اور شاید ایسے ختم بھی نہیں ہوں گے۔ ہم خود بھی تو مجرم ہیں اگر ایمانداری سے دیکھا جائے تو۔ کیا نہیں کیا ہے ہم نے اور جو کیا ہے قانون کی نظر میں وہ جرم ہے۔ تمہارا یہ نظریہ اور فلسفہ بھی ٹھیک ہے کہ جو قانون کو ماننا ہی نہ ہو اس سے قانون کی زبان میں کیسے بات کی جائے۔ اور خود قانون بے بس ہے شہادت کے بغیر۔"

میں نے کہا "رابعہ۔ اس گھر میں خاموشی کیوں ہے؟"

"واقعی۔ اُلو بول رہے ہیں یہاں تو۔"

"دو اُلو۔ ایک نر ایک مادہ۔" میں نے کہا "اور کوئی آواز ہی نہیں۔ میں دیکھتا ہوں..."

رابعہ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا "بیٹھے رہو آرام سے۔"

"بیٹھ کے کیا کروں۔ تمہیں دیکھتا رہوں؟" میں نے کہا "اس سے ذہن میں فاسد خیالات پیدا ہوتے ہیں یعنی رومانی جذبات کا ٹمپریچر بڑھتا ہے۔"

"ابھی ٹھنڈے پڑ جائیں گے سارے جذبات اگر سر پر پھر ڈنڈا پڑ گیا" رابعہ بولی "پُرانا گومڑ ملاحظہ کر و اپنا۔"

"یہ گومڑ خاص ہے" میں نے کہا "میری بہادری کا میڈل۔ آخر ہم کب تک فضول باتیں کرتے رہیں گے۔ یا تو تم وہی ڈائیلاگ بولو جو فلم سات لاکھ میں مسرت نذیر نے بولے تھے اور ویسا ہی ڈانس کرو۔"

"مسرت نذیر بہت اچھی لگتی ہے؟"

"ہاں۔ بس ایک خرابی ہے اس میں۔ محبت نہیں کرتی مجھ سے۔ مجبوراً تم سے دل لگانا پڑا۔ قورمہ نہ ملے تو ٹنڈے ہی کھانے پڑتے ہیں۔ اب برائے مہربانی میرا ہاتھ چھوڑ دیں آپ۔ ورنہ اس کے غیر اخلاقی نتائج کے لیے تیار ہو جائیں۔ میں کوئی ایسی جذباتی گستاخی کروں گا... کہ سنسر والے بھی دم بخود رہ جائیں گے۔"

رابعہ نے گھبرا کے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ میں نے دروازے تک جا کے دیکھا "لاحول ولا قوۃ۔ یہ تو باتھ روم تھا۔ خیر اب آ گئے ہیں یہاں تو استعمال بھی کر لیتے ہیں۔"

دوسرا دروازہ رابعہ نے کھولا "ادھر بھی ایک کمرا ہے۔"

میں نے کہا "مبارک ہو۔ کولمبس کی بچی۔ اس نے امریکا دریافت کیا تھا۔ تم نے ایک کمرا دریافت کر لیا۔ کمرے میں کون ہے اور کیا ہے؟ میری مراد ان اشیا سے نہیں جو یہاں بھی ہیں۔ کوئی بندہ بشر، ہاتھی شیر، کتا بلی، جن بھوت غالب کے سسر جیسا۔"

رابعہ نے نفی میں سر ہلایا "ایک ہی بھوت کو دیکھ سکتی ہوں مگر جو میری جان کو چمٹ گیا ہے۔ چھوڑتا ہی نہیں۔"

"چھوڑنے کا بھی نہیں۔ جان کو کیا کسی دن تم کو ایسا چمٹے گا جیسے ویلڈنگ سے لوہا لوہے کو پکڑ لیتا ہے۔" میں نے دوسرے کمرے میں داخل ہو کے دیکھا "میرے جذبات کی قوت ویلڈنگ کے شعلے سے زیادہ ہے اور ہم ہیں بھی فولادی۔ عزائم کی وجہ سے۔"

رابعہ ہنستی رہی اور کچھ شرماتی بھی رہی۔ اس کے خیال میں میری باتیں فحاشی کے زمرے میں آتی تھیں جبکہ میں بڑی شریفانہ گفتگو کر رہا تھا۔ ظاہر ہے قصور اس کی سمجھ کا تھا۔

ہم ایک کے بعد دوسرے کمرے میں گئے۔ یہ بہت بڑی اور شاہانہ انداز میں آراستہ کوٹھی تھی لیکن اس میں نہ دلاور تھا نہ اس کے محافظ اور نہ بیوی بچے۔ سجا سجایا لیکن انسانوں سے خالی گھر آسیب زدہ لگتا ہے۔

"کیسی عجیب بات ہے۔ قیدی موجود ہیں۔ قید کرنے والے بھاگ گئے تم نے کبھی سنا کہ جیلر فرار ہو گیا ہو جیل سے۔"

رابعہ نے ڈر کے میرا بازو تھام رکھا تھا "یہاں سے نکل چلو سکندر۔ نہ جانے کس کی کوٹھی ہے۔ کوئی آ گیا تو خواہ مخواہ پکڑے جائیں گے۔"

"واقعی خواہ مخواہ کیوں پکڑے جائیں۔ چلو ایسا کرتے ہیں کچھ چُرا کے لے جاتے ہیں۔ ابھی نہیں مالک آ جائے، اس کے سامنے چوری کریں گے ورنہ تو پکڑا جانا مشکل ہے۔ آخر تم ایک معزز وکیل ہو... اور میں..."

"ہائے اللہ..." رابعہ نے ایک دروازہ کھولا اور پھر ایک چیخ مار کے بند کر دیا۔

میں نے کہا "کیا ہے اندر؟ لاش؟ آدم خور شیر..... بھوت...؟"

"وہ... پیڈرو..... اندر پیڈرو ہے" رابعہ نے بمشکل تمام کہا۔

"استاد پیڈرو کہو" میں نے اسے ڈانٹا "فوت شدہ حالت میں ہے؟"

رابعہ نے نفی میں سر ہلایا اور دروازہ کھول دیا۔ یہ ایک شاک کا ردِ عمل تھا ورنہ پیڈرو کو دیکھ کے چیخ مارنا ضروری نہیں تھا خواتین بعض اوقات ایسی زنانہ حرکات شوقیہ بھی کرتی ہیں۔ دج

...استاد پیڈرو اہرامِ مصر سے برآمد ہونے والی ممی کی طرح ...لپٹا ہوا تھا۔ وہ ٹیڑھا ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ ایک بہت مضبوط ...مگر لمبی رسی اس کے جسم پر اوپر سے نیچے تک ایسے ...لپیٹی گئی تھی کہ ایک بل سے دوسرا بل ملا ہوا تھا۔ رسی نیلے رنگ کی تھی چنانچہ پیڈرو کے جسم پر نیلی ڈانگری سی نظر آ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں لیکن منہ بند تھا۔ منہ بند رکھنے کے لیے ...بھی استعمال کیا جا سکتا تھا اور ٹیپ بھی مگر پیڈرو کے منہ میں ...مُردہ چوہا تھا۔

...میں قائل ہونے لگا تھا کہ رابعہ نے جو چیخ ماری تھی وہ بے ...نہیں تھی۔ اگر یہ سین پہلے میں دیکھتا تو حلق سے کوئی آواز ...ضرور نکلتا خواہ چیخ مار کے ہائے اللہ نہ کہتا۔

یہ چوہا بالکل ویسا ہی اور اتنا ہی بڑا تھا جیسا میں نے گنز لائن کی ...میں دیکھا تھا۔ میرا زخمی انگوٹھا ابھی تک درد کر رہا تھا اور مجھے ...معلوم تھا کہ اس کے زہریلے اثرات سے بچنے کے لیے مجھے کوئی ...اینٹی بایوٹک دوا بھی کھانی پڑے گی۔ شاید اے ٹی ایس کا انجکشن ...بھی لگوانا پڑے۔

اتنا بڑا چوہا پیڈرو کے حلق سے نہیں اُتارا جا سکتا تھا اور پورا ...اس کے منہ میں بھی نہیں ٹھونسا جا سکتا تھا چنانچہ چوہے کا پچھلا ...نصف دھڑ اندر تھا۔ مُردہ چوہے کی کھلی آنکھوں والا منہ باہر تھا اور ...یوں لگتا تھا جیسے چوہا اپنے بِل سے باہر آ رہا ہو۔ یہ بھی میں نے دیکھ ...لیا کہ پیڈرو کیوں سر کو جھٹک کے چوہے کو منہ سے اُگل نہیں سکتا ...تھا۔ اس کا سر دونوں طرف سے شکنجے میں کسا ہوا تھا۔ یہ شکنجہ خاص ...طور پر نہیں بنوایا گیا تھا۔ سر کے ایک طرف دو اینٹوں سے دیوار اور ...سر کے درمیانی خلا کو پُر کر دیا گیا تھا۔ دوسری طرف لکڑی کا بلاک ...رکھ کے کار کو اٹھانے والے جیک سے لوہے کی ایک سلاخ کو ٹائٹ کر دیا گیا تھا۔

پیڈرو کے پاؤں بھی آزاد نہیں تھے۔ جانے سے پہلے چوہدری دلاور کا انتظام کر گیا تھا کہ وہ اپنی جگہ سے ایک سوت بھر اِدھر اُدھر نہ ہو سکے۔ پیڈرو بہت بڑا بدمعاش تھا اور اس نے بے خوفی سے بڑے بڑے جرائم کیے تھے، انسانوں کو بڑی بے رحمی سے مارا تھا مگر اس وقت وہ اتنا دہشت زدہ تھا کہ اس کی حالت الفاظ میں بیان نہیں کی جا سکتی۔

"شیخ صاحب۔ میں کیا بتاؤں کہ یہاں تم سے مل کے اور تمہیں اتنا خوش و خرم دیکھ کے مجھے کتنی دلی مسرت حاصل ہوئی ہے" میں نے اس کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھ کے کہا۔

رابعہ نے ابکائی لی "سکندر۔ خدا کے لیے۔ اس چوہے کو تو منہ سے باہر نکال دو۔"

میں نے کہا "تم ادھر مت دیکھو۔ یا باہر چلی جاؤ۔ دیکھو کسی کمرے میں فریج تھا۔ اس میں کچھ مل جائے گا۔ ٹھنڈا پانی پی لو۔ اپنے اُستاد پیڈرو جو کھا رہے ہیں انہیں کھانے دو۔ انہیں ایسی ہی چیزیں مرغوب ہیں۔ نہ جانے کتنے انسانوں کا خون پیا ہو گا۔ چوہا کیا چیز ہے۔"

رابعہ باہر چلی گئی تو میں نے چوہے کو مخاطب کیا "خبیث۔ گنز لائن سے پیڈرو کے پیٹ میں پہنچ گیا تھا۔ خیر، ایک جیسی گندی جگہ ہے یہ بھی۔ مگر دیکھا، پھنس گیا نا استاد پیڈرو کے پاس آ کے۔ بڑے شکاری ہیں یہ۔ مارا گیا تو بھی۔"

اِدھر اُدھر دیکھ کے میں نے ایک جوتا اٹھا لیا۔ یہ کوئی زنانہ سینڈل تھا۔ اس سے میں نے چوہے کے سر پر یوں مارا جیسے اسے اندر اُتارنا چاہتا ہوں۔ چوہے کی دُم غالباً پیڈرو کے حلق میں ہو گی۔ اس کا جسم یوں تھرتھرایا جیسے الیکٹرک شاک لگا ہو۔ اس کی آنکھوں کی دہشت خطرناک حد تک بڑھ گئی۔ عام آدمی کا اس قسم کی اذیت میں ہارٹ فیل بھی ہو سکتا تھا مگر پیڈرو عام آدمی نہیں تھا اس کا دل بہت سخت تھا۔ وہ ابکائی تک نہیں لے سکتا تھا اور قے نہیں کر سکتا تھا۔ قے کرنے کا راستہ ہی بند تھا۔

"جی تو یہی چاہتا ہے پیڈرو کہ تم کو اسی حالت میں چھوڑ جاؤں۔ اتنی پُر اذیت موت کا آئیڈیا تو میرے ذہن میں بھی نہیں آ سکتا تھا۔ یہ کمال ہے اپنے چوہدری صاحب کے دماغ کا۔ تمہارے باس، تمہارے ان داتا، تمہارے آقا اور والد ماجد۔ بڑی وفاداری سے تم نے ان کے ہر حکم کی تعمیل کی۔ وہ کہتے تو ان کے اشارے پر تم اپنی ماں.... خیر چھوڑو، تم نے جو کچھ کیا اس کا انعام بھی پایا۔ یہ آخری خدمت کا صلہ بھی خوب ملا تمہیں۔ اس نے تمہیں میرے حوالے کر دیا ہے۔ اور صاف کہہ دیا ہے کہ..."

میں نے محسوس کیا کہ پیڈرو کی آنکھیں بند ہو گئی ہیں اور وہ میری باتیں نہیں سُن رہا ہے۔ اس کی قوتِ برداشت ختم ہو گئی تھی۔

میں نے اس کے منہ سے چوہے کو کھینچ کے نکالا تو کراہیت سے خود میرا جی متلانے لگا اور پھر مجھے اُلٹی آ گئی۔ شاید چوہا اس وقت زندہ تھا جب اسے پیڈرو کے منہ میں ٹھونسا گیا تھا۔ پیڈرو نے مزاحمت ضرور کی ہو گی۔ اس نے اپنا منہ بند کر لیا ہو گا اور دانت مضبوطی سے دانتوں پر جمائے ہوں گے لیکن وہ لوگ منہ کھُلوانا جانتے ہیں۔ پیڈرو ان کی طاقت کے سامنے اتنا ہی بے بس تھا جتنا چوہا۔ اس کوشش میں چوہا مر گیا تھا اور اس کا جسم پیڈرو کے دانتوں سے کٹ گیا تھا۔ اُدھڑے ہوئے جسم سے نکلنے والی غلاظت میں خون بھی شامل تھا۔ یہ سب پیڈرو کے حلق میں اُتر گیا تھا۔ جب تک چوہا مرا نہیں ہو گا اسے پیڈرو کے منہ میں دبا کے رکھا گیا ہو گا اور پھر پیڈرو کو چھوڑ دیا گیا ہو گا کہ اب وہ چاہے تو اپنا منہ بند کرے۔ اپنے دانتوں کو چوہے کے جسم میں گاڑ دے اور چوہے کے گوشت کا ذائقہ اچھا نہیں لگتا تو پھر منہ کھُلا رکھے۔

یہ بدترین اذیت تھی جس کو پیڈرو جھیل گیا تھا۔ اس خیال

ست ۔ ۔ مجھے جھرجھری آگئی کہ کوئی یہ میرے ساتھ کرتا تو کیا میں برداشت کرپاتا۔ چوہدری دلاور نے جو پیڈرو کے ساتھ کیا تھا وہ رابعہ کے ساتھ بھی کرسکتا تھا۔ رابعہ تو مرجاتی۔ پھر مجھے خیال آیا کہ ممکن ہے یہ ظلم دلاور نے نہ کیا ہو۔ اس کے کسی حکم کے غلام نے پیڈرو سے پرانا بدلہ لیا ہو۔ جب وہ دلاور کا دست راست اور منظور نظر تھا تو اس نے بہت سے لوگوں کے ساتھ انسانیت سوز سلوک روا رکھا تھا۔ اب وہ معتوب تھا اور کل کے معتوب مقربینِ خاص کے عہدے پر فائز تھے۔

میں نے کپڑے سے پکڑ کے چوہے کو ایک پلاسٹک کی تھیلی میں ڈالا اور باہر کی گیلری میں پھینک دیا۔ رابعہ صوفے پر نڈھال پڑی تھی اور کوئی شربت پی رہی تھی۔ اس نے مجھے باہر آتے دیکھا اور تھیلی دیکھ کے سمجھ گئی کہ میں کیا کارروائی کررہا ہوں۔

جب میں واپس آیا تو وہ پیڈرو کے پاس موجود تھی۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں بھی کوئی ڈرنک تھا "لو پیو، عیش کرو۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ میں نہیں پیتا۔ غم غلط کرنے کے لیے۔"

"دودھ میں ہارلکس" اس نے کہا "گلوکوز کے ساتھ۔"

"اور کچھ نہیں ملا گھر میں؟" میں نے گلاس لے لیا۔

"میرے سسر کا گھر نہیں ہے یہ کہ مجھے معلوم ہو۔ فرج میں جو تھا وہ بنالیا۔" وہ بولی "جلدی سے نکلو یہاں سے ورنہ بے عزتی ہوگی۔"

"یہ فکر مجھے تو نہیں ہے کیونکہ فی زمانہ اپنی کوئی عزت ہی نہیں، مسئلہ ہے اس ممی کا۔"

"یہاں کون سی ممی بنالی؟"

"جاہل لڑکی۔ فرعون مصر کی لاش کو ممی کہتے ہیں۔ جو اہرام مصر سے نکالی گئی تھی۔ اگر رکھنے والے اس کا نام ڈیڈی رکھ دیتے تو میں ڈیڈی کہتا۔"

رابعہ نے کہا "یہ بے ہوش ہے یا مرگیا ہے؟"

"ایسے نہیں مرنے دوں گا میں اس کو۔ اور ویسے بھی بے غیرت مشکل سے مرتے ہیں۔" میں نے کہا "اب ہم جائیں تو اسے کیسے لے جائیں؟"

"پہلے تو اس کی رسیاں کھولو۔ شکنجے سے نکالو اسے ورنہ لاش ہی لے جانی پڑے گی۔ بے ہوشی میں ہی اٹھالیتے ہیں۔ راستے میں ہوش آیا تو پھر بے ہوش کردینا۔ تم تو ماہر ہو اس کام کے۔"

میں نے عاجزی سے تسلیم کیا "اب تو اتنی مہارت ہے خاتون کہ مجھے کوئی بھی سرجن آپریشن سے پہلے بلا کے کہہ سکتا ہے کہ مریض کو ایک گھنٹے کے لیے بے ہوش کردو یا چار گھنٹے کے لیے۔ اسی کے حساب سے وار ہوگا۔ بہت خرچہ بچ جائے گا "اینس تھیزیا" (ANES THESIA) کے ماہرین کی فیس بھی سرجن سے کم نہیں ہوتی۔"

رسی ایک کنارے سے کھل گئی تو پھر کھلتی چلی گئی۔ ہر پل کے ساتھ پیڈرو کو اُلٹنے پلٹنے میں البتہ محنت ہوئی۔ یہ اطمینان ہوجانے کے بعد کہ دلاور اینڈ کمپنی واقعی ہم کو ہمارے حال پر چھوڑ کے اسی طرح چلی گئی ہے جیسے انگریز ہندوستان چھوڑ کر گئے تھے تو میں خود کو بہت آزاد اور پراعتماد محسوس کررہا تھا۔ میں نے باہر نکل کے اندازہ کرنا چاہا کہ ہم کہاں ہیں مگر سمت کے سوا کسی بات کا پتا نہیں چلا۔ پورچ میں ایک گاڑی موجود تھی اور یہ سفید رنگ کی اوپل ایکارا تھی۔ اس کی ڈکی میں دلاور جیسے دو بھی مزے سے لیٹ سکتے تھے۔ گاڑی میں چابی دیکھ کے میں سمجھ گیا کہ یہ ہمارے ہی استعمال کے لیے چھوڑی گئی تھی لیکن اس بھروسے پر سوچے سمجھے بغیر گاڑی اسٹارٹ کرنے کا نتیجہ یہ بھی نکل سکتا تھا کہ کچھ پتا چلنے سے پہلے جسم کے اجزائے خاکی منتشر ہوجائیں اور روح پہنچ جائے عالم ارواح میں۔ اپنی مرگِ ناگہاں پر حیران ہونے یا افسوس کرنے کا موقع بھی نہ ملے۔

میں نے احتیاط سے کار کا بونٹ کھولا اور انجن کا معائنہ کسی ماہر کی طرح فرمایا۔ انجن کے پُرزے ہر گاڑی میں وہی ہوتے ہیں خواہ ان کی جگہ بدلی ہوئی ہو اور ٹائم بم یا الیکٹرک اسپارک سے پھٹنے والا بم سامنے ہی کہیں نصب کردیا جائے ۔۔ ڈسٹری بیوٹر کیپ یا مین کوائل کے ساتھ تو فوراً نظر آجاتا ہے۔ لگانے والا عموماً یہ سمجھتا ہے کہ کار والا تو دروازہ کھول کے بیٹھے گا۔ چابی لگا کے گاڑی اسٹارٹ کرے گا اور اللہ کو پیارا ہوجائے گا چنانچہ بم کو چھپانے کے لیے زیادہ محنت کرنے کی کیا ضرورت ہے لیکن چالاک یا محتاط شخص بم کو ایسے چھپا سکتا تھا کہ مجھے ایک نظر میں خاک پتا نہ چلتا۔

میں نے جھک کے باڈی کے نیچے، [illegible] اور سسپنشن کے حصوں کو دیکھا۔ پھر ڈکی کھولی اور لائٹس کے کنکشن چیک کیے۔ بظاہر سب ٹھیک تھا اور گاڑی لے جانے میں خطرے کی بات صرف اس حد تک تھی کہ ہم کار چوری کرنے کے الزام میں پکڑے جاتے تو ثبوت دینا مشکل ہوجاتا کہ ہماری نیت نیک تھی اور ہم شریف آدمی ہیں۔

آخری جگہ گلوز کمپارٹمنٹ تھی۔ اس میں گاڑی کے کاغذات تھے اور جب مالک کی جگہ میں نے رابعہ کا نام دیکھا تو واقعی بھونچکا رہ گیا۔ اب شبے کی کوئی بات نہیں رہی تھی کہ دلاور نے ہمیں رشوت میں آزادی، استاد پیڈرو اور یہ کار پیش کردی تھی کہ اب آگے تمہاری مرضی، جو چاہو کرو۔ کاغذات کے ساتھ مجھے ایک ٹیپ بھی ملا جو ہر طرف سے بند تھا۔ اس پر لکھا ہوا تھا "یہ مجرم کے اعترافِ جرم کے بعد سنا جائے" دوسری طرف یہ لکھا تھا کہ گم ہونے یا ضائع ہوجانے کی صورت میں اس کی نقل حاصل کی جاسکتی ہے۔

میں کاغذات لے کر اندر جانے لگا تو رابعہ مجھے دروازے میں کھڑی ہوئی نظر آئی۔ "میں نے پتا کرلیا ہے کہ کوٹھی کس کی ہے اور کہاں ہے؟"

"میں نے بھی بہت کچھ معلوم کرلیا ہے" میں نے کاغذات کو یوں لہرایا جیسے میں سی آئی اے کے ہیڈ کوارٹر سے انتہائی خفیہ دستاویزات نکال لایا ہوں "تمہارا کیا خیال تھا کہ مجھے پتا نہیں چلے گا۔ اتنا الو ہوں میں؟"

"تم نے کبھی بتایا بھی نہیں کہ تم کتنے الو ہو" رابعہ نے معصومیت سے کہا "ویسے کیا تیر مارا ہے آپ نے؟"

"یہ دیکھو۔ تم نے اتنی بڑی اور مہنگی کار خریدی۔ مجھے کیا کسی کو بھی نہیں بتایا۔ آخر کیوں، اتنا پیسہ کہاں سے آیا تمہارے پاس اور یہ کار یہاں کیوں کھڑی ہوئی تھی۔ کیا تعلق ہے تمہارا اس قصرِ عالی شان سے اور اس میں رہنے والے سے۔"

"رہنے والی سے بھی تو ہوسکتا ہے" رابعہ نے کاغذات مجھ سے لے کر دیکھے اور مجھ سے زیادہ حیران ہوئی "گاڑی میرے نام پر!"

"ہاں۔ یہ بھی جذباتی وابستگی کا ثبوت ہے۔ کون ہے وہ آخر جس نے اتنا قیمتی نذرانہ پیش کیا ہے تمہیں؟"

"دلاور کی بیوی تم پر فریفتہ ہوسکتی ہے تو دلاور مجھ پر ہوسکتا ہے۔ اور میں بھی اسے جذباتی ہمدردی کہہ سکتی ہوں۔ اب بتاؤ کرنا کیا ہے۔ ایسا نہ ہو پیڈرو اٹھ کے شور مچادے یا حملہ کردے۔ ہم نے اس کی تلاشی بھی نہیں لی ہے۔ کیا پتا اس کی جیب میں توپ ہو۔"

میں نے سرہلا کے رابعہ کی ذہانت کی داد دی "واقعی۔ یہ تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ خیر، یہ بتاؤ گھر کس کا ہے؟"

"کوئی راجا گل زمان ہے۔ اور کوٹھی ہے گلبرگ تھری میں۔ وہ شاید یہاں رہتا نہیں ہوگا۔ دلاور نے باپ کا گھر سمجھ کے استعمال کرلی۔ اب ہمیں فوراً کوچ کرجانا چاہیے یہاں سے۔"

"ٹھیک ہے۔ تم چل کے گاڑی میں بیٹھو اور گاڑی اسٹارٹ کرو۔ میں پیڈرو کو لاتا ہوں۔"

رابعہ نے صاف انکار کردیا۔ "میں دلاور پر بھروسا نہیں کرسکتی چابی لگاتے ہی دھماکا ہوگیا پھر؟"

"پھر کیا؟ ساری دنیا کا اصول ہے کہ لیڈیز فرسٹ۔ تمہارے پیچھے پیچھے میں بھی پہنچ جاؤں گا۔ وعدہ، اگلے دھماکے کی فلائٹ سے ویسے میں نے سب چیک کرلیا ہے۔ اپنی عقابی نظروں سے۔"

"ٹھیک ہے۔ جب تم بیٹھ جاؤ گے میرے ساتھ تو میں گاڑی ڈرائیو بھی کرلوں گی" رابعہ نے کہا۔

کوٹھی بہت بڑی تھی۔ غالباً دو کینال پر بنی ہوئی تھی۔ آدھا حصہ تو لان اور باغات کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا۔ باقی آدھے حصے کی عمارت بھی شاندار تھی اور اندر کے تمام اسباب سے مکینوں کی امارت کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا تھا۔ یہاں ہماری پوزیشن واقعی انتہائی مشکوک تھی لیکن آدھی رات کے وقت ہم نسبتاً محفوظ تھے۔ یہ بھی حیرانی کی بات تھی کہ اتنی بڑی کوٹھی لاوارث پڑی تھی۔ راجا صاحب نے یہاں چوکیدار تک نہیں چھوڑا تھا۔ اگر چھوڑا تھا تو اسے دلاور اینڈ کمپنی نے نہیں چھوڑا تھا۔ بہ صورت میں ہم کوٹھی کو اسی طرح کھلا چھوڑ کے جانے پر مجبور تھے۔ میرا دل تو بہت چاہتا تھا کہ جانے سے پہلے کچن میں جاکے دیکھا جائے اور رابعہ کو حکم دیا جائے کہ اشیائے خوردونوش تلاش کرے یا تیار کرے اور کافی کے ساتھ پیش کرے مگر مجھے پتا تھا کہ ایسی فرمائش کے جواب میں مجھے کیا سننے کو ملے گا۔ میں نے خود کو یاد دلایا کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے اور یہاں سے نکلنے کے بعد ہم وقار یوسف کے یا منظر کے گھر پہنچ کے حسبِ خواہش خاطر تواضع کراسکتے ہیں۔

پیڈرو کو میں نے پھر ڈکی میں ڈالا تو مجھے کراچی کا حادثہ یاد آیا۔ ایک معمولی سی انجانے میں سرزد ہونے والی غلطی نے مجھے اور پیڈرو کو کہاں سے کہاں پہنچادیا تھا۔ نہ میں گاڑی غلط جگہ پارک کرتا اور نہ پیڈرو کو رہائی نصیب ہوتی اور نہ میری فرنچ وکیل کی مصنوعی صورت کا راز فاش ہوتا۔ نہ دلاور میرے تعاقب میں آتا اور نہ ہم دلاور کے مہمان ہوتے۔ وہ تو کچھ پیڈرو کے ہی ستارے گردش میں تھے کہ اس کی تدبیر الٹی ہوگئی اور وہ پھر اسی طرح کار کی ڈکی میں قید تھا اور مجھے ایک نیکی نے دلاور کی قید سے نجات دلادی تھی۔

گاڑی باہر نکالنے تک مجھے یقین نہیں تھا کہ اب کچھ نہیں ہوگا۔ دلاور کی ہر بات کا مطلب اتنا سیدھا اور آسان بھی ہوسکتا ہے۔ یہ اتنا ہی بعید از امکان تھا جتنا وظیفے اور نقش اعظم کے باوجود مولوی خادم حسین کا الزبتھ ٹیلر سے عقدِ چہارم۔ تیسرا نمبر اس نے نیک والی مسرت نذیر کو پہلے سے دے رکھا تھا۔

جب رابعہ نے گاڑی دوڑانی شروع کی تو میں نے کچھ دیر مڑمڑ کے دیکھا اور سننے کی کوشش بھی کی کہ کار میں سے ٹک ٹک کی آواز تو سنائی نہیں دے رہی ہے۔ کیا پتا ایسا ٹائم بم ہو جس کا الیکٹرانک ٹائمر پانچ دس منٹ بعد شارٹ سرکٹ ہوجائے۔ پریشانی سے رابعہ کی حالت بھی غیر تھی اور میرے جسم پر بھی پسینہ بہہ رہا تھا۔

"اف۔ مجھے ابھی تک ایسا لگتا ہے.... جیسے کچھ ہوجائے گا؟"

میں مصنوعی طور پر اچھل پڑا "کچھ ہوجائے گا؟ کیا..." میں نے چلا کے کہا "اور چلتی گاڑی میں۔ آخر کیسے.... گاڑی موڑلو میٹرنٹی ہوم کی طرف...!"

رابعہ نے لال آنکھیں نکال کے کہا "اتنی بے شرمی کی باتیں کروگے تو سچ مچ کچھ ہوجائے گا۔"

میں نے ڈر کے کہا "کیا؟ لڑکا یا لڑکی؟"

"سکندر۔ باز آجاؤ۔ میں اتر جاؤں گی گاڑی سے" وہ خفگی سے بولی "یہ وقت ہے اس قسم کے مذاق کا؟"

"سوری، سوری۔ تم اتر جاؤ گی چلتی گاڑی سے تو گاڑی چڑھ جائے گی فٹ پاتھ پر" میں نے کہا "میں تو ذرا تمہارے ذہن کا بوجھ ہلکا کررہا تھا۔ تمہیں ہنسانا چاہتا تھا۔ تاکہ تمہارے اعصاب..."

"میرے اعصاب ٹھیک ہیں، یہ بتاؤ کدھر چلیں؟"

"تم پھر مذاق سمجھو گی مگر میں سیریس ہوں" میں نے کہا "ہمیں کہیں بھی نہیں جانا چاہیے۔"

"کیا مطلب؟ ایسے ہی سڑکوں پر پھرتے رہیں؟"

"نہیں۔ ہمیں وہاں نہیں جانا چاہیے۔ جہاں دلاور سمجھتا ہو کہ ہم جائیں گے۔ ہمیں غائب ہو جانا چاہیے فی الحال۔ مجھے یہ فرنچ وکیل کا ڈراما فوراً ختم کرنا پڑے گا۔ ابھی دلاور کے معاملے کو کچھ دن کے لیے ڈراپ کر دیتے ہیں۔ وہ ابھی ہاتھ آنے والا ہے بھی نہیں۔ پھر ہم کیوں اس کے ہاتھ آئیں۔ وقار یوسف کے یا منظر کے گھر۔ تمہارے آفس یا محسن کے گھر سے تو وہ ہمیں دوبارہ بھی پکڑ سکتا ہے۔"

"تمہاری بات غور طلب ہے۔"

"تم بلاوجہ دماغ پر بوجھ مت ڈالو۔ چھوٹی موٹر بھی زیادہ لوڈ سے جل جاتی ہے۔" میں نے کہا "سوچنے کے لیے میرا ہیوی ڈیوٹی اے ون دماغ جو ہے۔۔۔"

وہ بھنا کے بولی "اتنی بڑی وکیل میں دماغ کے بغیر بن گئی تھی؟"

میں نے کہا "میرا مطلب تھا کہ کافی استعمال کر لیا۔ جتنا بھی تھا۔ اب دیکھو اللہ نے کیا حسین صورت دی ہے۔ اس پر جتنا چاہو ناز کرو اور اتراؤ۔ کوئی حرج نہیں۔ دل چُراؤ' دل توڑو' دل سے فٹ بال کھیلو۔ میرے جذبات سے کھیلو۔ جذبات میں آگ لگاؤ۔ آتش زنی کا کیس نہیں بنے گا۔"

"افوہ۔ کیا اول فول بولے جا رہے ہو۔"

"وہ دراصل۔ یہ حال ہوا ہے بھوک سے۔ پیٹ خالی ہو تو دماغ اُتر آتا ہے معدے میں" میں نے کہا "ایسا کرتے ہیں۔۔۔۔ پہلے تو چلتے ہیں کہیں پیٹ پوجا کرتے ہیں۔ وہیں سے اپنے لواحقین کو فون کر کے بتا دیں گے کہ ہم جا رہے ہیں' کہا سُنا معاف۔"

"کہاں جا رہے ہیں؟ یہ بھی بتانا پڑے گا۔"

"یہ ہم کیسے بتا سکتے ہیں۔ جہاں تقدیر لے جائے یا استاد پیڈرو۔"

"یعنی رات کو قیام نہیں ہو گا کہیں بھی۔"

"میری مانو تو لاہور سے نکل چلو' آج ہی رات۔ سو پچاس میل دور جا کے کہیں گاڑی روک لیں گے۔ کسی بھی جگہ جہاں ٹرک اور بسیں وغیرہ کھڑی ہوئی ہوں۔ وہیں ہم ایک سائڈ پر کار پارک کر دیں گے۔ میں کہہ دوں گا کہ بیوی کی طبیعت۔۔۔"

"کون سی بیوی۔۔۔۔ کس کی بیوی۔۔۔؟"

"اچھا بھئی کار کی طبیعت اچانک بگڑ گئی ہے۔ صبح تک تم کار میں بھی سو سکتی ہو۔ چارپائی بھی مل جائے گی۔ میں پیڈرو کا خیال رکھوں گا۔ صبح پھر روانہ ہو جائیں گے۔"

"لیکن جائیں گے کدھر۔ کس سمت میں؟"

میں نے کہا "جی ٹی روڈ پر مغرب کی طرف۔ مجھے یقین ہے کہ پیڈرو بھی ہمیں اُدھر ہی لے جائے گا۔ اوکاڑہ سے آگے۔"

"یہاں سب پریشان ہوں گے۔"

"ان کو سمجھا دیں گے کہ بچو۔ پریشان مت ہونا۔ ہم لوٹ آئیں گے۔ ہنی مون سے۔۔۔۔ تم کہہ دینا کہ شادی کر لی ہے میں نے۔"

"پھر بکواس۔"

"اچھا بھئی میں کہہ دوں گا کہ میں نے شادی کر لی ہے۔ تمہیں کیا اعتراض ہے۔ اور اس بات کا یہ مطلب تو نہیں نکلتا کہ میں نے تم سے شادی کی ہے۔ یا تم نے مجھ سے۔۔۔۔ ہنی مون الگ الگ بھی تو ہو سکتا ہے۔"

"پاگل ہو رہے ہو تم۔ چلو کہیں کھانا کھا لیں۔"

میں نے متفکر ہو کے کہا "مس رابعہ۔ ہم تو بالکل پھکڑ ہیں۔"

"میرے پاس ہیں کچھ پیسے۔ لیکن ان سے زیادہ دن گزارا نہیں ہو گا" رابعہ بولی۔

میں نے بے تکلفی سے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا "اوہ جانی' دل خوش کر دیا اس وقت۔"

"کیا بدتمیزی ہے سکندر۔ لوفروں کی طرح مت بات کرو۔"

میں نے کہا "سارا مسئلہ ابھی کا تھا۔ بعد میں تو ہم یہ گاڑی بیچ دیں گے۔ آخر تم اس کی جائز مالک ہو۔ بیس ہزار تو اس میں سے نکالے جا سکتے ہیں اگر کوئی کم قیمت گاڑی مل جائے۔"

رابعہ نے کہا "مجھے یہ کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ دلاور کا ہمیں یوں گرفتار کرنا۔ قید میں رکھ دینا اور عزت کے ساتھ رخصت کر دینا۔ جیسے واقعی ہم بڑے عزیز اور معزز مہمان تھے۔ میں تو کہتی ہوں اس گاڑی سے بھی پیچھا چھڑا لینا چاہیے۔ ضرور اس میں بھی کوئی چال ہے جو ابھی ہم سمجھ نہیں پا رہے ہیں۔ دلاور آسان بازی نہیں کھیلتا۔ جب پتا چلتا ہے اصل بات کا تو پچھتانے کا وقت بھی نہیں ملتا۔"

میں نے کہا "چلو اس مسئلے پر تمہارے نقطۂ نظر سے بھی غور فرماتے ہیں مگر پہلے دماغ تو ٹھکانے آئے۔ معدے سے باہر نکلے اور یہ تب ہی ممکن ہے جب معدے کو اتنا بھر دیا جائے کہ اس میں تل دھرنے کی جگہ نہ رہے۔"

رابعہ نے ایک چکن ہاؤس کے سامنے گاڑی روک دی جہاں اب بھی کچھ لوگ مرغوں اور مرغیوں کی نسلیں تباہ کر رہے تھے اور ایسا لگتا تھا کہ صبح تک کھاتے رہیں گے جب آخری مرغی بھی نہیں رہے گی۔ گاڑی میں کھانے کے بجائے ہم نے باہر فٹ پاتھ پر بیٹھنے کو ترجیح دی۔ باہر بیٹھے ہوئے لوگ رابعہ کو بھی مرغی کی طرح دیکھ رہے تھے اور ان کا بس چلتا تو نظروں ہی نظروں میں کچا چبا جاتے مگر میں نے رابعہ سے کہا کہ وہ پروا نہ کرے۔

"جیسے ایک حسین منظر کو دیکھنے کا حق سب کو ہے ایسے کسی حسین چہرے کے دیدار پر پابندی نہیں" میں نے کہا۔

"گاڑی میں بیٹھے رہتے تو کیا تھا؟"

چاہیں تو فٹ پاتھ پر بیٹھے رہیں۔ دُکان کل پھر کھُلے گی۔

میں نے اس کی عاجزی کو دیکھتے ہوئے بل ادا کرنے کے لیے رابعہ کی طرف دیکھ کے شوہرانہ تمکنت سے کہا "بیگم۔ بل ادا کرو۔ ہم بھی بھول ہی گئے تھے کہ رات کتنی ہو گئی ہے۔ گھر پر بچے اکیلے ہیں۔ تمہاری ساس اچھی خبر لیں گی۔۔۔"

ریسٹورنٹ کا مالک خوش ہوا "او جی اپنی ساس بھی ایسی ہی ظالم ہے۔ وہ تو شروع ہو جاتی ہے آدھی رات کو بھی۔ توبہ توبہ۔۔۔"

"یعنی گالیاں دیتی ہے؟"

"او نئیں جی' لتر ماردی اے۔۔۔۔ توبہ توبہ۔"

"اور تم جوتے کھا لیتے ہو ہنسی خوشی؟" میں نے اس کے پہلوان جیسے ڈیل ڈول کو پُر ملامت نظروں سے دیکھا۔

"بس جی۔ گھر والی کو تو خوش رکھنا ہی پڑتا ہے۔ کوئی پہاڑ پر مارے پتھر۔ پہاڑ کا کیا بگڑ سکتا ہے۔"

نازو کے ساتھ غالب عین وقت پر نمودار ہوا جب ہم اٹھ چکے تھے۔ میں نے کہا "کیا عبرت ناک وفا شعار شوہر ہے۔ محبت کرنے والے ایسے اُلو کے پٹھے بھی ہوتے ہیں۔"

غالب نے گاڑی سے سر نکال کے کہا "تسلیمات بجا لاتا ہوں۔ خیر سے یہ لَو برڈز (LOVE BIRDS) اس وقت یہاں!"

"نہ شاخ تھی نہ چمن تھا نہ آشیانہ تھا۔ پھر ہم کہاں جاتے۔ اب ہم آگے چلتے ہیں۔ تم ہمارا تعاقب ایسے کرو جیسے اپنی جوانی میں محبوبہ نمبر دن کا کرتے تھے۔۔۔۔ چلو محبوبہ۔"

"مگر جانا کہاں ہے۔ محبوبہ کے بچے" غالب نے چلّا کے کہا۔

رابعہ نے گاڑی اسٹارٹ کر دی تھی۔ غالب کو مجبوراً پیچھے آنا پڑا۔ رابعہ بھی موڈ میں آ گئی تھی۔ غالب جتنا سائیڈ میں آ کے کچھ پوچھنے کے لیے گاڑی دوڑاتا تھا رابعہ اپنی رفتار اس سے زیادہ کر دیتی تھی۔ یہ اوپل ایکارڈ بھی اسٹینڈرڈ ماڈل نہیں تھی۔ اس کا انجن انیس سو سی سی والا تھا۔

گوجرانوالے تک خطرناک قسم کی دوڑ ہوئی۔ خطرہ غالب کے لیے زیادہ تھا۔ اس کی گاڑی اپنی بساط سے بڑھ کر کارکردگی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ غالب پہلے غصے میں ہو گا۔ بعد میں اس کھیل میں شریک ہو گیا۔ چالیس میل کا راستہ طے کرنے میں چالیس منٹ بھی نہیں لگے۔ آخری راؤنڈ میں غالب نے اپنی شکست تسلیم کر لی اور کافی پیچھے رہ گیا۔

میں نے ایک پٹرول پمپ کے ساتھ والے ہوٹل پر اپنی گاڑی روک دی اور بقول رابعہ کے بدتمیزی کی انتہا کر دی۔ تاہم میرے بیان پر ہوٹل کے مالک کے دل میں انسانی ہمدردی اور شرافت کے جذبات کا طوفان آ گیا اور اس نے میری بیمار بیوی کے لیے خصوصی انتظامات کر دیے۔ پچھلے حصے میں اس کے اپنے آرام کرنے کی جگہ تھی۔ اس نے دروازہ کھول کے کہا "لو جی۔ بیگم صاحب کو اِدھر لے آؤ۔ خیر سے سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اُدھر ڈرائیور لوگ رات بھر

"میں جو باتیں یہاں آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا تھا۔ وہ گاڑی میں نہیں کر سکتا تھا" میں نے کہا۔ "مجھے ڈر تھا کہ ہماری ساری گفتگو کوئی سُن رہا ہو گا۔ مجھے اپنے پلان کو سیکرٹ رکھنا تھا اور انہیں گمراہ کرنے کے لیے وہ ساری گفتگو ضروری تھی جو میں نے کی تھی۔"

"اچھا اصل پلان کیا ہے؟"

"اس گاڑی کے استعمال کا رسک ہم نہیں لے سکتے۔ دلاور نے ہمیں پھنسانے کی کوشش کی ہے اور ہم ظاہر یہی کریں گے کہ پھنس چکے ہیں۔ یہاں سے تم فون کرو مرزا غالب کو۔ اس سے کہو کہ وہ کار کپڑے اور کیش لے کر گوجرانوالہ روانہ ہو جائے۔"

"گجرانوالہ۔۔۔۔ یا اوکاڑہ۔۔۔؟"

"گوجرانوالے میں چنگی ناکے سے پہلے جو ٹرک اسٹینڈ یا پٹرول پمپ آئے۔ وہاں ہمیں تلاش کرے۔ اسے گاڑی کے بارے میں بتا دیتے ہیں۔ اس کا رنگ اور نمبر وغیرہ۔ وہ پہنچ جائے گا صبح تک۔ صبح ہونے سے پہلے ہم چوہدری دلاور کی تحفے میں دی ہوئی کار وہیں چھوڑیں گے اور ایسے غائب ہو جائیں گے کہ پھر ڈھونڈتے رہیں ہمیں۔ جب تک انہیں معلوم ہو گا کہ کار تو مخالف سمت میں فلاں جگہ کھڑی ہوئی ہے یا گوجرانوالہ کے فلاں پولیس اسٹیشن پر موجود ہے۔ ہم بہت دور جا چکے ہوں گے اور وہ خاصے کنفیوز ہوں گے کہ بندے نے اوکاڑہ کہا تھا مگر پہنچا گوجرانوالہ۔ گاڑی ملی ہے گوجرانوالہ میں تو اس کا مطلب صاف یہ ہے کہ وہ دھوکا دے کر نکل گیا اور دھوکا دینے والے سیدھے راستے پر نہیں جاتے۔ یہاں سے بھی وہ دائیں بائیں نکل گیا ہو گا یا واپس لوٹ کے اوکاڑہ گیا ہو گا۔ اوکاڑہ براستہ گوجرانوالہ۔ چکر دینے والے ایسا ہی کرتے ہیں اس کا فائدہ یہ ہو گا کہ انہوں نے تعاقب کیا تو اُلٹی سمت میں کریں گے۔"

"تمہیں یہ بھی یقین ہے کہ وہ تعاقب کریں گے۔"

"اتنا ہی جتنا مجھے یقین ہے کہ نکاح کے وقت تم انکار نہیں کرو گی خواہ خود چوہدری دلاور تمہارے سر پر سلطان راہی کی طرح گنڈاسا لہرا کے اعلان کر رہا ہو کہ یہ شادی نہیں ہو سکتی۔ میں ٹوٹے کر دیاں گا اس دے۔۔۔ یعنی میرے۔۔۔"

رابعہ نے غالب کو فون کیا اور ہم نے کھانے کے بعد چائے صرف وقت گزارنے کی خاطر پی جب آخری گاہک بھی رخصت ہو گیا اور چکن تکہ ہاؤس بند ہونے کی تیاری ہونے لگی کہ۔

گُل کرو شمعیں بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا

تو مجھے فکر لاحق ہونے لگی کہ کہیں غالب کے آنے سے پہلے ہماری رخصتی عمل میں نہ آ جائے۔ بالآخر پروپرائٹر۔ چیئرمین اور ایم ڈی چکن تکہ ہاؤس بقلم خود ہمارے پاس تشریف لائے اور سخت شرمندگی کے ساتھ عرض کی کہ آخری وقت آ گیا۔ ویسے ہم

آتے جاتے رہتے ہیں۔ شور شرابا ہوتا ہے اور ان کی باتیں بھی ایسی ہی ہوتی ہیں۔"

میں نے کہا "آپ نے بڑی تکلیف کی پیچھے میرا سالا آرہا ہے وہ ہمیں اپنی گاڑی میں لے جائے گا۔۔ گاڑی لینے کے لیے کل میں خود آؤں گا۔ اس کے تو بریک بالکل ہی فیل ہو گئے ہیں۔"

وہ کمرا عین ہماری ضرورت کے مطابق تھا یعنی آرام دہ اور سڑک سے کچھ فاصلے پر پیچھے کی طرف۔ خرابی صرف یہ تھی کہ دیواروں پر چند تصاویر خاصی قابل اعتراض تھیں اور خالص مردانہ ذوق کا مظہر۔ تاہم یہ ایک شریف آدمی کی خلوت گاہ تھی اور خلوت میں شرافت کی نقاب پہن کے کون رہتا ہے۔

رابعہ نے میرے اصرار کے باوجود بیڈ پر لیٹنے سے انکار کردیا۔ اسے بیڈ سے گھن آرہی تھی۔ وہ اپنے جذبات کے اظہار میں برحق تھی۔ نہ جانے اس بیڈ پر کتنی عورتیں اور کتنے مرد سوچکے تھے۔ یہ بات اس نے الفاظ میں نہیں کی مگر میں سمجھ گیا کہ کراہیت کا سبب اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ بستر بالکل صاف ستھرا تھا۔ رابعہ ایک کرسی پر بیٹھی رہی اور میں نے پھر سڑک پر آکے غالب کا انتظار کیا۔ مجھے کچھ تشویش ہونے لگی تھی کہ وہ اتنا پیچھے کیسے رہ گیا۔

بالآخر وہ آہستہ آہستہ گاڑی چلاتا نمودار ہوا۔ میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک لیا "اوئے۔ شرم کر۔ ہار گیا ایک زنانی سے۔"

غالب نے خالص لاہوری بدتہذیبی کا مظاہرہ کیا "شرم تو کر۔ نہ زنانی اپنی نہ گاڑی۔ خود دوڑ کے دیکھ لے میرے ساتھ۔"

اس نے اپنی گاڑی کو سڑک کے کنارے ہی چھوڑدیا۔ پھر ہم اوپل ایکارڈ کو دھکیل کر یوں پیچھے لے گئے جیسے سچ مچ اس کے بریک کام نہیں کررہے ہیں۔ ہوٹل والے نے مزید مہمان نوازی کا مظاہرہ یوں کیا کہ زبردست ملائی والی اسپیشل چائے خود لے کر آیا۔

"گاڑی صبح ٹھیک ہوجائے گی۔ اُدھر پیٹرول پمپ پر مستری آجاتا ہے نو بجے تک۔ میں خود بتادوں گا اسے۔"

میں نے کہا "گاڑی تو محفوظ رہے گی نا۔"

"لو جی۔ سمجھ لو کہ اپنے ہی گھر میں کھڑی ہے۔ مجال ہے جو کوئی ہاتھ بھی لگادے" اس نے ہمیں چائے پیش کی اور پھر رابعہ سے مخاطب ہوگیا "آپ کے لیے بیگم صاحبہ الائچی والی چائے ہے۔"

چائے پیتے ہوئے میں نے ندامت کا اظہار کیا "ہم کتنا جھوٹ بولتے ہیں اور لوگ کتنے شریف ہیں کہ شک نہیں کرتے۔"

غالب نے کسی فلسفی کی طرح ارشاد کیا "سچ اس دنیا میں ایک شجرِ ممنوعہ ہے۔"

میں نے اسے بعد کے واقعات کا خلاصہ سنایا جب وہ نازو کو ساتھ لے کر چلا گیا تھا۔ رابعہ نے یہی سب کچھ زنانہ جذبات کی رنگ آمیزی کے ساتھ نازو کو بتایا۔ ہماری فرمائش پر وہ کپڑوں کا ایک سوٹ کیس بھرلائے تھے جس میں رابعہ کے اور میرے کپڑوں کے ساتھ ایک لاکھ روپے بھی تھے۔ یہ وہی رقم تھی ... شوکت رانا کے گھر سے مالِ غنیمت کے طور پر ...

غالب نے میری اسکیم سے اتفاق کیا "روپوشی تو ... پیڈرو سے اعترافِ جرم حاصل کرنے کا بھی اس سے اچھا ... مل سکتا ہے مگر ایک تو آپ دونوں کو اکیلا نہیں رہنا چاہیے۔"

"دونوں اور اکیلے۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ میں اور ... چور اور لاٹھی دو۔"

"ہم تمہارے درمیان ظالم سماج کی دیوار بن کے ..."

رابعہ نے احتجاج کیا "یہ فلمی عشق نہیں ہے اور تم ... آخر؟"

"دیکھو میری بے عزتی برداشت نہیں کرتی نازو۔ ... بندے مار چکی ہے اب تک" غالب نے کہا۔

نازو نے کہا "ایسے ہی کبھی کھیل کھیل میں تمہیں ہاتھ ... ہوں پیار سے۔ اور کسے مارا ہے میں نے؟"

"نہیں مارا تو کیا ماروگی نہیں۔ اگر کوئی ایسے سرِعام ... کہے کہ تو کیا چیز ہے بے۔"

نازو بولی "میں شرافت سے بتادوں گی کہ یہ کوئی چیز ... غالب ہے۔"

"اور یہ بات بھی کتنی غلط ہے۔ سارے ہاتھ مارنے والی ... مجھے تو زندگی کا بیمہ کرالینا چاہیے۔ اگر غصے میں ہاتھ ماردیا ... بھوت کی بچی۔"

"غصہ تم دلا رہے ہو نا۔ بھوت کسے کہا ہے۔"

غالب نے بے خوفی سے کہا "بھوت کو اور کسے۔ انسان ... بھوت کون کہہ سکتا ہے۔ یا کدو کو بھوت کون سمجھتا ہے۔"

"کیا میرے ابا انسان نہیں تھے؟" نازو چلا کے بولی۔

"دیکھنے میں تو لگتے تھے۔ دیکھنے میں تم بھی انسان کی بچی ... ہو۔"

"بس۔ شروع ہوگئی تمہاری منہ ماری۔" میں نے کہا "کیا بات ... ہو رہی تھی۔ تم نے کیا فساد شروع کردیا۔"

"بات یہ کہی تھی میں نے کہ ہم تمہارے ساتھ رہیں گے ... یا نہ مانو۔ ہم پوری تیاری کے ساتھ آئے ہیں اور کوئی بھوت بھگانے والا بھی ہمیں نہیں بھگا سکتا۔"

"تم نے پھر بھوت کہا مجھے۔"

غالب بولا "بھوت میں نے اپنے آپ کو کہا ہے 'تم چڑیل ہو' الٹے پاؤں والی' دیکھے بغیر کسی کو پتا نہیں چلتا۔"

"میرے پاؤں الٹے ہیں 'تمہاری کھوپڑی الٹی ہے۔"

"سکندر۔ چل یار تو بتا۔ کیا اس کے پاؤں سیدھے ہیں۔"

میں نے کہا "پاؤں تو خیر الٹے ہیں۔ مگر یار' چڑیلوں کے بھی جذبات ہوتے ہیں۔ خیال رکھنا چاہیے۔ میں بھی رابعہ سے نہیں کہتا ایسی بات۔"

... والے تھے۔ اوپل ایکارڈ آگے تھی اور اس کو اکیلا ... چلا رہا تھا۔ اپنی فاکس ویگن کو رابعہ نے خود ڈرائیو کیا۔ رات ... سڑکوں پر سینا کم ٹریفک تھا۔ ٹرک بھی گزر چکے تھے اور ... سمت سے آنے والی کاریں تھیں یا رات بھر چلنے والی ... تھی ورنہ سڑک خالی تھی۔

... جہلم سے سطح مرتفع پوٹھوہار کا علاقہ شروع ہوتے ہی سڑک بل ... اور نشیب و فراز کا خطرناک سلسلہ شروع ہوگیا۔ یہ موڑ ... خطرناک تو نہیں جتنے مری سے آگے کاغان تک نظر آتے ہیں ... بھی آگے ناران یا جھیل سیف الملوک تک مگر پھر بھی ... پہاڑیوں اور زردی مائل پتھروں کے بلند ٹیلے اور سیکڑوں ... کھائیاں حادثات کا سبب بنتی ہیں۔ یہاں بارش کی افراط ... کٹتے ہیں اور زمین بھی اپنی ہیئت بدلتی رہتی ہے۔

... آگے جانے والی اوپل ایکارڈ کی ٹیل لائٹ پر نظر رکھے ... تھا۔ جب غالب نے مسلسل کلیئر دیا تو میں نے رابعہ سے کہا ... گاڑی روک لے۔ اس وقت تک ہم راستے کے ایک ... سے ریسٹورنٹ کے قریب پہنچ گئے تھے۔ پیڈرو کی حالت ابتر ... اور یہ موقع تھا کہ ہم اسے کچھ کھلا پلا دیں۔ اس کے ہاتھ پاؤں ... پہلے ہی کھول دیے تھے مگر اس کے باوجود وہ نقاہت سے کھڑا ... نہیں ہوسکتا تھا۔

غالب نے گاڑی کو ایک پہاڑی کے کٹاؤ میں روک دیا تھا اور ... کا بونٹ ایسے کھول دیا تھا کہ دیکھنے والے کو گاڑی کی خرابی کے ... کوئی شک کی وجہ نظر نہ آئے۔ تاہم وہ گاڑی ہماری نظر سے ... اوجھل تھی اور پہاڑی کے موڑ سے پہلے صرف فاکس ویگن ہی نظر ... آتی تھی۔ رابعہ نے اس کے انجن کا کور بھی اٹھادیا تھا۔ کسی جگہ دو ... گاڑیوں کا خراب ہوجانا کوئی غیر معمولی اتفاق نہیں تھا۔

غالب نے کہا "تم یہیں میرا انتظار کرنا۔ میں گاڑی کو ٹھکانے ... لگا کے آتا ہوں۔"

نازو کچھ پریشان ہوگئی "غالب اپنا خیال رکھنا۔"

"تمہارا کیا خیال ہے کہ گاڑی کے ساتھ میں بھی چھلانگ ... لگاؤں گا نیچے۔ اور وہ بھی تمہارے بغیر۔"

میں نے کہا "ہم یہاں پیڈرو میں چائے پانی ڈالتے ہیں تاکہ یہ ... بھی گاڑی کی طرح خراب نہ ہوجائے۔ نازو خیال رکھے گی پیڈرو ... کا۔ رابعہ گاڑی ٹھیک کرنے کی کوشش میں مصروف رہے گی۔ میں ... آسے چائے لاتا ہوں سب کے لیے۔"

"میرا کام آدھے گھنٹے میں یا اس سے پہلے ہی ختم ہوجائے ...گا" غالب بولا۔

میں نے کہا "اس کی ڈکی میں پٹرول کا کین ہے۔ گلوز ... کمپارٹمنٹ میں کاغذات ہیں۔ خیال رہے کہ وہ باہر گریں اور آگ ... میں نہ جلیں اور ہاں 'ایک ٹیپ ہے' وہ ضرور نکال لینا۔"

... ہم پیدل چل کے پچاس قدم دور واقع جھونپڑی ریسٹورنٹ ...

"کیا خیال ہے چلیں؟" غالب نے کہا۔

"چلیں نہیں۔ آپ واپس تشریف لے جائیں" میں نے کہا۔ رابعہ کے ووٹ سے مجھے شکست ہوگئی۔ وہ پہلے ہی نازو سے اتفاق کرچکی تھی کہ انہیں ہمارے ساتھ چلنا چاہیے۔

"ایک اور شاندار اسکیم ہے میرے ذہن میں جس کا اعلان میں کچھ دیر بعد کروں گا۔" غالب نے کہا۔

"بلاوجہ سسپنس مت پیدا کرو۔ ابھی بتادو۔"

"اچھا۔ ہم یہ گاڑی بھی لے جائیں گے۔ جو خراب تھی۔ تھی کا مطلب یہ ہے کہ میں نے ٹھیک کردی۔ اتفاق سے میں ایک ماہر مستری بھی ہوں۔ دماغ تک درست کردیتا ہوں۔" اس نے نازو کو دیکھ کے کہا۔

"لیکن اپنا دماغ خراب ہے" نازو نے فوراً کہا "نائی اپنے بال خود نہیں کاٹ سکتا۔"

"ہم اسی طرح روانہ ہوں گے۔ جیسے لاہور سے آئے ہیں۔ تقریباً دو گھنٹے کے بعد جہلم کے بعد وہ پہاڑی علاقہ شروع ہوگا جہاں سڑک پر خطرناک موڑ آتے ہیں۔ ٹرین بھی سرنگ سے گزرتی ہے۔ وہاں تمہاری گاڑی کو ایسا حادثہ پیش آسکتا ہے کہ تم سب ہلاک ہوجاؤ۔"

"کیا بک رہے ہو بلاوجہ" نازو گھبرا کے بولی۔

"بات سمجھ میں نہ آئے تو بیچ میں نہیں بولنا چاہیے۔ ہم ایسا حادثہ خود کریں گے۔ آگے تم لے جانا رابعہ کی گاڑی۔ اور اس میں ڈال لینا پیڈرو کو۔ ہم بعد میں پنڈی پہنچ جائیں گے۔ کسی بس کے ذریعے یا کسی سے لفٹ لے کر۔"

"ہمارے ساتھ رہنے میں کیا حرج ہے؟"

"حرج تو کچھ نہیں۔ تمہارے ساتھ ایک لاش بھی تو ہوگی۔ میرا مطلب ہے استاد پیڈرو۔ فاکس ویگن کی ڈکی میں تو اسے ڈالا نہیں جاسکتا۔" غالب نے کہا۔

"مگر ہم اسے درمیان میں بٹھاسکتے ہیں۔ پچھلی سیٹ پر" نازو نے تجویز پیش کی۔ "کسی کو کیا پتا کہ وہ سو رہا ہے یا بے ہوش ہے۔"

"اب تو ہوش میں ہوگا۔" میں نے کہا "اسے نکالنا بھی ضروری ہے ورنہ مرجائے گا تو ہماری سب محنت رائگاں جائے گی۔"

وقتِ عمل آیا تو میں نے اور غالب نے بڑی پھرتی سے پیڈرو کو ڈکی سے نکال کے فاکس ویگن میں رکھا اور اس کے دائیں بائیں نازو اور میں بیٹھ گئے۔ ہمارے حفاظتی حصار کو توڑ کے فرار ہونا پیڈرو کے لیے ممکن نہیں تھا۔ وہ ہوش میں تھا مگر تھکن اور بھوک سے نیم جاں ہو رہا تھا۔ ہم نے اسے یقین دلایا کہ اگر اس نے پیڈرو پن نہ دکھایا تو آگے جاکے ہم اس کے ہاتھ پاؤں کھول کے آزاد بھی کردیں گے اور اس کی خاطر تواضع بھی کریں گے۔

ہم ہوٹل کے مالک کا شکریہ ادا کرکے روانہ ہوئے تو رات

تک گیا مگر وہاں سب سو رہے تھے۔ ایک بار پھر جھوٹی کہانی سُنا کے اور کچھ رقم کا لالچ دے کے میں نے ایک شخص کو مٹی کے تیل کا اسٹوو جلانے اور چائے بنانے پر رضامند کر لیا۔ اس کے پاس خاصے پرانے اور بدذائقہ بسکٹ تھے۔ سو کا نوٹ بطور ضمانت رکھنے کے بعد اس نے چائے مع برتنوں کے میرے حوالے کر دی۔

بیس منٹ تک میری نظر رابعہ پر رہی اور کان رات کے سناٹے میں سنائی دی جانے والی آواز پر۔ گاڑی کے سڑک سے نیچے پتھریلی کھائی میں گرنے سے دھماکا ہونا لازمی تھا۔ یہ بھی یقین تھا کہ اس میں آگ لگے گی تو پہاڑی کے پیچھے آسمان روشن ہو جائے گا۔ چائے بنانے والا بھی یہ منظر ضرور دیکھے گا اور دور سے آنے والی گاڑیوں کے مسافر اور ڈرائیور بھی سمجھ جائیں گے کہ کوئی حادثہ ہوا ہے۔

بیس منٹ بعد میں چائے لے کر روانہ ہوا ہی تھا کہ دھماکا ہوا۔ میں رُک گیا "یہ کیسی آواز تھی؟"

چائے والے نے پہاڑی کی طرف دیکھا "لگدا اے کوئی گڈی وج گئی اے۔"

"اوہ۔ یہ شعلہ دیکھا تم نے.... آگ بھی لگی ہے۔"

"چلو جی۔ بندہ کیا کر سکتا ہے۔ جو رب کی مرضی" اس نے قطعی بے حسی کے ساتھ کہا "چائے پی کے برتن رکھ جانا۔ مجھے مت جگانا۔ تھوڑی دیر میں تو اُٹھنا ہی ہے۔"

لاہور اور پنڈی کی طرف سے آنے والی اِکا دُکا گاڑیاں حادثے کی جگہ پر رکنے لگی تھیں۔ لاہور کی طرف سے آنے والے پہلے یہ سمجھے تھے کہ حادثہ ہماری گاڑی کو پیش آیا ہو گا مگر ہمیں اطمینان سے چائے پیتا دیکھ کے آگے بڑھ جاتے تھے۔

غالب اطمینان سے چلتا ہوا نمودار ہوا اور ہمارے ساتھ کھڑا ہو کے چائے پینے لگا۔ پہاڑی کے پیچھے روشنی یہ ظاہر کرتی تھی کہ گاڑی کی آگ خوب بھڑک چکی ہے۔ دس منٹ بعد میں نے چائے کے برتن واپس جھونپڑی ہوٹل میں لے جا کے رکھے تو مالک بے خبر سو رہا تھا۔ اس کی بلا سے ساری دنیا جل جائے۔ جب تک اس کا چھپر محفوظ ہے 'سب ٹھیک ہے'۔ سو کا نوٹ اس نے ضمانت کے طور پر رکھا تھا کہ ہم برتن لے کر نہ بھاگ جائیں مگر اب اس کی نیند سے صاف ظاہر تھا کہ نہ اسے برتنوں کی پروا تھی اور نہ اس کا باقی رقم واپس کرنے کا ارادہ تھا۔

کچھ دیر بعد ہم بھی ان لوگوں میں شامل ہو گئے جو سڑک کے کنارے گاڑیاں روک کے ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ حادثہ کیسے ہوا۔ گاڑی میں کتنے لوگ تھے۔ کون تھے وغیرہ وغیرہ۔ عملی طور پر کسی کے کچھ کرنے کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ ہم دیکھ سکتے تھے کہ کار پُرزہ پُرزہ ہو کے کتنی گہرائی تک چلی گئی تھی۔ اس کے ٹکڑے سیکڑوں فٹ کی گہرائی تک جگہ جگہ روشن تھے۔ تاریکی میں جلنے والے یہ دیے خود اپنی کہانی کہتے تھے۔ جب کار کا کچھ نہیں بچا تھا تو اندر موجود لوگوں کے بچنے کا کیا سوال۔ یہ بڑا بھیانک اور عجیب منظر تھا۔ کاروں اور ویگنوں میں بیٹھے ہوئے دہشت زدہ مرد، عورتیں اور بچے صرف تصور کر سکتے تھے کہ کار کے حادثے میں مرنے والوں کی موت کتنی اذیت ناک ہوگی۔ شاید وہ دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کر رہے ہوں گے کہ وہ محفوظ ہیں اور زندہ ہیں۔ باقی راستہ انہوں نے زیادہ احتیاط کے ساتھ طے کیا ہو گا۔

ہر گاڑی کے مسافر وہاں دس پندرہ منٹ رُک کے دکھ اور افسوس سے سر ہلاتے روانہ ہو جاتے تھے۔ کسی نے پولیس کو مطلع کرنے کا ذکر بھی کیا تو دوسرے نے کہا کہ یہاں پولیس کہاں' پولیس صبح آئے گی جہلم سے یا "متعلقہ" تھانے سے۔ انہیں یہاں آ کے ضابطے کی کارروائی کے سوا کرنا ہی کیا ہے۔ ہاں ڈاکٹر یا ایمبولینس کا مسئلہ ہوتا تو ہم ابھی لے آتے۔

ایسی ہی باتیں کر کے ہم نے بھی روانگی کا فیصلہ کیا۔ نازو تمام وقت پیڈرو کی طرف سے محتاط رہی جو کھا پی کے سو گیا تھا۔ اسے کچھ آرام ملا تھا۔ یہ اس کا نتیجہ تھا یا شاید وہ مکر کر رہا تھا۔ وہ مجمع کی موجودگی سے فائدہ بھی اٹھا سکتا تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ نازو اس کے حلق سے آواز نکلنے سے پہلے ہی پیڈرو کا حشر نشر کر دے گی۔ ایسے کہ کسی کو کچھ پتا نہیں چلے گا۔

مجموعی طور پر کسی حادثے کا نظارہ کرنے والوں کی تعداد وہی رہتی تھی۔ ایک گاڑی روانہ ہوتی تھی تو ایک رک جاتی تھی۔ یہ تماشا صبح تک ایسے ہی جاری رہتا تھا۔

رابعہ نے گاڑی کو قطار میں سے نکالنے کے لیے کچھ پیچھے کیا ہی تھا کہ ایک جیپ ٹائپ اسٹیشن ویگن تیزی سے آگے آئی اور اس نے سائڈ دے کر رابعہ کی گاڑی کو ٹکر ماری۔ رابعہ کی گاڑی کا اگلا دایاں مڈگارڈ تباہ ہو گیا اور پہیے کے ساتھ رگڑ کھانے لگا۔

رابعہ نے غصے میں گاڑی بند کی اور باہر اُترنے لگی مگر جیپ سے اُترنے والوں نے بڑی پھرتی دکھاتے ہوئے اس کا راستہ روک لیا۔ غالب کے اُترنے سے پہلے ہی وہ دوسری طرف بھی آ گئے۔

اس دن مجھے پہلی بار فاکس ویگن کی اس خرابی کا شدت سے احساس ہوا کہ اس کے صرف دو دروازے ہوتے ہیں۔ جب تک آگے والے نہ اُتر جائیں' پیچھے والے بیٹھے رہنے پر مجبور ہوتے ہیں اور اس وقت اتفاق سے آگے بیٹھنے والے دونوں لڑبھڑ کے راستہ بنانے والے لوگ نہیں تھے۔ آگے میں ہوتا یا نازو ہوتی تو صورتِ حال مختلف ہوتی۔ اب میں اور نازو کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔

اچانک پیڈرو نے بھی آنکھیں کھول کے انگڑائی لی اور اس کے لبوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

وہ سب ہٹے کٹے نوجوان تھے جو اسی کو اپنی کامیابی سمجھتے تھے کہ وہ انداز و اطوار سے بدمعاش نظر آئیں۔ لوگ ان سے ڈریں اور ان کو سلام کریں، غلطی ان کی ہو تب بھی معافی مانگیں اور اپنی ہو تو جو بھی سزا ملے اسے خاموشی سے قبول کرلیں۔ غالباً یہی ان کے نزدیک عزت کا تصور تھا۔

صرف ایک شخص گاڑی میں بیٹھا ہوا باہر دیکھ رہا تھا اور اس کے انداز میں اتنی بے اعتنائی تھی کہ وہ ہماری طرف متوجہ ہی نہیں تھا۔ اسے قطعی دلچسپی نہیں تھی کہ باہر جھگڑا کیوں ہو رہا ہے اور کس سے ہو رہا ہے۔ جب میری نظر گاڑی کے پچھلے حصے پر گئی تو ان سب کا رویہ مجھ پر واضح ہوگیا۔

قیمتی گاڑی کے پیچھے پیتل کی چمکتی ہوئی گول پلیٹ پر ابھرے ہوئے حروف میں "ایم این اے" لکھا ہوا تھا۔ آگے جھنڈا دیکھ کے میری عقل میں یہ بات بھی آگئی کہ گاڑی کسی وزیر کی تھی اور غالباً وزیر صاحب خود ہی گاڑی میں تشریف فرما تھے۔ باقی ان کے ڈرائیور، باڈی گارڈز وغیرہ تھے۔

پہلے گفتگو پنجابی میں ہوئی تھی۔ رابعہ کا راستہ روکنے والے نے غرا کے کہا "ایسے کہاں جاتی ہو جانی۔ گاڑی میں بیٹھنے کا مطلب یہ نہیں کہ پکی ڈرائیوری بن گئی ہو اور اب جسے چاہو ٹکر مار کے بھاگ جاؤ۔"

رابعہ نے کہا "بدتمیزی مت کرو..... اور راستہ چھوڑو میرا۔"

"راستہ چھوڑ دیا تو پھر باقی کیا رہا۔ یہ نقصان تمہارا باپ پورا کرے گا" اس نے اپنی گاڑی کی طرف اشارہ کیا۔

"دیکھو۔ بکواس مت کرو۔ غلطی تمہاری تھی۔ تم گاڑی سامنے لے آئے، نظر نہیں آتا تھا کہ گاڑی نکل رہی ہے۔"

"بڑی تیکھی ہے بھئی۔ ہمیں کہہ رہی ہے کہ غلطی ہماری ہے۔"

دوسری طرف والا بھی کم نہیں تھا۔ غالب نے اسے دھکیل کر دور کرنے کی کوشش کی مگر اس نے دروازے کو دبائے رکھا "بیٹھا رہ اپنی جگہ پر۔"

"جب تک ہمارا نقصان پورا نہیں ہوگا، ہم جانے نہیں دیں گے۔ گاڑی چلانے سے پہلے ڈرائیور کو دیکھ لینا چاہیے کہ پیچھے سے کوئی گاڑی تو نہیں آرہی ہے۔" پہلے نے رابعہ سے بحث جاری رکھی۔

غالب نے کہا "یار باہر آکے دیکھیں گے پہلے پھر بات ہوگی، ایسے راستہ روکنے کا کیا مطلب ہے آخر؟"

"اوئے گاڑی کا بیڑہ غرق کردیا تیری زنانی نے۔"

رابعہ نے کہا "ذرا ہوش میں رہو۔ یہ بھائی ہے میرا..."

نازو نے ساری توجہ استاد پیڈرو پر مرکوز کردی تھی اور غالباً اسے یہ بھی سمجھادیا تھا کہ وہ اپنی جان سے کھیلنے کی کوشش نہ کرے۔ خود پیڈرو سمجھتا تھا کہ شور مچانے سے فائدہ نہیں ہوگا۔ ہم تو لڑ بھڑ کے نکل ہی جائیں گے۔ خمیازہ بعد میں اسے بھگتنا پڑے گا پھر شاید خطرہ محسوس کرتے ہوئے اس نے پیڈرو کو ناک آؤٹ کردیا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ زیادہ نقصان رابعہ کی گاڑی کا ہوا تھا۔ وزیر کی گاڑی ویسے بھی سرکاری تھی اور وہ خود بھی صاحب حیثیت تھے۔ مرمت اور رنگ و روغن کے لیے وہ گاڑی کو باہر بھیج سکتے تھے اور ایسے بھی کم نہ تھے جو اپنا کام نکالنے کے لیے خدمت کا یہ موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے لیکن غلطی رابعہ کی تھی۔ اسے واقعی پہلے دیکھ لینا چاہیے تھا کہ پیچھے سے کوئی گاڑی تو نہیں آرہی ہے۔ یہ نیشنل ہائی وے تھی اور یہاں گاڑیاں تیز رفتاری سے گزرتی تھیں۔ کوئی ڈرائیور کیسے اندازہ لگا سکتا ہے کہ سائیڈ میں کھڑی ہوئی گاڑی اچانک چل پڑے گی اور یوں اس کے سامنے آجائے گی کہ اسے بریک لگانے کے لیے وقت ہی نہیں ملے گا۔

میں نے کہا "دیکھو۔ ہم نقصان پورا کریں گے۔ ہم سے غلطی ہوئی لیکن تم پہلے انہیں باہر نکل کے وزیر صاحب سے بات کرنے کا موقع دو۔"

"وزیر صاحب سے پہلے ہم بات کریں گے۔ ملک صاحب ہر ایرے غیرے کو منہ نہیں لگاتے۔"

میں نے کہا "تمہیں معلوم ہے، یہ کون ہیں؟"

اب رابعہ نے کہا "لو۔ یہ میرا کارڈ دو وزیر صاحب کو۔ میں رابعہ قاری ایڈووکیٹ ہائی کورٹ ہوں۔"

صورت حال ایک دم بدل گئی۔ بدمعاش اپنی ساری بدمعاشی بھول گئے اور کسی قدر بدحواس ہو کے پیچھے ہٹ گئے۔

میں نے رابعہ کے کان میں کہا "گاڑی پیچھے کرو اور فرار ہوجاؤ۔"

رابعہ نے حیرانی سے کہا "اس کی کیا ضرورت ہے؟"

"ضرورت ہے اسی لیے کہہ رہا ہوں۔ جلدی سے نکلو۔"

رابعہ نے دروازہ بند کرکے ایک دم گاڑی کو پیچھے کیا اور پھر اس سے پہلے کہ وزیر صاحب کا ڈرائیور اور باڈی گارڈ سامنے آتا، اس نے گاڑی کو بڑے خطرناک انداز میں نکال لیا۔ جو رابعہ کا راستہ روکے کھڑا تھا اس نے بھی خود کو بڑی مشکل سے بچایا ورنہ فاکس ویگن کا باہر نکلا ہوا مڈ گارڈ اسے چھو جاتا تو وہ سڑک پر گرتا۔

میں نے انہیں مشتعل ہو کے گاڑی میں بیٹھتے دیکھا۔ ابھی تک وہ کارڈ پر لکھی ہوئی عبارت پڑھ نہیں پائے تھے۔ انہوں نے یہی سمجھا کہ ہم انہیں چکر دے کر نکل گئے۔ انہوں نے کارڈ کو وزیر صاحب کی خدمت میں پیش کرنے سے زیادہ ضروری یہ سمجھا ہوگا کہ پہلے مجرمان کا تعاقب کرکے انہیں گرفتار کیا جائے۔ وکیل بھی ہوگی تو اپنے گھر کی۔ اس کا بھی دماغ درست کردیں گے۔

رابعہ نے کہا "وہ لوگ پیچھے آرہے ہیں۔"

غالب نے بھی کہا "آنے دو۔ وہاں مجمع لگ جاتا۔ یہاں نمٹ لیں گے، ان سے بھی اور وزیر صاحب سے بھی۔"

"یہی میں بھی چاہتا تھا۔ شرافت کی زبان ان کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ اب تم رفتار کم کرو اور گاڑی ایک طرف روک کے نیچے اتر جاؤ۔ تاکہ میں باہر نکل سکوں۔" میں نے کہا۔

رابعہ نے کہا "کیا فائدہ جھگڑے سے۔ دے دو ان کو جتنے پیسے مانگتے ہیں، غلطی میری تھی۔"

"بات غلطی کی نہیں، غلطی پر ہم معذرت کرلیتے اور نقصان بھی پورا کردیتے مگر وزیر ہوتا ہے عوامی نمائندہ، کوئی فرعون نہیں۔ یہ بات اسے بھی سمجھا دیں اپنی زبان میں۔"

غالب نے کہا "اس کے لیے یہ نقصان کیا ہے۔ ایسی تو دس گاڑیاں ہوں گی اس کے پاس اور سب سرکاری خرچ پر چلتی ہوں گی۔"

دیو ہیکل گاڑی پھر ہمارے سامنے آکے ٹھہر گئی لیکن اب میں اور غالب ان کا استقبال کرنے کے لیے پہلے سے تیار تھے۔ شاید انہوں نے بھی سمجھ لیا تھا کہ ہم وہاں سے کیوں فرار ہوئے تھے اور پھر رک کر ان کا انتظار کیوں کر رہے تھے۔

میں نے غالب سے کہا "تم مت بولنا۔ بس تماشا دیکھنا۔"

وزیر کے ایک محافظ نے ریوالور نکال لیا تھا۔ "اچھا ہوا جو خود ہی رک گئے تم۔ بھاگ کے کہاں جا سکتے تھے۔"

میں نے حیرانی سے کہا "ہم تو بہت دیر سے کھڑے ہیں یہاں۔ ایک گھنٹے سے زیادہ ہوگیا۔"

دوسرا بولا "تو بڑا غلطی مان کے نقصان پورا کرنے کی بات کر رہا تھا۔ غلطی کے بچے.... ہمارے ساتھ چالاکی۔"

میں نے ایک دم اس کی کلائی پکڑ کے جھٹکا دیا اور اسے گھما کے اپنے سامنے کرلیا "اب چلاؤ گولی، دیکھتے ہیں تم کتنے چالاک ہو۔"

آرم لاک کی وجہ سے میرے سامنے ڈھال بننے والا بڑی اذیت میں تھا اور اپنے بھاری بھرکم جسم کے باوجود خود کو میری گرفت سے چھڑانے کی کوشش میں ناکام تھا۔ دوسرا باڈی گارڈ اپنے ساتھی کی مدد کے لیے آگے بڑھا تو میں نے پہلے کو اس پر یوں دے مارا کہ وہ دونوں ایک ساتھ سڑک پر ڈھیر ہوگئے۔ ایک لمحے کے لیے ریوالور والے کی توجہ اپنے ساتھیوں کی طرف ہوگئی۔ میں نے اسی لمحے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے گھوم کے اس کے ہاتھ پر کک ماری۔ غالب نے کہا "بھئی سبحان اللہ۔"

ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل گیا اور اڑتا ہوا نیچے گہرائی میں گم ہوگیا۔ اس نے ایک پردرد ہائے کی اور اپنا ہاتھ پکڑ کے ناچنے لگا۔ غالباً اس کی کلائی ٹوٹ گئی تھی۔ غالب نے کہا "بھئی کیا ڈانس ہے۔"

"کتنا نقصان ہوا بیٹے؟" میں نے کہا "آؤ میں پورا کروں۔"

ایک ساتھ گرنے والے باڈی گارڈز غضب ناک ہو کے ایک ساتھ اٹھے اور مجھ پر حملہ آور ہوئے۔ میں نے غوطہ مار کے ایک کو سیدھا گزرنے کا موقع دیا اور دوسرے کو پیٹ میں گھٹنا مار کے تھوڑا سا اوپر اٹھایا اور سر کے اوپر اٹھا کے وزیر صاحب کی گاڑی پر دے مارا۔ غالب نے تالی بجا کے کہا "بھئی، بہت خوب۔"

جو شخص اپنے زور میں سیدھا گزرا تھا وہ سڑک کے ساتھ لگی ہوئی جھاڑی میں گر گیا تھا۔ جھاڑی نہ ہوتی تو وہ نیچے لڑھک جاتا۔ اس نے ہمت کرکے پھر میری طرف رخ کیا۔ اپنے ساتھیوں کا حشر دیکھنے کے باوجود نمک خواری کا تقاضا یہ تھا کہ وہ مزید مار کھائے۔ اپنی جان پر کھیل جائے مگر وزیر صاحب کو اپنی وفاداری کا یقین دلا دے۔ ایسے مواقع روز کہاں آتے ہیں بلکہ زندگی میں ایک بار ہی آتے ہیں۔

میں نے تیسرے کو اس کی قابل رحم حالت کے باوجود پہلے یوں الٹ دیا کہ زمین آسمان اس کی نظر میں گھوم گئے ہوں گے۔ پھر اس کی ٹانگ پکڑی اور اسے یوں گھمایا جیسے ہیمر تھرو والے گولے کو دائرے میں گردش دیتے ہیں۔ وہ سمجھا کہ میں بھی اچانک اسے چھوڑ دوں گا تو وہ پتا نہیں کتنی دور تک اڑتا ہوا جائے گا اور کسی جگہ گرے گا۔ اگر وہ گاڑی سے ٹکراتا تو اس کا سر پاش پاش ہوجاتا اور میں اسے گہرائی کی طرف روانہ کردیتا تو اس کا انجام زیادہ برا ہوتا۔ وہ چلانے لگا۔ غالب نے قہقہہ مار کے کہا "بھئی ماشاء اللہ، کیا آواز پائی ہے۔"

بالآخر وہی ہوا جس کا مجھے انتظار تھا۔ وزیر صاحب نے دو منٹ کی یہ کارروائی بڑے غور سے ملاحظہ فرمائی تھی اور متاثر ہوئے تھے۔ جان نثاروں کی جان بھی چلی جاتی تو وہ متاثر نہ ہوتے۔ یہ ان کا کام تھا اور ضرورت پڑنے پر انہوں نے صرف اپنی نااہلی ثابت کی تھی۔ انہوں نے گاڑی سے باہر آکے ایک شان استغنا کے ساتھ ہاتھ اٹھایا جس کا مطلب تھا کہ بس۔

میں نے آگے بڑھ کے ان سے ہاتھ ملایا "غالباً آپ کوئی وزیر ہیں۔" میں نے کہا "میں سب وزیروں کو پہچانتا نہیں۔"

اس نے کہا "پہچاننا چاہیے۔"

"دراصل میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ آدمی خود اپنی پہچان بن جاتا ہے۔ مگر عہدے یا وزارت سے نہیں، یہ تو آنی جانی چیزیں ہیں۔"

"میں ملک خداداد عباسی ہوں۔ صوبائی وزیر جنگلات۔"

میں نے درمیان میں غالب سے کہا "بھئی ان کا مال گاڑی میں ڈال دو۔ ٹوٹا پھوٹا جیسا بھی ہے۔ مرمت یہ خود کرالیں گے۔ ہاں جی، کون سا محکمہ بتایا آپ نے؟"

اس نے کہا "جنگلات۔"

"پھر تو یہ سارا علاقہ آپ کا ہی ہوا۔ خیر جی ہم تو رہتے ہیں شہر میں۔"

وہ مجھ سے متاثر نظر آرہا تھا اس لیے کسی بات کا برا نہیں مان رہا تھا۔ "کرتے کیا ہو؟" اس نے مسکرا کے کہا۔

"کچھ بھی۔۔۔ جو کام مل جائے۔ کام تو دیکھا آپ نے؟"

وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا "کام اچھا ہے۔ کتنا کما لیتے ہو اس طرح؟"

میں نے پیشہ ور گھریلو کلاس بدمعاشوں کی عاجزی اختیار کی "آپ انکم ٹیکس والوں کو پیچھے لگا دیں گے۔ بس گزارا ہو جاتا ہے۔"

"آج کل کس کے لیے کام کر رہے ہو؟" اس نے مجھے سچ مچ کرائے کا بدمعاش سمجھ لیا تو مجھے افسوس ہوا کہ کیا میں شکل سے شریف آدمی نہیں لگتا۔

میں نے کہا "یہ وکیل صاحبہ ہیں۔ کچھ لوگ ان کی جان کے دشمن ہو رہے تھے۔ ایک کو تو پکڑ لایا ہوں میں۔ باقی کے بارے میں یہ خود بتا دے گا۔"

"کون وکیل؟"

میں نے کہا "یہ لڑکی۔ جو گاڑی چلا رہی تھی۔ اس نے اپنا کارڈ بھی دیا تھا آپ کے بندوں کو۔ وہ شاید پڑھنا نہیں جانتے۔ بہت نامور وکیل ہے یہ لاہور کی۔"

"کمال ہے" اس نے دلچسپی سے کہا "صورت سے تو ماڈل یا فلم کی ہیروئن لگتی ہے۔ ایسی وکیل پہلی بار دیکھی ہے۔ باقی لوگ کون ہیں جو ساتھ ہیں؟ اس کی فیملی کے لوگ ہوں گے۔۔۔ شوہر وغیرہ۔"

"اس نے شادی نہیں کی ابھی۔"

وزیر صاحب کی دلچسپی مزید بڑھ گئی "اچھا بھئی' یہ لو میرا کارڈ۔ اگر دل چاہے تو ہم سے کوٹھی پر مل لینا۔ تمہارے جیسے بندے کی ہم بڑی قدر کرتے ہیں۔ تم ہمارے ساتھ رہو گے تو فائدہ ہو گا۔"

"مگر ایسے آپ کی کوٹھی میں کون آنے دے گا مجھے؟"

وہ مسکرایا "اس کے پیچھے میرے دستخط ہیں۔ دستخط والا کارڈ جس کے پاس ہو وہ کسی بھی وقت مجھ سے مل سکتا ہے۔ نام کیا ہے تمہارا؟"

"بہادر۔ بہادر علی" میں نے کہا۔

"یعنی اسم بامسمیٰ ہو۔ تم نے تو ہمارے بندوں کا حلیہ اتنا بگاڑ دیا ہے۔ اتنا تو گاڑی کا حلیہ نہیں بگڑا۔ خیر تم وکیل صاحب سے کہنا کہ۔۔۔"

میں نے کہا "آپ خود ہی کہہ دیں جو کہنا ہے۔"

اس نے سہلایا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا کار تک گیا۔ وزیر کے ساتھی پٹنے کے بعد اُٹھ کے گاڑی میں بیٹھ چکے تھے مگر شرمندگی سے زیادہ ان کی صورت سے پریشانی عیاں تھی۔ میری وجہ سے پہلے ان کی زندگی خطرے میں پڑی تھی۔ اب نوکری خطرے میں تھی۔ مگر وہ مجھے خوں آشام نظروں سے گھورنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔

عباسی نے بڑی شائستگی سے رابعہ کو مخاطب کیا "خاتون' میں پنجاب کا وزیر جنگلات عباسی ہوں۔"

رابعہ بولی "اسی لیے جنگلی ساتھ رہتے ہیں آپ کے؟"

وہ ہنسا "مجھے افسوس ہے کہ انہوں نے آپ کے ساتھ جنگلی پن کا مظاہرہ کیا۔ دراصل ہمیں بھی اپنی حفاظت کے لیے یہ سب کرنا پڑتا ہے۔"

"لیکن آپ تو عوامی نمائندے ہیں۔" رابعہ بولی "عوام سے آپ کا رابطہ ہونا چاہیے۔ ایسے لوگوں کا نہیں جو یہ بھی نہیں دیکھتے کہ کس سے مخاطب ہیں۔ ایسے محافظ رکھیں گے تو آپ کی ساکھ۔۔۔" رابعہ غصے میں تھی۔

"میں نے کہا نا کہ غلطی ہوئی ان سے۔ آپ کی گاڑی بنوانے کی ذمے داری میری۔ جہاں سے چاہیں ٹھیک کرا لیں اور بل مجھے بھجوا دیں۔ میں نے بہادر علی کو کارڈ دے دیا ہے۔ اس کے ساتھ آیئے غریب خانے پر۔ اچھا خدا حافظ۔" اسے اچانک اپنے مرتبے کا خیال آ گیا۔

رابعہ کو میں پیچھے سے اشارہ نہ کرتا تو وہ بول پڑتی کہ کون بہادر علی۔ جب وزیر اپنی شاہی سواری میں بیٹھ کے رخصت ہو گیا تو رابعہ مجھ پر برس پڑی "کیا یہ سب ضروری تھا؟"

میں نے کہا "دیکھو کیسے سب ٹھیک کر لیا میں نے۔ ان کی دھول بھی جھاڑ دی اچھی طرح۔ تمہاری گاڑی ٹھیک کرانے کا بندوبست کرا دیا۔ شاندار ڈینٹ پینٹ کراؤ سرکاری خرچ پر۔"

"جی نہیں۔ میں خود بھی افورڈ کر سکتی ہوں۔"

غالب نے کہا "وہ کون سا اپنی جیب سے دے گا۔ سکندر عقل سے کام نہ لیتا تو الٹا تمہیں سرکاری گاڑی کی مرمت کا خرچہ دینا پڑتا۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کون سی عقلمندی ہے۔ جب بات ختم ہو سکتی تھی ایسے ہی تو مار پیٹ کی ضرورت کیا تھی۔"

"ان کی خرد ماغی کا علاج ضروری تھا" میں نے کہا۔

"تم ایک کلینک کھول لو۔ اس پر لکھوا دو کہ یہاں خرد ماغ افراد کا دماغ درست کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر بہادر علی۔"

"اب گاڑی چلاؤ گی یا۔۔۔ منظر کی بیوی کی طرح زبان ہی چلاتی رہو گی۔"

رابعہ نے گاڑی آگے بڑھائی "یہ ثابت کر کے کیا فائدہ ہوا کہ آپ پروفیشنل بدمعاش ہیں؟"

"تم نے دیکھا نہیں۔ وزیرِ جنگلات کتنا متاثر ہوا۔ انہیں ایسے لوگوں کی ضرورت رہتی ہے۔"

"اور تم اب ان کے لیے کام کرو گے؟"

"بے وقوف لڑکی۔۔۔ وزیر کی دشمنی سے وزیر کی دوستی اچھی۔"

"دونوں خراب۔"

میں نے کہا "میرا مطلب تھا کہ جوائس کرنا پڑے تو دوستی دشمنی کے نقصانات سے بچا جا سکتا ہے۔ یہ آدمی ہمارے کام آ سکتا ہے کیونکہ یہ جاہل اور احمق مگر بااثر اور امیر ہے۔"

غالب نے سہلایا "خاص طور پر اگر تم چاہو۔ مدعو کیا ہے اس نے نہیں۔"

"غالب۔ میں لعنت بھیجتی ہوں اس کی وزارت' امارت اور دولت پر۔ بہت اچھی طرح جانتی ہوں میں ایسے لوگوں کو اور ان کے کردار کو۔"

نازو نے کہا "ٹھیک کہا تم نے۔ حسین عورت دیکھتے ہی رال ٹپکنے لگتی ہے۔"

غالب کھی کھی کر کے ہنسنے لگا "حسین عورت۔ اسے کہتے ہیں اپنے منہ میاں مٹھو۔"

نازو نے جھینپ کے کہا "میں اپنی بات نہیں کر رہی تھی۔"

"مگر بھی کیسے سکتی ہو۔ تمہیں دیکھتے ہی وہ کیسے جل تو جلال تو پڑھتا ہوا بھاگا۔ بھئی بھوت یا چڑیل کو دیکھ کے ایسی ہی حالت ہو جاتی ہے آدمی کی۔"

"رابعہ سے بات کرتا رہا وہ تو" میں نے کہا۔

"اس وقت تک پیچھے نظر نہیں پڑی ہو گی اس کی۔ بعد میں کیسا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ تھر تھر کانپ رہا تھا۔۔۔ بے چارہ۔"

"بولتے رہو۔ میں نہیں سُن رہی" نازو نے چڑ کے کہا۔

"میں کب تمہیں سُنا رہا ہوں۔ میرا سسر ہوتا سامنے تو اسے سناتا میں کھری کھری کہ آخر اس نے یہ دشمنی کیوں کی مجھ سے۔ صاف بتا دیتا کہ میں بھوت ہوں۔ بھوتوں کے خاندان میں کوئی اُلو کا پٹھا نہیں ملا تھا کہ بلا میرے سر منڈھ دی۔"

"غالب۔ غالب۔۔۔ حد سے مت بڑھو۔ پھر ابا کو بھوت کہا نا۔۔؟"

"یار ابھی تو تم کہہ رہی تھیں کہ میں نہیں سن رہی کچھ بھی۔ اور سن رہی تھیں چوری چوری تو یہ کیسے فرض کر لیا کہ میں سکندر سے تمہارا ذکر کر رہا تھا۔ کیا تم ہو بھوت کی بچی؟"

"پھر کس کی بات کر رہے تھے آخر؟"

"میں نے جو پوچھا ہے وہ بتاؤ۔ تم بھوت کی بچی ہو۔ نہیں تو پھر بُرا مانا کیوں ہو۔" غالب بولا "یار سکندر۔ ایک بار بچپن میں عید کی نماز پڑھنے میں بادشاہی مسجد گیا اور بھیڑ میں ابا سے بچھڑ گیا۔ لوگوں نے مولوی صاحب کے پاس پہنچا دیا اور انہوں نے اعلان کرا دیا کہ ایک بچہ اس حلیے کا روتا ہوا ملا ہے۔ جن کا بچہ ہے وہ لے جائیں۔ ابا آئے اور لے گئے۔ انہوں نے تو کسی سے جھگڑا نہیں کیا کہ انسان کے بچے کو جن کا بچہ کیوں کہا؟"

نازو ہنس پڑی "پرانا لطیفہ ہے؟"

"پھر ہنسنے والا ہے بے وقوف۔" غالب نے پیچھے پلٹ کے کہا "نازو ذرا اپنے پاؤں دکھانا۔"

اس کا موڈ پھر خراب ہو گیا "جوتوں سمیت دکھاؤں؟"

غالب سیدھا ہو کے بیٹھ گیا "تم نے دیکھا سکندر۔ اسے پھر شک ہو گیا کہ میں سیدھا اُلٹا دیکھنا چاہتا تھا۔ چور کی داڑھی میں تنکا۔"

"چور اگر عورت ہو پھر؟" میں نے کہا۔

"اس کی زلفوں میں تنکوں والی جھاڑو" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "رابعہ بہت غصے میں ہے ابھی تک۔ ایسی حالت میں ڈرائیونگ خطرناک ہوتی ہے۔ دوسروں کے حق میں۔"

"ہاں مجھے غصہ آ رہا ہے۔ تم اب بہادر علی بننے کے چکر میں ہو بلاوجہ" رابعہ بولی "ہم اس لیے نہیں آئے تھے یہاں۔ تم اس جنگلی وزیر جنگلات سے ملے تو ٹھیک نہیں ہو گا۔"

"وہ تم سے ملنے میں زیادہ INTERESTED تھا۔" میں نے آہ بھری "آخر جذبات تو وزیر کے بھی ہو سکتے ہیں۔"

"اور نیک بھی ہو سکتے ہیں۔ ممکن ہے وہ جنگل کی کسی کُٹیا میں رہتا ہو۔ رات دن عبادت کرتا ہو۔ بادشاہ کا گزر ہوا ادھر سے تو وزیر بنا دیا۔"

"یا جنگل کا بادشاہ ہو۔ وزیراعظم نے کابینہ میں لے لیا۔ اور وہی قلمدان دے دیا جو اس نے جنگل کے جنگل صاف کر کے بنایا تھا۔ ایک دن جنگل میں اس نے دیکھ لیا' ایک شہزادی کو۔ وہ ہزار جان سے فریفتہ ہو گیا۔"

"شہزادی کے ساتھ اس کی سہیلی کے روپ میں ایک بدروح بھی تھی" غالب نے کہانی کو آگے بڑھایا۔

"چُپ کرتے ہو یا نہیں۔" نازو نے پیچھے سے اس کی گُدی پر ہاتھ مارا۔

غالب نے زور سے کہا "اللہ" اور پھر ایسے گردن ڈھلکا دی جیسے اس کا منکا ٹوٹ گیا ہو اور ساکت ہو کے پڑ گیا۔

"مکار۔" نازو بولی۔

میں نے تشویش سے کہا "نازو۔ یہ مکر کی بات نہیں لگتی مجھے۔ ذرا دیکھو۔"

نازو کا رنگ فق ہونے لگا "غالب۔۔۔ اے غالب۔"

غالب کی گردن دوسری طرف لڑھک گئی۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی اور بالکل ساکت تھیں۔ میں نے دل ہی دل میں اس کی اداکاری کو سراہا۔

"رابعہ۔ گاڑی روکو۔ کچھ گڑبڑ لگتی ہے مجھے۔"

نازو بدحواس ہو گئی۔ "غالب۔۔۔ ہوش میں آؤ۔۔۔"

میں نے کہا "تم بھی غصے میں پاگل ہو جاتی ہو۔ بغیر دیکھے ہاتھ چلانے کی عادت بہت بری ہے۔ یہ تو ہونا تھا ایک دن۔"

نازو رونے لگی "سکندر۔ میں نے تو بہت آہستہ سے مارا تھا۔"

رابعہ نے اسے ڈانٹا "بے وقوف۔ کن کی باتوں میں آ رہی ہو۔ رونے کے بجائے نبض دیکھو اس کی۔"

نازو نے فوراً غالب کا ہاتھ پکڑ لیا "واقعی۔۔۔"

غالب نے خوابیدہ لہجے میں کہا "کوئی فائدہ نہیں۔ نبض رُکی ہوئی ہے" اور پھر قہقہہ مار کے اٹھ بیٹھا۔

"یہ تو حال ہے عقل کا" میں نے کہا۔

نازو کی آنکھوں میں اب بھی آنسو تھے "غالب۔ ایسے مت ڈرایا کرو مجھے اگر میرا ہارٹ فیل ہو جاتا پھر۔"

"میں دل کو بند ہرگز نہ ہونے دیتا۔ اس دل میں تو میں رہتا ہوں۔" اس نے تسلیم بجالا کے کہا "کیسا زوردار ڈا۔ گ ہے۔"

رابعہ نے اسے ملامت کی "وہ رو رہی ہے۔ تم دانت نکال رہے ہو۔"

"پھر کیا میں بھی ساتھ ہی رونا شروع کردوں۔ ابھی ایک جھانپڑ رسید کروں گا تو چپ ہو جائے گی۔"

میں نے بھی کہا "حد ہے نازو۔ اتنا کمزور ہے تمہارا دل؟"

نازو کا ردِ عمل محض جذباتی دیوانگی تھا۔ یہ دیوانگی محبت کی تھی ورنہ جو مارشل آرٹ میں تھوڑی بہت مہارت رکھتا ہو وہ بھی حریف پر وار کرتا ہے تو ناپ تول کر اور اسے وار کی نوعیت' شدت اور نتائج کا اتنا ہی صحیح اندازہ ہوتا ہے جتنا آرٹلری کے کسی ماہر کو توپ سے نکلنے والے گولے کی رینج' ہدف اور تباہ کاری کے دائرے کا۔ بقول شاعر۔ مرگیا صدمہ یک جنبش لب سے غالب۔ ایسا صرف ایک ہی حالت میں ہوتا ہے یعنی پھر غالب کی زبان میں' کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا۔

آوازِ اذاں کے ساتھ ہم نے سوان ندی کا پل پار کیا اور ایوب نیشنل پارک کے ساتھ ہی راولپنڈی کا علاقہ شروع ہوگیا۔ ایوان صدر اور اس کے مقابل سڑک کے دوسری جانب کافی فاصلے پر سی او ڈی کی بیرک جیسی عمارات نظر آرہی تھیں۔ سڑکوں پر ابھی لائٹس جل رہی تھیں۔ صبح دم اٹھنے والوں میں دو ہی طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن کو فکر آخرت سحرخیزی پر مجبور کرتی ہے۔ دوسرے وہ جو فکر معاش میں نکلتے ہیں۔ اس جہاں کا غم' اس جہاں کا غم۔ غم جاناں' غم دوراں۔ یہی انسان کا مقدر ہے اور اس کی زندگی کا محور۔

نازو اب کچھ شرمندہ اور چپ چاپ بیٹھی ہوئی تھی۔ پیڈرو پھر ہوش میں آگیا تھا۔ اس کے سامنے غالب کے لیے نازو کو پورے آداب دلبری کے ساتھ منانے کا موقع نہ تھا اور خیر سے مرزا غالب بھی بڑی بے نیازی سے سر پیچھے کیے سونے جاگنے میں مصروف تھے۔ نازو کے نزدیک یہ بے حسی تھی کہ مذاق کرلیا' رلا دیا اور پھر سو گئے۔ کیا اس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو اتنے بے وقعت تھے۔

رابعہ کا موڈ بھی ٹھیک نہیں تھا۔ اس نے مجھے بڑے طنزیہ لہجے میں مخاطب کیا "جناب کی نیند میں مخل ہونے کی اجازت ہو تو عرض کروں؟"

میں پوری طرح جاگ رہا تھا مگر میں نے غنودگی میں کہا "اجازت نہیں ہے۔"

اس نے گاڑی روک کے بند کی اور باہر نکل کے کو...

"سخت بدتمیز ہیں آپ دونوں۔ کیا بے فکری ہے۔ ...ہور سے... تک میں نے ڈرائیونگ کی ہے۔ کسی کو خیال نہیں آیا کہ میں ...گئی ہوں۔"

میں نے حیرانی سے کہا "اچھا! کیا تمہیں خیال آیا تھا... تھک گئی ہو؟"

رابعہ نے کہا "نازو۔ تم بھی آجاؤ باہر۔ یہ سوتے رہیں... سے۔"

غالب نے بھی کاہلی سے کہا "اچھا بھئی خدا حافظ۔ یعنی... بخیر' کہیں جانا نہیں۔ اور ذرا خیال رکھنا۔ نو بجے سے پہلے مت... ہمیں۔"

میں نے کہا "ہاں۔ اور جگانے سے پہلے بیڈ ٹی لے آنا۔"

نازو نے غالب کو آگے دھکیلا۔ "تم خود ہی باہر نکلو گے یا... پھینک دوں؟"

"بڑی مہربانی ہوگی اگر تم ہی یہ کام کردو۔ مجھے واقعی نیند آ... ہے؟"

رابعہ نے دوسری طرف کا دروازہ باہر سے کھول دیا "گر... انہیں باہر۔ لڑھکا دو سیٹ پر سے۔"

غالب کھسک کے ڈرائیونگ سیٹ پر ہوگیا "تم واقعی بہت سے بھری بیٹھی تھیں۔ چلو اب تم آرام کرو۔ گاڑی میں چلاتا... اور بلاوجہ معافی بھی مانگ لیتا ہوں کہ تمہارے ساتھ زیادتی کی... نے۔ تم سے کسی نے پھوٹے منہ نہیں پوچھا کہ چلو اب تم آ... کرو۔ آخر تم بھی انسان ہو۔"

میں نے کہا "ہم یہ بھی بلاوجہ مان لیتے ہیں.... اخلاقاً۔"

رابعہ نے بیٹھ کے کہا "اب جہاں جانا ہے چلو۔ پنڈی تو... گئے۔"

غالب نے سوچ کے کہا "کہاں چلیں؟ کسی ہوٹل میں جا... سکتے۔ یہاں کسی کے ماے چاچے کا پتر بھی نہیں۔ کوئی دوست نہیں۔ اتنی صبح کہیں کرائے کا مکان بھی نہیں مل سکتا۔"

میں نے کہا "یہ مسئلہ بہادر علی حل کر سکتا ہے۔"

رابعہ سمجھ گئی "اس وزیر جنگلات کی بات مت کرنا۔"

"تم بھی بعض اوقات بچوں کی طرح اڑ جاتی ہو۔ ایک ر... ضرورت ہے جو وہی پوری کر سکتا ہے۔ ضروری نہیں کہ ہم اس... گھر میں قیام کریں اور بعد میں بھی تعلق رکھیں اس سے۔ وہ... گھر پہنچا ہی ہوگا۔ کچھ دیر بعد شاید سو جائے گا۔"

"تمہارا کیا خیال ہے۔ وہ فوراً کسی مکان کی چابی دے... کہ جاؤ عیش کرو۔ باپ کا گھر سمجھ کے رہو۔" غالب نے کہا۔

"بھائی وزیر کو کیا سمجھتے ہو تم؟ ملک کے اصل مالک تو یہ... ہیں وہ تو گھر خالی کرا کے بھی دے سکتا ہے۔ ایک فون یا...

...ے سوا کیا کرتے ہیں یہ لوگ۔ اصل چراغ کا جن تو ان... ...رات ہیں۔ کوشش کرنے میں کیا حرج ہے آخر۔"

...اگر اس نے کہا کہ کوٹھی حاضر ہے۔ مہمان خانہ کھلوا دیتا ...آپ کے لیے" رابعہ نے تلخی سے کہا "اتنی بڑی کوٹھی میں جگہ ...جو خواب گاہ پسند ہو۔ وہ کھلوا دی جائے۔"

...میں نے کہا "تم خواہ مخواہ اتنا REACT کررہی ہو۔ اول تو ...سامنے جانا نہیں۔ بات میں کروں گا اور جانا پڑے تو ڈرنے ...بات ہے۔ وہ تمہیں کھا تو نہیں جائے گا۔ کسی اسکول گرل کی BEHAVE مت کرو جس نے پہلی بار کسی دفتر میں ملازمت ...لیے قدم رکھا ہو۔ وہ وزیر ہے تو تم بھی بڑی توپ چیز ہو۔ وہ کل ...رہے نہ رہے۔ تم سپریم کورٹ کی وکیل بن جاؤ گی۔ کیا پتا ہائی ...میں جج ہو جاؤ۔ بابا عقل سے کام لو اور اسے استعمال کرو۔ ...وہ لوگوں کو استعمال کرتے ہیں' ان کے جذبات سے کھیلتے ..."

"یعنی میں بھی اس کے جذبات سے کھیلوں؟ تم یہ مشورہ دے ...رہے ہو مجھے؟"

"ہرگز نہیں۔ مجھے تو اس کا تمہیں یوں دیکھنا ہی اچھا نہیں لگا"

...میں نے کہا "لیکن یوں تو نہ جانے کتنے لوگ تمہیں دیکھتے ہیں۔ ...ان ہزاروں کی بات نہیں' لاکھوں ہوں گے۔ سچی بات کڑوی ...لگے گی۔ حسین صورت نظر آئے تو کیا ہم نہیں دیکھتے؟ مگر ہر ...کو اس جرم میں سزا نہیں دی جاسکتی کہ اس نے تمہیں یا نازو کو ...بری نظر سے کیوں دیکھا۔ ایسا ہونے لگے تو ہم عادی سزا ...یافتہ میں شمار ہوں گے اور اکثر سزا کاٹیں گے۔"

"کتنی ڈھٹائی سے اعتراف جرم کررہے ہو" نازو نے کہا۔

"اچھی دیکھتی تم بھی ہو۔ مگر مانو گی نہیں۔ فلم اسٹار اور کرکٹر ہی ...اور بھی لاکھوں نظر آتے ہیں ہم سے زیادہ وجیہہ اور خوبرو۔" ...غالب بولا۔

...میں نے کہا "مرزا جی۔ یہ میں نہیں مان سکتا۔"

رابعہ خوش ہوگئی "سکندر نے کہی نا سچی بات۔ ہم کسی کو نہیں ...سمجھتے۔"

...میں نے کہا "خاتون۔ حسب معمول آپ نے غلط سمجھا۔ میں ...یہ مان سکتا کہ ہم سے زیادہ وجیہہ اور خوبرو مرد بھی ہو سکتے ...ہیں۔"

...غالب نے کھی کھی کرکے مصنوعی ہنسی سے نازو کو چڑایا۔ نازو ...باہر آ کے صبح کی ٹھنڈی اور لطیف ہوا میں لمبے لمبے سانس لے ...رہی۔ ایوب نیشنل پارک کے گھنے جنگل جیسے میلوں تک پھیلے ...سرسبز و شاداب علاقے میں پرندوں کا ملا جلا شور گونج رہا تھا ...فضا میں وہ خوشبو تھی جو خالص تھی اور قدرت کے ہاتھوں کی ...بنائی ہوئی کائنات کی خوشبو تھی۔ یہ رات کی نمی کی خوشبو تھی جو ...درختوں کے ہر پتے سے پھوٹ رہی تھی اور صبح کے اجالے کی خوشبو تھی جو فرش خاک پر گل کاری کرنے والے سبزے سے اُٹھ رہی تھی۔ اس میں انسان کی شامل کردہ کثافت نہیں تھی۔ پٹرول اور ڈیزل کے دھوئیں کی بو' کارخانوں میں استعمال ہونے والے کیمیکلز کی بو اور سیوریج کی بو۔

اب صرف پیڈرو گاڑی میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ خلاف معمول خاموش تھا اور کچھ افسردہ بھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اسے چوہدری دلاور کی سنگدلانہ خود غرضی اور بے وفائی کا دکھ ہے۔ اس نے پیڈرو کو اپنی جان کا صدقہ سمجھ کے قربان کردیا تھا اور اسی طرح ہمارے حوالے کردیا تھا جیسے لوگ کالے بکرے کو قصاب کے سپرد کردیتے ہیں۔ اسے یہ احساس بھی ہوگا کہ خوش قسمتی کے ستارے ڈوب جائیں تو اندھیرے میں امید کی کرن کو بھی راستہ نہیں ملتا۔ شاید وہ ذہنی طور پر یہ تسلیم کرچکا تھا کہ اب جدوجہد سے رہائی کی کوشش سے کچھ نہیں ہوگا لیکن ہم سے تعاون کرکے اور معافی مانگ کے اس کی جان بچ سکتی ہے۔

میں خود بھی نہیں چاہتا تھا کہ پیڈرو کچھ بتائے بغیر مرجائے۔ سب سے پہلے تو اسے وزیر خان کے بارے میں وہ سب بتانا تھا جو میرے لیے ابھی تک ایک راز سربستہ تھا۔ جب میں اعلیٰ تعلیم کے لیے ولایت گیا تھا تو وزیر خان ایک صحت مند اور خوش و خرم' مطمئن اور پرسکون زندگی گزارنے والا شفیق باپ تھا' سختی حالات اور حادثات اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے تھے۔ جب میں واپس آیا تو وہ ایک قبر تھا۔ پختہ اینٹوں کی بے حس خاموشی پر نوحہ خواں وہ کتبہ تھا جس پر وزیر خان کے نام اور اس کی تاریخ وفات کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ وزیر خان صرف ایک نام نہیں تھا۔ وہ ایک عہد تھا۔ میرا ماضی تھا اور میری شناخت تھا۔ پھر وہ ایک قبر بھی نہیں رہا۔ زمین کا خلا رہ گیا اور یہ خلا آج بھی مجھے اپنے وجود میں محسوس ہوتا تھا۔

مجھے پیڈرو سے صرف وزیر خان کے بارے میں ہی نہیں پوچھنا تھا۔ اس کے ذریعے چوہدری دلاور کی زندگی کے خفیہ اور تاریک گوشوں تک بھی رسائی حاصل کرنی تھی جیسے دلاور نے ایک سودا کیا تھا ایسے ہی پیڈرو بھی اپنی زندگی کا سودا کرسکتا تھا اور اس کے بدلے میں چوہدری دلاور کے خلاف مجرمانہ الزامات کے ثبوت اور شہادتیں فراہم کرسکتا تھا۔

"چلو بیٹھو گاڑی میں۔ یہاں کب تک کھڑے رہیں گے ہم" غالب نے گاڑی اسٹارٹ کی تو میں چونکا۔

رابعہ نے میری طرف دیکھا "واپس آجاؤ خیالوں کی دنیا سے۔"

میں نے کہا "حاضر جناب۔ کیا حکم ہے میرے لیے۔ آپ کو بھی لے چلوں خیالوں اور خوابوں کی دنیا میں۔"

"آپ رہیں خیالوں کی دنیا میں' خیالی پلاؤ کھائیں اور خیالی گھوڑے دوڑائیں۔ مجھے رہنے دیں حقائق کی دنیا میں" رابعہ بولی۔

میں نے پیچھے بیٹھ کے کہا "یہ ہے بہت مشکل کام۔ گھوڑا دوڑاتے ہوئے پلاؤ کھانا۔ خواہ وہ خیالی ہو یا اصلی۔"

غالب نے آہ بھری "کتنا اجنبی لگتا ہے یہ لفظ۔ پلاؤ' اب اس کی خوشبو تک تصور میں نہیں آتی۔ نہ جانے کب کھایا تھا۔ اور قورمہ.... آہ۔"

میں نے اسے تسلی دی "زیادہ دن نہیں بیٹے' تمہیں اپنی بارات اور ولیمے میں سب مل جائے گا۔ خانہ بدوش!"

"آمین.... اللہ تجھے بھی جلد ٹھکانے لگائے۔ صحرا میں بھٹکنے والے مجنوں کے اونٹ کی روح۔"

اب روشنی ہوگئی تھی۔ سڑک پر ٹریفک بھی نظر آنے لگی تھی۔ میں نے رابعہ کو قائل کرلیا کہ اس وقت بہادر علی بدمعاش کو موقع دیا جائے تو وہ سب کے مسائل حل کرسکتا ہے۔ رابعہ اس شرط پر مان گئی تھی کہ نہ وہ کسی وزیر کے سامنے جائے گی اور نہ اس سے کوئی بات کرے گی۔

"تم کچھ بھی مت کرو۔ سب مجھ پر چھوڑ دو۔"

"یہی میں نازو سے کہتا ہوں۔ سب مجھ پر چھوڑ دو۔ بارات بینڈ' گھوڑے اور سہرے کا انتظام۔ باورچی سے قاضی تک۔" غالب بولا۔

میں نے کہا "تو ابھی تک پلاؤ اور قورمے کی دنیا میں ہے؟ ولیمے سے پہلے ناشتے کی ضرورت ہے مرزا جی۔"

"اچھا یاد دلایا۔ کہاں ہے ناشتا؟ کیا ہے ناشتے میں؟ آخر ایسے کب تک چلے گا۔ روز ناشتے میں دیر.... روز جلے ہوئے سلائس اور ٹھنڈی چائے۔" اس نے نازو کو ڈانٹنا شروع کیا "مجھے کیا پتا تھا کہ ایسی پھوہڑ عورت سے واسطہ پڑے گا جو صرف زبان چلا سکتی ہے یا ہاتھ۔ گھر چلانا نہیں آتا۔ لاتوں کے بھوت کی بچی۔"

نازو نے کہا "پھر بک بک..."

غالب نے کہا "پلیز بُرا مت مانیں.... میرا دماغ چل گیا ہے غالباً اور ویسے بھی میاں بیوی کی لڑائی میں آپ کو بولنے کا حق نہیں۔"

وزیر صاحب کا گھر خاصی تلاش کے بعد ملا۔ پتا سمجھانے والے خود نہیں جانتے تھے کہ وہ کتنے لاپتا ہیں۔ وزیر موصوف کی شہرت بھی ایک خاص حلقے تک محدود تھی اور جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا ان کی سوشل لائف بھی محدود تھی۔ خواتین تک۔ وہ خواتین تنظیموں کی سرپرستی کے شوقین تھے۔ ان کی فلاح و بہبود کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے خواہ خواتین کا تعلق کسی بھی شعبے یا طبقے سے ہو۔ وزیر جنگلات تھے مگر مسائل خواتین کے حل کرتے تھے۔ بشرطیکہ وہ دیکھنے میں اچھی لگیں۔ اکثر کے لیے وہ خود ایک مسئلہ تھے۔

ملک نے مجھے اندر بُلوالیا۔ گاڑی کو میں نے درِ خاص سے خاصے فاصلے پر روک لیا تھا۔ ہر کس و ناکس کو زیادہ قریب آنے سے روکنے کے لیے معقول سرکاری انتظام تھا۔ پولیس کا ایک سپاہی بندوق لیے بند دروازے پر بڑی کاہلی سے پہرا دے رہا تھا۔ سامنے خیمے لگائے دو گارڈ اس سے بھی زیادہ بیزار بیٹھے تھے۔

ملک صبح صبح کوئی "مسئلہ" حل کررہا تھا مگر اس نے مجھے بلانے میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔ اس کی نجی زندگی کی یہ جھلک دیکھنے والا ایک بدمعاش ہی تو تھا۔ کوئی سیاسی حریف تو نہیں جو اس کو پکڑ کر پبلک میں اُچھالے۔

"کیا بات ہے بہادر علی۔ اتنی جلدی تم سے ملاقات کی امید نہیں تھی۔"

"معاف کرنا جی۔ مجھے پتا ہوتا کہ آپ مصروف ہوں گے تو..."

"نہیں۔ تم کہو کیا بات ہے" اس نے مصروفیت کو مسکرا کے دیکھا۔

مصروفیت تیس سال سے کچھ کم کی قدرے فربہ بدن اور بے باک تھی۔ وہ چائے کے کپ سے جام شراب کی طرح چسکیاں لے رہی تھی اور میز پر رکھے ہوئے خشک میوے کو ایسے چر رہی تھی جیسے بھینس چارا کھاتی ہے۔

"وہ جناب' راستے میں کچھ گڑبڑ ہو گئی۔ آپ کو میں نے بتایا تھا کہ وکیل صاحبہ کے ایک مخالف کو...."

اس نے آنکھ دبا کے کہا "ہاں ہاں۔ کیا حال ہے وکیل صاحب کا۔ ان کا مخالف کچھ گڑبڑ کررہا ہے کیا؟"

"نہیں گڑبڑ تو نہیں کررہا ہے مگر اس سے ہمیں کچھ اُگلوانا ہے اس لئے اب وکیل صاحبہ کچھ پریشان ہیں۔ ویسے تو ان کا ذاتی بنگلا ہے یہاں اور ہوٹل میں بھی جگہ مل سکتی ہے مگر ان کو ڈر ہے کہ کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔"

"یہ بتاؤ تم کیا چاہتے ہو؟"

"سر۔ کوئی ایسی جگہ مل جائے عارضی طور پر۔ دو کمرے ہی ہوں بے شک جہاں وہ چند دن قیام کریں تو خطرہ کوئی نہ ہو۔"

"بھئی وکیل صاحب سے کہنا کہ ہم ہیں تو انہیں فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔" اس نے ایک فون اٹھا کے انٹرکام کا بٹن دبایا "ہم آئیں گے وکیل صاحب سے ملنے۔ ہاں' سیکریٹری' دیکھو یہ بہادر علی کا ایک چھوٹا سا مسئلہ ہے۔ لاہور سے ہمارے ایک دکیل دوست آئے ہوئے ہیں۔ یہ ان کا ڈرائیور ہے۔ بات یہ خود سمجھا دے گا تمہیں۔ اسے ریسٹ ہاؤس کی چابی دے دو۔ نہیں' مری والا نہیں۔ یہ جو مری روڈ پر ہم نے ابھی لیا ہے۔ ہاں گارڈن کالج کے پاس۔"

اس نے فون رکھ کے مجھ سے کہا "بہادر علی۔ وکیل صاحب سے کہنا آج رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھائیں۔ دن میں ذرا مصروفیت ہے۔"

مصروفیت نے انٹرکام کا بٹن دبا کے کہا "میں نے ناشتے میں مغز ...

... پراٹھے کے ساتھ۔ اور دیکھو' گاڑی جائے تو ہاتھی دروازے کے اندر چوک سے پہلے ایک دکان ہے' ادھر سے حلوا ... لانا ہے۔"

میں دل ہی دل میں افسوس کرتا ہوا باہر آگیا۔ جب وزیر ایسے ہوں گے اور ان کی مصروفیات ایسی ہوں گی تو پھر ملک کا اللہ ہی حافظ ہے۔ میں نے وزیر خان مرحوم سے ایک فارسی شعر اکثر سنا تھا ... ہمیں مکتب و ہمیں مُلّا۔ کارِ طفلاں تمام خواہد شد۔ اس کا مطلب وہ بتاتے تھے کہ ایسے ہی اسکول اور ایسے ہی پڑھانے والے ہوں گے تو سمجھو بچوں کا کام تمام۔ اب معاملات ... سے بڑھ کے بیٹوں تک آگئے تھے اور خراب سے خراب تر ہوتے جارہے تھے۔

سیکریٹری ایک جوان اور گربہ مسکین شخص تھا جو صورت سے غلام ابن غلام ابن غلام نظر آتا تھا۔ اس نے چابی میرے حوالے کرکے کہا "اور کوئی حکم میری سرکار۔" اور پھر سینے پر ہاتھ رکھا۔

میں نے کہا "یہ بتا دو کہ چابی لے کے میں کدھر جاؤں۔ مشرق کی طرف یا مغرب کی طرف۔"

اس کے لبوں پر ایسی مسکراہٹ تھی جو آدمی کو خوش کرنے کے بجائے چڑاتی تھی۔ "گاڑی خود لے جائے گی جی آپ کو۔ یہ چابی ڈرائیور کو دینی ہے اور بس۔ آپ کا کام ختم' جاؤ موجاں کرو۔"

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "کسی دن تم بھی موج کرکے دیکھو یار۔ بس نوکری ہی کررہے ہو اور سب کو موج کرتا دیکھ رہے ہو۔"

اس کا چہرہ تاریک ہوگیا مگر میں اس پر مسکراتا ہوا باہر آگیا۔ چابی گارڈ کو دینے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ ایک شخص نے خود مجھ سے چابی لے لی اور بڑی نخوت سے مجھے حکم دیا کہ میں اس کے پیچھے چلوں۔

سرکاری گاڑی کا پیچھا کرتے ہوئے ہم واپس پنڈی کی طرف گئے۔ جیپ پر بھی جھنڈا لگانے کی جگہ تھی مگر اس پر کور چڑھا دیا گیا تھا۔ سرکاری نمبر پلیٹ ہی عوام کو متاثر کرنے کے لیے کافی تھی۔ گاڑی چلانے والا بھی اپنی ڈراؤنی شکل سے بدمعاش لگتا تھا اور انداز و اطوار سے بدمعاشی کا اظہار کرنا بھی ضروری سمجھتا تھا۔ اس نے چابی میرے ہاتھ پر یوں رکھی جیسے کوئی غصے میں فقیر کے ہاتھ پر سکہ رکھتا ہے۔

"خیال رکھنا کوئی چیز اِدھر سے اُدھر نہ ہو۔" اس نے مونچھوں کو تاؤ دے کے کہا۔

میں نے کہا "تم بھی خیال رکھو۔ کہیں یہ مونچھیں اِدھر اُدھر نہ ہو کے ہاتھ میں نہ آجائیں۔"

وہ آگ بگولا ہوگیا "کیا مطلب ہے اس بات کا؟"

"مطلب جا کے ملک صاحب سے پوچھنا۔ ان کا لحاظ نہ ہوتا تو میں خود یہ مونچھیں اکھاڑ کے تمہارے ہاتھ پر رکھ دیتا۔ تم کب سے کوشش کررہے ہو۔ اور اب خود بھی اِدھر اُدھر ہو جاؤ تو اچھا ہے۔ میرے غصے کا ٹائم ہوگیا ہے۔" میں نے گھڑی دیکھ کے کہا۔

وہ کچھ سوچتا ہوا اور مجھے گھورتا ہوا چلا گیا۔ اس کی آنکھوں میں کھلا چیلنج تھا کہ اس وقت جانا مجبوری ہے لیکن پھر ملیں گے تم سے۔ اس کے رخصت ہونے تک غالب نے ملک صاحب کے نئے "ریسٹ ہاؤس" کا تالا کھول لیا تھا اور خواتین کے ساتھ پیڈرو بھی اندر چلا گیا تھا۔ نیا ریسٹ ہاؤس پرانی عمارت تھی۔ ملک صاحب نے حال ہی میں خرید فرمائی ہوگی۔ وہ اسے نیا کہنے میں حق بجانب تھے۔ پرانے ریسٹ ہاؤس نہ جانے کتنے اور کہاں تھے۔ شاید ہر شہر میں تھے۔ ہمارا وزیر عوامی کام کرتے کرتے اتنا تھک جاتا ہے کہ اسے ہر قدم پر ایک ریسٹ ہاؤس کی ضرورت پڑتی ہے۔

اندر جاتے ہوئے مجھے اچانک یاد آگیا کہ مجھے ملک صاحب کی مصروفیت کو دیکھ کے ایسا کیوں لگا تھا جیسے میں نے پہلے بھی اس کو دیکھا ہے۔ وہ ایک فلم اسٹار تھی۔ ملک جیسے خاندانی جاگیردار اور جدی پشتی حاکم مرد بھی ہوتے ہیں اور دولت مند بھی چنانچہ وہ فلم اسٹارز اور ماڈل گرلز کے نازِ ادا اور اندازِ دلبری سے والہانہ لگاؤ رکھتے ہیں تو جوانی کے مختصر وقت میں حسن و شباب کے چیک کو کیش کرانے والی ہر فلمی محبوبہ بھی ان کو دورِ اقتدار میں ضرور پسند کرتی ہے۔ دونوں کے لیے یہ ماضی کے ریکارڈز کو قابلِ فخر بنانے کے لیے زیادہ سے زیادہ کامیابیاں سمیٹنے کا زمانہ ہوتا ہے۔ ملک صاحب بھی تازہ مصروفیت کو لاہور کے ستاروں بھرے فلمی آسمان پر کمند ڈال کے لائے تھے اور اپنے دل کی ڈائری کے اسکور میں شامل کرچکے تھے۔ خود فریق ثانی کے لیے شاید یہ پہلا وزیر نہ ہو' اس کی اپنی اسکور بک ہو۔

ریسٹ ہاؤس میں وہ سب کچھ تھا جو آرام کے لوازمات میں شامل سمجھا جاسکتا ہے۔ کچھ آرام سے آگے حرام کی حد میں شامل تھا۔ رابعہ اور نازو نے بہت ناک بھوں چڑھائی کہ یہ بھی ہوتا ہے یہاں اور وہ بھی ہے تو کیوں ہے؟ میں نے کہا کہ اعتراضات اپنے پاس رکھو۔ دنیا میں سب کچھ ہوتا ہے چنانچہ بقول شاعر۔ جس کو ہو جان و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں۔ اپنے کام سے کام رکھو۔

وہاں دو باتھ روم تھے۔ ایک میں نازو چلی گئی اور دوسرے میں غالب۔ رابعہ نے کچن کا دورہ کیا اور میں ریوالور کو دسترس میں رکھے ایک کرسی پر نیم دراز لیکن مستعد بیٹھا رہا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ بیڈ پر لیٹا تو سو نہ جاؤں۔ پیڈرو لیٹ گیا تھا اور سو چکا تھا۔

رابعہ نے کچھ دیر بعد رپورٹ دی کہ بجلی' پانی اور گیس اور چولہا سب ہیں۔ برتن بھی کم نہیں مگر چائے کافی بنانے کا سامان نہیں ہے۔ قریب کے کسی ہوٹل سے چائے لانے سے بہتر تھا کہ ناشتا ریڈی میڈ لایا جائے اور چینی پتی دودھ لا کے چائے خود بنائی

جائے۔ میں نے فیتہ ں کا چارج نازو کو دیا اور غالب کو بازار بھیج دیا۔

پیڈرو جتنا جسمانی تھکن سے بے حال تھا اس سے زیادہ ذہنی احساس شکست سے نڈھال تھا۔ اس نے خود ہم سے بات کرنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی شاید چوہدری دلاور نے اسے اس کے انجام سے آگاہ کردیا تھا یا وہ چاہتا تھا کہ اپنے دفاع کی کوشش کرنے سے پہلے ہمارے رویے اور الزامات کی سنگینی کو سمجھ لے۔ ڈیپریشن کا شکار صرف ذہنی طور حساس لوگ ہی نہیں ہوتے۔ بدمعاش اور بے کردار لوگ بھی ہوسکتے ہیں۔ فرق صرف وجہ کا ہوتا ہے۔

رابعہ کے اور میرے غسل سے فارغ ہونے تک غالب بازار سے نہیں لوٹا تھا۔ نازو کرسی پر بیٹھی کسی پرانے رسالے کی ورق گردانی کررہی تھی مگر پیڈرو کی طرف سے غافل نہیں تھی۔

رابعہ نے تولیہ پشت کی جانب سے شانوں پر پھیلا لیا تھا اور گیلے بالوں کو برش سے سلجھا رہی تھی "سکندر۔ یہ سب مجھے اچھا نہیں لگ رہا ہے۔"

میں نے اسے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں دیکھتے ہوئے کہا "یعنی میرا یوں تم کو گھورنا۔ یا ایسے دور دور رہنا؟"

"بات کو مت ٹالو۔ ہم اس ریسٹ ہاؤس کے بغیر بھی گزارا کرسکتے تھے۔ تم نے اپنے معاملات میں ملک کو ملوث کرکے اپنے خلاف ایک گواہ پیدا کرلیا ہے۔"

"صاف کہو کہ تمہیں ملک سے ڈر لگتا ہے۔"

"ہاں۔ ڈر لگتا ہے مجھے۔ اس جیسے ہر مرد سے ڈر لگتا ہے۔"

میں نے کہا "ہم یہاں سیر و تفریح کی غرض سے نہیں آئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ زیادہ سے زیادہ دو دن کی بات ہے۔ کل نہیں تو پرسوں ہم واپس لوٹ جائیں گے۔"

"ملک نے تو آج ہی کھانے پر بلالیا ہے۔"

"بھئی دعوت میں زبردستی تو نہیں چلتی۔ اس نے مدعو کیا، تم مصروفیت کے عذر پر انکار کردو۔"

"وہ خود آدھمکے گا یہاں۔"

"پھر کیا ہوا۔ ہم بھی ہیں یہاں۔ تم اس کے ساتھ حوصلہ شکن رویہ اختیار کرو۔ بلکہ توہین آمیز۔ یہ احساس جرم کے مارے ہوئے لوگ پہلے ہی بے غیرت ہوتے ہیں۔ وہ برا مانے تو زیادہ سے زیادہ یہ کمینہ پن کرے گا کہ ریسٹ ہاؤس خالی کرنے کے لیے کہہ دے گا۔ ہم فوراً سامان اٹھائیں گے کل پرسوں۔ آج میں اسے ٹال دوں گا کہ وکیل صاحب کی طبیعت ناساز ہے اور وہ سو رہی ہیں۔ کل تم غائب ہوجانا۔ گھومنے پھرنے نکل جانا اور رات کو دعوت ناگزیر ہوجائے تو قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ وہ ذرا بھی بدنیتی کا مظاہرہ کرے تو اسے دل کھول کے بے عزت کرنے میں بھی حرج نہیں۔ پرسوں ہمیں بہرحال جانا ہے۔"

"میں کہتی ہوں کہ آخر کہیں اور کیوں نہیں جاسکتے ہم؟"

"مثلاً؟" میں نے چڑ کے کہا "ابھی ناشتے کے بعد میں اور غالب یا ہم سب کرائے کا مکان ڈھونڈنے نکلیں۔ صرف ... لیے۔ کوئی مکان ملے تو جھوٹ بول کرلیں، کہیں کہ ہم شادی ... ہیں.... سامان کل پرسوں تک آئے گا۔ مہینے بھر کا کرایہ اور ... کا ایڈوانس جمع کرائیں اور پھر چلے جائیں۔ کیا وہ گواہ نہیں ... ہمارے خلاف۔ ملک ہے پبلک کا آدمی۔ اپنا امیج خراب ... سے ڈرتا ہے۔ وہ بے عزتی کو بھی خاموشی سے پی جائے گا اور ... شکر ادا کرے گا کہ جان چھوٹی۔ پھر تم لاہور میں خوش اور ... مصروفیات میں مگن۔ رہا میں تو میرا یہ چھو بھی آج کل کا ... ہے۔ فرنچ وکیل پرسوں کے بعد نظر نہیں آئے گا۔ غالب ... جس سے ملک جیسے عوامی نمائندے ویسے ہی ڈرتے ہیں۔ تم ... سکتی ہو کہ میں نے تو لاہور سے باہر قدم نہیں رکھا۔ اور ... گواہی دے غالب تو ملک کیا کرے گا۔ تاہم اس کی نوبت بھی ... آئے گی۔"

رابعہ نے سرہلایا "پتا نہیں کیوں.... سب ٹھیک ہونے ... باوجود مجھے غلط لگتا ہے۔"

"بات یہ ہے جان.... کہ ہم ہوٹل میں ٹھہر سکتے تو کوئی ... نہیں تھا لیکن پھر گمنام رہنا مشکل تھا اور ہمارے خلاف حالات ... واقعات کی گواہی بھی ہوتی۔ ہم انکار نہیں کرسکتے تھے کہ راولپنڈی ... تو ہم گئے ہی نہیں۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہمیں پیڈرو سے پوچھنا ... اور جیسے پوچھنا ہے۔ اس کے لیے بھی جگہ مناسب ترین ہے۔"

غالب نے دروازے میں نمودار ہوکے کہا "اگر آپ ... زلفیں اور آپ نے معاملات کو سلجھالیا ہو تو ہم ناشتا کریں۔"

"مرزا جی۔ کیا خیال ہے، خواتین آج کا دن شاپنگ میں یا تفریح میں نہ گزاریں۔" میں رابعہ کے ساتھ کھانے کے کمرے پہنچ گیا۔

"کمال ہے۔ یہی مشورہ میں نازو کو دے چکا ہوں لیکن ناشکری خواتین ہمارے سنہرے مشورے مفت بھی قبول نہ کریں" غالب نے ناشتے کی میز پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ نازو وہاں سے براجمان تھی۔

رابعہ بولی "مفت ہم کچھ بھی نہیں لیتے۔"

میں نے کہا "خیر اب اتنا مفت بھی نہیں، اس کا معاوضہ رقم کی صورت میں نہ سہی، کسی اور طرح بھی ادا کیا جاسکتا ہے۔"

"بالکل۔ بدلے میں آپ بھی کچھ مفت دے دیں۔ خلوص ... محبت کا کوئی تحفہ" غالب شرارت سے مسکرانے لگا "جس سے ... خوش ہوجائے۔"

رابعہ چائے بنانے میں مصروف تھی "جو چاہے مانگ لو ... سے، تکلف کیسا؟"

"اچھا سکندر۔ کیا آج نازو قیامت نہیں ڈھا رہی ہے؟"

"ذرا دھلنے سے میل کچیل اتر گیا ہے اس لیے ... لگ رہی ہے۔ تم رابعہ کو دیکھو، جی چاہتا ہے ناشتے سے پہلے ..."

... ڈالوں۔"

... یار ناشتا چھوڑو۔ تم لکھ ڈالو دو چار غزلیں" غالب نے کہا ... تانے رہو رابعہ کو۔ میں اور نازو غیر شاعرانہ مزاج رکھتے ... اتنی دیر میں یہ حلوا پوری ختم کرتے ہیں۔"

... نے کہا "اور پیڈرو، کہیں وہ تو ختم نہیں ہوگیا۔"

... سے میں نے لاک کردیا ہے۔ نیند میں تھا" نازو بولی۔

... غالب نے کہا "اب تم ناشتا کرو اور آنکھیں اور کان بند ... سو جاؤ یا چلی جاؤ شام تک کے لیے کہیں۔ میں نے گاڑی کی ... بدل دی ہے۔"

"نمبر پلیٹ کیسے بدلی؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"وہ در اصل۔ جب میں نے چوہدری صاحب کا تحفہ نذر آتش ... تو نمبر پلیٹ اتار لی تھی۔ کچھ کنفیوژن پیدا کرنے کے لیے۔ ... گاڑی پر وہی نمبر پلیٹ ہے۔ اصل کے اوپر۔"

"تم ایک قابل فخر مجرمانہ ذہن کے مالک ہو مرزا جی۔"

غالب نے عاجزی سے کہا "سب آپ سے سیکھا ہے سر۔ ... ہم کیا ہیں؟"

... میں نے کہا "آپ صحافی ہیں، عاشق ہیں، بے دال کے بودم ..."

"بے دال کا بودم کیا ہوتا ہے؟" نازو نے شک بھرے لہجے میں ...

"بودم میں سے دال نکال دو تو کیا بچا.... بوم.... فارسی میں بوم ... پرندے کو کہتے ہیں جسے انگریزی میں دانائی کا مظہر سمجھتے ہیں یعنی ..."

رابعہ اور نازو نے باہر جانے پر سو جانے کو ترجیح دی۔ پیڈرو ... ہمارے جگانے پر بادل ناخواستہ تھوڑا سا ناشتا کیا اور چائے پی۔

"پیڈرو۔ تم جانتے ہو...." میں نے کہا۔

"ہاں۔ میں جانتا ہوں کہ تم مجھے یہاں راولپنڈی کی سیر کرانے ... لیے نہیں لائے ہو" وہ بولا۔

"تمہیں چوہدری دلاور نے...."

"اس.... کا نام مت لو میرے سامنے" وہ دلاور کو گالیاں بکنے ... "تمام عمر اس کا ساتھ دیا میں نے، ہر جائز ناجائز کام کیا۔"

"جائز کام بھی کیا تھا کوئی؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

غالب نے کہا "اس نے بھی تمہیں مالا مال کردیا۔ اتنا دیا کہ ... تم اپنے کاروبار کے مالک ہو۔ شیخ مختار بنے بیٹھے ہو۔ احسان ... حق یا انصاف کے نام سے نہ تم آشنا تھے اور نہ چوہدری ... کے لیے ان الفاظ کی کوئی اہمیت تھی۔"

"اس کا احساس مجھے بہت دیر سے ہوا.... خیر، اب بتاؤ کیا ... چاہتے ہو مجھ سے؟ میں تم سے کوئی درخواست، کوئی التجا نہیں کروں ..."

غالب نے کہا "چلو کچھ تو عقل سے کام لیا تم نے۔ اس کا فائدہ بھی نہیں تھا۔ خود ہم نے کبھی یہ بے وقوفی نہیں کی تھی۔ دشمن تو دشمن ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "شاید تمہیں معلوم ہوگا، تمہیں ایک سودے کے بدلے میں ہمارے حوالے کیا گیا ہے۔"

"ہاں۔ اور تم میری جان لے سکتے ہو یا مجھ سے بھی سودا کرسکتے ہو" پیڈرو بولا۔

میں نے غور کرکے کہا "سودا کرنے کے لیے کچھ ہے تمہارے پاس؟"

"بہت کچھ ہے" وہ بولا۔

میں نے کہا "ٹھیک ہے۔ یہ بعد میں دیکھا جائے گا کہ جان سے بڑی کیا چیز ہے جو تم دے سکتے ہو۔ اس وقت صورت حال کچھ یوں ہے کہ ہمیں تم سے بہت کچھ معلوم کرنا ہے۔ جھوٹ سننے کے ہم عادی نہیں۔ سچ بولنے میں دونوں کا فائدہ ہے۔ ہمارا وقت بچے گا، تم تکلیف سے بچو گے۔"

اس نے نفی میں سرہلایا "نہیں۔ تم وہی کروگے جو تمہیں کرنا ہے۔ جھوٹ سچ سے فرق نہیں پڑتا۔ تم مجھ سے جتنی نفرت کرتے ہو اور جس طرح اس کا اعلان کرتے رہتے ہو، اس کے بعد تم سے یہ امید رکھنا کہ تم مجھے آرام سے رکھو گے۔ پیڈرو اتنا بے وقوف نہیں ہے۔ تم مجھے سخت اذیت دوگے اور آسانی سے مرنے نہیں دوگے۔ یہ مجھے معلوم ہے۔"

میں نے کہا "اس بحث سے کیا فائدہ۔ چوہدری دلاور نے کہا ہے کہ میرے والد وزیر خاں کو قتل کرنے والے تم تھے۔"

اس نے تلخی سے کہا "صدر کینیڈی کو اور اس سے پہلے لیاقت علی خان کو بھی میں نے ہی قتل کیا تھا۔"

میں نے اس کے منہ پر ہاتھ گھما کے جھانپڑ مارا۔ وہ الٹ کے بستر پر گر گیا اور ہنسنے لگا "میں نے بہت قتل کیے ہیں۔ اخبار اٹھا کے دیکھتے جاؤ۔ جتنے قتل نامعلوم قاتلوں سے منسوب ہوتے ہیں، وہ نامعلوم قاتل میں ہوں۔"

میں نے سکون سے کہا "جواب کو سوال تک محدود رکھو۔"

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا "ابھی ایک قتل اور کروں گا میں۔ سب کو بلالو۔ میں سب کے سامنے کہنا چاہتا ہوں تاکہ گواہی کسی کی جھوٹی نہ ہو۔ میں لکھ کر بھی دے سکتا ہوں کہ چوہدری دلاور کو میں قتل کروں گا۔"

"اچھا؟" میں نے کہا "کب کروگے؟ وقت اور تاریخ کا بھی اعلان کردو۔ اخبار والے اور فوٹو گرافر پہنچ جائیں گے۔"

"اگر میں زندہ رہا۔ اگر تم نے مجھے مہلت دی اور تمہیں مہلت دینی چاہیے۔ آخر وہی تو ہے تمہارا دشمن نمبر ون۔ میں تو نمبر ٹو بھی نہیں جیسا کہ تم سمجھتے ہو۔ تم اس کے ساتھ بھی حساب برابر کرنا چاہتے تھے۔ چھوڑو، یہ کام میں کرسکتا ہوں تو تمہیں کیا ضرورت ہے اپنے سر الزام لینے کی۔ یہ ٹھیک ہے کہ الزام تم پر

ثابت نہیں ہو گا مگر مجھے چوہدری دلاور سے اپنا بدلہ لینا ہے۔ تمہارا کام ایسے ہی ہو جائے گا۔ اسے دوبار تو مارا نہیں جا سکتا۔"

میں نے غالب کی طرف دیکھا "پیڈرو کتنی سمجھ داری کی باتیں کرنے لگا ہے ایک جھانپڑ کھا کے۔"

"اس کا دماغ ٹھکانے آگیا ہے۔"

میں نے کہا "نہیں یار۔ کتے کی دُم اتنی جلدی سیدھی نہیں ہوتی لیکن ہو جائے گی۔ کیا چوہدری دلاور جھوٹ کہتا ہے پیڈرو؟"

"کیا کہتا ہے وہ..... کہ وہ بے قصور ہے.....؟"

"اس نے بتایا ہے کہ ویسے تو وہ واقعی جان سے مار دینا چاہتا تھا وزیر خان کو۔ اس نے کہا بھی تھا کہ بڈھے نے دخل در معقولات بند نہ کیا تو اس کی زبان ہمیشہ کے لیے بند کرنے کا پکا بندوبست کرنا پڑے گا۔ لیکن ابھی وہ نوبت نہیں آئی تھی کہ وہ کسی سے کہتا کہ جاؤ، وزیر خان کو ٹھکانے لگادو۔ یہ کام تم نے شاہ سے بڑھ کر شاہ کے وفادار کی حیثیت سے کیا۔ دلاور کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے۔ اس نے اُلٹا تمہیں بُرا بھلا کہا تھا۔"

"یعنی بُرا بھی کہا تھا اور بھلا بھی۔ آدھی بات سچ ہے۔"

"یعنی اس نے کہا کہ پیڈرو تم نے اچھا کیا....." غالب بولا۔

پیڈرو نے کہا "یہ مطلب تم نے نکالا ہے میری بات کا۔"

"پھر کون سی آدھی بات سچ تھی۔ تم خود ہی بتاؤ" میں نے کہا۔

"اس نے مجھے بُرا کہا تھا۔ اس بات پر گالیاں دی تھیں کہ میں نے حرف بحرف اس کے احکامات پر عمل کیوں نہیں کیا تھا؟"

"یہ بات تفصیل سے بتاؤ۔ اس نے کیا کہا تھا اور تم نے کیا غلط کردیا تھا؟"

پیڈرو سوچ میں پڑ گیا "مجھے کچھ یاد نہیں۔"

میں نے کہا "کوئی بات نہیں۔ یاد آجائے گا۔ ہمارے پاس یادداشت کی بحالی کا نسخہ نمبر تیرہ بہت کارگر ہے۔ حافظے پر اس کا اثر حیرت انگیز ہوتا ہے۔ آدمی کو وہ غلطیاں بھی یاد آجاتی ہیں جو اس نے پیدائش سے پہلے کی تھیں۔ چوہدری دلاور نے تم سے کہا تھا کہ وزیر خان کو قتل کردو؟"

"ہاں۔ صرف ایک بار نہیں، کئی بار اور میرے علاوہ بھی کئی لوگ تھے جن سے اس نے یہ کہا تھا۔"

"مگر تم سب پر سبقت لے گئے تھے۔"

"نہیں۔ میں نے اسے قتل نہیں کیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں وزیر خان کو اپنے ساتھ راوی کے پل پر لے جاؤں اور اسے نیچے دھکا دے دوں۔ اس کے بارے میں یہ پہلے سے مشہور کردیا گیا کہ وزیر خان مخبوط الحواس ہے۔ اگر میں ایسا کرتا تو وزیر خان ڈوب کے مرجاتا۔ اسے تیرنا نہیں آتا تھا لیکن اس کی لاش بہہ کر آگے نہ جاتی۔ اسے وہاں پہلے سے موجود لوگ نکال لیتے لیکن اس سے پہلے وہ لوگ مجھے پکڑ لیتے جو پُل پر اسی تاک میں تھے کہ پیڈرو کو رنگے ہاتھوں پکڑلیں۔ ایک بڈھے کو دریا میں پھینکتے ہوئے۔ پُل کے دونوں جانب پولیس بھی موجود رہتی ہے۔ وہ مجھے پکڑ کے پولیس کے حوالے کردیتے اور گواہی میں اپنے اپنے نام لکھوا دیتے۔ بظاہر چشم دید گواہ بن کے آنے والوں کے نام تو وہی ہوتے، مگر وہ دوسرے لوگ ہوتے۔ یہ بات مجھے پتا چل گئی تھی۔"

"کس سے؟"

"ڈی سلوا سے۔ بلکہ اس کے ایک خاص بندے سے۔"

"پھر کیا تم نے چوہدری دلاور سے شکایت کی تھی؟"

"ہاں۔ اس نے کہا کہ "پیڈرو، تُو میرا یار ہے۔ میرا بیوا ہاتھ ہے، سب سے زیادہ بھروسا میں تجھ پر کرتا ہوں۔ کیا یہ غلط ہے؟ سارے اہم کام میں تیرے سپرد کرتا ہوں۔ میرے جتنے راز تیرے علم میں ہیں کسی اور کے علم میں نہیں۔ میرا کام تیرے بغیر چل ہی نہیں سکتا۔ جب تو یہ سب جانتا ہے تو پھر کسی۔۔۔ کی زبان پر اعتبار کرکے مجھ پر شک کرنا کہاں کی عقل مندی ہے؟"

میں نے کہا "چوہدری صاحب! میرے جیسے رازداری مارے بھی جاتے ہیں اگر کوئی خود ڈرتا ہو کہ یہ آدمی مجھے بلیک میل کرسکتا ہے۔ اس کو میری بہت سی کمزوریاں معلوم ہیں" چوہدری دلاور ہنسنے لگا اور بولا "پیڈرو۔ ایسے تو دنیا کا کوئی دھندا نہیں چلتا۔ کسی نہ کسی پر اعتبار کرنا پڑتا ہے۔ کوئی نہ کوئی شریکِ راز ضرور ہوجاتا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ میں بھروسے کے آدمی مارتا جاؤں۔ ہر ہفتے کسی کو ٹھکانے لگادوں اور ہر ہفتے مجھے کوئی استاد پیڈرو جیسا دوسرا مل جائے۔ قتل کرنے سے مسئلے پیدا ہوتے ہیں حل نہیں ہوتے۔ اب اس وزیر خان کو ختم کرنا ہی اتنا بڑا مسئلہ ہے۔ دوسرا مسئلہ دوسرے قتل سے پیدا ہوجائے گا۔ چوہدری دلاور ایسی حماقت نہیں کرسکتا۔ جس نے تجھے ورغلایا ہے وہ یقیناً اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ وہ تجھ سے حسد کرتا ہے اور شاید تیری جگہ لینا چاہتا ہے۔ جیسے ڈی سلوا میری جگہ لینا چاہتا ہے" دلاور کی اس بات نے مجھے قائل کرلیا اور میں نے اسے بتادیا کہ میرے دل میں شک پیدا کرنے والا کون تھا۔ اس کی لاش تین دن بعد راوی سے ملی کئی میل آگے۔"

"پھر تم نے بعد میں وزیر خان کو کیسے قتل کیا تھا؟"

"میں نے اسے قتل نہیں کیا تھا۔"

"تم جھوٹ بکتے ہو۔"

"تم سچ اُگلوا سکتے ہو" اس نے تسلیم کیا۔

سچ اگلوانا ایک مشکل کام ثابت ہوا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اور بھی سُنے۔ اسی ریسٹ ہاؤس میں رابعہ اور نازو سو رہی تھیں مجھے ان کی نیند میں خلل ڈالنا بھی منظور نہیں تھا چنانچہ میں نے ایک دم ہاتھ مار کے پیڈرو کو ہوش سے بے گانہ کردیا۔

باقی کارروائی اس کے بعد شروع ہوئی۔ میں نے اس کے کپڑے اُتار کے اسے پولیس اسٹائل میں پنکھے سے اُلٹا لٹکا دیا۔ اس کے لیے میں نے فاضل ٹیلی فون تار کا استعمال کیا۔ پیڈرو کے

۔۔۔نوں کے درمیان تین فٹ لمبا ڈنڈا غالب نے ایسے باندھا کہ پیڈرو کی ٹانگیں اردو میں آٹھ کا ہندسہ بن گئیں۔ پھر پیڈرو کے دونوں ہاتھ سر کے اوپر کرکے باندھے گئے اور اسے سر کی طرف کچھ اوپر اٹھادیا گیا۔ باقی تار وہیں باندھ دیا گیا جہاں پنکھے کا ہک تھا۔ اب پیڈرو کا نچلا دھڑ این شیپ میں تھا۔ پھر غالب کچن سے ۔۔۔ کی چیزیں لایا جن میں چھری، چاقو، نمک مرچ اور بیلن وغیرہ ۔۔۔ال تھے۔

پیڈرو کو ہوش میں لانے سے پہلے ہم نے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا تھا۔ جب تفتیش کے عمل کا آغاز ہوا تو پیڈرو کی ۔۔۔ آواز تک نہیں نکلی۔ آدھے گھنٹے بعد ہم نے اسے اُتار کے بیڈ پر ڈال دیا۔ دوسرے مرحلے میں ہر سوال کے بعد میں نے پیڈرو کے جسم پر کہیں بھی چاقو سے کٹ لگایا اور غالب نے نمک ملے پانی سے زخم کو صاف کیا۔

پیڈرو کے بدن پر پانی سے زیادہ پسینہ تھا اور وہ کرب سے اینٹھ رہا تھا مگر اس کا جسم بیڈ سے یوں بندھا ہوا تھا کہ وہ صرف سر کو دائیں بائیں ہلا سکتا تھا۔ اس کی مزاحمت کی صلاحیت اور قوتِ برداشت دیکھتے ہوئے مجھے یہ فکر لاحق ہونے لگی تھی کہ وہ مرجائے گا مگر کچھ بتائے گا نہیں۔

غالب بھی کچھ بے یقینی کا شکار تھا "یار، یہ مرگیا تو ایک مسئلہ اور کھڑا ہوجائے گا۔ دلاور نے تو خیر اسے ہمارے سپرد کیا ہی تھا۔ لیکن اور بھی لوگوں نے دیکھ لیا ہے۔ اس کا ڈسپوزل....."

"ڈسپوزل بعد کی بات ہے۔ ابھی ہم اسے مرنے نہیں دیں گے۔ اس کو تھوڑا سا وقفہ دیتے ہیں۔ پھر دوسرے زاویے سے تفتیش کرتے ہیں۔ ممکن ہے یہی سچ ہو۔ وزیر خان کو اس نے قتل نہ کیا ہو۔ دلاور اسے ہمارے ہاتھوں مروانا چاہتا ہو، جیسے یہ دلاور کے ہاتھوں ہمیں مروانے کے لیے لایا تھا۔"

دو گھنٹے بعد پیڈرو کی حالت کچھ بہتر ہوگئی۔ ہم نے خود اسے طبی امداد فراہم کی تھی یعنی کچھ درد کا احساس کم کرنے والی گولیاں اور ایک سکون بخش گولی۔ میں نے اسے گرم دودھ پیش کیا تو اس نے ہاتھ مار کے گرادیا۔

"یہ سب چھوڑو، اپنا کام شروع کرو۔"

میں نے کہا "پیڈرو، تم بھی سودا کرنا چاہتے تھے۔ سودا ایسے نہیں ہوتا۔"

"سودا کیسے ہوسکتا ہے تم سے۔ تم صرف جان لینا چاہتے ہو ۔۔۔ میں مرنے کے لیے تیار ہوں۔ ایک دن دو دن..... جتنے دن ۔۔۔ مجھے تڑپا تڑپا کے مارو۔"

غالب نے کہا "فرض کرو ہم یہ بات مان لیں کہ وزیر خان کو تم نے قتل نہیں کیا تھا۔"

"اس میں فرض کرنے کی کون سی بات ہے۔ یہ سچ ہے۔"

"پھر وزیر خان کا قاتل کون تھا؟"

"خود چوہدری دلاور۔ کیا تمہاری سمجھ میں نہیں آئی یہ بات کہ کسی نے بھی وزیر خان کو گولی نہیں ماری تھی۔ اس پر خنجر سے وار نہیں کیا تھا، اس کا گلا نہیں گھونٹا تھا۔"

"پھر اس کی موت کیسے واقع ہوئی تھی؟"

"سلو پوائزننگ سے۔ تھوڑا تھوڑا کرکے اسے زہر دیا گیا تھا۔"

"کس طرح، کس نے زہر دیا تھا؟"

"چراغ دین کے ایک ملازم نے جہاں وہ رہتا تھا۔"

میں نے کہا "وہاں اس کی حیثیت ایک ملازم کی تھی؟"

"ہاں۔ چراغ دین نے کہا تھا کہ وزیر خان۔ میرے پاس آجاؤ ورنہ مارے جاؤ گے۔ تم چوہدری دلاور کا اور میر شرافت علی کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ تم ان کے لیے خطرہ بن گئے ہو مگر اصل خطرہ خود تمہیں لاحق ہے۔ کسی دن تم اچانک سڑک کے حادثے میں مارے جاؤ گے یا دفتر میں بیٹھے بیٹھے مرجاؤ گے اور پوسٹ مارٹم رپورٹ میں لکھا جائے گا ہارٹ فیل ہوگیا تھا۔ اس نے چراغ دین کی بات مان لی۔ اس نے اپنے پرانے نمک خوار کے گھر میں پناہ لی تھی اور ایک طرح سے روپوشی اختیار کرلی تھی۔ وہ ملازم بن کے رہتا تھا تاکہ کسی کو شک ہی نہ ہو۔ زہر کے اثرات سے وہ بیمار ہوگیا اور علاج کے باوجود اس کی بیماری بڑھتی گئی۔"

میں نے کہا "کیا تم جانتے ہو کہ اسے زہر کیسے دیا گیا تھا؟"

"اس کے استعمال کے برتنوں میں" پیڈرو نے کہا "اس کے پانی پینے کا ایک مخصوص کٹورا تھا۔"

میں نے کہا "ہاں۔ چاندی کا نقشی کٹورا تھا۔ مراد آباد کا بنا ہوا۔ اسے وہ اپنے ساتھ لانے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ اس پر وزیر خان کے والد یعنی میرے دادا کا نام بھی کھُدا ہوا تھا۔"

"یہ سب مجھے نہیں معلوم۔ زہر کی بہت خفیف سی مقدار اس کٹورے کے نقوش پر مل دی جاتی تھی۔ جب وہ اس میں پانی انڈیلتا تھا تو زہر پانی میں حل ہوجاتا تھا۔"

میں نے کہا "مگر اس کی ایک عادت یہ تھی کہ پانی پینے سے پہلے تھوڑے سے پانی سے کٹورے کو صاف کرلیتا تھا۔ پانی کو ہلا کے پھینک دیتا تھا۔"

"اس سے کچھ نہیں ہوتا تھا۔ زہر اوپر کے کناروں پر بھی لگایا جاتا تھا۔ جس کو اس کے لب چھوتے تھے۔ ظاہر ہے لب ہمیشہ ایک ہی جگہ کو نہیں چھوتے۔ وہ کھانے کے درمیان پانی پیتا تھا۔ یوں زہر خوراک کا جزو بن جاتا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کا نظام ہضم بگڑا پھر جگر کا فعل خراب ہوا اور زہر کے اثرات خون میں سرایت کرگئے۔ ڈاکٹر تو اسے صرف ہاضمے کی خرابی سمجھتے رہے۔"

غالب نے پوچھا "جب تم اتنا جانتے ہو، تو یہ بھی تمہارے علم میں ہونا چاہیے کہ زہر کیا تھا۔"

"سنکھیا" پیڈرو بولا۔

"سنکھیا" غالب چونکا "یعنی آرسینک۔ تمہیں یقین ہے؟"

"مجھے ہر زہر کا نام نہیں معلوم۔ نیلا تھوتھا' سنکھیا' کچلا' یہی چند نام آتے ہیں۔"

غالب نے کچھ سوچ کے کہا "ہوں..." اور خاموش ہوگیا۔

میں نے کہا "وہ چراغ دین کے گھر میں ملازم بن کے رہتا تھا۔ آخر کیوں؟ اس کے پاس بہت دولت تھی۔ وہ چراغ دین جیسے دس کو خود ملازم رکھ سکتا تھا۔ کیا یہ دولت اس نے کہیں چھپا رکھی تھی' کسی بینک میں...؟"

"کہیں اور جا کے وہ خود زندہ نہیں رہ سکتا۔ یہ اسی کا خیال تھا۔ زندہ تو وہ بہرحال نہیں رہا۔ مگر دولت والی بات غلط ہے۔ اس کے پاس نہ بینک میں پیسہ تھا نہ اس نے دولت کہیں گاڑ رکھی تھی۔ چوہدری دلاور نے سب کچھ ہتھیا لیا تھا۔"

میں نے کہا "کیا تم جانتے ہو کہ یہ سب کیسے ہوا تھا؟"

"ہاں۔ میں نے بڑی محنت سے ساری معلومات اکٹھی کی تھیں۔ خود کو محفوظ رکھنے کے لیے اور زندہ رہنے کے لیے میں نے یہ ثبوت اکٹھے کیے تھے۔ اور بالواسطہ طریقے پر دلاور تک بھی یہ بات پہنچا دی تھی کہ مجھے کچھ ہوا تو وہ بھی محفوظ نہیں رہے گا۔"

میں نے کہا "مگر تمہیں یہ معلومات فراہم کرنے والا کون تھا؟"

"ڈی سلوا۔ تم جانتے ہو وہ کیسے مارا گیا تھا۔ وہ گوا سے میرے ساتھ ہی آیا تھا۔ ہم کلاس فیلو تھے۔ وہ زیادہ پڑھ لکھ کے جنرل منیجر بن گیا مگر اس نے مجھے بھی ساتھ رکھا لیکن چوہدری دلاور کو کبھی یہ معلوم نہیں ہوا کہ ہمارا آپس میں کوئی اور تعلق بھی ہے۔ وہ بڑا اچھا دوست تھا۔ اپنا ایک ہی یار تھا۔ ہم ایک ساتھ بیٹھ کے پیتے تھے اور ایک دوسرے کا خیال رکھتے تھے۔ وہ کہتا تھا کہ پیڈرو' کو برا سانپ پر بھروسا کرنا' دلاور پر نہیں۔ اگر وہ میرے خلاف سازش کرے تو مجھے بتا دینا اور تیرے خلاف بات ہوگی تو میں تجھے خبردار کردوں گا۔ ہم ایک دوسرے کا سہارا تھے اور اسی نے مجھے سب کچھ بتایا تھا۔"

"کیا بتایا تھا؟" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔

"تم نے پوچھا تھا مجھ سے کہ سودا کرنے کے لیے میرے پاس کیا ہے؟ اب کیا خیال ہے' سودا ہو سکتا ہے؟"

ابھی تو تم نے کوئی خاص بات نہیں بتائی۔"

"خاص باتیں بہت" وہ بولا "استاد پیڈرو تو مر گیا۔ اب تم شیخ مختار سے بات کر رہے ہو۔ اسے مار کے تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔ ایسے آدمی کو مار کے تمہارے انتقام کا مقصد پورا نہیں ہوگا۔ پھر تم پچھتاؤ گے۔ مجھے سلطانی گواہ سمجھ لو۔ جو کچھ میں جانتا ہوں میرے لیے بے کار ہوگیا ہے مگر تمہارے لیے کارآمد ہے۔ تم چوہدری دلاور سے تصدیق بھی کر سکتے ہو اور بھی بہت سے ثبوت دے سکتا ہوں میں۔ بتا سکتا ہوں کہ ناقابل تردید شہادت کہاں سے ملے گی لیکن مجھے ضمانت چاہیے پکی۔ کسی کاغذ پر نہیں' [illegible] کس کی......؟ یہ بھی میں بعد میں بتاؤں گا۔"

"بعد میں؟" میں نے نفی میں سر ہلایا "ہمارے پاس وقت نہیں ہے پیڈرو اور اس کا مطلب یہ بھی نکلتا ہے کہ تمہارے پاس وقت نہیں ہے۔"

غالب نے کہا "رہی ضمانت کی بات تو تمہیں یہ سمجھنا چاہیے کہ تمہاری کوئی بات ہمارے لیے قابل اعتبار نہیں رہی۔ آخر ہو تو بھی چوہدری دلاور کے تربیت یافتہ شاگرد۔ آج استاد کہلاتے [illegible] ہو۔ اسی لیے کہ تم بھی اپنی صلاحیت کے اعتبار سے اتنے ہی بڑے ڈرامے باز ہو۔ ایکٹر ہو اور بڑی روانی اور مہارت سے ایسی جھوٹی کہانی سنا دیتے ہو جو سچ سے زیادہ قابل اعتبار لگتی ہے لیکن سننے والے ہم جیسے ہوں تو پرکھے بغیر اور تصدیق کے بغیر تمہاری بات ماننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

میں نے کہا "جھوٹے آدمی کے سامنے میں قسم کوئی بھی نہیں کھا سکتا اور نہ کوئی وعدہ کر سکتا ہوں۔"

"تم بلاوجہ میرے دشمن ہو رہے ہو۔ اگر معاملہ وزیر خان کا ہے تو اس کی موت میں میرا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔"

میں نے مشتعل ہو کے کہا "سور کے بچے۔ اور کس کس کے خون کا داغ ہے تیرے دامن پر۔ یہ بھی دیکھ لے۔ استاد ٹیڈی کو کس نے مارا تھا' محسن کی بیوی شہلا کو اور اس کے بیٹے کا قتل کس نے کیا تھا؟"

اس نے کچھ دیر بعد کہا "صرف مجھے ہی قاتل سمجھتے ہو تم۔ ان سب کا اور سزا بھی مجھے ہی دے کے مطمئن ہونا چاہتے ہو تو ٹھیک ہے' مجھے تو ایک نہ ایک دن مرنا ہی تھا۔ میں جس کام میں چوہدری دلاور کے ساتھ تھا اس میں موت تو ہر وقت سامنے رہتی تھی۔ مجھے مارنے کے لیے صرف ایک گولی کافی تھی جو کوئی بھی مار سکتا تھا۔ میرا کوئی دشمن' کاروباری حریف' خود میرا باس دلاور یا تم سب میں سے کوئی۔ جیسے تم بچے رہے ایسے ہی میں بھی بچ گیا تھا لیکن میرے ساتھ بہت کچھ دفن ہو جائے گا۔ بہت جلد احساس ہوگا تمہیں کہ جلدی میں تم نے استاد پیڈرو یا شیخ مختار کو مار کے اصل قاتلوں تک پہنچنے کے راستے خود بند کر دیے۔"

ہم دوپہر تک سوچتے رہے۔ پیڈرو مکمل طور پر ہماری تحویل میں تھا اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ نہ کوئی اس کا مددگار یہاں پہنچ سکتا تھا اور نہ وہ فرار ہونے کی پوزیشن میں تھا۔ ہم نے اس پر تشدد کا جو حربہ آزمایا تھا وہ اچھے خاصے سخت جان مجرم سے اعتراف جرم کرانے کے لیے کافی تھا مگر لگتا تھا پیڈرو ہماری توقعات سے کہیں زیادہ مزاحمت کی طاقت رکھتا ہے اور عین ممکن ہے کہ وہ مر جائے لیکن کچھ نہ بتائے۔ جسم کی قوتِ برداشت بھی ایک حد تک ساتھ دیتی ہے۔ اچانک کہیں وہ نظر نہ آنے والی اور محسوس نہ ہونے والی لکیر آ جاتی ہے جو زندگی اور موت کے درمیان حائل ہے اور ایک

[illegible] ہو کے آیا تھا۔ آخر وزیر خان بھی تو زندہ رہا تھا۔ [illegible] دل کے ساتھ۔ میرا بارِ غم کیا اس سے زیادہ بھاری ہے۔"

غالب نے کہا "یہ بار ہم سب مل کے اٹھائیں گے۔ ہم سب کا [illegible] مشترک ہے۔"

نازو نے اندر سر ڈال کے کہا "کیا مطلب؟ دونوں کے پیٹ میں درد ہو رہا ہے؟"

غالب نے سر ہلایا "پہلے پیٹ میں تھا۔ تمہیں دیکھ کے دل میں ہوگیا۔"

"وجہ بہرحال بھوک ہے" میں نے وضاحت کی "پیٹ تو بھر جائے گا روٹی سے۔"

"دل کے درد کا علاج بھی ہے" نازو نے اندر آ کے کہا "اس کو انجائنا کہتے ہیں۔ ایسے لوگ زیادہ دن جیتے نہیں جن کو اس عمر میں یہ روگ لاحق ہو جائے۔"

"تمہاری تشخیص غلط ہے۔ اسے انجائنا نہیں۔ نازلی کہتے ہیں۔ یہ بیماری مجھے بہت پہلے لاحق ہوئی تھی۔ اس میں مرنے والا اکیلا نہیں مرتا۔ کسی کو مار کے مرتا ہے۔" غالب بولا۔

نازو کا اصل نام تو نازلی ہی تھا۔ غالب کی بات پر اس نے بُرا سا منہ بنا کے کہا "اور اکیلا مرنا پڑے پھر؟"

"پھر وہ بھوت بن جاتا ہے اور کسی بھوت کی بچی سے چمٹ جاتا ہے۔" غالب نے کہا۔

اس سے پہلے کہ وہ لڑنے لگتے باہر کوئی گاڑی آ کے رُکی اور کسی نے کال بیل بجائی۔ نازو فوراً اندر غائب ہوگئی۔ میں نے غالب سے کہا کہ وہ استاد پیڈرو کو سنبھالے "میں دیکھتا ہوں کہ ہم سے ملنے کون آگیا یہاں؟"

باہر وہی ڈرائیور کھڑا ہوا تھا جس سے صبح میرے تعلقات میں اس کی مونچھوں کے باعث کچھ کشیدگی آگئی تھی۔

"ملک صاحب نے یہ کھانا بھیجا ہے۔ وکیل صاحب کے لیے" اس نے مونچھوں کو بل دیتے ہوئے کہا۔

"اچھا۔ میں کھا لوں گا" میں نے اس سے ٹفن کیریر لے لیا۔

"تم وکیل ہو؟" اس نے غرا کے کہا اور گاڑی میں سے دوسرا ڈبا نکال لیا "یہ ہے تمہاری خوراک۔"

میں نے وہ بھی لے لیا "میں سب صاف کردوں گا۔ تم ذرا لسو باہر' برتن لے جانا۔ وکیل صاحب تو ہیں نہیں۔ ملک صاحب کا شکریہ ادا کر دینا۔"

دروازہ بند ہو جانے کے بعد وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اگر وہ پہلے پوچھ لیتا تو شاید اسپیشل لنچ واپس لے جاتا۔ "اوئے تم شرافت سے کھانا وکیل صاحب کے لیے چھوڑ دینا۔ وہ آ کے کھا لیں گی۔"

میں نے اندر سے ہی جواب دیا "مسٹر مونچھ۔ وکیل صاحبہ کی دعوت تھی کہیں۔ کھا کے آئیں گی۔"

لمحہ قبل دھڑکتے دل اور جسم میں رواں خون کے ساتھ سانس لینے والا جیتا جاگتا آدمی دوسرے لمحے میں لاش رہ جاتا ہے۔

دوپہر کے کھانے کا وقت ہوا تو میں نے کہا "لڑکیوں کو اُٹھا دینا چاہیے۔ بہت دیر سو لی ہیں۔"

"کیا ان سے کھانا پکوانا ہے۔ وہ ہانڈی چولہا کریں گی؟"

"ہانڈی چولہا نہ کریں۔ یہاں وہ سونے کے لیے بھی نہیں آئی ہیں۔ ہم ان سے مشورہ تو کر سکتے ہیں" میں نے کہا۔

"ہاں ایک قانونی پہلو ہے غور طلب" غالب نے کہا "پیڈرو نے کہا ہے کہ تمہارے والد کو تھوڑا تھوڑا سنکھیا دیا گیا تھا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے۔ سنکھیا جسم میں جذب ہو جاتا ہے۔ ہڈیوں اور بالوں میں بھی اتر جاتا ہے اور اس کے آثار برسوں بعد بھی ملتے ہیں۔ جسم خاک میں مل جاتا ہے مگر ہڈیاں اور بال رہتے ہیں۔"

میں نے کہا "رائٹ۔ یہ میں نے بھی سنا ہے اور پڑھا ہے کہ دس سال بعد بھی پوسٹ مارٹم سے آرسینک کی موجودگی کا پتا چلایا جا سکتا ہے۔"

"ان کا پوسٹ مارٹم نہیں ہوا تھا؟"

"ہاں۔ پوسٹ مارٹم سے قبل ہی لاش ان کے مدفن سے غائب کر دی گئی تھی۔ پیڈرو نے کیا تھا یہ کام" میں نے کہا۔

غالب بولا "اب وہ ہمیں بتا سکتا ہے کہ اس نے ہڈیاں کہاں دفن کی تھیں؟"

"اگر اس نے... ہڈیوں کو واقعی کہیں دفن کیا تھا... تو وہ ہمیں اسی جگہ لے جائے۔ ہم رابعہ سے کہیں گے کہ وہ میڈیکل ایگزامنر سے رپورٹ حاصل کرے۔ اگر سنکھیا کی موجودگی ثابت ہوگئی تو پیڈرو کی کہانی قابلِ اعتبار ہو جائے گی۔"

"اس کے بعد؟"

"ہم رپورٹ اپنے پاس رکھیں گے اور ہڈیوں کو واپس وہیں دفن کرا دیں گے۔ جہاں خالی جگہ آج بھی موجود ہے۔ اپنی امانت وصول کرنے کے انتظار میں۔"

غالب نے افسوس اور دکھ سے سر ہلایا "کاش یہ سب نہ ہوتا۔"

میں نے ٹھنڈی سانس لی "زندگی لوگوں کے ساتھ اس سے کہیں زیادہ بے رحمی کے ساتھ پیش آتی ہے۔ ہم نے المیۂ مشرقی پاکستان میں کیا نہیں دیکھا تھا۔ باپ کے سامنے بیٹی اور بھائی کے سامنے بہن کو جس درندگی سے ہلاک کیا گیا تھا۔ ماؤں کے شیر خوار بچے بھون دیے گئے تھے۔ اور اس سے بھی پہلے میرے اپنے خاندان کے سب لوگ۔ میری ماں اور میرے بھائی بہن۔ جس طرح شہید کیے گئے تھے۔ صرف مسلمان ہونے اور پاکستان کے حامی ہونے کے جرم میں۔ وہ سب مجھے یاد تو نہیں مگر میرے والد نے پورے خاندان کی لاشیں بے گور و کفن چھوڑ دی تھیں اور پاکستان پہنچنے والا اس بھرے گھر کی کل واحد نشانی ایک بچہ میں تھا جو اس

"یہ پہلے کیوں نہیں بتایا تھا۔ مونچھ کے بچّے' تمہارا بیڑا غرق۔"

"تم نے پوچھا کب تھا۔" میں نے اندر ہی سے جواب دیا "تمہاری مونچھ کا بیڑا غرق۔"

"مونچھ ہوتی ہے مردوں کی نشانی۔"

"پھر تم نے کیوں لگا رکھی ہے؟" میں نے کہا۔

"میرا نام ہے شیر خان۔ چیر کے رکھ دوں گا۔"

"میرا نام بہادر علی ہے۔ پالتو شیر تو بلّی سے بھی گیا گزرا ہوتا ہے چوہا تک نہیں مار سکتا۔"

"تو ذرا بِل سے باہر آ کے دیکھ۔"

"اچھا بِل کی بات کرتا ہے۔ میں بتا دوں گا وکیل صاحب کو۔ وہ ملک صاحب سے بات کریں گی کہ کھانا لانے والا بِل کی بات کر رہا تھا۔ ملک صاحب کے کچن میں کیا ہوٹل چل رہا ہے۔ ان کے مہمانوں سے پیسہ وصول کرتے ہو تم؟ کتنا بِل ہے اس کھانے کا۔ ہم شام کو ادا کر دیں گے۔"

وہ پتا نہیں کیا کہتا رہا۔ میں نے اس کی نہیں سُنی اور بالآخر اسے ہی جھک مار کے جانا پڑا۔

رابعہ نے خفگی سے کہا "کیا بلاوجہ اس کے منہ لگتے ہو۔"

"جب تمہارے منہ نہیں لگ سکتے اور تم ہمیں منہ نہیں لگاتیں تو پھر کیا کریں" میں نے کہا۔

غالب نے فوراً ٹفن کیریر کھول لیا "واہ بھئی واہ۔ کبھی تو خدا بھی فوراً سن لیتا ہے معدے کی فریاد۔ کل ہی پلاؤ اور قورمے کی بات کی تھی۔"

رابعہ نے کہا "آپ اوقات میں رہیے اپنی۔ آپ کا کھانا وہ ہے' دال چاول۔"

میں نے کہا "تم نے غلط سنا۔ وکیل صاحب کا نام لے کر یہ ڈبا دیا تھا اس نے۔ چاہو تو فون کر کے پوچھ لو۔"

غالب نے کہا "بڑا افسوس ہوتا ہے اس ذہنیت پر۔ عورتوں کے ساتھ کتنا غیر مساوی اور امتیازی سلوک کیا جاتا ہے۔ جیسے یہ انسان نہیں' پاؤں کی جوتیاں ہیں۔ کنیزیں ہیں۔"

"مگر ہم فراخ دل لوگ ہیں۔ انہیں برابر بٹھا کے وہی کھلاتے ہیں جو خود کھاتے ہیں۔"

نازو نے جل کے کہا "اور خود کیا کھاتے ہیں۔ دنیا بھر میں دھکّے' زمانے بھر کے جوتے' اور ہر ایک سے گالیاں۔"

پیڈرو نے پھر بھوک نہ ہونے کا عذر پیش کر کے کھانے سے انکار کر دیا۔ وہ ایک کمرے میں مقفل تھا اور اس کے فرار ہونے کے راستے مسدود تھے۔ دو کھڑکیوں میں لوہے کی گرل تھی۔ ایک دروازہ جو ساتھ والے کمرے میں کھلتا تھا دوسری طرف سے بند تھا اور باتھ روم کے روشندان سے وہ صرف اسی صورت میں گزر سکتا تھا جب وہ انسان کا نہیں کتّے کا بچہ ہوتا یا اس کی عمر دو سال ہوتی۔

رابعہ اور نازو سو کے اٹھی تھیں تو زیادہ تازہ دم نظر آتی تھیں اور ان کے چہروں پر تھکن کی پژمردگی بھی نہیں تھی۔ انہوں نے ہماری تفتیشی رپورٹ بڑے دھیان سے سنی۔ اس میں سے ہم نے پُرتشدد اور قابلِ اعتراض مناظر کاٹ دیے تھے۔

"یہ سب پیڈرو نے خود ہی بتا دیا؟"

میں نے اور غالب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کے کہا "ہاں خود ہی بتا دیا۔ رضاکارانہ طور پر۔"

رابعہ بولی "مشترکہ جھوٹ پر شرم آنی چاہیے آپ دونوں کو۔"

"بالکل نہیں" میں نے کہا "اسے ہم اتفاقِ رائے کہتے ہیں یہ برادرانہ اتحاد سمجھتے ہیں۔"

غالب بولا "ویسے بھی آپ اپنی توجہ نتائج پر مرتکز رکھیے۔ آم کھائیں سر نہ کھائیں ہمارا کہ پیڑ کتنا اونچا تھا۔ اس کے پتے کتنے تھے اور عمر کیا تھی۔ کس نے لگایا تھا۔"

رابعہ نے کہا "پیڈرو کی بات اگر مان لی جائے اور بعد میں اس کی صداقت بھی ثابت ہو جائے تو کیا ہم اسے کوئی ضمانت فراہم کر سکتے ہیں۔"

"یہ تم بتاؤ۔ تم قانون کو سمجھتی ہو اور سمجھاتی ہو۔ کیا ایسے مجرم کے لیے رعایت اور معافی کی گنجائش ہو سکتی ہے۔"

"مجرم وہ ہوتا ہے جس پر جرم ثابت ہو جائے۔ عدالت اسے سزا سُنا سکتی ہے۔"

"پیڈرو پر جرم ثابت ہے۔"

"کس بنیاد پر۔ ہمارے یقین کی بنیاد کوئی قانونی حیثیت نہیں رکھتی۔ کیونکہ خیال اور یقین کی شہادت کسی عدالت میں تسلیم نہیں کی جاتی۔ کیا ہم میں سے کوئی اس کے جرائم کا چشم دید گواہ ہے؟" رابعہ نے کہا۔

"اگر وہ خود اعترافِ جرم کر لیتا ہے تو کافی ہے۔"

رابعہ نے کہا "اعترافِ جرم پولیس بھی حاصل کر لیتی ہے۔ جبر کے تحت حاصل ہونے والا تحریری بیان بھی بے معنی ہے۔"

میں نے بھنّا کے کہا "پھر کیا کریں۔ اس سے کہیں سوری پیڈرو' اور اسے باعزت طور پر رخصت کر دیں۔ گھر چھوڑ آئیں۔"

رابعہ نے کہا "یہ تو میں نے نہیں کہا۔ ہم پیڈرو سے مدد لے سکتے ہیں اگر وہ ثبوت اور شہادت فراہم کر سکتا ہے جن سے اصل مجرم تک پہنچنا اور اسے کیفرِ کردار تک پہنچانا ممکن ہو جاتا ہے تو پھر ہمیں پیڈرو کے سامنے یہی شرط رکھنی چاہیے کہ جو کچھ وہ جانتا ہے سب ہمیں بتا دے۔ اس کا بیان زبانی نہیں تحریری ہونا چاہیے۔ وہ جو بھی لکھے اپنی ذمّے داری پر لکھے اگر وہ اپنی بے گناہی ثابت کر سکتا ہے' وزیر خان مرحوم کے قتل کی حد تک اور اس کی فراہم کردہ معلومات سے اصل حقیقت سامنے آ جاتی ہے' اصل قاتل بے نقاب ہوتے ہیں تو پھر ہم اسے وعدہ معاف گواہ کی حیثیت دے کے

ہم اسے چھوڑ دیں گے۔"

"یہ کہنا قبل از وقت ہے" میں نے کہا۔

"ابھی سب کچھ قبل از وقت ہے۔" غالب بولا "ابھی تو یہ ایک تجویز ہے۔ ممکن ہے پیڈرو لکھ کر کچھ نہ دے۔ اس کی گواہی دستاویز کی صورت میں ہوگی۔ تو عدالت میں بھی پیش کر دی جائے گی۔ اب عدالت میں وہ کہے کہ یہ تحریر مجھ سے جبراً لی گئی تھی۔ گن پوائنٹ پر لکھوائی گئی تھی۔ تو ہمارا دشمنی کا رشتہ زیادہ انتقامی ہو جائے گا۔ اگر وہ اسے درست مانے تو پھر اصل مجرم اور اس کے ساتھی' ولاور اینڈ کمپنی ہم سے بڑھ کے جان کے دشمن۔"

رابعہ نے کہا "وہ عدالت کے چکر میں نہیں پڑے گا۔ نہ زبانی گواہی دے گا نہ تحریری۔"

"دوسری صورت یہ ہے کہ اس کا پورا بیان سُنا جائے اور ریکارڈ کر لیا جائے۔ اس کے لیے بندوبست ہی ایسا کرنا پڑے گا کہ پیڈرو کو شک نہ ہو۔ ہم باتوں باتوں میں سب پوچھ سکتے ہیں۔ تفصیل کے ساتھ۔ ہر بات معلوم ہو سکتی ہے۔ اگر وہ کچھ بھول جائے یا چھپانے کی کوشش کرے تو ہم سوالات کر سکتے ہیں۔ ایسے سوالات جن کا جواب اسے دینا ہی پڑے۔ وہ گول مول بات نہ کر پائے۔"

"یعنی اس سے وکیلوں والی جرح کی جائے۔"

"ہاں۔ سچ ہوگا تو اس میں تضاد نہیں ہوگا۔ اس کے دو مطلب نہیں نکالے جا سکیں گے۔" نازو نے کہا "یہ کام تو رابعہ باجی ہی کر سکتی ہیں۔"

غالب نے کہا "بات تو معقول ہے۔"

"کمال ہے۔ یہ تم کہہ رہے ہو؟" نازو نے طنز کیا۔

غالب نے آہ بھری "آدمی کو سب کچھ کرنا پڑتا ہے محبت میں۔ جھوٹ بھی بولنا پڑتا ہے۔ اللہ معاف کرے۔"

میں نے کہا "چلو یہ کام ہم سب مل کے کریں گے۔ اس کا بیان سُنیں گے۔ سوال و جواب کریں گے۔ جس کے دماغ میں جو آئے پوچھ لے۔"

"ہاں۔ بشرطیکہ اس کے پاس دماغ ہو۔ نازو سوال تو کرنے سے رہی۔ ہاں ریکارڈنگ کرے گی کہیں بیٹھ کے۔" غالب بولا۔

"اس کے لیے بھی مجھے تمہارے دماغ کی ضرورت ہوگی" نازو نے جل کے کہا۔

"کچھ تم پہلے ہی کھا چکی ہو۔ جو تھوڑا بہت بچا ہے۔ اس کی مجھے بھی ضرورت ہے' سوری۔"

"میں گائے بھینس نہیں ہوں کہ بھوسا کھاؤں۔"

"وہ تو جب میں گھاس ڈالوں گا تمہیں تب پتا چلے گا کہ تم کیا چیز ہو۔ گائے بھینس سے زیادہ تم دولتی جھاڑنے والی مخلوق لگتی ہو جس کے سینگ غائب ہو گئے ہیں۔"

"سکندر۔ اس نے مجھے گدھا کہا ہے" نازو نے برہمی سے کہا۔

"میں مذکر مونث کی غلطی نہیں کر سکتا۔"

"نامعقول گدھے۔ میرے سامنے تم نے نازو کو گدھی کہا تو بہت بُرا ہوگا تمہارے ساتھ" میں نے اسے ڈانٹا "کبھی میں نے بدتمیزی کی ہے ایسی رابعہ سے؟"

"تم نام کے بہادر علی ہو۔ میں کسی کے باپ سے نہیں ڈرتا خواہ وہ بھوت کی بچی ہو یا کوئی چڑیل۔ نازو کو تم کیا سمجھتے ہو۔"

"غالب مجھے غصہ آ گیا تو میں پھر ہاتھ مار دوں گی۔"

"ماردو۔ میں پھر مر جاؤں گا۔ ہم تو ایسے ہی مرتے رہیں گے تم پر۔ اگر ہزار بار مریں گے تو نو سو ننانوے بار تمہارے لیے۔"

"اچھا!" نازو ہنسنے لگی "اور ایک بار؟"

"یار ایک بار تو سچ مچ مرنا پڑے گا۔" غالب منہ لٹکا کے بولا "ڈراما نہیں چلے گا۔"

رابعہ نے تنگ آ کے کہا "اب کسی اور کو بھی بولنے دو گے یا نہیں؟"

"سوری۔ چلو اب تمہاری باری۔ تم کہو کیا کہتا ہے سکندر ہے۔ ہم تیار ہیں دردناک جذباتی رومانی سین کے لیے۔" غالب نے کہا۔

رابعہ نے کہا "پہلے پیڈرو سے کہو کہ ہمیں وہاں لے چلے۔"

میں نے کہا "وہاں بھی لے جائیں گے اسے لیکن آج نہیں' کل۔ آج ہم اس کا بیان ریکارڈ کرتے ہیں۔ میرے خیال میں نازو نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ یہ قانونی مسئلہ ہے۔ اگر پیڈرو تحریری بیان نہیں دیتا تو پھر اس سے ہر سوال رابعہ ہی کو کرنا چاہیے تاکہ قانونی سقم کوئی نہ رہے اور پیڈرو خود اپنی باتوں کے جال میں پھنس جائے۔ باتوں میں اُلجھا کے حقیقت کیسے معلوم کی جا سکتی ہے۔ یہ آرٹ رابعہ کے پاس ہے۔"

"یعنی چکر دینے کا آرٹ" غالب نے کہا۔

"یہی سمجھ لو۔ ہم سے کوئی بھول چوک ہو سکتی ہے۔ کوئی قانونی نکتہ مِس ہو سکتا ہے۔ رابعہ اپنے تجربے سے فائدہ اٹھا سکتی ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے یہ عقل اور ذہانت کا کام نہیں ہے" غالب بولا "جیسے تجربے کی بنا پر موچی جوتے گانٹھتا ہے یا نائی بال بناتا ہے۔"

نازو نے فوراً وار کیا "تم جیسا صحافی خبر بناتا ہے۔"

میں نے کہا "ایک وجہ اور بھی ہے۔ میری آواز ریکارڈ نہیں ہونی چاہیے اس اعترافِ جرم میں۔ ویسے بھی پیڈرو مجھ سے اور غالب سے کھل کے بات نہیں کرے گا۔ اس کے ذہن پر نفسیاتی دہشت سوار ہوگی۔ رابعہ کچھ نرمی سے اس کی حوصلہ افزائی کر سکتی ہے کہ وہ اوّل و آخر سب کچھ بتا دے۔ جو کچھ اسے معلوم ہے کمی بیشی کے بغیر رابعہ کو یوں سنا دے جیسے رابعہ اس کی طرف سے وکیلِ صفائی ہے اور حقائق کی روشنی میں رابعہ اس کے کیس کو سمجھ لے گی تو بتائے گی کہ اس کے لیے رعایت کی کتنی گنجائش ہے۔ قانون

کی نظر میں اور ایم آر ایس کی عدالت میں اس کے لیے وعدہ معاف گواہ کی حیثیت سے معافی کی سفارش ممکن ہے یا نہیں۔ اگر رابعہ اس کو یقین دلانے میں کامیاب ہو جائے کہ وزیر خان کے معاملے میں وہ بے گناہ ثابت ہوا تو شاید سکندر رابعہ کے کہنے سے اس کو چھوڑ دے۔"

رابعہ نے کہا "میں پوری کوشش کروں گی۔"

غالب نے کہا "یہ کام آج ہی ہو جائے تو اچھا ہے۔ ہم چلتے ہیں بازار اور کوئی اچھا سا ریکارڈنگ سسٹم خرید لاتے ہیں۔"

"ہم سے آپ کی مراد کیا ہے؟ میں اور تم ایک ساتھ نہیں جا سکتے۔ یہ دونوں خواتین بھلا اکیلی رہ سکتی ہیں؟"

"پھر وہی دونوں اور اکیلی؟"

"ہاں۔ رابعہ تو موجود ہی نہیں ہے۔ وزیر صاحب کا کچھ بھروسا نہیں۔ ان کی مصروفیت موقع دے تو وہ شرفِ نیاز حاصل کرنے آجائیں۔"

"مصروفیت کو وہ لاہور سے لائے ہیں۔ اتنی جلدی فارغ نہیں ہوں گے" غالب نے کہا "مصروفیت خود بڑی جان لیوا ہے۔"

"تم اور نازو چلے جاؤ۔ واپسی میں گاڑی کہیں چھوڑ دینا۔"

"کہاں چھوڑوں؟ کسی سڑک پر یا قبرستان میں؟"

"کسی گیراج میں سروس کے لیے دے آنا۔ صبح لے آئیں گے۔ رات کو گاڑی نظر نہیں آئے گی تو وزیر صاحب کو یقین آجائے گا کہ وکیل صاحب واقعی موجود نہیں۔ اگر ان کا نامہ بر آیا یا وہ خود آئے تو میں ان سے نمٹ لوں گا۔ رابعہ ابھی سے پیڈرو کی جذباتی ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش کر کے دیکھ لے۔"

نازو نے کہا "ٹھیک ہے۔ چلو غالب۔"

غالب نے اسے تنقیدی نظروں سے دیکھا "اس حلیے میں؟ ان کپڑوں میں میرے ساتھ جاؤ گی؟"

"کیوں کیا خرابی ہے ان میں؟"

"خرابی ہی خرابی ہے۔ تمہارا کیا ہے' بے عزتی میری ہوگی۔"

نازو بگڑ گئی "جاؤ پھر اکیلے۔ میں نہیں جاتی۔"

غالب فوراً خوشامد پر اتر آیا "ارے یار تم سمجھتی کیوں نہیں ہو۔ یہ ٹھیک ہے کہ تمہارے حسین چہرے کو نہ میک اپ کی حاجت ہے اور نہ تمہارے حسن و جمال میں کوئی کمی ہے۔ میں تو چاہتا ہوں کہ جب تم میرے ساتھ ہو تو ہر طرف چکا چوند ہو جائے۔ جو دیکھے دم بخود رہ جائے۔ پلٹ کے گرے۔ تمہارے حسن کو چار چاند لگ جائیں۔ پانچواں میں خود تمہارے ساتھ لگا ہوا نظر آؤں۔"

ہم سب ہنسنے لگے۔ نازو نے بھی مصنوعی خفگی کا اظہار کرتے ہوئے غالب کو بکواسی کہا مگر تیار ہونے چلی گئی۔ آدھے گھنٹے بعد وہ لوٹی تو غالب اسے دیکھتا رہ گیا۔ اس کے حسن کی آب و تاب پر واقعی نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔

"چلو اب اٹھو" نازو نے شرما کے کہا "ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟"

"میں اجازت چاہتا ہوں پٹ سے گر کے قدموں پر دینے کی۔ پروانہ وار شمعِ حسن پر نثار ہونے کی۔"

میں نے اسے لات مار کے دھکیل دیا "زیادہ ایکٹنگ مت ابھی باہر نکلو گے تو لڑائی شروع ہو جائے گی۔ واپس آؤ گے تو کے منہ سُوجے ہوئے ہوں گے۔"

غالب نے نازو کی طرف دیکھا "یہ بات ہے۔ شرط لگا لو ہنستے جائیں گے مسکراتے آئیں گے کیوں نازو؟"

نہ جانے کیسے نازو نے کہہ دیا "بالکل شرط لگا لو۔ کیا ہے؟"

میں نے سوچ کے کہا "اگر تم اسی موڈ میں لوٹے تو ہمارے میں زور سے کہنا۔ تم شرط ہار گئے اور لڑتے آئے تو ہم تمہارے کان میں یہی بات کہیں گے۔"

"چلّا کے نہیں۔ چیخ کے۔" غالب نے ہاتھ ملا کے کہا "ٹھیک نازو۔"

ریسٹ ہاؤس دو بیڈ روم کی پرانی عمارت تھی جو شاید مرلے پر محیط تھی۔ اس کے سامنے والے حصے میں چھوٹا سا باغ تھا۔ اور ایک جھولا بھی لگا ہوا تھا۔ رابعہ اس میں جھولتی رہی پھر اندر جا کے چائے بنانے لگی۔ میں نے پیڈرو کو دیکھا۔ وہ آنکھ کھولے نڈھال پڑا چھت کو گھور رہا تھا۔

مجھے دیکھ کے اس نے کہا "ایسے میں مر جاؤں گا۔ مجھے کھول دو۔ میں تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ دیکھو مجھے بخار بھی ہو گیا ہے۔"

رابعہ صحیح وقت پر دروازے میں نمودار ہوئی "کھول دو سکندر۔"

رابعہ کی بات کا مطلب اور مقصد سمجھنے کے باوجود میں نے "تمہیں بہت ترس آرہا ہے اس پر؟"

"ترس کی بات نہیں۔ اس کی حالت دیکھو ذرا۔ اس میں ہے کچھ کرنے کا' تم بلاوجہ ہی ڈر رہے ہو۔"

میں نے برہمی سے کہا "کیسی بے وقوفی کی بات ہے۔ ڈروں گا اس سے۔ اس جیسے دس بھی ہوں تو خالی ہاتھوں سے سب کی ہڈیوں کا سرمہ کر دوں۔"

میں نے یہ ظاہر کیا جیسے رابعہ کی بات پر مشتعل ہو کے میں نے پیڈرو کو کھول دیا ہے۔ وہ اپنی کلائیاں اور ٹخنے ملتا ہوا اٹھ کے بیٹھ گیا۔ ٹیلی فون کا تار بہت سخت ہوتا ہے۔ اس کی جلد پر گہرے نشان پڑ گئے تھے۔

رابعہ کے ہاتھ میں چائے کے دو مگ تھے۔ ایک اس نے مجھے تھما دیا اور دوسرا خود لے کر بیٹھ گئی۔ پھر اس نے پیڈرو کو دیکھا جس کی نظر چائے پر تھی "یہ لو۔ میں اپنے لیے اور لے آتی ہوں۔" رابعہ نے مگ اس کی طرف بڑھا کے کہا "اسے اسپرین بھی دے دو اگر ہے۔ اسے تو واقعی بخار ہے۔"

"ثواب بھی تم ہی کما لو۔" میں نے بیزاری سے کہا۔

رابعہ چلی گئی تو پیڈرو بولا "تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟"

میں نے اسے گالی دی "فیصلہ مجھے کرنا ہے یا تجھے؟ ابھی تک کیا بتایا ہے تو نے۔"

"میں نے کہا تھا کہ میرے پاس تمہارے مطلب کی معلومات کا بڑا ذخیرہ ہے۔ تمہیں بہت سی نئی باتیں معلوم ہوں گی۔ اس سے تمہارے خیالات بدل جائیں گے میرے بارے میں۔"

"شیطان اپنی صفائی میں جو چاہے کہے۔ کسی کو اس کے نیک ہونے کا یقین نہیں آسکتا۔ رہی معلومات کی بات تو اس ذخیرے کو ہم تیرے سر سے برآمد کر لیں گے۔"

"نہیں سکندر۔ تم پھر کوشش کر کے دیکھ لو۔ تمہیں تو تشدد کرنا بھی نہیں آتا۔ تم اگر ماہرین کی خدمات حاصل کر لو تب بھی یہ ہے۔ زیادہ سے زیادہ تم میری جان لے سکتے ہو۔ اس کے لیے میں تیار ہوں۔ میری جان تمہارے کسی کام کی ہے تو جیسے چاہو لو۔ میرا خیال تھا کہ تم اپنے آپ کو بااصول' شریف اور انسان سمجھتے ہو۔ کردار پر اور ضمیر پر یقین رکھتے ہو۔"

"تمہارے خیال سے مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔ اگر بدل بھی ہے۔"

"مہذب دنیا کا قاعدہ ہے کہ جسے سزائے موت دینی ہو اسے کم سے کم اذیت دی جائے۔ پھانسی سے الیکٹرک چیئر اور پھر گیس چیمبر کا مارنے کا مقصد اور کیا تھا۔ پہلے تو کولہو میں پلوا دیتے تھے۔ ہاتھی سے روندنے کا حکم دیتے تھے یا دیوار میں چنواتے تھے۔"

رابعہ اپنے لیے چائے اور پیڈرو کے لیے اسپرین لے آئی تھی نے ظاہر کیا کہ پیڈرو کی بات اس کے دل کو لگی ہے اور وہ سوچنے پر مجبور ہوئی ہے۔ پیڈرو نے گولیاں نگل کے چائے کا ایک گھونٹ بھرا۔

"میں اب مرنے کے لیے بالکل تیار ہوں۔ اگر تمہارا فیصلہ ہے۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ تم پہلے مجھے عذاب دو گے۔ ہفتوں یا مہینوں تک اپنی اذیت پسندی کے جذبات کی تسکین کرو گے۔ مجھے اذیت دے کے مارنے سے تمہارے اندر کا بے رحم اور سفاک آدمی تسکین حاصل کرنا چاہتا ہے۔"

"اپنی بکواس بند کرو..... ورنہ....."

"ورنہ تم گولی مار دو گے مجھے۔ ہاتھ مار کے میری گردن کا منکا توڑ دو گے۔ یہی میں چاہتا ہوں۔"

"تم غلط سمجھ رہے ہو پیڈرو۔ سکندر کا دل ایسا نہیں ہے۔"

"سکندر کا دل تمہارے لیے کچھ اور ہے مس رابعہ۔ تمہارے جذبات کی نوعیت مختلف ہے۔ یہ دوغلا پن تمہیں اس لیے نظر نہیں ہوگا کہ خود تمہاری آنکھوں پر جذبات کی پٹی ہے۔ تمہیں سکندر کی صرف اچھائیاں دکھائی دیتی ہیں۔ مجھے بتاؤ تمہارا قانون کیا کہتا ہے۔ بہت سے مقدمات ہوں کسی ایک شخص پر تو یہ اکثر ہوتا ہے کہ ہر جرم کی سزا الگ سنائی جاتی ہے۔ کم سنگین جرم میں قید کی سزا ہو تو قتلِ عمد میں اسی مجرم کو سزائے موت دی جاتی ہے۔ مگر ایسا نہیں ہوتا کہ پہلے مجرم کئی سال کی جیل کاٹے اور پھر اسے پھانسی دی جائے۔ پھانسی سے بڑی سزا کیا ہو گی۔ باقی سزائیں خود بخود ختم ہو جاتی ہیں۔ یہی میں بھی چاہتا ہوں۔ تم کو مارنا ہے تو مجھے آسانی سے مار دو۔ اگر تم اپنے آپ کو واقعی مجھ سے مختلف سمجھتے ہو۔ یہ دعوے ہیں تمہارے کہ میں شیطان ہوں اور تم انسان ہو۔ تو پھر انسانیت کا ثبوت دو مس رابعہ!"

"رابعہ!" میں نے کہا "مت سنو اس کی بکواس۔ جو ہمارا جی چاہے گا کریں گے۔ آج اسے انسانیت کا درس یاد آرہا ہے۔"

رابعہ نے آہستہ سے کہا "کیا غلط ہے یہ بات؟"

"یہ تمہارے جذبات سے کھیل کے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے رابعہ۔"

"یہ عقل کی بات ہے سکندر۔"

"ٹھیک ہے پھر تم سنو' مگر یہ مت بھولنا کہ اس شیطان کا نام استاد پیڈرو ہے۔ شاید شیطان کو بھی یہ نام دیا جائے تو وہ ذلت محسوس کرے" میں نے اسے ریوالور تھمایا اور خود احتجاجاً واک آؤٹ کر گیا۔

ہم دونوں نے بڑا متوازن ڈراما کیا تھا۔ پیڈرو کے سامنے یہ اختلاف رائے کا اظہار بالکل فطری تھا۔ اس سے رابعہ کو حصول مقصد میں مدد ملی۔ میں بڑی گرمی میں باہر گیا تھا مگر باہر آتے ہی مسکرانے لگا اور دروازے سے لگ کے کھڑا ہو گیا۔

"مس رابعہ۔ آپ یقین کریں....."

"میرے یقین کرنے نہ کرنے سے فرق نہیں پڑتا۔ یہ مسئلہ ہے سکندر کے جذبات کا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی جگہ میں ہوتی یا تم ہوتے تو اپنے باپ کے قاتل کو کیسے رعایت دے سکتے تھے۔"

"میں رعایت نہیں مانگ رہا ہوں۔ صرف یہ بتانا چاہتا ہوں مس رابعہ کہ میں وزیر خان کا قاتل نہیں ہوں۔ اور سب جرم کیے ہیں میں نے۔ لیکن یہ جرم نہیں کیا جس کا تعلق سکندر کی ذات سے ہے۔ سکندر میری بات تو سنے پہلے۔"

"بات سننے سے کس کو انکار ہے لیکن جو ضمانت تم چاہتے ہو....."

"وہ بھی زبانی بات ہے۔ اگر بعد میں کچھ جھوٹ ثابت ہو یا سکندر کو احساس ہو کہ مجھے معاف کرنا اس کی غلطی تھی۔ اس نے گھاٹے کا سودا کیا تھا اور مجھے مار دینے میں زیادہ فائدہ تھا تو کیا وہ مجھے قتل نہیں کر سکتا۔ قتل کرنا کسی کے لیے بھی مشکل نہیں ہوتا اگر اس میں ایک گولی چلانے کی ہمت ہو۔ موقع ہر شخص کو ملتا ہے۔ ہر جگہ' ہر وقت بعد میں بھی ملے گا اسے۔"

"دیکھو پیڈرو۔ ہم جو فیصلہ کرتے ہیں اتفاقِ رائے سے کرتے

ہیں۔ تم ایسا کیوں نہیں کرتے کہ مجھے سب بتا دو۔ میں دوسروں کو بتا کے دیکھتی ہوں۔ تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے بارے میں فیصلہ کیا ہوا تھا؟ اتفاق اس بات پر تھا کہ تم اپنا مفصل بیان لکھ کے دو۔ تحریری بیان ہوگا تمہارا۔ تم جو لکھو گے سوچ سمجھ کے لکھو گے تاکہ بعد میں مکرنے اور سچ جھوٹ کو بدلنے کی گنجائش نہ رہے۔"

"مس رابعہ۔ کیا واقعی آپ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ پیڈرو اپنا اعترافِ جرم یا اپنے انکشافات تحریری طور پر آپ کے حوالے کرسکتا ہے۔ اگر میرا دماغ بالکل خراب ہو جائے تب بھی یہ ناممکن ہے۔ تشدّد کے حربے بھی آزما لو جتنے تمہیں آتے ہیں۔ ورنہ اسپیشل پولیس کے ماہرین کو بُلا لو۔ دیکھو کیا وہ پیڈرو سے وہ معلوم کرسکتے ہیں جو اس کے دماغ میں محفوظ ہے۔ میں کوئی انوکھا اور نیا دعویٰ نہیں کررہا ہوں۔ ایسے لوگ ہوتے ہیں جو مر جاتے ہیں مگر کچھ نہیں بتاتے۔ آپ تو جانتی ہوں گی۔"

"پھر تو کچھ نہیں ہوسکتا پیڈرو۔"

"یہ ہوسکتا ہے کہ میں آپ کو بتا دوں۔ آپ سب مل کے اس پر غور کریں۔ پھر جو پوچھنا ہے مجھ سے پوچھیں۔"

رابعہ نے سوچ کے کہا "ہاں۔ یہ شاید ممکن ہے۔ لیکن ایک بات ضرور اپنے ذہن میں رکھنا کہ جھوٹ ایک فیصد بھی ہوگا تو تم ننانوے فیصد سچ کے فوائد بھی حاصل نہ کرسکو گے۔ فرض کرو تم کو یہ ضمانت حاصل ہو جاتی ہے کہ تم کو وعدہ معاف گواہ کی حیثیت مل جائے گی۔ بشرطیکہ تم وزیر خان کے قاتل ثابت نہ ہوئے۔ تو پھر تم کو ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ تم جو بھی جانتے ہو یا تم سے جو بھی پوچھا جائے اس کا جواب بالکل ٹھیک ہونا چاہیے۔ تمہاری معلومات کی حد تک۔ جانتے بوجھتے تم نے کوئی بات چُھپائی یا حقائق کو توڑ موڑ کے پیش کیا تو بالآخر ہمیں پتا چل جائے گا' ہم آنکھیں بند کرکے یقین کرنے والے لوگ نہیں ہیں۔"

"تم ایک دفعہ نہیں۔ دس دفعہ تصدیق کرو۔ لیکن کوئی مجھے جھوٹا کہے تو پہلے مجھ سے بھی پوچھ لو۔ کیا پتا مجھے جھوٹا کہنے والا اپنی جان بچانے کے لیے ایسا کہہ رہا ہو۔"

رابعہ نے اُٹھتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے۔ پہلے میں سکندر سے اور باقی سب لوگوں سے بات کرلوں۔"

رابعہ نے باہر سے کُنڈی لگائی اور میری طرف دیکھ کے مسکرائی۔ میں اسے باہر لے گیا۔ اور ہم مختصر سے باغیچے میں بیٹھ گئے۔ پھر میں رابعہ کی گود میں سر رکھ کے سبزے پر لیٹ گیا۔ وہ میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہی اور میں اس کی زلفوں سے کھیلتا رہا جو میرے چہرے پر سایہ فگن تھیں۔ میرا موڈ خاصا رومانٹک ہو رہا تھا اور میرے احساس پر رابعہ کے وجود کی خوشبو نے جادو سا کر دیا تھا۔ میں وقتی طور پر سارے جہان کو بھولا ہوا تھا۔ میں نے اس کے لب و رخسار کو چوما تو اس نے کچھ نہیں کہا پھر میں نے اس کے گال پر کاٹ لیا۔

"آدم خور مت بنو" اس نے اپنا گال سہلا کے کہا۔

"کیا ذائقہ ہے۔" میں نے لبوں پر زبان پھیری "جی واقعی چاہتا ہے کہ تمہیں کھا جاؤں۔"

"یہ گھاس کھاؤ فی الحال" رابعہ بولی۔

"تمہارے گال پر نشان پڑ گیا ہے" میں نے انگلی رکھ کے بتایا۔

"شرم تو نہیں آتی" وہ اپنا گال ملنے لگی۔

"بالکل نہیں۔ شرمانا لڑکیوں کا کام ہے' تم کو مبارک ہو۔"

"نازو غالب دیکھیں گے۔ کیا کہیں گے۔ تم بھی جانور بن جاتے ہو۔"

میں نے ہنس کے کہا "رگڑنے سے یہ داغِ محبت نہیں جائے گا۔ کہنے والے کچھ بھی کہیں۔ تمہیں ندامت کیوں؟ میں اعترافِ جرم کرسکتا ہوں سب کے سامنے کہ یہ گستاخی اور بدتمیزی میں نے کی تھی اور پھر کروں گا۔ جب موقع ملا...."

"اچھا چلو اُٹھو" اس نے مجھے دھکیل دیا "شرافت کے ساتھ دور بیٹھو۔"

"شرافت' کون شرافت؟" میں نے اِدھر اُدھر دیکھا "اگر یہ کسی لڑکی کا نام ہے اور وہ تم سے لاکھ درجہ حسین ہے۔ تب بھی میں اس کے ساتھ جا کے دور نہیں بیٹھ سکتا۔ تمہارے قریب..."

"تمہارے جذبات کا گھوڑا بے لگام ہو جاتا ہے۔" رابعہ نے بات کاٹ کر کہا۔

"یہ گھوڑا ایسا ہی ہوتا ہے خاتون۔ اسے سدھایا نہیں جاسکتا۔ اپنے ایمان سے کہو۔ کیا تم نے کبھی نازو کے گال پر ایسا نشان نہیں دیکھا؟"

رابعہ ہنس پڑی "یعنی تم بھی بڑے غور سے یہی دیکھتے ہو۔"

میں نے کہا "چاند کا داغ کسے نظر نہیں آتا۔ غور کرنے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔ محبت کرنے والے عشق کے ہر تمغے پر ناز کرتے ہیں۔ جیسے اپنا یار عبدالودود منظر۔ سترہواں تمغا ملنے والا ہے اسے مگر مجال ہے جو اسے ذرا بھی شرمندگی ہو۔"

"وہ بھی پاگل ہے۔"

"میں اس سے بڑا پاگل ہوں۔ یہ وقت ثابت کرے گا" میں نے سینے پر ہاتھ مار کے کہا "جب مقابلے پر ایک ساتھ دو ٹیمیں میدان میں اُتریں گی۔"

"کون سی دو ٹیمیں؟"

"بھئی میں اور تم ایک ٹیم۔ غالب اور نازو دوسری۔ اسکور سے پتا چلے گا کہ کس کی محبت کے طوفان میں زیادہ زور ہے۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو!" رابعہ کا چہرہ لال ہوگیا۔

"دیکھ لینا۔ بڑا سخت مقابلہ ہوگا اور انشاء اللہ ہم جیت جائیں گے۔ خود منظر ہاتھ جوڑ کے کہے گا کہ مان گئے استاد۔ اور یہ منظر دیکھنے والے ہوں گے اس کے سوسوا سو نواسے پوتے۔ ممکن ہے دو سو ہوں تعداد میں۔"

رابعہ ہنسنے لگی "تم نے پہلے سے فرض کرلیا ہے کہ ہر بچہ باپ کے نقشِ قدم پر چلے گا۔"

میں نے افسوس زدہ لہجے میں کہا "نہیں۔ اتنا جوش و خروش کہاں ہے سب کی ازدواجی محبت میں۔ اور اتنے خشوع و خضوع کے ساتھ ایک ہی مقصد کے لیے کون زندگی وقف کرتا ہے۔"

رابعہ اور ہنسی "یعنی یہ بھی مقصد ہے کوئی 'کثرتِ اولاد۔'"

"بڑا عظیم مقصد ہے۔" میں نے کہا "حکومت کے مخالف تحریک چلا رہا ہے اپنی بیوی کے ساتھ مل کے۔ خاندانی منصوبہ بندی والوں کے لیے چیلنج ہے۔ اسے شرمندہ کرنے والا خود شرمندہ ہو جاتا ہے جب وہ علی الاعلان کہتا ہے کہ ابھی تو میں جوان ہوں اور درجن پورے نہ کیے تو نام منظر نہیں۔"

غالب اور نازو کچھ دیر بعد آئے تو سوال کیے بغیر ہم نے جان لیا کہ تعلقات سخت کشیدہ ہیں اور جاتے وقت جذبات جتنے رومانی تھے اب اتنے ہی جارحانہ ہیں۔

غالب نے ایک بنڈل مجھے تھما دیا "اس میں سب کچھ ہے۔ مائکروفون' ٹیپ ریکارڈر..."

میں نے لفافہ کھول کے دیکھا۔ "روغنی نان۔ چکن تکہ.... اور یہ کیا ہے؟ رس ملائی۔"

غالب نے سر کھجایا "وہ... دوسرا بیگ اس کے پاس ہوگا۔"

"یہ کون ہے؟" میں نے نازو کا سُوجا ہوا منہ دیکھ کے کہا۔

غالب نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا "میری شامتِ اعمال۔ میری جان کا عذاب۔ مصیبت جو میرے گلے پڑ گئی ہے۔"

نازو پھٹ پڑی "دیکھو۔ میرے منہ مت لگو۔"

"تمہارا منہ ہے اس قابل؟" غالب نے کہا "کدو جیسے چہرے پر گوبھی جیسی ناک۔ ٹماٹر جیسی آنکھیں۔ پہاڑی مرچ جیسے کان۔ منہ جیسے پھٹی ہوئی مٹر کی پھلی۔ کریلے سے زیادہ تلخ زبان۔ تم لڑکی ہو کہ پُرانی سبزی منڈی ہو۔"

نازو رونے کے قریب ہوگئی "اور اس سے پہلے.... ابھی جو تم باغِ جناح میں کہہ رہے تھے۔ چہرے کو چاند' آنکھیں ستارے' میں ہنستی ہوں تو موتی لٹاتی ہوں۔ بولتی ہوں تو فضا میں نغمے بکھر جاتے ہیں۔"

"وہ سب شاعری تھی جس کا حقیقت سے کوئی رشتہ نہیں۔ بکواس فرما رہا تھا میں۔ اُلو بنا رہا تھا تمہیں" غالب نے دہاڑ کر کہا۔

نازو نے وہ بیگ غالب پر کھینچ مارا "اُلو بنا رہے تھے مجھے' اب دیکھنا تمہیں کیسے مرغا بناتی ہوں۔"

غالب نے بیگ کو کیچ کر لیا "پاگل کی بچی۔ ابھی سب کا بیڑا غرق ہو جاتا۔ اتنی نازک چیزیں ہیں۔"

"مگر۔ آخر تم نے سبزی منڈی کیسے کہا۔ بوچڑ خانے" نازو اس کی طرف لپکی۔ "سامنے آکے بات کرو نا۔"

غالب میرے پیچھے ہو گیا "مرکھنی گائے کے سامنے جا کے مرنا ہے مجھے۔"

رابعہ نے نازو کو پکڑ لیا "بھئی بس' بہت ہو گئی۔"

میں نے کہا "نہیں یار۔ ابھی سے پکڑ لیا تم نے۔ کچھ مزہ نہیں آیا خیر' اب آرام سے بیٹھ کے بتاؤ کہ خود کیا کھا کے آئے ہو؟"

نازو بولی "دھکے کھا کے آئے ہیں ہم۔ وقت برباد کرکے آئے ہیں۔"

"میری تو زندگی برباد ہو گئی۔ ایسا پھنسایا ہے اپنی محبت کے جال میں۔ میرے جیسے بھولے بھالے معصوم شخص کو" غالب بڑبڑایا۔

"تم کیا سمجھتے ہو ایسی باتوں سے متاثر ہو کے میں جان چھوڑ دوں گی تمہاری؟ ابھی تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ بھولے بھالے معصوم شخص..."

غالب نے آہ بھری "ہو گئیں غالب بلائیں سب تمام۔ ایک مرگِ ناگہانی اور ہے۔"

"بھئی تم لوگ تو بڑے اچھے موڈ میں گئے تھے گھومنے پھرنے۔"

نازو نے کہا "لیکن اس سے پوچھیں کیا میں نے ایسی کوئی بات کی تھی پہلے' وہاں دہی بھلے کھانے لگے تو اس نے پوچھا کہ بیگم صاحب کے لیے مسالا تیز رکھوں؟"

"اسے کیا معلوم تھا کہ تم بیگم صاحبہ نہیں ہو" میں نے کہا۔

"غالب کو کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ بیگم صاحبہ کی پلیٹ میں بے شک بارود ڈال دو۔ یہ آتش فشاں ہیں بھائی۔ اور وہ خبیث دانت نکال کے بولا کہ سرجی پھر آپ کیا ہیں تو بک دیا کہ میں کیا ہوں یار' آتش فشاں کے دہانے پر بیٹھا ہوا الو۔"

اب غالب کی باری تھی "اور تم نے کیا بکواس فرمائی تھی۔ اس سے پہلے۔ میں لڑکیاں تاڑ رہا تھا۔ ٹھرکی ہوں میں۔"

"یہ تو نہیں کہا تھا میں نے.... تم میری طرف متوجہ نہیں تھے۔"

"باغ میں جا کے پھول اور سبزے۔ کُھلا آسمان اور درخت بھی نہ دیکھتا۔ بینچ پر تمہاری طرف کیمرے کی طرح دیکھتا رہتا۔"

"تم مسکرا بھی رہے تھے' بدنیتی سے..."

"لاحول ولا قوۃ۔ وہاں جا کے کیا رونے بیٹھ جاتا.... اور بدنیتی سے تو میں تمہیں دیکھ کے ہی مسکراتا ہوں۔ تمہاری اپنی نیت بڑی صاف ہے۔"

"تانگے میں بیٹھ کے کیا بدتمیزی ہو رہی تھی۔ سڑک پر....؟"

"جھٹکے تو لگتے ہیں۔ اور دو آدمی پیچھے بیٹھے ہوں تو آپس میں ٹکرا بھی جاتے ہیں" غالب نے ڈھٹائی سے کہا "تانگا سڑک پر ہی چلتا ہے۔ ہوا میں نہیں اُڑتا۔"

"میں نے کہا تھا ٹیکسی لے لو۔"

"یہ بھی تم نے ہی کہا تھا کہ تانگے میں بڑا مزہ آرہا ہے۔ شرم تو مجھے آرہی تھی۔ تم جان بوجھ کے گرتی تھیں مجھ پر اور مجھے سنبھالنا پڑتا تھا۔ یہ بھی خیال نہیں تھا کہ لوگ دیکھ رہے ہیں۔"

نازو پھر آگ بگولا ہو کے اُٹھی تھی مگر میں نے اسے ہاتھ پکڑ کے بٹھالیا۔ رابعہ کا ہنسی سے بُرا حال تھا۔

"پتا نہیں تم دونوں کی زندگی کیسے گزرے گی؟"

غالب نے کہا "بہت اچھی گزرے گی۔ کم سے کم بور تو نہیں ہوں گے۔ جیسے تم دونوں بُت بنے بیٹھے رہتے ہو۔ بس کبھی آہ بھرلی۔ کبھی نظر ملالی۔ انتہائی فضول اور بور قسم کی افلاطونی محبت سے یہ لڑائی بہتر ہے۔"

نازو اچانک غالب کی طرف دار ہوگئی "اور کیا۔ ہم تو محبت میں لڑتے ہیں۔ انداز ہے اپنا اپنا۔ رابعہ' یہ تمہارے گال پر' کسی کیڑے نے کاٹا ہے؟"

غالب نے قہقہہ مارا "نہیں۔ یہ کیڑے مکوڑے کا کاٹا ہوا نہیں لگتا مجھے۔"

میں نے ریکارڈنگ کے اسباب کا معائنہ کیا۔ غالب نے خاصی محنت اور مہارت سے بڑے حساس آلات کا انتخاب کیا تھا۔ اگلا مرحلہ اس کو نصب کرنے کا تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ کمرے میں پیڈرو موجود نہ ہو اور ہماری خفیہ کارروائی خفیہ ہی رہے۔ طے یہ ہوا کہ نازو یا رابعہ اسے تازہ ہواخوری کے بہانے باہر لائیں گی اور یہ ظاہر کریں گی کہ ہم گھر میں موجود ہی نہیں۔ ہم اندر ہی اندر دس پندرہ منٹ میں اپنا کام مکمل کرلیں گے تو پیڈرو کو واپس اسی کمرے میں پہنچادیا جائے گا۔

غالب اور نازو نے الا بلا تو کھالیا تھا مگر اپنا کھانا بھی ساتھ ہی لے آئے تھے۔ اب ان کو بھوک نہیں تھی۔ رابعہ نے اور میں نے کھانا شروع بھی نہیں کیا تھا کہ باہر سے موٹر کا ہارن سُنائی دیا اور پھر گیٹ پر رکنے والی گاڑی کی ہیڈلائٹس آف ہوئیں۔

میں نے آہستہ سے کہا "یہ مسٹر مونچھ ہوگا۔ تم کو ساتھ لے جانے کے لیے آیا ہوگا۔"

رابعہ نے ناگواری سے کہا "میں کیوں جاؤں گی اس کے ساتھ۔"

"یاد نہیں وزیر صاحب نے تمہیں بطور مہمانِ خصوصی ڈنر پر مدعو کیا تھا۔"

نازو کے ساتھ رابعہ اندر چلی گئی۔ مسٹر مونچھ نے تیسری بار گھنٹی بجائی تو میں نے دروازہ کھولا "سُن لیا یار سُن لیا۔ بہرے نہیں ہیں ہم۔ گھنٹی کو گھنٹے کی طرح مت بجاؤ۔"

مسٹر مونچھ کے بجائے دروازے پر ملک صاحب بنفسِ نفیس موجود تھے "یہ کیا طریقہ ہے بات کرنے کا۔"

میں نے کہا "سوری۔ میں سمجھا کہ آپ کا وہ جاہل اور جانگلوس نوکر ہے۔ مسٹر مونچھ۔"

اس نے مجھے گھور کے کہا "وہ نوکر نہیں۔ میرا بھائی بھی ہے اور میرا پی آر او بھی۔"

"پھر تو مجھے ہمدردی ہے آپ سے۔" میں نے زیرِ لب کہا۔

"وکیل صاحبہ کہاں ہیں؟" اس نے اندر جھانکنے کی کوشش کی۔

"وہ تو نہیں ہیں" میں نے کہا۔

اس نے غرا کے کہا "نہیں ہیں کا کیا مطلب ہے؟"

"وہ دوپہر کو راولپنڈی بار کے عہدے داروں سے ملنے گئی تھیں۔ وہیں ان کے اعزاز میں لنچ تھا۔ اس کے بعد کیا پروگرام تھا۔ یہ مجھے نہیں معلوم۔ اب تک آجانا چاہیے تھا انہیں۔" میں نے شرافت سے کہا۔

"میں نے ان کے لیے ڈنر رکھا تھا آج۔"

"غالباً میں نے بتادیا تھا آپ کو.... کہ ان کا آنا ممکن نہیں ہوگا۔"

"مجھے خود آنا پڑا اور ان کا پتا نہیں" وہ سخت جھنجلایا ہوا تھا۔

"آپ چاہیں تو انتظار کرلیں یا بار کے صدر سے فون پر پوچھ لیں۔" میں نے کہا۔

"اندر کون ہے؟"

غالب نے کہا "میری وائف ہے.... اور وہ شخص۔"

میں نے کہا "جس کے بارے میں آپ کو بتادیا تھا میں نے کہ وکیل صاحبہ کا ایک جانی دشمن ہے۔"

"تم اسے اغوا کرکے یہاں لائے ہو؟"

"مجبوری تھی جناب" میں نے کہا۔

عباسی نے غالب کو مخاطب کیا "اور تم صحافی صاحب۔ یہ سب دیکھ رہے ہو۔ کوئی اسٹوری بنا رہے ہو اپنے اخبار کے لیے۔ اس بات کا خیال رکھنا کہ میرا نام اس کیس میں نہیں آنا چاہیے اور نہ یہ کہ میں نے تمہیں اپنے ریسٹ ہاؤس میں جگہ دی تھی۔"

"آپ مطمئن رہیں۔"

"اصل بات یہ ہے کہ میں مطمئن نہیں ہوں۔" عباسی نے کہا "مجھے اس کیس میں گڑبڑ نظر آرہی ہے۔ کیا نام ہے تمہاری اس وکیل خاتون کا؟"

میں نے کہا "کیا آپ نے کارڈ ملاحظہ نہیں فرمایا؟"

"کارڈ اس اُلو کے پٹھے نے وہیں پھینک دیا تھا۔ ورنہ میں لاہور فون کرکے پوچھ لیتا۔"

"میں آپ کو دو فون نمبر دیتا ہوں۔ دونوں وکیلوں کے گھر کے فون ہیں۔ وقار یوسف اور عبدالودود منظر ہائی کورٹ کے وکیل ہیں۔ آپ ان سے پوچھ لیں یا لاہور ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کے صدر کا نمبر ان سے حاصل کرلیں۔ رابعہ قاری بہت مشہور وکیل ہیں۔"

عباسی نے کہا "وہ لال فاکس ویگن کس کی تھی؟"

"مس رابعہ کی۔"

"اس کا نمبر کیا ہے؟" عباسی نے کہا۔

میرا ماتھا ٹھنکا۔ آخر گاڑی کے نمبر کے بارے میں یہ تفتیش کس لیے۔ اس پر چوہدری دلاور کی تحفے میں دی جانے والی گاڑی کی نمبر پلیٹ لگی ہوئی تھی۔ وہ گاڑی بھی رابعہ کے نام پر تھی۔ عباسی جانتا تھا کہ ایک گاڑی کو جہلم کے قریب حادثہ پیش آیا تھا۔ ہم بھی وہاں موجود تھے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ جائے واردات سے ملنے والے کاغذات کو دیکھ کر پولیس نے عباسی کو بھی مطلع کردیا ہو کہ وہ گاڑی ایک خاتون وکیل رابعہ قاری کی تھی جو اس حادثے میں ہلاک ہوچکی ہیں۔ عباسی نے رابعہ کی گاڑی پر وہی نمبر دیکھا ہوگا اور ممکن ہے نوٹ کرلیا ہو۔ اس کا شک میں مبتلا ہونا یقینی تھا کیونکہ وہ رابعہ قاری کو زندہ سلامت دیکھ چکا تھا اور اسی نمبر کی دوسری گاڑی میں۔

میں نے عباسی کو رابعہ کی گاڑی کا اصل نمبر بتادیا۔ گاڑی کو غالب میری ہدایات کے مطابق سروس کے لیے ایک گیراج میں چھوڑ آیا تھا اور صرف وہی جانتا تھا کہ گاڑی کہاں ہے۔ وہ صبح گاڑی لانے سے پہلے ہی اس کے اوپر سے تباہ شدہ گاڑی کی نمبر پلیٹ ہٹا سکتا تھا۔

میں نے کہا "عباسی صاحب۔ خیر تو ہے' آپ کچھ پریشان ہیں۔"

اس نے سرہلایا "کچھ دیر پہلے علاقہ ایس پی میرے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے باتوں باتوں میں کہا کہ گزشتہ رات جہلم کے پاس ایک بڑا ہی بھیانک حادثہ ہوا۔ میں نے کہا کہ ہاں' میں نے بھی دیکھا تھا۔ وہ کہنے لگا کہ آپ کی گاڑی دیکھ لی تھی میں نے۔ میں بھی وہاں موجود تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ لاہور کی ایک بڑی مشہور وکیل خاتون اس حادثے میں ہلاک ہوگئی۔ پتا نہیں اور اس کے ساتھ کون تھا۔ گاڑی میں تو کچھ بچا ہی نہیں۔ گاڑی پُرزہ پُرزہ ہوکے وادی میں سیکڑوں فٹ تک بکھر گئی تھی اور آگ لگ جانے کے بعد سب کچھ جل کے ختم ہوگیا۔ اس کی بات پر چونک کے میں نے پوچھا "تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ اس میں لاہور کی مشہور خاتون وکیل تھی۔ کیا نام تھا اس کا؟" وہ بولا "رابعہ قاری۔ گاڑی کے کاغذات اتفاق سے باہر گرگئے تھے اور جلنے سے بچ گئے تھے۔ ان پر گاڑی کا نمبر بھی تھا اور یہ نام بھی" مجھے بڑی حیرت ہوئی اور میں نے کہا۔ تم کو یقین ہے کہ نمبر یہی تھا اور نام بھی۔ اس نے کہا کہ جناب عالی' تماشا دیکھنے کے لیے وہاں بہت لوگ رُکے تھے لیکن پولیس افسر ایک میں ہی تھا۔ میں نے یہی کیا کہ کاغذات کو قبضے میں لے کر اپنے ڈرائیور کانسٹیبل کو ادھر ہی کھڑا کردیا اور اس کی ڈیوٹی لگادی کہ کسی کو نیچے نہ جانے دے۔ پھر میں نے ہی پنڈی سے جہلم فون کرکے حادثے کی اطلاع دی تھی مگر اس سے پہلے کئی فون مل چکے تھے۔ پولیس صبح دس بجے وہاں پہنچی تھی۔ میں تو اس کی بات سُن کے چکر میں پڑگیا اور میں نے کہا کہ "ایس پی صاحب' کیا عجیب بات ہے۔ میں نے اس خاتون وکیل کو زندہ دیکھا ہے اور اس سے بات بھی کی ہے۔ اتفاق سے یہ نمبر بھی میں نے نوٹ کیا تھا۔ یہ لال رنگ کی فاکس ویگن ہے جس کو وہ خود چلا رہی تھی۔" ایس پی نے یہ تو نہیں کہا کہ سر آپ نشے میں ہوں گے لیکن اس کی نگاہ میں کچھ ایسی ہی بات تھی۔ اتفاق سے اس وقت میرا ایک فون آگیا اور میں اندر بات کرنے گیا تو کچھ دیر لگی۔ وہ ایس پی اتنی دیر میں اُٹھ کے چلا گیا۔ اسے بھی کوئی کام تھا۔ اب تم بتاؤ یہ معاملہ کیا ہے؟"

"میں کیا بتاؤں جناب عالی۔ جو خود آپ نے دیکھا وہ غلط تو نہیں ہوسکتا اور گاڑی آجائے تو کاغذات بھی ملاحظہ فرماسکتے ہیں آپ۔ مس رابعہ قاری کی فاکس ویگن انہی کے نام پر رجسٹرڈ ہے اور اس کا نمبر بھی وہی ہے جو میں نے بتایا۔"

"لیکن رات کو یہ نمبر نہیں تھا اس پر۔ اور پھر دوسری گاڑی کے کاغذات پر بھی رابعہ قاری کا نام تھا۔ کیا ان کے پاس دو گاڑیاں ہیں؟"

میں نے گڑبڑا کے کہا "جی... نہیں.... میرا مطلب ہے مجھے معلوم نہیں۔"

"اگر ان کے پاس دو گاڑیاں ہوتیں تو انہیں یہ بھی معلوم ہوتا کہ دوسری گاڑی کہاں ہے؟"

"کیا پتا انہوں نے کسی کو دی ہو۔ اور اسے حادثہ پیش آگیا۔ مس رابعہ نے حادثہ ضرور دیکھا مگر یہ خیال ان کو کیسے آسکتا تھا کہ گاڑی انہی کی تھی.... اوپر سے تو کچھ پتا نہیں چلتا تھا۔ اندھیرے میں دیئے سے جل رہے تھے۔ آپ نے بھی دیکھا ہوگا۔"

"پھر یہ نمبر والا چکر کیا ہے؟ اگر انہوں نے کسی کو گاڑی دی تھی تو کیا اس پر اپنی فاکس ویگن کا نمبر لگا رکھا تھا؟ اور خود جو فاکس ویگن چلا رہی تھیں اس پر تباہ ہوجانے والی گاڑی کی نمبر پلیٹ تھی؟ ایسا پہلے سے تھا تو اس کا مقصد؟ اور اگر گاڑی دینے سے پہلے نمبر پلیٹوں کو اِدھر اُدھر کیا گیا تھا تو کس لیے؟ کیا اتنی مشہور وکیل کو یہ نہیں معلوم کہ قانوناً یہ جرم ہے۔ انہیں قانون کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کیا ضرورت تھی؟"

میں نے اتنی دیر میں ایک جواب سوچ لیا تھا "جناب عالی۔ ان کے پاس ایک گاڑی ہے یا دو ہیں۔ یہ تو خود مس رابعہ قاری ہی بتاسکتی ہیں۔ مجھے تو فاکس ویگن کا نمبر ہی یاد ہے۔ آپ صبح دیکھ لیں۔ ممکن ہے نمبر انہوں نے اپنے انہی جانی دشمنوں کو چکر دینے کے لیے بدلا ہو جو ان کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔"

لیکن عباسی بہت کائیاں تھا "چکر تم مجھے دے رہے ہو بہادر علی۔ کیا ان کے دشمن اتنے بے وقوف تھے کہ نمبر دیکھ کے گاڑی کا پیچھا کرتے تھے؟ گاڑی کو نہیں پہچانتے تھے۔ تباہ ہونے والی اوپل ایکارڈ تھی جو بہت لمبی چوڑی کار ہوتی ہے۔ مس رابعہ کی لال فاکس ویگن بالکل الگ چیز ہے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ تم نے ان کے ایک دشمن کو پکڑا تو دوسرے کی چھٹی کردی۔"

"جی۔۔۔ میں سمجھا نہیں۔"
"شاید یہ حادثہ نہیں قتل تھا۔ گاڑی میں جو لوگ تھے ان کی موت کا سامان پہلے سے کرلیا گیا تھا۔ جہلم کی پہاڑیوں کے موڑ کاٹتے ہوئے گاڑی کو حادثے کا شکار ہونا ہی تھا۔ اس کے پہیوں کے نٹ بولٹ ڈھیلے کردیے گئے ہوں گے یا بریک لائن کاٹ دی گئی ہوگی۔ اسٹیرنگ وہیل نکل گیا ہوگا۔۔۔ لیکن نمبر پلیٹ بدلنے والی بات پھر بھی سمجھ میں نہیں آتی۔ تم بتاؤ یہ کیا معاملہ ہے؟"
"میں کیا بتاؤں جی۔۔۔!"
"کتنے لوگ تھے اس گاڑی میں۔۔۔ جو حادثے کا شکار ہوئی؟"
"مجھے کچھ نہیں معلوم سر۔۔۔ میرا کوئی تعلق نہیں اس حادثے سے۔"
"تم وکیل صاحبہ کے دشمنوں کو جانتے ہو؟"
"جی۔۔۔ کسی حد تک۔۔۔ میرا مطلب ہے سب کو نہیں جانتا۔"
"بہادر علی۔ اوّل تو کسی مشہور وکیل کا کوئی دشمن اتنا طاقتور نہیں ہوتا کہ اسے راستے سے ہٹانے کے لیے وکیل کو تم جیسے بدمعاش کی خدمات حاصل کرنی پڑیں۔ چلو مان لیتے ہیں کہ کوئی دشمن تھا۔ بعض اوقات لوگ جج کے بھی دشمن ہوجاتے ہیں جو ان کے کسی بہت قریبی عزیز کو سزائے موت سناتا ہے اور منت سماجت' سفارش یا رشوت اسے تختۂ دار تک پہنچنے سے نہیں بچاتی۔ وہ وکیل کے دشمن بھی ہوسکتے ہیں کہ اس نے کیس لڑنے کی فیس پوری لی مگر محنت پوری نہیں کی۔ پھانسی تو آئے دن ہوتی رہتی ہے مگر ابھی تک میں نے ایسا سنا نہیں کہ کسی نے وکیل یا جج سے بدلہ لیا ہو۔"
میں نے کہا "جناب عالی۔ یہ خاندانی تنازعہ ہے۔"
"کیسا خاندانی تنازعہ۔ زمین جائداد کا؟ پھر تو سب دشمن ان کے اپنے ہی عزیز ہوں گے۔ چچا یا ماموں' سوتیلے یا سگے بھائی بہن۔"
میں بُری طرح پھنس گیا تھا "میرا خیال ہے سر کہ کچھ رشتے کا مسئلہ ہے۔۔۔ ابھی تک شادی نہیں ہوئی مس رابعہ کی۔"
"آئی سی" وہ مجھے گھور کے بولا "رقابت کا چکر ہے۔ لڑکی خوب صورت ہے' پیسہ بھی بہت ہوگا۔ دولت کے علاوہ شہرت ہے۔ ویسے تو سونے کا انڈا دینے والی خوب صورت مرغی پر سب کی نظر ہوگی مگر میرا خیال ہے کہ مقابلے پر دو ہی حریف ہوں گے۔ شاید ایک کوئی پُرانا منگیتر۔ جس سے بچپن میں منگنی طے کردی گئی ہوگی یا والدین کی مرضی ہوگی کسی چاہنے والے کو لڑکی دینے کی۔ لڑکی نے کسی اور کو پسند کرلیا ہوگا۔"
میرا دماغ عباسی کی جرح سے چکرا گیا تھا "یہ آپ خود انہی سے پوچھیں تو اچھا ہے سر۔"
"سر کے بچے۔ تم کسے ٹھکانے لگا رہے تھے؟" وہ ایک دم گرم ہوگیا "کیا کام تمہارے سپرد کیا گیا تھا؟ مس رابعہ نے کیا کہا تھا تم سے کہ ان کا جانی دشمن کون ہے؟"
میں نے کہا "آپ بلاوجہ مجھ پر ناراض ہورہے ہیں جناب عالی۔"
"بلاوجہ۔۔۔؟ خود تم نے بتایا تھا کہ تم ایک بندے کو اُٹھانے آئے ہو۔ کون ہے یہ بندہ؟ اور کہاں ہے؟ میں خود اس سے مل کے پوچھ لیتا ہوں۔ اگر وہ سب جھوٹ نکلا جو تم نے مجھے بتایا تو تمہاری خیر نہیں۔" وہ میرے روکنے کے باوجود اندر گھستا چلا گیا۔
اب میرے لیے فوراً کچھ کرنا ضروری ہوگیا۔ وہ اندر جا کے رابعہ پر نظر پڑتے ہی اسے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہ رہتی۔ سفید جھوٹ اس کے غیظ و غضب کے بارود میں چنگاری کا کام کرتا ہوتا۔
میں اس کے پیچھے لپکا۔ وہ سیدھا اس کمرے میں گیا جہاں پیڈرو بیڈ پر بندھا پڑا تھا۔ "کون ہو تم؟" عباسی نے اس کے قریب جا کے کہا۔
پیڈرو کے جواب دینے سے پہلے ہی میں نے اسے جا لیا۔ وہ قدموں کی آہٹ سن کے پلٹا۔ میرے عزائم میرے چہرے سے ظاہر تھے اور وہ میری آنکھوں میں اپنا انجام دیکھ سکتا تھا۔ حیرت اور خوف سے اس کا منہ کھلا رہ گیا۔ اسے حلق سے آواز نکالنے کی مہلت بھی نہیں ملی کیونکہ میرا ہاتھ تو اُٹھ چکا تھا۔ اس نے خود کو بچانے کی واجبی سی کوشش کی مگر کھڑی ہتھیلی کا وار اس کی کنپٹی پر پڑا تو وہ لڑکھڑا کے فرش پر ڈھیر ہوگیا۔ میں ساتھ والے کمرے میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ رابعہ' غالب اور نازو خاموشی سے میرے پاس آکر کھڑے ہوگئے۔ غالباً وہ سب میری اور عباسی کی ساری گفتگو سن چکے تھے۔
"یہ تو بہت بُرا ہوا" غالب نے کہا۔
رابعہ نے پھنسی ہوئی آواز میں کہا "اب کیا ہوگا؟"
میں نے کہا "ایک منٹ ٹھہرو۔ پہلے میں وزیر جنگلات کے ساتھ آنے والوں کو بھی اندر لے آؤں۔ نازو تم اسے سنبھال لینا۔"
رابعہ گھبرا گئی "اس کی کیا ضرورت ہے۔ انہیں رخصت کردو کوئی بہانہ کرکے۔"
"وہ وزیر صاحب کے باڈی گارڈ ہیں۔ انہیں کسی حالت میں کہیں چھوڑ کے نہیں جاسکتے۔ جب تک خود وزیر صاحب یہ حکم نہ دیں" غالب نے کہا۔
"کیا مصیبت ہے" نازو بولی "ایک پیڈرو ہی کم نہیں تھا! وزیر اور اب اس کا باڈی گارڈ۔ ہم بُری طرح پھنس جائیں گے۔"
میں نے کہا "صحیح جملہ یوں ہوگا۔ ہم بُری طرح پھنس چکے ہیں۔"
میں دروازے سے باہر نکلا تو مجھے گاڑی میں ایک ہی شخص نظر آیا جو ونڈ اسکرین کے پیچھے سائے کی طرح لگتا تھا۔ وہ سگریٹ پی رہا تھا اور وقفے وقفے سے وہ کش لیتا تھا تو چنگاری سی روشن ہوتی تھی۔ قریب جا کے دیکھا تو وہ مسٹر مونچھ تھا۔
"اچھا تو تم سگریٹ پی رہے ہو؟"
"نہیں کیا تکلیف ہے؟" وہ کش لے کر دھواں پھر چھوڑتے بولا "میں سگریٹ پیوں یا شراب۔۔۔؟"
میں نے کہا "شراب کیا تم چرس پیو یا زہر پیو۔ مجھے تو ایسا لگا تھا تمہارے منہ میں جگنو پھنس گیا ہے۔ تم منہ کھولتے ہو تو اس کی دم نظر آتی ہے۔"
"کام کی بات کرو۔"
"کام کی بات یہ ہے کہ تم جاؤ" میں نے کہا۔
"عباسی صاحب کو تمہارے پاس چھوڑ کے؟"
"نہیں مسٹر مونچھ۔ عباسی صاحب کے پاس جاؤ۔ انہوں نے یاد کیا ہے۔ یہ شریفانہ الفاظ میرے ہیں۔ انہوں نے کہا تھا اس جنگلی مونچھوں والے پاگل سانڈ کو بُلا کے لاؤ۔"
"بکتے ہو تم۔ عباسی صاحب ایسا نہیں کہہ سکتے" وہ نیچے اُترا۔
"یہ بھی پوچھ لینا اندر جا کے" میں بے نیازی سے واپس آیا۔
گیٹ بند کرنے کے بعد میں باہر ہی ٹھہر گیا۔ وہ سیدھا اندر پہنچا چند سیکنڈ کے بعد میں نے پہلے ایک آواز سنی۔ جیسے بیل نے ڈکرائی ہو۔ پھر ایک دھماکا ہوا جیسے بیل کھڑے کھڑے زمین پر گر گیا ہو۔ میں نے مطمئن ہو کے اندر کا رخ کیا۔ مسٹر مونچھ اپنے آقائے محترم وزیر جنگلات کے قریب ہی چت پڑے ہوئے تھے۔ محمود و ایاز ایک ہی صف میں نظر آرہے تھے اور نازو اپنے ہاتھ جھاڑ رہی تھی۔
"یہ بیٹھے بٹھائے کیا مصیبت مول لے لی" رابعہ نے پریشانی سے کہا۔
میں نے کہا "دیکھو رابعہ۔ تقدیر کے لکھے کو ہم کیسے مٹا سکتے ہیں۔ جب جب جو جو ہوتا ہے' تب تب سو سو ہوتا ہے۔"
غالب نے تعریفی انداز میں سرہلایا "مصیبت اس وقت سے شروع ہوئی جب دلاور نے پیڈرو کو ہمارے حوالے کیا اور ساتھ ہی ایک کار تمہیں تحفے میں پیش کردی۔ تم کہہ سکتی ہو کہ کار کا حادثہ اور پھر نمبر پلیٹ بدلنا میری حماقت کی روشن مثال ہے لیکن اس وقت کون جانتا تھا کہ ایک وزیر جنگلات سے اچانک آدھی رات کو یہ ملاقات ہوگی۔"
"اور وہ تم پر فریفتہ ہو کے ہمارے پیچھے لگ جائے گا۔"
رابعہ نے برہمی سے کہا "مجھے الزام مت دو۔"
میں نے کہا "الزام میں تمہارے قاتل حسن کو دے رہا ہوں۔"
"وزیر جنگلات تمہارے جنگلی پن سے متاثر ہوا تھا۔ تم نے اس کے محافظوں کے مقابلے میں خود کو نازرن نہ ثابت کیا ہوتا تو کچھ نہ ہوتا۔"
"ہاں۔ بس وہ میری ہڈیاں توڑ کے چلے جاتے۔ اور کچھ نہ ہوتا۔"
رابعہ نے کہا "کیسے ہڈیاں توڑ سکتے تھے وہ۔ مجھے تو ان سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں دیا تم نے۔"
"انجام تب بھی یہی ہوتا۔ وہ تم سے بات کرتا تو کیا ڈر کے بھاگ جاتا" غالب نے کہا "خیر اب جو ہونا تھا ہوگیا' آگے کی سوچو۔"
"ہمیں فوراً یہاں سے نکل جانا چاہیے۔"
اچانک کمرے میں رکھے ہوئے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ ہم سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ہمیں فون کرنے والا کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔ کسی کو بھی یہ معلوم نہیں تھا کہ ہم اس ریسٹ ہاؤس میں مقیم ہیں۔
میں نے ریسیور اُٹھا کے کہا "جی؟"
کسی عورت نے کہا "خیر سے عباسی صاحب یہاں ہیں؟"
میں نے کہا "آپ کون ہیں جی؟"
"تمہیں کیا اس سے۔ میری بات کا جواب دو" وہ تحکمانہ لہجے میں بولی۔
"ایسے آرڈر نہیں ہے جی ہر ایک کو بتانے کا۔"
"ہر ایک کے بچے۔ میں پوچھتی ہوں آخر تم ہو کون؟ میں ان کی پہلی بیوی ان کے گھر سے بول رہی ہوں۔"
"اوہ۔ معاف کرنا بیگم صاحب۔ میں تو آپ کی آواز نہیں پہچان سکتا ٹیلی فون پر۔۔۔"
"عباسی صاحب کہہ گئے تھے کہ کچھ مہمانوں کو لینے جا رہا ہوں۔ انہوں نے کھانے پر بُلایا تھا۔ کوئی خاص ہی لوگ ہوں گے کہ وہ خود گاڑی لے کر گئے ورنہ کھانے پر تو وزیر سفیر سب ہی آتے رہتے ہیں۔"
میں نے سوچ کے کہا "عباسی صاحب آئے تو تھے۔ لیکن چلے گئے۔"
"اُسی کے ساتھ؟ وہ جو لاہور سے وکیل آئی ہوئی ہے؟" پہلی بیوی کے لہجے میں حسد' غصہ اور بے بسی کے جذبات کی فریاد تھی "کیا بہت خوب صورت ہے وہ؟"
میں نے کہا "بیگم صاحبہ۔ عباسی صاحب باہر ہی سے چلے گئے تھے۔ اچانک انہیں ایوانِ صدر سے بُلاوا آگیا تھا۔"
"اور وہ وکیل۔۔۔؟"
میں نے کہا "وہ تو ویسے بھی یہاں نہیں ہیں۔ دن میں انہیں کسی کے ساتھ لنچ کرنا تھا۔"
"ہاں جی۔ ایسی عورتوں کو دیوانوں کی کیا کمی۔ بس میں ہوں جسے اس کا شوہر بھی اب نہیں پوچھتا۔ میری بَلا سے چوتھی اس وکیل سے کرلے۔" اس نے فون بند کردیا۔ مجھے غصہ بھی آیا اور

افسوس بھی ہوا۔ یہ بھی معلوم ہو گیا کہ خیر سے وزیر جنگلات کی پہلے سے تین بیویاں موجود ہیں۔

میں نے رابعہ سے کہا "بھئی مبارک ہو۔ تم اب جھنڈے والی گاڑی میں پھرو گی۔"

"کیا بک رہے ہو" رابعہ نے کہا۔

"وزیر جنگلات نے تمہیں اپنی چوتھی منکوحہ کے عہدے پر فائز کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ہم کب سے فیصلہ کرنے کے بعد پہلی نہیں کر سکے۔"

"سکندر۔ میں اس وقت بے ہودہ مذاق برداشت نہیں کر سکتی۔"

"یہ مذاق کی بات نہیں۔ اب تو میرا جی چاہتا ہے کہ اس رقیب روسیاہ کو ہوش میں لا کے اس سے پوچھوں کہ کیوں بے جنگلی، تیری یہ مجال اور اسے دوبارہ ایسا ناک آؤٹ کردوں کہ صور اسرافیل پر ہی ہوش آئے۔"

بات پُر لطف تھی مگر سب پریشان تھے۔ فیصلہ یہ ہوا کہ نازو فوراً پیڈرو کو باہر لائے گی۔ غالب کم سے کم وقت میں ریکارڈنگ کے آلات نصب کرے گا۔ میں عباسی کو اور مسٹر مونچھ کو دوسرے کمرے میں بحفاظت رکھنے کا بندوبست کروں گا اور اس کے بعد رابعہ پروگرام کے مطابق پیڈرو سے مفصل انٹرویو لے گی۔ یہ کام ایک گھنٹے میں ہو جائے گا تو ہم وزیر صاحب کی گاڑی میں ہی یہاں سے اپنی موجودگی کے سارے آثار مٹا کے رخصت ہو جائیں گے۔ وزیر جنگلات اور جنگلی مونچھوں والے باڈی گارڈ کو ہم گاڑی سمیت کسی سنسان مقام پر چھوڑ دیں گے اور صبح ہوتے ہی اپنی گاڑی میں فرار ہو جائیں گے۔ جانے سے پہلے میں اپنا فرضی وکیل کا میک اپ بدل دوں گا اور غالب گاڑی پر اصل نمبر پلیٹ لگا دے گا۔

"یہ سب تو صبح ہوگا۔ نو دس بجے سے پہلے سروس اسٹیشن پر کوئی نہیں ملے گا" غالب نے کہا۔

"اور صبح نو دس بجے تک ہم یہاں نہیں ٹھہر سکتے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں وزیر صاحب کی بیوی نمبر ایک یا دو تین میں سے کسی کو ان کی ضرورت محسوس ہوگی یا کسی اور کو تلاش ہوگی تو پھر یہاں فون آئے گا" نازو بولی۔

"اب فون نہیں آئے گا۔ کوئی خود آئے گا۔" میں نے کہا "جب ایوان صدر سے معلوم ہوگا کہ وزیر جنگلات وہاں نہیں ہیں بلکہ وہاں گئے ہی نہیں تو ظاہر ہے تشویش کے اسباب پیدا ہو جائیں گے۔"

میری بات نے مزید افراتفری پیدا کی "ان کی بیویوں سے کون لڑے گا" نازو نے گھبرا کے کہا "ایک نہیں، بیک وقت تین۔"

غالب بولا "وہ بھی وزیر جنگلات کی۔ کڑوا کریلا نیم چڑھا اور نمک کے پانی میں...."

اب ایکشن شروع ہوا تو بہت سی بدحواسیاں سرزد ہوئیں۔

میں نے سوچا کہ وزیر کی گاڑی کو اندر لے جانا چاہیے۔ ... میں ہی تھی۔

میں نے رابعہ سے کہا "گیٹ کھولو۔ میں گاڑی ... کروں گا۔"

"بڑے گیٹ میں تالا لگا ہوا ہے۔"

"تو پھر تالا کھولو۔ اندر سے چابی لے کر آؤ۔ جاؤ۔"

"خواہ مخواہ مت چلاؤ۔ چابی میرے پاس ہے تو ... جاؤں؟"

جب میں گاڑی اندر لے کر گیا تو نازو بھی پیڈرو کو ... تھی۔ "جب کہہ دیا کہ تم کو تازہ ہوا کھانی ہے تو انکار کا ... ہم جو بھی دیں گے وہ کھانا پڑے گا تمہیں اور یہ میرا حکم ہے۔"

اندر سے غالب چلایا "کیا مصیبت ہے۔ سارے ... ہیں۔"

نازو نے پیڈرو سے کہا "دیکھا۔ غالب جھٹکے پر جھٹکا کھا ... یہ بھی میرا حکم ہے۔"

پیڈرو بولا "کیا تم نے جنگل کے وزیر کو قتل کر دیا ہے؟"

"میں جنگل کے بادشاہ کو بھی قتل کر دوں، تمہیں کیا؟"

"تم سب پریشان ہو۔ وزیر کا قتل بہت سنگین بات ہے۔"

"کوئی سنگین بات نہیں۔ دوسرا وزیر حلف اٹھا لے ... جلد" میں نے کہا "جنگل ختم نہیں ہو گیا ایک وزیر کے ختم ... ہے۔"

پیڈرو بولا "میری مانو تو یہاں سے نکل چلو۔"

"یہ تو رابعہ اکثر کہتی ہے مجھ سے لیکن میں اس کے د... میں نہیں آیا تو تمہارے ساتھ کیسے نکل جاؤں" میں نے کہا۔

رابعہ بولی "بہتر ہے کہ تم اس کی مان لو اور اسی کے ساتھ ... جاؤ۔"

"پھر تمہارا کیا ہوگا۔ تمہاری ڈولی کیسے اٹھے گی؟"

"میں اگلے وزیر جنگلات سے شادی کر لوں گی" رابعہ بھنا کے کہا اور اندر چلی گئی۔

بالآخر پیڈرو کو اندر لے جایا گیا۔ اس وقت تک میں نے ... کو اور اس کے باڈی گارڈ کو پیڈرو کے کمرے سے ہٹا دیا تھا۔ وہ ... کہ شاید اسی لیے نازو اسے باہر لے گئی تھی۔ رابعہ کمرے میں ... پریشان بیٹھی ایک پاکٹ ریڈیو سن رہی تھی۔ اسی کے اندر وہ ... مائکروفون بھی تھا جو سو فٹ کے دائرے میں ہر آواز کو نشر ... تھا۔ پاکٹ ریڈیو کا چھوٹا سا سینا اس کے لیے کافی تھا۔ نازو با... ساتھ والے کمرے میں مشکل سے دس فٹ کے فاصلے پر ... ریکارڈ لیے بیٹھی تھی۔ اتنے کم فاصلے پر آواز بالکل صاف سنائی دے... تھی۔

غالب نے بھی نازو سے کہا "کیا تمہارا اب بھی وہی فیصلہ ... ہے۔"

...لتی پالتی مار کے بیٹھ گئے۔ ہم سے چند ... ے فاصلے ... گفتگو کا ہر لفظ یہاں صاف سنائی دیتا تھا۔

... نے پیڈرو کو شیشے میں اتار لیا تھا اور یہ یقین دلانے میں ... ہو چکی تھی کہ جو کچھ وہ رابعہ کو بتائے گا اس کی بنیاد پر وہ ... بخشی کے لیے ہم سے سفارش کرے گی۔

... جان ... نے کہا "وعدہ میں کیسے کر لوں۔ تم تو کہو گے کہ وزیر خان ... قتل نہیں کیا تھا۔ ساری بات ثبوت کی ہے یا گواہی کی ..."

... بولا "میں جانتا ہوں تم بہت بڑی وکیل ہو۔ ایسے نہیں ... بات کا ثبوت نہیں ہے میرے پاس۔ بہت سے واقعات ... میں خود ہوں لیکن چوہدری دلاور کا جرم ثابت کرنے کے لیے ... پاس بہت کچھ ہے جو تم عدالت میں پیش کر سکتی ہو۔"

... پہلے وزیر خاں کے قتل کا مسئلہ ہے جو سکندر کے لیے سب ... اہم ہے۔ اس معاملے میں وہ اتنا جذباتی ہے کہ میری بھی ... نے گا۔ تم کہتے ہو کہ اسے تھوڑا تھوڑا زہر دے کے مارا گیا ... نام دلاور کے کہنے پر چراغ دین کے نوکر نے کیا تھا۔ اب وہ ... یہ ہیں ہے۔ ذی سلوا بھی نہیں ہے۔ خیر، تم یہ بتاؤ کہ جب ... ان کو راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کیا گیا تھا تو کیا میر شرافت علی ... میں شریک تھا؟"

"... چوہدری دلاور اکیلا تو اتنا بڑا قدم نہیں اٹھا سکتا تھا۔"

"... لیکن میر شرافت علی اور وزیر خاں دوست تھے۔"

"کاروبار میں جب لالچ غالب آ جائے تو دوستی خود بخود ختم ... ہے۔ میر شرافت علی کے دل میں لالچ پیدا کرنے والا ... دلاور تھا۔ اس نے قائل کیا تھا میر شرافت علی کو کہ جو ... ہم کر رہے ہیں اس میں پچاس سال اور گزار دیں تب بھی ... ہاتھ میں نہیں آئے گا جتنا دوسرے کاروبار میں صرف ایک ... میں مل سکتا ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے اسلحے کے کاروبار میں؟"

"ہاں۔ یہ سلسلہ ایوب خان کے زوال سے شروع ہوا تھا۔ ... اس کی حکومت کا تختہ الٹا گیا تھا تو پاکستان میں سازشی عناصر ... پکڑ چکے تھے۔"

"تمہارا مطلب ان سپر پاورز سے ہے جو پاکستان کی سیاست ... اپنا گھناؤنا کھیل شروع کر چکے تھے۔"

"... کیا سمجھ لیں آپ۔ مشرقی پاکستان میں علیحدگی پسندوں کے ... ت کو ہوا دینے والے تو نہ جانے کب سے سرگرم تھے۔ وہ ... عوام کے عوام میں نفرت کی خلیج بڑھانے کے لیے بدگمانیاں ... غلط فہمیاں پیدا کر رہے تھے۔ بالآخر وہ کامیاب ہوئے۔"

"... یہ سب مجھے معلوم ہے۔"

"جب انتخابات کے نتائج آ گئے تو بیرونی عناصر کھل کے ... سامنے آ گئے۔ ایک ہمسایہ ملک کی خفیہ فوجی تنظیم کے رکن نے ..."

"ہاں، ہاں۔ تم جاؤ۔ میری جان چھوڑو، سر مت کھاؤ میرا۔"

"ظالم میں نے تمہارے لیے کیا نہیں کھایا۔ زمانے کے دھکے، دنیا والوں کی گالیاں" غالب دردناک لہجے میں بولا "پاگل خانے کی ہوا۔ تمہارے نازک ہاتھوں کی پیار بھری مار، پھر درد کی دوا، مسور کی دال.... اور ٹھنڈے۔"

رابعہ نے کہا "زیادہ ڈراما مت کرو۔ جلدی سے جاؤ اور انہیں ٹھکانے لگا کے آ جاؤ۔ مگر دیکھو اپنا خیال رکھنا۔"

"تم خواہ مخواہ ڈر رہی ہو۔ یہ تو معمولی وزیر ہے۔ کتنے وزیراعظم ٹھکانے لگا چکے تھے ہم مارشل لا سے پہلے۔ دنیا نے کیا بگاڑ لیا ہمارا؟" میں نے کہا۔

غالب بولا "ہاں۔ خود ہم نے بگاڑ لیا اپنا۔ جتنا بگاڑ سکتے تھے۔"

میں نے ایک کندھے پر عباسی کو اٹھایا اور غالب نے اس کے باڈی گارڈ مسٹر مونچھ کو۔ ہم پھر پیڈرو کے کمرے سے گزرے۔

پیڈرو نے حیرانی سے یہ سب دیکھا "کیا واقعی.... یہ لوگ ان کو ٹھکانے لگانے جا رہے ہیں.... یہ.... مر چکے ہیں۔"

رابعہ نے بے نیازی سے کہا "ہاں۔ راول ڈیم میں ڈالنے جا رہے ہیں۔"

"راول ڈیم میں۔ اس وقت!"

"وہی قریب ہے اور محفوظ جگہ ہے۔ گاڑی بھی ڈوب جائے گی تو کسی کو پتا نہیں چلے گا مہینوں" میں نے رابعہ کی آواز سنی۔

غالب نے ہانپتے ہوئے کہا "نازو ساتھ والے کمرے میں موجود ہے۔ اگر ذرا بھی خطرہ ہو۔ تو اسے گولی مار دینا۔ نازو کو نہیں، اسے۔"

رابعہ بولی "مجھے کسی سے کوئی خطرہ نہیں۔ اور میں اپنی حفاظت کر سکتی ہوں۔"

میں نے وزیر کو گاڑی کی پچھلی سیٹ پر ڈالا۔ غالب نے اس کے باڈی گارڈ کو اوپر پٹخ دیا "دیکھنے میں اتنا بھاری نہیں لگتا۔"

میں نے کہا "زیادہ بوجھ گناہوں کا ہوگا۔ گاڑی میں شراب کا پورا کریٹ رکھا ہوا ہے۔ ایک بوتل آدھی ہے۔"

غالب نے سرہلایا "یہی پی رہا ہوگا۔ مونچھ والا۔"

میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور ریس دے کر انجن بند کر دیا۔ پھر ہم آہستہ سے نیچے اترے اور میں نے گیٹ کو یوں ہلایا کہ محسوس ہو بند کیا ہے۔

اندر پیڈرو کو یہی محسوس ہوا ہوگا کہ گاڑی باہر نکل گئی تو نازو نے گیٹ بند کر دیا۔

میں اور غالب گھوم کے پچھلی طرف سے اندر داخل ہوئے اور اس کمرے میں پہنچ گئے جہاں نازو کسی ریڈیو اناؤنسر کی طرح کانوں پر ہیڈ فون چڑھائے بے حد مستعد بیٹھی ہوئی تھی۔ ایف ایم مائکروفون سے موصول ہونے والی آواز ریکارڈ بھی ہو رہی تھی اور اس کے کانوں میں بھی پہنچ رہی تھی۔ میں اور غالب دروازے کے قریب

خود چوہدری دلاور سے رابطہ کیا۔ مجھے اس کا نام یاد نہیں۔ وہ کوئی غیر ملکی تھا۔ شاید امریکن۔ وہ ظاہر یہی کرتا تھا کہ اردو نہیں سمجھتا اور اپنے ساتھ ایک مترجم رکھتا تھا۔ اس مترجم کا نام نوازش علی تھا۔ مجھے بعد میں کئی بار اندازہ ہوا کہ وہ امریکن.... ہاں، اس کا نام اچانک یاد آگیا ہے مجھے۔ مسٹر ہربرٹ بیکر۔ دلاور اسے مسٹر بیکر کہتا تھا اور اکثر مذاق میں کہتا تھا کہ یار کوئی بیکری بھی ہے تمہاری یا ایسے ہی بیکر بن گئے ہو۔"

"کیا دلاور کو اندازہ نہیں تھا کہ بیکر اردو سمجھتا ہے؟"

"جب میں نے تاڑ لیا تھا تو چوہدری دلاور سے یہ بات کیسے چھپی رہ سکتی تھی۔ وہ تو جان بوجھ کے ایسی بات کہتا تھا کہ بیکر اپنے جذبات کے ردِ عمل کو چھپا نہ سکے۔ مثلاً ایک بار اس نے ابراہیم لنکن کو اور دوسری بار جارج واشنگٹن کو بڑی گالیاں دیں۔ کسی وجہ کے بغیر۔ اس کی جگہ کوئی پاکستانی ہوتا اور کوئی کچھ کہتا... بابائے قوم کو تو کیا وہ مشتعل نہ ہوتا۔ بیکر مجبور تھا کہ سب سنے اور خاموش رہے۔ وہ بہت جلد نارمل ہو کے مسکرانے لگتا تھا اور نوازش علی سے پوچھتا تھا کہ ابراہیم لنکن اور جارج واشنگٹن کا کیا حوالہ تھا۔ اور وہ خبیث مسکرا کے کہتا تھا کہ چوہدری صاحب ان کی تعریف کر رہے ہیں کہ لنکن نے سیاہ فاموں اور غلاموں کو ان کے حقوق دلوانے کے لیے جان دے دی۔ اور جارج واشنگٹن نے جمہوریت کی جو روایات قائم کی تھیں، کاش ایسی ہی یہاں بھی ہوتیں۔"

"یہ نوازش علی کون تھا؟"

"چوہدری دلاور نے معلوم کر لیا تھا۔ وہ ہماری وزارتِ خارجہ کا ایک سیکشن افسر تھا اور ان تین سو تین افسران میں شامل تھا جن کو یحییٰ خان نے نکال دیا تھا۔ اس کا ایک پورا گروہ تھا۔ یہاں ہر محکمے میں کچھ بنگالی افسر تھے۔ ان میں کچھ غدار تھے۔ کچھ ضمیر فروش تھے۔ ان کو خرید لیا گیا تھا۔ مسٹر بیکر کے علاوہ بھی امریکن سی آئی اے نے ایران سے کچھ لوگ یہاں بھیج دیے تھے۔"

"یہ بیکر سی آئی اے کا آدمی تھا؟ تم جانتے تھے؟"

"سی آئی اے کا تو ہونے سے رہا مس رابعہ" پیڈرو نے جواب دیا "میرا بس اندازہ تھا۔ دلاور کا بھی یہی خیال تھا۔ یہ لوگ ایسے افراد کو خریدتے پھر رہے تھے جو ان کے مقصد کی تکمیل کے لئے مددگار ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ صحیح آدمی کو تاڑتے تھے۔ نہ جانے کب سے ان کی نظر چوہدری دلاور پر تھی اور انہیں معلوم تھا کہ یہ شخص پیسے کے لیے سب کچھ کر سکتا ہے۔ وہ سرمایہ کار بن کے آیا۔ اس نے سب کے ساتھ میٹنگ کی۔ وزیر خان سے بھی کہا کہ وہ ایم ڈبلیو ڈی انڈسٹری کو جدید خطوط پر وسعت دینے اور اس کے لیے بین الاقوامی مارکیٹ بنانے میں دلچسپی رکھتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس نے پچاس لاکھ سے ایک کروڑ ڈالر تک لگانے کی بات کی تھی۔ ظاہر ہے یہ بہت بڑی رقم تھی۔ ہربرٹ بیکر کا خیال یہ تھا کہ انہیں زرعی مشینری کے پرزوں تک محدود نہیں رہنا چاہیے۔ جب ان کے پاس کارخانے کو وسعت دینے کے لیے ... بھی ہے، ان کے پاس ماہر انجینئر بھی ہیں اور بہترین مشینری ... ان کو دیگر بلکہ ہر قسم کے مشینی پرزے بنانے کی کوشش ... چاہیے۔ اس نے ایک میٹنگ میں کہا کہ ہم جو ٹریکٹر، تھریشر ... وغیرہ کے پرزے بناتے ہیں تو ان کی ملک میں تعداد کیا ہے ... دس بیس سال میں کیا ہو گی۔ ان کے علاوہ اور کتنے لوگ اس ... یہی کام کر رہے ہیں اور آگے جا کے مزید کتنے کریں گے۔ زراعت ... میں کام آنے والی مشینری صرف دیہات میں جاتی ہے اور وہاں ... فیصد لوگ مشینی زراعت کرتے ہیں۔ ظاہر ہے بہت کم ... گاؤں ورکشاپ نہیں کھولے جا سکتے اور پرزے فراہم کرنا ... مشکل ہے۔ دیہاتی ان پرزوں کی منہ مانگی قیمت بھی نہیں ... سکتے۔ وغیرہ وغیرہ۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ اس کی باتیں سب کو ... کر رہی ہیں۔ اس نے اچانک سوال کر دیا کہ فرض کریں ہم گاڑیوں کے پرزے بنائیں۔ سب نہیں، کچھ پرزے۔ گاڑیوں میں کاریں ... بسیں ٹرک اور جیپ سب شامل ہیں۔ پورے ملک میں ان کی تعداد کتنی تیزی سے بڑھ رہی ہے اور موٹر کے پرزے تو ہم باہر کہیں ... بھیج سکتے ہیں۔ ہمارے پڑوسی ملک کی موٹر انڈسٹری اس صورتِ حال سے پورا فائدہ اٹھا رہی ہے۔ وہ پرزے خود بناتے ہیں اور ان پر جاپانی ہونے کی مہر لگا کے تائیوان اور کوریا کی مارکیٹ میں پھیلا دیتے ہیں۔ اور اس میں فائدہ دو سو فیصد سے آٹھ سو فیصد تک ہو سکتا ہے۔ بیکر کی بات کا اثر سب سے زیادہ چوہدری دلاور نے قبول کیا۔ میر شرافت علی تھوڑا بہت قائل ہوا مگر وزیر خان نے اس تجویز کو قبول نہیں کیا۔ اس نے کہا کہ ابھی ہمارے پاس اتنی پیداوار نہیں کہ ہم صرف اپنے ملک کی ضرورت پوری کر سکیں۔ ... باہر کی بات کر رہا ہے۔ اگر کاروبار کو وسعت دینی ہے تو دو سو یا آٹھ سو فیصد منافع کے لیے وہی جعلسازی کیا ضروری ہے جو ہمارا پڑوسی ملک کرتا ہے؟ ابھی ہم کسان کی ضرورت پوری کرتے ہیں اور ملک کی زرعی پیداوار بڑھنے کے عمل میں شریک ہیں۔ ہمیں موٹر انڈسٹری کے دھوکے بازوں میں شامل ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ میر شرافت علی نے کہا کہ جعلی مارک نہ سہی۔ ہم اپنے ٹریڈ مارک سے اپنی مارکیٹ میں گاڑیوں کے پرزے فراہم کریں تو کیا حرج ہے۔ جب ہماری گڈول بن جائے گی تو یہی پرزے مڈل ایسٹ بھی جا سکتے ہیں۔ مجھے یہ ساری روداد ڈی سلوا نے بتائی تھی جو خود بھی چوہدری دلاور کا ہم خیال تھا۔ دنیا بزنس کر رہی ہے، آخرت کے چکر میں نہیں ہے۔ منافع کما رہی ہے ثواب نہیں۔ مقابلہ سخت ہوتا جا رہا ہے جو آج آگے بڑھ جائے گا وہی آگے رہے گا۔ جائز ناجائز طریقے سب اختیار کرتے ہیں کیونکہ کاروبار ایک معاشی جنگ ہے جس میں سب آپ کے حریف ہیں اور حریف کو نیچا دکھانے اور اس پر سبقت لے جانے کے لیے سب کچھ کیا جا سکتا ہے۔ آہستہ آہستہ اختلافات کھل کر سامنے آتے گئے۔ وزیر خان

... بیکر کی تجاویز کو رد کر دیا۔ چوہدری دلاور نے اس کی حمایت کی ... وہ میر شرافت علی کا ووٹ لینے میں بھی کامیاب ہو گیا۔ فیصلہ یہ ... کہ کاروبار کو وسعت دی جائے اور موٹر پارٹس بنانے کے لئے نئی ... شینری لگائی جائے مگر اس کے لیے مسٹر بیکر کے ڈالر نہ لیے ... ئیں۔ زرعی ترقیاتی بینک کے علاوہ صنعتی ترقیاتی بینک سے قرضہ ... جائے اور موٹر پارٹس پر "ایم ڈبلیو ڈی" کا وہی مونوگرام ہو جو ... راعت میں کام آنے والی مشینری کے پرزوں پر مارکیٹ میں اپنی ... اکھ بنا چکا ہے۔ وزیر خان نے اس پر بھی زور دیا کہ ہر پرزے پر "... یڈ اِن پاکستان" صاف لکھا جانا چاہیے۔ گڑبڑ اس کے بعد ... روع ہوئی۔ کاروبار کے تین شعبے، تینوں پارٹنرز کے حوالے ... ر دیے گئے۔ ایک کے کام میں دوسرے کی دخل اندازی سے گریز ... رنے کی پالیسی اپنائی گئی۔ دلاور نے ہم سے کہا کہ ہم سب اعتماد کی بنیاد پر اپنا اپنا کام کریں گے اور دوسروں کو ان کا کام کرنے دیں گے۔ ہر شخص ہر معاملے میں ٹانگ اڑائے گا تو پوری توجہ اپنے حصے کے کام کو کیسے دے گا اور دوسروں کے لیے بھی کام کرنا دشوار ہو گا۔ وزیر خان یہیں مار کھا گیا۔ صرف اس لیے کہ وہ شریف آدمی تھا اور سب کو قابلِ اعتماد سمجھتا تھا۔ اس وقت تک ایسی کوئی بات بھی نہیں تھی کہ وہ شک کرتا۔ دلاور نے پروڈکشن کا شعبہ سنبھال لیا۔ کارخانے کے اندر کیا بن رہا ہے، کیسا بن رہا ہے اور کتنا بن رہا ہے، یہ اس کی ذمے داری تھی۔ اکاؤنٹ اور ایڈمنسٹریشن کو سب سے اہم قرار دیتے ہوئے وزیر خان کو مجبور کیا گیا کہ یہ شعبہ وہ سنبھالے۔ میر شرافت علی نے مارکیٹنگ کی ذمے داری لے لی۔ اس کے بعد بڑی چالاکی اور ہوشیاری سے عملے کا انتخاب ہوا۔ وزیر خان کو ایسے ماتحت دیے گئے جو دلاور کے بھروسے کے آدمی تھے اور بھاری انعام کے لالچ میں اس سے مل گئے تھے۔ وزیر خان کو کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ اس کے اپنے پرانے کارکن بھی نمک حرام اور غدار ہو سکتے ہیں لیکن پیسہ چیز ہی ایسی ہے کہ کسی کا بھی ایمان خریدا جا سکتا ہے۔ اکاؤنٹ کے شعبے میں اس کا چیف اکاؤنٹنٹ اور اکاؤنٹنٹ ہی سب کچھ کرتے تھے۔ وہ آمدنی اور خرچ کا حساب تیار کرتے تھے اور وزیر خان سے ہر جگہ دستخط کرا لیتے تھے۔ ممکن ہے شروع شروع میں وزیر خان نے اکاؤنٹ بکس، لیجر وغیرہ کا تفصیلی جائزہ لیا ہو اور حسابات دیکھے ہوں۔ اس وقت کوئی گڑبڑ نہیں تھی۔ بعد میں وہ دیکھے بغیر کاغذات پر دستخط کرنے لگا۔ چیف اکاؤنٹنٹ تھا ڈی سلوا جو بعد میں جنرل منیجر بنا۔ ڈی سلوا پہلے ایماندار تھا۔ وہ گوا سے لٹ لٹا کے آیا تھا مگر یہاں اس نے محنت سے سب کچھ دوبارہ حاصل کر لیا تھا۔ سوائے بیوی بچوں کے۔ اس کی بیوی ہالینڈ چلی گئی تھی۔ وہ خوب صورت عورت تھی۔ ڈی سلوا کے خیال میں دنیا کی سب سے خوب صورت لڑکی اسے بدقسمتی سے مل گئی تھی۔"

رابعہ نے کہا "بدقسمتی یا خوش قسمتی!"

پیڈرو بولا "اسے وہ بدقسمتی کہتا تھا کیونکہ پھر ساری دنیا اس کے پیچھے پڑ گئی اور بالآخر اسے ورغلانے میں کامیاب ہو گئی۔ ڈی سلوا ایک ڈچ فرم میں اچھے عہدے پر تھا۔ گوا کا ماحول سو فیصد ہالینڈ کا ماحول تھا مگر سب انگریزی بولتے تھے اور گوا کو یورپ سمجھ کر رہتے تھے۔ ڈی سلوا ہی نہیں، سب لوگ شام کو کلب جاتے تھے اور گھروں پر پارٹیاں بہت کرتے تھے۔ ڈی سلوا کے تین باس بیک وقت اس کی بیوی پر مر مٹے۔ ماتحت تو شاید درجن بھر ہوں گے جو اس کو دیکھ دیکھ کے صرف آہیں بھر سکتے تھے۔ وہ ڈی سلوا کی سیکریٹری بھی تھی چنانچہ دن میں بھی اس کے ساتھ رہتی تھی۔ اس سے ساری خرابی پیدا ہوئی۔ اس کے دو بچے ہو گئے مگر اسے فرق نہیں پڑا۔ وہ بدستور لڑکی بنی رہی اور ہر محفل میں اپنے حسن اور ناز و ادا سے لوگوں کے عقل و ہوش لوٹتی رہی۔ ہر عورت کو اس کھیل میں لطف آتا ہے۔ شریف عورت کو معاشرتی پابندیاں ایک حد میں رکھتی ہیں ورنہ وہ بھی پرستاروں کی بھیڑ میں خوش رہنا چاہے گی۔ ایک شوہر سے وفا کرنا ان کو ایسا ہی لگتا ہے جیسے آدمی ہر روز ایک ہی ڈش کھاتا رہے خواہ وہ دنیا کی سب سے اچھی اور مہنگی ڈش ہی کیوں نہ ہو۔"

"کیا مرد ایسا نہیں کرتے؟" رابعہ بولی۔

"مرد ہی زیادہ کرتے ہیں مگر کیا تالی ایک ہاتھ سے بجتی ہے؟"

پیڈرو بولا "بعد میں ڈی سلوا روتا تھا کہ پتا نہیں وہ دو میرے ... تھے یا سب کی دولتِ مشترکہ تھے۔ جب بالآخر ایک ڈچ ... جنرل منیجر تھا۔ جوان اور ہینڈسم ہونے کے علاوہ انتہائی دولت ... تھا۔ اس کی بیوی کو اپنے ساتھ لے گیا۔ وہ خود پہلے ایک ... کو چھوڑ چکا تھا۔ ڈی سلوا اتنا بددل ہوا کہ اس نے سب کچھ ... دیا۔ تین مہینے وہ روتا رہا اور شراب پیتا رہا۔ اس کی داڑھی ... تھی اور وہ میلے کپڑوں میں اِدھر اُدھر بھٹکتا پھرتا تھا لیکن گھر ... جاتا تھا۔ اس کو شراب پی کے ہنگامہ کرنے اور لوگوں سے مار پیٹ کے جرم میں تین بار حوالات جانا پڑا۔ ایک بار اسے جرمانہ ہوا جو کسی دوست نے ادا کیا اور اسے چھڑا لیا۔ دوسری بار اس نے تین ماہ کی جیل کاٹی۔ پھر بھارت نے گوا پر قبضہ کیا تو بہت سے لوگ وہاں سے فرار ہوئے۔ وہ بھی بھاگنے والوں کے ساتھ پاکستان پہنچا۔ اس کے پاس اکاؤنٹس کی ڈگری تھی اور تجربہ تھا۔ حالات نے اسے وزیر خان کے پاس پہنچا دیا۔ خود وزیر خان کا گھر اسی طرح تباہ ہوا تھا۔"

رابعہ نے اس کی بات کاٹ دی "وزیر خان کے حالات بالکل مختلف تھے۔"

"ہاں۔ مگر دونوں کے بیوی بچے اور بھرا ہوا گھر پیچھے رہ جانے کا دکھ ایک تھا۔ وزیر خان نے اسے حوصلہ اور سہارا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ وزیر خان کو جتنا بھروسا ڈی سلوا پر تھا کسی اور پر نہیں تھا۔ ڈی سلوا اس کے سامنے رجسٹر اور کیش بک یا کوئی بھی کاغذ رکھ دیتا تھا

اور کہتا تھا کہ سر یہاں دستخط کردیں تو وہ زیادہ سے زیادہ یہ پوچھتا تھا کہ تم نے ٹھیک سے دیکھ لیا ہے نا؟ اور ڈی سلوا کہتا تھا کہ سر میں نہیں دیکھوں گا تو کیا فرشتے دیکھیں گے۔ اور وزیر خان ہنس پڑتا تھا اور دستخط کردیتا تھا۔ بھئی مروا مت دینا۔ یہ بات وہ عادتاً کہتا تھا اور ڈی سلوا جواب میں کہتا تھا کہ سر۔ جب مروانا ہوگا تو بتادوں گا۔ بس اسی چکر میں وزیر خان مارا گیا۔ ڈی سلوا کو جنرل منیجر بننے کے لالچ نے اپنے محسن کا بیڑا غرق کرنے پر مجبور کردیا۔ وہ کہتا تھا کہ میری خوب صورت بیوی کو ایک جنرل منیجر لے گیا۔ میں جنرل منیجر بن جاؤں تو کسی سے اس کی خوب صورت بیوی چھین لوں گا۔ کارخانے میں نئی مشینری آگئی۔ پیداوار بڑھ گئی۔ منافع بہت زیادہ ہوگیا۔ مشرقی پاکستان سے بھی آرڈر آنے لگے اور وہاں مال کی کھپت میں تیزی سے اضافہ ہوا۔ وزیر خان کا خیال تھا کہ یہ شرافت علی کی سمجھ بوجھ اور ولاور کی محنت کا نتیجہ ہے۔ بھئی میں کیا کرتا ہوں‘ سارا دن دفتر میں بیٹھ کے دستخط کرتا ہوں۔ میرا کام ڈی سلوا کرتا ہے۔ ڈی سلوا نے ہی اس کا کام تمام کردیا۔“

”اکاؤنٹس کے شعبے میں اور لوگ بھی تھے؟“ رابعہ نے پوچھا ”کسی نے وزیر خان کو خبردار نہیں کیا۔“

”ایک اکاؤنٹنٹ تھا مگر اس کو بھی بہت دیر سے پتا چلا کہ ڈی سلوا کیا کرچکا ہے۔ ڈی سلوا ڈپلی کیٹ اکاؤنٹ رکھتا تھا۔ ایک وہ اکاؤنٹس بکس تھیں جو آڈٹ کے لئے پیش کی جاتی تھیں۔ دوسری وہ جو ڈی سلوا کی تحویل میں رہتی تھیں۔ اکاؤنٹنٹ کا حساب کچھ اور تھا۔ ڈی سلوا اس پر بھی وزیر خان سے دستخط کرالیتا تھا اور دوسرا حساب کتاب خود تیار کرتا تھا۔ وزیر خان اس پر بھی دستخط کردیتا تھا۔ اکاؤنٹنٹ کو پتا چلنے تک بہت دیر ہوچکی تھی۔ کسی ثبوت کے بغیر اکاؤنٹنٹ بھی ڈی سلوا پر فراڈ اور نمک حرامی کا اتنا بڑا الزام عائد نہیں کرسکتا تھا۔ پروڈکشن کے شعبے میں چوہدری ولاور کیا کررہا ہے۔ یہ وزیر خان نے کبھی پلٹ کے نہیں دیکھا۔ وہ ایک شریفانہ معاہدے کا پابند تھا۔ اس کے دونوں پارٹنر بھی اکاؤنٹ کے شعبے سے دور رہتے تھے۔ چوہدری ولاور نے ایک سال میں سات افراد کو برطرف کرایا۔ انہیں وزیر خان کے سامنے پیش کیا گیا کہ وہ چوری اور غبن کے مرتکب ہوئے ہیں۔ ولاور ان کا کیس پولیس کو دینا چاہتا تھا مگر وزیر خان کے سامنے انہوں نے اپنے جرم کا اعتراف کرلیا تو انہیں برطرفی کی سزا دینا کافی سمجھا گیا۔ یہ سب ایک ڈراما تھا۔ ان کی برطرفی کے احکامات صرف وزیر خان ہی جاری کرسکتا تھا۔“

”ڈراما کیا تھا اس میں“ رابعہ نے کہا ”وہ مجرم نہیں تھے؟“

”انہیں مجرم بنادیا گیا تھا اور پھر یہ سمجھادیا گیا تھا کہ وہ وزیر خان کے سامنے اپنا جرم تسلیم کرلیں تو انہیں پولیس کے حوالے نہیں کیا جائے گا۔ گزارے کے لیے معقول رقم دے دی جائے گی اور برطرفی کے خط میں یہ لکھا جائے گا کہ وہ فاضل ہوگئے تھے۔ ان کی اچھی کارکردگی کی تعریف بھی ہوگی اور اس سے انہیں یہ فائدہ ہوگا کہ وہ کسی دوسرے کارخانے میں ملازمت حاصل کرلیں گے شرط یہی ہے کہ وہ چپ رہیں ورنہ ان کا مستقبل جیل کی دیواروں کے پیچھے ہوگا۔ آج بھی اور کل بھی۔ یہاں سے جاکے بھی وہ خود کو آزاد نہ سمجھیں۔ آدمی پکڑا اسی وقت جاتا ہے جب جرم کا سراغ اور ثبوت سامنے آئے۔ وہ خاموشی سے اپنا کام کرتے رہیں گے تو سب ٹھیک رہے گا۔ ظاہر ہے انہوں نے وہی کیا جو ان سے کہا گیا تھا۔ ان کی جگہ ولاور نے اپنے کام کے ماہر آدمی رکھے۔ ان کی تقرری کا حکم بھی وزیر خان نے جاری کیا۔ یہ خاص لوگ تھے۔“

”یہ خاص لوگ کون تھے؟ کس کام کے ماہر تھے؟“

”یہ اسلحہ بنانے والے کاریگر تھے اور علاقہ غیر سے لائے گئے تھے۔ درّے سے اور لنڈی کوتل سے۔ ان کے کام کرنے کا انداز اور تھا۔ وہ اور ان کے بڑے پہاڑوں میں صدیوں سے اسلحہ بنارہے تھے اور یہ اسلحہ یورپ کی جدید ترین فیکٹریوں کے مقابلے کا بھی ہوتا تھا۔ یہاں ان کو خراد مشینوں پر۔ ڈرلنگ ٹرننگ اور ملنگ کی تربیت دی گئی۔ یہ کام ان کو میں نے سکھایا۔ ان کو سرحد سے لانے والا بھی میں تھا۔ ان میں بڑی صلاحیت تھی۔ وہ ہاتھ کا کام مشین سے کرنا بہت جلد سیکھ گئے تو ان کو سپروائزر بنادیا گیا اور ان میں سے ہر ایک کو تین تین اپرنٹس دے دیے گئے۔ تین لڑکے مشینوں پر ان کی ہدایات کے مطابق کام کرتے تھے اور وہ کام کی کوالٹی پر نظر رکھتے تھے۔“

”یہ اکیس لڑکے بھی تم نے ہی بھرتی کیے تھے؟“

”ہاں جی۔ وہ سب لاہور کے چھوٹے موٹے کارخانوں میں ورکشاپ اور فونڈری میں بہت کم تنخواہ پر کام کرتے تھے۔ میں نے ہنرمند اور ذہین لڑکے منتخب کیے اور دس گنا تنخواہ پر۔ ہر لڑکے کو میں اور ولاور اچھی طرح سمجھادیتے تھے کہ جب تک وہ اپنے کام سے کام رکھیں گے عیش کریں گے۔ ان کو تنخواہ کے علاوہ اچھی کارکردگی اور اچھے رویے پر اضافی بونس بھی ملے گا۔ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ یہ وزارت دفاع کا ایک خفیہ یونٹ ہے۔ ایسے بہت سے چھوٹے چھوٹے یونٹ پورے ملک میں لگائے گئے ہیں۔ ان کا مقصد پیداوار میں اضافے کے علاوہ یہ بھی ہے کہ جنگ کی صورت میں آرڈیننس فیکٹری جیسے بڑے کارخانے بمباری سے تباہ ہوجائیں تب بھی دفاعی ضروریات کسی حد تک پوری ہوتی رہیں مگر یہ انتہائی ذمے داری کا کام ہے۔ اگر غلطی سے بھی ان کی زبان سے کوئی لفظ نکلا کہ وہ کیا کرتے ہیں یا انہوں نے کسی کو بتایا کہ وہ کہاں کام کرتے ہیں تو فوراً معلوم ہوجائے گا اور پھر ان کی خیر نہیں۔ ان کے ساتھ خاندان والے بھی مشکل میں پڑجائیں گے۔ وہ ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلکس میں زرعی مشینری کے پرزے بناتے ہیں۔ ہر جگہ ان کا ایک ہی بیان ہونا چاہیے۔ کوئی ملٹری کا جنرل پوچھے یا صدر۔ کوئی پولیس افسر پوچھے یا سپریم کورٹ کا جج۔ سب کو یہی

جواب دینا ہے۔ ظاہر ہے جو لڑکے پانچ سو روپے ماہانہ پارہے تھے وہ پانچ ہزار کی نوکری کو بچانے کے لیے سب کچھ کرسکتے تھے۔ یہ تو سرے سے کوئی کام ہی نہیں تھا۔ ان کے نزدیک تو یہ قومی خدمت تھی اور ملک کا دفاع کرنے والوں کا ساتھ دینے والی بات تھی۔ پہلے ہی مہینے ان کو ایک ایک ہزار کا بونس بھی دے دیا گیا تو وہ ہمارے ذاتی ملازم بن گئے۔ انہوں نے دن رات ایک کردیے‘ ان کے تو جیسے دن پھر گئے تھے۔“

”یہ سات سپروائزر اور اکیس لڑکے اب کہاں ہیں؟“

”چھ سپروائزر تھے۔ اٹھارہ کاریگر۔ ساتواں سپروائزر ان سب کا فورمین تھا۔ وہ اسلحے کی فائنل چیکنگ کرتا تھا اور اس کی آنکھوں میں تو جیسے مائکرو اسکوپ یا محدب عدسے لگے ہوئے تھے کہ وہ بال کے سویں حصے کا فرق دیکھ لیتا تھا اور اس کے ہاتھ نقص والے مال کو فوراً پکڑ لیتے تھے۔ بعد میں ان سب کو مروادیا گیا۔“

رابعہ اچھل پڑی۔ میں اور غالب بھی اچھل پڑے۔ پیڈرو نے اتنی بڑی بات بڑی آسانی سے کہہ دی تھی۔

”مروادیا گیا..... سب کو؟“ رابعہ نے صدمے سے سنبھل کے کہا۔

”ہاں۔ یہ تو پہلے سے طے تھا۔“

”اُف۔ ایک ساتھ اتنے افراد قتل کردیے گئے؟“

”ایک ساتھ نہیں۔“ پیڈرو بولا ”سات افراد جو سرحد کے علاقہ غیر سے آئے تھے ایک ویگن میں واپس جارہے تھے۔ ان کی ساری کمائی تقریباً ایک ایک لاکھ کی رقم بھی ان کے پاس تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اب وہ اپنے اپنے گھر والوں کو ساتھ لے کر شہر آجائیں گے اور ایک لاکھ سے کوئی کاروبار کریں گے۔ گھر بنائیں گے اور آرام سے رہیں گے۔ کوئی رکشا چلانے کا سوچ رہا تھا کوئی ٹیکسی خریدنا چاہتا تھا۔ صرف ایک خود بھی حج پر جانا چاہتا تھا اور اپنے ماں باپ کو بھی لے جانے کی خواہش رکھتا تھا۔ یہ فورمین تھا جس کے پاس رقم بھی دوسروں کے مقابلے میں زیادہ تھی۔ اٹک کا پل پار کرنے کے بعد ویگن اکوڑہ خٹک میں شاید جہانگیرہ میں رکی اور پھر روانہ ہوئی تو ویگن میں بم کا دھماکا ہوا۔ وہ ساتوں ایک ساتھ آئے تھے‘ ایک ساتھ اس دنیا سے گئے۔ میرے پاس ان سب کے نام اور پتے موجود ہیں۔ آج بھی ان کے رشتے داروں کو معلوم ہوجائے کہ ان کو قتل کرنے والا کون تھا تو وہ اس کی اگلی سات پشتوں کو نہ چھوڑیں۔“

”اور باقی کاریگر۔ ان کا کیا انجام ہوا؟“ رابعہ سخت نروس تھی۔

”وہ باری باری ختم کردیے گئے۔ اس طرح کہ ایک کو دوسرے کی موت کا پتا بھی نہیں چلا۔ وہ مختلف علاقوں میں رہتے تھے اور میرے ساتھ آنے سے پہلے ایک دوسرے سے قطعی ناواقف تھے۔ ان کو یہ بھی سمجھایا گیا تھا کہ بات چیت میں ہی نہیں میل ملاقات میں بھی محتاط رہیں‘ یہ ہوسکتا ہے کہ دشمن ملک کے جاسوس جو پاکستان میں پہلے سے بہت ایکٹو ہیں کسی طرح لاہور کے پروڈکشن یونٹ کا سراغ لگالیں اور کسی ایک بندے کا پیچھا کرتے ہوئے باقی لوگوں تک پہنچ جائیں۔ انہیں بتایا گیا تھا کہ ایسے ہی خفیہ یونٹ پشاور‘ پنڈی‘ کراچی‘ کوئٹہ اور حیدر آباد جیسے بڑے شہروں کے علاوہ بھی بہت سے چھوٹے قصبوں میں موجود ہیں۔ وزیر آباد یونٹ میں ایسا ہی ہوا تھا۔ بھارتی ایجنٹوں نے سب کو قتل کرادیا تھا۔ پھر یونٹ کو اُڑادیا تھا۔ وہ بے چارے اتنے ڈر گئے تھے کہ فیکٹری سے سیدھے گھر جاتے تھے اور بعد میں گھر سے نکلتے ہی نہیں تھے۔ انہیں ایک سال کے کنٹریکٹ پر رکھا تھا۔ مئی میں ان کا کنٹریکٹ ختم ہوا تو ہر ایک کو پچاس پچاس ہزار کا بونس دیا گیا اور یہ کہا گیا کہ نہ جانے کیوں جی ایچ کیو نے ان کے کنٹریکٹ کی تجدید نہیں کی۔ کام تو ابھی چلے گا‘ ممکن ہے کوئی بجٹ کا مسئلہ ہو۔ جولائی سے ان کی ملازمت ہر حال میں شروع ہوجائے گی۔ وہ بھی پریشان نہیں ہوئے۔ مسلسل کام نے ان کو تھکادیا تھا۔ انہوں نے سوچا کہ چلو دو مہینے آرام کرلیں گے۔ پچاس ہزار تو مل ہی گئے ہیں۔ ایک مہینے میں ان سب کو ٹھکانے لگادیا گیا۔“

”پیڈرو۔ تم لوگ بڑے سفاک ہو۔ کتنے گھروں کے چراغ بجھادیے تم نے۔ زندگی کی تھوڑی سی قیمت دے کر۔“

”رابعہ بی بی۔ آپ جذباتی ہورہی ہیں۔ مشرقی پاکستان میں اور ہماری سرحدوں پر بے گناہ مرنے والوں کا حساب کریں۔ ہر روز جو ذاتی دشمنی کے باعث قتل ہوجاتے ہیں...“

”چھوڑو بحث کو۔ یہ بتاؤ کہ تمہارے پاس ان کے بارے میں کیا معلومات ہیں؟ کیسے قتل کیا گیا تھا انہیں اور کس نے کیا تھا؟“

”دو کی لاشیں دریائے راوی سے نکالی گئی تھیں۔ دو سڑک کے حادثات میں ہلاک ہوئے تھے۔ دو ایسے غائب ہوئے کہ آج تک ان کا سراغ نہیں ملا۔ یہ پہلے ہفتے کی کہانی ہے۔ دوسرے ہفتے میں کچھ اسی طرح کے واقعات پھر پیش آئے۔ اب تفصیل جان کے آپ کو کیا فائدہ ہوگا۔ ان کو جیسے مرنا تھا ویسے مرگئے۔ مارنے والوں کے نام میں نہیں بتاؤں گا۔“

”اس لیے کہ خود تمہارا نام بھی ان میں شامل ہوگا۔ چلو‘ تم اپنے علاوہ دوسرے لوگوں کے نام بتادو۔“

”جو سڑک کے حادثات میں ہلاک ہوئے تھے۔ انہیں تو خود چوہدری ولاور نے مارا تھا۔ انہیں بلایا گیا کہ فلاں جگہ آجاؤ۔ وہ سمجھے کہ شاید کام پھر شروع ہوگیا۔ وہ مقررہ وقت پر وہاں پہنچ گئے جہاں موت کو ان کا انتظار تھا۔ دریا میں غرق کرنے کی کارروائی کا ذمے دار ڈی سلوا تھا۔ ولاور نے ان کو خاموشی سے کامران کی بارہ دری میں طلب کیا تھا اور وہ بھی دن کے وقت وہاں پہنچ گئے۔ ڈی سلوا نے انہیں مبارک باد دی کہ انہیں مزید ایک سال کے کنٹریکٹ پر رکھ لیا گیا ہے اور ان کی تنخواہ بھی اب چھ ہزار ہوگی۔

ظاہر ہے کہ وہ بہت خوش ہوئے۔ ڈی سلوا نے ان کو ٹھنڈی بوتلیں پیش کردیں اور خود بھی ان کے ساتھ بوتل پی چونکہ گرمی بہت تھی اور پیاس سے سب کا بُرا حال تھا اس لیے وہ غٹاغٹ پی گئے اور چند منٹ میں ختم ہوگئے۔ ڈی سلوا نے لاشوں کو کنارے سے پانی میں لڑھکا دیا اور ہاتھ جھاڑ کے روانہ ہوگیا۔ دو ہرن مینار گئے تھے پکنک منانے۔ ان کی لاشیں جھیل سے ملیں۔ پکنک کا تمام سامان پولیس نے اپنے قبضے میں لے لیا۔ دو ٹرین سے کٹ گئے تھے۔ ایک رائے ونڈ ریلوے اسٹیشن پر خیبر میل کے سامنے آگیا تھا۔ دوسرا شاہدرہ میں مال گاڑی کے سامنے۔۔۔"

"غائب کتنے ہوئے تھے۔ جن کا پتا ہی نہیں چلا؟"

"چار۔ مگر اس سے یہ نہ سمجھیں کہ غائب کرنے والا میں تھا" پیڈرو بولا۔

"تم ماہر ہو اس کام کے۔ خیر' یہ بتاؤ' تمہارے پاس ان سب کے نام پتے ہیں' تم نے ابھی کہا تھا۔۔۔"

"سب کے نام پتے ایک ڈائری میں ہیں۔ ایکس کاریگر' سات سپروائزر مع فورمین جو ویگن میں مارے گئے تھے۔ ان سب کے بارے میں ایک صفحے پر ساری تفصیل ہے۔ وہ کب ملازم ہوئے تھے' کتنی تنخواہ پر' بونس کتنا ملا' کب مارے گئے اور کیسے؟"

"اور یہ ڈائری کہاں ہے؟"

"بہت محفوظ جگہ پر۔ ایک بینک کے لاکر میں۔ اگر یہ ڈائری نہ ہوتی تو چوہدری دلاور مجھے زندہ چھوڑتا؟ اب اس نے مجھے تمہارے حوالے کیا ہے' اس یقین کے ساتھ کہ تم مجھے زندہ نہیں چھوڑو گے۔"

"اور تمہارا یقین اس کے برعکس ہے؟"

"مس رابعہ۔ اگر اب بھی مجھے قتل کیا گیا تو نقصان کس کا ہوگا' آپ کے ہاتھ وہ ڈائری نہیں آئے گی۔ اس میں تو اور بھی بہت کچھ ہے۔ تاریخ وار۔ ترتیب وار' دلاور اس جال سے مر کے بھی نہیں نکل سکتا ہے۔"

"مگر اس میں تمہارے خلاف کچھ نہیں ہوگا۔"

"ظاہر ہے۔ اپنے لیے پھانسی کا پھندا خود کون بناتا ہے۔"

رابعہ نے کہا "لیکن پیڈرو۔ کیا ایسا ہی جال دلاور نے تمہارے لیے نہیں بُنا ہوگا' وہ تم سے بڑا شکاری ہے۔"

"تقدیر سے بڑا شکاری کوئی نہیں۔ دیکھنا تو یہی ہے کہ آخر میں کون کس کو شکار کرتا ہے۔ ڈی سلوا' نواب صاحب' میر شرافت علی' سب ہی بڑے شکاری تھے۔ اب میدان میں کتنے رہ گئے ہیں؟"

"اچھا اب جلدی سے باقی بات بھی بتادو۔ اصل بات کی طرف آؤ۔ وزیر خان کو کب پتا چلا اس سازش کا؟ اور کیسے؟"

"بس کسی نے اسے گمنام فون کردیا۔ اس سے کہا کہ وزیر خان' ہوش میں آؤ۔ دیکھو تمہارے کارخانے میں کیا ہورہا ہے۔ تمہیں خبر ہی نہیں۔ وہ پریشان ہوگیا۔ فون کرنے والے نے اور کچھ نہیں بتایا تھا۔ فون بھی آدھی رات کے وقت کیا تھا۔"

"تاریخ یاد ہے؟"

"نہیں۔ لیکن تین چار مہینے گزر چکے تھے۔ اسلحہ سازی شروع ہوئے۔ مال خوب سپلائی ہورہا تھا اور مانگ بڑھتی جارہی تھی۔ ظاہر ہے دلاور کو قیمت بھی منہ مانگی مل رہی تھی۔ وزیر خان نے سب سے پہلے ڈی سلوا سے کہا کہ رات کسی نے فون پر عجیب سی بات کی۔ ڈی سلوا نے بات سُنی تو ہنسنے لگا کہ سر ایسے فون تو مجھے بھی آتے ہیں۔ لڑکے شرارت کرتے ہیں' لوگوں کو پریشان کرکے خوش ہوتے ہیں۔ مگر وزیر خان مطمئن نہیں ہوا' اس نے کہا کہ یہ شرارت نہیں ہوسکتی۔ وہ بہت سیریس تھا۔ ڈی سلوا نے کہا کہ سب ایکٹر ہوتے ہیں بدمعاش۔ آپ فکر میں مت پڑیں۔ سب کام ٹھیک چل رہا ہے۔ وزیر خان نے چوہدری دلاور سے اور پھر میر شرافت علی سے ذکر کیا تو انہوں نے بھی وہی کہا جو ڈی سلوا نے کہا تھا۔ اس سے وزیر خان کا شک بڑھ گیا۔ تین آدمی ایک ہی بات کہہ رہے ہیں۔ کیا وہ آپس میں طے کرچکے تھے کہ اس قسم کی صورت حال میں انہیں کیا کرنا ہوگا۔ کوئی یہ بھی تو کہہ سکتا تھا کہ رانگ نمبر تھا۔ یا مزید اطمینان کی بات ہوتی اگر وہ کہتے کہ وزیر خان' چل کے دیکھ لو خود اپنی آنکھوں سے تاکہ تمہارے دل کا وہم دور ہوجائے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ بھی اس فون کے ذکر سے پریشان ہوئے ہیں کہ وزیر خان نے اسے غیر ضروری اہمیت کیوں دی۔ اس دن وزیر خان نے ایک دو مخلص ساتھیوں سے بھی مشورہ کیا۔ شاید انہی میں سے کوئی فون کرنے والا تھا۔ اس نے رات بارہ بجے پھر فون کردیا اور وزیر خان کو بہت ڈرایا کہ تم بے خبری میں مارے جاؤ گے۔ جن پر تم نے بھروسا کیا ہے وہ آستین کے سانپ ہیں۔ فون پر زیادہ نہیں بتایا جاسکتا اور کسی میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ سامنے آکے بات کرے۔ تم ڈرتے کیوں ہو۔ فیکٹری کے ایک مالک تم بھی ہو۔ صبح وزیر خان آفس پہنچا تو اس نے چوہدری دلاور سے کہا کہ وہ فیکٹری دیکھنا چاہتا ہے۔ دلاور نے کہا کہ فیکٹری میں دیکھنے کی کیا چیز ہے؟ جو مال تیار ہے وہ گودام میں چل کے دیکھ لو۔ میر شرافت علی نے بھی اس کی حمایت کی کہ یہ تو پہلے ہی طے ہوگیا تھا کہ ہم چوہدری دلاور کے کام میں مداخلت نہیں کریں گے۔ پروڈکشن کے شعبے سے ہمارا کیا تعلق۔ اس پر وزیر خان بگڑ گیا کہ تعلق کیوں نہیں' میرا کارخانے کے ہر شعبے سے اتنا ہی تعلق ہے جتنا تمہارا۔ آخر میں بھی مالک ہوں۔ میرے کہیں جانے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ جیسے تم اکاؤنٹ بکس دیکھ سکتے ہو یا مارکیٹ کا سروے کرسکتے ہو اور ڈسٹری بیوٹر سے خریدار تک کسی سے بھی مل سکتے ہو۔ چوہدری دلاور اور شرافت علی اپنی بات پر اُڑے رہے کہ معاہدے کی رو سے یہ نہیں ہوسکتا۔ وزیر خان کی جھنجلاہٹ غصے میں بدل گئی۔ وہ چلانے لگا کہ معاہدے کی ایسی تیسی۔ یہ آپس کی بات تھی۔ قانونی دستاویز ہوتی تو میں اسے بھی پھاڑ کے پھینک دیتا۔ چلو مجھے ابھی دکھاؤ کہ فیکٹری میں کیا ہورہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد بات بگڑ گئی۔ چوہدری دلاور نے اسے آفس کے کمرے میں ہی روک لیا اور بتادیا کہ وہ خیریت چاہتا ہے تو خاموش رہے اور منافع میں سے اپنا حصہ وصول کرتا رہے ورنہ مارا جائے گا۔ اچانک وزیر خان کو معلوم ہوا کہ زرعی مشینری کے پُرزوں کی آڑ میں وہاں اسلحہ بن رہا ہے اور اس خطرناک کام میں اب تک اس کی معاونت شامل تھی۔ اعتماد میں اس نے بہت سی ایسی دستاویزات پر دستخط کردیے تھے جن سے اس کا شریک جرم ہونا ثابت ہوتا تھا بلکہ اصل مجرم وہی بنتا تھا۔ اس نے قرض کی دستاویز پر دستخط کیے تھے۔ مشینری امپورٹ کی تھی۔ اس کی قیمت ادا کی تھی۔ مشینوں کو نصب کرنے کا معاوضہ ادا کیا تھا لیکن ان کا وجود کاغذی تھا۔ کیا بتائے گا وہ کہ اصل مشینیں کہاں گئیں۔ باہر سے آنے والی مشینیں جو کارخانے میں اسلحہ سازی کے لیے استعمال ہورہی تھیں' بالکل مختلف تھیں۔ وزیر خان کی حالت بگڑ گئی۔ اس کو اسپتال لے جایا گیا اور وہ ایک ہفتے آئی سی یو میں رہا۔ وہاں چوہدری دلاور کا کڑا پہرا تھا۔ ڈاکٹر' نرسیں اور آنے جانے والے وزیر خان سے کوئی بات نہیں کرسکتے تھے۔ اس کے پاس فون نہیں تھا اور دلاور اسے باربار یہ بتاتا تھا کہ تمہارا بیٹا سکندر بخت لندن میں ہے۔ اس کی تعلیم ختم ہوجائے گی۔ مستقبل تباہ ہوجائے گا۔ بہتر ہے کہ تم اب خاموشی سے الگ ہوجاؤ۔ اسپتال ہی میں اسے پتا چلا کہ وہ عملاً خود کو کاروبار سے الگ کرنے کی قانونی دستاویز پر بھی دستخط کرچکا ہے اور اب محض ایک سلیپنگ پارٹنر ہے۔ اس کے حصے کا معاوضہ بھی اسے ادا کردیا گیا ہے۔ لیکن اس نے جو قرض لیا تھا وہ اتنا زیادہ تھا کہ اب اس کے پاس کچھ بھی نہیں بچا۔ اس کی وہ کوٹھی بھی کمپنی نے لے لی ہے جس میں وہ رہتا تھا اور اب اسے فروخت کردیا جائے گا۔ وزیر خان پر قرض میں لاکھوں کا غبن ثابت ہوتا تھا۔ اس نے پچاس لاکھ کا قرض لیا تھا۔ خرچ صرف بیس لاکھ ہوئے تھے۔ باقی تیس لاکھ کا حساب ہی نہیں تھا۔ وزیر خان بُری طرح پھنس گیا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کو بھی کچھ نہیں بتاسکتا تھا۔ سارے ثبوت اس کے خلاف تھے۔ حالات اور واقعات کی گواہی اس کے خلاف تھی۔ وہ سکندر بخت کا مستقبل تاریک کرنا نہیں چاہتا تھا چنانچہ وہ خاموشی سے چراغ دین کے گھر چلا گیا اور خاموشی سے مرگیا۔ وہاں اس کی حیثیت ایک قیدی جیسی تھی۔ وہ کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا۔ دلاور نے اسے یہ بھی بتادیا تھا کہ اگر تم نے زبان کھولی تو تمہارے ساتھ تمہارے بیٹے کو بھی سزا ملے گی۔ وہ لندن میں ہے تو کیا ہوا۔ ہم اسے پاکستان لاسکتے ہیں۔ وزیر خان نے ان کی ہر بات مان لی تھی۔ وہ تمام معاملات سے لاتعلق ہوگیا تھا۔ اس نے کاروبار سے علیحدہ ہونا قبول کرلیا تھا۔ اپنا گھر ان کے حوالے کردیا تھا' ساری نقد رقم بھی انہیں دے دی تھی۔ یہ بڑی عجیب بات تھی۔ چوہدری دلاور۔۔۔ اور میر شرافت علی کی توقعات کے برعکس۔ ان کا یہ خیال تھا کہ وزیر خان ایک تو ویسے ہی پٹھان ہے۔ اپنی بات پر اُڑ جائے تو جان دینے اور لینے سے دریغ نہ کرے۔ پھر اس کی ساری عمر یہی کاروبار کرتے گزری تھی۔ وہ لوگوں کو جانتا تھا اور لوگ اسے جانتے تھے۔ اگر وہ چاہتا تو قانون کی مدد لے سکتا تھا اور یہ معاملہ ایسا تھا کہ چوہدری دلاور اور میر شرافت علی کو لینے کے دینے پڑجاتے۔ جس طرح وزیر خان کو کاروبار سے بے دخل کیا گیا اور پھر اس کا سب کچھ چھینا گیا' یہ سوفیصد غیر قانونی تھا۔"

"پھر وہ کیوں خاموش رہا' بیٹے کی وجہ سے؟"

"ہاں۔ اسے پتا چل گیا تھا کہ دلاور بین الاقوامی سطح پر اسلحے کی خرید و فروخت میں ملوث تھا۔ بہت سے دہشت گرد بھی دلاور کے ساتھی ہیں۔ وہ سکندر بخت کو نقصان پہنچا سکتے تھے۔ اس نے ہر ظلم اور سب زیادتی اور ناانصافی قبول کرلی اور کہا کہ بس سکندر بخت کو کچھ پتا نہ چلے ورنہ اس کی تعلیم کا حرج ہوگا۔ وہ سب کچھ چھوڑ کے آجائے گا۔"

"پھر سکندر بخت کو پاکستان کیوں بُلایا گیا تھا؟"

"دراصل۔ وزیر خان کے سکون اور اطمینان نے دلاور کی نیندیں حرام کررکھی تھیں۔" پیڈرو بولا "وہ اور میر شرافت علی اس بات پر پریشان تھے کہ وزیر خان پریشان کیوں نہیں۔ وہ اتنے آرام سے کیوں بیٹھا ہوا ہے۔ چراغ دین کے گھر میں وہ نوکر کی طرح کام کرتا تھا مگر مسکراتا رہتا تھا۔ کوئی مطالبہ نہیں کرتا تھا۔ کسی سے شکایت نہیں کرتا تھا۔ غصہ نہیں کرتا تھا۔ روتا نہیں تھا۔ بس زیرِ لب کچھ کہتا رہتا تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ تلاوت کیا کرتا تھا۔ وہ حافظِ قرآن تھا۔ ایک بار ختم ہوجانے کے بعد پھر پہلے حرف سے شروع کرتا تھا اور اس تمام عرصے میں جب وہ ایک طرح سے قیدِ تنہائی کاٹ رہا تھا شاید اس نے سیکڑوں قرآن ختم کیے ہوں گے۔ یہ بھی اس کے دلی سکون کی ایک وجہ تھی مگر دلاور کا خیال تھا کہ اصل بات کچھ اور ہے۔ چور دلاور کے دل میں تھا اور خوف بن کے اندر بیٹھ گیا تھا۔ اگر اس کا بس چلتا تو وہ وزیر خان کو مار مار کے اس کے اطمینان کا سبب پوچھتا۔ اس نے یہ شک بھی ظاہر کیا کہ وزیر خان اندر ہی اندر کچھ کررہا ہوگا مگر چراغ دین کے پاس ہر لمحے کی رپورٹ تھی۔ نہ وہ کسی سے ملتا تھا اور نہ کوئی اس سے ملنے آتا تھا۔ بیماری میں وہ ریلوے اسپتال سے دوا لینے جاتا تھا تو سائے کی طرح ایک آدمی اس کا تعاقب کرتا تھا لیکن ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ چراغ دین محض اسے ذلیل کرنے کے لیے اس سے کام لیتا تھا لیکن بعد میں وہ ڈرنے لگا تھا۔ اس نے دلاور سے کہا تھا کہ وہ تو میرے اعصاب پر سوار ہوگیا ہے۔ اس نے میرے گھر کو آسیب زدہ کردیا ہے۔ مجھے خوف آتا ہے اس کی مسکراہٹ سے اور اس کے ہونٹ ہلتے دیکھ کر۔ ایسا لگتا ہے کہ میں نے اسے ہاتھ بھی لگایا تو مجھے کچھ ہوجائے گا۔ کسی دن وہ اچانک مجھے جلالی نظروں سے دیکھے گا اور میرا وجود پانی بن کے بہہ جائے گا یا جل کے خاک ہوجائے گا۔

ولاور اسے سمجھاتا تھا کہ وہ تو پاگل ہوگیا ہے۔ صدمے سے وزیر خان کا دماغ چل گیا ہے۔ پہلے اسے نانی یاد آگئی ہوگی اور چھٹی کا دودھ یاد آگیا ہوگا۔ اب خدا یاد آیا ہے۔ نماز اور تلاوت سے کسی کو نقصان کیسے ہوسکتا ہے۔ تیرا گھر تو آسیب سے اور بلاؤں سے محفوظ ہوگیا ہے۔ چراغ دین نے وزیر خان کو کام سے منع کردیا اور کہا کہ وہ اپنے کمرے سے باہر نہ نکلے۔ وہ خود وزیر خان کا بہت خیال رکھنے لگا۔ اس کو جو کمرا پہلے ملا ہوا تھا وہ سرونٹ کوارٹر تھا۔ بعد میں اسے کوٹھی کا ایک بیڈروم دے دیا جس میں آرام و آسائش کے سب اسباب مہیا تھے۔ ایک بہت اچھا ڈاکٹر ہر روز اس کو دیکھنے کے لیے آنے لگا۔ اس کی خوراک اور آرام کا خیال رکھنے کے لیے چراغ دین نے ایک نوکر بھی رکھ دیا۔ وہ خود بھی اکثر وزیر خان سے پوچھتا رہتا تھا کہ کوئی تکلیف تو نہیں ہے۔ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے اور وزیر خان جواب میں ہمیشہ یہی کہتا تھا کہ شکر ہے اس مالک کا جس نے مجھے ہر تکلیف اور ضرورت سے بے نیاز کیا۔ پھر دلاور نے ایک چال چلی۔ اس نے وزیر خان کے ایک پرانے نمک خوار کو تلاش کیا جس کو بہت پہلے نکال دیا گیا تھا۔ اسے چراغ دین کی کوٹھی پر وزیر خان سے ملنے کے لیے بھیجا گیا۔ وہ وزیر خان کی حالت دیکھ کے بھونچکا رہ گیا اور رونے لگا کہ مالک یہ کیا ہوگیا۔ وزیر خان نے کہا کہ کچھ بھی نہیں ہوا۔ مگر وہ بھی پیچھے ہی پڑ گیا تو راز داری کے وعدے پر اور قرآن کی قسم دے کر وزیر خان نے اسے دلاور کی پوری سازش کی کہانی سنادی۔ وہ شخص تو جیسے پاگل ہوگیا۔ اس نے صاف کہہ دیا کہ نہ کوئی وعدہ اور نہ قسم۔ میں جاتا ہوں اخبار والوں کے پاس اور وکیلوں کے پاس۔ وزیر خان نے کہا کہ ایسے سکندر بخت کو نقصان ہوگا۔ دلاور نے جو کیا وہ اپنی جگہ مگر سکندر کو کچھ ہوا تو اس کا ذمے دار تو ہوگا۔ یہ لوگ سکندر بخت کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ خدا نے ظالم کی رسی کو اتنا دراز نہیں کیا کہ وزیر خان کی گردن کا پھندا اس کے بیٹے کے گلے میں بھی پڑ جائے۔ ہر روز ایک ہی دعا مانگتا ہوں خدا سے لیکن اپنے لیے نہیں، خدا نے مجھے سب کچھ دے دیا تھا۔ اب مجھے اپنے لیے کسی دعا کی ضرورت نہیں۔ زندگی جتنی بھی ہے خدا کے اختیار میں ہے۔ اس میں نہ میری کوشش سے ایک سانس کا اضافہ ہوسکتا ہے اور نہ دلاور ایک سانس کم کرسکتا ہے۔ میں دعا مانگتا ہوں سکندر بخت کے لیے کہ جب وہ واپس آئے تو اس کو حق اور انصاف دینا۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ لوٹ کر آئے گا تو اسے سب معلوم ہوجائے گا۔ وہ خود معلوم کرلے گا۔ اور وہ بھی وزیر خان کا خون ہے۔ جو اس کا حق ہے وہ [illegible] حاصل کرے گا۔ میرا جو کچھ تھا اسی کا تھا اور رہے گا۔ وقتی طور پر کسی کے قابض ہوجانے سے حق ختم نہیں ہوتا۔ میری اپنی زندگی اب زیادہ نہیں ہوگی۔ مجھے اس دنیاوی مال و متاع کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ یہ سب کچھ سکندر بخت کے پاس ہی جاتا تھا۔ ہر ختم قرآن کے بعد میں سکندر بخت کے لیے خدا سے تحفظ اور سلامتی مانگتا ہوں۔ باقی کام وہ خود کرے گا۔ اسی یقین کی وجہ سے میں مطمئن ہوں اور میرے اطمینان نے چوہدری دلاور کا سکون چھین لیا ہے۔ سکندر بخت جب بھی آیا سب حساب برابر کردے گا۔ میرا بھی اور اپنا بھی۔ چوہدری دلاور نے چھپ کر یہ ساری گفتگو سُنی تھی۔ وہ اتنا پریشان ہوا کہ اس نے فوری طور پر دو فیصلے کیے۔ ایک وزیر خان کو قتل کرنے کا اور دوسرا سکندر بخت کو۔ اس زمانے میں میر شرافت علی کا بھی حال خراب تھا۔ وزیر خان کے ساتھ ہونے والے ظلم کے احساس نے اسے پشیمانی میں مبتلا کررکھا تھا۔ وہ احساس جرم کا بھی شکار تھا۔ اسے یہ خوف بھی تھا کہ وزیر خان کے بعد اس کا اپنا بھی ایسا ہی انجام نہ ہو۔ اس نے چوہدری دلاور کے خلاف اپنا دفاع مضبوط کرلیا تھا اور اسے صاف بتادیا تھا کہ وہ ایسی بات کبھی نہ سوچے کہ سارے کاروبار پر اکیلا قابض ہوجائے گا۔ اگر اس نے میر شرافت علی کو وزیر خان سمجھنے کی غلطی کی تو یہ غلطی خودکشی کے مترادف ہوگی۔ دلاور نے بھی سمجھ لیا تھا کہ میر شرافت علی نے اس کے خلاف اتنا مواد اکھٹا کررکھا ہے جو اسے تختہ دار تک پہنچا سکتا ہے۔ ایک بار نہیں سو بار۔ جب دلاور نے میر شرافت علی سے اپنے فیصلے کا ذکر کیا تو اس نے مخالفت کی۔ اس نے کہا کہ دلاور، ہم نے اس کا سب کچھ لے لیا ہے۔ اب اسے سکون سے الگ بیٹھا رہنے دو۔ اس کو قتل کرنے کا گناہ مت کرو۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ سکندر بخت سے ڈرتے ہو تو اسے بلالو یا اس کی واپسی کا انتظار کرو۔ جب وہ پاکستان آئے تو اس سے سودا کرو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ سب کچھ معلوم کرلے گا۔ تم اس سے کہہ سکتے ہو کہ چلو جو ہوا اس کا جرمانہ لے لو اور قانون کے چکر میں مت پڑو۔ اسے اتنی دولت دے دو کہ وہ تمام عمر لندن میں بیٹھ کے خرچ کرنا چاہے تو کم نہ پڑے۔ اتنا عرصہ لندن میں رہنے کے بعد وہ خود کب چاہے گا کہ اس جھمیلے میں پڑے۔ وہ لندن میں سیٹل ہوکے کوئی کاروبار کرلے گا اور پھر وہیں کسی گوری میم سے شادی کرلے گا۔ میری اطلاع کے مطابق وہ کسی لارڈ کی بیٹی کے عشق میں مبتلا ہے اور یہ فیصلہ پہلے ہی کرچکا ہے۔ اس لڑکی کا نام غالباً الزبتھ ہے۔ دلاور کو یہ تجویز پسند آئی لیکن ڈی سلوا نے اس سے کہا کہ چوہدری صاحب، فرض کریں وہ نہ مانا۔ ہے تو پٹھان کا سپوت اور نئے زمانے کا آدمی۔ ایسا نہ ہو کہ وہ آپ کی پیش کش آپ کے منہ پر مارے اور کہے کہ یہ سب تو میرا ہے۔ میں لے ہی لوں گا، پہلے وزیر خان کے ساتھ ہونے والے ظلم کا حساب دو۔ ڈی سلوا نے یہ تجویز دی کہ سکندر بخت شرافت سے نہ مانے تو اسے مجبور کردیا جائے۔ اس کو کسی ماہر شکاری کی طرح گھیر کر اور ہانک کر یہاں اپنی شکار گاہ تک لایا جائے اور اس پر واپسی کے سارے راستے بند کردیے جائیں۔ جب وہ محصور ہوجائے تو اس کے سامنے دونوں متبادل رکھ دیے جائیں۔ یا تو ہماری منافع بخش پیش کش قبول کرو، ورنہ تمہاری تو ایسی کی تیسی۔ دلاور کو یہ تجویز زیادہ پسند آئی۔ اس نے وزیر خان کو

[illegible]انے کا فیصلہ نہیں بدلا لیکن طریقہ وہ اختیار کیا جس سے میر [illegible]فت علی کو شک نہ ہو۔ اس نے چراغ دین کے اس نوکر کو خرید [illegible] وزیر خان کی خدمت پر مامور تھا۔"

رابعہ نے ایک گہری سانس لی "اس نے وزیر خان کو زہر [illegible]؟"

"ہاں۔ وہ اس کے کھانے میں تھوڑا تھوڑا سنکھیا ملاتا گیا۔ [illegible]ر کی ہدایات کے مطابق۔ دلاور اس معاملے میں بہت محتاط تھا۔ [illegible]کھیا کی یومیہ مقدار خود فراہم کرتا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ وزیر خان [illegible]یک نہ مرجائے اور شرافت علی کو شک نہ ہوجائے۔"

"یہ نوکر کون تھا؟ تم اسے جانتے ہو؟"

"بہت اچھی طرح۔ اس کا نام بھی اور پتا بھی۔"

"وہ زندہ ہے؟"

"ہاں۔ زندہ ہے اور اسی شہر میں ہے۔ اب تو بہت معزز ہوگیا ہے اس دولت سے جو اسے دلاور نے اس کی کارگزاری پر خوش ہو کے انعام میں دی تھی۔"

"پیڈرو۔ یہ خیال رکھنا کہ جھوٹ اور مبالغہ نہیں ہونا چاہیے۔ خود کو بے گناہ ثابت کرنا تمہارا حق ہے لیکن تم کسی کو بے وقوف نہیں بناسکتے۔"

"مس رابعہ۔ یہ سب کچھ میں اس لیے بتارہا ہوں کہ میں مرنا نہیں چاہتا، میں زندہ رہنے کی کوشش کررہا ہوں۔"

"وزیر خان کی موت کا میر شرافت علی پر کیا اثر ہوا تھا؟"

"اس کا نروس بریک ڈاؤن ہوگیا تھا۔ وہ اعصابی مریض بن گیا تھا۔ اس نے کارخانے کے آفس میں بیٹھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ اس نے دلاور سے کہہ دیا تھا کہ میرا کام کسی اور کے سپرد کرو۔ منافع میں میرا حصہ مجھے دیتے رہو۔ بعد میں اس نے کہا کہ سارا کاروبار تم سنبھالو۔ مجھے میرے حصے کی رقم دے دو۔ میں الگ ہونا چاہتا ہوں۔ دلاور نے اس کے حصے کی جو قیمت لگائی وہ بہت کم تھی۔ مگر میر شرافت علی نے وہ بھی قبول کرلی۔ دوسری طرف ڈی سلوا بڑی ہوشیاری سے چوہدری دلاور کو راستہ دکھا رہا تھا۔ وہ انتہائی ذہین آدمی تھا۔ زندگی کے ایک حادثے نے غلط راہ پر ڈال دیا ورنہ وہ بہت ترقی کرتا اور عزت پاتا۔ اس نے سکندر بخت کو لندن سے لاہور لانے کی پوری اسکیم تیار کی تھی۔ اسی نے دلاور کو یہ لائن دی کہ میر شرافت علی سے بات کرتے رہو۔ سودا فائنل مت کرو۔ وہ ہمت ہار بیٹھا ہے اور ہمارے لیے خطرناک ہوگیا ہے۔ ایسا نہ ہو کسی دن ضمیر کی [illegible] کے چکر میں خود تھانے پہنچ جائے اور اپنے ساتھ ہمیں بھی مروادے۔ اس کی نگرانی ضروری ہے۔ یہ ڈی سلوا ہی کا پلان تھا کہ ایک تیر سے دو شکار کیسے ہوسکتے ہیں۔ اس نے بڑی مہارت سے منصوبہ بنایا کہ جیسے ہی سکندر بخت لاہور پہنچے اس کی ملاقات میر شرافت علی سے کرادی جائے اور سکندر بخت کو میر شرافت علی کے قتل میں ملوث کردیا جائے۔ ایک حصے دار کا قتل، ایک وارث کو اس قتل میں پھانسی کی سزا۔ چوہدری دلاور کے سارے مسائل ختم۔"

رابعہ نے غصے سے کہا "اور اس طرح تم نے سکندر بخت کو پھنسادیا؟"

"میں نے....؟"

"ہاں تم نے۔ تم ہی اسے میر شرافت علی کے گھر لے گئے تھے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے مگر جو کچھ وہاں ہوا..."

رابعہ نے کہا "کیا تمہیں معلوم ہے وہاں کیا ہوا تھا؟"

"سکندر کی گرما گرمی ہوگئی تھی میر شرافت علی کے ساتھ اور اچھی خاصی مارپیٹ ہوئی تھی۔ سکندر نے سامان توڑ پھوڑ ڈالا تھا۔ کوئی چوٹ ایسی لگی تھی کہ میر شرافت علی مرگیا۔"

"یعنی یہ سب تم دیکھ رہے تھے۔ باہر سے تم ٹیکسی لے کر رخصت ہوگئے تھے مگر پھر لوٹ آئے تھے اور کسی طرح اندر چلے گئے تھے۔ تم کو معلوم تھا وہاں کیا ہوگا؟"

"نہیں جی۔ میں وہی بتارہا ہوں جو میں نے سنا تھا۔"

"کس سے سنا تھا؟" رابعہ بولی۔

"اندر نوکر چاکر سب ہی دیکھ رہے تھے۔"

رابعہ نے کہا "انہی نوکروں کے ساتھ تم بھی تھے۔ نوکروں نے اپنے آقا کو بچانے کی کوشش کیوں نہیں کی تھی۔ پولیس کو فون کیوں نہیں کیا تھا؟"

"پولیس اتنی جلدی کہاں آتی ہے؟"

"وہ شور ہنگامہ کرکے پاس پڑوس کے لوگوں کو اکھٹا کرسکتے تھے۔ لیکن تم سب خاموش تماشائی بنے دیکھتے رہے اور جب سکندر چلا گیا تو تم نے میر شرافت علی کو خود ماردیا۔"

"میں تو...باہر ملا تھا سکندر کو۔ گاڑی ٹھیک کررہا تھا۔ اور مس رابعہ، بات تھی وزیر خان کے قتل کی۔ سکندر کا مجرم تب ہوتا میں جب مجھ پر وزیر خان کے قتل کا الزام ہوتا۔ میں نے بتادیا ہے کہ میرا اس میں بالکل ہاتھ نہیں تھا۔ دلاور کے حکم پر یہ کام چراغ دین کے ایک نوکر نے کیا تھا۔ خود چراغ دین اب دنیا میں نہیں ورنہ سکندر اسے بھی نہ چھوڑتا حالانکہ اس نے دلاور کی مخالفت کی تھی۔ میر شرافت علی نے بھی وزیر خان کو بچانا چاہا تھا۔ ہاں ڈی سلوا نے دلاور کو قتل پر اکسایا تھا۔ اس کی عملی منصوبہ بندی کی تھی۔ اسے شریک جرم سمجھا جاسکتا تھا مگر وہ بھی مرچکا ہے۔"

"تم نے میر شرافت علی کو قتل کیا تھا یا نہیں؟"

"آپ مانیں گی نہیں۔ مگر میرا جواب ہے نہیں۔"

"پیڈرو۔ یہ عدالت نہیں ہے۔ یہاں میرے سوا کوئی موجود نہیں جو تمہارے خلاف گواہی دے کہ تم نے کیا کہا تھا؟"

"میں پھر کہوں گا کہ اسے قتل کرنے والا میں نہیں تھا۔"

رابعہ نے کہا "لیکن تم وہاں موجود تھے۔ تم نے قتل ہوتے

دیکھا تھا۔"
"یہ مان سکتا ہوں میں۔"
"قتل کسی ملازم نے کیا تھا؟" رابعہ نے وکیلانہ جرح جاری رکھی۔
"ہاں۔ وہ بھی مارا گیا تھا بعد میں۔"
رابعہ بولی "تم نے اس سے کہا تھا کہ شرافت علی کو مار ڈالو؟ بولو' جواب کیوں نہیں دیتے؟ تمہاری خاموشی ہی اعترافِ جرم ہے۔ اسی لیے تم اصرار کر رہے تھے کہ شرافت علی کا قتل تم نے نہیں کیا۔ وہاں تم پاس تھے۔ تم نے اپنے ہاتھوں سے مارنے کے بجائے تم نے حکم دیا کہ اسے ختم کردو اور پھر سکندر کے باہر آنے سے پہلے تم نکل آئے۔ سڑک پر کھڑی ہوئی اپنی ٹیکسی ٹھیک کرنے لگے۔"
"مس رابعہ۔ یہ سب باتیں آپ کے کس کام کی۔ اگر میں نے میر شرافت علی کو قتل کیا ہوتا۔ خود اپنے ہاتھوں سے تب بھی اس معاملے کا سکندر بخت سے کیا تعلق۔ ایسے تو میں نے نہ جانے کتنے قتل کیے ہیں زندگی میں۔"
رابعہ نے کہا "کبھی حساب نہیں رکھا؟ سنچری ہوئی یا ہاف...؟"
پیڈرو ہنسنے لگا "توبہ جی۔ میرے حساب سے گیارہ قتل کرنے پڑے مجھے۔ خود اپنے ہاتھوں سے۔ مگر اس کاروبار میں یہ تو ہوتا ہے۔ جو بھی راستے میں آئے یا خطرہ بنے اسے راستے سے ہٹانا پڑتا ہے۔ شوقیہ قتل کوئی بھی نہیں کرتا اور جہاں پیسہ یا دھمکی کافی ہو یا قاتلانہ حملے کا ڈراما چل جائے وہاں قتل کرنا بھی نہیں چاہیے۔ ایسے چھوٹی چھوٹی باتوں پر قتل ہوتے تو روز کوئی مارا جاتا میرے ہاتھوں۔ خود چوہدری دلاور کے دوسرے معاملات کو چھوڑ دیں۔ اس سے صرف وزیر خان کا حساب لیں۔ اس کے مال کا اور اس کی جان کا۔ مجھ سے آپ نے کہا تھا کہ اگر وزیر خان کو تم نے قتل نہیں کیا تھا اور تم شریکِ جرم بھی نہیں تھے تو تمہیں وعدہ معاف گواہ بنالیا جائے گا' میں نے سب بتا دیا۔"
"ابھی بہت کچھ باقی ہے پیڈرو۔"
"وزیر خان کے بارے میں بتانے کو اب کچھ نہیں رہا۔"
"ابھی وہ بات نہیں ہوئی۔ جس کی خاطر ہم تمہیں یہاں اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔"
پیڈرو نے کہا "اچھا۔ وہ بات..... وزیر خان کی لاش کو میں نے کہاں دفن کیا تھا؟"
"ہاں۔ تم اس جگہ کی نشاندہی کروگے؟"
"میں کوشش کروں گا۔"
"تمہاری کوشش کی کامیابی پر ہی تمہاری زندگی کا انحصار ہے۔ یہ بات ہوگئی تھی۔"
"اب تم لوگ کیسے مار سکتے ہو مجھے۔ تمہیں میری ضرورت ہے۔ میری مدد کے بغیر تم وہ سب معلومات حاصل نہیں کرسکتے جو تمہارے لیے بے حد ضروری ہیں۔ زبردستی تم کر کے دیکھ لو۔"
رابعہ نے کہا "زبردستی نہیں ہوگی۔ ہمارے اور تمہارے درمیان ابھی صرف وزیر خان کا معاملہ ہے۔ بے شک یہ سکندر کا جذباتی مسئلہ ہے۔"
"لیکن وہ تمہارا جذباتی مسئلہ ہے" پیڈرو ہنسا۔
"ہم سب ایک دوسرے کے لیے ایسے ہی جذبات رکھتے ہیں" رابعہ نے مشتعل ہو کے کہا "ہمارے درمیان دوستی' انسانیت اور شرافت کے وہ رشتے ہیں جن کو سمجھنا تمہارے لیے ممکن ہی نہیں۔ چلو چھوڑو یہ بھی' وقت کم ہے۔ مجھے بتاؤ کہ کیا وزیر خان کی قبر تم نے کھودی تھی؟"
"کیا میں گورکن ہوں؟"
"ٹھیک ہے تم نے پیسے دیے تھے اور کام گورکن نے کیا تھا؟"
"مجھے دلاور کا حکم تھا اور میں انکار نہیں کرسکتا تھا۔ ہر آدمی مجبور ہوتا ہے۔"
"یہ کام تم نے کب کیا تھا؟"
"ظاہر ہے رات کے وقت۔ گورکن نے کہا تھا کہ آپ مغرب کے بعد کسی وقت بھی آ کے ہڈیاں لے جانا مگر میں نے کہا کہ نہیں' میں رسک نہیں لے سکتا جب میں آؤں تب قبر کھودنا۔"
"اس میں رسک کیا تھا؟"
پیڈرو بولا "کچھ گورکن بڑے بدمعاش ہوتے ہیں۔ وہ مُردوں کی ہڈیاں اور ڈھانچے بیچنے کا دھندا کرتے ہیں۔ میڈیکل کے طلبا انہیں اچھی قیمت دیتے ہیں۔ مجھے شک تھا کہ وہ پہلے سے رکھی ہوئی ہڈیاں بوری میں ڈال کے مجھے پکڑا دے گا۔ یہ کام وہ دن میں آسانی سے کرلیتے ہیں پھر رات کو تکلیف اُٹھانے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ مجھے بھی مروا دیتا اور دلاور کو بھی۔ اگلے دن مجسٹریٹ کی موجودگی میں پوسٹ مارٹم کے لیے قبر کھودی جاتی تو اصل لاش نکل آتی۔ دلاور تو مجھے زندہ نہ چھوڑتا۔ وہ سمجھتا کہ میں نے حرام خوری کی اور کسی قبرستان سے ہڈیاں خرید لایا۔"
"چنانچہ تم نے خود اپنی نگرانی میں قبر کھدوائی اور ہڈیاں ساتھ لے گئے۔ پھر انہیں کہاں دفن کیا؟"
"نور پور شاہان اور سید پور کے درمیان۔ کچھ نشانیاں میرے ذہن میں ہیں۔ مس رابعہ' ایک بات بتاؤ' تم اتنی تفصیل سے ہر بات کیوں پوچھ رہی ہو؟"
"تم جانتے ہو؟"
"میرا مطلب تھا تمہیں بالکل فکر نہیں۔ ابھی دو لاشیں پڑی تھیں یہاں۔ وہ عام لوگ نہیں تھے۔ ہم جیسے لاوارث بدمعاش' ایک وزیر تھا اور دوسرا اس کا باڈی گارڈ۔ اگر کوئی ان کو تلاش کرتا ہوا یہاں آگیا تو کیا ہوگا؟"
"فکر تو مجھے بھی ہو رہی ہے۔ اتنی دیر ہوگئی ہے ان لوگوں کو

"ویری گڈ پیڈرو۔ کس قدر ذہانت کی بات کی ہے تم نے۔"
"تم سب دوسرے کمرے میں تھے۔ نازو کے ساتھ۔ کیا کر رہے تھے وہاں تم دم سادھے؟"
"میں ایک وظیفہ پڑھ رہا تھا۔ ایک بھوت سے جان چھڑانے کے لیے جو میرا سسر بننے پر آمادہ ہے۔" غالب نے کہا۔
میں نے نازو کے ردِعمل سے پہلے کہہ دیا "میں تم پر شک کر رہا تھا۔ اتنی باتیں رابعہ نے کبھی مجھ سے ایک نشست میں نہیں کی ہوں گی۔"
"بکواس کرتے ہو تم سب..... اس طرح باتیں سننے کا ضرور کوئی مقصد ہوگا۔ ضرور تم نے وہ سب ریکارڈ کرلیا ہوگا" پیڈرو چلانے لگا۔
اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میرا دل بیٹھ گیا۔ غالب کا ہاتھ آگے بڑھا اور رُک گیا۔ رابعہ اور نازو کے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا۔
پیڈرو نے کہا "اب کیا ہوگیا۔ فون اُٹھانے کی ہمت نہیں ہے کسی میں۔ اچھا میں اُٹھاتا ہوں۔"
میں نے اس کے ہاتھ پر کِک ماری "مجھے غصہ مت دلاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ تمہاری لاش یہیں پڑی رہ جائے۔"
پیڈرو کراہتے ہوئی گالیاں بکنے لگا "تم سب پکڑے جاؤ گے جیسے چوہے دان میں چوہا پکڑا جاتا ہے۔"
"بجنے دو گھنٹی کو۔ ہم نکل جاتے ہیں" میں نے غالب سے کہا۔
غالب نے سہلایا "ہم گاڑی میں بیٹھتے ہیں۔"
"میں آتا ہوں لائٹس آف کرکے۔ اور دروازے بند کرکے" میں پیڈرو کی طرف بڑھا "تم شرافت سے چلو گے یا...؟"
پیڈرو کے کچھ کہنے سے پہلے کال بیل بجی۔ میں اُچھل پڑا۔ پیڈرو نے قہقہہ لگایا۔

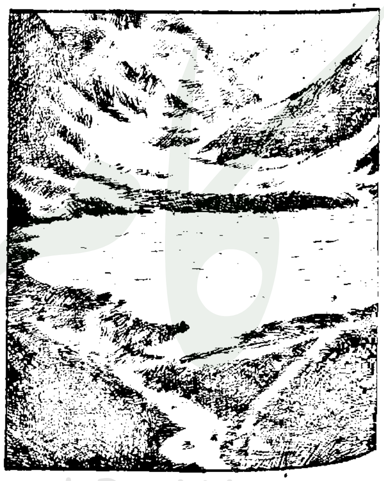

گئے ہوئے" رابعہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔
"یہ بھی عجیب سا لگتا ہے کہ دوسرے کمرے میں نازو اطمینان سے بیٹھی ہے۔ ایسی صورتِ حال میں کون مطمئن رہ سکتا ہے؟"
اب میں اور غالب پھر پچھلی طرف سے نکل کر باہر آئے اور ہم نے گاڑی کے انجن کو اسٹارٹ کرکے بند کردیا۔ پھر غالب نے گیٹ کھولا اور میں گاڑی کو باہر لے گیا۔ عباسی اور اس کا محافظ اسی طرح بے خبر پڑے ہوئے تھے۔ رابعہ کا انٹرویو ایک گھنٹے جاری رہا تھا اور یہ وقت ہم نے سخت پریشانی میں گزارا تھا۔ میرے اعصاب پر یہ خوف بھی سوار تھا کہ اچانک کوئی عباسی کو تلاش کرتا ہوا آگیا تو ہماری مشکلات میں اضافہ ہوجائے گا۔ گاڑی اندر موجود تھی اور اس میں عباسی بھی لاش کی طرح پڑا ہوا تھا۔ ہمارے پاس اس کے سوا چارہ نہ ہوتا کہ عباسی کی تلاش میں آنے والے کو بھی گاڑی میں لٹائیں اور فرار ہوجائیں۔
پیڈرو کی باتیں سُن سُن کے میرا خون الگ کھول رہا تھا۔ پُرانے زخم پھر تازہ ہوگئے تھے اور یادوں کے ناسور پھر بہنے لگے تھے۔ غالب میرے ساتھ نہ ہوتا تو شاید میں اپنے آپ پر قابو نہ رکھ پاتا۔ وہ بار بار مجھے تھپکی دے کر یہ احساس دلاتا تھا کہ مجھے ضبط سے کام لینا ہوگا ورنہ ہماری ساری محنت رائگاں جائے گی۔ رابعہ نے بڑی ذہانت سے ہر سوال کیا تھا اور نازو نے سب ریکارڈ کرلیا تھا۔ اس نے کئی بار اشاروں میں بتایا کہ سب بالکل ٹھیک جا رہا ہے۔
رابعہ نے بات ختم کی تو ایک دم سب ایکشن میں آگئے۔ نازو نے اپنا ریکارڈنگ کا سامان سمیٹ لیا اور احتیاط سے سوٹ کیس میں رکھ دیا۔ اس سوٹ کیس میں ہمارے کپڑے تھے اور ایک لاکھ سے کچھ کم رقم تھی۔ غالب نے اسے بھی گاڑی میں منتقل کیا۔ پھر ہم سب نے کپڑے سے ہر اس جگہ کو صاف کرنا شروع کیا جہاں ہمارے فنگر پرنٹ ملنے کا امکان تھا۔ پیڈرو سب حیرانی سے دیکھتا رہا۔
"تم واقعی انہیں راول ڈیم میں پھینک آئے ہو؟" اس نے پوچھا۔
میں نے کہا "راستے میں ارادہ بدل گیا۔ ہم نے سوچا کہ دو پھیرے کیوں کریں تمہیں بھی ساتھ ہی لے جائیں اور غرق کردیں۔"
غالب نے کہا "چلو اُٹھو۔"
"تم نے کوئی ڈراما کیا ہے میرے ساتھ۔ تم کہیں بھی نہیں گئے تھے۔ تم انہیں گاڑی سمیت راول ڈیم میں پھینکنے کا ارادہ رکھتے تھے پھر گاڑی کیوں واپس لے آئے ہو؟ شک تو مجھے ہوا تھا تمہارے واپس آنے پر۔ دور سے آنے والی گاڑی پاس آ کے رُک جائے تو انجن کی آواز ایسے نہیں سُنائی دیتی جیسے کسی نے اسٹارٹ کیا اور بند کردیا۔ گاڑی وہیں کھڑی ہوئی تھی..... جانے کا ڈراما بھی ایسا ہی ہوگا۔"

"لو۔ اب کرلو جو کرنا ہے۔ آگئے تمہارے حمایتی ۔۔۔۔۔۔"

پیڈرو ہم سب کی صورت پر اڑتی ہوئی ہوائیاں دیکھ کے بہت خوش تھا۔

ایک لمحے کے لیے مجھے اس کی ہنسی نے اتنا مشتعل کیا تھا کہ میں شاید اس کا گلا گھونٹ دیتا۔ نازو نے زیادہ سمجھداری سے کام لیتے ہوئے پیچھے سے ہاتھ مار کر اسے خاموش کردیا۔

"اس وقت کون آگیا!" رابعہ نے پرخیال انداز میں کہا۔

"اس وقت کسی کے آنے پر پابندی نہیں ہے۔ ویسے بھی گاہک اور موت کا کوئی وقت مقرر نہیں" غالب بولا۔

"میں دیکھتا ہوں" میں نے نازو کو اشارہ کیا "تم میرے پیچھے رہو۔"

نازو نے مجھے پیچھے کردیا۔ "تم نہ جاؤ کسی کے سامنے تو بہتر ہے۔ بات میں کرتی ہوں۔"

نازو نے بڑے گیٹ میں بنا ہوا چھوٹا گیٹ کھولا۔ جھری سے مجھے ایک جیپ نظر آئی۔ ایک شخص ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ دوسرا گیٹ سے کچھ فاصلے پر ۔۔ بانہ انتظار کررہا تھا۔

"ملک صاحب ہیں جی؟"

نازو نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا "کیا کام ہے تمہیں؟"

"کام۔۔۔۔ تو کچھ نہیں ہے جی۔ یہ کچھ چیزیں منگوائی تھیں انہوں نے۔"

"وہ ایوان صدر گئے ہیں کسی ضروری کام سے، تم چیزیں دے جاؤ" نازو بولی۔

"اچھا جی۔ ملک صاحب کو بتادیں کہ مری سے راجا شاہنواز ٹھیکے دار خود آیا تھا" اس نے خود پر زور دے کر کہا اور پھر ڈرائیور سے مخاطب ہوگیا "اوئے پوستی، سامان اٹھا کے لا ادھر۔"

پوستی اس کا نام بالکل ٹھیک تھا۔ وہ کاہلی سے اترا اور انتہائی مجبوری اور بے زاری کے ساتھ گتے کا ایک ڈبا اٹھا کے لایا۔ یہ باکس تقریباً دو فٹ لمبا ڈیڑھ فٹ چوڑا اور اتنا ہی اونچا بھی تھا۔ اس کا وزن زیادہ نہیں تھا مگر پوستی نے اسے یوں اٹھایا جیسے اس کے اندر اتنا ہی بڑا پتھر ہے۔ نازو نے اسے اندر پہنچانے کے لیے آسانی سے اٹھالیا۔ پوستی نیند کی کیفیت میں چلتا ہوا واپس گیا۔ باول ناخواستہ ایسا ہی دوسرا باکس بھی لایا۔

"کیا ہے ان میں؟" نازو نے پوچھا۔

"وہ جی۔ ملک صاحب کو معلوم ہے" راجا نے سلام کیا اور جیپ میں بیٹھ گیا۔

نازو نے دروازہ بند کردیا "کیا ہوگا اس میں؟"

"وہی تحفے تحائف اور نذرانے" میں نے کہا "انگریز حاکم کی خدمت میں رعایا نذرانے لے کر حاضر ہوتی تھی۔ اب ہم آزاد ہیں اور خود حکمران ہیں۔"

"چنانچہ اپنوں سے بھی منہ مانگی رشوت لیتے ہیں سب ایک دوسرے کے کام کردیتے ہیں۔ جائز ہوں یا ناجائز۔ ٹھیکے دار کا کوئی کام اٹکا ہوگا۔"

غالب نے کہا "پھر بھی دیکھ لینا چاہیے۔ اس میں کوئی بم وغیرہ نہ ہو۔"

"بم ایک ہی کافی تھا" رابعہ بولی۔

میں نے کہا "اس کے علاوہ بم ہوگا تو پھٹ جائے گا۔ ہمیں معلوم ہوجائے گا۔ دیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔"

دونوں ڈبے بھی گاڑی میں رکھ دیے گئے تو میں اندر سے پیڈرو کو اٹھا کے لایا اور گاڑی کے پچھلے حصے میں ڈال دیا۔ رابعہ میرے ساتھ بیٹھ گئی۔ غالب کے ساتھ نازو، اس نے گیسٹ ہاؤس کو مقفل کرکے چابیاں دور پھینک دی تھیں۔

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ راجا شاہنواز کے سوا کوئی بھی گیسٹ ہاؤس نہیں پہنچا اور ہم خیروعافیت کے ساتھ نکلنے میں کامیاب رہے۔

"اب پہلا کام یہ کرو کہ ملک صاحب سے جان چھڑاؤ" رابعہ بولی۔

"یہ بھی بتادو کہ کیسے؟" میں نے کہا۔

غالب بولا "میں دروازہ کھول کے ملک صاحب اور مسٹر مونچھ کو باہر گرادیتا ہوں۔ جب بھی آنکھ کھلے گی کپڑے جھاڑ کے اٹھیں گے اور گھر چلے جائیں گے۔ اپنی کسی بیوی کے پاس۔"

"اپنی پسندیدہ بیوی کے پاس" میں نے تصحیح کی "بڑے لوگوں کے مزے ہیں یار۔ ضرورت، خواہش اور موڈ کے مطابق انہیں ہر چیز مل جاتی ہے۔ یہاں گرمی پڑے تو مری کی کوٹھی ہے۔ سردی ہو تو کراچی۔"

"بے وقوف انسان۔ ان کا اپنا موسم ہوتا ہے۔ گرمی سردی سے انہیں فرق نہیں پڑتا۔ ائرکنڈیشنر اور ہیٹر ہر جگہ موجود ہیں۔ گھر میں، دفتر میں اور گاڑی میں۔ ہاں بیویاں انہیں موڈ اور ضرورت کے مطابق دستیاب ہیں۔ ایک سنجیدہ مشیر اور منتظم، دوسری شوخ اور سوشل۔ تیسری اعلیٰ ذوق کی حامل دانشور ٹائپ۔ ایک کالی، دوسری سانولی، تیسری گوری۔ ایک موٹی تازی تو دوسری اسمارٹ اور سلم۔"

نازو نے کہا "بڑا رشک آرہا ہے تمہیں۔"

غالب بولا "کیوں نہ آئے مس نازو۔ ایک ہم ہیں کہ جو بھوت کی بچی چمٹ گئی سو چمٹ گئی ساری عمر کے لیے۔"

رابعہ نے اسے شرمندہ کرنے کی کوشش کی "محبت میں وفا تو ایک سے ہی ممکن ہے۔"

غالب نے آہ بھری "ہاں۔ مجبوری کا نام وفا۔"

نازو نے کہا "کوئی مجبوری نہیں، جاؤ دس کرو۔"

غالب خوش ہوا "اپنے ایمان سے کہو۔ تم برا نہیں مانوگی۔ ایک وقت میں دس تو مشکل ہیں۔ چار کی گنجائش ہوگی پھر کوئی دل سے اتر جائے یا اللہ کو پیاری ہوجائے، پاگل ہوکے گھر سے نکل جائے۔"

"پاگل تو ہوگی جو تمہارے چکر میں پڑے گی" نازو جل کے بولی۔

"یہ بات بھی ٹھیک ہے۔ تم اپنی مثال لو۔"

رابعہ نے خفگی سے کہا "یہ کیا فضول باتیں شروع کردی ہیں تم نے۔ بڑی سنگین صورت حال سے دوچار ہیں ہم لوگ۔ اس مشکل کا حل سوچو۔"

میں نے اس کے ہاتھ پر تھپکی دی۔ "فکر مت کرو۔ تمہارا یہ ازلی وابدی خادم اس وقت یہی کام کررہا ہے اور چونکہ سوچنا کام ہے دماغ کا اس لیے میرے سوا کوئی اور مثلاً غالب کیا کرسکتا ہے سوائے فضول باتوں کے۔"

غالب نے مصنوعی قہقہہ مارا "ہاہاہا۔ بس یہی فرق ہے تمہارے اور ہمارے دماغ میں دوست۔ تم ابھی سوچ رہے ہو۔ ہم نے ہنستے کھیلتے حل تلاش بھی کرلیا ہے، پوچھو کیا؟"

"ہم نہیں پوچھتے۔"

"سب سے پہلے تو ہمیں جان چھڑا لینی چاہیے اس گاڑی سے یعنی راجا صاحب کے ہاتھی سے۔ اس کو یہاں کے لوگ ضرور پہچانتے ہوں گے۔ جس حلقے سے منتخب ہوکے ملک صاحب اسمبلی میں داخل ہوئے اور پھر وزیر بنے وہاں ان کی سیاست کا آغاز برسوں قبل ہوا ہوگا۔ انہوں نے اس علاقے میں جلسے جلوس، پوسٹر اور بیان بازی سب کی ہوگی۔ اب تو خیر ہذا من فضل ربی۔ لیکن پہلے بھی وہ کم دولت مند اور بارسوخ نہیں ہوں گے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہاں ان کو جاننے اور پہچاننے والے بہت ہیں۔ ان کی سواری بھی جس سڑک سے گزرتی ہوگی۔۔۔"

میں نے کہا "ہماری خوش قسمتی ہے کہ یہ ان کی ذاتی گاڑی نہیں۔ سرکاری گاڑی ہے۔ ایسی ہی گاڑیاں دوسرے وزیروں اور اعلیٰ سرکاری افسروں کے پاس بھی ہوں گی اور نمبر کوئی اتنے غور سے دیکھتا نہیں۔ لیکن غالب کی بات سے مجھے اتفاق ہے۔ یہ گاڑی ہم جتنی جلد چھوڑ دیں اچھا ہے۔"

رابعہ نے بھی کہا "وہ تو ٹھیک ہے مگر ہماری اپنی گاڑی بھی نہیں ہے اس وقت۔"

میں نے کہا "وہ گاڑی صبح ہی ملے گی۔"

غالب بولا "یار کوشش کرلینے میں کیا حرج ہے۔ پیٹرول پمپ تو رات بھر کھلے ہی رہتے ہیں۔"

"لیکن سروس اسٹیشن بند ہوگا۔"

"اگر ہم اپنی اشد ضرورت بیان کریں۔ کوئی دکھ بھری داستان سنائیں تو ممکن ہے پیٹرول پمپ پر موجود اسٹاف ہماری مدد کرنے پر آمادہ ہوجائے۔ انہیں علم تو ہوگا کہ سروس کرنے والے کہاں رہتے ہیں۔"

رابعہ نے کہا "اس گاڑی میں پیٹرول پمپ جانا ٹھیک نہیں۔"

میں نے کہا "ابھی ہم صدر کی طرف جارہے ہیں۔"

نازو نے گھبرا کے کہا "یعنی ایوان صدر۔ پاگل تو نہیں ہوگئے ہو؟"

میں نے کہا "ملک کو وہیں پہنچادیں جہاں ہمارے بیان کے مطابق اس کو ہونا چاہیے۔"

غالب نے بھی لطف لینے کے لیے کہا "اس بہانے صدر سے بھی ملاقات ہوجائے گی۔"

"تم صدر سے ملوگے۔۔۔۔ اس وقت!"

"ظاہر ہے صدر تو ہم سے ملنے نہیں آئے گا اور وقت کی کوئی بات نہیں۔ ہر مسلمان جب چاہے خلیفہ وقت سے مل سکتا ہے۔"

نازو سمجھ گئی کہ اسے بے وقوف بنایا جارہا ہے۔ "یہ نذرانے پیش کردینا امیرالمومنین کی خدمت میں۔ اور ساتھ ہی یہ تین نمونے بھی۔ بتادینا کہ ایک تو آپ کے وزیر باتدبیر ہیں۔ دوسرے ان کے محافظ و مشیر اعلیٰ اور تیسرے ہمارے استاد محترم پیڈرو صاحب ہیں۔"

میں نے کہا "میرا مطلب تھا ہم صدر بازار کی طرف جارہے ہیں۔ وہاں ہم تمہیں سامان کے ساتھ کامران ہوٹل میں چھوڑیں گے اور پھر جائیں گے اپنی گاڑی لینے۔ ملک صاحب کو گاڑی میں ہی کہیں سڑک کے کنارے چھوڑا جاسکتا ہے۔"

"لیکن تمہیں اکیلا نہیں چھوڑا جاسکتا" نازو نے کہا۔

"کیوں، کیا ہم نادان بچے ہیں؟" غالب بولا۔

نازو نے کہا "تم پر بھروسا نہیں کرسکتے ہم۔"

رابعہ نے بھی اس کا ساتھ دیا "ہاں۔ تمہارے ذہن میں کچھ اور ہے۔ ہمیں ہوٹل میں چھوڑ کر جاؤگے تو پتا نہیں کیا کروگے۔"

"کیا مقصد ہے آخر اس تحریک عدم اعتماد کا۔ کیا میں اور سکندر تمہارے اڑائیں گے۔ آوارہ گردی کریں گے، عیاشی کریں گے۔" غالب نے کہا۔

نازو بولی "جو مطلب چاہو سمجھ لو۔"

میں نے کہا "یہ ہماری کردار کشی کی مذموم کوشش ہے۔ ہم ابھی سے ایسا نہیں کرسکتے۔"

"ہاں۔ کرنا ہی ہوگا تو یہ سب شادی کے بعد کریں گے۔ تمہیں گھر میں بٹھا کے۔ جیسا کہ شرفا کا قاعدہ ہے۔" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "لیکن ابھی ہم ایسا کام نہیں کرسکتے جس سے عاشقی کا نام بدنام ہو۔"

"وہ تو ہوچکا۔" رابعہ بولی "اب تو ہمیں صرف یہ فکر ہے کہ تم کسی وجہ کے بغیر شامت اعمال کو گلے نہ لگالو۔"

"وہ تو ہم لگا چکے ہیں" غالب نے فوراً بدلہ لے لیا۔

نازو نے کہا "ہٹو پیچھے، بے ہودہ آدمی" اور غالب نے آہ کی تو مجھے اندازہ ہوا کہ مرزا غالب نے کیا حرکت فرمائی ہوگی۔ انہوں

نے وہی کیا ہو گا جو کہا تھا۔

کامران ہوٹل کوئی بہت بڑا یا عالی شان ہوٹل نہیں تھا۔ وہاں عام لوگ قیام کرتے تھے۔ اس کے شریفانہ ماحول' محلِ وقوع اور نسبتاً کم ریٹ کے باعث ہوٹل میں جگہ کم ہی ملتی تھی۔ میں نے خود اندر جانے سے گریز کیا۔ غالب نے سوٹ کیس اتار کے نیچے رکھا۔ پھر ملک صاحب کے تحائف اُتارے۔ میں نے گاڑی آگے بڑھا کے ایک سائیڈ پر روک دی اور غالب کے واپس آنے کا انتظار کرنے لگا۔ یہ ایک چوراہا سا تھا۔ بائیں جانب سڑک سیدھی صدر بازار اور مال روڈ کی طرف جاتی تھی۔ اس پر دن کے وقت ٹریفک کا بہت رش ہوتا تھا۔ راجا بازار اور مری روڈ جانے والی بسیں' کاریں اور تانگے سب کا یہی راستہ تھا۔ ایک سڑک عین میرے سامنے گوال منڈی کی طرف جارہی تھی اور ریلوے پُل کے نیچے سے گزرتی تھی۔ گوال منڈی اور شہر کے درمیان نالہ لئی حائل تھا اور ایک زمانے میں اس پر چند فٹ چوڑا عارضی پُل بنا ہوا تھا جس پر سے صرف سائیکل یا موٹر سائیکل گزر سکتی تھی۔ بارش کے دنوں میں پل ڈوب جاتا تھا اور گارڈن کالج یا نشاط سنیما جانے والے شارٹ کٹ سے محروم ہوجاتے تھے۔ متبادل راستہ ریلوے پُل سے بائیں جانب تھا جس پر تاج محل سنیما سے پہلے پختہ پُل موجود تھا۔ تانگے والے عموماً اسی راستے سے جاتے تھے۔ یہاں میں نے ایک اور تماشا دیکھا تھا جو مجھے کسی دوسرے شہر میں دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ راجا بازار کی طرف سے سائیکل پر آنے والے جب نالہ لئی کا پل پار کرکے موڑ پر پہنچتے تھے تو ریلوے کا اوور ہیڈ برج آجاتا تھا۔ اس کے نیچے ریلوے لائنوں کا جال تھا اور یہ پُل شہر کو صدر سے ملاتا تھا۔ لوگ سائیکل کندھے پر اٹھا کے پُل عبور کرتے تھے اور صدر بازار میں جا اُترتے تھے۔ جو یہ مشقت نہیں کرسکتے تھے ان کی خدمت کے لیے نوجوان لڑکے موجود رہتے تھے۔ وہ ایک آنہ یعنی آج کے چھ پیسے میں آپ کی سائیکل اُٹھا لیتے تھے۔ پھر آپ فراغت سے پیچھے چلتے جائیں اور پل سے اتر کے دوبارہ سائیکل پر سوار ہوجائیں۔ یہ شارٹ کٹ نہ لینے کی صورت میں سائیکل پر دو میل کا راؤنڈ لگانا پڑتا تھا اور خاصے پُرہجوم' مشکل اور اونچے نیچے راستے سے گزرنا پڑتا تھا۔ اس پریشانی سے ایک آنے میں بچنا آسان تھا۔ تاہم اس وقت بھی ایسے بہت تھے جو ایک آنہ بچاتے تھے۔

غالب خاموشی سے چلتا ہوا آیا اور میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ "ایک ڈبل روم ملا ہے۔ منیجر نے بڑی مہربانی کی اور ہم چاروں کو اسی میں قیام فرمانے کی اجازت بھی دے دی۔"

"ڈبل کرایہ چارج کیا ہو گا؟"

"نہیں۔ اسے ترس آگیا ہماری مجبوری پر۔ میں نے کہا کہ ہمیں صرف رات گزارنی ہے۔ ہوٹل کے قواعد وضوابط میں اس کی گنجائش نہیں تھی۔"

"لیکن پیڈرو بھی ہے ہمارے ساتھ۔ ہم پانچ ہیں۔"

"مجھے اس وقت خیال نہیں آیا۔ خیر' دیکھی جائے گی۔ پانچویں کی گنجائش نہ نکلی تو پھر ہم میں سے ایک یعنی میں بدبخت وناہنجار اس لال رنگ کی بے ہودہ شکل والی چیز میں رات گزار لوں گا جسے رابعہ اپنی گاڑی کہتی ہے اور تمہیں بھی اس پر شرم نہیں آتی۔"

میں نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا "لیلیٰ کے اونٹ کے لیے مجنوں کے دل میں عقیدت واحترام کے کیا جذبات تھے۔"

غالب نے سہلایا "سچ کہا تم نے دوست۔ مجھے معاف کردو میں نے تمہارے جذبات مجروح کیے۔ نازو کی گدھا گاڑی بھی ہوتی تو مجھے مرسیڈیز سے زیادہ عزیز ہوگی۔"

"لیکن بیوی کی مرسیڈیز بھی ہوگی تو تمہیں اس میں بیٹھتے ہوئے اتنی ہی شرم آئے گی جتنی گدھا گاڑی میں بیٹھتے ہوئے۔"

"پھر کیا کروں یار۔ گدھا گاڑی خرید لوں شادی سے پہلے یا مرسیڈیز۔ میرا خیال ہے دونوں خرید لوں۔ آگے گدھا گاڑی میں مرزا غالب' پیچھے رسّی سے بندھی ہوئی مرسیڈیز میں مسز غالب۔ پیٹرول کی صاف بچت اور گاڑی کا انجن ہمیشہ زیرو میٹر۔ بائی دا وے کیا آپ کو معلوم ہے کہ ہمیں کس سمت میں جانا ہے۔ وہ سروس اسٹیشن کہاں ہے...."

"اگر میں غلط جارہا ہوتا تو تم مجھے ٹوک دیتے۔"

"مجھے ٹوکنا یاد نہیں رہا۔" غالب نے دانت نکال کے کہا "ہم غلط جارہے ہو واپس چلو۔"

پیچھے سے ملک نے کراہنا شروع کیا۔ پھر وہ بڑبڑانے لگا "اوئے خبیث.... آہ.... میرے اوپر.... لیٹا ہے۔"

غالب فوراً پیچھے چلا گیا۔ اس نے شراب کی آدھی بوتل کھول کے ملک صاحب سے کہا "لوجی۔ دو گھونٹ لے لو۔"

ملک نے دھکیل کر اپنے باڈی گارڈ کو الگ کیا اور سر پکڑ کے بولا "یہ.... یہ میرے سر کو کیا ہوگیا۔"

"آپ کا سر پھر گیا ہے جی۔ اس سے ٹھیک ہو جائے گا۔"

ملک نے بوتل پکڑ کے دو گھونٹ بھرے اور بولا "یہ۔ یہ میرے سر پر.... کس نے وار کیا تھا؟"

غالب نے بوتل اس سے لے کر کہا "میں نے...." اور بوتل اس کے سر پر ماری۔ ملک پھر لڑھک گیا۔ غالب نے بوتل اس کے ہاتھ میں تھمادی "پھر ضرورت پڑے تو سب پی جانا۔ مفت کی ہے اور بہت ہے۔"

میں نے کہا "یار مجھے راستہ بتاؤ' کدھر جانا ہے؟"

غالب نے سر پر ہاتھ مارا "اوہ۔ وہ راستہ تو پیچھے رہ گیا۔ دائیں جانب مڑنا تھا۔ سیروز سنیما کی طرف۔ لیکن یہ گاڑی تم سیروز سنیما کے پاس روک لینا۔ پیٹرول پمپ اور سروس اسٹیشن والے اسے پہچان نہ لیں۔ میں خود جا کے رابعہ کی گاڑی لے آؤں گا۔ یہ ہوسکتا ہے کہ مجھے چابی حاصل کرنے کے لیے سروس اسٹیشن والے کے گھر جانا پڑے یا مالک سے این او سی لانا پڑے' اس میں کچھ وقت لگ سکتا ہے۔"

میں نے کہا "گاڑی یہاں کھڑی ہوگی تو مشکوک لگے گی۔ میں ادھر ادھر کی سڑکوں پر گھوم پھر کے وقت گزاروں گا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد چکر لگا جاؤں گا۔ مجھے غیر حاضر پا کے یہ مت سمجھنا کہ پکڑ لیا پولیس نے۔"

غالب نے سہلایا "ویسے پکڑے جانے کے امکانات بھی بے روشن ہیں۔"

"سروس اسٹیشن یہاں سے کتنی دور ہے؟"

"سنیما کے پیچھے ہے۔ پانچ منٹ کی واک ہوگی۔" غالب اُتر گیا اور سنیما کی چوڑائی کے رخ پتلی سی سڑک پر غائب ہوگیا۔ اس گلی کے عین مقابل دوسری طرف کی سڑک پر ووگ ہاؤس کی وہ دکان تھی جہاں سے ایک بار میں نے اور رابعہ نے بڑے رئیسانہ انداز میں شاپنگ کی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ وہاں سے مجھے گہرے پیلے رنگ کی وہ ساری مل گئی تھی جس پر ننھے منے شوخ سفید ستارے یوں جھلملاتے تھے جیسے وہ ساری نہیں بہاروں کے روشن آسمان کا ایک ٹکڑا ہے۔ ایسی ساری میرے لیے جذباتی وابستگی سے بڑھ کر OBSESSION بن گئی تھی۔ یہ سب وقت کے ایک جادوئی لمحے کی یاد کا کرشمہ تھا جب میں نے رابعہ کو پہلی بار اچانک مقابل دیکھا تھا۔

گاڑی کو مناسب رفتار سے چلاتے ہوئے میں سیدھا کینٹ اسٹیشن کی طرف جانے والی سڑک پر لے گیا۔ اگلے چوک سے بائیں ہاتھ گھوم کے میں مال پر آگیا۔ وہاں سے پھر دائیں طرف مڑا اور مال پر چلتا ہوا پلازا سنیما کے سامنے ایم اسمٰعیل ٹیلرز تک گیا اور دائیں جانب کی سڑک سے دوبارہ سیروز سنیما پہنچ گیا۔ اس راؤنڈ میں دس منٹ بھی نہیں لگے تھے اور اتنی جلدی غالب کے لوٹ آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن میں کیپٹل سنیما اور کنٹونمنٹ جنرل اسپتال کی طرف سے میس گیٹ کا راؤنڈ لگا کے پہنچا تو رابعہ کی گاڑی مجھے جی پی او کا موڑ کاٹتے ہی نظر آگئی۔

غالب بلاوجہ اس کا بونٹ اُٹھائے انجن کا معائنہ کرکے وقت گزار رہا تھا "بہت دیر کی مہرباں آتے آتے۔"

میں نے کہا "یہ دوسرا پھیرا تھا۔ تم تو معلوم ہوتا ہے گئے اور آگئے۔"

"ہاں۔ وہ شریف النفس نوجوان جس نے مجھ سے گاڑی سروس کے لیے وصول کی تھی سروس اسٹیشن پر ہی سو رہا تھا۔ میں نے اسے جگا کے ایک جھوٹ بولا مگر اس سے کام نہیں چلا۔ پھر سو روپے پیش کیے تو وہ اندر گیا اور چابی لا کے میرے حوالے کرتے ہی سو گیا۔"

"سو روپے کس بات کے؟"

"سروس نہ کرنے کے اور احسان کرنے کے" غالب بولا۔

"خیر اب تم آگئے ہو' رابعہ کی لال پری کو کامران ہوٹل میں چھوڑ دو۔ خواتین کو تسلی دو کہ ابھی تم ہم دل وجان سے انہی کے ہیں اور وہ ہماری خیروعافیت سے واپسی کی دعائیں مانگنا جاری رکھیں۔ گاڑی اندر کے حصے میں کہیں کھڑی کرنا اور چابی رابعہ کے حوالے کرتے ہوئے بتا دینا کہ ایک گھنٹے میں ہمارے لوٹ آنے کے امکانات نوّے فیصد ہیں۔"

"میرے اکیانوے فیصد" غالب نے کہا۔

"لیکن بفرضِ محال.... ایسی کوئی بات ہوجائے...." میں نے کہا۔

"مثلاً ہمیں کوہِ قاف کی پری کے روپ میں کوئی چڑیل مل جائے جو ہمیں اغوا کرلے یا حسنِ اتفاق سے ہمیں صوفیہ لارین اور نیلو مال روڈ پر ٹہلتی ہوئی مل جائیں اور ورغلا کے بھگا لے جائیں تو وہ صبر کرلیں۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔" غالب بولا۔

"میں رابعہ کو چھوڑ کے نیلو کے ساتھ نہیں بھاگ سکتا۔"

"چلو تم صوفیہ لارین کے ساتھ بھاگ جانا" غالب نے کہا

"آپس کی بات ہے یار۔"

یہ مرحلہ خوش اسلوبی سے طے ہوگیا تو غالب پھر ملک کی گاڑی میں میرے ساتھ آبیٹھا "اب بقول شاعر۔ جاتے ہو کس طرف کو کدھر کا خیال ہے۔"

"مرزا گدھے ہو تم مگر اچھا سوال ہے۔" میں نے عرض کی "جب تم گئے ہوئے تھے تو میرے ذہن میں ایک بہت شاندار اسکیم آئی۔ تم کبھی پُل پار گئے ہو؟"

"پُل پار!"

"پُل ہر شہر میں اور ہر ندی نالے پر ہوتے ہیں مگر پنڈی میں پُل پار کی اصطلاح خاص معنی رکھتی ہے۔"

"ناچیز اپنی کوتاہ علمی کا اعتراف کرتا ہے۔"

"کبھی بازارِ حُسن دیکھا ہے یہاں کا؟"

غالب نے گرج کے کہا "استغفراللہ۔ اس کلمۂ بے حیائی پر ہم غصّے میں تھرتھر کانپنا چاہتے ہیں اور مارے شرم کے چاہتے ہیں کہ زمین پھٹ جائے... اور تم اس میں سما جاؤ۔"

میں نے کہا "یہاں پُل پار بازارِ حُسن ہے۔ راجا بازار کے چوک سے سیدھا راستہ ہے۔"

"سیدھا راستہ یعنی صراطِ مستقیم۔ سکندر' مجھے تم سے یہ امید نہ تھی۔ ہماری مستقبل کی شریکِ حیات ہم پر کتنا اعتماد کرتی ہیں۔ جب انہیں معلوم ہو گا کہ ابھی سے ان کے مجازی خدا اس بازار میں قدم رنجہ فرما چکے ہیں۔"

"میں ایک جھانپڑ ماروں گا تو بند ہو جائے گی ساری بک بک۔ میرا خیال ہے ملک صاحب کو وہیں پہنچا دیں۔ ان کو ہوش آنے سے پہلے یہ خبر خاص وعام تک پہنچ جائے گی کہ محترم وزیرِ جنگلات' کہاں کس حال میں تھے اور ان کی تمام بیویوں کو بھی پتا چل جائے کہ بُلاوا

ایوان صدر سے نہیں کسی مشتری بائی یا زہرہ جان کے کوٹھے سے آیا تھا۔ اس کے بعد ملک صاحب اسے سازش کہیں یا کردار کشی کی مہم۔ یقین کرنے والا کوئی نہ ہو گا۔"

غالب بہت خوش ہوا "یا رپیرو مرشد۔ نیک کام میں دیر کیسی، چلیے۔ چشم ماروشن دل ماشاد۔"

چوک راجا بازار سے گزرنے کے دس منٹ بعد گاڑی نے پل عبور کیا۔ اس علاقے میں کچھ گڈز ٹرانسپورٹ کمپنیوں کے دفاتر اور کچھ بسوں کے اڈے بھی تھے۔ نیم پختہ دیواروں اور چھپر والے ہوٹلوں میں ڈرائیور، کلینز اور مکینک برادری کے لوگ میلی بان کی چارپائیوں پر گندے بستروں پر اور بینچوں پر سو رہے تھے۔ لکڑی کی بدوضع کرسیوں اور میزوں پر بیٹھے چائے پی رہے تھے اور بے سری آوازوں میں پرانے فلمی گانے سن رہے تھے لیکن یہ سب رونق پل تک محدود تھی۔ پل کے بعد والی سڑک سیدھی ویسٹرج چھاؤنی جاتی تھی اور اس کے شروع میں آدھا میل یا کچھ کم میں بازار حسن تھا اور وہ بدنام گلی کوچے تھے جہاں قدم رکھنے کے خیال سے ہی عزت دار آدمی کو پسینہ آتا تھا۔

یہاں سے گزرنا بھی لوگوں کی مجبوری تھی۔ جو ویسٹرج چھاؤنی کے علاقے میں رہتے تھے یا ملازمت کرتے تھے ان کے لیے شہر پہنچنے کا کوئی متبادل راستہ نہیں تھا۔ کچھ لوگ اس "مجبوری" سے فائدہ بھی اٹھاتے تھے اور بعض اوقات دو چینوئن مجبور اچانک آمنا سامنا ہونے پر سوچتے تھے کہ انہیں پل سے چھلانگ لگا کے نالہ لئی میں ڈوب مرنا چاہیے۔ مگر وہ دوسرا بھی تو وہیں ملا تھا۔ یہ سوچ کے وہ مطمئن ہو جاتے تھے۔

اس بازار کی رونق بھی اب ماند پڑ رہی تھی۔ شوقین مزاجوں کے تھکے ہارے قدم واپسی کی راہوں پر گامزن تھے۔ تہی داماں تہی دست و تہی دل۔ اپنی اپنی تنہا زندگی کی محرومیوں اور مایوسیوں کی طرف مراجعت۔ جھوٹی خوشیوں کے کچھ دغاباز لمحے نوٹ بن کے اڑ گئے تھے۔ دروازے اور دریچے بند ہو رہے تھے۔ روشنیاں گل ہونے لگی تھیں مگر کہیں کہیں سے اب بھی پائلوں کی چھن چھن اور سکوں کی کھنا کھن میں کوئی رقص کناں تھا یا نغمہ سرا تھا۔

میں نے غالب سے کہا "دیکھو مرزا جی۔"

"سب دیکھ رہا ہوں۔" وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولا "تماشائے عبرت..."

"یہ جذباتی ہونے کا وقت نہیں" میں نے کہا "اب تم اتر کے واپس جاؤ۔ موڑ پر تمہیں کوئی ٹیکسی ضرور مل جائے گی۔ وہ آخر شب تک کسی راہ گم کردہ مسافر کی واپسی کا انتظار کرتے ہیں جو انہیں دگنا معاوضہ دیتا ہے۔ رازداری سے گھر پہنچانے کا۔ یا وہ نشے میں دھت ہو تو اس کی جیب خالی کرنا کوئی مشکل نہیں ہوتا۔"

"یہاں سے تو سب ہی خالی جیب جاتے ہوں گے۔ خیر، میں کیا کہوں ٹیکسی ڈرائیور سے۔ کہاں جانا ہے؟"

"ہمیں واپس جانا ہے" میں نے کہا۔

"کہاں، کامران ہوٹل؟"

"ظاہر ہے۔ ٹیکسی والے کو بتا دینا کہ ایک مدہوش شخص کو بھی لے جانا ہو گا۔" میں نے کہا "تمہارے آنے تک میں پیر صاحب کا کچھ بندوبست کرتا ہوں۔"

غالب روانہ ہوا تو میں نے گاڑی کو تھوڑا سا آگے بڑھایا اور ایک روشن بالکونی کے سامنے روک لیا۔ زینے کے ساتھ لگے ہوئے تھڑے پر سونے والا ایک مدقوق سا شخص ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔

"کون... کون ہے بے، آ گیا نیند خراب کرنے۔"

میں نے کہا "یہ نیلم بائی کا کوٹھا ہے نا؟"

وہ ہنس پڑا "نیلم بائی کے گھوڑے۔ یہ پتلی بائی کا کوٹھا ہے۔ پتلی.... آنکھ کی پتلی.... کٹھ پتلی.... پتلی بائی۔ نیلم بائی تو اس پتلی کو نچاتی ہے۔ سونے کی ڈوری سے.... اور پتلی بائی کے اشارے پر تیرے جیسے گھوڑے گدھے.... سب ناچتے ہیں، چل بھاگ یہاں سے۔"

وہ پھر سو گیا تو میں اوپر گیا۔ کسی طوائف کے بالاخانے پر چڑھنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ اس سے پہلے میں نے کوٹھوں کے بارے میں بہت کچھ پڑھا تھا، سنا تھا اور فلموں میں دیکھا تھا۔ اگر میں یہاں چوری چھپے دل لگی کے لیے آتا تو میرے قدم لڑکھڑاتے اور دل دھک دھک کرتا اور میرے پسینے چھوٹ رہے ہوتے لیکن میرے یہاں آنے کا مقصد ہی کچھ اور تھا۔

ایک موالی ٹائپ شخص نے مجھے آخری زینے پر روک دیا "کیا بات ہے۔" اس نے میرا بازو سختی سے تھام لیا تھا۔

میں نے کہا "مجھے نیلم بائی سے ملنا ہے۔"

"کل آنا شہزادے۔ اس وقت تو چلتے پھرتے نظر آؤ۔ پھٹو ادھر سے۔"

میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا "میری جیب میں ریوالور ہے لیکن اس کے بغیر بھی میں تم کو سیڑھیوں سے نیچے پھینک سکتا ہوں۔"

وہ ڈر گیا "کیا چاہتے ہو آخر تم۔"

"ایک وزیر صاحب کی گاڑی کھڑی ہے نیچے۔ میں ان کا ڈرائیور ہوں۔"

"وزیر.... کون سے وزیر...." اس نے مشکوک لہجے میں کہا۔

"عباسی صاحب، وزیر جنگلات... نام سنا ہے ان کا؟"

"وہ.... وہ خود آئے ہیں، اس وقت...."

میں نے کہا "ہاں۔ انہیں جلدی آنا تھا مگر وزیر وقت کے پابند نہیں ہو سکتے۔ نیلم بائی سے کہو انہیں اوپر بلوا لے۔"

"بلوا لے سے کیا مطلب.... وہ خود نہیں آ سکتے؟"

"وہ ذرا.... اوور ہو گئے ہیں" میں نے کہا "زیادہ چڑھا لی تھی۔ اسے پھر پتے آئے۔ ہوش آ جائے گا کچھ دیر میں۔"

وہ سوچ میں پڑ گیا "اس وقت تو پیر صاحب آئے ہوئے ہیں۔"

میں نے کہا "کون سے پیر؟ بائی جی کے پیر۔"

"بائی جی کے کیا، وہ تو سب کے پیر ہیں آج کل۔ ان کے آستانے پر حاکم لوگ حاضری دینے جاتے ہیں" وہ بولا۔

مجھے کچھ خطرہ محسوس ہوا "پھر تو عباسی صاحب کی دال نہیں گلے گی۔"

"میرا خیال بھی کچھ ایسا ہی ہے۔" وہ بولا "میں بتا دیتا ہوں بائی جی کے کان میں۔ آگے جیسی ان کی مرضی۔"

میں نے کہا "چھوڑو۔ میں عباسی صاحب کو واپس لے جاتا ہوں۔"

"نہیں شہزادے۔ وزیر بڑی شے ہوتا ہے۔ ایسا نہ ہو بعد میں بائی جی مجھ پر خفا ہوں۔ یہاں تو بڑے بڑے لوگ آتے ہیں۔ اس وقت بھی موجود ہیں پیر صاحب کی وجہ سے۔ جب اشارہ ہو گا باقی سب اٹھ جائیں گے۔ پیر صاحب رہ جائیں گے۔"

میں نے کہا "پتلی بائی بھی بڑی شے ہے۔ ہمیں تو پتا بھی نہیں تھا۔"

"گڈی چڑھی ہوئی ہے آج کل۔ ٹیم ٹیم کی بات ہے۔"

میں نے کہا "نیچے کوئی گاڑی نہیں۔"

وہ بولا "سب کی گاڑیاں سائڈ کی گلی میں ہیں۔ یا ڈرائیور کہیں دور لے گئے ہیں۔"

میں نے کہا "پھر تو مجھے بھی گاڑی یہاں نہیں روکنی چاہیے تھی۔"

"تم نئے ڈرائیور ہو۔ ابھی تجربہ نہیں ہے۔ تھوڑا سا آگے جا کے الٹے ہاتھ پر گلی ہے۔ اس میں کہیں بھی گاڑی کھڑی کر دو۔ میں آتا ہوں بائی جی سے بات کر کے۔"

میں نے باتوں میں کچھ وقت گزار دیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ جتنی دیر میں پتلی بائی کے کوٹھے سے کوئی نیچے اتر کے آئے محسن بھی ٹیکسی لے کر پہنچ جائے اور ہم سرکاری گاڑی کو وہیں چھوڑ کے پیڈرو کے ساتھ نکل جائیں۔ میں نیچے اترا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ جس گلی کا ذکر پتلی بائی کے دربان یا دربار کے کارندے نے کیا تھا وہ زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ اس تاریک گلی میں مجھے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کھڑی ہوئی تین شاندار گاڑیاں نظر آئیں۔ میں نے عباسی کی گاڑی کو آغاز میں ہی روک لیا۔

محسن نے عین وقت پر مجھے گاڑی بڑھاتے دیکھ لیا تھا۔ وہ میرے پیچھے گلی میں پہنچ گیا۔ ٹیکسی ڈرائیوران گلی کوچوں کے راز ہائے سربستہ سے آشنا معلوم ہوتا تھا اور شاید ایسے تماشے ہر روز دیکھتا تھا۔ وہ عباسی کی سرکاری گاڑی دیکھ کے کچھ مرعوب نظر آنے لگا تھا۔

ابھی تک پتلی بائی کے کوٹھے سے کوئی بھی عباسی کو لے جانے کے لیے نہیں اترا تھا جب میں نے اور غالب نے پیڈرو کو ٹیکسی میں شفٹ کیا تب بھی کوئی اس وزیر باتدبیر کی پذیرائی کے لیے نہیں آیا تھا۔ غالباً نیلم بائی نے خود یا پیر صاحب قبلہ کی نظر کا اشارہ سمجھتے ہوئے عباسی کو شریک محفل نہیں کیا تھا۔ ایک پیر اور ایک وزیر میں سے کون زیادہ طاقتور تھا۔ شاید پیر.... وزارت آنی جانی چیز ہے۔ پیری فقیری کا سلسلہ نسب در نسب چلتا ہے۔

ویسٹرج کے سنسان علاقے کی طرف جانا بے سود تھا۔ ہم پل کو عبور کر کے پھر شہر کی طرف لوٹ آئے تھے۔

ٹیکسی ڈرائیور نے کہا "کیا ہوا ہے اس بندے کو؟"

میں نے کہا "بہت زیادہ پی گیا ہے۔ اب سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے اپنے ساتھ لے کر ہوٹل کیسے جائیں۔ ہوٹل والے نہ جانے کیا سمجھیں گے؟"

غالب نے کہا "کیا تم تھوڑا سا انتظار نہیں کر سکتے؟"

"تھوڑا سا کیوں جی۔ بہت انتظار بھی کر سکتا ہوں میں۔"

غالب اس کا مطلب سمجھ گیا۔ "ٹھیک ہے۔ ہم تمہارے وقت کی قیمت ادا کریں گے۔"

میں نے کہا "ظاہر ہے تم رات کے وقت ٹیکسی چلاتے ہو کچھ زیادہ کمانے کے لیے۔ ورنہ دنیا کے لیے یہ آرام کا وقت ہے۔"

اس نے مجھے ممنونیت سے دیکھا "پھر آپ بتائیں جی کہاں چلوں۔ گاڑی سڑک کے کنارے روکی تو پولیس والے آ جائیں گے سوال جواب کرنے۔"

"میرا خیال ہے کہ ہم کہیں بیٹھ کے چائے پیتے ہیں اور اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کرتے ہیں۔ لیکن پہلے کسی اخبار کے دفتر چلو۔"

"کون سے اخبار کے دفتر جی؟" اس نے حیرانی سے کہا۔

غالب نے کہا "روزنامہ "کوہستان" کا دفتر دیکھا ہے؟"

"بالکل دیکھا ہے۔ روزنامہ مشرق کا بھی دیکھا ہے۔"

"پھر جو قریب ہو وہاں چلو" غالب نے کہا اور پھر مجھ سے مخاطب ہو گیا "وہی خبر دینی ہے نا۔"

غالب نے اشاروں کی زبان میں کچھ اور سوال کیا تھا۔ میں نے کہا "ہاں۔ اگر اخباری نمائندے تصدیق کرنا چاہیں کہ عباسی صاحب کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں، تو ابھی وقت ہے۔ آخری کاپی کے پریس میں جانے سے پہلے وہ خبر لگا سکتے ہیں۔"

غالب کے لیے اشارہ کافی تھا۔ وہ اپنا پریس کارڈ ایسے ہی مواقع پر استعمال کرتا تھا۔ وہ ٹیکسی سے اتر کے دس منٹ کے لیے اخبار کے آفس میں گیا مگر اس کے واپس آنے سے پہلے ہی میں نے رپورٹر ٹائپ ایک شخص کو بڑی افراتفری میں فوٹوگرافر کے ساتھ موٹر سائیکل پر روانہ ہوتے دیکھ لیا تھا۔ اخبار والوں کو ایسی چٹپٹی خبر شائع کرنے کا موقع خدا دے۔ بس وزیر جنگلات کا وہاں ملنا شرط ہے۔ صبح کا اخبار ان کی نظر سے بہت دیر میں گزرے گا۔ اس سے

پہلے ہی سارا شہر جان لے گا کہ گزشتہ شب ایوانِ صدر کا کہہ کے وہ کہاں پہنچے تھے اور کس حال میں پائے گئے تھے۔ کیا بتائے گا عباسی کسی کو اور کون یقین کرے گا اس کی بات پر۔ خود اس کی تین بیویاں نہیں مانیں گی کہ وہ سچ بول رہا ہے۔ کون بہادر علی، کون رابعہ قاری ایڈووکیٹ؟ گیسٹ ہاؤس میں تو کسی نے بھی قیام نہیں کیا تھا۔ اگر اس نے کسی کو کھانے کی دعوت دی تھی تو وہ آئی کیوں نہیں تھی۔ گھر سے تو عباسی خود اسے اپنے ساتھ لانے کے لیے روانہ ہوا تھا۔ پل پار کیسے پہنچا؟ وہ لاکھ شور کرے۔ قسمیں کھائے، کون مانے گا کہ اس کے خلاف سازش کا اتنا مضبوط جال بُننے والے شکاری بہت چالاک لوگ تھے جنہوں نے خود کو بچانے کے لیے اس کے خلاف بدنامی کی ایک جھوٹی کہانی کو ناقابلِ تردید سچ بنا کے دنیا کی گواہی کے ساتھ اخبار میں چھاپ دیا ہے۔

صدر میں گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کے اڈے پر ٹیکسی روک کے ہم نے چائے پی۔ ہر طرف موجود خالی بسوں کے درمیان وہ خاصی محفوظ جگہ تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے ہمیں چائے لا کے دی اور پھر خود باہر ٹہلتے ہوئے سگریٹ پیتا رہا۔

میں نے اس وقت مہلت سے فائدہ اُٹھایا "مرزا جی۔ اس خبیث سے تو جان چھوٹ گئی۔"

"اُلٹا وہ مشکل میں پڑ گیا" غالب نے مجھ سے ہاتھ ملایا "تمہاری اسکیم خطرناک تھی مگر کامیاب ہو گئی۔"

"اب تم پہلی فرصت میں لاہور چلے جاؤ۔"

"میں اکیلا چلا جاؤں؟"

"اکیلے نہیں۔ اپنے ساتھ رابعہ کو لے جاؤ۔"

"میری عقل شریف میں یہ بات نہیں آئی" غالب نے کہا "کچھ وضاحت فرمایئے۔"

"دیکھ بھائی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس حالت میں پیڈرو کے ساتھ میرا کامران ہوٹل جانا ٹھیک نہیں۔ انہوں نے پہلے ہی بڑی مشکل سے دو کے بجائے چار افراد کو ایک کمرے میں ٹھہرنے کی اجازت دی تھی۔ پانچواں ساتھ ہوگا اور وہ بھی اس حالت میں تو صورتِ حال مشتبہ ہو جائے گی۔ خدانخواستہ انہوں نے پولیس کو بُلا لیا تو ہم سب پھنس جائیں گے۔"

"لیکن ہم نے کیا جرم کیا ہے؟"

"یار تم کیسے صحافی ہو۔ اتنا نہیں سمجھتے کہ ہوٹل کے مالکان پولیس والوں سے بنا کے رکھتے ہیں۔ وہ شک کی بنیاد پر خاموشی سے انہیں بُلا کے کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں دال میں کچھ کالا نظر آ رہا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ میں آج رات پیڈرو کے ساتھ رہوں، تم جاؤ ہوٹل۔"

"تم کہاں جاؤ گے؟"

"میں، میں چلا جاؤں گا کہیں بھی۔ ورنہ یہ ٹیکسی ہے۔ اگر رات بھر اسی جگہ کھڑی رہے تو کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوگا۔ یہاں اور کتنے رکشے کھڑے ہیں اور کئی ٹیکسیاں موجود ہیں۔ ڈرائیور صبح جاتے ہوں گے۔ اور اس جگہ کا کرایہ بھی ادا کرتے ہوں گے ... کو۔ سرکاری جگہ ہے۔ کرایہ کچھ لوگ جیب میں ڈال لیتے ہوں گے۔"

"بھاڑ میں جائیں سب۔ مجھے یہ بتاؤ کہ میں کیا کروں؟"

"تم صبح ہوتے ہی رابعہ کے ساتھ روانہ ہو جاؤ۔ دوپہر سے پہلے تمہیں لاہور میں ہونا چاہیے۔ رابعہ سیدھی کورٹ جائے اور بار میں نظر آئے۔ اپنے عبدالودود منظر اور وقار یوسف کے علاوہ بھی بہت سے لوگ اسے دیکھ لیں تاکہ بعد میں وہ ثابت کر سکے کہ گزشتہ روز بھی وہ لاہور میں تھی۔"

"بعد میں یہ کیسے ثابت ہوگا؟"

"یار غالب، رابعہ کے پاس خاصی عقل ہے اور وہاں اتنے بہت سے لوگ ہیں۔ رابعہ کل کی تاریخ میں مؤکلوں کی فائلوں پر نوٹ کر سکتی ہے۔ تم کوئی خبر لگا سکتے ہو کہ مس رابعہ قاری نے خواتین کی فلاں انجمن کی تقریب میں شرکت کی تھی۔ تم خود اپنی لاہور میں موجودگی کے حالات اور گواہ پیدا کر لو تاکہ عباسی کو جھوٹا ثابت کیا جا سکے۔ تمہارے یا رابعہ کے ہم پیشہ لوگ اور دوست احباب آخر کس مرض کی دوا ہیں۔"

"او کے۔ یہ سب ہو جائے گا۔ اگرچہ آسانی سے نہیں ہوگا اور خرابی بہت ہوگی اس میں۔ وہ بھی وزیر ہے اور اتنا بڑا جھٹکا برداشت نہیں کرے گا۔ اس کی اتنی رُسوائی ہوگی تو وہ بدلہ لے گا۔"

"وہ عقل سے کام لے گا تو مزید رُسوائی سے بچ جائے گا۔ میرا اور نازو تو پکچر میں آتے ہی نہیں۔ آج کے بعد یہ فرنچ وکیل کا چہرہ پبلک کی نظر سے اوجھل ہو جائے گا۔ نازو کا نام کون جانتا ہے۔ تم ماشاء اللہ سے اتنے بڑے صحافی ہو اور مس رابعہ ماشاء اللہ سے اتنی بڑی وکیل ہیں کہ وزیرِ جنگلات اس بدنامی کے بعد تمہارے خلاف کچھ بولیں گے تو اپنا ہی نقصان کریں گے اور میرا خیال ہے کہ اس کا کوئی پی آر او صورتِ حال کو سنبھال لے گا۔ اسے سمجھا دے گا کہ وہ سوچے سمجھے بغیر بیان نہ دے۔"

"ہو سکتا ہے اس چکر میں عباسی کا دلاور سے رابطہ ہو جائے۔ پھر دلاور اسے ساری بات سمجھا دے گا۔ ہم سب سے متعارف کرا دے گا۔"

میں نے کہا "اتنی دور کی مت سوچ۔ کل کی کل دیکھی جائے گی اور جب ہم نے دلاور کا بینڈ بجا دیا ہے تو عباسی سے بھی نمٹ لیں گے۔ ابھی تو مجھے پیڈرو کے ساتھ جا کے اپنے والد کا مدفن تلاش کرنا ہے اور یہ کام آسان بہرحال نہیں ہے۔ اس نے ہڈیوں کو شہر میں تو دفن کیا نہیں ہوگا۔ اور اس کے ساتھ جنگل یا پہاڑی کی طرف جانا پڑا اور کھدائی کرانی پڑی تو یہ کام ایک دن میں نہیں ہوگا۔ صرف پیڈرو کا مسئلہ نہیں ہے ... کے لیے میں اکیلا ہی ... تھا لیکن مجھے ایک ایسے معاون کی ضرورت ہے جو ضرورت ... پڑنے پر خود اپنی حفاظت بھی کر سکے۔"

غالب نے کہا "یہ تو صرف نازو کر سکتی ہے۔"

"ہاں۔ ایک تو چوبیس گھنٹے کی نگرانی کا مسئلہ ہے۔ اگر میں ... جاؤں یا مجھے کہیں جانا پڑے تو میرے لیے پریشانی کی کوئی بات نہیں ہوگی۔ نازو کا پیڈرو کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

"میں سمجھ گیا یار۔ لیکن ہمارے لاہور جانے کے بعد تم کیا کرو گے؟"

"یہ تو خود مجھے معلوم نہیں۔ اس کا انحصار پیڈرو کے رویّے پر ہے۔ اس نے تعاون جاری رکھا اور ہماری صحیح سمت میں راہنمائی کی تو کام آسان ہو جائے گا۔ ایک دو دن میں ہم بھی لوٹ کے لاہور آ جائیں گے۔"

"اور پیڈرو کے بارے میں کیا سوچا ہے، اسے چھوڑ دو گے۔"

"سچ تو یہ ہے کہ ابھی اس سوال کا میرے ذہن میں کوئی واضح جواب ہی نہیں، اسے چھوڑنے کا مطلب ہے کہ میں اس کے سارے گھناؤنے جرائم کو بھول جاؤں تو صرف میرا ذاتی معاملہ ہوتا تب بھی میں اس کو نہیں معاف کر سکتا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ معاف کرنے میں بڑائی ہے۔ پیڈرو شریف آدمی ہوتا اور اس نے نادانستگی میں یا مجبوری میں میرے والد کو قتل کیا ہوتا تو میں اس غلطی سے درگزر کرتا مگر یہ غلطی نہیں تھی۔ یہ ایک سوچا سمجھا بہیمانہ قتل تھا اور بات صرف وزیر خان کے قتل پر ہی ختم نہیں ہو جاتی۔ وہ اور بھی بہت سے بے گناہوں کا قاتل ہے۔ ایسی کون سی نیکی کی ہے اس نے یا کون سا احسان کیا ہے مجھ پر کہ میں اسے معافی نامے کے ساتھ بے فکری کی زندگی گزارنے کی کھلی چھٹی دے دوں کہ جاؤ استاد پیڈرو، شیخ مختار بن کے باقی زندگی عیش سے گزارو۔"

"لیکن تم نے اس سے وعدہ کیا تھا؟"

"میں نے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔ اور کیا تھا تب بھی پیڈرو جیسے لوگوں کے ساتھ بدعہدی کوئی اخلاقی جرم نہیں۔ ایک جرم کا سُراغ لگانے یا مجرم سے اعترافِ جرم حاصل کرنے کے لیے شرافت کے اصولوں کی پاسداری نہیں کی جا سکتی۔ میرا خیال ہے کہ اب تم جاؤ۔ رابعہ اور نازو پریشان ہوں گی۔ یہاں سے پیدل دس منٹ کا راستہ ہے۔"

"صبح تم نازو کو ہوٹل سے لے جاؤ گے نا؟"

"نہیں۔ میرا ہوٹل جانا ٹھیک نہیں۔ میں اسے فون کر کے بلا لوں گا۔" میں نے کہا "اسے کہنا گھبرائے نہیں۔"

غالب بادلِ ناخواستہ رخصت ہوا۔ پیڈرو ابھی تک ہوش میں نہیں آیا تھا اور اس سے مجھے تھوڑی سی تشویش لاحق ہونے لگی تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ انجانے میں ہاتھ زیادہ سخت پڑ گیا ہو اور سر کے اندر کی چوٹ سے دماغ کی کوئی شریان پھٹ گئی ہو۔

میں نے پیڈرو کو ہلا جُلا کے دیکھا اور پھر اس کی نبض کی رفتار دیکھی۔ نبض کی رفتار بے ہوشی میں کچھ سست پڑ جاتی ہے۔ میں کوئی ڈاکٹر نہیں تھا کہ اس رفتار سے بے ہوشی کی نوعیت کا اندازہ کر سکتا۔ میں نے ایک گلاس میں کینٹین سے پانی لا کے پیڈرو پر چھینٹے مارے تو اس نے خفیف سے ردِعمل کا اظہار کیا۔

ٹیکسی ڈرائیور اس کارروائی کا بغور مشاہدہ کر رہا تھا "آخر معاملہ کیا ہے؟"

میں نے چونکے بغیر اسے پلٹ کے دیکھا "کون سا معاملہ؟"

"یہ بندہ شراب کے نشے میں نہیں ہے۔"

میں نے ایک گہری سانس لی "ٹھیک سمجھے ہو تم۔ یہ بے ہوش ہے۔"

"پھر اسے یہاں کیوں ڈال رکھا ہے۔ اسپتال یا کسی ڈاکٹر کے پاس کیوں نہیں لے جاتے، ایسے یہ مر گیا تو......؟"

میں نے اسے تسلی دی "نہیں۔ ایسی بات بھی نہیں۔ یہ مرنے والا نہیں ہے۔ تھوڑی دیر میں ہوش آ جائے گا۔ ڈاکٹر اس وقت کون ملے گا۔ اسپتال لے گیا تو وہ دس سوال کریں گے اور پھر کہیں گے کہ سرکاری اسپتال لے کر جاؤ۔ سرکاری اسپتال میں پولیس ہوگی۔"

"کیا تم نے اسے زہر دیا تھا؟"

"لاحول ولا قوۃ۔ یہ خیال کیسے آیا تمہارے دماغ میں؟"

ٹیکسی ڈرائیور نے کہا "پھر کیا ہوا تھا؟ اگر یہ تمہاری غلطی سے بے ہوش نہیں ہوا ہے تو پھر تمہیں پولیس سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"پولیس سے بے گناہ ہی ڈرتے ہیں" میں نے کہا "وہ کسی کے سچ پر اعتبار نہیں کرتے۔"

ٹیکسی ڈرائیور کچھ فکرمند ہو گیا تھا "تم مجھے تو بتا سکتے ہو کہ سچ کیا ہے؟"

میں نے سوچ کے کہا "ہاں۔ تم شریف آدمی ہو۔ تم نے ہماری ... دکی ہے۔ میں تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔ اس کا اصل نام تو ہے شیخ مختار لیکن سب استاد پیڈرو کہتے ہیں۔ آٹھ دس سال سے عباسی صاحب کے ساتھ تھا۔"

"کون عباسی؟"

میں نے کہا "پہلے کونسلر تھا اور ٹھیکے داری کرتا تھا۔ پھر اسمبلی میں منتخب ہو گیا اور آج کل وزیر ہے۔ تم اس علاقے کے رہنے والے ہو؟"

"ہاں جی۔ اچھی طرح جانتا ہوں اسے... اور اس کے سارے دھندوں سے بھی واقف ہوں۔"

"پھر تم سمجھ سکتے ہو کہ یہ عباسی کے ساتھ کیسے کام کرتا ہوگا۔ یہ بدمعاشوں والا نام خود اختیار کیا تھا اس نے۔ کہتا تھا اس سے رعب پڑتا ہے۔ ہم تو سمجھاتے تھے کہ زیادہ لالچ مت کر۔ بدمعاشی

کے کاروبار میں نہ کوئی کسی پر بھروسا کرتا ہے اور نہ مشکل وقت میں کوئی بچاتا ہے۔ عباسی کو شک ہوگیا تھا کہ استاد پیڈرو اسے دھوکا دے رہا ہے اور اس کی بدمعاشی حد سے بڑھ گئی ہے۔ وہ تو اسے مروا دیتا۔ ہم نے خوشامد کی' ہاتھ پاؤں جوڑے تو اس نے کہا کہ اچھا لے جاؤ اسے مگر دوبارہ اس کی شکل نظر نہ آئے مجھے۔ اسے سمجھا دینا کہ عباسی کو بلیک میل کرنے کا خیال دل میں آنے سے پہلے اپنی قبر کی جگہ دیکھ لے۔"

"بلیک میل کیا ہوتا ہے؟" وہ سر کھجا کے بولا۔

میں نے کہا "اتنا عرصہ عباسی کے لیے سارے ناجائز کام کیے تھے۔ اسے سب معلوم ہے۔ عباسی نے دولت کیسے کمائی اور اس کا ساتھ دینے والے کون تھے۔ شاید اس نے دھمکی دی ہوگی کہ میں سب کو بتادوں گا۔ کیا پتا اپنا حصہ مانگا ہو۔ ہوش میں آئے گا تو بتائے گا۔ بُرے کام کا برا نتیجہ۔" میں نے کہا "اور اس کا عباسی سے کیا مقابلہ۔"

"تم اس کے کیا لگتے ہو؟"

میں نے کہا "کچھ نہیں۔ پہلے ہم ایک ہی محلّے میں رہتے تھے۔"

"دوست ہوا نا پھر تمہارا؟"

میں نے کہا "ہرگز نہیں۔ میرے دوست سب شریف آدمی ہیں۔ پڑھے لکھے اور مہذب لوگ۔"

اس نے بے چینی سے گھڑی دیکھی "آخر تم کب تک روکے رکھو گے مجھے؟"

میں نے کہا "ایک رات میں تم جتنا کما لیتے ہو اس سے دُگنا مجھ سے لے لو۔"

اس نے مجھے غور سے دیکھا "ٹھیک ہے۔ صبح مجھے پانچ سو دے دینا مگر کیا ساری رات گاڑی میں گزارو گے..... یہاں؟"

"ویسے تو ہوٹل کم نہیں ہیں لیکن اس الّو کے پٹھے کو ایسی حالت میں اپنے ساتھ کیسے لے جاؤں۔ تمہارے پاس ہے کوئی جگہ تو مجھے بتاؤ۔ ایک رات کا اچھا معاوضہ دے سکتا ہوں میں۔ صبح تک یہ ٹھیک ہو جائے گا۔"

"پیسہ بہت ہے تمہارے پاس" اس نے طنز سے کہا۔

میں نے کہا "زیادہ تو نہیں لیکن تم بیچنا چاہو تو میں یہ ٹیکسی بھی خرید لوں گا۔ مجھے گاڑی کی ضرورت ہے۔"

وہ مجھے بڑی عجیب سی نظروں سے دیکھتا رہا "میرا خیال ہے کہ ایک رات تم میرے گھر میں بھی گزار سکتے ہو۔"

"جگہ ہے اور تمہیں کوئی پریشانی نہیں تو چلو۔" میں نے کہا۔

"گھر تو چھوٹا سا ہے۔ بس دو کمرے ہیں" وہ بولا "ایک میں تم رات گزار لیتا لیکن....."

"لیکن کیا....؟"

"میری بیوی..... غصّے کی ذرا تیز ہے۔ اس کی کسی بات کا بُرا مت ماننا۔" وہ بولا "مگر پانچ سو ملیں گے تو وہ بھی خوش ہو جائے گی۔"

اس کی پیشکش بڑی مخلصانہ اور بے غرض تھی۔ مہمان...

"تم رہتے کہاں ہو؟"

"سید پوری روڈ پر۔ اصغر خاں چوک سے آگے" اس نے ٹیکسی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

چند مشہور مقامات اور سڑکوں کے سوا مجھے راولپنڈی کے غیر معروف محلّوں کے بھی گنے چنے نام آتے تھے۔ کمیٹی چوک، محلہ وارث خاں۔ باقی نام خاصے مشکل تھے مثلاً چوہڑ پال' نئی مائی ویرو۔ یہ بھی ہوگا شہر کا کوئی پرانا علاقہ۔ میں نے سوچا۔ مجھے باقی رات ٹیکسی میں بیٹھ کے جاگنے یا پیڈرو کے ساتھ کسی محفوظ مقام کی تلاش میں بھٹکنے کی پریشانی سے نجات مل گئی تھی۔

ٹیکسی ڈرائیور کا گھر ایک سنسان گلی میں تھا اور اس گلی کا آخری مکان تھا۔ اس کے بعد کسی اسکول کا پلے گراؤنڈ تھا۔ میدان اور گھر کے درمیان ایک خستہ حال سڑک تھی۔ ڈرائیور کے گھر سے پہلے والا پلاٹ بھی خالی تھی شاید اس کا مالک بھی لاپتا تھا اور ادھر نہیں آتا تھا۔ چنانچہ گلی والے وہاں کوڑا ڈالنے لگے تھے۔ کوڑے کے ڈھیر کی بلندی خود بتاتی تھی کہ مہینوں یا برسوں سے کارپوریشن کا کوڑا لے جانے والا ٹرک ادھر نہیں آیا ہوگا۔ بارش سے اور دباؤ کے باعث نیچے والا کوڑا دبتا جارہا تھا لیکن اوپر کے ڈھیر میں مسلسل اضافے سے تین طرف کے مکانوں کی دیواروں سے گھرا ہوا یہ پلاٹ کئی فٹ اونچا کچرا گھر بن چکا تھا۔ اس کی بدبو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی اور اس کی وجہ سے ٹیکسی ڈرائیور کا گھر کسی حد تک گلی کے دوسرے گھروں سے کٹ گیا تھا۔

"کیا تمہارے لیے اس سڑک کے راستے آنا آسان نہ ہوتا جو تمہارے گھر اور میدان کے درمیان ہے۔"

اس نے کہا "آگے سڑک کو ہر شخص نے دیوار بڑھا کے اپنے گھر میں شامل کرلیا ہے۔ گلی کے آخری مکان میں رہنے والے کو تین مرلے جگہ مفت میں مل گئی ہے۔ ایک نے دیوار کو اسکول کی دیوار سے ملایا تو دوسرے نے بھی ملا دیا۔"

"پھر تم نے ایسا کیوں نہیں کیا؟"

"میں کرائے پر ہوں۔ مالکِ مکان جب چاہے گا کرلے گا۔ ابھی تو یہ جگہ گاڑی کھڑی کرنے کے لیے اچھی ہے۔ میری ٹیکسی یہیں ہوتی ہے۔"

میں نے دیکھا تو وہاں سفید رنگ کی ایک کار پہلے سے موجود تھی۔ "یہ کس کی گاڑی ہے؟"

اس نے بے خیالی میں کہا "کوئی آیا ہوگا" اور پھر خود ہی اس کی وضاحت بھی کردی۔ "میرا بھائی اکثر آجاتا ہے۔"

اس نے دروازے کی کُنڈی بجائی لیکن دروازہ کھلنے پر ایسے گھر میں داخل ہوا جیسے گھر کا مالک وہ نہیں۔ اس نے کسی سے آہستہ

...کچھ کہا۔ میں نے کسی عورت کے تیز لہجے میں باتیں کرنے کی ... ٹیکسی ڈرائیور نے چور نظروں سے میری طرف دیکھا تو ... اس کا انداز مشکوک لگا مگر اب محتاط ہو جانے کے سوا میں کیا ... سکتا تھا۔

"آؤ جناب۔" ٹیکسی ڈرائیور نے بالآخر کہا۔

میں نے کہا "تم ذرا مدد کرو میری۔"

ڈرائیور نے سرہلایا اور پیڈرو کو کھینچ کر باہر نکالنے اور ... کے اندر لے جانے میں میری مدد کی۔ پرانے کواڑ مشکل سے ... فٹ چوڑے تھے اور ان کی اونچائی بھی چھ فٹ سے کم ہی ... مجھے سر جھکا کے گزرنا پڑا۔ اندر کا نقشہ وہی تھا جو ایک ... نے سے پلاٹ پر بنے ہوئے گھر کا ہوتا ہے۔ مختصر صحن' ایک ... نے میں لیٹرین' برآمدے میں کچن اور پیچھے دو چھوٹے چھوٹے ... رے۔

برآمدے میں جلنے والے چالیس واٹ کے بلب کی روشنی کے ... اور اگھر اندھیرے میں تھا۔ مجھے تعجب ہوا کہ ٹیکسی ڈرائیور کا ... اگر دوسرے کمرے میں تھا تو وہاں لائٹ کیوں نہیں جل رہی ... اور ایک خالی کمرے کے ہوتے وہ اپنی شادی شدہ بہن کے ... کمرے میں کیوں سو گیا تھا۔

ٹیکسی ڈرائیور نے کمرے کی لائٹ جلائی تو اندر داخل ہوتے مجھے بہت سے سوالات کا جواب مل گیا۔ دس فٹ لمبا اور چوڑا ... کمرا بڑی نفاست سے سجایا گیا تھا۔ اس میں بیڈ نہیں تھا مگر فرش پر ... ت عمدہ اور دبیز کشمیری قالین بچھا ہوا تھا۔ قالین کا سائز سات ... ن دس فٹ تھا۔ دروازے کے سامنے ڈھائی تین فٹ چوڑی جگہ ... خالی رہ گئی تھی۔ اس کے ساتھ والی دیوار کے وسط میں دروازہ ہوگا ... پردے کے پیچھے نظر نہیں آتا تھا۔ اسی کمرے میں ایک چھوٹا سا ... ن رکھا ہوا تھا۔ قالین کی طرح پردے بھی شوخ رنگ کے بھاری ... اور ریشمی تھے۔

قالین کے اوپر سفید چادر بچھی ہوئی تھی اور سرہانے کی طرف ... ونے کے لیے ایک ہی تکیہ تھا۔ جب میں نے پیڈرو کو اس پر لٹایا تو ... ستے قسم کے سینٹ کی خوشبو میں اضافہ ہوگیا جو کمرے کی فضا میں ... بری ہوئی تھی۔ پھر میری نظر دیوار پر گئی تو میرے لیے شک کی گنجائش ہی نہ رہی۔ دیواروں پر انتہائی قابلِ اعتراض تصاویر پلاسٹک ٹیپ سے یوں چپکا دی گئی تھیں کہ ٹیپ کا حاشیہ فریم کی طرح نظر آتا تھا۔

ٹیکسی ڈرائیور نے شک میری آنکھوں میں یا میرے چہرے کے تاثرات میں پڑھ لیا "وہ..... دراصل..... یہاں میری بیوی سو رہی تھی۔"

میں پوچھتے پوچھتے رہ گیا کہ کس کے ساتھ؟ مجھے رات کے چند گھنٹے ہی یہاں گزارنے تھے۔ اگر کوئی عورت جو اس ٹیکسی ڈرائیور کی بیوی تھی یا نہیں تھی۔ اس گھر میں جسم فروشی کرتی تھی تو مجھے کیا۔ جب تک کسی کی نیت خراب نہیں ہوتی مجھے کسی کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہیے۔ دنیا میں سب کچھ ہوتا ہے اور ایسے دھوکے ہر شخص ہر قدم پر کھاتا ہے۔ نہ کوئی فاحشہ مجھے رجھا سکتی تھی اور نہ اس کا دلال مجھے لوٹ سکتا تھا۔

میں نے قالین پر بیٹھ کے اپنے جوتے کھولے تو میری نگاہ ان مردانہ جوتوں پر گئی جو وہاں پہلے سے موجود تھے۔ یہ پولیس یا فوج کے جوانوں کو وردی کے ساتھ ملتے تھے۔ خود ٹیکسی ڈرائیور کی صحت ایسی تھی کہ وہ کسی بھرتی کے دفتر میں جاتا تو لطیفہ بن جاتا۔ جوتوں کی پالش یہ بتاتی تھی کہ وہ آج بھی وردی کے ساتھ پہنے گئے تھے۔

میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو دیکھا "تم کیوں ایسے کھڑے ہو جیسے مہمان ہو؟"

اس نے جھینپ کے کہا "نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

"ابھی تک نام بھی نہیں پوچھا میں نے تمہارا۔ یہ تمہارا ہی گھر ہے نا؟"

"ہاں۔ ہاں جی..... اور میرا نام ہے عبدالرحمان۔" وہ کچھ نروس ہونے لگا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں دیواروں پر چسپاں آرٹ کے نمونوں کے بارے میں کوئی سوال کرتا اس کی نام نہاد بیوی خود اپنے ذوقِ دشوق کی عملی تفسیر بن کے آگئی۔ اس کے لبوں کی لالی بھونڈی ہی نہیں فحش لگتی تھی۔ اس کا رنگ اچھا خاصا تھا مگر اس نے پھر بھی گالوں پر غازہ تھوپ رکھا تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور آنکھوں میں سرمے کی لکیر پھیل گئی تھی۔ وہ عمر میں عبدالرحمان سے یقیناً دو چار سال بڑی تھی۔ اس کا گداز بدن مائل بہ فربہی تھا۔ کپڑے پہلے کے سلے ہوئے تھے یا عمداً اتنے تنگ سلوائے گئے تھے کہ وہ کسی طرف سے بھی جامے میں نہیں سما رہی تھی اور اس کے بدن کا سارا گوشت باہر چھلکنے کے لیے زور لگا رہا تھا۔

"اس گھر کو اپنا ہی سمجھو۔" اس نے مجھے گھور کے کہا "کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دو۔"

میں نے دل کڑا کر کے کہہ دیا "پہلے تو پانی ایک گلاس۔"

"بس..." وہ ہنس پڑی۔

میں نے کہا "اس کے بعد اگر مل جائے تو چائے۔"

عورت نے مایوسی سے اور کچھ خفگی سے عبدالرحمان کو دیکھا۔ اس کی نظروں کا مفہوم بہت واضح تھا۔ وہ پوچھ رہی تھی کہ یہ کیا مصیبت اُٹھا لائے ہو تم۔ یہ بندہ تو ایویں ہے۔ عبدالرحمان نے میری نظر بچا کے اسے آنکھ ماری مگر میں نے دیکھ لیا۔

"ہاں جی۔ چائے بھی آجائے گی۔" عبدالرحمان بولا اور پھر عورت سے مخاطب ہوگیا "او بھلئی لوکے۔ یہ ایسے ویسے لوگ نہیں ہیں۔ رات بھر کے لیے ٹیکسی لی تو پانچ سو دیے۔ ہوٹل میں جانا چاہتے تھے مگر جا نہیں سکتے تھے۔ میں ادھر لے آیا۔ تجھے بھی مل

جائیں گے پانچ سو۔"
عورت نے سرہلایا "چل اچھا کیا۔ تو بھی چائے پیئے گا؟"
عبدالرحمان کے جواب دینے سے پہلے ایک تاڑ جیسا لمبا اور سیاہ رو شخص اندر آگیا۔ اس کا سر چوکھٹ سے لگا تو اس نے عادتاً گالی بکی۔ عورت ہنس پڑی۔
یہ صورتِ حال میرے اعصاب پر سوار ہونے لگی تھی۔ میں نے کہا "تم عبدالرحمان کے بھائی ہو؟"
اس نے مجھے پلٹ کے گھورا "تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"
میں نے کہا "تم بھائی لگتے نہیں' کیا پولیس میں نوکری کرتے ہو؟"
وہ چونکا "ہاں۔ اے ایس آئی ہوں' تم جانتے ہو مجھے؟"
"دیکھا تو آج ہی ہے مگر پھر بھی پہچان لیا' پوچھو کیسے؟"
"شہر کے سارے چور اُچکے اور بدمعاش پولیس والوں کو پہچانتے ہیں۔" اس نے غرا کے کہا اور ایک دم روانہ ہوگیا۔ باہر جاتے ہوئے اس نے دروازے کو دھڑ سے لات مار کے بند کیا۔ پھر میں نے اس کی گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سُنی۔ اے ایس آئی کو میری آمد ناگوار گزری تھی۔ عبدالرحمان نے انجانے میں یہ حرکت کی تھی کہ رنگ میں بھنگ ڈال دی تھی یا اس کا بھی کوئی مقصد تھا؟ میں عبدالرحمان کے ساتھ آکے پچھتا رہا تھا لیکن میری اب بھی یہ خواہش تھی کہ صبح تک مزید خرابی نہ ہو۔ میں نے عمداً عبدالرحمان سے اس کے گھر اس عورت یا ان کے مذموم کاروبار کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا' اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ غلطی مجھ سے عبدالرحمان کی نیت کو سمجھنے میں ہوئی تھی اور اب پانچ سو دے کے یہاں رات گزار لینا یہاں سے واپس جانے اور ٹیکسی میں رات گزارنے سے بہرحال بہتر تھا۔
پیڈرو کچھ دیر بعد ہوش میں آگیا' میں نے اسے پانی پلایا اور پھر گرم چائے دی۔ وہ حیران نظروں سے چاروں طرف دیکھتا رہا۔
"یہ کون سی جگہ ہے۔ باقی لوگ کہاں ہیں؟" اس نے کہا۔
"صرف میں اور تم بچے ہیں" میں نے اوپر دیکھ کے کہا "باقی سب لوگ گئے۔ اس جگہ کے بارے میں مجھے بھی علم نہیں۔"
وہ سمجھ گیا کہ میں اسے کچھ بتانا نہیں چاہتا۔ عبدالرحمان اور وہ عورت دوسرے کمرے میں نہ جانے کس بات پر لڑ رہے تھے۔ میرا خیال تھا کہ وہ اپنی بیوی کو وہی پانچ سو دے گا جو میں اسے رات بھر کے لیے ٹیکسی بُک کرنے کا دوں گا مگر اب ایسا لگتا تھا کہ قیام وطعام کے پانچ سو الگ نہ دیے تو وہ خوش نہیں ہوگی۔ میں نے احمقانہ حد تک غیر ضروری فیاضی کا مظاہرہ کیا تھا۔ عبدالرحمان شاید رات بھر میں سو ہی کماتا ہوگا مگر اسے ٹیکسی چلائے بغیر پانچ سو مل گئے تھے۔ کوئی شوقین مزاج ہوتا تو اس عورت سے بھی پانچ سو وصول کر لیتا۔ ان کے نزدیک مجھ سے بڑا بے وقوف کون ہوگا جس نے ایک ہزار دے کے لیا کچھ بھی نہیں۔

اب میں کچھ دیر کے لیے سونا چاہتا تھا۔ عبدالرحمان نے اور اس کی نام نہاد بیوی نے ہماری ہر فرمائش پوری کی تھی۔ ہمیں فریج میں سے کھانے کے لیے اتنا مل گیا تھا کہ صبح تک گزارا کیا جاسکتا تھا۔ پیڈرو کو اسپرین بھی مل گئی تھی اور اب اسے آرام کی ضرورت تھی مگر ہم ایک ہی کمرے میں سو نہیں سکتے تھے۔
جب پیڈرو سو گیا تو میں نے عبدالرحمان سے کہا "اس کمرے کو باہر سے تالا لگانا ہے۔"
وہ حیرانی سے مجھے دیکھنے لگا "باہر سے..... یا اندر سے؟"
میں نے کہا "پیڈرو اندر سوئے گا۔ میں تالا لگا کے باہر سونا چاہتا ہوں۔ یہ مت پوچھنا کہ کیوں؟ میں نے بھی تم سے کوئی سوال نہیں کیا۔"
وہ کچھ پریشان ہوا لیکن پھر اس نے مجھے تالے کی چابی لا دی۔ میں نے دروازے کے باہر دری بچھا کے تکیہ رکھا اور چابی جیب میں ڈال کے لیٹ گیا۔ عبدالرحمان اور وہ عورت دوسرے کمرے میں بند ہوگئے۔ ان کے درمیان بحث جاری تھی۔ کوشش کے باوجود میں ان کی گفتگو کا ایک لفظ نہیں سمجھ پایا۔ وہ دبے دبے لہجے میں بات کر رہے تھے۔ ایک بار کسی نے دروازہ کھول کے دیکھا تو میں نے فوراً آنکھیں بند کرلیں۔ دروازہ بند ہوتے ہی وہ پھر جھگڑنے لگے۔ میں نے دروازے سے کان لگا دیے۔
عورت عبدالرحمان کو گالیاں دے رہی تھی "کہہ دیتا کہ چابی نہیں ہے۔"
"چابی دے دی تو کیا ہوگیا؟"
"اسے شک ہوگیا ہے' اسی لیے وہ باہر سونا چاہتا تھا۔"
"میں نے کہا نا کہ تو فکر مت کر۔ وہ رات کو بھاگ کر کہیں جانے والا نہیں ہے۔"
"چلا گیا پھر؟ تو کہاں سے ڈھونڈ کے لائے گا... ابھی سراج سے بات کرلیتا۔"
"جلدی میں کام خراب ہوجاتا ہے پاگل۔ تیرے ایک ہزار پکے۔ یہ بندہ تو ٹیکسی خریدنے کی بات کر رہا تھا۔"
لاحول ولا قوۃ۔ ایک ٹیکسی ڈرائیور اور ایک جسم فروش عورت صرف پیسے کے لیے پریشان ہیں۔ میں نے اطمینان سے آنکھیں بند کرتے ہوئے سوچا۔ عورت کو فکر ہے کہ میں ان کے بیدار ہونے سے پہلے ہی ہزار روپے لے کر نہ چلا جاؤں۔ اچھا ہوتا اگر میں دونوں کے منہ پر پانچ پانچ سو پہلے ہی مار دیتا۔ سکون کی نیند سوتے دونوں۔
لیکن میرا اخذ کردہ نتیجہ غلط تھا۔ اس کا اندازہ مجھے صبح ہوا۔ چار پانچ گھنٹے کی نیند کے بعد میں جاگا تو دن کا اُجالا صحن میں بہت پہلے پھیل چکا تھا۔ میری آنکھ عورت کی کھٹ پٹ سے کھلی تھی۔ وہ باورچی خانے میں چائے بنا رہی تھی۔ وہ ہاتھ منہ دھو چکی تھی اور میک اپ کے بغیر عام قسم کی عورت نظر آتی تھی۔

...ہلِ شکست اور فولادی عزم رکھنے والے وہشت گردوں کے ...صاب بھی جواب دینے لگتے ہیں اور وہ سوچنے پر مجبور ہوجاتے ...کہ دولت اور طاقت کے کھیل کی سنسنی خیزی میں بھی اب لطف نہیں آتا؟ وہ دوسروں کی پُرسکون اور خوشیوں سے معمور ...وں ...دگی کی طرف دیکھنے لگتے ہیں اور بعض اوقات اس احساس کی ...ت ان کی اپنی زندگی کا رُخ بدل دیتی ہے۔
شاید ایسا ہی خاموش انقلاب پیڈرو کی سوچ میں آیا تھا۔ وہ ہم ...ے بھرپور تعاون کر رہا تھا۔ اس نے مقابلہ کرنے یا فرار ہونے کی ...شش بھی نہیں کی تھی۔ اس اُمید میں کہ ہم اسے وعدہ معاف ...راو کی حیثیت دے کر اس کی جان بخشی کے وعدے پر قائم رہیں ...ے۔ وہ ہمیں بہت کچھ بتا چکا تھا جو ہم پہلے نہیں جانتے تھے لیکن ...ت کچھ ابھی باقی تھا۔ وہ سمجھتا کہ اس نے سب بتادیا تو اس کے ...ں اپنے تحفظ کی کوئی ضمانت باقی نہیں رہے گی۔ سوائے ہمارے ...رے کے۔ دشمن کے وعدے کا کیا اعتبار جب دوست بھی وعدہ ...رکے مکر جاتے ہیں۔
پیڈرو کے بیان نے کسی حد تک صورت حال کو بدل دیا تھا۔ ...ں نے ثابت کردیا تھا کہ وزیر خان کو قتل کرنے والا وہ نہیں تھا۔ ...ڈرو نے یہ بھی نہیں کہا تھا کہ اس نے تو آج تک کسی کو بھی قتل ...یں کیا۔ اس کے بیان کی صداقت پر آنکھ بند کرکے یقین کرنے ...لا کوئی نہیں تھا۔ اگر یہ ثابت ہوجاتا کہ وزیر خان کا قاتل وہ نہیں ...پھر اس کے اور میرے درمیان ذاتی عداوت کا خونی رشتہ کمزور ...جاتا تھا۔ پھر اسے اپنے ہاتھوں کیفرِ کردار تک پہنچانے کی قسم بھی ...ڑی جاسکتی تھی۔ اس کے دیگر جرائم کی سزا باقی رہتی تھی۔ دنیا ...ں اور آخرت میں مکافاتِ عمل کے قانون کو بدلنا کسی کے اختیار ...ں نہیں تھا۔
چائے ختم کرکے میں نے پیڈرو کو جگایا۔ وہ جماہی لے کر اُٹھ ...بیٹھا۔ ایک بار پھر اس نے گرد و پیش کو حیرانی سے اور غور سے ...یکھا۔
میں نے کہا "ہم صرف رات گزارنے کے لیے یہاں آئے ...تھے۔"
"یہ کوئی شریفانہ جگہ تو نہیں ہے۔"
میں نے طنز سے کہا "تم بھی شریفانہ اور غیر شریفانہ ماحول کے ...رق کے قائل ہو۔"
"وہ عورت... اسے جانتے ہو تم..... یا پہلی بار..."
میں نے کہا "بکواس مت کرو۔"
"میں اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ تم ایسے آدمی نہیں ہو۔"
"ہاں۔ میں ایسا آدمی نہیں ہوں اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں ...تھا کہ یہاں ایسی عورت سے پالا پڑے گا ورنہ میں کبھی نہ آتا۔ اب ...تیار ہوجاؤ۔ ہمیں آگے جانا ہے" میں نے کہا "صرف مجھے اور ...تمہیں۔"

میں نے تالے میں چابی لگائی تو وہ چونکی اور مجھے دیکھ کے مسکرانے لگی "تم نے اپنے دوست کو تالا ڈال کے کمرے میں کیوں بند کردیا تھا۔"
میں نے کہا "اس لیے کہ وہ میرا دوست نہیں دشمن ہے۔"
"عبدالرحمان کو تم نے کچھ اور بتایا تھا۔"
"عبدالرحمان نے بھی مجھے کچھ اور بتایا تھا" میں نے کہا۔
وہ کھسیا کے خاموش ہوگئی "چائے پیو گے؟"
"ہاں۔ عبدالرحمان کہاں ہے؟" میں نے جیب سے ہزار روپے نکالتے ہوئے کہا "یہ پانچ سو تم رکھ لو' پانچ سو اسے دے دینا۔"
"وہ لیٹرین میں ہے۔ کیا تم جا رہے ہو؟" وہ متفکر ہوگئی۔
"ابھی نہیں۔ یہ تمہارے دل کی تسلی کے لیے ہیں" میں نے کہا "تمہیں بہت پریشانی تھی کہ میں بھاگ نہ جاؤں۔"
اس کا رنگ اُڑ گیا "کیا تم ہماری باتیں سُن رہے تھے؟"
"تمہارے درمیان آخر کیا جھگڑا ہو رہا تھا؟ میرے لیے باہر سونا مشکل ہوگیا تھا" میں نے کہا اور اندر جا کے بیٹھ گیا۔ پیڈرو ابھی تک سو رہا تھا۔
وہ میرے لیے چائے کا کپ لے کر آئی تو میں نے سوچا کہ اب پیڈرو کو بھی جگا دینا چاہیے۔ صبح کے ساڑھے سات بج رہے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ ہوٹل میں رابعہ' غالب اور نازو رات بھر چین کی نیند نہیں سوئے ہوں گے۔ انہیں میری طرف سے پریشانی لاحق ہوگی اور صبح سے ہی وہ میری فون کال کے انتظار میں ہوں گے۔ اب تو شاید نازو اکیلی ہوگی۔ میری ہدایات کے مطابق رابعہ اور غالب واپس لاہور چلے گئے ہوں گے۔
پیڈرو کا رویّہ میرے لیے حیران کن ثابت ہو رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ ساری بدمعاشی بھول گیا ہے۔ اس کی وہ اکڑفوں اور خونخواری بھی باقی نہیں رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ اب وہ استاد پیڈرو نہیں شیخ مختار بن گیا تھا۔ اس کے کاروبار کی نوعیت بھی وہ نہیں رہی تھی تو اس نے ضرورت کے پیشِ نظر اپنا رویّہ' اپنی عادات اور مزاج بھی بدل دیے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پیڈرو کی عمر کو پہنچ کے آدمی کی فطرت نہیں بدلتی۔ چوہدری دلاور کی طرح اسے بھی اپنے بدنام ماضی سے دامن چھڑانے کی مجبوری لاحق تھی۔ انہوں نے ایک دوسرے کو بھی چھوڑ دیا تھا لیکن ان کے پُرانے دشمن یعنی ہم بدستور ان کی زندگی کا آسیب بنے ہوئے تھے۔
پیڈرو اب زندہ رہنا چاہتا تھا۔ وہ دوسری زندگی مختلف انداز میں جینے کا خواہش مند تھا جس میں احساسِ جرم' پکڑے جانے کا ڈر' ہر گام پر تعاقب کرتی ہوئی موت کا خوف اور ہر سمت میں موجود لیکن نظر نہ آنے والے دشمنوں کا اندیشہ نہ ہو۔ ایک وقت آتا ہے جب بڑے بڑے خود کو قانون کے مقابلے میں کمزور یا وہ طاقتور'

"یہاں ناشتا ملے گا لیکن پہلے میں لیٹرین جاؤں گا۔"

"پیڈرو۔ ابھی تک تمہارا جیسا رویہ تھا۔ آگے بھی ویسا ہی رہے گا تو تم زندہ رہو گے۔ یہ مت سمجھنا کہ کوئی جگہ ایسی ہوگی یا کوئی لمحہ ایسا آئے گا جب تم موقع سے فائدہ اٹھا کے۔۔۔"

اس نے میری بات کاٹ دی "زبان سے تو کہہ دیا۔ ویسے تمہاری مرضی ہے۔ لکھے ہوئے پر بھی اعتبار نہ کرو۔"

میں نے اپنی بات جاری رکھی "موت ہمیشہ تم سے بس ایک ہاتھ دور تمہارے ساتھ ہوگی۔ محاورے کے مطابق یہ میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے کہ ایک وار میں تمہارے جسم وجاں کا رشتہ منقطع کردوں۔ بہت مضبوط نظر آنے کے باوجود یہ رشتہ بہت نازک ہوتا ہے۔ پُرانے زمانے کے لوگ شمشیر آبدار سے گردن کو بھُٹے کی طرح اُڑا دیتے تھے۔ اب یہ کام خالی ہاتھ سے بھی کیا جاسکتا ہے اور کمال یہ ہے کہ الگ ہوجانے کے باوجود گردن الگ نظر نہیں آتی۔"

پیڈرو میری بات سُننے اور برداشت کرنے پر مجبور تھا۔ اس کے لیے کوئی بات نئی نہیں تھی مگر میں یہ ضروری سمجھتا تھا کہ کبھی کبھی اس کو دہشت زدہ کیا جائے تاکہ اس کا حوصلہ پست رہے اور وہ ذہنی طور پر بھی خود کو مغلوب اور شکست خوردہ محسوس کرے۔

اس نے کہا "یہ باہر سے کُنڈی کیوں لگائی ہے؟"

"رات کو میں برآمدے میں سویا تھا" میں نے کہا "تمہیں کُھلا چھوڑ دیتا؟"

"میں اس وقت کی بات کررہا ہوں۔" پیڈرو بولا "میرے ساتھ تم بھی اندر بند ہو۔"

اپنے پیچھے میں نے دروازہ بند ہوتے محسوس کیا تھا اور پلٹ کے دیکھا بھی تھا کیونکہ برآمدے کی طرف سے آنے والی روشنی کچھ کم ہوگئی تھی۔ مجھے کوئی بھی نظر نہیں آیا تو میں نے سمجھا تھا کہ دروازہ ہوا کے جھونکے سے خود ہی بند ہوگیا۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ اس میں لوہے کی آدھا انچ موٹی سلاخیں تین تین انچ کے فاصلے سے لگی ہوئی تھیں۔ اس میں سے بھی روشنی کا گزر تھا اور اندر ٹیوب لائٹ روشن تھیں۔

میں نے کھڑکی کے قریب جاکے دیکھا۔ عبدالرحمان برآمدے میں بڑی بہادری سے کھڑا یوں مسکرا رہا تھا جیسے عیّار شکاری شیر کو دھوکے سے پنجرے میں بند کردینے کے بعد مسکراتا ہے۔ اس کی صورت سے کمینگی اور خباثت برس رہی تھی۔ اس کی نام نہاد اہلیہ غالباً دوسرے کمرے میں روپوش تھی۔

میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا "دروازے کو تالا کیوں لگایا ہے؟"

اس نے کہا "رات کو تم نے بھی لگایا تھا۔"

"بکواس بند کرو۔ آخر کیا مقصد ہے اس حرکت کا۔" میں نے برہمی سے کہا۔

وہ بولا "رات کو تمہیں ڈر تھا کہ یہ بندہ نہ بھاگ جائے۔ اب مجھے ڈر ہے کہ تم نہ بھاگ جاؤ۔"

"کیا مطلب؟ تم مجھے قید میں رکھو گے؟"

"ہاں۔ جب تک پولیس نہیں آجاتی" وہ بولا۔

"تم نے پولیس کو بلایا ہے؟"

"پولیس خود آئے گی' میں تم کو ان کے حوالے کردوں گا۔"

"لیکن کیوں۔۔۔ آخر پولیس خود کیوں آئے گی؟" میں نے پیڈرو کی طرف دیکھا تو مجھے زیادہ غصہ آیا "کیا جرم کیا ہے میں نے؟"

"یہ مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔ میں تو رات کو ہی سمجھ گیا تھا کہ معاملہ گڑبڑ ہے' پولیس خود معلوم کرے گی اصل بات" وہ بولا "رات کو جواے ایس آئی سراج تھا۔ اس کو بھی شک ہوگیا تھا۔"

میں نے محسوس کیا کہ شور مچانے یا چیخنے چلانے سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا اگر واقعی معاملہ پولیس کے ہاتھ میں چلا گیا اور انہوں نے شک کے بغیر ہی پوچھ گچھ شروع کردی تو بہت گڑبڑ ہوجائے گی۔

"تم نے کہا تھا کہ وہ بھائی ہے تمہارا" میں نے حقارت سے کہا "وہ خود مجرم ہے۔ اس کے ساتھ مل کے تم یہاں بے حیائی کا دھندا کررہے ہو۔ شرفا کے رہائشی علاقے میں۔ جس عورت کو تم نے اپنی بیوی بتایا تھا وہ ایک جسم فروش فاحشہ اور طوائف ہے۔"

اس نے کسی فلسفی کی طرح کہا "طوائف کہہ دیا تو پھر جسم فروش اور فاحشہ کہنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"پھر تو تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ تم اس عورت کے شوہر نہیں دلّال ہو۔ یہاں لوگ تمہیں میاں بیوی اور شریف سمجھتے ہوں گے۔ جب انہیں تمہاری اصلیت کا پتا چلے گا۔"

"کیسے پتا چلے گا؟ ابھی تک تو کسی کو پتا نہیں۔ دو سال ہوگئے ہیں یہاں رہتے اور پتا چل گیا تو ہمارا کیا بگڑے گا' ہم مکان بدل لیں گے۔"

"کیا تمہیں نہیں پتا کہ وہ غیر قانونی کام ہے؟"

"کون سا کام؟" وہ ڈھٹائی سے بولا "عبدالرحمان بے وقوف نہیں ہے۔ پکّا نکاح نامہ بنوا رکھا ہے میں نے۔ رپورٹ تم لکھواؤ گے؟ ثبوت اور گواہ تم لاؤ گے۔ سراج کے علاوہ بھی اپنے بہت سے لوگوں سے تعلقات ہیں۔ ایک ڈی ایس پی صاحب بھی آتے ہیں کبھی کبھی۔"

میں پریشانی میں مبتلا ہونے لگا تھا۔ یہ شامتِ اعمال تھی جو مجھے گھیر کر یہاں لے آئی تھی ورنہ ایک رات کہیں بھی گزر جاتی۔ خطرے سے بچنے کے لیے میں ہوٹل نہیں گیا تھا۔ یہ آسمان سے گر کر کھجور میں اٹکنے کی بہترین مثال تھی۔

پیڈرو اس صورتِ حال سے خوش نظر آتا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اندر میرے ساتھ رہ کے وہ عبدالرحمان کے لیے نیک خواہشات کا اظہار بھی نہیں کرسکتا اور اس نے زبان سے یا اشارے سے عبدالرحمان کی حوصلہ افزائی کی تو نقصان اسے ہوگا۔ بھی کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ کیا ہوگا۔ پیڈرو کے حق میں یہی بہتر تھا کہ وہ خاموش رہے۔ اگر وہ خبیث ٹیکسی ڈرائیور سچ مچ مجھے پولیس کے حوالے کرتا ہے تو پیڈرو کے لیے خطرے کی کوئی بات نہیں۔ وہ کہے گا کہ اچھا بھئی سکندر' خدا حافظ۔ ہمارا تمہارا اتنا ہی ساتھ تھا۔ افسوس ہے کہ تمہاری یہ دوسری کوشش بھی ناکام ہوگئی۔ تم نہ دلاور کا کچھ بگاڑ سکے اور نہ میرا۔ تم اپنی خوش بختی پر بہت بھروسا کرتے تھے۔ اب بدبختی کا زمانہ ہے۔ پہلے تم بال بال بچ جاتے تھے۔ اب تمہارا بال بال قانون کے شکنجے میں ہے اور تمہارے پرانے دشمنوں کو بھی اب کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ تم سے نمٹنے کے لیے وزیر جنگلات ہی کافی ہے اور اس کے ساتھ تمہارے تعلقات کی نوعیت میں بتا سکتا ہوں۔

اگر کسی سبب سے بازی پلٹ جاتی اور میں آزاد ہوجاتا تو پیڈرو پر کوئی الزام نہ ہوتا کہ اس نے صورت حال سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ اسے پہلے سے اپنے کیے کرائے پر پانی پھیرنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں اس کی نیک نیتی پر اعتبار کرنے والا نہیں تھا مگر ابھی تک اس کے ظاہری رویے سے میرے لیے پریشانی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ وہ یہ ثابت کرچکا تھا کہ وہ مجھ سے تعاون کررہا ہے۔

اس وقت بھی جب میں عبدالرحمان کی نیت کو سمجھنے اور اس مشکل سے نکلنے کی اُلجھن میں گرفتار تھا' پیڈرو نے آہستہ سے کہا "اس سے پوچھو کہ یہ کیا چاہتا ہے؟"

میں نے چونک کے اس کی طرف دیکھا اور سر ہلایا "عبدالرحمان۔ تمہاری یہ بدمعاشی تمہیں بہت مہنگی پڑے گی۔"

"سستی تو بھائی جی موت بھی نہیں ہوتی" وہ بولا۔

"ہم اگر چاہیں تو یہ دروازہ توڑ کے بھی باہر آجائیں گے۔ تم کیا کرو گے؟ شور مچاؤ گے' جتنا محلے والے ماریں گے اس سے زیادہ ہم تمہیں ماریں گے۔"

"اچھا جی" وہ بولا "بڑی جان ہے تمہاری۔ دروازہ تو ایویں ہے مگر ایک منٹ ٹھہرو۔"

وہ دوسرے کمرے میں گیا اور واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ "رات کو سراج اتنا غصے میں تھا کہ یہ بھول گیا تھا۔ اس لیے میں نے کہا کہ پولیس خود آئے گی۔ ڈیوٹی پر جانے سے پہلے وہ سیدھا اِدھر آئے گا۔ میں نے کسی پر گولی تو نہیں چلائی پہلے لیکن اس چیز کا استعمال آتا ہے مجھے۔ تم نکلو باہر' دونوں کو ادھر ہی ٹھنڈا کردوں گا۔ کہہ دوں گا میرے گھر میں بُری نیت سے گھسے تھے۔ میں نے اندر بند کردیا تھا اور پولیس کو بُلایا تھا۔ انہوں نے بھاگنے کی کوشش کی تو میں نے گولی ماردی۔"

میں نے کہا "یہ ریوالور پولیس کا ہے' بے وقوف آدمی۔"

"اس کی تمہیں کیوں فکر ہے۔ تم کو مرنا ہے تو آؤ باہر۔ بعد میں سراج خود نمٹ لے گا۔"

میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا "آخر تم ایسا کیوں کررہے ہو عبدالرحمان۔ کیا بگاڑا ہے ہم نے تمہارا۔ تم نے ہماری مدد کی اور ہم نے تمہیں اس کی منہ مانگی قیمت ادا کردی۔ کیا فائدہ ہوگا تمہیں۔۔۔"

"فائدہ تمہیں دیکھنا چاہیے۔ نقصان بھی تمہارا ہوسکتا ہے' میرا نہیں۔ میں تو ایک غریب ڈرائیور ہوں جس کی ٹیکسی بھی اپنی نہیں۔ یہ ٹیکسی بھی سراج کی ہے اور وہ دوسری بھی۔" اس نے بے غیرتی سے دانت نکالتے ہوئے ساتھ والے کمرے کی طرف اشارہ کیا "مجھے تو دونوں کے لیے سواریاں لانے سے کمائی ہوتی ہے تھوڑی بہت۔"

میں نے کہا "اب تم زیادہ کمائی کرنا چاہتے ہو' اپنی ٹیکسی چلا کے؟"

"بڑی جلدی سمجھ گئے۔ سیانے بندے ہو تم۔ تم نے بھی ٹیکسی خریدنے کی بات کی تھی۔ جو ٹیکسی باہر کھڑی ہے وہ میں بھی خریدنا چاہتا ہوں۔ اپنی ہوگی تو آدھی کمائی کسی کو نہیں دینی پڑے گی۔"

"اور تم یہ چاہتے ہو کہ میں وہ ٹیکسی سراج سے خرید کے تمہارے نام کردوں؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا "بس اتنی ہی بات ہے۔"

پیڈرو نے کہا "کیا قیمت ہے اس کی؟"

"ہوگی تیس چالیس ہزار۔ میرے لیے سراج خاصی رعایت بھی کردے گا۔" اس نے پُرامید لہجے میں کہا۔

پیڈرو بولا "اگر اس ٹیکسی کی بات کررہے ہو تو سودا مجھ سے کرو۔ اس کی قیمت پچیس ہزار سے زیادہ نہیں ہوسکتی۔ میں خود بھی یہی کام کرتا ہوں۔"

"تم ٹیکسی چلاتے ہو؟" عبدالرحمان کچھ مایوس نظر آنے لگا۔

"نہیں۔ میں پُرانی گاڑیوں کی خرید و فروخت کرتا ہوں۔"

"سراج اس قیمت میں یہ گاڑی نہیں دے گا۔"

پیڈرو نے کہا "لعنت بھیجو سراج کی ٹیکسی پر۔ تمہیں اس سے اچھی گاڑی میں دلوا سکتا ہوں اس سے بھی کم قیمت میں۔ اب صاف بات کرو کہ ٹیکسی چاہتے ہو یا پیسہ چاہیے؟"

وہ چکر میں پڑ گیا "ٹیکسی میں خود لے لوں گا۔"

"ہم پیسہ نہیں دیں گے۔ اور دیں گے تو پچیس ہزار۔ منظور ہے تو بولو۔"

اس نے کچھ دیر سوچ کے کہا "اچھا نکالو پچیس ہزار۔"

میں نے کہا "تمہارا دماغ خراب ہے۔ ہم کیا جیب میں بینک ڈالے پھرتے ہیں؟ میری جیب میں دو ڈھائی ہزار روپے ہیں۔"

"باقی تم منگوا سکتے ہو" اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ اس کے لیے کسی کو کامران ہوٹل جانا پڑے گا۔" مجھے معلوم تھا کہ عبدالرحمان خود اپنے پھیلائے ہوئے جال

میں پھنس چکا ہے۔

پیڈرو بولا "تم ٹیکسی لے کر جاؤ تو ایک گھنٹے میں واپس آسکتے ہو۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "میں، تم کو اس بے وقوف عورت کے سپرد کر جاؤں؟"

"تو پھر اسے بھیج دو۔ وہ تو شہر میں ہر جگہ آتی جاتی ہوگی۔ خصوصاً ہوٹلوں میں۔"

اس نے پھر انکار کردیا "یہ کام سراج کرے گا۔ تم آرام سے بیٹھ جاؤ۔"

ہم آرام سے بیٹھ گئے۔ سلاخوں کو پکڑنے سے میری انگلیاں درد کرنے لگی تھیں اور بظاہر مذاکرات ایک ایسے نتیجہ خیز موڑ پر پہنچ گئے تھے کہ اب ہم پچیس ہزار ادا ہوجانے کے بعد ہی رہائی حاصل کرسکتے تھے۔

"اس کی اور سراج کی تو..." میں نے ایک گہری سانس لے کر زیرِ لب کہا۔

پیڈرو نے سر ہلایا "میں اس کی نیت کو سمجھ گیا تھا۔"

"ہر لالچی اور بے ضمیر آدمی کو پیسے سے ہی خریدا جاتا ہے۔ پھر بھی میں نے تمہارا سودا کرادیا۔ اور دس پندرہ ہزار بھی بچا دیے۔"

میں نے کہا "میں تمہارا احسان نہیں لے سکتا۔ جو رقم بچی ہے تمہاری کوشش سے وہ تم لے سکتے ہو۔ میرے لیے اس پیسے کی اتنی اہمیت نہیں۔"

باہر ایک کار آئی تو عبدالرحمان کا چہرہ کھل اُٹھا "لو وہ آگیا تھانے دار بھی۔" پھر وہ کنڈی کھولنے چلا گیا۔

"کیا اندھیر نگری ہے۔ ایک معمولی اے ایس آئی ایسی شاندار گاڑی میں عیاشی کرتا پھرتا ہے اور کوئی سوال نہیں کرتا کہ اس تنخواہ میں یہ ٹھاٹ باٹ کیسے؟" میں نے کہا۔

پیڈرو بولا "ڈیوٹی پر وہ پیدل ہی جاتا ہوگا یا موٹر سائیکل پر۔ گاڑی ہوگی اس کی بیوی کے نام پر۔ سب ایسا ہی کرتے ہیں۔"

"یہاں ریوالور ہوگا میرا۔ رات کو ادھر ہی چھوڑ گیا تھا۔ بھول کے۔" سراج بولا۔

عبدالرحمان نے کہا "اچھا جی؟ دیکھ لو ادھر ہی جدھر چھوڑا تھا۔"

وہ ایک منٹ کے لیے کمرے میں گیا اور لوٹ آیا۔ اس کے اور عورت کے درمیان بلند آواز میں ناقابلِ اشاعت مکالموں کا تبادلہ ہوا۔ پھر سراج گالیاں بکتا ہوا باہر آیا "اوئے سیدھی طرح بتا تونے اٹھایا ہے ریوالور؟"

عبدالرحمان دانت نکالنے لگا "او جی۔ میں بھی بھول گیا تھا آپ کی طرح۔"

"کیا بھول گیا تھا؟"

"یہ بتانا کہ ریوالور میں نے دیکھ لیا تھا۔ یہ لو" اس نے ریوالور جیب سے نکال کر اسے پیش کردیا۔

سراج نے اسے ایک اور گالی دی "مخول کرتا ہے۔ اوئے یہ گم جائے نا تو اپنی پیٹی اُتر جائے۔ نوکری گل ہوجائے۔"

"رات تم بہت غصے میں تھے ورنہ ایسی غلطی نہ کرتے۔"

اب سراج کی نظر بند دروازے پر گئی "یہ کیا۔ تونے ان کو بند کر رکھا ہے؟"

"ہاں۔ اب تم لے جاؤ ان کو اور ڈال دو حوالات میں۔"

عبدالرحمان آہستہ آہستہ کھڑکی کے قریب آیا۔ اس کی نظر پیڈرو پر جمی ہوئی تھی "یہ جو... ہے نا۔ اس کی وجہ سے میں نے بڑی مار کھائی تھی۔ پانچ ہزار دے کے ایک مہینے بعد بڑی مشکل سے جان چھوٹی تھی۔"

پیڈرو شاید اسے پہچاننے کی کوشش کررہا تھا "میری وجہ سے؟"

عبدالرحمان چلّایا "ہاں ہاں تیری وجہ سے... تھوڑے عرصے پہلے کی بات ہے... نہیں، اب تو کافی وقت گزر گیا ہے۔"

پیڈرو نے گالی کھانے کے باوجود نرمی سے کہا "تمہیں ضرور غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں نے پہلی بار دیکھا ہے تمہیں۔"

عبدالرحمان نے پھر اسے ایک شاندار گالی سے نوازا "لیکن میں تیری شکل کیسے بھول سکتا ہوں... تیری وجہ سے میں ایک مہینہ بستر پر پڑا رہا۔ کل غور سے تیری شکل نہیں دیکھی تھی میں نے۔ ادھر آکے میں تو حیران رہ گیا۔ غصہ تو مجھے اتنا تھا کہ تجھے قتل کردیتا لیکن میں نے کہا کہ پہلے تیری وجہ سے تھانے میں چھترول برداشت کی، اب پھانسی چڑھ جاؤں، نہیں۔ میں نے اب حساب برابر کرنا ہے۔"

"اوئے پاگل۔ یہ تو کوئی مشکل کام نہیں۔ پورا مہینہ اس کی چھترول ہوجائے گی لیکن اس کا فائدہ؟" سراج بولا "کم مکا کرلے۔"

"وہ کرلیا ہے میں نے" عبدالرحمان بولا "یہ چالیس ہزار دے گا مجھے۔"

پیڈرو نے احتجاج کیا "پچیس ہزار کی بات ہوئی تھی۔"

سراج کی دلچسپی ایک دم بڑھ گئی "اچھا تو سودا بھی ہوگیا۔ اوئے جو پچیس ہزار دے سکتا ہے ہم پچاس بھی نکلوا سکتے ہیں اس... سے۔ یہ کام عبدالرحمان کا نہیں ہے۔ تُو بتا مجھے کیا کیس ہے؟"

"یہ کیا معاملہ ہے؟" میں نے پیڈرو سے پوچھا۔

وہ انجان بن گیا "میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اچانک اسے کیا ہوگیا ہے؟"

"اچانک کچھ نہیں ہوا۔ رات کو تم پچھلی سیٹ پر لیٹے ہوئے تھے اور اس نے تمہارا چہرہ صاف نہیں دیکھا تھا۔"

سراج اور عبدالرحمان برآمدے میں ہی کھڑے ہوئے تھے۔ ...نے کہا تھا کہ میں اس ٹیکسی سے جان چھڑانا چاہتا ہوں۔"

...رحمان بولا۔

"جان تو میں تم سے چھڑانا چاہتا ہوں۔"

"تم یہ کرکے دیکھ چکے ہو۔ دوسروں نے زیادہ نقصان پہنچایا۔ ...بھی نقصان میں رہے۔ تمہاری ٹیکسی جو لے گا وہ آخر میں ...گا۔ تم تو چاہتے ہو کہ جتنا وہ کمائے اس سے زیادہ تمہیں ...تمہاری تھانے داری کے ساتھ ٹیکسی کیسے چل سکتی ہے۔ ...ڈرائیور کچھ کمائے گا نہیں تو خود کیا کھائے گا اور گھر والے کیا ...یں گے۔"

"اچھا زیادہ بکواس مت کر۔ تُو خرید رہا ہے ٹیکسی؟"

"ہاں۔ اللہ نے میری سُن لی اور بندوبست کردیا... گھر بیٹھے۔"

سراج نے کہا "قیمت اس سے وصول کرے گا۔"

"اور میرے پاس اتنی رقم کہاں ہے۔ اس نے ٹیکسی کے ...ہزار ادا کرنے کا وعدہ کیا ہے۔"

"ٹیکسی چالیس کی ہے۔"

"دیکھو تم اس سے چالیس وصول کرسکتے ہو تو کرلو۔ پچاس ...ستر۔ جتنے ہوں سب تمہارے۔ مجھے بس ٹیکسی چاہیے اور ...کا مجھے پتا ہے کہ پچیس میں آرام سے مل جاتی ہے۔ دیکھو نا ...اسامی تو میری ہے۔ میں ہی لایا ہوں اسے اور جب تک میں نہ ...کہ بندے کا جرم کیا ہے تم اس سے کیا وصول کرو گے۔ میں ...رقم جمع کرکے دیتا تو شاید تمہیں پورے پچیس بھی نہ ملتے۔ اس ...تمہارا بھی فائدہ ہے۔ جتنی قیمت لینی ہے اس سے لو۔ مجھے یہ ...ی چاہیے، اور کچھ نہیں۔"

بات سراج کی سمجھ میں آگئی۔ "چل تو خوش رہ..." اس نے ...ب گالی کے ساتھ عبدالرحمان کے دھپ مارا "اب مجھے بتا ...اں بات۔"

"سراج۔ تمہاری ٹیکسی چلانے سے پہلے میں بے روزگار تھا۔ ...کوئی کام آتا بھی نہیں تھا ورنہ اتنے دھکے نہ کھاتا۔ صحت ایسی ...تھی کہ فوج میں بھرتی ہوجاتا یا کہیں چوکیدار بن جاتا۔ میں تو ...خانساماں، ترکھان، موچی کچھ نہیں بن سکتا تھا۔ بس مزدوری مل ...تی۔ سارا دن پتھر کوٹنا۔ کسی راج کے ساتھ محنت مشقت ...زمین کھودنا، بوجھ اُٹھانا۔ یہ اسی زمانے کی بات ہے کہ میں ...کو کندھے پر کدال رکھے واپس جا رہا تھا۔ ادھر ہی ایک چھپر تھا ...میرے ساتھ تین مزدور رہتے تھے۔ چھپر ایک فقیر کا تھا جو ...دو روپے روز کے لیتا تھا۔ میرا حلیہ بہت خراب ہورہا تھا ...تھکن سے میرا بُرا حال تھا۔ سارا جسم مٹی میں بھرا ہوا تھا اور ...سوچ رہا تھا کہ اب کنوئیں پر نہا کے سیدھا تندور پر جاؤں گا اور ...کھاکے سو جاؤں گا۔ کھانا کیا جی وہی تین روٹیاں اور دال یا ...سچ پوچھو تو میں اس زندگی سے بہت عاجز تھا۔ گاؤں سے شہر آیا تھا کمائی کرنے کے لیے۔ باپ کا گزارا ہوجاتا تھا اپنی زمین سے اور اس کی مدد کرنے والا میرا بھائی تھا۔ باپ کے بعد ہم دونوں بھائیوں کا اس سے گزارا نہ ہوتا۔ میں نے سوچا کہ چلو زمین چھوڑو بھائی کے لیے۔ وہ تھا بھی بے وقوف سا اور بس ہل چلا سکتا تھا۔"

"اوئے لمبی کہانی مت ڈال... ڈیوٹی پر جانا ہے مجھے۔"

"آج ذرا دیر سے چلے جانا۔" اس عورت نے بڑی ادا سے کہا "میری خاطر۔"

"تیری خاطر" سراج نے تلخ لہجے میں کہا "رات بڑی خاطریں کی تھیں نا میری۔"

"چل آج کسر پوری کرلینا" وہ بولی "معاملہ ہی ایسا آگیا تھا سراج۔"

سراج کو اس کے تازہ ادا کی اور بونس میں ملنے والی شبِ وصل کی رشوت نے فوراً احساسِ فرض سے بے گانہ کردیا "چل تو کہتی ہے تو یوں ہی سہی۔"

عبدالرحمان نے پھر بولنا شروع کردیا "میں سڑک پار کرنے کے لیے رکا تو ایک گاڑی میرے سامنے آکے رک گئی۔ اس بندے نے مجھ سے پوچھا کہ مزدوری کرنی ہے؟ میں نے کہا کہ آج نہیں کل، وہ بولا کہ ابھی اور اسی وقت میرے ساتھ چلو تو اچھے پیسے ملیں گے۔ صرف کھدائی کرنی ہے۔ میں نے کدال تو اُٹھایا ہوا تھا۔ اس سے یہ سمجھ گیا کہ میں مٹی کھود سکتا ہوں۔ اچھے پیسوں کی بات سن کے میں نے کہا کہ جناب اس وقت میں بہت تھکا ہوا ہوں۔ اس نے مجھے بہت سارے نوٹ دکھائے اور بولا کہ یہ پورے ہزار ہیں۔ تم تین چار گھنٹے میں کما سکتے ہو۔ مزدور بہت ہیں، ایک گڑھا کھودنے کے سو روپے بھی بہت ہوں گے۔ لو جی ہزار کے نوٹ دیکھ کے میں سب کچھ بھول گیا۔ تھکن بھی اور بھوک بھی۔ میں اللہ کا نام لے کر اس کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اندر دو بندے اور بھی تھے۔ ان میں سے ایک آگے بیٹھا ہوا تھا اور دوسرا پیچھے۔ گاڑی میں عجیب سی بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ لو جی گاڑی سیدھی اسی سڑک پر چلتی گئی اور سید پور جاکے رُکی۔ پھر ان میں سے ایک نے کہا کہ یہ بوری اُٹھاؤ اور چلو۔ میں نے مجبوراً بوری اٹھالی۔ وزن زیادہ نہیں تھا مگر وہ بدبو میرا دماغ خراب کررہی تھی جو اس بوری میں سے نکل رہی تھی۔ میں نے گاڑی والے سے پوچھا کہ آخر اس میں کیا ہے تو اس نے کہا کہ تیرے باپ کی لاش ہے۔ فضول سوال کرے گا تو اپنا نقصان کرے گا۔ ہم یہاں سے کوئی مزدور پکڑ لیں گے۔ ان کا کہنا ٹھیک تھا۔ گاؤں میں مزدوروں کی کیا کمی۔ کیتی کدال تو ہر کسان کے پاس ہوتا ہے۔ میرے لیے ہزار روپے ایک لاکھ سے کم نہیں تھے۔ میں چُپ ہوگیا اور ان کے پیچھے چلتا گیا۔ شک مجھے پہلے بھی تھا۔ اب پکا یقین ہوگیا تھا کہ لاش کے سوا بوری میں کچھ نہیں ہوسکتا۔"

سراج نے جو، اب جرم کی ایک واردات کا احوال بڑی دلچسپی اور توجہ سے سُن رہا تھا، پوچھا "بوری میں سے خون شون نہیں نکل

رہا تھا' لاش کتنی پُرانی تھی؟"

"او جی لاش کی بس ہڈیاں رہ گئی تھیں۔ لاش ہوتی تو میں ایسے آرام سے نہیں اُٹھا سکتا تھا۔"

"صرف ہڈیاں؟"

"نری ہڈیاں جناب۔ ایسا لگتا تھا کہ کہیں سے کئی ہفتے یا مہینے پُرانی لاش نکالی گئی تھی اور ہڈیوں کو الگ کرکے بوری میں ڈال دیا گیا تھا۔ ہڈیاں میری پیٹھ پر لگ رہی تھیں اور ان کے آپس میں ٹکرانے کی عجیب آواز آتی تھی۔ میرا تو بُرا حال ہوگیا تھا۔ ڈر سے میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور ایسا لگتا تھا کہ مُردے کی روح میرے کندھوں پر سوار ہے۔ ادھر ایک ہزار کا لالچ تھا اور وہ تینوں بندے بھی خطرناک لگتے تھے۔ میں لالچ میں ایسا پھنسا تھا کہ اتنی دور آکے انکار کرنے کے قابل نہیں رہا تھا ورنہ بوری وہیں پھینک کے بھاگ جاتا کہ ہزار روپے کی خاطر میں تمہارے گناہ میں شریک نہیں ہوسکتا۔ اور گناہ کیا جی یہ تو جرم تھا۔ ان کے ساتھ میں بھی پکڑا جاتا۔"

"اب پکڑا جائے گا" سراج نے بڑے یقین سے کہا۔

"مذاق مت کر یار۔ اپنا سمجھ کے میں سب بتا رہا ہوں تمہیں۔ اتنی پرانی بات بھی ہوگئی ہے کہ اب گڑے مُردے اکھاڑنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ پتا نہیں کون تھا وہ جس کی ہڈیاں تھیں۔ اس کے دونوں ساتھی آگے پیچھے چل رہے تھے اور سب سے آگے یہ تھا" عبدالرحمان نے پیڈرو کی طرف اشارہ کیا "ان سب کے پاس ریوالور تھے۔"

"تجھے کیسے معلوم ہوا؟"

"انہوں نے باری باری نکال کے دیکھے تھے۔ دراصل مجھے دکھائے تھے۔ ڈرانے کے لیے۔ تم نے سیدپور دیکھا ہے؟"

"سیدپور کس نے نہیں دیکھا؟" سراج بولا۔

"جب پہاڑی کے اوپر جانے والے راستے پر جاتے ہیں تو ایک لکڑی کا پول سا آتا ہے۔ ادھر حمام بنے ہوئے ہیں۔ عورتوں کے اور مردوں کے نہانے کی جگہ ہے۔ سیڑھیوں والے حوض ہیں جو ہندوؤں نے بنوائے تھے۔ ان میں اوپر پہاڑی چشمے سے پانی آتا تھا اور دوسری طرف سے نکل جاتا تھا۔ سُنا ہے پہلے اوپر کوئی مندر بھی تھا۔ عورتیں اب بھی سیڑھیوں پر بیٹھ کے کپڑے دھوتی ہیں اور بچوں کو نہلاتی ہیں۔"

سراج بولا "خود نہیں نہاتیں؟"

"نہیں۔ ادھر عام راستہ بن گیا ہے۔ ہندو ہوں گے تو شاید یہ جگہ الگ ہوگی۔ اب اوپر سے صاف نظر آتا ہے۔ پردہ نہیں رہتا۔ خیر جی ہم بھی ادھر سے گزرے اور سیدھے چلتے ہوئے پہاڑی کی طرف نکل گئے۔ میں اتنا تھک گیا تھا کہ ایک جگہ گر گیا۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ چل تھوڑی دیر آرام کرلے۔ ادھر پہاڑ کے اوپر سے آنے والے چشمے کی ایک دھار گرتی ہے۔ پندرہ بیس منٹ کی بلندی ہے۔ نیچے پتھروں کے درمیان موتی جیسا صاف ... ہوجاتا ہے۔ ہم سب نے ادھر غسل کیا۔ ایک ساتھ ... تھی پھر بھی مجھے شرم آئی۔"

"اچھا۔ اُس زمانے میں شرم آتی تھی تجھے۔" عورت ...

"اب تیرے جیسا بے شرم دوسرا کوئی نہیں۔"

"کیوں۔ تو مجھ سے کم ہے کیا؟ روز خصم کون بدلتا ..."

عبدالرحمان گرم ہوگیا۔ اس نے نو سو چوہے کھانے والی ... حوالے سے اس عورت کے بارے میں جو بات کی وہ بیان نہیں ... جاسکتی۔

سراج نے ان دونوں کو گالی دے کے خاموش کیا "... کر۔ اور تو بھی چپ کر۔"

سراج نے یا اس کی نام نہاد بیوی نے قطعی برا نہیں ...

"نہا کے میرے جسم میں تھوڑی سی جان آئی۔ پھر انہوں نے کھانا دیا اور چائے دی۔ ایک بندے نے جو بیگ لٹکا رکھا تھا ... اسی میں تھا۔ انہوں نے بعد میں شراب کی بوتل نکال کے تھوڑی پی اور مجھ سے بھی پوچھا مگر میں نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ ... سمجھ میں اچھی طرح آگئی تھی کہ یہ کیسے لوگ ہیں۔ میں نے دل ... کہا کہ عبدالرحمان' آج تیری خیر نہیں۔ یہ ایک ہزار دینے والے بندے نہیں ہیں۔ یہ تجھے ایک گولی ماریں گے اور چلے جائیں گے۔ تیری لاش ادھر رات بھر پڑی رہے گی۔ کل دن بھر چیل کوّے اور گدھ کھائیں گے۔ رات کو گیدڑ' ہزار کا مجھے خیال بھی نہیں تھا۔ بس یہ فکر تھی کہ کسی طرح جان بچ جائے۔ خیر جی ایک گھنٹے بعد ... گھپ اندھیرے میں آگے گئے اور اوپر۔ وہاں ایک جگہ رک ... انہوں نے مجھے گڑھا کھودنے کا حکم دیا اور خود ایک طرف بیٹھ گئے۔ اللہ ہی جانتا ہے اس وقت میری حالت کیا تھی۔ اندھیرا بڑا سخت تھا اور وہ جگہ ویران تھی۔ ہوا اتنی تیز تھی کہ درختوں سے گزرتی تھی تو رونے کی آواز آتی تھی۔ یا مجھے ایسا لگتا تھا کہ چاروں طرف بدروحیں جمع ہوگئی ہیں۔ گڑھا کھودتے ہوئے میرے ہاتھ پاؤں قابو میں نہیں تھے۔ میں نے سوچا کہ پتا نہیں بوری میں کس کی ہڈیاں ہیں۔ وہ کون تھا۔ اس کا گھر کہاں تھا۔ بیوی بچے ماں باپ بھائی بہن سب اس کو رو دھو کے صبر سے بیٹھ گئے ہوں گے۔ اب انہیں پتا چلا کہ قبر سے لاش بھی غائب ہوگئی ہے تو کتنا دکھ ہوگا انہیں۔ پھر میں نے سوچا کہ انہیں شاید پتا ہی نہیں چلے گا کہ اندر سے قبر خالی ہے۔ اس وقت میں نے پوسٹ مارٹم کا لفظ سنا بھی نہیں تھا۔ میں یہ سمجھ سکتا تھا کہ کسی قبر سے ہڈیاں نکال کے دوسری جگہ گاڑنے کا مقصد کیا ہوتا ہے۔ میرا تو خیال تھا کہ یہ لوگ کوئی سفلی عمل کریں گے مگر یہ ڈر بھی تھا کہ کہیں گڑھا کھودنے کے بعد مجھے بھی گولی مار کے اسی میں دفن نہ کردیں۔ زمین بہت سخت اور پتھریلی تھی۔ صبح ہوگئی اور جب انہوں نے کہا کہ بس اتنا کافی ہے تو میں باہر نکل کے لمبا لیٹ گیا۔ مجھ میں اٹھنے کی ہمت ہی نہیں تھی۔ ان تینوں نے ... ڈال کے خود ہی مٹی برابر کی۔ اصل کام تھا گڑھا کھودنا۔ ... کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ پھر بھی یہ ایک دوسرے کو ... رہے تھے کہ کسی جان دار بندے کو نہیں لائے اور ایک ... آجاتے تو کام جلدی ہوجاتا۔ یہ بندہ جو اندر بیٹھا ہے ... کہا کہ چلو جو ہوا ٹھیک ہوا۔ یہ آدمی بے ضرر لگتا ہے۔ ... اتنا مسکین اور بے وقوف نظر آتا ہے۔ ایک کہتا تھا کہ ... مت چھوڑو' مار کے ادھر ہی چھوڑ جاؤ۔ باقی دو کی وجہ سے ... بچ گئی۔ انہوں نے کہا کہ اسے کچھ پیسے اور دیں گے۔ ... ئیں گے اور دھمکی دیں گے تو یہ خاموش رہے گا۔ وہ ... آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ اور میں خاموش پڑا سن رہا تھا۔ آرام کرنے کے بعد میں نے پھر ہمت کی۔ اب جو کام رہ گیا ... گیا۔ میں نے کہا کہ جناب مشین بھی خراب ہوجاتی ہے۔ ... انسان ہوں۔ کام ہوگیا تو انہوں نے مجھے ایک کے بجائے دو ... اور کہا کہ جو کچھ میں نے دیکھا یا سُنا ہے وہ بھول جاؤں۔ ... بارے میں اور اس کام کے بارے میں کسی کو کچھ بتانے کی ... نہیں' میں نے کہا کہ جناب میں پاگل نہیں ہوں۔ سب ... میں پکڑا جاؤں گا اگر میں نے کسی سے بات کی۔ واپسی میں ... پھر نہا کے کپڑے پہنے۔ تم کو پتا ہے ادھر ایک لڑکا ہے سیدپور ... مٹی کے کھلونے بناتا ہے۔ اس نے مٹی کی ایک ریل گاڑی ... بنا کے کمرے میں رکھے ہوئے ہیں۔ ان کو وہ چلا کے دکھاتا ... پکنک پر آنے والے خوش ہوکے اس کی کوئی چیز خرید لیتے ... ویسے ہی انعام بخش دیتے ہیں۔ ہم نے اس گھر سے کھلونے ... لیے اور وہاں ناشتا بھی کیا۔ دیسی گھی کے پراٹھے اور بکری ... دودھ۔ ساری رات محنت کرنے کے بعد میرا بھوک سے دم ... تھا۔ اس وقت جو مزہ ملا تھا وہ پھر نہیں ملا۔ نیچے آکے ان ... نے کہا کہ اب تم ہمارے ساتھ نہیں جاؤ گے۔ یہ اپنی گاڑی ... گئے اور مجھے بڑی مشکل پیش آئی۔ نہ ادھر سے کوئی تانگا ... تھا اور نہ بس تھی۔ میں پیدل ہی چل پڑا۔ ادھر ہولی فیملی ... تک پہنچنے سے پہلے ہی میرے لیے چلنا مشکل ہوگیا۔ رات ... منٹ سونا نصیب نہیں ہوا تھا۔ پھر اتنی سخت محنت کی اور ... بعد پیدل چلنا پڑا۔ میں ادھر ہی سڑک کے کنارے ایک ... کے نیچے پڑ کے سوگیا۔ دو ہزار میں نے شلوار کے نیفے میں ... تھے۔ میں ایسا سویا جیسے مردے سوتے ہیں۔ چار پانچ بج ... مجھے پولیس والوں نے لات مار کے جگایا۔ وہ گشت پر تھے ... بدقسمتی کہ میں ان کے ہتھے چڑھ گیا۔ انہوں نے اُلٹے ... سوال کیے کہ کون ہے تو' کیا کرتا ہے۔ کہاں رہتا ہے۔ ... مجھے آوارہ گرد اور چور کہا۔ دو ہزار پاس ہونے کی وجہ ... زیادہ ڈرا ہوا تھا۔ میں نے قسمیں کھائیں کہ مزدور ہوں اور ... حال ہے۔ ایک پولیس والے نے کہا کہ مزدور ایسے لمبی ... بے فکری سے سوتے ہیں؟ یہ مزدوری کا وقت ہے۔ چل تلاشی دے اپنی۔ تلاشی کے نام پر میں بدک گیا تو ان کا شک بڑھ گیا۔ انہوں نے میرے دو ہزار نکال لیے اور پھر مجھے بہت مارا کہ یہ نئے نوٹ کہاں سے آئے تیرے پاس۔ میں نے ان کو کچھ نہیں بتایا اور یہی کہتا رہا کہ میں نے مزدوری کرکے بچائے تھے۔ وہ مجھے تھانے لے گئے اور حوالات میں بند کردیا۔ ادھر ہر رات وہ میری چمڑی اُدھیڑتے تھے۔ ان کا پکا خیال تھا کہ میں چور ہوں۔ وہ مجھ سے پوچھتے تھے کہ اس علاقے میں کہاں کہاں چوری کی۔ کیا مال ملا۔ وہ مال کہاں گیا۔ وہ میرے ٹھکانے سے باقی لوگوں کو بھی اُٹھا لائے۔ جس فقیر کا چھپر تھا وہ بھی پکڑا گیا۔ ہم سب لاوارث لوگ تھے۔ مطلب یہ کہ شہر میں کوئی ہماری ضمانت دینے والا نہیں تھا۔ پولیس نے فرض کرلیا کہ ہم چوروں کا گروہ ہیں۔ اس زمانے میں اچانک چوری کی وارداتیں بھی بہت بڑھ گئی تھیں اور اخباروں میں بہت شور تھا کہ پولیس کچھ نہیں کرتی۔ اصل چور ہاتھ کہاں آتے ہیں۔ وہ تو خود پولیس سے ملے ہوتے ہیں۔"

"اوئے عبدالرحمان۔ سوچ سمجھ کے بولا کر" سراج گرم ہوگیا۔

"او جی تمہاری بات کون کررہا ہے۔" عبدالرحمان خوشامدانہ لہجے میں بولا "تم ہو تھانے دار۔ افسر لوگوں کا چوری سے کیا واسطہ۔"

شاید دل ہی دل میں اس نے کہا ہو کہ اوپر والوں کا معاملہ ہوتا ہے ڈاکوؤں سے اور اسمگلروں سے۔ دس نمبریوں سے اور جگا ٹیکس لینے والوں سے۔ بڑے افسر کا واسطہ بڑے دھندے سے۔ چوروں' جیب کتروں' لفنگوں اور آوارہ گردوں سے' پرچون فروشوں سے نیچے والوں کا واسطہ ہوتا ہے۔

"جب پولیس والے مار مار کے تھک گئے اور زیرِ تفتیش ملزمان میں سے ایک نے جان دے دی لیکن نہ کسی چوری کا اعتراف کیا اور نہ چوری کی مال کی نشاندہی کی تو انہیں ہم سب کو چھوڑنا پڑا۔"

"تو نے بتا دیا ہوگا جو تیرے ساتھ ہوا تھا؟"

عبدالرحمان بولا "کیسے بتا دیتا یار۔"

"دیکھ عبدالرحمان۔ تو میرا گرائیں ہے اور میرے تیرے درمیان دوسرے معاملات بھی ہیں۔ لیکن یاری نہیں ہے... کوئی۔"

عبدالرحمان سمجھ گیا "بس جی ایسے ہی منہ سے نکل گیا۔ میں پولیس کو سچ بتا دیتا تو مارا جاتا۔ وہ کہاں مانتے میری بات اور مان لیتے تو مجھ پر ہی قتل کا کیس بنا دیتے۔ یہ پوچھتے کہ لاش کس کی ہے۔ تو نے کیوں دفن کی یہاں لاکے۔ میں اصل لوگوں کے بارے میں کچھ جانتا ہی نہیں تھا۔ میں نے تو ان کی گاڑی کا نمبر تک نہیں دیکھا تھا۔ صرف اتنا معلوم تھا کہ گاڑی کا کیا رنگ تھا۔ اور اگر پولیس لاش برآمد کرلیتی تو خبر چھپ جاتی اور پھر ان کو بھی پتا چل جاتا۔ بعد میں وہ آجاتے میری زبان بند رکھنے کے لیے۔ اس بات کو میں نے بھولے

سے بھی نہیں چھیڑا۔ اسی لیے بچ گیا اور دیکھو قدرت کے کھیل۔ جتنی مصیبت میں نے اُٹھائی۔ اللہ توبہ' آج اس کا بدلہ لینے کے لیے قسمت نے کیسی اُلٹی چال چلی ہے۔ وہ بندہ خود میرے قبضے میں آگیا جس کی وجہ سے میں مرتے مرتے بچا تھا۔ مجھے بھی یقین تھا کہ اس شہر میں ہوگا تو کبھی سامنے ضرور آئے گا۔"

عبدالرحمان کی باتوں نے جہاں پیڈرو کے ہوش گم کردیے تھے وہیں میرے لیے خیالات اور امکانات کے بہت سے دریچے وا کردیے تھے۔ عبدالرحمان ایک سیدھا سادہ دیہاتی' کسان کا بیٹا اور اَن پڑھ محنت کش آج جو کچھ تھا ایک حادثے کے سبب تھا۔ گیدڑ کے بارے میں مشہور ہے کہ شامت اسے شہر لے آتی ہے۔ یہی عبدالرحمان کے ساتھ ہوا تھا۔ استاد پیڈرو کی نگاہ اس مزدور پر نہ گئی ہوتی جو سڑک کے ایک کنارے پر کدال اٹھائے تھکا ہارا گھر لوٹ رہا تھا تو عبدالرحمان کی کہانی میں کوئی سنسنی خیز ڈرامائی موڑ نہ آتا۔ دو ہزار کما کے گنوانے کے بعد اس کو جرمِ بے گناہی کی جو سزا ملی تھی اس نے عبدالرحمان کی زندگی کا رُخ بدل دیا تھا۔ بعد میں پولیس نے اسے مخبر بنالیا اور بدلے میں اس کو شہر میں رہ کے پیسہ کمانے کے ایسے طریقے سکھادیے جن میں محنت کیے بغیر پیسہ کمایا جاسکتا تھا۔ آج وہ سراج کی ٹیکسی چلا رہا تھا اور ایک عورت کے لیے گاہک لاتا تھا۔ ظاہر ہے اس کی کمائی میں بھی وہ سراج کے ساتھ حصّے دار ہوگا۔ وہ عورت کون تھی' کیسے ان بے غیرت لوگوں کے ہتھے چڑھ گئی تھی۔ یہ بھی کوئی کہانی ہوگی مگر مجھے اس سے دلچسپی نہیں تھی۔ ایسی کہانیاں عام ہیں اور ہر دور کے ہر معاشرے میں ملتی ہیں۔ یہ اتفاق تھا یا نوشتہ تقدیر جس نے مجھے' عبدالرحمان کو اور استاد پیڈرو کو ایک ہی چھت کے نیچے جمع کردیا تھا۔

اتنے عرصے بعد عبدالرحمان کو موقع ملا تھا کہ وہ استاد پیڈرو کے ساتھ پُرانا حساب برابر کرے۔ ابھی تک وہ پیڈرو کو بھی میرا ساتھی سمجھ رہا تھا اور اس کا خیال تھا کہ ہم پھر کوئی واردات کرچکے ہیں یا کرنا چاہتے ہیں۔ اچانک میں بری الذمہ ہوگیا تھا اور اب اپنی جان بچانے کی قیمت خود پیڈرو کو ادا کرنی تھی۔ اس کا مجھ پر کوئی احسان نہیں رہا تھا کہ میرے اور عبدالرحمان کے بیچ میں پڑ کے اس نے سستا سودا کرادیا تھا۔ اب یہ بھی ممکن نہیں رہا تھا کہ استاد پیڈرو اسے دھوکا دے سکے اور گمراہ کرسکے یا کہے کہ مجھے اصل جگہ یاد نہیں۔ عبدالرحمان بھی اس جگہ کی نشاندہی کرنے میں مدد کرسکتا تھا۔

سراج نے کہا "پھر اب کیا صلاح ہے تیری۔ اس بندے کو اُدھر لے جائیں اور لاش برآمد کرلیں۔ تجھے جگہ تو معلوم ہے نا؟"

"جگہ تو معلوم ہے لیکن اب اس گڑے مُردے کو اکھاڑنے سے کیا ملے گا۔ پتا نہیں وہ کون تھا؟"

"ہم پتا کرلیں گے۔"

"نہیں سراج۔ ساری بات میں نے بتادی۔ اب جتنا یہ اپنی جان بچانے کا دے سکتا ہے اس سے وصول کر ... معاملے میں پڑنا نہیں چاہتا۔ تمہاری بات اور ہے۔ اس کے ... میرے پیچھے پڑجائیں گے۔"

سراج نے سوچ کے کہا "چل ٹھیک ہے۔ میں اپنا ... تیرے حوالے کرتا ہوں۔ تو اپنا بندہ میرے حوالے کر۔"

میں نے پیڈرو سے کہا "اب کیا خیال ہے پیڈرو؟"

پیڈرو نے سکون سے کہا "میں نے اس کو پہچانا نہیں تھا۔ ... جو کچھ کہہ رہا ہے ٹھیک ہے۔"

سراج نے سلاخوں والی کھڑکی کے قریب آکے ایک زوردار ... فصاحت وبلاغت سے پُر تھانے دارانہ تقریر کی جس میں ایک ... گالیوں کے ساتھ دو تہائی سلیس اردو کے الفاظ میں ہم پر واضح ... گیا تھا کہ آج تک ہم نے جتنے قتل کیے' جتنے ڈاکے ڈالے ... عورتیں اُٹھائیں۔ اور اسی نوعیت کے جتنے سنگین جرائم کیے ... ان سب کا حساب ہوگا اور اس سے پہلے جو کچھ ہوگا اس کا ابھی ... تصور بھی نہیں کرسکتے۔ ہم اس دن کو روئیں گے جب پیدا ہوئے تھے اور پھر اس دن کو جب سراج سے ملے تھے۔ تیسرا دن وہ ہو ... جب ہمیں رونے والا کوئی نہ ہوگا۔

سراج نام کا یہ دوسرا تھانے دار تھا جو میرے سامنے اپنے ... فرعونی لہجے میں آتش فشاں تھا۔ شاید اس کا انجام بھی وہی ہونے ... والا تھا جو پہلے والے انسپکٹر سراج کا ہوا تھا۔ اس کی بکواس سے ... میں پریشان تھا اور نہ پیڈرو۔ جو حکمت عملی ہمارے ذہن میں تھی ... وہ سراج یا عبدالرحمان کے خواب وخیال میں بھی نہیں آسکتی ... تھی۔ اس کے لیے اداکاری کا اچھا مظاہرہ ضروری تھا۔

بالآخر مجھے بھی کچھ عرض کرنے کا موقع ملا "تھانے دار صاحب۔ ویسے تو بات ہوگئی تھی عبدالرحمان سے۔"

اس نے مجھے اور عبدالرحمان کو ایک درجن گالیاں دیں ... "مذاق سمجھ رکھا ہے تم نے قانون کو۔ اب بات ہوگی تھانے میں۔"

میں نے کہا "سرکار۔ آپ مالک ہیں۔ مائی باپ ہیں' تھانے میں اور لوگ بھی ہوں گے۔ اودھر ہی بات ختم ہوجائے تو اچھا ہے۔"

سراج کے ذہن میں بھی یہ نکتہ ہوگا کہ تھانے میں اس کو اس کے حصّے سے زیادہ کچھ نہیں ملے گا۔ تھانہ انچارج صاحب کے علاوہ اوپر نیچے کے سب لوگ ہاتھ پھیلائیں گے۔ یہاں سارا مال اپنی جیب میں جائے گا اور پوچھنے والا کوئی نہیں ہوگا۔

"تم پچیس ہزار میں بات ختم کرنا چاہتے ہو؟" اس نے واشگاف الفاظ میں اعلان کیا کہ سراج کو عبدالرحمان سمجھنا ہماری غلطی ہے اور اگر ہم تھانے میں تفتیش کے جان لیوا عمل سے گزرے بغیر ایک لاکھ دے کے چھوٹ جائیں تو یہ بڑی خوش قسمتی ہوگی۔

کافی ردوکد کے بعد پچاس ہزار میں معاملہ پھر طے پاگیا۔ قناعت پسند عبدالرحمان ایک ٹیکسی کا مالک بن جانے پر ہی بہت خوش تھا اور اسے سراج سے کوئی حسد محسوس نہیں ہورہا تھا جس نے پچیس ہزار کی چیز کے پچاس وصول کرلیے۔ ایک ٹیکسی ڈرائیور کے مقابلے میں تھانے دار اتنا بااختیار ضرور ہوتا ہے۔

میں نے عبدالرحمان کو بتایا کہ وہ سیدھا کامران ہوٹل جائے اور بستر ہوگا کہ نورا ہی چلا نہ جائے۔ میں نے اسے نازو کا کمرا نمبر بھی بتادیا اور ایک رقعہ لکھ دیا جس کا مضمون سراج کی مرضی کے عین مطابق تھا۔ میں نے لکھا تھا۔

"نازو۔۔۔

یہ رقعہ ملتے ہی پچاس ہزار روپے نقد لے کر اس پتے پر آجاؤ جو میں نے پیچھے لکھا ہے۔ تمہاری آسانی کے لیے نقشہ بھی بنادیا ہے۔ اگر میری زندہ سلامت واپسی مطلوب ہے تو کسی کو کچھ مت بتانا۔ اپنے ساتھ کسی کو مت لانا۔ کسی کو فون بھی مت کرنا۔ خالی ہاتھ آنا' ہوٹل کے دروازے سے چند قدم کے فاصلے پر ایک ٹیکسی کھڑی ہوگی۔ اس میں بیٹھ جانا۔ اسے پتا سمجھانا بلکہ یہ رقعہ اسے دے دینا۔ وہ خود تمہیں لے آئے گا۔ یہ میری زندگی اور موت کا معاملہ ہے۔ دیر مت کرنا۔ تمہارا کبیر خان۔"

مجھے اندازہ تھا کہ دس بجے تک میری طرف سے رابطہ نہ ہونے کے باعث اکیلی رہ جانے والی نازو کتنی پریشان ہوگی۔ رابعہ اور غالب صبح ہوتے ہی چلے گئے ہوں گے اور اب وہ کمرے میں میرے فون کا' میرا یا کسی پیغام کا انتظار کرتے کرتے بھی تھک گئی ہوگی لیکن وہ ہوٹل چھوڑ کے کہیں جا بھی نہیں سکتی تھی۔

عبدالرحمان ٹیکسی لے کر چلا گیا تو سراج کھڑکی کے سامنے کرسی ڈال کے بیٹھ گیا۔ "کیا تم جنت کے چکر میں پڑ گئے؟"

"جنت؟ ہم تو جہنم کے عذاب میں پڑ گئے جی۔۔۔۔ بڑے گنہگار لوگ ہیں۔"

"اوئے پاگل دے پتر۔ جنت بی بی۔ وہ کسبی جو سوئی پڑی ہے اُدھر دوسرے کمرے میں۔"

میں نے کانوں کو ہاتھ لگائے "توبہ جی۔ ہمیں پتا ہوتا تو ہم کبھی عبدالرحمان کے ساتھ نہ آتے۔ اس نے کہا کہ رات گزارنے کی جگہ ہے۔"

سراج ہنسا "یہ تو ٹھیک کہا تھا اس نے۔"

"ہم غلط سمجھے تھے۔" میں نے بے وقوفوں کی طرح سرہلایا "ویسے یہ عورت جنت بی بی کون ہے؟"

"تم کیوں پوچھ رہے ہو؟ رپورٹ کرنی ہے میری؟ اس کے مامے لگتے ہو تم۔۔۔؟" سراج نے مجھے گالیاں دے کے کہا۔

"وہ عبدالرحمان۔۔۔۔ اسے اپنی بیوی کہتا ہے۔"

"کہتا ہے نکاح نامہ ہے اس کے پاس" پیڈرو بولا۔

"چھوڑو یہ بات۔ وہ بندہ کون تھا جس کو تم نے قتل کیا تھا اور اِدھر لا کے گاڑا تھا؟"

"تھانے دار صاحب۔ آپ بڑے تجربہ کار ہو۔ کیا ہم صورت سے قاتل لگتے ہیں؟" میں نے عاجزی سے کہا۔

"یہی تو بات ہے۔ قاتل شکل سے پہچانے جائیں تو سب پکڑے جائیں اور پھانسی چڑھ جائیں۔"

میں نے کہا "جنابِ عالی۔ ایسی بات نہیں ہے۔ ہم تو چھوٹے موٹے کام کرتے ہیں۔ قتل کرنا' ڈاکے ڈالنا یہ ہمارے بس کی بات نہیں۔ ہم سے تو کسی نے کہا تھا کہ یہ کام کرنا ہے۔ اس کے دس ہزار دیے تھے۔ ہم نے دو ہزار عبدالرحمان کو دے کے کام کرالیا۔"

اس نے غور سے مجھے دیکھا "بکواس کرتا ہے۔ اُلو بناتا ہے مجھے؟"

میں نے کہا "سرجی۔ اب جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے مجھے' بات ہوچکی۔"

"کام کرانے والے کون لوگ تھے؟"

"وہ جی۔ اُدھر لاہور کے بندے ہیں۔ الف دین اور ان کے ساتھی پہلے ریڈیو پر قوالی کرتے تھے۔ پھر بدمعاشی کرنے لگے۔"

سراج نے پھر مجھے شک سے دیکھا "قوالی۔۔۔۔ قوالی چھوڑ کے بدمعاشی شروع کردی؟"

میں نے آہ بھر کے کہا "کسی شریفانہ پیشے میں آمدنی نہیں رہی۔ گزارا نہیں ہوتا۔ آپ بتاؤ' اگر صرف یہ وردی اور تنخواہ ہو تو پورا پڑے گا؟"

وہ کسی اور چکر میں تھا۔ اس نے نفی میں سرہلا کے کہا "تم لاہور سے آئے ہو۔ الف دین کے کسی کام سے؟"

میں نے کہا "نہیں جی۔ ابھی تو ایسے ہی سیرسپاٹے کے لیے آئے تھے۔ اسی لیے ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔"

"لیکن عبدالرحمان نے بتایا کہ تم اسے پُل پار ملے تھے۔"

"ہاں جی۔ ادھر جانا منع تو نہیں ہے" میں نے مسکرا کے کہا "اس کو زیادہ شوق تھا۔ ادھر جانے سے پہلے ہی ٹن ہوگیا۔"

"ٹُن ہوگیا؟"

"میرا مطلب ہے جی۔ بہت زیادہ پی گیا' مفت کی ملی تھی۔"

سراج نے کہا "وہ گاڑی تو سرکاری تھی اور بہت شاندار تھی جس میں سے۔۔۔۔"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "ہاں جی۔ الف دین ان کا خاص آدمی ہے۔ اس کی سفارش سے ہمیں گاڑی مل گئی تھی۔"

"یہ کون ہے جس کو تُونے رقعہ بھیجا ہے؟"

"بس جی۔ آپ کچھ بھی سمجھ لیں۔ بیوی کے علاوہ۔۔۔۔" میں نے کہا۔

وہ سرہلانے لگا "الف دین کو ضرور معلوم ہوگا۔۔۔ کہ یہ بندہ کون تھا؟"

میں سمجھ گیا کہ ایک پُراسرار قتل کے معاملے میں وہ صرف پچاس ہزار پر سودا کرکے... مطمئن نہیں ہے۔ اس کی نیت میں فتور آگیا تھا۔ شاید اب وہ سوچ رہا تھا کہ پچاس ہزار بیعانہ رکھ لے اور ہمیں حوالات میں بند کرکے الف دین کو بلوائے۔ اس سے پوچھا جائے کہ مقتول کون تھا اور قتل کیوں ہوا تھا اور کس نے کیا تھا۔ پولیس ویسے تو بہت کم جرائم کا سُراغ لگانے میں کامیاب ہوتی ہے اور کامیابی کا جو بھی تناسب ہے اس میں عقل اور ذہانت سے زیادہ اتفاق کا دخل ہوتا ہے۔ کوئی مخبری کردیتا ہے یا شک میں دس بیس بندوں کی کھال میں بھس بھرا جاتا ہے تو ایک اعتراف کرلیتا ہے۔ اس کیس میں پولیس دعویٰ کرسکتی تھی کہ انہوں نے مہینوں دن رات ایک کرکے جرم کا سُراغ لگایا اور قاتل تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ سراج زیادہ کے چکر میں پڑگیا تھا۔ وہ الف دین سے بھی کچھ وصول کرنا چاہتا تھا اور قاتل سے بھی اس کو لمبی رقم کی اُمید تھی۔

پیڈرو بھی جانتا تھا کہ نازو آئے گی تو کیا ہوگا۔ اس وقت وہ سو فیصد میرے ساتھ تھا۔ دلاور سے اسے کوئی اُمید نہ تھی۔ اُلٹا وہ پیڈرو کا جانی دشمن ہوگیا تھا۔ پیڈرو میں اس سے مقابلے کا دم خم نہیں تھا۔ اب وہ ہر قیمت پر اپنی جان چھڑا کے اور بچا کے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ شیخ مختار کے لیے اپنی نئی زندگی میں بڑی کشش تھی، سکون کا احساس تھا اور تحفظ کی ضمانت تھی لیکن اس کے لیے عمرِ رفتہ کا آسیب وبالِ جان تھا۔ اس کے مجرم ماضی کا ہر لمحہ کسی بدروح کی طرح اس کے تعاقب میں تھا۔ شاید یہی قدرت کا نظام انصاف ہے کہ جب آدمی نفرت کی زمین میں دشمنی کے بیج ڈالتا ہے تو پھر اسے انتقام کا پھل بھی کھانا پڑتا ہے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ تمام عمر کوئی بے گناہوں کو دکھ اور عذاب، خوف اور دہشت، ظلم اور جبر کی چکی میں پیستا رہے اور جب دل بھر جائے یا موت کا خوف غالب آنے لگے تو وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے سکون اور عافیت کی زندگی میں یوں داخل ہوجائے جیسے آدمی اندھیرے سے اُجالے میں چلا جاتا ہے۔ یہ اتنا آسان اور خود اختیاری نہیں ہوتا۔ عمل کے بعد مکافاتِ عمل۔ گناہ کے بعد اس کا کفارہ ادا کرنے اور جرم کے بعد اس کی سزا بھگتنے سے ایسے کون بچ سکتا ہے۔ اسی لیے دمِ آخر توبہ بھی قبول نہیں ہوتی۔

گیارہ بجے کے قریب سراج نے ہم سے پہلے ٹیکسی کی آواز سُن لی اور بولا "لو عبدالرحمان تو آگیا" اس کے ساتھ ہی ٹیکسی دروازے کے سامنے رک گئی۔ عبدالرحمان پہلے اندر آیا۔ اس کے لبوں کی فاتحانہ مسکراہٹ بتاتی تھی کہ وہ اپنی کامیابی پر خوش ہے۔

نازو اس کے پیچھے سخت بدحواسی اور گھبراہٹ کا مظاہرہ کرتی داخل ہوئی۔ اس نے اے ایس آئی کو دیکھا تو سہم کر رُک گئی۔ لیکن اسے دیکھ کر سراج بھونچکا رہ گیا۔ وہ حُسن و رعنائی اور نزاکت کے ایسے خیرہ کن نظارے کے لیے تیار نہ تھا۔ سادگی کے باوجود نازو کے انداز و اطوار میں پُرکاری تھی اور یہ سراج کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ ہم جیسے لوگوں کے ساتھ ایسی صورت بھی نظر آسکتی ہے۔ اس کے تصور میں کوئی عام سی عورت ہوگی۔ موٹی بھدی، کالی اور جاہل۔ سرمے کاجل اور مِسّی، بھدے میک اپ اور زیورات سے بنی سنوری۔ جب نازو میری طرف لپکی تو سراج کو ہوش آیا۔

اس نے ایک دم نازو کی راہ میں حائل ہوکے اسے پکڑ لیا "رک جا اِدھر ہی۔ تجھے بڑی جلدی ہے اپنے یار سے ملنے کی۔ ہم جو راستے میں وردی پہنے بیٹھے ہیں۔"

اس کا اتنا بولنا ہی بارود میں چنگاری بن گیا۔ پلک جھپکتے میں نازو کا روپ بدل گیا۔ وہ چاندنی کی کرن سے آسمانی بجلی بن گئی۔ وہ ایک دم پیچھے ہٹی۔ پھر اس نے سراج کی کلائی پکڑلی اور اسے جھٹکا دے کے اپنی طرف کھینچا۔ اس کی عقل تو پہلے ہی خبط تھی۔ اس کے دل و دماغ کو برقِ حسن کا زبردست الیکٹرک شاک لگا تھا۔ پھر چند سیکنڈ میں یہ آسمانی بجلی اس پر یوں گری کہ وہ اپنی تھانے داری اور مردانگی کے زعم سمیت زمیں بوس ہوگیا۔ وہ چلایا "اوئے کیا کرتی ہے..." مگر اس وقت تک نازو نے اس کے پیٹ سے ذرا نیچے گھٹنا مار کے اسے دُہرا کردیا تھا اور پھر گھٹنے کو اونچا کرتے ہوئے سراج کو بھی اوپر اٹھالیا تھا۔

سراج کا سر نیچے ہوگیا اور ٹانگیں چھت کی طرف اٹھ گئیں۔ اس پوز میں ایک سیکنڈ سے زیادہ نہیں رہا۔ نازو کے دوسرے ہاتھ نے اس کو کمر کی بیلٹ پکڑ کے جھٹکا دیا، وہ خود کسی ماہر رقاص کی طرح جھک گئی اور سراج اس کے سر کے اوپر سے گزرتا ہوا پیچھے کھڑے ہوئے عبدالرحمان پر جالگا۔ عبدالرحمان اس کے نیچے دب گیا۔

نازو بڑی تیزی سے پلٹی اور اس نے سراج کے اُٹھنے سے پہلے ہی لات گھما کے اس کی گردن پر ماری۔ ایسا کرتے ہوئے نازو خود بھی دوسرے پاؤں کی ایڑی پر گھوم گئی تھی، نتیجہ یہ کہ پورے تین سو ساٹھ ڈگری کے دائرے میں گھوم کر آنے والی لات کی ضرب سراج کے حق میں اتنی ہی مہلک ثابت ہوئی اور وہ اس طرح پٹ سے گرا جیسے گھومتے ہوئے بجلی کے پنکھے کی زد میں آجانے والی چڑیا دیوار سے ٹکرا کے گرتی ہے۔

عبدالرحمان نے چلّا کے کہا "اوئے مجھے مت مارو" مگر نازو اس رحم کی درخواست کی وصولی سے قبل ہی سزا پر عمل درآمد کرنے کے لیے ایکشن میں آچکی تھی۔ سراج کا حشر دیکھ کے عبدالرحمان پر ویسے ہی رعشہ طاری تھا۔ اس نے بھاگنے کی کوشش کی تو پیچھے دیوار آگئی۔ نازو کی پہلی کک اس کی پسلیوں میں لگی اور اس نے منہ کھول کے سانس لینے کی کوشش کی اور پھر آگے جھک گیا۔ نازو نے اسے کالر سے پکڑ کے کھینچا اور مخالف سمت میں دھکا دے

"اب کیا کرنا ہے مجھے؟" اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"تم نے اپنا فرض بطریقِ احسن پورا کیا عزیزہ۔ باقی کام ہمارا ہے۔ تم چاہو تو ایک چیز اپنے ساتھ لے کر جاؤ اس گاڑی میں۔ جو باہر موجود ہے" میں نے کہا۔

"کیا چیز لے جاؤں" اس نے بے سدھ پڑے ہوئے دونوں افراد کی طرف دیکھ کے کہا۔

"اسی کو لے جاؤ جو تمہیں لایا تھا" میں نے کہا "میں اسے گاڑی کی ڈکی میں ڈال دیتا ہوں۔"

"اسے لے کر میں کہاں جاؤں؟ ابھی تو میں نے ہوٹل بھی نہیں چھوڑا۔"

"تم راولپنڈی کے راستوں سے واقف ہو... نہیں، خیر واپس کامران ہوٹل پہنچو کوئی مشکل کام نہیں۔ اطمینان سے چیک آؤٹ کرو اور لوٹ کے اسی راستے پر آؤگی تو ہم کہیں نہ کہیں مل جائیں گے۔ کسی گلی میں مڑنے کی ضرورت نہیں۔ یہ سیّد پوری روڈ ہے۔ اس پر سیدھا چلتی جانا۔"

"تم ساتھ کیوں نہیں چلتے۔"

میں نے کہا "کیوں اکیلے جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔"

"نہیں۔ تم کو اکیلا چھوڑتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ پتا نہیں میری واپسی تک نئی حماقت نہ سوجھ جائے۔"

"تم سمجھتی ہو کہ یہ پنگا میں نے جانتے بوجھتے لیا تھا تو یہ تمہاری غلط فہمی ہے جو میں بعد میں دور کروں گا۔" میں نے کہا "چلو تم باہر جاکے گاڑی میں بیٹھو... میں ان سب کا بندوبست کرکے آتا ہوں۔"

"میرے یہاں رُکنے میں کیا حرج ہے۔"

"حرج ہے نا یار۔" میں نے کہا "اچھا تم اس کمرے میں پیڈرو سے باتیں کرو۔ یہ تمہیں بتا سکتا ہے کہ ہم یہاں کیسے پہنچ گئے تھے؟ پانچ دس منٹ لگیں گے مجھے۔"

نازو نے سرہلایا "جو کرنا ہے جلد کرو۔"

میں نے وہی کیا جو پہلے سے میرے ذہن میں تھا۔ دوسرے کمرے میں عبدالرحمان کی مبینہ منکوحہ ایسے منہ دوسری طرف کرکے بیٹھی رہی جیسے اس سے زیادہ باحیا اور شرمیلی عورت کوئی نہیں۔ جب میں نے اسے بھی تیار ہونے کا حکم دیا تو اس کو پہلے یقین نہیں آیا۔

"تم نے سُنا نہیں میں نے کیا کہا ہے؟"

"لیکن... اس کی کیا ضرورت ہے۔ میں پہلے ہی وعدہ کرچکی ہوں... کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی... اور شور بھی نہیں کروں گی۔"

"بحث کے لیے میرے پاس وقت نہیں ہے۔" میں نے دہاڑ کے کہا "مجھے زبردستی پر مجبور نہ کرو۔ یہ مرد تھے۔ وار سہ گئے۔ تم مرجاؤگی اگر ہاتھ سخت پڑگیا۔ جلدی کرو۔"

اس نے ڈر کے میرے حکم کی تعمیل کی۔ میں نے اسے اور کراسٹارٹ کردیا۔ وہ دوڑتا ہوا گیا اور اپنے سامنے کی دیوار سے ٹکرا کے سراج کے ساتھ ہی لیٹ گیا۔

اس ہنگامہ آرائی نے دوسرے کمرے میں سارے معاملات سے بے خبر سونے والی عورت کو بھی جگادیا تھا۔ وہ دروازے میں کھڑی پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایک ناقابلِ یقین منظر دیکھ رہی تھی۔ اس نے فلموں میں سلطان راہی کا یہ ایکشن ضرور دیکھا ہوگا مگر حقیقی زندگی میں ایک دبلی پتلی نازک اندام اور حسین لڑکی چند سیکنڈ میں دو مردوں کو مقابلے کی مہلت دیے بغیر لمبا ڈال دے۔ ایسا اس نے سُنا بھی نہیں تھا اور شاید وہ کسی کو سُناتی تو وہ یقین نہ کرتا۔ وہ سمجھتا کہ وہ مذاق نہیں کررہی ہے تو پھر نشے میں ہوگی یا اس نے خواب میں ایسا دیکھا ہوگا۔

جب نازو نے اس کی طرف دیکھا تو وہ تھر تھر کانپنے لگی اور ہاتھ جوڑنے لگی "میں... میں بے قصور ہوں۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔"

میں نے نازو سے کہا "اس سے کہو کہ اندر جاکے خاموش بیٹھے۔ تم تالا کھولو۔"

نازو نے مسکرانے کی کوشش کی "تالا کیسے کھولوں۔ کہو تو دروازہ توڑ دوں۔"

میں نے کہا "مانا کہ آپ بڑی شہ زور ہیں مگر بے سبب ان نازک ہاتھوں کو زحمت نہ دیں۔ یہ بے حس دروازے متاثر نہیں ہوں گے۔"

"پھر کیا کروں؟ چابی کہاں ہے تالے کی؟"

میں نے کہا "مسٹر عبدالرحمان کی جیب میں۔"

"اور مسٹر عبدالرحمان کون ہیں؟" اس نے سراج کی طرف دیکھا "یہ تھانے دار صاحب!"

"نہیں۔ وہ ٹیکسی ڈرائیور جو اپنی شامتِ اعمال کو خود بُلا کے لایا تھا۔"

نازو نے عبدالرحمان کی جیب میں سے چابی کے ساتھ ہی پچاس ہزار روپے بھی نکال لیے۔ پھر اس نے تالا کھول دیا "تم بھی کمال کی بے وقوفی کرتے ہو سکندر بعض اوقات۔"

میں نے تسلیم کیا "بعض اوقات بڑے بڑے دانشور بھی بے وقوفی کرتے ہیں۔ غلطی کرنا انسان کا پیدائشی حق ہے کیونکہ وہ خطا کا پتلا ہے۔"

نازو پر اب غصّے کا بھوت سوار ہورہا تھا "یہ مذاق کی بات نہیں۔ میں بہت پریشان تھی۔ رابعہ کو غالب کے ساتھ تم نے بھیجا۔ میں اکیلی تھی ہوٹل میں..."

میں نے افسوس اور ہمدردی سے کہا "اچھا؟ سب ہوٹل چھوڑ کے بھاگ گئے۔ سارے مسافر اور انتظامیہ کے ارکان...؟ ویری بیڈ۔"

نازو سمجھ گئی کہ اس وقت سیریس ہونے کا کوئی فائدہ نہیں

تھانے دار کو ایک ساتھ باندھ دیا۔ تھانے دار کے ہاتھ عورت کی کمر کے گرد حمائل تھے اور ایک رسّی نے ان کو نیچے سے اوپر تک یک جان دو قالب کردیا۔ اس حالت میں وہ ایک دوسرے کو نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ تھانے دار ہوش میں آجاتا تب بھی کسی اور کی مدد کے بغیر اس جبری ہم آغوشی سے نجات حاصل نہیں کرسکتا تھا۔ جتنی ذلت گزشتہ شب عباسی نے جھیلی تھی اس تھانے دار کے مقدر میں اس سے کہیں زیادہ تھی۔ جب بالآخر لوہے اور مقناطیس کی طرح چپکے ہوئے طالب و مطلوب کو جدا کرنے والا ظالم سماج آئے گا تو اس غیر سنسر شدہ غیر فلمی منظر کے جتنے گواہ ہوں گے' اتنی باتیں۔ یہ قصّہ کسی نے مرچ مسالے کے ساتھ اخبار والوں تک پہنچادیا تو تھانے دار کی وردی ہمیشہ کے لیے گئی۔ عبدالرحمان اور اس کی نام نہاد بیوی کے لیے یہاں رہنا ناممکن ہوگا لیکن وہ بے غیرت ہیں۔ کچھ دن تھانے میں گزار کے کوئی اور سراج تلاش کرلیں گے۔

عورت کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ وہ آنے والے وقت کے تصور سے خوف زدہ تھی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ ہم پیشہ ور چور ڈاکو نہیں ہیں۔ اس سے کسی نے نقد یا زیور طلب نہیں کیا تھا۔ اس کے جسم کو بدنیتی سے چھُوا تک نہیں تھا۔ وہ سمجھ رہی ہوگی کہ کسی نے سراج کی دشمنی میں ایسا کیا۔ ظلم اور زیادتی سراج کے معمول کا حصّہ تھا اور آمدنی کا ذریعہ۔

کمرے کی کنڈی باہر سے لگانے سے پہلے میں نے سراج کی وردی لپیٹ کر رکھ لی۔ اس میں ریوالور بھی تھا اور اس کا بہت پھُولا ہوا پرس بھی۔ مجھے اپنا میک اپ اُتار کے اصل چہرہ بحال کرنے کے لیے بھی وقت درکار تھا اور لباس بھی بدلنا تھا۔ میک اپ کرنے کے لوازمات کی طرح پکے میک اپ کو اتارنے کے لیے بھی کچھ ضروری چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ عارضی میک اپ پانی اور صابن سے منہ دھوکے اُتارا جاسکتا تھا مگر میرا فرنچ وکیل والا حُلیہ مشکل سے بنتا تھا اور مشکل سے بگڑتا تھا۔ میں نے سراج کی گاڑی میں سے پیٹرول نکالا اور ایک تولیے کو گیلا کرکے چہرے کو صاف کرتا رہا۔ دس پندرہ منٹ بعد میں چہرے کے اصل رنگ روپ کو بحال کرنے میں نوّے فیصد کامیاب ہوگیا تھا۔ میں نے آنکھوں کے اندر سے سبزی مائل بھورے رنگ کے کنٹیکٹ لینز نکال دیے اور ناک میں سے دو اسپرنگ جو میری خاندانی ناک کو افسوسناک بنادیتے تھے۔ میں نے بالوں کی وگ اُتاردی تو بہت دن بعد آئینے میں سکندر بخت کو دیکھ کر خوشی ہوئی۔

جب ہم وہاں سے نکلے تو حسبِ ضرورت سب نے تھوڑا بہت حُلیہ تبدیل کرلیا تھا۔ میں نے عبدالرحمان کا ایک پُرانا اور خستہ حال قمیص شلوار پہن کے سر پر ایک گول ٹوپی رکھ لی تھی جو شاید عبدالرحمان جمعے کے جمعے نماز پڑھتے وقت استعمال کرتا ہوگا یا عید بقرعید۔ خود نازو نے بھی ایسے ہی میلے کچیلے اور مسترد شدہ پُرانے کپڑے پہننا منظور کرلیا تھا مگر بعد میں اسے خیال آیا کہ ابھی اسے ہوٹل جا کے سامان اُٹھانا ہے۔ پھر اتفاق سے عورت کی کپڑوں کی الماری میں سے ایک برقع نکل آیا۔ اسے بھی رات کے اندھیرے میں آتے جاتے اپنا چہرہ چھُپانے کی ضرورت پڑتی ہوگی اور محلّے دار اس محنت کش ٹیکسی ڈرائیور کی بیوی کو بھی شریف اور پردہ دار عورت سمجھتے ہوں گے۔

عبدالرحمان کی ٹیکسی ہم نے وہیں چھوڑ دی اور دروازے کو مقفل کردیا۔ عبدالرحمان کو میں نے بے ہوشی کی حالت میں اُٹھایا اور سراج کی گاڑی کی ڈکی میں ڈال دیا۔ سراج کی حالت بھی میں نے دیکھی تھی اور میرا اندازہ تھا کہ ایک گھنٹے میں اسے ہوش آجائے گا۔ ہوش آنے کے بعد بھی وہ دل ہی دل میں مجھے گالیاں دینے کے سوا کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ جس عورت کی جسم کی طلب میں وہ اپنی عزت اور غیرت کو بھول کے بصدِ شوق آتا تھا اب اسی عورت کے وجود سے چمٹے رہنا اس کے لیے باعث اذیت ہوگیا تھا۔ اصل کھیل جذبات کا ہے۔ شاید زندگی میں پھر کبھی سراج اس سے ملے تو یہ سب بھول گیا ہو اور اس کی ہوس کے فطری جذبات پھر وہی ہوں جو آج ہیں۔

کامران ہوٹل تک گاڑی نازو نے ڈرائیو کی۔ اسے ہوٹل سے چیک آؤٹ کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ دس منٹ بعد ایک پورٹر اس کا سوٹ کیس باہر رکھ کے اور ٹپ لے کر چلا گیا تو میں نے سوٹ کیس اٹھا کے پچھلی سیٹ پر اپنے ساتھ رکھ لیا۔ پیڈرو اگلی سیٹ پر تھا اور میں عین اس کے پیچھے۔ اس کے پُرتعاون جذبے پر اعتبار کرتے ہوئے یہ فرض کرلیتا کہ اب وہ کوئی ایسی ویسی حرکت نہیں کرے گا میرے لیے ناممکن تھا۔ اس کی مکاری اور فطری خطرناکی سے محتاط رہنا ازحد ضروری تھا۔ وہ پُرانا دشمن تھا اور شاید اتنا بے بس اور مجبور بھی نہیں تھا جتنا نظر آنے کی کوشش کررہا تھا۔

نازو پھر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی تو میں نے کہا "کل دو باکس بھی سامان میں شامل تھے۔"

"وہ لاہور گئے" نازو بولی۔

"کیا تھا ان میں؟"

"یہ پوچھو کیا نہیں تھا۔ نہایت قیمتی غیر ملکی کپڑوں کے سوٹ پیس' گھڑیاں' کیمرے' شراب اور سگریٹ کے کارٹن۔ پرفیوم اور جیولری' لاکھوں کی رشوت تھی۔"

"کروڑوں کمانے کے لیے۔ تم نے آج کا اخبار دیکھا؟"

"ہوٹل میں تمہارے فون کا انتظار کرتے ہوئے میں نے سارے اخبار اور رسالے پڑھ ڈالے تھے۔"

میں نے کہا "عباسی کے بارے میں کیا خبر ہے؟"

"صرف ایک ہی اخبار نے رنگیلے وزیر کی مصروفیات کا احوال چھاپ دیا ہے۔ ٹُکی بائی اور خبر دینے والا دونوں مشکل میں پڑجائیں گے۔"

"خبر میں پیر صاحب کا حوالہ تو نہیں ہے۔ وہ بھی وہیں موجود تھے۔"

"نہیں۔ پیر صاحب غالباً عباسی کے سیاسی حریف ہیں۔ انہوں نے اس افسوسناک واقعے کو اپنے مخالفین کے خلاف بیان بازی کے لیے استعمال کیا ہے۔ بقول ان کے' جب پولیس اسٹیشن پر فون وصول ہوا تو وہ ایک بے گناہ کی رہائی کے لیے تھانہ انچارج سے بات کررہے تھے۔"

"پھر تو عباسی مارا گیا' اس کی وزارت بھی گئی۔"

"بھاڑ میں جائے عباسی۔ یہ بتاؤ اب جانا کدھر ہے۔ یہ گاڑی بھی فوراً چھوڑ دینی چاہیے۔"

میں نے کہا "پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ سراج کو اس وقت تک رہائی نہیں مل سکتی جب تک خود عبدالرحمان اپنے گھر نہ پہنچے۔ گھر میں باہر سے تالا لگا ہوا ہے۔ کسی اور کو یہ شک کیسے ہوسکتا ہے کہ اندر تھانے دار صاحب کس حال میں ہیں اور کس کے ساتھ ہیں۔ عبدالرحمان کو شاید کسی اسپتال میں ہی ہوش آئے گا۔ تم چلو پشاور کی طرف۔"

نازو نے متفکر ہوکے کہا "یہ مر تو نہیں جائے گا؟"

"میں ڈاکٹر نہیں ہوں خاتون۔ آپ زیادہ ہی غصّے میں آگئی تھیں۔"

نازو نے کہا "ہاں۔ اس نے حرکت ہی ایسی کی تھی۔ میں نے اس کو وہ رقعہ دیا جس پر تم نے پتا لکھا تھا تو یہ دانت نکالنے لگا کہ رہنے دیں جی۔ مجھے معلوم ہے آپ کو کہاں جانا ہے۔ میں ہی تو یہ رقعہ لایا تھا لیکن آپ نے شور مچایا اور پولیس سے مدد لینے کی کوشش کی تو پھر آپ کا بندہ کبھی نہیں ملے گا۔ اگر ملا تو زندہ نہیں ملے گا۔ میں نے کہا کہ تم بھی بچ نہیں سکتے۔ میں نے تمہاری ٹیکسی کا نمبر نوٹ کرلیا تھا۔ عبدالرحمان نے کہا کہ جناب پہلی بات تو یہ کہ میں صرف ٹیکسی چلا رہا ہوں۔ ٹیکسی کسی اور کی ہے اور اس کا کوئی بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ دوسری بات یہ کہ نمبر تو خود میں صاف نہیں پڑھ سکتا۔ آپ نے کیسے نوٹ کرلیا۔ پھر اس نے مجھ سے پچاس ہزار کا مطالبہ کیا کہ یہ رقم اسے ابھی ادا نہ کی گئی تو وہ مجھے صحیح پتے پر نہیں لے جائے گا۔"

"عبدالرحمان انتہائی کم عقل آدمی ہے۔"

"ہاں۔ رقم کی مجھے فکر نہیں تھی۔ وہ میں نے واپس وصول کرلینا۔ میں اس کا دماغ راستے میں ہی درست کردیتی مگر مجھے تمہاری فکر تھی۔ پہلے میں تم تک پہنچنا چاہتی تھی۔ یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ تمہیں اغوا کرنے والے کون لوگ ہیں۔ تم آسانی سے اغوا ہوجانے والی چیز نہیں ہو۔"

میں نے کہا "یہ تو اغوا کرنے والے پر منحصر ہے۔ الزبتھ ٹیلر یا صوفیہ لارین جب چاہیں میں برضا و رغبت اغوا ہونے کے لیے تیار ہوں۔"

"میں ان کو مطلع کردوں گی۔ بلکہ رابعہ سے کہوں گی کہ وہ بتادے۔"

"رابعہ کے نام سے مجھے ڈرانے یا بلیک میل کرنے کی کوشش فضول ہے۔ یہ میرے حقیقی دلی جذبات ہیں" میں نے کہا "میں غالب کی طرح بزدل نہیں ہوں۔"

نازو مسکرائی "کیا ہم واقعی پشاور جارہے ہیں؟"

"نہیں۔ ہم پشاور کی طرف اور پنڈی سے دور جارہے ہیں۔ پندرہ میل کے فاصلے پر سنگ جانی ہے۔ دو پہاڑیوں کے درمیان تمہیں ایک ستون سا کھڑا ہوا نظر آرہا ہے نا۔ وہیں تھانہ سنگ جانی ہے۔ اس سے کچھ آگے گاڑی کو سڑک کے کنارے چھوڑ دیں گے۔ خود وہاں سے کیسے واپس آئیں گے' یہ سوال غور طلب ہے مگر میرا خیال ہے کہ ٹیکسی نہ ملی تو تانگا ضرور مل جائے گا۔ شاید تمہیں دیکھ کے کوئی لفٹ دے دے۔ دل والے ایک ہم ہی تو نہیں۔"

ٹیکسلا کے آثارِ قدیمہ اور اس شہرِ گم گشتہ کی تاریخی اہمیت سے بہت لوگ واقف ہیں۔ اس سے کچھ آگے پاکستان کی اکلوتی اور غالباً قابلِ فخر اسلحہ ساز فیکٹری واہ میں ہے۔ سنگ جانی کوئی معروف جگہ نہیں۔ ٹیکسلا سے چند میل پہلے سڑک مٹی اور بھربھرے پتھروں کی دو پہاڑیوں کے درمیان سے گزرتی ہے تو ایک پہاڑی پر بنی ہوئی لاٹ یا کھمبے کی طرح لمبی یادگار نظر آتی ہے۔ اینٹ' چونے اور سیمنٹ سے بنا ہوا یہ تمیں چالیس فٹ بلند ستون پہاڑی پر ہونے کے باعث آسمان کو چھُوتا محسوس ہوتا ہے۔ کسی انگریز کی موت پر تعمیر کی جانے والی لاٹ فرنگی سامراج کی نشانی تھی۔ انگریز حاکم اپنا بوریا بستر گول کرگئے مگر راولپنڈی اور اس کے نواح میں ان کے عہدِ حکومت کی نشانیاں اسی طرح موجود ہیں جیسے لاہور میں مغل دورِ حکومت کی۔ راولپنڈی میں سیکڑوں سال پرانا گورا قبرستان ہے۔ آفس لک پول' ایڈورڈ روڈ' ڈلہوزی روڈ' لاکھڑتی بازار (انفنٹری رجمنٹ بازار) آرائے بازار (رائل آرٹلری بازار) کمپنی باغ (جسے ہم نے پہلے وزیراعظم کو شہید کرکے لیاقت باغ کیا) کینٹ ایریا اور صدر بازار کے ماحول میں اب بھی انگریزوں کے زمانے کی چھاپ صاف نظر آتی ہے۔

میں نے نازو کو سنگ جانی تھانے کے بعد گاڑی روکنے کو کہا تھا۔ تھانہ عین پہاڑی کے دامن میں واقع ہے۔ دور سے لاٹ کو دیکھتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ ایسی ہر نشانی' کوئی مقبرہ یا لوح مزار کسی جذباتی سانحے کا وقتی ردِّ عمل ہوتی ہے۔ پھر وقت آگے بڑھ جاتا ہے اور پلٹ کر دیکھنے کی نہ کسی کو فرصت ہوتی اور نہ ضرورت۔ اس انگریز کے وارثوں کو شاید خبر بھی نہ ہوگی کہ ان کے کسی جدِّ امجد کو غلام دیس کے کسی کالے آدمی نے کیوں اور کیسے مارا تھا اور کہاں مارا تھا۔ میں بھی وزیر خان کی خالی رہ جانے والی قبر کی امانت اس کی ہڈیاں واپس لانا چاہتا تھا کہ انہیں پھر اسی زمین میں دفن

کردوں جس پر اس کی لوحِ مزار نصب ہے۔ خاک ہو جانے والوں کے لیے مٹی صرف مٹی ہے۔ کتبہ صرف پتھر پر نقش ہو جانے والی یاد ہے اور یادوں کا اصل مدفن تو آدمی کا دل ہے۔ اگر مجھے وزیر خاں مرحوم کی ہڈیوں کے کیمیائی معائنے سے قتل کا ثبوت حاصل نہ کرنا ہوتا تو شاید دل کی تسلی کے لیے میں اس جگہ تک جاتا جو اس کا دوسرا مدفن تھی اور مغفرت کی دعا کر کے آجاتا۔ آخر انہیں بھی تو لوگ یاد رکھتے ہیں جو کسی ہوائی حادثے میں ریگِ صحرا میں بکھر جاتے ہیں یا سمندر کی مخلوق کا رزق بن جاتے ہیں اور جو آگ میں راکھ ہو کے اُڑ جاتے ہیں۔ وزیر خان کی برسی قریب تھی۔ اس احساس میں میرے لیے عجیب سی تسکین تھی کہ میں نے اس کے قتل کا سُراغ لگالیا۔ قاتلوں کو پہچان لیا اور اب وزیر خان کو اس کی ابدی آرام گاہ تک پہنچانے کے بعد میرے انتقامی جذبات کی آگ بھی ٹھنڈی پڑ جائے گی۔ کیا اس کے بعد مجھے سکون مل جائے گا؟

نازو نے میرے خیالات کا سلسلہ منقطع کردیا۔ گاڑی سنگ جانی کے تھانے سے سو گز پہلے ہی رُک گئی تھی۔

میں نے کہا "اس پہاڑی کے بعد رُکنے کو کہا تھا میں نے۔ آگے چلو۔"

نازو نے کہا "او کے۔ دھکا لگائیں آپ لوگ۔"

"کیا مطلب؟"

"پیٹرول ختم ہو گیا ہے" نازو نے مجرمانہ معصومیت کے ساتھ کہا۔

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "خدا کا شکر ہے کہ ہم پشاور نہیں جا رہے تھے۔ کیا اس گاڑی کا فیول میٹر کام نہیں کرتا۔"

"وہ دراصل۔ دیکھا تو تھا میں نے.... لیکن بھول گئی کہ پیٹرول ڈلوالینا چاہیے۔" نازو نے کہا "مگر اب کیا فرق پڑتا ہے۔ میں نے تمہیں وہاں پہنچا دیا جہاں جانا تھا۔"

"گاڑی نے پہنچا دیا۔"

"جی نہیں۔ میں نے پیٹرول کا ہر قطرہ بہت کفایت شعاری سے اور سوچ سمجھ کے استعمال کیا۔" نازو نے ڈھٹائی سے کہا۔

اس زنانہ منطق کا جواب نہیں تھا۔ میں نے نیچے اُتر کے سوٹ کیس بھی اُتار لیا۔ پیڈرو بیشتر وقت خاموش ہی رہا تھا۔ یہ اس کے مزاج اور اس کی عادت کے خلاف تھا۔ بعض اوقات مجھے شک ہوتا تھا کہ یہ خاموشی بے سبب نہیں اور غالباً کسی طوفان کا پیش خیمہ ہے۔ وہ مشتعل ہو کے مقابلے میں نقصان اُٹھانے کا رسک لینا نہیں چاہتا۔ وہ سوچ رہا ہے کہ کیا چال چلے اور چال چلنے کے لیے مناسب وقت کا انتظار کر رہا ہے۔ اس کا تعاون بھی محض دکھاوا ہے اور دھوکا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ لاشعوری طور پر میں چوکس رہتا تھا۔ پیڈرو غلطی سے بھی مجھے غافل سمجھتا تو مارا جاتا۔ میرے ذہن کا خود کار دفاعی نظام پوری طرح فعال تھا۔

"کیا بھر لیا ہے اس سوٹ کیس میں آخر" میں نے کہا "یہ اتنا بھاری کیوں ہے؟"

"ایک لاکھ روپے کافی وزن رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ تو بس تمہارے کچھ کپڑے ہیں اور میرے چند جوڑے۔"

"پھر شاید یہاں کشش ثقل زیادہ ہے؟" میں نے کہا "سائنسی زبان میں اسی کو وزن کہتے ہیں۔ لیکن تم اس جنگل بیابان میں اور ویران سڑک پر بیانگ دہل اعلان کیوں کر رہی ہو کہ اس میں ایک لاکھ روپے ہیں۔"

"سوری۔ اس میں ایک لاکھ دس ہزار روپے ہیں" نازو نے دروازہ لاک کرتے ہوئے کہا۔

سوٹ کیس کو اُٹھا کے میں نے اپنے پیچھے رکھ لیا "اگر کوئی ہمیں لُوٹ لے پھر؟"

"پھر کیا؟ ہم اسے لُوٹ لیں گے" نازو نے بڑے یقین سے کہا۔

قدرے بلندی پر بنے تھانے سے اُترنے والا ایک ہیڈ کانسٹیبل گاڑی کو مشتبہ نظروں سے دیکھتا ہوا ہماری طرف آگیا "کیا بات ہے جی؟"

میں نے عاجزی سے کہا "کوئی بات نہیں جی۔"

"پھر یہ گاڑی ادھر سڑک کے بیچ میں کیوں کھڑی کردی ہے؟" اس نے مذاق پر بُرا مان کے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ یہ بیچ میں نہیں ہے۔ بیچ میں وہ لکیر ہے جو سڑک کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہے۔"

وہ اور ناراض ہو گیا "دیکھتے نہیں اس سے حادثہ ہو سکتا ہے۔ ٹریفک میں خلل واقع ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "حوالدار صاحب۔ جو گاڑیاں اِدھر سے جاری ہیں ان کے ڈرائیور گاڑی کو ایک میل سے دیکھ لیں گے۔ جو دوسری طرف سے آرہی ہیں وہ پچاس فٹ دور سے گزریں گی۔"

"اس کے باوجود آپ کا خیال ہے کہ ٹریفک میں خلل پڑ رہا ہے تو بُلالیں اپنی نفری کو۔ اسے اٹھا کے اوپر تھانے میں لے جائیں۔" نازو بولی۔

"میں گرفتار بھی کر سکتا ہوں تمہیں" اس نے برہمی سے کہا۔

"ہاں۔ سب کچھ کر سکتے ہو تم۔ اس سوٹ کیس میں سے چرس برآمد کر سکتے ہو یا اسلحہ۔" میں نے کہا "لیکن تم یہ نہیں جانتے کہ بعد میں ہم کیا کریں گے اس لیے بہتر ہے کہ سودا کرلو۔"

"سودا؟ کیسا سودا؟"

"ہم پشاور جا رہے تھے گاڑی خراب ہو گئی" میں نے کہا۔

"گاڑی میں پیٹرول ختم ہو گیا" نازو نے تصحیح کی "تم یہ سو روپے لو پیٹرول کے۔ اور سو روپے محنت کے۔ کسی گاڑی کو روک کے اگلے پیٹرول پمپ تک جاؤ اور کسی ڈبے میں پیٹرول لے آؤ۔ تم وردی میں ہو کسی بس کو بھی روک سکتے ہو یا پھر خیال رکھو گاڑی کا

ارے واپس آنے تک۔"

اس نے دو سو روپے جیب میں رکھ لیے "یہ کر سکتا ہوں میں۔ پ کی گاڑی کو کچھ نہیں ہو گا۔ دراصل آج میری ڈیوٹی ہے دھر۔"

"کوئی خاص ڈیوٹی ہے؟"

"ہاں۔ میری ڈیوٹی ہے کہ آتی جاتی گاڑیوں پر نظر رکھوں۔ تک پُل پر سخت ناکا بندی ہے۔ خود ڈی ایس پی صاحب چیکنگ کررہے ہیں۔"

میں نے کہا "کوئی واردات ہوئی ہے؟"

"کچھ ملتان ہیں' دو عورتیں اور تین مرد۔ ان کی لال رنگ کی گاڑی ہے۔ کل انہوں نے اس علاقے کے وزیر عباسی صاحب کو قتل کردیا۔"

اگر حوالدار دوسری طرف نہ دیکھ رہا ہوتا تو وہ ہمارے شدید ردِعمل سے شک میں پڑ جاتا۔ اس کی نگاہ پشاور کی طرف سے آنے والی گاڑیوں پر تھی۔

"قتل کردیا؟ آخر کیوں؟" میں نے فوراً خود کو سنبھال لیا۔

"بس جی۔ اخبار والے تو کہتے ہیں کہ انہوں نے عباسی کو دشمنی میں قتل کیا۔ سیاست میں یہ دشمنی تو چلتی ہے۔ الزام مخالفین پر ہے لیکن...."

"لیکن کیا؟"

"اصل بات کچھ اور ہے۔"

نازو بولی "تم بڑے یقین کے ساتھ کہہ رہے ہو...."

"اسی علاقے کا رہنے والا ہوں میں جی۔ اور عباسی کے ساتھ بھی رہا تھا کچھ عرصہ۔ ایسے بندے کو بہت پہلے مر جانا چاہیے تھا۔ بہت مہلت مل گئی اسے۔ اس کے دشمن بہت تھے اور سب خطرناک۔ بہت مال کھایا لوگوں کا اور عورتوں کے معاملے میں...."

وہ نازو کی طرف دیکھ کے خاموش ہو گیا۔

میں نے کہا "کسی نے رقابت میں قتل کیا ہو گا اسے؟"

نازو بولی "سُنا ہے اس کی چار بیویاں ہیں۔"

"ہوں گی.... پہلے تین تھیں.... اس کے علاوہ بھی اِدھر اُدھر منہ مارنے کی عادت تھی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ قتل اس کے بھائی نے کیا۔"

میں نے اور نازو نے ایک ساتھ کہا "بھائی نے؟"

"ہاں۔ بھائی اس کا باڈی گارڈ بھی تھا اور وارث بھی۔ اتنی شادیاں آخر کس لیے کی تھیں اس نے۔ صرف اولاد کے لیے اور اولاد نصیب میں ہوتی تو پہلی سے ہو جاتی۔ اس کا سب کچھ اب بھائی کو ملے گا۔"

"کیوں۔ بیویوں کو نہیں ملے گا؟"

"ملے گا۔ مگر بہت تھوڑا۔ نقد رقم جو ان کے حساب میں ہو گی بس یا ایک ایک کوٹھی مل جائے گی۔ سارا کاروبار بھائی کے نام پر تھا۔ سارے ٹھیکے بھائی کو ملتے تھے۔ پتا نہیں کہاں کہاں تک پاؤں پھیلا رکھے تھے دونوں بھائیوں نے۔ وزیر خود کچھ نہیں کرتا تھا۔ بھائی بھی ایسے ساتھ رہتا تھا جیسے ڈرائیور ہے لیکن سب جانتے ہیں کہ وہ کروڑوں کا مالک تھا۔"

"اگر سب اسی کے نام پر تھا تو پھر اسے کیا ضرورت تھی ایسے بھائی کو مارنے کی۔"

"آپ نہیں سمجھتے جی یہاں کی سیاست کو۔ اب عباسی کی سیٹ پر کون کھڑا ہو گا؟ اس کا بھائی۔ ابھی تک اس کی عزت نہیں تھی۔ اب اسمبلی کی ممبری بھی مل جائے گی۔ پارٹی اس کو ٹکٹ دے گی اور لوگ بھی اسے ہی ووٹ دیں گے۔ وزیر بھی بن جائے گا وہ کسی دن۔ عباسی زندہ رہتا تو یہ سب کیسے ہوتا۔ اللہ معاف کرے' جو جیسا کرتا ہے ویسا بھرتا ہے۔"

"تمہارے ساتھ عباسی نے کیا کیا تھا؟"

"میرے ساتھ...." وہ خلا میں دیکھتے ہوئے بولا "کچھ نہیں۔"

"یار' ہم سے کیوں چُھپا رہے ہو' ہم تو اجنبی ہیں۔ نہ عباسی کے طرف دار ہیں نہ تمہارے دشمن۔"

"اس نے.... بیوی چھین لی مجھ سے.... زبردستی طلاق دلوائی.... پھر اس سے شادی کرلی۔ میں بے غیرت اور بزدل تھا ورنہ اسے قتل کردیتا۔ اس کے علاوہ خود میری بیوی اس کے ساتھ خوش ہے۔ خوش نہ ہوتی تو اس کے ساتھ رہتی؟ بھاگ جاتی یا مر جاتی...."

نازو نے ہمدردی سے کہا "عورت تو مرد سے بھی زیادہ مجبور ہوتی ہے۔"

"یہی میں بھی کہہ رہا تھا۔ پہلے وہ میرے ساتھ رہنے پر مجبور تھی۔ اب وزیر کی تین بیویوں کے ساتھ رہتی تھی' یہ بھی مجبوری تھی۔"

نازو بولی "یہ کوئی مجبوری نہیں تھی۔ ہوس تھی' پیسے کی ہوس۔"

وہ فلسفی حوالدار بولا "کیا ہوس مجبوری نہیں ہوتی۔ اسی ہوس نے عباسی کو بالآخر مروا دیا۔"

"پھر تو تمہارے پاس بھی مجبوری کا عذر ہو گا۔"

"نہیں۔ بس میں بزدل تھا اور سوچتا رہ گیا کہ کسے قتل کروں۔ وزیر کو یا اپنی بیوی کو۔ تم دیکھتے ہو کہ جینا میری مجبوری بن گیا تھا۔ میں نے بالآخر طے کیا کہ دونوں پر لعنت۔ زندگی کیوں ضائع کروں۔ ایک ہفتے بعد میں دوسری بیوی لے آیا۔ برانڈ نیو' پہلے والی سے زیادہ خوب صورت۔ اس سے پہلے میں رشوت نہیں لیتا تھا۔ پھر رشوت لینے لگا۔ خوب رشوت لی کیونکہ پیسے کی وجہ سے پہلی گئی تھی۔ پیسہ نہ ہوتا تو دوسری کو بھی کوئی لے جاتا۔ اچھا اب تم جاؤ' ڈی ایس پی صاحب نے باتیں کرتا دیکھ لیا تو...."

میں نے کہا "کیا باتیں کرنا بھی جرم ہے۔ اس کے علاوہ ہم

کہاں جائیں اور کیسے جائیں؟"

نازو بولی "تم ہمارا مسئلہ حل کردو۔ تو ہم جا سکتے ہیں پشاور۔"

"میں بس روک لیتا ہوں، کسی نہ کسی میں جگہ مل جائے گی" وہ بولا۔

میں نے کہا "بس، یہاں بس نہیں رُکے گی۔ سب پنڈی سے فل ہو کے چلتی ہیں۔ کیمبل پور سے پہلے کوئی نہیں رُکتا۔"

"تم کوئی گاڑی روک لو۔ جس میں ایک ڈرائیور کے سوا کوئی نہ ہو۔ چالان کردو اس کا۔" نازو نے مشورہ دیا۔

"چالان کردوں؟ کس جرم میں؟"

"جرم تلاش کرلینا۔ اس کی کوئی لائٹ خراب ہوگی۔ آگے یا پیچھے کی اتنی لائٹوں میں سے ایک کا بلب فیوز ہوسکتا ہے۔ کاغذات میں کمی بیشی نکل آئے گی۔ کچھ نہ ہو تو کار کے ریڈیو کا لائسنس مانگ لینا۔ وہ کسی کے پاس نہیں ہوتا۔"

اس نے مجھے غور سے دیکھا "لگتا ہے تم نے بھی پولیس کی نوکری کی ہے یا تمہارا کوئی بندہ پولیس میں ہے۔"

"تم ہونا یار" میں نے کہا "روکو کسی گاڑی کو۔"

"تین سو اور نکالو" اس نے کہا "کار میں آرام سے پشاور جانے کا کرایہ۔"

وہ صاف گو آدمی پہلے ہی وضاحت کرچکا تھا کہ رشوت لینا اس کی مجبوری ہے۔ میں نے اسے تین سو دیے تو اس نے دس منٹ میں ایک گاڑی روک لی۔ چیکنگ کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ اس شریف آدمی نے اندازہ کرلیا کہ یہ ہماری گاڑی ہے جو سڑک کے کنارے روٹھ کے کھڑی ہوگئی ہے۔ فیملی یعنی نازو کو ساتھ دیکھ کر اور پولیس مین کا اشارہ سمجھ کے اسے اپنا اخلاقی فرض یاد آگیا ورنہ شاید وہ بھی زوم سے گزر جاتا۔

گاڑی میں بیٹھنے کے بعد میں نے کہا "ہمیں لارنس پور پر اُتار دینا ہم براستہ غازی تربیلا ڈیم جائیں گے۔"

اس نے کہا "میں تربیلا ڈیم ہی جا رہا ہوں۔"

نازو نے مجھے گھور کے دیکھا جس کا مطلب یہ تھا کہ اب کیا کرو گے۔ آدھا جملہ کافی تھا۔ باقی آدھا نہ بولتے تو لارنس پور پر اُتر جاتے۔

میں نے کہا "دراصل لارنس پور پر ہمیں خاندان کے دوسرے افراد کا انتظار کرنا پڑے گا۔ یا وہ ہمارا انتظار کررہے ہوں گے۔ وہ پشاور سے آئیں گے۔"

اس نے سر ہلایا "تربیلا ڈیم پر کون ہے تمہارا؟"

مزید جھوٹ بولنے سے بچنے کے لیے میں نے کہا "میرا تو کوئی نہیں۔ میرے بھائی کا رشتہ ہو رہا ہے کہیں، وہی بتا سکتا ہے۔"

اس شریف آدمی نے ہمیں لارنس پور وولن ملز کے سامنے اُتار دیا اور خود غازی جانے والی سڑک پر نکل گیا۔ اب دوپہر ہوگئی تھی۔ ہم نے ایک ہوٹل میں کھانا کھایا اور وہ اخبار پڑھا جس کو صبح سے سیکڑوں افراد نے پڑھنے کے عمل میں اتنا رگڑا تھا کہ اس کی ساری اکڑفوں نکال دی تھی۔ اس کا مسلا ہوا اور خستہ حال کاغذ نرم پڑ گیا تھا۔ جگہ جگہ سے پھٹ گیا تھا اور اس پر ہوٹل کے ہر سالن اور چائے کے داغ اخبار بینوں کے ذوق و شوق کی عکاسی کرتے تھے۔

اس میں دو خبریں تھیں۔ ایک غالب کے رپورٹر دوست یا ساتھی نے لگائی تھی کہ عباسی صاحب اور ان کے بھائی شراب کے نشے میں دُھت پتلی بائی کے کوٹھے پر پائے گئے۔ ان کی گاڑی نیچے موجود تھی اور اس میں بھی شراب کی قابل گرفت مقدار موجود تھی۔ اس خبر کے ساتھ ہی پتلی بائی کے کوٹھے سے رپورٹر کے ہمراہ نکل جانے والے پیر صاحب کا مذمتی بیان تھا۔ پیر صاحب نے رپورٹر سے "مک مکا" یعنی سودا کرلیا ہوگا کہ وہ ان کی موجودگی کا راز فاش نہ کرے تو وہ اس کی تائید میں بیان کا صداقت نامہ جاری کردیں گے۔

دوسری خبر کی تفصیل ہمیں مل گئی تھی مگر اخبار میں اس کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ کسی نے اخبار کے دفتر میں فون کرکے یہ اطلاع دی تھی کہ عباسی صاحب جو گھر سے اپنے گیسٹ ہاؤس گئے تھے لاپتا ہیں۔ گیسٹ ہاؤس سے کسی نے یہ بتایا تھا کہ انہیں ایوانِ صدر بلایا گیا ہے مگر یہ بات جھوٹ ثابت ہوئی۔

ہم سڑک کے کنارے چھپر ہوٹل کی پشت پر ایک گھنے سایہ دار درخت کی چھاؤں میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ٹین کی کرسیاں اور میزیں پتلون پوش ہی استعمال کرتے تھے۔ عوام اپنے عوامی لباس میں چارپائی کو ترجیح دیتے تھے۔ یہ چارپائیاں کھانے کی میز کا کام بھی دیتی تھیں۔ چارپائیاں اور کچھ میزیں ایک وسیع علاقے میں ہوٹل کے سامنے پھیلی ہوئی تھیں اور وہاں رُکنے والی بسوں کے مسافر بس سے اُترتے تھے تو ٹانگیں سیدھی کرنے کے لیے فوراً کسی چارپائی پر لیٹ جاتے تھے۔ پیچھے ہونے کی وجہ سے ہمیں کچھ تنہائی میسر تھی۔

اخبار نازو نے اور پیڈرو نے بھی پڑھ لیا تھا حوالدار کی بات بھی سمجھ میں آنے لگی۔ اس نے سیاست میں رقابت کی بنا پر بھائی کے ہاتھوں بھائی کے قتل کا بالکل صحیح تجزیہ کیا تھا مگر اس تجزیے کے ساتھ وہ پولیس اسٹیشن جاکے سچ بولنے کی کوشش کرتا تو اس کی دوسری بیوی کو طلاق نہ ہوتی۔ وہ بیوہ ہوجاتی اور عباسی کے بھائی کے حرم میں جگہ پاتی۔

میں نے کہا "عباسی کے بھائی نے قتل کا الزام ہم پر تھوپ دیا ہے۔"

پیڈرو بولا "تھوپنے کا کیا مطلب؟ تم نے قتل کیا ہے عباسی کو۔"

میں نے اسے چونک کے دیکھا "میں تم کو بھی قتل کرسکتا ہوں۔"

وہ مسکرانے لگا "میں نے تمہارے خلاف گواہی تو نہیں دی"

کہنے کا مطلب یہ تھا کہ جب الزام ایک مقتول وزیر کا بھائی لگائے۔ اور وہ بھائی بھی بہت جلد اسمبلی کا ممبر یا وزیر بننے والا ہو۔ تو پولیس اس کے بیان کو ایک سو ایک فیصد سچ ثابت کرنے کے لیے چشم دید گواہ اور واقعاتی شہادت خود پیدا کرلیتی ہے۔"

نازو نے کہا "اس خبیث نے ہم سب کے حُلیے ضرور بتائے ہوں گے۔"

"حُلیے کیا نام بھی بتائے ہوں گے" میں نے کہا "صرف دو نام اصلی تھے رابعہ کا اور غالب کا۔ اب بتاؤ میں نے انہیں فوراً یہاں سے دوڑا کے عقلمندی کا ثبوت دیا تھا یا نہیں؟"

نازو نے کہا "کاغذ قلم نکالو۔ میں لکھ دیتی ہوں کہ ثبوت تم نے فراہم کردیا ہے۔ کوئی مانے یا نہ مانے۔"

پیڈرو نے کہا "اس چکر میں ہم سب پھنس ہی نہ جائیں۔ میرا پہلے ہی بہت وقت ضائع ہوگیا ہے۔"

"پھر وہی احمقانہ بات۔ اس بات پر خدا کا شکر ادا نہیں کرتے کہ ابھی تک خود ضائع نہیں ہوئے۔"

نازو نے کہا "تھانہ سنگ جانی کے پاس کھڑی ہوئی گاڑی سے عبدالرحمان برآمد ہوگا۔"

"ابھی اس کا کوئی امکان نہیں۔"

"شام تک ضرور ہوجائے گا۔" نازو نے کہا "اس کے ساتھ ہی دوسرا کیس پبلک کے سامنے آئے گا۔"

"اس کیس میں کچھ نہیں ہوگا" میں نے کہا "حوالدار خود بتائے گا کہ جو گاڑی میں تھے وہ پشاور چلے گئے۔ وہاں سے ہم فوراً واپس ہوجاتے تو اسے شک ہوتا۔ اے ایس آئی سراج اپنی عزت بچانے کے لیے اس معاملے کو دبادے گا۔ اس کے پچاس ہزار گئے۔ عبدالرحمان کی ٹیکسی گئی۔ تاہم وہ اپنی بدمعاشی جاری رکھیں گے تو کسی دن ضرور کامیاب ہوں گے۔ اندر ہونے میں۔"

نازو نے کہا "موڑ پر بہت سی ویگنوں کے ساتھ کاریں بھی کھڑی ہیں۔"

پیڈرو نے کہا "وہ کرائے پر چلنے والی گاڑیاں ہیں۔ یہاں سے لوگ کیمبل پور بھی لے جاتے ہیں اور تربیلا بھی۔"

"پھر تو کوئی مسئلہ نہیں۔" میں نے کہا "ان سے کیا بات کی جائے ہمیں اب کہاں جانا ہے؟"

"واپس۔ ایک گھنٹے میں ہم سید پور پہنچ جائیں گے" پیڈرو بولا۔

یہ پُرانے ماڈل کی شیورلٹ اور فورڈ گاڑیاں تھیں جو اب مضافات کے کچے پکے راستوں پر مسافر ڈھورہی تھیں۔ ایسی گاڑیاں شہروں میں غیر مقبول ہونے لگی تھیں لیکن گاؤں دیہات اور قصبوں والوں کو یہ اس لیے پسند تھیں کہ ان میں پوری برات بھی ٹھونسی جاسکتی تھی خواہ انہیں چھت پر ڈگی میں اور بونٹ پر بٹھانا پڑے۔ یہ بھاری بھرکم مضبوط گاڑیاں ان سب کا بوجھ اُٹھالیتی تھیں اور ان کا مضبوط سسپنشن کچے راستوں کے جھٹکے برداشت کرسکتا تھا پھر یہ انہیں بہت کم قیمت پر مل جاتی تھیں۔ شہر والے ان کے پیٹرول کے خرچ اور اسپیئر پارٹس کی مہنگائی کے باعث جاپانی گاڑیاں خرید رہے تھے۔

ایک ٹیکسی کے مالک نے جو پچھلی سیٹ پر لمبی تان کے سو رہا تھا ہمیں غور سے دیکھ کے پانچ سو مانگے۔ غالباً اس نے ہمیں بے وقوف' راستوں سے ناواقف یا پیسے کو ہاتھ کا میل سمجھنے والا فرض کرلیا تھا۔ ہم نے مول تول کرکے اس کے علم قیافہ شناسی کو غلط ثابت کردیا۔ ڈھائی سو لے کر بھی وہ نقصان میں نہیں تھا مگر اپنی افسردہ صورت سے اور مہنگائی کا رونا رو کے وہ یہی ثابت کرتا رہا کہ اس پھیرے میں دس روپے بھی مشکل سے بچیں گے۔

"لو جی' ایک تو یہ گاڑی نہیں' جہاز ہے۔ پیٹرول تو ایسے پیتی ہے سر جی غٹ غٹ کہ اِدھر ٹنکی فل کرائی اُدھر خالی۔"

میں نے ہمدردی سے کہا "ایک میل میں کتنے گیلن خرچ ہوجاتے ہیں؟"

اس نے میرے طنز کو نظرانداز کردیا "پھر جناب پیٹرول کا بھاؤ دیکھو۔ اپنے برادر اسلامی ملک چاہیں تو پاکستان تک لائن ڈال دیں۔ مکے اور مدینے سے سمندر کے نیچے نیچے تیل کی لائن پہنچے کراچی۔ امریکا کو پتا ہی نہ چلے۔ اور جناب پیٹرول ملے پانی کی طرح۔ گھر کا نلکا کھولا اور ٹنکی بھرلی۔"

"اسی سے نہائیں' اسی میں قورمہ بریانی پکائیں۔"

"آپ تو بڑے مخولیے ہو جی۔" وہ بولا "اب تو اس گاڑی کے پارٹس بھی نہیں ملتے۔ پنڈی کے فراڈیے ہیں۔ دس کے پچاس لیتے ہیں تو کام چل جاتا ہے مگر اصل والی بات کہاں۔ اصل پُرزہ چل گیا بیس سال۔ کچا مال بیس مہینے نہیں چلتا۔ مستری کہتا ہے اب انجن بنوالو۔ لو جی چھ مہینے کی کمائی انجن کھا جائے گا۔"

میں نے کہا "ایک مشورہ ہے بُرا نہ مانو تو۔ تم یہ انجن نکال دو' آگے دو گھوڑے لگادو۔ دیکھو وہ کیسا کھینچتے ہیں گاڑی کو بھی اور سواری کو بھی۔ سارے جھنجھٹ ختم۔ دو ہارس پاور کی گاڑی میں کیا پیٹرول کا خرچہ۔ گھوڑے تو سادہ پانی سے چلتے ہیں اور ان کے پارٹس کا بھی کوئی مسئلہ نہیں۔ گھوڑے میں خچر اور گدھے کے پارٹس بھی لگ جاتے ہوں گے۔"

کچھ دیر پہلے اس نے مجھے مخولیا قرار دیا تھا لیکن اس مخول سے وہ لطف اندوز نہیں ہوا۔ نازو کی ہنسی نے اسے مزید کبیدہ خاطر کیا۔ وہ سمجھ گیا کہ مردِ ناداں پر کلام نرم ونازک بے اثر۔ وہ مجھے قائل نہیں کرسکتا۔ اُلٹا یہ خطرہ ہے کہ میں ڈھائی سو میں تین سو کا منافع نہ ثابت کردوں۔

اسلام آباد کا حصّہ بننے سے پہلے سید پور ایک پکنک پوائنٹ تھا اور سید پوری روڈ جب ہولی فیملی اسپتال سے آگے نکل آتی تھی تو اس کی چوڑائی چند فٹ رہ جاتی تھی۔ اس پر سے ایک وقت میں ایک ہی گاڑی [illegible]۔ دوسری گاڑی آجاتی تھی تو دونوں کو کچے راستے پر اُترنا پڑتا تھا۔ اس سڑک پر خوبانی اور آلوچے کے باغات تھے اکثر جگہ اوپر سے درختوں کی شاخیں اور پتے یوں ملے ہوئے تھے کہ لگتا تھا سڑک کوئی سرسبز سرنگ ہے۔ لوگ خوبانی اور آلوچے توڑ کے کھالیتے تھے۔ شاخ سے توڑے جانے والے پکے ہوئے تازہ پھلوں کا ذائقہ اور ان کی خوشبو کا الگ لطف تھا۔ عام طور پر مالی بُرا نہیں مانتے تھے۔ اِدھر سے گزرنے والے ہی کتنے ہوتے تھے۔ ایک روپے یا سوا روپے میں وہ چٹی بھر کے پکڑا دیتے تھے۔ اب نقشہ ہی بدل گیا ہے۔ نہ سید پور کا پتا چلتا ہے نہ اس سرسبز سرنگ جیسی سڑک کا۔

ٹیکسی والا ڈھائی سو روپے لے کر رخصت ہوگیا تو میں نازو اور پیڈرو سہ پہر کی سنسان خاموشی میں کھڑے رہ گئے۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں اس جگہ سے بہت قریب ہوں جہاں میرے والد کی ہڈیاں کسی پہاڑ کے دامن میں یا کسی چٹان کے سائے میں' کسی پُرسکون گوشۂ عافیت میں مدفون ہیں۔ یہ بڑی خوب صورت جگہ تھی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے خیال بھی آیا کہ اب انہیں اس ابدی مسکن سے اُٹھانے کی کیا ضرورت ہے۔ جب یومِ حساب آئے گا اور صورِ اسرافیل کی صدا تمام خفتگانِ خاک تک پہنچے گی تو سب ہی اُٹھیں گے اور سب ہی محشر کی جانب رواں ہوں گے۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ کون کہاں سے آیا؟

پیڈرو اپنے جرم کا اعتراف پہلے ہی کرچکا تھا اور وزیر خان کے قتل کے رازِ سربستہ کی ساری تفصیل چوہدری دلاور کی سفاکانہ محسن کش خود غرضی اور بے رحمی کے آئینے میں واضح ہوگئی تھی مگر میرے دل میں ایک خلش سی تھی کہ میں... وزیر خان کا واحد وارث۔ اگر اس کے ورثے کی حفاظت میں اس حد تک ناکام رہا کہ اس کی قبر سے چوری ہوجانے والی ہڈیاں بھی واپس نہ حاصل کرسکا تو مجھے اپنے آپ سے ہمیشہ شرمندگی رہے گی۔ یہ اتنا ہی ضروری تھا جتنا قاتلوں کو سرِعام مجرم ثابت کرنا۔ ایک خواہش تھی کہ جب تک زندگی ہے میں وزیر خان کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لیے جاؤں تو مجھے یہ احساس نہ ہو کہ وہاں صرف کتبے پر وزیر خان کا نام ہے' نیچے صرف خلا ہے' وزیر خان کا جسدِ خاکی نہیں ہے۔

چوہدری دلاور نے بھی مجھے ایک کیسٹ دیا تھا اور اس تاکید کے ساتھ کہ جب میں استاد پیڈرو سے اعترافِ جرم حاصل کرلوں تو پھر اسے سُنوں اور موازنہ کروں کہ سچ اور جھوٹ کی آمیزش کا تناسب کیا ہے۔ کہاں سچ کا چہرہ مسخ کرکے اسے جھوٹ بنادیا گیا ہے اور کہاں جھوٹ پر سچ کا ملمع ہے۔ دلاور کا دیا ہوا کیسٹ بھی سند نہیں تھا۔ جھوٹ اس میں بھی ہوسکتا تھا مگر اس کے باوجود دو کیسٹ دو آئینوں کی طرح تھے جو میں پیڈرو کو بھی دکھا سکتا تھا اور چوہدری دلاور کو بھی۔ اور پوچھ سکتا تھا کہ ایک سچ دوسرے کے آئینے میں مختلف کیوں نظر آتا ہے۔ سچ اکائی ہے' وحدانیت کا ثبوت ہے۔

نازو گھنے درختوں سے اور شاداب جھاڑیوں سے ڈھکے ہوئے پہاڑ کو دیکھ رہی تھی جس کے دامن میں سید پور کا چھوٹا سا گاؤں سویا سویا لگتا تھا۔ جہاں کوئی ہلچل نہیں تھی۔ دوڑ بھاگ نہیں تھی۔ ٹریفک نہیں تھی۔ شور نہیں تھا۔ حرکت نہیں تھی اور حیرت ہوتی تھی کہ دن و رات کے چوبیس گھنٹے یہاں کے لوگ کچھ بھی نہیں کرتے تو پھر کیا کرتے ہیں؟

میں نے کہا "مس نازو۔ یہ سوٹ کیس اُٹھایئے۔"

نازو نے بے نیازی سے کہا "ہوٹل کے پورٹر کو بُلالو۔ اور دیکھو کمرا ذرا دیکھ کے لینا' ویو اچھا ہو۔"

اچانک گھوڑے پر سوار ایک باریش شخص نمودار ہوا۔ مجھے بڑا تعجب ہوا کیونکہ خاموشی کے باوجود میں نے گھوڑے کے سموں کی آواز تک نہیں سنی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کوئی پُراسرار مخلوق ہے جو اوپر سے اُڑتی ہوئی آگئی ہے۔ صوفی ٹائپ شخص جوان آدمی تھا۔ اس کے سر پر ٹوپی سے باہر نکلے ہوئے پٹے دار بال اور داڑھی سب سیاہ تھے۔ اس نے ہمیں بڑی قرات سے "السّلام علیکم" کہا اور ہمارے پاس ہی پہنچ کے اُترا۔

میں نے کہا "صوفی صاحب۔ ہم مسافر ہیں۔ یہاں ہمارے ٹھہرنے کی کوئی جگہ ہے؟"

"حضرت۔ یہ شہر نہیں ہے۔ ہوٹل یا سرائے کا یہاں کیا کام۔ یہاں ٹھہرنا مقصود ہے تو بسم اللہ۔ مسجد میں تشریف لایئے۔ خیر سے میرا گھر بھی ساتھ ہی ہے۔ مستورات کے قیام کا انتظام بھی ہوجائے گا۔"

میں نے قدرے تامل سے کہا "آپ کو زحمت ہوگی۔"

"زحمت... نعوذ باللہ۔ مہمان تو رحمتِ خداوندی ہوتے ہیں۔ کسی اور کے گھر میں نہ جگہ ہوگی' نہ وہاں آپ کا قیام مناسب ہوگا۔ آپ کھلے آسمان کے نیچے بھی نہیں رہ سکتے۔ مستورات ہیں آپ کے ساتھ۔"

ایک نازو کے لیے وہ جمع کا صیغہ استعمال کررہا تھا مگر وہ مہذب اور باحیا شخص تھا۔ نازو بے پردہ تھی چنانچہ اس کی نظر مجھ پر رہی۔ اپنی طرف سے وہ آنکھ کا پردہ رکھنے کی پوری کوشش کررہا تھا۔

میں نے کہا "ہم صرف آج رات قیام کریں گے۔"

اس نے کہا "حضرت۔ خدا کے گھر میں اور بندے کے دل میں جگہ کی کمی تو نہیں۔ جب تک جی چاہے قیام کریں۔ رزق تو آدمی کو وہی ملتا ہے جو اس کے نصیب میں ہو اور جہاں بھی ہو۔ ویسے بندے کو بشارت احمد قادری کہتے ہیں۔ مسجد میں موذن اور پیش امام ہوں۔"

اب ضروری ہوگیا کہ میں اپنا تعارف کراؤں۔ جھوٹ بولے بنا چارہ نہ تھا۔ پھر بھی میں نے سچ بولنے کی پوری کوشش کی "میں کبیر خان ہوں۔"

صوفی اب گھوڑے کی لگام پکڑے چلنے کے لیے تیار تھا "اور

یہ آپ کی...."

میں نے فوراً کہا "میری ہمشیرہ' نازلی بیگم' انہی کی وجہ سے مجھے یہاں آنا پڑا۔"

صوفی نے میرا سوٹ کیس اُٹھالیا "آیئے میرے ساتھ۔"

میں نے کہا "مولوی صاحب۔ آپ یہ کیا کرتے ہیں۔ لایئے سوٹ کیس مجھے دیجئے۔ آپ گھوڑے کی لگام تھامیں۔"

اس نے انکار کردیا "حضرت یہ نہیں ہوسکتا....."

میں نے کہا "آپ کے ساتھ خالی ہاتھ چلتا میں اچھا لگوں گا۔"

"دوسری صورت میں مجھے اچھا نہیں لگے گا۔ تھوڑا سا فاصلہ ہی تو ہے حضرت" وہ بولا "خیر سے یہ صاحب.... آپ کی ہمشیرہ کے...."

میں نے کہا "بالکل نہیں۔ ان کا نام ہے شیخ مختار۔ اور ان کا معاملہ میں پھر عرض کروں گا۔"

ہم تنگ راستوں اور کچے مکانوں کے سامنے سے گزرے تو ہر شخص نے ہمیں دلچسپی سے دیکھا۔ مؤدبانہ انداز میں مولوی صاحب سے مصافحہ کرنے والے ہم سے بھی ہاتھ ملاتے تھے۔ اس وقت تک بچّوں اور بڑوں کی زبانی یہ خبر شاید پورے سید پور میں پہنچ گئی تھی کہ مولوی صاحب کے گھر مہمان آئے ہیں۔ مجھے اندازہ تھا کہ یہ ہوگا۔ نازو کو ساتھ لائے بنا چارہ نہ تھا اور اس کے ساتھ ہونے سے قیام کا مسئلہ پیدا ہوا تھا ورنہ ہم سیدھے گزر جاتے اور ایک رات کھلے آسمان کے نیچے بھی گزار دیتے تو کسی کو خبر نہ ہوتی۔ ہمارے حُلیے میں کوئی بات غیر معمولی نہ تھی مگر نازو کے حُسن کی آب و تاب غیر معمولی تھی۔ وہ ہر جگہ مرکز نگاہ بنی۔ اسے مرد ایسے دیکھتے تھے جیسے وہ کوہِ قاف سے سیدھی سید پور میں اُتری ہے اور عورتیں حسد' رشک اور حیرانی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ۔ وہ پھٹے پرانے کپڑوں میں ہوتی تب بھی فرق نہ پڑتا۔ زیرِ لب یہ بھی کہا گیا کہ وہ فلم ایکٹریس ہے۔ گاؤں کے تو جوان اور بوڑھے ایسی من موہنی صورتیں صرف فلموں میں دیکھنے کے عادی تھے۔

تشویش مجھے پیڈرو کی طرف سے تھی۔ کہیں عین وقت پر وہ دغا نہ دے جائے۔ یہاں وہ موقع سے فائدہ اُٹھا سکتا تھا۔ تھانے دار کا ریوالور میرے پاس تھا۔ مجھے اس بارے میں کوئی کنفیوژن نہیں تھا کہ پیڈرو نے حرامی پن کیا تو میں کیا کروں گا۔ میں اسے گولی ماردوں گا اور نازو کو ساتھ لے کر بھاگ جاؤں گا۔ اس گاؤں میں میرا راستہ روکنے والا کون ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ مجھے اپنا سوٹ کیس چھوڑ کے جانا پڑے گا۔ بھاڑ میں جائے سوٹ کیس۔ اس میں ایک لاکھ دس ہزار روپے ہیں اور چند جوڑے کپڑوں کے۔ ان سے ہمارا سُراغ نہیں ملے گا۔ بھاگنا ذرا مشکل کام ہوگا۔ یہاں نہ کار ہے نہ رکشا ٹیکسی۔ یہاں کے لوگ سائیکلوں پر یا گھوڑے پر ہمارا تعاقب کریں گے۔ کوئی بات نہیں۔ ہم سڑک چھوڑ کے کسی اور سمت میں نکل جائیں گے۔ دو چار ہم تک پہنچ گئے تو انہیں لٹا دیں گے۔

اچانک پیڈرو نے میرے کان میں کہا "کیا تم انہیں۔۔۔ سچ بتاؤ گے۔"

"پتا نہیں" میں نے کہا "جھوٹ بولنا بہت مشکل ہوگا۔"

"تم خود بھی پھنس جاؤ گے۔ اپنے ساتھ مجھے بھی پھنساؤ گے کوئی پولیس کو بُلالے گا۔ یہ دیہاتی نہیں شہری لوگ ہیں' روز شہر جاتے ہیں۔"

میں نے کہا "مگر یہ گاؤں ہے۔ یہاں کوئی کام چُھپ کے نہیں کیا جاسکتا اور اگر ہم کوئی قبر کھود کے ہڈیاں نکالیں گے تو یہاں اشتعال پھیل جائے گا۔ اس کا جواز ہونا چاہیے ہمارے پاس۔ جواز بھی ایسا کہ سب قائل ہوجائیں' سب کو ہمدردی ہو ہم سے۔"

ہم اشنان کے پُرانے تالابوں کے قریب سے گزرے اور دائیں جانب مڑ گئے۔ اشنان گھاٹ میں کوڑا کرکٹ بھرا ہوا تھا۔ اس میں پہاڑ کی بلندی سے جس چشمے کا پانی آتا تھا وہ سوکھ گیا تھا یا اس کا راستہ بدل گیا تھا۔ مجھے پُرانا مندر کہیں دکھائی نہ دیا۔ تھوڑا سا آگے جاکے مسجد آگئی۔ اس کے احاطے سے متصل پیش امام کا گھر تھا۔ مسجد کی عمارت اینٹوں سے تعمیر ہوئی تھی اور خاصی کشادہ تھی مگر امام صاحب دو کچی کوٹھریوں والے گھر میں رہتے تھے۔ نازو نے مجھے بے بسی سے دیکھا مگر میں بھی کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ اسے ایک رات بہرحال انہی لوگوں کے درمیان گزارنی تھی۔ یہ بے ضرر اور مخلص لوگ تھے۔ مہمان نوازی ان کی روایات اور سرشت میں شامل تھی لیکن ڈر ہمارے اندر تھا۔ ہم ان سے اصلیت چُھپانا چاہتے تھے لیکن یہاں من مانی کرنا بھی مشکل تھا۔

مسجد کے ایک خالی حجرے میں دو چارپائیاں پڑی ہوئی تھیں۔ یہاں مجھے پیڈرو کے ساتھ رات گزارنی تھی۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ ہم یہاں اتنی دیر سے پہنچے۔ اگر ہم صبح آتے تو شام تک اپنا کام نمٹا کے واپس جاسکتے تھے۔ یہ بھی اتفاق تھا کہ سب سے پہلے ملنے والا شخص مسجد کا پیش امام تھا۔ اس کی میزبانی کی پیش کش کو ٹھکرایا نہیں جاسکتا تھا۔ اس کا مہمان بننا عام حالات میں اعزاز کی بات ہوگی مگر اسے دھوکا دینا اور جھوٹ بول کے شریکِ جرم ہونے پر آمادہ کرنا عملاً ناممکن تھا۔ اچھا ہوتا اگر ہم کسی عام دیہاتی کے گھر میں ٹھہر جاتے۔ اس کے گھر کے آنگن میں سو جاتے۔ وہ ہماری مدد کرتا اور دو چار سو یا ہزار روپے لے کر رازداری میں معاون ثابت ہوتا۔ اب ہم خدا کے گھر میں تھے اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہاں جھوٹ کیسے بولا جاسکتا ہے۔ عیسائیوں کا ایک فرقہ پادری کے سامنے جاکے ہر گناہ یا جرم کا اعتراف کرلیتا ہے۔ پادری اس کے لیے دعا کرتا ہے اور اس کے راز کو راز رکھتا ہے۔ مگر ایک پیش امام کسی جرم کی پردہ پوشی نہیں کرسکتا۔ نہ وہ کسی مجرم کو پناہ دے ...اور نہ اس کے جرم میں بالواسطہ طور پر بھی شریک ہوسکتا ...

...ابھی سورج غروب ہونے میں دیر تھی۔ پیش امام نے عصر کی ...دی اور پھر نماز پڑھائی۔ موقع پاتے ہی میں نے پیڈرو سے کہا ...مجھے اس سے کچھ بات کرنی ہے۔ وہ میرے ساتھ باہر آگیا۔ ہم ...دور پیدل گئے اور ایک چٹان کی اوٹ میں بیٹھ گئے جہاں سے ...بلندی' نشیب میں بنے ہوئے گھر۔ دور تک پھیلے ہوئے پہاڑ ...کل سب نظر آتے تھے۔

"کیا تمہیں کچھ یاد آیا۔ وہ جگہ کس طرف ہے؟"

"ہاں۔ ہم دائیں جانب مڑ گئے تھے۔ بائیں طرف ذرا بلندی پر ...کچھ نشانیاں اور ملیں گی۔"

"مگر یہ کام کیسے ہوگا۔ ہمیں ایک مزدور کی ضرورت ہوگی۔ ہم ...کھدائی نہیں کرسکتے۔ گاؤں میں مزدور بہت لیکن میں کیا بتاؤں گا ...یہ قبر کس کی ہے اور اگر میں اپنے والد کی ہڈیاں نکال کے لے ...جاؤں تو پہلا سوال یہ ہوگا کہ ہڈیاں اس جگہ دفن کرنے والا ...تھا۔ اس نے ایسا کیوں کیا تھا اور اب مجھے کیسے معلوم ہوا ..."

"یہ سب بتاؤ گے تو مشکلات میں پھنس جاؤ گے۔ حاصل کچھ ...نہیں ہوگا۔ ہم کسی کو کچھ بتائے بغیر بھی یہ کام کرسکتے ہیں۔ وہ ...آبادی سے باہر ہے۔"

میں نے نفی میں سرہلایا "یہ ناممکن ہے پیڈرو۔ کوئی دیکھ لے ..."

"ہم یہ کام رات کے وقت کرسکتے ہیں' آج رات۔"

"کھدائی تم کروگے؟"

"یہ کام مشکل ہے۔ مگر ناممکن نہیں" پیڈرو نے کہا۔

"اگر کسی نے آواز سُن لی۔" میں نے کہا "اس کے علاوہ میں ...ہڈیوں کو اپنے ساتھ کیسے لے جاؤں گا جو ایک بوری میں ہیں۔"

پیڈرو نے سوچ کے کہا "یہ ہوسکتا ہے کہ ابھی میں اس جگہ کی ...نشاندہی کردوں۔ تم بعد میں بھیس بدل کے اکیلے آؤ۔ کسی مزدور ...ساتھ۔ اور اپنا کام کرکے چلے جاؤ۔ اس وقت نازو کے ساتھ ...سے کام خراب ہوا۔"

"بعد میں کب؟" میں نے کہا "اور تم پر میں کیسے اعتبار کرلوں ...تم صحیح جگہ کی نشاندہی کروگے۔"

"وہ گاؤں کا قبرستان تھا۔ اس کے ایک کونے میں ہم نے قبر ...تھی۔ جہاں دو دیواریں ملتی تھیں' وہاں ایک درخت بھی تھا ...کا۔ آس پاس دوسرے درخت شہتوت کے تھے یا املی کے۔ ...دیکھ لو۔ وہ قبر شاید موجود ہوگی۔ گورکن تمہاری مدد کرسکتا ...ہے۔"

"اصل مسئلہ پیش امام صاحب کا ہے۔ اسے میں کیا بتاؤں گا ...تمہارے سید پور آنے کا مقصد کیا تھا۔ میں مسجد میں بیٹھ کے جھوٹ نہیں بول سکتا۔"

"تم مسجد سے باہر آکے جھوٹ بول سکتے ہو۔"

"نہیں۔ یہ گناہ بھی نہیں ہوگا مجھ سے۔"

پیڈرو نے کہا "اچھا پھر سب مجھ پر چھوڑو۔ میں اپنے آپ کو اور تمہیں محفوظ رکھتے ہوئے سچ بتادوں گا۔"

"مجھ سے حمایت کی اُمید نہیں رکھنا۔ میں تمہارا دوست نہیں دشمن ہوں پیڈرو۔ تم میرے مجرم ہو اور یہاں خود کو بے گناہ ثابت کرنے آئے ہو۔"

ہم واپس گئے تو پیش امام ہمارا منتظر تھا "آپ کہاں نکل گئے تھے حضرت۔ میں نے چائے بنوائی تھی' آپ شہر کے لوگ اس وقت چائے پیتے ہیں۔"

میں نے کہا "یہ آپ کس تکلف میں پڑ گئے؟"

"ہم یہاں کھانا بھی سرِ شام ہی کھالیتے ہیں۔ مغرب کے بعد اور عشا کی نماز پڑھ کے سو جاتے ہیں۔" وہ بولا "لیکن آپ جب چاہیں کھانا کھائیں۔ رات کو مچھر بہت ہوتے ہیں۔ ہم تو عادی ہیں۔"

"ہم بھی چادر لپیٹ کر سو جائیں گے" میں نے کہا۔

"آپ کی بہن اردو پنجابی نہیں بول سکتی۔ سمجھ لیتی ہے' تھوڑا بہت۔"

ظاہر ہے نازو نے خاموش رہنے کے لیے یہ ڈراما کیا تھا "ہاں جی۔ دراصل ہم کئی سال سے لندن میں تھے" میں نے کہا "میری یہ بہن گونگی بہری تھی۔ بچپن میں ٹائیفائیڈ ہوا تھا۔ یہاں کیس خراب ہوگیا۔ لندن میں بہت علاج کرانے سے اب کچھ سننے اور بولنے لگی ہے۔"

"اچھا یہ بات ہے" وہ مطمئن ہوگیا۔

جھوٹ کی ابتدا نازو نے کی تھی اور میں اسے نباہنے پر مجبور ہوگیا تھا۔ اس وقت ہم مسجد میں نہیں تھے۔ پیش امام کے گھر کے سامنے کھلی جگہ میں بچھی ہوئی چارپائیوں پر بیٹھے ہوئے تھے لیکن اس عذرِ گناہ سے میرے ضمیر کی خلش کم نہیں ہوئی تھی۔ مجھے اپنی مجبوری پر شرمندگی بھی تھی اور میں نے دل ہی دل میں خدا سے دُعا مانگی کہ وہ میرے جھوٹ پر مجھے معاف کردے۔

رات کے کھانے کے بعد میں نے پیش امام سے کہا "آپ نے ابھی تک ہم سے یہاں آنے کا مقصد نہیں پوچھا۔"

"یہاں بہت لوگ آتے ہیں۔ سیر و تفریح کے لیے۔"

"وہ رات کو یہاں قیام نہیں کرتے ہوں گے۔" میں نے کہا "اور ان کے ساتھ خواتین نہیں آتی ہوں گی۔"

"یہ بات نہیں حضرت۔ یہاں تو غیر ملکی بھی آتے ہیں۔ وہ اس علاقے میں تاریخی تحقیق کرتے ہیں۔ گاؤں سے باہر کیمپ لگا کے رہتے ہیں۔"

اچانک میری مشکل آسان ہوگئی تھی۔ "پھر تو آپ سب سمجھتے

ہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہاں کے لوگوں کو کیسے قائل کروں گا۔ ہم جیسے لوگ یعنی ریسرچ کرنے والے عموماً قبرستانوں میں جھانکتے نظر آتے ہیں۔ اہرامِ مصر کھود ڈالے تاریخ دانوں نے اور ہزاروں سال پُرانی لاشیں نکال لیں۔ پھر یہاں اپنے پاکستان میں موہنجو دڑو یعنی مُردوں کا ٹیلہ۔ چوکھنڈی کا قبرستان' تاریخ کے آثارِ قدیمہ یہی ہیں۔"

"یعنی آپ بھی گڑے مُردے اکھاڑتے پھرتے ہیں حضرت۔"

"نہیں مولوی صاحب۔ یہ مسلمانوں کے قبرستان ہیں لیکن یہ سارا علاقہ تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ ٹیکسلا ویسے تو شاید انیس بیس میل ہے سڑک کے راستے۔ اصل میں اس جگہ سے پندرہ میل بھی نہیں ہوگا۔ گندھارا تہذیب کے کچھ آثار کا سُراغ یہاں بھی ملا ہے۔"

"اچھا حضرت!" مولوی صاحب کی دلچسپی بڑھ گئی "گویا یہاں سے بھی کوئی ٹیکسلا برآمد ہوگا۔ یہاں کوئی میوزیم بن جائے گا؟ اس میں مجسمے رکھے جائیں گے۔ پھر انہیں دیکھنے کے لیے دن و رات سیّاح آئیں گے۔"

میں نے کہا "مولوی صاحب۔ آپ تو بہت دُور کی سوچنے لگے۔"

"سوچنا پڑتا ہے حضرت۔ ابھی تک یہ گاؤں ہی ہے حالانکہ یہاں کے سب مرد پنڈی شہر میں کام کرنے جاتے ہیں اور یہاں کی عورتیں بھی نور پور شاہان والی بس میں بیٹھ کے پنڈی چلی جاتی ہیں۔ پھر بھی وہ بے حیائی نہیں ہے یہاں جس کو آپ پڑھے لکھے لوگ آزادی' ترقی یا روشن خیالی کہتے ہیں۔"

"آپ نے ٹھیک کہا۔ یہ تعلیم اپنے ساتھ بہت خرابی لائی ہے کیونکہ یہ مغربی نظامِ تعلیم ہمارا نہیں ہے۔"

"آپ کیا قبرستان میں ہی تحقیق کریں گے۔"

"ضروری نہیں۔ آس پاس کا سب علاقہ دیکھیں گے۔ لیکن کہیں کُھدائی کرتے ہوئے کوئی قبر نکل آئی یا کسی قبر کو نقصان ہوا تو....."

وہ فکر مند ہوگیا "دیکھیے حضرت۔ ویسے ذاتی طور پر میں سمجھتا ہوں کہ علم حاصل کرنے کے لیے ایک غیر جذباتی انداز اختیار کرنا پڑتا ہے۔ یہ ڈاکٹر جو آج آپریشن کر رہے ہیں۔ آنکھوں کو بینائی دے رہے ہیں۔ دل کی مرمت کر رہے ہیں یہاں تک کہ دل بدل رہے ہیں۔ تو یہ سب اسی طرح ممکن ہوا کہ پہلے چوہوں پر خرگوشوں پر تجربات ہوئے۔ پھر انسانوں پر۔ پوسٹ مارٹم بھی تو ایک ضرورت ہے۔ اس سے قتل کا سُراغ ملتا ہے اور مجرم پکڑا جاتا ہے۔ پوسٹ مارٹم کے لیے بھی قبریں کھودی جاتی ہیں۔ اصل مسئلہ ہے نیت کا۔ نیت اگر بے حرمتی کی نہ ہو تو میری ذاتی رائے میں قبر کھودنا اشد ضرورت کے تحت ناجائز نہیں۔ یہ ناپسندیدہ فعل ہو سکتا ہے مگر میں اسے شرع کے خلاف یا کفر قرار نہیں دوں گا۔"

"ماشاءاللہ آپ بہت روشن خیال ہیں۔"

"اسلام بڑا روشن خیال دین ہے حضرت۔ اب ہم نے اپنی تنگ نظری کے باعث اسی کو عام آدمی کے لیے بہت مشکل بنا دیا ہے۔ فروعی مسائل میں اُلجھ گئے ہیں اور فرقہ بندی کر لی ہے تو اسلام کا کیا قصور۔ میں نے تو اسلامی علوم میں اسناد بھی حاصل کی ہیں اور ایم اے بھی کیا ہے معارفِ اسلامیہ میں۔ لیکن یہاں کے لوگ ذرا جذباتی ہیں کیونکہ یہ قبریں ان کے عزیزوں کی یا آباؤاجداد کی ہیں۔"

"ہم کسی قبر کو نہیں چھیڑیں گے" میں نے کہا۔

"آپ کی بہن بھی ساتھ رہیں گی؟"

میں نے کہا "اصل میں تو یہ اسی کا شوق ہے۔"

"بُرا نہ مانیں تو کچھ عرض کروں حضرت۔ آخر اس شوق میں ایسی تعلیم کا فائدہ؟ عورتوں کو بالآخر گھرداری کرنی ہے۔ امورِ خانہ داری کے علاوہ بھی عورت کے لیے علوم ہیں۔ صحتِ عامہ' بچوں کی نفسیات' سماجی اور قانونی مسائل۔"

"میں آپ سے سو فیصد اتفاق کرتا ہوں۔ اعلیٰ تعلیم نے آپ کو یہ تعمیری سوچ عطا کی ہے۔ آپ کو تو کہیں پڑھانا چاہیے تاکہ ہمارے بچوں میں یہی وسیع النظری پیدا ہو" میں نے کہا۔

وہ بولا "دل تو چاہتا ہے حضرت مگر میری سُنے گا کون۔ نقار خانے میں طوطی کی آواز۔ بہتّر فرقوں کے بہتّر نام نہاد علما اپنی اپنی کہہ رہے ہیں۔ پتا نہیں میری سوچ پر کتنے کفر کے فتوے صادر ہو جائیں گے اس لیے یہیں عافیت ہے۔ خیر اب آپ آرام کریں۔ ہاں' ان کے بارے میں کچھ نہیں بتایا آپ نے۔"

پیڈرو بہت پہلے ہی سو گیا تھا۔ یا سونے کی اداکاری میں مصروف تھا۔ میں نے کہا "یہ کُھدائی کے ماہر ہیں۔ زمین کھودنے کا کام کوئی بھی مزدور کر سکتا ہے مگر بعض اوقات زمین کی ہر پرت احتیاط سے ہٹانی پڑتی ہے۔"

پیش امام رخصت ہو گیا تو میں بھی چارپائی پر لیٹ گیا۔ اگر ہم مسجد کے حجرے میں سوتے تو گرمی اور حبس سے پریشانی ہوتی۔ یہ کھلی جگہ بہت بہتر تھی جو دراصل گلی تھی۔ مسجد کے عقبی حصے میں مکان دور دور بنے ہوئے تھے۔ یہاں کوئی ہموار میدان نہیں تھا کہ لوگ ایک قطار میں دیوار سے دیوار ملا کے مکان کھڑے کر لیتے جسے جہاں ہموار قطعۂ زمین ملا اس نے وہاں گھر بنا لیا اور مزید جگہ کی ضرورت پڑی تو اونچی نیچی جگہ کو خود برابر کر لیا۔

پیڈرو بہت گہری نیند میں تھا اور خراٹے بھی لے رہا تھا۔ میرا اپنا تھکن سے بُرا حال تھا لیکن میں سونا نہیں چاہتا تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ پیڈرو کی نیت میں فتور آجائے۔ عین وقت پر وہ اپنا خیال بدل دے یا اس کو موقع ملے تو تعاون کا یہ ڈراما ختم کر کے بھاگ جائے جس موقع کی تلاش میں وہ ابھی تک تھا' وہ اسے میری غفلت سے فراہم ہو جائے۔ میں سوتا رہ جاؤں اور وہ فرار ہو جائے۔ اس سے

[...]بلکہ جاتے جاتے مجھے مار جائے۔ نہیں' پیڈرو ایسا نہیں کرے [...] واقع اسے ملے ہوں گے مگر اس کا ارادہ بھاگنے کا نہیں تھا۔ وہ اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے ہمارے ساتھ آیا ہے۔ وہ [...] ہے کہ میں اسے وزیر خان کا قاتل سمجھنا چھوڑ دوں۔ اگر اس [...]ت میں فتور ہوتا تو وہ اتنے سکون سے نہ سوتا۔

میرا ذہن بڑی اُلجھن میں تھا۔ عقل کے دلائل دونوں طرف [...] جیسے تھے۔ جسم آرام مانگتا تھا اور آنکھیں نیند سے بوجھل [...] مگر میں نے جاگتے رہنے کا فیصلہ کیا۔ اگر اس میں دس فیصد [...] ہو تب بھی سونا غلط ہوگا۔ میری ساری محنت رائگاں جائے [...] گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں۔ دوبارہ پیڈرو کے ساتھ ادھر آنا ہو [...] اتنی سختی جھیلنے کے بعد ایک رات کی بے آرامی کیا ہے۔

میں اُٹھ کر بیٹھ گیا اور پھر کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر میں اِدھر سے [...] ٹہلتا رہا۔ اس بلندی سے اسلام آباد کا اور راولپنڈی کا منظر [...] روشن آسمان کی طرح نظر آتا تھا۔ آس پاس صرف تاریکی [...] کچے پکے گھروں میں چراغ بھی نہیں جل رہے تھے۔ نہ جانے [...]ں سے ریڈیو پر گانے نشر ہو رہے تھے۔ کوئی شوقین مزاج نوجوان [...] جاگ رہا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ میں نے بعض گھروں پر ٹی وی [...] انٹینا بھی دیکھے تھے۔ ابھی ہم صرف بلیک اینڈ وائٹ نشریات [...] دور میں تھے۔ ٹی وی عام نہیں تھا۔ پاک بھارت جنگ سے کچھ [...]ہ پہلے ہی لاہور کے پہلے ٹی وی اسٹیشن نے نشریات کا آغاز کیا تھا [...]ر چند سالوں میں ٹی وی سید پور پہنچ گیا تھا۔ کچھ لوگوں کے لیے یہ [...]ت مہنگا تھا۔ کچھ شوق کے مارے یہ تفریح کا سامان قسطوں پر بھی [...]لے آئے تھے۔ اسے لہو و لعب میں شمار کرنے والے بھی بہت تھے [...]ور اس کے دیوانے بھی۔

نازو کا ساتھ آنا ضروری تھا اور وہ اپنی افادیت کا بھرپور [...] ظاہر کر چکی تھی۔ اس نے عبدالرحمان سے اور سراج سے ہماری [...] گلو خلاصی کرائی تھی۔ ان کا خیال آیا تو میں ہنس پڑا۔ سنگ جانی [...] خانے والوں نے اب تک عبدالرحمان کو ڈکی سے نکال کے گھر [...] پہنچا دیا ہوگا۔ اور عبدالرحمان کے گھر پہنچ کے پولیس نے محلے [...] والوں کے سامنے دروازہ کھولا ہوگا۔ اے ایس آئی سراج اور اس [...] کی محبوبہ دلنواز کو میں نے اتنی مضبوطی سے جوڑا تھا کہ شاید رسّی [...] کھولنے کے بعد بھی ان کو زور لگا کے الگ کرنا پڑا ہوگا۔ پیوند کاری [...] ایسے ہی ہوتی ہے۔ اگر وہ چند دن یا چند ہفتے اسی طرح گزارتے تو کیا [...] ان کے اجسام ایک ہو جاتے؟

یہ بڑا مضحکہ خیز خیال تھا۔ میں نے جُڑے ہوئے آم دیکھے تھے [...] اور ایسے بچوں کی تصویر دیکھی تھی جو پیدائش کے وقت آپس میں [...]ے ہوتے تھے۔ پھر کسی سرجن نے انہیں الگ کر دیا۔ ایسے بچوں [...] کو غالباً SIAMESE TWINS کہا جاتا ہے۔ معلوم نہیں کیوں' [...] کیا سیام میں ایسے بچے زیادہ ہوتے ہیں یا پہلی بار وہیں قدرت کا یہ [...] کرشمہ ظہور میں آیا تھا؟ سیام جواب تھائی لینڈ ہے۔

اچانک میری پیٹھ پر ایک پتھر لگا تو میں اُچھل پڑا۔ میں نے پلٹ کے دیکھا تو نازو ہاتھ باندھے کھڑی تھی۔

"یہ کیا حرکت ہے" میں نے کہا "تم کیوں آئی ہو یہاں؟"

"تم کیوں بے چین روح کی طرح اس ویرانے میں سرگرداں ہو؟"

"مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ میں سونا نہیں چاہتا تھا۔"

نازو نے کہا "سچ صرف دوسرے جملے میں بولا تم نے۔ میری اپنی کیفیت یہی تھی۔"

"کیفیت کی بچّی۔ اندر جاؤ' یہ شہر نہیں ہے۔"

"کیا یہاں بہن بھائی باتیں نہیں کر سکتے۔ اگر انہیں نیند نہ آرہی ہو۔"

"لاحول ولا قوۃ۔" میں نے کہا "بلاوجہ شک کریں گے لوگ۔"

"کون لوگ؟ مجھے تو یہاں کوئی بھی نظر نہیں آرہا ہے اور شک کی بھلا کون سی بات ہے۔ جسے شک ہو یہاں آ کے بیٹھ جائے" وہ میری چارپائی پر بیٹھ گئی۔

"تم نے خواتین کے سامنے کیا ظاہر کیا تھا؟ یہ کہ تم نہ اردو بول سکتی ہو نہ پنجابی۔"

"وہ خواتین سو رہی ہیں۔ زور زور سے خراٹے لے رہی ہیں۔"

"میں نے بڑی مشکل سے بات نبھائی۔ یہ کہا کہ تمہیں ٹائیفائیڈ ہو گیا تھا۔ تم بچپن سے لندن میں زیرِ علاج تھیں اور اب کچھ بولنے سمجھنے لگی ہو۔ کسی نے تمہیں چٹاخ پٹاخ بولتے سن لیا تو....."

"میں چٹاخ پٹاخ بول رہی ہوں؟ میں تو کانا پھوسی کر رہی ہوں۔ میری آواز پہنچ رہی ہے نا تمہارے کانوں تک۔ تم سُن رہے ہو میری بات۔"

"نہیں۔ اور سُننا بھی نہیں چاہتا۔ تم اندر جا کے سو جاؤ۔"

"اندر گرمی ہے اور مچھر ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ تم سو جاؤ تھوڑی دیر کے لیے میں تمہاری جگہ ٹہلنے کی ڈیوٹی دیتی ہوں۔"

"ضدمت کرو۔"

"تم ضد مت کرو۔ یہ بتاؤ کہ کل کے لیے کیا طے ہوا؟"

"میں اور پیڈرو جائیں گے کھدائی کے لیے" میں نے کہا "ہم آثارِ قدیمہ پر تحقیق کر رہے ہیں۔ مولوی بہت پڑھا لکھا اور روشن خیال آدمی ہے' بات سمجھ گیا۔"

"کمال ہے۔ میرے ذہن میں بھی یہی خیال آیا تھا۔ کیا میں ساتھ نہیں جا سکتی۔"

"جا سکتی ہو۔ لیکن ضرورت نہیں' تم تماشا بن جاؤ گی" میں نے کہا۔

وہ بولی "تماشا تو اب بھی بن رہی ہوں۔ میں سارا دن یہاں ان جاہل عورتوں کے ساتھ نہیں گزار سکتی۔"

"اچھا تو پھر جا کے سو جاؤ۔ شرط یہی ہے ورنہ..."

"اچھا ایسا کرو۔ تین گھنٹے تم آرام کرلو۔ میں بیٹھتی ہوں دروازے کے پاس۔ کسی نے پوچھا تو کہہ دوں گی نیند نہیں آرہی تھی۔ اس کے بعد تمہیں جگادوں گی اور خود صبح تک سوتی رہوں گی.....وعدہ۔"

"دیکھو بے ایمانی مت کرنا۔" میں نے کہا "یہ نہ ہو صبح تک میں سوتا رہوں اور تم یہاں بیٹھی رہو۔"

دروازہ کافی دور تھا اور وہاں نازو کے بیٹھے رہنے میں کوئی حرج یا شک کی بات نہیں تھی۔ میں لیٹ گیا اور لیٹتے ہی سو گیا۔ نازو نے مجھے چار گھنٹے بعد رات دو بجے جگادیا اور خود سونے چلی گئی۔ ایک سے دو بھلے۔ یہ بات سچ تھی۔ چار گھنٹے آرام کرنے سے میری حالت میں نمایاں تبدیلی آئی۔ میں بالکل تازہ دم ہوگیا۔ اب میں اگلا پورا دن آرام سے گزار سکتا تھا۔ میری ساری تھکن دور ہوگئی تھی۔ رات کا باقی حصہ میں نے وادی اور بلندی پر گیدڑوں کی آوازیں سنتے گزارا۔ ایک گیدڑ میرے سامنے سے گزرا تو میں نے اسے کتا سمجھا۔ صرف اس کی چال پر مجھے شک ہوا اور میں نے اسے دوبارہ دیکھ کے گیدڑ قرار دیا۔ وہ اتنا بزدل بہرحال نہیں تھا جتنے گیدڑ مشہور ہیں۔ ممکن ہے کتا ہی ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مجھے پیڈرو پر سخت غصہ آیا۔ اس خبیث کی وجہ سے میں جاگنے پر مجبور تھا اور وہ ساری رات مُردے کی طرح پڑا رہا۔ پانچ بجے اذان ہوئی تو مجھے کچھ سکون ملا۔ حیرانی بھی ہوئی کہ صبح اتنی جلدی ہوجاتی ہے۔ شہروں میں کسی کی صبح نو بجے ہوتی ہے کسی کی دس بجے۔ ابھی اندھیرا ہی تھا کہ نمازی میرے سامنے سے گزرنے لگے۔ سلام سب کرتے تھے۔ ایک دو نے مجھے شرمندہ کرنے والی نظروں سے دیکھنے پر اکتفا کی۔ ایک بزرگ نے براہِ راست شہر کے مغرب زدہ نوجوانوں کو اور بالواسطہ طور پر مجھے دائرۂ اسلام سے خارج قرار دیا۔ میں نے مؤدبانہ گزارش کی کہ آپ چلیں، میں حاضر ہوتا ہوں۔ واپسی پر انہوں نے مجھ جیسے مردود کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ انہیں میں کیسے سمجھاتا کہ پیڈرو کو چھوڑ کے میں کہیں نہیں جاسکتا۔ تاہم مجھے اس کوتاہی گناہ یا جرم سے انکار نہیں تھا کہ عام نوجوانوں کی طرح میں بھی نماز پابندی سے نہیں پڑھتا۔

جب مکھیاں پیڈرو کو پریشان کرنے لگیں تو وہ بھی جماہیاں اور انگڑائیاں لیتا اُٹھا "تم رات بھر بیٹھے جاگتے رہے؟"

میں نے کہا "نہیں۔ ایک ٹانگ پر کھڑا سوتا رہا۔"

وہ ہنسا "تمہیں ڈر تھا کہ میں بھاگ جاؤں گا۔"

"میں تم کو پھر پکڑ کے لاسکتا تھا۔ لیکن تم مجھے قتل کرکے بھاگ جاتے پھر" میں نے کہا۔

"اعتبار نہ کرنا تمہاری فطرت بن گئی ہے۔"

"تمہاری حد تک" میں نے کہا۔

"اگر تم اپنے ساتھ ایک ہتھکڑی لاتے۔ اس کا سرا میری کلائی میں اور دوسرا اپنی کلائی میں ڈال کے لاک کردیتے۔"

"فضول باتوں میں وقت مت ضائع کرو۔ تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں بھی کچھ دیر پہلے ہی اُٹھا ہوں۔"

"تم اور مولوی صاحب بہت دیر تک کائیں کائیں کرتے رہے۔ پھر میں تو سو گیا تھا۔ اب میں غسل کرنا چاہتا ہوں" وہ بولا۔

"مسجد میں جا کے آخری غسل کرلو۔ تمہاری تو نماز جنازہ بھی یہیں ہوگی۔"

پیڈرو کا رنگ اُڑ گیا۔ "ایسا مذاق مت کرو۔ مجھے مارنے کے لیے اتنی دور لانا ضروری نہیں تھا۔ کسی کو مقابلے کا موقع دیے بغیر اور اعتماد کو دھوکا دے کر قتل کرنا تمہارے نزدیک جائز ہے۔ تم نے قسم بھی کھائی تھی۔"

میں نے ہنس کے کہا "پیڈرو۔ جائز ناجائز، وعدہ خلافی اور قسم توڑنا، دشمنی میں ان کی کوئی اہمیت نہیں لیکن تم ڈرو نہیں۔ تمہیں مارنا ہوتا تو میں بہت پہلے ماردیتا۔ بے شک تم میری گرفت میں ہو لیکن وعدے کے مطابق میں تمہیں ایک موقع دوں گا۔ جیسے داؤد نے مجھے ایک موقع دیا۔ احسان کا بدلہ چکانے کے لیے۔ بازی اس کے بعد پھر شروع ہوگی۔"

صبح چھ بجے ہم ناشتے سے فارغ ہوگئے۔ اسی وقت دھوپ نکل آئی تھی۔ پیڈرو کا خیال تھا کہ پہاڑ کی اتنی بلندی کے باعث سورج یہاں بہت پہلے نظر آنے لگتا ہے۔ شہر والے دیر سے دیکھتے ہیں۔ بشارت احمد قادری حد درجہ خلیق اور فراخ دل آدمی تھا۔ اس کی عمر زیادہ نہیں تھی لیکن اپنے علم و فضل سے وہ بہت معتبر اور معزز مقام حاصل کرچکا تھا۔ اس نے بطورِ خاص شہری ناشتے کا بندوبست کیا تھا یعنی پراٹھا انڈا اور چائے۔ ہم نے اسے اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دی جو اس نے حسبِ توقع بڑی عاجزی سے مسترد کردی۔

"مجھے یہاں بہت مصروفیت رہتی ہے۔ صبح سے شام تک قرآن کی تدریس ہے۔ موذن بھی میں ہوں۔ تیسرے پہر درس الگ ہے۔"

میں نے کہا "ایک گزارش اور تھی۔"

"حکم فرمائیں حضرت" اس نے کہا۔

"بات یہ ہے کہ میری بہن پردہ تو کرتی نہیں۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ یہ غلط ہے۔ مگر یہاں شاید اسے زیادہ پریشانی ہوگی۔ ہم ایک خالص علمی سطح کی تحقیق میں مصروف ہوں گے مگر گاؤں کے سب بے کار نوجوان اور بچے ہی نہیں عورتیں بھی تماشا دیکھنے آجائیں گی۔ ایک جمگھٹا لگ جائے گا قبرستان میں۔ اگر آپ تھوڑی سی مدد کریں۔"

"کھل کر بات کیجیے حضرت۔ میں کیا کرسکتا ہوں۔"

"آپ لوگوں کو منع کرسکتے ہیں کہ وہ اپنے کام سے کام رکھیں اور ہمارے کام میں مخل نہ ہوں۔"

"یہ تو بہت مشکل ہے میرے لیے" وہ سوچ میں پڑ گیا "لیکن ...ترکیب ہے۔ دو لڑکے ہیں ذرا بگڑے ہوئے۔ ان سے سب ...تے ہیں۔ آپ خود ان سے بات کرلیں اور ان کی ڈیوٹی ...ب۔"

"کیا نام ہیں ان کے؟" میں نے دل ہی دل میں خوش ہوکے ...

"صمدو اور ممدو۔ سگے بھائی ہیں حضرت۔"

"اس وقت کہاں ملیں گے؟" میں نے کہا۔

"اسی گاؤں میں۔ کوئی بتادے گا کہ وہ کدھر ہیں یا انہیں خبر مل ...ے گی تو وہ خود آجائیں گے۔ میں اب اجازت چاہوں گا۔ مسجد ...بچے درس کے لیے آگئے ہیں۔ دوپہر کے کھانے پر ملاقات ہوگی ...رت۔"

میں نے کہا "آپ دوپہر کے کھانے کی فکر نہ کریں..."

"کھانے کے بغیر تو کام بھی نہیں ہوتا حضرت۔ اگر آپ کو ...ت نہ ملے تو کسی کو ادھر بھیج دیں۔ ممدو یا صمدو کو۔ وہ کھانا لے ...ئے گا۔ یا چھوڑیں، میں بھجوادوں گا کسی کے ہاتھ۔"

پیش امام کی شرافت، مہمان نوازی اور فراخ دلی مجھے زیادہ ...رمندہ کررہی تھی۔ عام مولویوں کی طرح نہ اس نے مجھے ...برا اسلامی شعائر پر بُرا بھلا کہا تھا۔ نہ راتوں رات میرے اخلاق ...کردار کی اصلاح فرمانے کی کوشش کی تھی اور نہ مجھ پر کسی شک ...شبے کا اظہار کیا تھا۔ وہ ایسا شخص تھا جو صرف قول سے نہیں ...اپنے عمل سے متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا اور اس کا کردار یقیناً قابلِ تقلید تھا۔

میں نے اور پیڈرو نے ممدو اور صمدو کو خود ہی دریافت کیا۔ اس وقت وہ ایک اجنبی کی ٹھکائی کرکے فارغ ہوئے تھے۔ اجنبی غلطی سے ادھر جا نکلا تھا جدھر عورتیں کپڑے دھوتی تھیں اور نہاتی تھیں۔ ثابت ہوا کہ وہ گاؤں کے تھانے دار بھی تھے جو خود لاقانونیت کا منبع ہوتا ہے مگر قانون کا رکھوالا کہلاتا ہے۔

صمدو بڑا تھا لیکن قدرے احمق تھا۔ اس نے سو روپے کا سُنتے ہی مجھ سے ہاتھ ملالیا "ٹھیک ہے بابو۔"

ممدو نے اسے ڈانٹا "کیا ٹھیک ہے۔ سو روپے میں سارا دن ادھر سے اُدھر کھجل خواری۔ لوگوں کو روکنا کوئی آسان کام ہے۔ آنی بری ہے گاؤں موچی کے دادا کی۔ تو روک لے گا اسے۔ اور اگر کوئی مرگیا آج تو جنازہ کہاں جائے گا؟"

صمدو نے کہا "کون مرا ہے آج۔ ابھی تک تو....."

میں نے فوراً بات ختم کرنے کے لیے کہا "ممدو ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہے کام واقعی بہت مشکل ہے۔ چلو ممدو تم خود ہی بتادو۔"

"سو میرے، سو اس کے" وہ بولا۔

"مجھے منظور ہے" میں نے ان کو سو سو کے نوٹ پکڑا دیے۔

"بس آج کا ہی کام ہے؟" ممدو بولا۔

"نہیں۔ کام ایک ہفتے جاری رہے یا ایک مہینے۔ تمہارا حساب روز کے روز ہوگا۔"

اس کے بعد ہمارے سب مسائل خود بخود حل ہوگئے۔ صمدو نے گاؤں کی طرف سے آنے والے ایک راستے پر چوکی بٹھادی۔ اس کا نگراں وہ خود تھا۔ دوسری طرف سے ممدو نے ناکا بندی کردی۔ انہوں نے ہمیں کدال، گینتی اور بیلچہ وغیرہ بھی فراہم کرنے کا وعدہ کیا۔

گاؤں کی گلیوں سے گزرتے ہوئے ہمیں بہت لوگوں نے گھور گھور کے دیکھا۔ ہم شہر کی طرف سے آتے اور پکنک منانے والے ہوتے تو کسی کو دلچسپی نہ ہوتی مگر یہ بات گاؤں میں سب جان چکے تھے کہ ہم مولوی صاحب کے مہمان ہیں اور کسی خاص کام سے آئے ہیں۔ نازو نے خود کو چادر میں لپیٹ کر کسی حد تک بے پردگی کے الزام سے بچنے کی کوشش کی تھی مگر اس کا چہرہ از خود دعوتِ نظارہ دیتا تھا۔ نوجوانوں کی آنکھوں میں حسرت اُتر آتی تھی اور بوڑھے دم بخود رہ جاتے تھے۔ ایک عورت نے دوسری سے کہا "ہائے نی یہ تو میم ہے میم" اور دوسری نے کہا "ولایت سے آئی ہے تو میم ہی ہوگی پاگل۔"

قبرستان کا احاطہ بھی مختصر تھا۔ ایک کچی پکی دیوار تھی جو ہر طرف دو سو گز تک پھیلی ہوئی تھی۔ پُرانی دیوار کئی جگہ سے گرگئی تھی۔ ناہموار اور اونچی نیچی جگہ پر دیوار کیسے سیدھی اُٹھائی جاسکتی تھی۔ کہیں یہ نشیب کی جانب مائل تھی تو دوسری طرف سے بلندی کی طرف اُٹھتی نظر آتی تھی۔ اندر قبریں بھی بے ترتیب تھیں اور کچھ بہت اوپر تھیں تو کچھ بہت نیچے۔ جو نوجوان اور بچے ہمارے ساتھ ہولیے تھے ان کو صمدو ممدو اینڈ برادرز نے علاقہ ممنوعہ کی سرحد پر روک دیا اور خاصی اشتعال انگیزی کے ساتھ دفع ہوجانے کا حکم دیا۔ کچھ نافرمان اور مایوس بچوں نے اس حکم پر پوری طرح عمل نہیں کیا اور دور کھڑے فحش کلامی کرتے رہے۔ صمدو اور ممدو کا بیشتر وقت ان کی طرف پتھر مارنے اور انہیں ڈرانے کی دوڑ دھوپ میں صرف ہوا۔ تاہم قبرستان کی حدود کے قریب آنے کی جُرات بھی کسی نے نہیں کی۔

اس قبرستان میں شہر کی طرح کوئی بھی فُل ٹائم گورکن نہیں تھا۔ جس کا کوئی مرجاتا تھا اس کے اعزا خود ہی قبر بھی کھود لیتے تھے۔ میں نے دور ہی سے جائزہ لیا تو مجھے شیشم کا واحد درخت دوسرے کنارے پر نظر آیا۔ باقی چند درخت شہتوت کے تھے یا دریک کے جو نیم ہی نظر آتا ہے۔ املی کا درخت کوئی نہیں تھا اور کیکر غالباً صاف کردیے گئے تھے۔

پیڈرو کچھ نروس تھا۔ بہت پہلے اس نے ایک سنگین جرم کیا تھا۔ گردشِ حالات اسے ایسے موڑ پر لے آئی تھی کہ وہ خود اس جرم کا ثبوت فراہم کرنے پر مجبور تھا۔ جب اس نے وزیر خان کی ہڈیاں کھود کے نکال لیں اور پھر یہاں لا کے دفن کی تھیں تو اس کے جذبات کچھ اور تھے۔ وہ طاقت اور بدمعاشی کے زعم میں مبتلا تھا۔

آج پھر ان ہڈیوں کو کھود کے نکالتے ہوئے اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ اعترافِ جرم کے باوجود اسے یقین نہیں تھا کہ ہم اس سے کیے ہوئے وعدے پر قائم رہیں گے۔ شاید اس کے لیے یہ خیال زیادہ پریشان کن ہو گا کہ اپنے والد کی "ہڈیاں" دیکھ کے مجھ پر اشتعال اور جنون کا دورہ نہ پڑ جائے۔ میں غیظ و غضب کے جذبات سے مغلوب ہو کے اسے جان سے نہ مار دوں۔ اس جرم میں پیڈرو اول تا آخر شریک تھا۔ قتل کرنے والا وہ نہ سہی، دلاور کی طرح وہ بھی قتل کرانے والوں میں شامل تھا۔

میں نے کہا "پیڈرو۔ پھر سوچ لو۔ تم ہمیں ٹھیک جگہ لائے ہو؟"

اس نے اقرار میں سرہلایا "یہی جگہ ہے وہ۔"

میں نے کہا "ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ آخر لاہور سے اتنی دور آنے کا مشورہ کس نے دیا تھا؟ سید پور کا خیال کس کو آیا تھا؟"

"میں نے وہی کیا جو دلاور نے کہا تھا۔ اس بات کا جواب میں نہیں دے سکتا۔" پیڈرو بولا "شاید اس نے ایسی جگہ کا انتخاب کیا تھا جہاں کسی کے تصور کی رسائی بھی نہ ہو۔"

نازو نے کہا "اب انتظار کس کا ہے؟"

میں نے کہا "ممدو کھدائی کے آلات لے آئے، پھر چلتے ہیں۔"

نازو نے کہا "تم نے انہیں کتنی گہرائی میں دفن کیا تھا؟"

"زیادہ نہیں، ڈھائی تین فٹ گہرا کھودا تھا۔ وہاں کسی اور کی قبر ہو گی، زمین اندر سے کھوکھلی تھی۔"

"قبر ہو گی تو اندر کسی کا ڈھانچا بھی ہو گا" میں نے کہا۔

"رات کے وقت ہم نے غور نہیں کیا۔ شاید اور کھودتے تو ڈھانچا بھی نکل آتا۔" پیڈرو نے کہا "وزیر خاں کی ہڈیاں ایک بوری میں بند تھیں۔ وہ ہم نے ویسے ہی رکھ دی تھی۔"

"اور گڑھا برابر کر دیا تھا؟"

"نہیں۔ ہم نے اسے قبر کی شکل دے دی تھی۔ تاکہ کسی کو شک نہ ہو۔ سرہانے پتھر بھی لگا دیا تھا۔"

ممدو نے کدال گینتی اور بیلچہ ہمارے سپرد کرتے ہوئے کہا "ان کا کرایہ دس روپے الگ ہو گا۔ ایک دن کا۔"

میں نے کہا "ممدو۔ کیا اس قبرستان میں دوسرے گاؤں کے مُردے بھی دفن کیے جاتے ہیں۔"

"ہاں۔ کبھی اِدھر اُدھر کے گاؤں سے کوئی میت آ جاتی ہے۔ دراصل آس پاس پہاڑ ہیں۔ یہی ایک جگہ ہے قبرستان کی۔ جہاں قبر کھودنا آسان ہے" ممدو نے کہا۔

ہم کچی قبروں کے درمیان سے گزرے۔ شہر کے لوگوں کی طرح یہاں پکی قبر بنوانے کا رواج بہت کم تھا۔ کتبے بھی دو چار ہی نظر آ رہے تھے لیکن کچی قبروں کی دیکھ بھال کی جاتی تھی۔ لوگ مر جانے والوں کو اتنی جلدی بھولتے نہیں تھے کہ موسم اور بارش سے قبر کا نشان تک باقی نہ رہے اور انہیں خبر نہ ہو۔

شیشم کے درخت پر سبز ریشمی کپڑے کا ایک تکونا جھنڈا دور سے لہراتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ قریب پہنچنے پر مجھے اس کے نیچے وہ قبر نظر آئی جس پر سبز غلاف بھی پڑا ہوا تھا۔ غلاف کے چاروں طرف گوٹا تھا۔ قبر کے کناروں پر اینٹوں کا حاشیہ بنا ہوا تھا اور سرہانے پانی کا مٹکا رکھا ہوا تھا۔ چار بانس گاڑ کے قبر کے چار کونوں پر مختلف رنگ کے جھنڈے لگا دیے گئے تھے۔ یہ کسی غیر معروف پیر کا مزار تھا جس کا مجاور ایک ننگ دھڑنگ مجذوب تھا۔ اس نے لنگوٹی کے نام پر چیتھڑا سا لپیٹ لیا تھا۔ میرے خیال میں وہ جوان آدمی تھا کیونکہ اس کے چوڑے مضبوط سینے پر سارے بال کالے تھے۔ سر کے بالوں میں اس نے سب کچھ ڈال رکھا تھا۔ گھاس پھوس مٹی اور آٹا۔ اس کے گلے میں ہر رنگ کے بڑے بڑے منکوں کی مالا تھی۔

میں نے کہا "بابا جی۔ یہ کس کا مزار ہے؟"

اس نے کڑک کے کہا "کیا تو نہیں جانتا نادان؟"

پیڈرو نے کہا "لیکن یہ تو وہی قبر ہے۔"

میں نے اسے بے یقینی سے دیکھا "کیا؟"

"ہاں۔ بالکل یہی جگہ تھی۔ یہاں کوئی مزار نہیں تھا۔"

اچانک نازو نے میرا ہاتھ پکڑ کے کھینچا "سکندر۔ اُدھر دیکھو۔"

میں نے پلٹ کے دیکھا۔ ایک تھانے دار ٹائپ افسر کی ماتحتی میں دو بندوق بردار پولیس مین قبرستان کی طرف آ رہے تھے۔ ان کے پیچھے بہت سے بچے اور نوجوان تھے جن کو ممدو نے چیک پوسٹ سے آگے نہیں آنے دیا تھا۔ تھانے دار کے ساتھ خود بشارت احمد قادری پیش امام تھا۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ آخر پولیس ہم تک کیسے پہنچ گئی۔ ہم نے اپنی طرف سے پوری احتیاط کی تھی اور کہیں بھی نقشِ پا کا سراغ تک نہیں چھوڑا تھا۔ فنگر پرنٹس تک مٹا دیے تھے اور تعاقب کرنے والوں کو گمراہ کرنے والی نشانیاں دے آئے تھے۔

قدرتی طور پر مجھے یہی خیال آیا کہ کسی نے شک کی بنا پر، شاید خود پیش امام نے پولیس کو مطلع کر دیا۔ وہ پڑھا لکھا اور سمجھ دار آدمی تھا۔ میری باتوں سے وہ قائل نہیں ہوا تھا لیکن اس نے اخلاق اور شائستگی کے آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنا رویہ نہیں بدلا تھا۔ پولیس کو بلوالیا تھا تاکہ اس پر بعد میں امانت بھانے کا الزام نہ آئے۔

اس چیک پوسٹ پر ممدو تھا جو پولیس کے راستے میں پڑتی تھی۔ اس نے خوشامدانہ عاجزی سے جو چھوٹے بدمعاشوں کا وتیرہ ہوتی ہے۔ تھانے دار کو سلام کیا اور اس کے پیچھے آنے والوں کو روک دیا۔

دریافت کرنے چلے آئے۔ میں نے کہا کہ حضرت وہ مہذب اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ ہیں۔"

تھانے دار نے کہا "مولوی صاحب۔ وہ بھی پڑھے لکھے بندے "

میں نے اس سے ہاتھ ملایا "میرا نام پروفیسر کبیر ہے۔ میرا ہیڈ کوارٹر تو پیرس ہے مگر میں یونیسکو کے کمیشن برائے تاریخی نوادرات پاکستان کا نمائندہ ہوں اور یہ میری بہن آثارِ قدیمہ پر ریسرچ کر رہی ہے۔ مس نازلی خان۔ بہت جلد یہ ڈاکٹر خان کہلائے گی اور مجھے جوائن کرے گی۔ یہ میرے اسپیشل اسسٹنٹ ہیں، شیخ "

اتنی روانی سے میں نے ایک ایسے ادارے کا حوالہ دیا تھا جس کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ اس کی جگہ تاریخ کا پروفیسر یا تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے کسی سرکاری محکمے کا افسر ہوتا تو وہ بھی کنفیوز ہو جاتا۔

تھانے دار نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور نظر نازو پر رکھی۔

میں نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے فرنچ میں کہا "جان چھوڑ میری اور خود بھی خیریت سے چلا جا۔" اور پھر اس کا ترجمہ کیا "اپنے وطن آ کے اردو پنجابی بولنا بڑا اچھا لگتا ہے۔ وہاں تو فرنچ بول بول کے منہ ٹیڑھا ہو جاتا ہے۔"

تھانے دار نے سرہلایا "بے شک جی۔ آپ کی موج ہے پروفیسر صاحب۔ پیرس میں رہتے ہو اور یہاں آئے ہو تو یہاں بھی عیش ہے۔ بس ہم خوار ہیں۔"

میں نے ہمدردی سے کہا "ایسی کیا بات ہے آفیسر۔"

"دیکھو لو جی ہتھیلی پر جان رکھ کے پھر رہے ہیں جنگلوں میں۔ اب پتا نہیں وہ مجرم کون ہیں، کہاں گئے ہیں۔ ہمیں تو آرڈر آیا ہے اوپر سے کہ اپنے علاقے پر نظر رکھو جو اجنبی نظر آئے اس کے بارے میں معلومات حاصل کرو۔"

میں نے تشویش کا اظہار کیا "آخر بات کیا ہے۔ کوئی سنگین واردات ہو گئی ہے؟"

"اُدھر فرانس میں کوئی وزیر قتل ہو جائے تو کیا ہوتا ہے؟"

میں نے سرسری لہجے میں کہا "تفتیش ہوتی ہے۔ جیسے کسی عام آدمی کے قتل کا معاملہ ہوتا ہے۔ قتل کسی کا بھی ہو قاتل پکڑا ضرور جاتا ہے۔"

"یہاں ایک وزیر کا قتل ہوا ہے، عباسی کا۔ اس کے اپنے بندے تھے جو اسے لوٹ کے اور مار کے بھاگ گئے۔"

"اس کے اپنے بندے؟"

"ہاں۔ سُنا ہے اس کے مہمان تھے" تھانے دار نے کہا "دو اور تیں، تین مرد ایک لال گاڑی میں ہیں۔ وہ جو لال بیگ جیسی ہوتی ہے۔"

"فاکس ویگن" میں نے کہا۔

"چلو پھٹو اِدھر سے۔ کوئی تماشا ہو رہا ہے یہاں۔ تھانے دار صاحب کو آرام سے کام کرنے دو ورنہ سب کو پکڑ لیں گے۔"

پیچھے آنے والے مایوس ہوئے۔ ممدو نے پہلے انہیں بدمعاشی کے اختیار سے روک دیا تھا۔ اب قانون کا چمچہ بن کے۔

مزار کے مجاور ملنگ نے پہلے ہمیں اور پھر پولیس کے ساتھ پیش امام کو دیکھا تو اس نے لاتعلقی اور تجاہلِ عارفانہ کا مظاہرہ کرنے میں عافیت دیکھی۔ بابا فقیر کو دنیا کے معاملات سے کیا سروکار۔ وہ آلتی پالتی مار کے اور آنکھیں بند کر کے فرشِ خاک پر بیٹھ گیا۔

اس وقت اچانک مجھے پولیس کے سروس ریوالور کا خیال آیا جو میں نے ڈب میں چھپا رکھا تھا۔ یہ واحد چیز تھی جو میری پوزیشن کو قانونی طور پر خراب کر سکتی تھی۔ ایک ممنوعہ بور والے اور بغیر لائسنس کے ریوالور کا کسی کے پاس سے برآمد ہو جانا اور وہ بھی اتنے چشم دید گواہوں کے سامنے، پولیس کو گرفتاری کا مضبوط جواز فراہم کر دیتا تھا۔ میری ہر بات جھوٹ ہو جاتی۔ تاریخ پر ریسرچ کرنے والے کو اسلحے سے کیا کام۔ جنگل اور ویرانوں میں خود اپنی حفاظت مقصود ہو تو لائسنس ہونا چاہیے اور اسلحہ بھی عام قسم کا۔ پولیس اور فوج کے زیرِ استعمال ریوالور میں نے کہاں سے حاصل کیا؟

ملنگ آنکھیں بند کر کے جھوم رہا تھا اور "حق اللہ" کے نعرے لگا رہا تھا۔ نازو کی اور پیڈرو کی نظریں پولیس پر تھیں۔ میں نے پیڈرو کی آڑ لیتے ہوئے ریوالور نکالا، جھک کے قبر کے غلاف کا ایک کونا اُٹھایا اور ریوالور کو نیچے سرکا کے غلاف برابر کر دیا۔ میری یہ حرکت کسی نے نہیں دیکھی۔ دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ میں کوئی چیز اٹھانے کے لیے جھکا تھا مگر میں فوراً سیدھا نہیں ہوا۔ میں نے شلوار کا پائنچا تھوڑا سا اونچا کر کے جھٹکا۔ یوں جیسے کوئی کیڑا مکوڑا میری پنڈلی پر چڑھ گیا ہے۔ پھر میں نے موزے کو نیچا کیا اور جوتا اُتار کے جھاڑا۔

پیش امام کی آواز پر میں نے سر اٹھا کے دیکھا اور جوتا پہننے لگا۔ "آپ کو ضرور غلط فہمی ہوئی ہے حضرت۔"

"چھوڑیں جی مولوی صاحب۔ ایسی باتیں آپ نہیں سمجھتے" تھانے دار بولا۔

میں نے کہا "خیریت تو ہے نا پیش امام صاحب۔"

"جی حضرت۔ یہ خیر سے اپنا بچّہ ہے۔ اسی گاؤں کے مکتب کا پڑھا ہوا۔ میرے والد مرحوم سے قرآن پڑھتا تھا۔ آج اسی علاقے کا تھانے دار ہے" مولوی صاحب نے بڑے فخر سے بتایا۔

تھانے دار اب میری اور پیڈرو کی صورتوں کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ آنے والے سپاہی تھکے ہوئے اور بیزار سے کھڑے تھے۔

"نہیں کہیں سے اطلاع ملی تھی کہ کچھ مفرور مجرم اِدھر آئے ہیں۔ لوگوں نے بتایا کہ پیش امام صاحب کے گھر میں مہمان ہیں۔ یہ

یہاں پہنچی کیسے لیکن یہاں اظہارِ رائے کسی طرح بھی مناسب نہیں تھا۔ مجھے میری چھٹی حس نے بروقت خطرے سے آگاہ کردیا تھا اور میں نے ریوالور چھپادیا تھا۔ یہ انتہائی مشکل کام تھا اور خطرناک بھی۔ وہ ریوالور پیڈرو کے ہاتھ میں بھی جاسکتا تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ پولیس پارٹی یا ان کے ساتھ آنے والوں میں سے کسی کی نظر میری حرکت کو تاڑ جاتی۔ پیڈرو کی آڑ میں ہونے کی وجہ سے کسی نے کچھ نہیں دیکھا اور جو دیکھا وہ کسی طرح بھی قابلِ اعتراض حرکت نہیں تھی۔

قبر کا مجاور ملنگ ابھی تک دھونی رمانے کے اسٹائل میں آنکھیں بند کیے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ چالیس پینتالیس سال کا ادھیڑ عمر شخص تھا مگر بے فکری، خوش خوراکی اور صحت بخش آب و ہوا میسر ہونے سے وہ جوان لگتا تھا۔ اس کی جوانی بھی محنت مشقت کرتے گزری ہوگی چنانچہ اس کے ہاتھ پاؤں مضبوط تھے۔ درویشی کا روپ بھرنے کے لیے اس نے داڑھی اور سر کے بالوں کو جھاڑ جھنکاڑ کی طرح بڑھنے اور پھیلنے کا موقع دیا تھا۔ منکے مالائیں اور بے لباسی اس سوانگ کا ایک روایتی انداز ہے۔

اس کی پُرفریب شخصیت کا پردہ اس وقت چاک ہوا جب اس نے اچانک آگے بڑھ کر غلاف کے نیچے سے ریوالور نکالنے کی کوشش کی۔ نازو کی نظر سے میری حرکت پوشیدہ نہ تھی اور میری طرح اسے بھی شک تھا کہ درویشی بھی عیاری ہے۔ گاؤں کے سادہ لوح یا خوش عقیدہ لوگ دنیاوی معاملات کی ہیرا پھیری سے زیادہ واقف نہیں ہوتے اور جہالت کے باعث پیروں فقیروں کی پُرفریب شعبدہ گری کو بھی نہیں سمجھ پاتے چنانچہ وہاں دل کی مراد پوری کرانے والے نام نہاد پہنچے ہوئے لوگ انہیں خوب لُوٹتے ہیں اور ایسے جھوٹے مزاروں کی صنعت روز افزوں ترقی پر ہے جہاں منت ماننے اور نذرانے پیش کرکے نامراد لوگ جھوٹے پیروں سے خدا کے حضور اپنی دعا کو سفارش کے ساتھ پہنچاتے ہیں۔ حالانکہ خدا تو سب کی سُنتا ہے اور بلاواسطہ سُنتا ہے۔

صرف نازو کی اس پر نظر تھی۔ میں اور پیڈرو دور جاتے لوگوں کو دیکھ رہے تھے۔ فقیر اچانک چلّایا تو ہم چونک کر پلٹے۔ نازو کا پیر زیادہ تیزی سے حرکت میں آیا تھا اور اس کی ٹھوکر نے فقیر کے ہاتھ کو ریوالور تک پہنچنے سے پہلے ہی جھٹک کر دور کردیا تھا۔ نازو ایک کِک سے کلائی توڑنے پر قادر تھی۔ اس نے احتیاط سے صرف ہاتھ کو نشانہ بنایا تھا۔

فقیر اپنے ہاتھ کو بغل میں دبا کے کراہ رہا تھا۔ "آہ، اوف... ہاتھ توڑ دیا فقیر کا۔ تیرا بیڑا غرق۔"

نازو نے کہا "بابا جی۔ حکم کریں کیا چاہیے آپ کو، یہ چیز...؟"

اس نے قبر پر پڑے ہوئے سبز غلاف کا کونا اٹھا کے ریوالور نکال لیا اور اس کا رُخ فقیر کی طرف کردیا۔

فقیر کی آواز بند ہوگئی۔ وہ ایک دم ساکت ہوگیا اور اس کی ...یں پتھرا کے ریوالور پر جم گئیں۔

"جب اس میں سے گولی نکلتی ہے تو آواز نہیں نکلتی۔" نازو ...اسے مزید خوف زدہ کرنے کے لیے کہا "اور جسے گولی لگے اس ...جان بھی گولی کی طرح نکل جاتی ہے۔ گولی اندر... جان باہر۔"

وہ عجیب سی مضحکہ خیز آواز میں بولا "کیا ملے گا مجھے مار کے ...ہیں... میں نے کیا بگاڑا ہے تمہارا؟"

میں اس کے پاس بیٹھ گیا "بابا جی۔ ہم بھی تمہارا کچھ بگاڑنا ...یں چاہتے۔ چند سوالوں کے جواب چاہتے ہیں۔"

نازو نے ریوالور اپنے بیگ میں ڈال لیا "ہم بلاوجہ لوگوں کو ...ل نہیں کرتے پھرتے۔ خواہ دنیا کو ان کے فریب اور شر سے ...بات دلانے کے لئے ایسا کرنا عین کارِ ثواب ہو۔"

پیڈرو نے کہا "اوئے بابے، یہ کیا ڈراما ہے۔ کس کا مزار ہے ...یہ۔ یہاں تو کوئی مزار نہیں تھا۔ یہ کتبہ کس کے نام کا لگا لیا ہے؟"

میں نے کہا "تمہیں معلوم ہے یہ کس کی قبر ہے؟"

اس نے اقرار میں سرہلایا "میرے پیرو مرشد کرامت بادشاہ کی۔"

میں نے اس کی گردن دبوچ لی "جھوٹ نہیں چلے گا۔ ہمیں ...سب معلوم ہے اس لیے آخری بار سُن لو۔ تم نے سچ نہ بتایا تو ہم تمہیں مار کے اسی جگہ دفن کر جائیں گے۔"

نازو بولی "اور اپنا کوئی بندہ بھی بٹھا جائیں گے۔ زیادہ اچھے گیٹ اپ میں۔ وہ تم سے زیادہ کمائی کرے گا۔ مانا ہوا پیر بن جائے گا۔"

اس نے سرہلایا تو میں نے اس کی گردن چھوڑ دی۔ وہ لمبی لمبی سانسیں لینے لگا "مجھے... مجھے نہیں معلوم۔"

"کیا نہیں معلوم؟"

"کہ یہ قبر کس کی ہے۔" وہ بولا "اس رات میں قبرستان میں سویا ہوا تھا جب یہاں کچھ لوگ آئے اور کسی کو دفن کر گئے۔ میں خود جھنگ سے فرار ہو کے یہاں آیا تھا۔"

"فرار ہو کے کیوں؟"

"وہاں میں ایک خانقاہ میں تھا۔ اس کا مجاور مجھے قتل کرا دیتا۔ میری آنکھ اس کی بیوی سے لڑ گئی تھی۔ اس نے ہمیں دیکھ لیا تھا۔ ایک ساتھ۔"

"تم تو بھاگ آئے۔ اس نے بیوی کو قتل کردیا ہوگا۔"

فقیر نے کہا "ہو سکتا ہے۔"

"تم فراڈ ہی نہیں، بے غیرت اور بزدل بھی ہو" نازو نے کہا۔

میں نے کہا "مزار چلانے کی ٹریننگ تم پہلے ہی لے چکے تھے۔ کتنا عرصہ رہے تھے جھنگ کی خانقاہ پر؟"

"چار سال۔"

"پھر تو اسسٹنٹ پیر بن گئے ہوگے تم" میں نے کہا "یہ خیال تو

"ہاں وہی۔ آپ ہمارے مولوی صاحب کے مہمان ہو۔ لیکن ہماری ڈیوٹی ہے کہ اپنی تسلی کریں" اس نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

"کیوں نہیں۔ اگر ہماری پولیس میں تم جیسے فرض شناس نوجوان ہوں تو حالات نہ بدل جائیں اس ملک کے۔" میں نے کہا۔

وہ خوش ہوگیا "شناختی کاغذات تو ہوں گے آپ کے پاس۔"

"کیوں نہیں۔ میرا ڈپلومیٹک پاسپورٹ ہے۔ اور مس خان کے پاس لیٹر آف اتھارٹی ہے اس علاقے میں کُھدائی کرنے کا۔ آرکیولوجی کے ڈائریکٹر جنرل مسٹر عبدالودود منظر نے خود دیا ہے لیکن، سوٹ کیس میں ہے۔ پیش امام صاحب کے گھر میں..."

پیش امام صاحب نے تائید میں سرہلایا تھا کہ سوٹ کیس واقعی ان کے گھر میں موجود ہے۔ تھانے دار نے غالباً یہ سمجھا کہ وہ دستاویزات موجود ہونے کی تصدیق کر رہے ہیں۔

"چلو جی ٹھیک ہے۔ ایک رسمی سی کارروائی ہے۔ بُرا نہ مانیں تو میں تلاشی لے لوں آپ کی۔"

"ضرور۔ اس میں بُرا ماننے کی کیا بات ہے؟"

پیش امام صاحب نے فوراً کہا "صرف آپ کی حضرت۔"

تھانے دار نے کہا "ہاں جی، صرف آپ دونوں کی۔ لیڈی سرچر نہیں ہے اس لیے یہ ایک طرف ہو جائیں۔"

میں نے کہا "تم چاہو تو اپنے اطمینان کے لیے گاؤں سے کسی عورت کو بُلا لو۔ مس خان کو تلاشی دینے پر اعتراض نہیں ہوگا۔"

پیش امام نے فیصلہ صادر کردیا "اس کی ضرورت نہیں حضرت۔ آپ کی تلاشی لینا بھی مجبوری ہے۔"

تھانے دار کے اشارے پر دونوں سپاہی حرکت میں آئے اور انہوں نے ہماری ہر جیب خالی کردی۔ اس میں سوائے تھوڑی سی رقم کے اور کچھ بھی نہیں تھا جو انہوں نے مولوی صاحب اور اپنے افسر کو دکھا کے بڑی ایمانداری اور احتیاط سے واپس ہماری تحویل میں دے دی۔ اتنے چشم دید گواہ خصوصاً پیش امام صاحب نہ ہوتے تو شاید وہ مالِ غنیمت کو اتنی دور آنے کی زحمت کا معاوضہ سمجھ کے رکھ لیتے۔

"تکلیف معاف" تھانے دار نے مجھ سے ہاتھ ملایا "کیا آپ کسی عورت کو جانتے ہو جو وکیل ہے۔ رابعہ، رابعہ قاری۔"

میں نے سخت حیرت کا اظہار کیا "عجیب سا نام ہے۔ قادری ہوگا۔"

پیش امام بشارت احمد قادری نے بھی کہا "قادری ہو سکتا ہے۔"

"رابعہ قادری کو جانتے ہو؟"

"ہاں۔ میرے کولیگ ہیں۔ انڈیا کے پروفیسر حق نواز قادری۔ ان کی بیٹی ہے۔ بہت پیاری سی مگر پولیو ہوگیا بے چاری کو۔"

"اور... سکندر بخت، مرزا غالب؟"

"مرزا غالب۔ تھانے دا... ان کو تو مرے ہوئے بھی سو سا... ہوگئے۔ بڑے نامور شاعر تھے؟"... پیش امام نے کہا۔

"پتا نہیں جی۔ ہمیں تو یہ نام لکھوائے گئے تھے۔ خیر..." ...نے رخصت ہونے کے لیے مجھ سے مصافحہ کیا اور پھر استاد پیڈ... سے۔ اسی وقت نازو نے ایک حرکت کی۔ اس نے تھانے دار... ہاتھ ملا لیا یوں جیسے وہ عادی ہے۔

میں نے اسے سرزنش کی "مس خان۔ میں کتنی بار بتاؤ... تمہیں کہ ہم پاکستان میں ہیں۔ BE VERY CAREFUL"

مولوی صاحب کی صورت پر عیاں ناپسندیدگی کے جذبات... کم ہوئے مگر تھانے دار مسکراتا ہوا گیا۔ شاید وہ نازو کے ناز... ہاتھوں کے لمس کے احساس سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ کبھی ا... انہی ہاتھوں کی نزاکت میں پنہاں ہلاکت خیز قوت کا مشاہدہ یا تج... کرنے کا موقع ملتا تو اس کی حیرت قابلِ دید ہوتی۔

ممدو کی چیک پوسٹ سے کچھ فاصلے پر شرپسند بچے، تجسس م... جتلا بے کار جوانوں اور قنوطی بوڑھوں کا ایک ٹولا اب بھی موجود... تھا۔ ان سب کو خاصی مایوسی ہوئی۔ وہ کسی سنسنی خیز انکشاف او... ڈرامائی انجام میں ہماری گرفتاری کے منتظر تھے۔ جیسا کہ ہمیں بع... میں ممد اینڈ صمدو نے بتایا۔ پولیس کی آمد نے سب کو ہی قیاس آرا... کا موقع فراہم کردیا تھا لیکن دو فلمی نظریات پر زیادہ اتفاق را... تھا۔ ایک یہ کہ ہم ہیروں کے بین الاقوامی اسمگلر ہیں جو چوری... ہیرے جواہرات اس دور افتادہ مقام پر دفن کرنے آئے تھے یا ... ہمیں یہاں کسی مدفون خزانے کا سراغ ملا تھا اور ہم چوری چور... اسے نکال کرلے جانا چاہتے تھے۔ خزانہ کسی بادشاہ کا بھی ہو سکتا... اور کسی ڈاکوؤں کے گروہ کا بھی۔

جب یہ ہنگامہ فرو ہوا اور ہمارا تماشا بنانے والوں سے ... والوں تک سب ہی چلے گئے تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا جس... ہماری عزت رکھ لی۔ اس گاؤں کے تھانے دار کو بہت کم تفصیلا... فراہم کی گئی تھیں اور وہ ہمارے کارناموں سے بھی ناواقف تھا... پیش امام صاحب کا مہمان ہونے سے ہم معتبر بھی ہوگئے تھے او... پولیس والوں کی نظر نے بھی ہمیں شک کی اس نظر سے نہیں دیکھ... جس سے ان کو ساری دنیا مجرم نظر آتی ہے۔ اگر ہم چوری چھپے ا... گاؤں سے اور کہیں قیام کرتے اور پُراسرار انداز میں قبرستان م... مصروفِ کار نظر آتے تو صورتِ حال یقیناً بہت مختلف ہوتی۔ ... معاملہ سرسری تفتیش سے ختم نہ ہوتا اور ہمیں تھانے ضرور جا... پڑتا یا جان چُھڑانے کے لیے دس بیس ہزار قربان کرنا پڑتا۔ اس کے... باوجود ہم اپنا کام اطمینان سے نہ کرپاتے لیکن ہم شرفا کی طر... آئے تھے۔ ہم نے اپنے شریفانہ عزائم کو پوشیدہ نہیں رکھا تھا او... ہماری خوش قسمتی تھی جس نے پیش امام کو ہمارا میزبان بنا کے بھیج... دیا تھا۔

حیرانی اس بات پر مجھے بھی تھی اور سب کو ہوگی کہ پولیس

آتا ہوگا تمہارے دل میں کہ مجاور کو قتل کردو تو دونوں چیزیں تمہاری ہوسکتی ہیں' مزار بھی اور وہ بھی۔"

وہ خاموش رہا اور کچھ دیر بعد بولا "وہ اس گاؤں کے لوگ نہیں تھے' شہری لوگ تھے۔ میں نے ان کا حلیہ دیکھ لیا تھا۔"

"انہیں پھر دیکھو گے تو پہچان لوگے؟" یہ سوال پیڈرو نے کیا۔

"نہیں۔ اندھیرا تھا اور میں بہت دور تھا" وہ بولا۔

میں نے کہا "ان کے جاتے ہی تمہیں یہاں مزار بنانے کی سوجھی؟"

"ہاں۔ گاؤں کے لوگ ہر جگہ ایک سے ہوتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی چالاکیوں کو کرامات سمجھ لیتے ہیں۔" وہ بولا "میں نے راتوں رات وہاں ایک قبر بنادی۔ جو لوگ یہاں کسی کو دفن کرگئے تھے انہوں نے مٹی کا ڈھیر برابر کردیا تھا۔ میں نے اس کو اونچا کرکے چاروں طرف اینٹوں کا احاطہ سا بنایا۔ اس کے لیے اینٹیں میں نے قبرستان کے اندر سے ہی جمع کی تھیں۔ قبر کو میں نے گارے سے لیپ پوت کے برابر کیا اور اگلے دن صبح صبح شہر سے یہ غلاف بنوا کے لایا اور باقی ضروری چیزیں۔"

نازو نے دلچسپی سے پوچھا "مثلاً؟"

اس نے ضروری چیزوں کی تفصیل بتائی "ایک تو یہ ریشمی غلاف۔ اس کا رنگ اب ہلکا پڑگیا ہے' نیا تھا تو لشکارے مارتا تھا۔ یہ جھنڈے اور کچھ خاص لباس۔ پیروں کی کرامات کی شہرت ہو تو بزنس چلتا ہے۔"

"تم جیسے لوگوں کو گولی ماردینی چاہیے جنہوں نے لوگوں کو گمراہی میں مبتلا کردیا ہے اور اصل دین سے دور کرکے اپنا اُلو سیدھا کررہے ہیں۔" نازو بولی۔

"اپنا اُلو سب سیدھا کررہے ہیں۔ کیا بزنس مین اور کیا سیاست داں' فراڈ کس پیشے میں نہیں ہے' حلال کی جائز آمدنی کس کی ہے؟"

میں نے کہا "لیکچر مت دو۔ یہ بتاؤ کہ تم نے کیا چکر چلایا تھا؟"

اس نے بتایا کہ ایک رات وہ سرتاپا کفن جیسا سفید لباس پہن کے لمبی سفید داڑھی لگا کے قبرستان کے اس گوشے میں دیوار پر کھڑا ہوگیا۔ اس نے اپنی ٹانگ سے ایک ٹارچ باندھ لی تھی۔ اس کا رُخ اوپر کی طرف تھا۔ ٹارچ روشن ہونے سے سفید لباس کے اندر سے روشنی پھوٹنے لگی اور جو لوگ ادھر سے گزرے انہوں نے تاریکی میں ایک نورانی ہیولے کو دیکھا۔ اس کے ہاتھ ہوا میں بلند ہوتے تھے اور وہ کہتا تھا "بری امامؒ کے غلام کا تم پر سلام۔"

صبح تک یہ بات گاؤں میں پھیل گئی۔ نورانی ہیولے کو دیکھنے والوں میں دو نوجوان تھے۔ ان کو ناقابلِ اعتبار سمجھا جاسکتا تھا مگر ایک ٹیچر نے اور گاؤں کی ایک عورت نے بھی گواہی دی کہ یہ سچ ہے۔ لوگ قبرستان کی طرف گئے تو قبر کو دیکھ کر حیران رہ گئے جس پر سفید گوٹے والا سبز غلام پڑا ہوا تھا اور سرہانے کتبے پر لکھا ہوا تھا "بری امامؒ کا غلام۔ بندۂ بے دام۔ سیّد کرامت بادشاہ" اس پر پچاس سال پہلے کی تاریخِ وفات درج تھی اور کتبہ بھی بہت پُرانا تھا۔ سارا دن گاؤں میں اُس بات کا چرچا رہا۔ ایک نورانی ہیولا دیکھنے والوں نے سنا تھا کہ وہ خود کو بری امامؒ کا غلام کہہ رہا تھا۔ قبر پر جانے والوں کو عجیب سی سحر آفریں خوشبو کی لپٹیں بھی محسوس ہوئیں۔ یہ خوشبو قبر کی مٹی سے اٹھ رہی تھی۔ دو تین دن بعد ایک نیا تماشا ہوا۔ کچھ لوگوں نے اسی نورانی ہیولے کو فضا میں معلق دیکھا۔ وہ پیپل کے پیڑ کے نیچے ہوا میں زمین سے آٹھ دس فٹ اوپر کھڑا ہوا تھا۔ اس کا لباس وہی کفن جیسا تھا۔ بے داغ سفید اور اس میں سے روشنی نکل رہی تھی۔ یہ کرامت دکھانے کے لیے اس نے کالے رنگ کی رسّی استعمال کی تھی جو رات کے اندھیرے میں نظر نہیں آسکتی تھی۔ رسی اس کے بغل سے گزار کے درخت کی شاخ میں باندھ دی تھی۔ ایسے لٹکنا آسان کام نہیں تھا مگر وہ بہ آواز بلند تلاوت کرتا رہا اور وہاں سے گزرنے والوں کو ہاتھ ہلاہلا کے وہی بات کہتا رہا "بری امامؒ کے غلام کا تم سب پر سلام" اس کے دونوں ہاتھ ہوا میں ایسے لہراتے تھے کہ لگتا تھا وہ پرواز کررہا ہے۔ کالی رسّی اس کی بغل کے نیچے تھی اور کمر کی طرف سے درخت کے ساتھ بندھی ہوئی تھی۔ رسّی کسی نے بھی نہیں دیکھی اور خوف زدہ لوگ دور ہی سے یہ کرشمہ دیکھ کے گاؤں کی طرف دوڑے تاکہ دوسروں کو بھی ساتھ لاکے یہ نظارہ دکھائیں۔ رات کے وقت ادھر آنے کی ہمت بہت کم لوگوں نے کی۔ پیش امام صاحب کا ان باتوں پر اعتقاد نہیں تھا۔ وہ چند عمر رسیدہ افراد کے ساتھ لالٹین لے کر قبرستان کی طرف گئے۔ نورانی ہیولا انہیں دور سے ہی فضا میں معلق نظر آگیا۔ آدھے تو دور ہی سے لوٹ گئے۔ دو چار آگے بڑھے تو اچانک وہ روشنی غائب ہوگئی۔ اس چالاک شخص نے کفن کے اندر جلنے والی ٹارچ لائٹس بجھادی تھیں اور لوگوں کو قریب آتا دیکھ کے رسّی کے سہارے درخت پر چڑھ گیا تھا۔ اوپر پہنچ کے اس نے رسّی کھولی اور اپنا کفن اُتار کے زیادہ بلندی پر گھنے درخت کی شاخوں اور پتّوں میں روپوش ہوگیا۔ پیش امام صاحب نے درخت کے نیچے جاکے لالٹین کی روشنی میں ہر طرف دیکھا مگر وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ ایک روشن ہیولے کے وجود کو سب کے ساتھ انہوں نے بھی دیکھا تھا۔ اس کی آواز بھی سنی تھی۔ وہ واقعی ہوا میں کھڑا ہوا تھا اور اچانک غائب ہوگیا تھا۔ نہ وہ کسی کو قائل کرسکے اور نہ کسی نے ان کی مانی۔ اس علاقے کے لوگوں کا بری امامؒ پر بہت اعتقاد ہے اور ان کا سالانہ عرس بڑی دھوم دھام سے نور پور شاہاں میں ان کے مزار پر ہوتا ہے۔ اس میں تقسیم ہند سے قبل بھی لوگ ہزاروں میل کا سفر طے کرکے آتے تھے اور آج بھی یہ جگہ مرجع خلائق ہے۔ ان کے غلام سیّد کرامت بادشاہ کا نام کیسے نہ چلتا۔ اس واقعے کی شہرت گردو نواح کے دیہات تک ہوگئی۔ لوگ اگلی رات سے وہاں دیئے روشن کرنے لگے اور مر...

فقیر سمجھ چکا تھا کہ سچ بتائے بنا چارہ نہیں۔ اتنے عرصے بعد مزار کی اصل حقیقت جاننے والے اس کی شامتِ اعمال بن کے آپہنچے تھے اور اسے دونوں طرف سے خطرہ لاحق تھا۔ ایک طرف ہمارا رویّہ جارحانہ تھا تو دوسری طرف اس کو جعلسازی کا بھانڈا پھوٹنے کے بعد عقیدت مندوں سے اندیشہ تھا کہ جوتے مار مار کے وہ اس سے سارے نذرانے وصول کرلیں گے' کاروبار تو خیر گیا بھاڑ میں۔ اسے جان کے لالے پڑگئے تھے۔

اس نے اعترافِ جرم کے بعد پوچھا "یہاں آپ کے کوئی عزیز دفن تھے؟"

میں نے کہا "ہاں۔ اور وہ کوئی پیر فقیر نہیں تھے۔ عام آدمی تھے۔"

وہ ڈر کے خوشامد پر اُتر آیا "دیکھو جی' میں نے کوئی بے حرمتی والی بات نہیں کی۔ میں نے تو ان کی قبر کو عزت دی۔"

میں نے اس کے اُلٹا جھانپڑ مارا "قبر کو عزت دینے والا ٹھیکے دار تجھے کس نے بنادیا۔ دنیا میں ان کی عزت تھی اپنے کردار سے اور آخرت میں کام آئیں گے ان کے اعمال۔ جو کچھ تو یہاں کررہا تھا یہ ان کی روح کے لیے باعثِ آزار ہوگا۔"

وہ ہاتھ جوڑنے لگا۔ "مجھے معاف کردو۔ میں یہاں سے چلا جاتا ہوں۔"

میں نے کہا "ایسے تو ہم نہیں جانے دیں گے تجھے۔ ہم اپنا جرم معاف کرسکتے ہیں۔ جو تو نے اس گاؤں کے لوگوں کے ساتھ کیا' اس کی معافی انہی سے مانگنا۔"

"وہ بہت ماریں گے مجھے۔ منہ کالا کرکے گدھے پر بٹھائیں گے۔"

"مال بھی بہت کھلایا تھا انہوں نے۔ جس کے مقدر میں روسیاہی ہو اسے کون بچاسکتا ہے۔"

نازو نے کہا "تمہیں چھوڑدیا تو تم کہیں اور جاکے یہی فراڈ کروگے۔"

وہ کان پکڑ کے بولا "میری توبہ جی۔ آئندہ یہ کام نہیں کروں گا۔"

میں اس کی منت سماجت' رونے دھونے یا قسموں وعدوں سے متاثر ہونے والا نہیں تھا۔ میں چاہتا تھا کہ سارے گاؤں والوں کو یہاں جمع کرلوں۔ پیش امام سے کہوں کہ وہ سارے چشم دید گواہوں کو ضرور لائے جنہوں نے قبرستان میں ایک کفن پوش روشن ہیولا دیکھا تھا جو ہوا میں کھڑا تھا۔ مجاور بن کے بیٹھنے والا خود ان کو اپنی شعبدہ بازی کا کچا چٹھا سنائے اور گاؤں کے لوگوں کی آنکھوں پر بندھی ہوئی عقیدت کے اندھے جذبات کی پٹی اُتر جائے تو انہیں اس شخص کا اصل روپ نظر آئے جس نے بری امامؒ جیسی برگزیدہ شخصیت کے نام کو اپنے مذموم کاروباری مقاصد کے لیے استعمال کیا تھا۔

مانگنے کے لیے آنے لگے۔ مجاور بن کے بیٹھنے والا جمعرات کی شام کو گاؤں میں نمودار ہوا۔ اسی حلیئے میں جواب نظر آرہا تھا۔ وہ گاؤں کی گلیوں میں لوگوں سے پوچھتا رہا "اوئے کسی نے میرے کرامت بادشاہ کو دیکھا ہے۔ بری امامؒ صاحب نے کہا ہے کہ وہ سید پور میں ہیں" ظاہر ہے جن لوگوں نے اس کی شعبدہ گری کا تماشا دیکھا تھا وہ پہلے ہی عقیدت کے جذبات سے مغلوب تھے۔ ایک فقیر جب نعرۂ مستانہ لگاتا ہوا قبرستان کی طرف گیا تو وہ اس کے پیچھے ہولیے۔ فقیر نے قبرستان کے اس گوشے میں پہنچتے ہی دیوانہ وار رقص کرتے ہوئے کہا "مل گیا۔ میرا کرامت بادشاہ مجھے مل گیا۔ میں آگیا کرامت بادشاہ۔ بری امام کے غلام کا غلام آگیا۔"

بعد میں اس نے مشہور کیا کہ سیّد کرامت بادشاہ کو بری امام صاحبؒ کے خاص مریدوں کا درجہ حاصل تھا اور وہ ان کے حکم پر بنگال چلے گئے تھے۔ ان کا وصال کلکتہ میں ہوا تھا اور آج بھی وہاں ان کے ہزاروں عقیدت مند ہیں لیکن بدبخت اور بدکردار ہندو نے مزار شریف کے ساتھ کالی کا مندر بنانے کا قصد کیا تو بری امامؒ نے ان کو کفر و شرک کی نجاست سے دور اس مقام کی جانب کوچ کرنے کا حکم دیا جو اسلام کے نام پر آباد کیا گیا تھا۔ سیّد کرامت بادشاہ اپنے مرقد کے ساتھ پرواز کرکے یہاں تشریف لے آئے۔ یہ سید پور والوں کی خوش قسمتی ہے۔ وہ اپنے پیرو مرشد بری امامؒ کے زیادہ سے زیادہ قریب ہونا چاہتے تھے لیکن حدِ ادب کے باعث نور پور شاہاں کو اپنا مسکن نہیں بناسکتے تھے۔ کلکتہ والے ان کے مزار کو نور بادشاہ کی درگاہ کہتے تھے لیکن ان کی بدقسمتی نے انہیں اتنے پہنچے ہوئے بزرگ کے سایۂ رحمت سے محروم کردیا۔ یہ باتیں بہت جلد مشہور ہوگئیں اور لوگوں کی اکثریت نے ان پر آنکھ بند کرکے یقین بھی کرلیا۔ تحقیق کون کرتا کہ تاریخی اعتبار سے یہ کس حد تک درست ہے۔ کلکتہ اس وقت ہندوستان کا سب سے بڑا شہر تھا۔ وہاں جاکے تصدیق کون کرتا کہ نور بادشاہ کی درگاہ کہیں تھی یا نہیں تھی۔ پیش امام صاحب کے سمجھانے کا بھی جاہل لوگوں پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ آہستہ آہستہ مزار پر آنے والوں کی تعداد بڑھ رہی تھی۔ مجاور کبھی کبھی کوئی شعبدہ گری کا کمال بھی دکھادیتا تھا اور بہت جلد مزار کی تعمیر کا آغاز کرنے والا تھا تاکہ عرس مبارک دھوم دھام سے ہو۔

اس کی روداد میں کوئی بات انوکھی اور چونکا دینے والی نہیں تھی۔ خدا رسیدہ بزرگانِ دین کبھی نام و نمود اور کثافتِ دنیاوی میں ملوث نہیں ہوتے اور نہ انہوں نے کبھی مریدانِ باصفا سے بالواسطہ طور پر بھی یہ چاہا کہ بعد از مرگ وہ ان کے مزار کو دنیاوی خواہشات کی تکمیل کا وسیلہ اور کاروبار بنالیں۔ شاید انہیں علم ہوتا کہ مرید ایسا کریں گے تو وہ سختی سے انہیں منع بھی کرجاتے مگر اب ہر گاؤں اور شہر میں جعلی پیر اسی طرح روحانی مسائل کا علاج کررہے ہیں جیسے جعلی ڈاکٹر جسمانی امراض کا۔ ذہنی و جسمانی روگ میں مبتلا مایوس اور بے خبر آدمی آسانی سے ان کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔

مشکل یہ تھی کہ اس کے بعد خود میں اپنی پوزیشن کی وضاحت کیسے کروں گا۔ میں نے پیش امام سے کچھ اور کہا تھا۔ یہ وہ پڑھا لکھا آدمی تھا۔ اگر میں نے اعتراف کرلیا اور معافی بھی مانگ لی کہ ضرورت اور مصلحت کے تحت میں نے اس سے جھوٹ بولا تھا تو بچ جان کے بھی اسے خوشی نہیں ہوگی اور وہ ایسے بات ختم نہیں کرے گا کہ اچھا بھئی' سب ایک دوسرے کا کہا سُنا معاف کرو اور جاؤ اپنے اپنے راستے۔ گاؤں والے اپنے گھر جائیں۔ تم اپنا راستہ پکڑو...مجاور صاحب اور آپ لوگ جو یہاں تاریخ پر تحقیق کرنے آئے تھے۔ اپنے والد مرحوم کی ہڈیاں لے کر لوٹ جائیں اپنی دنیا میں۔ یہ پولیس کیس تھا۔ پیش امام کسی معاملے میں ملوث نہ ہوتا۔ وہ کہتا کہ جب پولیس آجائے تو آپ اس جعلی پیر کو ان کے حوالے کریں اور پھر قانون کے مطابق اجازت حاصل کرکے قبر کھودیں۔ پوسٹ مارٹم کرائیں اور مجرم کے ساتھ جو کچھ ہو قانون کے مطابق ہو۔ مجرم کون ہے' یہ فیصلہ کرنا بھی قانون کا کام ہے۔

خود پیش امام یا گاؤں والے ہمیں ہرگز اجازت نہ دیتے کہ ہم قانون کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے جو چاہیں کریں۔

میں نے نازو سے مشورہ کیا تو اس کی رائے بھی میری رائے سے مختلف نہیں تھی۔ "ہمیں اپنے کام سے کام رکھنا چاہیے۔"

"یعنی اس خبیث کو ایسے ہی چھوڑدیں۔"

"اور کیا کرسکتے ہیں ہم۔ نہ ایسے لوگ ختم ہوں گے اور نہ ان کے دھندے۔" نازو نے کہا "جب تک بے وقوف زندہ ہیں ایسے عقلمند انہیں لُوٹتے رہیں گے۔"

"پھر کیا کریں' اس سے کہیں کہ دفع ہوجائے؟"

"اس سے بہتر ہے کہ بطور سزا... اسی سے قبر کُھدوالو۔ یہ یہاں کے راستوں سے واقف ہوگا۔ اس سے کہو کہ بوری شہر جانے والے راستے پر پہنچادے' اس کے بعد جہاں چاہے جائے۔ واپس آکے اپنی دکان پھر جمالے یا خالی قبر میں خود دفن ہوکے کسی اور کو مجاور بنادے' ہمیں کیا؟"

پیڈرو نے کہا "اگر اس معاملے میں پولیس آگئی تو اس جعلی پیر سے زیادہ تم پھنس جاؤ گے سکندر بخت۔ خود غور کرو کہ تمہاری اپنی پوزیشن کیا ہے۔"

میں دشمنی ہونے کے باوجود اس کی رائے کو مسترد نہ کرسکا۔ بے شک میں نے جعلسازی سے دنیا کو لوٹا نہیں تھا مگر قانون کی نظر میں ایک جعلی پیر کا حُلیہ بنانے والا اور ایک جعلی فرنچ وکیل کے جرم کی نوعیت برابر تھی۔ دوسرے معاملات میں بھی جعلی پیر کے جرائم کی نوعیت اتنی سنگین نہیں تھی جتنی مجھ پر پہلے سے قائم مقدمات کی۔ اگر اس پیر کو پتا چل جاتا کہ میں ہی سکندر بخت ہوں جس کے خلاف میر شرافت کے قتل کا پُرانا مقدمہ ہنوز تصفیہ طلب ہے کیونکہ میں ضمانت پر رہائی کے بعد بھاگ گیا تھا اور پولیس کے ریکارڈ میں آج بھی میرا نام مفرور مجرمان کی فہرست میں شامل ہے۔

تو اُلٹا وہ مجھے بلیک میل کرتا۔

وہ بڑی التجا بھری اور پُرامید نظروں سے فیصلے کا انتظار کررہا تھا۔ میں نے اس کے قریب جاکے کہا "پیری فقیری کے علاوہ تم کیا کرسکتے ہو؟"

"میں.....میں سب کچھ کرسکتا ہوں جی۔ بس آئندہ یہ کام نہیں کروں گا۔ خلقِ خدا کو اور خدا کو دھوکا نہیں دوں گا۔"

"اسی لیے پوچھ رہا ہوں کہ ہم تمہیں ایک شرط پر یہاں سے جانے دیں گے۔ تم حلف اُٹھاؤ گے کہ دوبارہ یہ دھندا کبھی نہیں کروگے ایک بار نہیں جی۔ دس بار حلف اُٹھانے کو تیار ہوں۔"

حلف تو ایک بار بھی بہت ہوتا ہے۔ عام آدمی قسم توڑنے کا کفارہ اسی دنیا میں ادا کرکے عہد شکنی کی زیادہ سخت سزا سے بچتا ہے جو اسے دوسری دنیا میں ملے گی۔ حلف اٹھانے کے بعد وہ خدا سے وعدہ شکنی کا تصور ہی نہیں کرسکتا مگر جھوٹے لوگ وہی ہوتے ہیں جو دس بار حلف اُٹھانے کا حوصلہ رکھتے ہیں کیونکہ وہ بندوں سے جھوٹ بولنے کو بھی اتنا ہی آسان سمجھتے ہیں جتنا خدا سے جھوٹ بولنا۔

دس بار حلف اٹھانے کی بات جعلی پیر نے جذباتی ہوکے کہہ دی تھی۔ میری بات اس کے لیے معافی کے اعلان اور اس خوش خبری کے مترادف تھی کہ ہم نے اسے کوئی سزا نہ دینے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ مجھے اس جھوٹے اور لعنتی شخص کو سزا دیے بغیر چھوڑدینے کا ملال تھا۔ وہ لوگوں کے جذبات کا استحصال کرتا تھا' ان کی زندگی کی مایوسیوں اور ناکامیوں' حسرتوں اور امیدوں کے بدلے انہیں ایک پُرفریب دعا کے ذریعے یہ گارنٹی فراہم کرتا تھا کہ اب ان کے سارے دکھ خوشی میں بدل جائیں گے۔ سب ناکامیوں کے بدلے کامیابی حاصل ہوگی۔ ہر خواہش پوری ہوجائے گی اور جائز ہویا ناجائز۔ خدا ان کی ہر تمنا پوری کردے گا۔ ان کے ہر خواب کو تعبیر مل جائے گی خواہ اس کا تعلق زر' زمین یا زن کی ہوس سے ہو یا نفرت' خونریزی اور شیطانی جذبات کی بالادستی سے۔ اس گارنٹی کے معاوضے میں وہ غریب آدمی کا تمام عمر کا اندوختہ بھی لے سکتا تھا۔ اس کی حق حلال کی ساری کمائی بھی مانگ سکتا تھا اور کسی مجبور عورت کا سرمایۂ حیات اس کی عزت بھی لوٹ سکتا تھا لیکن تقدیر نے ہر انسان کو دکھ اور غم دیے ہیں تو اس کا درماں اور مداوا بھی فراہم کیا ہے۔ دوا کے ساتھ دُعا پر بھروسا کرنے کے لیے عقل کی راہنمائی بھی عطا کی ہے مگر بدبخت انسان خود ہی نادانی اور جہالت کے اندھیرے غار میں بھٹکنا چاہے تو اس کو تباہی سے کون بچاسکتا ہے۔

"چار سال تم نے جھنگ کی کسی خانقاہ میں بسر کیے۔ سال بھر یہاں ہونے کو آیا' اس سے پہلے تم کیا کرتے تھے؟"

"میں نے بہت پاپڑ بیلے تھے جی۔" وہ افسردگی سے بولا "باپ کا چھوڑا ہوا تانگا چلاتا تھا۔ تانگے کی ٹکر ایک ڈپٹی کمشنر کی گاڑی سے ہوگئی۔ ساری غلطی اس کے ڈرائیور کی تھی مگر اس کی خوبصورت اور قیمتی گاڑی کا بہت نقصان ہوا تھا۔ پولیس نے مجھے

پندرہ دن گزارے۔ بس وہیں سے میری لائن غلط ہوگئی۔ ایک کانسٹیبل میرے گاؤں کا نکل آیا اور اس نے مجھے بہت سے کام سکھادیے۔ میں ٹکٹوں کی بلیک کرتا تھا۔ ٹکٹ خود کانسٹیبل خریدتا تھا اور میں یہ ٹکٹ آخری وقت میں آنے والے مسافروں کو زیادہ قیمت پر بیچ دیتا تھا۔ ایسے مسافروں کو تاڑنا ہی اصل کام تھا۔ ضرورت مند منہ مانگی قیمت ادا کردیتے تھے۔ میں وہاں واشنگ لائن سے برتھ پکڑلیتا تھا اور پچاس روپے کھرے ہوجاتے تھے۔ یہ کام سب کی ملی بھگت سے ہوتا تھا جن میں ریلوے کے بکنگ کلرک سے لے کر افسران تک سب شامل تھے۔ اگر میں سو کماتا تھا تو مجھے صرف پچیس ہی ملتے تھے۔ باقی اوپر تک سب میں تقسیم ہوجاتے تھے۔ بڑے افسروں کو ماہانہ رقم پہنچ جاتی تھی پھر وہ پبلک کی یا پریس کی آواز کیوں سُنتے۔ وہ اپنے کمروں سے ہی باہر نہیں آتے تھے۔ ہاں کبھی کبھی اپنی کارکردگی دکھانے کے لیے چھاپا مارتے تھے تو ہمیں پہلے سے خبر ہوجاتی تھی۔ دکھانے کے لیے دوچار قلی پکڑے بھی جاتے تھے یا بکنگ کلرک معطل ہوجاتے تھے لیکن بعد میں سب ٹھیک ہوجاتا تھا۔ میرا گزارا ہورہا تھا مگر کانسٹیبل نے مجھے نئی راہ دکھائی۔ اس نے مجھے بتایا کہ رات کو اس کی ٹرین میں ڈیوٹی ہو تو اسے کیا کچھ مل جاتا ہے۔ وہ بے ٹکٹ مسافروں سے کچھ وصول کرلیتا تھا۔ کچھ مسافروں سے پیسے لے کر ان کو گاڑی میں سوار کرادیتا تھا۔ اسے تلاشی کے بہانے چیزیں غائب کرنا آتا تھا اور وہ بے خبر سونے والے مسافروں کی کوئی قیمتی چیز بھی اُٹھالاتا تھا۔ اس نے کہا کہ میرے ساتھ چلو اور دیکھو' کام مشکل نہیں۔ تھوڑی سی ذہانت ہونی چاہیے۔ پھر وارے نیارے۔ اس کے پاس دو سرکاری وردیاں تھیں۔ ایک میں نے پہن لی اور ہم مل کے کام کرنے لگے۔ یہ تو ناممکن تھا کہ ہم کبھی پکڑے نہ جاتے۔ ایک رات کسی مسافر نے اسے پکڑلیا اور اگلے اسٹیشن پر پولیس کے حوالے کردیا۔ ریلوے کی پولیس' ریلوے کا چور' انہوں نے اپنے آدمی کو بچانے کے لیے مجھے پھنسادیا۔ میرے اس گرائیں نے الزام لگادیا کہ میں نے اس کی وردی چُرا کے پہنی اور میں اس کی شرافت سے ناجائز فائدہ اٹھا کے یہ کام کررہا تھا۔ پکڑا وہ گیا تھا۔ سزا مجھے ہوجاتی۔ ریلوے مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا گیا۔ میرا تو وکیل بھی کوئی نہیں تھا۔ پہلی پیشی کے بعد میں نے اپنے اس گرائیں کو بُلایا اور اس سے کہا کہ میری وجہ سے اس کی کمائی دُگنی ہوگئی تھی۔ سارا مال بھی اس نے ہضم کرلیا اور اپنا جرم میرے سرمنڈھ دیا۔ اب اتنا لحاظ تو کرے کہ میرے فرار کا کوئی راستہ نکالے۔ بعد کی ذمے داریاں میری۔ ورنہ مجھے چھ ماہ کی جیل ہونی لازمی ہے۔ اس کو کچھ شرم آئی یا یہ خیال آیا کہ کہیں میں مجسٹریٹ کے سامنے سچ نہ بک دوں۔ یہ نہ بتادوں کہ مجھے یہ راستہ دکھانے والا وہی تھا۔ اس نے مجھے پیشی پر لے جانے والوں سے کہا کہ یہ اپنا بندہ ہے اور شریف آدمی ہے اس کا خیال کیا کرو۔ خیال کرنے کا مطلب ہوتا ہے تھوڑی سی

پکڑلیا اور کہا کہ مرمت پر پانچ ہزار کا خرچہ ہوگا۔ میں پانچ ہزار کہاں سے لاتا۔ میں نے ان کی منت سماجت کی کہ مجھے صاحب سے یا بیگم صاحبہ سے ملوادو۔ میں ان کے پاؤں پڑکے معافی مانگ لوں گا۔ رحم کی بھیک مانگ لوں گا لیکن پولیس والے اپنے چکر میں تھے۔ انہوں نے مجھے بہت مارا اور ڈی سی سے نہیں ملنے دیا۔ مجھے یقین ہے کہ اتنا بڑا افسر اتنا بے رحم نہیں ہوسکتا کہ کسی غریب سے اس کی روزی بھی چھین لے اور اسے جیل بھی کراوے۔ اس کو خدا نے سب کچھ دیا تھا۔ وہ ضلع کا حاکم تھا۔ اپنی جیب سے ایک پیسہ خرچ کیے بغیر جہاں سے چاہتا اپنی گاڑی ٹھیک کرالیتا سرکاری خرچ پر وہ سب کچھ کرسکتا تھا۔ میں اسے بتاتا کہ غلطی میری نہیں تھی' اس کے باوجود میں ہاتھ جوڑتا ہوں۔ وہ میرا تانگا گھوڑا مجھے واپس دلوادیتا لیکن پولیس کو ڈی سی صاحب کے ڈرائیور نے کہا کہ ایسا نہ ہو یہ مجھے نوکری سے نکلوادے۔ پولیس نے مجھ پر شراب کے نشے میں تانگا چلانے کا کیس بنادیا۔ یہ لکھ دیا کہ میں رانگ سائیڈ پر تھا اور مجسٹریٹ نے مجھے تین مہینے کے لیے جیل بھیج دیا۔ تین کے بجائے میں چھ مہینے میں باہر آیا تو نہ تانگا تھا نہ گھوڑا۔ میں نے لاہور کے اسٹیشن پر قلی بننا چاہا تو ٹھیکے دار بیچ میں آگیا۔ اس نے پانچ سو پہلے مانگے اور پھر مہینے کے سو روپے۔ میں نے ٹرین میں مسافروں کو مکھن ڈبل روٹی بیچنے کی کوشش کی تو ڈائننگ کار والے اور اسٹیشن پر کھانے پینے کی چیزوں کے ٹھیکے داروں نے مجھے پکڑلیا کہ ہمارا دھندا خراب کرتا ہے۔ پشاور سے کراچی تک کہیں تُونے ڈبل روٹی یا مکھن دیکھا ہے کسی اسٹال پر یا کسی وینڈر کے پاس۔ انہوں نے مجھے چور بنا کے ریلوے پولیس کے حوالے کردیا اور وہاں میں نے

آزادی دینا۔ کینٹین میں چائے پینے کی اجازت یا کھانا منگوانے کی اجازت۔ کسی سے ملاقات کی اجازت اور لیٹرین جانے کی اجازت۔ ملاقاتی میرا کون تھا۔ میں لیٹرین جانے کے بہانے فرار ہوگیا۔ کینٹین اور لیٹرین میں وہ میری ہتھکڑی کھول دیتے تھے۔ لیٹرین کے اندر مجھے پرانے فلش ٹینک کا لوہے کا پائپ اکھاڑنے کا موقع مل گیا۔ جب میں باہر نکلا تو مجھے ساتھ لے جانے والے دونوں کانسٹیبل آرام سے کھڑے سگریٹ پی رہے تھے۔ میں نے پائپ ان کے سر پر مارا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ بھاگنا آسان نہیں تھا مگر میں کسی نہ کسی طرح نکل گیا۔ پتا نہیں وہ کون سی ٹرین تھی اور کہاں جارہی تھی۔ آدھی رات کے وقت میں اُتر گیا اور پھر بھاگا تو سیدھا اسی خانقاہ میں پہنچ گیا جہاں میں نے چار سال گزارے۔ مجاور کو میں نے سب بتادیا اور اس نے مجھے تسلی دی کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ تو سیانا بندہ لگتا ہے مجھے۔ یہاں شرافت سے رہے گا تو عیش کرے گا۔ میں اس کا مددگار بن گیا اور خانقاہ کی آمدنی دن دونی رات چوگنی ہونے لگی۔ میں نے خانقاہ پر آنے والی ایک لڑکی سے شادی بھی کرلی۔ اس کے بھائی کا خیال تھا کہ لڑکی پر جن آتے ہیں۔ لڑکی بہت خوب صورت تھی بس اس کو ہسٹریا کے دورے پڑتے تھے۔ اس کی عمر زیادہ ہوگئی تھی۔ ماں باپ مرگئے۔ بھائی نے خود شادی کرلی، بہن کی شادی کے لیے اس کے پاس پیسے نہیں تھے۔ ایک لڑکا اسے پسند کرتا تھا اور کسی خرچ کے بغیر اس سے نکاح پڑھوانے پر تیار تھا مگر بھائی نے اسے محبت کرنے کی سزا دی اور لڑکے کو دھمکی دی کہ وہ باز نہ آیا تو اسے قتل کرادیا جائے گا۔ وہ ڈر کے پیچھے ہٹ گیا حالانکہ قتل کرانا بھائی کے بس کی بات نہ تھی۔ بھائی اپنی بیوی کے ساتھ ایک کمرے کے مکان میں رہتا تھا اور اتنا بے غیرت تھا کہ بہن کی موجودگی کا بھی خیال نہیں کرتا تھا۔ بہن کے جذبات کو ازدواجی زندگی کے مناظر نے بھڑکادیا لیکن اس کے لیے تسکین کے ذرائع نہ تھے۔ اس پر ہسٹریا کے دورے پڑنے لگے۔ شادی کے بعد وہ ٹھیک ہوگئی اور ہم اپنے گھر میں بہت خوش تھے۔ گھر بھی خانقاہ کے احاطے میں ہی ایک کمرے پر مشتمل تھا۔ کچھ دن بعد مجاور کی نیت خراب ہوگئی۔ سچی بات یہ ہے کہ میری بیوی خانقاہ میں ہونے والی ساری بدمعاشی دیکھتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ میں اور مجاور کس طرح لوگوں کو بے وقوف بنا کے لوٹتے ہیں۔ خیر اس سے بھی فرق نہ پڑتا مگر اسے یہ بھی پتا چل گیا تھا کہ ہم مجبور اور احمق عورتوں کے ساتھ کیا ڈراما کرتے ہیں۔ اولاد یا اولادِ نرینہ کی خواہش مند کسی سوکن کی ستائی ہوئی یا ساس کے ظلم سے پریشان عورت کبھی کبھی ہمارے چنگل میں پھنس جاتی تھی۔ یہ بات میری بیوی کو سخت ناپسند تھی اور اس کا اکثر مجھ سے جھگڑا ہوتا تھا۔ مجھے بُری عادت پڑی ہوئی تھی ورنہ اس جیسی بیوی کے ہوتے ہوئے مجھے کسی کی طرف آنکھ اٹھا کے دیکھنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ جب مجاور نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو شاید مجھے سزا دینے کے لیے یا انتقامی جذبے سے مغلوب ہوکے اس نے مزاحمت نہیں کی۔ مجھ سے شکایت ہی نہیں کی۔ بُرے ماحول میں بُرائی کو قبول کرنا آسان ہوتا ہے۔ شاید اس نے سوچا کہ میرا شوہر ایک عورت پر اکتفا نہیں کرتا تو میں کیوں ایک مرد سے وفا کروں۔ بس میری بدقسمتی یا بے وقوفی، تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔ مجاور نے میری بیوی کو پھانس لیا۔ جب مجھے پتا چلا تو میں نے دونوں کو قتل کردیا اور وہاں سے بھاگ کے یہاں آگیا۔"

اگرچہ یہ اس مجاور یا جعلی پیر کی پوری کہانی سُننے کا موقع نہ تھا مگر اس کی داستانِ عبرت میں ایسا اثر تھا کہ ہم سب محو ہوگئے۔ اس سے پہلے اس نے سب کچھ غلط بتایا تھا اور خود کو مجاور کی بیوی کے ساتھ منسوب کیا تھا۔ اس کے خاموش ہوتے ہی مجھے وقت کا خیال آیا۔

"اُف۔۔۔ دوپہر ہوگئی۔ ابھی تک ہم نے کچھ نہیں کیا۔"

نازو بولی "چلو اب دیر مت کرو۔"

میں نے پیر سے کہا "دیکھو پیر صاحب۔ جو ہوا سو ہوا۔ تم نے مجبوری میں غلط راستہ اختیار کیا یا شیطان کا مقابلہ کرنے میں تم نے کمزوری دکھائی۔ اب بھی وقت ہے کہ تم زندگی کا راستہ بدل دو۔"

اس نے کہا "میں وعدہ کرچکا ہوں۔"

"تمہارے وعدے پر ہمیں اعتبار نہیں۔ لیکن ہم کیا کرسکتے ہیں۔ ہم کسی لمبے چکر میں پڑنا نہیں چاہتے۔ ورنہ تمہیں پولیس کے حوالے کردیتے۔"

وہ پھر قسم کھانے لگا "میں محنت مزدوری کروں گا جی۔۔۔"

نازو نے کہا "کبھی کی ہے محنت مزدوری۔ ہمیشہ حرام کی کھاتے آئے ہو۔ تم مشقت کا کوئی کام نہیں کرسکتے۔"

"کرسکتے ہو تو یہ کام کرو" میں نے کہا "اس قبر کو کھودو۔"

وہ بھونچکا رہ گیا "قبر کھوددوں، وہ کس لیے جی؟"

میں نے کہا "اس جگہ میرے والد مرحوم کی ہڈیاں دفن ہیں۔ ان کا انتقال سفر کی حالت میں یہاں ہوا تھا۔ ہم نے انہیں امانتاً یہاں سپردِ خاک کردیا تھا۔"

وہ نفی میں سرہلانے لگا "نہیں جی۔ تین آدمی کسی میت کو نہیں لائے تھے۔ یہاں کوئی جنازہ نہیں آیا تھا۔ جنازہ اُٹھانے والے کم سے کم چار ہوتے اور اپنے ساتھ چارپائی لاتے، یہ معاملہ کچھ اور ہے۔"

میں نے پیڈرو اور نازو کی طرف دیکھا اور ایک گہری سانس لی "معاملہ تو واقعی کچھ اور ہے، ان کا قتل ہوا تھا۔"

وہ اچھل پڑا "قتل ہوا تھا۔۔۔؟"

میں نے کہا "تم تو ایسے حیران ہو جیسے قتل کا لفظ ہی پہلی بار سُنا ہے حالانکہ تم خود دُہرے قتل کا ارتکاب کرچکے ہو۔"

"وہ۔۔۔ وہ تو ٹھیک ہے۔۔۔ لیکن اب قبر کھودنے کا مقصد۔"

میں نے کہا "ان کو یہاں وہی لوگ دفن کرگئے تھے جو ان کے قاتل تھے۔ میں نے بڑی مشکل سے اس قتل کا سُراغ لگالیا ہے۔"

"قاتل گرفتار بھی ہوگیا ہے؟"

"بس یہی سمجھ لو۔ اس نے جگہ کی نشاندہی کردی ہے اب مسئلہ ہے صرف پوسٹ مارٹم رپورٹ کا۔ اسی سے پتچلے گا کہ میرے والد کو یہاں دفن کیا گیا تھا۔"

"اب تم پوسٹ مارٹم کروگے؟"

میں نے کہا "ہاں۔ اس کے بعد قاتل گرفتار ہوجائے گا۔"

وہ بولا "تم یہ کام پولیس کو کرنے دو۔ عدالت کے حکم پر وہ خود قبر کھود کے لاش لے جائیں گے۔۔۔ یہ کام خود کروگے تو خود بھی پکڑے جاؤگے۔"

میں نے برہمی سے کہا "تم بہت جانتے ہو قانون کو۔"

"ایسے کیس ہوتے ہیں۔ جھنگ کی خانقاہ میں رہتے ہوئے میں نے دوبار دیکھا تھا۔ ایک عورت تھی، اسے شوہر نے خود شک کی بنیاد پر ہلاک کردیا تھا کہ اس کی کسی سے یاری ہے۔ وہ شوہر کو بھنگ کے پکوڑے کھلا کر رات کے وقت غائب ہوجاتی تھی۔"

میں نے سوچ کے کہا "بھنگ تو خانقاہ میں بھی گھوٹی جاتی ہوگی۔"

اس نے سرہلایا "اس کے اولاد نہیں ہوتی تھی۔ جب پیر صاحب کی دعا سے ہوئی تو بچہ گورا چٹا تھا۔ ماں باپ کالے، ذات کے میراثی جو تھے۔ شک اس کو پہلے بھی تھا۔ لوگوں نے باتیں بنائی تھیں۔"

"بھنگ اسے کون دیتا تھا۔ تم یا پیر صاحب۔ کس سے یاری تھی اس کی؟"

اس نے اعترافِ جرم کرلیا۔۔۔ "دونوں سے۔"

"اس کے شوہر کو تم دونوں پر شک نہیں ہوا تھا؟"

"نہ جی۔ پیروں فقیروں پر شک کون کرسکتا ہے۔ شوہر نے اسے بہت مارا تھا۔ یہ پوچھنے کے لئے کہ وہ اپنے یار کا نام بتادے۔ اسی میں کوئی چوٹ لگ گئی اور وہ مرگئی۔ شوہر پکڑا گیا تھا اور اسے عمر قید ہوگئی تھی۔"

میں نے کہا "اچھا چھوڑو یہ ساری باتیں۔ اگر تم کہتے ہو تو ہم پولیس کو لے آتے ہیں۔ مجسٹریٹ بھی ساتھ آئے گا۔ ان کے سامنے تم وضاحت کردینا کہ سرہانے سید کرامت بادشاہ کا کتبہ کہاں سے آیا، پچاس سال تو ابھی تمہاری عمر بھی نہیں۔"

نازو نے کہا "پھر جو کچھ تم نے ہمیں بتایا ہے وہ مجسٹریٹ کی عدالت میں بھی بتانا پڑے گا۔ گواہ یہاں بہت ہیں تمہارے فراڈ کے۔"

وہ پریشان ہوگیا "دیکھو جی۔ یہ بڑا گناہ ہے۔"

اب میں برداشت نہ کرسکا اور میں نے اس کو اچھی خاصی مار لگائی مگر حلق سے آواز نہیں نکالنے دی "گناہ کے بچے۔ جو کچھ تو آج تک کرتا رہا ہے اس کے بعد گناہ ثواب کی بات کرتا ہے؟"

اس نے روتے ہوئے کہا "اچھا بابا۔ جیسا تم کہوگے میں کروں گا مگر اس کے بعد مجھے بخش دوگے؟"

میں نے کہا "ہم تمہیں تمہارے حال پر چھوڑ کے چلے جائیں گے۔ آگے تمہارے ساتھ کچھ ہوا تو ذمّے دار ہم نہیں۔"

"کبھی نہ کبھی اس دنیا میں تم کو اعمال کی سزا ملے گی۔" نازو بولی۔

جب اس نے بادل ناخواستہ غلاف ہٹا کے قبر کھودنا شروع کی تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ باربار کہہ رہا تھا "یارب، میری توبہ" وہ تندرست و توانا آدمی تھا اور اس کا ملنگوں جیسا حُلیہ مٹی میں اَٹ جانے سے زیادہ خراب نہیں ہوسکتا تھا۔ اس نے زندگی میں ہر گناہ کیا تھا اور ہر جرم کیا تھا مگر یہ جگہ ایسی تھی جہاں آنے والا ہر شخص یہ ضرور سوچتا ہے کہ ایک دن اس کو بھی یہاں لایا جائے گا اور وہ بھی محض مٹی کا ایسا ہی ڈھیر رہ جائے گا۔ قبر کے عذاب سے دہشت سب کو ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود زندگی کے سارے کاروبار پُرانی ڈگر پر چلتے رہتے ہیں۔

فقیر نے بھی ایک مٹی کے ڈھیر پر قبضہ جما کے اپنا کاروبار شروع کیا تھا۔ یہ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ ایک دن اسے یہی قبر کھود کے اندر اُترنا پڑے گا اور کسی نامعلوم ڈھانچے کو نکالنا ہوگا۔ ہڈیوں کا پنجر آدمی کو کچھ نہیں کہتا مگر احساسِ گناہ میں مبتلا شخص کو اس کا ضمیر بہت کچھ کہتا ہے جو اس نے پہلے نہیں سُنا ہوتا ہے۔

پیڈرو نے بتایا تھا کہ انہوں نے زیادہ گہرائی تک کھدائی نہیں کی تھی اور دو تین فٹ کا گڑھا کھود کے ہڈیاں دبادی تھیں۔ اس گڑھے کو قبر کی شکل دینے والا یہی فقیر تھا جو اب پیری کے مرتبے پر فائز ہونے کی جدوجہد کررہا تھا۔

دوپہر گزر گئی تو میں نے ممدو کو پیش امام صاحب کے گھر روانہ کردیا "تم ان کے گھر سے کھانا لے آؤ۔"

وہ ڈر گیا "او جی، میں مولوی صاحب کے گھر گیا نا، تو وہ ماریں گے۔"

"نہیں ماریں گے۔" میں نے اسے تسلی دی "انہیں بتادینا کہ مہمانوں نے کھانا منگوایا ہے۔"

ممدو اور صمدو گاؤں کے بدمعاش تھے اور اچھی شہرت نہیں رکھتے تھے۔ ظاہر ہے ایک نیک سیرت پیش امام ان کے وجود کو ناپسند کرتا ہوگا۔ انہیں وہ اپنے دروازے پر دیکھنا کیسے برداشت کرسکتا تھا۔ ممدو اور صمدو کی بدمعاشی کے مقابلے میں مولوی صاحب کی دہشت کسی تھانے دار کے رعب سے کم نہ تھی۔

بھوک کا خیال کسی کو نہ تھا۔ ممدو کو وہاں سے ہٹانے کا اصل مقصد یہ تھا کہ اس کے کانوں تک کھدائی کرنے کی آواز نہ پہنچے۔ تماشا دیکھنے والوں کو ادھر آنے سے وہ پہلے ہی روک چکے تھے۔ رہی سہی کسر پولیس کے آنے اور جانے سے پوری ہوگئی تھی۔ ہم پیش امام صاحب کے مہمان تھے اور تھانے دار بھی ہم سے مؤدبانہ انداز میں ہاتھ ملا کے گیا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ہم کتنے

معزز ہیں۔ اب کسی کی مجال تھی کہ ہمارے کام میں رخنہ اندازی کرے۔ ویسے بھی دوپہر سنسان ہوتی ہے اور اس گاؤں میں تو ایسا لگتا تھا کہ زمین کے اندر، اس کے اوپر اور فضا میں رہنے والے سب پرندے، حشرات الارض اور جانور تک سوگئے ہیں۔ خاموشی اتنی گہری تھی کہ ہماری باتیں کرنے کی آواز بھی پہاڑوں میں گونجتی محسوس ہوتی تھی۔

اگرچہ موسم گرما ابھی شروع نہیں ہوا تھا اور ہوا میں بہار کی خوشبو بسی ہوئی تھی مگر دوپہر کے سورج کی تپش سے پتھریلی زمین اور چٹانوں کا سینہ دہکنے لگا تھا۔ درختوں، خود رو پودوں اور گھاس کی افراط نے ہوا میں بخارات بھردیے تھے۔ اس سے حبس پیدا ہورہا تھا اور ہم سب کو پسینہ آرہا تھا جو سائے میں کھڑے تھے اور قبر کی مٹی کھودنے والے کے جسم پر تو پسینہ پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ اس پسینے میں مٹی شامل ہو کے کیچڑ بن گئی تھی اور وہ بھوت نظر آنے لگا تھا۔

اس نے کئی بار رُک کے اپنی گھڑونچی میں سے پانی پیا۔ ممدو جب کھانا لے کر آیا تو میں نے اسے دور سے ہی فارغ کردیا اور اس سے کہا کہ اگر وہ اپنے بھائی کے ساتھ جانا چاہے تو جا سکتا ہے۔ اب ادھر کوئی نہیں آئے گا۔ ممدو کے لیے بھی دوپہر کا وقت کاٹنا مشکل ہورہا تھا، کرنے کے لیے کوئی کام بھی نہ تھا۔ میری طرف سے اجازت ملی تو اس نے سکون آمیز مسرت کے جذبات کو دبانے کی ناکام کوشش کی۔ کمائی پورے دن کی ہوگئی تھی اور چھٹی آدھے دن کی ڈیوٹی کرکے۔ اس سے اچھی کیا بات ہوسکتی تھی۔

"کل صبح ہم کس وقت آجائیں جناب؟" وہ بولا۔

میں نے کہا "تم آجانا مولوی صاحب کے گھر۔ صبح سات آٹھ بجے تک۔"

وہ مجھ سے ہاتھ ملاکے رخصت ہوگئے۔ اگر انہوں نے قبرستان کی طرف سے آنے والی کھدائی کرنے کی آوازیں سنی تھیں تو اس پر کسی شک وشبے کا اظہار نہیں کیا تھا۔ جو کام ہم کررہے تھے مولوی صاحب بھی دیکھ چکے تھے اور خود تھانے دار بھی مطمئن ہو کے لوٹ گیا تھا۔

فقیر کے لیے یہ مشقت بڑی سخت تھی۔ وہ سارا دن بیٹھ کے عبادت وریاضت کا ڈراما کرنے اور حاجت مندوں کو باتوں سے چکر دینے کے سوا کرتا کیا تھا۔ گاؤں والے نیا زمند تھے اور اس کو کھانے کے لیے بڑھ چڑھ کے بھیجتے تھے۔ وہ خود روکھی سوکھی کھاتے تھے مگر اس فقیر کے لیے میٹھے چاول یا حلوا ضرور آجاتا تھا۔ وہ خود کو غلاموں کا غلام کہتا تھا کیونکہ اس کے جعلی پیر سید کرامت بادشاہ خود کو بری امام کا غلام کہتے تھے۔

قبر ڈھائی تین فٹ تک کھودی جاچکی تھی۔ مٹی کا ڈھیر اس کے چاروں طرف جمع ہوگیا تھا۔ غلاموں کا غلام تھکن سے چور پڑا تھا اور کھانا کھانے کے بعد اس پر غنودگی طاری تھی۔

میں نے پیڈرو سے کہا "ابھی تک کچھ بھی نہیں ملا۔"

وہ خود بھی فکرمند تھا "اتنا ہی کھودا تھا ہم نے۔ زیادہ کھودنے کے لیے وقت بھی نہیں تھا۔"

"تم جگہ تو نہیں بھول گئے؟"

پیڈرو نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ تم پاگل تو نہیں ہوگئے۔ "قبر کھودنے والا خود ایک چشم دید گواہ ہے۔"

میں نے کہا "اچھا۔ اور ایک فٹ تک دیکھ لیتے ہیں۔"

غلاموں کے غلام کی حالت غیر ہورہی تھی مگر ہم نے اسے پھر کام پر لگادیا۔ سوال بیک وقت اس کی زندگی کا اور کاروبار کا نہ ہوتا تو وہ انکار کردیتا۔ وہ یہاں اپنی گُدّول بناچکا تھا اور خود بھی یہی چاہتا تھا کہ ہم کسی کو کچھ پتا چلنے سے پہلے دفع ہوجائیں۔

اگلے دو گھنٹے میں قبر کی گہرائی چار فٹ سے زیادہ ہوگئی۔ قبر کھودنے والا خود مرنے کے قریب ہوگیا تو میں نے اسے روک دیا۔ وہ باہر نکل کے لمبا لیٹ گیا اور لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔

میں نے کہا "پیڈرو۔ آخر یہ کیا چکر ہے؟"

"چکر خود میری سمجھ میں نہیں آیا" اس نے کہا۔

میں نے کہا "کیا تم چاہتے ہو کہ قبر مزید کھودی جائے؟"

اس نے نفی میں سرہلایا "کوئی فائدہ نہیں۔ ہم دو گھنٹے میں فارغ ہوگئے تھے۔ ہمارے لیے چار فٹ کی گہرائی تک کھودنا بالکل ناممکن تھا۔"

"پھر؟ تم یہ بھی کہتے ہو کہ اندازے کی غلطی نہیں۔ اسی جگہ تم نے ہڈیاں دفن کی تھیں اور بہت کم گہرائی پر۔"

"کیا تم نے جھوٹ بولا تھا؟" نازو نے کہا۔

"نہیں۔ جھوٹ بولنے کے لیے میرا یہاں تک آنا ضروری نہیں تھا۔"

"تم جیسے شخص سے کچھ بعید نہیں" نازو نے کہا۔

میں نے کہا "شاید تمہارا خیال ہوگا کہ ہم صرف قبر تک پہنچنا چاہتے ہیں، ہم قبر کھودیں گے نہیں۔ فاتحہ پڑھ کے لوٹ جائیں گے۔"

وہ پریشانی اور خوف میں مبتلا ہوگیا "ایسی بات نہیں۔"

میں نے سختی سے کہا "پھر کیا بات ہے۔ کہاں ہے میری امانت؟"

"میں کیا بتاؤں؟"

میں نے ریوالور نکال لیا "اور کون بتائے گا، تمہارا باپ؟"

"سکندر۔ میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا تھا۔ یہی تھی وہ جگہ۔ تم خود سوچو کہ کسی فرضی قبر کی نشاندہی کرنا ہوتی تو میں ایسی جگہ کے بارے میں سوچ بھی سکتا تھا۔ یہاں کون آسکتا ہے۔ لاہور سے یہاں تک راستے میں کتنے شہر ہیں۔ گوجرانوالہ، گجرات، وزیر آباد، لالہ موسیٰ، جہلم ہر شہر میں نہ جانے کتنے قبرستان ہوں گے۔ میں تم کو کہیں بھی لے جاتا اور کیا خود لاہور میں قبرستانوں کی کمی ہے؟ آس پاس کے دیہات میں کسی سڑک کے قریب کوئی بھی قبر دکھادیتا۔"

"میں یہ سب نہیں جانتا۔ میرے نزدیک یہ سب تمہارا کوئی کھیل تھا۔ تمہارے شیطانی دماغ کی اسی چال کو میں سمجھ نہیں سکا۔ مجھے شرافت سے بتادو کہ تم نے ایسا کیوں کیا تھا؟"

"میں نے کچھ نہیں کیا۔ سب کچھ بتادیا تمہیں" وہ میرے لہجے سے ڈر گیا۔

میں نے ریوالور سے اس کے منہ پر وار کیا "میں نے کہا تھا کہ جھوٹ مت بولنا۔ پھر اتنا بڑا جھوٹ بولنے کی ہمت کیسے کی تم نے؟"

"اب میں کیسے یقین دلاؤں تمہیں" اس نے کراہ کے خون تھوکا "تم میری کسی قسم پر بھی اعتبار نہیں کروگے۔"

"تم نے جُوا کھیلا تھا کہ تمہیں راستے میں ہی ہمیشہ کے لیے ہم سے نجات حاصل کرنے کا موقع مل جائے گا یا تم ہمارا اعتبار حاصل کرلوگے۔"

"یہ غلط ہے۔"

میں نے اس کے جبڑے پر ایک مُکّا رسید کیا "پھر ٹھیک کیا ہے... بول۔"

وہ نیچے گرا اور پھر کھڑا ہوگیا۔ "خدا کے لیے میری سُنو۔ کچھ سمجھو، میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں سکندر۔ مجھے راستے میں دس مواقع ملے تھے۔ کیا میں ابھی کچھ دیر پہلے تھانے دار کے سامنے نہیں بول سکتا تھا؟ کل میں سراج کو نہیں بتا سکتا تھا؟"

میں نے اسے گریبان تھام کے قبر میں دھکیل دیا۔ "میں کچھ سُننا نہیں چاہتا۔ کھودو زمین اور اس وقت تک کھودتے رہو جب تک میری امانت مجھے نہ مل جائے۔ ورنہ میں تم کو اسی قبر میں زندہ گاڑ جاؤں گا۔"

پیڈرو قبر میں سیدھا لیٹ گیا "ٹھیک ہے سکندر۔ اُٹھاؤ بیلچہ اور ڈالو مجھ پر مٹی۔ یا اس فقیر سے کہو کہ مجھے دفن کردے۔ زندہ گاڑ دو یا ایک گولی مار کے میرا کام تمام کردو۔ سب کچھ تمہارے اختیار میں ہے۔"

غصّے میں میرا دماغ خراب ہورہا تھا۔ مایوسی اور ناکامی کا یہ ردِعمل بالکل فطری تھا۔ پیڈرو نے مجھے مزید مشتعل کرنے کے بجائے ایک نفسیاتی چال چلی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ کامیاب رہا۔ جب اس نے آنکھیں بند کرلیں اور کلمۂ شہادت پڑھنے لگا تو میرا نشانہ لینے والا ہاتھ کانپنے لگا۔

فقیر کی نیند ہی نہیں ہوش بھی اُڑ گئے تھے۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا تھا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظر ریوالور پر جم کے رہ گئی تھی اور شاید فائر کے انتظار میں اس کی سانس بھی رُک گئی ہوگی۔

نازو نے میرے ہاتھ سے ریوالور لے لیا "یہ جھوٹ نہیں بول رہا ہے سکندر۔ کوئی گڑبڑ ہوگئی ہے۔"

"کیسی گڑبڑ۔" میں نے شکستہ لہجے میں کہا "گڑبڑ کا ذمّے دار کون ہے۔ گڑبڑ میرے ساتھ ہی کیوں ہوتی ہے؟"

"ابھی پتا چل جائے گا۔ تم باہر آؤ پیڈرو" نازو نے کہا۔

پیڈرو بڑی مشکل سے باہر آیا۔ دہشت سے اس کا بدن کانپ رہا تھا۔ شاید اسے یقین آچکا تھا کہ نفرت اشتعال اور انتقام کے جذبات کی شدت ایک ایسی انتہا تک پہنچ گئی ہے کہ میں اپنی عقل پر اختیار سے محروم ہوگیا ہوں اور اسے قتل کرنے کی دیرینہ آرزو آج ضرور پوری ہوگی۔ وہ بس ایک لمحہ تھا جب اس کو اپنی موت کے یقین نے آخری سانس شمار کرنے پر مجبور کردیا تھا اور اس نے اپنی خون آلودہ لاش کو اپنی قبر میں دیکھ لیا تھا۔ وہ اس کی نفسیاتی چال نہیں تھی۔ آخری وقت میں اس نے کلمۂ شہادت نیک نیتی کے ساتھ پڑھا تھا۔ وہ گناہ گار تھا اور مجرم تھا لیکن وہ کافر نہیں تھا۔

فقیر کی حالت سنبھلی تو وہ اٹھ کھڑا ہوا "بہت اچھا کیا تم نے جو گولی نہیں چلائی۔"

میں نے بے خیالی میں کہا "نہیں۔ اچھا نہیں کیا میں نے۔"

"تم اسے قتل کردیتے تو ہم سب پھنس جاتے۔"

میں نے کہا "افسوس کہ یہ پھر بچ گیا۔"

نازو نے کہا "چلو تم یہ مٹی برابر کرو۔ ہم جارہے ہیں۔ یہاں جو کچھ ہوا اس کے بارے میں نہ تم کسی کو بتاؤ گے نہ ہم بتائیں گے۔"

ریوالور نازو کے ہاتھ میں تھا اور اس نے فقیر کو اسی سے اشارہ کیا تھا۔ میں دل گرفتہ اور مایوس خالی قبر پر نظریں جمائے ساکت کھڑا ہوا تھا۔ قبر کھودتے وقت میرے جذبات کی کیفیت جدا تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب ان ہڈیوں کو اصل مدفن تک پہنچانے کے بعد میں ذہنی طور پر کچھ پُرسکون ہوجاؤں گا۔ وزیر خان نے مجھ پر جو قرض چھوڑا تھا وہ کچھ تو ادا ہوگا۔ میں پوسٹ مارٹم رپورٹ لینے کے بعد وزیر خان کے مدفن پر نیا عہد کروں گا۔ اس کے قاتلوں کو کیفر کردار تک پہنچانے کا۔ اس کے خون کا بدلہ لینے کا۔ حق اور انصاف حاصل کرنے کا۔ اس کی برسی قریب تھی۔ میں اس کی مغفرت اور اپنی کامیابی کے لیے دعا کروں گا۔

اچانک میرے سارے تصورات باطل ہوگئے تھے۔ یہاں تک آنا سراب تک رسائی کا لاحاصل سفر بن گیا تھا۔ میں سعیِ رائگاں کے گرداب میں مسلسل ناکامیوں کے تھپیڑے کھا رہا تھا اور ناامیدی کا اندھیرا مجھے نگلنے کے لیے بڑھ رہا تھا۔

اس وقت میں پیڈرو کی طرف سے غافل ہوگیا تھا۔ نازو نے بھی شاید یہ سمجھ لیا تھا کہ ایک نیم مُردہ اور شکست خوردہ شخص جو اپنی موت سے گلے مل کے اٹھا ہو اچانک اتنی ہمت کہاں سے لائے گا کہ پلک جھپکتے میں بساط ہی اُلٹ دے لیکن پیڈرو نے یہی کیا۔ اس کی جگہ میں ہوتا تو شاید میں بھی ایسا کرنا ضروری سمجھتا۔

اس نے ایک دم جست لگا کے نازو سے ریوالور چھین لیا۔

نازو کا ہاتھ ساکت تھا۔ وہ پیڈرو کی طرف دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔ اس کے لیے دفاعی انداز اختیار کرنا ممکن ہی نہ تھا۔ پیڈرو نے ریوالور یوں جھپٹ لیا جیسے بلندی سے پرواز کرنے والا عقاب اپنے شکار کو پنجوں میں دبوچ کے نکل جاتا ہے۔

پیڈرو اپنے ہی زور میں آگے جا گرا تھا مگر اس نے گرنے سے پہلے نازو کو گرا دیا تھا۔ وہ دُبلی پتلی نازک سی لڑکی پیڈرو جیسے جسامت اور وزن کے مرد کی ٹکر کیسے برداشت کرسکتی تھی۔ وہ قبر کی کھدی ہوئی مٹی کے ڈھیر پر کھڑی تھی۔ اگلے لمحے وہ قبر میں گر گئی۔

پیڈرو گرتے ہی تڑپ کے اُٹھا اور اس نے ریوالور کا رخ میری طرف کردیا۔ میں غوطہ مار کے زمین پر گر چکا تھا مگر مجھے اندازہ تھا کہ اس سے کچھ نہیں ہوگا۔ اگر وہ مجھے گولی مارنے کا فیصلہ کرچکا ہوگا تو اس پر عمل درآمد میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کرے گا۔ میرے لیے چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ غوطہ مار کے میں پہلی گولی سے بچ سکتا تھا۔ دوسرا فائر وہ نشانہ لے کر کرتا۔ میں کھلی جگہ پر بہت واضح ہدف تھا اور پیڈرو کا نشانہ بہرحال بُرا نہیں تھا۔

وہ چند سیکنڈ انتہائی جان لیوا اور پُرعذاب تھے جب میں تقدیر کے فیصلے کا انتظار اسی طرح کررہا تھا جیسے تختۂ دار پر کھڑا ہوا مجرم جلاد کے اشارے کا منتظر ہوتا ہے۔ میں اوندھے منہ پڑا ہوا تھا اور بالکل بے حس و حرکت تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس وقت میری معمولی سی جارحانہ کوشش میری جان لے سکتی ہے۔

بالآخر پیڈرو کی آواز نے مجھے مژدۂ حیات دیا "اٹھ جاؤ سکندر اور خدا کا شکر ادا کرو کہ اس حالت میں بھی جذبات میرے کنٹرول میں رہے ورنہ اب تک گولی تمہارے سر سے گزر چکی ہوتی۔ تم بھی باہر آجاؤ اس قبر سے مِس نازو۔ کیسا لگا تمہیں اس میں گرنا جس میں کچھ دیر پہلے میں مرچکا تھا اور تم میری لاش کو اوپر سے دیکھ رہی تھیں۔"

آہستہ آہستہ میں سیدھا کھڑا ہوگیا۔ نازو کو میں نے ہاتھ پکڑ کے اوپر کھینچا۔ اس کا چہرہ دہشت سے سفید پڑ گیا تھا۔ گورے رنگ میں لہو کا گلابی پن نہیں رہا تھا تو یہ سفیدی کورے لٹھے جیسی ہوگئی تھی۔ اس کا ہاتھ بھی لاش کی طرح سرد تھا۔

وقت آدمی کو ایسے ہی مات دیتا ہے۔ ساری فتح مندی کی چالوں کے جواب میں تقدیر کی صرف ایک چال سے آدمی جیتی ہوئی بازی ہار جاتا ہے۔ دو دن سے پیڈرو میری تحویل میں تھا اور میں نے ایک لمحے کے لیے نگرانی میں کوتاہی نہیں کی تھی۔ میرے عزائم بہت واضح تھے۔ میری ذہنی کیفیت میں کوئی انتشار نہیں تھا۔ میرا لائحۂ عمل ایک ہی مقصد کے حصول کا آئینہ دار تھا اور میں ہر لحظہ مستعد اور چوکس تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پیڈرو کو متعدد مواقع ملے تھے جب وہ فائدہ اُٹھانے کی کوشش ضرور کرسکتا تھا مگر اس کا نقصان پیڈرو کو زیادہ ہوتا۔ شاید وہ اپنی جان گنوا دیتا۔ بعد میں ہم جان کیسے بچاتے۔ یہ ہم نے پہلے کبھی نہیں سوچا تھا لیکن ہم مشکل وقت میں اور آزمائش سے گزرنا جانتے تھے۔ زندگی کے ایسے تجربات کا شمار نہ تھا۔ جب موت نے زندگی کے سارے راستوں پر پہرے بٹھا دیے تھے مگر ہم خدا پر اور اپنی ہمت پر، تقدیر پر اور تدبیر پر بھروسا کرکے سر کٹھن نکل گئے تھے اور موت ہمیں راستہ دینے پر مجبور ہوگئی تھی۔

اس وقت صورتِ حال یکسر مختلف تھی۔ ہم پیڈرو کے رحم و کرم پر تھے اور دستِ قدرت نے پہلے سے طے کردیا ہو تاکہ ہماری زندگی کو اس دور افتادہ مقام پر اپنے بدترین دشمن کے ہاتھوں میں تمام ہونا ہے تو پھر ہماری جُرات و ہمت اور خواہش یا کوشش سب بے کار تھی۔ موت خود آدمی کو وہاں کھینچ لاتی ہے جہاں خدا کی دی ہوئی گنتی کی آخری سانس کے بعد سفرِ حیات تمام ہوتا ہے اور اگلا لمحہ حیاتِ ابدی کا ہوتا ہے۔ وجود اور عدم کے درمیان حائل لمحہ چُپ چاپ آتا ہے اور کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی۔

میں نے نازو کو اپنے قریب کرلیا "تم اب کیا چاہتے ہو؟"

"ہاں۔ اب وقت آیا ہے تمہیں بتانے کا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ اب تک تو وہی ہوا جو تم چاہتے تھے۔" پیڈرو کی صورت پر اب بھی وحشت اور جنوں کے آثار عیاں تھے۔ "میں نے کوشش کی تمہارا اعتبار حاصل کرنے کی۔ صرف اس لیے کہ میں خود بھی جینا چاہتا تھا اور تمہیں بھی زندہ رہنے کے حق سے محروم کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ وقت گزر گیا ہے جب تمہارے اور میرے درمیان کوئی رشتہ تھا تو عداوت کا۔ ہم ایک دوسرے کی جان کے ایک سے دشمن تھے۔ قسمت نے تمہیں بھی زندہ رکھا اور مجھے بھی اور حالات نے بالآخر ہمیں یکجا کردیا۔ ایک ایسے موڑ پر جہاں ہم ایک دوسرے کی مدد کے بغیر چل ہی نہیں سکتے تھے کیونکہ ہمارے مقابل زیادہ خطرناک اور مکار دشمن صف آرا تھا۔ افسوس کہ تم نے مجھے کسی رعایت کے قابل نہیں سمجھا حالانکہ تمہارے کسی بھی دوست سے زیادہ اس معاملے میں تمہارا مددگار میں تھا۔ اس کی وجہ بھی تم سمجھتے ہو۔ آج میں دلاور کا تم سے بڑا دشمن ہوں۔ میں نے پوری کوشش کی تھی کہ وہ پُرانے تعلقات کا لحاظ کرے۔ میری خدمت، میری وفاداری، دوستی اور جانثاری کا مجھے کیا صلہ دیا اس نے؟ نقد معاوضہ تو وہ سب کو دیتا تھا مگر کیا وہ جان کی قیمت تھی؟ جہاں اسے مرنے کا ڈر ہوتا تھا وہاں وہ کسی اور کی خدمات حاصل کرلیتا تھا یا مجھے بھیج دیتا تھا۔ میری زندگی اتنی کم قیمت تو نہیں تھی۔ کسی کی زندگی بھی اتنی سستی نہیں تھی لیکن وہ قیمت ادا کرتا تھا مجبوری کی۔ میں اس کا ساتھ دینے پر مجبور تھا اور برسوں بعد میں یہ سمجھتا تھا کہ اس کے دل میں میرے لیے قدر کے جذبات ہوں گے۔ میری حیثیت ان کرائے کے بدمعاشوں کے برابر نہیں ہوگی جن کو وہ مرواتا رہتا تھا۔ میں خود کو اس کا دوست، پارٹنر اور دستِ راست سمجھنے لگا تھا مگر اس کمینے اور خود غرض آدمی کی نظر میں میری وقعت برسوں بعد بھی وہی تھی۔ وہ مجھ سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔ اپنی جان ہوگی۔ جو میرے ساتھ یہاں آئے تھے ان میں سے کسی کو دلاور نے لالچ دے کر اور میری جگہ اپنا خاص آدمی بنانے کا وعدہ کرکے بھیجا ہوگا کہ جاؤ لاش وہاں سے بھی غائب کردو تاکہ کل پیڈرو مجھے بلیک میل نہ کرسکے۔ ان میں سے ایک خود کو دلاور کے سامنے نمایاں کرنے کی بہت کوشش کرتا تھا۔ یہ ثابت کرتا تھا کہ اس سے بڑھ کر وفادار جانثار کوئی نہیں۔ وہی اچانک غائب ہوگیا تھا۔ شاید مہینے بھر بعد۔ جب اس نے دلاور کو اپنی اعلیٰ کارکردگی کی خفیہ رپورٹ دی ہوگی تو دلاور نے اس کی پیٹھ ٹھونکی ہوگی اور دوسرے ہاتھ سے کسی کو اشارہ کردیا ہوگا کہ اس کی پیٹھ میں خنجر گھونپ دے۔ پیادہ جب بہت آگے بڑھ جائے اور بساط کے اس خانے تک پہنچنے کی کوشش کرے جہاں وہ وزیر بن سکتا ہے تو مارا جاتا ہے۔"

میں نے کہا "غالباً تمہارا خیال درست ہی ہے۔ اب مجھے دلاور سے پوچھنا پڑے گا کہ وزیر خاں کہاں دفن ہے؟"

"تمہارے دل میں اب میرے خلاف کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ میں نے پوری وضاحت کردی ہے۔ سب بتا دیا ہے کہ وزیر خاں کو کیسے قتل کیا گیا تھا اور کس نے قتل کیا تھا۔ ویسے تو میرے تمہارے سب کے دامن پر کسی قتل کا داغ ہے مگر تمہارے والد کی حد تک میرے تمہارے درمیان ذاتی دشمنی کا سبب کوئی نہیں رہا۔ تم تصدیق بھی کرلوگے۔ پھر تمہیں یقین آجائے گا کہ پیڈرو نے غلط نہیں کہا تھا۔ میرا یہاں تک آنا بھی بے مقصد نہیں تھا لیکن وہ مقصد حاصل نہیں ہوا تو اس میں میرا قصور نہیں۔ دیکھ لو میں تم کو تمہاری زندگی بخش کے جارہا ہوں۔ کون ہے یہاں میرا راستہ روکنے والا۔ اس ریوالور میں تین گولیاں ہی نہیں، چھ گولیاں ہیں۔ تین پھر بھی بچ جائیں گی۔ کسی کے فائرنگ کی آواز پر یہاں پہنچنے اور تین لاشوں کو دیکھنے سے پہلے ہی میں بہت دور نکل جاتا۔ ان پہاڑی راستوں سے میں واقف تو نہیں لیکن چلتا رہتا تو کہیں ضرور پہنچ جاتا کسی دوسرے گاؤں میں یا کسی سڑک پر جہاں سے مجھے آگے راہنمائی مل جائے گی۔"

میں نے کہا "تمہارا شکریہ میں پھر بھی ادا نہیں کروں گا کیونکہ میرا عقیدہ اب بھی یہی ہے کہ زندگی میری ہو یا تمہاری۔ اس پر اختیار صرف اُسی کا ہے جو زندگی دیتا ہے۔"

جعلی پیر اس عرصے میں پتھر کا بُت بنا بیٹھا رہا تھا۔ ہماری باتیں اس کی سمجھ میں نہیں آسکتی تھیں مگر وہ دیکھ رہا تھا کہ ہم دوست یا ساتھی نہیں تھے۔ ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے۔ شاید اس نے اندازہ کرلیا تھا کہ اس معاملے میں مجرم پیڈرو ہے۔ اس کی صورت کی خباثت نے یا باتوں نے یہ راز فاش کردیا تھا کہ وہ قاتل تھا اور قتل ہونے والا میرا باپ تھا۔ میرے ساتھ نازو تھی جس کو میں نے اپنی بہن بتایا تھا اور اس سے بھی فقیر یہ سمجھنے میں حق بجانب تھا کہ ہم بہن بھائی اپنے باپ کا مدفن تلاش کرتے ہوئے یہاں تک پہنچے تھے اور اس کا سُراغ بتانے والا خود قاتل ہی تھا۔

بچانے کے لیے میں نے اس سے وعدہ کیا کہ اس سے الگ ہوکے میں اپنی زندگی کہیں بہت دور گزاروں گا۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو وہ مجھے ضرور مروا دیتا۔"

"چنانچہ تم شیخ مختار بن گئے اور کراچی چلے گئے؟"

"ہاں۔ میں نے وہ راستہ ہی چھوڑ دیا تھا جس پر دلاور سے پھر ملاقات ہونے کا امکان ہوتا لیکن تم نے وہاں پہنچ کے میری یہ کوشش بھی ناکام کردی۔ دلاور نے مجھے بخش دیا تھا مگر تم نے نہیں، مجھے پھر سوچنا پڑا اور۔۔۔"

"اور تم نے ایک تیر سے دو شکار کرنے کا فیصلہ کیا" میں نے اس کی بات کاٹ دی "تم نے مجھے دلاور کی خدمت میں پیش کردیا تاکہ وہ تمہاری نیک نیتی اور دوستانہ خیر سگالی کے جذبات سے متاثر ہوجائے۔ وہ ہمیں مار دے اور تم اپنا دامن بچا کے زیادہ مطمئن زندگی گزارنے کے لیے کراچی لوٹ جاؤ۔ لیکن افسوس کہ تمہاری اسکیم کو ایک عورت کے جذبات نے ناکام کردیا۔ اگر صرف دلاور کا معاملہ ہوتا تو تم یقیناً کامیاب ہوجاتے مگر اس کی بیوی بیچ میں آگئی اور اس نے ایک جذباتی بے وقوفی کی۔ اس نے دلاور کو مجبور کردیا کہ ہمارا قرض اُتار دے۔ احسان کا بدلہ چُکا دے۔ دلاور جیسا شخص بھلا کہاں احسان مند ہوتا ہے مگر وہ عورت سے مار کھا گیا۔ ساری عمر وہ عورت کو کھلونا سمجھتا رہا مگر جس عورت نے اسے مغلوب کرلیا وہ اس کے جوان بیٹے کی مغرور ماں تھی۔ وہ بیٹا دلاور کا مستقبل تھا جسے وہ گنوانا افورڈ نہیں کرسکتا تھا۔"

پیڈرو نے دلاور کی بیوی کو ایک گالی دی "دلاور سے پہلے میں اس کو ایسا سبق دوں گا جو وہ یاد رکھے گی۔ میں اسے ماروں گا نہیں۔ اس کو بدشکل، اپاہج اور معذور کردوں گا۔ وہ بدنما گوشت کا ایک لوتھڑا رہ جائے گی۔ میں دیکھوں گا کہ پھر دلاور اسے کتنی اہمیت دیتا ہے۔ اس کا جوان بیٹا کیا کرتا ہے۔ ابھی تو اس نے مجھے مروانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی اور اس کی بات مان کے دلاور نے مجھے ایک آخری سبق سکھایا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ پیڈرو، تم پھر میرے سامنے آگئے، میں نے بتا دیا تھا کہ میں اس دنیا میں تمہاری شکل پھر نہ دیکھوں۔ اب تمہیں اس دنیا سے جانا ہوگا۔ یہی فیصلہ صادر کیا تھا اس۔۔۔نے۔ اور وہاں جو کچھ میرے ساتھ ہوا تھا۔۔۔ وہ تمہیں دہشت زدہ کرنے کے لیے تھا تاکہ تم یہ نہ سمجھو کہ دلاور کی فطرت بدل گئی ہے۔"

"یہ وقت باتوں میں ضائع کرنے کا نہیں ہے" میں نے کہا۔

"ہاں۔ اب میں جارہا ہوں سکندر۔ مجھے افسوس ہے کہ میری محنت رائگاں گئی۔ میں نے تم سے جھوٹ نہیں بولا تھا اور تمہیں دھوکا دینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میرا خیال ہے کہ دھوکا میرے ساتھ بہت پہلے ہوچکا تھا۔ دلاور کسی پر اتنا بھروسا نہیں کرتا تھا کہ وہ اس کی کمزوری بن جائے یا اس کا رازدار سمجھنے لگے خود کو۔ شاید اس نے بعد میں تمہارے والد کی لاش یہاں سے بھی نکلوا دی

پیڈرو ایک قدم پیچھے ہٹا "میرا راستہ روکنے کی کوشش مت کرنا سکندر۔"

میں نے کہا "تمہارے لیے وہ وقت ابھی نہیں آیا پیڈرو جب سارے راستے خود بخود بند ہو جاتے ہیں۔"

اچانک فقیر نے اپنا ہاتھ گھمایا اور میں نے پیڈرو کو سر پکڑ کے منہ کے بل گرتے دیکھا۔ ایک اچھے خاصے وزن کا پتھر اس کے سر پر توپ کے گولے کی طرح لگا تھا۔

میں پیڈرو سے بیس فٹ کے فاصلے پر تھا اور اتنی لمبی چھلانگ نہیں مار سکتا تھا۔ نازو کچھ قریب تھی مگر اس کے اور پیڈرو کے درمیان قبر کی مٹی کا ڈھیر حائل تھا۔ پھر مجھے اس فقیر کی احمقانہ جُرات نے حیران کردیا تھا۔ اس کی یہ حرکت بے مقصد خودکشی کے مترادف تھی لیکن وہ پتھر مارتے ہی ایک دم اُٹھا اور مخالف سمت میں دوڑا۔ اس نے بندر کی سی پھُرتی کے ساتھ دیوار عبور کی اور غائب ہوگیا۔

پیڈرو نے سنبھلنے اور اٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ "خبردار.... خبردار.... جو کسی نے میرے قریب آنے کی کوشش کی" وہ ایک دم گھوما اور اس نے پتھر مارنے والے کا نشانہ لینے کی کوشش کی مگر وہاں اب کوئی بھی نہیں تھا۔

پیڈرو قدم قدم پیچھے ہٹا اور دیوار تک گیا۔ اس کا رخ ہماری طرف تھا لیکن وہ مڑ مڑ کے پیچھے بھی دیکھتا جارہا تھا۔ شاید فقیر دیوار کے پیچھے کہیں چھُپا ہوا تھا۔ کسی درخت کی آڑ میں یا چٹان کے عقب میں۔ پیڈرو کی نگاہیں اسے تلاش کررہی تھیں اور وہ زیرِ لب اسے گالیاں دے رہا تھا۔

"قسمت اچھی تھی.... کی۔ بھاگ گیا.... ورنہ اسی قبر میں دفن کردیتا جو خود اس نے کھودی تھی...." پیڈرو غصے میں پاگل ہو رہا تھا۔

ریوالور کا رُخ ہماری طرف رکھتے ہوئے پیڈرو دوسری طرف آگیا۔ وہاں سے ایک راستہ نیچے جاتا تھا۔ یہ کچا راستہ تھا۔ وہ پگڈنڈی جو انسانوں کے نقشِ پا مسلسل ثبت ہونے سے بنی تھی۔ اس گاؤں کے وجود میں آنے یا اس سے بھی پہلے سے مسافروں نے اس کو ہستانی علاقے سے گزرنے کا یہ آسان راستہ تلاش کرلیا تھا اور وہ آج بھی اسی پر رواں تھے۔

پیڈرو اسی جگہ سے ہم پر بھی نظر رکھ سکتا تھا اور دوسری طرف اس فقیر پر بھی جو غائب ہوچکا تھا۔ وہ کسی بھی سمت سے نمودار ہوکے پھر حملہ کرسکتا تھا۔ اس نے پیڈرو کا سر پھاڑنے کی کوشش کرکے میری ہمدردی حاصل کرلی تھی۔ وہ خود اچھا آدمی نہیں تھا مگر اس بزنس میں پبلک ڈیلنگ کرتے کرتے اسے اچھے بُرے انسانوں کی پہچان کرنا آگیا تھا۔ اس کی پیڈرو سے دشمنی کی کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔ اس کے لیے ہم بھی بُرے تھے مگر انتخاب کا موقع ملا تو اس نے پیڈرو کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ شاید اس خیال سے کہ بعد میں ہم سے نیکی کی توقع کی جاسکتی تھی پیڈرو سے نہیں۔

"میرا پیچھا مت کرنا سکندر۔ ورنہ میں مجبور ہو جاؤں گا" وہ بولا "اور اب ویسے بھی تمہیں میری ضرورت نہیں۔ سب کچھ میں بتا چکا ہوں۔"

میں نے کہا "لیکن... ایک ڈائری ہے تمہارے پاس۔"

"ہاں۔ مگر وہ میری میز کی دراز میں مقفل ہے... کراچی میں" وہ بولا "میں تم کو اس کی نقل فراہم کردوں گا۔"

"اصل کیوں نہیں؟"

"اصل تو میری لائف انشورنس ہے۔ چوہدری دلاور کی جان ہے اس میں۔ جب تک وہ ڈائری میرے پاس ہے دلاور مجھ سے پنگا نہیں لے سکتا۔ ابھی تو اس نے اپنی طرف سے پکا کام کیا تھا۔ وہ سمجھتا ہوگا کہ سکندر کے ہاتھوں پیڈرو یقیناً مارا جائے گا۔ اس کے بچ جانے کا ایک فیصد چانس ہے اور مارے جانے کا ننانوے فیصد یقین۔ لیکن دیکھو، قسمت اس کو کہتے ہیں۔ ایک فیصد کے جوئے میں موت ہار گئی۔ جب میں دلاور کو بتاؤں گا کہ اس کی سازش ناکام ہوگئی۔ اس نے مجھ سے جان چھڑانے کی کوشش میں اپنی زندگی کو داؤ پر لگا دیا ہے۔ سکندر بخت، ایک بااصول اور شریف دشمن ہے جو سامنے آکے وار کرتا ہے۔ پیڈرو بہت کمینہ اور خطرناک دشمن ہے۔ وہ تمہیں دھوکے سے شکار کرے گا۔ وہاں تم کو مارے گا جہاں اس کی موجودگی کا خیال بھی تمہارے دماغ میں نہیں ہوگا اور میں اس کو آسان موت نہیں ماروں گا۔ وہ پہلے عمر قید کاٹنے اور پھر پھانسی پانے والے مجرم کی طرح دُہری سزا کاٹے گا۔ پہلے میں اس سے زندگی کی قیمت وصول کروں گا۔ سودا کروں گا کہ مجھ سے تحفظ کی ضمانت حاصل کرلے۔ وہ ڈائری مجھ سے خرید لے اور جب وہ قیمت ادا کرکے مطمئن ہوجائے گا تو..."

فقیر کا سر پیڈرو کے پیچھے نمودار ہوا۔ وہ اتنی خاموشی سے آیا تھا کہ پیڈرو کے کان اس کے قدموں کی آواز نہ سُن سکے حالانکہ وہاں زمین پر ایک پتا ٹوٹ کے گرنے کی آواز بھی سکوت کو منتشر کرسکتی تھی۔ بس نازو کے بے اختیار حیرانی کے ردِعمل نے پیڈرو کو ہوشیار کردیا۔ اس نے ایک دم پلٹ کے دیکھا اور اس کے لبوں سے گالی پہلے نکلی، پھر اس نے گولی چلائی۔

میرا دل بیٹھ گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ فائر کی آواز ان پہاڑوں کی خاموشی میں کہاں تک پھیلے گی اور اس کی بازگشت کتنی بار آئے گی۔ درختوں میں اور پہاڑ کی بلندی سے نشیب میں وادی تک سارے پرندے ہراساں ہوکے چلاتے ہوئے اُڑیں گے۔ گاؤں کے ہر فرد کے کان اس آواز کو سنیں گے۔ مرگِ ناگہاں کی آواز، ان سب آوازوں سے جدا جو زندگی کی علامت ہوتی ہیں۔ پرندوں کے چہچہانے، کسی بچے کی معصوم اور شوخ ہنسی۔ کسی کانچ کے برتن کے گر کر ٹوٹنے، کسی گائے بھینس کے ڈکرانے۔ کسی کے کسی کو پکارنے کی آواز۔ آدمی کے کان سب سنتے ہیں۔ خلوتِ شب کے

اندھیرے میں چوڑیوں کی مدھر پیار اور اقرار کی صدا۔ دکھ میں ڈوبی دل کی فریاد۔ ہمیشہ کے لیے بچھڑ جانے والوں کی یاد میں بہنے والے آنسوؤں کا نوحہ۔ لیکن مرگِ ناگہاں کی آواز سب سے بھیانک لگتی ہے۔ پل بھر میں جیتے جاگتے انسان کے بے جان ہوجانے کا تصور بڑا دہشت زدہ کرتا ہے۔

شاید فقیر بھی چلایا تھا۔ اس نے چلا کے کیا کہا تھا۔ یہ مجھے معلوم نہیں مگر اس کے پاس مہلت ہی کتنی تھی کہ وہ سوچ سمجھ کے کچھ کہتا۔ اس ریوالور کی گولی اور فقیر کے دل میں مشکل سے دس قدم کی دوری تھی اور گولی یہ فاصلہ ایک سانس کے پورا ہونے سے پہلے طے کرلیتی ہے۔

اچانک مجھے خاموشی کا احساس ہوا۔ وہ ایک لمحہ تھا جو گزر گیا۔ میں نے کوئی دھماکا نہیں سُنا۔ میرے کانوں میں ایک اور آواز آئی۔ یہ آواز بالکل مختلف تھی۔ مرگِ ناگہاں کی پکار سے بالکل الگ۔ یہ شکست کی آواز تھی اور ناکامی کی آواز تھی۔ میں نے اس آواز کو پہچان لیا۔

جب آدمی کا ہاتھ ٹریگر کو دباتا ہے تو "کلک" کی ہلکی سی آواز ہوتی ہے جو فائر کے اس دھماکے میں دب جاتی ہے مگر میں نے صرف یہی آواز سُنی تھی۔ ایک بار، پھر دوبار۔ پیڈرو کے ہاتھ کا ریوالور دغاباز ثابت ہوا تھا۔ دلاور سے زیادہ ناقابلِ اعتبار ثابت ہوا تھا حالانکہ پیڈرو نے اسی پر بھروسا کرتے ہوئے اپنا سب کچھ داؤ پر لگادیا تھا۔ اور وہ بازی ہار گیا تھا کیونکہ اس بے بسی اور بے چارگی کا نام تقدیر ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کا قول بڑی عظیم آفاقی صداقت ہے، میں نے اپنے رب کو اپنے ارادوں کی شکست سے پہچانا۔

پیڈرو نے بھی جان لیا ہوگا کہ صرف وہ نہیں۔ صرف اس کے ارادے ہی نہیں۔ صرف ریوالور ہی نہیں۔ خدا بھی ہے جس کی رضا نہ ہو تو کچھ نہیں۔ اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا اور میں نے اس کی صورت پر اس کی آنکھوں میں اور اس کے اطراف خوف اور بے یقینی کو دیکھا۔

وہ ایک دم بھاگا۔ میں اس کے پیچھے دوڑا۔ نازو نے مجھے روکنے کی ناکام کوشش کی۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کے کہا "رک جاؤ سکندر۔" مگر میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور چیخ کے کہا۔

"رک جاؤ پیڈرو۔"

پیڈرو نہیں رُکا۔ وہ جانتا تھا کہ رک جانے کا نتیجہ کسی صورت میں اچھا نہیں ہوگا۔ شاید ہم اسے مار کے اس قبر میں گاڑ جائیں گے جس میں سے ایک بار وہ نکل آیا تھا۔ دوسری بار کا کوئی بھروسا نہیں۔ اگر ہم نے نہ مارا تب بھی اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کریں گے۔ شاید اسے اپنی قید میں رکھیں گے۔ اس وقت تک جب تک کہ پیڈرو سب کچھ نہیں بتا دیتا جو اس کے دماغ میں ہے اور سب کچھ ہمارے حوالے نہیں کردیتا جو اس کے پاس ہے اور جسے وہ اپنی لائف انشورنس کہتا ہے۔ وہ مسلسل قید اور مسلسل اذیت اور مسلسل ذلت سے ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ اس کی قوتِ برداشت ختم ہوگئی تھی۔

وہ دیوانہ وار بھاگ رہا تھا۔ میں نے اس کا تعاقب جاری رکھا۔ وہ نشیب کی طرف رواں تھا۔ پتھروں پر لڑکھڑا کے سنبھلنے کی کوشش کرتا۔ جھاڑیوں کو پھلانگتا۔ چٹانوں کی آڑ لیتا۔ میں نے دوبار اس کا نشانہ لے کر پتھر پھینکے۔ ایک بار اس نے رک کے میرا نشانہ لیا اور فائر کرنے کی احمقانہ خواہش پر جھنجلا کے پھر بھاگا۔ ریوالور خراب ہوگیا تھا یا اس میں گولیاں ہی نہیں تھیں۔ مجھے خیال آیا کہ خود میں اس بے مصرف چیز کو کتنے اعتماد کے ساتھ اپنی طاقت سمجھے ہوئے تھا۔

اچانک پیڈرو گر گیا۔ اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ آگئی اور ناہموار راستے پر توازن برقرار رکھتے ہوئے بڑھتے رہنے کی جدوجہد ختم ہوگئی۔ وہ ایک چھوٹی سی چٹان تھی جو نہ جانے کب سے اسی طرح قائم تھی۔ اس ایک لمحے کے انتظار میں تھی جب استاد پیڈرو یا شیخ مختار نام کا کوئی شخص اس پر دوڑتے ہوئے قدم رکھے تو وہ زمین سے الگ ہوجائے۔ چٹانیں، پہاڑ، بلند و بالا مینار اور سر بفلک اسکائی اسکریپر۔ زمین اور چاند سورج اور یہ کائنات۔ سب توازن پر قائم ہیں۔ یہ توازن نہ رہے تو چٹان ٹوٹ جاتی ہے۔ اسکائی اسکریپر کھنڈر ہو جاتے ہیں۔ قیامت آسکتی ہے۔

پیڈرو چٹان کے ساتھ ہی گیا۔ ایک چٹان کے اکھڑ جانے سے جو زیادہ بڑی بھی نہیں تھی بہت سے پتھر بھی لڑھک گئے۔ یہ پتھر نشیب کے دوسرے پتھروں پر گرے۔ چٹان نے ایک اور چٹان کا حصہ توڑ دیا۔ پھر وہ حصہ بھی نیچے سیکڑوں پتھروں کے قافلے میں شامل ہوگیا۔ پیڈرو ان سب کے درمیان تھا۔ پتھر اور چٹانیں جو آپس میں ٹکرا رہے تھے، پیڈرو سے بھی ٹکرا رہے تھے۔ پتھر ٹوٹ کے بھی پتھر رہتا ہے۔ آدمی ٹوٹ کے آدمی نہیں رہتا۔

میں رُک کر اس دہشت ناک منظر کو دیکھتا رہا۔ ان آوازوں کو سُنتا رہا جو پتھروں اور چٹانوں اور پیڈرو کا ملا جلا شور تھا۔ سیکڑوں فٹ نیچے کہیں پر پتھر کو ٹھہر جانا تھا۔ ہر چٹان کو رک جانا تھا۔ وہی پیڈرو کی منزل تھی۔ زندگی کے سفر کا آخری پڑاؤ جہاں اس کے انجام کو دیکھنے والا، اس کے شکستہ خون آلود اور پسے ہوئے جسم سے عبرت پکڑنے والا اور اس کی موت پر رونے والا کوئی نہیں تھا۔

بالآخر بھیانک آوازوں کا وہ شور تھم گیا۔ آوازیں نیچے پہنچ کے مدھم پڑ گئی تھیں پھر خاموشی چھا گئی۔ میں دم بخود کھڑا رہا۔ بہت دیر بعد مجھے یہ کہنا یاد آیا کہ بے شک ہم سب اللہ کے لیے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔ اچھے بُرے، معصوم اور گنہگار، گورے کالے، عربی اور عجمی، دوست اور دشمن۔ تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے!

پھر میں نے اپنے پیچھے اوپر دیکھا تو مجھے نازو اس لاش کی طرح

تھی جو سنگ جانی کی پہاڑی پر استادہ تھی۔ نیلے سپاٹ آسمان کے پس منظر میں نازو کا ہیولا وسعتِ افلاک سے اُترنے والی کسی مخلوق جیسا لگتا تھا۔ وہ کسی حسین مجسّمے کی طرح ساکت کھڑی تھی۔

آہستہ آہستہ میں نے واپس اوپر چڑھنا شروع کیا۔ پیڈرو مرگیا تھا یا مارا گیا تھا۔ اسے ہم نے نہیں مارا تھا۔ چوہدری دلاور نے نہیں مارا تھا۔ کسی عدالت نے سزائے موت نہیں دی تھی۔ وہ مرنا نہیں چاہتا تھا اور زندگی کی طرف بھاگ رہا تھا۔ زندہ رہنے کی خاطر ہی وہ یہاں تک ہمارے ساتھ آیا تھا اور ہم سے پورا تعاون کررہا تھا۔ خود کو وزیر خاں کے قتل سے بری الذمہ ثابت کررہا تھا۔

میں نے نازو کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ ہاتھ ٹھنڈا ہورہا تھا۔ ایک دشمن کی موت پر اسے خوش ہونا چاہیے تھا مگر وہ سخت خوف زدہ تھی۔ دشمن مرے تے خوشی نہ کرئے سجناں وی مرجانا۔

فقیر اپنی جگہ پر موجود تھا۔ وہ مٹی کے ڈھیر کو دیکھ رہا تھا۔

میں نے کہا "تم نے ایسا کیوں کیا تھا؟"

وہ بولا "کیا میں نے بُرا کیا تھا؟"

"یہ تم جانتے ہو یا خدا بہتر جانتا ہے کہ جو کچھ تم کررہے ہو وہ اچھا ہے یا بُرا ہے۔" میں نے کہا "فیصلہ وقت کرتا ہے۔ تم نے دیکھا کہ جو اپنی کوشش سے بچ گیا تھا اور تمہاری کوشش سے ہلاک نہیں ہوا تھا۔ وہ بغیر کوشش کے مرگیا۔"

اس نے کہا "کیا میں یہ مٹی برابر کردوں؟"

میں نے کہا "ہم جارہے ہیں۔ تم کچھ بھی کرو۔ اس قبر کو برابر کرکے پھر غلاف بچھادو یا اپنی قسموں پر اور اپنے حلف پر قائم رہو۔ سزا اور جزا ہم خدا پر چھوڑتے ہیں۔"

اس نے جواب میں کچھ نہیں کہا اور بیلچہ اُٹھا کے مٹی کو خالی قبر میں گرانے لگا۔ میں نازو کے ساتھ گاؤں کی طرف جانے والے راستے پر چل پڑا۔

منزلِ شب ہنوز دور تھی۔ آفتاب کی تابانی میں شام چمکنے لگی تھی۔ جب میں اور نازو اُن مسافرانِ درماندہ کی طرح لوٹے جو تمام دن سفر میں رہے مگر فریبِ راہ نے انھیں پھر وہیں پہنچادیا جہاں سے وہ چلے تھے۔ پیش امام صاحب مسجد میں درس دے رہے تھے۔ میں ان کو سلام کرتا ہوا خاموشی سے غسل خانے میں چلا گیا۔ انھوں نے شفقت سے مسکرا کے جواب دیا۔ ان کے گھر میں نازو نے بھی غسل کے بعد واپسی کے سفر کی تیاری کی۔

"یہ کیا حضرت۔" پیش امام نے اجازت طلب کرنے پر کہا "اتنی عجلت کیسی۔ کیا آپ کی تحقیق مکمل ہوگئی؟"

میں نے کہا "تحقیق کبھی مکمل نہیں ہوتی۔ ہمارا کام فی الحال رُک گیا ہے۔"

"خیریت تو ہے نا۔ آپ کے تیسرے ساتھی کہاں ہیں؟"

میں نے کہا "ہمیں کچھ ایسی مشکلات کا سامنا ہوا کہ وہ جیالوجی میں کام آنے والے کچھ آلات لینے راولپنڈی چلے گئے۔ بعد میں ہمیں اندازہ ہوا کہ شاید اس کام کے لیے زیادہ وسائل، خصوصی ماہرین کی خدمات اور کافی وقت درکار ہے۔ ہم تین آدمی چند دن میں سروے کبھی مکمل نہیں کرسکتے۔"

"تو آپ قیام کی مدت بڑھالیں حضرت۔"

میں نے کہا "بات یہ ہے مولانا صاحب کہ یہ ہمارا پراجیکٹ نہیں تھا۔ ہمیں جتنا وقت اور بجٹ ملا تھا وہ ناکافی ہے۔ اس میں ہم اضافہ نہیں کرسکتے۔ ہم دوبارہ آئیں گے۔ زیادہ کار آمد آلات اور بڑی ٹیم کے ساتھ۔"

"انشاء اللہ۔" پیش امام نے کہا "آپ مجھے چشم براہ پائیں گے۔ بشرطِ زندگی..... لیکن صبح تک قیام فرمائیں۔"

میں نے کہا "اس میزبانی اور محبت کا بہت شکریہ۔ آٹھ دس میل ہی تو جانا ہے۔ رات ہونے سے پہلے پہنچ جائیں گے۔"

اس نے کہا "لیکن آپ جائیں گے کیسے۔ اس وقت کوئی بس نہیں ملے گی۔ نور پور شاہان سے آنے والی بس کل ملے گی۔"

میں نے اس مسئلے پر غور بھی نہیں کیا تھا۔ شہری زندگی کے عادی افراد کا ذہن دیہی آبادی کے مسائل کی طرف کیسے جاسکتا ہے۔ ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ کہیں جانے کے لیے اپنی گاڑی نہیں تو ٹیکسی ہوگی، رکشا مل جائے گا۔

"کیا یہاں تانگا بھی نہیں ہے کسی کے پاس؟" میں نے کہا۔

"تانگے صبح شہر چلے جاتے ہیں۔ ان کا یہی ذریعۂ معاش ہے۔ صرف رات کو واپس آئیں گے۔ نو دس بجے تک، بعض اوقات سینما کے آخری شو کی سواریاں اُٹھاتے ہیں تو ایک بھی بج جاتا ہے۔ زندہ رہنے کے لیے سب کچھ کرنا پڑتا ہے لیکن اصل مسئلہ ہے قناعت کا، ان کا بس چلے تو یہ ساری رات تانگا چلائیں اور گھر میں نہ آئیں۔ رات ایک بجے آکے صبح منہ اندھیرے نکل جانا بھی کوئی زندگی ہے۔ بیوی تو راہ دیکھتی ہے۔ بچّے ہفتوں باپ کی شکل نہیں دیکھتے۔"

میں نے کہا "کیا تانگے والا اور کیا صنعت کار۔ سب کا یہی حال ہے۔ وہ رات کو کارخانوں پر چھاپے مارتے ہیں کہ کام ٹھیک ہورہا ہے یا نہیں۔ سارا دن کاروباری مصروفیت میں گزارتے ہیں اور فکریں نیند حرام کردیتی ہیں۔ اعصابی امراض اور بیماریوں کے باعث دنیا کی ہر نعمت حرام ہوجاتی ہے۔ پیسہ ہمیشہ کم نظر آتا ہے۔ لاکھ ہو تو کروڑ، کروڑ ہوں تو ارب اور ارب ہوں تو کھرب کی کشش، کبھی ختم نہ ہونے والا چکر چلتا رہتا ہے۔"

"خیر سے آپ کچھ زیادہ ہی قناعت پسند ہیں۔ ابھی تک تجرد کی زندگی گزار رہے ہیں۔"

میں حیران رہ گیا کہ یہ بات انھیں کیسے معلوم ہوئی "بس جناب۔ کچھ ایسی ہی مصروفیت حائل رہی کہ گھر بسانے کی فرصت نہیں ملی۔"

"چلیے اللہ مسبب الاسباب ہے لیکن اپنی بہن کی ذمّے داری سے آپ کو فوراً سبکدوش ہوجانا چاہیے حضرت۔"

"بس اب یہی ارادہ ہے" میں نے دفاعی انداز میں کہا "یہ بتائیے کہ تانگا نہ سہی۔ کسی کے پاس کوئی گاڑی ہو تو ہم معقول کرایہ ادا کردیں گے۔"

وہ ہنسنے لگا "ان پہاڑوں پر گاڑی ہوتی کسی کے پاس حضرت تب بھی وہ کرایہ نہ لیتا آپ سے۔ ایک ریڑھا ہے البتہ 'صبح دودھ لے کر شہر جاتا ہے۔ شام کو خالی ڈول واپس لاتا ہے' وہ لوٹ آیا ہوگا۔"

میں نے کہا "اگر وہ مان جائے..... میری طرف سے گزارش کریں..."

"کیسی باتیں کرتے ہیں آپ حضرت۔ آپ میرے مہمان ہیں تو سب کے مہمان ہیں۔ آپ گزارش نہیں حکم کریں۔"

یہ اپنی نوعیت کا انوکھا سفر تھا۔ میں اور نازو ریڑھے کے فرش پر ایسے بیٹھے جیسے ہم انسان نہیں دودھ کے ڈول ہیں۔ سوٹ کیس اتنا نازک بھی نہیں تھا کہ نازو کے بیٹھنے سے ٹوٹ جاتا مگر اس نے انکار کردیا پھر ہمارے آرام کے لیے ریڑھے میں گدّا بچھانے کی تجویز پیش امام صاحب کے گھر میں سے پیش کی گئی اور ایک گدّا ڈبل کرکے بچھادیا گیا۔ اس سے صورتِ حال خاصی بہتر ہوگئی ورنہ مجھے یقین تھا کہ خستہ حال سڑک پر ریڑھا اچھلتا ہوا چلے گا تو تختے اور تختے کی ہر کیل پر ہمارے لیے تشریف کو رکھنے میں اتنی تکلیف ہوگی کہ ہم اکڑوں بیٹھنے پر مجبور ہوں گے۔

ریڑھے کا پائلٹ ممدو اینڈ صمدو کا ابّا تھا اور وہ تمام راستہ فی زمانہ ساری دنیا کی اولاد کے ناخلف ہونے کا رونا روتا رہا اور بار بار عرض کرتا رہا کہ ممدو اور صمدو کو پولیس میں بھرتی کرادیں فی سبیل اللہ۔ اور یہ مشکل ہے تو کسی بھی سرکاری محکمے میں افسر لگوادیں۔ میں اس کو کچھ دیر تسلی دیتا رہا کہ فکر مت کرو۔ انشاء اللہ کچھ نہ کچھ ہوجائے گا۔ پھر نازو نے اس سے کہا کہ بابا شہر تو پہنچنے دو یا ہمیں راستے میں انھیں بھرتی کرادیں فی سبیل اللہ۔ جنگل میں افسر لگوادیں۔

وہ خاموش ہوا تو میں نے نازو سے کہا "آپ نے تذکرہ فرمایا تھا ناچیز کے تاحال مجرد رہنے کا؟"

وہ ہنسی "بھائی وہاں تو عورتوں کے پاس اس کے سوا کوئی موضوع ہی نہیں۔ شادی کیوں نہیں ہوئی۔ منگنی ہوئی کہ نہیں۔ کوئی پیغام آیا۔ لڑکا کیا کرتا ہے۔ اس کے ماں باپ کون ہیں۔ ذات کیا ہے۔ بہن بھائی کتنے ہیں۔ کتنوں کی شادی ہوئی ہے؟ کب اور کس کے کتنے بچّے ہیں۔ توبہ..... وہ تو اچھا ہوا کہ میں نے شروع میں ہی خاموش رہنے کا بہانہ تلاش کرلیا تھا۔ یہ ظاہر کرتی رہی کہ میرے لیے بات سمجھنا مشکل ہورہا ہے مگر وہ سب ایسی ڈھیٹ تھیں کہ ایک ایک بات کو سو دفعہ دُہراتی تھیں۔ تنگ آکے مجھے کچھ ہوں ہاں کرنی پڑتی تھی اور اشاروں میں یا ایک آدھ لفظ یا ٹوٹے پھوٹے جملوں میں جواب دے کر انھیں مطمئن کرنا پڑتا تھا مگر اطمینان کیسا جناب۔ ہر جواب کے بعد ایک کے چار سوال۔"

ہم غروبِ آفتاب کے کچھ دیر بعد راولپنڈی پہنچے۔ ممدو صمدو کے ابّا نے ہمیں چوک بنی مائی وِیرو پر اُتار کے پھر وہی عرض کی۔ ہم نے پھر گول مول جواب دیا اور شکریے کے ساتھ روپے پیش کیے۔ اس نے لالچی نظروں سے دیکھتے ہوئے پہلے واجبی سے تذبذب کا مظاہرہ کیا اور پھر "بسم اللہ" کہہ کے واسکٹ کی جیب میں ڈال لیے "اپنے مولوی صاحب کو مت بتانا جناب" وہ رخصت ہوتے وقت ہاتھ ملا کے بولا "اور میری عرض..."

میں نے سوٹ کیس اُٹھالیا اور ہم سڑک کے ساتھ ہی ایک ریسٹورنٹ کے باہر پڑی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ہوٹل کا فرنٹ رنگین بلبوں سے اور ٹیوب لائٹس سے جگمگا رہا تھا۔ اندر ہال بھی بھرا ہوا تھا اور باہر بھی خوش باش لوگ گپ لگانے میں مصروف تھے۔ ہم ذرا فاصلے پر نسبتاً تاریک حصے میں لوگوں کی نظروں سے کچھ محفوظ تھے مگر ہمارے کان چنگھاڑتے لاؤڈ اسپیکر پر بجنے والے فلمی گانوں سے محفوظ نہیں تھے۔

ہم نے اتفاقِ رائے سے لسّی کو ترجیح دی۔ زیادہ تر لوگ لسّی پی رہے تھے۔ جب لسّی آئی تو اس کی مقبولیت کی وجہ جائز لگی۔

نازو نے کہا "لسّی پی کے ہم کہاں جائیں گے... لاہور؟"

"اتفاق سے ہم دونوں ہی مجبور ہیں ورنہ سوئزرلینڈ چلے جاتے۔ مجھے رابعہ نہیں بخشے گی، تمھیں غالب چھوڑنے والا نہیں۔"

"جناب کے ساتھ میں سید پور آگئی تھی تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ جہنم میں بھی جاسکتی ہوں۔"

"نہیں، وہاں تم غالب کے ساتھ جانا" میں نے کہا "دونوں کا وقت ایسا ہی گزرے گا جیسا اس دنیا میں گزر رہا ہے، میرا مطلب ہے بہت اچھا۔"

"ہم ابھی سیدھے لاہور جائیں گے..... اور کہیں نہیں۔ بس میں نے کردیا فیصلہ۔" نازو بولی۔

"میں نے یہ فیصلہ مسترد کردیا۔" میں نے کہا اور اپنے قریب لاوارث لاش کی طرح پڑا ہوا اخبار اُٹھالیا جس کو اب پڑھنے والا کوئی نہیں رہا تھا۔

"یہاں اب کیا کام رہ گیا ہے۔ لاہور جانے کے لیے بس ویگن ہر وقت ملتی ہے" نازو نے کہا۔

میں نے صفحہ پلٹا اور میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ شہر کی خبروں کے نیچے تین کالمی دس انچ میں ایک اشتہار لگا ہوا تھا۔ یہ ملک خداداد عباسی فیملی کی طرف سے دیا گیا تھا۔ اس میں "لاکھوں" ہمدرد واحباب اور تعزیت کرنے والوں کا شکریہ ادا کیا گیا تھا جو ان کے غم میں شریک ہوئے۔ مرنے والے کے سوئم کی تاریخ اور جگہ کا اعلان تھا اور آخر میں اپیل تھی کہ اس حلقے سے ان کو منتخب

کرانے والے ووٹر بالخصوص اپنے محبوب رہنما کے قاتلوں کا سُراغ لگانے کے کارِ خیر میں شریک ہوں اور دیگر محب وطن پاکستانی بھی ان ملزمان کو کہیں دیکھیں تو فوراً پولیس کو اطلاع دیں۔ نیچے سوگوار فیملی کے ارکان کے نام اور فون نمبروں کی لائن تھی اور ایک طرف پولیس کی "ہاٹ لائن" یعنی وہ نمبر جس پر کوئی بھی کسی بھی وقت فون کر کے خصوصی تفتیشی ٹیم کے نگراں ایس پی محمود بٹ سے براہِ راست بات کرسکتا تھا۔

اشتہار میں اوپر ایک باکس میں میری صورت کا خاکہ چشم دید گواہوں کی مدد سے بنا کے لگایا گیا تھا۔ میں نے وہ اخبار نازو کے سامنے کردیا۔

"یہ تو آپ کا رُخِ پُرنور ہے۔"

"ہے نہیں، تھا۔" میں نے کہا "خدا کا شکر ہے کہ میرا چہرہ اب وہ نہیں رہا ورنہ اب تک میں جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہوتا۔ گاؤں میں بھی ایک اخبار تو پہنچتا ہی ہوگا۔"

"معاملہ کسی عام آدمی کا نہیں، ایک وزیر کا ہے۔"

"تم نے غور کیا۔ اس میں صرف محبوب اور منتخب رہنما لکھا گیا ہے۔ خبر میں بھی وزیرِ جنگلات نہیں لکھا گیا۔"

نازو نے ایک اور خبر تلاش کرلی "وہ نامزد ہوا تھا۔ ابھی حلف نہیں اُٹھایا تھا، بے چارہ۔"

"فارسی میں کہتے ہیں.... اگر پدر نتواند پسر تمام کند۔ یعنی جو کام باپ نہ کرسکے وہ بیٹا پورا کرتا ہے۔ باپ کی جگہ بھائی کرلو لیکن عزیزہ، سب سے اہم سوال تم نے ابھی تک نہیں کیا۔"

"یہ کہ اس میں رابعہ یا غالب کا ذکر کیوں نہیں؟"

"نہیں۔ سوال یہ بھی اہم ہے لیکن اس کا جواب تم خود تلاش کرسکتی ہو کہ کسی ثبوت اور شہادت کے بغیر ایک مشہور وکیل اور ایک نامور صحافی کو ملوث کرنا خلافِ مصلحت سمجھا گیا۔"

"پھر کیا ہے سب سے اہم سوال؟"

"آخر پولیس سید پور کیسے پہنچ گئی۔ ان کو رابعہ کے اور مرزا غالب کے نام کس نے دیے؟"

"ہاں۔ یہ تو میری سمجھ میں بھی نہیں آیا۔"

"ہم نے اپنے پیچھے کوئی سراغ نہیں چھوڑا تھا۔ یہ ناممکن تھا کہ اتنے کم وقت میں سید پور تک اطلاع پہنچ جائے۔ اے ایس آئی سراج کے باپ کو پتا نہیں تھا کہ ہم کدھر گئے ہوں گے۔ ہم نے حُلیہ بھی بدل لیا تھا۔ تھانہ سنگ جانی کے پاس جہاں ہم نے اس کی گاڑی چھوڑی تھی صرف ایک کانسٹیبل نے ہمیں دیکھا تھا اور اس نے ہمیں پشاور جانے والی گاڑی میں بٹھادیا تھا۔ گاڑی والا چلا گیا تھا تربیلا ڈیم۔ اسے کیا معلوم ہم کون تھے۔ ٹیکسی ڈرائیور عبدالرحمان کو جب گاڑی کی ڈکی سے نکالا گیا ہوگا۔ اس کے شور مچانے یا گاڑی کو مشکوک سمجھ کے تحویل میں لینے کے بعد۔ تو وہ یقیناً بہت کچھ بتا سکتا تھا۔ میرے تمہارے حلیے کے بارے میں۔ تمہارے کامران ہوٹل میں ٹھہرنے کے بارے میں۔ لیکن اسے ڈر ہوگا کہ اس نے ساری بات بتائی تو ممکن ہے مجرم پکڑے جائیں مگر پکڑے جانے والے مجرم بھی تو بولیں گے۔ وہ عبدالرحمان۔ اس کی نام نہاد منکوحہ اور سراج کی تکذّم کے کرتوت بیان کریں گے کہ ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے۔ ہمیں پکڑوا کے خود کہاں جاتے ہو۔ چنانچہ میرا ذاتی خیال ہے کہ اس نے جھوٹ بول کے اپنی جان چھڑائی۔"

"کیسا جھوٹ؟"

"جھوٹ تو جھوٹ ہوتا ہے۔ ایسا ویسا کیسا کیا۔ اس کی جگہ میں ہوتا تو یہی کہتا کہ مجھے کچھ معلوم نہیں وہ کون تھے۔ انہوں نے مجھ سے میری ٹیکسی چھین لی اور مجھے گاڑی میں ڈال کے لے گئے۔ میں انہیں پہچان نہیں سکتا اور نہ ان کے حلیے ٹھیک طرح سے بیان کرسکتا ہوں۔ میں نے ان کو غور سے دیکھا ہی نہیں تھا۔ مجھے نہیں معلوم انہوں نے ایسا کیوں کیا تھا۔ میری کسی سے ذاتی دشمنی نہیں۔ وہ جان چھڑا کے گھر بھاگا ہوگا اور شاید اس نے خاموشی سے سراج کو اس عورت سے الگ کر کے روانہ کردیا ہوگا کہ جاؤ اور اپنے تعلقات استعمال کرتے ہوئے تھانہ سنگ جانی سے اپنی گاڑی لے آؤ۔ ان سے سراج نے بھی یہی کہا ہوگا کہ میری گاڑی چھیننے والے دو مرد اور ایک عورت تھے مگر میں ان کو پہچانتا نہیں۔ اس نے ہمارا حُلیہ بھی نہیں بتایا ہوگا۔"

"یہ تم اتنے یقین سے کہہ رہے ہو؟"

"بابا عقل سے کام لو۔ اگر عبدالرحمان اور اے ایس آئی سراج کا کیس بھی پولیس کے پاس ہوتا تو تفتیش کا خمیازہ کسے بھگتنا پڑتا۔ یا میری بات کی صداقت یوں بھی ظاہر ہے کہ میری صورت کا یہ خاکہ میری پُرانی شکل سے ملتا ہے۔ اصل صورت صرف عبدالرحمان نے اور سراج نے دیکھی تھی۔ وہ حُلیہ بیان کرتے تو سکندر بخت کی تصویر شائع ہوتی مگر خاکے میں نظر آرہا ہے فرنچ وکیل اور ماشاء اللہ سے کچھ تو پولیس نے جس مصور سے خاکہ بنوایا ہے وہ شاید پہلے جوتے بناتا ہوگا۔ تصویر میں میری شکل باٹا کے پُرانے پھٹے ہوئے جوتے جیسی نظر آرہی ہے اور مجھ سے کیا اس فرنچ وکیل سے بھی بس اسی حد تک ملتی ہے کہ دونوں کے چہروں پر ایک ناک تھی۔ دو کان تھے اور دو آنکھیں۔ یہ سب ایک چہرے کے فریم میں فٹ تھے جس کے اوپر سر کے بال تھے۔ رہی سہی کسر طباعت واشاعت کے ناقص عمل میں پوری ہوگئی ہے۔ یہ بھی دیکھو کہ اخبار میں اس واردات کا ذکر ہی نہیں۔ جو اے ایس آئی سراج یا عبدالرحمان کے ساتھ ہوئی۔"

"پھر سید پور کی پولیس کو کیسے خبر ملی؟"

"یہ سوال میں نے کیا تھا، جواب تم دو" میں نے کہا۔

نازو ہنسی "چلو سوال میں کرلیتی ہوں۔"

"جواب اس کا یہ ہے مس نازو! کہ چوہدری دلاور ہمارے تعاقب میں ہے" میں نے کہا۔

نازو دم بخود رہ گئی۔ "ہمارے تعاقب میں!"

"یس۔ اسی نے حادثے کی اطلاع دی۔ گاڑی کی ملکیت اور نمبر پلیٹ کے بارے میں ایس پی کو بتایا اور ایس پی نے ملک خداداد عباسی کو۔ وہ ہم سے بلی چوہے کا کھیل روائتی طریقے پر کھیل رہا ہے۔ اس نے ہمیں بھاگنے کی مہلت دی اور پھر ہمارے پیچھے لگ گیا۔"

"لیکن اس کا مقصد؟"

"بعض اوقات تم انتہائی فضول، بلکہ احمقانہ سوال کرتی ہو۔ بھئی وہ مجبور ہے اپنی فطرت سے۔ اس نے بیوی کی بات بھی مان لی اور بیٹے کو بھی خفا نہیں کیا۔ اسے معلوم تھا کہ پیڈرو کے ساتھ ہم کہاں جائیں گے۔ اس نے پیڈرو کا ایک اعترافِ جرم بھی ہمارے حوالے کردیا اور یہ بھی کہہ دیا کہ جب ہم خود پیڈرو سے سب پوچھ کچھ کرلیں تو اپنے حاصل کردہ نتائج کا موازنہ اس کے دیے ہوئے کیسٹ سے کریں۔ اب ہمارے پاس کیسٹیں ہیں جو ہم اوّلین فرصت میں سُن لیں گے لیکن اس میں مجھے کوئی شک نہیں کہ ہمارے سید پور پہنچنے کی اطلاع چوہدری دلاور ہی دے سکتا تھا۔ وہ تو کچھ تھانے دار بے وقوف اور نیا تھا۔ کچھ پیش امام صاحب کا مہمان ہونا کام آیا اور ہم بچ گئے۔"

"تمہارا مطلب ہے۔ گاؤں میں کوئی تھا؟"

"نہیں نازو۔ دلاور یہ بات سمجھتا تھا کہ پیڈرو ہمیں کہاں لے جائے گا۔ وہ راولپنڈی تک ہمارے ساتھ ہوگا۔ پنڈی میں ہم اسے پچھاڑ کر نکل آئے۔ چوہدری دلاور نے پنڈی میں سب دیکھا اور سُنا ہوگا۔ جو ہم نے کیا اور شاید اس نے ہی عباسی کے بھائی کو ہمارے بارے میں بتادیا ہوگا۔ عباسی کا بھائی کچھ تو پہلے سے جانتا تھا۔ رابعہ اور غالب بروقت فرار ہونے سے بچ گئے اور ہم قسمت سے۔ تم تو پھر بھی محفوظ ہو کہ تمہارا نام کسی نے نہیں لیا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کل تک صورتِ حال کچھ اور خراب ہوجائے گی۔"

"بلاوجہ مجھے مت ڈراؤ۔"

"تم بلاوجہ مت ڈرو۔" میں نے اسے ڈانٹا "کل میری اصل تصویر بھی شائع ہوسکتی ہے۔ اس وضاحت کے ساتھ کہ فرنچ وکیل درحقیقت سکندر بخت تھا۔ میرے اصلی اور نقلی چہرے سامنے آئیں گے تو کیا رابعہ اور وقار یوسف یا منظر کے لیے مسائل پیدا نہیں ہوں گے۔ فرنچ وکیل زیادہ تر ان کے ساتھ ہی رہا تھا۔ وہ کیا بتائیں گے کہ انہوں نے اس پر کیسے اعتبار کرلیا تھا۔ خیر وہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں یہ بات معلوم نہیں تھی اور کسی غیر ملکی وکیل کے شناختی کاغذات چیک کرنا ہمارا کام بھی نہیں ہے۔ لیکن ساتھ ہی رابعہ دوسرے کیس میں بھی ملوث ہے۔ ملک خداداد عباسی کے قتل کے وقت اسے اور غالب کو فرنچ وکیل کے ساتھ دیکھا گیا تھا۔ یہ بات کسی ایف آئی آر میں بھی ہے یا نہیں۔ یہ ابھی ہم نہیں جانتے مگر رابعہ کس کس بات کی تردید کرے گی۔ کہاں کہاں انکار کرے گی۔ ملک خداداد عباسی کا بھائی، اس کا قاتل بھائی، بہت کینہ ہے۔ وہ اپنا جرم کسی کے سر تو منڈھے گا پھر وہ عام آدمی نہیں ہے۔ اس کے بھائی کا حلقہ اب اس کا حلقہ ہے۔ اسے خود کو ہر الزام سے بچانا ہے۔ اس کا اثر رسوخ ہم سب کے لیے پریشانی کے اسباب پیدا کرسکتا ہے۔ خصوصاً رابعہ اور غالب کے لیے۔ کوئی کتنا ہی بڑا وکیل یا صحافی کیوں نہ ہو۔ قانون سے بالاتر تو نہیں ہوتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ پولیس ان کے ساتھ دھاندلی کرتے ہوئے ڈرتی ہے مگر ان کا نام ایف آئی آر میں آجانے خصوصاً قتل جیسے سنگین جرم میں تو گرفتاری لازمی ہے۔ بعد میں ان کی ضمانت ہوجائے اور وہ خود کو جائے واردات سے دو سو میل دور ثابت کردیں۔ وہ ایک الگ بات ہے۔"

نازو پریشان ہوگئی تھی۔ وہ میرے اندیشوں کی تردید نہیں کرسکتی تھی۔ اس نے کہا "پھر تو ہمیں بالکل دیر نہیں کرنی چاہیے۔"

"مجھے ڈر ہے کہ راستے میں بسوں کے اڈوں پر اور ریلوے اسٹیشن پر چیکنگ نہ کی جارہی ہو۔ پنڈی سے لاہور تک پولیس کو میری اصل تصویر بھی فراہم کردی گئی ہو۔ فرنچ وکیل کا خاکہ تو نہ جانے کتنے اخباروں کو جاری کیا گیا ہوگا۔ ہم پر الزام ہے کہ عباسی کو لوٹنے کے بعد قتل کیا یعنی بیک وقت ڈکیتی اور قتل کے دو سنگین جرم۔"

"کیا لوٹا تھا آخر ہم نے اس کا؟"

"لکھوانے والے کچھ بھی لکھوا سکتے ہیں۔ ایک لاکھ روپے نقد۔ دس ہزار ڈالر۔ ایک ہزار پاؤنڈ جیولری اور گھڑی.... اور برآمد بھی کرسکتے ہیں اگر مجرم پکڑے جائیں" میں نے کہا۔

"دس ہزار ڈالر اور ایک ہزار پاؤنڈ برآمد کرنا اتنا آسان ہے؟"

میں نے کہا "بھولی لڑکی۔ یہ سارا کھیل کاغذی ہوتا ہے۔ کیس سوچ سمجھ کے بنائے جاتے ہیں۔ کسے ملوث کرنا ہے کسے نہیں۔ کیا بتانا ہے کیا چھپانا ہے۔ قتل تو ہوگیا اب اس سے کیا سیاسی فوائد حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ کس کی جذباتی ہمدردی حاصل کی جاسکتی ہے۔ تمام خبریں انہی مقاصد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے جاری کی جاتی ہیں اور جو پکڑے جاتے ہیں ان سے منسوب سارے بیانات خواہ وہ اقبالی ہوں ایک خبر کے سوا کچھ نہیں ہوتے۔ پریس کانفرنس میں ایک ہزار پاؤنڈ اور ایک لاکھ ڈالر کیا، صحافیوں کے سامنے توپیں اور ٹینک بھی پیش کیے جاسکتے ہیں کہ یہ ملزم کی تحویل میں تھے اور ملزمان حکومت کا تختہ اُلٹنا چاہتے تھے۔ جب حکومت کسی پر کیس بناتی ہے تو ثبوت کوئی مسئلہ نہیں ہوتے۔"

نازو نے اس وقت ایک عقلمندی کی بات کی "یہ جو ملک خداداد عباسی تھا۔ یہ سرکاری پارٹی کا تھا۔ اپوزیشن کا یا آزاد

امیدوار؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ میں سیاسی خبروں سے قطعی لاتعلق ہوں مگر اس کا وزیرِ جنگلات نامزد ہونا اور حلف اُٹھانے میں تاخیر کا مسئلہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس نے سودے بازی کی ہوگی اور آخری وقت تک کوئی بات تصفیہ طلب تھی کہ دیر ہوئی۔ پارٹی کے لوگوں کے ساتھ ایسا مسئلہ نہیں ہوتا۔ عام طور پر وزارت کی رشوت حریف جماعت کو یا کسی آزاد امیدوار کو دی جاتی ہے جس کا اپنے حلقے میں بہت زیادہ اثر رسوخ ہو۔"

نازو نے اخبار دیکھتے دیکھتے اچانک کہا "یہ دیکھو۔ عباسی سے تعزیت کرنے والوں کے بیانات' پڑھو غور سے۔"

"ان میں کیا ہے۔ وہی کہ ملک اور قوم کا ناقابلِ تلافی نقصان ہوگیا' عوام ایک عظیم محبِ وطن اور مخلص رہنما سے محروم ہوگئے۔"

"نہیں بھئی' تم پڑھو تو سہی۔"

سرورق کی خبر کا بقیہ آخری صفحے کے آخری کالم میں تھا اور اس میں مختلف سیاسی راہنماؤں کے ساتھ اہم سماجی شخصیات اور کاغذی تنظیموں کے بہت سے خود ساختہ صدور کے بیانات تھے۔ ہر ایک نے بڑھ چڑھ کے لفاظی کی تھی اور یوں لگتا تھا کہ ان سے زیادہ عباسی کی مرگِ ناگہاں سے کوئی اور متاثر نہیں ہوا۔ سب سے زیادہ صدمہ انہی کو ہے اور عوام بھی دریائے غم میں غوطہ زن ہیں کیونکہ اس جیسا راہنما نہ تھا نہ ہوگا۔

چونکا دینے والا نام چوہدری دلاور کا تھا۔ اس نے ملک خداداد عباسی کے بھائی ملک نبی داد عباسی سے ملاقات کی تھی اور اپنے دلی جذبات کا اظہار کرنے کے بعد اس یقین کا اظہار کیا تھا کہ قاتل بہت جلد گرفتار کرلیے جائیں گے۔

نازو بولی "چوہدری دلاور کا کیا تعلق عباسی سے؟"

"تعلق تو دلاور نے پیدا کرلیا ہوگا۔ آخر وہ بھی سیاست کے میدان میں کودنے پر کمربستہ ہے۔ ہم اس کی راہ میں کانٹے نہ بچھاتے تو اب تک ملک اور قوم کا درد دل میں بسائے کسی پلیٹ فارم سے حب الوطنی کے جذبات سے چھلکتے بیانات دے رہا ہوتا۔"

نازو بولی "میرا خیال ہے کہ اس نے موقع سے فائدہ اُٹھایا۔ نبی داد سے ملاقات کا ایک مقصد یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اسے ہمارے بارے میں تفصیل سے وہ ساری باتیں بتادے جو نبی داد نہیں جانتا۔ نبی داد کے لیے یہ معلومات بے حد کارآمد ثابت ہوں گی اور وہ چوہدری دلاور کے اس تعاون کا صلہ بعد میں ادا کرے گا۔"

"میں نے ٹھیک کہا تھا نا۔ وہ پنڈی تک ہمارے پیچھے آیا تھا۔ اسی نے خداداد عباسی کو سب بتایا ہوگا لیکن دوسرے بہت سے لوگوں کے بیانات پڑھ کے اب میرا خیال بدل گیا ہے۔ زیادہ تر بیانات حزبِ اختلاف کے ہیں۔ وہ قتل کا ذمے دار حکومت کو ٹھہرانا چاہتے ہیں۔"

"سکندر وہ جو پیر صاحب تھے۔ جو چُلبلی بائی کے کوٹھے پر موجود تھے۔ انہوں نے عباسی کے خلاف بیان دیا تھا۔"

"وہ سرکاری آدمی ہیں لیکن ایسا لگتا ہے کہ چھوٹے بھائی کو حکومت کی مخالف پارٹی کی تائید وحمایت حاصل تھی۔ جب تک وہ حکومت کے خلاف آزاد امیدوار کی حیثیت سے کامیاب نہیں ہوگا اور حکومت کو بلیک میل نہیں کرے گا۔ فائدہ کیسے اٹھائے گا۔ اسے خریدنے اور اس کی آواز کو دبانے کے لیے پیش کش حکومت کی جانب سے ہی آسکتی ہے۔ حزبِ اختلاف کسی کو کیا دے گی۔ وعدوں کے سوا" میں نے پُرامید لہجے میں کہا۔

"دو دن ہوگئے۔ ہمارا کسی سے رابطہ نہیں۔" نازو نے کہا۔

میں نے کہا "چلو کہیں سے فون کرلیتے ہیں۔ آج رات یہاں کسی ہوٹل میں گزار کے صبح چلے جائیں گے۔"

"اگر تمہیں اندیشہ ہے کہ لاہور جانے والی بسوں میں تم کو تلاش کیا جارہا ہوگا تو ہم ٹرین سے چلے جاتے ہیں۔"

میں نے کہا "اس وقت کوئی ٹرین لاہور نہیں جاتی۔ خیبر میل ملے گی رات دو ڈھائی بجے۔"

نازو نے کہا "میں یہاں ایک منٹ رُکنا نہیں چاہتی۔ مجھے لگتا ہے کہ بِن بُلائے ہم پر کوئی مصیبت نازل نہ ہوجائے۔ یہاں خطرہ زیادہ ہے۔ یہ عباسی فیملی کا حلقۂ اثر ہے۔ یہاں کی پولیس بھی زیادہ دباؤ میں ہوگی اور ویسے بھی سیاسی جوڑ توڑ اور سرگرمیوں کا یہی محور ہے۔ لاہور میں ہمارے محفوظ ٹھکانے ہیں۔"

"اگر ہم کراچی چلے جائیں میں اور رابعہ!" میں نے سوچتے ہوئے کہا "خیر لاہور جاکے ہی قطعی فیصلہ کریں گے۔ سب سے محفوظ جگہ کراچی ہے ہمارے لیے اور مجھے تو وہاں فوراً پہنچ جانا چاہیے۔"

"وہاں کیا ہے؟"

"یار تم اتنی جلدی بھول گئیں۔ پیڈرو نے کیا کہا تھا۔ ایک ڈائری ہے اس کے آفس میں' اس کی میز کی دراز میں۔"

"وہ... دراصل میرا ذہن اس وقت دوسری اُلجھنوں میں گرفتار ہے۔ پہلے تو یہاں سے نکلو۔ پھر کراچی بھی چلے جانا۔ ہم ایسا کرتے ہیں' کوئی گاڑی لے کر چلے جاتے ہیں۔"

"اس وقت میں کوئی شوروم کھلواکے گاڑی کا سودا نہیں کرسکتا۔"

"میں گاڑی خریدنے کی بات نہیں کررہی تھی۔ پرائیویٹ کاریں کرائے پر مل جاتی ہیں۔ لاہور تک جانے کا کیا بنے گا' پانچ سو... ہزار۔"

یہ آئیڈیا مجھے پسند آیا۔ نازو کی بات بھی میرے ذہن میں تھی کہ سب سے پُرخطر جگہ راولپنڈی ہے جہاں ہزاروں آنکھیں عباسی کے قاتلوں کو تلاش کررہی ہیں۔ یہ کیسی عجیب دنیا تھی۔ آدمی دنیا سمجھتی تھی کہ اس کو قتل کرنے والا اس کے بھائی کے سوا کوئی نہیں ہوسکتا۔ وہ سب لوگ جو ان دونوں کے برادرانہ جذبات کے پیچھے سیاسی رقابت کی خاندانی روایات کو سمجھتے تھے اچھی طرح جانتے تھے کہ باپ جب تک زندہ ہو بیٹا اس کا جانشین نہیں ہوسکتا اور بڑے بھائی کے ہوتے چھوٹا بھائی اس کی جگہ نہیں لے سکتا۔ خداداد عباسی بھی جانتا ہوگا کہ سیاست میں رشتوں کی جذباتی اہمیت کچھ نہیں ہوتی۔ وقت کے ساتھ ساتھ سازشی عناصر کے حربے بدل رہے ہیں۔ رشوت اور لالچ کے ساتھ اب تشدد اور بلیک میلنگ کا عنصر بھی کامیابی کی منزل تک پہنچنے کا جائز وسیلہ سمجھا جاتا ہے۔ وہ اس لیے بھائی کو ہر جگہ ہر وقت اپنے ساتھ رکھتا تھا کہ ایک طرف تو دنیا کے سامنے ان کے باہمی اعتماد واتحاد کی مثال ہو لیکن درحقیقت یہ عدم اعتماد کا نتیجہ تھا کہ خداداد عباسی بھائی کو اکیلا چھوڑتے ہوئے ڈرتا تھا۔ اس طرح بظاہر چھوٹا بھائی اپنے بڑے بھائی کا محافظ تھا مگر اصل معاملہ اس کے برعکس تھا کہ بڑا بھائی ہر وقت اپنے چھوٹے بھائی پر خود نظر رکھتا تھا۔

مجھے راولپنڈی کے عام راستوں سے واقفیت تھی۔ کسی اچھے ہوٹل میں جاکے ہم آسانی سے کرائے کی کار بھی لے سکتے تھے مگر نازو بجا طور پر آج رات یہاں رُکنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ گزشتہ شب ہم نے تھوڑا بہت آرام کرلیا تھا۔ آج رات ہم سفر کے دوران بے فکری سے کار کی پچھلی سیٹ پر سوسکتے تھے۔ چیکنگ سے بچ کر نکل جانے کے لیے آدھی رات کے بعد کا وقت ہر لحاظ سے موزوں تھا۔

بھاری سوٹ کیس اُٹھا کے چلنا میرے لیے مشکل ہورہا تھا اور ابھی تک مجھے کسی کار رینٹل سروس کا پتا نہیں چلا تھا۔ ایک ٹیکسی والے نے ہمیں صدر جانے کا مشورہ دیا اور خود ہی ہمیں صدر لے گیا۔ رات کے ساڑھے نو بجے تھے اور صدر بازار کی رونق ماند پڑچکی تھی۔ اب صرف ہوٹل ریسٹورنٹ کھلے ہوئے تھے یا پان سگریٹ کی دُکانیں۔ میرے ذہن میں ایک خیال میک اپ سے چہرہ اور حُلیہ بدلنے کا بھی تھا۔ اتنی رات گئے کچھ ہو نہیں سکتا تھا لیکن خدا بڑا مسبب الاسباب ہے۔ اچانک میں نے ایک درزی کی دُکان دیکھی جہاں سلے ہوئے کپڑوں کا ڈھیر تھا۔ کام زیادہ ہونے کی وجہ سے ٹیلر ماسٹر بھی مصروف تھا اور کاریگر بھی سر جھکائے سلائی کررہے تھے۔

میں نے اندر داخل ہونے سے پہلے نازو سے مشورہ بھی نہیں کیا۔ وہ مجبوراً میرے پیچھے اندر آگئی۔ ٹیلر ماسٹر نے مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

میں نے کہا "ماسٹر صاحب۔ شیروانی کتنے کی ہے؟"

اس نے خوش دلی سے کہا "سر۔ ہم کپڑے سیتے ہیں' بیچتے نہیں۔"

"میں نے بھی صرف قیمت پوچھی ہے۔ کسی دُلہا کے کپڑے ہیں یہ سب؟" میں نے کہا "باہر کا کپڑا ہے؟"

"ہاں جی۔ کپڑا پاکستانی سلک ہے۔ سلائی ملا کے سوا چار ہزار میں سب تیار ہوا ہے۔"

میں نے آگے جھک کر کہا "اگر میں آپ کو دُگنی قیمت دوں؟"

وہ بھونچکا رہ گیا "دُگنی قیمت؟"

"بات قیمت کی نہیں' میری ضرورت کی ہے۔ فائدہ آپ اُٹھا سکتے ہیں اگر یہ کپڑے فوراً یعنی کل پرسوں دینے کے نہیں ہیں۔ تو آپ پھر تیار کرسکتے ہیں۔ میرے پاس وقت نہیں ہے۔ میں دس ہزار تک دے سکتا ہوں۔"

وہ بوکھلا کے نازو کو دیکھنے لگا "اتنی جلدی ہے آپ کو۔ آج رات ہی شادی کا ارادہ ہے کیا؟"

میں نے ہنس کے کہا "نہیں۔ کل پرسوں میں کسی قیامت کے آنے کی پیش گوئی نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ صبح میری فلائٹ ہے کینیڈا کے لیے۔ شادی وہاں ہوگی اور میں چاہتا ہوں کہ اسی طرح ہو جیسے پاکستان میں ہوتی ہے۔ دُلہا دلہن تو وہاں پاکستانی مل جاتے ہیں قاضی اور باراتی سب دستیاب ہیں۔ بس ایسے ملبوسات نہیں ملتے۔"

اس نے نازو کی طرف دیکھا "دلہن کے جوڑے خرید لیے ہیں آپ نے؟"

"بھائی وہ میں کیوں خریدوں گا۔" میں نے کہا "اس کے ماں باپ بلکہ ہر لڑکی کے ماں باپ بہت پہلے سے تیاری شروع کرتے ہیں۔ یہ تو میں ہی ہوں جس کے آگے پیچھے فکر کرنے والا کوئی نہیں تھا اور مجھے اپنی شادی کا پہلے سے کوئی تجربہ نہیں ہے۔"

وہ بولا "لیکن شیروانی... ایسے ہر ایک کو فٹ نہیں آتی۔"

میں نے کہا "تھوڑا بہت فرق چلے گا۔ تنگ ہوگی تو میں اپنا وزن پانچ دس پاؤنڈز کم کرلوں گا۔ ڈھیلی ہوئی تو اندر کچھ پہن لوں گا اضافی۔"

"ٹھیک ہے جی۔ ایسی بات ہے تو آپ لے جائیں۔ اس کی ڈلیوری تین دن بعد تھی" اس نے لباس اتار کے پیک کرنا شروع کردیا "آپ کی دلہن کو شاید یہ لباس زیادہ پسند نہیں آیا اس لیے خاموش ہیں۔"

میں نے کہا "لاحول ولا قوۃ۔ یہ بہن ہے میری اور خدا نہ کرے کہ ایسی فضول دلہن ہو میری... یا کسی کی۔"

وہ ہنسنے لگا "آئی ایم سوری۔ لیکن ماشاءاللہ آپ کی بہن بھی لاکھوں میں ایک ہیں۔"

نازو نے اسے سوٹ کیس میں سے دس ہزار دینے چاہے تو اس نے پورے سوا چار ہزار لیے "کمائی تو سارا سال کرتے ہیں سر۔ اس سودے میں کون سا نقصان ہوا ہے مجھے۔ محنت تو پوری مل گئی لیکن تھوڑی سی خوشی اضافی ملی جیسے کہ ہم نے باہر رہنے والے کسی پاکستانی بھائی کی شادی میں شرکت کرلی۔ اللہ مبارک کرے۔"

ایسا اکثر ہوتا تھا۔ سب لوگ لالچی اور خود غرض اور جھوٹے نہیں تھے۔ ان سے کوئی بے ضرر سا جھوٹ بول کے بھی شرمندگی ہوتی تھی۔

نازو باہر آتے ہی بگڑ گئی "یعنی اب آپ دُلہا بن کے جائیں گے؟ کیا خیال ہے رابعہ کو فون نہ کردوں؟ وہ بھی تیار رہے۔ قاضی کے ساتھ آپ کا استقبال کرے۔"

میں نے کہا "اجی وہ تو ہردم تیار ہے گلے پڑنے کو۔ ہم ہی ٹالتے رہتے ہیں۔ مصیبت جتنی دیر سے آئے اچھا ہے۔"

"پھر یہ شوق کیسا۔؟"

"وہ جو کہا ہے نا غالب صاحب نے' تمہارے والے صحافی غالب نے نہیں۔ اصلی تے وڈے غالب نے ۔ نہ سہی وصل تو حسرت ہی سہی۔ ساری عمر لوگوں کی شادیوں میں قورمے پلاؤ بھی کھاتے ہی رہے ہیں۔ ایک دن دُلہا کا لباس پہن لیا تو کیا ہوا۔"

"اور یہ لباس پہن کے آپ میرے ساتھ بیٹھیں گے؟ ہرگز نہیں۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے۔ تم میرے ساتھ بیٹھ جانا۔ یا آگے بیٹھ جاؤں گا میں۔ ورنہ ڈکی میں جگہ ہوگی تمہارے لیے۔ چلو اب غصہ تھوک دو تاکہ ہم کھانا کھالیں کہیں' پھر چلتے ہیں۔"

"مجھے بالکل بھوک نہیں ہے" نازو نے خفگی سے کہا۔

وہ واقعی بہت اپ سیٹ تھی۔ میری باتوں نے اسے غالب کی طرف سے متفکر کردیا تھا۔ اسے رابعہ کی تشویش لاحق ہوگئی تھی۔ اس پر پیڈرو کی موت کا اثر تھا اور وہ ولاور کے خیال سے پریشان تھی جس نے ہمارے ایک اور دشمن ملک نبی داد عباسی سے ملاقات کی تھی۔ اس کا خیال غلط نہیں تھا کہ ہم نے راولپنڈی آکے جھک ماری۔ اصل مقصد حاصل نہیں ہوا۔ دشمن بلاوجہ بنالیے۔

میں نے اسے سمجھایا "دیکھو آدمی کے ذہن میں خیال تو آتا ہی ہے مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ جو ذہن میں آئے وہ سچ بھی ثابت ہوجائے۔ آخر رابعہ اور غالب بھی ماشاء اللہ سے عاقل وبالغ ہیں اور کسی چوہدری دلاور سے کم بھی نہیں۔ اپنے دفاع کے لیے کچھ انہوں نے بھی کیا ہوگا' یہ ساری باتیں معلوم ہوجانے کے بعد۔ چوہدری دلاور کا نبی داد سے ملنا صرف ایک سیاسی نوعیت کی رسمی ملاقات بھی ہوسکتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ ہیں تو ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے۔"

میری باتوں سے نازو کو کچھ قرار آیا۔ "اگر ایف آئی آر میں ان کا نام نہ ہو' پولیس تو پھر بھی پکڑ سکتی ہے انہیں' شک میں۔"

میں نے اِدھر اُدھر دیکھ کے کہا "شک میں تو وہ ہمیں اسی وقت پکڑ سکتے ہیں۔ ہم بہن بھائی نہیں' گھر سے بھاگے ہوئے عاشق معشوق لگتے ہیں۔ شریف آدمی اعتبار کرلیتا ہے۔ پولیس والے ثبوت مانگتے ہیں۔"

نازو نے مسکرا کے کہا "ابھی ایک لاکھ ثبوت باقی ہیں سوٹ کیس میں۔"

"چلو اب تمہاری خفگی تو دور ہوگئی' کچھ کھالو۔"

"نہیں' میں کافی پی لوں گی۔ سینڈوچ کھالوں گی۔"

"پندرہ بیس کافی ہوں گے" میں نے کہا "کافی سے تو پیٹ نہیں بھرتا۔"

کھانے کے بعد میں نازو کو ائرپورٹ لے گیا۔ یہ سارا پروگرام میں نے باتوں کے دوران بنالیا تھا۔ پورٹر نے سوٹ کیس ڈیپارچر لاؤنج میں پہنچادیا تھا۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ ہم رات کی کسی فلائٹ سے جارہے ہوں گے۔ اسے میں خود دوسری طرف لے گیا جہاں۔۔۔ "بین الاقوامی آمد" کا بورڈ آویزاں تھا۔

میں نے نازو سے کہا "اب جیسا میں کہوں ویسا کرو۔ تم جاؤ لیڈیز ٹائلٹ میں اور یہ سوٹ کیس ساتھ رکھو۔ اس میں جو لباس سب سے اچھا ہو وہ پہن لو۔ میں یہ لباسِ عروسی زیبِ تن فرماتا ہوں۔"

"سکندر۔ آخر اس کی کیا ضرورت ہے؟"

میں نے اسے ڈانٹا "بے وقوف لڑکی۔ یہ صرف دُلہا کا لباس نہیں۔ خاندانی نواب' زمیندار' پُرانے وضع دار قسم کے رئیس آج بھی یہ لباس پہنتے ہیں۔ ہم ہیں خانزادہ اورنگزیب عثمانی آف سابق حیدر آباد دکن۔ فرانس میں رہتے ہیں اور پاکستان میں اپنے کزن خانزادہ عالمگیر عثمانی کی شادی کے لیے تشریف لائے ہیں۔ تم بھی ہماری کزن ہو اور یہاں ہماری پروٹوکول افسر' گائیڈ' سیکریٹری اور پی آر او۔"

"بیک وقت چار عہدے" نازو ہنسی "اور جناب اورنگزیب کے کزن عالمگیر کی شادی کہاں ہے؟"

"یہاں سے ہم اوکاڑے جائیں گے۔ سابق والیِ دکن کے خاندان کے سب ہی افراد مختلف ممالک میں سیٹل ہوچکے ہیں جیسے راجا صاحب محمود آباد کی فیملی کے کچھ لوگ آسٹریلیا میں بھیڑوں کے فارم کے مالک ہیں۔ ہمارا کزن اوکاڑہ میں ڈیری فارم چلارہا ہے۔ ہم ٹیکساس میں رینچ ہاؤس کے مالک ہیں۔ اگر ہم سب پاکستان میں ہوتے تو گڈریے۔ گوالے اور سائیس وغیرہ کہلاتے۔"

پندرہ منٹ بعد میں بڑی رئیسانہ شان کے ساتھ آف وائٹ سِلک کی شیروانی۔ پاجامے اور طرح دار کُلاہ سجائے کھڑا تھا اور نازو نے بڑی عقلمندی سے کام لیتے ہوئے زنانہ شلوار پر مردانہ قمیص پہن لی تھی اور بال کھلے چھوڑ دیے تھے۔ لاابالی پن اور بے نیازی کا یہ انداز بیک وقت فیشن اور اس کے پوش فیملی سے تعلق کی دلیل بن گیا تھا۔ احساسِ کمتری کے مارے ہوئے تنگ نظر لوگ ہمیں گھورتے رہے' ہماری بلا سے۔

میں نے انگریزی میں "ویلکم ٹو پاکستان سر۔ یو وانٹ اے ٹیکسی" کہنے والے ٹیکسی ڈرائیور سے فرنچ میں بات کی تو وہ بوکھلا گیا۔

نازو ہنس پڑی "اوڈیئر خان زادہ صاحب۔ وس از ناٹ پیرس۔ یہاں فرنچ کوئی نہیں جانتا۔"

میں نے خفت سے کہا "سوری بھئی۔ اب تم ہی بات کرلو کزن۔"

اوکاڑے کا تُن کے ٹیکسی ڈرائیور شش وپنج میں مبتلا ہوگیا۔ اس کی بہت قیمتی کار تھی جسے وہ ٹھیکے پر چلاتا تھا۔ دن میں گاڑی مالک کے پاس رہتی تھی۔ رات کو وہ ائرپورٹ پر کسی مسافر کو بک کرلیتا تھا اور کسی ٹورسٹ سے بات ہوجاتی تھی تو مالک دو چار دن بغیر گاڑی کے بھی گزارلیتا تھا۔

"سرآپ ایسا کیوں نہیں کرتے' ابھی لاہور چلیں۔ چند گھنٹے کسی ہوٹل میں قیام فرمائیں۔ صبح آرام سے اوکاڑے پہنچادوں گا۔ صرف ستر میل ہے وہاں سے۔"

"ہم جانتے ہیں ایڈیٹ۔ ہمارا کزن خانزادہ عالمگیر عثمانی وہاں بہت بڑے ڈیری فارم کا مالک ہے۔ مگر کیا رات کو لاہور شیرٹن میں جگہ مل جائے گی۔"

"شیرٹن۔۔۔ لاہور میں تو فلیٹیز ہے سر۔"

نازو نے کہا "ڈیئر کزن۔ لاہور میں سرشاہ دین کے پوتے جمال شاہ ہیں۔۔۔۔ اور چیف سیکریٹری بھی آپ کے والد کی سوتیلی خالہ کے نواسے ہیں۔ وہ خوش ہوں گے۔"

میں نے سوچ کے کہا "پھر لاہور چلو۔"

یہ ایکٹنگ ہمارے بہت کام آئی۔ راستے میں تین جگہ چیکنگ ہوئی۔ میں نے نازو کو روک دیا اور ڈرائیور سے کہا "ان کو بتاؤ' ہم کون ہیں؟"

ڈرائیور پہلے ہی مرعوب تھا۔ اس نے کہا "یہ تو پیرس سے آئے ہیں ابھی ابھی۔ میں چک لالہ ائرپورٹ سے لایا ہوں۔ خانزادہ اورنگ زیب عثمانی۔ اور ساتھ میں ان کی کزن۔ اوکاڑے میں ان کے کزن خانزادہ عالمگیر عثمانی کا ڈیری فارم ہے۔"

پولیس والے نے بیزاری سے کہا "او بابا جاؤ خدا کے لیے۔ اتنے لمبے لمبے نام۔۔۔"

ڈرائیور نے کہا "معاملہ کیا ہے سرجی!"

"اوئے اویں وخت ڈال دیا ہے۔ وہ تمہارے خانزادہ جیسا نواب زادہ حرام زادہ۔ ملک خداداد عباسی قتل ہوگیا ہے۔ قتل تو ہونا تھا اسے۔ اب آرڈر ہے کہ سڑک پر پنڈی لاہور آتے جاتے لوگوں پر نظر رکھو۔ قاتل فرار نہ ہوجائے۔" پولیس والے نے اخبار اس کے سامنے کردیا "یہ بندہ کہیں دیکھا تو نہیں؟"

میرا دل بیٹھ گیا کیونکہ ٹیکسی ڈرائیور نے اخبار کو غور سے دیکھ کے میری طرف دیکھا تھا۔ یہ دوسرا اخبار تھا یا اگلے دن کا۔ اس میں وہی اشتہار تھا مگر میں نے دو چوکھٹوں میں دو تصویریں دیکھ لی تھیں۔ جب ٹیکسی ڈرائیور نے نفی میں سر ہلایا تو میں نے سکون کا سانس لیا۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی اس کا رویّہ بدل گیا "تو آپ ہیں خانزادہ اورنگزیب عثمانی۔ پیرس سے آئے ہیں۔"

میں نے کہا "شک کی کیا بات ہے اس میں۔"

اس نے پلٹ کے کہا "تمہاری تصویریں دیکھ لی تھیں میں نے اخبار میں۔ تم بہروپ بدلنے کے ماہر ہو۔"

"پھر تم نے پولیس کو بتایا کیوں نہیں؟"

"اس لیے کہ پہلے میں کچھ اور کہہ چکا تھا۔ میں جھوٹ بول کے پھنس گیا تھا۔ وہ تمہارے ساتھ مجھے بھی گرفتار کرلیتے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ ایک وزیر کا قتل ہوا ہے۔"

"ابھی وہ وزیر بنا نہیں تھا۔ نامزد ہوا تھا۔"

"اسمبلی کا ممبر تو تھا۔ تم نے اسے لوٹا اور قتل کیا اور بیٹھ گئے میری گاڑی میں" وہ فریادی لہجے میں بولا "مجھے مروادیا نا۔ چلو اب اتر جاؤ۔"

"کیا مطلب؟ یہاں جنگل میں اُتر جائیں۔" نازو نے کہا "پاگل ہوئے ہو۔"

"پاگل ہونا اچھا ہے تمہارے ساتھ جیل جانے سے۔"

"دیکھو اب تم واپس نہیں جاسکتے۔ پولیس تم سے پوچھے گی کہ خانزادہ اورنگزیب عثمانی کو اتنی جلدی اوکاڑہ پہنچا کے لوٹ آئے' ڈیری فارم تک۔"

"اُف میری تقدیر۔" اس نے سر پر ہاتھ مارا۔

میں نے کہا "اب تمہارے حق میں یہی بہتر ہے کہ اعتماد سے کام لو۔ رات کا وقت ہے۔ کوئی بھی ہمارے چہرے غور سے نہیں دیکھ رہا ہے۔"

"نہیں جی۔ ایک جگہ میں بچ گیا۔ دوسری جگہ پکڑ" یا پھر؟"

میں نے کہا "حوصلہ رکھو گے تو نہیں پکڑے جاؤ گے اور صبح واپس آؤ گے تو تمہاری جیب میں پانچ ہزار ہوں گے۔"

"میں لعنت بھیجتا ہوں پانچ ہزار پر۔"

"اب پیچھے مڑ کے مت دیکھنا" میں نے کہا "صرف ہاں یا نہ میں جواب چاہیے مجھے' دس ہزار لو گے؟"

وہ خوف زدہ ہوگیا "آپ سمجھتے کیوں نہیں؟"

"انکار کی صورت میں ہم تمہیں زبردستی لے جائیں گے۔ خواہ تمہیں مار کے تمہاری لاش ڈکی میں ڈالنی پڑے" میں نے کہا "اگلی چیک پوسٹ سے پہلے ڈرائیونگ خاتون کے سپرد کردینا۔ خود ساتھ بیٹھ جانا۔ جہاں وضاحت کی ضرورت ہو وہی کہنا جو پہلے کہا تھا تاکہ تمہارے بیان میں فرق سے کوئی مشکل پیدا نہ ہو۔ تم نے بیان بدلا تو ہم بہرحال نکل جائیں گے۔ تم وہیں پڑے رہ جاؤ گے۔ اس پولیس مین کے ساتھ۔ پھر وہ پیچھا کرکے دیکھ لیں یا فائرنگ کرکے۔ یوں ہم کسی کے ہاتھ آنے والے نہیں ہیں لیکن مرنے سے بھی کون ڈرتا ہے۔"

اب اس کی حالت غیر ہوگئی۔ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔

وہ بُری طرح پھنس گیا تھا۔ پولیس کے سامنے اقرار کر کے بھی اور ہمیں انکار کر کے بھی۔ میرے ہاتھ میں کچھ نہیں تھا مگر اس کو نفسیاتی خوف نے یقین دلادیا کہ میرے پاس کوئی جان لیوا آتشیں اسلحہ ہے۔ ایسے لوگوں کے ہاتھ میں پھول تو ہوتے نہیں۔

"دیکھو.... اگر تمہارے ساتھ میں پکڑا جاؤں۔ تو خدا کے لیے مجھ پر رحم کرنا۔ یہ کہہ دینا کہ میرا تم سے کوئی تعلق نہیں اور تم نے ہی مجھے جھوٹ بولنے پر مجبور کیا تھا۔ گن پوائنٹ پر۔ میرا جھوٹ چل جائے اور تم خیریت سے لاہور میں اُتر جاؤ تو پھر مجھے انعام ضرور دینا۔"

"اسے انعام کہنا غلط ہوگا۔ وہ معاوضہ کہلائے گا۔ اس رسک کا جو تم نے مجبوراً لیا۔ بلاوجہ ہم کسی سے زیادتی نہیں کرتے اس لیے دس ہزار بھی دے دیں گے حالانکہ تم نے تو ان پر لعنت بھیج دی تھی۔"

"وہ....وہ غصّے میں کہا تھا میں نے" وہ پچھتانے لگا۔

جہلم کے بعد دوسری بار ہمیں گوجرانوالہ سے کچھ پہلے روکا گیا۔ وہاں سڑک کے کنارے ایک ہی پولیس کی گاڑی تھی جس پر نیلی روشنی گھوم رہی تھی۔ مجھے پولیس کا یہ طریقہ پسند آیا کہ وہ بزدلوں کی طرح چھپ کے کارروائی نہیں کرتے۔ بہادروں کی طرح فلیشر آن کر کے کھڑے ہو جاتے ہیں اور مجرموں کو پہلے سے بتا دیتے ہیں کہ خبردار، ہم کھڑے ہیں یہاں۔ سوچ سمجھ کے آگے آنا۔ ملزم سمجھ دار ہو تو راستہ کاٹ کے نکل جائے۔

میں نے کہا "گاڑی روکو۔ آگے پولیس کھڑی ہے۔"

"اور کوئی راستہ نہیں ہے۔"

میں نے اسے جھاڑ پلائی "تم سے اپنی عقل استعمال کرنے کو کس نے کہا ہے۔ تم صرف گاڑی چلاؤ۔ بلاوجہ زبان مت چلاؤ۔"

اس نے گاڑی روک لی۔ میں اُتر کے ڈکی میں لیٹ گیا۔ اس سے نازو کے لیے بہت آسانی ہوگئی۔ پولیس نے گاڑی روک کے ٹارچ کی روشنی میں اندر دیکھا اور بنظر غائر ان دونوں کی اشکال ملاحظہ فرمائیں۔

نازو نے روتے ہوئے لہجے میں کہا "اب اور دیر مت کرو۔ میری ماں کا آخری وقت ہے میو اسپتال میں۔ اس کی جان میرے انتظار میں اٹکی ہوئی ہے۔"

پولیس افسر اتنی حسین عورت کی آنکھوں میں آنسو نہ دیکھ سکا اور خود بھی آبدیدہ ہوگیا۔ "سوری میڈم۔ ہم بھی مجبور ہیں لیکن آپ جائیں، آرڈر تو سخت تلاشی کے ہیں۔"

گاڑی آگے بڑھی اور پھر رک گئی۔ میں ڈکی سے نکل کے دوبارہ نازو کے ساتھ آبیٹھا۔ دُلہا کا لباس اسپیئر وہیل، جیک اور آئل کے ڈبے پر لیٹنے سے داغ دار ہوگیا تھا۔

نازو نے میری اس طرف توجہ دلائی "یہ تو برباد ہوگیا۔"

"ہاں۔ میں نے سوچا تھا اپنی بربادی.... میرا مطلب ہے شادی خانہ آبادی پر چل جائے گا۔"

"اس کی فی الحال کوئی اُمید نہیں۔ زندگی کے دن ہی کتنے رہ گئے ہیں تمہارے؟" نازو نے کہا۔

"چلو غالب پہن لے گا دُھلوا کے۔ کچھ خرچہ بچ جائے گا۔ ویسے بھی ساری عمر لنڈے کے سیکنڈ ہینڈ کپڑے پہنتا رہا ہے۔ میں نے تو کہا تھا کہ بیوی بھی وہیں دیکھو۔ شاید کسی اسکرٹ میں سے میم بھی نکل آئے۔ ایک بار مجھے پُرانے کوٹ میں سے دس ڈالر ملے تھے۔"

"مگر اسے کوئی بھوت کی بچّی ہی چاہیے" نازو بولی۔

میں بے اختیار قہقہہ مارتے مارتے رہ گیا۔ کہاں وہ حال کہ غالب کے مذاق پر نازو چراغ پا ہو جاتی تھی اور اسی بات پر ان کی سال میں تین سو پینسٹھ بار لڑائی ہو چکی تھی۔ کہاں یہ کہ وہ خود غالب کی بات دُہرا رہی تھی۔ یہ غالباً ہجر کے جذبات کا ردِعمل تھا۔ جب لڑنے والا یاد آیا تو اس کی بات یاد آگئی۔

شاہدرے کے پُل پر مجھے سخت ترین چیکنگ کا اندیشہ تھا مگر منزل کے قریب پہنچ کے ڈرائیور کو دس ہزار کے نوٹوں کی خوشبو اپنی جیب سے آنے لگی تھی۔ اس میں غیر معمولی ہمت اور حاضر دماغی پیدا ہوگئی۔ نازو سے پہلے اس نے کہا۔ "سرجی۔ بڑا نازک معاملہ ہے۔ یہ اپنے وزیر آباد کے ڈی ایس پی نثار علی کی بہن ہیں۔ میو اسپتال پہنچنا ہے۔ ان کی بڑی بہن، اللہ کرے زندہ مل جائیں۔ کینسر کا موذی مرض تھا۔ آخری وقت ہے۔"

پولیس افسر نے ٹارچ سے نازو کی روتی شکل دیکھی اور فوراً پیچھے ہٹ کے راستہ دے دیا "جاؤ جاؤ۔ اللہ خیر کرے۔"

بادشاہی مسجد اور مینار پاکستان والی سڑک پر آتے ہی میں پھر ڈکی سے نکل کے سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میرے کپڑوں پر بریک آئل بھی لگ گیا تھا۔

نازو نے کہا "اب تو دُلہا کا لباس چولہے میں جھونکنے کے قابل ہوگیا۔"

میں نے کہا "چلو غالب دوسری شادی میں پہن لے گا.... میرا مطلب ہے۔ خدانخواستہ ایسا موقع آیا تو.... ایسے خوش قسمت کم ہوتے ہیں مگر...."

نازو نے غصّے میں کہا "بار بار غالب کو کیوں بیچ میں لاتے ہو۔"

"اس لیے کہ تم نے پہلے ہی مجھے آؤٹ کردیا ہے کہ اب میرے دن تو پورے ہوگئے۔ ایک مرگِ ناگہانی اور ہے۔"

"فضول باتیں مت کرو۔ یہ بتاؤ کہاں جانا ہے؟"

"وہیں جہاں سب کو جانا ہے.... میرا مطلب ہے تمہیں اور مجھے۔ رابعہ اور غالب اس وقت کہاں ہوں گے۔"

"وقار یوسف کے یا منظر کے گھر اور کہاں؟"

"کچھ پتا نہیں نازو۔ آج کل بھروسا کسی پر نہیں کرنا چاہیے۔ غالب کو کیا پتا کہ تم نہار منہ نازل ہو جاؤ گی۔ وہ آزادی کا ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے خواب میں عیش کر رہا ہو۔"

نازو ہنس پڑی "تم خواب میں کیا کرتے ہو، عبادت؟"

ڈرائیور ہماری باتیں نہیں سُن سکتا تھا۔ ہم آہستہ آہستہ ایک دوسرے کے کان میں بولتے تھے اور انگریزی بول رہے تھے۔ اس نے داتا دربار کے پاس گاڑی روک دی۔

"لو جی لہور آگیا۔ اب آگے جانے سے پہلے حساب صاف کردو۔ یہ داتا صاحبؒ کا مزار شریف ہے۔ یہاں معاملہ کھرا اور ایمانداری سے ہونا چاہیے۔"

"ہم کھرے اور ایماندار لوگ ہیں۔"

"نہیں جی۔ اِدھر تو داتا صاحب کی ضمانت ہے مجھے۔ آپ کا کیا ہے دس ہزار کے لیے گولی مار کے چلے جاؤ۔"

میں نے کہا "اوئے پاگل خانے۔ خالی ہاتھوں سے گولی ماریں گے تو تم مرو گے نہیں۔ مگر ہمارے پاس تو گولی بھی نہیں ہے" میں نے کہا "بے شک تلاشی لے لو۔"

اس نے مجھے بے یقینی سے دیکھا "اویں دفعہ پر کانوے لگادی تھی مجھ پر خیر۔ اب میں آگے ایک گز نہیں جانے والا۔"

وہ گاڑی سے اُتر گیا تو ہم بھی اُتر گئے۔ پہلے میرا ارادہ تھا کہ اسے تھوڑا سا پریشان کرنے کے لیے ہاتھ ملا کے کہوں کہ "اچھا تو پھر رب راکھا۔" مگر نازو نے اسے دس ہزار سوٹ کیس میں سے نکال کے پکڑا دیے۔ اس نے نوٹوں کو چوم کے کہا "واہ رب جی۔ تُو سب کے کام بنانے والا ہے۔ اب خیر سے اپنا بھی بینڈ بج جائے گا۔ چلو بیٹھو" وہ پھر بیٹھتے ہوئے بولا۔

میں نے انکار کردیا "تم نے بے عزتی کی ہے ہماری۔"

وہ ہنس پڑا "کیا بے عزتی کی ہے؟"

"تم نے ہمیں جھوٹا اور بے ایمان سمجھا۔ ہم تمہارے ساتھ نہیں جائیں گے۔"

اس نے گاڑی اسٹارٹ کر کے کہا "تو نہ جاؤ۔ آئے بڑے عزت دار مجھے بھی واپس جانا ہے۔"

وہ گاڑی کو نصف دائرے میں گھما کے خوشی سے گاڑی دوڑاتا ہوا نکل گیا۔ جاتے جاتے اس نے ہاتھ بھی ہلایا اور نازو کی طرف ایک ہوائی بوسہ بھی ارسال کیا۔ دس ہزار اس کے لیے بہت بڑی دولت تھی اور شاید اس کی شادی کا بینڈ اسی لیے نہیں بج رہا تھا کہ وہ قلاش تھا۔ وہ بے حد خوش اور EXCITED تھا۔

میں بھی اس کو وقار یوسف یا منظر کے گھر تک لے جانا نہیں چاہتا تھا۔ اس وقت صبح کے ساڑھے چار بجے تھے اور سحر خیز لوگ سڑکوں پر نظر آنے لگے تھے۔ آوازِ اذاں کے ساتھ ہی جیسے دن کے آغاز کا اعلان ہوا۔ داتا صاحبؒ کی گلی سے ایک شخص بگل مارے نمودار ہوا۔ ہمارے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے "السّلام علیکم" کے بعد پوچھا "کدھر جاؤ گے باؤ جی۔" میں نے گلبرگ کا کہا تو اس نے کہا "بس میں آیا ایک منٹ میں گڈی لے کے۔"

اس کی ٹیکسی شاید قریب ہی کہیں موجود تھی۔ ہم دس منٹ کھڑے رہے۔ اس دوران دو ٹیکسیاں گزر گئیں مگر ہم نے اس کے وعدے پر کسی کو بھی نہیں روکا۔ بالآخر وہ آگیا۔ ابھی ہم ایک فرلانگ بھی نہیں گئے ہوں گے کہ پہلے وہ پیٹرول ڈلوانے کے لیے رُکا۔ پھر اس نے ہوا بھروائی۔ وہاں سے چلتے ہی ایک ٹائر پنکچر ہوگیا اور ہر بار اس نے کہا "بس جی ایک منٹ" اپنے مخصوص لہجے میں وہ منٹ کو MINT کی طرح بولتا تھا اور یہ ایک منٹ دس پندرہ منٹ کا ہوتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ پہیہ بدلنے کے لیے ڈکی سے اسٹپنی اور جیک وغیرہ نکال رہا ہوگا مگر وہ غائب ہوگیا۔ دیکھا تو وہ پنکچر شدہ اسٹپنی کو لڑھکاتا ہوا بہت دور جا چکا تھا۔ اسے لات مار کے پہیّے کو سڑک پر رواں رکھنے میں خصوصی مہارت تھی۔ ہم اب ٹیکسی کو چھوڑ کے بھی نہیں جا سکتے تھے۔ وہ پنکچر لگوا کے لوٹا پھر اس نے ٹائر بدلا۔ اس وقت تک دن کا اُجالا ہر طرف پھیل چکا تھا۔

آدھے گھنٹے کا فاصلہ ہم نے ڈیڑھ گھنٹے میں طے کیا۔ اگر ہم تانگا پکڑ لیتے تو شاید بہت پہلے پہنچ جاتے۔ نہار منہ سب کو جگا کے حیران کرنے کا مزہ جاتا رہا۔ غالب چھت پر کسی تنہا اُلّو کی طرح اداس بیٹھا تھا۔ اس نے ٹیکسی کو ادھر آتے دیکھ کر ہی سمجھ لیا تھا کہ مجنوں اور شیریں آگئے۔ اس نے چلّا کے لیلیٰ کو پکارا اور خود فرہاد کی طرح لپکا۔ اس شور سے نکی اور وقار یوسف کا بیدار ہونا لازمی تھا۔

میں نے رابعہ کو دیکھ کے مسرت کا اظہار کیا "بھئی ہم تو سمجھ رہے تھے کہ حوالات میں ملو گی۔ خود نازو کا اصرار تھا کہ سیدھے حوالات ہی جاتے ہیں۔ غالب بھی ہوگا وہیں۔"

غالب نے کہا "تم چاہو تو حوالات کے اندر بھی جا سکتے ہو۔"

نکی نے خفگی سے کہا "بھئی یہ کیا منحوس باتیں شروع کردی ہیں تم نے ملتے ہی۔ نہ سلام دعا، نہ خیریت۔"

میں نے کہا "سابق مِس نکی اور اب مسز وقار۔ ہم بدتمیزوں کی فکر مت کرو۔ تم اپنا اخلاقی فرض مت بھولو۔ صبح دم تمہارے گھر میں رحمت کے فرشتے یعنی مہمان آئے ہیں۔ اللہ کا نام لے کر خاطر تواضع میں لگ جاؤ۔"

اچھا ناشتا کرلو۔ پھر آج میں فیصلہ کرا کے چھوڑوں گی۔ آخر کب تک چلیں گی ایسی حرکتیں۔ اپنی جان عذاب میں، دوسروں کی بھی۔"

"آہ!" وقار نے کہا "میری بات مت کرنا، ظالم۔"

"کیوں۔ تمہاری جان کس عذاب میں ہے؟" وہ جاتے جاتے پلٹی۔

"وہ بس ایسے ہی آہ نکل گئی۔ خیال آگیا اپنے شادی شدہ ہونے کا۔" وقار نے کہا۔

"میں ظالم ہوں۔ ظلم کرتی ہوں تم پر۔"

"نہیں بھائی۔ تم تو وہی کرتی ہو جو سب بیویاں کرتی ہیں۔ ظلم نہ کہو اس کو۔ ستم کہہ لو۔ جو جی چاہے کہو، کرم کہہ لو۔"

انتقامی جذبات کی شدت کا بخوبی اندازہ تھا۔ اگر پیڈرو تعاون نہ کرتا تو یقیناً اس کی موت انتہائی اذیت ناک ہوتی۔ دلاور کو اس سے دو فائدے ہوتے۔ اس کا ایک کتّا جسے وہ دھتکارتا تھا مگر وہ بار بار لوٹ کے اس کے پاس آتا تھا ہمارے ہاتھوں ختم ہو جاتا شاید وہ خود اسے مارنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے دوسرا فائدہ یہ ہوتا کہ پیڈرو کے خون سے انتقام کی اس آگ کے شعلے کچھ سرد پڑ جاتے جو میرے دل میں دہک رہی تھی۔ چوہدری دلاور کی صرف پہلی توقع پوری ہوئی۔"

"کیا مطلب... تم نے پیڈرو کو مار دیا؟" غالب چونکا۔

"نہیں' اسے میں نے نہیں مارا۔"

"پھر کیا نازو نے؟" وقار بولا۔

"نہیں۔ اسے دستِ اجل نے مارا۔ بے شک وہ حادثاتی موت تھی لیکن ہم کسی طرح بھی اس کے ذمّے دار نہیں تھے۔" میں نے کہا "نہ ہم ایسا چاہتے تھے۔ پیڈرو کو آخر تک ہماری نیت پر شک رہا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کو قتل کرنا ضروری نہیں رہا تھا۔ شاید اس کا زندہ رہنا ہمارے لیے زیادہ کار آمد ہوتا۔"

"پہیلیوں میں باتیں مت کرو۔"

میں نے کہا "ابھی سب بتاتا ہوں۔ نکی بھی آجائے۔"

"میں آگئی" نکی ٹرے سمیت افراتفری میں اندر آئی "میرے کانوں نے کچھ ایسا سنا تھا جیسے پیڈرو کو مار دیا تم نے۔"

وقار نے کہا "آج کسی ای این ٹی اسپیشلسٹ کے پاس چلیں گے۔ تمہارا گلا اور کان دیکھ لے گا۔"

"کیا ہوا ہے میرے گلے اور کان کو؟"

"کانوں سے تم جو الفاظ سُنتی ہو وہ بدل جاتے ہیں' مرگیا تو تم نے مار دیا سُنا۔ خرابی زیادہ ہوگئی تو میں کروں گا پیار کی بات تم سُنو گی پیاز کا بھاؤ۔"

نکی خفا ہونے لگی "تم غلط نہیں سُنتے کبھی۔ کل میں نے کہا تھا دروازہ بند کردو۔ تم نے مجھے باتھ روم میں بند کردیا تھا۔"

"میں نے دروازہ ہی بند کیا تھا۔ اور یہی تمہارے گلے کی خرابی ہے کہ بات غلط نکل جاتی ہے یا ادھوری۔ تمہیں کہنا چاہیے تھا کہ باہر والا دروازہ بند کردو جو پورچ میں کھلتا ہے.... ابھی جو بات تم نے کی وہ غلط تھی۔ کسی اور کے سامنے نکلتی تو یہ بے چارے پکڑے جاتے۔"

"نکی۔ تم اتنی جلدی چائے کیسے بنالائیں" میں نے کہا "کمال کردیا تم نے تو.... اور یہ سب لوازمات۔ واہ واہ' کیا سلیقہ ہے۔ بیوی ہو تو تم جیسی۔ ہم نے کل رات بھی کھانا نہیں کھایا تھا۔"

وقار ہنسنے لگا "آخر لوگ دوسروں کی بیوی کے بارے میں ہی اتنی اچھی رائے کیوں رکھتے ہیں؟"

نکی نے کہا "شوہر تو قدر کرتے نہیں' گھر کی مرغی دال برابر۔"

"شوہر جھوٹ نہیں بولتے بیوی سے" وقار نے کہا۔

"شوہر سب سے زیادہ جھوٹ بیوی سے بولتے ہیں" نکی نے

میں نے کہا "نکی۔ تم بھی صبر کرو۔ مقدر میں یہی لکھا تھا" میں نے وقار کی طرف اشارہ کیا "جاؤ' چائے بنا کے لاؤ۔ قبل اس کے کہ ہم اتنے لمبے سفر کے بعد سفرِ آخرت پر روانہ ہوں۔"

رابعہ نے مجھے ڈانٹا "کیوں تنگ کرتے ہو اسے۔ یہ بتاؤ اس وقت کیسے پہنچے؟ اس وقت تو کوئی ٹرین نہیں آتی۔"

"ہوائی جہاز سے آئے ہو؟" غالب نے کہا۔

"بھئی ساری بات نیت اور ارادے کی ہے۔ آدمی آنا چاہے تو مری سے بحری جہاز میں آسکتا ہے۔" میں نے کہا "افسوس ناک امر یہ ہے حضرات و خواتین کہ آپ لوگ ذرائعِ سفر کے بارے میں سوالات کررہے ہیں۔ مسافروں کی خیریت کے بارے میں کسی نے کلمۂ شکر ادا نہیں کیا کہ جیسے بھی پہنچے' پہنچ تو گئے۔"

نازو نے کہا "ویسے ہم اپنی گاڑی میں سفر کو ترجیح دیتے ہیں۔"

"کوئی گاڑی خریدلی۔ بڑے رئیس ہو" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "یہ تو نازو نے نہیں کہا۔ کرائے کی گاڑی بھی تو اپنی ہی ہوتی ہے۔ جب تک آدمی اسے نہ چھوڑے۔"

نازو بولی "سکندر کا خیال تھا کہ رات پنڈی میں ہی رُک جائیں مگر مجھے بہت فکر تھی۔"

"ہاں۔ بلکہ یقین تھا کہ یہاں رابعہ اور غالب دونوں بفضلِ خدا گرفتار ہو کے حوالات پہنچ چکے ہوں گے۔ آخر ایک وزیر کو قتل کرکے بھاگے تھے" میں نے کہا۔

"یہ میں نے کہا تھا؟"

"بالکل کہا تھا۔ تم بار بار ٹھنڈی سانس بھر کے کہتی رہیں کہ اس کیس میں رابعہ کا اور غالب کا بچنا مشکل ہے۔ آخر کیا بنے گا میرا اور تمہارا۔ تم اپنے مستقبل سے اتنی مایوس تھیں کہ....."

رابعہ نے کہا "چھوڑو انہیں نازو۔ آرام سے بیٹھو اور یہ بتاؤ کہ دو دن میں کیا ہوا۔"

نازو نے نفی میں سر ہلایا "افسوس یہ کہ کچھ بھی نہیں ہوا۔"

غالب بولا "پیڈرو نے کچھ نہیں بتایا؟"

"اس نے تمہارے سامنے ہی سب بتادیا تھا لیکن وہاں کچھ نہیں تھا جہاں وہ ہمیں لے کر گیا تھا۔" میں صوفے پر بیٹھ کے جوتے اُتارنے لگا۔

"جھوٹ بولا تھا اس نے؟"

"میرا خیال ہے نہیں۔"

غالب نے کہا "پھر کیا وہ راستہ بھول گیا تھا؟"

"نہیں یار۔ چوہدری دلاور نے اس کے ساتھ وہ کیا جو کوئی اپنے پالتو کتے کے ساتھ بھی نہیں کرتا۔ خواہ اس کی افادیت ختم ہوجائے' اس نے پیڈرو کو اسی لیے ہمارے حوالے کیا تھا کہ ہم اسے جان سے ماردیں۔ دلاور کو یقین تھا کہ پیڈرو کچھ بتانے والا نہیں ہے۔ وہ مزاحمت کرے گا۔ جھوٹ بولے گا اور ہم سچ اُگلوانے کے لیے اس کے جسم کو تختۂ مشق بنائیں گے۔ دلاور کو میرے

سے چیلنج کردیا۔ "گنواؤں تمہارے جھوٹ؟"

میں نے کہا "ایسا کرو' فرصت میں یاد کرکے لکھ لینا اور ہمارے سامنے چارج شیٹ پیش کردینا۔"

نکی نے صرف چائے بنائی تھی۔ مکھن' ڈبل روٹی' جام اور پنیر اس نے فرج میں سے نکال لیے تھے۔ باقی لوگ ابھی ناشتے کے موڈ میں نہیں تھے' انہوں نے صرف چائے پی۔ میں نے سب صاف کردیا۔ نازو نے تھوڑا بہت کھالیا۔ اس دوران میں زبان بھی منہ کے ساتھ چلتی رہی اور میں نے راولپنڈی یاترا کا وہ قصہ بھی تفصیل سے سُنادیا جس میں میرے ساتھ صرف نازو شریک تھی۔

غالب نے میرے خیال سے اتفاق کیا "چوہدری دلاور یقیناً ہمارے پیچھے رہا ہوگا۔"

"اور آئندہ بھی رہے گا۔ وہ اب پہلے سے زیادہ خطرناک شکاری ہوگیا ہے۔ شکار کرنے سے زیادہ شکار کا پیچھا کرنے میں اسے مزہ آتا ہے۔ یہ بھی کوئی نفسیاتی مسئلہ ہے۔ اپنی دہشت قائم رکھنا۔ اپنے خوف کے احساس میں دوسروں کو مبتلا رکھنا اور یوں اپنی طاقت پر غرور میں مبتلا رہنا۔ غرور کا بھی نشہ ہوتا ہے جسے کوئی چھوڑنا نہیں چاہتا بلکہ اس کی خواہش اور طلب بھی بڑھتی جاتی ہے۔ بڑی دانائی کا نکتہ ہے یہ بھی" میں نے کہا "دلاور اذیت پسندی کا شکار ہے۔ وہ جب پیچھا کرتا ہے تو خاموشی سے بنا بتائے نہیں کرتا۔ وہ ہر جگہ اپنی موجودگی کا احساس دلاتا رہتا ہے۔ کوئی شوشہ چھوڑتا جاتا ہے جس سے اس کے قریب ہونے کی خبر ملتی رہے۔ ہم مطمئن اور پُرسکون نہ ہونے پائیں اور چین سے نہ بیٹھ سکیں۔ مڑ مڑ کے' پلٹ کے آگے پیچھے دیکھتے رہیں۔ خوف ہمارے اعصاب پر سوار رہے اور ہمارے ذہنوں میں بیٹھ جائے۔ جسمانی تھکن کے ساتھ یہ اعصابی تناؤ آدمی کو پاگل کردیتا ہے۔ وہ اس سے لطف لیتا ہے۔ ہماری حالت کا تصور کرکے۔"

رابعہ نے کہا "اس کا ملک نبی داد عباسی سے ملنا تو یہی ظاہر کرتا ہے اور اس کا یہ بیان کہ قاتل بہت جلد گرفتار ہوجائیں گے۔"

"اس کو یقین ہوگا کہ ہم اخبارات دیکھیں گے۔ ہمیں پتا چل جائے گا کہ دلاور نے نبی داد سے ملاقات کی ہے اور اس کا یہ جملہ ہمیں چوکنا کردے گا اور ایسا ہی ہوا۔ مجھے فوراً خیال آیا کہ چوہدری دلاور ہمارے بارے میں نبی داد کو یا قتل کا سراغ لگانے والوں کو ایسی باتیں بتادے گا جو کسی اور کے علم میں نہیں اور اس طرح انہیں ہمارے پیچھے لگادے گا" نازو بولی۔

"میں نے بہت عاقلانہ مشورہ دیا تھا کہ تم لوگ فرار ہوجاؤ اور لاہور میں اپنی موجودگی کے ثبوت اور گواہ پیدا کرلو۔" میں نے کہا۔

"معاف کرنا دوست۔ اس معاملے میں آپ کی رائے سُن کے اس محاورے کا مطلب سمجھ میں آجاتا ہے۔ اپنے منہ میاں مٹھو" غالب بولا۔

"کیوں۔ تم وہاں ہوتے تو ضرور پکڑے جاتے۔ سید پور جیسی جگہ پر پولیس کو تمہارا نام معلوم تھا۔"

"اسی لیے عرض کیا نا حضرت کہ آپ کا مشورہ احمقانہ تھا۔"

وقار نے سوچ کے کہا "احمقانہ مت کہو۔ جاہلانہ کہو' احمق اور جاہل میں فرق ہے۔"

میں نے کہا "یار وقار۔ تم سے یہ اُمید نہ تھی۔"

"میں تو دفاع کررہا ہوں تمہارا۔ علم کا نہ ہونا جہالت ہے۔ تمہیں قانون کا پتا نہیں اس لئے کہ قانون کے معاملے میں تم جاہل ہو ورنہ ایسا مشورہ نہ دیتے۔ تم بضد ہو خود کو احمق کہلوانے پر تو تمہاری مرضی" وقار بولا۔

"پکڑے ہم یہاں بھی جاتے" غالب نے کہا "وہ تو اللہ اس کا ہدف آسان کرے۔ دودرجن کا۔ بڑی عقلمندی اور دوراندیشی..."

نکی نے بات کاٹ کے کہا "کل اس کے بچوں کی تعداد سترہ ہوگئی۔"

غالب نے اپنی بات جاری رکھی "عبدالودود منظر کو خدا میری عمر اور سکندر کا حوصلہ دے۔"

میں نے کچھ احتجاج اور کچھ گھبراہٹ کا مظاہرہ کیا "توبہ توبہ۔ مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں ہے۔ کیوں رابعہ؟"

غالب نے مجھے ڈانٹا "مجھ سے پوچھو۔ میں سکندرِ اعظم کا حوالہ دے رہا تھا۔ جوانی میں مرگیا تھا اس لیے مرزا غالب جتنی عمر کی دعا الگ تھی۔"

رابعہ مسکرا کے خاموش ہوگئی تھی' اس نے کہا "اب دیکھ لو وقار۔ جاہل کے ساتھ احمق بھی ثابت کرہی دیا خود کو۔"

میں نے کہا "کچھ سترہ بچوں کے باپ کی عقلمندی اور دوراندیشی کا ذکر تھا۔"

"ہاں۔ اس نے کہا کہ حضرت اور خاتون۔ یہ کیا بوگس بات ہے۔ تم لاکھ خود کو لاہور یا ٹمبکٹو میں ثابت کرو۔ پہلے تو پولیس پکڑے گی۔ بعد میں صفائی میں اور وقار پیش کرتے رہیں گے کیونکہ آپ دونوں تو ہوں گے اندر۔ فوراً سے پیشتر ضمانت قبل از گرفتاری حاصل کرو۔ ہم راولپنڈی سے لاہور پہنچے تو سیدھے کورٹ گئے تھے۔ پندرہ بیس منٹ باقی تھے۔ رابعہ نے خود ہی درخواست پیش کردی جو ظاہر ہے کہ منظور ہوگئی۔"

"درخواست میں کیا لکھا تھا؟" میں نے کہا۔

"میری تو عقل کام نہیں کررہی تھی" رابعہ بولی۔

"ہاں۔ ناقص چیز عین وقت پر دھوکا دے جاتی ہے۔ یہی نقصان ہوتا ہے۔"

رابعہ نے جھینپ کے کہا "جیسی بھی ہے' ہے تو سہی۔"

میں نے اسے لوفروں کی طرح آنکھ ماری "میں بھی یہی کہتا ہوں سب کے سامنے کہ تمہاری تو ہے بھی نہیں۔ ہماری کو نظر مت لگادینا۔ کوہ قاف سے بہت اُترتی تھیں۔ شاید ساری اُتر گئیں۔ یہ

اسپیشل کوہ کاف یا گاف سے آئی ہے۔"

رابعہ نے کچھ خوش اور کچھ خفا ہوکے کہا "تم بھی کہاں کی بات کہاں لے جاتے ہو اور رُکنا بھول جاتے ہو۔"

غالب بولا "میں عرض کرتا ہوں۔ منظر نے میری طرف سے درخواست لگائی تھی۔ دونوں میں ایک ہی بات لکھی گئی تھی۔ رابعہ نے لکھا تھا کہ میری اوپل ایکارڈ گاڑی' نمبر فلاں فلاں' چھن گئی تھی۔ اس وقت گاڑی کو مرزا غالب چلا رہے تھے جو بڑے نامور... دنیا کے سب سے عظیم' سب سے ذہین' لائق فائق' نڈر' خوبرو اور..."

میں نے اسے ٹوکا "آپ جذبات کے پرنالے میں بہ گئے ہیں۔"

"سوری۔ سچ خود بخود زبان پر آجاتا ہے۔" غالب نے معذرت کی "درخواست میں لکھا تھا کہ مرزا غالب سے گاڑی کچہری روڈ پر اس وقت چھین لی گئی جب یہ میرے ساتھ کورٹ سے واپس گھر جانا چاہتے تھے۔ میرے پاس اپنی پہلے والی گاڑی تھی۔ فاکس ویگن نمبر فلاں فلاں۔ ملزمان جو تعداد میں تین تھے۔ گاڑی لے کر فرار ہوئے تو مرزا غالب نے جو کہ انتہائی بہادر' حوصلہ مند' حاضر دماغ اور ایکٹو ہیں..."

میں نے پھر اسے ٹوکا "اس بار آپ جذبات کے نالے میں بہہ گئے۔"

"معاف کرنا یار۔ آدمی بلبلہ ہے پانی کا۔ کبھی پرنالے میں بہہ جاتا ہے کبھی نالے میں۔ اس ناچیز نے فوراً مس رابعہ کی بیربہوٹی جیسی فاکس ویگن میں ناہنجار ملزمان کا تعاقب شروع کردیا مگر گوجرانوالے کے قریب ایک معمولی حادثہ پیش آگیا۔ ایک لینڈ روور جیپ نے فاکس ویگن کو سائڈ سے ٹکر ماردی جس میں ملک خداداد عباسی ایم این اے لاہور سے راولپنڈی جارہے تھے۔ انہوں نے بڑی شرافت سے معذرت کی اور کہا کہ وہ گاڑی خود مرمت کراکے دیں گے۔ اس لیے فائدہ اُٹھاکے ملزمان فرار ہوگئے۔ ہم واپس لاہور آکے چوری کی رپورٹ لکھوانا چاہتے تھے مگر گاڑی کا تباہ شدہ مڈگارڈ پہیے میں گھس گیا تھا۔ اسے عارضی طور پر ٹھیک کرانے میں کچھ وقت لگا۔ اس دوران میں رابعہ کے لاہور آفس میں ان کے لئے ایک پیغام چھوڑا گیا۔ کسی نے گمنام فون کرکے اطلاع دی تھی کہ کار چھیننے والے بھی ملک خداداد عباسی ایم این اے کے خاص آدمی تھے اور غالباً ٹکر بھی جان بوجھ کے ہمیں روکنے کے لیے ماری گئی ہوگی۔ مسٹر وقار یوسف ایڈووکیٹ نے یہ پیغام لکھا تھا۔ تصدیق اور وضاحت کے لیے ہم نے ذاتی طور پر ملک خداداد عباسی سے رابطہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ وہ صبح معلوم کریں گے اور ہمیں رات کو اپنے گیسٹ ہاؤس واقع مری روڈ میں قیام کی دعوت دی۔ انہوں نے رات کو ہمیں ڈنر کے لیے بھی مدعو کیا تھا مگر بعد میں اطلاع ملی کہ غالباً انہیں وزیرِ جنگلات نامزد کیا گیا ہے اور انہیں حلف برداری کی تقریب کے لیے ایوانِ صدر بلایا گیا ہے۔ اس اطلاع کے مصدقہ ہونے کے بارے میں ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ لیکن پھر ہم نے مزید قیام کو لاحاصل سمجھتے ہوئے واپس لاہور لوٹ آنا بہتر سمجھا۔ بدقسمتی سے اسی رات ملک خداداد عباسی کو قتل کردیا گیا۔ ایسا لگتا ہے کہ ان کے ملازمین یا ماتحت عملے میں سے کسی کو مس رابعہ سے پرخاش تھی جس کا مس رابعہ کو بھی سبب نہیں معلوم اور ملک خداداد عباسی بھی نہیں جانتے تھے کہ ایسی مذموم حرکت کرنے والا کون ہوسکتا ہے۔ مرحوم ایک اصول پرست اور شریف النفس انسان تھے اور انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ صبح وہ ملزمان کا پتا چلانے کے بعد انہیں سخت ترین سزا دیں گے۔ چونکہ ملزمان کو مس رابعہ اور مرزا غالب کی اس ملاقات کا بھی علم ہوگا اور شاید انہیں ملک خداداد عباسی کی بات کا بھی پتا چل گیا ہوگا اس لیے خطرہ یہ ہے کہ وہ بدمعاش اب موقع سے فائدہ اٹھائیں گے اور حالات وواقعات کی بنا پر مس رابعہ اور مرزا غالب کو اس قتل میں ملوث کرنے کی کوشش ضرور کریں گے۔ مرزا غالب اور مس رابعہ اس واقعے سے قبل ملک خداداد عباسی کے نام سے بھی واقف نہیں تھے اور نہ ملک صاحب کا کبھی پیشہ ورانہ مسئلے پر ان سے واسطہ رہا تھا۔ یہ مس رابعہ قاری اور مرزا غالب کی پیشہ ورانہ نیک نامی اور شہرت کو نقصان پہنچانے کی سازش بھی ہوسکتی ہے چنانچہ استدعا ہے کہ اس کیس میں بلاجواز ملوث ہونے سے قبل ان کی ضمانت قبل از گرفتاری کی درخواست منظور کی جائے۔"

"ویری گڈ۔ پس ثابت ہوا کہ عبدالودود منظر کا جتنا بڑا پیٹ اور ظرف ہے اس سے بڑا دماغ ہے۔"

"معمولی رسمی کارروائی کے بعد ضمانت قبل از گرفتاری ہوگئی۔ ایک ہفتے کے لیے" رابعہ بولی "جج مجھے جانتا تھا اور غالب کی طرف سے خود اخبار کے مالک نے ضامن بننا قبول کیا۔ اخبار کے مالک بہت نامور صحافی تھے اور آج بھی ان کا رابطہ اعلیٰ ترین سطح پر صدر سے بھی رہتا ہے۔ شخصی ضمانت کے علاوہ صرف دس دس ہزار کے مچلکے بھرے گئے۔"

"اصل میں تو اثر رسوخ کام آتا ہے" غالب بولا "تمہاری گُڈول نہ ہوتی تو زرِ ضمانت بھی ایک لاکھ سے کم نہ ہوتا اور ضمانت دو دن کے لیے ہوتی۔"

میں نے کہا "ایک ہفتے کے بعد کیا ہوگا؟"

"اگر ایف آئی آر میں نام نہ ہوا تو درخواست غیر مؤثر ہوجائے گی۔ نام ہوا تو ضمانت کی توثیق کی درخواست دائر کی جائے گی۔"

"جو منظور ہوجائے گی" وقار بولا "پھر جب تک مقدمہ خارج یا فیصلہ نہیں ہوتا یا پولیس خود ایف آئی آر میں سے نام خارج کرنے پر اسرار نہیں کرتی' یہ ملزمان کہلائیں گے' ماشاء اللہ سے۔"

"ایف آئی آر میں ہمارا نام نہیں ہے" رابعہ نے کہا "شام کو منظر کے پاس کسی کا فون آیا تھا پنڈی سے۔ اس نے بتایا تھا۔"

مرزا غالب نے کہا "تمہاری ضمانت قبل از گرفتاری کی اطلاع پنڈی میں ملک نبی داد عباسی کو بھی ہوگئی۔"

"بڑے بھائی کے قاتل محافظ کو۔"

"مبینہ قاتل کہو" وقار بولا "اور قتل بھی اس نے بڑے بھائی کا نہیں کیا ہے۔ ایک ایم این اے کا کیا ہے۔ اس کی سیٹ حاصل کرنے کے لیے۔ وہ بدقسمتی سے اس کا بھائی تھا۔"

"ہماری تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ تخت وتاج کے لیے بھائی اور باپ کو راستے سے ہٹانے کے لیے انہیں مروا دینا' اندھا کرادینا۔ قید خانے میں ڈال دینا۔ سیاست کے ضابطۂ اخلاق میں پہلے بھی جائز سمجھا جاتا تھا اور آج بھی ہے۔"

غالب بولا "حیرت تو مجھے نبی داد کے فون پر ہوئی؟"

"اس نے فون بھی کیا تمہیں؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ کل رات آفس میں فون آیا۔ بہت گلے شکوے اور معذرت کررہا تھا کہ جناب ہم تو صحافیوں کو سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ خادم ہیں آپ کے۔ یہ آپ نے کیا ظلم کیا کہ ہم کو مجرم بنادیا۔ بھلا ہم آپ کے خلاف ایف آئی آر درج کرانے کی جُرات کرسکتے ہیں۔ خیر سے اتنا بڑا نام ہے آپ کا اور ان خاتون کا۔"

"اس کا سیاسی کیریئر اب شروع ہورہا ہے۔ ضمنی انتخاب میں اسے بھائی کی جگہ کھڑا ہونا ہے" میں نے کہا۔

"ہاں۔ اسی لیے اخبار والوں سے تو بالکل بگاڑ مول لینا نہیں چاہتا۔"

"مطلب یہ کہ چوہدری دلاور اسے ہمارے خلاف استعمال کرنے میں ناکام رہا اور منہ کی کھاکے واپس آیا" نازو بولی۔

"بظاہر ایسا ہی لگتا ہے۔" میں نے کہا "لیکن یہ ذہن میں رہے کہ ہمارے مقابل ہے چوہدری دلاور' وہ اپنی چالوں کا پتا نہیں چلنے دیتا اور اکثر بات وہ نہیں ہوتی جو ہم سمجھتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ملک نبی داد عباسی وہ سیاست داں ہے جس نے حال ہی میں ایک حریف پر سیاسی فتح حاصل کی ہے۔ حریف بھی اس کا بھائی تھا جو عمر اور تجربے میں اس سے بڑا تھا۔ وہ جذباتی آدمی ہوتا تو اس خونی رشتے پر اپنے مقصد کو حاوی نہ آنے دیتا مگر وہ صبر اور عقل وہوش کے ساتھ انتظار کرنے اور صحیح وقت پر صحیح نشانہ لینے کا قائل تھا۔ یعنی ایک ایسا شکاری ہے جو ناکامی کے تمام اسباب کو ذہن میں رکھ کر کامیابی کا ہدف حاصل کرتا ہے۔"

"تم نے تو اس کی پوری شخصیت اور کردار کا پوسٹ مارٹم کردیا۔ حالانکہ تم اس سے ایک دو بار ایسے ملے ہو کہ اسے ملنا بھی نہیں کہا جاسکتا۔" غالب بولا۔

میں نے کہا "نتائج خود مقصد کی عکاسی کرتے ہیں۔ نبی داد نے اگر دلاور کے جذبۂ تعاون کو سراہتے ہوئے اسے اپنا حلیف بنایا ہوگا تو اس سے کہا ہوگا کہ تھینک یو دلاور۔ یہ سب اسلحہ جو تم نے مفید معلومات کی صورت میں فراہم کیا ہے میرے پاس محفوظ ہے اور اس وقت کام آئے گا جب شکار پوری طرح محصور ہوگا۔ ابھی خاموش رہو اور انتظار کرو۔ جیسے میں نے کیا تھا۔ میں بڑے بھائی صاحب کی وفاتِ حسرت آیات پر غم واندوہ کے بحرِ بیکراں سے ساحلِ مراد تک تو پہنچ جاؤں۔ ضمنی انتخابات اور نامزدگی اور کامیابی کے مرحلے آسان ہیں مگر منتخب ہونے تک مجھے آبدیدہ رہنا ہے۔ دکھی دل اور مغموم شکل بناکے پھرنا ہے یہاں تک کہ حلف اُٹھاتے وقت بھی میری آواز رقت سے بھرا جانی چاہیے اس کے بعد اپنی حکومت.... لیکن..."

رابعہ بولی "اب آگے بھی بولو۔ لیکن پر گاڑی کیوں رُک گئی۔"

"لیکن اس کے برعکس۔ نبی داد عباسی ہمارا دوست اور چوہدری دلاور کا دشمن بھی ثابت ہوسکتا ہے۔ 'پوچھو کیسے؟'"

غالب نے کہا "وہ ایسے کہ منصب وزارت تک پہنچنے کی منصوبہ بندی اس کی اپنی تھی اور پہلے سے تھی مگر ابھی تو کامیابی کا وسیلہ ہم ہی بنے تھے۔ موقع اسے ہمارے طفیل ملا تھا۔ اس کے علاوہ چوہدری دلاور جیسے شخص سے اسے کیا فائدہ حاصل ہوسکتا ہے۔ انتخابی مہم میں اور وزارت کی منزل تک پہنچنے کے لیے اسے پیسہ چاہیے۔ پیسہ اس کے پاس بہت ہے۔ ووٹ چاہئیں' ووٹ بھی کم نہیں' نیک نامی چاہیے' نیک نام اس کا بھائی بھی نہیں تھا اور سیاست کے قومی افق پر ہر نئے ستارے کے نئے آب وتاب سے طلوع ہونے کے فوائد لامحدود ہوتے ہیں۔ بھائی مقامی سیاست تک محدود رہا۔ وہ اپنا امیج ذرا مختلف بنالے تو قومی لیڈر کی حیثیت بھی اختیار کرسکتا ہے اور اس کام میں دلاور اس کی مدد نہیں کرسکتا۔ اُلٹا اسے دلاور جیسے لوگوں کی رفاقت سے نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اس کی پبلسٹی اور سیاسی کیریئر کی گاڑی کو دھکا لگانے والے کون ہوسکتے ہیں۔ نمبر ون صحافی' نمبر دو وکیل اور اس کے بعد باقی لوگ۔ صحافی اس کے خلاف کچھ نہ لکھیں' اس کو حسب منشا کوریج دیں۔ اسے پروجیکٹ کریں۔ اس کی تقریریں' جو وہ اپنی جاہلانہ زبان میں کرے' مؤثر انداز میں رپورٹ کریں۔ بلکہ اسے لکھ کر بھی دیں۔ اس کی تصاویر' انٹرویو' اس کی ہر بات پر واہ واہ کا کالم۔ یہ ہم لوگ ہی کرسکتے ہیں اور کرتے ہیں۔ ملک نبی داد عباسی کسی بھی چوہدری دلاور کے اکسانے پر ہم سے پنگا نہیں لے گا۔ شاید اپنے چوہدری صاحب کو بھی یہ پنگا لینا مہنگا پڑے۔ اسی طرح وکیل اس کا خانہ خراب کرسکتے ہیں اگر اس کے خلاف قانونی محاذ کھول دیں۔ اس کے ہر بیان پر نوٹس یا کیس کا چکر چلادیں۔ ممکن ہے دلاور ہارے ہوئے جواری کی طرح خالی ہاتھ لوٹا ہو۔ سب کچھ بتانے کا مقصد تھا قربت.... ملی ذلت۔"

میں نے غالب کی پیٹھ ٹھونکی "ہونہار برخوردار۔ ہم قائل

ہوئے تمہاری حماقت کے۔"

نازو نے فخریہ مسرت سے کہا "تم جل گئے نا۔ کیا حماقت ہے اس میں؟"

میں نے کہا "اگر ہمارے کہنے سے یہ صرف دو لفظ بولتا۔ وہ کیسے.... تو اتنی زحمت سے بچ جاتا۔ ہم کہہ دیتے یہ سب کچھ۔ ایک نکتہ اور بھی ہے ہمارے حق میں۔ سیاست نام ہے دوسرے کی کمزوری کو اپنی شہ زوری بنانے کا۔ نبی داد کو ہماری کمزوری کا پتا چل گیا۔ اب وہ بڑی عاجزی سے کہہ سکتا ہے کہ جی مٹی پاؤ پرانی باتوں پر۔ ہم آپ کی مدد کرتے ہیں' آپ ہماری مدد کرو۔ اور ہم مدد قبول کرنے سے کیسے انکار کرسکتے ہیں؟"

"بالفاظ دیگر اس کی مدد کرنے سے انکار نہیں کرسکتے؟" رابعہ نے کہا

"ہاں۔ دلاور کے بارے میں وہ پہلے سے ہی جانتا ہوگا۔ ورنہ کچھ جان لے گا اور کچھ معلوم کرلے گا۔ وہ دلاور کی بیساکھی پر آگے کیوں بڑھے۔ ایسے حلیف کو شکریہ کہنے سے گیٹ آؤٹ یا شٹ اپ کہنا بہتر۔ دلاور نے بہت جلدی کی۔ نبی داد نئے حلیف سوچ سمجھ کے بنائے گا اور انتخاب ہمارے اور دلاور کے درمیان ہو تو وہ ہماری طرف ہاتھ بڑھائے گا۔ وہ پٹھانوں کی طرح خاندانی دشمنی کا قائل تو ہو نہیں سکتا کہ بھائی کے قاتل کو گولی مارے بنا چین سے نہ بیٹھے اور نسل در نسل دونوں طرف کے بھائی مرتے رہیں۔ وہ تو خود بھی یہی چاہتا تھا۔ اگر اسے سچ مچ قاتل کا پتا چل جائے۔"

غالب نے کہا "قطع کلامی معاف۔ اسے معلوم ہوگا کہ قاتل کون ہے؟"

نازو نے کہا "اُش...اُش۔"

میں نے کہا "تم تو کروگی اش اُش۔ غالب کی غالبا۔"

رابعہ نے بھی غالب کی تائید کی "غالب ٹھیک کہتا ہے۔ قتل خود اس نے کیا ہے یا اس کے ہی کسی آدمی نے۔ لیکن تمہارا خیال بھی ٹھیک ہے کہ وہ ہمارا نام لینے کی بے وقوفی نہیں کرسکتا۔"

میں نے کہا "تم نے اچھا کیا کہ دونوں کو ٹھیک کہہ دیا ورنہ ابھی کشت و خون ہوجاتا۔"

"نبی داد کو نام لینا ہی ہوگا تو کسی سے پُرانا حساب برابر کرنے کا یہ اچھا موقع ہے۔ دشمن تو سب کے ہوتے ہیں۔ وہ نمبر ون پر انگلی رکھ دے گا جس کے بارے میں پہلے سے سب جانتے ہوں گے کہ اس کی اور مرحوم کی دشمنی میں کھلی جنگ تھی۔" غالب نے کہا۔

وقار ایسی باتوں میں بہت کم بولتا تھا۔ وہ بیٹھے بیٹھے سوگیا تھا۔ نکی نے اسے ٹھوکا دیا تو وہ لڑھک گیا۔

نکی نے کہا "یہ کیا ہو رہا ہے سب کے بیچ میں۔"

وقار نے آنکھیں کھول کر ادھر اُدھر دیکھا "کہاں۔ کیا ہو رہا ہے۔ مجھے تو ایسا کچھ ہوتا دکھائی نہیں دیتا جس پر تم اتنی خفا ہو۔"

"یہ سونے کی جگہ ہے؟"

"ہاں۔ سونے کی جگہ وہ ہوتی ہے جہاں نیند آجائے۔ آج سَترمنٹ قبل از وقت بیدار ہوگیا تھا۔"

غالب نے کہا "تم اکہتر منٹ سوچکے ہو اس کے بعد۔"

اب نکی کو سب کے لیے باقاعدہ ناشتا بنانے کے لیے جانا پڑا۔ وہ بڑی باکمال بیوی تھی۔ اگر وہ چاہتی تو ایک نہیں دس ملازم رکھ لیتی۔ اس کے ابا بڑی توپ چیز تھے اور اس کے لیے اتنا چھوڑ گئے تھے بلکہ بھیجے گئے تھے کہ وقار کی آمدنی اس کے سود سے بھی تھی مگر نکی نے صرف لو میرج ہی نہیں کی تھی۔ زندگی میں محبت کے ناٹک میں روایتی ظالم باپ کا رول کرنے والے نقوی صاحب کی روح کو یہ دیکھ کے شانتی نہیں ملتی ہوگی کہ نکی اب بھی وقار کی محبت میں اتنی ہی پاگل ہے جتنی شادی سے پہلے تھی۔ اس کا سارا کام خود کرکے خوش ہوتی ہے۔ خود نوکرانی بننے میں فخر محسوس کرتی ہے بے وقوف لڑکی۔

میرا بہت مذاق اُڑایا گیا۔ نازو نے کسی دُلہا کے ریڈی میڈ لباس کی خریداری اور سفر کے دوران چیکنگ سے بچنے کے لیے خانزادہ صاحب کے ڈکی میں گھس جانے کے واقعات کی افسوسناک رپورٹنگ کی۔

میں نے احتجاج کیا "اتنی عقلمندی پر دانت نکالنا آپ سب لوگوں کی کم عقلی ہے۔ اس وقت میں اور کیا کرتا۔ میک اپ سے حلیہ اور چہرہ کیسے بدلتا۔"

غالب نے کہا "یار تم گھوڑے پر بھی بیٹھ جاتے۔"

وقار بولا "دس ہزار گاڑی کے دیے۔ ایک ہزار میں گھوڑا مل جاتا۔"

رابعہ نے بھی سرہلایا "لاہور تک فاصلہ بھی کتنا ہے۔ جرنیلی سڑک پر بگٹٹ گھوڑا دوڑاتے فجر کے وقت شہر پناہ میں داخل ہوجاتے۔"

غالب بولا "آدھی رات کو جو دیکھتا کہ گھوڑے پر اُلو بیٹھا ہے اور صبح کسی کو بتاتا تو لوگ کیا سمجھتے یہی کہ وہ نشہ کرنے لگا ہے۔"

"اور پیچھے نازو کو دیکھ کے کیا کہتا؟"

غالب نے کہا "تم مجھ سے کہلوانا چاہتے ہو کہ پیچھے نظر آتی اُلو کی پٹھی۔ ہرگز نہیں' یہ گستاخی کرسکتا ہوں میں۔"

میں نے قہقہہ مار کے کہا "چلو کوئی بات نہیں۔ جو کہنا تھا تم نے کہہ دیا۔"

نازو نے خفگی سے کہا "وہاں تو سب کے سامنے بہن اور ہمشیرہ صاحبہ کہتے تھے ہر جگہ...."

ناشتے سے پہلے منظر کا فون آگیا "ابے تو آگیا زندہ سلامت بھوتنی کے۔ پیشہ ور قاتل۔ سالے جہاں جاتا ہے کسی کو بلاوجہ قتل کردیتا ہے۔"

"تیری باری بھی آجائے گی کسی دن۔"

اس نے مجھے مزید گالیاں دیں "میں تو سوچ رہا ہوں کہ اس روز روز کی مصیبت سے بہتر ہے کہ ایک دن تجھے خنجر گھونپ کے رضا کارانہ طور پر عمر قید کاٹنے جیل چلا جاؤں۔ زیادہ سکون سے رہوں گا وہاں۔"

"ہاں یار۔ تیری بھی کوئی زندگی ہے۔ اس گھر میں تو اب جگہ ہی نہیں رہی تیرے لیے..."

وہ قہقہہ مار کے بولا "یار مبارک باد دے مجھے۔ ایک اور بچے کا باپ بن گیا۔"

میں نے کہا "ابھی یقین کے ساتھ صرف یہ کہا جاسکتا ہے کہ تیری بیوی ایک اور بچے کی ماں بن گئی۔"

"اُف.... میری غیرت کے منہ پر یہ طمانچہ۔ میری محبت کی یہ تذلیل۔ جی چاہتا ہے ٹیلی فون پر تجھے گولی ماردوں۔ اچھا میں اپنی بیوی کو بتا رہا ہوں' وہ خود نمٹ لے گی تجھ سے۔"

میں نے گھبرا کے کہا "یار خدا کے لیے یہ غضب مت کرنا۔ اس سے تو بہتر ہے تُو خود گولی ماردے۔ اس کی زبان کی قینچی سے مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔"

وہ ہنسا "سالی نے پھر مایوس کیا مجھے۔ میں نے بہت شرمندہ کیا اسے کہ اتنا تجربہ ہوگیا' اسپیڈ اب بھی وہی ہے۔ تین چار نہ سہی کم سے کم دو تو ہوتے۔ ایسے تو مزید سات آٹھ سال لگ جائیں گے دو درجن ہونے میں۔ خیر تُو بتا کیا کھٹ کے لے آیا؟"

میں نے کہا "کچھ نہیں یار۔ اُلٹا پیڈ رو گیا اس دارِفانی سے۔"

"میں اچھل پڑا ہوں۔ تو نہیں دیکھ سکتا اس لیے بتا رہا ہوں۔ تو نے قصاص میں فوت کردیا اسے بھوتنی کے۔"

"نہیں۔ میں ابھی آکے بقلم خود عرض کرتا ہوں" میں نے کہا۔

"خالی ہاتھ مت آنا۔ مٹھائی کا ڈبّا ضرور ساتھ لانا ورنہ زچہ وبچہ بُرا مانیں گے۔ ابھی تک کسی سالے کو توفیق نہیں ہوئی حالانکہ کل تم پر بھی بُرا وقت آئے گا۔ شادی اور اس کے بعد سالانہ خانہ آبادی۔ ہم بھی تو آئیں گے تمہارے گھر مٹھائی لے کے۔"

میں نے کہا "حق ہے۔ آج ہم تمہارے جنازے کو کندھا دیں گے تو کل تم ہمارے جنازے کو۔ ہم سب باجماعت آتے ہیں۔"

"یہ بتا دینا سب کو کہ ہر شخص اپنا الگ مٹھائی کا ڈبّا لائے۔ سب چندے سے ایک مت لے آنا۔ ایک سے کچھ نہیں بنتا یہاں۔"

ہم سب وقار کی گاڑی میں لد کے منظر کے گھر پہنچے۔ اس نے سارے ڈبے کھول کے درمیان میں رکھ دیے "لو میرے پیارے بچو۔ تمہارے چاچے مامے خالائیں اور پھوپیاں لائی ہیں۔ کھاؤ حرام کا مال سمجھ کے۔"

ذرا سی دیر میں وہ سب چٹ کرگئے۔ میں اور غالب تو اس کی بیوی کو رسمی مبارک باد دے کر کھسک لیے۔ رابعہ' نکی اور نازو کو باقاعدہ سازش کرکے وہیں بیٹھنے پر مجبور کردیا گیا۔ منظر کی بیوی کے پاس موضوعات کی کمی نہیں تھی مگر اس نے شادی نہ کرنے پر انہیں ڈانٹنا شروع کیا تو ہمارا دل باغ باغ ہوگیا۔ وہ بے بسی سے سنتی رہیں۔ منظر کی بیوی کسی کو کچھ کہنے کا موقع ہی کب دیتی تھی۔ نکی تک ہکا بکا بیٹھی رہی جو بولنے میں کسی سے کم نہ تھی۔ غالب نے کہا "کیوں نہ ہم گھر چھوڑ کے بھاگ جائیں۔"

میں نے کہا "ویری گڈ۔ خوا... تین۔ آپس میں خوب بول رہی ہیں۔"

پھر میں نے تجویز پیش کی "اپنے مولوی خادم حسین کے غریب خانے کی دوسری برانچ میں چلتے ہیں۔ وہاں سکون سے بات بھی کریں گے اور چائے بھی پئیں گے۔"

مولوی خادم حسین ہمیں دیکھ کے کھل اُٹھا "آپ نے تو کمال کردیا جی۔ بڑا مبارک دن ہے کہ سب تشریف لائے۔ سب ایک ساتھ۔"

منظر نے کہا "لائے کچھ نہیں ہیں بھوتنی کے۔ خالی ہاتھ آئے ہیں سب۔"

اس نے بالکل بُرا نہیں مانا۔ وہ عادی ہوگیا تھا یا خوشی کے باعث منظر کی گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا۔ اس نے فوراً بیوی کو خاطر مدارات کے انتظامات پر لگادیا جو ہمیں دیکھ کے خادم حسین سے زیادہ خوش ہوئی تھی۔

"آپ خیر سے گھر لوٹ آئے جی۔ شام کو آئے ہوں گے؟"

غالب نے کہا "یہ تمہیں بدھو کہہ رہا ہے سکندر۔ محاورے کی زبان میں۔"

خادم حسین نے اپنے منہ پر دونوں ہاتھوں سے تھپڑ مارتے ہوئے کہا "توبہ' توبہ' میری یہ مجال۔ غالب صاحب صرف جھگڑا کرانا چاہتے ہیں۔"

"دیکھا تم نے۔ پہلے تم کو بدھو کہا اور اب مجھے شرپسند کہہ دیا۔ اب منظر کو ایسے ہی باتوں باتوں میں کچھ کہہ دے گا۔ دیکھنے میں ابوالہول' عملاً ابوالغول۔ بچے غول بیابانی' بیوی ایکسیڈیٹر۔"

منظر نے خادم حسین کے کندھے پر بے تکلفی سے ہاتھ مارا "مولوی یار ہے اپنا۔ جو چاہے کہے' اور پھر یہ ہے بھی سچ۔"

خادم حسین کراہنے لگا اور پھر کندھے کو اوپر نیچے ہلا کے ملتے ہوئے بولا "بس خرابی یہی ہے آپ میں منظر صاحب کہ مذاق کرتے ہیں ہاتھ پاؤں کا۔"

میں نے کہا "کسی دن تم بھی جواب میں ایک سوئی چبھو دو اس کے پیٹ میں۔ غبارے کی طرح پھٹ جائے گا۔"

غالب نے چھت کی طرف دیکھا "لیکن یار دھماکے سے چھت گرگئی تو مولوی خادم حسین مرحوم و مغفور و مدفون ہوجائے گا۔ ابھی تو یہ کسی جھینگر کے بچے کا ابا بھی نہیں بنا۔"

میں نے کہا "ہاں یار یہ کیا مسئلہ ہے۔ شادیاں ایک چھوڑ دو کرلی ہیں تم نے۔"

"یہ تو اللہ کی دین ہے جی۔" وہ آہ بھر کے بولا۔
منظر نے کہا "ابے تو بھوتنی کے۔ خدا سے دعا مانگ کہ باپ بننا تیرے نصیب میں نہیں تو تیری کوئی بیوی ہی ماں بن جائے۔"
مولوی خادم حسین پھٹ پڑا "یہ..... یہ کس قدر بے غیرتی کی بات ہے۔ منظر صاحب آپ نے گالی دی ہے مجھے۔ کوئی صحیح الدماغ آدمی ایسی لغویات نہیں کر سکتا۔"
"یار تو ہم نے کب کہا ہے کہ ہم صحیح الدماغ ہیں۔"
خادم حسین کا رنگ اُڑ گیا۔ "یہ تو خیال فرمایئے کہ میری اہلیہ سُن لیں گی۔"
"ابے تو کیا عاق کر دے گی تجھے؟ اتنا احمق شوہر پھر کہاں ملے گا اسے۔" منظر نے کہا "رہی بات اولاد کی تو آخر ہم بھی تیری ماتا کا دکھ سمجھتے ہیں۔ دوست وہ جو مصیبت میں کام آئے۔ تو میری بیوی لے لے۔"
اسی وقت خادم حسین کی بیوی اندر آگئی "منظر بھائی...!"
خادم حسین ہڑبڑا کے اٹھا اور پھر بیٹھ گیا "بکواس... فرماتے ہیں آپ' بے ہودگی کی انتہا... میرے مہمان نہ ہوتے آپ... تو میں...."
"یعنی مہمان نہ ہوتے تو ہماری پیش کش قبول کر لیتا" منظر بولا۔
"میں آپ کے سرِ عزیز کو پاپوشِ قدیم سے زدوکوب کر کے آپ کو غریب خانے سے بے دخل کر دیتا۔" خادم حسین کا غصے سے بُرا حال تھا۔
"یار' دیکھو اس مولوی کو۔ ابھی خود ہی کہہ رہا تھا کہ کوئی بچے وچے والی بیوی لا دو۔" منظر کہاں باز آنے والا تھا "میں گارنٹی کے ساتھ دے رہا ہوں تو اچھل رہا ہے پٹاخے کی طرح۔"
خادم کی بیوی بھی ہم سب کے ساتھ ہنسنے لگی تھی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ سب خادم حسین کو چھیڑ کر لطف لے رہے ہیں۔ ابھی ہم چائے پی ہی رہے تھے کہ اس کی بیوی نے اشارے سے خادم حسین کو اندر بُلا لیا۔ وہ گیا اور واپس آیا تو چیخ مار کے منظر سے لپٹ گیا اور اسے مُکے مارنے لگا۔
"ابے... ابے کیا ہو گیا۔ غالب' مولوی باؤلا ہو گیا۔"
مولوی اسے چھوڑ کر سب کے بیچ میں ناچنے لگا اور اپنی بے سُری آواز میں گانے لگا "دشمنوں کا منہ کالا۔ میں ہوں ابّا بننے والا۔"
میں سمجھ گیا کہ اس کی بیوی نے شوہر کی پوزیشن کو عین وقت پر مزید خراب ہونے سے بچا لیا اور بروقت وہ خوش خبری دے دی جو عام طور پر بیویاں خلوت میں بڑے اہتمام سے دیتی ہیں۔ اس کی بیوی پھر ہمارے سامنے نہیں آئی۔ ہم سب کا پہلے ہی ہنستے ہنستے بُرا حال ہو رہا تھا۔ مولوی خادم حسین کے ناچنے گانے سے اور ہنسی آئی۔ ہم سب نے باری باری اسے گلے لگا کے اور خوب دبا دبا کے

مبارک باد دی۔ منظر نے بھی خوب گُل فشانی کی مگر مولوی خادم حسین نے خوشی میں سب کچھ برداشت کیا۔
جب ماحول کچھ سنجیدہ ہوا تو میں نے منظر کو وہ سب بتایا جو دوسرے سب سُن چکے تھے۔ منظر نے بھی اس خیال سے اتفاق کیا کہ ملک نبی داد عباسی کا چوہدری دلاور سے سیاسی اتحاد بھی سردست ممکن نہیں کیونکہ ماضی کا سایہ ہنوز دلاور کے پیچھے ہے۔ وہ ابھی تک اپنے سیاسی مستقبل کی جانب دیکھ ضرور رہا ہے مگر اس سمت میں کوئی پیش قدمی نہیں ہوئی ہے۔ نبی داد پہلے سے سیاسی میدان میں ہے اور دلاور کے بہکانے میں آ کے ہمارے خلاف کوئی ایسا قدم اُٹھانے پر ہرگز تیار نہیں ہو گا جس سے اس کو آغاز ہی میں پریس کی مخالفت اور عدالتی چارہ جوئی کا رسک لینا پڑے۔
ہم نے استاد پیڈرو کا وہ اعتراف نامہ بھی سُنا جو نازو نے ریکارڈ کیا تھا۔ سوالات رابعہ کے تھے۔ دوسرے کیسٹ میں کوئی انٹرویو نہیں تھا اور نہ اس سے براہِ راست کچھ پوچھا گیا تھا۔ یہ دلاور کی اور پیڈرو کی گفتگو تھی۔ دلاور کو معلوم تھا کہ اسے پیڈرو سے کیا اُگلوانا ہے چنانچہ وہ محتاط تھا۔ اس نے خود کوئی ایسی بات نہیں کی جس پر بعد میں گرفت ہو مگر پیڈرو نے بہت سی باتوں کا اقرار کر لیا اور بہت سے انکشافات بھی کیے۔ تاہم اس سے کوئی بھی نئی بات معلوم نہیں ہوئی جو کسی طرح بھی ہمارے کام آتی۔ پیڈرو کا قصہ ختم ہو گیا تھا۔ اس کے خلاف سارے الزامات اور اس کے جرائم کی پوری فہرست بے مقصد ہو کے رہ گئی تھی لیکن اس نے جو کچھ ہمیں بتایا تھا وہ یقیناً اہم تھا۔
منظر نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ چوہدری دلاور سے پیڈرو نے جو کچھ کہا ہے بقائمی ہوش و حواس نہیں کہا ہے' وہ نشے میں تھا۔ اس کی آواز اور لہجے میں لکنت ہے۔
"چوہدری دلاور نے اسے خود پلائی ہو گی" غالب نے کہا۔
"یہ صرف شراب نہیں بول رہی تھی۔ اگر شراب کے ساتھ کوئی سکون آور دوا دی جائے تو اس کا اثر دُگنا ہو جاتا ہے۔" منظر بولا۔
میں نے کہا "میرے والد کی برسی پرسوں ہے۔"
غالب نے کہا "پرسوں نہیں' کل۔"
میں نے گھڑی میں تاریخ دیکھی تو مجھے خیال آیا کہ اپریل کا مہینہ تیس دن کا ہوتا ہے اور میں نے رات کے بعد تاریخ کو آگے نہیں کیا تھا۔ اس میں اکتیس تاریخ آگئی تھی جبکہ آج یکم مئی تھی اور اسی لیے چھٹی تھی۔
میں نے تاریخ درست کر کے کیلنڈر آگے بڑھا دیا "ایک سال اور گزر گیا۔"
"اس مختصر سے عرصے میں کتنے لوگ نہیں رہے" غالب بولا۔
یہ فہرست واقعی بہت لمبی تھی۔ اس عرصے میں ہم سب ہی یتیم ہو گئے تھے۔ میرے والد کے بعد رابعہ کی ماں کو قتل کر دیا گیا تھا۔

سن کے والدین رضائے الٰہی سے اللہ کو پیارے ہوئے تھے۔ پھر زو کے والد کا انتقال ہوا تھا۔ گُل بانو کا' جو اس وقت ناگ منی ڈاکو بھائی شیش ناگ مارا گیا تھا۔ نکی کے ابّا نقوی صاحب بھی پُراسرار حالات میں ہلاک ہوئے۔ ہمارے اپنے ساتھیوں میں محسن کی بیوی شہلا اور اس کا بیٹا۔ استاد پیڈرو' محسن کی بہن فوزیہ اور اس کا شوہر۔ یا میرے خدا' ہم کتنے رشتوں سے محروم ہو گئے۔ ایسا لگتا ہے کہ دنیا خالی ہو گئی۔
غالب نے کہا "افسردہ ہونے کی کوئی بات نہیں۔ برسی فقط یادوں کی تجدید کا دن ہے ورنہ دعائے مغفرت آدمی ہر دن کر سکتا ہے۔"
"ہاں۔ بس ایسے ہی ایک خواہش تھی کہ اس برسی پر میں فاتحہ خوانی کے لیے جاؤں تو یہ خیال نہ ہو کہ میں خالی قبر کے سرہانے کھڑا ہوں۔ محسن کہاں ہے؟"
میرے اچانک سوال سے غالب چونکا "اس کا کچھ پتا نہیں۔"
"پتا نہیں کا کیا مطلب؟"
"وہ اپنے گھر میں نہیں ہے۔ گُل بھی نہیں ہے اور ببلی بھی۔"
"تم نے مالکِ مکان سے پوچھا؟"
منظر نے کہا "وہ چپراسی ہمارے دفتر میں ہے جس نے یہ ایک کمرے کا مکان دلوایا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ مکان خالی کر گئے۔"
"کب؟ اور خالی کر کے کہاں گئے؟" میں نے کہا۔
"یہ کسی کو خبر نہیں۔ وہ بتا کے بھی نہیں گئے اور نہ اس کے بعد خود انہوں نے اپنے بارے میں کوئی اطلاع دی۔ یہ تین دن پہلے کی بات ہے' وقار یوسف نے چپراسی کی ڈیوٹی لگائی تھی کہ اِدھر اُدھر کے لوگوں سے پوچھ کر آئے مگر وہ ناکام لوٹا۔"
میں تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ "کمال ہے۔ تم سب اتنے مطمئن بیٹھے ہو جیسے کوئی بات ہی نہیں۔"
"وہ اپنی مرضی سے گئے ہیں۔ جہاں بھی گئے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ انہیں ببلی کی حفاظت کا خیال ہو۔ انہوں نے کوئی خطرہ محسوس کیا ہو تو خاموشی سے روپوش ہو جانا بہتر سمجھا ہو۔ وہ بچّے کی خاطر سب کچھ کر سکتے ہیں۔"
میں نے کہا "خدا کرے کہ ایسا ہی ہو لیکن ببلی کو اچانک کیا خطرہ لاحق ہو گیا؟"
"فرض کرو انہیں کوئی شخص مشتبہ محسوس ہوتا ہے یا ان کو دھمکی ملتی ہے" غالب نے کہا "ان کی جگہ میں بھی ہوتا تو کسی کو بتائے بغیر ایسے ہی غائب ہو جاتا۔ ببلی ان کی زندگی ہے۔ وہ ہمارے بغیر جی سکتے ہیں' ببلی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔"
"ان بے وقوفوں نے ابھی تک کسی سے رابطہ نہیں کیا۔ تین دن ہو گئے۔ انہیں سوچنا چاہیے کہ سب پریشان ہوں گے۔ یہی خیال آئے گا ہمارے دل میں کہ انہیں کسی نے اغوا تو نہیں کر لیا۔ ایک رقعہ چھوڑ جاتے یا کہیں سے کسی کو بھی فون پر پیغام دینا کوئی

مشکل تو نہیں تھا۔"
"ہم بھی انتظار کر رہے ہیں۔ اور مجھے شک ہے کہ وہ کراچی چلے گئے ہوں گے۔" منظر نے کہا "اکرام شیخ کا فون آیا تھا' اس کی بات تو نہیں ہوئی غالب سے۔ پیغام مل گیا تھا۔"
"میں یہاں ہوتا تو بات بھی ہو جاتی" غالب نے کہا۔
"پیغام کیا تھا؟"
"کوئی خاص نہیں۔ ہم سب کی خیریت پوچھی تھی۔ اور ببلی کے بارے میں کہا تھا کہ لاہور میں خطرہ ہو تو اسے کراچی بھیج دو۔"
"مگر اس پیغام کا علم محسن کو کیسے ہوا؟"
"ہاں یہ بات ذرا عجیب لگتی ہے۔"
میں نے کہا "کراچی سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ کاجل کے اسکول میں فون ہے' گھر پر فون ہے۔"
"فون نمبر کس کے پاس ہے؟" غالب نے کہا۔
"رابعہ کے پاس ہو گا۔ اور کاجل کا اسکول عام اسکول نہیں ہے۔ کافی شہرت ہے اس کی۔ آپریٹر خود نمبر معلوم کر کے لائن ملا سکتا ہے لیکن چھوڑو..... میں خود کراچی جا رہا ہوں" میں نے کہا۔
"کیوں اب کیا خارش ہو رہی ہے؟" منظر بولا۔
"مجھے شیخ مختار کی درازوں سے وہ ڈائری حاصل کرنی ہے۔ ہر قیمت پر" میں نے کہا۔
مولوی خادم حسین کو سخت مایوسی ہوئی جب ہم نے دوپہر کے کھانے پر رُکنے سے معذرت کر لی "ہم نے چائے پی لی۔ اتنا کافی ہے۔"
"اب تم ولیمہ کروا اپنا بھوتنی کے" منظر نے پھر اس کے ہاتھ مار دیا "اس میں کھائیں گے خوب۔"
"ولیمہ اب کیا جی۔"
"ابے شادی کے بعد اور کیا سوئم ہوتا ہے؟ بیٹا یہ شرعی مسئلہ ہے۔ ولیمے کے بغیر اولاد جائز نہیں رہتی۔ تم حرامی ہو پھر تمہاری اولاد حرامی ہو گی تو..."
"حرامی پن کی ساری نشانیاں تو آپ کی ذات میں مجتمع ہو گئی ہیں" مولوی خادم حسین چراغ پا ہو گیا "اپنے سترہ بچّوں کو جو چاہیں کہیں' میرے بچے کو کچھ کہا تو..."
"تو..... سوت نہ کپاس جلاہے سے لٹھم لٹھا۔ ابھی سے یہ بھوتنی کا باپ بن بیٹھا۔ ابے اُلو بنایا ہو گا بیوی نے۔ اولاد پیدا کرنا مردوں کا کام ہے۔ زنخوں کا نہیں سالے۔ پہلے چیک کرا۔ ایسے ہی ڈراما نہ ہو۔ جب کچھ ہو گا تو پھر حرامی حلالی کا فیصلہ کریں گے۔"
"بس جی آج کے بعد آپ سے بات کرنے والا حرامی..." وہ چلّانے لگا "بخدا اشتعال میں کسی دن آپ کی جان میرے ہاتھوں جائے گی۔ مجھے بلاوجہ پھانسی ہو گی۔"
"انشاء اللہ اور آمین" منظر بولا "اب بتا سکندر' تم' غالب اور وقار۔ سب نے سُنی ہے نا مولوی خادم حسین کی بات۔ جو مجھ سے

بات کرے وہ حرامی۔ جا کے اپنی بیوی بچّوں کو بھی بتا دیتا ہوں۔"

ہم دو بجے کے قریب منظر کے گھر پہنچے تو ظاہر ہے خواتین' رابعہ' نگی اور نازو.... سخت برہم تھیں۔ وہ بہت بُری پھنسی تھیں۔ دو گھنٹے میں منظر کی بیوی ان تینوں کا دماغ چاٹ گئی تھی اور ابھی تک اس کی زبان اتنی ہی مستعدی اور برق رفتاری سے رواں تھی۔ رابعہ یوں ہی کم گو تھی۔ نازو سے زیادہ نگی نے اس کی بیوی کے نظریات اور خیالات سے عدم اتفاق کی ناکام کوشش کی تھی لیکن وہ سیلابی ریلے کو ریت کی دیوار سے روکنے کی کوشش ثابت ہوئی تھی۔ وہ سوائے تائید کے اور ہوں ہاں کرنے کے کچھ نہیں کر سکتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ یک طرفہ گفتگو' جسے مونولاگ کہتے ہیں' آخر کتنی دیر جاری رہ سکتی ہے۔ بالآخر منظر کی بیوی کو احساس ہوگا کہ اکیلی وہی بول رہی ہے تو وہ تھک کے یا مروت میں چُپ ہو جائے گی اور کچھ ان کی بھی سُننے گی مگر ایسا نہیں ہوا۔ منظر کی بیوی بلا تکان بولتی رہی اور اس کے پاس موضوعات کی کمی نہیں تھی اور فصاحت وبلاغت کی صلاحیت خداداد تھی اس لیے وہ بچّوں اور شوہر کے اخلاق وعادات پر کنٹرول کرنے کے طریقوں سے خاندانی تنازعات' مہنگائی' فلموں میں بے حیائی اور سفلی عمل سے جنات کے وجود کو برحق ثابت کرنے تک ہر مسئلے پر بول چکی تھی اور جب ہم پہنچے تو یہ بتا رہی تھی کہ سولہ بچّوں کے نام کیسے غلط رکھ دیے گئے تھے۔

اس کے دس پندرہ بچے گھر میں یوں چیخ پکار اور مار دھاڑ میں مصروف تھے کہ لگتا تھا جیل میں بلوہ ہوگیا مگر منظر کی بیوی پر کوئی اثر نہ تھا۔ اس کا سولھواں لختِ جگر فرش پر چت پڑا فریاد کناں تھا اور غالباً ہجوم کے پیروں میں فٹ بال بنا ہوا تھا۔

منظر نے تعریفی نظروں سے مجھے دیکھا "اسے کہتے ہیں گھر بیٹا۔ کتنی رونق ہے اور کتنا سکون ہے۔"

"بجا ارشاد.... لیکن یہی سکون ہے تو ہم بے سکون بھلے۔"

"ابے بھوتنی کے' سکون ہوتا ہے دل کا۔ دیکھ میری بیوی ذرا بھی پریشان ہے یا میں...؟"

"پریشان تو دوسرے ہوں گے۔ تمہارے ہمسائے۔ گھر آنے والے یا دنیا والے" میں نے کہا "ہم چلتے ہیں اب۔"

"ابے نہیں یار۔ کھانا کھا کے جاؤ۔ میری گھر والی تو کچھ کر نہیں سکتی۔ ان تینوں نے بھی اتنی دیر میں کچھ نہیں کیا۔ بس بیٹھی رہیں مہمان بن کے۔ خیر بازار سے منگوا لیتے ہیں کھانا۔ اب تو میرا ولی عہد بھی جوان ہوگیا ہے۔ مجھے کل ہی پتا چلا۔"

غالب نے کہا "کیسے پتا چلا؟"

"وہ گھر میں آتی ہے نا ایک ملازمہ۔ آج کل اپنی بیٹی کو بھی ساتھ لا رہی ہے۔ کل اس پر ڈورے ڈال رہا تھا۔ باقاعدہ ورغلا رہا تھا کہ بھاگ چلو میرے ساتھ۔ بالکل میرے نقشِ قدم پر چل رہا ہے۔ ہے بھی ہیرو ٹائپ میری طرح...."

ہم جان چھڑا کے بھاگے۔ رابعہ نے تو صرف اتنا ہی کہا کہ ہمیں چھوڑ کے خود کہاں نکل گئے تھے مگر نگی اور نازو تو پنجے جھاڑ کے پیچھے پڑ گئیں۔ وقار ہوشیار اور تجربے کار تھا' اس نے دفاعی حکمتِ عملی اختیار کی اور الزام ہمارے سر ڈال کے مظلوم بن گیا۔

"تمہاری قسم۔ مجھے تو یہ لوگ لے گئے تھے۔"

"زبردستی لے گئے تھے؟ گن پوائنٹ پر لے گئے تھے' بچّے ہو تم؟"

"یار نگی۔ گاڑی میں چلا رہا تھا۔ ڈرائیور کیا کر سکتا ہے بے چارہ۔ ان کو چھوڑ کے بھی کیسے آجاتا۔"

غالب کی نازو سے زبردست جنگ ہوئی۔ لڑنے کے لیے انہیں ویسے بھی کسی بہانے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ اس وقت تو بہت معقول وجہ تھی۔

"کیا ہو آخر تم میری۔ افسر' حاکم' اتالیق یا امّاں۔ کہ مجھ سے ایسے پوچھ رہی ہو۔ میں کہیں بھی جاؤں' جہنم میں جاؤں۔"

"میں بھی جاؤں گی اور تم ایسے مجھے بتائے بغیر نہیں جاؤ گے۔"

"میں جاؤں گا۔ تمہارا بھوت باپ مجھے منع نہیں کر سکتا۔"

"دیکھو باپ تک مت جاؤ۔ میں روک سکتی ہوں تمہیں اور پھر تم نے بھوت کہا میرے ابّا کو۔"

"ہاں کہا۔ ان سے پوچھو نا کہ وہ بھوت کیوں بنے آخر۔ میں نے تو نہیں کہا تھا۔ ان کے اعمال ہی ایسے ہوں گے۔"

نازو نے اپنے آخری ہتھیار سے کام لیا اور رونے لگی "تم ہمیشہ انہیں ذلیل کرتے ہو خواہ مخواہ اپنی لڑائی میں۔"

غالب بھول گیا "لڑائی۔ ہماری تو کوئی لڑائی نہیں نازو۔ اور میں تو مذاق کر رہا تھا۔"

"کوئی ضرورت نہیں مجھ سے مذاق کرنے کی۔ بلکہ بات کرنے کی۔ ابھی سے یہ حال ہے تو بعد میں کیا کرو گے؟"

"بعد میں اس سے زیادہ کروں گا" غالب نے کہا۔

نازو نے رابعہ سے فریاد کی "دیکھا' سُنا آپ نے...؟"

غالب بولا "یار میرا مطلب تھا زیادہ محبت کروں گا۔ اچھا تمہارے خالی سر کی قسم۔ آئندہ باتھ روم بھی جاؤں گا تو ایسے پوچھ کے" اس نے دو انگلیاں کھڑی کر کے کہا "اور تمہارے ابّا کو جن بھوت بد روح کچھ نہیں کہوں گا۔ بس اب رونا بند کرو۔"

"سچ کہہ رہے ہو" نازو نے فوراً آنسو پونچھ لیے۔

"ہاں۔ میں سچ کہہ رہا ہوں.... کہ آئندہ سچ نہیں بولوں گا۔" غالب نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ اس کے بعد دوسرا راؤنڈ کیسے شروع نہ ہوتا۔ ہم سب کی کوشش سلامتی کونسل کی قراردادِ امن سے زیادہ مؤثر ثابت نہ ہوئی۔ کھانا ہم نے باہر کھایا۔ یومِ مئی کے سلسلے میں بازار اور دفاتر بند تھے مگر ریسٹورنٹ زیادہ آباد تھے۔

گھر پہنچ کے سب ہی تھوڑی دیر کے لیے سو گئے۔ شام کو مجھے رابعہ لان پر بیٹھی نظر آئی تو میں اس کے پاس جا بیٹھا۔

"تم بہت اچھی لگ رہی ہو" میں نے کہا۔

"مجھے پتا تھا کہ تم یہی کہو گے۔ کہنے کو جب کچھ نہیں ہوتا تو یہی بات رہ جاتی ہے۔"

میں نے سٹپٹا کے کہا "تم بہت اکھڑی اکھڑی باتیں کر رہی ہو۔"

"مجھے لچھے دار باتیں کرنا نہیں آتا اور مجھے ایسی باتیں سُننا بھی اچھا نہیں لگتا۔"

"تم لڑنا چاہتی ہو؟"

"لڑنے سے بھی کیا ہوگا۔ آخر ہار میری ہی ہوگی۔ تم وہی کرو گے جو تمہارا دل چاہے گا۔ میں نے تم کو روکا تھا عباسی کے گھر جانے سے اور اس کے گیسٹ ہاؤس میں قیام کرنے سے۔ تم نے مانی میری بات؟ اور دیکھ لو اس کے نتیجے میں کیا ہوا۔ اب تم کراچی جانا چاہتے ہو تو میرے منع کرنے سے مانو گے؟ تم ضرور جاؤ گے۔"

"یہ ضروری ہے رابعہ...."

"سب کچھ ضروری ہے تمہارے لیے" وہ روہانسی ہوگئی۔

شاید وہ کہنا چاہتی تھی کہ شادی کے مسئلے پر سنجیدگی سے سوچنے اور گھر بسانے کی فکر کرنے کے سوا تمہارے لیے دنیا کا ہر کام ضروری ہے مگر کسی وجہ سے اس نے الفاظ کو زبان تک آنے سے پہلے روک دیا۔ میں اس کی ذہنی کیفیت کو سمجھتا تھا۔ میرا ساتھ دیتے دیتے اس کے صبر کا حوصلہ جواب دینے لگا تھا۔ اس کے اعصاب جواب دینے لگے تھے۔ وہ خود کو سمجھاتے سمجھاتے بھی تھک گئی تھی۔ اب تو مجھے اس کے سامنے کسی مجبوری کا عذر پیش کرنے یا اسے تھوڑا سا انتظار اور کرنے.... کے لئے کہتے ہوئے بھی شرم آتی تھی۔

نگی نے بروقت نمودار ہو کے میری مشکل آسان کی ورنہ شاید میں کچھ کہتا تو اس کا اثر اُلٹا ہوتا اور رابعہ رو پڑتی یا ہماری لڑائی ہو جاتی۔

نگی چائے کی ٹرے باہر ہی لے آئی تھی۔ چھوٹے سے لان میں بید کی چار کرسیاں پڑی ہوئی تھیں اور درمیان میں ایسی ہی میز تھی۔

میں نے کہا "باقی لوگ ابھی تک سو رہے ہیں؟"

"وقار تو خراٹے لے رہے تھے۔ ان کی کھال بہت موٹی ہے۔ کسی بات کا ان پر اثر نہیں ہوتا۔" نگی نے چائے بناتے ہوئے کہا "غالب اور غالباً آ رہے ہیں۔ پہلے غالب اسے مناتا رہا۔ پھر معاملہ اُلٹا ہوگیا۔ اب نازو منا رہی ہے اسے۔ خوب ہے ان کی جوڑی بھی۔"

"یہ تو شادی کے دو چار یا پانچ دس سال بعد ہی پتا چلتا ہے۔"

"اچھا! ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ رہے ہو یا سنی سنائی" اس نے مجھے چائے پکڑاتے ہوئے کہا "دیکھو سکندر بھائی۔ میں آخری بار سمجھا رہی ہوں کہ بہت ہو چکی' اب شادی کر لو۔"

میں نے کہا "یعنی پھر نہیں کہو گی؟"

"مذاق میں مت ٹالو۔"

"تمہارے آنے سے پہلے ہم بھی یہی سوچ رہے تھے۔ بلکہ اسی مسئلے پر تبادلۂ خیال.... کر رہے تھے" میں نے کن انکھیوں سے رابعہ کو دیکھا۔

"جھوٹ۔ تم ہمیشہ کی طرح ٹالنے کے بہانے تلاش کر رہے تھے" رابعہ نے تلخی سے کہا۔

نگی نے مجھے غصے سے دیکھا "آج یہ مسئلہ طے ہو کے رہے گا۔ رات کو سب کے سامنے بات ہوگی۔ مجھے تاریخ چاہیے۔"

"تم تو بالکل دُلہا کی اماں کی طرح بات کر رہی ہو۔ جیسے لڑکی والے ٹال رہے ہوں" میں نے کہا۔

"غالب کو بھی فیصلہ کرنا پڑے گا۔ بلکہ فیصلہ میں کروں گی۔ میں منظر بھائی کو بھی بُلا لوں گی۔ تمہارا کوئی بڑا نہیں ہے تو کیا تم بے مہار ہو گئے ہو۔ مزید مہلت نہیں دی جا سکتی تمہیں۔ ہم دو تین پرچیوں پر تاریخ لکھ کر رکھیں گے۔ تم ایک اٹھا لو گے' وہی تاریخ پکی۔"

نگی بڑے جلال میں تھی اور رابعہ کے موڈ کو دیکھتے ہوئے میں نے بھی اس کی بات کو مذاق میں اُڑانے کی ہمت نہیں کی۔ میرے ہاں یا نہ کرنے سے پہلے غالب نے کھڑکی میں سے چلّا کے کہا "منظر کا فون ہے۔"

میں نے اندر جا کے ریسیور اٹھا لیا "کیا بات ہے؟"

"بات کے بچّے۔ اس بھوتنی والے نے مجھے فون کیا تھا۔"

"کس نے؟"

"اپنے چوہدری دلاور نے۔ کہنے لگا کہ اپنے سکندر صاحب سے کہو کہ ذرا خیال کریں۔ لاہور میں ایسے مت پھریں جیسے لندن میں پھرتے تھے اور ان کو میری طرف سے کہنا کہ وزیر خاں کی برسی مبارک ہو۔"

میں نے بے اختیار گالی دے کر کہا "اس.... سے کہنا تھا کہ مجھ سے بات کرے۔"

"یہی کہا تھا میں نے۔ اور یہ بھی کہ آئندہ سال میں تمہاری مبینہ اولاد کو ایسی ہی مبارک باد پیش کروں گا۔ انشاءاللہ۔ تو ہنسنے لگا کہ اپنے سیزی صاحب۔ منظر کو سیزی کہہ رہا تھا۔ بات آج کی کرنی چاہیے۔ کل کا کسے پتا۔ ہیں جی' میں بات کر لیتا ہوں اپنے سکندر اعظم سے بھی۔"

میں نے کہا "اسے معلوم ہے.... کہ میں کہاں ہوں..؟"

"بھوتنی کے۔ تم بھی سورما بنے پھرتے ہو؟ اب انتظار کرو اس کے فون کا۔ پھر مجھے بتانا اس نے کیا کہا؟" منظر نے فون رکھ دیا۔

میں نے ریسیور رکھا ہی تھا کہ گھنٹی پھر بجنے لگی۔ میں نے آواز بدل کے کہا "ہیلو۔"

چوہدری دلاور بہت چالاک ثابت ہوا "ڈراما مت کرو اپنے سکندر صاحب۔ یہ تو ایسے ہی وہ ہے' کیا کہتے ہیں اسے.... انفارمل کال۔"

"مجھے مبارک باد دینے کے لیے؟"

"اب میں کیا کہوں۔ میرے کہنے سے تم کب مانو گے۔ خیر' تمہاری مرضی ہے اسے جھوٹ سمجھو یا سچ' ہیں جی۔ مگر سید پور کا نام ہی آج سُنا ہے میں نے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اس جگہ سے پیڈرو کا کوئی تعلق ہو۔ یا اس کے ساتھ جانے والوں میں سے کسی کا.... مایوس ہونے کے لیے بڑی دور جانا پڑا تمہیں۔"

میں نے کہا "یہ جذبات کی باتیں ہیں۔ تم نہیں سمجھو گے۔ وہاں پہنچ کے مجھے احساس ہوا کہ اس سے میرے والد کی روح کو بالکل فرق نہیں پڑتا کہ جسدِ خاکی سپردِ خاک ہوا تو کہاں ہوا۔ زمین کی مٹی کہیں کی ہو' کیسی بھی ہو۔ ایک بے جان جسم کے لیے برابر ہے۔ فرق پڑ سکتا ہے پودوں یا درختوں کو جب تک وہ زمین پر موجود ہیں۔ ورنہ ازل سے زمین نے لاکھوں بستیاں اور قبرستان نگل لیے جن کا کوئی سُراغ نہیں۔"

"یار ہم جیسے اَن پڑھ بندے ایسی کتابی باتیں کہاں سمجھتے ہیں' ہیں جی!"

میں نے کہا "بتانے کا مقصد یہی تھا کہ مجھے مایوسی نہیں ہوئی۔ قرار آگیا جب وہاں جاکے میں نے اپنے والد کا مدفن دیکھ لیا۔ پھر میں نے وہ خیال ہی چھوڑ دیا۔ ہڈیوں کو پھر کھود کے نکالنے اور یہاں لاکے دفن کرنے کا۔ میں وہاں سے فاتحہ پڑھ کے لوٹ آیا تھا۔ اب تم کہتے ہو تو ٹھیک ہے لیکن مجھے فرق نہیں پڑتا۔ میں پہلے بھی اسی نیک نیتی اور خشوع وخضوع سے فاتحہ پڑھنے جاتا تھا۔ اب بھی ویسے ہی ان کے لیے دعائے مغفرت کروں گا۔ اس کے لیے وقت یا جگہ کی قید نہیں۔"

"خیر جی۔ یہ تمہارے مسئلے مسائل ہیں.... ہمیں کیا۔"

میں نے کہا "رہی تمہاری مرضی کی بات کہ تم نے مجھے مہلت دی تو یہ سمجھ لو کہ اسے ایک لمحے کے لیے بھی میں نے تمہاری دی ہوئی مہلت نہیں سمجھا۔ تم میرے قدموں کے سُراغ پر میرے تعاقب میں تھے۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ تم مجھ سے فون پر بات کر رہے ہو۔ تم نے منظر کے گھر فون کیا تھا اور بالآخر پتا چلالیا کہ میں یہاں ہوں۔ کسی اور دشمن کو یہ بات معلوم نہیں۔ تم تو یہ بھی جانتے ہو کہ میں کسی احتیاط کے بغیر کہاں کہاں گیا تھا۔ بس یہی غلطی ہوگئی تم سے۔"

"اجی اپنے سکندر اعظم صاحب۔ غلطیاں تو ہم کرتے رہیں گے۔ بندہ بشر جو ہوئے۔"

"میرا پہلے ارادہ تھا کل کراچی جانے کا۔ لیکن اب میں یہاں ایک منٹ بھی نہیں ٹھہر سکتا۔"

وہ اپنی مایوسی کو چھپا نہیں سکا "کل برسی بھی نہیں کروگے؟"

"میں ایسی دنیاوی رسموں کا قائل نہیں۔" میں نے کہا "آخرت میں ان کی مغفرت کے لیے دعا میں کہیں بھی کر سکتا ہوں اور کسی وقت بھی کر سکتا ہوں۔ تم میری تلاش میں یہاں آئے تو کچھ حاصل نہیں ہوگا۔"

"ہاں۔ ہم نے کہا کہ رسمِ دنیا بھی ہے موقع بھی ہے دستور بھی ہے۔"

"تم اپنی خیر مناؤ دلاور۔"

"نہ..... نہ سکندر صاحب۔ کل برسی ہے اس لیے ابھی میں بھی کچھ نہیں کر رہا ہوں۔ ورنہ آج بہت کچھ ہو جاتا۔ دیکھو نا' مجھے پتا ہے تم کس کے ساتھ' کہاں کہاں گئے تھے اور اس وقت کہاں موجود ہو مگر وہ جو ایک بے وقوفی کر بیٹھا تھا میں تمہیں مہلت دینے کی۔ بیوی کی بات مان کے۔ تو میں نے کہا کہ چلو ایک دن اور سہی۔ ہیں جی' ایک اطلاع بھی دینی تھی تمہیں۔ تمہارے مطلب کی۔"

میں نے کہا "ایک اطلاع مجھے دینی تھی۔ پیڈرو جو تمہارا دستِ راست تھا مارا گیا۔"

وہ ہنسنے لگا "دفع کرو جی۔ ہمیں اس سے کیا لینا دینا۔ مارا گیا تو ہم کیا سوئم کریں اس کا۔ تمہارے لیے چھوڑ دیا تھا میں نے وہ شکار۔ ہیں جی' خیر سے تم بھی اچھے شکاری ہو مگر وہ قابو آگیا تھا میرے۔ میں نے کہا کہ اس پر تو اپنے سکندر اعظم کا حق بنتا ہے۔ کیا ہوا خیر سے بعد میں' پیڈرو نے کچھ بتایا؟"

"بہت کچھ بتایا جو تمہیں بھی معلوم نہیں۔ مگر معلوم ہو جائے گا۔"

"یہ نہیں بتا سکا ہوگا وہ کہ تمہارے والد وزیر خان مرحوم کی ہڈیاں کہاں گئیں۔ اسے خود معلوم نہیں تھا۔ ہیں جی' کل برسی ہے نا تو میں نے سوچا کہ خود ہی تمہیں بتا دوں۔ وہ میں نے بعد میں اصل قبر میں دفن کرادی تھیں۔ واپس منگوالی تھیں۔"

"تم میرے جذبات سے کھیل رہے ہو۔"

"توبہ توبہ۔ کیسی بات کرتے ہو جی اپنے سکندر صاحب۔ یقین نہ کرو تمہاری مرضی۔ لیکن حقیقت یہی ہے۔ جب پوسٹ مارٹم والی بات ختم ہوگئی تھی تو میں نے ایسا ہی کیا تھا۔ اب تمہارے والد وہیں دفن ہیں جہاں ان کی قبر ہے۔ ہیں جی' کل تک خطرے کی کوئی بات نہیں۔ تم تسلی سے جاؤ۔ فاتحہ پڑھو' پرسوں.... اچھا چھوڑو۔"

"کیا چھوڑوں؟"

"پرسوں کی بات۔ ابھی سے کیا کرنی.... ہیں جی!"

میں نے کہا "دلاور۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں پیڈرو کو وہاں لے گیا تھا جہاں اس نے تمہارے کہنے پر میرے والد کی ہڈیوں کو دفن کیا تھا اور میں اس بات پر بہت حیران تھا کہ اس کے لیے بطورِ خاص وہی جگہ کیوں منتخب کی گئی تھی۔"

"کون سی جگہ؟"

میں نے دلاور کے اسٹائل میں قہقہہ مارا "تم کیا سمجھتے ہو مجھے معلوم نہیں کہ لاہور سے سید پور تک ہر لمحہ ہر قدم پر تم میرے تعاقب میں تھے۔ یہ بلی چوہے کا کھیل تم کیوں کھیل رہے تھے۔ یہ بھی میں نے سمجھ لیا ہے۔"

"لیکن خود ہم۔"

"بابا' مجھے یا منظر کو وہ کچھ نہیں کہتے۔ آج تک ہم اسی لیے محفوظ ہیں کہ ان کی ہم سے کوئی دشمنی نہیں۔ ہم صرف وکالت کر رہے ہیں۔

وقار کی بات ٹھیک تھی مگر اس سے نکی کی پریشانی کم نہیں ہوئی۔ اچانک ہنگامی صورتِ حال کے اعلان نے سب کو PANIC میں مبتلا کردیا تھا۔ غالب پرسکون تھا لیکن نازو نروس تھی۔

"ہم کیسے جائیں گے اور کدھر سے؟" غالب نے کہا۔

"آخر جانا کہاں ہے؟" رابعہ بولی۔

میں نے اس کی بات کاٹ دی "تم نے سوٹ کیس پیک کرلیا ہے؟"

"ہاں۔ وقار کی گاڑی میں رکھوادوں۔"

میں نے غالب سے کہا "سوٹ کیس لے کر چھت پر چلو۔ ہم سامنے سے جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔"

"پیچھے سے کون سا راستہ ہے؟"

"خالی پلاٹ ہے نا۔ اس پر اُتر جائیں گے" میں نے کہا "کیا پتا وہ سڑک پر گھات میں بیٹھے ہوں۔ دلاور نے کہیں قریب سے ہی فون کیا ہو۔"

اپنی طرف سے میں نے ایک منٹ کی دیر نہیں کی تھی مگر مجھ سے ایک غلطی یہ ہوئی تھی کہ میں نے صرف ایک دشمن کے بارے میں سوچا تھا۔

ابھی غالب نے سوٹ کیس اُٹھایا ہی تھا کہ باہر سڑک کی طرف سے پولیس کا سائرن سُنائی دیا۔ ہم سب اپنی اپنی جگہ کھڑے رہ گئے۔

"یہ خیال تو مجھے آیا ہی نہیں تھا" میں نے مایوسی سے کہا "اب کچھ نہیں ہوسکتا سوائے اس کے کہ میں اکیلا فرار ہوجاؤں۔ چھت سے کود کے۔"

رابعہ نے میرا ہاتھ پکڑلیا "نہیں۔ چھت سے کودنے میں خطرہ ہے۔ تم زخمی ہوجاؤ گے۔ اور پولیس کے پاس فرار ہونے والے ملزم پر گولی مارنے کا جواز ہوتا ہے۔"

وہ چند سیکنڈ کا وقت تھا جب میں یہ جُوا کھیل سکتا تھا کہ چھت پر چڑھ کے پیچھے چھلانگ لگادوں۔ ٹانگ نہ ٹوٹے تو بھاگ جاؤں۔ پولیس مجھے چھت پر جاتا ہوا دیکھ سکتی تھی اور چھت پر آکے بھی پیچھے سے فائر کرسکتی تھی۔ شاید رابعہ نے ٹھیک ہی کیا کہ مجھے روک لیا۔

چند لمحوں بعد نکی کے چلّانے کی آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی پولیس والے اندر آگئے۔ بالکل روایتی انداز میں انہوں نے ہر طرف سے یلغار کی تھی۔ ان کے ہاتھوں میں ریوالور تھے اور ان کی قیادت کرنے والا ایک انسپکٹر تھا۔

انسپکٹر نے فلمی اسٹائل میں چلّا کے کہا "خبردار! جو بھاگنے کی

اس کے فون بند کرنے سے پہلے میں نے ریسیور رکھ دیا۔ میں اچانک تشویش میں مبتلا ہوگیا تھا۔ خطرہ مجھے ہر سمت سے یلغار کرتا محسوس ہو رہا تھا۔

غالب نے کہا "کیا ہوا...؟"

میں نے کہا "کچھ بھی ہوسکتا ہے غالب۔ باقی لوگ کہاں ہیں؟"

"باہر چائے پی کے نکی کو پریشان کر رہے ہیں۔ کوئی سیریس ہی نہیں۔ وہ شادی کی تاریخ مقرر کرنا چاہتی ہے۔"

میں نے باہر جاتے ہی کہا "رابعہ۔ اب میں یہاں ایک منٹ نہیں ٹھہر سکتا۔ تم چلو گی میرے ساتھ۔"

نکی چلّائی "لیکن کہاں... اور اچانک کیا ہوگیا؟"

"نکی۔ تمہاری عقل شریف میں یہ بات نہیں آتی کہ جب دلاور کا فون یہاں آگیا تو وہ خود بھی آسکتا ہے۔"

"کیا اس نے دھمکی دی ہے؟"

"اس نے تو مہلت دی ہے اپنی طرف سے مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ دھوکا ہے۔ حیرت مجھے منظر پر ہے۔ اس احمق کی عقل میں بھی یہ بات نہیں آئی۔ اس نے دلاور کو یہاں کا فون نمبر کیسے دے دیا؟"

"یہ دلاور کو پہلے سے معلوم ہے" وقار نے کہا۔

"میرا مطلب تھا کہ منظر نے کیسے بتادیا کہ سکندر بخت یہاں ملے گا۔ حد ہوتی ہے بے وقوفی کی بھی۔" میں نے کہا "دلاور نے کہا ہے کہ پرسوں تک اس کی طرف سے مجھے کوئی خطرہ محسوس نہیں کرنا چاہیے کیونکہ کل برسی ہے میرے والد کی۔ اگر دلاور جیسا جانی دشمن یہ بات کہے تو اس پر اعتبار کیا جاسکتا ہے؟ اتنا خیال کرے گا وہ ہمارے جذبات کا؟"

غالب نے کہا "بالکل ٹھیک سوچا ہے تم نے۔ وہ صرف معلوم کرنا چاہتا ہوگا کہ تم منظر کے گھر میں ہو یا یہاں؟"

"پھر اب کیا کریں؟" نازو نے گھبراہٹ میں سوال کیا۔

غالب نے گھڑی دیکھی "وہی جو نکی کہہ رہی ہے۔ کیوں نکی' اگر آج ہی کی تاریخ رکھ لی جائے تو شادی کتنی دیر میں ہوسکتی ہے۔ دراصل ٹائم کچھ کم ہے ہمارے پاس۔"

میں نے کہا "فضول باتیں چھوڑو۔ تم نکل جاؤ نازو کے ساتھ۔"

"نکل کے کہاں جاؤں؟"

"کہیں بھی جاؤ۔ اس گھر میں مت رہو" میں نے رابعہ کو ہاتھ پکڑ کے کھینچ لیا "چلو جلدی کرو۔ وہ لوگ آتے ہی ہوں گے۔"

نکی پر بدحواسی طاری ہوگئی "وقار۔ تم بھی کچھ کرو۔"

وقار اسی طرح بیٹھا رہا "میں دعا کر رہا ہوں کہ انہیں نکل جانے کی کچھ مہلت مل جائے پھر ہمیں کوئی خطرہ نہیں۔ وہ آئیں اور دیکھ لیں کہ یہاں کوئی بھی نہیں ہے۔"

کوشش کی۔ ہینڈز اَپ۔"

ہم سب نے ہاتھ اوپر اُٹھادیے۔ مقابلے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

"سکندر بخت کون ہے؟" پولیس انسپکٹر نے کہا۔

"کیا تم پہچانتے نہیں" غالب نے کہا "میں ہوں سکندر۔"

انسپکٹر نے کہا "ہتھکڑی لگادو اسے۔"

اس کے پیچھے آنے والے مسلح کانسٹیبل آگے بڑھے اور انہوں نے غالب کو ہتھکڑی پہنادی۔ نازو کی حالت غیر ہوگئی مگر سب کو خاموش دیکھ کے اس نے ضبط سے کام لیا۔ نیا انسپکٹر شاید سکندر بخت کو پہچانتا نہیں تھا اور اس غلط فہمی سے فائدہ اٹھانے کا خیال مجھ سے پہلے غالب کے دماغ میں آیا تھا۔ کسی تذبذب کے بغیر اس نے خود کو گرفتاری کے لیے پیش کردیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ بعد میں وہ آسانی سے رہا نہیں ہوگا مگر سکندر کے بجائے غالب کو پکڑ لانے والے انسپکٹر کی نوکری ضرور چلی جائے گی۔

انسپکٹر نے قدرے مطمئن ہوکے کہا "او ر یہ... میں رابعہ قاری کون ہے!"

اب نازو نے اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہاتھ بڑھادیے "میں؟"

وقار نے پیچھے سے کہا "تم نے ابھی تک مجھے وارنٹ نہیں دکھائے اور تم لیڈی پولیس کے بغیر میرے گھر میں داخل ہوئے ہو۔"

"وکیل صاحب۔ لیڈی پولیس گاڑی میں موجود ہے۔ ان کا ساتھ ہونا کافی ہے" انسپکٹر بولا "مفرور ملزمان کی گرفتاری کے لیے وارنٹ نہیں ہوتا' چھاپا مارا جاتا ہے ایسے ہی ورنہ ٹائم نکل جاتا ہے۔"

"لیکن ان کا جرم کیا ہے۔ مجھے معلوم ہونا چاہیے۔ میں ان کا وکیل ہوں" وقار نے بحث جاری رکھی۔

"وکیل صاحب۔ جرم بھی پتا چل جائے گا۔"

"نہیں۔ تم میرے گھر میں یہ لاقانونیت نہیں چلا سکتے انسپکٹر۔ میں ہرگز اس کی اجازت نہیں دوں گا۔"

"اوئے پاگل خانے۔ تیری اجازت کی ضرورت کسے ہے؟"

وقار اس کے اندازِ تخاطب پر چراغ پا ہوگیا "میں ابھی بات کرتا ہوں' ایس پی فضل احمد سے' جمالی صاحب سے۔"

نازو کو ہتھکڑی لگانے والا کانسٹیبل ہنس پڑا "ضرور کرو جی' اگر ٹیلی فون زندہ ہو۔"

وقار نے پلٹ کے کہا "فون ڈیڈ ہے۔ تم نے لائن کاٹ دی ہے میرے فون کی۔"

"چھاپا ایسے ہی مارا جاتا ہے سرکار" دوسرا کانسٹیبل بولا۔

میں نے اسے بھی غور سے دیکھا۔ اچھی بات یہ ہوئی تھی کہ وہ مجھے شکل سے نہیں پہچانتے تھے ورنہ میں اس وقت اپنے اصلی چہرے کے ساتھ سامنے تھا اور انکار نہیں کرسکتا تھا کہ میں سکندر بخت نہیں ہوں۔ غالب پر اعانتِ مجرمانہ کا الزام عائد کرسکتے تھے۔ یہ کہہ سکتے تھے کہ اس نے اور نازو نے اصل مجرمان کے فرار میں مدد کی مگر وہ غالب کو سکندر کے جرم میں بند نہیں کرسکتے تھے۔

اس وقت جو بات میرے ذہن میں تھی وہی غالب بھی سوچ رہا تھا اور شاید وقار بھی۔ میں نے نظر بچا کے رابعہ کو اشارہ کیا مگر وہ نہیں سمجھی' نازو نے دیکھا اور سمجھ لیا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ وہ آہستہ سے ایک قدم پیچھے ہٹی۔ پھر اس نے دوسرا قدم پیچھے ہٹایا۔

باہر سے نکی نے پھر چلّانا شروع کیا۔ "آخر یہ کیا ہو رہا ہے.... ...... میرے گھر میں۔"

میرا شبہ درست ثابت ہو رہا تھا۔ وہ مجھے اور رابعہ کو ملک خداداد عباسی کے قتل کے الزام میں گرفتار کرنے آئے تھے۔ بڑے عذاب سے چھوٹا عذاب یقیناً قابلِ ترجیح تھا لیکن باہر سے ملک نبی داد عباسی کی آواز سن کے میری ساری امیدیں خاک میں مل گئیں۔ وہ اندر آتے ہی پہچان جائے گا کہ سکندر بخت کون ہے۔ پولیس نے غلط آدمی کو گرفتار کرلیا تھا۔ یہ ہمارے نقطۂ نظر سے اچھی بات تھی مگر قسمت کی خرابی نے ہمیں فائدہ نہیں اُٹھانے دیا تھا۔

اب میں شک کے باوجود اپنا پلان بدلنے پر مجبور تھا مگر مجھے بہت دیر ہوچکی تھی۔ اب نازو میری طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔

پھر ملک نبی داد عباسی یعنی مسٹر مونچھ اندر آیا اور اس نے حیرانی سے اندر کا منظر دیکھا۔ میں نے نازو کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی آخری کوشش کی۔

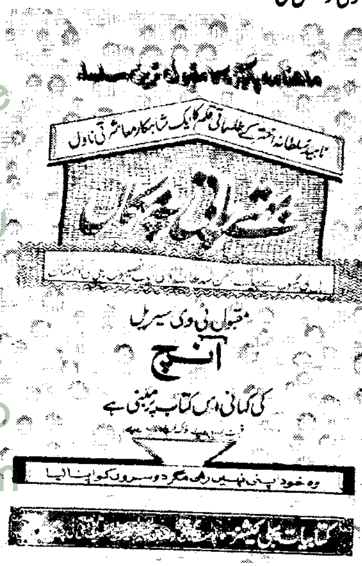

دونوں ہاتھ آگے بڑھائے "ہمارا نام بھی آجائے خبر میں۔"

"تم پتا نہیں خود کو کیا سمجھتے ہو" تھانے دار نے کہا "مشہور وکیل اور مشہور صحافی چوری کریں' ڈاکے ڈالیں' قتل کریں۔ کوئی ان کو پوچھنے والا نہیں۔ ان کو گرفتار کوئی نہیں کرسکتا۔ چلو اوئے۔"

اس نے آخری الفاظ اپنے ماتحتوں کو مخاطب کر کے کہے تھے۔

اس وقفے میں ملک نبی داد عباسی خاموشی سے دو کام کرتا رہا تھا یعنی زیرِ لب مسکراتا رہا تھا اور اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتا رہا تھا۔

نکی نے ہنگامہ کیا تھا مگر بعد میں اسے وقار نے خاموش کردیا تھا اور غالباً کوئی خفیہ اشارہ بھی کیا ہوگا ورنہ وقار کے کہنے سے نکی چپ ہونے والی نہیں تھی۔

میری طرح رابعہ بھی سارا کھیل سمجھ گئی تھی اور وقار نے بھی محض اس لیے ہنگامہ کیا تھا کہ انہیں شک نہ ہو وہ اسی غلط فہمی میں مبتلا رہیں کہ ہم دھوکا کھا گئے حالانکہ ان کی جعلسازی کا پردہ بہت پہلے چاک ہوگیا تھا۔

سب سے پہلی بات تو یہ کہ پولیس پارٹی کسی کی گرفتاری کے لیے چھاپا مارے اور خود انچارج تھانے دار کسی ملزم کو پہچانتا نہ ہو۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا۔

ان کی دوسری غلطی یہ تھی کہ وہ گرفتاری کے وارنٹ اور لیڈی پولیس کے ساتھ نہیں آئے تھے۔ بے شک... غریب اور لاوارث قسم کی بستیوں میں پولیس کی لاقانونیت کو چیلنج کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ وہ دن دھاڑے کسی بھی گھر میں گھس کے کسی کو بھی اٹھالیں۔ اس پر کوئی بھی الزام عائد کردیں اور پھر رقم بٹور کے اسے چھوڑ دیں۔ یہ سب ہوتا رہتا ہے مگر وہ ہر جگہ ایسا نہیں کرتے۔ جہاں نوکری کے لالے پڑنے کا ڈر ہو وہاں وہ محتاط ہوجاتے ہیں۔ خصوصاً کسی مشہور وکیل یا صحافی کے سامنے۔ یہاں تو معاملہ زیادہ سنگین تھا۔ گھر بھی ایک وکیل کا تھا اور انہیں گرفتار بھی ہائی کورٹ کی ایک نامور وکیل کو کرنا تھا۔ وہ اصلی پولیس والے ہوتے تو یہ غلطی کبھی نہ کرتے۔

ان کی تیسری فاش غلطی ٹیلی فون کے تار کاٹنا تھی۔ اصلی پولیس والے ایسا نہیں کرسکتے تھے۔ چور ڈاکو یہ کرتے ہیں' انہیں ڈر ہوتا ہے کہ کوئی پولیس کو فون نہ کردے۔ کسی ملزم کی گرفتاری کے لیے چھاپا مارنے والوں کو کس کا ڈر۔

میں نے بہت جلد سمجھ لیا تھا کہ پولیس کی وردی میں آنے والے پولیس مین نہیں ہیں۔ ان کی اداکاری بھی اچھی نہیں تھی۔ غالب نے اور وقار نے بھی اس جعلسازی کو سمجھنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ رابعہ وکیل تھی' صرف نازو اور وقار کی بیوی نکی کنفیوژن کا شکار تھیں اور یہ سمجھ رہی تھیں کہ فی الحال ہم پولیس کو غلطی کرنے کا موقع فراہم کررہے ہیں۔ بعد میں رابعہ اور سکندر نکل جائیں گے اور پولیس والوں کو پتا چلے گا کہ انہوں نے عملاً اس

میرے لیے اس کو چلاکے خبردار کرنے کے سوا چارہ نہ تھا ورنہ وہ ہتھکڑی میں بندھے ہوئے دونوں ہاتھوں سے پولیس مین کو دن میں تارے دکھادیتی۔ بلکہ رات کے وقت اسے سورج نظر آجاتا۔

میں نے کہا "رابعہ' یہ کیا کررہی ہو؟"

نازو کا ہاتھ اٹھتے اٹھتے رہ گیا۔ میرے مقابل کھڑا ہوا تھانے دار چونکا اور اس نے فوراً اپنے ریوالور کا رخ بھی نازو کی طرف کرلیا۔ اس وقت میرے لیے تھانے دار صاحب کی تھانے داری کے غبارے سے ہوا نکال دینا بہت آسان تھا مگر میں نے جانتے بوجھتے ایسا نہیں کیا۔

میری آواز پر رابعہ بھی چونکی تھی مگر اس کے چونکنے کو نہ میں نے دیکھا تھا اور نہ غالب یا وقار نے۔ ہم سب محتاط تھے اور نازو کو دیکھ رہے تھے۔

نازو نے ہکلا کے کہا "میں.... میں تو کچھ نہیں کررہی ہوں۔"

تھانے دار نے اسے وارننگ دی "دیکھو۔ چالاکی دکھانا عدالت میں وکیل صاحبہ۔ ادھر مجھے اختیار ہے کہ مجرم فرار ہونے کی کوشش کرے تو...."

"ابھی تم زیادہ سے زیادہ ملزم کہہ سکتے ہو۔" وقار بولا۔

میں نے کہا "رابعہ۔ یہ قانون کے نمائندے ہیں۔ ہم قانون سے نہیں لڑسکتے۔ اور ہمیں لڑنا بھی نہیں چاہیے۔"

وقار نے میری تائید کی "یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑسکتے۔ کل تمہاری ضمانت ہوجائے گی۔"

تھانے دار بڑے زہریلے انداز میں مسکرایا "بار بار ضمانت کرانا آسان نہیں ہوتا وکیل صاحب۔"

میں نے کہا "جس لاقانونیت کا مظاہرہ تم نے کیا ہے اس کے خلاف میں پہلے صفحے پر لکھوں گا۔ تین کالم کی سُرخی لگاؤں گا۔"

تھانے دار اکڑ کے بولا "اویار تم ہیڈ لائن لگادو۔ ہم کون سا غلط کام کررہے ہیں۔"

"اس میں کیا شک ہے۔ تمہارے پاس وارنٹ نہیں' لیڈی پولیس نہیں اور تم ایک نامور وکیل کو گرفتار کرکے ہتھکڑیاں لگاکے لے جارہے ہو۔ کوئی وجہ بتائے بغیر۔"

وہ بولا "ان پر ملک خدا داد عباسی کو قتل کرنے کا الزام ہے۔"

وقار نے کہا "کیا ان کا نام ایف آئی آر میں ہے؟"

"ہاں ہے" وہ بولا "لیکن نہ ہو تب بھی ہم کسی کو تفتیش کے لیے شک میں گرفتار کرسکتے ہیں۔"

"ایف آئی آر دکھاؤ مجھے' مجھے اس کی نقل چاہیے۔"

"تھانے آؤ گے تو نقل بھی مل جائے گی" تھانے دار نے کہا۔

"کون سے تھانے؟"

"تھانہ انار کلی۔" اس نے بڑی روانی سے جھوٹ بولا۔

"شک کی بات ہے تو مجھے بھی گرفتار کرلو۔" میں نے اپنے

جاسوسی ڈائجسٹ کا منفرد و مقبول سلسلہ
شکاری
بیسواں حصہ

شکاری

معاشرے کے اُن ناسوروں کی رُوداد جو گوشت و پوست سے گزر کر انسانی ذہنوں میں اُتر رہے تھے۔ ایک کفن بردوش نوجوان کی کہانی جس کے شب و روز موت کی بستی میں گزر رہے تھے۔ جلد دیکھئے تلخیاں آس و یاس، خوف و ہراس، تلخ حقائق، شیریں خواب۔

نئی سوچ، نیا رنگ، نیا لہجہ، نیا آہنگ
احمد اقبال کے شر ربار و شبنم فشاں قلم سے

اس نے اقرار میں سر ہلایا "لیکن.... میں تم کو وہاں کیسے لے جا سکتا ہوں۔ اگر دلاور نے مجھے تمہارے ساتھ دیکھ لیا۔"

"تم اس کی فکر مت کرو۔ وہ ہمیں نہیں دیکھ سکے گا۔"

اس نے کہا "خدا کے لیے سمجھنے کی کوشش کرو۔ اس نے کہا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہوئی تو وہ اپنی ایک جان بچانے کے لئے دس کا خون بھی کر سکتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ مایوسی اور غصّے میں وہ تمہارے دوستوں کو مار ڈالے اور بھاگ جائے۔"

میں نے کہا "اب وہاں جا کے دلاور کو مطمئن کرنا اور اسے یقین دلانا کہ تم اس غلطی کا ازالہ کر دوگے۔ یہ تمہارا کام ہے۔ تم اکیلے جاؤ گے اور اس سے کہو گے کہ غالب اور نازو کو چھوڑ دے۔ رابعہ اور سکندر موجود نہیں تھے اس لیے یہ جاہل پولیس والے غلط افراد کو پکڑ لائے۔ اصل بندے اسے مل جائیں گے۔"

وہ انکار میں سر ہلانے لگا "میں یہ خطرہ مول نہیں لوں گا۔ میں کہیں بھی اکیلا نہیں جاتا۔ اگر اس نے تمہارے دوستوں کے بعد مجھے بھی مار دیا یا اپنے ساتھ لے گیا... اور مجھے قتل کر دیا۔"

"نہیں.... وہ پاگل نہیں ہے نبی داد۔ مجھے تو یہ بات ہی سمجھ میں نہیں آئی کہ آخر مجھے یا رابعہ کو حاصل کرنے کے لیے اس نے تم سے کیوں بات کی۔ اس کے اپنے وسائل بہت ہیں اور آج تک ہم سے ہر معاملہ اس نے خود ہی طے کیا ہے۔ تمہیں بیچ میں لا کے اسے کیا ملے گا۔ پھر یہ کہ ہم لاپتا نہیں تھے۔ وہ ہر قدم پر سائے کی طرح ہمارے تعاقب میں تھا۔ وہ ہمیں کہیں بھی پکڑ سکتا تھا۔ ہم نہ تمہاری تحویل میں تھے اور نہ تمہاری حفاظتی پناہ میں۔ تم کسی مملکت کے سربراہ نہیں ہو کہ... مجرموں کو گرفتار کرنے سے پہلے تمہاری رضامندی ضروری ہو یا تمہاری مدد کے بغیر ان کا ہاتھ آنا محال ہو۔

"مزید یہ کہ ہمیں گرفتار کرا کے اسے کیا ملے گا۔ ہم پہلے بھی اس کی دسترس میں تھے۔ آئندہ بھی ہوں گے۔ ہمیں مارنا ہوتا تو وہ کب کا مار چکا ہوتا اور اسی طرح ہم بھی اسے ختم کر سکتے تھے۔ یہ کوئی اور گیم ہے نبی داد جو دلاور تمہارے ساتھ کھیل رہا ہے۔ تم نووارد ہو اور وہ اس میدان کا پُرانا شکاری ہے۔ تمہارا میدان سیاست ہے اور وہ اس میں قدم رکھنا چاہتا ہے۔ وہ بدمعاشی کا مرد میدان ہے اور تم اس کی چالوں کو نہیں سمجھ سکتے۔"

وہ سخت کنفیوژ اور نروس ہو گیا۔ "شاید۔ تم ٹھیک کہتے ہو.... پھر اب میں کیا کروں...؟"

"وہی جو میں نے کہا ہے۔ تم اس سے مل کے معذرت کرو اور اسے یقین دلاؤ کہ بہت جلد رابعہ اور سکندر اسے مل جائیں گے لیکن وہ غالب اور نازو کو چھوڑ دے۔ انہیں رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اُلٹی پریشانی گلے پڑ جائے گی۔"

"وہ تمہاری بات مان جائے گا۔ کیونکہ وہ تم سے سیاسی اتحاد کے نام پر کوئی ڈراما کرنا چاہتا ہے۔" رابعہ نے کہا "تم اسے یہ بھی کہہ سکتے ہو کہ رابعہ اور سکندر کو شاید پتا چل گیا تھا۔ وہ عین وقت پر فرار ہو گئے اور پولیس غلط فہمی کی بنا پر غالب اور نازو کو پکڑ لائی۔ خیر بھاگ کے وہ کہاں جائیں گے۔ میں اپنے بھائی کے قاتلوں کو چھوڑوں گا نہیں خواہ وہ زمین میں چھپ جائیں یا چاند پر چڑھ جائیں۔"

وہ بادل ناخواستہ اُٹھا "اچھا۔ میں جاتا ہوں.... لیکن..."

"لیکن کیا؟" میں نے کہا۔

وہ بولا "ایک طریقہ اور بھی ہے۔"

"وہ کیا؟ جلدی سے بتادو۔"

"میں... تم کو وہ جگہ بتادیتا ہوں۔ جہاں چوہدری دلاور میرا انتظار کررہا ہوگا۔" اس نے کسی مجرم کی طرح کہا جو بالآخر اعتراف پر مجبور ہوجائے۔

"یہ تم پہلے بھی بتاسکتے تھے۔ اتنا وقت کیوں ضائع کیا اپنا بھی اور ہمارا بھی۔" میں نے ایک قدم آگے بڑھایا۔

وہ رابعہ کے پیچھے ہوگیا "آخر تم میری مجبوری کیوں نہیں سمجھتے۔ میرا خیال تھا کہ تم بدمعاش نہیں ہو مگر تم تو بات بات پر مارپیٹ کرتے ہو۔ بلیک میل کرتے ہو۔ قتل کرنے کی دھمکی دیتے ہو۔ صرف اس لیے کہ یہاں میں اکیلا ہوں۔ تم کو سمجھنا چاہیے کہ نہ خداداد عباسی معمولی آدمی تھا اور نہ میں کمزور ہوں۔ تم کو بھی میری حمایت سے فائدہ ہوسکتا ہے۔ مخالفت سے نہیں۔ میرے پاس حکومتی ذرائع اور وسائل ہیں۔ دلاور کیا چیز ہے؟ ہمارے اثر رسوخ اور ہماری طاقت کے سامنے کسی پھنے خاں کی مجال نہیں... کہ ہم سے ٹکر لینے کی سوچے۔ جو ہماری ٹکر کے ہیں وہ ہم سے چھیڑ چھاڑ نہیں کرتے اور ہم ان سے۔ اپنے گھر میں کتا بھی شیر ہوتا ہے۔ ایک بار مجھے چیلنج دے کر چھوڑ دو پھر دیکھو میں لوٹ کر آتا ہوں یا نہیں۔ پھر میں ایسے نہیں آؤں گا سکندر بخت جیسے آج آگیا تھا۔ خالی ہاتھ اور اکیلا۔"

میں نے کہا "اوکے ملک نبی داد۔ میں تمہارا چیلنج قبول کرتا ہوں اور تمہیں بھی چیلنج دیتا ہوں کہ جاؤ دلاور کے ساتھ مل کے....."

رابعہ نے میری بات کاٹ دی "ایسی جذباتی باتوں سے کیا فائدہ۔ غصے میں اپنا ہی نقصان کرنا کون سی عقلمندی ہے۔ اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے کا چیلنج قبول کرنا بے وقوفی ہے۔"

"تم زیادہ سمجھ دار ہو۔ عورت ہونے کے باوجود۔ اس ہیرو کو کنٹرول کرو۔ پٹا ڈال کے رکھو اسے۔"

"جیسے بھائی نے تمہیں پٹا ڈال رکھا تھا۔ تم اس کے وفادار کُتّے تھے مگر وہ تمہارے کاٹنے سے مرگیا" رابعہ نے برہمی سے کہا۔

"ملک خداداد عباسی اور ملک نبی داد عباسی کے خاندان کی سات پشتوں سے علاقے میں دہشت ہے۔ تم نے دوبار اس کے منہ پر تھپڑ مارا۔ یہ ٹھیک ہے کہ دیکھنے والا تمہارے سوا کوئی نہیں تھا مگر بھلانے والا میں بھی نہیں ہوں سکندر بخت۔ مناسب وقت پر تم کو اس تھپڑ کا جواب ملے گا۔ اپنی طرف انگلی اُٹھانے والے کا ہاتھ کاٹ دیتا ہوں۔ کیا اتنی بے عزتی برداشت کرسکتا ہوں میں؟"

میں نے کہا "وقت وقت کی بات ہے۔ جنگل کا شیر چڑیا گھر میں یا سرکس میں بڑا مظلوم ہوجاتا ہے۔ لیکن میں ڈر کے پیچھے ہٹنے والا نہیں ہوں۔ میں دیکھتا ہوں کہ تم دلاور کے ساتھ مل کے کیا توپ چلاتے ہو۔ یہ نہ ہو کہ تم اس کے ساتھ بلاوجہ مارے جاؤ۔ اسے تو میں چھوڑنے والا نہیں ہوں۔"

اس نے ایک گہری سانس لی اور بولا "شاہی قلعے کی دیوار کے ساتھ ساتھ دیکھنا۔ مینار پاکستان کی سیدھ میں۔ تمہیں برگد کا ایک پُرانا درخت نظر آئے گا۔ وہاں ایک جھونپڑی سی بنی ہوئی ہے کسی فقیر کی۔ دلاور اسی کے اندر یا آس پاس ملے گا۔"

رابعہ بولی "کیا وہ اکیلا ہوگا؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ آس پاس کہیں اس کے محافظ ہوئے تو نظر کہاں آئیں گے۔ خود میں نے اکیلے یہاں آنے کی غلطی کا خمیازہ بھگت لیا ہے۔ مجھے خطرہ محسوس ہوتا تو میں ایسی حماقت نہیں کرتا لیکن میں سمجھا تھا کہ یہ گھر ایک وکیل کا ہے۔"

"تم ٹھیک سمجھے تھے۔" میں نے اسے اپنی طرف کھینچ کے دوسری طرف پھینک دیا "لیکن ابھی تمہیں بہت کچھ سمجھنے کی ضرورت ہے جو وکیل صاحب تمہیں سمجھائیں گے۔ تمہیں اندازہ ہوجائے گا کہ تمہاری خاندانی دہشت سے قانون نہیں ڈرتا اور نہ ہم متاثر ہوتے ہیں۔"

وہ دیوار سے ٹکرا کے اُٹھا "تم... تم کیا چاہتے ہو آخر؟"

"جو ہم معلوم کرنا چاہتے تھے وہ ہمیں معلوم ہوگیا۔" میں نے کہا "اب تم کو وہ باتیں معلوم ہوں گی جو تمہاری عقل اور تجربے میں اضافہ کریں گی۔ وقار فون کرو جمالی صاحب کو۔"

وقار نے ریسیور اُٹھالیا "کیا کہوں ان سے؟"

"ان سے کہو کہ کوئی بدمعاش میرے گھر میں پولیس کے ساتھ آیا تھا۔ میں اسے نہیں جانتا۔ وہ تھانہ انارکلی سے پولیس کو ساتھ لایا تھا اور ان کا مقصد رابعہ اور سکندر کو پکڑنا تھا۔ رابعہ اور سکندر نہ یہاں رہتے ہیں اور نہ کبھی یہاں آئے ہیں۔ ان کے پاس وارنٹ نام کی کوئی چیز نہیں تھی اور سمجھانے کے باوجود وہ مرزا غالب نام کے ایک صحافی کو اور ایک خاتون کو رابعہ سمجھ کے زبردستی لے گئے۔"

رابعہ بولی "تم خود سمجھتے ہو کہ تمہیں کیا کہنا ہے؟"

نبی داد نے بہت ہنگامہ کیا مگر ہم نے اسے پکڑ کے غسل خانے میں بند کردیا۔ نکی کچھ پریشان ہوگئی تھی مگر وقار کا ساتھ دے رہی تھی۔

وقار نے پھر فون اُٹھایا ہی تھا کہ میں نے اسے روک دیا "تم وہ بات نہیں کروگے جو نبی داد کے سامنے ہوئی تھی۔"

"پھر؟" وقار نے ریسیور تھام کے ہاتھ سے کریڈل دبائے رکھا۔

"غالب اور نازو کی بالکل فکر مت کرو۔ غالب کی پوزیشن بہت محفوظ ہے اور نازو اپنی حفاظت خود کرنا جانتی ہے۔" میں نے کہا "تم ایس پی سے کہو کہ تمہیں ایف آئی آر درج کرانی ہے۔ پولیس نے تمہارے گھر سے سکندر بخت کو بھی گرفتار کرلیا اور اس کے ساتھ رابعہ کو بھی۔"

"ایسے تو میں پھنس جاؤں گا۔"

"نہیں۔ تم کہنا کہ سکندر بخت گرفتاری دینا چاہتا تھا۔ وہ خود کو قانون کے حوالے کرنے کے لیے میرے گھر پہنچا ہی تھا کہ چوہدری دلاور نے اپنے کسی آدمی نبی داد کو پولیس کے ساتھ بھیج دیا۔ وہ مقتول ایم این اے خداداد عباسی کا بھائی ہے اور اس نے اپنے اثر رسوخ کا ناجائز استعمال کیا۔ پولیس کے پاس نہ وارنٹ تھا اور نہ ہی ان کے ساتھ لیڈی پولیس تھی۔ تم ان پر جو الزام چاہو عائد کرو۔ ایک الزام یہ بھی ہوگا کہ رابعہ نے ضمانت قبل از گرفتاری کا عدالتی حکم نامہ دکھایا تھا جو پولیس نے پھاڑ کے پھینک دیا۔"

"پھر ہم کیا کریں گے؟" رابعہ بولی۔

"ہم غائب ہوجاتے ہیں۔ نبی داد بتائے گا کہ پولیس کیسے آئی تھی۔ پولیس بتائے گی کہ رابعہ اور سکندر بخت کہاں ہیں؟ وہ ہمیں گرفتار کرنا چاہتے تھے.... اس مقصد میں کامیاب ہوگئے۔ اب انہیں عدالت میں پیش کرنا پولیس کی ذمے داری ہے۔ پولیس مشکل میں پڑجائے گی۔ نبی داد کی بھی ایسی تیسی ہوجائے گی اور ہم کچھ عرصے کے لئے محفوظ ہوجائیں گے۔ ہم کراچی چلے جاتے ہیں فی الحال۔ وہاں مجھے ویسے بھی ایک ضروری کام سے جانا تھا۔"

وقار تذبذب میں پڑگیا "پولیس میری بات کا اعتبار تو کرے گی مگر ثبوت گواہ کہاں سے آئیں گے۔"

میں نے کہا "اپنے یار منظر کو بُلالو' مولوی خادم حسین کو طلب کرو۔ اس کی بیوی ہے' تم ہو' نکی ہے۔ اتنے لوگوں کے سامنے پولیس ہمیں لے گئی۔ غالب اور نازو کی دلاور کو بھی ضرورت نہیں۔ وہ خود ہی آجائیں گے شاید پہنچنے ہی والے ہوں گے۔"

رابعہ نے کہا "خدا کرے کہ پہنچ جائیں۔ مگر کیا اس شخص کو پولیس کے حوالے کرنا ٹھیک ہے؟"

"یہ انتہائی ضروری ہے ورنہ دلاور کے علاوہ یہ بھی ہمارے لیے خطرہ بنے گا۔ پتا نہیں دلاور نے اس کو کیا پٹی پڑھائی ہے اور یہ ہمارے ساتھ کیا ڈبل گیم کھیل رہا ہے۔ دلاور چالاک آدمی ہے۔ یہ اس کے ہاتھوں میں کھیلے گا اور خود تو مشکل میں پڑے گا' ہمارے لئے بھی مصیبت بن جائے گا۔ اس کا راستہ ہمیں بلاک کردینا چاہیے۔ اس سے پہلے کہ یہ اپنے احمقانہ مذموم عزائم کی راہ پر قدم آگے بڑھائے۔ ہمیں بلیک میل کرے یا ہم سے کوئی غلط کام لے۔ اس کو پہلا سبق ایسا ملے کہ یہ یاد رکھے اور دلاور کا دشمن ہوجائے۔"

"اگر دلاور نے غالب اور نازو کو نہ چھوڑا.... پھر؟"

میں نے کہا "اب تم باتیں چھوڑو۔ تیاری کرو۔"

"کیسی تیاری؟" رابعہ نے حیرانی سے کہا۔

"تمہیں میرے ساتھ جانا ہے.... کراچی۔"

خلافِ توقع رابعہ نے کوئی اور سوال نہیں کیا اور مجھے روکا بھی نہیں۔ اس نے شوہر کی فرماں بردار بیویوں کی طرح سر جھکا کے "اچھا" کہا اور اندر چلی گئی۔

وقار نے کہا "کراچی جانا ضروری ہے ؟"

"ایک ضرورت تو تمہارے سامنے ہے" میں نے کہا "روپوشی کے لیے لاہور مناسب نہیں۔ پولیس کو مصیبت میں ڈال دو کہ سکندر کہاں ہے۔ رابعہ کو پولیس کہاں لے گئی اور کیسے لے گئی۔ ہائی کورٹ میں پولیس کے خلاف توہینِ عدالت کا کیس کردو۔ ہائی کورٹ پولیس کو نوٹس جاری کرے گی تو نیچے والوں کے لیے مسئلہ کھڑا ہوجائے کہ آخر انہیں کون لے گیا۔ پولیس کی طرف سے ایڈووکیٹ جنرل کو حلف نامہ داخل کرنا پڑے گا کہ رابعہ یا سکندر ہماری تحویل میں نہیں ہیں۔ اس سے ہم بہت محفوظ ہوجائیں گے اور پولیس ہمیں نہیں تلاش کرے گی۔ انہیں پکڑے گی جن پر شک ہوگا ہمارے اغوا کا۔ سرِفہرست چوہدری دلاور۔ اس کے بعد نبی داد۔"

"نبی داد پہلے گرفتار ہوگا۔ وہی لایا تھا پولیس کو اور صاحب پولیس والوں کو جیل کا راستہ نظر آیا تو وہ سچ بول کے نوکری بچائیں گے کہ ہمیں تو ملک نبی داد عباسی نے ایسا کرنے کو کہا تھا۔ ہمیں کیا معلوم سکندر کون ہے اور غالب کون۔" وقار بولا۔

"مجھے ویسے ہی کراچی جانا تھا۔ پیڈرو کے آفس میں اس کی میز کی دراز سے وہ ڈائری حاصل کرنے کے لیے جس کا اس نے حوالہ دیا تھا۔ اس میں دلاور کے خلاف سارے ثبوت ہیں اور گواہوں کے نام پتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"یہ کام کیسے ہوگا؟"

میں نے کہا "جیسے آج تک سارے کام ہوتے ہیں۔"

"خواہ مخواہ خود کو وہاں کسی مشکل میں مت ڈالنا۔ زیادہ عام فہم الفاظ میں بلاوجہ پنگا مت لینا ایسا کہ....."

میں نے کہا "یار اسی لیے میں رابعہ کو ساتھ لے جارہا ہوں۔ اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل۔"

"لیکن تم ایسے ہی پھروگے۔ تو پہچانے جاؤگے۔"

میں نے کہا "اب تو میں حلیے اور بھیس بدلنے کا ماہر ہوگیا ہوں۔ ہم اب تک ہوائی جہاز میں' کار میں سفر کرتے رہے ہیں۔ اب عام لوگوں کی طرح ٹرین سے جائیں گے۔ عوامی کلاس میں۔"

رابعہ ایک چھوٹا سا سوٹ کیس اُٹھائے نمودار ہوئی "چلو..."

میں حیران رہ گیا۔ "یعنی تیاری مکمل!"

"ہم کون سا حج کرنے جارہے ہیں جس کے لیے لمبی چوڑی تیاری کی ضرورت ہو۔ دو چار دن ہی رہیں گے کراچی میں۔"

"یہ بھی معلوم ہے تمہیں... ویری گڈ" میں نے کہا "تم نے کپڑے بھی نہیں بدلے۔ میک اپ تک نہیں کیا۔"

"بس اب نکل چلو" رابعہ بولی "نبی داد کو زیادہ دیر قید میں رکھنا ٹھیک نہیں ہے۔ وقار تم فوراً پولیس کو بلالو۔"

وہ بولا "پہلے منظر اور مولوی خادم حسین تو آجائیں۔"

"ابھی ہم سیدھے مولوی خادم حسین کے گھر جا رہے تھے"

میں نے کہا "چلو اچھا ہے ان سے یہیں چابیاں لے لیں گے۔"

وقار نے کہا "اتنی جلدی مت کرو۔ غالب اور نازو تو واپس آجائیں۔"

نگی نے بھی اس کی تائید کی "مجھے تو بہت پریشانی لاحق ہو گئی ہے۔"

"یعنی پریشانی کو پریشانی لاحق ہو گئی" وقار بولا۔

"تم تو بس ایسی ہی باتیں کرتے رہتے ہو۔ پتا نہیں کیا ہونے والا ہے" وہ بولی۔

"یہ بات ہمیشہ یاد رکھو کہ...وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔ تم کو پہلے سے کیسے پتا چل سکتا ہے" وقار نے کہا۔

"وہ نبی داد اتنا شور کر رہا ہے اندر۔"

"شور کرنے دو اسے۔ اور تم اس کے شور کو بالکل اہمیت نہ دو۔ یہ سمجھ لو کہ تم بہری ہو۔ تمہارے کان کوئی آواز ہی نہیں سن رہے ہیں سوائے میری آواز کے۔ نبی داد تو مزید شور کرے گا جب پولیس اسے گرفتار کرے گی۔ سارے مجرم شور کرتے ہیں اور یہی کہتے ہیں کہ وہ بے گناہ ہیں۔"

نگی نے کہا "اچھا چلیں، آپ لوگ کھانا تو کھالیں جانے سے پہلے۔"

میں نے کہا "کھانا اس وقت کھایا جاتا ہے جب بھوک ہو۔"

"جی نہیں۔ جب کھانا پک جائے تو کھانا پڑتا ہے۔" اس نے ہمیں ڈانٹ کے کہا "میں ایسے نہیں جانے دوں گی۔"

اس کے بعد واقعات تیزی سے پیش آئے۔ وقار نے منظر کو فون کیا اور اسے ساری صورتِ حال سمجھائی۔ اس کی آشیرباد حاصل ہونے سے وقار کو کچھ تقویت ملی۔

"منظر صاحب فرماتے ہیں کہ بالکل ٹھیک کیا تم نے۔ کون ہے یہ نبی داد بھوتنی کا۔ اس کی تو ایسی تیسی کردو۔"

میں نے کہا "وہ آ رہا ہے گواہی دینے کے لیے یا نہیں؟"

"انہوں نے کہا ہے کہ وہ پندرہ بیس منٹ میں پہنچ جائیں گے اور اپنے ساتھ خادم حسین اور اس کی بیوی کو بھی لے آئیں گے۔"

"پھر وہ پندرہ بیس منٹ میں کیسے پہنچ جائے گا" رابعہ بولی۔

"ہاں۔ کم سے کم.... آدھا گھنٹا ورنہ چالیس منٹ لگیں گے" میں نے کہا۔

"پولیس کو ان کے آنے کے بعد ہی بلایا جائے گا۔ امید ہے اس وقت تک غالب اور نازو بھی آجائیں گے۔"

نبی داد باتھ روم میں گالیاں بک رہا تھا اور دھمکیاں دے رہا تھا کہ وہ ایک ایک سے نمٹ لے گا۔ یہ کردے گا اور وہ کردے گا۔ میں نے رابعہ کے ساتھ مل کے باتھ روم کے سامنے ایک ڈراما کیا۔

میں نے باہر سے دروازہ کھولا اور نبی داد آگے آیا تو اسے پیچھے دھکا دے دیا "ابھی نہیں ملک صاحب۔ پولیس آ کے تمہیں رہائی دلائے گی۔ ان سے شکایت کرنا ہمارے ظلم کی۔"

وہ دیوار سے ٹکرا کے وہیں کھڑا ہو گیا۔ ہمیں خوں آشام نظروں سے گھورنے لگا "تمہیں معلوم ہو جائے گا۔"

میں نے کہا "ہم تو جا رہے ہیں۔ ہمیں کچھ پتا نہیں چلے گا لیکن تم سے پولیس یہ ضرور پوچھے گی کہ غالب اور نازو کہاں ہیں۔ تم پولیس کو کیوں لائے تھے اور تمہیں کس نے بتایا تھا کہ سکندر بخت یا رابعہ کو گرفتار کرنے کے لیے یہاں چھاپا مارنے سے کامیابی تمہارے قدم چومے گی۔"

"تم نے دھوکا کیا ہے میرے ساتھ...."

"ہم دھوکے بازوں کو دھوکا دینا عین کارِ ثواب سمجھتے ہیں۔ اب پولیس یا تم اور دلاور کا باپ کوئی ہمارا سراغ نہیں لگا سکتا۔ اگر غالب اور نازو واپس نہ آئے تو سمجھو تم اندر۔ جب ایس پی نے معاملہ اپنے ہاتھ میں لیا تو وہ پولیس والے خود تمہارے خلاف بیان دیں گے جن کو تم بڑے فخر سے اپنے بندے کہہ رہے تھے۔"

"پولیس میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ میں صاف انکار کردوں گا" وہ بولا "وقار کی گواہی سے کچھ نہیں ہو گا۔"

"تم پاگل ہو۔ ہم نے کچھ معتبر گواہ اور منگوائے ہیں۔ تم انہیں نہیں جانتے مگر وہ کہیں گے کہ انہوں نے تمہیں پکڑ کے غسل خانے میں بند کیا تھا۔ پولیس کے حوالے کرنے کے لیے۔ وہ سب بہت بڑے وکیل ہیں۔ انہیں قانون کا تم سے زیادہ علم ہے۔ تم اس گھر میں کیا لاہور میں ہماری موجودگی ثابت نہیں کرسکتے نبی داد۔ ہم کل پشاور میں ہوں گے۔"

"میری بات سنو۔ خدا کے لیے ایسا مت کرو۔" وہ چلّایا۔

میں نے دروازہ پھر بند کردیا "اب جو بھی کہنا ہے پولیس سے کہنا۔"

"دیکھو میں اپنی غلطی مانتا ہوں۔ تم مجھ سے سودا کرلو۔ پولیس کو مت بلاؤ۔ تم جیسا کہو گے میں ویسا کروں گا۔ مجھ پر جرمانہ لگادو۔ جو لینا ہے مجھ سے لے لو۔ بس مجھے جانے دو خدا کے لیے۔" وہ اب منت سماجت کر رہا تھا۔

میں نے کہا "خدا حافظ۔ خدا کرے پھر کبھی تم سے ملاقات نہ ہو۔ ہمارا کوئی ارادہ نہیں ہے واپس لاہور آنے کا۔ لیکن ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ تم کس جیل میں ہو۔"

وقار نے بہ آوازِ بلند کہا "دیکھو خیال رکھنا اپنا۔ خدا حافظ۔" پھر نگی نے کہا "فون مت کرنا۔ خط لکھ دینا وقار کے آفس کے پتے پر۔ اطلاع دیتے رہنا کہ کہاں ہو۔"

"ہاں پشاور میں ہوں گے تو خط ڈال دیں گے۔ علاقہ غیر کی طرف نکل گئے تو رابطہ مشکل ہو گا" میں نے کہا۔

"علاقہ غیر میں خطرہ نہیں ہو گا؟"

میں نے زور سے کہا "ارے نہیں نگی۔ وہاں خیبر ایجنسی میں سردار داؤد خان کا بیٹا میرا کلاس فیلو تھا۔ اس کے علاقے میں پرندہ پر نہیں مار سکتا۔ درندہ در نہیں مار سکتا اور چرندہ چر.... اچھا خدا حافظ۔"

یہ سب نبی داد نے بھی سنا ہو گا۔ ہم نے دروازے تک جا کے پھر خدا حافظ کہا اور لوٹ کے اندر آ گئے۔ غالب اور نازو کے نہ آنے سے میری تشویش بھی پریشانی میں ڈھلنے لگی تھی مگر منظر کے پہنچنے سے کچھ دیر پہلے ہی وہ ایک ٹیکسی سے اترے اور اندر آ گئے۔ رابعہ اور میں چھت پر خاموش بیٹھے تھے لیکن اوپر سے سب کچھ دیکھ اور سن سکتے تھے۔

وقار نے دروازہ کھولتے ہی انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اوپر بھیج دیا۔ وہ کچھ حیران ہوئے مگر پھر اوپر آئے تو ہمیں بت بنا دیکھ کے مزید حیران ہوئے۔ میں نے انہیں اشارے سے اپنے سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا۔ یہ فولادی کرسیاں دن رات دھوپ اور بارش میں ایسے ہی چھت پر پڑی رہتی تھیں۔

غالب نے سرگوشی میں کہا "یہ کیا خاموشی کا ڈراما چل رہا ہے۔"

میں نے بھی سرگوشی میں جواب دیا "تم اغوا کیے جا چکے ہو اور ابھی تک واپس نہیں آئے ہو۔"

نازو نے کہا "وہ تو ٹھیک ہے مگر تم دونوں کو کیا ہوا ہے؟"

"ہم بھی یہاں نہیں ہیں۔" رابعہ بولی "یہاں سے جا چکے ہیں۔"

"بلکہ ہم یہاں تھے ہی نہیں.... اس گھر میں کیا لاہور میں بھی نہیں تھے۔ کسی نے ہمیں مدت سے نہیں دیکھا۔"

"ہمیں نہیں مجھے کہو۔" رابعہ بولی۔ "میں تو لاہور میں تھی اب پتا نہیں کہاں ہوں۔ مجھے پولیس پکڑ کے لے گئی تھی۔ مرزا غالب کے ساتھ۔"

بالآخر ساری بات ان کی سمجھ میں آ گئی۔

نازو نے کہا "یعنی اب میں جاؤں نیچے۔"

"بالکل جاؤ۔ منظر اور مولوی خادم حسین کے آتے ہی پولیس بھی پہنچ جائے گی۔"

"میں سخت کنفیوژن میں مبتلا ہوں۔ کس نے کیا دیکھا۔ کسے پکڑا.... کون وہاں تھا، کون نہیں تھا۔ کون اغوا ہوا، کیا کہنا ہو گا مجھے؟" نازو بولی۔

"بے وقوف لڑکی" غالب نے اسے ڈانٹا "سیدھی سی بات ہے۔ یہاں میں اور تم تھے۔ رابعہ تھی، وقار یوسف اور اس کی بیوی تھے۔"

"سکندر نہیں تھا" رابعہ نے کہا۔

"سکندر کا ہمیں کیا معلوم کہ کہاں ہے؟" غالب نے کہا "اچانک نبی داد پولیس کے ساتھ آیا اور اس نے کہا کہ یہ ہے سکندر بخت، اسے گرفتار کرلو۔ میرے انکار کے باوجود پولیس نے میری ایک نہیں سنی۔ پھر انہوں نے رابعہ کو بھی گرفتار کرلیا۔ حالانکہ رابعہ نے ان کو ضمانت قبل از گرفتاری کے احکامات دکھائے تھے۔"

"احکامات انہوں نے پھاڑ کر پھینک دیے اور کہا کہ ہم ہائی کورٹ کو نہیں جانتے" رابعہ نے کہا۔

"کوشش کرنا کہ جب تک تم سے کوئی سوال نہ پوچھا جائے تم کچھ نہ بولو، وقار بات کرے گا یا منظر۔ ان کے بیان سے تمہیں سب معلوم ہو جائے گا کہ کیا کہنا ہے اور کیا نہیں کہنا ہے؟" میں نے کہا۔

خادم حسین اور اس کی بیوی جب منظر کی گاڑی سے اترے تو ہم نے اوپر سے دیکھا۔ حسبِ معمول خادم اور منظر کے درمیان بحث ہو رہی تھی۔ نازو فوراً نیچے چلی گئی۔ پھر منظر ذرا سی دیر کے لیے اوپر آیا۔

"ابے بھوتنی کے۔ تو یہاں بیٹھا ہے۔"

میں نے کہا "آہستہ بول الو کے پٹھے۔ وہ تیرا باپ نیچے سن لے گا۔"

منظر ہنسنے لگا "اس کی اب کون سنے گا۔ مارا گیا سالا۔ گیدڑ کی اولاد۔ شامت آئی تھی کہ شہر کا رخ کیا۔"

"نبی داد کو مروایا دلاور نے۔"

"بڑی حرامی چیز ہے دلاور بھی۔ اپنی طرف سے اس نے اچھی چال چلی تھی لیکن پانسا پلٹ گیا۔" منظر نے کہا۔

منظر اور وقار یوسف کے فون پر پولیس کا فوری حرکت میں آنا لازمی تھا۔ ایک ڈی ایس پی اپنی جیپ میں انسپکٹر اور چار مسلح پولیس والوں کے ساتھ پہنچا۔ وقار نے پہلے سے طے شدہ بیان دیا اور منظر کے ساتھ خادم حسین نے بھی گواہی دی۔ نبی داد نے بہت شور کیا کہ یہ سب جھوٹ ہے مگر ڈی ایس پی نے اسے خاموش کردیا۔

رابعہ اور میں اوپر خاموش بیٹھے نیچے سے آنے والی ہر آواز سن رہے تھے۔ ڈی ایس پی نے تھانہ انارکلی فون کیا تو وقار کے بیان کی تصدیق ہو گئی۔

"مسٹر نبی داد۔ پولیس آپ کے کہنے پر یہاں آئی تھی" ڈی ایس پی نے کہا "مگر سکندر بخت کے بجائے وہ ایک مشہور صحافی اور مرزا غالب کو گرفتار کر کے لے گئے۔"

"اس نے خود کہا تھا کہ وہ سکندر بخت ہے۔"

"یعنی آپ سکندر بخت کو نہیں پہچانتے تھے؟ پھر آپ کو کیا دلچسپی تھی اس کی گرفتاری سے۔ کس نے اطلاع دی تھی آپ کو کہ وہ یہاں ہو گا؟"

"وہ... ایک مفرور مجرم ہے۔"

"آپ پنڈی سے لاہور صرف اسے گرفتار کرانے کے لیے آئے تھے؟"

"مجھے شک ہے کہ اس نے میرے بڑے بھائی ملک خداداد عباسی کو قتل کیا تھا۔"

"جب آپ اسے پہچانتے ہی نہیں تو شک کس بنیاد پر؟ اور کیا شک کی بنیاد پر آپ نے پنڈی میں اس کا نام ایف آئی آر میں لکھوادیا تھا؟"

"ایف آئی آر... میں تو نہیں..."

"پھر آپ اسے یہاں گرفتار کرنے کیسے آگئے۔ کس نے آپ کو یہ اختیار دیا کہ آپ تھانہ انارکلی سے پولیس لے کر چھاپا ماریں۔ کسی وارنٹ کے بغیر۔" ڈی ایس پی نے گرج کے کہا "کیا سمجھتے ہو آخر تم خود کو۔ تمہیں معلوم ہے کہ یہ ایک وکیل کا گھر ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے سر..."

"سر کے بچے۔ تم نے مس رابعہ کو کیسے گرفتار کرادیا؟ انہوں نے ہائی کورٹ سے ضمانت قبل از گرفتاری لے رکھی تھی..."

"یہ جھوٹ ہے۔ اس نے کہا تھا کہ یہ رابعہ ہے" نبی داد نے چیخ کر نازو کی طرف اشارہ کیا "خود گرفتاری پیش کی تھی۔"

شاید ڈی ایس پی نے اس کے تھپڑ مارا "بھونکنے کی ضرورت نہیں ہے میرے سامنے۔ تھانہ انارکلی کا سارا اسٹاف معطل ہوگیا ہے اور سارے گرفتار بھی ہوجائیں گے تھوڑی دیر میں۔ ہائی کورٹ کے احکامات کو پھاڑ کر پھینکنا بہت سنگین جرم ہے۔ تمہاری بدمعاشی بھی نکل جائے گی اگر غالب اور مس رابعہ نہ ملے۔"

"آپ پولیس سے پوچھ سکتے ہیں سر۔" نبی داد کی ساری اکڑفوں نکل گئی تھی اور وہ ایک عام مجرم کے سے عاجزانہ لہجے میں بات کررہا تھا جو عین ارتکابِ جرم کے وقت پکڑا گیا ہو۔

"تھانے والوں کا کہنا ہے کہ انہوں نے اوپر سے ملنے والے حکم کی تعمیل کی تھی۔ اور حکم صرف یہ ملا تھا کہ ملک نبی داد کے ساتھ جاؤ اور دو بندے اُٹھالو.... ان کو معلوم نہ تھا کہ بندے کون ہیں' ان کا جرم کیا ہے اور وہ کہاں ملیں گے۔ ان کو تم یہاں لائے تھے۔ تھانے پہنچ کے جب انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا تو انہوں نے دونوں کو چھوڑدیا.... لیکن یہ..."

منظر نے اس کی بات کاٹ دی "آخر یہ بھوتنی کا اوپر والا کون ہے ڈی ایس پی صاحب۔ یہ بھی تو پتا کریں۔"

"ایس پی غلام قادر..."

"پھر ذرا ایس پی صاحب سے بھی پوچھ لیں کہ انہوں نے پنگا لینے کی زحمت کس خوشی میں کی تھی" منظر بولا "اور نبی داد ان کا کیا لگتا ہے آخر؟"

"وہ افسر ہیں بڑے۔ میں ان سے نہیں پوچھ سکتا" ڈی ایس پی یقیناً منظر کے اندازِ گفتگو سے خوش نہیں تھا۔

"یہ بھی ٹھیک ہے۔ وقار.... ذرا تم دیکھو کہ ایس پی صاحب کی تشریف گھر پر رکھی ہوئی ہے یا کہیں اور.... نمبر ہے نا اس کا تمہارے پاس؟"

وقار نے کہا "میں شرط لگا سکتا ہوں کہ اس نے فون نہیں کیا ہوگا۔ ہوگئی سو سو روپے کی۔"

منظر ہنسنے لگا "ابے ٹھگنا چاہتا ہے مجھے۔ کون اُلّو کا پٹھا یہ مانے گا کہ اس نے غیر قانونی احکامات دیے تھے۔"

وقار نے نمبر ملا کے ریسیور منظر کو تھمادیا "نمستے سرکار۔ ہاں جی آپ کا نمک حرام یار منظر بول رہا ہوں۔ یار تم نے جو کھانا کھلایا تھا اس میں نمک جان بوجھ کے زیادہ کردیا تھا تاکہ میں زیادہ نمک حرام کہلاؤں۔ خیر وہ تم سے ایک شرم ناک اور معیوب بات پوچھنی تھی۔ کوئی بھوتنی کا تمہارے آس پاس تو نہیں ہے نا' تمہارا بیٹا یا باپ... گھروالی..." پھر وہ اپنے مخصوص انداز میں ہوہو ہو کرکے ہنسا "پوچھنا یہ تھا کہ آج تم نے تھانہ انارکلی کے انچارج کو فون کرکے دو بندے اُٹھانے کے لیے بھیجا تھا؟ کون اور کہاں کی بات مت کرو۔ پہلے ہاں یا نہ میں جواب دو۔ دیکھو میرے ساتھ چکربازی مت کرو۔ تم لوگ اٹھاتے رہتے ہو بندے اِدھراُدھر سے۔ جرم کا کیا ہے' کسی نے نہیں کیا ہو تو تھانے پہنچا کے تم اس کے کھاتے میں کچھ بھی ڈال سکتے ہو۔ نہیں کیا' پکا پتا ہے؟ خیر' ہوا یہ کہ کسی بھوتنی والے نے تمہاری آواز بنا کے مروادیا انارکلی تھانے والوں کو..... انہوں نے میرے یار وقار یوسف کے گھر پولیس کی بھاری نفری کے ساتھ چڑھائی کردی۔ نہ وارنٹ' نہ ساتھ کوئی مجسٹریٹ اور لیڈی سرچر۔ وقار یوسف بھی وکیل ہے میرے ساتھ۔ ہاں' وہ تھا ایک فرعون ٹائپ تھانے دار۔ نام پتا نہیں کیا تھا۔ شکل سے اور لہجے سے پکا تھانے دار لگتا تھا اور اندر گھس کے انہوں نے بڑا حرامی پن مچایا۔ بڑی گالم گلوچ کی۔ وقار یوسف کی بیوی سے بھی بدتمیزی کی۔ اور پھر پکڑ کے لے گئے ایک بڑے حرامی صحافی کو۔ تم جانتے ہوگے اسے۔ مرزا غالب کہلاتا ہے۔ ہاں یار' جرم کوئی نہیں۔ پولیس کے ساتھ ایک پاٹے خان قسم کی چیز تھی۔ خود کو نبی داد کہتا ہے۔ اور ملک خداداد عباسی کا بھائی بتاتا ہے۔ ہاں وہی جس کا قتل پنڈی میں ہوا تھا۔ اس کی لاش بازارِ حسن میں پڑی ہوئی ملی تھی۔ اپنی گاڑی میں' ہاں نشے میں دُھت تھا وہ بھی اور اس کا بھائی بھی۔ نہیں میں اسے نہیں پہچانتا۔ نبی داد نے کہا کہ یہ ہے سکندر بخت اور یہ ہے اس کی معشوق رابعہ۔ دونوں کو آج رات تھانے میں رکھو یا کہیں اور۔ نہیں جرم کوئی نہیں بتایا انہوں نے۔ وقار نے کہا تھا مگر مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ انچارج خود نشے میں دُھت ہوگا۔ یار اس نے عبوری ضمانت کے احکامات پھاڑ کے پھینک دیے۔ ہاں' ہائی کورٹ نے دیے تھے۔ تم تو جانتے ہو مس رابعہ قاری کتنی توپ وکیل ہے۔ میاں جی اس کیس میں تمہاری پیٹی اُتر جائے گی اگر یہ خبر شائع ہوگئی کہ تم نے پولیس کو احکامات دیے تھے۔ مجھے معلوم ہے تم پاگل نہیں ہو مگر بھائی' پولیس کی وردی ہو جسم پر تو آدمی کا دماغ خراب ہوتے کتنی دیر لگتی ہے۔ کیا تم جو چاہو کرو' نہیں میں کچھ نہیں کروں گا۔ کسی کو رپورٹ نہیں کررہا ہوں

یار۔ تم سے پوچھنا تھا' تم نے بتادیا۔ نہیں' تھانے والے تو کہتے ہیں کہ انہوں نے چھوڑدیا مگر نہ مرزا غالب کا پتا ہے نہ مس رابعہ کا۔ ہم رپورٹ لکھوا رہے ہیں۔ تم ذرا انچارج سے بھی کہہ دو کہ حرامی پن نہ کرے۔ رپورٹ لکھ لے جو ہم بتائیں اس کے مطابق۔ اچھا... اللہ حافظ۔"

"یعنی میں شرط جیت گیا" وقار بولا۔

"شرط کس اُلّو کے پٹھے نے لگائی تھی۔" منظر بولا "حق اپنے ڈی ایس پی صاحب۔ غلام قادر تو کہتا ہے کہ کیا میں پاگل ہوں کہ ایسا آرڈر دوں گا کسی کو۔ وہ خود بات کررہا ہے ڈی آئی جی سے۔ مرزا غالب اور مس رابعہ کو باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت اغوا کیا گیا ہے۔ اب انہیں برآمد کرنا پولیس کا کام ہے۔ ہم تو بینڈ بجادیں گے سب کا۔"

نبی داد نے قسم کھا کے کہا "ڈی ایس پی صاحب۔ خدا کی قسم پولیس اس عورت نازو کو لے گئی تھی۔ یہ جو اتنی معصوم بنی کھڑی ہے۔ اس سے پوچھیں کہ یہ کیسے واپس آگئی؟"

ڈی ایس پی نے اسے مارا ہوگا کہ وہ چلّانے لگا "سر یہ سازش ہے' میری بات سنیں۔ دیکھیں میں کوئی معمولی آدمی نہیں ہوں۔ یہ آپ اچھا نہیں کررہے ہیں۔"

ڈی ایس پی نے دہاڑ کے کہا "لے جاؤ اس حرام زادے کو اور کسی اچھے سے تھانے میں رکھو آج رات۔ صبح تک ذرا پیار و محبت سے پوچھوگے تو سب بک دے گا۔"

میں سمجھ گیا کہ "اچھا سا تھانہ" اور "پیار و محبت" سے اس کی مراد کیا تھی۔ نبی داد کو کسی شہرت یافتہ چنگیز خان ٹائپ تھانے دار کے حوالے کرنا تھا جو اس سے تشدّد کے بدترین طریقے استعمال کرکے تمام معلومات حاصل کرے لیکن اس طرح کہ نبی داد کے جسم پر خراش تک نہ آئے اور وہ بعد میں پولیس کے خلاف شکایت بھی نہ کرسکے۔

پولیس والے چیختے چلّاتے نبی داد کو مارتے ہوئے باہر لے گئے۔ میں نے اوپر سے دیکھا تو وہ نبی داد کو لاتیں گھُونسے مار رہے تھے اور گالیاں دے رہے تھے۔ یہ فرض شناسی کا بے مثل مظاہرہ افسرِ اعلیٰ کی خواہش کو سمجھتے ہوئے کیا جارہا تھا۔ ڈی ایس پی نے رسمی طور پر سب کے بیانات لیے۔ بیان دینے والوں میں منظر کے ساتھ وقار نے تحریری بیان دیا۔ نازو' نکی' مولوی خادم حسین اور اس کی بیوی نے بطورِ گواہ اس پر دستخط کیے۔ ہم نے یہ اندازہ بھی باتوں سے ہی کیا ورنہ ہم اوپر سے کچھ بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔

جب ڈی ایس پی معذرت کرکے مجرموں کے خلاف سخت ترین تادیبی کارروائی کا وعدہ کرکے اور اغوا کرکے اور اغوا ہونے والوں کی بازیابی کا یقین دلا کے چلا گیا تو میں اور رابعہ بھی نیچے آگئے۔

"ابے تم دونوں اغوا ہوچکے ہو۔ اب اپنی شکل گُم کرو۔" منظر نے مجھ سے ہاتھ ملا کے کہا "ہمیں رپورٹ لکھوانی ہے۔"

میں نے کہا "ہم جارہے ہیں یار۔ ایسے دھکے دے کے تو مت نکالو گھر سے۔"

منظر بولا "آخر یہ بھوتنی کا دلاور چاہتا کیا تھا؟ کیوں مروادیا اس نے نبی داد کو۔"

میں نے کہا "وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔ نہ اسے سکندر بخت کی گرفتاری سے دلچسپی تھی اور نہ رابعہ کی۔ وہ نبی داد کا سیاسی مستقبل تباہ کرنا چاہتا تھا تاکہ میدان اس کے لیے صاف ہوجائے۔"

"یہ نبی داد اس کا سیاسی حریف کیسے ہوگیا جب کہ دلاور نے ابھی سیاست شروع ہی نہیں کی" منظر بولا۔

میں نے اسے بتایا "غالباً وہ سرکاری پارٹی کا ٹکٹ حاصل کرنا چاہتا ہے اور پارٹی اسے راولپنڈی کے حلقے میں نبی داد سے بھڑانا چاہتی ہے۔ نبی داد وہاں سے آزاد امیدوار ہوتا اور کامیاب بھی ہوجاتا کیونکہ وہ ان کی آبائی سیٹ ہے اور ابھی نبی داد کو اپنے مقتول بھائی کی وجہ سے ووٹرز کی جذباتی ہمدردی بھی حاصل ہے۔ اس کا مضبوط حریف ہے حق نواز۔ دلاور کو اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ کبھی نہیں جیت سکتا مگر سیاست کے میدان میں قدم رکھنے کے لیے پہلی شکست بھی کم اہم نہیں ہوتی۔ اس سے آدمی کو پبلسٹی ملتی ہے۔ وہ سامنے آجاتا ہے اور اس کا نام نامانوس نہیں رہتا۔ دلاور نے نبی داد کو زبردست چکر دیا کہ تم میری مدد کرو اور میں تمہاری مدد کرتا ہوں۔ وہ آگیا اس کی باتوں میں اور مارا گیا۔ اب دلاور کو راجا حق نواز خود بُلائے گا کیونکہ اسی کی سازش کے کامیاب ہونے سے حق نواز کی کامیابی یقینی ہوگئی ہے۔ پارٹی بھی اس کو ٹکٹ دے کر دلاور کو سرکاری قبولیت کی سند عطا کردے گی اور اگلی بار شاید دلاور ہی منتخب ہوگا۔ چار سال میں حق نواز خود مرجائے گا۔ ورنہ دلاور کے ہاتھوں اسی طرح مارا جائے گا جیسے نبی داد مارا گیا۔ دلاور جیسے آدمی کے لیے چار سال بہت ہیں۔ دلاور کی ایک چال نے نبی داد کا خانہ خراب کردیا۔"

منظر نے کہا "گویا اب اپنے چوہدری دلاور اسمبلی کے ممبر بھی ہوں گے اور وزیر بھی۔ خیر تم کیوں جھک مارتے پھر رہے ہو بھوتنی کے؟"

"دلاور جو چاہے سوچے اور کرے۔ ہم اپنے عہد پر قائم ہیں اور خدا نے چاہا تو اسمبلی میں بیٹھنے سے پہلے وہ تختۂ دار پر پہنچ جائے گا۔"

"ٹھیک ہے بیٹا۔ لگے رہو تم اس کے پیچھے۔ رابعہ لگی رہے تمہارے پیچھے اور ہم ہیں تم دونوں کے پیچھے۔ ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا۔ مولوی.... چل رہے ہو میرے ساتھ واپس۔ میں گاڑی میں گھر چھوڑ دوں گا۔"

خادم حسین جو ابھی تک چُپ چُپ تھا ایک دم پھٹ پڑا۔

"اجی لعنت اس پر جو پھر آپ کے ساتھ کہیں جائے۔ قسم خدا کی جو اب میں اس گاڑی میں قدم بھی رکھوں۔"

میں سمجھ گیا کہ آتے وقت ان کے درمیان منظر کے کسی مذاق پر فساد ہوا ہوگا۔ منظر کے لیے مذاق کی کوئی حد نہیں تھی۔ خادم حسین میں برداشت نہیں تھی۔ ان کی ہر بات پر لڑائی ہو جاتی تھی مگر اس کے باوجود بات چیت بند نہیں ہوتی تھی۔ زبان سے خادم حسین کچھ بھی کہے۔ عملاً نہ وہ منظر پر لعنت بھیج سکتا تھا اور نہ اس کی گاڑی پر۔

اس کی بیوی نے کہا "چلو اب چھوڑو۔ وہ مذاق کی بات تھی۔"

"مذاق۔ یعنی تم بھی اس بے ہودگی کو مذاق کہتی ہو" خادم حسین اُچھلا "تم کو شرم آنی چاہیے بے شرمی کو مذاق کہتے ہوئے۔"

"بھوتنی کے۔ شرم تجھے نہیں آئی جھوٹی گواہی دیتے وقت۔ توبہ توبہ 'اتنی بڑی داڑھی کے ساتھ اتنا بڑا جھوٹ۔"

"میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ اور نہ گواہی دی۔"

"پھر دستخط کیا نکاح نامے پر کیے تھے۔ میرے بیان کی تائید اور تصدیق کا آخر کیا مطلب تھا۔"

خادم حسین نے ڈھٹائی سے کہا "میں نے بیان پڑھا نہیں تھا۔ مجھے کیا معلوم تم نے اس میں کیا جھوٹ لکھا تھا۔ جھوٹ کا گناہ تمہارے سر۔"

منظر ہنسنے لگا "ہے نا چکر باز مولوی 'خیر بیٹا ہمیں کیا۔ جھوٹ سچ کا حساب ہوگا میدانِ حشر میں تو پتا چلے گا۔ میں آخری بار پوچھ رہا ہوں۔ چلنا ہے میرے ساتھ تو چلو۔ میں سکندر کو رابعہ کے ساتھ تمہارے پاگل خانے لے جا رہا ہوں۔ یہ رات وہ وہیں رہیں گے۔"

میں نے کہا "صبح ہم وہیں سے نکل جائیں گے۔"

"ہاں مگر رات بھر تو مولوی خادم حسین جیسا کوئی سخت پہرے دار ہونا چاہیے جو تمہارے اخلاق و کردار کی نگرانی کرے" منظر بولا "ورنہ تمہارا کیا ہے 'دیدوں کا پانی ڈھل گیا ہے۔"

رابعہ نے کہا "منظر۔ حد سے مت بڑھو۔ شرم کرو کچھ۔"

"اچھا بھائی۔ چلو بیٹھو گاڑی میں۔" وہ ہاتھ جوڑ کے بولا "تم جو چاہو کرتے پھرو۔ بولنے والا مجرم۔ دیکھنے والا بے شرم۔"

میں نے بھی کہا "چلو خادم حسین۔ اتنا غصہ ٹھیک نہیں۔"

"اجی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ کو کیا معلوم کہ میری اہلیہ کے سامنے انہوں نے کیسے کیسے کلماتِ نازیبا ادا کیے 'توبہ توبہ۔"

"اچھا تم کرتے رہو توبہ توبہ۔ میں تمہاری چہیتی بیوی کو ورغلا کے لے جاتا ہوں۔" منظر بولا۔

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا" خادم حسین اکڑ گیا "کہ اپنے خداوندِ مجازی کی رضا کے بغیر وہ تمہارے ساتھ جائے۔"

"میں جا رہی ہوں" اس کی بیوی نے تنگ آ کے کہا "تم کو گاڑی میں نہیں جانا تو پھر پیدل آ جانا۔"

ہم سب کے ہنسنے سے مولوی خادم حسین کی پوزیشن مزید خراب ہوئی "دیکھو مریم جب میں بتا چکا ہوں اور عہد کر چکا ہوں کہ اس گاڑی میں نہیں جاؤں گا تو تم کو میرا ساتھ دینا چاہیے.... اخلاقاً اور شرعاً۔"

"شرع کی بات مت کرو" رابعہ نے کہا "یہ کوئی دینی معاملہ نہیں ہے۔"

"اور تمہاری بے وقوفی میں ساتھ دینا اس کا اخلاقی فریضہ بھی نہیں بنتا" میں نے کہا۔

ہم سب کے بیٹھنے کے بعد بھی مولوی وہیں کھڑا رہا "میں تو قسم کھا چکا ہوں۔"

اچانک مجھے ایک خیال آیا "تم نے گاڑی میں قدم نہ رکھنے کی قسم کھائی تھی؟"

"ہاں۔ مجھے پیدل جانا منظور ہے۔"

"چلو تم گاڑی میں قدم مت رکھو۔" میں نے کہا "مگر ہمارے ساتھ چلو۔"

"کیا مکھی مچھر کی طرح اُڑ کے اندر چلا جاؤں۔ اور اندر اُڑتا رہوں۔" خادم حسین جل کے بولا۔

"نہیں۔ تم گاڑی میں مت بیٹھو۔ گاڑی کے اوپر بیٹھ جاؤ۔"

منظر نے کہا "ڈکی میں.... مگر وہ بھی گاڑی کے اندر ہوتی ہے۔"

میں نے کہا "تم چُپ کرو بھوتنی کے۔ خادم حسین 'تمہاری قسم بھی نہیں ٹوٹے گی اگر تم چھت پر بیٹھ جاؤ۔"

وہ سوچ میں پڑ گیا "چھت کے اوپر۔ لیکن میں گر گیا پھر..."

"ابے ہم فضول چیزیں اُٹھاتے تو نہیں ہیں 'مگر تمہیں پھر اُٹھا کے رکھ لیں گے" منظر نے کہا۔

میں نے کہا "تم آگے انجن پر بیٹھ جاؤ۔"

منظر بولا "ہاں۔ بالکل میری ناک کے سامنے تاکہ مجھے کچھ نظر نہ آئے اور میں گاڑی اُتار دوں نہر میں یا کسی کھمبے پر چڑھا دوں۔"

بالآخر خادم حسین نے پیچھے ڈکی کے اوپر تشریف رکھنا منظور کیا اور اپنی قسم نہیں توڑی۔ رات کے وقت کسی نے یہ مزاحیہ سین نہیں دیکھا۔ سوائے دو چار گاڑیوں کے جو ہمارے پاس سے گزریں۔ بچے بعض اوقات تفریح کے لیے ایسی حرکت کرتے ہیں مگر ایک باریش عمر رسیدہ شخص کو ڈکی پر بیٹھا دیکھ کے کچھ لوگ حیران ہوئے۔ پھر شاید انہوں نے فرض کر لیا ہوگا کہ اندر جگہ کی کمی کے باعث ایک شخص کو مجبوری میں باہر لا دو دیا گیا ہے۔

دلچسپ صورتِ حال مال روڈ کراس کرتے وقت پیدا ہوئی جب ایک سارجنٹ نے پیچھے سے دیکھا اور موٹر سائیکل پر تعاقب کرتا ہوا آ گیا۔ اس نے سامنے آ کے گاڑی روک لی۔

اس نے منظر سے کہا "یہ بندہ پیچھے ڈکی پر کیوں رکھا ہوا ہے؟"

"وہ بندہ نہیں ہے" منظر نے کہا۔

"پھر کیا بندر ہے" انسپکٹر نے برہمی سے کہا "یا بُلا ہے؟"

"وہ مولوی خادم حسین ہے۔ تمہیں اتنا بھی معلوم نہیں" منظر نے عادت کے مطابق اسے ڈانٹ کے مزید مشتعل کیا "اور ڈکی پر کیوں بیٹھا ہے یہ اس سے پوچھو۔ میں کیا بتاؤں؟"

میں نے کہا "جگہ تو ہے اندر۔ کیا پتا تازہ ہوا کھانے کے لیے بیٹھا ہو۔"

انسپکٹر نے ہمیں گھور کے دیکھا "تم سب نشے میں ہو" اور پھر پیچھے جا کے خادم حسین سے پوچھا "اوئے صوفی۔ یہاں مرنے کے لیے بیٹھا ہے کیا؟ پتا نہیں یہ جرم ہے؟"

خادم حسین نے عاجزی سے کہا "یہ تو ٹھیک ہے سر۔ لیکن گناہ سے جرم بہتر ہے۔ دراصل میں نے غصے میں قسم کھالی تھی کہ گاڑی میں نہیں بیٹھوں گا اس لئے میں گاڑی پر بیٹھ گیا۔"

انسپکٹر کا شبہ مزید قوی ہو گیا "کون ہو تم لوگ۔ کہاں سے آ رہے ہو 'اس وقت اتنی پی کے.... کسی کلب سے...؟"

"لاحول ولا قوۃ۔ انسپکٹر صاحب۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے ایک ذمے دار پولیس افسر کو ایسا مذموم الزام عائد نہیں کرنا چاہیے کسی بھی معزز شہری پر 'جو مسلمان بھی ہو' یہ منظر صاحب ویسے تو بڑے ہی بدزبان اور بے شرم ہیں لیکن یہ بہت نامی گرامی وکیل ہیں۔ اور ان کے ساتھ جو خاتون ہیں مس رابعہ قاری ہیں۔ ہائی کورٹ کی مشہور وکیل۔ اور میں منشی ہوں ان کا؟"

انسپکٹر نے بے یقینی سے منظر کو دیکھا لیکن اس وقت تک غالب باہر آ چکا تھا۔ اس نے اپنے کارڈ کی نمائش کی اور انسپکٹر کو یقین دلا دیا کہ مولوی خادم حسین نے غلط نہیں کہا۔ وہ غلط کہتا تب بھی انسپکٹر کے لیے پریس کارڈ دیکھنے کے بعد مزید کچھ کہنے کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ وہ خاموشی سے واپس لوٹ گیا۔

ہم کو خادم حسین کے گھر کے قریب گلی کے موڑ پر ڈراپ کرنے کے بعد منظر نے کہا "تم سے پھر کب ملاقات ہوگی؟"

میں نے کہا "پھر ملیں گے اگر خدا لایا۔ تم ذرا نبی داد کی خبر لیتے رہنا۔ صبح پوچھ لینا ڈی ایس پی سے۔"

"صبح کیوں۔ میں ابھی جا کے اسے فون کروں گا۔ وقار یوسف اس وقت تک ایف آئی آر درج کرا دے گا۔"

خادم حسین سوٹ کیس اُٹھا کے رابعہ کے ساتھ گلی میں غائب ہو چکا تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی تو سوا گیارہ بجے تھے۔ مجھے نبی داد کی بات یاد آئی۔ اس نے کہا تھا کہ دلاور کی اس سے ملاقات کا وقت رات بارہ بجے طے ہے۔ میں منظر سے کہتے کہتے رُک گیا کہ ہمیں اقبال پارک کے پاس چھوڑ دے۔ اسے مخالف سمت میں جانا تھا اور پہلے ہی بہت دیر ہو چکی تھی۔ اس کے علاوہ شاید منظر میرے ارادے کی سخت مخالفت کرتا اور مجھے دلاور سے مل کے "آ بیل مجھے مار" والے محاورے پر ہرگز عمل نہ کرنے دیتا۔

جب وہ چلا گیا تو میں نے گلی کے اندر دیکھا "مرزا جی...."

غالب نے کہا "رابعہ کو بتائے بغیر چلیں؟"

میں نے حیرانی سے کہا "کہاں؟"

غالب ہنسا "اپنے چوہدری دلاور صاحب سے شرفِ ملاقات کے لیے اور کہاں؟"

"یار کمال ہے۔ تُو نے میرے دل کی بات جان لی۔ یہ تو خیر ٹھیک ہے کہ بارہ بجے چوہدری دلاور سے ملاقات کا امکان ہے مگر میں رابعہ کو نہیں بتانا چاہتا۔ یہ کیسے اندازہ کیا تُو نے؟"

"اگر تیری جگہ میں ہوتا برادر عزیز" وہ آہ بھر کے بولا "تو میں بھی نازو کو نہ بتاتا۔ اس کا ردِ عمل بھی وہی ہوتا جو رابعہ کا۔ وہ ہرگز مجھے اس کی اجازت نہ دیتی۔ میں بلا اجازت چلا جاتا۔ وہ ناراض ہو جاتی اور پھر اس کو منانے کا ڈراما کرنا پڑتا۔"

میں ہنس پڑا "یہ ڈراما تو مجھے بھی کرنا پڑے گا۔"

"رابعہ کی ناراضی بھی کوئی ناراضی ہے" غالب بولا "وہ تو جیسے رسماً روٹھ جاتی ہے اور منتظر ہوتی ہے کہ تم ذرا اسے مناؤ اور وہ مان جائے۔ نازو تو آتش فشاں ہے۔ اسے ٹھنڈا کرنا کتنا مشکل کام ہے۔ یہ ہم جانتے ہیں دوست۔"

ہم وہیں سے ایک گزرتے ہوئے رکشا میں سوار ہو گئے۔ رکشا والے نے بہت بُرا مانا "باؤ جی 'یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ آپ تو ایسے بیٹھ گئے ہو۔ جیسے ٹیلی فون کر کے گڈی بُلائی تھی۔"

میں نے کہا "بلائی تو تھی۔ لیکن آئی نہیں۔"

غالب نے کہا "اور تمہارا یہ رکشا کیا کسی گاڑی سے کم ہے۔"

"اوہو۔ پر بندے کو پوچھ لینا چاہیے کہ کدھر جانا ہے۔"

میں نے کہا "چلو اب پوچھ لیتے ہیں۔"

"میں تو جا رہا ہوں داتا صاحب کے دربار" وہ بولا۔

"پھر تو تمہیں صرف ہمارے لیے بھیجا گیا ہے۔ ہم بھی تو وہیں جا رہے ہیں۔"

وہ بد مزاج اور بد تمیز شخص تھا مگر داتا دربار پہنچ کے میں نے اسے کرائے کی مد میں بیس روپے دینے چاہے تو اس نے انکار کر دیا۔ مجھے غصہ اس لیے آیا کہ بیس روپے کم نہیں تھے۔ میٹر کے حساب سے کرایہ شاید دس روپے ہی بنتا لیکن رات کے وقت دُگنا کرایہ چارج کرنا ایک عام سی بات تھی۔ جھگڑے سے بچنے کے لیے میں نے پچاس کا نوٹ نکالا تو اس نے نوٹ لے کر واپس میری جیب میں رکھ دیا اور نرمی سے بولا "معاف کرنا باؤ جی 'داتا صاحب کی سواری سے میں پیسے نہیں لیتا۔ میرا باپ تانگا چلاتا تھا۔ وہ بھی نہیں لیتا تھا۔ ہماری روزی میں بڑی برکت ہے۔"

میں اور غالب اس کی بات پر شرمندہ اور حیران کھڑے رہ گئے۔ جب وہ گلی میں چلا گیا تو ہم نے تھوڑا سا فاصلہ پیدل طے کیا۔ میری گھڑی میں ساڑھے گیارہ سے کچھ اوپر کا ٹائم تھا۔ نبی داد کی بتائی ہوئی جگہ تک پہنچنے میں مزید پندرہ منٹ صرف ہوئے۔

شاہی قلعے کی دیوار کے ساتھ ساتھ پھیلے ہوئے اُجاڑ میدان میں بھی اندھیرا تھا۔ اندرونِ شہر جانے والی گلیوں میں لوگوں کی آمدورفت جاری تھی اور دونوں جانب بنے ہوئے مکانوں کی تاریکی سے اندازہ ہوتا تھا کہ مکین سوچکے ہیں۔

قلعے کی سیکڑوں سال پُرانی خستہ حال' بارش سے سیاہ پڑجانے والی اینٹوں کی دیوار کے ساتھ رات کی ویرانی میں ماضی کے پُر آسیب سائے حرکت کرتے محسوس ہوتے تھے۔ میں نے غور سے دیکھا اور اندازے سے اس جگہ کا تعین کرنے کی کوشش کی جہاں نبی داد نے کسی فقیر کے جھونپڑے کی نشاندہی کی تھی۔

اچانک غالب نے کہا "تمہارا کیا خیال ہے۔ چوہدری دلاور آئے گا؟"

میں نے کہا "یقین تو مجھے بھی نہیں۔"

"اگر وہ نظر آگیا تو ہم اس سے مل کے کیا کہیں گے۔ کیا کریں گے؟ یہ کہ اپنے دلاور صاحب' تم نے یہ حرامی پن کیوں کیا؟"

"مجھے اس سے ملنے کا کوئی شوق نہیں۔"

"یہ ہوسکتا ہے مسٹر سکندر اعظم کہ تم اپنا اصلی چہرہ لے کر اس کے سامنے جاؤ اور وہ کہے کہ آؤ جی بسم اللہ۔ مجھے معلوم تھا کہ تم ہی آؤ گے۔ اور میں نے بتا بھی دیا تھا کہ اگلا راؤنڈ پھر دشمنی کا ہوگا۔"

میں نے کہا "یار میں صرف یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ نبی داد نے جھوٹ بولا تھا یا سچ۔"

"اس نے جھوٹ بولا تھا" غالب نے قطعی لہجے میں کہا۔

غالب کی بات ٹھیک تھی۔ خود میری عقل بھی کہتی تھی کہ دلاور جیسا شخص کسی سے ملنے کے لیے اس جگہ کا انتخاب نہیں کرسکتا۔ رات کے ساڑھے بارہ بجے تک میں اور غالب کسی فقیر کے جھونپڑے کو ہی تلاش نہ کرسکے۔

پھر ایک بجنے میں پانچ منٹ پر ہم خادم حسین کے گھر پہنچے تو رابعہ کے غصے کا سامنا کرنے کے لیے بالکل تیار تھے۔

"کہاں غائب ہوگئے تھے آپ دونوں' سچ بتاؤ؟"

میں نے کہا "کیوں ہمیں جھوٹ بولنے پر مجبور کرتی ہو۔ سچ بتایا تو تمہارا غصہ اور بلڈ پریشر بڑھ جائے گا۔"

"تم دلاور سے ملنے گئے تھے؟"

میں نے کہا "جب جانتی ہو تو پھر پوچھتی کیوں ہو۔ وہ ملا نہیں تو واپس آگئے۔"

وہ رات ہم نے مولوی خادم حسین کے پُرسکون گھر میں سو کے گزاری۔ دو کمروں کے اس گھر کا ایک کمرا مستقل مہمان خانہ بن گیا تھا۔ مریم نے وہاں سے صوفے ہٹا کے پورے کمرے میں قالین لگادیا تھا اور قالین کے نیچے فوم جیسا انڈر لے تھا۔ سفید بے داغ غلاف والے گاؤ تکیے اور کشن کے ساتھ یہ کمرا بہت آرام دہ محسوس ہوتا تھا۔ اس پر پاؤں پھیلا کے سونے یا آلتی پالتی مار کے بیٹھنے میں مزہ آتا تھا۔ فراغت اور آزادی کا احساس ہوتا تھا جو صوفے یا بیڈ کے تکلف میں عنقا تھا۔

صبح میں اور غالب دیر سے اُٹھے۔ رابعہ ہم سے پہلے اُٹھ کے نماز سے فارغ ہوچکی تھی اور مریم سے ماضی' حال اور مستقبل کے مسائل' اندیشوں اور امکانات پر ان کی زنانہ کانفرنس کچن میں ہورہی تھی۔

مین نے لیٹے لیٹے تالی بجا کے کہا "کوئی ہے؟"

رابعہ نے کھڑکی سے جھانک کے کہا "کیا ہے' کیوں شور کررہے ہو؟"

میں نے کہا "بے ادب کنیز' مابدولت کے جلال میں آنے سے قبل ہی بیڈ ٹی حاضر کی جائے۔"

"یہ کوئی بیڈ ٹی کا وقت نہیں ہے۔ اُٹھو اور ناشتا کرو بادشاہ سلامت۔ ورنہ بعد میں یہ بھی نہیں ملے گا" رابعہ نے کہا اور غائب ہوگئی۔

میں نے اپنی خودی کو بلند رکھا "تُو نے دیکھا غالب۔ گمراہی اور تقلیدِ مغرب نے دخترانِ وطن کو کس درجہ گستاخ عاقبت نااندیش اور اخلاقی اقدار سے بے گانہ کردیا ہے۔"

"میری بیوی ہوتی تو ایسے جواب پر میں اس کو دندان شکن جواب دیتا۔" غالب بولا۔

"تو جواب سے اس کے دانت توڑتا۔ وہ دستِ نازک سے تیرا سر توڑتی۔ کتنا قابلِ رشک ہے پیار کا یہ جذبہ۔ سبحان اللہ' بس ایک دوسرے کا دل نہیں توڑتے۔ گھر کے برتن ٹوٹ جائیں۔ کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ جائیں۔ ہڈی پسلی ٹوٹ جائے۔"

مریم نے اندر آ کے کہا "آپ ہاتھ منہ دھولیں یا نہالیں تو میں ناشتا لگاؤں۔"

غالب بولا "مسٹر خادم حسین کہاں ہیں۔ ان کا دیدار نہیں ہوا۔"

مریم نے کہا "وہ گئے ہیں ذرا.... کسی سے مشورہ کرنے۔"

"کس مسئلے پر؟"

"وہی۔ کل رات والی بات" مریم نے کہا "ان کے دل میں شک بیٹھ گیا تھا کہ ڈکی پر بیٹھنے سے ان کی قسم ٹوٹ گئی ہے۔ بات الفاظ کی نہیں نیت کی تھی۔"

جب ہم ناشتا کررہے تھے تو خادم حسین آگیا۔ وہ بہت خفا تھا "دیکھیں ناجی۔ ہمسائے کا حق پہلے ہوتا ہے۔ جب مولوی صاحب نے فتویٰ دے دیا کہ قسم توڑنے کا کفارہ لازم ہے اور مجھے ساٹھ مساکین کو کھانا کھلانا ہوگا۔ تو کیا میں نے محلے والوں کو دعوت دے کر ان کی بے عزتی کی؟ ایک سرکاری افسر ہے' خوب حرام کھارہا ہے۔ کہنے لگا کہ مولوی کیا ہم تجھے خیرات کھانے والے لگتے ہیں۔ میں نے دل میں کہا کہ لگتے تو خیر حرام کھانے والے ہو۔ دوسرے نے پوچھا کہ کیا کھلاؤ گے؟ چکن کڑاہی ہو تو میں آجاؤں گا۔ تیسرے نے پوچھا کہ کون سے ہوٹل میں ہوگا ڈنر۔ ساٹھ افراد کی بکنگ کرالو پھر بتانا۔ کوئی پوچھتا ہے سویٹ ڈش کیا ہوگی' سلاد کیسا ہوگا...."

ہم سب کو بہت ہنسی آئی۔ "پھر اب کیا سوچا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی تک مسئلہ حل نہیں ہوا ہے جی" وہ بولا "ساٹھ فقیروں کے لیے ایک ٹھیکے دار سے بات ہوئی تھی۔ وہ کہنے لگا کہ بھائی کس دنیا میں ہو۔ آج کل فقیر کسی کے کھانا کھانے نہیں جاتے۔ اچھے سے اچھا کھا کے ڈیرے پر لوٹتے ہیں۔ دھندا کھوٹا کرکے اتنی دور جائیں بھی تو کیا کھلاؤ گے تم؟ میں نے کہا کہ جو میں کھاتا ہوں۔ دال چاول' سبزی یا گوشت روٹی تو وہ حساب لگا کے بولا کہ چلو تم پندرہ سو دے دو۔ پچیس روپے فی کس۔ ساٹھ فقیروں کا کھانا ہوجائے گا ویسا ہی جیسا تم کھاتے ہو۔ جیسا فقیر کھاتے ہیں وہ تو پچاس روپے کے حساب سے تین ہزار ہوجائیں گے۔ کیا زمانہ آگیا ہے جی۔ خیر اللہ مالک ہے۔ ساٹھ بھوکے پکڑ ہی لاؤں گا میں کہیں نہ کہیں سے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ یہ دنیا پیٹ بھروں کی ہے۔ بھوک افلاس کہیں نہیں رہا۔"

میں نے کہا "تمہیں کچھ محسن یا گُل کی خبر ہے؟"

"ہاں جی۔ وقار صاحب نے بھیجا تھا معلوم کرنے کے لیے مگر ان کے گھر میں پڑا ہوا تھا تالا۔ مالکِ مکان نے کہا کہ وہ خالی کرگئے۔"

"مگر خالی کرکے کہاں گئے۔ یہ بات تھی معلوم کرنے کی۔"

"وہ جی۔ ایک خفیہ خبر ہے" وہ چور نظروں سے مریم کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"جب تمہیں معلوم ہے تو خفیہ کہاں رہی" غالب نے کہا۔

"مریم نے کہا تھا.... کسی کو بتانا نہیں۔ اس سے پوچھ لیں۔"

مریم نے اسے غصّے سے گھورا "اب کیا رہ گیا ہے نہ بتانے کو خود ہی بتادو نا۔"

"چلو اجازت مل گئی" میں نے کہا۔

"دراصل جناب۔ اپنے محسن صاحب کو کسی نے بتایا تھا کہ ایک بڑے پہنچے ہوئے درویش ہیں۔ کہیں درۂ خنجراب کے پاس کوئی مزار ہے وہاں جا کے لوگ چلہ کاٹتے ہیں۔"

"کس لیے؟" رابعہ بولی۔

"بس جی۔ ہر شخص اپنے دل کی مراد مانگتا ہے۔ اور کیا.... اب میری تو اللہ نے یہاں سُن لی۔ دعائیں بہت مانگی تھیں میں نے مگر قبول اپنے وقت پر ہوئی جب مجھے مریم ملی اور الحمد اللہ وہ امید سے ہوئی۔ اولاد نہ ہو تو شادی کے ارمان ختم ہوجاتے ہیں جی۔"

"تمہارا مطلب ہے.... وہ اولاد کے لیے وہاں چلہ کاٹنے گئے ہیں" میں نے بے یقینی سے کہا۔

غالب نے بھی کہا "کمال ہے۔ محسن تو ایسا نہیں تھا۔"

"مایوسی میں آدمی سب کچھ کرتا ہے جی۔ جادو ٹونا سفلی عمل اور پتا نہیں کیا کچھ۔ سب کچھ دینے والا تو وہی ہے۔ اس کی مرضی نہ ہو تو سب بے کار ہے۔ لیکن آدمی سہارے تلاش کرتا پھرتا ہے۔ کسی سے سُن لیا تھا انہوں نے... میرا مطلب ہے گل نے۔ محلے کی عورتوں کا بہت آنا جانا تھا۔ عورتیں ہر طرح کی باتیں کرتی ہیں۔ بس اس کے بعد گُل نے بھی محسن سے کہا کہ چلو۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا "یعنی گل کی خوشی کی خاطر اس نے یہ مشکل کام کرنے کا فیصلہ بھی کرلیا۔ چلو اچھا ہے اگر گل مطمئن ہوجائے۔ کسی طرح بھی۔"

غالب نے پوچھا "کب گئے آخر وہ؟"

"یہ تو مجھے نہیں معلوم۔ اُسی ہفتے میں نکل گئے خاموشی سے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ ہم سے ذکر کرتے تو ہم انہیں منع کرتے کہ ان فضولیات میں نہ پڑیں۔ اللہ پر بھروسا رکھیں۔"

"کیا وہ بوبی کو بھی ساتھ لے گئے ہیں؟" غالب بولا۔

"ہاں جی۔ ساتھ ہی لے گئے ہوں گے۔"

"حد ہوتی ہے حماقت کی۔" رابعہ نے غصے سے کہا "اپنے ساتھ اس بچے کو بھی خوار کریں گے۔ کیا ملے گا اس راستے پر اگر کسی چیز کی ضرورت پڑگئی۔ دوا کی یا ڈاکٹر کی۔ کھانے پینے کا سامان تک نہیں ہوتا۔"

"وہ اپنے ساتھ لے گئے ہوں گے سب کچھ" میں نے اسے تسلی دی "گل نے مجھے مایوس کیا۔ اس اُلّو کے پٹھے محسن سے تو میں سمجھ لوں گا" میں نے کہا "بوبی کیا ان کا بیٹا نہیں تھا۔ زبان سے کہتے تھے دل سے ایسا نہیں سمجھتے تھے نا ورنہ صبر شکر کے ساتھ تقدیر کے فیصلے کو قبول کرتے۔ واپس آجائیں پھر ہم لے لیں گے بوبی کو۔"

"گل نہیں دے گی مر کے بھی" رابعہ بولی۔

"کیوں۔ جب اسے اپنا ہی بیٹا چاہیے تو پھر پرایا چھوڑ دے۔"

رابعہ نے کہا "یہ بھی مجبوری ہے عورت کی۔ ماں بننا اور ماں کہلانا۔ ماں ہونا اور ماں کی جگہ ہونا۔ دونوں کام مشکل ہیں مگر وہ دونوں کرتی ہے۔ گل کے لیے غیر جذباتی انداز میں سوچنا ناممکن ہے اور جذبات سے سوچنا ایک ناگزیر ضرورت۔ تم اسے مت چھیڑو۔ چھوڑ دو اس کے حال پر۔ بوبی بھی اس کا بیٹا رہے گا اور گل اس پر فوزیہ سے زیادہ ممتا لٹاتی رہے گی۔"

"جب تک اس کا اپنا بچہ نہیں ہوتا۔" غالب نے کہا۔

"تم کیا سمجھتے ہو اس دور افتادہ نامعلوم پیر کے مزار پر چلہ کاٹنے سے کچھ ہوگا۔ نہیں' جو ہوگا خدا کے حکم سے ہوگا" میں نے کہا۔

غالب بولا "پھر ابھی سے بوبی کے لیے کیوں پریشان ہو۔"

رابعہ نے کہا "پتا نہیں اس وقت وہ کہاں ہوں گے۔ کب واپس آئیں گے۔"

میں نے کہا "مت سوچو ان کے بارے میں۔ بس اپنی فکر کرو۔ دس بج گئے باتوں باتوں میں۔ اب ہمیں نکل جانا چاہیے۔ لیکن مسٹر غالب' واٹ اباؤٹ یو' تم کیا کرو گے؟"

"میں کچھ نہیں کروں گا۔ یہ بھی بہت مشکل کام ہے۔"

"تم کب تک روپوش رہو گے؟"

"تمہارے واپس آنے تک" غالب نے کہا۔

"لاحول ولا قوۃ۔ پھر ہمارے ساتھ چلو۔ یہاں تمہیں کسی نے دیکھ لیا تو ہماری سازش کا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ پتا چل جائے گا کہ رابعہ بھی یہیں روپوش ہے اور پولیس پر خواہ مخواہ کا الزام ہے۔ نبی داد صاف بچ جائے گا۔ ابھی ذرا نبی داد سے تفتیش ہونے دو۔ اور پولیس کو بھی تلاش میں مصروف رہنے دو۔" پھر میں نے سوچ کر کہا۔

"یہ نبی داد کیا واقعی اتنا بے وقوف ہے۔ دلاور کے کہنے پر وقار کے گھر پہنچ گیا۔ سکندر بخت کو گرفتار کرنے کے لیے۔ کیا اسے اندازہ نہیں تھا کہ یہ ناممکن ہے۔ فرض کرو عین وقت پر نازو اور تم خود کو گرفتاری کے لیے پیش نہ کرتے تو کیا پولیس مجھے اور رابعہ کو پکڑ سکتی تھی۔ رابعہ تو شاید گرفتار ہونے سے پہلے ہی ضمانت قبل از گرفتاری کا پروانہ دکھا دیتی یا تھانے پہنچ کے منظر کو بلا لیتی۔ مگر میں' کیا میں گرفتار ہو جاتا؟ میں تو سب کو لمبا لٹا کے نکل جاتا۔ چار پولیس والے کیا چیز ہیں' پھر میں نبی داد کو بھی ساتھ لے جاتا۔"

"دلاور کو یقین ہو گا کہ نبی داد کا باپ بھی سکندر بخت پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ یا وہ مارا جائے گا یا خراب ہو گا۔ اور ایسا ہی ہوا۔ خیر اب اگلا مرحلہ ہو گا ہمارے منظرِ عام پر آنے کا۔ ہم کیا بیان دیں گے؟ پولیس نے ہمیں کہاں رکھا اور ہمارے ساتھ کیا سلوک کیا؟"

میں نے کہا "ہمارا بیان بہت سادہ ہو گا۔ پولیس نے ہمیں چوہدری دلاور کے سپرد کر دیا تھا۔ پتا نہیں وہ ہمیں کہاں لے گئے تھے' اور کہاں قید رکھا تھا۔ دلاور وہاں اکثر آتا تھا۔ ہم نے اس کی آواز سُنی تھی۔ ہم تہ خانے میں تھے اور ہماری آنکھوں پر پٹی تھی' ہم دیکھ نہیں سکتے تھے۔ کوئی سنسنی خیز کہانی بنا لیں گے بعد میں۔ ابھی تو چلنے کی بات کرو۔"

"بات کیا کرنی ہے' بس چلو" غالب نے کہا۔

"ایسے ہی روانہ ہو گئے تو کراچی نہیں کہیں اور پہنچ جائیں گے۔ پولیس ہم تینوں کو بڑی سرگرمی سے تلاش کر رہی ہو گی۔ بسوں کے اڈے' ریلوے اسٹیشن اور ائرپورٹ پر تو خاص نظر رکھی جاتی ہے۔"

غالب نے مجھ سے اتفاق کیا "یہ تو ہے۔ اس کے باوجود پولیس کی ناکابندی کا ڈراما ہمیشہ فیل ہو جاتا ہے۔ ملزم جُل دے کر نکل جاتے ہیں۔"

"رائٹ۔ ہم بھی جُل دے کر ہی نکل سکتے ہیں۔ حُلیہ اور میک اپ بدل کے" میں نے کہا "میں کوئی رسک نہیں لے سکتا۔"

"ہم بھی روپوشی کے کھیل کو ایک منطقی انجام تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ پکڑے گئے تو بے عزتی الگ ہو گی۔ لوگ مذاق اڑائیں گے۔" رابعہ بولی

میں نے کہا "آج میرے والد کی برسی ہے۔"

غالب نے سرہلایا "کیا تمہارا خیال ہے قبرستان جا کے فاتحہ خوانی کا۔"

"کیا مجھے نہیں جانا چاہیے؟" میں نے اُلٹا سوال کر دیا۔

غالب نے نفی میں سرہلایا "یہ بات چوہدری دلاور کو بھی معلو ہے شاید پولیس کو بھی معلوم ہو گی۔"

میں نے افسردگی سے کہا "پولیس کو یقیناً معلوم ہو گا۔ خود دلاور نے بتا دیا ہو گا۔"

"اس کے فون کرنے کا مقصد بھی یہی تھا۔ اس نے بڑا احسان کیا یہ بتا کے کہ تمہارے والد کی ہڈیاں اپنے اصل مدفن میں ہی ہیں۔ اسے یقین ہو گیا کہ یہ معلوم ہو جانے کے بعد تم جذباتی ہو کے برسی پر قبرستان ضرور جاؤ گے۔"

میں نے مضبوط لہجے میں کہا "میں نہیں جاؤں گا۔ برسی کوئی تقریب نہیں ہوتی۔"

مجھے علم نہیں تھا کہ رابعہ سب سُن رہی ہے "ہاں۔ آج ہم سب مل کے ختم قرآن کریں گے اور ان کے لیے دعائے مغفرت۔" وہ بولی۔

"افسوس کہ غالب بھی وہاں نہیں جا سکتا' محسن بھی نہیں ہے۔"

مولوی خادم حسین نے رابعہ کے پاس آ کے کہا "میں ضرو جاؤں گا جی اپنے منظر صاحب کے ساتھ۔ انہیں تو معلوم ہو گا کہ ق کہاں ہے۔ اور وقار صاحب کو بھی لے جاؤں گا۔ آج سب ا بُلا لیتے ہیں قرآن خوانی کے لیے۔ آپ کل چلے جانا کراچی۔"

وہ دن بڑا سوگوار گزرا۔ غالب اور منظر یا رابعہ کے سوا کوئ بھی وزیر خان کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھا۔ میں نکی وقار یوسف' مولوی خادم حسین اور مریم سے پُرانی باتیں کرتا رہا۔ اپ بچپن کے قصے۔ پاکستان آنے کے' پاکستان میں اپنے والد کی جدوجہد کی کامیابی۔ ان کی خواہشات اور ناتمام حسرتوں کی باتیں۔ نکی نے بڑی عقیدت کے ساتھ نیاز کی دو دیگیں میاں میر صاحبؒ کے مزار پر بھجوائیں۔ شام کو جب وقار' منظر اور مولوی خادم حسین قبرستان گئے تو میں نے خود کو بہت اکیلا اور بے بس محسوس کیا۔

"کتنے دکھ کی بات ہے کہ ایک بیٹا اپنے باپ کی قبر پر فاتح خوانی کے لیے بھی نہ جائے۔ ان کی روح کو کتنی تکلیف ہو گی؟" میں نے رابعہ سے کہا۔

"کیا فائدہ ایسی باتیں سوچ کے خود کو دُکھی کرنے سے۔ کیا وہ تمہاری مجبوری کو سمجھتے نہیں ہوں گے۔ اگر تم جاتے اور گرفتار ہو جاتے تو کیا وزیر خان مرحوم کی روح کو تسکین ملتی؟ شاید اب ان

کی روح زیادہ مطمئن ہو گی کہ تم نے جذبات کے بجائے عقل سے کام لیا اور اپنے دشمنوں کے عزائم کو ناکام بنا دیا؟" رابعہ مجھے تسلی دیتی رہی۔

مجھے قبرستان نہ جانے کا کچھ زیادہ ہی رنج تھا۔ شاید اس لیے کہ میری خواہش کی تکمیل کے راستے میں خوف کی دیوار کھڑی تھی اور مجھے اپنے بے بس ولاچار ہونے کا احساس تھا لیکن قبرستان سے واپسی پر مولوی خادم حسین نے جو کچھ مجھے بتایا اس کے بعد تاسف کی جگہ اطمینان نے لے لی۔

"بس جی اللہ کی مصلحت ہوتی ہے ہر کام میں" اس نے آتے ہی کہا "خدا کا شکر ادا کرنے کے لیے دو نفل پڑھنے چاہئیں آپ کو۔"

"تم بہت گھبرائے ہوئے لگ رہے ہو۔ خیریت ہے نا؟" میں نے کہا۔

"اجی خیریت کہاں۔ دھڑکا سا لگا ہوا ہے کہ میرے پیچھے پیچھے کوئی بھی یہاں تک نہ چلا آیا ہو۔ آگیا تو بڑا گھمسان کا رن پڑے گا جی۔ دنادن گولیاں اور گولے چلیں گے۔ کشتوں کے پشتے لگ جائیں گے اور آپ تو دو چار کے سری پائے یا گردن اور چانپیں توڑ کے نکل جاؤ گے اسی دیوار میں سے بھی۔ بس مریم اور اس کا اکلوتا شوہر یہاں پڑے رہ جائیں گے۔"

مریم نے اسے ٹوکا "کیا بولے جا رہے ہو۔ کچھ ہمیں بھی پتا چلے۔"

"میں کہتا ہوں جی کہ خطرہ ہو تو حفاظت کے خیال سے غافل نہیں ہونا چاہیے۔ تمہیں پہلے سے بتا رہا ہوں کہ کوئی خبیث زادہ ولدیت نامعلوم ضرور میرے تعاقب میں ہو گا۔ اب نصیبِ دشمناں کوئی کنڈی بھی کھڑکائے تو تم ہرگز دروازے کی طرف مت دیکھنا۔ گھس جانا پلنگ کے نیچے اور سانس بھی روک لینا۔ میرا اللہ مالک ہے۔ میں باتھ روم میں لوٹا لے کر بیٹھ جاؤں گا۔ حملہ آور قاتل عموماً لیٹرین میں خون خرابا نہیں کرتے۔ سمجھ لیتے ہیں کہ اس حالت میں کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔"

میں نے کہا "اچھا طریقہ ہے۔ اس طرح کپڑے بھی خراب نہیں ہوتے اور بزدلی کا الزام بھی نہیں آتا۔ لیکن کون آ رہا ہے یہاں خون خرابا کرنے؟"

"وہی جی۔ نطفہ ناتحقیق چوہدری دلاور۔ اس کے چیلے چانٹے وہاں پہلے سے موجود تھے۔"

مریم بولی "کہاں' قبرستان میں؟"

"اور کیا اس وقت میں عالمِ بالا سے واپس آیا ہوں" خادم حسین بولا "کاش وہ قبرستان میں زمین کے اوپر نہیں زمین کے نیچے ہوتے۔ مگر جناب انہوں نے تو ہر طرف ڈیرا ڈال رکھا تھا۔ اپنے منظر صاحب کی نظر بہت تیز ہے اور کیوں نہ ہو' ولی را ولی می شناسد۔ بدمعاش کو بدمعاش ہی پہچان سکتا ہے۔ انہوں نے وقار کو

اور مجھے بتایا کہ ادھر دیکھو۔ اور وہاں دیکھو' پھر تو جی میری نظر نے بھی دیکھ لیا۔ کوئی وزیرِ خان مرحوم کی قبر کے دائیں جانب کچھ فاصلے پر موجود ہے تو کوئی بائیں طرف کھڑا ہے۔ کسی قبر پر فاتحہ خوانی کا ڈراما کر رہے تھے سب لیکن نظر ہم پر تھی۔ اور نیت تو آدمی کی صورت پر نظر آتی ہے جی۔"

"کہیں وہ سادہ کپڑوں میں پولیس والے تو نہیں تھے؟"

"نہیں جی۔ پولیس کی چھاپ دوسری ہوتی ہے۔ ان کی شکل پر بدمعاشی کی چھاپ تھی۔ منظر صاحب نے تو کہا مجھ سے کہ خادم حسین کلمہ پڑھ کے لیٹ جاؤ اور شرافت سے مر جاؤ۔ ورنہ وہ گولی ماریں گے تو بہت اذیت سے مرو گے اسلحہ صاف نظر آ رہا تھا ان کی جیب میں لیکن جناب ایسے بلاوجہ اپنی مرضی سے کون مر سکتا ہے۔"

میں نے کہا "ہو سکتا ہے یہ تمہارا وہم ہو؟"

وہ چہک کے بولا "وہم! کمال بات کرتے ہو جی آپ۔ کیا وہ سب مُردے تھے جو قبروں سے نکل کے ہمارے استقبال کے لیے کھڑے ہو گئے تھے؟"

"میرا مطلب ہے وہ عام لوگ ہوں جو تمہاری طرح فاتحہ خوانی کے لیے گئے ہوں؟"

خادم حسین نے پُرجوش انداز میں تردید کی "نہیں جی۔ وہ تو سب برابر فاصلے پر موجود تھے ہر طرف۔ آج کوئی جمعرات تو نہیں تھی۔ جمعرات کو زیادہ لوگ نظر آتے ہیں۔ اس طرف اور کوئی بھی نہیں تھا۔ اس لیے پہچانے گئے وہ لوگ کہ انہوں نے ایک ہی قبر کو ہر طرف سے گھیر لیا تھا اور سو سو گز کا فاصلہ تھا ان کے درمیان۔ قبرستان میں بچے بوڑھے دھوتی شلوار والے' بالوں والے اور گنجے سب ہی آتے ہیں۔ وہ سب ایک جیسے جوان اور ہٹے کٹے تھے اور انہوں نے وہ پتلونیں چڑھا رکھی تھیں ٹانگوں پر جو آج کل چل رہی ہیں۔ ٹیڈی پتلون کہتے ہیں جی اسے۔ دونوں ٹانگیں یوں لگتی ہیں جیسے غلاف میں بندوق اور وہ بھی اُلٹی۔"

"انہیں میرا انتظار ہو گا؟"

"ہاں جی۔ میں تو پہچانتا ہوں اپنے دشمنوں کو صورت سے۔ سب دو ٹانگوں والے بھینسے ہیں۔ مشک جیسی توند ہے سب کی۔ ان کے ہاتھ لگ جاؤں میں تو وہ میری چٹنی بنا دیں گے جی مگر میں کہاں ہاتھ آتا ہوں ان کے۔ میں تو سرپٹ بھاگتا ہوا دو میل آگے جا کے دم لوں گا۔ دو چار قدم دوڑ کے ہانپ جائیں گے.... ان کے سوا میرا کوئی دشمن نہیں۔"

غالب نے ہنس کے کہا "کس کی بات کر رہے ہو تم؟"

"اپنے سالوں کی جناب۔ پہلی بیوی کے حرام الدہر بھائیوں کی۔ عقد ثانی پر سخت مشتعل ہیں وہ اور سارے پہلوان ہیں۔ اکھاڑے میں زور کرتے ہیں اور خصلت میں بھی اپنی ہمشیرہ جیسے ہیں۔ ابھی تک کسی نے چوہے کا بچہ تک پیدا نہیں کیا۔ اب کیا

عرض کروں میں۔ سمجھ لیں کہ قصوروار ان کی منکوحات نہیں۔ اس لیے جناب میں نے منظر صاحب سے کہا کہ آج میرا خون ہوگا آپ کی گردن پر۔ گناہ آپ کے جرم آپ کے اور دشمن بھی آپ کے۔ مارا جائے گا آپ کے ساتھ مولوی خادم حسین۔"

"چلو کچھ بھی نہیں ہوا۔ خدا کی مرضی نہ ہو تو کون کسی کو مار سکتا ہے؟"

خادم حسین نے ایک گال دبا کے کہا "مُکاّ تو ماردیا جی اس نے۔ آہ' یہ ڈاڑھ ضرور ہل گئی ہے اپنی جگہ سے۔"

میں نے کہا "تمہارا جھگڑا ہوا تھا؟"

"بس جی۔ ہم چاہتے تو نہیں تھے مگر ہونے والی بات ہوجاتی ہے۔ وقار صاحب اور منظر صاحب نے تو بہت کہا تھا کہ ہمارے ساتھ چلو لیکن جناب منظر صاحب کی گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے مجھے قسم توڑنے کا کفارہ ادا کرنے کا خیال آگیا۔ وہاں قبرستان کے باہر گداگروں کی فوج بیٹھی تھی۔ میں نے سوچا کہ یہ قرض بھی ادا کردوں۔ بڑے خبیث ہیں جی وہ بھی۔ پوچھنے لگے کہ کیا کھلاؤ گے۔ میں نے کہا کہ جو میری مرضی' ایک بڈھا خواہ مخواہ ساٹھ فقیروں کا نمائندہ بن گیا اور بولا کہ کھانے والے ہم ہیں۔ ہماری مرضی چلے گی۔ ادھر بریانی والے سے بھی تم کو ڈسکاؤنٹ دلادیں گے اور پائے والے سے بھی۔ قورمے والا اور مچھلی فرائی والا کوئی رعایت نہیں کرتے۔ بس جی میں نے سوچا کہ آج یہ معاملہ ختم ہوجائے تو اچھا ہے ورنہ ساٹھ محتاج ایسے کہاں ملیں گے جو میری مرضی سے دال روٹی کھا کے بھی خدا کا شکر اور میرا شکریہ ادا کریں۔ میں نے کہا کہ چلو ساٹھ بندوں کے لیے بات کرلو۔ دس پرسنٹ ڈسکاؤنٹ پر ادائیگی کرکے میں نے ہوٹل والے سے کہا کہ اب دیر کیا ہے۔ کھانا بھیج دو تو وہ ہنسنے لگا کہ صوفی صاحب' ابھی ان کے ڈنر کا ٹائم نہیں ہوا۔ ابھی بزنس کا ٹائم ہے۔ یہ رات دس بجے کھانا کھائیں گے۔ ویسے بھی پانچ بجے تو انہوں نے شیرمال قورمہ کھایا ہے۔ آپ جیسے تو سارا دن آتے رہتے ہیں۔ یہ ہر وقت تو نہیں کھاسکتے۔ پھر میں نے کہا کہ اچھا آرڈر کینسل کرو اور پیسے واپس۔ تمہارا کیا بھروسا میرے جانے کے بعد کسی دوسرے آدمی سے بھی رقم وصول کرلوگے۔ میں دس بجے رات تک نہیں رُک سکتا۔ تو جناب ہوٹل والا کہنے لگا کہ آرڈر بک ہونے کے بعد کینسل نہیں ہوتا۔ وہ سامنے لکھا ہوا ہے۔ مجھے اور غصہ آیا مگر جناب میں نے دل میں کہا کہ اپنی نیک نیتی کے ساتھ میں نے کفارہ ادا کردیا۔ اب آگے کوئی بے ایمانی کرے تو مجھے کیا۔ میں دکان سے نکلا تو سامنے سے ایک مشٹنڈا بیل کی طرح ٹکرا گیا۔ اس نے جان بوجھ کے ٹکر ماری تھی مجھے۔ کہنے لگا کہ تمہاری نظر ہی نہیں دماغ بھی خراب ہے۔ یہ بریانی والا اور قورمے والا تو بھائی ہیں اور فقیروں سے ملے ہوئے ہیں۔ رات کو آدھی رقم انہیں دیں گے۔ آدھی خود رکھ لیں گے۔ روز نہ جانے کتنے تم جیسے آتے ہیں باپ کی قبر پر فاتحہ پڑھنے۔ میں نے کہا کہ مرے تمہارا باپ' میرا باپ تو اس وقت بھی ڈالڈا سے بنی ہوئی اصلی دیسی گھی کی مٹھائی بیچ رہا ہوگا گوجرانوالہ میں۔ وہ بدمعاش دانت نکالنے لگا کہ پھر تم کس کی قبر پر گئے تھے۔ اب جناب میں نے اسے غور سے دیکھا تو پہچان گیا اسے۔ صورت کی خباثت سے۔ میں نے جان چھڑانے کے لیے کہا کہ وہ میرے ماموں کی قبر تھی۔ کہنے لگا کہ سکندر بخت کہاں ہے؟ وہ کیوں نہیں آیا؟"

میں نے اور غالب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا "پھر....؟"

"پھر کیا جی۔ میں نے کہا کہ ایک تو سکندرِ اعظم تھا ڈھائی ہزار سال پہلے' ایک میرے ماموں کا لڑکا ہے۔ درزی کا کام کرتا ہے۔ بس جی اس نے مجھے گالی دی کہ صوفی.... مجھ سے چالاکی مت کر ورنہ داڑھی اکھاڑ کے ہاتھ میں دے دوں گا۔ غصہ تو مجھے پہلے ہی آیا تھا۔ یہ بات گولی کی طرح لگی میرے دل میں جناب اور میں نے جان کی پروا نہ کرتے ہوئے اس کے پیٹ میں مُکا ماردیا۔ جواب میں اس نے بڑا ظالم مُکاّ مارا جی.... آہ۔"

مریم نے اسے تشویش سے دیکھا "کیا ڈاڑھ نکلوانی پڑے گی؟"

میں نے کہا "کیا پتا پوری بتیسی ہل گئی ہو۔ آج کل مصنوعی بتیسی کے بجائے اصلی لگادیتے ہیں۔ کسی مُردے کی۔ پتا بھی نہیں چلتا۔"

"کسے پتا نہیں چلتا' مُردے کو؟" غالب بولا۔

خادم حسین نے خفگی سے کہا "آپ مہمان نہ ہوتے میرے تو میں بھی آپ کو دندان شکن جواب دیتا۔ لیکن میں مجبور ہوں پوری بات سُنانے پر۔"

"جیسے ہم ہنسنے پر مجبور ہیں۔"

غالب بولا "یعنی اس کے بعد بھی کچھ ہوا تھا؟ ایک مُکاّ کھا کے تم لیٹے نہیں تھے؟ فوت بھی نہیں ہوئے تھے' بے ہوش بھی نہیں؟"

رابعہ نے اسے ڈانٹا۔ "یہ کیا بدتمیزی ہے۔ خادم حسین تم مجھے بتاؤ۔"

خادم حسین دردناک لہجے میں بولا "وہ جی.... میں بے ہوش تو خیر نہیں ہوا تھا مگر لیٹ گیا تھا فٹ پاتھ پر آنکھیں بند کرکے۔ اور جب دیکھا کہ لوگ جمع ہوگئے ہیں اور وہ بدمعاش بھاگ گیا ہے تو میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ ابھی کچھ دور ہی آیا تھا کہ پیچھے سے وہ پھر آگیا۔ وہی حرام الدہر۔ کہنے لگا کہ صوفی معاف کرنا یار۔ غصے میں قابو نہیں رہا مگر تم کو بھی اپنی جان کا خیال رکھنا چاہیے۔ میں نے کہا کہ اب کیا جان لینے آئے ہو۔ اس نے کہا کہ میں تم کو خبردار کرنے آیا تھا۔ چوہدری دلاور کے بندے تمہارے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ میں بھی ان کے ساتھ قبرستان میں موجود تھا اور سکندر بخت کی قسمت اچھی تھی کہ آیا نہیں ورنہ ہم اسے واپس نہ جانے دیتے۔ میں تو

جناب بھونچکا رہ گیا۔ میں نے کہا کہ تم بھی ان میں شامل تھے تو پھر مجھے کیوں بتا رہے ہو اور وہ کون لوگ ہیں آخر جو تمہارے ساتھ تھے۔ وہ بولا کہ نام تو کسی کا نہیں بتا سکتا میں ورنہ وہ میرا نام و نشان مٹادیں گے۔ لیکن میرے ساتھ بے ایمانی کی ہے انہوں نے اس لیے میں تم کو بتا رہا ہوں۔"

"کیا بے ایمان لوگ بھی بے ایمانی کرتے ہیں؟" غالب بولا۔

"اسے کہا گیا تھا جی کہ بندے کو اُٹھالاؤ گے تو ہزار روپے ملیں گے" خادم حسین نے کہا "وہ شکایت کررہا تھا کہ بندہ ہی نہ پہنچے وہاں تو میرا کیا قصور۔ میں تو گیا تھا۔ ہزار نہ سہی پانچ سو دیتے آخر میرا ٹائم ضائع ہوا۔ اور سارا خطرہ بھی تو میں نے ہی مول لیا تھا۔ لیکن اس کی کسی نے نہیں سُنی تھی چنانچہ وہ مشتعل تھا اور بدلہ اس نے یوں لیا کہ خادم حسین کو بتادیا۔"

"کیا یہ بات باقی لوگوں کو معلوم نہیں ہوگی؟"

"باقی لوگ منظر صاحب اور وقار کے پیچھے گئے تھے۔ اس اُمید میں کہ وہ سکندر کے ٹھکانے پر پہنچ جائیں گے۔ اللہ کا ہزار شکر ہے جی کہ وہ میرے ساتھ نہیں آئے۔ قبرستان سے اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ یہ بندہ میرے پیچھے رہا۔"

"تم نے اس کا نام پتا تو پوچھا ہوتا۔"

"اس نے کہاں بتایا تھا جی۔ لیکن میں نے اس کو پانچ سو روپے دے دیے تھے" خادم حسین بولا۔

"واہ خادم۔ جی چاہتا ہے تمہارا منہ چوم لوں۔ مگر رابعہ بیٹھی ہے سامنے۔ اور مریم بھی' یہ بُرا مانیں گی" میں نے کہا۔

"بُرا تو میں زیادہ مانوں گا جی" خادم حسین اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیر کے بولا "وہ آپ کے ہی دیے ہوئے پیسے تھے۔"

"ہم نے کب دیے تھے؟" رابعہ بولی۔

"آپ لوگ دیتے ہی رہتے ہو جی ورنہ میری اتنی اوقات کہاں؟"

"خیر تم نے بہت اچھا کیا۔ اسے ایک مُکاّ مار کے دانت توڑنے کا انعام پانچ سو روپے دے دیا۔"

خادم ہنسنے لگا "وہ دوسرا مُکاّ مارتا تو میرے پاس ہزار نہیں تھے جناب پھر تو آپ کے ہزار خرچ ہوتے۔ بتیسی بنوانے پر۔ اور آخری رسوم پر۔"

مریم نے گھبرا کے کہا "کیا واہی تباہی بکتے جارہے ہو۔"

خادم حسین نے کہا "نیک بخت۔ بندہ کچھ بھی کہے۔ رب کی رضا کے بغیر ایک چیونٹی کی موت ممکن نہیں' یہ مذاق تھا۔"

"ایسا مذاق بھی اچھا نہیں لگتا مجھے۔"

غالب نے کہا "منحوس شکل ہو پھر بھی منحوس بات نہیں کرنی چاہیے۔"

خادم حسین گرم ہوگیا "اپنی شکل دیکھ کے بات کرنی چاہیے آدمی کو۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا "آدمی کی بات اور ہے۔ یہ تو غالب ہے خیر تم باقی بات سُناؤ۔"

"بس جی۔ وہ پانچ سو لے کے اور میرے ہاتھ چوم کے چلا گیا۔ کہہ رہا تھا کہ بزرگو' بڑی بابرکت ذات ہے آپ کی۔ گستاخی کا بھی انعام دے دیا۔ پھر کبھی حاضری دوں گا۔"

غالب بولا "یعنی جب پھر پانچ سو کی ضرورت ہوگی۔ مُکاّ مار کے لے جاؤں گا۔"

"مرزا جی۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ کی ذات میں بھی شرپسندی بڑھتی جارہی ہے اور یہ سب اثر ہے منظر صاحب کی صحبتِ بد کا۔"

میں نے کہا "مولوی خادم حسین۔ تمہیں یقین ہے کہ کسی نے تمہارا یہاں تک پیچھا نہیں کیا۔ لیکن منظر سے اور وقار یوسف سے بھی پوچھ لیتے...."

"میں نے پوچھ لیا جناب۔ اور آنے سے پہلے میں نے ان کے گھر فون کیا تھا اور انہیں یہ بات بتادی تھی۔"

غالب نے پوچھا "مولوی خادم حسین' سچ بتانا۔ منظر نے تمہاری بات سُن کے کیا کہا؟"

خادم حسین کا چہرہ سُرخ ہوگیا "انہوں نے.... انہوں نے کہا کہ تم نے بڑی عقلمندی کا ثبوت دیا۔"

"ایسے نہیں' ان کے الفاظ کیا تھے؟"

"اجی ان کی زبان' اللہ انہیں معاف کرے۔ میں اپنی زبان کیوں گندی کروں؟"

"تمہیں مریم کی جان کی قسم" غالب پیچھے پڑ گیا۔

"یہ زیادتی ہے" خادم نے احتجاج کیا اور بے بسی سے مریم کو اور پھر رابعہ کو دیکھا "خواتین کے سامنے.... خیر' آپ ادھر آجائیں۔"

ایک کونے میں جاکے اس نے سرگوشی میں کہا "منظر صاحب نے کہا تھا.... کہ خادم حسین' تم لونڈیا ہوتے تو میں بھی تم سے شادی کرلیتا۔ توبہ توبہ.... کس قدر خرافات کا منبع ہے منظر صاحب کی زبان اور کتنی غلاظت بھری ہوئی ہے ان کے دماغ میں۔"

رابعہ اور مریم پہلے ہی خادم حسین کی بات پر ہنس رہی تھیں۔ اب ہم نے بھی قہقہے مارے تو شرمیلا مولوی خادم حسین دوسرے کمرے میں روپوش ہوگیا۔ وہ سخت جھینپ رہا تھا۔

خادم حسین کی بات نے مجھے متفکر کردیا تھا "اس کا مطلب یہ ہوا مرزا غالب کہ اپنے چوہدری دلاور نے وقفے کے بعد دوسرا راؤنڈ بڑے زور شور سے شروع کیا ہے۔"

"وہ ہمارا کھیل سمجھ گیا ہوگا۔ ہم نے اس کی چال ناکام بنادی۔ اگر وہ سکندر بخت کو اُٹھالیتا تو ایک تیر سے دو نہیں تین شکار کرتا۔ وہ نبی داد کو رہا کرالیتا۔ پولیس کو الزام سے بچالیتا' اپنے دشمن سے نجات پالیتا اور خود بھی الزامات سے محفوظ ہوجاتا لیکن

اب ہمیں کسی خوش فہمی میں بالکل نہیں رہنا چاہیے۔ دشمن کے عزائم کھل کر سامنے آگئے ہیں۔" غالب نے کہا۔

"نہ دشمن نیا نہ اس کے عزائم نئے۔ ہمیں نہ پہلے خوش فہمی تھی اور نہ آئندہ ہوگی" میں نے کہا۔

"منظر صاحب نے یہ بھی کہا تھا کہ سکندر سے کہنا کہ یہاں سے فوراً چلا جائے۔ اور جتنا عرصہ لاہور سے دور گزار سکے گزارے۔ ہم یہاں نبی داد کو اور پولیس کو مصیبت میں ڈالے رہیں گے۔" مولوی خادم حسین دوبارہ نمودار ہو کر بولا۔

میں نے کہا "مولوی صاحب۔ اللہ کو حاضر و ناظر جان کے ایک بات کہنا۔ کیا منظر نے یہی کہا تھا؟"

"جی....؟ بالکل.... زبان ان کی اپنی ہوتی ہے۔ یہ تو آپ بھی جانتے ہیں۔"

"منظر نے کہا ہوگا کہ اس بھوتنی والے سے کہنا کہ دفع ہو جائے اپنی شکل گم کرے.... یہ تو ٹھیک ہے۔ مگر کیا اس نے یہ بھی کہا تھا کہ اکیلا جائے' رابعہ کے بارے میں کچھ نہیں کہا تھا... کہ اسے کیسے ساتھ رکھوں؟"

"کیسے کیا مطلب جی؟" خادم حسین چکرا گیا۔

"مطلب یہ کہ سیکریٹری بنا کے۔ شریکِ سفر.... گرل فرینڈ یا نصف بہتر بنا کے؟"

رابعہ اٹھ کھڑی ہوئی "بدتمیزی مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔"

"یہاں کون بدتمیزی کر رہا ہے؟ غالب.... میں اس کو سمجھا دیتا ہوں۔"

"یار لڑکیاں شرماتی ہیں" غالب بولا "ایسی باتیں سب کے سامنے نہیں کرنی چاہئیں۔"

"کبھی تم نے رابعہ اور نازو کی باتیں سُنی ہیں۔ اللہ توبہ" میں نے کانوں کو ہاتھ لگا کے کہا۔

"اور جو باتیں خادم حسین کرتا ہے اکیلے میں۔ اس پر مزید توبہ" غالب نے بھی کانوں کو ہاتھ لگایا۔

"میں ایسی کیا بات کرتا ہوں جی؟" خادم حسین گرم ہو گیا۔

غالب معصوم بن گیا "مجھے کیا معلوم۔ میں کوئی چُھپ چُھپ کے تمہاری باتیں سنتا ہوں' مریم سے پوچھو۔"

"پھر تم کیسے کہہ رہے تھے؟"

"میں اپنا خیال ظاہر کر رہا تھا" غالب نے کہا "تم بھی میرے بارے میں جو چاہو کہو۔"

صبح ہم نے "فرار" کی منصوبہ بندی کی۔ یہ بات یقینی تھی کہ لاہور کی پولیس زبردستی کے الزام سے خود کو بچانے کے لیے ہماری تلاش میں لاہور کا چپہ چپہ چھان مارے گی اور اپنے سارے وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے پیشہ ورانہ مستعدی کا مثالی مظاہرہ کرے گی جو وہ اس وقت تک نہیں کرتے جب تک کہ دباؤ بڑا نہ ہو یا معاوضہ بڑا نہ ہو۔

میں نے تجویز پیش کی تھی کہ رابعہ مردانہ سوٹ بوٹ پہن لے اور بالوں کو کسی طرح ٹوپی میں نہ چُھپا سکے تو وہ پگڑی سر پر رکھ لے جو پنڈی سے لاہور کے سفر میں میرے سر پر تھی۔ اس نے میری تجویز کو صاف مسترد کر دیا۔ پھر میں نے زنانہ لباس پہننے کی تجویز سامنے رکھی تو اس کے ساتھ غالب نے بھی مجھے سخت شرمندہ کیا کہ چھ فٹ کی لڑکی سے زیادہ میں اپنی ظاہری صفات کے باعث تیسری جنس کا نمائندہ لگوں گا۔

مسئلے کا قابلِ عمل حل مولوی خادم حسین نے پیش کیا کہ رابعہ برقع میں رہے اور میں دیہاتی وضع کے پھٹے پرانے کپڑے پہنوں۔ یہ کپڑے فراہم کرنے میں بھی اس نے اہم کردار ادا کیا۔ میک اپ سے سب کچھ ہو سکتا تھا مگر اس کے لیے وقت نہیں تھا۔

خادم حسین نے اپنے کمرے کی ایک الماری میں سیدھا کھڑا ہوا پُرانا ٹین کا بکس نکالا "یہ میرا خزانہ ہے جی۔"

میں نے حیرانی سے اس زنگ خوردہ بکس کو دیکھا "کیا ہے اس میں؟"

"میرا ماضی۔ اس کو میں ہر جگہ اپنے ساتھ رکھتا ہوں۔" وہ بولا "اس میں بہت سی نشانیاں ہیں۔ میرے والدین کی چھوڑی ہوئیں۔"

"ابھی تم نے کہا تھا.... اپنے والد کے بارے میں..."

"وہ جھوٹ بولا تھا میں نے اس سے۔ میرے والد مرحوم تو بڑے درویش تھے۔ آخری عمر میں صوفی ہو گئے۔ خدا سے ایسی لو لگائی کہ اپنا ہوش نہ رہا۔ لوگ تو پاگل ہی سمجھتے تھے جی۔ جب شادی ہوئی تھی تو اسکول ٹیچر تھے ترقی کرتے کرتے ہیڈ ماسٹر ہوئے اور انسپکٹر اسکول بن گئے۔ پھر کسی فقیر نے کایا کلپ کر دی۔ فقیروں سے ان کو بڑی عقیدت تھی۔ نوکری چھوڑ دی۔ گھر بار چھوڑ دیا۔ قبرستانوں میں رات بھر چلے کاٹتے تھے۔ تن بدن کی فکر نہ رہی۔ دیوانوں کی طرح گلیوں بازاروں میں پھرتے تھے۔ کوئی سمجھاتا تھا تو کہتے تھے کہ میرا گھر ہے دو گز زمین کے اندر۔ اسی کو تلاش کر رہا ہوں۔ زبردستی گھر لاتے تھے تو اماں سے کہتے تھے کہ میرے ساتھ رہنا ہے تو میری دنیا میں چلو۔ ویسے وہ پاگل نہیں تھے۔ ہر علمی سوال کا جواب فوراً اور بڑی معقولیت سے دیتے تھے۔ اماں کی اسی صدمے نے جان لے لی۔ وہ خود ایک رات اماں کی قبر کے سرہانے بیٹھے نظر آئے تھے۔ جھوم جھوم کے تلاوت کر رہے تھے۔ اگلے دن ایسے غائب ہوئے کہ پھر نہیں ملے۔ یہ ان کی نشانیاں ہیں جو میں نے سنبھال کے رکھی ہیں جی۔ یہ دیکھیں' یہ ہے ان کی وہ لنگی جو اماں نے خریدی تھی۔ بس یہی پہن کے پھرتے تھے۔"

لنگی بہت پُرانی اور میلی تھی۔ اس کے تار تار میں میل اور گرد ہوگی اور پسینہ ہوگا۔ ایک دیوانے باپ کی یہ نشانی اس بیٹے نے سنبھال کے رکھ لی تھی جسے ہم دیوانہ ہی سمجھتے تھے۔

... وہ قبرستان میں اماں کی قبر پر نظر آئے تھے یہی لنگی باندھے ہوئے تھے۔ صبح اسے قبر پر پھیلا گئے تھے۔ اور یہ ان کا کرتہ ہے۔ آخری عید پر پہنا تھا۔ اس ٹوپی کے ساتھ۔ یہ ان کی عینک ہے جو وہ اسکول میں استعمال کرتے تھے۔"

میں نے' غالب نے اور رابعہ نے باری باری ہر چیز کو ایسے ہاتھ میں لیا جیسے وہ مقدس چیزیں ہیں۔ کسی عجائب خانے کے نوادرات کی طرح وہ انہیں بڑے فخر اور انکسار کے ساتھ پیش کرتا جا رہا تھا اور اس کی صورت پر طمانیت بھی تھی کہ دیکھنے والے حقیقی احترام اور دلچسپی کے ساتھ اس کے تاریخی سرمائے کو دیکھ رہے تھے۔

میں نے کہا "کتنی پُرانی ہیں یہ سب چیزیں؟"

وہ سوچ کے بولا "اماں کے انتقال کو سات سال ہو گئے ہیں۔ لنگی اس سے پہلے کی ہے۔ سال بھر والد مرحوم نے استعمال کی ہوگی۔ کیونکہ سال بھر بعد عین اماں کی برسی والے دن ابا غائب ہو گئے تھے۔ زندگی عجیب اتفاقات کا نام ہے جناب کہ بعض اوقات سچی بات بھی افسانہ لگتی ہے۔ اب یہی دیکھ لیں کہ جب برسی پر میں اماں کی قبر پر گیا تو وہاں ابا بیٹھے تلاوت کر رہے تھے۔ زور زور سے۔ اور جھوم رہے تھے۔ میری طرف انہوں نے بس ایک بار دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ سال بھر بعد نظر آئے تھے۔ میں نے سوچا کہ اب آگئے ہیں تو پھر کہاں جائیں گے۔ میں ان کا خیال رکھوں گا اور انہیں ساتھ لے جاؤں گا لیکن وہ اسی رات ایسے غائب ہوئے کہ صبح مجھے قبر پر یہ لنگی ایسے نظر آئی جیسے وہ پھولوں کی چادر ڈال گئے ہوں۔ میرے لیے تو وہی ان کی تاریخ وفات ہو گئی ہے۔ پہلے امید تھی کہ شاید پھر لوٹ آئیں' اب کوئی آس نہیں۔"

رابعہ نے کہا "اور یہ کرتہ...... عینک۔"

"عینک بارہ چودہ سال پہلے کی ہے۔ کرتہ بھی لنگی کے ساتھ کا ہے۔ آخری عید کا۔ مہینہ دو مہینہ پہن کے قبرستانوں میں چکر لگاتے رہے۔ رات رات بھر وہیں رہتے تھے۔ چلہ کاٹ کے گھر آئے تو بُری حالت تھی۔ اماں نے دھو کے ڈال دیا اور دوسرا دیا۔ وہ کچھ دن بعد ایسے گئے کہ گھر کو ہی بھول گئے۔ اماں کو کہیں نظر آجاتے تھے۔ مجذوب ہو گئے تھے۔ کچھ لوگ احترام کرتے تھے۔ کچھ مذاق اُڑایا کرتے تھے اور دیوانہ کہتے تھے۔ اماں کے لیے بڑے سخت دن تھے۔ وہ دمے کی مریض تھیں۔ ابا کی نوکری پنشن ملنے سے پہلے ہی ختم ہو گئی تھی۔ جو تھوڑا بہت پیسہ ملا وہ انہی پر خرچ کر دیا۔ بعد میں ہم نے بڑی سختی جھیلی۔ میرا ایک بڑا بھائی تھا۔ وہ گھر سے بھاگ گیا۔ وہ خود غرض اور بزدل تھا۔ حالات کا مقابلہ نہ کر سکا ورنہ ساری ذمے داری اس کی تھی۔"

"اب وہ کہاں ہے؟"

"سُنا ہے کراچی میں کہیں اس کا بہت بڑا بزنس ہے جی لیکن اس نے لوٹ کر ہماری خبر ہی نہیں لی تو پھر ہم اس سے کیا تعلق رکھتے۔"

"اس کے علاوہ کون تھا' کوئی نہیں تھا؟"

"ہاں جی۔ ایک بہن تھی' شادی ہو کے دوبئی چلی گئی تھی۔ وہاں سے آگے نکل گئی۔ شاید امریکا۔ پتا نہیں' اور جناب یہ برقع ہے میری ماں کا۔ اسی کو سر پہ ڈال کے وہ ابا کی تلاش میں یا ان کے پیچھے پیچھے پھرتی تھیں۔ میری پہلی بیوی' اللہ اسے عقل دے۔ اسے کباڑ خانہ کہہ کے میرے جذبات کو مجروح کرتی تھی۔ کہتی تھی کہ کیا قبر میں اپنے ساتھ لے جاؤ گے اماں ابا کی نشانیاں لیکن ایسا ہی خزانہ مریم کے پاس بھی ہے۔ اسے قدر ہے ان چیزوں کی۔ سارا مسئلہ جذبات کا ہے جی۔ میرے لیے تو والدین کی وہ دعائیں ہی خیر و برکت کا باعث ہیں جو خوشی مجھے ان کی خدمت کرتے ملی اس سے میرا بدبخت بھائی محروم رہا۔ مجھے یاد ہے کہ قبرستان میں ابا کو دیکھ کر میں حیران ہوا تھا اور میں نے پاس جا کے سلام کیا تھا تو ایک سیکنڈ کے لیے انہوں نے آنکھیں کھولی تھیں اور کہا تھا "خوش رہو۔" پھر ہاتھ اوپر اٹھایا تھا اور میں نے سر جھکایا تو اپنا ہاتھ میرے سر پر رکھ کے دوبارہ کہا تھا "خوش رہو" یہ ان کے آخری الفاظ تھے جو میں نے سُنے لیکن یہ دل سے نکلی ہوئی دعا تھی۔ کسی دیوانے کی بات نہیں تھی اور رسمی دعا نہیں تھی۔ اب یہ ساری چیزیں آپ کے کام آئیں گی۔"

میں نے چونک کے کہا "یہ.... یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

"کیوں جی۔ کیوں نہیں ہو سکتا۔ آپ نے یہی سب لانے کو کہا تھا۔"

غالب نے کہا "مگر یہ.... بہت قیمتی چیزیں ہیں تمہارے لیے۔"

"میں نے کہا نا جناب۔ قیمت تو جذبات کی ہے ورنہ انہیں دس روپے میں بھی کوئی نہ لے۔ میری خواہش ہے کہ یہ آپ استعمال کریں۔ بے شک بعد میں لوٹا دیں مجھے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ان سے صرف آپ کی ضرورت ہی پوری نہیں ہوگی بلکہ یہ آپ کے لیے بھی موجب خیر و برکت ہوں گی۔ آپ آفات سے محفوظ رہیں گے۔ یہ سب چیزیں مجھے واپس لوٹانے کے لیے لوٹ کر آئیں گی۔"

اس کے جذبات کی منطق کا جواب کوئی نہیں تھا۔ اسے انکار کرنا بھی مشکل تھا اور ان چیزوں کو استعمال کرتے ہوئے یوں لگتا تھا جیسے ہم کوئی جرم کر رہے ہیں۔ عجائب خانے کے نوادرات حفاظت کے لیے ہوتے ہیں' استعمال کے لیے نہیں۔ اگر میوزیم کا ڈائریکٹر یا کیوریٹر وہاں سے تاریخی نمونے لے جا کے اپنے ڈرائنگ روم میں آرائش کے لیے سجاوے تو وہ مجرم کہلائے گا۔

مولوی خادم حسین نے مریم سے کہا "تم بھی دکھاؤ نا اپنا خزانہ...."

وہ کچھ خفیف ہوئی "کیا ہے اس خزانے میں؟"

میں نے کہا "تمہارے جذبات ہوں گے۔ تمہارے ماضی کے رشتے ہوں گے۔"

"صرف دکھ ہیں میرے ماضی میں۔ سارے رشتے دکھوں کے

رشتے ہیں۔ انہیں دیکھ کے کیا کریں گے آپ؟" وہ بولی۔

لیکن پھر ہمارے اصرار پر ایک بیگ لے آئی۔ اس کے ماں باپ کرسچن تھے۔ باپ سیالکوٹ کی سڑکوں پر جھاڑو دیتا تھا اور کمیٹی میں اس کا نام خاکروب کی حیثیت سے لکھا ہوا تھا۔ ماں بھی یہی کام کرتی تھی۔ بعد کے حالات کا ہمیں علم تھا۔ اس کے پاس ماں کی ایک صلیب تھی جو خاندانی تھی۔ اسے اپنی ماں سے ملی تھی۔ سب سے عجیب چیز چند تنکے تھے جو مریم نے شفاف پلاسٹک کی ایک تھیلی میں محفوظ کر رکھے تھے۔ یہ اس جھاڑو کے تنکے تھے جو اس کے باپ کو کارپوریشن نے دی تھی۔ جس سے وہ شہر کی سڑکیں صاف رکھتا تھا اور خود اتنا گندا رہتا تھا کہ لوگ اس کے وجود سے گھن کھاتے تھے۔ وہ شودروں کی طرح تھے۔ انہیں کسی گھر سے چائے ملتی تھی تو وہ ٹوٹا ہوا مگ الگ پڑا رہتا تھا۔ ان کو پیاس لگتی تھی تو نیک دل لوگ لوٹے کی دھار ان کے ہاتھوں کی اوک میں ڈالتے تھے اور وہ پانی پی لیتے تھے تو لوٹے کو بھی دھو کے پاک کیا جاتا تھا۔

"آج آپ لوگوں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے میں سوچتی ہوں کہ خدا نے مجھے کتنی عزت دی۔ اتنے بڑے اور مشہور لوگ ہیں آپ سب۔ آپ سب کے خاندان اور گھرانے بڑے ہیں۔ نام بڑے ہیں۔ سب دولت مند ہیں، آپ نے مجھے اپنا لیا۔ اپنے جیسا سمجھ لیا..." وہ رونے لگی۔

میں نے کہا "بے وقوف لڑکی۔ جب رونے کا وقت تھا تو بہادری سے مقابلہ کیا حالات کا، اب یہ آنسو کیسے؟"

"یہ دکھ کے نہیں، خوشی کے آنسو ہیں۔"

میں اور رابعہ کراچی کے لئے روانہ ہوئے تو غالب نے ہمارے ساتھ جانے کا ارادہ ملتوی کردیا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ لاہور میں ہی رہے گا اور ہفتہ دس دن آرام سے آفس میں ہی چھپا رہے گا۔ ہم نے اس کی بات مان لی۔

ناشتے کے بعد میں نے اور رابعہ نے اپنا حُلیہ بدلا۔ ہم نے اپنے کپڑے اور سامانِ سفر کو سوٹ کیس سے ٹین کے اس پرانے صندوق میں منتقل کیا جو مولوی خادم حسین نے خالی کردیا تھا۔ مریم نے ہمیں راستے میں کھانے کے لیے قیمہ بھون کے پراٹھوں کے ساتھ باندھ دیا تھا۔ پھر خادم حسین ٹیکسی لینے چلا گیا اور ہم چند قدم چل کے گلی کے موڑ تک گئے۔ خادم حسین ہمیں ریلوے اسٹیشن تک چھوڑنے کا آرزو مند تھا مگر ہم نے اسے روک دیا۔ اس حلئے میں ہماری شناخت کا امکان کم تھا لیکن ہمارے ساتھ کوئی دوست نظر آجاتا تو سب چوکنے ہوجاتے۔

تھرڈ کلاس کے مسافر خانے میں گھمسان کی جنگ لڑکے میں نے کراچی کا ٹکٹ حاصل کیا اور پھر ایک قلی کو دس دس روپے دے کر اوپر والی دو برتھوں کی غیر قانونی ریزرویشن بھی حاصل کرلی۔ وہ ہمیں واشنگ لائن تک لے گیا اور وہاں ایک ڈبے میں سوار کرادیا۔ ہم اوپر جا کے لیٹ گئے۔ قبضہ رکھنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ ٹرین کے روانہ ہونے تک ہم جگہ نہ چھوڑیں۔

ٹرین کے روانہ ہونے میں ابھی پورا ایک گھنٹا تھا۔ ریلوے پولیس قلیوں کے ساتھ مل کے ہر ڈبے میں ہم جیسے مسافروں کو جگہ دلانے میں بڑی مستعد تھی۔ یہ سب خاص بندے تھے چنانچہ وہاں کسی نے بھی ہماری صورت پر غور نہیں کیا تھا تاہم دو پولیس والوں کی گفتگو سے میں نے اندازہ کرلیا کہ ریلوے اسٹیشن پر چیکنگ ہورہی ہے اور سی آئی ڈی والے دو بندے تلاش کررہے ہیں۔

جب ڈبے ٹرین میں جوڑے گئے اور ٹرین روانگی کے لیے پلیٹ فارم پر کھڑی ہوئی تو مجھے اندازہ ہوا کہ ہمیں تلاش کرنے والے کتنے مستعد ہیں۔ وہ ہر برتھ کے ہر مسافر کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ یہ سادہ کپڑوں والے ہر قلی سے بھی پوچھ گچھ کررہے تھے اور ہمارا حُلیہ بیان کرکے یہ معلوم کرتے تھے کہ ان میں سے کسی نے ہمیں دیکھا ہو تو بتادے۔ ظاہر ہے وہ انکار کردیتے تھے۔ قلی جیسا معمولی حیثیت کا آدمی پولیس سے تعاون کی غلطی کرے تو اسے گواہی پیشی اور عدالتی کارروائی اور تھانے میں تفتیش کے سارے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے وقت یا جاں کے زیاں سے سب ڈرتے ہیں۔

حلئے اور لباس سے میں ایک عام غریب آدمی نظر آتا تھا۔ صرف رابعہ کا حُسن، آب و تاب سے دمکتا چہرہ کسی کو متوجہ اور دوبارہ نظر بھر کے دیکھنے پر مجبور کرسکتا تھا اور یہ بات میں نے اسے سمجھادی تھی۔ اس نے ٹرین میں بیٹھنے کے بعد نقاب اُٹھایا تھا تو چہرہ دوسری طرف کرکے بیٹھی تھی۔

اوپر والی برتھ نسبتاً کم اُجالے میں تھی۔ میں اسی سمت میں سر کیے لیٹا ہوا تھا جہاں سے میں آنے جانے والوں کو دیکھ سکتا تھا۔ اخبار کا مطالعہ بھی ایک غلطی ثابت ہوسکتا تھا چنانچہ میں نے ریلوے بک اسٹال سے ہیر وارث شاہ کا سستا سا ایڈیشن خرید لیا تھا اور اسے اپنی بے سُری آواز میں لہک لہک کر گاتے ہوئے رابعہ کو سنا رہا تھا۔ بالآخر برتھ کی مشترک دیوار کے دوسری طرف سے کسی نے مجھے ڈانٹ کے کہا "اوئے کیا ابھی سے ریڈیو اسٹیشن چلا دیا ہے۔ اتنی اونچی آواز میں" اور دوسرے نے اس کی حمایت میں بیان دیا کہ ایسے تو سامعین منزل پر پہنچنے سے قبل ہی بہرے یا پاگل ہوجائیں گے تو میں نے آواز بہت کم کردی۔ پھر مجھے دو پولیس والے نظر آئے جو ہر سیٹ کے مسافروں کو بیزاری سے ڈیوٹی پوری کرنے کے لیے دیکھتے جارہے تھے۔ میں نے ان کے قریب آنے پر آواز بڑھادی اور رابعہ کو مخاطب کرکے کہا "سُن بھلی لوکے۔ وارث شاہ کی آکھدا ہے۔" ایک پولیس مین نے گزرتے ہوئے کہا "اوئے میراثی دے پتر۔ ہوراں دا وی خیال کر۔" تو میں نے گانا ہی بند کردیا۔ قانون کے احترام کے اس مظاہرے کا فائدہ یہ ہوا کہ وہ مجھ پر دوسری نگاہ ڈالے بغیر گزر گئے۔ ان میں سے کسی نے میرے چہرے پر غور ہی نہیں کیا تھا۔ میرے سامنے کتاب تھی اور انہوں نے صرف میرا سائیڈ پوز دیکھا تھا۔

ٹرین روانہ ہونے ہی والی تھی کہ سادہ کپڑوں میں دو خطرناک چہروں والے ڈبے میں داخل ہوئے۔ وہ خفیہ پولیس والے تھے مگر ان کی کوئی ادا خفیہ نہ تھی۔ ان کا چہرہ، ان کے تیور، انداز و اطوار سب ان کے پولیس مین ہونے کی گواہی دیتے تھے۔ میں نے پھر ہیر وارث شاہ شروع کی اور جب وہ قریب آگئے تو رابعہ نے میری ہدایات کے مطابق جھگڑنا شروع کردیا کہ دماغ خراب کردیا ہے۔ جب گانا نہیں آتا تو چُپ کرکے بیٹھو۔"

میں نے کہا "تجھے تو میرے مقابلے میں کوّے کی آواز اچھی لگتی ہے۔"

"ہوتی ہے اچھی" اس نے کہا۔

میں نے گرم ہوکے کہا "اور جو مجھ سے فرمائش کرکے سُنتے ہیں۔ گاؤں کے مولوی صاحب اور ملک صاحب، کیا وہ پاگل ہیں؟"

"وہ تمہیں پاگل بناتے ہیں۔ تم سمجھنے لگے ہو خود کو عنایت حسین بھٹی۔ کام کرتے ہو بھٹے پر۔ اس کا بھی بھٹا بٹھادیا ہے۔"

لوگ ہنسنے لگے۔ خفیہ پولیس والے گزر گئے تھے لیکن ٹرین چل پڑی تو وہ اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ "چھاؤنی پر اتر جائیں گے" ان میں سے ایک نے کہا "ادھر تو کوئی بھی نہیں ہے۔"

"ہم ایسے ہی کھجل خوار ... ہو رہے ہیں۔ وہ کیا ابھی تک ادھر بیٹھے ہوں گے" دوسرے نے بے زاری سے کہا "لا سگریٹ دے۔"

"افسروں کو سمجھا یہ بات۔ ان کا آرڈر ہے کہ ہر ٹرین میں دیکھو۔ سوچنے کی بات ہے کہ مجرم کیا ٹرین سے سفر کرتے ہیں اور پھر ایسے مجرم۔"

"ہاں۔ وہ شوں کرکے جہاز سے اُڑ گئے ہوں گے اور اس وقت بیٹھے ہوں گے ولایت میں۔"

ایک دلیر مسافر نے دخل در معقولات کرتے ہوئے تجسس کا اظہار کیا اور مذکورہ ملزمان کے بارے میں پوچھا۔ لاہور کینٹ تک ٹرین دس منٹ میں پہنچی۔ اتنی دیر میں پولیس مین نے زیبِ داستان کے لیے کچھ بڑھا کے ہی سنادیا، اس نے کہا کہ ایک عورت ہے جو بہت بڑی وکیل اور بہت سوہنی ہے اور اس کا یار ہے بہت بڑا ڈاکو۔ کہتے ہیں اس کی ضمانت کا مقدمہ لڑتے لڑتے آنکھ لڑگئی اور اس نے اپنے یار کو جیل سے فرار کرادیا۔ ہوگی جیلر سے بھی یاری....

مجھے پولیس کی کم علمی پر افسوس نہ ہوتا۔ ان کی غلط بیانی اور غیر ذمے دارانہ رویے پر افسوس ہوا۔ وہ کہہ سکتے تھے کہ ہمیں تفصیلات کا علم نہیں۔ ہم صرف اس حلئے کے ایک مرد اور ایک عورت کو تلاش کررہے ہیں لیکن انہوں نے عام لوگوں کو ایک سنسنی خیز کہانی صرف یہ ظاہر کرنے کے لیے سنادی کہ وہ کتنے باخبر ہیں۔ بعد میں اس خبر پر جو تبصرے ہوئے وہ بھی مبنی بر جہالت تھے۔ دو عمر رسیدہ افراد نے اپنا زمانہ یاد کیا اور اس واقعے کو قربِ قیامت کی نشانی قرار دیا اور نوجوان ان کا تمسخر اُڑانے لگے۔

"بابا جی۔ آپ کے زمانے میں کوئی محبت نہیں کرتا تھا؟"

بابے نے کہا "یہ کوئی محبت ہے۔ کدھر ایک وکیل کدھر ڈاکو۔"

دوسرے لڑکے نے کہا "عشق نہ پچھے ذاتاں۔ بابا جی آپ جوان تھے تو صورت دیکھ کے مرتے تھے یا پہلے ڈگری دیکھتے تھے اور خاندان کا پیشہ..."

پہلے لڑکے نے کہا "اس زمانے میں کوئی لڑکی گھر سے نہیں بھاگتی تھی؟"

"توبہ کرو...." بابے نے کہا۔

"تو پھر یہ قصّے کیسے بن گئے.... ہیر رانجھا سسی پنوں اور سوہنی مہینوال کے۔ تھیٹر میں جو ڈرامے ہوتے تھے ان میں کیا درس دیتے تھے؟ ہیرو ہیروئن نہیں ہوتے تھے۔ داڑھی والے مذہبی مسئلے بیان کرتے تھے۔"

لڑکے قہقہہ مار کے ہنسے اور بابے گرم ہوگئے "یہ اپنے باپ سے پوچھنا۔ بے غیرت..."

"میرا باپ تو نہیں بتاتا، اسی طرح گرمی کھاتا ہے۔"

"میرے باپ نے تو خود ہی کیا تھا۔ میری ماں کو لے کر دوڑ گیا تھا گاؤں سے۔ بعد میں دھکے کھائے تھے اور واپس آکے جوتے بھی۔ لیکن پھر سب ٹھیک ہوگیا تھا۔ کوئی قیامت نہیں آئی تھی۔"

دوسرے بابے نے براہِ راست حملہ کیا "پتر آج تیری بہن کو لے جائے کوئی پھر میں پوچھوں گا۔"

وہ پھر ہنس پڑا "میری بہن ہی نہیں تو لے جانے کا سوال....."

اب دوسرے لوگ بھی ہنسنے لگے۔ اوپر میں اور رابعہ بھی مسکراتے ہوئے سب سُن رہے تھے۔ موضوعِ سخن ہم سے آغاز ہوا تھا مگر موضوع اتنا ہی پُرانا تھا جتنی انسانیت کی تاریخ۔ اس تاریخ کی ابتدا محبت تھی۔ پہلی کہانی کا حرفِ اوّل محبت تھا۔ آج بھی نہ محبت کا انداز بدلا تھا نہ محبت کرنے والوں کے جذبات بدلے تھے۔ میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد۔ سنگ اُٹھایا تھا کہ سر یاد آیا۔ غالب کو ڈر تھا کہ کل کہیں وہ عشق میں مجنوں نہ ہوجائیں۔ پھر آج پتھر اٹھانے والے کیوں بھول جاتے ہیں کہ وہ بھی تو گنہگار ہیں۔

چھاؤنی کے اسٹیشن پر ٹرین کا اسٹاپ پانچ منٹ کا تھا۔ پولیس والے اُتر گئے۔ نئی اور پرانی نسل کے درمیان جنریشن گیپ کا مسئلہ بھی کچھ کم ہوگیا اور جب نوجوانوں نے بزرگوں کی خدمت گزاری میں مستعدی کا مظاہرہ کیا تو قربِ قیامت کی نشانیاں بھی نہ رہیں۔ میں نے رابعہ سے کہا کہ اب چاند کو بدلی سے نکل آنا چاہیے۔ میں نے عینک اُتاری اور اس نے برقع اتار کے رکھ دیا۔

"کیسا اُجالا ہوگیا ہے اچانک" میں نے آنکھیں مل کے کہا۔

"عینک کے شیشے سیاہ تو نہیں تھے" رابعہ مسکرائی۔

میں نے کہا "اس سے تو بقول شاعر۔۔۔ دنیا کا ہر اک نقشہ اُلٹا نظر آتا ہے۔ مجنوں نظر آتی ہے لیلیٰ نظر آتا ہے۔ روشنی تمہارے

آفتابِ حسن کے طلوع ہونے سے پہلے ہے۔"

"کبھی آفتابِ حسن کہتے ہو کبھی چاند" رابعہ ہنسی "طے کرلو ایک بار اور پھر بتاؤ۔"

"دراصل مجھے دونوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ سورج اور چاند دونوں میں سے کسی کے جذبات کو ٹھیس نہ لگے" میں نے کہا۔

"ڈاکو ہو کے ایسی گفتگو کرتے ہو" رابعہ بولی۔

"اُلّو کا پٹھا۔ کیسی روانی سے ایک اسٹوری سنا گیا۔ وہ خاک ڈاکو ہوا جس کو ایک وکیل اور وہ بھی عورت جیل پر ڈاکا ڈال کے نکال لے گئی۔"

"فلمی کہانی میں ایسا ہی ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "کل ہم گھر سے نہیں نکلے بہت اچھا کیا۔ آج تو تیسرا دن ہے بات کچھ سے کچھ ہوگئی ہے۔ ہر شخص جو ہمیں تلاش کرتا پھر رہا ہے کسی کو کچھ بتاتا ہوگا کسی کو کچھ۔ اور آگے پھر بتانے والے کی مرضی۔ رنگی کو نارنگی کہیں اور پھٹے دودھ کو کھویا۔ عاشق کو ڈاکو کہیں دیکھ کبیر خاں رویا۔"

"حلیہ سب کے ذہن میں بالکل ٹھیک ہے۔ پولیس پر جھوٹا الزام آیا ہے تو اب اپنی عزت بچانے کے لیے بھاگے پھر رہے ہیں۔"

میں نے کہا "دلاور سمجھ جائے گا کہ ہم نے سب کی آنکھوں میں دھول جھونک دی اور خود نکل گئے۔ وہ بہت تلملائے گا کہ اس نے جو وار کیا تھا اُلٹا خود اس کا نشانہ بن گیا۔ BOOMRANG کی طرح وہ اپنی سازش کے ہتھیار سے خود شکار ہوگیا۔ نبی داد کا سیاسی مستقبل تباہ ہوگیا تو وہ دلاور کو تباہ کردے گا۔"

"دلاور اس کا بھی بدلہ لے گا۔ پولیس تھک ہار کے بیٹھ جائے گی مگر دلاور ہار ماننے والوں میں نہیں ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ وہ کراچی میں ہمارے پیچھے لگا رہے۔ اسے معلوم ہے کہ لاہور کے بعد ہمارا کوئی ٹھکانا ہے تو کراچی۔"

میں نے سوچتے ہوئے کہا "تمہاری بات میں تھوڑی بہت گہرائی ضرور ہے۔ اتفاق سے تم عقلمندی کی بات بھی کرجاتی ہو۔ اس پر میں کھلے دل سے غور کروں گا۔"

"ہم کراچی میں بھی غیر محفوظ ہوں گے کیا یہ غلط ہے؟"

"ہم ماؤنٹ ایورسٹ پر بھی غیر محفوظ ہوں گے۔ پیر پھسل جانے کا ڈر ہوگا اور یہ خطرہ بھی کہ کہیں ہم سے پہلے دلاور وہاں نہ پہنچ جائے ہمارے قاتلانہ استقبال کے لیے۔ اس لیے ڈرنا چھوڑ دو وکیل صاحبہ۔"

"میں اب وکیل نہیں رہی' وکالت چھوڑ دی میں نے۔"

"پھر اب کیا کروگی؟" میں نے افسوس سے سر ہلایا "بے روزگار رہوگی۔"

"صرف محبت۔ یہ وکالت اور محبت ایک ساتھ چلانا میرے لیے ناممکن ہوگیا ہے۔"

میں نے کہا "اچھا فیصلہ ہے۔ بعد میں گھر بھی چلانا پڑا تو ناممکن مزید ناممکن ہوجائے گا۔"

"وکالت فل ٹائم جاب ہے۔ پوری توجہ مانگتی ہے۔"

"محبت بھی فل ٹائم جاب ہے۔" میں نے کہا۔

"پوری توجہ نہ دینے سے پریکٹس نہیں چلتی' گُڈ ول ختم ہوجاتی ہے۔ یہ تو وقار یوسف کی شرافت اور وفاداری ہے کہ وہ کمپنی چلا رہا ہے اور اسی طرح کام کررہا ہے۔ مجھے اب کون کلائنٹ پہچانتا ہے۔ مدت سے نہ میں نے کوئی کیس لیا' نہ مقدمہ لڑا' نہ کسی عدالت میں پیش ہوئی کسی کی طرف سے۔ گڈ ول اب وقار یوسف کی بن رہی ہے۔ مؤکل اسے جانتے ہیں۔ وہ چاہے تو آج الگ ہوجائے اور اپنی دکان چلائے۔ میرا کام تمام۔ منظر سینئر ہے اس لیے تھوڑی سی راہنمائی کردیتا ہے مگر اب وقار یوسف کا تجربہ اتنا ہے کہ اسے کسی کی راہنمائی کی ضرورت نہیں۔"

"مخلص آدمی..... دوستی نبھا رہا ہے۔"

"کب تک نبھائے گا دوستی۔ ہر وکیل اپنی ساکھ بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ کامیابی ساکھ سے ملتی ہے اور پیسہ بھی ساکھ سے آتا ہے۔ بڑے مؤکل متوجہ ہوتے ہیں تو بڑی فیس ملتی ہے اور بڑے مقدمات سے بڑی پبلسٹی ملتی ہے۔ اسے فی الحال کچھ بھی نہیں مل رہا ہے۔ جب اس نے وکالت شروع کی تھی تو اس کے پیشِ نظر ہرگز یہ مقصد نہیں ہوگا کہ ساری عمر کسی فرم میں اسسٹنٹ کے طور پر کام کرتا رہے اور خود اس کا نام نہ ہو۔ پیسے کی اسے ضرورت نہیں۔ اس کی بیوی کے پاس بہت پیسہ ہے مگر کیا کوئی مرد بیوی کے پیسے کو اپنا سمجھتا ہے؟ اور یہ نہیں چاہتا کہ وہ خود بیوی سے زیادہ دولت مند ہو؟"

"میں تمہاری رائے سے سوفیصد متفق ہوں مگر میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ تم میری خاطر اپنی برسوں کی ساکھ کو قربان کرو۔ آخر تمہاری بھی ایک شناخت ہے۔ تم کو صرف مسز سکندر بخت بنا کے مجھے شرمندگی ہوگی۔ اپنی خود غرضی پر۔ تم کوئی عام عورت نہیں ہو۔"

"عورت صرف عورت ہوتی ہے۔ عام یا خاص نہیں۔ بہت کرلی پریکٹس اور بہت نام اور پیسہ کمالیا۔ اب میں صرف مسز سکندر بخت بن کے گھر میں رہنا چاہتی ہوں۔ صرف محبت کرنا چاہتی ہوں' تم سے' اپنے گھر سے۔"

"اور اپنے بچّوں سے....." میں نے اس کے دل کی وہ بات کہہ دی جو اس کے لبوں تک نہیں آئی تھی۔

"میرے لیے سکون راحت اور خوشی اسی میں ہے۔"

"لیکن اس معزز پیشے سے مکمل دستبرداری بھی ضروری نہیں۔ گھر شوہر اور بچّوں سے محبت کی راہ میں وکالت کہاں سے حائل ہوتی ہے۔ گھر میں نوکر چاکر سب ہوں گے....."

"ابھی تم نے کہا تھا کہ محبت فل ٹائم جاب ہے۔ کہا تھا نا۔ محبت کے لیے اس عورت کے پاس کہاں وقت ہوگا جو صبح ہوتے ہی

کورٹ چلی جائے وہاں دماغ سوزی کرکے مشکل سے اپنے چیمبر میں پہنچ کے لنچ کرے اور پھر اگلے دن کے کیس دیکھے۔ مؤکلوں سے معاملات طے کرے۔ اپیلیں تیار کرے پی ایل ڈی اور دنیا بھر کی اعلیٰ عدالتوں کے فیصلے کھنگالے اور پھر رات کو تھکی ہاری گھر پہنچے۔ کتنا وقت ہوگا اس کے پاس بچّوں کے لیے اور شوہر کے لیے۔ کتنی دیر ان سے باتیں کرسکتی ہے وہ؟ اسے تو پھر صبح کی فکر لاحق ہوگی۔ اس کے لیے سیر و تفریح' ہنسی مذاق سب ناممکن ہوگا۔ اسے خاک علم ہوگا کہ بچے کیا پڑھ رہے ہیں اور ان کی تعلیمی حالت کیسی ہے۔ ان کی تربیت کون کرے گا جب ماں سارا دن گھر سے باہر گزارے گی۔ اور پھر شوہر صاحب' ابھی معاملہ مختلف ہے۔ بعد میں انہی کا منہ سُوجا ہوا نظر آئے گا کہ ہمیں تو کوئی پوچھنے والا نہیں۔"

میں اسے حیرانی سے دیکھتا رہا۔ "تم عجیب چیز ہو۔ بہت دور کا سوچا ہے تم نے۔ اور میں مانتا ہوں کہ بالکل ٹھیک سوچا ہے۔ تمہاری کسی بات سے اختلاف کیا ہی نہیں جاسکتا۔ میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں بہت خوش قسمت ہوں۔ شاید دنیا کا سب سے خوش قسمت آدمی کہ دنیا میں رابعہ ایک ہی تھی اور وہ مجھے مل گئی۔"

"یہ تم پہلے بھی کہہ چکے ہو۔"

"سچ میں جب بھی بولوں گا ایک ہی ہوگا۔ اس میں غلط کیا ہے۔ تم جتنی دیکھنے میں خوب صورت ہو اس سے کہیں زیادہ تمہاری خوب صورتی ایک احساس ہے۔ ایک طاقت ہے جس نے مجھے تسخیر کرلیا ہے۔"

"باتیں...باتیں....باتیں....کب سے سُن رہی ہوں میں تمہاری باتیں اور سُنتی جارہی ہوں۔"

میں نے کہا "کیا تمہیں اعتبار نہیں رہا باتوں پر؟"

"اعتبار نہ ہوتا تو میں تمہیں چھوڑ دیتی' وکالت نہ چھوڑتی...؟"

"تمہارا مطلب ہے.... میرا عمل کچھ نہیں۔ تم تنگ آگئی ہو انتظار سے؟"

"نہیں۔ یہ بات بھی نہیں۔ بڑا حوصلہ ہے مجھ میں صبر کا اور انتظار کا۔ لیکن بیک وقت تمہارے ساتھ اور تم سے دور رہنا اب ناممکن ہوگیا تھا۔ میں اب تمہیں نہیں چھوڑوں گی۔ جہاں تم جاؤ گے تمہارے ساتھ جاؤں گی۔ ہر وقت' ہر جگہ۔"

"اگر میں جیل گیا؟"

"تو میں بھی جیل پہنچ جاؤں گی۔"

میں نے ہنس کے کہا "جیل میں تم میرے ساتھ نہیں رہوگی۔ مردانہ زنانہ جیلیں الگ ہوتی ہیں۔"

رابعہ نے خفت سے کہا "میرا مطلب تھا۔ تم سے ملنے' اب یہ مت کہنا کہ میں تختہ' دار پر پہنچ گیا پھر۔ یہ ناممکن ہے میرے جیتے جی۔ اس سے پہلے ہی میں مرجاؤں گی۔ مار ڈالوں گی تمہارے ایک دشمن کو۔"

میں نے کہا "آج تم خطرناک حد تک جذباتی ہورہی ہو۔"

"میں نے اپنی کشتیاں جلا دی ہیں سکندر..."

میں نے گھبرا کے کہا "خدا کے لیے نام تو مت لو میرا۔ مانا کہ ٹرین کے شور میں ہماری باتیں کسی کی سمجھ میں نہیں آرہی ہوں گی لیکن نام تو کوئی بھی سُن سکتا ہے اور یاد رکھ سکتا ہے۔ ویسے بھی اب تم نے وکیل کے بجائے ایک مشرقی گھریلو بیوی کا کردار ادا کرنے کا فیصلہ کیا ہے تو فی الحال 'اجی' اوجی۔ سُنتے ہیں۔ ایسے کام چلاؤ۔ بعد میں منے کے ابا وغیرہ کہہ کے بلاسکتی ہو۔ نام لینا تو سخت بے شرمی کی بات ہے۔ بڑی بوڑھیاں تو کہتی تھیں کہ اس سے نکاح ٹوٹ جاتا ہے۔"

رابعہ نے آنکھیں کھول کے کہا "معاف کرنا۔ مجھے ذرا جھپکی آگئی تھی تم کچھ کہہ رہے تھے؟"

میں نے کہا "بالکل نہیں۔ میں خاموش بیٹھا تھا۔"

کراچی تک کا سفر بڑا سخت مرحلہ تھا۔ گرمی گھٹن اور بُو سے سانس لینا دشوار ہورہا تھا اور مسافر تھے کہ مسلسل یلغار کررہے تھے۔ رات تک فرش کے ایک ایک انچ پر دیہاتی عورتیں اور مرد اور بچّے قابض ہوگئے تھے اور انہوں نے باہر نکلنے یا باتھ روم تک جانے کے راستے بھی بند کردیے تھے۔ کچھ نوجوان دروازے میں اور درمیانی کاریڈور میں بھی کھڑے سگریٹیں پی رہے تھے اور ہم سونے سے پہلے آخری بار باتھ روم ہوکے آئے تو مجھے اپنی برتھ پر ایک شخص قابض نظر آیا۔ شرافت اور مروت کے اصول ایسے سفر میں کام نہیں آتے۔ اس نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا اور سیٹ خالی کرنے سے انکار کردیا۔ "تُو نے ریزرو کرائی ہے برتھ؟"

میں نے اسے وارننگ دی "ریزرو تو نے بھی نہیں کرائی مگر ہم لاہور سے آرہے ہیں۔ رشوت دے کے جگہ لی تھی۔ اب تُو میری بیوی کی جگہ خالی کرتا ہے یا میں تجھے نیچے گراؤں۔"

اس نے حسبِ توقع انکار کیا "ہمت ہے تو....."

اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی میں نے اس کی ٹانگ پکڑ کے ایک جھٹکا دیا اور ہاتھ پیر سنبھال کے دوسری خالی برتھ پر پھینک دیا۔ اس کی مزاحمت رائگاں گئی اور وہ دوسری برتھ پر گرنے کے بعد شاید کچھ دیر غور کرتا رہا کہ یہ سب کیسے ہوگیا۔ اس کا سر بھی تختے سے ٹکرایا تھا اور اسے کافی چوٹ آئی تھی۔

"چلو بھئی جگہ بناؤ۔ بعد میں مت کہنا بندہ گر گیا تھا ہمارے اوپر" میں نے اکڑوں بیٹھے ہوئے اور فرش پر نیم دراز لوگوں سے کہا "چلو ہٹ جاؤ سارے۔"

لیکن میرے مزید کچھ کرنے سے پہلے ہی برتھ پر لیٹا ہوا شخص اُٹھ بیٹھا "او یار۔ بڑا غصہ ہے تیرا۔ میں تو مذاق کررہا تھا۔" اس نے کھسیانی ہنسی کے ساتھ کہا اور نیچے اتر گیا۔

رابعہ نے اوپر قدم رنجہ فرماتے ہی مجھے ڈانٹا "تم باز نہیں

آتے ہر جگہ دنگا فساد کرنے سے؟"

میں نے کہا "نیک بخت۔ ہم ایک سیٹ پر نہیں سوسکتے۔ ہم میں سے کوئی نیچے رات بھر کھڑا نہیں رہ سکتا۔ تل دھرنے کی جگہ نہیں ہے نیچے۔ اس نے مجبور کردیا تھا مجھے اور ویسے بھی اس کلاس میں ایسے ہی ہوتا ہے۔ کوئی مجھے غلط نہیں سمجھ رہا ہے۔ چلو اب سوجاؤ۔"

"اس تختے پر تو مجھے نیند نہیں آئے گی۔"

"اچھا تو پھر شب بخیر" میں نے کہنی سر کے نیچے رکھی اور سوگیا۔

کراچی تک سفر میں خیروعافیت رہی۔ ریلوے کی شاندار روایات کو برقرار رکھتے ہوئے ٹرین ڈھائی گھنٹے کی تاخیر سے کراچی کینٹ ریلوے اسٹیشن پہنچی تو تھکن سے ہمارا حال خراب تھا۔ رات سندھ کے میدانوں اور ریگ زاروں میں گزری تھی اور ہر مسافر کی طرح ہمارے چہرے اور بال گردوغبار سے خاکستری ہوچکے تھے۔ ہمارے ٹین کے زنگ آلود بکس کو اُٹھانے میں کسی قلی نے دلچسپی کا اظہار تک نہیں کیا۔

رابعہ پھر قدیم خیمہ نما برقع میں روپوش ہوگئی تو میں نے بکس کو سر پر اُٹھالیا۔ رابعہ نے بہت بُرا مانا "یہ کیا طریقہ ہے؟"

میں نے کہا "یہی ایک طریقہ ہے اسے اُٹھانے کا۔ اس میں ہینڈل نہیں ہے۔"

"لاہور میں تو تھا۔"

"ہاں مگر وہ کراچی میں داغِ مفارقت دے گیا اور اس وقت میری جیب میں ہے۔ تم فرض کرلو کہ تمہارا سامان ایک قلی نے اٹھا رکھا ہے اور تم ابھی ابھی فرسٹ کلاس اے سی سلیپر سے اتری ہو۔ یہ ٹین کا صندوق نہیں۔ سیمسونائٹ کا امپورٹڈ سوٹ کیس ہے' ایسے تصورات سے تمہارا دل خوش رہے گا۔ میری طرف مت دیکھو۔"

وہ میرے پیچھے چلتی آرہی تھی۔ ہم نے ریلوے لائنوں کے اوپر سے پُل کو عبور کیا اور مسافروں' ان کو وصول کرنے والوں اور قلیوں کے بے لگام ہجوم میں دھکے کھاتے باہر جانے والے گیٹ کی طرف بڑھے۔ نہ جانے کب رابعہ بہت پیچھے رہ گئی اور میرے پیچھے دوسری عورت آگئی۔

میں نے پلٹ کے کہا "بس میرے پیچھے لگی رہو بلا کی طرح۔ چہرے سے نقاب اٹھا کے لائٹ مت مارنا۔"

عورت نے چلا کے کہا "ہائے ہائے گڈو دے ابّا۔ دیکھ اسے مینوں آکھدا پیا اے کہ میرے نال چل۔"

گڈو کا ابا بھی رابعہ کی طرح کہیں پیچھے رہ گیا تھا چنانچہ اس نے اپنی زوجہ کی فریاد نہیں سنی۔ میں نے گھبرا کے کہا "معاف کرنا بہن۔ میری گھروالی میرے ساتھ تھی۔ کہیں پیچھے رہ گئی" اور وہیں رک گیا اور رابعہ ٹائپ برقع والی عورت کو ہجوم کے باعث آگے بڑھنا پڑا۔ پھر میں نے دیکھا کہ وہ ایک مونچھوں والے شخص کو کچھ بتا رہی ہے۔ وہ شخص صرف پلٹ کر دیکھ سکتا تھا۔ ہجوم کے مخالف ریلے کو چیر کر مجھ سے لڑنے نہیں آسکتا تھا۔

رابعہ نے کہا "چلو نا۔ یہاں کیوں کھڑے ہو تماشا بنے۔"

میں نے کہا "تماشا تو ہوتے ہوتے رہ گیا ورنہ تم کو میری سرِعام گوشمالی کا دلچسپ منظر پہلی بار دیکھنے کا موقع ملتا۔"

"کیا ہوا تھا۔ پھر کوئی حرکت کی تھی۔"

"حرکت تو تم بھی کررہی ہو۔ کون ہے جو حرکت میں نہیں ہے مگر میں نے ایک بہت بُری بات کی تھی۔ میں نے ایک شخص کی تم سے بھی زیادہ حسین بیوی کو ورغلانے کے لیے اس سے کہا تھا کہ میرے ساتھ چلو۔ اس نے اتنی اچھی پیش کش کو مسترد کردیا اور شور مچادیا۔ اس کا برقع بالکل ایسا ہی تھا۔"

رابعہ برقع کے اندر کڑکڑائی "پھر اس کا دیدارِ حُسن کیسے کرلیا؟"

"چشمِ تصور سے اور کیسے؟" میں نے ڈانٹ کے کہا "اور تم کس کے ساتھ چل پڑی تھیں ساتھ چھوڑ کے۔ تمہارے ساتھ لا مہندی رنگ کی داڑھی والا کون تھا؟"

باہر نکل کے میں نے سکون کا سانس لیا اور ٹین کے صندوق کو نیچے رکھ دیا۔ ریلوے اسٹیشن پر پولیس بھی بہت تھی اور رش بھی کم نہیں تھا۔ اگر یہاں بھی کوئی ہمیں تلاش کرنے والا موجود تھا تو تھرڈ کلاس مسافروں کے ہجوم کی یلغار میں ہمیں آسانی سے شناخت نہیں کرسکتا تھا تاہم بہت کچھ قسمت کی بات تھی۔ اگر ہم لاہور میں پکڑے جاتے تو۔ اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے۔ والا شعر صادق آتا اور کراچی میں ۔دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا۔ والا۔

"تمہیں معلوم ہے اب میں کیا سوال کرنے والا ہوں؟" میں نے کہا۔

رابعہ بولی "ہاں۔ یہی کہ اب ہم کہاں جائیں۔"

"یہاں سے کہاں جائیں گے۔ آگے سمندر ہے۔ میں سوال یہ کرنے والا تھا کہ کیا مجھے برقع کے اندر آنے کی اجازت ہے؟ یہاں کس....."

"بکو مت..." رابعہ نے خفگی سے کہا۔

"بھئی یہ انگریزی کا KISS نہیں تھا۔ میں کہنا چاہتا تھا کہ یہاں کس کو اعتراض ہوسکتا ہے۔ میاں بیوی ایک سائیکل! موٹر سائیکل پر سفر کریں یا ایک برقع میں.... خیر اب میں تمہاری مرضی کا سوال کرتا ہوں۔ ہم کہاں جائیں؟ یہاں اپنے ڈبل الما آئی اکرام شیخ کا دولت خانہ بھی ہے مگر وہاں مہمان بننے میں خطرہ ہے۔ سراغ لگانے والے شاید پہلے سے جانتے ہوں گے کہ وہ مس نازو کا بھائی ہے۔ خالی ہاتھ ہم کوئی کمرا یا فلیٹ کرائے پر لینے جائیں گے تو مشکوک سمجھے جائیں گے۔ اب رہا سوال ہوٹل کا تو اس طرح میں ہم کسی اچھے ہوٹل میں داخل بھی نہیں ہوسکتے۔ تیسرے درجے کے یہ مسافر خانے تم دیکھ رہی ہو۔ یہاں بھی قیام ممکن نہیں۔"

"اُفوہ۔ باتیں مت کرو۔ جہاں چلنا ہے چلو ورنہ میں بے ہوش ہوکے گر جاؤں گی۔"

میں نے کہا "خوب یاد دلایا۔ بے ہوش تو میں بھی ہونے والا تھا بھوک سے مگر لیڈیز فرسٹ۔"

صدر کے ایک معمولی سے ہوٹل میں ہمیں ایک اچھا کمرا مل گیا۔ میں نے اندازہ کرلیا تھا کہ ہوٹل کا مالک یا منیجر پنجاب کا رہنے والا ہے اور انگریزی' اردو' فرنچ کے بعد پنجابی واحد زبان تھی جو میرے کام آسکتی تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ ہم میاں بیوی دوبئی جارہے ہیں۔

اس نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا "اچھا۔ کام کیا کرتے ہو؟"

میں نے کہا "مستری ہوں' موٹریں ٹھیک کرتا ہوں۔"

"تو ویزا شیزا مل گیا ہے نا؟"

"مل جائے گا۔ ادھر ہے ایک بندہ" میں نے کہا "اپنے گجرات کا ہے۔"

"او میاں۔ ادھر کوئی اپنا نہیں ہوتا۔ خیال کرنا کوئی نوسرباز لوٹ ہی نہ لے۔ کتنے میں بات ہوئی ہے۔"

"بیس ہزار میں۔ جلدی ویزا لینے کے پانچ دس اوپر بھی دینے پڑے تو دیں گے۔"

میں نے ایک ویٹر کو سُنانے کے لیے کہا جو میری باتیں غیر معمولی دلچسپی کے ساتھ سُن رہا تھا "اوئے تو کیا دیکھ رہا ہے۔ سامان اٹھا اور لے چل کمرے میں۔"

اس نے بُرا سا منہ بنایا اور ٹین کا صندوق اٹھا کے طنز سے بولا "چلو جی بیگم صاحب۔ آپ بھی آئیں مسٹر... چار سو بیس۔"

"اوئے یہ کیا بکواس ہے۔ چار سو بیس کس کو کہا ہے" میں گرم ہوگیا۔

وہ دانت نکالنے لگا "آپ کو... کمرے کا نمبر ہے چار سو بیس۔" اور پھر سیڑھیوں پر آگے آگے چل پڑا "بڑا مبارک نمبر ہے۔ ادھر ایک فلم ڈائریکٹر تھا۔ کل پولیس پکڑ کے لے گئی۔ اس سے پہلے...."

میں نے کہا "ایک بندہ تھا۔ اس نے چوتھی منزل سے چھلانگ مار کے خودکشی کرلی۔ ایک اور بندہ تھا اس کی زنانی بھاگ گئی ایک ویٹر کے ساتھ۔ ایک بندے کا قتل ہوگیا تھا۔ وہ کسی کی بیوی کو بھگا لایا تھا۔ سب معلوم ہے مجھے۔"

اس نے شرمندہ ہونے کے بجائے ڈھٹائی سے کہا "کیسے معلوم ہے؟"

میں نے رازداری سے کہا "قتل میں نے ہی کیا تھا۔ مگر اب میں قتل ہونے آیا ہوں۔ میرے ساتھ بھی کسی اور کی بیوی ہے۔"

ظاہر ہے اس کے بعد ویٹر سے میرے تعلقات اتنے کشیدہ ہوگئے کہ اسے ٹپ دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ لمبا تڑنگا اور صورت سے چالاک نظر آتا تھا۔ اس وقت ہم اتنے تھکے ہوئے تھے کہ نہا دھو کے اور کپڑے بدل کے ہم کھانا کھاتے ہی سوگئے تھے اور پھر آنکھ کھلی تو رات ہوچکی تھی۔ میں نے اُٹھ کر لائٹ جلائی اور گھڑی دیکھی تو رابعہ بھی جاگ گئی۔

"کیا ٹائم ہوا ہے؟"

"تمہارے جاگنے اور فتنۂ محشر جگانے کا۔ آٹھ بج کر ساٹھ منٹ۔"

وہ اُٹھ بیٹھی "یعنی نو بجے ہیں۔ چلو اکرام شیخ سے مل آئیں۔ یہ بہت مناسب وقت ہے۔"

"میں بھی یہی کہنے والا تھا" میں نے کہا۔

وہ بولی "کہیں سے منظر کے گھر فون پر بات کرکے خیریت بھی معلوم کرلیں گے۔"

"میں بھی یہی کہنے والا تھا۔"

"اکرام شیخ کے گھر گئے تو پھر یہی باتیں ہوں گی اور مجھے ایسا لگتا ہے کہ اب اسے ہمارے معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ کیوں نہ بس گھومتے رہیں' سمندر کے کنارے..."

"میں بھی یہی کہنے والا تھا۔"

اس نے مجھ پر تکیہ کھینچ مارا "آگے بولو۔ اور کیا کہنے والے تھے تم۔"

میں نے تکیے کو کیچ کرکے سینے سے لگالیا "کہہ تو دوں مگر تم ناراض ہوجاؤ گی اور گالیاں دینے لگو گی۔"

"میں گالیاں بکتی ہوں' خدا کا خوف کرو" وہ ہنسنے لگی۔

"کیوں.... بے شرم.... بدتمیز.... بدمعاش.... یہ کیا میرے سرکاری خطابات ہیں۔ جو تم ایسی ہی باتوں پر دیتی ہو۔"

"کیسی باتوں پر؟"

"جو' اب میں کہنے والا ہوں۔" میں نے اسے آنکھ ماری

"ہائے جانی مار ڈالا۔"

"توبہ ہے سکندر۔ ایک دم لوفر بن جاتے ہو تم۔ ایسی گھٹیا حرکت کرتے ہو۔"

"دیکھا۔ لوفر بھی کہہ دیا نا۔ پھر کہتی ہو میں کب گالیاں دیتی ہوں۔ ایسی کون سی غیراخلاقی بات کی تھی میں نے۔ آنکھ میں ایک مکھی نے پر مار دیا تھا اس لیے جھپک گئی تھی۔ آخری جملہ میں نے مکھی کو مخاطب کرکے کہا تھا اور اس میں بھی سارے الفاظ شریفانہ تھے۔"

کراچی کے راستوں کا ہمیں زیادہ علم نہیں تھا لیکن ڈرائیونگ کا مسئلہ نہیں تھا۔ میں نے ایک ٹیکسی ڈرائیور سے بات کی جو ہوٹل کے باہر کھڑا اپنی پرائیویٹ ٹیکسی کو چمکانے میں مصروف تھا اور کسی ہم جیسے ہی مسافر کا انتظار کررہا تھا۔ ہم اب پہلے کی نسبت بہت بہتر حلیے میں تھے جس کو ہوٹل کے مالک اور منیجر نے بھی حیرت سے

دیکھا۔ رابعہ کا شٹل کاک برقع اُتر گیا تھا اور میں ساتھ نہ ہوتا تو وہ صدمے سے بے ہوش ہو جاتا کہ کوہِ قاف کی پری سیدھی ہوٹل کی چھت پر اُتری اور اب سیڑھیوں سے اُتر کے باہر جارہی ہے ورنہ اتنی حسین لڑکی اس ہوٹل میں کہاں سے آئی۔ میں پینٹ شرٹ میں تھا اور شخصیات کا یہ ظاہری انقلاب یقیناً شکوک پیدا کرسکتا تھا۔ ویٹر کی آنکھوں میں تو شک کے سوا کچھ تھا ہی نہیں۔ شاید وہ سوچ رہا ہوگا کہ آخر یہ چکر کیا ہے۔ سفر میں ہر شریف آدمی کا حُلیہ بگڑ جاتا ہے مگر بدلتا نہیں۔ ہم جو اپنے ٹین کے صندوق اور لباس سے اتنے پینڈو لگتے تھے اچانک شہری کیسے بن گئے اور کیوں بن گئے۔ کیوں کا مسئلہ زیادہ غور طلب تھا۔

ٹیکسی ڈرائیور جب یہ ثابت کرچکا کہ اس کی ٹیکسی سے اچھی کار اس وقت کراچی تو کیا پاکستان میں بھی شاید نہیں ہوگی اور اس سے زیادہ ایماندار ڈرائیور کا ملنا بھی محال ہے تو میں نے فی گھنٹا کرائے کا مسئلہ اُٹھایا اور بقول شاعر۔ ادھر سے تم چلے اور ہم ادھر سے۔ انگریزی محاورے کے مطابق ہم آدھے راستے میں ملے۔ اس نے پچاس روپے گھنٹا طلب کیے تو میں نے دس روپے پر آمادگی ظاہر کی اور گھٹتے بڑھتے تیس روپے پر معاہدہ ہوگیا۔

وہ باتونی لیکن جاہل شخص تھا اور اس نے ہمیں ٹورسٹ اور خود کو گائیڈ فرض کرتے ہوئے کراچی کی تاریخ جغرافیے کے بارے میں غلط معلومات فراہم کرنا جاری رکھا۔ "اب یہ جو بندر روڈ ہے یہاں کیا تھا پہلے؟ بندر ہی بندر۔ ہزاروں لاکھوں' پھر انگریزوں نے ان سب کو مار مار کے ایک جگہ کردیا۔ وہ بندرگاہ ہوگئی۔ ان بندروں کو بحری جہاز میں بھر بھر کے افریقہ لے جاتے تھے۔ وہاں آدم خور قبیلے بندر بھی کھالیتے ہیں۔"

میں نے کہا "جیسے بریانی نہ ملے تو آدمی چاول کا خشکہ کھالیتا ہے۔"

"بالکل۔ پھر وہاں سے جہاز آنے لگے تو پورٹ بن گئی۔ اور یہ کلفٹن..... یہ شہزادی گلبدن کی سیرگاہ تھی۔ جیسے انگریزوں نے سکندر کو الیگزینڈر کردیا ایسے ہی گلبدن کو کلفٹن بنادیا۔ سُنا ہے شیکسپیئر بھی شیخ پیر تھا اور..."

"... تم جانتے ہو شیکسپیئر کو؟"

"کیوں نہیں جی۔ آٹھ جماعت پاس ہوں۔ وہ امریکی صدر تھا۔ اسی نے ایسٹ انڈیا کمپنی بنائی تھی۔ سن ستاون میں اپنے سرسید خاں کے ہاتھوں جہنم رسید ہوا۔"

اس سے زیادہ کی مجھ میں تاب نہیں تھی۔ میں نے کہا "خدا کے لیے اس علم کے دریا کی روانی روکو ورنہ ہم اس میں شرم سے ڈوب کے مرجائیں گے۔"

اس کی سمجھ میں میری بات نہیں آئی لیکن وہ خاموش ہوگیا۔ اس نے یہی سمجھا ہوگا کہ ہم جیسے جاہل ایسی عالمانہ باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ ساحلِ سمندر پر ٹیکسی روک کے وہ اُترا نہیں اور ٹیکسی ہی میں رہا ورنہ وہ ہمارے ساتھ چلتا اور ہمیں یہ بتاتا کہ پہلے کراچی میں کوئی سمندر نہیں تھا مگر انگریز آئے اور انہیں بندرگاہ کی ضرورت پڑی۔ بندر ایکسپورٹ کرنے کے لیے۔ تو انہوں نے بحراوقیانوس کا رُخ موڑ دیا اور پانی ادھر لے آئے۔

اولڈ کلفٹن کے ساحل پر تفریح کرنے والے وہی تھے جو اپنی اپنی گاڑی میں فیملی کے ساتھ آئے تھے۔ مجمع عام نہ ہونے کے باعث یہاں ایک دوسرے کی پرائیوسی کے احترام باہمی کی فضا تھی۔ ہم بھی ٹہلتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ یہاں کی اجنبی فضا میں بے خوفی نے تھوڑا سا اعتماد پیدا کردیا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے ہم تفکرات اور اندیشوں کی دنیا سے کسی اور دنیا میں پہنچ گئے ہیں۔

آزادی سے گھومتے پھرتے اور فرصت کے ساتھ خلوت میسر آنے سے رابعہ کا موڈ بھی بہت اچھا ہوگیا تھا۔ وہ کھل کے باتیں کررہی تھی اور ہنس رہی تھی۔ اس کے لہجے میں شوخی آگئی تھی اور ہم وہ سب باتیں کررہے تھے جو مدت سے بھولے ہوئے تھے۔

واپسی پر ہم نے کلفٹن کے ایک کشادہ چوک کے گرد بنے ہوئے جدید شاپنگ سینٹر کو دیکھا لیکن سرِدست ہمیں کچھ خریدنے کی ضرورت نہیں تھی۔ پھر بھی رابعہ نے میرے لیے ایک شرٹ لی تو میں نے اس کے لیے ایک پسندیدہ پرفیوم خریدلی۔ پھر ہم نے ایک چائنیز ریسٹورنٹ میں صرف سی فوڈ نوش فرمایا۔ رابعہ نے کریب سوپ پر خاصا منہ بنایا لیکن میرے اصرار پر لے لیا۔ فرائیڈ پران اور فش سوپ اور آئس کریم سب خوب تھے۔ بل بھی خوب تھا۔

ہم نصف شب کے قریب لوٹے تو ٹیکسی ڈرائیور سو کا نوٹ لے کر بھی ٹپ کا انتظار کرتا رہا۔ میں نے حساب لگا کے کہا "تیس روپے فی گھنٹا کے حساب سے دو گھنٹے چالیس منٹ کے ہوئے پورے اسّی روپے۔ بیس روپے واپس کرو۔"

اس نے بڑی آزردگی سے بیس روپے میرے حوالے کیے اور بولا "اچھی طرح گن لو۔"

میں نے بیس روپے اس کے ہاتھ پر رکھ دیے "اب تم خود گن لینا۔ یہ ہے تمہاری ٹپ۔ آگئی بات سمجھ میں۔"

اس وقت اچانک مجھے یوں لگا جیسے کہیں کوئی گڑبڑ ہے۔ بظاہر سب ٹھیک تھا۔ وہ بارونق جگہ تھی۔ ہوٹل کے گیٹ پر بندوق والا باوردی چوکیدار پوری طرح مستعد تھا۔ سب کمروں کے باہر گیلری میں لائٹس سے عمارت میں چراغاں محسوس ہوتا تھا۔ پورچ اور لاؤنج میں رنگین روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ میں نے رابعہ کے ساتھ اندر جاتے ہوئے سوچا کہ آخر میں نے کون سی غیر معمولی بات دیکھی تھی۔

جواب یوں میرے ذہن میں آیا جیسے تاریک سینما ہال کے پردے پر کوئی تصویر روشن ہوتی ہے۔ اس تصویر میں کوئی گڑبڑ تھی۔ میں نے اوپر سے کسی کو باہر جھانکتے دیکھا تھا۔ پھر کھڑکی بند ہوگئی

تھی اور میں جھانکنے والے کا چہرہ نہیں دیکھ سکا تھا لیکن یہ کمرا نمبر چار سو بیس کی کھڑکی تھی۔ چوتھے فلور کا کمرا نمبر بیس۔ میں نے اس کھڑکی سے باہر دیکھا تھا تو مجھے اس کے عین مقابل اسٹریٹ لائٹ کا مرکری بلب نظر آیا تھا اور کھڑکی کے ایک پٹ کا سب سے نیچے والا شیشہ بھی غائب تھا۔ ایک قطار میں پانچ کھڑکیاں پانچ کمروں کی تھیں اور ابھی ابھی میں نے جو کھڑکی بند ہوتے دیکھی تھی اس کا ایک شیشہ نہیں تھا۔ باقی سب کے شیشے پورے تھے۔

میں نے اندر داخل ہونے کے بعد بھی رابعہ سے کچھ نہیں کہا لیکن سیڑھیاں چڑھتے ہوئی اسے خبردار کردیا "رابعہ۔ دال میں کچھ کالا ہے۔"

وہ میرے لہجے سے ڈر گئی "کیا..... یہاں بھی...؟"

میں نے اسے تسلی دی "ابھی صرف میرا شک ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے کمرے میں کوئی ہے جو اوپر سے دیکھ رہا تھا۔ شاید ہماری واپسی کا منتظر تھا۔"

اس نے میرا بازو پکڑلیا "پھر کیا ضرورت ہے اوپر جانے کی؟"

میں نے کہا "کیا یہیں سے واپس لوٹ جائیں؟"

"منیجر کو بتادو۔ وہ پولیس کو بُلا لے گا۔"

میں نے کہا "پولیس سب سے پہلے ہمیں پکڑے گی۔"

"کیوں پکڑے گی۔ ہر پولیس مین تو ہمیں نہیں جانتا۔ سارے پاکستان کی پولیس ہمیں نہیں پہچانتی۔"

میں نے چڑ کے کہا "رابعہ جب معاملہ پولیس کے پاس جاتا ہے تو تفتیش ہوتی ہے اور تفتیش میں بہت کچھ سامنے آجاتا ہے۔ جو پہلے سامنے نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ منیجر کبھی پولیس کو نہیں بُلائے گا۔ وہ بھی پہلے ہمارے ساتھ جا کے خود دیکھے گا۔"

"تو اسے ساتھ لے لو۔"

"وہ کیا مدد کرے گا میری" میں نے کہا "تم باہر رہنا۔ تم ریوالور لائی تھیں؟"

"ہاں۔ لیکن وہ تو ٹرنک میں ہے۔"

"چلو کوئی بات نہیں" میں نے کہا۔

میں نے اطمینان سے اوپر جا کے دروازے میں چابی لگائی اور ایک دم دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ کسی نے اندھیرے میں کہا "تم مجھے نہیں دیکھ سکتے مگر میں دیکھ سکتا ہوں۔ میرے ہاتھ میں ریوالور ہے۔"

میں نے اپنے ہاتھ اوپر اٹھا دیے "کیا چاہتے ہو آخر تم؟"

اس نے کہا "اپنی زنانی کو بھی اندر بُلالو۔"

میں نے رابعہ سے کہا "اجی آپ بھی آجائیں اندر۔ ہم مقابلہ نہیں کریں گے۔"

مجھے یقین تھا کہ رابعہ نے ساری گفتگو سُنی ہوگی۔ وہ اندر آگئی۔

"دروازہ خاموشی سے بند کردو" اس نے حکم دیا۔

رابعہ نے تعمیل کی۔ دروازہ بند ہوتے ہی کمرا روشن ہوگیا اور میں نے اپنے مقابل اسی ویٹر کو دیکھا جس نے ہمارا ٹین کا صندوق اوپر پہنچایا تھا۔

میں نے کہا "میں نے تم کو آواز سے پہچان لیا تھا۔"

رابعہ نے کمرے میں بکھرے ہوئے سامان کو دیکھا۔ اس نے ہمارے ٹرنک کو الٹ کر خالی کردیا تھا اور اب اس کے ہاتھ میں ہمارا ہی ریوالور تھا۔

میں نے کہا "جس چیز کی تلاش تھی تمہیں وہ مل گئی۔"

اس نے مجھے گھورنا جاری رکھا "کدھر سے مل گئی۔ تم بہت چالاک ہو۔"

میں نے جلدی سے کہا "ہم اتنے بے وقوف بہرحال نہیں ہیں جتنے نظر آتے ہیں۔ یا جتنا تم نے سمجھ لیا تھا۔"

اس نے میری بات ختم ہونے سے پہلے ہی کہا "سیدھی طرح بتاؤ کہ پیسہ کہاں چُھپا کے رکھا ہے؟"

میں نے کہا "کیا ہم پیسے والے لگتے ہیں تم کو؟"

"اوئے جلدی کرو۔ مجھے پتا ہے کہ تم دوبئی جارہے ہو۔ بیس ہزار ایجنٹ کو دینے کی بات کررہے تھے۔ پانچ دس اوپر دینے پر راضی تھے۔"

میں نے سرہلایا "میں نے اسی وقت تمہاری دلچسپی میں بدنیتی دیکھ لی تھی مگر افسوس کہ وہ سب جھوٹ تھا..."

"بکواس کرتے ہو تم۔ جھوٹ اب بول رہے ہو۔"

"دوبئی جا کے ہم کیا کریں گے۔ ہمارے پاس تو ابھی پاسپورٹ تک نہیں ہیں۔ ہم نے ذرا مالک پر رعب ڈالنے کے لیے بات کی تھی..."

"پاسپورٹ تمہاری زنانی کے بیگ میں ہوں گے اور پیسہ بھی.... ادھر لاؤ اپنا بیگ" اس نے رابعہ کو حکم دیا۔

رابعہ نے کہا "نہیں۔ بیگ میں نہیں دوں گی۔"

"میں گولی ماردوں گا اسے۔" اس نے مشتعل ہو کے میری طرف اشارہ کیا۔

میں نے محسوس کیا کہ تاخیر کی وجہ سے اس پر گھبراہٹ طاری ہورہی ہے اور اسے ڈر ہے کہ کوئی آنہ جائے۔ ایسے شخص سے کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ سچ مچ گولی چلادے یا اس سے گولی چل جائے۔

میں نے رابعہ سے کہا "بیگ اسے دے دو ڈیئر۔ یہ تمیں چالیس ہزار کی خاطر کسی آدمی کی جان لے سکتا ہے اور خود بھی پھانسی چڑھ سکتا ہے لیکن ہماری زندگی اس سے بہت زیادہ قیمتی ہے۔"

رابعہ نے بڑی عقلمندی سے کام لیا اور بیگ اس کی طرف پھینک دیا لیکن اس کی طرف کیچ نہیں اُچھالا۔ بیگ اس سے دو تین فٹ کے فاصلے پر گرگیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ آگے جھک کر بیگ اُٹھائے گا مگر اس نے چالاکی سے کام لیا اور مجھے ریوالور سے اشارہ

کیا "راستہ چھوڑدو میرا۔"

راستے میں رابعہ تھی، وہ میرے پیچھے آگئی۔ اس نے بیگ کو فٹ بال کی طرح کک مار کے آگے کھسکایا اور خود میری طرف دیکھتا رہا۔ اس کے ریوالور کا رخ بھی میری طرف رہا اور وہ ایک لمحے کے لیے بھی میری طرف سے غافل نہیں ہوا۔ ٹھوکر مار کے بیگ کو دروازے کی طرف لے گیا۔ میں نے صبر اور سکون سے کام لیا۔ مجھے معلوم تھا کہ آگے بھی اسے بہت سے مرحلے درپیش ہوں گے۔ وہ دروازہ کھولے گا اور باہر جاتے ہوئے دروازہ بند کرے گا تو اسے احساس ہوگا کہ دروازے کو مقفل نہیں کیا جاسکتا۔ باہر کوئی کنڈی نہیں تھی۔ چابی کے بغیر دروازہ اندر سے تو لاک ہوسکتا تھا۔ باہر سے نہیں۔ ابھی تک اسے چابی مانگنے کا خیال نہیں آیا تھا جو میری جیب میں تھی۔ پھر شاید وہ دوڑ لگائے گا اور میں اسے جالوں گا۔ چوتھی منزل سے نیچے تک جاتے ہوئے اس کو زینے کے آٹھ موڑ کاٹنے پڑیں گے۔ میں اوپر سے چیخ پکار مچا سکتا ہوں تاکہ نیچے کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا منیجر یا کوئی ویٹر سُن لے اور گن مین کو ہوشیار کردے۔ رابعہ فون اُٹھا کے گراؤنڈ فلور پر ٹیلی فون آپریٹر کو بتا سکتی تھی۔

میرا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا۔ کمرے سے باہر جاکے اس کو خیال آیا کہ اس کے پاس چابی نہیں ہے لیکن اس وقت تک وہ دروازہ بند کرچکا تھا اور میں دروازے تک پہنچ گیا تھا۔ اس نے دوبارہ اندر آکے مجھ سے چابی مانگنے کے لیے دروازہ کھولنا چاہا مگر میں نے دروازے کے لاک کا بٹن دبا کے یہ کوشش ناکام بنادی۔ پھر وہ بھاگا۔

میں نے ایک دم دروازہ کھولا اور اس کے پیچھے دوڑا۔ رابعہ نے چلّا کے مجھے روکنا چاہا مگر میں نے جواب میں چلّا کے کہا "تم فون کرو نیچے۔"

وہ زینے سے اُتر چکا تھا اور تیسرے فلور پر تھا جب میں نے اس کی ایک جھلک دیکھی۔ خود کو محفوظ رکھتے ہوئے میں نے چیخ کے کہا "چور۔ ڈاکو.... روکو اسے۔"

میں چاہتا تھا کہ وہ نروس ہو کے فائر کرے اور فائر کی آواز پر ہوٹل میں موجود ہر شخص کو ہنگامی صورتِ حال کی اطلاع مل جائے۔ شاید اس ڈر سے خود اس نے بھی پلٹ کر مجھ پر گولی نہیں چلائی۔ آدھی رات کے وقت سارے کاریڈور خالی تھے اور میں اس کے بھاری قدموں کی آواز صاف سن سکتا تھا۔

اچانک یہ آواز تھم گئی تھی۔ میں تیسرے فلور سے دوسرے فلور پر پہنچا تو وہ غائب ہوچکا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ہوا میں تحلیل ہوگیا یا جن بھوت کی طرح دیوار میں سے گزر گیا۔ بات فوراً میری سمجھ میں آگئی۔ وہ سیکنڈ فلور کے کسی کمرے میں گھس گیا تھا۔ اس نے واردات کی صحیح منصوبہ بندی پہلے سے کرلی تھی لیکن اس طرح میرا کام آسان ہوگیا تھا۔ میں نے اسی طرح چلّاتے ہوئے پھر دوڑنا شروع کیا "ارے کوئی پکڑو اسے۔ میں برباد ہوگیا۔ لُٹ گیا میرا سب کچھ۔"

نیچے میرے شور نے سب کو متوجہ کرلیا تھا۔ اونگھتے منیجر نے چلّا کے چوکیدار کو آواز دی۔ پھر اندر کچن کی طرف سے کوئی آیا۔ ایک ویٹر ہڑبڑا کے اُٹھ بیٹھا۔ وہ لاؤنج میں پڑے صوفے پر سو رہا تھا۔

منیجر نے مجھ سے کہا "کیا ہوا سر۔ کس نے لُوٹ لیا..؟"

میں نے اس کے قریب جاکے سکون سے کہا "تمہارے ہوٹل کے ایک ویٹر نے۔"

اس نے سوچے سمجھے بغیر کہا "یہ کیسے ہوسکتا ہے؟"

میں نے آگے جھک کر اس کی ناک سے ناک ملا کے کہا "یہ ہوا ہے اور میں ابھی ملزم کو تمہارے حوالے کردوں گا۔"

اس نے کہا "ملزم۔ کون ملزم.... کہاں ہے ملزم؟"

میں نے کہا "ملزم سیکنڈ فلور کے کسی کمرے میں چھُپا ہوا ہے۔ شاید وردی پہن رہا ہے اور وہ رقم چھُپا رہا ہے۔"

"رقم کتنی ہے....؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ چالیس پچاس ہزار سے زیادہ ہی ہوگی۔"

"سرجی آپ کو تو معلوم ہے نقد رقم اور قیمتی چیزیں انتظامیہ کے حوالے کرکے رسید لینی چاہیے۔ بعد میں چوری ہوجائے تو ہم کیا کرسکتے ہیں۔ یہاں تو چوری کا ڈراما کرنے والے بھی آجاتے ہیں۔"

"مگر میں ڈراما نہیں کررہا ہوں۔ میں ملزم کو پکڑنا چاہتا ہوں۔ وہ خود تمہارے سامنے اقبالِ جرم کرے گا..."

ٹیلی فون آپریٹر دوڑتا ہوا آیا "سرجی۔ اوپر سے میڈم چار سو بیس نے فون کیا ہے۔ ڈاکا پڑ گیا ہے جی۔ وہ اپنا میرزمان..."

میں نے کہا "اب تم بتاؤ۔ کیا میں باہر جاکے ہنگامہ کروں۔ پولیس کو بُلاؤں؟"

"نہیں سر.... پولیس کیا کرے گی.... آپ کو پکا پتا ہے وہ ہمارے ہوٹل کا ویٹر تھا؟"

میں نے کہا "وہی ویٹر جو دوپہر کے وقت میرا ٹین کا باکس اُٹھا کے اوپر لے گیا تھا۔ تم یہ بتاؤ کہ سیکنڈ فلور پر کتنے کمرے خالی ہیں۔"

اس نے رجسٹر دیکھے بغیر کہا "صرف ایک.... لیکن میر زمان...."

"کوئی راستہ ہے پچھلی طرف۔ کیا وہ کھڑکی سے باہر اُتر سکتا ہے؟"

منیجر نے نفی میں سر ہلایا "ہر کھڑکی میں گرل لگی ہوئی ہے۔"

"یہ ہوسکتا ہے کہ دن میں ہی اس نے گرل ڈھیلی کرکے چھوڑ دی ہو۔ خیر یہ بتاؤ کہ نمبر کیا ہے خالی کمرے کا؟"

"دو سو آٹھ۔" وہ بولا "اس کی کھڑکی سڑک کی طرف کھُلتی ہے۔ ادھر سے وہ دکانوں کے چھجے پر اتر سکتا ہے لیکن سامنے بڑے بڑے سائن بورڈ ہیں۔ کوئی اسے ضرور دیکھ لے گا۔"

"چلو میرے ساتھ اوپر۔ کسی ویٹر سے کہو کہ اسے آواز دے کر بہانے سے دروازہ کھلوا لے۔ اس کے پاس ریوالور ہے.... وہ میرے یا تمہارے حکم دینے سے باہر نہیں آئے گا۔"

جو ویٹر سوتے سے اُٹھا تھا وہی کلمۂ شہادت پڑھتا ہوا گیا۔ اسے یقین تھا کہ ملزم اسے گولی مار دے گا۔ "نوکری میں جان دینا تو ویٹر کا فرض نہیں ہوتا۔ آخر چوکیدار کس لیے ہے..."

منیجر نے کہا "بکواس مت کر۔ میرزمان کو آواز دے کے کہنا کہ نیچے جائے۔ نہیں، اس سے کہنا کہ میری طبیعت خراب ہے۔ میں بھی سونا چاہتا ہوں۔"

"کیا اس کمرے میں ویٹر سوتے ہیں؟"

"جو کمرا خالی ہو ویٹر اس میں سو جاتے ہیں۔" منیجر بولا۔

ہماری چال کامیاب رہی۔ میرزمان نے یہ ظاہر کیا جیسے وہ سوتے سے اُٹھا ہے۔ اس نے خوابیدہ لہجے میں کہا "کیا مصیبت ہے یار۔ ابھی نیند آئی تھی۔"

"میرزمان۔ میری حالت خراب ہورہی ہے۔"

دوسرے ویٹر کا بیان سوفیصد درست تھا۔ خراب کیا اس کی حالت غیر ہورہی تھی مگر اندر پہنچنے کے بعد اس نے سکون کا سانس لیا ہوگا کہ محاذِ جنگ پر افسر کے حکم سے آگے جانے والے سپاہی کی طرح اسے پہلے شہید نہیں ہونا پڑا۔ ٹیلی فون آپریٹر سب سے پیچھے رہا۔

اس سے پہلے کہ دروازہ پھر بند ہوتا میں اندر پہنچ گیا۔ دروازے کو دھکا لگا تو میرزمان لڑکھڑا کے پیچھے ہٹا اور اس کا ہاتھ بے اختیار اپنی جیب کی طرف گیا۔ اب اس نے کپڑے بدل لیے تھے اور اپنی بیرے کی وردی پہن لی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ رقم بھی اس نے کمرے ہی میں چھُپائی ہوگی۔

اس کے ریوالور نکالنے سے پہلے میں نے لات گھُما کے اس کے پیٹ پر ماری۔ وہ ضرب کی شدت سے بلبلا اٹھا۔ اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ وہ ریوالور نکالنے کے بجائے دونوں ہاتھوں سے پیٹ دبا کے دُہرا ہوگیا۔ پھر میں نے اس کو دوسری لات ماری جو اس کے شانے پر لگی اور وہ سائیڈ کی دیوار سے ٹکرا کے گر گیا۔

میں نے جھک کے اس کی جیب سے ریوالور برآمد کیا اور پھر اسے کھینچ کے سیدھا کھڑا کردیا۔ منیجر اور دوسرا بیرا دم بخود کھڑے تھے۔ میں نے مُکّے مار مار کے میرزمان کا چہرہ بگاڑ دیا۔ اس کی ناک سے خون بہنے لگا۔ نیم بے ہوشی کے عالم میں وہ چلّانے لگا "اجی معاف کردو مجھے۔ آ‌ہ.... اوجی مت مارو غریب کو... ہائے اوئے میرا ربا۔"

جب وہ بے ہوش ہوگیا تو میں نے اس کی ساری جیبوں کی تلاشی لی مگر حسبِ توقع اس کے پاس سے کچھ نہیں ملا۔ میں نے بیرے سے کہا "اوپر جاکے بیگم صاحبہ کو بُلا لاؤ۔ اور سُنو، ان کا نام میڈم چار سو بیس نہیں ہے۔"

پیچھے کھڑے ہوئے ٹیلی فون آپریٹر نے شرمندگی سے کہا "وہ... سرجی، ہم تو نمبر سے ہی سب کو بُلاتے ہیں۔ غلطی معاف۔"

میں نے منیجر سے کہا "کمرے کی اچھی طرح تلاشی لو۔ باتھ روم میں خاص طور پر فلش ٹینک میں دیکھو۔"

رابعہ کے پہنچنے سے پہلے ہی آپریٹر نے فلش ٹینک کے پانی میں سے وہ پلاسٹک شیٹ کا پیکٹ نکال لیا جس میں ساری رقم تھی۔ اس نے مالِ مسروقہ کسی کامیاب سراغ رساں کی طرح منیجر کے سامنے پیش کیا۔

رابعہ نے اندر آکے کمرے کا نقشہ دیکھا تو صورتِ حال کو سمجھ گئی۔ میں نے اس سے پوچھا "کتنی رقم تھی تمہارے پاس؟"

"تقریباً بہتر ہزار.... سات آٹھ سو اوپر ہوں گے۔"

منیجر نے پیکٹ کھولا اور رقم شمار کیے بغیر میری طرف بڑھادی۔ میں نے کہا "نہیں۔ اسے گن کر دیکھو تاکہ تمہیں یقین آجائے کہ ہم ڈراما نہیں کررہے تھے۔"

"وہ تو سر، میں نے آپ کو نہیں کہا تھا۔"

میں نے کہا "خدا کا شکر ہے کہ میری عقلمند بیوی نے پیسہ ہوٹل کے کمرے میں نہیں چھوڑا تھا ورنہ واپسی پر ہمیں خالی صندوق ملتا۔ ہمارے پاس کمرے کا کرایہ ادا کرنے کے پیسے بھی نہ ہوتے اور تم ہمیں پولیس کے حوالے کردیتے اگر ہم چوری کی بات کرتے۔ کون مانتا ہماری کہ اس ٹین کے پُرانے صندوق میں بہتر ہزار روپے تھے۔"

رابعہ نے کہا "چلو اب پولیس کو بُلا کر رپورٹ لکھواؤ۔"

منیجر نے عاجزی سے کہا "میڈم کوئی فائدہ نہیں۔"

"فائدہ اور نقصان تم دیکھو۔ ایک جرم ہوا ہے اور اس کی رپورٹ کرنا ہمارا فرض ہے۔" رابعہ نے تیز ہو کے کہا۔

"سر۔ آپ سمجھائیں میڈم کو۔ اس حرامی کو میں نے ابھی ایک ہفتے پہلے ہی رکھا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ بدمعاش ڈاکو ہے۔ میں اس کو پولیس کے حوالے ضرور کردوں گا لیکن رپورٹ کی ضرورت نہیں۔ وہ اس پر دس الزام لگا کے اس کی ایسی چھترکاری کریں گے کہ یہ روئے گا اس دن کو جب یہ پیدا ہوا تھا.... پھر اس کو جیل بھی وہ خود ہی بھجوادیں گے۔"

میں نے گرج کر کہا "معلوم ہوتا ہے کہ تم اسے بچانا چاہتے ہو؟ تم بھی شریکِ جرم ہو۔ ہوٹل میں سب چوروں کو بیروں کی وردی پہنادی ہے۔"

"سر.... سر...! یہ کیسی باتیں کررہے ہیں آپ" وہ گھبرا گیا "پولیس کو بُلانے سے بدنامی ہوتی ہے۔ آپ یقین کریں ایسی واردات یہاں پہلے کبھی نہیں ہوئی۔"

"یا ہوئی تو مسافر کچھ کر نہیں سکا۔ وہ کسی کو رنگے ہاتھوں نہیں

پکڑ سکا اور تم نے معاملے کو دبا دیا.... آخر ہم ایسا کیوں کریں؟"

"تعاون.... صرف تعاون سر۔ اور اس کے بدلے میں ہم بھی بہت کچھ کریں گے آپ کے لئے" اس نے پلٹ کے ویٹر سے کہا "صاحب کا سامان شفٹ کرادو وی آئی پی سوئٹ میں۔ آپ جتنا عرصہ چاہیں رہیں سر۔ نو چارجز۔ کسی بھی سروس کے چارجز نہیں۔ فون کالز' کار سب کمپلی مینٹری..."

میں نے کہا "اچھا۔ تمہاری شرافت نے ہمیں متاثر کیا ہے منیجر' اس لیے ہم تمہاری بات ماننے پر مجبور ہیں۔"

"میں مالک ہوں سر" وہ بولا "آپ نے کہا تھا کہ دوبئی جانے کا خیال ہے تو سر ہوٹل میں ایک ایجنٹ آتا ہے۔ وہ بھروسے کا آدمی ہے اسی لیے ہم نے داخلے کی اجازت دے رکھی ہے.... وہ آپ کا ہر کام کر سکتا ہے اور بہت مناسب۔ انتہائی کم معاوضے پر۔"

میں نے غور کرتے ہوئے کہا "ہوں۔ صبح اسے بھیج دینا اگر وہ آئے۔"

واپس اپنے کمرے میں آکے رابعہ نے کہا "اُف!" اور دھڑام سے بیڈ پر گر گئی "آخر ہر جگہ ہمارے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوتا ہے؟"

میں نے کہا "ایسا کیا۔ اللہ جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔ اب دیکھو بیٹھے بٹھائے رہائش کا مستقل بندوبست ہو گیا۔ کھانا پینا سب فری۔ کیا شاندار سوئٹ ہے۔ میں تو واقعی خود کو وی آئی پی محسوس کر رہا ہوں۔"

"ساری تفریح کا لطف غارت ہو گیا۔"

میں نے کہا "اس وقت میں صدقِ دل اور فرطِ جذبات سے یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہوں کہ تم کو ناقص العقل سمجھنا میری دور اندیشی.... میرا مطلب ہے کوتاہ اندیشی تھی۔ آخر تمہیں کیسے خیال آگیا کہ رقم ساتھ ہونی چاہیے۔"

"عقل تمہارے پاس ہوتی تو تم بھی اتنا پیسہ ہوٹل میں چھوڑ کے نہ جاتے۔ واقعی کیا ثبوت ہوتا ہمارے پاس بعد میں۔"

"آدمی کی نیت خراب ہوتے دیر نہیں لگتی" میں نے اپنا بستر قالین پر بچھاتے ہوئے کہا "ڈرتا ہوں کسی دن میری نیت خراب نہ ہو جائے۔"

رابعہ مسکرانے لگی "ریوالور رکھ کے سوتی ہوں میں تکیے کے نیچے۔"

میں نے لائٹ بجھا کے کہا "اگر استعمال کرنا پڑے تو دل کا نشانہ مت لینا۔ خرابی دماغ کی ہو گی۔ دل کا تو پہلے ہی خانہ خراب ہے۔"

صبح میں منظر یا وقار سے فون پر بات کرنا چاہتا تھا مگر رابعہ نے روک دیا کہ کیا پتا ان کے فون آبزرویشن پر ہوں۔ پولیس ہمارا سراغ لگانے کے لئے کچھ بھی کر سکتی ہے۔ انہیں یقین ہو گا کہ ہم جہاں بھی ہوں گے اپنے دوستوں سے رابطے کی کوشش ضرور کریں گے۔"

"اچھا پھر تم اپنے بار روم کے فون پر اس بھوتنی والے سے بات کر لینا۔ اگر گھومنا پھرنا چاہو تو ہوٹل کی کار تمہارے ڈسپوزل پر ہے۔ فری آف چارج۔"

"کیوں تم کہاں جا رہے ہو؟"

"میں ایک مردانہ کام سے جا رہا ہوں" میں نے کہا "شام سے پہلے...."

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں نے بتا دیا تھا کہ اب جہاں تم وہاں میں۔ تم اکیلے نہیں جا سکتے۔ میں بھی ساتھ چلوں گی۔"

"وہ دراصل.... میں ایک بہت عزیز گرل فرینڈ سے ملنے جا رہا ہوں۔ بلاوجہ کباب میں ہڈی مت بنو۔"

"میرے کانوں میں روئی ٹھونس دو اور آنکھوں پر پٹی باندھ دو۔ میں کچھ نہیں سنوں گی اور کچھ نہیں دیکھوں گی لیکن ساتھ ضرور رہوں گی۔"

میں نے جھلا کے کہا "میں چھمیا جان کے کوٹھے پر جا رہا ہوں۔ نیپئر روڈ۔"

"ٹھیک ہے۔ میں بھی چلوں گی" رابعہ نے قطعی لہجے میں کہا۔

"چلو بابا۔ تم ہاریں میں جیتا" میں نے ہاتھ جوڑ کے کہا۔

"سکندر اعظم جو ہوئے۔ ہار کیسے سکتے ہو؟" وہ فاتحانہ انداز میں بولی۔

ہم نے نکلنے سے پہلے فون پر اکرام شیخ سے بات کی' اس نے اسکول میں فون ریسیو کیا "کون؟"

میں نے کہا "ابے تو کون۔ کیا سمجھتا ہے خود کو ڈبل ایس آئی کے بچے؟"

وہ چلانے لگا اور ہنسنے لگا "پھر آگیا تو خانہ خراب خانہ بدوش۔ لاوارث۔"

میں نے کہا "لاوارث کیوں۔ لواحقین ساتھ موجود ہیں۔ مستقبل قریب کی مسز سکندر بخت۔"

"قریب اور دور کا فرق بھول گیا ہے تو۔ دکھاتا رہ اسے سبز باغ اور لارے دیتا رہ۔ الو کے پٹھے۔ وکیل ہے تو کیا' لڑکی ہے آخر۔ جذبات کے معاملے میں عقل سے پیدل۔"

میں نے کہا "تیری ٹھکائی مجھ پر واجب ہوئی۔ کہاں پٹنا پسند کرے گا تو؟ اپنے گھر میں جورو کے سامنے یا سرِ عام۔ کاجل کہاں ہے؟"

"کلاس میں۔ آخر تم ہو کہاں؟"

"ایک سکس اسٹار ہوٹل کے وی آئی پی سوئٹ میں۔ یقین نہیں تو آکے دیکھ لے۔ آج شام۔"

"ہم آئیں ہوٹل۔ تم لوگ سامان اُٹھا کے آجاؤ۔"

"تمہارے غریب خانے پر؟ لاحول ولا قوۃ۔ ہم کیا پاگل ہیں۔ مطلب یہ کہ پاگل تو ہیں مگر اتنے بھی نہیں۔ شام ٹھیک چھ بجے۔ اوکے" میں نے فون رکھ دیا حالانکہ میں رابعہ کی صورت پر بھی اشتیاق کے جذبات موجزن دیکھ رہا تھا اور وہ بھی فوراً کاجل سے گفتگو کرنا چاہتی تھی۔

میں نے کہا "کاجل کلاس روم میں تھی۔"

"تم نے اچھا کیا انہیں بُلا لیا۔ رسمی ملاقات ہی تو ہے۔ تمہارا پچھلی دفعہ ان سے ملنا انہیں خاصا مہنگا پڑا تھا۔"

میں نے چابیاں مالک کے حوالے کرتے ہوئے کہا "گاڑی کہاں ہے؟" وہ فون کے قریب ہی کھڑا تھا۔

"باہر موجود ہے سر۔ شوفر کے ساتھ" اس نے مؤدبانہ عرض کی۔

"گڈ۔ اور وہ جو ایک ریکروٹنگ ایجنٹ ہے؟"

"عثمانی صاحب۔ وہ آئیں گے تو میں بتا دوں گا۔ بلکہ میں ان کو فون کر دیتا ہوں۔"

میں نے کہا "رات دس بجے کا ٹائم دے دو اسے۔"

میں نے شوفر کو میٹرو پول چلنے کا حکم دیا۔ ایک وی آئی پی کے رول کو رابعہ نے اوور ایکٹنگ قرار دیا مگر میں نے کہا کہ وی آئی پی اگر ایسا نہ کرے تو وہ عام آدمی نظر آنے لگتا ہے۔

گاڑی کو میں نے پیلس سینما کی سائڈ پر روک کے شوفر کو انتظار کرنے کا حکم دیا اور خود رابعہ کے ساتھ نوادرات یعنی ANTIQUE شاپ میں داخل ہو گیا۔ وہاں سے نکلا تو دکانیں جھانکتا گھوم کے سروسز کلب کی سائڈ پر اس آفس کے سامنے پہنچ گیا جہاں شیخ مختار کے نام سے استاد پیڈرو نے اپنا آفس بنا رکھا تھا۔ رابعہ کو میں نے اس کا رول سمجھا دیا تھا اور وہ نہ ماننے کے باوجود مان گئی تھی۔

شیخ مختار کا پارٹنر اپنے شیشے کے کیبن میں سر جھکائے کوئی فائل پڑھنے میں اتنا مصروف تھا کہ اس نے ہماری طرف بھی سر اُٹھا کے نہیں دیکھا اور بولا "بیٹھو۔" اس کی انگلیاں پنسل سے ایک کاغذ پر اعداد لکھتی جا رہی تھیں۔ اس کے آفس میں سب ہی کام کرنے والے سو فیصد کلرک تھے۔ اُداس اور بیزار۔ خاموش اور جذبات سے عاری سپاٹ چہروں والے۔ جو ایک دوسرے کی طرف دیکھتے بھی تھے تو ڈرتے ڈرتے۔ بات ایسے کرتے تھے جیسے جھوٹ بول رہے ہوں۔

جب اس نے نظر اُٹھا کے ہمیں دیکھا تو چونکا "تم.... اپن سمجھا... خیر چھوڑو اپن کیا سمجھا۔"

میں نے دردناک صورت بنا کے کہا "میں شیخ مختار کا بڑا بھائی ہوں۔ شیخ بخت یار۔ اسلام آباد سے آیا ہوں۔"

"اوہ.... نائس میٹنگ یو۔" اس نے خوش اخلاقی سے ہاتھ ملایا "کیا حال ہے اپنے شیخ مختار کا۔ اتنا دن ہو گیا۔ دھندا اپن سنبھالتا ہے لیکن ابھی ڈبل ڈیوٹی بوت مشکل ہے۔ کب آئیں گا وہ۔"

میں نے رقت زدہ لہجہ بنا لیا "وہ۔ اب وہ کبھی نہیں آئے گا۔"

"کیا؟ نئیں آئیں گا۔ ایسا تو بزنس میں نئیں چلتا۔ ایک دم پارٹنر شپ خلاص کر کے بیٹھ گیا۔ الگ ہونے کو تھا تو پہلے بولتا۔"

میں نے تقریباً رو کے کہا "وہ چلا گیا... اوپر...." میں نے انگلی کو آسمان کی طرف اُٹھایا "ادھر سے آج تک کون لوٹ کر آیا ہے۔"

اس نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا اور پیچھے ٹیک لگا کے بہت دیر تک گھورتا رہا۔ "تم کیا بات کرتا ہے۔ تم بولتا وہ مر گیا؟"

"بالکل مر گیا؟ ذرا بھی نہیں بچا۔ سو فیصد مر گیا۔"

"دیکھو ابھی اپن کا پاس مذاق کا ٹائم نہیں ہے۔ اپن کو بولو تم کون ہے؟"

میں نے کہا "اس کا بھائی..."

"شٹ اپ مین۔ تم کوئی فراڈ ہے" وہ بولا۔

"تمہیں یقین نہیں آتا۔ اس سے پوچھو۔ یہ اس کی بیوہ ہے۔"

وہ ایک دم کھڑا ہو گیا اور شاید کسی کو بُلانا چاہتا تھا مگر پھر اس نے اپنا ارادہ بدل دیا "دیکھو۔ شیخ مختار ہم کو کل فون کیا۔"

میں تقریباً اچھل پڑا "تمہیں فون کیا تھا اس نے' کہاں سے؟"

"راولپنڈی سے۔ ادھر کسی اسپتال سے' اس نے بولا کہ وہ زخمی ہے۔ ایکسی ڈنٹ ہوا اس کا۔ بس ایک ٹانگ دو پسلی ٹوٹا۔ باقی سب بچ گیا۔ تم بولتا ہے وہ مر گیا۔ اس نے خود بولا کہ بہت جلدی آئیں گا۔ تم بولتا کبھی نہیں آئیں گا۔ اس نے شادی نئیں بنایا۔ تم بولتا یہ اس کا وڈو..."

میں نے ریوالور نکال لیا "کیا اب بھی تمہارا خیال ہے کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں؟"

اس کا رنگ لاش کی طرح سفید پڑ گیا "نئیں.... نئیں بابا۔ تم سچا ہم جھوٹا۔ تم اس کا بھائی' اس کا باپ..."

میں نے کہا "مجھے اس کی دراز میں سے صرف ایک ڈائری چاہیے' میں کسی کی جان یا تجوری سے پیسہ لینے نہیں آیا ہوں۔"

"ڈائری.... کیسا ڈائری.... ہم کیسے دیوے۔"

"تم مت دو' ہم خود لے لیں گے" میں نے ریوالور کا سیفٹی کیچ بھی ہٹا دیا "اس ڈائری کا تمہارے بزنس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تم ہمارے ساتھ اس کے آفس میں چلو اور خود دیکھ لو کہ ہماری بات میں کتنا سچ ہے' تم ڈائری بھی دیکھ سکتے ہو۔"

"اچھا۔ اچھا" اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کے کہا "اپن کا ہارٹ ایک دم کنڈم ہو گیا ہے۔ بہت اولڈ ماڈل کا مشین ہے۔ گن کو ہٹا لو سامنے سے ورنہ ہم بغیر گولی کے ڈیڈ ہو جائے گا۔"

وہ بزدلی کی حد تک صلح پسند شخص تھا چنانچہ ڈائری کے حصول میں ہمیں کسی دشواری کا سامنا نہیں ہوا۔ وہ ہمیں پیڈرو کے آفس میں لے گیا۔ اس نے کسی پر کچھ بھی ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ اندر جا کے اس نے دراز کی چابیاں رابعہ کے حوالے کر دیں اور خود میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ عملے کے تینوں بے حس اور منجمد ارکان کی

طرف اس کی پشت تھی جو سر جھکائے جمع تفریق میں مصروف تھے اور اپنے سیٹھ کے رویے کا فرق نوٹ ہی نہیں کر سکتے تھے۔

بہت سے کاغذات کھنگالنے اور ساری درازیں دیکھنے کے بعد رابعہ نے ڈائری جیسی تین چیزیں برآمد کرلیں۔ ایک نوٹ بک سائز کی نیلی البم تھی یعنی قابلِ غور مگر شرمناک تصاویر کا حیرت ناک انتخاب۔ میں نے بادلِ ناخواستہ اسے سرسری نظر سے دیکھ کے ایک طرف ڈال دیا۔ دوسری میں روز مرہ کے کاروباری اندراجات تھے۔ تیسری اوّل تا آخر سادہ تھی۔ مجھے سخت مایوسی ہوئی۔

کیا پیڈرو نے جھوٹ بولا تھا؟ حرام زادہ۔ مرجاتا تو جان چھوٹ جاتی مگر ایسا لگتا ہے کہ زیادہ ذلت اٹھا کے مارا جانا اس کا مقدر ہے۔ پھر اچانک رابعہ نے درمیانی جگہ میں بہت کم گہرائی والی دراز باہر کھینچی اور اس میں سے اصل ڈائری برآمد کرلی۔ اس میں نقد رقم بھی کافی تھی اور دیگر کاغذات بھی خفیہ نوعیت کے ہی ہوں گے مگر ہم وعدہ کرچکے تھے کہ ڈائری کے سوا کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگائیں گے۔

میں نے ڈائری کے چند اوراق ملاحظہ فرماتے ہی نعرہ لگایا "مل گیا گوہرِ مطلوب۔"

سیٹھ بھونچکا رہ گیا "یہ اپنا مطلوب صاب تو کدھر گیا ہی نہیں۔ تم کو کیسے ملا اور گوہر کون ہے۔ اس کا وائف؟"

میں نے کہا "سیٹھ تم نے اس خبر سے ہمیں بہت دکھ پہنچایا ہے کہ استاد پیڈرو ابھی تک زندہ ہے۔"

وہ بولا "دیکھو اپن قسم کھا سکتا ہے کہ ایسا بات نہیں بولا..."

میں نے اپنی بات جاری رکھی "اس کے باوجود ہم نے تمہیں گولی نہیں ماری؟ نہیں ماری نا؟"

اس نے سرہلایا "ایک دم نہیں ماری' ابھی تک۔"

"اور اُدھر دراز میں کتنا روکڑا ہے۔ اپن اس کو بھی ہاتھ نہیں لگایا۔ اپن کے کام کا یہ چیز تھا۔ اس کے سوا ہم نے کچھ نہیں لیا۔ نہیں لیا نا؟"

اس نے پھر سرہلایا "برابر۔ تم شریف ڈاکو ہے۔"

"اب ہم جاتے ہیں" میں نے کہا "ہم یہ چاہتے ہیں کہ تم آج کے واقعات کو بھول جاؤ۔ یہ سمجھ لو کہ کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔"

"سمجھ لیا۔ ایک دم سمجھ لیا بابا۔"

"تم نے ہمیں دیکھا ہی نہیں۔ اس دنیا میں تم ہمیں پہچاننے کی غلطی کروگے تو دوسری دنیا میں پہنچ جاؤ گے۔ تم جا کے اپنے آفس میں بیٹھ جاؤ اور اسی طرح کام شروع کردو جیسے ہمارے آنے سے پہلے کر رہے تھے۔ تم نے ہمارے پیچھے آکے سڑک پر گدھے کا مالک چلانا شروع کیا' پولیس' پولیس تو جواب میں دو گولی آئے گا۔ ایک دل کے لیے' دوسری دماغ کے لیے۔"

"دل کے لیے کیوں... ہم ابھی دل کا مریض ہے' بائی پاس کرایا..."

"چلو دوسری بھی دماغ کے لیے۔ باہر ہمارے دو آدمی کھڑے ہیں۔ بلکہ ایک کھڑا ہے دوسرا گاڑی میں بیٹھا ہے۔ دو گولیاں چلا کے وہ رخصت ہو جائیں گے اور ظاہر ہے تم بھی دنیا سے رخصت ہو جاؤ گے۔ اس لیے باہر نکل کے دوستانہ طریقے سے ہاتھ ملاؤ۔ تاکہ گوہر مطلوب صاحب بھی دیکھے کہ ہم کاروباری کام سے آئے تھے۔ اور یہ غلط بھی نہیں۔"

اس نے میرے ریوالور کو دیکھا "غلط کیسے ہو سکتا ہے تمہارا بات۔ لیکن اپن کو ایک بات بتادو ورنہ اپن کا دل میں وہ رہے گا... کھالص۔"

رابعہ نے کہا "سیٹھ کا مطلب ہے خلش۔"

"کھالس یہ ہوگی کہ آخر شیخ مختار کے ساتھ میرا کیا تعلق تھا؟ تو سمجھو' غور سے سُنو۔ وہ میرا بھائی نہیں' رقیب ہے اور دشمن۔ اس نے میری بیوی کو اغوا کیا تھا۔"

سیٹھ نے رابعہ کو دیکھا "یہ نمبر ٹو ہے؟"

میں نے کہا "یہ نمبر ٹین ہے۔ دس نمبری۔ نو سال میں اس نے میری نو بیویاں اغوا کرلیں۔ سوچو ذرا یہ کتنا نقصان ہے۔ نئی بیوی کیا آسانی سے مل جاتی ہے۔ اور پھر خرچہ ہر سال کا۔ انکم ٹیکس والے لے جائیں تو آدمی روپیٹ کے صبر کرلیتا ہے مگر ہر سال دہی لوگ شادی میں پلاؤ زردہ کھا کے اُڑادیں۔ یہ بڑے صدمے کی بات ہے۔ پھر میرے گھر میں جہیز جمع ہوتا جارہا ہے۔ فرنیچر شاپ کھول لی ہے میں نے۔ اس کے باوجود گھر میں جگہ نہیں رہی۔ اس ڈائری میں سب لکھا ہوا ہے کہ شیخ مختار نے میری کس بیوی کو کہاں رکھا ہے۔"

"یہ شیخ لوگ بہت شادیاں کرتا ہے۔ اس کو بولو میرا والا بھی لے جائے۔"

میں نے کہا "ابھی تو میں جارہا ہوں ساری بیویاں برآمد کرنے۔ جب تمام بیویاں مل جائیں گی تو پھر مجھے ایک اور مشکل ہوگی کہ کون سی تین رکھوں۔ کم سے کم چھ کی چھٹی کرنی پڑے گی' دو تین تم لے لو۔"

اب وہ سمجھ گیا کہ میں سیریس نہیں ہوں "ہم کو ابھی معاف کرو یار۔"

مجھے پورا یقین تھا کہ وہ جان بچ جانے پر خدا کا ہزار بار شکر ادا کرے گا اور شور بالکل نہیں کرے گا۔ اس کے باوجود باہر نکلنے کے بعد میں نے انتظار کیا۔ اگر وہ باہر آتا تو سب سے پہلے اسے میری شکل اور پھر ریوالور کی نال دکھائی دیتی۔ وہ فوراً واپس اندر چلا جاتا۔

ایک منٹ بعد میں نے رابعہ سے کہا "نمبر ٹین۔ بھاگو۔"

رابعہ نے کہا "میڈم چار سو بیس۔ دس نمبری۔ سارے مبارک نام کیا میرے لیے ہی رہ گئے ہیں۔ تم ہو شریف ڈاکو۔"

گاڑی میں بیٹھنے کے بعد میں نے سکون کا سانس لیا "ابھی اپنے دل میں بہت کھالص ہے سالا۔ یہ پیڈرو مرا نہیں۔"

"بے غیرت مشکل سے مرتے ہیں۔"

"غالباً ایسی ہی رائے وہ ہمارے لیے رکھتا ہوگا۔ خیر' افسوس ناک یہ بات بھی ہے کہ اس کی صرف ایک ٹانگ ٹوٹی اور دو پسلیاں۔ سر گردن اور ریڑھ کی ہڈی سب بچ گئے۔ سوچو یہاں وہ خود مل جاتا۔ ایک ٹانگ پر پلستر چڑھائے بیٹھا ہوتا۔ ہاتھ منہ سر پر پٹیاں بندھی ہوتیں اور اس نے میز پر کوئی مشین گن لگا کے رُخ رکھا ہوتا دروازے کی طرف۔"

شوفر نے کہا "سر۔ میرے لیے کیا حکم ہے؟"

میں نے چونک کے کہا "اوہ۔ تمہیں تو میں بھول ہی گیا تھا۔"

ہم وہ دن اکرام شیخ اور کاجل کے ساتھ گزارنا چاہتے تھے مگر اپنی اصل صورت کے ساتھ کسی کے پاس جانا اسے مشکل میں ڈالنے کے مترادف تھا۔ ٹی وی اسٹیشن کے ایک میک اپ مین سے میری شناسائی تھی جس نے مجھے فرنچ وکیل کا لاجواب گیٹ اپ دیا تھا۔ میں نے اسی سے رابطے کی کوشش کی مگر وہ مصروف تھا اور شام سے پہلے نہیں مل سکتا تھا۔ رابعہ نے کہا کہ اسے دن دہاڑے آزادانہ گھومتے پھرتے ڈر لگتا ہے۔ میں نے شوفر سے واپس ہوٹل چلنے کو کہہ دیا۔ یہ بھی اچھا ہی ہوا کیونکہ وہاں ایک عقابی آنکھوں' طوطے جیسی ناک والا چغد صورت شخص ہمارا انتظار کر رہا تھا اور ہوٹل کے مالک کے حکم پر انتظار کی کٹھن گھڑیاں' گھڑی دیکھ دیکھ کے' آہیں بھر کے چائے پی کے اور پان چبا کے کاٹ رہا تھا۔

منیجر کی نظر کے اشارے پر وہ دوڑتا ہوا آیا۔ "آپ آگئے۔ اللہ تیرا شکر ہے۔" اس نے ہاتھ جوڑ کے اوپر دیکھا اور پھر مجھ سے مصافحہ کرنے کے بعد رابعہ سے ہاتھ ملانے کی ناکام کوشش پر شرمندہ ہوا "میرا نام غلام نبی چرخ ہے۔ چرخ ایک تو جانور ہوتا ہے۔ چڑیا گھر میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں آپ۔ دوسرا چرخ نیلی فام' آسمان۔"

میں نے کہا "آپ کیا ہیں؟ آسمان یا وہ جانور؟"

وہ "کھی" کر کے یوں ہنسا کہ ہنسنے کی آواز تک نہیں آئی "میں خدمتِ خلق کرتا ہوں۔ سب کا خادم ہوں۔ غالباً آپ کو کچھ مسئلہ درپیش ہے پاسپورٹ وغیرہ کا۔"

میں اسے اوپر اپنے وی آئی پی سوئٹ میں لے گیا۔

"چرخ صاحب۔ میرے مسائل تو اتنے ہیں کہ سُنانے لگوں تو عمرِ خضر بھی ناکافی ہو" میں نے عرض کیا "آپ صرف پاسپورٹ اور ویزا کا مسئلہ حل کردیں۔"

"لائیے پاسپورٹ کہاں ہیں؟"

میں نے کہا "پاسپورٹ ہوتا تو پھر مسئلہ ہی کیا تھا۔"

"بہت خوب۔ بہت خوب۔ گویا پہلے پاسپورٹ بنوانے ہیں" اس نے ایک ڈائری کھول لی "اپنا نام۔ ولدیت' پتا بتائیے۔ پھر اپنی نصف بہتر کا۔"

"یہ بہتر ہیں؟" میں نے آہ بھر کے کہا "خیر اپنی اپنی قسمت ہے۔ تو آپ لکھئے۔ سیف فقیر حسین ولد لکیر حسین... حیران مت ہوں۔ ان کا نام ٹھیک ہوتا تو مجھے لکیر کا فقیر نہ کہا جاتا۔ جب بنارس خاں اور لال بیگ جیسے نام ہو سکتے ہیں..."

"جی میں نے لکھ لیا اب خاتون محترم کا نام نامی" چرخ بولا۔

"رئیسہ زوجہ فقیر حسین" میں نے کہا "پتا وہی جو فقیر کے ڈیرے کا۔"

"آپ کو جانا ہے دوبئی؟"

"لاحول ولا قوۃ۔ چرخ صاحب دوبئی بھی کوئی جانے کی جگہ ہے۔ ہم لندن جائیں گے۔ کیوں رئیسہ۔ وہ تمہارے ماموں بھی تو وہیں ہیں جو بال بھی کاٹتے ہیں اور نومولود کے... میرا مطلب ہے کفار کی سرزمین پر وارد ہونے والی اولاد ملت بیضہ کو مشرف بہ اسلام کرتے ہیں۔ جزاک اللہ۔"

چرخ صاحب نے ایک شعر گُنانے کے بعد حساب لگا کے بتایا "آپ کے صرف چار ہزار خرچ ہوں گے۔ چار چار تصویریں لائیے۔"

میں نے کہا "چرخ صاحب۔ ایک بات اور بھی ہے۔ ذرا کان اِدھر لائیے۔"

اس نے کان کو میری ناک سے لگادیا "بہت راز کی بات ہے" میں نے کہا۔

وہ بولا "فکر نہ کریں۔ میرا دل رازداری کا قبرستان میوہ شاہ ہے۔"

میں نے کہا "ہم ملک سے فرار ہو رہے ہیں۔ میں کسی کی بیوی کے ساتھ فرار ہو رہا ہوں۔ بڑا خطرناک آدمی ہے لیکن نام ہے رحم دل خان۔ وہ ہر ائرپورٹ پر توپ لے کے بیٹھا ہوگا بقلم خود۔"

"ہر ائرپورٹ پ... خود...!"

"کراچی میں تو ضرور ہوگا کیونکہ ہوا یا پانی۔ دو ہی راستے ہیں فرار کے۔ زمین پر تو صرف رحم دل خان ہے اور اس کی توپ... چنانچہ میں جو تصویریں فراہم کروں گا۔ ان میں میری شکل آپ سے ملتی جلتی ہوگی۔"

چرخ نے چرخ جیسی آواز نکالی "مجھ...ے... مجھے مروانا چاہتے ہیں آپ۔"

میں نے کہا "میرا مطلب تھا کہ بدلی ہوئی ہوگی۔ بلکہ بہت زیادہ بدلی ہوئی ہوگی اور تصویر بھی پھر اس چہرے کی نہیں ہوگی۔"

چرخ نے غور فرما کے کہا "ایسی صورت میں...؟"

میں نے کہا "معاوضہ ہوگا دس ہزار۔ مجھے منظور ہے۔ بس کام جلد از جلد' میری تاریخِ وفات سے قبل ہو جائے۔ لندن کے دو ٹکٹ حاصل کرنا بھی آپ کی ذمّے داری اور سیٹ کنفرم کرانا بھی۔ یہ بتائیے میں کب اُڑ سکتا ہوں۔"

اس نے پھر غور کیا اور بولا "ویسے تو چار دن لگتے ہیں... پیر

منگل بدھ جمعرات۔ ہزار روپے یومیہ پر دن کم ہو جاتے ہیں۔"

میں نے دو ہزار بڑھا کے کہا "پرسوں رات کوئی فلائٹ ممکن ہے؟"

"بالکل ممکن ہے۔ بس موسم ٹھیک رہے" وہ بولا "اور آپ فوت نہ ہوں۔"

اس کے جاتے ہی رابعہ نے مجھ سے لڑنا شروع کیا "وہ تو خیر تھا ہی چرخ۔ تم کیا اوٹ پٹانگ بولتے رہے۔"

میں نے کسی فلسفی کی طرح کہا "تمہارے ذہنِ نارسا اور کج فہم ذہن کے لیے عقل ودانش کا ہر نکتہ، فکر اوٹ پٹانگ ہے۔ میڈم چار سو بیس۔"

"یہ اچانک لندن کی کیوں سُوجھ گئی؟"

میں نے اوپر دیکھ کے کہا "آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں۔"

"سیدھی طرح بات کرو ورنہ۔۔"

"ورنہ کیا بیگم۔ پھر وہی میکے جانے کی دھمکی" میں نے ڈر کے کہا "اچھا سُنو۔ دراصل پہلے میرا پروگرام کراچی میں اکیلے ہی آنے کا تھا لیکن تم زبردستی چمٹ گئیں۔ مجھ سے۔ محاورتاً۔ عملاً نہیں، ایسے ہمارے نصیب کہاں؟ اس کے بعد مجھے لندن ہی جانا تھا۔ الزبتھ کی یاد بہت دل کو تڑپا رہی تھی۔ ملکہ الزبتھ یا الزبتھ ٹیلر نہیں۔ یہ ایسی چیز ہے کہ تم دیکھو گی تو جل کے کوئلہ ہو جاؤ گی۔ بہانہ میں نے کیا تھا اس نیگرو جارج سے جیل میں ملنے کا۔ لیکن اب تم نے قسم کھالی ہے کہ قبر میں بھی میرے ساتھ ہی جاؤ گی تو میں کیا کروں؟"

رابعہ ہنسنے لگی "بدمعاش ہو گئے ہو تم بہت۔"

"بدمعاش کی مونث بدمعاشی۔ ہاہاہا" میں نے مصنوعی قہقہہ لگایا "بات یہ ہے رئیسہ زوجہ فقیر۔ کہ ابھی میں کچھ عرصہ روپوش رہنے میں ہی عافیت سمجھتا ہوں۔ تم بھی جتنا عرصہ منظر سے غائب رہو پولیس والوں کے لیے عذاب اتنا ہی طویل۔ منظران کی جان کھائے گا۔ وکیل ہنگامہ برپا کریں گے اور اخبارات خوب شور مچائیں گے۔ مشہور وکیل مس رابعہ قاری کے اغوا کا چوتھا دن۔ پانچواں دن، دسواں دن، عدالت میں آئی جی کی طلبی۔ ایڈووکیٹ جنرل کا حلف نامہ جھوٹا ہے۔ استغاثہ کا موقف۔ کیوں نہ یہ دس دن ہم لندن میں گزار آئیں۔ میں تم کو بہت سی۔۔۔۔ میرا مطلب ہے بہت سے دوستوں سے ملواؤں گا۔"

"بہت سی دوستوں سے کہنے میں کیا حرج ہے۔ شرم آتی ہے؟"

میں نے شرما کے کہا "ہاں۔ وہ تمہیں دیکھ کے کیا کہیں گی۔ آخر تھا نا بلڈی کالا آدمی۔ ہیروں کی دُکان سے گیا کوئلوں کی کان میں اور کیا چیز لے کر آیا؟"

رابعہ خفا ہو گئی "اگر میں اتنی ہی بُری ہوں تو پھر مت ملوانا مجھے کسی سے خود مل لیتا سب سے۔"

"بھئی الٹا مطلب نکال کے لڑنا تمہاری عادت ہے بیگم۔ کوئلوں کی کان میں کیا کوہِ نور ہیرا نکالا میں نے۔ یہ دیکھ کے وہ سب کوئلہ ہو جائیں گی۔ سمجھا کرو بات کو۔ میں اور محسن کہاں رہتے تھے کہاں کہاں جاتے تھے اور کیا کرتے تھے؟ میری زندگی کے وہ چار برس" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "ہائے کیا چیز تھی جوانی بھی۔"

رابعہ مسکرانے لگی "بڑے میاں۔ جوانی کیا تمہارا تو بڑھاپا بھی دیوانہ ہے۔"

"دیوانہ بنا کے کہتی ہو دیوانہ ہے" میں نے کہا "اسی کو کہتے ہیں جنگل میں مور ناچا سب نے دیکھا۔ غالباً غلط محاورہ بولا میں نے اور وہ بھی غلط وقت پر۔"

شام کو میں نے میک اپ مین سے ملاقات کی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی پہچان گیا اور جب میں نے اردو بولی تو بھونچکا رہ گیا "تم فرنچ نہیں ہو؟"

میں نے کہا "فرنچ ایک زبان ہے جو فرانس میں بولی جاتی ہے اور میں زبان نہیں انسان ہوں۔"

وہ ہنسا "اب کیا بننا چاہتے ہیں آپ؟"

میں نے رابعہ کی طرف دیکھا "ان کا شوہر۔ میرا مطلب ہے فقیر حسین۔ یہ جو سامنے فٹ پاتھ پر فقیر بیٹھا ہے۔"

اس نے رازداری سے کہا "یہ سی آئی اے کا آدمی ہے۔"

"اسی لیے سی آئی اے کی یہ حالت ہے۔ خیر تم اس کی صورت بنا دو یا تمہیں جو پسند ہو۔ بس یہ اصلی چہرہ کسی کا باپ نہ پہچان سکے۔"

"آخر آپ بار بار بھیس کیوں بدلتے ہیں؟"

"فکر مت کرو۔ نہ میں مجرم ہوں اور نہ مفرور۔" میں نے اسے پانچ ہزار تھماتے ہوئے کہا "تمہارے اطمینان کے لیے یہ کافی ہونے چاہئیں۔"

وہ مطمئن کیسے نہ ہوتا۔ اس نے مجھے رات کے وقت اپنے گھر آنے کی تاکید کی۔ شام ہو چکی تھی۔ باقی وقت ہم نے اکرام شیخ اور کاجل کے ساتھ گزارنے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے بظاہر بڑی گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا اور رات کے کھانے تک روکا مگر اندر جو کچھ کاجل نے اکرام شیخ سے دبے دبے لہجے میں کہا وہ میں نے سُن لیا اور شاید اس کا مقصد بھی مجھے سُنانا ہوگا۔ مجھے احساس ہوا کہ یہاں آکے میں نے غلطی کی تھی۔ وہ کاجل جسے ہم مشرقی پاکستان سے بچا کے لائے تھے اور اس وقت سہارا دیا تھا جب دنیا میں اس کا کوئی نہیں تھا۔ بالکل بدل گئی تھی۔ اس سے بھی زیادہ افسوس کی بات یہ تھی کہ ہمارا دوست اکرام شیخ۔ سابق ایس آئی۔ سابق ٹیکسی ڈرائیور۔ دولت مند ہوا تھا تو سارے رشتوں کو فراموش کر چکا تھا۔ بیوی اس پر حاوی تھی۔ سالا جورو کا غلام۔ میں نے دل ہی دل میں کہا اور آئندہ کبھی وہاں نہ آنے کا عہد کیا۔ خود رابعہ کے لیے یہ صدمے کی بات تھی۔

میں نے اسے ہوٹل میں چھوڑ کے میک اپ مین کے گھر کا رُخ کیا۔ اس کے لیے میں نے ٹیکسی استعمال کی تھی۔ میں نے رابعہ کو تاکید کر دی تھی کہ وہ رات کو ہوٹل چھوڑ دے اور جہاں میں کہوں وہاں آجائے۔

رات دس بجے میں نے اسے فون کیا تو وہ گھبرائی ہوئی تھی "سکندر۔ یہاں تو بڑی مصیبت میں ہوں میں۔ نیچے وہ بیٹھا ہے۔"

میں نے کہا "کون بیٹھا ہے؟"

"چوہدری دلاور۔ وہ ہم سے ملنے آیا تھا۔۔۔۔ منیجر نے کہا کہ اس نام سے تو یہاں کوئی بھی ٹھہرا ہوا نہیں ہے تو وہ ہال میں بیٹھ گیا۔ بتاؤ میں کیا کروں؟"

مجھے یقین تھا کہ رابعہ کو غلط فہمی نہیں ہو سکتی۔

میں نے صورتِ حال پر غور فرما کے کہا "رابعہ، کیا تم نے دلاور کو دیکھا ہے؟"

رابعہ نے خفگی سے کہا "مذاق کا یہ کون سا وقت ہے۔"

"لاحول مذاق کرنے والے پر۔۔۔ جواب دو میری بات کا۔"

"بھئی دیکھا کیوں نہیں، ہزار بار دیکھا ہے۔ کل کو تم پوچھو گے۔ سکندر کو دیکھا ہے؟"

میں نے اپنے سر پر ہاتھ مارا "نیک بخت، جس دن میرا دماغ اتنا خراب ہوا اس دن میں پاگل خانے کے اندر نظر آؤں گا۔ ابھی تو میں نے پوچھا تھا کہ آج ابھی اور اسی وقت تم نے دلاور کو نیچے دیکھا ہے۔ بقلم خود۔۔۔ بقائمی ہوش وحواس؟"

"ابھی۔۔۔ نہیں۔۔۔ ابھی کیسے دیکھ سکتی تھی میں۔۔"

"یعنی تم نے سن کر یقین کر لیا۔ کس سے سنا یہ تم نے کہ دلاور ہمیں ہی پوچھ رہا تھا۔"

"خود منیجر سے۔۔۔"

"اس نے کسی کو بھیجا تھا یا بقلم خود کہا تھا۔"

"کیا بقلم خود بقلم خود لگا رکھی ہے۔ اس نے فون کیا تھا مجھے۔"

میں نے کہا "اور تمہیں یقین ہے کہ وہ آواز منیجر کی تھی؟"

وہ بولی "اور کس کی ہو سکتی تھی۔ کمرے میں ڈائریکٹ لائن تو ہے نہیں کہ کوئی باہر سے مجھے فون کر سکے۔ ویسے مجھے شک بھی نہیں۔ وہ منیجر ہی تھا۔"

میں نے کہا "اس بدتمیز، بدعقل بدصورت شخص کو تم نے جھاڑ نہیں پلائی اس گستاخی پر کہ آخر اس نے تمہیں فون کر کے یہ کیوں پوچھا؟"

"میں نے کہا تھا کہ جب تمہیں میرا نام معلوم ہے تو پھر مجھ سے یہ احمقانہ بات کیوں پوچھ رہے ہو؟ اس نے بڑی معذرت کی اور بولا کہ بعض اوقات لوگوں کے دو نام ہوتے ہیں۔ خود میری بیوی حیدر آباد دکن کی ہے اور اس کے دو نام ہیں۔ ایک ننھیال کا دوسرا ددھیال کا۔ اور بھی بہت سے کیس دیکھے ہیں میں نے جہاں گھر کا نام کچھ اور تھا، اسکول سرٹیفکیٹ اور دستاویزات کا نام کچھ اور۔"

"لیکن خاص طور پر اس نے صرف تم سے کیوں پوچھا؟"

"بھئی اس نے سب سے پوچھا۔ ہر کمرے میں جہاں کوئی عورت کسی کے ساتھ تھی۔ اس نے معلوم کیا۔ جھاڑ کھائی اور یہی وضاحت پیش کی۔ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ خفا ہونے والی آپ تیسری خاتون ہیں۔ ابھی دو باقی ہیں۔ لیکن ہم کیا کریں کسی کا مہمان آئے دور سے اور ہم اس کی اتنی مدد بھی نہ کریں۔"

"اچھا اب تم ایکشن کے لیے تیار ہو جاؤ۔ میں اس وقت تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ اگر میں نے یہ رسک لیا تو بہت زبردست مار دھاڑ اور خون خرابہ ہوگا۔ کشتوں کے پشتے لگ جائیں گے۔ اس کے بعد میں تم کو دشمنوں کے نرغے سے نکال لاؤں گا۔ انشاءاللہ۔"

"مجھے بتاؤ میں کیا کروں؟"

"تم پہلے نیچے جا کے دیکھو۔ کیا وہ واقعی دلاور ہے۔"

"اور کون ہو سکتا ہے؟"

"کوئی دلاور کا نام لے کر تمہیں یا مجھے ہراساں کر سکتا ہے۔"

"ایسا کون ہوگا۔ اور ہوگا تو وہ ہمارا دوست نہیں دشمن ہی ہوگا جس نے ہمیں پہچان لیا اور ہمارا تعاقب کرتا ہوا اس جگہ تک پہنچ گیا جہاں ہم خود کو بہت محفوظ سمجھ رہے تھے۔"

میں نے ڈانٹ کر کہا "کل تم بے پردہ گھوم رہی تھیں۔ آج بھی میرے ساتھ تھیں اور یہ سارا قصور ہے تمہارے ہزار واٹ سے زیادہ روشن نگاہوں کو خیرہ کر دینے والے حسن کا۔ جو ایک بار دیکھ لیتا ہے وہ بھلا نہیں سکتا۔"

"تم خود بھی تو بڑی بے وقوفی سے دندناتے پھر رہے تھے سارے شہر میں۔" رابعہ نے کہا "کیا تمہیں کوئی نہیں پہچان سکتا۔"

"خیر غلطی کسی کی نہیں۔ یہ کھیل ہے تقدیر کا۔ اب تم کسی طرح نیچے تک جا کے دیکھو۔ کیا لاؤنج میں واقعی وہ حرام زادہ بیٹھا ہے؟"

"اور بیٹھا ہو تو کیا کروں؟"

"بھئی یا تو اس سے مل لو اور پھر جو اللہ کو منظور" میں نے آہ بھر کے کہا "یا پھر کسی طرح اس کی آنکھوں میں دھول جھونک کے نکل آؤ۔ غائب ہو جاؤ وہاں سے ایسے۔۔۔۔ جیسے کبھی وہاں تھیں ہی نہیں۔"

"مجھے جادو نہیں آتا۔ اور میں کھڑکی سے سیدھا سڑک پر بھی نہیں کود سکتی۔"

میں نے کہا "کوشش تو کرو۔ زیادہ سے زیادہ فوت ہو جاؤ گی تم۔

شہید وفا کہلاؤگی ورنہ ایک آدھ ٹانگ ٹوٹے گی تو لنگڑی محبوبہ۔"

"سکندر۔ خدا کے لیے مجھے پریشان مت کرو۔ میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔"

میں نے کہا "کیا خوب فرمایا ہے اس موقع کے لیے فلمی شاعر نے کہ۔ مجھ کو اس رات کی تنہائی میں آواز نہ دو۔ میں پریشاں ہوں مجھے اور پریشاں نہ کرو۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے مس رابعہ کہ تم برقع میں روپوش ہو کے نکل آؤ۔"

"یہ اتنا آسان کام ہوتا تو میں تم سے کہتی۔ سب سے پہلے تو مجھے منیجر سے کہنا پڑے گا کہ میرا بل بھیج دو۔ میں جارہی ہوں' اس کے بعد میں نکلی برقع میں تو کیا اسے شک نہیں ہوگا؟ میں آئی تھی برقع میں پھر تمہارے ساتھ بے پردہ پھرتی رہی اور اب کوئی پوچھ رہا ہے تو میں فوراً ہوٹل چھوڑ کے جارہی ہوں۔ پھر برقع میں۔"

"اتنا رسک تو تمہیں لینا پڑے گا۔ بس تم باہر آجاؤ۔ پھر کوئی مسئلہ نہیں۔ میں تمہیں یوں لے جاؤں گا کہ دیکھنے والے دیکھتے رہ جائیں گے۔"

"نہیں سکندر۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ دلاور میرے پیچھے لگ جائے گا اور اس نے مجھے قابو کرلیا گن پوائنٹ پر.... تو تم بھی کچھ نہیں کرسکو گے۔"

میں نے کہا "یہ بات واقعی قابل غور ہے۔ تم کسی ویٹر سے مدد لے سکتی ہو۔ اس کے ہاتھ پر رکھو پانچ سو ہزار روپے اور اس سے کہو کہ اپنی وردی دے دو۔"

"اپنا مردانہ چہرہ بھی دے دے۔"

میں نے کہا "پھر وہی ہزار واٹ کے بلب جیسے' نگاہوں کو خیرہ کرنے والے چہرے کا مسئلہ۔ تم کسی سے پوچھو کہ باہر جانے کا کوئی دوسرا راستہ بھی ہے؟ اگر وہ تمہیں اس خفیہ چور دروازے سے عقبی گلی میں نکال دے۔"

"سکندر یہ ناممکن ہے۔ ہوٹل والے خود ایسے راستے نہیں رکھتے ورنہ مسافر بل ادا کیے بغیر فرار ہوجائیں۔"

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "اچھا.... پھر میں تمہاری فریاد پر لبیک کہتا ہوں اور جیسے محمد بن قاسم شمشیر بکف سندھ پر حملہ آور ہوا تھا ایسے ہی ہوٹل پہنچتا ہوں یا جیبی۔ ویسے تو میری شکل مبارک بہت بدل چکی ہے اور میں تم کو بھی چھیڑوں تو تم چلانے لگوگی کہ چل حرامی' ماں بہن نہیں ہیں گھر میں۔ لیکن دلاور کی آنکھوں میں سکندر بخت کو پہچاننے کے لیے خصوصی لینز فٹ ہیں یا وہ میرے اتنے بہروپ دیکھ چکا ہے کہ اب ہر روپ میں مجھے شناخت کرسکتا ہے۔ تم جہاں ہو وہیں میرا انتظار کرو۔"

"کتنی دیر میں آرہے ہو تم؟"

"یہ بتانا مشکل ہے لیکن ایک نہ ایک دن میں ضرور آؤں گا۔ بینڈ باجے کے ساتھ۔ مکھڑے پہ سہرا ڈالے' گھوڑے پر سوار۔ پھر یہ ظالم سماج میری راہ میں دیوار نہیں بن سکے گا۔ آندھی طوفان اور زلزلہ میرا راستہ نہیں روک سکیں گے۔"

یہ سب باتیں میں نے رابعہ کا حوصلہ بڑھانے کے لیے کی تھیں۔ حقیقت یہ تھی کہ اس نے مجھے اپنی کم ہمتی سے مایوس کیا تھا۔ اگر اس وقت میں غلطی سے بھی کہہ دیتا کہ تم بس عدالت میں قانونی وکیلوں کی جنگ لڑسکتی ہو۔ نازو ہوتی تو سارے ہوٹل کو تباہ کرکے نکل آتی۔ تو رابعہ اتنی خفا ہوتی کہ بعد میں اسے منانا مشکل ہوتا۔ تریا ہٹ یعنی عورت کی ضد کا کیا علاج۔ اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اب میرا ساتھ نہیں چھوڑے گی خواہ اِدھر کی دنیا اُدھر ہوجائے۔

میں ہوٹل سے کچھ فاصلے پر رُک گیا اور صورتِ حال کا جائزہ لینے لگا۔ رات کے ساڑھے گیارہ بج چکے تھے۔ کیا آدھی رات کے وقت بھی چوہدری دلاور ہال میں بیٹھا ہوگا بے شک وہ ڈھیٹ آدمی ہے مگر ہوٹل والے بھی ڈائننگ ہال رات بھر کھلا نہیں رکھتے اور کسی کو ساری رات لاؤنج میں بیٹھنے کی اجازت کیسے دے سکتے ہیں۔ کچھ دیر میں بارہ بج جائیں گے تو لاؤنج کی لائٹس بھی آف ہوجائیں گی۔ صرف باہر پورچ کی روشنی رہ جائے گی جہاں چوکیدار بندوق لیے کرسی پر بیٹھا رہتا ہے۔ یا پھر کاؤنٹر کے پیچھے کرسی پر سونے والے منیجر کے لیے ایک لائٹ جلتی رہتی ہے۔

یہ سوال اپنی جگہ میرے ذہن میں موجود تھا کہ آخر چوہدری دلاور یہاں پہنچا کیسے؟ اب اس کا سب سے آسان جواب یہی تھا کہ اس نے اندازے کی بنیاد پر کراچی کا رُخ کیا کہ ہم کہیں اور نہیں جاسکتے۔ ہم اس کی توقعات کے عین مطابق اتنے ہی احمق ثابت ہوئے جتنا اس نے سمجھا تھا اور یہ ہماری بدقسمتی یا اس کی خوش قسمتی کہ اتنے بڑے شہر میں اس نے گل و بلبل کی جوڑی کو دیکھ لیا۔

پھر مجھے ایک اور خیال آیا۔ کہیں وہ اکرام شیخ کے گھر تو نہیں پہنچا تھا؟ ممکن ہے اس نے اکرام شیخ یا کاجل کو فون کیا ہو۔ اکرام شیخ تو سب کی آواز شاید اب بھی فون پر سُنتے تو پہچان لے مگر کاجل کیسے سمجھ سکتی ہے کہ فون کرنے والا منظر ہی ہے یا وقار یوسف ہی ہے۔ منظر کی اسٹائل کو کاپی کرنا تو بہت آسان ہوگا۔ بھئی کاجل' کہاں ہے وہ بھوتنی کا سکندر اعظم کی اولاد۔ تمہارے ڈبل ایس آئی شیخ شوہر کو ضرور معلوم ہوگا کہ لیلیٰ مجنوں کہاں ٹھہرے ہیں۔ تمہارے در پر بھی آئے ہوں گے صدا لگانے اور کاجل ضرور بتادے گی۔

نہ جانے کیوں مجھے یقین آگیا کہ ایسا ہی ہوا ہوگا۔ اکرام شیخ اور کاجل کی بے مروتی دیکھنے کے بعد یہ بعید از قیاس بھی نہیں لگتا تھا کہ خود کو دلاور کے عتاب سے بچانے کے لیے انہوں نے اسے ہمارے ہوٹل کا پتا دے دیا ہو۔ وہ اب ہمارے معاملات میں پڑنا تو دور کی بات ہے شاید ہم سے ملنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے۔

رابعہ تک پہنچنے کا ایک طریقہ تو یہ تھا کہ میں سیدھا اندر جاؤں اور اپنے کسی نئے نام سے کوئی کمرا حاصل کرلوں۔ اس طرح میں یہ بھی دیکھ سکتا تھا کہ چوہدری دلاور ابھی تک میری واپسی کی راہ دیکھ

رہا ہے یا نہیں۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ خود اس نے کسی فرضی نام سے ہوٹل میں کمرا لے کر اپنا ڈیرا جمالیا ہو۔ کمرا خالی ہوگا تو اسے بھی مل گیا ہوگا اور مجھے بھی مل جائے گا۔

اچانک اوپر والی وہی کھڑکی کھلی جس سے گزشتہ شب میں نے ایک چور ویٹر کو جھانکتے دیکھا تھا۔ مجھے رابعہ کے بدحواس چہرے کی ایک جھلک نظر آئی۔ پھر اس سے پہلے کہ میں اسے اشارہ کرکے کمانڈو فورس پہنچ جانے کی خوش خبری دیتا وہ کھڑکی بند ہوگئی۔

یہ بھی اچھا ہی ہوا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ ورنہ میں اشارہ اسے کرتا اور دیکھ لیتا چوہدری دلاور تو زیادہ خرابی ہوتی۔ اب میرے لیے اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ ہوٹل کے اندر قدم رنجہ فرما کے منیجر سے کوئی کمرا حاصل کرنے کی درخواست کروں۔ میں اس سے براہِ راست یہ سوال تو نہیں کرسکتا تھا کہ ابھی کوئی چوہدری دلاور نام کا شخص آیا تھا جو سکندر بخت یا رابعہ کا پتا پوچھ رہا تھا؟ الٹا وہ مجھ سے سوال کرتا کہ آپ کو کیسے الہام ہوا جناب۔ پھر میرے لیے بغلیں جھانکنا ضروری ہوتا۔

میں نے لاؤنج میں داخل ہوکے دیکھا تو وہاں کا منظر وہی تھا۔ تمام لائٹس آف تھیں۔ ایک بینچ پر ویٹر محوِ خواب تھا اور کاؤنٹر کے پیچھے مالک اونگھ رہا تھا۔ وہاں کسی چوہدری دلاور کا وجود نہیں تھا۔ یہ بات بھی مجھے عجیب سی لگی کہ ہوٹل کا مالک رات کو خود موجود ہوتا تھا اور دن میں اس کا ملازم منیجر۔ رات کو صرف اُلو' چور' چوکیدار اور اخبار والے جاگتے ہیں۔

میری بات پر اس نے کہا "کمرے تو بہت ہیں جی۔ بس خالی کوئی نہیں ہے۔"

میں نے کہا "ابھی کچھ دیر پہلے فون کیا تھا میں نے۔ اس وقت خالی تھا ایک کمرا؟"

"اس وقت دو کمرے خالی تھے" وہ بولا "آپ ان سے پہلے پہنچ جاتے تو.... خیر' اب آپ جاسکتے ہیں مولانا۔"

میں نے جاتے جاتے رُک کے کہا "جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔ آپ ہی اس ہوٹل کے مالک ہیں جو رات کی ڈیوٹی دیتے ہیں۔"

اس نے چونک کے کہا "بات تو سولہ آنے ٹھیک ہے مولوی صاحب۔"

میں نے کہا "کوئی سال بھر پہلے میں نے قیام کیا تھا۔ کمرا نمبر چار سو بیس میں۔ اور یہ بات پوچھی تھی تو آپ ناراض ہوگئے تھے کہ کیا آپ صحافی تھے؟"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "اب سُن لو جناب۔ اپنی جو گھر والی ہے نا۔ وہ ہے صحافی' اس کی ڈیوٹی ہوتی ہے رات کو۔ تو ہم نے کہا کہ اب ہم سوئیں رات کو اور تم سوتی رہو دن بھر۔ ایسے تو نکاح ٹوٹ جائے گا۔ زندگی کی گاڑی کا ایک پہیہ دن میں چلے ایک رات کو۔ تو خانہ آبادی کیسے بڑھے گی۔ اب یا تو تم چھوڑ دو صحافت کو یا میں بیچ دوں ہوٹل کو۔ مجھے بھی نوکری دلادو اخبار میں یا پھر ہم دوبارہ شادی کریں۔ کسی اور سے.... یہ سب ناممکن تھا۔ ہم جاہل اخبار میں صرف چپراسی ہوسکتے تھے۔ اس میں بیوی کی بے عزتی خراب ہوتی۔ وہ صحافت نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ شادی سے پہلے ہی شرط منظور کرلی تھی میں نے۔ میں ہوٹل بیچ دیتا تو ساری عیاشی ختم ہوجاتی۔ اصل آمدنی ہوٹل سے ہے۔ صحافت سے نہیں۔ اور وہ تو بالکل ہی ناممکن تھا۔ ایک دوسرے کو چھوڑنا۔ چنانچہ جناب میں نے اس کا یہ حل نکالا کہ اب خود بھی رات کو جاگتا ہوں۔ دن میں ہم ایک ساتھ سوتے ہیں۔ ہمارے لیے وہ رات ہے جو دنیا کے لیے دن ہے۔"

میں نے کہا "بُرا نہ مانیں تو ایک سوال...."

"یہی نا کہ کیا میری مت ماری گئی تھی۔ تو جواب یہ ہے کہ ہاں۔ ہر بندے کی مت ماری جاتی ہے تو وہ ایسا ہی کرتا ہے ورنہ میں تھا باڈی بلڈر۔ مسٹر لاہور بننے کا شوق تھا۔ بس ایک دن اس نے میرا انٹرویو لیا۔ انٹرویو کیا لیا سب کچھ لے لیا۔ وہ میری باڈی پر عاشق ہوگئی تھی' میں اس کی باڈی پر۔ صورت میری بھی ایسی تھی اور اس کی بھی مگر رب نے ملائی جوڑی" اس نے اوپر آسمان کی طرف انگلی اٹھائی "آپ اس گلی میں دوسرے ہوٹل دیکھ لو۔ کہیں نہ کہیں جگہ مل جائے گی مولانا صاحب۔"

میں نے اس کے قیمتی مشورے کو گرہ میں باندھ لیا اور پھر باہر آگیا۔ اب مجھے رابعہ کی طرف سے باقاعدہ تشویش لاحق ہورہی تھی۔ وہ میرے انتظار میں صرف پریشان ہوسکتی تھی اور پریشان آدمی سے کوئی بھی حماقت سرزد ہوسکتی ہے۔ میں چاہتا تھا کہ ہیروئن پھر بالائے بام آئے اور دریچہ وا ہو تو میں اسے فوراً اشارے سے سمجھادوں کہ ہیرو آگیا ہے۔ فکر کی کوئی بات نہیں مگر میں سڑک پر منہ اوپر اُٹھائے کھڑا نہیں رہ سکتا تھا۔

میں نے اسے دوبارہ فون کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ اسے قیامت تک انتظار کرنے والا شعر سُناؤں مگر مشکل یہ تھی کہ اِدھر اُدھر کی ساری دکانیں ہوٹل' بازار سب بند ہوگئے تھے۔ آگے ایک ہوٹل میں مجھے ٹال دیا گیا کہ فون خراب ہے۔ دوسرے ہوٹل میں فون واقعی خراب تھا۔ میں جھنجلاہٹ میں باہر آیا ہی تھا کہ ہر طرف اندھیرا چھاگیا۔ لائٹ چلی گئی تھی اور سڑکوں پر روشنی تک بجھ گئی تھی۔ دو ہوٹلوں نے اپنے جنریٹر اسٹارٹ کیے مگر باقی سڑک پر تمام عمارات تاریکی میں ڈوبی رہیں۔ ایک شخص اوپر والے فلیٹ کے زینے سے اُترا اور تھڑے پر بیٹھ کے سگریٹ پیتے ہوئے اس نے مجھے مخاطب کیا۔ "زندگی عذاب کردی ہے سب نے مل کے۔ فون ٹھیک ہوا تو بجلی خراب۔ دو دن سے پانی نہیں آیا۔ گیس کا پریشر ہی نہیں۔ بل ایک مہینے نہ دو تو فوراً کاٹ دیتے ہیں۔ دن بھر کام کرو گدھے کی طرح رات کو سونا مشکل...." وہ دل کی بھڑاس نکالنا چاہتا تھا چنانچہ ہر جملے میں مختلف محکموں سمیت حکومت کے لیے بھی پسندیدہ گالیوں سے ہر جملے میں موتی پرو رہا تھا۔

میں نے بھی دردناک لہجے میں کہا "ہم غریبوں کی بھی کوئی

زندگی ہے۔ اتنی دیر سے بیوی تڑپ رہی ہے۔ میں فون کرنے کے لیے بھٹک رہا ہوں‘ کسی ڈاکٹر کو بلانا تھا۔"

وہ ایک دم موم ہوگیا۔ "فون کرنا ہے۔ اوپر آجاؤ‘ کیا ہوا ہے بیوی کو؟"

میں نے آواز میں مزید رقت پیدا کی "اللہ ہی جانے۔ لوٹن کبوتر ہورہی ہے۔"

"پہلے بھی ایسا ہوا ہے کبھی؟"

"ہاں۔ میری ساس کے ساتھ ہوا تھا۔ صبح تک اوپر چلی گئی تھیں۔ ڈاکٹر کے آنے میں دیر ہوگئی تھی۔"

"صوفی صاحب۔ میرا مطلب تھا بیوی کے ساتھ؟"

"نہیں۔ اسی لیے تو ڈرتا ہوں بھائی کہ تاریخ اپنے آپ کو نہ دُہرائے؟"

وہ شریف اور رقیق القلب آدمی تھا۔ اس نے مجھے فون کے سامنے بٹھادیا اور خود کھڑکیاں کھولنے لگا۔ مختصر سے فلیٹ میں سخت گھٹن تھی اور کھڑکیاں کھولنے کے باوجود اس میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ اس نے کہا "ہوا کدھر سے آئے گی۔ ہر طرف تو پہاڑ کھڑے کردیے ہیں۔ عمارت سے عمارت جوڑدی ہے۔"

مجھے اتنی دیر میں کمرا نمبر چار سو بیس مانگنے کا موقع مل گیا تھا۔ ورنہ وہ نہ جانے کیا سمجھتا "رابعہ۔ ہاں‘ دیکھو فکر کی کوئی بات نہیں۔ میں آتا ہوں ابھی۔ کچھ نہ کچھ ضرور ہوجائے گا۔ نہیں تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ میں پوری کوشش کررہا ہوں۔ نہیں‘ وہ تو نہیں ملا۔ کیا معلوم‘ ممکن ہے وہ وہیں ہو کسی کمرے میں‘ گھبراؤ مت۔"

فلیٹ میں رہنے والے نے مجھے غور سے دیکھا "تم نے اپنے گھر فون کیا تھا؟"

میں نے کہا "ہاں۔ اپنی بیوی کو۔"

"پھر اپنے گھر سے ڈاکٹر کو فون کیوں نہیں کیا تھا صوفی صاحب!"

میں نے کہا "فون خراب ہے۔ کال آرہی ہے۔ نمبر ڈائل نہیں ہوتا۔"

"اچھا اچھا۔ ایک بار میرا فون بھی ون وے ہوگیا تھا۔ بس جی خرابی ہی خرابی ہے۔ وہ بھی ہماری قسمت میں..."

میں نے کہا "کیا بات ہے۔ اس فلیٹ میں نہ سامان ہے‘ نہ کوئی اور...؟"

"فلیٹ خالی کردیا ہے میں نے۔ یہاں کوئی رہ سکتا ہے؟ بیوی بچوں کو کرائے کے مکان میں شفٹ کردیا ہے۔ خود یہاں آجاتا ہوں کبھی کبھی۔ جب تک فلیٹ بک نہیں جاتا۔"

میں نے سوچ کے کہا "بات ہوئی ہے کسی سے؟"

"ہاں۔ خریدار تو مفت لینا چاہتے ہیں۔ میں بائیس ہزار سے ایک ٹیڈی پائی کم نہیں لوں گا۔"

میں نے کہا "دیکھو۔ بیس میں بات کرتے ہو تو ابھی بیعانہ لو۔ صبح پوری رقم کی ادائیگی۔ بولو منظور ہے۔"

وہ بھونچکا رہ گیا۔ اس کے خواب وخیال میں بھی نہیں تھا کہ آدھی رات کے وقت بجلی چلی جائے گی اور ایک گاہک آجائے گا۔ "منظور!" اس نے یوں کہا جیسے دیر کی تو سامنے والا شخص دھواں بن کے فضا میں تحلیل ہوجائے گا۔ یہ ناقابلِ یقین سی بات تھی کہ ایک فون کال کرنے والا فلیٹ مع فون خریدے۔ خود میں کب سوچ سکتا تھا کہ اگلے لمحے میں اتنا بڑا فیصلہ کرلوں گا لیکن اس وقت مجھے یہ سب کچھ اتنا حیران کن نہیں بلکہ انتظامِ غیب لگا۔ بجلی کا جانا دو ضرورت مندوں کی ضرورت پوری ہونے کا بہانہ تھا۔

میری جیب میں پندرہ سو روپے تھے۔ اسے میں نے ایک ہزار پیش کردیے جو اس نے بڑی خوشی خوشی قبول کرلیے۔ میں نے اس سے رسید بھی نہیں مانگی۔

"صوفی صاحب‘ باقی کب‘ بینک کھلنے کے بعد؟"

"تم بینک کھلنے سے پہلے لو یار" میں نے بے تکلفی سے کہا۔

"سیل ڈیڈ بنواؤ گے یا..."

میں نے کہا "صبح سب ہوجائے گا۔ میں نو بجے آؤں گا بیوی کے ساتھ۔"

نیچے اُتر کے میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ چلو ایسا مکان تو ہوا جس کا پتا دلاور کے باپ کو نہیں۔ اب یہاں میں ایک سال بھی گزار لوں تو کسی کو معلوم نہیں ہوسکتا۔ رابعہ تو برقع میں محفوظ ہے اور میرا یہ نیا حُلیہ سب سے بہتر ہے۔ اس چھوٹے سے فلیٹ میں رہنے والوں پر شک بھی کون کرسکتا ہے۔ مسئلہ صرف رابعہ کو دلاور کی نظر سے بچا کے یہاں لانے کا تھا۔

میں نیچے اتر کے آیا تو ابھی تک بجلی کا بریک ڈاؤن چل رہا تھا۔ مجھے بجلی کمپنی کی ایک گاڑی نظر آئی جس کا ڈرائیور نیچے کھڑا ہوا تھا۔ ایک الیکٹریشن ٹرک کے پچھلے حصے میں نصب بلند ہوجانے والی سیڑھی پر چڑھا ہوا کھمبے کے تاروں کو دیکھ رہا تھا اور ایک پی ایم ٹی کو چیک کررہا تھا۔ اسے دیکھ کے میرے ذہن میں ایک ایسا خیال آیا جو بادی النظر میں قابلِ عمل نہیں لگتا تھا مگر کسی بھی کام میں ہاتھ ڈالتے ہوئے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اس کے دو نتائج ممکن ہیں۔ کامیابی یا ناکامی۔ کامیابی کا تناسب زیادہ ہونے کی صورت میں کوشش نہ کرنے سے کوشش کرنا بہرحال بہتر ہوتا ہے۔

ڈرائیور منہ اُٹھائے اوپر دیکھ رہا تھا۔ "ابے کیا ہوگیا۔ اتنی دیر لگادی۔"

اوپر سے الیکٹریشن نے جواب دیا "تجھے بہت جلدی ہے گھر جانے کی تو جا۔ میں خود ہی گاڑی چلالوں گا۔"

"جیسے پہلے چلائی تھی" ڈرائیور نے برہمی سے کہا تھا اور اسے ایک گالی دی۔

الیکٹریشن نیچے اُتر آیا "بس یار‘ ہونے والی بات ہوجاتی ہے ورنہ میں بھی ڈرائیوری کرلیتا ہوں۔ تُو جانتا ہے کہ بجلی کمپنی کی نوکری تو پارٹ ٹائم ہے۔"

"وہ سب معلوم ہے مجھے لیکن اب ایسے نہیں چلے گا۔ میری آدھی تنخواہ کٹ جاتی ہے اور تو نے اس مہینے پھر کچھ نہیں دیا ہے۔"

"دوں گا یار۔"

"ایسی کی تیسی میں گئی یاری۔ میرے گھر میں فاقے پڑ رہے ہیں۔"

الیکٹریشن منت کرنے لگا "بس اوور ٹائم مل جائے اس مہینے کا۔"

"پچھلے مہینے بھی تُو نے یہی کہا تھا لیکن اوور ٹائم وصول کرتے ہی نکل گیا تھا۔"

"یار تو میرے حالات سے واقف ہے۔ پھر بھی ایسی بات کرتا ہے۔" الیکٹریشن بھی غصے میں آگیا۔

"تیرے حالات تو خراب تھے‘ خانہ خراب ہوگیا میرا..."

بات بڑھ گئی اور میں دخل اندازی نہ کرتا تو اشتعال کی کیفیت میں کچھ بھی ہوجاتا۔ وہ ایک دوسرے کے کپڑے پھاڑ دیتے یا سر۔ میں حلیے سے سخت پابندِ شرع قسم کا پکا مولوی نظر آتا تھا۔ میری داڑھی بالشت بھر لمبی تھی اور سر پر وہ پگڑی جو عموماً دینی مدارس کے طلبا یا اساتذہ باندھتے ہیں۔ میری شلوار بھی ٹخنوں سے اوپر تھی اور میں نے لٹھے کا بند گلے والا کرتہ پہن رکھا تھا۔ جو عینک میں نے لگا رکھی تھی اس کا کوئی نمبر نہیں تھا مگر سیاہ فریم سے ایسا لگتا تھا کہ میری نظر خاصی کمزور ہے۔

میں نے بیچ میں پڑتے ہوئے کہا "کیا بات ہے۔ آدھی رات کے وقت گلی میں کتے لڑتے ہیں۔ تم انسان ہو۔"

ڈرائیور نے کہا "آپ اپنا کام کریں مولوی صاحب۔ یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے۔" الیکٹریشن نے مجھے امداد طلب نظروں سے دیکھا مگر بولا نہیں۔

میں نے کہا "حکم ہے کہ دو مومن بھائی آمادۂ فساد ہوں تو ان کے درمیان صلح کرادو۔"

الیکٹریشن نے کہا "آپ اسے سمجھائیں۔"

ڈرائیور گرم ہوگیا "اس میں سمجھنے سمجھانے والی کون سی بات ہے۔ تو ماں کا زیور بیچ یا بیوی کا۔ مجھے میرے پیسے چاہئیں۔"

"تیرے پیسے!" الیکٹریشن نے تلخی سے کہا "ادھار دیا تھا تُو نے مجھے۔ انکار کردوں میں تو کیا کرے گا تُو... بول‘ تھانے جائے گا؟ کیس کرے گا مجھ پر؟"

ڈرائیور نے اس کے گریبان پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی "بتاؤں‘ میں کیا کروں گا... تیری تو..."

میں نے الیکٹریشن کو بچالیا "دیکھو‘ یہ مسئلے کسی کی عزت پر ہاتھ ڈالنے سے یا کسی کی جان لینے سے حل نہیں ہوتے۔ اس طرح مسائل بڑھ جاتے ہیں۔ تم مجھے بتاؤ‘ شاید میں تمہاری مدد کرسکوں۔ ویسے تو سب کا مشکل کشا وہی ایک اللہ ہے۔"

الیکٹریشن نے کہا "مولوی صاحب۔ یہ میری شرافت ہے... ورنہ..."

ڈرائیور نے کہا "ورنہ کیا... بیٹا میں قبر تک پیچھا چھوڑنے والا نہیں ہوں۔ دیکھو جی مولوی صاحب‘ میں غریب آدمی ہوں۔ کمپنی میں ڈرائیوری کرتا ہوں۔ تنخواہ بہت کم ہے گزارے کے لیے۔ تھوڑی بہت اوپر کی آمدنی نہ ہو تو گزارا مشکل کیا‘ ناممکن ہوجائے۔ اس کے لیے اوور ٹائم کرتے ہیں۔ آپ دیکھ لو کہ اس وقت بھی کام کررہے ہیں۔ اللہ معاف کرے‘ ہم مجبور لوگ ہیں مگر افسر بھی حصہ وصول کیے بغیر چھوڑتے نہیں۔ ہیرا پھیری سے سو روپے ملتے ہیں تو ہمارے حصے میں پچاس ہی آتے ہیں۔"

الیکٹریشن نے تائید میں سرہلایا "اوپر والے کچھ کیے بغیر آدھے لے جاتے ہیں نگران کی مرضی کے بغیر کچھ ہو بھی نہیں سکتا۔"

میں نے کہا "تم محنت سے اوور ٹائم کمارہے ہو۔ اس میں افسران کون ہوتے ہیں حصہ مانگنے والے۔"

الیکٹریشن نے کہا "آپ نہیں جانتے مولوی صاحب۔ ایسے دھندے میں سب کو شامل کرنا پڑتا ہے۔ اوور ٹائم بنتا نہیں۔ بنایا جاتا ہے۔ ہر انجینئر کا اپنا علاقہ ہے۔ تھانے دار کی طرح وہ بھی ماہانہ بھتا وصول کرتا ہے۔"

میں نے حیرانی سے کہا "کس بات کا بھتا؟"

"بجلی سپلائی کرنے کا۔"

میں نے کہا "اس کا تو بِل آتا ہے۔"

"بھولے شہنشاہ۔ گھر میں بجلی چلی جائے تو نیند حرام ہوجاتی ہے۔ ریڈیو ٹی وی فریج سب بند ہوجاتے ہیں۔ کاروباری آدمی کا تو بیڑا غرق ہوجاتا ہے اگر بجلی دو گھنٹے بند رہے۔ ہم بجلی بند نہ کرنے کا بھتا لیتے ہیں۔ گارنٹی دیتے ہیں کہ بریک ڈاؤن نہیں ہوگا اور کارخانہ چلتا رہے گا۔ چھوٹے کارخانے دار کا نقصان سیکڑوں میں ہوتا ہے تو بڑی فیکٹری کے مالک کا ہزاروں میں۔ ہم ان کو نقصان سے بچاتے ہیں۔"

ڈرائیور نے کہا "جتنا نذرانہ وہ ہمیں دیتے ہیں وہ ان کے نقصان کی زکوٰۃ سے بھی کم ہوتا ہے۔ اب تو ہر علاقے کا معاملہ سیٹ ہے۔ مقررہ تاریخ پر کارخانے والے اور دُکان دار خود ہی رقم اکٹھی کرکے پہنچادیتے ہیں۔"

"اور نہ پہنچائیں تو؟" میں نے کہا۔

"تو اگلے دن بریک ڈاؤن۔ جو ایک گھنٹے کا بھی ہوسکتا ہے اور پورے دن کا بھی۔ وہ کرتے رہیں نیچے سے اوپر تک رپورٹ۔ خرابی کا تو ہمیں پتا ہوتا ہے اور ٹھیک بھی ہم ہی کرسکتے ہیں۔ دوسرے علاقے کی گاڑی تو آنہیں سکتی۔"

میں نے کہا "یعنی اس وقت جو ہر طرف اندھیرا ہے اس کے ذمے دار تم ہو۔ تمہیں معلوم ہے کہ خرابی کہاں ہے مگر تم ٹھیک نہیں کررہے ہو؟"

"نہیں مولوی صاحب۔ اس وقت تو واقعی بریک ڈاؤن ہوا ہے اور اسی لیے ہم خوار ہورہے ہیں۔ ورنہ ہم سیدھے وہاں جاتے

ہیں جہاں کوئی تار ڈس کنکٹ ہوتا ہے یا فیوز اُڑا ہوتا ہے۔ دو منٹ میں خرابی دور کرکے گھر جاتے ہیں اور لمبی تان کے سوجاتے ہیں" ڈرائیور نے کہا۔

الیکٹریشن بولا "دیکھو جی خرابی میں دیکھ بھال کے خود پیدا کرتا ہوں۔ ٹھیک بھی میں کرتا ہوں۔ جان کا خطرہ بھی ہے تو میرے لیے۔"

"فضول باتیں مت بنا۔ مولوی صاحب کے بجائے کسی افسر کے سامنے یہ کہنے کی ہمت ہے؟ میں گاڑی نہ چلاؤں تو یہاں سائیکل پر آئے گا تُو؟ اور افسروں کو پیسہ نہ ملے تو کیا وہ رات بارہ بجے تک بیٹھنے دیں گے ہمیں۔ تو بھی دن میں ایک کمپنی کا ٹرک چلاتا ہے اور میں حاضری لگا کے ایک بنگلے پر چوکیداری کرنے چلا جاتا ہوں۔ افسروں کی مرضی کے بغیر یہ ہو سکتا ہے۔"

"تم لوگ دن میں دوسری نوکری کرتے ہو؟ تنخواہ بھی کمپنی سے صرف حاضری لگانے کی لیتے ہو۔" میں نے پُرملامت لہجے میں کہا "مگر قصور تمہارا نہیں۔ حکومت نے مہنگائی کو آسمان پر پہنچا دیا ہے۔ غریب آدمی کا جینا مشکل کردیا ہے۔"

"اللہ خوش رکھے" ڈرائیور بولا "ہم مجبوری میں حرام کھاتے ہیں۔ دن میں خرابی کی رپورٹ آتی ہے مگر ہم ٹھیک کرنے نکلتے ہیں رات بارہ بجے۔ اس سے پہلے ڈبل اوور ٹائم نہیں بنتا۔ دن میں فرضی شکایات دور کرتے ہیں۔ شکایات کے رجسٹر میں رپورٹ لکھنے والے کو بھی حصہ ملتا ہے۔ وہ دن بھر میں دس اصلی رپورٹیں لکھتا ہے تو نوّے جعلی۔ نوّے فرضی خرابیاں دور کرنے کے لیے ہم دن بھر گاڑی لے کر پھرتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ گاڑی کام آتی ہے افسروں کے ذاتی کام کے لیے اور ہم کرتے ہیں دوسری نوکری۔ اصل خرابی تو گھنٹے دو گھنٹے میں ٹھیک ہو جاتی ہے۔ پھر گھر جا کے سو جاتے ہیں۔"

"کبھی زیادہ ٹائم بھی لگ جاتا ہے۔" الیکٹریشن نے کہا۔

"ہاں۔ بارش کے موسم میں یا آندھی طوفان آنے کے بعد۔"

میں نے کہا "کیا یہ دُکان دار اور کارخانے والے احتجاج نہیں کرتے؟"

"کرتے ہیں مگر اس سے بریک ڈاؤن تو ٹھیک نہیں ہوتا" الیکٹریشن ہنسا "کبھی کبھی اخبار میں بیان دے دیتے ہیں مگر دو چار دن بعد بھگت لیتے ہیں۔ اب بیٹھے رہیں ہاتھ پر ہاتھ رکھے۔ کسی کا باپ نہیں جان سکتا کہ خرابی کیا ہے اور کہاں ہے۔ پی ایم ٹی میں 'سب اسٹیشن میں' فیڈر میں یا گرڈ اسٹیشن پر۔ ہم جانتے ہیں اس لیے یوں ٹھیک کردیتے ہیں چٹکی بجاتے میں۔"

ڈرائیور نے کہا "مجھے کل پیسے چاہئیں۔"

"کل....؟ تیرا دماغ خراب ہے۔"

میں نے کہا "بھئی یہ جھگڑا کیا ہے آخر....؟"

ڈرائیور نے کہا "اجی مولوی صاحب' اس کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ یہ بیوی کو گھمانے لے جاتا تھا اس گاڑی میں۔ رات کو گاڑی اپنے پاس رکھتا تھا۔ خرابی ٹھیک کرنے بھی خود ہی چلا جاتا تھا۔ سالے نے مستی میں گاڑی ٹھوک دی ایک کھمبے میں۔"

"مستی کیا.... غلطی ہو گئی.... ورنہ میں پکا ڈرائیور ہوں۔"

"بکواس مت کر۔ تو نے بتایا تھا کہ گاڑی چلاتے ہوئے تُو نے بیوی سے چھیڑ چھاڑ کرنے کی کوشش کی تھی۔ گاڑی کا بیڑا غرق ہوا۔ کھمبا گر گیا اور تاریں ٹوٹ گئیں۔ انکوائری ہوئی تو الزام مجھ پر آگیا۔ میں کیسے کہتا کہ گاڑی کوئی اور چلا رہا تھا۔ گاڑی میرے چارج پر ہے اور وہ وقت تھا اوور ٹائم ڈیوٹی کا۔ اس حرامی سے پوچھو کہ رات بارہ بجے کے بعد کام کے ٹائم پر بیوی کا کیا کام؟"

الیکٹریشن نے خفت سے سر کھجایا "میں نے بتایا تھا تجھے کہ ہم آخری شو دیکھ کے نکلے تھے۔ سوچا دو چار فالٹ ہیں۔ وہ دور کرکے ہی گھر جائیں گے۔"

"اور فلم دیکھ کے کچھ زیادہ ہی دماغ خراب ہوگیا تھا۔ سارا نقصان میرے کھاتے میں ڈال دیا گیا۔ اللہ کا شکر ہے کہ نوکری بچ گئی۔ میں نے جھوٹ بول دیا تھا کہ ایک سائیکل والے کو بچانے کی کوشش میں حادثہ ہوگیا مگر گواہ ثبوت کوئی نہیں تھا اور ادھر کوئی فالٹ رپورٹ بھی نہیں تھی۔ دس ہزار کا نقصان مجھے ایک سال میں پورا کرنا ہے۔ ہزار روپے ہر مہینے دیتا ہوں تو بجلی کمپنی سے کچھ بھی نہیں ملتا۔ صرف چوکیداری کی تنخواہ میں گھر نہیں چلتا۔ نقصان اس نے کیا تھا' یہ پورا کرے' میں نے اس کے ساتھ بھلائی کی تھی۔"

"میں کب انکار کرتا ہوں مگر میں ہزار کہاں سے لاؤں ہر مہینے۔ بیوی الگ بیمار ہے۔"

"خاک بیمار ہے۔ تُو نے بیمار کیا ہے اسے۔ بچہ جنے گی تو خرچہ کمپنی دے گی۔" ڈرائیور بولا "تم ابھی دو ہو۔ میرے تو پانچ بچے ہیں لیکن تمہیں سیر سپاٹے جو کرنے ہیں۔"

"آدھے تو میں نے دے دیے۔ اور کیا چاہیے۔"

"باقی آدھے کیا تیرا باپ دے گا؟"

"باپ تک مت جا۔ میں نہیں دیتا' جو کرنا ہے کرلے۔"

میں نے پھر انہیں روکا "دیکھو۔ صرف پانچ ہزار کی بات ہے نا۔ چلو میں ادا کردیتا ہوں۔ صبح مجھ سے لے لینا اور کمپنی میں جمع کرادینا اکٹھے۔ اِدھر اُدھر مت اڑانا۔"

وہ ایک دم خاموش ہو کے میری صورت دیکھنے لگے "آپ دو گے پانچ ہزار۔ آخر کیوں؟"

"بس اللہ نے مجھے توفیق دی ہے تو اچھا ہے تمہاری مشکل آسان ہو جائے اور تم خون خرابے سے بچ جاؤ۔"

الیکٹریشن بولا "توفیق تو خدا نے ہر سیٹھ کو دی ہے۔"

ڈرائیور بولا "آخر آپ کون ہو؟ کیا کرتے ہو مولوی صاحب۔ کسی مسجد کا چندہ دے رہے ہو؟"

میں نے کہا "لعنت ہزار بار مسجد کے نام پر چندے کھانے والوں پر۔ یہ میرا پیسہ ہے۔ اور سچی بات یہ ہے کہ میں بھی تم پر کوئی احسان نہیں کررہا ہوں۔ تم نے مجھے سچ سچ بتادیا تو میرا بھی فرض بنتا ہے کہ تم سے کچھ نہ چھپاؤں۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"

انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر الیکٹریشن بولا "کوئی ایسا ویسا کام ہے مولانا صاحب؟"

"لاحول ولا قوۃ۔ ایسے ویسے کام سے تمہاری کیا مراد ہے آخر۔ خدانخواستہ میں تم سے کسی کا قتل کراؤں گا یا تم سے چرس اسمگل کرنے کو کہوں گا۔"

"پھر پانچ ہزار کس لیے دے رہے ہو؟"

"اس لیے کہ تمہارے سوا میری مدد کوئی نہیں کرسکتا۔" میں نے کہا "مجھے تمہاری یہ سیڑھی چاہیے جو اوپر نیچے ہو جاتی ہے۔ مجھے ایک عمارت کی چوتھی منزل تک پہنچنا ہے۔"

"یہ چوتھی منزل تک نہیں جاسکتی۔ تاروں کی اونچائی دوسری منزل تک ہے۔" ڈرائیور نے کہا "اور چوتھی منزل تک جانے کے لیے زینہ نہیں ہے کیا؟"

"زینہ تو ہے...."

الیکٹریشن کو پانچ ہزار لینے کی جلدی تھی "یار بند ہوگا زینہ یا ٹوٹ گیا ہوگا۔"

"عمارت کہاں ہے؟" ڈرائیور بولا۔

میں نے کہا "اسی گلی میں' ذرا آگے۔ ایک ہوٹل ہے۔"

"ہوٹل...." ڈرائیور چونک پڑا "مولوی صاحب۔ کیوں مرنے اور مروانے کا کام کرتے ہو۔ ہوٹل میں ہروقت لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ گیٹ پر چوکیدار بندوق لیے بیٹھا رہتا ہے۔"

میں نے کہا "تم مجھے ہوٹل کے ساتھ والی بلڈنگ پر پہنچادو۔"

"اس میں بھی لوگ رہتے ہیں۔"

"لوگ اس وقت سو رہے ہیں" میں نے کہا۔

"کسی فلیٹ کی کھڑکی کھلی ہوگی.... یہ بتاؤ کہ مولوی کے بھیس میں تم چور ڈاکو تو نہیں ہو یا کسی کو قتل کرنے کا ارادہ تو نہیں ہے تمہارا؟"

"توبہ توبہ" میں نے دونوں کان پکڑے "تم کہو تو میں قرآن پر ہاتھ رکھ کے یہ کہہ سکتا ہوں کہ میرا ارادہ بالکل مجرمانہ نہیں ہے۔ مجھے تو وہاں سے ایک مصیبت زدہ کو نکالنا ہے۔"

"کون ہے وہ مصیبت زدہ؟" ڈرائیور بولا۔

"ایک عورت...."

وہ اُچھل پڑے "عورت....!"

میں نے کہا "عورت میری بیوی ہے۔"

"کیا ثبوت ہے کہ تم کسی اور کی بیوی کو اغوا نہیں کررہے ہو؟"

میں نے کہا "اغوا ہوتا ہے زور زبردستی سے۔ وہ عورت خود آئے گی' پھر تو تمہیں یقین آجائے گا۔"

"نہیں جی۔ یہ معاملہ گڑبڑ ہے۔ کیا پتا وہ ہوٹل کا بل دیے بغیر بھاگ رہی ہو۔ کوئی ایسی ویسی عورت ہو۔ کسی گاہک کا خون کرکے اس کا مال سمیٹ کر فرار ہونا چاہتی ہو۔"

"بڑے افسوس کی بات ہے۔ میں حلف اُٹھانے کو تیار ہوں اور تم کو میری بات کا پھر بھی اعتبار نہیں۔ کیسے مسلمان ہو تم۔ وہ عورت سخت مصیبت میں ہے۔ اس کی مدد کرنا عین کارِ ثواب ہے۔ ہوٹل میں ایک بدکردار شخص موجود ہے جو اس کو قتل کردے گا۔ وہ سیدھے راستے سے نہیں آسکتی...."

"نہیں مولوی صاحب۔ مجھے تو معاف رکھو" ڈرائیور بولا "تمہاری بات سچ ہے تو پولیس کے پاس جاؤ۔"

"پولیس.... تاکہ سارے زمانے کو پتا چل جائے۔ وہ عورت کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔ تفتیش کے نام پر پولیس مجھے بھی روک لے اور اسے بھی۔ ثبوت مانگے اور پھر ارادۂ قتل رکھنے والا ملزم تو نکل جائے اور بے گناہ پھنس جائیں۔ پولیس شرافت سے کسی شریف آدمی کی مدد کرتی ہے؟ پیسہ خرچ کرکے رسوائی مول لینی ہوتی تو میں ضرور پولیس کے پاس جاتا۔"

"مولوی صاحب کی بات دل کو لگتی ہے" الیکٹریشن بولا۔

"پانچ ہزار کی بات ہے نا۔ تیرے دل کو کیسے نہیں لگے گی مگر مجھے کیا ضرورت ہے ایسے چکر والے کام میں پڑنے کی۔ ساری رقم قرض میں چلی جائے گی۔ تیرا بوجھ اُتر جائے گا۔ مجھے کیا ملے گا۔"

ڈرائیور کی بات میرے دل کو لگی۔ "تم نے ٹھیک کہا۔ تمہیں کیا ملے گا۔ چلو میں پانچ کے دس کردیتا ہوں۔ پانچ بچ جائیں گے۔ وہ تم آدھے آدھے کرلینا۔"

ڈرائیور کا پلہ بھاری تھا۔ وہ اڑ گیا کہ صرف ڈھائی ہزار کے لیے وہ ایسا کوئی کام نہیں کرے گا کہ نوکری بھی جائے اور بندہ تھانے بھی جائے۔ الیکٹریشن پانچ ہزار کو اس لیے غنیمت سمجھ رہا تھا کہ وہ اپنی مجرمانہ غلطی کا قرض بے باق کرتے کرتے پریشان ہوگیا تھا۔ اس کے پاس نئی نویلی بیوی پر خرچ کرنے کے لیے پیسہ نہیں بچ رہا تھا اور ڈرائیور اس پر واضح کرچکا تھا کہ کمپنی کا جرمانہ تو اسے مر کے بھی ادا کرنا پڑے گا۔ میری پیش کش میں اسے اپنے سارے مسائل کا حل نظر آرہا تھا۔ وہ نوجوان تھا اور ابھی اس کے بچے بھی نہیں تھے۔ وہ رسک لینے پر تیار تھا۔ مزاحمت تو ڈرائیور کی بھی کمزور پڑ گئی تھی اور وہ پہلے کی نسبت کم مخالفت کررہا تھا۔

میں نے کہا "دیکھو۔ میرے پاس جو کچھ تھا سب تمہیں پیش کردیا اس سے زیادہ ہوتا تو ضرور دیتا۔ آگے تمہاری مرضی۔ میں شریف آدمی ہوں اور اسی گلی میں رہتا ہوں۔ ادھر اوپر میرا فلیٹ ہے۔ یقین نہیں تو چل کے دیکھ لو۔ یہ دس ہزار کمانے کا موقع گنوادیا تو پھر مصیبت میں پڑے رہو گے اور ایک دوسرے کو پانچ ہزار کی دشمنی میں قتل کردو گے کسی دن۔ خطرہ تو زندگی میں ہر قدم پر آدمی کے ساتھ ہے۔ سڑک پر چلنے میں حادثے کا خطرہ ہے۔ پھر کیا آدمی گھر سے نہ نکلے۔ خطرہ تو سانس لینے میں بھی ہے کہ نہ جانے کب کسی مہلک بیماری کے جراثیم جسم میں داخل ہو جائیں۔ رسک تو لینا ہی پڑتا ہے کامیابی کے لیے۔ ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کرنے کے خبط میں سیکڑوں مر گئے۔ محمد علی کلے بننے سے پہلے نہ نہ

جانے کتنے باکسر مرگئے سر کی چوٹ سے یا مفلوج ہوگئے۔ کھیل میں بھی خطرہ ہے۔"

الیکٹریشن میری عالمانہ تقریر سے سخت متاثر تھا "چلو جی مولوی صاحب۔"

ڈرائیور نے کہا "پہلے ہم دیکھیں گے۔ کام ہو سکتا ہے یا نہیں اور اس کے بعد بھی میری ایک شرط ہے۔ پانچ ہزار میں سے چار میرے۔"

"یہ بڑی ناانصافی ہے۔"

"کیوں ناانصافی ہے۔ تجھے مل رہے ہیں چھ ہزار۔ اب یہ الگ بات ہے کہ اس میں سے تو اپنی غلطی سے ہونے والے نقصان کے پانچ ہزار ادا کرے گا۔ غلطی نہ کرتا تو سارے تیرے ہوتے۔"

الیکٹریشن نے ایک آہ بھری "اچھا یار۔ اللہ کرے آج میری جان چھوٹ جائے تیرے جیسے لیچڑ سے۔ دو نفل شکرانے کے پڑھوں گا۔"

"یہ بھی عہد کرنا کہ آئندہ کبھی گاڑی چلاتے ہوئے، دوبارہ وہ حرکت نہیں کروگے جس سے بجلی کمپنی کی گاڑی تباہ ہو۔ کھمبا گرے، تمہارا سر ٹوٹ جائے یا تمہارا گھر۔" میں نے کہا۔

"اتنی بڑی سزا کے بعد میرے باپ کی توبہ، چلو مولوی صاحب۔"

ڈرائیور پھر شش وپنج میں پڑ گیا "ابے پھر سوچ لے۔ ایسا نہ ہو بعد میں اسی طرح توبہ کرتا پھرے۔"

میں نے کہا "دیکھو بھائی تم کو پوچھنے والا کون ہے۔ تم جہاں چاہو گاڑی کھڑی کر کے جس کھمبے پر چاہو چڑھو۔ لوگ تو یہی سمجھیں گے کہ بجلی ٹھیک کر رہے ہو۔ کھمبے بالکل فلیٹوں کے اور کمروں کے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔ تم پر کون شک کر سکتا ہے کہ تم اوپر کسی کھڑکی کے راستے اندر جا رہے ہو یا کسی کو برآمد کر رہے ہو۔ ویسے بھی آدھی رات کے وقت دیکھنے والا کوئی نہیں اور یہ اندھیرا تو ایک طرح سے تمہارا معاون ومددگار ہے۔"

ڈرائیور مان گیا مگر عین ہوٹل کے سامنے گاڑی روکنے کے بعد اس کی ہمت پھر جواب دینے لگی۔

اس نے الیکٹریشن سے کہا "یار تو اپنے رسک پر یہ کام کر۔ میں پکڑا گیا تو بیوی بچوں کے لیے نوکری کا آسرا بھی نہیں رہے گا۔"

جوشیلا اور نوجوان الیکٹریشن اِس ایڈونچر میں پوری طرح شریک ہوگیا تھا۔ اس نے کہا "اچھا تو چلا جا یہاں سے۔ اپن تو جوا کھیلے گا بھائی۔ ہار ہو یا جیت۔"

میں ان دونوں کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ ہوٹل کے سامنے پہنچ کے میں نے دو کھمبے دیکھے جو سیکنڈ فلور کی گیلری سے چند فٹ دور تھے۔ ان میں سے ایک پر ٹرانسفارمر بھی نصب تھا مگر اس کا پلیٹ فارم پہلی اور دوسری منزل کے درمیان تھا۔ اگر میں براہ راست سیکنڈ فلور کے چھجے پر اُترتا اور پھر ہر کمرے کی کھڑکی میں [illegible] تو یہ ہو سکتا تھا کہ کوئی مجھے مقابل کی کسی عمارت کے اندر سے یا سڑک پر سے دیکھ لے۔ میں براہِ راست کسی گیلری میں کود جاتا تو مجھے کمرے کے دروازے پر دستک دے کر کسی مہمان کو جگانا پڑتا اور پھر اسے آواز نکالنے سے قبل ہی ناک آؤٹ کرنا پڑتا۔ پہلی قطار کے کمروں سے گزرے بغیر میں اس کاریڈور میں نہیں پہنچ سکتا تھا جس کے دوسری طرف بھی دس کمروں کے دروازے تھے۔ ہر منزل پر پہلی قطار میں کمرا نمبر ایک تھا اور اس کے مقابل کمرا نمبر دو۔ اس طرح کمرا نمبر انیس سڑک کی جانب تھا اور بیس پیچھے۔

میں نے نقشہ ذہن میں رکھتے ہوئے وہ راستہ اختیار کیا جس میں خطرہ کم تھا۔ الیکٹریشن نے گاڑی روکی تو چوکیدار باہر آگیا۔

"ایک گھنٹا ہو گیا بریک ڈاؤن کو۔"

"ایک گھنٹا دس منٹ" الیکٹریشن سیڑھی پر چڑھ کے بولا۔

"کب آئے گی آخر بجلی؟"

"جب خرابی دور ہوگی۔ خرابی کب دور ہوگی۔ اس سوال کا جواب ہمارا چیف انجینئر بھی نہیں دے سکتا۔ ہم کوشش کر رہے ہیں ٹھیک کرنے کی۔ تم جاؤ اپنا کام کرو۔ ہمارا دماغ خراب مت کرو۔"

اس کے بعد چوکیدار کے لیے وہاں کھڑے رہنا بے عزتی کی بات تھی۔ وہ پھر اپنی کرسی پر جا بیٹھا تو میں گاڑی سے اُترا اور پچھلے حصے میں پہنچ گیا۔

الیکٹریشن کچھ نروس تھا۔ "اب بولو۔ کدھر لگا دوں سیڑھی؟"

میں نے کہا "یہ جو ٹرانسفارمر ہے۔ اس کے پیچھے۔"

"جانا کہاں ہے؟"

میں نے کہا "ان دُکانوں کے اوپر والے چھجے پر۔"

"واپس کتنی دیر میں آؤ گے؟"

"دس منٹ تو لگ جائیں گے۔"

"میں یہاں ٹرانسفارمر کے کٹ آؤٹ دیکھتا ہوں۔ دیر ہوئی تو پیچھے والے کھمبے کے ساتھ سیڑھی لگا کے اوپر چڑھوں گا۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے۔ ادھر بھی گیلری ہے۔ اب دیکھو واپسی کا راستہ کدھر سے ملتا ہے۔"

میں سیڑھی پر چڑھا۔ الیکٹریشن نے اسے لیور گھما کے اونچا کیا اور پھر تھوڑا سا جھکایا تو میں بہ آسانی گیلری میں اُتر گیا۔ اس نے سیڑھی ہٹا کے مزید بلند کی اور خود اس پر چڑھ گیا۔

اب میں الیکٹرانک مارکیٹ کی بڑی بڑی دکانوں کے وسیع وعریض اور بلند وبالا سائن بورڈ کے پیچھے تھا جو میرے سامنے کسی دیوار کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ عام حالات میں اس چھجے پر چلنا خطرناک کام تھا کیونکہ یہاں نیون سائن کے تاروں کا جال بھی پھیلا ہوا تھا۔ بجلی ہوتی تو احتیاط کے باوجود میرا ہاتھ یا میرا پیر کسی ننگے تار کے جوڑ کو چھو سکتا تھا۔ نیون سائن میں ہائی وولٹیج سے رنگین اور جلتی بجھتی روشنیوں کا کھیل چلتا ہے۔ شیشے کی پتلی ٹیوب سے بنے ہوئے نیلے پیلے حروف اور متحرک نظر آنے والی ہر شبیہ اس وقت خاموش تھی ورنہ ان میں سنسناتی بجلی کی آواز صاف سنائی دیتی۔

میں تاروں کے جال سے بچتا سر جھکائے آگے بڑھا اور پہلی گیلری کا کنارہ پکڑ کے اوپر چڑھ گیا۔ یہ گیلری شاید سو فٹ لمبی ہوگی اور اس میں سڑک کی سمت واقع تمام کمروں کے دروازے کھلتے تھے۔ اس گیلری کا مقصد مہمانوں کو بازار کی رونق کے نظارے سے لطف اندوز ہونے کا موقع فراہم کرنا تھا۔ اس وقت مہمان سوئے پڑے تھے اور میرے لیے تاریکی میں کسی کھڑکی یا دروازے کے شیشے سے اندر جھانک کر یہ دیکھنا مشکل تھا کہ کون سا کمرا خالی ہے اور کس میں کوئی مسافر ہے لیکن قدرت شاید میری مدد پر آمادہ تھی کہ مجھے دو کمروں کی کھڑکیاں کھلی ہوئی نظر آئیں۔ میں جھک کر گیلری میں کسی جانور کی طرح چاروں ہاتھوں پیروں پر چلتا ہوا پہلی کھڑکی تک گیا اور آہستہ آہستہ اپنا سر اٹھا کے اندر جھانکا۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ میرا یوں چوروں کی طرح اندر دیکھنا قانونی جرم ہی نہیں تھا اخلاقی اعتبار سے بھی غلط حرکت تھی۔ اس کا احساس مجھے کمرے میں ایک نظر ڈالتے ہی ہو گیا۔ میں نے ایک انتہائی ہیجان انگیز منظر دیکھ لیا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ اس منظر کے دونوں کرداروں کی ساری توجہ ایک دوسرے پر تھی۔ کہیں غلطی سے بھی عورت کی نگاہ کھڑکی پر ہوتی تو وہ چیخ مارتی اور میرا بنا بنایا کھیل بگاڑ دیتی۔

میں نے ایک گہری سانس لی اور اپنے ماتھے کا پسینہ پگڑی کے پلو سے صاف کر کے آگے بڑھا۔ دوسری کھڑکی میں جھانکنے سے پہلے میں نے اپنے اعصاب پر قابو پالیا تھا۔ ہوٹل کے کمروں کی خلوت کے مناظر ایسے ہی ہوتے ہیں۔ میں نے خود سے کہا۔ اور ہوٹل میں صرف مسافر ہی نہیں ہوتے۔

دوسرے کمرے میں صرف ایک شخص تھا جو گہری نیند میں خراٹے لے رہا تھا۔ اس نے کروٹ لے کر اپنا منہ دیوار کی طرف کر لیا تھا۔ اس سے مجھے مزید تقویت ملی اور میں دبے پاؤں کھڑکی سے کمرے میں اُتر گیا۔ میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا اور میں اس خیال سے خوف زدہ تھا کہ اگر اس کی نیند کچی ہوئی یا میری کسی غلطی سے وہ جاگ اٹھا تو پھر میری خیر نہیں۔ وہ چور چور چلّانے لگے گا اور جب سارا ہوٹل جاگ جائے گا تو چودھری دلاور بھی کسی کمرے سے نکل آئے گا۔ اس طرح کسی ہوٹل کے کمرے میں چور کا داخل ہونا بڑی غیر معمولی بات ہے۔ چور ہوٹل کے اندر ہو سکتا ہے مگر باہر سے براہ راست فرسٹ فلور پر کیسے پہنچ سکتا ہے۔ زینہ یا لفٹ استعمال کیے بغیر۔

میں دبے پاؤں سوتے ہوئے شخص کے پاس سے گزرا اور احتیاط سے اپنا ہاتھ کنڈی کی طرف بڑھایا جو اس نے اندر سے لگا رکھی تھی۔ کنڈی اضافی تھی ورنہ کمرے کو اندر ڈور لاک کا بٹن دبا کے بھی بند کیا جا سکتا تھا۔ پہلا مرحلہ کسی دشواری کے بغیر سر ہو گیا۔ کنڈی آہستہ آہستہ کسی آواز کے بغیر کھولنے میں مجھے دو تین منٹ لگے ہوں گے مگر یہ میرے لیے دو تین گھنٹے کے برابر تھے۔ میری نظر ہر لحظہ سوئے ہوئے شخص پر تھی۔ وہ کسی وقت بھی کروٹ لے کر آنکھیں کھول سکتا تھا یا اچانک اٹھ کے باتھ روم کا رخ کر سکتا تھا۔ پھر میرے لیے اسے فوراً خاموش کرنا ضروری ہو جاتا۔

ڈور لاک کھولنا زیادہ خطرناک کام تھا۔ بیشتر ڈور لاک کھٹکا کرتے ہیں۔ یہ لٹو جیسا ڈور لاک تھا۔ میں نے اسے مضبوطی سے پکڑا اور آہستہ آہستہ گھمایا۔ خوابیدہ شخص اس وقت خراٹے لے رہا تھا۔ ہلکا سا کھٹکا ہوا تو میرا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ میں بلاوجہ کی ہنگامہ آرائی نہیں چاہتا تھا ورنہ اس شخص سے ڈرنے کا سوال ہی نہیں تھا۔

جب میں نے دروازہ کھولا تو اس کے قبضے بھی چرچرائے مگر خراٹوں میں یہ آواز دب گئی۔ میں نے باہر آ کے سکون کا سانس لیا اور دروازے کو اپنی طرف کھینچ کے دونوں پٹ آپس میں ملا دیے۔ اس طرح کہ دروازہ کھلا نظر نہ آئے لیکن لاک بھی نہ ہو۔ ابھی مجھے رابعہ کے ساتھ اسی راستے سے واپس بھی جانا تھا۔

کاریڈور میں پہنچ کے میں کچھ پُرسکون ہو گیا اور میں نے اعتماد کے ساتھ زینے کے راستے فورتھ فلور کا فاصلہ طے کیا۔ میں بہت محتاط تھا اور پوری کوشش کر رہا تھا کہ میرے قدموں کی آہٹ بھی کوئی نہ سنے۔ نیچے سے اوپر تک دو کمروں میں روشنی تھی۔ وہاں کوئی جاگ رہا تھا یا لائٹ جلا کے سونے کا عادی تھا۔

کمرا نمبر فور ٹو زیرو کی درز سے بھی لائٹ جھانک رہی تھی۔ میں نے انگلی سے دروازہ بجا کے دبی دبی آواز میں رابعہ کو آواز دی۔

اس نے قریب آ کے خوف زدہ لہجے میں پوچھا "کون ہے؟"

میں نے کہا "کوئی نہیں ہے۔"

اس نے دروازہ کھول دیا اور مجھے دیکھ کے ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"سکندر۔ یہ تم ہو یا میرے خدا۔" اس نے اپنے سر پر ہاتھ مارا "یہ کیا حُلیہ بنا کے آئے ہو۔"

میں نے کہا "خاتون محترم۔ جس فرینچ وکیل کے ساتھ آپ اتنا عرصہ رہیں۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ ناچیز کو مولانا فقیرالدین قدوسی کہتے ہیں۔"

"مولانا ناچیز۔ آخر آپ آئے کدھر سے؟"

میں نے کہا "یہ مت پوچھو۔ بڑی لمبی کہانی ہے۔ جب میرے ساتھ جاؤ گی تو خود ہی پتا چل جائے گا۔"

"دلاور نے تمہیں دیکھا تو ہوگا!"

"مجھے تو اس کا سایہ بھی دکھائی نہیں دیا۔ لیکن ہوٹل میں دو کمرے بک ہوئے ہیں۔ ایک میں دلاور ہو سکتا ہے۔"

"وہ کمرے میں دروازے بند کر کے سونے نہیں آیا ہوگا۔ کسی نہ کسی نے تو تمہیں ضرور دیکھا ہوگا۔ تمہارے حلیے سے دھوکا کھا جائے تو اور بات ہے۔"

"چھوڑو یہ ساری باتیں" میں نے کہا "تم نے بل ادا کر دیا ہے؟"

"ہاں۔ لیکن منیجر نے کہا کہ چارجز کل صبح بارہ بجے تک کے

ہوں گے۔ کمرا آپ ابھی خالی کریں یا صبح۔ آپ کی مرضی۔ پھر میں نے کہہ دیا کہ اب ہم صبح ہی جائیں گے۔"

"یہ تم نے اچھا کیا" میں نے کہا "میں ٹین کا یہ صندوق اُٹھاتا ہوں۔ تم میرے پیچھے آؤ۔ کاش ہم اس ٹین کے صندوق کو یہاں چھوڑ سکتے۔"

"یہ مولوی خادم حسین کے لیے ایک جذباتی نشانی ہے۔"

"یہی تو مصیبت ہے" میں نے کہا۔

"کیا میں برقع اوڑھ لوں؟"

"نہیں۔ اب جو میں کہہ رہا ہوں غور سے سُنو۔ سوال کوئی مت کرنا۔ میرے پاس جواب دینے کے لیے وقت نہیں ہے۔ پہلے میں جاتا ہوں۔ پانچ منٹ بعد تم اندر لائٹ جلتی چھوڑ کے نکلو۔ دروازہ بند کردو۔ فرسٹ فلور تک ایسے آؤ کہ کسی کو پتا نہ چلے۔ زینے سے اُترو گی تو پہلا کمرا جو تمہارے سامنے ہوگا اس کا نمبر ہے ایک سو انیس۔ کمرا نمبر ایک سو تیرہ کا دروازہ کھلا ہوگا۔ چوتھا دروازہ۔"

"چوتھا دروازہ۔ ٹھیک ہے۔ تم ملوگے وہاں؟" رابعہ بولی۔

"نہیں۔ وہ میرا کمرا نہیں ہے۔"

"پھر کس کا ہے؟"

"مجھے کیا معلوم۔ میں تو خود اس میں سے گزر کے آیا تھا۔"

"تو ایسے کہو نا کہ خالی ہے" رابعہ کچھ مطمئن ہوگئی۔

"خالی نہیں ہے۔ کوئی شخص کھڑکی کھول کے سو رہا تھا۔ میں سڑک کی طرف والی گیلری سے اندر داخل ہوا تو اسے پتا ہی نہیں چلا۔"

رابعہ کی حالت خوف سے غیر ہوگئی "تم اوپر کیسے پہنچے۔ چوکیدار نے روکا نہیں؟"

میں نے کہا "سوال پر سوال کیے جارہی ہو۔ میں سیڑھی لگا کے اوپر آیا تھا۔ واپسی بھی اسی طرح ہوگی۔ اور کوئی صورت نہیں ہے ہمارے خاموشی سے نکل جانے کی۔ دیر کی تو سیڑھی ہٹ جائے گی۔ چلو۔"

رابعہ نے کہا "لیکن..... اس طرح کسی کے کمرے میں داخل ہونا....."

میں نے کہا "تمہیں وہاں سے دبے پاؤں گزرنا ہے اور کھڑکی تک پہنچنے کے لیے دس بارہ فٹ کا فاصلہ طے کرنا ہے۔ کھڑکی کھلی ہوئی ہے۔ تم گیلری میں پہنچ جاؤ۔ اس کے بعد کوئی مسئلہ نہیں۔ وہاں میں تمہارا انتظار کروں گا۔ رائٹ' ذرا خیال رکھنا۔ گھبراہٹ میں کسی چیز سے مت ٹکرا جانا۔ کچھ گرا مت دینا۔ ویسے اندھیرا نہیں ہے کمرے میں۔ باہر سے روشنی آرہی ہے تھوڑی بہت۔ ہوٹل میں تو جنریٹر چل رہا ہے ورنہ بجلی کا بریک ڈاؤن ہے اور یہ ہمارے لیے بہترین موقع ہے۔"

رابعہ نے کانپتی آواز میں کہا "اگر وہ شخص جاگ اُٹھا..... یا اس نے مجھے دیکھ کے شور مچادیا..... پھر؟"

"رابعہ۔ یہ خطرہ تو مول لینا ہی پڑے گا۔ اگر ایسا ہوا تو پھر دیکھا جائے گا۔ تمہیں کمرے سے گزرنے میں دس سیکنڈ بھی نہیں لگیں گے اور وہ شخص گہری نیند میں ہے۔"

میں صندوق اٹھا کے باہر نکلا۔ کاریڈور کی لائٹس آف تھیں۔ جنریٹر پر کم سے کم لوڈ رکھنے کے لیے ہوٹل کی انتظامیہ نے ضروری لائٹس آن کی تھیں۔ وہ مہمانوں کو لائٹ جلانے یا پنکھا چلانے سے منع نہیں کرسکتے تھے۔ بنیادی طور پر یہ سہولت انہی کے آرام کی خاطر فراہم کی گئی تھی۔ انہوں نے ڈیکوریشن لائٹس بجھادی تھیں جو پورچ میں تھیں اور ہر کمرے کی گیلری میں اور ہال میں تھیں۔ سائن بورڈ کو روشن کرتی تھیں اور ہوٹل کے نام کو نمایاں کرنے والے مختصر سے نیون سائن کو۔

اندھیرے کی وجہ سے ویرانی کا تاثر گہرا ہوتا تھا۔ اتنی رات گئے اوپر کی منزلوں پر آمدورفت بھی نہیں تھی اور نہ کوئی روم سروس کو آرڈر دینے کے لیے جاگ رہا تھا۔ میری کسی ویٹر سے ملاقات نہیں ہوئی اور فرسٹ فلور تک میں دو منٹ میں پہنچ گیا۔

روم نمبر ایک سو تیرہ کا دروازہ اسی طرح بند تھا اور کھُلا ہوا بھی تھا۔ ٹین کا وہ بکس اُٹھانا بھی میرے لیے ایک عذاب تھا۔ اس کے ساتھ میں زیادہ مضحکہ خیز لگتا تھا لیکن اس سے بھی زیادہ پریشانی کی بات یہ تھی کہ میرا ایک ہاتھ بے مصرف ہوگیا تھا۔ دوسرا ہاتھ بھی میں اس وقت تک استعمال نہیں کرسکتا تھا جب تک ٹین کے صندوق کو نیچے نہ رکھ دوں۔ اسے اچانک چھوڑنے کی صورت میں وہ دھماکا ہوتا جو سارے ہوٹل میں سُنا جاتا۔

احتیاطاً میں نے صندوق کو دروازے کے قریب رکھ دیا اور اندر داخل ہونے سے پہلے یہ دیکھنا بہتر سمجھا کہ اس میں رہنے والے کو دیکھ لوں۔ اگر وہ اسی طرح بے خبر سو رہا ہوگا تو میں دروازہ رابعہ کے لیے کھلا چھوڑ کے گزر جاؤں گا اور خدانخواستہ اس نے کھلی آنکھوں سے مجھے دیکھ لیا تو پھر اس کی آواز کے الارم کو بجنے سے پہلے بند کرنا ضروری ہوگا۔ اس کے لیے میرے دونوں ہاتھ آزاد ہونے چاہئیں۔

ایک احتیاط دس پریشانیوں سے بچاتی ہے۔ اس بات کی صداقت پر یقین نے مجھے بچالیا۔ میں نے دروازے کو تھوڑا سا دھکیلا تو مجھے یوں لگا جیسے کوئی دروازے کے پیچھے کھڑا تھا جو ایک دم اس کے پیچھے غائب ہوگیا ہے۔ اندھیرے میں مجھے ایک سایہ سا متحرک نظر آیا تھا یا شاید وہ میرا وہم تھا۔

میں نے چند سیکنڈ انتظار کیا اور پھر ایک دم اندر داخل ہوتے ہی پلٹا۔ میری یہ حرکت دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑے ہونے والے کے لیے قدرے غیر متوقع تھی۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا جو وہ یقیناً میرے سر پر مارتا مگر اسے موقع ہی نہیں ملا۔ اس سے پہلے ہی میرا ہاتھ بجلی کی طرح حرکت میں آیا اور اس کی کلائی پر لگا۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کے اچھلا تو اسی کے منہ پر لگا۔ پھر میں نے اسے دبوچنے کی کوشش کی مگر وہ پھُرتیلا اور طاقتور تھا۔ اس نے غوطہ مار کے میرے پیٹ میں اپنے سر سے بیل کی طرح ٹکر ماری اور میں لڑکھڑا کے پیچھے ہٹا تو وہ دروازے کی طرف لپکا مگر میں نے اسے اڑنگی ماردی یعنی اس کے پیروں میں اپنا پیر اڑادیا۔ وہ دھڑام سے منہ کے بل گرا مگر گرتے ہی اس کے ہاتھ نے پھر فرش پر پڑا ہوا ریوالور اٹھالیا۔ ایک دم پلٹ کے اس نے مجھ پر گولی چلانے کی کوشش کی مگر اس وقت تک میں بھی اس کے اوپر پہنچ چکا تھا۔ اس بار میں نے کِک مار کے اس کا ہاتھ ناکارہ کردیا اور وہ درد سے بلبلایا۔

میں نے اس کی گردن کو ہاتھوں کے شکنجے میں کس لیا۔ اب اس شخص کی صورت میرے سامنے تھی اور کمرے کے اندھیرے سے مانوس ہوجانے کے بعد میری آنکھیں بھی اسے صاف طور پر دیکھ سکتی تھیں۔ "کون ہو تم۔ آواز نکالی تو گلا گھونٹ دوں گا۔"

وہ ہانپنے لگا "مگر جواب دوں گا تو..... آواز نکلے گی۔"

اسی وقت رابعہ اندر آگئی۔ اس کے قدم رُک گئے اور وہ خوف سے بُت بنی کھڑی رہی۔

میں نے اسے اشارہ کیا "جاؤ۔ ادھر سے نکل جاؤ۔"

نیچے پڑے ہوئے شخص نے کہا "جاؤ۔ خدا کے لیے جاؤ۔ ورنہ تمہارے ساتھ میں بھی مارا جاؤں گا۔ ایسا نہ ہو لائٹ آجائے۔"

میں نے حیرانی سے کہا "لائٹ آنے سے کیا ہوگا۔ جھوٹ بولا تو ایک جھٹکے سے گردن توڑ دوں گا۔"

"وہ سب سُن لے گا۔ دیکھ لے گا۔"

"کون۔ چوہدری دلاور؟"

اس نے پھر اقرار میں سرہلایا "یہاں مائک ہیں اور خفیہ کیمرا بھی ہے' ہر کمرے میں....."

"ہر کمرے میں؟ یہ کیسے ممکن ہے؟"

"فضول باتوں میں وقت مت ضائع کرو۔ سب ہوجاتا ہے دنیا میں اگر پیسہ ہو۔ اچھا مجھے چھوڑو۔ اس کمرے سے نکلو۔ چلو میں بتاتا ہوں۔"

میں نے رابعہ سے کہا "چلو کھڑکی کے راستے باہر۔ میں بھی آتا ہوں۔"

رابعہ ڈرتے ڈرتے آگے بڑھی اور کھڑکی پر چڑھ کے باہر اُتر گئی۔ میں نے اس شخص کو اٹھنے کا موقع دیا مگر اس کا ریوالور اپنے ہاتھ میں رکھا۔ میں اس لیے مطمئن تھا کہ جب تک الیکٹریشن میرے ساتھ تھا لائٹ کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کمپنی کی تار ٹھیک کرنے والی گاڑی تو دس ہزار دے کے میں نے اپنے کام کے لیے حاصل کرلی تھی۔ اس شخص نے ٹھیک کہا تھا۔ پیسہ ہو تو سب ہوجاتا ہے۔

میں نے ٹین کا صندوق رابعہ کو پکڑادیا "جلدی بولو۔ تم اگر دلاور کے آدمی ہو تو مجھے یہ سب کیوں بتا رہے ہو۔"

"اس لیے کہ..... دلاور کو معلوم ہوگا تو وہ مجھے مار ڈالے گا۔" وہ اچھا خاصا صحت مند آدمی خوف سے کانپ رہا تھا "نہ بتاتا تو تم مجھے مار ڈالتے۔ میں نے تمہیں نکل جانے کا موقع دیا۔ اب تو تم مجھے نہیں مارو گے۔"

میں نے کہا "نہیں ماروں گا۔ مگر تمہارا کیا تعلق ہے دلاور سے؟"

"کوئی تعلق نہیں۔ اس نے مجھے کہا تھا کہ اس کمرے میں موجود رہوں اور جاگتا رہوں۔ میں اسی ہوٹل میں ملازم ہوں۔ چوہدری دلاور نے مجھے خفیہ مائک دیے تھے کہ ہر کمرے میں لگادو۔ یہ ریوالور بھی دیا تھا۔"

"کیا تم یہ کام جانتے ہو؟"

اس نے کہا "میں ہوٹل کا الیکٹریشن ہوں۔ لائٹ سے لے کر ائرکنڈیشن تک سب میں ٹھیک کرتا ہوں۔ میں نے باری باری ہر کمرے کی لائٹ اس کا کٹ آؤٹ نکال کے بند کی اور پھر پوائنٹ چیک کرنے کے بہانے اندر پہنچ گیا۔"

"خفیہ مائک کہاں لگائے تھے تم نے؟"

"ہر بیڈ کے نیچے سرہانے کی طرف پاور ساکٹ ہے جو کوئی بھی استعمال نہیں کرتا اور سامنے چادر ہونے کی وجہ سے نظر بھی نہیں آتا۔ مائیک اسی سے پلگ کردیے تھے۔"

"اور خفیہ کیمرے؟"

"کیمرے صرف دو ہیں۔ ایک باہر کے گیٹ پر فوکس ہے اور آنے جانے والوں کو دیکھتا رہتا ہے۔ دوسرا پہلے زینے کے موڑ پر ہے۔ ظاہر ہے جو بھی اندر آئے گا یا اوپر جائے گا وہ نظر آجائے گا۔"

"اور کیمرے کی آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے وہ کہاں نظر آتا ہے؟"

"کمرا نمبر تین سو تین۔ اور چوہدری دلاور کے کمرے میں۔ یہی دو کمرے خالی تھے جو دلاور نے لے لیے تھے۔ اس نے منیجر سے کہا تھا کہ اب جو کمرا خالی ہو اس کے لیے بک کرلیا جائے۔ کل پرسوں تک ہر کمرے میں اس کے آدمی آجاتے۔ اب تم جاؤ۔"

"ایک آخری سوال۔ تم یہ سب مجھے کیوں بتا رہے ہو؟"

"اس لیے کہ میں سو گیا تھا۔ دلاور نے مجھے سونے کے لیے پانچ ہزار نہیں دیے تھے۔ اس نے کہا تھا کہ سو گئے تو ہمیشہ کے لیے سُلادوں گا۔ میرا کام تھا ہیڈ فون پر ہر آواز سننا اور مانیٹر پر نظر رکھنا۔ ہر کمرے میں ہونے والی گفتگو سننا اور اگر کسی کمرے میں کوئی رابعہ یا سکندر بخت یا کبیر خان کا لفظ استعمال کرے تو اس کمرے کے نمبر سے چوہدری دلاور کو مطلع کرنا۔ پھر میں زینے والے کیمرے کو زینے کے پہلے موڑ سے ہٹا کے ایسے نصب کردیتا کہ وہ کمرا فوکس میں رہے۔ خدا کے لیے اب جاؤ۔ لائٹ آجائے گی۔"

میں نے کہا "لائٹ نہیں آسکتی میری اجازت کے بغیر۔ چوہدری دلاور یہ سب کرسکتا ہے تو میں اس کا باپ ہوں۔ میں اس سے بہت آگے جاسکتا ہوں۔ اگر لائٹ ہوتی تب بھی کوئی کیمرا مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں نہ دروازے سے داخل ہوا تھا اور نہ زینے سے اوپر آیا تھا۔ بجلی خود میں نے بند کراوی ہے آدھے گھنٹے کے

کیونکہ مجھے آنے اور جانے کے لیے اندھیرے کی ضرورت تھی۔"

"آخر۔ تم لوگ یہ سب کیوں کر رہے ہو؟"

"چوہدری دلاور نے کچھ نہیں بتایا تھا؟"

"نہیں۔ اس نے کہا تھا کہ سوال کوئی نہیں کرنا ہے" وہ بولا۔

میں نے کہا "بس یہ سمجھ لو کہ ہم دونوں شکاری ہیں۔ ایک دوسرے کی جان لینا چاہتے ہیں۔ بالآخر ہم میں سے ایک مارا جائے گا۔ بہت سے بے گناہ ہماری لڑائی میں مارے جاچکے ہیں۔ وہ تمہاری طرح بیچ میں آگئے تھے۔ جیسے سانڈوں کی لڑائی میں مینڈک پس جاتے ہیں۔ تم اپنی جان بچاؤ۔ اور یہ لو اپنا ریوالور ورنہ دلاور تم سے پوچھے گا تو کیا جواب دوگے۔ بس اتنا خیال رکھنا کہ ریوالور سے مجھ پر گولی مت چلانا۔ میں مارا گیا تو بدلہ لینے والے بہت ہیں۔ وہ تمہارے سارے خاندان کو ماردیں گے۔ چُن چُن کے۔ خواہ تم کہیں بھی چلے جاؤ۔ زمین کے اندر گھس جاؤ یا ہمالیہ کی چوٹی پر جابیٹھو۔"

اس نے ریوالور لے لیا "میں لالچ میں پھنس گیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ اتنا خطرناک کھیل ہے۔ میں گولی کیسے چلا سکتا ہوں۔ میری تم سے کوئی دشمنی بھی نہیں۔ پھر میں اپنی گردن پھانسی کے پھندے میں کیوں ڈالوں۔ میری نوکری بھی جائے اور زندگی بھی۔ میرا تو خیال تھا کہ مائک لگانے اور کیمرے فٹ کرنے کے پانچ ہزار بہت ہیں اور اس میں خطرہ بھی کوئی نہیں۔ میرے توباپ کی توبہ۔"

"تم نے مجھ پر حملہ کیوں کیا تھا؟"

"اور کیا کرتا میں۔ مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ میں سوتا رہ گیا تھا اور تم میرے کمرے میں سے گزر گئے۔ ورنہ اندر سے کنڈی کون کھول سکتا تھا۔ جب تم پھر آئے تو میں سمجھ گیا کہ تم ہی سکندر بخت یا کبیر خان ہو۔ چند سیکنڈ پہلے ہی میری آنکھ کھلی تھی دروازہ ھلنے سے۔ مجھے شک ہوگیا۔"

"یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔"

"میں نے بدحواسی میں غلطی کی تھی۔ میں شور مچاتا تو چوہدری دلاور کے علاوہ ہوٹل کے سب لوگ آجاتے۔ میں نے سوچا کہ تمہیں ناک آؤٹ کرکے دلاور کو بتادوں۔"

"وری گڈ۔ تم ناک آؤٹ کا مطلب بھی سمجھتے ہو۔" میں نے کہا اور ایک دم ہاتھ مار کے اسے ناک آؤٹ کردیا۔ ہاتھ اس کی کنپٹی پر لگا تھا اور وہ وہیں گر گیا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ اسے ایک گھنٹے میں ہوش آجائے گا تو وہ اندر سے کنڈی لگا کے کھڑکی دروازہ سب بند کردے گا۔ اتنی جرح کرنے کے باوجود نہ جانے کیوں مجھے اس شخص کی باتوں پر اعتبار نہیں آیا تھا۔ اس کی باتوں میں ڈر سے زیادہ چالاکی تھی۔ اس نے پانچ ہزار میں چوہدری دلاور کا نمک خوار اور خدمت گار بننا منظور کیا تھا مگر شرطیں پوری کرنے سے قاصر رہا تھا۔ اس نے ادائے فرض میں کوتاہی کی تھی۔ پھر خود کو تارزن سمجھتے ہوئے مجھے زیر کرنا چاہا تھا اور مقابلے پر زیادہ طاقتور حریف کو دیکھتے ہوئے فوراً اپنی جان بچانے کے لیے دلاور کا راز فاش کردیا

تھا۔ ایسے شخص پر میں کیسے اعتبار کرتا۔ میرے ساتھ رابعہ نہ ہوتی تو میں اس کو جُل دے کر بندر کی طرح چھلانگیں مارتا ہوا غائب ہوجاتا۔ میں دکانوں کے چھجے سے کود جاتا یا بجلی کے کھمبے سے پھسل جاتا مگر یہ سب رابعہ کے بس کی بات نہیں تھی اور اس کے ساتھ ایک مقدس صندوق کی حفاظت بھی مجھ پر لازم تھی۔

رابعہ گیلری میں یوں کھڑی تھی کہ لگتا تھا ہاتھ لگاتے ہی کرز مارے گی یا پٹ سے گر کے بے ہوش ہوجائے گی۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس گیلری سے فرار ہونے کے لیے ہم خود پرواز کریں گے یا ہمیں لینے کے لیے کوئی ہیلی کوپٹر آئے گا۔ مجھ سے تو کچھ بعید تھا کہ میں اس کا ہاتھ تھام کے کہوں کہ ریڈی۔ اب ہم سڑک کودیں گے۔ ون ٹو.... تھری.... چنانچہ وہ چکرائی ہوئی تھی۔

نیچے بجلی کمپنی کا الیکٹریشن بھی سخت غصے میں بھرا ہوا تھا۔ ہم نے دس کے بجائے بیس منٹ لگادیے تھے اور وہ مجبور تھا کہ بلاوجہ ٹرانسفارمر کو چھیڑتا رہے اور بجلی ٹھیک کرنے کی کوشش میں مصروف نظر آئے۔ جب میں نے اسے اوپر سے اشارہ کیا تو اس نے ہنڈولے جیسی چیز کو گیلری سے لگادیا۔ میں نے اس میں ٹرنک رکھا اور پھر رابعہ سے کہا "چلو' اترو۔ میری شکل مت دیکھو۔"

اس وقت وہ کیا بولتی۔ وہ سارا غصہ پیتی رہی۔ مجھے معلوم کہ موقع ملتے ہی آتش فشاں پھٹے گا تو کتنا لاوا نکلے گا۔ اس نے گیلری کے اوپر سے سیڑھی پر قدم رکھا۔ سیڑھی اس کے وزن سے تھوڑا سا جھولی۔

میں نے کہا "مضبوطی سے قدم جماؤ۔ مضبوطی سے سیڑھی پکڑو۔ اور خدا پر یقین کی مضبوطی کے سہارے زمین پر اتر جاؤ۔"

اس کے ساتھ ہی میں بھی سیڑھی پر پہنچ گیا۔ رابعہ مجھ سے نشیب نیچے تھی۔ میرے وزن نے فضا میں بلند سیڑھی کو ایک جھکولا دیا۔ معلوم نہیں اس وقت رابعہ میں اتنی قوت برداشت پیدا ہوگئی ورنہ وہ دہل کے چیخ مارنے میں حق بجانب ہوتی۔

جب ہم نیچے اُتر گئے تو الیکٹریشن نے فوراً سیڑھی کو فولڈ کیا۔ سیڑھی سمٹ کر قدِ آدم رہ گئی۔

"آپ نے حد کردی جناب۔ میری نوکری کا بھی خیال نہ آپ کو۔ وہ ڈرائیور الگ مجھ پر گرم ہو رہا ہے۔ ایکس ای این صاحب مسلسل وائرلیس پر پوچھ رہے ہیں کہ تم کہاں ہو۔ خرابی ابھی تک دور کیوں نہیں ہوئی۔ لوگ فون کررہے ہیں۔ میں جھوٹ بول رہا ہوں کہ جناب یہاں ہوں' اب وہاں جارہا ہوں۔ اتنی دور سے ایک پی ایم ٹی پر لگا ہوا تھا۔ خود آجاتے انجینئر صاحب تو جاتا۔ یہ خرابی تو اصلی ہے۔ پتا چلانا پڑے گا کہ فالٹ کہاں ہے ورنہ ہم سیدھے وہاں جاتے جہاں خرابی پیدا کی تھی اور دو منٹ میں کٹ آؤٹ لگادیتے۔"

ڈرائیور نے گاڑی چلادی تھی۔ رابعہ اور میں ٹرک کے پچھلے حصے میں سر جھکائے الیکٹریشن کی تقریر سن رہے تھے۔ میں آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ رابعہ گھٹنوں کو ہاتھوں میں سمیٹے اور ان پر

نگاہ زیرِ لب کچھ پڑھ رہی تھی۔ دعائے قنوت یا آیت الکرسی۔ یہ فرض کرنا محال تھا کہ وہ مجھے گالیاں دے رہی ہوگی۔

گلی سے نکل کے برنس روڈ پر آتے ہی میں نے کہا "بس اب گاڑی اور اپنی زبان۔ دونوں کو روک دو۔ تم نے میری مدد کی' اس کے لیے شکریہ۔ یہ لو اپنا معاوضہ اور میرا شکریہ ادا کرو۔"

دس ہزار کے نوٹ دیکھتے ہی اس کی زبان کو فل اسٹاپ لگ گیا "مہربانی ہے جناب آپ کی۔ ہم غریب لوگ ہیں۔"

میں نے کہا "پھر تو میری دعا ہے کہ دنیا میں سب تم جیسے غریب ہوجائیں۔"

ڈرائیور نے آگے سے سر نکال کے کہا "مولوی صاحب۔ تم ہو کوئی فراڈ' کسی عورت کو بھگا کے لائے ہو۔"

میں نے کہا "غور سے دیکھ لو۔ تمہاری عورت تو نہیں ہے۔"

اس نے ہاتھ جوڑ کے کہا "پکڑے جاؤ تو اللہ رسولؐ کا واسطہ۔ ہمارا نام مت لینا۔"

"مجھے تمہارا نام معلوم ہی نہیں۔ تم بھی اس واقعے کو بھول جانا۔"

جب گاڑی چلی گئی تو میرا جی چاہا کہ میں ایک فلک شگاف نعرہ لگاؤں۔ "دہ مارا پاپڑ والے کو۔" جیسے کہ میں اور محسن ہاتھ پر ہاتھ مار کے لگاتے تھے۔ لیکن وقت جگہ اور رابعہ کا موڈ دیکھتے ہوئے میں نے کہا "دلاور کی دلاوری میں تو.... گدھے کی دم۔"

"سکندر' خدا کے لیے کہیں چلو۔ مجھے سخت وحشت ہورہی ہے۔ تم نہیں جانتے دو گھنٹے میں نے کیسے گزارے اس ہوٹل میں۔ اور جس طرح تم نے مجھے نکالا ہے۔ اف' یہ سوچ کے ہی میرا تو ہارٹ فیل ہونے لگتا ہے کہ اگر کوئی دیکھ لیتا۔ چوہدری دلاور کو پتا چل جاتا تو کیا ہوتا؟؟"

میں نے ٹین کا صندوق اُٹھالیا۔ "چلو۔ ہم اپنے گھر چلتے ہیں۔ وہاں میں تم کو پہلے لخلخہ سونگھاؤں گا۔ پھر خمیرہ ابریشم حکیم ارشد والا کھلاؤں گا۔ اس کے بعد گلوکوز پلاؤں گا۔ پھر تم میرے لیے کچھ کرنا۔ ایسا ہی کوئی روح کو تسکین اور قلب و جگر کو سرور عطا کرنے والا جام دینا۔ جس میں لسی کا مزہ ہو' روح افزا کی ٹھنڈک اور کافی کی حرارت۔ کوکا کولا کی تلخی اور ہاضمے کے کارمی نیٹو مکسچر کی تیزی ہو۔"

رابعہ پہلے مسکرانے پر مجبور ہوئی اور پھر ہنس پڑی "ایک ہی جام میں یہ سب چاہیے۔ تو پھر سوری' ایسا کوئی ڈرنک نہیں میرے پاس۔"

"ہے۔ اور اس کے بارے میں شاعر فرماتا ہے۔ اتنے شیریں ہیں تیرے لب...."

"انسان بنو انسان۔" رابعہ نے کچھ شرما کے کچھ مسکرا کے اور کچھ غصے کی ادا سے کہا "بس بولے چلے جارہے ہو۔ یہ معلوم نہیں کہ کدھر جارہے ہو۔"

"ابھی بتایا تھا کہ اپنے گھر جارہے ہیں۔ اپنے ذاتی فلیٹ میں جو میں نے کچھ دیر پہلے بیس ہزار میں خرید لیا تھا۔ بس ایسے ہی موڈ بن گیا خریداری کا۔ تم تو جانتی ہو ہم رئیسوں کی عادت...."

"سکندر۔ تم نے پی رکھی ہے کیا؟ پاگل ہوگئے ہو؟"

میں نے جھوم کے لڑکھڑاتے لہجے میں کہا "ہاں دیوانہ ہوں میں۔ میں نے پی رکھی ہے ان آنکھوں کے پیمانے سے۔ اس کے میخانے سے۔ مس رابعہ کے حسن کے شراب خانے سے۔ ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں۔ مگر میں ہوش میں ہوں بلبلِ بغداد' میں نے واقعی ایک فلیٹ خریدا ہے کچھ دیر پہلے۔ تمہارے لیے' بس تھوڑی دور۔ اس موڑ کے بعد۔"

رابعہ مجھ پر یقین کیسے کرسکتی تھی۔ وہ خاموش ہوگئی۔ اس کے خیال میں مجھ سے سنجیدگی کی توقع رکھنا لاحاصل تھا۔ میں اپنی ہانک رہا تھا اور وہ سڑک پر چلتے ہوئے مجھ سے لڑ بھی نہیں سکتی تھی۔ جب بالآخر میں نے ایک جگہ رک کر اوپر جانے والے تنگ سے زینے پر قدم رکھا تو اس سے برداشت نہ ہوا۔

"یہ کہاں لے جارہے ہو مجھے؟"

"تم یہ سوال کرنے کا حق کھوچکی ہو مس رابعہ" میں نے کہا "اپنے الفاظ یاد کرو' تم نے کہا تھا کہ اب جہاں تم وہاں میں" میں نے اوپر چڑھتے ہوئے کہا "اب خاموشی سے میرے پیچھے چلتی رہو۔"

وہ پیچھے نہ آتی تو کہاں جاتی۔ شاید اسے یقین آگیا تھا کہ میں نے فلیٹ خرید لیا ہوگا۔ سوچے سمجھے بغیر ایسے فیصلے کرنا میرے مزاج اور میری فطرت کے خلاف نہیں تھا۔ اسے یہ اعتماد بہرحال تھا کہ یہ فیصلے احمقانہ نہیں ہوتے۔

میں نے دروازے پر دستک دی۔ زینے پر آمنے سامنے دو دروازے تھے جو یقیناً الگ الگ فلیٹس میں داخل ہونے کا راستہ تھا۔ زینہ گھوم کے اوپر جارہا تھا اور میرے اندازے کے مطابق ایسے ہی دو فلیٹس اوپر کی ہر منزل پر تھے یعنی عمارت کے اس حصے میں آٹھ فلیٹ تھے جن کے مکین ایک ہی زینے کو استعمال کرتے تھے۔ ہر موڑ پر چھت میں بلب ہولڈر ضرور تھا مگر اس میں لگا ہوا بلب فیوز ہوگیا تھا تو بدلا نہیں گیا تھا۔

وہی نیک دل شخص پھر دروازے میں نمودار ہوا جس نے کچھ دیر پہلے مجھے ایک فون کال کی اجازت دی تھی اور فلیٹ کی ملکیت سے دستبردار ہوگیا تھا۔ یہ عرب کے اونٹ والا کیس تھا کہ میں فون کرنے آیا تھا اور فلیٹ کا مالک بن بیٹھا۔ تاہم اس میں مالک کی جبری بے دخلی کا ناخوش گوار پہلو نہیں تھا۔ وہ تو ہزار روپے وصول کرکے میرے مقابلے میں ہزار گنا خوش تھا۔

مجھے دوبارہ دیکھ کے پہلے اس کا چہرہ اُتر گیا۔ شاید وہ سمجھا کہ میں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے اور جلدی میں ہونے والے فیصلے کو منسوخ کرنے آیا ہوں۔ اس نے کہا "خیر ہے صوفی صاحب؟"

میں نے کہا "بالکل خیر ہے الحمدللہ۔ یہ اپنی زوجہ' میرے پیچھے پڑگئیں۔"

اس کا چہرہ مزید اُتر گیا "دیکھو جی۔ سودا تو اب ہوگیا اور

کی آپ نے۔ اچھا تھا صبح گھر والی کو بھی فلیٹ دکھاتے۔ آخر انہوں نے ہی رہنا ہوتا ہے گھر میں۔ ان کی مرضی ہوتی تو بیعانہ دیتے۔"

میں نے کہا "آپ نے ٹھیک کہا مگر..."

"اگر مگر کچھ نہیں صوفی صاحب۔ بیعانہ اب واپس نہیں ہو سکتا۔ فلیٹ لو نہ لو۔" وہ بولا "جب بیوی کی مرضی کے بغیر کچھ کر نہیں سکتے تو پھر..."

میں نے کہا "او یار، میری بھی سُن لو۔ میری گھر والی تو اتنی خوش ہوئی کہ میرے سر ہو گئی کہ مجھے ابھی لے کر چلو۔ زندگی گزر گئی جھگیوں میں اور کچے مکانوں میں۔ صدر بازار میں فلیٹ تو اس کے لیے تاج محل ہے۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ مقبوہ ہے اس کا۔"

وہ خوشی سے گڑگڑایا "اچھا اچھا۔ آؤ جی بھابی صاحبہ، اندر آؤ۔ آپ کا گھر آپ کو مبارک۔ میں نے تو صوفی صاحب کی شرافت دیکھی اور بس کھڑے کھڑے کہہ دیا کہ فلیٹ آپ کا۔"

وہ ایسے ظاہر کر رہا تھا جیسے اس نے بیعانہ لیا نہ قیمت طے کی۔ بس میری شرافت پر اپنا ٹھکانا قربان کر دیا۔ اندر ایک خاصی بڑی موم بتی جل رہی تھی مگر پھر بھی اجالا برائے نام تھا۔ رابعہ بہت سنجیدہ اور خاموش تھی۔ سامان سے عاری فلیٹ میں خانہ ویراں کا تاثر بہت نمایاں تھا مگر مالک نے لائٹس جلا کے فلیٹ کی ایک ایک خوبی پر روشنی ڈالی۔ وہ اپنے بیوی بچوں کو اس لیے یہاں سے منتقل کر چکا تھا کہ یہ فلیٹ کسی طرح بھی انسانوں کے رہنے کی جگہ نہیں تھی۔ اب اس کے سارے نقائص اس کی خوبیاں بن گئے تھے۔

میں نے کہا "کیا تم اسی وقت قبضہ دے سکتے ہو؟"

وہ بھونچکا رہ گیا "اس وقت۔ تم پوری ادائیگی کرو گے؟"

میں نے کہا "ہاں لیکن کاغذات کا کیا ہو گا؟"

"ابھی تو رسید لکھ کے دے سکتا ہوں۔ اپنے ہاتھ سے۔ باقی کاغذات تو صبح لے کر آؤں گا۔ اگر تمہیں اعتبار نہیں تو سامنے والوں سے پوچھ لو۔ وہ چار سال سے ہمارے پڑوسی ہیں۔ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔ ساری بلڈنگ والے جانتے ہیں۔ میں پیسہ لے کر بھی بھاگنے والا آدمی نہیں ہوں۔"

میں نے کہا "میں بھی ایک ہزار بیعانہ دے کر فلیٹ پر قبضہ کرنا نہیں چاہتا۔ تم پوری قیمت لو اور ہاتھ سے رسید بنا دو۔ باقی معاملات صبح طے ہو جائیں گے۔ صبح ہونے میں اب دیر ہی کتنی ہے۔ ڈیڑھ تو بج گیا ہے۔"

اس نے باقی انیس ہزار ایسے وصول کیے جیسے اس کے لیے خواب اور حقیقت میں فرق کرنا دشوار ثابت ہو رہا ہے۔ آدھی رات کے وقت بیعانہ، ایک گھنٹے بعد پوری رقم کی وصولیابی، بیس ہزار کے نوٹ اصلی تھے لیکن رابعہ نے جس ٹین کے صندوق سے نکالے تھے اس کی خستہ حالی اور قدامت دیکھ کے وہ سخت حیرانی میں مبتلا تھا۔ اس سے زیادہ وہ رابعہ کے حُسن کی تابانی سے پریشان تھا۔ میرے جیسے مضحکہ خیز حلیے والے مولوی کے ساتھ ایک بے پردہ قیامت خیز حسینہ تھی جسے میں علی الاعلان اپنی منکوحہ بتا رہا تھا۔ اس

کی عقل خبط کیسے نہ ہوتی مگر شک کی گنجائش نہ تھی۔ وہ شک کرتا تو اپنا سودا خراب کرتا۔

اس نے کہا "کیا اب آپ یہاں ٹھہرو گے؟ فلیٹ تو آپ کا ہو گیا۔"

میں نے کہا "ہم بہت دور سے آئے ہیں۔ واپس جانے کے لیے سواری بھی نہیں ملے گی۔"

"مطلب یہ کہ میں جاؤں۔ اسی وقت؟"

میں نے کہا "یہ ضروری نہیں۔ ہم دوسرے کمرے میں سو جاتے ہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ میں چلا ہی جاؤں۔ یہاں تو ایک چارپائی ہے اور ایک دری۔ تم اپنا سامان کب لاؤ گے؟"

"ظاہر ہے کل ہی لائیں گے۔ تم اس وقت کیسے جاؤ گے؟"

"میری موٹر سائیکل کھڑی ہے نیچے۔ میں دس منٹ میں گھر پہنچ جاؤں گا۔ تم کو سونا ہی ہے تو کوئی مسئلہ نہیں۔ کسی چیز کی ضرورت پڑے تو سامنے والوں سے مانگ لینا۔ اچھے لوگ ہیں۔ باتھ روم کے اوپر ٹنکی ہے جو ابھی پوری بھری ہوئی ہے۔ صبح آٹھ نو بجے آدھے گھنٹے کے لیے پانی آتا ہے تو سب اپنا کام کر لیتے ہیں اور ٹنکی بھر جاتی ہے۔ بجلی، گیس، ٹیلی فون کے کوئی بل باقی نہیں۔ صبح میں کاغذات کے ہمراہ لے آؤں گا۔"

وہ بات مجھ سے کر رہا تھا لیکن اس کی نظر رابعہ پر تھی۔ اسے یہ جوڑی ہی عجیب لگ رہی ہو گی پھر ہمارا آدھی رات کے بعد آ[کر] اچانک فلیٹ خریدنا اور اس میں منتقل ہو جانا بھی شکوک پیدا کر[تا] تھا۔ ہم نے کہا تھا کہ سامان صبح لائیں گے مگر اس ٹین کے صند[وق]... صندوق میں رابعہ کے اور میرے کپڑے بھرے ہوئے تھے اور ر[قم] بھی کم نہیں تھی۔ اس کی جگہ میں ہوتا تو یہی سمجھتا کہ معاملہ گڑ[بڑ] ہے یا تو میرے پاس نقشِ اعظم وغیرہ ہے جس کی مدد سے میں... اس پری کو شیشے میں اُتار کے اپنا بنا لیا ہے اور وہ میرے ساتھ گھر سے بھاگ آئی ہے۔ رابعہ صورت کے علاوہ مہذب اطوار اور باوقار انداز سے معزز اور اچھے گھر کی لڑکی نظر آتی تھی اور میرے حلیے کے ساتھ یہ فرق زیادہ نمایاں ہوتا تھا تو مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگتا تھا۔ سمجھنے والے اس سے زیادہ بھی سمجھ سکتے تھے کہ رابعہ میری کچھ نہیں بس میں اس کے حُسن کی دکان کا سیلزمین ہوں یا ہم مل کے بے وقوف دولت مندوں کو لوٹتے ہیں۔

میں نے کہا "ہمارے لیے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ رات گزار لیں گے۔ یہاں نیچے پورا صدر بازار ہے۔ ہر چیز [مل جاتی] ہے۔"

اس نے کہا "تم اکیلے ہو۔ میرا مطلب ہے کوئی اور نہیں ہے۔ ماں باپ یا بھائی بہن... بچے۔"

میں نے کہا "اب کیا بتاؤں بھائی صاحب۔ شادی کو تین [مہینے] ہوئے تھے کہ گھر میں جھگڑے شروع ہو گئے۔ بڑے بھائی کا گھر [...] کمرے کم نہیں تھے، ماں باپ بھی اس کے ساتھ رہتے تھے۔ ہمارے لیے اس کے دل میں جگہ نہیں رہی تھی۔ وہ پیسے والا آدمی ہے۔ پیسہ بھی حق حلال کی کمائی کا نہیں۔ میں ذرا دوسری قسم کا آدمی ہوں۔ شادی سے پہلے بھی اس کے ساتھ نہیں بنتی تھی۔ اسے میری سچی باتیں کڑوی لگتی تھیں۔ شادی کے بعد اس کی بیوی کی زبان زیادہ کھل گئی۔ دن رات کا فساد عذاب ہو گیا۔ یہ بے چاری کہاں تک برداشت کرتی۔ ہم الگ ہونے کا فیصلہ پہلے ہی کر چکے تھے۔ اتفاق سے یہ فلیٹ مل گیا۔ میں گھر پہنچا تو وہاں جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ سارا محلّہ سُن رہا تھا اور یہ رو رہی تھی زار و قطار۔ ماں باپ بھی بس اس لیے سوتیلے بن گئے کہ میں غریب ہوں اور میں نے شادی کے وقت جہیز لینے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ بس میں نے اپنا یہ صندوق اُٹھایا۔ چند کپڑے لیے اور بیوی کا ہاتھ پکڑ کے نکل آیا۔ سب دیکھتے رہ گئے۔ آج رات فرش پر سو جائیں گے مگر سکون سے سوئیں گے اپنے گھر میں۔ کل باقی ضرورت کا سامان خرید لیں گے۔ تم کو ضرور عجیب لگا ہو گا ہمارا اس وقت آنا اور وہ بھی خالی ہاتھ... اس لیے تمہیں بتا دیا ورنہ گھر کی بات تھی۔"

میری بات کا بڑا اچھا اثر ہوا۔ اس کا شک رفع ہو گیا اور اس نے مجھ سے بہت ہمدردی کا اظہار کیا "چلو اللہ مبارک کرے نئی زندگی کا سفر، نئے گھر میں۔ اصل چیز خوشی ہے۔ پیسہ تو ہاتھ کا میل ہے۔ بس دلوں میں میل نہ آئے۔"

میں نے کہا "ہم تو اپنے شہر میں اپنوں کے ہوتے اجنبی بن گئے ہیں۔"

وہ بولا "کاغذ قلم ہے تمہارے پاس۔ میں رسید لکھ دوں۔"

میں نے کہا "چلو چھوڑو۔ صبح سب کاغذات لے آنا۔"

رابعہ نے مجھے تنبیہہ کے انداز میں گھورا کہ ایسے بیس ہزار دے کر رسید بھی نہ لینا بے وقوفی کی بات ہے۔ "آپ سامنے والوں سے کاغذ اور قلم مانگ لیں۔" رابعہ نے آہستہ سے کہا "نہیں تکلیف تو ہو گی... وہ سو رہے ہوں گے مگر..."

"نہیں، تکلیف کی کیا بات ہے۔ ہمسائے کا حق تو بہت زیادہ ہوتا ہے۔ میں انہیں جگا کے کہوں کہ مجھے گھر چھوڑ آؤ تو وہ انکار نہیں کریں گے۔"

وہ بولا اور دروازے سے باہر جا کے مقابل کے فلیٹ کی کال بیل بجانے لگا۔ اسی وقت لائٹ آ گئی تھی اور فلیٹ میں بھی بلب روشن ہو گیا تھا۔

رابعہ نے کہا "کیا ہو گیا ہے تمہاری عقل کو۔"

میں نے کہا "گھاس چرنے چلی گئی تھی۔ اچھا ہوا تم ہانک کے واپس لے آئیں۔"

"جب جھوٹ بولتے ہو اتنی روانی سے۔ اس وقت عقل خوب ساتھ دیتی ہے۔" رابعہ نے کہا "آخر کون ہے وہ جس سے تین مہینے پہلے شادی ہوئی تھی۔ ماں باپ بھائی بہن، سارے رشتے گھڑ لیے۔ جھوٹے ایک نمبر کے۔"

میں نے کہا "داد نہیں دو گی کہ میں نے کیسی زبردست اسٹوری گنا کے اسے قائل کر لیا ورنہ دیکھا نہیں۔ شک کی پیچش سے اس کے پیٹ میں مروڑ اُٹھ رہے تھے۔ حسد کا ملیریا بخار الگ چڑھ رہا تھا۔"

"حسد کیسا؟"

"پہلوئے حور میں لنگور خدا کی قدرت۔ یہ دیکھ کے تو میں بھی رشک اور حسد سے مر جاتا۔"

وہ اندر آ کے بولا "عجیب اتفاق ہے۔ وہ گھر میں نہیں ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اپنے سسرال میں رُک گئے۔ ان کی ساس بیمار ہیں۔ شاید دل کا دورہ پڑا تھا۔ اللہ خیر کرے۔ آپ ایسا کیوں نہیں کرتے۔ بھابی صاحبہ کو یہاں چھوڑو اور موٹر سائیکل پر میرے ساتھ چلو۔ رسید کیا سارے اصل کاغذات ابھی لے لو۔ میں واپس چھوڑ جاؤں گا تمہیں۔"

رابعہ کا رنگ اُڑ گیا تھا لیکن مجھے بڑی حیرت ہوئی جب اس نے کہا "ہاں کیا حرج ہے، میں اندر سے کنڈی لگا کے بیٹھ جاتی ہوں۔"

"ابھی آدھے گھنٹے میں آ جائیں گے۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں، اوپر نیچے سب ہی شریف فیملی والے لوگ رہتے ہیں۔"

رابعہ کا ذہن کسی وکیل کی طرح سوچ رہا تھا اور وہ چاہتی تھی کہ میں نے بیس ہزار روپے ہیں تو فلیٹ کی خرید کا ثبوت میرے پاس ضرور ہونا چاہیے۔ یہ نہ ہو کہ صبح وہ انکار کر دے کہ میں تو انہیں نہیں جانتا۔ پتا نہیں یہ کون ہیں جو میرے فلیٹ میں گھس کے بیٹھ گئے ہیں۔ وہ ایسا لگتا نہیں تھا اور اگر چار سال سے اس فلیٹ میں مقیم تھا تو کوئی لاوارث شخص نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر وہ پولیس کو ساتھ لے آتا تو ہمارا ساتھ کون دیتا۔ رابعہ کی احتیاط پسندی سو فیصد جائز تھی۔ جب میں اس کی موٹر سائیکل پر پیچھے بیٹھا ہوا تھا تو مجھے گزرے ہوئے تین گھنٹوں میں پیش آنے والے واقعات کسی خواب کا حصہ لگتے تھے۔ تین گھنٹے پہلے میں سکندر بخت تھا۔ اوریجنل اور اصلی حالت میں پھر میں نے یہ صوفیانہ وضع قطع اختیار کی اور جب رابعہ کو ہوٹل فون کیا تو گویا دھماکا ہو گیا۔ چوہدری دلاور کی وہاں موجودگی کسی بلائے ناگہانی کے نزول سے کم نہ تھی مگر پھر جس طرح میں نے رابعہ کو وہاں سے نکالا وہ بھی ہمتِ مرداں مددِ خدا کی انوکھی مثال تھی۔

اب میں بہت پُرسکون تھا۔ میری پگڑی کا پچھلا حصہ سامنے سے آنے والی ہوا میں پیچھے اڑ رہا تھا اور پرانی موٹر سائیکل کی پھٹ پھٹ رات کی خاموشی میں خالی سڑک پر زیادہ گونج پیدا کر رہی تھی۔ اسے چلانے والے نے چلّا کے مجھ سے کوئی سوال بھی کیا تھا مگر مجھے الفاظ صاف سنائی نہیں دے رہے تھے تو میں جواب کیا دیتا۔ اب وہ بھی خاموش تھا اور میں کراچی کے شہر کی روشنیوں میں خوابیدہ شہر کی سڑکوں کو ایسے دیکھ رہا تھا جیسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

موٹر سائیکل نے ریلوے کے اوور ہیڈ برج کو عبور کیا اور پھر ایک ایسی آبادی میں داخل ہو گئی جہاں کچی گلیاں، کچے پکے، ٹین کی

اور ایسبٹاس... کی چھتوں والے۔ چھوٹے چھوٹے بے ترتیب اور بدوضع گھر خود اس بستی کے مکینوں کی غربت کا اعتراف کرتے تھے یہاں کی دکانیں بھی چھوٹی تھیں اور غلاظت بھی بہت تھی۔ گلیوں میں آوارہ کتے پھر رہے تھے اور جگہ جگہ نالیوں کا پانی بہہ رہا تھا۔ بعد میں اس نے مجھے بتایا کہ یہ اختر کالونی کا علاقہ تھا اور یہاں اسے دو سو گز زمین پر قبضہ کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ اس کے صرف دو سو روپے خرچ ہوئے تھے۔ اس نے یہاں چار دیواری کھینچ کے ایک کمرا بنالیا اور فیملی کو شفٹ کردیا۔

"سال دو سال کی تکلیف ہے پھر گیس بھی آجائے گی۔ بجلی ہے" اس نے اوپر تاروں سے لیے گئے ڈائریکٹ کنکشن کی طرف اشارہ کیا۔ "پانی خریدنا پڑتا ہے لیکن اب میں لائن لے لوں گا گھر میں۔ اس رقم سے تو سب کچھ ہو جائے گا۔ کہاں وہ دڑبے جیسا فلیٹ کہاں یہ دو سو گز کا مکان۔"

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ ایسی زمین پر قبضہ کرکے مکان بنانا۔ پھر اس کی لیز حاصل کرنا بجلی پانی گیس لگوا کے اس کو سو دو سو گنا منافع پر بیچنا اور خود پھر کہیں ناجائز طور پر زمین پکڑنا کچھ لوگوں کا پیشہ ہے۔ وہ مسلسل خانہ بدوشی کی زندگی گزارتے ہیں اور ہر دو چار سال بعد پیسہ خوب کما لیتے ہیں مگر آرام سے کبھی نہیں رہتے۔ اس ناجائز کاروبار میں پولیس بھی ان کی مدد کرتی ہے اور شہری انتظامیہ کے بدعنوان اہلکار بھی شریک ہوتے ہیں۔ اس شہر کی آدھی آبادی اسی طرح ناجائز طور پر وجود میں آنے والی کچی آبادیوں میں رہتی ہے جہاں بنیادی سہولتوں کا فقدان ہے۔

یہ ساری معلومات مجھے واپسی کے سفر میں حاصل ہوئیں۔ میں موٹر سائیکل کے پیچھے فلیٹ کے کاغذات کی فائل بغل میں دبائے بیٹھا تھا اور اس شخص پر حیران تھا جس نے مجھ سے کہا تھا کہ یہ فلیٹ بھی کوئی انسانوں کے رہنے کی جگہ ہے۔ اب وہ جہاں اپنی فیملی کو لے گیا تھا وہ شاید جانوروں کے رہنے کے لائق جگہ بھی نہیں تھی۔ خیر اپنی اپنی زندگی گزارنے کا انداز ہے۔ میرے خیال میں وہ چھوٹا سا فلیٹ اس دو سو گز کے مکان سے لاکھ درجے بہتر تھا۔

رات کے تین بجے وہ مجھے نیچے ہی اُتار کے رخصت ہو گیا۔ رابعہ نے ... دروازہ کھولا تو میں نے فائل اسے تھما دی۔

"دیکھا، ہم جھوٹ نہیں بولتے۔ یہ گھر ہمارا ہے۔"

رابعہ چارپائی پر بیٹھ گئی۔ "سکندر۔ مجھے لگتا ہے کہ میں پاگل ہو جاؤں گی۔"

میں فرش پر بچھی ہوئی دری پر لیٹ گیا "کچھ لوگ اپنے آپ سے بھی کتنے بے خبر ہوتے ہیں۔ آپ پاگل ہو چکی ہیں خاتون.... بہت پہلے۔"

"تم نے تو یہ بھی نہیں پوچھا کہ رابعہ۔ تم نے کچھ کھایا پیا ہے یا نہیں۔"

"یہ زنانہ سوال ہے جو بیویاں شوہروں سے کرتی ہیں۔ جب وہ جھک مار کے گھر لوٹتے ہیں۔"

"بجا ارشاد۔ آپ کا گھر ہوگا تو آپ کی بیوی ضرور پوچھے گی۔"

میں نے کہا "بھوک تو مجھے بھی لگی ہے۔ اب دماغ کو ذرا سکون ملا ہے تو معدے کی فریاد سُنی ہے۔ مگر اس وقت کیا ملے گا اور کہاں ملے گا۔"

"ابھی تم باہر گئے تھے کیا کہیں کوئی ہوٹل کھلا نظر نہیں آیا تھا؟"

میں اُٹھ بیٹھا "ایک ایرانی ہوٹل ہے پیراڈائز سینما کے سامنے۔ کھانا تو شاید نہ ملے، چائے ضرور ملے گی میں ابھی آیا۔"

ایرانی ہوٹل میں اس وقت بھی لوگ لکڑی کی کرسیوں پر پاؤں اوپر رکھے اکڑوں بیٹھے سڑپ سڑپ کرکے ابلتی ہوئی چائے پی رہے تھے اور سیاست پر بحث کر رہے تھے۔ عین ان کی نظروں کے سامنے متعدد ہدایات منجانب انتظامیہ واضح حروف میں تحریر تھیں جن میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ سیاسی گفتگو کرنا منع ہے۔

کاؤنٹر ایک لمبا سا شوکیس تھا جس میں دن بھر کی بچی ہوئی چیزیں میلے شیشے سے زیادہ باسی نظر آتی تھیں۔ خشک پیسٹریاں، ٹھنڈے سخت آلو بھرے سموسے۔ جمے ہوئے شیرے والی جلیبیاں۔ میں نے بہتر سمجھا کہ بسکٹوں کا ڈبا لے لوں۔ چائے دو قسم کی تھی۔ عام چائے اور اسپیشل۔ اسپیشل کو عرفِ عام میں دودھ پتی بھی کہا جاتا تھا کیونکہ اس میں پانی کی جگہ دودھ استعمال ہوتا تھا۔ اب دودھ کس حد تک دودھ ہوتا تھا۔ یہ شاید دودھ دینے والے جانور کو بھی پتا نہیں ہوگا۔

میں نے چار کپ اسپیشل کی فرمائش کی "میں برتن ساتھ لے جاؤں گا۔"

"لے جاؤ بابا۔ پچاس روپیہ ادھر چھوڑ جاؤ" مالک نے کمال محبت سے کہا۔

یہ گاڑھا میٹھا سنہرا مشروب ہمیں اس وقت بہت مزے دار اور فرحت بخش لگا جس میں پہلے دودھ کو چُورا چائے کے ساتھ خوب اُبالا گیا تھا پھر اس میں خوب چینی ملا کے خوب پکایا گیا تھا۔ میں نے رابعہ کے ساتھ مل کے بسکٹوں کا پیکٹ ختم کردیا، گرم چائے پی کے رابعہ پُرسکون ہوگئی اور اس کا موڈ بھی اچھا ہو گیا۔

"آج تو تم نے کمال کردیا۔"

میں نے کہا "جو لوگ کچھ نہیں کرتے، کمال کرتے ہیں۔"

"آخر یہ بجلی کمپنی کی سیڑھی استعمال کرنے کا خیال تمہارے دماغ میں کیسے آگیا" وہ بولی۔

میں نے پھر شعر پڑھا "آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں۔"

"بجلی کمپنی کے ڈرائیور کو کیسے راضی کیا تم نے، کیا اسٹوری سنائی؟"

"بڑی دردناک کہانی تھی۔ سُنو گی تو تمہاری آنکھوں سے سیلِ اشک بہے گا" میں نے رقت بھرے لہجے میں کہا "میں نے کہا کہ اے رحم دل، نیک صورت، فرشتہ سیرت شخص۔ اس وقت میری اکلوتی محبوبۂ دلنواز ایک رقیب روسیاہ کے قبضے میں ہے جس نے اسے ایک آدم خور شیر کے ساتھ والے کمرے میں بند کردیا ہے اور اس سے پوچھ رہا ہے کہ بولو کس کا لقمہ تر بنوگی۔ آدم کا یا آدم خور شیر کا؟ اس نے پوچھا کہ کیا وہ اتنی باوفا ہے کہ برضا و رغبت شیر کے پیٹ میں جانے کو ترجیح دے گی۔ میں نے کہا کہ ہاں تو وہ ہنسنے لگا کہ ایسی بے وقوف لڑکی کے لیے اتنا پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ لڑکی اور بس ہاتھ سے نکل جائے تو رونے کے بجائے دوسری کا انتظار کرو۔"

"پھر تم نے مانی کیوں نہیں اس کی بات؟" رابعہ مسکرائی۔

میں نے کہا "کیسے مان لیتا۔ لڑکی نہیں تم رابعہ ہو۔ جو صرف ایک ہے اور میری ہے۔"

"باتونی آدمی!"

میں نے کہا "کیا میں صرف باتیں کرتا ہوں؟ دیکھو تمہیں کیسے نکالا وہاں سے۔ دودھ میں مکھی، نہیں۔ یہ محاورہ نہیں چلے گا۔ جیسے چور آنکھوں سے کاجل چُرا لیتے ہیں اور کسی کو پتا بھی نہیں چلتا۔ جیسے تم نے میرا دل چُرا لیا تھا۔"

وہ ہنسی "اور تمہیں پتا نہیں چلا تھا؟ آج میں مان گئی کہ تم واقعی سکندرِ اعظم ہو۔ تمہیں کوئی شکست نہیں دے سکتا۔"

"تقدیر کے سوا" میں نے کہا "کچے کاغذ پر اپنے ہاتھ سے لکھ دو یہ بات کہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آوے۔"

"صبح چوہدری دلاور کی عقل خبط ہو جائے گی جب دیکھے گا کہ اس نے تو ہر طرف بڑا مضبوط جال پھیلایا تھا۔ یہ دونوں پنچھی پُھر سے کیسے اڑ گئے کہ کسی نے دیکھا بھی نہیں۔ نہ انسان کی آنکھ نے نہ کیمرے نے۔"

"تمہیں کیمرے کے بارے میں کس نے بتایا؟"

"میں گیلری میں کھڑی تمہاری باتیں سن رہی تھی۔"

میں نے کہا "کیا وہ تمہارے کمرے میں بھی لائٹ ٹھیک کرنے آیا تھا۔"

"آیا تو تھا لیکن مجھے کچھ شک ہو گیا تھا کہ خرابی کوئی نہیں تو یہ کیا اپنا سر ٹھیک کرنے آیا ہے۔ اس نے جہاں کارگزاری دکھائی تھی وہاں میں نے اس کے جاتے ہی یہ دیکھ لیا" رابعہ نے بیگ میں سے پلگ جیسی دو ٹانگوں والا مائک دکھایا۔

"آفرین ہے تم پر سکندر کی سکندری" میں نے مائیک دیکھ کے کہا "خاصی وزنی چیز ہے یہ۔ غالباً اندر ٹرانسفارمر بھی ہوگا۔ دو سو بیس وولٹ کو چھ یا بارہ وولٹ میں تبدیل کرنے والا۔ اسے سنبھال کے رکھو، داشتہ آید بکار۔"

"کیا؟" رابعہ نے داشتہ کے لفظ پر مجھے گھورا۔

"اس کے دو مطلب ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ داشتہ کار میں آتی ہے۔ اصل یہ کہ رکھی ہوئی چیز کام آجاتی ہے۔"

"آخر اپنے چوہدری صاحب وہاں پہنچے کیسے؟"

"میرا خیال ہے کہ اس نے اکرام شیخ سے معلوم کیا۔ پہلے بھی ہماری وجہ سے اکرام شیخ پر مصیبت آئی تھی۔"

"اس مرتبہ انہوں نے دلاور کو ہمارا پتا بتا کے اپنی جان بچائی۔" رابعہ بولی۔

"یہ بھی ہو سکتا ہے" میں نے بے خیالی میں کہا "لیکن بقول شاعر۔

جب توقع ہی اُٹھ گئی غالب
کیا کسی کا گلہ کرے کوئی"

"تم فون کرکے پوچھ کیوں نہیں لیتے؟"

"کیوں نہ پہلے اپنے چوہدری صاحب سے ان کا حال پوچھ لو۔ اب تو وہاں بھی روشنی ہوگی۔ چودہ طبق روشن ہو گئے ہوں گے۔"

رابعہ نے ریسیور پر ہاتھ رکھ دیا "کوئی ضرورت نہیں اس چھیڑخانی کی۔"

میں نے کہا "بعض اوقات پنگا لینا ضروری ہوتا ہے رابعہ، تم ذرا دیکھو۔"

اس نے اپنا ہاتھ ہٹالیا "میں نے ہوٹل کا فون نمبر ڈائل کیا تو آپریٹر نے سوتے سے جاگ کے کہا "ہے...لو..."

میں نے کہا "اپنے چوہدری دلاور صاحب کے کمرے کا نمبر ملاؤ۔"

"کون چوہدری دلاور سر؟ یہاں تو....."

میں نے بات کاٹ دی "روم نمبر تھری زیرو تھری۔"

"اس میں تو ریٹائرڈ میجر معین الدین ہیں۔"

میں نے کہا "گھر میں ان کا نام دلاور ہے، خیر تم نمبر دو۔"

وہ تذبذب میں پڑ گیا "وہ.... سو رہے ہوں گے سر، کیا بتاؤں؟"

"کہنا کرنل کبیر خان بات کرنا چاہتے ہیں۔ میں والد ہوں میجر معین کا۔"

حسبِ توقع چوہدری دلاور نے ریسیور فوراً اٹھالیا، وہ جاگ رہا تھا۔

"تو خیر سے اب تم کرنل ہو گئے ہو اپنے سکندرِ اعظم صاحب۔"

میں نے کہا "تم بھی کم تو نہیں ہو۔ میجر اور کرنل میں ایک ہی عہدے کا فرق ہے۔"

وہ ہنسنے لگا "اتنا کم فرق تو نہیں تھا ہمارے درمیان۔ ہیں جی ہم تو ہیں غدار تم ہو وہ.... کیا کہتے ہیں اسے 'محبِ وطن'۔"

میں نے کہا "تمہیں افسوس تو ہو گا کہ اس بار تم نے بڑا مضبوط جال بچھایا تھا۔ خفیہ کیمرے اور خفیہ مائکروفون....."

"خفیہ کیمرے اور مائک.... خیر سے طبیعت تو ٹھیک ہے نا تمہاری۔ یہ بات کچھ اپنے پلّے نہیں پڑی... ہیں جی۔"

میں نے کہا "ہوٹل کے اندر بھی تمہیں ایک آدمی مل گیا اپنے مطلب کا۔"

وہ متاثر ہوئے بغیر بولا "ہوٹل والے تو ایسے انتظامات کرتے ہی ہیں آج کل، ہیں جی۔ حفاظت کے لیے، تم کس کی بات کر رہے ہو؟"

میں نے کہا "ایک نمونہ میں بھی لے آیا ہوں تمہاری کارگزاری کے ثبوت کے طور پر۔ افسوس یہ ہے کہ کیمرا نہیں لا سکا۔"

"تم کچھ بہکی بہکی سی باتیں کررہے ہو اپنے سکندر اعظم صاحب۔ خیر سے کوئی چوٹ تو نہیں آگئی تھی لڑائی میں۔"

"میری کسی سے لڑائی نہیں' سوائے تمہارے.....؟"

"میں نے کہا شاید اس بندے نے سر پر کچھ ماردیا ہو۔ ہیں جی' جس کو مار کے تم نکل گئے اپنی والدہ کے ساتھ....."

"تم مجھے بتانا چاہتے ہو کہ تم نے اس کو ماردیا؟" میں نے کہا "اپنے پانچ ہزار بھی بچالیے ہیں ایک آدمی کی جان لے کے؟"

"میں نے؟" وہ ہنسنے لگا "وہ تو جب تم نے اس پر اسی کے ریوالور سے گولی چلائی تو سارا ہوٹل جاگ گیا تھا۔ ہیں جی' اور سارے ہی پہنچ گئے تھے کمرا نمبر ایک سو تیرہ میں جہاں اس بے چارے کی لاش پڑی تھی۔ خون میں لت پت' آلۂ قتل کے ساتھ....."

مجھے اچانک احساس ہوا کہ دلاور مجھے باتوں میں اُلجھا رہا ہے۔ میں نے ریوالور اس الیکٹریشن کو واپس دیتے ہوئے ایک بڑی فاش غلطی کی تھی۔ میں نے اس کو صاف نہیں کیا تھا۔ اس پر پولیس کو میرے فنگر پرنٹس آسانی سے مل جائیں گے۔ دلاور نے پہلے الیکٹریشن سے سب اُگلوالیا ہوگا اور پھر اس کے عیار ذہن میں ایک تیر سے دو شکار کرنے کا خیال آیا ہوگا۔ اس نے الیکٹریشن کو گولی ماردی اور وہ ریوالور وہیں چھوڑ کے پچھلی طرف کی گیلری سے اپنے کمرے میں جا پہنچا۔ پھر وہ کوریڈور میں کھلنے والے دروازے سے نکل کر قدرے تاخیر سے جائے واردات پر پہنچا ہوگا جب دوسرے لوگ وہاں پہلے سے جمع ہوں گے۔

میں نے کہا "تم کس ہوٹل سے بات کررہے ہو؟"

وہ ہنسنے لگا "اپنے سکندر اعظم صاحب' آپ نے خیر سے کہاں فون کیا تھا؟ تمہاری میڈم چار سو بیس کو تصویر دیکھ کے شناخت کرلیا تھا یہاں لوگوں نے۔ بس جی' حرامی منیجر اڑ گیا کہ ایسے میں کسی کو بھی اجازت نہیں دے سکتا کمرے میں جانے کی۔ ابھی عورت اکیلی ہے۔ جب آپ کا بندہ آئے تو آپ انہیں باہر گرفتار کریں۔ ہوٹل میں ہم نے پولیس کو آج تک نہیں آنے دیا ہے بے شک وارنٹ ہو ان کے پاس۔ کوئی مجرم ہو پھر بھی کب تک کمرے میں چھُپ کر بیٹھے گا۔"

میں نے کہا "آخر تم کب تک سائے کی طرح میرا تعاقب کروگے؟" "سایہ ہمیشہ پیچھے ہی رہتا ہے۔"

"ہاں جی' اگر روشنی سامنے ہو۔ مگر بندہ پلٹ کے دیکھے تو سایہ سامنے آجاتا ہے۔"

میں نے کہا "ہاتھ پھر بھی نہیں آتا۔ اب تم دیکھ لو کہ کتنے پاپڑ بیلے تم نے۔ ہر جگہ میرا تعاقب کیا۔ پنڈی میں مجھے پھنسانے کی کوشش کی۔ خداداد کو قتل کرنے کے الزام میں۔ پھر لاہور میں نبی داد کو پھنسوادیا۔ کراچی پہنچے' کیا ملا تمہیں ناکامی کے سوا؟ اب لوٹ کے لاہور آجاؤ۔"

"یعنی تم اس وقت لاہور سے بول رہے ہو۔ ہیں جی' خیر سے فوراً ہی جہاز میں سیٹ مل گئی تمہیں یا اپنی اور رابعہ کی سیٹ کنفرم کرا کے گئے تھے۔ چلو جی ہم مان لیتے ہیں کہ تم کراچی سے نہیں بول رہے ہو۔"

میں نے کہا "میں ڈرتا نہیں کہ جھوٹ بولوں۔ کہنے کو میں پشاور بھی کہہ سکتا تھا۔"

"اپنے سکندر اعظم صاحب۔ ماننا پڑتا ہے کہ تم نے جادو کا کمال دکھایا۔ رابعہ کو ایسے نکال کرلے گئے۔"

میں نے کہا "غالب اور رابعہ کو پولیس برآمد کرلے گی دلاور۔ نبی داد سب اُگل دے گا۔"

"نبی داد!" دلاور ہنسنے لگا "لگتا ہے تم نے اخبار نہیں دیکھا آج۔ ہیں جی' وہ بے چارہ اب اس دنیا میں کہاں؟"

مجھے ایک ذہنی شاک نے ہلادیا "وہ..... اسے بھی ماردیا؟"

"نہیں۔ مارا اسے کسی نے نہیں۔ بس وقت آگیا تھا اس کا" چوہدری دلاور نے ایک آہ بھری "اس کو حوالات میں ہارٹ اٹیک ہوا۔ اس نے کہا کہ میں ایک بیان دینا چاہتا ہوں۔ مجسٹریٹ کے سامنے' ہیں جی۔ مگر اجل نے مہلت نہیں دی۔ کیا ہے وہ شعر' آگہ اپنی وفات سے کوئی بندہ بشر نہیں۔ اور اپنے سکندر صاحب' سامان سو سال کا ہے لیکن کل کی خبر نہیں۔ کچھ ایسا ہی ہے۔ ہم اَن پڑھ بندے' زیادہ شعر شاعری نہیں جانتے۔ غلط پڑھا ہو شعر تو معاف کردینا۔ نبی داد کی بات تھی۔ بھائی کی جگہ بننا چاہتا تھا ایم پی اے شاید ایم این اے' اقتدار کی ہوس چیز ہی ایسی ہے۔ جھنڈے والی گاڑی کا ارمان دل میں ہی رہ گیا۔ خاندانی سیٹ بھی گئی' بھائی بھی گیا۔"

میں نے مشتعل ہوکے کہا "شیطان کی ناخلف اولاد۔ کبھی اپنے بارے میں بھی ایسا سوچا ہے؟ تُو شاید کفن بھی نہ لے جاسکے میں۔"

"تم بھی ایک بات گرہ میں باندھ لو سکندر اعظم۔ میں نے بڑی رعایت دی تمہیں۔ بہت مہلت دی سوچنے کی..... یہ کھیل اب ختم ہوجانا چاہیے۔"

میں رابعہ کے ساتھ دلاور کے چُنگل سے تو نکل آیا تھا مگر اس کھیل میں میری چال غلط ہونے سے دو مہرے پٹ گئے تھے اور بازی ہنوز جاری تھی۔ مجھے احساس ہونے لگا تھا کہ رفتہ رفتہ میرے لیے بھی زندگی اور موت کے اس مقابلے میں انسانوں کا مرنا کوئی اب اندوہ ناک سانحہ یا دکھ کی بات نہیں رہی تھی۔ نبی داد بُرا آدمی تھا وہ الیکٹریشن بھی خطا کار تھا مگر ان کو مارنے والے ان سے بڑے مجرم تھے۔ اور کسی انسان کی زندگی بھی اتنی بے وقعت نہیں ہو جتنی شطرنج کی بساط پر پیادے کی۔ شاہ کو بازی مات ہوجائے تو بازی پھر شروع ہوجاتی ہے مگر زندگی کی بازی آدمی صرف ایک ہی بار ہارتا ہے۔

"تم نے ٹھیک کہا۔ کیا ہم میں سے ایک کو میدان چھوڑنا چاہیے؟ اگر ہم اس دنیا میں ایک ساتھ زندہ نہیں رہ سکتے تو دونوں کو مرجانا چاہیے۔"

"کیا تم سوچتے ہو۔" دلاور بولا "میں نے ہمیشہ صلح اور مفاہمت کے دروازے کھلے رکھے... ہیں جی۔"

"خیر و شر کے درمیان مفاہمت کیسی" میں نے کہا "تم کو احساس نہیں ہے دلاور کہ موت کا گھیرا تمہارے گرد تنگ ہوتا جارہا ہے۔ تمہارے خلاف پیڈرو نے بڑے ٹھوس ثبوت فراہم کیے ہیں۔ اس کی ڈائری میرے پاس ہے۔ میں نے منظر کے حوالے کردی ہے اور اس کی اصل' صبح کسی بینک کے لاکر میں رکھوادے گا۔ اس کی نقل وقت آنے پر عدالت میں بھی پیش کردی جائے گی اور تمہارے خلاف وعدہ معاف گواہ خود پیڈرو ہوگا۔"

"میں نے سُنا ہے کہ تم ولایت سے بھی ایک گواہ امپورٹ کررہے ہو" اس نے میرا تمسخر اڑاتے ہوئے کہا "چوہدری دلاور نے کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں اپنے سکندر اعظم صاحب۔ میں تم کو نہیں بتاؤں گا کہ میرے پلان کیا ہیں۔ وقت آنے پر تم خود دیکھ لوگے کہ تمہاری ساری جدوجہد لاحاصل تھی۔ ثبوت شہادت' گواہی' مقدمات اور تعزیرات۔ قانون اور عدالتی انصاف' ان سب سے عام آدمی ڈرتا ہے۔ ہیں جی' اور چوہدری دلاور عام آدمی ہوتا تو اپنے سکندر صاحب' تمہاری ایم آر ایس کب کا اسے تختہ دار پر پہنچادیتی۔ مگر یہ تو آج بھی حسرت ہی ہے تمہاری۔"

میں نے کہا "بکرے کی اولاد۔ اپنی ماما سے کہنا کہ تجھے قسائی سے بچاکے رکھے کیا تجھے خواب میں چھُری دکھائی نہیں دیتی؟"

رابعہ نے کریڈل دباکے لائن کاٹ دی "یہ کیا کررہے ہو۔ ٹیلی فون پر گالیاں دینا کہاں کی شرافت ہے۔"

"میں کسی شریف آدمی سے بات نہیں کررہا تھا۔"

"مقابلے پر کتا بھونک رہا ہوگا تو تم بھی بھونکنے لگوگے" رابعہ نے کہا۔

میں نے ریسیور اسے دے دیا اور اس نے کریڈل پر رکھ دیا "آئی ایم سوری..... بس مجھے جذبات پر قابو نہیں رہا۔"

"میرا خیال ہے کہ تمہارے اعصاب اس سے زیادہ دباؤ برداشت نہیں کرسکتے۔ تم تھک گئے ہو۔" رابعہ نے کہا "ابھی اور کچھ مت سوچو۔ بس سوجاؤ۔"

میں نے کسی بچے کی طرح تعمیل کی اور لیٹ گیا مگر اس کے باوجود نیند میری آنکھوں سے دور تھی۔ خالی فلیٹ کی خانہ ویرانی سے رابعہ پہلے ہی خوف زدہ تھی۔ میں لائٹ بجھادیتا تو اسے اندھیرے میں آسیب نظر آنے لگتا۔ گرمی اور مچھروں کے خیال سے بھی میں نے لائٹ جلتی چھوڑدی۔ یہ عجب مسافرت کا عالم تھا اور عجیب دربدری تھی کہ سب کچھ ہونے کے باوجود ہم زندگی کی ہر مسرت سے اور راحت سے محروم تھے اور اس بے سروسامانی میں سب سے منہ چھُپائے پڑے تھے۔ قدرت نے ہمیں زندگی کی ہر نعمت سے سرفراز کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی اور ہم اپنی تقدیر پر ناز کرسکتے تھے۔ رابعہ ایک ہمہ صفت مجموعۂ خوبی و محبوبی تھی۔ ایک کامیاب وکیل تھی اور اس کے پاس جتنی فراوانی دولت کی تھی اس سے زیادہ وہ دولتِ حسن وشباب کے خزانے کی مالک تھی۔ مجھے بھی یہ خوش بختی ورثے میں ہی ملی تھی۔ آج بھی وزیر خان مرحوم کا آبائی گھر' جسے رابعہ نے دوبارہ خرید کے میرے نام کردیا تھا۔ لاکھوں کی مالیت رکھتا تھا۔ مجھے انہوں نے اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن بھیجا تھا۔ ایک ایسے ملک سے اور ایسے دور میں جب آبادی کی اکثریت کو پرائمری تعلیم کی سہولت میسر نہ تھی پھر مجھے رابعہ جیسی ہستی کی بے حد حساب محبت ملی تھی اور دوستوں کے خلوص کا۔ رفاقت اور وفا کا بحرِ بیکراں۔

واقعی یہ ذہنی و جسمانی تھکن کی فرسٹریشن تھی کہ میں ایسی باتیں سوچ رہا تھا اور جذبات کا منفی دھارا مجھے کسی حقیر تنکے کی طرح بہائے لیے جارہا تھا۔ صبح جب میں سو کے اُٹھا تو میری ہمت اور توانائی عود کر آئی تھی۔ مایوسی اور کم ہمتی کے بادل سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی چھٹ چکے تھے اور میں نئے عزم کی روشنی میں زندگی کی جدوجہد کے معمول سے نبرد آزما ہونے کے لیے تازہ دم تھا۔

میں شاید چار بجے سویا تھا۔ چھ گھنٹے بعد کال بیل پر میری آنکھ کھُلی تو میں گھڑی میں وقت دیکھ کے حیران ہوا۔ میں سحر خیز آدمی تھا اور ایسا کم ہی ہوتا تھا کہ میری آنکھ صبح کی روشنی سے نہ کھلے۔ یہاں دو طرف کی کھڑکیوں کے شیشوں سے دھوپ براہِ راست مجھ پر پڑرہی تھی اور میں پھر بھی سوتا رہا۔ خود رابعہ کال بیل کی سمع خراش آواز پر جاگی۔

"یہ مالکِ مکان ہوں گے" میں نے کہا۔

"آج تو حد ہوگئی۔" رابعہ نے کہا۔

اتنی دیر میں گھنٹی پھر بجی تو میں دروازے کی طرف لپکا۔ کریم الدین صاحب بے صبرے آدمی لگتے تھے ورنہ انہیں ہم سے بہتر علم ہوگا کہ وہ گھنٹی نہیں گھنتا ہے جس سے مُردے جاگ جائیں۔ ہماری صورت دیکھ کے ان کی صورت پر مایوسی کے آثار نمودار ہوئے۔

"میں تو سمجھا تھا کہ مجھے دیر ہوگئی۔ آپ لوگ منتظر ہوں گے۔"

میں نے کہا "کیا آپ سیل ڈیڈ وغیرہ بنوا کے لائے ہیں؟"

"نہیں' لیکن میرا خیال ہے کہ اب بنوالوں۔ یہ ٹھیک ہے۔ جتنی دیر میں یہ کاغذی کارروائی پوری ہو۔ آپ بھی تیار ہوکے سیدھے رجسٹرار کے دفتر پہنچ جائیں۔"

"یہ آفس کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

"دس نمبر لالو کھیت پر بینک والی گلی میں۔ بہت آسان پتا ہے۔ آپ رکشا ٹیکسی میں پہنچ سکتے ہیں۔"

"میں پہنچ جاؤں گا" میں نے کہا۔

"اپنا نام وغیرہ لکھ دیں کسی کاغذ پر۔"

میں نے کہا "آپ لکھیں۔ وقار یوسف ولد یوسف علی خاں مرحوم ایڈووکیٹ....."

وہ لکھتے لکھتے چونکا "کون ہے یہ وقار یوسف ایڈووکیٹ؟"

میں نے کہا "ظاہر ہے کہ میں...."

"آپ.... ایڈووکیٹ..... اچھا پتا لکھوائیں۔"

میں نے وقار یوسف کا پتا لکھوایا تو وہ پھر رکا "یہاں کا پتا" آپ کیوں نہیں دیتے؟ یہ لاہور میں کس کا پتا ہے۔"

میں نے کہا "آپ اس سلسلے میں پریشان نہ ہوں۔ کیا لاہور کا رہنے والا کراچی میں پراپرٹی نہیں خرید سکتا۔"

"بالکل خرید سکتا ہے۔ مگر آپ نے ماں باپ اور بھائی کا ذکر کیا تھا اس لیے میں نے پوچھا تھا۔"

"میں اس گھر سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا۔ یہ میری بیوی کے گھر کا پتا ہے۔ میری سالی رہتی ہے یہاں۔"

اس نے سرہلایا اور مجھ سے ہاتھ ملا کے رخصت ہوگیا۔ میں سیڑھیاں اتر کے نیچے گیا اور تولیہ صابن لے کر لوٹا۔ نہا دھو کے پھر گیا تو رات کے برتن واپس کیے اور ناشتا لے کر آیا۔ میرے واپس آنے تک رابعہ بھی منہ دھو چکی تھی۔ اس نے مجھے ایک فہرست دی "واپسی میں یہ سامان لیتے آنا۔"

"یہ کیا' جھاڑو' چولھا' کیتلی' چائے کے برتن' تم کیا اس فلیٹ کو آباد کرنے کا سوچ رہی ہو؟"

"جب تک ہم یہاں ہیں...؟"

میں نے کہا "ایک دو دن کے لیے یہ سب غیر ضروری ہے۔ پاسپورٹ اور ویزا ملتے ہی ہم اُڑ جائیں گے لندن کی طرف۔"

"اس میں زیادہ دن بھی لگ سکتے ہیں۔ اس گندے فلیٹ میں پڑے رہیں گے ہم اور بازار سے لائیں گے کھانے پینے کی ہر چیز۔"

میں نے کہا "دو گھنٹے بعد میں تمہاری آزادی کا پروانہ لے کر لوٹوں گا۔ پھر یہ شہر ہوگا اور ہم۔ دو دن لگیں یا دو ہفتے۔ صبح سے رات تک سیر کریں گے۔ اور گھر میں کیوں بیٹھیں گے۔"

ساڑھے گیارہ بجے میں رجسٹرار کے آفس پہنچا تو کریم الدین باہر بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔

"میں نے وکیل سے بھی بات کرلی ہے" اس نے کالے کوٹ میں اسٹول پر بیٹھ کے اونگھنے والے ایک شخص کی طرف اشارہ کیا۔ "پچاس روپے لے گا۔ سارا کام کرادے گا۔"

وکیل کی حالت افسوس ناک تھی۔ اس کا میلا کوٹ برسوں پُرانا تھا۔ شاید بیس سال پہلے جب وہ جوان اور صحت مند ہوگا تو یہ کوٹ اسے فٹ ہوگا۔ اس وقت وہ بھی خواب دیکھتا ہوگا کہ وہ قلم اسٹار محمد علی کی طرح فلمی عدالت میں زورِ خطابت سے تہلکہ مچادے گا اور اس کا نام صفِ اوّل کے قانون دانوں میں ہوگا مگر ہر آدمی کا ہر خواب پورا ہونے لگے تو یہی دنیا جنت کا بدل ہوجائے۔ سارے سائنس پڑھنے والے آئن اسٹائن نہیں بنتے۔ سارے شاعر فیضؔ نہیں ہوتے۔ ایسے ہی سارے وکیل اے کے بروہی یا کارنیلسن نہیں ہوتے۔ ایں سعادت بزورِ بازو نیست۔

ہر عدالت کے باہر ایسے ناکام وکیل منڈلاتے نظر آتے ہیں جن کی آمدنی کا انحصار صرف دستاویزات کی تصدیق اور کاغذی خانہ پُری پر ہوتا ہے اور جو کبھی کسی عدالت میں دلائل کی قانونی جنگ نہیں لڑتے۔ شاید ان میں اس کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی یا وہ اپنی صلاحیت سے خود بے خبر ہوتے ہیں اور چند کیسوں پر قناعت کرکے بیٹھ جاتے ہیں ورنہ گلشن میں علاج تنگیِ داماں بھی ہے۔

پھٹے کالروں والی قمیص اور بوسیدہ پتلون والے دُبلے پتلے وکیل نے مجھے پرانی عینک کے دھندلے چشموں سے دیکھا پھر پیڈ کو۔ "وقار یوسف تمہارا ہی نام ہے؟ ولد یوسف علی.... ایڈووکیٹ' تم.... وکیل تو نظر نہیں آتے۔"

میں نے کہا "وکیل کیسے نظر آتے ہیں؟ کیا ہر کالے کوٹ والا وکیل ہوتا ہے۔ داڑھی پگڑی والا وکیل کیوں نہیں ہوسکتا اور کالے کوٹ والا مولوی کیوں نہیں ہوسکتا۔"

اس نے سرہلایا "دلیل سے وکیل لگتے ہو۔"

اس کا مطلب یہ تھا کہ میں نے تمہاری صورت کے بارے میں اپنا مؤقف تبدیل نہیں کیا۔ بدقسمتی سے یہ خیال درست بھی تھا۔ یہ اس کی قیافہ شناسی کا کمال نہیں تھا۔ ہم لوگوں سے ان کے لباس کی شناخت کے مطابق رویّہ اختیار کرتے ہیں۔ ایسا شیخ سعدیؒ کے ساتھ بھی ہوا تھا جب وہ فقیرانہ حلیے میں کسی امیر کی دعوت میں پہنچے تو انہیں روک دیا گیا تھا۔ وہ لباسِ فاخرہ میں گئے تو ان کی بڑی آؤ بھگت ہوئی چنانچہ انہوں نے کھانا کپڑوں پر ڈالنا شروع کردیا کہ مہمان تو یہ لباس ہے' میں نہیں۔

اپنی فیس وصول کرنے کے بعد وکیل نے سب کچھ خود ہی کیا۔ اس نے مہریں لگائیں اور مجھے انگلی رکھ کے بتاتا گیا کہ دستخط کہاں کرنے ہیں۔ پھر اس نے میری شناخت کی تصدیق کی اور مجھے رجسٹرار کے سامنے پیش کردیا۔

رجسٹرار بڑے طمطراق سے میز پر جھنڈا لگائے بیٹھا تھا جیسے کہ وہ کلرک نہیں وزیر یا جج ہے۔ شاید آمدنی اور اختیارات کے ناجائز استعمال میں وہ کسی وزیر سے کم نہ ہو۔ اس نے پھر مجھ سے رسماً میرا نام ولدیت پتا پوچھا۔ پھر ایک رجسٹر میں ہاتھ کی پانچوں انگلیوں کے پرنٹ لیے۔ اپنے سامنے دستخط کروائے اور مجھے ایک ماہ بعد کی تاریخ دے دی۔

وکیل نے مجھ سے سرگوشی میں کہا "کاغذات جلدی بھی مل سکتے ہیں۔ میں بات کروں رجسٹرار صاحب سے؟"

میں نے بات کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا "بزرگ فرماتے ہیں کہ عجلت کار شیطان۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ حرام کھانے والوں اور کھلانے والوں کا ٹھکانا جہنم ہے۔"

عمداً یہ بات میں نے بہ آواز بلند کہی تھی۔ وکیل نے اور رجسٹرار نے ویسا ہی منہ بنایا جیسا سچ کی کڑواہٹ کو نگلنے والا بناتا ہے۔ شاید ان کے نزدیک میں نیم چڑھا کڑوا کریلا تھا۔ ایک تو وکیل پھر مُلا۔ دنیا کا قانون اور دین کا علم رکھنے والا۔ انہوں نے خاموشی میں عافیت جانی۔

میں ٹہلتا ہوا واپس چلنے لگا۔ لالوکھیت کے بازار میں زندگی اور کاروبار کی گہما گہمی عروج پر تھی۔ یہ ان غریب اور غیور لوگوں کی بستی تھی جس کو شہید ملت لیاقت علی خان کا نام ملا تو یہاں کا بچہ بچہ لیاقت علی خان بن گیا اور لیاقت آباد کی شہرت کا ڈنکا بی بی سی اور وائس آف امریکا سے بھی بجنے لگا۔ یہ ظالم و جابر حکمرانوں کے سامنے کلمۂ حق کہہ کے ڈٹ جانے والوں کی بستی تھی اور اس نے ایوب خان جیسے فوجی آمر کی حکومت کا تختہ اُلٹنے میں ہراول دستے کا کردار ادا کیا تھا۔ شاید غریب آدمی ہی غیرت اور حمیت' حق وصداقت اور ہمت وجرات کے جذبات رکھتا ہے۔ دولت آتی ہے تو بزدلی ساتھ لاتی ہے اور عیاش آدمی اخلاقی' قانونی اور مذہبی اصولوں کی دیوار میں مفاہمت کے رخنے تلاش کرلیتا ہے۔ عذرِ گناہ پیدا کرلیتا ہے۔ دانستہ غلطی پر خطائے بشر کا جواز لے آتا ہے۔

لالوکھیت سے میں نے رابعہ کے قدوقامت کے مطابق جدید وضع کا سیاہ برقع خریدا اور پاسپورٹ کے لیے اپنی دو ارجنٹ تصاویر بنوائیں۔ مجھے پھر خیال آیا کہ میں یہ شرعی لباس اور پگڑی چھوڑ کے پتلون قمیص پہن لوں اور سر پر ٹوپی رکھ لوں مگر میں نے پھر خود کو سمجھایا کہ جب تک خطرہ ہے مجھے پرانی وضع قطع بھی اختیار کرنے سے گریز لازمی ہے۔ یوں تو خطرہ ہی میری زندگی تھا لیکن اچانک خطرہ اتنا بڑھ گیا تھا جیسے معمول پر بہنے والے دریا میں سیلاب کا طوفانی ریلا آجائے۔ مجھے اندازہ تھا کہ اپنی ناکامی پر دلاور کی مایوسی' جھنجلاہٹ اشتعال اور شرمندگی کے جذبات کا ردِعمل کتنا شدید ہوگا۔

گزشتہ شب اپنے فلیٹ سے دلاور کو فون کرنا اس لیے غلطی نہیں سمجھا جاسکتا تھا کہ دلاور کے لیے کال ٹریس کرنا ناممکن تھا۔ وہ ہوٹل کا فون نمبر تھا اور کال غیر متوقع تھی۔ میں اکرام شیخ سے تصدیق کرنا چاہتا تھا کہ کیا اس نے دلاور کو اس ہوٹل کا پتا بتایا تھا جہاں میں رابعہ کے ساتھ مقیم تھا۔ میں اب اس سے ملنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے اپنے فلیٹ سے فون کرنے کا رسک بھی نہیں لے سکتا تھا۔ ایک پبلک کال آفس کو دیکھ کے میں نے اس سے بات کرنے کا فیصلہ کیا مجھے معلوم تھا کہ اس وقت وہ اپنے اسکول کے شاندار آفس میں ایڈمنسٹریٹر بنا بیٹھا ہوگا اور ویسے ہی دوسرے شاندار آفس میں کاجل پرنسپل بنی بڑے رعب داب کے ساتھ موجود ہوگی۔

ریسیور خود اکرام شیخ نے ہی اُٹھایا "ہیلو۔"

میں نے کہا "میری آواز پہچان سکتے ہو۔"

اس نے کہا "سکندر۔ یار یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔"

میں نے کہا "میں چاہتا ہوں کہ تم آئندہ میری آواز کو بھی نہ پہچانو اور نہ صورت کو۔"

وہ میرے طنز کو سمجھ گیا "ایسی کیا خطا ہوگئی ہے یار...."

"مزید یہ کہ تم آئندہ مجھے یار بھی مت کہو' یہ بہت مشکل کام ہے۔ یاری نبھانا جواب تمہارے بس کا نہیں رہا۔"

وہ کچھ دیر خاموش رہا "میں تمہاری خفگی کی وجہ سمجھتا ہوں۔"

"مگر تم مجبور ہو" میں نے کہا "اب تم دوست یا دوستی کے نام پر کچھ نہیں کرسکتے' میں تمہاری اس مجبوری پر رحم کھاتے ہوئے تمہیں معاف کرتا ہوں اور پرانے حوالوں سے اور رشتوں کی ذمّے داری سے سبکدوش کرتا ہوں۔"

اکرم نے کہا "میں تم سے ملنا چاہتا ہوں کہیں...."

"لیکن میں تم سے پھر کہیں بھی نہیں ملنا چاہتا۔ کل اگر میں تم سے نہ ملا ہوتا تو وہ حرام زادہ چوہدری دلاور سیدھا اس ہوٹل میں ہرگز نہیں پہنچ سکتا تھا۔ یہ رابعہ کی اور میری قسمت تھی کہ اکرام شیخ صاحب کہ ہم اس کے اتنے ہوشیاری سے بچھائے ہوئے جال میں گرفتار نہیں ہوئے۔ میں تم سے پھر ملا تو تمہیں پھر پتا چل جائے گا کہ میں اب کون ہوں اور کیا ہوں۔ مجھے اپنا چہرہ بار بار بدلنا پڑتا ہے اسی لیے کہ کبھی خود اپنی غلطی سے تو کبھی دوستوں کی کمزوری سے میرا راز فاش ہوجاتا ہے۔ کمزوری ہی مجبوری بنتی ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں اپنی کمزوری کا اعتراف کرتا ہوں۔ میں پہلے کمزور نہیں تھا تو مجبور بھی نہیں تھا۔ پہلے میں اکیلا تھا۔ اب کاجل ہے۔ میرا بچّہ ہے اور وہ سیکڑوں بچّے ہیں جو ہمارے اسکول میں آتے ہیں۔ وہ بھی ہماری ذمّے داری ہیں جو دوسرے والدین نے ہمیں سونپ رکھی ہے۔ چوہدری دلاور جیسے لوگ تو ایسی ہر کمزوری کو اپنی شہ زوری بناتے ہیں۔"

"کیا اس نے تمہیں دھمکی دی تھی؟"

"وہ کاجل کے اسکول پہنچ گیا تھا۔ اس نے کہا کہ پرنسپل صاحبہ۔ آپ انتخاب کرلیں۔ ایک طرف آپ کے شوہر کا پُرانا مگر بدنامِ زمانہ۔ مجرم اور مجسم مصیبت سکندر بخت ہے۔ دوسری طرف یہ عزت شہرت اور دولت کی زندگی ہے۔ اگر ان بچّوں کے والدین کو یہ احساس ہوجائے کہ ان کے بچّے یہاں محفوظ نہیں۔ یہاں کا ماحول غیر اخلاقی ہے۔ وہ پرنسپل کی کچھ تصاویر دیکھ لیں' قابلِ اعتراض قسم کی۔ یا شہر کی دیواروں پر اسکول کے خلاف راتوں رات نعرے لکھوا دیے جائیں۔ کاجل ڈر گئی۔ اس نے دلاور کی ہر بات مان لی۔"

"مثلاً..."

"اس نے پوچھا کہ..... وہ کہاں ہیں۔ آج کل سکندر بخت کا حلیہ کیا ہے' وہ پھر کب آئے گا۔"

میں نے کہا "اس لیے اب میرا تم سے ملنا کسی طرح بھی تمہارے یا میرے حق میں ٹھیک نہیں۔ میں تمہیں یا کاجل کو کسی آزمائش میں نہیں ڈالوں گا اور نہ مجھے یہ منظور ہوگا کہ چوہدری دلاور جیسے بدمعاش تمہاری ساری محنت اور کیے کرائے کو خاک میں ملادیں۔ تمہیں ہم سے دوستی کی اتنی بڑی سزا ملے۔ وقت بہت بدل گیا ہے' حالات پہلے جیسے نہیں رہے۔"

"حالات ٹھیک ہوجائیں گے۔"

"ہاں۔ اسی اُمید پر جی رہے ہیں ہم۔ کیا دلاور نے یہ بھی مطالبہ کیا تھا کہ تم آئندہ بھی اسے ہمارے بارے میں اطلاع دیتے رہوگے۔"

"ہاں۔"

"ممکن ہے تمہارے گھر کے دروازے پر اس کے آدمی نظر رکھتے ہوں۔"

"ممکن تو ہے۔"

"یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس وقت تمہارا یہ فون ٹیپ کیا جارہا ہو۔"

"یہ ہو سکتا تھا۔ مگر میں نے پہلے سے اس کا انتظام کرلیا۔ تم جانتے ہو ہمارے اسکول میں بڑے لوگوں کے بچے بھی ہیں۔ اسی لیے اچھے خاصے تعلقات ہیں ہمارے۔ میں نے ڈویژنل انجینئر سے کہا تھا کہ مجھے شک ہے کوئی ہمارے فون ٹیپ کررہا ہے۔ اس نے مجھے یقین دلایا کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں ابھی ایکس چینج میں سخت ہدایات جاری کردیتا ہوں کہ آئندہ بھی نہ ہونے پائے۔ لاقانونیت کا علاج کوئی نہیں۔ دلاور کی دھمکی زبانی تھی۔ ہم اس کے خلاف پولیس کے آئی جی سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ پولیس چوبیس گھنٹے ہماری۔ اسکول کی اور ہر بچے کی حفاظت کیسے کرسکتی ہے۔"

میں نے کہا "اپنے گھر کے فون کی شکایت مت کرنا۔"

"کیوں؟"

"ہم کبھی کبھی تم سے بات کرتے رہیں گے۔ تاکہ دلاور کو شک نہ ہو اور تمہاری پوزیشن محفوظ رہے۔ اسے قطع تعلق کا شبہ نہیں ہونا چاہیے۔ پھر ہم جو باتیں کریں گے وہ خود اس تک پہنچ جائیں گی۔ کچھ باتیں ہم خود اس تک پہنچانا چاہیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔"

"کاجل سے بھی کہہ دینا کہ ہمیں اس سے کوئی گلہ نہیں۔"

"تھینک یو سکندر۔ تم عظیم ہو۔"

"نہیں، میں اعظم ہوں۔۔۔ سکندر اعظم" میں نے کہا "چوہدری دلاور نے دیا ہے مجھے یہ نام۔"

"تم کب تک ہو کراچی میں؟"

میں نے کہا "اس وقت میں لاہور میں ہوں۔ یہ پوچھو کہ لاہور میں کب تک ہو تو میں کہوں گا کہ جب تک تقدیر کہیں کھینچ کر نہیں لے جاتی۔ یا دھکّے کھانے کے لیے دوسری جگہ نہیں ملتی۔"

"بات کہاں سے کررہے ہو؟"

"رابعہ کے آفس سے۔۔۔ وہ موجود ہے یہاں مگر اس کے جذبات کی نوعیت ذرا مختلف ہے۔ وہ تم سے بات نہیں کرے گی۔ تم ایک کام کرو۔ اس میں تمہارے لیے عافیت ہے۔ چوہدری دلاور شاید تمہیں اسی ہوٹل میں مل جائے۔ میں نے منظر کے گھر سے اس کو فون کیا تھا۔ تم اسے فون کرکے بتادو کہ سکندر نے لاہور سے فون کیا تھا اور اس نے مجھے بہت گالیاں دیں۔ یہ کہا کہ تم نے دوستی میں دغا کی ہے۔ اب ہم سے وفا کی اُمید مت رکھنا۔"

"اس سے کیا ہوگا؟"

"تمہارا اعتبار قائم رہے گا۔ تم محفوظ رہو گے۔ دلاور یہ سمجھتا رہے گا کہ تم نے اس کے ڈر کی وجہ سے یہ اطلاع دی ہے۔"

"میں بہت شرمندہ ہوں سکندر۔"

"تیری شرمندگی ہمارے کس کام کی۔ خوش رہ بیٹا اور بھول جا سب رشتوں کو۔ یہ بھی کہ تیری ایک بہن تھی اور تو اس کا بڑا بھائی تھا جو باپ کی جگہ ہوتا ہے۔ شادی کرکے گل اور محسن نے بھی یہ کیا۔ تیرے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے انہوں نے اپنی زندگی کی راہ الگ کرلی۔ کیا پتا کسی دن مجبوری میں غالب اور نازو بھی شادی کرکے تیرے پاس پہنچ جائیں۔ کسی نے بھی اپنی زندگی میرے پاس گروی تو نہیں رکھی ہے نا۔"

"میں نازو کو تم سے بہتر طور پر جانتا ہوں۔ وہ غالب کو چھوڑ دے گی اگر غالب نے کمزوری دکھائی۔ کاش میں بھی اتنا ہی بہادر ہوتا۔ اور وہ مجھ پر فخر کرسکتی۔"

"فکر مت کرو" میں نے کہا "میں اسے کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

اکرام شیخ سے بات کرنے کے بعد میرے دل میں اس کے خلاف پہلے جتنا غصہ نہیں رہا۔ اس کی مجبوری جینوئن تھی۔ قربانی اپنے کاروبار کی یا نوکری کی دی جاسکتی ہے۔ اپنے جان ومال کی دی جاسکتی ہے۔ سیکڑوں معصوم بچوں کی نہیں جو بھروسے اور اعتماد میں روشن مستقبل کے تابناک خوابوں کی راہ پر چلتے ہوئے، والدین کی امیدوں پر پورا اُترنے کے یقین کے ساتھ۔ بڑا آدمی بننے کے لیے وہاں علم کی روشنی حاصل کرنے آتے تھے۔

رابعہ نے برقع کو پہن کر دیکھتے ہوئے مجھ سے اتفاق کیا "قربانی صرف عورتیں دے سکتی ہیں۔"

"اپنے شوہروں کی۔" میں نے کہا "کاجل اور گل کی طرح۔"

"تم شہلا کو بھول گئے" اس نے مجھے ملامت بھری نظروں سے دیکھا "خیر یہ بتاؤ کہ میں کیسی لگ رہی ہوں؟"

"میرے اسٹاک میں بہت پُرانی مثالیں ہیں۔ بدلی کا چاند جیسی۔ اصولاً تمہیں یہ پوچھنا چاہیے کہ کیا میری وجہ سے کپڑے اچھے لگ رہے ہیں۔ اب یہی کپڑے اگر میں پہن لوں یا مولانا خادم حسین کی اولین زوجہ پہنے تو افسوس ناک لگیں گے۔ رنگِ گل سے رونقِ گلشن ہے گلشن کچھ نہیں۔ چلو اب تم آزاد ہو۔"

"مولانا، کیا اب تک میں قید میں تھی" وہ بولی "کیا اسیری کیا رہائی ہے؟"

میں نے کہا "وکالت چھوڑ کے شاعری شروع کردی۔ خیر ٹھیک کیا۔ وہ ذرا مشکل کام تھا۔ دماغ کے بغیر ہو نہیں سکتا تھا۔"

ہم باہر نکلے تو سامنے والے فلیٹ کا قفل کھولنے والے نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔ اس کی جسامت اور چوڑائی دیکھ کے میں نے سوچا کہ دروازہ کھول کے بھی یہ اس میں سے اندر کیسے جائے گا۔ اس کی آنکھوں میں سوالیہ نشان دیکھ کے مجھے اپنا تعارف کرانا پڑا۔

"میں آپ کا نیا ہمسایہ ہوں" میں نے اس سے ہاتھ ملایا "فلیٹ خرید لیا ہے میں نے۔ انیس ہزار میں۔"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "آپ جیسا ہی کوئی شخص یہ کام کرسکتا تھا۔"

"آپ کا مطلب ہے میرے جیسا احمق۔"

"یہ تو میں نے نہیں کہا۔ کریم الدین مہینہ بھر سے کوشش کررہا تھا بہت لوگ آئے اور قیمت سُن کے چلے گئے۔ میں نے شرط لگائی تھی اس سے۔ جو شاید میں ہار گیا۔ ایک ہزار گئے۔"

"شرط کیا تھی؟" میں نے کہا۔

"یہی کہ فلیٹ کے بیس ہزار اسے ایک سال میں بھی نہیں ملیں گے لیکن اس نے کہا کہ پانچ ہزار کی خاطر میں پانچ مہینے انتظار کروں گا۔ کیا سو میں سے سو عقلمند ہی آئیں گے۔ ایک خریدار کبھی نہ کبھی ضرور آئے گا۔"

میں نے خفت سے رابعہ کی طرف دیکھا جو برقع کے اندر یقیناً مسکرا رہی ہوگی۔ اس نے دوبارہ مجھے بے وقوف کہے بغیر بے وقوف ثابت کردیا تھا۔

میں نے کہا "مجھے تو فلیٹ ملا۔ آپ کو ہزار گنوا کے کیا ملا؟"

"سبق۔۔۔" وہ بولا "قیمت سُنتے ہی گاہک بھاگ جاتے تھے یا میں انہیں اشارہ کرکے بھگا دیتا تھا۔ مجھے تو مروا دیا ساس نے۔ اور آپ نے، اس نے مرنے میں جلدی کی۔ آپ نے فلیٹ خریدنے میں۔ میں ہوتا یہاں تو۔۔۔" اس نے پھر آہ بھری۔

"خیر۔۔۔ اللہ آپ کو صبر دے اور ایک نئی ساس دے۔" میں نے کہا اور رابعہ کے ساتھ نیچے چل پڑا۔ بعد میں رابعہ نے جو کچھ مجھ سے اس عاجلانہ اور عاقلانہ فیصلے کے بارے میں کہا وہ میں نے تحمل سے سُنا اور اپنی خودی کو بلند رکھا۔ دنیا میں شریف آدمی ہی سُنتے ہیں۔

پاسپورٹ آفس وہاں سے بہت قریب تھا۔ میں نے کہا "مجھے تو اس ایجنٹ کا نام بھی یاد نہیں۔ اور ہوٹل ہم جا نہیں سکتے۔"

"حلیہ یاد ہے یا وہ بھی بھول گئے" رابعہ نے کہا "یہاں اتنے لوگ پھر رہے ہیں۔ مجھے تو سارے ہی ایجنٹ لگتے ہیں۔"

رابعہ کی بات کسی حد تک درست تھی۔ متعدد افراد نے مجھ سے گزرتے گزرتے پُراسرار انداز میں سوال کیا "مولانا صاحب۔ پاسپورٹ، ارجنٹ ملے گا۔"

میں نے نفی میں سر ہلانے کے ساتھ اس شخص کی تلاش جاری رکھی۔ بالآخر وہ مجھے ایک کینٹین سے نکلتا ہوا مل گیا۔

وہ میرا بدلا ہوا حُلیہ دیکھ کے بھونچکا رہ گیا "آپ۔۔۔"

میں نے کہا "میرے کام کا کیا ہوا۔۔۔ میں نے کہا تھا کہ تم سوال کوئی نہیں کرو گے؟"

"آجاؤ۔۔۔ تصویر لائے ہو۔"

میں نے چار تصویریں اس کے حوالے کردیں۔ "میری بیوی کا فوٹو نہیں ہوگا۔ اب یہ بتاؤ کہ میں کب آؤں اور تم کہاں ملو گے؟"

اس نے کہا "پاسپورٹ کل لے لو۔ لیکن لندن کا ویزا۔ یہ میں تم کو کل بتاؤں گا ہوٹل میں۔"

میں نے کہا "ہم وہ ہوٹل چھوڑ چکے ہیں۔ ہماری جان سخت خطرے میں تھی۔ ہمارے دشمن پہنچ گئے تھے وہاں۔ ہمیں وہاں سے فرار ہونا پڑا۔ میں یہ حُلیہ بدل کے بھی خود کو محفوظ نہیں سمجھتا۔ میرا اس ملک سے فرار ہونا ضروری ہے۔"

اس نے سوچ کے کہا "ایک طریقہ ہے۔ تم سیلون جاؤ۔ سیلون کا ٹورسٹ ویزا آسانی سے ملتا ہے۔ پھر وہاں برٹش ایمبیسی سے لندن کا ویزا لگوالو۔"

میں نے کہا "تم کوشش کرو۔ ورنہ پھر ایسا ہی کرنا پڑے گا۔ کل میں کس وقت آؤں۔۔۔ اور کہاں؟"

"ادھر آؤ۔ ایک بجے کے بعد" وہ بولا "ہم ادھر ہی ملے گا کسی جگہ۔"

دن کا باقی حصہ ہم نے گھوم پھر کے گزارا۔ رابعہ کو برقع میں گھومنے پھرنے سے کوئی الجھن محسوس نہیں ہورہی تھی مگر وہ میرے حلئے پر سخت معترض تھی۔ اس کا خیال تھا کہ یہ جھاڑ جھنکاڑ داڑھی بالکل ضروری نہیں اور نہ یہ پگڑی اور اونچی شلوار قمیص۔

میں نے اسے سمجھایا "اتنا عرصہ میں فرنچ وکیل کا حُلیہ بنائے پھرتا رہا ہوں۔ اب داڑھی کو تراش خراش کے باقاعدہ کیا اور قمیص پتلون پہن لی تو میرا حُلیہ کافی حد تک وہی پرانا حُلیہ بن جائے گا۔ چوہدری دلاور ابھی اسی شہر میں ہے اور نہ جانے اس کے کتنے مخبر ہوں گے جو مجھے ڈھونڈتے پھر رہے ہوں گے۔ دلاور کی نظر کو جانتی ہو تم۔ اگر اسے شک ہوگیا تو وہ چشمِ تصور سے داڑھی تھوڑا سا بڑھا کے غور کرے گا اور چہرے سے ملائے گا تو مجھے پہچان لے گا۔ میں ابھی سو فیصد مختلف نظر آنا چاہتا ہوں۔ میرے جیسے شخص کی طرف وہ متوجہ بھی نہیں ہوگا۔"

"اگر ہم لندن پہنچ گئے؟"

"اگر کا کیا سوال۔ اب لندن پہنچنا بے حد ضروری ہے" میں نے کہا "خواہ کولمبو کے راستے جانا پڑے۔ وہاں پہنچ کے تم یہ برقع اُتار سکتی ہو۔ میں یہ پگڑی ہٹا سکتا ہوں، سوٹ پہن سکتا ہوں۔"

"کیا دلاور لندن نہیں پہنچ سکتا؟ میرا تو خیال ہے کہ ان حالات میں وہ خود بھی لندن کا رُخ کرے گا۔ وہاں بھی اس سے تمہاری ملاقات ہو سکتی ہے۔ وہ تمہاری عقل سے سوچنے کی کوشش کرتا ہے اور ابھی تک صحیح سمت میں جارہا ہے۔ تمہارے ساتھ ہے وہ ہر جگہ۔ تم پنڈی میں تھے تو وہ وہیں تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ تم پیڈرو کو کہاں لے جاؤ گے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ناکامی کے بعد تم واپس آؤ گے تو کیا کرو گے؟ وہ برسی پر تمہارے والد کی قبر پر بھی تمہیں نظر آجاتا مگر ہم نے تمہیں روک لیا تھا۔ اب وہ کراچی میں ہے۔ اسے معلوم ہوگیا ہے کہ تم اس کے خلاف ثبوت جمع کررہے ہو۔ پیڈرو کی ڈائری تمہیں مل گئی ہے۔ اس خبر نے دلاور کی پریشانی میں ؛؛ اضافہ کیا ہوگا۔ اس کے بعد تم کیا کرسکتے۔۔؟ تم لندن جاکے اس چشم دید گواہ سے ملو گے جس نے دلاور کو دُہرے قتل کی واردات کا ارتکاب کرتے دیکھا تھا۔ اور اسے گواہی کے لیے پاکستان لانے کی کوشش کرو گے۔ دلاور کو معلوم ہے کہ لندن میں تمہاری شناسائی کا حلقہ خاصا وسیع ہے اور مؤثر ہے۔"

میں نے کلفٹن کے ساحل پر ٹہلتے ہوئے رابعہ کا ہاتھ پکڑ کے جذباتی لہجے میں کہا "اگر آئندہ میں نے تمہیں ناقص العقل کہا تا۔ تو سمجھ لینا کہ میرا دماغ چل گیا ہے۔"

اس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا "مولانا صاحب۔ آپ سرِعام اتنے رومانٹک نہ ہوں۔ لوگ دیکھیں گے تو ہنسیں گے۔"

"اگر تم نقاب ہٹادو تو روئیں گے۔ اپنی تقدیر کو۔ حسد کریں گے مجھ سے۔ مگر۔ ابھی کیا کہا تھا تم نے؟" میں... رک گیا "ہاں حلقۂ اثر کی بات کی تھی۔ یہ تو میں واقعی بھولا ہوا تھا۔"

"ایک بات اور بھولے ہوئے ہو تم؟"

"وہ کیا؟"

"تم کو لندن سے ڈی پورٹ کیا گیا تھا۔ جبری بے دخلی بحکم سرکار۔"

"وہ میں نہیں تھا۔ سکندر بخت تھا" میں نے چٹکی بجا کے کہا "جعلی نام سے مجھے لندن جانے سے کون روک سکتا ہے۔ کیا ٹائم ہوا ہے اس وقت؟ چھ بجے ہیں شام کے۔ گویا لندن میں دوپہر کا ایک بجا ہے۔ وری گڈ' یہ بہت مناسب وقت ہے فون کرنے کے لیے۔ چلو پہلے کہیں چائے کافی پیتے ہیں۔ پھر اپنے فلیٹ سے کال بک کرائیں گے۔"

"کسے فون کرو گے؟ نمبر یاد ہے؟"

"نمبر معلوم کرنا پڑے گا۔ مجھے تو پہلے والا نمبر بھی یاد نہیں ہے مگر وہ ہے ایک لارڈ کی بیٹی۔ کسی لارڈ کو برطانیہ میں دریافت کرنا اتنا ہی آسان ہے جتنا پاکستان میں کسی ایم این اے کو۔ صرف نام کافی ہے اس کے باپ کا۔"

"الزبتھ کے باپ کا؟" رابعہ نے کہا۔

"الزبتھ...؟ زباں پہ بارِ خدا یہ کس کا نام آیا" میں نے کہا۔

"ایسے نام کم تو نہیں ہوں گے" رابعہ نے شوخی سے کہا۔

میں نے ٹھنڈی سانس لی "ہاں۔ نام ہی بہت تھے۔ کام بھی بہت تھے مگر یہ قصہ ہے تب کا جب آتش جواں تھا۔"

"اور اب کیا ہے؟"

"اب!" میں نے کہا "جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے۔"

"بہت چالاک ہو۔"

میں نے کہا "تم سے کیا چالاکی۔ بتایا تو ہے کہ ولایت میں چار سال رہے تھے میں اور محسن۔ گئے تھے پڑھنے مگر یہ مقصد ثانوی حیثیت اختیار کر گیا۔ کچھ عمر ایسی تھی کچھ حالات تھے کہ ایک ہتھیلی پر دل اور دوسری پر جان لیے پھرتے تھے۔ مقصد اس وقت بھی بہت عظیم تھا کہ انگریزوں سے دو سو سال کی غلامی کا بدلہ لینا ہے۔ توپ تلوار تو چلا نہیں سکتے تھے۔ مغرور اور متعصب انگریزوں کی ناک کاٹتے رہے۔ ان کی دخترانِ عزیز پر ڈورے ڈالتے تھے اور جہاد سمجھ کے عشق کرتے تھے۔ چونکہ رقیب اکثریت میں تھے اور ہم پٹتے بہت تھے اس لیے میں نے باقاعدہ مارشل آرٹ سیکھا' پہلے پٹتے بہت تھے' بعد میں للکارتے پھرتے تھے کہ ہم سا ہو تو سامنے آئے۔

محسن کی لڑائی بھی مجھے لڑنی پڑتی تھی۔ البتہ الزبتھ کا معاملہ سنگین ہو گیا تھا۔ اور یوں سمجھ لو کہ تمہاری خوش قسمتی تھی کہ مجھے اس جرم میں برطانیہ سے ہی نکال دیا گیا۔"

"سبحان اللہ۔ اسے آپ میری خوش قسمتی قرار دے رہے ہیں۔"

"اس میں بُرا ماننے کی کیا بات ہے۔ میری خوش قسمتی سمجھ لو۔ پہنچی وہیں پہ خاک' جہاں کا خمیر تھا۔ الزبتھ کا باپ بڑی توپ چیز تھا اس کے دل میں ہم کالے لوگوں کے خلاف نفرت کے جذبات کی کوئی انتہا نہیں تھی مگر بیٹی اس کے نسلی غرور کو شکست دینے پر تُل گئی تو اس توپ نے مجھے گولے کی طرح واپس پھنکوا دیا۔ وضع داری اور شرافت اپنی جگہ رہی۔ خبیث اپنی بیٹی کے ساتھ مجھے الوداع کہنے بھی آیا تھا۔"

"بڑا رقت انگیز منظر ہو گا۔ الزبتھ نے صرف آنسو بہائے سمندر میں چھلانگ مارنے کی کوشش تک نہیں کی۔"

میں نے کہا "تم ایک مشرقی لڑکی ہو۔ ابھی تک تم نے ایسا نہیں کیا حالانکہ موقع تھا۔ پھر وہ کیوں کرتی' وہاں تو جذبات بھی عقل کے تابع رہتے ہیں خصوصاً ان خاندانی قسم کے نجیب الطرفین لوگوں کے۔ الزبتھ قدرے مختلف تھی مگر خاندانی احساسِ برتری یا غرور اس میں بھی تھا۔ بعد میں کرلی ہو گی کسی لارڈزادے سے شادی۔"

"کیا پتا ابھی تک تمہاری یاد کو دل میں بسائے اور تمہاری تصویر کو سینے سے لگائے بیٹھی ہو۔ دنیا تیاگ دی ہو راہِ عشق میں۔ جوگن یعنی نن بن گئی ہو۔ یا اس غم میں گھل گھل کے مر گئی ہو اور اس کی لوحِ مزار پر لکھا ہو۔ وہ دنیا جسے سکندرِ اعظم فتح کر کے چھوڑ گیا۔"

"ایک اچھی دردناک رومانی فلم کا آخری المیہ سین۔ مگر ایسی فلمیں صرف یہاں بنتی ہیں خاتون۔ حقیقت اس کے برعکس ہو گی۔"

الزبتھ سے رابطہ کرنے سے پہلے مجھے کئی معرکے سر کرنے پڑے۔ میں نے اپنے فلیٹ سے لندن کی کال بک کرنے والے آپریٹر کو الزبتھ کے باپ کا نام بتایا تو اس نے کہا "نام نہیں نمبر بتائیں سر؟"

میں نے کہا "تم لندن ایکس چینج کو نام بتاؤ گے تو وہ خود ہی ملا دے گا۔"

"اس نام کے نہ جانے کتنے ہوں گے لندن میں سر۔"

"لیکن وہ لارڈ ہے۔ عام آدمی نہیں ہے۔"

"سوری سر۔ کال نمبر سے بک ہوتی ہے۔ نام سے نہیں۔"

مجھے سخت غصہ آیا مگر میں اس آپریٹر کے ساتھ گستاخی سے پیش آتا تو شاید میرا فون ہی بند ہو جاتا۔ میں کچھ دیر کمرے میں ٹہلتا رہا اور ان طریقوں پر عمل کرتا رہا جو کتابوں میں غصے پر قابو پانے کے لیے ملتے ہیں۔ ایک سے سو تک گنتی گنو۔ کسی اور موضوع پر سوچو۔ کوئی اچھا سا گانا سنو۔ پانچ منٹ تک کوئی کتاب پڑھو یا دلکش تصویریں دیکھو۔ یہ سب طریقے اس لیے بھی ناکام ہوئے کہ رابعہ مسلسل اشتعال انگیزی پر آمادہ تھی اور مجھے الزبتھ کے نام سے چھیڑ رہی تھی۔

میں نے ایک اور کوشش کی۔ اس بار آپریٹر بھی دوسرا تھا۔ میں نے اس سے برٹش ہوم منسٹری کا نمبر مانگا اور اس نے میرا نمبر پوچھ کے کہا "یس سر!" میں بہت خوش ہوا کہ کام بن گیا۔ کچھ دیر بعد گھنٹی بجی تو کسی خالص سیکریٹری ٹائپ عورت نے بڑی شائستگی سے کہا "آپ کس سے بات کریں گے؟"

میں نے سوچ کے کہا "کسی بھی انڈر سیکریٹری یا سیکریٹری سے۔"

اس نے پوچھا "کیا آپ کی کال آفیشل ہے؟"

"آفیشل... نہیں... لیکن میں...."

اس نے میری بات کاٹ دی "پھر آپ اپنا نام اور نمبر بتادیں۔ وہ خود آپ کو رنگ بیک کریں گے۔ آپ کے ہائی کمشنر سے بات کرنے کے بعد۔"

میں نے ریسیور رکھ دیا۔ ظاہر ہے کہ یہ اتنا آسان بھی نہیں تھا کہ کسی جان پہچان یا کام کے بغیر آپ حکومتِ برطانیہ کے کسی انڈر سیکریٹری یا سیکریٹری سے آفس میں بات کرلیں جس کے نام سے آپ خود بھی واقف نہ ہوں۔

رابعہ نے کہا "وہ کیا شعر ہے۔ کوئی اُمید بر نہیں آتی۔ کوئی صورت نظر نہیں آتی۔"

میں نے کہا "یہ تم بول رہی ہو' تمہارے اندر کی حاسد عورت بول رہی ہے۔ لیکن انشاء اللہ دونوں کام ہوں گے۔ اُمید بھی بر آئے گی اور صورت بھی نظر آئے گی۔"

کریم الدین خالی فلیٹ میں ٹیلی فون ڈائریکٹری بھی نہیں چھوڑ کے گیا تھا۔ میں اُتر کے نیچے گیا اور دو جگہ سے انکار سننے کے بعد تیسری جگہ ڈائریکٹری حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔ میں نے برٹش لائبریری کا نمبر دیکھا۔ لیکن لائبریری اس وقت بند تھی۔ پھر مجھے برٹش قونصلیٹ کا نمبر مل گیا۔ میں نے اس کے گھر کا نمبر لکھ لیا۔ واپس اپنے فلیٹ میں پہنچ کے میں نے وہ کاغذ کا پُرزہ رابعہ کی ناک کے سامنے لہرایا جس پر نمبر لکھا ہوا تھا۔ "یہ دیکھو۔ یہ ہے کامیابی' جہاں چاہ ہے' وہاں راہ ہے۔"

نمبر ملاتے ہوئے میں نے دل ہی دل میں دعا مانگی۔ یا اللہ میری لاج رکھ لے۔ یہ دعا نہ جانے کیسے قبول ہو گئی۔ کسی شریر بچے نے کہا "اپنا نام بتاؤ' ابھی وہ ممی سے جھگڑ رہے تھے۔ فوراً آجائیں گے۔ ایسا اکثر ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "وقار یوسف ایڈووکیٹ' تمہیں یاد رہے گا۔"

"اس سے زیادہ مشکل نام والے لوگ فون کرتے ہیں ڈیڈی کو" وہ بولا اور ریسیور رکھ کے چلا گیا۔

چند منٹ انتظار میں گزرے پھر خود قونصلیٹ نے کہا "یس مسٹر وائی کار یو سی۔"

دانستہ یا نادانستہ تصریح بچے نے کی تھی اور میرے نام کو ایک سوال بنا دیا تھا۔ (WHY CAR YOU SEE) کہ آپ کار کیوں دیکھتے ہیں؟

میں نے کہا "اصل نام ہے وقار یوسف اور میں ایڈووکیٹ ہوں۔"

"میرے بیٹے نے کہا تھا۔ اینڈ اے کیٹ (اور ایک بلی) خیر بتائیں میں آپ کے لیے کیا کرسکتا ہوں؟"

میں نے کہا "مجھے لندن کا ایک ٹیلی فون نمبر درکار ہے جو مجھ سے گُم ہو گیا ہے۔"

پھر میں نے اسے ایک کہانی سُنائی کہ دورانِ تعلیم میرے ایک فیملی سے اچھے مراسم تھے مگر یہاں آنے کے بعد رابطہ نہیں رہا لیکن آج میری عدم موجودگی میں ایک فون کال ریسیو ہوئی اور پیغام یہ ملا کہ میں فوراً ان کو فون کروں۔ کیا آپ ان کا فون نمبر معلوم کرنے میں میری مدد کرسکتے ہیں؟

"آف کورس مسٹر یوسف" اس نے کہا اور مجھے ایک نمبر دے دیا "اس طرح آپ براہِ راست کوئی بھی نمبر حاصل کرسکتے ہیں اگر آپ صحیح نام بتادیں۔"

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور تیسری بار کال بک کرائی۔ یہ بھی ارجنٹ کال تھی مگر اس کے لیے مجھے ایک گھنٹا انتظار کرنا پڑا اور دو بار یاد دہانی کرانی پڑی۔ بالآخر گھنٹی بجی اور مجھے مطلوبہ نمبر مل گیا۔ پھر کسی آپریٹر کی شیریں آواز نے بات کی مگر میں نے اس لارڈ کا نام لیا ہی تھا کہ شیرینی میں تھوڑا سا نمک آگیا۔

"اگر آپ مذاق کر رہے ہیں مسٹر یوسف تو یہ بہت بُرا مذاق ہے۔"

میں نے کہا "اتنی دور سے ایک ٹرنک کال بک کرا کے میں آپ سے مذاق کروں گا جسے میں جانتا تک نہیں۔"

"کیا آپ کو معلوم نہیں کہ ان کا انتقال ہوئے کئی مہینے ہو گئے۔"

میں نے کہا "بالکل معلوم ہے لیکن مجھے یہ خبر ذرا دیر سے ملی۔ میں ان کی فیملی سے اظہارِ تعزیت کرنا چاہتا تھا۔ اگر اب بھی آپ کا خیال ہے کہ میں مذاق کر رہا ہوں تو کسی اور کو بلائیں جو سنجیدہ بات میں مذاق کا پہلو تلاش نہ کرتا ہو۔"

"آئی ایم سوری۔" آپریٹر کا رویّہ ایک دم معذرت خواہانہ ہو گیا اور اس نے مجھے نمبر دے دیا۔

اس کے باوجود کامیابی ادھوری رہی۔ نمبر معلوم کرنے کے دشوار مراحل میں تین گھنٹے سے زیادہ صرف ہو گئے تھے۔ رات دس بجے میں نے آخری بار لندن کی کال بک کرانے کے لئے کہا تو بہت دیر ہو گئی۔ لندن میں شام کے پانچ بجے تھے۔ نمبر ملنے میں مزید ایک گھنٹا صرف ہوا اور جب بالآخر گھنٹی بجی تو کسی ہاؤس میڈ نے مجھے مؤدبانہ مطلع کیا کہ لیڈی الزبتھ گورڈن چند منٹ پہلے ونڈسر پیلس گئی

کسی تقریب میں گئی ہیں اور ڈنر کے بعد دیر سے واپس آئیں گی۔
میں نے کہا "اچھا پھر میرا نام اور ٹیلی فون نمبر لکھ لو۔ وہ آئیں تو انھیں کہنا کہ فوراً مجھے فون کریں۔"

رابعہ نے میری صورت کی مایوسی دیکھ کے کہا "کیا ہوا۔ اس نے بات کرنے سے انکار کردیا؟ بہانہ کردیا۔"

"ہاں۔ اس کا شوہر تھا۔ خبیث" میں نے روتی آواز میں کہا "وہ اب لیڈی الزبتھ گورڈن ہے۔ یہ گورڈن بھی ہوگا کوئی ارل' کاؤنٹ یا لارڈ۔"

رابعہ نے افسوس اور ہمدردی سے کہا "تم اگر خود کو پرنس سکندر بخت آف کاموکے منڈی یا نواب آف چوہڑکانہ کہتے۔ تو شاید اتنے بے آبرو ہوکے اس کے کوچے سے نہ نکلتے۔"

میں نے کہا "غم غلط کرنے کے لیے ضروری ہے کہ تم مجھے کسی اچھی سی جگہ لے جاکے اچھا کھانا کھلاؤ۔ ماضی کے زخموں پر نمک پاشی مت کرو۔ نمک ضائع ہوگا۔ زخم مندمل ہوچکے ہیں۔"

"تم نے آج کے دن کچھ نہیں کیا۔ میں نے کہا تھا کہ تھوڑا بہت سامان لے آؤ۔ یہاں کچھ دن گزارنے ہیں۔ کیا بار بار کھانے اور چائے پینے کے لیے باہر جائیں گے۔ موڈ ہو نہ ہو۔" رابعہ نے مجھے ڈانٹنا شروع کیا۔

میں نے کہا "اب دو چار دن کے لیے گھرداری سے فائدہ؟"

ہم آدھی رات سے کچھ پہلے کھانا کھا کے لوٹے تو خلافِ معمول رابعہ کچھ سنجیدہ اور متفکر تھی۔ میرے پوچھنے پر اس نے کہا "سکندر۔ ہمیں کسی ہوٹل میں رہنا چاہیے۔ الگ الگ کمروں میں۔"

میں نے برہمی سے کہا "کیوں۔ یہاں کیا ہے؟ تمہیں ڈر لگتا ہے مجھ سے؟"

وہ ایک دم بھڑک اُٹھی "ہاں مجھے ڈر لگتا ہے تم سے کیونکہ تم بہرحال ایک مرد ہو اور میں عورت ہوں۔ کون سا رشتہ ہے ہمارے درمیان جو ہم یہاں ایک ہی کمرے میں رہتے ہیں؟ دوستی کا اور خلوص کا؟ یہی کہوگے نا تم؟"

"کیا یہ غلط ہے؟"

"ہاں یہ بالکل غلط ہے۔ ہمارے مذہب میں ہمارے معاشرے میں ہمارے اس اخلاقی نظام میں ایک غیر شادی شدہ مرد اور عورت کے درمیان دوستی کا کوئی تصور نہیں۔ اور یہ بالکل ٹھیک ہے۔ آگ اور پانی کی کیا دوستی۔ جب تک شیطان کا وجود ہے۔ اعتبار اور اعتماد' نیک نیتی اور شرافت کے سارے حصار کمزور ہیں۔"

"ابھی تک اس میں کوئی رخنہ نہیں آیا رابعہ۔"

"جب زلزلہ آتا ہے سکندر تو مضبوط ترین بنیادوں والی برسوں پرانی عمارتیں چند سیکنڈ میں زمیں بوس ہوجاتی ہیں۔ آتش فشاں برسوں اپنے دامن میں سرسبز بستیوں کو پناہ دیے رہتے ہیں اور پھر اچانک خاکستر کردیتے ہیں۔ مجھے ڈر لگتا ہے اس ایک لمحے سے۔ جو ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔ جس نے آدم کو اس کی جنت سے بے دخل کرادیا تھا۔ ہم بھی اولادِ آدم ہیں۔ خطا کار کہلائے ہیں' فرشتے نہیں ہیں۔"

میں خاموش ہوگیا۔ میں رابعہ کی کسی بات کی تردید یا نفی نہیں کرسکتا تھا۔ رابعہ کو خود ہی احساس ہوگیا کہ اس کے لہجے کی تلخی نے مجھے احساسِ جرم میں جتلا کردیا ہے۔

اس نے کچھ دیر بعد نرمی سے کہا "دیکھو سکندر۔ محبت بڑا عظیم جذبہ ہے مگر اس کو رُسوا ہم خود کررہے ہیں۔ چلو مانا تم بکواس کرنے والوں کی پروا نہیں کرتے۔ ہماری نیت اور ہمارے قول وفعل کو خدا سے بہتر کون جانتا ہے۔ جو ہمیں نہیں جانتے وہ بُرا بھلا کچھ بھی نہیں کہتے۔ چوہدری دلاور جیسے بدخواہ بھلا باتوں سے ہمارا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔ یہ بھی مانا کہ ہمارے اپنے دوست اور ساتھی ہمارے بارے میں اچھی رائے رکھتے ہیں لیکن تم کو کسی کے دل کی کیا خبر۔ گل اور محسن نے شادی کرلی۔ اکرام شیخ اور کاجل تو سب سے پہلے الگ ہوگئے تھے۔ مولوی خادم حسین نے بھی مارگریٹ کو مسلمان کیا اور پھر نکاح پڑھوالیا۔"

میں نے غصّے سے کہا "پھر میں کیا کروں۔ ابھی شادی کرلوں تم سے؟ اسی وقت چلیں ہم کسی نکاح خواں کے پاس؟"

"میں کوئی غلط بات نہیں کہہ رہی ہوں۔" رابعہ نے بھی گرم ہوکے کہا "تم کو کیا معلوم کہ پیٹھ پیچھے کون ہمارے بارے میں کیا کہتا ہے۔ یا ہمارے بارے میں کیا رائے رکھتا ہے۔ کہہ دو کہ مجھے ان کی بھی پروا نہیں۔ منظر بھی لحاظ کرتا ہے۔ حالانکہ وہ بہت منہ پھٹ ہے۔ وقار یوسف تو بول ہی نہیں سکتا لیکن کیا کبھی ان کے دل میں بھی خیال نہیں آتا ہوگا کہ آخر یہ لوگ کیسی زندگی گزار رہے ہیں۔ رابعہ اور سکندر' غالب اور نازو۔ ہر جگہ ہر وقت ایک ساتھ رہتے ہیں تو پھر شادی کیوں نہیں کرلیتے۔ کیا فرق ہے ان کی اور کسی شادی شدہ جوڑے کے جذبات میں اور..... معمولات میں..... مجھے شرم آنے لگی ہے لوگوں سے نظر ملاتے ہوئے بھی۔ اگر ہم الگ رہیں۔ صرف کام سے ملیں اور سب کے سامنے تو اور بات ہے مگر تم دیکھو ہم کیسے رہتے ہیں۔ کیا کسی کے دل میں غلط خیال نہیں آئے گا اگر یہ معلوم ہوجائے کہ کراچی میں ہمارے پاس ایک ہی کمرا تھا۔ ہوٹل میں بھی۔ اِدھر ہم نے ایک فلیٹ لے لیا تھا۔ پھر ہم لندن چلے گئے۔"

میں نے اسے بولنے دیا مگر جب وہ پھُوٹ پھُوٹ کے رونے لگی تو میں نے کہا "تم ٹھیک کہتی ہو رابعہ۔ ابھی کسی کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں لیکن صبح ہم نکاح پڑھوالیں گے۔ اس کے لیے دو گواہوں کے سوا کسی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اکرام شیخ اتنا تو کرہی سکتا ہے کہ کاجل کو بتائے بغیر نکاح کا گواہ بننے آجائے' کسی مسجد میں۔ اور اپنے ساتھ کسی کو بھی لے آئے۔"

رابعہ نے انکار میں سر ہلایا "میں ایسے شادی نہیں کروں گی جیسے میں گھر سے بھاگ کے آئی ہوں۔"

"یہ نکاح ہوگا کسی گناہ کے امکانات سے بچنے کے لیے۔ ہم اسی طرح رہیں گے۔ جب تک نکاح کا اعلان نہیں کرتے اور تمہاری رخصتی نہیں ہوتی۔ بالکل اسی طرح جیسے تم چاہتی ہو۔ محض ایک اخلاقی قانونی اور مذہبی ضرورت پوری کرنے کے لیے ہم نکاح کرلیتے ہیں۔ ازدواجی زندگی کا آغاز ہم ایسے گھر میں آباد ہوکے کریں گے۔"

"بُرا مت ماننا سکندر۔ یہ ہوسکتا ہے لیکن....."

"لیکن کیا.... اب کیا اعتراض ہے؟"

"اس کے بعد تمہارے ذہن کو بہانے کی تلاش ہوگی۔ کوئی ایسی دیوار نہیں ہوگی جو گرائی نہ جاسکے' جو تمہیں روکے یا جس کے وجود کو تسلیم کرنا ضروری ہو۔ رابعہ کی بات اور ہے۔ تمہاری بیوی کیا کرے گی" اس نے نظر جھکا کے بڑی مشکل سے کہا۔

میں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا "آخر کیا چاہتی ہو تم؟"

"صرف یقین۔ کہ تم سے میری شادی ایسے ہوگی جیسے سب لڑکیاں چاہتی ہیں۔ اس میں میرے لیے صرف خوشی کے احساس کی تکمیل ہوگی۔ یہ خیال نہیں ہوگا کہ شادی ایک رسمی کارروائی ہے۔ خانہ پُری ہے اور لوگوں کے لیے ایک دلچسپ تماشا ہے۔ ڈراما ہے۔ کوئی یہ نہ کہے اور سمجھے کہ ہم نے مصلحت کے تحت یا خوف سے شادی کی۔ ہم مجبور ہوگئے تھے.... خدانخواستہ افشائے راز کے ڈر سے۔ نہیں' سب کو یہ یقین ہونا چاہیے کہ ہم نے اپنی مرضی اور خوشی سے محبت کی اور عزت آبرو کے ساتھ بالکل صحیح وقت پر شادی کی۔ جب حالات سازگار ہوئے اور ہم نے محسوس کیا کہ اب گھر بسانا چاہیے۔"

میں اسے حیرانی سے دیکھتا رہا "میں تم سے سو فیصد متفق ہوں۔ لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا ہے کہ تم مجھ سے کیا چاہتی ہو۔ میں کیا کروں؟"

"تم کچھ مت کرو۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہارے دل میں میری محبت کا جذبہ کتنا پاک صاف ہے۔ تم کو میری عزت اتنی ہی عزیز ہے جتنی خود مجھے۔ اور اسی لیے میں تمہاری بہت عزت کرتی ہوں۔ ان دوچار دنوں کی کوئی بات نہیں لیکن ایک تو کسی کو بھی پتا نہیں چلنا چاہیے کہ ہم ہوٹل میں تھے تو ایک کمرے میں تھے اور پھر یہاں اس فلیٹ میں ساتھ تھے۔ ہم آئندہ ایسی صورتِ حال سے بچیں گے۔ ہم الگ رہیں گے۔ ہر وقت ساتھ رہنے کے باوجود۔ ہوٹل میں ہوں گے تو ہمارے کمرے الگ ہوں گے۔ لندن میں بھی۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں تمہاری نکاح والی تجویز مسترد کررہی ہوں۔ اخلاقی اور مذہبی نقطۂ نظر سے نکاح صرف ایجاب وقبول ہے۔ قانونی طور پر اس کی رجسٹریشن ضروری ہے۔ ہم اس نکاح کی حیثیت کو اپنی ذات تک محدود رکھیں گے۔ پھر جب ہم شادی کریں گے تو اعلانیہ نکاح ہوگا۔ سب دوست احباب کے سامنے۔ دوبارہ نکاح پڑھوانا کوئی گناہ نہیں۔"

میں نے دری پر لیٹ کر چھت کو گھورتے ہوئے کہا "جیسی تمہاری مرضی۔ مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تمہاری خوشی کے لیے میں کچھ بھی کرسکتا ہوں۔"

"تھینک یو سکندر۔" اس نے سکون کی گہری سانس لی اور مسکرائی "یہ بات کہتے ہوئے میں بلاوجہ ڈر رہی تھی۔"

"تم پاگل ہو" میں نے کہا اور کروٹ بدل کے سوگیا۔

ٹیلی فون کی گھنٹی پر میں ہڑبڑا کے اُٹھا۔ ریسیور اُٹھاتے ہوئے میں نے کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی تو صبح کے چار بجے تھے۔ لندن میں رات کے گیارہ' آپریٹر نے کہا "مسٹر سکندر بخت۔"

میں نے کہا "یس۔ اسپیکنگ۔"

"ہولڈ آن کریں۔ آپ کی کال ہے لندن سے۔"

اب رابعہ بھی آنکھیں کھول کے مسکرا رہی تھی۔ میں نے اسے آنکھ ماری "اب ذرا سُننا جذباتی مکالمے' تمہارا دل کباب ہوجائے گا۔"

رابعہ کے بولنے سے پہلے الزبتھ کی آواز آئی "ہیلو!"

میں نے کہا "الزبتھ!"

"از دیٹ یو۔ سکندر؟" الزبتھ نے کہا "مجھے یقین نہیں آتا۔"

میں نے کہا "آجانا چاہیے۔ یہ میری روح کی آواز نہیں ہے۔ میں اسی دنیا میں ہوں اور زندہ ہوں۔ تم سے بچھڑنے کے باوجود۔ اصولاً تو مجھے مرجانا چاہیے تھا۔"

وہ ہنسی "تم وہی ہو۔ بالکل نہیں بدلے۔ مجھے تمہارا پیغام اور فون نمبر ابھی واپسی پر ملا۔"

"ہاں۔ تم ونڈسر پیلس میں مدعو تھیں لیڈی الزبتھ گورڈن۔ مبارک ہو تم نے شادی کرلی۔ بے وفا۔"

"تھینکس" وہ ہنسی "اور تم نے؟"

"مرد تو ہوتے ہی بے وفا ہیں" میں نے کہا "کیا وہ بہت ہینڈسم ہے۔ مجھ سے بھی زیادہ؟"

"ہاں۔ اور تمہاری بیوی؟ کیا وہ مجھ سے زیادہ حسین ہے؟"

"کیا سورج سے بڑھ کر کوئی روشن ہوسکتا ہے۔ خیر تم خود فیصلہ کرلینا دیکھنے کے بعد کہ یہ کس حد تک سچ ہے" میں نے کہا۔

"اوہ۔ کیا تم لندن آرہے ہو۔ یو راسکل" وہ چلاّئی۔

میں نے کہا "یہی بتانے کے لیے میں نے تمہیں فون کیا تھا۔"

"لیکن سکندر بخت..."

میں نے کہا "ہاں۔ قانونی طور پر میں حکومت سے کلیرنس لیے بغیر تمہاری مقدس سرزمین پر قدم نہیں رکھ سکتا۔"

"میں تم کو این او سی دلوانے کے لیے کیا کرسکتی ہوں۔"

"کچھ نہیں" میں نے کہا "برطانوی حکومت پہلے میری حکومت کو لکھے گی اور یہ بڑا لمبا سُرخ فیتے کا چکر ہے۔ میں دوسرے نام سے آؤں گا۔"

"دوسرے نام سے۔ جعلی پاسپورٹ پر؟"

"نہیں۔ پاسپورٹ اصل ہوگا۔ بس اپنا نام بدل لیا ہے میں نے۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ میں انتظار کروں گی۔"

میں نے کہا "الزبتھ۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ اگر تم کسی سے برٹش قونصلیٹ کو فون کرادو کہ مسٹر وقار یوسف ایڈووکیٹ کو ٹورسٹ ویزا دے دیا جائے تو میرا کام آسان ہو جائے گا۔"

"وقار یوسف۔ یہ تمہارا نیا نام ہے... آفیشل۔"

"سو فیصد آفیشل۔ پاسپورٹ پر میرا یہی نام ہے۔ دراصل تمہارے نسل پرست گورے سفارتی ارکان آج بھی پسند نہیں کرتے کہ بلاوجہ کوئی میرے جیسا کالا برطانیہ گھومنے جائے۔ خواہ اس کی جانِ تمنا آج بھی الزبتھ جیسی لڑکی ہو جس کی حسرتِ دید....."

وہ ہنسی "اوکے اوکے۔ زیادہ بد معاشی کی ضرورت نہیں۔ میں اپنے شوہر سے کہہ دوں گی۔ کل کسی وقت تم برٹش قونصلیٹ سے مل لو۔"

میں نے کہا "تھینک یو ڈارلنگ... باقی ملاقات پر....."

"تم اور تمہاری بیوی میرے مہمان رہو گے۔ گاڑی تمہیں ہیتھرو سے پک کرے گی۔ ہمارا شوفر وہی ہے' تم اسے پہچان لو گے۔"

"مگر تمہارا شوہر۔ وہ مجھے قتل تو نہیں کر دے گا۔"

"الٹا مجھے ڈر ہے کہ تم اسے قتل کر دو گے۔ پھر بھی میں رسک لے رہی ہوں۔ وہ بے چارہ ذرا بھی جوڈو کراٹے نہیں جانتا۔ تم اپنی بیوی سے بات نہیں کراؤ گے۔"

"وہ جاہل ہے۔ انگریزی کا ایک لفظ نہیں بول سکتی" میں نے کہا۔

"اوہ ڈیئر" اس نے ترس کھا کے کہا "یہی تو المیہ ہے تم لوگوں کا۔ ارینج میرج کر لیتے ہو اور بس شکل دیکھتے ہو یا جہیز۔ کیا تمہیں یہاں رہ کے بھی فرق نہیں پڑا کہ خود پسند کرتے کسی کو۔"

"کیا کریں الزبتھ۔ ہم جاہل دقیانوسی سوچ والے معاشرے کے قیدی ہیں۔ ویری بیک ورڈ۔ اچھا' تھینکس اگین اینڈ بائی۔"

میں نے ریسیور رکھ دیا۔

"چکر باز!" رابعہ نے کہا۔

میں نے کہا "صدمے سے بے ہوش ہو جائے گی تمہیں دیکھ کے۔ پاکستانی لڑکی کے بارے میں سارے تصورات باطل ہو جائیں گے۔ ایڈووکیٹ سپریم کورٹ' او مائی گاڈ۔ موروثی دولت مندی سے پرنس یا پرنسس بن جانا تو تقدیر کے کھیل ہیں۔ صلاحیت یا قسمت سے عزت پانا معیار ہو تو تمہارا مقابلہ کوئی الزبتھ نہیں کر سکتی۔ یہ الزبتھ کیا چیز ہے۔"

"لیں۔ اور یہ میرا بکنگھم پیلس۔ کیا بات ہے اس کی۔" رابعہ بولی "پانچ ہزار زیادہ دے کے خریدا ہے ہم نے۔"

اس کے بعد سونا مشکل تھا۔ آدھے گھنٹے بعد صبح کا اُجالا پھیلنے لگا۔ میں رابعہ کو الزبتھ کے بارے میں بتاتا رہا اور اس کے باپ کے بارے میں۔

"اچھا ہوا مر گیا ورنہ میرا نام سُنتے ہی وہ برطانوی بحریہ' فضائیہ سب کو الرٹ کر دیتا کہ ہوشیار' خبردار۔ جس خطرناک شخص کو سلطنتِ برطانیہ کی حدود سے بے دخل کر دیا گیا تھا وہ بھیس بدل کے پھر لندن آ رہا ہے۔ ضرور ہمارا تہذیبی ورثہ برباد کرنے یا چرا کر لے جانے کی نیت سے۔ ایسا نہ ہو وہ بگ بین اٹھا لے جائے یا دریائے ٹیمز چرا کر نکل جائے۔ اس کالے آدمی کو دیکھتے ہی گولی بلکہ گولا مار دو۔ اب پتا نہیں الزبتھ کا شوہر کیا چیز ہے۔ اگر بڈھے نے خود پسند کیا ہو گا تو ویسا ہی ہو گا۔"

"الزبتھ نے تمہیں پسند کیا تھا تو دوسرا بھی تم جیسا ضرور دیکھا ہو گا۔"

میں نے کہا "خاتون۔ اس ناچیز کا ثانی زمانے میں نہیں۔ ایک اوریجنل پیس آف آرٹ تھا جو اب آپ کی ملکیت ہے۔"

ناشتا کرنے کے لیے ہمیں تیار ہو کے صبح سات بجے پھر فلیٹ سے نکلنا پڑا۔ اور کچھ نہ سہی' اگر میں نے چائے بنانے کا انتظام ہی کر لیا ہوتا تو ہم صبح پانچ بجے سے سات بجے تک چائے کی حسرت دل میں لیے نہ پڑے رہتے' باہر جانے سے پہلے مجھے خیال آیا تھا کہ اکرام شیخ سے اس کے گھر پر ہی بات کر لوں۔ وہ میاں بیوی آٹھ بجے اسکول پہنچتے ہوں گے تو سات بجے یقیناً جاگ جاتے ہوں گے اور گھر سے شاید ساڑھے سات بجے نکلتے ہوں گے لیکن نہ جانے کیوں اب میں اکرام شیخ پر بھروسا کرتے ہوئے ڈرتا تھا۔ اصل خطرہ اس کی ذات کو مجھ سے تھا۔ سب سے اچھا یہی تھا کہ اسے ہمارے بارے میں کچھ علم ہی نہ ہو۔ پھر دلاور کو بتانے کے لیے اس کے پاس کیا ہو گا۔

صبح سویرے تمام اچھے ریسٹورنٹ بند تھے لیکن ایرانی ہوٹل بھرے ہوئے تھے۔ یہ سب دفتروں' کارخانوں میں کام کرنے والے یا مزدور پیشہ لوگ تھے۔ ہم نے ایک فیملی کیبن میں بیٹھ کے پوری چھولے کھائے اور چائے پی۔ اب میں بھی خاموش تھا۔ رابعہ بھی خاموش تھی لیکن ہمارے ذہن ایک ہی بات سوچ رہے تھے جو اہم نہ ہونے کے باوجود میرے اور رابعہ کے لیے زندگی کے اہم ترین فیصلے کی حیثیت رکھتی تھی۔ یہ مستقبل کے خوابوں کے محل کی خشتِ اول تھی۔ جب بنیاد رکھ دی تو پھر محل بھی کھڑا ہو جائے گا۔

قدرتی طور پر میں جذباتی تھا اور قدرے رنجیدہ۔ مجھے اپنے والد کا خیال آیا اور اپنے دوست یاد آئے۔ یہ کس نے سوچا تھا کہ یہ تقریب کسی اہتمام اور انتظام کے بغیر ایسے اچانک ہو جائے گی کہ ہمارے سوا کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہو گی۔ یہ ایسی بات نہ تھی جس کو راز رکھا جاتا۔ یہ سارے زمانے کو ڈنکے کی چوٹ پر سُنائے جانے کے قابل خوش خبری تھی مگر ہم حالات کے سامنے سرِ تسلیم خم کر کے خاموش رہنے پر مجبور تھے۔ شاید ایسے ہی جذبات رابعہ کے تھے۔ عورتیں یوں بھی زیادہ حساس ہوتی ہیں اور خوشی ہو یا غم' آنسو ہی ان کے جذبات کی غمازی کرتے ہیں۔

میں نے کہا "تم نے کچھ کھایا نہیں؟"

"تم نے کب کھایا ہے" رابعہ نے نظر اٹھائے بغیر کہا۔

میں نے کہا "رابعہ۔ میں آنسو نہیں دیکھنا چاہتا تمہاری آنکھوں میں۔"

اس نے آنکھوں میں اتر آنے والی نمی پر شرمیلی اداس مسکراہٹ کا پردہ ڈال دیا "رونے کی تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔"

"ہاں۔ اور میں نے یہ طے کیا ہے کہ ہم اس معاملے میں اکرام شیخ کو بھی شریکِ راز نہیں کریں گے" میں نے کہا۔

"یہاں اور کون ہے ہمارا؟" رابعہ آہستہ سے بولی۔

میں نے کہا "ہم مسجد چلتے ہیں۔ کسی بھی مسجد میں۔ ہم عاقل بالغ ہیں یہ مولوی صاحب بھی دیکھ سکتے ہیں۔ ہم حلفیہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم اپنی مرضی سے شادی کر رہے ہیں۔ شرعاً یہ نہ گناہ ہے نہ معیوب ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ ہم پر اعتبار نہ کیا جائے اور ہمیں دو گواہ نہ مل جائیں۔"

رابعہ نے اپنی رضامندی کا اظہار صرف سرہلا کے کیا۔ ساری ذمے داری اس نے مجھ پر چھوڑ دی تھی۔ وہ مجھ سے زیادہ قانون کو سمجھتی تھی مگر یہ معاملہ کسی عدالت کا نہیں تھا۔ میں کچھ نروس ہونے لگا۔ مسجدیں بہت تھیں اور ان میں موذن' پیش امام درس دینے والے اور لینے والے سب تھے۔ محلے کی چھوٹی چھوٹی مسجدوں سے وسیع وعالی شان مساجد تک جن کے اقامتی دارالعلوم میں سیکڑوں طلبا تھے۔ ان میں ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانے والے تفرقہ باز مُلاّ بھی تھے اور واجب الاحترام جید علما بھی۔ فیصلہ صرف یہ تھا کہ ہم کس کا انتخاب کریں جہاں ہم پر اعتبار کیا جائے اور کوئی قانونی مسئلہ نہ اُٹھائے۔ شک کوئی نہ کرے اور آسان کام کو مشکل نہ بنائے۔

میں رابعہ کے ساتھ پھرتا رہا۔ آدھے گھنٹے میں ہم تین مسجدوں کے پاس سے گزرے مگر خود میری ہمت نہ پڑی کہ اندر قدم رکھوں۔ پھر میں نے اپنے آپ سے کہا کہ جب میں نیک نیتی کے ساتھ ایک کام کرنے جا رہا ہوں اور میری نیت کو خود میرا رب بہتر جانتا ہے تو مجھے اس کی تائید و حمایت پر بھی بھروسا کرنا چاہیے۔

وہ جیکب لائن کے علاقے کی ایک مسجد تھی جس کے صحن میں چند بچے قرآن پڑھ رہے تھے۔ اندر چند افراد حلقہ بنائے بیٹھے تھے۔ میں نے رابعہ کو باہر ہی روکا اور خود اندر چلا گیا۔ درس دینے والا جوان آدمی تھا' درس لینے والوں میں عمر رسیدہ افراد شامل تھے۔ ان سب نے ایک ساتھ میرے سلام کا جواب دیا۔

میں نے کہا "مولوی صاحب! میرا نام سکندر بخت ہے۔ میرے والد وزیر خان مرحوم تھے۔ اس وقت دنیا میں میرا حقیقی رشتے دار کوئی بھی نہیں۔ میں حال ہی میں کراچی آیا ہوں اور صدر میں رہتا ہوں۔ یہ فلیٹ میں نے کل خریدا ہے۔"

کسی نے فائل دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ان کی آنکھوں میں دوسرے سوالات تھے.... "آپ کس سلسلے میں تشریف لائے ہیں؟" درس دینے والے نے شائستگی سے کہا۔

میں نے کہا "میں تخلیے میں عرض کروں گا۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا "آپ لوگ تشریف رکھیں۔ میں ان کی بات سن لوں۔"

وہ مجھے مسجد کے صحن سے ملحق اپنے دو کمروں والے گھر میں لے گیا۔ وہاں میں نے اسے بتا دیا "میں ایک لڑکی سے نکاح کرنا چاہتا ہوں۔ ہم الحمدللہ مسلمان ہیں اور بالغ ہیں۔ لڑکی کا بھی کوئی والی وارث نہیں مگر وہ تعلیم یافتہ اور باشعور ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کے حلفیہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم کسی لالچ' ڈر یا دباؤ کے بغیر برضا و رغبت نکاح کرنا چاہتے ہیں اور اس میں کوئی بات خلافِ شرع بھی نہیں ہے اور خلافِ قانون بھی۔ ویسے تو کسی مسلمان کے لیے حلف اٹھا کے بیان دینا بھی کافی ہے لیکن اس کے علاوہ بھی آپ اپنی تشفی کے لیے....."

"نعوذ باللہ" اس نے شفقت سے کہا "اس کے بعد یقین نہ کرنے والا خود مسلمان کہلانے کا مستحق نہیں۔ آپ خود پابندِ شرع اور دین دار ہیں۔ آپ کا اندازِ گفتگو خود آپ کی شرافت اور صداقت کی دلیل ہے۔ لڑکی کہاں ہے؟"

میں نے کہا "وہ میرے ہمراہ آئی ہے۔"

"اسے اندر بلا لیجیے۔ اُدھر سے" اس نے دوسرے دروازے کی طرف اشارہ کیا "میں آپ کی موجودگی میں اس سے چند سوالات کر لوں گا۔"

میں نے رابعہ کو بُلا لیا۔ مولانا نے اس سے صرف وہی پوچھا جو ضروری تھا۔ "بی بی' آپ مسلمان ہیں۔ بالغ ہیں۔ آپ کی پہلے تو شادی نہیں ہوئی؟ یہ شادی آپ اپنی مرضی سے کسی دباؤ یا لالچ کے بغیر کر رہی ہیں۔ آپ خدا کو حاضر و ناظر جان کے کہیں گی کہ جو کچھ آپ نے بتایا سب سچ ہے۔"

رابعہ نے نقاب ہٹائے بغیر سب کہہ دیا پھر رابعہ پردے کے پیچھے چلی گئی جہاں اس کی بیوی موجود تھی۔ مولانا صاحب پھر مسجد کی طرف گئے جہاں وہ اپنا درس نامکمل چھوڑ آئے تھے۔ میں اس مختصر سے کمرے میں اکیلا رہ گیا جو شاید آٹھ نو فٹ چوڑا اور دس بارہ فٹ لمبا تھا۔ اس میں ایک دری بچھی ہوئی تھی اور دیواری الماریوں میں شیشوں والے پٹوں کے پیچھے دینی کتب اور رسائل بھرے ہوئے تھے۔ دیواروں پر آیاتِ قرآنی اور خطاطی کے نمونے خانۂ کعبہ اور مقاماتِ مقدسہ کی تصاویر آویزاں تھیں۔

مولانا صاحب تقریباً آدھے گھنٹے بعد پھر آئے تو ان کے ساتھ چار آدمی تھے۔ غالباً وہ چاروں ہی درس میں شریک تھے۔ انہوں نے باری باری مجھے سب سے متعارف کرایا۔ وہ سب تبلیغی جماعت کے کارکن تھے۔ انہوں نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ مصافحہ کیا۔ وہ سب میرے ظاہری حلیے سے اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے کہ وہ مجھے اپنی جماعت میں شامل ہونے پر آمادہ کر لیں گے۔

نکاح کی رسم بڑی سادگی سے اور چند منٹ میں سرانجام پائی۔ مولانا خود دلہن کے وکیل ہوئے۔ حاضرین میں سے دو میں

بنے۔ حق مہر کے مسئلے کو میں نے رابعہ پر چھوڑا تھا۔ اس نے مجھ پر چھوڑا تو خود مولانا نے مجھ سے پوچھ کے شرعی حق مہر مبلغ بتیس روپے آٹھ آنے طے کردیا۔ نہ اس وقت میں نے سوال کیا اور نہ بعد میں کسی سے پوچھا کہ آخر اس کی سند کیا ہے اور اس رقم کا تعین کس بنیاد پر کیا گیا ہے؟

مولانا رجسٹرڈ نکاح خواں بھی تھے چنانچہ انہوں نے کاغذی خانہ پُری کی اور مجھے فائل میں دیکھ کے اپنا پتا بھی لکھوانا پڑا۔ جب سب لوگ دستخط کر چکے تو انہوں نے دعائے خیر کے لیے ہاتھ اٹھائے اور مجھے مبارک باد دی۔ میری ذہنی کیفیت اس وقت بہت عجیب تھی۔ اس نکاح میں کوئی غیر اخلاقی پہلو نہیں تھا مگر اس کے باوجود میرے ذہن میں ایک خلش سی تھی کہ کسی معاملے میں جھوٹ نہ بولنے اور نیک نیتی سے سب کچھ سچ بتانے کے باوجود میں نے یہ کام ڈر کے باعث چوری چھپے کیا تھا اور ظاہری صداقت کچھ اور تھی جو اصل حقیقت سے مختلف تھی۔ سکندر بخت وہ نہیں تھا جو نظر آرہا تھا۔ ڈر یہ نہیں تھا کہ کوئی اس شادی میں حارج ہوگا یا آج نہ ہوئی تو یہ شادی کبھی نہیں ہوگی۔ ڈر مجھے اپنی جان کا تھا جس کی وجہ سے میں حلیہ بدل کے آیا تھا مگر یہ بات میں نے چھپالی تھی۔ ڈر مجھے یا رابعہ کو خود اپنی بشری کمزوری کے باعث کوئی خطا ہو جانے کا تھا مگر یہ بات بھی بتائی نہیں جاسکتی تھی۔ کوئی جرم نہ کرنے کے باوجود میں خود کو مجرم محسوس کررہا تھا۔ اب میں جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا تاکہ مجھے اور جھوٹ نہ بولنا پڑے۔

وہ سب شریف النفس پاکیزہ کردار والے دین دار لوگ تھے اور شاید اس لیے میں ان کے درمیان خود کو اجنبی اور گنہ گار محسوس کررہا تھا۔ ان کے اعتبار اور اعتماد نے مجھے شرمندہ کردیا تھا۔ مجھے مزید شرمندگی اس وقت ہوئی جب اندر سے چائے کے ساتھ مٹھائی آگئی۔ اس سے باتوں کا سلسلہ لمبا ہوا اور انہوں نے میری زندگی کے بارے میں پوچھنا شروع کیا۔ کراچی آنے سے پہلے میں کہاں تھا۔ کیا کرتا تھا۔ اب کیا ارادہ ہے۔ میں بُری طرح پھنس گیا اور نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے بہت سے بے ضرر جھوٹ بولنے پڑے۔ انہوں نے مجھے تبلیغی جماعت میں شمولیت کی دعوت دی جو میں رد نہ کرسکا۔ ایک گھنٹے بعد جب انہوں نے مجھے رخصت ہونے کی اجازت دی تو مولانا نے کہا کہ نکاح نامے کی مصدقہ نقول مجھے دو ہفتے بعد مل جائیں گی۔

میں رابعہ کے ساتھ باہر آیا تو مجھے ساری دنیا بدلی ہوئی لگی۔ جب رابعہ میرے ساتھ چل رہی تھی تو میں یوں محسوس کررہا تھا جیسے میں فضا میں پرواز کررہا ہوں۔ اچانک میں اور وہ میاں بیوی ہوگئے تھے۔ ایسا بالآخر ہونا تھا لیکن یہ سب یوں ہوگا' ایسا کس نے سوچا تھا۔ یہ سب غلط نہ ہونے کے باوجود غلط لگتا کہ ہر ذاتی فیصلہ اتنا ذاتی بھی نہیں ہوتا کہ اس میں دوست احباب کو بھی شریک نہ کیا جائے۔ اگر یہ بات منظر اور غالب' محسن یا وقار یوسف کو معلوم ہوجائے تو انہیں صدمہ ہوگا۔ یہ سب ہم ان کے سامنے بھی کرسکتے تھے۔ ان کو بتا کے بھی کرسکتے تھے۔ اس کے لیے ہمیں بہت مہلت ملی تھی اور ہم آزاد تھے کہ جب چاہیں' جہاں چاہیں نکاح کرلیں۔ اس کے باوجود ہم نے یہ کام چُھپ کے اور انہیں بتائے بغیر کرلیا تھا۔ اس کے لیے مجھے رابعہ نے مجبور کیا تھا اور غلط نہیں کہا تھا۔

اب وہ میرے ساتھ چُپ چاپ چل رہی تھی اور میں اندازہ کرنے سے قاصر تھا کہ وہ کیا سوچ رہی ہے۔ بالآخر میں نے کہا "رابعہ۔ کیا سوچ رہی ہو؟"

وہ چونکی "کچھ نہیں۔"

میں نے کہا "تم خوش ہو نا؟"

"کیوں نہیں۔ کیا تم خوش نہیں ہو" وہ بولی۔

"میں بہت مطمئن ہوں کہ ہم نے کسی خرابی سے پہلے اس کے امکان کو ختم کردیا لیکن ایک احساس ہے کہ یہ سب کچھ ویسے ہی ہوتا جیسے سب چاہتے تھے تو اچھا ہوتا۔ خیر' یہ ہم طے کرچکے تھے کہ جب وقت آئے گا تو..."

"ہاں۔ ابھی یہ بات صرف ہم جانتے ہیں۔"

"میں اپنے وعدے پر قائم ہوں۔ عملاً اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا لیکن اب میں تم کو اپنی شریکِ حیات کہوں گا تو یہ جھوٹ نہیں ہوگا۔"

الزبتھ سے بات کرلینے کے بعد مجھے قوی امید تھی کہ اب لندن کا ویزا ملنے کی راہ میں کوئی دشواری حائل نہیں ہوگی لیکن ابھی دس بجے تھے۔ ویزا کی درخواست دینے سے پہلے پاسپورٹ کا حصول ضروری تھا اور ایجنٹ نے مجھے دوپہر بعد کا وقت دیا تھا۔ ابھی صبح کے دس بجے تھے اور بازار بھی پوری طرح کھلے نہیں تھے لیکن بیشتر دکانیں کھل گئی تھیں۔

وقت گزارنے کے لیے اور توجہ ہٹانے کے لیے میں رابعہ کو بوہری بازار لے گیا۔ ہمارا کل سرمایہ اب گھٹ کر نصف رہ گیا تھا مگر یہ چالیس ہزار کی رقم بھی کم نہیں تھی۔ رابعہ نے سفر کے لیے درمیانے سائز کا ایک اچھا سوٹ کیس خریدا۔ وہ بضد ہوئی کہ میں اپنے لیے کچھ شرٹ پینٹ اور ٹائیاں خرید لوں کیونکہ لندن میں یہ چیزیں دُگنے دام میں ملیں گی پھر میں نے کہا کہ وہ بھی چند ساڑیاں پسند کرلے مگر اس نے شلوار قمیص کے ریڈی میڈ سوٹ خریدے۔

"میری تو خواہش تھی کہ تم لندن میں اُترو تو تہلکہ مچ جائے کہ اتنی ماڈرن ہوتی ہے پاکستانی لڑکی۔" میں نے کہا "ٹی شرٹ اور جینز میں۔"

"اپنی خواہش کو اپنے پاس رکھو۔ نہ پاکستانی لڑکی ایسی ہوتی ہے اور نہ مجھے ماڈرن کہلانے کا شوق ہے" وہ بولی "ہماری نمائندگی یہی لباس کرتا ہے۔"

"پھر میرے لباس میں کیا خرابی ہے؟"

"خرابی کوئی نہیں مگر ہمارے ملک میں پڑھا لکھا طبقہ پتلون قمیص کو ترجیح دیتا ہے اور خود تم بھی یہی لباس پہنتے رہے ہو۔" رابعہ بولی "قمیص پتلون تو تقریباً یونیورسل ہے۔ کمیونسٹ روس سے امریکہ اور عرب ممالک سے افریقہ تک ہر جگہ کے مرد بلا تفریق پہنتے ہیں۔"

کچھ وقت ہم نے الفنسٹن اسٹریٹ میں جوتے دیکھتے گزارا اور پھر کھانا کھانے چلے گئے۔ رابعہ پر بھی جذباتی دباؤ کم ہوگیا تھا اور وہ اب پہلے سے زیادہ پُراعتماد اور خوش نظر آرہی تھی۔ یہ عہد کرنے کے باوجود کہ ہم نکاح کے بعد بھی پہلے کی طرح رہیں گے ایک لاشعوری فرق ہمارے رویوں میں نمودار ہوگیا تھا۔ خریداری کرتے وقت وہ ایک اچھی بیوی کی طرح میری ضروریات اور میری پسند کے معاملے میں اپنی مرضی چلارہی تھی اور شاید ایسا پہلے بھی ہوتا تھا مگر مجھے احساس نہیں تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے میری ذمّے داریاں اس نے سنبھال لی ہیں اور اب مجھے اپنے معاملات کی فکروں سے کلی طور پر دستبردار ہوجانا چاہیے۔ نہ جانے بیویاں گھریلو معاملات میں اس قسم کی تھانے داری سے خوش کیوں ہوتی ہیں۔ شادی سے پہلے بہت بے مہار پھر لیے۔ اب سیدھے ہوجاؤ۔ کُتّے کی دُم سیدھی تو ہوتی نہیں مگر بیویوں کو شوق ہوتا ہے اسے نلکی میں ڈال کے رکھنے کا۔ دال پکے یا ٹنڈے' کھاؤ۔ یہ گھر ہے ہوٹل نہیں۔ کسی کو زیادہ تو کسی کو کم مگر بیویوں کی خواہش ضرور ہوتی ہے کہ ہر معاملے میں ان کی چلے' خواہ ان کی زبان یہی کہتی رہے کہ جیسی آپ کی مرضی۔

دو بجے کھانا کھا کے ہم سیدھے پاسپورٹ آفس پہنچے تو ایجنٹ مجھے کینٹین میں بیٹھا ہوا نظر آگیا۔ اس نے دوسری پارٹی پھنسا رکھی تھی اور ان سے سعودی عرب کا ویزا لگوانے کا سودا کررہا تھا۔ مجھے دیکھ کے اس کا چہرہ کھل اٹھا تو میں سمجھ گیا کہ میرا کام ہوگیا ہے۔

"آؤ جی' مولانا صاحب۔ یہ لو اپنا پاسپورٹ۔" اس نے اپنے تھیلے میں سے دو پاسپورٹ نکال کے میرے حوالے کیے "اپنی گھر والی سے کہنا کہ یہاں دستخط کردے۔"

میں نے کہا "تم نے تو کہا تھا کہ افسر کے سامنے جا کے دستخط کرنے پڑیں گے؟"

"ہونا تو ایسا ہی ہے مگر میں نے کہا کہ اپنے بندے ہیں۔ میں جانتا ہوں۔" وہ بولا اور پھر دوسری پارٹی سے مخاطب ہوگیا "حاجی' اب آپ کے سامنے ہیں یہ مولانا صاحب۔ ان سے پوچھ لو ان کا ارجنٹ کام تھا۔ ارجنٹ ہوا یا نہیں؟"

میں نے کہا "اگر میں تمہارے حق میں گواہی دوں تو تم مجھے کتنی رعایت دوگے؟"

"حاجی اب اتنی بڑی داڑھی کے ساتھ آپ جھوٹ تو نہیں بولو گے۔"

میں نے کہا "میرے ساتھ واقعی کوئی ایسی بات نہیں ہوئی۔ خدا کرے کہ یہ پاسپورٹ جعلی نہ ہوں۔"

وہ چمک کے بولا "لعنت جعلسازی کرنے والے پر۔ ابھی جا کے کسی کو بھی دکھا دو۔ میری فیس بعد میں دینا۔"

میں نے کہا "میاں' خفا کیوں ہوتے ہو۔ اصل پہچان تو ائرپورٹ پر ہوگی۔"

وہ بہت تیز طرار آدمی تھا۔ میں نے نوٹ کیا تھا کہ وہ اپنا لہجہ ہر روز بدل لیتا تھا اور سامنے والے سے اسی کے لہجے میں بات کرتا تھا۔ پنجاب کا رہنے والا ہو تو لاہوری اردو۔ پٹھان ہو تو پشاوری اردو۔ ہر کاروبار کے اپنے تقاضے ہیں اور یہ تو ایک قدرتی بات ہے کہ ایک شخص سندھ کے دیہی لب ولہجے میں اردو بول رہا ہو تو دوسرا ٹھیٹ لکھنوی زبان استعمال نہیں کرتا۔ وہ جنابِ عالی یا بادشاہو کے بجائے سائیں کہہ کے مخاطب کرتا ہے۔

رابعہ نے پاسپورٹ پر اپنے دستخط ثبت کیے۔ ہم نے وہیں سے اپنے اپنے پاسپورٹ کی فوٹو کاپیاں بنوا کے نوٹری پبلک سے تصدیق کرائی۔ وہیں سے ریڈی میڈ فولڈر بھی مل گئے۔ ایجنٹ نے مجھے ایک ٹریول ایجنسی کا پتا بتادیا تھا کہ وہاں سے ٹکٹ بھی مل جائیں گے اور کسی جہاز پر سیٹ بھی کنفرم ہوجائے گی لیکن یہ مسئلہ ثانوی تھا۔ پہلے مجھے ویزا حاصل کرنا تھا۔

برٹش قونصلیٹ کو الزبتھ کے شوہر کا فون موصول ہوگیا تھا۔ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ مسٹر گورڈن برطانوی سیکرٹ سروس کے بہت اہم رکن تھے اور مستند تھا ان کا فرمایا ہوا۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ الزبتھ جیسی بیوی کی بات نہیں ٹال سکتے تھے قونصلیٹ ان کی بات نہیں ٹال سکتا تھا۔ ہمیں براہِ راست اس کے کمرے میں پہنچادیا گیا۔

وہ میرا حلیہ دیکھ کے کچھ مایوس ہوا۔ شاید اسے امید نہیں تھی کہ ایسے اصلی اور نسلی خاندان کے میرے جیسے مولوی سے اتنے قریبی مراسم ہوں گے۔

"مسٹر وقار یوسف!" اس نے مجھ سے مصافحہ کرکے برقع پوش رابعہ کو بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا "کل آپ نے مجھے فون کیا تھا۔"

میں نے کہا "وائی کار یوسی.... اینڈ اے کیٹ۔" میں نے کہا "وقار یوسف ایڈووکیٹ اور میری وائف۔ شی از این ایڈووکیٹ ٹو۔"

وہ بھونچکا رہ گیا "یو مین۔ انہوں نے لا کا امتحان پاس کیا ہے؟"

میں نے کہا "یہ پریکٹس کرتی ہیں' ہائیکورٹ میں۔"

"اس برقع کے ساتھ!" اسے یقین نہ آیا۔

"آف کورس" میں نے کہا "پردہ ہماری معاشرتی ضرورت ہے۔"

اس نے سرہلایا "آپ کو ٹورسٹ ویزا چاہیے۔ مجھے آج صبح ہی لندن سے مسٹر گورڈن کا فون موصول ہوا تھا کہ آپ کو ارجنٹ ویزا جاری کردیا جائے۔ آپ کے پاسپورٹ کہاں ہیں؟"

رابعہ نے اپنے ہینڈ بیگ میں سے نکال کے دونوں پاسپورٹ اسے پیش کردیے۔

اس نے میرے پاسپورٹ کو غور سے دیکھا "مسٹر یوسف۔ یہ پاسپورٹ آج ہی جاری ہوا ہے؟"

میں نے کہا "ابھی کچھ دیر پہلے ہی لیا ہے میں نے۔"

"آپ لیڈی الزبتھ گورڈن کے کلاس میٹ تھے؟"
میں نے کہا "لیس۔ پُرانی بات ہے۔"
"کتنی پُرانی؟"
میں نے کہا "کم سے کم پانچ سال ہو گئے۔ جب میں اور وہ ایک ساتھ پڑھتے تھے۔ انیس سو چھیاسٹھ کے بعد..."
"کہاں؟" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔
"یونیورسٹی کالج، وہاں میں نے چار سال گزارے۔"
"اور کس مضمون میں ڈگری لی تھی آپ نے...؟"
"میں بدقسمتی سے تعلیم مکمل نہیں کر سکا تھا۔"
"کیا تعلیم کے لیے جانے سے پہلے بھی آپ وکیل تھے؟"
میں اس کی جرح سے پریشان ہونے لگا تھا "نہیں۔ واپس آنے کے بعد میں نے وکالت کا امتحان پاس کیا۔"
"یہ بھی حال کی بات ہو گی" وہ بولا "انیس سو ستّر تک آپ لندن میں تھے۔ لیڈی الزبتھ گورڈن کے مضامین..... جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، ہسٹری اینڈ آرکیولوجی تھے۔"
میں نے محتاط لہجے میں کہا "آپ کو کیسے یاد پڑتا ہے؟"
وہ مسکرایا "اس لیے کہ میں خود بھی لیڈی الزبتھ گورڈن کا کلاس میٹ تھا۔"
میں نے اسے غور سے دیکھا "عجیب بات ہے کہ مجھے آپ کی صورت یاد نہیں آ رہی۔"
"لیس۔ ایسا ہی میرے ساتھ ہے۔" وہ بولا "آپ سکندر بخت کو جانتے ہیں؟"
میں نے بڑی مشکل سے اپنے ردِّ عمل کو کنٹرول کیا "لیس۔ وہ بھی پاکستان سے آیا تھا۔"
"اور وہ بھی تعلیم مکمل نہیں کر سکا تھا۔"
"اس کا مجھے علم نہیں..."
"مجھے معلوم ہے..... وہ برطانیہ سے نکالا گیا تھا۔ ڈی پورٹ کیا گیا تھا کیونکہ وہ سنگین جرائم میں ملوث تھا" وہ سوچتے ہوئے بولا۔
میں یہ کہتے کہتے رک گیا کہ وہ ملوث کر دیا گیا تھا اور میرا خیال ہے کہ اس نے بھی مصلحت یا کسی اور وجہ سے بہت کچھ نہیں کہا جو وہ جانتا تھا۔ غالباً اسے یہ بھی علم ہو گا کہ سکندر بخت کو نکلوانے میں الزبتھ کے باپ کا بہت ہاتھ تھا۔ وہ ان باتوں سے بے خبر نہیں ہو گا جو میرے اور الزبتھ کے تعلق کے بارے میں مشہور تھیں۔ اگر وہ واقعی میرا اور الزبتھ کا کلاس فیلو رہا تھا۔ تو وہ جانتا ہو گا کہ یہ باتیں بھی بے بنیاد نہیں تھیں مگر اب وہ لیڈی الزبتھ گورڈن اور اس کے ماضی کا کوئی نامناسب حوالہ دینا ایک غیر ذمّے دارانہ، معیوب اور غلط حرکت ہوتی۔
میں اسے پہچاننے کی کوشش میں ناکام تھا۔ میں اور محسن کلاس کے بیشتر سفید فام لڑکوں سے مجاہدانہ رقابت مول لے چکے تھے۔ ان کی گرل فرینڈز کو ورغلانا ہمارے نزدیک ایک جہاد تھا۔ اس کے نتیجے میں اکثر ہمارے ڈوئل ہو جاتے تھے یا ہم اجتماعی گوشمالی کا شکار ہوتے تھے۔ کامیابی کی صورت میں بھی اور ناکامی کی صورت میں بھی۔ بہت سے سرمنڈے گورے لڑکے ایک سے لگتے تھے اور کیا پتا یہ بھی انہی میں سے ایک ہو۔ میں نے اس کی گرل فرینڈ کو ہتھیالیا ہو اور اس نے مشتعل ہو کے مجھ سے مار کھائی ہو یا گرل فرینڈ نے اس سے میری شکایت کر دی ہو تو اس نے انگریز قوم کے سپوتوں کو ساتھ ملا کے میری ہڈی پسلی ایک کر دی ہو۔ شاید وہ بھی میرے چہرے کو داڑھی کے بغیر چشم تصور سے دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا اور کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر تھا۔
ایک مؤدب بیرا چائے رکھ کے چلا گیا تو میں نے کہا "انتہائی کوشش کے باوجود میں آپ کی پانچ سال پہلے کی صورت کا تصور نہیں کر سکتا۔"
وہ مسکرایا "کچھ ایسا ہی مسئلہ میرا ہے۔ یہ داڑھی اس وقت یقیناً نہیں ہو گی ورنہ آپ کلاس میں منفرد اور نمایاں ہوتے۔"
"دراصل ہماری کچھ کلاسز کامن ہوتی تھیں اور الگ..."
"وہ تو ہوتا ہے لیکن مسٹر یوسف..... ایک لڑکا اور تھا جو سکندر بخت کا بہت گہرا دوست تھا۔ کچھ حسن شیر... ایسا ہی نام تھا۔ وہ چوبیس گھنٹے ساتھ رہتے تھے اور ساتھ ہی واپس بھی گئے۔"
میں نے کہا "لیکن وہ سائنس اسٹوڈنٹ تھا۔ غالباً آپ محسن خاں شیروانی کی بات کر رہے ہیں۔"
اس نے چٹکی بجائی "دیٹ از اٹ۔ یہ دونوں کہاں ہیں آج کل؟"
میں نے کہا "مجھے کچھ معلوم نہیں۔"
"یہ کیسے ہو سکتا ہے..." وہ حیران ہو کے بولا "سکندر بخت کا نام تو یہاں بھی خبروں میں بہت آیا ہے۔ اس کا اچھا خاصا کرمنل ریکارڈ ہے۔ پاکستان پہنچ کے بھی اس نے وہی کام جاری رکھا جو لندن میں کر رہا تھا بلکہ یہاں تو اس نے موقع سے پورا فائدہ اٹھایا..."
میں نے غصّے کو ضبط کرتے ہوئے کہا "دراصل میں باقاعدگی سے اخبار نہیں پڑھتا اور خصوصاً جرائم کی خبریں۔"
"وکیل ہو کے جرائم سے لاتعلق رہنا عجیب سی بات ہے۔ خیر، آپ کا پُرانا پاسپورٹ کہاں ہے مسٹر یوسف!"
"پرانا پاسپورٹ!"
"ہاں۔ جب آپ پانچ سال پہلے لندن گئے تھے تو آپ نے پاسپورٹ لیا ہو گا، آپ نے اس کی تجدید کیوں نہیں کرائی۔ یہ نیا پاسپورٹ کیوں حاصل کیا؟"
"دراصل..... وہ پاسپورٹ کھو گیا تھا۔ اس طرح کہ مجھے بھی پتا نہیں چلا۔ میرے صندوق میں سے غائب ہو گیا تھا۔ میرا ایک ملازم تھا۔ وہ نکال کر لے گیا بعد میں اس نے کسی جعلساز کے ساتھ مل کے اس پر اپنا فوٹو لگا لیا۔"
"فوٹو چینج یونٹ سے ایسا ہو جاتا ہے۔ مگر اس کا نام ولدیت وغیرہ سب وہی رہے ہوں گے۔ کیا اس نے برطانیہ میں داخل ہونے کی کوشش کی تھی، کی ہو گی تو پکڑا گیا ہو گا۔"
"ہاں۔ وہ پکڑا گیا تھا۔"
"پھر کیا اسے جیل ہو گئی تھی۔" وہ بال کی کھال نکالنے پر آمادہ تھا۔
"غالباً نہیں۔ رشوت دے دلا کے نکل گیا ہو گا۔ کیونکہ بعد میں کوئی مجھ سے پوچھ کچھ کے لیے نہیں آیا۔ یہاں ایسے ہی ہوتا ہے۔"
"آپ نے چوری کی رپورٹ تو لکھوائی ہو گی۔"
میں نے نفی میں سرہلایا "وہ بہت لمبا چکر تھا۔ میں نے بھی اپنی جان چھڑائی کیونکہ میں کراچی آ گیا تھا۔ نیا پاسپورٹ بنوانا زیادہ آسان تھا۔"
وہ مسکرانے لگا "آپ کے ملک میں لوگ شارٹ کٹ کے عادی ہیں خواہ وہ غلط ہوں اور قانون کو ٹریس پاس کرتے ہوں۔ خیر مجھے کیا، میں لیڈی الزبتھ گورڈن کی خواہش کے احترام میں آپ کو ویزا دینے پر مجبور ہوں۔ آپ رسمی کارروائی کے بعد جب چاہیں چلے جائیں۔"
"کیا آج ہی ویزا جاری نہیں ہو سکتا؟"
"آج تو مشکل ہے۔ وقت بہت کم ہے۔ بہرحال میں کوشش کرتا ہوں، آپ نیچے چلے جائیں۔" اس نے انٹرکام پر کسی سے بات کی اور اسے میرا مسئلہ حل کرنے کے لیے کہا۔
میں پاسپورٹ لے کے باہر نکلا تو رابعہ نے کہا "سکندر۔ کیا یہ تمہیں پہچان گیا ہے۔"
میں نے کہا "نہیں لیکن شک میں ضرور پڑ گیا ہے۔"
"ایسا نہ ہو یہ تصدیق کا مسئلہ کھڑا کر دے کہ کیا وقار یوسف نام کا کوئی اسٹوڈنٹ محسن اور سکندر بخت کے ساتھ تھا۔ وہ کالج سے پوچھ سکتا ہے اور اس کے بارے میں دیگر تفصیلات مانگ سکتا ہے۔ ظاہر ہے یہ نام کالج کے ریکارڈ پر نہیں ہو گا تو وہ کیا بتائیں گے۔ پھر وہ مقامی طور پر وقار یوسف ایڈووکیٹ کے بارے میں معلومات حاصل کر سکتا ہے۔"
میں نے کہا "اب کچھ نہیں ہو سکتا رابعہ۔"
"ابھی وقت ہے۔ پاسپورٹ ہمارے پاس ہیں۔"
"تمہارا مطلب ہے کہ ہم ویزا لیے بغیر واک آؤٹ کر جائیں۔ بھاگ جائیں" میں نے کہا۔
"ایک بار ثبوت اس کے ہاتھ میں چلا گیا تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔"
میں نے کہا "بات تو ٹھیک ہے تمہاری لیکن..."
"لیکن کیا... تمہاری وہ الزبتھ تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکے گی یہاں۔ چلو" رابعہ نے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا۔
ہم اس وقت لاؤنج میں تھے اور باہر جانے والا راستہ ہمارے دائیں ہاتھ پر تھا۔ ماتحت عملے کے دفاتر بائیں طرف نظر آ رہے تھے۔
"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہم لندن نہیں جا سکتے" میں نے مایوسی سے کہا۔
"نہیں۔ لندن جانے کی کوشش کی تو جیل پہنچ جائیں گے ہم دونوں۔ اگر یہاں نہ پکڑے گئے تو لندن کے ائرپورٹ پر دھر لیے جائیں گے اور وہاں اسکاٹ لینڈ یارڈ والے پاکستان کی طرح تفتیش نہیں کرتے۔ وہ دو منٹ میں تمہاری داڑھی اتار کے ہاتھ میں پکڑا دیں گے اور میک اپ اُتار کے تم کو سکندر بخت ثابت کر دیں گے، وہاں سے واپسی زیرِ حراست اور لوٹ کے یہاں گرفتاری۔"
"اس کو کہتے ہیں قسمت کی خرابی" میں نے رابعہ کے ساتھ باہر آتے ہوئے سخت جھنجلاہٹ اور کوفت محسوس کی۔
"تم خرابی کہتے ہو اسے۔ میں کہتی ہوں کہ خوش قسمتی ہے ہماری۔ اگر وہ پاسپورٹ تمہیں نہ دیتا بلکہ چپراسی کے ہاتھ نیچے بھجوا دیتا۔ پھر ہم پھنس جاتے۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ بال بال بچے۔"
میں نے بدمزگی اور تلخی سے کہا "یہ اُلّو کا پٹھا کہاں سے الزبتھ کا کلاس فیلو نکل آیا۔ مجھے تو یاد نہیں آتا۔"
"وقار یوسف اس کا کوئی کلاس فیلو نہیں تھا۔ یہ بات اسے بہرحال یاد ہے۔"
"ہونی بھی چاہیے۔ کلاس میں پاکستانی لڑکے دو ہی تھے۔ اور ان دو نے بھی بڑا نام روشن کیا تھا اپنے ملک کا۔ چار ہندو لڑکے تھے۔ باقی سب گورے تھے۔"
"پھر تمہیں اس کی صورت کیوں بھول گئی؟"
"یہی مجھے حیرت ہے؟"
"حیرت کی کوئی بات نہیں۔ آپ صرف لڑکیوں کی صورت پر غور فرماتے تھے۔ وہ سب صورتیں دل پر نقش ہوں گی۔"
ناکامی اور احساسِ شکست نے مجھے مایوس اور افسردہ کر دیا تھا۔ "قسمت کی خوبی دیکھیے ٹوٹی کہاں کمند" میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔
"میں تو اس کی جرح سے گھبرا گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ ابھی فون اُٹھا لے گا اور ہمیں اپنے سکیورٹی والوں کے حوالے کر دے گا کہ ان جعلسازوں کو اس وقت تک روک کے رکھو جب تک پولیس نہ آ جائے۔"
"یہ تو بڑی گڑبڑ ہو گئی۔ سارا پروگرام چوپٹ ہو گیا۔"
"کیسی باتیں کرتے ہو۔ ہم مشکل میں پڑنے سے بچ گئے۔"
میں نے کہا "اس شخص نے لیڈی الزبتھ گورڈن کا بھی لحاظ نہیں کیا۔"
"وہ کوئن الزبتھ کی پروا بھی نہیں کرے گا اگر اسے حقیقت معلوم ہو جائے اور نہ کوئن الزبتھ اسے کچھ کہے گی۔ اس کی فرض شناسی کو سراہا جائے گا۔ تمہاری الزبتھ کی سفارش اس کے لیے قانون سے بالاتر نہیں ہو سکتی۔"
"تم نے ٹھیک کہا۔ یہ پاکستانی سفارت خانے کا افسر ہوتا تو کسی وزیر کی سفارش پر آنکھ بند کر کے ویزا لگا دیتا۔ خواہ اس کے سامنے

کوئی اشتہاری مجرم ہوتا۔ خیر' سوال یہ ہے کہ اب کیا کیا جائے۔"

"کچھ نہیں۔ چلو کہیں بیٹھ کے چائے پیتے ہیں۔ سکون سے سوچیں گے" رابعہ نے کہا۔

"یہ دوسری بار نقصان ہو گیا۔ پانچ ہزار فلیٹ بیچنے والے نے ٹھگ لیے۔ اب یہ پاسپورٹ بے کار ہو گئے' پیسہ ضائع ہوا۔"

"ضائع کیوں ہوا" رابعہ نے کہا "تمہیں یاد ہے ایجنٹ نے ایک بات کہی تھی کہ یہاں سے ویزا ملنا مشکل ہے۔"

"اب تو ناممکن ہے۔"

"مگر اس نے کہا تھا کہ کولمبو چلے جاؤ" رابعہ بولی "وہاں آسانی سے مل جائے گا۔"

میں چلتے چلتے رُک گیا "اوہ رابعہ۔ رابعہ' دل چاہتا ہے۔"

رابعہ نے کہا "آرام سے چلتے جاؤ۔ چلّاؤ نہیں اور اپنے دل کو قابو میں رکھو۔ تاکہ تمہارا دماغ ٹھکانے رہے۔"

رابعہ کی بات نے مجھے اچانک مایوسی کے گھپ اندھیرے میں روشنی دے دی تھی اور قونصلیٹ آفس سے دور آجانے کے بعد میں یہ سوچنے پر مجبور تھا کہ کیا یہ اتفاق بھی دستِ قدرت کی تائید کا اور پُر تحفظ ضمانت کا ایک نمونہ نہیں تھا کہ اپنے دل میں بغض' کینہ اور حسد و رقابت کے جذبات رکھنے والے ایک شخص کی سکندر بخت سے نفرت نے مجھے بچا لیا تھا۔ اگر وہ زبان سے کچھ نہ کہتا مگر مجھے لندن روانہ کرنے کے بعد وزارتِ داخلہ کے کسی ذمّے دار افسر کو فون کر دیتا کہ مسٹر وقار یوسف اور ان کی برقع پوش اہلیہ کے لیڈی الزبتھ گورڈن سے مراسم کی نوعیت اور ان کی مصروفیات پر نظر رکھی جائے کیونکہ ظاہری حقائق کی اصل صورت سے مطابقت محسوس نہیں ہوتی۔ پھر لندن پولیس سب معلوم کر لیتی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ الزبتھ میری کوئی مدد نہ کر پاتی۔ وہ اب پہلے والی جذباتی اور غیر ذمّے دار لڑکی نہیں تھی۔ اس کی اور اس کے شوہر مسٹر گورڈن کی ایک سماجی حیثیت تھی اور ایک بیوی کا یہ فرض بنتا تھا کہ وہ اپنے شوہر کی عزت کو اسکینڈل سے محفوظ رکھے۔

ہم نے میٹرو پول کے مقابل ایک ریسٹورنٹ میں چائے پی تو میرا ذہن پُرسکون ہو گیا۔ "خدا جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔"

رابعہ نے کہا "سچ بتاؤ' تم اسے پہچانے نہیں تھے؟"

میں نے کہا "پہچان لیتا تو دروازے سے اندر قدم رکھتے ہی لوٹ آتا۔ مجھے اب بھی شک ہے کہ وہ جھوٹ بول رہا تھا...!"

"وہ تمہارے اور محسن کے بارے میں سب کچھ جانتا تھا۔"

میں نے کہا "یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اسے یہ سب کچھ بتایا گیا ہو؟"

رابعہ نے حیرانی سے کہا "بتانے والا کون ہو سکتا ہے؟"

"میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ممکن ہے خود مسٹر گورڈن نے اس کے کان میں یہ بات ڈال دی ہو۔"

"مسٹر گورڈن نے؟ خود الزبتھ کے شوہر نے؟"

"ہاں۔ فرض کرو یہ مسٹر گورڈن ہی اصل کلاس فیلو تھے۔ مجھے آج سب لڑکوں کے نام یاد نہیں جو میرے یا الزبتھ کے ساتھ پڑھتے تھے۔ اس پر مرنے والے تو بہت تھے۔ ایک وجہ تو یہی تھی کہ وہ خاندانی اور دولت مند باپ کی بیٹی تھی۔"

"اور دوسرے یہ کہ کلاس کی سب سے حسین لڑکی تھی" رابعہ بولی۔

"کم سے کم میں ایسا ہی سمجھتا تھا۔ ممکن ہے کسی اور کو دوسری لڑکی نمبرون لگتی ہو۔ وہ واحد حسین لڑکی بہرحال نہیں تھی۔"

"لیکن الزبتھ کی نظر میں ہیرو صرف ایک تھا۔ باقی سب زیرو تھے۔"

میں نے کہا "کم سے کم اس معاملے میں لیڈی الزبتھ گورڈن اور ایڈووکیٹ رابعہ قاری کے درمیان مکمل اتفاق رائے پایا جاتا ہے" میں نے کہا "جب ہیرو کو بیک بینی و دو گوش سلطنتِ برطانیہ کی حدود سے نکال باہر کیا گیا تو جتنے زیرو تھے وہ خود بخود ہیرو بن گئے ہوں گے اور ان میں سے بالآخر ایک نے سکندر بخت کے جانشین کی جگہ اقلیم عشق میں اپنی نصرت کے ڈنکے بجائے ہوں گے اور الزبتھ کے دل پر فتح حاصل کی ہو گی۔ کلاس میں اعلیٰ خاندانوں کے ایسے بہت سے چشم و چراغ تھے جو الزبتھ کے متعصب اور نسل پرست باپ کے معیارِ انتخاب پر پورے اُترتے تھے۔ اس نے فوراً کسی عالی نسب پرستار کو اپنی فرزندی میں قبول کر لیا تاکہ الزبتھ اس اُلو کے پٹھے کو یاد بھی نہ رکھے جس کا نام سکندر بخت تھا۔"

رابعہ نے افسوس سے سہلایا۔ "بڑی بے وفا نکلی۔ اتنی جلدی بھول گئی تھی۔ بڑی سطحی قسم کی محبت تھی۔ غالباً بعد میں جب اسے عقل آئی ہو گی تو احساس ہوا ہو گا کہ جذبات کی رو میں بہہ کے وہ اندھے کنوئیں میں کودنے والی تھی۔"

"تم اب کچھ بھی کہہ سکتی ہو" میں نے ٹھنڈی آہ بھر کے کہا "مگر ایسا ہوتا تو وہ میرے فون پر اتنی بے قرار نہ ہوتی۔ رکھائی سے معذرت کر لیتی۔"

"اس نے بداخلاقی کا مظاہرہ کرنا لاحاصل سمجھا۔ شوہر سے وہ کام کرایا جو خود کرنا نہیں چاہتی تھی۔"

میں نے کہا "نہیں۔ الزبتھ ایسی لڑکی نہیں تھی۔ وہ مجھے دھوکا نہیں دے سکتی۔ یہ ہو سکتا تھا کہ وہ صاف انکار کر دیتی۔ یہ کہہ دیتی کہ اب میں تمہارے لیے کچھ نہیں کروں گی۔ یہ مسٹر گورڈن نے کیا ہو گا۔ اسے سب یاد ہو گا اور اس نے قونصلیٹ کو بریف کر دیا ہو گا کہ ذرا خیال رکھنا۔ میرا ایک پاکستانی کلاس میٹ تھا جسے دہشت گرد قرار دے کر برطانیہ بدر کیا گیا تھا۔ کہیں وہ پھر کسی اور نام سے یہاں نہ آجائے۔ پاکستانی برطانیہ میں داخل ہونے کے لیے سب کچھ کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں۔ اس نے میری بیوی کا سہارا کیوں لیا ہے آخر؟ وہ لیڈی الزبتھ کو کیسے جانتا ہے؟' قونصلیٹ سمجھ دار آدمی تھا۔ اس نے ایک اچھے ڈپلومیٹ کی طرح صورتِ حال کو سنبھال لیا۔ عین ممکن ہے کہ اس نے خود ہی مجھے ایک موقع دیا ہو کہ سوچ لو' اب بھی لندن جانا ہے یا نہیں۔"

رابعہ قائل ہو گئی "چلو جو بھی ہوا ٹھیک ہوا۔"

"باز آنے والے ہم بھی نہیں ہیں اور اس پر ہمارا یقین ہے کہ بندہ ایک در بند کرتا ہے تو خدا سو در کھولتا ہے۔"

رابعہ بولی "مقصد اگر کچھ عرصہ روپوش رہنا ہے۔ تو ہم کولمبو میں لندن سے زیادہ محفوظ ہوں گے۔"

"پھر کولمبو ہی کیوں۔ ساری دنیا پڑی ہے" میں نے کہا "لیکن مجھے ایک کام بھی ہے۔ اب میں الزبتھ کو بھی پتا نہیں چلنے دوں گا کہ میں لندن میں ہوں۔"

"اس کا شوہر پتا چلا لے گا۔"

"آخر کیسے؟ اوّل تو قونصلیٹ اسے بتا دے گا کہ غالباً وہ خود سکندر بخت ہی تھا جو بھیس بدل کے آیا لیکن میری جرح سے گھبرا کے بھاگ گیا۔ میں نے اسے جانے دیا۔ کیا فائدہ کسی جھگڑے میں پڑنے کا۔ خصوصاً ایسی صورت میں کہ اس سے لیڈی الزبتھ کے ماضی کا کوئی سلسلہ ہو۔ مجھے امید نہیں کہ اب وہ لندن کا رخ بھی کرے۔ اس سے مسٹر گورڈن مطمئن ہو جائیں گے۔ زیادہ سے زیادہ وہ لندن پولیس کو ائرپورٹ پر الرٹ کر سکتے ہیں کہ پاکستان سے آنے والی کسی فلائٹ میں وقار یوسف نام کا کوئی مسافر ہو تو اسے چیک کیا جائے۔"

"اس کے باوجود تم لندن جانے کا رسک لو گے؟"

"نہیں۔ میں لندن نہیں جاؤں گا۔" میں نے کہا۔

"خدا کا شکر ہے کہ تمہاری عقل میں کوئی بات آئی۔"

"میں براہِ راست لندن نہیں جاؤں گا۔" میں نے کہا "چور دروازے سے جاؤں گا۔ ہر سال سیکڑوں لوگ ہر ملک میں ناجائز طریقے سے داخل ہوتے ہیں۔"

"مگر تم ایسا نہیں کر سکتے" رابعہ نے برہمی سے کہا۔

"کرنے کو میں کیا نہیں کر سکتا۔ میں یہاں کراچی کے ساحل سے بحیرۂ عرب میں غوطہ لگاؤں تو نیچے ہی نیچے تیرتا ہوا برطانیہ کے کسی بھی ساحل پر جا نکلوں لیکن ظاہر ہے کہ میں ایسا نہیں کروں گا۔ میں یہاں سے جاؤں گا پیرس۔ فرنچ میں ایسے بولتا ہوں کہ خود فرانس والے نہیں بول سکتے۔"

رابعہ بولی "اور فرانس والے سمجھ بھی نہیں سکتے۔ یہاں تو سب کو مرعوب کر لیتے ہو۔"

میں نے کہا "زبان کے معاملے میں بہت سی یورپی اقوام انتہائی متعصب ہیں۔ فرنچ بھی کسی سے فرانسیسی کے سوا کسی زبان میں بات کرنا اپنی ذاتی اور قومی توہین سمجھتے ہیں۔ انگریزی سے انہیں خاص چڑ ہے۔ معقول آدمی بھی جانتے بوجھتے خاموش رہتا' سر ہلا کے لاعلمی کا اظہار کرتا یا ایک جملہ "سوری' نو انگلش" کہہ کے ٹال دیتا ہے خواہ اس کی ماں انگریز ہو اور انگریزی اس کی مادری زبان۔ انگریزی جاننے والا بھی فرنچ ہی بولے گا۔"

"زبان سے یہ تعصب کیوں؟"

"بڑا اچھا سوال کیا آپ نے بی بی۔ میں سمجھتا ہوں کہ جیسے کُتّے کو شاید دوسرے کتے کی بولی اچھی لگتی ہے۔ جسے ہم بھونکنا کہتے ہے۔ ایسے ہی ہر جاندار اپنی جنس کے دوسرے جانور کی بولی سمجھتا ہے۔ یہ معاشرتی حیوان عرف حضرت انسان بھی اپنی سرشت میں حیوانِ ناطق ہونے کے باوجود ایک ایسے ہی جانور ہیں۔ دنیا بھر میں زبان کا رشتہ دو اجنبیوں کو ایک کر دیتا ہے۔ برطانیہ میں انگریزی بولتے بولتے جبڑے درد کرنے لگتے ہیں تو انڈین اور پاکستانی ایک دوسرے سے اردو بول کے بہت خوش ہوتے ہیں اور اپنی مذہبی یا سیاسی دشمنی کو بھول کر شیر و شکر ہو جاتے ہیں۔ عرب خود کو ایک قوم کہتے ہیں۔ سارا مڈل ایسٹ عربی زبان کے رشتے سے ایک ہے۔ بس کچھ ایسا ہی مسئلہ ہے کہ فرنچ ہو جرمن ہو یا برطانوی۔ اپنی قومی شناخت کو انہوں نے انا کا مسئلہ بنا لیا ہے۔ حالانکہ زبان صرف ذریعۂ اظہار ہے۔ اپنی بات دوسروں تک پہنچانے اور دوسرے کی بات سمجھنے کا وسیلہ۔ گونگے بہروں کی بین الاقوامی زبان ہے۔ موسیقی کی تحریر تک ساری دنیا میں ایک ہے۔"

"یہ تعصب کسی حد تک ہمارے اپنے وطن میں بھی ہے۔ قومی زبان اردو ہے جو کراچی سے کشمیر تک سب سمجھتے ہیں مگر جہاں آپ نے کسی صوبے کی زبان بولی مخالف فوراً آپ کا ہم زبان ہو جائے گا اور اجنبیت ختم ہو جائے گی۔" رابعہ نے کہا۔

"تو اسی طرح فرنچ فرانس میں اجنبیت کو ختم کر دے گی۔ پیرس اور لندن سے لوگ ویک اینڈ پر بائی روڈ اِدھر سے اُدھر آتے جاتے ہیں۔ درمیان میں انگلش چینل ہے۔ اس پر فیری سروس ہے یعنی آپ کار میں بیٹھے رہیں اور کار کو سڑک کے ختم ہوتے ہی سیدھا بحری جہاز کے عرشے پر لے جائیں۔ جہاز آپ کو دوسری طرف اُتار دے گا۔ گاڑی چلائیں اور پھر سڑک پر۔ کار میں آنے جانے والی فیملی کو سرحدی حکام چیک بھی نہیں کرتے۔ یوں سمجھ لو کہ ویزا کی ضرورت نہیں پڑتی۔ جب تک کہ شک نہ ہو کوئی۔ پاسپورٹ بھی کوئی طلب نہیں کرتا۔ ہم پیرس میں کار لے لیں گے جو وہاں آسانی سے کرائے پر مل جاتی ہے۔ دو گھنٹے میں لندن۔"

"وہ کاروں کے نمبر تو نوٹ کرتے ہوں گے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ یہ ایک مسئلہ ہے۔ وہ ریکارڈ رکھتے ہیں کہ سرحد پار سے کتنی کاریں آئیں اور ان میں سے کتنی واپس گئیں۔ جو واپس نہ جائیں وہ انہیں تلاش کر لیتے ہیں لیکن اس مسئلے کا بھی ایک حل ہے۔ ہم جو کار پیرس میں کرائے پر لیں گے وہ ان کی لندن والی ایجنسی کو واپس کر دیں گے۔ نوّے فیصد چانس ہے کہ وہ کار اسی روز کوئی اور واپس لے جائے گا۔ ٹورسٹ ایسا ہی کرتے ہیں۔ کرائے پر کار دینے والی کمپنی کی ایجنسی یورپ کے ہر شہر میں ہوتی ہے۔ آپ ایک جگہ سے کار لیں اور سفر کے بعد دوسری جگہ واپس کر دیں۔ جب ہم لندن سے پیرس آئیں گے تو دوسری کار لے لیں گے اور وہ پیرس میں واپس کر کے خود بھی واپس۔ میں سمجھتا ہوں' ہمارا کام دو تین دن سے زیادہ کا نہیں ہے۔"

"تم سمجھتے ہو اس میں کوئی خطرہ نہیں؟"

"یار تم خطرے کو اور مجھے لازم و ملزوم سمجھو۔ یہ میں نے پہلے ہی سمجھا دیا تھا تمہیں کہ اوکھلی میں سر مت دو۔ ڈر لگتا ہے تو یہاں اپنے فلیٹ میں آرام سے بیٹھو اور میرے واپس آنے کا انتظار کرو۔ یہاں تم بالکل محفوظ رہو گی۔ ضرورت کا سامان میں جانے سے پہلے فراہم کر جاؤں گا ورنہ تم خود بھی برقع پہن کے کراچی میں گھومتی پھرو۔ کوئی خطرے کی بات نہیں ہو گی۔"

"تم خفا ہو گئے۔"

"اُف۔ اب یہ عورتوں کے منفی حربے مت استعمال کرنا۔ رونا مت شروع کر دینا۔ میں کیا خفا ہونے کا حق نہیں رکھتا۔ تم بھی تو خفا ہو جاتی ہو۔ بلکہ اکثر باتوں پر خفا ہوتی ہو۔"

"تم یہ طعنہ کیوں دیتے ہو کہ میں ڈرتی ہوں۔ کہاں ساتھ نہیں دیا میں نے تمہارا آخر۔" اس نے رونے کے بجائے لڑنا شروع کر دیا۔

"یہ میں نے کب کہا ہے کہ تم نے ساتھ نہیں دیا۔"

وہ بولی "بس میں احتیاط سے کام لینے کو کہتی ہوں۔ اس لیے کہ تم کو مزید مشکلات کا سامنا نہ ہو۔"

"مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں۔ اب مشکلات سے میں ڈرتا نہیں اور مشکل میں پڑے بغیر تو کوئی مسئلہ حل نہیں ہو گا۔"

"اچھا بابا' جو تمہارا دل چاہے' کرو۔"

"پھر بابا کہہ دیا تم نے مجھے۔ فارسی یا پشتو میں کہا ہے تو غالباً نکاح پھر ہو گا۔ اردو میں کہا ہے تو میری سخت توہین ہے۔ یہ فقیر سے کہا جاتا ہے کہ معاف کرو بابا۔"

"حلیہ تو ایسا ہی ہے کہ سڑک کے کنارے کٹورا رکھ کے بیٹھ جاؤ اور صدا لگاؤ تو کمائی ہی کمائی۔ ایکٹر تو پیدائشی ہو۔"

ناک کو دوسری طرف سے پکڑنے کے لیے میں نے اسلام آباد کو ترجیح دی۔ سری لنکا کا سفارت خانہ وہیں تھا اور وہاں ویزا ملنا نسبتاً آسان تھا۔ وہ ایک ڈپلومیٹک سٹی تھا جہاں سے بیورو کریٹ۔ سیاسی دورے کرنے والے' تجارتی اور ثقافتی وفود۔ سفارتی عملے کے ارکان اور ایسے ہی شک و شبے سے بالاتر معززین آتے جاتے رہتے تھے۔ کراچی کاروباری شہر تھا اور جتنے لوگ وہاں جائز کاروبار کے سلسلے میں پاکستان سے باہر جاتے تھے شاید اس سے دُگنے ناجائز کاروبار کے چکر میں آتے جاتے رہتے تھے۔ سنگاپور' مڈل ایسٹ یا ہانگ کانگ کے راستے خوب اسمگلنگ ہوتی تھی اور اس کاروبار کو منظم طور پر چلانے والوں کو ہمیشہ نئے لوگوں کی تلاش رہتی تھی جو ٹورسٹ ویزا پر جاتے ہوئے کچھ سامان ساتھ لے جائیں اور واپسی میں بھی ان کے ایجنٹ سے سامان لے آئیں۔ وہاں کے امیگریشن حکام بھی زیادہ مستعد تھے۔

ہم نے بادلِ ناخواستہ مولوی خادم حسین کی خاندانی نشانیوں کو اپنے فلیٹ میں بحفاظت چھوڑا اور نئے سوٹ کیس کے ساتھ نائٹ کوچ سے اسلام آباد روانہ ہو گئے۔ رات دو بجے چک لالہ ائرپورٹ سے راولپنڈی جانے سے بہتر تھا کہ ہم ائرپورٹ ہوٹل میں ہی قیام کریں۔ وہاں جگہ کا ہمیشہ مسئلہ رہتا تھا مگر اتفاق سے کچھ دیر پہلے ہی کسی مسافر نے خواہش ظاہر کی تھی کہ اس کا حساب فوراً بنا دیا جائے۔ اس کی فلائٹ دو گھنٹے بعد تھی۔ ہم لاؤنج سے ملحق ریسٹورنٹ میں بیٹھ گئے۔ انتظار کرنے اور نیند بھگانے کے لیے کافی سے بہتر کوئی چیز نہیں ہو سکتی تھی۔

آدھے گھنٹے میں پورٹر نے ہمارا سوٹ کیس کمرے میں پہنچا دیا۔ میں نے روم سروس کو مطلع کیا کہ مجھے آٹھ بجے بیڈ ٹی چاہیے اور ساڑھے آٹھ بجے ناشتا۔ سونے کے لیے ساڑھے چار گھنٹے بہت تھے۔

صبح باہر نکلنے سے پہلے میں نے اپنا حُلیہ تبدیل کر دیا۔ میں نے ہوٹل کے ہیر ڈریسر سے داڑھی کو تراش کے چھوٹا کیے بغیر چہرے کے مطابق بنانے کو کہا۔ اپنی پگڑی میں نے کراچی میں ہی چھوڑ دی تھی۔ اب میں نے شلوار قمیص کی جگہ قمیص پتلون پہن لی تو کسی کو شک نہیں ہوا۔ نائٹ کوچ سے سفر کرنے والے کاروباری لوگ بھی شلوار قمیص پہن کے پہنچتے تھے اور صبح سوٹ پہن کے ہوٹل سے نکلتے تھے۔ رابعہ نے اپنا برقع کراچی سے ہوائی جہاز کے پرواز کرتے ہی اتار دیا تھا۔

ہم پنڈی شہر سے بچتے ہوئے براہِ راست اسلام آباد گئے۔ بڑے سفارت خانے ایک ہی جگہ تھے چنانچہ سری لنکا کا جھنڈا دیکھ کے میں ایک عمارت میں داخل ہو گیا۔ وہاں نہ رش تھا' نہ کوئی ایجنٹ۔ ویزا لینے والے لوگ برائے نام تھے اور جو تھے وہ بھی بڑے دوستانہ ماحول میں کام کرنے والے عملے سے گپ شپ کر رہے تھے۔ بھارت دشمنی کے باعث سری لنکا اور پاکستان کی حکومتوں کے اور عوام کے مراسم بہت اچھے تھے۔

کسی دشواری کے بغیر تمام کاغذی کارروائی مکمل ہو گئی اور دو گھنٹے بعد ہمیں کولمبو کا ویزا مل گیا۔ ہم نے "ائرلنکا" کو اپنی قومی ائرلائن پر مصلحت کے تحت ترجیح دی مگر اس کے لیے واپس کراچی جانا ضروری تھا۔ میں نے ایک ٹریول ایجنسی سے ٹکٹ خریدا اور ہمیں کولمبو کے لیے براستہ کراچی ایک فلائٹ بھی مل گئی۔ اب یہ ہماری مرضی تھی کہ کراچی پہنچ کے ایک گھنٹا جہاز میں بیٹھے رہیں یا کراچی میں رُک جائیں اور کسی اگلی فلائٹ سے پھر سفر کا آغاز کریں۔ ظاہر ہے ہم نے ایک گھنٹا انتظار کرنے کو ترجیح دی۔ ہم کسی اور ملک میں ہوتے تو جہاز سے اُتر بھی نہیں سکتے تھے مگر اپنے وطن میں یہ پابندی نہیں تھی۔

اب حالات موافق تھے تو ٹکٹ ملنے کے تین گھنٹے بعد ہمیں کراچی کی فلائٹ بھی مل گئی اور چھ گھنٹے جہاز میں گزارنے کے بعد ہم رات دس بجے کولمبو کے بین الاقوامی ائرپورٹ پر اُتر گئے۔ ایک اجنبی دنیا تھی مگر وہاں ہمارے ہم زبان بہت تھے۔ ائرپورٹ پر ہی کرنسی تبدیل ہو گئی اور پھر ایک مہذب کسٹمر ریلیشن افسر قسم کے شخص نے ہمیں ضروری ہدایات دیں۔ "آپ ٹورسٹ ہیں تو کریں۔ یہ نہ کریں' باہر آپ کو ہوٹل کے گائیڈ بہت مِس گائیڈ کریں گے۔" اس نے مجھے ایک بروشر دیا جس میں مختلف ہوٹلوں کے نام پتے اور کمروں کے کرائے تک لکھے ہوئے تھے۔ شہر کے مختلف مقامات کے فاصلے دیے ہوئے تھے تاکہ ہم خود کو ٹیکسی والوں کے ہاتھوں سے بچا سکیں۔ تفریح کے قابلِ دید مقامات کے ساتھ ہی ناپسندیدہ مقامات کا حوالہ بھی تھا کہ وہاں ٹورسٹ کی دلچسپی کی کوئی چیز نہیں۔ اگر ناگزیر ہو تو مقامی پولیس کو ضرور مطلع کر کے جائیں۔

مجھے حیرانی بھی ہوئی اور افسوس بھی ہوا کہ ہمارے اتنے بڑے بڑے ہوائی اڈوں پر باہر سے آنے والوں کی رہنمائی کرنے والا کوئی نہیں ہوتا اور نہ محکمۂ سیاحت کسی ائرپورٹ پر ایسی سہولت فراہم کرتا ہے جس کے بغیر کوئی بھی اجنبی باہر نکلتے ہی ٹیکسی والوں' ہوٹل کے ایجنٹوں اور پولیس والوں میں گھر جاتا ہے جو شکار سمجھ کے اس پر گِدھ کی طرح جھپٹتے ہیں۔

ہم نے درمیانے درجے کے ایک ہوٹل کا انتخاب کیا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے سوٹ کیس رکھنے کے بعد جو کرایہ بتایا وہ اصل کرائے سے تقریباً تین گُنا تھا۔ میں نے اسے بروشر دکھایا تو وہ نصف پر آگیا اور پھر اصل قبول کرنے پر مجبور ہو گیا۔ مجھے فاصلے کا علم نہ ہوتا تو وہ مجھ سے کچھ بھی لے سکتا تھا۔ ٹیکسی والوں پر ٹریفک پولیس اور ائرپورٹ حکام کا پورا کنٹرول تھا اور وہ ملی بھگت سے من مانی نہیں کر سکتے تھے۔ تاہم اس کی کوشش ضرور کرتے تھے۔

سری لنکا اتنا خوب صورت ملک تھا کہ اسے چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ کام کا خیال نہ ہوتا تو میں دو دن کے قیام کو ایک ہفتے تک بڑھا دیتا۔ مجھے واپسی کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ ہمارا اصل مقصد تو زیادہ سے زیادہ عرصہ روپوش رہنا تھا اور وقت کہیں بھی گزارا جا سکتا تھا مگر مجھے لندن پہنچ کے جارج سے ملنا تھا۔

کراچی یا اسلام آباد کے مقابلے میں کولمبو سے لندن' پیرس یا دنیا بھر میں کہیں بھی جانا آسان تھا۔ ہم مصدقہ طور پر ٹورسٹ تھے اور سری لنکا ٹورسٹوں کے لیے بڑی کشش رکھتا ہے۔ جب میں رابعہ کے ساتھ فرانس کے سفارت خانے گیا تو وہاں بھی مجھے دنیا کے ہر گوشے سے آنے والے سیّاح ملے۔ ان میں سے کسی کی اگلی منزل دہلی تھی تو کسی کی لاہور۔ کوئی ٹوکیو جانا چاہتا تھا تو کوئی جزائر بالی۔ وہاں ہر براعظم کے ہر رنگ اور نسل کے لوگ تھے۔ سیاحت دنیا بھر میں ایک انڈسٹری تسلیم کی جاتی ہے اور دنیا کے بیشتر ممالک سیاحوں کو خوش آمدید کہتے ہیں۔

کراچی میں ویزا کے خواستگار بیشتر پاکستانی ہی ہوتے تھے اور ان کا زیادہ رش چند مخصوص ممالک کے سفارت خانوں میں رہتا تھا۔ عمرہ کرنے والے یا مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کرنے والے سعودی عرب' ایران یا عراق جاتے تھے لیکن سب سے بڑی تعداد کاروباری مقاصد کے لیے دبئی' ہانگ کانگ' سنگاپور یا بنکاک کا ویزا مانگتی تھی اور یہ سب ٹورسٹ بن کے ہی جاتے تھے چنانچہ ویزا دینے والے زیادہ چھان بین کرتے تھے۔ کوئی ملک یہ نہیں چاہتا کہ سیاحوں کے بھیس میں غیر اخلاقی یا غیر قانونی دھندے کرنے والے پہنچ جائیں۔

کولمبو میں پیرس کا ویزا مجھے آسانی سے مل گیا۔ سفارت خانے والے سب سے زیادہ میری فرنچ سے متاثر ہوئے۔ فرسٹ سیکریٹری نے اعتراف کیا کہ اتنی روانی اور اتنے صحیح لب و لہجے میں فرنچ بولنے والے کسی پاکستانی سے پہلے اس کی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔۔۔ وہ میرے حلیے سے بھی متاثر تھا اور میرے ایڈووکیٹ کے پیشے سے بھی۔

"آپ سیر و سیاحت کے لیے نکلے ہیں؟"

میں نے کہا "سچ بات تو یہ ہے کہ ہم شادی کے بعد ہنی مون کے لیے نکلے ہیں اور میری بیوی کو پیرس کے نام سے عشق ہے۔"

وہ خوش ہو کے ہنسا "آپ کی حسین بیوی کو پیرس دنیا کا سب سے حسین شہر لگے گا۔ یہ حقیقت بھی ہے۔ زبان کا مسئلہ بھی نہیں ہو گا آپ کی وجہ سے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ میں بیک وقت شوہر اور مترجم کے فرائض سرانجام دینے کا اہل ہوں۔"

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اتنی اچھی فرنچ آپ نے کہاں سے سیکھی؟"

میں نے کہا "آپ کے ثقافتی مرکز سے۔ کراچی میں الائنس فرانس نے میری بہت مدد کی۔ باقی میرا شوق تھا یا زبان سیکھنے کی ایک خداداد صلاحیت تھی' اب تو میں خود وہاں دوسروں کو سکھاتا ہوں۔"

"کہاں۔ الائنس فرانس میں؟"

میں نے کہا "جی نہیں۔ لاہور میں' فرنچ سیکھنے کے شوقین بہت ہیں۔"

"پیرس میں آپ کو کسی قسم کی مدد درکار ہو تو وزارتِ سیاحت سے ضرور رابطہ کریں۔" اس نے پاسپورٹ میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

باہر آ کے میں نے کہا "تم کو اب سنجیدگی سے میری شاگردی اختیار کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔"

"مجھے کوئی ضرورت نہیں آپ کو استاد ماننے کی۔"

"مت مانو۔ تمہارا ہی نقصان ہے۔ فرنچ سیکھ لو گی تو بہت کام آئے گی" میں نے کہا "ورنہ اسی طرح بے وقوفوں کی طرح ہکّابکّا بیٹھی رہو گی جیسے ابھی بیٹھی تھیں۔"

"مجھے زندگی فرانس میں نہیں گزارنی ہے۔"

"اچھا جوڈو کراٹے تو سیکھ لو۔ پاکستان میں خواتین کے لیے اس کی ضرورت بڑھتی جا رہی ہے اور تمہارا تو واسطہ بھی جرائم پیشہ افراد سے رہتا ہے۔"

اس نے پھر دو ٹوک جواب دیا "میرا واسطہ صرف ایک شخص سے پڑے گا اور اسے میں سیدھا کروں گی۔ جوڈو کراٹے کے بغیر ہی اس کے دماغ کی خرابی دور ہو جائے گی۔"

ظاہر ہے اس کے بعد میرے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔

جو کچھ سیکھنے پر آمادہ ہی نہ ہو۔ اُلٹا استاد کو چیلنج کرے' اسے زبردستی شاگرد بنانے میں بھی خطرہ استاد کی استادی کے لیے تھا۔

پیرس کے لیے پہلی فلائٹ آدھی رات کے بعد تھی اور ابھی صبح کے گیارہ بجے تھے۔ رابعہ کے ساتھ گھومتے پھرتے مجھے خیال آیا کہ پیرس جانے سے پہلے ہم لاہور میں کسی سے بات کریں۔

رابعہ نے کہا "میں تو خود یہی چاہتی تھی۔ آج کتنے دن ہو گئے نہ انہیں ہماری خبر ہے نہ ہمیں ان کی۔"

میں نے کہا "خیال تو مجھے بارہا آیا مگر کسی کے گھر فون کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ تمہارے آفس کا فون بھی آبزرویشن پر ہو گا۔"

رابعہ بولی "تم بار روم کے فون پر منظر یا وقار یوسف سے بات کرلو۔ یہاں سے تو کال بھی آسانی سے ملے گی۔"

رابعہ کی بات ٹھیک تھی۔ میں نے ہوٹل پہنچ کے آپریٹر کو نمبر بتایا۔ یہ نمبر مجھے رابعہ نے دیا تھا۔ دس منٹ کے بعد گھنٹی بجی تو میں نے ریسیور اُٹھالیا۔ پس منظر میں شور سے میں سمجھ گیا کہ یہ بار روم ہی ہو گا۔

"عبدالودود منظر صاحب۔ وہ تو نظر نہیں آرہے ہیں مجھے۔ نہ ان کی آواز سُنائی دے رہی ہے۔" ریسیور اُٹھانے والے نے کہا۔

میں نے کہا "وقار یوسف صاحب۔"

"وہ بھی نہیں ہیں۔ ہوں گے کسی کورٹ میں' آپ کا نام؟"

میں نے کہا "اکرام شیخ' میں کولمبو سے بول رہا ہوں۔"

"اوہ۔ اچھا دیکھئے میں ان کو بُلواتا ہوں۔ ذرا تلاش کر کے لانا پڑے گا۔ اگر آپ آدھے گھنٹے بعد پھر فون کرلیں۔"

میں نے کہا "نو پرابلم۔ میں دوبارہ فون کروں گا۔ ان میں سے جو بھی ملے اسے بتادیں کہ بہت ضروری بات کرنی ہے مجھے۔"

"وہ تو ظاہر ہے۔ کولمبو سے کوئی گپ شپ کے لیے فون نہیں کرتا۔" وہ بولا "بارہ بجے کوئی ضرور موجود ہو گا یہاں۔"

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور فون رکھ کے آپریٹر سے دوبارہ آدھے گھنٹے بعد یہی نمبر ملانے کے لیے کہا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ اکرام شیخ کا نام سُن کے منظر اور وقار یوسف فوراً سمجھ لیں گے کہ فون کرنے والا میرے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔ اکرام شیخ کراچی میں تھا۔ کولمبو میں نہیں اور اور اس کا نام استعمال کرنے کا مقصد یہی تھا کہ میں اپنا نام بتانا نہیں چاہتا تھا۔

ٹھیک بارہ بجے پھر گھنٹی بجی اور آپریٹر نے کہا "بات کریں سر۔"

میں نے کہا "کیا میں منظر ایڈووکیٹ سے۔۔۔"

میرا جملہ پورا ہونے سے پہلے ریسیور اٹھانے والا چِلّا کے بولا "منظر صاحب۔ جلدی آئیں' آپ کا فون آگیا۔"

چند سیکنڈ بعد منظر بولا "یہ کون بھوتنی کا اکرام شیخ پیدا ہو گیا کولمبو میں۔"

میں نے کہا "سر۔ السّلام علیکم۔ اکرام شیخ کی اس میں کیا غلطی ۔ آخر آپ بھی تو پیدا ہوئے تھے بلاوجہ۔ اس دنیا کو آپ کی قطعی ضرورت نہیں تھی۔"

"میں سمجھ گیا تھا کہ یہ وہی ہو سکتا ہے جو گیا تھا مغرب کی کر کے اور چلا گیا جنوب کی طرف۔ گدھے کے ساتھ دُم ہے یا اسے بھی کہیں چھوڑ دیا؟"

میں نے کہا "گدھا رہ سکتا ہے دُم کے بغیر۔ آدمی کے لیے اس کی ناک کتنی اہم ہے۔ ناک کٹ جانے کے دردناک موضوع پر کتنی فلمیں ہیں۔۔۔"

"خیر چھوڑ یہ باتیں۔ اس سے زیادہ دردناک واقعہ بچپن میں آدمی کے ہوش سنبھالنے سے پہلے پیش آتا ہے جب سالا نائی بر سکندرِ اعظم کی تلوار کی طرح استرا لہراتا آتا ہے۔" منظر بولا "ا ہوا جو تمہیں کسی اُلّو کے پٹھے کا خیال آیا۔"

میں نے کہا "ہم دستِ قدرت کے انتظامِ غیب سے مجبور ہو کے یہاں پہنچ گئے یار۔ ہم ایسا چاہتے نہیں تھے۔ جیسے تو نہ چاہتا تھا کہ سترہ بچوں کا باپ ہو۔"

اس نے شور مچایا "یہ کون بھوتنی کا کہتا ہے۔ میری مرضی اور نیت نہ ہوتی تو میری گھر والی کو کسی کا باپ سترہ بچے دینے پر مجبور نہیں کر سکتا تھا۔"

"معاف کرنا مثال غلط ہو گئی۔ ہم نے سوچا کہ اپنی خیریت سے اور جائے وقوع سے آگاہ کردیں۔ آج رات ہم یہاں سے بھی جائیں گے اور خود سمجھ لو کہ کہاں جائیں گے۔ وہاں سب خیریت ہے نا۔"

"خیریت کہاں ہے۔ کیا چیز ہوتی ہے خیریت۔ کیسی ہوتی ہے؟" وہ خفا ہونے لگا "سالے جب سے تم تولد ہوئے ہو ہم اور ہمارے ساتھ بہت سے خیریت کا مطلب بھول گئے۔ تمہارے اعمال کی سزا بھگت رہے ہیں ہم زندگی کے نام پر۔"

"ایسی کیا خطا ہو گئی ہم سے سرکار۔"

"خطا۔ ابے تم خطا کار' گناہ گار' بدکار' کیا نہیں ہو۔ نیک کام خود بھی نہیں کیا اور اس کو بھی کسی کام کا نہیں چھوڑا۔ نہ اِدھر کی رہی نہ اُدھر کی۔ پھر رہی ہے تمہارے ساتھ خوار۔ یہاں سب پر مصیبت پڑی ہوئی ہے۔ اخباروں میں شور مچا ہوا ہے اور تم جانتے ہو شور کس کی شہ پر مچ رہا ہے۔ اپنے اسداللہ خاں ہیں اس کے پیچھے۔"

میں سمجھ گیا کہ اسداللہ خاں سے اس کی مراد غالب ہے۔ "اسی مسئلے پر؟"

"ہاں بھائی' اتنا بڑا صحافی اور ایک اتنا بڑا وکیل نہ رہے تو ملک کیسے چلے گا۔ سمجھ لو قیامت آگئی ہے۔ پولیس کا سارا عملہ اِدھر سے اُدھر بھاگا پھر رہا ہے۔ وکیلوں نے شور مچا رکھا ہے۔ احتجاجی جلسے اور جلوس' بیان بازی اور خبریں۔"

"میں نے سنا ہے کہ اصل بندہ بیان دینے سے قبل ہی اللہ کو پیارا ہو گیا۔"

"ہاں۔ ٹھیک سُنا تو نے۔" منظر بولا "اسمبلی پہنچنے کے بجائے اوپر والے حرامیوں کی اسمبلی میں پہنچ گیا۔ جنہم کہتے ہیں اسے لیکن ہم بھی کم نہیں۔ مجھے ڈر تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ میں اس سے ملنے گیا تھا۔ حالانکہ وہ خاص سرکاری مہمان تھا جس سے کسی کو ملنے کی اجازت نہیں تھی لیکن تھانے دار آگیا میرے قابو میں۔ ان سالوں کی دُکھتی رگ ہوتی ہے ہمارے ہاتھ میں۔ اس سے بھی بس ایک بات کی میں نے اور وہ الف کی طرح سیدھا ہو گیا۔ میں نے اسے ایک کاغذ اور قلم دیا کہ اس پر اپنا بیان لکھ دو ورنہ یہ سمجھ لو کہ تم یہاں سے زندہ نہیں نکلو گے۔ چوہدری نے پھانسی کا پھندا تمہاری گردن میں ڈال دیا ہے۔ تم اس کی گردن میں ڈال دو۔ یہی ایک صورت ہے تمہارے بچنے کی اور تمہیں خدا کے بعد میں ہی بچا سکتا ہوں۔ وہ بھی سمجھتا تھا کہ اسے پھانسا گیا ہے' مرتا کیا نہ کرتا۔ اس نے لکھ دیا اور سارا الزام چوہدری پر رکھ دیا کہ اس نے یہ کیا تھا اور وہ کیا تھا۔ حالانکہ اس سے فرق زیادہ نہیں پڑتا۔ بھوتنی کے تیری اپنی عقل ماری گئی تھی کہ تو چوہدری کی بات مانتا رہا۔ تو اس کے حکم کا غلام ہے؟ لیکن اس بیان سے بڑی مدد ملے گی ہمیں۔"

"یار منظر۔ بڑی حرامی چیز ہے تو بھی۔ یہاں اس گالی کو میں تعریف اور خراجِ تحسین کے لیے استعمال کرنے پر مجبور ہوں۔ تو نے واقعی کمال کردیا۔ تھانے دار نے اعتراض نہیں کیا؟"

"وہ سامنے نہیں تھا۔ حوالات میں چار چھ بندے اور بے سدھ پڑے تھے۔ خاطر تواضع کے بعد۔ تھانے دار آیا دو مرتبہ تو میں باتیں کرنے لگا اور اس نے قلم کاغذ چُھپالیا۔"

"حوالات کے باہر بھی تو ایک بندوق والا ہوتا ہے۔"

"وہ دوسری طرف دیکھ رہا تھا۔ جدھر سو کا نوٹ تھا۔" منظر نے قہقہہ مارا "اب اس کو تو مرنا ہی تھا۔ اگلے دن اس کی خودکشی کرادی گئی لیکن وہ تحریر ہے میرے پاس۔"

"وہ تھانے دار مارا جائے گا۔ اس کی نوکری تو سمجھو گئی۔"

"ابے نوکری خاک کرتے ہیں یہ لوگ۔ بادشاہی کرتے ہیں۔ بہت کمالیا ہو گا۔ اتنا کہ اس کی سات حرامی پشتیں گھر بیٹھ کے کھا سکتی ہیں۔ اس سے مجھے کوئی ہمدردی نہیں۔"

میں نے کہا "یار معلوم ہے ہمیں کیوں آنا پڑا کولمبو! وہ حرام زادہ وہاں پہنچ گیا تھا۔ ہمارے پیچھے پیچھے۔"

منظر نے حیرانی سے کہا "لیکن اسے کیسے معلوم ہوا؟"

"اکرام شیخ سے مِلنے کی غلطی کی تھی ہم نے۔"

"پھر؟ جان کیسے چھڑائی اس سے؟"

میں نے کہا "یہ بڑی لمبی کہانی ہے۔ بس یوں سمجھ لے کہ اللہ نے بچالیا اور ہم اسے دھوکا دے کر نکل آئے۔"

"تجھے یقین ہے کہ وہ بھوت اب تیرے تعاقب میں نہیں ہے؟"

میں نے کہا "اس کا مجھے سو فیصد یقین ہے اور اسی لیے ہم اب جارہے ہیں پیرس۔ ناک کو سیدھا پکڑنے میں خطرہ تھا۔ پیرس سے آگے بائی روڈ۔"

"میں سمجھ گیا۔ اور یہ بھی عقلمندی کی تُونے کہ کسی کے گھر فون نہیں کیا۔ سب کے آبزرویشن لگی ہوئی ہے۔ بلکہ مجھے تو شک ہے میرا اور وقار کا تو باقاعدہ تعاقب کیا جاتا ہے۔ نازو کو میں نے اپنے گھر بُلالیا ہے لیکن باہر جھانکنے سے بھی منع کردیا ہے۔ ہم آفس میں بھی کوئی بات کرتے ہیں تو سوچ سمجھ کے۔ کل میں نے وقار کو فون کر کے پوچھا تھا کہ رابعہ اور غالب کا کچھ پتا چلا۔ پھر ہم آدھے گھنٹے تک پریشان رہے۔ دفتر میں بھی باقاعدہ پُرتشویش گفتگو ہوتی ہے۔"

میں نے کہا "ایک بات میری بھی دھیان میں رکھ۔ اکرام شیخ کو فون مت کرنا۔ اور نہ اس پر اعتبار کرنا۔"

"اچھا! کیا حرامی پن کیا ہے اس نے؟"

"چھوڑ یار منظر۔ دنیا بہت بدل گئی ہے۔ لوگوں کی نظریں' جذبات اور رشتے سب وہ نہیں رہے۔"

منظر نے کہا "اچھا اس سے بھی نمٹ لیں گے بعد میں۔"

میں نے کہا "گُل اور محسن کا کچھ پتا چلا۔"

"ہاں۔ پاگل تو وہ پہلے بھی ہوا تھا صدمے سے۔ اس مرتبہ صدمے کا نام بدل گیا ہے۔ گل کو بڑا صدمہ تھا اولاد کے نہ ہونے کا۔ بوبی کو دیکھ دیکھ کے اس کے اندر جو ماتا کا جذبہ تھا وہ اسے خون کے آنسو رُلاتا تھا۔ نہ جانے کس نے اسے بتادیا کہ تم ماں بن سکتی ہو۔ اور محسن نے اس کا دل رکھنے کے لیے اس کی بات مان لی۔ یہ سب لکھا ہے خط میں۔ کمال یہ ہے کہ وہ بوبی کو بھی چھوڑنے پر تیار نہیں۔ اس کے لیے بھی پاگل رہتی ہے۔"

میں نے کہا "میں ایک ڈائری بھیج رہا ہوں تجھے۔ اس کو بحفاظت کہیں رکھوا دینا۔ دس نقلیں بنوانے کے بعد۔"

"ٹھیک ہے۔ تُو بھی دو تین فون نمبر لکھ لے۔ یہ میرے کلائنٹ تھے جن کو میں نے پھانسی ہونے سے بچالیا تھا۔ اب وہ میری خاطر سب کچھ کر سکتے ہیں۔ ان کو جو پیغام دے گا وہ مجھے مل جائے گا۔ وقت طے کر کے بات بھی ہو جائے گی۔ اچھا یار' یہ بار روم کا فون زیادہ دیر استعمال نہیں ہو سکتا۔ کم سے کم ایک درجن وکیل گالیاں دے رہے ہیں مجھے۔"

میں نے کہا "صرف ایک درجن۔"

"اتنے ہی فون ملانے والے بھی ہوں گے جن کو نمبر انگیج مل رہا ہو گا۔ اس لیے خدا حافظ۔ اور ہاں' اس کو میری طرف سے پیار کرلینا۔ دوبار۔۔۔"

منظر کا یہ پیغام میں نے فوراً رابعہ تک پہنچادیا۔

اس نے سخت خفگی کا اظہار کرتے ہوئے مجھے دھکیل دیا "یہ کیا بدتمیزی ہے۔"

"مجھ سے منظر نے کہا تھا۔ ورنہ میں بہت تمیزدار بچہ ہوں۔"

دن کا باقی حصہ ہم نے پھر گھومتے پھرتے گزارا۔ میں نے پیڈرو کی ڈائری ایک کوریئر سروس سے ایک لاکھ روپے کی انشورنس کرا کے منظر کو ارسال کی۔ اس ڈائری کی اصل قیمت بہت زیادہ تھی مگر کوریئر سروس والوں کے لیے دستاویزات کی اہمیت کیا

انوکھی بات نہیں تھی۔ وہ تو بس چیزوں کو حفاظت کے ساتھ صحیح آدمی کے حوالے کرنا جانتے تھے اور اسی کام کے پیسے لیتے تھے۔

رات کو جب ہم پیرس روانہ ہوئے تو میں بہت پُرسکون تھا۔ ان تمام خرابیوں کے باوجود جو چوہدری دلاور کی ذات سے منسوب تھیں۔ ہم ابھی تک محفوظ تھے اور اپنے مقصد کی طرف پیش قدمی کر رہے تھے۔ طویل سفر کا بیشتر حصّہ ہم نے سو کے گزارا۔

چارلس ڈیگال ائرپورٹ آنے سے پہلے ہی مسافروں سے سیٹ بیلٹ باندھنے کو کہا گیا۔ ہم ناشتے اور کافی کے ساتھ اسنیک بھی لے چکے تھے اور تھکن کے علاوہ رابعہ کا متلی اور قے سے حال خراب ہو گیا تھا۔ وہ بہت پژمردہ اور نڈھال تھی۔

میں نے کہا "چلو اب تھوڑی دیر میں ہوٹل پہنچ کے آرام کرنا۔"

وہ مسکرائی "تمہیں بھی پریشان کیا میں نے۔ دراصل اتنا لمبا ہوائی سفر کرنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔"

امیگریشن کاؤنٹر تک پہنچنے میں بھی کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ فرانسیسی حکام کا شائستہ رویّہ انتہائی مددگار ثابت ہوا۔ لیکن اس سے زیادہ میری فرنچ کا جادو ان کے سر چڑھ کے بولا۔ وہ کسی پاکستانی کو اتنی روانی سے فرانسیسی میں بات کرتا دیکھ کے اتنے ہی خوش ہوئے تھے جتنا کہ پاکستانی انہیں منظر کی زبان میں بات کرتا سُن کے خوش ہوتا۔

میں ایک کاؤنٹر پر ہوٹل ریزرویشن کا مسئلہ طے کر رہا تھا جب کسی نے میرے بہت قریب آ کے کہا "آؤ جی اپنے سکندرِ اعظم صاحب۔ خیر سے ہم نے سوچا آپ کو لینے ائرپورٹ آ جائیں۔"

میں ایک دم پلٹا۔ یہ الفاظ بم کا دھماکا تھے۔

اپنے سامنے محسن اور گُل کو دیکھ کے میں بھونچکا رہ گیا۔ ان کا وہاں نظر آنا میرے لیے اتنا ہی ناقابلِ یقین تھا جتنا فرانسیسی صدر کا میرے استقبال کے لیے پھولوں کا گلدستہ لیے موجود ہونا۔ اگر مجھے یہ علم ہوتا کہ... نصیبِ دشمناں، وہ اس دارِ فانی سے کوچ کر چکے ہیں تو میں سمجھتا کہ ان کی روحیں پیرس کے ائرپورٹ پر صرف مجھے نظر آ رہی ہیں۔

جب میں نے اس سے کہا "اُلو کے پٹھے" اور جواب میں اس نے مجھ سے کہا کہ "سؤر کے بچے" پھر مزید فادری زبان کی شریفانہ گالیوں کے ساتھ ہم نے ایک دوسرے کو مُکے مارے۔ رابعہ نے گُل کو دیکھ کے چیخ ماری اور گُل نے زیادہ بلند چیخ مار کے رابعہ کا نام لیا تو ہمارے ساتھ کھڑے ہوئے بہت سے غیر ملکی چلتے چلتے رک گئے اور جو کھڑے تھے وہ بے اختیار ایک قدم دور ہو گئے۔

ایک پولیس مین اسے خانہ جنگی سمجھ کے دوڑتا ہوا آیا اور ہمیں سمجھانے لگا "موسیو، موسیو، یہ کیا ہو رہا ہے، آخر معاملہ کیا ہے۔"

میں اور محسن ایک ساتھ ہنسنے لگے پھر میں نے بہترین فرنچ بولنے کا مظاہرہ کیا "معاف کرنا۔ ہم ایک ایسے قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں جو محبت کا اظہار اسی طرح کرتے ہیں۔ ایک دوسرے سے لڑ کر۔"

"اور نفرت کا اظہار ایسے کرتے ہیں جیسے آپ لوگ محبت کرتے ہیں" محسن بولا۔

پولیس والے کو اس قبائلی رسم پر اتنی حیرت نہیں ہوئی تھی جتنی میری اور محسن کی صحیح لب و لہجے کے ساتھ فرنچ سن کے ہوئی۔ اگر اس کے سامنے کوئی بچہ کھلونا پستول سے گولی چلا دیتا یا بھیڑ کی کھال میں سے اصلی بھیڑیا برآمد ہو کے سوال کرتا کہ بولو اب تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ تو بھی وہ اتنا پریشان نہ ہوتا۔

اس نے خالص فرنچ اسٹائل میں کندھے اچکائے جس کا مطلب یہ تھا کہ یہ لڑائی نہیں صرف ایک قبائلی رسم ہے تو بھاڑ میں جاؤ۔ اخلاقی فرض پورا کرنے کے لیے اس نے معذرت کے چند الفاظ کہے اور واپس چلا گیا۔

میں نے کہا "شیروانی صاحب، یہ میں خواب دیکھ رہا ہوں یا میں پاگل ہو گیا ہوں۔"

اس نے کہا۔ "کبیر خان صاحب! دونوں باتیں سچ ہیں، آخر پاگل بھی تو خواب دیکھتے ہیں۔"

میں نے کہا "تُو یہاں... پیرس میں!"

اس نے کہا "اور تُو خود کہاں ہے؟"

میں نے کہا "مگر یار تُو کسی پیر فقیر سے تعویذ لینے گیا تھا یا ہمالیہ کی چوٹی پر کسی سو سالہ سنیاسی باوا سے ملنے جو وہاں ڈیڑھ سو سال سے جڑی بوٹیاں تلاش کر رہا ہے۔"

محسن نے قہقہہ مارا "تو بھی کراچی گیا تھا اور پھر تجھے لندن جانا تھا۔ کیا جہاز راستہ بھول گیا۔"

"یار، مجھے اب بھی یقین نہیں آتا۔ تم سب کی تصویر اور آواز اتنی صاف آ رہی ہے کہ تم لوگ بالکل حقیقی لگتے ہو۔"

ہم سے چند قدم کے فاصلے پر دوسرا جذباتی سین چل رہا تھا۔ چیخ مارنے اور گلے ملنے کے بعد رابعہ اور گُل پہلے ہنسی تھیں اور پھر روئی تھیں۔ پھر ان کے درمیان بھی حیرت اور خوشی سے بھرپور مکالمے اور سوال و جواب یوں شروع ہو گئے تھے کہ دونوں کی زبان نان اسٹاپ چل رہی تھی۔ حجام کی قینچی کی طرح۔ اپنے سوال کا جواب سننے کی نہ کسی کو فرصت تھی اور نہ ضرورت۔ گفتگو کے فن میں یہ کمال غالباً خواتین ہی کو حاصل ہے کہ وہ بیک وقت بول اور سن سکتی ہیں.... اور سمجھ بھی لیتی ہیں۔

مغربی اقوام میں اور ہم میں یہ جذباتی تفاوت بہت نمایاں ہے۔ وہاں برسوں کے بچھڑے ہوئے ایک دوسرے کو ہاتھ ہلا کے اور "ہائے" کہہ کے گزر جاتے ہیں۔ ہینڈپمپ اسٹائل میں مصافحہ کرنے، بغلگیر ہونے کے بہانے ایک دوسرے کو نچوڑنے کے بعد بھوری خالہ سے گبرو بھینس تک کی خیر و عافیت پوچھنے کی فرصت کسی کے پاس نہیں۔ ناخلف بیٹا (خلف بیٹے وہاں نہیں ہوتے) کسی اجنبی لڑکی کو اچانک لا کے نئی سہ ماہی کی بہو کے طور پر متعارف کرائے تو ماں بیٹے پر دو ہنٹر مار کے پٹ سے بے ہوش نہیں ہوتی بلکہ مسکرا کے کہتی ہے ہیلو، ان سے ملو یہ ہیں میرے اس سال کے شوہر۔ اور خاندان کی ناک کاٹنے پر جینوئن باپ اسے عاق کرنے یا خود کو گولی مارنے کی دھمکی تک نہیں دیتا بلکہ الٹا پیٹھ تھپک کے کہتا ہے کہ ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند... شاباش!

جب ہم بالآخر شانت ہوئے تو رابعہ نے کہا "کیا خیال ہے اب باہر چلیں۔"

میں نے کہا "بھئی خوب یاد دلایا۔ میں تو واقعی بھول گیا تھا کہ ہمیں باہر بھی جانا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کہاں؟"

محسن نے کہا "یار تم واقف ہو پیرس سے۔ یہاں بہت ٹھکانے ہیں بے گھر لوگوں کے..."

میں نے کہا "ہاں۔ ہم جب لندن سے آئے تھے تو پیسے بچانے کے لیے وہیں جاتے تھے۔ کھانا، رہنا سب مفت۔"

"اور کیسے کیسے کردار ملتے تھے وہاں" محسن نے ہمارا سوٹ کیس اُٹھالیا "اچھے خاصے دولت مندوں کی اولادیں۔ لڑکے لڑکیاں، ہٹے کٹے کام چور نوجوان۔ چرسی اور بھک منگے آرٹسٹ۔ بوہیمی دانش ور اور آوارہ گرد۔"

"اور فقیر.... جن کی خودی بہت بلند تھی..."

"توبہ توبہ۔ ایسے لوگوں کے ساتھ رہتے تھے اور کھاتے تھے" گُل نے ناک بھوں چڑھا کے کہا۔

"تم ایک دن رہ کے دیکھو وہاں۔ پھر پتا چلے گا کہ بے فکری کسے کہتے ہیں اور سکون کیا چیز ہے" محسن نے کہا "وہ کوئی کام نہیں کرتے۔ کھاتے پیتے ہیں۔ سوتے ہیں لمبی تان کے اور دنیا کو جوتی کی نوک پر رکھتے ہیں۔ جس کا جو دل چاہے کہے۔"

میں نے کہا "یار ان لڑکیوں کے لیے کوئی بندوبست ہو جائے تو اپنا کیا ہے؟ پُرانے ٹھکانے پر چلے جائیں گے۔"

رابعہ نے کہا "کیوں؟ ہوٹل نہیں ہوتے پیرس میں۔"

محسن بولا "ہوتے ہیں۔ امیروں کے لیے۔ پیرس کو لاہور مت سمجھو کہ ایک روپیہ منجی بستر والے ہوٹل میں رات گزار لی اور صبح سڑک کے کنارے نلکے پر منہ دھو لیا اور ایک گلاس لسّی پی کے ڈکار لی تو کام ہو گیا۔"

میں نے کہا "یار فضول خرچی سے کیا حاصل۔ آخر لڑکیاں بھی تو ہوتی ہیں وہاں۔ یہ کیا شہزادیاں اور پریاں ہیں؟"

"ان کے مقابلے میں تو وہ پریاں اور شہزادیاں لگیں گی۔ سچ تو کہنا ہے۔ اب ان کا دل رکھنے کے لیے ہم جھوٹ بولیں؟"

میں نے کہا "کیا حرج ہے یار اگر جھوٹ سے کوئی خوش ہو جائے۔"

رابعہ اور گُل اب ہم سے چند قدم پیچھے تھیں اور ان کی باتوں کا سلسلہ پھر وہیں سے شروع ہو گیا تھا جہاں سے ٹوٹا تھا چنانچہ انہوں نے اپنے بارے میں ہمارے ریمارکس سُنے ہی نہیں تھے۔

محسن بولا "یار تیری اور میری مشترکہ خوش قسمتی ہے کہ یہاں عارضی طور پر قیام کا بندوبست ہو گیا ہے مگر ایک خرابی ہے۔"

"کیا کرایہ بہت ہے؟"

"نہیں۔ کھانے پینے کا اور رہنے کا خرچہ تو نہ ہونے کے برابر ہے۔ میرا مطلب ہے پیرس کے ہوٹلوں کے مقابلے میں۔"

"پھر کیا خرابی ہے؟"

"خرابی اخلاقی نوعیت کی ہے۔ ہم تو یہاں کی مادر پدر آزاد دنیا میں کافی وقت گزار چکے ہیں اور جانتے ہیں کہ یہاں دوسرے کی آزادی کا احترام صرف اپنی آزادی کا تحفظ ہے ...... آپ خود جو چاہیں کریں۔ رابعہ اور گل کو شاید وہ جگہ سخت ناپسند ہو گی۔"

"کوئی بات نہیں۔ ہمیں یہاں عمر نہیں گزارنی ہے۔ دو چار دن میں وہ بھی عادی ہو جائیں گی جب یہاں ہر قدم پر بے شرمی کے مظاہرے دیکھیں گی۔ ہوٹل میں تو دیوالیا نکل جائے گا، یہ کیا جگہ ہے۔"

"بس ایک مشترکہ رہائش گاہ ہے۔ ہوسٹل جیسی۔ ایک کمرے میں دو رہ سکتے ہیں۔"

"بلا لحاظ جنس و عمر، رنگ و نسل!"

"ہاں۔ اور ان کا شادی شدہ ہونا بھی ضروری نہیں، باہمی رضامندی کافی ہے۔"

میں نے کہا "وہ تو ہے لیکن ہم چار ہیں۔"

"اسی لیے میں نے مشترکہ خوش قسمتی کا حوالہ دیا۔ کمرے بھی دو ہیں۔ کم سے کم ایک ہفتہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ جن کے کمرے ہیں وہ ہنی مون منانے گئے ہوئے ہیں۔ میں نے انہیں ایک ہفتے کا کرایہ ادا کر دیا تھا۔"

"تجھے کیا الہام ہوا تھا کہ ہم وارد ہونے والے ہیں۔"

"تو بھول گیا کہ میری چھٹی حس اور تیری ساتویں حس ایک ہیں۔ ہمارے ذہن میں خیالات یوں آتے ہیں جیسے دو ٹی وی سیٹ پر ایک ہی چینل کے پروگرام۔"

"آپ بکواس فرماتے ہیں۔"

محسن نے افسوس سے سر ہلایا "کیا تو ٹیلی پیتھی کا قائل نہیں رہا۔"

"ٹیلی پیتھی سے فلائٹ نمبر اور ٹائم معلوم نہیں کیا جا سکتا۔ سچ بتا تجھے کیسے پتا چلا...."

محسن نے اچانک رک کے ایک گاڑی کا دروازہ کھولا "سچ جاننے کی اتنی جلدی کیوں ہے؟"

میں نے کہا "یہ کار کرائے کی ہے؟"

"یہ کار میری ہے، اسے آپ اپنی ہی سمجھئے۔"

میں نے کہا "پھر جھوٹ۔"

"یہ بھی ایک ہفتے تک اپنی ہے" اس نے رابعہ اور گُل کے لیے پیچھے والا دروازہ کھولا "تشریف رکھیے معزز خواتین۔"

رابعہ نے حیرت سے کہا "محسن، یہ کیا چکر ہے؟"

"اسے یہاں کار کہتے ہیں خاتون۔" محسن بولا "اور کیا آپ

کے ملک میں اسے چکر کہتے ہیں؟"
گُل نے بوبی کو درمیان میں بٹھالیا "ان کے چکروں سے خدا بچائے۔"
میں نے کہا "تم خود بچنا نہیں چاہتی تھیں۔ ہم نے تو سمجھایا تھا۔"
گُل نے میری بات کو نظرانداز کردیا "دودن میں مجھے ان کے سارے چکروں کا پتا چل گیا ہے جو انہوں نے یہاں چلا رکھے تھے۔"
محسن نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا "بات تو ایسے کررہی ہو جیسے تم شرلاک ہومز سے بڑی سراغ رساں ہو کہ دودن میں سب معلوم کرلیا۔ تمہارے تو باپ کو بھی کچھ پتا نہ چلتا اگر میں خود نہ بتاتا۔"
"باپ تک کیوں جاتے ہو؟"
"اوکے۔ تمہارے دادا کو پر دادا کو پتا نہ چلتا۔ کیا اور آگے جاؤں؟"
رابعہ بولی "مذاق چھوڑو' یہ بتاؤ..."
"اونہوں... ابھی تم پیرس کو دیکھو۔ یہ دنیا کا سب سے حسین شہر ہے بقول شاعر، رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے۔ ہم جیسے.... میں اور محسن نے اپنی جوانی کے حسین ترین شب وروز یہاں ایسے گزارے جیسے تم نے لاہور کی گوالمنڈی میں یا دھرمپورے میں" میں نے کہا۔
محسن نے ایک آہ بھری "پیرس کے گلی کوچے اوراقِ مصور تھے۔"
"اور اسی لیے۔ سیکھے تھے مہ رخوں کے لیے ہم مصوری۔"
"اور اسی لیے۔ بڑے بے آبرو ہوکے ترے کوچے سے ہم نکلے' شرافت سے رہتے تو نکالے کیوں جاتے" رابعہ بولی۔
گل نے کہا "اور اب چوروں کی طرح چھپ کے کیوں آتے۔ وہ بھی ہمارے ساتھ آنے سے شریف اور عزت دار ہوگئے ورنہ...."
محسن نے قہقہہ مارا "یہاں عزت اور شرافت کا معیار کچھ اور ہے بے وقوف لڑکی۔ شادی شدہ ہی زیادہ بدمعاش ہوتے ہیں اور سمجھے جاتے ہیں۔ کنوارے... میرا مطلب ہے غیرشادی شدہ لڑکے یا لڑکی کا کردار کوئی نہیں دیکھتا۔"
"خیر یہ بحث چھوڑو" میں نے کہا "تمہیں میرے جیسے ماہر اور قابل گائیڈ کی خدمات حاصل ہیں' بلا معاوضہ۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ ہم کہاں سے گزر رہے ہیں۔ ان مجسموں کو دیکھ کے شرم سے پانی پانی ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہاں یہ آرٹ کے شاہکار سمجھے جاتے ہیں۔"
"لیکن یہ جو مجسم تصویرِ عشق۔ یک جان دو قالب ہوئے بیٹھے ہیں۔ یہ مجسمہ نہیں جیتے جاگتے انسان ہیں۔ یہ دنیا کو نہیں دیکھ رہے ہیں۔ دنیا انہیں نہیں دیکھ رہی ہے۔ تم بھی مت دیکھو" محسن بولا۔

گُل نے کہا "حد ہے بے شرمی کی بھی۔"
محسن بولا "حد ہے میڈم۔ اس حد سے آگے جانے والے کو جیل جانا پڑتا ہے۔ لباس چاہے چار گرہ کپڑے کا' ایسا ہو کہ ٹریفک جام ہوجائے مگر ہونا ضرور چاہیے۔"
گل نے کہا "شروع میں تو بڑی وحشت ہوتی تھی۔"
محسن بولا "چار دن میں رابعہ باجی بھی عادی ہوجائیں گی۔"
رابعہ نے کہا "چار دن ہوگئے ہیں تمہیں یہاں؟"
گُل نے کہا "آج چوتھا دن ہے۔"
میں نے کہا "جب رہنا مجبوری ہو تو ذہن ہر ماحول کو قبول کرلیتا ہے جیسے ہر طرف کھارا سمندر ہو تو میٹھے پانی کی تلاش کا کسی کو بھی خیال نہیں آتا۔"
میں نے کہا "سبزہ وگل کی خوش نمائی دیکھو۔ یہ موسم بہار نہیں مگر پھر بھی پھولوں کی فراوانی ہے۔ رنگ ہی رنگ ہیں اور خوشبو ہے۔ دنیا کا کوئی بھی شہر نفاست اور خوش ذوقی میں پیرس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ پھر انفرادی آزادی کا جتنا حقیقی احترام فرانس میں ہے دنیا میں کہیں نہیں۔ لینن' چو این لائی اور ہوچی منہہ سب کے انقلابی نظریات کو فرانس میں تحفظ ملا کیونکہ یہاں سوچ پر قدغن نہیں۔ بعد میں ان سب نے اپنے اپنے ملک جاکے انقلاب کی قیادت کی اور تاریخ کا رُخ بدل دیا۔ (ایرانی انقلاب کے قائد بنی صدر اور آیت اللہ خمینی بھی پندرہ سال فرانس میں جلاوطن رہے لیکن یہ بعد کی بات ہے)
رابعہ بولی "آپ سیاسی تاریخ پر لیکچر مت دیں۔ مجھے سب معلوم ہے۔"
میں نے کہا "ہاں' تم تو آتی جاتی رہی ہو پیرس۔"
"میں نے روم نہیں دیکھا۔ دہلی نہیں دیکھی لیکن ان کے بارے میں کون نہیں جانتا۔ سفرنامے' کتابیں اور فلمیں بنیں۔ مثلاً رومن ہالیڈے" رابعہ نے کہا۔
"اور تھری کوائن ان اے فاؤنٹین" میں نے کہا "مگر خود جاکے روم کو دیکھنے اور محسوس کرنے میں وہی فرق ہے جو رضیہ کے شاہی دسترخوان میں بریانی پکانے کی ترکیب پڑھنے اور بریانی کھانے میں ہے۔"
رابعہ باہر دیکھ رہی تھی اور میری بات نہیں سُن رہی تھی "یہ کون سی جگہ ہے؟"
میں نے کہا "یہ لوور ہے۔ پیرس کا کیا دنیا کا سب سے بڑا آرٹ میوزیم۔ فن تعمیر کا شاہکار۔"
گل نے خفگی سے کہا "محسن تو کہہ رہا تھا کہ نپولین کا مزار ہے۔"
محسن نے دانت نکالتے ہوئے کہا "جہانگیر کے مقبرے اور قائداعظم کے مزار کی باتیں سمجھنے والی لڑکی سے اور کیا کہا جاسکتا ہے۔"
رابعہ نے کہا "مانو گے نہیں کہ خود تمہیں معلوم نہیں تھا۔"

گاڑی پاکستانی معیار سے اچھی تھی مگر پیرس کی شیشے جیسی عمارت اور ہموار سڑکوں پر رواں چمکتی دمکتی جدید ترین ماڈل کی کاروں کے مقابلے میں یقیناً کھٹارا کا لقب پانے کی مستحق تھی۔ سڑکوں پر ٹریفک کا دریا بہہ رہا تھا لیکن نظم وضبط کا یہ عالم تھا کہ لگتا تھا ساری کاروں کو ایک ہی غیبی ہاتھ کنٹرول کررہا ہے۔ ٹریفک سگنل کی خلاف ورزی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایک جگہ کسی وجہ کے بغیر ساری کاریں رک گئیں تو رابعہ نے پوچھا "کیا ہوا؟ یہاں کوئی چوک تو نظر نہیں آرہا ہے۔"
محسن بولا "ایک بڑی بی اپنے پاکٹ سائز کُتّے کے ساتھ زیبرا کراسنگ پر سے گزر رہی ہیں۔ جب تک وہ سڑک پار نہیں کرلیں گی سب انتظار کریں گے۔"
اور ایسا ہی ہوا۔ بڑی بی نے اطمینان سے سڑک پار کی۔ کسی نے بھی اس پر بے اطمینانی کا اظہار ہارن بجاکے یا بڑی بی کو گالیاں دے کے نہیں کیا۔ گل نے گزشتہ تین دنوں میں بہت کچھ دیکھ لیا تھا اس لیے وہ کم حیران تھی۔ رابعہ نے اس فقیدالمثال شہر کے بارے میں جو سنا یا پڑھا تھا اس سے کہیں زیادہ دیکھ کے شاید اسے ہر درد مند دل رکھنے والے پاکستانی کی طرح یہی خیال دکھ دے رہا تھا کہ آخر یہ سب کچھ کراچی یا لاہور میں کیوں نہیں ہوتا۔ سڑکیں جیسی بھی ہیں ان کو صاف تو رکھا جاسکتا ہے۔ پھول اُگانے اور درخت لگانے میں قومی خزانے پر کون سا بار پڑتا ہے۔ ایک پاکستانی ایک پودا لگادے اور اسے پروان چڑھائے تو کروڑوں پودوں کی ہریالی سے اور ان میں کھلنے والے پھولوں سے پورا ملک ایک چمن بن سکتا ہے۔ اصولوں کی پابندی' نظم وضبط اور تحمل مزاجی۔ TOLERANCE کی صفات کو ہم اہمیت کیوں نہیں دیتے۔ لیکن ان سوالوں کا جواب تو علامہ اقبال نے بہت پہلے دے دیا تھا۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

پون گھنٹے بعد رابعہ کا حوصلہ جواب دے گیا "آخر کب ختم ہوگا یہ سفر؟"
محسن نے کہا "بھئی گُل۔ اپنے لور سے آنے والی اس پینڈو خاتون کو سمجھاؤ کہ یہ پیرس ہے۔"
گل نے کہا "بس آدھے گھنٹے میں ہم پہنچ جائیں گے۔"
"مزید آدھا گھنٹا!"
میں نے کہا "اب تو کراچی بھی اتنا پھیل گیا ہے کہ کسی بھی سمت میں بیس پچیس میل کا فاصلہ عام بات ہے اور شہر کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک چالیس پچاس میل ہوجاتے ہیں مثلاً لانڈھی سے اورنگی۔ یا نارتھ کراچی سے کلفٹن۔"
"یہاں ستر اسّی کلومیٹر عام فاصلہ ہے۔ مضافات سو کلومیٹر کے بعد شروع ہوتے ہیں' حسنِ اتفاق سے ہم مضافات میں ہی قیام فرمائیں گے۔ شہر کے مرکزی علاقوں میں ہم جیسے پھکڑ لوگ نہیں رہتے۔"

"ایک دودن کی بات تھی۔ اب ہم ایسے گئے گزرے بھی نہیں ہیں کہ پیرس کا کوئی بھی ہوٹل افورڈ نہیں کرسکتے۔"
میں نے کہا "بات صرف استطاعت کی نہیں ہے۔ سیکیورٹی بھی اہم ہے۔ ہوٹل میں ہمارے ناموں کا اندراج ہوگا..."
"ہم غیرقانونی طور پر تو نہیں آئے ہیں۔" رابعہ بولی۔
"مگر چھُپ کے ضرور آئے ہیں۔ اپنا سراغ کہیں چھوڑنا نہیں چاہتے۔ لندن کے دروازے ہم پر بند ہیں۔ ہم وہاں چور دروازے سے داخل ہوں گے۔"
محسن نے کہا "دیکھا بیوی' میرا اندازہ کتنا صحیح تھا۔"
گُل نے کہا "ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہوناں۔"
"چٹے بٹے کیا کریں۔ جب کوئی شرافت سے دروازہ نہیں کھولے گا تو مہمان کیا واپس لوٹ جائے گا۔ وہ بھی ہم جیسا مہمان۔ ہم دیوار پھاند کر اندر جائیں گے یا نقب لگاکے۔ مگر جائیں گے ضرور۔"
"ہاں۔ یہ ہماری نہیں پوری پاکستانی قوم کی عزت کا سوال ہے۔ یہ گوری چمڑی والے اب ہمارے حاکم نہیں ہیں۔" میں نے کہا "ہمارے ارادے نیک ہیں۔"
"ہم خود نیک ہیں اور ہماری نیک نیتی کا حال خدا جانتا ہے" محسن نے فریادی لہجے میں کہا۔
رابعہ بولی "لیکن نیک اور شریف کہلانے کی سند نہیں ہے تمہارے پاس۔"
میں نے کہا "ہمیں کسی کی سند کی ضرورت بھی نہیں۔ ہم کون سا لندن برج اڑانے یا پارلیمنٹ ہاؤس چرانے آئے ہیں۔ ایک قانونی ضرورت نے ہمیں مجبور کردیا ورنہ اس شہر پر لعنت بھیجتے ہیں ہم۔ اپنا لور ٹھیک ہے۔"
"تم یہاں سے ڈی پورٹ کیے جاچکے ہو اس لیے اب لعنت بھیجنے کے سوا کیا کرسکتے ہو۔ انگور کھٹے ہیں" گل نے کہا۔
"مجھے کشمیری سیب پسند ہیں۔ تمہارے گالوں جیسے" محسن بولا۔
میں نے کہا "اور مجھے رس کے بھرے نرم اور لال شہتوت جیسے لب...."
رابعہ یوں باہر دیکھتی رہی جیسے اس نے کچھ سُنا ہی نہیں۔
شہر کا گنجان آباد مرکزی علاقہ ختم ہونے کے بعد رہائشی علاقہ شروع ہوا جہاں متمول لوگوں کی محل جیسی کوٹھیاں تھیں۔ زمین پر حدِ نگاہ تک سبزہ وگل کا شوخ رنگ تھا۔ درختوں کی بھرپور ہریالی تھی اور اوپر آسمان کی نیلاہٹ۔ یوں لگتا تھا جیسے کائنات انہی دو رنگوں میں لپٹی ہوئی ہے۔ ان کے درمیان قدیم رومن اور گوتھک طرز کے سفید شالے (CHALET) نظر آتے تھے۔ جدید رنگوں کے حسن آفریں امتزاج کا نمونہ نئی تعمیرات تھیں۔ اپارٹمنٹس تھے اور ٹاؤن ہاؤس تھے جن کو دیکھ کر غالب کا شعر یاد آتا تھا کہ۔ اُگ رہا ہے درودیوار پر سبزہ غالب۔ چھت کی ہر منڈیر پر' ہر کھڑکی دروازے

کے چھجّے پر ہر ستون اور محراب پر گملے رکھے ہوئے تھے یا آویزاں تھے اور بیلیں چڑھادی گئی تھیں۔ رنگ، خوشبو، فیشن اور آرٹ۔ شاید فرانس سے زیادہ احساسِ جمال کی فراوانی کسی قوم کے مزاج میں نہیں۔

بالآخر منزل آگئی۔ محسن نے ایک سہ منزلہ عمارت کے احاطے میں داخل ہوکے گاڑی کو وہیں کھڑا کیا جہاں کوئی اور گاڑی پارک نہیں کی جاسکتی تھی۔ ہر مکین کے لیے کار کی جگہ مخصوص تھی جس کا کرایہ وہ الگ دیتا تھا۔ مجھے چاروں طرف ایک ہی رُخ میں برابر فاصلے پر کھڑی ہوئی دو درجن سے زائد کاریں نظر آئیں لیکن ان کے درمیان اس سے زیادہ جگہ خالی پڑی تھی۔ بیشتر لوگ باہر گئے ہوئے تھے مگر ان کو یہ اطمینان تھا کہ واپسی پر انہیں اپنی گاڑی کھڑی کرنے کی جگہ پر دوسری گاڑی نظر نہیں آئے گی۔ تمام بڑے شہروں میں جگہ کی قلت نے سنگین مسائل پیدا کردیے ہیں۔ انسانوں کے لیے بھی اور کاروں کے لیے بھی۔

"تو یہ ہے جناب ہمارا مشترکہ غریب خانہ!" محسن بولا "مگر اس میں صرف غریب نہیں رہتے۔"

رابعہ نے کہا "اس کا اندازہ تو کاریں دیکھ کر ہو رہا ہے۔"

"کار تو یہاں سائیکل کی طرح ہے۔ قلی اور مزدور بھی گاڑی کے بغیر ڈیوٹی پر حاضر نہیں ہوسکتا۔"

"وقت پر حاضر نہیں ہوسکتا" میں نے تصحیح کی۔

محسن نے ہمارا سوٹ کیس نکال لیا "لیٹ آنے کا یہاں کوئی تصور نہیں، آپ عین مرکزِ شہر میں رہتے ہوں یا سو کلومیٹر دور۔ وقت پر پہنچنا ہر شخص کی ذاتی ذمّے داری ہے۔ اس کے لیے وہ اپنے وقت کا حساب خود رکھے کہ کتنی دیر گاڑی میں بس یا انڈر گراؤنڈ ریلوے میں لگے گی۔ بس یا ٹرین لیٹ نہیں ہوسکتی۔ نانی کے مرجانے یا بیوی کی بیماری کا عذر یہاں نہیں چلتا۔"

"کوئی چلاتا بھی نہیں۔ سب سے اچھی بات یہ ہے کہ یہاں منافقت نہیں ملتی۔ آپ کی غلطی ہوگی تو منہ پر کہہ دیں گے۔ اپنی ہوگی تو اعتراف کرلیں گے اور معذرت۔ جھوٹی انا کوئی چیز نہیں۔۔۔" محسن بولا۔

"بس کرو محسن۔ تمہاری باتوں سے تو ایسا لگتا ہے جیسے یہاں صرف فرشتے بستے ہیں۔ یہ جو اتنے اخلاقی اور قانونی جرائم ہوتے ہیں۔۔۔" رابعہ نے کہا۔

"بھئی میرا مطلب تھا عام طور پر۔۔۔ جیسی منافقت ہمارے قومی مزاج میں شامل ہے۔ ایسا یہاں نہیں ہے۔ معاشرتی برائیاں اور جرائم یہاں بھی ہیں ورنہ پولیس اور عدالتی نظام کیوں ہوتا" محسن نے پارکنگ ایریا کے میدان سے گزرتے ہوئے اوپر جانے والی سیڑھیوں کا رخ کیا۔

آتے جاتے ہمیں بہت سے لوگ ملے مگر کسی نے ہماری طرف آنکھ اٹھاکے بھی نہیں دیکھا۔ ایک اچھی خاصی حسین اور جوان لڑکی خاصی قابلِ اعتراض حالت میں عین اس جگہ لیٹی ہوئی تھی جہاں سے زینہ شروع ہوتا تھا۔ وہ چرس یا پھر ایل ایس ڈی کے زیرِ اثر میں تھی۔ اس کی طرف بھی کوئی متوجہ نہیں تھا۔ اپنے کام سے کام رکھنے کی عادت کا ایک سفاک نمونہ میں نے لندن میں دیکھا تھا جب میں اور محسن ایک بک شاپ میں تھے۔ اونچے لمبے شیلف والی دکانوں میں کتابیں دیکھتے دیکھتے ایک شخص ہارٹ فیل ہونے سے مرگیا تھا۔ باقی لوگ "ایکس کیوز می" کہہ کے اسے پھلانگ جاتے تھے۔ یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ جو مرچکا ہے اس سے معذرت کرنا بے سود ہے۔ جب میں نے اور محسن نے کاؤنٹر پر بتایا تو ہمارا خیال تھا سننے والا اچھل پڑے گا یا خوف سے پیلا پڑجائے گا مگر اس نے رقم لوٹاتے ہوئے صرف اتنا کہا کہ اچھا میں پولیس کو بتاتا ہوں۔ بس یا ٹرین میں کوئی مرجائے تو کسی پر ذرا اثر نہیں ہوتا۔ وہ سمجھتے ہیں جب بس یا ٹرین اپنے ٹرمینل پر پہنچے گی تو مسافروں کے چھوڑے ہوئے اخبارات اور دیگر چیزوں کے ساتھ لاش کو بھی اٹھالیا جائے گا۔

گیٹ پر کھڑا ہوا چوکیدار یا JANITOR بظاہر بے نیاز لگتا تھا لیکن ادائے فرض کے معاملے میں پوری طرح مستعد تھا۔ اس نے ایک شخص کو روک کے کہا "آپ نے کمرے کی چابی کاؤنٹر پر نہیں دی ہے" اور اس شخص نے سرہلا کے کہا 'میں بھول گیا تھا؟' محسن نے بھی کمرے کی چابی کاؤنٹر سے ہی لی تھی جہاں ایک بھینس نما عورت ... میں مصروف تھی۔ وہ بھینس کے رنگ اور وزن کی عورت نما ... اسٹول پر بیٹھی چیونگم کو دانت پیسنے کے انداز میں چبارہی تھی۔

"یہ داڑھی والا اور یہ لڑکی کون ہیں؟" اس نے سوال کیا۔

"میاں بیوی۔۔۔ اور میرے مہمان، کوئی اعتراض؟" محسن بولا۔

"تم خود مہمان تھے۔ اب تمہارے مہمان آگئے پھر ان کے مہمان آجائیں گے تو ذمّے دار کون ہوگا؟"

"وہی جس نے ہماری ذمّے داری قبول کی ہے۔ کس قانون کی رو سے مہمان پر یہ پابندی ہے کہ وہ مہمان نہ لائے۔"

"قانون کی بات مت کرو۔ جہنم میں جاؤ" اس نے چابی پھینکتے ہوئے کہا۔

"وہاں تو ہم سب پہلے ہی ہیں" محسن نے کہا۔

میں نے فرنچ میں کہا "تمہیں یا کسی اور کو ہم سے شکایت نہیں ہوگی۔"

اس نے غرا کے کہا "میں تو مجبور ہوں۔ تمہیں فرنچ بولنے کی کون سی مجبوری لاحق ہے؟"

"مجبوری یہ ہے کہ میں فرانس میں ہوں اور مجھے دنیا کے ہر خطے کی زبان نہیں آتی مثلاً تمہاری مادری زبان۔"

محسن نے مجھے کھینچ لیا "چھوڑو اس کالی بلا کو۔ چمٹ جائے گی تو جان نہیں چھوڑے گی۔ اس سے خوش اخلاقی کا مظاہرہ مہنگا پڑتا ہے۔"

اوپر فرسٹ فلور تک جاتے ہوئے ہمارے پاس سے ایک جوڑا گزرا جس سے جسم سے کوڑے کرکٹ اور مہینوں سے جمع ہونے والے میل کی بُو کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ پھر ایک بے ہنگم جوڑا ملا۔ غالباً انہوں نے ایک دوسرے کے کپڑے پہن لیے تھے۔ فرطِ جذبات میں وہ ہر زینے پر رک کر ایک دوسرے کو چومتے تھے۔ رابعہ اور گل کو سخت وحشت ہورہی تھی۔

"محسن۔ یہ تم کہاں لے آئے ہو ہمیں۔ اتنی بے ہودہ جگہ ہے" رابعہ نے کہا۔

محسن نے فوراً تردید کی "تمہیں کیا معلوم۔ اس جگہ کی ساکھ اچھی ہے۔ یہ جگہ شریفانہ سمجھی جاتی ہے۔ یہاں کی انتظامیہ سخت ہے۔ یہاں جُوا نہیں ہوتا۔ کوئی لٹتا نہیں۔ کبھی ہنگامہ نہیں ہوتا۔ یعنی ایسا کہ پولیس آئے۔ کرائے معقول ہیں اور انتظام اچھا ہے اور کیا چاہیے؟"

اس نے ایک کمرے کا دروازہ کھولا اور ہمیں اندر تشریف لے جانے کی دعوت دی "پہلے آپ۔۔۔"

کمرے کی لمبائی دس فٹ اور چوڑائی بارہ فٹ ہوگی۔ لمبائی کے رُخ اس میں اوپر تلے دو بیڈ بنے ہوئے تھے جن کو BUNKERS کہا جاتا ہے۔ ضرورت پڑنے پر تختے اوپر نیچے کرکے تیسرا بیڈ بھی فٹ کیا جاسکتا تھا لیکن ایک دیوار پر لکھے ہوئے ضوابط کی رو سے یہاں تیسرے شخص کو ٹھہرنے کی اجازت نہیں تھی۔ یہاں کھانا پکانے کے لیے ہیٹر یا کسی قسم کا چولھا جلانا منع تھا۔ کپڑے استری کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ جُوا کھلانا، شراب پی کے ہنگامہ کرنا۔ رات گیارہ بجے کے بعد شور کرنا یا اونچی آواز میں گانے سننا منع تھا۔ آخری تنبیہہ تھی کہ "خیال رکھیے۔ یہاں صرف آپ ہی نہیں رہتے۔" یا باالفاظ دیگر کمرے کے اندر آپ سب کچھ کرنے کے لیے آزاد ہیں بشرطیکہ دوسروں کی آزادی میں مخل نہ ہوں۔

ہر بیڈ کے سرہانے کی طرف تین فٹ چوڑا اور دو فٹ اونچا سلائڈنگ دروازے والا خانہ سا تھا جس میں آپ باآسانی اپنا سامان رکھ سکتے تھے۔ کپڑے جوتے اور بریف کیس یا چھوٹا سوٹ کیس۔ اس کے اوپر دو فٹ لمبی ٹیوب لائٹ تھی جس کی روشنی صرف نیچے لیٹے ہوئے شخص تک محدود رہتی تھی کہ وہ سونے سے پہلے کتاب، رسالہ پڑھنے کے مرض میں مبتلا ہو تو دوسروں کو نہ جگائے۔

نوفٹ بائی نوفٹ کی خالی جگہ کو بھی بڑے سلیقے سے استعمال کیا گیا تھا۔ اس میں قالین کے ساتھ کونے میں دو دیواروں سے ملا ہوا صوفہ سیٹ تھا جس پر چھ افراد بیٹھ سکتے تھے۔ دوسرے کونے میں باتھ روم کا دروازہ تھا۔ بیڈ اور صوفے کے مقابل کی دیواروں پر گھومنے والے فین تھے۔ مجموعی طور پر یہ آرام دہ کمرا تھا۔ باتھ روم چھوٹا ضرور تھا مگر صاف ستھرا تھا۔

بیڈ روم کی سائڈ پر ایک چھوٹا سا ٹی وی موجود تھا اور اس پر مجھے کتاب کی طرح کھلے ہوئے فریم میں دو تصویریں نظر آئیں۔ ایک عمر رسیدہ شخص کی جس نے خاصا پرانا ڈھیلا ڈھالا سوٹ پہن رکھا تھا اور جوان عورت کی۔ جس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہوتا تھا کہ کم سے کم لباس میں زیادہ سے زیادہ خود نمائی کے باوجود اسے کچھ ملال ہے کہ وہ معاشرتی حیوان کیوں ہے۔ صرف حیوان کیوں نہیں۔

چند اور چیزوں سے میں نے اندازہ کیا کہ اس کمرے میں زیادہ اسباب انہی کا ہے جو ہنی مون منارہے تھے۔ میں نے محسن سے پوچھا "کیا یہی ہے وہ نوبیاہتا جوڑا۔"

"ہاں۔ عمر کے فرق کو نظرانداز کردو۔"

میں نے کہا "سارا کھیل جذبات کا ہے۔"

محسن بولا "جی نہیں۔ سارا کھیل پیسے کا ہے۔"

رابعہ نے کہا "ہم چار افراد اس ایک کمرے میں نہیں رہ سکتے۔"

"چالاک لوگ سب کچھ کرتے ہیں مگر انتظامیہ بھی سارے ہتھکنڈوں سے واقف ہے۔ ایک دو دن تو گزر ہی جاتے ہیں پھر اچانک پولیس وارنٹ کے ساتھ چھاپا مارتی ہے اور کسی کمرے سے دو کے بجائے تین چار کو برآمد کرلیتی ہے۔ دراصل یہاں ہر آدمی کے لیے کم سے کم جگہ مقرر ہے اور یہ کمرا دو افراد کے لیے ہی بنایا گیا ہے۔ تین ہوں تو قانون کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ اس پر جرمانہ ہوتا ہے ورنہ جیل۔ کچھ لوگ کسی مسافر کو سستی جگہ فراہم کرنے کے بہانے ساتھ لے آتے ہیں۔"

"جیسے تم ہمیں لے آئے ہو" میں نے کہا۔

"جی نہیں۔ ایک کمرا اور ہے" محسن بولا "یہ خاتون پہلے اس میں رہتی تھیں اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ۔"

"پھر کیا ان کا جھگڑا ہوگیا؟"

"نہیں۔ جھگڑا ہوا تھا بڑی بی کا اور بڑے میاں کا۔ سب بچوں کی شادیاں کرچکے تھے اور خود لاوارث ہوگئے تھے۔ تیس سال بعد طلاق ہوگئی۔ بڑے میاں نے ایک سال کے لیے لڑکی سے شادی کرلی اور بڑی بی نے اس کے بوائے فرینڈ سے۔ باقاعدہ معاہدے کے تحت۔"

میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا "ایک سال کا معاہدہ۔ یہ کیا بات ہوئی؟"

"بات کچھ یوں ہے کہ نوجوان لڑکی اور اس کا بوائے فرینڈ مالی پریشانی کا شکار تھے۔ آمدنی کم تھی اس لیے نہ گھر بناسکتے تھے اور نہ شادی کرسکتے تھے۔ باہمی رضامندی سے ایک ساتھ رہتے تھے مگر ان حالات میں بچّوں کا روگ پالنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ ان کو حالات نے ایک موقع فراہم کردیا۔ بڈھے بڑھیا کے پاس پیسے کی کمی نہیں تھی۔ لڑکی نے اپنے بوائے فرینڈ کی مرضی سے خود بڈھے کو پیشکش کی کہ وہ چاہے تو ایک معاہدے کے تحت سال بھر کے لیے وہ اس کی بیوی بن سکتی ہے۔ بڈھے نے تمام شرائط قبول کرلیں۔ وہ نئی بیوی کے تمام اخراجات کا ذمّے دار ہوگیا اور اسے ایک معقول لگی بندھی رقم ہر ماہ ادا کرنے لگا۔ پیسہ اس کے پاس بہت تھا۔

ایسی ہی پیشکش دل شکستہ اور غم زدہ بڑی بی کو لڑکے کی طرف سے ہوئی تو انہوں نے بھی فوراً معاہدہ کرلیا۔"

"یعنی اس لڑکے نے اپنی ماں کے برابر عمر کی لڑکی سے شادی کرلی۔"

"بڈھے نے بھی تو بیٹی کی عمر کی لڑکی سے شادی کی تھی۔" محسن بولا "معاہدے کی شرائط تقریباً یکساں تھیں۔ جو لگی بندھی رقم نوجوان لڑکے اور لڑکی کو ملے گی اسے وہ ایک مشترکہ اکاؤنٹ میں جمع کریں گے اور انہیں امید ہے کہ سال بھر بعد ان کے سب دلدّر دور ہوجائیں گے۔ وہ ایک کمرے کا اپارٹمنٹ خرید لیں گے تو پھر ایک دوسرے سے شادی بھی کرلیں گے۔"

"اور اگر سال بھر کی پس انداز کی ہوئی رقم کم پڑ گئی؟"

"تو معاہدے میں مزید چھ مہینے سال کی توسیع ہوجائے گی۔ دو سال میں جوانی کی ٹرین تو نہیں نکلی جارہی ہے۔"

رابعہ نے کانوں کو ہاتھ لگایا "حد ہے بے غیرتی کی۔"

"یہاں غیرت کا تصور ذرا مختلف ہے خاتون۔ یہ غیر جذباتی انداز میں محبت کرنا بھی جانتے ہیں اور نفرت کرنا بھی۔ اس معاہدے سے چاروں خوش ہیں تو کسی اور کو پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ معاہدے کے ختم ہونے کے بعد بڈھا بڑھیا پھر ایک ہوجائیں۔"

گل نے اپنا سر پکڑ لیا "اور ان کے بچے۔"

"وہ کہیں گے کہ بھئی ابا اماں کی اپنی زندگی ہے۔ جیسے چاہیں جہاں چاہیں خوش رہیں۔ کیا بھروسا ہے زندگانی کا۔"

میں نے کہا "ایسی باتوں سے خواتین کو ڈی مورالائز مت کر، یہ بتا کہ یہاں کھانے پینے کا بھی کوئی بندوبست ہے یا نہیں۔"

"گراؤنڈ فلور پر کیفے ہے۔ باہر کے مقابلے میں سستا ہے۔ بلڈنگ کا مالک کرائے پر اکتفا کرتا ہے۔ کھانے پینے کی چیزیں لاگت پر فراہم کرتا ہے۔ نہ نفع نہ نقصان۔"

"اور معیار!" رابعہ نے کہا۔

"معیار تو وزارتِ خوراک اور وزارتِ صحت مقرر کرتا ہے۔ ناقص ہو ہی نہیں سکتا۔ باقی آپ کی جیب پر منحصر ہے کہ آپ کیا کھاتے ہیں۔ برگر یہاں بھی ملتا ہے، میکڈانلڈ میں بھی۔ پیرس میں دنیا بھر کے کھانے ملتے ہیں۔ روڈ سائڈ کیفے سے فائیو اسٹار ہوٹل تک ہر جگہ ملنے والی چیز کی قیمت الگ ہے۔ آپ فون کرکے اٹالین پیزا منگوا سکتے ہیں یہاں۔ یا سکیا تک کی تلخ۔"

"اچھا یار، ابھی تو نیچے جا کے ہی کچھ کھا پی آئیں۔"

"پہلے نہا دھو کے فریش ہوجاؤ۔" محسن نے مشورہ دیا "گل، تم لے جاؤ رابعہ کو دوسرے کمرے میں۔"

"کہاں ہے یہ دوسرا کمرا؟" رابعہ نے کہا۔

"سامنے ہی ہے۔ ڈرو نہیں" گل نے کہا "آؤ میرے ساتھ۔"

پیرس سے رابعہ اور گل کے ابتدائی تعارف کا یہ تجربہ اس

اعتبار سے خوش گوار نہیں تھا کہ وہ اپنی اخلاقی سوچ کے معیار
۔ فیصد مشرقی تھیں لیکن بعد میں انہوں نے دیکھا اور تسلیم
ان اخلاقی قدروں سے قطع نظر اس قوم کے مزاج اور کردار
تقلید کے قابلِ رشک پہلو ہیں۔ اور من حیث القوم وہ قائد
کے اتحاد، ایمان اور یقینِ محکم کے فلسفے پر ہم سے زیادہ عمل
ہیں۔

دوسرا کمرا سامنے والی قطار میں تھوڑا سا دائیں جانب
رابعہ اور گل نے وہاں ڈیرا جمالیا۔ ان کے ساتھ بوبی بھی
اسے نیچے والے بنکر میں بیڈ پر سلا کے خود انہوں نے اوپر
فیصلہ کیا۔

جب میں اور محسن اکٹھے ہوئے تو میں نے کہا "اپنے ٹیرو
صاحب، یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہم پیرس میں ہیں۔ رات
کے صرف دس بجے ہیں اور ہم اس کمرے میں بند ہوگئے ہیں
سونے کے لیے، ایسا تو لاہور میں بھی نہیں ہوتا تھا۔ باہر رات
شباب پر آئی ہے۔"

محسن بولا "پیرس کی جوانی رات ہی کو انگڑائی لے کے بیدار
ہوتی ہے۔ اس کے دن جذبات سے عاری مشینی اور بے رنگ
گزرتے ہیں۔"

"مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے میں بوڑھا ہوچکا ہوں اور پنڈداد
خان میں ہوں۔" میں نے کہا "جب ہم لندن سے پیرس آتے تھے
سونے کے لیے؟"

محسن نے آہ بھری "اس وقت کو یاد دلا کے دل مت دکھا
خان۔"

میں نے کہا "یہ ابھی کل کی بات لگتی ہے۔ مجھے سب یاد
ذرا ذرا۔ کوئی ہمارے بچپن کی بات نہیں ہے اور ہم بچپن بر
نہیں ہیں۔"

"پھر کیا خیال ہے۔ سٹک جائیں۔"

میں اُٹھ کھڑا ہوا "چل یار۔ سونا تو ہمیں یہاں بھی نہ
باتیں باہر گھومتے پھرتے کی جاسکتی ہیں۔"

"کیا خیال ہے انہیں بتا کے جائیں؟"

"نہیں یار۔ وہ کہیں گی ہم بھی چلتے ہیں لیکن ہم تو پرانے
عادی آوارہ گرد ہیں۔ وہ ہمارا ساتھ نہیں دے پائیں گی۔ تو
جائیں گی تو ہماری تفریح بھی ادھوری رہ جائے گی۔ اس
علاوہ... ان نیک بیبیوں کا ہر جگہ جانا ٹھیک نہیں۔"

محسن ہنسا اور ہم دروازے کو مقفل کرکے نکل گئے
میں اس وقت بھی ایک خاتون تشریف فرما تھیں۔ کمرے کی
لیتے ہوئے اس نے ہماری طرف نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھا اور
ناول پڑھنے میں مصروف رہی۔ وہ جوان ضرور تھی مگر نسوانی
سے محروم تھی۔ شاید نسوانی جذبات سے بھی محروم تھی۔
خدوخال کے باعث وہ کچھ درمیان کی چیز لگتی تھی۔

محسن نے گاڑی نکالی اور ہم ایک بار پھر پیرس کی سڑکوں

پھیلی ہوئی رنگ و نور میں ڈوبی ہوئی خوشبو سے مہکتی اور مدہوش قہقہوں سے کھنکتی رات کے ساتھ پرانی یادیں تازہ کرنے نکل کھڑے ہوئے۔ رات بھر آباد رہنے والے زندگی کے ہنگاموں سے معمور اور پُررونق مے خانے۔ کیفے اور نائٹ کلب سب ہمارے دیکھے بھالے تھے۔ آج ہم اپنے آپ سے بھی شرمندہ نہیں تھے کہ لندن یا پیرس کے کسی میخانے میں دوست احباب کے ساتھ جانا پڑا تو ہم نے ہر ترغیب کے خلاف مزاحمت میں کامیابی حاصل کی۔ نہ ہم دوستوں کے اصرار سے مجبور ہوئے، نہ کسی محبوبۂ دلنواز کسی بُتِ کافر اور کسی زہد شکن رفیقِ تنہائی کی خواہش کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا۔ غیر مہذب، دقیانوسی اور قابلِ رحم حد تک بے ذوق کہلائے۔ بعض اوقات یہی شرطِ وصل ٹھہری تو ہم نے بصدِ حسرت و یاس استعفیٰ دینا منظور کرلیا لیکن ہمارا ہاتھ جام کی طرف نہ بڑھا۔ باقی سب عمر کی رنگینی اور ماحول کی بے خود کردینے والی فضا کا نتیجہ تھا کہ ہم دامنِ پارسائی کو بے داغ رکھنے میں ناکام رہے۔ ہم بہرحال فرشتے نہیں تھے۔

اس رات ہم نے کچھ وقت ایک نائٹ کلب کی ہیجان خیز فضا میں گزارا۔ پھر لیٹن کوارٹرز کے ایک مشہور کافی ہاؤس میں گئے۔ صبح تک ہم نے تین جگہ کافی پی۔ ہر جگہ کسی نہ کسی پہلو سے یادگار تھی۔ باقی وقت ہم سڑکوں پر گاڑی میں خراماں خراماں پھرتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔

پہلے میں نے اسے پیرس پہنچنے کی وجہ بتائی اور وہ سب واقعات اسے تفصیل سے سُنائے جو اس فیصلے کا سبب بنے تھے۔ میں نے اسے یہ بھی بتادیا کہ میں نے رابعہ سے نکاح پڑھوالیا تھا۔

وہ دم بخود رہ گیا "تم نے نکاح کرلیا خاموشی سے۔ کسی کو بتائے بغیر اچانک۔"

میں نے کہا "ابھی تک تیرے سوا یہ بات کوئی بھی نہیں جانتا۔"

"مجھے بھی بتانے کی کیا ضرورت تھی۔ آخر ایسی کیا آفت آرہی تھی۔"

میں نے کہا "آفت آسکتی تھی۔ میں رابعہ کے ساتھ دو دن ایک ہوٹل میں رہا۔ پھر دو راتیں ایک فلیٹ میں گزریں۔ خدا کا شکر ہے کہ مجھے شیطان نے ورغلایا نہیں مگر جب رابعہ نے خود کہا کہ ہمارا ایسے ساتھ رہنا اخلاقی اور شرعی اعتبار سے غلط ہے اور خطرناک بھی۔ تو میں نے یہی بہتر سمجھا کہ اسے احساسِ جرم کی خلش سے نجات دلادوں۔"

"اتنا عرصہ ساتھ گزارنے کے باوجود اسے تجھ پر بھروسا نہیں تھا؟"

میں نے کہا "بھروسا نہ ہوتا تو وہ میرے ساتھ کیوں آتی۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تو اتنا عرصہ ساتھ رہنے کے بعد مجھے اپنے جذبات پر کنٹرول رکھنا آگیا ہے۔ میں نے اس فطری بشری کمزوری پر قابو پالیا تھا۔ میری مثال بینک کے اس کیشیئر کی ہے جو سارا دن لاکھوں

کروڑوں وصول کرتا ہے اور بانٹتا ہے۔ اس کی درازیں نوٹوں سے بھری رہتی ہیں لیکن اس دولت کو وہ اپنا نہیں سمجھتا۔ اسے خیال بھی نہیں آتا کہ اس میں سے کچھ خرچ کرے۔ خواہشات تو اس کی بھی لامحدود ہوتی ہیں۔ بعض اوقات مالی پریشانی بھی ہوتی ہے اور یہ خیال بھی آتا ہے کہ اتنی دولت ہو تو وہ عیش کرسکتا ہے لیکن وہ ایسا کرتا نہیں۔ وہ جتنی رقم گھر سے جیب میں رکھ کے لاتا ہے اس سے زیادہ خرچ نہیں کرتا۔ ایک عادت سی ہوجاتی ہے اسے نوٹوں کو کاغذ کے پُرزے سمجھنے کی مگر اس کو کہیں سے لاکھوں مل جائیں تو جو اس کے اپنے ہوں تو پھر وہ دل کھول کے خرچ کرتا ہے۔ کچھ ایسی ہی بات رابعہ کے ساتھ تھی۔ ابھی تک میں اسے اپنا نہیں سمجھتا۔ وہ ایک امانت ہے جس میں خیانت کا مرتکب ہونے کا مجھے خیال بھی نہیں آتا مگر یار، آدمی کو بڑا بول نہیں بولنا چاہیے۔ عورت، مرد کا ساتھ بجلی کے دو تاروں جیسا ہے اور ان کے جذبات پیٹرول ٹینک کی طرح۔ حادثاتی طور پر شارٹ سرکٹ ہوجانے کے امکانات کو مسترد نہیں کیا جاسکتا۔ ایک اسپارک سے وہ آگ بھڑک سکتی ہے جو سب کچھ جلا کے خاکستر کردے۔"

"یہ رسک تو ہر وقت اور ہر جگہ تھا۔"

"ہاں۔ مگر ایک وقت آیا کہ رابعہ کے لیے رسک بڑھ گیا۔ اس نے ایک حفاظتی یا احتیاطی تدبیر کی تو کیا غلط کیا۔"

"یار فرض کر تجھ سے کوئی لغزش ہوجاتی تو کیا رابعہ تجھے معاف نہ کرتی؟"

"معاف نہ کرنے کا کیا سوال۔ میں فرشتہ ہوں یا شیطان۔ اسے اپنی زندگی میرے ہی ساتھ گزارنی ہے۔ وہ سب سمجھتی ہے۔ کوئی ایسی ویسی بات ہوجاتی تو اس غلطی کا کفارہ بھی ہم ادا کرتے۔ ہم شادی کرلیتے لیکن کیا تمام عمر احساسِ گناہ کی خلش کو دل سے نکال پاتے۔ اب رابعہ کا اعتماد مجھ پر پہلے سے زیادہ ہوگیا ہے کیونکہ نکاح کے بعد بھی میرا رویّہ بدلا نہیں ہے۔ ہماری حقیقی ازدواجی زندگی اسی دن شروع ہوگی جس دن میں سب کے سامنے اس سے شادی کروں گا اور وہ دلہن بن کے میرے ساتھ میرے گھر جائے گی۔ اس دن کے انتظار میں ہم خوابوں کی راہ گزر پر چل رہے ہیں۔ نہ میں انتظار کی لذت سے محروم ہونا چاہتا ہوں اور نہ تعبیرِ خواب کی مسرت سے۔ تجھ سے میں نے آج تک کچھ نہیں چھپایا۔ پھر یہ بات کیسے چھپاتا لیکن رابعہ کو معلوم ہوگا تو اسے مایوسی ہوگی۔"

"مایوسی تو سب کو ہوگی۔"

"ہاں۔ اس لیے کسی کو کچھ نہ بتانا ہی بہتر ہے۔ یہ نکاح تو خود حفاظتی کے لیے ہے۔ اس ریوالور کی طرح جو ہم ساتھ لیے پھرتے ہیں مگر اعلانیہ نہیں۔"

"چل ٹھیک ہے یار۔ جب میاں بیوی راضی تو کیا کریں گے قاضی اور براتی" محسن نے کہا اور گاڑی روک لی۔

زیبرا کراسنگ پر سے ایک نوجوان جوڑا گزر رہا تھا۔ ان کے

لڑکھڑاتے قدم بتاتے تھے کہ نشۂ عشق کو خمارِ مے نے دوچند کردیا ہے۔ عین سڑک کے وسط میں رک کے وہ ایسے لپٹے جیسے ایک دوسرے سے پھر کبھی نہیں ملیں گے۔۔۔۔ محسن نے گاڑی کو ان کے پیچھے سے نکال لیا۔ رات کے دو بجے ہم پیرس کے ایک اور مشہور کیفے میں جا بیٹھے۔ الہ دین کے جادوئی چراغ والے غار کی طرح اس کیفے کا ماحول بھی طلسماتی تھا اور مصنوعی ہونے کے باوجود اندر کی دیواروں کو اور چھت کو دیکھ کے یقین نہیں آتا تھا کہ یہ اصلی چٹانیں نہیں ہیں۔ اس کا نام بھی THE CAVE تھا۔ ویٹریس بھی زمانہ قبل از تاریخ کی جنگلی لڑکی نظر آتی تھی۔ اس نے جس کپڑے کو بدن پر لپیٹ رکھا تھا وہ کسی جانور کی کھال جیسا تھا۔ ممکن ہے وہ اصلی کھال ہی ہو لیکن جانور بہت چھوٹا تھا۔ کھال نے بڑی مشکل سے نصف سینے سے کولھوں تک اس کے جسم کو جتنا چھپایا تھا اس سے زیادہ عیاں کردیا تھا۔ یہ کم لباسی کا آرٹ تھا جو دیکھنے والے کے تصور کو بیدار کرتا تھا کہ وہ نامکمل کو مکمل دیکھے اور مستور کو غیر مستور۔

کافی منگوانے کے بعد میں نے کہا "تمہاری اور گل کی پیرس ائرپورٹ پر موجودگی کے راز پر ابھی تک پردہ پڑا ہوا ہے۔"

"میں عرض کرچکا ہوں کہ اسے آپ ٹیلی پیتھی کا اعجاز سمجھیں۔ جس آوازِ غیب نے آپ سے کہا کہ لندن براستہ پیرس جا۔ اس نے مجھ سے چند دن پہلے کہا کہ پیرس پہنچ کے اپنے یار کا انتظار کر۔"

میں نے کہا "آپ بکواس فرماتے ہیں۔ لاہور میں کچھ اور کہانی مشہور ہے۔"

محسن نے کہا "وہ بھی سچ ہے۔"

"یہ بھی سچ ہے وہ بھی سچ ہے۔۔۔؟"

محسن بولا "اس گلاس کی مثال سامنے رکھ۔ یہ آدھا بھرا ہوا ہے، یہ سچ ہے۔ یہ آدھا خالی ہے۔ یہ بھی سچ ہے۔"

میں نے کہا "کیا واقعی گل کو بچے کی اتنی ہی خواہش ہے۔"

"خواہش پر کس کو اختیار ہے اور عورت کے خمیر میں ماتا اسی طرح شامل ہے۔ جیسے اس کافی میں چینی۔ اس کے بغیر یہ سیاہ تلخ مشروب کون پی سکتا ہے؟"

"میں۔۔۔۔ اور بہت سے لوگ بلیک کافی پیتے ہیں شکر کے بغیر۔"

"رائٹ۔ گل بھی پی رہی ہے۔" محسن بولا "اس نے ایک تلخ حقیقت کو اسی طرح قبول کرلیا ہے۔ وہ جانتی ہے کہ اب خواہش لاحاصل ہے۔"

"پھر یہ کیا بے سروپا بات پھیلی ہوئی ہے کہ تم گل کے ساتھ کسی پیر فقیر کی خدمت میں حاضر ہونے اور کوئی جادو اثر نقش یا تعویذ لینے گئے ہو۔"

"مصلحت کا تقاضا تھا کہ ایسی بات مشہور کی جائے۔ اصل بات کا علم خود گل کو بھی نہیں۔"

میں چوکنا ہوگیا "وہ کیا بات ہے؟"

"چوہدری دلاور کے گرگوں نے میرے ٹھکانے کا سراغ لگا[illegible] تھا۔ بوبی اور گل کی سلامتی کے خیال سے میں انتہائی محتاط تھا۔ آتے جاتے میں ہر طرف دیکھتا تھا کہ کوئی میرے تعاقب میں تو نہیں ہے۔ میں راستے بدل لیتا تھا اور کبھی ایک ہی وقت پر گھر سے نہیں نکلتا تھا۔ میں بزدل اور خود غرض ہوتا جارہا تھا۔ دراصل ایک بار بیوی اور بچے کو قربان کردینے کے بعد میں دیوانگی کی سرحد سے لوٹ آیا تھا۔ خدانخواستہ ایسا دوسری بار ہوجاتا تو میں موت کی سرحد عبور کرجاتا۔ گل نے مجھے دوسری زندگی دی تھی اور بوبی نے گل کو زندہ رہنے کی خواہش کا جواز فراہم کیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ کر[illegible] نے کہاں سے میرا پیچھا کیا۔ میں ایک دن گھر سے نکلا اور سڑک تک پہنچا ہی تھا کہ ایک ٹیکسی آگئی اور اس نے مجھے بٹھانے سے انکار بھی نہیں کیا۔ اس سے مجھے کیسے شک ہوسکتا تھا۔ شریف ٹیکسی ڈرائیور بھی ہوتے ہیں جو ہر وقت ہر جگہ جانے کے لیے تیار ہوجاتے ہیں۔ ٹیکسی نے مشکل سے سو گز کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ ایک جھٹکے سے انجن بند ہوگیا۔ میرا خیال ہے کہ ڈرائیور نے بریک لگا کے کلچ چھوڑ دیا تھا۔ میں آگے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ جھٹکے سے میرا سر ڈیش بورڈ پر لگتا مگر میں نے خود کو بچالیا۔ اسی وقت پیچھے کا دروازہ کھول کے دو آدمی بیٹھ گئے اور انہوں نے ریوالور نکال کے کہا کہ "پیچھے کیا ہے۔ آگے دیکھو" ڈرائیور نے ٹیکسی ا[illegible] اسٹارٹ کی تو میں نے سوچا کہ دروازہ کھول کے چلتی گاڑی سے باہر لڑھک جاؤں۔ رسک اس میں بھی تھا۔ میری گردن ٹوٹ جاتی [illegible] پیچھے آنے والی کوئی گاڑی میرے اوپر سے گزر جاتی۔ پھر بھی [illegible] بلامقابلہ شکست تسلیم کرنے سے بہتر تھا لیکن افسوس کی بات یہ [illegible] کیر خان کہ اس دروازے کو اندر سے نہیں کھولا جاسکتا تھا۔"

میں نے کہا "وہ پورا انتظام کرکے آئے تھے۔"

"ہاں، اور نہ جانے کب سے میرے لیے چشم براہ تھے۔"

"اگر تو پیچھے بیٹھ جاتا پھر؟"

"پھر کیا۔ دروازے کھولنے والے ہینڈل پیچھے بھی نہیں تھے [illegible] اندر بیٹھ جانے والے اس وقت تک باہر نہیں نکل سکتے تھے جب تک خود ڈرائیور نیچے اُتر کے ان کے لیے دروازے کو باہر سے نہ کھولے۔ میں نے ان سے کہا کہ "بہت خوب" میں نے مان لیا کہ ریوالور اصلی ہیں اور لوڈڈ ہیں۔ تم ان کا استعمال بھی جانتے ہو لیکن سوال یہ ہے کہ تم چاہتے کیا ہو؟" ان میں سے ایک نے کہا کہ "مجھے تمہاری بیوی چاہیے۔ میرا اس پر دل آگیا ہے" دوسرے نے کہا "مجھے وہ بچہ چاہیے جس میں تمہاری جان ہے۔" وہ مجھے اشتعال دلانا چاہتے تھے تاکہ انہیں مجھ پر حملہ کرنے کا موقع مل جائے۔ میں نے کہا "بچہ میرا نہیں ہے۔ اس کی خاطر میں جان نہیں دے سکتا۔ بیوی کا معاملہ ذرا مشکل ہے مگر نا ممکن نہیں۔ پہلے بھی ایک بیوی سے میں اتنی ہی محبت کرتا تھا مگر وہ مرگئی تو مجھے دوسری مل گئی۔ اللہ بڑا مسبب الاسباب ہے، تیسری دے دے گا۔" ان [illegible]

[illegible] ایک [illegible] میرے سر کے پچھلے حصے پر ریوالور مار دیا۔ میرا جواب کچھ بھی ہوتا اس نے کرنا یہی تھا۔"

"بزدلوں نے دھوکے سے وار کیا اور وہ بھی پیچھے آکے۔" میں نے افسوس سے سرہلایا "آپ نہتے بھی ہوں گے۔"

"میرے پاس توپ ہوتی تو بھی گولہ کیسے چلاتا۔ بس اس کے بعد دنیا میری نظر میں اندھیر ہوگئی۔ ہوش میں آنے کے بعد بھی یہ اندھیرا باقی رہا تو مجھے شک ہوا کہ شاید میں سر کی چوٹ سے اندھا ہوگیا ہوں۔ گھپ اندھیرے میں مجھے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ جب میں اس قابل ہوا کہ اٹھ سکوں تو میں نے اندھوں کی طرح ہاتھ بڑھا کے اس جگہ کا جائزہ لیا اور ٹٹول ٹٹول کے دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا گیا۔ قدم آگے بڑھانے سے پہلے میں فرش کو بھی محسوس کرتا تھا کہ میری راہ میں کوئی چیز تو حائل نہیں ہے۔ ایسا نہ ہو میں اچانک کسی گڑھے میں گرجاؤں یا چوہے دان جیسے شکنجے میں پاؤں پھنسالوں۔ یہ تو میں سمجھ گیا تھا کہ چوہدری دلاور کے سوا مجھے کوئی اور نہیں اٹھوا سکتا۔ شکاری دلاور جیسا ہو اور شکار میرے جیسا تو ذہن میں ہر قسم کے خدشات جنم لیتے ہیں۔ بہت جلد میں نے دریافت کرلیا کہ چاروں دیواریں ہر طرف سے سپاٹ ہیں اور دروازہ صرف ایک ہے جو باہر سے مقفل ہے اور انتہائی مضبوط ہے۔ کمرے میں ایک تخت بچھا ہوا تھا۔ ایک میز کرسی اور چند کتابوں کے ساتھ رکھا ہوا ٹیبل لیمپ یہ ثابت کرتے تھے کہ وہاں کوئی بجلی کی روشنی میں پڑھتا ہے۔ لیمپ کا پلگ ایک ساکٹ میں میز کے قریب ہی لگا ہوا تھا وہ کسی طرح بھی روشن نہیں ہوا۔ بجلی بند کردی گئی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ یہ کمرا زیرِ زمین ہے۔ لاہور کے پرانے شہر میں تہ خانے عام ہیں۔ تصدیق کے لیے میں نے کرسی پر چڑھ کے دیواروں پر ہاتھ پھیرا اور کسی روشندان کا سراغ لگانے کی کوشش کی۔ ایک دیوار کے اوپر والے حصے میں دو روشندان تھے۔ میں نے ٹیبل لیمپ کو الگ کیا اور میز کو کھینچ کر عین روشندان کے نیچے لے گیا۔ پھر میں نے لیمپ کی مدد سے روشندان کے وہ تختے توڑ دیے جو شیشوں کی جگہ لگائے گئے تھے۔ روشندان میں لمبائی کے رخ بہت موٹی لوہے کی سلاخ نہ ہوتی تو میں بہ آسانی اس میں سے گزر جاتا۔ باہر ایک وسیع احاطہ تھا جس میں پرانی گاڑیوں کا اسکریپ ڈھیر کی صورت میں پڑا تھا۔ احاطے میں بھی رات کا اندھیرا تھا۔"

میں نے کہا "قطع کلامی کی معافی چاہتا ہوں۔ آپ کو اٹھایا کس وقت گیا تھا؟"

محسن بولا "شام پانچ چھ بجے کا وقت تھا اور میں رابعہ کے آفس جانے کے لیے نکلا تھا۔"

"اور جب آپ نے باہر جھانک کے دنیا کو دیکھا تو۔۔۔۔"

"رات کے نو بجے تھے۔" محسن نے کہا "احاطے کی دیوار کے بعد آبادی تھی اور میں اسٹریٹ لائٹس کے علاوہ گھروں کو روشن دیکھ سکتا تھا۔ تھوڑی بہت روشنی احاطے میں بھی پہنچ رہی تھی اور جب روشندان میں تختے نہ رہے تو تھوڑے سے اجالے کی زکوۃ کے برابر روشنی کمرے میں بھی اُتری۔ اس سے اتنا فائدہ ہوا کہ میں اندھا نہیں رہا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے سے مجھے کمرے کی دیواریں نظر آنے لگیں۔ پھر میں نے دوسرے روشندان کے تختے بھی اکھاڑ دیے۔ پلائی ووڈ کے تختے زیادہ مضبوط نہیں تھے۔"

"ٹیبل لیمپ لکڑی کا تھا یا پیتل کا؟"

"پیتل کا ہوتا تو میں دروازہ بھی توڑ دیتا۔ دوسرا روشندان توڑتے ہوئے لوہے کی سلاخ پر لگنے سے ٹیبل لیمپ کے دو ٹکڑے ہوگئے۔ احاطے میں کوئی ہوتا تو اتنے شور سے متوجہ ضرور ہوتا۔ میں نے روشندان میں منہ ڈال کے آوازیں بھی دیں کہ کوئی ہے۔ ایکسیڈنٹ میں یا لمبی عمر کو پہنچ کے مرجانے والی کاروں کے زنگ خوردہ ڈھانچے، دروازے اور بونٹ۔ بیٹھی ہوئی سیٹوں اور پچکے ہوئے پرانے ٹائروں کے انبار کسی کباڑی کی ملکیت تھے اور وہ جانتا تھا کہ ان کی حفاظت کے لیے چوکیدار رکھنا فضول خرچی ہے۔ میری آواز اتنی پاٹ دار بھی نہیں تھی کہ احاطے کے پار بنے ہوئے مکانوں کی دیواروں سے گزر کے مکینوں کے کانوں تک پہنچ جاتی۔ میرا چیخنا چلانا رائگاں گیا۔ پھر بھی میں نے ہمت نہیں ہاری اور پہلے کرسی اٹھا کے دروازے پر مارتا رہا یہاں تک کہ کرسی کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے۔"

"پھر آپ نے میز اُٹھا کے ماری؟"

"نہیں، میں نے میز کا پایہ توڑنے کی کوشش کی پھر تخت کا پایہ الگ کرنے کے لیے زور آزمائی کی۔ اگر کوئی مجھے دیکھتا تو پاگل سمجھتا۔ اس کمرے میں اور کچھ بھی نہیں تھا۔ دراصل وہ تہ خانہ نہیں انڈرگراؤنڈ واٹر ٹینک تھا۔ اتنے بڑے پلاٹ پر کوئی کوٹھی بناتا تو یہاں پانی ذخیرہ کرتا مگر کباڑ خانہ بنا تو پانی کی ضرورت نہ رہی اور کباڑیے نے اسے معمولی ردوبدل کے ساتھ اپنا آفس بنالیا۔ میز پر کتابیں نہیں اسی کی نوٹ بکس اور ڈائریاں تھیں جن میں اس کا سارا حساب کتاب درج تھا۔ میں نے روشندان کے رخ کرکے نوٹ بکس دیکھ لی تھیں۔ میز کی ایک دراز میں اسکریپ میں خریدی جانے والی گاڑیوں کے کاغذات بھرے ہوئے تھے لیکن نچلی دونوں درازوں میں نوٹ تھے۔ اس وقت نوٹ میرے لیے بے کار تھے۔ مجھے یقین تھا کہ دلاور اینڈ کمپنی کا کوئی نمائندہ یا خود دلاور یہاں ضرور آئے گا۔ شاید وہ مجھ سے کچھ معلوم کریں گے۔ جو بات مجھے معلوم نہیں وہ میں بتا نہیں سکتا مگر جو معلوم ہے وہ بھی کہاں بتاؤں گا۔ پھر وہ تشدد کے حربے آزمائیں گے۔ چوہدری دلاور سوچے سمجھے بغیر کوئی کام نہیں کرتا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ مجھے اس تہ خانے میں ڈال کے اسی طرح بھول جائے جیسے ہم اسے بھول گئے تھے۔ شاید یہ جگہ بھی اسی کے کسی آدمی کی ہو۔"

"تو نے ڈائری یا کسی نوٹ بک میں کیا دیکھا تھا؟"

"تیرا سر دیکھا تھا۔ اس گھپ اندھیرے میں کسی کباڑی کے ہاتھ کی تحریریں کیسے پڑھتا۔ بس ایسے ہی ورق پلٹ کے دیکھا تھا تو

کچھ اعداد و شمار نظر آئے تھے۔ مجھے تو فکر تھی وہاں سے نکلنے کی۔ میرا خیال تھا کہ ابھی تو صرف نو بجے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ آدمی رات کے بعد کوئی آئے۔ میں نے دروازے پر مکّے مارے اور لاتیں ماریں اور چیخا چلّایا اور پھر مایوس ہو کے تخت پر لیٹ گیا۔ اپنی ساری جسمانی توانائی ضائع کر کے بھی مجھے کچھ حاصل نہیں ہوا تھا۔ میں پسینے پسینے ہو گیا تھا۔ میرا حلق پیاس سے خشک ہو رہا تھا۔ ایسے وقت میں آدمی کو سب سے زیادہ پریشان اس کے خیالات کرتے ہیں۔ بے ہوشی میں تین گھنٹے گزر جانے کا پتا نہیں چلا تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد آدھا گھنٹا آدھے دن کے برابر ہو گیا تھا۔ میں نے بڑے دکھ سے گل اور ببلی کے بارے میں اور تم سب کے بارے میں سوچا۔ کتنی آسانی سے دلاور نے مجھے شکار کر لیا تھا۔ کیا پتا میرے بعد اس نے گل کو بھی اٹھا لیا ہو... اور ببلی کو بھی۔ اکیلا آدمی مرنے سے نہیں ڈرتا مگر اس کی نظروں کے سامنے اس کے بچے کو یا بیوی کو عذاب دیا جائے تو وہ ان کا درد سے تڑپنا اور اذیت سے چلّانا برداشت نہیں کر پاتا۔ عورت کی سب سے بڑی کمزوری اس کا بچہ ہوتی ہے تو مرد کے لیے عورت کی عزت۔ اگر گل کے سامنے ببلی کو مارا، کاٹا یا جلایا جاتا تو کیا وہ اسے بچانے کے لیے ان کی ہر شرط تسلیم نہ کرتی۔ اور اگر میرے سامنے گل کی آبرو کو حیوانوں اور شیطانوں کی سفاک شہوانیت کا نشانہ بنایا جاتا تو میں کتّے کی طرح چوہدری دلاور کے قدموں میں نہ لوٹنے لگتا۔ ایسی ہی باتیں سوچ سوچ کے میں پاگل ہونے کے قریب تھا کہ اچانک ایک دھماکا ہوا جس سے تہ خانے کی دیواریں لرز گئیں۔ پھر دوسرا دھماکا ہوا اور میں نے دلخراش انسانی چیخوں کی آواز سنی۔ پھر کئی دھماکے ہوئے جو کم شدید تھے اور تہ خانہ روشن ہونے لگا۔ یہ دھماکے ساتھ والی عمارت میں ہوئے تھے اور یہ روشنی آگ کے شعلوں کی تھی۔ میرا خیال تھا کہ بس اب کسی بھی دھماکے کے ساتھ تہ خانے کی چھت بیٹھ جائے گی اور میں اسی گمنام قبر میں دفن ہو جاؤں گا جہاں یوم حشر سے پہلے میرا سراغ بھی نہیں ملے گا یا آگ یہاں تک پہنچی تو میں جل کے کوئلہ ہو جاؤں گا۔ لیکن جیسا کہ میں نے بتایا، وہ انڈر گراؤنڈ واٹر ٹینک تھا جو پانی کا دباؤ برداشت کرنے کے لیے بنایا گیا تھا۔ اس میں کافی سریا اور سیمنٹ تھا۔ اسے کچھ نہیں ہوا اگر اس کے اوپر دو فٹ اونچی دیوار کھڑی کر کے روشندان لگائے گئے تھے۔ اس دیوار کا ایک کونہ ہل گیا اور اینٹیں اندر آ گریں۔ میں تو ویسے ہی تخت پر بیٹھا کلمۂ شہادت پڑھ رہا تھا اور مجھے اپنی موت کا یقین بھی آ چکا تھا۔ وہ زیرِ زمین ٹینک سلامت رہتا تب بھی ساتھ والی عمارت کا ملبہ اس پر گرنے سے روشندان بند ہو جاتے تو ہوا کا راستہ نہ رہتا یا پوری عمارت میں بھڑکنے والے شعلوں کی حدّت اس کو تنور بنا دیتی جس میں شیروانی صاحب اسٹیم روسٹ ہو جاتے۔ اینٹوں کے اندر گرنے سے دھماکا ہوا تو میں چھلانگ مار کے دوسرے کونے میں جا کھڑا ہوا۔ مگر پھر مجھے اوپر کے شگاف سے باہر کا اجالا نظر آیا اور میں نے الاؤ کی طرح جلتی آگ کی ایک جھلک دیکھی۔

میں نے ہمت کی اور میز کو گھسیٹ کر اس شگاف کے قریب ... اس کے اوپر کرسی رکھی تو میرا سر شگاف تک پہنچ گیا۔ احاطے ... ساتھ دونوں طرف بلند عمارات تھیں اور دھماکے دائیں جانب والی تین منزلہ بلڈنگ کے نچلے حصے میں ہوئے تھے۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا، وہاں آتش بازی کا سامان بنتا تھا اور ایسی جگہ دھماکے کے لیے ایک معمولی چنگاری بھی بہت ہوتی ہے۔ حفاظتی انتظامات کے معاملے میں تو بڑے بڑے اداروں کی کارکردگی کا ... دیکھ کے افسوس ہوتا ہے۔ آتش بازی بنانے والے بھی احتیاط ضرور کرتے ہیں مگر عموماً وہ شارٹ سرکٹ کے امکانات کو ... جاتے ہیں۔"

"ہاں۔ ایسے کئی حادثات ہو چکے ہیں۔ پھر بھی یہ کام ... شہر میں عین رہائشی علاقے میں جاری ہے۔"

دھماکوں سے عمارت کا ایک حصہ گرا تھا اور باقی حصے آگ کی لپیٹ میں آ گئے تھے۔ درمیان میں کباڑی کے احاطے کی موجودگی نے دوسری طرف کے مکانات کو محفوظ کر دیا تھا مگر اس بلڈنگ سے متصل عمارتوں کو بہرحال خطرہ لاحق تھا۔ میں لوگوں کا شور سن رہا تھا اور تصور بھی کر سکتا تھا کہ افراتفری میں کیا منظر ہوگا۔ کچھ جان بچا کے نکل رہے ہوں گے تو کچھ سامان نکال رہے ہوں گے اور ... جی دار ملبے میں سے لوگوں کو نکالنے یا آگ بجھانے کی کوشش ... اپنی جان کی بازی لگانے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ پھر فائر بریگیڈ آئے گا اور ایمبولینس پہنچے گی اور صبح بس ایک خبر ہوگی ... اس حادثے میں اتنے ہلاک اور اتنے زخمی ہوئے۔ اخبارات ... لے دے کریں گے کہ انتظامیہ کو اس خطرناک کاروبار پر قدغن لگانی چاہیے۔ ہوگا کچھ نہیں۔ خود میں اس وقت کسی اور کے بارے میں نہیں صرف اپنی جان بچا کے فرار ہونے کی فکر میں تھا۔ یہ تقدیر کی ستم ظریفی ہے یا زندگی اور موت کا، فنا اور بقا کا سمجھ ... نہ آنے والا کھیل۔ کسی کی قضا کسی اور کے لیے حیاتِ نو کا بہانہ ... جاتی ہے۔ جب آدمی کی اپنی جان پر بن جائے تو وہ کتنا خود غرض ... کمینہ ہو جاتا ہے۔ اس کا اندازہ عام حالات میں نہیں کیا جا سکتا ... میں نے دیکھا تو نہیں سنا اور پڑھا ہے کہ قحط اور خشک سالی میں ... مٹھی چاول کے لیے عورتوں نے اپنی عصمت بیچ دی اور ماؤں نے ... دی۔ انسان ایک آدم خور حیوان بن گیا۔ میں بھی وہاں سے نکلا ... مجھے بالکل خیال نہیں آیا کہ میں مدد کرنے والوں میں شامل ... ہو جاؤں۔ میں عمارت کے عقبی حصے میں تھا اور چیخ پکار سامنے کی طرف تھی۔ اگر میں چاہتا تو گھوم کے ادھر بھی جا سکتا تھا مگر ... ہے میں نے کیا کیا؟"

"تو کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ جو تجھ سے پہلے پہنچ چکے تھے وہی ... ہوں گے۔ تماشا دیکھنے والوں کی بھیڑ کام کرنے والوں کے ... مشکلات پیدا کرتی ہے۔"

"مگر میں نے یہ بھی نہیں سوچا۔ مجھے خیال آیا کہ میز کی ... میں جو نوٹ بھرے ہوئے ہیں وہ نکال لوں۔ ورنہ بعد میں وہ جل ...

... خاک ہو ...یں گے یا انہیں کوئی اور لے جائے گا۔ اب یہ لالچ میں جان کی بازی لگانے والی بات تھی۔ میں پھر اندر اُتر گیا اور میں نے بڑے بڑے نوٹوں کی گڈیاں اپنی جیبوں میں ٹھونس لیں، قمیص کے بٹن کھول کے پتلون کی بیلٹ میں اڑس لیں اور پانچ منٹ میں پھر باہر آ گیا۔ یہ کتنا خطرناک کام تھا۔ فرض کرو اتنی دیر میں کوئی دروازہ کھول کے نیچے آ جاتا تو شاید مجھے گولی مار دیتا یا اس شگاف پر ملبہ آ گرتا تو میں مارا جاتا اور یہ خودکشی ہوتی۔"

"تو نے واقعی بڑی حماقت کی تھی۔ گل اور ببلی کے لیے یا ہمارے لیے تیری جان کا بدل وہ پیسہ ہو سکتا ہے، اُلّو کے پٹھے۔"

"میں نے کہا نا۔ بڑی کمینگی کا ثبوت دیا تھا میں نے۔ مجھے یہ خیال تھا کہ چوہدری دلاور کا مال ہے۔ اسے چھوڑنا نہیں چاہیے۔"

"تیرا خیال غلط بھی ہو سکتا تھا۔"

"مگر میرا خیال بعد میں درست ثابت ہوا۔ وہ احاطہ اور اسکریپ چوہدری دلاور ہی کا تھا۔"

"وہ کباڑی کب سے بن گیا؟" میں نے کہا۔

"اب اگر تو شپ بریکر کو کباڑی کہے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ ایسے تو باٹا بھی موچی کہلائے گا۔ لاکھوں کا بزنس ہے اسکریپ کا۔"

"کتنا مالِ غنیمت لے گیا تو اپنے ساتھ؟"

"سو سو کے نوٹوں کی آٹھ گڈیاں تھیں۔ اسّی ہزار، سب پرانے نوٹ تھے۔ پتا نہیں وہاں کیوں رکھے تھے؟"

"وہ محفوظ جگہ تھی۔ لوگ اپنا پیسہ گھر کی تجوریوں میں رکھتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ ممکن ہے وہ رقم کسی کو ادا کرنی ہو یا کسی نے ادا کی ہو۔ بینک تو ایک بجے ہی بند ہو جاتے ہیں" میں نے کہا۔

"خیر میں اس کے بعد وہاں سے بھاگا تو پلٹ کے نہیں دیکھا۔ کسی دشواری کے بغیر میں احاطے کی دیوار پر سے دوسری جانب سڑک پر پہنچ گیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ بادامی باغ کا علاقہ تھا۔ میں نے ایک ٹیکسی پکڑی اور دس بجے گھر پہنچ گیا۔ میری حالت دیکھ کے گل پریشان ہو گئی لیکن میں نے اسے صرف اتنا بتایا کہ کچھ دیر پہلے میں نے چوہدری دلاور کو اس گلی سے نکلتے دیکھا ہے چنانچہ اب ہمیں ایک منٹ ضائع کیے بغیر یہاں سے فرار ہو جانا چاہیے۔ مجھے معلوم تھا کہ میرے پاس ایک گھنٹے کی مہلت ضرور ہے۔ چوہدری دلاور کو اتنی جلدی حادثے کی خبر نہیں مل سکتی اور مل جائے تو اسے یہ خیال نہیں آ سکتا کہ اس حادثے کے باعث مجھے وہاں سے نکلنے کا موقع مل گیا ہے۔ میں بے ہوش پڑا تھا اور ہوش میں آنے کے بعد بھی اس ناقابلِ شکست دیواروں والے تہ خانے سے نکل نہیں سکتا تھا۔ اب میری سمجھ میں آتا ہے کہ وہاں اتنا مضبوط دروازہ کیوں لگایا گیا تھا اور اتنی موٹی سلاخ سے روشندان کا راستہ کیوں بند کیا گیا تھا۔ وہ جگہ چوہدری دلاور کی انڈر گراؤنڈ ٹریژری تھی جہاں وہ کالے دھندوں کا کالا دھن چھپا کے رکھتا تھا اور کالا دھن بھی آتا جاتا رہتا ہے۔ جتنا میرے نصیب میں تھا مجھے مل گیا۔ جتنا عذاب جھیلا اس کے مقابلے میں تو کچھ نہیں مگر پھر بھی قدرت نے تھوڑا بہت ازالہ کر دیا۔ مجھے بچانے والا تو وہی ہاتھ تھا جو مارنے والے سے زبردست ہے مگر دلاور کو اسّی ہزار کا نقصان پہنچانے کی خوشی اب محسوس ہوتی ہے۔ بعد میں اس کو کتنا شاک لگا ہوگا کہ بندہ بھی گیا اور جاتے ہوئے اسّی ہزار کا نقصان بھی دے گیا۔"

میں نے کہا "تجھے شرم آنی چاہیے۔ اتنا مالدار ہو کے بھی اس غریب خانے میں ڈال رکھا ہے بیوی بچوں کو۔ دلاور کے مال پر عیش کیوں نہیں کرتا۔"

محسن ہنسا "نو عیش ود آؤٹ کیش۔ یہ تو صحیح ہے مگر میں گیدڑ کی طرح شہر کا رخ کرنے سے ڈرتا ہوں۔ جب ہم گھر سے فرار ہوئے تو میں نے گھر چھوڑا نہیں تھا۔ اس بلڈنگ میں ایک جاہل عورت تھی جس کے شاید شادی کے دس بارہ سال بعد اولاد ہوئی تھی۔ شوہر کا پیروں فقیروں اور تعویذ گنڈے پر اعتقاد نہیں تھا۔ اس نے علاج پر بہت پیسہ خرچ کیا تھا۔ بیوی ہر اوٹ پٹانگ پیر فقیر جوگی، مجذوب کے پاس بھی جاتی تھی اور جھاڑ پھونک سے وظیفے اور عمل تک سب کچھ کرتی تھی۔ اب یہ دوا سے ہوا یا دعا سے۔ اللہ جانے، لیکن اس عورت کو پورا یقین تھا کہ یہ ایک بڑے پہنچے ہوئے ملنگ بابا کی کرامت ہے جو کہیں منگورہ میں ایک لنگوٹ باندھے بیٹھے رہتے ہیں خواہ برف باری ہو رہی ہو۔ روانہ ہونے سے پہلے میں نے گل کو اس عورت کے پاس بھیجا اور گل نے میری ہدایات کے مطابق اس سے کہا کہ بہن مجھے ذرا منگورہ والے بابا کا پتا پھر سمجھاؤ۔ میں بھی جا رہی ہوں ان کے پاس من کی مراد پانے۔ گل بہت خفا تھی کہ یہ کیا خرافات ہے مگر میں نے کہا کہ نیک بخت یہ ہماری دفاعی حکمتِ عملی ہے۔ یہ عورت سب میں پھیلا دے گی کہ دیکھو میرے کہنے سے اس گھر میں رہنے والی منگورہ والے بابا کے آستانے پر گئی ہے۔ لوٹ کے آئے گی تو دیکھ لینا، سال بھر میں ماں بن جائے گی اور اس جیسے جاہل یقین بھی کریں گے۔ حقیقت کیا ہے۔ یہ خدا جانتا ہے یا اس عورت کو معلوم ہوگا مگر میں نے تو ایک شخص کو اسے گالیاں دیتے بھی سنا ہے کہ اولاد کو شوہر کے سر منڈھ دیا۔ کون نہیں جانتا کہ اس کا باپ کون ہے۔ ولدیت کے خانے میں دو تین نام لکھے جا سکتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔ ہم تو آدھے گھنٹے میں سب کچھ وہیں چھوڑ کے خالی ہاتھ نکل آئے۔ دروازے کو تالا لگا کے چابی اس پڑوسن کو دے دی کہ خیال رکھے۔"

"اور خود ٹرین میں بیٹھ کے کراچی روانہ ہو گئے۔"

"اس سوال میں دو احمقانہ نکات ہیں" محسن بولا "ایک یہ کہ رات دس بجے کے بعد کون سی ٹرین کراچی جاتی ہے۔ دوسری یہ، دولت مند لوگ ٹرین میں رینگ رینگ کے سفر نہیں کرتے۔ ہم گئے ایئرپورٹ اور نائٹ کوچ پکڑنے کی کوشش کی۔ فلائٹ اسلام آباد سے آ رہی تھی۔ ہمیں چانس پر سیٹ کا انتظار کرنا پڑا۔ ان اللہ مع الصابرین۔ رات ساڑھے گیارہ بجے لاہور سے روانہ ہونے والے جہاز میں ہی جگہ مل گئی اور ڈیڑھ بجے ہم کراچی ایئرپورٹ پر اُترے تو

خود مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ صرف چار گھنٹے پہلے مجھے ہوش آیا تو میں کہاں تھا۔ تمام راستے میرے تصور میں وہ جگہ رہی جہاں دھماکا ہوا تھا اور میں قدرت کی کرم نوازی پر حیران ہوتا رہا۔ ظاہر ہے اس وقت تک چوہدری دلاور کو بھی خبر مل گئی ہوگی کہ پنجرہ توڑ کے پنچھی اُڑ گیا مگر پنچھی اُڑ کے کراچی چلا گیا۔ یہ خیال اسے ذرا دیر سے ہی آیا ہوگا۔ اس نے پہلے تو بندے دوڑائے ہوں گے میرے گھر کی طرف اور وہاں تالا دیکھنے کے بعد دوسرے ٹھکانے دیکھے ہوں گے۔ کوئی سیدھا وقار یا منظر کے گھر میں تو گھس نہیں سکتا تھا۔ نہ رابعہ کے آفس جا سکتا تھا اور نہ کسی کو مولوی خادم حسین کے گھر کا پتا معلوم تھا۔"

"اب بھی یہ خوش فہمی ہے آپ کو شیروانی صاحب کہ انہیں کسی کا پتا ٹھکانا معلوم نہیں ہو سکتا؟"

"اس کی وجہ ہے۔ میرا سراغ لگانے کے لیے انہوں نے دن رات ایک کردیے ہوں گے۔ سکندر بخت اور محسن کے درمیان جذباتی کمزوریوں کی ایک زنجیر ہے۔ حلقہ در حلقہ۔ سکندر، محسن، گل اور بوبی۔ پتا نہیں کیوں انہوں نے آخری سرے کو نہیں پکڑا۔ اگر وہ بوبی کو لے جاتے تو ہم سب دست بستہ ان کی خدمت میں حاضر ہونے پر مجبور ہو جاتے۔ شاید چوہدری دلاور نے یہی سوچا کہ پہلے محسن کو بُلاتے ہیں اور اسے دھمکاتے ہیں کہ اب گل کی باری ہے اور پھر بوبی کی۔"

"آخر دلاور نے یہ انتہائی قدم کیوں اُٹھایا؟"

"میرا خیال ہے کہ اب وہ مایوس بلکہ DESPERATE ہے۔ اسے معلوم ہے کہ تُو نے پیڈرو کا اعترافِ جرم حاصل کرلیا ہے۔"

"پیڈرو کے اعترافِ جرم پر مبنی کیسٹ تو خود اس نے میرے حوالے کردیا تھا" میں نے کہا "پھر خود ہم نے اس کا اقبالی بیان ریکارڈ کیا تھا۔"

محسن بولا "دونوں میں کیا فرق ہے؟"

"بہت فرق ہے۔ پیڈرو نے ساری ذمّے داری چوہدری دلاور پر عائد کی ہے اور اسے ہی قاتل ٹھہرایا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ چوہدری دلاور کے خلاف جرائم کے بہت سے ثبوت اس کی ایک ڈائری میں درج ہیں۔"

"کیا یہ ڈائری والی بات دلاور کے علم میں تھی؟" محسن نے کہا۔

میں نے کہا "یہ تو سیاست کا ایک مسلمہ طریق کار ہے کہ اپنے حریف کی دُکھتی رگ ہاتھ میں رکھو۔ وہ گینگ لیڈر ہوں، سربراہانِ مملکت یا وزیر۔ خاموشی سے ایک دوسرے کے خلاف اختیارات کے ناجائز استعمال کے وہ ثبوت جمع کرتے رہتے ہیں جو قابلِ مواخذہ ہوں اور ناقابلِ تردید۔ تاکہ کل جب ان کے حریف یا حلیف برسرِ اقتدار آئیں تو ان پر کوئی فردِ جرم نہ بنا پائیں۔ مجرم سب ہوں تو پھر کون کس کا احتساب کرتا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ ان کی اپنی غلطیوں اور بداعمالیوں کا سارا حساب کسی نہ کسی کے پاس ہے اور ایک کو پکڑا تو باقی سب یہ حساب لے کر سامنے آجائیں گے۔ پیڈرو کا کہنا تھا کہ وہ اسی لیے اب تک بچا ہوا ہے کہ اس کے پاس چوہدری دلاور کی ایسی تیسی کرنے کے لیے بہت مواد ہے اور یہ بات دلاور کو معلوم ہوگی۔"

"پھر اس نے خود پیڈرو سے یہ مواد حاصل کیوں نہیں کیا؟"

"بے وقوف آدمی، اپنے حفاظتی نظام تک کون اتنی آسانی سے رسائی حاصل کرنے دیتا ہے۔ یہ سسٹم اسی صورت میں کامیاب ہوتا ہے۔ جب فول پروف ہو یعنی اس میں خامی کوئی نہ ہو۔ اگر دلاور کے لیے یہ اتنا آسان ہوتا کہ پیڈرو کو جب چاہے جبر کے شکنجے میں دبا کے اس سے کہے کہ بتاؤ میرے خلاف کیا گولہ بارود اکٹھا کررکھا ہے اور کہاں چھپا کے رکھا ہے تو پیڈرو ہر وقت حاضر تھا مگر اس نے بھی استادوں سے استادی سیکھی تھی۔ دلاور ایسی حماقت کرتا تو وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہتا کہ اپنے چوہدری صاحب، ذرا خیال سے۔ اگر مجھے کچھ ہوا تو آپ کی بھی خیر نہیں۔ میں نے بڑا پکا بندوبست کرلیا ہے خیر سے۔ اتنا عرصہ آپ کے ساتھ رہ کے جھک نہیں ماری۔"

"چنانچہ اس نے پیڈرو کو تمہارے حوالے کردیا اور پھر خود تمہارے پیچھے لگ گیا" محسن بولا۔

"ہاں۔ وہ سائے کی طرح ہمارے تعاقب میں تھا۔ جب اسے پتا چلا ہوگا کہ پیڈرو نے ہمارے ساتھ مل کے محاذ بنالیا ہے۔ اپنی جان بچانے کے لیے دلاور کو مروانے کی تحریک میں شامل ہوگیا ہے اور دلاور کے خلاف کامیابی سے استعمال ہونے والا سارا اسلحہ بم دشمنوں کے حوالے کردیا ہے تو وہ گھبرا گیا۔ PANIC کا شکار ہوگیا۔ جب تک میں فرنچ وکیل کے حلئے میں تھا اسے پتا نہیں چلا۔ جب پتا چلا تو فرنچ وکیل غائب ہوگیا۔ اس نے مجھے پنڈی میں ملک خداداد کے قتل میں پکڑوانے کی کوشش کی۔ پھر اس کے بھائی ملک نبی داد کے ذریعے وقار یوسف کے گھر سے اُٹھوانا چاہا مگر معاملہ اُلٹا ہوگیا۔ وہ چاہتا ہوگا کہ پیڈرو کے اصل اعترافِ جرم کا کیسٹ اور اس کی ڈائری مل جائے۔"

"اسے ڈائری کے بارے میں کیا معلوم تھا؟ اور کیسے؟"

"ڈائری سے میری مراد ہے وہ مواد جو پیڈرو نے ہمارے حوالے کردیا تھا۔ دلاور نے دیکھ لیا ہوگا کہ پیڈرو کس طرح ہم سے تعاون کررہا ہے۔"

"اور جب پیڈرو ایک حادثے کی وجہ سے مارا گیا۔ اسے حادثہ ہی کہا جائے گا۔"

میں نے کہا "شیروانی صاحب، پیڈرو زندہ ہے۔"

محسن اُچھل پڑا "پیڈرو زندہ ہے!"

"ہاں۔ وہ حرام زادہ بچ گیا تھا۔ زخمی ہو کے کسی اسپتال میں پڑا تھا اور وہاں سے اس نے... یعنی شیخ مختار نے.... کراچی فون کیا تھا۔"

"تجھے کیسے معلوم ہوا؟"

"میں گیا تھا وہ ڈائری لینے جو پیڈرو کے آفس میں تھی۔ اس کی میز کی دراز میں" میں نے کہا "ڈائری کو چُرا کے لانا ناممکن تھا۔ میں نے اور رابعہ نے تھوڑا سا جذباتی ڈراما کیا تھا اور شیخ مختار کے پارٹنر کو یقین دلانے کی کوشش کی تھی کہ وہ قضائے الٰہی سے اللہ کو پیارا ہوگیا۔ پارٹنر کے پاس پیڈرو کا فون پہلے ہی آچکا تھا اسپتال سے چنانچہ ڈراما فیل ہوگیا اور بالآخر ہمیں وہی کرنا پڑا جو ہم نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ہم نے گن پوائنٹ پر سیٹھ کو مجبور کیا کہ وہ خاموشی سے ڈائری نکال کے ہمارے حوالے کردے اور پھر خاموش بیٹھ جائے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔"

"اب وہ ڈائری کہاں ہے؟"

"منظر کے پاس ہے۔ میں نے منظر کو بتادیا تھا کہ ہم ڈائری اسے بھیج رہے ہیں۔"

محسن بولا "اس کی کوئی نقل اپنے پاس رکھی تھی یا نہیں؟"

میں نے کہا "ہاں ایک نقل میرے پاس ہے۔ بس مجھے ڈر تھا کہ وہ ڈاک میں اِدھر اُدھر نہ ہو جائے۔ میں نے اسے ایک کوریئر سروس سے بھیجا تھا اور وہ بھی ایک لاکھ کی انشورنس کرا کے۔"

محسن بولا "چوہدری دلاور اسی لیے تمہارے پیچھے کراچی پہنچ گیا تھا؟"

"ہاں۔ ایک ساتھ اسے بہت سی غیر متوقع ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ پہلے میں غائب ہوگیا پھر پیڈرو، اس کے بعد تو نکل آیا اور جس مقصد کے لیے وہ ساری تگ و دو کررہا تھا وہ پھر بھی حاصل نہیں ہوا۔ ویسے تو کہتے ہیں کہ عجلت کار شیطان ہے مگر ہم نے بڑی عجلت میں فیصلے کیے اور بڑی عجلت میں ان پر عمل کیا اس لیے بچ گئے۔ تو چند گھنٹوں میں لاہور سے فرار ہو کے کراچی پہنچ گیا۔ میں چند گھنٹوں میں ہوٹل سے غائب ہو کے فلیٹ میں پہنچ گیا اور وہاں سے کولمبو چلا گیا۔ چوہدری دلاور نے ہمارے ذہن سے سوچتے ہوئے فرض کیا ہوگا کہ اب ہم لندن جائیں گے۔ اس کے خلاف ایک اہم گواہ لندن جیل میں ہے۔ ہم اس سے ملیں گے اور اسے بتائیں گے کہ اسے رہائی مل سکتی ہے۔ وہ اسی ٹریک پر ہمارا تعاقب کرتا ہوا لندن بھی پہنچے گا۔ جو بات کوئی اور نہیں سمجھتا وہ دلاور جانتا ہے۔ اسے یقین ہوگا کہ نہ رابعہ کو پولیس نے اغوا کیا ہے نہ غالب کو۔ وہ دونوں سکندر بخت کے ساتھ روپوش ہیں اور اس مہم میں سکندر کی مدد کرنے کے لیے ہر جگہ اس کے ساتھ ہی ہوں گے۔ پولیس غالب اور رابعہ کے اغوا کے کیس میں پھنسی ہوئی ہے۔ نبی داد کے حوالات میں ہلاک ہونے کے بعد صورتِ حال مزید پیچیدہ ہو چکی ہے اور یہ خیال صرف دلاور کو آسکتا ہے کہ اغوا کی کہانی جھوٹی ہے۔ دراصل ہم چھپ کے ملک سے ہی نکل چکے ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ سکندر اور محسن اصل نام سے ولایت کی سرزمین پر قدم نہیں رکھ سکتے۔"

"یعنی اب وہ خود بھی کسی فرضی نام سے لندن میں ہمارے لیے چشم براہ ہوگا۔" محسن نے کہا "ہر فلائٹ دیکھ رہا ہوگا۔"

"ہاں اور اسے یہ بھی معلوم ہوگا کہ لندن پہنچ کے ہم کیا کریں گے۔ کس سے ملیں گے۔ وہ خود بھی تو مفرور اور روپوش ہے۔"

"اور ہم اس کی توقعات پر پورا اُترتے ہوئے لندن جا کے سیدھے اس کے پھیلائے ہوئے جال میں گرفتار ہو جائیں گے۔ اگر وہ ایسا سمجھتا ہے تو پھر اس کے بُرے دن آگئے ہیں۔ جب عقل ساتھ چھوڑ جائے تو وہ نہیں ہوتا جو آدمی چاہتا ہے یا سمجھتا ہے کہ ہوگا۔ مثلاً اس وقت ہم لندن میں نہیں پیرس میں ہیں۔" محسن بولا۔

میں نے کہا "تیرا پیرس آنا برحق لیکن یہ بتا کہ تو ہمیں ریسیو کرنے ائرپورٹ پر کیسے پہنچ گیا تھا۔"

"وہ ایسا ہے کہ تعلق نہ ہونے کے باوجود میں تیری طرف سے بے خبر نہیں تھا، مجھے کچھ وقار سے اور منظر سے پتا چل جاتا تھا۔ کچھ اخبارات میں آپ کے کارنامے نظر آجاتے تھے۔ مثال کے طور پر جو ہلچل آپ نے راولپنڈی میں مچائی۔ جہاں آپ پیڈرو کے ساتھ گئے تھے، مرحوم وزیر خان کا مدفن دیکھنے پھر پتا چلا کہ اپنے چوہدری صاحب کو بڑی مایوسی ہوئی جب تو برسی پر قبرستان نہیں گیا۔ حالانکہ وہ اطلاع بھی دے چکے تھے کہ دوبارہ وزیر خان مرحوم کی ہڈیاں وہیں دفن کردی گئی ہیں جہاں سے نکالی گئی تھیں پھر مجھے پتا چلا کہ ایک بڑا نامی گرامی صحافی اور ایک بڑی نامور وکیل خاتون کو پولیس نے وقار کے گھر سے گرفتار کیا تھا مگر اب ان کا پتا نہیں چل رہا ہے۔ اخباروں میں بڑی لے دے ہو رہی تھی پولیس کے کردار پر اور ان کی نااہلی پر۔ کراچی سے میں نے منظر کو فون کیا تھا تو اس نے اشاروں اشاروں میں بتایا کہ تم پہلے کراچی میں تھے اور اب کولمبو میں ہو۔ اس نے کہا کہ اکرام شیخ نے کولمبو سے فون کیا تھا تو میں چکرا گیا تھا لیکن بعد میں سمجھ گیا کہ یہ نام تم نے استعمال کیا ہوگا۔ کولمبو والی بات بھی مجھے غلط لگی تھی۔ میں سمجھا کہ تم نے کراچی سے فون کیا ہوگا اور کولمبو کہہ دیا ہوگا۔"

"ہم واقعی کولمبو میں تھے۔ کراچی سے ویزا لینے کی کوشش ناکام ہوگئی تھی، ہم بال بال بچے تھے۔"

"ہاں، تو نے بتایا تھا کہ غالباً الزبتھ کے شوہر نے قونصلیٹ کو بریف کردیا تھا کہ خیال رکھنا یہ الزبتھ کا پرانا عاشقِ زار نہ ہو۔"

"وہ ایک سابق رقیب ہے جو شوہر کے مرتبے پر فائز ہوا اور اس کی فتح مندی یا میری شکست کی ذمّے دار وہی تنگ نظر، متعصب اور مغرور بیوروکریسی کا سازشی ذہن تھا، جس کا اب وہ خود ایک فعال پُرزہ ہے۔ پاکستان سے اپنی بیوی کے نام موصول ہونے والے کسی سابق کلاس فیلو کے فون اور اس کی آمد کی اطلاع سے اس کے شوہرانہ حسد اور رقابت کے جذبات پھر جاگ اُٹھے ہوں گے۔ اس نے الزبتھ کو بتائے بغیر پورا بندوبست کرلیا ہوگا کہ ذلت کے ساتھ واپس وطن ارسال کیے جانے والے رقیب روسیاہ کے ناپسندیدہ خیال کا بھی اس کی پیاری بیوی کے دل سے گزر نہ ہو۔ اس کا

ناپاک سایہ بھی لندن کی زمین پر نہ پڑے۔"

"منظر کی بات کا غلط مطلب نکالتے ہوئے میں یہ سمجھا کہ تُو بھی کہیں کراچی میں ہے" محسن نے کہا "اب یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم میں سے کوئی کراچی آئے اور اکرام شیخ سے نہ ملے۔"

میں نے کہا "اس اُلو کے پٹھے کا نام مت لے میرے سامنے۔ سالا جورو کا غلام۔ بہت بدل گیا ہے۔ خون سفید ہوگیا ہے اس کا۔ تُو ملا تھا اس سے؟"

"ہاں۔۔۔ اور میں نے تو بالکل لحاظ نہیں کیا۔ خوب کھری کھری سُنائیں اسے بھی اور اس کی کاجل بیگم کو بھی۔ دولت اور شہرت کے ساتھ عزت بھی مل گئی ہے انہیں۔ ہم جیسے لوگوں سے ملتے ہوئے گھبراتے ہیں۔"

"گھبرانے کی بات تو ہے نا یار۔ انہیں دلاور سے خطرہ رہتا ہے کہ کہیں اسکول میں بدمعاشی کا چکر نہ چلا دے۔"

"کاجل یہی کہہ رہی تھی کہ ہماری پوزیشن بہت نازک ہے۔ تمہاری وجہ سے انہوں نے بچّوں کو اغوا کرایا۔ اسکول میں بم کا دھماکا کرادیا یا دیواروں پر ہمارے خلاف کچھ لکھوادیا تو ہماری گڈول ہی نہیں اسکول بھی ختم ہوجائیں گے جو ہم نے اتنی محنت سے بنائے ہیں۔ میں نے کہا کہ ہم بھی تمہارے دشمن تو نہیں ہیں لیکن تمہارا رویّہ بدلا ہوا ہے۔ تمہاری نظریں بدل گئی ہیں۔ صاف نظر آتا ہے کہ تم کو ہمارا آنا اچھا نہیں لگا۔ تم نے سکندر کی کوئی مدد نہیں کی حالانکہ کاجل آج جہاں ہے اور جس مقام پر ہے سکندر کی وجہ سے ہے۔ سکندر نہ لاتا تو وہ پڑی ہوتی بہاریوں کے کیمپ میں۔ کوئی پوچھنے والا نہ ہوتا وہاں۔ اس جیسی لڑکیاں وہاں کیا کررہی ہیں جسم فروشی کے سوا۔ بس اس پر وہ چراغ پا ہوگئی اور اکرام شیخ بھی اس کی حمایت میں بولنے لگا اور اس نے گل کے بارے میں کہا کہ یہ گل بانو بھی تو ناگ منی تھی اور آج بھی پولیس ریکارڈ پر اس کے سب کارنامے ہیں۔ میں نے کہا کہ پولیس ریکارڈ پر تو شاید تمہاری بہن کے کارنامے بھی ہوں گے۔ نازو کو پکڑوادو۔ مردانگی کی سند مل جائے گی۔ بس اس کے بعد گل نے کہا کہ چلو اور ہم کھانا چھوڑ کے آگئے حالانکہ اکرام نے دعوت کی تھی۔ اس کے بعد گنجائش کہاں رہی تھی کہ ہم رُکتے۔ اس نے روکنے کی کوشش کی تو کاجل نے کہا کہ جانے دو اور ان سے کہہ دینا کہ پھر ادھر نہ آئیں تو ان کی بڑی مہربانی۔"

"اس حد تک بات بڑھ گئی تھی؟"

"میں تو غصّے سے پاگل ہورہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ ابھی جاکے اس کے اسکول کو آگ لگادوں۔ جو کام دلاور نے نہیں کیا وہ میں کروں۔ جس چیز نے اتنا دماغ خراب کیا ہے اس کا" وہی نہ رہے تو دماغ درست ہوجائے گا مگر گل نے میرا غصہ ٹھنڈا کیا۔ ہم نے تمہیں ہوٹل میں جاکے دیکھا تو عجیب کہانی سُنی کہ نہ کسی نے اندر جاتے دیکھا نہ باہر آتے مگر تم دونوں غائب ہوگئے۔ بس اس کے بعد ہم نے تلاش چھوڑ دی اور میں نے گل سے کہا کہ اب وہ ملیں گے لندن میں' براہِ راست لندن آنا مشکل تھا۔ میں نے پیرس کا رُخ کیا۔ مجھے یقین تھا کہ تو بھی ایسا ہی کرے گا۔ روز فون کرکے پاکستان سے آنے والی ہر فلائٹ کو چیک کرتا تھا۔ پسنجر انفارمیشن والے ہر فلائٹ کے مسافروں کی لسٹ دیکھ کے نام بتادیتے تھے کہ کراچی سے یہ مسافر سوار ہوئے ہیں۔"

"مگر ہم تو کولمبو سے آئے ہیں۔"

"مجھے کراچی کی فلائٹس چیک کرتے ہوئے تین دن ہوگئے تھے۔ کل خیال آیا کہ کہیں کولمبو والی بات سچ ہی نہ ہو۔ لندن براستہ کولمبو اور پیرس۔ یہ بھی ناممکن تو نہیں بلکہ دیکھا جائے تو کراچی سے پیرس کے راستے لندن جانے کا خیال کسی کو بھی آسکتا ہے مگر کولمبو کی کون سوچتا ہے حالانکہ وہ زیادہ آسان ہے اور زیادہ محفوظ ہے۔ گل تو میرا مذاق اڑاتی تھی کہ تمہیں الہام تو نہیں ہوا جو اتنی باقاعدگی سے فلائٹ چیک کرتے ہو۔ میں اسے کیا بتاتا کہ یہ الہام سے کم نہیں کہ میری چھٹی حس اور تیری ساتویں حس۔"

"میری چھٹی حس اور تیری ساتویں حس" میں نے تصحیح کی۔

"کل سے میں کولمبو کی پروازیں بھی دیکھ رہا تھا۔ آج انکوائری نے ایک نام لیا وقار یوسف ایڈووکیٹ تو میں اچھل پڑا اور میں نے گل کا ہاتھ پکڑا اور چلّا کے کہا کہ "تھا جس کا انتظار وہ شہکار آگیا... آگیا... آگیا آپ کے شہر پیرس میں" گل سمجھی میں پاگل ہوگیا ہوں۔"

"مجھے یاد ہے بچپن کی بات۔ لاہور میں تانگوں پر نئی فلم کا اشتہار اسی طرح دیا جاتا تھا۔ تانگے کے تین طرف پوسٹر لگائے جاتے تھے' بڑے بڑے۔ اندر بیٹھا ہوا ایک شخص اشتہار پھینکتا جاتا تھا جس پر فلم کی ریلیز کی دھماکا خیز تاریخ کے علاوہ دیگر سنسنی خیز تفصیلات اور بعض اوقات ہاتھ سے بنائی ہوئی ہیجان انگیز تصویریں بنی ہوتی تھیں۔ بچے اشتہار دیکھنے کے لیے پیچھے دوڑتے تھے اور اندر بیٹھا ہوا کوئی دوسرا شخص لاؤڈ اسپیکر پر یہی اعلان کرتا تھا "آگیا... آگیا... دلیپ کمار' نرگس' نمی اور اشوک کمار کا نیا شہکار۔ دیدار... جمعۃ المبارک کو شاندار افتتاح۔"

"گل تو قائل ہوگئی" محسن ہنسا۔ "میں نے کہا کہ یہ معاملات دل کے نہیں دماغ کے ہیں تم نہیں سمجھوگی۔ پیدائش سے اب تک ساتھ رہنے سے ہمارے دماغ ایک ہی انداز میں سوچتے سوچتے ایک ہوگئے ہیں۔ ہماری مینٹل فریکوئنسی ایک ہوگئی ہے۔ اسے ٹیلی پیتھی کہو یا خیال خوانی۔ میں جانتا ہوں کہ مخصوص حالات میں سکندر کیا سوچے گا اور اس کا ذہنی ردِعمل کیا ہوگا۔ وہ کیا کرسکتا ہے اور کیا نہیں کرسکتا۔"

میں نے کہا "اور فرض کرو وقار یوسف کوئی اور ہوتا؟"

"وہ دوسری رابعہ کہاں سے لاتا" محسن بولا "تجھے تو میں نے نہیں پہچانا اس گھنی داڑھی میں لیکن گل نے رابعہ کو مجھ سے پہلے ہی دیکھ کے چیخ ماردی تھی۔"

میں نے کہا "تو نے بھی کراچی سے پاسپورٹ بنوایا؟"

"بالکل۔ نقد مال لُٹایا۔"

"بڑا آسانی سے مل گیا تھا؟"

"ہاں۔ اپنی فرنچ نے وہ کام کیا جو پیسے سے نہیں ہوسکتا تھا۔ ایک خاتون تھیں بڑی طرح دار۔ میں نے کچھ زیادہ ہی فرنچ داغ دی۔ وہ بہت خوش ہوئیں اور بہت ہنسیں کہ تم دلچسپ آدمی ہو۔ افسوس ہے دوست کہ ہم اب وہ نہیں ورنہ جب کوئی عورت یہ کہے تو سمجھو گرین سگنل ہے۔ اب یہ مرد کا کام ہے کہ وہ پیش قدمی کرے۔ گل بہت جل بھُن رہی تھی کیونکہ سمجھ میں تو اس کی کچھ بھی نہیں آرہا تھا مگر ایک تو اسے میم کے لباس پر اعتراض تھا' دوسرا اس سے میری بے تکلفی پر۔"

میں نے کہا "انسان کا کیا بھروسا ہے بہک جاتا ہے... یا پھسل جاتا ہے۔"

"کیا خیال ہے' واپس چلیں؟"

میں نے گھڑی دیکھی "ساڑھے چار۔ کیا تجھے نیند آرہی ہے؟"

"نہیں لیکن ہماری بیویاں پھر کوئی تہمت لگادیں گی۔"

"وہ بھی دیر تک باتیں کرتی رہی ہوں گی اور دیر سے اُٹھیں گی۔ چل کہیں اور چلتے ہیں۔ پیرس... کی یہ رات پھر آئے نہ آئے؟"

"ہم واپس بھی ادھر ہی آسکتے ہیں اور جب تک ٹھہرنا چاہیں...."

میں نے کہا "نہیں دوست۔ وقت کم ہے اور سفر طویل۔ ہم خود بھی نہیں جانتے کہ ہماری اگلی منزل کہاں ہے۔ تقدیر ہمیں کہیں بھی لے جاتی ہے ہمارے ارادے کچھ کام نہیں آتے۔"

"تُو بلاوجہ قنوطی ہورہا ہے۔" محسن نے اٹھتے ہوئے کہا۔

صبح کا اجالا افق پر نمودار ہونے لگا اور اسٹریٹ لائٹس ابھی روشن تھیں۔ ہم نے تیسری جگہ کافی پی اور واپس ہوئے۔ اب گاڑی میں چلا رہا تھا۔ انٹرنیشنل ڈرائیونگ لائسنس ہم دونوں میں سے کسی کے پاس بھی نہیں تھا اور اگر کوئی پولیس مین چیک کرتا تو پھر اپنے پاکستان کی طرح ہم رشوت دے کر نہیں چھوٹ سکتے تھے لیکن پیرس میں یا لندن میں پولیس مین اس وقت تک کسی سے تعرض نہیں کرتا جب تک کوئی غلطی نہ کرے۔ راہ چلتے لوگوں کو بلاوجہ روک کے پوچھ گچھ کرنے کا وہاں کوئی تصور نہیں۔ میں پیرس کے ٹریفک رولز سے واقف تھا اور محسن کی نظر ہر ٹریفک سائن کو دیکھ رہی تھی۔ خطرہ صرف یہ تھا کہ ہم ون وے ٹریفک کے خلاف نہ چل پڑیں۔

ہم ہوٹل کے قریب تھے جب محسن نے ایک دلچسپ تجویز پیش کی۔ اس نے ایک جگہ سے گہری سُرخ اور آتشیں گلابی لپ اسٹک خریدی۔ ایک لپ اسٹک سے میں نے اپنے ہونٹ لال کیے۔ دوسری سے محسن نے گلابی پھر ہم نے باری باری ایک دوسرے کی قمیص کے کالر اور کوٹ کے شولڈر پر لبوں کے نشانات ثبت کیے پھر ہونٹ یوں صاف کیے کہ خفیف سی سُرخی اور گلابی رنگ کی جھلک باقی رہے۔ یوں جیسے یہ کسی اور کے لبوں کا رنگ ہے جو ہمارے ہونٹوں پر آگیا۔ لپ اسٹک ہم نے کوٹ کی جیب میں ڈال لی۔

ہوٹل میں کار پارک کرتے ہوئے مجھے خیال آیا "شیردانی صاحب' یہ تو میں نے پوچھا ہی نہیں کہ میں وقار یوسف ہوں تو آپ کیا ہیں؟"

"ناچیز کو عباس علی شاہ کہتے ہیں۔ اے اے شاہ' گل نے مجھے شاہ جی کہنا شروع کردیا ہے۔ رابعہ کیا کہتی ہے تجھے۔"

"اب وہ نام نہیں لیتی میرا۔ کہتی ہے نکاح ٹوٹ جائے گا۔"

"پھر تو بڑا مسئلہ ہوگا۔ منے کے ابا بھی نہیں کہہ سکتی" محسن ہنسا۔

محسن نے کاؤنٹر سے چابی لی تو اس مرد نما عورت نے غور سے اس کے اور میرے لبوں کی رنگینی کو دیکھا "کون بدتمیز لڑکی تھی تمہارے ساتھ؟"

محسن نے اشارے سے کہا "شش... بدتمیزی میں نے کی تھی" اس نے جیب سے نکال کے لپ اسٹک دکھائی اور خاتون کو حیران چھوڑ کے چل پڑا۔ یہ مہمل بات اس کی سمجھ میں آ بھی نہیں سکتی تھی۔

ابھی محسن نے دروازے میں چابی لگائی ہی تھی کہ سامنے والے کمرے کا دروازہ کھل گیا۔ میں اور محسن یوں چونک کر پلٹے جیسے چوری کرتے ہوئے پکڑے گئے ہوں۔ رابعہ کے پیچھے مجھے گل کا چہرہ نظر آیا۔ ان کا طنزیہ تبسم ان کے جذبات کی ترجمانی کرتا تھا۔

محسن نے دانت نکال کے کہا "بھئی جاگ رہی ہو تم لوگ۔"

میں نے مجرم لہجے میں کہا "خیر ہم آگئے۔"

وہ ہمارے کمرے میں آگئیں۔ ان کے تیور بھی جارحانہ تھے۔

گل نے کہا "شاہ جی۔ کہاں سے آرہی ہے سواری۔"

محسن نے جانتے بوجھتے ہکلا کے کہا "کہیں سے نہیں.... میرا مطلب ہے بس ایسے ہی۔ نیچے گئے تھے۔"

میں نے کہا "ہاں نیچے گئے تھے۔ ہم اوپر بھی جاسکتے تھے۔ مگر وہ نیچے تھی۔"

"ہاں... وہ۔ اس کا مطلب ہے چائے.... چائے.... کیفے میں۔"

رابعہ نے مجھے گھور کے کہا "چائے' لال چائے تھی؟"

میں نے کہا "ہاں.... لال ہوتی ہے نا چائے۔ کشمیری چائے لال ہوتی ہے۔"

گل نے کہا "اور تم نے کون سی چائے پی جو گلابی تھی؟"

"وہ گلابی چائے.... تم مذاق کررہی ہو" محسن خفت سے بولا "البتہ پان کھایا تھا۔ ہونٹ لال ہورہے ہیں نا؟"

گل نے بگڑ کے کہا "یہاں پیرس میں پان' شاہ جی! کچھ شرم کرو' کہاں کہاں گلابی رنگ چغلی کھا رہا ہے۔"

رابعہ بولی "تمہاری لال چائے بھی اِدھر اُدھر بہت چھلکی ہے' کون تھی یہ لال پری؟"

"لال پری؟ لاحول ولا قوۃ۔" میں نے کہا "کیا سمجھ رہی ہو تم آخر؟"

"وہی جو مجھے نظر آرہا ہے۔" رابعہ نے برہمی سے کہا "اس لیے آئے تھے پیرس!"

گل نے بھی ہنگامہ کیا "سچ سچ بتادو کس کے ساتھ رہے رات بھر۔"

میں اور محسن شکست خوردہ اور شرمسار چہرے بنا کے بیٹھ گئے اور ایک دوسرے سے لڑنے لگے "اُلّو کے پٹھے... میں نے کہا تھا۔"

"تُو نے خاک کہا تھا۔ فون کس نے کیا تھا؟"

"تُو نے کہا تھا کہ پتا نہیں چلے گا۔ وہ تو مری پڑی ہیں۔"

گل تو آگ بگولا ہوگئی "ہم مرے پڑے تھے۔ شاہ جی' میں مار ڈالوں گی تمہیں۔ کس کو بلایا تھا فون کرکے۔ میرے ساتھ یہ سب نہیں چلے گا۔ بھول جاؤ پُرانے کرتوت۔"

رابعہ سیریس ہوگئی "چھوڑو گل۔ ابھی تو پیرس پہنچے ہیں۔ لندن جا کے کیا ہوگا جہاں چار سال انہوں نے ایسے ہی گزارے تھے۔"

"تمہیں کچھ فراخ دلی کا مظاہرہ کرنا چاہیے گل۔ ہم پاکستان میں تو نہیں ہیں" محسن بولا "یہاں سب چلتا ہے۔"

میں نے اسے ڈانٹا "بکواس مت کر۔ تو بہک رہا ہے۔ اتنی کیوں پی تھی؟"

"اتنی کہاں۔ اتنی سی پی تھی۔ تھوڑی سی" محسن نے دو انگلیوں اور ایک انگوٹھے سے چھوٹے پیگ کی وضاحت کی۔

"عادت نہ ہو تو تھوڑی بھی بہت ہوتی ہے۔"

"ہاں۔ یہ تو ہے۔ جتنی تو نے پی۔ اس سے ایک... نہیں دو پیگ زیادہ میں نے پی' اس نے پلادی۔"

"کس نے پلادی..." میں نے بوکھلا کے کہا۔

رابعہ اور گل دم بخود کھڑی تھیں اور سناٹے میں آگئی تھیں۔ ہم نشے کی اوور ایکٹنگ کرتے تو وہ سمجھ جاتیں مگر ہم ہوش میں رہ کے بات کررہے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ سچ بلا ارادہ ہماری زبان سے نکل گیا ہے۔ مشہور ہے کہ آدمی نشے میں ہو تو سچ بولنے لگتا ہے۔

گل ایک دم محسن پر پل پڑی "تم نے... شراب بھی پی لی۔ یہاں آتے ہی حرام چیز کو منہ لگالیا۔ ذلیل' کمینے' بے شرم..." وہ محسن کا منہ نوچ لیتی اگر اسے رابعہ نہ پکڑتی۔ رابعہ کا ردِعمل قطعی مختلف تھا۔ وہ رو رہی تھی۔

جب محسن نے ہنسنا شروع کیا اور میں نے بھی رابعہ کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کے قہقہے لگائے تو پہلے انہیں شک ہوا کہ یہ بھی نشے کا اثر ہے پھر محسن نے اور میں نے جیب سے لپ اسٹک نکال کے دکھائی تو انہیں اندازہ ہوا کہ یہ مذاق تھا۔ کھسیانی بلی کھمبا نوچے۔ حقیقت معلوم ہوجانے کے بعد گل اور محسن کی خوب لڑائی ہوئی۔

محسن نے کہا "تف ہے تم پہ۔ ایسا سمجھتی ہو تم مجھے۔"

"ایسا بے ہودہ مذاق کرتے ہوئے شرم نہیں آتی۔"

"کیا بے ہودگی ہے اس میں۔ اگر ہم نے لپ اسٹک لگالی۔"

رابعہ نے آنسو پونچھ کے صرف اتنا کہا "آئی ایم سوری۔"

میں نے محسن اور گل کی موجودگی کا خیال کیے بغیر اسے چوم لیا۔ اس کی آنکھوں کو' پھر گلے لگالیا........ اس کی ساری مزاحمت رائگاں گئی۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ گل اور محسن اپنی لڑائی بھول گئے اور ہمیں دیکھنے لگے۔ رابعہ خود کو مجھ سے چھڑا کے بھاگ گئی' اب وہ سخت خفا تھی۔

میں نے کہا "یہ پیرس ہے۔ یہاں سب چلتا ہے۔"

محسن نے کہا "اچھا' میں تو بھول ہی گیا تھا" لیکن گل نے اسے دھکا دے کر صوفے پر گرالیا اور ہنستی ہوئی رابعہ کے پیچھے بھاگ گئی۔ اب ہم نے سونے کی فضول کوشش بھی ترک کردی۔ بہت دیر ہوگئی تھی اور مجھے معلوم تھا کہ اب رابعہ اور گل بدلہ لیں گی اور ہمارا سونا محال کردیں گی۔

میں نے ناشتے سے پہلے بڑی مشکل سے رابعہ کو منایا "مجھ سے غلطی ہوگئی۔ تمہاری آنکھوں میں آنسو دیکھ کے میں جذباتی ہوگیا تھا۔ اس بار معاف کردو۔"

رابعہ نے کہا "آئندہ یہ سمجھنا کہ ہم پاکستان میں ہی ہیں۔ پیرس کا بہانہ کرکے کوئی ایسی حرکت کی نا... جسے یہاں معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ تو میں وہیں تھپڑ ماردوں گی منہ پر۔"

"چلو ایک تھپڑ کی کوئی بات نہیں' تم ایڈوانس مارلو" میں نے کہا۔ "مجھے بہت اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ ایسا کہہ سکتی ہے کر نہیں سکتی۔

ایک پورا دن ہم نے پیرس میں تفریح کی نذر کردیا۔ ہم سب ہی ایک لاشعوری خوف کے دباؤ میں تھے حالانکہ ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ نہ ہمارے پاسپورٹ جعلی تھے اور نہ ہم بغیر ویزا کے یا غیر قانونی طور پر یہاں آئے تھے۔ صرف ہمارے نام پتے غلط تھے مگر ان کو چیلنج کرنے والا کون تھا۔ پیرس میں کسی آشنا کے مل جانے کا امکان ہی نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس کے علاوہ ہمیں ایک ایڈوانٹیج یہ حاصل تھا کہ میں اور محسن فرنچ جانتے تھے۔ مزید یہ کہ بلحاظِ پیشہ میں وکیل تھا تو محسن صحافی' اور پاکستان کی طرح فرانس میں بھی یہ معزز پیشے شمار ہوتے تھے۔ میں نے اور مجھ سے پہلے محسن نے ایئرپورٹ پر ہی کرنسی ایکس چینج کرالی تھی۔ جتنی رقم میرے پاس بچی تھی وہ چند دن قیام کے بعد واپسی کے لیے کافی تھی مگر محسن کے مل جانے سے مجموعی مالی صورتِ حال بہت بہتر ہوگئی تھی اور اب ہم تھوڑی بہت عیاشی کے بھی متحمل ہوسکتے تھے۔

اس رات میں نے اور محسن نے سنجیدگی سے لندن پہنچنے کی راہ میں حائل عملی دشواریوں کا جائزہ لیا "بائی روڈ جانے میں کوئی قباحت نہیں۔" محسن بولا۔

"فرانس کے شہریوں کے لیے واقعی کوئی قباحت نہیں۔ لندن والے بھی اِدھر آجاتے ہیں۔ دونوں سفید فام نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایشیائی اپنے رنگ سے پہچانے جاتے ہیں" میں نے کہا۔

"ہمیں بارڈر پر روک لیا جائے گا" محسن بولا "ہمارے فرنچ بولنے سے امیگریشن والے قانونی پابندی میں نرمی نہیں کریں گے۔ بغیر ویزا کے آنے جانے کی سہولت ویک اینڈ پر کالے لوگوں کو حاصل نہیں۔"

"پھر کیا ویزا حاصل کریں؟"

"میں نے بات کرلی ہے" محسن بولا "ویزا کی پرابلم نہیں ہوگی مگر میرا اور تیرا نام ریکارڈ پر آجائے گا۔ میں تو کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتا مگر کراچی سے اپنی سابقہ محبوبۂ دلنواز کو فون کرکے آپ نے جو جذباتی حماقت فرمائی تھی اس کے بعد آپ کی پوزیشن محفوظ نہیں رہی۔"

"مجھے کیا معلوم تھا کہ اس کا شوہر اتنا حاسد ہوگا اور سابقہ رقیب بھی۔ یعنی کڑوا کریلا اور نیم چڑھا۔ مزید بدقسمتی یہ کہ قونصلیٹ بھی کلاس میٹ نکلا۔"

"اب فرض کرکہ کراچی کے قونصلیٹ نے دوبارہ فون کرنے پر اس کریلے کو یہ بتایا ہو کہ غالباً وہ سکندر بخت ہی تھا جو وقار یوسف ایڈووکیٹ بن کے ویزا لینے آیا تھا۔ اس نے خود کو لیڈی الزبتھ کا کلاس فیلو بتایا مگر میں بھی بھولا نہیں ہوں سکندر بخت کو اور یہ بھی کہ ہمارے ساتھ کتنے پاکستانی لڑکے تھے۔ میں نے تھوڑی سی جرح کی تو وہ نکل گیا۔ پلٹ کے ہی نہیں آیا۔ اس سے میرے شبہات کی تصدیق ہوتی ہے۔ بس مجھ سے تھوڑی سی غلطی یہ ہوگئی کہ اسے فوراً گرفتار نہیں کرایا۔ میں نے سوچا کہ اسے لندن ایئرپورٹ پر گرفتار کرکے پہلے کی طرح واپس کیا جائے گا تو باقی معاملات سے مقامی پولیس خود نمٹ لے گی۔ چور کی داڑھی میں تنکا۔ غالباً اس کی تو داڑھی بھی نقلی ہوگی۔ وہ گھبرا کے بھاگ گیا۔ اب یہ ہوسکتا ہے کہ وہ کسی اور طرف سے لندن میں داخل ہونے کی کوشش کرے۔ جرمنی' فرانس اور سوئزرلینڈ یا آسٹریا سے بہت سیاح آتے ہیں مگر آسان ترین راستہ یہی ہے۔ پیرس سے لندن' کیا پتا مسٹر گورڈن نے امیگریشن والوں کو پہلے ہی وقار یوسف ایڈووکیٹ کا نام دے رکھا ہو۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا "میرے نام کو ایک بین الاقوامی حیثیت حاصل ہوچکی ہے۔ مسٹر گورڈن کے علاوہ بھی کم سے کم دو درجن افراد ضرور ایسے ہوں گے جن کو میری رقابت کا شرف حاصل ہے۔ یہ اور بات ہے کہ انہیں علم نہیں ورنہ سب باری باری مجھے قتل کرنے آجائیں۔"

محسن ہنسا "اب کیا معلوم کون کہاں ہے' کس حال میں ہے۔ کون کتنے بچوں کی ماں ہے اور کس کی بیوی ہے یا محبوبہ ہے؟"

"ایسا کرتے ہیں۔ اخبار میں اشتہار دیتے ہیں کہ ہم جو فلاں فلاں سے فلاں دَور میں مراسم رکھتے تھے پھر آگئے ہیں۔ صلائے عام ہے' جس کا جی چاہے پھر دل لگالے۔ اگر کسی نے دل نہ لگایا ہو' اور کوئی رقابت یا عداوت کے ارمان نکالنا چاہے تو آجائے مقابلے پر۔"

محسن نے کہا "کتنا مزہ آتا اگر ہم دونوں ہی آتے۔ ان سب سے مل کر دیکھتے کہ اب ان کا جذباتی ردِعمل کیا ہوتا ہے؟"

"جذباتی ردِعمل سے آپ کو مایوسی ہوتی۔ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل اور یہ لڑکیاں دیارِ مغرب کی۔ شاید وہ ہمیں پہچاننے سے بھی انکار کردیں۔ ایسے عشق کا روگ تو صرف فلمی ہیروئن پالتی ہیں کہ... بیٹھی تری یاد کو سینے سے لگائے۔ وہ جو علامہ صاحب نے فرمایا ہے کہ۔

ہاں دکھادے اے تصور پھر وہ صبح وشام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

یہ تصور کی حد تک ٹھیک ہے۔ ورنہ وقت جو گزر گیا سو گزر گیا۔"

محسن نے کہا "ایک طریقہ اور بھی ہے۔ دراصل یہ ہوسٹل ایک یونیورسل قسم کی جگہ ہے جہاں دنیا کے ہر حصے کا سیاح بھی آتا ہے اور فرانس کا رہنے والا بھی اس سرائے کو عارضی قیام کے لیے برا نہیں سمجھتا۔ مستقل ٹھکانا کسی کا بھی نہیں۔ فرنچ بولنے کی وجہ سے میری ملاقات ایک ٹرک ڈرائیور سے ہوگئی۔ وہ لندن اور پیرس کے ڈیپارٹمنٹل اسٹورز میں گروسری سپلائر ہے لیکن اس نے مجھے بتایا کہ اب اس نے شادی کرلی ہے تو اخراجات پورے نہیں ہوتے۔ وضاحت بھی اس نے خود ہی کردی کہ اخراجات سے اس کی مراد ہے عیاشی کے اخراجات۔ جب آدمی لندن اور پیرس کے درمیان ٹرک میں آتا جاتا ہو تو یکسانیت سے اکتا جاتا ہے اور اسے کچھ تفریح کی ضرورت پڑتی ہے جو پیرس میں بہت ہے مگر مہنگی ہے۔ اب وہ گروسری کے ساتھ کچھ اور سامان بھی اِدھر سے اُدھر پہنچاتا ہے تو عیاشی کے لیے رقم نکل آتی ہے۔ اس نے کہا کہ آدمی لندن میں اپنے بیوی بچوں کو تنگی میں نہیں دیکھ سکتا اور اصل آمدنی چھپا نہیں سکتا۔ آمدنی پر ان کا حق ہے۔"

میں نے کہا "بڑا خیال ہے فیملی کا' بدمعاش۔"

"جب اس نے اضافی آمدنی کا ذکر کیا تھا تو میں سمجھ گیا تھا کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔ اس نے مجھے آنکھ مار کے اور واضح کردیا کہ جو مال وہ اِدھر سے اُدھر لے جاتا ہے وہ آسانی سے اور قانونی طریقے سے سرحد پار نہیں کرسکتا۔ عرفِ عام میں اسے اسمگلنگ کہتے ہیں۔ اس کی پرانی گڈول ہے اور کمپنی کی بھی چنانچہ اس کے ٹرک کو کہیں کوئی نہیں روکتا۔ کیا خیال ہے اگر اس سے بات کی جائے؟"

میں نے کہا "کیسی بات؟ یعنی وہ ہمیں ٹرک میں اسمگل کردے؟"

"یہ ٹرک کوئی عام ٹرک نہیں ہے۔ چالیس فٹ لمبا کنٹینر ہے۔ جس میں وہ ہر ہفتے سامان لاتا اور لے جاتا ہے۔ ایک ویک اینڈ سے پہلے لندن پہنچتا ہے اور ڈلیوری دیتا ہے۔ پھر دو دن چھٹی کے مل جاتے ہیں۔ اگلے دو تین دن دوبارہ لوڈنگ ہوتی ہے اور اگلا ویک

اینڈ پیرس میں گزرتا ہے۔"

"ہم اس کنٹینر میں بیٹھ جائیں۔ آلو گوبھی اور ٹماٹر کے کسی کریٹ میں گھس جائیں اور وہ ہمیں لندن کی سڑک پر اُتار کے بری الذمہ ہو جائے۔"

"ہاں۔ اس میں حرج ہی کیا ہے؟"

"ایسے ہی واپسی بھی ہو گی؟"

"اگر ہم تین دن میں اپنا کام ختم کرلیتے ہیں تو ایڈی کو ہمیں واپس لانے میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔"

"ایڈی' اس ڈرائیور کا نام ہے' پورا نام ایڈورڈ ہو گا؟"

محسن نے اقرار میں سر ہلایا "خطرہ نہ اس کے لیے ہے نہ ہمارے لیے' اسے صرف معاوضے سے سروکار ہے جو ہم یہاں طے کرسکتے ہیں۔"

"کیا وہ اس حد تک بھروسے کے قابل ہے؟ سامان کی بات اور ہے۔ ہم پاکستانیوں کو برطانیہ والے زیادہ پسند نہیں کرتے۔"

"ناپسند کرتے ہیں۔" محسن بولا "لیکن ایڈی نسلی تعصب کے خلاف ہے۔ فخریہ بتاتا ہے کہ اس کی بیوی کالی ہے اور وہ اس سے بہت محبت کرتا ہے۔ مجھے اس کی تصویر بھی دکھائی تھی۔ میں نے کہا یہ نیگیٹو ہے تو وہ بہت ہنسا۔ کہنے لگا کہ تم لوگ گورے رنگ پر مرتے ہو۔ گوری لڑکیاں نیگروز کے پیچھے پھرتی ہیں۔ مخالف جنس کے مخالف رنگ میں کشش ہوتی ہے شاید۔"

"وہ پوچھے گا نہیں کہ تم لوگ ایسا کیوں کر رہے ہو؟"

"اس سے صاف بات کی جاسکتی ہے کہ آخر ہم معقول معاوضہ کس بات کا دے رہے ہیں۔ وہ فضول سوال نہ کرے۔ ہم قانونی طور پر آجاسکتے تو پھر مسئلہ ہی کیا تھا۔ معقول معاوضہ اگر بہت معقول ہو گا تو اس نامعقول کا منہ بند کردے گا۔"

میں نے کہا "اگر آپ کے اندازے غلط ہوئے۔ اس نے رقم وصول کرلی اور آپ کو پولیس کے حوالے کردیا پھر۔ جو شخص نسلی تعصب نہ رکھتا ہو۔ ضروری نہیں کہ وہ محبِ وطن بھی نہ ہو اور غلط قسم کے افراد کو برطانیہ اسمگل کرنے پر راضی ہو جائے۔"

"اسے قائل کیا جاسکتا ہے کہ ہمارے عزائم غلط نہیں۔ کچھ مجبوریاں ہیں ایسی کہ ہم براہِ راست لندن نہیں جاسکتے۔ فرض کرو ہم اسے بتادیں کہ ہمیں لیڈی الزبتھ کے متعصب باپ نے ڈی پورٹ کرادیا تھا اور اب اس کا شوہر مسٹر گورڈن بھی اس نسلی تعصب کے جذبات کے باعث یہ نہیں چاہتا کہ ہم برطانیہ میں داخل ہوں۔ ہم نے لیڈی الزبتھ کو اعتماد میں لینے کی غلطی کی تھی ورنہ کسی کو پتا بھی نہ چلتا اور ہم اپنا کام کرکے چلے جاتے۔ کام بہت اہم ہے۔ اس پر کسی کی زندگی کا انحصار ہے۔ ایک ٹرک ڈرائیور مان جائے گا کہ پاکستان سے ایک وکیل اور ایک صحافی مجرمانہ عزائم کے ساتھ لندن نہیں آسکتے۔ ہم اسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ چاہے تو لیڈی الزبتھ کے شوہر مسٹر گورڈن سے فون پر بات کرکے تصدیق کرلے۔ وقار یوسف ایڈووکیٹ کے نام پر وہ مشتعل ہو جائے گا۔"

میں نے کہا "اوکے۔ یہ اسکیم قابلِ عمل ہے لیکن ... کیا ہو گا۔ وہ راضی ہو جائیں گی سبزی کی طرح جانے پر۔ اس کے علاوہ ایک مسئلہ ہو گا بوبی کا۔"

"میری تجویز یہ ہے کہ خواتین اسی ہوسٹل میں قیام فرمائیں لندن جانے کی زحمت نہ کریں۔ وہاں ان کا کوئی کام نہیں ... ہمارے لیے مسائل پیدا کریں گی۔ ہمارا کیا ہے۔"

"شیروانی صاحب۔ وہ ہمیں اکیلا ہرگز نہیں جانے ... ہمارا سابقہ ریکارڈ اچھا نہیں اور گزشتہ رات آوارہ گردی ... نے اپنے کردار کو مزید ناقابلِ اعتماد ثابت کردیا ہے۔"

محسن نے چٹکی بجا کے کہا "اس کا بھی ایک طریقہ ہے۔ ... کے لیے پیغام چھوڑ کے نکل جائیں گے۔"

"یعنی چپکے سے فرار ہو جائیں گے" میں نے کہا۔

"بالکل۔ وہ کیا کریں گی۔ ہمارے لوٹ کر آنے تک ایک دوسرے کو تسلی دیں گی کہ فکر کی کوئی بات نہیں یا غصے میں گالیاں دیں گی۔ جھلاہٹ اور بے بسی میں بُرا بھلا کہیں گی اور جب ... بدھو گھر کو لوٹ کر آئیں گے تو بڑی زبردست لڑائی بھی ہو گی لیکن لڑائی تو ہوتی رہتی ہے۔ انہیں خفا ہونا آتا ہے تو ہمیں منانا آتا ہے آج تُو نے بھی تو منا ہی لیا تھا۔" محسن نے قہقہہ مارا۔

"لندن میں تین دن کہاں رہیں گے ؟"

"سو سال پہلے غالب نے پوچھا تھا۔ ہم نے یہ مانا کہ دلّی میں رہیں کھائیں گے کیا؟ حالانکہ دلّی میں رہنے والے اس وقت بھی کچھ نہ کچھ ضرور کھا رہے ہوں گے۔ اب آپ نے رہنے کی بابت سوال کیا ہے تو جناب کیا لندن میں جو دنیا کا سب سے بڑا شہر ... ہے۔ ہم دو افراد کے لیے جگہ نہیں ہو گی۔ کیا واقعی ... جگہ نہیں رہی وہاں..."

"میرا مطلب تھا کس کے ساتھ۔ ہوٹل میں گئے ... پاسپورٹ دیکھیں گے اور اس میں کوئی اندراج نہیں ہے۔"

"بھائی بریڈ فورڈ میں لاکھوں پاکستانی اور بھارتی رہتے ہیں ... یہ گورے بڑے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہوئے پوچھتے ہیں کہ تم دونوں میں فرق کیا ہے۔ سالے خود ایک کے دو ملک بنا کے ... تھے۔ بریڈ فورڈ کو منی پاکستان بھی کہتے ہیں' یہ باتیں آپ کو معلوم ہوں گی۔ وہاں غیر قانونی تارکینِ وطن سے لے کر وہ پاکستانی ... مین بھی ہیں جو بھول گئے ہیں کہ وہ پاکستانی ہیں۔ ان کے آباؤ ... نقلِ وطن کرکے آئے تھے مگر وہ پیدا بھی وہیں ہوئے اور وہیں ... گے۔ ہمارے بہت جاننے والے تھے وہاں۔"

"اب صورتِ حالات کچھ اور ہے۔ ان سب کو علم ہے کہ ... کو برطانوی حکومت نے پورے سرکاری اعزاز کے ساتھ بے ... کیا تھا۔ جو ہمیں جانتے تھے وہ سب یہ بات جانتے ہیں۔ یہ مسئلہ ... ہوتا تو سارا لندن اپنا تھا۔"

"تو فکر مت کر۔ ایسے ہم وطن بہت ہیں جو ہماری مدد کریں گے اور ہمدرد ہوں گے ہمارے۔"

"کیا ان کے ماتھے پر لکھا ہو گا کہ وہ ہمدرد ہیں' یا ہم خود ان سے معلوم کریں گے کہ بھائی صاحب آپ ہماری مدد کریں گے یا قانون کی؟"

"ایک ہستی سے میں واقف ہوں۔ جس کے بارے میں دعوے سے کہا جاسکتا ہے کہ ہر محبِ وطن پاکستانی کے لیے اس کے گھر اور دل کے دروازے کھلے رہتے ہیں۔ فی سبیل اللہ دشمنی میں سرِفہرست گورے ہیں۔ اس معاملے میں ان کے اور ہمارے درمیان انگریز دشمنی واحد قدرِ مشترک سمجھی جاسکتی ہے۔ بقول ان کے' وہ گوروں کے ملک میں صرف اس لیے رہتے ہیں کہ گوروں کو ذلیل کریں کیونکہ یہ ڈیڑھ سو سال ہمارے ملک میں ایسا ہی کرتے رہے تھے۔"

میں نے ہنس کے کہا "یعنی دریا میں رہ کے مگرمچھ سے بیر رکھتے ہیں یا رکھتے تھے۔ کیا معلوم وہ اس صلیبی جنگ میں جامِ شہادت نوش کرچکے ہوں۔"

"ان کا کوئی گدی نشین ضرور ہو گا۔ ان کا ایک حلقۂ یاراں تھا جس میں سب انہی جیسے کریک تھے۔ دشمنی میں وہ دوسرے نمبر پر بھارت کو رکھتے ہیں۔ بلکہ ایک زمانے میں تو انہوں نے دروازے پر تختی لگادی تھی کہ "گورے' کتے اور بھارتی کو داخل ہونے کی اجازت نہیں" اس پر کسی نے مقدمہ کردیا اور غالباً ان کی متعدد بار گوشمالی ہوئی۔ عدالت میں انہوں نے یہ مؤقف اختیار کیا کہ آخر برطانیہ میں بھی ہوٹلوں کے باہر یہ لکھا جاتا تھا کہ کتے اور کالے کو اندر آنے کی اجازت نہیں۔ وہ ایک پبلک پلیس تھا جہاں کسی کو روکا نہیں جاسکتا۔ میں کیا اپنے گھر کے دروازے سب کے لیے کھول دوں؟ سنا ہے ان کے مؤقف کو تسلیم کرلیا گیا تھا۔"

میں نے کہا "کون ہے یہ ہستی؟ آخر میں ان کو کیوں نہیں جانتا؟"

"وہ تجھے ضرور جانتے ہوں گے۔ میں شرط لگا سکتا ہوں۔ کیونکہ تُو نے جو کارنامے سرانجام دیے۔"

"ایم آر ایس نے جو کارنامے سرانجام دیے" میں نے تصحیح کی۔

"او یار' نام تو سپہ سالار کا ہی ہوتا ہے نا۔ تجھے وہ مجاہدِ اعظم تسلیم کرتے ہوں گے۔ یہاں اپنے پاکستان کے پہلے تو بہت لوگ ملتے تھے جو ہمارے قدردان مہربان ہوتے تھے۔ اب یہ اتفاق ہے کہ تو ان سے نہیں ملا جیسے میں ابھی تک امریکی صدر سے نہیں ملا اور اس شخص سے بھی نہیں ملا جس نے چاند پر قدم رکھا تھا اور بہت مایوس تھا کہ وہ تو نہایت فضول سی چیز ہے۔ دور کے ڈھول سہانے بس زمین سے دیکھتے رہو تو اچھا لگتا ہے۔ اس لیے پھر کوئی وہاں نہیں گیا۔"

"فضول باتیں چھوڑ۔ یہ بتا کہ تُو نے کس کا ذکر کیا تھا۔ نام کیا ہے اس شخص کا۔"

"اس کا نام ہے حاجی علم دین طوطی۔ ایک اخبار بھی نکالتے ہیں جو غالباً ہفت روزہ ہے یا پندرہ روزہ۔ اخبار کا نام بھی طوطی ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ یہ کیا نام ہوا۔"

"اس کی لوح پر لکھا ہوتا ہے۔ کفر کے نقار خانے میں طوطی کی آوازِ حق۔ اپنا تخلص بھی انہوں نے اسی لیے طوطی کیا کہ ملکِ افرنگ میں جہاں کفر کا نقارہ بج رہا ہے طوطی کی آوازِ حق شعر بن کے لوگوں کے دل میں اُتر جائے۔ اپنے اشعار خود فریم کرا کے دیتے تھے کہ پان کی دکانوں پر اور ہوٹلوں میں طغروں کی طرح آویزاں کیے جائیں مگر قدرداں کاروبار کے نقصان سے ڈرتے تھے۔"

میں نے کہا "ان کا کوئی شعر یاد ہے؟"

محسن سوچ کے بولا "ہاں۔ کچھ یاد ہے' ایک قطعہ۔"

جب منی اسکرٹ سے ٹانگیں دکھائیں میم نے
ہم نے زورِ بازوئے مسلم دکھا کے یوں کہا
پہن لے شلوار قمیص ورنہ اِدھر سے دوڑ جا
اوئے کھوتی کیا سمجھ رکھا ہے طوطی کو گدھا"

"واہ واہ۔ کمال کردیا۔ کھوتی کے ساتھ گدھا۔ کیا رعایتِ لفظی ہے شیروانی صاحب اور زورِ بازوئے مسلم۔ سبحان اللہ۔ بازو اور ٹانگیں" میرا ہنستے ہنستے بُرا حال ہو گیا۔ "یار' تو کبھی ان کے اشعار لایا نہیں ورنہ ہم اپنے کمرے کی دیواروں کو بھردیتے۔"

"بس اتفاق ہے یا بدقسمتی ہے تیری" محسن بولا۔

"اگر وہ ابھی تک شہادت کے رتبے پر فائز نہیں ہوئے تو پھر سیدھے انہی کے پاس چلتے ہیں۔" میں نے کہا "یہ طے ہو گیا۔ اب تو ایڈی سے بات کرلے۔ وہ کب آئے گا۔"

"وہ آیا ہوا ہے۔ آج بدھ ہے نا۔ کل شام کو یا پرسوں صبح جائے گا۔"

میں نے کہا "اس میں بس ایک خرابی ہے۔"

"ذرا وضاحت فرمایئے۔"

"ہمارے دو دن ضائع ہو جائیں گے۔ سنیچر اتوار۔" میں نے کہا۔

"ابے گدھے۔ یہی دو دن تو ضائع نہیں ہوں گے۔ باقی تو ہم نے گویا عمر ضائع کردی اپنے ساتھ انہیں لا کر۔ یہ جو بلائیں چمٹ گئی ہیں ہمیں۔"

میں نے کہا "میں نے چغل خوری کردی تو مارا جائے گا بھوتنی کے۔"

"یہ عشق اپنی جگہ یار اور بڑا سچا اور پکا عشق ہے مگر اب آدمی لندن میں دو دن بھی آزاد نہ رہے اور پیرس میں بھی۔"

میں نے آہ بھر کے کہا "ہم اب شوہر ہیں۔ آدمی کی بات مت کر۔"

ایڈی سے صبح ملاقات ہوئی۔ میری توقعات کے برعکس وہ دبلا پتلا اور مختصر سا شخص تھا۔ میرا خیال تھا کہ جو شخص چالیس فٹ کا ٹرالر لے جاتا ہے اور عیاشی کی بات کرتا ہے وہ ہو گا کوئی لمبا تڑنگا

جاندار شخص۔ تاہم اس کے مختصر وجود میں بجلی بلکہ ایٹمی توانائی بھری ہوئی تھی۔ محسن اسے ہمارے کمرے میں ہی لے آیا تھا۔ خواتین نے بوجوہ احتجاجی واک آوٴٹ کیا۔ ایک تو وہ اکیلا نہیں آیا تھا۔ بوتل ساتھ لایا تھا جس سے وہ منہ لگا کے پی رہا تھا پھر ہم فرنچ میں فصاحت وبلاغت کے دریا بہا رہے تھے مگر رابعہ یا گل کے پلے ایک لفظ نہیں پڑ رہا تھا۔

"یہ تمہاری گرل فرینڈز کیوں اُٹھ کے چلی گئیں؟" ایڈی نے کہا۔

"یہ ہماری بیویاں تھیں۔"

"بیویاں!" اس نے بے یقینی سے کہا "تم جہاں جاتے ہو بیویوں کو ساتھ رکھتے ہو۔ بڑا حوصلہ ہے تمہارا۔ یہ دیکھو' میری بیوی۔"

اب میرے حیران ہونے کی باری تھی۔ جو تصویر مجھے ایڈی نے دکھائی تھی اس میں چھ فٹ لمبی اور تین فٹ قطر کی تارکول کے ڈرم جیسی سیاہ فام حسینہ ایڈی کو اپنی بھیانک بغل میں دبوچے کھڑی تھی اور ایڈی پھر بھی مسکرا رہا تھا۔ اس کا بھی بڑا حوصلہ تھا۔

میں نے محسن سے کہا "یار تو نے وہ لطیفہ سنا ہے۔ کسی ہتھنی سے ایک چوہے نے بیاہ کر لیا تھا۔"

محسن کی ہنسی چھوٹ گئی "سنا ہے' مگر اسے مت سنانا۔"

ایڈی بھی ہنسنے لگا "مجھے معلوم ہے تم کیا کہہ رہے ہو۔ یہی نا کہ اتنی بڑی اور بھاری بھرکم چیز کو میں کیسے ہینڈل کرتا ہوں؟ مگر میں تو چالیس فٹ لمبے ٹرالر کو بھی آسانی سے ہینڈل کر لیتا ہوں۔ بس اسٹیرنگ ٹھیک ہونا چاہیے اور ڈرائیور ماہر۔" پھر وہ اپنی مثال ..... پر خود ہی ہنسا۔

میں نے کہا "تم نے بُرا نہیں مانا۔ ہم واقعی یہی کہہ رہے تھے۔"

"برا ماننے کی کیا بات ہے اس میں۔ اپنی اپنی پسند ہے۔ کوئی موٹر سائیکل چلاتا ہے کوئی کار اور کوئی ٹرک" وہ پھر اچھل اچھل کے ہنسنے لگا۔

محسن نے اس سے کام کی بات کی تو وہ سیریس ہو گیا۔ اس نے پوری بات بڑی توجہ سے سنی اور پھر بولا "تم جھوٹ تو نہیں بول رہے ہو نا؟"

میں نے کہا "ہم جھوٹ بولنے والے ہوتے تو تمہیں نہ بتاتے کہ تمہاری بیوی کے بارے میں کیا بات کی تھی۔ ہم کہہ دیتے کہ تعریف کر رہے تھے۔"

"دیکھو۔ میرا کام تم کو لندن پہنچانا ہے۔ اب لندن جا کے تم کیا کرتے ہو۔ اس کی فکر میں کیوں کروں؟"

میں نے کہا۔ "رائٹ' تمہیں فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

وہ بولا "اگر تم نے کسی کو قتل کیا تو جیل بھی خود جاوٴ گے۔ اگر پکڑے گئے تو پھر پوچھا جائے گا کہ لندن کیسے پہنچے؟"

"ہم تمہارا نام نہیں لیں گے۔"

"نام لینے سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کوئی نہیں ... تمہاری بات۔ میں صاف انکار کر دوں گا۔ یہ ضرور تسلیم کروں گا کہ پیرس کے ایک ہوٹل میں ان کو دیکھا تھا۔"

میں نے کہا "یار ہم کسی کو قتل نہیں کر سکتے۔ بہت بزدل ہیں ہم لوگ۔"

"ایک بات بتاوٴں؟ بزدل ہی قتل کرتے ہیں" اس نے گویا بہت اہم انکشاف کرتے ہوئے کہا "بہادر نظر انداز کر دیتے ہیں ... معاف کر دیتے ہیں۔"

"تم خود کیا ہو؟"

"میں بہت بزدل ہوں۔" اس نے اعتراف کیا "کوئی میری بیوی کو ورغلائے تو میں اسے شوٹ کر دوں گا۔"

میں نے کہا "ایسا پاگل کون ہو گا دنیا میں؟"

وہ ہنسنے لگا "اچھا' اب بات کرو پیسے کی۔"

"تم خود بتاوٴ۔"

اس نے سوچ کے کہا "تم دونوں پانچ ہزار فرانک دے دینا۔"

"آنے جانے کے۔"

وہ چونکا "ابھی واپسی کی بات نہیں کی تم نے۔"

محسن بولا "فرض کرو ہم تین دن بعد واپس آنا چاہیں۔ تمہارا ریٹرن ٹرپ ہو گا۔ اس میں جگہ ہو گی۔"

وہ دانت نکال کے بولا "پانچ ہزار فرانک ہوں تو میں اپنے تابوت میں تمہارے لیے جگہ نکال سکتا ہوں۔"

"اوکے۔ ابھی ہم پانچ ہزار فرانک دیں گے۔ تم کب جاوٴ گے؟"

"جمعہ کی صبح۔ شام کو لندن' ایڈوانس نکالو۔"

محسن نے کہا "بیوی سے لا کے دیتا ہوں۔"

وہ پھر حیران ہوا "تمہارے پاس اتنے پیسے بھی نہیں ہوتے ... بڑی قابلِ رحم ہے تمہاری زندگی۔"

محسن نے اسے پانچ ہزار فرانک پورے ادا کر دیے "اب ... بتاوٴ کہ ہم کیسے جائیں گے؟"

"یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ تمہیں معلوم ہے میرا ٹرالر کہاں کھڑا ہوتا ہے؟"

محسن نے سر ہلایا "میرا دوست ڈر رہا تھا کہ تم اسے آلو پیاز کے ڈھیر میں دفن کر کے لے جاوٴ گے۔"

"بالکل ٹھیک ڈر رہا تھا۔ حالانکہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں ... آلو پیاز کے درمیان کافی جگہ ہو گی۔ سانس لینا کوئی مسئلہ نہیں ... تم کو ذرا جم کے بیٹھنا پڑے گا پانچ چھ گھنٹے۔"

"پانچ چھ گھنٹے۔ اتنا وقت لگتا ہے پیرس سے لندن پہنچنے میں" میں نے لرز کے کہا۔

"ٹرالر آہستہ چلتے ہیں۔ ان کی حدِ رفتار مقرر ہے۔ ویسے ... مرو گے نہیں" اس نے پانچ ہزار فرانک جیب میں ٹھونس لیے ... کھڑا ہو گیا۔ "خدا نے میرا مسئلہ بھی حل کر دیا۔ خدا سب کے ... حل کرتا ہے۔"

میں نے کہا "تمہارا کیا مسئلہ تھا؟"

"دو ہزار فرانک کا ایک نیکلس۔ اس کے ہیرے نقلی ہیں۔"

"بیوی کے لیے!"

"نہیں" اس نے مختصراً کہا اور خالی بوتل وہیں چھوڑ کے چلا گیا۔

انگریزی محاورے کے مطابق گیند اب ہمارے کورٹ میں تھی اور کھیل شروع ہو چکا تھا۔

میں نے ایڈی کے جانے کے بعد کہا "مسٹر محسن۔ آپ کے ذہن میں کوئی کنفیوژن تو نہیں ہے۔"

"کنفیوژن کیسا؟"

میں نے کہا "ہر معاملے کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ روشن اور تاریک۔ کیا اس فیصلے کے روشن پہلو زیادہ ہیں۔ تاریک پہلو زیادہ قابلِ توجہ ہوتے ہیں۔"

"جُوا کھیلنے والا کیا دیکھتا ہے؟ صرف جیت' اگر وہ ہار پر نظر رکھے تو جُوا کبھی نہ کھیلے اور جوئے خانے سنسان ہو جائیں۔ ہار جیت تدبیر کا نہیں تقدیر کا مسئلہ ہے۔ یہ کوئی نفع نقصان کے فارمولے سے حل ہونے والا سوال ہی نہیں۔ نو رسک نو گیم۔ آپ نوے فیصد کامیابی کے یقین پر بھی ہار جاتے ہیں کیونکہ دس فیصد امکانات پر آپ اختیار نہیں رکھتے پھر کیا کریں۔ ان دس فیصد امکانات سے ڈرتے ہوئے کچھ بھی نہ کریں۔ جدوجہد چھوڑ دیں۔"

میں نے کہا "بالکل ٹھیک۔ اب یہ فرمائیں کہ آپ کی ذاتی عقل کیا کہتی ہے۔ اس طرح لندن جا کے خیر وعافیت کے ساتھ لوٹ آنے کے امکانات کیا ہیں؟ دس فیصد' بیس فیصد یا ففٹی ففٹی۔"

"میرا خیال ہے' ایڈی حرامی پن نہ کرے تو رسک دس فیصد ہے۔ صرف لندن جا کے آنا ہوتا تو کوئی رسک نہیں تھا مگر ہمیں وہاں کاوٴنٹی جیل میں جا کے ایک مجرم سے ملاقات بھی کرنی ہے اور وہ عام مجرم نہیں ہے۔ اس کا تعلق ہے چوہدری دلاور کے کیس سے۔ چوہدری دلاور اس سے بے خبر نہیں ہے اور شاید پہلے سے لندن میں موجود ہے۔ کسی اور نام سے۔ کسی اور حلیے میں۔ وہ تاک میں ہو گا کہ کاوٴنٹی جیل میں کون جارج سے ملاقات کرتا ہے۔ اگر معاملہ پاکستانی جیل کا ہوتا تو اب تک وہ رشوت دے کر جارج کو ہلاک کرا چکا ہوتا۔ ڈاکٹر شیلی مرڈر کیس میں نئی شہادت سامنے آنے کے بعد اس کی نگرانی بھی سخت کر دی گئی ہو گی اور جیل حکام بھی زیادہ محتاط ہوں گے۔ ہمارا بھی اس سے ملنا آسان نہیں ہو گا اور یہ بعید از امکان نہیں کہ اس ملاقات کی خبر چوہدری دلاور کو مل جائے۔ اب ترتیب وار اس مسئلے کے ہر مرحلے کو دیکھا جائے تو ہمیں کتنے چیلنج درپیش ہیں۔ نمبر ون خفیہ طور پر لندن جانا اور قیام فرمانا۔ نمبر ٹو' لندن کاوٴنٹی جیل میں جارج سے رابطے کا خفیہ ذریعہ پیدا کرنا' نمبر تین خفیہ طور پر جارج سے مل کے تمام معلومات حاصل کرنا اور اسے بریف کرنا۔ نمبر چار ممکن ہو تو دلاور کا سراغ لگانا ورنہ..... خفیہ طریقے سے واپس آنا۔ یہ ہے پورے آپریشن جارج کی حکمتِ عملی۔"

میں نے کہا "ویری سائنٹیفک۔ اتنے جامع تجزیے اور مکمل پلان پر میں تیری عقل ودانش کی ضرور تعریف کرتا لیکن یہ سب تُو نے مجھ سے میری صحبت میں سیکھا ہے تو پھر اپنی تعریف کیا کرنی۔"

"کیپر داس۔ پانچ ہزار فرانک تو بڑی دریا دلی سے پھینک دیے مگر اب مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"کس سے۔ پکڑے جانے سے؟"

"نہیں۔ گل سے" وہ رونی آواز میں بولا "بعد میں کیا ہو گا!"

"جو میرا ہو گا بیٹے' مرد بن۔ تیرے اسلاف کی روحیں شرمندہ ہوں گی۔ تو بیوی سے ڈرتا ہے؟"

"میرے اسلاف بھی خاندانی شرفا تھے۔ خدا کے بعد صرف بیوی سے ڈرتے تھے۔ نجیب الطرفین لوگ تھے۔"

"تو خاندانی نجیب الطرفین ضرور ہے مگر اب تیری اولاد بہرحال خبیث الطرفین ہو گی۔ جتنا حرامی پن چاہے کر۔ بیوی اپنے نصیب کو رو پیٹ کے صبر کر لے گی۔"

"سچ فرمایا آپ نے۔ یہ بیویاں روٹھنے اور خفا ہونے کا ڈراما زیادہ کرتی ہیں۔ بندہ ذرا ڈھیٹ ہو اور اچھا ایکٹر تو فوراً کان پکڑے۔ مرغا بن جائے' بس اس کے بعد کہاں کی ناراضگی اور کیسی خفگی۔"

"یہ ہوئی نا بات۔ کامیاب ازدواجی زندگی کے اصول یہی ہیں۔ بیوی کو بے وقوف بناتے رہو اور من مانی کرتے رہو۔"

"مطلب یہ کہ بے وقوف تو عورت ہے۔ اسے مزید بے وقوف بناوٴ اور عیش کرو۔" محسن نے خالی بوتل اُٹھا کے کہا۔

اب یہ ایک افسوسناک اتفاق تھا یا ہماری کوتاہی تھی کہ ہم اپنی باتوں میں اتنے مگن ہو گئے تھے کہ ہمیں رابعہ اور گل کے اندر آنے کی خبر بھی نہیں ہوئی۔ میری آخری بات بھی رابعہ نے سنی اور گل نے تو محسن کو بوتل لہرا کے کسی شرابی کی طرح للکارتے سُنا۔

وہ ایک دم پھٹ پڑی "بہت خوب۔ بڑے اعلیٰ وارفع خیالات ہیں آپ کے۔"

"آپ دونوں کے" رابعہ نے کہا۔

محسن نے بوکھلا کے کہا "تم..... یہ کیا کہہ رہی ہو؟"

"تم ابھی کیا کہہ رہے تھے؟" گل نے چراغ پا ہو کے کہا۔

"وہ..... وہ تو کسی اور کی بات بتا رہا تھا میں' کیوں سکندر۔"

میں نے سر ہلایا "ہاں۔ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں۔ ہم انہی کی بات کر رہے تھے۔ جو ایسا سمجھتے ہیں۔ ظاہر ہے ہم ایسے نہیں ہیں۔"

"گل' میں ایک دوست کی مثال دے رہا تھا۔ بہت غلط آدمی ہے۔"

"بہت ہی غلط بات ہے۔ بھلا ہم ایسا سوچ سکتے ہیں۔ یا کر سکتے ہیں۔ تم ایسی توقع رکھ سکتی ہو ہم سے؟"

"توقع کی بات نہیں۔ تم ایسے ہی ہو۔ دونوں ایک سے بڑھ کر ایک چکرباز۔ اس وقت بھی اور کیا کررہے ہو۔ بے وقوف بنارہے ہو ہمیں' دوست کی مثال دے کر۔"

رابعہ نے طنز سے کہا "دونوں ایک دوسرے کی مثال دے رہے ہیں گل۔ ایک سکندر کا دوست۔ دوسرا محسن کا۔ بے وقوف ان کی بیویاں جن کو یہ مزید بے وقوف بنا کے من مانی کرتے پھرتے ہیں۔"

محسن نے افسوس سے سرہلایا "اتنا عدم اعتماد۔ وہ بھی اپنے اکلوتے خداوندِ مجازی پر۔ توبہ توبہ۔"

میں نے کہا "صریحاً کفر کے زمرے میں آتا ہے۔ بلکہ مجھے تو علما سے رجوع کرنا پڑے گا فتوے کے لیے کہ کیا حکم ہے اس عورت کے لیے جو بقائمی ہوش وحواس اپنے نیک چلن پاکباز' معصوم اور مومن شوہر کو دو بالغ گواہان کی موجودگی میں جھوٹا' فریبی' بدکردار کہے۔۔۔"

"اوہو۔ نیک چلن اور پاک باز۔۔۔" گُل نے طنز سے کہا۔

"معصوم اور مومن! دیکھ لو گل ایسے ہوتے ہیں" رابعہ نے کہا۔

محسن بولا "خاصا سنگین شرعی مسئلہ ہے یار۔ شاید یہ صدقِ دل سے معافی مانگ لیں اور اللہ سے توبہ کرلیں تو ایک بار کہنے سے نکاح نہ ٹوٹتا ہو۔"

"ورنہ کریک تو پڑجاتا ہوگا اس میں" میں نے وثوق سے کہا۔

"چلو زیادہ ڈراما مت کرو۔ نکاح کوئی ریت کی دیوار نہیں ہے کہ بات بات پر ٹوٹ جائے۔"

"ہاں۔ آر سی سی اسٹرکچر ہے۔ ٹکریں مارتے رہو۔ اپنا ہی سر پھوٹے گا۔" رابعہ بولی "قسم کھاکے کہو کیا بات کررہے تھے؟"

"قسم کھاتے ہیں جھوٹے لوگ" محسن بولا۔

میں نے بھی کہا "ہاں۔ ہم کیوں کھائیں اور تم کیا ہو آخر؟ عدالتِ عالیہ جس کے سامنے حلفیہ بیان دینا پڑے۔ ہم ملزم ہیں؟"

محسن نے کہا "تمھیں ہماری قسم ہے جو اپنی قسم دے کے سچ بولنے کو کہا۔"

میں نے قہقہہ مار کے ہاتھ ملایا "کیا ترپ کا پتا پھینکا ہے یار۔ لاجواب کردیا دونوں کو۔"

محسن نے کہا "اس کے بعد یہی ہونا تھا' مجھے معلوم ہے۔"

گل نے جز بز ہوکے کہا "دیکھا رابعہ۔ سچ بولنا نہیں چاہتے نا۔ الٹا ہمیں قسم کا پابند کردیا۔"

"بہت چالاک لوگ ہیں۔ خیر پتا چل گیا نا کہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ خود ہی مان لیا کہ ہم سے سچ مت پوچھنا۔"

میں نے کہا "رابعہ تمھیں پیرس کیسا لگا۔ ہے نا گھومنے پھرنے کی جگہ۔"

گل نے کہا "پٹڑی بدل رہے ہو۔"

میں نے کہا "چلو یہی سمجھ لو مگر اس شہر کا واقعی جواب نہیں۔ ایک ہفتے میں آدمی گھوم سکتا ہے۔ دیکھ نہیں سکتا۔"

رابعہ نے کہا "یہ تو ہے۔ ایک بالکل نئی دنیا ہے۔"

گل نے کہا "بالکل خواب کی طرح لگتی ہے ہر چیز۔ میں نے خواب میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی کہ کبھی میری زندگی میں ایسا وقت بھی آئے گا کہ میں جہاز میں بیٹھ کے ولایت پہنچ جاؤں گی۔ سات سمندر پار۔ سوچتی بھی کیسے' وہ زندگی ہی اور تھی۔ لاہور' کراچی اور راولپنڈی بھی میرے لیے دوسری دنیا کے شہر تھے۔ اللہ کتنا مہربان اور غفور الرحیم ہے۔ اس نے ناگ منی کو گل بانو بنادیا۔ ایک گھر دے دیا۔ تحفظ دے دیا۔ اس کو پیرس پہنچادیا۔"

رابعہ بھی جذباتی ہوگئی "سوچا تو میں نے بھی نہیں تھا۔ ایک فضول بے رنگ اور یکسانیت سے بیزار کردینے والے معمول کی زندگی تھی۔"

میں نے محسن کو دیکھ کر آنکھ ماری "خیر اب اس وقت کو کیا یاد کرنا۔ ہم کیا کم خوش قسمت ہیں۔"

محسن نے جذباتی لہجے میں کہا "اور میں کیا کہوں۔ مجھے تو دوسری زندگی ہی گل کی دعاؤں کے طفیل ملی ہے۔ ورنہ میری جوانی کی ناؤ تو مایوسی اور دیوانگی کے بے کراں سمندر میں حالات کے بے رحم تھپیڑوں میں ڈول رہی تھی۔ اپنا سب کچھ گنوادینے کا احساس اتنا حوصلہ شکن تھا کہ میں خودکشی کرکے اس بے مصرف زندگی کا خاتمہ کرلیتا لیکن گل' تمھاری محبت نے مجھے ایسے سنبھالا۔۔۔"

میں نے دل ہی دل میں اس جذباتی تقریر پر محسن کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ خواتین کا موڈ بدل گیا تھا۔ "جیسے کوئی پاگل آوارہ کتے کے گلے میں پٹا ڈال دے اور اس کی زنجیر اپنے ہاتھ میں تھام لے" میں نے دردناک لہجے میں کہا۔

گل ہنس پڑی "اچھی مثال دی۔"

محسن بولا "یار' تجھ سے صبر نہیں ہوتا۔ اتنی جلدی بول پڑا بیچ میں۔ کیا زبردست ڈائیلاگ بول رہا تھا میں۔"

"یار' ان پر رقت طاری ہورہی تھی۔ میں نے سوچا کہیں رو نہ پڑیں فرطِ جذبات میں۔ یہ کون سی فلم کے سین کے ڈائیلاگ تھے۔"

"اس فلم کے جو میں بناؤں گا۔ کہانی' منظر نامہ' پروڈکشن' ڈائریکشن۔ سب میری' لیلیٰ مجنوں اور شیریں فرہاد کی طرح یہ صدی کی عظیم ترین رومانی فلم ہوگی۔ شیروانی ناگ منی' لازوال عشق کی لافانی داستان۔"

گل ہنسنے لگی "تم ہی ہیرو بھی بن جانا۔"

"ڈبل رول بھی کرسکتے ہو تم۔ بالکل نیا آئیڈیا ہوگا۔ ہیرو کا اور۔۔۔" میں نے کہا۔

"دلہن کا بھی" گل نے کہا۔

"نہیں بھئی۔ بیک وقت ہیرو اور ہیروئن کا۔ ماشاءاللہ خوبرو ہے۔ صفات بھی دونوں کی ہیں۔۔۔"

رابعہ بولی "اور ایک دفعہ کر بھی چکے ہیں زنانہ رول۔"

محسن ہنسنے لگا "جناب ہم کیا نہیں کرسکتے۔ تم بتاؤ کہ ہمارے بغیر کیا کرسکتی ہو۔ فرض کرو پیرس میں راستہ بھول جاؤ۔"

"تو ہم کوئی بچے ہیں۔ آجائیں گے یہاں۔"

"آخر کیسے۔ یہاں اردو پنجابی کوئی نہیں سمجھتا۔ بھٹکتی پھروگی شہر میں اور کوئی راستہ بتانے والا نہیں ملے گا۔"

"ہمارا ساتھ نہ ہو تو تم دو دن یہاں اکیلے نہیں رہ سکتیں۔"

رابعہ نے کہا "خیال ہے آپ کا۔ بلکہ غلط فہمی ہے آپ کی۔"

"نہیں رہ سکتی ہو۔ چلو شرط لگالو۔ چوک میں بیٹھ کے رونا شروع کردوگی۔ مجمع لگ جائے گا۔ پولیس آجائے گی۔"

رابعہ نے کہا "جی نہیں۔ ہم انگریزی بھی بول لیتے ہیں۔"

"انگریزی سن کے تو فرانسیسی بہرا گونگا بن جاتا ہے۔۔۔ اور اس شہر کے راستے۔ توبہ۔۔۔" محسن نے کہا۔

رابعہ بولی "شہر کے راستوں کا نقشہ بھی ملتا ہے۔ انگریزی جاننے والے بھی ناپید نہیں ہیں۔ اپنے پاکستانی یا بھارتی نظر آجاتے ہیں۔"

"پھر یہاں خطرہ نہیں ہے اکیلی عورت کو۔" گل نے کہا۔

محسن بولا "گویا دعویٰ ہے آپ دونوں کو کہ اکیلی رہ سکتی ہیں۔"

میں نے کہا "ویری گڈ۔ بڑی حوصلہ مند اور بہادر ہیں دونوں۔"

رابعہ اور گل کے ذہن میں یہ خیال کیسے آسکتا تھا کہ ہم نے جو کہا ہے وہ کرکے بھی دکھاسکتے ہیں۔ یہ تو بات برائے بات تھی لیکن ہم نے باتوں باتوں میں بعد کے حالات کا قابلِ قبول جواز پیدا کرلیا تھا۔ اب ہم دو تین دن کے لیے غائب ہونے سے پہلے یہ کہہ سکتے تھے کہ اچھا ہم چیلنج دے رہے ہیں۔ یہ ہماری غلط فہمی تھی تو اب دو تین دن اکیلے رہ کے دکھاؤ۔ عملاً یہ مشکل نہیں تھا مگر جذباتی طور پر رابعہ یا گل کے لیے ناقابلِ تصور۔"

ہم نے ایک اور دن سیر سپاٹے میں گزارا اور خاموشی سے اپنے منصوبے پر بھی کام کرتے رہے۔ ابھی سب نیا نیا تھا۔ بے فکری اور آزادی کے چند دن بہت پُرلطف تھے اور ہم نے بھی کہہ دیا تھا کہ مسئلے مسائل کی بات کوئی نہیں کرے گا۔ جو ہونا ہے اپنے وقت پر ہوگا۔ اس کے بارے میں سوچ کے پریشان ہوتے اور تفریح کا مزہ کرکرا کرنے سے کیا فائدہ۔ پیرس کی رنگینی اور چکاچوند نے رابعہ اور گل کو بھی سب کچھ بھلا رکھا تھا۔ انہیں نہ گھر کی یاد آئی تھی نہ وطن کی اور نہ ابھی وہ وقت آیا تھا کہ وہ بور ہوکے HOMESICK محسوس کریں۔ وہ ہر جگہ ہمارے ساتھ رہتی تھیں مگر بعض اوقات ہم انہیں نُچا دے کر بھی نکل جاتے تھے۔ خصوصاً رات کے وقت۔ انہوں نے بھی برا ماننا یا خفا ہونا چھوڑ دیا تھا کہ چلو دو چار دن آزادی کے نام پر بے راہ روی بھی برداشت کرلو۔ واپس جائیں گے تو پھر وہی ہوں گے۔ وہی شب و روز ہوں گے۔ وہی ان کی چاہت کے انداز۔

رابعہ اور گل کو شاید یہ خیال تھا کہ پرانی یادیں تازہ کرنے کے لیے ہم پرانے دوستوں سے ملتے ہیں اور دوستوں میں بھی انہیں تلاش کرتے ہیں جن کے ساتھ بقول شاعر' دل لگایا تھا دل لگی کے لیے۔ الزبتھ جیسی یہاں بھی ہوں گی جن سے ہم نے فلرٹ کیا تھا۔ یہاں کی روایات اور معاشرتی قدریں ایسی تھیں کہ سرِراہ گزر کسی سے پھر ملاقات ہوجائے جو کبھی جانِ آرزو اور حاصلِ تمنا تھی اور جس نے کبھی آپ کے ساتھ عمر بھر ساتھ نبھانے کی قسم کھائی تھی۔ تو وہ فطری حیرت اور خوشی کے جذبات کا اظہار کرتی ہوئی یوں بے اختیار ملے گی جیسے ہماری رومانی فلموں کی ہجر زدہ پیار لوٹ آنے والے پردیسی شہری بابو سے بھی نہیں مل سکتی۔ ہنستے ہوئے اپنے شوہر سے بھی ملوائے گی کہ ڈارلنگ' یہ ہے وہ شخص جس کے بغیر میرا خیال تھا کہ میں زندہ نہیں رہ سکتی۔ یہ بھی مرتا تھا مجھ پر۔۔۔ اور قہقہہ لگاکے شوہر بھی ہاتھ ملائے گا۔ جوانی میں ہم سب ایسے ہی ہوتے ہیں پھر وہ اخلاقاً کہیں گے کہ کسی دن آؤ۔

ہم ایسے نہیں تھے اور نہ پیرس میں ہم نے کسی سے دل لگایا تھا دل لگی کے لیے۔ ہم ایڈی سے ملتے تھے اور فرار کی راہ میں حائل دشواریوں پر غور بھی کرتے تھے لیکن ہمارا بیشتر وقت ایڈی سے لندن کے بارے میں معلومات حاصل کرتے گزرتا تھا۔ ہم نے اسے بتادیا تھا کہ لندن جانے کا مقصد جیل میں بند ایک بے گناہ شخص سے ملاقات کرنا ہے جو ناکردہ گناہ کی پاداش میں عمر قید کاٹ رہا ہے۔ خوش قسمت ہے کہ الیکٹرک چیئر پر نہیں بٹھایا گیا تھا ورنہ ہم اس کافر کے لیے تو دعائے مغفرت بھی نہ کرتے۔ ہمارے پاس کچھ ایسے شواہد تھے جن کی بنا پر ہم اسے بری کراسکتے تھے۔ وہ کون ہے' اس کا نام کیا ہے۔ جرم کیا تھا؟ یہ سب بتانے سے ہم نے معذرت کرلی تھی اور ایڈی نے بھی اصرار نہیں کیا تھا۔ جو بات پرائیویٹ ہے یا افشائے راز میں خرابی کا اندیشہ ہے اس کو جاننے پر اصرار کرنا بھی نہیں چاہیے۔ یہ ایک [illegible] ہے۔ ایڈی کا ایسا ہی رویّہ تھا۔ اس نے ہمیں خاصی مفید معلومات فراہم کردیں اور ہم پر اتنا اعتماد کرنے لگا کہ اس نے اپنے گھر کا پتا اور فون نمبر بھی دے دیا۔

"ضرورت پڑے تو تم کال کرسکتے ہو۔ میری بیوی تمھاری بہت مدد کرے گی" اس نے نیک نیتی سے کہا۔

"یعنی تم اپنی بیوی کو بتادوگے ہمارے بارے میں؟"

"آف کورس۔ اس سے میں کچھ نہیں چھپاتا۔ آخر وہ شریکِ حیات ہے۔"

"لیکن ایک عورت ہے۔"

"پھر کیا ہوا۔ شریکِ حیات مرد تو ہو نہیں سکتا۔"

میں نے کہا "میرا مطلب تھا۔ عورتیں ذرا پیٹ کی ہلکی ہوتی ہیں۔"

وہ ہنسنے لگا "وہ ایسی نہیں ہے۔"

"یہی خوش فہمی مروادیتی ہے شوہروں کو۔"

"ایسی بات نہیں۔ اسے میں جانتا ہوں۔ مجھ میں اور اس میں کوئی فرق مت سمجھو۔"

"تصویر میں تو بہت فرق نظر آتا ہے۔ خصوصاً وزن اور رنگ میں۔"

ایڈی ہنسنے لگا "اور جنس میں فرق نظر نہیں آتا؟"

میں نے کہا "خیر اس پیش کش کا شکریہ۔ اب یہ بتاؤ کہ روانگی کیسے اور کب ہوگی؟"

اس نے کہا "تم صبح میرے ساتھ چلو۔ میں تم کو لوڈر کی حیثیت سے لے جاؤں گا۔ تم سامان لوڈ کرانے میں مدد کرو گے؟"

میں نے کہا "اب تم مزدوری کراؤ گے ہم سے۔ کیا صورت سے اور حلئے سے ہم لوڈر لگتے ہیں؟"

"صورت سے چارلس کب شہزادہ لگتا ہے" وہ بولا "رہا حلیہ تو کیا تم ایسے حلئے میں جاؤ گے؟ تمہارے سوٹ ٹائی اور کپڑوں کا ستیاناس ہو جائے گا۔ میں تم کو ڈانگری دوں گا' اوور آل۔"

"لندن میں ہم ڈانگری پہن کے وارد ہوں گے" محسن رونی شکل بنا کے بولا۔

"تم کیسی باتیں کرتے ہو۔ دن میں جب کام کا وقت ہوتا ہے تو ڈرائیور سے لے کر کمپنی کا چیف انجینئر تک ڈانگری پہنتے ہیں اور ڈانگری صرف لوڈر کا لباس نہیں۔ مکینک الیکٹریشن سے لے کر خلائی اداروں کے انجینئر اور نیوکلیئر پاور پلانٹ کے چیف تک سب کے لیے کام کا ایک ہی لباس ہے۔"

میں نے کہا "بالکل ٹھیک کہتے ہو تم۔ اچھے اور معقول کپڑے ہم ساتھ رکھ لیں گے۔ ایک الگ سوٹ کیس میں۔"

"وہ تمہاری مرضی۔ اتنے بڑے کنٹینر میں بہت جگہ ہے ورنہ لندن جیسے شہر میں آدمی کسی عام ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں سستی خریداری کرے یا ہیروڈز HARRODS میں گھس جائے۔ دس منٹ بعد جوتے سے ٹائی تک بدل کے باہر آسکتا ہے۔"

رات کو رابعہ پر یادِ وطن کا پہلا دورہ پڑا "تین دن ہو گئے ہیں یہاں۔"

میں نے کہا "تین دن دس گھنٹے.... اٹھارہ منٹ..."

محسن بولا "ہمیں ہو گئے چھ دن۔ سترہ گھنٹے' انیس منٹ۔"

"بس اب چلو آگے۔" رابعہ بولی۔

"سوائے جہنم کے۔ ہر جگہ ہم ہی آگے ہوں گے۔ میں سمجھتا ہوں لیڈیز فرسٹ کے اصول پر عمل کرنے والے انگریز شوہر بھی ایسا ہی کرتے ہیں... اور کریں گے۔"

"ہر بات مذاق میں ٹالنے کی نہیں ہوتی" رابعہ بگڑ گئی "ہم یورپ کے تفریحی دورے پر نہیں آئے ہیں۔"

محسن نے کہا "جس کو انگریزی میں ہنی مون کہتے ہیں۔ بالکل ٹھیک' آگے بولو۔"

"جس کام سے آئے ہیں وہ کرو اور چلو واپس۔" رابعہ نے کہا۔

میں نے کہا "کیوں دل نہیں لگا یہاں؟"

"یہاں دل لگانے نہیں آئے تھے ہم اور کوئی ضرورت بھی نہیں اس کی۔"

میں نے کہا "سوچو کہ لوگ کتنے جتن کرتے ہیں یہاں آنے کے لیے اور کتنی مشکل سے انہیں سیٹل ہونے کا موقع ملتا ہے۔ ایک تم ہو کہ خوش قسمتی کو ٹھکرا رہی ہو۔ کفرانِ نعمت..."

"میرے لیے میرا وطن ہی نعمت ہے اور وہی زندگی اچھی ہے جو اپنوں کے درمیان گزرے" رابعہ نے کہا۔

"بھئی ہم کیا غیر ہیں۔ دائیں طرف میں۔ سامنے محسن' بائیں جانب گل' پیچھے بوبی۔ تم واقعی اپنوں کے درمیان ہو" میں نے کہا "بس اپنے چوہدری دلاور صاحب نہیں ہیں تو تمہیں پیرس بھی اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ نمک کے بغیر قورمہ بریانی بیکار...."

"بھاڑ میں جائے چوہدری دلاور۔"

"واہ۔ کیا جاہل عورتوں والا جملہ کہا ہے۔ وہ چاہتا ہے ہم بھاڑ میں جائیں۔ بھاڑ ایک ہے لیکن انشاء اللہ تمہاری خواہش پوری ہوگی۔"

"لندن میں کتنے دن لگیں گے؟" گل نے کہا۔

"میں نے وہ لوگ بھی دیکھے ہیں جن کو لندن میں برسوں لگ گئے" محسن نے کہا "محاورہ تھا کہ ساری عمر دلی میں رہے کیا بھاڑ جھونکا۔ تو لندن میں ساری عمر بھاڑ جھونکنے والے نہیں ہیں۔"

رابعہ نے اٹھتے ہوئے کہا "چلو گل۔ یہ لوگ اس وقت سیریس نہیں ہیں۔"

میں نے کہا "کیا واپس پاکستان جارہی ہو۔ اچھا بھئی خدا حافظ۔ رات نہ ہوتی تو تمہیں ائرپورٹ چھوڑنے بھی جاتے مگر ابھی تو نیند آرہی ہے۔"

"سیریس تو ہم سوتے میں بھی نہیں ہوتے۔ بڑے مزاحیہ خواب دیکھتے ہیں۔ جیری لوئیس اور اپنے رنگیلا کی فلموں کے ٹوٹے۔"

"ٹوٹے تو میں تمہارے کروں گی کسی دن۔" گُل نے ہاتھ سے قیمہ بنانے کا تصور پیش کیا۔

محسن نے قہقہہ مارا "ایسے نہیں۔ بڑک مار کے کہو۔ اوئے شیروانی' میں تیرے ٹوٹے کر کے کوٹ بنا دیاں گی۔ ہا آ۔ آ..."

"تم سلطان راہی کا زنانہ ایڈیشن بن سکتی ہو" میں نے کہا "بس گنڈاسا ذرا بھاری ہوتا ہے۔ وہ چھری لہرا دینا جس سے شوہروں کا چارا کاٹتی ہو کچن میں۔ کدو' کریلے' ٹینڈے' بینگن وغیرہ۔"

وہ پھر بیٹھ گئیں "اچھا اب تو ہم بھی فیصلہ کر کے ہی جائیں گے۔"

"تم اتنے ڈھیٹ ہو گئے ہو...."

محسن نے اس کی بات کاٹی "ہم بڑے پُرانے ڈھیٹ ہیں خاتون۔ جیسے خاندانی رئیس ہوتے ہیں نا' ویسے ہی۔"

میں نے کہا "او کے سویٹ ہارٹ۔ ہم کل جائیں گے لندن۔"

محسن نے بھی سرہلایا "چلو ٹھیک ہے۔ فیصلہ ہو گیا' اب جاؤ۔"

"پھر ٹال رہے ہو" رابعہ بولی "قسم کھاؤ۔"

"لے آؤ ایک پلیٹ میں رکھ کے۔ بڑی بھوک لگی ہے" میں نے کہا۔

محسن نے کہا "یار یہ رو پڑے گی تو پھر ناک رگڑتے نظر آؤ گے زمین پر۔"

رابعہ کی صورت رونے والی ہو رہی تھی "میری قسم کھا کے کہو۔"

میں نے کہا "جان۔ تمہاری قسم۔ تمہارے سرِ عزیز' رُخِ روشن' لبِ لعلیں کی قسم۔ تمہارے عارض و گیسو کی قسم' کل ہم جارہے ہیں' صبح صبح۔"

محسن چکر میں پڑ گیا "ساری قسمیں تو کھا گیا۔ میں کیا کھاؤں اب؟ خیر گُل' تمہارے گھٹنوں کی قسم۔ ٹخنوں کی قسم' تمہاری بہتی ناک کی قسم اور تمہارے سر کی جوؤں کی قسم۔ ہم صبح لندن جائیں گے۔"

"خواہ ادھر کی دنیا اُدھر ہو جائے یعنی لندن کی جگہ آجائے اپنا لہور اور لہور کی جگہ چلا جائے لندن۔ آندھی طوفان زلزلہ سیلاب کوئی ہمارا راستہ نہیں روک سکے گا۔"

وہ مسکراتی ہوئی اٹھ گئیں اور سونے چلی گئیں تو میں نے محسن سے ہاتھ ملایا "کیسی گولی دی ہے دونوں کو۔"

"جھوٹی قسم بھی نہیں کھائی۔"

رابعہ اور گل ایک دم اندر آگئیں۔ وہ باہر نکل کے دروازے سے لگی کھڑی تھیں۔ دھماکے سے میں اور محسن اُچھل پڑے۔

"تو گولی دی ہے آپ نے" گل نے دانت پیس کے کہا۔

"لاحول ولا قوۃ۔ جب قسم کھالی تمہاری پھر بھی اعتبار نہیں" میں نے اپنے حواس بحال رکھے۔

رابعہ بولی "پھر وہ دونوں کون ہیں جن کو گولی دے کے بڑے خوش تھے۔"

"یار' تم تو پنجے جھاڑ کے پیچھے پڑ گئی ہو۔ اب اور کیا کہیں ہم۔"

"صبح دیکھ لینا۔ جو کہا ہے وہ کر کے دکھائیں گے۔" محسن بولا "چلو اب نکلو یہاں سے۔ ہمیں بہت نیند آرہی ہے۔"

"بلکہ مجھے تو آچکی ہے" میں آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا اور خراٹے لینے لگا۔

رابعہ اور گُل مطمئن کیسے ہو سکتی تھیں مگر گُل کو بوبی کی فکر لاحق تھی۔ جو کمرے میں اکیلا سو رہا تھا۔ وہ رابعہ کو بھی لے گئی "ٹھیک ہے کل دیکھوں گی میں کہ تم کیسے نہیں جاتے لندن۔"

رابعہ نے بھی کہا "ہاں۔ اگر کل بہانہ کیا تو ٹھیک نہیں ہوگا۔"

"اُفوہ رابعہ بی بی۔ کیا لکھ کے دے دوں کہ ہم صبح لندن جائیں گے؟ یہ بڑی سخت توہین ہے کہ ہمارے زبان پر اعتبار نہ کیا جائے۔ آج تک میں نے کسی کے گٹوں گوڈوں کی قسم نہیں کھائی اور میری ذاتی بیوی پھر بھی نہیں مانتی۔ تف ہے میری اوقات پر۔"

"اور گل کے سر کی جوؤں پر۔ ان کی قسم بھی کھائی تھی تُو نے۔" میں نے سوتے میں بڑبڑا کے کہا۔

اندر سے کنڈی لگا کے اور لائٹ بجھا کے محسن بھی لیٹ گیا تو میں نے کہا "اب آہستہ بولنا' کہیں وہ پھر نہ کھڑی ہوں دروازے سے کان لگا کے۔"

"کھڑی رہیں۔ ہم فرنچ میں بات کریں گے۔"

"ایڈی تو شاید دیر سے اٹھے گا اور دیر سے جائے گا" میں نے کہا۔

"جس دن روانگی ہو وہ سات بجے لوڈنگ شروع کر دیتا ہے۔"

"یعنی ہم چھ بجے نکل سکتے ہیں۔"

"چھ' ساڑھے چھ۔ پانچ گھنٹے بعد" محسن بولا "گُل تو آٹھ نو بجے سے پہلے اٹھنے والی نہیں ہے۔"

میں نے کہا "رابعہ اُٹھے گی اپنے ٹائم پر نماز پڑھنے کے لیے۔"

"نماز پڑھ کے پھر سو جائے گی۔ صبح صبح کمرے سے اکیلی باہر نہیں آئے گی۔ ہمیں جگانے کے لیے۔"

میں نے کہا "تو نے بھی جھوٹی قسم کھائی۔ میرے ساتھ۔"

"لفظی اعتبار سے وہ جھوٹ نہیں تھا۔ معنوی اعتبار سے بھی میں اسے غلطی نہیں سمجھتا۔ رابعہ یا گل نے غلط سمجھا تو میرا کیا قصور۔ ہم کا لفظ استعمال ہوا تھا۔ ہم دونوں کے لیے۔ انہوں نے ہم کا مطلب نکالا ہم سب۔"

میں نے کہا "اللہ میاں نیت کو سمجھتے ہیں۔ یا محبت کو لفظوں کی ہیرا پھیری سے کام نہیں چلے گا۔"

"میں نے کون سی اللہ میاں کی قسم کھائی تھی یار۔ جو قسمیں ہم نے کھائی تھیں ان کو توڑنے کا کفارہ بھی نہیں ہوگا۔"

"کفارہ تو واپس آکے ادا کرنا پڑے گا بھوتنی کے۔ آتش فشاں بنی ہوئی ملیں گی دونوں۔"

"اللہ ہمیں اپنی امان میں رکھے۔ شب بخیر" محسن بولا اور کروٹ بدل کے سو گیا۔

صبح چھ بجے میں نے ایک رقعہ لکھا۔

"اپنی قسم پوری کرنے کے لیے "ہم" جارہے ہیں۔ لندن میں دو تین دن لگ جائیں گے۔ گھبرانا اور رونا نہیں۔ بس اللہ سے دعا کرنا کہ تمہارا سہاگ سلامت رہے تاکہ دودھوں نہانے اور پوتوں پھلنے کی دعا لاحاصل نہ رہے۔ ایک چیلنج تم نے بھی دیا تھا کہ ہمارے بغیر یہاں اکیلی رہ سکتی ہو۔ ہم یہ پورا کرنے کا موقع فراہم کر رہے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ لندن میں کوئی زنانہ کام نہیں اور ہم تمہیں یہاں بوبی کے ساتھ زیادہ محفوظ تصور کرتے ہیں۔ ہمارے لیے تم جیسا نہ ہے اور نہ ہوگا۔ نہ لندن میں نہ کوہِ قاف پر۔ پھر بھی عام بیویوں کی طرح تم شک اور حسد میں یہ فرض کرنا چاہو کہ ہم جنت کے میوے چھوڑ کے سبزی منڈی میں گونگلو بتاؤں (شلجم

بیگن) پر منہ مارتے پھریں گے تو تمہاری مرضی۔ جلتے بھنتے اپنا وقت گزار دو یا ہنستے کھیلتے۔ کام ختم ہوتے ہی ہم ہنہناتے ہوئے اصطبل کی طرف دوڑیں گے۔

تمہارے گھوڑے گدھے"

یہ رقعہ ہم نے لفافے میں بند کیے بغیر ایڈی کو دیا کہ وہ نیچے استقبالیہ پر بیٹھی ہوئی خوفناک حسینہ کے سپرد کردے اور اسے تاکید کرے کہ ٹھیک دس بجے رابعہ اور گل کے کمرے میں پہنچادے۔ ایڈی کے اس سے دوستانہ بلکہ غائبانہ تعلقات تھے۔ اس کے غائب ہونے کا تعلق ایڈی سے ہوتا تھا۔ محسن کو بجا طور پر اعتراض تھا کہ آخر ایسی ڈراؤنی چیز استقبالیہ پر کیوں رکھ دی گئی ہے۔

میں نے کہا "اس کرائے میں آپ کا استقبال حسینہ عالم نہیں کرسکتی۔"

"پھر وہ خود کو ایسا سمجھتی کیوں ہے؟"

ایڈی نے کہا "یہ اس کا اور ہر عورت کا پیدائشی حق ہے۔"

"وہ استقبال نہیں کرتی دہشت زدہ کرنے پر مامور ہے۔ مسکراتی تک نہیں۔"

میں نے کہا "اس کرائے میں یہی ہوسکتا ہے۔"

ایڈی نے کہا "وہ میرے لیے مسکراتی ہے۔ سو فرانک میں۔"

"کیسی بھیانک لگتی ہوگی" محسن پُرخیال لہجے میں بولا "پتا نہیں تم اسے کیسے قبول کرلیتے ہو۔"

"میں وسیع القلب شخص ہوں۔ صرف یہ دیکھتا ہوں کہ نبض چل رہی ہے یا نہیں" ایڈی نے اپنے فلسفہ حیات کا نچوڑ پیش کردیا "اس کے علاوہ صرف صورت کے نقوش کو دیکھ کر سالم عورت کو مسترد کردینا ایسا ہی ہے جیسے عنوان پسند نہ آنے پر ناول پڑھے بغیر چھوڑ دینا۔"

میں اس کی فراخ دلی کا قائل ہوگیا۔ ظاہر ہے اس خوش قسمت شخص کے لیے دنیا کی ہر عورت میں حُسن تھا اور اسے بدصورتی دکھائی ہی نہیں دیتی تھی۔ وہ خوش رہنے کا سلیقہ جانتا تھا اور خوش رکھنے کا بھی۔

ناشتا کرتے ہوئے میں نے ڈرتے ڈرتے وہ سوال کیا جس کا خیال مجھے دہلاتا تھا۔ "کیا تم یہ گروسری آئٹم باکس میں لے جاتے ہو۔"

"جیب میں بھر کے تو نہیں لے جاسکتا۔"

"میرا مطلب تھا.... کیسے باکس ہوتے ہیں وہ؟"

"بالکل تابوت جیسے۔ ذرا بڑے سمجھ لو۔ آٹھ فٹ لمبے چار فٹ چوڑے اور چار فٹ اونچے۔"

محسن بولا "بہت مضبوط ہوتے ہیں۔ مقفل بھی کرتے ہو تم؟"

"میں نہیں کرتا۔ جو یہاں سے مال بھیجتے ہیں وہ خود قفل لگا کے اپنی سیل لگادیتے ہیں۔"

میں نے کہا "چار فٹ اونچے تابوت میں تو مُردہ.... میرا مطلب ہے تم [illegible] بھی نہیں سکتے۔"

"نہیں۔" اس نے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے مختصراً کہا۔

میں نے کہا "گویا تم پہلے ٹماٹر پیاز کو بھی پالک بھر کے ہمیں اوپر سیدھا لٹادو گے اور ڈھکنا بند کردو گے۔"

"پاگل ہوئے ہو" وہ بولا "ایسے تو سب چیزیں تباہ ہوجائیں گی۔ پالک چرمر ہوجائے گی۔ ٹماٹروں کا کچومر بن جائے گا۔ یہ سب چیزیں اوپر ہوں گی۔"

میرے حلق سے ایک کراہ نکلی "یعنی مُردہ.... میرا مطلب ہے میں ٹماٹروں میں دفن کردیا جاؤں گا۔"

"اور میں ٹنڈوں میں" محسن دہل کے بولا۔

میں نے محسن کی طرف دیکھا "اب بھی وقت ہے کہ ہم اس پروگرام کو ملتوی کردیں...."

"یعنی جارج سے ملنے آئے ہیں۔ جارج سے ملے بغیر چلے جائیں۔"

"نہیں یار۔ کوئی شریفانہ اور باعزت راستہ تلاش کریں۔" میں نے کہا۔

محسن بولا "راستے تو کُھلے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ ہم حکام کے نزدیک شریف اور عزت دار نہیں۔ اب کچھ نہیں ہوسکتا۔"

میں نے سہلایا "پانچ ہزار فرانک بھی دے چکے ہیں۔ فرانک پر مجھے یاد آیا کہ تیرے پاس مال ہے؟"

"ہاں۔ کل میں نے پانچ سو پاؤنڈ چوری کرلیے تھے۔ مانگتا تو گل پہلے بولتی کیوں اور میرے جواب سے ہرگز مطمئن نہ ہوتی۔"

"بیویوں کو یہ خطرہ ہر وقت لاحق رہتا ہے کہ شوہر نام کا یہ جانور رسّی تڑا کے نہ بھاگ جائے۔ حالانکہ کولہو کا بیل اگر آزاد کردیا جائے پھر بھی اسی دائرے میں گھومتا رہے گا۔ وہ اپنی مرضی سے اور سیدھا چلنا بھول چکا ہوتا ہے۔"

ایڈی نے کہا "تم لوگ اپنی زبان میں کیا کہہ رہے ہو؟ اب تم جاؤ یا نہ جاؤ۔ میں پانچ ہزار فرانک تو خرچ کرچکا۔"

میں نے کہا "کوئی بات نہیں۔ مایہ آنی جانی ہے۔"

"کون مایہ؟ اس کے لیے سب ہی آنی جانی ہیں۔ مایا دیوی۔ مارگریٹ یا رضیہ...."

میں نے کہا "اندازاً ہمارے اوپر کتنا وزن ہوگا۔"

ایڈی بولا "ٹماٹر ہوں تو سمجھو تیس پینتیس کلو۔ آلو ذرا وزنی ہوتے ہیں۔"

میرے حلق سے پھر وہی دردناک صدا نکلی "مجھے تم پالک کے نیچے رکھنا۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔ اس میں سے پانی بہت رستا ہے۔ تم خود کو کسی ڈیپ فریزر میں محسوس کروگے۔ میرا مشورہ ہے کہ لہسن کے نیچے رہو۔ وزن کم ہوگا۔"

"مگر بدبو بہت ہوگی۔ بُرے پھنسے شیروانی صاحب۔"

محسن نے پوچھا "ہم سانس تو لے سکیں گے نا۔"

"کیوں نہیں۔ باکس ائرٹائٹ نہیں ہوتا اور اندر کافی آکسیجن رہتی ہے۔"

"راستے میں کہیں رُکو گے تم۔ آئل یا فیول کے لیے۔ جہاں ہم چائے پی لیں یا کھانا کھالیں۔"

"میں تو سب کچھ ڈرائیونگ کے دوران ہی کرتا ہوں۔ تم کچھ سینڈوچ وغیرہ رکھ لینا اپنے ساتھ۔ ورنہ تم نیچے والے ٹماٹر کھاسکتے ہو۔ صحت افزا چیز ہے۔ بھوک پیاس نہیں لگے گی۔ تم باہر کیسے آسکتے ہو۔"

محسن اردو میں بولا "میں نے بھی لیٹے لیٹے پیشاب نہ کیا تو محسن نام نہیں۔ سالے کافر کھائیں گے انہی آلو ٹماٹروں کو۔"

"وہ پانی تک دھو کے پیتے ہیں۔"

"ہاتھ پاؤں تک تو پھر بھی رہیں گے لیکن یار، یہ بڑا پرتشدد طریقہ ہے سفر کا۔"

میں نے کہا "ایک زبردست آئیڈیا ہے۔ اگر ایک باکس خالی ہو تو میں اور محسن اس میں ایسے لیٹ جائیں گے۔ جیسے باٹا کے ڈبے میں جوتے رکھے جاتے ہیں۔ ایک کا سر اور دوسرے کی لات۔"

ایڈی نے نفی میں سر ہلایا "خالی باکس کی گنجائش نہیں۔"

محسن بولا "یار کتنے کے ہوتے ہیں ٹماٹر۔ جو سبزی کم لاگت کی ہو وہ مت لے جاؤ۔ اس کے پیسے ہم سے لے لو۔"

ایڈی نے پھر انکار کردیا "یہ ناممکن ہے۔ ہر ہفتے مجھے مقررہ مقدار میں سب کچھ لے جانا پڑتا ہے۔ پالک نہیں ملی تو اسٹور والے گاہکوں کو پالک کی جگہ کیا دیں گے؟" اس نے سوال کا خود ہی جواب دیتے ہوئے ایک غلط اور ناقابلِ اشاعت چیز کا نام لیا۔

اب ہم مجبور تھے اور ایڈی کے رحم و کرم پر تھے۔ ہم اس کے ساتھ چل کے یوں ٹرلر تک گئے جیسے رضاکارانہ طور پر اعترافِ جرم کرنے کے لیے تھانے جارہے ہوں۔ ایڈی نے کسی سفاک تھانے دار کا رویہ رکھا۔ اس نے ہم سے کریٹ اٹھوائے اور یہ بڑے بڑے تابوت نما باکس اٹھا کے ٹرلر تک لے جاتے اور ٹرالر پر چڑھاتے ہوئے میرا اور محسن کا حال پتلا ہوگیا۔ ہمارے ساتھ آٹھ دس لوڈر اور بھی تھے مگر وہ اس مشقت کے عادی تھے۔ ان کا یہی کام تھا۔

ایڈی نے کہا "فکر مت کرو۔ تمہیں بھی مزدوری ملے گی، سو سو فرانک۔"

"لعنت سو فرانک پر۔ میری کمر دُہری ہوگئی ہے۔" میں نے کہا۔

"میرا سارا جسم درد کررہا ہے" محسن بولا۔

"جب تم لیٹو گے تو تمہیں بہت آرام ملے گا۔ اچھی نیند آئے گی اگر تم سونا چاہو" ایڈی نے کہا۔

کچھ دیر بعد ہمیں معلوم ہوا کہ یہ سب ایڈی کا ظالمانہ مذاق تھا۔ جب لوڈنگ ختم ہوگئی تو اس نے کہا "چلو اب تم اندر گھس جاؤ۔ کوئی نہیں دیکھ رہا ہے۔"

میں نے اسے حیرانی سے دیکھا "یعنی.... ٹرلر میں ایسے ہی بیٹھ جائیں۔"

"بیٹھو یا لیٹو۔ گھومو پھرو تمہاری مرضی۔ باکس کی دیواروں کے درمیان بہت جگہ ہے۔ گلیاں بنی ہوئی ہیں۔ کار ہوتی تو تم اندر ہی ڈرائیونگ بھی کرسکتے تھے اور اگر تمہاری گرل فرینڈز ساتھ ہوتیں تو....؛ وہ منہ پھاڑ کے ہنسا۔

میں نے جز بز ہوکے کہا "تم ہمیں دہشت میں مبتلا کررہے تھے۔"

"میں ذرا انجوائے کررہا تھا۔ ہر دو گھنٹے کے بعد ہم رک کر کچھ کھائیں گے پئیں گے۔ اپنے اپنے خرچ پر۔ سو سو فرانک بھی تو کمائے ہیں تم نے۔ تم بھی سفر کو بہت انجوائے کروگے۔"

انجوائے کی اولاد۔ میں نے دل ہی دل میں اسے ایک سو ایک گالیاں دیں مگر وہ ہنستا ہوا ٹرلر میں سوار ہوگیا "بڑی حرامی چیز ہے یہ ایڈی۔"

محسن بولا "وہ گرل فرینڈز کے ساتھ ہونے والی بات تو ٹھیک ہی تھی۔ ایک گلی میں ہم ہوتے دوسری میں تم۔ خاصی پرائیوسی تھی۔"

محسن نے ٹھیک کہا تھا۔ اندر اتنی پرائیوسی تھی کہ ہم ایک دوسرے کو بھی نہیں دیکھ سکتے تھے اور ٹرلر کے بیرونی گیٹ کے بند ہوتے ہی اندر گھپ اندھیرا ہوگیا۔

محسن چلاّ کے بولا "کبیر خاں، کیا میں اندھا ہوگیا۔"

میں نے کہا "نہیں یار۔ ایک دم رات ہوگئی ہے شاید۔ تو نے ایک سردار جی کا لطیفہ نہیں سنا ہوگا۔"

"میں نے سنا ہے" محسن نے فریاد کی۔

"نہیں سنا" میں نے اسے ڈانٹ کے کہا "انہوں نے سکھ یاتریوں کی ایک جماعت کے ساتھ پنجہ صاحب حسن ابدال کا دورہ کیا۔ پہلی بار پنڈی میں ایک ڈرائی فروٹ دیکھا جسے "ملوک" کہتے ہیں۔ واپس جانے کے لیے پنڈی سے لاہور والی ٹرین میں سوار ہوئے تو کسی نے ایک تھیلی بھر کے دی کہ راستے میں کھاتے جانا۔ ان کو کہیں جہلم کے پاس خیال آیا کہ چکھ کر تو دیکھا جائے۔ ابھی ایک دانہ منہ میں ڈالا ہی تھا کہ گاڑی سرنگ میں داخل ہوگئی۔ سردار جی چلانے لگے۔ اوئے بیڑا غرق ہو ان مسلوں کا۔ جھوٹ بول کے مروادیا خالصہ کو۔ اسے تو کھاتے ہی میری بینائی چلی گئی۔"

محسن کو ہنس پڑا "ہم تو کچھ بھی نہیں کرسکتے اس اندھیرے میں۔"

میں نے کہا "باتیں کرسکتے ہیں۔ لطیفے سنانے پر پابندی نہیں ہے اور گانے کی بھی اجازت ہے۔ چونکہ میری آواز میں قدرتی سوز و گداز ہے...."

"اس لیے آپ بعد میں۔ پہلے میں ہیر وارث شاہ سناتا ہوں" محسن نے کان پر ہاتھ رکھ کے گانا شروع کیا۔

"ڈولی چڑھدیاں ماریاں ہیر
اندر چیکاں تے لال بیگ وے بابلا۔"

ٹرک رُک گیا اور ایڈی نے دروازہ کھول کے جھانکا "کیا ہوا؟"

میں نے کہا "کہاں کیا ہوا؟"

"کون اتنے زور زور سے رو رہا تھا۔ کیا تکلیف ہے۔"

"میرے ساتھی کو اپنی ساس یاد آ رہی ہے۔ فکر کی کوئی بات نہیں" میں نے کہا۔

دو گھنٹے بعد جو ہمارے لیے دو دن کی قید کے برابر تھے ٹرک پھر رُکا اور ایڈی نے ہمیں ایک بار میں مدعو کیا۔ "پہلا ڈرنک میری طرف سے۔"

میں نے کہا "تم جانتے نہیں کہ ہم مسلمان ہیں۔ شراب نہیں پیتے۔"

وہ بولا "باقی سب بُرے کام تو کرتے ہو۔ سود، رشوت، مردوں کا سونا پہننا، عورت کی بے پردگی۔ یہ سب بھی تو حرام ہیں تمہارے مذہب میں۔"

مجھے یوں لگا جیسے اس نے مذاق کے جواب میں میرے منہ پر تھپڑ مار دیا ہو "یہ تم کیسے جانتے ہو؟"

"میری بیوی مسلمان ہے۔" وہ بولا "نائجیریا کی رہنے والی ہے۔ اس نے بتایا تھا۔ مسلمان کا قتل، چوری ڈکیتی، زنا، یہ سب وہاں بھی حرام ہے مگر مسلمان کرتے ہیں۔ بس ایک شراب اور سؤر کا گوشت نہ کھا کے خوش رہتے ہیں کہ حرام سے بچ گئے اور مسلمان رہے۔"

میں نے کہا "میں مذہبی معاملات میں بحث پسند نہیں کرتا۔"

"ڈرنک سے تمہاری مراد ہو کافی تو منظور ہے" محسن نے کہا۔

"کیوں نہیں، میرے تو پیسے بچیں گے۔ مگر اگلی باری تمہاری ہوگی تو میں کافی نہیں پیوں گا۔ تمہارا وقت کیسا گزر رہا ہے اندر۔"

"وقت نہیں گزر رہا ہے۔" میں نے کہا۔

"یا گزر رہا ہے تو ایسے جیسے کہ مُردے کا قبر میں گزرتا ہوگا۔" محسن بولا۔

"تم کو واقعی اتنی محبت ہے اپنی ساس سے؟"

محسن بولا "نہیں۔ میں اس لیے رو رہا تھا کہ وہ پیدا ہی کیوں ہوئی تھی۔"

ایڈی ہنسنے لگا "پھر تم شادی کیسے کرتے اس لڑکی سے...."

محسن نے کہا "پھر میں پرنسس مارگریٹ سے شادی کرتا ڈیئر ایڈی۔ کیا یہ رونے کی بات نہیں ہے۔"

واپسی پر ہماری آنکھیں کچھ دیر بعد اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہو گئی تھیں۔ محسن نے اسے ڈارون کی تھیوری کے مطابق قرار دیا۔ اگر ہم مستقل اندھیرے میں رہیں تو ہماری آنکھیں اُلو جیسی ہو جائیں گی۔ ہم اندھیرے میں دیکھنے لگیں گے۔

میں نے کہا "اس کنٹینر کی فولادی دیواروں میں کوئی جھری ہوتی یا کوئی سوراخ ہوتا تو ہم باہر کے نظارے دیکھتے جاتے۔"

محسن نے چالیس فٹ لمبی جگہ میں چہل قدمی شروع کی "میں ایک بہت بڑا چلتا پھرتا اُلو محسوس کرتا ہوں خود کو۔"

"آہستہ بول۔ کسی نے سُن لیا تو تیرے چپس بنا دے گا" ... نے کریٹوں کی ایک دیوار کے پیچھے دوسری گلی میں چلتے ہو...

"رابعہ اور گل تو فرض کریں گی کہ ہم کسی میم کے ساتھ ہوا... وہ کیسے سمجھ سکتی ہیں کہ ہمارے ساتھ کردسری آئٹم کی طرح اور بینگن جیسا سلوک ہو رہا ہے۔ ہم پیرس سے لندن کر... سے جا رہے ہیں۔"

"یہ ڈاڑھی مجھ پر ایسے سج رہی ہے جیسے گاندھی کو لنگوٹی تھی۔ یا تجھے یہ واش اینڈ ویئر داڑھی سج رہی ہے۔ اس طرح حلیہ کافی بدل گیا ہے مگر مجھے چہرہ بدلنے کے لیے بھی کچھ کرنا... ورنہ میری وجہ سے تیرے پکڑے جانے کے امکانات روشن... گے۔ جو تجھے پہچانتے تھے وہ مجھے بھی پہچانیں گے اور یہ سمجھ لیں... کہ سونڈ ہے تو ساتھ ہاتھی بھی ہوگا، شیر نہیں ہو سکتا۔"

"اب لندن میں اُترتے ہی تو کوئی پکڑنے سے رہا۔ ... بدل لینا خود ہی۔ کسی سے میک اپ کر کے چہرہ بدلوایا تو شک ہو... ہر قسم کی وگ ملتی ہے جو اصل بالوں کی جگہ لگائی جا سکتی ہے... کنٹیکٹ لینز ہیں جن سے تو اپنی کنجی اور بھینگی آنکھیں ... صورت اور رنگین بنا سکتا ہے۔ کیا پتا کوئی داڑھی مل جائے... تیرے چوکھٹے پر اصل لگے۔"

باہر سے ٹریفک بھی گزر رہی ہوگی مگر اندر کوئی آواز سنائی نہ... دیتی تھی۔ دو بار ٹریفک پولیس کا سائرن سُن کے مجھے شک ہوا کہ ... ہمارے تعاقب میں آئے ہوں گے۔ کوئی مخبری کر دے یا خود ... حرامی پن کر جائے۔ پانچ ہزار فرانک وصول کرنے کا نہ ثبوت ... گواہ۔ الٹا بیان داغ دے کہ یہ بکنگھم پیلس پر میرے ... چاہتے تھے۔ تو مانی اسی کی جائے گی۔

جب سرِ شام ایڈی نے ہمیں دروازہ کھول کے باہر آنے ... دیا اور ہم نے لندن کی سڑک پر رواں ٹریفک کو دیکھا تو مجھے ... خوشی ہوئی جتنی کولمبس کو بے سمت بحری سفر کے بعد امریکا کا ... دیکھ کے ہوئی ہوگی۔ میں اور محسن فوراً باہر کود گئے۔ لندن ... مخصوص انداز میں ٹہلنے والے ایک پولیس مین نے ہماری ... حرکت کا بالکل بُرا نہیں منایا۔ لندن کے پولیس مین کو پیار سے ... کہا جاتا ہے۔ کتنی ناقابلِ یقین بات لگتی ہے کہ لوگ پولیس ... پیار کرتے ہیں۔ وہ دوست کہلاتا ہے... اور ہوتا ہے۔ وہ ہمیں ... کے مسکرایا اور گزر گیا۔

"اب تم آزاد ہو میری طرف سے" ایڈی بولا "اگلے ... میں اپنے گھر میں گزاروں گا یا گھر والی کے ساتھ۔ میرا ... اور ... نمبر سنبھال کے رکھنا۔ جمعرات کی شام کو معلوم کر لینا کہ میری ... کتنے بجے ہوگی۔"

"تمہیں بھی ضرورت پڑے تو بلا تکلف آ جانا۔ ہم شاید ... میں قیام پذیر ہوں گے۔ رائل گیسٹ" محسن بولا۔

جب ٹرک چلا گیا تو میں نے کہا "اب کہاں چلیں ... برطانیہ کو شرفِ ملاقات عطا کریں یا جناب طوطی کو۔"

"کفر کے نقار خانے میں طوطی کی صدا پہلے سنی جا چکی ہے۔ قیام وطعام کا بندوبست ہو جائے تو پھر آگے کی سوچیں گے۔" محسن نے کہا۔

لندن کے سارے راستے ہمارے اسی طرح دیکھے بھالے تھے جیسے اپنے شہرِ خوباں کے کوچہ و بازار۔ ہم کچھ دور پیدل چلے۔ پھر ڈبل ڈیکر بس میں اوپر چڑھ گئے جہاں سے لندن شہر کا نظارہ بہتر طور پر کیا جا سکتا تھا۔ ہم بہ آسانی ٹیکسی میں بھی جا سکتے تھے مگر ہمیں جلدی نہیں تھی اور دل میں ایک بار پھر لندن کی جانی پہچانی سڑکوں کو اطمینان سے دیکھنے کی تمنا بھی تھی۔ حسبِ عادت انگریز بس میں بھی یوں ایک دوسرے سے بے نیاز، بیزار اور خاموش بیٹھے تھے جیسے وہ سب کے درمیان نہیں اکیلے ہیں۔ وہاں کسی اجنبی سے گفتگو کی ضرورت کوئی محسوس نہیں کرتا۔ کچھ لوگ تو اسے باقاعدہ معیوب اور غیر اخلاقی حرکت سمجھتے ہیں۔ ان کے درمیان اگر بہت خوش اخلاقی اور شائستگی برتی جائے تو گفتگو کچھ یوں ہوتی ہے کہ "آج تو موسم بہت اچھا ہے" اور دوسرا مسکرا کے سرہلا سکتا ہے کہ "ہیں۔ نائس ویدر" اور بس....

میں نے محسن سے کہا "ابھی تک کچھ نہیں بدلا یہاں۔"

محسن نے سرہلایا "میں بھی یہی دیکھ رہا ہوں دوست ہر چیز پرانی ہے۔"

"یہ پرانی چیز کو پرانا رکھنا ہی پسند کرتے ہیں۔ عمارات ہوں یا روایات۔ نیا پن کہاں سے آئے گا" میں نے کہا "ان کے رویے تک سخت قدامت پسندانہ ہیں۔" میں نے کہا۔

محسن نے اپنے ساتھ بیٹھے اخبار کے مطالعے میں غرق شخص سے پنگا لینے کی خاطر کہا "تمہارا کیا خیال ہے۔ بادشاہت اور کتنے دن.... میرا مطلب کتنے سال چلے گی برطانیہ میں۔ کیا اکیسویں صدی میں بادشاہ کی جگہ صدر ہوگا؟"

صدمے اور غصے سے اس شخص کا بُرا حال ہو گیا مگر اس نے ضبط کرتے ہوئے قطعی غیر جذباتی لہجے میں کہا "میں جاننا نہیں چاہتا۔"

محسن نے کہا "ویل۔ میں بھی نہیں بتانا چاہتا۔ اگر ایسا ہوا تو صدر نہ تم بنو گے نہ میں پھر ہمیں کیا۔"

چند اور سر ہماری طرف احتجاجاً گھومے مگر کسی نے ہم سے تخت و تاج کے مستقبل اور سیاسی امکانات پر بحث شروع نہیں کی۔ انہوں نے بھی خاموشی سے گھورا اور پھر سامنے دیکھنے لگے۔ لیکن ہم بس سے اُترے تو ایک ہٹے کٹے نوجوان نے پیچھے سے میرے کندھے پر تھپکی دی۔

"میں نے سُنا تھا جو تم کہہ رہے تھے۔" وہ غنڈا ٹائپ لڑکا چیونگم بھی چبا رہا تھا "یو بلیک سوائن۔ تم نے ملکہ کی توہین کی تھی۔"

میں نے کہا "گیٹ لوسٹ۔ تم نے انڈیا میں ہمارے شہنشاہ کے ساتھ کیا کیا تھا۔ میں اس سے بُرا سلوک تمہارے ساتھ کروں گا۔"

اس نے سر منڈوا رکھا تھا اور صاف ظاہر تھا کہ وہ نسلی منافرت کے علمبردار "اسکن ہیڈز" میں شامل تھا جو عام طور پر گروہوں کی شکل میں ایشیائی باشندوں کو گھیر لیتے تھے اور مار پیٹ کرتے تھے۔ انہیں لوٹ لیتے تھے اور ان کی املاک کو نقصان پہنچا کر بھاگ جاتے تھے۔ میں کسی جھگڑے میں پڑنا نہیں چاہتا تھا لیکن ایک بے ضرر سے مذاق کو بہانہ بنا کے وہ نوجوان خود یہ دعوت دے رہا تھا کہ آ بیل مجھے مار۔

اس نے مجھے بیل کی طرح ٹکر مارنے کی کوشش کی جس کے لیے میں پہلے سے تیار تھا۔ میں نے اپنا گھٹنا اوپر اٹھا کے اسے روکا۔ گھٹنا اس کے ماتھے اور ناک پر لگا۔ وہ کراہ کے پیچھے ہٹا اور اس نے اپنی ناک سے خون ٹپکتا دیکھا تو پھر حملہ آور ہوا۔ میں نے قصہ مختصر کرنے کے لیے اسے اٹھا لیا اور آگے بڑھا دیا۔ وہ ایک دکان کے شو کیس کا شیشہ توڑتا ہوا سیدھا اندر گیا جہاں لکڑی کے دو زنانہ مجسمے استادہ تھے۔ دونوں اس کے اوپر گرے۔

میں اور محسن بھاگے۔ ہم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ آس پاس کوئی پولیس والا نہیں تھا اور گلی کا موڑ چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ گلی کا موڑ کاٹتے ہی ہم رک گئے۔ چند قدم سکون سے چل کے ہم نے ایک ٹیکسی کو روک لیا۔ اس گلی میں کسی کو علم نہ تھا کہ ہم کیا کارنامہ سرانجام دے کے آئے ہیں۔

"سیدھے چلو" میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔

"یس سر!" اس نے عادتاً کہا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

میں نے کہا "خواہ مخواہ گلے پڑ گیا وہ گنجا۔"

محسن نے خفگی سے کہا "تو معافی مانگ لیتا تو بات ٹل جاتی۔ یہ لوگ بادشاہ کے معاملے میں جذباتی ہوتے ہیں۔"

"وہ معافی پر ٹلنے والا نہیں تھا۔ پُرانے اور بوڑھے لوگ مہذب ہوتے ہیں کہ سوری کے جواب میں کہہ دیں کہ چلو کوئی بات نہیں۔"

"بس پولیس پیچھے نہ آئے۔ پکڑے گئے تو چھُڑانے والا کوئی نہیں ہوگا" محسن نے پیچھے دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو ہدایات دینی شروع کیں۔ دائیں، پھر دائیں.... بائیں.... پھر بائیں۔ وہ اصل مقصد سمجھے بغیر تعمیل کرتا رہا۔ جھنجلانا ان کی عادت اور مزاج میں شامل نہیں۔ دل ہی دل میں وہ کہتا ہوگا کہ میری بلا سے سارا دن ایک دائرے میں گھومتے رہو۔ مجھے کرائے سے غرض ہے لیکن زبان سے اس نے سوال ہی نہیں کیا کہ آخر جانا کہاں ہے۔

بالآخر محسن نے اسے طوطی صاحب کے آفس چلنے کو کہا۔ وہ پھر بھی نہیں بولا کہ بے وقوفو، پہلے کہہ دیتے تو اپنا پیسہ اور وقت بچا لیتے۔ میں سیدھا وہاں لے جاتا۔ اس نے ہمیں اتار کے کرایہ وصول کیا۔ ٹپ لے کر تھینک یو کہا اور سیدھا نکل گیا۔

ایسٹ اینڈ کا یہ علاقہ ہم نے جیسا پہلے دیکھا تھا آج بھی ویسا ہی تھا۔ ہر طرف اردو بولنے والوں کی ریل پیل تھی جو ہوٹلوں میں

انڈین اور پاکستانی گانے سن کے سردھن رہے تھے۔ پان والوں کی دکان سے میٹھا پان بارہ مسالے والا... بنوا کے کھا رہے تھے۔ گلے مل رہے تھے اور گالیاں بک رہے تھے۔ جیسے علامہ اقبال نے کہا تھا۔ سواد رومتہ الکبریٰ میں دلی یاد آتی ہے ایسے ہی مجھے اپنا لہور یاد آیا مگر لہور لہور ہے۔ ایسٹ اینڈ اس کا ہمسر نہیں ہو سکتا تھا۔

محسن کے ساتھ میں نے اس علاقے میں بہت سی مانوس صورتوں کو دیکھا۔ لسی ربڑی والے حاجی صاحب' جن کا دعوی تھا کہ وہی حیدر آباد کے اصل حاجی ربڑی والے ہیں۔ ایک انڈین حلوائی کی دکان جہاں پوری کچوری لاجواب ہوتی تھی۔ اب ہمیں پہچاننے والا کوئی نہ تھا مگر ہم نے ہر جگہ اور ہر شخص کو پہچانا۔

بالآخر محسن ایک عمارت کے سامنے رک گیا جس کے سامنے والے رخ پر آٹھ فٹ اونچا اور چوڑا سائن بورڈ اعلان کر رہا تھا۔ "کفر کے نقار خانے میں طوطی کی آواز" ہفت روزہ "طوطی" مالک اور مدیر اعلیٰ جناب علم دین طوطی آف سانده کلاں لاہور شریف پاکستان۔"

گھنٹی بجانے پر ایک کارٹون برآمد ہوا۔ اس کا خلعت فاخرہ ٹائپ لباس ایسا تھا جیسا شاہان مغلیہ کا تاریخی تصاویر میں نظر آتا ہے۔ اگر وہ گلاب کا پھول بھی سونگھ رہا ہوتا تو شہزادہ سلیم عرف جہانگیر آف انارکلی فیم نظر آتا۔

جب اس نے ڈرامائی لہجے میں کہا "تم ہو فریادی؟ ہمارے انصاف کو تم نے پکارا ہے۔ تمہارے ہاتھوں نے زنجیر عدل تمام کے گھنٹا بجایا تھا۔"

"گھنٹی ضرور بجائی تھی ہم نے" میں نے کہا اور محسن کی طرف دیکھا تو اس نے سرہلا کے گویا میرے شبہات کی تصدیق کی۔ وہ ایکٹر تھا یا پھر پاگل۔

محسن نے کہا "حاجی صاحب کے فرزند ہو تم؟"

"ہاں۔ ہم ہی عظیم شہنشاہ ہند کے جانشین ہیں۔ اپنی عرض داشت پیش کرو۔ تم کیا چاہتے ہو فریادی؟"

"او بھائی۔ میرا نام محسن ہے۔ فریادی نہیں۔"

میں نے کہا "ویسے تو میں بھی سکندر اعظم ہوں جس نے پورس کو شکست دی تھی۔"

اندر سے کسی نے کہا "او حرامی پھر ڈراما شروع کر دیا۔ کون آیا ہے۔ آ کے بتا تا کیوں نہیں۔"

"آیا اباجی" وہ بوکھلا کے بولا "سکندر اعظم اور پورس آئے ہیں۔ آجاؤ جی اندر۔ آفس ادھر ہے حاجی صاحب کا۔"

ایک شاندار کباڑ خانے جیسے آفس میں شاندار کباڑی نظر آنے والے طوطی صاحب بڑے طمطراق کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ ان کے سامنے پھیلی ہوئی میز کے مقابل دو کرسیاں تھیں۔ ان پر بیٹھنے والا عین اپنی سامنے وہ پیتل کی جگمگاتی تختی دیکھ سکتا تھا جس پر حاجی صاحب کا پورا نام مع تخلص عربی رسم الخط میں نقش تھا لیکن اس کے نیچے ایڈیٹر کے حروف انگریزی کے تھے۔ یہ اہتمام غالباً ان جاہلوں کے لیے تھا جن میں فرنگی بھی شامل ہوں گے جو ان کا نام نہ پڑھ سکیں تو جان لیں کہ وہ کسی عام آدمی سے نہیں ایڈیٹر سے مخاطب ہیں۔ ہوشیار خبردار' پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی منہ سے غلط بات نکلی اور خبر بنی۔

میز پر بہت خوب صورت اور قیمتی رائٹنگ سیٹ تھا اور اس کے چاروں طرف کاغذات' خطوط اخباروں کے تراشے رسالے اور تصویروں کا وہ ڈھیر جس کے بغیر ایڈیٹر کی میز کی تزئین و آرائش میں حسن نہیں آتا۔ دائیں جانب روایتی انداز میں تخت پر ایک کاتب رکھا ہوا تھا۔ وہ ایک گھٹنے پر زرد رنگ کے کاغذ پر خوش خطی کے مظاہرے میں مصروف تھا اور غالباً اس کی عمر اسی فن کی خدمت کرتے گزری تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اسی پوزیشن میں فکس ہو چکا ہے۔ سر جھکا ہوا' ایک پاؤں گھٹنا اوپر رکھنے کے لیے اردو کے ہندسے آٹھ کی طرح اٹھا ہوا تو دوسرا سات کے عدد کی طرح بچھا اور جما ہوا۔ نظریں تحریر پر جمائے رکھنے سے اس کی آنکھیں بھی گویا پتھرا گئی تھیں۔ اس نے ہمیں نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھا۔

خود طوطی صاحب ایڈیٹر سے زیادہ پہلوان نظر آتے تھے۔ حاجی ہونے اور عمر کی گولڈن جوبلی کے قریب پہنچنے کے باوجود وہ کلین شیو تھے اور اپنے حلیے سے کسی حد تک (مرحوم) مولانا عبدالرب نشتر لگتے تھے۔ کلف لگی طرہ والی کلاہ' گھڑی کی سوئیوں کی طرح نوکیلی سوا نو بجاتی مونچھیں۔ کوٹ کے ساتھ سفید لیس اور سبز ٹائی جس پر چاند تارا چمک رہا تھا۔ فن کشیدہ کاری میں کسی ماہر کے ہاتھوں نے یہ نقش کاڑھا تھا جو بالکل پرنٹ لگتا تھا۔ ہمارے "السلام علیکم" کے جواب میں حاجی صاحب بڑی پھرتی سے اٹھے۔ "وعلیکم السلام۔ آؤ جی بسم اللہ" انہوں نے پرجوش مصافحے کے بعد ہمیں بیٹھنے کے لیے کہا "تشریف رکھو اپنے پاکستانی بھائی۔"

میں نے کہا "طوطی صاحب۔ آپ نے کیسے جان لیا کہ ہم پاکستانی ہیں؟"

طوطی صاحب نے بڑی گھن گرج سے قہقہہ لگایا "کمال سرکار۔ یہ دو آنکھیں دیکھ رہے ہو آپ' یہ ایڈیٹر کی آنکھیں ہیں اندر تک دیکھنے والی۔ کیا فرمایا ہے اپنے شاعر مشرق نے۔ تاڑنے والے مضموں بھانپ لیتے ہیں لفافہ دیکھ کر۔ نئے آئے ہو؟"

میں نے اس شعر کو علامہ اقبال سے منسوب کرنے پر ٹوکنے سے ان کے جذبات کو ٹھیس پہنچانا مناسب نہ سمجھا۔

محسن نے کہا "آپ نے بالکل ٹھیک پہچانا۔"

"جب آپ نے السلام علیکم کہا اور حاجی صاحب تو بس ہم سرکار' سب واضح ہو گیا۔ بھارتی اور فرنگی ادھر صرف احتجاج کرنے آتے ہیں۔ بھارتی مسلمان ہو تو آداب عرض ہے کہتا ہے اور السلام بھی اتنی قرات کے ساتھ نہیں کرتا اور طوطی کو حاجی صاحب نہیں کہتا۔ نئے آنے والے ہی ایسے مخاطب کرتے ہیں۔"

"آپ سے تعارف بہت پرانا ہے اور ملاقات کا شرف حاصل رہا ہے مجھے۔ کچھ عرصہ پہلے ہی میں چار سال لندن میں رہ چکا ہوں" محسن بولا "مجھے آپ کے بہت زبردست شعر یاد تھے۔ ایک قطعہ آپ نے بہت خوب صورت فریم میں لکھوا کے اپنے دستخط کے ساتھ مجھے پیش کیا تھا۔ وہ میرے کمرے میں آویزاں رہتا تھا۔"

حاجی صاحب کا چہرہ کھل اٹھا "اچھا میرے پاکستانی بھائی' کیا قطعہ تھا؟"

محسن نے انہیں وہی قطعہ سنا دیا جو مجھے سنایا تھا۔ شاید اس کے سوا اسے کچھ یاد بھی نہیں تھا مگر ہر شاعر کی کمزوری یہی ہوتی ہے کہ اسے سامع اور قدر دان ملتے نہیں اور مل جائیں تو پھر بقول شاعر بک جاتے ہیں ہم آپ متاع سخن کے ساتھ۔ محسن کے قطعے نے وہ کام کیا جو کسی کا سفارشی خط بھی نہیں کر سکتا تھا۔

"واہ واہ۔ کیا ذوق سلیم پایا ہے میری سرکار۔ اب تو طوطی کی صدا لندن سے باہر فرانس' جرمنی اور سوئزرلینڈ تک پہنچ گئی ہے۔ تبلیغ دین اسلام اور خدمت اسلامی جمہوریہ پاکستان۔ طوطی کی زندگی انہی دو مقاصد کے لیے وقف ہے بس آخری سانس تک لبوں سے کلمہ محمدؐ اور نعرہ پاکستان نکلے۔ آمین" پھر وہ میری طرف روئے سخن کر کے بولے "آپ بھی کچھ عرض کرو میرے پاکستانی بھائی۔"

میں نے کہا "ناچیز کو سکندر بخت کہتے ہیں۔"

"اچھا اچھا۔ اسی لیے وہ حرامی کہہ رہا تھا کہ سکندر اعظم اور پورس آئے ہیں۔ برباد کر دیا اس ناخلف کو تھیٹر نے۔"

میں نے کہا "وہ شہزادہ سلیم' میں تو سمجھا تھا خدانخواستہ..."

"وہ میری پہلی بیوی کا پہلا بچہ ہے۔ ڈرامے باز۔"

"ماشاء اللہ۔ خیر سے کتنی بیویاں ہیں آپ کی؟" میں نے مودبانہ پوچھا۔

"صرف دو۔ ایک اپنے پیارے پاکستان کی سوغات۔ اگر میں صدر ہوں تو اسے وزیر اعظم کا مقام حاصل ہے۔ دوسری یہاں کفار کے منہ پر طمانچہ مارنے اور ان کی غیرت کا جلوس نکالنے کے لیے کی تھی۔ خالص انگریز اور کرستان تھی جسے مشرف بہ اسلام کرنے کے بعد اس سے نکاح کر لیا۔ بہت تلملائے فرنگی میری سرکار۔ میں نے تو دو کالمی سرخی کے ساتھ قطعہ بھی چھاپ دیا تھا۔ اس سے بھی پانچ اولادیں ہیں۔ زوجگان کے درمیان عدل و انصاف کی شرط ہے۔"

"یعنی جب تک پہلی کے چھٹا بچہ نہیں ہو گا دوسری کے بھی نہیں ہو گا۔"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا" انہوں نے میز پر ہاتھ مارا "پہلا حق بھی اسی کا بنتا ہے۔ اچھا جی اب فرماؤ کیا حکم ہے میرے لیے۔"

میں نے کہا "میں نے بھی لندن میں چار سال گزارے تھے۔ پھر یہاں سے نکال دیا گیا تھا۔ ان گوروں نے سازش کی تھی میرے خلاف۔"

"اچھا جی۔ گویا اب آپ غیر قانونی طور پر یہاں آئے ہو اپنے پاکستانی بھائی۔"

"یہی سمجھ لیں۔ ہم پہلے پیرس گئے۔ وہاں سے سڑک کے راستے لندن میں داخل ہو گئے۔ براہ راست آنے کا ویزا مل جاتا لیکن ایک خبیث نسل پرست انگریز نے ٹانگ اڑا دی۔ پاکستانی قونسیٹ کو منع کر دیا۔ ہم بھی آپ کے پیروکار ہیں طوطی صاحب۔ جب تک لندن میں تھے انگریز ہم سے عاجز تھے۔ سب کے جینڈ بجا دیے تھے ہم نے۔ میں اور محسن مل کے جہاد کرتے تھے انگریز اور بھارتی قوم کے خلاف۔ اب آپ سے کیا پردہ۔ ان کی لڑکیاں خود ہم پر مرتی تھیں تو ہم کیا کرتے۔ شادی تو اپنے پاکستان جا کے والدین کی مرضی سے ہی کرنی تھی لیکن ہم نے کسی کو نظر اٹھا کے بات کرنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ ان کی عزت کو ذلت میں بدلنا ہمارا مشن تھا اور یہی ہمارا جرم بن گیا بعد میں۔ انگریزوں نے ہمیں اس طرح جلا وطن کر کے چھوڑا جیسے تحریک آزادی کے مجاہدوں کو کالا پانی بھیجتے تھے۔ ہم تو خیر سے اپنے وطن ہی گئے تھے۔"

"اور اب پھر لوٹ آئے ہیں" محسن بولا۔

طوطی صاحب نے کہا "آفرین ہے تم پر میرے پاکستانی بھائی۔ کیا پھر وہی جہاد شروع کرنے کا ارادہ ہے۔"

میں نے کہا "نہیں جناب۔ اب تو ہم شادیاں بھی کر چکے ہیں۔ ہم ایک اور کام سے آئے ہیں جس میں آپ ہی ہماری مدد کر سکتے ہیں۔"

محسن نے کہا "ہم نے بہت سوچا لیکن آپ کے سوا ہمارے ذہن میں کسی کا نام نہ آیا۔ کہنے کو یہاں دوست بہت اور پاکستانی بھی اپنے ہم وطن ہیں۔ اگر صرف رہائش کا یا نوکری کا مسئلہ ہوتا تو سب مل کے کچھ کر سکتے تھے۔"

میں نے گرہ لگائی "لیکن ہمارا کام مشکل ہے۔ وہی ہمارا ساتھ دے گا جو حق و صداقت اور عدل و انصاف کا علم بردار ہو۔ مومن ہو اور پاکستانی ہو۔"

محسن نے کہا "انسانیت اور شرافت کا عملی نمونہ ہو۔"

میں نے کہا "بے باک اور نڈر ہو۔ جیسا کہ فرمایا ہے شاعر مشرق نے۔

گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان"

محسن نے کہا "اور چار سال یہاں رہ کے ہم نے آپ کی جو شہرت دیکھی تھی اور جس سے سارا عالم واقف ہے۔ وہ ایسی تھی کہ ہم سیدھے آپ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ خدا کے بعد یہاں آپ کا آسرا ہے..."

خوشامد ایک بشری کمزوری ہے اور طوطی صاحب اس معاملے میں زیادہ ہی کمزور ثابت ہوئے۔ ہماری مبالغہ آمیز تعریف کو انہوں نے مبنی بر حقیقت خراج تحسین کے طور پر وصول کیا۔ غرور سے ان کا سر اونچا ہو گیا۔ فخر سے مونچھیں پھڑکنے لگیں اور خوشی سے آنکھیں چمک اٹھیں۔

"دیکھو برخوردارو۔ میرے پاکستانی بھائیو!" انہوں نے گویا کر

مزید جما کے اور ٹائی کی ناٹ کو ہلا کے کہا "تعریف کے لائق بس خدا کی ذات ہے۔ طوطی کیا چیز ہے۔ اس نے توفیق دی تو سب ہوا۔ میں یہاں جو کچھ کرتا ہوں اللہ رسولؐ کی خوشنودی اور اپنے پیارے پاکستان کی خاطر کرتا ہوں۔ یہ انگریز اور بھارتی میرا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔ طوطی نے جان ہتھیلی پر رکھ لی ہے اور کفن پہلے خرید لیا ہے۔ یہ بتاؤ کہ تم ٹھہرے کہاں ہو؟"

میں نے کہا "ابھی تک تو چل ہی رہے ہیں۔ سفر ختم نہیں ہوا۔"

"یعنی فیصلہ نہیں کیا ابھی کہ کہاں قیام ہوگا۔ خیر' یہ بولو میری سرکار کہ آخر تمہارے ارادے کیا ہیں۔ تم کس کس کو قتل کرنے آئے ہو اور کیسے کروگے یہ کام؟ کوئی بم وغیرہ ماروگے یا۔۔۔" طوطی صاحب کا رنگ اُڑنے لگا۔

میں نے کہا "توبہ طوطی صاحب۔ ہم تو اس معاملے میں شرمناک حد تک بزدل ہیں۔ ریوالور دیکھا ہے چلایا نہیں۔ عید پر بکرے کے گلے پر چھری پھیرتے ہیں تو ہاتھ کانپتا ہے اور لگتا ہے بکرے کے ساتھ دم نکل جائے گا۔ انسان کو قتل کرنا' خواہ وہ فرنگی ہو یا بھارتی' ہمارے بس کی بات نہیں۔"

"میں سمجھا تم انتقام لینے آئے ہو ان سے جن کا تم نے بینڈ بجایا تھا اور جنہوں نے سازش کرکے تمہیں نکلوادیا تھا۔" طوطی صاحب نے اطمینان کی سانس لی۔

"ہم تو بڑے نیک ارادے سے آئے ہیں۔ کارِ خیر کے لیے۔"

"کسی بے گناہ کی جان بچانا ثواب کا کام ہے" محسن بولا۔

"بے شک میرے پاکستانی بھائی لیکن اسٹوری کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔"

میں نے کہا "اسٹوری لمبی ہے اور بڑی دردناک۔ جذبۂ حب الوطنی اور جوشِ ایمانی سے بھرپور۔ ایک سچے پاکستانی مسلمان کے لیے باعثِ فخر۔"

"اچھا! پھر ایسا کرو' صبح آجاؤ میرے پاس۔"

"لیکن ہم آپ کے پاس سے کہیں جائیں گے تو صبح آئیں گے۔ بقول فلمی شاعر۔ نکل کے تیری محفل سے یہ دیوانے کہاں جائیں؟"

"کیا مطلب میری سرکار۔۔۔!"

"مطلب صاف ہے طوطی صاحب۔ اگر ہم ہوٹل میں گئے تو وہاں اپنا پاسپورٹ دکھانا پڑے گا۔"

"پاسپورٹ جعلی ہے یا ہے ہی نہیں؟"

"اصل پاسپورٹ ہیں ہمارے پاس" میں نے کہا "لیکن کسی ہوٹل کے رجسٹر میں ہمارے نام کا اندراج ہوا تو یہ کافر انگریز جو ہمارے دشمن ہو رہے ہیں ہمیں تلاش کرلیں گے اور پھر برطانیہ بدر کردیں گے یا جیل میں ڈال دیں گے۔ ہم ان کی مرضی کے خلاف زبردستی یہاں آئے ہیں۔ جس خبیث الزماں نے برطانوی قونصیٹ ۔۔۔ یا تھا کہ ہمیں ویزا نہ جاری کرے اس نے امیگریشن والوں کو بھی ہوشیار کردیا ہوگا اور عین ممکن ہے لندن کی پولیس ہمارے نام اور حلیے فراہم کردیے ہوں' ہم اتنی دور آکے ناکام لو[ٹ] جائیں آپ کے ہوتے ہوئے۔"

"نہیں میرے پاکستانی بھائی۔ طوطی ایسا نہیں ہونے دے گا۔ یہاں ہزاروں پاکستانی بھائی کسی ویزا پاسپورٹ کے بغیر رہتے ہیں۔ یہ سب ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ خود بھی چھپ کر رہتے ہیں اور جاب بھی کرتے ہیں۔ دوسروں کو بھی چھپا کے رکھتے ہیں اور نوکریاں دلاتے ہیں۔ ان کے عزیز واقارب کو پاکستان سے بلاتے ہیں اور یہاں آباد ہونے میں مدد کرتے ہیں۔ کوئی پکڑا جائے تو مل کے وکیل کرتے ہیں اور مقدمے کے اخراجات شیئر کرتے ہیں۔ طوطی ان سب کا ساتھ دیتا ہے۔ ان کے حقوق کی حفاظت کرتا ہے اور ان کو انگریزوں کے ظلم اور زیادتی سے بچاتا ہے۔"

میں نے کہا "اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔"

طوطی صاحب نے جوش سے کہا "میرے پاکستانی بھائی' یہ ایک جہاد ہے۔ ایک قومی جدوجہد ہے۔ جتنے زیادہ پاکستانی یہاں آباد ہوں گے اتنی ان کی قوت بڑھے گی۔ ان کی منظم طاقت انگریز کا سر نیچا کردے گی۔ محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔ محبت ہے ہمیں مسلمان پاکستانی بھائیوں سے اور جنگ ہے ہماری کافروں اور انگریزوں سے۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ آؤ' گروہ کی صورت میں اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام کے آؤ۔ سمندر کے راستے۔ خشکی کے راستے۔ ہوائی جہاز سے۔ اپنے خاندانوں کے ساتھ یا اکیلے۔ یہاں میموں سے شادی کرو۔ ان کی اولادوں سے شادی کرو۔ ان کو مشرف بہ اسلام کرو۔ اپنی طاقت بڑھاؤ۔ بغیر پاسپورٹ کے آؤ۔ جعلی پاسپورٹ پر آؤ۔ اگر اسلامی اخوت کا یہ جذبہ سب میں ہو میری سرکار تو ایک دن یہاں پاکستانی قوم آباد ہوگی۔ یہ بھی ایک پاکستان بن جائے گا۔ آج ہم دو فیصد ہیں یا پانچ فیصد تو کل دس فیصد ہوں گے۔ پھر بیس فیصد یہاں تک کہ ایک دن پچاس فیصد پھر ہم انگریزوں سے بڑھ جائیں گے کیونکہ یہ لحمِ خنزیر کھانے والے برتھ کنٹرول کرتے ہیں۔ ہم تو مہم چلا رہے ہیں کہ مسلمان بچے خوب پیدا کرو۔ دن رات ایک کردو اس مقصد کے لیے۔ انگریز کے ملک میں پیدا ہونے والے مسلمان پاکستانی بچے کل کے مجاہد ہیں۔ انگریز دو بچے پیدا کریں تو تم دس کرو۔ جیسے کہ میں نے کیے پھر دیکھنا ہماری زندگی میں ہی انگلستان کا نام پاکستان رکھا جائے گا۔ ہم اکثریت میں ہوں گے۔ پارلیمنٹ میں اکثریت ہماری ہوگی تو ہم وزیرِ اعظم بھی اپنا مسلمان پاکستانی بھائی ہوگا۔"

میں طوطی کی احمقانہ جذباتی سوچ اور منطق پر دم بخود رہ گیا۔ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا پورے یقین کے ساتھ کہہ رہا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے اور ہوگا۔ یہ اس کے ذہنی طور پر دیوالیا ہونے کی دلیل تھی مگر جنون اسی کا نام ہے۔ ہم اسے قائل نہیں کرسکتے تھے کہ یہ دیوانگی ہے۔ وہ ہمیں بڑے جوش وخروش سے قائل کر رہا تھا کہ زیادہ مسلمان بچے ہوں اور پاکستان کی آدھی آبادی جا[کر]

برطانیہ پہنچ جائے تو اس ملک پر پاکستان کا جھنڈا لہرایا جا سکتا ہے۔ دنا جائز طور پر

کفر کے نقار خانے میں طوطی کی صدا!

محسن نے مجھے میز کے نیچے سے ٹھوکر ماری اور میں نے اسے۔ ہم نے ایک دوسرے کو خبردار کیا کہ تردید نہیں کرنی۔ بحث نہیں کرنی۔ طوطی کی بھرپور حمایت حاصل کرنے کے لیے اس کے مؤقف اور نظریات سے مکمل اتفاق کرنا ضروری ہے۔ یہ کام ہم نے بڑی شدومد کے ساتھ کیا اور طوطی صاحب کے اس عظیم مقصد کی خاطر جہاد میں انگریز کافروں کی شکست کا یقین دلایا۔ انہوں نے تو ہند پر صرف ڈیڑھ سو سال حکومت کی۔ ہم یہاں ڈیڑھ ہزار سال رہیں گے۔ ڈیڑھ لاکھ سال رہیں گے۔ انہیں غلام بنائیں گے اور میموں کو کنیز۔ اس سے پہلے یومِ جزا آگیا تو پھر جنت کے مزے اور حور و غلمان۔ مسلمان کے لیے دنیا ودیں میں سرفرازی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس وقت وہ دنیا میں نفاق وانتشار کے باعث خوار وزبوں ہیں۔

طوطی صاحب نے ایک شب کے لیے ہمیں اپنے نقار خانے کی چھت پر سونے کی جگہ اور اجازت مرحمت فرمائی۔ نقار خانہ ان کے گھر کا نام تھا۔ اس پر وہ سائن بورڈ آج کل نہیں تھا جس پر انگریزی حروف میں لکھا گیا تھا کہ "یہاں کتوں' انگریزوں اور بھارتیوں کا داخلہ منع ہے" اس معاملے میں قانونی جنگ جاری تھی جس میں کبھی کسی بہانے طوطی صاحب جیت جاتے تھے تو فوراً بورڈ آویزاں کردیتے تھے۔ کبھی دشمنوں کو اسے ہٹوانے کا موقع مل جاتا تھا۔ طوطی صاحب کو یقینِ کامل تھا کہ ایک دن یہ بورڈ لندن کیا پورے انگلستان کی بیشتر عمارتوں پر نظر آئے گا۔ انشاءاللہ!

میں اور محسن اب بہت مطمئن تھے۔ ہم طوطی صاحب کو شیشے میں اُتار چکے تھے۔ وہ بااثر آدمی تھے۔ اکثر جذباتی مسلمان اور پاکستانی ان کے حامی تھے اور اس جہاد میں بالواسطہ طور پر شریک ہوکے ان کی مدد کرتے تھے۔ براہِ راست مدد کرنے والے کم تھے۔ مجھے یقین تھا کہ ایم آر ایس کی ولولہ انگیز داستان شجاعت سے اور سکندر بخت کے ایمان افروز کارناموں سے وہ پہلے بھی واقف ہوں گے اور جب انہیں علم ہوگا کہ میں وہی پاکستانی جانباز ہوں تو وہ میری مدد ایک مقدس فریضہ سمجھ کے کریں گے۔

نقار خانے کے نچلے حصے میں رات گئے تک شورِ محشر بپا رہا۔ ایک ٹی وی پر انگلش فلم بڑی اونچی آواز میں چل رہی تھی۔ دوسری طرف ڈیک پر پاکستانی پنجابی فلموں کے گانے بجائے جا رہے تھے۔ مقابلہ دونوں بیگمات کے درمیان تھا کہ کون کس کی آواز کو دبا سکتا ہے۔ درمیان میں طوطی صاحب بحیثیت مشترکہ شوہر یوں عدل ومساوات کی مثال قائم کرتے تھے کہ دونوں کو ایک ہی لہجے میں ایک جیسی گالیوں سے نواز کے سیز فائر کراتے تھے اور ٹی وی اور ڈیک بند کرادیتے تھے مگر ان کے آفس لوٹتے ہی حالات پھر معمول پر آجاتے تھے۔ دس میں سے چار چھ بچے مستقل لڑتے یا روتے تھے۔ نمبر ون جو ڈرامے کرنے کا شوقین تھا بدستور شہزادہ سلیم بنا پھرتا رہا اور ہمیں اس ڈرامے کے مکالموں سے مستفید کرتا رہا جو عنقریب کسی اسٹیج پر پیش کیا جانے والا تھا۔ اس نے رازداری سے انکشاف کیا کہ انار کلی کا رول کرنے والی اس کی گرل فرینڈ ہے جس سے شادی کرنے کے لیے وہ اپنا مذہب تک چھوڑ دے گا۔ میں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ آزر کے گھر میں ابراہیمؑ کے پیدا ہونے کی مثال یہاں اُلٹی ہو رہی تھی۔

یہ اتفاق تھا کہ اس رات ہفت روزہ "طوطی" کی آخری کاپی پریس میں جانی ضروری تھی چنانچہ حاجی صاحب (جوکہ مدیر کی اعلیٰ حیثیت رکھنے کے ساتھ ساتھ پبلشر' کاپی پیسٹر' فلم میکر' سرکولیشن منیجر۔ بزنس منیجر یہاں تک کہ وقتِ ضرورت چائے بنانے سے دفتر میں جھاڑو دینے تک کے جملہ امور بھی سنبھالتے تھے) مصروف تھے۔ "طوطی" پہلے دو ہفتے میں ایک بار شائع ہوتا تھا اور اس کی ضخامت بھی کم تھی مگر آہستہ آہستہ اس نے پاکستانیوں میں قارئین کا ایک جوشیلا حلقہ پیدا کرلیا تھا جو دامے درمے سخنے امداد بھی کرتے تھے اور معرکۂ کفرواسلام میں طوطی کے ہمنوا تھے۔ اب یہ ہر ہفتے باقاعدگی سے شائع ہوتا تھا۔ اس کی ضخامت دگنی ہوگئی تھی تو غالباً اشاعت دس گنا۔ اس سے اشتہارات بڑھے تھے اور پرچا زیادہ آب وتاب کے ساتھ شائع ہو رہا تھا۔ اس کا سرورق بالکل پاکستانی جھنڈا تھا۔ اوپر سفید پٹی باقی سبز۔ اس میں مقامی پاکستانیوں کے علاوہ وطن سے موصول ہونے والی نگارشات' ایمان پرور قصے' حب الوطنی کے جذبات سے چمکتی نظمیں۔ خون گرمانے والے قومی نعرے اور کچھ اشتعال انگیز مواد بھی ہوتا تھا جس سے کفار کے سینے چھلنی ہو جائیں نگران کے سینوں پر مونگ دلنا اور پھر قانونی اور غیر قانونی جنگ میں اُلجھنا طوطی صاحب کی زندگی کا مقصد تھا۔

نصف شب کے قریب شہزادہ سلیم اچانک نمودار ہوا جب ہم سونے کی کوشش میں مصروف تھے۔ "انار کلی رونما ہوا چاہتی ہے" اس نے اعلان کیا۔

میں نے کہا "یہاں' اس وقت؟"

"ہاں۔ یہی وقت ہے اور یہی جگہ ہے سلیم اور انار کلی کے ملنے کی جہاں آج تم نے دو محبت کے متوالوں کی خلوت میں دخل اندازی کی گستاخی کی ہے۔ دل آرام۔"

میں نے کہا "تم بتا رہے تھے کہ انار کلی انگریز اور کرسٹان ہے پھر وہ اردو کے ایسے مشکل ڈائیلاگ کیسے بولے گی؟"

"اس کی ڈبنگ چلے گی" وہ بولا "طوطی اپنے پنجرے میں قید ہے۔ کیا تم آنکھیں بند کرکے سو نہیں سکتے۔ یا گھومنے پھرنے نہیں جاسکتے۔"

محسن نے کہا "دیکھو مسٹر سلیم' ہم سونا چاہتے ہیں۔ بہتر ہے کہ تم خود چلتے پھرتے نظر آؤ ورنہ میں تمہارے ابا جان کو تمہارے عزائم سے آگاہ کردوں گا اور تمہارے خیالات سے بھی۔"

"کردو۔ ظالم سماج کے سنگدل نمائندے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ محبت کرنے والے جان کیسے دیتے ہیں۔ جیسے شمع پر پروانے۔"

اس پر ڈراموں کا اثر بہت زیادہ تھا۔

"تم زیادہ مشکل سے جان دو گے۔ انارکلی کی جگہ تمہیں دیوار میں زندہ چنوائے گا تمہارا باپ۔"

"باپ.. تم باپ! جس کے سینے میں پتھر ہے۔ وہ ہر رومانس میں ایسا کیوں کرتا ہے۔ کیا ... کافی نہیں؟ وہ محبت کرنے والوں کے بیچ میں دیوار کیوں بن جاتا ہے۔ کیا وہ نہیں جانتا کہ عشق کے طوفان کو یہ ریت کی دیوار نہیں روک سکتی۔"

اس وقت طوطی صاحب نمودار ہوئے "اوئے تو.... اس وقت یہاں بھی ڈراما" انہوں نے پاؤں میں سے جوتی اتار لی۔

شہزادہ سلیم بدحواس ہو کے دوڑے۔ اکبر اعظم نے پیچھے سے جوتی کو میزائل کی طرح داغا۔ ان کا نشانہ پاکستانی آرٹلری (توپ خانے) کے اس ماہر توپچی جیسا تھا جس نے ۶۵ء کی جنگ میں لاہور کی مشہور توپ "شیرنی" چلائی تھی یا "رانی"۔ شہزادہ سلیم نے چلا کے کہا "ہائے اباجی!" اور نیچے چلے گئے' جوتی سمیت۔

طوطی صاحب ایک جوتی میں ہمارے پاس آ بیٹھے "ہاں بھئی' اپنے پاکستان بھائی۔ اب فراغت ہے ہمیں۔ ذرا ہم بھی سنیں کیا اسٹوری ہے تمہاری۔ میں نے بقراط سے کہہ دیا ہے کہ ہر گھنٹے بعد چائے آجانی چاہیے۔"

"بقراط کون؟"

"اپنا کاتب میری سرکار۔ اس کی باتیں کسی کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ اس لیے بقراط کہتے ہیں۔ وقت کا بڑا پابند تھا۔ میں نے کہا کہ خبردار جو انگریزوں کی کوئی عادت اپنائی۔ ہم کفار کی تقلید کیوں کریں۔ وقت ہمارا غلام ہے جی کہ ہم غلام ہیں وقت کے۔"

"کیا ہر ایک گھنٹے بعد چائے لانے کے لیے وقت کی پابندی نہیں کرنی پڑے گی؟" محسن بولا۔

"وہ آئے گا سوا گھنٹے یا ڈیڑھ گھنٹے میں۔ آپ فکر مت کرو میرے پاکستانی بھائی' شروع ہو جاؤ۔"

میں اور محسن مجبوراً اٹھ بیٹھے۔ ہمارے سونے کے لیے فرش پر ہی بستر بچھا دیے گئے تھے۔ موسم بہت خوش گوار بلکہ قدرے خنک تھا اور ہم جس چھت پر فروکش تھے اس کے اردگرد اونچے مکان تھے۔ طوطی صاحب نے مجھے مطلع کیا کہ دائیں بائیں تو اپنے پاکستانی بھائی پکا قبضہ جما چکے ہیں مگر پچھلی طرف بڑا بے حیا اور ڈھیٹ انگریز خاندان ہے۔ کسی قیمت پر مکان دینے کو تیار نہیں۔ انہوں نے اس کی ایک لڑکی کے بارے میں نازیبا کلمات بھی کہے جس سے میں نے اندازہ کیا کہ وہی شہزادہ سلیم کی انارکلی ہوگی جو خالص دیسی اسٹائل میں "کوٹھے ٹپ" کے آتی ہوگی۔ آج ظالم سماج مع سنگدل باپ کے موجود تھا تو ملاقات کا کوئی امکان نہیں تھا۔

ہر گھنٹے بعد توانائی بخش خالص دودھ ملائی والی چائے پینے کی سزا سے بچنے کے لیے میں نے اپنی روداد میں اختصار کے ہنر سے کام لیا ... عملاً دریا کو کوزے میں بند کرنے کی پوری کوشش کی مگر طوطی ... نے ... سے ناکام کردیا۔

وہ ایم آر ایس کے سارے کارناموں سے واقف تھے اور مجھ[ے] ہی انہیں علم ہوا کہ میں وہی سکندر بخت ہوں جو ایم آر ایس کا ہیرو تھا اور محسن میرا دست راست تو انہوں نے فرط جذبات سے نعرہ لگا کے پہلے مجھے دبوچ کر اپنی آغوش میں خوب نچوڑا۔ پھر محسن کو' مزاحمت کی بالکل گنجائش نہ تھی۔ طوطی صاحب پہلوانی کا زور رکھتے تھے چنانچہ میں اور محسن خاصے پریس ہو گئے پھر اس کہانی کے دوران جہاں کوئی ولولہ انگیز مرحلہ آتا تھا وہ "مرحبا۔ آفرین۔ شاباش" جیسے نعرے لگا کے مجھے گلے لگا لیتے تھے۔ کبھی ستائشی انداز میں میرے کندھے پر ہاتھ مارتے تھے اور چلاتے تھے "کمال کر دیا میرے پاکستانی بھائی" یا فرط مسرت سے بے قابو ہو کے نعرہ لگاتے تھے "بھئی واہ' جوان!" ہر بار میں اچھل پڑتا تھا۔ اپنا کندھا یا ران سہلاتا رہ جاتا تھا اور سوچتا تھا کہ اس معرکہ آرائی کی داستان شجاعت کو مزید مختصر کردوں مگر طوطی صاحب ہر بار خراج تحسین کا غلغلہ بلند کرنے کے بعد سوالات کی بوچھاڑ کر دیتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ میں دشمنان پاکستان کی ہر شکست کا منظر یوں بیان کروں کہ الفاظ میں تصویر عبرت نظر آئے مگر میں نے معذرت کرلی کہ جناب! آپ جیسا زور بیان میں کہاں سے لاؤں۔

اس کے باوجود مجھے اور محسن کو بقراط کی تیار کردہ ٹانک تین بار نوش فرمانا پڑی۔ وہ اچھی خوراک اور اچھی صحت کے بارے میں پہلوانوں کے فلسفے پر یقین رکھتے تھے کہ زیادہ کھاؤ اور اچھا کھاؤ۔ اچھا وہ جو دیسی ہو۔ دیسی گھی' دیسی مکھن' دیسی مرغی' اس کا ... دیسی انڈا۔ ولایتی انڈا جس کو اپنے پاکستانی بھائی پی آئی اے کا انڈا کہتے ہیں۔ وہ تو ہوتا ہے نامرد انڈا۔ اس سے چوزہ پیدا نہیں ہوتا۔ پھر وہ کیا ہوا؟ اور جو اسے کھائے وہ کیا ہوگا۔ میں نے ایک بار ڈرتے ڈرتے کافی کا سوال کیا تو انہوں نے مجھے ڈانٹ لگائی "میرے پاکستانی بھائی۔ اس عمر میں کافی' زرا زہر ہے زہر۔ اندر سے جلا دیتی ہے۔ گرم اور خشک ہوتی ہے۔ جوانی ہوتی ہے دودھ ملائی لسی پی کے ... جان بنانے کے لیے۔ آج بھی میری سرکار خوراک ہے دو کلو گوشت بھنا ہوا۔ دو کلو بھینس کا تازہ دودھ۔ صبح بادام گھوٹ کے اور شام کو چھ انڈے ڈال کے۔ ہزار ڈنڈ بیٹھک تو ایک سانس میں پورے کرلیتا ہوں۔"

ان کی شاندار توند کو دیکھتے ہوئے یہ سب غلط بھی نہیں تھا۔ وہ میڈیکل سائنس کے جدید نظریات سے یکسر منکر تھے۔ اہالیانِ مغرب نے طبِ مشرق سے لیے مگر اب اسی کو مٹانے پر تلے ہوئے تھے۔ ان کو میں کیسے سمجھاتا کہ طبِ مشرق کو ... کی جانب اور فنا کی منزل کے قریب پہنچانے والے تو خود وہ جاہل خود ساختہ دیواری حکیم تھے جو تحقیق کے نام سے نا آشنا تھے اور سیکڑوں سال پرانے نظریات اور مجربات کے مطابق عوارض و عواقب جانے بغیر قدیم یونانی ادویات سے "ہوالشافی" لکھ کے ہر مرض کا علاج کر رہے تھے۔ صدری نسخوں کو ایک خود غرضانہ رویے کے ساتھ قبر میں لے جا رہے تھے۔

صبح ہوتے میں اور محسن ایم آر ایس کی جد وجہد اور اپنے مسائل پر بنی داستان کا آخری باب سنانے میں کامیاب ہوئے اور طوطی صاحب کے پاس بھی مزید فضول سوالات ختم ہو گئے تو انہوں نے مجموعی صورت حال کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہا "ہوں" اور پھر فکر میں ڈوب گئے۔ پانچ منٹ تک خلا میں گھورنے اور مونچھوں کے "گیسوئے تابدار" کو اور بھی تابدار کرنے کے بعد انہوں نے پھر کہا "ہوں" اور جب تیسری بار دریائے فکر میں غوطہ ... تب میں اور محسن اونگھ رہے تھے۔

طوطی صاحب نے میرے کندھے پر ہاتھ مارا "سمجھ لو کہ سارے سب مسائل حل ہو گئے میرے پاکستانی بھائی۔"

میں نے معذوب کندھا ہلا کے کہا "کس چیز میں حل ہو گئے؟"

ان کے قہقہے پر محسن ہڑبڑا کے سیدھا ہو گیا "ہل.... کیسا ہل.... جو بیل چلاتا ہے کھیت میں۔"

طوطی صاحب نے کمال شفقت سے فرمایا "چو اب تم نیچے ... میں جا کے سو جاؤ۔ وہیں بقراط بھی ہوگا مگر تمہارے لیے جگہ ... آئے گی میری سرکار۔ میں آج "طوطی" کی طباعت میں مصروف رہوں گا مگر تمہارے معاملات بھی زیر غور رہیں گے۔ شام تک سب بندوبست ہو جائے گا۔ ان حالات میں تمہارا باہر نکلنا بھی مناسب نہیں۔ طوطی کے مخالف بہت ہیں۔"

بقراط سونے کی کوشش میں آنکھیں کھولے چھت کو گھور رہا تھا۔ اس نے کہا "قیامت یوں بھی تو آسکتی ہے کہ آسمان دھڑام سے زمین پر گر جائے۔ یہ گنبد مینائی بے ستون ہے۔ اور زمیں خلا میں معلق ہے۔ اگر یہ مزید نیچے گر گئی لاکھوں میل تو سورج سے فاصلہ بڑھ جائے گا۔ شجر حجر' چرند پرند درند۔ انسان حیوان سب مردہ ہو جائیں گے سردی سے۔ برف کے ہو جائیں گے۔"

وہ قیامت آنے کے مختلف امکانات پر بہ آواز بلند غور و خوض کر رہا تھا۔ بلاشبہ وہ بقراط تھا اور اس کی باتیں ناقابل فہم تھیں۔ مجھے اور محسن کے کانوں میں نیند آنے تک اس کی آواز آتی رہی۔ خواب بھی میں نے ایسے ہی دیکھے کہ چودھری دلاور زمین کے نیچے خلا کی گہرائی سے زنجیر کے ذریعے کرۂ ارض کو نیچے کھینچ رہا ہے۔ ... کے غبارے کو ڈور پکڑ کے اتار لیا جائے۔ اور قہقہے لگا رہا ہے۔ اب بولو' اپنے سکندر اعظم صاحب' ابھی تم کو برف کا وہ بناتا ... کیا کہتے ہیں اسے ہیں جی' مجسمہ۔ بڑی مضبوط زنجیر ہے اور ... دوسرے کنارے پر میں باندھنے لگا ہوں مریخ کو۔ اس کا وزن بہت زیادہ ہے۔ اتنی دور چلی جائے گی تمہاری دنیا کہ سورج تم کو قطب ستارے کی طرح نظر آئے گا۔

پھر نہ جانے کس نے صور اسرافیل پھونکا اور میں فوراً مردے کی طرح قبر سے اٹھ کے میدان حشر کی جانب دوڑنے کے لیے اٹھا تو محسن بھی جاگ گیا۔ یہ آفس ٹیبل پر رکھے ہوئے الارم کی آواز تھی جس کا بقراط پر ذرا بھی اثر نہیں ہوا تھا۔ میں نے بھنا کے گھڑی پر ہاتھ مارا مگر الارم بجتا رہا۔ اس میں چھ بجے کا وقت سیٹ تھا لیکن گھڑی نو بجا رہی تھی۔ غالباً پابندیِ وقت کی عادت اسے بھی پسند نہیں تھی۔ اس کا مزاج طوطی صاحب کی صحبت میں پاکستانی ہو گیا تھا۔

صرف چار گھنٹے کی نیند ناکافی تھی مگر اب دوبارہ سونا بھی مشکل تھا۔ بقراط کے بارے میں یقین سے کہنا مشکل تھا کہ وہ اٹھے گا یا نہیں اور اٹھا تو خود اٹھے گا یا اسے چار آدمی اٹھائیں گے۔ ہمارا سوٹ کیس وہیں موجود تھا اور مجھے آفس سے ملحق باتھ روم بھی نظر آرہا تھا۔ نہا دھو کے تیار ہونے کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ اب ہم کیا کریں؟ طوطی صاحب کی ممانعت کے باوجود ہم باہر گئے اور ایک پاکستانی بھائی کے ہوٹل سے پراٹھے پائے کا ناشتا کر کے اور دوسری جگہ لاجواب کافی پی کے لوٹے تو صورت حال جوں کی توں تھی۔ دفتر خالی تھا اور بقراط ساکت لیٹا ہوا تھا۔ طوطی صاحب کا شہزادہ سلیم نہ جانے کہاں تھا۔ اندر زنان خانے میں بھی کوئی صدا نہ تھی۔

میں نے ایڈیٹر کی کرسی پر براجمان ہو کے کہا "شیروانی صاحب۔ دل بہت اداس ہے۔ پیرس کے تصور سے۔"

محسن پر رقت طاری ہو گئی "وہاں وہ ہمیں یاد کر رہی ہوں گی۔"

"بالکل اسی طرح جیسے ہم.... چوہدری دلاور کو یاد کرتے ہیں۔ جذبات کچھ ایسے ہی ہوں گے۔"

"کیوں نہ ہم ان سے فون پر وہ گالیاں کوسنے وغیرہ سن لیں جو واپسی پر سننے ہیں" محسن بولا۔

میں نے کہا "آتش فشاں کو خود پھاڑنا کہاں کی عقلمندی ہے۔ وہ اپنے وقت پر پھٹے گا تو بھگت لیں گے۔ ہاں یہ ٹیلی فون دیکھ کے مجھے بڑی ترغیب ہو رہی ہے۔"

میں نے فون اپنی طرف کھسکا لیا اور الزبتھ کا نمبر ملایا۔ ریسیور غالباً کسی ہاؤس میڈ قسم کی کنیز نے اٹھایا۔ میں نے کہا "سکندر بخت فرام پاکستان۔ مجھے لیڈی الزبتھ سے بات کرنی ہے۔"

"یس سر۔ پلیز ہولڈ آن" اس نے مؤدبانہ کہا اور چند سیکنڈ بعد میں نے الزبتھ کی آواز سنی۔

"تم۔ پاکستان میں ہو ابھی تک۔"

میں نے کہا "ہاں اور آزاد بھی ہوں۔ جیل خانے سے نہیں ... رہا ہوں۔"

"... تمہاری آمد کی منتظر رہی۔"

"وہاں کی پولیس بھی منتظر رہی ہوگی" میں نے ... سے کہا "سچ بتاؤ الزبتھ۔ کیا تمہارا یہ شوہر بھی تمہارے باپ کی طرح متعصب اور کینہ ہے؟"

"شٹ اپ۔ کیا تم پاگل ہو گئے ہو۔ کیسے بات کر رہے ہو؟"

میں نے کہا "اس نے پکا بندوبست کیا تھا کہ میں پکڑا جاؤں۔ کراچی سے لندن پہنچ کے پھر ڈی پورٹ کیا جاؤں۔ اس نے برٹش قونصلیٹ کو میرے خلاف بریف کیا۔ اتنا حسد کرتا ہے وہ اب تک مجھ سے۔ اب تو میں اس کا رقیب نہیں تھا اور میں نے تم سے راز داری کی بات کی تھی۔ تم نے اسے سب کچھ بتا دیا..."

الزبتھ پھٹ پڑی "کیوں نہ بتاؤں اسے۔ آخر وہ شوہر ہے میرا۔ تم کیا ہو' ایک ہرجائی پلے بوائے۔ کتنی لڑکیوں سے انتقام لیا تھا تم نے دور غلامی کا۔ ان میں ایک میں بھی تھی۔ کیا اس سے زیادہ کمینگی ممکن تھی؟ پھر میں کیسے معاف کرتی تمہیں۔ تم نے شادی کرلی۔ مجھے معلوم ہے تمہاری بیوی بہت خوب صورت ہے اور بہت مشہور وکیل ہے۔ تم نے جھوٹ بولا تھا مجھ سے۔"

"اس کا مطلب ہے تم میری جاسوسی کرتی رہی تھیں۔"

"یہی سمجھ لو۔ میں جاننا چاہتی تھی کہ تم..... تم کیا کررہے ہو۔ میرے بغیر تمہارا کیا حال ہے۔ تم نے بھلا دیا تھا مجھے۔"

"میں مجبور تھا۔ تمہارے باپ نے اتنی ذلت کے ساتھ نکلوایا تھا مجھے۔"

"ذلت تو میں نے برداشت کی تھی۔ تم سے دل لگا کے بھی۔ طعنے سنے تھے کہ میں نے اپنے خاندانی وقار کو خاک میں ملادیا۔ ایک کالے آدمی پر عاشق ہوگئی' باپ کی عزت کا جنازہ نکال دیا۔ اور تمہارے جانے کے بعد بھی ذلیل ہوئی جب مجھے تمہاری فتوحات کا علم ہوا۔ انکار مت کرنا۔ میں خود ان سے ملی ہوں۔ جو تمہاری مفتوحہ تھیں۔ ایک.....دو..... تین..... حد ہوتی ہے بے شرمی کی۔ اس کے بعد میں نے واقعی جاسوسی کی۔ ایک ایک کو تلاش کیا..... پھر انڈیا..."

"ٹو ہیل ود انڈیا۔ دس از پاکستان۔"

"میرے لیے برابر ہے۔ وہاں بھی ایک منگیتر تھی تمہاری۔ تم نے اسے بھی چھوڑا۔ جو تمہاری واپسی کی آس میں سالوں بیٹھی رہی تھی۔ پور گرل' تم نے ایک دولت مند وکیل کو پھانس لیا۔"

"شٹ اپ.....!"

"یو شٹ اپ۔ کیا غلط ہے اس میں؟ وہ ایک مطلقہ عورت تھی۔ پہلے شوہر نے اسے چھوڑ دیا تھا پھر بھی تم نے اس کے ساتھ محبت کا ڈراما کیا اور پھر اسے ساتھ لے کر پھرتے رہے۔ اس کا گھر بار تباہ کردیا۔ لیکن ابھی تک تم نے شادی نہیں کی ہے اس سے۔ کیا اب کسی اور پر نظر ہے۔"

"بس کرو الزبتھ ورنہ میں لندن آکے تمہارے گھر میں گھس کے تمہیں ماردوں گا۔ تم بہت گھٹیا بازاری باتیں کررہی ہو۔"

"تم ہو ایک ایسے آدمی جو بازاری عورتوں کے لائق تھا۔ میرے جیسی خاندانی لڑکی کے لیے نہیں..... اور لندن آکے تو دیکھو' پولیس تمہاری بو سونگھتی پھر رہی ہے۔ میرے گھر میں تم کیا گھسوگے۔ میرے کتے تمہیں تکا بوٹی کرکے کھاجائیں گے اور میرا شوہر۔"

"تمہارے شوہر کی ایسی کی تیسی اور میں ضرور آؤں گا لندن۔ بہت جلد' اور تمہیں اپنی بیوی سے ملواؤں گا۔ اسی وکیل سے۔ یہ بتادوں تمہیں کہ وہ تم سے بہت زیادہ حسین ہے۔ تم اس کی خاک پا بھی نہیں ہو اور نہ تمہاری محبت اس کے عشق کا مقابلہ کرسکتی

"رہنے دو سکندر بخت۔ تم کو ایسے آنا ہوتا تو جانا آتے۔ تمہارا عشق سچا ہوتا تو کون تمہارا راستہ روک... اب بھی تو آہی رہے تھے تم۔ مگر اس وقت تم خود جانا... مجھ سے جان بھی چھوٹ رہی تھی اور تمہیں اپنے باپ... اپنے کاروبار کی فکر تھی۔ جائداد کی فکر تھی۔ الزبتھ... ایک بے وقوف لڑکی تھی جو تمہارے ساتھ انڈیا بھی چلی...

"پھر انڈیا۔ میرا وطن پاکستان ہے لیکن الزبتھ... کس نے بتایا تھا۔ میرے خاندانی معاملات کے بارے...

"تھا کوئی میرا ہمدرد۔ اس نے فون کرکے مجھے حالات... کیا۔ مجھے معلوم ہے تمہارے باپ کی موت تمہارے... سے پہلے ہوگئی تھی۔ پھر تم نے اس کے قاتل کو مار ڈالا... رہے۔ پھانسی ہوجاتی تمہیں مگر اس وکیل نے تمہیں بچا... تم نے ایک گروہ بنالیا تھا۔ دہشت گردی شروع کرا... میں اور بنگلہ دیش میں تم تخریبی کارروائیاں کرتے رہے... تمہارے اس گروہ کا.....ہاں' ایم آر ایس۔ مائٹ سوسائٹی۔"

میں نے کہا "تمہارے اس ہمدرد کا نام چوہدری... تھا؟"

اس کی ایک لمحے کی خاموشی نے مجھے بتادیا کہ تم... ہے "وہ..... کوئی بھی ہو۔"

"وہ اکثر فون کرتا ہوگا تمہیں۔ تمہاری معلومات... کرنے کے لیے یا اس نے حال ہی میں رابطہ کیا تھا تم سے...

"چھوڑو یہ ساری باتیں سکندر۔ آئندہ مجھے اپنا... مت سمجھنا۔ تم نے انگریزوں سے دور غلامی کا بدلہ لیا... سے تمہاری فتوحات کا بدلہ ضرور لوں گی۔ اگر کبھی تم... اس بار تو تم قسمت سے بچ گئے۔"

"میں ضرور آؤں گا الزبتھ۔ مزید فتوحات کے لیے... ہمنام ملکہ اور نانی دوئم الزبتھ ٹیلر۔ سب کو اپنی کالونی...

میں نے فون رکھ دیا اور دھاڑ کے کہا "الو کی پٹھی۔"

بقراط ایک دم اٹھ بیٹھا "وعلیکم السلام۔ کیا ہوا... آج بھی سورج نکلا ہے اور مشرق سے ہی نکلا ہے۔ اسے... چار گھنٹے ستائیس منٹ ہوچکے۔"

میں بھونچکا رہ گیا "یہ گھڑی دیکھے بغیر تم نے کیسے بتایا..."

"جب میری آنکھ کھلتی ہے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔"

"یعنی اتنے پابند ہو تم وقت کے؟ یہ انگریزوں کی... نے کیسے اختیار کرلی۔ طوطی صاحب کے احکامات کی... ورزی۔"

"مگر آج تو دیر سے اٹھا ہوں میں۔ کل چار گھنٹے... ہوچکے تھے سورج نکلے ہوئے۔ کیا تم سورج کا درجہ حرارت... ہو؟"

میں نے اپنی کم علمی کا اعتراف کیا "نہیں۔ بھو...

...بنز لے کر جاؤں گا اور دیکھوں گا۔"

"وہاں مت جانا۔ ایک لمبا سا بانس لے کر اس کے اوپر... باندھ لینا اور صبح صبح دیکھ لینا۔ اس وقت سورج بہت نیچا ہوتا ہے۔"

وہ یقیناً کھسکا ہوا تھا مگر خطرناک پاگل نہیں تھا۔ طوطی صاحب... سمجھ میں اس کی باتیں کیسے آسکتی تھیں۔ وہ بقراط تھا۔

محسن نے بڑے غور سے میرے یکطرفہ مکالمے سنے تھے اور... لہجے سے اندازہ کرلیا تھا کہ دونوں طرف ہے آگ برابر لگی... بس یہ محبت کی نہیں نفرت اور حسد و رقابت کی آگ تھی۔ ...سمجھ لینے کے بعد اسے مجھ سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں... بقراط ابھی کائنات کے کسی عمیق نکتے میں ہی الجھا ہوا تھا کہ... طوطی صاحب وارد ہوئے۔ میں نے فوراً ان کی کرسی خالی کردی۔ انہوں نے بیٹھتے ہی فرمایا "لو بھئی اپنے پاکستانی بھائیو! تمہارا... کام تمام ہوگیا۔ یعنی میں نے سارا انتظام کردیا۔"

میں نے اطمینان کی سانس لی "با محاورہ گفتگو سے میں ڈر گیا...

انہوں نے میز پر ہاتھ مارا "ڈرتے نہیں دنیا میں مسلمان کسی سے۔ شاعر مشرق کا یہ شعر یاد رکھو۔ ڈرو صرف اللہ سے۔"

وہ دل کو لگنے والے ہر شعر کو علامہ اقبال سے منسوب کر دیتے تھے۔ یہ ان کی شاعر مشرق سے عقیدت کی انتہا تھی "اوئے بقراط اب اٹھ جا نہیں تو ڈنڈا مارتا ہوں تیرے سر پر۔ دماغ ٹھکانے آجائے گا۔ پریس جاکے دیکھ پرچا چھپ رہا ہے ٹھیک سے یا نہیں۔ میرا ہونہار سپوت تو دیکھ رہا ہوگا اس حرافہ کو جو آفس میں بیٹھی ہے تو دیکھنے کی چیز مگر اس پر واجب ہے کہ پہلے دعوتِ اسلام... پھر عشق کرے۔ جیسا کہ ہمارا قاعدہ تھا۔"

میں نے انہیں یاد دلایا "آپ ہمارے کام کی بات کررہے تھے۔"

"ہاں۔ خوب یاد دلایا میری سرکار۔ کاؤنٹی جیل کے اندر تو... مگر باہر کے اسٹاف میں اپنا ایک پاکستانی بھائی ہے۔ اس نے ادھر ادھر بہت کنکشن ملا رکھے ہیں۔ بڑی خرابی یہ ہے ان کافر انگریزوں میں کہ رشوت بہت کم کھاتے ہیں۔ آٹے میں نمک کے برابر ہیں ایسے لوگ۔ اپنے وطن میں تو ماشاء اللہ نمک میں آٹے کے برابر ہیں رشوت لے کر خدمت خلق کرنے والے۔ ایک راستہ نکل آیا ہے۔ ایک دھوبن ہے' واش وومن' وہ اندر ہی کام کرتی ہے اور اس کے ناجائز مراسم سب سے ہیں۔ قیدی سے جیلر تک سب کی دولت مشترکہ ہے وہ میری سرکار۔ وہی کرے گی اپنا کام۔ ...پونڈ سے بولی شروع ہوگی۔"

"بولی؟ ہم اسے کسی قیمت پر خریدنا نہیں چاہتے۔ مفت ملے تب بھی۔"

طوطی صاحب ہنسے "کام کی بولی۔ اپنا پاکستانی بھائی اسے آفر دے گا کہ جارج سے ملوادو۔ وہ بے گناہ جیل کاٹ رہا ہے۔ اگر اس کی جان بچ جائے اور تمہیں ثواب کے ساتھ سو پونڈ بھی ملیں تو اس سے اچھی کیا بات ہوسکتی ہے۔ امید ہے دو سو پونڈ میں کام ہوجائے گا۔ میں دو سو پونڈ دے آیا کہ بسم اللہ کرو۔"

رشوت دینے کے لیے بسم اللہ! مجھے افسوس بھی ہوا اور ہنسی بھی آئی مگر میں طوطی صاحب سے کچھ کہتا تو ان کا جواب یہی ہوتا کہ میری سرکار۔ جو کام بھی خدا کا نام لے کر شروع کیا جائے اس میں برکت ہوتی ہے۔

محسن نے دو سو پونڈ انہیں پیش کیے جو انہوں نے فوراً اچک لیے اور میز کی دراز میں ڈال کے پھر تالا لگادیا "اس نے کہا تھا کہ دوپہر تک فون کرکے مجھے بتائے گا۔"

"کیا بتائے گا؟"

"یہی کہ جارج سے کب' کیسے اور کہاں ملاقات ہوسکتی ہے۔ آسان طریقہ یہ ہے کہ تم خود اندر پہنچ جاؤ۔ کوئی چھوٹا موٹا جرم کرکے۔ جب جرمانہ ہو تو خالی جیب دکھادینا۔ وہ ہمیں دو چار دن یا ہفتے بھر کے لیے جیل میں ڈال دیں گے۔ وہاں اطمینان سے ملاقات کرنا۔"

"طوطی صاحب۔ یہ کیا فرمارہے ہیں آپ؟ میں یہاں سزا یافتہ کہلاؤں۔ واپس پاکستان جاؤں یہ داغ رسوائی لے کر کہ میں کافر انگریز کی جیل میں رہا تھا۔ اور یہ چھوٹا موٹا جرم کیا ہوتا ہے جس کی سزا دو چار دن کی جیل ہو۔"

طوطی صاحب نے غور فرماکے کہا "یہی..... پتھر مار کے کسی گاڑی کی لائٹ توڑ دو۔ کسی میم کے کتے کو لات ماردو۔ ٹریفک سگنل پر چڑھ کے بیٹھ جاؤ۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ ویزا کے بغیر داخلہ زیادہ بڑا جرم بن جائے گا۔"

"خدا کا شکر ہے کہ آپ سمجھ گئے" میں نے کہا۔

طوطی صاحب نے کہا "اس میں بھی کیا حرج ہے۔ تمہیں دوبارہ ڈی پورٹ کریں گے۔ واپس پاکستان ہی جاؤگے نا میری سرکار۔ کوئی کالے پانی تو نہیں۔ خرچہ بچے گا واپسی کا۔ کچھ دن یہاں بھی جیل میں رکھیں گے..... جیل یہاں کی اپنے پیارے پاکستان جیسی نہیں ہوتی... اچھا ماحول ہوتا ہے اور کھانا بھی..."

میں نے سر پکڑ کے کہا "طوطی صاحب۔ واپسی پر تو پاکستان کی جیل ہی جانا پڑے گا۔ آپ کیوں مجھے اندر کرانا چاہتے ہیں۔"

"نہیں میرے بھائی۔ میرے چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔"

"شاعرِ مشرق نے فرمایا ہے یہ بھی؟" میں نے طنز سے کہا۔

"اور کون فرما سکتا ہے۔ تم نے تو داڑھی لگالی۔ اچھا کیا' لیکن شیروانی صاحب بالکل اوریجنل چہرہ لیے پھر رہے ہیں۔ یہ تشویش کی بات ہے۔"

"اس مسئلے کا حل یہ ہے کہ محسن بھی میک اپ سے چہرہ بدل لے" میں نے کہا۔

اس سے پہلے کہ طوطی صاحب تائید یا تردید کرتے اور محسن کی شکل بدلنے کے امکانات پر لائٹ ڈالتے۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے

گی۔

ریسیور اٹھا کے انہوں نے آغا حشر اسٹائل میں کہا "طوطی بول رہا ہے۔" پھر ریسیور پر ہاتھ رکھ کے ہمیں مطلع کیا "وہی ہے۔ اپنا پاکستانی بھائی۔ ہاں میری سرکار۔ کیا' ہاں' بالکل جانتا ہوں اس خر زاد کو۔ یہ کیا کہہ رہے ہو۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ تم سے جھوٹ تو نہیں بولا اس انٹرنیشنل معشوق نے۔ اچھا.... ہاں.... میں سمجھ گیا.... ٹھیک ہے...."

جب انہوں ریسیور رکھا تو ان کے چہرے پر سکھوں والے بارہ بجے ہوئے تھے۔ "گڑبڑ ہو گئی اپنے پاکستانی بھائی۔ وہ خبیث زادہ تم سے پہلے اپنا کام کر گیا۔"

"کون.... چوہدری دلاور؟" میں نے اور محسن نے ایک ساتھ کہا۔

طوطی صاحب نے اوپر نیچے سر ہلا کے افسوس سے دائیں بائیں ہلایا "وہ کسی طرح جیل کے اندر پہنچ گیا تھا۔ جارج سے ملا اور اس کو کچھ دے گیا۔ کھانے پینے کی کوئی چیز ہو گی۔ چاکلیٹ چیونگم وغیرہ۔ بعد میں اس کی حالت بگڑ گئی۔"

صدمے سے میں اور محسن سن بیٹھے رہے۔ "آگے بتایئے کیا وہ مر گیا یا زندہ ہے؟"

طوطی صاحب نے ایک گہری ٹھنڈی سانس لے کر اوپر دیکھا۔ "زندہ ہے میرے پاکستانی بھائی۔ خیر اللہ تمہیں صبرِ جمیل عطا کرے۔"

میں نے کہا "یہ تو اچھی خبر ہے۔"

طوطی صاحب نے مجھے اشارہ کیا "یہ اچھی خبر ہے؟ ذرا اپنا مکھڑا ادھر کرو.... اور عنقریب کرو۔"

میں نے ڈرتے ڈرتے چہرہ آگے کیا تو انہوں نے میری داڑھی پکڑ لی "یہ.... کیا کر رہے ہیں آپ طوطی صاحب!.... نقلی داڑھی ہے۔"

انہوں نے داڑھی ہٹا کے میرا منہ سونگھا اور ناک سے سوں سوں کی ایسی آواز نکالی جو اسٹیم انجن روانگی سے پہلے نکالتا ہے۔ "الحمد اللہ۔ تمہاری بات سے مجھے شک پیدا ہو چلا تھا کہ تمہارے ذہن میں ام الخبائث کا نشہ غالب ہے۔ ویسے داڑھی ملائم اور ریشمی ہے۔ واش این ویئر۔ غالباً میڈ ان جاپان ہو گی۔ اوریجنل لگتی ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ۔" میں نے کہا "اپنی سو فیصد خالص دیسی چیز ہے۔ ساختہ اسلامی جمہوریہ پاکستان۔ مگر یہ آپ نے کیا نامعقول حرکت فرمائی تھی۔ کیسے فرض کر لیا آپ نے کہ حرام شے میرے حلق سے اتر کے دماغ تک چڑھ گئی ہے۔"

انہوں نے دوستانہ انداز میں اپنا پہلوانی کے داؤ والا ہاتھ میرے شانے پر مارا "بُرا ماننے کی بات نہیں۔ اپنے بہت سے پاکستانی بھائی ولایت کا رخ آخر کس لیے کرتے ہیں؟ ولایتی شراب کے لیے جس کو منہ لگاتے ہی وہ جامے سے باہر ہو جاتے ہیں یا ولایتی شباب کے لیے جو منہ لگانے سے پہلے ہی جامے سے باہر..... تم نے بات ہی ایسی کی تھی۔"

میں نے کہا "ایسی کون سی غلط بات کی تھی میں نے"

محسن بھی بولا "ہمارا کون اللہ کو پیارا ہوا تھا کہ تم صبرِ جمیل کی دعا کی تھی؟"

انہوں نے سر ہلایا "دعا برحق تھی۔ آخر تمہارے ... کی خطیر رقم نے انتقال کیا۔ تمہاری جیب سے نکل کے اس انٹرنیشنل معشوق کے حساب میں۔ بڑا دردناک ... خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم...."

میں نے کہا "دو سو پاؤنڈ پر لعنت۔ خدا کا شکر ہے ... انتقال نہیں ہوا۔ ورنہ ہمارے یہاں تک پہنچنے کا ... ہو جاتا۔"

محسن بولا "واپس جا کے کیا منہ دکھاتے اپنی منکوحہ ... فردِ جرم عائد کرنے میں دیر نہ لگاتیں کہ جارج کا تو بہانہ ... ایک شرمناک مقصد کے ساتھ کچھ اور لینے لندن گئے تھے ..."

"خیر ان کو مطمئن کرنا اتنا سنگین مسئلہ نہیں تھا۔ ہم ... کوئی جارج پکڑ لیتے۔ اپنے پاکستان میں کیا کم جارج ہیں ... اپنے محلے خادم حسین کی گلی میں آتا ہے روز صبح ... کے ساتھ سائیکل کے کیریئر پر بیٹھ کے آتی ہے۔"

طوطی صاحب نے ہمیں پرملامت نظروں سے دیکھا ... ہے تمہاری مردانگی پر اپنے پاکستانی بھائیو! بیویوں سے ... ہو۔ پاؤں کی جوتی سمجھتے اسے روزِ اول سے...."

میں نے کہا "کوشش کی تھی مگر انہوں نے پاؤں ... اتار لی۔ خیر اب فرمایئے کہ یہ مسئلہ آخر کیسے حل ہو گا۔ ... کہاں ہے؟"

"ظاہر ہے کہ وہ اسپتال میں ہے۔"

"اور اس کی حالت کے بارے میں کیا اطلاع ہے ..." بولا۔

طوطی صاحب نے کہا "بھئی ابھی تمہارے سامنے اطلاع ملی ہے مجھے بھی۔ اب نئے سرے سے جاسوس ... اور اپنے چیف رپورٹر کو روانہ کرتا ہوں اسپتال کی جانب ... تفصیلی خبر لائے گا۔"

میں نے کہا "کون ہے آپ کا چیف رپورٹر۔"

"بھئی تم مل چکے ہو اس سے۔ ماشاء اللہ بڑا ہونہار ... جگہ پہنچ جاتا ہے اور اندر تو ایسے گھس جاتا ہے گوروں کی ... میں دھول جھونک کے" انہوں نے قہقہہ مار کے پھر میرے ... ہاتھ مارنے کی ناکام کوشش کی۔

میں فوراً پیچھے ہو گیا "ہماری اس سے کب ملاقات ہوئی ..."

"کل کئی بار تم نے دیکھا اسے میرے پاکستانی بھائی ... حلیہ بھی ملاحظہ کیا اور اس کے کرتوت بھی دیکھے۔ بھئی ... ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہمارا وہی ناخلف ولی عہد شہزادہ ... بہت سے کام کر لیتا ہے۔ اللہ نے بڑی صلاحیت عطا کی ہے ... ایک بار ہم نے ذاتی پاپوش مبارک کے ذریعے اس کو اعترافِ جرم پر مجبور کر دیا تھا تو یہ سنسنی خیز انکشاف ہوا تھا کہ وہ اپنی جوانی دیوانی کو نصف درجن دخترانِ کفار کے سچے عشق میں برباد کر رہا ہے۔"

"سب سے سچا عشق تھا اسے؟" محسن نے طنزیہ کہا۔

"الحمد اللہ۔ جھوٹ سے اس کو بھی نفرت ہے ہماری طرح۔ ہم نے سخت تنبیہہ کر کے چھوڑ دیا کہ چار سے تجاوز کی ہم اجازت نہیں دیں گے۔ یہ شرع کی حد ہے جس پر ہم بھی کاربند ہیں۔ اس کی شادی تو خیر کسی ایک سے بھی ممکن نہیں تھی ہمارے جیتے جی۔ اپنے پاکستانی بھائیوں کی دخترانِ نیک اختر با حیا اور شعائرِ اسلامی کی پابند ہوں گی تو ہمیں قبول ہیں لیکن ڈرامے کی ریہرسل بھی تو ڈرامے کے مطابق ہونی چاہیے۔ اس نے قرعہ اندازی سے دو کو خارج از نصاب کیا اور اتنا سعادت مند ہے کہ پھر جب بھی دریافت کیا' حلفیہ بیان دیتا ہے بلکہ چار کے نام تک بتا دیتا ہے شرماتے ہوئے۔"

میں نے کہا "ایک انارکلی سے رات بھی ملاقات طے تھی لیکن ہماری وجہ سے نہ ہو سکی۔"

انہوں نے فخریہ رازداری سے بتایا "اسی لیے میں نے اس کو چیف رپورٹر بنا دیا کہ حرامی نمبرون ہے اور ڈرامے باز بھی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ ہم نے تو سنا ہے اس کے پاس گیدڑ سنگی ہے۔ ہم تلاش کرتے رہے ساری عمر۔ ہمیں تو اصلی نہیں ملی' یہ نہ جانے کہاں سے لے آیا۔ یہی راز ہے اس کی فتوحات کا میرے پاکستانی بھائی۔ سنچری کے قریب پہنچ گیا ہے۔ ہم نے بھی بڑی دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے اس کی عاشقانہ صلاحیت کا رخ موڑ دیا' تعمیری کام کی طرف۔ اب ہر جگہ سے اندر کی خبر وہ ایسے ہی لاتا ہے کہ اپنی گیدڑ سنگی سے کسی پر جادو چلا دیتا ہے۔ کہیں کوئی ہاؤس میڈ ہو' خادمہ ہو' نرس یا ٹیچر ہو۔ یوں اس کی گرل فرینڈ بن جاتی ہیں"

انہوں نے چٹکی بجا کے واضح کیا "اس معاملے میں جتنا خوش قسمت اور باصلاحیت ہے اتنا ہی پریکٹیکل بھی ہے خیر سے۔ نہ رنگ دیکھتا ہے نہ عمر۔ نہ صورت نہ سیرت۔ بس گونگی' بہری یا اندھی نہ ہو.... اور ہاں' نبض چل رہی ہو۔ یہ تو دستور ہے یہاں کا' ساٹھ سالہ بھی گرل فرینڈ ہی ہوتی ہے۔"

میں نے کہا "آپ نے واقعی کمال دانش مندی کا ثبوت دیا ہے اسے چیف رپورٹر بنا کے۔ موروثی صلاحیت اور ذہانت کے ساتھ گیدڑ سنگی ہے۔"

ان کا سر فخر سے بلند ہو گیا "کیا فرمایا ہے اپنے علامہ صاحب نے کہ.... ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں۔ بالکل اسی پر عمل کرتا ہے۔ اسکول کے امتحان تو میں پاس کرا دیتا ہوں سفارش سے۔ اپنے ایک پاکستانی بھائی کا اسکول ہے۔ ان کو فون کرتا ہوں۔ کبھی دھمکی بھی دینی پڑتی ہے غلط خبر لگانے کی۔ مگر وہ اچھے نمبروں سے پاس کر دیتے تھے۔"

محسن نے کہا "گویا پڑھ لکھ کے عالم فاضل بھی ہو گیا آپ کی دعا سے۔ عشق کے امتحان میں خود پاس ہو جاتا ہے۔"

"اچھے نمبروں سے" میں نے اضافہ کیا "چیف رپورٹر ایسے ہی تو نہیں بن گیا "طوطی" کا۔"

ان کا سر فخر سے مزید بلند ہو گیا "اور بھی بہت کچھ کر لیتا ہے وہ میرے بھائی! سرکولیشن کا بھی مسئلہ نہیں۔ خود ہی اخبار بھی پہنچا سکتا ہے ہر جگہ۔ اشتہار لے آتا ہے ٹھیک ٹھاک۔ حقہ بھرنا خود میں نے سکھایا۔ پراٹھے واہ واہ خوب بناتا ہے اور کریلے قیمہ تو ایسا پکاتا ہے...."

میں نے کہا "بس تو پھر آپ اس کریلے.... میرا مطلب ہے اپنے چیف رپورٹر کو فوراً روانہ کر دیں اسپتال۔"

طوطی صاحب نے روئے سخن مخالف سمت میں کر کے ہانک لگائی "اوئے میرے پتر نوردین۔ نوردین...." ان کی آواز میں جو غرور آمیز شفقت تھی وہ جواب موصول نہ ہونے پر فطری ناراضگی میں بدل گئی "اوئے حرامی۔ سُور دے پتر' نوردین....!"

دروازے کی اوٹ سے ان کے دوسرے برخوردار نے کہا "نئیں اے اباجی۔" اور پھر صرف قمیص میں نمودار ہوا جس سے وہ ناک بھی صاف کر رہا تھا۔

طوطی صاحب نے خاصی شرمندگی کا اظہار کیا "وہ جی.... عمر تو اتنی نہیں ہے اس کی۔ سات سال کا ہے مگر لگتا ہے پورا کھوتا۔ سارا قصور ہے اس اپنے پاکستانی بھائی لال خان جرّاح سیالکوٹی کا۔ ہر ہفتے کہتا ہے جی بس اب کے جمعے اور پھر غائب.... کسی اور پر بھروسا نہیں۔"

میں نے زیادہ اہم امور کی جانب متوجہ کرنے کے لیے کہا "کیا حرج ہے اگر ہم خود اسپتال چلے جائیں۔"

"جاؤ' جاؤ۔ شوق سے جاؤ۔ پولیس سے ملو اور ان کو بتاؤ کہ تم کون ہو اور کس لیے تشریف لائے ہو۔ لندن کی پولیس کے بارے میں سنا ہی ہو گا آپ نے کہ بڑی خوش اخلاق ہے اور ملنسار ہے۔ آپ کو سر آنکھوں پر بٹھائیں گے اور جارج کو اسی وقت ٹھیک ٹھاک کر کے آپ کے ساتھ کریں گے کہ لو جی' چاند سی بنو اب تیرے حوالے۔ کیا پتا ٹکٹ بھی دیں اور آپ کو چھوڑنے بھی جائیں ائرپورٹ تک۔"

میں نے کہا "آپ تو خفا ہو گئے۔"

"او چن ماہی۔ دور کے ڈھول سہانے۔ یہاں کی جو پولیس ہے نا وہ بس گوری چمڑی والوں کی یار ہے۔ کالا رنگ دیکھ کے تو ان کا خون سفید ہو جاتا ہے۔ اور دوستی کی بات محدود ہے شرفا تک۔ جہاں تک میرا خیال ہے تم کو وہ شرفا نہیں سمجھ سکتے۔ یہی کیا کم قصور ہے تمہارا کہ تم پاکستانی ہو میرے بھائی' اور پھر خیر سے مشہوری بھی ہے تمہاری۔ مفرور مجرم' دہشت گرد جیسے خطابات کے ساتھ تشریف لائے ہو۔ وہ بھی بلا اجازت۔"

میں نے کہا "یہ سب تو ٹھیک فرمایا آپ نے۔"

"مگر ہمارے فرمانے سے پہلے جو آپ نے فرمایا تھا بھولے بادشاہ۔ اس پر بھی غور کرو۔ تم گئے تو پھر سمجھو گئے کام سے۔ واپس کیسے آؤ گے؟"

محسن نے بات مختصر کی "اچھا پھر آپ خود فون کر کے معلوم کرلیں۔"

"میں کہاں فون کروں؟"

"اسپتال۔ جہاں جارج کو رکھا گیا ہوگا.... آخر آپ ایڈیٹر ہیں۔ کفر کے نقار خانے میں طوطی کی صدا سب سن چکے ہیں۔ ذرا رعب والی آواز نکال کے انگریزی میں پوچھیں کہ آج صبح کاؤنٹی جیل میں جس نیگرو قیدی کو زہر دیا تھا تم لوگوں نے' وہ زندہ ہے کہ مرگیا؟ پھر دیکھیں وہ کیا کہتے ہیں۔"

ان کی آنکھیں چمکنے لگیں "یہ بات تو سولہ آنے ٹھیک ہے کہ اس بندۂ ناچیز حاجی علم دین آف سانده کلاں لاہور شریف کو اس مولا کریم نے ولایت پہنچایا اور عزت دے کے ایڈیٹر بنایا۔ جس کے نام سے آج یہ گورے ایسے دہشت زدہ ہو کے کانپتے ہیں جیسے کبھی انگریز ڈپٹی کلکٹر کے سامنے بڑے بڑے رائے بہادروں کی دھوتی گیلی ہوتی تھی۔ لیکن بڑی خرابی یہ ہے کہ اس لحم خنزیر کھانے والی قوم میں کہ یہ بے مروت ہوتے ہیں۔ اگر معاملہ قانون کا اور فرض کا ہو۔ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ ایڈیٹر ہو یا لندن کا لارڈ میئر' یہ کسی کی دخل اندازی برداشت نہیں کرتے۔ دخل اندازی کرتا جو کوئی نہیں۔ اپنا پیارا پاکستان ہوتا تو ہم ایڈیٹر کی حیثیت سے کسی وزیر کے مشیر کے سیکریٹری کے پتر کو فون کر دیتے تو اب تک بندہ گھر پہنچ چکا ہوتا اور اسے پکڑنے والا پکڑا گیا ہوتا۔" انہوں نے ایک آہ بھری "اِدھر تو نوٹ بھی نہیں چلتے میرے پاکستانی بھائی' فون کیا تو میرے پیچھے پڑ جائیں گے۔ ادھر پہنچ جائے گا کوئی منکر نکیر سوال کرنے کہ تم کو کس نے بتایا اور تم نے کیوں پوچھا۔"

"پھر کیا کریں ہم۔ ایسے ہی ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہیں۔ مجھے تو بڑی پریشانی ہو رہی ہے۔"

طوطی صاحب نے فوراً اپنی میز کی دراز میں سے ایک ڈبیا برآمد کی "یہ لو' خمیرہ ابریشم حکیم ارشد والا۔ خاص چیز ہے اور گجرات کے ایک حکیم ہیں ادھر۔ بڑی محبت سے اور محنت سے تیار کرتے ہیں میرے لیے۔ دل کو بڑا قرار ملتا ہے ایک ہی خوراک میں۔ میں تو ان کفار کی ولایتی دواؤں سے اتنا ہی دور رہتا ہوں جتنا کہ ہر سچے پاکستانی کو رہنا چاہیے۔ اللہ جانتا ہے بس کہ کیا ڈالتے ہیں یہ ان میں۔ مجھے حکیم صاحب نے خود بتایا حلفیہ کہ نجس جانوروں کے نظامِ اخراج سے....."

شہزادہ سلیم قطعی بدلے ہوئے حلیے میں نمودار ہوئے۔ اس وقت وہ جینز' جوگرز اور جیکٹ میں انسان کا بچہ نظر آرہا تھا اور خاصا اسمارٹ بھی لگ رہا تھا۔ اس کے لمبے لمبے بال شانوں سے ذرا اوپر جھول رہے تھے اور اس نے بڑے بڑے شیشوں والی دھوپ کی عینک لگا رکھی تھی۔

"تم نے مجھے بلایا ڈیڈ!" اس نے چیونگم چباتے ہوئے...

"ڈیڈ دا پتر!" طوطی صاحب آگ بگولا ہو کے اٹھے... ملعون کافروں والا حلیہ۔ لباس بدلتے ہی لہجہ بدل گیا... گھر۔"

نوردین دوڑ کے میز کی دوسری طرف نہ پہنچتا تو وا... پاؤں کی جوتی ہاتھ میں پکڑ چکے تھے اس کی سرِعام گوشمالی...

"اباجی غلطی ہوگئی۔ آپ میری بات تو سنیں"... غوطہ مار کے خود کو فلائنگ جوتی کی ضربِ مومن سے بچایا... میں جا رہا تھا کسی سے ملنے۔ ایک ضروری کام سے۔ مجبور...

طوطی صاحب پھر ایڈیٹر کی کرسی پر بیٹھ گئے... تھی.... بول؟"

"اباجی' اس نے کہا تھا کہ کارٹون بن کے مت آ... شرما کے بولا۔

"کیا مطلب! مجھے تو اس وقت کارٹون لگ رہا ہے تو..."

"جب میں شلوار قمیص شیروانی اور جناح کیپ پہن... ہوں تو سوسن کہتی ہے کہ....."

"اور تو ہمارے قومی لباس کی توہین برداشت کرتا ہے؟"... مشتعل ہو کے اٹھے "تیری تو....."

نوردین نے فوراً ہمارے پیچھے پناہ لی "اباجی' آپ... کہ سوسن سے وہ سب معلوم ہو سکتا ہے جو پولیس چھپا رہی ہے..."

اباجی سوچ میں پڑ گئے "یہ کس کیس کا حوالہ ہے؟"

چیف رپورٹر کا حوصلہ بڑھ گیا۔ اس نے ایڈیٹر صاحب... میں کچھ کہا۔ اس کا چہرہ حیا سے یوں لال ہوگیا تھا جیسے... زادیوں کا اپنے منگیتر کے ذکر پر ہو جاتا ہے۔ حاجی صاحب... سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کی گدی پر جھانپڑ رسید کیا... ہے۔ مگر یہ سوسن..... ایک منٹ ٹھہر..... میں ڈائری میں... پہلے تو اس کا نام نہیں تھا۔"

پتر نوردین نے اپنی خودی کو بلند رکھا "یہ عارضی... ایڈہاک گرل فرینڈ ہے۔"

اباجی نے ڈائری ملاحظہ فرما کے کہا "ایڈہاک؟ جب... کہہ دیا کہ ایک وقت میں چار سے زیادہ نہیں تو پھر... نام کاٹوں؟"

نوردین نے منہ بسور کے ٹھنڈی سانس لی "اباجی۔... ہے۔ کاٹ دیں جون کا نام۔ سوسن کا لکھ دیں۔"

حاجی علم دین نے ترمیم فرما کے ڈائری جیب میں رکھی... بہت ہوگئی پتر۔ اب میں تیری ایک شادی کر رہا ہوں فی الحال...

"نہیں اباجی۔ میں نے نہیں کرنی شادی۔"

"چپ حرامی! تیرا تو باپ بھی کرے گا" طوطی صاحب... گرج کے کہا۔

"ہاں' آپ بے شک کرلیں۔"

"ہاں آپ بے شک کرالیں۔ ویسے بھی اب کیا بچا ہے سر میں..."

"اچھا بکواس مت کر۔ ادھر جا رہا ہے تو اپنے لال خان... سے بھی کہنا کہ اباجی نے یاد کیا ہے۔ جمعے... جراح یا لکوٹی... مرتے جا رہے ہیں۔ ایسے تو لڑکا ہو جائے گا عاقل و بالغ... نہیں آئے گا اور حکیم صاحب کا اپنا ہاتھ بھی کانپنے لگے گا... اور نظر کمزور ہو جائے گی۔ تیری بھی ٹنڈ کرانی ہے پتر... بے لگام ہو رہا ہے تو۔"

"میں نے نہیں کرانی اباجی۔" نوردین نے احتجاج کیا۔

"چپ حرامی! تیرا تو باپ بھی کرائے گا" طوطی صاحب پھر...

طوطی صاحب نے اس کو فرار کا موقع نہیں دیا "اوئے بدبختا۔... ہوتا ہے سر کے اندر ہوتا ہے۔ سر کے اوپر کچھ نہیں ہوتا۔ آئی سمجھ میں؟ یہ جو گھاس پھوس ہے نا تیرے سر پر۔ تیری یہ... ایسی تو اپنے پیارے پاکستان میں وہ رکھتے ہیں' تالی بجانے والے۔ مبارک بادیاں گانے والے..... میں جو ایڈیٹر ہوں نا..... تو ... کی وجہ ہے جو سر کے اندر ہے۔ آئی بات سمجھ میں۔"

"آئی..... آئی اباجی' میرا کان اکھڑ جائے گا۔"

اباجی نے اس کان کو چھوڑ کے دوسرا پکڑ لیا "دیکھ آج کاؤنٹی جیل میں کسی نے ایک نیگرو کو زہر دینے کی کوشش کی۔ کوئی ملاقاتی تھا۔ اس کا نام معلوم کرنا ہے۔ ہو سکے تو حلیہ بھی۔ قیدی ہوگا اسپتال میں۔ اس پر دوہرے قتل کا جرم ثابت ہوا تھا۔"

"کان چھوڑیں اور قیدی کا نام بتائیں اباجی۔"

"قیدی کا نام تھا جارج۔ ذرا پتا کرو کس حال میں ہے۔ جیئے گا کہ مر جائے گا۔ اور زندہ ہے تو معلوم کر کہ زہر کیا تھا' کیسے دیا گیا..... خبردار اس قیدی سے مت پوچھنا اور پولیس سے بھی نہیں ورنہ تجھے پکڑ لیں گے کہ تو ہی مجرم ہے۔ شکل سے مشکوک نظر آتا ہے تو..... میری طرح..... اب دفع ہو جا اور جیسے ہی کوئی کام کی بات معلوم ہو مجھے فون کر کے بتا۔"

"اباجی!" چیف رپورٹر نے دونوں کان ایک ساتھ ہلا کر دیکھے "اباجی..... وہ نرس ہے' جس کا نام کاٹ دیا تھا آپ نے..... جون۔ مجھے اسپتال میں وہی لے جا سکتی تھی۔ اس کے مراسم ہیں ڈاکٹروں سے۔"

طوطی صاحب نے میری طرف شکایتی نظروں سے دیکھا "ملاحظہ کرلو آپ بھی میرے پاکستانی بھائی' کہتا ہے مراسم۔ اوئے یاری کیوں نہیں کہتا بے غیرتا۔ ناجائز تعلقات کیوں نہیں کہتا۔ مراسم ہوتے ہیں شرفا کے درمیان۔ یہی خرابی ہے اس مغربی تہذیب کی۔ ہمارے آبا و اجداد کی اخلاقی قدروں کا جلوس نکال دیا ہے اس نئی پود نے۔"

میں نے کہا "طوطی صاحب! مشرق سے مغرب کا سفر آپ نے کیا تھا' اپنی مرضی سے۔ اپنے لہور شریف کے سانده کلاں کی تہذیب سے منہ موڑ کے آپ آخر لندن کیوں آگئے تھے۔"

نوردین بہت خوش ہوا "بالکل ٹھیک فرمایا آپ نے۔ اباجی مکے مدینے بھی تو جا سکتے تھے۔"

محسن نے کہا "اب نئی پود کو الزام دینے سے کیا فائدہ۔ انہوں نے تو آنکھ ہی اس معاشرے میں کھولی جہاں بقول آپ کے..... بے حیائی اور بے غیرتی کے سوا کچھ نہیں ہے۔"

طوطی صاحب جلال میں آگئے "اجی آپ کیا سمجھتے ہو کہ ہم یہاں اس معاشرے میں اپنی خواہشاتِ نفسانی سے مغلوب ہو کے آئے تھے؟ ایسا ہوتا تو ایک بھی عقدِ شرعی نہ کرتے۔ ہر روز ایک میم پکڑ لاتے بازار سے۔ ایک ڈھونڈو ہزار ملتی ہیں۔ اپنے پیارے پاکستان سے بڑے بڑے گھروں کے بگڑے رئیس زادے آتے ہیں جی حصولِ علم کے لیے' اور جاتے ہیں تو ہاتھ میں سند چاہے نہ ہو بغل میں فرنگی میم ضرور ہوتی ہے۔ ہم تو آئے تھے ایک عظیم مقصد لے کر۔ اس کافر اور گمراہ معاشرے کی اصلاح کے لیے۔ بے حیائی اور کفر کے خلاف جہاد ایک مقدس فریضہ ہے میرے پاکستانی بھائی۔ کیا تاریخ نہیں پڑھی آپ نے۔ کیسے کیسے بزرگانِ دین اللہ کے حکم سے ہندوستان پہنچے جو خالص کفرستان تھا اور وہاں اسلام کا پرچم بلند کیا۔ اور اپنے محمود غزنوی جیسے بادشاہوں نے سترہ حملے کیے' کفار کے بت پاش پاش کرنے کے لیے۔ تو ایسے ہی ہم آئے تھے۔"

نوردین نے متاثر ہو کے سوال کیا "آپ بادشاہ تھے یا بزرگانِ دین؟"

حاجی صاحب چراغ پا ہو کے اٹھے "اوئے حرامی! تو ابھی تک کھڑا ہے ادھر سے دفع نہیں ہوا۔"

نوردین دروازے کی طرف لپکا مگر اس کے والد ماجد کو فلائنگ جوتی سے نشانہ لینے کی بڑی مشق تھی۔ اس بار بھی ان کا نشانہ خطا نہیں ہوا اور جوتی (اصلی پشاوری چپل ٹائر سول والی) پتر نوردین کی کمر کے زیریں حصے پر اس جگہ لگی جہاں سے اس کی ٹانگیں شروع ہوتی تھیں۔ عادتاً اس نے کہا "ہائے اباجی!" اور پھر جوتی اٹھا کے فرار ہوگیا۔ اباجی شور مچاتے رہ گئے۔ پھر وہ ایک پاؤں میں چپل پہن کے لنگڑاتے ہوئے زنان خانے میں تشریف لے گئے اور جب واپس آئے تو فائر کی جانے والی چپل پھر ان کے پیر میں تھی۔ انہوں نے خاصی خوش دلی سے کہا "خبیث باز نہیں آتا۔ روز جوتی اٹھا کے دوڑ جاتا ہے۔"

"دوڑ کے کہاں جاتا ہے؟" میں نے کہا۔

"اپنی ماں کے پاس اور کہاں..... اُدھر جا کے جھوٹ بکواس کرتا ہے کہ اباجی نے اس جوتی سے مار مار کے چمڑی اتار دی۔ لو جی پھر ماں کا نیپ چل پڑتا ہے کہ زمانہ بدل گیا تم نہیں بدلے۔ کوئی اس طرح ذلیل کرتا ہے جوان اولاد کو۔ آپ ہی بتاؤ میرے بھائی' زمانہ بدل گیا ہے تو کیا بیٹا ہمارا باپ ہوگیا ہے۔ یہ جو عزت آج ہمیں ملی ہے یہ ماں باپ کی جوتیاں کھا کے اور اٹھا کے ملی ہے۔ آخر والدین کے بھی حقوق ہیں۔ میرے اباجی' اللہ ان کو کروٹ کروٹ

جنت نصیب کرے.... اس گھروالی کے سامنے چھترول فرماتے تھے ہماری۔ ہمارا فرض تھا کہ اف نہ کریں۔"

حقوق و فرائض کی اس بحث سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ اپنے معاملات کی باگ ڈور طوطی صاحب کے ہاتھوں میں دینے کے بعد ہم بالکل بے کار اور بیزار ہو گئے ہیں۔ بلاشبہ ان کی پناہ میں ہم بہت محفوظ تھے اور ہمیں کوئی کام خود کر کے کوئی خطرہ مول لینے کی ضرورت بھی نہیں تھی مگر یہ پُر تحفظ بے عملی ہمارے مزاج اور ہماری عادت کے خلاف تھی۔

طوطی صاحب کا کام کرنے کا اپنا ہی انداز تھا۔ وہ بیک وقت صحافتی مسائل سے نمٹتے تھے۔ زوجگان کے درمیان امن اور عدل رکھنے کے لیے خانگی معاملات کو زور بازوئے مسلم دکھا کے حل فرماتے تھے اور ان کی جملہ پیداوار کے اکلوتے والد کی حیثیت سے ہر عمر اور جنس کے بچوں کے اخلاق و کردار کو لندن میں رہ کے سانده کلاں کی تہذیبی روایات کا قابلِ رشک نمونہ بنانے کی سعی ناکام میں بھی لگے رہتے تھے۔ لندن کے ہر پاکستانی بھائی کو تہذیبِ مغرب کے تباہ کن اثرات سے بچانا اور انہیں اپنے جہاد میں شامل ہونے کے لیے آمادہ کرنا، جس کے نتیجے میں بالآخر انگلستان میں مسلم اکثریت کا پاکستان قائم ہونا تھا۔ سب سے مشکل کام تھا مگر وہ اپنے ہفت روزہ "طوطی" کے ذریعے تبلیغ کا یہ فریضہ بڑے جوش و خروش سے سرانجام دے رہے تھے۔ اسلامی اور پاکستانی جذبات سے جھلکتی شاعری بھی ایک مصروفیت تھی اور اس بامقصد شاعری کے نمونے فریم کرا کے نمایاں مقامات پر آویزاں کرنے کے لیے مفت تقسیم کرنا تاکہ ان کے کلام کی تاثیر زیادہ سے زیادہ پاکستانی بھائیوں کے دلوں پر اثر کرے۔ پاکستان کے اخبارات سے ہفتے بھر کی چیدہ چیدہ خبریں نکالنا۔ اداریہ تحریر کرتے ہوئے جذبات کے دریا کو کوزے میں بند کرنا۔ مقامی طور پر انگریز قوم کی ناک کاٹنے والی یا بھارت کی ایسی تیسی کرنے والی خبروں کا حصول۔ پاکستان دشمن عناصر کے دانت کھٹے کرنا اور مقدمے بازی۔ یہ سب کام طوطی صاحب اس عمر میں بھی اسی انہماک سے کر رہے تھے جیسے جوانی میں کرتے تھے۔ بقراط ان کا ہم عصر ساتھی اور دستِ راست تھا۔ چیف رپورٹر ان کا ڈرامے باز عاشقِ جانباز اور حد درجہ سعادت مند ولی عہد تھا۔ رپورٹر ہر علاقے میں اعزازی خدمات سرانجام دیتے تھے اور وہ پاکستانی بھائی تھے جو حاجی علم دین طوطی کے ہمنوا تھے۔ اندر کی ہر خبر جس سے انگریز قوم کے منہ پر جوتا مارا جاسکے یا بھارت کے رہنے والوں کو نیچا دکھایا جاسکے، انہیں ثبوت اور تصاویر کے ساتھ خود ہی مل جاتی تھیں۔ اسی طرح پاکستان کے بارے میں کوئی خبر یا تبصرہ کسی بھی ریڈیو، ٹی وی اسٹیشن سے نشر ہو، اس کی تفصیل بھی کوئی انہیں فون پر بتا رہا تھا۔ "حاجی صاحب! آپ نے سنا، آج بی بی سی نے کیا بکواس کی؟" یا "وائس آف امریکا نے کیا بھونکا" اگلے شمارے میں ان دنوں کا خانہ خراب۔ طوطی کا اداریہ یا ہما کا خیز قطعہ۔

جب حاجی علم دین طوطی اپنے معمولات میں مگن ہو گئے تو میرے لیے اور محسن کے لیے جارج کے بارے میں کرنے کے سوا کوئی کام نہ رہا۔ ہم نے کچھ دیر "طوطی" کے پرانے شمارے ملاحظہ کیے اور وہ اعتراض تصاویر دیکھیں جو ناقابلِ اشاعت ہونے کی صاحب نے سنبھال کے ایک طرف رکھ دی تھیں۔

اللہ بڑا مسبب الاسباب ہے۔ اس نے مجھے اور ہی وقت میں الگ الگ راستوں سے لندن پہنچادیا تھا۔ ہماری پوزیشن ایک جیسی تھی۔ ہم پر برطانیہ میں داخلے برقرار تھی۔ ہمارے عازمِ لندن ہونے سے قبل ہی ہمار علم ہمارے دشمنوں کو ہو گیا تھا اور ہر دشمن نے حسب حوصلے پست کرنے کے لیے مخالفانہ کارروائی سے مشکلات بھی پیدا کی تھیں مگر ہم سب رکاوٹوں کو عبور سازش کرنے والوں سے بچتے بچاتے لندن میں قدم تھے لیکن ہماری تقدیر بھی کم ستم ظریف نہ تھی۔ ہمارے دشمن نمبر ایک چوہدری دلاور نے لندن پہنچ کے کرلی تھی۔ بس اسے ائرپورٹ پر ہمارے استقبال کی سعادت نہ ہوسکی۔ ہم سے ملاقات کا اشتیاق اسے یقیناً ہوگا ذرائع استعمال کرتے ہوئے وہ بھی ہمیں تلاش کر رہا ہو چہرے کے ساتھ وہ بھی نہیں آیا ہوگا اور خوف اسے جانے کب، کہاں، کون مل جائے جو اسے پہچان لے۔

مجھ سے ملاقات کا اتنا ہی شدت سے الزبتھ کو ہوگا۔ میں نے اسے چیلنج کیا تھا اور اس نے بھی کھل کے کہ پرانی محبت گئی چولہے میں۔ اب تو نفرت اور انتقام دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔ اس نے ایک کی شکست سے دوچار، محبت کے نام پر ہوس کے شکار میں پھنس جانے والی عورت کے زہریلے لہجے میں دل فشانی کی تھی اور اپنی طرف سے مجھ پر واضح کردیا تھا تذلیل کا بدلہ لینے کے لیے مجھے اب اتنا ذلیل کرے گی کہ کے لفظ کا مطلب بھول جاؤں گا۔ اب اس بے وقوف ناقص العقل عورت بن جانے والی لیڈی الزبتھ گورڈن بتایا سمجھایا اور ثابت کیا جاسکتا ہے کہ سکندر بخت نے محبت صرف ایک بار کی تھی اور اس کے سوا کسی سے نہیں یہ الزام قبول کرنے سے مجھے انکار نہیں تھا کہ میں نے سابق انگریز حاکموں کے مظالم کا بدلہ ان کی اولاد لیے مجاہدانہ جذبے سے کام لیا تھا اور زیادہ سے زیادہ بنا کے چھوڑ دینا ہمارا محبوب مشغلہ تھا۔ محبت کا دھوکا لڑکیاں تو کچھ دن رو دھو کے صبر کرلیتی تھیں اور انہیں بھی مل جاتا تھا مگر زیادہ نقصان ہمیں ان رقیبان رو سیاہ تھا جن کی گرل فرینڈز پر ہم نے سازش کر کے اس طرح حاصل کرلیا تھا جیسے انگریزوں نے ہندوستان پر تجارت قبضہ کیا تھا۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ہمارا ناپختہ شعور تھا

جذبات کا منفی ردِ عمل تھا۔ غلامی کے زیر... سال کی بیکے ہوئے جذبات کا حصہ تھا۔ اسے بھلا ہم کیسے دھو سکتے تھے۔ ذلت کا داغ تو تاریخ کا حصہ تھا۔ وہ بھی اگلی نسل کی جوان لڑکیوں کے جذبات سے کھیل کر جو شاید اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئی تھیں جب انگریز وہ ملک چھوڑنے پر مجبور ہوگئے تھے۔

الزبتھ بہرحال ان لڑکیوں میں شامل نہیں تھی اور اس کے لیے میرے دل میں محبت کے جذبات ایسے ہی تھے جیسے محبت کے جذبات ہوتے ہیں۔ ہر جگہ، ہر زمانے میں، ہر دور میں۔ ہر مرد جب کسی عورت کو چاہتا ہے تو پھر اس کی چاہت میں اور سیکڑوں سال پہلے کے یا ہزاروں میل دور کے کسی مرد کے جذبات کی نوعیت میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ مگر یہ بات الزبتھ کو آج نہیں سمجھائی جاسکتی تھی۔ ایک چور جب سو گھروں میں چوری کے جرم کا ارتکاب اور اعتراف کرچکا ہو تو کسی ایک گھر کے بارے میں کس منہ سے کہے گا کہ وہاں وہ نیک نیتی سے گیا تھا۔

اس بات نے الزبتھ کو مزید مشتعل کیا تھا کہ میں نے اس سے زیادہ حسین لڑکی تلاش کرلی تھی جو قابلیت میں بھی اس سے بدرجہا بہتر تھی۔ قابلیت والی بات پر شاید وہ چراغ پا نہ ہوتی اور حسد سے کباب نہ ہوتی مگر یہ کہ وہ زیادہ حسین ہے، جب عام لڑکی بڑی مشکل سے مانتی ہے کہ دنیا میں اس سے بڑھ کر بھی حسین کوئی ہوسکتا ہے تو الزبتھ پھر الزبتھ تھی۔ خالص ولایتی نسل کی سفید چمڑی والی عالی نسب لڑکی جسے ہر روز ایک سو ایک پرستار یقین دلاتے ہوں گے کہ مس یونیورس وغیرہ تو محض ایک کمرشل ریکٹ ہے ورنہ اس کرۂ ارض پر کوہ قاف سمیت اس جیسی پری وش مہ جبین زہرہ جمال نہ تھی نہ ہے اور نہ ہوگی۔ سب چاہت کے چیمپئن یہی تکنیک استعمال کرتے آئے ہیں اور میں نے بھی کی تھی۔ آج میرا یہ کہنا کہ رابعہ اس سے زیادہ حسین ہے اس کے لیے کسی گالی سے کم نہ تھا۔ رابعہ کا مجھ سے ملنا زندگی کے تسلسل میں معمول کے حالات اور واقعات کا کرشمہ تھا۔ نہ اس میں میری خواہش کو دخل تھا۔ نہ کوشش کو اور نہ سازش کو۔ ایسا ہونا تھا سو ہوا مگر الزبتھ یہ ماننے پر تیار نہ تھی۔ خیر بی بی، تمہارے شیکسپیئر سے بڑا ہمارا غالب تھا جس نے یہ فرمایا کہ

یارب نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

الزبتھ بھی نوشتۂ تقدیر کو قبول کرچکی تھی اور مجھ سے محبت تو کیا نفرت کو بھی بھول چکی تھی کہ میں نے بقلم خود پنگا لیا اور اسے فون کر کے اپنی تشریف آوری کے پروگرام سے مطلع کیا۔ میرا خیال تھا کہ بس اب وہ آغازِ شباب کی جذباتی نادانی کا دور تمام ہوا۔ نہ ہم برباد ہوئے نہ تم۔ خانہ آبادی ہوگئی۔ دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو۔ پرانے تعلق کی بنا پر مل تو سکتے ہیں دوستوں کی طرح۔ مگر اس نے سمجھا کہ میں اس کی تذلیل کے زخموں پر نمک پاشی کر رہا ہوں یا پھر اس کا جذباتی استحصال کرنے کے موڈ میں ہوں۔ برسوں کا سویا ہوا آتش فشاں جیسے کسی بہانے کا منتظر تھا اور کنکری مارتے ہی پھٹ گیا۔ اس نے خود کچھ نہیں کیا۔ میرے جانی دشمنوں کو خبردار کردیا۔

جانی دشمنوں میں سرِفہرست اس کا شوہرِ نامدار تھا جس کے دل میں میرے خلاف رقابت کے جذبات کم شدید نہ تھے۔ وہ اپنی کامیابی اور فتح پر نازاں، خوش اور مطمئن تھا کہ سالا کالا بڑا اتراتا تھا۔ جوتے مار کے نکالا گیا اور الزبتھ جیسی چیز بالآخر اسی کو ملی جو اس کا سب سے زیادہ مستحق تھا۔ میری آمد کی اطلاع نے اس کے غرور اور اطمینان کے جذبات کی بنیادیں ہلادیں اور اپنے پورے انتقامی جذبات اور اختیارات کی طاقت کے ساتھ اس نے لندن میں میرا وہ حشر کرنے کا فیصلہ کیا جس سے تمام کالے اور کم نسل عاشقوں کو عبرت ہو جو الزبتھ جیسی لڑکیوں پر نظر رکھتے ہیں۔ اس نے میرے تمام رقیبوں کو بھی خبر کردی۔ ان میں سے ایک کراچی میں دستیاب تھا، باقی لندن میں کارِ ثواب سمجھ کے اجتماعی طور پر اور انفرادی طور پر گن گن کے پرانے بدلے لیتے۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

ہم تو سمجھے تھے کہ غالب کے اُڑیں گے پُرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

وہ سب میرے دشمن جاں دلوں میں خوں آشام جذبات، زباں پر خالص ولایتی گالیاں اور ہاتھوں میں راکٹ توپ وغیرہ لیے پھر رہے ہوں گے کہ کہیں نظر آئے سکندر بخت تو اسے بدبخت و مرحوم کریں۔ لندن کے سارے پولیس والے ان عالی نسب عالی مقام مگر کمینے لوگوں کی پشت پناہی کے لیے قانون کا ڈنڈا لیے موجود تھے۔ سب سکندر بخت کو جانتے اور پہچانتے تھے۔ سب کو معلوم تھا کہ وہ کب آئے گا، کدھر سے آئے گا اور کہاں جائے گا۔ کیا کرے گا اور کیسے کرے گا؟

اب وہ ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہوں گے اور خود بھی حیران ہوں گے کہ کیا ہوا؟ سکندر بخت کیوں نہیں آیا؟ آتا تو پکڑا جاتا۔ ہر جگہ لوگ الرٹ تھے۔ WHAT HAPPENED? اور مسٹر گورڈن نے کفِ افسوس ملتے ہوئے کہا ہوگا کہ وہ سلپ کرگیا۔ وہ ڈیم فول.... کراچی میں ہمارے قونصیٹ کا آفس۔ انہوں نے اسے نکل جانے کا موقع دیا۔ وہ پہنچا تھا داڑھی لگا کے اور نام بدل کے۔ ایک برقع پوش عورت کے ساتھ۔ اسے وہیں پکڑ لینا چاہیے تھا۔ اس نے جرح کر کے غلطی کی اور پھر پاسپورٹ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ دوسری غلطی.... وہ باسٹرڈ بھاگ گیا۔ مگر مجھے معلوم ہوا کہ وہ آگیا ہے۔ آگیا ہے؟ کیسے؟ کس وقت.... کدھر سے؟ اور آیا ہے تو پھر کہاں ہے۔ کسی نے دیکھا اسے۔ کیا حلیہ ہے اس کا؟ پولیس کیا کر رہی ہے؟ وہ لندن میں ہے اور ہم بے خبر ہیں۔ او مائی لارڈ! مجھے نظر آجائے تو میں اسے گولی ماردوں وہیں۔ اسکاٹ لینڈ یارڈ کو اس کے پیچھے لگادو.... دوڑو، پکڑو.... مارو۔

یہ سب دل باغ باغ کرنے والے خیالات تھے کہ میں یہاں

محفوظ بیٹھا ہوں اور چیلنج دینے کے باوجود ابھی تک دشمن اور رقیب جھک مارتے پھر رہے ہیں۔ دوبارہ لیڈی الزبتھ کو فون کرنا خطرناک ثابت ہوسکتا تھا۔ اس کے دولت مند' عقل مند اور ہنرمند شوہر نے ہر فون پر آبزرویشن لگوا دی ہوگی۔ الزبتھ ڈارلنگ' وہ پھر فون کرے تو اسے دل بستگی کی باتوں میں لگاتا۔ یہ ظاہر کرتا جیسے تم نادم ہو اپنے رویے پر اور محبت کے پرانے جذبات پھر عود کر آئے ہیں اچانک۔ اسے مدعو کرنا کہیں۔ ہم اٹھالیں گے اسے۔ اور کہاں کہاں فون کرسکتا ہے وہ۔ اس کی سوئٹ ہارٹ اور کون تھی؟ سب کے نام بتادو۔ چلو درجن بھر نام تمہیں یاد نہیں' دو چار لکھوا دو۔

محسن نے میری پسلی میں کہنی ماری "تیرا دماغ چل گیا ہے۔ کب سے دیکھ رہا ہوں میں۔ اکیلا بیٹھا مسکرا رہا ہے۔"

میں نے پسلی کو دبا کے کہا "کیا یہ ایسا جرم ہے جس کی پاداش میں میری پسلیاں توڑی جائیں۔ پسلیوں کے اندر دل ہوتا ہے۔ وہ بھی ٹوٹ سکتا ہے شیروانی صاحب۔"

"وہ اتنی بار ٹوٹا ہے اور اتنی بار جوڑا گیا ہے کہ اب کوئی مسئلہ نہیں۔ چل کہیں باہر چلتے ہیں۔"

"طوطی صاحب کہاں ہیں؟" میں نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔

"اندر کسی زوجہ کی گوشمالی فرمانے گئے ہیں۔ بے حیا بہ آوازِ بلند ایک بھارتی گانا گا رہی تھی۔ وہ بھی عشقیہ۔ انہیں دیر لگے گی۔" محسن نے بتایا۔

"ہاں از روئے انصاف گوشمالی وہ چاروں کی فرمائیں گے۔ لیکن یار وہ اپنے چیف رپورٹر کا فون بھی تو آنے والا ہے۔"

"میں تو تھک گیا ہوں جمائیاں لے لے کر۔ یہاں کھیاں بھی تو نہیں ہیں مارنے کے لیے۔" محسن بولا۔

"یہ چیف رپورٹر کہاں جا کے مرگیا۔" میں نے گھڑی دیکھی "دوپہر ہونے کو ہے۔ ہمارا آدھا دن ضائع ہوگیا۔"

"مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ میں خود ضائع ہو رہا ہوں۔ چل یار اس طوطی کے پنجرے سے نکلتے ہیں... باہر..."

میں نے کہا "باہر سے فون کریں گے الزبتھ کو یا اس کے شوہر کو۔"

محسن بہت خوش ہوا "ایمان سے میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔ کل سے ہمارے قاتل خنجر بکف پھر رہے ہیں۔ منتظر ہیں کہ ہمارا سراغ ملے۔ خبر تو پہنچ گئی ہوگی کہ ہم لندن آگئے۔ وہ ہم سے زیادہ مایوس اور پریشان ہوں گے۔ خصوصاً اپنے چوہدری ولاور صاحب' ہیں جی۔ ان کو ہر لحظہ یہ خطرہ لاحق ہوگا کہ......"

اس کی بات ٹیلی فون کی گھنٹی کے باعث ادھوری رہ گئی۔ میرا خیال تھا کہ ریسیور بقراط اٹھائے گا جو اس وقت انتظامیہ کا واحد حاضر رکن تھا مگر اس کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی۔ وہ اسی طرح گھٹنے پر جھکا ہوا کتابت میں مصروف رہا۔

میں نے کہا "بقراط صاحب۔ فون کی گھنٹی بج رہی ہے۔"

"ہاں۔" اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا مگر اس کے انہماک میں فرق نہیں آیا۔ اس کیفیت میں اس کو بتایا جاتا کہ بقراط تمہارے سامنے آدم خور شیر کھڑا دھاڑ رہا ہے تو وہ یہی جواب ... اور پھر مطلع کیا جاتا کہ شیر آپ کو کھانا چاہتا ہے تو وہ کہتا اچھا ... اسی پوز میں کھالیا جاتا۔ شاید شیر کے پیٹ میں پہنچ کے بھی وہ ... استغراق کے عالم میں کتابت کرتا رہتا۔

مجبوراً میں نے ریسیور اٹھایا اور کہا "طوطی کے نقار خانے ... آداب عرض۔"

"تم کون ہو؟" یہ چیف رپورٹر کی آواز تھی۔

"وہی جس کی بالائے بام موجودگی نے سلیم کو انارکلی سے ... ملنے دیا۔"

"اچھا اچھا۔ آپ ہو.... اباجی کہاں ہیں؟"

میں نے رقت انگیز لہجے میں کہا "انہیں تو فوت ہوئے ... ہوگیا۔"

"اوجی میں آپ کے نہیں' اپنے اباجی کی بات کر رہا تھا۔ ہماری ایسی قسمت کہاں؟" اس نے ٹھنڈی آہ بھر کے کہا۔

"وہ زنان خانے میں کچھ مصروف ہیں۔ تم مجھے بتاؤ کہ اس ... کا کیا بنا جس کے لیے تم کو گرل فرینڈ نمبر پانچ کی اسامی ایڈہاک بنیادوں پر پُر کرنے کی خصوصی اجازت ملی تھی۔ کیا نام تھا اس ... کا.... جون....!"

"جون میری بغل میں ہے" اس نے بڑی مسرت سے ... "بلکہ سچ تو یہ ہے جی کہ میں اس کی بغلِ عظیم میں ہوں۔ بغلیں جھانکنا کسے کہتے ہیں۔"

"اسی کو جو تم کر رہے ہو.... لیکن تم کو اسپتال بھیجا گیا تھا اور تم ابھی تک بغلیں جھانک رہے ہو؟"

"میں اسپتال سے ہی بول رہا ہوں جی۔ یہ کام میرے بس کا نہیں۔ پولیس والے مجھے گھاس نہیں ڈالتے۔ اتنا جون نے معلوم کرلیا ہے کہ وہ نیگرو مرا نہیں ہے۔ اسے الگ کمرے میں رکھا ... ہے جہاں پولیس کا سخت پہرا ہے۔ اباجی سے کہنا خود آئیں اور اپنے ساتھ وکیل کو بھی لائیں ورنہ کچھ نہیں پتا چلے گا۔ اسپتال والے کہتے ہیں پولیس سے پوچھو اور پولیس والے کہتے ہیں کہ ... کیوں پوچھ رہے ہو.... آہ...."

"یہ کیا ہوا؟ چیخ کیوں ماری تھی تم نے؟"

"وہ.... پرائیویٹ بات ہے۔ معمولی سا رومانٹک حادثہ ... آیا تھا۔"

"کون سی بغل میں.... میرا مطلب ہے کہاں؟"

"کاؤنٹی جیل کے اسپتال میں۔ ہوسکتا ہے کسی بیڈ پر میں ... لیٹا ہوا نظر آجاؤں۔ آہ.... ابھی تو کال آفس میں ہوں۔ ہائے..."

اس آخری دلخراش صدا کے ساتھ ہی فون لائن منقطع ہوگئی۔

"چیف رپورٹر پر تشدد ہو رہا ہے" میں نے تشویش سے کہا۔

"کیا اسے پکڑلیا ہے پولیس نے؟"

"نہیں۔ وہ اپنی نرس محبوبہ جون کی آغوشِ محبت میں تڑپ ..."

اور میں تصور کرسکتا ہوں کہ بلی نے چوہے کو دبوچ لیا ہے وہ یقیناً کوئی بارہ من کی دھوبن یا ڈریکولا ٹائپ عورت ہے۔"

"جاسج کی کوئی خبر نہیں؟"

"جاسج زندہ ہے مگر پولیس کے سخت پہرے میں۔"

"یعنی محفوظ بھی ہے" محسن نے اطمینان کا سانس لیا "یہاں پولیس کی تحویل میں کسی کی ہلاکت نہیں ہوسکتی۔"

"کوئی خودکشی نہیں کرسکتا" میں نے تصحیح کی "پولیس بڑی بے مروت ہے یہاں کی۔ ہماری پولیس کی طرح تعاون نہیں کرتی کہ قیدی کو خودکشی کی سہولت بھی فراہم کرے۔ شلوار کا ازاربند ہی استعمال کرنے دے۔"

بقراط نے سر اٹھا کے قلم کو منہ میں دبایا اور خلا میں دیکھتے ہوئے بولا "غور کرنے کے قابل نکتہ یہ ہے کہ آدمی کے وجود میں روح کہاں رہتی ہے؟ اعضائے رئیسہ میں گردے کلیجی سے زیادہ اہم ہے دل۔ تو دل کے کون سے حصے میں روح کی جگہ ہے؟ کیا روح کوئی گیس ہے؟ گیس ہے تو اس میں رنگ و بُو ہے یا یہ آکسیجن کی طرح ہے۔ پھر یہ کہ اس کی کتنی تعداد ہوتی ہے۔ وزن اور حجم کے اعتبار سے؟ آدمی کے جسم میں کتنے سوراخ ہیں؟ اور آخر روح کس سوراخ سے نکلتی ہے۔"

اس کی عالمانہ سائنسی تحقیق پر مبنی پُرتجسس سوالات کا یہ سلسلہ طوطی صاحب کے آجانے سے منقطع ہوا "اوئے بقراط۔ کام کر اپنا۔ ہم یہ سب ملک الموت سے پوچھ لیں گے جب وہ تیری روح قبض کرنے آئے گا۔"

اس نے سہلا کے کہا "اچھا" اور پھر کتابت کرنے لگا۔

میں نے طوطی صاحب کو چیف رپورٹر کی رپورٹ کا خلاصہ پیش کیا جس میں بغلیں جھانکنے کا ذکر بھی نہیں تھا اور کسی پُرتشدد رومانٹک حادثے کا بھی۔

حاجی صاحب نماز سے بھی فارغ ہو کر آئے تھے "بس تو پھر چلتے ہیں۔"

میں نے کہا "چلیے۔ کوئی وکیل ہے آپ کے ذہن میں؟"

انہوں نے تبسم فرمایا "وکیل ذہن میں نہیں' اپنے آفس میں ہوتا ہے۔ یہ ذہن ہے ایک ایڈیٹر کا۔ یہاں صرف صحافت رہتی ہے لیکن میرے پاکستانی بھائی' عجلت کار شیطان ہے۔ اور ویسے بھی یہ وقت ہے دوپہر کے طعام کا۔ عقلمند کہتے ہیں اول طعام پھر کلام۔ ہاں بھئی لاؤ کچھ دال دلیہ......"

ان کی آخری بات زنان خانے کی طرف منہ کرکے کہی گئی تھی مگر اس کے نتیجے میں مختلف سائز' قد' وزن اور حلیے کے بچوں کی ایک قطار نمودار ہوئی۔ سب سے چھوٹا بچہ تیس پاؤنڈ کا ہوگا اور سب سے بڑا سو پاؤنڈ کے لگ بھگ۔ ہر بچے کے ہاتھ میں کچھ نہ کچھ تھا۔ چمچے' گلاس' ڈونگے' پلیٹ' جگ۔ حیرت انگیز ڈسپلن کے ساتھ انہوں نے ایڈیٹر کی میز صاف کرکے ہر چیز رکھ دی اور پھر ایک ایک کرکے رخصت ہوگئے۔ یہ نظم و ضبط مسلسل مشق اور سخت تربیت کے بغیر نہیں آسکتا تھا۔

اس ٹیم کے بارہ ارکان میں طوطی صاحب کی ہر منکوحہ کو مساوی نمائندگی دی گئی تھی۔ سالن بھی چار تھے۔ معلوم ہوا کہ طوطی صاحب مینو خود منتخب فرماتے تھے اور عدل کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک شیڈول کے مطابق ہر بیوی کو مساوی مواقع فراہم کرتے تھے۔ مرغی' مچھلی' قورمہ' بریانی۔ سب باری باری پکاتی تھیں۔ زنانہ مسابقت یا رقابت کے جذبات کا پورا فائدہ طوطی صاحب کو حاصل ہوتا تھا۔ جو درحقیقت نقصان تھا کیونکہ مسلسل پُرلطف اور مرغن غذاؤں سے ان کا پیٹ کسی غبارے کی طرح پھولتا جا رہا تھا اور طے شدہ طور پر ان کے خون میں کولسٹرول اور ان کا بلڈ پریشر بھی بڑھ رہا ہوگا مگر فرنگی ڈاکٹروں کے کافرانہ طریقۂ علاج پر یقین ان کے لیے اتنا ہی محال اور ناقابلِ قبول تھا جتنا کسی خالص انگریز کے لیے گجرات کے حکیم صاحب کا تیار کردہ خمیرہ گاؤزبان' عنبری جواہر والا۔ ان کی خوش خوراکی نے بھی مجھے اور محسن کو حیران کیا۔ یہ رزق دینے والی کی فراخ دلی تھی کہ وہ دنیا میں اپنے رزق کا کوٹا برسوں پہلے ختم کردینے کے باوجود زندہ تھے اور اپنے شکم کے اسٹور میں مسلسل قورمے' بریانی زردے پلاؤ اور حلوے کی دیگ پر دیگ انڈیلتے جا رہے تھے۔

بالآخر ظہرانے کے.... جس کو ملعون گورے لنچ کہتے ہیں سارے مراحل مکمل ہوئے اور ہماری بے تابی سے زیادہ اپنے لختِ جگر نمبر ون یعنی چیف رپورٹر کی سلامتی کو مدِنظر رکھتے ہوئے حاجی صاحب نے بادلِ ناخواستہ قیلولہ منسوخ فرمایا اور اپنی وہ گاڑی نکالی جو ان کے کہنے کے مطابق پاکستانی تھی۔ یہ سبز اسلامی رنگ والی گاڑی تھی..... جس کی چھت پر انہوں نے فرمائشی سفید رنگ کرا کے کار کو بھی پاکستان کا جھنڈا بنا دیا تھا۔ کسر صرف چاند تارے کی رہ گئی تھی۔

"طوجی' یہ گاڑی اپنے پیارے پاکستان سے لانا مجھے بہت مہنگا پڑا" انہوں نے راستے میں بتایا "لیکن ان گوروں کی چھاتی پر مونگ دلتا ہوں جب اسے سڑک پر دوڑاتا ہوں۔ جہاں موقع ملتا ہے ٹریفک کے قانون کی ایسی تیسی بھی کردیتا ہوں' نظر بچا کے۔ دیکھو نا میرے پاکستانی بھائی! ان کے قانون کی ہم کیوں پابندی کریں؟ مجبوری کی بات الگ ہے۔ بڑا ناز ہے ان کو اپنی رولز رائس پر۔ میں نے ایک انگریزی اخبار کے ایڈیٹر کے سامنے ایک رولز رائس کو لات مار کے اس پر تھوک دیا اور اسے گدھا گاڑی بھی کہا تو وہ بڑا چراغ پا ہوا۔ دراصل وہ تھی شاہی محل کی گاڑی۔ کیس کرنے کی دھمکی دے رہا تھا۔ میں نے کہا کہ چلو اسے گھوڑا گاڑی سمجھ لو۔ آخر انجن میں ہارس پاور ہوتی ہے۔ ڈنکی پاور نہ سہی۔ جو مزا اس خالص پاکستانی کار کی سواری میں ہے...."

میں نے کہا "طوطی صاحب۔ یہ گاڑی..... بھی جاپانی... ہے۔"

"طوجی' ایسی بات تم کروگے تو یہ لعنتی گورے کیوں نہ بولیں

گے۔ کیسے نہیں ہے یہ پاکستانی کار۔ اس کا نام دیکھو' اس کے پرزے پاکستان میں بنے۔ باڈی اپنے پاکستانی کاریگروں نے بنائی۔ ٹائر پاکستانی جنرل کے۔ بے شک..... کمپنی جاپان کی ہے مگر جاپانی بھی ان گوروں کے دشمن ہیں تو اپنے کیا ہوئے؟ دشمن کا دشمن ہوتا ہے دوست۔ میں تو پاکستان کا پرچم لہراتا پھرتا تھا مگر بھائی جب اپنے ہی مخالف ہوں تو طوطی کیا کرے۔ خود ہمارے سفارت خانے والوں نے اعتراض کردیا" انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

باقی راستہ انہوں نے بے حیا میموں کی ٹانگوں اور ستر پوشی میں کفایت شعاری کی انتہا۔ سرِعام نظر آنے والے جذباتی بے شرمی کے افسوس ناک مظاہروں' بے ہودہ فلموں اور ان سب سے متاثر ہونے والے پاکستانی بھائیوں کی اخلاقی پستی پر تبصرہ کرتے طے کیا۔ میں نے اور محسن نے کان ان کی طرف رکھے مگر آنکھیں باہر کے زہد شکن مناظر پر رکھیں۔ بالآخر ہماری پاکستانی کار رک گئی اور ہم ایک عمارت میں داخل ہوئے جو بیک وقت رہائشی اور کاروباری مقاصد کے لیے استعمال ہورہی تھی۔ اس علاقے میں پاکستانی اکثریت میں تھے اور وہ قانون کو نچا دینے کی مکمل تربیت اپنے وطن مالوف سے لے کر آئے تھے۔ ان میں سے کچھ دن میں کام کرتے تھے۔ ان کے چاچے مامے' چترِیا سالے کے بہنوئی جو ناجائز طور سلطنتِ برطانیہ کی حدود میں داخل ہونے کا کارنامہ سرانجام دے چکے تھے' دن میں روپوش رہنے کے لیے آرام کرتے تھے۔ ان کے لیے پاکستانی برادری رات کی شفٹ کے کام تلاش کرلیتی تھی اور انہیں رہائش کی سہولت کے علاوہ تحفظ بھی حاصل رہتا تھا۔ ان کے لیے ہدایت صرف یہ تھی کہ کوئی ایسا کام مت کرو جس میں پولیس سے واسطہ پڑے اور وہ تم سے کاغذات مانگے یا شناخت پوچھے۔ کہیں کوئی واردات ہو تو پنگا مت لو۔ فوراً بھاگ جاؤ وہاں سے ورنہ تماشائی بھی بنے تو پولیس گواہ بنالے گی اور پھر وہی ہوگا جو منظورِ خدا ہوگا۔

طوطی صاحب نے ایک دروازے پر دستک دینے سے پہلے ہی ہمیں بتادیا "یہ بندہ یہاں کے قانونی معاملات کو ایسے سمجھتا ہے میرے پاکستانی بھائی جیسے اپنے وطن میں چور' ڈاکو اور سیاسی لیڈر سمجھتے ہیں۔ جیل بھی ہو آیا ہے ایک بار عملی تجربے کی خاطر۔"

بے بال و پر وکیل ایک انڈرویئر اور بنیان میں نمودار ہوا۔ بنیان پر پہلے مجھے شبہ ہوا کہ زنانہ استعمال کی چیز ہے جو اس نے جلدی میں پہن لی۔ وہ سوتے سے اٹھ کے آیا تھا مگر پھر غور کرنے پر اندازہ ہوا کہ قصور اس کی توند کا تھا۔ بنیان اس کے حجم اور حدودِ اربعہ کو مستور کرنے میں ناکام تھا۔

"اوئے بلے بلے۔ سردار جی' آج تو بڑی شان ہے توند شریف کی۔ کیا بھرا ہے اس دوزخ میں" طوطی صاحب نے ان کے پیٹ میں انگلی کو خنجر کی طرح گھونپا۔

وہ اچھلا "طوطی صاحب۔ بابا کیا کرتے ہو۔ ذرا اپنا ڈھول تو دیکھو سائیں۔"

"سردار جی' یہ اپنے دو پاکستانی بھائی ہیں۔ مصیبت زدہ"

"بابادہ۔ تم میں ان کی اور تمہاری شکل دیکھ کے ہی سمجھ گیا۔"

اس وکیل نے کہا جو کسی زاویے سے سکھ نہیں لگتا تھا' سوائے کا چھے کے۔

طوطی صاحب نے ہمیں قابلِ تعریف نظروں سے دیکھا "ناتجربہ کار اور سیانا بندہ۔ صورت دیکھ کے سمجھ گیا۔"

میں نے کہا "کیا ہم واقعی اتنے مظلوم اور دکھی نظر آتے ہیں؟"

سردار جی نے ہمیں ایک آفس میں بٹھایا "اس کے سوا اور کون آسکتا ہے یہاں؟ سارے چور' اچکے' لفنگے' اٹھائی گیرے یہاں قانون کے چکر میں آجائیں یا پکڑے جائیں ایسے ہی رہتے ہیں۔"

طوطی صاحب نے میز پر اپنی چھڑی بجا کے کہا "بکواس بند کرو ان کا معاملہ کچھ اور ہے۔ یہ مجاہدین ہیں۔"

وکیل نے مجھے اور محسن میں مجاہدانہ شان تلاش کرنے کی ناکام کوشش کی اور پھر بولا "اچھا میں ابھی آیا" اور اندر غائب ہوگیا۔

موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے کہا "طوطی صاحب بڑے افسوس کی بات ہے۔ ویسے تو آپ کفار کے دشمن بنے پھرتے ہیں۔ ہمیں لے آئے ہیں ایک سکھ کے پاس۔"

محسن نے کہا "جو بھارتی بھی ہوگا۔"

طوطی صاحب نے ایک قہقہہ مار کے محسن کی ران پر زبردست ہاتھ مارا "یہی ہوتا ہے میرے بھائی' ایسا ہی ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "یعنی قول و فعل میں تضاد ہوتا ہے..... یہ کوئی برائی نہیں۔"

"نہیں۔ لوگ ایسا ہی سمجھتے ہیں جب میں کسی کو پہلی بار ملتا ہوں۔ اس کا نام ہے سردار ملک۔ سچا اور کھرا پاکستانی ہے۔ اپنے لاڑکانہ شریف کا۔ میں تو محبت سے سردار جی کہتا ہوں۔ سکھ ہوتا تو اس کی کرپان سے میں اس کا پیٹ پھاڑ کے جیل چلا جاتا مگر اس کے آفس نہ آتا۔"

سردار جی واپس لوٹے تو سچ مچ کے وکیل لگ رہے تھے "ہاں تو ہم بھی باہر پیتے ہیں سائیں' پہلے کام کی بات کرو۔"

میں نے انتہائی اختصار سے کام لیا اور اسے صرف وہ باتیں بتائیں جن میں اس کی قانونی مدد ہمارے مسائل حل کرسکتی تھی۔ ہم نے اپنے لندن آنے کے غیر قانونی طریقے کا ذکر نہیں کیا۔ اپنی تشریف آوری کا مقصد نہیں بتایا اور چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کے خلاف اپنی مجاہدانہ صف آرائی کا حوالہ بھی نہیں دیا۔ طوطی صاحب نے دخل در معقولات نہ کرکے مجھے حیران کیا۔ وقت گزاری کے لیے وہ ایک کاغذ پنسل سنبھال کے فکرِ سخن میں غرق ہوگئے تھے۔

سردار جی نے ساری بات سن کے کہا "اس میں کوئی بات

نہیں' صرف ہوں گے تمہارے۔"

پاؤنڈ صرف ہوں گے تمہارے۔"

طوطی صاحب نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا "چار سو پاؤنڈ۔"

سردار جی نے فریاد کی "سو پاؤنڈ میری فیس....."

"چار سو پاؤنڈ" طوطی صاحب نے کہا۔

"حاجی صاحب' بڑا مشکل معاملہ ہے۔ معمولی رشوت نہیں چلے گی۔"

"چار سو پاؤنڈ" طوطی صاحب نے تیسری بار اسی لہجے میں کہا۔

"اچھا سائیں۔ ابھی آپ کی زبان سے اور کچھ نہیں نکلے گا" اس نے شکست تسلیم کرلی "دو سو پاؤنڈ دے جاؤ اور کل آؤ۔ صبح۔ اچھا ٹائم کو چھوڑو میں فون کرکے بتادوں گا۔"

میں نے محسن کو اشارہ کیا اور اس نے دو سو پاؤنڈ سردار جی کے سامنے رکھ دیے "کیسے ہوگی ہماری اور اس کی ملاقات۔"

"بابا' کیسے کی بات مت کرو۔ ابھی راستہ نکالنا ہمارا کام ہے۔ میں اس کے پرانے وکیل کو تلاش کروں گا۔ جس نے پہلے اس کا کیس لیا تھا۔ اسے بتاؤں گا کہ جیل والوں نے اس کے موکل کو زہر دے دیا ہے۔ وہ گورا تھا یا کالا؟"

میں نے اور محسن نے ایک ساتھ نفی میں سرہلا کے کہا "پتا نہیں۔"

"کالا ہوگا تو بابا حملہ کردے گا جیل پر اور پولیس کا بیڑا غرق کرادے گا۔ یہ کالے اپنے حقوق کے معاملے میں بڑے متحد ہیں اور ان کے ساتھ قانون ذرا سی زیادتی کرے تو ان کے لیڈر شور مچادیتے ہیں۔ اخباروں میں بیان اور خبریں۔ مظاہرے اور ہنگامے کراتے ہیں۔"

طوطی صاحب نے سرہلایا "خود مہاحرامی ہیں۔ کوئی کام قانونی نہیں کرتے' غلطی سے بھی۔ لوٹ مار' خواتین کے بیگ چھیننا اور اکا دکا راہ گیر کی جیب خالی کرانا۔ دکانوں سے چیزیں اٹھالینا۔"

سردار جی نے کہا "بابا ٹھیک کیا۔ اچھا ہے یہ کالے بھی ہمارے ساتھ مل کے اس ملک کو خراب کرتے ہیں۔"

میں نے کہا "اگر گورا وکیل ہوا پھر؟"

"پھر بھی اسے جانا پڑے گا اسپتال اپنے موکل کو دیکھنے کے لیے۔ وہ اخلاقی اور قانونی طور پر اس کا پابند ہے کہ اپنے موکل کا خیال رکھے۔ اسے سزا ہوجانے کے بعد بھی۔ اگر جیل میں اس کے ساتھ قانون کے مطابق سلوک نہیں ہوتا تو وہی وکیل جج کو رپورٹ کرتا ہے۔"

میں نے کہا "یہ قانونی مسئلہ بن گیا تو ہمیں زیادہ پریشانی ہوگی۔"

میری بات میں پنہاں مطلب کو محسن نے سمجھ لیا "ہاں۔ تم پہلے ہمیں ملوادو کسی طرح۔ اس کے وکیل سے بعد میں بات کرنا۔"

"حوصلہ رکھو۔ تسلی رکھو بابا" سردار جی نے کہا "اللہ نے چاہا تو آج ہی تمہاری ملاقات ہوگی۔ رات کو بھی ہوسکتی ہے۔ بس تم تیار رہنا۔ ابھی میں وکیل کا پتا کرنے کے لیے اسپتال جاتا ہوں۔"

"پولیس تم کو نہیں روکے گی۔"

"کیسے روکے گی بابا۔ کیا میں وکیل نہیں ہوں۔ اور میں بولوں گا کہ جارج میرا موکل تھا۔ پھر تو روکنے والا خود مجرم بن جائے گا۔ جارج سے وکیل کا نام پتا معلوم ہوجائے گا تو میں جاؤں گا اس وکیل کے پاس اور اس کو ساری اسٹوری سناؤں گا۔ ابھی وہ کچھ نہیں کرے گا۔ نوٹس دے گا صبح لیکن میرے کہنے سے فون ضرور کردے گا۔ پولیس کمشنر کو بھی اور جیل سپرنٹنڈنٹ کو بھی۔ ابھی تک یہ بات کسی کو معلوم نہیں۔ ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ جائیں گے سائیں۔ دوبارہ میں جاؤں گا رات کو اور پولیس کے کسی چھوٹے افسر سے بات کروں گا کہ معاملہ ختم ہوسکتا ہے اگر جارج کہہ دے کہ اس کو کسی نے زہر نہیں دیا۔ اس کی طبیعت ویسے ہی خراب ہوگئی تھی۔ اگر اس نے اپنے وکیل کے ذریعے جیل والوں پر کیس کردیا کہ انہوں نے غفلت برتی اور مجھے قتل کرانے کی سازش میں بالواسطہ طور پر شریک ہوئے تو پھر انکوائری ہوگی اور معاملہ بہت بڑھ جائے گا۔ اخباروں میں آجائے گا تو کتنا ہنگامہ ہوگا۔ یہ تم جانتے ہو۔ کالے حبشی رائی کا پہاڑ بنانا جانتے ہیں۔ پولیس بھی چاہے گی کہ جارج ان کے لیے مشکل پیدا نہ کرے۔ کوئی سیدھا سادا بیان دے کر معاملہ ختم کردے پھر میں شرط عائد کروں گا کہ جارج کو اسپتال کے کسی کمرے میں طوطی صاحب سے اور تم سے ملاقات کا موقع فراہم کیا جائے۔ اس ملاقات کے بعد جارج ان کی پسند کا بیان دے گا ورنہ نہیں۔"

"دیکھا میرے پاکستانی بھائی' کیسا سیانا بندہ ہے سردار ملک سنگھ" طوطی صاحب بولے۔

"اور اگر کسی نے تعاون نہ کیا..... کوئی اڑ گیا.....؟" میں نے کہا۔

"بابا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا" سردار ملک نے میز پر ہاتھ مارا اور پھر درد سے چلاتے ہوئے ہاتھ ہلانے لگا "ارے مرگیا سائیں..... اف۔"

میں نے گھبرا کے میز کو دیکھا "کیا چوٹ آگئی۔ میز میں کوئی کیل تھی؟"

"نہیں بابا۔ میں بھول گیا تھا کہ ہاتھ میں پہلے ہی چوٹ ہے۔ ہاتھ آگیا تھا اپنا دروازے میں۔"

طوطی صاحب نے اسے پُرملامت اور ہمیں عبرت آمیز نظروں سے دیکھا "یہ حال ہوتا ہے تہذیبِ مغرب کی تقلید میں اپنی روایات کو بھول جانے کا۔ سردار جی نے ایک میم پال لی ہے نری مصیبت۔ میں تو کہتا ہوں کہ جیل چلا جا زیادہ سکھی رہے گا۔ یہ دیر سے آئے تو دروازہ نہیں کھولتی۔ یہ زور لگاتا ہے باہر سے تو اندر سے وہ ہاتھ پر مارتی ہے ڈنڈا۔ ایک بار پاؤں اڑادیا تھا تو پنجہ توڑ دیا تھا گل دان مار کے۔ بے غیرت سے برتن دھلواتی ہے۔"

"ڈش واشر ہے طوطی صاحب....."

"اور جھاڑو لگواتی ہے..... جوتے پالش کرتا ہے اس کے۔"

سردار جی نے کہا "بابا' اچھی نسل کی کتیا ہو یا گھوڑی۔ ہاتھ

مرغ ہویا عورت۔ اس کے ناز نخرے تو اٹھانے پڑتے ہیں۔ خیر ابھی تم جاؤ۔"

"اور وہ چائے والی بات کیا بھول گئے سردار جی۔ ہم ایسے گئے گزرے بھی نہیں ہیں۔ آخر ایڈیٹر ہیں۔ ملکہ کے پاس بھی جائیں تو کھڑی ہو جاتی ہے سلام کرنے اور چائے خود بنا کے پلاتی ہے...."

"میں ملکہ نہیں ہوں ملک ہوں" وہ آہ بھر کے بولا "یہ لو ایک پاؤنڈ۔ میری طرف سے باہر جا کے پی لینا۔ بیوی سے کہا تو وہ میرا سوپ بنا دے گی مگر چائے نہیں بنائے گی۔"

"رکھ لے یہ ایک پاؤنڈ اور کہیں سے نیلا تھوتھا لا کے خود کھا لے یا اسے کھلا دے" طوطی صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔

"وہ... باقی دو سو پاؤنڈ کب ملیں گے؟"

"اگر کام ہو گیا تو فوراً۔ ورنہ تیرے کفن دفن میں خرچ ہوں گے سردار۔ کل اسی وقت ہم تجھے قتل کر دیں گے۔ ہاں خوب یاد آیا' میں نے اپنے چیف رپورٹر کو بھیجا تھا اسپتال۔ اس نے شکایت کی ہے کہ پولیس نے اسے گھاس نہیں ڈالی۔"

"میں ان سے کہہ دوں گا سائیں۔ چیف رپورٹر کو اصطبل میں باندھ کے اچھی گھاس ڈالیں۔ وہی خرزاد ہے نا۔ تمہارا مبینہ پتر نوردین!"

"ہاں" طوطی صاحب نے بُرا مانے بغیر کہا اور مصافحہ کر کے نیچے اتر گئے۔

دن کا باقی وقت طوطی صاحب کی صحبت میں ان کے ارشاداتِ عالیہ سنتے ہوئے گزارنا مشکل کام تھا۔ میں نے ان سے کہا "اب آپ کا کیا پروگرام ہے؟"

"یہ وقت ہے دربارِ عام کا" انہوں نے گھڑی دیکھی "ملاقاتی اور فریادی شام چار سے سات بجے تک حاضر ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا "پھر آپ جائیں۔ ہم سات بجے تک کچھ سیر سپاٹا' کھیل تماشا' آنکھ مٹکا وغیرہ کر لیں۔"

حسبِ توقع طوطی صاحب خفا ہوئے "سیر سپاٹے کی خیر ہے مگر میرے پاکستانی بھائی' یہ کھیل تماشا اور آنکھ مٹکا۔ تم جیسے مجاہدینِ وطن اور نوجوانانِ اسلام کو اس سے بچنا چاہیے۔ کفار نے بے حیا میموں کو کھلی چھٹی دے رکھی ہے تم جیسے بھولے بھالے مومن جوانوں کو ترغیبِ گناہ دیتی پھرتی ہیں۔ مسلمانوں کو دنیا و عقبٰی میں رسوا کرنے کی صیہونی سازش...."

میں نے کہا "آپ فکر مت کریں۔ ہم اپنا ایمان اور کردار ایسے ہی بے داغ اور سلامت لے آئیں گے۔"

انہوں نے بادلِ ناخواستہ ہمیں چند مفید مشوروں سے نوازا کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے تاکہ ہم پولیس' شکاری میموں اور بھارتی ایجنٹوں کے جال میں گرفتار نہ ہوں۔ پھر وہ اپنی پاکستانی کار کو اس طرح دوڑاتے ہوئے نکل گئے جیسے اپنے لہور شریف کے ریڑھے والے بھائی لوہاری سے "بچ او ئے" کی صدا لگاتے گزر جاتے ہیں۔ بچے نہ بچے' راہ گیر کی مرضی اور تقدیر۔ یا اپنی کراچی شریف کے رکشا والے مجمعِ عام میں سے رکشا نکال لے جاتے ہیں کہ اونٹ کو سوئی کے ناکے سے گزرنا آسان ہے۔

میں نے سکون کا سانس لے کر کہا "لیجیے شیروانی صاحب آدھا دن ضائع نہیں ہوا اور ہم بھی بچ گئے۔"

"ان دو تین گھنٹوں میں ہم کیا کارہائے نمایاں سرانجام دے سکتے ہیں جن سے سلطنتِ برطانیہ غروب ہو جائے۔ اس پر سورج بہت پہلے غروب ہو چکا ہے" محسن بولا۔

"جارج سے ملاقات تو میری توقع سے زیادہ آسان کام ثابت ہوا۔ میرا خیال تھا کہ ایک قاتلانہ حملے کے بعد جارج کے حفاظتی انتظامات زیادہ سخت ہو جائیں گے۔" میں نے کہا۔

"انتظامات واقعی سخت ہونے چاہئیں۔ ایسے دو چار روپے رشوت دے کر ہر ٹام' ڈک یا ہیری اس سے ملنے پہنچ گئے۔"

"یہ صرف رشوت کی بات نہیں ہے۔ ہمیں ایڈیٹر ہفت روزہ "طوطی" کی حمایت حاصل ہے اور ہم ایک وکیل کی معرفت جارج سے ملیں گے ورنہ طوطی کا چیف رپورٹر ایک نرس کی مدد حاصل کر کے بھی ناکام رہا تھا۔ میرا اپنا بھی یہ خیال ہے کہ طوطی صاحب کو اس معاملے میں ایک فریق بنایا جائے۔"

"کس معاملے میں؟"

"جارج کو یہاں سے پاکستان لے جانا کوئی آسان کام نہیں۔ اگر وہاں سے کوئی درخواست آئے گی تو وہ دونوں ممالک کی وزارتِ خارجہ اور وزارتِ داخلہ کے حکام کی معرفت محکمۂ انصاف و قانون تک پہنچے گی۔ اس میں خاصا وقت صرف ہوگا۔ سرکاری سرخ فیتے کا چکر آئے گا اور قانونی رکاوٹیں حائل ہوں گی۔ یہ ہو سکتا ہے کہ حاجی صاحب خود جارج کی طرف سے رجوع کر کے درخواست دائر کریں کہ اس کیس میں کچھ نئی شہادت سامنے آئی ہے اور ڈاکٹر شیلی مرڈر کیس میں یہ ثبوت ملا ہے کہ دہرے قتل کے جس جرم میں جارج عمر قید کاٹ رہا ہے وہ چوہدری دلاور نامی ایک شخص نے کیا تھا۔ وہی ڈاکٹر شیلی کا قاتل بھی ہے۔ خود جارج نے بھی اپنے مقدمے کی سماعت کے دوران بار بار کہا تھا کہ قاتل ایک ایشیائی ہے اور اس نے قاتل کا حلیہ بھی بیان کیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ قاتل فوراً جائے واردات سے فرار ہو گیا تھا مگر وہ سامنے آنے پر اس کو آسانی سے پہچان سکتا ہے۔ ڈاکٹر شیلی کا قتل لاہور میں ہوا اور یہ کیس وہیں زیرِ سماعت ہے۔ چونکہ عدالت کو مدعا علیہ اور گواہوں سمیت لندن نہیں لایا جا سکتا۔ اس لیے جارج کو لاہور کی عدالت میں پیش ہونے کا موقع دیا جائے تاکہ اس شخص' چوہدری دلاور کو دیکھ سکے اور عدالت کے روبرو شناخت کر سکے جس نے ڈاکٹر شیلی کی ماں اور اس کے شوہر جارج کی گرل فرینڈ کا قتل کیا تھا۔ دلاور نے گرل فرینڈ کو غلطی سے ڈاکٹر شیلی سمجھ لیا تھا کیونکہ اس نے پہلے شیلی کو دیکھا نہیں تھا۔ وہ خوش قسمتی سے اس وقت موجود نہیں تھی۔ یہ شہادت ریکارڈ پر ہے کہ ڈاکٹر شیلی کی

ماں دلاور کے باپ کی دوسری بیوی تھی اور اس طرح ڈاکٹر شیلی درحقیقت چوہدری دلاور کی سوتیلی بہن تھی۔ شیلی اور دلاور کے باپ کی موت کے بعد اس کی بیوہ نے نیگرو جارج سے شادی کی تھی۔ صرف اس کی دولت کے لیے ورنہ وہ عمر میں جارج کی بھی ماں کے برابر تھی۔"

محسن نے کہا "اس طرح تو یہ نیگرو جارج چوہدری دلاور کا بھی سوتیلا باپ ہی ہوا... اور شیلی کا بھی۔"

"بالکل ہوا۔" میں نے کہا "شیلی اور دلاور کا باپ ایک ہی تھا۔ ماں دونوں کی الگ تھیں۔ باپ کی موت کے بعد ماں جس سے بھی شادی کرے وہ رشتے کے اعتبار سے سوتیلا باپ ہی کہلائے گا۔ دلاور کا رشتہ ڈبل سوتیلا ہو جاتا ہے یعنی سوتیلی ماں کا دوسرا شوہر جارج ہے۔"

"پھر بھی تعلق تو واضح ہے" محسن بولا۔

"وہ سب یہاں عدالتی ریکارڈ پر پہلے سے ہے" میں نے کہا "اب یہاں درخواست دی جائے کہ وہ دلاور جو لندن میں ڈاکٹر شیلی کو قتل کرنے کی نیت سے آیا تھا اور غلط فہمی کے باعث کسی اور کو مار کے فرار ہو گیا تھا۔ اب اسی دلاور پر الزام ہے کہ اس نے اپنی سوتیلی بہن ڈاکٹر شیلی کو لاہور بلایا اور قتل کر دیا اور اس قتل کے کیس میں فردِ جرم اس پر عائد ہو چکی ہے مگر وہ مفرور ہے۔ تاہم اس کیس کا جارج کے کیس سے گہرا تعلق ہے۔ دلاور یہاں ناکام ہو گیا تھا مگر لاہور میں کامیاب رہا۔ قاتل وہی ہے مقتول وہی ہے۔ یہ اس کا تیسرا قتل ہے۔ پہلے دو کا چشم دید گواہ جارج ہے جو اسے شناخت کر سکتا ہے۔ ایک بے گناہ کی بقیہ سزا ختم کرانے کے لیے اسے لاہور بھیجنا کوئی مشکل کام نہیں۔ اسے یہاں سے پاکستان کا ویزا دلوایا جا سکتا ہے اور وہ کورٹ آرڈر پر پولیس کی تحویل میں لاہور جا سکتا ہے۔ وہاں اس کو صرف ایک بار عدالت میں حاضر ہونا ہے۔ جب ملزم چوہدری دلاور پیش ہو۔"

"وہ کب پیش ہوگا؟" محسن مایوسی سے بولا۔

"کب تک پیش نہیں ہوگا۔ چوہدری دلاور جیسے ملزم کے لیے خاندان اور کاروبار سب کچھ چھوڑ کے بقیہ زندگی جلاوطنی اور گمنامی میں گزارنا عملاً ناممکن ہے۔ اسے اپنے نامی گرامی وکیلوں کے پینل پر بہت بھروسا ہے۔ یہ یقین ہے کہ وہ سپریم کورٹ تک جا سکتا ہے اور یہ بھی خیال ہے کہ پولیس اس کے ساتھ ہے۔ وہ گواہ' ثبوت اور واقعاتی شہادتوں کو بدل سکتی ہے۔"

"ابھی تو وہ لندن میں ہے اور اسے بھی یقیناً پتا چل گیا ہوگا کہ اس کی ایک کوشش ناکام ہو گئی ہے۔"

میں نے کہا "شاید زہر وہ پاکستان سے لایا ہوگا۔"

"یہ کیسے پتا چلا لیا آپ نے؟"

"ملاوٹ والی چیزیں وہیں ملتی ہیں۔ زہر بھی خالص نہیں ہوگا۔ اگلی مرتبہ وہ یہاں کا خالص زہر استعمال کرے گا۔ میڈ اِن انگلینڈ کے لیبل والا۔"

"شاید اسے دوسرا چانس نہ ملے" محسن نے کہا۔

میں نے کہا "چوہدری دلاور ایک ناکامی سے ہمت ہارنے والا نہیں ہے۔ وہ انتظار کر سکتا ہے۔ غیر معینہ مدت تک۔ بالآخر یہ معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے گا اور حالات معمول پر آ جائیں گے۔ اس کے بعد دوسری کوشش زیادہ تیاری کے ساتھ۔ چانس کا مسئلہ کوئی نہیں۔ دنیا کی گاڑی پیسے کے پہیے پر چل رہی ہے۔ دو سو پاؤنڈ کی جگہ دو ہزار پاؤنڈ کی طاقت ہو تو جام پہیہ بھی دوڑنے لگتا ہے۔ جارج کا کام تمام کیے بغیر چوہدری دلاور کے واپس پاکستان جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مفرور مجرم تو وہ بن چکا۔ اب کیا فرق پڑتا ہے اسے اگر دو دو ماہ مفرور رہے یا دو سال۔ پاکستان میں تو وہ ساری عمر روپوش رہ سکتا تھا مگر لندن میں یہ آسان نہیں ہوگا۔ جیسے جیسے وقت گزارے گا اس کی مشکلات بڑھتی جائیں گی۔ لیکن اس کے لیے جارج کے وجود کو ختم کرنا اپنے آپ کو پھانسی کے پھندے سے بچانے کے لیے ضروری ہے۔ ڈاکٹر شیلی کیس میں وہ شہادتیں خورد بُرد کر کے یا قانونی موشگافی سے شک کا فائدہ حاصل کرتے ہوئے بچ سکتا ہے۔ میرا مطلب ہے سزائے موت سے۔ عمر قید یا سات سال کے لیے جیل جانا تو وہاں بھی لازمی ہے مگر یہاں جارج کو چھوڑ کے اسے پکڑ لیا گیا تو گورے اسے فوراً الیکٹرک چیئر پر روسٹ کرنے کے لیے بٹھا دیں گے۔ جس دن بھی وہ جارج کو قتل کرانے میں کامیاب ہو گیا اس کے سر سے یقینی موت کا خطرہ ٹل جائے گا۔ پھر وہ خود ہی عدالت میں پیش ہو جائے گا اور ظاہر ہے ضمانت بھی حاصل کر لے گا۔"

"ان حالات میں طوطی کی صدا موثر ثابت ہو سکتی ہے۔ وہ خود جیسے بھی ایڈیٹر ہیں مگر ایڈیٹر ہیں اور ان کے تعلقات دوسرے اخبارات کے مدیروں سے بھی ہوں گے۔ وہ جارج کے کیس کو دوبارہ زندہ کر سکتے ہیں اور اچھال سکتے ہیں۔ مقامی سیاہ فام لیڈروں اور تنظیموں کو جارج کے لیے انصاف حاصل کرنے پر اکسانا کوئی مسئلہ نہیں۔ اس طرح برطانوی وزارتِ قانون و انصاف پر دباؤ بڑھ جائے گا کہ جارج کی حفاظت کے خصوصی انتظامات کیے جائیں۔ چوہدری دلاور کے لیے اس کو قتل کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن بنا دیا جائے۔ ہم اس کی یادداشت کو تازہ کرنے کے لیے اسے چوہدری دلاور کی تصویر دکھا دیں گے۔ دلاور کو اس نے بہت پہلے دیکھا تھا۔"

"کیا ابھی نہیں دیکھا ہوگا؟"

"آپ گھاس کھا گئے ہیں؟ کیا دلاور نے اس کے سامنے جا کے خود زہر پیش کیا ہوگا؟ کہ لیجیے نوش فرمائیے۔ جارج تو اسے دیکھتے ہی قاتل قاتل چلّانے لگتا۔ یہ کام اس کے لیے کسی اور نے کیا ہوگا۔ جب تفتیش ہوگی تو سب معلوم ہو جائے گا کہ زہر اسے کس نے دیا اور کیسے دیا؟"

"مگر اس سے تو وعدہ لیا جائے گا کہ وہ ایسی کوئی بات نہیں کہے گا۔"

میں نے کہا "ہماری ملاقات اسی بیان سے مشروط ہے۔"

"ایسی کی تیسی وعدے کی اور شرط کی۔ یہ کوئی شریفانہ کاروباری سودا ہے جس میں آدمی کی ساکھ اس کی زبان سے قائم رہتی ہے۔ یہ بدمعاشی' لاقانونیت اور سنگین مجرمانہ عزائم کا مظاہرہ کرنے والے چوہدری دلاور کی گردن میں پھانسی کا پھندا ڈالنے کی بات ہے۔ اس میں شرافت اور ایفائے عہد کی ساکھ کا کیا سوال۔ جارج کے ساتھ کتنا ظلم ہوا۔ وہ بے سبب جیل میں اپنی جوانی لٹا رہا ہے۔ کتنا خون جلتا ہوگا اس کا یہ سوچ کر کہ وہ ایسے جرم کی سزا کاٹ رہا ہے جو اس نے کیا ہی نہیں تھا۔ اب وہ اصل مجرم کے معاملے میں وعدے پر قائم رہے؟ آج وہ ہم سے ملاقات کے بعد کل اپنا بیان بدل دے گا تو کوئی اس کا کیا بگاڑ لے گا۔ طوطی صاحب پر یا ہم پر کوئی الزام نہیں آسکتا۔ یہ ایک اور جرم بن جائے گا پولیس کا' اگر وہ کہیں کہ اس شرط پر جارج کی ملاقات کرائی گئی تھی کہ وہ جیل حکام پر زہر دینے کا یا غفلت برتنے کا الزام عائد نہیں کرے گا۔ رشوت لے کر کسی قانونی اختیار کے بغیر ایک مجرم کو کسی سے خصوصی طور پر خلوت میں ملاقات کا موقع فراہم کرنا خود پولیس کے جرم کا ثبوت ہوگا۔"

ہم باتیں کرتے گئے اور چلتے گئے۔ لندن کے شہر کی قدامت میں کوئی ایسی بات ہے کہ ہم جیسے اس کی فضا میں اجنبیت ضرور محسوس کرتے ہیں لیکن صرف اس حد تک جیسے ٹنڈو آدم کا رہنے والا پشاور میں یا چک جھمرہ کا باسی کراچی میں محسوس کرسکتا ہے۔ ہمارے ہر طرف انگریزی بولنے والے لوگ تھے اور انگریزی کسی حد تک ہماری بھی ثانوی قومی زبان کا درجہ رکھتی تھی۔ ہم سائن بورڈ پڑھ سکتے تھے اور یہ سمجھ سکتے تھے کہ آس پاس لوگ ایک دوسرے سے کیا کہہ رہے ہیں۔ انگریز ویسے بھی وضع دار اور بے تکلف نہ ہونے والی قوم ہے۔ برعکس ان لوگوں کے جو تکلف کو سراسر تکلیف سمجھتے ہیں۔ یہاں اردو یا پنجابی بنگالی یا مدراسی بولنے والے بھی مل جاتے تھے تو تعجب نہیں ہوتا تھا۔ میں اور محسن فرنچ جانتے تھے اس لیے فرانس میں بھی ہمارا گزارہ تھا ورنہ عام آدمی تو برطانیہ' امریکا اور چند انگریزی بولنے والے ممالک کو چھوڑ کے ہر جگہ خود کو تنہا اور احمق محسوس کرتا ہے جب اسے راستہ بتانے والا یا بازار میں کسی چیز کی قیمت بتانے والا بھی نہیں ملتا۔ وہ بس اسٹاپ پر' ٹیکسی ڈرائیور کو یا دکان میں کچھ کہنا چاہے تو تماشا بن جاتا ہے اور ہر طرف سمجھ میں نہ آنے والی زبان میں باتیں کرنے والوں کو دیکھ کے یہ سمجھنے لگتا ہے کہ وہ زمین سے کسی اور سیارے پر اتر گیا ہے۔

ایک بار چائے اور پھر کافی پینے کے بعد مجھے رابعہ کا خیال آیا "یار اپنے شیروانی صاحب' وہ کیا ہے کہ شام بڑی اُداس ہے' ہیں جی!"

"ہاں جی۔ ایسا ہی لگتا ہے کچھ اپنے سکندرِ اعظم صاحب۔"

"رابعہ اداس ہے غالباً" میں نے کہا "میں بڑا کمینہ ہوں کہ اسے تنہا چھوڑ کے بھاگ آیا۔ وہ ضرور روتی رہی ہوگی۔"

"گل تو اس وقت بھی آنسو بہا رہی ہے۔ میں ا... چہرے کو چشمِ تصور سے دیکھ سکتا ہوں۔ یہاں بر... تصویر کا عنوان ہوگا جو اس وقت اتاری جائے۔"

"رابعہ کی چشمِ گہربار کے خیال سے مجھ پر رقت طار... ہے۔"

"اور گل کو یاد کرکے میری آنکھیں نم ہو رہی ہیں۔ آ... سکتے ہیں" محسن بولا۔

"بکواس فرماتے ہیں آپ۔ اس وقت آپ کی آ... اتنی بھی نمی نہیں جتنی صحرائے گوبی کی ہوا میں ہوتی ہے... ہوس ہے۔"

"اور آپ بھی کم جھوٹے نہیں ہیں۔ رقت خاک ... ہو رہی ہے۔ آپ ندیدوں کی طرح ہر شرمناک منظر کا عمیق نظ... سے مطالعہ فرما رہے ہیں اور ہر اچھی صورت پر بُری نظر ڈال ر... ہیں آپ" محسن نے جواب دیا۔

"کافی شرم آنی چاہیے تمہیں۔ ایک بیوی کے ہوتے ... قابلِ اعتراض خیالات سے اور نیلے خوابوں سے بھی گریز کرنا ... ہے۔"

محسن نے قہقہہ مارا "حضرت۔ بھول گئے آپ کہ اب ... بیوی والے ہیں آپ بھی۔"

میں نے آہ بھر کے کہا "وہ خاک بیوی ہے شیروانی صاحب ابھی تک محبوبہ کا لیبل لگا ہوا ہے اس لیے یاد بھی آرہی ہے آزادی کے احساس سے خوشی بھی نہیں ہو رہی ہے۔"

"یہ سچ کہا۔ میں خاصا ہلکا پھلکا محسوس کر رہا ہوں۔ پتا نہیں... فرق پڑ جاتا ہے شادی کے بعد۔ پہلے جس کے خیال اور تصور... روز و شب خواب کی صورت بسر ہوتے ہیں وہ ایک ذمے دار... کے اعصاب پر سوار ہو جاتی ہے۔ گل کے یاد آنے کی وجہ ... مختلف ہے۔"

اتفاقِ رائے سے ہم نے ایک پبلک کال آفس کا رخ کیا... اپنے پیارے پاکستان کے ڈاک خانے والے ٹیلی فون بوتھ ... بہت مختلف تھا جہاں نیم تاریک' نیم روشن پیلی دیواروں اور ... کاؤنٹر کے پیچھے کوئی آدم بیزار اونگھتے خاں کانتے خاں کال ... کریں تو پھر انتظار شروع ہوتا ہے اور جس خوش نصیب کی کال ... فون والے ملادیں اسے ایک کابک میں بھیج دیا جاتا ہے جہاں ... قبل از تاریخ کا کوئی فون پڑا ہوتا ہے اور کیبن کی دیواروں ... کشا تصاویر سے مردانہ عبارات واشتہارات تک سب نظ... سامنے رہتا ہے۔ یہاں ایک اسمارٹ خوش ادا و خوش لباس و ... مزاج لڑکی نے حیرت سے کہا "پے کارڈ نہیں ہے آپ کے پا...

"ہوتا تو آپ کے دیدارِ حسن کا یہ حسین اتفاق کیسے آتا؟"

وہ ہنسی "خیر آپ لے لیں۔ دس پاؤنڈ کا دوں یا پانچ والا؟"

میں نے سوچا کہ داشتہ آید بکار۔ ابھی لندن میں دو دن نہ جانے کہاں فون کرنے کی ضرورت پڑے۔ پانچ پاؤنڈ کا فون کارڈ جیب میں ہوگا تو کہیں سے بھی کال ہو جائے گی۔ ویسے بھی پیرس کی کال کوئی لوکل کال نہیں ہے۔ دس پاؤنڈ میں سے کچھ رقم بچے گی تو کہیں کام آجائے گی ورنہ غیر استعمال شدہ رقم کا کارڈ ہم طوطی صاحب کو گفٹ کر جائیں گے۔

دس پاؤنڈ والے کارڈ کے ساتھ ہم نے ایک ائرکنڈیشنڈ بوتھ سے پیرس کا نمبر ملایا۔ ریسیور اٹھانے والی خاتون نے مردانہ آواز میں ہیلو کہا تو میں سمجھ گیا کہ یہ رانگ نمبر نہیں ہے۔ یہ وہی نیم مردانہ نیم زنانہ چیز تھی جسے ہم کاؤنٹر کے پیچھے رکھا ہوا دیکھتے تھے۔ میں نے اسے ہوسٹل کے کمرے کا نمبر دیا اور کہا کہ کسی بھی خاتون کو بلایا جائے۔ رابعہ یا گل۔ اس نے اپنے تلفظ میں دونوں نام دہرائے "رابے آ... اور مس غل... پانچ منٹ بعد پھر فون کرنا۔"

پانچ منٹ میں ہم نے دس بار گھڑی دیکھی۔ بہت کم لباس اور بہت زیادہ خوشبو پہنے ہوئے (انگریزی میں خوشبو لگاتا نہیں' خوشبو پہنا کہا جاتا ہے) دو لڑکیوں کو مسکرا کے دیکھنے کی غلطی کی... وہ کال گرلز تھیں اور غالباً کسی سے ان کی ڈیٹ منسوخ ہوگئی تھی۔ وہ فوراً ہمارے پاس آکر بیٹھ گئیں۔

"ہائے ہینڈسم! آج رات تم کیا کر رہے ہو؟"

میں نے شرما کے کہا "یہ تمہیں کیسے بتادیں ڈیئر سسٹر۔"

محسن نے بے وقوفوں کی طرح کہا "ہماری بیویوں سے پوچھ لینا۔ وہ آنے ہی والی ہیں سسٹر۔"

وہ بُرا سا منہ بنا کے اٹھ گئیں تو میں نے ڈیسک پر طبلہ بجانا شروع کیا اور محسن گانے لگا "تیرے لونگ دا پیا لشکارا۔"

دوسری طرف سے فون کرنے والی ایک بڑی بی نے ڈانٹ کے کہا "ول یو پلیز شٹ اپ۔"

"بدذوق ہے" محسن نے خوش دلی سے کہا۔

میں نے پھر نمبر ملاتے ہوئے کہا "نہیں۔ موسیقی کو سمجھتی ہے۔"

پیرس میں ریسیور اٹھانے والی خاتون نے کہا "رابے آ نے ایک بڑا دلچسپ جواب دیا ہے۔ سنو گے؟ اس نے کہا ہے جہنم میں جاؤ... اکیلے۔"

"وہ خود نہیں آئی؟" میں نے مایوسی سے کہا "اور گل...؟"

"ہاں۔ غل نے زیادہ مفید بات کی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ واپس آنے کی ضرورت نہیں۔ ہم تمہارے بغیر زیادہ خوش ہیں۔"

لائن کٹ گئی تو میں نے اور محسن نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ "ان کا دماغ درست کریں گے واپس جاکے۔" محسن نے نخوت سے کہا۔

"انشاء اللہ۔ مگر سوال یہ ہے کہ اس وقت کیا کریں؟" میں نے کہا۔

"صبر۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔" محسن اٹھ کھڑا ہوا۔

"بڑی بے عزتی خراب ہوگئی دوست۔ وہ سخت خفا ہیں۔"

"ہمارے اعمال ہی ایسے ہیں۔ کون بیوی خوش رہ سکتی ہے ہم جیسے دغاباز' چکرباز' چال باز شوہروں کے ساتھ؟"

"رابعہ اور گل جیسی" میں نے کہا "کیا پھر کوشش کریں؟"

محسن نے نفی میں سر ہلایا "بے کار ہے۔ اس باران کی طرف سے وہ ڈراؤنی حسینہ خود ایسا دندان شکن جواب دے گی کہ تیری بتیسی باہر آگرے گی۔"

"دندان شکن جواب کے لیے ہم لندن میں ہی ایک رقیب سے رجوع کرسکتے ہیں" میں نے کہا "چھیڑ خوباں سے نہ سہی اس کے شوہر سے سہی۔"

ہم واپس ہوئے اور الزبتھ کے گھر کا نمبر ملایا۔ حسبِ توقع اس کی ہاؤس میڈ نے ریسیور اٹھایا "آپ نام بتائیں گے اپنا۔"

"الیگزینڈر دی گریٹ" میں نے کہا "فاتح عالم۔ وہ سمجھ جائے گی۔"

کچھ دیر بعد الزبتھ نے کہا "کون سکندر! میں تو سمجھی تھی کہ اب تم کبھی مجھ سے بات نہیں کرو گے۔"

"بات کرنی تو بے حد ضروری تھی" میں نے کہا "ورنہ تمہاری محنت... سوری' الزبتھ کے ٹیلر کی محنت رائگاں جاتی۔"

انگریزی میں اس کے شوہر کو ELIZEBETH'S TAILOR کہنا آسان تھا۔ اس طرح کہ وہ سمجھے' میں اسے الزبتھ ٹیلر کہہ رہا ہوں لیکن وہ سمجھ گئی۔

"کیسی محنت؟" اس کا لہجہ بدل گیا۔

"جو اس نے فون پر آبزرویشن لگوا کے کی ہے۔ اب تم میری آواز کا ٹیپ منگوا کے دن میں دس بار سن سکتی ہو۔"

"تم کہاں سے بول رہے ہو؟"

"اپنے منہ سے... ہاہاہا" میں نے اپنے مذاق پر مصنوعی قہقہہ لگایا "تین منٹ میں کوئی مجھ تک نہیں پہنچ سکتا الزبتھ' اور میں دو منٹ انسٹھ سیکنڈ بات کرکے فون بند کردوں گا۔ یہ پی سی او ہے اور آئندہ بھی میں ایسے ہی فون کروں گا۔"

"سکندر! آئی ایم سوری۔"

"مجھے بھی بہت افسوس ہے... کہ میں تم سے ملا اور تم سے محبت کی۔ اچھا ہوتا اگر تمہارا نام بھی میں انہی لڑکیوں میں لکھ کے بھول جاتا جن کو آج بھی افسوس ہوگا کہ وہ اتنی CHEAP اور آسان حاصل کیوں تھیں۔ تمہیں تو میں نے ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ یہ محبت نہ ہوتی تو تم کیسے SAFE رہ سکتی تھیں خاتون محترم۔ غور کرنا اس سوال پر..."

"میں ملنا چاہتی ہوں تم سے..."

"سکندر سب کچھ ہے۔ کمینہ یا بوالہوس۔ کالا اور کم نسل۔ مگر وہ احمق نہیں ہے لیڈی۔ اب میری ملاقات ہوگی تمہارے اس لارڈ سے اور اسے اندازہ ہوگا کہ ایم آر ایس کیا کرسکتی ہے جواب

میں....."

الزبتھ نے دہشت زدہ ہو کے چیخ ماری "پلیز سکندر....!"

میں نے ریسیور رکھ دیا اور ہم فوراً وہاں سے نکل آئے۔ کچھ فاصلے پر ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھ کے ہم نے پھر چائے کا آرڈر دیا اور بڑے بڑے شیشوں سے باہر دیکھتے رہے۔ ایک پولیس کار دو منٹ بعد وہاں پہنچی اور اس میں سے شرلاک ہومز جیسے حلیے میں ایک شخص اترا۔ اس نے مشکوک نظروں سے اِدھر اُدھر نگاہ ڈالی اور ایک لمحے کے لیے اس کی نظر ریسٹورنٹ پر بھی رکی تو مجھے یوں لگا جیسے اس نے "مجرموں" کی جائے پناہ تاڑلی ہے۔ میرے ذہن میں اپنے وطن کی پولیس کے ذہنی معیار اور سراغ رسی کی صلاحیت کے بارے میں اچھا تاثر نہیں تھا مگر فلموں اور جاسوسی ادب کی کہانیوں نے اسکاٹ لینڈ یارڈ کے سراغ رسانوں کو بڑی مافوق الفطرت قسم کی چیز بنادیا تھا کہ ارتکاب کے بعد تو خیر وہ مجرم کو چٹکی بجاتے ہی دھر لیتے ہیں لیکن مقابلے پر چھلاوا قسم کا مجرم ہو جو زمانے بھر کی آنکھوں میں دھول جھونک کے غائب ہو جائے تو وہ بھی بھوت کی طرح اس کے پیچھے لگ جاتے ہیں اور ہمالیہ کی چوٹی پر قتل ہو تو وہ لاش قطب شمالی سے' آلۂ قتل قطب جنوبی سے اور قاتل کو بحرالکاہل کی تہ سے نکال سکتے ہیں۔ لیکن ایسا کمال بھی دکھا سکتے ہیں کہ ابھی جرم کرنے کا خیال کسی مجرم کے ذہن میں آیا ہو یا اس نے منصوبہ ہی بنایا ہو کہ ان پر الہام ہوتا ہے اور وہ مجرم سے پہلے جائے واردات پر پہنچ جاتے ہیں اور بڑے ڈرامائی طریقے پر جہاں مجرم نے قتل کی نیت سے ریوالور نکالا' انہوں نے نشانہ لے کر فائر کیا اور ملزم کا ریوالور اس کے ہاتھ سے غائب اور بس اس کے بعد ہینڈز اپ۔

ایسی ہی افسانوی باتوں نے ہماری پولیس کو بہت بدنام کیا ہے اور اس کے برعکس ترقی یافتہ ممالک کے مجرموں کو احمق ثابت کیا ہے جو کسی نہ کسی غلطی سے پکڑے ضرور جاتے ہیں۔ لوگ ہماری اور برطانوی پولیس کا موازنہ کرتے وقت بھول جاتے ہیں کہ وہاں عام پولیس مین کو ایک ڈاکٹر کے برابر تنخواہ ملتی ہے اور ان کے پاس جدید ترین وسائل ہیں۔ اس کے باوجود وہاں بھی جرائم کا سراغ لگانے کا تناسب سو فیصد نہیں اور ہماری پولیس کا ریکارڈ بھی اتنا بُرا نہیں۔

جب پولیس کار سے اترنے والا پبلک کال آفس میں گیا ہوا تھا تو صرف ایک ڈرائیور ہی کار میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے پاس بالکل نئے ماڈل کی کار تھی اور کار کا وائرلیس ایریل یہ ظاہر کرتا تھا کہ اس کا اپنے ہیڈ آفس سے بھی مسلسل رابطہ ہے۔ مجھے اپنے وطن کی پولیس کی بے سروسامانی یاد آئی جہاں واردات کی اطلاع ملے تو عموماً گاڑی نہیں ہوتی اور انہیں کہیں پہنچنا ہو تو وہ مجبور ہوتے ہیں کہ کسی گاڑی کو بیگار میں پکڑلیں یا زبردستی ٹیکسی میں فٹ ہو جائیں۔ بعض اوقات تو انہیں پیدل یا سائیکل پر بھی جانا پڑتا ہے۔ اپنی گوروں کے وقت کی دقیانوسی رائفل کے سوا ان کے پاس کچھ نہیں ہوتا۔

میں یہ سب سوچ ہی رہا تھا کہ دوسری کار عین پولیس کی گاڑی کے پیچھے آ کے رکی اور اس میں سے جو شخص برآمد ہوا اسے دیکھ کے میں اور محسن چونکے بغیر نہ رہ سکے۔

محسن نے کہا "یار' یہ تو کاکروچ ہے۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا "بالکل وہی ہے۔"

"تو یہ مسٹر گورڈن ہیں' اپنی الزبتھ کے مجازی خدا۔ ہیں جی۔"

"ہاں جی۔ تقدیر کے کھیل نرالے ہیں۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر گرم چائے کو حلق سے اتارلیا "یہ کتنا بزدل اور احمق لڑکا ہوا کرتا تھا۔"

محسن نے سرہلایا "لڑکیوں کی طرح شرمانے والا اور کسی حد تک احساس کمتری کا مارا ہوا۔ ہم سے تو خیر کتراتا تھا مگر کلاس کی شریر لڑکیاں اسے کتنا پریشان کرتی تھیں۔ یہ کونوں کھدروں میں منہ چھپاتا پھرتا تھا۔"

"اور اسی لیے ہم نے اسے کاکروچ کے خطاب سے نوازا تھا جو اس کے نام سے زیادہ مقبول ہوا تھا" میں نے کہا "اب میں سمجھ سکتا ہوں شیروانی صاحب کہ الزبتھ کے فرسٹریشن کے اسباب کیا ہیں۔ اگر اسے کوئی میرے جیسا خوبرو جوان رعنا مل جاتا' رچرڈ برٹن ٹائپ' تو الزبتھ مجھے بھول چکی ہوتی اور اب میرا نام سن کے یا رابعہ کی تعریف سن کے اتنی مشتعل نہ ہوتی۔ نوجوانی کے جذباتی رومانوی دور کے بعد عملی زندگی کی حقیقت سے سب ہی سمجھوتا کرلیتے ہیں اور سب رو رو کے فریاد نہیں کرتے کہ..... یادِ ماضی عذاب ہے یارب۔ چھین لے مجھ سے حافظہ میرا۔"

اچانک محسن نے کہا "ابے اُدھر دیکھ۔"

میں نے دیکھا تو مسٹر گورڈن کی کار کے پیچھے ایک ٹیکسی آگئی تھی۔ اس میں سے اترنے والا حلیے سے کسی ریاست کا راجا لگتا تھا۔ روایتی انداز میں اس نے سلیم شاہی جوتے' تنگ پاجامہ اور سلک کی شیروانی زیب تن کی تھی اور اس کے سر پر راجے مہاراجوں جیسی پگڑی بھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں چاندی کے مٹھ والی چھڑی بھی نظر آرہی تھی۔ ایسے حلیے کے راجا اب یا تو قدیم تصاویر میں نظر آتے ہیں یا ان بلیک اینڈ وائٹ دور کی فلموں میں جن کی کہانیاں کسی فرضی ریاست کے محلات میں چلتی ہیں لیکن انگریز کے ملک میں ایسے حلیے کو آج بھی احترام آمیز دلچسپی سے دیکھا جاتا ہے۔

"مہاراجا صاحب ٹیکسی میں! کیا زمانہ آگیا ہے؟" محسن بولا۔

"یہ ریاست قلاش پور کے مہاراجا کنگال رائے آخر کون ہیں؟" میں نے کہا۔

محسن نے کہا "اپنی شکل اِدھر کرے تو میں بتاؤں۔ ویسے مجھے یہ اپنے طوطی صاحب کا ڈرامے باز فرزند لگتا ہے۔"

میں نے کہا "وہ تو یار شہزادہ سلیم کا رول کررہا ہے کسی مغلِ اعظم ٹائپ ڈرامے میں۔ وہ قد میں چھوٹا ہے اور اتنا موٹا نہیں ہے۔"

محسن نے ایک دم میز پر ہاتھ مارا "وہ مارا پاپڑ والے کو۔"

اِدھر اُدھر بیٹھے ہوئے حضرات و خواتین نے بدتمیزی کے اس مظاہرے پر ناک بھوں چڑھائی۔ ویٹر نے فوراً نمودار ہو کے کہا "سر! آپ کو اتنی نہیں پینی چاہیے۔"

میں نے کہا "ابھی تو ہم اور پییں گے۔"

محسن بولا "بس دو کپ اور لادو۔ ہم مسلمان شراب تو چھوتے نہیں' چائے پی کر بھی ہمیں نشہ ہو جاتا ہے۔"

وہ ہمیں عجیب سی نظروں سے دیکھتا ہوا چلا گیا تو میں نے کہا "پاپڑ والا کون تھا؟"

"یار' اپنے چوہدری دلاور صاحب اور کون!" محسن بولا "قلاش پور کے مہاراجا کنگال رائے کے روپ میں آپ کے سامنے ہیں۔"

"اوہ۔ کیا میں اچھل پڑوں؟" میں نے کہا "خوب پہچانا تونے۔ مجھے حسد محسوس ہو رہا ہے تیری ذہانت سے۔"

"اسی خرزاد نے لیڈی الزبتھ کو آپ سے برگشتہ کرنے کے لیے آپ کے نجی معاملات کی پوری رپورٹ پہلے سے پہنچائی تھی۔ اس کو علم تھا کہ الزبتھ سے بھی آپ کو اتنا ہی عشق تھا جتنا آج کل رابعہ سے ہے۔ کل خدا جانے کس سے ہوگا؟"

میں نے میز پر مکا مار کے کہا "کل بھی رابعہ سے ہی ہوگا' پرسوں بھی...."

جن لوگوں نے پہلے ناک بھوں چڑھائی تھی انہوں نے پھر ہمیں گھور کے ناپسندیدگی کے جذبات کا اظہار کیا مگر اب ان کی شدت کم تھی۔ غالباً انہوں نے فرض کرلیا اور بادلِ ناخواستہ تسلیم بھی کرلیا تھا کہ ہم کسی جوشیلی گفتگو کرنے والی قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔

"اس نے بالکل ٹھیک سمجھا تھا کہ جب آپ حبشی نژاد جارج سے ملنے آئیں گے تو یہ ناممکن ہے کہ پرانے عشق کا کیڑا آپ کے دماغ میں نہ کلبلائے اور آپ سابق محبوبۂ دلنواز کا دیدار کیے بغیر لوٹ جائیں۔ ایسا تو ممکن ہی نہیں۔ اس نے الزبتھ کے دل میں آتشِ غضب روشن کرنے کے بعد آس پاس رہتے ہوئے آپ کا انتظار کیا۔ ویسے تو شاید اس حلیے میں دلاور کا باپ بھی آپ کو نہیں پہچان سکتا تھا۔ وہ سارے لندن میں آپ کو کہاں تلاش کرتا۔ بس ایک جگہ مورچا بند ہوگیا۔ جیسے شکاری بیٹھ جاتے ہیں مچان باندھ کے اور پیڑ کے نیچے باندھ دیتے ہیں بکرا کہ شیر اس راستے سے ضرور گزرے گا اور پھر بکرے کی خوشبو یا آواز پر آئے گا مرنے کے لیے عین اسی پیڑ کے نیچے۔"

میں نے سرہلایا "یعنی اس کہانی میں شیر ہوں میں' بکری ہے لیڈی الزبتھ گورڈن اور شکاری اپنے چوہدری دلاور صاحب۔ میرا راستہ گزرتا ہے کوئے یار میں درِ جاناں کے سامنے سے۔ کیا غضب کی اسٹوری ہے شیروانی صاحب! اب اس کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں۔ شیر احمق نہیں ہے۔ اسے معلوم بھی ہوگیا ہے کہ پیڑ پر شکاری بندوق لیے بیٹھا ہے۔ وہ بکری کی اشتہا انگیز خوشبو اور پُرکشش آواز کو نظرانداز کرتے ہوئے پیچھے سے جاتا ہے اور درخت پر چڑھ کے شکاری کو کھالیتا ہے' بندوق سمیت۔"

"ابھی تک چوہدری صاحب نے ہمارا حلیہ ملاحظہ نہیں فرمایا ہے۔"

میں نے کہا "بدلا ہوا حلیہ صرف میرا ہے۔ تجھے تو وہ دیکھتے ہی گلے لگالے گا کہ میرے پاکستانی بھائی' تم یہاں کہاں؟"

"میں طوطی صاحب کے ڈرامے باز فرزند سے کہوں گا کہ مجھے بھی شہزادہ سلیم بنادے۔ اس کے پاس میک اپ کا سامان ہوگا۔"

میں نے کہا "یہ انتہائی ضروری ہے ورنہ کسی دن ہو جائے گا آمنا سامنا۔ ویسے تو لندن جیسے شہر میں کسی کو پہچان کے بغیر نام سے تلاش کرنا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا بھوسے کے ڈھیر میں سوئی تلاش کرنا۔ سوئی اگر گھاس کے رنگ کی ہو تو مزید ناممکن۔"

"لیکن اپنے چوہدری صاحب تو خود ہی سامنے آگئے۔ اب ہم کیا کریں گے؟" محسن بولا۔

"کچھ نہیں۔ ہم یہاں بیٹھ کے ناکام ڈرامے کا اختتام دیکھتے ہیں۔ قلاش پور کے راجا کنگال رائے اور سر رچرڈ گورڈن ابھی جھک مار کے واپس چلے جائیں گے۔ یار زندہ صحبت باقی۔"

محسن نے کہا "کیا ہمیں چوہدری دلاور کا تعاقب نہیں کرنا چاہیے؟"

"کرنا تو چاہیے" میں نے کہا "آخر یہ ایک ایکشن' رومانس اور سسپنس سے بھرپور اسٹوری ہے۔"

"ہوشیار! شیر نے ناسمجھ شکاری کو کھانے کا فیصلہ بھی کیا تھا۔"

میں نے کہا "ہاں۔ شیر نے کہا تو تھا مگر شیر اس وقت چائے پی رہا ہے اور اس کا ڈنر ٹائم بھی نہیں ہوا۔"

اسی وقت شرلاک ہومز ٹائپ شخص اوور کوٹ لہراتا اور فیلٹ ہیٹ کو سر پر جماتا نمودار ہوا۔ اس نے برآمدے جیسی کھلی جگہ پر کھڑے ہو کر دوبارا اپنی دو آنکھوں کے دو کیمرے گردوپیش کی منظر کشی کے لیے گھمائے اور مجرمان کو فوکس کرنے کی کوشش کی کہ شاید وہ انجان بنے کہیں قریب ہی کسی کھمبے سے ٹیک لگائے سگریٹ پی رہے ہوں یا کسی بینچ پر اخبار سے چہرہ چھپائے بیٹھے ہوں۔ اسے مجرمان سے ملتا جلتا کوئی چہرہ نظر آتا تو شاید وہ کچھ کرتا مگر وہاں سے صرف کاریں گزر رہی تھیں۔ فٹ پاتھ پر ایک بڑھیا اپنے پالتو شوہر اور کتے کے ساتھ سڑک پار کرنے کا انتظار کررہی تھی اور ایک عشوہ طراز حسینہ کسی کا انتظار کررہی تھی۔ اس نے مایوسی سے نفی میں سرہلایا اور اپنی گاڑی میں بیٹھ کے روانہ ہوگیا۔

"کاش میرے پاس رابعہ کی گاڑی ہوتی" میں نے کہا "مگر اس میں رابعہ نہ ہوتی۔ پیدل تو میں صرف اسی کا تعاقب کرسکتا ہوں۔"

محسن نے فٹ پاتھ پر محوِ انتظار لڑکی کو دیکھا۔ "وہ میں کرلوں گا۔ تو جا اپنے چوہدری دلاور کے پیچھے۔"

"اچھی دوستی ہے۔ مرنے میں جاؤں.... اور اس کے پیچھے میں کیسے جاؤں۔ خود دوڑ لگادے ٹیکسی کے پیچھے۔"

"ایک ٹیکسی کا پیچھا دوسری ٹیکسی میں کیا جاسکتا ہے۔"

"رائٹ" میں نے میز پر ہاتھ مار کے کہا جس سے برتن اچھلے اور ایک کپ نیچے گر کے ٹوٹ گیا۔ حضرات اور خواتین نے بدتمیزی کے اس مظاہرے پر شدید دلی صدمہ محسوس کیا۔ سلطنتِ برطانیہ کی حدود میں کیسے کیسے لوگ داخل ہوجاتے ہیں۔ کالے پیلے سانولے بھورے۔ حرام خور سے آدم خور اقوام تک۔ جن کو شرفا کے ریسٹورنٹ میں بیٹھنا بھی نہیں آتا۔

میں دروازے تک پہنچ کے پلٹا اور چلا کے محسن سے کہا "کپ کی قیمت ادا کردینا۔ کپ توڑنا کوئی جرم نہیں ہے۔"

اس نے چیخ کے جواب دیا "جو کپ کی قیمت مانگے گا میں اس کا سر توڑ دوں گا ناریل کی طرح۔"

دروازے کے پاس ایک بوڑھی میم بیٹھی تھی جس کو دیکھ کے لال لگام والا محاورہ یاد آتا تھا۔ اس نے کانپتے ہوئے اپنے نوجوان ساتھی سے پوچھا "یہ داڑھی والا تو مجھے دہشت گرد لگتا ہے۔ کیا دھمکی دے رہا تھا' ڈارلنگ۔"

نوجوان ڈارلنگ سیلونی یا مدراسی تھا۔ اس نے کہا "ابھی اس کا ساتھی ویٹر کا سر توڑے گا' سویٹ ہارٹ۔ بڑا مزہ آئے گا۔ ہمارے ملک میں ناریل بہت توڑے جاتے ہیں۔ میں بھی توڑتا تھا۔"

فٹ پاتھ پر قدم رنجہ فرماتے ہی میں نے ایک ٹیکسی کو ہاتھ دے کر روک لیا۔ اسے ایک سکھ چلا رہا تھا۔ "واہگورو کا خالصہ۔ کتھے جانا جے سردارا!"

میں نے خفگی سے کہا "چل پھٹ ادھر سے پاگل سکھ دا پتر۔ ہر داڑھی والا سکھ نہیں ہوتا۔ ہم ہیں مولانا۔"

مگر میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی وہ ہوا ہوگیا تھا۔ یہ ایک طرح سے اچھا ہوا کیونکہ دوسری ٹیکسی مجھے فوراً نہیں ملی۔ میری نظر کے سامنے پوسٹ آفس کی عمارت سے کاکروچ برآمد ہوا۔ وہ بھی کچھ دیر اپنے اوورکوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے مایوسی سے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا اور اپنی جھینگر جیسی مونچھیں ہلاتا رہا۔ اس کی گاڑی سڑک کے دوسرے کنارے پر درجن بھر دوسری کاروں کے درمیان کھڑی تھی۔ مؤدب شوفر نے اس کے لیے پیچھے کا دروازہ کھول کے تھام رکھا تھا۔ اس کے ساتھ چوہدری دلاور کو نہ دیکھ کے مجھے بھی کچھ مایوسی ہوئی تھی۔ جس ٹیکسی میں وہ آیا تھا وہ بھی مجھے دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

دھماکا اچانک ہوا۔ میری نظر سڑک پر تھی چنانچہ میں پہلے تو اچھل پڑا اور پھر ایک دم وہیں لیٹ گیا۔ آس پاس بھگدڑ مچ گئی تھی۔ دونوں جانب سے آنے والی کاریں رک گئی تھیں اور کچھ عورتیں چیختی ہوئی اپنی کاروں کی طرف دوڑ رہی تھیں۔ میں نے ایک عورت کے چہرے پر خون بہتا دیکھا۔ جس ریسٹورنٹ سے میں نکلا تھا' اس کے شیشے بکھر گئے تھے اور اندر تاریکی پھیل گئی تھی۔ شاید دھماکے سے بجلی کا تار بھی ٹوٹا تھا۔

محسن دوڑتا ہوا میرے پاس آیا "یہاں کیوں مرا پڑا ہے۔ چل اٹھ۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا "بھاگنا بزدلی ہے' ہم شیر ہیں۔"

اس نے مجھے کھینچ لیا "ابھی پولیس آجائے گی شیر خان۔ آس پاس ہر مشکوک شخص کو پکڑے گی یا گواہی میں نام لکھ لے گی۔"

دھماکا سر رچرڈ گورڈن کی گاڑی میں ہوا تھا اور یقیناً ٹائم بم کے ذریعے کیا گیا تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی تو ساڑھے آٹھ بجے تھے۔ میں اور محسن سست روی سے فٹ پاتھ پر چلنے لگے۔ ابھی تک پوسٹ آفس میں سے قلاش پور کے مہاراجا کنگال رائے برآمد نہیں ہوئے تھے۔ سر رچرڈ گورڈن عرف کاکروچ کی گاڑی میں آگ لگی ہوئی تھی اور وہ خود جہاں کھڑا ہوا تھا وہیں لمبا لیٹ گیا تھا۔ اس کا ڈرائیور حیرت انگیز طور پر صاف بچ گیا تھا یا اسے معمولی زخم آئے تھے۔ وہ دوڑتا ہوا اپنے آقا کی جانب جارہا تھا اور چلا رہا تھا۔

"سر.... سر آپ زندہ ہیں؟" نہ جانے کیوں مجھے اس کی آواز میں امید سے زیادہ افسوس کا تاثر محسوس ہوا۔

"ایڈیٹ۔ پہلے مجھے اٹھاؤ اور پھر پوچھو۔" کاکروچ نے کہا۔

ایک شخص نے ڈرائیور کا حوصلہ بڑھانے کے لیے اس کے کندھے پر تھپکی دی "اگر یہ جواب دے رہا ہے تو یقیناً زندہ ہے۔"

ہمارے سامنے مخالف سمت سے آنے والے ایک شرابی نے مجھ سے سوال کیا "یہ کیسا دھماکا تھا؟"

میں نے کہا "دھماکا! کیسا دھماکا؟ میں نے تو کچھ نہیں سنا۔"

اس نے ہیٹ اتار کے سر جھکایا "اس اطلاع کے لیے بہت شکریہ۔"

محسن نے کہا "کیا ہم اندر جائیں؟"

"اگر ہم اندر گئے تو اندر ہوجائیں گے۔ طوطی صاحب کی ہدایات بھول گیا۔ انہوں نے کہا تھا کہ نہ واردات کرو نہ دیکھو۔"

"یہ اس کی کارستانی تھی۔" میں نے چلتے ہوئے کہا "مگر وہ خود ابھی تک اندر ہے۔ فرار کیوں نہیں ہوا؟"

محسن نے کہا "وہ نکل گیا ہوگا۔ ہم نے دیکھا نہیں۔"

"کب نکل گیا ہوگا۔؟"

"دھماکے سے پہلے۔ مجھے وہ ٹیکسی نظر نہیں آئی تھی جس میں وہ کاکروچ کے پیچھے آیا تھا۔"

"اس نے یہاں بھی ہمارے خلاف چکر چلا دیا ہے۔ ظاہر ہے میری سابقہ محبوبہ کھل کے مجھ پر شک کا اظہار کرے گی۔ کرنا بھی چاہیے۔"

محسن نے کہا "گناہ بے لذت۔ کاکروچ مارا جاتا کم سے کم"

میں نے نفی میں سر ہلایا "دلاور کا یہ منشا اور مقصد نہیں تھا ورنہ دھماکا اسی وقت ہوجاتا جب کاکروچ گاڑی میں تھا۔ الزبتھ ایک عورت ہے۔ وہ ہمارے خلاف زبان سے زہر اگل سکتی ہے؟ اصل خطرناک دشمن تو اس کا یہی شوہر ہے۔ رقابت کے جذبات سے وہ پہلے ہی مغلوب تھا الزبتھ اسے اور بانس پر چڑھاتی ہے۔"

محسن بولا "وہ تو اب ہنگامہ کھڑا کردے گا کہ میری زندگی کو ایک دہشت گرد سکندر بخت سے خطرہ لاحق ہے۔ وہ میری آواز کا ٹیپ پیش کردے گا کہ سکندر بخت ناجائز طور پر لندن میں موجود ہے۔ اس کا سرکاری اثر رسوخ پولیس کے سراغ رسانوں کو مزید مستعد کردے گا۔ بہتر ہے کہ ہم انہیں کچھ نہ بتائیں۔ اپنے طوطی صاحب کو۔"

میں نے کہا "سر رچرڈ گورڈن پر قاتلانہ حملے کی خبر بی بی سی سے نشر ہونے ہی والی ہوگی اور صبح کے سب اخباروں میں یہ خبر تصویروں کے ساتھ آئے گی۔ لیڈی الزبتھ کا بیان ہوگا۔ کاکروچ کے ڈرائیور کا بیان ہوگا۔ ہم طوطی صاحب کو بتائیں نہ بتائیں۔"

محسن بولا "میرا مطلب تھا۔ یہ نہ بتائیں کہ جب دھماکا ہوا تو ہم بھی وہیں موجود تھے اور ہم نے قلاش پور کے مہاراجا کنگال رائے کو ٹیکسی میں سے برآمد ہوکے اندر جاتے بھی دیکھا تھا اور اسے پہچان بھی گئے تھے۔ کیا پتا وہ کون تھا جسے ہم نے دلاور فرض کرلیا تھا۔"

"جمع کا صیغہ مت استعمال کریں شیروانی صاحب! آپ نے فرض کیا تھا۔"

محسن نے کہا "آدمی کی نظر دھوکا بھی کھا جاتی ہے۔"

"آپ آدمی نہیں' شیروانی ہیں۔"

"آپ پاجامے ہیں" محسن نے کہا اور ایک ٹیکسی کو روک لیا۔

ہم طوطی صاحب کے آفس اور گھر کے نزدیک ہی واقع ایک پاکستانی ریسٹورنٹ میں بیٹھ گئے۔ وہاں ہندوستانی' پاکستانی سارے سیاسی اور مذہبی اختلافات بھلا کے دال چاول اپنے اپنے اسٹائل سے نوش فرما رہے تھے۔ کچھ چمچے کانٹے استعمال کررہے تھے۔ کچھ پانچوں انگلیاں' ایک چینی یا کوریائی جوڑا ڈنڈیوں سے چاول کو منہ کے دہانے میں اچھال رہا تھا۔ ایک میز پر دو مدراسی دال چاول سے ہاتھ میں کوفتے جیسے گولے بنا رہے تھے اور اپنے اپنے منہ میں ڈالتے جارہے تھے۔ محسن کا خیال تھا کہ یہ گولے وہ میز پر آمنے سامنے بیٹھ کے ایک دوسرے کے منہ میں بھی پھینک سکتے ہیں۔

"اہلِ ہنود کے ساتھ ہم بھی اپنی اسلامی خوراک کو بھول گئے میرے پاکستانی بھائی" میں نے افسوس سے کہا۔

"آپ کے لیے کھجوریں' اونٹنی کا دودھ یا شتر مرغ کے انڈے کا آملیٹ منگواؤں؟" محسن بولا۔

اچانک ایک شخص ہماری میز پر آبیٹھا۔ وہ ریسٹورنٹ کا مالک تھا جسے ہم کاؤنٹر کے پیچھے دیکھتے تھے "معاف کرنا سرجی۔ آپ وہی ہیں نا' محسن صاحب؟"

محسن کو شاک سا لگا مگر وہ دوستانہ جذبات کے اس مظاہرے کا جواب بے مروتی سے نہیں دے سکتا تھا۔

"ہاں۔ تم نے کیسے پہچانا.... تم کون ہو؟"

اس نے بڑی محبت سے تین بار محسن کو گلے لگایا "سرجی' میں عبدل ہوں۔ ہوسٹل میں ویٹر تھا۔ اب خیر سے یہ ہوٹل کھول لیا ہے۔"

پہچانا تو اسے میں نے بھی تھا مگر محسن نے سخت حیرت اور مسرت کا اظہار کیا "اچھا.... تم عبدل ہو.... بھئی' بہت بدل گئے ہو اور بڑی ترقی کی ہے تم نے تو۔"

عبدل نے کہا "وہ جی۔ یہ کون ہیں۔ آپ کے والد ہیں؟"

میں نے داڑھی پر ہاتھ پھیر کے کہا "نعوذ باللہ۔ ایسی ناخلف اولاد سے...."

محسن نے فوراً کہا "یار' میرے والد شریف آدمی ہیں۔ یہ تو بس ایک دوست ہیں۔"

اس نے مجھ سے مصافحہ کرکے ہاتھ سینے پر رکھا "محسن صاحب! آپ کا ایک جوڑی دار ہوتا تھا.... اس کی آپ کی دوستی بڑی پکی تھی۔ سکندر نام تھا اس کا؟"

محسن نے سوچ کے کہا "ہاں' تھا تو سہی۔"

"بڑا زبردست تھا جی۔ اس کے پاس کوئی جادو تھا سرجی۔ یہ انگریز لڑکیاں اس کے سامنے ٹھہر نہیں سکتی تھیں۔ ہنسی تو پھنسی اور مسکرائی تو آئی۔"

محسن نے کہا "ہاں.... مگر یار ہم بھی کیا کم تھے۔"

"مجھے یاد ہے۔ آپ دونوں کی انگریزوں سے خوب مارا ماری ہوتی تھی۔ اور وہ آپ کا دوست تو سرجی شیر تھا شیر۔"

محسن بولا "شیر ایک جانور ہوتا ہے عبدل! جیسے گدھا...."

"لیکن جنگل کا بادشاہ تو شیر ہی ہوتا ہے۔ آپ کے دوست کا ایک بڑا احسان ہے مجھ پر...."

میں نے بے اختیار کہہ دیا "وہ کیا عبدل!"

محسن نے مجھے گھور کے دیکھا "صوفی صاحب بھی سکندر کے دوست ہیں۔ اسی لیے پوچھ رہے ہیں۔"

"سرجی' انہوں نے میری جان بچائی تھی۔ کچھ بڑے حرامی لونڈے تھے۔ ان کو مجھ پر شک تھا کہ میں پیغام رسانی کرتا ہوں اور پاکستانی لڑکوں کے ساتھ مل کے ان کی گرل فرینڈز کو خراب کرتا ہوں۔ وہ مجھے اٹھا کے لے جارہے تھے قتل کرنے کے لیے۔ اگر سکندر صاحب نہ آجاتے تو سرجی اس دن اپنا معاملہ خلاص تھا۔ ان کا پروگرام تھا کہ مار کے گٹر میں ڈال دیں۔ سکندر صاحب' نے ان کو روک کر پوچھا کہ یہ کون ہے اور اسے کہاں لے جارہے ہو۔ انہوں نے میرا منہ ٹیپ سے بند کررکھا تھا۔ اور میرے بازو دونوں طرف سے پکڑے ہوئے تھے۔ پھر بھی میں نے لاتیں چلائیں تو سکندر صاحب نے ان کو للکارا۔ وہ چار تھے مگر اکیلے سکندر صاحب نے ان کی تو ایسی تیسی کردی۔ اس کے بعد چاروں پہنچ گئے پرنسپل کے گھر شکایت کرنے کہ ہمیں سکندر نے مارا ہے۔ الٹی بات کی انہوں نے کہ سکندر ایک ویٹر کو مار رہا تھا۔ ہم نے اسے بچانا چاہا تو

سکندر نے ہمیں بھی مارا۔ سکندر کی پولیس میں رپورٹ لکھوا دی گئی لیکن سرجی۔ میرے بیان نے ان کی تو اسٹوری ہی غلط کر دی۔ پرنسپل نے ان کو وارننگ دی اور پولیس نے چاروں کے والدین کو تنبیہہ کی کہ لڑکوں کو پٹا ڈال کے رکھیں۔ اس دن کے بعد وہ چاروں میرے بھی دشمن بن گئے تھے۔ بس سکندر صاحب کی وجہ سے میں بچا ہوا تھا۔"

محسن نے سوچ کے کہا "ہوں۔"

"آپ کو پھر دیکھ کے بڑی خوشی ہوئی سرجی۔ یہ آپ کا ہی ہوٹل ہے۔ کبھی سکندر صاحب سے ملاقات ہو تو میرا سلام دینا۔ بے شک زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے لیکن اس دن سکندر صاحب نہ آتے تو پتا نہیں کیا ہو جاتا۔ قتل نہ کرتے ہاتھ پاؤں توڑ دیتے تو معذور ہو جاتا میں ساری زندگی کے لیے۔ آج اپنے ہوٹل میں شان سے بیٹھا ہوں.... میرے لیے کوئی خدمت ہو تو فرماؤ۔"

"مسٹر عبدل۔ ہم یہاں کتنی دیر سے بیٹھے ہوئے ہیں۔"

"یہی کوئی آدھے گھنٹے سے۔"

"کیا تم ضرورت پڑنے پر کہہ سکتے ہو کہ ہم ایک گھنٹے سے یہاں تھے۔"

اس کا رنگ کچھ بدلا پھر بولا "خیر تو ہے سرجی۔ کیا کوئی قتل وغیرہ کا معاملہ ہے؟"

"نہیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہم پوسٹ آفس گئے تھے فون کرنے۔ وہاں کسی نے ایک کار پر بم پھینک دیا۔"

"کس کی کار پر سرجی؟"

"ہمیں کیا معلوم یار۔" محسن بولا "ہم نے وہاں ایک منٹ رکنا مناسب نہیں سمجھا ورنہ گواہی کا چکر ضرور پڑ جاتا۔ یہ تو کل پتا چلے گا کہ یہ کس کی حرکت تھی۔"

"آپ فکر ہی مت کرو سرجی۔ یہاں کی پولیس ایسی نہیں ہے کہ زبردستی بیان لے' میں کہہ دوں گا..."

"پولیس شاید نہ پوچھے مگر طوطی صاحب سے خطرہ ہے۔ اپنے حاجی علم دین...."

"وہ تو میں سمجھ گیا سرجی۔ انہیں کون نہیں جانتا۔ لیکن وہ کیوں پوچھیں گے آپ کے بارے میں۔"

"مسٹر عبدل۔ کیا تم جانتے ہو کہ ہر سال کتنے غیر ملکی جائز طور پر یہاں آتے ہیں اور کتنے حرامی طریقے سے آتے ہیں؟"

عبدل دم بخود رہ گیا "حرامی طریقے سے! آپ کا مطلب ہے پیدا ہوتے ہیں.... ناجائز تعلقات کے نتیجے میں۔"

"نہیں یار! میرا مطلب تھا ناجائز طریقے سے برطانیہ آتے ہیں۔"

اس نے سر کھجایا "ہزاروں آتے ہوں گے۔"

"اس سال ان کی تعداد میں دو کا اضافہ ہوا ہے۔ میں اور یہ صوفی صاحب پاسپورٹ ویزا کے بغیر یہاں آ گئے تھے۔ طوطی صاحب کے پاس قیام ہے ابھی۔ امید یہ تھی کہ وہ کچھ مدد کریں گے مگر انہوں نے کہا کہ اب حالات پہلے جیسے نہیں رہے۔ شاید ہم کو واپس پاکستان جانا پڑے گا۔ انہوں نے سمجھا دیا تھا کہ یہاں کسی قانونی معاملے میں بالکل مت پڑنا۔ گواہی کا معاملہ بھی قانونی ہے۔ اب ہمیں کیا معلوم تھا کہ وہاں دھماکا ہونے والا ہے۔"

"تو کیا آپ کا نام لکھا گیا ہے گواہی میں؟"

"نہیں۔ ہم تو بھاگ آئے تھے لیکن کیا پتا کسی نے بھاگتے ہوئے دیکھ لیا ہو۔"

عبدل نے کہا "پھر تو آپ فکر ہی مت کرو جی۔ میں نے کہا کہ آپ ایک گھنٹے سے ادھر ہو تو پولیس کی بھی مجال نہیں جو میرے بیان کو چیلنج کرے۔ ادھر زبردستی بیان لینے کا دستور نہیں ہے سرجی۔"

محسن نے کہا "اچھا تو پھر ہم چلتے ہیں۔ حاجی صاحب منتظر ہوں گے۔"

عبدل نے کہا "لو جی وہ آ گیا حاجی صاحب کا پتر نوردین۔"

محسن نے اور میں نے باہر دیکھا تو وہ سیدھا ریسٹورنٹ کی طرف آ رہا تھا۔ شہزادہ سلیم اور چیف رپورٹر ہفت روزہ طوطی۔

اس نے اندر آتے ہی کہا "آپ یہاں بیٹھے ہو جی مزے سے ابا جی' انتظار کر رہے ہیں آپ کا۔"

"تمہیں کس نے بتا دیا کہ ہم یہاں ملیں گے۔"

"کسی نے بھی نہیں۔ مجھے تو ابا جی نے کہا کہ جاؤ انہیں کہیں سے بھی تلاش کر کے لاؤ تو میں نے کہا کہ اچھا جاتا ہوں۔ اب آپ ابا جی کو یہ مت بتانا کہ آپ کو میں نے بھیجا تھا..."

"اس میں کیا خرابی ہے؟"

"اس میں اچھائی یہ ہے کہ میں آؤں گا ایک گھنٹے بعد۔ کسی سے مل کے۔ واپس جاؤں گا تو کہہ دوں گا کہ سارا لندن دیکھ لیا آپ نہیں ملے" اس نے ہمیں آنکھ ماری۔

"ہم تمہاری مدد کر سکتے ہیں۔ تم چاہو تو دو گھنٹے بعد آؤ لیکن اس کے بعد تمہیں بھی ہمارا ایک کام کرنا ہو گا۔ تمہارے لیے بہت معمولی کام ہے۔"

"کیا کام ہے؟" اس نے کہا۔

"واپس آؤ گے تو ہم بتائیں گے" محسن بولا "جاؤ عیش کرو کیونکہ اللہ نے مقدر میں عیش لکھ دیا ہے۔ جوانی بھی لندن میں آئی ہے تم پر۔ جوان ہوتے پنڈ دادن خان میں تو ہل چلاتے اور گائیں چراتے۔ تمہاری اور بیل کی زندگی میں کوئی خاص فرق نہ ہوتا۔"

اس نے کہا "ابا جی کی کم عیش ہے اس عمر میں بھی۔ میرے پاکستانی بھائی!"

وہ بدمعاشی سے ہنسا اور عبدل سے سو پاؤنڈ لے کر چلا گیا۔ ہمیں بعد میں معلوم ہوا کہ اس کا عبدل سے حساب چلتا تھا۔ عبدل کے ہوٹل کا اشتہار اس کی تصویر کے ساتھ "مفت" چھپا کرتا تھا۔

حاجی علم دین طوطی اپنے کمرے میں اسی طرح پھڑک رہے تھے جیسے طوطا پنجرے میں پھڑکتا ہے۔ "کہاں گم ہو گئے تھے میری سرکار۔ میں نے تو ہر طرف خیال کے گھوڑے دوڑائے اور پھر نوردین سے کہا کہ عبدل کے ہوٹل پر دیکھو.....وہ ملا تمہیں؟"

میں نے اور محسن نے کہا "نہیں۔ ویسے تو ہم وہیں تھے گھنٹے بھر عبدل سے گپ شپ کر رہے تھے۔ جب ہم لندن میں پڑھتے تھے تو یہ ہمارے ہوسٹل میں بیرا تھا۔"

"عبدل کا ہوٹل مرکزِ اطلاعات ہے۔" حاجی صاحب بولے "جن کا کوئی پتا ٹھکانا یا فون نمبر نہ ہو ان کے پیغامات وہیں موصول ہوتے ہیں۔ کوئی آتے جاتے اسے بتا دیتا ہے۔ خیر تم فوراً جا کے ملو وکیل سے۔ اس نے سارا بندوبست کر لیا ہے۔ دو بار فون آ چکا ہے اس کا میرے پاکستانی بھائی۔"

"کہاں جائیں ہم؟ اس کے گھر یا اسپتال؟"

"اسپتال جاؤ۔ وہ تم کو نرسنگ کوارٹرز کی کینٹین میں ملے گا۔ کینٹین میں نہ ہو تو وہاں ایک ویٹریس ہے سونی۔ اپنے پیارے پاکستان کی سوہنی نہیں 'کورین ہے' چپٹی ناک اور پیلے رنگ والی۔ ٹیکسی لو اور فائنٹ پہنچ جاؤ۔ وہ حرامی نوردین کہاں گیا؟ اگر تمہیں نہیں ملا۔"

میں نے کہا "کیا پتا وہ بعد میں پہنچا ہو۔ بے چارہ ہمیں تلاش کرتا پھر رہا ہو گا۔ بڑا نیک اور سعادت مند بچہ ہے۔ آپ کے حکم کی تعمیل..."

حاجی صاحب نے سر ہلایا "چھوڑو یہ بات میرے پاکستانی بھائی۔ میں جانتا ہوں وہ کتنا نیک اور کتنا سعادت مند ہے۔ آخر باپ ہوں اس کا۔ مجھے معلوم ہے کہ اس بہانے وہ مل کے آئے گا ان [illegible] سے۔ آپ کہو تو ابھی دو منٹ میں [illegible] اسے پیچھے والے مکان سے؟"

میں نے کہا "اس کی کیا ضرورت ہے' ہم جاتے ہیں۔"

"جاتے ہوئے دو سو پاؤنڈ ضرور لے جانا۔ بقایا ادا کرو گے تو وہ یہودی باقی کام کرے گا۔"

ہم ساڑھے نو بجے اسپتال کے دروازے پر اترے تو ایک چوکیدار ٹائپ شخص نے ہمیں روک لیا "اسپتال آنے جانے والوں کے لیے یہ راستہ نو بجے تک کھلا رہتا ہے۔"

میں نے کہا "نو بجے کے بعد کوئی بیمار نہیں ہو سکتا۔ کسی کو حادثہ پیش آ جائے پھر؟"

"پھر وہ میری طرف سے جائے جہنم میں۔ تم کو اندر جانا ہے تو پیچھے دوسرا گیٹ ہے اسٹاف کے لیے۔"

وکیل ہمیں کینٹین کے اندر بڑی افسوس ناک حالت میں ملا۔ وہاں بیٹھے رہنے کے لیے اور اپنی کوریائی سوہنی کے دستِ نازک سے پینے کے لیے وہ چائے کی سات پیالیاں حلق سے اتار چکا تھا اور آٹھویں ایسے لیے بیٹھا تھا جیسے اس پر نیاز دے رہا ہو۔ اس کے بیان کے مطابق چھ پیالیاں اس کی قارورہ میں شامل ہو کے خارج ہو گئی تھیں۔ آٹھویں پیالی محسن نے اور نویں میں نے نوش فرمائی اور کورین سوہنی کے دیدار سے بھی فیضیاب ہوئے۔ طوطی صاحب نے اس کے بیانِ حسن میں خاصی کنجوسی برتی تھی۔ وہ واقعی اتنی حسین اور دلکش جسم کی مالک تھی کہ کوئی بھی اس کی خاطر نو پیالی چائے کیا جوشاندے کی بھی پی سکتا تھا۔

"میں گیا تھا حبشی کے گورے وکیل کے پاس۔ الفریڈ نام ہے اس کا۔ اتفاق سے وہ مل گیا اور اتفاق سے شریف آدمی بھی ثابت ہوا۔ اتفاق سے وہ فارغ تھا۔ اتفاق سے اس کو جارج یاد تھا۔"

میں نے کہا "چنانچہ اس نے تمہارے موقف سے اتفاق کیا۔"

"ہاں۔ اس نے فوراً ٹیلی فون اٹھا کے جیل کے کسی افسر کا فون نمبر ملایا اور اسے بہت سخت سست کہا اور بڑی دھمکیاں دیں کہ ایک قیدی کو قتل کرنے کی کوشش کا خمیازہ انہیں بھگتنا پڑے گا۔ اس نے کہا کہ میں ابھی سیاہ فام قیدیوں کے حقوق کی انجمن اور ہیومن رائٹس والوں سے اور اخبار والوں سے رابطہ کرتا ہوں۔ جیل والے بضد تھے کہ ایسی کسی واردات میں ان کے عملے کا کوئی فرد ملوث نہیں۔ یہ سیکیورٹی والوں کی کوتاہی تھی کہ دلاور نام کا کوئی شخص جارج سے ملنے پہنچ گیا اور اس نے جارج کو ایک سگریٹ کا پیکٹ دیا۔"

"جارج نے بتایا ہے کہ ملاقاتی کا نام دلاور تھا؟"

"ہاں۔ اور کون بتا سکتا ہے؟"

میں نے کہا "یہ نام وزیٹرس بک میں بھی تو ہو گا۔ جو لوگ کسی قیدی سے ملاقات کرنے جاتے ہیں' ان کا نام پتا اور قیدی سے رشتہ وغیرہ کسی رجسٹر میں لکھا جاتا ہو گا؟"

محسن بولا "کیا یہاں ملاقات کا شیڈول نہیں ہوتا۔ کوئی کسی بھی وقت جیل جا کے قیدی سے مل سکتا ہے۔"

"آف کورس ایسا نہیں ہے" وکیل نے کہا "خصوصی ملاقات ہو تو اس کی وجہ کا بھی اندراج ہوتا ہے۔ خصوصی اجازت یا تو عدالت دیتی ہے یا پھر جیلر دے سکتا ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ رجسٹر میں دلاور کا نام ہی نہیں۔"

"پھر کس کا نام ہے؟"

"جارج کے ملاقاتی کا نام سکندر بخت درج ہے۔"

میں اور محسن اس انکشاف پر نہ اچھلتے تو کیا کرتے۔ میں نے سخت احتجاج کرتے ہوئے کہا "یہ کیا بات ہوئی؟"

محسن نے کہا "جس کا دل چاہے..... وہ کچھ بھی نام لکھوا دے۔ تمہارا نام لکھوا دے' کسی ثبوت کے بغیر...؟"

وکیل نے کہا "تم جذباتی ہو رہے ہو۔ اگر تم کسی کو اپنا نام بتاتے ہو تو کیا وہ پوچھتا ہے کہ کیا ثبوت ہے تمہارے پاس۔ ایسے تو بڑا مسئلہ پیدا ہو سکتا ہے کہ دو اجنبی ہاتھ ملا کے ایک دوسرے سے اپنا تعارف کرائیں تو یہ نہ کہیں کہ آپ سے مل کر خوشی ہوئی' یہ کہیں کہ تصدیق کے کاغذات ملاحظہ فرمائیے۔"

میں نے کہا "اس کو اجازت کس نے دی تھی آخر؟"

"جیلر نے یہ بات وہ تسلیم کرتا ہے۔ اسے سر جیرڈ گورڈن نے فون پر کہا تھا کہ جارج سے کوئی ملنا چاہتا ہے۔ میری وائف کا پرانا کلاس میٹ ہے وہ اور اس کا نام ہے سکندر بخت۔ یہی وجہ ہے کہ جیل کے آفس میں پہنچ کے جب کسی نے کہا کہ میں سکندر بخت ہوں اور مجھے جارج سے ملنا ہے۔ جیل میں ہوں گے درجنوں جارج۔ اس نے پورا نام اور حوالہ نمبر بھی بتایا ہوگا۔ پھر کون شک کرسکتا تھا۔ اسے اندر بھیج دیا گیا تھا۔ یہ تو بعد میں جارج نے شور کیا کہ چوہدری دلاور کو میرے پاس کس نے بھیجا تھا اور کیوں؟ اس نے شریفانہ زبان میں یہ سوال نہیں کیا تھا۔ کیا تم اس کے اصل الفاظ سنو گے؟"

"نہیں۔ کیا رجسٹر میں اندراج خود دلاور نے کیا تھا؟"

"اندراج تو آفس کے کسی کلرک نے کیا ہوگا مگر ملاقاتی کو اپنے دستخط کرنے پڑتے ہیں۔ ظاہر ہے دلاور نے غلط دستخط کیے ہوں گے۔ نام ایسے لکھ دیا ہوگا کہ سکندر بخت پڑھا جائے۔"

دلاور کا سازشی ذہن لندن پہنچتے ہی مصروفِ کار ہوگیا تھا۔ اس نے سکندر بخت کے نام کو گمنامی میں نہیں رہنے دیا تھا۔ الزبتھ اور اس کے حاسد وکم ظرف شوہر کو پہلے سے معلوم ہوگیا تھا کہ سکندر بخت لندن میں وارد ہوچکا ہے۔ میرے استقبال کی تیاریاں مکمل تھیں اور الزبتھ کسی آتش فشاں کی طرح نفرت کا سارا لاوا مجھ پر اور رابعہ پر اگلنے کی دلی خواہش مند تھی۔ اس کے کاکروچ شوہر کا انتقامی جذبہ زیادہ شدید اور خطرناک انداز میں سامنے آچکا تھا لیکن چوہدری دلاور ان سب پر بازی لے گیا۔ اس نے میرے نام کو وہ پبلسٹی دے دی جس سے میں گریزاں تھا۔ میرا نام اب جیل کے رجسٹر میں لکھا ہوا تھا۔ جارج جتنا چاہے چیخے چلائے۔ اس کی پہلے کس نے سنی تھی کہ اصل قاتل چوہدری دلاور ہے۔ حالات کی گواہی پھر اس کے خلاف جائے گی۔ یہ ثابت ہوجائے گا کہ سکندر بخت چوری چھپے لندن جا کے جارج سے ملنا چاہتا تھا۔ اس نے وقار یوسف کے نام سے جعلی پاسپورٹ بنوا کے قونصلیٹ سے ویزا حاصل کرنے کی ناکام کوشش بھی کی تھی اور پھر کسی نہ کسی طرح لندن پہنچنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ ہزاروں لوگ ہر سال پولیس اور کسٹم حکام کو جل دے کر، اور بقول محسن کے حرامی طریقے سے لندن پہنچ بھی جاتے ہیں۔ چوہدری دلاور نے سر جیرڈ گورڈن کو بچاتے ہوئے اس کی کار میں بم کا دھماکا بھی کرادیا تھا اور اب یہ لازمی بات تھی کہ مرحوم نہ ہونے کے بعد کاکروچ کی زبان پر میرے سوا کسی کا نام نہیں آئے گا۔ وہ صاف کہے گا کہ یہ کارستانی سکندر بخت کی تھی۔ اس نے میری بیوی کو فون کرکے دھمکی بھی دی تھی۔ میرا فون آبزرویشن پر تھا۔ ٹیپ میں اس کی آواز موجود ہے۔

غصے سے میرا خون کھول رہا تھا مگر میں بے بس تھا۔ چوہدری دلاور مجھ سے بہت آگے جارہا تھا اور میں اس کے پھیلائے ہوئے جال میں پھنسا چلا جارہا تھا۔ ان حالات میں میرا بہت زیادہ عرصہ لندن میں روپوش رہنا بھی ناممکن ہوگیا تھا۔ جب اخبارات کی

سرخیاں دھماکے اور سر جیرڈ گورڈن کے بیانات سے بھری ہوں گی لندن کی پولیس سکندر بخت کو پکڑنے کے لیے لندن کو چھان مارے گی۔ وہ خاک بھی چھانتے ہیں تو ذرہ ذرہ الگ کرلیتے ہیں۔ عام حالات میں کوئی پاکستانی یا غیر ملکی اپنے ہم وطنوں کی مدد سے روپوش رہنا چاہے تو پولیس بھی زیادہ تردد نہیں کرتی مگر معاملہ ہو کسی گورے کا تو پھر سراغ رسانی کے ماہرین اور اسکاٹ لینڈ یارڈ والے سرگرم ہوجاتے ہیں اور کوئی آنجہانی ہوجائے تو اس کے جسم کو پاتال سے اور روح کو عالم بالا سے عدالت میں حاضر کردیتے ہیں۔

میرے لیے حالات بڑی تیزی سے پُرتشویش ہو رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی حوصلہ افزا بات یہ تھی کہ ابھی صرف دوسرا دن تھا اور ہم جارج سے ملاقات کرنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ چوہدری دلاور نے جہاں ہمارے لیے مشکلات پیدا کی تھیں وہیں اس کی ایک معمولی سی ناکامی نے ہماری کامیابی کی منزل کو آسان کردیا تھا۔ جیل کے اندر شاید جارج سے ملنا دشوار ہوتا مگر اسپتال میں یہ کام بہتر طور پر بہت کم وقت میں ہوگیا تھا۔

وکیل کی کارگزاری یقیناً قابلِ داد تھی۔ چار سو پاؤنڈ اس کے لیے ایک خطیر رقم تھی مگر ہمارے لیے یہ زندگی اور موت کا سوال تھا۔ اس کے لیے ہم ہر قیمت ادا کرسکتے تھے۔ سارا کمال وکیل کے ذہن کا تھا جس نے حصولِ مقصد کی خاطر دھن، دھونس اور دھاندلی کے سب حربے آزمائے اور اچھی منصوبہ بندی کی۔ اس نے رابطے اور راستے تلاش کیے۔ وقت سے فائدہ اٹھایا، کسی کو دھمکی دی اور کسی کو بلیک میل کیا۔ جھوٹ سے اور چالاکی سے کام لیا مگر اس کے بغیر چارہ بھی نہ تھا۔ یہ شرافت اور قاعدے قانون کے مطابق ہونے والا کام نہیں تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ چار سو پاؤنڈ سارے اس کی جیب میں گئے ہوں گے، اس نے رشوت کسی کو بھی نہیں دی تھی لیکن مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں تھا کہ چار سو پاؤنڈ کہاں اور کیسے خرچ ہوتے ہیں۔

وکیل نے گھڑی دیکھ کے کہا "دس تو بج گئے۔"

محسن نے پوچھا "ملاقات کے لیے کیا وقت طے ہوا ہے؟"

"بارہ بجے شفٹ بدلے گی۔ اسپتال کا اسٹاف دوسرا آئے گا۔ باہر پولیس والے بھی تبدیل ہوں گے۔ یہ لوگ صبح آٹھ بجے تک ڈیوٹی دیں گے.... انہی سے بات ہوئی ہے۔"

میں نے کہا "یعنی ابھی دو گھنٹے اور گزاریں گے ہم یہاں۔ تم نے بڑی جلدی کی تھی۔ طوطی صاحب سخت پریشان تھے۔ تمہارے فون پر فون آرہے تھے تو ہمارا کچھ پتا نہیں تھا۔"

"میں نے صرف ایک بار فون کرکے کہا تھا کہ انہیں میرے پاس بھیج دیں۔ مجھے تم سے بات تو کرنی تھی۔ تم وکیل ہونا۔"

"ہاں۔ پاسپورٹ میں میرا نام وقار یوسف ایڈووکیٹ ہے۔"

"اور تم...؟" وہ محسن سے مخاطب ہوا۔

"میں جرنلسٹ ہوں۔"

وہ سوچ میں پڑ گیا "پھر تم جارج سے نہیں مل سکو گے، سوری۔"

محسن نے کہا "کوئی بات نہیں۔ کیا صرف وکیل کو ملاقات کی اجازت دی گئی ہے؟"

"اجازت کیا... سودا ہوا ہے" وکیل نے کہا "الفریڈ نے جیل حکام کے بعد پولیس کمشنر سے بات کرنی چاہی مگر وہ ملا نہیں۔ ملتا بھی تو شاید بات نہ بنتی۔ وہ بڑا خر دماغ ہے۔ اخبار والوں سے بھی لڑ پڑتا ہے چنانچہ وہ اس سے سخت خفا ہیں اور اس کا امیج خراب کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ الفریڈ کہتا ہے کہ میرے بارے میں جو بکواس کرتا ہے کرے، میرا کچھ نہیں بگڑتا۔ لیکن ایسا نہیں ہے، یہ اخبار والے جس کے پیچھے پڑجائیں اس کا ستیاناس کرکے چھوڑتے ہیں۔ خیر اس کے ڈپٹی نے الفریڈ کو یقین دلایا کہ وہ ہر طرح سے تعاون کرنے کو تیار ہے۔ اگر غلطی پولیس کی ہوگی تو انہیں بخشا نہیں جائے گا۔ وہ کل خود جائے گا مگر اس نے الفریڈ کو اجازت دے دی ہے کہ جارج سے ملاقات کرلے۔"

"کیا وہ اجازت دے سکتا ہے؟"

"قانونی طور پر تو نہیں۔ اور یہی ہمارے حق میں اچھا ہوا۔ ہم کورٹ سے اجازت لیتے یا جیلر سے تو آسان نہ ہوتا۔ اس کے علاوہ یہ اجازت ریکارڈ پر آجاتی۔ اب پولیس چیف کی طرف سے اگر اس کا ڈپٹی کسی سے کوئی درخواست کرے تو وہ مان ہی جاتا ہے۔ خصوصاً ان حالات میں کہ معاملہ نازک ہو اور افہام و تفہیم سے بگڑی بات بن جانے کا امکان نظر آئے۔ پولیس کمشنر کے ڈپٹی نے جیلر سے پوچھا کہ اس نیگرو کو زہر دینے کا جو واقعہ پیش آیا تھا ابھی تک اس کی خبر باہر تو نہیں پہنچی؟ جیلر نے کہا کہ ہم خود کیوں پہنچائیں گے لیکن جارج کا وکیل اس سے ملے گا تو خاموش نہیں بیٹھے گا۔ ہنگامہ کرنا اس کا حق ہے اور اس کے مفاد میں ہے۔ ڈپٹی چیف نے کہا کہ جارج کے وکیل نے مجھ سے بات کی تھی۔ اس کا فیصلہ تو بعد میں ہوگا کہ غلطی اور کوتاہی جیل کے عملے کی تھی یا حفاظتی عملے کی لیکن اس کیس میں ایک اور بھی پیچیدگی ہے۔ ملاقاتی کا نام جیل کے ریکارڈ پر کچھ اور ہے۔ جارج اس کا نام کچھ اور بتاتا ہے۔ جیلر نے کہا کہ وہ تو حرامی ہے، فائدہ اٹھانا چاہتا ہے صورتِ حال سے۔ کہہ رہا تھا کہ اس کا ملاقاتی وہی تھا جو اصل قاتل تھا جس نے دہرے قتل کی واردات کی تھی مگر پکڑا میں گیا تھا۔ اسے نام بھی یاد تھا۔ وہ اس بنیاد پر ہمارے لیے مصیبت پیدا کرسکتا ہے کہ ایک تو اس کو ناکردہ گناہ پر جیل کاٹنی پڑی، ہم نے اصل قاتل کو بچایا اور اب ہم چاہتے ہیں کہ جارج کو جیل میں ہی ٹھکانے لگادیا جائے۔ اس کا قاتل آخر اس سے ملنے کیسے پہنچا اور جیل حکام نے اسے کیسے اندر جانے دیا کہ وہ جارج کو بھی مار دے۔ خیر اس پر پولیس کے ڈپٹی چیف نے کہا کہ جارج کا وکیل اس سے ملاقات کرنا چاہتا ہے اور اس نے وعدہ کیا ہے کہ یہ جارج کا ڈراما ثابت ہوا تو وہ قانون کی مدد کرے گا اور جارج کو بھی سمجھادے گا کہ بلاوجہ جیل میں اپنے لیے مسائل پیدا نہ کرے۔ اچھے رویے کے باعث اسے جو رعایت مل سکتی ہے وہ ضائع ہوجائے گی اور اس کی پیروی پر رہائی کے امکانات بالکل معدوم ہوجائیں گے۔ جیلر نے کہا کہ یہ ملاقات میں تمہاری ضمانت اور یقین دہانی پر کرا سکتا ہوں۔ ذمے دار ہوگا تمہارا حفاظتی عملہ۔ اگر اس غیر سرکاری ملاقات کی خبر باہر پہنچی۔ پولیس کے ڈپٹی چیف نے یہ ذمے داری قبول کرلی اور کہا کہ جارج کو اپنے وکیل سے ملنے دو۔ اس ملاقات کے نتیجے میں کوئی اچھی بات معلوم ہوتی ہے جس سے پولیس اور جیل حکام دونوں کی پوزیشن خراب ہونے سے بچ جائے تو یہ چانس لیا جاسکتا ہے۔ بس وکیل کی اچھی طرح تلاشی لینا۔ وہ اپنے ساتھ کوئی غلط چیز نہ لے جائے مثلاً ٹیپ ریکارڈر وغیرہ۔ جیلر مان گیا اور یوں ایک خفیہ اور غیر سرکاری ملاقات کا بندوبست ممکن ہوا۔"

"کیا جیلر نے جارج کے وکیل کا نام نہیں پوچھا تھا؟"

"پوچھا تھا۔ جب بعد میں میری الفریڈ سے دوبارہ بات ہوئی تو اس نے کہا کہ فکر مت کرو۔ میں صبح جارج سے ملوں گا۔ میں نے کہا کہ سر، آپ کیوں اپنی پوزیشن خراب کرتے ہیں۔ آپ اتنے مشہور وکیل ہیں۔ کسی نے آپ کو وہاں دیکھ لیا تو خواہ مخواہ بات پھیلے گی اور آپ کی بدنامی ہوگی۔ میں مل لیتا ہوں اس سے اور جارج سے دوستانہ طریقے پر بات کرکے دیکھتا ہوں۔ میں اس کا ہم وطن تو خیر نہیں مگر کالا ضرور ہوں۔ شاید وہ مجھ پر اعتماد کرے اور سچ بتادے۔ الفریڈ نے کہا کہ کوئی حرج نہیں تمہارے ملنے میں بھی۔ مجھے بتانا کہ جارج کیا کہتا ہے۔ اس کے بعد میں صبح جارج سے ملوں گا۔ میں نے کہا کہ پھر آپ پولیس کے چیف کو بتادیں کہ ایک نیٹو NATIVE وکیل اگر جارج سے ملنا چاہے تو اسے نہ روکا جائے۔"

میں نے کہا "تم بہت چالاک ہو۔"

"ہیرا پھیری تو اس پیشے کا ہنر ہے کیونکہ واسطہ بھی شریف لوگوں سے نہیں پڑتا" وہ بولا "پولیس کے ڈپٹی چیف نے وعدہ کیا کہ وہ رات کی گارڈ ڈیوٹی والوں کو سمجھادے گا مگر یہ آپس کے اعتماد کا معاملہ ہے۔ اس کی پوزیشن خراب نہیں ہونی چاہیے۔ اخبار والوں کو ہوا بھی نہیں لگنی چاہیے۔ ہم معاملے کو سلجھانے کے لیے یہ قدم اٹھا رہے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ معاملہ اور الجھ جائے۔ اور الفریڈ نے کہا کہ فکر مت کرو، ایسا ہی ہوگا جیسا تم چاہتے ہو۔ دراصل خود الفریڈ بھی پریشانی سے اور مفت کی مقدمے بازی سے بچنا چاہتا ہے۔ جارج خاموش رہے تو وہ بھی اپنا کام کرتا رہے گا ورنہ اسے جارج کی طرف سے قانون کے مطابق کارروائی کرنی پڑے گی اور جارج کوئی اس کا باپ یا بھائی نہیں ہے کہ وہ اس کے لیے وقت ضائع کرے تو اسے اپنی اخلاقی ذمے داری سمجھے۔"

"اگر جارج کی جگہ سفید چمڑی والا ہوتا پھر؟"

"پھر کچھ نہیں۔ قانونی پوزیشن تو بدل نہیں سکتی۔ الفریڈ کے جذبات اور نسلی تعصب کے معاملے میں اس کے نظریات کچھ بھی ہوں، ایک وکیل کی حیثیت سے موکل کی ہر ممکن قانونی مدد اس کا فرض ہے۔ کیا حرج ہے اگر ہم کھانا کھالیں؟"

سوال اس نے روانی میں کردیا تھا چنانچہ کچھ دیر تو میں اور

محسن ایسے ہی بیٹھے رہے۔ پھر میں نے کہا "کھانا؟..... واقعی، خوب یاد دلایا۔"

محسن نے کہا "تم نے دس اور ہم نے تین تین کپ چائے خواہ مخواہ پی۔ سونی کی وجہ سے۔"

وہ بولا "آف کورس سونی کی وجہ سے۔ کھانا بھی ہمیں وہی کھلائے گی۔"

"اپنے پیارے پیارے نازک ہاتھوں سے" محسن بولا۔

میں نے کہا "سوال یہ ہے کہ کیا کھلائے گی؟"

وکیل نے کہا "جو اسے پسند ہوگا۔"

میں نے کہا "کوریا کے لوگ کتے بہت شوق سے کھاتے ہیں۔"

اس نے کچھ برا مانا "مگر وہ لندن میں ہے۔"

"لندن میں لحم خنزیر بھی تو ملتا ہے.... اور یہ کافر بہت سے کھانوں میں وہ بھی ڈالتے ہیں، ذائقے کے لیے.... ام الخبائث۔"

وکیل نے سوچ کے کہا "یہ کیا چیز ہے؟ کوئی ساس یا چٹنی؟ مسالے میں شامل..."

میں نے کہا "مئے ناب.... بادۂ گلرنگ..."

"اردو میں بتاؤ بھائی!" وہ چکرا گیا۔

محسن نے کہا "آتش سیال.... انگور کی بیٹی۔"

وہ مسکرانے لگا "نہیں۔ سونی جانتی ہے کہ میں مسلمان ہوں اور یہاں کوئی لمبا چوڑا مشکل مینو بھی نہیں ہوتا۔"

سونی نے مجھے اور محسن کو قائل کرنے کی کوشش کی کہ آس پاس جتنے لوگ اسٹیک، برگر اور ہاٹ ڈاگ اتنے ذوق و شوق سے کھا رہے ہیں اس میں بکرے کا خالص گوشت ہے اور اس میں سفید یا لال شراب کا تڑکا بھی نہیں لگایا گیا مگر اگلا مرحلہ زیادہ نازک تھا جو سونی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ بکرا کیسے کاٹا گیا تھا؟ اس کو قتل کیا گیا تھا یا ذبح؟ وہ خاصی حیران ہوئی کیونکہ اس کے خیال میں مرغی ہو بکرا یا بیل، اسے انسانی خوراک میں شامل ہونے سے پہلے مرنا تو پڑتا ہی ہے۔ آج تک فوت کیے جانے والے جانوروں کے بارے میں کوئی نکتۂ اعتراض موصول نہیں ہوا کہ ان کی موت کیسے واقع ہوئی؟ انسانوں کو پہلے سولی پر ٹانگا جاتا تھا پھر پھانسی دینے لگے۔ اس کے بعد الیکٹرک چیئر بنی پھر گیس چیمبر استعمال ہوئے اور آج کل تو ایک انجکشن لگا کے سزائے موت دی جاتی ہے مگر.....!

میں نے اس کی تقریر دل پذیر میں مداخلت کی "مس سونی! ہم کو شرمیٹ کھا سکتے ہیں۔ آئی بات سمجھ میں؟"

وہ فوراً سمجھ گئی "اوہ۔ تم یہودی ہو۔ تمہارا دوست مسلمان ہے، تمہیں تو دشمن ہونا چاہیے۔ خیر ہم کوشر میٹ استعمال نہیں کرتے۔ تم اور کچھ کھالو۔ مثلاً....." اس نے کہا اور پھر سوچ میں پڑ گئی کہ اب کیا مثال دے اور متبادل خوراک کیا تجویز کرے۔

میں نے کہا "ہم مچھلی کھا سکتے ہیں ورنہ دال سبزی۔ یہ بھی نہیں تو مس سونی! ہم فرض کر سکتے ہیں کہ کھانا کھالیا۔"

اس کے چاہنے والے وکیل نے کہا "تم میرے لیے اسٹیکس لاؤ۔ ان کو آملیٹ لا دو۔ فرض کرلو کہ یہ ناشتا کریں گے اور میں ... کھاؤں گا۔"

رات کے پونے بارہ بجے ہم نے اخلاقاً بل ادا کیا اور سونی ایک پاؤنڈ ٹپ دی جو ہمارے خیال میں بہت معقول تھی مگر وکیل نے باہر آ کے ہمیں اس کنجوسی کے مظاہرے پر شرمندہ کرنے کی کوشش کی "وہ کیا سمجھے گی، پانچ پاؤنڈ تو دیتے۔"

"اگر ہمیں اس سے اتنی ہی احمقانہ محبت ہوتی جتنی تمہیں ہے تو ہم اسے پانچ پاؤنڈ دے کے ذلیل نہ کرتے۔ وہ تو ایسی چیز ہے کہ اس پر نقدِ جاں نثار کرنا بھی کم ہے۔ متاعِ حیات لٹانا بھی جائز ہے۔ سرمایۂ ہوش و خرد نذر کرنا بھی روا ہے.... دولت و شکیب۔"

وکیل نے اپنا سر پکڑ لیا "یار یہ گھر کے ڈیکوریشن پیس کا کیا کرے گی؟ پانچ پاؤنڈ تو نکالے نہیں، پتا نہیں کیا کچھ لٹانے کی بات کرتے ہو۔ لو یہ پہن لو" اس نے اپنا کالا کوٹ اتار کے مجھے دیا۔

میں نے کہا "تھینک یو۔ تمہارا یہ تحفۂ خلوص۔"

"میں واپسی پر تم سے لے لوں گا" اس نے خفگی سے کہا۔

میں نے کہا "تمہاری یہ پتلون..."

"پتلون کیا قمیص بھی اتار دوں؟ خود سردی میں بنیان، انڈرویئر پہنے کھڑا کانپتا رہوں۔ لاؤ اپنا کوٹ مجھے دو۔"

میں نے اپنا کوٹ اسے دے دیا۔ "اس کی جیب میں سے کچھ مت نکالنا۔ میں بھی کسی جیب میں ہاتھ نہیں ڈالوں گا۔"

"بہت لمبی بات مت کرنا۔ میں اور محسن وہیں جا کے بیٹھے ہیں۔ ہاں وہ دو سو پاؤنڈ تو نکالو!"

محسن نے کہا "وہ میں دیتا ہوں۔ چلو وقت گزاری کے لیے میں بھی سونی پر ڈورے ڈالتا ہوں، برا مت ماننا۔"

"تم ایسی کوئی حرکت نہیں کرو گے۔"

"کیوں۔ وہ تمہاری بیوی تو نہیں ہے۔" محسن بولا۔

"تم میری بیوی پر ڈورے ڈالو تو مجھے خوشی ہوگی۔ ابھی تک کسی نے ہمت نہیں کی۔ کیا پتا تم اسے ورغلانے میں کامیاب ہو جاؤ اور میری گلو خلاصی ہو جائے" وکیل نے کہا اور وہ مجھے ایک کاریڈور تک پہنچا کے رخصت ہو گئے۔

کاریڈور میں سناٹا تھا اور خاموشی تھی۔ بیشتر لائٹس آف کر دی گئی تھیں۔ صرف ضروری لائٹس جل رہی تھیں۔ مجھے صرف ایک بند دروازے کے باہر وردی والا پولیس مین استادہ نظر آرہا تھا۔ میں پچھلی طرف کے اس راستے سے گیا تھا جو اسٹاف کے لیے وقف تھا مگر حلیے سے ہی میں وکیل نظر آتا تھا۔ ایک نرس نے مجھے ٹوکا "تم یہاں کیا کر رہے ہو اس وقت؟"

میں نے کہا "سچ بتاؤں، ایک حسین نرس کو گھور رہا ہوں۔"

اس نے متانت سے کہا "بہتر ہے چلے جاؤ۔"

میں نے کہا "تم نے ہی مجھے روکا ورنہ میں تو جا رہا تھا۔ ... اگین۔"

"رک جاؤ ورنہ میں سیکیورٹی اسٹاف کو بلالوں گی۔"

میں نے کہا "بے بی۔ میں پولیس کمشنر اور جیلر کی اجازت سے آیا تھا جارج سے ملاقات کے لیے۔ تم سے ملاقات قسمت کا حسین اتفاق ہے۔"

"کون جارج!..... وہ قیدی...؟" اس کا لہجہ بھی بدل گیا اور وہ مسکرانے پر بھی مجبور ہو گئی۔ خوشامد اور تعریف کا اسلحہ طریقے سے استعمال کیا جائے تو مس یونیورس کو بھی تسخیر کیا جا سکتا ہے۔ کم سے کم کوشش ضرور کی جا سکتی ہے کیونکہ نتیجہ بہرصورت ایک رہتا ہے۔ کامیابی یا ناکامی۔

میں نے کہا "ہاں وہ بدقسمت قانون کا قیدی ہے اور میں..."

"تم بھی قیدی ہو!" وہ ہنس پڑی۔

"ہاں۔ ابھی ابھی قیدی بنا ہوں کسی کے ہنس دینے سے۔" میں نے کہا "اب اجازت ملے تو آگے جاؤں؟"

"اجازت ہے، شریر آدمی۔" وہ بولی اور ہنستی ہوئی آگے چلی گئی۔ اگر وہ اصرار کرتی کہ پولیس یا جیل حکام کا اجازت نامہ کہاں ہے، دکھاؤ تو میں اسے کیا دکھاتا۔ بحث ہوتی اور میں اس کے اختیار کو چیلنج کرتا۔ وہ سیکیورٹی اسٹاف کو بلاتی۔ وہ پولیس سے تصدیق کرتے اور مجھے کاغذات پیش کرنے پڑتے۔ وقار یوسف کی جارج سے ملاقات کے گواہ پیدا ہو جاتے۔

دور سے دیکھنے والے پولیس مین نے فرض کیا کہ اسٹاف نے مجھے شناخت کر لیا ہے۔ ان کا واسطہ پولیس سے بھی رہتا تھا اور وکیلوں سے بھی۔ یہ میڈیکو لیگل کیس وارڈ تھا۔

میں نے پولیس مین سے ہاتھ ملایا۔ "مجھے امید ہے کہ تم کو میرے بارے میں بتا دیا گیا ہوگا۔"

اس نے سر ہلایا "تم اندر جا سکتے ہو۔ تمہارے پاس کوئی خطرناک چیز ہے تو مجھے دے دو۔"

میں نے ہاتھ اوپر اٹھا دیے "تم اپنا اطمینان کرلو۔ میں ٹیپ ریکارڈر وغیرہ کچھ بھی نہیں لے جا رہا ہوں۔"

"اِٹ از او کے۔ مجھے اعتبار ہے۔"

"ایک بات تم بھی بتا دو۔ کمرہ ... کو بگ تو نہیں کیا گیا ہے؟"

اس نے ہاتھ پھیلا کے اور شانے ہلا کے کہا "مجھے نہیں معلوم۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ جارج سے کوئی ملنے آرہا ہے۔"

میں نے مسکرا کے کہا "اس سے ملنے کے لیے کوئی آیا بھی نہیں" اور اندر داخل ہو گیا۔

مجھے سفید بستر پر ایک لمبا تڑنگا سیاہ فام نظر آیا جو آنکھیں بند کیے لیٹا ہوا تھا اور صورت سے ہی بیمار لگتا تھا۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی اور داڑھی کے بالوں میں سفیدی جھلک رہی تھی۔ اس نے سر کے بال خود ہی صاف کرا دیے تھے۔ ساری عمر کی غربت نے اس کی صورت پر سختیِ حالات کی تحریر کو اتنا عیاں کر دیا تھا کہ چہرے کی شکنوں میں کوئی بھی اس کی زندگی کی کہانی پڑھ سکتا تھا۔

میں نے کھنکھار کے گلا صاف کیا اور کہا "ہیلو جارج!"

اس نے آنکھیں کھول کے مجھے دیکھا اور ناآشنائی کے احساس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں خون ابل آیا "کون..... ہو تم!" اس نے ڈرتے ہوئے کہا۔

"ڈرو نہیں۔ میں تمہارا دوست ہوں جارج!" میں نے نرمی سے کہا۔

"نہیں..... نہیں۔ جھوٹ بولتے ہو تم۔ دنیا میں جارج کا دوست کوئی نہیں رہا" اس نے نفرت اور بے زاری سے کہا "جاؤ، مجھے اکیلا چھوڑ دو۔"

میں کرسی پر بیٹھ گیا "میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"مگر میں کسی سے بات نہیں کرنا چاہتا۔ مجھے میرے حال پر رہنے دو۔" جارج نے کہا۔

میں نے کہا "جارج میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔"

"بکواس کرتے ہو تم بھی۔ ایسی ہی باتیں وہ بھی کرتا رہا تھا۔"

"تم دلاور کی بات کر رہے ہو نا؟"

وہ چونکا "میرا شک ٹھیک تھا۔ تم جانتے ہو اسے کیونکہ تم بھی اس کے آدمی ہو۔ تم بھی مجھے مارنا چاہتے ہو....." وہ گھبرا کے چلّانے لگا۔

"ٹیک اِٹ ایزی جارج۔ تم غلط سمجھ رہے ہو۔ میں دلاور کا ساتھی نہیں، اس کا دشمن ہوں" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

اس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا "ہاتھ مت لگاؤ مجھے۔ تم مجھے زہر میں ڈوبی ہوئی سوئی چبھو جاؤ گے، خنجر گھونپ دو گے۔"

میں نے ہاتھ پیچھے کھینچ لیا "پلیز جارج۔ سب کو ایک جیسا مت سمجھو۔ میں جانتا ہوں تمہارے ساتھ بہت ظلم ہوا۔ تم اس جرم کی سزا کاٹ رہے ہو جس کے تم عینی شاہد تھے۔ جرم کرنے والا چوہدری دلاور تھا۔ تم صرف دیکھ رہے تھے مگر وہ بھاگ گیا تھا اور تم پکڑے گئے تھے..... یہی بات ہے نا..."

وہ تھوڑا سا پُرسکون ہوا "مگر یہ مانتا کون ہے۔"

میں نے کہا "میں مانتا ہوں۔ اور بہت سے لوگ ہیں ایسے..."

"کہاں ہیں وہ لوگ؟" اس نے برہمی سے کہا "اس وقت کہاں تھے وہ جب جارج پر مقدمہ چلایا جا رہا تھا۔ اسے قاتل قرار دیا گیا تھا.... جارج نے ساری زندگی میں ایک چوزے کی جان بھی اپنے ہاتھوں سے نہیں لی تھی۔ وہ شریف نہیں تھا مگر بزدل تھا لیکن اس کی کسی نے ایک نہیں سُنی تھی۔ آج تم اچانک آ کے مجھے بتاتے ہو کہ تم کو اعتبار ہے اور تم جانتے ہو کہ میں سچ بول رہا تھا۔"

میں نے اسے بولنے دیا۔ "تقدیر کے بہت سے فیصلے انسان کی سمجھ میں نہیں آتے۔"

"ہاں۔ ایسے فیصلے صرف غریب آدمی کی تقدیر میں کیوں لکھے جاتے ہیں۔ سب اپنے پرائے، سوسائٹی اور اس ملک کا قانون۔ سب مل کے غریب کے خلاف ایک ہو جائیں، ظلم کرنے کے لیے۔ اس کو مجرم قرار دینے کے لیے۔ اس سے سب کچھ چھین لینے کے

لیے۔ تو اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ صبر کرو۔ صبر کا پھل میٹھا ہے۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اس کی مصلحت کو ہم نہیں سمجھ سکتے۔ وہ ظالم کی رسّی دراز کرتا ہے" وہ تلخی سے ہنسا "اتنی دراز کرتا ہے کہ وہ رسّی ہر غریب کے گلے کا پھندا بن جاتی ہے۔ کیا وہ غریب کا خدا نہیں ہے؟ یہ دنیا تو امیروں کی ہے۔ یہاں انہی کا نظام اور حکم چلتا ہے۔ قانون بھی ان کا ہے اور عدالت بھی ان کی ہے۔ لیکن خدا کو..."

سارجنٹ نے دروازے کے اندر جھانک کے کہا "یو بلڈی مین۔ اپنے حلق کے لاؤڈ اسپیکر کا والیوم کم کرو۔"

جارج خاموش ہوگیا۔ اس کی صورت پر بے بسی اور مظلومیت کا تاثر گہرا ہوگیا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔

میں نے کہا "دیکھو جارج۔ انتہائے مایوسی میں آدمی کا ذہن بھٹک جاتا ہے اور وہ کفر بکنے لگتا ہے۔ تمہاری طرح خدا کی رحمت پر سے اس کا یقین اُٹھ جاتا ہے۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے اور مجھے بڑی مشکل سے پولیس نے صرف ایک گھنٹے کی مہلت دی ہے۔"

وہ چھت کو گھورنے لگا "دلاور کو بھی پولیس نے بھیجا تھا۔"

"فار گاڈ سیک۔ جو ہوا اسے تھوڑی دیر کے لیے بھول جاؤ۔ ہر شخص دلاور نہیں ہوسکتا۔ میری طرف دیکھو کیا میں صورت سے تم کو ایسا لگتا ہوں؟"

"کیا صورت سے میں قاتل لگتا ہوں؟"

"ہاں۔ تم صورت سے مظلوم لگتے ہو۔ ظالم نہیں" میں نے کہا "تمہارے پاس میں بہت دور سے آیا ہوں۔ میں دلاور کا ہم وطن ہوں مگر اس نے مجھ پر اتنا ظلم کیا تھا کہ تم سُنو گے تو مجھ سے ہمدردی کرو گے۔ اس نے میرے باپ کو اذیت دے کر قتل کردیا۔ اس سے سب کچھ چھین لیا۔ وہ ایک انتہائی شریف اور ایماندار آدمی تھا اور اپنی محنت سے اس نے اتنی دولت کمائی تھی کہ اس نے مجھے پاکستان سے پڑھنے کے لیے یہاں بھیجا۔ اس وقت میں یہاں تھا جب دلاور نے میرے باپ پر ظلم کے پہاڑ توڑے۔ میرے سوا دنیا میں اس کا کوئی بھی نہیں تھا۔ نہ بیوی اور نہ بچے۔ میں واپس گیا تو مجھے اس کی قبر ملی۔ مجھے معلوم ہوا کہ اس کا قاتل دلاور ہے۔ دلاور نے اس کی ساری جائداد پر بھی قبضہ کرلیا تھا جس پر میرا اور صرف میرا حق تھا۔ پھر اس نے مجھے ایک قتل کے کیس میں مجرم بنادیا اور مجھے اپنی جان بچانے کے لیے فرار ہونا پڑا۔ حالات کی شہادت نے مجھے بھی اسی طرح مجرم بنادیا تھا جیسے تم کو بنادیا۔ اگر میں پکڑا جاتا تو میرے ساتھ زیادہ بُرا ہوتا۔ آج میں بھی پھانسی پانے کے بعد کسی نامعلوم قبر میں ڈھانچا بنا پڑا ہوتا مگر میں نے زندگی کے لیے اپنے حق اور انصاف کے لیے جدوجہد ترک نہیں کی۔ میں چوہدری دلاور کے پیچھے لگ گیا۔ میں نے عہد کرلیا تھا کہ ... دلاور کو قانون کی عدالت میں مجرم ثابت کرکے اپنی بے گناہی کا سرٹیفکیٹ حاصل کروں گا۔ تم کہہ سکتے ہو کہ اس سرٹیفکیٹ سے کیا فرق پڑتا ہے۔

اگر آدمی بے گناہ ہے تو وہ بے گناہ ہے اور یہ یقین اسے مطمئن رکھنے کے لیے کافی ہے۔ خدا بھی جانتا ہے کہ وہ بے گناہ ہے مگر جارج، یہ گناہ ثواب کا نہیں جرم وسزا کا مسئلہ تھا۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو خدا بھی میری مدد کیسے کرتا۔ وہ دنیا کی عدالت میں آکے تو فیصلہ نہیں سُنا سکتا تھا۔ اس کا آخری فیصلہ ہوگا یوم حساب پر۔ دنیا میں فنا وبقا کی جنگ ہم خود لڑتے ہیں۔ تم نے بھی لڑی تھی مگر تم ہار گئے تھے۔ میں نے ابھی تک ہار تسلیم نہیں کی تھی۔ میرا یہ جذبہ، یہ حوصلہ، یہ یقین خدا کو پسند آیا ہے کہ اب وہ میری حفاظت کرتا ہے اور مجھے تائید غیبی حاصل ہے۔ شاید کوئی اور ایسی باتوں کو مضحکہ خیز قرار دے مگر میرا ایمان آج پہلے سے زیادہ کامل ہے۔ میں اپنی جدوجہد میں تقریباً کامیاب ہوگیا ہوں۔ اب دلاور بُرا پھنسا ہے۔ قانون کے لمبے ہاتھوں کی پکڑ ... سے بچنے کے لیے۔ تم کو ماننا پڑے گا جارج کہ خدا کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں ہے۔ پھانسی کا پھندا جو میری گردن میں پڑ سکتا تھا وہ اب چوہدری دلاور کی گردن کے بہت قریب ہے۔ میری جدوجہد رائگاں نہیں گئی۔ مجھے حق مل جائے گا اور انصاف بھی۔"

جارج رفتہ رفتہ میری باتوں میں دلچسپی لینے پر مجبور ہوا تھا اور اب متاثر نظر آرہا تھا "مجھے تمہاری بات پر اعتبار آنے لگا ہے۔"

میں نے کہا "دیکھو جارج۔ نہ تم میرے دوست ہو اور نہ رشتے دار۔ مگر میرے اور تمہارے درمیان ایک تعلق ہے۔ وہ تعلق جو دنیا بھر کے مظلوم انسانوں کے درمیان ہوتا ہے جو اگر ختم ہوجائیں۔ جیسے فلسطینی ہوئے یا جنوبی افریقہ میں سیاہ فام ہوئے یا سرعرفات اور نیلسن منڈیلا میں بھی مشترک مقصد کا رشتہ ہے۔ انصاف اور حقوق کے حصول کے لیے ان کی جدوجہد کا نظریاتی فلسفہ ایک ہی ہے۔ اب فرض کرلو کہ میں ہوں یا سرعرفات اور تم ہو نیلسن منڈیلا اور ہم لڑ رہے ہیں جبرو استبداد کی استحصالی قوتوں سے۔ تو کیا ہم ایک دوسرے کے دشمن ہوسکتے ہیں؟"

وہ مسکرانے لگا "نہیں۔ دوست شاید ہوسکتے ہیں۔"

"شاید نہیں، یقیناً ہوں گے" میں نے کہا "میرا تم سے ملاقات کے لیے آنا بھی میری جدوجہد کا ایک حصہ ہے۔ مجھے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے تسلیم کرلینا چاہیے کہ یہ جدوجہد میں اپنے لیے کررہا تھا۔ تمہاری بے گناہی ثابت کرنے کے لیے اور تمہیں رہائی دلانے کے لیے نہیں مگر میری کامیابی کے نتیجے میں تمہارے ساتھ بھی انصاف ہوگا۔ اس کا فائدہ تمہیں بھی ملے گا۔ اصلی مجرم پکڑا جائے گا تو تم رہا ہو جاؤ گے۔"

وہ مجھے بے یقینی سے دیکھتا رہا "کیا ایسا ہوسکتا ہے؟ میں نے تو ہر اُمید چھوڑ دی تھی۔ مجھے اپنے بارے میں اور بتاؤ۔"

"میرا اصلی نام سکندر بخت ہے جارج۔ لیکن یہاں میں تم سے..."

"تم سکندر بخت ہو۔" وہ ایک دم اُٹھ کے بیٹھ گیا۔

میں نے مسکرا کے کہا "ہاں۔ دیکھ لو مجھے۔ میرا نام استعمال کرکے خدانخواستہ وہ تمہیں ہلاک کرنے میں کامیاب ہوجاتا تو الزام مجھ پر آتا اور میں واقعی پکڑا جاتا۔ اللہ نے تم سے زیادہ مجھ پر کرم کیا کہ تمہیں بچالیا۔ یہ انکشاف کرنے کے لیے کہ تم کو قتل کرنے کی کوشش کرنے والا چوہدری دلاور تھا، سکندر بخت نہیں۔ دنیا کے سامنے اس کے دھوکے اور جعلسازی کا پردہ چاک کرنے کے لیے تم زندہ رہے۔ مارنے والے سے بچانے والے کا ہاتھ زیادہ طاقتور ہے جارج۔ اگر تم مرجاتے تو یہ کون بتاتا۔"

اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا "تم اچھے آدمی لگتے ہو سکندر بخت۔"

"میں تم سے جھوٹ بالکل نہیں بولوں گا" میں نے کہا "یہاں میں وقار یوسف کے نام سے آیا ہوں۔"

"وقار یوسف۔" اس نے دُہرایا۔

"ہاں اور تم دیکھ رہے ہو کہ میں نے یہ کالا کوٹ پہن رکھا ہے۔ وکیلوں والا۔ یہ بھی ایک مجبوری تھی" میں نے اسے اپنا پاسپورٹ پیش کیا "دیکھ لو اس پر میری تصویر اور میرا نام۔"

اس نے پاسپورٹ کو غور سے پڑھا "یہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن تم کو ایسی کیا مجبوری تھی، نام بدلنے کی؟"

میں نے کہا "اگر سکندر بخت یہاں آتا تو... نہیں، سکندر بخت کے نام سے تو میں یہاں آہی نہیں سکتا تھا۔ میرے برطانیہ میں داخلے پر پابندی عائد ہے لیکن یہ الگ کہانی ہے۔ میں پیرس پہنچا اور وہاں سے خفیہ طریقے پر لندن میں داخل ہوا۔ سکندر بخت کو یہاں پولیس تلاش کررہی ہے۔ چوہدری دلاور کے ذریعے انہیں بھی اطلاع مل گئی ہے کہ میں ایک مفرور مجرم ہوں۔ خود دلاور بھی یہاں ہے مگر اس حلیے اور نام کی وجہ سے میں محفوظ ہوں ورنہ وہ تم سے پہلے مجھے قتل کرا دیتا۔"

"کیا وہ گینگسٹر GANGSTER ہے؟"

"اس سے بھی زیادہ" میں نے کہا "لیکن میں نے اس کی ساری بدمعاشی نکال دی ہے۔ میں نے یہ مصنوعی داڑھی لگا رکھی ہے اور یہ سب کچھ مجھے صرف اس لیے کرنا پڑا کہ میرا تم سے ملنا از حد ضروری تھا۔"

"میں کس طرح تمہارے کام آسکتا ہوں؟"

"تم چوہدری دلاور کو شناخت کرسکتے ہو؟" میں نے کہا "واردات کے بعد وہ بھاگ گیا تھا اور تم نے اسے دوبارہ نہیں دیکھا۔ کسی نے تمہاری بات کا یقین نہیں کیا کہ چوہدری دلاور کوئی حقیقی آدمی ہے۔ سب اسے جھوٹ اور تمہارے ذہن کی اختراع سمجھتے رہے۔ وہ پھر کبھی برطانیہ میں نظر نہیں آیا مگر جیل میں وہ پھر آیا تو تم نے اسے پہچان لیا تھا۔ آخر کیسے؟ جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ لندن میں میری طرح بھیس بدل کے پھر رہا ہے۔ آج شام میں نے اسے دیکھا تو وہ کسی مہاراجا جیسے لباس میں تھا۔"

"وہ میرے پاس بھی وہی بھیس بدل کے آیا تھا۔ مگر اس کی صورت کے نقوش میرے ذہن میں محفوظ تھے۔ میں بھول سکتا تھا میں اس کا چہرہ" جارج نے کہا۔

"جب تمہیں جیل کے حکام نے بتایا تھا کہ سکندر بخت تم سے ملنا چاہتا ہے تو تم نے کیوں ملنا قبول کیا تھا؟ تم اس نام سے آشنا تھے؟"

اس نے ٹھنڈی سانس لی "بس میری بے وقوفی۔ میں کسی سکندر بخت کو نہیں جانتا تھا لیکن میں نے سوچا کہ مل لینے میں کیا حرج ہے۔ میں کیسے اندازہ کرسکتا تھا کہ دو سال بعد کوئی مجھے قتل کرنے کے لیے بھی آسکتا ہے اور وہ بھی جیل کے اندر۔ تم کسی جیل میں رہے ہو؟"

میں اس غیر متوقع سوال پر چونکا "ہاں۔ مگر بہت مختصر عرصے کے لیے۔"

"کس جرم پر سزا ہوئی تھی تمہیں؟"

میں نے وضاحت کی "جرم میں نے کوئی نہیں کیا تھا اور نہ مجھے سزا ہوئی تھی۔ یوں سمجھ لو کہ پولیس نے مجھے گرفتار کرلیا اور میں پولیس اسٹیشن کی جیل میں رہا۔ پولیس کی تحویل میں۔ اسے ہماری زبان میں حوالات کہتے ہیں۔ پھر میری ضمانت ہوگئی اور مجھے رہائی مل گئی۔"

اس نے نفی میں سرہلایا "وہ دوسری بات ہے۔ میں ایسی جیل کی بات کررہا تھا جہاں عدالت سے سزا پانے کے بعد کچھ وقت گزارنا پڑے۔ چھ مہینے، سال یا لمبی عمر قید۔ وہ بڑا خوفناک تجربہ ہوتا ہے۔ شروع شروع میں آپ کے دوست اور خاندان والے بڑی بھاگ دوڑ کرتے ہیں اور قانونی جنگ لڑنے میں بڑے جوش وخروش سے حصّہ لیتے ہیں۔ آپ کا حوصلہ بلند رکھنے میں بھی بڑے جوش وخروش سے حصّہ لیتے ہیں مگر ایک دفعہ یہ جنگ ختم ہوجائے۔ آپ سب سے کٹ کر جیل کی دنیا میں اکیلے رہنے کے لیے پہنچ جائیں تو بہت سی تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ انسان کی فطرت سے زیادہ لوگوں کے رویّے میں۔ پہلے باقاعدگی سے آنے والے کبھی کبھی ناغہ کرجاتے ہیں اور بڑے اچھے عذر پیش کرتے ہیں۔ پھر ملاقات کا وقفہ طویل ہوجاتا ہے اور عذر بھی یہی رہ جاتا ہے کہ وقت نہیں ملتا۔ واقعی، دنیا میں ہر شخص کو جتنا وقت ملتا ہے وہ اس کی اپنی زندگی، اس کے مسائل، اس میں کامیابی کی جدوجہد کے لیے ہوتا ہے اور اپنے خاندان کے لیے ہوتا ہے لیکن سب سے افسوس ناک بات یہ ہے کہ خود اپنے خاندان والے پھر آہستہ آہستہ گھر میں آپ کے خلا کو محسوس کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ کھانے کی میز پر آپ کی کرسی پر کوئی اور بیٹھنے لگتا ہے۔ مثلاً آپ کا بچّہ یا خود آپ کی بیوی۔ وہ جگہ جو ٹی وی دیکھنے کے لیے مخصوص تھی، بیڈ روم میں آپ کے بیڈ پر سے ایک تکیہ ہٹا دیا جاتا ہے۔ آپ کے کپڑے بند کردیے جاتے ہیں اور ذاتی سامان اُٹھا کے ایک طرف رکھ دیا جاتا ہے۔ بالکل ایسے..... جیسے آپ مرگئے ہوں۔ اور یہ عارضی موت ہی ہوتی ہے جیسے اس دنیا سے کوئی واپس نہیں آسکتا ایسے ہی جیل سے گھر نہیں آسکتا۔ اگر چھ مہینے سال کی بات ہو پھر تو زیادہ فرق

پڑتا مگر جو عمر قید کاٹنے گیا ہو' وہ ٹوٹ گیا۔ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔ محبت کے سارے رشتے اور دعوے اتنے کھوکھلے اور جھوٹے' اتنے منافقانہ ہوتے ہیں۔" میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں اور مجھے اس پر جتنا ترس آیا اس سے زیادہ خوف جیل سے محسوس ہوا۔

میں نے اسے تسلی دی "خیر' اب تمہارے لیے یہ عذاب کے دن تھوڑے رہ گئے ہیں۔"

اس نے اپنے آنسو صاف کیے "خدا کرے' خدا کرے۔ آمین" اس نے دوبار دعائیہ انداز میں دُہرایا اور پھر سینے پر صلیب بنائی "معلوم ہے میرے ساتھ کیا ہوا؟"

میں نے کہا "مجھے شروع سے بتاؤ۔ تم نے اس عورت سے شادی کیوں کی تھی جو عمر میں تمہاری ماں کے برابر..... بہت زیادہ تھی۔"

وہ شرمندہ نظر آنے لگا "لالچ۔ میں نے دولت کے لیے اس کو بیوی بنالیا تھا۔ بڑے ذلیل خیالات تھے میرے۔ میں نے خود سے کہا کہ عورت تو وہ بھی ہے اور بوڑھی بھی نہیں ہوئی۔ اس کی بدمزاجی یا عادات واطوار کا مجھے زیادہ علم نہیں تھا۔ بس اس نے مجھے پسند کرلیا تھا۔ میں جوان اور صحت مند تھا۔ دو سال میں میری باڈی کچھ بھی نہیں رہی۔ ورنہ بڑی پُرکشش باڈی تھی میری' عورتوں کے لیے..... وہ مجھ پر رِیجھ گئی تھی اور اس کے پاس پہلے شوہر کی چھوڑی ہوئی دولت بہت تھی۔"

"اس کا پہلا شوہر..... ڈاکٹر شیلی کا باپ تھا؟"

"یس۔ یہ مجھے معلوم تھا' وہ مجھے سخت ناپسند کرتی تھی اور اپنی ماں سے بہت لڑتی تھی۔"

"وہ چوہدری دلاور کا بھی باپ تھا" میں نے کہا۔

وہ چونکا "یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"یس۔ یہ ٹھیک ہے' کیا تمہیں یہ بات معلوم نہیں تھی؟ مجھے حیرت ہے۔"

"میں نہیں مان سکتا۔" وہ مجھے دیکھتے ہوئے خود سے بات کررہا تھا "یہ کیسے ہوسکتا ہے؟"

میں نے کہا "ڈیئر جارج۔ اگر کوئی بات کسی کے علم میں نہ ہو۔ تو یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ وہ غلط بھی ہوگی۔ اگر آج تم یہ نہ مانو کہ چاند ایک فضول بنجر اور بے ہنگم زمین جیسی سطح والی بدصورت جگہ ہے تو کیا فرق پڑے گا اس سے۔ حقیقت اپنی جگہ رہے گی جسے دنیا تسلیم کرتی ہے۔"

"شی واز اے رئیل بچ!" اس نے دانت پیس کے کہا "اس نے مجھے کبھی نہیں بتایا۔ آخر میں اس کا شوہر تھا' جیسا بھی تھا۔"

"اس سے کیا فرق پڑجاتا؟"

اس نے بے وقوفوں کی طرح دیدے گھمائے "شاید کچھ نہیں۔ اس کے دو بچے ہوتے یا دس۔ ڈاکٹر شیلی نے بھی مجھے نہیں بتایا۔ میری گرفتاری اور میرے جیل پہنچ جانے کے باوجود....."

میں نے کہا "اس کی ایک معقول وجہ ہے۔ وہ تم کو... تھی۔"

"وہ مجھ سے نفرت کرتی تھی۔ وہ یقیناً دل سے چاہتی... الیکٹرک چیئر پر بیٹھ جاؤں۔ غصہ اس کو اپنی ماں پر تھا... سے شادی کی۔ میں اچھا شوہر نہیں بن سکتا تھا۔ یہ بات... بھی محسوس کرسکتا تھا اور ڈاکٹر شیلی نے میری نیت کو...

اس کی ماں ایک پُرہوس کتیا تھی۔ جنسی ناآسودگی کے... جیسا مرد اس کے لیے ایسا ہی تھا جیسے فاقہ زدہ شخص کے... چکن خواہ وہ کوڑے کے ڈھیر پر پھینک کے اسے کہا جا... میں نے جو سوچا تھا وہی بعد میں کیا۔ میں نے خوب عیش... کے لیے کیش اپنی بیوی کا استعمال کیا۔ یہ بات اسے گراں... ہوتی۔ شروع شروع میں وہ بُرا مان کے خاموش رہتی تھی... لیے یہ اطمینان کافی تھا کہ میں اس کی ملکیت ہوں۔ وہ... کرلیتی تھی۔ خیرات کے طور پر دوسروں کو بھی تھوڑا... دینے سے اس کو فرق نہیں پڑتا تھا۔ بعد میں وہ عورت... حسد کے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی اور مجھ سے لڑنے... ڈھیٹ ہوگیا۔ شراب پہلے میں پیتا تھا' پھر وہ بھی پینے لگی... میں ہم دونوں لڑنے لگے۔ وہ سچ بولنے لگے جو ایک دوسرے... کرنے کے مترادف تھا۔ میں شروع سے ایک عورت... کرنے والا مرد نہیں تھا۔ عورتیں خود مجھ پر ٹوٹ کے گرتی... جیسے کھیاں شیرے سے چمٹتی ہیں۔ شادی کے بعد میں... پارسا' عزت دار اور وفادار شوہر بن جاتا۔ میں اپنی گرل فرینڈ... ساتھ گھر چلا جاتا تھا اور..... یہ بڑی بے شرمی اور بے غیرتی... تھی۔ ڈاکٹر شیلی اپنے کمرے میں بند ہوجاتی تھی۔ وہ ماں... تھی کہ کسی دن وہ زہر کھالے گی یا اسے ماردے گی... بالواسطہ وہ مجھے دیتی تھی۔ وہ کبھی مجھ سے بات نہیں کرتی..."

میں نے کہا "اس کے علم میں تھا کہ چوہدری دلاور اس... بھائی ہے؟"

"کیا چوہدری دلاور کا اپنی ماں سے رابطہ تھا؟"

"غالباً نہیں۔ وہ اپنے پہلے شوہر کی زندگی میں بھی بال... سے الگ تھی۔ چوہدری دلاور کی ماں پشاور کے قریب کی... تھی۔ اسے مرے زمانہ ہوا۔ دلاور کا باپ وہاں سے... لندن پہنچا تھا۔ کسی کو علم نہیں کہ وہ فرار ہونے پر کیوں... تھا۔ لندن میں اس نے ایک اور شادی کرلی تھی اور پھر... تھا۔ یہ ہوسکتا ہے کہ بعد میں اس نے اپنے بیٹے سے رابطہ... اور دلاور کو یہ معلوم ہو کہ اس کا باپ لندن میں ہے۔ اس... شادی کرلی ہے اور اس کی ایک بیٹی ہے۔ جب باپ مرگیا... طور پر دلاور کو خیال آیا کہ اس کا وارث وہ خود ہے یا... ہے اور اگر ڈاکٹر شیلی نہ رہے اور اس کی ماں نہ رہے تو... میں اپنے باپ کی ساری دولت اور جائداد کا بلاشرکت غیرے... ہوجائے گا۔ یہی سوچ کے اس نے ان دونوں کو ختم کر...

...ہوئی کہ اس نے تمہاری گرل فرینڈ کو ڈاکٹر شیلی ...پایا تھا۔ خرابی یہ ...سمجھ لیا۔ اپنی سوتیلی ماں کو مارنے کے بعد اس نے ایک لڑکی کو دیکھا ...عمر میں بہت کم تھی اور فرض کرلیا کہ وہی ڈاکٹر شیلی ہوگی اس نے ...بنگلے میں دونوں کو قتل کیا اور فرار ہوگیا۔ یہ سب تم نے دیکھا تھا ...اور چھپ کے اپنی جان بچائی تھی ورنہ شاید دلاور تمہیں بھی ختم ...کردیتا۔ وہ کسی بھی چشم دید گواہ کو زندہ چھوڑنے کا رسک نہیں لے ...سکتا تھا۔ لیکن تمہارا وہاں موجود ہونا ہی تمہارے مجرم ہونے کا ...ثبوت بن گیا۔ مجھے ایک بار پھر بتاؤ کہ یہ سب کیسے ہوا تھا؟ عدالت ...میں تم نے یقیناً تفصیل سے سب بتایا ہوگا مگر وہ مجھے معلوم نہیں۔"

"بتانے کا فائدہ کچھ نہیں ہوا۔ کسی نے بھی یقین نہیں کیا۔ سچ ...کو ایک بنائی ہوئی کہانی یعنی (CONCOCTED STORY) ...سمجھا گیا۔ سوچنے کی بات ہے کہ میرے جیسا اَن پڑھ اور غیر تخلیقی ...ذہن رکھنے والا اتنی اچھی کہانی کیسے بنا سکتا تھا۔ اتنی جزئیات کیسے ...بیان کرسکتا تھا۔ میں کوئی رائٹر یا ڈراما نگار نہیں تھا۔ بس انہوں ...نے کہا کہ تم جھوٹ بکتے ہو۔ قتل تم نے کیا ہے اور مجھے سزا ...ہوگئی۔ مجھے چوہدری دلاور کے بارے میں کچھ پتا ہی نہیں تھا۔ میں ...ایک لڑکی کے ساتھ پھر رہا تھا۔ وہ بھی مجھ سے شادی کرنا چاہتی ...تھی۔ آخر یہ لڑکیاں شادی کے لیے ہاتھ دھوکے کیوں پیچھے پڑجاتی ...ہیں' میں سوچتا تھا۔"

"وہ غلط نہیں سوچتی ہیں۔ ایسا نہ سوچیں تو مرد ان کو کھلونا ...یا تماشا یا تفریح کا ذریعہ بنالیں۔" میں نے کہا۔

"میں نے اس سے کہا کہ شادی کا کیا سوال۔ میں شادی شدہ ...ہوں۔ اس نے میری بات نہیں مانی اور کہنے لگی کہ اچھا مجھے اپنی ...بیوی سے ملاؤ ورنہ میں سمجھوں گی کہ تم ٹال رہے ہو۔ میں نے جان ...چھڑانے کے لیے کہا کہ چلو' ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ دیکھ لو میرا گھر ...اور میری بیوی۔ اب مجھے خیال آتا ہے کہ وہ اچھی لڑکی تھی۔ عقل ...والی۔ مجھ میں تو شیلی کی ماں کو چھوڑ کے میں اس سے شادی کرلیتا۔ ...بے چاری خواہ مخواہ ماری گئی۔ جب میں اسے گھر لے گیا تو میری ...سوتیلی بیٹی شیلی وہاں نہیں تھی۔ وہ ہوسٹل میں رہنے لگی تھی۔ اس کا ...خیال تھا کہ گھر کا ماحول اس قابل نہیں رہا' گھر اب گھر نہیں رہا' ...طوائف خانہ ہوگیا ہے۔ ٹھیک ہی سمجھتی تھی وہ۔ خیر' میری بیوی نے ...میرے ساتھ ایک جوان اور پُرشباب لڑکی کو دیکھا تو اس کا پارا چڑھ ...گیا اور اس نے مجھے بے نقط سنانی شروع کردیں' نشے میں تھی۔ ...اس نے کہا کہ اب وہ بھی ہر روز مردوں کو پھانس کر لائے گی۔ میں ...نے اس کو مارا۔ یہ ایک معمول سا بن چکا تھا۔ پڑوس میں رہنے ...والے اس کے عادی تھے اور ظاہر ہے' نہ دخل دیتے تھے اور نہ ...پولیس کو بلاتے تھے۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ کسی دن ہم میں سے ...کوئی ایک دوسرے کو مار ڈالے تو یہ شور ہنگامہ..... ختم ہوجائے۔ وہ ...لڑکی بہت ڈر گئی تھی اور وہاں سے جانا چاہتی تھی۔ اچانک کسی نے ...دروازے کی گھنٹی بجائی اور میں نے جا کے دیکھا تو ایک اجنبی کھڑا ...تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کس سے ملنا چاہتا ہے۔ اس نے

جواب دیے بغیر گن نکال لی اور بولا کہ زبان بند رکھنا اپنی کالے کتے' پھر وہ مجھے دھکیل کر اندر لے گیا۔ سب سے پہلے اس کے سامنے میری بیوی آئی۔ اس نے بلاتوقف اس کے سر کا نشانہ لے کر گولی چلادی۔ میرا خیال ہے کہ وہ دلاور کو پہچانتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں حیرت تھی اور اس نے چلاّ کے کہا بھی تھا کہ یہ تم کیا کررہے ہو؟"

"کیا اس نے دلاور کا نام لے کر اسے مخاطب کیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

اس نے سوچ کے کہا "مجھے یاد نہیں آتا۔"

"پھر تم کو کیسے معلوم ہوا کہ وہ دلاور ہے۔ تم نے اسے پہلے دیکھا بھی نہیں تھا اور اس کے بارے میں تم کچھ نہیں جانتے تھے۔"

"بیوی کو گولی مارنے کے بعد اس نے میری گرل فرینڈ کی طرف دیکھا جو خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس کی حالت اتنی خراب تھی کہ وہ چیخ بھی نہ سکی۔ یقیناً وہ ڈرتی ہوگی کہ اس نے آواز نکالی تو قاتل اس کو بھی نہیں چھوڑے گا۔ وہ ایک کونے میں گم صم اور بے حس وحرکت کھڑی تھی اور اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری بیوی کو دم توڑتا دیکھ رہی تھی۔ بے شک اسے میری بیوی سے رقابت تھی اور حسد بھی ہوگا۔ اس کی کوئی جذباتی ہمدردی میری بیوی کے ساتھ نہیں ہوسکتی تھی مگر اسے اچانک گولی لگنے کے بعد خاک وخون میں غلطاں دیکھنا اس کے لیے ایک بھیانک تجربہ تھا۔ ویسے کوئی پاگل کتے یا معذور گھوڑے کو بھی گولی مارے تو دکھ ہوتا ہے۔ تاہم اسے یقین ہوگا کہ یہ اجنبی قاتل جس نے میری بیوی کو قتل کیا تھا اس کی ذاتی وجوہ رکھتا ہوگا اور ان کے درمیان اختلاف یا عداوت کی کوئی ایسی صورتِ حال ہوگی جس میں وہ شخص پاگل ہوگیا تھا اور گولی مارنے پر مجبور تھا۔ وہ اس اختلافی مسئلے کو عقل' ٹھنڈے دماغ اور بات چیت سے حل کرنے کی کوشش میں ناکام رہے ہوں گے اور قطع نظر اس سے کہ غلطی کس کی تھی اور زیادتی کس نے کی تھی۔ قصوروار کون تھا اور سزا غلط تھی یا صحیح۔ میری گرل فرینڈ کے ذہن میں یہ ہرگز نہیں ہوگا کہ کوئی اسے بھی بلاوجہ قتل کرسکتا ہے۔ بے شک عینی گواہ ہونا بھی کم سنگین جرم نہیں ہوتا اور کچھ قاتل کسی گواہ کو زندہ چھوڑنے کا خطرہ مول نہیں لیتے مگر اس وقت وہ یہی سمجھی ہوگی کہ وہ محفوظ ہے اور قاتل اپنا کام کرکے چلا جائے گا۔ چنانچہ وہ خاموش اور ساکت کھڑی رہی۔"

میں نے کہا "اور تم..... تم اس وقت کہاں تھے؟"

"میں دلاور کے پیچھے ایک صوفے کی اوٹ میں دبکا ہوا تھا۔ جہاں سے اسے دیکھ سکتا تھا اور اپنی گرل فرینڈ کو بھی۔"

"تم نے اسے..... اپنی بیوی کو بچانے کے لیے کچھ نہیں کیا؟"

"مجھے وقت کہاں ملا؟"

میں نے کہا "تمہیں خیال بھی نہیں آیا تھا کہ تمہیں کچھ کرنا چاہیے؟ آخر وہ تمہاری بیوی تھی۔"

"سچ پوچھو تو..... مجھے خیال آیا تھا۔ دیر سے ہی سہی۔ اس وقت جب دلاور نے مجھے ایک طرف دھکیل کر میری بیوی کا پوچھا۔ نام لے کر اور گالی دے کر کہا کہ وہ..... کہاں ہے۔ تب بھی مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ کیا کرسکتا ہے اور کیا کرنے والا ہے۔ مگر اس نے ریوالور نکالا تو میں حیرت' صدمے اور خوف سے سن ہوگیا تھا۔ اس وقت مجھے خیال آیا تھا' شور مچانے کا یا اس پر کوئی چیز کھینچ مارنے کا..اور اسے روکنے کا۔ مگر پھر میں نے سوچا کہ..... کیا ضرورت ہے؟ میرا کام کوئی اور آسان کررہا ہے۔ میری جان چھوٹ جائے گی اس کُتیا سے اور مجھے اس کی دولت جائداد میں سے اپنا حصہ بھی مل جائے گا۔ سارا نہ سہی' آدھا بھی مجھے بہت تھا۔ میں نے ہیرو جیسی بہادری سے کام لینے کا ارادہ ترک کردیا اور پھر سب کچھ اتنی سرعت کے ساتھ ہوا کہ میں جنبش بھی نہ کرسکا۔ اندر داخل ہونے کے پانچ سیکنڈ بعد وہ فائر کرچکا تھا۔ اس نے اپنی سوتیلی ماں سے کوئی سوال نہیں کیا۔ اسے کوئی وجہ نہیں بتائی اور صفائی کا موقع دینے میں بالکل وقت ضائع نہیں کیا۔ بس نشانہ لیا' اس کے سامنے آتے ہی اور پیشانی میں سوراخ کردیا۔ اس کا نشانہ یقیناً بہت اچھا تھا۔"

"کیا فائر کی آواز باہر گئی تھی؟"

"گئی ہوگی مگر بہت کم۔ دروازے کھڑکیاں سب بند تھے اور وہ فلیٹ بھی آخری گوشے میں تھا۔ اس کے سامنے والا فلیٹ خالی تھا۔ دائیں طرف والے میں جو نوجوان جوڑا رہتا تھا وہ دن بھر ملازمت کے سلسلے میں باہر رہتے تھے۔ شام کو ذرا سی دیر کے لیے گھر آتے تھے اور پھر اکٹھے گھومنے پھرنے نکل جاتے تو رات گئے لوٹتے تھے۔ دوسری طرف دن میں ایک بڑھیا رہتی ہے جس کو ٹھیک سُنائی نہیں دیتا۔ وہ آلۂ سماعت استعمال کرتی تھی مگر اس وقت جب بیٹا اور بہو اصرار کریں اور ہنگامہ کریں کہ آخر وہ خریدا ہی کس لیے گیا ہے۔ دن میں بیٹا بہو باہر ہوتے تھے اور بچے اسکول میں تو بڑھیا بہری بنی رہنا پسند کرتی تھی۔ اس کے علاوہ آس پاس شور بہت ہوتا تھا۔ ایک فائر کی آواز پر لوگ اچھل نہیں پڑتے۔ یہ خیال آتا ہے کہ کسی کار کا بیک فائر ہوگا۔ کوئی ٹائر برسٹ ہوا ہوگا۔ ممکن ہے ٹی وی پر جرائم کا کوئی سیریل چل رہا ہو۔ کسی نے آواز اونچی کردی ہو۔ ایک مضافاتی مکان میں یا گاؤں میں یقیناً فائر کی آواز پر درختوں سے پرندے اُڑجاتے اور گھروں سے لوگ نکل آتے مگر شہر میں ایسا نہیں ہوتا۔ فرض کریں کسی کو شک ہوتا کہ یہ ریوالور کا فائر تھا تو اسے ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ کام چھوڑ کے یا تفریح میں خلل ڈال کے تفتیش کرنے نکلے اور خواہ مخواہ گواہی کے جھمیلے میں پڑے۔ کسی مسلح قاتل یا ڈاکو سے مقابلے کا تو سوال ہی نہیں۔ میری بیوی کو گولی مارنے کے بعد جب اس نے مرتی ہوئی عورت سے پوچھا کہ تمہاری بیٹی کہاں ہے؟ اور پھر اسے ٹھوکر مار کے بولا "بول تیلی کہاں ہے؟" تو مرتے مرتے بھی میری بیوی نے سر اٹھا کے کہا تھا "... کے لیے دلاور۔ اسے چھوڑ دو۔" اور پھر مرگئی تھی۔ میرا خیال ہے کہ اس کی بات نے غلط فہمی پیدا کی۔ دلاور کو لڑکی شیلی ہے جو گھر میں موجود ہے۔ اگر وہ کہہ ... ہے تو شاید دلاور ایسے ہی نکل جاتا۔ مگر مرنے والی کا اشارہ میری گرل فرینڈ کی طرف تھا۔ اس نے جانتے بوجھتے ... اسے معلوم ہوگا کہ دلاور نے شیلی کو کبھی نہیں دیکھا ... لڑکی کو مارنے گا تو شیلی بچ جائے گی اور اس عورت کا قصہ ... ہوجائے گا جس نے اس کے شوہر کو ورغلا کے غاصبانہ ... تھا اور اس سے شادی کے چکر میں تھی۔ اس نے ایک ... شکار کیے۔ اپنی بیٹی کو بچالیا' اپنی دشمن کو مروادیا اور ... دلوادی۔ دلاور نے ریوالور اٹھا کے اس لڑکی کا نشانہ لیا تو ... لگی۔ مجھے مت مارو۔ مجھے مت مارو۔ میں کسی کو نہیں ... گی۔

"اگر وہ کہتی کہ میں شیلی نہیں ہوں۔ تو شاید بچ جاتی ... نے سمجھا کہ دلاور اسے چشم دید گواہ ہونے کی وجہ سے مار ... دلاور نے اس کی بھی پیشانی میں سوراخ کیا۔ بلاشبہ غضب ... تھا اس کا۔ اور یقین کرو اس وقت میں نے سمجھ لیا تھا کہ ... باری ہے۔ موت کو اتنے قریب پا کے خوف سے میرا پیشاب ... ہوگیا تھا۔ میرا بدن ٹھنڈا پڑگیا تھا اور میں پتھر کا ہوگیا تھا۔ ... وقت آسانی سے مجھے گولی مار سکتا تھا مگر اچانک وہ پلٹا اور ... ماں کے جسم کو پھلانگ کے دروازے سے نکل گیا۔ شاید ... کرنے کے بعد اسے ڈر تھا کہ اب لوگ آجائیں گے۔ اس ... ریوالور وہیں پھینک دیا تھا جہاں اس کی سوتیلی ماں کی لاش ... تھی۔ مگر مجھے پتا نہیں تھا۔ وہ نکل گیا تو میں چھلانگ مار کے ... کے پیچھے سے نکلا۔"

"BRAVO" میں نے زور سے کہا جس کا مطلب ... شاباش ہی ہے۔

جارج کی آنکھوں سے آنسو ٹپک گئے۔ "وہ بھی مرچکی ... خون اس کی دونوں خوبصورت آنکھوں کے درمیان سے ... اور فرش پر جمع ہورہا تھا۔ بالکل یہی پوزیشن دوسری لاش کی ... بھی اوندھی پڑی تھی اور اس کے سر سے بھی خون کی دھار ... تھی۔ اچانک میری نظر ریوالور پر پڑی اور میں نے اسے ... اصولاً مجھے اس کو چھونا بھی نہیں چاہیے تھا مگر میرا دماغ ... کہاں تھا۔ مجھ میں اور ایک پاگل میں کوئی فرق نہیں تھا۔ ... میری بیوی کا خون تھا۔ تازہ۔ سرخ اور ہاتھ کی انگلیوں ... والا۔ وہاں تازہ خون کی باس تھی اور میں دو لاشوں کے ... کھڑا تھا جن کی پیشانی میں سوراخ تھے۔ ایک میری بیوی ... ایک محبوبہ۔ نہ جانے مجھے ان کی کھلی آنکھیں دیکھ کے ... میں نے وہی ریوالور اپنی پیشانی پر رکھا مگر میں گولی نہ چلا ... چکر سا آیا اور متلی سے میرا دماغ ماؤف ہوگیا۔ میرا ... اور میری آنکھوں کے آگے اندھیرا سا پھیل گیا۔ میں ... پھر جب مجھے ہوش آیا تو میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ...

... ہرا ہوا تھا۔"

... پلس سے ... خاموش ہوگیا مگر اس کی نظریں چھت کو یوں تکتی رہیں جیسی وہ ... سنیما کا سفید اسکرین ہے اور اس پر وہی خونی منظر ابھی تک ٹھہرا ... ہوا ہے جیسے سنیما سلائیڈ پروجیکٹر میں آخری تصویر اپنی ساری ... تفصیلات کے ساتھ رک گئی ہے۔

میں نے کہا "گویا دلاور کا نام تم نے صرف ایک بار ہی سنا ... تھا۔"

"ہاں۔ اس وقت جب میری بیوی نے کہا تھا کہ دلاور۔ خدا کے لیے اسے چھوڑ دو۔"

"اور تمہیں یہ نام یاد رہا؟"

"یاد کیسے نہ رہتا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ آخر یہ شخص کون ہے اور اس نے دو قتل کیوں کیے۔ یہی یاد رکھنے والی سب سے اہم بات تھی۔"

"تم نے اسے غور سے دیکھا تھا؟"

"اسے دیکھنے کے سوا میں نے کیا ہی کیا تھا۔ میں اس کی صورت کے ایک ایک نقش کو ذہن میں بٹھاتا رہا تھا۔ یہ بہت ضروری تھا۔ میں اس کے فیچرز' اس کے بالوں اور آنکھوں کا رنگ۔ قد و قامت۔ وزن۔ لباس اور بات چیت کے انداز سب کا مشاہدہ کرتا رہا تھا۔ اس لیے کہ ضرورت پڑے تو میں تفصیل سے سب بتا سکوں اور اسے پھر دیکھوں تو شک و شبے کے بغیر پہچان لوں۔ یہی وجہ ہے کہ دو سال بعد۔ دو سال تین ماہ۔ سات دن بعد۔ جب وہ پھر میرے سامنے آیا تو میں نے چھوٹتے ہی اس سے کہا' دلاور۔"

"کیا اس پر وہ حیران ہوا تھا؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟ وہ اصل حلیے میں نہیں تھا۔ اسے حیران ہونا چاہیے تھا۔"

جارج نے کہا "پتا نہیں۔ اس نے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اس نے اپنی حیرانی کے جذبات اور ردِ عمل پر قابو پالیا ہوگا۔"

میں نے کہا "وہ بڑا حرامی ایکٹر ہے۔ خیر۔ تمہارے لبوں سے اپنا نام سن کے اس نے کیا کہا؟"

"اس نے کہا کہ ہاں۔ میں دلاور ہی ہوں۔" جارج بولا "میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اب اس..... کو کیا کہوں؟ غلطی میری اپنی تھی کہ اس سے ملنے چلا گیا تھا۔ میں نے کہا کہ تم نے کچھ اور نام استعمال کیا تھا اس نے حیرانی سے کہا نہیں۔ نام بدلنے کی کیا ضرورت تھی مجھے۔ میں نے کہا۔ مجھے بتانے والے نے دلاور نام نہیں لیا تھا۔ وہ بولا' غلط سنایا سمجھا ہوگا اس نے۔ میں نے کہا کہ منحوس۔ یہ بتاؤ کہ اب کیوں آئے ہو؟ یہ دیکھنے کے لیے کہ تمہارے جرم کی سزا میں کیسے کاٹ رہا ہوں؟" اس نے کہا' نہیں جارج۔ مجھے بہت ہمدردی ہے تم سے۔ بس یہ بات سن کے میرے دماغ کا فیوز اڑ گیا۔ میں نے اسے گالیاں دیں کہ ایسی کی تیسی تمہاری ہمدردی کی۔ یہ ہمدردی ہے کہ تم نے دو قتل کیے۔ میری بیوی کو مار ڈالا اور میری گرل فرینڈ کو۔ اور مجھ بے گناہ کو قاتل بنادیا۔ دفع ہوجاؤ یہاں سے۔ میں شکل نہیں دیکھنا چاہتا تمہاری۔ کاش یہ میرے اختیار میں ہوتا کہ تمہیں قتل کرسکوں۔ اس پر وہ بولا "جارج۔ میں تمہارے جذبات سمجھتا ہوں اور اپنا قصور مانتا ہوں تم واقعی بے گناہ تھے اور سزا مجھے ملنی چاہیے۔ میں نے دو سال بڑی اذیت میں گزارے۔ میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا رہا۔ میں اعصابی اور ذہنی مریض ہوگیا تھا۔ میں رات کو سو نہیں سکتا تھا اور سوتا تھا تو مجھے ڈراؤنے خواب آتے تھے۔ میں تقریباً پاگل ہوگیا تھا۔ میں اپنا علاج بھی کراتا رہا مگر ماہرینِ نفسیات نے کہا کہ تمہارے دل پر جو بوجھ ہے۔ احساسِ جرم دگناہ کا۔ جب تک تم اس سے نجات حاصل نہیں کروگے تم ٹھیک نہیں ہوسکتے۔ بس اس کے بعد میں نے بہت سوچا اور بالآخر تمہارے پاس آگیا" میں نے کہا' میرے پاس آکے اقرارِ جرم کرنے سے یا کسی پادری کے سامنے ایسا کرنے سے کیا فائدہ۔ جاؤ پولیس کو بتاؤ۔ عدالت میں حاضر ہوکے بیان دو؟ اس نے کہا "جارج۔ میں یہی کروں گا۔ تم کو پہلے اس لیے بتارہا ہوں کہ تم کچھ اور مت سمجھنا۔ مجھے کسی کا ڈر نہیں تھا اور نہ کوئی پیچھے پڑسکتا تھا۔ میں اپنی مرضی سے اپنی سزا قبول کرنا چاہتا ہوں۔ میں تم سے معافی مانگنے آیا ہوں۔ میری وجہ سے تم نے دو سال جیل میں کاٹے۔" اس کی بات نے مجھے حیران کردیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ دلاور۔ کیا واقعی تم اعترافِ جرم کرلوگے؟ اور اس نے کہا "ہاں اب اس کے سوا چارہ نہیں" پھر اس نے مجھے سگریٹ کا ایک پیکٹ دیا "سگریٹ پیو" اس نے کہا اور اس پیکٹ میں سے اپنے لیے بھی ایک سگریٹ نکال کے جلائی۔ میرا خیال ہے کہ اس میں دو چار زہریلے سگریٹ ہوں گے۔ میں نے ایک سگریٹ جلائی اور پیکٹ جیب میں چُھپالیا۔ یہ بات یقینی تھی کہ باقی سگریٹ میں اکیلا جیل کی کوٹھری میں چھپ کے پیوں گا۔ جیل میں سگریٹ بڑی نعمت ہوتی ہے۔ آزاد دنیا کی ہر چیز نعمت ہوتی ہے جو آدمی کسی کے ساتھ شیئر نہیں کرتا۔ وہ خود غرض اور کمینہ ہوجاتا ہے۔ لیکن دیکھو کبھی آدمی کا کمینہ پن کیسے اس کے کام آتا ہے۔ اس کی بدی کا نتیجہ اچھا نکلتا ہے۔ اگر میں فراخدلی اور دوستانہ جذبات کا مظاہرہ کرتا اور سگریٹ کا وہ پیکٹ سب میں بانٹ دیتا کہ لو عیش کرو۔ آج باہر کی دنیا سے ایک تحفہ ملا ہے۔ اتنے قیمتی سگریٹ سب مل کے پیتے اور پتا نہیں کیا ہوتا۔ سب مرجاتے یا دو چار مرتے۔ میں بچ جاتا یا مرجاتا۔"

میں نے کہا "سگریٹ کا وہ پیکٹ اب کہاں ہے؟"

اس نے کہا "مجھے نہیں معلوم۔ میں دلاور سے آدھا گھنٹا باتیں کرتا رہا۔ میں نے اس سے کہا کہ چلو کوئی بات نہیں۔ دیر آید درست آید۔ آخر تم کو زیادتی کا احساس ہوگیا۔"

میں نے کہا "کیا اس وقت بھی تم نے اس سے نہیں پوچھا تھا کہ آخر.. قتل اس نے کیوں کیے تھے؟"

"میں نے پوچھا تھا مگر اس نے اُداس صورت بنا کے کہا کہ

اب وجہ جان کے کیا کرو گے۔ تمہیں زیادہ صدمہ ہوگا۔ بس تھی ایسی ہی کوئی بات کہ میں قتل کرنے پر مجبور ہوگیا تھا۔ معمولی بات پر کون قتل کرتا ہے۔"

"یہ بتایا اس نے کہ تمہاری بیوی کے بعد تمہاری گرل فرینڈ کو کیوں مار دیا تھا اس نے؟"

"اس نے کہا کہ وہ چشم دید گواہ جو تھی۔"

میں نے کہا "لیکن چشم دید گواہ تو تم بھی تھے۔"

"تم واقعی وکیل ہو" جارج بولا "مجھے خیال نہیں آیا تھا یہ بات پوچھنے کا۔ لیکن میں سوال کرتا تو وہ کہہ دیتا کہ مجھے جلدی تھی۔ یا وہ کہتا کہ تم سامنے نہیں آئے۔ میں سمجھا تم بھاگ گئے ہو۔ تم کو تلاش کرنے کے لیے میں رُک نہیں سکتا تھا۔"

میں نے سرہلایا "ہاں۔ ایسے ہی کسی جواب سے وہ تم کو مطمئن کردیتا۔ وہ بہت چالاک آدمی ہے۔ اتنا عیّار کہ تم تصور نہیں کرسکتے۔"

"ہاں۔ اس نے دوسری بار مجھے بے وقوف بنا کے قتل کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی اور دیکھو۔ میں اس کی باتوں میں آگیا۔ میں نے اس پر یقین کرلیا۔ حالانکہ ایسا کون کرتا ہے۔ یہ ضمیر وغیرہ کہاں ہوتا ہے دلاور جیسے لوگوں کا۔ اور ہو تو ان کو اتنا تنگ کیسے کرسکتا ہے کہ وہ رضاکارانہ طور پر مرنا قبول کرلیں۔ وہ بھی دو سال بعد......" وہ تلخی سے ہنسا۔

"ایک بات اور ہے جارج" میں نے کہا "تمہارے سامنے اس نے تمہاری بیوی سے پوچھا تھا کہ شیلی کہاں ہے؟"

"ہاں اور جواب میں مرتے مرتے بھی اس نے کہا تھا کہ خدا کے لیے دلاور۔ اس کو چھوڑ دو۔"

میں نے کہا "اس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟"

"کیا ثابت ہوتا ہے؟"

"یہی کہ اس معاملے سے شیلی کا بھی کوئی تعلق تھا۔ اس کی ماں نے ایک سیدھے سادے سوال کے نتیجے میں کیوں فرض کرلیا تھا کہ وہ شیلی کو بھی مار دے گا؟ جب کوئی تم سے کسی کے بارے میں معلوم کرے کہ وہ کہاں ہے تو تمہارا یا کسی عام آدمی کا جواب یہ ہوگا کہ مجھے نہیں معلوم۔ یا یہ کہ وہ فلاں جگہ ہے یا آنے والی ہے۔ لیکن شیلی کی ماں نے سوال سنتے ہی اس کی نیت کا اندازہ کرلیا تھا۔"

اس نے سوچ کے سرہلایا "یو آر ویری رائٹ۔"

"تمہارے مقدمے اور اپیل کے کیس میں تمہارے وکیل نے تم سے سارے واقعات سُنے ہوں گے۔ پولیس نے بھی بیان لیا ہوگا۔ زبانی۔ پھر تحریری۔ تم پر جرح ہوئی ہوگی تاکہ تمہارے بیان میں جھوٹ ہو تو پکڑا جائے۔"

"میرے بیان میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ میں نے وہی بتایا جو سچ تھا۔ جو میں نے سُنا اور دیکھا تھا۔ لیکن میری بات پر یقین کسی نے نہیں کیا۔"

"وہ ایک الگ بات ہے۔ کیا تمہارے وکیل نے یا مخالف وکیل نے تم سے یہ سوالات نہیں پوچھے تھے۔ جو میں ... ہوں؟"

"پوچھے تھے۔"

"پھر تم نے کیا بتایا تھا؟" میں نے کہا۔

"یہی کہ جب میں نے دلاور کو پہلے کبھی دیکھا ہی نہیں ... کیا بتاؤں کہ اسے میری بیوی سے کیا دشمنی تھی۔ کب سے ... شیلی کو کیوں مارنا چاہتا تھا اور اس کی ماں نے کیوں کہا تھا کہ ... لیے اسے چھوڑ دو۔ انہوں نے میرے جواب کا نتیجہ یہی نکالا ... نے جان بچانے کے لیے ایک کردار وضع کرلیا ہے اور اس ... دلاور رکھ دیا ہے۔"

"تم سے دلاور کا حُلیہ بھی پوچھا گیا ہوگا!"

"بار بار۔ اور ہر بار میں نے ایک ہی چہرہ اور حُلیہ بتایا ... وکیل نے دلاور کی تلاش میں ناکامی کا ذمّے دار پولیس کو ... کہا کہ انہیں جو آسانی سے مل گیا اسے وہ ملزم بنا کے مطمئن ... ہیں خواہ اس اطمینان کے نتیجے میں ایک بے گناہ کو سزائے ... ہوجائے لیکن پولیس نے اس الزام کی تردید کی۔ انہوں نے ... اس نام کے تین ایشیائی تلاش کرلیے گئے تھے۔ عدالت کے ... انہیں پیش کیا گیا اور مجھے شناخت کے لیے بلایا گیا مگر ان میں ... قاتل نہیں تھا۔ میں نے انہیں پہچاننے سے انکار کردیا۔"

میں نے کہا "جارج۔ کسی ملزم کو تلاش کرنے کے لیے ... ایک اور طریقہ بھی استعمال کرتی ہے۔ IDENTIFICATION-KIT استعمال کرتے ہیں ... بتایا جائے اس کے مطابق آنکھیں' ناک' کان اور چہرے ... مختلف حصے جوڑ کر کئی چہرے بنا لیتے ہیں اور جو بیان کردہ ... نزدیک ہو اسے مشتہر کردیا جاتا ہے۔ یا اس کام میں کوئی آرٹسٹ ... کرتا ہے جو ملزم کا چہرہ تصور کی مدد سے بناتا ہے۔ یعنی جیسا ... جائے اس کے مطابق ہو۔ پھر اس میں ملزم کو شناخت کرنے ... کی مدد سے تبدیلیاں کی جاتی ہیں۔ وہ ... اسکیچ ہوتا ہے ... والا جیسا محسوس کرتا ہے ویسا ہی ردوبدل کرتے جاتے ہیں ... کہ تعمیر دیکھو۔ ٹھوڑی لمبی یا چھوٹی ناک کھڑی یا ... پتلی یا پھیلی ہوئی۔ ایک جگہ شناخت کرنے والا کہتا ہے کہ ... رائٹ۔ بالکل یہی ناک تھی۔ پھر آنکھیں۔ ہونٹ ... ٹھوڑی۔ مٹاتے ہوئے بناتے بالآخر ایک ایسا چہرہ بن جاتا ... نوّے فیصد سے زائد مشابہت رکھتا ہے۔"

اس نے قدرے حیرانی سے کہا "ہاں میں نے سُنا تو ... کسی نے بھی میری اس طرح مدد نہیں کی۔"

"یہ تمہارے وکیل کا کام تھا۔ وہ آرٹسٹ یا کٹ کی ... دلاور کا چہرہ بنواتا اور پھر اسے مشتہر کیا جاتا۔ تم کہتے ہو کہ ... بہت غور سے دیکھا تھا اور تمہیں تفصیلات اچھی طرح یاد ... سے غلطی نہیں ہوسکتی تھی۔ اگر دلاور کی صورت کا خاکہ ... اسے اخبارات میں شائع کرایا جاسکتا تھا اور ٹی وی پر دکھا ...

تھا۔" اس نے تلخ لہجے میں کہا "شاید ایسا ہوسکتا تھا لیکن میرے لیے نہیں ہوا۔ کیونکہ میں کالا بھی تھا۔ اتنا امیر نہیں تھا کہ وکیل کی فیس کے بعد آرٹسٹ کو افورڈ کرتا اور پبلسٹی کے اخراجات۔ اخبار ... غلطی کا سوال آج بھی نہیں۔ جب وہ حُلیہ بدل کے آیا تب بھی اسے پہچان لیا تھا میں نے کیونکہ اس کے فیچر وہی تھے۔ اس کے جانے کے بعد میں نے رات کو دو سگریٹ پیے۔ پہلے سگریٹ کا مجھے بہت لطف آیا۔ دوسرے نے مجھے ناک آؤٹ کردیا۔ میں نے اس کا صرف ایک ہی کش لیا تھا۔"

"وہ سگریٹ جیل حکّام کو ملا ہوگا۔"

"ملا ہوگا لیکن انہوں نے اس کو غائب کردیا۔ وہ ایسا نہ کرتے تو خود مشکل میں پڑ جاتے۔"

میں نے کہا "اور باقی پیکٹ؟"

"میں نے بتایا۔ مجھے نہیں معلوم۔ جب میں نے ایک کش لیا پھر دوسرے کش سے تو میرے دماغ کو ایک جھٹکا لگا۔ یا شاید دل کو۔ بس وہ ایک سیکنڈ کی بات تھی۔"

"اس کا ذائقہ۔ یا جو تم کو کچھ یاد ہو۔"

جارج نے نفی میں سرہلایا "کچھ عجیب سی بو تھی۔"

میں نے کہا "جیسی کڑوے باداموں سے آتی ہے۔"

وہ چونک پڑا "رائٹ ..... رائٹ۔ اب تم نے احساس دلایا ہے تو مجھے لگتا ہے کہ وہ ایسی ہی بُو تھی۔ تم نے کیسے جانا...."

"اس میں سائنائیڈ تھا۔ جو گیس کی صورت میں تمہارے سانس کے ذریعے پھیپڑوں میں پہنچا اور خون میں شامل ہوا۔"

"سائنائیڈ! وہ کیا ہوتا ہے؟"

"ایک انتہائی مہلک اور قاتل زہر۔ گیس چیمبر میں سزائے موت کیسے دیتے ہیں۔ کیا تم جانتے ہو؟ ملزم کو اندر بند کرنے کے بعد سلفیورک ایسڈ میں سائنائیڈ کے دوچار کیپسول گرا دیے جاتے ہیں۔ اس سے سائنائیڈ گیس پیدا ہوتی ہے جو اوپر اٹھ کے سانس میں جاتی ہے اور فوراً ملزم کا خاتمہ کردیتی ہے۔"

"پھر میں کیسے بچ گیا تھا" وہ سہم کے بولا۔

"سب سے اہم بات تو یہی ہے کہ خدا کو تمہیں زندہ رکھنا منظور تھا اور اس کی مرضی کے بغیر تمہاری جان کون لے سکتا تھا۔ تم اسے معجزہ کہہ سکتے ہو یا اپنی خوش قسمتی۔ تم نے ہلکا کش لیا یا پھر بہت کم مقدار میں گیس تمہارے پھیپڑوں تک پہنچی۔ وہ کھلی جگہ تھی جہاں تم نے اسے ناک یا منہ کے راستے خارج کردیا۔ وہ بہت کم جذب ہوئی۔ اس سے تم مرتے مرتے بچ گئے۔ یہ پکی بات ہے کہ تم لمبا گہرا کش لیتے تو وہ تمہاری آخری سانس ہوتی۔ چونکہ ایک سگریٹ تم پہلے انجوائے کرچکے تھے اس لیے تم نے دوسرے سگریٹ سے لمبا کش نہیں لیا۔ جیسا پہلا سگریٹ جلا کے لیا ہوگا۔ میں صرف مفروضے پر بات کرسکتا ہوں۔ کیا وکیل نے تم سے یہ بھی نہیں پوچھا تھا۔"

"کیا؟" جارج نے کھوکھلے لہجے میں کہا۔

"سگریٹ کے کش کی بُو کے بارے میں....."

"پوچھا تھا۔ مگر کڑوے باداموں کی بُو والی بات اس کے ذہن میں نہیں آئی۔ یا اسے معلوم نہیں تھی۔"

"چلو اللہ نے تمہیں بچایا۔ اب غور سے دیکھو۔ یہ دلاور کی تصویر ہے۔" میں نے ایک تصویر جیب سے نکالی۔ "دو سال پہلے بھی اس کی صورت یہی ہوگی۔"

"ہاں۔ بالکل یہی تھی" اس نے تصویر مجھ سے لے لی "کیا اسے میں رکھ لوں؟"

"ہاں۔ یہ میں تمہارے لیے لایا تھا جارج" میں نے کہا "کل تمہارا وکیل آئے گا۔ وہی جس نے تمہاری پیروی کی تھی۔"

"اب وہ کیا کرے گا؟"

"وہ جیل حکّام اور پولیس پر کیس کرے گا تمہاری طرف سے کہ ان کی غفلت کے باعث دلاور تم کو قتل کرنے کے لیے جیل میں پہنچ گیا تھا۔ اپنی بات پر قائم رہنا۔ جو سچ ہے وہی بتانا۔ میرے یہاں آنے کا کسی سے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں لیکن یہ تصویر اس وکیل کو ضرور دے دینا کہ دیکھو۔ یہ ہے چوہدری دلاور۔ اس کی اصل تصویر۔"

باہر کھڑے ہوئے سارجنٹ نے ایک بار پھر اندر آکے کہا "کیا تم دونوں یہاں ساری رات باتیں کرو گے۔"

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا "کیا تمہارے افسران بالا نے ملاقات کے وقت کی کوئی حد مقرر کی تھی؟"

وہ اس براہِ راست سوال کے لیے تیار نہ تھا "حد..... مقرر کرنے کا کیا سوال' تم کو خود ہی خیال رکھنا چاہیے۔"

میں نے کہا "میں جس حد تک خیال رکھ سکتا تھا میں نے رکھا۔ اس سے زیادہ کی مجھے استطاعت نہیں تھی۔ استطاعت کا مطلب سمجھتے ہو نا تم..... اور تمہارے افسران نے اجازت نامہ مرحمت فرماتے وقت صرف رازداری پر زور دیا تھا۔ یہ نہیں کہا تھا کہ شارٹ ہینڈ میں بات کرنا۔"

اس نے بُرا سا منہ بنایا اور واپس چلا گیا "میری طرف سے جہنم میں جاؤ۔"

یہ اس کے لاجواب ہونے اور منہ کی کھانے کی دلیل تھی۔ جارج نے اسے گالی دی "تم نے دماغ درست کردیا اس کا۔"

میں نے کہا "تم میری بات دھیان سے سُنو۔ دلاور کی تصویر کی ایک نقل جاتے وقت میں تمہارے وکیل کو دے جاؤں گا۔ دلاور کا یہاں گرفتار ہونا محض اتفاق پر منحصر ہے۔ زیادہ امکان یہ ہے کہ وہ پھر بھیس بدل لے گا لیکن ابھی لندن میں ہی رہے گا۔ صبح جب وکیل تم سے ملنے آئے تو تم اسے تصویر دینا اور بتانا کہ یہ ہے وہ شخص جس کے جرم کی سزا میں کاٹ رہا ہوں۔ یہ کوئی فرضی شخص نہیں ہے۔ یہ لاہور میں رہتا ہے۔ اس کا ایک خاندان ہے۔ اس کے بیوی بچے ہیں اور کاروبار ہے۔ اس کے سب سے بڑے بیٹے

فیصل ہے۔"

"لیکن...... وکیل پوچھے گا کہ تصویر کہاں سے آئی...... اور تم کو یہ ساری معلومات کس نے فراہم کردیں؟"

"جواب آسان ہے۔ ایک ہمدرد نے۔ میں اسے نہیں جانتا لیکن یہ ساری باتیں غلط نہیں اور کوئی غلط سمجھتا ہے تو تصدیق نہیں کرسکتا ہے یا کرا سکتا ہے۔ چوہدری دلاور نے یہاں آکے اپنی سوتیلی ماں کو قتل کیا۔ شیلی کے دھوکے میں تمہاری گرل فرینڈ کو ماردیا اور بھاگ گیا لیکن اس نے شیلی کے قتل کا ارادہ ترک نہیں کیا تھا۔ ایک سال سے بھی زیادہ عرصہ وہ خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اس نے اپنی سوتیلی بہن کو دھوکے سے لاہور بلایا۔ ظاہر یہ کیا کہ سوتیلا ہونے کے باوجود وہ اس کا بڑا بھائی ہے اور اس کی خواہش ہے کہ ماں باپ دونوں کے مرجانے کے بعد وہ لندن میں اکیلی نہ رہے بلکہ لاہور میں اس کے ساتھ رہے۔ وہاں پریکٹس کر ...... وہ ڈاکٹر ہے تو اسے ایک اسپتال کا مالک اور نگراں بنایا جاسکتا ہے۔"

"کیا اس نے ایسا ہی کیا تھا؟"

"میں تمہیں کسی فلم کی کہانی نہیں سُنا رہا ہوں۔" میں نے برہمی سے کہا "یہ سب حقائق ہیں۔ وہ واقعات جو پیش آچکے ہیں۔ تمہیں سب یاد رہے گا یا میں لکھ کردے دوں۔"

"نہیں...... میں یہ سب کیسے بھول سکتا ہوں؟"

میں نے کہا "جارج۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں صرف ایک کام کرنا ہے۔ تمہیں صرف دلاور کو عدالت میں شناخت کرنا ہوگا۔ سب کے سامنے۔"

"کون سی عدالت میں؟"

میں نے کہا "یہاں نہیں۔ تم کو بہت دور جانا پڑے گا۔ پاکستان...... اس کا ایک شہر ہے لاہور۔"

"مگر میں لاہور کیسے جاؤں گا۔"

"تمہیں بُلایا جائے گا۔" میں نے کہا "عدالتی حکم پر...... اس کے اخراجات بھی تم ادا نہیں کروگے لیکن یہ سمجھ لو کہ اس پر تمہاری زندگی اور موت کا انحصار ہے۔ تم نے دلاور کو شناخت کرلیا تو تمہاری صداقت ثابت ہوجائے گی۔ یہ مان لیا جائے گا کہ تم ٹھیک کہہ رہے تھے۔"

"جب دلاور یہاں ہے...... اور میں اسے یہاں شناخت کرسکتا ہوں۔"

میں نے انکار میں سرہلایا "وہ پاکستان سے بھاگ کے یہاں آیا ہے۔ وہ فرار نہ ہوتا تو گرفتار ہوجاتا۔ پہلے بھی وہ پولیس کی حراست سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ اب پکڑا گیا تو شاید اس کی ضمانت بھی منظور نہیں ہوگی۔ یہ بات وہ اچھی طرح جانتا ہے۔ اس پر ایک نہیں کئی سنگین نوعیت کے مقدمات ہیں۔"

"کیا ان میں میرا مقدمہ بھی شامل ہے؟"

"نہیں۔ ابھی تک نہیں ہے لیکن ہوجائے گا۔" میں نے کہا "...... اس پر ایک کیس ہے۔ ڈاکٹر شیلی کے قتل کا۔"

"شیلی کا قتل؟"

"ہاں۔ اس نے شیلی کو دھوکے سے لاہور بُلایا مگر شیلی نے اسے قریب سے دیکھا تو اسے دلاور سے نفرت ہوگئی۔" میں نے...

"یہ چوہدری دلاور میرے باپ کا قاتل بھی ہے...... اور جیسا کہ اس نے بتایا اس نے میرے باپ سے اس کا سب کچھ چھین لیا تو... مقدمہ الگ ہے۔ دلاور نے شیلی کو لندن سے بلایا تو میرا اور... جھگڑا چل رہا تھا۔ میرا اور دلاور کا۔ دلاور نے شیلی کو مجھ سے... کرنے کی پوری کوشش کی مگر ہوا یہ کہ شیلی کو حقائق کا علم ہو... اسے یہ پتا چل گیا کہ میرے والد کو قتل کرنے یا کرانے کے بعد... نے دوسرا قتل اپنے کاروبار میں شریک میر شرافت علی کا کرایا... میرے والد ایک پارٹنر تھے۔ دلاور دوسرا اور میر شرافت علی تیس... جب دو قتل ہوگئے تو سارا کاروبار جائداد اور اثاثے چوہدری دلا... کے قبضے میں چلے گئے۔ میر شرافت علی کا وارث کوئی نہیں... اپنے والد کا میں ایک ہی بیٹا تھا۔ مجھے راستے سے ہٹا... بن ...... سکتا تھا۔ اس نے بڑی چالاکی سے میر شرافت علی کے قتل... مجھے ملوث کردیا۔ اس خیال سے کہ مجھے پھانسی ہوجائے گی تو... کا راستہ صاف ہوجائے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ میں نے خود کو بے... گناہ ثابت کرنے کے لیے وہ سب کچھ کیا جو میں کرسکتا تھا۔... اور غیر قانونی سب حربے استعمال کیے۔ جب مسئلہ زندگی کا ہو... اتنی آسانی سے کوئی بھی سازش کا شکار ہوکے جان دینے پر... نہیں ہوسکتا۔ اس نے میرے والد کو پھر ان کے پارٹنر کو قتل کیا... اچھے خاصے دولت مند تھے۔ انہیں قلاش کردیا اور اب وہ چاہتا... کہ مجھے بھی ہلاک کرادے۔ میں مقابلہ کیوں نہ کرتا۔ اس طرح... میرے اور اس کے درمیان دشمنی کا آغاز ہوا۔ وہ ایک چالاک... بے ضمیر آدمی ہے۔ اس نے بہت سے ناجائز کاروبار ایسے... شروع کردیے تھے جو سو فی صد غیر قانونی تھے اور وطن دشمنی... زمرے میں آتے تھے۔ اس کی وجہ سے لندن میں میری تعلیم... آخری اسٹیج پر نامکمل رہ گئی تھی۔ اب میں کہاں تک گنواؤں... میرے ساتھ دشمنی میں اس نے میرے دوستوں کو نہیں چھوڑا... ان کے خاندان کو ختم کرادیا۔ میرے ایک دوست کی بیوی اور... اس کے ہاتھوں بڑے بے رحمانہ طریقے پر ہلاک ہوئے... ایک سابقہ منگیتر تھی۔ وہ اور اس کا شوہر مارے گئے۔ یہ سب... ہراساں کرنے اور مجھ پر دباؤ ڈالنے کے لیے تھا کہ میں اس کے... خلاف اپنی جنگ ختم کردوں۔ اپنے حق سے دست بردار ہوجاؤں... کبھی ایسا ہوسکتا تھا؟ اس نے مجھے خریدنے کے لیے بھاری... پیش کی تھیں کہ میں اس کا پیچھا چھوڑ دوں۔ لندن میں... ہوجاؤں یا اس کا پارٹنر بن جاؤں لیکن دلاور جیسے شخص کو... چھوڑنا شیطان کو بخشنے سے زیادہ سنگین جرم ہوتا۔ جب شیلی کو... ساری باتیں معلوم ہوئیں تو اس نے اپنے سوتیلے بھائی کو چھوڑ... اور مجھ سے مل گئی۔ کچھ حالات ایسے ہوگئے کہ اسے دلاور سے... محسوس ہوا اور میں نے اس کی مدد کی مگر میری مدد اسے بچانہ...

دلاور نے اسے اس طرح مروادیا کہ بظاہر وہ حادثہ معلوم ہو مگر کچھ عرصے پہلے میرے بہت سے دوست وکیل عدالت سے لاش کا پوسٹ مارٹم کرانے کے احکامات حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ لاش دوبارہ کھود کے نکالی گئی۔ دلاور نے کوشش کی تھی کہ لاش کو پہلے ہی قبر سے غائب کرادے۔ اس نے اسپتال کے مُردہ خانے سے بھی لاش لے جانی چاہی تھی لیکن ہمیں اندازہ تھا کہ وہ کس انتہا تک جاسکتا ہے۔ ہم نے پہلے ہی اس کے خلاف پوری منصوبہ بندی کرلی تھی۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ سے اس کا جرم ثابت ہوگیا اور وہ پکڑ لیا گیا لیکن پھر وہ کسی طرح فرار ہوگیا۔ اس عرصے میں ہمیں یہ بھی پتا چل گیا تھا کہ لندن میں اس نے دو قتل کیے تھے جن کے عینی شاہد کو بھی یعنی تمہیں مجرم بنا کے عمر قید کی سزا دے دی گئی ہے۔ ہم نے تمہارا سُراغ لگانے اور تمہیں دلاور کو شناخت کرنے کا موقع دلانے کا فیصلہ کیا۔ یو سی جارج۔ تم عینی گواہ ہو۔ باقی جتنے قتل دلاور نے کیے ہیں یا کرائے ہیں، ان کا چشم دید گواہ کوئی نہیں ہے۔ صرف واقعاتی یا حالات کی شہادت اسے مجرم ثابت کرتی ہے۔ اس کے خلاف بڑے ٹھوس ثبوت ہیں اور جب وہ پکڑا جائے۔"

جارج نے مایوسی سے کہا "وہ کہاں پکڑا جائے گا۔"

"نہیں جارج۔ اب اس شخص کو ہر طرف موت کا جال نظر آرہا ہے۔ جو کبھی خود کو موت کا شکاری کتا اور سمجھتا تھا۔ اس کے لیے فرار کے راستے بھی بند ہوتے جارہے ہیں۔ یہ صرف وقت کی بات ہے۔ قضا کو دھوکا کون دے سکتا ہے۔ اب جو کچھ وہ کررہا ہے وہ مایوسی اور دیوانگی کی انتہا کو پہنچ کر سوچے سمجھے بغیر کررہا ہے۔ دلاور کو پتا چل گیا تھا کہ ہم تمہیں پھر عدالت میں اسے شناخت کرانے کے لیے پیش کرنے کے چکر میں ہیں۔ وہ ہم سے پہلے یہاں پہنچا اور اس نے تمہیں بے وقوف بنا کے قتل کرنے کی کوشش کی لیکن جارج۔ جب بُرا وقت آتا ہے نا تو سیدھا کام بھی اُلٹا ہوجاتا ہے اور انسان کی کوئی تدبیر نہیں چلتی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ تم نے اسے پہچان لیا حالاں کہ اپنی طرف سے وہ بھیس بدل کے آیا تھا۔ جب یہ چال ناکام ہوگئی تو اس نے فوراً ایک کہانی گھڑلی۔ وہ بلاشبہ ذہین آدمی ہے۔"

"شیطان کی طرح ذہین۔"

"ہاں۔ اس نے تمہیں قائل کرلیا کہ وہ ضمیر کی خلش سے پریشان ہوکر خود کو قانون کے حوالے کرنا چاہتا ہے حالاں کہ ضمیر نام کی کوئی چیز اس کے پاس نہیں۔ اگر وہ ایسا نہ کہتا تو تم اس کے ساتھ دشمنی کا رویّہ کرتے۔ وہ سگریٹ پیش کرتا تو تم اس کے منہ پر ماردیتے۔ اس کی ذہانت کا یوں اندازہ کرو کہ جب وہ تم سے ملنے پہنچا ہوگا تو اس کے پاس تم سے دوستانہ سلوک کے لیے دوسری کہانی ہوگی۔ جب غیر متوقع طور پر تم اسے پہچان گئے تو اس کو نئی کہانی بنانے میں کوئی دیر نہیں لگی اور وہ تم کو قائل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کے نزدیک سب سے خطرناک دشمن تم ہو

لیکن یہ دیکھو کہ اب دلاور کی تقدیر اسے کس طرح دھوکا دے رہی ہے۔ تم اس کا دیا ہوا زہریلا سگریٹ پینے کے باوجود زندہ ہو اور میں تم سے مل کر یہ سب کچھ بتانے یہاں پہنچ گیا ہوں۔ حالاں کہ جب میں لندن آیا تھا تو مجھے یہ کام بہت مشکل دکھائی دیتا تھا۔ اگر تم جیل میں ہوتے تو یقیناً تم سے مل کر اتنی باتیں کرنا آسان نہ ہوتا مگر قدرت نے اسباب پیدا کردیے۔ دشمنی کی تھی دلاور نے۔ دباؤ میں آگئے جیل کے حکام اور پولیس والے۔ انہیں خود کو بچانے کے لیے اس ملاقات کی اجازت دینی پڑی۔ اب وہ تم سے کہیں گے کہ تم ان کے خلاف کوئی بیان مت دو۔"

"پھر کیا کروں؟"

"صبح جب تمہارا وکیل آئے تو تم وکیل سے کہو کہ جیل حکام نے رشوت لی ورنہ حفاظتی انتظامات اتنے سخت ہونے کے باوجود دلاور کیسے جیل کے اندر پہنچ گیا۔ جیل حکام پر میرے قتل کی سازش میں شریک ہونے کا جرم ثابت ہوتا ہے اور مجھے خطرہ ہے کہ مجھے مروادیا جائے گا۔ یہی خطرہ مجھے پولیس سے ہے۔ میرے ساتھ نسلی تعصب کی بنا پر پہلے بھی انصاف نہیں ہوا تھا اور اب پھر مجھے جیل کے اندر ہی ہلاک کرنے کی کوشش کی گئی۔ پولیس اور جیل کے حکامِ اعلیٰ قاتل کو بچارہے ہیں۔ تمہارا بیان اخباروں میں آجائے گا اور جو کالے لوگوں کی جیل میں بند قیدیوں کی فلاح کی اور انسانی حقوق کی تنظیمیں ہیں وہ سب تمہارا کیس خوب اُچھالیں گی۔ ہنگامے اور مظاہرے کرادیں گی۔ اس کا مقصد صرف یہ ہوگا کہ تمہاری حفاظت اور نگرانی کے معاملے میں وہ پہلے سے زیادہ محتاط ہوجائیں۔ دلاور کسی اور طریقے سے تم کو ہلاک نہ کراسکے۔ تمہیں تو زندہ رکھنا جیل والوں کی ذمّے داری ہوجائے گی۔ تمہارا زندہ رہنا ہی اہم ہے۔ لاہور کی عدالت میں ہم خود تمہیں بُلوالیں گے۔ یہ کام تمہارا وکیل کرے گا لیکن یہاں تمہارا ایک اور اہم مددگار ہے حاجی علم دین۔ وہ ایک اخبار کا ایڈیٹر ہے۔"

"اخبار کا ایڈیٹر؟ کیا نام بتایا ہے تم نے؟"

"حاجی علم دین۔ اس کے اخبار کا نام ہے طوطی!"

"ٹوٹی......؟" اس نے حیرانی سے دُہرایا "کبھی سُنا نہیں۔ واٹ اے فنی نیم۔" اس نے پھر حاجی کا نام دُہرایا "وہ کیوں میرا دوست ہے۔"

"اس لیے کہ وہ میرا دوست ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ میرے لیے کیا کرے گا؟"

"وہ تم سے پاور آف اٹارنی لے گا۔ تمہارے دستخط حاصل کرے گا تاکہ اسے قانونی طور پر تمہاری طرف سے کوئی درخواست دائر کرنے کا حق حاصل ہوجائے۔ پھر وہ عدالت میں درخواست دے گا کہ تمہیں لاہور بھیجا جائے جہاں ایک عدالت میں چوہدری دلاور کے خلاف قتل کا مقدمہ چل رہا ہے۔ وہ اپنے اخبار کے ذریعے ڈاکٹر شیلی مرڈر کیس کی ساری روداد عام کردے گا اور تمہارے حق میں مہم چلائے گا۔ جیسے ہی چوہدری دلاور پکڑا گیا تم کو

بھی شناخت کے لیے لاہور بھیجنے کا انتظام کردیا جائے گا۔ تم جانتے ہو شناخت کیسے کرائی جاتی ہے؟ دلاور کو چار پانچ دوسرے لوگوں کے درمیان کھڑا کردیا جائے گا اور تم سے کہا جائے گا کہ اب بتاؤ دلاور کون ہے؟ تم نے تصویر دیکھ لی اب یہ مجھے واپس کردو تاکہ تمہاری پوزیشن ٹھیک رہے۔ یہ نہ کہا جائے کہ تم کو شناخت کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ تمہاری نظر اور یادداشت قابل تعریف ہے کہ تم نے چوہدری دلاور کو بھیس بدلنے کے باوجود پہچان لیا تھا۔ آئندہ بھی تم اسے پہچان لوگے۔ یہاں حاجی علم دین تمہارے وکیل کو......"

سارجنٹ نے اچانک اندر آتے ہوئے کہا "یو فول۔ تم نے میری بات نہیں مانی' اپنے ساتھ مجھے بھی مشکل میں ڈالا۔"

میں نے کہا "کیا ہوا؟"

مگر اس کے جواب دینے سے پہلے تین افراد اندر آگئے۔ ان میں ایک کوئی پولیس افسر تھا۔ دوسرا اسپتال کی سیکیورٹی کے عملے کا رکن نظر آتا تھا۔ سینئر ڈاکٹر بھی ہوسکتا تھا اور اسکاٹ لینڈ کا سُراغ رساں بھی۔

تیسرے شخص نے مجھ سے کچھ فاصلے پر رُک کے مجھے غور سے دیکھا "تم وقار یوسف ایڈووکیٹ ہو؟"

میرے لیے اقرار کرنا لازمی ہوگیا "ہاں۔ مگر۔"

"اگر مگر مت کرو۔ تم نے لیڈی الزبتھ گورڈن کو فون کیا تھا؟ ایک پبلک کال آفس سے...... میں پولیس کا سُراغ رساں ہوں۔" اس نے اپنے شناختی کارڈ کی جھلک دکھائی۔

"کیا انہیں فون کرنا جرم ہے۔"

"نہیں۔" سر رچرڈ گورڈن کی کار میں بم رکھنا بھی جرم نہیں۔ لیکن سکندر بخت کا وقار یوسف بن کے ویزا کے بغیر لندن آنا بہت سنگین جرم ہے۔ باقی جرائم کا مسئلہ اس کے بعد......"

میں نے بہت دیر کردی تھی اور دشمنوں کو میرا سُراغ لگا کے مجھ تک پہنچنے کا موقع مل گیا تھا۔ اب میں بے بس اور مجبور تھا۔ سراغ رساں کے پیچھے پولیس افسر اپنے ہاتھ میں ریوالور لیے کھڑا تھا اور اتنے کم فاصلے سے اس کا نشانہ خطا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ویسے بھی مجھے ماردینا میری گرفتاری سے زیادہ فائدہ مند تھا۔ یہ کہا جاسکتا تھا کہ میں نے مقابلہ کرکے فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔ پولیس کے لیے قانونی اور عدالتی مسائل یہیں ختم ہوجاتے تھے۔ شاید میرے رقیب اور دشمن گورڈن کی دلی خواہش بھی یہی ہوگی۔ ممکن ہے درپردہ اس نے پولیس کو ہدایت بھی کی ہو کہ موقع ہے تو۔ کِل دیٹ باسٹرڈ۔ برطانوی پولیس اور حکومت کے لیے میں انتہائی ناپسندیدہ شخص پہلے سے تھا۔

میں نے کہا "آخر تم لوگ کیا چاہتے ہو؟"

"پہلے تو اپنے ہاتھ اوپر اُٹھالو۔" سراغ رساں ٹائپ شخص بولا۔

"وہ کیوں؟" میں نے معصومیت سے سوال کیا۔

"تاکہ ہم تمہاری تلاشی لے سکیں۔"

"ہم یعنی تم سب باری باری ایک شریف آدمی کی تلاشی لوگے' تم نے جمع کا صیغہ استعمال کیا ہے۔"

"صرف میں تلاشی لوں گا۔" پولیس افسر ٹائپ شخص بولا "اور تم کوئی شریف آدمی نہیں ہو۔"

"کون شریف ہے اور کون نہیں ہے' اس کا فیصلہ کرنے والے تم کون ہوتے ہو۔ میرے پاس ڈیوک آف ایڈنبرا..."

"شٹ اَپ۔ ہاتھ اٹھاؤ اپنے ورنہ..."

میں نے کہا "ورنہ تم اسپتال کے ایک کمرے میں فائر کرکے ایک غیر ملکی کو قتل کردوگے' اتنے گواہوں کی موجودگی میں؟ وہ غیر ملکی کوئی عام آدمی نہیں بلکہ قانون کو جاننے اور سمجھنے والا وکیل ہے۔"

سُراغ رساں بولا "تم بکواس کرتے ہو' تم وکیل نہیں ہو۔"

"تم میرا پاسپورٹ دیکھ سکتے ہو۔" میں نے کہا۔

"وہ جعلی ہے۔"

میں نے کہا "اس کو جعلی کہنے سے حکومتِ پاکستان پر الزام آتا ہے کہ وہ جعلی پاسپورٹ بھی جاری کرتی ہے۔ اس سے دونوں ممالک کے تعلقات متاثر ہوسکتے ہیں۔ آخر ہم دولتِ مشترکہ میں شامل ہیں۔"

"تم اس کی فکر مت کرو۔" سراغ رساں بولا۔

میرا مقصد انہیں باتوں میں لگا کے سوچنے کی مہلت حاصل کرنا اور کچھ کرنے کا موقع تلاش کرنا تھا — میرے اعتماد نے ان کو تذبذب میں مبتلا کردیا۔

"میں نے سُنا تھا کہ برطانیہ میں جمہوریت ہے' قانون کے تحت ہر ملزم کو گرفتاری سے پہلے اس کے حقوق سے آگاہ کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے اور قانون میں نسلی تعصب کی گنجائش نہیں ہے؟"

سراغ رساں بولا "اس میں کیا غلط ہے؟"

میں نے کہا "یہ جو کچھ تم کررہے ہو یہ دھاندلی ہے، لاقانونیت ہے اور غنڈاگردی ہے۔ چونکہ میں اور میرا مؤکل جارج سفید فام نہیں ہیں۔"

"مسٹر' تم کو جو کچھ کہنا ہے پولیس اسٹیشن جاکے کہنا۔"

میں نے کہا "ہرگز نہیں۔ جب تک مجھے معلوم نہیں ہوگا کہ مجھے کیوں اور کس قانونی اختیار کے تحت گرفتار کیا جارہا ہے' میں گرفتاری نہیں دوں گا بلکہ مزاحمت کروں گا۔ جارحیت کے خلاف... دفاع ہر شہری کا اور ہر انسان کا بنیادی حق ہے۔ میں تمہیں خبردار کرتا ہوں' میں مارشل آرٹ میں بلیک بیلٹ ہوں اور مجھے پکڑنے کے لیے تمہیں مجھ پر گولی چلانی پڑے گی۔ کم سے کم ایک جو میرے دل میں یا سر میں لگے۔ ہاتھ ٹانگ کے زخم سے میں معذور ہونے والا نہیں۔ مجھ سے دور رہو' سمجھے اور پہلے مجھے بتاؤ کہ تم کون ہو؟"

سراغ رساں نے پریشانی سے کہا "میں نے ابھی اپنا شناختی کارڈ تم کو دکھایا تھا۔"

"اتنی دور سے کوئی دوربین لگائے بغیر کیسے دیکھ سکتا ہے کہ اس پر تمہارا نام ہے اور تمہاری تصویر ہے...."

اس نے پھر کارڈ نکالا اور میری ناک کے سامنے کردیا "پھر دیکھ لو۔ میں لیفٹیننٹ تھامس ہوں۔"

"رائٹ۔ میں نے دیکھ لیا" میں نے کہا "اب یہ دوسرا شخص بتائے کہ یہ توپ اُٹھائے کیوں کھڑا ہے؟"

"یہ پولیس سارجنٹ ایمر ہے" تھامس بولا۔

"کیا تم اس کے وکیل ہو؟" میں نے کہا "یا یہ کالے لوگوں کے سامنے اپنی قانونی پوزیشن کی وضاحت کرنے کو توہین خیال کرتا ہے۔"

اب سارجنٹ نے اپنا شناختی کارڈ نکالا۔ زیرِ لب کچھ کہتے ہوئے اس نے کارڈ میرے سامنے کیا۔ "پڑھ لو' اچھی طرح دیکھ لو۔"

"دیکھ لیا... مگر تم نے مجھے گالی کیوں دی؟"

"کون کہتا ہے؟"

"میں نے خود سُنا' تم نے مجھے گالی دی ہے۔ میں اس کی رپورٹ اپنے ہائی کمشنر کو اور تمہارے پولیس کمشنر کو کروں گا۔"

"تم اس کی رپورٹ کوئین کو کردو...."

"یہ جملہ بھی میں ضرور لکھوں گا.... جارج تم گواہ رہنا۔" میں نے کہا۔

جارج نے کہا "میں سب دیکھ اور سُن رہا ہوں۔"

میں نے کہا "اب میری گرفتاری کی وجہ بتاؤ۔"

"تم غلط نام سے برطانیہ میں داخل ہوئے ہو۔" تھامس بولا۔

"پہلے تم نے پاسپورٹ کو جعلی کہا' اب میرے نام کو۔ جارج تم گواہ رہنا۔"

جارج نے کہا "میں سب دیکھ اور سُن رہا ہوں۔"

"سکندر بخت کے برطانیہ میں داخلے پر پابندی ہے" تھامس بولا۔ "پولیس ریکارڈ کے مطابق سکندر بخت کو یہاں سے جبراً ڈی پورٹ کیا گیا تھا... ناپسندیدہ سرگرمیوں میں ملوث ہونے کے باعث۔"

میں نے برہمی سے کہا "آخر یہ سکندر بخت کون ہے جس کا نام بار بار لیا جارہا ہے میرے سامنے۔"

"تم ہو سکندر بخت۔" تھامس نے میرے سینے پر انگلی رکھی۔

"تم نے مجھے دھکا دیا!.... اسپتال میں.... جارج گواہ رہنا۔"

جارج نے کہا "میں سب دیکھ اور سُن رہا ہوں۔"

"کیا تم سکندر بخت ہونے سے انکار کرتے ہو؟" تھامس نے کہا۔

"آف کورس۔ میں ٹاور آف لندن یا ڈیوک آف ایڈنبرا ہونے سے بھی انکار کرسکتا ہوں کیونکہ میں وقار یوسف ایڈووکیٹ ہوں۔"

"یہ ثابت ہوجائے گا' پولیس اسٹیشن جاکے...." تھامس نے کہا۔

میں نے کہا "اگر مجھے اختیار ہو تمہیں اپنے ملک کے پولیس اسٹیشن لے جانے کا' تو یہ ثابت ہوسکتا ہے کہ تم لیفٹیننٹ تھامس نہیں' بھوت ہو۔"

"تم وقت ضائع کررہے ہو۔ ہمیں زبردستی پر مجبور مت کرو" سارجنٹ ایمر نے غرا کے کہا۔

"زبردستی کی دھمکی مت دو۔ تمہیں بڑی گھمسان کی جنگ لڑنی پڑے گی مجھے قابو کرنے کے لیے۔" میں نے سنبھل کے کہا "اس بات کے امکانات بہت روشن ہیں کہ تم میں سے دو تہائی اس کوشش میں معذور ہوجائیں' میں ان کی ٹانگیں توڑدوں گا' سر پھاڑ دوں گا' کپڑے پھاڑ دوں گا۔ پیٹ پھاڑ دوں گا۔" میں نے تقریر کی۔

"مزاحمت کی صورت میں ہمیں گولی مارنے کا پورا قانونی اختیار حاصل ہے" سارجنٹ آگے بڑھا۔

"تمہیں مریض کو بھی گولی مارنی پڑے گی۔ ورنہ یہ تمہارے خلاف گواہی دے گا۔ تم اسپتال میں دو قتل نہیں کرسکتے۔ سیاہ فام جارج کے حق میں اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ میں شہید ہوجاؤں گا لیکن اس کے بعد پاکستان کے وکیل عالمی عدالتِ انصاف میں احتجاج کریں گے۔ اقوامِ متحدہ کے سامنے دھرنا دیں گے.... ممکن ہے دونوں ملکوں میں جنگ چھڑ جائے..."

ابھی تک مجھے اتنی بکواس کرکے بھی کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ مستعد ہوگئے تھے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ میں باتوں میں وقت ضائع کرکے مہلت حاصل کررہا ہوں۔ سارجنٹ ایمر کے تیور بتارہے تھے کہ وہ میری دھمکیوں سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوا اور ضرورت پڑنے پر مجھے گولی مارنے میں ذرا تامل نہیں کرے گا۔

گرفتاری میرے سارے منصوبے کی تباہی اور میری بربادی کے مترادف تھی اور سوچے سمجھے بغیر کوئی قدم اُٹھانا بہت خطرناک جُوا تھا جس میں میری جان جاسکتی تھی اور میں نے اتنا طویل سفر اتنی مشکلات سے نبرد آزما ہوکے اور خطرات مول لے کے اس لیے نہیں کیا تھا کہ لندن میں ایک سارجنٹ مجھے اس طرح گولی مار دے جیسے وہ کسی تھرڈ کلاس اخلاقی مجرم کو چوری ڈکیتی کے بعد فرار ہونے پر مارتا ہے۔

"اب میں تین تک گِنوں گا..." سارجنٹ نے کہا۔

"کیا اس کے بعد تمہیں گنتی نہیں آتی؟"

اس نے کہا "ون..... ٹو....."

"اوکے.... اوکے' میں ہاتھ اوپر اُٹھا رہا ہوں" میں نے کہا اور ہاتھ اُٹھالیے۔

وہ بولا "ہاتھ اوپر اُٹھا کے گھوم جاؤ۔ اپنا منہ دیوار کی طرف کرلو۔"

میں نے کہا "اُدھر دیوار نہیں' کھڑکی ہے۔"

اس وقت وہ ہوا جو غیر متوقع تھا مگر مجھے اسی غیر متوقع کا انتظار

تھا اور اسی غیر متوقع لمحے پر میری بقا کا انحصار تھا۔ اسی غیر متوقع اتفاق سے میری تمام امیدیں وابستہ تھیں۔

جارج نے بیڈ سائڈ پر سے ایک بار شیشی میں سے کوئی گولی نکال کے استعمال کی تھی۔ دوسری بار اس نے پانی پیا تھا۔ تیسری بار اس نے یہ ظاہر کیا جیسے اس کو پیشاب کی حاجت ہے۔ اس نے بیڈ کے نیچے سے پین PAN اٹھایا۔ یہ پین ہر بیڈ کے نیچے موجود تھے لیکن ہر مریض کے لیے ان کا استعمال لازمی نہیں تھا۔ جو صحت مند تھے اور اٹھ کے باتھ روم تک جاسکتے تھے وہ ایسا ہی کرتے تھے۔ جارج کی حالت ہرگز اتنی خراب نہیں تھی کہ وہ اٹھ بھی نہ سکے مگر پولیس کے آتے ہی وہ حد درجے بیمار اور معذور بن گیا تھا۔ وہ بستر پر لیٹا کراہتا رہا تھا اور یہ ظاہر کرتا رہا تھا جیسے وہ سخت اذیت میں ہے۔

جب وہ بیڈ پین اُٹھانے کے لیے جھکا تو کسی نے بھی اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ ان کے نزدیک یہ مریض کا بنیادی حق تھا مگر جارج نے اسی کا غلط استعمال کیا۔ وہ کراہتا ہوا سیدھا ہونے کی کوشش میں بستر سے گرگیا۔ اس سے دھماکا ہوا اور کمرے میں موجود دو حملہ آوروں کی توجہ اس کی طرف ہوگئی۔ تیسرا خود سارجنٹ تھا جو ایسے مواقع کی نزاکت کو سمجھتا تھا۔ اس کی نیت اور پوز میں کوئی فرق نہیں آیا' وہ بدستور مجھ پر نظریں جمائے کھڑا رہا۔

جارج صرف چند سیکنڈ بے حس و حرکت رہا پھر اس نے بیڈ کے ساتھ ہی سرہانے کی طرف رکھا ہوا لوہے کا صلیب جیسا اسٹینڈ پکڑلیا۔ اس کے نچلے حصے میں فرش پر چار پائے تھے مگر اس چوپائے میں رولر لگادیے گئے تھے تاکہ اسے اشارے پر ہر جگہ چلا کے لے جایا جاسکے۔ اوپر چھ فٹ کا چمکیلا ڈنڈا تھا اور سب سے اوپر دو بازو سے پھیلے ہوئے تھے۔ ان بازوؤں کے آخر میں ہک تھے جو خون اور گلوکوز کی بوتلیں لٹکانے کے کام آتے تھے۔

جارج نے اسٹینڈ کو بڑی محنت اور مہارت سے اور نشانہ لے کر گرایا بلکہ سارجنٹ کے اس ہاتھ پر مارا جس میں ریوالور تھا۔ لوہے کا ڈنڈا اچھی خاصی قوت کے ساتھ سارجنٹ کی کلائی پر لگا تو اس نے چلّا کے کہا "یو باسٹرڈ" اور ہاتھ کو تکلیف سے جھٹکا۔ اس کا چہرہ بھی چوٹ کی تکلیف سے بگڑ گیا تھا۔ ریوالور خود ہی اس کے ہاتھ سے نکل کے دیوار پر لگا اور اس سے پہلے کہ لیفٹیننٹ تھامس سنبھلتا' صورتِ حال کو سمجھتا اور کچھ کرتا' جارج نے بڑی پھرتی سے ریوالور اٹھالیا۔

"بس.... سیدھے کھڑے رہو سب۔" اس نے پُرسکون مگر خطرناک لہجے میں کہا "مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا' میں پہلے ہی عمر قید کاٹ رہا ہوں۔"

تھامس نے کہا "کیا تم پاگل ہوگئے ہو؟"

"ہاں۔ پاگل بہت پہلے ہوگیا تھا۔ جب تمہارے قانون اور تمہاری انصاف دلانے کی دعوے دار عدالتوں نے مجھے ناکردہ جرم پر عمر قید کی سزا دی تھی۔ میری جگہ تم ہوتے لیفٹیننٹ تھامس تو اپنی بے بسی کا اور مظلومیت کا احساس تم کو بھی پاگل کردیتا۔ ایک سے ڈرو' وہ کچھ بھی کرسکتا ہے۔"

"تم کیوں الیکٹرک چیئر پر بیٹھنا چاہتے ہو" ایمر بولا۔

"تم جیسے دو کتّے مار کے میں بڑی خوشی سے کہیں بھی ہوں۔ الیکٹرک چیئر ہو یا گیس چیمبر۔ تم اپنے بیوی بچے خاندان کے بارے میں' اس دنیا کے بارے میں اور اپنے بارے میں سوچو اور زندہ رہنا چاہتے ہو تو اس شخص کو نکل جانے دو۔ بالکل خاموشی سے کھڑے رہو۔ ذرا غلط حرکت کی تم نے پاگل کے مقابلے میں اپنی عقل اور چالاکی پر ناز کیا یا بہادری کے جذبات کا مظاہرہ کیا تو سب چھوٹ جائے گا۔ دنیا کا عیش و آرام اور خاندان' یہ عہدہ اور اس کا اختیار۔ ایک منٹ بعد تم لیفٹیننٹ وغیرہ کہلاؤ گے اور جہنم میں اپنے پردادا کو اپنی بھری جوانی سے بھری وفات کی کہانی سُنا رہے ہوگے..."

اسپتال کا سیکیورٹی کا بندہ ابھی تک غیر جانبدار سفیر کا کردار ادا کررہا تھا۔ اسے قطعی دلچسپی نہ تھی کہ کون کس کے ساتھ کیسے پیش آتا ہے اور کیا کرتا ہے؟ وہ خانہ پری کے لیے انتظامیہ کی نمائندگی کرنے پولیس کے ساتھ گیا تھا۔ پولیس کا کام ہے پکڑنا' وہ جارج ہو یا جوزف۔ مگر میری اور پولیس کی مکالمے بازی شروع ہوئی تو اسے کچھ دلچسپی پیدا ہوگئی۔ پھر صورتِ حال مرنے مارنے جیسی ہونے لگی تو وہ نروس نظر آنے لگا۔ پولیس کا اور مجرموں کا قانون کی جنگ میں ایک دوسرے کے ہاتھوں فوت ہونا برحق۔ وہ کیوں اس مینڈک کی طرح مارا جائے جو بڑے شوق سے سانڈوں کی لڑائی دیکھنے کے لیے تالاب سے نکلا ہو۔

اس مردِ دانا نے کہا "جارج' زندگی ہم سب کے لیے خدا کی ایک نعمت ہے۔"

"تمہارے لیے ہوگی۔ میری جگہ جیل میں آکے گزارو تو تمہارے نظریات بھی بدل جائیں گے۔ میں نے ساری زندگی میں کبھی اسپرے نہیں کیا تھا کہ مجھ پر جراثیم کو ہلاک کرنے کا یا کیڑے مکوڑے مارنے کا الزام آتا مگر مجھے سزا ہوئی دُہرے قتل کے جرم میں۔ مجرم تو ان کے ہاتھ آیا نہیں' انہوں نے مجھے ساری عمر جیل میں گزارنے کے لیے بند کردیا۔ کیا تم ایسی زندگی کو پسند کروگے؟"

اس نے مجھ سے کہا "مسٹر جوزف۔ اسے سمجھاؤ' ہم سب اس خطرناک صورتِ حال سے بچ سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "جارج' یہ تم کیا کررہے ہو؟"

اس نے کہا "گیٹ آؤٹ۔ جاؤ' نکل جاؤ۔ مجھے معلوم ہے میں کیا کررہا ہوں۔"

میں نے کہا "میں نکل جاؤں.... اور تم...؟"

"میں نکل کے کہاں جاسکتا ہوں" وہ بولا "میں تو پہلے ہی قید میں ہوں۔ تم نے میرے لیے بہت رسک لیا تھا۔ تم میرے لیے رہائی کی اُمید لے کر آئے تھے۔ تم کو گرفتار نہیں ہونا چاہیے ورنہ میری رہائی ممکن نہیں ہوگی۔"

میں نے کہا "لیکن میرے لیے تم...."

"بس' اب جلدی کرو ورنہ کسی کی غلطی سے صورتِ حال خراب ہوجائے گی۔ میں کسی کو قتل کرنا نہیں چاہتا مگر کرسکتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ جرم ہے۔ میں نے قانون کو ادائے فرض سے روکا' ایک مجرم کی مدد کی۔ سوری! ملزم کی۔ پولیس پر حملہ کیا' اس کی مجھے کتنی سزا ہوگی آفیسر!"

"تم کو دو سال کی جیل بھی ہوسکتی ہے۔"

وہ ہنسا "دو سال۔ اس سے زیادہ وقت تو میں نے کچھ کیے بغیر جیل میں گزار دیا۔ اب یہ اطمینان تو ہوگا کہ میں نے کسی کے لیے کچھ کیا تھا۔ ایک نیک کام' ایک مقصد کی خاطر دو سال کی جیل میں بھی خوشی خوشی کاٹ لوں گا۔ اگر باقی سب ویسا ہی رہا' جیسا تم نے بتایا ہے تو مجھ پر قتل کا الزام تو نہیں رہے گا نا۔ مجھے رہائی تمہاری کوشش سے ملے گی۔ تمہارا یہ بہت بڑا احسان ہے اور اس کے لیے میں کچھ بھی کرسکتا ہوں۔"

میں اس کی منطقی سوچ کا قائل ہوگیا "او کے جارج۔ میں جاتا ہوں۔ میں نے ہر بات تمہیں سمجھادی ہے۔ صبح بیرسٹر الفریڈ تم سے ملاقات کرنے آرہے ہیں۔ میں ابھی ان کو ساری صورتِ حال کی رپورٹ دے دوں گا۔ یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

"یہ تو خود مجرم ہیں۔ پولیس نے جیل حکام سے مل کے مجھے زہر دیا تھا کھانے میں۔ بیرسٹر الفریڈ کو سب معلوم ہے" جارج بولا "میں ان پر ہرجانے کا کیس بعد میں کروں گا' جب مجھے رہائی ملے گی۔ مزید دو سال بعد.... اب تم جاؤ۔"

اسپتال کا نمائندہ' سارجنٹ ایمر اور لیفٹیننٹ تھامس بے وقوفوں کی طرح انتہائی بے بسی کے عالم میں کھڑے ایک قابلِ نفرت حبشی کی بکواس سُن رہے تھے۔ ایک ملزم کے فرار میں معاون ثابت ہونے پر اسے کیا فرق پڑتا تھا جو پہلے ہی زیرِ حراست ہو۔ وہ اسپتال میں اس پر تشدد بھی نہیں کرسکتے تھے۔

میں نے کہا "دیکھو' گولی مت چلانا جارج۔ تمہیں زندہ رہنا ہے۔"

جارج نے سرہلایا اور اسپتال کے نمائندے سے کہا "اپنے کپڑے اُتارو۔"

اسپتال کے نمائندے کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا "کیا؟"

"کپڑے اُتارو اپنے۔ ٹھیک سنا ہے تم نے۔" جارج بولا "یہاں نہیں اُتارنا چاہتے تو باتھ روم میں جاکے اُتارو۔ وکار جوزف' تم جاؤ اور اس کے کپڑے پہن لو۔ اپنے کپڑے ساتھ لے جاؤ ورنہ یہ کتے کو بُو سنگھا کے تمہارے پیچھے لگادیں گے۔"

اسپتال کے نمائندے نے فریاد کی "اور میں کیا پہنوں گا؟"

"جب تم دنیا میں آئے تھے تو کیا پہن رکھا تھا؟" جارج نے اس کی پریشانی سے لطف اندوز ہوکے کہا "نہیں معلوم تو اپنی ماں سے پوچھ لینا بعد میں۔ کبھی تم کو افسوس ہوا پہلے کہ آخر تم اس دنیا میں کیوں آئے تھے؟ اگر یہاں بھی نہ آتے اس وقت تو کیا فرق پڑتا۔ اب آئے ہو تو بھگتو۔"

"اندر.... باتھ روم میں۔ کافی سردی ہوگی۔"

جارج نے کہا "گرم پانی کی ٹونٹی کھول کے بیٹھ جانا۔ جب تک دوسرے کپڑوں کا بندوبست ہوگا تم غسل کرلوگے۔ مسٹر جوزف ایڈووکیٹ' تم اس کو سنبھال لوگے نا باتھ روم میں' تم نے ابھی بتایا تھا...."

"کہ میں بلیک بیلٹ ہوں' مجھے یاد ہے" میں نے کہا "شاید ان لوگوں کا خیال ہوگا کہ میں گپ مار رہا ہوں۔ کوئی اپنی گردن پیش کرے تو میں ایسے توڑ کے دکھا سکتا ہوں۔ جیسے خستہ بسکٹ۔"

جارج نے سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا "یہ لوگ بزدل ہیں۔ تم اس کرسی کے بازو کو لیفٹیننٹ تھامس کے ماموں کی گردن سمجھ لو۔"

"کسی سور کی گردن اتنی پتلی نہیں ہوسکتی۔ مگر خیر..." میں نے کہا اور ایک نپا تلا ہاتھ مار کے دو انچ موٹی لکڑی کے بازو کو درمیان سے توڑ دیا۔

"یہ نقصان اسپتال کا ہوا" جارج نے تاسف سے سرہلایا "آج تم اس کرسی پر بیٹھے تھے۔ کل کوئی آرام سے نہیں بیٹھے گا۔"

میں نے جیب میں سے ایک پاؤنڈ نکال کے جارج کو دیا "یہ میری طرف سے اسپتال والوں کو پیش کردینا۔ معذرت کے ساتھ۔"

اسپتال کی سیکورٹی کا نمائندہ غیر مسلح تھا اور اس کی یونیفارم بھی پولیس سے بالکل مختلف رنگ کی تھی۔ وہ ایک شریف النفس اور صلح جو شخص تھا اور اس پر رقت طاری ہونے لگی تھی۔

میں نے کہا "تم اپنی سب چیزیں نکال لو۔ مجھے صرف وردی چاہیے۔"

اس نے جارج کی طرف اجازت طلب نگاہوں سے دیکھا اور پھر جیب خالی کرکے بولا "تھینک یو۔" اس نے اپنا پرس رومال اور تاش کا ایک پیکٹ نکال کے میز پر رکھ دیا تھا۔ تاش کے باون پتوں کے پیچھے باون قابلِ دید تصاویر تھیں۔ یہ ہاتھی کے دانتوں کی طرح کھیلنے کے نہیں' دیکھنے کے تاش تھے جن پر وہ خاصا نادم نظر آتا تھا۔ تاہم میں نے اس کے بارے میں اپنی رائے نہیں بدلی۔ ایسی چیزیں شرفا کے پاس سے ہی برآمد ہوتی ہیں۔

"تم یہ کمبل بھی لے سکتے ہو" میں نے کہا "غسل نہ کرنا چاہو تو اوڑھ کے بیٹھ سکتے ہو۔"

وہ پھر بولا "تھینک یو۔ مگر کیا تمہارا میرے ساتھ جانا ضروری ہے؟"

"ہاں۔ مجھے کیا معلوم کہ باتھ روم میں کوئی کھڑکی یا روشن دان ہے اور اندر بند ہوجانے کے بعد تم کتنی بلند آواز میں کس کو بلاؤ گے؟"

وہ سرجھکا کے میرے ساتھ چل پڑا "تم اپنا منہ بھی دوسری طرف نہیں رکھوگے؟"

"نہیں، پیچھے پیچھے تم نہ جانے کیا کرو؟" میں نے کہا۔

اس نے نظریں نیچی رکھتے ہوئے اپنی وردی اُتار کے میرے حوالے کی "مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں۔ جان بچانے کے لیے میں بھی ایسا ہی کرتا۔ اگر میں تمہاری جگہ ہوتا۔"

میں نے کہا "اب برائے مہربانی تم اپنا منہ موڑ لو۔ میں زیادہ شرمیلا ہوں۔"

اس نے آہ بھری "تم کچھ بھی کہہ سکتے ہو' کیونکہ تم طاقتور ہو۔"

باتھ روم سے باہر آکے میں نے جارج سے کہا "... جارج۔ جو کچھ تم نے میرے لیے کیا' اللہ تمہیں اس کی جزا دے۔"

اس نے کہا "میں مزید پندرہ بیس منٹ ان کو کھڑا رکھوں گا۔"

میں نے کہا "ہتھیار ان کے سامنے مت ڈالنا۔ اسپتال کے ڈاکٹر کو یا نرس کو ضرور بلالینا۔ ورنہ یہ تم کو گرفتار نہیں کریں گے۔"

"کیونکہ میں پہلے سے گرفتار ہوں" جارج ہنسا۔

"ہاں۔ یہ تمہیں گولی ماردیں گے اور پھر یہ کچھ بھی کہیں۔ ان کی بات کو جھٹلانے والا کون ہوگا؟"

"یہ بڑا مفید مشورہ دیا ہے تم نے۔ تھینکس جوزف" اس نے فون اپنے قریب کرلیا۔

میں اپنے کپڑوں کی پوٹلی بغل میں دبائے نکلا اور کاریڈور میں چل پڑا۔ اگر میں چوروں کی طرح پہلے باہر جھانک کے دیکھتا کہ میدان خالی ہے یا نہیں تو وہ سارجنٹ شک میں پڑجاتا جو وہاں کچھ نہ کرنے پر مامور تھا۔ جارج قیدی زیر علاج اندر آرام سے لیٹا رہے تو وہ آرام سے باہر بیٹھا رہے۔ وہ فرار ہونے کی کوشش کرے تو اس کو ناکام بنادے مگر جارج کے ایسے عزائم سرے سے نہ تھے چنانچہ سارجنٹ کے لیے کچھ نہ کرنا اور آرام سے بیٹھنا مشکل ثابت ہورہا تھا۔ اسے سگریٹ پینے کی اجازت نہیں تھی کیونکہ یہ اسپتال تھا۔

اسے جماہیاں لینے کی' گنگنانے کی یا گانے کی اجازت نہیں تھی کیونکہ یہ اسپتال تھا۔ اسے اپنی گرل فرینڈ کو بلاکے دل پشوری کرنے' کسی دوست کے ساتھ ٹائم پاس کرنے کے لیے گپ شپ' یہاں تک کہ کسی نرس سے عشق لڑانے کی کوشش کرنے کی اجازت بھی نہیں تھی کیونکہ یہ اسپتال تھا۔ ظاہر ہے وہ اپنے آپ سے اور دنیا سے بیزار تھا اور برآمدے میں ٹہل رہا تھا۔ یہ بھی اس لیے کہ ایک اعلیٰ اختیاراتی وفد اندر مذاکرات میں مصروف تھا۔ وہ بند دروازے کے باہر کرسی پر بیٹھے بیٹھے اکڑ گیا تھا اور آتے جاتے اسٹاف کے لوگوں کو دیکھتے دیکھتے بھی تھک گیا تھا جو اسے اسی طرح نظرانداز کرکے گزر جاتے تھے جیسے وہ بھی کرسی ہے۔ کرسی پر بیٹھا ہوا انسان نہیں ہے۔

اب وہ کسی طرف بھی نہیں دیکھ رہا تھا سوائے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کے۔ جب میں نکلا تو اس کا چہرہ بھی ادھر ہی تھا جدھر میرا رخ تھا چنانچہ اس نے مجھے کمرے سے برآمد ہوتے بھی نہیں دیکھا اور جب تیز تیز قدموں سے میں نے تب بھی وہ متوجہ نہیں ہوا۔ پھر وہ پلٹ گیا اور اس قدموں سے ناپنے لگا جو دروازے سے بیس قدم بیس قدم دوسری طرف ہوگا۔ کہا جاسکتا ہے کہ وہ تھا۔

میں ابھی کاریڈور میں ہی تھا کہ جارج کے کمرے شور بلند ہوا اور بیزار پھرنے والا سارجنٹ ایک دم اس کی چھٹی حس نے فوراً اسے شور کی طرف متوجہ کی اطلاع دی اور وہ ریوالور نکال کے دوڑا۔

جارج کے ساتھ والے کمرے سے ایک شخص میں برآمد ہوکے چلانے لگا۔ "کیا مصیبت ہے۔ یہ اصطبل۔ ساتھ والے باتھ روم میں کون گھوڑے کی ہے۔ کیا یہاں گھوڑے بھی داخل کیے جاتے ہیں یہاں آگیا..."

میں نے سمجھ لیا کہ وہ کیوں ناراض تھا۔ دراصل درمیان چھ فٹ لمبی پٹی تھی جسے دو حصوں میں تقسیم کمروں کے ساتھ باتھ روم بنادیے گئے تھے۔ ہنگامہ روم میں ہوا تھا جو جارج کے کمرے سے ملحق تھا سیکیورٹی کے اس شریف النفس شخص نے کیا تھا میرے تن پر تھا۔ وہ کمبل اوڑھے باتھ روم میں بیٹھا اچانک اسے میری بات یاد آئی ہوگی اور اس نے دروازہ اندر سے بند کرکے چلانا شروع کردیا ہوگا کہ پکڑو اور اس کی چیخ پکار دوسرے باتھ روم کے راستے کمرے تک پہنچی ہوگی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ان دونوں الگ کرنے والی دیوار میں اوپر کوئی مشترک روشن دان اوقات ہوا کی نکاسی کے لیے یا کفایت شعاری سے کام درمیان میں ایک لائٹ لگانے کے لیے ایسا کیا جاتا ہے۔ ساتھ والے باتھ روم کے پڑوسی نے لائٹ جلائی ہوگی قیدی نے محسوس کیا ہوگا کہ اب ایس او ایس دیا جا دروازہ بدن کرتے ہی وہ گلا پھاڑ کے چلایا ہوگا کہ بھائی ضروری سے بعد میں فارغ ہونا۔ پہلے مجھ غریب مصیبت کرو۔ کمبل پوش قیدی کی فریاد کو گھوڑے کے ہنہنانے بڑی زیادتی کی بات تھی۔

میں سارجنٹ کے دوڑنے سے پہلے ہی موڑ کاٹ کے گیا تھا۔ میں تصور کرسکتا تھا کہ جب سارجنٹ اندر پہنچا ہوا ہوگا۔ وہ سراغ رساں اور اپنے ہم پیشہ سارجنٹ کے کردیا گیا ہوگا۔ اس نے بھی جارج کے سامنے ہتھیار ڈال ہوں گے اور اب اس کمرے میں دو نہیں تین مشتعل افراد فام بھی تھے اور قانون کے نمائندے بھی' اس سیاہ فام کو ہوں گے جو مجرم بھی تھا اور مریض بھی۔ لیکن صورت کنٹرول کررہا تھا۔ ماسٹر آف دی گیم۔ یہ مذاق زیادہ دیر

کمبل پوش قیدی کی درد بھری پکار اور ساتھ والے کمرے مریضوں کا احتجاج مزید لوگوں کو متوجہ کرے گا اور ظاہر ہے بالآخر مقابلے پر ایک مجمع ہوگا اور جب ڈاکٹر' نرس اور لوگ کمرے میں پہنچ جائیں گے تو جارج وقار اور متانت ہوئے ریوالور پھینک دے گا اور کوئی شاندار جھوٹ گا۔ مثلاً یہ کہ اس پر تین افراد نے دوسرا قاتلانہ حملہ کیا تھا' پولیس اور جیل حکام کی ملی بھگت کے باعث اسے جیل خانے یا فائر یہاں تو یہ لیفٹیننٹ تھامس اور سارجنٹ ایمر گھونٹ کرمارڈالتے۔ اگر وہ مزاحمت نہ کرتا اور ان کا ریوالور نہ چھین لیتا۔ اسپتال کے ایک ملازم کو انہوں نے مداخلت اور جارج کو بچانے کے جرم میں یہ سزادی تھی کہ اس کے کپڑے اُتار کے اسے باتھ روم میں بند کردیا تھا۔ اس کے کپڑے گئے؟ خدا معلوم۔ انہی سے پوچھو' وکار جوزف... یہ کس بلا کا اور سکندر... کون سا سکندر؟ ایک تو الیگزینڈر دی گریٹ تھا۔ مگر یہ الیگزینڈر...'

اب مجمع عام کے سامنے اسپتال میں جارج کو گولی تو کیا چھانپڑ نہیں مارا جاسکتا تھا کہ یہ کیا بکواس لگارکھی ہے۔ ڈاکٹرز کسی مریض پر یہ تشدد ہرگز نہیں ہونے دیں گے۔ "ٹھیک ہے لیفٹیننٹ۔ تم اس کے خلاف جو قانونی کارروائی کرنا چاہو کرو' لیکن یہاں تم اس کا بیان بھی ہماری اجازت کے بغیر نہیں لے سکتے۔ ہمیں دیکھنا پڑے گا کہ مریض کی حالت کیا ہے اور اس کے ہیجان کا سبب کیا تھا۔ تم بعد میں جھوٹ سچ کا پتا چلاتے رہنا۔ ہم عدالت کے معاملات میں نہیں بولیں گے اور بلایا گیا تو جتنا دیکھا وہی بتائیں گے۔"

میں باہر پہنچا تو محسن اور وکیل مجھے دیکھ کر دم بخود رہ گئے۔ وہ اس وقت بھی کوریائی ویٹریس سونی کے ساتھ بیٹھے پی رہے تھے۔ محسن کے سامنے ٹھنڈی کافی تھی۔ کوریائی حسینہ اور اس کا پرستار وکیل کوئی مدہوش کردینے والا مشروب پی کر ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانک رہے تھے اور جام ہوگئے تھے۔ ان کے لبوں پر مسکراہٹ تک جام ہوگئی تھی۔ کینٹین خالی پڑی تھی چنانچہ سونی آف کوریا فارغ تھی۔ غالباً فراغت میں اس کی ہابی اور ذریعۂ آمدنی یہی تھا۔

محسن نے پہلے کہا "یہ... یہ کیا..." اور اٹھ کے کھڑا ہوگیا۔

میں نے کہا "یہ میرے کپڑے ہیں تو لے جا۔ میں نے اس اسپتال میں نوکری کرلی ہے اور جوائن بھی کرلیا ہے۔"

سونی آف کوریا نے کہا "ویری گڈ" اور مجھ سے ہاتھ ملایا۔

وکیل نے مجھے گھورتے ہوئے کہا "میں نے اتنی تو نہیں پی۔ پھر مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ تم وقار یوسف ہو۔"

میں نے اس سے کہا "ہوش میں آجاؤ اور فوراً یہاں سے لودوگیارہ ہوجاؤ۔ صورت حال ہنگامی ہوگئی ہے بیٹے۔"

"ہنگامی تم نے کی ہوگی" وہ خفا ہوکے بولا "ورنہ رومانی تھی۔"

"تم تو یہاں سونی آف کوریا کو بھی ورغلانے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوئے" میں نے افسوس سے کہا۔

"اسے تم سونی آف کوریا مت کہو" وہ جذباتی ہوگیا۔ "سونی آف جاپان اصل چیز ہے۔ کوریا والے نقل کرتے ہیں۔ خواہ مخواہ جاپانیوں کا بزنس خراب کرنے پر آمادہ ہیں۔" میں نے کہا "کیا ہم جائیں؟"

"ایسے کیسے جائیں' پہلے بل ادا کرو۔ سونی کو ٹپ دو۔"

محسن نے بل ادا کیا اور وکیل نے آخری بار سونی کو چوم کے الوداع کہا۔ وہ اس کی عادی تھی۔ ٹپ سے اسے اچھی خاصی آمدنی ہوتی ہوگی۔ وہ ہی وکیل جیسے عشاق کو لوٹنے کی مشتاق معلوم ہوتی تھی۔

وکیل کی کار میں بیٹھتے ہی محسن نے کہا "وہاں تو موقع نہیں تھا کچھ بھی پوچھنے کا۔ وقت ضائع ہوتا۔ اب فرمائیے یہ ماجرا کیا ہے؟"

"اتنا عرصہ میرے ساتھ گزارنے کے بعد آپ کو خود سمجھ لینا چاہیے۔"

"سمجھ تو میں گیا" محسن بولا "مگر یہ کیوں ہوا اور کیسے ہوا؟ جارج ٹھیک ہے؟"

"ہاں۔ جارج بالکل خیریت سے ہے اور آپ کی خیریت خداوند کریم سے نیک مطلوب ہے مگر عزیز دوست۔ کیا کہا ہے اپنے فلمی شاعر نے اور کیا خوب گایا تھا سائیں اختر نے کہ۔ دل دیتا ہے رو رو دہائی کسی سے کوئی پیار نہ کرے۔"

محسن نے ایک منطقی سوال کیا "پھر کیا کریں۔"

میں نے کہا "شعر میں ترمیم 'کسی سے کوئی سچا پیار نہ کرے۔' جھوٹے کی البتہ اجازت ہے۔ جیسا کہ ہم دورانِ تعلیم دل لگا کے کرتے رہے تھے۔ سچا پیار کیا تھا ایک سے تو بھیا آج اسی نے پہنچادیا تھا تھانے۔ یاد ہے ہم بھی یہی سوال کرتے تھے سب سے کہ لفٹ دیتی ہے یا تھانے جانا ہے۔"

محسن بولا "الزبتھ سے بھی کیا ہوگا؟"

"نہیں یار۔ اس سے تو پوچھا تھا کہ دل میں رہنا ہے اور ساتھ نبھانا ہے اور ایسا ہی بیانِ حلفی اس نے مجھ سے لیا تھا لیکن..." میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

وکیل نے کہا "یہ الزبتھ کون ہے؟ الزبتھ ٹیلر؟"

"نہیں۔ ہمارے ٹیلر کا نام تھا ماسٹر میاں جانن دین آف میاں چنوں۔ چڈی اینڈ لنگوٹی اسپیشلسٹ۔ قمیص تو ایسی سیتے تھے کہ پاجامے کی ضرورت نہیں رہتی تھی۔ جب چاہو اوپر سے نیچے پہن لو۔ آستینوں میں ٹانگیں ڈال کے..."

وہ بُرا مان کے بولا "تم نے الزبتھ کا نام لیا تھا۔"

میں نے حیرانی سے کہا "اچھا... تم نے سُنا؟"

محسن بولا "میں نے تو نہیں سُنا' دراصل میں نے صرف چائے پی تھی۔"

اس کے بعد ہم نے وہ زبان بولنی شروع کردی جو وکیل کا باپ بھی نہیں سمجھ سکتا تھا اور اس میں الزبتھ کا نام لینے سے احتراز کیا۔ میں نے محسن کو فرنچ میں اپنی ساری بات سمجھائی تو اس پر بھی رقت طاری ہونے لگی۔

"واقعی۔ عورت ذات ہے نا۔" وہ بولا۔

میں نے کہا "میں تیرے مردانہ جذبات کی مشروط تائید کرتا ہوں۔"

"مشروط کیوں؟ تیرے ساتھ جو بھی ہوا سخت قابلِ مذمت ہے۔"

میں نے کہا "مگر اس قرارداد کو اس وقت پیش کیا جائے جب کم سے کم دو عورتیں بھی موجود ہوں۔"

"اگر تو انہی عورتوں کا حوالہ دے رہا ہے جو میں سمجھا ہوں تو پھر قرارداد پاس نہیں ہوگی۔"

"ہم کرالیں گے یار۔ زورِ بازوئے مسلم دکھا کے۔ آخر یہ مردوں کی دنیا ہے خود خواتین تسلیم کرتی ہیں۔" میں نے کہا۔

"کیا لندن میں ہمارا کام خلاص ہوا؟"

"حالات معمول پر آنے کے بعد ایک اعلیٰ سطحی اجلاس میں اس کا جائزہ لینے کے امکانات پر غور کرنے کا مسئلہ ایجنڈے میں شامل کرنے کی سفارش بھی کی جاسکتی ہے" میں نے اسے یقین دلایا "ابھی تو ہم فرار ہو رہے ہیں۔"

محسن بولا "فرار تو ہم پتا نہیں کب سے ہو رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اب لندن میں مزید قیام فرمانا بالکل ناقابلِ برداشت ہوگیا ہے۔"

"کس کے لیے۔ حکومتِ برطانیہ کے لیے۔"

"نہیں، میرے لیے" محسن بولا "مجھے گل کی یاد آرہی ہے۔"

"مفت کی چیز ہے۔ آنے دے۔ تیرا کیا جاتا ہے۔" میں نے کہا "ایک وقت آئے گا میرے عزیز جب فرصت اور آزادی کے یہی دن تجھے یاد آئیں گے۔ ذرا سوچ ہم جیسے خوش نصیب کتنے ہوتے ہیں جن کو اپنی عمرِ گزشتہ کا کوئی اچھا حصہ۔ خواہ وہ چند روز ہوں، دوبارہ جینے کے لیے مل جائیں۔ گل تیرا مستقبل ہے، تجھے کسی خواب کے سفر میں ملی تھی۔ اس کا اور تیرا ساتھ تو ایسا ہی ہوگا جیسے دن کے ساتھ صبح و شام کا۔ جو ازل سے ابد تک ہے اور رہے گا۔ یہاں گل کو یاد کرنے سے کیا حاصل۔"

محسن نے چونک کے کہا "کچھ فرما رہے تھے آپ؟ معاف کیجئے گا مجھے ذرا جھپکی آگئی تھی، مکرر ارشاد۔"

میں نے ایک آہ بھر کے کہا "میں کہہ رہا تھا کہ مجھے بھی رابعہ اتنی ہی یاد آرہی ہے مگر درمیان میں ابھی ایک دن اور ہے جدائی کا۔ کریلے، آلو، ٹماٹر، پیاز کے ساتھ لندن کی منڈی پہنچا تھا اور شاید لحمیات کے ساتھ واپس جاؤں گا۔ یہاں سے مٹن اور بیف کے علاوہ لحمِ خنزیر بھی جاتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا تھا ہمیں درآمد کرنے والے نے۔"

"وہ پرسوں روانہ ہوگا" محسن نے کہا "کل کا دن کیسے گزرے گا؟"

"آج سے اچھا گزرے گا۔ ابا کہتے تھے کہ ... سے۔ آنے والے دن کی سلامتی اور خوشی کے سوا کچھ ... چاہیے۔ اس سے زیادہ کی آدمی کو ضرورت ہی نہیں ہوتی ..."

"تیرے ابا بھی فلاسفر تھے؟"

میں نے عاجزی سے کہا "جی ہاں۔ میری طرح، ... زریں پر کل میری اولاد اسی طرح ناز کرے گی۔"

"اچھا!" محسن بولا "آپ کو یقین ہے... کہ وہ آپ ... ہوگی؟"

میں نے کہا "اس اشتعال انگیزی پر میں غصے میں ... رہا ہوں۔ میرے پاس ہوتا کوئی آلۂ قتل تو ابھی تیری ... کرتی۔"

محسن بولا "یار اس وکیل کو ساری بات سمجھا دینی چاہیے ... ہیں کہ وکیل سے اور ڈاکٹر سے کچھ نہیں چھپانا چاہیے ... خراب ہو جاتا ہے۔"

"پہلے محاورہ ہوگا۔ دائی سے اور ثالث سے کچھ نہیں ... چاہیے۔ ڈاکٹر اور وکیل کہاں ہوتے تھے۔ رہی بات ... سب کچھ دوبارہ بتانے کی تو میرا خیال ہے کہ ابھی اس ... نہیں۔ اسے پوچھو گے حال کیسا ہے تو یہ سوال کرے گا ... ہال۔ سنیما ہال یا آپیرا ہال... ہیرے کی بات کرو گے تو ... سمجھے گا۔ یہ نشے میں صرف سونی آف کوریا کی آواز سن رہا ... تصور میں اسی کو دیکھ رہا ہوگا۔"

محسن نے کہا "سالے نے اپنے عشقِ لاحاصل میں ... پاؤنڈ خرچ کرا دیے۔ دو گیلن چائے پی گیا۔ ایک گیلن شراب ...

"تیرے خرچ پر تیرے سامنے اسے چومتا بھی رہا۔"

"اناڑی ہے الو کا پٹھا۔ بلکہ احمق ہے" محسن بولا "... اسے الو بنا رہی تھی۔ لوٹنے پر کمربستہ تھی۔ میں شرطیہ ... وقت میں سونی کے جذبات میں آگ لگا دیتا۔ الٹا اس ... لے کے واپس جاتا۔ اس کے گھر سے اپنے گھر۔"

میں نے کہا "بڑا افسوس ہے شیروانی صاحب! آپ ... گھر جاتے؟ حضرت میں ہوتا تو اسے اپنے ساتھ لے جاتا ... وقت وہ مجھے سو پاؤنڈ دے کر پوچھتی کہ پھر کب ملو گے؟ آپ ... گدھا کہہ رہے ہیں خود خچر ہیں۔"

وکیل نے ایک دم گاڑی روک لی "اور تم کیا ہو۔ ... کے گھوڑے۔ میں کہتا ہوں نیچے اترو۔ میں اس سے زیادہ برداشت نہیں کرسکتا۔"

مجھ پر اور محسن پر حیرت صدمے اور شرمندگی کا ... صورتِ حال بیک وقت مضحکہ خیز اور سنگین تھی۔ یہ واقعہ ... اور کو سناتے تو ہنس ہنس کے بے حال ہوتے مگر یہ رونے ... تھا۔ میرے اور محسن کی شکل پر بارہ بج گئے تھے ادھر وکیل ... تھا کہ دروازہ کھولے باہر کھڑا تھا اور غصے میں واقعی لال ...

تھا۔ آخر میں نے کہا "سڑک پر تماشا کیوں بناتے ہو میرے پاکستانی بھائی۔"

اس نے ناقابلِ اشاعت جملے میں کہا "بھائی گیا ..... چلو تم باہر نکلو۔"

محسن بولا "اور تم چاہو تو بدلہ لے سکتے ہو ہم سے۔ ہمیں گدھا اور احمق کہہ کر۔"

میں نے کہا "یہ گدھا، میں احمق۔"

"تم نے مجھے اناڑی اور الو کا پٹھا بھی کہا، باہر نکلو۔"

"میرے پاکستانی بھائی۔ ہم لوگ دوستی اور بے تکلفی میں اس سے کہیں زیادہ کہہ جاتے ہیں ایک دوسرے کو" میں نے اسے سمجھایا۔

"میری تم سے دوستی؟ ناممکن۔ یہ ایک کاروباری تعلق تھا۔"

"او کے۔ اندر بیٹھو، ہم کاروباری معاملات پر بات کرلیں، آخری بات۔"

محسن نے کہا "ہاں۔ پہلے میرے دس پاؤنڈ واپس کردو۔ ہم ٹیکسی لے کر چلے جائیں گے۔"

"کیسے دس پاؤنڈ؟" وہ چلانے لگا۔

ایک پولیس مین ٹہلتا ہوا ہماری طرف بڑھا "یہ کیا شور ہے۔ دس پاؤنڈ کی بات ہے تو تم آرام سے بھی کرسکتے، اندر بیٹھ کے۔"

میں نے مسکرا کے کہا "یہی ہم بھی سمجھا رہے تھے اپنے دوست کو۔"

محسن نے کہا "اس کا غصہ ذرا تیز ہے لیکن ہم برا نہیں مانتے، تھینک یو آفیسر۔"

وکیل فوراً گاڑی میں بیٹھ کے مسکرانے لگا "دراصل۔ مجھے بلڈ پریشر ہے۔"

اور فوراً وہاں سے روانہ ہوگیا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں پولیس مین اس کا منہ سونگھنے کا مطالبہ نہ کردے۔

"دیکھا ہم نے تمہیں بچالیا" میں نے کہا۔

محسن بولا "ہم تمہاری شکایت بھی کرسکتے تھے کہ تم نشے میں ہو۔ اگر پہلے برائی کی تھی تمہارے ساتھ تو اب اچھائی سے حساب برابر۔"

اس نے سوچ کے کہا "تم بہت چالاک ہو۔ میں نے تم سے گالیاں کھائیں پہلے، پھر تمہارا احسان ہوگیا مجھ پر اور تم نے حساب بھی برابر کردیا۔"

"جو کچھ ہوا غلط فہمی کے باعث ہوا۔ اگر ہمیں معلوم ہوتا کہ تم فرنچ سمجھتے ہو تو ہم ہرگز سچ نہ بولتے" میں نے کہا۔

محسن نے جلدی سے کہا "خیر اس کا فائدہ بھی ہوا۔ تم نے سب سن لیا کہ اسپتال میں کیا ہوا تھا ورنہ تمہیں پھر سب بتانا پڑتا۔"

میں نے کہا "ان حالات میں تم خود بہتر سمجھتے ہو کہ تمہیں کیا کرنا چاہیے۔"

وہ بدستور خفا رہا "میں تمہارے لیے مزید کچھ نہیں کروں گا۔"

محسن نے کہا "ہم نے کب کہا ہے کہ ہمارے لیے کچھ کرو۔ ہم ویسے بھی یہ نہیں چاہتے کیونکہ جو کچھ تم کرو گے اس سے ہمیں فائدہ نہیں نقصان ہوگا۔"

"لیکن تم جارج کے لیے دن و رات ایک کردو۔" میں نے کہا "ایک تو تم اس کارِ خیر کا معاوضہ وصول فرما چکے ہو۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ تم بعد میں اپنے حاجی علم دین طوطی کو جواب دہ ہوگے۔ تم نے کوتاہی اور نالائقی کا ثبوت دیا، میرے پاکستانی بھائی تو وہ تمہارا بینڈ بجادیں گے، اپنے اخبار میں۔"

"یا تمہاری شان میں کوئی قطعہ لکھ کے ہر جگہ پھیلا دیں گے۔ جس میں سونی آف کوریا کا بھی ذکر ہوگا" محسن نے کہا۔

وہ آبدیدہ ہوگیا "دیکھو، اب تم مجھے بلیک میل بھی کر رہے ہو۔"

میں نے اسے تسلی دی "یار دنیا میں ایسے ہی ہوتا ہے۔ ہر شخص مجبور ہے اور کبھی نہ کبھی دوسرے کی مجبوری سے بھی فائدہ اٹھاتا ہے۔"

اس نے ہمیں حاجی علم دین طوطی صاحب کے طوطی خانے سے کچھ فاصلے پر ڈراپ کیا اور رخصت ہوتے وقت ہم سے گلے ملا۔ "تمہارا دل بہت بڑا ہے۔ تم نے ایک کالے حبشی کو بچانے کے لیے چار سو بیس پاؤنڈ خرچ کردیے۔ تمہارا حوصلہ بہت بڑا ہے، تم نے گوروں کی.......دی۔ تم بڑے مجاہد ہو۔ بڑے بہادر ہو، تمہارا قد بھی مجھ سے بڑا ہے۔ تم واقعی بڑے آدمی ہو، میں تمہارے مقابلے میں ایک دبی بڑا ہوں.... بلکہ وہی چھوٹا ہوں۔"

"ابھی تک ترنگ میں بول رہا ہے" محسن نے اس کے جانے کے بعد ہنس کے کہا۔

میں نے سر پر ہاتھ مار کے کہا "اوہ۔ ایک بہت اہم بات اس سے نہیں پوچھی۔"

محسن نے کہا "وہ کیا؟"

"یار یہ سونی کہاں کی تھی۔ شمالی کوریا کی یا جنوبی کوریا کی؟"

"ابھی کل کا دن ہے ہمارے پاس۔ خود چل کے اس سے پوچھ لیں گے" محسن نے میری کمر میں ایک مکا رسید کیا اور میں نے چلا کے کہا ہائے۔

جن کی طرح ایک پولیس مین نمودار ہوگیا۔ ایسا لندن میں ہی ہوتا ہے کہ کہیں نظر نہ آنے والا پولیس مین معمولی سے حادثے یا جھگڑے کی صورت میں فوراً ٹپک پڑتا ہے۔ "کیوں مار رہے ہو تم ایک دوسرے کو۔"

"... نے مارا ہے۔ اگر دوسرا مار کھا کے بہت خوش ہے تو ... کیا اعتراض ہے" میں نے کہا۔

"مجھے شک ہے کہ تم دونوں نشے میں ہو" وہ بولا۔

میں نے برہمی سے کہا "ہم مسلمان ہیں اور شراب کو چھوتا

بھی حرام سمجھتے ہیں۔"
"کیا تم جانتے ہو کہ یہ غلط ہے؟" وہ اپنی بات پر قائم رہا۔
"یہاں سب مسلمان پیتے ہیں' میں جانتا ہوں۔"
"سب کا لفظ غلط ہے" میں نے کہا "کچھ پیتے ہیں' اکثر نہیں پیتے۔"
"اور تمہارا دعویٰ ہے کہ تم اکثریت میں ہو جو نہیں پیتے' مگر میرا خیال ہے کہ تم کچھ میں شامل ہو' اپنا منہ ادھر لاؤ۔"
اس سے اختلافات بڑھانے کا فائدہ کچھ نہیں تھا۔ اس کو قانون نے یہ اختیار دے رکھا تھا کہ وہ شراب پی کے ڈرائیونگ کرنے یا ہنگامہ کرنے والوں کے بارے میں فوراً تصدیق کے لیے ان کا منہ سونگھے۔ یہ ٹیسٹ لے کر بھی وہ مطمئن نہ ہو تو چاک سے سڑک پر لکیر کھینچ کے مطالبہ کر سکتا ہے کہ اس پر سیدھا چل کے دکھاؤ۔ تاہم اس اختیار کو کیش کرانے کا وہاں کوئی تصور نہیں۔
جب وہ منہ سونگھ کے مطمئن ہو گیا کہ واقعی ہم نے شراب نہیں پی رکھی ہے تو اس نے شائستگی سے "سوری" کہا اور پھر شب بخیر کہہ کے گشت پر روانہ ہو گیا۔
رات کے ایک بجے ہم ہفت روزہ "طوطی" کے نقارخانے پہنچے تو اندر سے تشویشناک آوازوں کا شور سنائی دے رہا تھا جس میں طوطی صاحب کی آواز سب سے نمایاں تھی۔ ہم نے ان کے فرزند ارجمند مسٹر نوردین کی فریاد وبکا بھی سنی۔ چند بچے کھلکھلا کے ہنسے۔ ایک عورت نے چیخ ماری۔ پھر ایک چپلی گری اور کوئی شیشہ ٹوٹنے کی آواز آئی۔
ہم دبے پاؤں آفس میں پہنچ گئے جہاں بقراط کتابت نہ کرنے کے باوجود کتابت کرنے کے پوز میں منجمد رکھا ہوا تھا اور دیوار کو ایسے گھور رہا تھا جیسے اس کے پیچھے ہونے والے ڈرامے کا ہدایت کار وہی ہے۔
میں نے کہا "بقراط' یہ کیا ہو رہا ہے؟"
اس نے مجھے پرملامت نظروں سے دیکھا "یہ ایک غیر منطقی اور نامکمل سوال ہے۔ کہاں کیا ہو رہا ہے؟ میں تم کو دیکھ رہا ہوں۔ تم مجھے دیکھ رہے ہو۔ میری زبان سے ادا ہونے والے الفاظ تمہاری سماعت تک کانوں کے راستے پہنچ رہے ہیں۔ ہمارے دل دھڑک رہے ہیں۔ نبض چل رہی ہے۔ زمین چاند ستارے سب چل رہے ہیں۔ یہ جانے بغیر کہ کیوں چل رہے ہیں۔ چاند گھوم رہا ہے زمین کے گرد لیکن کسی دن راہ میں کوئی سیارہ حائل ہو گیا تو چاند ٹھوکر کھا کے دھڑام سے گرے گا زمین پر۔ یا زمین کے مدار پر چاند سے اس کا تصادم ہو گیا تو زمین سیدھی جائے گی سورج کے آتشیں جہنم میں... اور تمت بالخیر۔"
میں نے سر پر ہاتھ مار کے کہا "بقراط۔ اندر حاجی صاحب کے گھر میں یہ کیسا شور ہے۔"
اس نے آہ بھر کے کہا "اگر تمہاری بھی اتنی ہی بیویاں اور ان کے اتنے ہی بچے ہوں گے اور تم لندن کو سانڈہ کلاں سمجھتے رہو گے تو ایسا ہی تمہارے گھر میں بھی ہوگا۔ یہ تم خود ملاحظہ کر سکتے ہو کہ کیا ہو گا۔"
میں نے ایک دروازے کو ایک انچ کے قریب کھولتے ہوئے اندر جھانکا' محسن میرے پیچھے سے گردن لمبی کر کے دیکھنے لگا۔ سب سے پہلے مجھے ایک اجنبی نظر آیا جس کا سراپا سوا سو سالہ سنیاسی سے ملتا جلتا تھا۔ اس کے سر کے بال بالکل سفید مگر گھنے تھے اور اس کے شانوں تک پہنچتے تھے۔ یہ غالباً وگ تھی۔ جو اس کی داڑھی کے سفید رنگ سے میچ کرتی تھی۔ اس عمر میں اتنے بال میں نے کسی کے سر پر پہلے نہیں دیکھے تھے۔ اس کی گھنی مونچھیں بھی سفید تھیں چنانچہ اس کے منہ کا دہانہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ چارخانے والی لنگی اور لال کرتے میں ایک طرف کھڑا تھر تھر کانپ رہا تھا۔ یہ غصے یا خوف کا اثر نہیں تھا۔ اس کو عمر کے باعث رعشے کا مرض لاحق تھا۔ اس کے ہاتھ میں قینچی استرا دیکھ کے میں سمجھ گیا کہ یہ طوطی صاحب کے خاندانی جراح سیالکوٹ والے ہیں۔
صحن جیسی جگہ میں آلو جیسی رنگت کے صاف سروں والے بچے خاصی تعداد میں موجود تھے۔ ان کے سر بڑی صفائی سے مونڈ کر چمکا دیے گئے تھے اور یہ کارنامہ خلیفہ سیالکوٹی کے رعشہ زدہ ہاتھوں نے سرانجام دیا تھا چنانچہ ہر بچے کی ٹنڈ پر جہاں بال کی کھال بھی کٹ گئی تھی وہاں لہو کا سراغ مٹانے کے لیے پاؤڈر تھوپ دیا گیا تھا۔ سانولی گندمی اور کالی ٹنڈوں پر یہ سفید سفید داغ یوں لگ رہے تھے جیسے قبر کی مٹی پر پڑے ہوئے چنبیلی کے پھول۔ ان مظلوم بچوں کی فریاد بلب مائیں دروازوں میں کھڑی طوطی صاحب کو کنٹرول کرنے کی ناکام کوشش میں مصروف تھیں۔
طوطی صاحب ہانپتے ہوئے ایک تخت کے تین طرف گھوم رہے تھے۔ چوتھی سمت میں تخت دیوار کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ اب ان کے ہاتھ میں ایک لوٹا تھا اور وہ ہانپتے ہوئے لوٹے کو تخت کے نیچے پھینکنے کی کوشش کر رہے تھے۔
"کدھر گیا حرامی... باہر کیسے نہیں نکلے گا... تیرا تو... باپ بھی باہر آئے گا۔" انہوں نے لوٹا' ہاتھ گھما کے نیچے پھینکا۔
نیچے سے ان کے ولی عہد اور چیف رپورٹر نے چلا کے کہا "ہائے' ہائے ہائے میں مر گیا ابا جی۔"
اس کی ماں نے چیخ ماری "ہائے خدا کا خوف کرو حاجی صاحب سر پھاڑ دیا منڈے کا۔"
نیچے سے ایک قہقہہ برآمد ہوا۔ "فکر مت کرو ماں۔ لوٹا کیچ کر لیا تھا میں نے۔"
حاجی صاحب آگ بگولا ہو کے دوڑے "دینا ذرا یہ بانس۔ ابھی باہر نکالتا ہوں اس خر زاد کو خلیفہ' ساری چیزیں نیچے جمع کرا جا رہا ہے۔ جیسے اپنی اماں کا جہیز۔"
اس کی ماں نے دہائی دی "ٹھیک تو ہے۔ میرے جہیز کا لوٹا تھا اور چپلی بھی میرے جہیز کی تھی۔"
"چپ کر نابکار" حاجی صاحب دہاڑے۔ "اس نے نیچے میری عصا پکڑ کے کھینچ لی۔"
خلیفہ نے کپکپاتی آواز میں کہا "حاجی صاحب۔ چلو چھوڑو۔ خیر پھر بھی سہی' ابھی منڈے کا دل نہیں کرتا۔"
"آپ ٹھہرو جی۔ اس کے دل کی تو... میں ابھی بانس لے کر نکالتا ہوں اسے۔ تین مہینے سے بلاتے رہے آپ کو تو آج آئے ہو۔ پھر کب آؤ گے۔ بانس سے بچ کے کہاں جائے گا کھوتے دا پتر۔"
کھوتے دے پتر نے نیچے سے کہا "او ظالم باپ۔ جان لے کہ جان لے کر بھی تو میرے سر کے چمن کو ویراں نہیں کر سکتا اور اے خنجر بکف خلیفہ' تو میرے حلق پر استرا چلا سکتا ہے لیکن میرے سر کو نہیں۔ میری رگوں میں بھی اسلاف کا حق پرست لہو ہے۔ کوکا کولا نہیں۔ چنگیز خان اور ہلاکو بھی مقابل ہوں تو سر کٹ سکتا ہے جھک نہیں سکتا۔ جھکے گا تو خدا کے سامنے۔ تیرے سامنے نہیں سیالکوٹ کے مردود نائی۔ کیا تجھے فرشتۂ اجل کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی نہیں دیتی۔"
"بانس۔ اوئے کدھر ہے بانس" طوطی صاحب چلانے لگے "اس حرام الدہر کے حلق میں ڈالتا ہوں۔"
پتر نوردین نے خلیفہ صاحب کی شان میں ایک ناقابلِ اشاعت بات کی۔
طوطی صاحب کا پارا پھر چڑھ گیا "سر تو منڈاتا ہے میں نے تیرا حرامی۔ ابھی اسپرے کرتا ہوں نیچے۔ خود باہر آئے گا۔ کدھر ہے وہ کھٹمل مار دوا..."
اس دلچسپ تماشے کا اختتام یوں ہوا کہ خلیفہ صاحب نے اپنی کانپتی آواز میں خود اعلان کر دیا کہ وہ اپنی زندگی کا قیمتی وقت (جو اب برائے نام ہی رہ گیا تھا) اس ناخلفی کے مظاہرے میں ضائع نہیں کر سکتے۔ انہوں نے حاجی صاحب کو بھی مطعون کیا جن کی غلط تربیت کے اصولوں نے اولاد کو سرکش اور زوجگان کو بے حیا بنا دیا تھا اور ان کو کنٹرول کرنے میں اس ناکامی کے بعد اصولاً انہیں دریائے ٹیمز میں ڈوب مرنا چاہیے پھر وہ واک آؤٹ کر گئے۔
برخوردار نوردین تخت کے نیچے حفاظت اور سلامتی کے ساتھ روپوش رہا۔ تخت بہت بڑا تھا اور غالباً دیوار کے ساتھ ملا ہوا تھا کہ ہلایا نہیں جا سکتا تھا۔
میں اور محسن اس وقت ہنسی ضبط نہ کر سکے جب خلیفہ کے ساتھ ہی نوردین نیچے سے نکلا اور دروازے کی طرف دوڑا۔ طوطی صاحب کے ہاتھ میں اس وقت کچھ بھی نہیں تھا۔ انہوں نے چلا کے کہا "کھلو جا سؤر دے پتر" اور پھر پاؤں کی جوتی عادت کے مطابق میزائل کی طرح داغی۔ سؤر دا پتر اس وقت آگے نکل گیا تھا۔ جوتی خلیفہ کی کمر میں لگی۔ اس نے ایک پُردرد آواز نکالی۔ ہاتھ آسمان کی طرف بلند کیے اور زمین پر لیٹ گیا۔
میں اور محسن دروازہ بند کر کے پلٹے تو ہنستے ہنستے ہماری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ہنسی ضبط کرنے سے میرے پیٹ میں درد ہونے لگا تھا۔ ہم میز پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ بقراط ہمیں افسوس ناک نظروں سے دیکھتا رہا۔ وہ ہمہ وقت کائنات کے سیاروں' ستاروں اور زمین و آسمان کے درمیان پیش آنے والے قیامت خیز حادثات کے امکانات پر رنجیدگی سے غور کرتا رہتا تھا اور ہمیں یا کسی کو بھی ہنستا ہوا دیکھ کے اسے دکھ ہوتا تھا۔
"یار' میرا تو خیال ہے طوطی صاحب نے خلیفہ کو مقتول کر دیا" محسن بولا۔
میں نے کہا "بے شک یہ ایک غیر ارادی فعل تھا۔ مگر قتل تو قتل ہے۔ خلیفہ کا بھی دمِ واپسیں بر سرِ راہ تھا۔ کوئی بھی بات بہانہ بن سکتی تھی۔"
"طوطی صاحب کی ضربِ مجاہد کا صدمہ الگ تھا۔ خلیفہ کی کمر ٹوٹ گئی ہوگی۔ ذلت کا صدمہ الگ۔"
"ہاں۔ خلیفہ کے نصیب میں جوتے کھا کے مرنا تھا۔"
"جوتی آلۂ قتل کے طور پر پولیس اپنے قبضے میں کرے گی۔"
حاجی علم دین طوطی نمودار ہوئے تو ہم ایسی ہی فضول باتوں پر زار و قطار ہنس رہے تھے انہوں نے بڑی متانت سے مجھے دیکھا اور ایک انگلی سے اٹھنے کا اشارہ کیا "یہ ایڈیٹر کی کرسی ہے میرے پاکستانی بھائی' ہرا ایرا غیرا تو خیر اس پر بیٹھنے لگا تو..."
"ایسے ہی تو بیٹھے ہیں" میں نے زیرِ لب اور کہا اور کھڑا ہو گیا۔
"کیا فرمایا میری سرکار" حاجی صاحب پاؤں سمیت کرسی پر بیٹھ گئے۔
"کچھ نہیں۔ میں ندامت کا اظہار کر رہا تھا۔"
وہ مجھے اور محسن کو دکھی نظروں سے دیکھتے رہے۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ اس وقت وہ کس بات پر دکھی ہیں۔ معزز سفید ریش خلیفہ صاحب کی پشت مبارک پر جوتا مارنے پر۔ اولاد نرینہ کی ناخلفی کے مظاہرے پر۔ اپنی والدانہ اور شوہرانہ ناکامی پر یا قومی اور عالمی مسائل پر۔
"خیر سے آپ لوگ کس پر خندہ زن تھے؟" انہوں نے مشکوک لہجے میں کہا "تمہاری موسلادھار ہنسی بے سبب نہیں ہو سکتی۔ کہیں ایسا تو نہیں میرے پاکستانی بھائی کہ تم چوری چھپے اس دروازے کی اوٹ سے میرے خاندانی اور نجی معاملات کا نظارہ کر رہے تھے۔"
میں نے فوراً کہا "طوطی صاحب۔ بڑے افسوس کی بات ہے۔"
"افسوس کی بات ہے میرے بھائی اسی لیے تو پوچھ رہا ہوں۔ یہ کسی تعلیم یافتہ مہذب مسلمان کو زیب نہیں دیتا کہ وہ پردہ دار اہلِ خانہ پر نگاہ بھی ڈالے۔"
محسن نے کہا "کیا آپ ہمیں ایسا سمجھتے ہیں... یہ زیادہ افسوس کی بات ہے۔"
میں نے بھی کہا "ہم تو ان واقعات پر ہنس رہے تھے جو آج رات پیش آئے۔"

حاجی صاحب نے سکون کا سانس لیا "معاف کرنا۔ میں کافی دیر سے خانگی مسائل میں اُلجھا ہوا تھا۔ دراصل آج اپنے سیالکوٹ کے خلیفہ صاحب تشریف لائے تھے۔ وہ بھی بے حد مصروف رہتے ہیں۔ لوجی سن پینسٹھ کی جنگ چل رہی تھی جب آخری نومولود کو مسلمان کیا تھا۔ الحمداللہ آج تین کا دینی فریضہ پورا کیا۔ جتنی آپ کی عمر ہے نا میرے پاکستانی بھائی' اس سے دُگنا ان کا تجربہ ہے۔ اللہ نے بڑی صفائی دی ہے ان کے ہاتھ میں۔ چار برخورداروں کے سر بھی صاف کرائے۔"

میں نے سرسری لہجے میں کہا "نوردین نے بھی بال صاف کرالیے؟"

حاجی صاحب نے ایک ٹھنڈی سانس لی "یہی تو افسوس ہے کہ ولایت کی آب وہوا نے اس ناخلف کو باغی و سرکش کردیا ہے۔ اس نے ہیپیوں جیسے بالوں کے لیے والدین کی نافرمانی کا گناہ کیا۔ اب آپ ہی فرمائیں کہ آپ ہوتے تو کس کی خوشی کو عزیز رکھتے۔ ان بے حیا اور مادر پدر آزاد لڑکیوں کی جن کو وہ اپنی گرل فرینڈز کہتا ہے یا والدین کی...."

میں نے کہا "والدین کی رضا مقدم ہے۔"

محسن بولا "کیا اس نے سرمنڈوانے سے انکار کردیا؟"

"دراصل ماں کی شہ پر وہ روسیاہ ابھی تو روپوش ہونے میں کامیاب رہا لیکن جن بالوں پر وہ ناز کرتا ہے بلکہ غرور۔"

میں نے کہا "کرنا بھی چاہیے۔ علامہ اقبال صاحب نے آخر کس کو مخاطب کیا ہے۔ گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر۔ یہ تو فرض نہیں کیا جاسکتا کہ انہوں نے مسلمان لڑکیوں سے کہا ہوگا یا مسلم خواتین سے۔"

طوطی صاحب کے لیے علامہ صاحب کا فرمایا ہوا سند تھا۔ انہوں نے غور فرماتے ہوئے اِدھراُدھر دیکھا۔ "ہاں.... وہ تو خیر ٹھیک ہے میرے پاکستانی بھائی' خیر.... آپ فرمائیں کہ حصولِ مقصد میں کس حد تک کامیاب رہے۔"

میں نے کہا "آپ کی مدد اور تائید ایزدی سے ہم نے دشمنوں کی سازش کو ناکام کردیا اور جارج سے ملاقات بھی ہوئی۔ بڑی تفصیل ہے لیکن تفصیل سے بتائیں گے تو رات سے صبح ہوجائے گی۔"

طوطی صاحب پھڑک کر بولے "یہ کیا کہہ دیا میری سرکار۔ صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے۔ عمر یونہی تمام ہوتی ہے۔ ہر رات کے بعد صبح کا آنا مبارک اور برحق ہے اور برخوردار! وہ کیا فرمایا ہے اپنے علامہ صاحب نے کہ 'غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی....'"

"اُف!" میں نے کہا "یہ بھی علامہ صاحب نے فرمایا تھا۔"

انہوں نے حیرانی سے کہا "بھئی اور کون فرما سکتا ہے۔ لو دیکھو اس گھڑیال کی جانب جو تمہاری کلائی پر موجود ہے۔ صبح تو ہوگئی۔ اس کے بعد رات ہوگی اور پھر کل کی صبح تو آج کا کام کل پر کیوں چھوڑا جائے۔"

ان سے اتفاق نہ کرنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ میں نے جارج سے ملاقات کا احوالِ واقعی ان کے گوش گزار کردیا مگر اس میں وہ سب غیر شرعی اور رومانٹک مناظر نکال دیے جن میں شراب وشباب یعنی سونی آف کوریا اور اپنے پاکستانی وکیل بھی شیروشکر ہوگئے تھے۔ میرا خیال تھا کہ اسپتال کی معرکہ آرائی کا ذکر انہیں تشویش میں مبتلا کردے گا مگر طوطی صاحب بڑے مسرور ہوئے۔

"تم نے تو کمال کردیا میرے پاکستان بھائی۔ ایسی شکست دی ان گوری چمڑی والے کافر حملہ آوروں کو۔ بڑا ناز ہے ان کو اپنی پولیس کی ذہانت پر اور اسکاٹ لینڈ یارڈ کے جاسوسوں کی کارکردگی پر۔ سب کی بولتی بند کردی تم نے۔ ناکوں چنے چبوا دیے" وہ لپک کر اُٹھے اور مجھے گلے لگا کے بڑی محبت سے نچوڑا "اللہ تمہیں نظرِ بد سے بچائے میرے پاکستانی بھائی۔"

پہلے میرا خیال تھا کہ ان کو اس بم دھماکے کے بارے میں کچھ نہ بتایا جائے جس میں سرجیڈ گورڈن کی رولز رائس تباہ ہوگئی تھی مگر ریاست قلاش پور کے راجا کنگال رائے یعنی چوہدری دلاور کا تذکرہ کسی اور حوالے سے ممکن نہیں تھا اور ان کا رویہ دیکھ کے میرا یہ خوف بھی دور ہوگیا تھا کہ وہ ہر جگہ ہماری پنگا اندازی پر برہمی کا اظہار کریں گے۔

ساری بات سُن کے انہوں نے سرہلایا "لو بھئی ساری بات ہماری سمجھ شریف میں آگئی ہے۔ اب یہ سارا مسئلہ ہم نے ڈال دیا ہے اس قابلِ ذکر پاکستانی دماغ کے کمپیوٹر میں۔ رات بھر کمپیوٹر کام کرے گا اور صبح اس کا حل ایسے نکالے گا جیسے خالص مکھن۔"

میں نے بے وقوفوں کی طرح کہا "خالص مکھن۔"

"ہاں میرے بھولے بادشاہ۔ یہ باتیں تم کیسے سمجھ سکتے ہو۔ شہر میں پلے بڑھے۔ انگلش میڈیم اسکولوں میں پڑھے۔ ابھی دودھ کے دانت نہیں ٹوٹے تھے کہ چائے پینے لگے اور جگر جلانے والی کافی۔ کبھی گاؤں دیکھا ہوتا...."

میں نے کہا "گاؤں تو بہت دیکھے ہیں۔"

"خاک دیکھے ہیں۔ ٹرین میں بیٹھ کے یا لاری کی کھڑکی سے تو بندہ سب کچھ دیکھتا ہے مگر ادھر ایک دن رہو تو پتا ہے کہ صبح کیسے ہوتی ہے۔ جب گھروالی یا کوئی مُٹیار.... مُٹیار سمجھتے ہو؟"

میں نے عرض کی "جی پنجابی فلموں نے اس کا مطلب خوب سمجھادیا ہے۔"

"تو میرے پاکستانی بھائی' جب چاٹی میں چوڑیوں کی جھنکار کے ساتھ کوئی مُٹیار لسّی کو رڑکتی ہے۔ خوب رڑکتی ہے دہی تو پھر کہیں جاکے اس میں سے نکلتا ہے خالص مکھن کا چٹا گولا.... چاٹی کا رڑکنا...."

میں نے کہا "مٹکی میں دہی بلونا۔ طوطی صاحب یہ مت بھولیں کہ میں یونان کا سکندر اعظم نہیں۔ لاہور کا سکندر بخت ہوں۔"

"بس تو پھر سوجاؤ لمبی تان کے میری سرکار اور دیکھو ہمارے دماغ کے کمپیوٹر سے کیا برآمد ہوتا ہے۔"

محسن بولا "ابھی تو آپ نے فرمایا تھا کہ صبح ہوگئی۔"

وہ ہنسے "ہاں بھئی کہنے کو ہوگئی مگر تم بھی تو غور فرماؤ کہ جب بندہ سو کے اُٹھتا ہے تو صبح ہوتی ہے اور جب سوتا ہے تو رات ہوتی ہے۔"

بقراط نے نیند میں کہا "جو سوتا ہے وہ کھوتا ہے۔"

طوطی صاحب نے شکایتی لہجے میں کہا "دیکھو اس کھوتے کو۔ خود بھی تو سورہا ہے مگر اس کا دماغ چل گیا ہے اور خرابی یہ ہوگئی ہے کہ دماغ کے بریک فیل ہوچکے ہیں۔ سوتے جاگتے یہ خود اُدھر بیٹھا ہو کھڑا ہو یا پڑا ہو۔ اس کا دماغ چلتا رہتا ہے۔ وہ کیا فرمایا ہے اپنے علامہ صاحب نے۔ نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں...."

میں نے احتجاج کیا "یہ تو غالب کا شعر ہے۔"

"اوجی وہ اسداللہ تھا۔ اللہ کا شیر۔ مردِ مومن۔ اس دور میں تو اپنا پاکستانی شاعر ہی ہوتا اور علامہ صاحب سے کم وہ بھی نہیں ہے۔" انہوں نے کمال ڈھٹائی سے اپنے مؤقف کا دفاع کرتے ہوئے اپنی جہالت کو چھپالیا اور سونے کے لیے تشریف لے گئے۔

مجھے اور محسن کو پھر کھلی چھت پر جانا پڑتا مگر بارش جو وقفے وقفے سے سارا دن جاری رہی تھی' اس وقت بھی برس رہی تھی۔ گزشتہ رات لندن کی اُن بہت کم راتوں میں سے ایک تھی جب آسمان تاروں سے روشن تھا۔ شاید اسی لیے شہزادہ سلیم نے انارکلی کو بالائے بام طلب فرمایا تھا لیکن ایک رومان پرور فضا کو اس کے ظالم ابا نے اور ہم نے اپنی موجودگی سے اس طرح برباد کیا تھا جیسے محفلِ شعروسخن میں تالیاں اور ڈھولک بجاتے ہیجڑے گھس جائیں۔"

مجبوراً ہم نے اسی دفتر میں رات گزاری جہاں بستر تک نہیں تھا۔ بقراط اس تخت پر اسی پوز میں آڑا پڑا ہوا تھا جس پوز میں وہ دن بھر بیٹھا نظر آتا تھا۔ وہ چاہتا تو اس پر فراغت سے پاؤں پھیلاکے بھی سوسکتا تھا مگر اس کو کتابت کے فن نے الف سے ی بنادیا تھا اور تومی سے بقراط۔

میں نے ایڈیٹر کی میز پر اپنے لیے جگہ بنائی۔ بہت سی چیزوں کو میں نے لات مار کے فرش پر گرادیا۔ ٹوٹنے والی چیزیں محسن نے پہلے ہی اُٹھاکے نیچے رکھ دی تھیں۔ تکیے کے طور پر میں نے ہفت روزہ طوطی کی جلد اوّل استعمال کی۔ محسن نے خود غرضانہ رویّے کا مظاہرہ کرتے ہوئے صوفے پر غاصبانہ قبضے کا اعلان کیا تو میں نے فراخ دلی سے کام لیتے ہوئے اس کو چیلنج نہیں کیا۔ اگر اس مسئلے پر کوئی جنگ ہوتی تو بقراط مارا جاتا۔۔ مرگیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالب۔ بقراط تو ویسے ہی قریب الاختتام تھا۔

ہفت روزہ طوطی کی جلد دوم کو سر کے نیچے رکھتے ہوئے محسن نے کہا "واہ کیا نرم اور پُرتکلف بستر ہے۔ میں تو خواب میں الزبتھ کو بھی دیکھ سکتا ہوں۔"

میں نے کہا "اس حرکت پر میں بھی تجھے خواب میں سنگسار کروں گا۔ آخر تو ایک شادی شدہ حیوانِ ناطق ہے۔"

"تجھے بہت تکلیف ہوگی یار اس تختے پر۔ مُردے کو قبر کی زمین پر ایسا ہی لگتا ہوگا۔" محسن بولا۔

"تو اپنے لیے وہاں بھی فوم کے گدے لگوالینا...." میں نے جل کے کہا۔

"مجھے تو بڑی راحت محسوس ہورہی ہے.... مجھ پر غنودگی طاری ہورہی ہے۔ واہ.... کیسی پُرسکون نیند آئے گی.... صبح تروتازہ اُٹھوں گا۔ تیری تو کمر اکڑ چکی ہوگی۔" اس نے اچانک کہا "آہ۔"

میں نے کہا "کیا ہارٹ اٹیک ہوگیا؟"

"یار کسی چیز نے کاٹا ہے۔ کھٹمل اتنے زور سے تو نہیں کاٹتا۔"

میں نے کہا "کالا بچھو ہوگا۔ سخت مہلک ڈنک ہوتا ہے اس کا۔"

محسن اُٹھ بیٹھا "ابے یار لندن میں کھٹمل' یقین نہیں آتا۔"

میں نے کہا "امپورٹڈ ہوں گے۔ اپنے پیارے پاکستان کی سوغات لایا ہوگا کوئی۔"

اس نے ایک کو مارتے ہوئے کہا "اُف۔ یہ دوسرا.... خون پی پی کے کاکروچ ہورہا ہے۔"

"اس نے پیا ہوگا کسی شرابی گورے کا سفید خون۔ کالے آدمی کا خون پیئے گا تو بدہضمی سے مرجائے گا۔"

محسن سونے لیٹا اور پھر اُٹھا "یار' میں تو مارا گیا۔ ایک پتلون کے پائنچے سے اندر چلا گیا ہے۔"

"چل جانے دے یار۔ بے زبان جانور ہے اور سوجا سکون سے۔ خواب میں الزبتھ کو بلانا چاہے تو بلالینا۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں" میں نے قہقہہ مارا "شب بخیر۔ اور دیکھ' ڈانس مت کر۔ کھٹمل مارنے سے بُو بھی پھیل رہی ہے۔ میری نیند میں خلل پڑتا ہے۔"

علی الصباح آٹھ بجے اُٹھائے جانے پر مجھے سخت تاؤ آیا۔ رات ہم تین بجے سوئے تھے اور میرا دس بجے سے پہلے جاگنے کا کوئی پروگرام نہیں تھا مگر جگانے والا پتر نوردین تھا۔ وہ سخت بدحواس اور پریشان کھڑا تھا۔ مجھے جگانے کے لیے اس نے میرے پیر کے تلوے پر برش پھیرا تھا۔ شاید اس کے نزدیک جھنجوڑ کر جگانے کے مقابلے میں یہ نرمی اور شرافت سے بیدار کرنے کا مناسب طریقہ تھا مگر مجھے ایسا لگا جیسے میرے پاؤں پر کاکروچ یا بچھو چڑھ گیا ہے۔ میں نے ہڑبڑا کے لات چلائی تو وہ شہزادہ سلیم کے چہرۂ مبارک پر لگی۔ وہ مجھ پر جھکا ہوا تھا۔ لات کھاکے وہ گھوما اور بقراط پر جاگرا۔

بقراط اچھل کے کھڑا ہوگیا "یہ.... کون سا سیارہ گرا تھا مجھ پر...."

نوردین نے جبڑا ہلاتے اور سہلاتے ہوئے کہا "اوئے پاگل دے پتر۔ میں تجھے سیارہ لگتا ہوں' شور مت کر۔"

بقراط نے آسمان کی طرف دیکھا "اللہ کا شکر ہے۔ ویسے کیا تم

جانتے ہو کہ تم کو خلا میں راکٹ کی مدد سے چھوڑ دیا جائے تو تم بھی سیارے کی طرح ہمیشہ اسی مدار پر گردش کرتے رہو گے۔ خلا میں ہوا نہیں ہے چنانچہ جسم سے روح جدا ہونے پر بھی آدمی ویسا ہی رہتا ہے۔ نیوٹن کے قانون حرکت کے مطابق..... خیر' تم نہیں سمجھ سکو گے؟" وہ پھر لیٹ کے سو گیا۔

"توبہ توبہ' کیسی بھیانک باتیں کرتا ہے بقراط۔ یعنی لاش خلا میں گھومتی رہے گی۔" نوردین ابھی تک دہشت زدہ تھا۔

"یہ تو بقراط ٹھیک ہی کہتا تھا" میں نے کہا "مگر تم بتاؤ کہ میرے ساتھ یہ کیا نامعقولیت کر رہے تھے تم۔"

"لوجی۔ آپ نے تو دولتی جھاڑی ایسی کہ میرا منہ ٹیڑھا کر دیا۔ میں آپ کو جگا رہا تھا' شرافت سے۔"

"یہ شریفانہ طریقہ تھا؟" میں نے کہا۔

"اباجی تو منجی اُلٹ دیتے ہیں یا غسل خانے کا لوٹا بھر کے پانی سر پر ڈال دیتے ہیں۔" اس نے ڈاڑھیں ہلا کے کہا۔

میں نے محسن کی طرف دیکھا "یہ ایسے ہی اُٹھتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم ہی اُٹھا دو' لوٹا لے آؤ۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "اباجی نے دیکھا کہ صوفہ گیلا ہے تو سمجھیں گے نیند میں وہ خطا ہو گیا" اس نے ایک چھوٹی انگلی دکھا کے کہا۔

میں نے کہا "چلو صوفہ اُلٹ دو۔"

"یہ ماریں گے جی مجھے۔ مجھے آپ سے کام تھا ویسے بھی۔"

"نہیں ماریں گے" میں نے کہا "تم کہہ دینا کہ میرا حکم تھا۔ تمہارا کام بعد میں' پہلے یہ کام کرو۔"

نوردین نے سر ہلایا اور زور لگا کے صوفہ اُلٹ دیا۔ محسن لڑھک کر فرش پر گرا اور لال پیلا ہو کے اُٹھا "اُلو کے پٹھے" اس نے مجھے خوں آشام نظروں سے گھورا۔ پھر اس کی نگاہ نے اصل مجرم کو دیکھ لیا "تم...!"

نوردین فوراً میرے پیچھے آگیا "مجھ سے انہوں نے کہا تھا۔"

"یہ کہیں گے کہ جا کے اباجی کی چارپائی اُلٹ دو' تو اُلٹ دو گے؟ اتنی مشکل سے نیند آئی تھی" محسن غرا کے بولا۔

"آپ مہربانی فرما کے میری فریاد سُن لیں" نوردین نے ہاتھ جوڑ کے کہا "اباجی آگئے تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔ خدا کے لیے میری مدد کریں۔ میرے سر کو استرے سے بچائیں۔ اباجی میری ٹنڈ کرانے پر تل گئے ہیں۔ اتنی محنت سے اور محبت سے میں نے یہ ہیر اسٹائل بنایا تھا۔"

"واقعی!" محسن نے منہ پھاڑ کے جماہی لی "دلیپ کمار دیکھے تو اپنا پرانا اسٹائل بدل دے۔"

میں نے اسے تسلی دی "دیکھو مسٹر لائٹ آف دین۔ تمہارے بالوں کا کوئی بال بیکا نہیں کر سکتا۔ یہ ہماری ذمے داری ہے مگر اس کے بدلے میں تم ہمارے لیے کیا کرو گے..... بولو۔"

"اباجی کہتے ہیں" اس نے سوچ کے کہا "میں تو بالکل ہی نکما ہوں جی۔ میں کیا کر سکتا ہوں اس دنیا میں۔ سوائے عشق کے۔ تو وہ کیا نہیں جاتا ہو جاتا ہے خود بخود۔ اباجی بھی نہیں کہتے۔ انہیں تو جہاں عشق ہوا شادی کر لیتے ہیں۔"

محسن بولا "تم بھی کر لو تو وہ بہت خوش ہوں گے کہ تم ان کے نقشِ قدم پر چل رہے ہو۔"

"توبہ کریں جی۔ وہ تو بنا رہے ہیں اسلامی لشکر۔ کہتے ہیں کہ ہر مسلمان برطانیہ میں کرے چار شادیاں اور ہر شادی سے ہوں چودہ بچے۔ ان چھپن بچوں کے جوان ہونے تک وہ بوڑھا نہیں ہو گا۔ ان سب کی شادیاں خود کرائے' میڈیکل چیک اپ کے بعد۔"

"کس بات کا میڈیکل چیک اپ؟"

"یہ معلوم کرنے کے لیے کہ خدانخواستہ لڑکی بانجھ تو نہیں ہے۔ اس طرح چھپن بیٹوں کے بھی چودہ چودہ بچے ہوں تو وہ سات سو چوراسی پوتوں کا دادا ہو گا۔ دادا دادی کو شامل کر کے سات سو چھیاسی۔ بسم اللہ کے اعداد' یہ کتنا مبارک آغاز ہو گا۔"

میں نے کہا "یہ ان کا انگلستان کو بالآخر پاکستان بنانے کا منصوبہ ہے۔ تم کو اس عظیم کام میں ان سے یقیناً تعاون کرنا چاہیے۔"

محسن بولا "مگر کیا یہ ضروری ہے کہ ہر بیوی کے چودہ بچے ہوں' لڑکے ہوں اور پھر وہ سب بھی برطانیہ میں مسلمانوں کی آبادی بڑھانے کے اس کارِ خیر میں برابر کے شریک ہوں۔"

نوردین رونی شکل بنا کے بولا "میں نے بھی یہی کہا تھا ایک بار کہ آخر لڑکی کیا کرے گی تو انہوں نے میرے ایک جھانپڑ مارا۔ شاہجہاں کی بیوی تھی ممتاز محل' وہ بھی لڑکی تھی مگر اس نے پیدا کیے تھے چودہ بچے اور اس کا انتقال بھی چودھویں بچے کی پیدائش کے وقت ہوا تھا۔ دیکھ اس کے لیے تاج محل بنایا گیا تھا۔ مگر میں تو شادیاں کرنے سے بہتر یہ سمجھتا ہوں کہ شادی ہی نہ کروں' ایسے سب کو اپنی بیوی سمجھتا رہوں۔"

میں نے کہا "تم بڑے ناخلف گستاخ اور گنہگار ہو۔ خیر ایسے خیالات پر دنیا میں تمہارے اباجی اور آخرت میں اللہ میاں تم کو سزا دیں گے..... جس کے تم مستحق ہو۔ ابھی تو ہم سے مطلب کی بات کرو' اس شکل کو ملاحظہ فرماؤ۔"

اس نے محسن کی طرف دیکھا۔ "اس میں کیا ہے ملاحظہ فرمانے کو؟"

میں نے کہا "کیسا ہے یہ چوکھٹا۔"

"بس اچھا ہے۔ میرے جیسا حسین چہرہ تو بہت کم ہوتا ہے۔"

محسن نے کہا "ٹھیک ہی سلوک کرتے ہیں حاجی صاحب تمہارے ساتھ۔ اس چپل کباب جیسی شکل پر اتنا ناز ہے تمہیں۔"

وہ بُرا مان کے بولا "لوجی۔ ہر ہفتے میں ایک دن چھوڑ کے ایک لڑکی فریفتہ ہو جاتی ہے مجھ پر۔ پچھلے سال ایک سو چھپن تھیں ان میں سے چالیس....."

محسن نے کہا "ایسی لڑکیوں کی بات مت کرو جو شکل دیکھ کے یا عقل دیکھ کے یا جیب دیکھ کے عاشق ہوتی ہیں۔ پہلی چیز تمہارے پاس ہے نہیں اس لیے اور دوسری میں تم باپ کا مال اڑانے کے لیے غبن کرتے ہو۔ ممکن ہے چوری ڈکیتی بھی کرتے ہو۔"

میں نے فوراً حالات کو مزید خراب ہونے سے بچا لیا "نوردین۔ تم ڈرامے کرتے ہو نا' ایک ڈراما ہم بھی کرنا چاہتے ہیں۔"

"اچھا جی۔ مجھے چانس دیں گے آپ؟" وہ خوش ہو گیا "آپ دیکھ لیں کیسا بنا بنایا ہیرو ہوں میں۔ میری شکل کچھ گیری کوپر سے۔"

"اور کچھ تارزن کی محبوبہ سے ملتی ہے" محسن بولا۔

میں نے کہا "تم میری طرف دیکھو اور دھیان دو صرف میری بات پر۔"

"بہت ڈرامے کر چکا ہوں جی میں۔"

"وہ تو ہم دیکھ رہے ہیں۔ ایک نیا ڈراما تو ہر روز تمہارے اپنے گھر میں ہوتا ہے جس میں ولن ہوتے ہیں تمہارے والد ماجد۔" محسن بولا۔

میں نے محسن کو ڈانٹا "یار' تجھے رات بھر کھٹمل کاٹتے رہے تو اس میں کسی اور کا کیا قصور جو تو کاٹنے کو دوڑ رہا ہے۔ نوردین ہم جس ڈرامے کی بات کر رہے ہیں اس کا تعلق ہے اصل زندگی سے۔ اس میں تم ہمارا ساتھ دو گے تو ہم تمہیں اس کا معاوضہ دیں گے۔"

"معاوضہ دیں گے؟" اس کا چہرہ چمکنے لگا "کتنا؟"

میں نے متانت سے کہا "جتنا بڑے ہدایت کار دلیپ کمار کو دیتے تھے۔"

محسن بولا "انیس سو چھیالیس میں۔"

"سب بڑے فنکاروں نے پہلے ذلت اُٹھائی تھی" میں نے کہا۔ "اور بہت پاپڑ بیلے تھے۔"

محسن بولا "ہمارے ساتھ تم بھی پاپڑ کی طرح بیلے جاؤ گے' انشاءاللہ۔"

"تمہارے خوب صورت ہیرو ٹائپ ہیر اسٹائل کے مستقبل کی ضمانت ہم دیں گے۔ اس کے علاوہ تم کو دس پاؤنڈ یومیہ۔ علاوہ اخراجات آمدورفت اور خرچہ کھانے پینے کا۔"

"پینے کا خرچ بھی....."

میں نے کہا "تم عبدل کے ریسٹورنٹ سے چائے جتنی بار چاہو پی سکتے ہو اور کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ ہم مزید مذاکرات ناشتے کی میز پر کریں۔ ناشتا ہم مسٹر عبدل کے ڈھائی اسٹار ریسٹورنٹ میں کر سکتے ہیں۔ یہاں ویسے بھی تمہارے خطرناک اباجی کی دخل اندازی کا خطرہ ہمارے سر پر تلوار کی طرح موجود ہے۔"

"تلوار ویسے تو زنگ خوردہ ہے۔ ہماری گردن نہیں کٹ سکتی مگر کرپٹ جائے گا۔" محسن بولا "اس وقت کیا صورتِ حال ہے۔ تلوار کہاں ہے؟"

"تلوار تو حاجی صاحب کہتے ہیں' اپنی بیویوں کو" وہ دانت نکال کے بولا "کہتے ہیں کہ دیکھ لو ایک نیام میں دو تلواریں کیسے رہ سکتی ہیں۔ حاجی علم دین چار رکھ سکتا ہے۔"

میں نے کہا "کیا وہ ابھی تک خوابِ خرگوش میں گھوڑے بیچ کے سو رہے ہیں۔"

"وہ نماز پڑھنے کے لیے اُٹھتے ہیں اور پھر سو جاتے ہیں۔"

"انٹرول کے بعد خواب کی باقی فلم دیکھتے ہوں گے۔ خیر' اللہ انہیں کروٹ کروٹ آرام و سکون عطا کرے" میں نے ان کے برخوردار کے سامنے ایسا کہنا مناسب نہ سمجھا کہ طوطی صاحب کے لیے ایک سے زیادہ بیویوں کے باعث ناممکن ہے۔

عبدل کا چہرہ خلافِ توقع ہمیں دیکھتے ہی اتر گیا جیسے ہم اس کے قرض خواہ ہیں۔ اس پر جو احسان قرض تھا وہ پرانی بات تھی۔ وہ ہمیں دیکھ کے کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گیا تھا اور یہ کہنے کی غلطی کر بیٹھا تھا کہ ہم جب تک لندن میں ہیں اس کے ہوٹل کو اپنا ہی ہوٹل سمجھیں۔

میں نے کہا "بھئی عبدل۔ ہم تو جا رہے تھے انگلش بریک فاسٹ کے لیے کسی بہت اچھے ریسٹورنٹ میں۔"

"ضرور جانا چاہیے بندے کو۔ لندن میں بھی وہی کھایا جو بھاٹی گیٹ میں ملتا ہے تو پھر اتنی دور آنے کا فائدہ؟" وہ بولا۔

"لیکن ہم خلوص اور محبت کی قدر انگلش بریک فاسٹ سے زیادہ کرتے ہیں۔ تم لاؤ جو بھی ہے۔ پوری حلوہ اور پائے پراٹھے۔"

"اور تین ہاف بوائل انڈے۔ کافی' بھئی جب تم نے کہہ دیا ہے کہ اسے اپنا ہی ہوٹل سمجھیں تو پھر تکلف کیسا؟"

"میرے لیے دو انڈوں کا آملیٹ سلائس اور چائے میں مکھن کی ٹکیا ملائی کے ساتھ" نوردین بولا "ان کے حساب میں۔"

"ہمارا ان کا کوئی حساب نہیں نوردین۔ عبدل تو ساری عمر اپنا قرض نہیں اُتار سکتا۔ یہ خود اس کا خیال ہے۔"

"ہم نے احسان جو کیا تھا اس کی زندگی بچا کے۔ ہم نے تو خیر اپنا انسانی فرض ادا کیا تھا۔ مگر عبدل کہتا ہے کہ ہم نے اس کی جان نہ بچائی ہوتی تو آج یہ کاؤنٹر پر اس شان سے نہ بیٹھا نظر آتا۔ خود اپنے ذاتی ہوٹل میں۔ یہ اپنی ذاتی قبر میں ڈھانچا بنا پڑا ہوتا' ہے نا عبدل؟"

اس نے خون کے گھونٹ پی کے مسکرانے کی کوشش کی اور سر ہلا کے کہا "ہاں جی۔ اس میں کیا شک ہے مگر یہ نوردین سؤر دا پتر ہے۔ اسے تو میں سنکھیا اور دھتورا دوں گا ناشتے میں' نیلے تھوتھے کے ساتھ۔"

میں نے کہا "عبدل۔ یہ ہمارا مہمان ہے۔ یہ ہمارا چھوٹا بھائی ہے اور مستقبل کا عظیم ایکٹر ہے۔ دیکھ لینا ایک دن وحید مراد اس کے سامنے الٹے قدم جھاڑو دیتا نظر آئے گا۔ محمد علی اس کی جوتیاں اٹھائے گا اور ندیم اس کو سر پر بٹھائے گا۔"

وہ نوردین کو گھور کے بولا "ایسا ہوا تو جناب لکھ لیں میری بات بھی' وحید مراد اس کی صورت پر جھاڑو مارے گا۔ محمد علی جوتیاں اور ندیم اسے اُٹھا کے پھینکے گا گٹر میں یا کسی پہاڑ سے نیچے؟"

نوردین بڑا وسیع القلب تھا۔ اس نے تحمل اور بردباری کا بے مثل مظاہرہ کرتے ہوئے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا اور بقول اس کے مفت کا "بمباٹ" ناشتا کرکے اسے روحانی مسرت حاصل ہوئی۔

"بات یہ ہے مسٹر نوردین!" میں نے بالآخر مطلب کی بات کی "تم ہر قسم کا رول کرسکتے ہو۔ ظاہر ہے ہر طرح کا حُلیہ بنا سکتے ہو۔ میک اپ سے چہرہ بدلنا تمہارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔"

"اباجی تو بہت گالیاں دیتے ہیں کہ ہر کام اُلٹے ہاتھ سے کرتا ہے کھبے' اسی لیے سیدھا کام بھی الٹا ہو جاتا ہے۔ وہ سمجھتے ہی نہیں کہ میں پیدائشی لیفٹ ہینڈر ہوں۔"

میں نے کہا "سمجھ جائیں گے ایک دن۔ یہ بتاؤ کہ تم محسن کو کیا بنا سکتے ہو۔ اُلّو بنانے کے علاوہ۔"

محسن نے سہلایا "میں تمہارا ہم شکل نظر آنا بھی نہیں چاہتا۔"

"تم اسے میک اپ کرکے یا کرا کے۔ اتنا بدل دو کہ یہ پہچانا نہ جائے۔ تم اسے جوگی فقیر' پوسٹ مین یا وردی والا بس کنڈیکٹر' بوڑھی میم یا مس افریقہ' جو چاہو بنا دو۔ اور خود بھی ایسا بھیس بدلو کہ تمہارا باپ بھی تم کو نہ پہچان سکے۔"

"اسی میں تمہاری سلامتی ہے" محسن بولا "پہچان لیا تو وہ تمہیں گنجا کردے گا۔"

میں نے اسے خبردار کیا "بلاوجہ نوردین کو دہشت زدہ مت کر۔ اس کے سر کی زلفوں کو پورا تحفظ حاصل ہے۔ میں خود بھی جیسا نظر آرہا ہوں۔ ایسا نظر نہیں آنا چاہتا۔"

نوردین نے ڈکار لے کر کہا "یہ کوئی مشکل کام نہیں مگر مجھے ابھی تک تم نے ڈرامے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ میرا مطلب ہے اسکرپٹ وغیرہ......"

میں نے کہا "اسکرپٹ ہوتا ہے اسٹیج' ڈرامے کا اور یہ ہے حقیقی زندگی کا ڈراما۔ میں تم کو بتاتا رہوں گا کہ تمہیں کیا کرنا ہوگا۔ تمہاری اصل ذمّے داری ہے اپنا اور ہمارا میک اپ سے چہرہ بدلنا اور حُلیہ تبدیل کرنا۔"

"یہ تو کوئی مشکل کام نہیں۔ میں تم کو اس دُکان پر لے چلتا ہوں جو تھیٹر گروپس کو اور آرٹسٹوں کو ان کے رول کے لیے کرائے پر چیزیں دیتا ہے۔ داڑھی مونچھیں' وگ اور ماسک۔ کاسٹیوم لیکن......"

میں نے کہا "آگے بولو' مسٹر نوردین۔"

نوردین نے منمنا کے کہا "وہ یہودی ہے۔"

میں نے کہا "کوئی بات نہیں۔ ہم اس سے فلسطین کے مسئلے پر کوئی بات نہیں کریں گے۔"

محسن بولا "اسے قتل بھی نہیں کریں گے۔ حالانکہ ثواب ہوگا۔"

"یہ بات نہیں۔ وہ تو مجھے پکڑ لے گا۔" نوردین نے کہا۔

"آخر کیوں؟ تم کوئی پکڑنے والی چیز ہو؟" میں نے کہا۔

محسن بولا "ہاں۔ لوگ خرگوش ... چیتے اور بھالو تک پکڑتے ہیں اور تتلیاں یا رنگین طوطے۔ بے شک اُلّو بھی پکڑے جاتے ہیں۔"

"دراصل...... میں مقروض ہوں اس کا۔ اس سال کرسمس پر میں نے اس سے سانتا کلاز کا ڈریس لیا تھا۔ ایک ہاتھ لمبی داڑھی' سفید بالوں اور مونچھوں کا سیٹ تھا۔ داڑھی میں آگ لگ گئی تھی۔ پورا سیٹ برباد ہوگیا تھا۔ وہ دس پاؤنڈ مانگتا ہے۔"

"آگ کیسے لگی تھی؟" محسن نے کہا۔

"وہ جی۔ آج کل کے بچے تو آپ جانتے ہیں' کتنے تیز ہوگئے ہیں۔"

محسن نے سہلایا "تمہارے والد کی اس بات سے ہم پوری طرح اتفاق کرتے ہیں' تم کو دیکھتے ہوئے۔"

وہ بولا "میں کرسمس پر ایک بچّے کو کھلونے اور گفٹ دینے گیا جس کا آرڈر اس کے ماں باپ دے کر آئے تھے۔ کرسمس پر کئی شاپس کمیشن کی بنیاد پر سانتا کلاز رکھ لیتی ہیں۔ میں نے بھی پارٹ ٹائم جاب کرلیا تھا۔ وہ بچّہ ہوگا سات آٹھ سال کا مگر جناب دیکھتے ہی اس نے کہا کہ "اُلّو بناتے ہو مجھے؟ یہ دیکھو رسید' یہ ڈیڈی نے یہ گفٹ خریدے ہیں۔ تم فلاں شاپ سے آئے ہو نا؟ نہیں چاہئیں مجھے یہ فضول کھلونے۔ میں نے سائیکل مانگی تھی۔ وہ مجھے ٹرخانے پر آمادہ ہیں" میں نے سانتا کلاز کی طرح کہا "اچھے بچّے ایسی باتیں نہیں کرتے" تو اس نے کہا کہ "اوور ایکٹنگ مت کرو۔ میں تو ویسے ہی بہت حرامی ہوں اور یہ کہتے ہوئے اس نے لائٹر نکال کے میری داڑھی جلا دی اور مجھ پر اسپرے پرفیوم کا۔ میں نے ایک دم داڑھی مونچھیں اور وگ اُتار دی ورنہ چہرہ جل جاتا۔"

میں نے کہا "چلو دس پاؤنڈ ہم ادا کردیں گے۔"

"اب پندرہ پاؤنڈ ہوگئے ہیں۔ ایک پاؤنڈ ماہانہ سود لگا وہ۔"

"چلو جتنے بھی ہیں۔" میں نے کہا "سامان تو سب ل جائے گا نا؟"

"ہاں' سامان تو اچھا ہے اس کے پاس لیکن......"

"پھر لیکن......" محسن نے میز پر مُکّا مارا۔

عبدل لپک کر آیا "سر جی! ٹیبل کی کوئی بات نہیں لیکن اسے تو مفت میں مت توڑیں۔"

میں نے کہا "عبدل کیا تمہیں یاد ہے ہم نے ان گوروں کا کیا حال کیا تھا جو تمہیں قتل کرنے والے تھے۔"

اس نے خفت سے کہا "یاد ہے جی۔"

"ہفتے میں ہم کالوں کا بھی وہی حشر کرتے ہیں بلکہ رنگ دیکھتے ہی نہیں' جو سامنے آجائے اسی کا آملیٹ بنا دیتے ہیں۔"

وہ فوراً سامنے سے ہٹ گیا۔ ریستوران میں اس وقت چار گورے بھی تھے اور دو کالے بھی۔

محسن نے کہا "کیا میں دوسرا مکّا مار کے پوچھوں' لیکن کیا؟"

نوردین نے کہا "اس کی ایک لڑکی ہے' بہت خوب صورت۔"

میں نے کہا "سوری۔ ہم تمہاری اس سے شادی نہیں کرا سکتے۔"

"یہ بات نہیں ہے جی...... دعا کریں وہ دکان پر نہ ملے۔"

میں نے اور محسن نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور دعا کے لیے ہاتھ اُٹھا دیے "اے خدا۔ ہمیں اس یہودی کی بیٹی کے دیدارِ حُسن سے بچا۔"

نوردین نے سر جھکا کے کہا "آمین۔ دراصل' میں اس کا بھی مقروض ہوں۔ ایک بار وہ ڈیٹ پر میرے ساتھ گئی۔ ڈنر کے بعد چلی گئی ایک گوریلے جیسے حبشی کے ساتھ۔ دوسری بار میں نے بدلہ لے لیا۔ اس کو ساتھ لے گیا اور ڈنر کے بعد خود فرار ہوگیا۔ بل اسے دینا پڑا تھا ستائیس پاؤنڈ۔"

محسن نے کہا "پتر نوردین۔ تمہارے بالوں کی انشورنس پالیسی ہمیں بہت مہنگی پڑ رہی ہے۔ تم چھوڑو ڈرامے کا چکر' گنجے ہو جاؤ۔"

میں نے کہا "ہاں۔ فرض کرو یہ ستائیس پاؤنڈ بھی ہم ادا کردیں تو تم پھر لیکن کا چکر چلا دو گے۔"

"نہیں جی اور کوئی لیکن نہیں...... دراصل اس یہودی کے سوا میں کسی کو جانتا بھی نہیں۔ جس کے پاس آپ کی ضرورت کا سامان ہے۔ ویسے تو لندن میں بہت ہوں گے مگر سب ضمانت مانگتے ہیں۔"

"اوکے۔ سینتیس پاؤنڈ میں ہم تمہیں یہودی سے اور یہودی کی بیٹی کے ہاتھوں قتل ہونے سے بچالیں گے لیکن......"

"مجھے دس پاؤنڈ نہیں دیں گے؟" نوردین منمنا کے بولا۔

"تمہیں بھی مل جائیں گے دس پاؤنڈ......" میں نے اس کے اطمینان کے لئے کہا "لیکن پھر تم ہمارے ساتھ رہو گے اور جیسا ہم کہیں گے وہی کرو گے۔ تمہارے والد ماجد کو کچھ معلوم نہیں ہونا چاہیے۔"

"ان کو ضرور پتا چل جائے گا۔ ہر بات معلوم ہو جاتی ہے ان کو۔ فرشتے ہیں یا جنات جو ان کو خبر کردیتے ہیں......" وہ مایوسی سے بولا۔

"ہم اب لوٹ کے گھر نہیں جائیں گے" میں نے کہا۔

"اباجی تو قتل کردیں گے مجھے۔ وہ سمجھیں گے کہ میں رات بھر غائب رہا۔"

میں نے کہا "ہم بتا دیں گے انہیں کہ تم ہمارے ساتھ تھے۔ ہم تمہارے ساتھ لندن گھومنے نکل گئے تھے۔ ایک بڑے بھائی کی طرح ہم نے تمہارے اخلاق و کردار کی نگرانی کی۔ کسی سے آنکھ تک نہیں لڑانے دی۔"

یہودی کی دُکان ایک میوزیم تھی۔ اس میں فرش سے چھت تک اور تمام دیواروں پر الماریوں میں اور جہاں بھی جگہ تھی کچھ نہ کچھ رکھا ہوا تھا یا لٹکا ہوا تھا۔ ہر قسم کے ساز' ہر رنگ کی وگ' ہر سائز کی داڑھی' مصنوعی ناک اور کان۔ چہرے کے ماسک جن سے آدمی جن' بھوت' شیطان کچھ بھی نظر آسکتا تھا۔ ہر طرح کے ڈریس' چودھویں صدی سے اکیسویں صدی تک استعمال ہونے والے' ولیم شیکسپیئر' جولیس سیزر سے ریڈ انڈین اور خلائی مخلوق تک کے ملبوسات۔ گدھے سے شیر تک کے منہ اور کھال مع دُم۔ قدیم تلواروں سے جدید ترین نقلی مشین گن تک۔ وہاں اتنا سامان تھا کہ اسٹیج ڈراما کیا اس سے ایک فلم یونٹ کی ضروریات پوری ہوسکتی تھیں۔ ایسی دکان کا ابھی اپنے پاکستان کے کسی شہر میں تصور نہیں تھا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ یہودی چیزیں گروی بھی رکھتا تھا یعنی یہ PAWN شاپ بھی تھی۔ وہ نوادرات بھی خرید لیتا تھا اور چوری کا مال بھی۔

بلاشبہ وہ بدصورت ہی نہیں بدنیت اور بدباطن بھی تھا۔ نوردین کو دیکھتے ہی وہ چلانے لگا "تم پھر آگئے دغا باز۔ بندر کی شکل والے۔"

نوردین نے مسکراتے ہوئے کہا "آج تمہارے حلق سے پوری آواز نہیں نکل رہی ہے۔ تمہیں گلے کا کینسر تو نہیں ہوگیا؟"

وہ اُچھلا "کینسر ہو تمہارے باپ کو۔ میں کہتا ہوں کیوں قتل ہونے آئے ہو یہاں۔ میرے پاس اصلی بندوق بھی ہے۔"

"اس کا کتنا کرایہ لیتے ہو تم؟" نوردین نے جیب میں سے پندرہ پاؤنڈ نکالے اور اس کی طرف پھینک دیے "یہ تمہارے واجبات..."

اس نے نوٹ گنے اور ایک رجسٹر کھول لیا "بال بال بچ گئے آج تم۔ ذرا میں حساب دیکھ لوں۔ یہ...... یہ تو کم ہیں۔ ایک پاؤنڈ دس شلنگ اور چھ پنس۔"

"یہ کس بات کے؟" نوردین نے کہا۔

"میں تمہارے گھر گیا تھا۔ تمہارے باپ سے قرضہ وصول کرنے۔ دس شلنگ اور چھ پنس کرائے میں خرچ ہوئے تھے۔"

"تم...... اباجی سے ملے تھے؟"

"ہاں اور اس کینہ پرور گوریلے نے مجھ پر حملہ کیا۔ پہلے گالیاں دیں کہ میں یہودی ہوں۔ میں نے اس کے آفس میں قدم رکھا تو اسے ناپاک کیا۔ جیسے میں انسان نہیں سؤر ہوں۔ اس نے مجھ پر چیزیں پھینک کے ماریں۔ ایک پیپر ویٹ میرے سر میں لگا۔ اس سے میرا سر تو بچ گیا مگر چشمہ ٹوٹ گیا۔ ایک پاؤنڈ میں بنا۔"

نوردین نے قہقہہ مارا "کیا تم نے اسے بتایا تھا؟"

"بتایا خاک۔ اس نے میری بات کب سُنی۔" یہودی غرا کے بولا۔

"پھر تو میں نے تمہارے واجبات ادا کرکے غلطی کی۔ یہ ایک پاؤنڈ دس شلنگ چھ پنس تم میرے باپ سے وصول کرسکتے ہو تو کرلینا۔ تم اپنے رسک پر گئے تھے نہ جاتے۔"

"میں تمہاری وجہ سے گیا تھا اور ہاں' نادیا!" اس نے اندر دیکھتے ہوئے آواز لگائی "آگیا وہ حرام زادہ جس کے ساتھ تمہیں جانے سے میں نے منع کیا تھا۔ تم صبح بڑی مشکل سے گھر آئی تھیں۔"

نادیہ اندر سے یوں نمودار ہوئی کہ میں اور محسن دم بخود رہ گئے۔ نوردین نے اسے حسین قرار دیا تھا۔ اس سے نوردین کے کم عقل ہونے کا ہی نہیں بلکہ اس کی نظر کے فتور کا بھی پتا چلتا تھا۔ وہ باقاعدہ بدصورت تھی۔ اس کی عمر بھی نوردین کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی اور وزن میں شاید اس سے دُگنی۔

اس نے نوردین کو دیکھتے ہی چیخ ماری "ہاں پاپا۔ یہی ہے وہ جس کی وجہ سے مجھے اپنے ٹاپس چھوڑ کے آنا پڑا تھا۔ صرف ستائیس پاؤنڈ کے لیے۔ اس کو مار ڈالو پاپا' تلوار سے یا بندوق سے۔"

"اگر یہ ستائیس پاؤنڈ ادا کردے تو..... کیا ضرورت ہے اتنی زحمت اُٹھانے کی" پاپا نے لالچی نظروں سے ان نوٹوں کو دیکھا جو نوردین بڑی رئیسانہ شان سے گن رہا تھا۔

"یہ لو ستائیس پاؤنڈ۔ ویسے مجھے یقین نہیں کہ نادیہ نے وہاں اپنے ٹاپس چھوڑے ہوں گے۔ میں جانتا ہوں اس ہوٹل کے منیجر کو۔ اسے موٹی بھینس جیسی لڑکیاں بہت مرغوب ہیں۔ آخر یہ صبح تک....."

پاپا نے کہا "اس نے دو پاؤنڈ ٹیکسی ڈرائیور کو بھی دیے تھے۔"

"اس کا باپ آج تک ٹیکسی میں نہیں گیا۔ یہ لفٹ لے کر آئی ہوگی یا پیدل۔ مجھے ٹھگنے کی کوشش مت کرو۔ میں کچھ اور سامان لینا چاہتا ہوں۔ بدمعاشی کروگے تو کہیں اور چلا جاؤں گا۔" نوردین بڑا کائیاں ثابت ہو رہا تھا۔

یہودی کا موڈ ایک دم بدل گیا "ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ کون ہیں تمہارے ساتھ؟"

"یہ بڑے مشہور رائٹر اور ڈائریکٹر ہیں۔ ڈرامے کے لیے نئے ایکٹر لینا چاہتے ہیں۔ ٹرائل کے لیے کچھ سامان چاہیے۔"

"اگر تم اس کے ہیرو کا پارٹ کرو تو نادیہ کا خیال رکھنا۔ اس کی بڑی اچھی جوڑی بنے گی تمہارے ساتھ....." وہ گنجے سر پر ہاتھ پھیر کے بولا۔

نادیہ نے آگے جھک کے کہا "پچھلی باتیں بھول جاؤ۔ میں پھر ڈنر پر جاسکتی ہوں تمہارے ساتھ۔"

احمق نوردین پھر پٹڑی سے اُترنے لگا "اچھا.....واقعی..... تم چلوگی!"

میں نے اسے ٹھوکا دیا "خبردار۔ تم پھر اس یہودی کی بیٹی کے جال میں پھنس رہے ہو۔ کیا ستائیس پاؤنڈ کا جرمانہ ادا کرکے بھی تمہیں عقل نہیں آئی؟"

محسن نے کہا "بس سامان لو اس سے اور چلو۔"

میں نے اپنے لیے ایک پادری کا لباس منتخب کیا۔ اس کے ساتھ لمبا کالا کوٹ اور اونچا پاناما ہیٹ۔ گول شیشوں اور نمبر والا چشمہ۔ لانگ بوٹ اور سیاہ پتلون پہن کے۔ ایک ہاتھ میں عصا اور دوسرے میں بائبل جیسی کتاب تھام کے میں کیتھولک چرچ کا فادر..... بن سکتا تھا۔ محسن ایک بدھ بھکشو بننا چاہتا تھا مگر یہ مشکل کام تھا۔ گیروے رنگ کی دھوتی تو دستیاب تھی جو بھکشو نیچے سے اوپر تک بس لپیٹ لیتے ہیں مگر وہ سر بھی منڈ کراتے ہیں اور ننگے پاؤں پھرتے ہیں۔ تاہم یہودی نے اس کی حوصلہ افزائی کی اور مدد بھی۔ یہودی کی بیٹی اس لحاظ سے میک اپ مین (یا وومن) تھی کہ اسے تھیٹر کے اداکار مدد کے لیے بلاتے تھے۔ وہ کرداروں کے مطابق ان کے چہرے [illegible] تھی۔ میں نے اسے فراخ دلی سے معقول معاوضے کی پیش کش کی۔ اس نے میرا اور محسن کا چہرہ اور حُلیہ بالکل بدل دیا۔

"تم تو بڑی کمال کی چیز ہو" میں نے خود کو آئینے میں دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ شرمانے لگی "میں دن رات آپ کے کام آسکتی ہوں۔"

نوردین نے گھڑے جیسا سر ہلایا "جیسے سب کے کام آتی ہے۔"

محسن نے کہا "اللہ اسے خدمتِ خلق کی جزائے خیر دے۔ ہم اسے افورڈ نہیں کرسکتے۔ معاشی طور پر بھی اور اخلاقی طور پر بھی۔"

یہودی کی بیٹی نے کہا "نوردین۔ تمہارا کیا رول ہے ڈرامے میں' آج تک کسی نے تمہیں اچھا رول نہیں دیا۔"

نوردین نے اپنی خودی کو بلند رکھا "بڑے لوگوں' فنکاروں' سائنس دانوں کو دنیا نے بڑی دیر میں پہچانا۔"

میں نے کہا "اکثر تو ان کی صلاحیت کو ان کی زندگی میں تسلیم ہی نہیں کیا گیا۔ ان کو مرنے کے بعد عزت ملی لیکن تم کو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں' تمہارے لیے ایک رول پاگل کا ہے' ایک فقیر کا۔"

"دونوں تم اپنی فطری صلاحیت اور عادات و اطوار کے باعث آسانی سے کرلوگے۔" محسن نے کہا۔

"ہرگز نہیں۔ اس سے پہلے ہی مجھے پولیس پکڑ لے گی۔" نوردین بولا۔

نوردین بالآخر سب سے آسان حُلیہ بنانے میں کامیاب ہوگیا۔ وہ اپنے اصلی لمبے بالوں کے ساتھ میچ کرنے والی داڑھی مونچھیں لگا کے مولانا بن گیا۔ اس نے پتلون پر اسی قسم کی چھالی جیسی ملائشیا وغیرہ میں پہنی جاتی ہے۔ یہ کچھ زنانہ ٹائپ چیز تھی۔ چارخانے والے کپڑے کو گول کرکے سی لیا جاتا ہے اوپر سے کمر پر ازاربند سے باندھا جاسکتا تھا مگر نوردین کی الاسٹک تھا۔ اس نے زیرو نمبر کے شیشوں والی عینک بھی لگالی۔

یہودی کی بیٹی نے کوئی لوشن لگا کے ہمارے چہروں کا رنگ بھی ہماری پسند کے مطابق کردیا۔ نوردین کو ہم نے سیاہ فام نظر آنے کے فوائد کا قائل کرلیا۔ محسن کا رنگ جاپانیوں جیسا زردی مائل ہوگیا۔ میرا گندمی رنگ اتنا صاف ہوگیا کہ میں گورا پادری نظر آنے لگا۔ یہودی کی بیٹی نے اپنی خدمات کا معاوضہ دس پاؤنڈ وصول کیا اور اس کے باپ نے دس پاؤنڈ کرایہ ایڈوانس وصول کرنے کے علاوہ پچاس پاؤنڈ بطور ضمانت رکھے۔

"مجھے کیا معلوم کہ تم لوٹ کر آؤ گے یا نہیں" اس نے کہا۔

نوردین بہت خفا ہوا "اب کیا فرق پڑتا ہے اگر ہم واپس نہ آئیں۔ جتنی مالیت کا یہ سامان ہے اس سے دس گُنا تم نے کرائے کی صورت میں وصول کرلیا ہوگا۔"

وہ بولا "میں اسے کافی نہیں سمجھتا۔ اتنا ہی اور کیوں نہ وصول کروں میں۔"

"اس کے علاوہ۔ کیا تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں۔"

"نہیں۔"

"تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو۔" نوردین چلّا کے بولا۔

"جانتا ہوں اسی لیے تو اعتبار نہیں کرسکتا۔ اب باہر نکل کے تم کیا فراڈ کرتے ہو۔ اس کا ذمّے دار بھی میں نہیں۔ نہ میں کوئی رسید دیتا ہوں اور نہ اس لباس میں میری دکان کی مہر ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس طرح بھیس بدل کے تم کہیں ڈاکا ڈالو یا قتل کردو کسی کو اور پھر پکڑے جاؤ تو میں تمہیں پہچاننے سے بھی انکار کردوں گا۔"

میں نے ستر پاؤنڈ دے کر یہ بحث ختم کی "فکر مت کرو۔ اگر ہم پکڑے گئے تو سچ صرف سچ اور سچ کے سوا کچھ نہیں بولیں گے" میں نے اپنے سینے پر صلیب بنائی "خداوند یسوع مسیح تم پر اور نادیہ پر رحم کرے۔"

ہم دکان سے باہر نکلے تو کچھ لوگوں نے ہمیں دلچسپی سے دیکھا۔ ہم تین مختلف مذاہب کی نمائندگی کر رہے تھے۔ عیسائی' بدھ اور مسلمان ہونے کے ساتھ ہمارا تعلق تین مختلف ممالک سے نظر آتا تھا۔ سڑک کے کنارے بینچ پر بیٹھے ہوئے ایک شرابی نے اٹھ کر ہیٹ اُتارا اور سر جھکا کے ہمیں تعظیم دی "تم سب میرے جیسے گناہ گاروں کے مقدس باپ ہو۔ پھر بھی میں لامذہب ہوں۔"

نوردین بولا "کیا ڈراما شروع ہوگیا ہے؟"

میں نے کہا "تمہارے خیال میں یہ سب کیا ہے جو ہم کر رہے ہیں؟"

وہ کچھ مایوس ہوا "اس میں تو نہ ایکشن ہے نہ سسپنس۔"

میں نے کہا "سب آئے گا بیٹے۔ تھوڑا سا انتظار کرو۔"

"اتنی مار دھاڑ ہوگی۔ دناد ن گولیاں چلیں گی اور خوب بھاگ دوڑ ہوگی۔ اگر تمہیں گولی لگ جائے اور تم ہلاک ہو جاؤ تو بُرا مت ماننا" محسن نے کہا۔

وہ گھبرا کے بولا "کون چلائے گا مجھ پر گولیاں؟"

"ابھی سے کیا کہہ سکتے ہیں۔ ممکن ہے محافظ چلائیں یا پولیس چلائے اور کیا معلوم وہ ریوالور استعمال کریں گے یا مشین گن۔"

نوردین بولا "تم مذاق کر رہے ہو۔ مجھے اتنا تو بتادو کہ آخر ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

میں نے کہا "تم اسے تاریخ کا سب سے سنگین مذاق کہہ سکتے ہو نوردین۔ کوہ نور ہیرا ہماری ملکیت تھا۔ اسے بہادر شاہ ظفر سے چھین کر..."

"یہ بہادر شاہ ظفر کون تھا؟ کوئی جیولر؟"

میں نے کہا "ایسا سوال تم نے اپنے والد سے کیا ہوتا تو مناسب جواب وہ تم کو بزبانِ پاپوش دیتے کہ خبیث' حرام الدہر' کھوتے دے پتر' تو آخری مغل تاجدار کو نہیں جانتا۔"

"تم کیوں گالیاں دے رہے ہو مجھے؟"

میں نے کہا "میں بتا رہا تھا کہ تمہارے اباجی [illegible]۔ مجھے کیا ضرورت ہے گالیاں دینے کی۔"

"اچھا کوہ نور ہیرا مسٹر بہادر شاہ صفر سے کس نے چھینا تھا؟"

"صفر نہیں' ظفر۔ بے شک اسے انگریزوں نے بعد میں صفر کردیا تھا مگر ہم اس کا نام نہیں بدل سکتے۔ انگریز اس سے کوہِ نور ہیرا چھین لائے تھے اور اپنی ملکہ وکٹوریہ کے تاج میں لگادیا تھا۔ وہ تاج اب ملکہ الزبتھ کے سر پر ہے۔ ہم اسے واپس حاصل کرنے جا رہے ہیں۔"

نوردین نے مجھے بے یقینی سے دیکھا "وہ کیسے؟"

"ہم بکنگھم پیلس میں جا کے پہلے شرافت سے کہیں گے کہ ہمارا تاریخی ورثہ ہمیں لوٹا دو۔ ہم واپس چلے جائیں گے۔ کوئن الزبتھ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ دنیا کی سب سے زیادہ دولت مند خاتون ہے اور اس کے پاس ہیرے جواہرات کا انبار ہے جو اسے بے حد عزیز ہے۔ ظاہر ہے کوئی عورت اپنی خوشی سے ایک چھلا بھی نہیں دیتی۔ وہ انکار کرے گی پھر ہمیں زورِ بازوئے مسلم سے کوہِ نور ہیرا حاصل کرنا پڑے گا۔"

محسن نے کہا "تاج اس کے سر پر ہے۔ ہم تاج لے جائیں گے اور اس نے مزاحمت کی تو سر کاٹ کے لے جائیں گے۔ تاج سمیت' جیسے بہادر شاہ ظفر کو اس کے بیٹے کا سر کاٹ کے اور طشت میں رکھ کے پیش کیا تھا انہی انگریزوں نے۔"

نوردین کا رنگ فق ہوگیا "تم پاگل ہو۔ تمہیں کوئی بکنگھم پیلس کے نزدیک نہیں پھٹکنے دے گا۔ تم اس کی ایک اینٹ نہیں لے جاسکتے۔"

"پھر ہم اس کی اینٹ سے اینٹ بجا کے لوٹ آئیں گے" میں نے کہا۔

محسن نے کہا "پتر نوردین۔ لندن میں ہر شخص کے پاس اپنی گاڑی ہوتی ہے۔"

"ہر معزز شخص کے پاس" میں نے تصحیح کی۔

"تم پیدا یہاں ہوئے پھر بھی پیدل ہو۔ تمہاری وجہ سے ہم

پیدل ہیں۔"

نوردین دُکھی ہوگیا "گاڑی کو اباجی ہاتھ نہیں لگانے دیتے۔ کسی دن میں اسے آگ لگادوں گا۔ میری بہت بے عزتی خراب ہوتی ہے ہر جگہ۔ کسی اخبار کا چیف رپورٹر بس یا ٹرام میں سفر نہیں کرتا۔"

"تم گاڑی صرف آنے جانے کے لیے استعمال نہیں کرتے۔ اسے اپنی عاشقانہ مہم جوئی اور قابلِ اعتراض حرکات و سکنات کا ذریعہ بناتے ہو۔ ان کی پاکباز گاڑی میں شراب اور لحمِ خنزیر استعمال کرنے والی کافر لڑکیوں کو بٹھاتے ہو۔"

"بٹھاؤں نہ تو کیا کھڑا رکھوں؟" نوردین بولا "اور گرل فرینڈز کو ساتھ لے کر نہ پھروں تو کیا اباجی جیسے داڑھی والے مولویوں کو لے کر پھروں؟"

"تم اپنی گاڑی کیوں نہیں خرید لیتے۔ اپنی غیر شرعی اور قبیح افعال اور مردانہ مصروفیات کے لیے" محسن بولا۔

"خرید لوں گا بہت جلد۔ اصل مسئلہ ہوگا اسے اپنے پاس رکھنے کا۔ وہ تو میری بیوی کو بھی اپنے حرم میں داخل کرلیں گے۔"

"کیا بکتے ہو، تمہیں شرم آنی چاہیے۔"

"میرا مطلب تھا اپنی بہو بنا کے اسے پردے میں بٹھادیں گے۔ گاڑی بھی مجھے ان کی اجازت سے استعمال کے لیے ملے گی اور بیوی بھی۔ میں کتنا بدنصیب بیٹا ہوں" اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "سنا ہے پاکستان میں لڑکے گھر سے بھاگ جاتے ہیں۔ یہاں تو اگلے دن پولیس مجھے پکڑ لے گی۔"

"کیوں۔ تم بالغ نہیں ہوئے ابھی تک؟"

اس نے افسوس سے سرہلایا "میں تو ہوگیا، اباجی بھی عاقل و بالغ ہوجاتے تو اچھا تھا۔"

میں نے کہا "ہم تمہارے نیک خیالات سے حاجی صاحب کو ضرور آگاہ کریں گے۔ ممکن ہے وہ سدھر جائیں۔"

یہودی کی دکان سے اس اسپتال تک زیادہ فاصلہ نہیں تھا جہاں جارج کو جیل سے علاج کے لیے لایا گیا تھا۔ گزشتہ شب اس نے ایک مجرم کے فرار میں مدد دی اور قانون کے محافظوں پر حملہ کیا۔ اس طرح جارج نے دو سنگین جرائم کا ارتکاب کیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اب اس سے تفتیش ہوگی اور اس سے پوچھا جائے گا کہ وقار یوسف کون تھا، کہاں سے آیا تھا اور تم سے کیوں ملا تھا۔ وہ کہاں چھپا ہوا ہے اور اس کا اصل نام کیا ہے۔ پاکستان کا معاملہ ہوتا تو پولیس ایک رات میں سب اُگلوا لیتی مگر جارج سے تشدد کے ذریعے کچھ قبول کرانے کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ قیدی ہونے کے باوجود وہ اپنے قانونی حقوق رکھتا تھا اور یہ اس کا بنیادی حق تھا کہ اپنے وکیل سے مشورہ کیے بغیر کوئی بیان نہ دے۔ اس کا وکیل الفریڈ تھا جس کے بارے میں مجھے کچھ علم نہیں تھا۔ مگر اس نے دُہرے قتل کے کیس میں جارج کا دفاع کیا تھا اور اس کی خدمات بھی کالوں کے حقوق کی کسی تنظیم نے حاصل کی تھیں۔ گورا ہونے کے باوجود وہ جارج کا وکیل بنا تھا تو اس کی دو معقول وجوہات سمجھ میں آتی تھیں۔ ایک یہ کہ وہ اچھی شہرت کا حامل تھا اور دوسری یہ کہ متعصب نہیں تھا ورنہ کالے اس پر اعتبار نہ کرتے۔

اسپتال پہنچ کے نوردین کے دل کو کچھ قرار آیا "جارج سے ملنے کے لیے یہ سب اہتمام کیا ہے تم نے۔ وہ کوہ نور ہیرے والی کہانی ایسے ہی مجھے ڈرانے کے لیے سنائی تھی۔ بہادر شاہ ظفر..."

"تم نے پھر اسے صفر کہا تو میں تم کو زیرو کردوں گا" محسن بولا۔

اسپتال میں حالات معمول کے مطابق تھے۔ کسی قسم کی افراتفری یا غیر معمولی حفاظتی انتظامات اور پکڑ دھکڑ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہمارے ملک میں اس قسم کا سنگین واقعہ پیش آتا تو پولیس کی ساری فورس اسپتال پر چڑھائی کردیتی اور ہر طرف سے اسپتال کو محاصرے میں لے کر شدید انتقامی جذبات کے ساتھ تفتیشی عمل کا آغاز ایسے ہوتا کہ سب کو عبرت ہو۔ پولیس جسے چاہے قصور بتائے بنا پکڑ لے۔ وارنٹ کے بغیر گرفتار کرلے۔ کوئی بھی الزام کسی پر بھی عائد کردے اور پھر اعترافِ جرم کے لیے تشدد چاہے کرے مگر عام آدمی مشتعل ہوکے پولیس کو گالی دے یا اس کے ہاتھ ماردے تو یہ جرم ناقابلِ معافی۔ اب تک اسپتال میں سب کی شامت آجاتی۔ کیا نرسیں اور کیا ڈاکٹر۔ مریض اور ان کی عیادت کرنے والے اور علاج کے لیے آنے والے سب مشتبہ ٹھہرتے اور سب کو پوچھ گچھ کے بہانے پریشان اور ہراساں کرنے کا سلسلہ چل رہا ہوتا مگر یہاں اسپتال محفوظ و مامون تھے اور عبادت گاہوں کی طرح ان کے تقدس کو پامال نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس واقعے کی انکوائری بھی قاعدے قانون کے مطابق جارج کے کمرے تک محدود رہی ہوگی اور رسمی کارروائی کے بعد کیس تفتیش کے لیے متعلقہ اداروں کے سپرد کردیا گیا ہوگا۔

باہر دروازے پر مجھے پولیس کا ایک سارجنٹ نظر آیا جو پہلے نہیں تھا۔ یہ اضافی بندوبست، خصوصی انتظام کا حصہ سمجھا جاسکتا تھا۔ سارجنٹ صرف اندر سے باہر جانے والوں کو دیکھ رہا تھا اور اس کی ڈیوٹی بھی اتنی ہی تھی کہ جارج کو اسپتال سے فرار نہ ہونے دے۔ بفرضِ محال وہ اپنے کمرے کے باہر موجود پولیس گارڈ کو چکمہ دے کر نکل آنے میں کامیاب ہوجائے تو مین گیٹ پر پکڑا جائے۔ ممکن ہے وہ آنے والوں پر بھی نظر رکھے ہوئے ہو مگر وہ کسی سے تعرض نہیں کررہا تھا۔ مریض اور دوسرے لوگ اس کی موجودگی سے بے نیاز آجارہے تھے۔ ہم تین کو بھی اس نے بس ایک نظر دیکھا اور پھر دوسری طرف متوجہ ہوگیا حالانکہ ہم دیکھنے میں مختلف مذاہب، نسلوں اور قوموں کے نمائندے تھے جو عام طور پر ایک ساتھ نظر نہیں آتے۔

نوردین نے ہم کو ویٹنگ روم میں چھوڑ دیا۔ ایک تو وہ حلیے سے ہی مسلمان لگتا تھا اور انگریز یا یہودی اگر فی سبیل اللہ کسی مذہب کی بنیاد پر عناد رکھتے ہیں تو وہ مسلمان ہیں۔ پھر وہ سیاہ فام ہوگیا تھا۔ اس سے کسی حماقت کی توقع بھی کی جاسکتی تھی جو ہم سب کی پوزیشن خراب کردے۔ میں نے اور محسن نے اس برآمدے کی طرف مڑتے ہی جس کے آخر میں جارج کا کمرا تھا پہلے دروازے پر دستک دی اور اجازت ملنے پر اندر چلے گئے۔ اس کمرے میں ایک بہت موٹی عورت اکیلی لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے ہمیں دیکھ کر اُٹھنے کی کوشش کی مگر میں نے اسے اشارے سے لیٹے رہنے کو کہا۔

اس نے میرے ہاتھ پکڑ کے کہا "ہولی فادر۔ میرے لیے دعا کرو کہ میں اس معذور زندگی کے جنجال سے چھوٹ جاؤں۔"

میں نے لہجہ بنا کے کہا "زندگی ہر حال میں خدا کی عطا کردہ نعمت ہے۔ بہرحال ہم تمہارے لیے اجتماعی دعا کریں گے۔"

"اجتماعی دعا؟" اس نے حیرانی سے کہا۔

"ہاں۔ یہاں تمام مذاہب کا روحانی اجتماع ہورہا ہے۔ آج ہم سارے اسپتالوں میں جائیں گے۔ ہر مذہب کے پیروکار اپنے عقیدے کے مطابق مریضوں کی صحت یابی کے لیے دعا کریں گے۔ اللہ تو سب کی سُنتا ہے۔ دعا کسی بھی زبان میں مانگی جائے اور کوئی بھی مانگے۔"

میں نے اس کے ایک طرف اور محسن نے دوسری طرف کھڑے ہوکر دعا کی۔ میرے الفاظ بڑھیا کی سمجھ میں آرہے تھے۔ محسن بہ آوازِ بلند سورہ فاتحہ پڑھ رہا تھا۔ پھر اس نے بھی دعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے اور ہم باہر نکل آئے۔ میں نے دوسرے دروازے پر ناک کرتے ہوئے کن انکھیوں سے دیکھا۔ جارج کے کمرے کے باہر موجود سارجنٹ ہمیں غور سے دیکھ رہا تھا۔ دوسرے کمرے میں ایک خرداغ انگریز تھا۔ اس نے بادلِ ناخواستہ مجھے دعا کی اجازت دی مگر محسن کو کمرے سے نکل جانے کا حکم دیا۔ پھر میں نے اسے اپنی اجتماعی دعا کی دلیل سے قائل کرلیا اور اس نے کہا "او کے۔ جو تمہارا جی چاہے کرو" اور سر پر کمبل تان کے سوگیا۔

تیسرے کمرے میں ایک خبطی قسم کا فلاسفر تھا جو ہم سے روحانیات کے فلسفے، اجتماعی دعا اور عقائد پر بحث کرنا چاہتا تھا۔ ہم نے بڑی مشکل سے جان چھڑائی۔ وہ لادین شخص تھا اور ان سب چیزوں کو ڈھکوسلے قرار دیتا تھا۔ "خیر یہ تمہارا پیشہ ہے اور تمہیں اپنی پیشہ ورانہ سرگرمیاں جاری رکھنے کا قانونی و آئینی حق حاصل ہے۔ اگر تمہیں دعا کرکے تسکین ملتی ہے تو مجھے بھی کوئی تکلیف نہیں۔ بس یہاں آکے کوئی شور نہ کرے جس سے مجھے ذہنی اذیت ہو۔"

چوتھے کمرے میں اس کے برعکس کٹر مذہب پرست مریض تھے جنہوں نے بڑی مشکل سے ہماری جان چھوڑی۔ وہ چاہتا تھا کہ ہم اس کے لیے کم سے کم آدھا پون گھنٹا تو دعا کریں۔ اس نے محسن کی دعا کا مطلب بھی پوچھا اور اس کے ہاتھ بھی چومے۔ ہر کمرے میں ہمارا یہ تجربہ مختلف اور دلچسپ رہا لیکن ہم نے جس مقصد کے حصول کی خاطر یہ ڈراما کیا تھا وہ کامیاب رہا۔

جب ہم جارج کے کمرے کے دروازے پر پہنچے تو سارجنٹ نے کہا "ہولی فادر۔ یہاں ایک قیدی ہے۔"

میں نے کہا "قیدی! کیا یہ اسپتال نہیں ہے؟"

"اسپتال میں قیدی مریض لائے جاتے ہیں" وہ بولا۔

"اوہ۔ انہیں دعا کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔" میں نے کہا "ان کے جرائم کی زندگی اور ان کے گناہوں کے لیے۔ زیادہ قابلِ رحم ہیں ایسے لوگ آفیسر جو خدا سے بھی دور ہیں اور اس کے بندوں سے بھی۔ اللہ تم پر رحم کرے اور تمہارے ساتھ کبھی ایسا نہ ہو۔ اللہ رحم کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔"

اس نے سرہلا کے کہا "یس فادر لیکن آپ کچھ دیر ٹھہر جائیں۔ اس وقت قیدی کے پاس اس کا وکیل بیٹھا ہوا ہے۔"

"ہم دنیاوی قانون سے سروکار نہیں رکھتے۔ ہم آخرت کے وکیل ہیں" میں نے فلسفیانہ تدبر کے ساتھ کہا "ہمارے پاس وقت کم ہے اور دیکھا جائے تو ہم سب کے پاس وقت کم ہے۔ بس ہم سمجھتے ہیں کہ ابھی بہت وقت پڑا ہے۔ ہم نجات کی فکر نہیں کرتے۔"

اس نے سوچ کے کہا "میں وکیل سے پوچھ لیتا ہوں۔"

اس سے پہلے کہ وہ اندر جاتا۔ دروازہ کھلا اور وکیل باہر آگیا۔ وہ سفید فام وکیل ساٹھ سال کے قریب تھا مگر اس کی صحت اچھی تھی۔ اس کی شکل بھی مجھے بُری نہیں لگی۔ شاید اس لیے کہ اس پر نفرت تعصب یا غرور کے جذبات کا کمینہ پن نہیں پایا جاتا تھا۔

اس نے سارجنٹ سے کہا "تھینک یو آفیسر۔ لیکن میں تم کو پھر جارج کے قانونی حقوق یاد دلادوں۔ اس کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی دوبارہ ہوگی تو میں ہرجانے کا سوٹ فائل کردوں گا۔ ابھی تو میرے مؤکل نے مجھے روک دیا ہے۔"

"یس سر!" سارجنٹ نے عادتاً کہا "میں کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کرتا۔ دوسروں کی ذمّے داری نہیں لوں گا۔"

وکیل نے بُرا سا منہ بنایا "تم سب ایک جیسی بات کرتے ہو۔ یہ کون مسخرے ہیں؟" اس نے مجھے اور محسن کو دیکھا۔

میں نے کہا "ہم بُرا نہیں مانتے، تم کچھ بھی کہہ سکتے ہو۔"

"یہ جارج کے لیے دعا کرنے آئے ہیں۔"

"کیا جارج نے کہا تھا؟" وکیل چونکا۔

"ہم سب کے لیے دعا کرتے ہیں" میں نے کہا "ہر اسپتال میں، قید خانوں میں اور پاگل خانوں میں۔ جہاں بھی انسان مصیبت اور دکھ میں ہو۔ ہم ان کے لیے خدا کی رحمت طلب کرتے ہیں۔"

"یہ کام وہ خود بھی کرسکتے ہیں" وکیل پُر تمسخر لہجے میں بولا۔

"مگر کرتے نہیں" میں نے کہا "ہم یہاں روحانیت کے عالمی اجتماع میں شریک ہیں جس میں ساری دنیا سے ہر مذہب کے پیروکار آتے ہیں اور ہم اپنے اپنے عقیدے کے مطابق دعا مانگتے ہیں۔ مقصد ایک ہوتا ہے۔ الفاظ یا طریقہ الگ ہونے سے خدا کو فرق نہیں پڑتا۔"

"جس کے لیے تم دعا مانگتے ہو اسے کیا فرق پڑتا ہے۔" وہ بولا "کیا کیا ڈھونگ رچاتے ہیں لوگ مذہب کے نام پر۔ مذہب بھی ہمیشہ

ہو گیا ہے۔"
میں نے اس کی اشتعال انگیزی کو نظرانداز کردینا مناسب سمجھا اور جب وہ چلا گیا تو سارجنٹ سے کہا "خداوند یسوع مسیح فرماتا ہے 'اے خدا! ان کو معاف کردے کیونکہ یہ نہیں جانتے یہ کیا کررہے ہیں؟'" اور اپنے سینے پر صلیب بنا کے کمرے میں داخل ہو گیا۔
جارج کو دیکھ کے مجھے شاک لگا۔ اس کے سر پر سفید پٹی تھی اور آنکھوں کے نیچے ایک نیل بھی نظر آرہا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ میرے جانے کے بعد پولیس نے اس کی گوشمالی کی تھی۔ ڈاکٹروں کے آنے تک اور دوسرے لوگوں کے پہنچنے تک ان کے لیے چند منٹ بھی بہت تھے۔ انہوں نے اپنا غصہ ضرور اُتارا ہوگا۔
جارج نے حیرانی سے مجھے اور محسن کو دیکھا "کون ہو تم! کیا چاہتے ہو۔ اندر کیسے آئے؟"
میں نے اسے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے خاموش کیا "ڈرو نہیں جارج، ہم تمہارے لیے دعا کرنے آئے ہیں۔"
شاید میری آواز نے اسے شش و پنج میں ڈال دیا "سارجنٹ نے تم کو کیسے اندر آنے دیا؟"
"ہم بے ضرر لوگ ہیں جارج۔ ابھی الفریڈ آیا تھا؟"
جارج کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں "تم...؟"
"نام مت لینا میرا۔" میں نے سرگوشی میں کہا "سب ٹھیک ہے نا؟"
"ہاں۔ سب ٹھیک ہے۔ میں نے پولیس کو اپنا بیان لکھوا دیا ہے۔ ویسے ہی جیسے تم چاہتے تھے، وکیل کو بھی سمجھا دیا ہے۔"
"ویری گڈ! اب طوطی صاحب تمہاری طرف سے کیس کریں گے۔ الفریڈ سے کہنا ان سے مل لے۔ ڈاکٹر شیلی مرڈر کیس کو تمہارے کیس سے الگ نہیں سمجھا جاسکتا۔ جب دلاور کو سزا ہوگی تو تمہاری سزا ختم ہوجائے گی اور اس کو صرف تمہاری گواہی پھانسی کے تختے تک پہنچادے گی۔ طوطی صاحب تمہاری طرف سے درخواست دائر کریں گے کہ تمہیں لاہور بھیجا جائے۔ تمہیں لاہور بھیجنے کے لیے ہم وہاں کی عدالت سے احکامات لے کر یہاں بھجوادیں گے۔ ہماری وزارتِ قانون تمہاری وزارتِ انصاف سے رابطہ کرے گی اور جیسا کہ میں نے بتایا تھا۔ طوطی صاحب اس معاملے کو اخبارات میں خوب اُچھالیں گے۔ اس کے لیے جتنا پیسہ بھی خرچ ہوگا ہم دیں گے۔"
"تھینک یو... تم نے میری زندگی بچانے کے لیے بہت محنت کی اور بہت خطرہ مول لیا۔"
"یہ ہم سب کے باہمی مفاد میں تھا" میں نے کہا۔
"اچھا اب تم جاؤ۔" وہ بولا "پولیس نے یہاں کچھ خصوصی انتظامات کیے ہیں۔ سادہ کپڑوں میں سراغ رساں موجود ہیں ہر جگہ اور میرا خیال ہے کہ انہوں نے یہاں خفیہ مائک بھی لگائے تھے۔"
"خفیہ مائک" میں نے چلا کے کہا "تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا تھا؟"
"تم نے تو ہمیں مروادیا۔" محسن بولا "ہماری یہ گفتگو ریکارڈ کرلی گئی ہوگی اور کیا پتا باہر نکلتے ہی ہم دھر لیے جائیں۔"
میں نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر وہ باہر سے مقفل تھا۔ میں نے سارجنٹ کی آواز سُنی۔ وہ کسی سے فون پر بات کررہا تھا "کون سر...؟ نہیں سر... کوئی نہیں... ایک پادری اور ایک بدھ مذہب کا راہب اندر گئے ہیں۔ نو سر... وہ ہر کمرے میں جاتے کرتے ہیں... یس سر۔ میں نے دروازہ تو بند کردیا ہے لیکن سر... وہ عالمی مذاہب کے روحانی اجتماع میں شامل ہیں... سر...؟"
میں نے محسن کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا اور ہم باتھ روم میں گھس گئے۔ یہ پانچ فٹ، چھ فٹ کا باتھ روم تھا اور درمیانی دیوار اسے دوسرے باتھ روم سے جدا کرتی تھی جو ساتھ والے کمرے سے ملحق تھا۔ اوپر چھت کے ساتھ ان دونوں کے درمیان روشن دان سا تھا جو تقریباً ایک فٹ چوڑا اور دو فٹ لمبا تھا۔ اس کے مقابل والا روشن دان اس باتھ روم میں تھا جس میں ہم موجود تھے اور اس میں ہوا باہر پھینکنے والا پنکھا لگا ہوا تھا۔ اس طرح دونوں باتھ رومز کی ہوا باہر نکلتی رہتی تھی۔
میں نے محسن سے کہا "مہاتما بدھ کے چیلے۔ یہ روشندان ہماری امید کا واحد سہارا ہے۔ اگر ہم اس میں سے گزر گئے تو شاید..."
محسن نے کہا "باتیں کم کام زیادہ۔ چل پہلے تو" وہ دیوار سے لگ کے کھڑا ہوگیا اور پھر رکوع کی حالت میں چلا گیا۔
میں اس کی کمر پر پاؤں رکھ کے روشندان تک پہنچا اور اپنا سر اس میں سے گزار کے دوسری طرف لٹک گیا۔ میرے پنجوں کے اوپر پنڈلی کے سب سے نچلے حصے کو محسن کے ہاتھوں نے پکڑ لیا تھا۔ میں نے اپنا دھڑ روشن دان میں سے گزارا تو اپنے ہاتھ نیچے کی طرف پھیلادیے۔ میرے جسم کا سارا بوجھ آگے چلا گیا اور میں دوسرے باتھ روم میں لٹک گیا۔ محسن کسی زنجیر کی دوسری کڑی کی طرح مجھ سے منسلک تھا۔ میں نے اچانک ایک جھٹکا محسوس کیا۔ دوسری طرف کے باتھ روم میں محسن اُچھلا تھا۔ میں ایک دم نیچے گیا اور میرے ہاتھ فرش سے جا لگے۔
میں نے سر گھما کے دیکھا۔ اوپر روشندان سے میرے پاؤں باہر آگئے تھے اور ان کے ساتھ ہی محسن کے ہاتھ نظر آرہے تھے۔ فرش پر ہاتھ جما کے میں نے ٹانگوں کا زور لگایا تو محسن اوپر اٹھا۔ میں نے اس کے سر کو روشندان میں سے باہر آتے دیکھا۔ میں آگے بڑھا۔ وہ میرے پاؤں چھوڑتا تو واپس نیچے جاگرتا۔ میں پوری طاقت سے اس کو کھینچتا رہا یہاں تک کہ اس کا اوپری دھڑ روشندان میں سے نکل آیا۔ اب محسن نے میرے پاؤں چھوڑ دیے۔ وہ آدھا ایک طرف تھا اور آدھا دوسری طرف۔ میں پیروں پر کھڑے ہوتے ہی اپنے ہاتھ اوپر بڑھائے اور اس کے
میرے ہاتھ پکڑلیے۔ اب اسے کھینچنا آسان تھا۔ میرے لئے اپنے لبے ہیٹ کو اور کوٹ کو سنبھالنا زیادہ مشکل کام تھا۔ ہیٹ تو پہلے ہی فرش پر گر گیا تھا۔ کوٹ میں نے بعد میں اتار پھینکا۔ میرے مقابلے میں محسن کا لباس سادہ تھا۔ تاہم اس روشن دان میں سے گزرتے ہوئے محسن کی لنگی پھٹ گئی۔ اس کے جسم پر بھی معمولی خراشیں آئیں۔
باتھ روم میں قدم رکھتے ہی محسن نے دروازے سے کان لگا کے سُنا۔ اندر وہی مریض ہوتا جس نے گزشتہ رات اسپتال کو اصطبل قرار دیا تھا اور سوال کیا تھا کہ کیا میں گدھا ہوں... تو باتھ روم میں ہمارے لینڈ کرنے کی آوازوں پر متوجہ ہوکے فوراً اندر آجاتا مگر کمرے میں خاموشی تھی۔ میں نے باتھ روم کا دروازہ کھول کے دیکھا اور ایک لمحے کے لیے اپنی جگہ پر ساکت ہوگیا۔
اس کمرے میں بیڈ پر کوئی لاش لیٹی ہوئی تھی۔ یہ فرض کرنا مشکل تھا کہ کوئی سر سے پیر تک چادر اوڑھے سورہا ہے۔ سونے والا اتنا سیدھا تھا، ساکت اور منجمد نظر نہیں آتا۔ وہ جو بھی تھا مرچکا تھا اور بیڈ پر اس کی لاش غالباً لواحقین کا انتظار کررہی تھی کہ وہ آئیں اور اسے سپردِ خاک کرنے کے لیے لے جائیں۔
میں نے محسن سے کہا "یار... یہ زندہ تو نہیں ہوسکتا۔"
محسن نے نفی میں سرہلایا "شاید اسے مرے زیادہ دیر نہیں ہوئی ورنہ اس کو مُردہ خانے میں شفٹ کردیا جاتا۔"
اس وقت ہم دونوں کے ذہن میں ایک ہی خیال آیا۔ ہم اس مہلت سے فائدہ اٹھاسکتے تھے۔ محسن نے پہلے اپنے پیچھے باتھ روم کا دروازہ لاک کیا۔ پھر باہر والے دروازے کو۔ چند منٹ میں ہم نے لاش کے کپڑے اُتارے۔ محسن نے اسے میرے کپڑے پہنائے اور میں نے مرنے والے کے کپڑے پہن لیے۔ پھر میں اس کی جگہ بیڈ پر لیٹ گیا اور محسن نے لاش کو باتھ روم میں پہنچادیا۔ یہ سب انتہائی ناپسندیدہ اور غیرانسانی تھا مگر اس کے لیے ایک لاش سے معذرت کرنا بھی بے سود تھا۔ معافی ایک انسان سے مانگی جاسکتی تھی۔ اس لاش کو یہ دنیا چھوڑ دینے کے بعد کسی بات سے فرق نہیں پڑتا تھا کہ اسے کیسے اٹھایا جاتا ہے اور کیسے جلایا جاتا ہے یا دفن کیا جاتا ہے۔ ہمیں اپنی زندگی کے لیے یہ جدوجہد ہر صورت جاری رکھنی تھی۔
وقت کا ہر لمحہ ہمارے اعصاب پر سوار ہوکے گزر رہا تھا۔ ساتھ والے کمرے میں کسی بھی وقت ہنگامہ برپا ہوسکتا تھا۔ سارجنٹ یہ فرض نہیں کرسکتا تھا کہ پادری اور بھکشو بھوت یا چھلاوا تھے جو دیوار میں سے گزر گئے یا غائب ہوگئے۔ اس کا دھیان باتھ روم کی طرف جانا لازمی تھا اور درمیانی خلا کو دیکھتے ہی وہ سمجھ جاتا کہ ہم دوسرے کمرے میں پہنچ چکے ہیں۔
محسن پر سخت بدحواسی طاری تھی۔ "یار۔ اب کیا ہوگا۔ کیا بات ہے کوئی تیری لاش... میرا مطلب ہے لاش لینے نہیں آیا۔"
میں نے کہا "لاوارث لوگ بھی تو اسپتال میں مرجاتے ہیں اور کیا پتا ابھی تک وارثوں کو اطلاع ہی نہ ملی ہو۔ یا اطلاع ملی ہو تو لواحقین کو فرصت نہ ملی ہو۔"
"یہ تو بڑی گڑبڑ ہے" محسن بولا "لواحقین نہ ہوئے تو تجھے سیدھا مُردہ خانے لے جائیں گے اور یہاں کے مُردہ خانے بھی کولڈ اسٹوریج ہوتے ہیں۔"
"میں نے فلموں میں دیکھا ہے۔ دیوار میں خانے سے بنے ہوتے ہیں۔ ہر خانے میں ایک لاش ڈال دیتے ہیں۔ وہ خانہ نہیں برف خانہ ہوتا ہے۔"
"اوہو ہو... بڑی سردی ہوگی اندر۔ تو جم جائے گا۔"
میں نے کہا "پاگل ہوا ہے مجھے فریز کرنے سے پہلے شناخت کی کارروائی ہوگی ایسے ہی ٹیگ نہیں لگادیا جائے گا۔ مُردہ خانے پہنچنے سے پہلے ہی مُردہ بھاگ جائے گا تو فکر مت کر۔"
"کیا مُردے کو اسپتال کے اندر کے راستے معلوم ہیں؟ فرار ہونا اتنا آسان نہیں ہوگا میرے پاکستانی بھائی۔ قدم قدم پر سادے کپڑوں والے پولیس مین موجود ہیں۔ جارج نے بتایا تھا۔"
"مجھے تو نظر نہیں آتے۔ یہ جارج کا وہم یا خوف بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن بہتر ہے کہ آپ میرے لیے نہیں اپنے لیے پریشان ہوں۔ آپ یہاں سے کیسے باہر نکلیں گے بھکشو مہاراج۔ آپ تو فوراً دھر لیے جائیں گے۔"
"یہ بھی سچ کہا آپ نے۔ پھر میں کیا کروں؟"
"میرا خیال ہے تو مرجا" میں نے چادر ہٹا کے اٹھتے ہوئے کہا۔
"بات تو ایک ہی ہے۔" محسن نے کہا۔
"ایک بات نہیں ہے" میں نے کہا "میں اپنا راستہ بناسکتا ہوں۔ دو چار میری راہ میں حائل ہوں تو ان کو لٹا کے بھی نکل سکتا ہوں۔"
محسن میری جگہ لیٹ گیا "یار یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ مجھے سیدھا کسی ایمبولینس میں لے جائیں۔ لواحقین پہنچ چکے ہوں۔ یا پہنچنے والے ہوں۔"
"ایسی صورت میں ہمارا کام آسان ہوجائے گا۔" میں نے کہا اور کمرے کا لاک اندر سے کھول کے دیوار کے ساتھ لگ گیا۔
"آخر مرحوم کو عارضہ کیا لاحق تھا؟" محسن بولا۔
"وہی... دل کا روگ ہوگا" میں نے کہا "رات کو تو بھلا چنگا تھا لیکن جیسے وہ چلا رہا تھا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسے بلڈ پریشر کا مرض تھا۔"
"مریضِ دل کے ساتھ عموماً کوئی تیماردار بھی ہوتا ہے۔"
میں نے کہا "اپنے پاکستان میں، یہاں اتنی فرصت کسے..."
میری بات پوری ہونے سے پہلے کسی نے باہر سے لاک کا ہینڈل گھمایا اور دروازے کو دھکیلا۔ میں نے سانس روک لیا۔ محسن بھی چادر اپنے سر تک کھینچ کے لاش کی طرح اکڑ گیا۔ اسٹریچر لانے والا اسپتال ہی کا کوئی ملازم تھا۔ اس کی وردی سے یہی ظاہر ہوتا تھا۔ میں نے اسے اندر داخل ہوتے ہی پیچھے سے دبوچ لیا اور

لات مار کے دروازے کو بند کر دیا۔ وہ میری گرفت سے آزاد ہونے کے لیے تڑپا اور اس نے سر گھما کے مجھے دیکھنے کی کوشش کی مگر میں نے بائیں ہاتھ سے اس کا منہ دبا کے اسے اپنے ساتھ لگا رکھا تھا۔ دوسرے لمحے میرا دایاں ہاتھ حرکت میں آیا اور نپے تلے وار نے اس شخص کو فوراً بے حس و حرکت کر دیا۔

"آفرین" محسن بیڈ پر سے اٹھ کے میری طرف لپکا "کیا اب میں اسٹریچر پر لیٹ جاؤں؟"

میں نے کہا "ایسے نہیں بھاشے کے بچے۔ مرنے والے کے جسم پر یہ لباس ہوتا ہے۔ جو مریضوں کو اسپتال کی طرف سے ملتا ہے۔"

سوچنے سمجھنے میں وقت ضائع کرنے کے لیے وقت ہی نہیں تھا۔ محسن نے گیروے رنگ کا لباس اُتار کے وہ کپڑے پہن لیے جو کچھ دیر پہلے میں نے مرنے والے کے جسم پر سے اتارے تھے۔ محسن نے اتنی دیر میں اسپتال کے ملازم کی وردی اُتاری اور اسے … کے نیچے کر دیا تاکہ کسی اندر آنے والے کی نظر سیدھی اس … جائے۔

میں نے عملے کی یونیفارم اپنے جسم پر چڑھائی۔ پتلون اور بشرٹ دونوں مجھے کچھ ڈھیلے تھے لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وردی تنگ ہوتی تو میں اسے پہن ہی نہیں سکتا تھا۔ اسٹریچر لانے والا خاصے بھاری بھرکم جسم کا مالک تھا۔ اسپتال کے مریضوں کو دیے جانے والے کپڑے تو ویسے بھی ڈھیلے ڈھالے ہوتے ہیں۔

محسن اسٹریچر پر سیدھا لیٹ گیا تو میں نے اس پر چادر ڈال دی اور اسٹریچر کو دھکیلتا ہوا باہر آیا۔ دروازہ بند کرنے سے پہلے میں نے لاک کا بٹن اندر سے دبا دیا۔ اب دروازہ اندر سے کھولا جا سکتا تھا یا پھر باہر سے چابی لگا کے۔

ساتھ والے کمرے کے دروازے پر کھڑے ہوئے سارجنٹ نے چند منٹ پہلے اسٹریچر کے ساتھ اسپتال کے ایک ملازم کو اندر جاتے دیکھا تھا۔ اسٹریچر پر لاش دیکھ کے اس کو دال میں کالا کیسے نظر آسکتا تھا۔

وہ ٹیلی فون پر کسی سے باتوں میں مصروف تھا "یس سر۔ وہ اندر ہی ہیں۔ نو سر، میں ان کو نہیں نکلنے دوں گا۔ میں شوٹ کر دوں گا انہیں۔ وہ یقیناً دھوکے باز تھے۔ اتنی دیر ہو گئی۔ ابھی تک انہوں نے باہر آنے کی کوشش نہیں کی۔ یس سر، میں انتظار کر رہا ہوں۔ میں اکیلا اندر جانے کا رسک نہیں لوں گا۔"

میں نے پوری کوشش کی کہ میرا چہرہ سارجنٹ کی طرف نہ ہو۔ وردی سے وہ دھوکا کھا گیا تھا مگر چہرے کے نقوش دیکھ کے وہ شک میں پڑ سکتا تھا اور کچھ دیر پہلے کے باوردی کی صورت کو پہچان بھی سکتا تھا۔ میں اسٹریچر کو آہستہ آہستہ دھکیلتا ہوا مخالف سمت میں بڑھتا گیا۔ مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ مجھے کدھر جانا ہے۔ جس راستے سے ہم اندر آئے تھے وہاں پولیس موجود تھی اور ایک وردی والے … کے علاوہ نہ جانے کتنے لوگ سادہ کپڑوں میں آتے جاتے لوگوں کو دیکھ رہے تھے۔ اس راستے سے اسٹریچر لے جانا … کوئی ریمپ 'RAMP' یعنی سڑک سے اسپتال کے فرش تک … کی ڈھلوان سطح بھی نہیں تھی۔

میں نے کوریڈور میں لگے ہوئے نشانات پر نظر رکھی … کے مختلف شعبوں کی نشاندہی کرتے تھے۔ ان میں کسی پر مُردہ … کا نام نہیں تھا۔ میں دائیں طرف مڑنے کا تھا جب مخالف سمت … تین مسلح پولیس مین اندر آئے۔ وہ بڑی عجلت میں تھے۔ … ایک سائیڈ پر روک کے میں ویٹنگ ہال تک دوڑا۔ اسپتال میں … کے کسی فرد کو دوڑتا دیکھ کر کوئی حیران یا پریشان نہیں ہوتا … ایمرجنسی میں ایسا کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

نوردین وہیں موجود تھا جہاں ہم نے اسے انتظار کرنے … تھا۔ جب اس کے قریب سے گزرتے ہوئے میں نے اردو … "نوردین۔ باہر نکل جاؤ فوراً۔ کیا تمہیں اس اسپتال کے ر… معلوم ہیں۔"

"بہت اچھی طرح" وہ پہلے چونکا اور پھر کھڑا ہو گیا۔

"چلو میرے ساتھ چلو۔ تمہارے ماموں فوت ہو گئے ہیں۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو جی، میرا تو کوئی ماموں ہی نہیں" وہ بولا۔

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے کھینچ لیا "ڈراما شروع ہو گیا ہے اب پتا چلے گا کہ تم کتنے اچھے ایکٹر ہو۔ فرض کر لو کہ تمہارا … ماموں تھا جو ابھی ابھی فوت ہوا ہے۔ اب تم کو اس کی لاش … جانی ہے۔"

وہ میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا "کہاں لے جانی ہے؟"

"پاگل دے پتر۔ سوال کیے جا رہے ہو۔ رونا دھونا شروع … اور میرے ساتھ رہو۔ وہ دیکھو اسٹریچر پر لاش پڑی ہے۔ وہ … تمہارے ماموں" میں نے کہا۔

خلاف توقع نوردین نے صورت حال کی نزاکت کو سمجھ لیا … سر پر ہاتھ مار کے چلانے لگا "ماموں۔ ہائے میرے ماموں … مر گئے۔"

میں نے اس کے کندھے پر تھپکی دی "شاباش۔ آواز کم … آواز میں درد اور سوز و گداز پیدا کرو۔"

وہ بھوں بھوں رونے لگا "سوز و گداز.... وہ کیا ہوتا ہے جی …"

میں نے اسٹریچر کے قریب جا کے چادر ہٹائی اور اس کو ماموں کا دیدار کرا دیا "اب ذرا دلخراش چیخ مارو، غم کے جذبات میں … جاؤ۔"

اس نے چیخ ماری "یہاں کسی کو ماموں کی موت پر اتنا دکھ … ہوتا۔"

"تو فرض کر لو کہ یہ والد صاحب ہیں تمہارے۔" میں نے کہا اور اسے تسلی دینے لگا۔

"ان کے لیے تو میرے جذبات.... خیر مجھے اداکاری … ہے۔" وہ سینے پر ہاتھ مار کے رونے لگا۔ اس نے انگریزی … ماتمی کلمات ادا کیے۔

میں نے اسٹریچر کو آگے دھکیلا۔ "اب کدھر جانا ہے؟"

"تم تو سے الٹے ہاتھ۔ مردہ خانے جانا ہے نا۔" وہ ایسے بولا کہ لگتا تھا یہ بھی دکھ بھرے جذبات میں ڈوبے ہوئے الفاظ ہیں۔

"تم ایک ایسے گدھے ہو جس کی ذہانت کا معیار صفر ہے" میں نے کہا "جب بھانجا ساتھ ہو تو کیا لاش مُردہ خانے میں رکھی جائے گی؟ اسے باہر لے جانا ہے۔ جہاں ایمبولینس مل جائے۔"

"اچھا جی" وہ روتے روتے چلایا "آگے سے سیدھے ہاتھ۔"

قریب سے گزرنے والے لاش پر افسوس ناک نظر ڈالتے تھے تو نوردین کی حالت پر … افسوس کا اظہار کرتے تھے۔ کسی کی موت پر اتنا واویلا کرنا ہی انگریز قوم کے مزاج کے خلاف ہے۔ اسپتال میں رونا پیٹنا شور مچانے کے مترادف تھا۔ تاہم وہ دیکھ رہے تھے کہ اتنے معیوب اور غیر مہذب طریقے پر موت کا ماتم کرنے والا ان کا ہم قوم نہیں بلکہ ایک سیاہ فام داڑھی والا ہے' ایک ڈاکٹر نے قریب سے گزرتے ہوئے چادر ہٹا کے مرنے والے کا چہرہ دیکھا اور پھر ڈھک دیا۔ ایک بڑھیا نے انگلی سے سینے پر صلیب بناتے ہوئے اپنے ساتھی نوجوان لڑکے سے کہا "جب تمہارا باپ مرا تھا تو میں اتنی ہی غم زدہ تھی۔"

ناخلف لڑکے نے کہا "ماما کیوں جھوٹ بولتی ہو بلاوجہ۔"

"اب باہر جانے کا راستہ کتنی دور ہے؟" میں نے کہا۔

نوردین نے دہاڑیں مارتے ہوئے کہا "بس آگے جا کے بائیں طرف مڑتے ہی مردہ خانے کا راستہ آ جائے گا۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ پھر مُردہ خانہ۔"

"ایمبولینس وہیں ہوتی ہے" نوردین نے وضاحت کی۔

"وہ کاغذات مانگیں گے۔ ڈسچارج سلپ اور ڈیتھ سرٹیفکیٹ' ایمبولینس لے جانے کا اجازت نامہ۔" میں نے کہا۔

"یہ تو ہے" نوردین روتے روتے بولا۔

مُردے نے کہا "صبر کر پتر نوردین' کہیں فرط غم سے تیرا دل نہ پھٹ جائے۔"

میں نے کہا "چُپ کر کے پڑا رہ مُردے۔ اپنے ساتھ ہمیں بھی مروائے گا۔"

مُردے نے چھینک ماری۔ میں نے فوراً دوسری چھینک ماری۔ سامنے سے آنے والی ایک سیاہ فام بھینس کے قبیلے کی حسینہ نے دہل کر اپنے بے پناہ سینے پر ہاتھ رکھا "اوہ۔ مجھے ایسا لگا جیسے لاش نے چھینک ماری۔"

میں نے کہا "مرحوم کا انتقال زکام سے نہیں ہوا تھا۔"

ڈھلوان فرش اچانک سامنے آ گیا۔ میں نے پہیوں والے اسٹریچر کو اپنی طرف کھینچ کے رکھا اور آہستہ آہستہ نیچے اُتارا مگر نوردین کا پاؤں اس کی چکنی سطح پر پھسل گیا۔ وہ بعد سے گرا تو اس کا ہاتھ میرے پیروں میں اُلجھا۔ میں نے خود کو منہ کے بل گرنے سے بچانے کی کوشش کی تو اسٹریچر میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ ڈھلوان سطح کے آخری حصے پر اس کی رفتار بڑھ گئی۔ میں اس کے پیچھے دوڑا اور عین اس وقت پھر ہینڈل پکڑنے میں کامیاب ہو گیا جب اسٹریچر ایک نرس سے ٹکرانے والا تھا۔ وہ بڑی نزاکت سے چلتی اسی سمت میں جا رہی تھی۔ جب میرے قدموں کی آواز پر اس نے پلٹ کر دیکھا تو میں بھونچکا رہ گیا۔ وہ کوریا کی سونی تھی۔

میں نے کہا "مس سونی۔ ابھی ایک مُردہ تمہیں ناک آؤٹ کر دیتا۔"

نوردین روتا دھوتا آگے آیا "تم نے مجھے اُٹھایا بھی نہیں۔"

غصے سے میرا بُرا حال ہو گیا "اُلو کے پٹھے۔ اپنے ساتھ تم مجھے بھی گرا رہے تھے۔ تم کو کیا ضرورت تھی سیڑھیاں چھوڑ کے اس راستے سے اُترنے کی۔"

"وہ دراصل جوتوں کے سول بہت گھس گئے ہیں۔"

سونی آف کوریا نے کہا "میں نے تمہیں پہلے نہیں دیکھا۔"

میں نے کہا "میں نے دیکھا ہے تمہیں۔ تم کینٹین میں کام کرتی ہو نا۔ میرا نام اپنے چاہنے والوں کی فہرست کے آخر میں لکھ لو۔ میں انتظار کر سکتا ہوں۔"

وہ مسکرائی "یہ داڑھی والا حبشی کیوں رو رہا ہے؟"

"یہ اس کے ماموں کی لاش ہے۔ اس کی شادی ماموں کی لڑکی سے ہونے والی تھی۔ اب ایک سال تک نہیں ہو گی۔ اسی لیے رو رہا ہے۔"

"ایک سال تک کیوں؟ یہ کل شادی کر سکتے ہیں تدفین کے بعد۔"

میں نے کہا "ان کے قبیلے میں ایسا نہیں ہوتا۔ ان کا عقیدہ ہے کہ مرنے والے کی روح پہلی برسی کے بعد گھر سے جاتی ہے۔ اسے ایک ایمبولینس چاہیے۔"

"یہ کیا مسئلہ ہے۔ اتنی کھڑی ہیں۔ کوئی بھی لے جائے" اس نے ہاتھ کے اشارے سے کہا اور پھر اپنی مسحور کن کیٹ واک کے دلکش نمونے سے نظروں کا خراج تحسین لیتی روانہ ہو گئی۔

میں نے اس کے اشارے سے سمجھ لیا تھا کہ ایمبولینس کہاں ملے گی۔ نوردین نے کہا "یہ تمہاری گرل فرینڈ... بہت خوب صورت تھی۔"

میں نے اسے ڈانٹا "بے وقوف۔ تم نظر بازی کر رہے ہو۔ اپنے ماموں کی وفات کا صدمہ اتنی جلدی بھول گئے۔"

اس نے پھر سینے پر ہاتھ مارا اور چلایا "ہائے ماموں۔"

ماموں نے ایک آہ بھر کے کہا "سونی۔ کاش میں کوریا میں پیدا ہوتا۔ نہیں تم پاکستانی ہوتیں۔"

میں نے پھر اسے ڈانٹا "اس سے کوئی فرق نہ پڑتا۔ ہمارے نصیب میں وہی تھیں جو ہمیں ملیں۔ خاموش پڑا رہ' ابھی خطرہ ٹلا نہیں۔"

ایک ایمبولینس کے قریب جا کے میں نے اس کا پچھلا دروازہ کھولا اور اسٹریچر کو اندر دھکیل دیا۔ "نوردین۔ تم اندر جاؤ۔ لاش کو اسٹریچر سے ایمبولینس کی سیٹ پر منتقل کرو اور … والی سیٹ پر خود بیٹھ جاؤ۔"

نوردین نے پُردرد صدا بلند کی "ہائے ماموں۔ تمہیں کیا ضرورت تھی مرنے کی۔"

ایمبولینس ڈرائیور نے افسوس سے سرہلایا "ینگ مین۔ یہ ضرورت کی بات نہیں' وقت کی بات ہے۔ جب تمہارا وقت آئے گا تو تمہیں بھی مرنا پڑے گا۔"

میں نے کہا "مرحوم نے خودکشی فرمائی تھی۔ عشق میں مبتلا ہو کے۔"

"مطلب یہ کہ مرحوم بھی بے وقوف تھے۔ خیر' کاغذات کہاں ہیں؟"

میں نے دروازہ بند کر کے کہا "میرے پاس ہیں' چلو میں دیتا ہوں۔"

وہ کچھ حیران ہوا "کیا تم بھی ساتھ چلو گے؟"

اس وقت تک میں ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔ ڈرائیور نے اپنا سوال دُہرایا تو میں نے کہا "ہاں۔ دراصل میری ڈیوٹی ختم ہو چکی ہے' مجھے راستے میں ڈراپ کر دینا۔"

ڈرائیور نے نفی میں سرہلایا "تم ایمبولینس میں نہیں جا سکتے۔ تمہیں یہ بات معلوم ہونی چاہیے۔"

میں نے اسے یوں دیکھا جیسے اس کی بات کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن درحقیقت میں صورتِ حال کا جائزہ لے رہا تھا۔ ایمبولینس قطار کے آخر میں تھی۔ اس کے بعد دیوار تھی اور درمیان میں پیدل چلنے والوں کے لیے راستہ چھوڑ دیا گیا تھا۔ اس طرف سے کوئی بھی نہیں گزر رہا تھا۔ میں نے بڑی پھرتی سے وار کیا اور حیرت زدہ ڈرائیور آواز نکالے بغیر سیٹ پر لڑھک گیا۔

میں پھر نیچے اُترا اور دوسری طرف گیا۔ میں نے بے ہوش ڈرائیور کو آگے دھکیل کر اپنے لیے جگہ بنائی اور خود اس کی جگہ بیٹھ گیا۔ ڈرائیور نے چابی ایمبولینس کے سوئچ میں لگادی تھی۔ میں نے اسے اسٹارٹ کیا اور گاڑی آگے بڑھادی۔

عقبی مین گیٹ سے باہر آنے سے پہلے میں نے سڑک پر ٹریفک کے بہاؤ کا رخ دیکھ لیا تھا۔ سب ٹریفک بائیں طرف سے آ رہی تھی اور دائیں طرف جا رہی تھی۔ یہ ون وے اسٹریٹ تھی۔ اگر میں احتیاط نہ کرتا اور غلط سمت میں مڑ جاتا تو یہ فاش غلطی ہماری کامیابی کو ناکامی میں بدل دیتی۔

ایمبولینس ڈرائیور اب سیٹ سے نیچے گر گیا تھا۔ یہ بڑی ایمبولینس تھی۔ فاکس ویگن کی مائیکروبس جس میں آگے والی... سیٹ پر تین افراد بہ آسانی بیٹھ سکتے تھے۔ میں نے اس کے ڈیش بورڈ پر غور کیا تو مجھے ایک نیلے رنگ کا اضافی سوئچ نظر آیا۔ یہ یقیناً ایمبولینس کا سائرن آن کرنے کے کام آتا ہوگا۔ میں نے سوچا اور اسے باہر کھینچ لیا۔ ایک دم مائیکروبس کی چھت پر لگا ہوا سائرن چلا کے راستہ مانگنے لگا اور ایمرجنسی لائٹ بھی گھومنے لگی۔ سڑک پر ساری ٹریفک ایک طرف ہو گئی یا رک گئی۔ مجھے پھر اپنا ملک یاد آیا جہاں اکثر ایمبولینس گاڑیاں ٹریفک جام میں پھنسی سائرن بجاتی رہتی ہیں اور کسی کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔ خود ٹریفک پولیس والے بے حسی کے ساتھ کھڑے رہتے ہیں۔ کوئی نہیں سوچتا ایمبولینس کے سائرن کی آواز موت کی پکار ہوتی ہے۔ زندگی فریاد ہوتی ہے۔ خدا کے لیے راستہ دو' ہر لمحہ قیمتی ہے۔ ہر سانس آخری سانس ثابت ہو سکتی ہے۔ تم جیسا ہی ایک زندہ انسان زندگی کی بھیک مانگتا ہے۔ اسے اسپتال پہنچنے دو مگر کسی کے دل میں انسانی رشتوں کے ناتے رحم اور خدا ترسی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں نہ خود بھی ٹریفک جام میں بے بس ہوتا ہے۔ نہ جانے کتنے لوگ اس طرح راستے میں ہی دم توڑ دیتے ہوں گے۔

یہاں سائرن کی آواز پر راستہ خود بخود صاف ہوتا گیا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں کدھر جا رہا ہوں۔ اصل مقصد کم سے کم وقت میں اسپتال سے دور جانا تھا۔ مگر مجھے یہ بھی اندازہ تھا کہ اب تک ہمارے فرار کا راز فاش ہو چکا ہوگا' بہت جلد وائرلیس پر اس ایمبولینس کا نمبر نشر ہو جائے گا جو فرار میں استعمال ہوئی تھی اور سڑک پر موجود تمام پولیس ٹریفک سارجنٹ چوکنے اور مستعد ہو جائیں گے۔ ان سے ریس لگا کے فرار ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بچت کی صرف ایک ہی صورت تھی کہ ہم جلد از جلد اس ایمبولینس کو کہیں چھوڑ دیں اور فرار ہو جائیں۔ لیکن یہ آسان بہرحال نہیں تھا۔ ایک ٹیکسی یا کار کے مقابلے میں ایمبولینس کہیں زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے۔ یہ بھی ضروری تھا کہ ہمیں کوئی خالی سڑک ملے۔ میں لندن کے راستوں سے ضرور واقف تھا مگر اس وقت مجھے بہت سوچنے پر بھی یاد نہ آیا کہ ہم کہاں ہیں اور یہ سڑک کہاں جا کے ختم ہوگی۔

میں نے محسوس کیا کہ سائرن بجانا میری غلطی تھا۔ اس سے بہت زیادہ لوگ متوجہ ہوتے تھے۔ اگلے موڑ سے میں نے سائرن آف کر دیا اور چند منٹ بعد ہی میں نے خود کو ہارلے اسٹریٹ کے علاقے میں پایا تو مجھے راستوں کا جغرافیہ یاد آگیا۔ آگے جا کے میں بائیں طرف مڑ گیا۔ یہ موڑ MORTIMER اسٹریٹ تھی جو وگ مور ہال سے وگ مور اسٹریٹ بن جاتی تھی۔ مزید آگے بائیں طرف اسی کا نام سیمور اسٹریٹ تھا۔ وہاں سے پھر بائیں ہاتھ گھوم کے میں نے پورٹ مین اسٹریٹ کے راستے انڈر گراؤنڈ ریلوے اسٹیشن پہنچنے کا فیصلہ کیا۔ آکسفورڈ اسٹریٹ کے قریب پارکنگ ایریا میں ایمبولینس کو چھوڑنا اور ماربل آرچ سے زیر زمین چلنے والی ٹرین میں بیٹھ کے عام مسافروں میں شامل ہو جانا زیادہ مشکل کام نہیں تھا۔

میری یہ پلاننگ کامیاب رہی۔ آکسفورڈ اسٹریٹ کے پارکنگ ایریا میں سیکڑوں گاڑیاں صف بستہ کھڑی تھیں تو درجنوں خالی تھیں۔ میں نے ایمبولینس کو قطار کے آخری حصے میں ایک جگہ پارک کیا جہاں اس کے سامنے دوسری گاڑی نہیں تھی۔ نیچے اتر کے میں نے دروازے کو لاک کیا اور پیچھے والے گیٹ پر دستک دی۔ محسن اور پھر نوردین محتاط نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے اتر آئے۔ اس وقت بھی یقیناً کچھ لوگوں نے ہمیں دیکھا ہوگا مگر کسی کی طرف دیکھے بغیر چلنا شروع کر دیا۔ محسن نے دھاری دار کپڑے کا جو لباس پہن رکھا تھا وہ اسپتال کے مریضوں کا بھی ہو سکتا تھا اور نائٹ سوٹ بھی۔ ہر صورت میں یہ انگریز قوم کے مزاج پر گراں گزرنے والی بات تھی جو گھر سے نکلتے وقت کوٹ پتلون اور ٹائی کے ساتھ ہیٹ تک لگانا ضروری سمجھتے ہیں مگر ہم انگریز نہیں تھے اور لندن کے رہنے والوں نے اب ان لاکھوں ایشیائیوں کو طوعاً و کرہاً قبول کر لیا ہے جو ان کی تہذیب و معاشرت کے آداب کی ایسی تیسی کرنے کے لیے وہاں مستقل آباد ہیں۔

محسن نے سوچ کے کہا "یہ آکسفورڈ اسٹریٹ ہے؟"

نوردین نے مجھ سے پہلے سرہلایا "ہاں جی۔ آپ کو کیسے پتا چلا؟"

محسن مسکرایا "ہمیں تو یہ بھی معلوم ہے کہ تمہارا نام نوردین اور تمہارے باپ کا علم دین ہے۔ مگر نہ اس کے پاس علم کی روشنی ہے اور نہ تمہارے پاس نور کی کرن۔ تم دونوں کو اپنے نام سے پہلے بے لگا لینا چاہیے۔"

"بے لگالینا چاہیے..." نوردین نے اس معمے کو حل کرنے کے لیے دماغ لڑایا "یعنی بے علم دین اور بے نوردین۔ یہ تو بڑی زیادتی ہے جناب۔ آخر اباجی اتنے بڑے اور مشہور ایڈیٹر ہیں۔ ایڈیٹر عالم فاضل لوگ بن سکتے ہیں۔"

"چلو اباجی کو گولی مارو۔ یہ محاورہ ہے' سچ مچ میرے کہنے پر خود کو یتیم مت کر لینا" محسن نے کہا "تم اپنا نام تو بدل سکتے ہو؟"

"بہت مشکل ہے پھر اباجی مجھے گولی ماردیں گے۔ میرا نام انہوں نے دادا کے نام پر رکھا تھا۔ میرے ابا کے ابا واقعی بے نور تھے۔ بچپن میں آنکھیں ضائع ہو گئی تھیں۔ وہ نکلی تھی ان کو' خواب نہیں ہوتی.... بڑا مشکل سا نام ہے۔"

"چیچک..." میں نے کہا "مسٹر نوردین۔ کیسا رہا یہ ڈراما؟"

"مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آئی۔ نہ کچھ کرنا پڑا۔ ادھر بیٹھا رہا ویٹنگ روم میں" اس نے کہا "آپ لوگ جارج سے ملنے گئے تھے' کیا ہوا وہاں؟"

محسن نے کہا "کچھ نہیں ہوا۔ جارج بالکل خیریت سے تھا۔ تمہیں سلام کہہ رہا تھا۔"

"کچھ ہوا ضرور تھا۔ ورنہ آپ کو لاش بن کے باہر جانے کی کیا ضرورت تھی۔"

میں نے کہا "نوردین۔ تم نے تو ثابت کر دیا کہ تم بڑے اچھے ایکٹر ہو۔ کیا جذباتی المیہ اداکاری کا مظاہرہ کیا تھا تم نے اور وہ بھی فرضی ماموں کی موت پر۔ میں تو قائل ہو گیا۔"

"اور میں آبدیدہ ہو گیا تھا۔ سچ مچ ایسے زار و قطار رونے والا بھانجا ہوتا میرا تو میں اپنی موت پر رشک کرتا۔"

میں نے کہا "اگر یہ سین فلم بند کیا جاتا تو فلم دیکھنے والے دھاڑیں مار مار کے روتے۔"

"اور جب اس اداکاری پر آسکر ایوارڈ دیا جاتا تو ایوارڈ دینے والے بھی اتفاق رائے سے روتے" محسن نے کہا "کاش میں ہالی ووڈ کا کوئی ڈائریکٹر ہوتا نوردین۔"

نوردین کا چہرہ کھل اٹھا "آپ سچ کہتے ہو جی یا مجھے بے وقوف بنا رہے ہو؟"

"اس کی کیا ضرورت ہے' تم ریڈی میڈ ہو" میں نے کہا۔

"تمہاری اداکاری واقعی اچھی تھی" محسن نے اسے یقین دلایا "اور تم نے ثابت کر دیا کہ تم بزدل بھی نہیں ہو۔"

میں نے کہا "شیروانی صاحب۔ رقم کتنی ہے آپ کی جیب میں؟"

محسن بولا "ہوں گے ابھی سو ڈیڑھ سو پاؤنڈ۔ اچھا ہوا میں نے لباس بدلتے ہوئے اپنی کوئی چیز نہیں چھوڑی۔"

"میں نے تو دوسروں کی بھی نکال لی" میں نے کہا "اس بندے کی جیب میں خاصی رقم تھی۔ میرا خیال ہے سو پاؤنڈ سے زیادہ ہی ہوں گے اور ڈرائیور کی جیب میں سے ستر پاؤنڈ ملے ہیں۔"

محسن نے کہا "آپ کو شرم آنی چاہیے۔"

میں نے کہا "اب آ رہی ہے لیکن دوست' ہم کوئی پیشہ ور جیب کترے یا چور نہیں ہیں' مجبوری سب کراتی ہے۔"

"ہر مجرم یہی کہتا ہے۔ اس وقت کوئی مجبوری نہیں تھی۔"

میں نے کہا "دراصل رقم کپڑوں کے ساتھ ہی آگئی تھی۔ جو کپڑے تو نے پہن رکھے ہیں وہ پہلے میں نے پہنے تھے۔ اس کی جیب میں ہاتھ ڈال کے دیکھ۔"

محسن نے سائیڈ پاکٹ دیکھا "اس میں تو دوسرے کاغذات بھی ہیں۔ یہ رقم مرحوم کے لواحقین کو ارسال کی جا سکتی ہے۔"

"اس وردی کی جیب میں بھی ایمبولینس ڈرائیور کا شناختی کارڈ ہے۔"

"پھر تو کوئی مسئلہ نہیں۔ اسے کچھ دیر میں ہوش آجائے گا یا کوئی اسے دیکھ لے گا۔ ہم بعد میں فون کر کے اس سے معذرت کر لیں گے اور اسے رقم بھجوا دیں گے۔"

ہم دس منٹ میں انڈر گراؤنڈ ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر پہنچ گئے۔ ماربل آرچ کے اسٹیشن سے لندن کے کسی بھی علاقے میں پہنچنا آسان تھا۔ آدھے گھنٹے میں ہم جائے واردات سے بہت دور پہنچ چکے تھے مگر پھر بھی خود کو محفوظ نہیں سمجھ سکتے تھے۔ ہم نے اپنے پیچھے بہت سُراغ چھوڑے تھے اور اگر قسمت ساتھ نہ دیتی تو شاید ہم راستے میں ہی گرفتار ہو جاتے۔ لندن پولیس کی کارکردگی کے بارے میں مجھے کوئی غلط فہمی نہیں تھی۔ ہم نے جو باتیں جارج کے کمرے میں کی تھیں وہ ریکارڈ ہو گئی تھیں۔ پولیس کے پاس ایک ٹیپ اس فون کال کا بھی تھا جو میں نے الزبتھ کو کی تھی۔ ہم نے پادری کے اور بھکشو کے کپڑے بھی اسپتال میں چھوڑ دیے تھے اور ہمارے فنگر پرنٹس تو ہر جگہ تھے۔ ان کے بغیر ہی پولیس کو معلوم تھا کہ وہ سکندر بخت اور محسن لندن میں ہیں جن کو برطانیہ بدر کر دیا گیا تھا۔ ہمارا جارج سے تعلق بھی ثابت تھا۔ پولیس کے پاس شبہ... تھا

کہ ہم نے پہلے قانونی طریقے سے لندن میں داخل ہونے کی ناکام کوشش کی تھی اور پھر غیر قانونی طریقے سے لندن پہنچ گئے تھے۔ محسن کے بارے میں ان کو یہ علم نہیں تھا کہ وہ کس نام سے لندن میں پایا جاتا ہے مگر سکندر بخت کی وقار یوسف ایڈووکیٹ کے نام اور پاسپورٹ سے لندن میں موجودگی پولیس کے لیے ایک چیلنج بن گئی تھی۔ وہ اسپتال میں جارج کے کمرے سے فرار ہوگیا تھا اور بے شک اس میں سکندر بخت کا کوئی کمال نہیں تھا۔ قسمت نے اس کا ساتھ دیا اور جارج نے اس کی مدد کی تھی۔ لیکن آج کا دوسرا واقعہ پولیس کو زیادہ پریشان اور مشتعل کرے گا۔ سمجھنے والے فوراً سمجھ جائیں گے کہ پادری اور بھکشو درحقیقت سکندر بخت اور محسن تھے مگر ان کا دوبارہ سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کے اس دیدہ دلیری سے نکل جانا لندن کی نیک نام پولیس کے منہ پر بے عزتی کا دوسرا طمانچہ تھا۔

یہ لندن میں ہمارے قیام کا آخری دن تھا جو آدھا گزر چکا تھا۔ باقی آدھا خیروعافیت اور سکون کے ساتھ گزر جاتا تو اگلی صبح ہم ایڈی کے ٹرک میں چھپ کے برطانیہ سے فرانس پہنچ سکتے تھے۔ پیرس سے کراچی تک بدھو کے خیر سے گھر لوٹ آنے کا سفر آسان اور بے خطر تھا۔

لنچ کا وقت گزر گیا تھا۔ ہم نے مفت کے ناشتے کے بعد سے اب تک صرف دھکے کھائے تھے۔ ہم سب کے پیٹ خالی تھے اور ہفت روزہ طوطی کے چیف رپورٹر کی فاقہ زدہ مظلوم صورت دیکھ کر لگتا تھا کہ کسی ریسٹورنٹ تک وہ زندہ پہنچ گیا تو کھانا آنے سے پہلے میز پر ہی دم توڑ دے گا لیکن اپنے رنگ برنگے حلیے میں ہم تینوں کا کسی ریسٹورنٹ میں قدم رنجہ فرمانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ یہ ہوسکتا تھا کہ ہمارا حلیہ مشتہر ہوگیا ہو اور پولیس ہمیں سرکاری مہمان بنا کے لے جائے تو سارا کھایا پیا نکال دے۔

نوردین کے ساتھ ہم انڈر گراؤنڈ ریلوے میں بینک اسٹیشن پر اُترے تھے جو لیور پول اسٹریٹ سے پہلے پڑتا ہے اور وہاں سے دوسری ٹرین میں سوار ہوکے لندن برج پر اُترے تو سہ پہر کے تین بجنے والے تھے۔ باہر آنے کے بعد نوردین نے پھر ہمیں یاد دلایا کہ لنچ کتنا ضروری ہے اور ہم نے پھر اسے تسلی دی کہ بس اب انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں مگر وہ ہمیں یقین دلانے میں مصروف رہا کہ وہ خود ختم ہونے والا ہے۔ محسن نے اسے ڈانٹا۔

"مرنا ہوتا تو اب تک مرجاتے۔ میں شرط لگا سکتا ہوں کہ کل تک تمہیں کچھ بھی کھانے کو نہ ملے تب بھی تم زندہ رہوگے۔"

"جو شخص فوت ہونے والا ہو وہ کیسے شرط لگا سکتا ہے" میں نے کہا "نوردین کی حالت دیکھو۔ اس کی صورت سے تو لگتا ہے کہ ایک ہفتے سے اس نے کچھ نہیں کھایا۔ سوائے حاجی صاحب کی جوتیوں کے اور گالیوں کے۔"

محسن بولا "اس کی شکل ہی ایسی ہے۔ ہم تینوں کے حصے کا اُمیلا فیونس کے بھی یہ ایسا ہی رہے گا۔"

میں نے کہا "یار نوردین' مجاہد بنو۔ جہاد کرو اپنے نفس سے بھوک سے اور جسم کی طلب سے۔"

"یہ تو آپ اباجی کی طرح بول رہے ہیں۔ وہ بھی بس دوسروں کو تلقین کرتے ہیں۔ خود کچھ نہیں کرتے۔"

"اب تم کہیں سے کپڑوں کا بندوبست کرلو۔ میرا مطلب ہے کچھ معقول قسم کا لباس ہو...."

"مجھے تو معاف کریں جی۔ اچھا ہوا پچاس پاؤنڈ ضمانت کے رکھ لیے تھے اس یہودی نے۔ ورنہ میں پکڑا جاتا۔"

"یہودی نے گھاٹے کا سودا نہیں کیا تھا۔ وہ کپڑے دس پاؤنڈ کے بھی نہیں تھے" میں نے کہا "اب کیوں پکڑے گا وہ تمہیں۔"

محسن نے کہا "اسے خود شوق ہے پکڑے جانے کا۔ اس یہودی کی بیٹی میں ایسی کیا بات ہے' اگر آدمی عقل سے کام لے...."

نوردین آہ بھر کے بولا "یہ دل کا معاملہ ہے جی۔"

بہت جلد ہمیں ایک ڈیپارٹمنٹ اسٹور نظر آگیا اور ہم نے الگ الگ داخل ہوکے وہاں سے اپنے لیے کپڑے خریدے۔ میں نے صرف مختلف نظر آنے کے لیے برمودا شارٹ کے ساتھ افریقین پرنٹ کی ڈھیلی بشرٹ خریدی جس کے شوخ لال پیلے رنگ آنکھوں میں چبھتے تھے لیکن یہ سیاہ فاموں میں مقبول تھے اور ان کی تقلید میں بطور فیشن سب ہی استعمال کرنے لگے تھے۔ سب سے میری مراد غیر سنجیدہ اور انگریز قوم کے معیار پر غیر مہذب لوگ تھے۔ محسن جب باہر آیا تو میں یہ دیکھ کے حیران رہ گیا کہ اس نے بھی میرے جیسے ہی کپڑے پہن رکھے ہیں۔ کپڑوں کے رنگ کا فرق ضرور تھا مگر ڈیزائن اور اسٹائل ایک ہی تھا۔ ہم نے لباس کے انتخاب کے مسئلے پر کوئی بات نہیں کی تھی۔ یہ محض اتفاق تھا یا ہماری ایک جیسی سوچ کا نتیجہ' یہ لباس زیادہ مہنگا بھی نہیں تھا۔ ہم معزز نظر آنے کے لیے سوٹ خریدتے تو ہمارا تمام سرمایہ ناکافی ہوتا۔

نوردین کافی دیر سے برآمد ہوا۔ بہترین سوٹ شرٹ اور ٹائی خریدنے میں اس نے ہماری ساری بچت برابر کردی تھی مگر وہ خوش تھا کہ میں نے محسن کو بھی منع کردیا اور خود بھی اسے مال مفت دل بے رحم کے حوالے سے شرمندہ نہیں کیا۔

"تم بہت شاندار لگ رہے ہو اس سوٹ میں۔" میں نے کہا۔

وہ اور خوش ہوا "کیا واقعی؟ میری شخصیت بھی ایسی ہے؟ سوٹ بھی شاندار ہے۔"

محسن نے طنز سے کہا "سوٹ واقعی شاندار ہے۔"

"بس میرا کالا رنگ خرابی پیدا کررہا ہے' منہ دھونے سے صاف ہوجائے گا۔"

"ابھی یہ رنگ چلنے دو" میں نے کہا "کھانے کے بعد تمہاری اداکارانہ صلاحیت کی مزید آزمائش ہے۔"

"اچھا جی۔ اب کیا کرنا ہوگا مجھے" وہ متفکر ہوگیا۔

"مشکل رول تم نے نبھادیا۔ اب آسان کام ہے" میں نے کہا "اب یہ بتاؤ لنچ کہاں کروگے؟ آج تم مہمان ہو ہمارے۔ تمہاری پسند چلے گی۔"

محسن نے مجھے دیکھا۔ "پسند کو پاکٹ کے تابع رہنا چاہیے۔"

نوردین نے ایک انڈین ریسٹورنٹ کا انتخاب کیا جہاں پر ویٹرس ساری میں ملبوس تھی۔ اس کی پیدائش اور پرورش لندن میں ہوئی تھی مگر اس کو ولایتی کھانوں سے زیادہ مرغن اور چٹپٹے دیسی کھانے مرغوب تھے۔

میں نے کہا "کھانے تو انڈین اور پاکستانی ایک ہیں مگر تمہارا یہاں آنا شاید تمہارے والد صاحب کی قومی حمیت کو گوارا نہ ہو۔"

"وہ تو مجھے معلوم ہے کہ ان کو انڈین کے لفظ سے چڑ ہے مگر آپ مجھے بتاؤ جی کہ میرا کیا قصور ہے۔ مجھے انڈیا پاکستان میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ دونوں کی زبان لباس عادات اور خوراک ایک ہیں۔"

میں نے کہا "بنیادی فرق ہمارے ان کے مذہبی عقائد کا ہے۔"

"یہ بھی ٹھیک کہا آپ نے مگر یہاں آکے کھانا کھانے سے میرا عقیدہ تو نہیں بدل جائے گا۔ مسلمان کا بچہ تو مسلمان ہی رہے گا۔ وہ پتلون پہنے دھوتی یا شلوار۔ برگر کھائے بریانی یا ڈوسا۔ ہمارے پاکستانی ریسٹورنٹ بھی ہیں۔ جیسے عبدل کا.... وہاں ہندو' عیسائی سب آتے ہیں۔ کیا فرق پڑتا ہے اس سے۔ انڈیا پاکستان کا آپس میں مقابلہ ہو' ہاکی یا کرکٹ میچ ہو۔ اس وقت یہاں ہندوستان پاکستان الگ ہوجاتے ہیں لیکن یہاں پاکستان کی ٹیم آئے یا بھارت کی اور مقابلہ ہو انگلینڈ کی ٹیم سے تو سب ایشیائی ایک طرف ہوجاتے ہیں۔"

میں نے کہا "نوردین۔ یہ سارا معاملہ جذبات کا ہے۔"

"ہاں جی۔ اب میرے وہ جذبات کیسے ہوسکتے ہیں جو اباجی کے ہیں۔ انہوں نے تحریکِ پاکستان میں حصہ لیا۔ پاکستان بنایا اور پھر پاکستان چھوڑ کے یہاں آگئے۔ ہم نے پاکستان اسی طرح دیکھا ہے جیسے کوئی اور ملک۔ جرمنی یا جاپان۔ ہم وہاں رہتے' ہمارے دوست ہوتے وہاں اور ہم وہاں تعلیم پاتے' وہیں بڑے ہوتے' وہاں ہمارے چاچے مامے اور ان کے پتر۔ ہمارے کزن ہوتے' دادا دادی ہوتے' کوئی اپنا گھر ہوتا پھر ہم ان جیسے پاکستانی ہوتے مگر یہاں ہم تقسیم ہوگئے ہیں جی۔ انگریز دونوں کو انڈین سمجھتے ہیں یا ایشیائی' پاکستانی کالے لوگ۔ نہ ہم دل سے پکے پاکستانی ہیں اور نہ خود کو انڈین تسلیم کرتے ہیں۔ وہ سب بچے جو یہاں کے ماحول میں پل کے بڑے ہوں گے جذباتی طور پر پاکستانی کیسے ہوسکتے ہیں۔ خاص طور پر اُن والدین کے بچے جو خود بھی یہاں کی تہذیب اختیار کرچکے ہیں۔"

میں اور محسن اس کی بات غور سے سُن رہے تھے۔ وہ بے وقوف نظر آنے اور بے وقوفی کی باتیں کرنے کے باوجود عقل و شعور رکھتا تھا۔ اس کے احساس اور مشاہدے کو غلط نہیں کہا جاسکتا تھا۔

قصوروار اس نسل کے بڑے لوگ تھے جنہوں نے پاکستان بنانے کے بعد سمجھ لیا کہ ہم نے منزل پالی۔ انہوں نے اگلی نسل کے ذہن میں پاکستانی قومیت کا تصور اجاگر کرنے کے لیے باتوں کے سوا کچھ نہیں کیا۔ ان کی باتوں میں جو دوغلا پن تھا اس نے مزید ابہام پیدا کیا اور نوجوان جو مستقبل کے امین تھے اپنی ذمّے داریوں کو سمجھ ہی نہ سکے۔

نوردین کو اپنے اباجی کی طرف سے سخت تشویش لاحق تھی کہ اب تک وہ نہ جانے کہاں کہاں اپنے لختِ جگر کی پُراسرار گمشدگی کی اطلاع کرچکے ہوں گے۔

"اچھا ہوتا اگر ہم کوئی پیغام چھوڑ آتے۔" محسن بولا۔

"یا انہیں فون پر اطلاع دے کر مطمئن کردیتے۔" میں نے کہا۔

"یہ کام تو اس وقت بھی ہوسکتا ہے" محسن بولا۔

میں نے کہا "اچھا تم لوگ بل منگواؤ۔ میں فون پر حاجی صاحب سے بات کرتا ہوں۔"

طوطی صاحب کسی شیر کی طرح گرج رہے تھے۔ "وہ کھوتے دا پتر صبح سے غائب ہے۔ مجھے تو شک ہے کہ اسے کسی میم نے اغوا کرالیا۔ اس سے کچھ بعید بھی نہیں کہ گوری چمڑی کے لیے آباواجداد کا مذہب چھوڑ دے۔ ماں باپ کو عاق کردے۔"

میں نے بڑی مشکل سے کہا "حاجی صاحب۔ میری بات تو سُن لیں۔"

"اجی بات کیا سُنوں۔ اپنی اولاد کو میں آپ سے بہتر جانتا ہوں۔ وہ بھی وہی کریں گے نا جو ہم نے کیا تھا۔ آج سمجھ آتی ہے میرے پاکستانی بھائی کہ کیا مطلب ہے اس بات کا۔ کہ جیسا بوؤ گے ویسا کاٹو گے۔ تخم تو ہمارا ہے نا جی۔ پھل بھی ہم جیسا ہوگا۔"

میں نے کہا "گویا آپ اعتراف کررہے ہیں اپنے ناخلف اور باغی ہونے کا بلکہ آپ کے اپنے الفاظ میں 'حرام الدہر ہونے کا۔"

خلافِ توقع حاجی صاحب خفا نہیں ہوئے "اعتراف تو کرنا پڑے گا جی۔ کسی اور سے نہ سہی اپنے آپ سے بندہ کیسے جھوٹ بول سکتا ہے۔ ہم نے سب کو چھوڑ دیا تھا ولایت کے چکر میں۔ ہمارے اباجی سمجھاتے تھے کہ حرامی چھوڑ کے مت جا اپنا گھر۔ اپنی زمین کے لیے روئے گا بدبخت۔ تیری اولاد بھی تیری نہیں ہوگی۔ کوئی تیرا نہیں ہوگا وہاں۔ سچ فرماتے تھے اباجی جو آج ہمارے سامنے آرہا ہے۔"

میں نے کہا "طوطی صاحب۔ ایسا نہیں ہے۔ آپ کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ نوردین آپ کے نقشِ قدم پر نہیں چل رہا ہے۔"

"یہ آپ کو کیا معلوم؟"

"وہ اس وقت ہمارے ساتھ ہے۔ ہمیں لندن کی سیر کرا رہا ہے اور ہمیں اس سے بات کرکے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ قصوروار آپ کو ضرور سمجھتا ہے مگر وہ آپ کو چھوڑنے کا یا آپ کی مرضی کے خلاف کوئی قدم اُٹھانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا...."

"وہ حرامی کس طرح قصوروار سمجھتا ہے مجھے؟"

"آپ نے اس سے وطن چھینا۔ اسے پاکستانی بننے ہی نہیں دیا۔ یہاں ولایت میں رہ کے آپ کی باتوں سے تو وہ پکا پاکستانی نہیں بن سکتا۔ گستاخی معاف۔ پکے اور سچے پاکستانی تو آپ بھی نہیں تھے ورنہ ترکِ وطن کیوں کرتے۔"

"اللہ معاف کرے' اس وقت ہم یہی سمجھتے تھے کہ اس میں بھلائی ہے لیکن اس میں صرف خرابی تھی۔ آج پاکستان ہمارا نہیں رہا۔ ہم پاکستان کے نہیں رہے۔ تم نے ٹھیک کہا۔ ہم صرف باتیں کرتے ہیں۔ گفتار کے غازی ہیں۔"

میں نے کہا "خیر اس وقت آپ کو یہ اطلاع دینی مقصود تھی کہ نوردین کی طرف سے تشویش میں مبتلا نہ ہوں اور ہاں..... خدا ناخواستہ پولیس ہمیں پوچھتی ہوئی آئے تو کہہ دیں کہ ہم تین بجے تک گھر میں ہی تھے۔"

"کیوں؟ تم نے ایسی ویسی کوئی حرکت کی ہے تو مجھے بتادو۔"

"نہ ایسی نہ ویسی..... ہم نے کوئی غلط حرکت نہیں کی۔ بس سیر کی ہے مگر آپ جانتے ہیں پولیس کل رات سے ہمارے پیچھے لگی ہوئی ہے۔"

"اس کی تم فکر مت کرو۔ طوطی کے ہوتے ہوئے پولیس تم پر بلاوجہ ہاتھ کیسے ڈال سکتی ہے۔"

میں نے کہا "وجہ تو ہے۔"

"اوجی گولی مارو وجہ کو۔ بس موج کرو میرے پاکستانی بھائی۔ بندے کی نیت ٹھیک ہے تو سب ٹھیک ہے۔ اللہ تمہیں اپنے نیک مقصد میں کامیاب کرے اور تم خیروعافیت کے ساتھ واپس جاؤ۔ کوئی غلط کام کرتے تم یا تمہارا مقصد غلط ہوتا تو ہم تمہارا ساتھ کیوں دیتے۔ ان گوروں کی تو..."

حاجی صاحب کی طرف سے اس یقین دہانی کے بعد میرا.....

...حوصلہ بہت بلند ہوگیا۔ میں ٹیبل پر واپس آیا تو محسن بل ادا کرچکا تھا۔

نوردین نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا "اباجی بہت گرم ہوں گے۔"

میں نے کہا "اتنے گرم کہ فون میں سے گرم ہوا آرہی تھی۔ اژدہے کی طرح پھنکار رہے تھے۔"

"پھر آپ نے کیا کہا؟"

"میری کہانی سُنی انہوں نے تو کہنے لگے کہ جھوٹ مت بولو۔ مجھے پتا ہے وہ کل رات سے غائب ہے اور کہاں ہے۔ دراصل انہوں نے تمہاری سب گرل فرینڈز کو فون کیے تھے۔ نہ جانے کس نے کہہ دیا کہ ہاں وہ میری بغل میں ہے۔ کل رات سے میرے ساتھ ہے کیونکہ وہ میرا شوہر ہے۔ اس نے شادی کرلی ہے مجھ سے' پاگل بڈھے' ہمت ہے تو لے جا چھین کے۔"

نوردین کی حالت غیر ہوگئی "اُف..... مروادیا مجھے اس اُلو کی دُم نے۔ اس نے یہ سب کہہ دیا؟"

"ہاں مگر وہ ہے کون؟"

نوردین پر رقت طاری ہونے لگی "ہے ایک لڑکی۔ سچا عشق ہے ہمارا۔"

"تمہارا ہر عشق سچا ہوتا ہے!" محسن بولا۔

"وہ اکثر دھمکی دیتی تھی کہ تمہارے باپ نے کیا سمجھ رکھا ہے مجھے۔ کیوں فون کرکے مجھ سے اُلٹے سیدھے سوالات کرتا ہے۔ کسی دن میں دماغ درست کردوں گی اس پاگل بڈھے کا۔ اب خیر نہیں' اباجی میری شادی کرکے چھوڑیں گے۔ ان کے خیال میں میرا یہی علاج ہے۔"

"پرانے لوگ ایسا ہی سمجھتے تھے۔ آوارگی کے مرض کا علاج مشکل ہوتا ہے" میں نے کہا "خصوصاً یہاں کے ماحول میں۔"

محسن بولا "تم انکار بھی کرسکتے ہو شادی سے۔ اگر تمہیں پسند نہیں۔ گھر سے بھاگ سکتے ہو۔"

اس نے نفی میں سرہلایا "بڑا مشکل ہے جی۔ والدین کا حکم ہے۔ میں کب تک ٹالوں گا۔ لڑکی جیسی بھی ہو مجھے شادی کرنا پڑے گی مگر شادی کے بعد میں گرل فرینڈز کو چھوڑ دوں گا' یہ ناممکن ہے۔"

میں نے کہا "مبارک ہو پتر نوردین۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ میں نے جھوٹ بولا تھا۔ اباجی کو مطمئن کردیا ہے میں نے کہ نوردین ہمارے ساتھ ہے اور ہم لندن میں گھوم رہے ہیں۔ سیر سپاٹا کررہے ہیں۔"

"یہ بھی جھوٹ ہے۔ سیر سپاٹا خاک کررہے ہیں ہم' پنگا لیے پھررہے ہیں۔" وہ بولا "آپ کہتے تو ایسی ایسی جگہ لے جاتا میں کہ آنکھیں کھل جاتیں آپ کی۔"

میں نے کہا "ہماری آنکھیں تم سے بہت پہلے کھل چکی ہیں بیٹے۔"

محسن نے کہا "کیا حرج ہے اگر شام سے رات تک ہم نوردین کو موقع فراہم کریں۔ تفریح بھی تو ضروری ہوتی ہے کام کے ساتھ۔"

میں نے کہا "کام ابھی ختم نہیں ہوا۔"

"اب کیا سوجھی ہے آپ کو؟" محسن بولا۔

"نئی نہیں سوجھی۔ میں نے الزبتھ سے کہا تھا کہ میں آؤں گا' یہی نہیں' میں نے کہا تھا کہ تمہارے شوہر کو گھر میں گھس کے ماروں گا۔"

"اور تو سچ مچ ایسا کرنا چاہتا ہے۔"

"یس۔ ایک تو ہم پٹھان' پھر مرد.... اور مجاہد۔ جو بات زبان سے نکلی وہ پتھر پر لکیر ہوگئی۔"

"کیسے ہوگا یہ کام؟ قسمت ایک حد تک ساتھ دیتی ہے اگر آپ بھوکے شیر کے منہ میں سر ڈالیں گے تو قسمت کی خوبی سے بچنے کی امید نہیں کرسکتے۔"

میں نے کہا "اسی لیے تو مشورے' حمایت اور مدد کے لیے آپ کو اپنے ساتھ رکھتا ہوں۔ آپ فرمائیں...."

"میرے فرمانے سے کچھ نہیں ہوگا اور نہ میرے مشورے کی کوئی اہمیت ہے" محسن نے خفگی سے کہا "تو وہی کرے گا جو تیرا دل کہے گا۔"

میں نے کہا "یہ الزبتھ بکنگھم پیلس میں نہیں رہتی۔ اس کا گھر بڑا ضرور ہے مگر کوئی فوجی قلعہ نہیں ہے۔"

"لیکن کل اس کے شوہر پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا۔ اس کے بعد حفاظتی انتظامات سخت کردیے گئے ہوں گے۔"

"حفاظتی انتظامات جارج کے لیے بھی بہت سخت تھے مگر ہم پھر بھی گھس گئے اور نکل آئے۔"

"یار' خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ اسے بہانہ نہیں بنانا چاہیے' نئی حماقت کا۔ ایک بار خدا نے بچالیا۔ ہم جس کام کے لیے آئے تھے وہ ہوگیا۔ اب واپسی کی فکر کرنی چاہیے۔ خواہ مخواہ مصیبت کو دعوت دینے سے کیا حاصل۔ الزبتھ سے جو بات کہی تھی اس پر عمل نہ کیا تو کوئی گناہ نہیں ہوگا۔ آدمی قسم کھا کے عہد کرے اور پورا نہ کرپائے تو کفارہ ادا کردیتا ہے۔ کیا یہ اس سے بھی زیادہ ہے؟ ادھر پیرس میں رابعہ اور گل ہماری واپسی کی منتظر ہیں۔ یہاں پولیس ہماری بُو سونگھتی پھررہی ہے۔ خدا کے لیے ابھی یہ خیال چھوڑ دے۔" محسن ایک دم پھٹ پڑا "میں ہرگز اس احمقانہ مہم جوئی میں تیرا ساتھ خوشی سے نہیں دے سکتا جس میں اپنے ساتھ سب کے لیے خانہ خرابی اور تباہی کے اسباب سامنے نظر آتے ہوں۔ آدمی رسک لیتا ہے یا نقصان بھی اٹھاتا ہے کسی مقصد کے حصول کے لیے۔ مالی اور مادی فائدہ نہ سہی۔ اصولی بات ہو تب بھی جائز ہے مگر یہ کیا بات ہوئی کہ آپ نے غصے میں یا مذاق میں زبان سے کچھ فرمادیا اور اب اس پر اپنی جان قربان ہو یا کسی اور کی' آپ کو پروا نہیں۔ آپ کی انا زیادہ اہم ہے۔"

میرے پاس محسن کی دلیل کے جواب میں شرمساری کے سوا کچھ نہیں تھا چنانچہ میں سُنتا رہا اور نوردین حیرانی سے مجھے دیکھتا رہا۔

جب محسن خاموش ہوا تو میں نے کہا "پھر کیا خیال ہے' چلیں؟"

نوردین نے پہلے مجھے اور پھر محسن کو دیکھا "کہاں چلیں؟"

"جہاں سے آئے تھے" میں نے کہا "تم اپنے گھر.... ہم اپنے گھر۔"

نوردین بولا "گویا آپ نے اپنا وہ ارادہ بدل دیا' ویری گڈ!"

میں نے سوچ کے کہا "بدلا تو نہیں۔"

"پھر...؟" نوردین نے کہا۔

"ملتوی کردیا ہے۔ فی الحال" میں نے کہا "ہم اپنے الفاظ پر قائم ہیں۔ ہم الزبتھ کے سرتاج عزیز کو اسی کے گھر میں گھس کے ضرور جھپیٹیں لگائیں گے لیکن وقت اور تاریخ کا فیصلہ بعد میں ہوگا۔ اچھا ہوا کہ ہم نے اپنے منہ سے ایسی کوئی بات نہیں نکالی تھی کہ ہم فلاں دن اتنے بج کر اتنے منٹ پر سررچرڈ گورڈن کی گوشمالی فرمانے کے لیے بنفسِ نفیس تشریف لائیں گے۔ ہماری بات ہوتی ہے پتھر پر لکیر پھر ہمیں جانا پڑتا سر ہتھیلی پر رکھ کے' اب قانونی گنجائش نکل آئی ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یار زندہ صحبت باقی۔ ہم اس نیک کام کے لیے پھر حاضری دیں گے لیکن..."

"لیکن کیا...." محسن بولا۔

"میں چوہدری دلاور سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"کہاں ہوگی اس سے ملاقات؟ یہ بھی بتادیں۔ اس نے آپ کو مدعو کیا ہے تو پتا بھی بتایا ہوگا" محسن نے کہا۔

"کیوں نہ ہم عزت سے اُٹھ جائیں" میں نے کہا "کھانے پینے اور بل ادا کرنے کے بعد ریسٹورنٹ کی میز پر قبضہ جمائے رکھنا..؟"

میری بات پوری ہونے سے پہلے جوان مگر سانولی مدراس کے لہجے میں بات کرنے والی ویٹرس نے سوال کیا "ائی یو۔ آپ کو کچھ اور مانگتا جی۔"

"مانگتا جی۔" میں نے اسی کے لہجے میں کہا "اجازت مانگتا جی آپ سے جانے کا واسطے۔ آپ اجازت نئیں دیتا تو ہم بیٹھتا جی۔ آپ کا دل ہم نئیں توڑ سکتا جی۔"

اس نے مسکرا کے اور ہاتھ جوڑ کے کہا "وڑکم" جس کا مطلب کچھ سلام جیسا ہی ہوتا ہے۔ یہ ہندوستانی ریسٹورنٹ نہ ہوتا تو ہم سے بہت پہلے دوٹوک لہجے میں میز خالی کرنے کے لیے کہہ دیا جاتا مگر ایک تو یہ رش کا وقت نہیں تھا اور بیشتر میزیں خالی پڑی تھیں' دوسرے انڈین ویٹرس جانتی تھی کہ انڈیا پاکستان میں لوگ ریسٹورنٹ میں گپ لگانے اور وقت گزارنے جاتے ہیں۔ ایک کپ چائے پی کے گھنٹا بھر بیٹھتے ہیں۔ بڑی اپنائیت سے جوتے اُتار کے اور پاؤں کرسی پر سمیٹ کر سگریٹیں پھونکتے ہیں اور ٹوٹے چائے کی پیالی میں بجھاتے ہیں اور پیک تھوکتے ہیں۔

ہم باہر آئے تو میں نے کہا "جناب محسن شیروانی صاحب۔ آپ کی وجہ سے آج میرا وہ رقیب روسیاہ' سوری..... روسفید بچ گیا لیکن میری دلی خواہش ہے کہ میں کوئے جاناں سے گزر کر دیکھوں۔"

"کیا دیکھیں گے وہاں.... درِ جاناں پر کھڑے دربان کو؟"

"اگر تھوڑی سی سراغرسی کی جائے تو پتا چل سکتا ہے کہ چوہدری دلاور کا ٹھکانا کہاں ہے۔ وہ الزبتھ کے گھر کے آس پاس ہی موجود نہ ہوتا تو رچرڈ گورڈن کے پیچھے پیچھے کیسے آتا۔ وہاں وہ ہمارا انتظار کررہا تھا۔"

"ہمارا نہیں۔ میرا کہیے۔"

میں نے کہا "اوکے۔ میرا انتظار کررہا تھا۔"

"مہاراجہ کنگال رائے آف ریاست قلاش پور بنا فٹ پاتھ پر ٹہل رہا تھا اور جیسے ہی رچرڈ کی رولز رائس کو روانہ ہوتے دیکھا۔ فوراً ہی ٹیکسی میں بیٹھ کے پیچھے چل پڑا۔ راجے مہاراجے کے جانے میں وہ تماشا نہیں بنا۔ کسی نے اس کے بے مقصد کھڑے ...

اعتراض نہیں کیا۔ اسے فوراً ٹیکسی بھی مل گئی۔"

میں نے کہا "یہی تو حیرانی کی بات ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔"

"پھر کیا ہو سکتا ہے؟"

"یہ ہو سکتا ہے کہ اس نے اس گھر کے سامنے یا دائیں بائیں اپنا مورچہ قائم کر رکھا ہو۔ جہاں سے ہر آنے جانے والے پر نظر رکھی جا سکے مگر وہ خود سب کی نظروں سے اوجھل رہے۔ رہی ٹیکسی کی بات تو میرے پاکستانی بھائی.... لندن میں بھی بے شمار پاکستانی اور انڈین ٹیکسی چلا رہے ہیں۔ وہ کسی کی ٹیکسی کنٹریکٹ پر بک کر سکتا ہے جو چوبیس گھنٹے اس کی تحویل میں رہے۔ ڈرائیور کو معاوضے سے غرض ہے۔ دلاور کی جگہ ہم بھی ہوتے تو دگنا معاوضہ پیش کر کے کسی بھی ڈرائیور کی خدمات حاصل کر لیتے۔"

"اور تیرا خیال ہے کہ وہ ابھی تک وہیں چشم براہ ہو گا ہمارے لیے۔"

"ہاں۔ خصوصاً اس دھمکی کے بعد جو میں نے الزبتھ کو دی تھی" میں نے کہا۔

"اس کا دلاور کو کیسے پتا چل سکتا ہے؟"

"جب وہ رچرڈ کی گاڑی میں بم نصب کر سکتا ہے' اس کو ٹھیک جگہ پر اڑا سکتا ہے۔ ظاہر ہے بم خود نہیں پھٹا تھا۔ اس میں ریموٹ کنٹرول فیوز تھا۔ دلاور نے خود وہاں پہنچ کے دھماکا کیا۔ ایک ایسی جگہ جہاں ہماری موجودگی کا سراغ پولیس نے لگا لیا تھا۔ پولیس وہاں پہنچ گئی تھی۔ چند منٹ پہلے ہم نے الزبتھ کو دھمکی دی تھی۔ چند منٹ بعد دھماکا ہوا تو الزام خود بخود ہم پر آ گیا۔ دلاور کو سب اطلاعات مل رہی ہوں گی کہ ہم نے کس طرح جارج سے ملاقات کی' وہاں سے نکلنے میں کیسے کامیاب ہوئے۔ ہم نے تو نہیں پڑھے مگر آج کے اخبارات میں یہ اسٹوری ہو گی۔"

نوردین نے سر ہلایا "میں نے پڑھی تھی۔"

"اچھا اور کیا تھا اس میں؟" میں نے کہا۔

"پولیس کا اعلان تھا کہ سکندر بخت اور محسن شیروانی نام کے دو افراد جو غیر قانونی سرگرمیوں کی بنا پر برطانیہ سے نکال دیے گئے تھے ناجائز طریقے سے لندن پہنچنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ اعلان میں تمہارا حلیہ بھی تھا اور محسن کا بھی اور یہ کہ تم وقار یوسف ایڈووکیٹ کا فرضی نام استعمال کر رہے ہو۔"

میں نے کہا "میری کوئی تصویر نہیں تھی؟"

"نہیں۔ شاید اب آ جائے گی" نوردین بولا۔

"ان کے پاس وہی پرانی تصویر ہو گی" میں نے کہا "جو ان کے ریکارڈ پر ہے۔"

"کیوں؟ اگر ہم ایک زیرِ حراست قیدی جارج کو چوہدری دلاور کی تازہ تصویر فراہم کر سکتے ہیں تو لندن پولیس اپنے لامحدود وسائل کے ساتھ ہماری تصاویر کیوں حاصل نہیں کر سکتی۔ خود چوہدری دلاور ان کا سب سے بڑا غائبانہ معاون اور مددگار ثابت ہو گا۔ وہ [illegible] سے ہماری تصاویر فراہم کر چکا ہو گا کہ یہ ہیں سر رچرڈ گورڈن پر قاتلانہ حملے کے ملزم۔"

میں نے محسن کی بات سے اتفاق کیا "کل صبح کے اخبار میں جو خبر آئے گی وہ زیادہ سنسنی خیز ہو گی کہ ایک پادری اور بدھ بھکشو نے اسپتال میں کتنی گڑبڑ پھیلائی۔ ہمیں بہت سے [illegible] نے دیکھا تھا۔ بہت سے نامعلوم مریضوں نے جن کے لیے [illegible] اجتماعی دعا کی تھی" محسن نے گویا یاد دلایا۔

مجھے ہنسی آ گئی "دروازے پر کھڑے سارجنٹ نے [illegible] کو ریانے اور ایمبولینس ڈرائیور نے۔"

"اچھا ہوا کہ نوردین ہمارے ساتھ نہیں تھا۔"

نوردین نے کہا "ساتھ تو تھا جی۔ میں ہی تو اپنے ماموں کو [illegible] تھا۔"

میں نے کہا "نوردین۔ کیا وہ یہودی پولیس کو مطلع نہیں کرے گا کہ وہ پادری اور بدھ بھکشو کون تھے اور کس کے ساتھ آئے [illegible] کل ہماری اصلی اور حالیہ تصاویر بھی شائع ہوں گی۔"

نوردین نے کہا "وہ پولیس کے چکر میں نہیں پڑے گا۔ [illegible] اسے بھی شریکِ جرم سمجھے گی۔"

"وہ تمہیں بلیک میل تو کر سکتا ہے۔"

"پھر میں بھی اسے بلیک میل کر سکتا ہوں" نوردین ہنسا "میں ایک اخبار کا چیف رپورٹر ہوں۔ اس پیشے میں جھک نہیں ماری میں نے۔"

میں نے اسے تھپکی دی "شاباش پتر نوردین۔ کیا ہے تمہارے پاس اس یہودی کا منہ بند رکھنے کے لیے؟"

"یہودی کی بیٹی۔ اس کی رنگین راتوں کی دلچسپ کہانیاں۔"

میں نے پوچھا "باتصویر کہانیاں؟"

"ہاں۔ کچھ باتصویر بھی ہیں۔ میں ایک بار بلیک میل ہوا [illegible] اس کے بعد میں نے خود کو بچانے کے لیے اس کے خلاف [illegible] اکٹھا کیا۔ اس کا پیچھا کیا' اس کے سچے عاشقوں سے ملا اور [illegible] انہوں نے بتایا وہ ٹیپ پر ریکارڈ کیا۔"

"تم بھی تو اس کے سچے عشق میں مبتلا ہو؟" محسن نے طنز [illegible]

"یہاں سچا عشق ایسے ہی ہوتا ہے جی۔" نوردین بولا "[illegible] لندن میں رہے ہیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے۔ میں خود کو [illegible] تو لندن میں نہ جانے کتنے بچوں کی ولدیت کے خانے میں [illegible] میرا نام آ جاتا۔ اس کے بعد اباجی کے جذبات کیا ہوتے۔"

میں نے کہا "وہی جو ایک قصاب کے دل میں قربانی [illegible] کے لیے ہو سکتے ہیں۔"

"اس سے بھی بدتر۔ وہ جو ایک تھانے دار کے دل [illegible] چور کے لیے ہو سکتے ہیں جو اس کے گھر میں چوری کرتے پکڑا [illegible] یا اس کی بیوی کی عزت لوٹتے" محسن نے کہا۔

نوردین نے محسن کی مثال کو زیادہ حقیقت پسندانہ [illegible]

"میں تو جان ہتھیلی پر رکھ کے عشق کرتا ہوں ہر بار لیکن [illegible] رہنے.... کا قائل ہوں۔ یہ بات لڑکیوں کو بعد میں پتا چلتی [illegible]

"آفرین ہے تم پر میرے پاکستانی بھائی۔ یہ بتاؤ کہ اب تم اس یہودی سے کیا کہو گے۔ کل جب وہ اخبار میں سب پڑھ لے گا۔"

نوردین نے کہا "اس کی تو مجھے فکر نہیں۔ میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے جھوٹ بول سکتا ہوں کہ کیا کہہ رہے ہو؟ میں کل کس کے ساتھ آیا تھا؟ میں تو پرسوں رات کو لیور پول چلا گیا تھا۔ سارا دن وہاں رہا۔ گواہی دینے والے بہت ہیں' وہ نہ رسید جاری کرتا ہے' نہ دستخط لیتا ہے۔ کیسے ثابت کرے گا کہ ہم نے وہاں سے پادری کا اور بھکشو کا لباس لیا تھا۔ وہ اپنی آمدنی بھی چھپاتا ہے اور خود کو ایسے چکروں سے بھی محفوظ رکھتا ہے۔ اس کو اچھی طرح معلوم ہے کہ میں کیا چیز ہوں۔ وہ مجھ سے بگاڑ مول نہیں لے گا۔"

"اصل مسئلہ ہے حاجی علم دین طوطی کا میرے پاکستانی بھائی۔ ان کے جلال سے اللہ تمہیں بچائے۔" میں نے کہا۔

"اور ان کی جو آکاری ہے" محسن بولا "میرا تو خیال ہے کہ اب ہمیں بھی ان سے دور رہنا چاہیے۔ پولیس وہاں ضرور پہنچ جائے گی۔"

میں نے کہا "ہاں۔ انہوں نے ہماری بہت مدد کی۔ ہم ان کے لیے کیوں پریشانی کے اسباب پیدا کریں۔ نوردین' تم اب شرافت سے اچھے بچوں کی طرح گھر جاؤ۔ حاجی صاحب تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ ہماری وجہ سے۔"

"اور آپ لوگ کہاں جاؤ گے؟"

میں نے اسے ایڈی کا پتا اور فون نمبر بتایا "کل صبح ہمیں لندن سے واپس جانا ہے۔ ہم طوطی صاحب سے بھی بات کر لیں گے۔ تم ہمارے بیگ کسی طرح ایڈی کے گھر پہنچا دو گے؟ اس میں ہمارے پاسپورٹ نہ ہوتے تو ہم پروانہ کرتے مگر پیرس سے ہم واپس کولمبو جائیں گے یا یہ [illegible] ہیں۔"

نوردین نے کہا "میں پہنچا دوں گا۔ آپ فکر ہی مت کرو لیکن ابھی تو بہت وقت ہے' کچھ شغل میلہ کرتے۔"

میں نے کہا "اس کے لیے تمہارے پاس زندگی پڑی ہے۔ ہمیں کیوں گنہگار کرتے ہو اپنے ساتھ۔"

نوردین رخصت ہوتے وقت خاصا جذباتی تھا "آپ سے بہت کچھ سیکھا ہے میں نے۔ میں آپ جیسا بننا چاہتا ہوں۔ کاش آپ میرے اباجی ہوتے۔"

میں نے کہا "شاید تمہاری والدہ کو اس سے اتفاق نہ ہو۔ تم کو ایسا بیان جاری نہیں کرنا چاہیے۔"

جب وہ چلا گیا تو میں نے حاجی صاحب کو فون کیا اور انہیں مختصراً آج کے دن کی ساری روداد سنا دی "نوردین نے کچھ نہیں کیا۔ آپ اسے کچھ نہ کہیں۔ اس نے بس ہمارا ساتھ دیا اور خوب دیا۔ وہ ماشاء اللہ سے بڑا ذہین اور سمجھ دار ہے۔"

"اچھا جی۔ آپ اس کھوتے دے پتر کی تعریف کرنے والے پہلے بندے ہو میرے پاکستانی بھائی!" حاجی صاحب نے خوش ہو کے کہا "پولیس سے تو میں نمٹ لوں گا' تم آ جاؤ۔"

میں نے کہا "نہیں طوطی صاحب! ہمارا کام ہو گیا۔ آپ کا بڑا احسان ہے ہم پر' آپ نہ ہوتے تو شاید...."

"ایسا مت کہو۔ اللہ تمہارا حامی و ناصر ہے۔ اس سے پہلے تم نے جو کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔ کفار کے دانت کھٹے کیے اور حق کا بول بالا کیا۔ وہ سب تائیدِ ایزدی سے تھا۔"

میں نے کہا "جارج کا معاملہ اب آپ کے سپرد۔ ہم پاکستان جا کے اسے قانونی طور پر گواہ کی حیثیت سے بلوانے کی پوری کوشش کریں گے۔"

"یہاں کے معاملات میں سنبھال لوں گا۔"

میں نے کہا "جارج کو زندہ رہنا چاہیے۔ اس کی گواہی بہت اہم ہے۔"

"زندگی اور موت پر تو میرا اختیار نہیں میرے پاکستانی بھائی مگر جارج کے لیے "طوطی" کی صدا اس نقار خانے میں جس کو ولایت کہتے ہیں۔ ایسے سنی جائے گی جیسے جنگل میں شیر کی دھاڑ۔ اس کی بے گناہی کا نقارہ میں ایسے بجاؤں گا کہ انگریزوں کا اندھا بہرا قانون بھی مجبور ہو گا۔ اس کی قانونی اور اخلاقی مدد کے لیے میں جہاد کروں گا تو میرا ساتھ دینے والے بھی کم نہیں ہوں گے۔ انشاء اللہ تمہارے اور پاکستان کے دشمن چوہدری دلاور ملعون کا انجام عبرت ناک ہو گا...."

ان کی باتوں نے مجھے بڑی امید دی اور میرا حوصلہ بڑھایا۔

ابھی شام کے چند گھنٹے بہ آسانی سیر و تفریح میں گزارے جا سکتے تھے مگر محسن کوئی رسک لینے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس کے مشورے پر میں نے داڑھی سے بھی نجات حاصل کر لی تھی کہ میرا حلیہ پولیس کے جاری کردہ حلیے سے مختلف نظر آئے۔ ہم نے رات کا اندھیرا پھیلنے تک دو گھنٹے مختلف مقامات پر گزارے۔ ایک جگہ کافی پی اور پھر پرانی یادیں تازہ کرنے کے لیے تین خاصے بدنام قسم کے نائٹ کلبوں میں گئے۔ آج وہ پہلے سے زیادہ بدنام تھے اور مشہور تھے مگر وہاں جو کچھ ہو رہا تھا ہمارے لئے ناقابلِ برداشت ثابت ہوا۔ شاید اس لیے کہ وقت بدل گیا تھا اور ہمارے جذبات بدل گئے تھے۔ ہم وہاں سے بدمزہ ہو کے نکل آئے۔

میں نے کہا "یار محسن۔ ایسا لگتا ہے کہ ہم بوڑھے ہو گئے ہیں۔"

محسن نے آہ بھری "واقعی۔ ورنہ کتنی ہیجان انگیز محسوس ہوتی تھی یہاں کی فضا۔ رگوں میں لہو کی گردش تیز ہو جاتی تھی۔"

"تو نے انہیں دیکھا۔ جو آج وہاں رقص کر رہے تھے یا دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہرے فرطِ جذبات سے تمتما رہے تھے۔ ہم اپنی عمر کے اس دور سے بہت عجلت میں گزر گئے۔ وقت تو بہت تھا ہمارے پاس۔"

"لیکن وقت پر ہمارا اختیار باقی نہیں رہا تھا" محسن نے کہا "ہم وقت سے پہلے جوان ہو گئے تھے۔ وقت سے پہلے بڑھاپا بھی آ [illegible]

تھا۔"

"بڑھاپا جسمانی عمر کا نام نہیں ہوتا۔ زندگی کے تجربات اور حادثات سے حاصل ہونے والی عقل کی پختگی سے سنجیدگی آتی ہے۔ ذمے داری کا شعور آتا ہے۔ کچھ لوگ ساری عمر گزار کے بھی بچے ہی رہتے ہیں۔ ذہنی طور پر..... اور کچھ ہماری طرح پچاس سال کے تجربات سے پانچ سال میں گزر جاتے ہیں..."

اس عرات ڈنر کے لیے ہم ٹیکسی میں ٹیمز کے کنارے وکٹوریہ ٹاور گارڈن گئے۔ کھانے سے پہلے ہم دریا کے کنارے کھڑے آتی جاتی کشتیوں اور لانچوں کو دیکھتے رہے۔ ان میں کچھ بحری جہازوں سے کم نہ تھیں۔ مسافر بردار لانچوں میں ایک سطح آب پر رواں ریسٹورنٹ بھی تھا جس کی رنگین جھلمل کرتی روشنیوں کے ساتھ موسیقی کی اور تفریح کرنے والوں کے قہقہوں کی آواز احساس دلاتی تھی کہ زندگی کتنی حسین ہے۔

آسمان پر چاند وقفے وقفے سے بادلوں کو چیر کے کچھ دیر فضا کو روشن رکھتا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے زمین کے اُجالے ماند پڑ گئے ہیں پھر کوئی بادل کا ٹکڑا چاند کو ڈھانپ لیتا تھا اور آسمان کے تاریک پس منظر میں شہر کے چراغ زیادہ روشن محسوس ہوتے تھے۔ بادل رفتہ رفتہ گہرے ہوتے جا رہے تھے اور کچھ دیر میں بارش شروع ہو سکتی تھی۔

میں نے ٹیمز کے پانی میں لرزاں اجالوں کے عکس کو دیکھتے ہوئے کہا "کتنا اچھا ہوتا اگر یہاں میرے ساتھ رابعہ ہوتی۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔ آپ کی جگہ گل کھڑی ہوتی تو یہی منظر کتنا زیادہ حسین ہو جاتا" محسن بولا۔

"وہ اس وقت کیا کر رہی ہوں گی؟" میں نے کہا۔

"بظاہر ہماری غیر حاضری کو نظر انداز کرتے ہوئے خوش و خرم نظر آنے کی اداکاری کر رہی ہوں گی۔ ہنس کھیل رہی ہوں گی بوبی کے ساتھ" محسن بولا۔

"لیکن اندر سے اُداس ہوں گی۔ انتظار کر رہی ہوں گی ہمارے واپس لوٹنے کا اور پریشان ہوں گی ہماری کوئی اطلاع موصول نہ ہونے پر۔"

"گل ضرور رو رہی ہوگی" محسن نے کہا۔

"رابعہ رات کو روتی ہوگی، تکیے میں منہ چھپا کے" میں نے کہا۔

پھر ہم دونوں ہنس پڑے اور پلٹ کے ریسٹورنٹ کے ٹیرس پر کھلی جگہ میں پڑی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ہمارے ساتھ والی میزوں پر ہر عمر کے لوگ تھے مگر اکثریت نوجوان جوڑوں کی تھی جن کے دلوں میں جذبات کے سمندر موجزن تھے۔ باہر کا ماحول انہیں بے خود کیے دے رہا تھا اور وہ سب کے درمیان ہوتے ہوئے بھی اپنی خلوت میں صرف ایک دوسرے کے ساتھ تھے۔ کسی کو پروا بھی نہیں تھی کہ وہ کیا کر رہے ہیں اور کیوں کر رہے ہیں۔ حسن و عشق کے ناز و نیاز کا یہ تماشا وہاں کے معاشرتی ماحول کا حصہ تھا۔

آرڈر دینے کے بعد میں نے تجویز پیش کی "کیوں نہ ہم ان کو اپنی واپسی کی اطلاع کر دیں، فون کر کے۔"

"اس سے کچھ حاصل نہیں۔ وہ نہیں آئیں گی فون پر بار بار کرنے۔"

میں نے کہا "چل شرط لگا لے، وہ آئیں گی۔"

"تو ہار جائے گا۔ وہ پہلے بھی نہیں آئی تھیں۔" محسن بولا۔

"پہلے کی بات اور تھی۔ پہلا دن تھا اس لیے غصے کا اظہار کر رہی تھیں۔ تین دن میں غصے کے سب بخارات نکل گئے ہوں گے۔ اب تو آہٹ پر کان لگائے بیٹھی ہوں گی۔ فون کی اطلاع پر ہی دوڑیں گی۔"

"چل لگا شرط۔ کیا کرے گا ہارنے والا؟"

میں نے سوچ کے کہا "وہ سارے کپڑے اُتار کے صرف ایک انڈرویئر میں ایک گھنٹے تک سیدھا کھڑا رہے گا۔"

"یہ بھی کوئی شرط ہے؟" محسن بولا۔

"باقی سب لوگ اس کے جسم پر اپنے پسندیدہ رنگ سے جو چاہیں کچھ بھی لکھنے کے لیے آزاد ہوں گے۔"

محسن نے غور کر کے کہا "من پسند رنگ..."

"ہاں۔ وہ تارکول بھی ہو سکتا ہے۔ اینمل بھی، کارپینٹ بھی جو آسانی سے دھویا نہیں جا سکتا پھر وہ اسی حالت میں ایک راؤنڈ پورے ہوسٹل کا لگائے گا۔"

محسن نے میرے ہاتھ پر ہاتھ مارا "منظور۔ چل پہلے فون کر لیں۔"

"پہلے طعام... ویٹرس پریشان ہوگی کہ آرڈر دے کر کہاں چلے گئے۔ لو وہ آ گئی" میں نے کہا۔

ہم سی فوڈ پر ہمیشہ اتفاق کرتے تھے۔ یہ ہمیں پسند بھی تھا اور اس میں حرام حلال کا خدشہ بھی نہیں تھا۔ اس ریسٹورنٹ کی خصوصیت یعنی اسپیشلٹی تھی اور اتنے عرصے بعد ہم نے اسے پہلے سے بہتر پایا۔ کسی بھی کاروبار میں گڈول بنانا مشکل ہوتا ہے مگر اس کو برقرار رکھنا زیادہ مشکل ثابت ہوتا ہے۔ خصوصاً اس وقت جب نام کی شہرت سے دولت کمانا آسان ہو جاتا ہے۔

کھانے کے بعد آئس کریم کی باری آئی تو محسن نے دوسری جگہ تجویز کی جو زیادہ دور نہیں تھی۔ اس آئس کریم پارلر کو ہمارے لندن کے دورِ طالب علمی میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ یہاں ہم نے سب سے زیادہ ملاقاتیں کی تھیں، عشق کیے تھے اور بے وفائیاں کی تھیں۔ اس علاقے میں یہ محبت کرنے والے نوجوان جوڑوں کی پسندیدہ جگہ تھی جو دریا کے کنارے ٹہلتے رہتے تھے یا اوپن ایئر میں بینچوں پر بیٹھے نظر آتے تھے۔ یک جان دو قالب ہوئے سے دل ملے ہوتے۔ ہاتھوں سے ہاتھ اور کبھی لب سے لب۔ آئس کریم سستی تھی اور اچھی تھی مگر اس سے بھی اچھی بات یہ تھی کہ آئس کریم کھا لینے کے بعد بھی کوئی یہ نہیں پوچھتا تھا کہ اب آپ بل ادا کر کے تشریف کیوں نہیں لے جاتے۔

میں نے اور محسن نے وہاں خود کو احمق محسوس کیا کیونکہ ہمارے سوا وہاں کوئی مردانہ جوڑا نہیں تھا۔ ہر مرد کے ساتھ کم سے کم ایک لڑکی تھی مگر وہ بھی اسپیئر وہیل کی طرح نہیں تھی کہ اپنی گاڑی پنکچر ہو تو کام آئے۔ عموماً یہ رنگ میں بھنگ ڈالنے والی کسی لڑکی کی بہن ہوتی تھی، سہیلی یا پھر رقیب۔

پیرس فون کرنے سے پہلے میں نے ایڈی کا نمبر ملایا "پہلے اس کا پروگرام تو پتا چلے، یہ کب جائے گا۔ شیڈول کے مطابق اسے کل ہی جانا ہوگا۔ صبح کسی وقت۔"

ریسیور اٹھانے والی عورت نے بڑی نرمی سے کہا "ہیلو۔"

میں نے کہا "کیا ایڈی گھر پر ہے۔ میں اس کا دوست ہوں۔"

"نہیں.... وہ تو گھر پر نہیں ہے۔"

میں نے کہا "کہاں گیا ہے اور کب آئے گا؟ تم اس کی بیوی ہو نا؟"

"ہاں اور تم وہ تو نہیں.... جو پیرس سے اس کے ساتھ آئے تھے؟"

"بالکل صحیح ہے تمہارا اندازہ...."

"ایڈی آج صبح پیرس چلا گیا۔ وہ تمہارے فون کا انتظار کرتا رہا تھا۔"

میں نے کہا "وہ چلا گیا مگر اس کو کل صبح جانا تھا۔ اس نے ہمیں یہی بتایا تھا۔"

"بعض اوقات ایمرجنسی میں اسے بریک نہیں ملتا۔ اس کا یہ ہفتہ ایسے ہی گزرے گا۔ وہ کل شام واپس آئے گا۔ پرسوں کا دن لوڈنگ میں گزرے گا اور اگلے دن اسے پھر جانا پڑے گا۔"

میں نے پریشانی سے کہا "یہ تو بڑی پرابلم ہو گئی ہمارے لیے۔"

"میں کیا کر سکتی ہوں تمہارے لیے۔ ایڈی نے کہا تھا کہ جو کچھ میں کر سکتی ہوں، ضرور کر دوں۔ ہاں اس نے ایک ٹیلی فون نمبر بھی دیا تھا۔ اس کا کوئی دوست ہے جو یہی کام کرتا ہے۔ وہ کل شام کو جائے گا۔ اسی کمپنی میں ہے اور تم اس پر بھروسا کر سکتے ہو۔"

"کیا ہم تمہارے گھر آ سکتے ہیں اس وقت" میں نے کہا "دراصل ہم کچھ مجبور ہیں۔ لندن میں مزید قیام ہمارے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے اور یہاں ایسی کوئی جگہ نہیں ہے جہاں ہم چھپ کے دو دن گزار سکیں۔"

"تم کسی وقت بھی آ سکتے ہو لیکن ہمارا یہ گھر بہت چھوٹا ہے۔ تم کو گیراج میں سونا پڑے گا۔"

"وہ کوئی مسئلہ نہیں۔ اس کے علاوہ..... ہم اس شخص سے بھی ملنا چاہیں گے جو ایڈی کا دوست ہے۔ ہم کوئی رسک نہیں لے سکتے۔ ہم یہ دیکھیں گے کہ کیا وہ بھی ایڈی کی طرح اعتبار کے قابل ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ تم یہاں اس سے ملاقات کر سکتے ہو" اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

"یہ تو بڑی گڑبڑ ہو گئی" میں نے کہا "ایڈی کا یہ دوست ہماری خاطر مشکل میں کیوں پڑے گا۔ ایڈی نے تو معاوضہ وصول کیا تھا۔"

محسن بولا "کیا پتا ایڈی نے اسے بھی معاوضے میں سے کچھ دے دیا ہو۔ خیر تو پیرس کے غریب نواز ہوسٹل کا نمبر ملا۔"

میں نے نمبر ملایا اور حسبِ توقع وہی نیم مردانہ نیم زنانہ اکھڑ لہجے والی آواز سُنی "کیا نمبر بتایا تم نے؟"

میں نے پھر کمرے کا نمبر بتایا "دو لڑکیاں ہیں وہاں۔ ایک بچے کے ساتھ ایک کا نام رابعہ، دوسری کا گل۔"

"سوری۔ وہ اس کمرے میں نہیں ہیں" اس نے فون رکھ دیا۔

میں نے دوبارہ نمبر ملایا "اس کمرے میں نہیں ہیں کا کیا مطلب ہے آخر؟ کیا وہ کسی دوسرے کمرے میں شفٹ کر گئی ہیں؟"

"انہوں نے وہ کمرا چھوڑ دیا ہے۔"

"کمرا چھوڑ دیا ہے؟ یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"وہی جو تم نے سُنا۔ اس کمرے میں ایک سیاہ فام جوڑا ہے اب۔"

میں نے کہا "دیکھو۔ وہ ایسے کمرا چھوڑ کے نہیں جائیں گی۔ جب تک ہم ان کے ساتھ نہ ہوں۔"

"شاید تمہیں خوش فہمی تھی۔ جو اب دور ہو جانی چاہیے۔ کل وہ کسی اور کے ساتھ چلی گئی ہیں۔"

میں نے اپنے غصے کو ضبط کیا "کیا جاتے وقت انہوں نے کچھ بتایا تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہیں۔ کوئی پتا چھوڑا تھا؟"

"نہیں۔ کم سے کم مجھے نہیں معلوم۔ پتا چھوڑا ہوتا تو رجسٹر میں بھی لکھا ہوتا۔ یہاں صرف یہ لکھا ہے کہ انہوں نے کتنی رقم ادا کی اور کمرا کس وقت خالی کیا۔" اس نے پھر فون بند کر دیا۔

میں نے محسن کی طرف پریشانی سے دیکھا "یہ کیا چکر ہے یار۔ وہ کہاں جا سکتی ہیں پیرس میں؟"

محسن نے نفی میں سر ہلایا "کہیں نہیں۔"

اسی وقت میری نظر دروازے کی طرف گئی۔ دو دروازوں سے چار پولیس مین بڑے جارحانہ انداز میں داخل ہو کے آگے بڑھ رہے تھے۔ انہوں نے ہر سمت سے یلغار کی تھی اور اپنی طرف سے فرار کے راستے بھی نہیں چھوڑے تھے۔ کوئی ایسی کوشش کرتا تو وہ اسے ہر طرف سے دبوچ لیتے۔ ان کے ہاتھوں میں ریوالور بھی تھے۔

میں نے بدحواسی کے مظاہرے سے اجتناب کرتے ہوئے اللہ کو یاد کیا کہ وہ بڑا مسبب الاسباب ہے اور بے نیاز ہے۔ بندہ اسے صرف مصیبت میں یاد کرتا ہے اور وہ پھر بھی اس کی سُن لیتا ہے۔

میں نے محسن سے کہا "ایسی شکل مت بنا جو پولیس کو خود متوجہ کرے۔"

محسن نے کہا "میری صورت تو ایسی ہے کہ یومِ حساب فرشتے بھی کہیں گے کہ جانے دو اسے جنت میں۔ گنہگار ہوتا تو صورت سے معصومیت ایسے نہ ٹپکتی جیسے چھتے سے شہد ٹپکتا ہے۔"

"سب غلط فہمی یہ ولایتی پولیس والے دور کر دیں گے۔"

پاکستانی بھائی۔ ابھی وقت ہے‘ آیت الکرسی یا دعائے قنوت کچھ پڑھ۔"

پولیس والے ایک ایک میز پر جاکے کچھ پوچھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے ہمارے ساتھ والی میز پر آکے کہا "ایکسکیوزمی سر‘کیا آپ نے اسے کہیں دیکھا ہے آج؟" اس نے ایک تصویر میز پر ڈال دی۔ میز پر بیٹھے ہوئے جوڑے میں ایک خمیدہ ناک اور کنجی آنکھوں والا مجنوں ٹائپ لڑکا تھا۔ اس کی لیلیٰ سیاہ فام تھی اور سوائے عمر کے ساتھ آنے والی جوانی کے‘جس کا طوفانی ریلا لباس کے ہر بند کو ہر سمت سے توڑ کر بہنے پر آمادہ تھا۔ اس میں حُسن تلاش کرنا ایسا ہی تھا جیسے شادی کے پچیس سال بعد اپنی بیوی میں اس محبوبہ کو دیکھنا جس کے عشق نے بقول شاعر‘ اس دل کو پری خانہ بنا رکھا تھا۔ مگر کہنے والے غلط نہیں کہتے کہ حُسن تو دیکھنے والے کی نظر میں ہوتا ہے۔

خمیدہ ناک اور کنجی آنکھوں والا اور اس کی سیاہ فام دلربا۔ جو اس لمحے اس کے لیے سارے زمانے سے حسین تھی‘ آئس کریم منگوانے کے بعد اسے کھانا بھولے ہوئے تھے۔ پگھل کے شربت ہو جانے والی آئس کریم شاید ان کی آتشِ شوق کی حدت سے گرم ہوکے اُبلنے والی ہوگی کہ پولیس نے ان کے رومانی جذبات کی دنیا میں یوں رخنہ اندازی کی جیسے انگریزی محاورے کے مطابق چینی کے برتنوں کی دُکان میں بیل۔

دوسری بار پوچھنے پر مجنوں کو ہوش آیا "کیا بات ہے۔ تم اتنا چلّا کے کیوں بات کر رہے ہو؟ اور ایسے میز پر چمچہ بجانے کی کیا ضرورت تھی؟"

پولیس مین نے تحمل سے کام لیا "اب بھی تم متوجہ نہ ہوتے تو میں یہ آئس کریم کا کپ تمہارے سر پر اُنڈیل دیتا‘ اس لڑکی کو دیکھو۔"

"کیوں دیکھوں میں اس لڑکی کو۔ جب کہ دنیا کی سب سے خوب صورت لڑکی میرے سامنے موجود ہے۔"

سیاہ فام حسینہ نے خوشی سے جھوم کے کہا "اوہ ڈارلنگ۔ جو بھی مجھ سے سچا پیار کرتا ہے‘ایسا ہی کہتا ہے۔"

"کیا تم نے یہاں اس لڑکی کو دیکھا ہے‘ آس پاس کہیں؟" پولیس مین بولا۔

لڑکے نے بدمزگی سے کہا "نہیں‘ اور دیکھنا بھی نہیں چاہتا۔"

پولیس والا سیاہ فام حسینہ کی طرف متوجہ ہوگیا "اور آپ نے مِس؟"

وہ ہنس پڑی "کون ہے یہ۔ تمہاری محبوبہ..... بھاگ گئی ہے کسی کے ساتھ؟"

"شٹ اَپ... جواب دو ہاں یا نہیں؟"

"نہیں" لڑکی ڈر کے بولی۔

پولیس مین دوسرے ٹیبل پر چلا گیا۔ وہاں بیٹھے ہوئے جوڑے میں لڑکا اور لڑکی دونوں نابالغ تھے۔ دس بارہ سال کا لڑکا بھی اس معاشرے میں اگر اپنی گرل فرینڈ کو ڈیٹ پر لے جاتا ہے تو یہ برا نہیں سمجھا جاتا۔ وہ اتنے کم عمر بھی نہیں تھے۔ لڑکا سولہ سترہ کا ہوگا۔ لڑکی شاید دو سال کم کی ہوگی سو وہ پہلے ہی ہنس ہنس کے بے حال ہو رہے تھے۔ نوجوان عاشق اپنی نوعمر محبوبہ کو کھلکھلاتے دیکھنے کے لئے بزرگوں کی احمقانہ سوچ اور بدحواسیوں کے قصے سُنا رہا تھا اور وہ اس لیے ہنس رہی تھی کہ ہر بے ہودہ لطیفے کے بعد اس کا پرستار کہتا تھا "جب تم ہنستی ہو تو لگتا ہے پھولوں کی بارش ہو رہی ہے" معلوم نہیں یہ جملہ اس نے کہاں سے یاد کیا تھا۔ کسی فلم سے یا رومانی افسانے سے۔

"اوہ یس‘ میں نے دیکھا ہے اسے....." وہ تصویر دیکھ کے بولا۔

پولیس آفیسر پُرامید ہوگیا "دیکھا ہے..... کہاں..... کب؟"

"اپنے خوابوں میں۔ اس جل پری کے ملنے سے پہلے۔"

جل پری نے پھر پھولوں کی بارش کی مگر پولیس آفیسر کو نہ لطیفہ پسند آیا اور نہ ہنسی‘ اس نے غرا کے کہا "تم نے پی ہے؟ کیا عمر ہے تمہاری؟"

"میں..... بالغ ہوں" نوجوان ساری شوخی بھول گیا۔

"کیا ثبوت ہے تمہارے پاس؟" اس نے چٹکی بجائی "شو دی پیپرز۔"

"پیپرز... ایسے تو کوئی کاغذات نہیں ہیں..... اس وقت۔"

نوعمر محبوبہ نے فوراً حواس باختہ عاشق کی مدد کی "لیکن آفیسر اس نے پی کہاں ہے جو تم بالغ ہونے کا ثبوت مانگ رہے ہو؟"

اس نے لڑکی کو دیکھا "ریئلی مِس! پھر یہ ایسی بہکی بہکی باتیں کیوں کر رہا ہے۔ جاگتے ہوئے خواب کی بات کرتا ہے۔ اگر یہ تم کو پسند کرتا ہے تو خواب میں ایسی خطرناک مجرم عورتوں کو دیکھنے کا کیا مطلب ہے‘ تم کو محتاط رہنا چاہیے۔"

پولیس مین آگے بڑھ گیا۔ اس کا مقصد انہیں پریشان یا ہراساں کرنا نہیں تھا۔ وہ خواب میں قلوپطرہ کو دیکھے یا پھولن دیوی کو‘ اسے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا مگر اسے سنجیدگی سے کیے جانے والے سوال کا غیر سنجیدہ جواب قانون سے مذاق کے مترادف لگا تھا اور اس نے فوراً واضح کر دیا تھا کہ اس کا نتیجہ خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے پاس قانونی اختیار تھا کہ وہ کسی نابالغ کو شراب پیتے دیکھے تو اسے گرفتار کرلے۔ یہ اس نظام کی خوبی تھی کہ پولیس اپنے اختیار کا جائز استعمال کرتی ہے۔ اگر اس لڑکے نے واقعی پی رکھی ہوتی تو اسے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔ پہلے اس کو شراب دینے والے لپیٹ میں آتے‘ پھر اس کے ماں باپ کی شامت آتی۔ گھر میں دعوت میں یا باہر۔ جو نابالغ ہے اسے شراب نہیں ملتی اور یہ صرف قانون کی ذمّے داری نہیں‘ معاشرہ بھی یہ ذمّے داری قبول کرتا ہے۔ چنانچہ بار میں بھی کسی سے عمر کا ثبوت طلب کیا جا سکتا ہے۔ ثبوت نہ ہو تو کم عمر نظر آنے والے کو شراب نہیں ملتی۔ اس کے برعکس اپنا ملک بھی ہے جہاں بحیثیت مسلمان ہم پر ویسے ہی شراب حرام ہے مگر حکومت کو امتناعِ شراب کا قانون نافذ کرنا پڑا۔

اس کے باوجود یہ حرام شے اُسے دستیاب ہے جس کے پاس قوتِ خرید ہے۔ جائز ناجائز طور پر تیار کردہ زہریلی شراب سے لے کر امپورٹڈ یعنی اسمگل کی ہوئی اعلیٰ ولایتی شراب تک۔ اپنے وطن میں سب کچھ بے پیار ہے۔

میں اور محسن اب خاصے مطمئن تھے کہ معاملہ ہماری گرفتاری کا نہیں‘ پولیس کو کسی مجرمہ کی تلاش ہے۔ پھر بھی دل میں ایک چور تھا جو خوف کا لبادہ اوڑھے بیٹھا تھا کہ کہیں پولیس کے ساتھ بھی وہ معاملہ نہ ہو کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے۔ مجرمہ کا سُراغ نہ ملے مگر دو نامی گرامی دہشت گرد ہاتھ آجائیں۔ خیر سے دو دن میں ہم نے اپنا نام بہت روشن کیا تھا کچھ تو ہم خود بھی اپنے مصائب کے ذمّے دار تھے۔ ناجائز طور پر چور دروازے سے برطانیہ کی حدود میں داخل ہونا ہی کم سنگین جرم نہ تھا۔ حکومت جو ہماری صورت دیکھنے کی روادار نہ تھی بہت پہلے کہہ چکی تھی کہ جاؤ اپنی شکل گم کرو اور خبردار جو پھر ادھر کا رُخ کیا۔ پھر تھوڑا سا ہنگامہ جارج سے ملاقات کے چکر میں ہوگیا تھا اس میں ہمارے ارادے کو دخل نہیں تھا مگر لیڈی الزبتھ کو فون پر دھمکی دینے کی حماقت ہم نے شوقیہ فرمائی تھی۔ رہی سہی کسر چوہدری دلاور نے پوری کردی تھی کہ سر رچرڈ گورڈن کی گاڑی میں بم کا دھماکا کرا کے ہمارے نام سے منسوب کروا دیا تھا چنانچہ اب ہم مستند اور مسلمہ دہشت گرد تھے۔ پولیس کہیں بھی اور کسی بھی جگہ ہمیں شناخت کر سکتی تھی۔

پولیس آفیسر نے ہماری میز پر آکے کہا "یو ٹو۔ تم نے اسے کہیں دیکھا ہے۔ غور سے دیکھ کے بتاؤ۔"

میں نے ٹیمز کی موجوں پر رواں روشن سفینے کو دیکھا "ایسا تو نہیں‘ لیکن ایمسٹرڈم میں اس سے ہزار درجہ خوب صورت فلوٹنگ ریسٹورنٹ ہے۔"

اس نے تصویر کو میرے سامنے لہرایا "میں اس عورت کی بات کر رہا تھا۔"

میں نے تصویر لے کر تیس سال سے زائد عمر کی اس عورت کا چہرہ دیکھا جو اتنی حسین تھی کہ میں مبہوت رہ گیا۔ اس کی مسکراہٹ میں ساحرانہ دلکشی تھی اور اس کی حیرت خیز معصوم آنکھوں میں ایک سوال سا محسوس ہوتا تھا کہ دیکھو‘ کیا میں خطرناک مجرم ہو سکتی ہوں؟ مگر پولیس ایسا سمجھتی تھی تو ایسا ہی تھا۔

ایک آہ بھر کے میں نے تصویر واپس کردی "کاش میری آنکھوں نے اسے دیکھا ہوتا۔ پھر میں اسے کیسے بُھلا سکتا تھا‘ میں تو فوراً اس پر فریفتہ ہو جاتا۔"

اب محسن نے تصویر ملاحظہ کی اور ماتھے پر شکن ڈال کے بولا "یہ سو وہی نہیں ہے؟..... وہی...؟"

میں نے کہا "وہی کون؟" اور پولیس آفیسر نے سر ہلا کے میرے سوال کی تائید کی یعنی وضاحت فرمایئے۔

"وہ اپنی مارلن منرو..... نہیں صوفیہ لارین..... جو سن فلاور میں تھی..... اور ٹو ویمن میں... اوہ آئی لو یو صوفیہ۔"

پولیس آفیسر نے تصویر اس سے چھین لی اور ہمیں گھورتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ "کیا سارے لندن کے احمق‘ پاگل اور مسخرے یہاں جمع ہوتے ہیں" وہ بولا۔

میں نے اور محسن نے فرنچ میں احتجاج کیا "کیا لندن ہم اس لیے آئے ہیں کہ یہاں پولیس ہمیں احمق‘ پاگل اور مسخرا کہے۔ پیرس میں ایسا ہوتا....."

پولیس آفیسر رُک گیا اور ہمیں دیکھنے لگا۔ ایک ویٹریس نے اسے انگلش میں سمجھایا کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں تو اس نے بُرا سا منہ بنایا "ابھی یہ مجھ سے انگلش بول رہے تھے۔ انہیں کسی مترجم کی ضرورت نہیں تھی۔ خیر‘ انہیں بتادو کہ اتنے سیریس نہ ہوں۔ انہوں نے مذاق کیا تھا مجھ سے۔ کیا میں ان کو جو کہ کچھ بھی نہ کہوں؟"

میں نے محسن سے ہاتھ ملایا "مبارک ہو۔ تو گرفتار ہونے سے بچ گیا۔"

محسن نے آہ بھر کے نفی میں سر ہلایا "نہیں دوست۔ میں گرفتار ہوگیا۔ اس کے دامِ حُسن میں۔ قسم اللہ کی کیا جادو تھا اس کی آنکھوں میں۔ اس کی مسکراہٹ میں اور کے لب و رخسار میں۔"

"واللہ کیا ملک ہے" میں نے کہا "ہر ولایتی چیز کی اسی لیے تو مانگ ہے دنیا میں۔ مجرم بھی کیا طرح دار ہے۔"

"جی چاہتا ہے اس کے ساتھ میں بھی پکڑا جاؤں" محسن نے میری بات کاٹ کے کہا "اور جیل میں ساری عمر اس کے ساتھ شاد و آباد رہوں۔"

میں نے کہا "معلوم نہیں جرم کیا تھا اس کا۔ ڈاکا ڈالا تھا کسی کی تجوری پر یا عقل و ہوش پر یا قتل کیا تھا کوئی۔"

محسن بولا "قتل تو اس نے بہت کیے ہوں گے۔ بقول شاعر۔ ناوک انداز جدھر دیدۂ جاناں ہوں گے۔ نیم بسمل کئی ہوں گے کئی بے جاں ہوں گے۔"

میں نے کہا "بکواس بند کر اپنی ورنہ میں تجھے قتل کرکے جیل چلا جاؤں گا اس کے ساتھ۔ اور یہ بھی مت بھول کہ صرف ایک پولیس مین کی نظر چوک گئی۔ اس کے ساتھ تین اور بھی ہیں۔ جن کی چھ آنکھیں ہیں۔"

"آٹھ آنکھیں" محسن نے میری تصحیح کی "ایک عینک والا ہے۔ مگر میں آپ سے متفق ہوں‘ ہمیں یہاں سے دوڑ جانا چاہیے۔"

"دوڑ کے ہم کہاں جا سکتے ہیں" میں نے کہا "طوطی کے نقار خانے کا رُخ کرنا بھی خطرے سے خالی نہیں۔ آج رات پولیس وہاں پہنچ سکتی ہے۔"

"ہم ایڈی کے گھر جا سکتے ہیں" محسن نے کہا "بل ادا کرنے کے بعد۔"

ایک نوعمر دُبلی پتلی اسکول گرل ٹائپ لڑکی نے بل پیش کیا۔ مجھے اس کی مظلوم صورت دیکھ کے ہمدردی سی محسوس ہوئی "تم یہاں مجبوراً کام کرتی ہو یا شوقیہ؟" میں نے وہ سوال کیا جو ہر جذباتی

تماش بین طوائف سے بھی کرتا ہے۔

"اس سے کوئی فرق تو نہیں پڑتا" وہ بولی "کیا دنیا میں کوئی کام واقعی ایسا ہے جو آدمی شوقیہ کرتا ہو۔ میرا مطلب کام سے ہے۔ شغل یا شوق سے نہیں اور پھر ایسا کام۔ ہر شخص مجھے مدعو کرتا ہے کہ جب فراغت ہو تو میرے ساتھ چلو‘ میں کس کس کو بتاؤں کہ رات کو واپس جا کے مجھے کتنے کام ہوتے ہیں۔ میں باپ کے لیے شراب لے کر جاتی ہوں‘ بچی کھچی.... اور کچھ چوری کی۔ ماں کے لیے دوائیں۔ وہ بھی بہت پیتی تھی غالباً اسے جگر کا سرطان ہو چکا ہے۔ پہلے وہ مر جائے گی پھر اسی طرح باپ دنیا سے رخصت ہو گا۔ اس کے بعد مجھ پر کوئی ذمے داری نہیں ہو گی۔"

میں نے مزید ہمدردی کے ساتھ کہا "آئی ایم سوری۔ تمہاری یہ عمر اور اتنی ذمّے داریاں۔ کیا بھائی نہیں ہیں تمہارے؟"

وہ تلخی سے مسکرائی "ہیں‘ جیل میں۔ وہ مجھ سے کہتے ہیں کہ مرنے دو ماں باپ کو‘ تم کیوں مرتی ہو ان کے لیے۔ کاش میں ان کی طرح سوچنے کے قابل ہوتی۔ صبح مجھے اسکول جانا ہوتا ہے۔ شام سے آدھی رات تک یہاں سے جو ملتا ہے اسی سے سارے اخراجات پورے ہوتے ہیں۔"

میں نے اسے دس پاؤنڈ کا نوٹ دیا تھا اور آئس کریم کا بل ایک پاؤنڈ بھی نہیں تھا مگر اس لڑکی نے محسن کو بھی اتنا جذباتی کر دیا تھا کہ اس نے میری طرف سے کہہ دیا "باقی رقم رکھو... تمہارے کام آئے گی ڈیئر گرل۔"

اس کی آنکھوں میں حیرانی نمودار ہوئی "نو پاؤنڈ..."

میں نے کہا "اور ہم یہ بھی نہیں کہیں گے کہ یہاں سے فارغ ہو کے ہمارے ساتھ چلو۔ ہم جا رہے ہیں اور پھر کبھی یہاں نہیں آئیں گے‘ گڈ نائٹ۔"

"گڈ نائٹ سر" اس نے احسان مندی کے جذبات سے مغلوب ہو کے کہا۔

صدمہ مجھے اس وقت ہوا جب ساتھ والی میز پر سے کسی نے پنجابی میں کہا "اوئے بھولے بادشاہو۔ لندن وچ رہ کے دی اکل نئیں آئی...."

میں نے ایک خوش شکل‘ خوش لباس سردار جی کو دیکھا جن کے ساتھ غالباً ان کی دھرم پتنی تھی۔ میں نے کہا "کوئی غلطی کی ہم نے؟"

وہ ہنسے "دس پاؤنڈ دے دیے مفت میں اور پوچھتے ہو غلطی کی؟ یہ کہانی تو ہر روز سُناتی ہے یہ لڑکی۔ کوئی نہ کوئی تم جیسا بے وقوف ایسا ہی سوال کر بیٹھتا ہے۔ ہم لوگ جذبات سے مار کھاتے ہیں۔ وہ بڑی اچھی ایکٹنگ کرتی ہے اور ہم اسے سچ سمجھ لیتے ہیں۔ اور یہاں تو ہر لڑکی کام کرتی ہے۔ اسکول کی ہو یا کالج کی۔ اپنا خرچہ نکالتی ہے اور ان کے لیے جائز ناجائز کام کا کوئی مسئلہ نہیں۔"

میں نے خفت سے کہا "یعنی‘ یہ سب جھوٹ تھا۔ آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

سردار جی نے اپنی گھر والی کو دیکھا "بول نا بے وقوف کی بچی!"

سردارنی نے نظر جھکا کے کہا "میں نے اس کو سو پاؤنڈ دے دیے تھے۔"

"جیسے حرام کی کمائی ہو میری!" سردار جی بولے "اگلے دن میں اکیلا ادھر آیا۔ وہی سوال کیا جو تم نے کیا تھا۔ اور اس نے سٹوری سُنائی تو میں نے کہا کہ کل تو سو پاؤنڈ ٹھگ لیے تھے میری گھر والی سے۔ آج سو تھپڑ ماروں گا۔ اگر بکواس کی۔ سب پتا ہے مجھے تیرا۔"

میں نے اس لڑکی کو دیکھا۔ وہ مجھ سے بہت دور ایک ٹیبل سرو کر رہی تھی۔ شاید کسی اور ہمدرد سے اپنی مظلومیت کا خراج وصول کر رہی تھی۔ اس سے نو پاؤنڈ واپس لینا یا اسے جھوٹ پر شرمندہ کرنے کی کوشش میں وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

سردار جی نے کہا "چلو دفع کرو جی۔ آؤ بیٹھو اِدھر ہمارے ساتھ۔ آئس کریم کھاؤ تے غم بُھلاؤ۔"

میں نے کہا "شکریہ۔ ہم کھا چکے ہیں۔ آئس کریم اور دھوکا۔"

"اِک ہور سہی" انہوں نے ہمارا ہاتھ پکڑ کے بٹھا لیا "تم تو مجھے اپنے لہور کے لگدے ہو۔"

میں بیٹھ گیا "آپ صورت دیکھ کے بتا دیتے ہو؟"

محسن نے کہا "اور مجھے لگتا ہے کہ آپ لہور سے بچھڑے ہوئے ہو۔"

سردار جی نے ایک آہ بھری "ہاں بھولے بادشاہو۔ اپنا لہور پرایا ہو گیا۔ ایک بار میچ دیکھنے کے بہانے گیا تھا۔ اپنی جند کور کا کوٹھا بھی ساتھ ہی تھا۔ کنڈ ٹپ کے آجاتی تھی۔"

سردارنی نے شرما کے کہا "اب ان کو بھی بتاؤ گے سب باتیں؟"

ہماری ساری گفتگو پنجابی میں چل رہی تھی۔ سردار جی نے قہقہہ مارا "او نیک بختے۔ ان کو کیا‘ ساری دنیا کو سُناوں گا۔"

میں نے معذرت کی "سردار جی! ہم ضرور سُنتے آپ کی اسٹوری مگر ہمیں جانا ہے واپس لہور۔"

"آج ہی؟ آج تو بڑا مشکل ہے۔ لو پہلے تماشا دیکھو۔ وہ پھر آ رہا ہے ادھر۔"

لڑکی ہماری میز پر آ کے جھکی "آپ کو کچھ اور چاہیے؟"

سردار جی نے کہا "ہاں۔ چار آئس کریم.... اور نو پاؤنڈ واپس۔"

اس نے سپاٹ لہجے میں کہا "نو پاؤنڈ.... کیسے نو پاؤنڈ؟"

میں نے کہا "جو تم نے مجھے اپنی جھوٹی کہانی سُنا کے ٹھگے تھے‘ ابھی..."

وہ اُلٹی میرے پیچھے پڑ گئی "یہ تم کیا کہہ رہے ہو مسٹر، تمہاری شکل نہیں دیکھی پہلے۔ تمہاری ہمت کیسے ہوئی مجھ پر گھٹیا الزام لگانے کی؟"

ایک تنومند حبشی جوان جو اپنے اطوار سے خود کو بدمعاش ٹائپ ظاہر کرنا چاہتا تھا چیونگم چباتا اور زورِ بازو کی نمائش کے لیے ہاتھ سینے پر باندھے سامنے آ کھڑا ہوا "کیا بات ہے بے بی!" اس نے الفاظ بھی چبا چبا کے کہا۔

"یہ شخص اگر شرابی نہیں ہے تو پاگل ہے۔ بڑی بے ہودہ بات کی ہے اس نے مجھ سے...." لڑکی نے باقاعدہ شکایت کی۔

میں اُٹھ کھڑا ہوا "اگر تم اس کے حمایتی بن کر آئے ہو تو بہتر ہے صحیح سلامت واپس لوٹ جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ تمہیں اسٹریچر پر لے جانا پڑے۔"

سردار جی بھی کھڑے ہو گئے "یا پھر پولیس کی گاڑی میں۔"

حبشی نے سردار جی کو دھکا دے کر دوبارہ کرسی پر بٹھا دیا "مجھے دھمکی دیتے ہو پولیس کی...." اس کا باقی جملہ فحش تھا۔

میں نے تاپ تول کے اس کو ایک مکّا رسید کیا۔ مُکّا اس کے جبڑے پر پڑا اور وہ گھوم کے ایک میز پر گرا۔ میز اُلٹ گئی۔ لڑکی نے چیخ ماری۔ دوسری میز پر بیٹھے ہوئے لوگ نہ بدحواس ہوئے نہ پریشان۔ کاؤنٹر کے پیچھے سے سوٹ والا منیجر ٹائپ شخص ہماری طرف لپکا "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

حبشی پر چودہ طبق روشن ہو گئے تھے مگر وہ ایک بار پھر اُٹھ کے میری طرف بڑھا۔ اپنے لبوں پر آ جانے والا لہو آستین سے صاف کر کے اس نے مجھے گالی دی۔

میں نے کہا "آگے آؤ۔ زبان سے نہیں ہاتھ سے بات کرو۔"

"چھوڑو یار کر۔ یہ بدمعاش لوگ ہیں" لڑکی نے چلّا کے کہا۔

مگر یار کر مشتعل ہو گیا تھا‘ اپنی بدمعاشی کا بھرم رکھنے کے لیے اس نے لڑکی کو ایک طرف کر دیا "میں مار ڈالوں گا انہیں..."

میں نے دوسرا مُکّا اس کے پیٹ میں مارا۔ وہ اناڑی تھا۔ اس نے جو ہاتھ گُھمایا تھا وہ میں نے غوطہ مار کے بے مصرف کر دیا تھا۔ وہ بلبلا کے دُہرا ہوا۔

لڑکی رونے کے قریب ہو گئی "یہ لو۔ یہ لو اپنے نو پاؤنڈ۔ اور دفع ہو جاؤ۔"

سردار جی نے کہا "چار آئس کریم!" اور سردارنی کی طرف دیکھ کے ہنسے۔

منیجر نے صورتِ حال کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے مداخلت کی "شٹ اَپ۔ تم فوراً معزز گاہکوں سے معافی مانگو اور پارکر....! تم جا کے اپنی شکل ٹھیک کرو۔ تمہارا کام بدمعاشی کرنے والوں سے نمٹنا ہے۔ شریف لوگوں کو پریشان کرو گے تو میں تم دونوں کی چھٹی کر دوں گا۔"

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ پولیس نہیں آئی۔ منیجر نے معاملہ رفع دفع کرا دیا۔ وہ بھی غالباً ہنگامی صورت میں سلامتی کونسل والا کردار ادا کرنے کا ماہر تھا۔ ہنگامہ ختم ہوتے ہی لوگ بھی اپنی باتوں میں مصروف ہو گئے۔ منیجر کی بات سب نے سُنی تھی اور سمجھ لیا تھا کہ اختلاف معمولی تھا۔

سردار جی نے میری پیٹھ پر ہاتھ مارا "اوئے بلّے بلّے جوانا۔ دل خوش کیا تُو نے میرا یار۔ ثابت کر دیا کہ تُو ہے سکندر اعظم۔"

میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا "سکندر اعظم تو بہت بڑا فاتح تھا۔ ایسی لڑائیاں نہیں لڑتا تھا۔"

سردارنی نے مجھے بڑی میٹھی مسکراہٹ سے نوازا "ہمیں غیر مت سمجھو جی۔ میں نے ہی آپ کو پہچانا تھا پہلے۔"

سردار جی نے سرہلایا "جند کور کی نظر ایسے ہی تاڑتی ہے بندے کو‘ اب تو خیر سے بیوی ہے میری اور کوئی خطرے والی بات نہیں۔ شادی سے پہلے ملی ہوتی تم سے تو پھر میرے ہاتھ نہ آتی۔ اس نے ہو جانا تھا مسلمان بھی..."

جند کور نے جس کا نام غالباً راجندر کور ہو گا خفگی سے کہا "کیا بکتے جا رہے ہو۔"

لڑکی آئس کریم لے کر آئی تو زیادہ دُکھی لگ رہی تھی مگر یہ دکھ حقیقی تھا۔ "تم نے پارکر کو بڑی بے رحمی سے مارا۔"

میں نے مسکرا کے کہا "نہیں۔ میں نے خاصی رحم دلی سے کام لیا ورنہ کل اس کی تدفین ہوتی۔ تم نے بدلہ لینے کے لیے آئس کریم میں زہر تو نہیں ڈالا؟"

سردار جی نے قہقہہ مارا "تمہارے چالاک منیجر نے اسے بچا لیا۔"

لڑکی نے جاتے جاتے مجھ پر ایک قہر بھری نگاہ ڈالی "دس از آن دی ہاؤس" اس کا مطلب تھا کہ آئس کریم خیر سگالی کے جذبات کا مظاہرہ کرنے کے لیے ہماری طرف سے بلا معاوضہ۔

سردار جی نے کہا "ہم کل بھی آئیں گے۔ مفت کی کھانے۔"

راجندر کور نے مجھے مخاطب کیا "آپ اِدھر کب آئے جی سکندر صاحب۔"

میں نے انکار کرنے کا کوئی فائدہ نہ دیکھا۔ "دو دن پہلے لیکن پلیز مجھے یہ بتائیں کہ آپ مجھے کیسے جانتی ہیں۔"

"پُرانی بات ہے جی" سردار جی نے مجھے آنکھ ماری "تم ڈھاکا میں تھے اور مجھے آرڈر تھا تم کو پکڑنے کا۔ بلکہ گولی مارنے کا۔ میرا افسر تھا کرنل رام چند۔ اس نے تو گھیر لیا تھا تم کو مگر تم جیسے نکلے تھے۔ واہ واہ... میں تو حیران رہ گیا تھا۔ سچی بات ہے کہ معاملہ نوکری کا تھا ورنہ میں خود تمہیں نکال دیتا۔"

محسن نے کہا "یہاں آپ کیا کریں گے ہمارے ساتھ؟"

"یہاں کیا کرنا ہے ہم نے۔ تم کو گھر لے جائیں گے۔ کچھ خاطر داری کریں گے اور جند کور باتیں کرے گی تم سے۔ ہماری خیر ہے‘ ہم نے نوکری چھوڑ دی اور ادھر آ گئے۔ تم سے نہ پہلے اپنی دشمنی تھی نہ اب ہے مگر یہ جند کور۔ اس نے تمہارے ساتھ کچھ پُرانا حساب برابر کرنا ہے۔"

میں نے مُردہ آواز میں کہا "پُرانا حساب... معاف نہیں ہو سکتا؟"

"بالکل نہیں ہو سکتا" سردار جی نے کہا "میں خود جاننا چاہتا

ہوں کہ تم یہاں کیا کر رہے ہو۔"

میں نے کہا "یہ ایک نجی نوعیت کا دورہ تھا۔ ہم نے پُرانے دھندے سب چھوڑ رکھے ہیں سردار جی۔"

وہ ہنس ہنس کے بے حال ہو گیا "سُن جند کورے، کہتے ہیں کہ پُرانے کرتوت چھوڑ دیے ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے بھلا کہ بھینس کھے میں نے دودھ دینا چھوڑ دیا ہے۔ آج کل میں انڈے دیتی ہوں۔"

میں نے محسن کی طرف اور محسن نے میری طرف دیکھا۔ ابھی تک واضح نہیں ہوا تھا کہ ایک پُرانا انڈین آرمی آفیسر ہمارے ساتھ بلّی چوہے والا کھیل کیوں کھیل رہا ہے۔ وہ واقعی دوست ہے یا دوستی کے بہانے دشمنی کا جال پھیلانے میں مصروف ہے۔ اس مظلوم صورت لڑکی کی دکھ بھری کہانی کا جھوٹ کھل جانے کے بعد سردار جی کی بات بھی اعتبار کے قابل نہیں لگتی تھی۔ کیا پتا یہ بھی اداکار ہو۔

میں نے اس سے صاف صاف بات کرنے کا فیصلہ کیا "دیکھو سردار جی۔ یہ اتفاق ہے کہ ہم آج لندن میں نظر آ رہے ہیں۔"

"اتفاق نہیں، بدقسمتی" محسن نے گویا تصحیح کی۔

"ہم یہاں غیر قانونی طور پر آئے تھے" میں نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے" سکھ بولا۔

"لیکن ہم نے یہاں کوئی گڑبڑ نہیں پھیلائی۔"

"یہ جھوٹ ہے" وہ بولا "یہ میں نہیں کہتا۔ پولیس کہتی ہے۔"

"پولیس کہتی ہے؟ آپ کا رابطہ پولیس سے ہے؟"

اس نے اقرار میں سرہلایا "براہِ راست تو نہیں مگر ہے۔"

"پھر میں یہ واضح کر دوں کہ میرا گرفتار ہونے کا کوئی ارادہ نہیں، آپ تو خود ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ ہم ہر طرف سے محصور ہو جانے کے باوجود کیسے نکل گئے تھے؟"

سردار نے تعریفی انداز میں سرہلایا "ایسے نکل گئے تھے جیسے.... سمجھو کہ چھاننی.... میں سے چائے نکل جاتی ہے۔"

"تو یہاں بھی یہ تماشا پھر دیکھیں گے۔ اگر کسی نے ہمارا راستہ روکنے کی بے وقوفی کی" محسن بولا۔

"اوئے بے وقوفی تو تم کر رہے ہو جو ادھر بیٹھے آئس کریم بھی کھا رہے ہو اور مارپیٹ بھی۔ شکر کرو ابھی پولیس آئی تھی تو انہوں نے تم کو پہچانا نہیں۔ لیکن کل صبح تمہاری خیر نہیں۔ بچّے بچّے کو پتا چل جائے گا کہ تم کتنے بہادر ہو۔ پھر کیا کرو گے جب ہر اخبار میں تمہاری تصویر ہو گی اور ہر بندے کے ہاتھ میں اخبار ہو گا۔"

میں نے کہا "آپ.... آپ کو کیسے معلوم؟"

"یار بس معلوم ہو گیا۔ اپنے بھی سورس (SOURCE) ہیں اُدھر۔ کدھر قیام ہے خیر سے؟"

میں نے کہا "ایک پاکستانی ہیں۔ ان کا اخبار ہے صدائے طوطی۔"

وہ پھر ہنس ہنس کے دُہرا ہو گیا "وہ پاگل دا پتر۔ بہت اچھی طرح جانتا ہوں میں اسے۔ حاجی علم دین طوطی۔ ایڈیٹر بنا پھرتا ہے۔"

"وہ ایڈیٹر ہیں" میں نے کہا "اور اس نے ہماری بہت [illegible] ہے، اپنے محسن کے خلاف میں کچھ سُننے کو تیار نہیں۔"

"بڑا پکّا پاکستانی ہے۔ پاکستان سے تو کوئی سانپ بچھو [illegible] آجائے تو وہ کہے گا کہ خوش آمدید میرے پاکستانی بھائی۔ مجھے [illegible] آئے ہو نا؟ بسم اللہ۔"

میں نے حیرانی سے کہا "آپ تو بہت زیادہ جانتے ہیں ان کو۔"

اس نے اقرار میں سرہلایا "اپنا بھی ایک یار ہے ادھر۔ [illegible] تم اپنے طوطی صاحب کا خالصا ایڈیشن سمجھ لو۔ وہ مسلمان ہے [illegible] سکھ۔ باقی عقل کے معاملے میں ایک سیر ہے تو دوسرا سوا سیر۔ نہیں [illegible] یہ بات کچھ غلط ہو گئی۔ عقل میں نہیں، بے وقوفی میں۔"

"آپ کا یار بھی اخبار کا ایڈیٹر ہے؟"

"آہو جی۔ اس کا نام ہے ہرنام سنگھ کھوتا۔ اور جیسے تمہارے طوطی صاحب کے اخبار کا نام ہے صدائے طوطی۔ ایسے ہی کھو[illegible] جس اخبار کا ایڈیٹر ہے اس کا نام ہے "ڈھینچوں۔"

مجھے بے اختیار ہنسی آئی "ڈھینچوں؟"

"کھوتے کی آواز اور کیا ہو گی۔ اور معلوم ہے وہ خود کو کھو[تا] کیوں کہتا ہے؟ اس کا کہنا ہے کہ یہ انگریز۔" اس نے روانی [illegible] خاصی فحش گالی استعمال کی اور پھر اپنی بیوی کی طرف دیکھ کے [illegible] "معاف کرنا یہ عادت کی بات ہے۔ جند کور بُرا نہیں مانتی۔ اور مجھے بھی ذرا سواد آتا ہے ان کی نسل خراب کر کے۔"

میں نے کہا "گالی انگریزوں کو دی جائے تو ہم بھی خوش ہو[تے] ہیں۔"

"کھوتا کہتا ہے کہ یہ ہمیں انسان نہیں کھوتا سمجھتے ہیں۔ بڑ[ا] عرصہ حکومت کی ہم کو کھوتے کی طرح ہانکتے رہے۔ کھوتے کی طر[ح] ہم نے ان کی غلامی کی اور ڈھینچوں ڈھینچوں کرتے رہے۔ اب اِدھر ولایت میں بیٹھ کے ڈھینچوں ڈھینچوں کریں گے۔ ان کے کان خراب کر دیں گے اور دماغ خراب کر دیں گے..... [illegible] بھی اس نے اخبار کا نام بھی ڈھینچوں رکھ لیا۔ کبھی دیکھا [ہے] تم نے؟"

میں نے کہا "ایسا خوش گوار اتفاق ابھی تک نہیں ہوا۔"

"ایک کونے میں اخبار کا نام ہوتا ہے، دوسرے کونے میں کھوتے کی تصویر اور نام کے اوپر لکھا ہوتا ہے۔ وقتِ اشاعت [illegible] بجے دوپہر...." وہ منہ پھاڑ کے ہنسا "کھلے دل کا بندہ ہے۔ کہتا ہے [جب] ہمارے بارہ بجتے ہیں تو ہم ڈھینچوں ڈھینچوں کرتے ہیں۔ اب امرتسر میں بھی اور لندن میں بیٹھ کے بھی۔ کھوتا تو کھوتا ہی رہتا ہے ہر جگہ۔ خیر بتانے کا مقصد یہ تھا کہ اس کو خبر ملی تھی اور اس نے مجھے بتا دیا کہ لندن کی پولیس نے بڑے بڑے اخباروں میں تمہارا فوٹو کے ساتھ تمہارے سارے کرتوت بیان کیے ہیں اور ان علاقوں میں اشتہار بھی لگائیں گے کل جہاں انڈین اور پاکستانی رہتے ہیں۔ ان کے جتنے چھوٹے بڑے اخبار ہیں سب میں اشتہار دیا ہے۔ [illegible] پیسہ ملتا ہے اشتہاروں کا اس لیے سب نے قبول کر لیا۔"

"حاجی علم دین طوطی نے نہیں کیا ہو گا" میں نے کہا۔

"بالکل ٹھیک۔ طوطی نے اور کھوتے نے صاف انکار کر دیا۔ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ کھوتا بھی تمہارا پنکھا ہے۔ پنکھا سمجھتے ہو نا؟ FAN۔ اب یہ اس نے کہا کہ یہ پاکستانی بھی شیر ہے۔ اس کا نام سکندر سنگھ ہونا چاہیے تھا۔ تمہیں پتا ہے نا سنگھ کا مطلب ہوتا ہے شیر۔"

میں نے کہا "مجھے معلوم ہے مگر کیا ہرنام سنگھ اپنا نام بدل کے کچھ اور رکھ سکتا ہے۔ مثلاً شیر خان خر۔"

"اوجی دفع کرو۔ نام میں کیا رکھا ہے۔ کام اصل چیز ہے۔ تم کو پولیس کل ہمارے بارہ بجنے سے پہلے پکڑ لے گی.... شرطیہ۔"

میں نے کہا "ہم اس سے پہلے ہی روپوش ہو جائیں گے۔"

"تمہارا قیام طوطی کے نقار خانے میں ہے نا۔ پولیس کو صبح پتا چل جائے گا۔ اور وہ پہنچ جائیں گے وارنٹ کے ساتھ۔ اسی لیے میں نے کہا ہے کہ ہمارے ساتھ چلو۔ خیر سے بڑی محفوظ جگہ ہے۔"

میں نے محسن کی طرف دیکھا "ہم ایسی جگہ جانے کی سوچ رہے تھے جو خاصی محفوظ ہے۔ اس شخص کے گھر جو ہمیں لندن لایا تھا۔"

"وہ کون ہے؟ کوئی ایشیائی یا انگریز؟"

"ہے تو انگریز۔ مگر اس نے معاوضہ وصول کیا تھا ہم سے۔ لانے اور لے جانے کا۔ ہمیں واپس پیرس جانا ہے۔ آج نکل جاتے تو کل جہاز پر بیٹھ کے فرار ہو جاتے۔ مگر اب ایسا لگتا ہے کہ دو دن انتظار کرنا پڑے گا۔"

سردار نے کہا "پیرس جانا ہے نا تم نے؟ یہ کام مجھ پر چھوڑ دو۔ کل صبح تک ہو جائے گا بندوبست۔ اپنے بھی کچھ سورس ہیں۔"

اب جند کور نے بھی زبان کھولی "بھائی جی، فکر کی کوئی بات نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

سردار جی کی بات نے مجھے اور محسن کو ایک جیسی تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ بظاہر اس اطلاع میں شک کی گنجائش نہ تھی اور سردار جی کی نیت میں بھی فتور نہیں لگتا تھا مگر میں نے ایڈیٹر "ڈھینچوں" کے وسیلے سے پہنچنے والی خبر کی تصدیق کر لینا بہتر سمجھا۔

میں نے معذرت کے ساتھ ان سے اجازت لی "میں ایک فون کرنا چاہتا ہوں۔" کم سے کم طوطی صاحب کو معلوم ہو جائے کہ آج رات ہمارا قیام کہیں اور ہو گا ورنہ وہ رات بھر خیال کے گھوڑے دوڑاتے رہیں گے اور پریشان ہوتے رہیں گے۔ میں نے سوچا مگر سردار جی کو یہ بات نہیں بتائی۔

سردار جی نے کہا "فون تو اُدھر کاؤنٹر پر ہی ہو گا۔"

میں نے کہا "مجھے اپنا سامان منگوانا ہو تو کیا پتا بتاؤں۔"

"قیمت ضروری سامان ہے؟"

"ہاں۔ اس میں پاسپورٹ ہیں اور باقی ماندہ رقم ہے جن کے بغیر ہماری واپسی مشکل بلکہ ناممکن ہو جائے گی۔ پیسہ تو خیر بھیک یا چندہ مانگ کے بھی مل جاتا ہے مگر پاسپورٹ بنوانے کے لیے جانا پڑے گا۔ اپنے سفارت خانے اور یہ بات یقینی ہے کہ انہیں ہمارے بارے میں پہلے سے اطلاع ہو گی۔"

سردار جی نے میری تائید کی "ہاں۔ پولیس فرار کے راستے بند کرے گی تو فرانس ہالینڈ اور چیکوسلواکیہ کی پولیس کو بھی خبردار کر دے گی۔ سب کی سرحدیں آپس میں ملتی ہیں لیکن تم کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ کچھ نہ کچھ انتظام ہو جائے گا۔ آخر ہمارے بھی سورس ہیں۔"

وہ جب بھی سورس کی بات کرتا تھا بڑے فخریہ انداز میں جند کور کی طرف تائید طلب نظروں سے دیکھتا تھا اور وہ عادتاً سرہلا کے مسکرا دیتی تھی۔ وہ تیس سال سے کم عمر کی گوری چٹی اور دراز قد، انتہائی متناسب اور پُرکشش جسم والی عورت تھی جس کی صورت کے نقوش ہی اسے پنجاب دی جٹی ثابت کرتے تھے۔ سردار جی کے مقابلے میں وہ خاموش طبع اور شرمیلی تھی۔ کوئی ولایتی بیوی ہوتی تو سورس والی بات پر اسے ضرور ٹوک دیتی کہ کیا بار بار جتانا ضروری ہے کون سے سورس ہیں تمہارے اور ہیں تو کیا تمہارے سورس اس ملک میں قانون کو اپنا فرض ادا کرنے سے روک سکتے ہیں یا دو سند یافتہ دہشت گردوں کے کام آ سکتے ہیں مگر مشرقی عورت اپنے خداوند مجازی کے سامنے سر اٹھا کے سچ بھی نہیں بول سکتی۔

میں نے کاؤنٹر کے فون سے طوطی صاحب کا نمبر ملایا۔ آٹھویں یا دسویں گھنٹی کے بعد ریسیور ان کے ہونہار سپوت اول مسٹر نوردین نے اٹھایا۔ وہ طوطی کے چیف رپورٹر کے منصبِ اعلیٰ پر بھی فائز تھا مگر ہم سے اس کا اولیں تعارف بطور شہزادہ سلیم ہوا تھا جب وہ شاہانہ لباس پہنے کسی اسٹیج ڈرامے کے گھن گرج والے مکالمے بولتا پھرتا تھا۔

میں نے کہا "شہزادہ سلیم"

"ایسی کی تیسی میں گیا شہزادہ سلیم" وہ روتی فریاد کرتی آواز میں بولا "میں تو ہوا سور دا پتر۔ کھوتے دا کھر، الو کا پٹھا۔"

میں نے کہا "بس بس.... یہ سب ڈگریاں تمہیں مبارک ہوں مگر یہ بتاؤ کہ آخر ہوا کیا ہے۔ میں سکندر بول رہا ہوں۔"

"اوجی چھوڑو۔ آپ سکندرِ اعظم ہوتے تب بھی کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ میرا کہا سنا معاف کرنا۔ میں نے فون کر کے سب کو بتا دیا ہے۔" اس نے پانچ چھ زنانہ نام گنوائے۔

"کیا بتا دیا ہے؟"

"یہی کہ.... دیوانہ دیکھ تیرا دنیا سے جا رہا ہے۔ انجام زندگی کا نزدیک آ رہا ہے۔ صبح کا سورج نکلے گا تو میری زندگی کا آفتاب غروب ہو چکا ہو گا۔"

میں نے پریشانی سے کہا "یہ کیسی فضول بکواس کر رہے ہو تم نوردین۔"

"بس جی۔ اب میں کیسے دنیا کو منہ دکھاؤں۔ آہ کیا [illegible]

اسٹائل تھا" اس نے دردناک آواز بنا کے کہا "اب وہاں ایک چٹیل میدان ہے جہاں میرے حسین بالوں کا چمن آباد تھا۔ میری گرل فرینڈز اس چمن میں بلبلوں کی طرح کڑکڑاتی تھیں۔"

میں نے ہنس کے کہا "وہ بلبلیں تھیں یا مرغیاں، کیا واقعی تمہارے سر کی کھیتی صاف کرادی گئی ہے، زبردستی...."

"ہاں۔ ایک ظالم باپ نے اولاد کے ارمانوں کا خون کردیا ہے۔ کاش میں بھی اس کے ارمانوں کا خون کرسکتا مگر اس کے ارمان اب کہاں بچے ہیں سب تو پورے کرلئے۔ وہ دنیا کا سب سے بڑا خبیث سیالکوٹی جراح کی اولاد اس نے اور طوطی صاحب نے مجھے ایسے پکڑلیا جناب، جیسے بھیڑ کو مونڈنے کے لیے پکڑلیتے ہیں۔ لمبا ڈال دیا جی مجھے فرش پر اور یہ میرے سگے سوتیلے بھائی بن۔ سارے حرامی درجۂ اول، میرے اوپر سوار ہوگئے۔ سانس نہیں لینے دیا مجھے۔ میں نے بھی کسی دن اسی طرح اس کی داڑھی صاف نہ کی تو میرا نام نوردین نہیں۔"

میں نے کہا "مگر صبح تک تم یہ کام کیسے کروگے؟ آخر خودکشی بھی کرنی ہے تمہیں۔"

اس نے جز بز ہو کے کہا "وہ.... میں ایک دو دن بعد بھی تو کرسکتا ہوں۔ ضروری تو ہے مگر ارجنٹ نہیں ہے۔"

میں نے کہا "ضروری بھی نہیں ہے نوردین۔ بال پھر بڑھ جائیں گے۔ اور اس وقت تک تم وگ استعمال کرسکتے ہو۔ ایک سے ایک شاندار وگ ملتی ہے لندن میں۔ تمہاری تو اپنی دکان ہے جہاں سے تم نے ہمیں میک اپ کا سامان دلایا تھا۔ وگ لگا کے تم رچرڈ برٹن بن سکتے ہو یا دلیپ کمار۔ مریں تمہارے دشمن...."

"آپ کا مطلب ہے اباجی تو آمین" وہ بولا مگر اس کے ساتھ ہی پس منظر میں دھماکا سنائی دیا اور پھر پتر نوردین کی مخصوص "ہائے اباجی" کی پُر درد صدا جس سے میں نے فرض کیا کہ والدِ ماجد نے اپنے ولی عہد کی آمین کے جواب میں جوتی کھینچ کے ماری تھی۔ مسلسل مشق کے نتیجے میں ان کا نشانہ بے خطا ہوگیا تھا۔ چشمِ تصور سے میں نے شہزادہ سلیم کو جوتی دبا کے فرار ہوتے دیکھا۔ پھر حاجی علم دین طوطی کی گرج دار آواز سنائی دی "ہیلو۔"

میں نے کہا "طوطی۔ میں سکندر عرض کررہا ہوں۔"

"اور طوطی آپ کو ولایت کے طول و عرض میں تلاش کرتا پھر رہا ہے میرے پاکستانی بھائی۔ از کجا می آید ایں آوازِ دوست۔ فارسی سمجھتے ہو؟ نہیں سمجھتے۔ خیر مطلب یہ ہے کہ تمہاری آواز کہاں سے سنائی دے رہی ہے مجھے۔"

میں نے کہا "اسی دنیا سے جس میں آپ بھی قیدِ حیات کاٹ رہے ہیں۔ ہم نے ابھی تک انتقال نہیں فرمایا۔ ولایت سے اپنے وطنِ مالوف کی جانب۔"

"آج کا سارا دن آپ اسی خرزاد کے ساتھ لاپتا رہے ہو۔ آخر کیا مصروفیت رہی۔ جو معلومات میں نے تفتیش کے نتیجے میں بزورِ بازو حاصل کی ہیں وہ بڑی افسوس ناک بلکہ شرمناک تھیں۔ آپ ادھر خانہ خراب کفار کے دامِ ہوس میں پھنس کے لہو و لعب اور غیر شرعی خرافات۔"

میں نے کہا "لاحول ولا قوۃ۔ یہ آپ کیا فرمارہے ہو طوطی صاحب۔ ہم اور لہو و لعب، توبہ توبہ۔"

"نوردین سب قبول کرچکا ہے کہ اس نے لندن کی ہر قابلِ... چیز اور جگہ دکھائی۔ اولادِ سگ بڑی ڈھٹائی سے بتارہا تھا کہ تم... سوہو کے علاقے میں روسیاہی کے لیے وہی لے کر گیا تھا اور... اس نے تم کو کس کس کی محبت سے فیضیاب ہونے کے مواقع فراہم کیے۔"

میں بھونچکا رہ گیا "سوہو کے قحبہ خانوں میں.... بالکل غلط۔"

"اور تم اس کے کتنے شکر گزار تھے اور تم نے وہاں کیا گُل کھلائے میری سرکار۔ جب وہ تم کو ان نائٹ کلبوں میں لے ... جہاں، استغفراللہ.... ستر پوشی ممنوع اور گناہ کا درجہ رکھتی ہے۔ نیوڈز کلب۔"

میں نے کہا "وہ مذاق کررہا ہوگا آپ سے۔"

"مذاق۔ میرے پاکستانی بھائی، ابھی تک اس بدبخت کی یہ مجال نہیں کہ اپنے باپ سے مذاق کرے اور وہ بھی اس وقت جب ہمارے جلال کا مظاہرہ پاپوش چرمی سے جاری ہو۔ خدا کو حاضر ناظر جان کے کہو کہ کیا تم نے خود اسٹیج پر جا کے اس حالت میں رقص نہیں فرمایا کہ تنِ عزیز پر سے تم کھال بھی اتار دیتے اگر ممکن ہوتا۔ افسوس، صد افسوس۔"

میں نے کہا "آپ بھی کمال کرتے ہیں طوطی صاحب۔ سُنی سنائی پر یقین کرلیتے ہیں۔ اس نے بکواس کی اگر ایسا کہا۔ میرا خیال ہے آپ کے رویے کے خلاف بغاوت کی ہے اس نے۔ وہ آپ کو گالیاں تو دے نہیں سکتا تھا۔ ذہنی اذیت دے سکتا تھا۔ آپ اس کے ساتھ بہت سختی کرتے ہیں۔ جوان لڑکا ہے اور ولایت کا پروردہ۔"

غالباً طوطی صاحب کچھ شرمندہ ہوئے "اچھا؟.... مجھے بھی کچھ شک ضرور تھا میرے پاکستانی بھائی کہ وہ نطفہ ناتحقیق ہر ضربِ پاپوش پر احتجاجاً دروغ گوئی کرتا ہے۔ جب اس کا توڑ میں نے یہ نکالا کہ اپنے سیالکوٹی خلیفہ کی مدد سے اس کے سر پر...."

میں نے کہا "یہ آپ نے بڑا ظلم کیا طوطی صاحب۔ اس نے مجھ سے کہا ہے کہ وہ اب خودکشی کرلے گا کیونکہ وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔"

وہ متفکر ہوئے "منہ دکھانے کے قابل وہ پہلے بھی کہاں تھا لیکن یہ حرام موت مرنے والی بات اس برادرِ خنزیر کے دماغ سے نکالنے کے لیے مجھے کچھ کرنا پڑے گا۔ بے شک وہم اور مرضِ عشق کا علاج حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا مگر...."

"مگر آپ کے پاس ہے۔" میں نے طنز سے کہا "آپ کیا کریں گے۔ اس کے گنجے سر کو جوتیاں مار مار کے پلپلا کردیں گے۔ خود مار ڈالیں گے اسے تاکہ وہ شہید ہوجائے سعادت مندی کے ساتھ۔ ناخلفی سے حرام موت نہ مرے، قبلہ حاجی صاحب! آنکھیں کھول کر دیکھیں۔ زمانہ بدل گیا ہے اور آپ جس دنیا میں رہتے ہیں وہ میری دنیا نہیں ہے۔ اس نے کسی میم سے شادی کرلی اور بھاگ گیا آپ کے گھر سے تو کیا بگاڑلیں گے آپ اس کا؟ خدا کا شکر ادا کریں کہ ابھی تک اس نے سرکشی اختیار نہیں کی...."

"شاید تم نے ٹھیک ہی کہا ہے میرے پاکستانی بھائی۔ لیکن اب ہم کیا کریں آخر۔"

میں نے کہا "آپ اس سے کہیں، سوری.... ظلم اور زیادتی یا غلطی کرنا بہت آسان ہے، کوئی بہادری نہیں مگر نادم ہونا اور اپنی غلطی پر معافی مانگنا بہت مشکل کام ہے اور اس کے لیے بہت حوصلہ چاہیے۔ آپ اس سے کہہ سکتے ہیں کہ پتر نوردین۔ غلط فہمی اور تیری غلط بیانی کے باعث ایسا ہوگیا۔ چل تو دل تو چھوٹا نہ کر۔ بال پھر آجائیں گے۔ جیسا بیڑا اسٹائل تیرا دل چاہے رکھ۔"

"یعنی.... میں کھلی چھٹی دے دوں اسے....؟"

"آپ نے ایسا نہ کیا میرے پاکستانی بھائی تو سمجھ لیں کہ کل اس کی لاش ملے گی دریائے ٹیمز میں سے۔ یا گھر کے کسی پنکھے سے جھولتی ہوئی۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ ہمارے ساتھ چلے گا اور ایفل ٹاور پر سے چھلانگ مارے گا۔ پہلے ایک غبارہ چھوڑے گا جس کے ساتھ بینر بندھا ہوا ہوگا کہ میرا قاتل میرا باپ ہے۔ پھر ہاتھ میں پاکستان کا جھنڈا لہراتا ہوا......"

حسبِ توقع حاجی صاحب کا حوصلہ جواب دے گیا "نہیں نہیں، ایسا نہیں ہونے دوں گا میں۔ میں اس کو راضی کرلوں گا۔ بچے تو بچے ہی ہوتے ہیں نا۔ غلطی بڑے بھی کرجاتے ہیں خیر سے۔ اگر یہی مرضی ہے اس تخمِ ابلیس کی کہ اپنے اصلی اور اکلوتے باپ کا سر اپنے قدموں میں جھکا لے" انہوں نے ایک آہ بھری۔

میں نے کہا "ایسی بات نہیں۔ نہ وہ ایسا چاہتا ہے۔ بس آپ اس کی عزتِ نفس کو بھی اہم سمجھیں۔ خیر آپ خود ٹھیک کرسکتے ہیں اپنے گھر کے معاملات کو۔ میں کیا کہوں، فون میں نے کسی اور کام سے کیا تھا۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ لندن پولیس نے مجھے پکڑنے کے لیے بڑی جامع منصوبہ بندی کی ہے۔ انہوں نے پوسٹر لگانے اور تمام اخباروں میں میری تلاش کے لیے باتصویر اشتہار دیا ہے۔ کیا انہوں نے آپ سے بھی کہا تھا کہ اشتہار لگادو۔ اور بھاری معاوضہ پیش کیا تھا۔"

طوطی صاحب نے کہا "بھاری معاوضہ کیا، وہ مجھے برطانیہ کی ملکہ کا شاہی خزانہ بھی پیش کرتے تو مجھے نہ خرید سکتے تھے اور نہ مجبور کرسکتے تھے لیکن اصل بات یہ ہے میرے پاکستانی بھائی کہ میرے پاس کوئی بھی اشتہار لے کر نہیں آیا۔"

میں نے کہا "اچھا۔ یہاں ایک سکھ ہے ہرنام سنگھ کھوتا۔ اس کے اخبار کا نام ہے ڈھینچوں۔ آپ جانتے ہیں؟"

حاجی علم دین نے جواب میں کھوتے کو بڑی فصاحت و بلاغت کے ساتھ وہ گالیاں دیں جو صرف سننے کے قابل تھیں سنانے کے قابل نہیں "ہاں۔ بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ کیا یہ شوشہ اسی نے چھوڑا ہے؟"

"ہاں۔ آپ تصدیق کرکے بتائیں مجھے۔ کیا واقعی صبح کے اخبارات میں کوئی ایسا اشتہار شائع ہوگا۔ میں آپ کو کچھ دیر بعد فون کروں گا۔"

کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے منیجر نے بڑے طنزیہ انداز میں اپنی گھڑی دیکھی "میں نے تو تم سے یہ نہیں کہا تھا کہ مختصر بات کرو۔"

"تم کہہ بھی نہیں سکتے تھے" میں نے مسکرا کے جواب دیا "سمجھ دار آدمی ہو اپنا نفع نقصان دیکھ کے بات کرتے ہو۔"

میں واپس اپنی میز پر پہنچا تو وہاں محسن کے ساتھ سردار جی بیٹھے بڑے انہماک سے ایک انگریز عورت سے آنکھیں چار کررہے تھے۔ وہ قدرے فربہ بدن عورت تھی اور میز پر یوں کہنیاں ٹکائے بیٹھی تھی کہ سردار جی اپنے گریبان میں جھانکنے کے بجائے اس کے گریبان کی وسعت اور گہرائی میں گم ہوگئے تھے۔ جند کور.... میز پر نہیں تھی۔

مجھے دیکھ کر انہوں نے عورت کو آنکھ ماری اور مسکرائے۔ جواب میں عورت بھی مسکرائی وہ پھر مجھ سے مخاطب ہوئے "حسین قدرتی مناظر کی ولایت میں کمی نہیں۔"

میں نے کہا "سچ فرمایا آپ نے۔ اور دیکھنے کا ٹکٹ بھی نہیں۔ جند کور کی غیر موجودگی میں تم آنکھیں بند کرکے تو نہیں بیٹھ سکتے۔"

"جند کور ذرا ٹائلٹ تک گئی ہے۔ آجائے تو چلتے ہیں۔"

میں نے کہا "یہ جند کور کا میرے ساتھ کیا حساب کتاب ہے؟"

"وہ تمہاری احسان مند ہے۔ شاید تمہیں یاد ہو۔ ایک دفعہ تم نے اس کی عزت بھی بچائی تھی اور جان بھی۔ تم نے اس کے خاندان کی حفاظت نہ کی ہوتی تو غنڈے جند کور کو اور اس کی بہن کو اُٹھا کر لے جاتے اور باقی سب کو مار دیتے۔"

میں نے ذہن پر زور دیا مگر مجھے ایسا کوئی واقعہ یاد نہیں آیا "وہ کون لوگ تھے اور یہ واقعہ کہاں پیش آیا تھا؟"

"یہ سب جند کور سے سننا۔ اس وقت کسی کو تمہارا شکریہ ادا کرنے کی مہلت ہی نہیں ملی تھی۔ یہ افراتفری میں ایک طرف نکل گئے تھے اور تم دوسری طرف۔ مگر جند کور کو سب اچھی طرح یاد ہے کہ تم نے چھ سات مسلح افراد کا آملیٹ بنادیا تھا۔ مار مار کے سب کو لمبا ڈال دیا تھا۔ پتا نہیں کتنے مرے تھے اور کتنے بے ہوش ہوئے تھے۔ تم بالکل فلمی ہیرو کی طرح نمودار ہوئے تھے اور سب کی پھینٹی بھی اسی طرح لگائی تھی۔"

جند کور خاموشی سے زیرِ لب مسکراتی ہوئی آ کے میرے ساتھ بیٹھ گئی۔ سردار جی کی نگاہوں کا مرکز بدل گیا۔ وہ اپنی دھرم پتنی کو عاشقانہ وارفتگی کے ساتھ دیکھنے لگے۔ اسے بیوی سے واقعی محبت تھی ورنہ آدابِ محبت کی وضع داری نبھانا اس پر فرض نہیں تھا۔

"کیا خیال ہے گھر چلیں یا آئس کریم کھانی ہے؟" سردار جی

نے کہا۔
جند کور نے ہنس کے کہا "کیا اسی سے پیٹ بھرو گے۔"
"او بھلئی لوکے۔ بات ساری ہے نیت کی۔ نیت نہیں بھرتی بندے کی۔" انہوں نے حسن قدرت کے نظارے کو آخری بار نگاہوں میں بساتے ہوئے کہا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ "میں بھی ذرا دیکھ آؤں ٹائلٹ کیسا ہے یہاں؟"
چند سیکنڈ کے وقفے سے میں نے فربہ بدن عورت کو اٹھ کے اُدھر ہی جاتے دیکھا۔ حضرات اور خواتین کے ٹائلٹ ساتھ ساتھ بنے ہوئے تھے۔ غالباً محسن نے بھی تاڑ لیا تھا کہ دل کے افسانے نگاہوں کی زبان تک پہنچے۔ بات چل نکلی ہے اب دیکھیں کہاں تک پہنچے۔
اچانک میں نے سردارنی کے لمس کو میز کے نیچے محسوس کیا میں نے گھبرا کے اس کی طرف دیکھا تو وہ بالکل پُرسکون تھی اور میری طرف دیکھ ہی نہیں رہی تھی۔ اس کا ہاتھ پہلے میرے گھٹنے پر تھا پھر میرے ہاتھ تک پہنچا تو مجھے ایسا لگا جیسے وہ مجھے کچھ دینا چاہتی ہے۔ میں نے ہاتھ آگے بڑھایا تو کاغذ کا ایک پرزہ میرے ہاتھ میں آگیا جسے موڑ کے تعویذ جیسا بنا دیا گیا تھا۔ میں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کے اس پرزے کو میز کے نیچے ہی کھولا اور اس پر انگریزی میں لکھے ہوئے مختصر پیغام کو پڑھا "میرے شوہر پر اعتبار مت کرنا" پیغام لپ اسٹک سے لکھا گیا تھا۔ سردار جی کے سامنے وہ مجھے خبردار نہیں کرسکتی تھی چنانچہ وہ ٹائلٹ تک گئی اور ٹائلٹ پیپر استعمال کرتے ہوئے لپ اسٹک سے ایک جملہ لکھ لائی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ سردار جی اس کے آتے ہی ٹائلٹ جانے کی ضرورت محسوس کریں گے۔ اب ایک پیغام کا تبادلہ میز کے نیچے سے ہوگیا تھا تو دوسرے نظروں کے پیغام کو ٹائلٹ میں کسی معاہدے کی شکل دی جارہی تھی۔
میں نے کہا "میں تمہیں کیا کہوں۔ سردارنی یا جند کور؟"
وہ چونک پڑی۔ اس نے محسن کی طرف دزدیدہ نظروں سے دیکھا اور پھر مسکرانے لگی "جو آپ کو اچھا لگے جی۔"
میں نے کہا "جند کور۔ یہ کیا معاملہ ہے؟"
اس نے سرگوشی میں بات کرنے سے پہلے اِدھر اُدھر دیکھا "سردار تمہارا دوست نہیں ہے، دشمن ہے۔"
میں نے کہا "تم اس کے دشمن پر کیوں مہربان ہو؟"
"بس جی۔ میں احسان فراموش نہیں ہوں۔ آپ کی عزت ہے میرے دل میں۔"
میں نے کہا "جو کہانی سردار نے مجھے سنائی ہے۔ وہ بھی مجھے جھوٹ لگتی ہے۔ کیا میں نے تمہاری اور تمہاری بہن کی عزت بچائی تھی۔ غنڈے تمہیں اغوا کرنے والے تھے اور شاید تمہارے خاندان کے باقی افراد کو مار ڈالتے۔"
اس کی آنکھوں میں حیرانی کے آثار نمودار ہوئے "ایسی بات تو نہیں تھی لیکن اتنا وقت نہیں ہے کہ میں آپ کو ساری بات بتاؤں۔ میرا خیال ہے کہ وہ تمہارے دشمنوں سے ملا ہوا ہے۔"
"کون سے دشمنوں سے؟ چوہدری دلاور سے؟"
اس نے اقرار میں سرہلایا "کل وہ ہمارے گھر آیا تھا۔ میں اسے نہیں پہچانتی مگر جب میں چائے لے کر آئی تو میز پر بہت سارے نوٹ پڑے تھے۔ میرا خیال ہے کہ دس ہزار پاؤنڈ ہوں گے۔ اس نے ایک جملہ کہا تھا۔ باقی سکندر کے پکڑے جانے کے بعد....."
میں نے اپنی نظر ٹائلٹ کی طرف رکھی "اچھا۔ سردار جی مجھے پکڑوانا چاہتے ہیں۔ کیا دلاور پہلے بھی آتا رہا ہے؟"
"اسی ہفتے میں وہ تین بار آیا ہے۔ پہلے کا مجھے علم نہیں۔ سردار نے مجھ سے کہا کہ میرا اس کے ساتھ کچھ بزنس کرنے کا خیال ہے، تم ابھی سردار کو ٹال دو۔"
میں نے کہا "نہیں جند کور۔ میں تمہارے ساتھ جاؤں گا۔"
"تم پکڑے جاؤ گے" اس نے پریشانی سے کہا۔
"یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ شکاری خود شکار ہوجائے۔ میں بھی تو چوہدری دلاور کو پکڑنا چاہتا ہوں۔"
اس نے نفی میں سرہلایا "یہ پاگل پن چھوڑو، بھاگ جاؤ یہاں سے۔ سردار کی باتوں میں آکے تم پھنس جاؤ گے۔"
"تم نے ہمیں خبردار کردیا۔ تمہارا احسان مجھے یاد رہے گا۔ باقی میری قسمت۔ میں یہ چانس لوں گا..... اب کوئی اور بات کرو۔ سردار آرہا ہے۔"
محسن نے بھی مسکرا کے کہا "تم فکر مت کرو۔ ہم اپنی حفاظت خود بھی کرسکتے ہیں اور ہمارا اصل محافظ تو خدا ہے۔"
سردار مسکراتا ہوا آیا تو نہ اس کے ہونٹوں پر لپ اسٹک کا داغ تھا اور نہ کوٹ پر مگر اس کی نگاہوں میں خوشی اور سرمستی تھی۔ شاید وہ اپنی تقدیر پر ناز کررہا تھا کہ ایک منافع بخش کاروباری معاہدہ چوہدری دلاور سے پورا کرنے کا وقت بھی آگیا تھا اور حسن قدرت کے نظارے کو دیگر تفصیلات کے ساتھ دیکھنے کا وقت بھی طے ہوگیا تھا۔
جند کور نے ایک بار پھر مجھ سے نظروں ہی نظروں میں التجا کی کہ میں اپنا ارادہ بدل دوں اور ان کے ساتھ نہ جاؤں مگر میری نظریں خدشات اور خطرات کے ساتھ اپنی امیدوں کے بر آنے کے امکانات کو بھی دیکھ رہی تھیں۔ ابھی تک چوہدری دلاور ہمارا سراغ لگانے میں اتنا ہی ناکام تھا جتنا لندن کی پولیس مگر اس نے مفروضے اور قیاس آرائی کی بنیاد پر ایک کامیابی کا "پوائنٹ" حاصل کرلیا تھا۔ اس نے رچرڈ گورڈن کو ہلاک کیے بغیر اس کی ہلاکت کی کوشش کا الزام ہمارے نامۂ اعمال میں لکھوا دیا تھا۔ ہم خود اسے ایک بار دیکھنے کے باوجود ابھی تک اس کا پتا ٹھکانا معلوم نہیں کرسکے تھے۔ اچانک ملنے والی ایک خبر نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کردیا تھا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم دلاور کو خود اس کے پھیلائے ہوئے جال میں گرفتار کرلیں؟ ہم بے خبری کا اظہار کرتے ہوئے اور انجان بنے ہوئے زیرِ دام آنے کا تاثر دیتے رہیں اور آخری وقت میں جب شکاری پوری طرح مطمئن، پُراعتماد اور مسرور کہ اس نے میدان مار لیا ہم پانسہ پلٹ دیں گے۔

مجھے محسن سے مشورے کا موقع نہیں ملا تھا مگر اس نے واضح کردیا تھا کہ وہ مجھ سے متفق ہے اور جان بچا کے فرار ہونے سے جان کی بازی لگا کے مقابلہ کرنے کو ترجیح دیتا ہے۔ نو رسک نو گیم۔
ابھی کچھ اندازہ نہیں تھا کہ بیس ہزار پاؤنڈ کا نصف ایڈوانس وصول کرکے ہمیں چوہدری دلاور کی خدمت میں پیش کردینے کا معاہدہ کرنے والے دشمن کے ذہن میں کیا ہے۔ اپنے گھر لے جاکے چوہدری دلاور کو مطلع کرنے سے پہلے اور اپنی کامیابی کو یقینی بنانے کے لیے وہ ہمارے ساتھ کیا کرے گا۔ زیادہ امید یہی تھی کہ وہ روایتی طریقے سے ریوالور نکال لے گا اور کہے گا کہ اپنے ہاتھ اوپر اٹھالو۔ تم اب میرے مہمان نہیں قیدی ہو۔ چوہدری دلاور تمہیں لے جانے کے لیے آنے والا ہے۔ پھر وہ اسے فون کرے گا یا جند کور سے کہے گا کہ اس نمبر پر میرے بزنس پارٹنر چوہدری دلاور کو فون کرکے یہ پیغام دو کہ آؤ، باقی رقم لاؤ اور اپنا مال اٹھالو۔ اور باقی دس ہزار پاؤنڈ وصول ہونے تک وہ خود بھی ایک ہی قاتلانہ پوز میں منجمد رہے گا اور ہمیں بھی صرف سانس لینے کی حد تک حرکت کی اجازت دے گا۔ دلاور کے آنے کے بعد کیا ہوگا۔ یہ شاید خود سردار جی کو اندازہ نہ ہو۔ وہ ایفائے عہد کرتے ہوئے شکریے کے ساتھ دس ہزار مزید دے جائے گا یا ایڈوانس کے علاوہ سردار جی کے جسم سے ان کی جان بھی نکال لے جائے گا۔ پرانے تعلق کی بنا پر ہم چوہدری دلاور کی سوچ اور رویے کو اپنی عقل اور تجربے کے مائیکرواسکوپ سے بہتر طور پر دیکھ اور سمجھ سکتے تھے۔ معلوم نہیں اس نے سردار جی کو کیسے بریف کیا تھا کہ دیکھو سردار، تم جسے الو بنانے کی کوشش کروگے وہ آدم خور شیر سے زیادہ خطرناک ہے اور شیر کو الو بنانے میں زیادہ امکان اس بات کا ہوتا ہے کہ وہ آپ کو مرغا بنادے یا گدھا ثابت کردے۔ ممکن ہے اس نے سردار جی کو کچھ ٹپ بھی دیے ہوں کہ انہیں کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے۔ مزید دس ہزار پاؤنڈ درکار ہیں تو بے وقوفی اور غلطی مت کرنا ورنہ سکندر تمہارے بارہ بجادے گا۔
سردار جی کی مورس کار میں ہم پیچھے فٹ ہوگئے۔ سردار جی عقب نما آئینے میں پیچھے آنے والی ٹریفک کے بجائے ہم پر نگاہ رکھنے میں مصروف تھے۔ جند کور خاموش تھی اور اپنی پریشانی کو چھپانے کے لیے باہر دیکھ رہی تھی۔ اس کے لیے کھل کے اپنے شوہر کے ارادوں کی مخالفت کرنا بھی مشکل تھا اور وہ اس خیال سے بھی مایوس اور افسردہ تھی کہ ہم نے اس کی وارننگ کو اہمیت نہیں دی تھی۔ زندگی اسے شوہر کے ساتھ گزارنی تھی۔ وہ ہماری احسان مند ضرور تھی مگر شوہر سے اعلانیہ بغاوت کا جرم کرنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ ہر بیوی کی طرح وہ اپنے گھر میں آباد رہنے کے لیے اخلاقی اور قانونی طور پر سردار جی کا ساتھ دینے کی پابند تھی۔ کوئی عورت اصول کی بنیاد پر یا ضمیر کی آواز پر شوہر سے اختلاف کرکے اپنی ازدواجی زندگی کو داؤ پر لگانا افورڈ نہیں کرسکتی۔ سارا مسئلہ معاشی اور معاشرتی عدم تحفظ کا ہوتا ہے جو انہیں ہر ناقابلِ قبول صورتِ حال سے ایڈجسٹ کرنے اور ناقابلِ برداشت فیصلوں سے COMPROMISE پر مجبور کردیتا ہے۔ مرد اس آزمائش اور کرب سے نہیں گزرتے۔"
"یہ گاڑی تو بڑا پرانا ماڈل ہے سردار جی!" محسن نے کہا۔
"او جی، بھولے بادشاہو۔ ہم کون سے نئے ماڈل کے ہیں" وہ بولا "گڈی تے ووہٹی، وہ اچھی جو ساتھ چلے اور دغا نہ دے وقت پر۔"
"پھر بھی..... جیسی ووہٹی ایسی گڈی ہونی چاہیے۔ کیوں بھابی؟"
سردار جی خوش ہوئے "رب کرے گا تو ایسی ہی سوہنی گڈی بھی آجائے گی بہت جلد۔"
میں نے تجاہل عارفانہ سے کہا "کتنے تک مل جاتی ہے نئی واکس ہال یا کوئی فورڈ کورٹینا وغیرہ۔ تین ہزار پاؤنڈ تک۔"
میں نے سردار جی کے جسم میں کپکپی کو واضح طور پر محسوس کیا مگر اس نے پلٹ کے دیکھنے اور چونکنے سے گریز کیا۔
"ہاں جی۔ بس تھوڑا کم زیادہ۔ ہم رولز رائس کی بات تو کرتے نہیں۔ اب تو جو اپنی جند کور پسند کرے، وہی اپنی پسند....."
جند کور نے اپنے جذبات پر مصنوعی مسکراہٹ کا پردہ ڈال کے سرہلایا۔
ان کا فلیٹ بلومس بری کے علاقے میں راجر اسٹریٹ کی ایک بلڈنگ کے سیکنڈ فلور پر تھا۔ وہاں سے کچھ فاصلے پر ہی مشہور ناول نگار چارلس ڈکنز کا گھر تھا جسے قومی یادگار قرار دے دیا گیا تھا اور وہاں ایک میوزیم ہے اور لائبریری ہے جسے انگریز تمام سیاحوں کو بڑی عقیدت کے ساتھ دکھاتے ہیں۔ ادیب ہوں یا سائنس داں، موسیقار ہوں یا کھلاڑی۔ ہر قوم اپنے عالمی شہرت یافتہ ہیروز کی عزت کو باعث تفاخر سمجھتی ہے۔ بدبختی کا یہ اعزاز صرف ہمارے برصغیر کے ادیبوں، فنکاروں اور موسیقاروں کا مقدر ہوا کہ اہلِ وطن کو چھوڑ کے سارے زمانے نے ان کی قدرشناسی کی۔
سردارنی کچھ گم صم تھی اور اس کی گھبراہٹ یہ سوچ کے بڑھتی جارہی تھی کہ نہ جانے کیا ہونے والا ہے۔ فلیٹ میں پہنچ کے وہ تھکی ہوئی سی صوفے پر گر گئی۔
"کیا ہوا جند کورے۔ تیرا جی تو ٹھیک ہے نا!"
"مجھے..... تھوڑا سا پانی لادو" اس نے کہا۔
"پانی کیوں..... میں گلوکوز لاتا ہوں۔ تو آرام سے بیٹھ۔ آپ کیوں کھڑے ہو میری سرکار۔ بیٹھو، یہ جیسا بھی ہے اپنا گھر سمجھو اسے۔"
میں دروازے کے مقابل بیٹھ گیا جہاں سے میں اندر بھی نظر رکھ سکتا تھا۔ اس کمرے کے ساتھ شاید بیڈ روم تھا۔ میرے دائیں

ہاتھ پر ایک دروازہ تھا جو باتھ روم کا ہو سکتا تھا۔ کچن اسی کمرے کے ایک گوشے میں بنا دیا گیا تھا۔ جند کور اب ہم سے نظر چُرا رہی تھی اور کچھ خفا بھی لگتی تھی۔ ہم نے اس کے خلوص اور ہمدردی پر مبنی مشورے کو قبول نہ کرکے اس کو مایوس کیا تھا اور وہ خود کو گناہ بے لذت کرنے والے کی طرح احمق محسوس کررہی تھی۔ اس نے بڑی نیک نیتی کے ساتھ اپنے شوہر کے اعتماد کو دھوکا دیا تھا مگر ہم نے ناقدری سے اس کو خود اپنی نظر سے گرا دیا تھا۔

سردار جی کا رویّہ ابھی تک نارمل تھا۔ نہ اس نے ریوالور نکالا تھا اور نہ وہ فون کی طرف لپکا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ چوہدری دلاور پہلے سے فلیٹ میں موجود ہو؟ مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ سردار سے ہماری ملاقات ایک اتفاق کا نتیجہ تھی مگر کیا یہ واقعی اتفاق تھا یا وہ ہمارے تعاقب میں تھا؟ دلاور کو اس نے فلیٹ میں انتظار کرنے کے لیے کہا ہوگا یا ملاقات کے بعد بتا دیا ہوگا کہ شکار تو مل گیا۔ بس اب دانہ ڈالتا ہوں۔ تم پہنچو جال کے ساتھ میرے فلیٹ پر۔ وہ اچانک باتھ روم سے نکل آئے گا" ہاہا.... ایسا تو ہوتا ہے اپنے سکندرِ اعظم صاحب اس طرح کے کاموں میں.... ہیں جی..."

سردار جی نے اپنی بیوی کو گلو کوز دیا اور پھر ہم سے مخاطب ہوا "ہاں جی۔ اب کیا پیو گے۔ گرم کہ ٹھنڈا؟"

سردارنی نے پیچھے سے انگلی ہلا کے اشارہ کیا کہ ہم کچھ نوش نہ فرمائیں اور انکار کردیں۔ ہم نے انکار کردیا۔ ایک خوب صورت اور دُکھی عورت کی ہر بات نہیں ٹالی جاسکتی۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ بیئر' وہسکی' شیمپین حرام ہے سمجھو لیکن کافی تو پانی ہے ادھر۔ میں کافی لاتا ہوں۔"

"آپ بیٹھو جی۔ میں بنا کے لاتی ہوں" جند کور تڑپ کے اُٹھی۔

"او نئیں جند کور۔ تُو آرام کر۔"

"میں ٹھیک ہوں' بالکل ٹھیک ہوں" اس نے خوف زدہ لہجے میں اصرار کیا "تم باتیں کرو مہمانوں سے۔"

"ہاں ہاں۔ باتیں بھی کریں گے' ساری رات پڑی ہے۔ تو بتا نا ان کو اپنی بات۔ کافی تو میں ہی اچھی بناتا ہوں۔ تو جانتی ہے۔ روز بناتا ہوں" اس نے زبردستی سردارنی کو صوفے پر بٹھا دیا۔

سردارنی کا رنگ اُڑا ہوا تھا مگر شوہر کی نازبرداری پر مسکرانا اس کا فرض تھا۔ اس کے خوف نے مجھ پر ساری صورتِ حال کو اظہر من الشمس کردیا تھا۔ سردار ہمیں کافی میں کوئی خواب آور دوا ملا کے دے گا اور جب ہم انٹاغفیل ہو جائیں گے تو بلا خوف و خطر وہ دس ہزار پاؤنڈ وصول کرنے کے لیے چوہدری دلاور کو بُلا لے گا۔ اسے ریوالور نکالنے کا رسک مول لینے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

سردار نے الیکٹرک کیتل کا پلگ لگایا اور شیلف میں سے مگ نکالے۔

"ہاں بھئی' چُپ کیوں ہو تم سب۔"

سردارنی نے لہجے کے ارتعاش کو چھپاتے ہوئے ہمیں بتانا شروع کیا کہ وہ کس طرح اور کب سے ہماری احسان مند تھی۔ اس نے جو واقعہ سُنایا وہ بھی مجھے یاد نہیں تھا۔ ہم نے کہیں دہشت گردوں اور علیحدگی پسندوں کے عزائم کو ناکام بنانے کے لیے بارود کا ایک ذخیرہ تباہ کیا تھا اور اس کے نتیجے میں جو لوگ ہلاک ہوئے تھے ان میں کچھ ایسے بدمعاش بھی تھے جو سکھوں کو بھی پاکستان والوں کا ساتھی قرار دیتے تھے اور ان کے ہمدرد تھے کیونکہ وہ یہاں ننکانہ صاحب اور حسن ابدال آتے تھے تو انہیں اپنے مقدس مقامات تک بڑی عزت احترام کے ساتھ لے جایا جاتا تھا اور پنجاب میں ان کی بڑی آؤ بھگت ہوتی تھی۔ انہوں نے جند کور اور اس کی بہن کو بھی پریشان کر رکھا تھا اور ان کے والدین کو بھی دھمکیاں دیتے رہتے تھے کہ پہلے ذرا فوج سے نمٹ لیں پھر تمہاری خیر نہیں۔ لڑکیوں نے کالج کیا بازار آنا جانا بھی چھوڑ دیا تھا اور ان کے والد یہی سوچ رہے تھے کہ موقع ملے تو اپنی فیملی کے ساتھ کلکتہ پہنچ جائیں مگر ذرائع آمد و رفت مسدود تھے اور بدمعاشوں کے حوصلے بڑھتے جارہے تھے۔ ایک رات وہ ان کے گھر میں بھی کودے تھے مگر چیخ پکار پر فوجی آگئے تو وہ فرار ہوگئے مگر جاتے میں انہوں نے الٹی میٹم دے دیا تھا کہ یا تو چوبیس گھنٹے میں لڑکیاں ہمارے حوالے کردو۔ پھر تم جاسکتے ہو ورنہ ہم اگلی بار آئیں گے تو مغربی پاکستان کی فوج تمہیں نہیں بچاسکے گی۔ ابھی چوبیس گھنٹے پورے ہوئے تھے کہ وہ سب ہلاک ہوگئے اور اس خاندان کو وہاں سے جان بچا کے نکلنے کا موقع مل گیا۔

سردارنی یہ بات سُناتے وقت ذہنی انتشار کا شکار تھی۔ وہ بات اپنی زبان سے کررہی تھی۔ اس کی نظر اپنے شوہر پر تھی اور آنکھوں کے اشاروں سے وہ ہمیں سمجھا رہی تھی کہ کافی میں زہر ہوگا۔ اسے ضائع کردیں یا پہلے سے انکار کردیں۔ اس نے خود ہی محسوس کیا کہ یہ شاید ممکن نہیں ہوگا تو اس نے ہمیں سمجھایا کہ ہم کس طرح کپ تبدیل کرلیں۔

سردار جی ایک ٹرے میں کافی کے چار مگ لیے نمودار ہوئے۔ "ہاں جی' تو پھر آگئی بات سمجھ میں۔ جند کور یہ لے" انہوں نے ایک مگ پکڑا دیا پھر ایک خود اُٹھایا اور ٹرے ہمارے سامنے رکھ دی۔

میں نے یا محسن نے کافی تیار ہونے کے سارے عمل کے دوران میں کوئی بھی ایسی بات نوٹ نہیں کی تھی جس سے شک ہوتا۔ اس نے چاروں مگ شیلف پر سے اُٹھائے تھے جہاں وہ قطار میں ہک سے لٹکے ہوئے تھے۔ ان سب میں ایک ہی کافی ڈالی تھی اور چینی ہمارے سامنے ڈالی تھی۔ نہ اس نے کوئی شیشی اُٹھا کے ہمارے مگ میں زہر کے قطرے ٹپکائے تھے اور نہ پُڑیا کھول کے کوئی سفوف شامل کیا تھا۔

کافی کا مگ جند کور کے ہاتھ میں کانپ رہا تھا۔ اس نے گلاس ٹاپ ٹیبل پر رکھ دیا "میرا دل نہیں کرتا..."

"اچھا تو نہ پی' کوئی زبردستی نہیں ہے' بھلی لوکے"

سردارنی کھڑی ہوگئی "ذرا میری بات تو سُن لو..." اس نے رازدارانہ انداز میں بیڈ روم کی جانب اشارہ کیا۔

"او بیٹھ ادھر۔ جو کہنا ہے ان کے سامنے بتا۔ اپنی ایسی کون سی بات ہے بھئی" اس نے کافی کا ایک گھونٹ لے کر کہا۔

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اب میں مگ بدل سکتا تھا۔ مجھے پریشانی یہ لاحق تھی کہ کہیں چالاک سردار جی نے پہلے سے اس امکان کو مدِ نظر نہ رکھا ہو کہ شک میں مبتلا ہو کے ہم مگ نہ بدل دیں۔ اس نے زہر آلود کافی اپنے لیے رکھی ہو اور بعد میں ہم مگ بدلیں تو خود اپنی شامت کو دعوت دیں۔ تاہم یہ بھی یقینی نہیں تھا کہ اسے شک ہو۔

جب اس نے اپنے مگ سے کافی کا ایک گھونٹ لے لیا تو میری پریشانی دور ہوگئی۔ میں نے کافی کو تھوڑا سا چکھا۔ مجھے یقین تھا کہ صرف چکھنے سے مجھ پر کسی خواب آور دوا یا زہر کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ پھر میں نے کہا "سردار جی۔ ذرا تکلیف کرو۔ چینی کچھ کم ہے۔"

"ابھی لو جی بھولے بادشاہو۔ چینی بہت" وہ اُٹھا اور پلٹ کے کچن کی طرف گیا ہی تھا کہ میں نے اور محسن نے مگ بدل دیے۔ جند کور نے خود اپنا مگ محسن کی طرف بڑھا دیا تھا اور اس سے مگ لے کر میز پر رکھ دیا تھا۔ مجھے اس کام میں بڑی پُھرتی دکھانی پڑی۔

جب سردار ایک منٹ سے بھی کم وقت میں چینی کا جار لے کر آیا تو محسن مزے سے کافی پی رہا تھا۔ "مجھے تو ٹھیک لگتی ہے چینی۔"

میں نے اپنی کافی میں آدھ چمچہ چینی کا شامل کیا اور ایک گھونٹ لیا تو مجھے ذائقے میں معمولی سی تبدیلی محسوس ہوئی۔ میرا ذہن اُلجھن کا شکار ہوگیا۔ کافی کے تلخ ذائقے میں کسی خواب آور دوا کے شامل ہونے سے کیا فرق پڑ سکتا ہے۔ یہ فرق میرا وہم ہے یا حقیقت۔ ذائقہ پہلے والے مگ کا ٹھیک تھا یا اب ٹھیک ہے؟

محسن کے بارے میں مجھے کوئی تشویش نہیں تھی۔ سردار اپنی بیوی کے معاملے میں رسک نہیں لے سکتا تھا۔ اس نے جند کور کو جو کافی دی ہوگی وہ ٹھیک ہوگی۔ جو مگ محسن کے پاس تھا اسے جند کور کے لبوں نے چُھوا تک نہیں تھا۔

سردار جی ایک دم مگ لے کر اٹھے "میں ذرا ایک فون کرلوں۔"

میں نے محسن سے فرنچ میں کہا "تو ذرا اسے چکھ" اور اس کے ساتھ اپنا مگ بدل لیا۔

سردار جی نے پلٹ کے کہا "مجھ سے کچھ فرمایا آپ نے؟"

میں نے کہا "ہاں۔ یہ کافی کون سی استعمال کرتے ہو آپ؟"

"میکس ویل ہاؤس" وہ بولا "آپ کو اچھی نہیں لگی؟"

میں نے مسکرا کے کہا "مجھے یہی پسند ہے۔"

سردار جی کچن کے قریب دیوار پر لگے فون کی جانب بڑھ گیا تو محسن نے مجھ سے کہا "ٹھیک ہے۔"

"تجھے کوئی فرق تو محسوس نہیں ہوا ذائقے میں؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا اور اسی مگ سے کافی پیتا رہا کیونکہ سردار کی نگاہ پھر ہماری طرف تھی۔

میں نے سردارنی سے کہا "جو بات آپ نے بتائی۔ وہ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں۔ ہم نے اسلحے کے بہت سے ذخائر تباہ کیے تھے۔"

سردار جی نے فون پر کہا "ہیلو۔ اوئے بہادر سنگھ حرامی دے پُتر۔ کتھے ہوندا ایں اج کل۔ اوئے چھڈ بکواس نہ کرایویں۔ آہو۔ بالکل... ہور کی' ہاں ہاں۔ اوئے مرداں والی گل اے۔ اوئے آجا چن کھناں اساں کتھے جاناں اے..." اس نے آخری فحش گالی کے ساتھ ریسیور رکھ دیا۔

مجھے اب ذرا بھی شک نہیں تھا کہ بہادر سنگھ درحقیقت چوہدری دلاور ہوگا۔ جو باتیں ادھر سے سردار جی نے کی تھیں وہ محض ہمیں دھوکے میں مبتلا رکھنے کے لیے تھیں۔ اصل سوال دوسری طرف سے دلاور نے کیے تھے اور ان کا سردار جی نے مثبت جواب دیا تھا۔ آہو' بالکل... ہاں ہاں' دسویں جماعت کے انگریزی کے پرچے میں ایک سوال ایسا بھی ہوتا تھا کہ جوابات دیے جاتے تھے اور کہا جاتا تھا کہ وہ سوالات بتائیں جن کے یہ جواب ہو سکتے ہیں۔ وہ بچپن کا سبق اب یاد نہیں تھا مگر عقل نے بہت کچھ سکھا دیا۔ میں اندازہ کرسکتا تھا کہ دلاور نے پوچھا ہوگا کہ کیا سکندر بخت پکڑا گیا؟ اور اس نے جواب دیا ہوگا۔ آہو۔ پھر دلاور نے سوال کیا ہوگا کہ تیرے قابو میں ہے نا؟ تو اس نے کہا بالکل' دلاور نے کہا ہوگا کہ پھر میں آجاؤں تو اس نے کہا ہوگا ہاں ہاں۔

وہ فون کرتے ہوئے کافی بھی پیتا جارہا تھا اور میں بڑے غور سے اس کے ردِ عمل کا مشاہدہ کرنے میں مصروف تھا۔ اس کے ساتھ ہی ہر گھونٹ لینے کے بعد میں اپنی حالت پر بھی غور کررہا تھا جیسے کوئی ڈاکٹر سوال کرتا ہے ایسے میں اپنے آپ سے مخاطب تھا۔ غنودگی تو محسوس نہیں ہوتی؟ سر تو بھاری نہیں ہورہا ہے؟ چکر... متلی کی کیفیت' گھبراہٹ یا کمزوری کا احساس؟ پسینہ یا سینے میں گھٹن؟ سب کا جواب ابھی تک نفی میں تھا۔ خواب آور دوا بھی چھو منتر کا جادو نہیں ہوتی۔ اسے دورانِ خون میں شامل ہو کے اثر کرنے میں پندرہ بیس منٹ ضرور لگتے ہیں۔ کیا چوہدری دلاور اس سے پہلے ہی آپہنچے گا؟

اچانک سردارنی جند کور نے کافی کا مگ اُٹھا لیا "میرا خیال ہے یہ پی لوں۔"

سردار جی خوش ہوئے "پی لے پی لے۔ شاوا... ابھی دو منٹ میں ٹھیک ہو جائے گی تُو... کمال کافی بناتا ہوں میں..." اس نے کہا اور پھر کچھ سوچنے لگا۔

میں نے کہا "واقعی۔ لاجواب کافی ہے۔"

اس نے خالی مگ میز پر رکھ دیا اور مجھے گھورنے لگا۔

"کافی... کافی تو... ہاں مگر یہ کیا ہو رہا ہے مجھے... جند کور۔"

جند کور نے مگ خالی کردیا تھا "کیا ہے جی!"

"کوئی۔ گڑبڑ ہوئی ہے۔ تُو نے دیکھا ہوگا..... جب میں فون کر رہا تھا۔ تو یہ..... یہ دونوں حرامی..... ان کی تو....." اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔

سردار جی کی زبان میں خفیف سی کیفیت محسوس کر کے میرا دل باغ باغ ہوا۔ دوا نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا تھا۔ میں نے سردار جی کو شانہ دبا کے وہیں بٹھا دیا۔ "چھڈو پراں سردار جی۔ اب تو تمہارے بارہ بج گئے۔"

سردار نے چلّا کے کہا "جند کور..... انہوں نے..... مگ بدلے تھے؟ اوئے تیرا بیڑا غرق..... تُو کیا دیکھ رہی تھی..... پاگل کی بچی۔"

اس نے اطمینان سے کہا "مگ خود تم نے سب کو دیے تھے۔ سب نے اپنی اپنی کافی پی ہے۔ کیوں؟ کیا ہوا؟"

"میرا بیڑا غرق..... بالکل غرق....." اس نے بڑی مشکل سے آنکھیں کھلی رکھتے ہوئے کہا۔ غنودگی اس کے اعصاب پر سوار ہونے لگی تھی۔ اس نے کسی ہکلانے والے کی طرح ہمیں اپنی مادری زبان میں وہ گالیاں دیں جو درحقیقت فادری تھیں مگر اس کے سوا وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ وہ محاورہ پھر درست ثابت ہو گیا تھا کہ کنواں کھودنے والا خود اس میں گرتا ہے۔ وہ خود نہیں گرا تھا، ہم نے اسے گرا دیا تھا مگر انت بھلا سو بھلا۔ گالیاں بکتے ہوئے اس کا سر ڈولنے لگا اور آنکھیں بند ہونے لگیں۔

جند کور نے تشویش سے کہا "ہائے ہائے۔ کیا یہ فوت ہو رہا ہے؟"

میں نے کہا "نہیں، یہ سونا چاہتا ہے۔ بہت جلد تم بھی سو جاؤ گی۔ اس نے کافی میں خواب آور دوا ملائی تھی۔"

اس نے چلّا کے کہا "سردار جی! ہائے ہائے یہ کیا ظلم کیا تم نے۔ گھر آئے مہمانوں کو زہر دے دیا۔"

لیکن اس وقت تک سردار صوفے پر لڑھک گیا تھا اور نیند کی آغوش میں پہنچ گیا تھا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"تم نے جانتے بوجھتے یہ کافی کیوں پی؟" میں نے کہا۔

"اپنے آپ کو بچانے کے لیے" وہ بولی "ورنہ یہ سمجھتا کہ میں نے جانتے بوجھتے کافی نہیں پی اور میں نے ہی تمہیں خبردار کر دیا تھا۔ تم نے مگ بدلے مگر میں نے اس سے یہ بات چھپائی۔"

میں نے کہا "اب تم بھی سو جاؤ گی۔ سونے سے پہلے یہ بتا دو کہ چوہدری دلاور کے دیے ہوئے دس ہزار پاؤنڈ کہاں رکھے ہیں۔"

اس نے کہا "کپڑوں کی الماری میں، کپڑوں کے نیچے۔"

میں نے کہا "گھر میں کوئی ریوالور ہے؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا "وہ بھی وہیں ملے گا۔"

"تم نے بڑا احسان کیا ہم پر....."

"میں نے اپنا قرض چکایا ہے" وہ بولی۔

"احسان میں یہ حساب نہیں ہوتا۔ جو ہم نے کیا وہ اپنی جگہ۔ جو تم نے کیا اس کی حیثیت اپنی جگہ۔ یہ ایک اخلاقی ذمّے داری تھی جس کا تمہیں احساس تھا۔ ہمیں تو کچھ علم ہی نہیں تھا۔"

"جب یہ اُٹھے گا تو مجھے بہت مارے گا۔ ہڈیاں توڑ دے گا کہ میں نے اسے دغا دی۔"

"تم کہہ سکتی ہو کہ غلطی خود اس نے مگ رکھتے یا پکڑاتے وقت کی ہو گی۔"

اس نے کہا "نہیں۔ یہ بات وہ آسانی سے نہیں مانے گا۔ مار تو مجھے کھانی پڑے گی۔"

"سردار ویسے تو بڑا دم بھرتا ہے تمہاری محبت کا۔"

وہ تلخی سے ہنسی "مرد باہر کچھ اور ہوتے ہیں، گھر میں کچھ اور۔ تم کیا سمجھتے ہو مجھے..... معلوم نہیں، یہ کیا نظربازی کر رہا تھا۔"

"تم نے دیکھا تھا؟"

"میں..... میں تو دیکھتی رہتی ہوں..... بس دیکھتی رہتی ہوں اور..... اور کر بھی کیا سکتی ہوں۔ یہ حق مجھے حاصل..... نہیں..... کہ میں... بھی... جس... کو... پسند... کروں... اس... کے... ساتھ... چلی جاؤں..... لیکن..... تم..... تم پھر آنا..... تمہاری خاطر میں..... دل و جان ہتھیلی پر رکھ کے..... دروازہ کھول سکتی ہوں..... آدھی رات کو بھی..... اسے..... ایسے ہی سُلا کے۔ ایک بار ضرور آنا..... بولو، آؤ گے نا؟..... آئی..... آئی لَو یو سکندر....."

جب اس کا سر صوفے کی پشت سے لگ گیا، آنکھیں بند ہو گئیں اور زبان خاموش ہو گئی تو میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ "پاگل عورت!"

"پاگل، مجبور اور بے بس عورت۔ جو نہ جھوٹ بول سکتی ہے اور نہ سچ۔ یک طرفہ وفاداری کے عہد کی پابند" محسن بولا "یہاں یہ جملہ بولنا کتنا آسان ہے۔ ہر لڑکا، ہر مرد، ہر شوہر، ایک میکانکی انداز میں ہر روز اسی طرح اظہارِ عشق کرتا رہتا ہے اور گویا زبان سے اقرار کرتا رہتا ہے کہ ابھی تک میں کسی اور کو نہیں چاہتا۔ ورنہ محبت ان تین لفظوں کی ادائیگی کا نام ہے۔"

"سردارنی کو بھی یہاں کے ماحول نے احساسِ محرومی میں مبتلا کر دیا تھا۔ شاید اس سے یہ جملہ کہنے والا کوئی نہیں تھا مگر یہاں عورت بھی ایسا کہہ سکتی ہے۔ جس سے چاہے، جب چاہے۔"

محسن نے گھڑی دیکھی "کیا پتا دلاور آنے والا ہو؟"

"جو آئے۔ آئے کہ ہم دل کشادہ رکھتے ہیں" میں نے زبان میں کہا۔

"ہمیں اسٹیج پر وہ منظر پیش کرنا چاہیے جو چوہدری دلاور کی نظریں دیکھنا چاہتی ہیں" محسن بولا۔

ہم نے سردار جی کو بالکل سیدھا بٹھا دیا۔ اس کی پشت دروازے کی جانب تھی چنانچہ اندر آنے والا فوراً نہیں جان سکتا تھا کہ وہ جاگ رہا ہے یا سو رہا ہے۔ سردارنی کو ہم نے اُٹھا کے بیڈ روم میں منتقل کر دیا اور کمبل اوڑھا کے سُلا دیا۔ میں نے کپڑوں کی الماری کی تلاشی لی تو مجھے اوپر والے خانے میں احتیاط سے پھیلائے گئے دس ہزار پاؤنڈ کے نوٹ اس شیٹ کے نیچے مل گئے جو کپڑوں کو گرد سے بچانے کے لیے

تھی۔ اس میں ایک تجوری ٹائپ خانہ بھی تھا مگر رقم اس میں نہیں تھی۔ خانہ مقفل بھی تھا۔ ممکن ہے اس میں مزید رقم ہو یا سردارنی کی جیولری۔ میں نے اسے کھول کے دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی مگر محسن نے سردار جی کی بیڈ سائڈ ٹیبل سے چابیوں کا ایک گچھا نکال کے مجھے پیش کیا تو میں نے بھی سوچا کہ دشمن کے ساتھ رعایت کیسی۔ مالِ غنیمت حلال ہے تو پھر جیسا دلاور کا مال ویسا ہی سردار جی کا۔

سیف کے خفیہ خانے سے بھی ریوالور برآمد ہوا۔ اس کے چیمبر میں پوری چھ گولیاں موجود تھیں۔ خانے میں فلیٹ کی ملکیت کے کاغذات تھے اور خاصی مہنگی جیولری تھی۔ انہیں میں نے ہاتھ نہیں لگایا۔ عورت کو اپنے زیورات سے بھی اتنا ہی پیار ہوتا ہے جتنا اپنے حُسن یا جوانی سے۔ شوہر کی اور بچوں کی محبت کے بعد۔

الماری بند کر کے ہم نے دس ہزار پاؤنڈ کی رقم پولیتھین کے دو شاپنگ بیگز میں ڈالی اور یہ پیکٹ اپنی اپنی پتلون میں شرٹ کے نیچے اڑس لی پھر ہم نے دروازے کی کنڈی کھولی مگر دروازے کو بند رکھا اور خود صوفوں پر آنکھیں بند کر کے لیٹ گئے۔ میری ٹانگیں صوفے پر بیٹھنے کے انداز میں لٹکی ہوئی تھیں اور ایسا لگتا تھا کہ میں بیٹھے بیٹھے لڑھک گیا ہوں۔ محسن نے لڑھک کر قالین پر گر جانے کو ترجیح دی۔

چند منٹ بعد میرا جسم اکڑنے لگا "یار، یہ پوز نیچرل تو ہے مگر ہے بہت مشکل۔"

"اللہ تیری مشکل آسان کرے۔ ہم مزے میں ہیں اور بڑے آرام سے لیٹے ہوئے ہیں دوست۔ چاہو تو تم بھی گر جاؤ۔"

میں نیچے گر گیا۔ میرا چہرہ دروازے کی طرف تھا اور آنکھیں بھی کھلی ہوئی تھیں۔ میرے کان باہر کی ہر آواز پر لگے ہوئے تھے۔ سردار جی کو فون کیے تقریباً آدھا گھنٹا ہو گیا تھا۔

"یار، وہ آئے گا بھی یا نہیں۔ کیا پتا سکھ نے کسی اور کو فون کیا ہو؟" محسن نے کہا۔

میں نے کہا "صبر..... صبر۔ لندن بہت بڑا شہر ہے۔"

"اپنے چک جھمرہ سے بھی بڑا؟"

میں نے کہا "ٹیکسی بھی ٹریفک جام میں پھنس جاتی ہے۔"

"چک جھمرہ کی طرح۔ وہاں بھی میں نے دیکھا تھا کہ ایک بیل گاڑی نے راستہ روک لیا تھا۔ دونوں طرف سائیکل سوار کھڑے تھے اور تانگے والے۔ گدھے گھوڑے، گائے بھینس اور بھیڑ بکریاں، بڑا سخت ٹریفک جام تھا۔"

دستک ہوتے ہی میرے دل نے سینے میں چھلانگ ماری اور میں یکدم ساکت ہو گیا۔ ایک آنکھ تھوڑی سی کھول کے میں نے اندر آنے والے کو دیکھا۔ چوہدری دلاور کا منحوس چہرہ دیکھ کے مجھے اس وقت وہی خوشی حاصل ہوئی جو انتظار میں سوکھنے والے عاشق کو محبوب کی صورت نظر آنے سے ملتی ہے۔ خوشی و غم سب بڑے عجیب جذبے ہیں۔ کبھی کوئی باپ کی موت پر بھی اندر سے خوشی محسوس کرتا ہے کہ دولت، جائداد اور مال و زر کے خزانے پر بیٹھا ہوا سانپ مر گیا بالآخر۔ اب عیش و دکیش۔ کبھی حسّاس دل رکھنے والے دشمن کی المناک حادثاتی موت پر بھی دکھی ہو جاتے ہیں۔

چوہدری دلاور اکیلا نہیں آیا تھا۔ اس کے ساتھ مجھے ایک اور شخص نظر آیا جو صورت سے اپنا ہم وطن ہی لگتا تھا۔ اس نے سوٹ پہن رکھا تھا اور اس کے ہاتھ میں میڈیکل بیگ تھا۔ چوہدری دلاور کو دیکھ کے مجھے نواب خسرو جمشید کی یاد آئی۔ اس نے کلف لگی لٹھے کی شلوار قمیص پر سیاہ شیروانی پہن رکھی تھی۔ سر پر کلف دار طرّے والی پگڑی تھی اور اس نے بڑی بارعب قسم کی گھنی نوکیلی مونچھوں کے ساتھ سیاہ فریم والی عینک لگا کے اپنی شخصیت کو متاثر کن بنا لیا تھا۔

"لے بھئی۔ ادھر تو خیر سے معاملہ تیار ہے۔ اوئے سردارا....." چوہدری دلاور بڑے طمطراق سے قدم بڑھاتا آگے آیا۔

"سب خوابِ غفلت میں ہیں" ڈاکٹر نے کہا "سردار جی بھی....."

بس وہی ایک لمحہ تھا جب میں نے مکّار چیتے کی طرح شکار پر جست لگائی۔ ریوالور محسن کے پاس تھا۔ اس نے ڈاکٹر کو لات رسید کی اور اسے دیوار سے لگا دیا "خبردار۔ آواز نکالی تو گولی اوپر سے جائے گی اور جان بھی... نکل جائے گی۔"

چوہدری دلاور مجھے اپنے مقابل پا کے منجمد ہو گیا تھا۔ حیرت اور صدمے کا پہلا ردِعمل بہت شدید تھا مگر اب اس نے خود کو سنبھال لیا تھا۔

"بہت اچھے اپنے سکندرِ اعظم صاحب!" اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے مسکراتے ہوئے کہا "خوب چال چلی تم نے۔"

"چال تقدیر چلتی ہے چوہدری دلاور۔ آدمی کامیابی کو اپنی تدبیر سے اور عقل کی عقدہ کشائی سے منسوب کر لیتا ہے۔ ناکامی کو بدبختی کا نام دے کر مطمئن ہو جاتا ہے۔"

اس نے سردار جی کی طرف دیکھا "سکھ واقعی سکھ ہوتا ہے۔ ہیں جی۔ بارہ بجے کا وقت تو ایسے ہی بدنام ہے۔ ان کی عقل کی گھڑی میں چوبیس گھنٹے سوئیاں ایک دوسرے پر دھری رہتی ہیں..... ہیں جی، کیا کہتے ہیں اسے، منطبق۔"

"یہ سب فضول باتیں ہیں۔ بات اِسی وقت کی ہے۔ وقت کے اِس لمحے کی ہے جس سے آدمی ساری عمر بھاگتا رہتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ آدمی قسمت کو شکست نہیں دے سکتا۔ اس کا یقین تب آتا ہے جب اچانک وہ خود کو بند گلی میں پاتا ہے، جیسے تم۔"

"بند گلی..... یہ چنگا بھلا فلیٹ ہے جی۔ اور یہ گلی بھی....." اس نے مصنوعی شگفتگی کا سہارا لینے کی کوشش کی "یہ اپنے ڈاکٹر صاحب تو آئے تھے اپنا کام دکھانے۔"

"یہ دیکھنے کے لیے کہ کون کتنا بے ہوش ہے؟ یا کچھ

انجکشن وغیرہ لگا کے لمبی نیند سُلانے کے لیے.... محسن' اپنے ڈاکٹر صاحب کو بھی ادھر ہی لا کے بٹھا دے۔ تم بھی بیٹھو دلاور' بہت عرصے بعد ملاقات ہوئی ہے۔ تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ یہاں مداخلت کرنے والا کوئی نہیں۔"

ڈاکٹر کسی مزاحمت کے بغیر اس صوفے پر بیٹھ گیا جس پر کچھ دیر پہلے میں لیٹا ہوا تھا۔ وہ ذرا بھی خوف زدہ نہیں تھا۔ کسی سے اجازت لیے بغیر اس نے میز پر سے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر اُٹھا لیے۔

محسن نے اسے خبردار کیا "یہاں تم اس وقت سانس بھی ہماری اجازت سے لوگے۔ پھر ایسا رسک مت لینا۔"

میں نے کہا "غالباً تم ڈاکٹر شاہ ہو!"

اس نے سگریٹ جلا کے اقرار میں سہلایا "اب میرے پاس برطانوی شہریت ہے۔ اس بات کا خیال رکھنا۔"

محسن نے اس کے منہ پر لات ماری۔ سگریٹ اس کے منہ میں گھس گئی اور اس کا چشمہ غائب ہو گیا۔ اس نے کراہ کے اپنا ہاتھ منہ سے بہنے والے خون پر رکھا اور بولا "مجھے مار کے تم بچ نہیں سکتے۔"

محسن نے اس کو دوسری لات ماری جو اس کے پیٹ میں لگی۔ "ہم نے بہت سے بھونکنے والے کتے مارے ہیں اور ابھی تک مار رہے ہیں۔ تم جس ملک کے بھی شہری ہو اس کے لیے باعثِ شرمندگی ہو۔ کیا برطانوی شہری بن کے تم اس ریوالور کی ایک گولی کے مستحق نہیں رہے۔ یہاں تم باعزت موت مرو گے۔ اپنے پاکستان میں ہوتے تو میں ان سب کو مدعو کرتا جن کو تم نے وزیر خان ٹرسٹ اسپتال میں داخل کیا۔ پاگل کرنے کے لیے۔ پاگل بنا کے مار دینے کے لیے۔ میں ان سب کے ورثا اور لواحقین کو بلاتا جنہوں نے تمہیں اس کام کا منہ مانگا معاوضہ ادا کیا تھا اور اس کے باوجود بلیک میل ہوئے تھے۔ ان سب کے سامنے میں تم پر بھوکے پاگل کتے چھوڑ دیتا جو تمہاری ہڈیاں تک چبا کے ہضم کر جاتے۔"

میں نے کہا "چوہدری دلاور۔ شاید اب یہ بازی تمام ہونے کو ہے۔ تمہارے ترکش میں اب کوئی تیر نہیں۔ شکار گاہ میں تم اکیلے ہو۔"

اس نے پگڑی اُتار کے میز پر رکھ دی پھر مونچھیں الگ کر کے عینک بھی اُتار دی۔ "چوہدری دلاور مر سکتا ہے' ہار نہیں مان سکتا اپنے سکندرِ اعظم' مرنے کی بات ہوتی تو تم مجھے کب کا مار چکے ہوتے اور میں نے بھی وہ ایک گولی بہت پہلے خرچ کر دی ہوتی۔"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "کون سی گولی! جیسے۔ اُنے دانے پر کھانے والے کا نام ہوتا ہے۔ ایسے ہی ہر گولی پر مرنے والے کا نام۔ کیا تم نے کسی گولی پر سکندر ربخت لکھا ہوا دیکھا تھا۔"

"کیا تم نے چوہدری دلاور کا نام لکھوا لیا ہے کسی گولی پر....؟"

"نہیں۔ یہ نام انسان کے ہاتھ نہیں لکھتے۔ فرشتۂ اجل لکھتا ہے۔ اب بس بات یہ ہے کہ میں نہیں جانتا کہ وہ گولی کہاں ہے اور کس ریوالور میں ہے۔"

"تاہم تم کو سوچنا چاہیے کہ کہیں سردار جی کے ریوالور میں وہ گولی موجود نہ ہو" محسن نے کہا۔

"ایسی باتوں سے کیا حاصل۔ اپنے سکندر صاحب' میں نے اپنے سارے پتے میز پر رکھ دیے۔ اب میں بھی بتاؤں۔ چوہدری دلاور کے پاس ڈگری نہ سہی' عقل ہے اور تجربہ ہے۔ تجربہ کہتی ہے کہ جنگل میں شکاری کو اپنی آنکھیں ہر طرف رکھنی چاہئیں۔ آگے پیچھے دائیں بائیں' اوپر نیچے' ہیں جی۔ اور سیدھے راستے پر ٹیڑھا چلنا چاہیے۔ تجربہ یہ ہے کہ کسی حصار میں داخل ہونے سے پہلے اسے توڑنے کے اسباب مہیا کرو۔ اندر جانے کا راستہ ایک ہو تو واپس باہر آنے کے دو راستے بناؤ۔"

"اس فلیٹ کا تو ایک ہی دروازہ ہے" میں نے کہا "جس سے تم اندر آئے تھے۔ دوسرا راستہ کھڑکی سے باہر چھلانگ لگانے کے لیے ہے۔"

وہ مسکرایا "سیانا کمانڈر ساری فوج ایک ہی محاذ پر ایک ساتھ نہیں جھونکتا۔ وہ دوسری دفاعی لائن تیار رکھتا ہے۔"

"تم مجھے اتنا احمق سمجھتے ہو کہ نیچے تمہارے اور ساتھی موجود نہیں ہیں اور تم کو دیر ہوئی تو وہ توپ خانہ لے کر اوپر چڑھائی کر دیں۔ پولیس کو مطلع کر دیں گے کہ اپنے چوہدری صاحب کو بڑی دیر ہو گئی ہے۔ کہیں وہ فوت نہ کر دیے گئے ہوں۔"

"یہ تمہیں بھی اندازہ کر لینا چاہیے تھا" دلاور بولا۔

"خیر.... مجھے بتاؤ وہ کہاں موجود ہیں۔ میں انہیں ادھر لے آؤں۔ یا پھر نیچے جا کے بتا دوں کہ وہ تمہارے سفرِ آخرت کی تیاری کریں۔" میں نے کہا "انہیں معلوم تو ہونا چاہیے کہ تم کیا چاہتے ہو۔ زمین میں گاڑا جانا یا جلایا جانا۔ جلائے جانے میں تمہارا یہ فائدہ ہے کہ بعد میں کوئی تمہارے مدفن پر آ کے تھوکے گا نہیں۔ مغفرت کی دعا کا تو سوال ہی نہیں۔ دعا مانگی جاتی ہے امید پر۔ شیطان کی بخشش کون مانگے گا۔ زمین بھی یہی مناسب ہے اگر تم دفن ہونا چاہو۔ پاکستان کی پاک مٹی کو اپنے وجود سے ناپاک کرنے کا گناہ بعد از مرگ...."

"بند کرو یہ فضول بکواس سکندر ربخت...." دلاور کا ضبط بالآخر جواب دے گیا "تم اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔"

میں نے کہا "وقت تم نے بہت ضائع کیا ہمارا۔ اور اپنی لاحاصل کوششوں میں صرف کرتے رہے۔ وقت نے بالآخر ثابت کیا؟ یہی کہ قدرت اپنا دستور نہیں بدلتی۔ خیر و شر کی جنگ ازل سے جاری ہے مگر تم دیکھ سکتے ہو کہ آج بھی دنیا میں شیطان پرستار نہیں ہیں۔ سوائے تم جیسے مردودوں کے۔ خدا کی خدائی دائم ہے اور خیر کی۔ سچ کی اور نیکی کی ہار نہیں...."

وہ تلخی سے مسکرایا "اپنے فلسفی صاحب! یہ تم نہیں تمہاری عمر کے جذبات بول رہے ہیں۔ جسے تم خیر و شر کی جنگ سمجھتے ہو جی' وہ درحقیقت فنا و بقا کی جدوجہد ہے۔ دنیا میں جینے کا حق ہے مگر سانپ اور بچھو بھی جینا چاہتے ہیں۔ خواہ سب ان کے دشمن ہوں اور انہیں مار دینا چاہتے ہوں مگر وہ زندہ ہیں' ہر جگہ موجود ہیں۔ بلبل کی آواز پر شاعروں نے دیوان بھر دیے تو کیا ہوا۔ کوا اسی طرح کائیں کائیں کر رہا ہے۔ پھول گلشن میں ہیں تو کانٹے شرم سے مرتے نہیں کہ ہمارا وجود سب کی آنکھوں میں کھٹکتا ہے تو کیا حاصل اپنے وجود کو برقرار رکھنے کی جدوجہد سے...."

میں نے حیرانی سے کہا "دلاور۔ تم بالکل نئی زبان بول رہے ہو آج۔"

"زبان حالات کی بولی بولتی ہے سکندر!" دلاور نے کہا "میں نے پہلے بھی تم سے کہا تھا کہ آؤ' ہم مل کے جینے کی راہ نکالتے ہیں۔ بے شک یہ بہت مشکل تھا اور ناممکن لگتا تھا مگر تم نے کوشش کرنے کی ضرورت کو بھی تسلیم نہیں کیا۔ میں نے تو معافی تلافی کی راہ بھی دکھائی مگر تم نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ میں اپنی غلطی پر' گناہ پر یا جرم پر تم سے دست بستہ معافی مانگنے کے لیے۔ تمہارے قدموں پر سر رکھنے کے لیے' تمہارا نقصان پورا کرنے کے لیے اور ترکو سب کچھ دینے کے لیے بھی تیار تھا مگر بات یہی ہے اپنے سکندرِ اعظم صاحب کہ تم خدا نہیں' میرے جیسے عام انسان ہو۔ خدا معاف کر سکتا ہے۔ بندے کے دل سے بدلے کا زہر نہیں نکلتا۔ تمہارے دل میں نہ اتنی وسعت تھی اور نہ تمہاری فطرت میں عفو و درگزر کی صلاحیت۔ پھر میں کیا کرتا؟ صرف تم کو جینے کا حق دے کر خود مر جاتا؟ تم پر انتقام کا بھوت سوار تھا تو میں تمہارا بھوت کیسے اتارتا؟ اپنی جان دے کر.... نہیں سکندر' تم بھی وہی کر رہے تھے جو میں کر رہا تھا۔ تم بھی زندگی کے لیے لڑ رہے تھے۔ تم بھی شکست سے بھاگ رہے تھے۔ تم بھی غرور میں مبتلا تھے کہ زیادہ طاقتور' زیادہ ذہین اور زیادہ حقدار ہو۔"

میں نے کہا "شاید پہلی بار تم نے مجھے دلیل سے قائل کیا ہے مگر اب یہ توقع بھی مت رکھو کہ میں ان باتوں سے متاثر ہو کے تمہیں گلے لگاؤں گا اور کہوں گا کہ چلو جو ہوا سو ہوا' میں نے تم کو قانون کے حوالے کرنے کا جو عہد کیا تھا میں اس پر قائم ہوں۔ قانون میرا بنایا ہوا نہیں ہے۔ تم خود اسی قانون کی وجہ سے جینے کے حق کی بات کرتے ہو۔ یہاں میرا تمہارا اپنا اپنا قانون ہوتا تو یہ دنیا ایک جنگل ہوتی۔ جزا اور سزا کا تصور ازلی و ابدی ہے۔ تم اپنے نفع و نقصان کے حوالے سے دیکھتے ہو۔ شرائط کے تحت اور ڈسپلن کے مطابق جینے کا سبق بچے کی پیدائش سے شروع ہو جاتا ہے اور پھر وقت سب سکھاتا رہتا ہے۔ کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے۔ یہ کسی کتاب میں نہیں لکھا مگر بعض کتابوں میں بھی ہے۔ یہ ایک مذہب انسانی معاشرے کی بقا کے اصول ہیں۔ تم آدھی رات کو اپنے گھر میں ڈھول نہیں بجا سکتے۔ اپنی چھت پر ننگے نہیں ناچ سکتے۔ اپنے آپ کو ہلاک تک نہیں کر سکتے۔ اپنا جسم نہیں' سب کچھ اسی طرح تمہارا ہے جیسے کرائے کی شرائط پر زمین تمہاری ہو جاتی ہے۔ صرف ننانوے سال کے لیے۔ زندگی کی لیز بھی اس سے زیادہ تو نہیں ہوتی۔ شرائط کی خلاف ورزی پر خود انسان کے ہاتھ انسانوں کو زندگی سے بے دخل کر دیتے ہیں۔ سزائے موت قاعدے قانون اور اصول کے مطابق دی جاتی ہے۔ دفاع کرنے کا حق تمہیں حاصل رہے گا مگر تمہارا مقدمہ اسی دنیا کی عدالت میں پیش ہو گا چوہدری دلاور جس سے تم نے سب کچھ حاصل کیا۔ زبردستی چھینا' خود کو زیادہ طاقتور سمجھتے ہوئے کسی کو اس کے حق سے محروم کیا' مثلاً میرے والد کو.... تم اتنے طاقتور نہیں تھے دلاور جتنا خود کو سمجھتے تھے۔ تم ساری دنیا سے' دنیا کے قانون سے اور موت سے اکیلے نہیں لڑ سکتے تھے اور جب یہ حقیقت تم پر عیاں ہوئی تو تمہارے لیے اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ تم فرار کی دفاعی جنگ لڑو۔ فرار کے بعد پھر فرار۔ مگر جیسا کہ میں نے کہا' بالآخر تم ایک بند گلی میں پہنچ گئے ہو کیونکہ وہ لمحہ جو فیصلہ کرتا ہے' آ گیا ہے۔"

"یہ تم کیسے جان سکتے ہو۔ ایسا تم نے پہلے بھی کئی بار سوچا اور کہا تھا۔" دلاور نے کہا۔

"تم نے لندن تک ہمارا پیچھا کیا۔ جارج کو مروانے کی کوشش کی۔ ہمیں مجرم بنانے کے لیے خود جرم کیے۔ اس سکھ کو میری گرفتاری کا کچھ نہیں ملا... (بقیہ سطر ناخوانا) بالآخر میں نے وصول کیا۔ باقی تم اپنے ساتھ لائے ہو گے۔ مہربانی کر کے وہ محسن کو دے دو۔"

"اس کے لیے مجھے جیب میں ہاتھ ڈالنے ہوں گے۔ جیب میں ریوالور بھی ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔ تم کوشش کرو ہمیں شوٹ کرنے کی۔ ایک سیکنڈ کے دسویں حصے کا فرق بھی بہت ہوتا ہے۔ سویں یا ہزارویں حصے کی پیمائش تو ممکن نہیں مگر شاید اسی فرق کے ساتھ محسن کی گولی سبقت لے جائے گی۔ فیصلہ تو دماغ کرتا ہے۔ تمہارے دماغ کے یہ فیصلہ کرنے سے پہلے کہ مرنے سے پہلے مار دو۔ وہ گولی تمہارے دماغ میں گھس کے سب کھیل ختم کر دے گی۔ تمہیں عمل درآمد کی مہلت ہی کہاں ملے گی۔"

چوہدری دلاور کی اس بات کو میں نے بظاہر جھوٹ قرار دیتے ہوئے قابلِ غور نہیں سمجھا تھا کہ اس کے کچھ ساتھی نیچے بھی اس کی واپسی کا انتظار کر رہے ہیں لیکن درحقیقت میں اس خیال سے متفکر تھا کہ کہیں کچھ دیر میں وہ دندناتے ہوئے اوپر نہ آ جائیں۔ وہ پولیس کو مطلع نہ کر دیں کہ دال کہاں ہے اور اس میں کالا کیا ہے؟

ہم اپنے وطن میں ہوتے تو کسی مشتبہ شخص کا سراغ لگانا بھی ناممکن ہوتا مگر گوروں کے دیس میں ہم جیسے کالے ابھی تک آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں تھے۔ جوق در جوق ہجرت اور کثرتِ اولاد سے مسلم اقلیت کو اکثریت میں تبدیل کر دینے کا طویل المعیاد منصوبہ اور بالآخر انگلستان کو پاکستان بنانے کا خواب ایسا ہی تھا جیسا ایک انڈے سے مرغی خانہ۔ مرغی خانے کے منافع سے مویشی خانہ' مویشی خانے کی آمدنی سے کارخانے قائم کر کے بڑھانے کی ساری صنعت و تجارت کا مالک بن جانے کا خیال۔ نیچے

کے محافظ موجود تھے تو با آسانی شناخت کیے جاسکتے تھے۔
میں نے محسن سے فرنچ میں کہا "تو یہ توپ میرے حوالے کر اور ذرا نیچے جاکے گردوپیش کا شرلاک ہومز کی نظر سے جائزہ لے۔"

"یہ خاصا مشکل ہوگا۔ وہ تو مجرم یا سُراغ کے سوا کچھ دیکھتا ہی نہیں تھا اور میری خطاکار نظر بہک جاتی ہے۔ کسی کافر حسینہ کے بال یا گال' خال اور چال...."

"اگر تجھے کوئی بدمعاشوں کے اسٹائل میں کھڑا دکھائی دے جو اِدھراُدھر سے زیادہ اوپر دیکھنے میں مصروف ہو اور صورت سے ایشیائی لگتا ہو تو اس کو پیغام دینا کہ اپنے چوہدری صاحب یاد فرمارہے ہیں۔ اوپر آکے وہ بھی پائے کھانے جیسے ڈاکٹر شاہ نے دو لاتیں کھائی ہیں۔"

"اور اگر وہ اُلٹا میرے سری پائے الگ کرنے پر آمادہ ہو؟"

"تو حافظ خدا تمہارا۔ تیرا خون رائگاں نہیں جائے گا۔ تو شہید کہلائے گا اور تیرا مزار شریف ولایت میں بنے گا۔ یہ اعزاز حاصل کرنے والا اپنے خاندان کا پہلا شخص تو ہوگا۔"

محسن نے ریوالور مجھے تھمایا اور بولا "اگر میں واپس نہ آؤں تو یہ مت سمجھنا کہ مجھے کوئی میم ورغلا کے بھگالے گئی' گل کو بھی سمجھادینا۔"

میں نے دلاور کو مخاطب کیا "خدا کا کوئی کام مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔ اگر آج ہم لوٹ گئے ہوتے تو تم سے شرفِ ملاقات کیسے حاصل ہوتا۔ ہم جسے اپنی بدقسمتی سمجھ رہے تھے وہ تمہاری بدقسمتی تھی۔"

"کیا معلوم اب بھی قدرت کو کیا منظور ہے۔ تم کیسے جان سکتے ہو۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا "سچ کہا تم نے۔ اس کے باوجود ہم سب اپنے ارادوں پر اُمید کے ساتھ عمل کرتے ہیں۔ اب تمہارا یہ سکھ دوست چاہتا تھا کہ اپنی پُرانی موررس مائنر کے بدلے بیس ہزار پاؤنڈ میں نئی گاڑی خرید لے اور آدھی گاڑی تو خرید ہی چکا تھا۔ ہمیں یہاں لانے اور کافی پیش کرنے کے بعد کسی برانڈ نیو لگژری کار کی سواری کا لطف اس کے لیے تصوّر سے حقیقت بن گیا ہوگا۔ مگر اس نے تمہیں مایوس کیا... خیر' آج کل تمہارے ستارے گردش میں ہیں۔ ہر قدم پر مایوسی کا سامنا ہوتا ہے۔ تم نے جارج کو مارنے کی کوشش کی۔ سکندر بخت بن کے جیل میں بھی پہنچ گئے اور اسے زہر آلود سگریٹ پلانے میں بھی کامیاب رہے مگر وہ پھر بھی بچ گیا۔ یہی نہیں' اس نے تمہیں پہچان بھی لیا۔ اور آئندہ بھی تمہیں وہی ایک چشم دید گواہ کی حیثیت سے شناخت کرے گا۔ ہم نے تمہیں ایک مہاراجا کے روپ میں بھی شناخت کرلیا تھا۔ محسن نے تمہیں راجا کنگال رائے آف قلاش پور کا خطاب دیا تھا کیونکہ تم رولز رائس سے نہیں ایک ٹیکسی سے اُترے تھے۔ مگر ہم تمہاری تلاش سے مایوس ہوچکے تھے۔ اچھا ہوا جو تم خود ہی آگئے۔"

"ابھی تک یہ ملاقات بے مقصد ہے" وہ بولا۔
میں نے کہا "ایک مقصد تمہارا تھا۔ وہ پورا نہیں ہوا۔ دوسرا مقصد ہمارے سامنے ہے۔ اللہ اس میں کامیاب کرے۔ کہ مشکل لگتا ہے مگر ناممکن نہیں۔"

"آخر تم کیا چاہتے ہو؟" دلاور کے لہجے میں شکست بولنے لگی۔

"ہمارا کوئی خفیہ منصوبہ نہیں ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ تم کو واپس پاکستان لے جائیں اور تم جس کی امانت ہو' اس کے حوالے کردیں۔ تم قانون کو دھوکا دے کر بھاگ آئے تھے' تمہیں قانون کی تحویل میں ہونا چاہیے۔"

"اور تم.... کیا تمہاری اور میری پوزیشن مختلف ہے؟"

"ہاں۔ تم نے اپنی الزام تراشی سے جھوٹ اور فریب سے قانون کو یقین دلادیا تھا کہ ہم بھی مجرم ہیں۔ جرم تمہارے تھے جو ہم سے منسوب کرانے میں تمہاری کوششوں کو بڑا دخل تھا۔ جب محاورے کے مطابق دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوگا تو ہم یہ شعر پڑھیں گے کہ مدعی لاکھ بُرا چاہے تو کیا ہوتا ہے۔ وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے... اور تمہارے لیے پسماندگان فاتحہ پڑھیں گے۔"

وہ زہریلے انداز میں مسکرایا "اور تم یہ کارنامہ کیسے سرانجام دوگے؟ مجھے یہاں سے واپس پاکستان لے جاکے قانون کے حوالے کرنے کا؟"

"اس کے بہت سے طریقے ہیں۔ آسان کوئی بھی نہیں۔ ایک یہ کہ ہم تمہیں دلائل سے قائل کریں کہ اس میں تمہاری فلاح ہے۔ آخرت کے دائمی عذاب سے۔ اسی دنیا میں اپنے کیے کی سزا قانون کے مطابق بھگت لینا بہتر ہے۔ ہے تو یہ فائدے کی بات مگر تم نہیں سُنوگے۔ دوسرا طریقہ ہے تم کو جادو کے ذریعے یہاں سے وہاں پہنچادینا۔ کوئی ایسا زبردست جادوگر مل جائے جو بس ایک بار اپنی چھڑی گھمائے اور شوں۔ تم لندن کے اسی فلیٹ سے لاہور کی جیل میں۔ اسی کوٹھری میں جہاں سے تم فرار ہوئے تھے لیکن سُنا ہے یہ جادو وغیرہ کچھ نہیں ہوتا۔ ابھی تک کوئی ایسا جادوگر بھی نہیں ملا جو سالم آدمی کو بلا ٹکٹ سات سمندر پہنچا سکے۔ چنانچہ ہم خود یہ کام کریں گے۔ تم کو کسی بوری بکس یا تابوت میں پیک کرکے لے جائیں گے۔ ایک پیس میں نہ لے جاسکے تو تمہارے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کریں گے۔"

محسن نے اوپر آکے اعلان کیا "نیچے سب لوگ مشتبہ لگتے ہیں مجھے مگر ان میں آدھی عورتیں ہیں جو کسی مرد کے ساتھ کہیں جارہی ہیں اور آدھے مرد ہیں جو باقی آدھی عورتوں کے ساتھ کہیں جانا چاہتے ہیں لیکن وہ سب ملعون گورے ہیں۔ اپنے ہندوستان یا پاکستان کا کوئی نہیں' صرف ایک شخص تھا۔"

"وہ کون تھا؟" میں نے کہا۔

"میں.... مگر میں بھی اب اوپر آگیا ہوں" محسن بولا۔

ڈاکٹر شاہ نے اپنی مدد آپ کے تحت خود کو مناسب طبّی امداد فراہم کی تھی اور اب دخل در معقولات نہ کرنے کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ شاید اسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ یہاں اس کا استقبال لاتوں کے بھوت کی طرح کیا جائے گا جو باتوں سے نہیں مانتے۔ مجرمانہ سرگرمیوں میں دلاور کا ساتھی ہونے کے باوجود وہ ڈاکٹر تھا اور کسی بھی مجرم کے لیے اپنا مستقبل تاریک نہیں کرسکتا تھا۔ وقتی طور پر پیسے کا لالچ کسی بھی وکیل' انجینئر' صحافی یا ڈاکٹر کو غیر قانونی معاملات میں ملوث کرسکتا ہے مگر کسی معزز پیشے سے وابستہ شخص صرف پیسے کی خاطر جرائم کی زندگی قبول نہیں کرسکتا۔ دلاور کا ساتھ دینا ڈاکٹر شاہ کی مجبوری بن گیا تھا یا اسے بہت آسانی سے ملنے والی دولت کے انبار نے اپنی اخلاقی ذمّے داریوں سے دور کردیا تھا۔ اس کا مجھے علم نہیں تھا مگر اس کا لاہور سے لندن پہنچ کے برطانوی شہریت حاصل کرلینا یہی ظاہر کرتا تھا کہ ڈاکٹر شاہ نے خود کو چوہدری دلاور کے چُنگل سے آزاد کرالیا تھا اور وہ اس دلدل سے نکل آیا تھا جس میں اس کے پیشے کی آبرو اور خود اس کی جان کو خطرہ لاحق تھا۔

چوہدری دلاور اس وقت اکیلا اور تہی دست تھا۔ اس کی جیب میں جو کچھ تھا وہ میز پر آگیا تھا۔ محسن نے اس کی شیروانی اُتروالی تھی۔ شیروانی کی جیبوں میں سے دس ہزار پاؤنڈ کے نوٹوں کے علاوہ ایک ریوالور بھی برآمد ہوا تھا۔ ایک پاسپورٹ پر اس کی تصویر' داڑھی مونچھوں اور طرۂ دستار کے ساتھ تھی۔ اس نے غیرشعوری طور پر اپنا نام بدلا تھا اور نواب خسرو جمشید کرلیا تھا۔ اپنا حُلیہ آئینے میں دیکھ کے اسے بھی یہ خیال ضرور آیا ہوگا کہ اس میں اور مرحوم نواب صاحب کی شباہت میں کتنی مماثلت ہے۔

میں نے پاسپورٹ کا معائنہ کرتے ہوئے طنز سے کہا "تو اب آپ مہاراجا کنگال رائے آف قلاش پور نہیں بلکہ نواب خسرو جمشید ہیں۔ اچھا طریقہ اختیار کیا تم نے ایک پُرانے ساتھی کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کا۔ جعلی پاسپورٹ بنوایا تو اس کا نام لکھوادیا جو اس دنیا میں ہی نہیں ہے۔"

"اپنے سکندرِ اعظم صاحب! یہ پاسپورٹ اصلی ہے۔ غور سے دیکھو۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ "وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ یہ نواب خسرو جمشید کا ہی پاسپورٹ تھا۔ چوہدری دلاور نے اپنی صورت کو تصویر کے مطابق بنالیا تھا۔ پانچ سال کے لیے جاری ہونے والا پاسپورٹ مزید ایک سال تک کارآمد تھا۔ یہ ہمارے دفتری نظام کا قصور کم تھا' عوامی شعور کا زیادہ۔ جائداد کی تقسیم میں وراثت کا مسئلہ نہ ہو تو کوئی ڈیتھ سرٹیفکیٹ تک حاصل کرنا ضروری نہیں سمجھتا۔ مرجانے والے کا نام نہ راشن کارڈ سے خارج ہوتا ہے نہ ووٹرز کی لسٹ سے۔ اس کا راشن کارڈ' پاسپورٹ' شناختی کارڈ' ڈرائیونگ لائسنس منسوخی کے لیے متعلقہ محکموں کے حوالے نہیں کیے جاتے۔ چنانچہ MISUSE بھی ہوجاتے ہیں۔ دروغ برگردن

داری۔ مشہور تو یہ بھی ہے کہ بہت سے مرکے خاک ہوجانے والوں کی پینشن جاری رہتی ہے اور غتربود ہوتی رہتی ہے۔ ان کے نام پر واجب الادا قرض کوئی ادا نہیں کرتا مگر نئے قرضے جاری ہوجاتے ہیں اور امداد وصول کرلی جاتی ہے۔

چوہدری دلاور نے دوسرا زیادہ خطرناک اسلحہ شیروانی کے نیچے شلوار کی ڈب میں چُھپار کھا تھا۔ گھیردار شلوار میں ایک خفیہ قسم کی اضافی جیب سے سائلنسر والا آٹومیٹک ریوالور برآمد ہوا جو شاید چوہدری دلاور کی آخری امید تھا۔ اس سے محروم ہوتے ہی مایوسی کی شام کا دھندلکا ناامیدی کی تاریک رات بن کے اس کی صورت پر پھیل گیا۔

میں نے دوسرا ریوالور محسن کو دے دیا۔ اب ہم دونوں مسلح تھے۔ چوہدری دلاور کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ میں خالی ہاتھوں سے بھی اس کی گردن مروڑ سکتا ہوں جیسے عورت کے نازک ہاتھ دُھلی ہوئی ریشمی قمیص کو پانی نچوڑنے کے لیے مروڑتے ہیں۔

"سکندر۔ مجھے ایک موقع اور دو.... کم سے کم میری بات سُنو اور پھر سوچو۔ میرا اور تمہارا فائدہ اسی میں ہے کہ...."

میں نے اسے گریبان سے پکڑ کے اُٹھایا اور دیوار پر دے مارا "فائدے اور نقصان کی بات بھول جاؤ دلاور۔ آج فیصلے کی رات ہے۔ یہاں میرے اور تمہارے سوا کوئی نہیں اور کسی کے یہاں مخل ہونے کا بھی امکان نہیں۔ اگر تم کسی کو بتاکے آئے ہو کہ تم کہاں جارہے ہو تب بھی شاید یہاں کوئی نہ آئے۔ اگر آیا تو یہ اس کی بدقسمتی ہوگی۔ ہمیں کوئی جلدی نہیں۔"

"مگر مجھے جلدی ہے۔ میرے پاس وقت کم ہے" دلاور نے دُکھی لہجے میں کہا۔

"شیروانی صاحب۔ اپنے چوہدری صاحب کو صبح کی فلائٹ پکڑنی ہے۔"

ڈاکٹر شاہ نے کہا "کیا میں کچھ کہہ سکتا ہوں۔"

"کہو۔ بس یہ خیال رکھنا کہ جھوٹ تمہیں نہیں بچاسکے گا" میں نے کہا۔

محسن بولا "ہم خود بھی تم سے بہت کچھ پوچھتے' اچھا ہے اگر تم رضاکارانہ طور پر سب سچ بتادو۔"

"میں جھوٹ بولنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ یہ تمہاری مرضی کہ میرے سچ کو جھوٹ سمجھو۔" ڈاکٹر شاہ نے کہا "جب میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میں نے اپنی شہریت بدل لی ہے تو مقصد یہ بتانا تھا کہ میں ان معاملات سے لاتعلق ہوگیا ہوں۔ جو مجھے پاکستان میں کرنے پڑے تھے۔"

"کیونکہ تم مجبور تھے" میں نے مصنوعی انداز میں اظہارِ ہمدردی کیا۔

"مجبوری کیا ہے۔ حالات کا تقاضا یا منہ زور خواہشات کا غلبہ۔ مجھے نہ کسی نے جان سے ماردینے کی دھمکی دی تھی۔

بلیک میل کیا تھا۔ دلاور کا ساتھ دینے سے پہلے میں نے ویسی ہی زندگی گزاری تھی۔ جیسی سب گزارتے ہیں۔ تم نے بھی گزاری ہوگی۔"

محسن نے اس کی تردید کی "ہم نے جو کچھ کیا' وہ سب نہیں کرتے۔"

"خیر۔ میں مجبور ہوگیا تھا مسلسل ناکامیوں سے۔ ڈاکٹر بننے کے بعد مجھے ایک سرکاری اسپتال میں نوکری ملی۔ وہاں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس میں ہر نوجوان پُرعزم اور جوشیلے ڈاکٹر کی طرح میں نے اصولی' اخلاقی اور قانونی مؤقف اختیار کیا۔ اس کی سزا مجھے یوں دی گئی کہ ایم ایس نے میرا ٹرانسفر ایک دور افتادہ گاؤں کی ڈسپنسری میں کرادیا جو لوکل ہیلتھ یونٹ کے نام پر بنا ہوا ایک خالی کمرا تھا۔ کرسی میز کے بغیر میں کام کرسکتا تھا مگر دوائیں' آلات اور علاج معالجے کی بنیادی سہولتیں بھی فراہم نہ ہونے کے باعث وہاں میرا وجود بے مصرف تھا۔ مقامی مولوی صاحب کے 'تعویذ' پیر صاحب کے آستانے کی خاک اور نیم حکیم صاحب کے نسخے زیادہ شفا بخش مانے جاتے تھے۔ میں تین ماہ بعد لوٹ آیا۔ لاہور جیسے شہر میں اپنا کلینک بنانا اور چلانا آسان کام نہیں۔ ہر جگہ پُرانے ڈاکٹر بیٹھے ہوئے ہیں جن کے ہاتھ کی شفا پر لوگوں کا اعتقاد ہے یا بڑی بڑی ڈگریوں والے اسپیشلسٹ ہیں جو میرے جیسے عام ڈاکٹروں کو اپنا اسسٹنٹ بنا کے کمپاؤنڈر کا کام لیتے تھے۔ اس وقت مجھے اتنے سرمائے کی ضرورت تھی جس سے میں کسی خوشحال آبادی میں شاندار اسپتال قائم کرسکوں۔ اسپتال نہ سہی ایک ایسا کلینک بنالوں جہاں آکے مریض متاثر ہوجائے کہ ڈاکٹر زبردست نظر آتا ہے۔ میری اپنی شخصیت میں کوئی کمی نہیں تھی۔ ساری بات چانس ملنے کی تھی جو تقدیر فراہم کرتی ہے۔ تقدیر نے مجھے چوہدری دلاور سے ملوادیا اور اس نے مجھے مطلوبہ رقم فراہم کرنے کی ہامی بھرلی۔"

"مطلوبہ رقم سے کچھ واضح نہیں ہوتا؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ دلاور نے بھی یہی کہا تھا کہ تم میرے کہے پر عمل کروگے تو سب کچھ بنالوگے۔ عالی شان مطب' عالی شان کوٹھی۔ عالی شان کار۔ جیب میں مال ہو تو دنیا میں کامیابی بھی خریدی جاسکتی ہے اور میں نے بھی سوچا کہ اصل مقصد تو منزل کا حصول ہے۔ وہ سیدھے راستے پر چل کے ملنے کی اُمید نہیں تو پھر کیا بھی کیا جاسکتا ہے۔ میں نے وہ کیا جو میرے پیشے کی تقدیس کے نام پر ایسی ہی تہمت ہے جیسے عورت کے نام پر طوائف ہونے کی۔ میں بھی طوائف بن گیا۔ آبرو اگر جسم کی ہوتی ہے تو پیشے کی بھی ہوتی ہے۔ کوئی جسم بیچے' آبرو یا اصول اور ایمان۔ کیا اسے طوائف کہنا غلط ہوگا۔ ایک سال تک میں وہاں بیٹھا جس کو میں طوائف کے کوٹھے سے زیادہ قابلِ نفرت جگہ کہوں گا۔ میں نے وہ کیا جس پر مجھے آج اس سے زیادہ شرم آتی ہے جتنی تمام عمر جسم فروشی کرنے والی عورت کو بڑھاپے میں آتی ہوگی۔ شاید نہ آتی ہو کیونکہ اس کا تو ... ہی مرچکا ہوتا ہے مگر میرا احساس زندہ تھا۔ اللہ مجھے معاف کرے۔ یومِ حشر وہ سب میرا دامن پکڑیں گے جو میرے پاس لائے گئے تھے تو نفسیاتی مریض بھی نہیں تھے۔ وہ ناخلف اولاد یا بیوی' پُرہوس گدھ جیسے رشتے داروں کے ہاتھوں ذہنی طور پر پریشان تھے' انہیں ڈر تھا کہ یہ سب ان سے سب کچھ چھین لینا چاہتے ہیں۔ ان کی تمام عمر کی کمائی ہتھیانے یا ان کی جائداد پر قبضہ کرنے کے لیے ان کو مارنا چاہتے ہیں۔ وہ وہم کے مریض ہوگئے تھے انہیں علاج کے لیے لانے والوں نے کہا کہ بڈھا سمجھا گیا ہے لاکھوں دبائے بیٹھا ہے لیکن پائی پائی شمار کرتا ہے اور گرہ سے پیسہ بھی خرچ ہوجائے تو واویلا کرتا ہے۔ کسی کو اس کا جائز حق تک دینے پر آمادہ نہیں۔ کہتا ہے میری زندگی میں سب میرا ہے۔ میرے بعد تم سب مل کے جو چاہو کرنا تو ڈاکٹر صاحب' اب آپ ہی کچھ کریں۔ کیا فائدہ ایسی معذوری کی زندگی کا۔ اتنی بیماریاں ہیں کہ تیماردار بھی عاجز ہیں۔ یہ جینا بھی کوئی جینا ہے کہ آدمی سب کا جینا حرام کردے.... میرے حوصلہ افزا رویّے کے بعد وہ کھل کے مطلب کی بات کرتے تھے۔ ایسی صورت ہو کوئی کہ ہماری بھی جان چھوٹے اور ان کی بھی۔ میں انہیں صاف بتادیتا تھا کہ قتل جرم ہے مگر ہاں' اگر یہ نفسیاتی مریض ہیں تو پھر یہ یہاں رہیں گے اور ہم انہیں سکون سے خود مرجانے کے مواقع فراہم کریں گے' آپ کے خرچ پر۔ یہ ٹھیک نہیں ہوں گے' زیادہ پاگل ہوسکتے ہیں اور پاگل کے ورثا قانونی طور پر حقِ وراثت حاصل کرسکتے ہیں۔ وہ ہر ماہ اخراجات کے علاوہ میری فیس ادا کرتے تھے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ دلاور ان کو بلیک میل بھی کرتا ہے۔ میں تو آمدنی کا نصف اس کے حوالے کردیتا تھا۔ وہاں ایسی وفادار شوہر پرست مگر بدصورت جاہل اور پُرانی بیویاں بھی تھیں جن کے شوہر نئے ماڈل کی بیوی خریدنا چاہتے تھے۔ وہ دولت مند ہوگئے تھے اور یہ پُرانی بلائیں ان کی جان نہیں چھوڑتی تھیں۔ انہوں نے منہ مانگا معاوضہ ادا کیا.... اور یوں میں نے سب کچھ کرلیا۔ لاکھوں جمع کرلیے۔ لیکن

مجھے معلوم تھا کہ میں دلاور کے چنگل میں پھنسا ہوا ہوں اور جس دن میں نے اس سے اپنے ارادے کا اظہار کیا کہ بس بھئی بس بہت ہوگیا یہ ضمیر فروشی کا دھندا۔ اب میرا اور تمہارا راستہ الگ ہوگا۔ میں اسپیشلسٹ بنوں گا۔ تو دلاور کہتا کہ ایسے تم کہاں جاسکتے ہو ڈاکٹر شاہ۔ نو سو چوہے کھا کے بلی حج کو جاسکتی ہے بھلا؟ خاموشی سے کام کرتے رہو... ورنہ..... اور اس ورنہ کے خوف سے میں نے اپنے اصل عزائم کو دلاور سے پوشیدہ رکھا۔ میں نے لندن میں اپنے دوستوں کی مدد سے رائل کالج آف فزیشن میں درخواست دی اور فیس جمع کرادی۔ ایک اور دوست نے اپنے وسیلے سے مجھے یہاں کی شہریت دلوادی اور میں ایک دن اچانک سارا سرمایہ سمیٹ کر لندن پہنچ گیا۔ ایک ڈاکٹر' ایک پاکستانی ڈاکٹر' یہاں گمنام اور روپوش رہ سکتا ہے۔ چوہدری دلاور نے آسانی سے میرا سُراغ لگالیا۔"

میں نے کہا "کیا چوہدری صاحب لندن میں بھی کوئی ویسا ہی کاروبار شروع کرنا چاہتے تھے۔ جس قسم کے مریض اور تیماردار اپنے لاہور میں آجاتے تھے ویسے تو یہاں بھی بہت ہوں گے' ہر جگہ ہوں گے۔"

"یہاں بھی بہت کچھ ہوتا ہے مگر جتنی قانون کی گرفت سخت ہے اس سے زیادہ یہاں معاشرے کی اخلاقی گرفت ہے" وہ بولا۔

"مگر پھر بھی تم بلیک میل ہونے سے انکار کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے!" محسن نے کہا۔

اس نے چوہدری دلاور کی آتش فشاں نظروں کو نظرانداز کردیا "ہاں' میں اپنا مستقبل تباہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں ایم آر سی پی کررہا ہوں۔ میں نیورو فزیشن بن گیا تو اپنے سابقہ گناہوں کی تلافی کرسکوں گا۔ اگر آج یہ بات کالج کی انتظامیہ کو معلوم ہوجائے...." وہ خاموش ہوکے خلا میں گھورنے لگا۔

"تو تمہیں کالج سے ہی نہیں' شاید برطانیہ سے ہی نکال دیا جائے گا۔ چنانچہ تم نے دلاور سے کہا کہ اچھا.... آخری بار... اور اس نے بھی کہا کہ ہاں یہ آخری کام ہے۔ یہ کیا کام تھا؟" میں نے کہا۔

ڈاکٹر نے دلاور کی طرف دیکھ کے ٹھنڈی سانس لی "اگر میں انکار کروں گا تو تم بھی وہی دھمکی دوگے؟"

میں نے کہا "نہیں۔ ہم زبانی دھمکی کو کافی نہیں سمجھتے۔ ہمارے پاس معقول جواز ہے تمہیں سزا دینے کا۔ تم لوگوں کی زندگی سے کھیلتے رہے' ایک ڈاکٹر ہوکے بھی انسانوں کو دکھ دیتے رہے اور انہیں دنیا کے سامنے تماشائے عبرت بناتے رہے۔ کیوں نہ تمہیں بھی عبرت ناک سزا دی جائے۔ تم جب تک جیو ایک تصویرِ عبرت بنے رہو۔ اپنے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی۔"

"نہیں... تم اتنے ظالم نہیں ہوسکتے۔"

"یہ ظلم نہیں' انصاف کہلائے گا" میں نے کہا "ایم آر ایس کے نظامِ عدل میں سقم نہیں ہے۔ آج تک ہم نے کسی بے گناہ کو سزا نہیں دی۔"

"اگر مجھے یہاں سے نکال دیا گیا... تو برباد ہوجاؤں گا۔"

میں نے ہنس کے کہا "تمہیں بہت پہلے برباد ہوجانا چاہیے تھا۔ آج پھر تم نے چوہدری دلاور کا ساتھ دینے کی مجبوری سے سمجھوتا کیا۔ کل پھر کروگے' مجبوری کا بہانہ بنا کے تم نہ جانے کتنی بار جرائم کا ارتکاب کروگے۔ کوئی بار آخری بار نہیں ہوگی۔ ہم دلاور کو تم سے زیادہ جانتے ہیں۔"

محسن نے کہا "تم خدا سے زیادہ چوہدری دلاور سے ڈرتے ہو۔ تم جیسے لوگوں کو ہم سے بھی ڈرنا چاہیے۔"

میں نے کہا "یہ ہوسکتا ہے کہ ہم کسی کو کچھ نہ بتائیں۔ تمہیں یہیں چھوڑ جائیں۔"

"تم مجھے..... قتل نہیں کرسکتے....." وہ دہشت زدہ ہوگیا۔

"پھر وہی فضول بات۔ فرض کرو ہم تمہاری آنکھوں میں کوئی دوا ڈال دیں۔ ایسی دوائیں بہت ہیں جن سے بینائی ضائع ہوجاتی ہے۔ فوری طور پر ہم تمہاری آنکھوں کا آپریشن بھی کرسکتے ہیں۔ سبزی کاٹنے والی چھری سے۔ تاہم ایک اندھا ڈاکٹر بھی علاج کرسکتا ہے اور نسخے لکھ سکتا ہے لیکن جس ڈاکٹر کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں نہ ہوں۔"

ڈاکٹر شاہ کا رنگ پیلا پڑگیا۔ اس نے بے اختیار ہاتھ پیچھے کرلیے۔

محسن بولا "وہ بول سکتا ہے اور نسخے لکھوا سکتا ہے۔"

میں نے سوچ کے کہا "آدمی کی آواز کہاں سے نکلتی ہے؟"

"گلے سے۔ مگر گلا کاٹنا تو ظلم کہلائے گا' ہم قتل نہیں کرنا چاہتے۔"

میں نے کہا "گلے میں کیا چیز ہوتی ہے؟"

"ایک نس جسے VOCAL CHORD کہتے ہیں۔ آواز اسی کے ارتعاش سے نکلتی ہے۔ جیسے ستار یا وائلن کے تار سے نکلتی ہے۔" محسن نے وضاحت کی۔

"تو ہم ووکل کورڈ کی سرجری کرسکتے ہیں۔ اور ہم نہیں کرسکتے تو کسی سرجن سے کراسکتے ہیں۔ آخر لندن میں اپنے وہ ڈاکٹر بھی تو ہیں...."

ایسا کوئی ڈاکٹر دنیا میں کہیں نہیں تھا جو ہمارے کہنے سے ڈاکٹر شاہ کی قوتِ گویائی ختم کردیتا مگر میں نے یوں کہا تھا جیسے دلاور کی طرح کوئی ہمارا بھی آلۂ کار ہے۔

ڈاکٹر شاہ کا حوصلہ جواب دے گیا۔ اس نے خشک لبوں پر زبان پھیر کے کہا "دیکھو۔ مجھے ایسے دہشت زدہ مت کرو۔ جس شخص کے آگے کنواں ہو اور پیچھے کھائی' وہ کیا کرسکتا ہے؟"

میں نے کہا "کنواں بہت جلد پاٹ دیا جائے گا۔ چوہدری دلاور کے لیے پھانسی گھاٹ کا کنواں چشم براہ ہے کب سے۔ اس سے"

"مجھ سے بھی مت ڈرو۔ تم جانتے ہو ڈاکٹر کہ یہ آخری بات تھی اس سے زیادہ کی مہلت کہاں ہے میرے پاس۔" دلاور بولا۔

ڈاکٹر نے اقرار میں سرہلایا "تمہیں بھی اب سمجھوتا کرلینا چاہیے دلاور' دنیا کے معاملات کو پھیلانے کے بجائے سمیٹنا ضروری ہے۔"

"چاہتا تو میں بھی یہی ہوں۔ مگر میرے چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ میں تو پہلے بھی چاہتا تھا مگر سکندر نے میری ہر پیشکش ٹھکرادی۔"

"اس وقت اور بات تھی" ڈاکٹر نے کہا "اب حقیقت تمہارے سامنے ہے۔"

"ویری گڈ! کیا چوہدری دلاور نے خود کو رضاکارانہ طور پر قانون کے حوالے کردینے کا فیصلہ کرلیا ہے" محسن بولا۔

دلاور تلخی سے مسکرایا "دلاور کی تقدیر نے یہ فیصلہ کردیا ہے۔ ورنہ دلاور نے شکست کے لفظ کو اپنی لغت سے خارج کردیا تھا۔ وہ تدبیر سے کبھی نہیں ہارا تھا۔"

میں نے کہا "تم تقدیر سے بھی لڑسکتے ہو۔ آخری وقت تک۔ تمہارے پاس دولت ہے۔ تم ملک کے سب سے بڑے وکیل ...

پورا پینل بنا سکتے ہو جو اعلیٰ ترین عدالت تک تمہاری بے گناہی ثابت کرنے کے لیے اپنی تمام صلاحیت صرف کردیں۔ اور ہو سکتا تم ... سزائے موت سے بچالیں۔"

... خلا میں دیکھتا رہا۔ "سزائے موت تو مجھے سنائی جا چکی ہے اپنے سکندر اعظم صاحب' اور اس عدالت سے جس کا فیصلہ آخری ہے۔ جس کے خلاف اپیل کی گنجائش ہی نہیں۔ وہاں وکیلوں کے دلائل کام نہیں آتے۔ فیصلہ کرنے والے ہوتے ہیں بڑے بڑے ڈاکٹر۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا "کیا تمہیں کینسر ہو گیا ہے؟"

میں نے یہ بات بددعا کے انداز میں قطعی غیر سنجیدگی سے کہی تھی لیکن دلاور نے اس کا نوٹس ہی نہیں لیا۔

ڈاکٹر شاہ نے کہا "ٹرمینل کینسر۔"

میں اور محسن بے یقینی کے صدمے کی کیفیت میں سپاٹ چہرے کے ساتھ دلاور کو دیکھتے رہے۔

"تمہیں یہ بھی جھوٹ لگتا ہے نا؟" دلاور بولا۔

ڈاکٹر شاہ نے کہا "دلاور کو برین ٹیومر ہے۔ اس کے دماغ میں ایک رسولی ہے۔ جو سامنے والے حصّے سے پیچھے کی طرف پھیل رہا ہے۔"

"دماغ کی رسولی۔ یہ کب سے ہے؟" میں نے کہا۔

"کافی عرصے سے' مگر اس کا پتا اب چلا ہے۔ جب کچھ نہیں ہو سکتا۔"

میں نے کہا "آپریشن بھی نہیں؟"

ڈاکٹر نے نفی میں سر ہلایا "فورتھ اسٹیج ہے۔ آخری اسٹیج۔ آپریشن کی گنجائش نہیں رہی۔"

میں نے کہا "تم جھوٹ بول رہے ہو۔ کینسر کی آخری اسٹیج پر کوئی اتنا صحت مند کیسے نظر آسکتا ہے۔ تمہارے کہنے کے مطابق تو یہ بسترِ مرگ پر ہے مگر یہ اسی طرح اپنے پیروں پر چل پھر رہا ہے جیسے میں یا تم؟"

ڈاکٹر نے مسکرانے کی کوشش کی "ایسا جھوٹ کوئی ڈاکٹر نہیں بولتا۔ رہی بات نظر آنے کی تو باہر سے اندر کا حال انسان کی آنکھ کیسے دیکھ سکتی ہے۔ کیا لوگ بیٹھے بیٹھے ہارٹ فیل ہونے سے نہیں مرجاتے؟ انہیں پتا بھی نہیں ہوتا کہ ان کا دل کتنا خراب ہے۔ بلڈ پریشر اور ذیابیطس جیسے امراض خاموشی سے آدمی کو اندر سے کھوکھلا کرتے رہتے ہیں۔ اسے تھوڑا تھوڑا قتل کرتے رہتے ہیں۔ وہ طبعی طور پر مرتا رہتا ہے مگر اسے خبر نہیں ہوتی کہ ایک ایک انچ وہ موت کی سرحد کے نزدیک ہوتا جارہا ہے۔ یہ خاموش قاتل SILENT KILLER بیماریاں کہلاتی ہیں اسی لیے۔ کینسر بھی اسی طرح شناخت نہیں ہوتا۔ برین ٹیومر کا بھی پتا اس وقت چلتا ہے' بعض صورتوں میں جب زندگی کا سفر بہت مختصر رہ جاتا ہے۔"

"کس حد تک مختصر؟" میں نے کہا۔

"اگر تم دلاور کے بارے میں جاننا چاہتے ہو تو چند ماہ۔"

"... کتنے۔ چھ' سات' آٹھ۔"

اس نے مایوسی سے سر ہلایا "تین... زیادہ سے زیادہ... چار۔"

"اور اس کا علاج کوئی نہیں؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ ابھی تک ساری دنیا میں کہیں نہیں۔"

میں نے کہا "اگر اس کا پتا پہلے چل جاتا؟"

"تب بھی زیادہ فرق نہ پڑتا۔ شاید آپریشن ہوتا۔ اس ... میں دلاور کی بینائی ختم ہو سکتی تھی۔ یہ معذور ہو سکتا تھا۔ ... بھی یہ رسولی کسی جگہ بھی نمودار ہو جاتی۔ کیونکہ یہ ... MALIGNANT ہے۔ کینسر کی رسولی کی ایک قسم BENIGN کہلاتی ہے۔ اسے نکال دیا جائے تو ختم بھی ہو سکتی ہے۔ ... دوسری قسم کا ٹیومر بڑا سفاک ہوتا ہے۔ اس کو ایک جگہ سے ... جائے تو یہ دو جگہ یا دس جگہ نمودار ہو سکتا ہے۔ دماغ میں ... ہے وہ PRIMARY نیچر کا ہے۔ اس کی SECONDARY جڑیں سارے جسم میں پھیل جاتی ہیں۔ ریڈیو تھراپی اور کیمو تھراپی سے دلاور شاید چار ماہ جی لے۔"

"اور اس کے بغیر!"

"تین مہینے... یا اس سے کم۔"

افسوس اور دُکھ سے بھری ہوئی خاموشی کا ایک طویل وقفہ ... جس میں دلاور کی نگاہیں خلا میں اپنی موت کو دیکھتی رہیں۔ شاید ... کے تصوّر میں آنے والا وقت تھا جب درد سے رُک جائیں گی ... زیست کی راہیں۔ اور حد سے گزر جائے گا ... عفریت اسے اپنے جان لیوا پنجوں میں جکڑے گا اور دیکھنے والے اس کی پُراذیت سانسوں کو شمار کرتے ہوئے دعا کریں گے اور ... یٰسین کی تلاوت کہ اللہ اس کے نزع کے عذاب کو آسان کرے۔

میں سوچ رہا تھا کہ کیا مجھے تقدیر کے اس فیصلے کے بعد ... عدالت سے سزائے موت حاصل کرنے کے فیصلے کا خیال چھوڑ ... چاہیے۔ اتنے کم وقت میں تو کسی عدالت سے بھی سزا نہیں ... جاسکتی۔ سماعت کے مرحلے بھی بڑے لمبے ہوتے ہیں اور ایک عدالت کے بعد دوسری عدالت میں اپیل دائر کرنے والے ... سال گزار ہی لیتے ہیں۔ اس کے بعد نظر ثانی کی درخواست اور ... کی اپیل۔ بلیک وارنٹ کا اجرا اور سزائے موت کی تاریخ کا تعین ... یہ سب اچانک ناممکن ہو گیا تھا۔

مجھے یوں لگا جیسے تقدیر نے دلاور کو نہیں' میرے ارادوں ... شکست دے دی ہے۔ ایک بار پھر مجھے حضرت علیؓ کا وہ قول ... کہ میں نے اپنے رب کو اپنے ارادوں کی شکست سے پہچانا ... بندہ چاہے وہ ہو جائے تو پھر رب کا اختیار کیسے واضح ہو۔ اگر ... اپنی کوشش سے چوہدری دلاور کو سزائے موت دلوا سکتا تو پھر ... اور موت کے بارے میں خدا کی مرضی والی بات تو ... باللہ... بے معنی ہو جاتی۔ خدا نے مجھے ٹوک دیا تھا۔ سکندر ... کی عدالت میں پکڑ نہیں تھی تو تم نے کیسے جان لیا اور مان لیا کہ ... رب کچھ نہیں دیکھ رہا اور کچھ نہیں سمجھ رہا۔ تمہاری ایم ... کی عدالت انصاف سے اوپر بھی ایک عدالت تھی' تم نے ...

فیصلہ سُنا؟

دلاور اب مسکرا دیا تھا۔ معلوم نہیں اپنی بے بسی پر یا ہماری۔

میں نے کہا "مجھے اب بھی تمہاری بات تسلیم کرتے ہوئے تامل ہوتا ہے۔ تم دلاور کے ساتھی ہو لیکن میرا خیال ہے کہ تم دلاور کو اتنی اچھی طرح نہیں جانتے جتنا میں جانتا ہوں۔ یہ دشمنی کا ایک طویل دور تھا جس میں ہم نے کئی بار اسے محصور کیا اور خود کئی بار محصور ہوئے لیکن ہر بار ہم ایک دوسرے کو چکمہ دے کر نکل گئے۔ شاید تقدیر ایسے مواقع فراہم کرتی رہی لیکن اس تجربے نے چوہدری دلاور کی شخصیت کا ہر پہلو ہمارے سامنے کھلی کتاب کی طرح عیاں کردیا۔"

"مجھ سے بھی کیا پوشیدہ ہے؟" ڈاکٹر شاہ بولا۔

"کیا تم جانتے ہو کہ چوہدری دلاور میں کتنی زبردست اداکاری کی صلاحیت ہے۔ اسے اپنے اصل جذبات پر مصنوعی جذبات کا پردہ ڈالنے میں جو مہارت حاصل ہے۔ ایک شخصیت کے کئی روپ پیش کرنے کا جو کمال حاصل ہے۔ ظاہر سے باطن کا پتا نہ چلنے دینا۔ اور زندگی کی عام صورتِ حال میں ڈرامائی تاثر پیدا کرنا۔ یہ سب دلاور سے بہتر کون کر سکتا ہے۔ یہ سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ بنا کے دکھا سکتا ہے۔ جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ بنا سکتا ہے۔ ضرورت پڑنے پر گدھے کو باپ بنا لینا اور مطلب نہ ہو تو باپ کو گدھا سمجھنا اس کی فطرت ہے۔"

ڈاکٹر شاہ نے بے چینی سے پہلو بدلا "لیکن.... اس وقت دلاور کے کردار کی خوبیوں اور ناکامیوں کے ذکر سے کیا حاصل...."

میں نے کہا "صاف بات یہ ہے کہ میں بھی اس صورت حال کو اتنا غیر معمولی اور ڈرامائی محسوس کرتا ہوں کہ مجھے تمہارے بیان کی صداقت بھی مشکوک لگتی ہے۔ جو شاک تم نے ہمیں دیا ہے۔ اس کا مقصد کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔"

"یعنی تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں؟" ڈاکٹر شاہ نے کہا۔

"یہ اعتبار کا کھیل ہی نہیں تھا' محبت اور جنگ میں سب جائز سمجھا جاتا ہے اور جھوٹ' فریب' عیاری اور مکاری کا اسلحہ سب استعمال کرتے ہیں۔"

"تم ڈاکٹرز کی رپورٹ دیکھ سکتے ہو۔"

"کیا ڈاکٹر جھوٹ نہیں بولتے" محسن نے کہا۔

"آخر تم بھی تو ڈاکٹر ہو" میں نے کہا۔

"ہاں۔ لیکن آلات جھوٹ نہیں بولتے۔ جدید الیکٹرانک مشینوں کو ایک آئینہ سمجھا جاسکتا ہے جس میں اندر کی تصویر نظر آتی ہے۔ ایکس رے پھیپھڑوں کے ہر داغ کو دکھا دیتا ہے۔ ای سی جی سے دل کی دھڑکن کی تصویر آجاتی ہے تو I.V.P سے گردوں کے نقل کی E.E.G سے دماغ کی حالت کا اندازہ کیا جاتا تھا مگر اب سی ٹی اسکین سے جسم کے کسی بھی حصّے کے اندر کو ایسے دیکھا جاسکتا ہے جیسے آدمی خود اپنی آنکھ سے دیکھے۔ صرف یہی نہیں۔ بعض اوقات باہر سے داغ دکھائی نہیں دیتا۔ پھر آپ اسے دو حصّوں میں کاٹ کر دیکھ سکتے ہیں۔ سی ٹی SCANNER اس سے بھی زیادہ تفصیل سے دماغ کے مختلف حصّوں کو دکھاتا ہے۔ یوں جیسے آپ سیب کے باریک باریک قتلے تراش لیں۔ نیچے سے اوپر یا دائیں سے بائیں۔ اور پھر ہر قتلے کو دیکھ لیں۔ دماغ کو تراشے بغیر کسی بھی حصّے میں واقع ٹیومر کی صحیح پوزیشن کا پتا چل جاتا ہے۔"

"رپورٹ تمہارے پاس ہے؟"

"نہیں۔ تم سینٹ تھامس اسپتال جا کے دیکھ سکتے ہو۔ وہاں ایک پاکستانی ڈاکٹر ہیں مسز زبیدہ ہارون۔ ان کے شوہر مسٹر ہارون ONCOLOGIST ہیں۔ یہ کینسر کے ماہرین میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی رائے حتمی سمجھی جاسکتی ہے مگر میں نے یونیورسٹی کالج اسپتال کے ڈاکٹر فریزر سے بھی ٹائم لیا اور انہوں نے وہی کہا جو میں نے تمہیں بتایا۔ یہاں اسپتال کا ریکارڈ اتنا CONFIDENTIAL ہوتا ہے کہ صرف عدالت کے حکم پر کسی کو دکھایا جاسکتا ہے۔ مریض اور ڈاکٹر کے درمیان جو ذاتی اعتماد کا رشتہ ہوتا ہے اس کا احترام ایسے ہی کیا جاتا ہے جیسے میاں بیوی کی خلوت کا۔ چنانچہ تم یہ ریکارڈ صرف میرے ساتھ جا کے دیکھ سکتے ہو یا پھر چوہدری دلاور کے ساتھ۔"

"مطلب یہ کہ نہیں دیکھ سکتے" محسن بولا۔

"تم ڈاکٹر فریزر سے یا ڈاکٹر زبیدہ سے بات کر سکتے ہو۔ اور یہ نام اتنے معتبر ہیں کہ تم انہیں بھی جھوٹا سمجھو گے تو انہیں گالی دو گے۔ یہاں کسی کو بھی آپ جھوٹا کہیں تو یہ گالی سے کم نہیں ہوتا۔"

خاموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد میں نے دلاور سے کہا "یہ کتنی عجیب بات ہے کہ تمہیں اپنے انجام کی خبر تھی۔ اس کے باوجود تم وہی کرتے رہے جو کرتے تھے۔ تم نے جارج کو قتل کرنا چاہا۔ رچرڈ گورڈن کی گاڑی میں بم نصب کیا۔ اگر مجھے خدانخواستہ یہ پتا چل جائے کہ میری زندگی اتنی کم رہ گئی ہے تو میں کوشش کروں گا کہ خدا سے اور اس کے بندوں سے اپنی تمام غلطیوں کی معافی مانگوں۔ ہر غلطی کا کفارہ ادا کروں۔ رنجش اور عداوت کے جو کانٹے میں نے دوسروں کے لیے بچھائے' وہ سب چُن لوں۔"

"تمام زندگی کے گناہوں کی تلافی تین مہینے میں تو ممکن نہیں۔ مگر میں بھی مرنے سے پہلے کوشش کروں گا کہ مجھ پر کسی کا قرض نہ باقی رہے۔ نہ رشتوں کا نہ جذبات کا' نہ نیکی کا نہ بدی کا۔" دلاور نے اُداسی سے کہا "ڈاکٹر شاہ نے مجھے قسمت کا یہ فیصلہ بہت دیر سے سُنایا۔"

"خود مجھے یہ اطلاع کل ملی تھی۔ ڈاکٹر فریزر سے پہلے ڈاکٹر زبیدہ ہارون نے مجھے اپنی تشخیص سے آگاہ کیا تو میں نے ڈاکٹر فریزر سے رجوع کیا۔ اور انہوں نے حتمی فیصلہ آج صبح دیا۔ انہوں نے وہی سی ٹی اسکین رپورٹ اپنے کمپیوٹر پر دیکھی۔ دلاور کا اصرار تھا کہ اس سے کچھ نہ چھپایا جائے۔ آج شام میں نے مجبوراً اسے سب بتا دیا۔"

میں نے دلاور کے لیے اپنے دل میں ہمدردی سے زیادہ نفرت محسوس کی۔ اس شخص کو مرنا تو تھا۔ اس کی موت سے زیادہ مجھے اپنی زندگی کی آرزو بھی نہیں تھی اور میں نے دن رات فرشتۂ اجل کا نامہ بر بن کے اس کا تعاقب کیا تھا مگر اس نے میرے باپ کے ساتھ اس کی زندگی میں دھوکا کیا تھا' دھوکے سے اس کی تمام عمر کی کمائی ہتھیالی تھی۔ پھر دھوکے سے اس کو مار دیا تھا اور مجھے دھوکے میں رکھا تھا۔ دھوکے سے مجھے جھوٹے مقدمات کی قانونی دلدل میں دھکیل دیا تھا اور پھر مجھے مسلسل دھوکے دیتا رہا تھا۔ ہر بار جب میں محسوس کرتا تھا کہ میں نے اس کی دھوکے بازی کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ ختم کردیا ہے اور اب وہ قانون کو دھوکا نہیں دے سکے گا تو وہ سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کے نکل جاتا تھا اور میں پھر اس کا تعاقب کرتا تھا۔ آج جب بالآخر دستِ غیب نے اس کی دھوکے بازیوں کا یہ کھیل ختم کرنے کا اعلان اسے سزائے موت سنا کے کیا تھا تو مجھے ایسا لگتا تھا کہ میرے ساتھ پھر دھوکا ہوا۔ تقدیر ہی نہیں مجھ پر دلاور بھی خندہ زن تھا کہ اپنے سکندرِ اعظم' تم پھر ہار گئے۔ تم مجھے نہیں مار سکے۔ تم مجھ سے اپنے باپ کے قتل کا انتقام نہیں لے سکے۔ تمہارے سارے دعوے باطل ہوئے۔ تم نے سب کچھ گنوا کے کچھ بھی نہیں پایا۔ جو پاؤ گے وہ تو میں تمہیں بہت پہلے بھی دینے پر تیار تھا۔ سکندر جب گیا دنیا سے دونوں ہاتھ خالی تھے۔ ہاتھ میرے بھی خالی ہوں گے اور تہی دست تم بھی محسوس کرو گے کہ تمہاری زندگی کی سب سے بڑی تمنا پوری نہ ہوئی۔ تم مجھے قانون کی عدالت سے سزا نہ دلوا سکے۔ مجھے تختۂ دار پر نہ دیکھ سکے۔ مجھے موت بھی ملی تو اپنی تقدیر سے۔ تمہاری تدبیر سے نہیں۔

چوہدری دلاور نے کہا "میں اپنی شکست تسلیم کرتا ہوں سکندر۔ میں ہارنے والا نہیں تھا مگر تم ٹھیک کہتے تھے۔ نوشتۂ تقدیر سے کون لڑ سکتا ہے۔"

میں نے کہا "تم بہت بڑے شکاری تھے۔ چھوٹے بڑے سب انسان تمہارے لیے خرگوش تھے یا ہرن۔ جو آسانی سے شکار ہوتے ہیں' یا چیتے اور شیر تھے جن کو شکار کرنا چیلنج سمجھا جاتا ہے مگر تمہارے ترکش میں سب کے لیے تیر تھے۔ تم ہر بار نیا جال بچھا سکتے تھے۔"

"اب یہ باتیں دہرانے سے کیا حاصل۔ ایک دن موت سب کو شکار کرلیتی ہے۔ اجل سے بڑا شکاری کوئی نہیں۔ تم آج خوش ہوسکتے ہو کہ اس نے پہلے مجھے شکار کیا۔"

"مگر مجھے افسوس ہورہا ہے کہ جیسے اس نے تمہیں شکار کیا۔ ایسے میں نہیں چاہتا تھا۔"

"ایسا ہو بھی نہیں سکتا سکندر۔ کون کب کہاں اور کیسے مرتا ہے؟ اس کا فیصلہ تو خدا انسان کو زندگی دینے سے پہلے ہی کردیتا ہے۔ تم یہ بات مانتے ہو تو پھر افسوس کیسا...؟"

"میری ساری جدوجہد تو تمہیں پھانسی کے پھندے سے لٹکتا دیکھنے کے لیے تھی" میں نے کہا۔

"جدوجہد تو میری رائگاں گئی۔ اب سے تین مہینے بعد چوہدری دلاور کا نام صرف ایک کتبے پر رہ جائے گا۔ لیکن تم اس دنیا میں مزید کامیابیاں اور خوشیاں سمیٹتے رہو گے۔ اگر مجھے طبعی عمر ملتی، میں عام لوگوں کی طرح جیتا اور مرتا۔ کوئی یہ نہ کہتا کہ یہ عبرت ناک موت تھی۔ تو مجھے رنج نہ ہوتا مگر ایسا نہیں ہوا' مجھے سزائے موت ہی سنائی گئی ہے۔ سزا سنانے والا سب سے بڑا جج ہے اور میری بے بسی یہ ہے کہ میں نہ اپنی صفائی پیش کرسکتا ہوں۔ نہ وکیل کرسکتا ہوں اور نہ اپیل' اگر سپریم کورٹ سزائے موت کے خلاف میری اپیل کو مسترد کردیتی۔ تب بھی میں ایسے ہی مرتا۔ تین مہینے تک موت کی راہ دیکھتا رہتا اور پھر ایک دن زندگی کے لیے تمام جدوجہد تمام ہوجاتی۔ ایسا ہی اب بھی ہوگا۔ تمہارے لیے اس میں یقیناً تسکین کا ایک پہلو ہونا چاہیے۔"

"کیا فائدہ اب ایسی باتوں سے۔ شاید سب ہی دنیا کی اس شکار گاہ میں خود کو سب سے بڑا شکاری سمجھتے ہیں۔ جب تک جیتے ہیں انہیں بھی چوہدری دلاور یا پیڈرو جیسے شکاری ملتے ہیں۔ بازی کبھی ایک جیت لیتا ہے تو کبھی دوسرا۔ تم یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ تم بڑے شکاری ہو اور میرا بھی یہی دعویٰ تھا۔ ثابت آخر میں یہ ہوا کہ بڑا شکاری کوئی نہیں ہوتا یا ہوتا ہے تو اس حد تک کہ اس نے بڑی عمر پائی۔ جس کو زندگی چھوٹی ملی وہ چھوٹا شکاری۔"

چوہدری دلاور نے ایک گہرا سانس لیا "پھر اب کیا کرو گے تم؟"

میں نے کہا "مجھے تو نہ جانے کیا کچھ کرنا ہے۔ جب تک جینا ہے کچھ تو کرنا ہی ہے۔ تم کیا کرو گے اب؟"

"میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے سکون سے مرنے دو۔ میں سب کچھ تمہارے حوالے کرسکتا ہوں۔ جو بھی آج میرا ہے' سب لے لو۔ اس میں سے کتنا تم میرے وارثوں کے لیے چھوڑتے ہو' ان کو عزت سے یا آرام سے زندگی گزارنے کے لیے کتنا دیتے ہو' یہ تم پر چھوڑتا ہوں۔ میں مانتا ہوں کہ سب میرا نہیں' اس میں تمہارے والد کا اور میر شرافت علی کا بھی حصہ تھا لیکن ایک تہائی میرا بھی تھا۔ میں نے اس ایک تہائی پر اکتفا نہیں کی۔ آج یہ حساب کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے کہ ان اثاثوں کی تقسیم کا منصفانہ فارمولا کیا ہوگا۔ اگر میں' وزیر خان اور میر شرافت علی کے اس طرح کاروبار کو چلاتے رہتے تو تمہیں کیا ملتا اور میرے وارثوں کے حصے میں کیا آتا۔ یقیناً وہ اس سے بہت کم ہوتا جو میرے پاس ہے۔ اس کاروبار میں جس کو تم جائز سمجھتے ہو ہم ایک لاکھ کے دس لاکھ بنالیتے تو میں نے اس سے دس کروڑ بنائے۔ اتنے ہی وقت میں وہ دس کروڑ بناتے تو میں نے دس ارب بنائے۔ وہ دوسری قسم کے لوگ تھے۔ ان کی سوچ الگ تھی۔ وہ حق' حلال اور جائز ناجائز اور کاروبار میں اخلاقی اصولوں کی پاسداری کے قائل تھے۔ جیسے تم ہو۔ آج کی دنیا میں ان جیسے لوگ ترقی تو کرتے ہیں مگر وہ کچھوے کی طرح چلتے ہیں۔ میں خرگوش کی طرح دوڑنا چاہتا تھا۔

وہ میرا ساتھ دیتے تو کوئی مسئلہ پیدا نہ ہوتا مگر انہوں نے میرا راستہ روکنے کی کوشش کی۔ مجبوراً میں نے انہیں اپنے راستے سے ہٹا دیا اور پھر جو چاہا کیا۔ ظاہر ہے کہ میں نے غلط کیا۔ اخلاقی اور قانونی طور پر میرا جرم ثابت ہے لیکن میں نے بھی جو سوچا تھا' جو کہا تھا وہ کرکے دکھا دیا۔ آگے کا فیصلہ تم کرو۔ تمہارے والد کے ساتھ کاروبار چلتا تو تمہیں آج کیا ملتا؟ آج جتنا ہے اس سے بہت کم۔ جائز ناجائز کی بات تم کرتے ہو۔ میں نے کبھی نہیں کی۔ میں نے اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ کوئی کچھ بھی کہتا رہے۔ میں نے پروا نہیں کی۔ برا میں بنا' خطرات میں نے مول لیے۔ اب تم کس حساب سے اپنا حصہ لوگے؟ تمہارے والد کے سو روپے ان کے طریقے سے شاید ہزار ہوتے۔ میں نے ان سے لاکھ بنائے۔ تم ہزار لو دس ہزار یا ایک لاکھ' تمہاری مرضی۔ میر شرافت کا تو کوئی وارث ہی نہیں۔ اس کے حصے کا تم کیا کرو گے؟ میرا حصہ میرے وارثوں کو دو گے یا ان سے بھی انتقام لوگے۔"

میں بڑی مشکل میں پڑ گیا تھا "میں کیا جواب دوں دلاور۔"

محسن نے کہا "اس سوال کا جواب عدالت دے گی۔ کس کا کیا حق بنتا ہے۔ یہ فیصلہ نہ ہم کریں گے اور نہ تم کرسکتے ہو۔"

دلاور بولا "عدالت! کیا اب بھی تم عدالت جانے کا سوچتے ہو؟"

میں نے کہا "محسن نے ٹھیک کہا۔ فیصلہ تو عدالت ہی کرے گی۔"

"مگر... میں تو سب تم پر چھوڑ رہا ہوں۔ تم جو فیصلہ کرو گے وہ مجھے قبول ہوگا" دلاور نے کہا۔

محسن بولا "ہم یہ اختیار نہیں رکھتے۔ ہم سے فیصلے میں غلطی بھی ہوسکتی ہے۔ کوئی ایسی غلطی جس کی تلافی ممکن نہ ہو۔ انصاف کرنا جج کی کرسی پر بیٹھنے والے کی ذمے داری ہے۔"

"جب عدالت میں جائے بغیر معاملات طے ہوسکتے ہیں تو....."

محسن نے اس کی بات کاٹ دی "یہ تم نے کیوں فرض کرلیا ہے کہ عدالتی معاملات ختم ہوگئے۔"

"عدالت کیا کرے گی اب۔ اتنا وقت کہاں ہے میرے پاس۔"

"ہمارے پاس تو ہے۔ اور انصاف کرنے والوں کے پاس ہے۔ صرف اسی بنا پر وہ تمہیں سارے مقدمات سے بری نہیں کرسکتے کہ تم کو تین چار مہینے بعد مرجانا ہے تو کیس چلانے کی کیا ضرورت ہے۔ اپنی زندگی کے آخری لمحے تک تم مجرم رہو گے چوہدری دلاور۔ تمہارے جرائم کا ریکارڈ رہے گا خواہ تم رہو یا نہ رہو۔ اپنی موت سے ایک دن پہلے بھی تم کوئی قتل کرو تو اس کی ایف آئی آر الگ درج ہوگی اور وہ مقدمہ بھی چلے گا۔"

"میرے مرنے کے بعد بھی؟" دلاور نے تلخی سے کہا۔

"ہاں۔ تمہارے مرنے کے بعد سرکار یہ مقدمات ختم کرنے کی درخواست دائر کرے گی اور اس کی سماعت ہوگی۔ قانونی طریقہ کار کے مطابق ہر کیس کی فائل داخل دفتر ہوگی۔ حق وراثت کا معاملہ تمہارے وارثوں کے اور وزیر خان کے وارث کے درمیان طے ہوگا۔ قوانین وراثت کے مطابق عدالت میں سب کا دعویٰ پیش ہوگا۔ اب کسی کو اپنا حصہ چھوڑنا ہے' کتنا چھوڑنا ہے اور کس کے حق میں۔ یہ بھی عدالتی معاملہ ہے۔ زبانی کچھ طے نہیں کیا جاسکتا اور اگر میں سادہ کاغذ یا اسٹامپ پیپر لکھ دوں تب بھی اس کی قانونی حیثیت کچھ نہیں۔ میرا خیال ہے کہ تم اس کی فکر چھوڑ دو کہ تمہارے بعد تمہاری دولت کہاں جائے گی اور کس کو ملے گی۔ تم اسے اپنے ساتھ بہرحال نہیں لے جاسکتے۔"

"ایسا کب کہا ہے میں نے؟" دلاور نے دکھی لہجے میں کہا۔

"رہا تمہارے جرائم کا معاملہ۔ تو وہ ہم کیسے ختم کرسکتے ہیں۔ تم کو عدالت میں پیش تو ہونا پڑے گا۔"

"سکندر۔ اتنے بے رحم مت بنو۔"

"تم سمجھتے کیوں نہیں دلاور۔ میں کون ہوتا ہوں تمہارے جرائم کے سارے مقدمات سے صرف نظر کرنے والا۔"

"تین مہینے میں کچھ بھی نہیں ہوگا۔"

"جو بھی ہوگا' وہ ہونا چاہیے' تم ایک اقبالی بیان تو دے ہی سکتے ہو۔ تم اپنے دفاع کے حق سے دستبردار ہوسکتے ہو۔ خود کو عدالت کے رحم و کرم پر چھوڑ سکتے ہو۔ تم عدالت کا بہت سا وقت بچاسکتے ہو۔ وکیلوں کے دلائل' گواہ اور شہادتیں۔ جرح اور بحث کے سارے مسئلے ختم ہوجائیں گے" میں نے کہا۔

محسن بولا "اس سے تمہارے ضمیر کا بوجھ ہلکا ہوجائے گا۔ یہ بوجھ اپنے ساتھ قبر میں مت لے جاؤ' دلاور۔"

دلاور نے سر جھکالیا اور اچانک مجھے یوں لگا جیسے چوہدری دلاور کی آنکھوں سے آنسو رواں ہیں۔ وہ واقعی رو رہا تھا۔ اتنا بڑا شکاری' اتنا طاقتور شکاری۔ اتنا مغرور شکاری' موت کی دستک سن کے ہی دہشت زدہ ہوگیا تھا۔ وہ سب بھول گیا تھا جو اس نے کیا تھا۔ یا سوچا تھا کہ وہ کرے گا۔ اور زندگی مہلت دیتی تو کرتا مگر یکلخت اس کا بلیک وارنٹ موصول ہوگیا۔ کسی گرفتاری' پیشی یا سماعت اور اپیل کے حق کے بغیر۔ تم چوہدری دلاور ولد فلاں... ساکن فلاں مقام.... تم کو فلاں فلاں جرم میں تعزیرات پاکستان کی فلاں فلاں دفعہ کے تحت فلاں تاریخ کو اتنے بجے بحکم عدالتِ خداوندی سزائے موت دی جائے گی۔"

میں نے محسن کی طرف دیکھا۔ وہ بھی دلاور کو پُر ترحم نظروں سے دیکھ رہا تھا "چوہدری دلاور۔ ہمارا خیال تھا کہ تم بڑے باہمت ہو۔"

دلاور نے سر اٹھایا "نہیں۔ میں ایک کم ہمت آدمی تھا۔ مجھ میں ہمت ہوتی تو وہ زندگی جیتا' جو تم جی رہے ہو۔ جو وزیر خان نے جی۔ محنت سے زیادہ کمانے کا حوصلہ ہوتا تو میں ان کے ساتھ رہتا۔ وہ واقعی ہمت والے لوگ تھے جو سیدھے مگر مشکل راستے پر چلتے تھے۔ صراطِ مستقیم اختیار کرنا ہر ایک کے بس کی بات

نے شارٹ کٹ لیا' شارٹ کٹ غیر قانونی تھا اور ممنوعہ علاقے سے گزرتا تھا مگر میں نے اصول' قانون اور اخلاقیات کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ پھر تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ میں ہمت والا تھا۔ میں نے دولت کمائی مگر عزت گنوا دی۔ میں نے تو سمجھا تھا کہ دولت کے ساتھ عزت خود بخود آجاتی ہے۔ مگر ایسا نہیں تھا۔ وہ عزت جو دل سے ملتی ہے وہ ایک پرائمری ٹیچر کو مل جاتی ہے جب اس کا کوئی بہت پرانا شاگرد جو پرائمری اسکول کا بچہ تھا۔ جنرل کی وردی سجائے یا وائس چانسلر کے عہدے پر پہنچ کے یا وزیر بن کے جھنڈے والی کار میں اس کے پاس آتا ہے اور کرسی پر اس کے ساتھ نہیں بیٹھتا۔ اس کے قدموں میں بیٹھنے پر اصرار کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کے اسے دعا دیں۔ اور عزت ملتی ہے اس بوڑھی ماں کو جس نے برتن مانجھ کے اور جھاڑو دے کے دو وقت

کی روٹی کمائی ہو اور بیٹے کو پڑھا لکھا کے ڈاکٹر' وکیل یا پروفیسر بنا دیا ہو۔ ہم جیسے عزت خریدتے ہیں' دولت کی طاقت سے اور اختیار سے۔ مگر وہ عزت کہاں ہوتی ہے۔ دہشت ہوتی ہے یا غرض مندی ہوتی ہے کہ ہمارے سامنے دست بستہ کھڑے رہنے والے ہمیں ہاتھ اٹھا کے سلام کرتے ہیں' ان داتا اور مائی باپ کہتے ہیں۔ ہماری گالیاں سن کے سر جھکا دیتے ہیں اور ہمارے سامنے لب نہیں کھولتے۔ میرے بیوی بچے مجھ سے محبت ضرور کرتے ہیں۔ یہ ایک فطری جذبہ ہے۔ وہ ڈرتے بھی ہیں مجھ سے۔ لیکن انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ میں کیا کرتا ہوں۔ میری آمدنی کے ذرائع اور وسائل کیا ہیں۔ وہ میرے بیوی بچے نہ ہوتے تو کیا مجھے اچھا آدمی کہتے۔ اتنا ہی اعتماد ہوتا انہیں اپنی عزتِ نفس پر جتنا ایک ایماندار صحافی' فرض شناس ڈاکٹر یا معاوضے کی پروا کیے بغیر علم کی روشنی پھیلانے والے لیکچرر کے بیوی بچوں کو ہوتا ہے؟"

وہ بول رہا تھا اور رو رہا تھا۔ رو رہا تھا اور بول رہا تھا۔ سچ پہلی بار اس کی زبان پر آیا تھا۔ احساس کی کسک پہلی بار آنسوؤں میں ڈھلی تھی۔ ضمیر کی خلش پہلی بار پچھتاوا بنی تھی مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ یہ تبدیلی نہیں تھی۔ ماہیتِ قلبی نہیں تھی۔ یہ موت کا خوف تھا۔ یہ دمِ آخر کی جانے والی توبہ تھی جو قبول نہیں ہوتی۔

ڈاکٹر شاہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا "دلاور۔ ٹیک اٹ ایزی۔ اگر تم موت کی خبر بہادری سے سن سکتے ہو تو پھر عدالت میں اعترافِ جرم کرنے سے کیوں ڈرتے ہو۔ تم نے اتنی بڑی حقیقت کو قبول کر لیا ہے کہ تمہارے لیے زندگی کی مہلت تین ماہ سے زائد نہیں رہی تو پھر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کی کیوں نہیں سوچتے؟"

دلاور نے سر ہلایا "تم ٹھیک کہتے ہو۔ مجھے اب کسی کا ڈر نہیں ہونا چاہیے۔ میں اس حد سے آگے نکل گیا ہوں جہاں لوگوں کی باتیں' رسوائی اور سزا کا خوف بے معنی ہو گیا ہے مگر ڈاکٹر شاہ' میری بیوی' میرے دونوں بیٹے اور ایک بیٹی۔ ان کو اسی دنیا میں رہنا ہے۔ ان کے سامنے میں اپنی زبان سے خود کو مجرم نہیں کہہ سکتا۔ یہ بھرم تو رہنا چاہیے کہ میں ان کا باپ ہوں اور وہ میری عزت بھی کرتے ہیں۔ سکندر' تم مجھے اتنی رعایت بھی نہیں دو گے کہ میں یہاں مر جاؤں' خاموشی سے۔ صرف میرے بیوی بچے میرے پاس ہوں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "سوری دلاور۔ قانون میں کوئی رعایت ہوتی تو تم جج سے یہ بات کہہ سکتے تھے۔ میں تو کچھ بھی نہیں ہوں۔ میں کسی اختیار کے بغیر تم کو کیسے چھوڑ دوں۔ کیسے معاف کرا دوں۔ میں صدقِ دل سے تم کو اپنے والد کا خون معاف کرتا ہوں۔ میں تم کو وہ سب ظلم اور بے ایمانی بھی معاف کرتا ہوں جو تم نے ان کے ساتھ روا رکھی۔ میں تم سے اپنے ساتھ کی گئی ہر زیادتی بھی معاف کرتا ہوں۔ ذاتی طور پر میں تم کو اپنے ساتھ اور اپنے دوست احباب کے ساتھ ہونے والے سب مظالم' حق تلفی اور ذہنی

و جسمانی اذیت بھی معاف کرتا ہوں۔ مگر جو تم نے دوسروں کے ساتھ کیا۔ تم خود بھی شاید صحیح حساب نہ بتا سکو کہ تم نے کتنے کمزور اور بے قصور انسانوں کو ان کی زندگی کے حق سے محروم کیا۔ کتنے خون کیے اور کتنے قتل کرائے۔ کتنی عورتوں کو سہاگ کے بدلے بیوگی عطا کی۔ کتنے بچوں کے سر پر یتیمی کے احساس کا عذاب مسلط کیا۔ اس کے علاوہ تم وطن کے غدار ہو' باغی ہو' تم نے وطن دشمن اور ملک توڑنے والوں کا ساتھ دیا۔ ان کی مدد کی' تمہارا یہی ایک جرم اتنا سنگین ہے کہ باقی سب جرائم معاف کرنے کے قابل ہوتے تب بھی اس جرم پر تمہیں دس بار سزائے موت دی جاتی۔ یہ معاملہ میرا نہیں' میرے وطن کا ہے۔ وطن کے محافظوں کا ہے۔ وطن کے قانون کی پاسبانی کرنے والوں کا ہے۔ وہ تمہیں کیسے معاف کر سکتے ہیں۔ میرا فرض ہے کہ ان کا مجرم ان کے حوالے کروں۔"

"نہیں' یہ نہیں ہو سکتا" دلاور چلایا۔

"یہ ضرور ہوگا" میں نے کہا۔

"تم مجھے مار سکتے ہو مگر مجھے زبردستی اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتے۔ تم میری لاش لے جا سکتے ہو اپنے ساتھ۔"

میں نے کہا "چوہدری دلاور' ہم تمہیں زندہ سلامت لے جائیں گے اور یہ تم دیکھو گے کہ ہم یہ کام کیسے کرتے ہیں۔"

"افسوس سکندر بخت۔ تم نے یہ آخری موقع بھی گنوا دیا۔ اس وقت تم فاتح تھے۔ میں نے تمہارے سامنے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ اپنی شکست تسلیم کر لی تھی۔ تم مجھے معاف کر کے ایک اخلاقی فتح بھی حاصل کر سکتے تھے۔"

"معاف کرنے کی حد تک میں نے تمہیں معاف کر دیا ہے۔ مگر وہ میرا ذاتی معاملہ تھا۔ قانونی اختیار کی بات الگ ہے۔ اگر میں نے اپنا فرض ادا نہ کیا تو یہ بھی جرم ہوگا۔ میں کسی وطن دشمن کا ساتھی کہلانے کی گالی نہیں سن سکتا۔ تم پاکستان کے دشمن تھے۔ اس حوالے سے تم وہی پرانے چوہدری دلاور ہو۔ تمہاری موت کے بعد میں تم کو مرحوم بھی نہیں کہوں گا۔ تمہاری مغفرت کی دعا کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں تم پر اس طرح لعنت بھیجتا رہوں گا جیسے بنگال کے میر جعفر پر اور دکن کے میر صادق پر بھیجی جاتی ہے۔ جیسے بریگیڈیئر جنرل ڈائر کے مارے جانے پر کہا گیا تھا کہ وہ جہنم رسید ہوا۔ ایسے ہی تمہارے لیے کہا جائے گا۔ اور جیسے بھگت سنگھ کو غیر مسلم ہونے کے باوجود کچھ لوگ شہید کہتے ہیں ایسے ہی میں اپنے ان دوستوں اور ساتھیوں کو شہید سمجھوں گا جو تمہارے مقابلے پر آئے اور مارے گئے۔"

دلاور کے چہرے پر وہی پرانی سختی' خباثت اور بدباطنی لوٹ آئی "میں لعنت بھیجتا ہوں تم پر۔ اور ان سب پر جو ایسا سمجھتے یا کہتے ہیں۔ مجھے مرنے کے بعد اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا کہ کتے بھونک رہے ہیں یا کوئل کوک رہی ہے لیکن مرنے سے پہلے میں ذلت و رسوائی کا طوق اپنے ہاتھوں سے اپنے گلے میں نہیں ڈالوں گا' نہ تمہیں ڈالنے دوں گا اور نہ کسی اور کو۔"

"کیا کرو گے آخر تم؟" محسن نے مشتعل ہو کے کہا۔

"جو میرا جی چاہے گا... اور تم مجھے روک نہیں سکو گے اپنے سکندرِ اعظم صاحب۔ چوہدری دلاور ابھی مرا نہیں ہے کہ اس کی لاش پر گدھ منڈلانے لگیں" اس کا چہرہ فرطِ غضب سے دہکنے لگا تھا۔

اچانک اس نے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی اور ایک بٹن دبایا۔ بظاہر یہ ایک بے ضرر سی حرکت تھی۔ کچھ گھڑیوں میں بٹن دبانے سے لائٹ آجاتی ہے' کچھ میں تاریخ یا دن نمودار ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ چوہدری دلاور کا گھڑی دیکھنے کا انداز تھا جس نے مجھے چوکنا کر دیا۔ وہ نروس تھا اور اس نے بٹن ایسے دبایا تھا جیسے اس سے کچھ ہوگا۔ کوئی دھماکا ہوگا' اچانک زہریلا دھواں پھیل جائے گا یا الارم چلانے لگے گا۔ یہ خفیہ بٹن اس نے ایس او ایس دینے کے لیے دبایا تھا۔ باقی سب تو خیال آرائی تھی مگر الارم اور مدد کے لیے سگنل دینے کے امکان کو مسترد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کلائی کی گھڑی میں کوئی چھوٹا سا سگنل دینے والا ایف ایم مائکروفون نصب کیا جا سکتا تھا۔ سو دو سو میٹر یا ایک کلومیٹر تک کہیں کسی ریسیور میں الارم آن ہو سکتا تھا یا کوئی سرخ لائٹ جل جاتی۔ چوہدری دلاور احتیاط پسند آدمی تھا۔ صرف ڈاکٹر شاہ جیسے شخص کی رفاقت پر اعتبار کرنا اس کی عادت اور مزاج کے خلاف تھا۔

میں نے اٹھ کے اس کی کلائی پکڑ لی اور گھڑی اتار لی "کیا ہوتا ہے اپنے چوہدری صاحب یہ بٹن دبانے سے؟" میں نے اس کا بٹن دوبارہ دبایا۔

دلاور کا رنگ ذرا سی دیر کے لیے بدلا پھر اس نے کہا "ایک بٹن دبانے سے تو بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ ایک بٹن ہی دبایا تھا اس ڈکٹیٹر نے جس نے ایٹم بم گرایا تھا۔ اور اب کہتے ہیں کہ ایک بٹن دبانے سے تیسری جنگِ عظیم شروع ہو سکتی ہے۔"

"بکواس میں وقت ضائع مت کرو... ورنہ میں لحاظ نہیں کروں گا کہ تم بیمار ہو یا مرنے والے ہو۔" میں نے دہاڑ کے کہا۔

"اس بٹن کے دبانے سے ناسا کا ایک میزائل اپنے ٹارگٹ پر روانہ ہو گیا ہے اور اس کا ٹارگٹ ہے تمہارا سر۔"

میں اس کی طرف بڑھا ہی تھا کہ ڈاکٹر شاہ نے مجھے روک لیا "کسی قسم کا جسمانی تشدد یا ذہنی دباؤ اس کے بلڈ پریشر میں اضافے کا سبب بن سکتا ہے اور اگر برین ہیمرج ہو گیا تو تم پر بلاوجہ اس قتل کا الزام آئے گا۔"

میں نے کہا "اس نے کسی کو سگنل دیا ہے۔"

"دیا ہوگا۔ تم جانتے ہو دلاور کو...." ڈاکٹر شاہ نے کہا۔

"او کے۔ ان سے بھی نمٹ لیں گے ہم" محسن بولا۔

سردار جی پہلے غوں غاں کر رہے تھے اب بڑبڑانے لگے "اوئے ہم بھی نمٹ لیں گے' بینڈ بجا دیں گے۔"

میں نے کہا "میں اس سکھ کو اندر پہنچا دوں پہلے۔"

محسن نے سائلنسر والے ریوالور کا سیفٹی کیچ ہٹا دیا "ان کو میں اوپر پہنچا دوں۔ اگر کسی نے کوئی حرکت کی..."

سکھ کو میں نے گھسیٹ کر اپنے پاؤں پر کھڑا کیا تو وہ جھولنے لگا "ہائے ظالم۔ کیا پلا دی ہے تو نے آنکھوں سے۔"

میں نے کہا "غالباً بھنگ تھی۔ بھینگی آنکھوں سے پلائی ہوگی۔ اب چلو آگے ورنہ نیچے پھینک دوں گا سڑک پر۔"

"پھینک دو۔" وہ آگے بڑھا "میرا کیا ہے۔ روئے گی جند کور۔"

"اور وہ موٹی.... جس سے تم باتھ روم میں ملے تھے۔"

"وہ.... تم وہ نہیں ہو؟" اس نے میرے گلے میں بانہیں حمائل کر دیں "وہی تو ہو تم۔ موٹی ماشوق۔"

میں نے اسے ناک آؤٹ کر کے جند کور کے قریب ہی لٹا دیا۔ پھر میں نے ڈاکٹر شاہ سے کہا "تمہارے اس میڈیکل بیگ میں کیا کچھ ہے؟"

"تم.... کیا چاہتے ہو؟"

"میں چاہتا ہوں کہ تم چوہدری صاحب کو خاموشی کا انجکشن لگا دو۔ ان کے لیے آرام ضروری ہے۔"

ڈاکٹر نے اجازت طلب نگاہوں سے دلاور کو دیکھا "ویلیم ٹین کا ایک انجکشن ہے۔"

دلاور نے غرا کے کہا "تم مجھے انجکشن نہیں لگاؤ گے۔"

"پھر میں دوسری قسم کا انجکشن دوں گا۔ تمہیں بے ہوش کرنے کا وہی طریقہ مؤثر ہے جو آج تک استعمال ہوتا رہا۔ یہ تو میں نے رعایت دینے کی کوشش کی تھی ڈاکٹر شاہ کی سفارش پر۔" میں نے کہا اور اس سے پہلے کہ دلاور کچھ بولتا میں نے اس کی گردن پر ہاتھ مار دیا۔ دلاور کو ہلنے کا موقع بھی نہیں ملا اور نپے تلے وار نے اسے کٹے ہوئے درخت کے تنے کی طرح زمیں بوس کر دیا۔

ڈاکٹر شاہ نے افسوس سے سر ہلایا لیکن منہ سے کچھ نہیں کہا۔

میں نے کہا "اسے اٹھانے میں میری مدد کرو۔"

ڈاکٹر شاہ بادلِ ناخواستہ اٹھا "اچھا ہوتا اگر تم لوگ سمجھوتا کر لیتے۔ ان حالات میں..."

میں نے کہا "حالات سے حقائق نہیں بدلتے۔ موسم بدلتے ہیں تو پودے پھوٹتے ہیں اور پھول کھلتے ہیں مگر پتھر تو پتھر ہی رہتے ہیں۔ حرارت سے برف پگھل جاتی ہے۔ درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے کتنا ہی نیچے کیوں نہ چلا جائے۔ آگ تو آگ ہی رہتی ہے۔"

ڈبل بیڈ پر دلاور کے لیے بھی جگہ تھی مگر میں نے اسے بیڈ کے نیچے ڈال دیا اور ڈاکٹر شاہ سے کہا "اب تم کیا کرو گے؟"

اس نے شانے اچکائے "جو بھی تم کہو گے۔ یو آر دی ماسٹر آف ..."

... ی نے کال بیل بجائی۔ میں نے عجلت میں ڈاکٹر شاہ کی تلاشی لی مگر اس کی کسی جیب میں کوئی خطرناک چیز نہیں تھی "تم اسی کمرے میں خاموش بیٹھے رہو گے تو محفوظ رہو گے۔ باہر کچھ بھی ہو تمہاری دخل اندازی خود تمہارے لیے نقصان دہ ثابت ہوگی۔"

"میں یہاں مطمئن ہوں" وہ بولا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

باہر سے محسن کی آواز آئی۔ اس نے آواز بدل کے فرنچ میں پوچھا تھا کہ کون ہے۔ جواب میں پھر کسی نے گھنٹی بجائی اور دروازے پر لات بھی ماری۔ میں نے دوسرے کمرے میں دروازے کے پیچھے چھپ کر انتظار کرنا مناسب سمجھا۔ میں حتی الامکان مار دھاڑ یا فائرنگ سے گریز کرنا چاہتا تھا۔

محسن کے دروازہ کھولتے ہی دو افراد اندر گھس آئے۔ وہ کرائے کے بدمعاش تھے۔ وہ سرمنڈے سیاہ فام جن کے قد چھ فٹ سے نکلتے تھے اور بدن سانڈ کی طرح مضبوط تھے۔ انہوں نے جینز کی تنگ پتلونیں اور رنگین چست بنیانیں پہن رکھی تھیں۔ چیونگم چباتے ہوئے انہوں نے منہ ٹیڑھا کر کے اور لہجہ بگاڑ کے کہا "وہ کہاں ہیں؟"

محسن نے بھی اداکاری کی۔ اس نے فرنچ میں واویلا کیا اور ان کے یوں اندر گھس آنے پر احتجاج جاری رکھا۔ ان میں سے ایک نے محسن کا گلا دبوچ لیا اور بولا "تم انگریزی میں بھونکنا نہیں جانتے تو میں سکھا سکتا ہوں۔"

"اوکے.... اوکے...." محسن ہانپ کے بولا "میں کہتا ہوں۔ مگر تم کیا چاہتے ہو۔ نہ میں تم کو کاٹ رہا ہوں نہ بھونک رہا ہوں۔"

دوسرا سیدھا دوسرے کمرے میں آیا۔ اس نے کمرے میں قدم رکھنے کے بعد کسی کو نہ پا کے سر ہلایا اور اپنے ساتھی سے کہا "اس کمرے میں تو...."

وہ پلٹنے ہی والا تھا کہ میں نے اسے سر پر ریوالور کا بٹ مار کے گرا دیا۔ اس نے گرتے گرتے بھی گالی دی جو ایک پُردرد کراہ بن گئی۔ یہ آواز اس کے ساتھی نے سنی "یہ کیا ہوا؟" اس نے محسن سے پوچھا۔

"کہاں کیا ہوا؟" محسن نے کانپتے ہوئے کہا۔

اس نے محسن کو پیچھے دھکیلا "چوہدری دلاور اور ڈاکٹر کہاں ہیں؟"

... نے چوہدری دلاور کا نام ایسے لیا تھا جیسے اس کی داڑھ میں درد ہو۔ چوڈاری ڈی لاوار۔

"یہ کیا چیز ہوتی ہے؟" محسن نے کہا "ڈاکٹر تو خیر میں ... ہوں۔"

"شٹ اپ.... وہ یہاں آئے تھے۔"

"تم دونوں یہاں آئے ہو۔ یہ تو میں مانتا ہوں۔"

اس نے محسن کو پیچھے دھکا دیا اور خود اپنے ساتھی کو پکار... آگے بڑھا "بائے بڈی.... ..."

دروازے تک پہنچ کے اس کے قدم رک گئے۔ اس نے اپنے بڈی کو فرش پر بے حس و حرکت الٹا پڑا ہوا دیکھ لیا تھا "کون ہے اندر؟"

محسن نے پیچھے سے اس پر وار کیا "تمہارا اصل باپ۔"

وار کچھ ہلکا تھا یا وہ زیادہ سخت جان تھا کہ اس نے بیل کی طرح ڈکرا کے ایک جھٹکا لیا اور پھر ایڑیوں پر گھوما۔ ریوالور اس کے ہاتھوں میں بھی تھا مگر اپنے مقابل زیادہ خطرناک سامنے والا ریوالور دیکھ کے اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ اب میں نے اس کی کھوپڑی کی دوسری طرف سے وار کیا اور اس نے کراہ کے کہا "اوہ شٹ" اور دھڑام سے گرا۔

"میدان صاف! یا کوئی اور بھی ہے؟" میں نے کہا۔

"ایک اور ہے" محسن بولا۔

"ایک اور ہے.... کہاں؟"

"میں آپ کے سامنے ہوں۔ کہیں آپ کانے تو نہیں ہیں۔ اُدھر دیکھیے۔"

میں نے کہا "مجھے کانا کہتا ہے اندھے۔ تجھے بھیجا تھا کہ جا کے دیکھ۔ کیا یہ نظر نہیں آئے تھے؟"

"ضرور نظر آئے ہوں گے مگر میری رپورٹ درست تھی۔ مجھے کوئی ایشیائی مکھڑا نظر نہیں آیا تھا۔"

میں نے کہا "کیا ہم فرض کر سکتے ہیں کہ دلاور کے پیغام ... والے دلاور یہی تھے یا ان کا کوئی دلاور ساتھی نیچے باقی ہے۔"

محسن بولا "ہم فرض کیوں کریں۔ انتظار کیوں نہ کریں۔ ... ہوگا سامنے آجائے گا۔ میں کافی بناتا ہوں اور دیکھتا ہوں کھانے ... لیے کیا ہے؟"

میں نے کہا "میں ڈاکٹر شاہ سے بات کرتا ہوں۔"

ڈاکٹر شاہ نے ایک بار جھانک کے ضرور دیکھا تھا مگر پھر فوراً ... اندر کر لیا تھا۔ وہ بے سدھ پڑے ہوئے پانچ افراد کے گروہ ... شامل نہیں ہونا چاہتا تھا۔ میں نے کہا "ڈاکٹر شاہ۔ یہ ... سکھ تو ... فوراً ہوش میں نہ آئے۔ مگر اس کی بیوی کو ہوش آجانا چاہیے۔ اس نے بھی خواب آور دوا والی کافی اپنے شوہر کے ساتھ پی تھی۔ یہ ہماری مدد کر سکتی ہے۔ تمہارے ہاں ہے کوئی ... انجکشن جو اس کی غنودگی ختم کر دے؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا "ویسے تو بلیک کافی بھی کام کرتی ... مگر ابھی خاتون خود کافی پینے کے قابل نہیں ہیں۔"

جند کور نے حلق سے اوں اوں کی آوازیں نکال کے کروٹ لی اور پھر سو گئی۔ ڈاکٹر شاہ نے اسے ایک انٹروینس انجکشن لگایا "پانچ دس منٹ میں یہ جاگ جائیں گی۔"

میں نے باہر جھانک کے محسن سے کہا "ایک بلیک کافی۔ جند کور کے لیے۔"

"جند کور کے لیے جند جان حاضر ہے" محسن نے جواب دیا "ویسے یہاں وہ خواب آور دوا ابھی رکھی ہوئی ہے۔"

میں نے کہا "ایک گھونٹ پی لے۔"

ڈاکٹر شاہ نے گھبرا کے کہا "ایک گھونٹ۔ اس کے چند قطرے استعمال ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا "انسانوں کے لیے۔ کافی بنانے والا ایک جن ہے۔ میرا غلام۔"

ہم نے اکٹھے بیٹھ کے کافی پی۔ جند کور کے ہوش میں آنے سے پہلے میں نے محسن کو سمجھا دیا کہ اب ہمیں کیا کرنا ہے۔ ڈاکٹر شاہ بے وقوفوں کی طرح ہمیں دیکھتا رہا اور اپنے جبڑے ہلاتا رہا۔ محسن کی دولتی نے اس کی بتیسی کو خاصا نقصان پہنچایا تھا۔ وہ کافی کے ہر گھونٹ کے ساتھ "سی" کرتا تھا۔

جند کور نے آنکھیں کھولتے ہی پلکیں جھپکائیں اور پھر اپنے ساتھ بے سدھ پڑے ہوئے سردار جی کو دیکھا پھر اس کی نگاہ ہم پر گئی۔ وہ کچھ دیر حیرت کی کیفیت میں کچھ سوچتی رہی۔ پھر شاید اسے سب یاد آگیا اور وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنے پریشان بالوں کو انگلیوں سے سنوارا اور دوپٹہ ٹھیک کیا۔ ایک زنانہ عادت کے تحت پھر اس نے کچھ شرما کے پوچھا "میں یہاں کیسے آئی؟"

"... لطف اور خوش گوار تجربہ میرے حصے میں آیا" میں نے ...

وہ خوش ہو کے مزید شرمائی۔ اس نے ڈاکٹر شاہ کی طرف دیکھا "یہ....!"

میں نے کہا "ڈاکٹر ہیں.... انہوں نے آپ کو ابھی انجکشن دیا تھا۔ جگانے کا انجکشن۔ یہ کافی نوش فرمائیے۔ پھر آپ سے کچھ اور عرض کروں۔"

اس نے کافی لے لی "آپ نے بڑی تکلیف اٹھائی.... اور تکلیف کی۔"

"اب ہم آرام سے رخصت ہونا چاہتے ہیں۔ لیکن آپ کی مدد کے بغیر شاید کچھ نہیں ہو سکتا۔"

اس نے کافی پی لی تو میں نے اسے اپنے ہی گھر میں سیر کے لیے چلنے کی دعوت دی۔ اس نے ایک نیگرو کو اوندھا پڑا دیکھا تو بے اختیار چیخ مار کے بولی "ہائے میں مر گئی" اور ایک ہاتھ سینے پر رکھا "یہ کون ہے؟"

محسن نے کہا "دلاور کا ساتھی۔"

اس نے ایکشن ری پلے کے طور پر کہا "ہائے میں مر گئی۔"

"تمہیں کہنا چاہیے تھا۔ ہائے میں پھر مر گئی۔ مریں آپ کے دشمن مگر یہاں نہیں" میں نے کہا "اب آپ ذرا دھیان سے میری بات سن لیں اور سمجھ لیں۔ ہم تینوں تو ابھی چلے جائیں گے، ڈاکٹر صاحب کے ساتھ۔"

"ہم چار...." محسن نے تصحیح کی۔

"یہ تینوں کون؟ تم سردار جی کو بھی لے جاؤ گے" وہ بولی۔

میں نے کہا "ایک بندہ آپ کے بیڈ کے نیچے بھی موجود ہے۔"

اس نے کہا "کیا وہ مر گیا ہے؟"

"وہ سو فیصد زندہ ہے" میں نے کہا۔

"آخر یہ سب کون لوگ ہیں؟ یہ کیا چکر ہے؟" وہ پریشان نظر آنے لگی۔

میں نے کہا "چکر میں آپ مت پڑیں۔ ہمارے جانے کے بعد آپ پولیس کو بلائیں۔ ڈاکٹر کو طلب کریں۔ انہیں بتائیں کہ دو بدمعاش آپ کے فلیٹ میں گھس آئے تھے۔ اگر آپ کے شوہر بہادری سے مقابلہ کرتے ہوئے ان کو ناک آؤٹ نہ کرتے اور اسی بہادری کے مظاہرے کے دوران میں خود بھی حریف کا ایک ہاتھ پڑنے سے ناک آؤٹ نہ ہوتے تو شاید یہ بدمعاش آپ کو لوٹ لیتے۔ آپ کو ایسی اداکاری کرنی پڑے گی جیسے یہی ہوا ہے۔"

اس نے سر ہلایا "وہ.... وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر کیا وہ مان لیں گے؟"

"کیوں نہیں مانیں گے۔ آخر آپ اس فلیٹ کی مالک ہیں۔ یہ آپ کے جینوئن شوہر ہیں اور یہ جینوئن بدمعاش" میں نے کہا "یہ ہے آپ کے شوہر کا وہ ریوالور جس سے انہوں نے ان دونوں کے سر پر ضرب لگائی تھی۔ یہ میں یہاں ڈال دیتا ہوں۔"

"لیکن.... سردار جی اِدھر لیٹے ہیں۔"

"آپ کی آسانی کے لیے میں ان کو ان بدمعاشوں کے پاس لٹا دیتا ہوں۔" میں نے کہا "سردار جی کو بھی آپ ہی سمجھائیں گی کہ ہمارا نام اس کہانی میں کہیں نہ آئے ورنہ خود ان کے لیے مصیبت ہو جائے گی۔ پولیس ایک عام سی چوری ڈکیتی کی نیت کا کیس آسانی سے رجسٹر کر لے گی اور ملزمان کو ساتھ ہی لے جائے گی۔ ان کا سابقہ ریکارڈ اچھا نہیں ہو سکتا۔ پولیس خود دیکھ لے گی۔"

محسن نے کہا "کیوں نہ ہم یہ سب سردار جی کو خود سمجھا دیں۔ پانچ دس منٹ میں یہ بھی جاگ سکتے ہیں۔"

میں نے ڈاکٹر شاہ کی طرف دیکھا "ایک اور انجکشن ہوگا ان کے لیے!"

اس نے اقرار میں سر ہلایا "وہ دس انجکشنوں کی شیشی ہے۔ ابھی تک میں نے تین استعمال کیے ہیں۔"

سردار جی نے ہوش میں آتے ہی زیادہ بے تکے سوالات کیے اور کافی پینے کے بعد بھی ان کی سمجھ دانی پوری طرح کارآمد نہیں ہوئی۔ انہیں ہر بات سمجھانے کے لیے مجھے بار بار دہرانی پڑی۔

"آپ نے انہیں ریوالور کا بٹ مار کے ناک آؤٹ کیا۔ دروازہ آپ کی بیوی نے کھولا تھا۔ آپ کو موقع مل گیا تھا دروازے کے پیچھے چھپنے کا۔ اور ریوالور نکالنے کا۔ پہلے آپ نے ایک کے سر پر وار کیا، پھر دوسرا آگیا۔"

"یہ کون ہیں؟"

"آپ انہیں نہیں جانتے۔ یہ آپ کو لوٹنا چاہتے تھے۔"

"اچھا۔ کیا انہوں نے مجھے لوٹ لیا؟"

"آپ کو پتا نہیں' پولیس کے سامنے آپ الماری میں دیکھ لیں۔ اگر آپ نے اپنے بیان میں کچھ اور کہا۔ تو پولیس کو شک ہو جائے گا۔ ہمارا کوئی حوالہ نہیں دینا ہے۔ بس یہ سمجھ لیں کہ ہم یہاں آئے ہی نہیں۔ نہ آپ نے ہمیں دیکھا۔ آپ کسی چوہدری دلاور کو یا سکندر بخت کو نہیں جانتیں۔"

"میں کہہ دوں گا کہ میں کسی چوہدری دلاور یا سکندر بخت کو نہیں جانتا۔"

میں نے سر پر ہاتھ مار کے کہا "سردار جی۔ میرا مطلب تھا کہ آپ کوئی نام ہی نہ لیں جس سے پولیس سوال جواب کرنے لگے۔"

جند کور نے کہا "آپ فکر مت کریں۔ میں سب سنبھال لوں گی۔"

میں نے کہا "آپ کا بیان سیدھا اور مختصر ہو گا تو کوئی الجھن پیدا نہیں ہو گی۔ آپ باہر جانے کا اور ہم سے ملاقات کا یا آئس کریم پارلر میں ہونے والے ہنگامے کا بھی ذکر نہ کریں۔ یہ کہیں کا آج ہم گھر پر تھے اور میری طبیعت کچھ ناساز تھی' ہم لاؤنج میں بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے کہ کسی نے گھنٹی بجائی۔ میں نے دروازہ کھولا' تو یہ دو بدمعاش اندر آ گئے۔ میرا شوہر ایک دم اپنا ریوالور لینے لپکا کیونکہ اندر آتے ہی بدمعاشوں نے مجھے دھکا دیا تھا اور کہا تھا کہ شور مچانے کی ضرورت نہیں۔ ان لوگوں کی نیت ٹھیک نہیں معلوم ہوتی تھی۔ میرے شوہر نے بڑی ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے ایک ایک کو باری باری ناک آؤٹ کیا مگر وہ خود بھی ایک بدمعاش کے ہاتھوں ناک آؤٹ ہو گیا تو مجھے بھی چکر سا آیا اور میں بے ہوش ہو گئی۔ چند منٹ میں مجھے ہوش آیا تو میں نے پولیس کو بلا لیا اتنی دیر میں سردار جی کو بھی ہوش آ گیا۔ اور ہاں' آپ یہ ضرور بتا دیں کہ غالباً ان کے ساتھ کوئی اور بھی تھا مگر آپ نے اسے دیکھا نہیں' وہ بعد میں آیا ہو گا۔"

اس نے پریشان ہو کے کہا "یہ کہنا کیوں ضروری ہے؟"

"اس لیے کہ ہم بیس ہزار پاؤنڈ اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں۔ دس ہزار پاؤنڈ تمہارے شوہر کو دلاور نے بطور ایڈوانس دیے تھے اور باقی دس اپنے ساتھ لایا تھا۔ چوہدری دلاور کا مال ہم پر حلال ہے۔ اگر یہ تمہارے گھر میں رہتا تو شاید تمہارے لیے نحوست لاتا۔ اپنے شوہر کو بھی سمجھانے کی کوشش کرنا کہ اس چکر میں نہ پڑے۔ ہم کل لندن سے پاکستان چلے جائیں گے۔ ہمارے پھر ملنے کا کوئی امکان نہیں اس لیے خدا حافظ۔ اور ہاں' یہ لو سردار جی کا ریوالور۔"

سردار جی نے ہاتھ جوڑ کے کہا "تمہارا بیڑا غرق ہو۔ واہگورو کرے تمہارا جہاز کریش ہو جائے۔"

میں نے کہا "بددعا کیوں دیتے ہو سردار جی!"

"اور کیا آشیرباد دوں۔ چنگا بھلا کام ہو گیا تھا ہمارا۔" پھر کے بولا "کل جند کور کے لیے اس کھنارا موری... گڈی آ جاتی۔ لگتا ہے ابھی کچھ دن اور یہی گاڑی ہے اپنے... میں سواری کے لیے۔"

"یہی کرتوت رہے تمہارے تو کسی دن پولیس کی گاڑی پر سواری کرتے نظر آؤ گے" میں نے کہا "جند کور پر اور مورٹر... قناعت کرو۔ اپنی چیز اپنی ہوتی ہے۔"

لاؤنج میں فون موجود تھا۔ میں نے ایڈی کے گھر کا نمبر ملایا... ریسیور اس کی بیوی نے اٹھایا اور بولی "ہیلو۔"

میں نے کہا "مسز ایڈی' ہم ابھی آ رہے ہیں۔"

"کون ہو تم؟" وہ بولی۔

"تمہارے گیراج میں سونے والے مہمان" میں نے کہا۔

وہ ہنسنے لگی "آ جاؤ۔ میں گاڑی باہر نکال دیتی ہوں۔"

"ایک مہربانی کرنا۔ ہمارے بارے میں کسی کو کچھ مت بتانا... ہم روپوش رہنا چاہتے ہیں۔ ایڈی ہمیں جیسے لایا تھا ویسے ہی... جائے گا۔"

"تم فکر مت کرو۔ یہاں تمہیں کوئی خطرہ نہیں۔ راستہ تو... اچھی طرح۔"

میں نے اور محسن نے چوہدری دلاور کو اٹھایا اور نیچے لے گئے۔ ڈاکٹر شاہ کی گاڑی نیچے موجود تھی۔ چوہدری دلاور اسی گاڑی میں وہاں پہنچا تھا۔ مجھے ایک بے ہودہ قسم کی لمبی چوڑی ڈاج بھی... آئی جس کی چھت نہیں تھی اور باڈی پر زیبرے جیسی سیاہ سفید لکیریں تھیں۔ یہ انہی دونوں کی گاڑی ہو سکتی تھی جو چوہدری دلاور کی مدد کرنے آئے تھے۔ مجھے اگلی سیٹ پر ان کا تیسرا ساتھی نظر آیا۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا لیکن وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ایک ڈبل ڈیکر قسم کی سیاہ فام گرل فرینڈ تھی اور دونوں ایک دوسرے کے عشق میں دنیا ومافیہا سے بے خبر تھے۔ شاید اسی لیے اپنے دونوں ساتھیوں کے لوٹ کر نہ آنے کی اسے فکر نہیں تھی... اس کا وقت اچھا گزر رہا تھا مگر بہت جلد پولیس اسے بیس ہزار پاؤنڈ کی ڈکیتی کے الزام میں پکڑنے کے لیے آنے والی تھی۔

میں نے دلاور کو پچھلی سیٹ پر ڈالا تو ڈاکٹر شاہ نے بالآخر... ہی لیا "کیا مجھے بھی تمہارے ساتھ ہی رہنا پڑے گا؟"

میں نے کہا "ہاں۔ ابھی تمہارا کام تمام نہیں ہوا۔"

محسن بولا "اور ہم نے ابھی تمہارے بارے میں فیصلہ کہاں... ہے؟"

اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور چلنے لگا "آخر تم کون ہو... فیصلے کرنے والے۔ کیا تم خدائی فوجدار ہو؟"

اس سے پہلے کہ کوئی متوجہ ہوتا یا ڈاکٹر شاہ مدد کے لیے... لگتا' میں نے اسے خاموش کر دیا۔ محسن نے اسے گاڑی میں... لیا۔ قریب سے گزرنے والی ایک بوڑھی عورت نے مجھے خوف... نظروں سے دیکھا اور سینے پر صلیب بنائی۔ ایک نوجوان جوڑا...

... "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

میں نے کہا "کیا تم بھی اس کے ساتھی ہو؟ ہمارے ساتھ پولیس اسٹیشن چلو۔ تمہیں اپنے سوال کا جواب مل جائے گا اور کچھ سوالات ہم بھی کریں گے۔"

اس کی ساتھی لڑکی نے جلدی سے کہا "نہیں نہیں۔ ہمارا کسی معاملے سے کوئی تعلق نہیں" پھر وہ لڑکے کو کھینچ کر لے گئی "خواہ مخواہ ہر معاملے میں ٹانگ مت اڑایا کرو۔ ایک شام ہم پہلے بھی غارت کر چکے ہیں اسی طرح۔"

اب ڈرائیونگ میں نے سنبھالی۔ راستہ ایڈی کی بیوی نے سمجھا دیا تھا۔ پون گھنٹے کی ڈرائیونگ کے بعد ہم اس علاقے میں پہنچ گئے اور تھوڑا سا بھٹکنے کے بعد بالآخر ایڈی کا گھر بھی مل گیا۔ یہ ڈھلوان چھت والا مختصر سا مکان تھا جس کی دیواریں اور چھت سب لکڑی کے بنے ہوئے تھے لیکن کھڑکیاں اور دروازے المونیم کے تھے۔ باہر سے اس کو سفید پینٹ کیا گیا تھا اور دیواروں پر کھڑکی دروازوں کے اوپر یہاں تک کہ چھت کے کناروں پر اتنے گملے لگا دیے گئے تھے کہ پورا گھر سبزہ و گل کی فراوانی سے چمن زار لگتا تھا۔

ایڈی کی بیوی نے ہمارا استقبال کیا اور ہمیں اندر لے گئی۔ وہ جیسی تصویر میں نظر آتی تھی اس سے کہیں زیادہ موٹی اور کالی تھی مگر وہ بے حد خلیق اور خوش مزاج عورت تھی۔ اندر سے وہ گھر بہت آرام دہ تھا اور بڑی سادگی اور خوب صورتی سے سجایا گیا تھا۔ ایڈی کے دونوں بچے سو گئے تھے۔

"تم ایڈی کے دوست سکندر ہو؟" اس نے محسن سے پوچھا۔

"سکندر میں ہوں" میں نے کہا "یہ محسن ہے۔ اور یہ تیسرا ڈاکٹر شاہ ہے۔ چوتھا شخص گاڑی میں لیٹا ہوا ہے۔"

"کیا یہ تمہیں چھوڑنے آئے ہیں؟"

"یہی سمجھ لو۔ مگر اب ہم ان کو چھوڑنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔"

"تو کیا تم سب گیراج میں رہو گے؟"

میں نے کہا "ہم گزارا کر لیں گے۔ جتنی جگہ ایک کار گھیرتی ہے وہ چار افراد کو لیٹنے کے لیے کافی ہونی چاہیے۔"

"گیراج اتنا چھوٹا نہیں ہے۔ ایڈی کی ورکشاپ بھی اسی میں ہے۔ وہ اچھا موٹر مکینک بھی ہے۔ لوگ اس سے گاڑی ٹھیک کرانا پسند کرتے ہیں کیونکہ وہ کسی کو ٹھگتا نہیں۔ اپنی فیملی کے لیے وہ دن رات محنت کرتا ہے۔ اسے مجھ سے بہت محبت ہے۔"

میں نے محسن کی طرف دیکھا اور سر ہلایا "بے شک۔"

"وہ بڑا اچھا کارپینٹر بھی ہے۔ یہ گھر اس نے خود اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا۔ ہماری شادی سے پہلے۔ دراصل اس کے پاس رہنے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی اور میری شرط یہی تھی کہ شادی سے پہلے تمہارا اپنا گھر ہونا چاہیے جس کو میں اپنا کہہ سکوں۔ اس سے فرق نہیں پڑتا کہ وہ کتنا بڑا ہے اور آرام دہ ہے یا نہیں۔ اس نے پورا ایک سال محنت کی اور تم دیکھ سکتے ہو کہ وہ اپنے کام میں کتنا ماہر ہے۔"

میں نے کہا "اس کی مہارت سے زیادہ میں اس کی محبت کے جذبے کی تعریف کروں گا۔ وہ تو فرہاد ہے۔"

"فرہاد... وہ کون ہے؟"

میں نے کہا "تم نہیں سمجھو گی۔ اس نے بھی اپنی گرل فرینڈ شیریں کے لیے ایسا ہی کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ پہاڑ سے دودھ کی نہر نکالی تھی۔"

"دودھ کی نہر" وہ ہنسنے لگی "تمہارا مطلب ہے کوئی ڈیری فارم قائم کیا تھا کسی پہاڑ پر۔ خیر یہ دیکھو کہ مکان بنانے کے بعد ایڈی نے اس پر خود ہی رنگ کیا۔ یہاں آنے کے بعد میں نے کہا کہ اب تمہارا کام ختم ہو گیا۔ میں نے اس کو سجایا' ہم یہاں بہت خوش ہیں۔ اچھا میں تم کو کمبل دیتی ہوں۔ اور کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دینا۔"

میں نے کہا "نو... تھینک یو۔"

گیراج خاصا کشادہ تھا اور مکان کی چوڑائی کے برابر اس کی لمبائی تھی۔ تقریباً اٹھارہ فٹ۔ سامنے سے یہ دس فٹ چوڑا ہو گا۔ اس کے فرش پر تیل کے داغ تھے۔ آخری حصے میں ورکشاپ کا سامان بھی نظر آ رہا تھا۔ محسن نے کمبل بچھا دیا تو میں نے چوہدری دلاور کو گاڑی سے نکالا اور فرش پر لٹا دیا۔ پھر ہم بھی جوتے اتار کے کمبل پر بیٹھ گئے۔

ڈاکٹر شاہ سخت پریشان تھا "یہ تم مجھے کہاں لے آئے ہو' اگر رات گزارنے کا مسئلہ تھا تو تم میرے ساتھ چلتے۔"

میں نے کہا "ہم جیسے رئیسوں کو جن کے پاس بیس ہزار پاؤنڈ ہوں قیام کے لیے فائیو اسٹار ہوٹل میں بھی جگہ مل سکتی ہے لیکن یہ جگہ ہمیں بہت پسند تھی۔"

"تم دلاور کی بیماری کو نظرانداز کر رہے ہو' اس کی حالت..."

میں نے اس کی بات کاٹ دی "اس کی حالت مجھے تو ٹھیک لگتی ہے۔ اگر وقت پر دوا نہ ملی تو کیا ہو گا؟ زیادہ سے زیادہ اس کی زندگی کچھ اور مختصر ہو جائے گی۔ اس سے نہ ہمیں فرق پڑتا ہے نہ دلاور کو۔"

"مجھ سے تم کیا چاہتے ہو آخر؟" وہ بولا۔

میں نے کہا "ایک ڈیتھ سرٹیفکیٹ!"

وہ بری طرح چونکا "ڈیتھ سرٹیفکیٹ۔ کس کی موت کا؟"

"چوہدری دلاور کی موت کا" میں نے کہا۔

"کیا... تم اسے قتل کرو گے؟"

میں نے کہا "قتل کرنا ہوتا تو ہم اسے بہت پہلے کر دیتے۔ اب اس کا کوئی فائدہ نہیں۔"

"میں ویسے ہی ڈیتھ سرٹیفکیٹ جاری نہیں کر سکتا۔ خواہ یہ مر جائے۔ میں یہاں اسپیشلائز کرنے آیا ہوں۔ یہ سمجھ لو کہ طالب علم ہوں۔ مجھے اجازت نہیں ہے پریکٹس کی۔"

میں نے کہا "اجازت؟ صرف پاکستانی ہی نہیں لاکھوں ہندوستانی اور دوسرے ایشیائی ممالک کے رہنے والے یہاں بلا اجازت سب کچھ کر رہے ہیں۔ مثلاً ہم' ہم یہاں بلا اجازت آئے ہیں۔ ہم جیسے ہزاروں ہر سال آتے ہیں اور چوری چھپے سب کچھ کرتے ہیں' پریکٹس بھی۔"

اس نے ایک گہری سانس لی "ٹھیک ہے۔ میں بھی مریض دیکھ لیتا ہوں۔ وہ سب اپنے پاکستانی یا انڈین ہوتے ہیں۔ ایک کلینک بھی ہے میرا مگر میرے پاس لائسنس نہیں ہے۔"

"لائسنس کس کے پاس ہے۔ یہ تم ضرور جانتے ہو گے۔"

"لیکن ایک زندہ آدمی کے لیے ڈیتھ سرٹیفکیٹ...."

میں نے کہا "ڈیتھ سرٹیفکیٹ فراہم کرنے کے بعد تمہاری بخشش ہو گی۔ اس کے بغیر نہیں۔"

محسن نے کہا "جب تم اچھی طرح جانتے ہو کہ تم انکار کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہو تو بحث کیوں کرتے ہو؟"

"یہ بلیک میلنگ ہے۔"

میں نے کہا "ہمیں معلوم ہے۔ سرٹیفکیٹ کون دے سکتا ہے؟"

"ایک ہندو ڈاکٹر ہے' امرناتھ۔ مگر وہ ایک ہزار پاؤنڈ مانگے گا۔"

میں نے کہا "کوئی بات نہیں' دے دو۔"

"میں دے دوں....؟"

میں نے کہا "بہت دولت اکٹھی کی تھی تم نے چوہدری دلاور کے ساتھ وزیر خاں اسپتال میں لوگوں کو پاگل بنا کے۔ اس کا بھی حساب تو ہونا چاہیے۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ تم ایسے ہی چھوٹ جاؤ گے۔ یہ مت بھولو کہ ہم بھی لاہور میں ہیں۔ وزیر خاں اسپتال میرا ہے اور ایک دن ہم اس کا چارج سنبھالیں گے تو بہت کچھ معلوم ہو جائے گا جو ابھی ہم نہیں جانتے۔ وہ سب ریکارڈ اگر کسی تفتیشی ادارے کے سپرد کر دیا جائے...."

ڈاکٹر شاہ کی حالت غیر ہو گئی "یہ خطرہ تو مجھے ہمیشہ لاحق رہے گا تم سے۔"

"ہم پیشہ ور بلیک میلر نہیں ہیں۔ چوہدری دلاور کے ساتھ ایک ذاتی معاملہ تھا پھر یہ حب الوطنی کا تقاضا بن گیا۔ تم نے دیکھا کہ میں نے تمام ذاتی عداوتوں کے رشتے آج ختم کر دیے۔ میں نے اسے معاف کر دیا مگر یہ پاکستان کا مجرم ہے۔ پاکستان کا قانون اسے جو سزا چاہے دے۔ تمہارے ساتھ ہمارا کوئی ذاتی جھگڑا نہیں۔ تم اس ملک کے ہزاروں بلکہ لاکھوں ضمیر فروش لالچی اور مجرمانہ ذہنیت رکھنے والے معزز اور شریف لوگوں میں شامل ہو جو انسانیت کے نام پر داغ ہیں مگر ہم ایسے سب لوگوں کی اصلاح نہیں کر سکتے اور ان کے خلاف سزا کے عمل کا آغاز کرنے کا ارادہ بھی نہیں رکھتے۔ ہمارے پاس نہ اتنا وقت ہے نہ اتنے وسائل اور نہ اتنا اختیار۔"

ڈاکٹر شاہ نے شکست خوردہ لہجے میں کہا "اچھا فرض کرو' میں تم کو ایک ڈیتھ سرٹیفکیٹ لا دیتا ہوں۔"

"وہ جعلی نہیں ہونا چاہیے۔ اس کی قانونی اور سرکاری حیثیت شبہے سے بالاتر ہونی چاہیے۔"

"اس کی رجسٹریشن بھی ہو گی۔ مگر دلاور تو زندہ ہے۔"

میں نے کہا "ہم یہاں سے اس کو تابوت میں لے جانا چاہتے ہیں۔ اس طرح کہ یہ لاش نظر بھی آئے' ثبوت ہمارے ہاتھ میں ہو گا تو کون شک کرے گا۔"

وہ کچھ دیر مجھے بے وقوفوں کی طرح دیکھتا رہا "تم خود ناجائز طور پر چھپ کے برطانیہ میں داخل ہوئے تھے۔"

"ہم اسی طرح نکل بھی جائیں گے" محسن بولا۔

"لیکن اس تابوت کے ساتھ۔ لاش کو چھپا کے لے جانا۔ اور لاش بھی وہ جو درحقیقت لاش نہ ہو۔ یہ سب کیسے ہو گا؟" وہ سر پکڑ کے بولا۔ "کہیں تم پکڑے گئے تو سب چکر میں آ جاؤ گے میں بھی' ڈاکٹر جو ڈیتھ سرٹیفکیٹ جاری کرے گا وہ بھی۔"

میں نے کہا "تم جیسے لوگ تو ویسے ہی پکڑے جانے کے خوف میں مبتلا رہتے ہیں۔ اللہ پر بھروسا رکھو۔ دل مضبوط رکھو۔ آج تک کچھ نہیں ہوا تو آئندہ بھی شاید کچھ نہ ہو۔"

"پھر بھی۔ مجھے بتاؤ تو سہی کہ تم یہ سب کیسے کرو گے؟"

"یہ سب تم کرو گے" میں نے کہا "ہے نا کمال کی بات؟"

"تم ایک ہی بار کہہ دو کہ مجھے کیا کرنا ہے" وہ بگڑ کے بولا۔

"اچھا سنو۔ ایک کام ہم نے تمہیں بتا دیا ہے۔ ڈیتھ سرٹیفکیٹ پر تم چوہدری دلاور کا نام' ولدیت اور پتا سب ٹھیک لکھو گے۔ یہ سب باتیں تم کو یقیناً معلوم ہوں گی۔ اس کے ساتھ تم اسپتال کا ریکارڈ لگاؤ گے۔ ڈاکٹر زبیدہ کی رپورٹ اور ڈاکٹر فرزند کی حتمی رپورٹ۔ سی ٹی اسکین کی فلمیں بھی ساتھ ہوں تو مزید بہتر ورنہ بایوپسی رپورٹ بھی کافی ہو گی۔ BIOPSY میں یقیناً یہ ہو گا کہ برین ٹیومر کی کون سی اسٹیج ہے اور یہ MALIGNANT ہے۔ اور اس کا سبب یہی ہو تو شک کون کرے گا۔ دوسرا کام تمہیں یہ کرنا ہے کہ دلاور کے سائز کا ایک تابوت حاصل کرو۔ بازار میں ہر قسم کے تابوت دستیاب ہیں۔ زیادہ کنجوسی مت کرنا۔ تابوت متاثر کن ہونا چاہیے۔ تمہارا آخری کام ایسا ہے جو صرف تم کر سکتے ہو۔ تم اپنے چوہدری دلاور صاحب کو نیند کا انجکشن دو گے' طویل گہری نیند۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "اس کا اثر چھ سے آٹھ گھنٹے رہتا ہے اس کے بعد جیسے ہی دلاور کو ہوش آئے گا یہ شور مچائے گا۔"

میں نے کہا "چھ آٹھ گھنٹے بعد ہم اسے دوسرا انجکشن لگا دیں گے یا لگوا دیں گے۔ یا چار چھ گھنٹے بعد ہی نیند کی گولی دے دیں گے اس سے نیند پکی ہو گی اور اگر اس کے بعد چار چار گھنٹے کے وقفے سے گولی دی گئی تو امید ہے چوہدری دلاور کی آنکھ اپنے پاکستان پہنچ کے کھلے گی۔"

"یہ اندر بڑا رسک لو گے تم۔"

"رسک تو اول تا آخر ہے۔ رسک کے سوا ہم کیا لے رہے ہیں" مگر رسک ہمارے لیے ہے' تمہارے لیے نہیں" میں نے کہا۔

"چوہدری دلاور کے لیے بھی ہے۔"

"ہوا کرے' ہمیں کیا اور تمہیں کیا؟" محسن بولا۔

"وہ مر بھی سکتا ہے۔"

محسن نے کہا "مر جائے' ہمیں کیا اور تمہیں کیا۔ دلاور کی ضرورت کسے ہے۔ نہ اس دنیا کو نہ اس کے دوستوں دشمنوں کو۔ دوست شاید اس کا کوئی نہیں۔ دشمن کیا خاک دشمنی نبھائیں۔ تین مہینے بعد اس کو مرنا ہی جانا ہے۔ بڑی اذیت کے ساتھ۔ اگر یہ ابھی مر گیا تو اس کے حق میں اچھا ہو گا۔ گھر والے بھی اسے مرتا دیکھنے کے عذاب سے بچ جائیں گے۔ کل بھی ان کو رو دھو کے صبر کرنا تھا سو آج کر لیں گے۔"

"کیسی بے رحمی کی باتیں کرتے ہو تم" ڈاکٹر بولا۔

"اگر زہریلا سانپ یا بچھو تمہیں ڈنک مارنے والا ہو تو اس کو مارتے وقت کیا تمہارے دل میں یہ رحمدلانہ خیال آتا ہے کہ ایک بے زبان کو مارنے کا کیا فائدہ۔ ہمارا مقصد چوہدری دلاور کو لاہور لے جا کے قانون کے حوالے کرنا ہے۔ زیادہ امید یہی ہے کہ ہم اپنے مشن میں کامیاب ہوں گے لیکن ہم اسے زندہ پیش نہ کر سکے تو مردہ پیش کر دیں گے۔"

"تم اسے بائی ائر کیسے لے جاؤ گے؟ ہوائی سفر کے قواعد بہت سخت ہیں" ڈاکٹر نے کہا۔

"عام حالات میں سخت قوانین کو نرم بنانے کے لیے کرنسی کا نسخہ مؤثر ثابت ہوتا ہے۔ اپنی قومی ائرلائن میں اپنے قومی مزاج کے مطابق لاجواب لوگ ہیں اور ان کی باکمال پرواز سے سب استفادہ کرتے ہیں مگر وہ نہ مانیں تو کچھ درجہ دوم اور سوم کی ائرلائنز ہر قسم کی خدمات کے لیے مستعد رہتی ہیں۔ وہ رعایتی نرخ پر مسافروں کو فرش پر بٹھا کے۔ ٹوائلٹ میں چھپا کے یا کریو کے ساتھ لے جاتے ہیں۔ ٹکٹوں میں بھی سودے بازی چلتی ہے۔ میں نے تو ایک ائرلائن کے اسٹاف کو باقاعدہ مسافروں کو متوجہ کرنے کے لیے اسی طرح آوازیں لگاتے بھی دیکھا ہے جیسے اپنے لاہور کے تانگے والے آواز لگاتے ہیں۔ چل بھئی بھائی انارکلی' کچھ پرائیویٹ آپریٹر ہیں۔ ایک جہاز' ایک پائلٹ اور ایک نیوی گیٹر۔ ائرلائن پوری۔ زیادہ ہوا تو کوئی چھیل چھبیلی مسافروں کو ورغلانے والی ائرہوسٹس رکھ لی۔ یہ کام ان کی بیوی' بیٹی بھی کر لیتی ہیں۔"

"تم جانتے ہو یہ سب تو ٹھیک ہے' میں اس معاملے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکوں گا۔"

"اب تم جانا چاہو تو جا سکتے ہو" میں نے کہا "لیکن یہ ہرگز مت بھولنا کہ تمہارا مستقبل ہمارے رحم و کرم پر ہے۔ اگر تم نے جان چھڑانے کی کوشش کی اور قانون کے یا بدمعاشی کے چکر میں پڑے تو اپنا ہی نقصان کرو گے۔ دلاور نے تمہیں یقیناً ہمارے بارے میں تفصیل سے بتایا ہو گا۔ یہ سوچ لینا کہ کیا تم میں ہم سے دشمنی مول لینے کا حوصلہ ہے؟"

"ابھی تک میں سب کچھ تمہاری خواہش کے مطابق کر رہا ہوں اور جہاں تک ممکن ہو گا میں تم سے تعاون کروں گا۔ کیا اس کے بعد مجھے یہ امید رکھنی چاہیے کہ تم پھر کبھی مجھے بلیک میل نہیں کرو گے؟"

"اگر ہم وعدہ کر لیں اور پھر مکر جائیں۔ تو تم کیا کرو گے؟ تم کوئی ضمانت حاصل کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہو۔ کسی یقین دہانی کی کوئی اہمیت ہو بھی نہیں سکتی۔ بہتر ہے کہ تم اچھے بچوں کی طرح ہر کام سعادت مندی کے ساتھ کرو اور ہمیں شکایت کا موقع نہ دو۔"

وہ سر ہلا کے رخصت ہو گیا تو محسن نے کہا "اگر ہم میں سے کوئی اس کے ساتھ چلا جاتا تو اچھا ہوتا۔"

"مجھے ڈاکٹر شاہ سے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا۔ وہ پوری طرح ہماری مٹھی میں ہے۔" میں نے کہا۔

"کیا یہ رات ہم ایسے ہی گزاریں گے' جاگتے ہوئے۔ بھوکے پیاسے" محسن نے کہا۔

"میں کوشش کرتا ہوں کہ ایڈی کی زوجہ کے دل میں مہمانوں کے ساتھ حسن سلوک کے جذبات جگا دوں۔ وہ ہمیں کافی بنا دے اور کچھ کھانے کو دے دے۔ مجھے ایک فون بھی کرنا ہے حاجی علم دین طوطی صاحب کو۔ اپنے پاسپورٹ منگوانے ہیں اور ان سے کچھ معلومات حاصل کرنی ہیں۔"

"تو جاؤ۔ اپنے چوہدری صاحب ہوش میں آنے لگے ہیں۔ میں ان سے تفتیش کرتا ہوں" محسن بولا۔

ایڈی کی بیوی نے میری دستک پر کہا "یس" اور میں اندر داخل ہو گیا۔ وہ اپنے وسیع گوشت کے پہاڑ جیسے جسم کو لباس شب خوابی میں سمیٹے کرسی پر بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ یہ لباس کسی اونٹ کے خیمے جتنا بڑا تھا اور اس میں سے ایڈی کی بیوی جس حد تک عیاں تھی اس کو دیکھتے ہوئے ایڈی کی محبت اور اس کی ہمت کو داد دینی پڑتی تھی۔ وہ ٹی وی پر اپنے جیسی خواتین کی فری اسٹائل کشتی دیکھ رہی تھی۔

میں نے کہا "میں نے تمہیں ڈسٹرب تو نہیں کیا؟"

"نہیں نہیں۔ بیٹھو' کچھ پیو گے؟" وہ بولی۔

میں نے کہا "مجھے حیرت ہوتی تھی کہ ایڈی کو تم سے اتنی محبت کیوں ہے کہ ہر وقت ہر جگہ وہ تمہارے گیت گاتا رہتا ہے۔ لیکن یہاں آ کے مجھے احساس ہوا کہ میری حیرت بے جا تھی۔"

وہ بہت خوش ہوئی "ایسی کیا بات ہے مجھ میں؟"

"تم جیسی عورت ایک مرد کی زندگی کی تکمیل کرتی ہے۔ میں اس گھر کو دیکھتا ہوں تو مجھے واقعی رشک آتا ہے۔ کتنی پرسکون اور پرآسائش بنا دیا ہے تم نے ایڈی کی زندگی کو۔ اس نے مجھے بتایا کہ تم کھانا بہت اچھا پکاتی ہو۔ سینڈوچ بہت مزے کے بناتی ہو اور کافی تو اسے سوائے تمہارے ہاتھ کی کافی کے کہیں پسند ہی نہیں آتی۔"

وہ ہنسی "ایسے ہی کہتا ہے وہ۔ تم فیصلہ کرو' میں تمہارے لیے

کافی لاتی ہوں۔ سینڈوچ کھاؤ گے؟"

"کسی اچھی پیش کش کو مسترد کرکے پچھتانے سے بہتر ہے کہ میں ہاں کہہ دوں۔ مگر مسز ایڈی' میرا دوست بُرا مانے گا۔"

"اسے بھی بلالو۔ میں جب اکیلی رہ جاتی ہوں تو بس ٹی وی کے سامنے بیٹھ کے ایڈی کا انتظار کرتی ہوں۔ اچھا ہے تم سے باتوں میں کچھ وقت گزر جائے گا۔"

میں نے کہا "وہ.....دراصل ہمارے ساتھ ایک بیمار شخص بھی ہے۔ میرا دوست اسے چھوڑ کے نہیں آسکتا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ میں اسے کافی اور سینڈوچ گیراج میں پہنچادوں گا۔ تمہارے بچّے بہت پیارے ہیں۔"

وہ پھر ہنسی "بڑے شریر ہیں' صرف باپ کے قابو میں آتے ہیں۔"

"شریر بچّے ہی ذہین ہوتے ہیں" میں نے کہا "اور جو بچّہ شریر نہ ہو وہ تو بوڑھا ہوتا ہے۔ کسی روز میرے بھی ایسے ہی شوخ اور شریر بچّے ہوں گے۔ میں اپنی بیوی کو تمہارے بارے میں بتاؤں گا۔ کیا میں ایک فون کرسکتا ہوں؟"

اتنی خوشامد اور تعریف کے بعد تو میں کہتا کہ مجھے خون کرنا ہے تو وہ کہتی کہ پوچھنے کی کیا ضرورت ہے' میرا کردو۔ اس نے فون کی طرف اشارہ ... ر ایک کونے میں بنے ہوئے کچن میں کافی بنانے لگی۔ میں نے حاجی علم دین طوطی صاحب کا نمبر ملایا۔

جواب میں خود ان کی آواز آئی "اوئے ابوالحرای' تیرا دماغ...ہے کہاں۔ ہیلو' اوئے...اوئے کدھر دوڑ رہا ہے' ٹھہر تیری تو.....ہیلو۔"

میں نے کہا "طوطی صاحب۔ میرا دماغ تو حاضر ہے۔ مگر آپ....."

"او جی۔ وہ میں اپنے فرزند سے مخاطب تھا۔ بڑی غلطی کی میں نے اس کے سر کو صاف کرا کے۔" وہ بولے "جو تھوڑی بہت عقل تھی' وہ بھی اُڑ گئی۔"

"اُڑ گئی...وہ کیسے؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔

"جیسے برف پگھل کے غائب ہوجاتی ہے جی اس پر بوری نہ ہو تو۔ اس کے سر پر بھی بالوں کا کمبل تھا تو عقل محفوظ تھی۔ اب تو خیر میں نے ٹوپی رکھ دی ہے اس کے سر پر۔ مجھے بھی آسانی ہے۔ جوتی مارنی ہو تو ٹوپی ہٹا کے مارتا ہوں۔ آپ سناؤ' میرے پاکستانی بھائی' سب خیر ہے نا.....جیل سے تو نہیں بول رہے ہو؟"

میں نے کہا "ہم اللہ کے فضل سے بالکل محفوظ ہیں اور اچھی خبر ہے ایک۔ ہم نے چوہدری دلاور کو پکڑ لیا ہے۔"

"اچھا! بھئی تمہیں مبارک ہو۔ کہاں سے پکڑا اور کیسے؟"

میں نے کہا "وہ خود ہی آگیا گرفتار ہونے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ وہ فوت ہونے والا ہے۔"

"اوہو ہو..... یہ تو ٹھیک نہیں کیا تم نے۔ میرے پاکستانی بھائی' قتل بڑا سنگین جرم ہے خواہ کسی قاتل کا ہو....."

میں نے کہا "آپ نے غلط سمجھا۔ وہ قضائے الٰہی سے فوت ہونے کے قریب ہے۔ اسے کینسر ہوگیا ہے دماغ کے اندر۔ ڈاکٹر نے حتمی فیصلہ دیا ہے کہ وہ تین ماہ کے اندر اندر مر جائے گا۔ ہم اسے جلد از جلد پاکستان لے جا کے قانون کے حوالے کرنا چاہتے ہیں۔"

"یہ تو عجیب خبر سُنائی تم نے۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ اللہ کی لاٹھی بے آواز ہے۔ دیکھو کیسی ماردی ہے اس نے۔ سارا قصور تو اس کے شیطانی دماغ کا۔ ...ہیں ہوگیا یہ موذی مرض۔ کب جارہے ہو تم؟"

میں نے کہا "ہمارے پاسپورٹ آپ کے پاس ہیں۔ اور ایک سوٹ کیس ہے۔ اسی میں ہے سب کچھ۔ وہ آپ ہمیں بھجوادیں۔ پتا لکھ لیں اور نوردین کو سمجھادیں۔ وہ صبح پہنچادے گا۔"

"بولو" انہوں نے کہا اور میرا بتایا ہوا پتا لکھا "یہ بتاؤ کہ آپ تو خود بھی چور دروازے سے آئے تھے۔ اس مردود بارگاہِ خداوندی کو کیسے ساتھ لے جاؤ گے؟"

میں نے کہا "حاجی صاحب! ماشاءاللہ آپ کے بڑے وسائل اور تعلقات ہیں۔ آپ کے علم میں ہے کوئی ایسا پائلٹ جس کا اپنا جہاز ہو اور لائسنس ہو۔"

"لو جی۔ ادھر تو وہ حال ہے' اپنے علامہ صاحب کے مطابق کہ ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔"

میں نے کہا "یہ تو غالباً غالب نے کہا تھا؟"

"او جی چھوڑو غالب اور غالبن کو۔ کیسا جہاز چاہیے آپ کو؟"

میں نے کہا "کوئی چار یا آٹھ سیٹوں والا سیسنا۔ یا اور کوئی چھوٹا جہاز جسے ہم چارٹر کرسکیں۔ ایسے پرائیویٹ جہاز تو یقیناً سیکڑوں ہوں گے مگر ہمیں کسی ایسے بندے سے ملوادیں جو ذرا ...دار ہو۔ میرا مطلب ہے....."

"تمہارا مطلب میں سمجھ گیا میرے پاکستانی بھائی۔ ایک گورا ملعون ہے۔ پہلے ائرفورس میں تھا۔ اسے شریفانہ کام ملے تو خود انکار کردیتا ہے۔ وہ صرف اسمگلنگ کرتا ہے۔ بندے اِدھر سے اُدھر کرنا تو معمولی بات ہے۔ وہ تو افریقہ سے ہاتھی اُٹھالائے اور بیچ دے چڑیا گھر والوں کو شتر مرغ کہہ کے۔"

میں نے کہا "ویری گڈ۔ ایسا ہی آدمی کرسکتا ہے یہ کام۔ آپ اسے بھی ہمارے پاس بھیج سکتے ہیں؟"

"اگر مل گیا کسی ٹھکانے پر تو اپنا چیف رپورٹر اس کو ڈھونڈ نکالے گا اور حاضر کردے گا۔ پیسہ وہ کام دیکھ کے مانگتا ہے۔"

"معاوضہ ہم طے کرلیں گے' کیا نام ہے اس کا؟"

"جیک۔ مگر خود کو ہائی جیک کہتا ہے۔ اور ہاں۔ ایک کام اور کہا تھا تم نے' میں نے پتا چلالیا ہے۔ ابھی تک تو اخبار والوں کو اشتہار جاری نہیں کیا گیا ہے۔ مگر یہ تجویز زیرِ غور ہے۔ اور میرے پاکستانی بھائی' یہاں غور کرنے میں سال مہینے نہیں لگتے۔ ہوسکتا ہے کل پرسوں تمہاری تصویر چھپ جائے۔ اگر تم اس سے پہلے ہی نکل جاؤ تو اچھا ہے۔"

میں نے کہا "آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ نے ہماری بہت مدد کی' اس کے بغیر ہم کچھ نہ کرپاتے۔"

"او جی ایسا مت کہو۔ طوطی بڑا گنہگار اور عاجز بندہ ہے۔ سب کی مدد کرتا ہے وہ رب سچا تے سوہنا۔ شکر اُس کا ادا کرو۔"

ان سے باقی باتیں الوداعی نوعیت کی تھیں۔ میں نے فون رکھا تو ایڈی کی بیوی نے کافی کے مگ اور سینڈوچ میرے سامنے رکھ دیے "یہ تم کس زبان میں کس سے باتیں کررہے تھے؟"

میں نے کہا "یہ اردو زبان تھی۔ اپنے ایک پاکستانی دوست سے بات کررہا تھا؟"

میں نے ٹرے اُٹھا کے ایڈی کی بیوی کا شکریہ ادا کیا اور گیراج میں آگیا۔ چوہدری دلاور کو ہوش آگیا تھا۔

محسن نے خفگی سے کہا "اتنی دیر کیسے ہوئی؟"

میں نے کہا "دس منٹ خاتونِ خانہ کی تعریف کی۔ دس منٹ اپنے طوطی صاحب سے بات کی۔ اور میں خالی ہاتھ نہیں لوٹا ہوں۔"

"دلاور کی حالت ٹھیک نہیں ہے" وہ بولا "اسے دوا کی ضرورت ہے۔ کہیں یہ مر نہ جائے۔"

"نہیں یار۔ مرنا نہیں چاہیے اسے پاکستان پہنچنے سے پہلے۔ میں نے تو کل ہی جانے کا انتظام کرلیا ہے' بائی ائر۔"

"بائی ائر۔ سیدھا کراچی؟"

"نہیں یار۔ ہم لندن سے نکل جائیں گے۔ چوہدری دلاور کا تابوت بھی ساتھ ہی پیرس پہنچ جائے گا۔ اس کے بعد دیکھیں گے' لے کافی پی۔"

"دلاور نے مجھے بتایا ہے کہ اسے دن میں تین چار مرتبہ مختلف دوائیں نہ ملیں تو اس پر غشی کے دورے پڑنے لگتے ہیں۔" محسن نے مگ لے لیا۔

"کیا اسے دواؤں کے نام یاد ہیں؟"

"نام تو یاد ہیں لیکن عام دوائیں بھی یہاں ڈاکٹر کے نسخے کے بغیر نہیں ملتی ہیں۔ وہ خاص دوائیں ہیں۔" محسن بولا "یہ سینڈوچ ہیں یا پُرانے جوتے کے سول اور یہ کافی....."

میں نے کہا "اُلو کے پٹھے۔ میں نے اتنی تعریف اور خوشامد کے بعد ایڈی کی بیوی سے یہ چیزیں بنوائی ہیں۔ نخرے مت کر۔ مجھے پتا ہے گل کیسی کافی بناتی ہے۔ سینڈوچ کا نام سُن کے تو وہ پوچھے گی سینڈ؟ سینڈ تو ہوگئی مٹی.....وچ..... مٹی میں..... مٹی میں کیا.....؟"

"گل کو کچھ مت کہنا۔ مجھ پر ویسے ہی رقت طاری ہورہی ہے اس کی یاد سے۔"

میں نے کہا "اپنے چوہدری صاحب۔ کچھ کافی شافی پی لو۔"

دلاور نے آنکھیں کھول کے نقاہت سے کہا "جو مجھے چاہیے وہ میں نے بتادیا ہے۔ دوا نہیں لاسکتے تو پھر زہر لادو مجھے۔"

میں نے کہا "یار محسن۔ کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ کیا خیال ہے' میں کوشش کروں۔ شاید کوئی ڈاکٹر یا کیمسٹ مہربان ہوجائے۔"

"ڈاکٹر کو یہاں لائیں گے تو وہ پہلے پوچھے گا کہ تم نے مریض کو کہاں ڈال رکھا ہے۔ اسے تو اسپتال میں ہونا چاہیے۔ کیمسٹ نسخہ مانگے گا۔"

دلاور نے کہا "اگر تم.....کچھ کرسکتے ہو تو پتا میں بتادیتا ہوں۔ تمہیں نسخہ بھی مل جائے گا...اور دوا بھی۔"

"کیا ڈاکٹر شاہ سے فون پر بات نہیں ہوسکتی؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "تمہیں میرے گھر جانا پڑے گا۔ میرا ... جہاں میں ٹھہرا ہوا تھا۔ کمرے کی چابی میرے پاس ہے۔"

"اور یہ کمرا کس گھر کا ہے۔ وہاں کتنے قاتل ملیں گے مجھے؟"

"یہ ہوٹل کا کمرا ہے" وہ بولا "تم کہہ سکتے ہو کہ نواب خسرو جمشید کو اچانک جانا پڑا۔ تم میرا بل ادا کردو گے تو وہ سامان تمہارے حوالے کردیں گے' تمہارے لیے خطرے کی کوئی بات نہیں۔ بل مشکل سے سو سوا سو پاؤنڈ ہوگا۔"

میں نے محسن کی طرف دیکھا "اگر میں اکیلا نہ جاؤں' اپنے ساتھ شہزادہ سلیم کو لے جاؤں؟"

محسن نے کہا "ایسا ہوسکتا ہے۔ مگر تو جائے گا کیسے؟"

"ٹیکسی سے۔ پہلے جاتا ہوں طوطی صاحب کے نقار خانے۔ وہاں سے اپنا سامان بھی اُٹھالوں گا۔ اور اسے اپنے ساتھ بٹھالوں گا۔ چیف رپورٹر صاحب کو۔ وہ ہوٹل میں جا کے چوہدری دلاور کا سامان لے آئے گا۔ دو گھنٹے میں سارے کام ہوجائیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ پھر تو جا۔"

ٹیکسی لندن کی سڑکوں پر چوبیس گھنٹے کسی دشواری کے بغیر ملتی ہے۔ اور وہ کہیں جانے سے انکار کرتے ہیں اور نہ انتظار کرنے سے۔ کرایہ فاصلے کے مطابق رہتا ہے اور ویٹنگ چارجز میٹر کے حساب سے۔ ایک گھنٹے بعد جب میں طوطی صاحب کے نقار خانے سے اپنا سامان اُٹھا کے نوردین کے ساتھ روانہ ہوا تو میرا تھکن سے بُرا حال تھا۔ نوردین نے کئی بار اپنے سر پر توڑے جانے والے ظلم کی داستان سُناتے ہوئے بے بال ٹنڈ میرے ملاحظے کے لیے پیش کی "ابّاجی کی جوتی ڈائریکٹ لگتی ہے جی۔ پہلے بال تھے تو اتنا پتا نہیں چلتا تھا۔ آواز بھی بڑی ظالم پیدا ہوتی ہے اور اندر مغز فرائی ہوجاتا ہے۔" وہ فریادی لہجے میں بولا "یہ ٹوپی پہنتا ہوں تو آئینے میں صورت دیکھ کے رونا آتا ہے۔"

میں نے کہا "اللہ تمہاری مشکل آسان کرے گا پُتر نوردین۔ جب تک سر پر بال دوبارہ نہ اُگ آئیں' سمجھو کہ آزمائش کا دور ہے۔ اللہ اپنے نیک بندوں کو ہی آزمائش میں ڈالتا ہے۔"

وہ تقریباً خالی سڑک تھی جس پر میں نے اچانک ایک پولیس کار کا سائرن سُنا۔ میں نے پلٹ کے دیکھا۔ ہمارے پیچھے کوئی اور گاڑی نہیں تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ نہ کوئی سگنل توڑا تھا اور نہ کسی ٹریفک کے قانون کی خلاف ورزی ہوئی تھی۔ مجھے شک ہوا کہ پولیس ٹیکسی کا تعاقب میری وجہ سے کررہی ہے۔ شاید کسی پولیس مین کی نظر نے مجھے تاڑ لیا تھا۔

میرا شک اس وقت قوی ہوگیا جب ٹیکسی کے ساتھ ہی پولیس کار بھی مڑ گئی۔ ہوٹل اب قریب ہی تھا۔ لندن کے ماہر ٹیکسی ڈرائیور پولیس کو جُل دے کر فرار ہونے کا فن بھی جانتے ہیں مگر اب اس کی گنجائش نہیں رہی تھی۔

ٹیکسی ہوٹل کے سامنے رکی تو پولیس کار بھی رک گئی۔

میرا خون خشک ہونے لگا تھا اور میری صورت دیکھ کے شہزادہ سلیم پر بدحواسی طاری تھی۔ "اب کیا ہوگا جی۔" اس نے پولیس مین کو اپنی طرف آتا دیکھ کے کہا۔

میں نے ٹھنڈی سانس لی "وہی جو بکرے کے ساتھ ایک دن ہوتا ہے۔ خواہ اس کی ماں کتنی ہی خیر کیوں نہ منائے۔"

"ابھی وقت ہے جی۔ دوڑ لگاتے ہیں' آپ ایک مکا مارو اس کو اور ناک آؤٹ کردو۔"

میں نے کہا "یہاں کی پولیس بڑی بے مروت ہے۔ ہم جیسے مہمانوں کا بھی لحاظ نہیں کرتی۔ جواب میں یہ گولی ماردے گا ہم دونوں کو۔ اپنا پاکستان ہوتا تو کچھ لے دے کے ٹُک مُکا ہوجاتا۔"

پولیس مین نے اپنی نوٹ بک نکال لی اور ڈرائیور کی کھڑکی کے پاس رک گیا "جس تیز رفتاری سے تم گاڑی چلاتے ہو اس کے لیے لندن کی سڑکیں بالکل موزوں نہیں۔ یہ ٹیکسی چلانا چھوڑو اور کار ریس ڈرائیور بن جاؤ یا ہوائی جہاز اُڑاؤ" اس نے فارم بھرتے ہوئے طنزیہ مزاحیہ انداز میں کہا اور پھر ٹکٹ اسے پکڑا دیا۔

شہزادہ سلیم نے ازراہِ ہمدردی کہا "آفیسر۔ اس کا کوئی قصور نہیں۔"

وہ رک گیا "اوہ۔ پھر کیا تمہارا قصور ہے؟ تم پیچھے بیٹھ کے رفتار کنٹرول کررہے تھے' کیسے.... ریموٹ کنٹرول سے یا جادو سے...."

شہزادہ سلیم کہنے لگا "تم مجھ سے اس لہجے میں بات نہیں کرسکتے' میں ایک اخبار کا چیف رپورٹر ہوں۔"

پولیس مین نے اس کا شناختی کارڈ دیکھا "پھر میں کیا کروں؟"

"میں تمہارے خلاف خبر چھاپ دوں گا۔"

"کیسی خبر؟" اس نے کارڈ واپس کردیا "روز سیکڑوں ٹکٹ جاری ہوتے ہیں تیز رفتاری پر' اس میں کیا نئی بات ہے؟"

"دراصل ہمارا ایک دوست بیمار ہے.... ہم نے اسے مجبور کیا تھا کہ گاڑی تیز چلاؤ۔"

"اوہ.... گویا اصل مجرم تم ہو۔" وہ بولا "کیا تم چاہتے ہو کہ میں تمہیں گرفتار کرلوں؟ اور تمہارا دوست اتنا بیمار ہے تو تم باتوں میں وقت کیوں ضائع کررہے ہو" وہ بولا اور واپس چل پڑا۔

افسوس ناک بات یہ ہوئی کہ خود ٹیکسی ڈرائیور ٹکٹ جیب میں رکھ کے روانہ ہوگیا۔ نہ اس نے اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے واویلا کیا تھا اور نہ پولیس مین کی زیادتی کے خلاف احتجاج۔ اُلٹا وہ شہزادہ سلیم کی حمایت کو دخل در معقولات سمجھتے ہوئے اسے ناشکری سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنا جرم بڑی فراخ

دلی سے تسلیم کرلیا تھا۔ دنیا کی ترقی یافتہ اقوام کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ جھوٹ بولنے کو گناہ کبیرہ سے کم قابل شرم نہیں سمجھتے۔ کسی کو جھوٹا کہنا وہاں بہت بڑی گالی سمجھا جاتا ہے۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہاں جھوٹے لوگ نہیں ہوتے یا جھوٹ کے نام سے نا آشنا ہیں۔ دراصل منافقت ان کے قومی مزاج اور کردار میں شامل نہیں اور وہ حقائق کو غیر جذباتی انداز میں تسلیم کرلیتے ہیں۔

ہوٹل کے دربان نے خوش آمدید کہنے کے انداز میں مسکرا کے "گڈ ایوننگ سر" کہا۔ یہ اس کا کام تھا جو وہ پوری دیانت داری کے ساتھ سرانجام دیتا تھا۔ یہ دیکھے بغیر کہ اس کے سامنے سے راجا بھوج گزرا ہے یا گنگو تیلی۔ سر کہنے سے نہ کسی کی شان بڑھتی تھی اور نہ دربان کی شان گھٹتی تھی۔ اگر ہم سلام کے جواب میں رک کر اس سے مصافحہ کرتے' اسے گلے لگاتے اور پھر اس کے بیوی بچوں کی خیریت دریافت کرتے' اس کے ابا اماں سے لے کر چاچے ماے اور بھوری بھینس تک سب کا حال پوچھتے تو وہ حیران بھی ہوتا اور شاید شک کرتا کہ ہم نے زیادہ پی لی ہے۔

کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی نازنین نے جو عمر میں نوردین کی والدہ کے برابر ہونے کے باوجود اس سے زیادہ جوان نظر آنے پر آمادہ تھی اور نظر بھی آتی تھی۔ مسکرا کے سوال کیا "یس سر۔ میں کیا کرسکتی ہوں آپ کے لیے؟"

میں نے رومانٹک لہجے میں کہا "بہت کچھ کرسکتی تھیں تم مگر افسوس کہ فرصت نہیں ہے تمہیں بھی اور مجھے بھی۔ ابھی تو یہ بتاؤ کہ نواب خسرو جمشید...."

اس نے پلٹ کے کی بورڈ کو دیکھا "سوری۔ وہ موجود نہیں ہیں۔"

میں نے کہا "کیا عجیب اتفاق ہے' میں بھی یہی بتانے والا تھا۔"

وہ ہنس پڑی "ہمیں تو معلوم ہوتا ہے۔"

میں نے دردناک صورت بنا کے کہا "نہیں' معلوم ہوتا تمہیں تو پہلے تم یہ سوال کرتیں کہ ہزلارڈ شپ کہاں ہیں۔ اس دنیا میں یا دوسری دنیا میں۔"

"ہزلارڈ شپ....!"

"نواب ہماری قومی زبان اور ہمارے ملک میں ریاست کے حکمراں کہلاتے ہیں۔ سلطان نہ ہوں تو راجا...."

"جیسے راجا کنگال رائے آف قلاش پور۔" نوردین بولا۔

اس نے کہا "کیا ہوا ہے نواب کو؟"

میں نے ایک آہ بھری "وہ سخت علیل ہیں اور کیا پتا اتنی دیر میں وہ مرحوم بھی ہوگئے ہوں۔ ان کو برین ٹیومر ہے' بالکل آخری اسٹیج پر۔"

نوردین نے کہا "ویسے میں بھی ایک اسٹیج آرٹسٹ ہوں۔"

وہ فوراً نوردین کی طرف متوجہ ہوگئی "واقعی۔ کون سا ڈراما کررہے ہو آج کل' کیا اگلے ڈرامے میں تم مجھے بھی مدعو کرسکتے ہو؟"

میں نے نوردین کو گھور کے خاموش کیا "نواب صاحب صرف علاج کے لیے لندن آئے تھے۔ ڈاکٹر فریزر نے بھی مایوسی کا اظہار کردیا ہے تو کوئی معجزہ ہی ان کو بچا سکتا ہے۔"

شہزادہ سلیم نے ایک منطقی سوال کیا "کیا آج کل بھی معجزے رونما ہوتے ہیں؟"

خاتون نے انگلی سے سینے پر صلیب بنائی "ایسا مت کہو۔ خدا کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیے' کیا وہ کسی اسپتال میں ہیں؟"

"سینٹ تھامس اسپتال میں تھے' ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تو میں اپنے گھر لے گیا تھا" میں نے کہا "ان کی حالت نازک ہے۔"

"آئی ایم رئیلی سوری۔"

میں نے افسردگی سے سر جھکا لیا "نواب صاحب کسی ہوٹل میں نہیں مرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے تو لندن آنے سے بھی انکار کیا تھا مگر ہم نے زبردستی کی۔ اب وہ ہمیں الزام دیتے ہیں کہ تم نے اپنے گھر میں بیوی بچوں کی موجودگی میں مرنے بھی نہیں دیا۔ حالانکہ اس سے زیادہ فرق نہیں پڑتا۔"

"فرق تو پڑتا ہے" خاتون نے کہا "اگر اپنے پیارے قریب نہ ہوں تو آدمی خود کو اجنبی اور تنہا محسوس کرتا ہے۔ اس میں اور صحرا میں مرنے والے میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔"

"خیر' جو خدا کو منظور ہو وہی ہوتا ہے۔ نواب صاحب نے اپنی آخری خواہش بیان کی تھی۔ وہ مقروض مرنا نہیں چاہتے تھے۔"

شہزادہ سلیم نے سرہلایا "ورنہ دوسری دنیا میں ستر گُنا ادا کرنا پڑتا ہے۔"

"دوسری دنیا میں ستر گُنا؟"

"اس کا مطلب تھا یومِ حساب پر' یہ ہمارا عقیدہ ہے۔ ایک قرض آپ کا بھی تھا۔"

وہ حیران ہوئی "میرا؟"

"آپ کے ہوٹل کا۔ وہ بِل ادا نہیں کرپائے تھے۔ انہوں نے مجھے تاکید کی تھی کہ میں حساب بے باق کردوں اور کمرے سے ان کا سامان اُٹھالاؤں۔"

اس نے قدرے تذبذب کے ساتھ دانتوں میں پنسل دبا کے کہا "سامان!"

"کوئی خاص سامان نہیں ہے" میں نے کہا "ایک بیمار اور قریب المرگ آدمی کے پاس ہیرے جواہرات نہیں ہوسکتے۔ ان کی دوائیں ہیں اور نسخے ہیں اور میڈیکل رپورٹیں ہیں۔ زیادہ اہم نسخے ہیں جن کے بغیر دوائیں نہیں ملتی ہیں۔"

اس نے منیجر کو بُلایا۔ منیجر نے ہمدردانہ رویہ رکھتے ہوئے ہمارا مفصل انٹرویو لیا۔ میرا پاسپورٹ دیکھا' نوردین کے کاغذات ملاحظہ کیے اور پھر ایک ڈاکٹر کو بلالیا۔ ڈاکٹر نے چوہدری دلاور کی بیماری کے بارے میں وہ سوالات کیے جو کوئی عام شخص نہیں کرسکتا تھا۔ سینٹ تھامس اسپتال اور ڈاکٹر فریزر کے حوالے بڑے مستند تھے۔ اس نے ڈاکٹر فریزر کو فون کیا اور معلوم نہیں وہاں سے کس نے اسے مطلوبہ معلومات فراہم کرکے ہماری بات کی تصدیق کردی تو شک کی کوئی بات نہ رہی۔ اس کے باوجود منیجر کے ساتھ خود ڈاکٹر بھی ہمارے ساتھ کمرے تک گیا اور اس نے دلاور کے سوٹ کیس میں سے برآمد ہونے والی رپورٹیں دیکھیں۔ یہ پیشہ ورانہ تجسس بھی تھا کہ اس نے زیر استعمال دواؤں کو بھی دیکھا اور پھر مایوسی سے سرہلا کے کہا "آئی ایم سوری!"

ہم نے ادائیگی کی اور سامان وصول کرنے کی رسید دی۔ اس میں نقد رقم کا ذکر الگ تھا جو ٹریولرز چیک کی صورت میں زیادہ تھی۔ تقریباً چالیس ہزار پاؤنڈز۔ نقد رقم صرف پانچ ہزار پاؤنڈز تھی۔ ہم نے جو کہا تھا اس کا ثبوت مل گیا تھا لیکن یوں بھی اس معاشرے کے آداب میں اعتماد کرنا شامل ہے۔ جب تک کوئی صورت سے ہی خبیث اور حلیے سے لفنگا نظر نہ آتا ہو' شرابی یا مخبوط الحواس نہ ہو اسے شریف آدمی ہی سمجھا جاتا ہے اور جب تک کوئی بے سروپا غیر منطقی یا مشکوک بات نہ کرے یہ مان لیا جاتا ہے کہ وہ سچ بول رہا ہے۔

ایک اتفاق نے بھی ہماری مدد کی۔ ہم ابھی کاؤنٹر پر ہی تھے کہ ایک فرنچ جوڑا نمودار ہوا۔ وہ نئے شادی شدہ تھے اور فی الحال ان کی زندگی کا ہر مون ہنی مون تھا مگر وہ رومانٹک جذبات کے بے پناہ مظاہرے سے ساری دنیا کو بھی مطلع کردینا چاہتے تھے کہ انہیں ایک دوسرے سے کیسی والہانہ محبت ہے اور ان کی شادی اس صدی کا عظیم ترین تاریخی واقعہ ہے۔ دیکھنے والے صرف مسکرائے تھے اور شاید انہیں وہ لطیفہ یاد آگیا تھا کہ شادی سے پہلے وہ بولتا تھا اور میں سنتی تھی' شادی کے بعد وہ بولتی تھی اور میں سنتا تھا۔ اب ہم دونوں بولتے ہیں اور سارا محلّہ سنتا ہے۔ نوجوان نے فرنچ میں کہا کہ انہیں ہوٹل کا سب سے خوب صورت کمرا چاہیے کیونکہ اس کے ساتھ دنیا کی سب سے خوب صورت لڑکی ہے اور یہ ان کی زندگی کا سب سے خوب صورت وقت ہے۔ میں نے کاؤنٹر پر موجود خاتون کی مدد کی خاطر اس کا ترجمہ کردیا مگر وہ فرنچ جانتی تھی۔ میری فرنچ نے اسے حیران بھی کیا اور خوش بھی۔

دلاور کا سامان صرف ایک سوٹ کیس اور ایک بریف کیس پر مشتمل تھا۔ ہوٹل کی انتظامیہ نے ہمیں گاڑی فراہم کی۔ یہ پک اینڈ ڈراپ سروس بلا معاوضہ تھی۔ مہمانوں کو ائرپورٹ سے لانے لے جانے کے لیے سب اچھے ہوٹل بہت کچھ "بلا معاوضہ" کرتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ اپنے بل میں وہ سب وصول کرلیتے ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ کھال آپ اتار نے دیں تو ہم اس میں بھس بلا معاوضہ بھردیں گے۔

میں نے ڈرائیور کو سینٹ تھامس اسپتال چلنے کو کہا تو اس نے اصولی اختلاف کیا "میں ائرپورٹ لے جاسکتا ہوں تمہیں۔"

میں نے کہا "او کے۔ یہ قانونی مسئلہ ہے تو پھر مجبوری ہے۔"

نوردین نے خفگی سے کہا "اتنی دور جانا منظور ہے۔ سینٹ تھامس اسپتال تو یہاں سے بہت قریب ہے۔"

میں نے کہا "ڈرائیور کو مجبور مت کرو۔ وہ اصول پرست ہے۔ اصولوں میں اخلاقیات کی اہمیت کو تسلیم نہیں کرتا۔"

وہ میرے طنز سے بھی متاثر نہیں ہوا اور ہمیں لندن کے ہیتھرو ائرپورٹ پہنچانے کے بعد واپس جانے سے پہلے اس نے نوردین کو غور سے دیکھا "تمہاری صورت مجھے دیکھی ہوئی لگتی ہے۔ تم گزشتہ ہفتے چڑیا گھر کے اندر شیر کے پنجرے میں گھس گئے تھے؟"

نوردین نے کہا "ہاں۔ اور مجھے شیر نے کھالیا تھا۔ کیونکہ میں شیر کو نہیں کھا سکتا تھا۔"

وہ چلا گیا تو میں نے نوردین کو محبت سے تین بار گلے لگا کے خدا حافظ کہا۔ "اللہ تمہیں یا طوطی صاحب میں سے کسی ایک کو تھوڑی بہت عقل ضرور عطا کرے تاکہ تمہارے درمیان ویسے ہی خوش گوار تعلقات قائم ہو جائیں جیسے بھارت اور پاکستان کے درمیان ہوسکتے ہیں۔ اگر مسئلہ کشمیر حل ہو جائے تو۔"

"میں اپنے بالوں کی انشورنس کرالوں گا" وہ سوچتے ہوئے بولا "آئندہ میرا بال بیکا ہوا تو انشورنس کمپنی والے آپ ہی سے رقم وصول کریں گے۔ دوبارہ میرے سر پر استرا پھروانے کے دس ہزار پاؤنڈز دینے پڑیں گے۔"

میں نے وہاں سے ایک عام ٹیکسی لی اور اسے بھی آدھے راستے میں چھوڑ دیا۔ دوسری ٹیکسی کو میں نے اڈی کے گھر سے سو گز دور روکا اور کرایہ ادا کرکے رخصت کردیا۔ یہ احتیاط کا تقاضا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ پولیس ہمارا تعاقب کرے اور سراغ لگانے میں ٹیکسی والوں سے مدد لے اور لندن میں ہماری آخری قیام گاہ تک پہنچ جائے۔ میں نے ایک ہاتھ میں سوٹ کیس اور دوسرے میں بریف کیس اُٹھا کے سو گز کا فاصلہ طے کیا اور گیراج میں پہنچا تو صبح کے تین بج رہے تھے۔

چوہدری دلاور کی حالت میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اس نے خود ہی دوا کا انتخاب کیا' ان میں ایک درد کے احساس کو دبانے والی گولی تھی اور دوسری خواب آور۔ باقی مخصوص دوائیں کینسر جیسے لاعلاج مرض میں کیوں دی جاتی تھیں۔ یہ سمجھنا مشکل تھا۔ شاید ہر سانس کے ساتھ کم ہونے والی زندگی کو موت کے خلاف لڑنے کا نفسیاتی حوصلہ فراہم کرنے کے لیے یا صرف کیس اسٹڈی کے لیے۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ کس دوا کا کس مریض پر کیا ردِ عمل ہوا۔ میڈیکل سائنس کے لیے ہر کینسر کا مریض ایک کیس تھا جس پر ڈاکٹر کامیابی کی امید میں مسلسل ناکام تجربات کرتے جارہے تھے۔ اپنے مشاہدات ریکارڈ کررہے تھے اور اپنی رپورٹس مطالعاتی تجزیے کے لیے جمع کررہے تھے۔

چوہدری دلاور آنکھیں بند کرکے لیٹ گیا تو اس سے کچھ فاصلے پر میں بھی دراز ہوگیا۔ محسن بھی کم تھکا ہوا نہیں تھا مگر اس نے ضد کرکے مجھے سونے پر مجبور کردیا "ہم باری باری سو سکتے ہیں۔ چھ بجے کے بعد میں سو جاؤں گا۔"

"ہاں۔ صبح نو بجے تک کرنے کے لیے کچھ نہیں۔ ڈاکٹر شاہ بھی دیر سے ہی آئے گا" میں نے کہا۔

"کہیں وہ پولیس کو نہ لے آئے۔ دلاور کے ساتھیوں کو نہ بتادے۔" محسن نے خدشہ ظاہر کیا۔

میں نے کہا "اس کے لیے یہ چوہدری دلاور سے نجات حاصل کرنے کا آخری موقع ہے۔ وہ فرار ہوکے لندن پہنچا تھا مگر دلاور نے اسے تلاش کرلیا۔ اگر اس نے ہمارا ساتھ نہ دیا تو وہ دلاور کے چنگل سے کبھی نہ نکل سکے گا۔"

"کیا ہم اسے ایسے ہی چھوڑ دیں گے؟"

"ایسے ہی کیا مطلب؟" میں نے کہا۔

محسن بولا "کوئی سزا دئے بغیر۔ دیکھا جائے تو اس کا جرم بھی دلاور کے جرائم سے کم سنگین نہیں۔"

"میں تیری بات سے اصولی اتفاق کرسکتا ہوں لیکن عملی طور پر شاید یہ ممکن نہیں۔ ڈاکٹر شاہ کو برطانوی شہریت کا تحفظ حاصل ہے۔ اس کے پاس مجبوری کا عذر ہے۔ جو کچھ اس نے کیا تھا دلاور کے ہاتھوں بلیک میل ہوکے کیا تھا۔ آج وہ ہماری مدد کرنے پر مجبور ہے مگر اس مجبوری میں ڈاکٹر شاہ کے لیے مستقبل کی بے فکری ہے۔ اگر اسے ذرا بھی اندیشہ ہوا کہ ہمارے ارادے ٹھیک نہیں اور ہم چوہدری دلاور کے بعد اسے بھی ایک شریک جرم کی حیثیت سے سزا دینا چاہتے ہیں تو پھر وہی بات ہوگی کہ ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے۔ وہ بڑی نیک نیتی کے ساتھ ہماری مدد کررہا ہے۔ دلاور کے نزدیک یہ غداری ہے مگر ڈاکٹر شاہ واقعی چاہتا ہے کہ اس کی جان چھوٹ جائے۔ ویسے بھی غدار سے غداری کو جرم نہیں سمجھا جاسکتا۔ وعدہ معاف گواہ کو سزا نہیں ہوتی۔"

محسن نے سہلایا "چل اب تو یہ بکواس اور اپنی آنکھیں بند کر۔ میں کچھ دیر گل کے تصور سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے اس وقت پیرس میں وہ بھی میرے تصور سے ہم کلام ہے۔"

"یہ ٹیلی پیتھی ٹیلی فون کال پہلی علامت ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔

"کس چیز کی؟"

"پاگل پن کی" میں نے کہا۔

صبح چھ بجے میں خود ہی جاگ گیا۔ محسن پوری طرح مستعد رہنے کے لیے گیراج میں ٹہل رہا تھا۔ میں نے باہر جا کے نل سے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ تین گھنٹے کی گہری نیند نے مجھے خاصا فائدہ پہنچایا تھا۔ میں نے محسن کو سونے کا موقع فراہم کیا اور خود ایک اسٹول پر بیٹھ گیا۔ مجھے چائے کافی کی سخت طلب محسوس ہورہی تھی مگر یہاں کچھ بھی دستیاب نہیں تھا۔ میں نے اپنی حالت پر غور کیا۔ ہم گھر سے اور وطن سے دور تھے' کوئی سوچ بھی نہیں

سکتا تھا کہ ہم اس وقت ایک گیراج میں چوہدری دلاور کے ساتھ روپوش اور قید ہیں اور یہ کہ چوہدری دلاور کو اچانک ہمارے انتقام سے دنیا کے نظام انصاف سے اور قانون کی گرفت سے اور سزائے موت سے تحفظ حاصل ہوگیا ہے۔ جو کچھ اس نے کیا اپنی مرضی سے کیا لیکن اس کے دشمن یعنی ہم اب کچھ نہیں کرسکتے۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے کوئی اپنے ریوالور کی ہر گولی سے ایک قتل کرنے کے بعد آخری گولی سے اپنا کام تمام کرلے۔ اسے گرفتار کرنے والے منہ دیکھتے رہ جائیں۔

میری یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ان حالات میں میرا طرز عمل کیا ہونا چاہیے۔ جس شخص کو عدالت نے سزائے موت سنادی ہو کیا اسے تختہ دار تک پہنچانے کی کوشش ایک سعی لاحاصل نہیں ہے؟ اس کے خلاف تمام جرائم کے مقدمات کی سماعت بلا تاخیر ہوتی اور باقاعدگی سے جاری رہتی تب بھی دو سال سے پہلے چوہدری دلاور کو پھانسی نہیں ہوسکتی تھی جب کہ دلاور کی زندگی کے شاید دو ہی مہینے باقی رہ گئے تھے۔ اسے تو قتل کرنا بھی بے مقصد ہوتا۔ ایم آر ایس کی عدالت میں بھی اس پر مقدمہ چلانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ بہت جلد انتہائی پُراذیت موت سے دوچار ہونے والا تھا۔ کیا ان حالات میں اس پر ترس کھانا جائز تھا؟ نہیں' میں نے اپنے ذہن میں پیدا ہونے والے سوال کا خود ہی جواب دیا۔ اپنی ذاتی حیثیت میں اسے معاف کردینے سے زیادہ میں کچھ کرنے کا اختیار ہی نہیں رکھتا۔ ایک مجرم کو قانون کے حوالے کردینا ہمارا کام تھا۔ اس کے بعد عدالتی معاملات کیسے چلتے ہیں اور کہاں تک چلتے ہیں' ان سے ہمیں سروکار نہیں ہونا چاہیے۔ کوئی سزائے موت کا مستحق قیدی جیل میں طبعی موت مرجائے یا حادثاتی موت کا شکار ہو' یہ اس کی تقدیر۔ دلاور کی لاش تو ورثا جیل سے ہی وصول کریں گے۔ اس سے کیا فرق پڑے گا کہ لاش اسپتال سے لائی جاتی ہے یا جیل کے پھانسی گھاٹ سے۔

ان تمام خیالات کے باوجود میں مایوسی کا شکار تھا۔ میری کامیابی ادھوری رہ گئی تھی۔ مجھے دلاور کی خاموشی بھی ایک خندۂ تحقیر کی طرح لگی تھی کہ تم نے دیکھا سکندر۔ چوہدری دلاور ہی وہ شکاری تھا جو زیر دام نہ آیا۔ میں نے کہا تھا کہ نہ تم مجھے مار سکتے ہو۔ نہ قانون مجھ پر ہاتھ ڈال سکتا ہے۔ نہ دنیا کی عدالت مجھے مجرم بنا سکتی ہے اور نہ یہ قانون مجھے سزا دینے پر قادر ہے۔ چوہدری دلاور کو شکست دی موت نے مگر جس سے کسی کو مفر نہیں۔ جو سب کے لیے ہے۔ جس میں بے گناہ اور گنہگار کی تخصیص نہیں۔ ایک عمر طبعی گزار کے میں بالآخر بیماری سے مروں گا۔ اسی طرح جیسے ہر سال کروڑوں افراد بچے بوڑھے اور جوان مرتے ہیں۔ بیماری کچھ بھی ہو' کینسر' ایڈز یا ٹی بی' مجھے کسی عدالت نے مجرم قرار نہیں دیا۔ کوئی نظام انصاف مجھ پر فرد جرم عائد نہیں کرسکا۔ میں تمہارے لیے ناقابل تسخیر رہا۔

میں اپنے خیالات میں اتنا محو تھا کہ مجھے چوہدری دلاور کے بیدار ہونے کی خبر ہی نہیں ہوئی۔

اس نے کہا "تم نے کچھ سوچا سکندر۔"

میں چونک پڑا "سوچنے کے لیے اب کیا ہے؟"

"مگر تم سوچ رہے تھے۔"

میں نے کہا "لاحاصل سوچ کا نتیجہ بھی لاحاصل۔"

"میں تم سے کچھ کہنا چاہتا تھا" وہ بولا۔

"مجھے معلوم ہے کہ تم کیا کہو گے....."

"پھر بھی سن لینے میں کیا حرج ہے" وہ لجاجت سے بولا "میں جانتا ہوں کہ تم میرے دشمن ہو۔ بالکل اسی طرح جیسے میں تمہارا دشمن ہوں مگر تم میں اور مجھ میں ایک فرق ہمیشہ تھا۔ تم فراخ دل اور عالی ظرف تھے' تم کینے نہیں ہو اور تمہاری دوستی اور دشمنی دونوں کی بنیاد معقولیت اور شرافت پر ہے۔ تم اچھے آدمی ہو۔"

میں نے کہا "تم ساری عمر جھوٹ بولتے آئے ہو۔"

"لیکن یہ جھوٹ نہیں ہے' میں نے ہمیشہ یہ کہا ہے" وہ بولا "میری بڑی خواہش تھی کہ تم مفاہمت کرلو۔"

"یہ ناممکن تھا۔"

"ہاں۔ مگر پھر بھی میں چاہتا تھا کہ کوئی راستہ نکل آئے کہ میں اور تم ایک دوسرے کو باعزت طور پر جینے اور مرنے کا موقع دینے پر متفق ہوجائیں۔ میں تم کو مارنا نہیں چاہتا تھا۔ تمہاری شکست سے بھی مجھے دلچسپی نہیں تھی۔ میں سمجھوتا چاہتا تھا۔ میں معافی تلافی کے لیے بھی تیار تھا۔ مگر خیر' اب تو دشمنی کے لیے بھی وقت باقی نہیں رہا۔"

"اب تم کیا چاہتے ہو؟" میں نے طنز سے کہا۔

"بات بہت معمولی ہے اور بہت بڑی بھی۔ اس میں کس کا فائدہ ہے اور کس کا نقصان۔ یہ الگ بحث ہے جس میں نہ تم مجھے قائل کرسکتے ہو اور نہ میں تم سے کوئی بات منوا سکتا ہوں۔ لیکن تم غور کرو ٹھنڈے دل سے۔"

میں نے تلخی سے کہا "میرے دل میں انتقام کی آگ کب سے روشن ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی تم مجھ سے توقع کرتے ہو کہ میں ٹھنڈے دل سے تمہاری کوئی بات سن سکتا ہوں۔"

"میں نے کہا نا۔ سن لینے میں کیا حرج ہے۔ ماننے نہ ماننے کا اختیار تو تمہارے ہی پاس رہے گا" وہ بولا "فرض کرو میں ایک اقبالی بیان دینا چاہتا ہوں؟"

"یہ بیان تم عدالت میں بھی دے سکتے ہو؟"

"نہیں۔ عدالت میں میرے بیان کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ دو مہینے تو میرے خلاف چالان پیش کرنے کے لیے بھی ناکافی ہوں گے۔ میں چار چھ مہینے اپنی پہلی پیشی کو ٹال سکتا ہوں۔ میرے درجن بھر وکیل اس مقدمے کو جتنا طول دینا چاہیں' دے سکتے ہیں۔ ثبوت گواہ پیش ہونے اور فرد جرم عائد ہونے سے پہلے ہی یہ کیس ختم ہوجائے گا۔ میرے خلاف سارے مقدمات خود ہی ختم ہوجائیں گے۔ تم جانتے ہو کہ جب تک کسی پر جرم ثابت نہ ہو وہ ملزم رہتا

ہے۔ الزام کی کوئی حیثیت نہیں۔ کوئی بھی کسی پر الزام لگا سکتا ہے۔ الزام تمہارے خلاف بہت ہیں اور سب دوستوں' ساتھیوں کے خلاف بھی۔"

"وہ سب جھوٹے الزامات ہیں۔"

دلاور نے کہا "ہاں۔ یہ میں مانتا ہوں اور تم جانتے ہو۔ دنیا وہ بات مانے گی جو عدالت کے فیصلے سے سچ ثابت ہوگی۔ اگر تم عدالت کا راستہ اختیار کرو گے تو تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔ سوائے مایوسی' حسرت اور شرمندگی کے۔ میں تم کو ایک آفر کرتا ہوں۔ میں قانونی طور پر معتبر گواہوں کی موجودگی میں ایک بیان دوں گا۔ تم اسے ریکارڈ کرسکتے ہو یا میں خود اپنے ہاتھ سے اپنے دستخط کے ساتھ یہ تحریری بیان تمہارے سپرد کرسکتا ہوں۔ اگر تم چاہو اور اس کا بندوبست کرسکو تو یہاں کے کسی مجسٹریٹ سے اس کی تصدیق کرالو یا مجسٹریٹ کی موجودگی میں یہ بیان ہو جائے۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے۔" میں نے کہا "مجسٹریٹ کوئی نکاح خواہ نہیں ہے کہ جہاں چاہا بُلالیا۔ وہ بیان لے گا تو پہلے اس کا قانونی جواز پوچھے گا۔ ضرورت معلوم کرے گا اور جو کچھ بھی ہوگا اس ملک کے قاعدے قانون کے مطابق ہوگا۔ اگر تم خود عدالت میں بیان دینے گئے تو ظاہر ہے لوٹ کر نہیں آؤ گے۔ تمہیں وہیں گرفتار کرلیا جائے گا۔"

"مجسٹریٹ نہ سہی' دو چار ایسے گواہ ہوسکتے ہیں مثلاً وکیل اپنی فیس لے کر بیان کی تصدیق کرسکتا ہے کہ یہ بیان فلاں نے میرے سامنے دیا تھا۔ دن' تاریخ اور وقت بتا سکتا ہے۔۔۔۔ یہاں لوگ پادری کے سامنے جاکے بھی اعتراف کرتے ہیں اور اسے سب سچ بتا دیتے ہیں۔ وہ کسی کو کچھ نہیں بتاتا تاہم کسی پادری کو بُلالو۔ جو میرا بیان سنے اور پڑھے۔ میں اس کے سامنے بیان پر دستخط کروں اور یہ ہدایت کردوں کہ اس بیان کو میری موت کے بعد خفیہ نہ رکھا جائے۔ ضرورت پڑنے پر کسی بھی عدالت میں پیش کردیا جائے۔"

میں نے کہا "بے شک یہ ہوسکتا ہے لیکن یہاں کی کسی عدالت میں تمہارا کوئی مقدمہ نہیں ہے۔"

"وہ بیان یہاں سچ ہے تو لاہور میں بھی سچ مانا جائے گا۔"

میں نے جھنجلا کے کہا "آخر مقصد کیا ہے تمہارا؟"

"میں اپنے تحریری بیان میں سب کچھ قبول کرنے کو تیار ہوں۔ جو کچھ بھی میں نے غیر قانونی طور پر کیا۔ ابھی وقت ہے' میں بقائمی ہوش وحواس یہ بتا سکتا ہوں کہ میں نے وزیر خان اور میر شرافت علی کے خلاف کیا سازش کی تھی۔ انہیں کیسے مروایا تھا' تمہارے خلاف الزامات کا جال کیسے پھیلایا تھا۔ میں نے جو بھی غلط کیا' اخلاقی یا قانونی اعتبار سے' جو گناہ کئے' جرائم کئے' ان سب کی تفصیل میرے سوا کوئی نہیں جانتا۔ تم صرف یہ جانتے ہو کہ میں نے کیا کیا' یہ نہیں کہ کیسے کیا' کس کی مدد سے کیا۔ بہت سی باتوں کا تمہیں علم ہی نہیں۔ میں سب بتا دوں گا۔"

میں اسے حیرانی سے دیکھتا رہا "آخر کیوں؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ اس طرح تم اپنے ضمیر کا بوجھ ہلکا کرسکو گے؟"

"نہیں' میرے اس بیان سے تمہارے مسائل بھی حل ہوجائیں گے اور میرے بھی۔ تم قانونی اُلجھنوں سے بچ جاؤ گے تمہارے خلاف سارے مقدمات میرے اقبالی بیان کے بعد خود بخود ختم ہوجائیں گے ورنہ تم جانتے ہو کہ ابھی تم خود ایک مفرور مجرم ہو۔ تمہارے خلاف پرانی ایف آئی آر ختم نہیں ہوئیں۔ تمہاری ضمانت کب کی منسوخ ہوچکی ہے اور تم باقاعدہ اشتہاری مجرم قرار دیئے جاچکے ہو۔ بے شک وہ مقدمات جھوٹے تھے اور ایف آئی آر میں سب جھوٹ تھا مگر عدالت میں پہلے جھوٹ کو جھوٹ ثابت کرنا پڑتا ہے۔ تمہیں خود کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے لمبی عدالتی کارروائی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ مانا وکیل تمہارے پاس بہت ہیں مگر نہ تم گرفتاری سے بچ سکتے ہو نہ جیل جانے سے۔ دوبارہ تمہاری ضمانت بڑی مشکل سے ہوگی اور اس کے بعد تم پہلی پیشی پر باعزت بری نہیں ہوجاؤ گے۔ یہ بھی سوچو کہ قانونی معاملات سے نمٹ کے تم وہ سب کیسے حاصل کرو گے جو آج میرے قبضے میں ہے' جس کے مالک میرے قانونی وارث ہیں۔ میں تو خیر جانتا ہوں اور مانتا بھی ہوں کہ وہ سب میرا نہیں تھا۔ تمہارے والد وزیر خان اور میر شرافت علی کا حصہ بھی میں نے غصب کرلیا تھا مگر میری بیوی اور میرا بیٹا شاید یہ بھی تسلیم نہیں کریں گے' وہ کہیں گے کہ ہمیں جو ملا چوہدری دلاور کا تھا اور ہم اس کے جائز قانونی وارث ہیں۔ چوہدری دلاور نے یہ سب کیسے اور کہاں سے حاصل کیا تھا ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں۔ اگر کوئی اور اس پر دعویٰ رکھتا ہے تو عدالت سے رجوع کرے۔ جب تمہارے اور میرے وارثوں کے درمیان دیوانی مقدمات کی لڑائی ہوگی تو وہ دو چار برس میں ختم نہیں ہوگی۔ وہ اپنا قبضہ برقرار رکھنے کے لیے پورا زور لگادیں گے۔ تمہارے دعوے کو غلط ثابت کرنے کے لیے وہ سب کریں گے جو۔۔۔۔ میں نے کیا تھا۔ جو دنیا میں سب کرتے ہیں۔ ایمانداری سے کوئی کسی کو کچھ نہیں دیتا۔ شرافت سے یا اصول کی بنیاد پر کوئی اپنے حق سے دستبردار نہیں ہوتا۔ یہ صرف میں ہوں جو تمہارا حق مان رہا ہوں۔ تمہارے دعوے کو کسی قانونی ڈگری کے بغیر تسلیم کررہا ہوں اور وجہ تم جانتے ہو۔ اگر قدرت کی طرف سے میرے لیے سزائے موت کا اعلان نہ ہوتا تو میں یہ لڑائی جاری رکھتا۔ میں تمہیں ایک پھوٹی کوڑی نہ دیتا اور الٹا تمہیں جیل بھجوا دیتا۔ شکست مجھے تم نے نہیں میری تقدیر نے دی ہے۔ تم کہہ سکتے ہو کہ یہ میرے اعمال کی سزا ہے اور بھی بہت لوگ ایسی ہی بات کریں گے۔ اس سے مجھے فرق نہیں پڑنا چاہیے۔ دو تین مہینے بعد چوہدری دلاور کہاں ہوگا کہ کسی کی بات سنے یا زبانِ خلق کی پروا کرے۔ آج میں تم کو ایک آخری پیشکش کررہا ہوں۔ تم اس سے فائدہ نہ اٹھاؤ تو تمہاری بدقسمتی۔ چوہدری دلاور تمہیں بعد میں یاد آئے گا کہ دشمنی میں بھی وضع دار تھا۔"

میں نے کہا "تمہاری پیش کش کو میں۔۔۔۔"

"نہیں۔ سنے بغیر مسترد مت کرو" اس نے میری بات کاٹ دی "مجھے چند منٹ دو۔ اس کے بعد تم جو کہو گے میں سنوں گا۔ اگر تم میرے بیان سے مطمئن ہوجاؤ اور تمہیں یقین آجائے کہ اس سے تمہارے تمام قانونی مسائل حل ہوسکتے ہیں تو پھر مجھ سے سودا کرلینا۔ تمہارے اپنے حساب سے تمہارا جتنا حق بنتا ہے یا اس سے زیادہ چاہتے ہو تم' وہ تم بتا دینا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ جو تم مانگو گے' اپنا حق سمجھتے ہوئے' وہ سب تمہیں مل جائے گا اور اس کے بدلے میں تم سے صرف ایک چیز مانگوں گا۔"

"ایک چیز۔۔۔۔؟"

"ہاں۔ تم میرا صرف ایک مطالبہ پورا کرو گے۔ میری ایک بات مانو گے جس سے تمہیں کوئی نقصان نہیں ہوسکتا۔"

"لیکن تمہیں بہت فائدہ ہوگا" میں نے طنز سے کہا۔

"میں نفع نقصان کی حد سے گزر چکا ہوں یا بہت جلد گزر جاؤں گا۔ موت کیسے آتی ہے اور کہاں آتی ہے' بس اتنا ہی فرق پڑ سکتا ہے۔ یہ تو طے شدہ ہے کہ قانونی طریقہ' کار کے مطابق مجھے سزائے موت دینے کا وقت ہی نہیں رہا۔ چنانچہ تمہاری یہ خواہش پوری نہیں ہوگی کہ تم مجھے اسی دنیا کے نظامِ انصاف کے مطابق سزا دلواسکو۔ اتنے کم وقت میں سماعت شروع بھی نہیں ہوگی اور قانونی معاملات میں عدالت تمہاری خواہش کے مطابق عجلت اختیار نہیں کرے گی۔ تم خود مجھے مار سکتے ہو' تمہاری ایم آر ایس کی عدالت میں تو سرسری سماعت ہوئی تھی۔"

"تم یہ بھی جانتے ہو۔"

وہ تلخی سے مسکرایا "اپنے سکندر صاحب۔ لوگ پُرانی دوستی کی بات کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ان سے کچھ پوشیدہ نہیں۔ ہم نے دشمنی میں ایک دوسرے کو جانا اور پہچانا ہے۔ کون سی بات ہے جو کسی سے پوشیدہ ہو' خیر۔۔۔۔ میں بتا رہا تھا کہ ابھی تمہارے پاس سوچنے سمجھنے کا وقت ہے۔ جذبات سے نہیں' عقل سے کام لے کر فیصلہ کرو کہ تمہیں کیا کرنا چاہیے۔"

"یہ فیصلہ ہم لاہور پہنچ کے کریں گے۔"

"نہیں۔ فیصلہ تم کو یہاں کرنا ہے۔" وہ بولا "اگر تم نے دیر کی تو تمہیں بعد میں افسوس ہوگا کہ تم نے یہ موقع گنوا دیا۔ تم جانتے ہو کہ میرا بیٹا فیصل جوان ہوگیا ہے اور اس کا خون بہت گرم ہے۔ تم میری بیوی سے بھی واقف ہو۔ وہ بھی کوئی گھریلو قسم کی مخلوق نہیں ہے جسے اللہ میاں کی گائے کہا جاتا ہے۔ میرے بعد یہ جنگ جاری رہی تو تمہارے مسائل میں اضافہ ہوگا۔ وہ ایک انتقامی جذبے کے ساتھ تم سے ہر قسم کی مقدمے بازی کریں گے۔ ان کی پوری کوشش ہوگی کہ تمہیں کچھ نہ ملے اور تمہارے خلاف سارے مقدمات میں تم کو زیادہ سے زیادہ سزا ہو۔"

"اور تم یہ سب ختم کرسکتے ہو۔"

"ہاں۔ میں اپنی زندگی میں ان کے مسائل ختم کردینا چاہتا ہوں۔ صاف بات یہ ہے سکندر کہ نہ مجھے اپنی فکر ہے اور نہ تمہاری۔ فکر ہے مجھے اپنے بیوی بچوں کی۔ وہ تم سے نہیں لڑسکتے۔ اگر یہ لڑائی جاری رہی تو زیادہ نقصان ان کا ہوگا۔ نہ جانے یہ جنگ کیا موڑ اختیار کرے اور کس انتہا تک پہنچ جائے۔ میرے اختلافات تمہارے والد سے تھے۔ ان کے بعد یہ جنگ تم نے بھی ایک انتقامی ردِعمل کے طور پر لڑی۔ میرے بعد یہ جنگ میرے وارث لڑتے رہے تو سب تباہ ہوجائیں گے۔ دیوانی مقدمات' دیوانہ اور دیوالیہ کرنے والے ہوتے ہیں۔ شاید تمہارے بعد والی نسل کے جوان ہونے تک فیصلہ ہوجائے مگر اس وقت کیا اہمیت ہوگی اس فیصلے کی۔ کیا رہے گا کسی کے پاس۔ پندرہ بیس سال میں تمہاری زندگی کا بہت سا وقت بہت سی توانائی اور کمائی اس عدالتی جنگ میں ضائع ہوجائے گی۔ ایسا ہی میری فیملی کے ساتھ ہوگا۔ وہ خاک کاروبار کریں گے۔ خاک ترقی کریں گے۔ کیا پتا فیصل تم کو قتل کردے یا تم فیصل کو ماردو۔ مجھے معلوم ہے کہ تم خود پہل نہیں کرو گے مگر تمہیں اپنے دفاع میں سب کچھ کرنے کا حق حاصل ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ وہ کبھی مشتعل ہو کے تم پر حملہ کرے اور خود مارا جائے۔ وہ بچہ ہے' تمہارا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ بہت جلد تم بھی شادی کرلو گے۔ محسن اور غالب بھی اپنا گھر بسالیں گے۔ تمہارے بھی بچے ہوں گے' کیا تم چاہتے ہو' یا تم پسند کرو گے کہ ان کی زندگی پر تمہارے ماضی کے پُر آسیب سائے منڈلاتے رہیں اور وہ خوف ودہشت کی فضا میں پروان چڑھیں۔ اصل مجرم میں تھا' میرے ساتھ ہی وہ سب کچھ ختم ہوجانا چاہیے جو نہ اچھا تھا' نہ اچھا ہوسکتا تھا۔ کیا تم میری بات سمجھ رہے ہو؟"

"ہاں کچھ کچھ" میں نے کہا۔

"میں یہ جنگ ختم کراسکتا ہوں۔ یہ اختیار میرے بعد کسی کے پاس نہیں ہوگا۔ تم نے دیر کی تو۔۔۔۔ پھر کچھ بھی نہیں ہوسکے گا۔ اگلی نسل تک پہنچنے والی خرابی کی جڑیں بہت دور تک پھیل جائیں گی۔ میں دشمنی اور نفرت کے اس درخت کو گرا دینا چاہتا ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ نفرت اور دشمنی کا یہ بیج میں نے ہی بویا تھا۔"

"اس کا پھل تو تمہاری آنے والی نسل بھی کاٹے گی دلاور۔ دنیا میں ایسا ہی ہوتا ہے" میں نے کہا۔

"تم میری اولاد کی فکر چھوڑو۔ اپنی اولاد کے لیے سوچو۔ ابھی تک تم نے رابعہ سے شادی صرف اس لیے نہیں کی کہ تمہاری زندگی ایک مسلسل فرار تھی۔ ایک ایسی جنگ تھی جس میں تمہارے ساتھ تمہارے دوست بھی شریک تھے۔ اس کا نقصان انہیں بھی ہوا۔"

"یہ نقصان پہنچانے والے تم تھے۔ اب تم چاہتے ہو کہ میں تمہاری یہ جنگ بندی کی پیشکش قبول کرلوں گا؟"

"میں تمہیں کیسے مجبور کرسکتا ہوں۔ تم جو فیصلہ چاہو کرو۔ یہ احساس صرف میری زندگی تک ہے کہ میرے بعد بیوی بچوں کا کیا ہوگا۔ تم نے ٹھیک کہا کہ بیج ایک نسل بوتی ہے تو پھل دوسری نسل کھاتی ہے۔ اور باپ نے کڑوا نیم لگایا ہوگا تو اولاد کو آم نہیں ملے

سکتے۔ ماں باپ کے گناہوں کی سزا اولاد کو بھگتنا پڑتی ہے۔ لیکن کوئی کفارہ ادا کرنا چاہے، کسی کو اپنی غلطی کا احساس ہو جائے، کوئی تلافی کرنا چاہتا ہو......"

"آخری وقت کی توبہ قبول نہیں ہوتی" میں نے کہا۔

"میں توبہ کہاں کر رہا ہوں۔ اس دنیا کے معاملات سے نمٹنے کے بعد جو بھی ہے، میرے اور خدا کے درمیان ہے۔ اس میں کسی بندے کا کیا دخل۔ میں تو دنیا کے معاملات سلجھانا چاہتا ہوں اور تمہیں سمجھنا چاہیے کہ یہ صرف میرے خاندان کے مفاد ہی میں نہیں ہے، یہ تم سب کے فائدے کی بات بھی ہے۔ جو سزا تم مجھے دینا یا دلوانا چاہتے تھے وہ مجھے مل جائے گی لیکن تم دوسروں کی زندگی کو ایک ختم نہ ہونے والی سزا بناؤ گے تو خود بھی عذاب کاٹو گے۔ میرے جرم کی سزا قانون بھی میرے بیوی بچوں کو نہیں دے سکتا۔ پھر تمہارے، محسن یا غالب کے بیوی بچے کیوں عذاب کاٹیں؟"

دلاور کی بات نے مجھے بھی سوچنے پر مجبور کر دیا تھا "صاف کہو کہ تم کیا چاہتے ہو؟"

"ایک بات میں نے بتا دی۔ تم اپنی مرضی کے مطابق مجھ سے اقبالی بیان حاصل کر سکتے ہو۔ ایک ایسا بیان جو قانون کی نظر میں مستند اور قابلِ قبول ہو۔ میں اپنے ہی نہیں تمہارے بھی سارے گناہ اپنے سر لے لوں گا۔ جو کچھ میں نے کیا اس کی تمام ذمے داری میری، جو تم نے اپنے دفاع میں کیا یا جواب میں کیا اس کو بھی میں اپنی فردِ جرم میں شامل کر سکتا ہوں۔ اس طرح کہ تم پر کوئی الزام نہ رہے اور تم کو انصاف ہی نہیں تمہارا حق بھی مل جائے۔ قانونی راستہ بہت لمبا اور مشکل ہے۔ میں آسانی سے اور شارٹ کٹ سے تمہیں سب کچھ دلوا سکتا ہوں۔ تم باعزت طور پر تمام مقدمات سے بری ہو کے باعزت زندگی گزار سکتے ہو۔ تم بھی اور تمہارے سب دوست بھی۔ یہ تھی ایک بات۔ دوسری بات یہ ہے کہ تم کو مجھ سے جو کچھ وصول کرنا ہے اس کا حساب کر لو۔ مجھے بتا دو کہ تمہیں کیا چاہیے۔ اصل کے علاوہ جتنا جرمانہ یا ہرجانہ تم وصول کرنا چاہو، میں تم کو دے سکتا ہوں۔ قانونی طور پر میں اس کا اختیار رکھتا ہوں کہ تمہاری سب جائداد تمہیں لوٹا دوں۔ وہ کارخانہ تمہارے حوالے کر دوں جو اب اسپتال ہے۔ تمہارے حصے کا سب منافع اور دیگر واجبات...سب تمہیں مل جائیں گے۔ میں تم کو لاہور میں بھی ادائیگی کرا سکتا ہوں اور تم چاہو تو یہاں یا باہر کے کسی ملک میں..."

"میرا باہر کے کسی ملک میں کوئی اکاؤنٹ نہیں ہے۔"

"خیر۔ کہنے کا مقصد یہ تھا کہ ابھی میں مالک ہوں۔ جسے بھی چاہوں سب کچھ دے سکتا ہوں۔ ابھی میرے دستخط کارآمد ہیں۔ میرے بعد تمہارے لیے یہ پیش کش بے معنی ہو جائے گی۔ میرے وارث تمہیں کچھ نہیں دیں گے اور تم وصول بھی نہیں کر سکو گے۔ ابھی میں ان سے بھی اپنی ہر بات منوا سکتا ہوں۔ انہیں بھی قائل کر سکتا ہوں کہ وہ دشمنی کے جذبات کو فراموش کر دیں۔ اپنی زندگی جئیں اور دوسروں کو بھی جینے دیں۔ میں لاہور میں اپنے وکیلوں کو ہدایات جاری کر دوں گا کہ وہ کاغذات تیار کر لیں اور دستخط کے لیے مجھے بھجوا دیں۔ جتنی نقد رقم تمہیں چاہیے وہ تمہارے حساب میں جمع کرا دی جائے گی لیکن یہ سب اسی وقت ہو گا جب میرے بیوی بچے یہاں پہنچ جائیں گے۔ اور تم مجھے ان کے حوالے کر دو گے۔ میرا بیان بھی میرے وکیل ہی عدالت میں پیش کریں گے۔ میرے ڈیتھ سرٹیفکیٹ کے ساتھ۔"

میں نے کہا "تم میری ساری جائداد میرے نام کر دو گے، میرے حصے کا سرمایہ اور منافع میرے حساب میں جمع کرا دو گے، جرمانے اور ہرجانے کی رقم بھی ادا کر دو گے، اپنی زندگی میں؟"

وہ بولا "ہاں۔ یہ سب ایک ہفتے میں ہو جائے گا بلکہ اس سے بھی کم وقت میں۔"

میں نے کہا "صرف تمہارا بیان باقی رہے گا!"

"ہاں۔ وہ صرف جنگ بندی کا معاہدہ ہی نہیں۔ میرے اور تمہارے بچوں کے مستقبل کے تحفظ کی ضمانت بھی ہو گا۔"

"اور فرض کرو میں تم سے سب کچھ وصول کرنے کے بعد"

اس نے میری بات کاٹ دی "نہیں۔ تم ایسا نہیں کرو گے، میں جانتا ہوں۔ تم میرے لئے قابلِ اعتبار ہو۔ تم جو کہو گے وہی کرو گے۔"

"اور بدلے میں تم صرف یہ چاہتے ہو کہ تمہیں قانون کے حوالے نہ کیا جائے۔ بیوی بچوں کے سپرد کر دیا جائے۔"

"ہاں۔ میں ان کے ساتھ زندگی کے آخری ایام سکون سے گزارنا چاہتا ہوں۔ میں جیل میں مرنا نہیں چاہتا۔ میں عزت کے ساتھ جی نہ سکا، مگر میں عزت کی موت ضرور چاہتا ہوں۔ جب تمہیں سب کچھ مل جائے تو تم مجھے بھول جاؤ۔ مجھے یہاں چھوڑ کے واپس لاہور چلے جاؤ۔ بالآخر تمہیں خبر مل جائے گی کہ دلاور مر گیا اور معلوم ہو جائے گا کہ دلاور نے جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کیا۔ سارے قانونی اور عدالتی معاملات بھی ختم ہو جائیں گے۔ سارے جھگڑے، دشمنی اور نفرت کے سارے اسباب باقی نہیں رہیں گے جب دلاور نہیں رہے گا۔"

وہ بہت دیر سے ضبط کر رہا تھا۔ اچانک وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔ ہچکیوں سے اس کا سارا بدن ہلنے لگا۔ میں نے اس کے لیے نفرت کے بجائے دکھ محسوس کیا۔ وہ بڑی اذیت میں تھا۔ اسے ہر گزرنے والے دن کے ساتھ قریب آنے والی موت کے خیال نے دہشت زدہ کر دیا تھا۔ اس کا سارا غرور اور تکبر اپنی بے بسی اور بے چارگی کے احساس میں ڈھل گیا تھا۔ اس نے اپنی ہار مان لی تھی۔ وہ بہت بڑا شکاری تھا جسے موت نے ایسے شکار کیا تھا کہ اسے خبر تک نہ ہوئی تھی اور زندگی کی ریلوے لائن پر دوڑنے والی کامیابی کی گاڑی کے سامنے اچانک وہ مقام آ گیا تھا جہاں کوئی پٹڑی نہ تھی۔

میں بڑی مشکل میں گرفتار ہو گیا تھا۔ مجھے دلاور کی بات ماننے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا اور بلاشبہ اس کی زندگی میں ہی وہ سارے معاملات طے ہو سکتے تھے جو تصفیہ طلب تھے اور دشمنی کا سبب تھے۔ اس جنگ کے اصل فریق میں اور دلاور تھے۔ باقی سب ہمارا ساتھ دینے والے تھے۔ اگر میں اس کی یہ پیشکش قبول کر لیتا تو باقی سب کی زندگی بھی پُرسکون ہو جاتی مگر میں فوری فیصلہ کرنے سے قاصر تھا۔ اپنے سب دوستوں سے مشورہ کیے بغیر میں کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا تھا۔

چوہدری دلاور کے رونے کی آواز نے محسن کی نیند میں خلل ڈالا تھا اور وہ اٹھ کے بیٹھ گیا تھا "اسے کیا ہوا ہے؟"

میں نے کہا "خیال آ رہا ہے کہ میرے بعد بیوی بچوں کا کیا بنے گا۔ چوہدری صاحب کی خواہش ہے کہ یہ جنگ جو ہمارے درمیان جاری تھی، اب ختم ہو جانی چاہیے۔"

محسن بولا "جب لڑنے والا ہی نہیں ہو گا کوئی تو جنگ کیسی۔ ہاں اس کے اثرات باقی رہیں گے۔ جرمنی نے پچیس سال تک جنگی جرائم کی سزا بھگتی۔ آج بھی بھگت رہا ہے۔"

چوہدری دلاور نے خود کو سنبھال لیا اور پھر دوا کی گولیاں نگل کے لیٹ گیا۔ بیماری کے آثار اس کی صورت سے عیاں تھے۔ عمر یا تلخیٔ حالات نے کبھی اس کی صحت کو یوں متاثر نہیں کیا تھا۔ ایک تو یہ جان لیوا مرض بھی ایسا تھا جس میں آدمی تیزی سے گھلنے لگتا ہے پھر اس احساس نے کہ ہر سانس اسے موت کی جانب دھکیل رہی ہے اور وہ اپنی ساری دولت اور طاقت استعمال کر لے پھر بھی موت کا راستہ نہیں روک سکتا، دلاور کو دہشت میں مبتلا کر دیا تھا۔ موت ہر فانی انسان کا مقدر ہے اور زندگی کے سفر میں آدمی کبھی اس حقیقت سے صرفِ نظر نہیں کرتا کہ بالآخر اس کی منزل بھی وہی شہرِ خموشاں ہے جہاں اس نے متعدد بار اپنے پیاروں کو کفن لپیٹ کر مٹی کے نیچے دبایا تھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ کسی کو مرتا دیکھ کے اور مرنے کے بعد آخری رسوم میں شریک ہو کے کسی پر موت کی دہشت طاری نہیں ہوتی۔ اسپتالوں میں جا کے یا حادثات میں مرنے والوں کی حالت دیکھ کے کوئی موت کے خوف میں مبتلا نہیں ہوتا۔ آدمی دیواروں پر پڑھتا ہے "نماز پڑھو موت کو مت بھولو" یا "نماز پڑھیے، قبل اس کے کہ آپ کی نماز پڑھی جائے" مگر وہ متاثر نہیں ہوتا۔ جیسے موت اگر ہے تو دوسروں کے لیے، خود اس کو فی الحال کوئی خطرہ نہیں۔ ایک سزائے موت کا منتظر قیدی اور دوسرا سرطان میں مبتلا ہونے والا جب زندگی کے باقی رہ جانے والے دن شمار کرنے لگتا ہے۔ اب ایک مہینہ رہ گیا، اب ایک ہفتہ۔ پھر ایک دن کے گھنٹے گزرنے لگتے ہیں۔ چوبیس، تیئیس، بائیس۔ اور اس COUNTDOWN کی رفتار بڑھتی جاتی ہے۔ پہلے، مہینے اگر ہفتوں میں گزرتے ہیں تو آخر میں گھنٹے سیکنڈ بن کے اڑتے ہیں۔

چوہدری دلاور کی ذہنی کیفیت ایسی ہی تھی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ وہ خود تو ہار گیا ہے مگر اس کے بعد بھی مقابلہ جاری رہا تو اس کے بیوی بچے عبرت ناک انجام سے دوچار ہوں گے۔ ابھی تک اس نے اپنے خاندان کو تحفظ فراہم کر رکھا تھا اور انہوں نے دولت مندی کی تمام شان و شوکت کے ساتھ پُرتعیش زندگی گزاری تھی۔ اب چوہدری دلاور کو یہ اندیشہ لاحق تھا کہ بعد میں ان کا مقدر ذلت و خواری ہو گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ دربدر ہوں، ان کے پاس سر چھپانے کا ٹھکانا بھی نہ رہے۔ ان کا ساتھ دینے والا کوئی نہ ہو اور وہ نان شبینہ کے محتاج ہو جائیں۔ آدمی کے دن پھرتے ہیں تو سایہ بھی اس کا ساتھ نہیں دیتا۔

ہم اتنے کمینے نہیں تھے کہ چوہدری دلاور کے اعمال کی سزا اس کے بیوی بچوں کو دیتے۔ ہم نے تو چوہدری دلاور کی زندگی میں بھی انہیں عناد کا نشانہ بنانے سے گریز کیا تھا بلکہ ایک بار چوہدری دلاور کی بیوی کی جان بچانے والے ہم ہی تھے، ہم نے اسے اپنے ساتھ لے جا کے دلاور سے بھی ملوایا تھا۔ دلاور اس وقت ہماری قید میں تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ ہم اس کی بیوی کو بھی وہیں روک لیتے اور پھر اس کے ساتھ وہ سلوک کرتے جو اس نے رابعہ کے ساتھ کیا تھا اور نازو کے ساتھ۔ اس کے مرنے کے بعد تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ ہم انسانیت کے درجے سے اس حد تک گر جائیں کہ لاوارث خاندان کو اپنے انتقام کا نشانہ بنا کے خوش ہوں۔

آٹھ بجے ایڈی کی بیوی نے گیراج میں جھانک کے کہا "ہیلو!"

میں نے کہا "ہیلو۔ ہم آپ کے انتظار میں رات بھر جاگتے رہے۔"

وہ ہنسی "یعنی تمہیں یہاں نیند نہیں آئی۔ آئی ایم سوری۔ ابھی ہمارے پاس کوئی اسپیئر بیڈ روم نہیں ہے۔"

میں نے کہا "میں مذاق کر رہا تھا۔ نیند ہر جگہ آ جاتی ہے۔ ہم ابھی جاگے ہیں اور اب ناشتے کے لیے باہر جانے والے تھے۔"

"ناشتا میں نے بنا لیا تھا۔ بچوں کو اسکول چھوڑنے گئی تھی اس لیے دیر ہو گئی۔ کیا تم ناشتے سے پہلے منہ دھونا چاہو گے یا نہانے کا موڈ ہے؟"

میں نے کہا "اگر غسل کا انتظام ہے تو کیا بات ہے۔"

"انتظام کیسا۔ باتھ روم میں جاؤ اور نہا لو" وہ بولی۔

ہم نے باری باری غسل کیا۔ اس سے بڑا فرق پڑا۔ میں نے خود کو بہت فریش محسوس کیا۔ باقی کسر ناشتے نے پوری کر دی۔ ڈاکٹر شاہ ابھی تک واپس نہیں آیا تھا اور نہ اس پائلٹ کے بارے میں کوئی اطلاع ملی تھی جو ہمیں اپنے ساتھ اڑا کے پیرس لے جا سکتا تھا۔

چوہدری دلاور نے بھی غسل کے بعد کپڑے بدلے تھے اور ناشتا بھی ہمارے ساتھ ہی کیا تھا۔ وہ بالکل خاموش اور ذہنی طور پر غیر حاضر تھا۔ شاید وہ ہر لمحہ اس وقت کے بارے میں سوچتا رہتا تھا جو گزر چکا تھا مگر اس کی پرچھائیاں آنے والے وقت پر سایہ فگن تھیں۔ آنے والا وقت اس کی گرفت اور دسترس سے باہر تھا اور اس کا تصور کر کے ڈرتے رہنے کے سوا چوہدری دلاور کے اختیار میں کچھ نہیں تھا۔

یہ جگہ اور یہ وقت مجھے اپنی زندگی سے الگ کسی اجنبی خواب کا حصہ محسوس ہوئے تھے۔ کون سوچ سکتا تھا کہ میں اور محسن یوں چوہدری دلاور کے ساتھ بیٹھ کے ناشتا کریں گے اور وہ بھی ایک ایسی جگہ جہاں نہ ہم نے پہلے کبھی آنے کا سوچا تھا اور نہ پھر زندگی میں کبھی آئیں گے۔ میں لاہور میں غالب اور نازو' وقار یوسف اور نگی' منظر اور اس کے گھر کا تصور کر سکتا تھا۔ وہ کہاں ہوں گے اور کیا کر رہے ہوں گے۔ لاہور کی صبح ہر روز جیسی ہوگی۔ آشنائی اور اپنائیت کے احساس سے معمور۔ حلوے پوری کی خوشبو سے۔ لسی رڑکنے کی آواز سے۔ بستے گلے میں ڈال کے اسکول جانے والے بچوں کی چہکار سے۔ سائیکلوں کی گھنٹی اور تانگے والوں کی "چل بھئی ٹیشن کلی سواری" کے شور سے بھری ہوئی۔ مگر وہاں کوئی بھی ہماری صبح کا تصور نہیں کر سکتا تھا کہ ہم کہاں' کس حال میں اور کس کے ساتھ ہیں؟ ہم سے کچھ دور پیرس کے شہر خوباں میں رابعہ اور گل موجود تھیں مگر ان کے لیے ان پھولوں' خوشبوؤں' فیشن اور آرٹ کے مرکز نگاہ میں کوئی دلکشی نہیں تھی۔ وہ ہماری طرف سے متفکر تھیں اور صبح سے شام تک اور پھر رات سے صبح تک ان کے لیے زندگی کا ہر لمحہ مسلسل انتظار تھا۔ بے بسی اور اکیلے پن کا احساس تھا اور ان کی ہر سانس میں' دل کی ہر دھڑکن میں اور آنکھوں میں آنے والے ہر قطرۂ اشک میں ایک خاموش تمنا تھی' دعا تھی اور امید تھی کہ ہم خیروعافیت کے ساتھ لوٹ آئیں۔

مجھے یوں لگتا تھا جیسے ٹی وی پر کسی ڈرامے کا کلائمکس تھا کہ لائٹ چلی گئی یا فلم درمیان سے ٹوٹ گئی۔ اچانک محاذ جنگ کی گھن گرج اور چیخ پکار تھم گئی ہے اور ہر طرف پھیلی ہوئی لاشوں کے درمیان۔ جلتے ہوئے درختوں' کھنڈر عمارتوں اور مٹی دھول کے درمیان متحارب فوجوں کے تین کمانڈر باقی رہ گئے ہیں۔ فتح مند فریق وہ ہے جس کے دو کمانڈر زندہ ہیں۔ شکست خوردہ غنیم کی طرف سے ہتھیار ڈالنے والا کمانڈر بھی زخموں سے چور ہے اور کوئی دم کا مہمان ہے۔ اب کوئی اسے کیا گرفتار کرے۔ اس پر کیا فرد جرم عائد کرے' کیا مقدمہ چلائے اور کیا سزا دے۔ جو قدموں میں پڑا دم توڑ رہا ہو اسے جنگی جرائم کے ٹریبونل میں کیسے پیش کیا جا سکتا ہے' ہار کے بعد اس کی ذلت کا نظارہ بھی خوش کن نہیں اور نہ اپنی جیت کا جشن منانے کے خیال میں کوئی لطف ہے۔

ناشتے کے بعد دلاور پھر اندر جا کے لیٹ گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کی طبیعت بگڑ رہی ہے۔ میں اور محسن گیراج سے کچھ فاصلے پر گھاس کے چھوٹے سے ٹکڑے پر بیٹھے رہے جہاں سے ہم دلاور پر بھی نظر رکھ سکتے تھے۔ میں نے محسن کو اپنی اور دلاور کی گفتگو کا خلاصہ سنا دیا اور اس کی رائے طلب کی۔

"بات تو چوہدری دلاور کی ٹھیک ہے۔"

"پھر میں اس سے کہہ دوں کہ مجھے یہ پیش کش منظور ہے" میں نے کہا۔

"ایسے نہیں۔ ہم یہاں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ اس میں قانونی مسائل کی نوعیت ذرا مختلف ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ ہم سب غیر قانونی طور پر برطانیہ میں مقیم ہیں۔ خود چوہدری دلاور نے نواب خسرو جمشید کا پاسپورٹ استعمال کیا تھا اور وہ مر چکا ہے۔ اگر کبھی کوئی قانونی بیان ریکارڈ پر لانے کی بات ہوگی تو کیا ہم سے شناخت نہیں مانگی جائے گی اور فرض کرو ہم نے کسی طرح اس کا انتظام بھی کر لیا' کوئی مجسٹریٹ یا وکیل چوہدری دلاور کے بیان کی تصدیق پر راضی ہو گیا تو اس بیان کی قانونی حیثیت بعد میں کیا ہوگی؟ جب یہ معلوم ہوگا کہ بیان دینے والا ایک مفرور مجرم تھا جو غیر قانونی طریقے سے برطانیہ پہنچا تھا۔ دلاور نے ہر جگہ اپنا نام خسرو جمشید لکھوایا ہوگا۔ یہ جعلسازی کا کیس ہے۔ یہ بھی مدنظر رکھنا ہوگا کہ اس معاہدے پر عمل در آمد کے دوران ہم کہاں رہیں گے اور دلاور کہاں ہوگا؟ اس میں کتنا وقت صرف ہوگا۔ دلاور کا مسئلہ ہے ایک خطرناک بیماری جس میں اس کی حالت کسی وقت بھی بگڑ سکتی ہے۔ اسے ہم نہیں سنبھال سکتے۔ اس کی دیکھ بھال عام ڈاکٹر بھی نہیں کر سکتا۔ اسے اسپتال میں خصوصی علاج کی ضرورت پیش آئے گی۔ پھر وہ اپنے بیوی بچوں کو بلانا چاہتا ہے۔ وہ سب کیسے آئیں گے اور کہاں رہیں گے؟ ہم ان کے ساتھ بھی نہیں رہ سکتے۔ ان سے کچھ بعید نہیں کہ وہ خود تو قانونی طور پر یہاں آئیں اور موقع ملتے ہی ہمیں گرفتار کرا دیں یا چوہدری دلاور کو ہم سے چھین کر لے جائیں۔ اس کے علاوہ سارے تصفیہ طلب معاملات کا تعلق لاہور سے ہے۔ لاہور میں دلاور سب کچھ کر سکتا ہے اور ہم دیکھ سکتے ہیں کہ وہ گڑبڑ نہیں کر رہا ہے۔ خود ہمارا سامنے آنا ضروری نہیں ہوگا۔ رابعہ' منظر اور وقار یوسف ہمارے وکیل ہیں۔ وہ ہر معاملے کا قانونی پہلو دیکھتے ہوئے ایک ایسا طریقہ کار وضع کر لیں گے کہ جو ہمارا حق ہے وہ ہمیں مل جائے اور اس سودے بازی میں کوئی قانونی سقم باقی نہ رہے۔ جو پراپرٹی تیری ہے وہ تیرے نام منتقل ہونے میں دیر نہ لگے۔ سارے اثاثے اور ان کی مالیت کا تعین کرتے ہوئے چوہدری دلاور سے جو بھی وصول کرنا ہے وہ آسانی سے مل جائے اور اس میں کسی کے لیے خطرے یا پریشانی کی بات نہ ہو۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا "یہاں رہ کے یہ سارے کام کرنا مجھے بھی مشکل نظر آتا ہے۔"

"مشکل ہی نہیں' یہ ناقابل عمل ہے" محسن بولا "وہاں سے قانونی دستاویزات یہاں آئیں گی۔ یہاں دلاور دستخط کرے گا تو اس کی تصدیق بھی لازمی ہوگی۔ گواہ درکار ہوں گے۔ پھر یہ کاغذات واپس لاہور ارسال کیے جائیں گے اور کچھ وقت لگے گا قانونی عمل میں۔ خدانخواستہ کوئی الجھن پیدا ہو گئی تو دور کیسے ہوگی اور اب یہ ہو جانے کے بعد دلاور کے بیوی بچے آئیں گے تو کیا ہوگا؟ وہ دلاور کو ساتھ لے جانا چاہیں گے تو کیا ہم بھی ساتھ جائیں گے؟ اگر ہم ان کو بھی اپنی قید میں رکھیں گے تو کہاں؟ یہ سب بڑا لمبا چکر ہے۔ جس میں ہمارے لیے خطرہ ہی خطرہ ہے۔ ہم صورت حال کو کنٹرول کرنے میں ناکام رہے تو مارے جائیں گے۔ بہتر یہی ہے کہ ہم پروگرام کے مطابق لاہور چلیں اور دلاور کو اپنے ساتھ لے جائیں۔ باقی سارے معاملات وہیں طے ہوں' جہاں کے ہیں۔"

"اور جب تک یہ معاملات طے نہ ہو جائیں اور ہمارے خلاف سارے مقدمات ختم نہ ہوں ہم روپوش رہیں۔"

"روپوش رہتے ہوئے قانونی مقدمات کیسے ختم ہو سکتے ہیں۔ چوہدری دلاور کا بیان ہو جائے تو ہمیں خود کو عدالت میں پیش کرنا پڑے گا۔ ابھی ہم مفرور مجرم ہیں۔ ہماری ضمانت منسوخ ہوئے زمانہ گزر گیا۔ ہمیں دوبارہ درخواست ضمانت دائر کرنی ہوگی۔ بدلے ہوئے حالات میں ضمانت آسانی سے منظور ہو جائے گی اور ہمیں جیل نہیں جانا پڑے گا لیکن جانا پڑا تو وہاں زیادہ دن نہیں رہیں گے۔ عدالتی طریقہ کار ویسے تو بہت پرپیچ اور لمبا ہے مگر ہمارے وکیل بہت مستعد ہیں اور نیک نام بھی ہیں۔ ان کو بڑے وکلا کی حمایت بھی حاصل ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ اپنے مرزا غالب کی وجہ سے پریس ہماری طرف داری کرے گا۔ یہ ہے تو غلط بات مگر ہم مجبور ہوں گے عدلیہ پر دباؤ ڈالنے کے لیے۔ ہمارے پاس' میرا مطلب ہے دلاور کے پاس وقت کم ہے' نہ جانے کب اس کی حالت اور بگڑ جائے۔ معاملہ دماغ کے ٹیومر کا ہے۔ وہ اندھا یا مفلوج ہو سکتا ہے اور کوما میں بھی جا سکتا ہے۔ انصاف کے عمل کو تیز رکھنے کے لیے ہمیں کوشش کرنا پڑے گی۔ اگر ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ اس کی زندگی کے زیادہ سے زیادہ تین مہینے باقی ہیں تو درحقیقت ہم آدھی مدت سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں' اس کے بعد کا کچھ پتا نہیں۔"

میں نے کہا "تو نے میرے ذہن سے سارا کنفیوژن دور کر دیا۔ مگر فوری مسئلہ ہے دلاور کو لاہور لے جانے کا۔"

"ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ وہ ہم سے تعاون کرے۔ ہم اس کی بات مان رہے ہیں۔ وہ ہماری بات مان لے اور لاہور چلے۔ لاہور کے معاملات طے ہوتے ہی اسے ہماری طرف سے آزادی ہوگی کہ جہاں چاہے چلا جائے لندن یا نیویارک۔"

"گویا اب ہم نے اپنا اصولی موقف بدل لیا ہے۔ ہم اسے قانون کے حوالے کرنا چاہتے تھے' ہر قیمت پر۔"

محسن نے کہا "لیکن خود دلاور کا موقف حیرت انگیز طور پر بدل گیا ہے۔ اب وہ اپنے ساتھ ہمارے سارے مسائل ختم کرنا چاہتا ہے تو ٹھیک ہے۔ اگر یہ دیوانی اور فوجداری مقدمات ختم نہ ہوئے تو ہم دلاور کی موت کے بعد بھی دس بیس سال پریشان رہیں گے۔ دلاور کو سزائے موت دلوانا ہمارا مقصد تھا۔ وہ قدرت نے پورا کر دیا۔ یہ معاملات عدالت میں طے ہوتے تو ہماری زندگی قانونی جنگ لڑتے گزر جاتی۔ قدرت نے آسان شارٹ کٹ سے سالوں کے معاملات دنوں میں ختم کرانے کا بندوبست کر دیا ہے تو ہم اس سے فائدہ کیوں نہ اٹھائیں؟"

"معلوم نہیں' ہمارے وکیل دوستوں کی رائے کیا ہوگی؟"

"ان کی رائے مختلف کیسے ہو سکتی ہے" محسن بولا "اور لاہور پہنچ کے ہمیں مشورے کے لیے وقت ملے گا۔ اصل مسئلہ ہے لاہور پہنچنا۔ اگر ایڈی مل جاتا تو پیرس پہنچ جاتے۔ وہاں رابعہ اور گل کا فکر اور پریشانی سے جینا حرام ہوگا۔ نہ ہمیں ان کی خبر ہے نہ انہیں ہماری۔"

"بدمعاشی خود انہوں نے کی۔ ہم تو فون پر بات کرنا چاہتے تھے۔ خود انہوں نے کہلوا دیا ہوگا کہ وہ یہاں نہیں ہیں حالانکہ وہاں سے ان کے کہیں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا" میں نے کہا۔

محسن نے سرہلایا "تو ٹھیک کہتا ہے۔ وہ وہیں ہوں گی۔ ہم نے بھی تو دوبارہ کوشش نہیں کی۔"

"اب کر لیتے ہیں۔ ان کا دماغ ٹھکانے آگیا ہوگا" میں نے کہا۔

ایڈی کی بیوی ہاتھ میں باسکٹ اور شاپنگ بیگ لیے نکلی "میں ذرا شاپنگ کے لیے ڈاؤن ٹاؤن جا رہی ہوں۔"

"ڈاؤن ٹاؤن ایک امریکی اصطلاح ہے۔"

وہ مسکرائی "میں امریکن ہوں۔ گھر کھلا ہوا ہے۔ تمہیں جس چیز کی ضرورت ہو مثلاً ٹیلی فون یا چائے وغیرہ' اندر جا کے جو چاہو کرو۔ ٹی وی دیکھو یا اخبار پڑھو اور ریڈیو پر موسیقی سنو۔"

میں نے کہا "ایڈی کی کوئی اطلاع؟"

"اس کا فون آیا تھا۔ وہ پرسوں سے پہلے نہیں آسکتا۔ اس کے ٹرک میں کچھ خرابی پیدا ہو گئی ہے۔"

"تم نے اسے ہمارے بارے میں بتایا تھا؟"

"ہاں۔ اور اس نے پھر کہا ہے کہ تم اس کے دوست سے رابطہ کر سکتے ہو وہ ہر طرح سے تمہاری مدد کرے گا۔ وہ بھروسے کے قابل ہے۔"

"تم اس کا نام اور فون نمبر دے جاؤ" میں نے کہا۔

ایڈی کی بیوی کی پیش کش بروقت تھی۔ میں نے محسن کو چوہدری دلاور کے پاس چھوڑا اور خود اندر چلا گیا۔ ڈاکٹر شاہ کے واپس نہ آنے سے مجھے تشویش ہو رہی تھی مگر میرا دل کہتا تھا کہ وہ ضرور آئے گا۔ ہم نے جو کام اس کے سپرد کیے تھے وہ آسان نہیں تھے۔ سب سے پہلے میں نے پیرس کے غریب نواز ہوسٹل کا نمبر ملایا۔ ریسیور اٹھانے والی وہ آدم بیزار مردمار بلا نہیں تھی۔ میں نے اسے رابعہ اور گل کے کمرے کا نمبر دیا "میں دس منٹ بعد دوبارہ فون کروں گا' اگر آپ انہیں بلالیں نیچے۔" میں نے فرنچ میں کہا۔

"کیوں نہیں موسیو" اس نے خوش دلی سے کہا "ویسے وہ بہت پریشان تھیں کسی ٹیلی فون کال کے لیے۔ بار بار پوچھنے آتی تھیں۔"

میں نے کہا "تو آپ ان سے جا کے صرف یہ کہیں کہ تمہیں جس فون کال کا انتظار تھا وہ موصول ہو گئی ہے۔"

دس منٹ کی مہلت میں نے طوطی صاحب سے فون پر بات کرنے میں صرف کی۔ معلوم نہیں یہ اتفاق تھا یا ان کا ہر وقت کا مشغلہ کہ ریسیور پر ان کی دبنگ "ہیلو" سے پہلے میں نے وہ خطاب سنا جو طوطی صاحب نے اپنے ولی عہد شہزادہ سلیم کو نہ جانے

تقصیر پر دیا تھا "اولادِ خنزیر" (جو ان کی مادری زبان میں سؤر دے پُتر کا فارسی ترجمہ تھا)

میں نے کہا "حاجی صاحب' یہ کیا فرما رہے ہیں آپ۔"

"کون سکندر۔ یہ تم سے نہیں فرمایا تھا میں نے میرے پاکستانی بھائی" حاجی علم دین طوطی نے معذرت کی "اس نابکار سے مخاطب تھا۔ نہ جانے کس مرے ہوئے پلید گورے کے بالوں سے بنی ہوئی وِگ اپنی ٹنڈ پر نجاست کے ٹوکرے کی طرح اٹھائے پھر رہا تھا اور مجھے بتانے آیا تھا کہ سنہرے بھورے بالوں میں بالکل انگریز لگتا ہوں میں۔ لوجی ہمارے لیے تو ڈوب مرنے کا مقام ہوا نا۔ خدا نہ کرے کہ کوئی بچہ اتنا حرامی ہو کہ صورت سے بھی پاکستانی نہ لگے۔ خیر سے جتنے ہیں اپنے دیسی ماڈل ہیں' سانولے رنگ کے۔"

میں نے کہا "وہ دراصل..... مجھے ایک ضروری بات کرنی تھی۔"

"کرونا میرے پاکستانی بھائی' کس نے روکا ہے تمہیں۔ اور بات تو ضروری ہی ہوتی ہے' ورنہ بات کرتا کون ہے؟"

میں نے کہا "آپ نے کسی پائلٹ کی بات کی تھی۔ جو ہمیں فرانس پہنچا سکتا ہے۔"

"ہاں بھئی' وہ میرا کل رات اس سے سامنا ہو گیا۔ اتفاق سمجھو یا اپنی خوش قسمتی۔ بدبخت اپنی عاقبت اتنی خراب کر چکا ہے کہ اس کی تو سات نسلیں بھی جہنم کا ایندھن ہوں گی۔ ایک تو کافر انگریز' پھر شرابی اور شبابی۔"

"شبابی! یہ کیا ہوتا ہے؟" میں نے انجان بن کے کہا۔

"ایک لت شراب کی' دوسری شباب کی۔ ایک ہاتھ میں بوتل تھی اور دوسرے میں ایک بے حیا اور فاحشہ۔ لباس اس کا..... الاماں... گریبان سے دیکھو تو دامن تک دکھائی دے" پھر انہوں نے تفصیل سے اس کے ملبوس کی تنگ دامنی سے لے کر اس کے جسم کے بنیادی اعداد و شمار تک تمام خرابی کے اسباب پر روشنی ڈالی۔

میں نے کہا "بڑے غور سے مشاہدہ کیا آپ نے طوطی صاحب۔"

وہ غالباً جھینپے "وہ... بس۔ کیا فرمایا ہے علامہ صاحب نے کہ۔ لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجئے۔"

"یہ تو فیض صاحب نے فرمایا ہے۔"

"اوجی دفع کرو۔ نام میں کیا رکھا ہے۔ سب اپنے پاکستانی شاعر ہیں نا۔ کہنے کا مطلب یہ تھا میرے پاکستانی بھائی کہ اس مردود سے ملاقات تو نہایت غیر شرعی ماحول میں ہوئی تھی مگر کیا کرتا۔ اس وقت تک نشہ غالب نہیں آیا تھا۔ چنانچہ اس نے میری بات بڑے دھیان سے سُنی۔ بس درمیان میں کبھی ایک ہاتھ کی چیز پر منہ مارتا رہا اور کبھی دوسرے ہاتھ کی چیز پر توجہ دیتا رہا۔ آخر میں بولا کہ مسٹر طوطی۔ بات کرو ڈالر یا پاؤنڈ کی زبان میں۔ معاوضہ ادا کرو تو میں یوگنڈا کے چڑیا گھر سے گینڈا چوری کر کے ہوائی جہاز سے تمہاری سات کی جتنے میں دے آؤں۔ اس نے پانچ ہزار پاؤنڈز مانگے تھے۔

میں نے ڈھائی لگائے' بالآخر تین ہزار نو سو ننانوے پاؤنڈز پر سودا ہو گیا۔"

مجھے بے اختیار ہنسی آئی "پورے چار ہزار کیوں نہیں؟"

"اس نے کہا کہ چار ہزار میں ایک پاؤنڈ کم نہیں لوں گا۔ تو میں بھی اڑ گیا میرے پاکستانی بھائی کہ میں ایک پاؤنڈ کم دوں گا اور وہ خبیث مان گیا۔ اب تمہیں بھی قسم ہے مینارِ پاکستان کی' پورے چار مت دینا اسے۔ گن کر پورے تین ہزار نو سو ننانوے پاؤنڈز ہی دینا۔"

میں نے کہا "چلیں یہ تو طے ہو گیا۔ اب مجھے بتائیں کہ میں اس سے کہاں اور کیسے رابطہ کروں؟"

"تم اس کا نام اور فون نمبر لکھ لو۔ فون نمبر تو اس نے تین دئے ہیں۔ یہاں نہ ملا تو فلاں کے بیڈ روم میں ملوں گا۔ وہاں نہ ملا تو فلاں کی آغوش میں اور وہاں نہ ملا تو......" ان کی آخری بات پر مجھے ہنسی ضرور آئی مگر وہ قابلِ اشاعت نہیں۔

"میں آج ہی اس سے ملتا ہوں۔ اگر ہم کل یہاں سے نکل جائیں۔"

"اگر کی بات نہیں میرے پاکستانی بھائی۔ لازماً نکل جاؤ تم ورنہ یہ لشکرِ کفار۔ یہاں کی پولیس تم کو پکڑ لے گی۔ میرا تو برادرانہ مشورہ ہے کہ تم فرانس میں بھی مت رکو' آگے نکل جاؤ۔ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔"

"یہ علامہ صاحب نے فرمایا تھا؟" میں نے کہا۔

"اور کون فرما سکتا ہے۔ تم جرمنی یا ہالینڈ چلے جاؤ۔ اٹلی پہنچ جاؤ۔ سب کی سرحدیں ملتی ہیں۔ ٹکٹ تمہیں لندن سے بھی مل سکتا ہے مگر تم پیرس سے بنوالو تو بہتر ہے۔ یہ جو ہوا باز تم کو پیرس پہنچائے گا اس کو سارے خفیہ راستوں کا علم ہے۔ مگر ایک گزارش ہے فدوی کی میرے پاکستانی بھائی۔"

"آپ حکم کریں۔"

"حکم یہ ہے کہ کہیں پکڑے جاؤ تو مجھے مت پکڑوانا۔ جیل جانے کی نوبت آجائے تو طوطی کو اپنے ساتھ مت لے جانا۔ جیسا کہ مجھے پُتر نور دین نے بتایا۔ تم خاصے لہو و لعب میں مبتلا رہے ہو یہاں۔ اس کی تو خیر میں نے ٹنڈ کرادی تھی۔ افسوس ہے کہ تمہاری نہیں کر سکتا۔ لیکن میرا مشورہ ہے کہ بس اپنے کام سے کام رکھو اور جتنی جلدی ممکن ہو بھاگ جاؤ اس کفرستان سے اپنا ایمان سلامت لے کر۔ ملت بیضا کی آبرو پر داغ آنے سے پہلے۔"

میں نے انہیں یقین دلایا کہ انشاءاللہ ایسا ہی ہو گا اور خدا حافظ کہہ کے ریسیور رکھ دیا۔ دوسری بار پیرس کا نمبر ملاتے ہوئے میں نے گھڑی دیکھی تو پندرہ منٹ ہو گئے تھے۔ رابعہ اور گل شاید کاؤنٹر سے لگی کھڑی تھیں۔

دوسری طرف سے رابعہ نے کہا "ہیلو۔"

میں نے خفت سے کہا "سلاما لیکم سر۔ کیا حال ہے۔"

وہ بم کی طرح پھٹ گئی "شرم نہیں آتی تمہیں حال پوچھتے

ہوئے۔ آج خیال آیا ہے ہمارا۔ تین دن ہو گئے۔"

میں نے کہا "سوری۔ آپ کی آواز سن کے دل شاد ہوا۔ ہم نے تو پہلے بھی کوشش کی تھی مگر ہمیں ٹرخا دیا گیا تھا۔ یہ کہہ کر کہ وہ یہاں نہیں ہیں۔"

"ٹھیک ہے غصے میں کہہ دی تھی ایک بات۔"

"ہم کو غصے پر پیار آتا ہے۔ تم کو آتا ہے پیار پر غصہ تو پھر تم کہو' ہم سنتے ہیں..... ہم گالیاں کھا کے بے مزہ ہونے والوں میں نہیں ہیں۔"

"ڈھیٹ اور بے شرم ہو تم' کمینے ہو....."

"دریں چہ شک۔ ہماری انہی باطنی صفات پر فریفتہ ہوئی تھیں آپ ورنہ صورت پر تو آج بھی بہت مرتی ہیں' یقین نہیں تو یہاں آکے دیکھ لو' سیکڑوں مری پڑی ہیں ہر طرف۔ جدھر سے گزرتے ہیں۔"

"فضول باتیں مت کرو' محسن کہاں ہے؟"

"میرے پیچھے چھپا کھڑا ہے۔ کہتا ہے گُل کو بُلبل کا سلام۔ بُلبل کی آواز سننے کی ہمت نہیں۔ گل سے کہو کہ جتنی گالیاں باقی رہ گئی ہیں وہ بھی مجھے دے کر سبکدوش ہو جائے۔"

"گل کی بات کراؤ محسن سے۔"

"بابا وہ نہیں ہے یہاں' مگر ہے بالکل خیر و عافیت کے ساتھ۔"

"کب آ رہے ہو تم۔ ہماری تو نیندیں حرام ہو گئی ہیں فکر سے۔"

"ارے فکر کیسی۔ ہم جیسے چاہنے والے تو..... ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔ ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہو گا۔"

"سکندر۔ بکو مت ورنہ میں رونے لگوں گی۔"

"واقعی" میں نے مسرت سے کہا "بہت دن ہو گئے ہیں۔ آج دکھا دو رو کے۔ بسم اللہ کرو' آواز صاف آنی چاہیے۔ ناک سڑ سڑ کرنے کی الگ۔ ہچکیاں اور سسکیاں الگ۔ اور ذرا سُر میں رونا۔ بھوں بھوں کر کے ایسے مت رونا کہ لگے عبدالودود منظر ہنس رہا ہے۔"

وہ ہنس پڑی "اچھا تم واپس آؤ پھر نمٹوں گی تم سے۔ یہ گل بہت بے قرار ہے۔"

گل نے کہا "سکندر بھائی' وہ کہاں ہیں؟"

"وہ کون۔ شکار پور کے مشہور اچار فروش۔ کدو خان توری۔"

وہ پہلے سے رونے پر کمربستہ تھی "پلیز ان کو دے دیں فون۔"

میں اس کی سنجیدگی پر حیران رہ گیا۔ میں نے باہر جا کے محسن کو گل کا پیغام دیا اور خود چوہدری دلاور کے پاس بیٹھ گیا۔

"وہ خبیث ڈاکٹر شاہ ابھی تک کیوں نہیں آیا؟" میں نے دلاور سے پوچھا۔

دلاور نے کہا "اس کے آنے نہ آنے سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"فرق پڑتا ہے" میں نے کہا "ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ تم کو اپنے ساتھ لاہور لے جائیں۔"

وہ ایک دم اٹھ بیٹھا "میں نے تم سے کہا تھا..."

"زیادہ اہم وہ ہے جو ہم کہہ رہے ہیں" میں نے کہا "یہ سب معاملات یہاں طے ہونے والے نہیں ہیں۔"

"آخر کیوں؟"

"اس لیے کہ جو کچھ ہے لاہور میں ہے۔ اصل مسئلہ لاہور کا ہے' ہمارے وکیل لاہور میں ہیں۔ عدالتی مقدمات لاہور میں ہیں۔ لندن میں بیٹھ کے کاغذی کارروائی پوری کرنے میں بھی خطرہ ہے۔ ہمارے لیے یہاں ایک ایک دن گزارنا مشکل ہے۔ ہم غیر معینہ مدت تک قیام کا رسک نہیں لے سکتے۔ تمہارے بیوی بچوں کو بھی یہاں نہیں بلایا جا سکتا۔ تم ان سے ملنا چاہتے ہو تو لاہور چلو۔"

"نہیں۔ میں لاہور نہیں جاؤں گا" اس نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

"تم اپنی مرضی سے نہیں جاؤ گے تو ہماری مرضی سے جاؤ گے۔"

"تم..... تم مجھے پولیس کے حوالے کردو گے... تو پھر وہ سب نہیں ہو گا جو میں چاہتا ہوں۔"

"یہ بھی ہم لاہور جا کے طے کریں گے کہ کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ میں نے محسن سے مشورہ کیا تھا اور ابھی فون پر رابعہ سے بھی بات ہوئی۔ تم جانتے ہو وہ کتنی بڑی وکیل ہے۔ میرے تمام قانونی معاملات کی نگرانی کرتی ہے۔ اس نے منظر اور وقار یوسف سے بھی پوچھا۔ اور ہم سب اس بات پر ضرور متفق ہیں کہ تمہاری حالت کے پیشِ نظر اب تمہیں پولیس کے حوالے کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔"

دلاور کا مایوس چہرہ پھر اُمید سے روشن نظر آنے لگا مگر یہ روشنی ایسی تھی جیسے میلی دیواروں پر چالیس واٹ کے بلب کی روشنی جو بہت کم وولٹیج پر جل رہا ہو۔

"پھر کیا طے کیا ہے تم نے؟" دلاور بولا۔

میں نے کہا "تم ہمارے ساتھ لاہور جاؤ گے۔ وہاں تم ہمیں سارا حساب دو گے۔ پہلے کیا تھا' آج کیا ہے' وزیر خان اور میر شرافت علی سے تم نے کتنا چھینا تھا؟ ان کے کتنے اثاثے تھے جو تمہاری تحویل میں رہے۔ پھر تم نے کیا کمایا۔ جائز ناجائز کا حساب الگ کرنا تو مشکل ہے۔ تمہیں بھی ہر بات تفصیل سے کہاں یاد ہو گی۔ تم اندازے کی بنیاد پر بتا سکتے ہو۔ دو چار ہزار یا ایک لاکھ کا فرق بھی ہم نظر انداز کر دیں گے۔ یہ سارا حساب میرے وکیل سمجھ لیں گے تو پھر تقسیم کا مرحلہ آئے گا۔ تمہارا حصہ ایک تہائی ہو گا۔ یہ تمہارے خاندان کی ملکیت رہے گا مگر اس طرح کہ انہیں نقد ادائیگی کر دی جائے گی۔ وہ تمام کاروباری معاملات سے الگ ہو جائیں گے۔ اگر وہ اپنا کاروبار کرنا چاہیں تو ان کی مرضی۔ جس گھر میں وہ رہتے ہیں' بس وہی ان کے پاس رہے گا۔ لیکن اس کی قیمت ان کے حصے میں سے وضع کر لی جائے گی۔"

"اور دو حصے تم لوگے' میر شرافت علی کا حصہ بھی!"

"ہاں۔ ایک حصہ میر... د وزیر خان کا ہے۔ ان کا وارث میں ہوں' دوسرا حصہ تم جرمانے یا ہرجانے کے طور پر میرے حوالے کروگے اور اس کو میں اپنے دوستوں میں تقسیم کردوں گا جنہوں نے میرا ساتھ دیا تھا اور بہت نقصان اٹھایا تھا' تمہاری وجہ سے۔"

دلاور کچھ دیر سوچتا رہا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ سارے معاملات یہاں بیٹھ کے طے کرنے میں تمہارا کیا نقصان ہے۔ دنیا کے کاروبار' لین دین سب کسی ایک جگہ بیٹھ کے ہوجاتا ہے۔ ادائیگی دنیا کے ایک کونے میں ہوتی ہے' مال دنیا کے دوسرے کونے میں ڈلیور ہوجاتا ہے۔ لاہور میں بیٹھا ہوا شخص اپنی جگہ سے ہلے بغیر دنیا کے کسی بھی شہر میں جائداد خرید سکتا ہے اور بیچ سکتا ہے۔"

میں نے کہا "یہ سب میں جانتا ہوں لیکن تم جانتے بوجھتے ایک حقیقت کو نظرانداز کررہے ہو شاید۔ کہ یہاں میری وہ حیثیت نہیں ہے جو عام آدمی کی ہوتی ہے۔ پاسپورٹ پر میرا نام وقار یوسف لکھا ہوا ہے مگر وقار یوسف لاہور میں ہے۔ میں سکندر بخت ہوں جس کو حدودِ برطانیہ سے بے دخل کردیا گیا تھا اور آج میں جعلی شخصیت بنا کے آیا ہوں تو یہ بات بھی کسی سے پوشیدہ نہیں رہی' تمہاری عنایات کے طفیل۔ قانون مجھے یہاں ایک منٹ قیام کی اجازت نہیں دیتا۔ تم یہاں بیٹھ کے قانونی معاملات طے کرنے کی بات کررہے ہو۔ بے شک میں لاہور میں بیٹھ کے لندن میں مکان خرید سکتا ہوں۔ یہاں کاروبار میں پیسہ لگا سکتا ہوں۔ میرا کوئی اٹارنی یہاں بلاخوف و تردد آجا سکتا ہے مگر میں اور محسن یہاں صرف جیل میں رہ سکتے ہیں۔ میں یہ خطرہ کیسے مول لے سکتا ہوں۔ اگر تمہارے ذہن میں کچھ اور ہے مثلاً یہ کہ اس بہانے ہم لندن میں ہفتہ دس دن گزاریں گے تو پکڑے بھی جائیں گے۔ پولیس خود پکڑلے گی یا تم کسی طرح انہیں ہم تک پہنچادوگے۔"

"تمہیں اعتبار کرنا ہی ہوگا مجھ پر سکندر۔ اگر میں ایسا چاہوں گا تو خرابی خود میرے لیے ہوگی۔ جو میں چاہتا ہوں وہ نہیں ہوگا۔"

"پھر تمہیں وہی کرنا چاہیے جو ہم چاہتے ہیں۔ ایک وعدہ میں نے تم سے کرلیا ہے کہ تم کو پولیس کے حوالے ہم خود نہیں کریں گے۔ تمہاری حفاظت کرنا تمہارے بیوی بچوں کا کام ہے۔"

اس نے ایک آہ بھری "چلو ٹھیک ہے۔"

محسن سخت خفگی کے عالم میں نمودار ہوا "اُلو کی پٹھی۔"

میں نے کہا "بجا ارشاد۔"

"دماغ خراب ہوگیا ہے اس کا" محسن غصے میں بولا۔

"صحیح فرمایا آپ نے۔"

"خود ہم نے بہت سر چڑھا رکھا ہے۔"

میں ہنس پڑا "ایسا لگتا ہے کہ تجھے زیادہ بیوی ڈوز ملی ہے۔ سنائی تو رابعہ نے بھی بہت تھیں مگر مجھے پہلے سے اندازہ تھا کہ یہ تو ... پی گیا' تو بھی مت بھول کہ عزت آنی جانی چیز ہے۔ کان کا میل ہے۔ بندہ ڈھیٹ اور موٹی کھال والا ہو تو کوئی کچھ بھی کہے اور پھر ان عورتوں کی باتیں' ان کا کیا بُرا ماننا۔"

"یار' سخت شکی مزاج ہے۔ کہنے لگی کہ مجھے معلوم ہے تم لندن اکیلے کیوں گئے تھے۔ گل چھرے اُڑانے کے لیے۔" محسن کا غصہ کچھ کم ہوا "ہم گل چھرے اُڑا رہے یا جھک مار رہے ہیں؟ جان ہتھیلی پر لے کر پھر رہے ہیں۔ اسے وہاں آرام سے بیٹھ کر بھی میری سلامتی کی فکر نہیں۔ بس یہ خیال ہے کہ میں دن بھر ایک کو بغل میں لیے پھرتا ہوں تو رات کو دوسری کی بغل میں ہوتا ہوں۔"

"بقول اپنے طوطی صاحب کے' سخت شرابی اور شبابی کبابی ہوگئے ہیں ہم لوگ۔ خیر سوچنے دے اسے ایسا ہی۔ جب ہم ایسے نہیں تو پھر بُرا ماننے کی کیا ضرورت ہے۔ کہہ دیتا کہ تین نکاح مزید کرنے ہیں یہاں۔ اب تو اپنے چوہدری دلاور صاحب کو سمجھا کر ہمارا لاہور جاکے سارے معاملات طے کرنا کیوں ضروری ہے۔ میں آتا ہوں ایک ضروری فون کرکے۔"

طوطی صاحب نے مجھے تین فون نمبر دئے تھے۔ اُس کا نام تو نہ جانے کیا تھا' عرفِ عام میں وہ جیک کہلانے لگا اور اب ہائی جیک مشہور تھا۔ غالباً اپنی پیشہ ورانہ مصروفیت کے باعث۔ پہلے نمبر پر ایک خاتون نے سُریلی' نشیلی' رسیلی آواز میں کہا "جیک۔ اس کو رات میں نے گھر سے باہر پھینک دیا۔"

"کس جرم کی پاداش میں' ویسے کیا تم پہلوان ہو؟"

وہ ہنسی "میرا مطلب تھا' میں نے اسے بے عزت کرکے نکال دیا۔ اس کے پاس سے میری بیٹی کی تصویر برآمد ہوئی۔ ابھی وہ صرف چودہ سال کی ہے...."

باقی بات سُنے بغیر میں نے لائن کاٹ دی اور دوسرا نمبر ملایا۔ یہاں ایک غصیلی زہریلی عورت نے سوال کیا "کیا کام ہے جیک سے؟"

میں نے عیّاری سے کہا "تمہارے فائدے کا کام ہے۔"

"میرے فائدے کا۔ جیک!" اس نے چلاّ کے کہا "کوئی سؤر کا بچہ تمہیں فون پر بُلا رہا ہے۔"

"اس سے کہہ دو' جیک مرگیا" پیچھے سے آواز آئی۔

"یہ تم خود کہہ دو یہاں آکے' یہ رکھا ہے ریسیور۔"

کچھ دیر بعد جیک نے کہا "ہیلو!"

میں نے کہا "ہائی جیک۔ کل تمہاری کسی سے بات ہوئی تھی؟"

"کل میری ایک ہزار لوگوں سے بات ہوئی تھی۔"

میں نے کہا "ایک بزنس ڈیل تھی' تین ہزار نو سو ننانوے پاؤنڈ کی۔"

وہ ایک دم مستعد ہوگیا "بالکل ہوئی تھی' تم وہی ہو؟"

"ہاں' میں وہی ہوں" میں نے کہا۔

"کیا پروگرام ہے تمہارا؟" وہ بولا "مجھے آج کے بعد اگلے دو دن فرصت نہیں ہوگی۔ ایک فرنچ ماڈل گرل کسی شیخ کے حرم میں داخل ہونا چاہتی ہے۔ ایک شخص چاہتا ہے کہ میں اس کی بیوی کو بحرالکاہل کے اوپر سے گزرتے ہوئے وہاں ڈراپ کردوں جہاں سمندر کی گہرائی سب سے زیادہ ہو۔"

"یہ سب مجھے مت بتاؤ" میں نے کہا "مجھے آج شام جانا ہے۔ تم اس وقت کہیں مل سکتے ہو مجھ سے؟"

"تم کہاں ہو۔ میں آجاتا ہوں۔ زیادہ بہتر ہوگا اگر تم ائرپورٹ آجاؤ۔ تمہیں آنے میں آدھا گھنٹا تو لگے گا۔ میں بھی اتنی دیر میں فارغ ہوجاؤں گا۔"

میں نے اس سے مصروفیت کی نوعیت نہیں پوچھی۔

میرے حساب سے وہ ایک گھنٹے کا راستہ تھا۔ میں ریسیور رکھ کے باہر آیا ہی تھا کہ ایڈی کی بیوی آگئی "یہ کیا ہے۔ باہر تابوت کیسا رکھا ہوا ہے' کون مرگیا ہے؟"

میں نے فوراً صورت حال کو سنبھال لیا "ابھی تو کوئی نہیں۔"

"پھر کیا وہ شخص مرنے والا ہے؟"

میں نے کہا "اس کی حالت ایسی ہوگئی تھی۔ میں نے احتیاطاً تابوت منگوالیا تھا۔ اگر ہمیں اس کی لاش لے جانی پڑتی تو تابوت ضروری تھا۔"

"اوہ۔ آئی ایم سوری' کیا اس کی حالت اتنی خراب ہے؟"

"کینسر کا مریض کسی بھی وقت مرسکتا ہے۔ خصوصاً وہ جس کو برین ٹیومر ہو اور آخری اسٹیج پر۔"

اس نے اپنے سینے پر صلیب بنائی "پھر وہ یہاں کیوں پڑا ہے' کیا دنیا میں اس کا کوئی نہیں؟"

"آج ہم اسے پیرس لے جارہے ہیں" میں نے کہا "ایک پرائیویٹ جہاز سے۔ جو شخص تابوت لایا ہے وہ ہمارا ہم وطن اور مریض کا دوست ہونے کے علاوہ ڈاکٹر ہے۔ وہ ہمارے ساتھ رہے گا۔"

"مجھے امید ہے کہ تم سچ بول رہے ہو۔ بات یہ ہے کہ میں کسی مشکل میں پڑنا نہیں چاہتی۔ مجھے معلوم ہے کہ ایڈی کے سب دوست اچھے نہیں ہیں اور وہ کچھ غلط کام بھی کرتا ہے پیسے کے لیے۔ میں نے اسے خبردار کردیا تھا کہ تم باہر کچھ بھی کرو' میرے گھر اور بچوں پر اس کا اثر نہیں پڑنا چاہیے۔ وہ بھی خیال رکھتا ہے۔"

"تم روکتی نہیں ہو ایڈی کو غلط کام سے...."

"کوئی مرد کسی عورت کے' خصوصاً بیوی کے کہنے سے اپنی عادت اور فطرت نہیں بدل سکتا۔ یہ عورت ہے جو مرد کو سمجھتی ہے اور پھر اس کی زندگی میں فٹ ہوجاتی ہے۔ خود کو اس کی پسند ناپسند کے سانچے میں ڈھال لیتی ہے۔ وہ جیسا بھی ہے' میرا ہے۔ کبھی باہر اِدھر اُدھر منہ مار لیتا ہے تو مجھے کیا۔ آخر وہ گھر سے باہر ہوٹل کا کھانا بھی تو کھاتا ہے۔ بھوکا تو نہیں رہ سکتا۔"

"خاتون۔ میں تمہاری فراخ دلی' محبت اور عظمت کو سلام کرتا ہوں۔ کاش سب عورتیں تم جیسی ہوتیں" میں نے کہا "سارے مرد خوش نصیب ہوتے ایڈی کی طرح۔"

وہ خوش ہوگئی۔ یہ خوشامد ضرور تھی مگر سچ پر مبنی۔ اس کا دل ہماری طرف سے صاف ہونا ضروری تھا۔ جو عورت گھر کی سلامتی کے لیے اتنی فکرمند ہو' وہ پولیس کو فون بھی کرسکتی تھی کہ مجھے شک ہے' یہاں دال میں کچھ کالا ہے۔

ڈاکٹر شاہ کو میں نے چوہدری دلاور کا معائنہ کرتے دیکھا "تم باقاعدگی سے دوا نہیں کھا رہے ہو۔"

"بکواس بند کرو اور دفع ہوجاؤ۔ مجھے تمہارے مشورے کی ضرورت نہیں" دلاور نے اسے مزید گالیوں سے نوازا۔

"پہلے میں تمہاری وجہ سے مجبور تھا دلاور' اب اپنی وجہ سے مجبور ہوں۔ میں نے پہلے بھی اپنا بھلا دیکھا تھا اور آج بھی میں وہی کررہا ہوں جو میرے مفاد میں ہے۔ نہ تم کبھی میرے ساتھ مخلص تھے نہ میں تھا" ڈاکٹر شاہ نے برہمی سے کہا۔

"کاش میں تمہیں قتل کرسکتا" دلاور نے دانت پیس کے کہا۔

"یہ خیال مجھے بھی اکثر آتا تھا۔ پتا نہیں میں نے ایسا کیوں نہیں کیا تھا۔"

میں نے کہا "اسٹاپ دس نان سنس۔ یہ بتاؤ تم نے کیا بندوبست کیا ہے۔ تابوت میں نے دیکھ لیا۔"

اس نے ایک کاغذ مجھے تھمادیا۔ "یہ ہے دلاور کا ڈیتھ سرٹیفکیٹ۔"

دلاور کا چہرہ پیلا پڑگیا' وہ کانپنے لگا "ذلیل' شیطان۔"

ڈاکٹر شاہ ہنسا "میرا مشورہ تو یہ ہے سکندر کہ تم اس کی لاش ہی لے جاؤ' جینوئن لاش۔ میں ایک انجکشن لگا کے اس کا کام تمام کرسکتا ہوں۔"

میں نے کہا "فضول باتیں مت کرو ورنہ میں تمہارا کام تمام کردوں گا۔ مجھے زندہ دلاور کی ضرورت ہے۔ یہاں نہیں' لاہور میں۔"

"اس کو تم پیرس تک لاش بنا کے ضرور لے جاسکتے ہو مگر وہاں سے لاہور تک انٹرنیشنل فلائٹ پر یہ مشکل ہوجائے گا۔"

"اپنی مشکلات سے ہم خود نمٹ لیں گے۔ یہ بتاؤ کہ ڈیتھ سرٹیفکیٹ کی صداقت کو چیلنج تو نہیں کیا جائے گا؟"

اس نے نفی میں سرہلایا "یہ سو فیصد جینوئن موت کا سرٹیفکیٹ ہے۔ یہاں جعلی سرٹیفکیٹ جاری نہیں ہوتے۔"

"پھر اسے تم کیا کہوگے۔ جو تم لائے ہو" محسن نے کہا۔

"ڈیتھ سرٹیفکیٹ اصلی ہے اور ایک شخص کی موت پر جاری کیا گیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کا نام کچھ اور تھا۔ اس کے وارثوں کے آنے سے پہلے میں نے نواب خسرو جمشید لکھوادیا اور ڈاکٹر نے لکھ لیا ریکارڈ دیکھے بغیر۔ عین وقت پر اسپتال میں اس کی فائل نہیں مل رہی تھی۔ جب ملے گی تو گڑبڑ کا پتا چلے گا مگر وارث خود نمٹ لیں گے۔ مجھے کوئی خطرہ نہیں اور نہ تمہیں۔"

دلاور نے کہا "خدا کے لیے ایسا مت کرو۔ میں ویسے ہی تمہارے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوں۔ میں تم سے تعاون کرتا

ہوں۔"

میں نے نفی میں سرہلایا "ہم رسک نہیں لے سکتے۔"

"رسک...... یہ بھی تو ہے کہ میں لاہور پہنچنے سے پہلے مرجاؤں" دلاور نے بڑی مشکل سے کہا۔

"ہاں۔ یہ رسک تو ہے تمہارے لیے" میں نے کہا۔

محسن نے کہا "لیکن ہمارا انٹرسٹ اس میں ہے کہ تم مر نہ سکو۔ ہم تمہیں زندہ رکھنے کی پوری کوشش کریں گے۔"

"کم آن ڈاکٹر شاہ۔ تم اپنے چوہدری دلاور صاحب کو ایسے سُلادو کہ پھر ان کی آنکھ اس دنیا میں نہ کھلے..... میرا مطلب ہے' آنکھ کھلے تو یہ پاکستان میں ہوں" میں نے کہا۔

"یا پھر دوسری دنیا میں" محسن نے انگلی سے اوپر اشارہ کیا۔

دلاور نے ڈاکٹر شاہ کو بیگ کھولتے دیکھا تو اس کی حالت غیر ہوگئی۔ وہ ہمیں خدا رسولؐ کے واسطے دینے لگا۔ قسمیں دینے لگا کہ ہم ایسا نہ کریں' وہ راستے میں خاموش رہے گا۔ جو ہم کہیں گے وہی کرے گا۔ اس کی منت سماجت رائگاں گئی۔ میں نے اور محسن نے اسے مضبوطی سے پکڑلیا اور ڈاکٹر شاہ نے ایک انجکشن اس کے بازو میں گھونپ دیا۔ دلاور نے اسے گندی گالیاں دیں مگر ڈاکٹر شاہ مسکراتا رہا۔ دلاور کو شور مچانے سے باز رکھنے کے لیے میں نے اس کا منہ ایک ہاتھ سے دبادیا۔ بالآخر اس نے مزاحمت ترک کردی' اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

میں نے اسے چھوڑ دیا۔ "تمہارے چیخنے چلّانے پر یہاں کوئی تمہاری مدد کے لیے کیسے آسکتا ہے' یہاں کون ہے تمہارا؟"

محسن نے کہا "تم بالکل اکیلے رہ گئے ہو دلاور۔ صرف ایک موذی مرض تمہارے ساتھ ہے جو تم پر عذاب الٰہی بن کے نازل ہوا ہے۔ اگر ہم تمہیں مار کے یہاں گاڑ جائیں تو روزِ قیامت سے پہلے کوئی تمہارا سراغ بھی نہیں لگا سکتا۔ نہ تمہارے بیوی بچے سوچ سکتے ہیں کہ اس وقت تم کہاں ہو' نہ امریکی ایف بی آئی اور برطانوی اسکاٹ لینڈ یارڈ کے اور دنیا بھر کے سراغ رساں اس جگہ پہنچ سکتے ہیں۔ خدا کی اتنی بڑی زمین میں ایک آدمی روپوش ہوجائے تو....."

دلاور نے کمزور آواز میں کہا "کیا فائدہ اب ایسی باتیں کرنے سے۔ میری ایک بات سن لو۔ اگر میں مرجاؤں..... تو..... میرے بیوی بچوں سے میرا انتقام مت لینا۔ ان کو اس جرم کی سزا مت دینا کہ وہ چوہدری دلاور کے بیوی بچے ہیں۔ تم شرافت اور انسانیت کے دعوے دار ہو تو ان کو جینے کے حق سے محروم مت کرنا۔ مجرم میں تھا' سارے گناہ میں نے کیے تھے۔ انہوں نے اپنی مرضی سے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ اگر میں اس راستے پر نہ چلتا تو وہ بھی نہ چلتے۔ میں دیندار ہوتا تو میرے گھر کا ہر فرد دیندار ہوتا۔ بیوی بچے وہی کرتے ہیں جو گھر کا سربراہ چاہتا ہے۔"

میں نے کہا "کیا تمہیں یاد ہے کہ جب رابعہ تمہاری قید میں تھی تو تم نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا؟ ایک بار نہیں' متعدد بار۔ مجھے ہر منظر یاد آتا ہے تو میرا خون کھول اٹھتا ہے۔ تم نے ایک کمزور عورت کے جسم پر تشدد کے سارے انسانیت سوز حربے آزمائے تھے۔ تم بھولے تو نہیں ہوگے اس پنجرے کو۔ ایک آہنی سلاخوں والے کمرے میں تم نے اس کے بدن پر شہد مل کے چوہے چھوڑے تھے۔ تمہیں وہ سیوریج لائن بھی یاد ہوگی جس میں تم نے اسے اور مجھے قید کیا تھا۔ ہمارے درمیان سلاخیں تھیں اور گٹر لائن کے غلیظ بدبُو والے پانی میں گوشت نوچنے والے بڑے بڑے چوہے دوڑ رہے تھے۔"

محسن نے کہا "اور تمہیں یہ بھی یاد ہوگا کہ تم نے نازو کو اور غالب کو اس اسپتال میں کتنا عرصہ قید رکھا تھا' کیوں ڈاکٹر شاہ؟"

ڈاکٹر شاہ کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں "مجھے یاد ہے۔"

محسن نے اس کے سر پر مکّا مارا "کتنا عرصہ رہے تھے وہ وہاں؟"

"تقریباً..... تقریباً تین مہینے....." ڈاکٹر شاہ بولا۔

"اور وہاں ان کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ نازو کو بجلی کے جھٹکے دیئے گئے تھے۔ غالب کو پاگل کردیا گیا تھا۔"

ڈاکٹر شاہ نے کہا "میں..... شرمندہ ہوں....."

"صرف شرمندگی کا اظہار کردینے سے بات ختم ہوجاتی ہے؟ تم خود سوچو کہ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا..... اور جو تم نے نازو کے ساتھ کیا تھا وہ تمہاری بہن کے ساتھ ہوتا یا بیوی اور بیٹی کے ساتھ..... تو تم اس شخص کو معاف کردیتے؟"

ڈاکٹر شاہ نے نفی میں سرہلایا "نہیں۔ میں اسے معاف کیسے کرسکتا تھا۔"

"کیا کرتے تم اس کے ساتھ؟ اگر وہ اسی طرح تمہارے سامنے بے بس کھڑا ہوتا جیسے تم ہمارے سامنے کھڑے ہو؟"

"میں اسے قتل کردیتا" ڈاکٹر شاہ نے کہا۔

"کیوں کیا تھا تم نے وہ سب۔ صرف نازو کے ساتھ ہی نہیں' ان سب کے ساتھ جو وزیر خان اسپتال میں لائے گئے تھے" محسن بولا۔

ڈاکٹر شاہ نے کہا "میں بتا چکا ہوں' میں مجبور تھا۔"

"کس نے مجبور کیا تھا تمہیں؟"

"لالچ نے۔ شیطان نے ورغلایا تھا مجھے۔ میں مانتا ہوں۔"

میں نے کہا "پھر آج تم اور دلاور ہم سے شرافت اور انسانیت کی بات کیوں کرتے ہو؟ ہمیں EXPLOIT کرنے کے لیے۔ تم سمجھتے ہو اپنی چالاکی اور عیاری سے تم ہمیں بے وقوف بنالوگے؟ یہ سب کچھ کرنے کے بعد صرف "سوری" کہہ کے بچ جاؤ گے اور بات ختم ہوجائے گی" محسن نے کہا۔

"تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ میں نے تعاون کیا تو تم مجھے معاف کردوگے؟" ڈاکٹر شاہ نے کہا۔

"کیا وعدہ خلافی ان سب جرائم کے مقابلے میں کوئی جرم ہے؟ جو تم نے کیئے تھے؟" میں نے کہا "اور تم کون سے شریف آدمی ہو جس کے ساتھ شرافت کا رویّہ اختیار کیا جائے۔ خیر چھوڑو' اب ان باتوں سے کیا فائدہ۔ یہ بتاؤ کہ راستے میں دلاور کو کیسے نیند میں رکھا جائے؟"

ڈاکٹر شاہ نے فرض کرلیا کہ ہم وقتی طور پر جذباتی اشتعال کا شکار ہوگئے تھے اور اب خطرے کی گھڑی ٹل گئی ہے۔ اس نے پُرامید چہرے کے ساتھ ہمیں بتانا شروع کیا "تم چھ گھنٹے بعد اسے ایک انجکشن اور لگادینا۔ انجکشن لگانا آتا ہے نا تمہیں؟"

محسن نے اقرار میں سرہلایا "مجھے آتا ہے۔"

میں نے پُرسکون نیند میں لیٹے ہوئے دلاور کی طرف دیکھا۔ "سوال یہ ہے کہ ہمیں ایک مُردے کو انجکشن لگانے کی اجازت کون دے گا۔ جہاز میں لاش الگ رکھی جاتی ہے اور دورانِ پرواز مسافر وہاں نہیں جاسکتے۔"

"تابوت بھی سیل پیک ہوتا ہے بلکہ ائرٹائٹ۔ یہ دم گھُٹنے سے مرجائے گا" محسن بولا۔

"تم تابوت میں سوراخ کرسکتے ہو۔ ایسی جگہ کہ نظر نہ آئیں۔" ڈاکٹر شاہ نے کہا "تمہارا سفر دس بارہ گھنٹے کا ہوگا۔ ایک انجکشن کا اثر بھی چھ گھنٹے ضرور رہتا ہے مگر دلاور کا دوسرا مسئلہ ہے اس کی بیماری۔ شاید یہ اذیت محسوس کرے تو چار گھنٹے بعد ہی جاگ جائے۔ اس کا علاج تم یہ کرسکتے ہو کہ اسے ہر چار گھنٹے بعد ایک انجکشن لگادو۔ بے شک اس میں رسک ہے۔"

میں نے کہا "راستے میں کینسر کی دوائیں نہ ملنے سے یہ مر تو نہیں جائے گا؟"

"نہیں۔ اگر اسے دوائیں بالکل نہ دی جائیں تب بھی زیادہ فرق نہیں پڑے گا۔ بس اس کی زندگی کی مہلت کم ہوجائے گی۔"

میں نے کہا "اور کوئی بات؟"

"نہیں۔ میرا کام ختم ہوگیا؟" ڈاکٹر شاہ نے کہا "کیا اب میں جاسکتا ہوں؟"

"ایسے نہیں ڈاکٹر شاہ" میں نے کہا "ابھی تو تم نے اپنے بارے میں کچھ بتایا ہی نہیں؟"

"اور..... اور کیا بتاؤں میں' تم سب جانتے ہو" وہ بولا۔

"ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ تم کیا کرتے رہے۔ تفصیل نہیں جانتے۔ یہاں اس اسٹول پر بیٹھ جاؤ" میں نے اسے کندھے پر ہاتھ رکھ کے بٹھادیا "فرض کرلو کہ تم کسی عدالت میں اقبالی بیان دے رہے ہو۔ اس طرح جیسے چوہدری دلاور لاہور جاکے دے گا۔"

"فرض کرنے کی کیا بات ہے۔ تم ایم آر ایس کی عدالت میں بیان دوگے۔ تم مجرموں کے کٹہرے میں ہو" محسن بولا۔

ڈاکٹر شاہ نے میری اور محسن کی صورت کو دیکھا اور اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری "آخر..... تم چاہتے کیا ہو؟"

"کچھ نہیں' بس تمہاری زبان سے وہ سب سننا چاہتے ہیں جو تم نے چوہدری دلاور کے لیے کیا۔"

"بولو۔ ہم سننے کے منتظر ہیں" محسن نے کہا۔

"..... کیا بتاؤں۔ تم سوال کرو' میں جواب دوں گا" وہ لکنت زدہ لہجے میں بولا۔

"او کے۔ یہ بتاؤ' تم نے کتنے ذہنی طور پر صحت مند لوگوں کو پاگل کیا تھا؟" میں نے کہا "اندازاً کیا تعداد رہی ہوگی ایسے لوگوں کی؟"

اس نے سوچ کے کہا "تیس..... چالیس کے درمیان۔"

"ان میں کتنی عورتیں تھیں اور کتنے مرد؟"

"میرا خیال ہے... تعداد برابر ہی ہوگی۔"

میں نے کہا "اور انہیں پاگل بنانے کے لیے تم نے کیا طریقے اختیار کیے تھے؟"

"وہی جو..... مینٹل اسپتال میں اختیار کیئے جاتے ہیں..... کچھ مخصوص دوائیں ہیں۔ الیکٹرک شاک' برین واشنگ' نفسیاتی تشدد..... اور جسمانی تشدد۔"

میں نے کہا "ایک کیس کا تم کتنا معاوضہ وصول کرتے تھے؟"

"معاوضہ مقرر نہیں تھا۔ ہر کیس کی نوعیت اور پارٹی کی مالی حیثیت کے مطابق رقم وصول کی جاتی تھی۔"

"صرف ایک بار۔"

"یکمشت رقم ایڈوانس۔ پھر ماہانہ اخراجات۔"

میں نے کہا "کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ تم نے کیا وصول کیا تھا؟"

"کم سے کم' ایک لاکھ....." وہ بولا "ایک شخص نے دس لاکھ بھی دیے تھے۔"

میں نے کہا "اچھا..... سوچ کے بتاؤ' کیا دوران علاج کچھ لوگ مر بھی گئے تھے۔ دوا سے یا الیکٹرک شاک سے؟"

"ہاں۔ کبھی غلطی سے ایسا ہوجاتا تھا۔"

"غلطی سے یا جانتے بوجھتے" میں نے کہا "جھوٹ بولنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ کچھ لوگ یہ بھی چاہتے ہوں گے کہ ان کی جان ہمیشہ کے لیے چھوٹ جائے۔"

اس نے ماتھے پر نمودار ہوجانے والا پسینہ صاف کیا "ہاں۔ وہ دلاور سے بات کرتے تھے۔ دو چار مہینے اسپتال میں رکھنے کے بعد کچھ لوگ ماہانہ اخراجات سے پریشان ہوجاتے تھے۔ وہ سودا کرلیتے تھے۔"

"ایسے کتنے سودے یاد ہیں تمہیں؟"

"میں نے..... کسی کو نہیں مارا۔"

"اور پھر کس نے مارا۔ کیا وہ طبعی موت مرگئے تھے۔ مقررہ مقدار سے زیادہ دوا کس نے دی۔ زیادہ دیر الیکٹرک شاک کس کے کہنے پر دیا گیا۔ ہائی وولٹیج کس کے اشارے پر کی گئی؟"

"وہاں..... ماتحت عملہ یہ کام کرتا تھا۔"

میں نے کہا "تمہارا ماتحت عملہ۔ بولو کتنے لوگوں کی جان لی تھی انہوں نے؟"

"تم..... یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو آخر؟" وہ چلانے لگا۔

"اپنی آواز کم رکھو۔ ایسا نہ ہو' ہمیں یہ آواز ہمیشہ کے

کرنی پڑے۔ سچ سنے بغیر ہم تمہیں جانے نہیں دیں گے" میں نے کہا۔

وہ اب کانپنے لگا تھا "دس بارہ۔۔۔ لوگ مرے ہوں گے۔"

"گویا تم اعتراف کرتے ہو کہ تم نے چوہدری دلاور کے ساتھ مل کر یا اس کے کہنے پر معاوضہ لے کر دس بارہ بے گناہوں کو قتل کیا یا کروایا۔ تمیں چالیس کو پاگل کیا۔ تم نے نفسیاتی اور جسمانی تشدّد کا ذکر کیا تھا۔ عورتوں کے ساتھ جنسی تشدّد بھی کیا گیا ہوگا۔ اگر تمہارا یہ اقبالی بیان دنیا کی کسی عدالت میں دیا جاتا تو اس عدالت سے تمہیں کیا سزا سُنائی جاتی؟"

ڈاکٹر شاہ کا رنگ لاش کی طرح سفید پڑگیا "میں۔۔۔ نہیں جانتا۔"

"تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ایک قتلِ عمد کی سزا موت ہے۔ تم نے دس بارہ قتل کئے۔ سوچ سمجھ کے 'ٹھنڈے دماغ کے ساتھ۔ منصوبہ بندی کرکے 'معاوضہ لے کر" میں نے کہا "تم نے خود ایم آر ایس کی عدالت میں اپنے ہر جرم کا اعتراف کیا۔"

"ایم آر ایس کی عدالت!" وہ ایک دم کھڑا ہوگیا۔

میں نے اسے پھر بٹھادیا "ہاں۔ یہ ایم آر ایس کی عدالت تھی جہاں تم بیان دے رہے تھے۔ یہ عدالت تمہیں سزائے موت سُناتی ہے۔"

محسن نے کہا "تم چاہو تو کلمہ پڑھ لو۔ سزائے موت کے فیصلے پر ابھی عمل درآمد ہوگا۔"

ڈاکٹر شاہ نے چلّانے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی سے اس کی گردن پر بھرپور وار کیا۔ اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹنے کی آواز ایسے سنائی دی جیسے خشک ٹہنی ٹوٹتی ہے۔ اس نے ایک جھٹکا لیا اور اسٹول پر سے لڑھک کر فرش پر گرگیا۔ اس کا جسم کرب میں بل کھانے لگا اور اس کا سر مضحکہ خیز انداز میں لڑھکنے لگا۔

جب وہ ساکت ہوگیا تو میں نے کہا "اب ہم ایک جینوئن لاش لے جاسکتے ہیں۔ ڈاکٹر شاہ کے مشورے کے مطابق۔"

"اور چوہدری دلاور' کیا وہ ہمارے ساتھ جائے گا؟"

"ہاں۔ اس سے مجھے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا۔ اس نے تعاون کا وعدہ کیا ہے۔ وہ تعاون کرنے پر مجبور ہے" میں نے کہا۔

"یہ بڑی عجیب بات ہے" محسن بولا۔

"کون سی بات؟"

"میں بھی یہی چاہتا تھا۔ تُو نے اپنا فیصلہ بدلنے سے پہلے مجھ سے بات نہیں کی" محسن بولا۔

"بس مجھے اچانک خیال آیا کہ ڈاکٹر شاہ کو معاف نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے جرائم انتہائی سنگین تھے۔"

"اس سے پہلے کہ ایڈی کی بیوی یہاں آکے کوئی سوال کرے' ہمیں یہاں سے روانہ ہوجانا چاہیے" محسن نے کہا۔

تابوت گیراج کی سائڈ میں رکھا ہوا تھا۔ سڑک پر سے گزرنے والا کوئی شخص اسے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ایڈی کی بیوی نے گھر کے اندر آتے ہوئے اسے دیکھ لیا تھا۔ میں اور محسن اسے اٹھا کے گیراج میں لے آئے۔ گیراج بنانے کا مقصد کار کو بحفاظت اندر کھڑا کرنا تھا مگر ہم نے اسے ایک رات کے لیے اپنا بیڈ روم بنایا تو ایڈی کی بیوی نے گاڑی کو اپنے گھر کے سامنے سڑک کی سائڈ پر پارک کردیا تھا۔ وہیں ڈاکٹر شاہ کی کار بھی موجود تھی۔

"ڈاکٹر شاہ سے ہم نے یہ تو پوچھا ہی نہیں تھا کہ وہ تابوت کیسے لایا تھا؟" محسن نے کہا "ہم اسے کیسے لے جائیں گے؟"

میں نے کہا "تابوت لے جانے والی گاڑی کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"ایڈی کی بیوی کیا کہے گی' کیا سوچے گی؟"

"میں اسے بتاچکا ہوں کہ مریض کی حالت نازک ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ فوت ہوگیا۔ ہم اس کی لاش واپس وطن ارسال کرنے کے لیے لے جارہے ہیں۔"

"اسے شک ضرور ہوگا۔ بھلا یہ کیا بات ہوئی کہ ہم ایک کینسر کے مریض کے ساتھ یہاں آئے' رات بھر قیام کیا' صبح مریض فوت ہوگیا۔ ہم نے تابوت منگوایا اور لاش لے کر چلے گئے۔ کینسر کے آخری اسٹیج پر مریضوں کو گیراج میں نہیں رکھا جاتا۔ وہ مرجائیں تو اس کی اطلاع یہاں کے قانون کے مطابق کسی کو دینی تو پڑتی ہوگی۔ پولیس کو یا پیدائش واموات کے کسی دفتر میں۔ ایسا نہیں ہوسکتا کہ آپ لاش اُٹھا کے روانہ ہوجائیں۔"

"بات تیری بالکل ٹھیک لگتی ہے مجھے۔"

"اگر یہاں تابوت لے جانے والی سیاہ گاڑی آئے گی تو ایڈی کے پاس پڑوس کے بھی بہت سے لوگ دیکھیں گے۔ وہ ایڈی کی بیوی سے پوچھیں گے کہ کون مرگیا تھا جس کے لیے میت گاڑی آئی تھی؟"

"پھر ہم ایسا کرتے ہیں کہ سامان لے جانے والی کوئی بند گاڑی لے آتے ہیں" میں نے کہا۔

"شاید وہ ایک تابوت میں بند لاش ڈھونے پر راضی نہ ہو۔"

"اگر اسے مناسب معاوضہ مل جائے تو اس میں کوئی قانونی قباحت نہیں پھر وہ کیوں انکار کرے گا" میں نے کہا۔

"ہم اسے کہاں لےجائیں گے۔"

"اچھا سوال کیا آپ نے" میں نے کہا "ہم اس کی تدفین نہیں کراسکتے' اسے پولیس کے حوالے نہیں کرسکتے۔ کسی کولڈ اسٹوریج میں نہیں رکھواسکتے' اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتے۔"

"آئیڈیا!" محسن نے چُٹکی بجا کے کہا "یہاں کفن دفن کا انتظام کرنے والے ادارے ہیں۔ یہ کاروباری ادارے UNDERTAKERS کہلاتے ہیں۔ کیوں نہ ہم لاش ان کے سپرد کردیں۔ انھیں بتادیں کہ ہم کس قسم کے انتظامات چاہتے ہیں اور تمام چارجز ادا کردیں۔ انھیں کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ ان کا یہی بزنس ہے' وہ معمول کے مطابق سب بندوبست کردیں گے۔ شک

انہیں اس لیے نہیں ہوگا کہ ہم ایک ڈیتھ سرٹیفکیٹ دکھاسکتے ہیں۔ چوہدری دلاور کا میڈیکل ریکارڈ بھی ہمارے پاس ہے جس سے ثابت ہوگا کہ موت کا سبب برین ٹیومر تھا۔ ڈاکٹر فریزر کی رپورٹ' اور سینٹ تھامس اسپتال کا حوالہ انتہائی مستند ہے۔"

"لیکن سرٹیفکیٹ پر نواب خسرو جمشید کا نام ہے۔"

"کیا وہ میت سے اس کا نام پوچھیں گے۔ جب ہم جیسے دو معزز افراد فریج میں بتائیں گے کہ مرحوم کون تھا اور ظاہر ہے ہم بے حد سوگوار بھی ہوں گے تو وہ کوئی سوال نہیں کریں گے۔ آخر اعتبار بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ قتل کے کسی بھی کیس میں یہ نہیں ہوتا کہ قاتل خود مقتول کو UNDERTAKERS کے پاس لے جائے اور اس کی شاندار تجہیز و تکفین کا بل بھی ادا کرے۔"

محسن کی بات معقول تھی۔ ہم نے ڈاکٹر شاہ کو تابوت میں ڈالا اور اس کو شریفانہ انداز میں لٹادیا۔ اس طرح کہ گردن ٹوٹی ہوئی ہونے کے باوجود اس کا چہرہ اوپر کی طرف رہے۔ دائیں بائیں نہ ہو۔ اس کے پاؤں سیدھے ہوں اور دونوں ہاتھ سینے پر بندھے ہوئے۔ چشمہ پہنا کے میں نے ڈاکٹر شاہ کی آنکھیں پہلے ہی بند کردی تھیں۔ اب تابوت کے شیشے والے حصے میں سے صرف اس کا چہرہ دکھائی دیتا تھا۔ ایڈی کی بیوی نے ابھی تک مریض کو نہیں دیکھا تھا۔ اس کی ملاقات صرف مجھ سے اور محسن سے ہوئی تھی۔

محسن ڈاکٹر شاہ کی کار میں روانہ ہونے ہی والا تھا کہ ایڈی کی بیوی گھر سے نکلی۔ اس نے کچھ ایسا لباس پہن رکھا تھا جیسے وہ کسی تقریب میں شرکت کے لیے جارہی ہو۔

"میں پہلے بچّوں کو اسکول سے لوں گی" اس نے میرے سوال پر کہا "پھر میں ان کے لیے کچھ کپڑے خریدوں گی۔ آج سہ پہر مجھے ان کو ایک برتھ ڈے پارٹی میں لے جانا ہے۔ میں شام تک واپس آؤں گی۔"

"پھر تو تم سے ملاقات نہیں ہوگی۔ ہم بھی جارہے ہیں۔"

"اچھا! تم ایڈی کی واپسی تک نہیں رُکوگے؟"

میں نے کہا "دراصل ہمارے دوست کی حالت زیادہ خراب ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اسے فوراً وطن واپس بھیج دیا جائے۔ وہ اپنے بیوی بچّوں کے سامنے مرنا چاہتا ہے۔ ڈاکٹر شاہ نے اس کے ساتھ جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ وہ شام کی کسی فلائٹ سے روانہ ہوجائیں گے۔"

"اور تم لوگ کیا کروگے؟" وہ بولی۔

"ہم شاید واپس آجائیں۔ ایڈی کی مدد کے بغیر ہم پیرس نہیں پہنچ سکتے مگر اس کا کوئی دوست ہے جس کا تم نے ذکر کیا تھا۔ اگر وہ مان گیا۔"

"پیسہ دوگے تو مانے گا کیوں نہیں۔"

میں نے کہا "ہم اس سے رابطہ کریں گے۔ تم اس کا فون نمبر دے دو۔"

اس نے فون نمبر دے کر کہا "اگر تم جارہے ہو تو جاتے وقت گھر کے دروازے کو مقفل کرجانا اور گیراج کو بھی۔ چابیاں میں اپنے ساتھ لے جارہی ہوں۔"

"جو کچھ تم نے ہمارے لیے کیا اس کے لیے بہت شکریہ۔"

اس نے مسکرا کے ہاتھ ہلایا اور گاڑی میں بیٹھ کے روانہ ہوگئی۔ میں نے اندر جا کے ہائی جیک کو فون کیا اور اسے بتایا کہ اب شاید میں ایک ڈیڑھ گھنٹے سے پہلے ائرپورٹ نہیں پہنچ سکوں گا۔

"کوئی بات نہیں" وہ بولا "میں اتنی دیر میں آئل اور فیول وغیرہ چیک کرالوں گا۔ میں بس نکلنے ہی والا تھا۔ نکل گیا ہوتا پہلے ہی مگر اس چڑیل کے چُنگل سے پیچھا چھڑانا آسان نہیں ہوتا۔"

"کسے چڑیل کہا ہے تم نے۔ میں چڑیل ہوں؟" پیچھے سے آواز آئی۔

"ہاں۔ تم چڑیل ہو' ڈریکولا ہو' خونی چمگادڑ ہو۔ چمٹ جاتی ہو تو جان نہیں چھوڑتی ہو جان لیے بغیر" وہ چلّا کے بولا۔

"پھر آج ایسا ہی ہوگا۔"

ان کی گفتگو جاری تھی۔ ہائی جیک نے ریسیور کو کریڈل پر نہیں رکھا تھا۔ شاید ایسے ہی چھوڑ دیا تھا چنانچہ میں ان کی گفتگو سُن سکتا تھا۔ گفتگو کچھ دیر بعد "صرف بالغوں کے لیے" ہوگئی تو میں نے ریسیور رکھ دیا۔

محسن کو ٹرک لانے میں آدھے گھنٹے سے زیادہ لگ گیا۔ ٹرک ڈرائیور ایک مریل اور منحوس شکل والا بوڑھا تھا جس کے منہ سے اس وقت بھی شراب کی بُو آرہی تھی۔ شاید وہ کام اسی لیے کرتا تھا کہ اسے شراب پینے کے لیے پیسے ملتے رہیں۔ جتنی دیر میں محسن نے اور میں نے تابوت کو ٹرک کے پچھلے حصّے میں لوڈ کیا' وہ بے نیازی سے اپنی جگہ بیٹھا وقفے وقفے سے ایک بوتل کو خالی کرتا رہا۔

"یہ اس طرح شراب پی کے گاڑی چلاتا ہے۔ اس کا ایکسیڈنٹ۔۔۔۔ یا چالان نہیں ہوتا؟"

"غالباً شراب اس پر اثر نہیں کرتی ورنہ چالان اور حادثات ہوتے رہتے ہوں گے۔ ٹرک کی حالت سے تو ایسا ہی لگتا ہے" محسن بولا۔

میں نے آگے جا کے اس سے سوال کیا "یہ تم کیا کررہے ہو۔ ایسے شراب پی کے ڈرائیونگ کروگے؟"

اس نے غرا کے کہا "دس سال سے کررہا ہوں۔ آج کون سی نئی بات ہوئی ہے۔"

"ایسا نہ ہو کہ ٹرک میں سے دو لاشیں اُتاری جائیں۔ ان میں ایک تمہاری ہو" میں نے کہا "میری بلا سے تم شراب پیو یا زہر۔"

محسن نے کہا "تمہارا چالان ہوگیا پھر؟"

"تو جرمانہ میں ادا کروں گا۔ جیل میں جاؤں گا' لائسنس میرا منسوخ ہوگا۔ تم کیوں پریشان ہو؟"

"یہاں کفن دفن کا کون سا اچھا ادارہ ہے؟"

"تم کتنا خرچ کرسکتے ہو؟" وہ بوتل سے ایک گھونٹ لے کر بولا "اس پر میرے جواب کا انحصار ہے۔ دو سو پاؤنڈ سے دو لاکھ پاؤنڈ تک تم جتنا چاہو' مُردے کو یا خدا کو فرق نہیں پڑتا۔"

"چلو' یہ معاملہ ہم خود طے کرلیں گے۔ تم وہاں چلو جہاں لوگ شریف ہوں۔ اور جگہ زیادہ دور نہ ہو۔"

میں نے ایڈی کے گھر اور گیراج کو مقفل کیا اور ٹرک میں ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ محسن نے ڈاکٹر شاہ کی کار ہمارے پیچھے رکھی۔ اس کی پچھلی سیٹ پر چوہدری دلاور اپنے پیر سمیٹے ایک کروٹ پر بے خبر سوتا رہا۔

ٹرک ڈرائیور میری توقعات کے برعکس ہوشیار اور مستعد ثابت ہوا۔ اس کے اعصاب اور حواس پوری طرح اس کے کنٹرول میں تھے اور یہ ضروری تھا۔ ورنہ وہ لندن کی سڑکوں پر ٹرک نہیں چلا سکتا تھا۔ اس نے رفتار بھی کم ہی رکھی اور ٹریفک کے کسی ضابطے کی خلاف ورزی نہیں کی۔

لندن کا کوئی بھی علاقہ میرے لیے نیا نہیں تھا مگر ٹرک ڈرائیور نے جن گلیوں کا انتخاب کیا تھا وہاں میری عقل بھی چکرا گئی۔ پون گھنٹے بعد اس نے ٹرک ایک دکان کے سامنے روک دیا۔ یہ شیشے کا ایک دروازہ تھا جس پر لکھا ہوا تھا "سائمن اینڈ سائمن' انڈر ٹیکرز۔"

میں نے اور محسن نے تابوت اتارا اور ٹرک ڈرائیور کو رخصت کردیا۔ ہم تابوت اٹھائے اندر داخل ہوئے تو ائرکنڈیشنر کی ٹھنڈک کے ساتھ ایک عجیب سی آسیب زدہ خوشبو نے ہمارا استقبال کیا۔ دروازہ عام کمرے کا لگتا تھا مگر اس کے پیچھے خاصا وسیع ہال تھا جس میں دائیں طرف والی دیوار کے ساتھ ہر قسم کے تابوت تدفین اور ڈلیوری کے لیے تیار تھے۔ بائیں طرف آفس کاؤنٹر تھا اور انتظار کرنے والوں کے لیے صوفے لگے ہوئے تھے۔ دیوار پر ہر قسم کے تابوتوں کی رنگین تصاویر تھیں اور ان کے ساتھ قیمت درج تھی۔

اندر ایک دروازے سے پچاس ساٹھ سال کا ایک بھوت نما شخص نمودار ہوا۔ اس نے کالا کوٹ پہن رکھا تھا اور اس کا سر بالکل صاف تھا اور چہرہ یرقان کے مریض جیسا پیلا۔ وہ بہت دبلا اور لمبا تھا۔ اس کا چہرہ بھی لمبوترا تھا اور ہاتھوں کی لمبائی بھی غیر معمولی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اسے کسی نے دونوں طرف سے کھینچ کے لمبا کردیا ہے۔

"یہ کام ہم بلا معاوضہ کرتے ہیں" وہ بولا "اگر تم فون کرکے ہمیں مطلع کردیتے تو تمہیں یہ تکلیف نہ اٹھانی پڑتی۔"

"مگر اپنے دوست کو یہاں خود پہنچانے پر ہم نے کوئی تکلیف محسوس نہیں کی" میں نے مغموم لہجے میں فرنچ بولتے ہوئے کہا۔

"اب وہ دنیا سے چلا گیا ہے تو ہمیں اس کے لیے کچھ تو کرنا ہی چاہیے۔ دوستی کا تقاضا ہے" محسن نے بھی فرنچ میں اور رقت بھرے لہجے میں کہا۔

بھوت نے فوراً ایک بٹن دبا کے کسی کو طلب کیا۔ قصاب کی شکل' لباس اور حلیے والا ایک ہٹا کٹا سیاہ فام چیونگم چباتا ہوا آیا

"ان اینگلو فرنچ بے وقوفوں سے بات کرو۔ یہ ظاہر کررہے ہیں کہ ان کو یہ بھی علم نہیں کہ لندن میں انگلش بولی جاتی ہے۔"

قصاب نے بہت مہذب لہجے میں پوچھا "تم اس کی تدفین کرانا چاہتے ہو؟"

"ہاں۔ یہ ہمارا دوست ہے۔ کینسر سے اچانک مرگیا۔" میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور ڈیتھ سرٹیفکیٹ پیش کیا۔

قصاب نے ڈیتھ سرٹیفکیٹ بھوت کو دے دیا "کتنا خرچ کرنا چاہو گے تم اپنے دوست کی شاندار آخری رسوم پر؟"

میں نے محسن کی طرف دیکھا۔ "اس کا جنازہ قابل رشک ہونا چاہیے۔ ہم پانچ ہزار پاؤنڈز تک دیں گے۔"

"پانچ ہزار۔ اس میں قابل رشک تو نہیں ہوگا لیکن قابل تعریف ضرور ہوگا۔"

بھوت نے کہا "تم صرف دوست ہو اس کے۔ کوئی رشتے دار نہیں ہے؟"

"نہیں' ہم ہی اس کے سب کچھ تھے" میں نے سینٹ تھامس اسپتال کا ریکارڈ اس کے سامنے رکھ دیا "دیکھو' ہم نے اس کے لیے کیا نہیں کیا۔ ڈاکٹر فریزر جیسا سرطان کا ماہر اس کو نہیں بچاسکا۔ اس نے کہا تھا کہ زیادہ سے زیادہ تین مہینے' یہ دو مہینے میں ہی مرگیا۔"

محسن نے سینے پر صلیب بنائی "خدا اس کی روح کو سکون اور چین نصیب کرے۔"

بھوت نے قصاب کی معرفت کہا "ہم پوری رقم ایڈوانس لیتے ہیں۔"

میں نے خفگی سے کہا "وہ کیوں؟"

"اس لیے کہ لوگ اپنے مردے وصول کریں۔ یہاں چھوڑ کر نہ جائیں۔ ہم ان پر محنت کرتے ہیں اور خرچہ کرتے ہیں۔ ادھار کریں تو ہمیں تدفین کے لیے قبرستان بھی جانا پڑے۔"

میں نے محسن سے کہا "اس بے اعتبار شخص کو پانچ ہزار پاؤنڈز دے دو۔ اس کی نظر کو ابھی تک اچھے برے کی پہچان نہیں ہوئی۔"

محسن نے کہا "کب سے کاروبار کررہے ہو تم؟"

بھوت نے جواب دیا "سو سال سے زیادہ ہوگئے۔ تم الزام میری نظر کو مت دو' قصور زمانے کا ہے۔ زمانہ بہت بدل گیا ہے۔ بتاؤ' تمہیں کوئی جلدی تو نہیں ہے۔"

"یہ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟" میں نے کہا۔

"اس لیے کہ ہمارے پاس کام زیادہ ہے۔ اگر ارجنٹ فیس دوگے تو ہم تمہارا کام پہلے کریں گے۔ ارجنٹ فیس پانچ سو پاؤنڈز ہے۔ تم کل شام آخری رسوم ادا کرسکتے ہو۔"

"اور جلدی نہ ہو تو۔"

"ایک ہفتے بعد۔ آج ہی کے دن۔" اس نے کہا۔

"پانچ ہزار پاؤنڈز خرچ کرنے کے بعد ہم پانچ سو پاؤنڈ ضرور بچائیں گے۔ ہمیں کوئی جلدی نہیں' ہمارا دوست اب تمہاری تحویل میں ہے۔"

"اس کا جسم..." محسن نے تصحیح کی "روح خدا کے پاس ہے۔"

رسید لے کر باہر آتے ہوئے میں نے محسن سے کہا "لے بھائی' یہ کام اچھا ہوگیا۔ اب ایک ہفتے تو ڈاکٹر شاہ پڑا رہے یہاں۔"

"اگر اس کی گمشدگی کی رپورٹ لکھوا دی گئی تو پولیس یہاں پہنچ جائے گی" محسن بولا۔

"کون لکھوائے گا رپورٹ؟" میں نے کہا "اور اگر دو چار دن بعد کسی کو اس کی کمی محسوس ہوئی اور اس نے پولیس سے رجوع کیا تو پولیس کیا کرے گی؟ وہ یہاں آکے صرف ریکارڈ دیکھیں گے۔ رجسٹر میں کسی ڈاکٹر شاہ کا نام نہیں ملے گا۔"

میں ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا اور محسن نے ڈرائیونگ کی۔ چوہدری دلاور ابھی تک بے سدھ پڑا تھا۔ "معلوم نہیں ایک ہفتے بعد یہ لوگ کیا کریں گے جب ہم تابوت واپس لینے نہیں آئیں گے۔ کتنے دن انتظار کرتے ہوں گے یہ لوگ۔"

"دو چار دن' تو نے پتا کیا لکھوایا ہے؟"

"سر رچرڈ گورڈن کا" میں نے کہا "فون نمبر بھی اسی کا دیا ہے۔"

"ویری گڈ۔ پھر ہمیں فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم تو اس وقت ہوں گے اپنے لہور شریف میں میرے پاکستانی بھائی۔"

"اور کتنی خوشی ہوگی اپنے لارڈ صاحب کو جب انہیں فون موصول ہوگا اس بھوت کا کہ اپنا مُردہ کیوں نہیں لے جاتے۔ لارڈ صاحب بھی لارڈ صاحب ہیں۔ ایک بار شاید رانگ نمبر کہہ کے رکھ دیں گے۔ اس کے بعد خاصے دلچسپ مکالمے ہوں گے ان کے درمیان۔ بالآخر فریقین' یعنی پولیس' مسٹر رچرڈ' ان کی زوجہ اور ڈاکٹر شاہ کے لواحقین جان لیں گے کہ یہ تو دلاور' سکندر کی پرانی کہانی کا نیا موڑ ہے۔ اگر الزبتھ سمجھ سکتی تو میں اسے ایک شعر لکھ بھیجتا اپنے علامہ صاحب کا۔ آئے عشاق گئے وعدۂ فردا لے کر۔ اب انہیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر۔"

محسن نے سوچ کے کہا "یار یہ اپنی فلموں کی سپر اسٹار زیبا اتنی پرانی ہے؟"

"نئی ہیروئن ہے یار۔"

"پھر علامہ صاحب نے رخ زیبا شعر کیسے کہہ دیا... یہ اس دور میں بھی تھی یعنی جنگ عظیم سے پہلے کی چیز ہے؟"

جیک عرف ہائی جیک ائرپورٹ سے باہر طے شدہ جگہ پر ہمارا منتظر تھا۔ وہ صورت شکل اور حلیے سے بالکل انگریزی فلموں کا مزاحیہ اداکار جیری لوئس تھا۔ اسی کی طرح ہنستا بولتا تھا اور ویسی ہی حرکتیں کرتا تھا۔ غالباً وہ خود بھی جانتا تھا اور بتانے والے اسے بتا چکے تھے کہ وہ جیری لوئس کی کاپی ہے۔ اس کے وجود میں اللہ نے ایک مضطرب روح ڈال دی تھی۔

اس نے محسن سے ہاتھ ملا کے کہا "الیگزینڈر دی گریٹ۔"

میں نے کہا "سکندر میرا نام ہے۔"

محسن بولا "میں افلاطون ہوں۔ سکندر کا استاد۔"

وہ قہقہہ مار کے ہنسا "پھر میں ارسطو ہوں۔ تمہارا بھی استاد۔ خیر یہ بتاؤ کہ معاملہ کیا ہے؟"

میں نے کہا "معاملہ بہت معمولی ہے۔ ہم ناجائز طور پر برطانیہ میں وارد ہوئے تھے۔ ہمارے ایک دوست کے مطابق' ہم برطانیہ میں حرامی تھے۔"

"مگر ناجائز طور پر وارد ہونا ایک مجبوری تھی۔ برطانوی حکومت کئی سال پہلے ہمیں ناخلف قرار دے کر عاق کرچکی تھی۔ اب ہم واپس جانا چاہتے ہیں مگر پولیس کا اصرار ہے کہ ہم کچھ عرصہ جیل میں ان کے مہمان رہیں۔" محسن بولا۔

وہ پھر ہنسا "تم آدمی دلچسپ ہو۔"

"تم ہمیں ہائی جیک کرکے پیرس پہنچا دو۔ کسی محفوظ مقام پر اتار دو۔ لندن سے پیرس جانا بہت آسان کام ہے مگر مشکل یہ ہے کہ پولیس بڑے جوش و خروش کے ساتھ ہمیں تلاش کرتی پھر رہی ہے۔ ہم کسی بھی پکڑے جاسکتے ہیں۔ یہ بھی عین ممکن ہے کہ ہمارے بارے میں پیرس کی پولیس کو بھی بتادیا گیا ہو۔"

اس نے کہا "پھر اتنی زحمت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہیں گرفتار ہوجاؤ۔"

میں نے کہا "ہماری منزل پیرس نہیں ہے۔ ہم پیرس کے راستے پاکستان سے لندن پہنچے تھے۔"

"مگر میں تو تمہیں پاکستان نہیں پہنچا سکتا۔ میرا جہاز چھوٹا ہے۔"

میں نے کہا "تم کہاں تک پہنچا سکتے ہو؟"

اس نے سوچ کے کہا "میں... یونان پہنچا سکتا ہوں تمہیں۔ پیرس سے روم اور پھر وہاں سے ایتھنز۔ تم وہاں سے ترکی بھی جاسکتے ہو اور ایران کے راستے پاکستان' خشکی کے راستے..."

میں نے کہا "اتنا وقت نہیں ہے ہمارے پاس۔ اس میں تو شاید ایک ہفتہ لگ جائے گا۔"

"یونان میں سیکڑوں شپنگ لائنز ہیں۔ صرف ایک جہاز پر بحری کمپنی چلانے والے بہت ہیں جو سب دنیا بھر میں اسمگلنگ کے فروغ کے لیے کوشاں ہیں۔ وہ تم کو اسمگل کرسکتے ہیں' دنیا کے ہر حصے میں۔"

میں نے کہا "یہ بھی لمبا سفر ہے۔ کیا ہم اُڑ کے نہیں پہنچ سکتے۔ تم تو پرانے ہائی جیکر ہو' خفیہ راستوں اور چور دروازوں کو تم سے بہتر کون جانتا ہوگا؟"

اس نے سر ہلایا "بے شک کسی راستے میں کہیں کوئی دیوار نہیں ہوتی اور ہو تو اس میں سے گزرنا مشکل ہوسکتا ہے' ناممکن نہیں۔ تم کتنے افراد ہو؟"

میں نے کہا "پانچ" تم کو تین نظر آرہے ہیں۔ ایک بیمار شخص کار میں سو رہا ہے اور اصل مسئلہ اسی کا ہے۔ ہم اسے اغوا کر کے لے جا رہے ہیں۔ اس کا تعاقب کرتے ہوئے لندن آئے تھے۔"

"باقی دو کون ہیں؟"

"دو بہت خوب صورت لڑکیاں" میں نے کہا "جو پیرس میں ہمارا انتظار کر رہی ہیں۔"

"پیرس میں سب لڑکیاں خوب صورت ہوتی ہیں۔ اور جو انتظار کرتی ہیں وہ زیادہ خوب صورت لگتی ہیں۔"

"وہ ہماری بیویاں ہیں" محسن بولا۔

"کمال ہے۔ تم ان کو لڑکیاں کہہ رہے تھے۔" وہ بولا "اس سے بھی زیادہ حیرانی کی بات یہ ہے کہ وہ تمہیں خوب صورت لگتی ہیں۔ بیویاں ہونے کے باوجود۔"

"لگتا ہے تم نے شادی نہیں کی؟"

"ایک بار نہیں کئی بار' مگر چلی نہیں۔ وجہ یہی کہ مجھے بیوی بن جانے کے بعد نہ وہ لڑکی لگتی تھی اور نہ خوب صورت۔ اس کے علاوہ سب لڑکیاں نظر آتی تھیں اور حسین بھی۔ اب میں جھوٹ کیوں بولوں۔ خیر بات تھی پانچ افراد کے فلائی کرنے کی۔ تم کہاں جانا چاہتے ہو؟"

"پاکستان۔ وہاں تین انٹرنیشنل ائرپورٹ ہیں۔ کراچی' اسلام آباد اور لاہور۔"

"انٹرنیشنل ائرپورٹ کو گولی مارو۔ وہاں چیکنگ سخت ہوتی ہے... اور ائرپورٹ کہاں ہیں۔ جہاں ایک چھوٹا جہاز اُتر جائے۔"

"ایسے تو بہت ہیں' ملتان... فیصل آباد... سکھر۔"

"سب سے کم فلائٹس کہاں اترتی ہیں؟"

"پتا نہیں۔ جیکب آباد' سبی یا سیالکوٹ جیسے شہر بھی ہیں۔"

محسن نے کہا "ایک طریقہ اور بھی ہے۔ ہم یہاں سے ہانگ کانگ' سنگاپور یا بنکاک چلے جائیں' وہاں سے کراچی۔"

"پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہیں" وہ میرے ہاتھ پر ہاتھ مار کے بولا "تمہارے پاس کاغذات بھی نہیں ہیں۔"

"کاغذات پورے ہیں۔" میں نے کہا "ہم پیرس سو فیصد جائز طریقے سے پہنچے تھے۔"

"پھر کیا پرابلم ہے؟"

"پرابلم یہ ہے کہ جو بیمار شخص ہمارے ساتھ ہے وہ درحقیقت سو رہا ہے" میں نے کہا۔

"وہ بیمار بھی ہے۔ کینسر سے مرنے والا ہے۔ تم اس کی میڈیکل رپورٹس دیکھ سکتے ہو" محسن بولا "لیکن وہ واپس جانا نہیں چاہتا۔ ہم اسے واپس لے جا کے پولیس کے حوالے کرنا چاہتے ہیں۔"

"جب وہ مرنے والا ہے تو پھر..."

میں نے کہا "یہ ہمارا آپس کا معاملہ ہے۔ ہمیں پاکستان میں اس سے کچھ حساب برابر کرنا ہے۔ ہم نے اسے انجکشن دے کر سُلا دیا ہے۔ دوبارہ اسے چار چھ گھنٹے میں پھر انجکشن دینا ضروری ہو گا۔ ورنہ وہ جاگ اٹھا تو ہنگامہ کرے گا۔ اسے کینسر کی دوائیں کھانا بھی ضروری ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ راستے میں ہی مر جائے' ہم اس خوش فہمی کا شکار رہیں کہ وہ سو رہا ہے۔"

"کسی انٹرنیشنل فلائٹ پر تم مشکل میں پڑ جاؤ گے۔ بہتر ہے اگر تم کوئی جہاز چارٹر کر لو۔ آٹھ افراد کا سیسنا بھی ساری دنیا گھوم آتا ہے مگر ڈائریکٹ فلائٹ نہیں ہوتی۔ اسے بار بار فیول لینے کے لیے اُترنا پڑتا ہے مگر وہ پائلٹ کا مسئلہ ہے۔ ڈائریکٹ فلائٹ کے مقابلے میں وقت کچھ زیادہ لگتا ہے۔ شاید چار پانچ گھنٹے کا فرق پڑ جائے گا۔"

میں نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا "اور کرائے میں کتنا فرق پڑے گا؟"

"کرائے میں بہت فرق پڑے گا۔ تمہیں کم سے کم بھی پندرہ ہزار پاؤنڈز خرچ کرنے ہوں گے۔ ویسے تو دس ہزار پاؤنڈز میں بھی تمہیں لے جانے والے بہت ملیں گے مگر ان کے جہاز ایسے ہیں کہ کچھ پتا نہیں' منزل پر پہنچائیں یا آخری منزل پر۔ ایک آرام دہ اور محفوظ جہاز پندرہ سے بیس ہزار پاؤنڈز میں ملتا ہے۔"

میں نے کہا "ویری گڈ۔ پھر تم ہمارا یہ مسئلہ بھی حل کر دو۔ چار ہزار پاؤنڈز تمہیں دینے کے بعد...."

"تین ہزار نو سو ننانوے" اس نے کہا۔

"ہمارے پاس بیس اکیس ہزار پاؤنڈز ہی رہ جائیں گے۔ شاید کچھ رقم ہماری بیویوں کے پاس ہو گی لیکن ہمارے سفر کے اگلے مرحلے کے لیے بھی کچھ رقم ہونی چاہیے۔ پاکستان ہم پیدل تو نہیں جا سکتے۔"

"او کے۔ تمہاری صاف گوئی اور اعتماد کو میں نے پسند کیا۔ میں تمہارے لیے یہ کر سکتا ہوں کہ بیس ہزار پاؤنڈز والا ایک جہاز تم کو پچیس فیصد ڈسکاؤنٹ پر دلوا دوں۔ تم پندرہ ہزار میں شاہانہ طریقے سے بنکاک پہنچ جاؤ گے۔ ایک ہزار پاؤنڈز میری خصوصی خدمت کا معاوضہ۔ تم پھر بھی چار ہزار پاؤنڈز بچا لو گے۔"

"ہمیں کیا ضرورت ہے شاہانہ سفر کی اور تمہارا احسان لینے کی۔ پندرہ بیس ہزار پاؤنڈز میں ہم بحفاظت پہنچ سکتے ہیں۔"

اس نے میری بات کاٹ دی "تم ایک ہزار پاؤنڈز کے بدلے حاصل ہونے والے فوائد کو نظر انداز کر رہے ہو۔ یہ پائلٹ میرا دوست ہے۔ میں اسے خود بریف کر دوں گا۔ وہ ٹریولنگ ایجنسی بھی چلاتا ہے اور اس کی فلائٹس خاص لوگوں کے لیے ہوتی ہیں جو اس کے مستقل گاہک ہیں۔ وہ اپنے خفیہ دورے اسی کے ساتھ کرتے ہیں۔ کچھ سیاست داں ہیں' کچھ تاجر اور کچھ فلم اسٹار۔ ان میں کوئی اسمگلر نہیں ہوتا۔ وہ سب تفریح کے لیے جاتے ہیں اور تم سمجھ سکتے ہو کہ خفیہ تفریح کیا ہوتی ہے اور کہاں ہوتی ہے۔ چونکہ مسافر وی آئی پی حضرات اور خواتین ہوتے ہیں اس لیے قاعدے ضابطے بھی نرم پڑ جاتے ہیں۔ ساحل سمندر پر ایسے بہت سے فائیو اسٹار ہوٹل ہیں جن کے اپنے پرائیویٹ ہیلی پیڈ ہیں اور چھوٹے

جہازوں کے رن وے بھی ہیں۔ یہ جہاز بھی کسی پبلک ائرپورٹ پر نہیں اترے گا۔ بنکاک کے سب سے مشہور اور بدنام ہوٹل کے پرائیویٹ ساحلی رن وے پر اترے گا۔ تمہارا استقبال ایک وی آئی پی کی طرح کیا جائے گا۔ وہاں پولیس کا داخلہ ممنوع ہے۔"

"باقی چار ہزار پاؤنڈز ہم وہاں قیام کے ادا کریں؟" محسن بولا۔

"قیام ضروری نہیں۔ تم کافی پی کے کسی ٹریول ایجنسی کے نمائندے کو بلا سکتے ہو اور اس سے فلائٹ شیڈول پوچھ سکتے ہو۔ وہ خود تمہاری بکنگ کرا دے گا۔ کوئی ایکسٹرا چارج نہیں۔ اب یہ تمہاری قسمت کہ تمہیں فلائٹ کب ملتی ہے؟"

"اگر ہم کو ایک دو دن انتظار کرنا پڑا؟"

"تو وہاں کم خرچ ہوٹل بھی ہیں۔ سو پاؤنڈز والے شریفانہ ہوٹل جو کسی طرح بھی کم نہیں سروس اور آسائش کے اعتبار سے۔ دو دن میں ایک ہزار پاؤنڈ خرچ کر دو گے تو غریب نہیں ہو جاؤ گے۔ سیر تفریح بھی کر لو گے' عیاشی بھی۔ مگر تمہارے ساتھ تو بیویاں لگی ہوئی ہیں۔ عیاشی خاک کرو گے۔"

محسن نے آہ بھری "ہم تو نظر بازی بھی نہیں کر سکتے۔"

میں نے کہا "وہ خواب تک سنسر کرتی ہیں۔ مگر تمہاری تجویز بے حد معقول اور قابل عمل ہے۔ اب تمہارا کیا پروگرام ہے؟"

"میرا پروگرام وہی ہو گا جو تمہارا؟"

"تم کتنی دیر میں روانہ ہو سکتے ہو؟" محسن نے کہا۔

"ابھی' اسی وقت۔ اگر تم تیار ہو" وہ بولا۔

"ہماری تیاری مکمل ہے" میں نے کہا "ہمارا سب ضروری سامان ہمارے ساتھ ہے۔ تمہارا جہاز کہاں ہے اور وہاں تک ہم ایک مریض کے ساتھ کیسے پہنچ سکتے ہیں۔"

اس نے سر ہلایا "ابھی ایک ایمبولینس آئے گی۔ اس میں اسٹریچر بھی ہو گا۔ مریض کو اس میں منتقل کرنے کے بعد پیچھے والا دروازہ بند کر لینا۔ تمہیں نرسنگ اسٹاف کی وردیاں اندر ہی ملیں گی۔ ان پر ریڈ کراس بنا ہوا ہو گا۔ ایمبولینس تقریباً آدھے گھنٹے میں ائرپورٹ کے اندر پہنچ جائے گی۔ اس وقت تک تم لباس بدل کے گیٹ کھول دینا۔ ایمبولینس سائرن بجاتی ہوئی اور لائٹس چمکاتی ہوئی چیک پوسٹ سے گزرے گی اور سیدھی میرے جہاز تک پہنچ جائے گی۔ ایمبولینس کو دیکھتے ہی میں انجن اسٹارٹ کر دوں گا۔ تم پیرامیڈیکل اسٹاف کی پیشہ ورانہ مہارت اور پُھرتی کے ساتھ مریض کو اسٹریچر پر ڈال کے جہاز میں منتقل کرو گے۔ ظاہر یہ ہو گا کہ کسی جاں بلب مریض کو جان بچانے کے لیے کہیں شفٹ کیا جا رہا ہے۔ ایسے ہی قاعدے ضابطے نافذ کرنے والے بھی جذباتی ہو جاتے ہیں اور ایک سیکنڈ کی تاخیر کے گناہ کا الزام کوئی قبول کرنا نہیں چاہتا۔ تمہارے سوار ہوتے ہی وہ دروازہ بند کر دے گی۔"

"وہ کون؟"

"میری اسسٹنٹ' ائرہوسٹس۔ کچھ بھی سمجھ لو۔ بڑی ہوشیار لڑکی ہے۔ تین سال سے میرے ساتھ ہے۔"

"خوب صورت اور جوان تو ہو گی؟"

"ظاہر ہے۔ اس کے بغیر میں اسے برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اچھی بات یہ ہے کہ وہ ہر طرح سے میرے کام آتی ہے مگر طے شدہ معاوضے کے سوا کچھ نہیں مانگتی۔ شادی پر اصرار نہیں کرتی حالانکہ ایک بیٹا بھی ہے ہمارا۔ ہم ہنسی خوشی رہتے ہیں۔ تم اس سے مل کے انجوائے کرو گے۔ اب میں چلتا ہوں' ایمبولینس پندرہ بیس منٹ سے پہلے نہیں آئے گی۔ تم اسی جگہ موجود رہنا" ہائی جیک نے ہاتھ ملایا اور روانہ ہو گیا۔

"استغفراللہ۔ میرے پاکستانی بھائی۔ اس جنسی شخص کے گناہوں کی سزا اور اعمال کی پاداش میں کہیں ہم نہ مارے جائیں۔"

میں نے کہا "جہاز پر یہ اکیلا نہیں' ایک بے حیا مجسم گناہ کافر حسینہ بھی ہو گی۔ اللہ ہم نوجوانانِ اسلام کے اخلاق و ایمان کو سلامت رکھے۔"

محسن بولا "اور جہاز کو کریش سے بچائے۔ اس پر ایک اور دوزخی چوہدری دلاور بھی اپنے بارِ گناہ کے ساتھ موجود ہے۔"

میں نے کہا "گستاخی معاف' آپ کون سے معصوم اور پاک باز ہیں۔"

محسن بولا "آپ کیا کم حرامی ہیں۔ اب تک نہ جانے کس کی دعائیں کام آرہی ہیں۔"

"غالباً ان کی جو صدقِ دل سے ہماری سلامتی کے لیے دستِ بہ دُعا ہیں" میں نے کہا۔

محسن نے کار میں لیٹے ہوئے دلاور کی نبض کسی ڈاکٹر کی طرح دیکھی اور مطمئن ہو کے سر ہلایا۔ میں نے ایک قریبی کیفے کا رخ کیا اور پیپر کپ میں کافی لے آیا۔ یہ کھانے کا وقت تھا مگر وہاں ہمارے کھانے کی کوئی چیز نہ تھی۔ ہاٹ ڈاگ یا برگر۔ سینڈوچ اور پیٹیز وغیرہ کے بارے میں ہمیشہ یہ اندیشہ لاحق رہتا تھا کہ ان میں لحم خنزیر کی آمیزش نہ ہو۔ محسن تو چکن کے قیمے کو بھی غور سے دیکھتا تھا کہ کہیں وہ سؤر کا گوشت تو نہیں۔ ایک مسئلہ چکن یا بکرے کے گوشت کے حلال ہونے کا بھی تھا۔ تلے ہوئے انڈے اور کیک بھی ہم نے اس دن سے کھانا چھوڑ دیے تھے جس دن طوطی صاحب نے فرمایا تھا کہ خنزیر کی چربی کا بطورِ روغن استعمال عام ہے۔ ہمارا گزارا صرف انڈین پاکستانی کھانوں پر تھا جہاں ذبح کیا ہوا گوشت استعمال ہوتا تھا۔ مرغی کے علاوہ مچھلی' سبزیاں' دال وغیرہ آسانی سے دستیاب تھے۔ دودھ دہی اور پھل میں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ چار سال لندن میں گزار کے ہمیں اس کفرستان میں ایمان کی سلامتی کے ساتھ جینا آگیا تھا۔

ابھی ہم کافی پی رہے تھے کہ ایک پولیس کار ہمارے قریب

آ کے رک گئی۔ اس میں سے اُترنے والے سارجنٹ نے بڑی شرافت سے سوال کیا "کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم لوگ اتنی دیر سے یہاں کیوں رُکے ہوئے ہو؟"

"کیا یہ بھی خلاف قانون ہے؟" میں نے کہا۔

"آف کورس۔ یہاں پارکنگ ممنوع ہے" اس نے ایک سائن بورڈ کی طرف اشارہ کیا اور اپنی چالان بک نکالنے لگا۔

میں نے محسن کے ساتھ فرنچ شروع کردی "لے بیٹا۔ اب مارے گئے۔ یہ مانگے گا کاغذات ہم سے۔"

محسن نے کہا "ہم کہہ سکتے ہیں کہ نہ ہماری گاڑی ہے اور نہ ہم اسے چلا کے لائے ہیں۔ جان تو چھڑانی ہے اس مصیبت سے کسی طرح۔"

سارجنٹ رک گیا "کیا مسئلہ ہے؟"

میں نے کہا "آفیسر۔ ہم یہاں ایمبولینس کا انتظار کررہے ہیں۔ تم دیکھ سکتے ہو کہ پچھلی سیٹ پر ایک بیمار شخص لیٹا ہوا ہے۔"

"مجھے اس کے بیمار ہونے پر کوئی اعتراض نہیں" وہ بولا۔

"دوسری بات یہ کہ نہ ہم اس گاڑی کے مالک ہیں اور نہ ہم نے گاڑی یہاں کھڑی کی تھی۔ ہمیں یہاں ڈاکٹر شاہ لے کر آئے تھے جن کی یہ کار ہے۔ تم کاغذات دیکھ سکتے ہو۔"

میں نے گلوز کمپارٹمنٹ میں سے گاڑی کے کاغذات اسے پیش کردیے۔ اس نے انھیں سرسری نظر سے دیکھ کے سہلایا "وہ خود کہاں ہے؟"

"وہ ایمبولینس کا بندوبست کرنے گیا ہے۔ ہم اپنے بیمار دوست کو لے کر پیرس جارہے ہیں۔ وہ لندن میں نہیں مرنا چاہتا۔"

سارجنٹ نے دلاور کو غور سے دیکھا "کہیں یہ مر تو نہیں گیا؟"

"ابھی تک تو زندہ ہے لیکن کینسر کی آخری اسٹیج پر کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ ہم سب پیرس میں ہی رہتے ہیں۔ مجھے قطعی علم نہیں تھا کہ گاڑی غلط جگہ پر کھڑی ہے۔"

"گاڑی سے زیادہ اہم یہ بات ہے کہ ایک مریض جو تمہارے کہنے کے مطابق کینسر سے مرنے والا ہے اس طرح ایک عام گاڑی میں پڑا ہے" اس نے نوٹ بک واپس جیب میں رکھ لی "کیا اتنے سیریس مریض کو آئی سی یو میں نہیں ہونا چاہیے تھا؟"

میں نے کہا "آف کورس' ہونا چاہیے۔"

"وہ کون ڈاکٹر تھا جس نے تمہیں اجازت دی کہ مریض کو گاڑی کی سیٹ پر ڈالو اور لے جاؤ" اس نے پچھلی سیٹ کی کھڑکی سے سر اندر ڈالا "اور تم اسے کہاں سے لا رہے ہو؟"

میں نے صورت حال کو سنبھالنے کی کوشش کی "یہ سینٹ تھامس اسپتال میں تھا۔ تم ڈاکٹر فریزر کی رپورٹس دیکھ سکتے ہو۔"

"میں ڈاکٹر نہیں ہوں کہ رپورٹس دیکھ کے سمجھ سکوں۔"

"ڈاکٹر فریزر مشہور آنکولوجسٹ ہیں۔ ان کی رائے سند سمجھی جاتی ہے" میں نے کہا۔

"یہ آنکولوجسٹ کیا ہوتا ہے؟"

"کینسر اسپیشلسٹ۔ مریض انھی کے زیرِ علاج تھا۔"

اس نے مجھے نظر جما کے دیکھا "مریض کا کوئی نام بھی ضرور ہوگا۔ کیا تم اپنے دوست کو اسی طرح مخاطب کرتے ہو۔"

میں نے دل ہی دل میں اس پولیس مین کو کوسا جو ٹریفک کی خلاف ورزی کا معاملہ بھول کے دوسرے مسئلے میں ٹانگ اڑا رہا تھا لیکن اس کے تجسس کو دخل در معقولات نہیں سمجھا جاسکتا تھا۔ وہ اپنا فرض ادا کررہا تھا اور اس کے فرائض میں صرف ٹریفک قواعد وضوابط کی پابندی کرانا شامل نہیں تھا۔ وہ قانون کا نمائندہ تھا اور یہ ان کی تربیت کا ایک نمایاں پہلو تھا کہ ان کی نظر ہر طرف رہتی تھی۔ کہیں کوئی بات خلاف معمول ہو' کوئی واقعہ ان کی سمجھ میں نہ آئے یا کوئی شخص اپنی حرکات وسکنات سے مشتبہ محسوس ہو تو وہ نظرانداز نہیں کرتے اور منہ پھیر کے نہیں چلے جاتے کہ ہمیں کیا۔ ابھی تو کچھ ہوا نہیں۔ نہ کسی نے رپورٹ درج کرائی' نہ شکایت کی۔ تھانہ کون سا لگتا ہے اور تفتیش کرنا کس کا کام ہے' یہ سب ہمارے ملک میں ہوتا ہے۔ یہاں کوئی پولیس مین کسی بھی جگہ شک میں مبتلا ہو تو اپنے قانونی اختیارات استعمال کرتے ہوئے اپنا شک رفع کرنے کے لیے وضاحت طلب کرسکتا ہے۔

میں نے کہا "یہ نواب خسرو جمشید ہیں۔"

"تم انڈین ہو؟"

"نہیں' میں.... ہم سب پاکستانی ہیں" میں نے بڑے فخر سے کہا۔

"پاکستانی... تم لوگ ابھی انڈیا سے لڑ رہے تھے۔"

میں نے کہا "اگر سیاست کے بارے میں کچھ جانتے نہیں تو اس موضوع پر فضول بات کرنے سے بہتر ہے کہ بات نہ کرو۔"

"اوکے۔ کیا نام بتایا تم نے..." وہ کاغذات اور میڈیکل رپورٹ دیکھتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا "نواب خسرو جمشید۔ تمہیں معلوم ہے نواب کیا ہوتا ہے۔ جیسے تمہارے ملک میں لارڈ یا کاؤنٹ ہوتا ہے۔ پہلے انڈیا میں ریاست کا حکمران نواب ہوتا تھا یا مہاراجا۔"

"آئی سی۔ تو یہ مہاراجا کے مرتبے کا شخص ہے' نواب۔ لیکن یہ کسی لاوارث فقیر کی طرح پڑا ہے۔ اس کا علاج اتنا بڑا ڈاکٹر کررہا تھا اتنے بڑے اسپتال میں لیکن اس کو لندن سے پیرس لے جانے کے لیے کوئی بہترین رولز رائس تک نہیں ہے۔ ایمبولینس بھی اب آئے گی۔ اصولاً تو اس کو اسپتال سے ایمبولینس میں ڈاکٹر یا نرس کے ساتھ لانا چاہیے تھا اور ایمبولینس میں ہنگامی صورت حال سے نمٹنے کا پورا بندوبست ہونا بھی لازمی تھا۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اس بے پروائی کا ذمے دار کون ہے۔ میں اسے مجرمانہ کوتاہی سے بھی زیادہ سنگین جرم کہوں گا۔"

محسن نے کہا "تم ہمیں قصوروار نہیں قرار دے سکتے"

"کیوں نہیں دے سکتا۔ کینسر کی بات الگ ہے۔ اگر کسی کو ت تیز بخار ہو' اتنا کہ وہ فوری طبی امداد نہ ملنے سے مر سکتا ہو اور نم اس کو پیدل چلا کے لے جاؤ یا اپنی گاڑی میں ایسے ہی ڈال کے ہر کرنے کی رفتار سے اسپتال جاؤ تو اس کا کیا مطلب سمجھا جائے !؟ یہی کہ تم اسے زندہ دیکھنا نہیں چاہتے۔ جانتے بوجھتے تم ایسے حالات پیدا کررہے ہو کہ وہ راستے میں ہی مرجائے۔ کیا یہ قتل کی کوشش کے مترادف نہیں ہوگا۔"

"یہ تم کیسی بات کررہے ہو؟"

"کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔ ایسی حالت میں مریض کے لواحقین ہنگامہ کھڑا کردیتے ہیں۔ ڈاکٹروں پر چیختے چلاتے ہیں اگر ذرا بھی کوتاہی ہو۔ وہ نروس ہوتے ہیں خود بھی اور دوسروں کو بھی پریشان کرتے ہیں۔ وہ بدحواس اور پریشان نظر آتے ہیں۔ اگر روتے ہوتے نظر نہ آئیں تب بھی اتنے اطمینان سے سڑک کے کنارے غلط جگہ گاڑی پارک کرکے گپ شپ میں مصروف نظر نہیں آتے۔ اتنے ایزی نہیں ہوتے کہ پیپر کپ میں کافی پی رہے ہوں۔ سچ بتاؤ' یہ کیا معاملہ ہے؟"

"معاملہ..... کیسا معاملہ۔ تم نے سارا ریکارڈ دیکھ لیا؟"

"جہنم میں گیا ریکارڈ۔ تم جھوٹ بول رہے ہو" اس نے برہمی سے کہا "یہ کیسے معلوم ہوگا کہ جس کی میڈیکل رپورٹس تم نے دکھائی ہیں' لا یہی شخص ہے۔"

"تم اس کا پاسپورٹ دیکھو گے؟"

"مجھے یہ بھی شک ہے کہ یہ شخص بیمار ہے۔ میرے خیال میں یہ سو رہا ہے یا پھر بے ہوش ہے۔"

"یہ سو رہا ہے اور خواب آور انجکشن کے اثر میں ہے جو اس کی اذیت کم کرنے کے لیے دیا گیا تھا" میں نے کہا۔

میرا ذہن اب تیزی سے کام کررہا تھا۔ مجھے صاف نظر آرہا تھا کہ پولیس افسر اپنا شک رفع کیے بغیر نہیں ٹلے گا۔ اس نے ایک بہت بڑی غلطی کی بنیاد پر ہمیں پکڑ لیا تھا۔ دلاور ہمارا دشمن تھا' اس لیے ہم اس کے لیے ذرا بھی پریشان نہیں تھے۔ ہم نے اسے لات کہنے کی غلطی کی تھی۔ دوسری غلطی اس کو گاڑی کی پچھلی سیٹ پر ڈالنا تھا۔ اگر واقعی ہمارا کوئی دوست یا عزیز اس حالت میں ہوتا تو ہم اتنی بے رحمی سے پیش نہ آتے۔ اسے رات بھر گیراج میں ڈال کے نہ رکھتے اور یوں گاڑی میں لٹا کے نہ لے جاتے۔ اصل بات یہ تھی کہ ہمارے دل میں اس کے لیے ہمدردی یا رحم کے جذبات کا وجود بھی نہیں تھا۔ ہماری بلا سے وہ جیئے یا مرجائے۔ اسے کتنی اذیت ہے' ہمیں فکرمند ہونے کی کیا ضرورت ہے؟

یہ سارا کھیل بھی قسمت کا ہے۔ ہاتھی نکل جاتا ہے اور دُم رہ جاتی ہے۔ سب کچھ جو ہم پیرس اور لندن میں کرتے رہے' قانون شکنی' بدمعاشی اور دہشت گردی کے زمرے میں آتا تھا۔ ہم نے جیل سے اسپتال تک ہر جگہ گڑبڑ پھیلائی مگر پکڑے نہیں گئے۔ جعلی پاسپورٹ پر پیرس پہنچ گئے۔ لندن میں داخل ہوگئے جہاں ہمارا داخلہ ممنوع تھا۔ چوہدری دلاور کی کوشش سے ہم پر یہ الزام بھی آگیا تھا کہ سر رچرڈ گورڈن پر قاتلانہ حملہ ہم نے کیا تھا اور ہماری دیدہ دلیری کہ ہم نے الزبتھ کو فون پر دھمکی دی۔ ہم غیر قانونی طور پر آئے تھے اور ہم نے دلاور کو بھی پکڑ لیا تھا۔ غیر قانونی طور پر ہماری واپسی کا انتظام بھی بہترین ہوگیا تھا۔ ہم نے ڈاکٹر شاہ کو مار کے اس کی لاش سے بھی بہ آسانی نجات حاصل کرلی تھی۔ پکڑے ہم کیسے گئے تھے؟ صرف کار غلط جگہ پارک کرکے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو سارجنٹ کار کے اندر نہ جھانکتا۔ جیسے سارے راستے میں کسی نے ہم سے نہیں پوچھا تھا کہ پچھلی سیٹ پر ایک آدمی کیوں لیٹا ہوا ہے۔ ہم یہاں نہ کھڑے ہوتے تو کسی کو دلچسپی نہ ہوتی۔ یہ محض بدقسمتی تھی کہ ایک سارجنٹ نے گاڑی کو غلط جگہ کھڑا دیکھا اور ہم سے سوال جواب کرنے آگیا۔

"کیا میں اسے جگا سکتا ہوں؟" سارجنٹ نے کہا۔

"ضرور جگاؤ" محسن بولا "مگر یہ جاگے گا نہیں۔"

"وہ ڈاکٹر کہاں ہے جس کی یہ کار ہے۔ میں اس سے بات کروں گا" وہ بولا "تم نے کہا کہ ایمبولینس آنے والی ہے۔"

"ہاں۔ ہمیں فلائٹ پکڑنی ہے۔"

"کون سی فلائٹ؟" اس نے کہا۔

"چارٹرڈ فلائٹ ہے" میں نے کہا۔

"ویری گڈ" اس نے طنز سے کہا "تم چارٹرڈ فلائٹ سے جاسکتے ہو۔ پیرس جانے کے لیے تم سینٹ تھامس اسپتال سے ائرکنڈیشنڈ ایمبولینس حاصل کرتے تو اب تک پیرس میں ہوتے۔ اور وہ ایمبولینس ایک موبائل آئی سی یو ہوتی' تم دونوں باہر آجاؤ۔"

میں نے کہا "آفیسر' بات سمجھنے کی کوشش کرو۔"

"وہی کررہا ہوں۔ ابھی تک مجھے تمہاری کوئی بات سمجھ نہیں آئی۔ اب یا تو تم مجھے یہاں سمجھادو ورنہ میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور تفصیل سے سب سمجھوں گا کہ یہ چکر کیا ہے" اس نے سخت لہجے میں کہا۔

"چکر کی کون سی بات ہے؟" میں نے اپنے حواس بحال رکھتے ہوئے پُرسکون لہجے میں کہا۔

"تم نے کہا کہ تم پاکستانی ہو؟"

میں نے اپنا پاسپورٹ اسے پیش کردیا "میں ایک وکیل بھی ہوں' خوش قسمتی سے۔"

اس نے پاسپورٹ دیکھا اور مجھے واپس کردیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ابھی تک میرا نام اور حلیہ اس حد تک مشتہر نہیں ہوا تھا کہ ساری لندن کی پولیس میرے کارناموں سے واقف ہوتی اور مجھے شناخت کرتی۔

"تم نے پہلے مجھ سے انگریزی میں بات کی پھر آپس میں فرنچ بولی' تمہاری مادری زبان کیا ہے؟"

"اردو۔ تم لوگ اسے ہندوستانی کہتے ہو۔"

"رائٹ۔ یہ ایک فطری بات ہے کہ راز کی بات ہو تو یہاں لوگ آپس میں مادری زبان بولتے ہیں۔ تیسرا شخص نہیں سمجھ سکتا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ تم نے فرنچ کیوں بولی تھی؟"

وہ میری توقعات سے کہیں زیادہ کائیاں ثابت ہو رہا تھا۔ میں نے کہا "کیا فرنچ میں بات کرنا جرم ہے؟"

"جرم کی بات مت کرو۔ میں نے کہا کہ یہ خلافِ فطرت ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ تمہارا اصل مقصد مجھے چکر دینا تھا۔ یہ یقین دلانا تھا کہ تم پیرس میں رہتے ہو۔ پیرس میں رہنے والے سب انڈین ہر وقت فرنچ نہیں بولتے۔ اب مجھے شک ہے کہ تم پیرس میں نہیں رہتے۔" اس نے چند سیکنڈ کا ڈرامائی وقفہ دیا اور پھر بولا "مزید یہ کہ..... جو تم نے ایک دوسرے سے کہا' وہ میں نے سمجھ لیا تھا۔ تمہاری بدقسمتی کہ میں فرنچ سمجھتا ہوں۔"

پھر اس نے وہ سب دُہرادیا جو میں نے اور محسن نے ایک دوسرے سے کہا تھا۔ میں اور محسن اس کے سامنے مجرم بن گئے تھے اور ہماری گرفتاری اب یقینی ہو چکی تھی۔

اگر یہ لندن نہ ہوتا' اپنا لہور شریف ہوتا تو پریشانی کی کوئی بات نہ ہوتی۔ میں آخری وقت تک حوصلہ نہ ہارتا۔ میں آسانی سے قانون کے نمائندے کو نتیجہ خیز مذاکرات پر آمادہ کرلیتا اور ہم باہمی مفاد کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس قانونی شکل کا مالیاتی حل تلاش کرلیتے۔ عرفِ عام میں اس کو ٹُک مکا کہا جاتا ہے۔ فریقین ہنسی خوشی پیار محبت سے دس منٹ میں قانونی معاملات طے کرلیتے ہیں جو عدالت میں دس سال میں طے نہیں ہوتے۔ پھر سب اپنی اپنی راہ لیتے ہیں۔ اگر بدقسمتی سے وہاں بھی کوئی فرض شناس پولیس افسر مل جاتا (مشہور ہے کہ پولیس اور کسٹم جیسے محکموں میں بھی ایماندار افسر ہوتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب) تو میرے پاس دوسرا مشکل راستہ تھا۔ میں بقول طوطی صاحب کے زورِ بازوئے مسلم دکھا کے نکل جاتا۔

لیکن یہاں صورتِ حال اس کے برعکس تھی۔ پولیس کی اکثریت اپنی تنخواہ میں گزارا کرنے کی قائل تھی چنانچہ وہ ٹک مکا کی کوشش کو بھی جرم بنادیتے تھے کہ رشوت دینے کی کوشش کی حالانکہ جو نذرانہ خلوص اور محبت سے پیش کیا جائے' اسے قبول کرلینا چاہیے۔ یہ تو دو طرفہ سودا ہے۔ ہم نے آپ کو رشوت دی' آپ نے ہمیں آزادی دی کہ جاؤ عیش کرو' تم نے کچھ نہیں کیا۔ رشوت تک نہیں دی۔

دوسرا مشکل طریقہ یعنی زورِ بازوئے مسلم دکھا کے نکل جانے کا' عملی طور پر خودکشی کے مترادف تھا۔ پولیس پوری طرح مسلح اور مستعد ہوتی ہے۔ وہ گولی مارنے سے دریغ نہیں کرتے اور ان پر حملہ انتہائی سنگین جرم تصور کیا جاتا ہے۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ وہاں بڑے بڑے بدمعاش پولیس کا بیج دیکھتے ہی سیدھے ہو جاتے ہیں۔ سارے زمانے میں مار دھاڑ کرنے والے' پولیس مین پر ہاتھ نہیں اٹھاتے۔ یہ صرف خوف کی بات نہیں' غالباً مجرم بھی قانون کا تھوڑا بہت احترام ضرور کرتے ہیں۔

اس وقت ایک پولیس آفیسر نے صورتِ حال کو کنٹرول کر رکھا تھا تو دوسرا کار میں بیٹھا ہوا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اگر یہ جرح کرنے والے کو ناک آؤٹ کرتا تو دوسرا دور ہی سے مجھے شوٹ کردیتا۔ فرار کے لیے ڈاکٹر کی کار موجود تھی مگر پولیس کار سے ریس میں کوئی نہیں جیت سکتا۔ اس کی وجہ پولیس کا مرکزی طور پر مربوط نظام ہے۔ کوئی فرار ہونا چاہے تو ایک پیغام ہر جگہ موصول ہو جاتا ہے اور شہر کے تمام راستوں سے پولیس کی گاڑیاں ایک سمت میں روانہ ہو جاتی ہیں۔ وہ فرار کے راستے بند کرتے ہوئے فرار ہونے والے کو کہیں بھی ہر طرف سے محصور کرکے پکڑ لیتے ہیں۔

ان سب باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے کہا "اچھا آفیسر' اب تم بتادو کہ کیا چاہتے ہو؟"

"کیا یہ بتانے کی ضرورت ہے؟" اس نے طنز سے کہا "تم بے وقوف آدمی نہیں ہو۔ خود کو قانون کے حوالے کردو۔ اگر تم بے گناہ ہو تو تمہیں کوئی خطرہ نہیں۔ ہم مطمئن ہو جانے کے بعد تمہیں چھوڑ دیں گے۔"

میں نے کہا "لیکن اس مریض کا کیا بنے گا۔"

"اگر یہ واقعی مریض ہے تو اسے اسپتال منتقل کردیا جائے گا۔"

"سینٹ تھامس اسپتال میں اس کا پورا ریکارڈ ہے اور وہاں ڈاکٹر فریزر بھی ہیں" میں نے کہا "لیکن ایک بات بتانا اب ناگزیر ہو گیا ہے۔ یہ مریض ایک خطرناک مجرم ہے۔ بین الاقوامی سطح کا دہشت گرد رہا ہے اور اب بھی پاکستان میں ایک مافیا کو کنٹرول کرتا ہے۔ ہم اس کے تعاقب میں تھے اور اب اسے گرفتار کرکے واپس لے جا رہے ہیں۔"

اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں "کیا تم پولیس سے تعلق رکھتے ہو؟"

"نہیں۔ لیکن پولیس کی ایک مددگار تنظیم ہے ایم آر ایس" محسن نے کہا۔

"ایم آر ایس؟ اس سے کیا بنا؟"

"وہ تم نہیں سمجھ سکو گے۔ یہ رضاکار تنظیم ہے جو معاشرے میں لاقانونیت کے خلاف جہاد کرتی ہے۔ اور ایسے مجرموں سے اپنے طور پر نمٹتی ہے جن کے سامنے قانون بے بس ہو۔ تم یقیناً یہ بات سمجھ سکتے ہو کیونکہ ایسے چالاک اور بااثر مجرم ہر ملک اور معاشرے میں پائے جاتے ہیں جو قانون کو غیر مؤثر بنادیتے ہیں یا خرید لیتے ہیں' بے بس کردیتے ہیں یہاں تک کہ بدل دیتے ہیں۔ یہ بھی ایک ایسا ہی مجرم تھا۔ اگر ہم اسے نہ پکڑتے اور اس کے خلاف ثبوت اکٹھے نہ کرتے تو شاید یہ کبھی ہاتھ نہ آتا۔ ہمارے ملک میں اسکاٹ لینڈ یارڈ جیسے ادارے نہیں ہیں اور ہوتے' تب بھی ایسے لوگوں کو فرق نہ پڑتا۔" محسن نے بڑے اعتماد سے کہا۔

وہ کچھ متاثر ہوا اور کچھ حیران۔ "مگر یہ تو مرنے والا ہے' تم نے بتایا۔"

"میں نے غلط نہیں بتایا۔ یہ اس وقت پکڑا گیا جب اس کے پکڑے جانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اگر اس کے سارے جرائم پر اسے عدالت میں پیش کیا جاتا تو ہمارے ملک کے قانون کے مطابق اسے ہر جرم پر سزائے موت دی جاتی لیکن جس شخص کا دو مہینے سے زیادہ زندہ رہنا ممکن ہی نہ ہو اسے کون سزائے موت دے سکتا ہے۔ دو مہینے میں تو ہمارے عدالتی نظام کا پہیہ حرکت میں بھی نہیں آتا۔ اپیل اور آخری اپیل کے مسترد ہونے میں دو سال سے کم نہیں لگتے۔ چنانچہ اب یہ چاہتا تھا کہ ہم اس سے سودا کرلیں۔ یہ ہر قیمت دینے کو تیار تھا اگر اس کو پولیس کے حوالے نہ کیا جائے۔ لندن میں رہنے کی اجازت دی جائے اور پاکستان سے اس کے بیوی بچوں کو بلا لیا جائے۔ مگر ہم نے اس کی آفر قبول نہیں کی۔ ہم اسے اپنے خرچ اور انتظام پر واپس پاکستان لے جا رہے تھے۔"

اس نے سرہلایا "اگر یہ سب درست ہے تو پھر تمہیں پولیس اسٹیشن جاکے وضاحت کرنے میں اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔"

میں نے کہا "ہم قانون سے تعاون کرنے والے لوگ ہیں اور کبھی اپنی قانونی حدود سے تجاوز بھی کرتے ہیں تو صرف قانون کی مدد کے لیے۔ اعتراض کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

محسن نے کہا "تمہیں یہ جان کر خوشی ہوگی کہ ہم نے چار سال اسی لندن شہر میں تعلیم حاصل کرتے گزارے تھے۔ یہاں ہمارے بہت سے مستند حوالے ہیں۔ بہت لوگ ہمیں جانتے ہیں' فرنچ ہم نے یہیں رہ کے سیکھی تھی۔"

"خوشی مجھے اس وقت ہوگی کہ جب یہ سچ ثابت ہو جائے گا۔ تمہاری وہ ایمبولینس اب تک کیوں نہیں آئی۔"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ جو شخص مجھے یہاں انتظار کرنے کے لیے کہہ گیا تھا' وہ غائب ہے۔ ممکن ہے اس نے پولیس کو دور سے دیکھ لیا ہو؟"

"مطلب یہ کہ وہ اب نہیں آئے گا؟ ایسی صورت میں ہم پولیس کی ایمبولینس منگوا سکتے ہیں۔" وہ بولا "تم میرے ساتھ آؤ۔ اور دیکھو' چالاک بننے کی کوشش مت کرنا۔"

"تمہیں یہ جملہ بولنے کی عادت ہو گئی ہے" میں نے پولیس کار کی طرف چلتے ہوئے کہا "تم شریف آدمی سے اور بدمعاش سے ایک ہی لہجے میں بات کرتے ہو۔"

"قانون میں دو لہجے' شریفانہ اور غیر شریفانہ نہیں ہوتے" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا "اور نہ ہم کسی کی صورت سے یا باتوں سے متاثر ہوتے ہیں۔"

مجھے اور محسن کو پولیس کار میں بٹھانے کے بعد اس نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص سے کہا "ایک ایمبولینس کال کرو۔ اسے یہ لوکیشن دو۔ ایک خطرناک مریض کو فول پروف پولیس کسٹڈی میں سینٹ تھامس اسپتال شفٹ کرنا ہے۔"

ایمبولینس کے آنے تک وہ ایک لمحے کے لئے بھی ہماری طرف سے غافل نہیں ہوا۔ یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ وہ فرنچ سمجھتا ہے' میں نے محسن سے اردو میں بات کرنا مناسب سمجھا۔

"مجھے یہ شخص نیک اور رحم دل لگتا ہے شیروانی صاحب!"

"بجا ارشاد۔ یہ تھانے لے جا کے ہماری خاطر تواضع کرے گا' ہم سے رو رو کے اپنی بے مروتی پر معافی مانگے گا اور پھر ہمیں تحفے تحائف دے کر اپنی کار میں رخصت کرنے ائرپورٹ آئے گا۔"

"میرا مطلب ہے کہ..... اسے ہم پر ابھی تک یہ شک نہیں کہ ہم خود بھی مفرور مجرم ہیں اور حدودِ برطانیہ میں غیر قانونی طور پر قیام پذیر ہیں۔"

"لیکن اسے معلوم ہو جائے گا۔" محسن بولا۔

"جب تک اسے کچھ پتا چلے' ہمارے پاس ایک چانس ہے۔ ہم اسے تفصیل سے چوہدری دلاور کے جرائم سے آگاہ کریں۔ یہ بتائیں کہ ہمارا اس کو یہاں آکے پکڑنا اور اپنے ساتھ لے جانا کیوں ضروری تھا۔ ہم ڈاکٹر تیسلی کا حوالہ دے سکتے ہیں اور اس کے قتل سے پہلے چوہدری دلاور نے جو دُہرے قتل کی واردات کی تھی' اس کے چشم دید گواہ کو بُلوا سکتے ہیں۔"

محسن نے کہا "اگر ہم یہاں کے قانونی معاملات میں ملوث ہوگئے تو پھر پھنس جائیں گے۔ ڈاکٹر تیسلی مرڈر کیس کا حوالہ کافی ہے۔ اگر پولیس چاہے تو یہاں وزارتِ داخلہ یا خارجہ کے متعلقہ افسر سے شہادت بھی حاصل کرسکتی ہے۔ وہ ایک برطانوی شہری تھی اور اس کے قتل کی تفتیش کے مسئلے پر دونوں حکومتوں کے درمیان سرکاری سطح پر مراسلت بھی ہوئی تھی۔ ان کو بتایا جاسکتا ہے کہ لاہور کے نامور وکیل کون ہیں۔ ایک خاتون بیرسٹر ہیں مس رابعہ قاری' وہ اتفاق سے پیرس میں مقیم ہیں۔"

"اتفاق سے" میں نے محسن سے اتفاق کیا۔

"اس کے علاوہ ایک عبدالودود منظر ہیں... اور وقار یوسف۔"

"بے وقوف آدمی' وقار یوسف میں خود ہوں۔"

"خوب یاد دلایا۔ میں آپ کو سکندر بخت سمجھے بیٹھا تھا۔"

میں نے اسے خونی نظروں سے دیکھا "تو کیوں مجھے اپنا قاتل بنانا چاہتا ہے آخر۔ ایسے میرا نام لینے کا کیا مقصد ہے؟"

محسن نے کہا "معاف کرنا' روانی میں زبان پر آگیا۔"

"مجھے روانی میں پھانسی ہو جائے گی۔ پھانسی نہ سہی جیل میں چکی پیستے جوانی ضرور گزر جائے گی۔ آپ کہہ دیں گے سوری۔"

محسن نے کہا "لے بھائی' مسلح ایمبولینس آگئی۔"

میں نے کہا "وہ خبیث ہائی جیک بھاگ گیا۔"

"اس نے تاڑلیا ہوگا کہ دال میں کچھ کالا پڑگیا ہے۔ ہمیں اس کا نام لینے کی ضرورت نہیں۔ وہ آدمی پھر ہمارے کام آسکتا ہے۔"

"دو چار سال بعد۔ جب ہم یہاں کاؤنٹی جیل سے رہا ہوں گے۔"

محسن بولا "اللہ سب ٹھیک کرے گا۔ یہ مت بھولو کہ تم ابھی تک ایم آر ایس کے چیف ہو' چیف کے ٹو۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہم کس حد تک اور کیسے پولیس کو متاثر کرتے ہیں۔"

میں نے مایوسی سے سرہلایا "یہ لوگ آسانی سے متاثر نہیں ہوتے۔ حقائق کچھ بھی ہوں' ان کی قانونی منطق اپنی جگہ رہتی ہے۔"

پولیس آفیسر ایمبولینس کے روانہ ہوتے ہی میرے ساتھ آبیٹھا۔ اب اس نے ریوالور بھی نکال لیا تھا۔ محسن اگلی سیٹ پر تھا اور بہت پُرسکون نظر آنے کی کوشش کررہا تھا۔

"میں نے غلطی کی تم کو یہ بتا کے کہ مجھے فرنچ آتی ہے" میرے ساتھ بیٹھنے والا بولا "اب تم آگئے ہو اپنی مادری زبان پر۔"

"یہ مشورہ تم نے ہی دیا تھا۔ کوئی بات نہیں' عقل مند آدمی سے بھی غلطی ہوجاتی ہے۔" محسن مسکرادیا "تمہارے خیال میں پولیس اسٹیشن پہنچ کے ہمیں کتنا وقت ضائع کرنا پڑے گا؟"

"پولیس کے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت نہیں ہوتا" وہ برا مان کے بولا "یہ تم پر منحصر ہے کہ تم کتنی دیر میں خود کو بے قصور ثابت کرتے ہو۔"

"کیا سچ کو بھی ثبوت کی ضرورت ہوتی ہے؟" میں نے کسی فلسفی کی طرح کہا۔

"ہوتی ہے' عدالت میں۔"

پولیس اسٹیشن بڑی جدید وضع کی خوب صورت اور صاف ستھری عمارت تھی۔ ہمیں ایک علیحدہ کمرے میں بٹھادیا گیا۔

میں نے کہا "اس سے پہلے کہ تم مجھے میرے قانونی حقوق یاد دلاؤ' میں تم کو یاد دلادوں کہ میرا تعلق بھی قانون کے پیشے سے ہے۔ تم نے میرے پاسپورٹ پر میرا پیشہ دیکھا ہوگا۔"

اس نے اقرار میں سرہلایا "اور تم کیا چیز ہو؟" وہ محسن سے بولا۔

"میں وہ چیز ہوں جسے صحافی کہتے ہیں۔ میری شہرت واقعی بین الاقوامی ہے" محسن بولا۔

"ٹھیک ہے۔ اب یہ بتاؤ کہ تمہیں اپنی صفائی میں کیا کہنا ہے؟" اس نے ہمارے مقابل بیٹھ کے کہا۔

"اپنی صفائی میں؟" میں نے کہا "ہم نے کیا جرم کیا ہے کہ ہم اپنی صفائی پیش کریں آفیسر؟"

وہ مجھے گھورنے لگا "ہوشیار مت بنو۔ تم جانتے ہو کہ تم نے کیا کیا ہے؟"

میں نے کہا "تم بھی مجھے دبانے کی کوشش مت کرو۔ تم کسی مجرم سے نہیں' ایک معزز وکیل سے بات کررہے ہو۔ گاڑی غلط جگہ پر کھڑی ہوئی تھی' میں مانتا ہوں مگر میں بتاچکا ہوں کہ وہ گاڑی میری نہیں تھی۔ تم کاغذات دیکھ کے تصدیق کرچکے ہو کہ وہ گاڑی کس کی تھی۔ میں اسے چلا بھی نہیں رہا تھا۔ اگر اس میں بیٹھنا میرا جرم ہے تو بتاؤ۔"

"تم نے ایک مریض کے بارے میں غلط بیانی کی۔"

"کیا غلط بیانی کی!" میں نے کہا "اب تک تمہاری پولیس ایمبولینس اسپتال پہنچ گئی ہوگی۔ تم تصدیق کرسکتے ہو کہ وہ برین ٹیومر سے مرنے والا ہے۔ اس کی آخری اسٹیج ہے اور وہ ساری رپورٹس اسی کی ہیں۔"

محسن نے کہا "اور جب یہ ثبوت مل جائے گا تو ہم تمہارے خلاف کیس کریں گے۔ تم نے ہمیں جھوٹا کہا' بے وجہ پریشان کیا۔ اختیارات سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے ہمیں گرفتار کرکے پولیس اسٹیشن لائے۔ یہ کہا کہ فرنچ بولنا جرم ہے' ہمیں اپنی مادری زبان میں بات کرنی چاہیے۔"

"تم کون ہوتے ہو اور کس نے اختیار دیا ہے تمہیں کہ کسی کو مادری زبان میں بات کرنے پر مجبور کرو" میں نے کہا۔

وہ نخیہ زہوگیا "دیکھو' بلاوجہ شور مت کرو۔"

"یہ شور ہے' شریفانہ گفتگو کو تم شور کہتے ہو۔ تم نے ہمیں پیرس جانے سے روکا۔ ہماری چارٹرڈ فلائٹ تھی۔ اس کا نقصان کون پورا کرے گا' پولیس ڈیپارٹمنٹ یا تم؟"

"تم نے کہا تھا کہ وہ مریض ایک خطرناک مجرم ہے۔"

"ہاں۔ کاؤنٹی جیل میں ایک نیگرو ہے جارج۔ بلاشبہ وہاں جارج بہت ہوں گے مگر اس کا کیس حال ہی میں بہت مشہور ہوا تھا۔ اسے جیل کے اندر قتل کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس کے انگریز وکیل نے' جس کا نام اس وقت مجھے یاد نہیں آرہا ہے' جیل حکام کو نوٹس بھی دیا تھا۔ تم اس وکیل کو بلاؤ' وہ تم کو پوری ہسٹری بتائے گا چوہدری دلاور کی۔"

"یہ چوہدری دلاور کون ہے؟"

"وہی مریض جس کو تم نے اسپتال بھیج دیا۔ اس پر پاکستان کی ایک عدالت میں بھی ایک برٹش ڈاکٹر کو قتل کرنے کا کیس چل رہا ہے۔ وہ یہاں سے لاہور گئی تھی اور اسے وہیں قتل کردیا گیا تھا۔ حال ہی میں اس کی لاش دوبارہ نکال کے پوسٹ مارٹم کیا گیا تو جرم دلاور پر ثابت ہوا۔ وہ بھاگ کے لندن آگیا۔"

"کیا نام تھا اس لیڈی ڈاکٹر کا؟"

"ڈاکٹر شیلی" میں نے کہا "یہ دلاور لندن میں اس ڈاکٹر کی بہن کو اور اس کے شوہر کی ایک گرل فرینڈ کو پہلے ہی قتل کرکے فرار ہوگیا تھا۔ اس کے شوہر کا نام جارج ہے۔ جارج خود تمہیں سب کچھ بتا سکتا ہے اگر تم کاؤنٹی جیل جاکے پوچھو۔"

"وہاں جانے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم فون پر معلوم کرلیتے ہیں۔"

"ضرور معلوم کرو۔ بہتر یہ ہوگا کہ تم جارج کے وکیل کو بلالو۔ اس کا نام غالباً الفریڈ ہے" میں نے کہا "وہ ہمیں شناخت بھی کرسکتا ہے۔"

"ایک اور مشہور شخص ہے یہاں' ایک اخبار کا مالک۔ حاجی علم دین طوطی" محسن بولا "میں چاہتا ہوں کہ وہ یہاں آجائے' تم نے ایک وکیل اور ایک جرنلسٹ کو گرفتار کیا ہے۔"

"میں نے تمہیں ابھی تک گرفتار نہیں کیا۔"

"پھر یہ کیا ہے؟ کیا ہم پولیس اسٹیشن تمہاری دعوت کھانے آئے ہیں؟ آخر یہ خبر سب اخباروں میں آنی چاہیے۔"

"اس دھمکی سے میں نہیں ڈرتا کیونکہ میں نے کچھ نہیں کیا۔ اگر مجھے قانون کی خلاف ورزی کا شبہ ہو تو اپنا شک رفع کرنا میرا فرض ہے۔ نمبر بتاؤ اس اخبار کے مالک کا۔ کیا نام تھا اس کا' ٹوٹی ڈین.... اور کچھ....."

"حاجی علم دین طوطی" محسن نے نمبر لکھوا کے کہا "اگر وہ خود نہ ہوں تو اپنے چیف رپورٹر کو بھیج دیں۔"

میں نے کہا "ایک نمبر اور لکھو' پیرس کا نمبر ہے۔ یہاں خاتون بیرسٹر رابعہ قاری موجود ہیں اتفاق سے۔"

"بالکل اتفاق سے" محسن نے سرہلایا۔

"وہ پاکستان کی ٹاپ رینکنگ لائر ہیں" میں نے کہا۔

"اس قدر افراتفری کی کیا ضرورت ہے۔ تمہیں پھانسی تو نہیں دی جارہی ہے یہاں" پولیس سارجنٹ بولا "اگر تم اپنی پوزیشن کلیئر کرسکتے ہو اور میں مطمئن ہوجاتا ہوں تو تم جاسکتے ہو۔"

"اوکے۔ پہلے تم اسپتال فون کرو" میں نے کہا۔

مگر میری بات ختم ہونے سے پہلے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے ریسیور اٹھا کے کہا "ہیلو۔ ہاں' سینٹ تھامس اسپتال سے' ہاں بولو۔"

میں نے اور محسن نے پُرامید نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ سارجنٹ اپنے ماتحت سے بات کررہا تھا اور بیچ بیچ میں کہاکے کوئی سوال بھی پوچھ رہا تھا۔ چند منٹ کے بعد اس نے ریسیور رکھ دیا اور ہمیں دیکھنے لگا۔ اپنی شکست پر ندامت کے آثار اس کی آنکھوں سے عیاں تھے۔

"کیوں' کیا معلوم ہوا؟" میں نے کہا۔

"تمہاری بات کی تصدیق ہوگئی۔ اس مریض کی حالت واقعی نازک ہے۔ اسپتال والوں نے اسے داخل کرنے سے انکار کردیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اب ہم کچھ نہیں کرسکتے۔ اس کو ریڈیو تھراپی کی ضرورت ہوگی۔"

ریڈیو تھراپی کے بارے میں ابھی ڈاکٹرز نے کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا کہ کب ہوگی اور کتنی۔ ریڈیو تھراپی کی مقدار کا تعین مریض کی حالت اور قوتِ برداشت کے مطابق کیا جاتا ہے۔" میں نے کہا۔

"کیا اب تم اسے اپنے گھر رکھوگے؟" محسن نے کہا۔

میں نے کہا "یا وہ ایمبولینس ہی اسے پیرس پہنچادے گی؟"

سارجنٹ نے سوچ کے کہا "اگر تم چاہتے ہو تو یہ انتظام بھی ہوجائے گا اور میرا مشورہ ہے....."

میں نے کہا "ہمیں تمہارے مشورے کی ضرورت ہوگی تو ہم مانگ لیں گے۔"

محسن بولا "اب تم الفریڈ کو بلالو۔"

"یعنی پہلے میں کاؤنٹی جیل کے کسی افسر سے بات کروں' پھر تمہارے اسی مشہور جارج کا حوالہ دوں۔ اسے بلواکے وکیل کا صحیح نام اور فون نمبر لوں اور پھر وکیل سے کہوں کہ یہاں آجائے؟"

"ہاں۔ اگر وہ گھر پر موجود ہو یا آفس میں.....اور تمہارے حکم پر دوڑا چلا آئے" میں نے کہا۔

"میں کوشش کرتا ہوں۔"

"جب تک تم کوشش میں مصروف ہو' ہمارے لیے کھانے پینے کا انتظام کرو' ادائیگی ہم کریں گے۔"

"تم کچھ بھی منگوا سکتے ہو۔"

میں نے کہا "کافی اور سینڈوچ۔ آملیٹ پنیر اور سلاد والے جس میں گوشت نہ ہو۔" میں نے کہا "جب تم فون کرکے فارغ ہوجاؤ تو فون مجھے دینا' میں ایک دو کالیں کروں گا۔"

پھر آدھے گھنٹے تک ہم اطمینان سے بیٹھے رہے۔ کافی اور ہماری پسند کے سینڈوچ آنے تک اردو میں بات کرتے رہے اور اپنی حکمتِ عملی طے کرتے رہے۔

"ایک سچ تو ثابت ہوگیا" میں نے کہا "دوسرا بھی ثابت ہوجائے گا۔ جارج یا اس کا وکیل بتادیں گے کہ چوہدری دلاور ایک قاتل ہے اور مفرور مجرم ہے۔"

"کہیں وہ یہاں کے دُہرے قتل کا کیس نہ شروع کردیں۔ اور دلاور کو یہاں نہ روک لیں۔"

"جارج انہیں بتادے گا کہ دلاور کا لاہور کی عدالت میں پیش ہونا بھی ضروری ہے ڈاکٹر شیلی مرڈر کیس میں۔ سب کچھ اس کے بیان پر ہے۔ اس نے اتنا ہی بتایا جتنا پوچھا گیا تو پھر کوئی خطرہ نہیں۔ اور اس نے شروع کردی پوری ظلم کی داستان تو شاید معاملہ بگڑ جائے۔"

سارجنٹ فون پر بات کرتے ہوئے کن انکھیوں سے ہمیں دیکھتا جارہا تھا کیونکہ اردو کے جملوں میں اس نے ڈاکٹر شیلی مرڈر کیس اور جارج کا ذکر بھی سنا تھا۔ تقریباً دس منٹ کے بعد اس نے تھک کر ریسیور رکھ دیا۔

"میں تو ناکام ہوگیا تمہارے اس جارج سے رابطہ کرنے میں۔ اس کا پورا نام کیا ہے' نمبر کیا ہے؟"

میں نے فون خود لے لیا "کاؤنٹی جیل کا نمبر بتاؤ۔"

کاؤنٹی جیل میں مجھے بھی اچھی خاصی بحث کرنی پڑی مگر میری اس بات کا اثر زیادہ ہوا تھا کہ میں وکیل ہوں۔ وہ مجھے جارج کا وکیل سمجھے اور جب میں نے ان واقعات کے حوالے سے بات کی جو گزشتہ تین روز میں جارج کے ساتھ پیش آئے تھے تو مطلوبہ جارج کو تلاش کرلیا گیا۔ اس کی آواز سُن کے میں نے کہا "ہیلو جارج!"

"کون ہو تم؟" وہ بولا۔

"وہی، جس کا نام لے کر ایک دشمن چوہدری دلاور نے تمہیں زہریلی سگریٹ پلادی تھی۔"

"سکندر بخت، تم سکندر بخت ہو؟" وہ چِلّا کے بولا۔

"ہاں۔ مگر میں یہاں پولیس اسٹیشن پر بیٹھا ہوں۔ یہ لوگ ماننے پر تیار نہیں کہ چوہدری دلاور مجرم ہے۔ ہم اسے لاہور لے جارہے تھے۔ تم اسے صرف ڈاکٹر شبلی کے بارے میں بتاؤ" میں نے ریسیور سارجنٹ کو تھمادیا۔

اس نے جارج کی بات سنی لیکن صاف ظاہر تھا کہ اس کا جوش و خروش پہلے سے بہت کم ہوگیا ہے۔ وہ مجبوراً جارج کی گواہی سنتا رہا جس سے چوہدری دلاور واقعی خطرناک مجرم ثابت ہوتا تھا۔ میں نے "صرف" کا لفظ استعمال کیا تھا مگر مجھے کم امید تھی کہ جارج اسے نوٹ کرے گا۔ اندیشہ ضرور تھا کہ وہ اشتعال کے جذبات میں چوہدری دلاور کو گالیاں دے گا تو اس کے خلاف پوری فردِ جرم پڑھ دے گا۔

سارجنٹ کے اور جارج کے درمیان خاصے زوردار مکالمے ہوئے تھے۔ سیاہ و سفید نسلوں کے تعصب کی بنیاد پر بھی انہوں نے ایک دوسرے کو گالیاں دیں مگر سارجنٹ اپنے مطلب کی بات معلوم کرنے میں کامیاب رہا۔ اگر اسپیکر والا فون ہوتا تو ہم جارج کی بات بھی سُنتے۔ سارجنٹ کے یک طرفہ مکالموں سے بھی ہم نے اندازہ کرلیا کہ جارج نے ہمارے بیان کی تصدیق کردی ہے۔

"اچھا کالے کتّے، اب بھونکنا بند کرو۔ مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارے وکیل کا نام کیا ہے اور ٹیلی فون نمبر کیا ہے؟ بولو، بکواس مت کرو" سارجنٹ نے ایک کاغذ پر کچھ لکھا اور پھر ریسیور کو دھڑ سے کریڈل پر مارا "باسٹرڈ۔"

میں نے کہا "تمہارا چہرہ سُرخ ہورہا ہے۔ ماتھے پر پسینا ہے، کہیں تم کو ہارٹ اٹیک تو نہیں ہورہا ہے۔"

"تمہارا بلڈ پریشر بہت بڑھ گیا ہے سچ سُن کے" محسن بولا "تم مجھے کچھ پریشان بھی نظر آرہے ہو۔"

"صرف تمہارا خیال ہے" وہ غرا کے بولا اور پھر جارج کے وکیل کا نمبر ملانے لگا۔

حسبِ توقع الفریڈ نے سارجنٹ سے بات کرنے سے انکار کردیا۔ اس کی سیکریٹری نے کہہ دیا کہ وہ کلائنٹس کے ساتھ مصروف ہے اور اسے ڈسٹرب نہیں کیا جاسکتا۔ جب وہ فارغ ہوگا تو تمہیں فون کرے گا۔

سارجنٹ نے سخت توہین محسوس کی "کیا سمجھتا ہے وہ خود کو آخر۔ میرا کون سا ذاتی کام تھا۔ اب اس کا فون آنے تک تم بیٹھو۔"

میں نے کہا "کیا میں کوشش کرکے دیکھ سکتا ہوں۔ شاید پولیس مین کے مقابلے میں وہ اپنے ہم پیشہ وکیل کی بات سُننے کے لیے وقت نکال لے۔"

اس نے فون میری طرف کھسکا دیا۔ میں نے نمبر ملا کے اس کی سیکریٹری سے کہا "میں وقار یوسف ایڈووکیٹ بول رہا ہوں۔ مجھے ایک کلائنٹ کے مسئلے پر ضروری بات کرنی ہے۔ معاملہ اس کی زندگی اور موت کا ہے۔"

سیکریٹری نے لائن ملادی۔ میں نے الفریڈ کی ہیلو سُنی۔

"آئی ایم سوری کہ میں نے تمہیں ڈسٹرب کیا۔ دراصل مجھے پولیس نے پکڑلیا ہے" میں نے کہا۔

"پھر کیا تم مجھ سے توقع رکھتے ہو کہ میں کلائنٹس کو چھوڑ کے تمہاری ضمانت کرانے کے لیے دوڑا چلا آؤں۔"

"اوہ نو۔ یہاں ایک سارجنٹ موجود ہے جو ہماری بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں۔ تم ڈاکٹر شبلی مرڈر کیس کے ملزم کو جانتے ہوتا۔"

"وہ کون ہے؟"

"چوہدری دلاور۔ اس کی وجہ سے وہ نیگرو جارج جیل میں بند ہے۔ اس نے جارج کو بھی جیل میں قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔"

"اوہ یس، مجھے یاد آگیا۔ اب کیا معاملہ ہے؟"

میں نے کہا "ہم چوہدری دلاور کو لاہور کی عدالت میں پیش کرنے کے لیے لے جارہے تھے جہاں ڈاکٹر شبلی مرڈر کیس کی سماعت جاری ہے۔ اس کیس میں جارج کو بطور عینی گواہ پیش ہونا تھا۔"

"تھا کیا مطلب، اب اس کی ضرورت نہیں رہی؟"

"غالباً نہیں۔ ملزم کو خدا نے سزائے موت سنادی ہے۔ اس کا برین ٹیومر تشخیص ہوا ہے۔ بالکل آخری یعنی چوتھے اسٹیج پر۔ شاید اتنے کم وقت میں عدالت فیصلہ نہ سُنا پائے۔ فیصلے پر عمل درآمد کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ ایک مفرور مجرم ہے اور ہم اسے پکڑنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ ہم اسے خصوصی انتظامات کے تحت چارٹرڈ فلائٹ سے لاہور لے جارہے تھے کہ اس سارجنٹ نے غلط پارکنگ پر ہمیں پکڑلیا اور یہاں لے آیا۔ کیا تم اسے بتاسکتے ہو کہ ہم نے اسے کوئی جھوٹی کہانی نہیں سُنائی تھی۔"

"اسے فون دو۔"

میں نے فون سارجنٹ کو تھمادیا "لو سُنو، باقی پیغام تمہارے لیے ہے۔"

ان کے درمیان خاصی تلخ کلامی ہوئی۔ پھر سارجنٹ نے فون کردیا۔ "میری طرف سے تم جہنم میں جاؤ۔"

"تمہارے بغیر؟" میں نے کہا۔

محسن بولا "اس کے علاوہ..... جہنم میں جانے کا بھی وقت مقرر ہے۔ تم نے ٹانگ نہ اڑائی ہوتی تو اس وقت ہم پیرس میں ہوتے۔ یہ بتاؤ کہ ہمارا مجرم مریض کہاں ہے؟"

"میں نے کہا ہے کہ ایمبولینس کو یہاں بھیج دیا جائے۔"

محسن نے اردو میں کہا "الّو کا پٹھا۔ ہمارے پروگرام کا بیڑا غرق کردیا۔"

میں نے کہا "خدا کا شکر ادا کر بھائی کہ اتنی آسانی سے جان چھوٹ گئی ورنہ مجھے تو صاف نظر آرہا تھا کہ آج گئے کام سے۔ اگر ہمارے سامان کی تلاشی لی جاتی تو بہت سے مسئلے کھڑے ہوجاتے۔ سامان میں اسلحہ بھی تھا اور......"

"اور کیا..... نقد رقم پر کسی کا نام نہیں تھا۔ اب اس جانباز ہواباز سے دوبارہ رابطہ کیسے ہوگا۔ خبیث کیسے غائب ہوگیا۔"

"اچھا کیا اس نے غائب ہوکے۔ رابطہ پھر ہوجائے گا۔ ہمارے ساتھ وہ بھی پکڑا جاتا تو پتا نہیں کیا بک دیتا۔"

"اس کار کا کیا ہوگا جس کی وجہ سے ہم پکڑے گئے تھے۔"

میں نے یہی سوال سارجنٹ سے کیا۔

اس نے کہا "گاڑی ٹریفک رولز کی خلاف ورزی کے باعث اُٹھالی گئی ہے۔ کچھ دیر میں یہاں پہنچ جائے گی۔"

میں نے کہا "گاڑی تم سنبھال کے رکھو۔ مالک خود لے جائے گا۔ اس میں ہمارا جو سامان تھا۔"

"اس کی ملکیت کا ثبوت دے کر تم لے جاسکتے ہو۔"

محسن نے کہا "کیا وہ ثبوت کافی نہیں تھا۔ میں نے تمہیں دلاور کی بیماری کا سارا ریکارڈ دکھایا تھا۔ میں بتاسکتا ہوں کہ اس میں کیا دوائیاں ہوں گی اور کیسے کپڑے ہیں۔ اگر ضمانت چاہیے تو میں حاجی علم دین طوطی کو بُلا لیتا ہوں۔"

"یہ کیا بلا ہے آخر۔ کس اخبار کا ایڈیٹر ہے؟"

"کسی بھی اخبار کے ایڈیٹر کو بلا کہنا دس بلاؤں کو اپنے پیچھے لگانے کے برابر ہے۔" میں نے کہا "اس اخبار کا نام "بھوت ٹائمز" ہو یا پھر "بیڈ نیوز" ٹیڈ ای والا۔"

"اگر وہ ذمّے داری قبول کرتا ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

میں نے حاجی علم دین کو فون کیا "جنابِ عالی، میں سکندر اعظم ہوں۔"

"کون..... اچھا اچھا۔ بھئی بڑی خوشی کی بات ہے کہ تم گوروں کے ملک کفرستان سے اپنے پاک وطن پہنچے۔ اور خیر سے اپنے نور ظرف سے ہمیں یاد کیا تم نے میرے پاکستانی بھائی۔"

میں نے کہا "حاجی صاحب۔ اتنے کم وقت میں تو صرف الہ دین کے چراغ کا جن ہی لاہور پہنچا سکتا تھا۔"

"اچھا تو پھر خیر سے کہاں ہو، پیرس سے بول رہے ہو؟"

میں نے کہا "طوطی صاحب۔ میں لندن کے ایک پولیس اسٹیشن سے....."

وہ شاید اُچھلے "پولیس اسٹیشن۔ یہی کہا نا تم نے۔ میں نے بھی ٹھیک ہی سُنا۔ تقدیر کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے۔ تم نے بھی ماشاء اللہ کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ پوری کوشش کی تھی تھانے جانے کے لیے....."

"خدانخواستہ ہم گرفتار نہیں ہوئے ہیں طوطی صاحب۔"

طوطی صاحب کو کچھ مایوسی ہوئی "کیوں نہیں ہوئے.... میرا مطلب ہے پھر پولیس کی حوالات میں کیوں بند ہو میرے پاکستانی بھائی، یہ گرفتاری نہیں تو پھر کیا ہے؟"

"محض ایک غلط فہمی کے باعث یہ ہمیں یہاں لے آئے۔"

"تو ان کی خوش فہمی، غلط فہمی سب دور کر..... ش جاؤ یہاں سے فوراً۔ گیٹ آؤٹ ہوجاؤ جتنی جلدی ممکن ہو۔"

میں نے کہا "یہ ہم سے کوئی حوالہ چاہتے تھے۔ آپ یہاں آنے کی زحمت کریں اور ہمارے ضامن بن جائیں تو بڑی مہربانی۔ ہم نے کہا کہ لندن کی ایک مشہور شخصیت ہیں طوطی صاحب، ایک بہت بڑے اخبار کے ایڈیٹر ہیں۔ کسی کے خلاف ایک قطعہ لکھ دیں تو وہ دنیا و عاقبت میں رسوا و روسیاہ ہوجاتا ہے۔ وہ ہمیں اچھی طرح جانتے ہیں اور ابھی ضمانت دینے آجائیں گے۔"

"کیوں نہیں میرے پاکستانی بھائی۔ ضمانت کیا چیز ہے، جان بھی حاضر ہے تمہارے لیے۔ ویسے کیا مضائقہ ہے اگر میں اس خچر کے برادرِ نسبتی کو بھیج دوں۔ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ اپنا پتر نوردین ماشاء اللہ سفارشی چیف رپورٹر نہیں ہے۔ وہ بھی بڑا حرامی ہے۔ خوب نمٹے گا ان سے، بے اعتبارے کہیں کے۔"

"اگر آپ خود زحمت کرتے تو ہماری توربن جاتی۔ دراصل اب ہمیں صرف اپنا سامان واپس چاہیے۔ پھر ہم دلاور کے ساتھ روانہ ہوجائیں گے، آپ کا جو رعب و دبدبہ ہے....."

"اچھا پھر میں ہی زحمت کرتا ہوں۔ ذرا مجھے بتاؤ کہ تم ہو کس سمت میں میرے پاکستانی بھائی، کچھ اپنا تاریخ جغرافیہ سمجھاؤ۔"

میں نے کہا "یہ تو آپ اس گورے صیاد سے ہی سمجھ لیں جس نے ہم طائرانِ بے وطن کو اسیر کرلیا ہے۔"

سارجنٹ نے پتا سمجھا کے بدمزگی سے کہا "اگر اس شخص کو انگریزی بولنی نہیں آتی تو یہ سیکھ سکتا ہے۔"

میں نے کہا "مگر وہ انگریز اور انگریزی، دونوں کی ایسی تیسی کرکے زیادہ خوشی محسوس کرتا ہے۔"

ڈاکٹر شاہ کی کار پہلے سے نمودار ہوئی۔ اسے پولیس کا ایک ڈرائیور چلا کے لایا تھا۔ اس میں سے ہمارا سامان اُتار کے باہر رکھ دیا گیا۔

"یہ گاڑی کب تک پولیس کی تحویل میں رہے گی؟" میں نے

کہا۔

"جب تک مالک خود آ کے جرمانہ ادا نہیں کرتا۔ اور اسے یہاں لانے اور رکھنے کے اخراجات کا بل ادا نہیں کرتا۔"

میں نے اپنے دل میں کہا "اس کے لیے انتظار کر دیومِ حساب کا۔"

محسن بولا "اگر تم وہیں غلط پارکنگ کا ٹکٹ دے دیتے تو تمہارا بہت وقت بچ جاتا۔"

طوطی صاحب آدھے گھنٹے بعد بڑی شان و شوکت سے تشریف لائے اور آتے ہی انہوں نے میز پر چھڑی بجا کے اعلان کیا "اب اس نظام کو بدلنا ہوگا۔ تم لوگ اب بھی حاکمانہ ذہنیت کا مظاہرہ کرتے ہو۔ میں اپنے اخبار کے ذریعے پولیس کے محکمے کو تہس نہس کر دوں گا۔"

"پہلے تم اپنی شناخت کراؤ" سارجنٹ نے کہا۔

طوطی صاحب نے اپنا ایکریڈیشن کارڈ لہرایا "قلم میں بڑی طاقت ہے۔ قلم پہلے تلوار سے زیادہ طاقتور تھا۔ اب توپ خانے اور ایٹم بم۔"

سارجنٹ نے کہا "یہ فارم سائن کرو۔ اپنے ایٹم بم سے۔"

طوطی صاحب نے خفگی سے کہا "غالباً اس نے بات سمجھی نہیں۔ سمجھی ہوتی تو ادب سے بات کرتا، کیا اس کی انگریزی کمزور ہے؟"

میں نے کہا "ایسا ہی لگتا ہے۔ آپ یہاں دستخط کر دیں اور کل اس بدبخت کی شان میں ایک قطعہ لکھ کے آویزاں کرا دیں ہر تھانے پر۔ تھانے میں اجازت نہ ملے تو پولیس کی گاڑیوں پر لکھوا دیں۔ آخر ہمارے پیارے پاکستان میں بھی تو ہر بس ٹرک یہاں تک کہ رکشا کے پیچھے غضب کی شاعری کے نمونے نظر آتے ہیں۔"

"ایسا ہی ہوگا میرے پاکستانی بھائی" انہوں نے رخصت ہونے سے پہلے ہمیں عید ملنے کے انداز میں تین بار گلے لگا کے دبایا۔ سارجنٹ اس جذباتی منظر سے خاصا متاثر نظر آتا تھا۔

"صدقہ دینا کالے بکرے کا" طوطی صاحب نے فرمایا "بکرا نہ سہی کالا مرغا ضرور کاٹ دینا میرے پاکستانی بھائی۔ اللہ نے تمہاری عزت بچائی اور تمہاری دیسی کھال کو ولایتی چھترول سے بچایا۔"

"چھترول، ہم نے کون سا جرم کیا تھا.....؟"

انہوں نے مجھے آنکھ ماری "ایسا مت کہو۔ یہ پوچھو کہ کون سا جرم نہیں کیا۔ بس ابھی ان کی آنکھوں پر اللہ نے پردہ ڈال رکھا ہے۔ میں پھر کہتا ہوں تاکید سے کہ دوڑ جاؤ ادھر سے 'سیدھے اپنے لہور شریف پہنچ کے دم لو۔ وہ حرام الحرامی کہاں ہے' چوہدری ولاور؟"

میں نے کہا "بس ایمبولینس کا انتظار ہے۔ وہ آجائے تو ہم بھی نکل جائیں گے۔"

طوطی صاحب کے جانے کے بعد بھی ہمیں مزید آدھا گھنٹہ انتظار میں صرف کرنا پڑا۔ میں نے اس مہلت سے فائدہ اٹھا کے جیک عرف ہائی جیک کا سراغ لگانے کی ناکام کوشش کی۔ اس کی تینوں محبوباؤں نے اس کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کیا اور کہا کہ اسے آج شام پیرس جانا تھا۔

میں نے کہا "جس کے ساتھ جانا تھا، میں وہی بدقسمت شخص ہوں۔ وہ اچانک غائب ہو گیا، اب میں کیا کروں.....؟"

"تم اسے ائرپورٹ کے پاس چارلی کے شراب خانے میں دیکھ سکتے ہو۔ آج کل وہ ایک ویٹریس کو اپنے سچے عشق کا یقین دلا رہا ہے جیسے اس نے مجھے دلایا تھا" اس کی غصیلی، زہریلی محبوبہ نے کہا "میں نے منگنی کی انگوٹھی اس کے منہ پر ماری تھی۔"

"وہ سمجھ دار آدمی ہے۔ شادی کی پیش کش انہی کو کرتا ہوگا جن کے بارے میں یقین ہو کہ وہ منگنی کی انگوٹھی منہ پر ماریں گی" میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں نے چارلی کے شراب خانے فون کیا۔ پس منظر میں سنائی دینے والے شور کے ساتھ کسی نے کہا "ہیلو۔"

میں نے کہا "کیا جیک یہاں موجود ہے؟ ہائی جیک!"

"ہائی جیک۔ وہ پائلٹ..... میں نے اسے ابھی دیکھا تھا۔ ایک منٹ ٹھہرو" وہ بولا اور پھر اس نے چلا کے کسی سے کہا "اس ہوائی گھوڑے کا فون ہے۔"

ہوائی گھوڑا اس کا نہایت مناسب نام تھا۔ اس نے بڑی ادا سے "ہیلو" کہا۔

میں نے کہا "یوں لگتا ہے جیسے ٹیلی فون کا ریسیور تمہارے منہ سے تین فٹ دور ہے۔"

"بالکل ٹھیک لگتا ہے تمہیں۔ ایک فٹ کے فاصلے پر کوئی اور ہے مگر تم کون ہو؟" اس کی آواز کچھ واضح ہوئی۔

"وہی، جس کو جانا تھا جہاز سے مگر جانا پڑا پولیس کی کار میں۔"

"اوہ۔ میں نے تو دور سے ہی دیکھ لیا تھا۔ اسی لیے میں بھاگ گیا۔ خیر اب بتاؤ، کتنے مہینے یا کتنے سال بعد پروگرام ہے؟"

"مہینے سال کیا مطلب..."

"مطلب یہ کہ جیل کتنے عرصے کے لیے جاؤ گے؟ اس کے بعد ہی....."

میں نے کہا "پرواز معمول کے مطابق آج شام ہوگی۔ تھوڑی سی دیر ضرور ہو گئی ہے۔ مگر پرواز منسوخ نہیں ہوئی۔ میں ذرا پولیس کو ان کی غلطی پر معاف کرنے میں مصروف ہوں، تم کہاں ملو گے؟"

"وہیں جہاں تم نے فون کیا ہے" وہ بولا۔

"اتنی مت پی لینا کہ جہاز کو بحری جہاز سمجھ کے سمندر میں اُتار لو۔"

وہ ہنسا "تمہیں تیرنا نہیں آتا شاید۔"

پولیس اسٹیشن کے اس کمرے میں دوسری میز پر ایک اور

پولیس آفیسر کسی جوڑے سے اُلجھ رہا تھا۔ اور بھی کئی لوگ اس کمرے میں آئے اور کوئی بات کر کے چلے گئے۔ کمرے کی کھڑکیوں کے شیشوں سے باہر کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ برآمدے میں پولیس کے اہلکاروں کی مسلسل آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا۔ ان میں لیڈی پولیس کی تعداد بھی کم نہ تھی۔ وہ سب اسمارٹ اور مصروف لوگ تھے۔ کسی کو گپ لگانے کی فرصت نہیں تھی۔ آتے جاتے کسی سے سلام دعا، ہنسی مذاق کی بات ہو گئی تو ہو گئی ورنہ ہر ایک اپنے کام میں مگن تھا۔ لوگ بھی آ جا رہے تھے مگر اسی طرح جیسے اسپتال یا کسی سرکاری آفس میں۔ وہ پریشان تو نظر آتے تھے، پولیس کے پاس جانے والا پریشانی کا شکار ضرور ہوتا ہے مگر مجھے کوئی خوف میں مبتلا نظر نہیں آیا۔ کسی کی صورت پر وہ دہشت کے تاثرات نہیں دکھائی دیے جو ہمارے ملک میں شریف آدمی کی صورت پر بھی تھانے میں قدم رکھتے وقت دکھائی دیتے ہیں۔ تھانے انتہائی بدنام عقوبت خانے اور بدترین ذہنی اذیت، ذلت اور پست کرداری کی علامت بن کے رہ جاتے ہیں۔ یہاں قانون کے نام پر انسانیت سوز مظالم کا سلسلہ دن رات جاری رہتا ہے۔ بے گناہوں پر تشدد، بھتے، رشوت خوری، ناانصافی میں ایک دوسرے سے بڑھ کر اور قانون کے نام پر مدد مانگنے والوں کے لیے صفر۔ تھانے دار گشت پر رہتے ہیں۔ حوالات میں نیم مردہ قیدی پڑے رہتے ہیں۔ ڈیوٹی افسر اور منشی سودوں میں مصروف نظر آتے ہیں اور باہر اندر پریشان حال مظلوم، لواحقین دست بستہ فریاد کناں مال لانے اور کھلانے کی فکر میں مبتلا خوار پھرتے ہیں۔

یہاں ایک دوستانہ اور پُرتحفظ فضا تھی۔ کسی کے ساتھ زیادتی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ عام شہری اس وقت تک معزز اور قابلِ احترام تھا جب تک کہ مجرم نہ ہو۔ یہ پوری معاشرتی رویے اور صدیوں کے آزاد جمہوری نظام کے علاوہ تعلیم اور تہذیب کا عکس تھا جو صرف پولیس کے کردار میں ہی نہیں، عام لوگوں کے عادات و اخلاق میں بھی نظر آتا تھا۔ اپنے ملک کے بارے میں یہی کہا جا سکتا تھا کہ جیسی روح ویسے فرشتے۔ جس قسم کے مجرم تھے ویسی ہی پولیس تھی۔ یہ فرق ضرور تھا کہ وہاں مجرم اور پولیس کے درمیان تعاون کا جذبہ اور رشتہ زیادہ فروغ پا رہا تھا اور عام آدمی دونوں کے گٹھ جوڑ سے گویا برائی کی دو پاٹوں کے درمیان پس رہا تھا۔

میں اور محسن بے چینی سے ایمبولینس کے آنے کا انتظار کر رہے تھے، جب اندر آنے والا ایک پولیس آفیسر مجھے دیکھ کے چونکا اور کچھ سوچنے لگا۔ اس کی نظر چند لمحوں کے لیے میری صورت پر جم گئی پھر وہ آہستہ آہستہ میری طرف دیکھا۔

"میرا خیال ہے کہ میں نے تمہیں پہلے بھی کہیں دیکھا ہے!" وہ بولا۔

میں نے پُرسکون اور پُراعتماد رہتے ہوئے مسکرا کے کہا "اگر میں کہوں کہ مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔ یہ دنیا بہرحال اتنی بڑی جگہ نہیں ہے اور پھر لندن..."

اس نے میری بات کاٹ دی "تمہارا..... سر رچرڈ گورڈن کے کسی معاملے سے تعلق تھا، رائٹ!" اس نے چٹکی بجائی۔

"سر رچرڈ گورڈن!" میں نے بہترین اداکاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے محسن کی طرف دیکھا "اس نام کا تو کوئی فلم ایکٹر بھی نہیں۔ سر رچرڈ برٹن ضرور ہیں 'الزبتھ ٹیلر کے ... شوہر۔"

محسن نے کہا "مذاق کی بات نہیں۔ ہم کسی رچرڈ گورڈن کو نہیں جانتے۔"

جو سارجنٹ ہمیں اپنے ساتھ لایا تھا وہ اٹھ کھڑا ہوا "میں اب جا رہا ہوں۔ آئی ایم سوری کہ مجھ سے صورتِ حال کو سمجھنے میں غلطی ہوئی اور آپ لوگوں کا تھوڑا سا وقت ضائع ہوا۔"

"کوئی بات نہیں، ایسا بھی ہو جاتا ہے کبھی" میں نے بے حد شائستگی کے ساتھ کہا۔

محسن نے بھی بہترین اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس سے ہاتھ ملایا۔ "قانون سے تعاون کرنا ہر مہذب شہری کا فرض ہے۔"

ہمارے رویے کی اس تبدیلی نے اسے کچھ حیران کیا "تم چاہو تو پھر سینٹ تھامس اسپتال فون کر کے معلوم کر لو۔ آخر ایمبولینس ابھی تک کیوں نہیں پہنچی۔"

میں نے کہا "تمہاری ایک تجویز تھی کہ ہم سینٹ تھامس اسپتال کی خصوصی سروس ایمبولینس حاصل کر لیں اور مریض کو اسی میں پیرس لے جائیں۔"

"ہاں۔ ان کے چارجز کچھ زیادہ ہوں گے" اس نے میز پر رکھی ہوئی کیپ اپنے سر پر رکھی "تم بات کر کے دیکھ لو۔"

میرا مقصد اس گفتگو کو طول دینے سے صرف یہ تھا کہ دوسرا پولیس افسر ٹل جائے مگر وہ اپنی جگہ پر کھڑا ہوا تھا۔ اس نے فوراً خالی ہو جانے والی کرسی پر قبضہ کر لیا "یہاں تم کس سلسلے میں آئے تھے؟"

میں نے کہا "ہم نے غلط جگہ گاڑی کھڑی کی تھی۔"

وہ حیرانی سے بولا "اس جرم میں پولیس اسٹیشن کوئی نہیں لایا جاتا۔ ٹکٹ جاری ہو جاتا ہے۔"

محسن بولا "گاڑی میں ایک مریض بھی تھا۔ اس کی حالت کافی خراب تھی اور ایمبولینس نہیں مل رہی تھی۔ یہ جو آفیسر ابھی گیا ہے، اسی نے ہماری مدد کی، پولیس ایمبولینس منگوائی اور پھر اسے سینٹ تھامس اسپتال بھیجا۔"

"اس نے تمہاری مدد کی، پھر وہ معذرت کیوں کر رہا تھا کہ اس کی وجہ سے تمہیں پریشانی ہوئی۔"

میں نے کہا "دراصل گاڑی ایک ڈاکٹر کی تھی۔ وہ ایمبولینس لینے گیا تو گاڑی غلط جگہ کھڑی کر گیا جلدی میں۔ اتنی دیر میں یہ آفیسر آ گیا۔ وہ ہم سے سوال جواب کرنے لگا۔ ہم نے کہا کہ نہ گاڑی ہماری ہے اور نہ ہم اسے چلا رہے تھے۔ ہم نے اسے کاغذات بھی

دکھادئے۔ پھر وہ کہنے لگا کہ مریض کی حالت نازک ہے اور تم نے اسے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر ڈال رکھا ہے۔ ہم نے بتایا کہ ڈاکٹر شاہ بہت دیر سے ایمبولینس کا بندوبست کرنے گئے ہوئے ہیں۔ معلوم نہیں' ان کے ساتھ کیا ہوا کہ وہ لوٹ کر نہیں آئے۔ اس نے مریض کو ایمبولینس میں اسپتال بھیج دیا اور ہمیں گاڑی کے ساتھ یہاں لے آیا۔ گاڑی اب پولیس کی تحویل میں ہے اور ڈاکٹر شاہ خود لے جائے گا۔ ہماری شناخت کے لیے ایک وکیل اور ایک اخبار کے ایڈیٹر آگئے تھے۔ ظاہر ہے اس میں وقت ضائع ہوا۔ اب ایمبولینس آجائے تو ہم جائیں' ہمیں اسپیشل چارٹرڈ فلائٹ سے پیرس جانا تھا۔"

"پیرس کے لیے چارٹرڈ فلائٹ؟" وہ بولا۔

"پیرس سے ہمیں اپنی بیویوں کو ساتھ لینا نہ ہوتا تو ہم چارٹرڈ فلائٹ کو براہِ راست پاکستان لے جاتے" میں نے کہا۔

"پاکستان!" وہ سوچ میں پڑ گیا "کیا لاہور' پاکستان کا شہر ہے۔"

"آف کورس! ایک قدیم تاریخی اور تہذیبی شہر۔"

"تمہارا نام کیا ہے؟" اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔

"وقار یوسف۔ میں ایک بیرسٹر ہوں۔"

"اور میں ایک جرنلسٹ" محسن نے کہا "کیا تم بھی ہمارے پاسپورٹ دیکھو گے؟ آخر ایسا کیوں ہے۔ برطانیہ میں ہر پولیس مین پاکستانیوں کے خلاف اس قسم کے پُر تعصب رویے کا مظاہرہ کیوں کرتا ہے؟"

"یا ہم صورت سے اتنے مشکوک لگتے ہیں" میں نے خفگی سے کہا۔

"آئی ایم سوری" اس نے جذبات سے عاری سپاٹ لہجے میں کہا اور اٹھ کے باہر نکل گیا۔

"شیروانی صاحب' صورتِ حال گمبھیر ہو گئی ہے اچانک۔"

محسن نے کہا "کیا کریں یار' دلاور کو چھوڑ کے بھی تو نہیں جاسکتے۔"

"ایمبولینس کہاں رک گئی آخر...؟"

محسن بولا "کہیں ایسا تو نہیں کہ..... دلاور جاگ گیا ہو اور ہوش میں آتے ہی اس نے ایمبولینس ڈرائیور سے کہا ہو کہ وہ راستہ بدل لے۔"

"مگر وہ پولیس کی ایمبولینس ہے۔"

"دلاور صرف ایک مریض ہے' کوئی ملزم نہیں۔ ایمبولینس اسے کہیں بھی پہنچادے گی" محسن نے کہا۔

"کیوں نہ ہم چارلی کے شراب خانے پہنچ جائیں" میں نے کہا "وہاں ہائی جیک ہوگا۔ اگر اس وقت تک ایمبولینس یہاں پہنچے گی تو اس کے لیے پیغام چھوڑ جائیں گے۔"

"یہ ٹھیک ہے۔ ایمبولینس وہیں آجائے گی۔ ہم اتنی دیر میں ہائی جیک سے فلائٹ کا نیا ٹائم طے کرلیں گے۔"

"یہاں سے ہم ٹیکسی سے جاسکتے ہیں" میں نے کہا۔

ہم ایک ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔ کمرے میں ہمارے سوا اب کوئی نہیں تھا۔ ہمارا سامان جو درحقیقت دلاور کا تھا' برآمدے میں رکھا ہوا تھا۔ اچانک ساتھ والے کمرے کا دروازہ کھلا اور ہم نے اسی پولیس آفیسر کی آواز سنی جو ہم پر شک کررہا تھا کہ ہمارا رچرڈ گورڈن کے کسی معاملے سے تعلق ہے۔ وہ کسی سے فون پر گفتگو کررہا تھا۔

میں نے اس کی زبان سے سر رچرڈ گورڈن کے الفاظ سنے۔ پھر اس نے شیشے کے پیچھے سے ہمیں دیکھا اور ہاتھ سے اشارہ کیا۔

اس کے اشارے کا مطلب واضح تھا۔

اگر واسطہ اپنے وطن کی پولیس سے ہوتا تو پریشانی کی انتہا میں بھی ناامیدی کی بات کوئی نہ ہوتی۔ بیشتر معاملات میں وہ خود اپنی پیشہ ورانہ سوچ میں سختی کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ اُن کے رویّے میں ایسی نرمی اور لچک پیدا ہوجاتی ہے کہ ملزم سمجھ دار ہو اور استطاعت رکھتا ہو تو قانون کی آہنی فصیل میں بہت سے چور دروازے پیدا ہوجاتے ہیں۔ جیو اور جینے دو کے اصول پر عمل کرنے سے سب سُکھی رہتے ہیں۔ پولیس پر بلاوجہ تفتیش کا بار نہیں رہتا اور وہ اپنا قیمتی وقت دیگر جرائم کی سرکوبی میں صرف کرسکتے ہیں۔ تھانے میں نئے نئے چہرے روز نظر آتے رہیں تو رونق رہتی ہے۔ پھر فریادی یا لواحقین بھی عدالتی چکروں سے' اخراجات اور پیروی کے مرحلوں کی زحمت سے بچ جاتے ہیں۔ عدالتوں میں مقدمات کی تعداد نہیں بڑھتی۔ کُمک مُکا کے فوائد سے ولایتی پولیس غالباً پوری طرح آگاہ نہیں تھی۔

ایسا بھی کئی بار ہوا تھا کہ مجھے ہر طرف سے نرغے میں لے لیا گیا مگر زورِ بازوئے مسلم سے کام لیتے ہوئے میں نے بدخواہوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور بالآخر ایسے نکل گیا جیسے دوڑتی گاڑی کے ٹائر سے ہوا نکل جاتی ہے۔ ہوا کو کون پکڑ سکتا ہے' گاڑی رک جاتی ہے۔

یہاں صورتِ حال یکسر مختلف تھی۔ یہ لوگ اصولوں کے معاملے میں ذاتی رویے میں کوئی لچک نہیں رکھتے تھے اور پولیس تو ادائے فرض کو عینِ ایمان سمجھتی تھی۔ نہ انہیں آنکھ مار کے میں سرگوشی میں کہہ سکتا تھا کہ چھوڑو بادشاہو' آپس کی بات ہے تو بڑھانے کی کیا ضرورت ہے۔ اور بات شروع ہوتی تو کہیں ختم بھی ہوجاتی۔ نہ میں ان کافروں کے' فلمی ہیرو کی طرح کشتوں کے پشتے لگا کے اپنے سلطان راہی اسٹائل میں گنڈاسا لہراتے ہوئے نوٹنے کرکے نکل سکتا تھا۔

ٹیلی فون پر بات کرنے والے سارجنٹ نے مجھے رُکنے کا اشارہ کیا تو مجھے رُکنا پڑا۔ میرے آس پاس درجنوں پولیس والے مسلح پھر رہے تھے اور میرے لیے وہاں سے فرار کے امکانات صفر سے بھی کم تھے۔ وہ سب فرار کی کوشش ناکام بنانے کے لیے مستعد اور متحد ہوجاتے اور مجھے وہیں کُتّے کی موت ماردیتے یا مجھے پکڑ لیتے اور

میرے جرائم کی سنگینی میں سنگین اضافہ ہوجاتا۔ وہ شریف آدمی کے ساتھ قانون کے مطابق برتاؤ کرتے ہیں لیکن جو مجرم قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کرے وہ کسی رعایت کا مستحق نہیں رہتا۔

سارجنٹ فون رکھ کے تیزی سے باہر لپکا "کیا تم کچھ دیر اندر بیٹھ کے انتظار کروگے!" اس نے ہمیں واپس جانے کا اشارہ کیا۔

میں نے متانت سے کہا "اب کیا نئی بات ہوگئی؟"

محسن نے کہا "جس شخص نے ہمیں غلط پارکنگ پر گرفتار کیا تھا وہ مطمئن ہوگیا' تم نے گاڑی اپنی تحویل میں لے لی۔ ہم نے ضامن فراہم کردیا۔"

اس نے سختی سے کہا "شٹ اَپ اور جیسا میں کہہ رہا ہوں ویسا ہی کرو۔"

میں نے کہا "تمہاری دخل اندازی کے باعث ہمیں پہلے ہی دیر ہوگئی ہے۔"

محسن نے دروازے سے پھر کمرے میں قدم رکھا "اگر مریض کو کچھ ہوگیا...؟"

سارجنٹ ہمارے پیچھے پیچھے اندر آگیا "کچھ نہیں ہوگا اسے۔ میں نے کہہ دیا ہے اسے سینٹ تھامس اسپتال والے نہیں رکھتے تو پولیس کی تحویل میں رکھتے ہوئے کسی بھی دوسرے اسپتال میں داخل کرادو۔"

میں نے اپنی خودی بلند رکھتے ہوئے کہا "کیا تم بتاسکتے ہو کہ آخر تمہیں کیا پریشانی ہے؟"

محسن نے بھی سر ہلایا "کیا شک ہے تمہیں آخر؟"

اس نے ہمارے سامنے بیٹھ کے ہمیں گھورتے ہوئے کہا "تمہاری اداکاری قابلِ تعریف ہے لیکن یہ تھیٹر کا اسٹیج نہیں' پولیس اسٹیشن ہے' اس لیے سچ سچ بتادو۔"

"سچ کے علاوہ ہم کچھ بتانا پسند بھی نہیں کرتے" میں نے کہا۔

محسن بولا "لیکن تم جھوٹ پر اعتبار کرسکتے ہو تو....."

اس نے میز پر مُکا مارا "یو بلڈی سن آف اے جوکر..... تم تو نکل ہی گئے تھے اپنی باتوں سے سب کو اُلو بنا کے' میں نے بروقت پہنچ کے تمہیں پہچان لیا۔"

میں نے کہا "اپنے جذبات کو قابو میں رکھو۔ ہمارا ضامن کوئی معمولی آدمی نہیں' ایک اخبار کا ایڈیٹر ہے۔"

"اخبار کے ایڈیٹر کیا فرشتے ہوتے ہیں" اس نے نفرت اور حقارت سے کہا "جوتی کی نوک پر رکھتا ہوں میں ان اخبار والوں کو۔ ان سے بڑا حرامی کوئی نہیں ہوتا۔ میرا بس چلے تو ان سب کو اخبار نکالنے کے جرم میں بند کردوں۔"

"اخبار والے تمہیں من مانی نہیں کرنے دیتے اور سچ چھاپ دیتے ہیں اس لیے؟" میں نے کہا۔

محسن نے کہا "ہم تمہاری رائے سے سب اخبار والوں کو مطلع کردیں گے۔"

"ضرور کرنا اگر موقع ملے۔ سب بلیک میلرز' رائی کا پہاڑ بنانے والے اور اسکینڈل باز' مافیا ہے ان کی بھی۔"

"یہ تم اپنے ملک کے گورے اخبار والوں کے بارے میں فرمارہے ہو تو ممکن ہے سچ ہو" میں نے کہا۔

محسن بولا "لیکن ہمارے پاکستانی صحافی ایسے نہیں ہوتے۔"

وہ بھڑک اُٹھا "کیا انڈین اور کیا پاکستانی' تم سب کالے لوگ پیدائشی طور پر حرامی ہوتے ہو اور یہاں آکے تم لوگوں نے حرامی پن کی انتہا کردی ہے۔ ہماری سوسائٹی کی ساری روایات کا بیڑا غرق کردیا ہے۔"

میں نے مشتعل ہوکے کہا "لیکن جو کچھ تمہارے آباواجداد نے انڈیا میں کیا تھا' یہ اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں۔ غلامی سے آزادی اور جمہوریت کے دوغلے نظریات پر تم آج بھی عمل پیرا ہو۔ جنوبی افریقہ میں تمہاری نسل پرستی کے انسانیت سوز مظالم پر شیطان کو بھی شرم آتی ہوگی۔"

اس نے دہاڑ کے کہا "میں تمہیں قتل کردوں گا اگر تم نے بکواس بند نہ کی۔"

"تھانے میں بہادر بن رہے ہو" میں نے کہا "ہمت ہے اور اپنے مرد باپ کی حلالی اولاد ہو تو یہ ریوالور رکھ دو ایک طرف اور مجھے قتل کرنے کی کوشش کرکے دیکھو۔ اس ریوالور کے ساتھ تو ایک نامرد اور بچّہ بھی ناریزن کے مقابلے پر آجاتا ہے۔"

"او کے کالے کُتّے' میں تمہیں وہ سبق سکھاؤں گا" اس نے حت طیش کے عالم میں کھڑے ہوکے ریوالور میز کی دراز میں رکھ دیا۔

"تمہارا تو وہ حال کروں گا میں کہ تمہاری ماں بھی پچھتائے گی کہ اس نے تمہیں پیدا ہی کیوں کیا تھا" میں نے اسے مزید غصّہ دلایا۔

ہماری چیخ پکار پر ساتھ والے کمروں سے دو پولیس افسر اور دو لیڈی پولیس...... کمرے میں آگئی تھیں "یہ کیا ہورہا ہے؟" ایک پولیس مین بولا۔

میرے حریف کا چہرہ غصّے سے لال ہورہا تھا "کوئی بیچ میں نہ بولے' میں اس کالے غلام زادے کا دماغ درست کرنا چاہتا ہوں۔"

"آر یو میڈ؟ تم اس سے لڑوگے؟" ایک خاتون پولیس آفیسر نے ہسٹریائی انداز میں چلّا کے کہا۔

میں نے بھی آستین چڑھا کے کہا "اس سؤر کے بچّے نے مجھے گالیاں دی ہیں' میرے باپ دادا کو گالیاں دی ہیں۔ اس نے سب کالے لوگوں کو حرامی کی اولاد کہا ہے' میں اس کی شکل ایسی کردوں گا کہ یہ آئینہ دیکھنا چھوڑ دے گا۔"

وہ اچھل کر میرے مقابلے پر آگیا "کوئی درمیان میں نہ آئے' میں اس کالے کُتّے کی ایسی تیسی کردوں گا۔"

میں نے زمین پر تھوک کے کہا "تیری شکل پر لعنت سفید سؤر۔"

محسن نے بھی میری حکمت عملی سمجھ لی تھی۔ اس اشتعال انگیزی اور مار دھاڑ کے نتیجے میں ہمارے قانون کی گرفت سے بچ نکلنے کے امکانات بہت کم تھے مگر جہاں کوئی راستہ نہ ہو وہاں ہلاکت خیز خطرناک راستہ بھی آزمایا جاسکتا ہے۔ ایک موہوم سی امید یہ تھی کہ شاید پولیس خود لاقانونیت کا مظاہرہ کرنے کے بعد بدنامی کی تشہیر کے خیال سے معاملہ رفع دفع کرنا چاہے۔

سارجنٹ نے مجھ پر حملہ کرنے کے لیے ایسا پوز بنایا جیسے ہم کمرے میں نہیں باکسنگ رنگ میں ہیں۔ وہ یقیناً باکسر ہوگا۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ وہ بہت اچھا باکسر ہو مگر ایک تو اسے میرے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ دوسرے وہ غصے کا تیز تھا۔ کسی ملزم کے ساتھ باکسنگ کرنا ایک احمقانہ حرکت تھی۔ اس کے تمام ساتھی اسے روکنے میں ناکام تھے۔ وہ اعلان کرچکا تھا کہ جو قریب آیا وہ بھی ناک آؤٹ کردیا جائے گا۔

دنیا کا عظیم ترین باکسر بھی کسی جوڈو کراٹے جاننے والے کو شکست نہیں دے سکتا۔ مارشل آرٹ کا ماہر اپنے حریف کو نزدیک ہی نہیں آنے دے گا۔ باکسر کا پنچ اسی وقت کارگر ہوسکتا ہے جب وہ سامنے سے مارا جائے اور درمیانی فاصلہ ایک دو فٹ ہو۔ باکسر کا مُکا سر سینے یا پیٹ پر اس صورت میں لگ سکتا ہے جب اس کے ہاتھ وہاں تک پہنچ سکیں۔ مگر مارشل آرٹ کا ماہر لات گھما سکتا ہے اور لات کی مار ہاتھوں سے زیادہ ہوتی ہے کیونکہ بازوؤں کے مقابلے میں ٹانگ لمبی ہوتی ہے پھر مارشل آرٹ میں فلائنگ کِک بڑا موثر وار ہے۔ باکسر ہوا میں اسے کیسے ناک آؤٹ کرے گا' فلائنگ کِک سے باکسر گر جائے تو پھر اٹھے گا کیسے؟

اس مقابلے میں بھی یہی ہوا۔ کمرے میں پانچ چھ حضرات وخواتین جو پہلے اس مقابلہ آرائی کے خلاف تھے اب اس کھیل میں دلچسپی لے رہے تھے غالباً اس یقین کے باعث کہ پولیس کے باکسر کے مقابلے میں میری عبرت ناک درگت بننے والی ہے۔ میں ایک ہی مُکے کی مار ہوں۔ اس کے بعد مجھ پر چودہ طبق روشن ہوجائیں گے اور دنیا میری نظروں میں اندھیر ہوجائے گی۔ میں دھڑام سے چکرا کے گروں گا تو مجھے دوبارہ اٹھنا نصیب نہ ہوگا۔ خدا جانے یہ کسی کے ذہن میں کیوں نہیں آیا کہ مقابلے پر آنے والا بے وقوف کے علاوہ بھی کچھ ہوسکتا ہے۔

جب میں نے ایک دو وار خالی دیے اور یہ ظاہر کیا کہ میں صرف اناڑیوں کی طرح جان بچانے کی فکر میں ہوں تو خوش فہمی رکھنے والے ہنسنے لگے اور باکسر بھی مسکرانے لگا۔ وہ تھوڑا سا ایزی ہوگیا تھا کہ اب مقابلہ کیا' بس دل لگی ہے۔ کسی بھی وقت ایک ہاتھ مار کے کھیل ختم کردوں گا۔ شغل کے لیے میں نے اِدھر اُدھر دوڑ کر بھی خود کو بچایا اور اس کے دو مُکے میرے شانے اور سر پر واجبی سے لگے۔ میں گھومتے ہوئی وقت اور جگہ کی موزونیت کا جائزہ لیتا رہا اور جب میں نے محسوس کیا کہ میں زیادہ دیر یہ تماشا نہ رکھ سکوں گا تو میں نے ایک ایڑی پر گھوم کے لات کو تقریباً پورا گھماتے ہوئے اس کی کمر پر رسید کیا۔ وہ سیدھا حاضرین کی طرف گیا جنہوں نے اسے سنبھال کے پھر میری طرف دھکیل دیا مگر اس ایک لات نے پل بھر میں کھیل کا نقشہ بدل دیا۔ اچانک سب نے سمجھ لیا کہ یہ اناڑی کی کِک نہیں تھی۔ اس میں پیشہ ورانہ مہارت' مشق اور تجربہ شامل تھا۔

وہ میری طرف آیا تو میں نے فلائنگ کِک کا نمونہ پیش کیا۔

میرا حریف پلٹ کے فرش پر گرا مگر ہمت کرکے دوبارہ پیروں پر کھڑا ہوگیا۔ اچانک' مسکرانے اور ہنسنے والے سیریس ہوکے خاموش ہوگئے۔ میں نے اسے اشارے سے قریب بلایا "کم آن۔ یو ڈرٹی سن آف اے..." میں نے اسے ایک گندی گالی دے کے اشتعال کی آگ پر تیل چھڑکا "میرے نزدیک آکے دیکھو' تم مجھے قتل کرنا چاہتے تھے نا' آؤ... ہاتھ لگاؤ مجھے۔"

وہ دیوانہ وار آگے بڑھا۔ میں نے اچانک ایک پاؤں کا گھٹنا اوپر اُٹھادیا۔ گھٹنا اس کے پیٹ میں لگا۔ وہ بلبلا کے دُہرا ہوا تو میں نے اس کی کمر پر کہنی ماری۔ پھر اسے کالر سے پکڑ کے کھینچا اور ان لوگوں کی طرف اچھال دیا جو اب تشویش اور اضطراب کا شکار تھے۔ وہ ان پر گرا تو اس کے ساتھ ہی دو افراد بھی گرے' ان میں ایک خاتون تھی۔ اس نے چیخ ماری۔

پھر پیچھے سے ایک اور شخص آگے آیا۔ اس کی وردی سے ہی ظاہر ہوگیا کہ وہ کیپٹن ہے "یہ کیا ہنگامہ ہے' کیا تماشا ہو رہا ہے۔"

سارجنٹ ہانپتے ہوئے بولا "اس... کالے سور نے مجھے مارا ہے۔"

میں نے کہا "تم پھر مجھے گالیاں دے رہے ہو۔ میں نے بہت برداشت کیا تھا۔ آخر کیا سمجھتے ہو تم خود کو۔"

کیپٹن نے گرج کے کہا "شٹ اپ۔ سیدھے کھڑے ہوجاؤ دونوں۔"

ہم دونوں سیدھے کھڑے ہوگئے۔

"اب مجھے بتاؤ یہ مار پیٹ کیوں ہورہی تھی؟"

میں نے کہا "یہ مار پیٹ نہیں تھی۔"

"پھر کیا تھا' کیا میں نے خواب دیکھا تھا" وہ گرجتا رہا۔

"یہ ایک مقابلہ تھا جس کی دعوت مجھے خود سارجنٹ نے دی تھی۔ اس نے باقی سب لوگوں کو بھی مصالحت اور مداخلت سے روک دیا تھا' تم پوچھ لو ان سے۔"

"کیا یہ ٹھیک کہہ رہا ہے؟" کیپٹن نے پلٹ کے سوال کیا۔

ایک لیڈی پولیس آفیسر نے اقرار میں سر ہلایا "معاملہ تو ہمیں معلوم نہیں مگر اس نے ہمیں منع ضرور کیا تھا۔"

میں نے کہا "اس نے مجھے۔ میرے باپ دادا کو' تمام پاکستانیوں کو... اور کالے رنگ والوں کو شرمناک گالیاں دیں۔ میں اس کے خلاف احتجاج کروں گا۔ یہ ایک سنگین سیاسی اور نسلی مسئلہ ہے۔ پولیس میں ایسے عناصر کو رہنے کا کوئی قانونی اور اخلاقی جواز نہیں بنتا جو متعصب ہوں۔"

محسن نے کہا "یہ شخص اذیت پسند ذہنی مریض ہے۔ اس کا مینٹل اسپتال میں معائنہ ضروری ہے۔"

کیپٹن نے فوراً فیصلہ کرلیا "او کے۔ باقی سب لوگ جائیں اپنا کام کریں۔ تم لوگ میرے ساتھ آؤ' میرے کمرے میں۔"

سارجنٹ نے خود کو صف ملزمان میں شامل کرنے پر احتجاج کیا "کیپٹن' یہ شخص ایک جعلساز ہے... جو پولیس کو مطلوب ہے۔"

"یہ جو کچھ بھی ہے' میں معلوم کرلوں گا۔" وہ بولا "تم کو جو کہنا ہے' میرے کمرے میں چل کے کہو۔"

سارجنٹ کو پہلے موقع دیا گیا' اس نے کہا "سر یہ شخص غلط جگہ گاڑی کھڑی کرنے کے جرم میں لایا گیا تھا اور اس نے اپنی باتوں سے سب کو بے وقوف بنایا' ایک ایڈیٹر کو بلالیا جو اس کا ضامن بن گیا۔"

میں نے شور مچایا "ابھی یہ کہانی باقی ہے کہ تم نے اخبار والوں کے خلاف کیا شرمناک الزامات عائد کیے تھے۔"

"شٹ اپ' جب تمہاری باری آئے گی تو تم بولنا" کیپٹن نے کہا۔

"یہ محض اتفاق ہے سر کہ میں نے اسے شناخت کرلیا۔ جو یہ ظاہر کررہا ہے' اس کا حقیقت سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ یہ کئی سال پہلے حدود برطانیہ سے نکال دیا گیا تھا۔ دہشت گردی کے الزام میں۔"

"یہ جھوٹ ہے۔ مجھے صرف ناپسندیدہ قرار دیا گیا تھا۔" میں نے کہا۔

کیپٹن نے کہا "کس وجہ سے؟"

"وجوہات بہت سی تھیں مگر اصل وجہ وہی ہے' نسلی تعصب۔"

"تم لوگ اس سے بہت فائدہ اُٹھاتے ہو۔ قانون سب کے لیے ایک ہے مگر تم پر لاگو کیا جائے تو یہ تمہارا سیاسی نعرہ بن جاتا ہے" کیپٹن نے کہا۔

"اس کا اصلی نام بھی کچھ اور ہے سر" سارجنٹ بولا "جو مجھے اس وقت یاد نہیں آرہا ہے۔ تاہم یہ مجھے معلوم ہے کہ اس کو برطانیہ کی حدود میں داخلے کی اجازت کسی نے نہیں دی۔ یہ غیر قانونی طور پر لندن آیا ہے۔"

"او کے۔ یہ سچ ہو تب بھی تم کو کس نے اختیار دیا ہے کہ مجھے گالیاں اور میرے ہم وطن لوگوں کو' اخبار والوں کو اور وکیلوں کو بلیک میلر' اسکینڈل باز اور مافیا کے ایجنٹ کہو۔ تم صرف مجھے واپس بھجوا سکتے ہو۔"

محسن نے کہا "ہر سال ہزاروں افراد غیر قانونی طور پر برطانیہ میں داخل ہوجاتے ہیں۔ جو پکڑے جاتے ہیں انہیں واپس کردیا جاتا ہے۔"

کیپٹن نے کہا "کیا یہ ٹھیک ہے کہ تم بھی انہی میں شامل ہو؟"

میں نے اس وقت تک فیصلہ کرلیا تھا کہ میں کم سنگین الزام کو قبول کرلوں گا "ہاں یہ ٹھیک ہے۔ مجھے لندن آنا پڑا' پاسپورٹ اور ویزا کے بغیر۔"

"آنا پڑا کیا مطلب...؟"

"میں ایک مجرم کی تلاش میں تھا۔ وہ پاکستان کی عدالتوں کو مطلوب ہے۔ اس نے یہاں دو قتل کیے تھے۔ پھر پاکستان میں اس نے ایک برطانوی شہری کا خون کیا۔ جو ڈاکٹر تھی' ڈاکٹر شیلی۔ جب گرفتاری کا وقت آیا تو وہ ملک سے فرار ہوگیا بلکہ جیل حکام کی آنکھوں میں دھول جھونک کے نکل گیا۔"

"تم کیا ہو؟ اسے گرفتار کرنے کے لیے تم نے خود برطانیہ آنے کا رسک کیوں لیا۔ کیا یہ کام پولیس نہیں کرسکتی تھی" کیپٹن نے کہا۔

"نہیں۔ مجھے پولیس پر بھروسا ہوتا تو میں یہ رسک ہرگز نہ لیتا۔ میں ایک پڑھا لکھا معزز آدمی ہوں۔ میں نے لندن میں چار سال رہ کے اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ یہاں ایک نہیں' درجنوں معزز لوگ میرے آشنا ہیں۔ اس مجرم کے ساتھ میرا ایک ذاتی دشمنی کا مسئلہ بھی تھا۔ اس نے میرے باپ کو بھی قتل کیا تھا۔ انتہائی بے رحمی سے۔ اس کے کاروبار پر' جائداد پر قبضہ کرلیا تھا۔ اس وقت میں لندن میں تھا۔ پھر اس نے مجھے جھوٹے مقدمات میں ملوث کرادیا۔ پولیس کی مدد سے۔ اس نے پولیس کو بھاری رشوت دی۔ پولیس اسے کیسے پکڑ سکتی تھی۔ میں اسے گرفتار کرکے عدالت میں پیش کرنا چاہتا تھا۔ عدالت اس کو مفرور مجرم قرار دے چکی ہے۔ اگر مجھے برطانیہ آنے کی قانونی اجازت مل جاتی تو میں غیر قانونی طور پر یہاں نہ آتا مگر کراچی میں تمہارے ہائی کمشنر' سوری... کونسلیٹ نے مجھے انکار کردیا۔ یہ بہت لمبی کہانی ہے۔ تم سن کے کیا کروگے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ پابندی ہونے کے باوجود میں لندن آیا۔ کسی قسم کی دستاویزات کے بغیر۔ اب تم مجھے حراست میں لے کر کسی بھی فلائٹ سے واپس پاکستان بھیج سکتے ہو۔ اخراجات میں خود ادا کروں گا۔"

کیپٹن متاثر نظر آنے لگا "او کے۔ بیٹھ جاؤ یہاں اور مجھے بتاؤ کہ یہ سب کیسے شروع ہوا تھا۔ سارجنٹ' تم فی الحال جاؤ۔ میں بعد میں ساری بات سن کے کوئی فیصلہ کروں گا۔"

سارجنٹ نے مجھ پر ایک قہر بھری نظر ڈالی "مجھے یقین ہے کہ اب بھی یہ سچ نہیں بول رہا ہے۔"

"سچ تم بتاسکتے ہو؟" کیپٹن نے برہمی سے کہا۔

"سچ لیڈی الزبتھ گورڈن بتاسکتی ہیں" اس نے کہا۔

کیپٹن حیران ہوا "کون... لیڈی الزبتھ... سر رچرڈ گورڈن کی وائف؟"

"یس سر۔ ان کے شوہر نے اس شخص کے خلاف رپورٹ لکھوائی ہے۔"

کیپٹن نے کہا "الزام کیا تھا؟"

"قاتلانہ حملہ۔ دہشت گردی" سارجنٹ بولا "آ...

کرسکتے ہیں۔"

"ہاں، میں معلوم کرلوں گا۔"

"لیڈی الزبتھ خود آرہی ہیں یہاں" سارجنٹ نے جاتے جاتے کہا "کیونکہ سر رچرڈ گورڈن شہر میں نہیں ہیں۔ وہ ایک ہفتے کے لیے جنیوا گئے ہیں کسی سرکاری وفد کے ساتھ۔"

"پھر تو ٹھیک ہے۔ صحیح صورتِ حال سامنے آجائے گی۔ تم دیکھو لیڈی الزبتھ کو ریسیو کرو اور انہیں میرے کمرے میں لاؤ۔ ہم سارے معاملات کو SORT OUT کریں گے۔"

الزبتھ کے آنے کا سُن کے ہی میرا دل بیٹھ گیا تھا۔ میں نے محسن سے کہا "لوجی اپنے شیروانی صاحب' بھٹا بیٹھ گیا ہمارا۔"

محسن بولا "مجھے تو شاید وہ بخش دے۔۔۔ مگر تو مارا گیا۔"

کیپٹن نے میز پر ہاتھ مارا "یہ کیا بکواس ہے؟"

"یہ ہماری مادری زبان ہے" میں نے احتجاج کیا۔

محسن بولا "ہم انگریزی زبان کو بکواس کہیں گے تو تمہارے جذبات کیا ہوں گے۔"

"جذبات گئے بھاڑ میں۔ تم کو اجازت نہیں دی جاسکتی کہ اپنی مادری زبان میں باتیں کرو۔ جو کہنا ہے انگریزی میں میں کہو ورنہ چُپ بیٹھو۔"

میں نے کہا "کس قانون کے تحت تم مجھے اپنی مادری زبان میں بات کرنے سے روک سکتے ہو۔"

"یہ میرا قانون ہے" وہ چلّا کے بولا "آئی بات سمجھ میں؟"

"نہیں، لیکن ہم یہ ضرور سمجھ گئے کہ پولیس میں زیادہ تر لوگ بلڈ پریشر میں مبتلا ہیں۔۔۔ اور متعصب ہیں۔"

اس نے اپنا سر پکڑلیا "پھر وہی تعصب کی بات۔ اگر میں تم سے ہاتھ ملا کے مسکراتے ہوئے کہوں کہ جاؤ عیش کرو۔۔۔ تو میں ٹھیک ورنہ متعصب۔"

میں نے کہا "اگر تم میری جگہ ہوتے تو کیا ایسا نہ کہتے۔ خدا کو حاضر و ناظر جان کے سچ سچ کہو۔"

اسی وقت ایک پولیس وومن نے دروازے سے سر اندر ڈال کے اعلان کیا "لیڈی الزبتھ آگئی ہیں' کیا میں انہیں اندر بھیج دوں۔"

"کیا مجھے اس سلسلے میں تحریری احکامات دینے پڑیں گے" کیپٹن بولا۔

الزبتھ کو اپنے مقابل دیکھنے کے خیال سے ہی مجھے پسینا آگیا۔ یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس سے پھر ملاقات ہوگی اور وہ بھی بدلے ہوئے حالات کے اس قابلِ شرم ماحول میں۔ وہ آج ایک معزز برطانوی خاتون تھی اور میں جو کبھی اس کا پرستار تھا ایک مجرم بنا بیٹھا تھا۔

الزبتھ آئی تو میں اسے دیکھ کے مبہوت رہ گیا۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ حسین اور پُرکشش ہوگئی تھی۔ شادی سے پہلے وہ ایک لڑکی تھی جس کی صورت پر نوجوانی کے جذبات کی شوخی اور معصومیت آمیز ادائے ناز آفرینی تھی۔ آج وہ ایک بھرپور عورت تھی جو اپنی قوتِ تسخیر پر غرور میں حق بجانب محسوس ہوتی تھی۔ اس کے حُسن میں تھوڑی سی متانت نے زیادہ دلکشی پیدا کی تھی۔ اس کا بدن بھی بھرگیا تھا اور آج اس نے اپنی حیثیت اور مرتبے کے مطابق لباس پہنا تھا جس سے اس کی شخصیت میں وقار اور تمکنت کی دلنوازی آگئی تھی۔ آغازِ شباب کا لاابالی پن داستانِ ماضی ہوگیا تھا جب وہ اوٹ پٹانگ لباس پہن لیتی تھی اور صرف اپنے عشق کے جذبات کو سرمایۂ حیات سمجھتی تھی۔ شاید آج وہ ناپختہ شعور کے اس دور کی ہر نادانی پر خود کو شرمسار محسوس کرتی ہوگی اور وقت نے اسے بھی احساس دلادیا ہوگا کہ مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب۔ اس نے اپنے نسلی اور خاندانی برتری کے احساس سے سمجھوتا کرلیا ہوگا اور آج اپنے حسب نسب' اپنے خاندانی روایات کے وارثوں' جدی پشتی اثاثوں' اپنی معاشرتی اقدار اور اپنے عالی مرتبت شوہر پر اتنا ہی فخر محسوس کرتی ہوگی جتنا اسے اپنے بے پناہ حسن پر ناز ہوگا۔

ہم کتنی دیر خاموش کھڑے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ شاید اس کا خیال ہم دونوں کو نہیں تھا۔ وقت اچانک پیچھے چلا گیا تھا اور ایک عمر کی یادوں کا پورا البم کھل گیا تھا جس میں یادوں کے ہزار عکس تھے اور ہر عکس میں جذبات کی ساری رنگ آمیزی اور شوخی تھی۔

بالآخر کیپٹن نے کھنکار کے کہا "وہ۔۔۔ لیڈی الزبتھ۔ پلیز تشریف رکھیے' آپ بھی سر۔۔۔ آئی ایم سوری۔۔۔ ابھی تک میں نے آپ کا نام نہیں پوچھا۔"

الزبتھ کرسی پر بیٹھ گئی "میں بتاتی ہوں۔ اس کا نام سکندر بخت ہے۔ یہی ہے نا تمہارا نام۔۔۔ یا بدل گیا ہے؟"

میں نے کہا "اور سب کچھ بدل گیا ہے۔ سوائے میرے نام کے۔ تم مجھے اسی نام سے پکار سکتی ہو مگر میں تمہیں لیڈی گورڈن کے بجائے الزبتھ کہوں تو شاید یہ بے ادبی شمار ہوگی۔"

"طنز کرنے کی ضرورت نہیں" وہ بولی "دوستوں کے لیے میں الزبتھ ہی ہوں۔"

کیپٹن کو اچانک صورتِ حال کا احساس ہوگیا تھا۔ جس کے ساتھ وہ پولیس اسٹیشن میں ایک مجرم کا سا سلوک کررہا تھا وہ ایک انتہائی معزز لیڈی کا پرانا دوست تھا۔ اس نے کہا "ویری گڈ۔ آپ لوگ ایک دوسرے سے متعارف ہیں۔۔۔ میرا مطلب ہے پُرانے دوست ہیں۔"

میں نے کہا "ہم دوست ضرور تھے' کیوں الزبتھ؟"

الزبتھ نے مجھ سے نظریں چُرا کے کہا "ہاں' کیپٹن۔۔۔ کیا یہ ممکن ہے کہ میں کچھ دیر مسٹر سکندر بخت سے۔۔۔"

"کیوں نہیں" وہ ایک دم اُٹھ کھڑا ہوا "میں بے حد معذرت خواہ ہوں کہ آپ کو یہاں آنا پڑا۔ دراصل کسی کو علم نہیں تھا۔۔۔ خیر۔۔۔ کیا پینا چاہیں گی آپ؟"

[الزب]تھ کے بولنے سے پہلے میں نے کہا "کافی پلیز۔۔۔ بلیک۔"

محسن نے بھی اُٹھتے ہوئے کہا "میں ذرا کیپٹن سے گپ شپ [ک]رتا ہوں۔"

میں نے اردو میں کہا "اسے سمجھا دیا کہ ہمارے تو خاندانی [...]راہم ہیں اور خاتون کے والد تو بضد تھے مجھے اپنی فرزندی میں لینے [...]کے لیے مگر ہم مشرقی لوگ اپنی وضع داری اور خاندانی روایات سے [د]ستبردار نہیں ہوسکتے۔"

"تو فکر بھی مت کر۔ ایسی گولی دیتا ہوں سب کو کہ یاد کریں [...]گے بس تو اسے شیشے میں اُتار لے۔ کسی طرح اسے اتنا جذباتی [...]کردے کہ یہ تیری میری ساری خطائیں معاف کردے اور۔۔۔"

میں نے کہا "پلیز گیٹ آؤٹ۔"

جب دروازہ بند ہوگیا تو میں نے کہا "الزبتھ۔ میں تمہارا مجرم ہوں' کم سے کم تم ایسا ہی سمجھتی ہو۔"

"تو کیا ایسا نہیں ہے؟" وہ بولی۔

"نہیں۔ تم بہت اچھی طرح جانتی ہو کہ اگر تمہارے نسل [پر]ست اور متعصب باپ نے مجھے مسترد نہ کیا ہوتا۔۔۔ اور مجھے یہاں [س]ے نکلوایا نہ ہوتا تو۔۔۔"

"ان باتوں کو مت دُہراؤ۔"

"کیوں نہ دُہراؤں۔ کیا یہ غلط ہے کہ میں شادی کرنا چاہتا تھا تم [س]ے۔۔۔ اور یہاں رہتا تو کون روک سکتا تھا ہمیں۔۔۔؟"

"تم ایک چالاک اور کمینے شخص ہو' تم نے میرا جذباتی استحصال کیا تھا۔"

"ایسا گھٹیا الزام مت لگاؤ مجھ پر۔ میں تمہاری عزت کرتا تھا' صرف اس لیے کہ میں واقعی تم سے محبت کرتا تھا۔"

اس نے تلخی سے کہا "دیگر ایک درجن لڑکیوں کے ساتھ؟"

"نہیں۔ یہ زیادتی ہوگی اگر تم کہو کہ تمہارے معاملے میں بھی میرے جذبات وہی تھے اور میں سیریس نہیں تھا۔"

"جھوٹ بولتے ہو تم۔ تم نے کتنی لڑکیوں کو پروپوز کیا تھا' کتنی لڑکیوں کو منگنی کی انگوٹھی دی تھی؟"

میں نے خفت سے کہا "الزبتھ۔۔۔ وہ ایک کھیل تھا جوانی کا۔ [...]تو میرے ساتھ دوسرے سب لڑکے کھیلتے تھے۔ اور یہ بات وہ [لڑ]کیاں بھی سمجھتی تھیں۔ میں کسی لڑکی کے ماں باپ سے نہیں ملا تھا۔ کسی کے لیے رُسوا نہیں ہوا تھا۔ اتنی ذلت برداشت نہیں کی تھی اور۔۔۔"

"چھوڑو پُرانی باتیں۔۔۔ تم جب یہاں سے گئے تو تمہارے جذبات ایک دم بدل گئے۔ تم فون کرسکتے تھے' خط لکھ سکتے تھے۔ میں نے وعدہ کیا تھا کہ میں اپنے والد کو راضی کرلوں گی۔"

"وہ کبھی راضی نہ ہوتے۔ وہ میری جان لے سکتے تھے یا اپنی جان دے سکتے تھے مگر تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ میں نہیں دے سکتے تھے۔"

"تم یہاں سے جاتے ہی اپنے خاندانی معاملات میں اُلجھ گئے

تھے۔ اپنی پراپرٹی اور بزنس... اور خاندانی جھگڑے خون خرابا' مقدمے بازیاں اور میں کیا کہوں...... جیسا کہ مجھے معلوم ہوتا رہا.... تم نے کوئی دہشت گرد تنظیم بنالی تھی۔"

"خدا کے لیے الزبتھ۔ اسٹاپ دس نان سینس۔"

"کیا یہ جھوٹ ہے۔ تم جیل میں رہے اور پھر تم نے اُسی وکیل سے شادی کرلی جس نے تمہارے مقدمات کی پیروی کی....." وہ مشتعل ہوکے بولی۔

"آہستہ، آہستہ بولو... اور پہلے میری بات سُن لو۔"

"میں ساری دنیا کو غلط نہیں کہہ سکتی۔ جو کچھ تم نے کیا سب میرے علم میں تھا مگر پھر لندن آکے تم نے کیا کیا....!"

میں نے کہا "فار ہیون سیک..... دنیا کی تم نے سُنی' میری بھی سُن لو۔ مجھے زیادہ نہیں دس منٹ دو' یقین کرنا نہ کرنا تمہاری مرضی۔"

"مجھے معلوم ہے کہ تمہیں میری مدد کی ضرورت ہے۔"

"پھر کیا تم میری مدد نہیں کروگی؟" میں نے کہا۔

"بالکل نہیں۔ میرا شوہر تمہیں اپنا دشمن سمجھتا ہے۔ تم نے اس کی جان لینے میں کون سی کسر چھوڑی تھی۔ وہ یہاں ہوتا تو...."

"تو پولیس اسٹیشن آکے مجھے شوٹ کردیتا؟ نہیں الزبتھ' وہ جیسا بھی ہے... پڑھا لکھا اور خاندانی آدمی ہے۔ اگر میں اس سے درخواست کرتا تو وہ میری بات ضرور سنتا۔ میں اس کی غلط فہمی رفع کرسکتا تھا۔ پھر وہ میرا دشمن کیسے ہوسکتا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم ایک دوسرے کو ناپسند کرتے تھے۔ ہمارے درمیان دشمنی کے جذبات کا ایک سبب تمہاری محبت تھی لیکن وہ نوجوانی کی عمر تھی۔ وہ وقت گزر گیا' زندگی میں ایسا کہاں نہیں ہوتا۔ ہر شخص کامیاب نہیں ہوتا۔ ناکامی تو میرا مقدر ہوئی۔ تمہاری محبت اسے ملی۔ میں نے اس کی خوش قسمتی پر رشک ضرور کیا مگر مجھے حسد نہیں ہے اس سے۔ نہ میں اس کا دشمن ہوں اور نہ بدخواہ۔ میں تو خود اسے مبارک باد دیتا' میں اس سے معافی بھی مانگ سکتا تھا۔ کیونکہ میں نے ہی اس کا نام کاکروچ رکھا تھا۔ اسے پریشان بھی کیا تھا۔ تم اپنے شوہر کے بارے میں مجھے بتاؤ کہ کیا وہ کینہ پرور ہے؟ کیا اس نے میرا نام لے کر کبھی..... تمہیں کچھ کہا؟"

"نہ وہ اتنا کم ظرف ہے اور نہ کینہ پرور" الزبتھ نے احتجاج کیا۔

"پھر وہ ہر بات سُنے گا۔ کوئی وجہ نہیں کہ وہ آج مجھ سے رقابت محسوس کرے اور اس بنیاد پر مجھ سے عداوت رکھے۔ کل ہم سب خیالی دنیا میں رہنے والے جذباتی نوجوان تھے جو زندگی کے حقائق کو نہیں سمجھتے تھے جیسے تم نہیں سمجھتی تھیں کہ عشق کتنا بھی سچا کیوں نہ ہو' معاشرتی یا معاشی حقائق سے زیادہ سچ نہیں ہوسکتا اور سچ ہمیشہ کڑوا ہوتا ہے۔"

"آخر تم کیا کہنے کی کوشش کررہے ہو؟"

میں نے کہا "دیکھو الزبتھ۔ کھوٹ نہ میری نیت میں تھا اور نہ تمہارے جذبات میں خلوص کی کمی تھی لیکن یہ بڑی تلخ حقیقت ہے کہ وہ محبت نہیں' حماقت تھی۔"

"تم واقعی ایسا سمجھتے ہو تو پھر....."

"پہلے میری بات پوری ہوجانے دو...." میں نے کہا "سچ یہ بھی ہے کہ تم کل مجھے جتنی اچھی لگتی تھیں' آج اس سے زیادہ حسین لگ رہی ہو لیکن حقیقت کا دوسرا ناگوار مگر ناگزیر پہلو یہ ہے کہ تم کسی اور کی امانت ہو اور میں کسی اور کے ساتھ زندگی بھر کی رفاقت قبول کرچکا ہوں۔ اب شرافت اور دیانت داری کا تقاضا ہے کہ ہم ایک دوسرے کو بُری نظر سے بھی نہ دیکھیں۔ چھونا تو دور کی بات ہے۔ جو ہم کل جائز سمجھتے تھے وہ آج ناجائز ہے۔ یہ معاشرتی حقیقت ہے۔ دباؤ ہے یا ڈسپلن ہے۔ میاں بیوی کے رشتے کی تقدیس کو قائم رکھنے اور خاندان کے وجود کے لیے اس معاشرتی قانون اور ڈسپلن پر سختی سے عمل کرنے کا نام اخلاقیات یا شرافت ہے۔ کل اگر ہم ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے تو کوئی وجہ نہیں اور کوئی حرج نہیں اگر ہم آج بھی پسند کرتے رہیں' کل ہماری پسند میں طلب کا عنصر شامل تھا۔ قربت کی خواہش اور جسمانی طلب کے بغیر بھی محبت کا وجود ممکن ہے۔ مگر اس کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ آخر ہم اپنے دوستوں عزیزوں اور خاندان کے سب رشتوں سے محبت کرتے ہیں۔"

"تم پہلے کی طرح باتونی ہو..... آج بھی..."

میں نے کہا "الزبتھ۔ دوسری لڑکیوں کے مقابلے میں تم سے شادی کے لیے سیریس ہونے کی کچھ وجوہات تھیں۔ تمہاری ذات میں کچھ ایسی خوبیاں تھیں۔ ایسی صفات تھیں جو مجھے کسی اور میں نظر نہیں آئیں۔ ایسا ہی تمہارے ساتھ ہوا' کتنے لڑکے اور تھے تمہارے آس پاس۔ کلاس میں اور تمہارے حلقۂ شناسائی میں لیکن مجھ میں تم کو کچھ مختلف نظر آیا جو تمہیں اچھا لگا۔ اس وقت ہم نے اپنی پسند کو زندگی بھر کی رفاقت کی بنیاد بنانے کی پوری کوشش کی تھی حالانکہ..... ایسا ہوجاتا تو ہم دونوں بہت جلد پچھتاتے۔ ہمیں احساس ہوجاتا کہ محبت کرنا اور زندگی بھر ساتھ نبھانا' دو مختلف باتیں ہیں۔ ایک کو تم شوق کہہ سکتی ہو' دوسرے کو ذمے داری... میں سمجھتا ہوں' تمہارے والد اپنی عمر اور تجربے کے باعث ہم سے زیادہ سمجھ بوجھ رکھتے تھے۔ وہ زندگی کی مشکلات کے عملی پہلو کو سمجھتے تھے۔"

وہ اُداسی سے مسکرائی "آج تم پہلی بار میرے والد کو اچھا کہہ رہے ہو۔"

"ہاں۔ یوں سمجھ لو کہ مجھے بھی تھوڑی بہت عقل آگئی ہے۔ حقائق نے خود کو تسلیم کرالیا ہے" میں نے کہا "ظاہر کا فرق کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ یہ گورے کالے رنگ کی بات نہیں' حسین لڑکیاں ہر رنگ میں ہر جگہ ملتی ہیں۔ اور شاید اسی طرح سکندر بخت بھی بہت ہوتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تم اپنے شوہر سے محبت کرتی ہو۔ اس سے کہیں زیادہ جتنی تمہیں مجھ سے تھی۔ اور وہ بھی تم کو مجھ سے زیادہ چاہتا ہوگا۔ یہ عملی زندگی کا تجربہ ہے' خیال و خواب کی بات نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ میں اور تم دو مختلف دنیاؤں سے تعلق رکھتے تھے۔ تمہارے میرے درمیان صرف جغرافیائی فاصلوں کا مسئلہ نہیں' ہماری تہذیب و تاریخ' معاشرتی پس منظر۔ ماحول اور ذہن کی سوچ سب میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ جو ہمیں نظر نہیں آتا تھا۔ تمہارے والد سمجھ سکتے تھے کہ ہم نے شادی کرلی تو ہمیں بعد میں کس قسم کی مشکلات کا سامنا ہوگا۔ میرا ماحول تمہیں قبول نہ کرتا اور تم وہاں خود کو محبوس اور پابند محسوس کرتیں۔ میں یہاں مس فٹ ہوتا اور مجھے تحقیر کی نظر سے دیکھنے والوں سے تمہاری نہ بنتی۔ تم بھی کمپلیکس کا شکار ہوجاتیں۔ میں بھی کب تک برداشت کرتا' میں کسی نواب کا بیٹا نہیں' تم خاندانی شجرۂ نسب کی برتری کو نظرانداز کرنا بھی چاہو تو دوسرے لوگ نہیں کرسکتے۔"

"شاید تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔"

"یہی ہیں وہ معاشرتی تلخ حقائق جو محبت سے زیادہ بے رحم ہیں۔ محبت بھی جان لے سکتی ہے مگر سچ کا زہر آدمی کو تمام عمر پینا پڑتا ہے اور جینا بھی پڑتا ہے۔ اگر ہم شادی کرلیتے تو یہ شادی زیادہ دن نہ چلتی۔ ہماری محبت بہت جلد ایسے ہی حقائق کی قربان گاہ کی بھینٹ چڑھ جاتی۔ ہم بدگمان ہوجاتے اور ایک دوسرے کو الزام دیتے۔ بالآخر الگ ہوجاتے' تم مجھے چھوڑ کے اپنی اس دنیا میں لوٹ آتیں جس میں تم پیدا ہوئیں' پل بڑھ کے جوان ہوئیں۔ جہاں تمہارے سب رشتوں کی جڑیں ہیں۔ معاشرتی حقائق کی طرح معاشی حقائق بھی بڑے سفاک ہوتے ہیں۔ زندہ رہنے کے وسیلے نہ ہوں تو رومیو جیولیٹ کی کوئی داستان جنم نہیں لیتی۔ سارے کلاسیکی عشق کے افسانے ہجر کے درد کی لذت کے باعث زندہ ہیں۔ اگر یہ انٹرنیشنل محبت کرنے والے شادی کرلیتے تو ان کا نام ان کے بچوں کے بچے بھی نہ جانتے۔"

وہ ہنس پڑی "کیسی باتیں کرتے ہو تم' دھوکے باز۔"

"میں دھوکے باز ہوتا الزبتھ' تو تمہیں میرا نام بھی یاد نہ رہتا۔ جیسے لندن کی بہت سی لڑکیوں کو یاد نہیں ہوگا۔ میں اس لیے اہمیت اختیار کرگیا کہ میں نے عہدِ وفا کی بات کی تھی۔ خواہ وہ جذباتی غلطی تھی مگر میرا عشق واقعی بے طلب تھا اور بے غرض تھا۔ ورنہ کیا تم میری دسترس میں نہ تھیں؟ مگر میں نے تم کو چاہا تو تمہیں اپنی عزت جان کے عزت دی۔ اسی سے میری عزت تمہارے دل میں پیدا ہوئی اور آج بھی ہونی چاہیے۔ تم مجھ پر ہوس پرست یا مطلبی ہونے کا الزام عائد نہیں کرسکوگی۔"

"معلوم نہیں میں یہاں کیوں آگئی" وہ خلا میں دیکھتے ہوئے بولی "حالانکہ میں..... سخت نفرت کرتی تھی تم سے' میرا خیال تھا....."

"حقیقت اس کے برعکس تھی۔ تم مجھ سے نفرت کرہی نہیں سکتیں۔ پُرانی محبت کی بنیادیں جھوٹ یا منافقت پر استوار نہیں تھیں۔ اس لیے آج بھی تمہارے دل میں سکندر بخت اسی طرح زندہ ہے جیسے تمہارا بچپن' جس سے خوب صورت یادیں وابستہ ہوں۔ خوب صورت یادیں کبھی بدصورتی کا احساس نہیں دلاتیں۔"

"تم نے بڑا غلط رویہ اختیار کیا تھا میرے ساتھ۔"

میں نے ہنس کے کہا "وہ غصے کی بات تھی' شکایت کا ایک احتجاجی انداز تھا۔ خود تم نے کیا فرمایا تھا؟"

"تم نے مجھے دھمکی دی تھی!"

"ہاں۔ ابھی ایک سارجنٹ نے مجھ سے کہا تھا کہ میں تمہیں قتل کردوں گا۔ اس کا ہرگز مجھے قتل کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔ نہ وہ کرسکتا تھا۔ میں نے اسے چیلنج کردیا کہ قتل کرنا تو دور کی بات ہے' مجھے چھو کے دکھاؤ' وہ باکسر تھا... جذباتی ہوکے میرے مقابلے پر آگیا۔"

"اور تم نے اسے مارا!"

"ہاں۔ اس کی خوش فہمی کے مرض کا ہمیشہ کے لیے علاج ہوگیا۔ اس کے حق میں یہ اچھا ہوا۔"

الزبتھ نے کہا "تم مشکل میں بھی پڑسکتے تھے۔"

"میں کچھ وقت لینا چاہتا تھا۔ ان لوگوں کی توجہ اصل مسئلے کی طرف سے ہٹانا چاہتا تھا۔" میں نے کہا "اور شاید میں اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔ کسی نے مجھ سے میرا نام تک نہیں پوچھا۔"

"میں نے تو بتادیا۔"

میں نے کہا "بہت اچھا کیا' میں بتاتا تو شاید یہ لوگ ثبوت مانگتے۔ ابھی تک کسی نے میرے سامان کی تلاشی نہیں لی۔ ورنہ وہ جعلی پاسپورٹ' سوری پاسپورٹ اصلی ہے' اس پر میرا نام غلط لکھا ہوا ہے۔ میں یہاں وقار یوسف ایڈووکیٹ بن کے پہنچا ہوں۔"

"وقار یوسف کون ہے؟"

میں نے کہا "میرا ایک دوست۔ سکندر بخت کے نام سے میں برطانیہ میں کیسے داخل ہوسکتا تھا مگر اب صورتِ حال یہ ہے کہ پولیس وقار یوسف کو اور محسن کو تلاش کررہی ہے۔ تمہارے شوہر کی رپورٹ پر۔"

"تم نے اس پر..... قاتلانہ حملہ کیا تھا' بم رکھا تھا اس کی گاڑی میں۔"

"تم اس خرافات پر یقین کرتی ہو؟"

وہ بولی "مجھے بھی یقین دلایا گیا ہے.... اور اسے بھی۔ تمہاری شہرت ایک دہشت گرد کی ہے۔"

"مجھے بدنام کرنے والے میرے پُرانے دشمن ہیں۔ اب میں تمہیں کیا بتاؤں' تمہارے یقین کرنے نہ کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ رپورٹ تمہارے شوہر کی ہے میرا اس کو قائل کرنا ضروری ہے۔"

"تم... ملو گے اس سے؟"

میں نے کہا "صرف وہی بچا سکتا ہے مجھے الزبتھ۔ اور مجھے یقین ہے کہ میری پوری بات سُن کے وہ قائل ہو جائے گا کہ میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا۔ وہ میری مدد کرے گا الزبتھ۔"

"ممکن ہے وہ تم سے نہ ملنا چاہے" وہ سوچ میں پڑ گئی۔

"اسے تم سمجھا سکتی ہو۔"

"میں؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ... کہ میں اس سے تمہاری سفارش کروں" وہ پریشان ہو کے بولی۔

"کیا تم اسے نہیں بتاؤ گی... کہ تم مجھ سے ملنے آئی تھیں۔"

"پتا نہیں" وہ بے خیالی میں بولی۔

"اسے بتا دو۔ ڈرتا وہی ہے جو چوری کرتا ہے... یا غلط کرتا ہے۔ تم نے کوئی غلطی نہیں کی۔ تمہارا دامن پہلے بھی صاف تھا' آج بھی رہنا چاہیے۔ تمہارے ضمیر پر کوئی بوجھ کیوں ہو الزبتھ۔ وہ تمہاری صاف گوئی کی قدر کرے گا۔ اگر اسے تم سے محبت ہے اور تم پر اعتماد ہے۔ وہ سمجھ لے گا کہ بیوی چاہتی تو مجھ سے یہ بات چھپا سکتی تھی۔ تم چھپا سکتی ہو مگر اسے بعد میں کبھی معلوم ہوا تو اس سے اعتماد کا رشتہ مجروح ہو گا۔ اس سے کہو کہ مجھے پولیس نے سکندر بخت کو شناخت کرنے کے لیے بلایا تھا۔ میں نے اسے پولیس اسٹیشن جا کے شناخت کیا۔ وہ اپنی پوزیشن کی وضاحت کرنا چاہتا تھا مگر میں نے کہا کہ جو کہنا ہے میرے شوہر سے کہو۔"

"یعنی میں جھوٹ بولوں اس سے۔"

"بے وقوف لڑکی۔ ایسے چھوٹے موٹے جھوٹ تو گریس کی طرح ہوتے ہیں۔ زندگی کی گاڑی کے پہیے کو بے آواز طریقے پر رواں رکھنے کے لیے گریس تو ڈالنی پڑتی ہے۔ سچ کے ساتھ زندگی گزر سکتی ہے کسی کی؟"

"او کے۔ میں اسے بتا دوں گی۔ تم ایسا کیوں نہیں کرتے..... یہ بتاؤ تم ٹھہرے کہاں ہو؟"

میں نے کہا "فی الحال تو لاک اپ میں قیام رہے گا۔"

"اس سے پہلے کہاں تھے... کسی ہوٹل میں...؟"

میں نے کہا "سفری دستاویزات کے بغیر لندن کے کون سے ہوٹل میں ٹھہر سکتا تھا میں' بس اِدھر اُدھر چھپ کے رہا' کچھ پرانے آشنا مہربان تھے۔"

"اچھا.... میں اس پولیس کیپٹن سے کہہ دیتی ہوں۔ تمہیں یہاں آرام سے رہنے کی جگہ فراہم کر دیں۔"

میں نے کہا "مجھے آرام سے یہاں نہیں رہنا۔ میری بیوی پیرس میں بیٹھی رو رہی ہے۔"

"کیوں رو رہی ہے؟" وہ ہنسی "کیا وہ خوش نہیں ہے تمہارے ساتھ؟"

"تمہارا کیا خیال ہے' کوئی لڑکی جو حسین بھی ہو تمہاری طرح اور تعلیم یافتہ بھی۔ وہ مجھ سے شادی کرے گی؟ اور کرے گی تو کیا خوش نہیں رہے گی؟"

"خوش تو رہنا چاہیے اسے۔ تم خوش رکھنے کا ہنر جانتے ہو۔"

"میں اسے تین دن کا کہہ کے آیا تھا۔ میں اور محسن پیرس کے راستے لندن پہنچے تھے۔ ایک شریف آدمی نے ہمیں آلو ٹماٹر پیاز کے درمیان رکھ کے اسمگل کر دیا تھا۔ ترس کھا کے نہیں' معاوضہ وصول کر کے۔"

"اور پھر بھی تم کہتے ہو وہ شریف آدمی تھا؟"

"ہاں۔ اس کے دل میں نیکی کا خیال تھا۔ اس نے میری مدد کی' میں اسے بُرا کیوں کہوں' کل رات میں نے اس کی بیوی کے ساتھ...."

"شرم آنی چاہیے تمہیں سکندر۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ اس کی بیوی کے ساتھ کا مطلب ہے اس کے گھر میں۔ گھر سے باہر گیراج میں' رات سو کے گزاری تھی۔ وہ بھی بڑی نیک دل عورت تھی۔ چاہتی تو ہمیں پکڑوا دیتی" میں نے کہا۔

"پھر تم ایسا کرو' آج ڈنر ہمارے ساتھ کرو۔"

"ہمارے ساتھ!"

"ہاں۔ ہمارے گھر آ جاؤ' میں تمہیں رچرڈ سے ملوا دوں گی۔"

میں نے کہا "تم نے تو کہا تھا...؟"

"میں نے جھوٹ بولا تھا' وہ کہیں نہیں گیا۔ اس نے خود مجھ سے کہا تھا کہ جاؤ پولیس اسٹیشن سے فون آیا ہے' جا کے دیکھو... وہ حرام زادہ.... سکندر بخت ہی ہے یا کوئی اور..."

"کیا اس طرح وہ تمہیں ذہنی اذیت دینا چاہتا تھا؟"

"نہیں۔ وہ شروع سے بزدل اور کم ہمت ہے۔ اس میں ہمت نہیں تھی تمہارا سامنا کرنے کی۔ اس نے منت سماجت کی میری تو میں نے اس کی بات مان لی۔"

"اس کا مطلب ہے وہ مجھ سے ملے گا... اگر تم کہو گی؟"

وہ مسکرائی "ہاں۔ وہ میری بات نہیں ٹال سکتا۔ تم آؤ گے ڈنر پر؟"

"میں سر کے بل آؤں گا لیکن دیکھو' کہیں دھوکے سے ڈنر پر بُلا کے قتل مت کرا دینا مجھے' اپنے رقیب کے ہاتھوں۔"

وہ ہنسنے لگی "میں ایسا کروں گی! دو گھنٹے بعد تم آ جاؤ۔ رچرڈ کے سامنے ہو جائے گی ساری بات... رائٹ۔"

"رائٹ۔ میں اس سے دوسری بات بھی کر لوں گا۔"

وہ بولی "دوسری بات کون سی؟"

"میں کہوں گا کہ وہ قربانی دے' اپنی محبت کی۔ محبت وہی عظیم ہوتی ہے جو قربانی دے سکتی ہو۔ اگر وہ مان گیا تو میں تم سے بھی شادی کر لوں گا۔ ہمارے مذہب میں ایک ساتھ چار تک کی اجازت ہے۔"

"بدمعاش۔ میں اتنے غصے میں آئی تھی" وہ بولی "یہ طے کر کے آئی تھی کہ تمہیں اچھی طرح ذلیل کروں گی اور تم نے کوئی بات کی تو تمہارے منہ پر تھپڑ ماروں گی مگر دیکھو.... میں ڈنر کی دعوت دے رہی ہوں۔"

میں نے کہا "محسن بھی ہو گا میرے ساتھ۔"

"ظاہر ہے' جسم سے جان تو جدا نہیں کی جا سکتی۔ کیا میں جانتی ہیں کہ تم دونوں دیکھنے میں دو ہو' ورنہ ایک۔ میں اپنی گاڑی بھیج دوں گی۔"

"کیا تمہاری شاہی گاڑی کو یہ پولیس والے نہیں روک سکتے؟" میں نے کہا۔

"تمہارا جرم کیا ہے؟ ابھی تک غلط جگہ گاڑی پارک کرنے کا الزام تھا۔"

میں نے کہا "اصل الزام تو یہ ہو گا کہ میں لندن پہنچ گیا۔ کسی قسم کی سفری دستاویزات کے بغیر۔"

"تم پیرس تک کیسے آئے تھے؟"

"باقاعدہ پاسپورٹ ویزا کے ساتھ" میں نے کہا "وہاں سے سڑک کے راستے۔"

"پھر ٹھیک ہے" وہ بولی "سڑک کے راستے ہر ہفتے بہت لوگ آتے ہیں۔ ان کے پاس صرف شناخت کی دستاویزات ہوتی ہیں۔"

"وہ میرے پاس ہیں۔ بشرطیکہ یہ سوال نہ کیا جائے کہ تم سکندر بخت ہو یا...."

وہ بولی "یہاں میں تمہارا نام بتا چکی ہوں۔"

"مگر انہوں نے میرا پاسپورٹ نہیں دیکھا ہے اور نہ محسن کا۔ لندن میں اس کی ضرورت پڑے گی۔ واپسی کا ٹکٹ لیتے وقت۔ اگر ہم پیرس پہنچ جائیں تو کوئی مسئلہ نہیں ہو گا۔"

"تم پیرس پہنچ جاؤ گے' فکر مت کرو۔ آخر میرے شوہر کا بھی کچھ اثر رسوخ ہے۔ وہ برطانیہ کی وزارتِ داخلہ کا بہت اہم افسر ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ بس جانے سے پہلے یہاں پولیس کو سمجھا دینا کہ لاہور میں کوئی قانونی مسئلہ نہ کھڑا کریں۔ اور انہیں تاکید کر دینا کہ اسپتال میں چوہدری دلاور کا خاص خیال رکھا جائے۔ کسی کو اس سے ملاقات کی اجازت نہ دی جائے اور نہ اسے اپنی مرضی سے جانے دیا جائے' وہ زیرِ حراست ہے۔"

"زیرِ حراست کس جرم میں؟" الزبتھ نے کہا۔

"زیرِ حراست نہ سہی' زیرِ علاج سہی" میں نے کہا "ویسے تو اس کے خلاف لندن میں دُہرے قتل کا الزام ہے۔ چشم دید گواہ بھی ہیں اور عدالتی ریکارڈ پر اس کے خلاف کافی مواد ہے۔ مگر ابھی ہم اس کیس کو دوبارہ شروع کرانے کے حق میں نہیں ہیں۔ پہلے اس کا لاہور جا کے ڈاکٹر شیلی مرڈر کیس میں پیش ہونا ضروری ہے۔"

"یہ ڈاکٹر شیلی مرڈر کیس کیا ہے؟"

میں نے کہا تاکہ ہر بات دو بار کہنے سے بہتر ہے کہ ایک بار سب کچھ بتا دوں' تم بھی سُن لو اور تمہارا وہ کاکروچ بھی۔"

"سکندر' اب وہ میرا شوہر ہے" الزبتھ نے مجھے خبردار کیا۔

"سوری۔ ویسے کاکروچ تو کاکروچ ہی رہے گا۔ خواہ وہ الزبتھ کا شوہر بن جائے" میں نے کہا۔

کیپٹن خود ایک ٹرے کے ساتھ اندر آیا۔ "سوری میڈم! مجھے کچھ دیر ہو گئی۔ دراصل کافی بنانے والا آج بیمار ہے' یہ کام خود مجھے کرنا پڑا۔"

میں نے کہا "یہ کام بھی کر لیتے ہو تم؟"

"اگر کبھی مجھے پولیس کی نوکری سے نکال دیا گیا تو میں کسی ہوٹل میں شیف ہو جاؤں گا۔ میری بیوی اس بات کی گواہی دے سکتی ہے کہ میں ہر قسم کے کھانے کتنے اچھے پکاتا ہوں' یہ میری ہوبی ہے۔ میں نے یہ فن باقاعدہ سیکھا ہے۔"

الزبتھ ہنسی "تمہاری بیوی بڑے فائدے میں ہے۔"

"مگر مجھے بڑا نقصان ہو رہا ہے" وہ کافی بناتے ہوئے بولا "مجھے اس کی فرمائش پر کھانے بنانے پڑتے ہیں۔ اُلٹا معاملہ ہے نا۔ وہ کھاتی ہے اور موٹی ہوتی جا رہی ہے۔ اگر کسی دن میں آپ کی اور سر رچرڈ گورڈن کی دعوت کروں تو کیا آپ اور سر رچرڈ آئیں گے؟"

الزبتھ نے کہا "میں.... کچھ کہہ نہیں سکتی.... رچرڈ بہت مصروف آدمی ہیں.... ویسے تم کو ثبوت فراہم کرنے کی ضرورت نہیں میں مانتی ہوں...."

"بات ماننے کی نہیں ہے خاتون.... میں کسی طرح ان کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا۔ میں ان کا احسان مند ہوں۔ وہ بہت بڑے آدمی ہیں اور یقیناً بہت مصروف بھی ہوں گے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کا شکریہ کیسے ادا کروں؟"

"تم فون پر شکریہ ادا کر سکتے ہو یا کسی دن گھر آ کے...."

"زبانی تو میں نے شکریہ ادا کر دیا تھا لیکن میری بڑی خواہش تھی کہ کسی دن.... وہ میرے گھر آئیں۔"

"آخر ایسی کیا بات ہے کیپٹن؟"

"بہت بڑی بات ہے خاتون۔ میں ایک سازش کا شکار رہا تھا۔ حادثاتی طور پر ایک ایسے معاملے میں ملوث ہو گیا تھا جس سے میرے مخالف بدخواہ اور حاسد لوگوں نے پورا فائدہ اُٹھایا۔ سر رچرڈ گورڈن تفتیش کے نتائج سے مطمئن نہیں تھے۔ انہوں نے خود ان سب سے جرح کی جن کے بیانات سے میرا کیس اتنا خراب ہو گیا تھا کہ میں برطرف بھی کیا جا سکتا تھا۔ مجھے جیل بھی جانا پڑتا شاید۔ پھر انہوں نے مجھے طلب کیا اور میری ساری بات بڑے تحمل سے سُنی۔ میں نے ان کو سچ بتا دیا اور یہ بھی کہہ دیا کہ بعض اوقات سچ ثابت نہیں ہوتا اور جھوٹ ثابت کر دیا جاتا ہے۔ آف دی ریکارڈ انہوں نے مجھ سے بہت کچھ پوچھا۔ وہ انتہائی ذہین اور معاملہ فہم آدمی ہیں۔ وہ سمجھ گئے کہ اصل بات کیا ہے اور کیا بات چھپائی جا رہی ہے۔ انہوں نے میرے حق میں فیصلہ دیا اور مجھے تحفظ بھی فراہم کیا۔ کچھ افسران کے اور دوسرے لوگوں کے ٹرانسفر

کرادیے۔ ورنہ وہ بعد میں انتقامی جذبے سے کام لیتے تو مجھے دوسرے معاملات میں ملوث کردیتے۔ ایک پولیس مین کی زندگی بہت پُرخطر ہوتی ہے۔ کوئی بھی اس پر الزام عائد کرسکتا ہے اور اسے بدنام کرنے کے لیے مہم چلا سکتا ہے۔"

میں نے اس کی بات پر الزبتھ کو خوش ہوتے دیکھا۔ کاکروچ شرمیلا تھا اور بزدل تھا مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ذہین تھا اور کلاس میں اس کی تعلیمی کارکردگی کا معیار ہم جیسے لوگوں کے لیے قابلِ رشک تھا۔ کوئی شخص مجموعۂ صفات نہیں ہوتا۔ یہ قدرت کا تلافی کا نظام ہے کہ وہ ایک کمی کو دوسری غیر معمولی صلاحیت سے پورا کردیتی ہے۔ اسے انسانی فطرت کا نفسیاتی ردِعمل بھی کہا جاسکتا ہے۔ جو لوگ احساسِ کمتری کے منفی ردِعمل کا شکار نہ ہوں بلکہ اسے دور کرنے کے لیے اپنی دوسری صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کرکے زندگی میں نمایاں مقام حاصل کرنے کی کوشش کریں وہ کامیابی اور شہرت کی بلندیوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ اس کی ایک مثال ہیلن کیلر ہے جو اندھی، گونگی اور بہری تھی مگر اس نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور اپنی قوتِ ارادی سے وہ ناموری حاصل کی جو ناممکن نظر آتی تھی۔ یہ عام زندگی کا مشاہدہ ہی ہے کہ جو دیکھ نہیں سکتے ان کی سُننے کی حِس بہت تیز ہوجاتی ہے۔

کاکروچ بھی سر رچرڈ گورڈن تو اپنے شجرۂ نسب سے بن گیا تھا مگر اس نے اعلیٰ تعلیمی ریکارڈ اور پھر سول سروس میں نمایاں کارکردگی سے اپنی شخصیت کی ان خامیوں کا ازالہ کرلیا جن کی وجہ سے وہ کاکروچ مشہور تھا۔ اب شاید اس کا مذاق اُڑانے والا کوئی نہیں ہوگا۔ سب اس کی تعریف ہی کرتے ہوں گے۔ کیپٹن میرے سامنے ایک بات بتارہا تھا اور میں سوچنے پر مجبور تھا کہ کیا سر رچرڈ گورڈن کی شرافت، فراخ دلی اور احسان مندی کا دوسرا گواہ خود میں ہوں گا۔

"اچھا کیپٹن، یہ میرے دوست ہیں۔ اس بات کا خیال رکھنا۔ انھیں کوئی شکایت نہ ہو کسی کے رویے سے" الزبتھ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"شاید انھوں نے آپ سے اس ناخوش گوار واقعے کا تذکرہ کیا ہے۔"

میں نے کہا "نہیں کیپٹن۔ میں نے الزبتھ کو کچھ نہیں بتایا۔"

الزبتھ نے کہا "تم مجھے بتاؤ کیپٹن۔ کیا ناخوش گوار واقعہ پیش آچکا تھا میرے یہاں آنے سے پہلے؟"

کیپٹن نے کہا "دراصل ..... وہ شخص کچھ ذہنی مریض ہے۔ اسے واقعی بلڈ پریشر کی شکایت ہے۔ اور اس کا غصہ بھی تیز ہے۔ اس کے خلاف کئی بار رپورٹ ہوئی ہے مگر میں اسے بچانے کی پوری کوشش کرتا ہوں۔ ہر شخص میں کچھ خامیاں ہوتی ہیں تو کچھ خوبیاں بھی ہوتی ہیں۔"

"مجھے اس سے کوئی شکوہ نہیں" میں نے کہا "وہ محض دل لگی تھی کوئی سیریس فائٹ نہیں تھی۔"

"تمھاری فائٹ ہوئی تھی کسی سے ..... یہاں..؟"

میں نے کہا "ہاں۔ وہ کچھ نسلی تعصب کے باعث ایسی باتیں کررہا تھا جو مجھے ناگوار گزریں، اس نے مجھے دھمکی دی۔"

الزبتھ نے کہا "اچھا۔ تم نے اس کا ذکر تو کیا تھا مگر شکایت بہرحال نہیں کی تھی۔"

میں نے کہا "میرا دل بالکل صاف ہے۔ بلکہ وہ ناراض ہو مجھ سے تو میں اس سے معافی بھی مانگ لوں گا۔ میرا مقصد ہرگز اس کی دل آزاری نہیں تھا۔"

الزبتھ نے کہا "میں نے سکندر کو اور اس کے دوست محسن کو آج رات ڈنر پر بُلایا ہے۔ میری گاڑی انھیں لینے آئے گی۔"

"اگر آپ بُرا نہ مانیں خاتون، تو انھیں اپنے ساتھ ہی لے جائیں، اپنی گاڑی میں ورنہ میں اپنی کار میں آپ کے ساتھ روانہ کردیتا ہوں۔ ایسا نہ ہو کوئی اور آفیسر کوئی نیا مسئلہ کھڑا کردے، کوئی نیا قانونی پہلو نکال لے، آپ تو جانتی ہیں پولیس والوں کی عادت، بال کی کھال نکالنے کی۔"

الزبتھ نے کچھ سوچا "اگر ایسی بات ہے تو پھر میں ان کو اپنے ساتھ ہی لے جاتی ہوں۔"

"کیا میں ان کا سامان گاڑی میں رکھوادوں؟"

"ہاں۔ شوفر سے کہہ دو، وہ خود ہی رکھ لے گا۔"

کیپٹن کے باہر جانے کے بعد میں نے کہا "کیا یہ مناسب رہے گا، میرا مطلب ہے تمھارے شوہر کو یہ اچھا لگے گا؟"

"اچھا تو اسے بہت کچھ نہیں لگتا۔ مگر کیا فرق پڑتا ہے اس سے۔ میں اس کی بیوی ہوں، غلام نہیں" وہ بولی "وہ بھی بہت کچھ کرتا ہے جو مجھے اچھا نہیں لگتا۔ اور پھر میں چوری چھپے کچھ نہیں کررہی ہوں۔"

"لیکن یہ خلافِ قانون تو ہے، کسی حد تک" محسن نے کہا۔

میں نے کہا "میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے تمھارے اور اس کے ازدواجی تعلقات میں کسی قسم کی رنجش پیدا ہو۔"

وہ ہنس پڑی "ازدواجی تعلقات ایسی چھوٹی چھوٹی رنجشوں سے متاثر نہیں ہوتے۔ کچھ میں اس کے لیے کرتی ہوں، مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ ہی میرے لیے زیادہ کرتا ہے۔ بعض اوقات تو مجھے احساس بھی ہوتا ہے اپنی زیادتی کا۔ وہ پاگل ہے میرے لیے، میری جائز ناجائز سب ہنسی خوشی برداشت کرتا ہے۔ مجھے آج تک انکار نہیں کیا اس نے۔"

"مگر یہ معاملہ ذرا مختلف ہے۔ وہ مجھے اپنا رقیب ضرور سمجھتا ہے اور تم کہو گی کہ وہ میرے لیے بھی اتنا ہی کرے۔"

"اس کا تم سے کیا تعلق؟ رچرڈ وہی کرے گا جو میں اس سے کہوں گی۔ ویسے بھی تم اسے قائل کرلوگے۔ اس لیے تم میرے ساتھ جارہے ہو کہ اس کے اور تمھارے درمیان جو غلط فہمی ہے وہ

نفع ہوجائے۔ تم بڑے اچھے مقرر تھے۔ اپنے دلائل سے دن کو رات ثابت کرسکتے تھے۔ اسی لیے تو اپنی ایکٹنگ سے ہر لڑکی کو اپنے سچے عشق کا یقین دلادیتے تھے۔"

"سوائے ایک لڑکی کے۔" میں نے کہا "اس کے سامنے میں نے بالکل ایکٹنگ نہیں کی تھی۔ یہی تو ساری خرابی ہے۔ جھوٹ کا سکہ چل جاتا ہے سچ پر کوئی اعتبار نہیں کرتا۔ خواہ مخواہ کی بات ہے کہ حق کا بول بالا۔"

"اچھا چلو۔ بہت سچ بول لیا تم نے" اس نے مجھے دروازے کی طرف دھکیلا۔ "اسی کا جادو ہے جو آج بھی میرے سر چڑھ کے بول رہا ہے۔ کتنا غصہ تھا میرے دل میں تمھارے خلاف، میں بھری بیٹھی تھی اور یہاں آئی تھی تم کو خوب ذلیل کرنے مگر دیکھو تم نے کتنی آسانی سے میرے ارادے خاک میں ملادیے، الٹا میں تم کو اپنے معزز مہمان کی حیثیت سے اپنے ساتھ لے جارہی ہوں۔"

"مجھے اپنی خوش قسمتی میں کبھی شک نہیں رہا" میں نے کہا۔

سفید وردی والے سیاہ فام لمبے تڑنگے شوفر نے بڑے مودبانہ انداز میں الزبتھ کے لیے اس کی چم چم کرتی رولز رائس کا دروازہ کھولا۔ اس نے مجھے اور محسن کو خاصے ناپسندیدہ اور مشکوک انداز میں دیکھا لیکن اس نے اپنے رویے سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ میں بیٹھنے ہی والا تھا کہ اندر سے ایک پولیس مین تیزی سے نکلا اور میری طرف بڑھا۔ میں نے اسے پہچان لیا تھا یہ وہی باکسر تھا۔

اس نے ہاتھ بڑھا کے کہا "تم اچھے فائٹر ہو۔"

میں نے بھی خوش دلی سے کہا "تم یقیناً اچھے باکسر ہوگے۔"

"میرے پاس پولیس کا کلر ہے۔ ایک بار میں نے کامن ویلتھ گیمز میں چاندی کا تمغا لیا تھا۔ اس میں پاکستان سے بھی ایک باکسر آیا تھا۔"

"میری خواہش ہے کہ تم گولڈ میڈل لو۔"

وہ ہنسا "خواہش تو میری تھی کہ محمد علی کلے کو ہرادوں۔ مگر میں نے اس کے بعد کامن ویلتھ گیمز اور یورپین گیمز میں چاندی کا تمغا تک نہیں جیتا۔ اب وقت گزر گیا ہے۔ خیر، مقابلہ اچھا رہا۔"

"مقابلہ دلچسپ رہا۔"

"اسے صرف مذاق یا تماشا ہی سمجھنا۔ سیریس مت ہوجانا۔ میں نے غصے میں بہت کچھ کہہ دیا تھا، کالے رنگ اور اخبار والوں کے خلاف۔"

میں نے اسے یقین دلایا "میں سب کچھ بھول چکا ہوں۔"

"NO HARD FEELINGS?"

میں نے کہا "NONE"

جب بالآخر رات کے آٹھ بجے کیپٹن کا شکریہ ادا کرکے ہم پولیس اسٹیشن سے باہر آئے تو میں نے صدقِ دل سے خدا کا شکر ادا کیا۔ مجھے اتنی ہی مسرت ہوئی جتنی جیل میں قدم رنجہ فرما کے رہائی کا حکم وصول کرنے والے کو ہوسکتی ہے۔ اس میں تھوڑا بہت دخل اتفاقات کو ضرور تھا۔ پولیس نے ہماری تلاشی نہیں لی تھی اور ہم سے کاغذات طلب نہیں کیے تھے۔ ہمارے بدلے ہوئے نام والی شخصیت کا راز فاش نہیں ہوا تھا ورنہ IMPERSONIFICATION کا کیس الگ ہوتا۔ غلط پارکنگ کی معمولی کوتاہی سے شروع ہونے والی کہاں تک پہنچی تھی۔ تفتیش ہوتی تو معاملہ صرف ہمارے غیر قانونی طور پر لندن میں داخل ہونے تک محدود نہ رہتا۔ پولیس معلوم کرلیتی کہ جس ڈاکٹر شاہ کی کار تھی وہ خود کہاں مرا ہوا پڑا ہے۔ قتلِ عمد کا کیس حالات اور واقعات کی شہادت سے ثابت ہوجاتا پھر چوہدری دلاور کا کیس سامنے آتا اور اس کے بعد دوسرے معاملات جن میں ہم لندن میں قیام کے دوران ملوث ہوئے تھے۔

مجھے یقین آیا کہ خدا کی مصلحت بندے کی ناقص عقل سے بہت بالاتر ہے۔ بظاہر خرابی کے اسباب دیکھنے والی نگاہ اس میں پوشیدہ خوبی کو نہیں دیکھ پاتی۔ گرفتار ہوکے پولیس اسٹیشن پہنچنا ہمارے نزدیک بدقسمتی کی انتہا تھی کہ ٹوٹی کہاں کمند۔ ہم نے اپنی طرف سے سارے ... تھے۔ ساری مشکلات پر قابو پالیا تھا اور تمام مرحلے کامیابی سے طے کرلیے تھے۔ ہم قانون کی آنکھوں میں دھول جھونک کے اڑنے ہی والے تھے کہ گرفتار ہوگئے۔ مگر اس بدقسمتی کو دستِ قدرت نے کیسے خوش قسمتی بنادیا۔ ذلت و رسوائی کے بدلے ہم بڑی عزت و آبرو کے ساتھ اس الزبتھ کے ساتھ اس کی گاڑی میں اس کے گھر جارہے تھے جس کے تصور سے ہماری روح فنا ہوتی تھی۔ اس کے شوہر کا نام میرے لیے ملک الموت کا نام تھا اور مجھے یقین تھا کہ اگر اس کا اور میرا کہیں سامنا ہوجائے جہاں کوئی دیکھنے والا نہ ہو تو وہ پستول سے توپ تک جو کچھ دستیاب ہوا مجھ پر داغ دے گا۔ اگر اسے یا مجھے بفرضِ محال، قانونی طور پر اجازت ہوتی کہ چلو ایک بندہ گرادو، تو میں چوہدری دلاور کو ماردیتا اور وہ شاید مجھے۔ لیکن اچانک تقدیر نے پانسہ پلٹ دیا تھا۔ چوہدری دلاور کسی گولی کے بغیر مر رہا تھا اور میں ملک الموت کے ساتھ ڈنر پر مدعو تھا۔

میں اندازہ کرسکتا تھا کہ خود محسن کے خیالات کیا ہوں گے۔ کوئی اور ساتھ ہوتا تو میں اور وہ بے تکلفی سے اپنی قومی اور مادری زبان میں اظہارِ خیال فرماتے اور اس کامیابی پر چلا کے ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے اور نعرہ لگاتے "وہ مارا پاپڑ والے کو۔"

الزبتھ کے سامنے۔ خصوصاً اس کے شوفر کی موجودگی میں، ہم ایسی گھٹیا حرکت کرتے تو اسے کوئی شبہ نہ رہتا کہ ہم ذرا بھی خاندانی لوگ نہیں ہیں۔ یہ ادب آداب کے بھی منافی ہوتا چنانچہ ہم بڑی پر تکلف گفتگو کرتے رہے۔ الزبتھ بھی فرنچ جانتی تھی چنانچہ کبھی انگریزی اور کبھی فرنچ میں ہم اس وقت کی یادوں کو دہراتے رہے جو بیت چکا تھا اور اس کے بعد انگریزی محاورے کے مطابق، پُل کے

نیچے سے ٹیمز کا بہت پانی بہہ گیا تھا۔ چار سال کی رفاقت کے کُل کتنے دن تھے، کتنے گھنٹے منٹ اور سیکنڈ۔ میں نے ایسے ہی ذہنی مشق کرتے ہوئے حساب کیا۔ تقریباً چودہ سو اکسٹھ دن اور تقریباً پینتیس ہزار گھنٹے۔ اس سے زیادہ کا زبانی جمع خرچ میرے لیے ممکن نہ تھا۔ مگر یہ لاکھوں منٹ اور شاید کروڑوں سیکنڈ ہوں گے۔ ہر لمحہ اپنا کوئی نقش چھوڑ جاتا ہے۔ ہمارے پاس بھی یادوں کا مشترک خزانہ تھا۔ ہم اس میں سے یادگار لمحے چُنتے رہے۔

گاڑی الزبتھ کے قصرِ عالی شان میں داخل ہوئی تو مجھے پھر تشویش لاحق ہونے لگی۔ اس یقین دہانی کے باوجود کہ شوہر اس کا غلام ہے مجھے اپنا الزبتھ کے ساتھ آنا ایک اشتعال انگیز کارروائی محسوس ہوتا تھا۔ میں وثوق سے کہہ سکتا تھا کہ ایسی ہی صورت حال مجھے درپیش ہوتی تو میں اپنے رقیب کو بلا تامل قتل کردیتا۔ خواہ قتل کرنے کے بعد اس کی بے گناہی ثابت ہوجاتی تو میں پچھتاتا۔

یہ گھر میرے لیے نیا نہیں تھا۔ یہ الزبتھ کے باپ کا گھر تھا۔ یہاں میں کتنی بار آیا تھا اور کئی بار بے عزت ہوکے گیا تھا۔ اگر میں الزبتھ سے سوال کرتا کہ آخر اس کا شوہر یہاں کیوں رہتا ہے، کیا اس کا اپنا کوئی گھر نہیں؟ ہمارے لیے تو یہ سخت باعث شرم بات ہے کہ بیوی رخصت نہ ہو، شوہر رخصت ہوکے سسرال میں رہنے لگے۔ بہت سے محاورے بھی بنا رکھے ہیں ہم نے کہ بہن کے گھر بھائی کتا، ساس کے گھر جوائی کتا۔

کاکروچ اپنے رتبے اور حیثیت کے اعتبار سے الزبتھ کا ہم پلہ تھا اور شاید وہ حسب نسب میں بھی کم نہ تھا۔ اس کی سرکاری حیثیت تقریباً ویسی ہی تھی جیسی نگی کے مرحوم ابّا اور وقار یوسف کے سسر نقوی صاحب کی۔ وہ بھی بڑی توپ چیز تھے۔ مگر وقار یوسف نے ان کا گھر داماد بننا بالکل قبول نہیں کیا تھا اور نگی بھی اپنے محل جیسے گھر کو چھوڑ کے وقار یوسف کے چھوٹے سے مکان میں آبسی تھی۔ یہاں معاشرتی اقدار مختلف تھیں۔ بیوی کے گھر میں رہنے سے شوہر کی ناک نہیں کٹتی تھی۔ یہ ان کے آپس میں طے کرنے والی بات تھی کہ وہ کہاں رہنا پسند کرتے ہیں۔

گاڑی ہمیں پورچ میں اتار کے آگے گیراج کی طرف چلی گئی۔ ایک اور خادم نے ہمارا سامان جو درحقیقت چوہدری دلاور کا سامان تھا، ایک شاندار بیڈ روم میں پہنچادیا۔

"لو بھئی اپنے شیروانی صاحب، عیش کرو عیش۔"

محسن صوفے پر دراز ہوگیا "مجھے تو یہ سب خواب کی طرح لگتا ہے۔ ایسا نہ ہو آنکھ کھلے تو پتا چلے حوالات میں پڑے ہیں۔"

میں نے کہا "اسی کو کہتے ہیں قسمت الو کے پٹھے۔ چند سال تو بھی رہا لندن میں، جھک ماری۔ ایک ہی محبوبہ تھی ایسی جو آج بھی سب کچھ نچھاور کرنے پر تیار ہے۔"

"نچھاور کے بچے۔ سنبھل کے بیٹھ۔ ابھی اچانک کسی ۔۔۔ازے سے تیرا قاتل رقیب نمودار ہوگا۔ ہاتھوں میں دو نالی شکاری بندوق کے ساتھ۔ ایک گولی تیرے دل نابکار میں مارے گا دوسری مجھے۔ میں صرف تیری رقابت میں ایسے مارا جاؤں گا جیسے گیہوں کے ساتھ گھن پس جاتے ہیں۔"

میرے مزید کچھ اور ارشاد فرمانے سے پہلے فون کی سُریلی گھنٹی بجنے لگی میں نے ریسیور اٹھالیا۔ میرا اندازہ درست تھا۔ یہ بیک وقت محل سے باہر اور محل کے اندر آپس میں بات چیت کرنے کے کام آتا تھا۔

الزبتھ نے کہا "تم لوگ نہا دھو کے ایزی ہوجاؤ۔ میں ذرا رچرڈ کو بریف کرتی ہوں۔"

میں نے کہا "اگر اس کا ارادہ پکا ہو اور وہ تمہاری نہ مانتے ہوئے ہمیں قتل کرنا چاہے تو ہمیں خبردار کردینا۔"

وہ ہنسی "کیا کروگے تم، بھاگ سکتے ہو یہاں سے؟"

میں نے کہا "نہیں، مگر اور بہت کچھ کرسکتے ہیں، رو دھو سکتے ہیں۔ کہا سنا معاف کراسکتے ہیں۔ کلمۂ شہادت پڑھ سکتے ہیں اور وصیت کرسکتے ہیں کہ ہماری تدفین اس جگہ ہو جہاں سے تمہارے قدم ہر روز گزرتے ہوں۔"

وہ بولی "باتونی آدمی، اس سے کیا ہوگا؟"

"ہر روز جب تم میرے دل کو روندتی گزروگی تو تمہیں آواز سنائی دے گی۔ آہ یہ میرا دل ہے ظالم حسینہ، کوئی پتھر نہیں۔"

وہ پھر ہنسی اور فون بند کردیا۔

محسن نے جل کے کہا "اب کوئی فائدہ نہیں مکھن لگانے کا بیٹے۔ وہ تمہاری رگ رگ سے واقف ہے۔"

"واقف نہ ہوتی تو اعتبار کرتی مجھ پر۔ اسی اعتبار کے صدقے میں تیری جان بھی بچ گئی ورنہ آج رات حوالات میں مچھر کھاتا۔ اب ٹھاٹ سے ڈنر کھائے گا، ایک لارڈ کے ساتھ بیٹھ کے۔"

"مجھے اب بھی خطرہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ کھانے میں ہمیں زہر دلوادے گا۔ اگر کھانے سے پہلے گولی نہ ماری۔"

رات نو بجے ایک باوردی بٹلر نمودار ہوا "لارڈ رچرڈ گورڈن اینڈ لیڈی الزبتھ گورڈن ڈائننگ ہال میں اپنے معزز مہمانوں کا استقبال کرنے کے لیے چشم براہ ہیں۔"

محسن نے کہا "بڑی اچھی بات ہے۔ جب ہمارے گھر کوئی مہمان آتا ہے تو ہم بھی چشم براہ رہتے ہیں۔"

میں نے اسے ڈانٹا۔ "گدھے۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ تشریف لائیے۔ زیادہ بے تکلفی میں کہا جائے گا کہ کھانا کھالو ورنہ نہیں کھانا تو جہنم میں جاؤ۔"

ڈائننگ ہال بڑا پرشکوہ تھا۔ محل کے اس حصے میں آنے کا مجھے پہلے اتفاق نہیں ہوا تھا۔ جب میں الزبتھ کی محبت کے وائرس سے ہونے والے ناقابلِ علاج مرض میں مبتلا تھا تو میری رسائی مہمانوں کے کمرے تک تھی یا انتظار گاہ تک۔ ایک دوبار میں جان ہتھیلی پر رکھ کر اس کے بیڈ روم تک پہنچ گیا تھا اور مناسب عزت افزائی کے ساتھ نکالا گیا تھا۔ الزبتھ کے سخت گیر اور متعصب باپ کا سیکیورٹی سسٹم بہت فعال اور مضبوط تھا۔ ایک کالے ایشیائی نے اس کی عالی نسب حسین وجمیل بیٹی کے گورے دل میں نقب لگا کے اپنی محبت کا دیا جلادیا تھا۔ اس کے بعد وہ زیادہ محتاط ہوگیا تھا۔ چونکہ بقول شاعر یہ آگ وہ نہیں جسے پانی بجھا سکے۔ وہ محبت کا دیا اس وقت تک گل نہیں کرسکا تھا جب تک اسے روشن رکھنے کے لیے میں موجود تھا۔ مجھے بیک بنی ودو گوش حدودِ برطانیہ سے نکالنے کے بعد اس نے میرے خلاف ڈس انفارمیشن اور بدنیتی پر مبنی پروپیگنڈا مہم چلا کے کامیابی حاصل کی اور الزبتھ کو مجھ سے بدظن کرنے کے بعد اس کی شادی کاکروچ سے کرنے میں کامیاب رہا۔ اس کے بعد دنیا میں کرنے کے لیے کچھ نہ تھا چنانچہ وہ رحلت فرماگیا۔

اس کی زندگی میں مجھے محل کے اندرونی حصوں تک کیسے رسائی حاصل ہوسکتی تھی۔ وہ مجھے قتل کروانے سے پہلے اس ڈائننگ ہال میں آخری طعام پیش کرسکتا تھا اور تعزیتی اجلاس کی طرح مجھ سے جان چھوٹ جانے کی خوشی میں تعزیتی ڈنر بھی دے سکتا تھا مگر مجھے معزز مہمان کی حیثیت سے یہاں مدعو کرلے، یہ اس کی زندگی میں ممکن نہیں تھا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ یہ دیکھنے سے پہلے ہی وہ اس دنیا سے رخصت ہوگیا تھا۔

شاہ بلوط کی سیاہ پالش سے چمکتی ہوئی منقش اور سنہرے حاشئے والی کرسیوں کی قطاریں گھری ہوئی میز ہال کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پھیلی ہوئی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق اس میز پر ایک ساتھ پچاس افراد بیٹھ کے ڈنر تناول فرماسکتے تھے۔ بعد میں یہ اندازہ غلط ثابت ہوا۔ اس پر چھبیس افراد کی گنجائش تھی۔ بارہ ایک طرف اور بارہ دوسری طرف۔ دو آمنے سامنے۔ ایرانی قالین اور کرسٹل کے نصف درجن فانوسوں سے مزین اس کمرے کے بالکل آغاز میں سر رچرڈ گورڈن عرف کاکروچ سیاہ سوٹ کے ساتھ سیاہ، بوٹائی لگائے باادب، باملاحظہ، ہوشیار کھڑا تھا۔ الزبتھ نے بھی اپنا لباس بدل لیا تھا اور وہ فارمل پارٹی ڈریس میں تھی یوں جیسے دو افراد کے لیے نہیں ڈنر بیس بائیس معزز حضرات وخواتین کے اعزاز میں دیا گیا ہے۔

رچرڈ کے لبوں پر خوش اخلاقی کی مسکراہٹ اس کے دل پر حکمرانی کرنے والی بیوی کے حکم کی تعمیل کے لیے تھی۔ سر تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے۔ اس نے انتہائی شائستگی سے کہا "ویلکم ٹو الزبی پیلس۔ کیسے مزاج ہیں آپ کے مسٹر سکندر بخت۔ اور آپ کا کیا حال ہے مسٹر محسن شیروانی؟"

الزبی پیلس غالباً اس محل کا نیا نام تھا جو الزبتھ کے نام کی مناسبت سے رکھا گیا تھا۔ الزبتھ نے اسے استقبالیہ کلمات کے لیے میرے اور محسن کے پورے نام پھر یاد دلادیے ہوں گے اگر وہ بھولا ہوا تھا تو۔

میں نے بھی پُرتکلف لہجے میں، اس سے مصافحہ کرکے کہا "فائن سر رچرڈ گورڈن! ہاؤ ڈو یو ڈو؟ اور آپ لیڈی الزبتھ..... یو لک بیوٹی فل ایز ایور۔"

اس نے نزاکت سے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیا اور مسکرائی۔ میں نے اس کا ہاتھ لبوں تک لے جاکے چھوڑ دیا۔ یہ استقبالیہ آداب تھے۔ ہر بار ڈنر یا پارٹی میں آنے والے اسی طرح یہی جملے اسی پُرتکلف انداز میں دُہرانے کے پابند تھے۔ ہم اتنی لمبی میز پر روایتی طریقے سے نہیں بیٹھ سکتے تھے ورنہ ایک کنارے پر سر رچرڈ گورڈن نظر آتے۔ دوسرے کنارے پر الزبتھ۔ اور ہم دو اگر آمنے سامنے بیٹھتے تو کس کے ساتھ۔ نتیجہ یہ کہ ایک طرف میزبانی کے لیے صرف الزبتھ رونق افروز ہوئی۔ اس کے دائیں ہاتھ پر خود رچرڈ رہا اور محسن اس کے ساتھ بیٹھا۔ مجھے عین رچرڈ کے مقابل جگہ ملی۔

کھانے کے دوران میں بہت رسمی قسم کی بے حد شریفانہ گفتگو ہوئی کیونکہ بٹلر اور ویٹر آہٹ پر کان دھرے دست بستہ کھڑے تھے۔ ان کے سامنے میں سر رچرڈ گورڈن کے کندھے پر ہاتھ مار کے کہتا۔ یو ڈرٹی کاکروچ! سیو ریج لائن کے کیڑے۔ تم بازی جیت گئے۔ میری محبوبہ پر اپنے سازشی ہتھکنڈوں سے قابض ہوگئے۔ تو نہ صرف یہ کہ اس کی خاندانی ناک جڑ سے کٹ جاتی بلکہ شاید الزبتھ اور ویٹر سب پٹ سے گر کے بے ہوش ہوجاتے کہ طعام گاہ میں اس قسم کی گری ہوئی ذہنیت کی غماز، بازاری گفتگو۔ او مائی گاڈ! ہمارے آباواجداد کی عالی نسل عالی نسب ارواح کو کس قدر شرمندگی ہوگی کہ ہم نے اس شرافت ونجابت کے ماحول کو کیسے لوگوں کو بُلا کے خراب کیا۔ ایسا رویّہ ان کے لیے اتنا ہی ناقابل تصور تھا جیسے اپنے خوب صورت اور آراستہ ڈرائنگ روم میں گندے جوہڑ سے غسل فرما کے قدم رنجہ فرمانے والی بھینس کا وجود جس کے معطر بدن سے کیچڑ اور غلاظت بہہ رہی ہو۔

سر رچرڈ نے اور لیڈی الزبتھ نے ہم سے اور ہم نے ان سے بے حد رسمی سوال کیے۔ انڈیا کا موسم کیسا ہے۔ سوری سر، میں پاکستان میں ہوں۔ یہ پہلے ہندوستان کا حصہ تھا۔ پھر مسلمانوں نے اپنی الگ حکومت قائم کرلی۔ اوہ یس، مجھے یاد آگیا۔ جنگِ عظیم دوم کے بعد انگریزوں نے اس ملک کو آزادی دے دی تھی۔ تو تم کیا کررہے ہو وہاں؟۔ ابھی کوئی خاص کام نہیں، بس پلان کررہا ہوں کہ اپنی جائداد اور جاگیر کی آمدن کو کیسے اور کہاں انویسٹ کیا جائے۔ اور آپ، سر رچرڈ غالباً وزارتِ داخلہ میں ہیں۔ اوہ یس، وقت گزاری کے لیے کچھ تو کرنا ہوگا۔ آپ نے ہمارا گھر دیکھا؟ اٹ از بیوٹی فل۔ آپ کی حسین بیوی کے شایانِ شان اور ان کے ذوقِ جمال کے مطابق۔ (اس نے دل ہی دل میں مجھے گالی دی ہوگی۔ سور کا بچہ، طعنہ دیتا ہے کہ محل میری بیوی کا ہے اور ذوقِ جمال سے کیا میں عاری ہوں؟)

کھانے کے سات کورس تھے۔ جو سوپ سے شروع ہوکے کافی

پر ختم ہوئے۔ کافی پینے کے لیے ہم اسموکنگ روم میں چلے گئے اور وہاں کھل کے بات ہوئی۔

"آج تم نے سب کے سامنے مجھے کاکروچ نہیں کہا؟" وہ بولا۔

میں نے کہا "وہ پرانی بات ہے۔ جب ہم نوجوان اور نادان تھے۔"

"کیا اب تم ذہنی طور پر بالغ ہوگئے ہو؟" وہ بولا۔

میں نے کہا "پتا نہیں۔ کیا تم اب کاکروچ نہیں رہے؟"

الزبتھ نے فوراً مداخلت کی "رچی۔ سکندر کی کچھ پرابلم ہے۔"

"اچھا؟ کیا پرابلم ہے؟" اس نے سگار جلاتے ہوئے کہا "اگر میں کچھ کرسکتا ہوں۔"

میں نے کہا "تم بہت کچھ جانتے ہو۔ مثلاً یہ کہ میں نے کراچی سے یہاں آنے کے لیے قانون کے مطابق کوشش کی تھی۔ ناکامی کے بعد میں نے ایک غیر قانونی طریقہ آزمایا تھا اور عین وقت پر فرار نہ ہوتا تو وہیں دھر لیا جاتا۔ تم نے اپنے کونسلیٹ کو میرے خلاف پوری طرح بریف کردیا تھا۔ خیر' قصور تمہارا نہیں' جو کچھ تم میرے بارے میں جانتے تھے' اس کے بعد تمہارا معاندانہ رویّہ غلط قرار نہیں دیا جاسکتا۔ ہم دوسری طرف نکل گئے یعنی پہلے کولمبو گئے' وہاں سے پیرس پہنچے اور پیرس سے چھپ کر لندن آئے۔ سوفیصد غیر قانونی طور پر۔ سفری دستاویزات کے بغیر' یہ رپورٹ بھی تمہارے محکمے کے نمک خواروں نے تمہیں دی ہوگی۔"

اس نے پہلو بدل کے کہا "ہاں' کچھ سنا تھا میں نے۔"

میں نے کہا "اس وقت مجھ سے سر رچرڈ گورڈن بن کے بات مت کرو۔ میں یہاں ایک پرانے دشمن کی حیثیت سے دوستی کا ہاتھ بڑھانے اور غلط فہمیاں رفع کرنے آیا ہوں۔ ہم پڑھے لکھے اور مہذب لوگ ہیں۔ ہمارے رویے میں فراخ دلانہ لچک اور مفاہمت کی گنجائش ہونی چاہیے۔ ہم نے چار سال ساتھ گزارے۔ ایک دوسرے کے لیے ہم صرف کلاس میٹ تھے۔ ہماری مصروفیات میں آپس کی رفاقت اور رقابت سب شامل تھی۔ یہ زندگی ہمیں آنے والے وقت کی ذمے داریوں کے لیے ایسے ہی تیار کرتی ہے۔ ہم بچپن میں اور پھر جوانی میں خواہشوں کی ناکامیوں سے اور خوابوں کی شکست سے۔ چھوٹی چھوٹی محرومیوں سے جذباتی صدمات کے بڑے بڑے دکھ اٹھانے اور آلام و مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کا سبق سیکھتے ہیں۔"

اس نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا "تم فلاسفر ہوگئے ہو۔"

"نہیں' میں پریکٹیکل ہوگیا ہوں۔ جو میں کل تھا وہ آج نہیں ہوں۔ اور جو آج ہوں کل وہی نہیں ہوسکتا۔ ہمیں حقیقت کا ادراک ہونا چاہیے کہ اس وقت ہم کہاں ہیں اور ہمارے درمیان تعلق کی اصلیت کیا ہے۔ آج میں ایک دوسری دنیا سے وارد ہوا ہوں۔ اس دنیا کے مسائل کے بارے میں تم کچھ نہیں جانتے' نہ تم ان تبدیلیوں کا اندازہ کرسکتے ہو جو میری شخصیت اور کردار میں رونما ہوئی ہیں۔ تم تسلسل کے ساتھ ایک زندگی جی رہے ہو جو کسی خلل اندازی کے بغیر وہی ہے جیسی تم نے اپنے لیے پسند کی۔ میرا معاملہ اس کے برعکس رہا۔ مجھے اس زندگی سے بے دخل کردیا گیا۔ زبردستی' لاقانونیت اور بدمعاشی کے ذریعے۔ جس پر میرا حق تھا' یا میں سمجھتا تھا کہ وہ زندگی مجھے واپسی میں منتظر ملے گی۔ میں فکر و غم اور اندیشوں سے بے نیاز زندگی ایک موروثی جائداد کے ساتھ حاصل کرلوں گا۔ میرے لیے سب کچھ میرے باپ نے پہلے ہی کردیا تھا۔ میری زندگی کے حصے کی ساری مشکلات خود اس نے جھیلی تھیں تاکہ مجھے کبھی پریشانی سے واسطہ نہ پڑے۔ یہ پرانے وقتوں کے باپ' بوڑھے لوگ' کیسے جذباتی اندازِ فکر رکھتے تھے' بھلا یہ ممکن ہے کہ زندگی میں کسی کو رنج و غم' دکھ اور پریشانی ہی نہ ملے۔ یہ سب زندگی کے ساتھ قبول کرنا پڑتا ہے۔ کسی کو کم کسی کو زیادہ۔ اس کم اور زیادہ ہی کے لیے زندگی کی جدوجہد ہے۔ غم ہے تو اس کا مداوا بھی ہے۔ رنج کا خوگر ہونے میں خوشی ہے۔ سارا سال بہار کے پھول کھلتے تو بہار میں کیا حُسن نظر آتا؟ خزاں بھی اہم ہے۔ خیر تم پھر کہو گے کہ میں فلسفہ بول رہا ہوں مگر یہ بنیادی حقائق ہیں۔ میں نے جو کچھ کیا' اس میں مجھے ہمیشہ انتخاب کا حق حاصل نہیں رہا۔ میں نے وہ سب کچھ نہیں کیا تھا جو مجھ سے منسوب تھا۔ پھر میں کیا کرتا' جب کسی طاقتور بلاک کی طرف سے کسی چھوٹے اور کمزور ملک پر جنگ مسلط کی جاتی ہے تو وہ مجبور ہوجاتا ہے اپنے دفاع' اپنی بقا اور اپنی شناخت برقرار رکھنے کے لیے لڑنے پر" میں نے ایک گہری سانس لی۔

مجھے اندازہ ہوا کہ میں نے تمہید سے مقصد کے حصول کی جانب نمایاں پیش قدمی کی ہے۔ کاکروچ بڑی توجہ اور انہماک کے ساتھ میری بات سُن رہا تھا اور متاثر بھی نظر آتا تھا۔ یہ اندازِ بیان سے زیادہ حقائق کا کمال تھا۔ جھوٹ اتنے اعتماد کے ساتھ کون بول سکتا ہے کہ سُننے والے کے دل میں شک کا خیال تک نہ آئے۔ شاید مجھے احساس تھا کہ مجھے اپنی وکالت خود کرنی ہے تو سچ کی طاقت کا بھرپور استعمال کرنا ہوگا۔ یہ میرے لیے دُہری جنگ تھی۔ ایک بقا کی جنگ تھی' میں ہاری ہوئی بازی پھر جیت لینا چاہتا تھا۔ کاکروچ کے قائل ہونے کی صورت میں یہ امید تھی کہ اس کا اثر رسوخ میری راہ میں حائل ہوجانے والی ہر رکاوٹ دور کرنے میں معاون ثابت ہوگا۔ دوسری جنگ ضمیر کی عدالت میں اخلاقی سند حاصل کرنے کے لیے تھی۔ میں کاکروچ کو یقین دلانا چاہتا تھا کہ الزبتھ سے میرے تعلق کی نوعیت محض جذباتی تھی اور آج میں اس کی عزت پہلے سے زیادہ کرتا ہوں کیونکہ وہ کسی اور کی بیوی ہے۔

میں نے لندن سے واپسی کے اسباب کو بنیاد بناتے ہوئے اپنی داستانِ حیات کا وہ حصہ بھی سنادیا جس کا تعلق میرے ماضی سے تھا۔ میں کون تھا' کہاں سے آیا تھا اور اپنے پیچھے کیا چھوڑ کر مستقبل میں کیا چاہنے کے لیے لندن پہنچا تھا لیکن واپس پہنچ کے میں نے کیا دیکھا اور کیا پایا پھر کیا سامنے آیا اور کیسے ناپاک شیطانی عزائم رکھنے والے ہوس کے شکاری میری جان کے دشمن ہوئے جب انہوں نے کیسے میرا ضمیر خریدنے کی کوشش کی اور ناکامی کے بعد کس طرح میرے گرد اپنا حصار تنگ کیا۔ صرف مجھے ہی نہیں میرے چاہنے والوں کو بھی شدید ترین ذہنی و جسمانی اذیت دے کر مجھ پر دباؤ ڈالا گیا۔ میرے دوستوں نے کس طرح خلوص کی اس آزمائش میں میرا ساتھ دیا۔ کیسے ایم آر ایس بنی۔ اس نے کیا معرکے سر کئے۔ اس راہِ وفا میں کس کس نے کیا قربانی دی۔ کسی نے اپنا گھر بار لٹایا تو کسی نے جان دینے میں بھی بخل سے کام نہیں لیا۔

میں نہیں چاہتا تھا کہ بیان کو اتنا طول دوں اور حقیقت میں افسانوی اندازِ بیاں سے ساحری یا شاعری کروں مگر جب بات شروع کی تو مجھے یوں لگا جیسے میں خود نہیں بول رہا ہوں' حقائق خود اپنے اظہار کے لیے الفاظ کا پیرایہ منتخب کرکے میری زبان سے ادا ہورہے ہیں۔ یہ مہینوں بلکہ برسوں کا غبار تھا جو موقع ملتے ہی ایسے نکلا جیسے پریشر ککر سے بھاپ نکلتی ہے۔ جیسے ساون کی بدلی بالآخر ٹوٹ کے برستی ہے۔ آج سے پہلے میں کسے سناتا اور کس کو بتاتا۔ جو سن سکتے تھے وہ تو خود سنے جانے والے واقعات کا حصہ تھے۔ وہ سب اس پُر صعوبت سفر میں شریکِ سفر تھے جس کی منزل بارہا سراب ثابت ہوئی تھی مگر آج مجھے اپنے سامنے نظر آرہی تھی۔ میں اس مرحلے پر منزل کا سُراغ پھر گم کرنے کا صدمہ اور نقصان افورڈ نہیں کرسکتا تھا۔ میں تھک گیا تھا۔ مجھ میں پہلا سا حوصلہ نہیں رہا تھا۔ میں انسان تھا' کوئی مافوق الفطرت ہستی نہیں تھا۔ میرے اعصاب ایک حد تک میرے عزائم کا ساتھ دے سکتے تھے۔ میں محسوس کرتا تھا کہ میری جدوجہد نے میرے دوستوں کی زندگی کے سارے خواب منتشر کردیے ہیں۔ ان کے مستقبل پر سے ان کا اعتبار ختم کردیا ہے۔ وہ بھی نہیں جانتے تھے کہ آگے کیا ہے؟ کیا ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں؟ شکاری کے ترکش میں کتنے تیر باقی ہیں جن کا نشانہ ان کا یقین ہوگا۔ وہ یقین جو انہیں اپنی راستی پر ہے۔ اپنی دوستی پر ہے' اپنی محبت پر اور انسانیت کی عظمت پر ہے۔ شرافت پر ہے اور قانون کی بالادستی پر اور اخلاقی اقدار کی تقدیس پر ہے۔

مجھے یوں لگا جیسے میں عدالت میں کھڑا ہوں اور وہ سب بتا رہا ہوں جس کے لیے مجھ سے پہلے بھی سقراط نے زہر کا پیالہ قبول کیا۔ ابن مریم نے صلیب کو چُوما۔ حسین ؓ نے خاکِ کربلا کو آبرو دی۔ میں ان کی ہمسری تو کیا ان کی تقلید کا دعویٰ بھی کروں تو شاید یہ تکبر میں شمار ہو۔ میں نے وہی کہا اور کیا تھا جس کو ساری دنیا کے ہر خطے میں پیغمبروں' اولیا اور اوتار' سماجی انقلاب کے بانیوں اور اخلاقی صحیفے مرتب کرنے والوں اور معاشرتی مفکرین نے عین انسانیت قرار دیا اور آدمیت بتایا۔ میں نے ان مظالم اور مصائب کا ذکر نہیں کیا جو میری ذات' میری زندگی اور میرے نصیب کا حصہ ہوئے۔ میں نے تو وہ بتادیا جو ساری دنیا میں ہر جگہ شیطان کے پیروکار' بدی کے علمبردار' امن و آشتی کے دشمن' محبت اور دوستی اور اخوت کے انسانی رشتوں کو بے اعتبار کرنے والے کررہے ہیں' یہ خیر و شر کی پرانی معرکہ آرائی کا نیا محاذ تھا جس پر میں نے ایم آر ایس کے نام پر ایک اور جنگ لڑی۔ اس کا انجام شکست پر نہیں ہوسکتا تھا۔

شاید یہ مواد میرے ذہن کی بھٹی میں پک رہا تھا اور میں غیر شعوری طور پر اس آخری معرکے کی تیاری میں مصروف تھا جو قانون کے میدان میں دلائل کے ہتھیاروں سے سر ہوگا۔ جہاں جذبات بے معنی ہوں گے۔ صرف حقائق کام آئیں گے۔ یہ وہی بیان تھا جو میں عدالت میں گواہوں کے کٹہرے میں کھڑا ہو کے دیتا۔ اب اس کے لیے وقت باقی نہیں رہا تھا۔ اچانک سب سے بڑی عدالت کا فیصلہ سامنے آگیا تھا اور چوہدری دلاور نے آخری معرکے سے پہلے ہی شکست تسلیم کرلی تھی۔ میری حالت اس بچے جیسی تھی جس نے بڑے جوش و خروش اور کامیابی کے سوفیصد یقین کے ساتھ کسی مقابلے کے لیے دن رات تیاری کی ہو مگر اسے آخری وقت میں بتایا جائے کہ انعام اسے دے دیا گیا ہے کیونکہ مقابلے کے لیے دوسرا حریف کوئی نہیں۔ جو حریف تھا وہ قضائے الٰہی سے فوت ہوگیا ہے۔ اس بچے کی خوشی میں کتنی مایوسی ہوگی۔ کتنا رنج ہو اور اس وقت جب وہ بلا مقابلہ جیتنے کے باوجود دل گرفتہ ہو تو اس کا شفیق باپ کہے کہ ہاں بھئی' ہم بھی تو سُنیں کہ تم نے کیا تیاری کی تھی مقابلے کے لیے۔ اور اس وقت وہ بچہ فرض کرے کہ وہ اکیلا نہیں بول رہا ہے۔ اس کے سامنے پنڈال ہے جو سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہے اور اس نے اپنے تقریر سے سماں باندھ دیا ہے' جادو کردیا ہے سُننے والوں پر۔

جب میں خاموش ہوا تو یہ خاموشی جاری رہی۔ اس خاموشی میں ان سب کی سوچ گونج رہی تھی جو میرے ساتھ تھے۔ عدالت کی فل بینچ فیصلہ مرتب کررہی تھی۔ وہ غور و خوص کے بعد سچ کو جھوٹ سے الگ کررہے تھے۔ قانونی موشگافیوں سے اُدھڑی ہوئی' جھوٹے گواہوں کے بیانوں سے مسخ ہوجانے والی' اور حلفیہ تضاد بیانی سے شناخت کھودینے والی حقائق کی لاش کا معائنہ کررہے تھے اور اصل حالات و واقعات کو مفروضات سے اخذ کررہے تھے۔

فرق صرف یہ تھا کہ یہاں ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ کے جج نہیں تھے۔ فیصلہ کرنے والی ایک عورت تھی جو مجھ پر اعتبار کرتی تھی اور ایک مرد تھا جو اس عورت کا شوہر ہونے کے ناتے اور بغض و عداوت کے جذبات سے مغلوب ہوکے میرے سچ کو جھوٹ قرار دے سکتا تھا۔ لیکن الزبتھ نے کہا تھا کہ وہ کینہ پرور نہیں ہے۔ کیا اس نے یہ بیان محض ایک روایتی طور پر وفادار بیوی کا تاثر برقرار رکھنے کے لیے دیا تھا؟

سرر چرڈ گورڈن کا رد عمل حوصلہ افزا تھا۔ آہستہ آہستہ اس پر چڑھا ہوا احساس برتری کا ملمع اترنے لگا تھا۔ وہ سرر چرڈ گورڈن کی پُرنخوت اور مصنوعی رکھ رکھاؤ والی شخصیت کے خول سے باہر آرہا تھا۔ وہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ ایزی تھا اور بے تکلفی سے مسکرانے بھی لگا تھا۔ اس نے درمیان میں مجھ سے جو سوالات کیے تھے وہ اس بات کی علامت تھے کہ وہ میرے کیس کو پوری توجہ اور دلچسپی کے ساتھ ذہن نشین کررہا ہے۔

خاموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد اس نے الزبتھ سے کہا "میرا خیال ہے کہ ہمارے دوست بھی ایک کپ کافی کی ضرورت محسوس کررہے ہوں گے۔"

اس نے تمہارے دوست نہیں کہا تھا۔ ہمارے دوست کا لفظ استعمال کیا تھا۔ ہم تو پہلے ہی ادب آداب کو بالائے طاق رکھتے ہوئے صوفے پر دراز تھے اور پھر کشن کے ساتھ قالین پر پھسل گئے تھے۔ کچھ دیر بعد اس نے بھی اپنا سرکاری فوٹو والا پوز ختم کردیا اور ہماری طرح فری ہوکے ایسے بیٹھ گیا جیسے ہر شریف آدمی اپنے گھر میں بیٹھنا پسند کرتا ہے۔ پاؤں صوفے پر سمیٹ کر یا خود فرش پر لمبا لیٹ کر اور پاؤں صوفے پر پھیلا کے یا کشن کو گود میں اور بغل میں دبوچ کر۔

میں نے کہا "اگر میں تمہیں کاکروچ کہوں الزبتھ کے سامنے تو تمہیں بُرا لگے گا؟"

وہ ہنس پڑا "نہیں، اب مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مجھے معلوم ہوگیا ہے کہ میں کاکروچ نہیں ہوں، تم کو بھی میں کرسی کی ٹانگ یا گدھے کی دم کہوں تو اٹ از جسٹ اے جوک۔"

"اس کے بعد مذاق بے لطف ہوجاتا ہے" میں نے کہا۔

"میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں سکندر!" اس نے کہا "کہ ویسے تو میرے پاس تصدیق کے وسائل کی کمی نہیں، میں تمہارا سارا ریکارڈ دیکھ سکتا ہوں۔ چوہدری دلاور سے پوچھ سکتا ہوں یا اس نیگرو جارج سے اور اس کے وکیل سے معلوم کرسکتا ہوں لیکن میرا خیال ہے کہ تم پر ویسے ہی اعتبار کرلوں۔"

"آخر کیوں؟" میں نے کہا۔

"اس لیے کہ تمہاری بات مجھے سچ لگتی ہے۔ اصل مسئلہ یہی ہوتا ہے۔ بعض اوقات جھوٹ کو سچ بنانے والے کمال کرتے ہیں۔ وہ عقل کو قائل کرسکتے ہیں لیکن یہ جو دل کا معاملہ ہے نا..... یہ ذرا مختلف ہوتا ہے۔ دل بہت کم گواہی دیتا ہے کہ کوئی بات مان لی جائے خواہ عقل اسے تسلیم نہ کرتی ہو۔"

"یعنی تم قائل نہیں ہوئے، بس دل کے ہاتھوں مجبور ہو؟"

"نہیں۔ تمہارے معاملے میں عقل کا فیصلہ وہی ہے جو دل کا۔ میں تم پر یقین کرنا تو نہیں چاہتا تھا مگر تم نے مجھے مجبور کردیا، پتا نہیں کیسے۔ اور اب میرا دل تمہاری طرف سے بالکل صاف ہے۔"

میں نے کہا "تھینک یو۔ مگر کہیں تم الزبتھ کا دل رکھنے کے لیے تو ایسا نہیں کہہ رہے ہو؟"

وہ ہنسا "عورتوں کو.....اور خصوصاً الزبتھ جیسی بیوی کو...یقیناً ہم جیسے زن مریدوں پر جذباتی بالادستی حاصل رہتی ہے۔ لیکن میں نجی مسائل کو اپنے عمومی فرائض سے الگ رکھتا ہوں۔ الزبتھ کی سفارش سے تمہیں کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ شاید الٹا نقصان ہوجاتا۔ اس نے تو صرف یہ کہا تھا کہ ایک بار تمہاری بات سن کے فیصلہ کروں۔ انصاف کا تقاضا بھی یہی تھا۔ میں تم سے رقابت کے جذبات بھی رکھتا تھا دراصل..... تمہارا پُرانا تاثر کچھ اور تھا۔ بعد میں اس تاثر کو مزید خراب کیا گیا۔ مجھے ایسی اطلاعات ملتی رہیں جو غالباً بدنیتی پر مبنی اور جانبدارانہ تھیں۔"

"مجھے خوشی ہے کہ میں تمہاری غلط فہمی رفع کرسکا۔"

"میں سمجھتا ہوں کہ تمہارے ساتھ اوّل تا آخر زیادتی ہوئی۔ الزبتھ کے معاملے میں تم بہت جذباتی تھے۔ مجھے ابھی الزبتھ نے بتایا کہ تم نے بھی اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔"

"کون سی غلطی کا؟"

"اگر تمہاری شادی الزبتھ سے ہوجاتی تو بہت خرابی ہوتی۔ اس فیصلے میں عقل کا کوئی دخل نہیں تھا اور شدید جذباتی ردِعمل کا مظاہرہ تمہاری غلطی تھا جس کی بنا پر تمہیں یہاں سے نکالا گیا۔ اب تم تسلیم کرتے ہو کہ وہ ٹھیک تھا، الزبتھ کے باپ کی سوچ متعصبانہ نہیں، پریکٹیکل تھی۔"

"یس..... ہم ایک دوسرے کے ساتھ نہ خوش رہ سکتے تھے اور نہ وفادار۔ تم اس کے لیے موزوں ترین شوہر تھے۔ اس نے بالکل صحیح انتخاب کیا بعد میں۔ اور یہ بڑی اچھی بات ہے کہ آج ہم سب اسی فراخ دلی کے باعث پُرانے دوستانہ جذبات رکھتے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کے دشمن نہیں ہیں، ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو سمجھ رہے ہیں اور....."

"اور کیا..... بس اتنا کافی ہے۔ اب مجھے یہ بتاؤ کہ اس معاملے میں ملوث ہوئے بغیر میں تمہارے لیے کیا کرسکتا ہوں؟"

"میرا خیال ہے کہ تم صرفِ نظر کرسکتے ہو۔ یعنی ہمارے قانونی مسائل ہم پر چھوڑ دو اور بس۔ ہم دلاور کے ساتھ نکل جائیں گے۔ پولیس کی دخل اندازی سے دس بارہ گھنٹے کی تاخیر ہوئی مگر وہاں کے معاملات کسی پریشانی کے بغیر طے ہوگئے۔ تم نے ہمارا نقطۂ نظر سمجھ لیا اور میں نے اپنی پوزیشن کلیئر کردی۔ رہے یہاں کے قانونی معاملات تو بعد میں تم جیسے چاہو سمیٹ لو۔"

اس نے سر ہلایا "تمہارا کیا پروگرام ہے؟"

میں نے کہا "ہم جانا چاہتے ہیں فوراً۔"

"کوئی حرج نہیں۔ تم صبح چلے جانا۔"

میں نے کہا "وہ کیوں، ابھی کیوں نہیں؟"

"اس وقت..... رات کے بارہ بجے" الزبتھ نے کہا۔

"وقت کی پابندی ان کے لیے اہم ہوتی ہے جو کسی معمول پر کاربند ہوں۔ یہ ایک غیر معمولی صورتِ حال ہے" محسن نے کہا۔ "رات کے بارہ بجے اور صبح کے سات یا دس بجے میں کیا فرق ہے۔ ہم یہ پانچ گھنٹے یا دس گھنٹے بڑی ٹینشن میں گزاریں گے۔ رات بھر آرام سے سوسکتے تو شاید رُک جاتے مگر ان حالات میں نیند آنے کا کوئی سوال نہیں۔ ہمارے اعصاب پر ایک خوف ضرور سوار رہے گا کہ نہ جانے اچانک کیا ہوجائے، چوہدری دلاور کچھ بھی کرسکتا ہے ہوش میں آنے کے بعد۔"

"پھر تقدیر جو کھیل ہمارے ساتھ کھیل رہی ہے" محسن بولا۔

"اوکے۔ جیسی تمہاری مرضی۔" رچرڈ نے کہا "میں تمہاری ہر طرح سے مدد کے لیے تیار رہوں۔"

میں نے اسے حیرانی سے دیکھا "میں نے سُنا تھا کہ تم بہت اصول پرست ہو؟"

"ٹھیک سنا تھا تم نے۔ عام طور پر ایسا ہی ہوں مگر ہر شخص کے لیے جذباتی رشتوں کی کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں۔ جب وہ خود اپنے اصولوں پر کاربند نہیں رہ سکتا۔ میں کوئی فرشتہ نہیں ہوں۔ بعض اوقات ملازمت میں اوپر والوں کے لیے بھی گنجائش نکالنی پڑتی ہے۔ پھر میں تمہارے لیے کیوں نہ نکالوں۔ خصوصاً ایسی صورت میں کہ خود میں محسوس کرتا ہوں کہ تمہارے ساتھ قانون کے نام پر لاقانونیت ہوئی اور انصاف کے نام پر ناانصافی۔"

میں نے اس سے ہاتھ ملا کے کہا "تھینک یو ڈیئر کاکروچ۔ مجھے خوشی ہے کہ تم نے پریکٹیکل ہونے کا ثبوت دیا۔ اصول ضابطے اور قاعدے کی آڑ لے کر اپنی معذوری ظاہر نہیں کی۔ میں ہمیشہ تمہارا احسان مند رہوں گا۔ اور مجھے یقین ہے کہ ہم پھر ملیں گے تو بہت اچھے حالات میں پُرانے دوستوں کی طرح..... بہت جلد ملیں گے۔"

الزبتھ بھی خوش تھی کہ اس نے جو کہا تھا وہی سچ ثابت ہوا۔ شوہر نے اعتراف کرلیا کہ وہ الزبتھ کے لیے کچھ بھی کرسکتا ہے۔

"اس وقت تم کیسے جاؤگے؟" الزبتھ نے کہا۔

میں نے کہا "یور ہائی نیس۔ جیسے آپ لائی تھیں، ویسے ہی باہر نکال دیں۔ میں تو پہلے بھی نکالا جاتا تھا۔"

محسن نے کہا "اگر تمہاری گاڑی کے شناخت ہونے سے کوئی خرابی پیدا ہونے کا امکان ہو تو ہمارے لیے ٹیکسی بھی طلب کی جاسکتی ہے۔"

رچرڈ نے اطمینان کا سانس لیا "ٹیکسی بہتر رہے گی۔"

میں نے کہا "شاید چوہدری دلاور کو اسپتال سے ساتھ لے جانا ہمارے لیے مشکل ہو۔ اسے وہاں پولیس نے داخل کرایا تھا اور پولیس کی تحویل میں رکھا تھا۔"

رچرڈ فکرمند نظر آنے لگا "ہاں۔ یہ پرابلم ہوسکتی ہے۔ خیر، میں کچھ کرتا ہوں۔"

الزبتھ نے پوچھا "تم دلاور کو ساتھ لے کر کہاں جاؤگے آخر؟"

میں نے کہا "یہ مجھے فون کرکے معلوم کرنا پڑے گا۔"

رچرڈ نے اٹھتے ہوئے کہا "میں بھی ایک فون کرکے آتا ہوں۔"

الزبتھ نے ایک کونے کی طرف اشارہ کیا "تم یہ فون استعمال کرسکتے ہو۔"

میں نے گھڑی دیکھی اور جیک عرف ہائی جیک کے پہلے ٹھکانے کا نمبر ملایا۔ گھنٹی مسلسل بجتی رہی مگر مجھے اندازہ تھا کہ اس وقت جیک جہاں بھی ملا سوتا ہوا ملے گا اور اسے بیدار ہوکے فون اٹھانے میں کچھ دیر لگے گی۔

بالآخر ایک عورت نے ہیلو کہا اور میں نے اس کی آواز پہچان لی "آئی ایم سوری خاتون، میں نے آپ کی نیند خراب کی۔"

اس نے اخلاقاً کہا "کوئی بات نہیں۔"

"دراصل میں نے سارا دن جیک کی تلاش میں گزار دیا۔ آپ سے بھی بات ہوئی تھی....."

"ابھی بات کرنا چاہتے ہو جیک سے۔ کیا کوئی ایمرجنسی ہے؟"

"سخت ایمرجنسی ہے۔ اگر وہ سو رہا ہے تو اسے اٹھادو پلیز!"

"اچھا۔ میں دیکھتی ہوں کوشش کرکے۔ اگر اس کا نشہ اتر گیا ہوگا تو وہ جاگ جائے گا۔"

میں انتظار کرتا رہا۔ چند منٹ بعد جیک نے پھاڑ کھانے والے انداز میں کہا "ہیلو۔ یہ کس کو ایمرجنسی ہے اس وقت؟"

میں نے کہا "تمہارا وہ کنٹریکٹ جو آج شام کے لیے تھا۔"

"اسے منسوخ سمجھو۔ مجھے نہ کل فرصت ہے اور نہ اس کے بعد۔"

"لیکن اس وقت تم وہ رقم کما سکتے ہو۔ صبح تک ہمیں پیرس پہنچادو۔"

اس نے کہا "کیا تم پاگل ہو؟"

"ہاں۔ کیا تمہیں شک ہے۔ اور اسی لیے میں تم کو ایک ہزار پاؤنڈ اضافی پیش کررہا ہوں۔ تم اندھیرے میں جہاز اڑا سکتے ہو نا؟"

"اندھیرے میں آنکھیں بند کرکے اڑا سکتا ہوں مگر تمہارا چکر میری سمجھ میں نہیں آیا۔ مجھے مرنا منظور ہے، جیل جانا نہیں۔"

"مطمئن رہو، نہ تم مروگے اور نہ جیل جاؤگے۔"

"اس وقت تم کہاں سے بول رہے ہو؟"

"اس کا صحیح جواب تو ہے اپنے منہ سے مگر تم شاید اس وقت مذاق کو انجوائے نہیں کروگے، میں ایلزی پیلس سے بول رہا ہوں۔"

اس نے خفگی سے کہا "اور کیا یہ مذاق نہیں ہے۔"

"نہیں۔ یہ ایک اتنی ہی ناقابلِ تردید حقیقت ہے جتنی تمہاری آج والی محبوبہ۔ جس نے تمہاری موجودگی کا اقرار کرکے بڑی اخلاقی جُرأت کا ثبوت دیا۔ حالانکہ یہ موجودگی ہی سراسر غیر اخلاقی ہے....."

"پلیز شٹ اپ۔ یہ ایلزی پیلس آخر کہاں ہے۔ لندن میں میرے باپ دادا پیدا ہوئے اور مرکھپ گئے۔ میں بھی چالیس سال گزار چکا ہوں۔ مجھے کیوں معلوم نہیں؟"

میں نے کسی فلاسفر کی طرح فرمایا "بعض اوقات کسی کو معلوم نہیں ہوتا کہ بچہ بغل میں ہے۔ وہ شہر میں ڈھنڈورا پیٹتا رہتا ہے۔"

"میں سمجھا نہیں!"

"مجھے امید بھی نہیں تھی کہ سمجھوگے۔ تم راستہ سمجھ لو' کس جگہ سے آؤگے۔"

اس نے مجھے اپنی جائے وقوع بتائی اور میں نے اسے ایلزی پیلس کا پتا بتایا تو وہ شور کرنے لگا "اسے ایلزی پیلس کون گدھا کہتا ہے۔"

میں نے کہا "سر رچرڈ گورڈن۔ جو محکمہ داخلہ کی بڑی توپ چیز ہے' الزبتھ اس کی بیوی کا نام ہے۔ یہ اسی کے نام پر ہے۔ اب یہ بتاؤ کہ ... تم اپنی گاڑی خود لاؤگے..."

"ہاں۔ مگر نہیں.... مجھے ٹیکسی میں آنا چاہیے۔ ابھی آدھے گھنٹے تک مجھ پر نیند کا اور نشے کا اثر رہے گا' میں ڈرائیونگ نہیں کرسکتا۔"

"پھر جہاز کیسے اُڑاؤگے؟"

وہ پھر ناراض ہوگیا "جہاز کے راستے میں کھمبے نہیں آتے' زیبرا کراسنگ اور ٹریفک سگنل نہیں ہوتے۔ ہوا میں غلط پارکنگ نہیں ہوتی جہازوں کی۔ سڑکوں پر ایسی ہی چیزوں سے حادثات ہوتے ہیں اور جہاز اُڑانے تک مجھے نشہ بھی نہیں رہے گا۔ نیند تو خیر اڑگئی ہے ابھی سے۔"

"نشہ تم ... طرح نہیں اُتار سکتے۔"

اس نے کہا "اتار سکتا ہوں۔ میرے پاس ایسی دوا بھی ہے جس سے... ہر نشہ صرف بیس منٹ میں پوری طرح غائب ہوجاتا ہے۔ ویسے بھی میرا دماغ اس پیشے میں پوری طرح سیٹ ہوگیا ہے۔ کاک پٹ میں بیٹھتے ہی میری چھٹی حس تک مستعد ہوجاتی ہے۔ میں تقریباً ایک گھنٹے میں پہنچ جاؤں گا۔"

میں نے کہا "ہم تمہیں تیار ملیں گے۔"

"ہم کون۔ ... سب لوگ؟"

"ہاں۔ میں اور میرا دوست.... اور ہمارا مریض.... تم جس ٹیکسی میں آؤگے ہم اس کو آگے لے جائیں گے۔"

"آگے کہاں' پیرس....؟"

سر رچرڈ نے کمرے میں داخل ہوکے گھڑی دیکھی اور مسکرایا "تمہارا وہ مسئلہ تو حل ہوگیا۔ ایک ایمبولینس تقریباً آدھے گھنٹے میں چوہدری دلاور کے ساتھ آنے والی ہے۔ مجھے خاصا لمبا چکر چلانا پڑا۔"

"میں پھر تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اللہ نے چاہا تو ہماری تقدیر کا چکر بھی بہت جلد ختم ہوجائے گا۔ ہم زندگی میں سیٹل ہوجائیں گے اور جب اپنے اپنے گھر آباد کرلیں گے تو پھر تمہیں مدعو کریں گے۔"

اس نے کہا "ہم ضرور آئیں گے اور تمہارے مہمان ہوں گے۔ مجھے مدت سے آرزو تھی انڈیا پاکستان جانے کی۔ میرا ایک دادا لاہور میں تھا۔ وہاں سے ایک اخبار شائع ہوتا تھا' سول اینڈ ملٹری گزٹ۔"

"ہاں۔ مشہور مصنف اڈیارڈ کپلنگ بھی اس کا ایڈیٹر رہا تھا۔ اس کی میں نے ایک ہی کتاب پڑھی ہے۔ ایک ناول ہے KID NAPPED۔"

"رائٹ۔ میرا وہ دادا اسی کے ساتھ تھا۔"

"ایک دادا سے تمہاری کیا مراد ہے؟" میں نے کہا۔

"وہ میرا حقیقی دادا نہیں تھا۔ میرے اصل دادا کے چار کزن تھے' فرسٹ کزن... ان میں سے ایک وہ تھا۔ اس کی ڈائری ہمارے پاس ہے۔ میرے والد نے مجھے دی تھی۔ اس نے لاہور کے بارے میں بہت دلچسپ باتیں لکھی ہیں۔"

میں نے کہا "شاید اب تمہیں وہ سب نہ ملے جو سو سال پہلے تھا۔ لاہور ایک جدید شہر ہے۔ اس کے کچھ حصے بالکل لندن جیسے ہیں۔ تم آئندہ مارچ میں آنا۔ ہم تمہیں ہاؤس اینڈ کیٹل شو دکھائیں گے۔ جو بہار میں ہوتا ہے اور شالیمار باغ کے میلہ چراغاں میں لے جاکے جیب اور تسمہ کھلائیں گے۔"

الزبتھ نے بڑے اشتیاق سے پوچھا "جیب اور...!"

میں نے کہا "تسمہ۔ قتلِ عامہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اور یہ بیان کرنے کی چیز بھی نہیں' کھانے کی چیز ہے۔ میلہ چراغاں کی اسپیشل ڈش۔"

دوسری بار کافی پیتے ہوئے ہم پھر پرانی باتوں میں کھوگئے مگر اب ماحول پہلے کے مقابلے میں زیادہ بے تکلفی کا تھا۔ ہم نے ان واقعات کا ذکر کیا جو شرارت اور بدمعاشی کے زمرے میں آتے تھے۔ ہم دل کھول کر ہنسے۔ ایک واقعے پر میں جھینپا تو دوسرے پر گورڈن۔ پھر محسن نے الزبتھ کو ایک ایسی بات بتائی جو مجھے بھی معلوم نہیں تھی اور اس نے ہنستے شرماتے محسن کو مصنوعی غصے کے ساتھ کہا کہ بکومت مگر پھر خود ہی ایک انکشاف کیا کہ محسن بھی اس پر ڈورے ڈالنے والے ناکام عاشقوں میں شامل تھا۔ لیکن یہ اس سے پہلے کی بات ہے جب میں الزبتھ پر فریفتہ ہوا تھا۔ محسن نے جھینپ کر تسلیم کیا کہ اس نے تو اپنے پروگرام اور منصوبے کے مطابق اظہارِ عشق کا فریضہ ادا کیا تھا۔

"میں نے خاصا رسک لیا ہے ایمبولینس کو یہاں بلاکے۔ اس سے میری پوزیشن پر حرف بھی آسکتا ہے۔ اگر کل کوئی مسئلہ پیدا ہوجائے" رچرڈ نے اچانک کہا۔

"تم کو ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ ہم اسے اسپتال سے اٹھالیتے" میں نے کہا۔

"وہ تمہارے لیے ممکن نہ ہوتا" وہ بولا "خیر کوئی بات نہیں۔ میں انکار کردیتا تمہیں' وہ دوسری بات تھی۔ اب تمہاری آدھی ادھوری مدد کرنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں۔ میں نمٹ لوں گا بعد میں جو بھی ہوگا۔ کوئی سیریس بات نہیں ہوگی۔ لیکن تم یہ بتاؤ کہ اس وقت پیرس کیسے جاؤگے؟"

میں نے اسے ہائی جیک کے بارے میں بتایا "یہ سب ہم نے اس پر چھوڑ دیا ہے۔ وہ ایسے دھندوں میں نہ جانے کب سے پڑا ہوا ہے۔ اسے سارے چور دروازوں کا اور ... راہداریوں کا پتا ہے۔"

"اور پیرس سے آگے؟"

میں نے کہا "ہائی جیک کی معرفت ایک چارٹرڈ فلائٹ سے ہم بنکاک پہنچ جائیں گے۔ ہانگ کانگ میں سنگاپور بھی جاسکتے ہیں اور وہاں سے کراچی۔"

"تم پورا جہاز چارٹر کروگے۔ اس میں خاصے اخراجات ہوں گے" الزبتھ بولی۔

"مجبوری ہے۔ میں کوئی رسک نہیں لے سکتا اس مرحلے پر۔ اگر وقت ہوتا تو ہم بائی روڈ جاتے۔ اس سے چوتھائی خرچ میں اپنی گاڑی بھی ساتھ لے جاتے جو پاکستان میں بھی کام آتی۔ ورنہ اسے بیچ کے ہم اخراجات پورے کرسکتے تھے۔ سفر بالکل فری ہوتا اور تفریح الگ ہوتی مگر دلاور کے پاس زندگی کی مہلت بہت کم رہ گئی ہے۔ معاملہ برین ٹیومر کا ہے۔ نہ جانے کس وقت وہ اچانک COLLAPSE کرجائے۔ یا کوما میں چلا جائے۔ جب تک اس کا دماغ کام کررہا ہے۔ اسے بھی بہت کچھ کرنا ہے۔ اور ہمیں بھی اس سے بہت کام ہیں۔"

"I WISH YOU A SAFE JOURNEY"

"تھینک ... ڈیئر کاکروچ۔ سب سے زیادہ اہم تمہاری نیک خواہشات تھیں جن کی مجھے بالکل توقع نہ تھی" میں نے کہا۔

اس نے میرے شانے پر ہاتھ مارا "یو بلیک ڈاگ۔ جب میں لاہور آؤں تو مجھے کسی کے سامنے کاکروچ مت کہنا۔"

میں نے ہنس کے کہا "ہم پاکستانی اور بالخصوص پٹھان بڑے مہمان نواز ہوتے ہیں۔ مہمان ہمارے لیے فرشتۂ رحمت ہوتا ہے۔ ان کی عزت کی خاطر ہم جان تک دے سکتے ہیں۔ تم آکے دیکھو ایک بار۔"

ایمبولینس بڑی خاموشی سے آگئی۔ مجھے بڑا تعجب ہوا جب میں نے اس کے ڈرائیور کی جگہ اسی حبشی کو دیکھا جو الزبتھ کی کار چلاکے لایا تھا۔ الزبتھ نے مجھے بتایا کہ وہ کتنا پرانا اور وفادار خاندانی ملازم ہے۔ اس کے باپ نے ساری عمر الزبتھ کے باپ کے شوفر کی حیثیت سے گزاری تھی۔ ان کی حیثیت گھر کے ایک فرد جیسی تھی اور ان پر اتنا ہی اعتماد بھی کیا جاتا تھا۔

حبشی کو پہلے ہی تمام ہدایات دے دی گئی تھیں چنانچہ وہ ایمبولینس کو باہر ایک نسبتاً تاریک سایہ دار جگہ پر روک کے خود اس میں بیٹھا رہا۔ جب ٹیکسی آگئی تو اس نے خود ہی چوہدری دلاور کو ایمبولینس سے ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر شفٹ کیا اور پھر ایمبولینس لے کر خاموشی سے روانہ ہوگیا۔ اس نے کسی کے شکریے اور شاباش کا انتظار نہیں کیا۔

ایک اور ملازم نے سوٹ کیس اور بریف کیس ٹیکسی میں رکھ دیے۔ میں نے ہائی جیک کا تعارف سر رچرڈ سے اور الزبتھ سے کرایا "یہ میرے پُرانے دوست ہیں" میں نے کہا۔

جیک خاصا مرعوب ہوا۔ اس کے لیے ایک خاندانی لارڈ اور اس کی خیرہ کن حسن کی مالک بیوی لیڈی الزبتھ سے ملاقات اعزاز کی بات تھی۔ خود میں اس کی نظر میں بے حد معتبر ہوگیا تھا۔ اس نے پورے رسمی اخلاق کے ساتھ کہا کہ ان سے مل کے اسے بے حد مسرت ہوئی ہے۔

رچرڈ نے کہا "ہمارے دوست کا خاص خیال رکھنا۔ ان کو کہیں کوئی پرابلم نہ ہو۔ خدانخواستہ کوئی مشکل درپیش ہو تو مجھ سے رابطہ کرنا۔"

"کوئی مشکل نہیں ہوگی یور لارڈشپ۔ ہائی جیک ان مسائل سے بہت اوپر اڑتا ہے جن سے زمین پر رہنے والوں کو واسطہ پڑتا ہے۔ ہائی جیک کی فلائٹ بہت ہائی ہوتی ہے۔"

الزبتھ نے کہا "مجھے اُمید ہے کہ تم شیخی نہیں بگھار رہے ہو۔"

"بیس سال کی فلائنگ کا تجربہ ہے میرے ساتھ لیڈی الزبتھ۔ اور اس میں سے نصف ایک ہی جہاز اُڑا کے حاصل کیا ہے۔ یہ میرا اپنا جہاز ہے اور ہم ایک دوسرے کے مزاج آشنا ہیں۔ ان راستوں پر میں ایسے آتا جاتا ہوں جیسے آپ محل کے اندر بیڈ روم سے باتھ روم تک آتی جاتی ہوں گی' عادت کے مطابق۔ کیا اس میں آپ کبھی کوئی مشکل یا خطرہ محسوس کرتی ہیں' نہیں تو پھر...."

"او کے۔ اب چلو" میں نے کہا۔

رات کے دو بجے یہ سفر دوبارہ شروع ہوا۔ درمیان میں تقریباً آٹھ گھنٹے کا وقفہ آگیا تھا۔ شام چھ بجے پولیس ہمیں اپنے ساتھ لے گئی تھی تو میری مایوسی کے جذبات کی انتہا نہ تھی۔ مجھے اپنی بدقسمتی پر رونا آرہا تھا کہ ایک معمولی سی غلطی نے بنا بنایا کام بگاڑ دیا۔ اتنا بڑا منصوبہ آخری مرحلے میں ناکامی سے یوں دوچار ہوگا۔ یہ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ پوری دیوار اٹھانے والا معمار جب آخری اینٹ رکھنے والا ہو تو دیوار دھڑام سے گرجائے' یہ کچھ ایسی ہی بدبختی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ اب کچھ باقی نہیں رہا' سب ختم ہوگیا۔ پولیس کی تحویل میں جانے کے بعد سب سامنے آجائے گا' یہ کہ ہم کون ہیں' ہماری اصل کیا ہے اور ہم کس کس جرم میں کہاں کہاں ملوث اور مطلوب ہیں۔ خدا کو کچھ ثابت کرنے کی کیا

ضرورت۔ یہ تو ہم جیسے خدا کو بھول جانے والوں کے لیے قدرت کے دست غیب کا معمولی سا جھٹکا ہوتا ہے۔ میں یہ بھولا ہوا تھا کہ جیسے میری زندگی اور موت پر کسی کا اختیار نہیں' ایسے ہی میں کسی کی موت کے وقت اور مقام یا سبب کا تعین نہیں کرسکتا۔ میں تو چاہتا تھا کہ دنیاوی نظام انصاف کے ذریعے چوہدری دلاور کو تختۂ دار پر پہنچا کے موت سے ہمکنار کروں مگر میرے زعم اور عزائم کو شکست ہوئی تو میں نے جانا کہ میرا فیصلہ بھی شاید نمرود کی خدائی کے دعوے کی طرح تکبر کا گناہ تھا جو مجھ سے نادانستگی میں سرزد ہوا۔ کیا یہ میری بندگی کا سجدۂ ندامت اور اپنے گناہ پر خجالت کا انعام تھا کہ اس نے اپنے عفو و رحمت سے پھر وہ بندوبست کردیا جو میری تدبیر کے حسن انتظام سے کہیں زیادہ مکمل اور محفوظ تھا۔ میری ناکامی دوبارہ کامیابی میں بدل گئی تھی۔ دشمن نے دوست بن کے مدد کی تھی' انہی ہاتھوں نے میرے راستے کی سب رکاوٹیں دور کی تھیں' جو رکاوٹیں کھڑی کرنے کے ذمّے دار تھے۔ یہ سب کیا تھا؟ اسے میں اپنی کوشش سے کیسے منسوب کرسکتا تھا۔ اسے صرف دستِ غیب سے ظہور میں آنے والا کرشمہ یا معجزہ ہی سمجھا جاسکتا تھا۔

میں' محسن اور چوہدری دلاور ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر تھے۔ دلاور ابھی تک سویا ہوا تھا جو تعجب کی بات تھی۔ نیند کے انجکشن کا اثر اتنی دیر بعد بھی ختم نہیں ہوا تھا۔ میں نے اس کو ہلا جلا کے دیکھا اور پھر اس کی نبض دیکھی' بظاہر سب ٹھیک تھا۔

محسن بولا "زندہ ہے ابھی۔"

میں نے سر ہلایا "پھر کیا بے ہوش ہے؟"

"بے ہوشی اور نیند میں کیا فرق ہوتا ہے' مفصل بیان کیجئے اور مثالوں سے واضح کیجئے۔"

میں نے کہا "یہ اب تک کیوں سو رہا ہے؟ انجکشن تو اسے چھ بجے سے بھی پہلے دیا گیا تھا۔ اور اگر یہ بے ہوش نہیں ہے تو پھر اسے جاگ جانا چاہیے۔ ہلانے جلانے سے' بے ہوش آدمی کے REFLEXES کام نہیں کرتے۔"

محسن نے کہا "REFLEXES ابھی چیک کرلیتے ہیں' بھائی ڈرائیور صاحب! ماچس ہوگی آپ کے پاس؟"

میں نے کہا "ولایتی ڈرائیور ہے' ولایت کی زبان سمجھے گا۔"

ماچس' جیک کے پاس تھی۔ محسن نے ایک دیا سلائی جلا کے بجھائی اور فوراً دلاور کی گردن پر لگادی۔ دلاور کراہ کے بری طرح چونکا اور اس کا ہاتھ خود بخود گردن کی طرف بڑھا "یہ سو رہا ہے" محسن نے اعلان کیا "ممکن ہے اسپتال میں کسی نے اس کو پھر انجکشن دے دیا ہو۔"

میں نے ہائی جیک کو ماچس واپس کردی "یہ تم کس طرف سے جا رہے ہو؟"

"تمہارے خیال میں مجھے کدھر جانا چاہیے؟"

میں نے کہا "ادھر کون سا ائرفیلڈ ہے؟"

"یہ ایک ایسا ائرفیلڈ ہے جہاں سے اسپیشل فلائٹس آپریٹ ہوتی ہیں۔" وہ بولا "جیسے یہ فلائٹ۔ ہم ہیتھرو ائرپورٹ سے کیسے جاسکتے ہیں؟"

میں نے کہا "یہ غیر قانونی ائرپورٹ کیسے چل رہا ہے آخر؟"

"غیر قانونی...... یہ تم سے کس نے کہا ہے۔ ائرپورٹ ایک امریکن کمپنی کا ہے اور ان کے عملے کو لانے لے جانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ان کا سامان بھی آتا ہے۔ یہ آئل کمپنی ہر ملک میں خصوصی مراعات حاصل کرلیتی ہے۔"

"یہ وہی کمپنی تو نہیں جس نے سعودی عرب جیسے بہت سے عرب ممالک میں تیل پر اپنی اجارہ داری قائم کرلی ہے۔"

"ٹھیک سمجھے تم۔ یہاں سے ٹیک آف کرنے والے اور یہاں اُترنے والے جہازوں کی تمام قانونی ذمّے داری کمپنی کی ہے کہ اس میں کون اور کیا آتا جاتا ہے؟"

میں نے کہا "یہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن تم.... تمہارا کیا تعلق ہے اس امریکن آئل کمپنی سے؟"

وہ ہنسا "میں بھی ان کے لیے خصوصی خدمات سرانجام دیتا ہوں۔"

"خصوصی خدمات... صاف کہو نا کہ تم سی آئی اے کے ایجنٹ ہو۔"

"یہ تو ایک عام سی اصطلاح ہے۔ خیر تم ایسا ہی سمجھ لو۔ ابھی تک مجھے یہ درجہ حاصل نہیں ہوا لیکن ہوجائے گا۔ پھر میرے سارے مسائل خود بخود حل ہوجائیں گے۔"

"اس وقت تمہارے کیا مسائل ہیں؟"

"مسائل ہم سب کے ہیں۔ خواہ نوعیت کے لحاظ سے مختلف ہوں۔ اب تم اس جہاز کو ہی لو' یہ کوئی اڑانے کی چیز ہے؟"

"پھر کیا ہے؟"

"یہ گلانے کی چیز ہے۔ اس ماڈل کے اور ایسے جہاز بہت کم رہ گئے ہیں اور میں تو بس کسی نہ کسی طرح اپنا فلائنگ لائسنس RENEW کرا ہی لیتا ہوں۔ جھوٹ بول کے اور غلط بیانی سے کہ جناب میرے جہاز کی کیا بات ہے۔ اس کے سامنے تو بوئنگ 747 ہیچ ہے۔ ماڈل بھی غلط بتاتا ہوں اور کچھ لوگ مروت میں بھی کام کردیتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ میں جہاز کو سمجھتا ہوں۔ اس کے پر نہ ہوں' بلکہ انجن نہ ہو تب بھی اڑالے گا ہائی جیک اور کریش ہرگز نہیں ہوگا کیونکہ پرواز سے پہلے ہی اس کی آواز سن کے ہر پرزے کی حالت اور کارکردگی کا صحیح اندازہ کرلیتا ہوں۔ ایک نٹ بھی ڈھیلا ہو تو مجھے پتا چل جاتا ہے اور میں بھی اس وقت تک ٹیک آف نہیں کرتا جب تک میرا دل گواہی نہ دے کہ سب ٹھیک ہے۔ ایک خالص ٹیکنیکل مسئلے میں دل کی گواہی.... ہے نا عجیب بات مگر ایسا ہوتا ہے۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا "جب آپ مشین کی نفسیات کو سمجھ لیتے ہیں' طویل رفاقت کے بعد.... اور مشین آپ سے جھوٹ نہیں بولتی۔"

"ابھی تو میں اس کو صرف اس حد تک ٹھیک رکھتا ہوں کہ یہ اُڑتا رہے۔ اسے خوب صورت اور آرام دہ بنانا اور ڈیکوریٹ کرنا سب بے کار ہے۔ بوڑھی عورت کو میک اپ سے کون جوان بنا سکتا ہے۔ بہت جلد میں ایک شاندار سیسنا خرید لوں گا۔ اگر ممکن ہوا تو سولہ سیٹوں والا ورنہ آٹھ سیٹوں کا۔ اور پھر شریفانہ طریقے سے لندن' پیرس۔ پیرس' روم۔ روم' جینیوا۔ ایسی ہی فلائٹس آپریٹ کروں گا۔ ٹورسٹ سروس چلاؤں گا... لو ہم پہنچ گئے۔"

ٹیکسی ذرا سی دیر کے لیے ایک گیٹ پر رکی۔ گیٹ کا راستہ ایک بیریر نے روک رکھا تھا۔ دروازے پر چوکس کھڑے ہوئے گارڈ نے ٹارچ کی روشنی میں ٹیکسی کے اندر جھانکا اور پھر جیک کو دیکھ کے مسکرایا "ہائی جیک۔"

جواب میں اس نے بھی مسکرا کے کہا "ہائی۔ یہ میرے مسافر ہیں۔"

اس نے بیریر کھول دیا "ایک تو سو گیا ہے۔"

"ہاں۔ یہ اس کے خواب دیکھنے کا ٹائم ہے اور وہ خواب ایسے ہوتے ہیں کہ یہ مس کرنا نہیں چاہتا۔ بدمعاش میرے ساتھ شیئر بھی نہیں کرتا۔"

گارڈ ہنسا "لکی باسٹرڈ۔"

ٹیکسی سیمنٹ کی رن وے جیسی سڑک پر چلتی ہوئی ایک سائڈ سے مڑگئی۔ ہائی جیک کا جہاز اچانک سامنے آگیا۔ وہاں اس کے ساتھ تین دوسرے جہاز بھی موجود تھے جن میں ایک ہیلی کوپٹر تھا۔ باقی دو جہاز بالکل نئے اور خوب صورت تھے۔ ان کے ساتھ جیک کا تھکا ہارا خستہ حال بے رنگ جہاز مجبورا کھڑا تھا۔ اسے موقع ملتا تو وہیں لیٹ جاتا یقینا اسے جدید ترین ماڈل کے جہازوں کے ساتھ احساسِ کمتری بھی ہوگا۔

ہم نے چوہدری دلاور کو اٹھا کے جہاز میں شفٹ کیا۔ اس میں کاک پٹ کیبن اور مسافروں کا حصہ ایک ہی تھے۔ ان کے درمیان کوئی دیوار حائل نہیں تھی۔ پچھلے حصے میں ایک لمبی سیٹ تھی۔ ایسی ہی دو سیٹیں سائڈ میں لگی ہوئی تھیں۔ ان کو فولڈ کرکے اوپر بھی کیا جاسکتا تھا۔ وقت ضرورت ان بینچ جیسی سیٹوں پر بارہ افراد بیٹھ سکتے تھے یا تین افراد لمبی تان کے سوسکتے تھے۔ سیٹوں کو اٹھا کے خالی جگہ میں سامان لوڈ کیا جاسکتا تھا۔

ہم نے چوہدری دلاور کو فرش پر لٹانا بہتر سمجھا۔ اگر بینچ پر لٹاتے تو پرواز کے دوران کئی بار لڑھک کر گرتا۔ ہائی جیک نے ہمیں ایک سلیپنگ بیگ فراہم کیا جو سفری بستر سمجھا جاسکتا ہے۔

"بعض اوقات مجھے باہر رکنا پڑتا ہے۔ ایک بار سخت برف باری میں اترنا پڑا تھا۔ برف باری دو دن جاری رہی' جہاز برف میں دب گیا مگر میں اندر آرام سے لیٹا رہا۔"

"دو دن لیٹے رہے؟" میں نے کہا۔

"اور کیا کرتا' پریشان ہو کے چیخنے چلّانے سے بھی کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ اس بیگ میں ہم دونوں بڑی مشکل سے سمائے...."

"ہم دونوں؟"

"ہاں۔ وہ..... دراصل ایک لڑکی بھی میرے ساتھ تھی۔ اس کا خیال تھا کہ فنی خرابی کا محض بہانہ ہے' میری نیت شروع سے خراب تھی۔ تھوڑا بہت راشن بھی تھا اندر۔ تیسرے دن موسم ٹھیک ہوگیا تو میں نے خرابی دور کی۔ مگر اس وقت تک لڑکی کا دماغ خراب ہوچکا تھا۔ وہ دوبارہ مجھ سے نہیں ملی۔ خیر' روز ایک گھنٹا ملتے تو تعلقات اڑتالیس دن چلتے' ایک ساتھ اڑتالیس گھنٹے گزار لیے۔ بات تو ایک ہی ہے' تم سیفٹی بیلٹ تلاش کر رہے ہو نا؟ وہ نہیں ہے۔ سنبھل کے بیٹھ جاؤ اور اپنے بیمار دوست کو بھی سنبھالو۔"

جیک نے باتیں کرتے ہوئے جہاز کا اکلوتا انجن اسٹارٹ کردیا تھا اور اس کے آر پی ایم دیکھ رہا تھا۔ یہ اپنی نوعیت کا پہلا اور انوکھا سفر تھا۔ مجھے صرف اپنے ملک کا اندازہ تھا جہاں پولیس بڑی فراخ دلی سے ہر ٹیکسی' ویگن اور بس کو فٹنس سرٹیفکیٹ جاری کردیتی ہے خواہ اس کی ظاہری حالت ایسی ہو کہ اس میں مسافر کا منزل کے مقابلے میں آخری منزل پر پہنچنا زیادہ قرین قیاس لگتا ہو لیکن لندن کے اس جہاز کو دیکھ کے مجھے وہ شعر یاد آیا جو میں نے کراچی کی ایک قدیم بس کے پیچھے لکھا ہوا دیکھا تھا۔ نہ منزل کا پتا نہ بریک پر کنٹرول' چلا جا رہا ہوں خدا کے سہارے۔ ایسے اشعار میں وزن' ردیف اور قافیے کو تلاش کرنا ایسا ہی ہوگا جیسے اونٹ کی چال میں اعضا کی شاعری تلاش کرنا۔

جہاز جب اُڑا تو میں اور محسن بے پیندے کے لوٹوں کی طرح پیچھے لڑھک گئے۔ ہم نے پہلے خود کو اور پھر دلاور کو سنبھالا ورنہ وہ بھی لیٹے لیٹے مخالف سمت میں چل پڑا تھا۔ جہاز اندر سے PRESSURISED نہیں تھا چنانچہ میرے کانوں میں سیٹیاں بج رہی تھیں اور محسن نے اپنا ہاتھ کنپٹی پر رکھ لیا تھا۔ اس کے سر میں درد ہو رہا تھا۔

چند منٹ میں یہ کیفیت ختم ہوگئی۔ جہاز کی رفتار بھی ہموار ہوگئی اور پائلٹ نے ہمیں مطلع کیا کہ اس وقت ہم پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر ہیں۔

"صرف پانچ ہزار فٹ!" میں نے کہا۔

"تو اور کیا تیس ہزار فٹ پر لے جاؤں۔ یہ بوئنگ نہیں ہے" وہ بولا "اور اس جہاز کے لیے اتنی بلندی بھی بہت ہے۔ اتنی عمر تمہاری ہوتی تو تم پانچ فٹ پر بھی نہیں اُڑ سکتے تھے۔ اس عمر کا کوئی پرندہ نہیں اُڑ سکتا' شترمرغ بھی نہیں۔"

میں نے کہا "بُرا ماننے کی کوئی بات نہیں۔ اگر ہم کسی اونچی عمارت یا کسی ٹاور سے نہیں ٹکرائے..."

"ساری دنیا میں کہیں بھی اس سے آدھی بلندی کے برابر نہ کوئی عمارت ہے اور نہ ٹاور۔ اور بہتر ہے کہ تم اُترنے کی تیاری

کرو۔ جہاز نیچے جائے گا تو تم سجدے میں جاؤ گے۔"
میں نے کہا "اتنی جلدی' کیا تم شارٹ کٹ سے آئے ہو؟"
"جہاز ٹیکسی کی طرح لمبے راستوں پر گھوم پھر کے نہیں جاتے' کرایہ بڑھانے کے لیے" وہ پھر خفا ہو گیا "ہوائی جہاز کا راستہ کوّے کی پرواز جیسا ہوتا ہے یعنی CROWFLY۔ میں اس اصطلاح سے اتفاق نہیں کرتا۔ اِسے گولی کا راستہ کہنا چاہیے اگر لندن سے پیرس کی سمت فائر کیا جائے تو جیسے گولی جاتی ہے۔"
میں نے کہا "بس اس کی رفتار کچھ زیادہ ہوتی ہے۔ اس جہاز کے لیے کوّے کی چال والی مثال ٹھیک ہے۔ یہ ہنس نہیں ہے' اس بات کو سمجھنے کی کوشش مت کرنا۔"
"مجھے فرصت بھی نہیں ہے' دیکھو نیچے پیرس ہے۔"
محسن بولا "یہ پیرس ہے' کمال ہے۔ میں تو لندن سمجھ رہا تھا۔"
"دونوں میں فرق ہی کتنا ہے۔ جتنا دو آنکھوں کے درمیان ہوتا ہے۔ بیچ میں ناک ہوتی ہے۔ ان کے بیچ میں انگلش چینل ہے۔ خدا کا شکر ہے فرانسیسی جھگڑا نہیں کرتے اور اسے فرنچ چینل نہیں کہتے۔ اس جہاز پر آخری فلائٹ ہوگی تو میں پیراشوٹ سے نیچے کود جاؤں گا۔ انگلش چینل میں۔ جہاز سیدھا نکل جائے گا۔"
میں نے کہا "تمہاری اس بے وفائی سے جہاز کو کتنا صدمہ ہوگا۔"
محسن نے کہا "کیا پتا وہ بھی تمہارے پیچھے انگلش چینل میں ڈوب مرے۔"
"پیرس میں تم کہاں جاؤ گے؟"
محسن بولا "اپنی بیویوں کے پاس۔ غریب نواز ہوسٹل میں۔ لیکن تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو۔ کیا تم ہمارے ساتھ نہیں رہو گے؟"
"میں تم کو ڈراپ کر کے واپس اُڑ جاؤں گا۔"
"اور ہمارے لیے اسپیشل فلائٹ کون چارٹر کرے گا؟ تم نے کہا تھا کہ تم خصوصی ڈسکاؤنٹ پر اچھا جہاز دلا دو گے۔"
"یہ کام اس وقت نہیں ہوگا۔ دس گیارہ بجے کسی سے رابطہ ہو سکتا ہے' اس سے پہلے مشکل ہے۔"
"کیوں مشکل ہے؟"
"آج اتوار ہے۔ لوگ سورج کے ساتھ باہر نہیں نکلتے۔ ابھی سو رہے ہوں گے" وہ بولا۔
"تمہارے پاس فون نمبر تو ہوں گے ایسے ہوا بازوں کے... اور کمپنیوں کے۔ ان کے آفس بند ہوں گے نگران سے فون پر بات ہو سکتی ہے۔"
اس نے کہا "او کے۔ میں کوشش کرتا ہوں۔ ویسے یہ ہے بڑی بداخلاقی۔ سنیچر کی رات کو مختصر کرنا۔"
"ہنگامی صورتِ حال میں یہ اخلاقی جرم قابلِ معافی ہونا چاہیے۔"
جہاز نے ایک دم غوطہ مارا اور ہائی جیک نے قہقہہ۔ ہم اس مرتبہ سامنے لڑھک گئے تھے اور واقعی سجدے میں چلے گئے تھے۔ دلاور اس مرتبہ آگے کھسکا اور اس کے پاؤں ایک سیٹ کو سہارا دینے والے اسٹینڈ سے ٹکرائے مگر سلیپنگ بیگ میں ہونے کی وجہ سے وہ محفوظ رہا۔ ہم کاک پٹ کی دیوار سے ٹیک لگا کے اور مخالف سمت میں منہ کر کے بیٹھ گئے اور دلاور کو دائیں بائیں لڑھکنے سے محفوظ رکھنے کے لیے اس کے دونوں جانب ٹانگیں پھیلا دیں۔
دس منٹ بعد جہاز اُتر گیا۔ لندن کے ائرفیلڈ کے مقابلے میں پیرس کا رن وے زیادہ خوب صورت اور روشن تھا۔ لیکن یہاں کوئی جہاز موجود نہیں تھا۔ کنٹرول ٹاور سے بھی یہی کہا گیا تھا کہ جہاں جی چاہے اتر جاؤ۔ ہینگر جیسی عمارت کا ایک حصہ روشن تھا۔ ہینگر کے اوپر بڑی بڑی سرچ لائٹس تھیں جن سے رن وے پر دن جیسا اُجالا تھا۔ یہ رن وے ایک طویل چار دیواری کے اندر تھا' اس دیوار پر بھی سوڈیم اور مرکری لائٹس سے چراغاں ہو رہا تھا۔
میلی ڈانگری میں ملبوس ایک گنجا اور گول مٹول شخص جہاز کے رُکتے ہی نمودار ہوا اور اس نے ہاتھ ہلا ہلا کے فرنچ میں چلانا شروع کیا۔ "یہ کیا مذاق ہے۔ یہ ائرفیلڈ ہے یا تمہارے باپ کے گھر کی چھت۔ جہاں چاہا جہاز اُتار لیا۔ کل تم میرے سر پر لینڈ کرو گے؟"
جیک ہنس پڑا "لینڈ تو کر سکتا ہوں مگر جہاز اسنڈ کر کے نکل جائے گا سیدھا۔ اتنی چکنی سطح پر بریک نہیں لگیں گے۔ ویسے مجھے ائرٹریفک کنٹرولر نے کہا تھا کہ جہاں چاہو اُتر جاؤ۔ یہ میری شرافت ہے کہ میں نے جہاز اس کے ٹاور پر نہیں اُتارا۔ کم آن فرینڈز' اترو نیچے تاکہ میں جہاز کو صحیح جگہ چھوڑ آؤں۔"
میں نے اور محسن نے مل کے چوہدری دلاور کو اُتارا۔
گنجے شخص کے وجود میں ایک مضطرب اور بے چین روح تھی۔ وہ پھر شور کرنے لگا "یہ کیا' جیک تم لاش لے کر آئے ہو یہاں؟"
جیک نے کہا "ہاں۔ اس نے وصیت کی تھی کہ مجھے ائرفیلڈ پر دفن کرنا۔"
اب گنجا مجھ سے مخاطب ہوا "کون ہو تم لوگ اور یہ کیا چکر ہے؟"
محسن نے کہا "تم کیسے خاموش ہونا پسند کرتے ہو۔ پیسے لے کر یا جھانپڑ کھا کے۔"
اس نے سوچ کے کہا "کتنے پیسے دو گے؟"
"ہم جھانپڑ دے سکتے ہیں۔ پیسے کے لیے ہائی جیک سے رجوع کرو" محسن نے کہا۔
ہائی جیک پانچ منٹ میں آگیا۔ اس نے گنجے کو خاموشی اختیار کرنے کا معاوضہ ادا کیا۔ اس کا حصہ سو پاؤنڈ مقرر تھا۔ اس نے کسی پرانے معاہدے کے مطابق اسے مزید ایک ہزار پاؤنڈ دیے کہ یہ باقی لوگوں کو دے دینا۔ اس کے بعد گنجا مسکرانے لگا اور اس نے ہمیں لفٹ بھی دی۔ اس کے پاس سٹروِن کار تھی جو اتنی ہلکی تھی کہ

چار آدمی اُٹھا کے رکھ سکتے تھے۔
میں اور محسن حیران تھے کہ یہ کیسا نظام ہے۔ کوئی روک ٹوک کرنے والا نہیں اور کس نمی پرسد کہ بھیا کون ہو۔ دراصل پرائیویٹ ائرفیلڈ یا ہیلی پیڈ پر حکومت کی ذمّے داری صرف لائسنس جاری کرنے کی حد تک رہتی ہے۔ لائسنس انہی کو ملتا ہے جو ائرفیلڈ چلانے کا تجربہ اور ضروری اسٹاف رکھتے ہوں۔ اب وہاں سے کون آتا ہے' کون جاتا ہے۔ کیا لوڈ ہوتا ہے اور کیا ان لوڈ۔ یہ خود لائسنس لینے والوں کی ذمّے داری۔ کوئی کام خلاف قانون ہوگا تو کب تک۔ جس دن معلوم ہوگا اس دن لائسنس منسوخ۔
ائرفیلڈ سے باہر آنے کے بعد بھی ہمیں ٹیکسی کے لیے انتظار کرنا پڑا۔ ہائی جیک کے کہنے پر گنجے نے فون کر کے ٹیکسی طلب کی تھی۔ دلاور اب کراہنے لگا تھا اور مجھے اس کی طرف سے تشویش لاحق تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے ہمارا سامان ڈکی میں رکھا اور پھر پوچھا کہ ہمیں کہاں جانا ہے۔ اسے غریب نواز ہوسٹل کا پتا سمجھانا خاصا دشوار کام ثابت ہوا۔ یہ نام تو اس ہوسٹل کو ہم نے دے رکھا تھا۔ درحقیقت وہ کوئی یوتھ ہوسٹل تھا جو سرکاری امداد سے ہی چلتا تھا۔ پیرس میں ایسے درجنوں ہوسٹل تھے۔ ٹیکسی ڈرائیور بڑا متحمل مزاج تھا۔ اس نے ہم سے بہت سے سوالات کیے اور بالآخر سہلا کے بولا میں سمجھ گیا۔ اب تم چاہو تو سو جاؤ آرام سے۔ میں منزل پر پہنچ کے تمہیں جگا دوں گا۔"
رات بھر جاگنے سے مجھ پر غنودگی طاری تھی مگر میں آنکھیں کھولے بیٹھا رہا۔ ٹیکسی انجان راستوں سے گزرتی ہوئی پون گھنٹے بعد ایک عمارت کے سامنے رُک گئی۔
"ایک گھنٹے کا راستہ تھا۔ ہم صرف چالیس منٹ میں پہنچ گئے" ٹیکسی ڈرائیور نے بڑی مسرت کے ساتھ ہمیں مطلع کیا۔
"کہاں پہنچ گئے' یہ ہرگز وہ جگہ نہیں ہے جہاں ہمیں جانا تھا۔"
"اچھا!" وہ مایوسی سے بولا "پتا نہیں کیوں میرا اندازہ اکثر غلط ہو جاتا ہے۔"
میں نے کہا "میں بتا سکتا ہوں کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ جب تک گاڑی چلتی رہتی ہے' میٹر بھی چلتا رہتا ہے۔"
"تم ضرور صبح ہونے تک ہمیں پیرس کی سیر کراؤ گے؟ ہمارے خرچ پر۔" محسن نے کہا "بہتر ہوگا اگر ہم پولیس سے راستہ سمجھ لیں۔"
اس نے معذرت کرتے ہوئے پھر چند سوالات کیے اور وہی کہا جو پہلے کہا تھا مگر اس بار چالیس منٹ میں ہمیں صحیح جگہ پہنچا دیا۔
"ہمیں واپس آنا پڑا" ڈرائیور نے کہا "اگر تم صحیح پتا بتاتے تو یہ صرف پانچ منٹ کی ڈرائیو تک تھی۔"
"قسمت کی بات ہے سب۔ خدا کو یہی منظور تھا کہ ہم تمہاری ٹیکسی میں اسّی منٹ کی مسافت طے کریں اور تمہیں اصل سے سونہ گنا زیادہ ادائیگی کریں۔"
ہم دلاور کو بڑی مشکل سے اٹھا کے ہوسٹل کے گیٹ تک پہنچے اور اسے اندر لے گئے۔ میں نے اپنا ایک ہاتھ اس کی بغلوں کے نیچے سے گزار کے دلاور کو سہارا دے رکھا تھا۔ دوسری طرف سے محسن نے اس کے بوجھ کو اٹھا رکھا تھا۔ دلاور کے دونوں ہاتھ ہمارے شانوں پر تھے۔ اس کے باوجود ہم اسے گھسیٹنے پر مجبور تھے۔
کاؤنٹر پر وہی آدم خور ٹائپ عورت بیٹھی تھی۔ اس نے ہمیں دیکھا تو وہ کتاب رکھ دی جس میں شاید پڑھنے سے زیادہ دیکھنے کے قابل مواد تھا۔ "تم پھر آگئے یہاں' اور یہ کون ہے جس کو تم ایسے اُٹھا لائے ہو' یہ تو مرنے والا ہے۔"
میں نے کہا "ہر شخص مرنے والا ہے۔ کوئی ایک گھنٹے میں' کوئی ایک سال میں۔ صورت دیکھ کے تو لگتا ہے کہ تم خود مرنے والی ہو۔"
"ہم تمہیں اچھا بھلا چھوڑ کر گئے تھے۔ اچانک کیا ہو گیا؟"
اس نے خفگی سے کہا "مجھے کچھ نہیں ہوا۔"
"تمہیں بڑی خطرناک بیماری لاحق ہے۔ یہ فضول بولنے کا مرض ہے۔ اس میں عموماً آدمی زیادہ دن نہیں جیتا۔ کسی دن قتل ہو جاتا ہے" میں نے کہا۔
وہ ہمیں غصیلی' مشکوک نظروں سے دیکھتی رہی اور ہم دلاور کو اسی طرح اوپر لے گئے۔ مجھے اندازہ تھا کہ رابعہ اور گل اس وقت سو رہی ہوں گی اور ہمیں اچانک سامنے پا کے ان پر بیک وقت خوشی اور غصے کے طوفانی جذبات کی یلغار ہوگی۔ کوئی ڈراما کرنے کا موقع نہیں تھا۔ ہمارے ساتھ ایک تو دلاور تھا اور دوسرا ہائی جیک۔
میں نے دروازے پر دستک دی تو اندر سے ایک ساتھ ان دونوں نے پوچھا "کون ہے؟"
میں نے کہا "کوئی نہیں ہے' سو جاؤ۔"
محسن بولا "تمہارے کان بج رہے ہیں' باہر تو خاموشی ہے۔"
رابعہ اور گل سخت غصّے میں اٹھی تھیں مگر دروازہ کھولتے ہی ان کی نظر ہم پر اور ہمارے درمیان مشکل سے کھڑے ہوئے بلکہ لٹکے ہوئے چوہدری دلاور پر گئی تو ان کے منہ کھلے رہ گئے۔ وہ چیخ مارنا تک بھول گئیں اور ایک دم دروازے کے سامنے سے ہٹ گئیں۔
"یہ... یہ چوہدری دلاور... ہے؟" گل نے کہا۔
"نہیں' یہ محسن شیروانی ہے' غور سے دیکھو" میں نے کہا۔
"بالکل غلط۔ یہ سکندر بخت ہے۔ چلو ہٹو ایک طرف۔ ایسے کیا ہونق بنی کھڑی ہو۔ کوئی تماشا ہو رہا ہے" محسن نے کہا۔
ہم نے دلاور کو اس بیڈ پر لٹا دیا جس پر رابعہ سو رہی تھی۔ محسن نے دروازہ بند کر دیا۔ میں نے ہاتھ جوڑ کے اوپر دیکھا "اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔"
محسن نے کہا "شکر انہیں ادا کرنا چاہیے... خیر' فی الحال تم چلو دوسرے کمرے میں' ہم آتے ہیں وہیں کچھ دیر میں۔"

رابعہ اور گُل بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھیں مگر جیک کی موجودگی کے خیال سے خاموش تھیں۔ ان کی نظریں چوہدری دلاور پر جم کے رہ گئی تھیں اور شاید ان کے لیے یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ ہم سچ مچ چوہدری دلاور کو اپنے ساتھ لے آئے ہیں۔

میں نے جیک سے کہا "تم اس دوسرے بیڈ پر سوسکتے ہو۔"

"میں بیڈ کے نیچے بھی سوسکتا ہوں" وہ بولا "مگر اس وقت جب مجھے نیند آ رہی ہو۔ ابھی تو میرا دماغ جہاز کے انجن سے زیادہ گرم ہے' مجھے کافی چاہیے۔"

"تم ذرا اپنے چوہدری صاحب کا خیال رکھو۔ پریشانی یا خطرے کی کوئی بات نہیں۔ ہم آتے ہیں ابھی کینٹین سے کافی پی کے" میں نے کہا۔

رابعہ اور گُل جاتے جاتے رک گئیں "اسے کیا ہوا ہے؟"

"کینسر!" محسن بولا۔

گل نے اسے یوں گھور کے دیکھا جیسے محسن نے کوئی افسوس ناک جھوٹ بولا ہو پھر رابعہ نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو میں نے بھی سرہلا کے محسن کی تائید کی۔ ہم نے سامان دوسرے کمرے میں رکھا اور اسے مقفل کرکے نیچے اُتر گئے۔ کینٹین میں کیفے ٹیریا میں اس وقت بھی لڑکے اور لڑکیاں کچھ نہ کچھ پینے میں مصروف تھے۔ یہ آزاد اور بے فکرے لوگوں کی دنیا تھی جن کے لیے نہ کوئی اخلاقی پابندی اہم تھی اور نہ معاشرتی یا خاندانی قدغن تھی۔ کون کس کے ساتھ رہتا ہے اور کیوں؟ اس سے بھی کسی کو سروکار نہ تھا۔ پابندی اگر تھی تو صرف ہوسٹل میں قیام کے ڈسپلن کی نگران کے قواعد وضوابط کا تعلق بھی کسی کی نجی زندگی کے معاملات سے نہیں تھا۔ یہاں صرف وہی رہ سکتے تھے جو کرایہ ادا کرسکتے ہوں۔ ہوسٹل کی کسی چیز کو نقصان نہ پہنچائیں اور کسی کو پریشان نہ کریں۔ باقی تمام معاملات میں ہر شخص کسی معمول کا پابند نہ تھا۔ جس کا جب دل چاہے اُٹھے اور جب دل چاہے سو جائے۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ اپنے ہی کمرے میں سوئے' کوئی اور مدعو کرے تو کیا اپنا' کیا پرایا... ہر کمرا محض کمرا ہے۔ ناشتا' لنچ اور ڈنر۔ ان سب کا وقت وہاں مقرر ہوتا ہے جہاں انسان ایک معمول کے مطابق رہتا ہو۔ ہر کام وقت دیکھ کے کرتا ہو اور اپنے ساتھ دوسروں کی زندگی کے معمولات کا بھی خیال رکھتا ہو۔ یہاں سیدھا سادہ اصول یہ تھا کہ جب بھوک لگے کچھ بھی کھالو۔

"میں تمہارا مہمان ہوں" جیک نے کہا "میرے لیے ہر اچھی چیز منگواؤ۔ مجھے سخت بھوک لگی ہے۔"

محسن نے کہا "ہمارے پاس جو کچھ تھا تمہیں دے دیا' اب تو تم ہی ہمیں اپنے پلے سے کھلاؤ گے اور اتنی بڑی رقم میں سے دو چار پاؤنڈ خرچ کرکے تم مرو گے نہیں۔"

وہ ہنسنے لگا "میں اس لڑکی پر دس پاؤنڈ خوشی سے خرچ کردوں گا' جس نے دروازہ کھولا تھا بلکہ سو پاؤنڈ۔"

"وہ میری بیوی ہے" میں نے کہا "میں تمہیں قتل کردوں گا۔"

"خیر دوسری بھی بُری نہیں تھی" اس نے خفت سے کہا۔

"وہ میری بیوی تھی۔ میں بھی تمہیں قتل کردوں گا... اور وہ سب رقم چھین لوں گا جو تم نے ہمیں لُوٹ کر کمائی ہے۔" محسن بولا۔

"لُوٹ کر کیوں' میں نے تمہیں یہاں پہنچادیا۔"

"اتنے سے کام کا اتنا بڑا معاوضہ وصول کرنا لُوٹنے کے مترادف ہے۔ خیر تم کھاپی کے فون کرو کسی کو اور معلوم کرو کہ ہم جلد از جلد کب جاسکتے ہیں۔"

جیک نے کہا "یہ ویٹریس بھی بُری نہیں۔ ویسے کیا تم واقعی سر رچرڈ اور لیڈی الزبتھ کے دوست ہو؟"

میں نے کہا "نہیں' ہم رشتے دار ہیں' میں اس کا دادا ہوں۔"

"اور میں پردادا۔" محسن بولا "کوئی اعتراض؟"

ہائی جیک نے اپنی بیک پاکٹ میں سے ایک نوٹ بک نکالی اور پھر کونے کے فون بوتھ میں چلا گیا۔

میں نے محسن سے کہا "حضرت۔ یہ بڑا لمبا سفر ہے۔ لیکن اطمینان کی بات یہ ہے کہ ہم قانونی طور پر بڑی عزت اور شان سے واپس جارہے ہیں۔"

"کسی وی آئی پی کی طرح چارٹرڈ فلائٹ سے۔ پورا جہاز صرف ہمارے نام سے بک ہے۔ ہم جتنے لوگوں کو چاہیں لے جائیں" محسن بولا۔

میں نے کہا "یہ تو ٹھیک ہے مگر اب یہ بھی نہیں کہ ہم جہاز بھر کے لے جائیں اور منافع جیب میں رکھ لیں۔ یہ بتانا پڑتا ہوگا کہ مسافر کتنے ہیں؟"

"مسافر ابھی تو ہم پانچ ہی ہیں مگر میرا خیال ہے کہ دو مسافر اور ساتھ جاسکتے ہیں۔"

"اور کون جانا چاہے گا ہمارے ساتھ؟" میں نے کہا۔

"کیا خیال ہے اگر ہم ایک ڈاکٹر اور ایک نرس کی خدمات حاصل کرلیں۔ وہ ہمیں منزل تک پہنچا کے اسی جہاز میں واپس بیرک لوٹ آئیں۔"

میں نے کہا "خیال تو اچھا ہے۔ کیا پتا راستے میں دلاور کو اچانک ضرورت پڑجائے۔ ہم جیک سے بات کریں گے۔"

جیک واپس آیا تو خاصا مطمئن نظر آتا تھا۔ "بات ہوگئی ہے ایک سے۔ لیکن وہ کہتا ہے کہ ایک اور ٹورسٹ پارٹی نے بھی فون کیا تھا۔ جو پہلے بکنگ کرے گا میں اسے لے جاؤں گا۔"

"کیا اس فیلڈ میں وہ اکیلا ہے؟"

"اور لوگ بھی ہیں مگر یہ ٹورسٹ سیزن ہے۔ سب بک ہیں اگلے ہفتے تک" ہائی جیک بولا۔

"پھر کیا کریں؟"

"صبح ہونے والی ہے" ہائی جیک نے کہا "دوسری ٹورسٹ

پارٹی صبح پہنچ گئی تو پھر تمہارے لیے چانس نہیں رہے گا۔ عام طور پر دس بجے سے پہلے صبح نہیں ہوتی۔ اگر ہم اس سے پہلے ہی ادائیگی کردیں۔"

"ہم کرسکتے ہیں" میں نے کہا "اگرچہ نیند سے میرا حال خراب ہے مگر یہ کام زیادہ ضروری ہے۔"

"تم دو گھنٹے آرام بھی کرسکتے ہو" ہائی جیک نے گھڑی دیکھی "ابھی صبح کے پانچ بجے ہیں' ہم سات بجے جاسکتے ہیں۔"

میں نے اسے اپنا مسئلہ بتایا "ہم چاہتے تھے کہ فلائٹ پر ایک ڈاکٹر اور نرس بھی ساتھ ہوں۔"

"یہ کوئی مشکل کام نہیں' تم چارلی سے کہہ دینا۔"

"چارلی کون ہے؟"

"وہ پائلٹ جو تمہیں بنکاک لے جائے گا" وہ بولا "میرا کام ہے تم کو اس سے متعارف کرانا... اور سودا کرانا۔"

"وہ کیا مانگ رہا ہے؟"

"ابھی تو بیس مانگ رہا ہے مگر میرا خیال ہے پندرہ میں مان جائے گا۔ تم اگر تھوڑی سی المیہ اداکاری کرو' یہ کہو کہ تم اپنے عزیز کو اس اُمید پر لندن لائے تھے کہ اس کا علاج ہوجائے گا مگر لندن میں تم کو ڈاکٹروں نے قلاش کردیا اور حاصل کچھ بھی نہیں ہوا۔"

"چنانچہ ہم قلاش لوگ اب چارٹرڈ فلائٹ سے واپس جارہے ہیں' یہ کیا بے تکی بات ہے۔ غریب آدمی عام جہاز کے فرسٹ کلاس سے بھی سفر نہیں کرتا" میں نے کہا۔

"جب ڈاکٹر بھی ساتھ ہوگا اور نرس بھی ہوگی تو اس سے یہی ثابت ہوگا کہ مریض کی حالت نازک ہے اور اسے عام مسافروں کی طرح لے جانا مشکل ہے۔ اس کے علاوہ لکھ پتی اس وقت قلاش ہوتا ہے جب اس کے پاس ہزاروں بھی نہ ہوں۔ یہاں تمہارے پاس ابھی پندرہ ہزار پاؤنڈ ہیں۔"

"حقیقی دولت مند کبھی اور کہیں بھی قلاش نہیں ہوتے۔ وہ ہر جگہ پیسہ منگواسکتے ہیں۔ انہیں اُدھار دینے والے بھی بہت ہوتے ہیں۔"

"خیر۔ تم جو چاہو کہو' یہ ایک اچھا پوائنٹ تھا۔"

"اسے ہم خود قائل کریں گے تو پھر تمہارا کمیشن ایک ہزار پاؤنڈ کس لیے؟" محسن بولا۔

"آخر میں نے تمہیں ایک راستہ بتایا اور تمہیں اس سے متعارف بھی کراؤں گا۔"

"تم بہت چالاک آدمی ہو۔ ایک گھنٹے میں اتنی بڑی رقم کما کے بھی تمہاری تسلی نہیں ہوئی۔ مروت بھی کوئی چیز ہے۔" محسن نے اسے شرمندہ کرنے کی کوشش کی۔

اس نے نفی میں سرہلایا "کاروبار میں مروت کا کیا سوال اور جو کرتا ہے وہ بزنس نہیں کرسکتا۔ رہی بات لالچ کی تو کیا تم لالچی نہیں ہو۔ کون ہے جو لالچ نہیں رکھتا۔ ایسا ہوتا تو تم یہاں وہ سب نہ کرتے پھرتے جو کررہے ہو۔ تم لنگوٹی باندھے کسی پہاڑ کی چوٹی پر آسن جمائے بیٹھے ہوتے اور ہرے راما ہرے کرشنا کررہے ہوتے۔"

محسن نے میز پر مُکا مارا "ہم کافر نہیں ہیں۔ ہم اللہ ہو' اللہ ہو کرتے ہیں۔"

میں نے کہا "تم جا کے اس کمرے میں سو جاؤ جس میں دلاور ہے۔ وہاں سے ہماری بیویوں کو نکال دینا۔ وہ دوسرے کمرے میں چلی جائیں گی۔"

"اور خبردار جو انہیں بُری نیت سے دیکھا" محسن بولا "ان کو اپنی بہنیں سمجھو آج سے۔"

وہ ہنسنے لگا "میری ایک بہن مجھے کافی ہے۔"

اس کے جانے کے بعد ہم نے آپس میں مشورے سے لاہور فون کیا۔ یہ ضروری تھا کہ ہمارے پہنچنے سے پہلے منظر اور وقار یوسف کو صورتِ حالات کا علم ہوجائے اور وہ ائرپورٹ پر ہمیں ریسیو کرنے کے مناسب انتظامات کرلیں۔ صبح کے پانچ بجے لمبی لائن بڑی آسانی سے مل گئی۔

ریسیور اٹھانے والا مولوی خادم حسین تھا۔ اس نے کہا "ہیلو۔"

میں نے آواز بدل کے اسے ڈانٹا۔ "کیا ہیلو۔ شرم آنی چاہیے تمہیں۔ السّلام علیکم نہیں کہہ سکتے۔ شکلِ مومناں کرتوت کافراں۔"

اس نے برہمی سے کہا "کون ہو جی' آپ ایسے فتوے باز۔ ہیلو کہنے سے کوئی کافر ہوجائے تو پھر سب ہی کافر ہیں۔"

"اور یہ تم کیا کررہے تھے صبح صبح مولوی خادم حسین؟"

اس کو کچھ شک ہوگیا "کیا کررہا تھا' سو رہا تھا... مگر تم کون ہو جناب!"

"پہلے یہ بتاؤ کہ خواب میں کیا دیکھ رہے تھے؟ اگر تمہاری بیوی کو پتا چل جائے..."

اس نے نعرہ لگایا "سکندر صاحب۔ اجی آپ زندہ ہو۔ ہم تو سمجھے تھے کہ مرحوم و مغفور ہوگئے۔"

"ہوجائیں گے یار' اتنی جلدی کیا ہے۔ تم بھی تو نہیں ہوئے ابھی تک حالانکہ نیک کام میں دیر کیسی؟" میں نے کہا۔

"اچھا جی کب آرہے ہو پھر' اور کیا کررہے ہو ولایت میں؟"

میں نے کہا "یار' تم رہے نا مولوی کے مولوی۔ ولایت میں آدمی کیا کرتا ہے آخر؟ اس وقت بھی ایک میم ہے ایک بغل میں اور دوسری میم دوسری بغل میں۔ بغل وہی رہتی ہے' میم ہر روز بدل جاتی ہے۔ پھر ہم کیا کریں گے آ کے۔ ہمارا تو مشورہ ہے کہ تم بھی آجاؤ۔"

"لاحول ولا قوۃ جناب! خدانخواستہ آپ نے حرام شے کو منہ تو نہیں لگایا" خادم حسین بولا۔

"دیکھو کسی سے کہنا مت....." میں نے کہا پھر ایسی آواز نکالی جیسے میں نے بوتل سے گھونٹ لیا ہو "یہ چیز بھی بس یہاں آسانی سے ملتی ہے۔ گناہ تو ہم نے زندگی میں بہت کیے ہیں' بلکہ گناہوں کے سوا کیا ہی کیا ہے۔ اک گناہ اور سہی۔ میں خود تو ہوں بہت بھولا بھالا اور سیدھا سادہ' یہ محسن مجھے شیطان کی طرح بہکاتا ہے اور غلط لائن پر ڈال دیتا ہے۔"

"چھوڑو جی سکندر صاحب' اللہ نے عقل سلیم عطا کی ہے آپ کو بھی۔.. اور پھر آپ کے ساتھ رابعہ بی بی ہیں۔ وہ نہیں روکتی ہیں آپ کو جناب!"

"ابے آپ جناب کے بچّے' بیوی ہوتی ہے پاؤں کی جوتی۔ اور ہم تیری طرح زن مرید نہیں ہیں کہ بیوی ہم پر حکم چلائے۔ تمہیں تو ہم جانتے ہیں' وہ کہہ دے کہ بچّہ بھی تم پیدا کرو' تو تم کرو گے۔ وہ کہے انڈے دو تو تم دو گے۔"

"اف۔ یہ کیسی واہیات بات ہے' آپ ضرور نشے میں ہیں۔ میں منظر صاحب کو بلاتا ہوں۔"

"آخر تم کیا کر رہے ہو منظر صاحب کے بیڈ روم میں۔ مولوی خادم حسین کہیں تم نے اس کی بیوی کے ساتھ ناجائز مراسم تو استوار نہیں کرلیے ہیں۔"

"توبہ توبہ' خدا کا خوف کریں سکندر صاحب۔ بات منہ سے نکالنے سے پہلے سوچ لیا کریں۔"

"دیکھو بیٹے۔ منظر کو کیا ساری دنیا کو پتا چل جائے گا۔ اگر اس کے سترہویں بیٹے کا ڈیزائن مختلف ہوا۔ اور اس کی صورت میں تمہاری مشابہت آئی۔ ایسی ہی شکل....."

"اسی لیے شراب حرام قرار دی گئی ہے جناب کہ بندے کی مت ماری جاتی ہے۔ اسے نیک وبد کی تمیز نہیں رہتی۔ آپ ہوش میں نہیں ہیں..... انسان کے اندر شیطان گھس جاتا ہے۔ مگر آپ سے یہ اُمید نہیں تھی....." اس نے سخت افسوس اور پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے ریسیور رکھ دیا۔

ایک منٹ پورا ہونے سے پہلے ہی منظر لائن پر آگیا۔ اب صورتِ حال بدل گئی۔ اس نے مجھے لتاڑنا شروع کردیا "ابے تو..... سؤر کے بچے..... کہاں ہے تو..... خیال آگیا تجھے ہمارا بھوتنی کے..... میں نے تو سمجھا تھا کہ مرکھپ گئے تم سب۔"

میں نے کہا "یار صبح صبح نیک بات منہ سے نکال۔ شریف آدمی کو پہلے سلام دعا کرنی چاہیے۔"

"کون شریف آدمی..... میں یا تو..... ہم تو خیر جیسے ہیں اپنے لیے ہیں۔ تم سالے کب سے شریف ہوئے۔ تمہارے آباواجداد میں شریف تھا کوئی؟"

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ اس نام کا ہماری فیملی میں کوئی نہیں گزرا۔"

"اور وہ دوسرا..... تیرا ہمزاد بھوتنی کا۔ وہ کہاں ہے؟"

"میرے ساتھ۔ تُونے عم زاد کہا یا ہم زاد.....؟"

"فضول بکواس بند کر۔ یہ بتا کہ تم لوگ ہو کہاں آخر؟ رابعہ کیسی ہے اور گل..... اُف' مجھے تمہارا منہ اتنا غصہ پہلے کبھی نہیں آیا تھا جتنا اس وقت آرہا ہے۔ اگر بلڈ پریشر بڑھنے سے میرا ہارٹ فیل ہوگیا تو میرے سترہ بچّوں کی امّاں کا کیا بنے گا؟۔ کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد۔"

میں نے قہقہہ مارا "ابے آج تو نے بھی موقع کا شعر پڑھ دیا۔ فکر مت کر' مولوی خادم حسین کے نام اپنے وصیت نامے میں سارے بچے لکھ جانا۔ بچے پیدا کرنے کی مشین سمیت۔"

"قسم خدا کی۔ واپسی پر تم سب کے سر جوتے مار مار کے گنجے نہ کیے تو سترہ بچّوں کے نام بدل دوں گا۔ سب کے نام کے ساتھ حرامی لگادوں گا' خاندانی نام کے طور پر۔ بہت پریشان کیا تم نے سب کو۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ تم سے بات کیسے کریں' کیسے پتا چلائیں؟"

میں نے کہا "چل اب غصہ تھوک دے۔ ہم سب آرہے ہیں کل۔"

"کل.....واقعی.....؟" وہ چلّایا "جتنے گئے تھے اتنے ہی آرہے ہو؟"

میں نے کہا "نہیں' ایک عدد بڑھ گیا ہے۔"

"بھئی مبارک ہو' بہت مبارک۔ کس نے پہل کی' رابعہ نے یا گل نے۔ نومولود لڑکا ہے یا لڑکی؟ بھئی مولوی خادم حسین' تم ماموں بن گئے۔"

میں نے کہا "اُلّو کے پٹھے۔ ہمارے ساتھ چوہدری دلاور ہے۔"

"دلاور.....! زندہ یا مُردہ؟" وہ ایک دم سیریس ہوگیا۔

"نیم مُردہ۔ ابھی تک تو زندہ ہے اور ہم چاہتے ہیں کچھ دن اور زندہ رہے" میں نے کہا۔

"تم لوگوں نے مارا ہوگا اسے۔"

"اسے مارنے والے نے مارا ہے" میں نے کہا "کوئی کسی کو نہیں مار سکتا یار۔ دلاور کو کینسر ہے..... ٹرمینل۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ برین ٹیومر کی آخری اسٹیج ہے۔ وہ دو مہینے سے زیادہ زندہ نہیں رہے گا۔"

"یہ تو کیا کہہ رہا ہے بھوتنی کے۔ نشے میں تو نہیں ہے؟"

"مولوی خادم حسین سے تو میں نے یہی کہا تھا مگر میں ہوش میں ہوں۔ جب ہم آئیں گے تو ساری بات بتائیں گے" میں نے کہا "دلاور کی زندگی کے مشکل سے دو مہینے باقی ہیں۔ یہاں کے ماہر ڈاکٹروں نے قطعی فیصلہ دے دیا ہے۔"

"پھر اب کیا ہوگا؟"

میں نے کہا "کچھ نہیں۔ اس نے ایک بار پھر سمجھوتے کی پیشکش کی اور اس بار انکار کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کے مرنے سے پہلے سارے معاملات طے ہوجائیں ورنہ بعد میں مقدمے بازی چلے گی۔ کئی سال لگ جائیں گے فیصلہ ہونے میں' یہ دشمنی اگلی نسل کو منتقل ہوجائے گی۔"

چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد منظر نے کہا "دو مہینے میں کچھ بھی نہیں ہوسکتا یار۔ مجھے بڑا صدمہ ہوا یہ جان کے۔ ہماری ساری جدوجہد رائگاں گئی۔"

"ایسا کیوں سمجھتا ہے تُو۔ یہ سمجھ لے کہ قدرت نے فوری انصاف مہیا کردیا۔ ہم دنیا کی عدالتوں میں خوار ہونے سے بچ گئے۔ ہم چوہدری دلاور کو سزائے موت دلوانا چاہتے تھے' وہ خدا نے دے دی۔ دنیا میں شاید وہ بچ جاتا' ایک کے بعد دوسری اپیل کرتا۔ بڑے بڑے قانونی ماہرین اس کا دفاع کرتے اور استغاثہ خود اپنے کیس میں کمزور پڑجاتا۔ شہادتیں اور گواہی' ثبوت اور بیان' پیسہ سب کو بدل سکتا ہے۔ لیکن اب اس کے لیے کچھ بھی ممکن نہیں رہا۔ وہ اپنی ساری دولت لٹادے تب بھی یہ سزائے موت نہیں ٹل سکتی' ہم اسے اسپیشل فلائٹ سے لارہے ہیں۔"

"کیسی اسپیشل فلائٹ؟"

میں نے کہا "ایک جہاز چارٹر کیا ہے۔"

"پورا جہاز۔ کیا بینک آف انگلینڈ لوٹ لیا ہے بھوتنی کے!"

"فلائٹ سیدھی بنکاک جائے گی۔ وہاں سے ہم کراچی آئیں گے۔ اب یہ سوال مت کرنا کہ ہم نے سیدھا راستہ کیوں اختیار نہیں کیا۔"

"سیدھا راستہ تمہارے باپ نے اختیار کیا ہوتا بیٹے تو آج تم یوں خوار نہ ہوتے۔ تمہیں ولایت بھیجنے کے بجائے لگادیتا اپنے کارخانے میں خراد کی مشین پر اور بیس سال میں تمہارا بیاہ کردیتا تو کچھ نہ ہوتا۔"

میں نے احتجاج کیا "ہوتا کیسے نہیں۔ سات آٹھ سال میں چار پانچ بچّے ہم بھی پیدا کرکے دکھاتے۔ تُو اکیلا مرد ہے کیا دنیا میں۔"

وہ ہنسنے لگا "اچھا بھوتنی کے! یاد رکھنا یہ بات..... اگلے سات آٹھ سال میں پوچھیں گے تم سے۔"

میں نے کہا "ہم نے چوہدری دلاور کو سُلا رکھا ہے۔ وہ ہمارے ساتھ آنے پر راضی نہیں تھا۔ کہتا تھا یہیں سارے معاملات طے کرلو۔ میرے بیوی بچّوں کو بلالو اور مجھے پولیس کے حوالے مت کرو۔"

"پولیس کے حوالے کرنے کا اب کیا فائدہ؟"

"ہاں۔ یہی ہم نے بھی سوچا کہ اب قانونی طریقے سے تو کچھ ملے گا نہیں' یا ملا تو مشکل طریقے سے ملے گا۔ دلاور تو سارے جھگڑے ہمارے لیے چھوڑ کے لیٹ جائے گا قبر میں۔ مگر ہم نے کہا کہ بیوی بچّوں کو لندن بُلانے والی بات غلط۔ لاہور چلو' جہاں کے معاملات ہیں وہیں طے ہونے چاہئیں۔"

"یہ عقل مندی کی تم نے۔"

"عقلمندی کے سوا ہم کرتے کیا ہیں۔ بے وقوفی کے لیے تجھے آزاد چھوڑ دیا ہے اور مولوی خادم حسین کو۔"

"بھئی وہ تو اب سچ مچ باپ بننے والا ہے۔ مجھے تو یقین نہیں آتا۔ دیکھو پھر گھور رہا ہے مجھے۔ میں تو اسے سمجھاتا ہوں کہ بھوتنی کے' ذرا پتا چلا کہ تیری عدم موجودگی میں کیا ہوتا ہے۔ کون کون آتا ہے' خیر بچّے کی صورت خود بتادے گی" اس نے قہقہہ مارا "بھاگ گیا مولوی بک بک کرتا ہوا۔"

میں نے کہا "وقار یوسف اور نگی کو بھی بتادینا کہ ہم سب بالکل خیریت سے ہیں اور اب ایک دو دن کی بات ہے۔ بنکاک سے ہم پھر فون کریں گے۔ یہ بتائیں گے کہ کب کراچی پہنچ رہے ہیں۔ یہ وہیں جا کے معلوم ہوگا کہ کس فلائٹ پر جگہ ملتی ہے' خدا حافظ۔"

رابعہ اور گل بڑی بے چینی سے ہماری واپسی کی راہ دیکھ رہی تھیں اور ظاہر ہے بہت خفا بھی تھیں۔ اگلے ایک گھنٹے تک ہم نے دونوں کام خیر و خوبی سے کیے۔ ان کو منا بھی لیا اور اپنی لندن یاترا کا احوالِ واقعی بھی سنادیا۔ اس میں ایسی کوئی بات نہ تھی جس کی پردہ پوشی امنِ عامہ کے لیے ضروری ہوتی۔ ہم پہ جو گزری وہ سب ہم نے بلاکم وکاست پیش کردیا۔

کہتے ہیں کامیابی سے بڑی کوئی کامیابی نہیں ہوتی۔ اگر ہم لندن سے خالی ہاتھ لوٹتے تو ساری وضاحتوں کی صداقت من وعن تسلیم نہ کی جاتی۔ کہا اور سمجھا یہی جاتا کہ ہم نے جھک ماری اور وقت ضائع کیا۔ گلچھرے اُڑائے اور عیش کی۔ باقی سب افسانہ طرازی' جھوٹ سچ کا ملغوبا اور اداکاری۔ لیکن چوہدری دلاور ہمارے ساتھ تھا۔ اس کی بیماری کی رپورٹیں تھیں اور ایک واضح لائحۂ عمل تھا جس نے ہمیں معتبر کردیا۔

رابعہ اور گل دونوں چوہدری دلاور کی جان لیوا بیماری کا سُن کے جذباتی ہوگئی تھیں۔ یہ ایک نفسیاتی مسئلہ تھا۔ ابھی تک رابعہ کی اور ہم سب کی خواہش اور پوری کوشش یہ تھی کہ چوہدری دلاور کو سزائے موت ہو اور وہ دن آئے کہ اپنے جرائم کی پاداش میں چوہدری دلاور تختۂ دار پر نظر آئے مگر مجھے یقین تھا کہ جس دن چوہدری دلاور کو پھانسی دی جاتی اس دن رابعہ' گل اور نگی سمیت تمام خواتین مغموم اور اُداس نظر آتیں۔ کچھ ایسی ہی کیفیت اب بھی تھی۔ اصولاً تو انہیں بے حد مسرور نظر آنا چاہیے تھا کہ ایسے شیطان صفت دشمن' بے ضمیر غدار اور ان گنت بے گناہوں کے لہو سے دامن داغدار رکھنے والے کو ایسی عبرت ناک موت ملی تو یہ عین تقاضائے انصاف تھا مگر وہ اس کے انجام پر ملول تھیں۔

"کیا واقعی وہ دو مہینے میں مرجائے گا؟" رابعہ نے کہا۔

"ڈاکٹر یہی کہتے ہیں" میں نے کہا۔

گل نے کہا "توبہ۔ بیماریاں بھی کیسی کیسی ایجاد ہوگئی ہیں۔"

محسن نے کہا "ملاحظہ ہو دانش وری۔ بیماری ایجاد ہوگئی۔"
"ہاں۔ پہلے کہاں تھیں یہ سب بیماریاں۔" گل بولی۔
محسن نے کہا "آپ جاہل ہیں' بیماریاں تھیں مگر ان کا علم نہیں تھا۔ اب تشخیص ہو جاتی ہے تو سب کو معلوم ہو جاتا ہے۔ یہ میڈیکل سائنس کا کمال ہے۔"
"خاک کمال ہے۔ جب بیماری کا علاج ہی نہیں" رابعہ نے کہا۔
"اگر یہ ٹھیک ہو جائے تو آپ کو خوشی ہوگی؟"
گل نے کہا "کینسر سے کون ٹھیک ہوتا ہے؟"
محسن بولا "نہیں' فرض کرو کہ کوئی معجزہ رونما ہو جائے۔"
میں نے کہا "چلو چھوڑو شیروانی صاحب' یہ خواتین کے جذبات کا مسئلہ ہے۔ اس کا عقل سے کیا تعلق۔ یہ تو فلموں اور ڈراموں میں دردناک مناظر دیکھ کے آنسو بہاتی ہیں۔"
"پتھر دل نہیں ہوتے خواتین کے۔"
"آنسو دل سے نہیں نکلتے۔ یہ ہوتا ہے دماغ کا فتور۔" محسن بولا۔
رابعہ نے کہا "کیا اس کے بیوی بچوں کو معلوم ہے؟"
"میرا خیال ہے کہ نہیں۔"
"کتنا دکھ ہوگا انہیں" رابعہ نے کہا "اچانک پتا چلے کہ کوئی امید ہی نہیں رہی۔ جیسے رحم کی آخری اپیل بھی مسترد ہو جائے اور پھانسی کی تاریخ اور وقت مقرر ہو جائے تو آخری ملاقات کرادی جائے۔"
گل نے کہا "ان کے لیے تو آخری ملاقات ہی ہوگی جب ہم لاہور پہنچ کے انہیں بلائیں گے اور بتائیں گے کہ۔۔۔"
رابعہ نے کہا "خیر یہ سب ہم نے تو نہیں کیا۔ سزائے موت اگر ہماری کوشش سے ہوتی تو اور بات تھی۔"
"ہاں اس لحاظ سے تو اچھا ہوا۔ وہ مقدمہ لڑتے اور ہار جاتے تو ہمارے خلاف دل میں انتقام کے جذبات' نفرت یا کدورت رکھتے' یہ تو تقدیر کا فیصلہ ہے۔"
"اگر یہ فیصلہ کچھ پہلے ہو جاتا۔"
میں نے کہا "کوئی کام وقت سے پہلے نہیں ہو سکتا۔ اور وقت سے مجھے یاد آیا کہ سات بجنے والے ہیں۔ ہائی جیک صاحب نے فرمایا تھا کہ ہم آٹھ بجے تک چارلی سے مل کے اپنی ریزرویشن کرالیں تو اچھا ہے اور اس سے مجھے مزید یاد آیا کہ چوہدری دلاور اب تک کیوں سو رہا ہے؟"
"میں نے اسے ایک اور انجکشن لگا دیا تھا۔" محسن بولا۔
"کب؟ میں نے تو نہیں دیکھا۔"
"جہاز کے اڑنے سے پہلے۔ اسے سوتے ہوئے مسلسل بارہ گھنٹے ہو گئے ہیں۔ اب اسے جاگنا چاہیے۔ ایسے کچھ کھائے پیئے بغیر تو نیند میں ہی بھوک سے فوت ہو جائے گا۔"
میں نے کہا "میں جاتا ہوں جیک کے ساتھ۔ تو دلاور کو سنبھال۔ وہ اٹھ جائے تو اسے کچھ کھانے پینے کے لیے دینا ہوگا۔ دوا کا مسئلہ الگ ہے۔ وہ خود ہی جانتا ہے کہ کون سی دوا کس وقت کھانی ہے۔"
"اگر وہ جاگنے کے بعد ہنگامہ کرے۔۔۔!"
"کیسے ہنگامہ کرے گا یار۔ غنودگی باقی رہتی ہے اور اگر وہ اپنے حواس میں ہو تو اسے پھر سمجھا دینا کہ اب وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ بہتر ہے خاموشی سے تعاون کرے۔ اسی میں فائدہ ہے ورنہ ہمارا کیا ہے۔ کارٹن میں پیک کر کے بھی لے جا سکتے ہیں۔ اسے سمجھا دینا کہ چارٹرڈ فلائٹ کے اخراجات خود اس نے ادا کیے ہیں' اس کے باوجود وہ آرام سے نہ جائے تو بد قسمت وہ خود۔"
محسن نے کہا "یہاں کے معاملات مجھ پر چھوڑ دے' تو جا۔"
رابعہ نے کہا "مگر میں سکندر کو ایسے نہیں چھوڑ سکتی۔ یہ پھر نکل گئے کسی پروگرام کے بغیر کہیں۔۔۔"
میں نے کہا "بیوی۔ اتنی بے اعتباری اپنے اکلوتے شوہر پر۔"
"تمہیں کیا معلوم ہم نے چار دن کس عذاب میں گزارے یہاں" وہ بولی "تم تو بغیر بتائے غائب ہو گئے تھے۔"
گل نے کہا "اگر ایسے ہی ہم غائب ہو جائیں پھر؟"
محسن نے خوش ہو کے کہا "ایمان سے کہو۔ ہے ایسا کوئی ارادہ؟"
میں نے بھی کہا "ہماری طرف سے اجازت ہے۔ چار دن کیا تم چار ہفتے غائب رہو۔ جب جی چاہے لوٹ آنا۔ ہم شکوہ بھی نہیں کریں گے۔"
"شکریہ ادا کریں گے کہ آپ نے ہمیں کچھ دن سکون سے رہنے کی مہلت عطا کی۔ غلام ہی سمجھتے ہیں کہ آزادی کتنی بڑی نعمت ہوتی ہے۔"
گل نے خفگی سے کہا "ہم نے غلام بنا رکھا ہے تمہیں؟ کوئی زنجیر ڈال رکھی ہے تمہارے پیروں میں۔"
میں نے کہا "شیروانی صاحب! میں تو چلتا ہوں۔ آپ خواتین کو مطمئن کریں ذرا۔ کچھ جذباتی ڈائیلاگ بولیں۔ ڈھیٹ بن کے معافی مانگ لیں۔ ہاتھ جوڑ کے ناک رگڑ کے' یہ کوئی مشکل کام نہیں۔"
محسن نے سر ہلایا "بہت آسان کام ہے۔ تم دیکھنا میں کیسا بے وقوف بناتا ہوں۔ واپسی پر دونوں کی بتیسی نظر آئے گی ٹوتھ پیسٹ کے اشتہار کی طرح۔"
محسن نے جانتے بوجھتے محض دل لگی کے لیے پنگا لیا تھا۔ جب میں جیک کے ساتھ روانہ ہوا تو ان کے کمرے سے زور زور سے ہنسنے کی آواز آ رہی تھی۔
جیک نے کہا "کیا تمہارا وہ مریض گزر گیا؟"
میں نے کہا "وہ سو فیصد زندہ ہے۔"
"پھر یہ رونے کی آوازیں کیسی ہیں؟" جیک نے کہا۔
"یہ لوگ ہنس رہے ہیں۔"
اس نے مشتبہ لہجے میں کہا "تم تو بتا رہے تھے کہ تمہارے لیے شراب حرام ہے۔"
"ہاں۔ ہمیں بن پیئے ہی نشہ ہو جاتا ہے۔ شراب کا نشہ ہو' محبت کا یا دولت کا' کیفیت ایک جیسی ہوتی ہے۔ آدمی پاگل ہو جاتا ہے۔"
وہ ہنس پڑا "شاید ٹھیک ہی کہہ رہے ہو تم۔"
ٹیکسی نے ہمیں آدھے گھنٹے میں ایک ہوٹل کے سامنے اُتار دیا۔ جیک نے بتایا کہ اتوار کی صبح ٹریفک کا رش نہیں ہے ورنہ یہی فاصلہ ہم اس سے تین گنا وقت میں طے کرتے۔ راستوں پر پھولوں کی افراط تھی۔ فرانسیسی حُسن کے شیدائی ہیں۔ صرف پھول ہی نہیں' فیشن' خوشبو' آرٹ۔۔۔۔ سب میں ان کا ذوق دیگر یورپی اقوام سے بڑھ کر ہے۔ ہوٹل کے باہر ہر گیلری میں' پورچ میں اور اندر لاؤنج میں پھول ہی پھول تھے۔ یہ درمیانے درجے کا ہوٹل تھا مگر خوب صورتی اور صفائی میں ہمارے ملک کے فور اسٹار ہوٹلوں سے بڑھ کر تھا۔
چارلی اسی وقت نیند سے بیدار ہوا تھا۔ اس نے مجھے لال لال آنکھوں سے گھورتے ہوئے مصافحہ کیا۔ وہ بھی چالیس بیالیس سال کی عمر کا مگر بھاری بھرکم شخص تھا۔ اسے بلاوجہ ہنسنے کی عادت تھی اور اس کی آواز مردانہ سے زیادہ بچکانہ تھی۔
"آج تم لے جانا چاہتے ہو نائٹ انگیل کو؟"
میں نے بوکھلا کے کہا "نائٹ انگیل۔۔۔۔ یہ کون خاتون ہیں۔ میں تو تمہارے جہاز کی بات کرنے آیا تھا۔"
وہ خوب ہنسا اور پھر اس نے عادت کے مطابق اپنا ہاتھ آگے کیا کہ میں اس پر ہاتھ ماروں "یہ جہاز کا نام ہے' اب تم پوچھو گے کہ۔۔۔"
"میں نہیں پوچھوں گا" میں نے کہا "یہ اپنے اپنے جذبات کا مسئلہ ہے۔ شاید تمہیں جہاز کے انجن کا شور ایسے لگتا ہوگا جیسے بلبل گا رہی ہے۔"
وہ پھر ہنسا اور مجھے پھر اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارنا پڑا "کمال کر دیا تم نے' میرے جذبات کی ترجمانی کر دی۔ بالکل یہی بات ہے' جذباتی مسئلہ ہے۔"
میں نے کہا "اب تم میرے جذبات کا معاشی مسئلہ حل کر دو۔ میں تمہیں پندرہ ہزار پاؤنڈ سے زیادہ دینے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ ہوتے تو انکار نہ کرتا۔ میں جھوٹ بولنا نہیں چاہتا تمہیں قائل کرنے کے لیے۔"
اس کی آنکھیں چمکنے لگیں "ٹھیک ہے۔ تم اپنے آدمی ہو اس لیے ٹھیک ہے۔ لاؤ پندرہ ہزار پاؤنڈ۔"
میں نے رقم اسے پیش کر دی "گن لو۔"
اس نے رقم اپنے سوٹ کیس میں ڈال دی "پوری ہے نا؟"
"نہیں۔ ایک پاؤنڈ کم ہے" میں نے کہا۔
وہ ہنسا "اگر ایک ہزار پاؤنڈ بھی کم ہوتے تو میں نہ گنتا۔ اب یہ بتاؤ کہ کب جانا ہے۔"
"تمہارا جہاز ٹیک آف کے لئے تیار ہے؟"
"بالکل تیار ہے۔ مجھے فلائٹ شیڈول بنا کے دینا پڑے گا۔ اپنے باپ کو تلاش کرتا ہوں۔ پتا نہیں رات وہ کہاں تھا؟"
میں نے حیرانی سے کہا "کیا اس کو بتا کے اجازت لو گے؟"
وہ ہنستے ہنستے دہرا ہو گیا "میرا باپ بھی میرا نیوی ہے۔ اس نے مجھے فلائنگ سکھائی۔ وہ خود بڑا زبردست پائلٹ ہے۔ اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دو اور اسے کسی بھی جہاز میں بٹھا دو۔ اور پھر کہو کہ چلو کوسٹاریکا یا ٹمبکٹو۔ تو وہ تم کو بڑی حفاظت کے ساتھ ٹھیک وقت پر وہاں اتار دے گا۔ بس وہ کچھ آوارہ اور اوباش ہو گیا ہے جب سے اس کی بیوی مری ہے۔"
"اس کی بیوی' یعنی تمہاری ماں؟"
اس نے ہنستے ہوئے کہا "اوہ نو۔ میری ماں سے تو اس نے شادی ہی نہیں کی تھی۔ اب تم آ جاؤ دو گھنٹے بعد جیک کے ساتھ۔"
جیک نے کہا "میرے ساتھ کیوں' مجھے واپس جانا ہے۔ اب تم جانو تمہارا کام۔"
میں نے کہا "مجھے بتا دو کہ ہم کہاں آئیں' کہاں آسانی ہوگی ہمارے لیے۔ دراصل ہم اس شہر کو بہت کم جانتے ہیں۔"
"پھر تم یہاں آ جاؤ۔ میرے پاس ہوٹل میں" وہ بولا "میں تمہیں ساتھ لے چلوں گا۔"
ہم نے وہیں سے ہائی جیک کو خدا حافظ کہا "تم نے یقیناً ہماری بہت مدد کی۔"
اس نے کہا "مگر تم نے نیکی سمجھ کے بھی مجھے ایک ہزار پاؤنڈ نہیں دیے۔ ہزار نہ سہی پانچ سو دے دو۔"
میں نے اسے پانچ سو پاؤنڈ دے دیے۔ "بات یہ ہے کہ مال ہمارا نہیں' تم بھی عیش کرو' یہ مالِ غنیمت ہے۔"
"وہ کیا ہوتا ہے؟" اس نے نوٹ جیب میں ٹھونس لیے۔
"دشمن کا مال' حرام کی کمائی۔ لاٹری کا پیسہ۔ مفت میں مل جانے والا خزانہ۔ کچھ بھی سمجھ لو۔ باپ کا مال ہوتا تو ہم ایسی بے دردی سے نہ لٹاتے' تم حقدار بھی نہیں تھے۔"
"حق کی بات مت کرو" وہ ہاتھ ملا کے بولا "حق کی راہ پر کیا تم چل رہے ہو' تم سمجھتے ہو کہ جو کچھ تم کر رہے ہو' وہ ٹھیک ہے۔"
محسن نے ٹھنڈی سانس لی "یہی تو ساری خرابی ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ ہم جو بھی کر رہے ہیں' وہ غلط ہے۔ اور پھر بھی وہی کرتے رہتے ہیں۔ اگر ہم صرف اپنے قول و فعل کو ٹھیک کر لیں تو پھر خاندان' معاشرہ' ساری دنیا ٹھیک ہو جائے۔"
وہ ہاتھ ملا کے رخصت ہو گیا تو ہم نے واپسی کے لیے ٹیکسی لی۔

غریب نواز ہوسٹل تک پھر آدھے گھنٹے کا سفر تھا۔

محسن نے کہا "چل یار، خدا کا شکر ہے۔ اب کوئی مشکل مرحلہ نہیں رہا۔"

میں نے کہا "ہاں۔ اگر ہم پر برطانیہ میں داخلے پر پابندی نہ ہوتی تو کچھ نہ ہوتا۔ ہم قانونی طور پر جارج سے ملاقات کرتے اور لوٹ جاتے۔ یہ کولمبو سے پیرس آنے کا اور ایڈی کے ساتھ لندن پہنچنے کے لیے خفیہ طریقہ استعمال کرنے کا چکر ہی نہ ہوتا۔ خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھئے احوال۔ کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے" میں نے کہا "آئے تھے ہم جارج سے ملاقات کے لیے اور اپنے ساتھ لے کر جارہے ہیں چوہدری دلاور کو۔"

محسن بولا "سارا کھیل تقدیر کا ہے۔ ہر بات کا ایک وقت مقرر ہے۔ آدمی لاکھ جتن کرے، کچھ نہیں ہوتا اور جب وقت آتا ہے تو سب خود بخود ہوجاتا ہے۔ ہمارے اور چوہدری دلاور کے درمیان اختلافات اور پھر دشمنی کا نقطۂ آغاز کیا تھا، اور انجام ہماری توقعات کے کتنا برعکس۔ بڑی طویل جدوجہد کی ہم نے۔ دلاور نے بھی ہمیں تباہ و برباد کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ پھر جب اس کے مہرے پٹنے لگے اور اسے شکست اپنا مقدر محسوس ہونے لگی تو اس نے کتنی بار صلح کی غیر مشروط پیش کش تک کی۔ وہ معافی تلافی کی بات کرنے لگا۔ کتنا بڑا شکاری سمجھتا تھا وہ اپنے آپ کو۔ کتنا غرور تھا اسے اپنی دولت کی طاقت پر۔"

"ہاں۔ مگر اب وہ ایک مرقعِ عبرت ہے۔ وہ پولیس کو زر خرید غلام سمجھتا تھا، قانون اس کی مٹھی میں تھا۔ اسے زعم تھا کہ کسی عدالت میں اس کے خلاف کچھ ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ وہ گرفتار ہوا تو پولیس نے اسے چھوڑ دیا۔ دوسری بار وہ جیل سے فرار ہوگیا اور زندگی مہلت دیتی تو وہ واقعی ہار نہ مانتا۔ ابھی تو وہ اس یقین کے ساتھ ہمارے سامنے ڈٹا ہوا تھا" میں نے کہا۔

محسن بولا "ہمارے سامنے کیا، دیکھا جائے تو نظامِ انصاف کی مشینری کو چلانے والے سب ہی اس کی لاقانونیت اور فرعونیت کے دشمن تھے۔ وکیلوں نے اسے ہر طرف سے محصور کرلیا تھا اور پولیس کو بھی مجبور کردیا تھا کہ وہ چوہدری دلاور پر..... قانون کے مطابق فردِ جرم عائد کریں۔"

میں نے کہا "دلاور کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وہ ہر قسم کی عدالتی کارروائی کے لیے تیار تھا۔ اس نے نامور وکیلوں کی پوری فوج یہ قانونی جنگ لڑنے کے لیے تیار کی ہوگی۔ اسے پورا بھروسا ہوگا کہ سیشن کورٹ سے ہائی کورٹ اور پھر سپریم کورٹ تک اس کا راستہ کون روک سکتا ہے اور پھر دلاور جیسے مجرم انصاف کی راہ میں روڑے اٹکانا بھی جانتے ہیں۔ عدالتوں میں اسی لیے تصفیہ طلب مقدمات کی تعداد بڑھتی جارہی ہے کہ ہر کیس کو طول دینے کے لامحدود امکانات پیدا کیے جاسکتے ہیں۔ ہفتوں کا معاملہ مہینوں پر اور مہینوں کا سالوں پر ٹالا جاسکتا ہے۔ لمبی تاریخ، سماعت پر غیر حاضری۔ بیماری کے عذر۔ ہر سمن کی عدم تعمیل جب تک کہ ناقابل ضمانت وارنٹ جاری نہ ہوجائیں۔ خود پولیس ہزاروں حیلے حوالے فراہم کردیتی ہے۔"

محسن بولا "ہاں۔ لیکن اس کے باوجود مجرم سزا پاتے ہیں۔ پھانسی پر لٹکائے جاتے ہیں اور جیلوں میں جگہ نہیں۔"

"وہ چوہدری دلاور جیسے لوگ کم ہی ہوتے ہیں۔ غریب لاوارث جو لمبی قانونی جنگ کے اخراجات برداشت نہیں کرسکتے رشوت، شہادت اور گواہ خرید نہیں سکتے اور مٹا نہیں سکتے۔ جن کے خلاف جھوٹے گواہ اور ثبوت فراہم کیے جاسکتے ہیں۔ ان کو ضرور سزا ہوجاتی ہے۔ اس میں عدالت کا یا جج کا کوئی قصور نہیں۔ وہ تو شہادت اور ثبوت دیکھتے ہیں۔ یہی بنیاد ہے انصاف کی اور جب بنیاد غلط کردی جائے گی تو انصاف کیسے ہوگا؟ کیا پاکستان میں یہ بڑے بڑے خاندانی لوگ، صنعت کار اور سرمایہ دار، بیوروکریٹ اور سیاست داں جرم نہیں کرتے، کتنے بڑے آدمی ہیں جیل میں۔ یہ وڈیرے جاگیردار اور اسمگلر۔ کیا کچھ نہیں کرتے، یہ مجرموں کی سرپرستی کرتے ہیں۔ پیشہ ور قاتل اور ڈاکو پالتے ہیں۔ یہ جسے چاہیں اٹھوالیں، غائب کردیں۔ پورے پورے خاندان اور گاؤں صفحۂ ہستی سے مٹادیں۔ کوئی پکڑ سکتا ہے انہیں؟ آج تک کسی نے ان بڑے مجرموں پر ہاتھ ڈالا ہے جن کو اپنے جرائم، دہشت گردی اور بدمعاشی پر اتنا ہی ناز ہے جتنا کبھی خاندانی لوگ اپنی شرافت پر کرتے تھے۔ آج تک ان میں سے کسی کو پھانسی ہوئی کوئی سزا کاٹ رہا ہے.....؟"

محسن نے سرہلایا "یہ تو ٹھیک ہی کہا تو نے۔ اسی صورتِ حال نے لوگوں کو مایوس کیا ہے۔ اب لوگ انصاف کے لیے آسمان کی طرف دیکھتے ہیں کہ انصاف خدا کرے گا۔ یومِ حشر تک صبر کرنے پر تیار ہیں کہ یہاں نہ سہی وہاں تو ہماری سنی جائے گی۔ جب کچھ نہ کرپائیں تو کہتے ہیں خدا ظالم کی رسّی دراز کرتا ہے۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ ایسے شعر پڑھتے ہیں کہ ظلم کی کھیتی سدا پھلتی نہیں۔ ناؤ کاغذ کی سدا چلتی نہیں۔ قدرت کے نظامِ انصاف پر یقین کے سہارے جیتے ہیں اور ایسی کوئی مثال مل جائے، جیسا دلاور کا انجام ہوا تو مطمئن اور خوش ہوجاتے ہیں کہ جیسی کرنی ویسی بھرنی۔ بُرے کام کا بُرا نتیجہ۔ جیسا بوؤ گے ویسا کاٹو گے۔ وغیرہ وغیرہ یہ مثال وہ دس جگہ دیتے ہیں لیکن دس دوسری مثالوں پر غور نہیں کرتے جہاں چوہدری دلاور جیسے لوگ ہی دنیا میں کامیاب رہے عزت دار کہلائے اور کوئی ان کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔

"دنیاوی کامیابی ہی سب کچھ نہیں۔ انہوں نے آخرت میں خسارے کا سودا کیا" میں نے کہا "بے شک سر حسینؓ نے کٹایا مگر یزید نے دنیا میں روسیاہی پائی۔ وہ ملعون و مردود ٹھہرا۔ دنیا و عقبیٰ میں رسوا ہوا۔ اس دنیاوی زندگی کی حقیقت بھی کیا ہے۔"

ڈرائیور نے گاڑی روک کے کہا "یہی وہ جگہ ہے۔"

میں نے کہا "تھینک یو۔ ہم باتوں میں ایسے کھوئے کہ تمہیں راستہ بتانا بھی یاد نہیں رہا مگر تم بالکل ٹھیک جگہ لے آئے۔"

وہ میری فرنچ سے خوش ہوا "تم بڑی روانی سے فرنچ بولتے ہو۔ اگرچہ تمہارا لہجہ سوفیصد فرنچ نہیں۔"

"ہو بھی نہیں سکتا" میں نے کہا "تم انگلش ویسے نہیں بول سکتے جیسے انگریز بولتے ہیں۔"

"مگر میں بولنا بھی نہیں چاہتا" اس نے کہا۔

محسن نے اچانک مجھے کہنی ماری "یہ کیا چکر ہے۔" پھر وہ ٹیکسی ڈرائیور سے مخاطب ہوا "یہاں گاڑی مت روکو، تھوڑا سا آگے چلو۔"

اس نے حیرانی سے کہا "مگر تم نے کہا تھا۔"

"ہاں۔ یہ مشہور جگہ ہے اس لیے تمہیں نشانی بتادی۔ ہم اس عمارت میں رہتے ہیں" محسن نے کہا "وہ سفید عمارت سیدھے ہاتھ پر۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھادی۔ جب محسن نے مجھے کہنی ماری تھی تو میں نے ہوسٹل کے مین گیٹ سے اندر دیکھا اور مجھے استقبالیہ کے کاؤنٹر پر رابعہ اور گل نظر آئی تھیں۔ وہ تین پولیس والوں سے نہ جانے کیا بحث کرنے میں مصروف تھیں۔ ایک پولیس کار گیٹ سے ذرا آگے کھڑی تھی، اس کا ڈرائیور بھی پولیس مین تھا اور وہ ہاتھ باندھے کار سے لگا کھڑا تھا۔ اس کی نگاہ بھی اندر تھی چنانچہ اس نے ٹیکسی کو رُکتے اور پھر روانہ ہوتے نہیں دیکھا۔

محسن نے جس عمارت کی طرف اشارہ کیا تھا وہ تقریباً سو گز آگے تھی۔ ٹیکسی سے اُتر کے میں نے کرایہ ادا کیا اور ڈرائیور کا فرنچ میں بڑے دوستانہ طریقے پر شکریہ ادا کیا۔ ہم نے عمارت کے صدر دروازے کا رُخ کیا مگر ٹیکسی کے روانہ ہوتے ہی ہم رُک گئے۔

"کہیں پولیس ہماری تلاش میں تو نہیں تھی؟" محسن بولا۔

"مگر وہ یہاں کیسے پہنچ سکتے ہیں؟" میں نے پریشانی سے کہا۔

"اگر برطانوی پولیس نے فرنچ پولیس کو ہمارے نام اور حلیے سے آگاہ کردیا ہوگا تو ان کا ہمیں تلاش کرتے ہوئے یہاں آجانا بعید از قیاس نہیں۔ وہ شہر کے سارے ہوٹل چیک کریں گے اور ایسے ہوسٹل یا گیسٹ ہاؤس جہاں ہم جیسے لوگ قیام کرسکتے ہیں۔ ہم الزبتھ اور سر رچرڈ کی مہربانی اور مدد سے نکل تو آئے مگر پولیس کے ریکارڈ پر ہم مطلوب ملزم ہیں۔"

میں نے کہا "یہ تو نئی مصیبت نازل ہوگئی۔ ہوسٹل والے ضرور بتادیں گے کہ اس حلیے کے اور نام کے لوگ یہاں مقیم ہیں۔ ممکن ہے وہ ہوسٹل کی تلاشی لیں اور دلاور کو برآمد کرلیں، ہم نے ایک اور غلطی کی ہے۔"

"وہ کیا؟"

"ہم نے ڈاکٹر شاہ کی تدفین کا انتظام کرنے والے ادارے کو الزبتھ اور سر رچرڈ گورڈن کا ٹیلی فون نمبر اور پتا لکھوادیا تھا۔"

"او مائی گاڈ۔ اس وقت ہمیں کیا معلوم تھا کہ حالات کیا رُخ اختیار کریں گے۔ الزبتھ ہم سے ملنے کے لیے پولیس اسٹیشن پہنچ جائے گی اور سر رچرڈ گورڈن ہمارے ساتھ ایسی فراخ دلی کا سلوک کرے گا۔"

"کہیں ایسا تو نہیں کہ انڈر ٹیکرز نے رچرڈ کو فون کیا ہو، کچھ پوچھنے کے لیے یا کوئی بات بتانے کے لیے" میں نے کہا۔

محسن بولا "یہ بھی ہوسکتا ہے کہ پولیس نے ڈاکٹر شاہ کا سُراغ لگالیا ہو۔ اس کی کار پولیس کی تحویل میں تھی۔ وہ بھوت نظر آنے والا جو اس ادارے کا منتظم یا مالک تھا۔ وہ پولیس کو بتا سکتا ہے کہ لاش کو تابوت کے ساتھ وہاں چھوڑ کر جانے والے کون لوگ تھے۔ ان کی صورت شکل اور حُلیہ کیا تھا....."

"کاکروچ تو غصے سے پاگل ہوجائے گا" میں نے کہا "خود الزبتھ ہمیں گالیاں دے گی کہ ہم نے اسے بے وقوف بنایا۔ اس نے اور سر رچرڈ نے ہماری مہمان نوازی میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی۔ ہمیں عزت دی اور ہمارے لیے سب کچھ کیا۔ اس کا ہم نے یہ صلہ دیا۔"

"خیر یہ تو ہے بعد کی بات۔ پھر کبھی موقع ملا تو اپنی صفائی پیش کردیں گے۔ وہ یقین نہیں کرتے تب بھی ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سوال یہ ہے کہ اس وقت ہم کیا کریں؟" محسن بولا۔

میں نے کہا "اگر ہم ہوسٹل میں گئے تو پکڑ لیے جائیں گے۔"

"اگر پولیس نے رابعہ اور گل کو پکڑلیا؟" محسن نے کہا۔

میں نے کہا "کس جرم میں؟ یہاں ایسی لاقانونیت نہیں چلتی کہ ملزم کی گرفتاری میں ناکام ہوکے پولیس اس کے باپ یا بھائی کو اُٹھالے جائے یا بیوی کو پریشان کرے۔"

ہم فٹ پاتھ پر کھڑے تھے کہ تینوں پولیس مین اندر سے باہر آئے اور گاڑی میں بیٹھ گئے۔ ڈرائیور نے اپنی سیٹ سنبھالی اور کار روانہ ہوگئی۔ ہم نے فوراً اپنا چہرہ مخالف سمت میں کرلیا اور اس عمارت کی سیڑھیوں کی جانب چند قدم بڑھائے جس کے سامنے ہم ٹیکسی سے اُترے تھے۔

جب پولیس کار آگے نکل گئی تو ہم واپس ہوئے۔ دروازے پر کھڑے ہوئے چوکیدار نے کہا "کیا تم کوئی پتا تلاش کررہے ہو؟"

میں نے فرنچ میں کہا "دراصل ہمیں کسی فون بوتھ کی تلاش ہے۔"

اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا "فون تو یہاں بھی ہے، ہال میں۔"

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور ہم نے ہال میں جاکے اپنے ہوسٹل کا فون نمبر ملایا۔ رابعہ کو آنے میں چند منٹ لگے۔

اس کی ہیلو سُن کے میں نے کہا "رابعہ!"

رابعہ نے کہا "سکندر، تم..... کہاں ہو تم لوگ؟"

"بہت قریب۔ ہم نے تمہیں پولیس سے باتیں کرتے دیکھ لیا

تھا۔ ہم ٹیکسی کو آگے لے گئے۔"

"بہت اچھا کیا تم نے" رابعہ بولی "پولیس تمہیں تلاش کرتی ہوئی آئی تھی۔"

"یہاں کا پتا کس نے بتایا انہیں؟"

"کسی نے بھی نہیں۔ برطانوی پولیس نے انہیں تمہارے نام اور حلیے سے مطلع کیا تھا۔ وہ ہر جگہ دیکھتے پھر رہے ہیں۔ ان کے پاس ان تمام مقامات کے پتے ہیں جہاں کوئی قیام کر سکتا ہے' ہوٹلوں کے علاوہ۔"

"وہ تم سے کیا پوچھ رہے تھے؟"

"انہوں نے ریسیپشن پر معلوم کیا تھا' شاید تصویر بھی دکھائی تھی۔"

میں نے کہا "پھر...؟ انہوں نے بتادیا ہوگا کہ ہم یہیں ہیں۔"

"ہاں۔ انہوں نے ہمیں بُلالیا۔ ہم نے کہہ دیا کہ تم لوگ واپس جاچکے ہو۔ انہوں نے پوچھا کہ کہاں تو ہم نے کہہ دیا کہ جہاں سے آئے تھے۔ اپنے وطن پاکستان۔ پھر انہوں نے پوچھا کہ یہ کب کی بات ہے تو ہم نے کہا کہ گزشتہ ہفتے کی۔ تمہیں واپس گئے پانچ دن ہوگئے۔"

"یہ کیا بے وقوفی کی بات کی تم نے۔ ہم کل رات.... بلکہ آج ہی صبح دو بجے پیرس میں وارد ہوئے تھے۔"

"رات کے وقت جو اسٹاف ڈیوٹی پر تھا۔ وہ اس وقت نہیں تھا۔ صبح کی شفٹ کے لوگ آٹھ بجے آئے تھے۔ ان میں سے کسی نے تمہیں نہ آتے دیکھا تھا اور نہ جاتے۔ انہوں نے ہمارے بیان کی تصدیق کردی کہ چار پانچ دن پہلے انہوں نے ہمیں دیکھا تھا' بس اس کے بعد وہ چلے گئے۔"

"انہوں نے تم سے کوئی سوال نہیں کیا کہ تمہارا ملزمان سے کیا رشتہ ہے؟ اور تم یہاں کیا کررہی ہو؟"

"پوچھا تھا مگر ہم نے کہہ دیا کہ فضول سوالات کا ہم جواب نہیں دے سکتے۔ ہمارا کوئی رشتہ ہے یا نہیں' اور ہم پیرس کیوں آئے ہیں اور کب تک یہاں رہیں گے' اس سے بھی انہیں کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔ تم نے وقار یوسف کے بارے میں پوچھا تھا وہ ہم نے بتادیا۔ اب تم چاہو تو اپنے طور پر تصدیق کرسکتے ہو۔ ہوسٹل کی انتظامیہ نے بھی سخت رویّہ اختیار کیا کہ وہ یہاں رہنے والوں کو بلاوجہ پریشان نہیں کرسکتے۔ ان کے مطلوبہ ملزمان یہاں نہیں ہیں۔ اگر یہاں پھر نظر آئے تو پولیس کو مطلع کردیا جائے گا۔ ان کے پاس کوئی وارنٹ نہیں تھا۔ نہ تلاشی کا اور نہ گرفتاری کا۔ وہ معذرت کرکے چلے گئے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ وہ پھر آئیں گے۔"

میں نے کہا "ان کے پھر آنے سے پہلے تم نکل آؤ۔"

رابعہ نے کہا "کیسے نکل آئیں؟"

"منیجر سے کہو کہ حساب کرے۔ بل ادا کرو اور فوراً سامان اُٹھاکے باہر آجاؤ۔" میں نے کہا "ہم باہر ٹیکسی میں تمہارا انتظار کررہے ہیں۔"

"لیکن دلاور...!"

میں نے کہا "رابعہ۔ عقل سے اور ہمت سے کام لو۔ کاؤنٹر پر جو بھی ہے اس کی مٹھی گرم کردو' سو دوسو پاؤنڈ دے دو تاکہ وہ خاموشی سے تمہیں نکل جانے دے۔ بعد میں پولیس پھر آئے گی تو اس پر کوئی الزام نہیں ہوگا۔ اسے کسی نے نہیں کہا تھا کہ تمہارے روانہ ہونے کی صورت میں پولیس کو مطلع کرے۔ اور نہ پولیس نے تم پر کوئی پابندی عائد کی تھی کہ پولیس کو اطلاع دیے بغیر تم کہیں نہیں جاؤگی۔"

"یہ تو خیر ٹھیک ہے۔"

"کیا چوہدری دلاور ہوش میں ہے؟ اس قابل ہے کہ اپنے پیروں پر چل سکے؟"

"ہاں۔ وہ ہم سے باتیں کررہا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ ہر طرح سے تعاون کرے گا۔ بس اسے نیند کا انجکشن نہ لگایا جائے۔"

"اوکے۔ اسے کہو کہ تمہارے ساتھ آجائے۔ اسے سمجھادینا کہ سکندر اور محسن باہر انتظار کررہے ہیں' وہ چالاکی نہ دکھائے۔"

"میں اسے گن پوائنٹ پر بھی لاسکتی ہوں" رابعہ نے کہا "ایسے کہ کسی کو پتا نہ چلے۔ صرف دلاور کو معلوم ہوگا کہ میرے ہاتھ میں بھرا ہوا ریوالور ہے اور میری انگلی ٹریگر پر ہے۔"

"ویری گڈ۔ یہ ایک مشکل کام ہے مگر مجھے اُمید ہے کہ تم ہوش وحواس برقرار رکھتے ہوئے سب کچھ کرسکتی ہو۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ گل کو بھی ساری بات اچھی طرح سمجھادو۔ پھر تم گل کو سامان کے ساتھ روانہ کردو۔ محسن اسے ٹیکسی میں لے جائے گا۔ میں تمہارا انتظار کروں گا جب تم باہر آجاؤگی تو میں دوسری ٹیکسی میں آؤں گا اور دلاور کو اپنے ساتھ بٹھالوں گا۔ تم آگے بیٹھ جانا۔ اس سے پہلے کہ کوئی ٹیکسی کا نمبر نوٹ کرے۔"

"مگر ہم جائیں گے کہاں؟"

"ہم ایک گھنٹے میں فلائی کرجائیں گے" میں نے کہا "ہم نے بات کرلی ہے اور سارا انتظام ہوگیا ہے۔ پولیس کو ریکارڈ چیک کرنے میں کچھ دیر لگے گی کہ گزشتہ چار پانچ ہفتوں میں کتنی فلائٹس کراچی کے لیے روانہ ہوئیں اور ان میں وقار یوسف نام کا کوئی مسافر تھا یا نہیں۔ جب تک انہیں معلوم ہوگا کہ تم نے جھوٹ بولا تھا اور وہ پھر ہوسٹل پہنچ کر تم سے مزید تفتیش کرنا چاہیں گے تم ان کی دسترس سے دور نکل جاؤگی۔ مگر دیکھو' ہوشیاری سے اور ہمت سے سارا کام کرنا ہے۔ ہم وہاں آکے تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکتے جیسے بھی ہو دلاور کے ساتھ ہوسٹل چھوڑدو۔"

میں اور محسن بیس منٹ تک ٹیکسی میں بیٹھے گل کے برآمد ہونے کا انتظار کرتے رہے۔ ہمارے پُراسرار رویے نے ٹیکسی ڈرائیور کو شک میں مبتلا کردیا تھا۔ اس نے بگڑ کے کہا "آخر تم بتاتے کیوں نہیں کہ تمہیں کہاں جانا ہے' جانا ہے یا نہیں جانا ہے؟"

محسن نے پھر فرنچ کا حربہ استعمال کیا۔ اس سے دوستانہ رازداری کے ساتھ کہا "دراصل میں اپنی گرل فرینڈ کا انتظار کررہا ہوں' وہ آتی ہوگی۔"

"پھر کوئی بات نہیں" وہ ڈرائیور موم ہوگیا "اسے روکنے والا کون ہے۔ ویسے تو لڑکیاں وقت پر کم ہی آتی ہیں۔"

محسن نے آہ بھری "مگر اس کی راہ میں حائل ہوگا یہ ظالم سماج۔ میرا مطلب ہے اس کا قاتل باپ۔"

"قاتل۔ کس کو قتل کیا ہے اس نے؟"

"وہ مجھے قتل کرے گا" محسن بولا "اس نے اعلان کیا ہے قسم کھاکے۔ تمہارا کیا خیال ہے' میں انتظار کروں یا پہلے اسے قتل کردوں؟"

ڈرائیور بولا "انتظار کرو۔ اگر وہ تمہیں قتل کردے تو پھر تم بھی یہی کرنا۔"

گل کے نمودار ہوتے ہی محسن نے کہا "چلو۔ ٹیکسی آگے بڑھاؤ اور اسے بٹھاتے ہی دوڑ لگاؤ۔ یہ نہ ہو پیچھے سے گولی آئے اور میرے بجائے تمہیں لگ جائے۔"

میں وہیں اُتر گیا اور محسن نے ٹیکسی کو ہوسٹل کے گیٹ سے چند گز آگے رکھا۔ گل بڑی مشکل سے سامان اُٹھاکے لائی تھی۔ ڈرائیور نے محسن کی مدد کی اور دو منٹ بعد وہ روانہ ہوگئے تو میں نے دوسری ٹیکسی پکڑی اور اس میں بیٹھ گیا۔ ڈرائیور نے بھی سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا تو میں نے کہا "کہاں جانا ہے؟"

اس نے جزبز ہوکے مجھے دیکھا "یہ تم بتاؤگے' میں کیا بتاؤں؟"

"فی الحال تو مجھے کہیں نہیں جانا۔ کیا حرج ہے اگر ہم یہیں بیٹھ کے انتظار کریں" میں نے کہا۔

"کس کا انتظار کریں؟" ٹیکسی ڈرائیور کو شک ہونے لگا تھا کہ میں نے پی رکھی ہے۔

"کسی کا بھی۔ لوگ جب ٹیکسی میں بیٹھتے ہیں تو افراتفری میں ہوتے ہیں۔ کہیں جانے کے لیے۔ آدمی کو کبھی سکون سے بھی رہنا چاہیے۔ کہیں نہ جانے کے لیے بھی ٹیکسی میں بیٹھنا ایک اچھا تجربہ ہے۔ تم کو ویٹنگ چارجز ملیں گے۔"

"لیکن میں سارا دن میٹر ڈاؤن کیے یہاں نہیں کھڑا رہ سکتا۔"

اسی وقت رابعہ باہر آئی۔ اس کے ساتھ ہوسٹل ہی کا کوئی شخص تھا جس نے دلاور کو سہارا دے رکھا تھا "اوکے۔ چلو' دیکھو وہ خوب صورت لڑکی مشکل میں ہے۔ غالباً اس کا باپ بیمار ہے' اسے اسپتال لے چلتے ہیں۔"

ڈرائیور نے مجھے عجیب نظروں سے دیکھا اور ٹیکسی آگے بڑھادی۔ رابعہ کی کامیابی پر میرا دل باغ باغ ہوگیا تھا۔ وہ برآمدے کی آخری سیڑھی پر تھی جب ٹیکسی اس کے سامنے آگئی۔ اس نے مجھے دیکھا اور میں نے فوراً پیچھے والا دروازہ کھول دیا۔ رابعہ کی شکل پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں اور صاف نظر آتا تھا کہ وہ نروس ہے مگر وہ مسکرانے کی کوشش کررہی تھی۔

دلاور میرے ساتھ بیٹھ گیا تو رابعہ آگے بیٹھ گئی "شکر ہے خدا کا" اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"سب ٹھیک؟" میں نے کہا۔

رابعہ نے اقرار میں سرہلایا "بس بال بال بچ گئے۔"

میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو سمجھایا کہ ہمیں کہاں جانا ہے۔ مجھے ہوٹل کا نام یاد تھا۔ اس نے کہا "باقی مجھ پر چھوڑدو۔"

دلاور نے کمزور لہجے میں پوچھا "اب ہم کہاں جارہے ہیں؟"

میں نے کہا "ہم واپس جارہے ہیں' پاکستان۔"

"گویا تم اپنے ارادے پر قائم ہو؟"

میں نے کہا "نہیں۔ تم بلاوجہ ڈر رہے ہو۔ سب کچھ ویسے ہی ہوگا جیسے تم چاہتے ہو مگر لندن میں بیٹھ کے نہیں' لاہور میں تمہارے اور میرے وکیل ان معاملات کو طے کریں گے۔"

اس نے سرہلایا اور آنکھیں بند کرکے سیٹ کی پشت سے سرلگادیا۔ وہ اپنے آپ کو تقدیر کے اور ہمارے رحم وکرم پر چھوڑ چکا تھا۔ پہلے وہ محاذِ جنگ پر فوج کی کمان کرتا تھا پھر وہ اکیلا لڑنے والا سپاہی رہ گیا۔ شکست ہوجانے کے بعد بھی اس نے مزاحمت ترک نہیں کی اور گرفتاری سے بچنے کے لیے بھاگتا رہا۔ اب وہ جنگی قیدی تھا اور اس نے مکمل طور پر ہار مان لی تھی۔ اس کو شکست ہم سے زیادہ مقدر نے دی تھی۔ اگر وہ جی سکتا تو رسّی جل جاتی مگر بل نہ جاتا۔ وہ ہاری ہوئی بازی پھر جیتنے کی خواہش سے کبھی دستبردار نہ ہوتا اور حوصلہ نہ ہارتا۔

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟" میں نے کہا اور مجھے خود اپنی بات بہت عجیب لگی۔

وہ تلخی سے مسکرایا "بے معنی ہے یہ سوال۔ مگر پھر بھی اپنے سکندرِ اعظم صاحب' تھینک یو! کہ تم نے پوچھا' ہیں جی۔"

میں نے کہا "تم ہمیشہ اسی لہجے میں بات کرتے تھے۔ یہی انداز تھا تمہارا۔ لیکن یہ مصنوعی تھا۔ تم جان بوجھ کے ایسے بولتے تھے۔"

اس نے اقرار میں سرہلایا "جب دلاور نہیں رہے گا تو... یاد آئیں گی ہماری باتیں۔ یہ دشمنی بھی یاد آئے گی تمہیں۔ شاید اس کے بغیر تم اپنی زندگی میں خلا محسوس کرو۔ اچانک تمہیں احساس ہو کہ دلاور نہیں رہا تو کوئی کام ہی نہیں رہا۔ تم سکون کے عادی نہیں رہے ہو۔"

میں نے کہا "ہاں۔ یہ سب مجھے بہت عجیب لگتا ہے۔ واقعی تقدیر کے فیصلے انسان نہیں کرسکتا۔"

"میں اپنے بیوی بچوں کو اطلاع دینا چاہتا ہوں۔"

"انہیں بھی اطلاع مل جائے گی مگر ہمارے لاہور پہنچنے کے بعد۔ کیا انہیں یہ سب معلوم ہے۔۔۔ تمہاری بیماری کے بارے میں؟"

"انہیں کیسے معلوم ہو سکتا تھا۔ قسمت کا فیصلہ تو خود مجھے ابھی چند روز پہلے بتایا گیا تھا۔" دلاور نے کہا "یہ بڑا ظلم ہوگا ان کے ساتھ۔ اچانک ان سے اُمید کا سارا چھین لیا جائے گا۔ اگر عدالتی معاملہ ہوتا تو وہ آخری وقت تک پُرامید رہتے۔ مجھے بھی حوصلہ دیتے۔ اس یقین کے ساتھ جنگ لڑتے رہتے کہ بالآخر جیت انہی کی ہوگی۔ وہ آج تک ہارے نہیں مگر ہار تو ایک بار ہی ہوتی ہے نا۔۔۔"

وہ بہت دُکھی تھا اور مایوس تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ آج دلاور اسے ظلم کہہ رہا ہے۔ جو کچھ وہ کرتا رہا اس کے بعد وہ کیوں اُمید رکھتا تھا کہ انجام بخیر ہوگا؟ اگر اچانک اتنے کم وقت میں قدرت کی طرف سے فرمانِ اجل جاری نہ ہوتا تو کچھ عرصے بعد ہوتا۔ آہستہ آہستہ اس کے وارث اور قانونی معاون بھی محسوس کرنے لگتے کہ ان کی شکست کے آثار پیدا ہو رہے ہیں۔ پھر انہیں یقین ہو جاتا کہ اب بازی انہیں مات ہو چکی۔ پھر انتظار باقی رہتا۔ یہی مایوسی اور دُکھ اور بے بسی کے ساتھ دن شمار کرنے کا سلسلہ باقی رہتا۔ سزائے موت سنائی جا چکی، رحم کی اپیل بھی مسترد ہوئی۔ اب بلیک وارنٹ بھی موصول ہوگیا۔ چند دن رہ گئے، تین دن، دو دن، ایک آخری دن پھر کاؤنٹ ڈاؤن شروع ہو جاتا۔ اب بھی تو یہی ہوگا۔ وہ اسی طرح دن گنیں گے۔ اتنی ہی بے رحمی کے ساتھ موت دلاور کو ان سے چھین لے گی۔ وقت کچھ مختصر ہوگیا۔ قانونی جنگ ہارنے میں شاید وہ دو چار سال گزار دیتے لیکن ایک اُمید پھر بھی ان کے ساتھ ہوتی۔ اب دو ماہ کی بات ہے اور اُمید کوئی نہیں۔

میں اپنے خیالات میں اتنا محو تھا کہ مجھے کچھ پتا نہیں چلا۔ وقت پر لگا کے اُڑتا گیا۔ میں نے اچانک دلاور کو ہوائی جہاز میں اپنی سیٹ کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا ہوا دیکھا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ آخری مرحلے میں کسی نے ہمارا راستہ نہیں روکا۔ کوئی رکاوٹ حائل نہیں ہوئی۔

دلاور نے نیچے دیکھتے ہوئے کہا "کیا یہ بحرِ اوقیانوس ہے؟"

میں نے کہا "یہ بحیرہ روم بھی ہو سکتا ہے۔"

رابعہ، محسن اور گل جہاز کے پچھلے حصے میں خوش گپیاں کر رہے تھے۔ میں ان کے ہنسنے کی آوازیں سُن سکتا تھا۔ یکلخت جہاز نے ایک جھٹکا لیا اور میں نے بادل کے ایک ٹکڑے کو کھڑکی سے اوپر اُٹھتا دیکھا۔ مگر بادل وہیں تھا، جہاز ایک دم نیچے چلا گیا تھا۔

دلاور نے گھبرا کے کہا "یہ کیا ہوا؟"

میرے جواب دینے سے پہلے پائلٹ کی آواز سُنائی دی "لیڈیز اینڈ جنٹلمین! میری بات غور سے سُنیں۔ جہاز میں کوئی فنی خرابی پیدا ہو گئی ہے۔ اس کے انجن اچانک بند ہو گئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے انہیں فیول نہیں مل رہا ہے۔ خیر میں کوشش کرتا ہوں، آپ لوگ سیفٹی بیلٹ باندھ لیں۔"

جہاز نے پھر زبردست ارتعاش کے ساتھ جھٹکا لیا۔ میں نے رابعہ اور گل کی چیخ سُنی۔ انجن بند ہونے سے جہاز میں ایک بھیانک خاموشی نے تسلط جما لیا تھا "کیا جہاز گر رہا ہے؟" رابعہ نے چیخ کر کہا۔

گل نے بھی چلا کے یہی سوال دہرایا۔ محسن نے بڑے سخت لہجے میں کہا "بے وقوف لڑکی۔ چلانے سے کیا ہوگا۔ سیٹ بیلٹ باندھو۔"

"کیا اس میں پیراشوٹ نہیں ہیں؟" دلاور نے پوچھا۔

"تمہارا مطلب ہے ہم جہاز کے گرنے سے پہلے ہی باہر کود جائیں اور جہاز کے انجن کام کرنے لگیں تو جہاز پھر آگے چلا جائے، ہم نیچے سمندر میں جا گریں۔۔۔"

لیکن میری بات پوری ہونے کے ساتھ ہی سب کچھ ہوگیا۔ اچانک ایسا لگا جیسے سب کچھ تہ و بالا ہوگیا ہے۔ میں منہ کے بل گرا کیونکہ ابھی تک میں نے بھی سیفٹی بیلٹ نہیں باندھی تھی۔ پائلٹ نے چلا کے کچھ کہا جو میری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں بہت آگے جھکا ہوا تھا اور میرے کان رابعہ اور گل کی چیخیں سُن رہے تھے۔ پھر ایک زبردست دھماکا ہوا اور میں ہوا میں ہاتھ پاؤں چلاتا پانی میں اُتر گیا۔ اتنی بلندی سے گرنے کے بعد میں بہت گہرائی تک اُتر گیا۔ پھر میں نے کوشش کی اور پانی کی سطح تک آنے میں کامیاب ہوگیا۔ شک کی اب کون سی بات رہی تھی۔ جہاز حادثے کا شکار ہو کے بحیرۂ روم میں گر چکا تھا۔

سانس لینے کی کوشش کرتے ہوئے میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ مجھے اپنے چاروں طرف جہاز کا ملبہ دکھائی دیا۔ کیا جہاز گرنے سے پہلے ہی فضا میں پھٹ گیا تھا؟ میں نے تیرنے کی کوشش کرتے ہوئے سوچا۔ دلاور نے اپنی ہار کو بھی اپنی جیت میں بدل دیا۔ آخری بازی اسی کے ہاتھ رہی۔ اپنے ساتھ وہ ہمیں بھی دنیا سے لے گیا۔ خود اس کو کیا فرق پڑتا تھا۔ دو مہینے بعد مرے یا دو گھنٹے بعد۔ اس نے اپنے وارثوں کو بھی بچا لیا۔ سب کچھ انہیں مل جائے گا اب۔ ان سے وراثت کی جنگ لڑنے والا ہی کون بچے گا؟

میں نے پانی کی سطح پر پھیلے ہوئے جہاز کے تیرنے والے ٹکڑوں میں رابعہ، گل اور محسن کو تلاش کرنے کی کوشش کی۔ سمندر کا نمکین پانی میری آنکھوں میں جلن پیدا کر رہا تھا۔ مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر محسن کا سر نمودار ہوا۔ میں نے اسے چیخ کے اپنی طرف متوجہ کیا "محسن۔۔۔ محسن۔۔۔ اِدھر دیکھ میری طرف۔ میرا ہاتھ پکڑ لے۔"

محسن شاید گل کو تلاش کر رہا تھا۔

اس نے کہا "پاگل ہوگیا ہے کیا' ہوش میں آ۔"

میں نے کہا "وہ... رابعہ... کیا وہ ڈوب گئی؟"

باہر کھڑے ہوئے محسن نے قہقہہ مارا "بھائی وہ اُسی دن ڈوب گئی تھی جس دن آپ سے ملی تھی۔"

رابعہ نے ہنستے ہوئے کہا "کہاں ڈوب رہے تھے تم مجھے؟"

میں نے سر جھٹک کے دیکھا۔ وہ سب باہر کھڑے مجھ پر ہنس رہے تھے۔ ان میں گل اور چوہدری دلاور بھی شامل تھے۔ اب تک مجھ پر واضح ہوگیا تھا کہ میں نے خواب دیکھا تھا' میں نے دروازہ کھولا اور باہر آگیا۔

"یار میں سوگیا تھا" میں نے خفت سے کہا "کمال ہے۔"

"جو سوتا ہے وہ کھوتا ہے" محسن بولا "کمال کی اس میں کون سی بات ہے۔ آپ کو کھوتا نہ سمجھنے والا تک کھوتا ہے۔"

میں نے اپنی صفائی پیش کی "دراصل رات بھر جاگتے رہے' تھکن بھی بہت زیادہ تھی۔ ایسے ہی جھپکی سی آگئی۔"

"اور تم خواب خرگوش... خوابِ خر میں گم ہوگئے۔ خر خر کرنے لگے' خر... راٹے لینے لگے" محسن بولا۔

"خواب میں کیا دیکھا؟" گل نے کہا۔

"میں نے دیکھا... کہ جہاز سمندر میں گرگیا ہے" میں نے کہا۔

"خدا کرے کہ اس کی تعبیر سچ ہو" دلاور بولا۔

گل نے اسے گھور کے دیکھا "اللہ نہ کرے۔ ویسے خواب کی تعبیر اُلٹی ہوتی ہے۔"

"یعنی سمندر گرے گا جہاز پر۔" محسن بولا "آفرین ہے تم پر بیوی۔ اللہ نے تمہارے اس حسین چہرے اور گیسوئے تابدار کے نیچے والے خانے میں کیا چیز کوٹ کوٹ کے بھری ہے۔"

گل نے خفگی سے کہا "تم سے زیادہ ہے۔"

"تمہارے پاس بالکل نہیں ہے جناب۔ ایک تنکا بھی ہمارے حصے کا آپ کو مل گیا اور تمہاری عقل ادھر ڈال دی گئی" اس نے سر کو انگلی سے کھجا کے کہا "خیر آپس کی بات ہے' جو بھی ہے گھر میں ہی ہے نا۔"

رابعہ نے کہا "چلو باقی فضول باتیں بعد میں کرنا۔ ان ٹیکسی ڈرائیوروں کو جانے دو۔ میں دلاور کے ساتھ اندر جارہی ہوں۔"

محسن بولا "ان کو میں نے کب روک رکھا ہے۔ یہ غالباً ہمیں سی آف کرکے جائیں گے۔"

گل نے کہا "کرایہ دو انہیں۔ وہ شرافت سے انتظار کررہے ہیں۔"

محسن نے جیب سے پیسے نکالے "پہلے کیوں نہیں بتایا۔ میں سمجھا کچھ لحاظ کریں گے مہمانوں کا۔ آخر ہم اتنی دور سے آئے ہیں ہم سے بھی کرایہ لیں گے۔ یہودی لگتے ہیں صورت سے ہی۔"

ایک ڈرائیور نے کہا "باتوں سے تم بھی سکھ لگتے ہو۔"

محسن بھونچکا رہ گیا۔ رابعہ اور گل کی ہنسی نے اسے مزید شرمندہ کیا۔

"تم... اردو سمجھتے ہو۔ کسی کو مغالطے میں رکھنا اچھی بات نہیں ہے اور انگریز نظر آنا بھی اچھی بات نہیں ہے" محسن نے کہا "باقی تم رکھو۔"

اس نے کہا "باقی بچا ہی کیا ہے انگریز میں اس لیے لگتا ہوں کہ میں یہاں پیدا ہوا تھا اور میرا باپ بھی انگریز تھا۔ تمہارے سکھوں جیسا لگنے کی کیا وجہ ہے؟"

"تمہاری عقل کی خرابی" محسن نے کہا "نظر کا فتور۔"

اس نے جاتے جاتے کہا "کہیں ایسا تو نہیں کہ تم امرتسر میں پیدا ہوئے ہو اور تمہارا باپ..."

اس نے قہقہہ مارا اور فرار ہوگیا۔ محسن سخت مشتعل ہوا۔ "اگر اس وقت دادا جان کی خاندانی بندوق ہوتی تو میں پیچھے سے اس کو گولی ماردیتا۔"

"تمہارا نشانہ خطا ہوجاتا اور واپس آکے وہ تمہیں گولی ماردیتا۔" گل نے کہا "اتنا کیوں بولتے ہو؟"

محسن اب اس سے لڑنے لگا "تم سے زیادہ تو نہیں بولتا اور یہ تم کیسے کہہ رہی ہو کہ میرا نشانہ چوک جاتا۔"

"تمہارے دادا جان کی خاندانی بندوق کی نال ٹیڑھی ہوگی۔ تمہاری طرح۔" گل نے کہا "ایک اور چیز بھی ہے جو سیدھی نہیں ہوسکتی۔"

"تم مجھے کُتے کی دُم کہہ رہی ہو؟"

میں نے کہا "تم تو بالکل غالب اور نازو کے اسٹائل میں لڑنے لگے ہو۔ چلو اندر گیٹ کیپر تماشا دیکھ رہا ہے" میں نے کہا۔

کشادہ اور صاف ستھرے لاؤنج کے ایک حصے میں رابعہ اور دلاور آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ دلاور نے اپنا سر صوفے کی پشت سے لگادیا تھا۔ وہ غالباً بہت تھک گیا تھا۔ رابعہ اسے پُرترحم نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ لاؤنج میں اور لوگ بھی تھے۔ ایک صوفے پر ایک نوجوان جوڑا الگ ہونے پر آمادہ نہ تھا۔

محسن نے کہا "یہ ان کی پہلی ملاقات ہے یا آخری۔"

میں نے کہا "احتیاطاً انہیں الگ کرکے دیکھ لینا چاہیے کہ کہیں اسی حالت میں طائرِ روح قفسِ عنصری سے پرواز تو نہیں کرگیا۔"

محسن نے مجھے دوسری طرف متوجہ کیا "کون کہتا ہے مشرق اور مغرب کبھی آپس میں نہیں مل سکتے" کاجل سے زیادہ سیاہ نوجوان کے ساتھ عشق کے جذبات کی وارفتگی کا اظہار کرنے والی لڑکی خالص ولایتی ٹالکم پاؤڈر جیسی سفید رنگت کی مالک تھی۔ ہال میں بیٹھے ہوئے باقی سب لوگ ایک دوسرے کی صورت سے بیزار لگتے تھے۔ گردوپیش سے بے نیاز' آس پاس موجود ہر شخص سے لاتعلق اور اپنے خیالوں کی دنیا میں یا پھر اخبار میں گم۔ ان میں بیشتر انگریز تھے۔ ان کے مقابلے میں فرنچ زیادہ ہنسنے ہنسانے والے زندہ دل اور باتونی قوم ہے۔

کاؤنٹر کے پیچھے جو طرح دار حسینہ تمام اسبابِ دلبری ودلربائی کے ساتھ موجود تھی وہ اپنے لباس کے فیشن اور آرائشِ جمال میں کسی فیشن ماڈل یا فلم ایکٹریس سے کم نہ تھی۔ فرانسیسی حُسن اور ذوقِ حسن سے مالا مال ہیں اور اس عطیۂ قدرت کی قدر بھی کرتے ہیں۔ فیشن' آرٹ' خوشبو اور پھولوں کے رنگ ان کی زندگی کا حصہ ہیں۔

میری فرنچ پر وہ خوش ہوئی۔ کسی بھی غیرملکی کو اپنی زبان میں بات کرتا دیکھ کے ہر فرانسیسی ایسے ہی خوش ہوتا ہے جیسے ہم انگریز' جاپانی یا روسی سے اردو میں بات کرکے۔ "میں آپ کے لیے کیا کرسکتی ہوں موسیو۔"

میں نے کہا "کاش میں آپ کے لیے کچھ کرسکتا۔ ابھی تو مجھے چارلی سے ملنا ہے۔"

"چارلی۔ صرف چارلی..." وہ بولی "ویسے تم میرے لیے کیا کرسکتے تھے؟"

میں نے کہا "کم سے کم مر تو سکتا تھا۔ چارلی پائلٹ ہے۔"

"اوہ... وہ تو چلا گیا" اس نے کہا "آئی ایم سوری۔"

محسن نے سینے پر صلیب بنائی اور اوپر دیکھا "افسوس کی بات تو ہے۔ ابھی اس کے جانے کے دن نہیں تھے۔"

وہ ہنس پڑی "میرا مطلب تھا کہ اس ہوٹل سے چلا گیا۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے؟" محسن بولا۔

"ایسا ہر روز ہوتا ہے۔ ہوٹل کسی کا گھر نہیں ہوتا جہاں وہ ہمیشہ رہے۔"

میں نے کہا "دراصل اس کو ہمارے ساتھ جانا تھا۔"

"کیوں ایک خوب صورت لڑکی کے سامنے جھوٹ بولتے ہو۔ ہمیں اس کے ساتھ جانا تھا" محسن نے کہا۔

وہ مسکرائی "کہیں تم وہی تو نہیں جنہوں نے اس کا جہاز چارٹر کیا تھا؟"

"میں حلفیہ بیان دے سکتا ہوں کہ ہم وہی ہیں" میں نے کہا۔ محسن بولا "اور میں اس پُرکشش خوشبو کی قسم کھا سکتا ہوں جو تم نے لگائی ہے۔"

تعریف اور خوشامد سے وہ خوش ضرور ہوئی مگر اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی "تمہارے لئے ایک پیغام ہے۔" اس نے پلٹ کے ایک خالی خانے میں سے ہوٹل کے نوٹ پیڈ پر لکھی ہوئی مختصر تحریر برآمد کی۔

اس پر انتہائی بدخط میں لکھا ہوا تھا کہ انتظار کرنے سے بہتر اس نے یہ سمجھا کہ نرس اور ڈاکٹر کا بندوبست کرنے چلا جائے۔ ہم ائرپورٹ پہنچ جائیں اور اس کا انتظار کریں۔ میں نے وہ چِٹ محسن کو دے دی۔

"کوئی بری خبر ہے؟" لڑکی نے میری صورت دیکھ کے کہا۔

"میرے لیے تو ہے" میں نے کہا "ابھی تم سے ملے دیر ہی کتنی ہوئی ہے کہ جدائی کی گھڑی آگئی۔"

وہ ہنسی "تم پھر مل سکتے ہو مجھ سے۔ اگر اتنا ضروری ہے تو آج شام۔"

میں نے کہا "آج رات بحرالکاہل پر سے گزرتے ہوئے میں تم سے خواب میں ضرور مل سکتا ہوں۔"

محسن نے کہا "میں خواب میں بھی تم کو اتنی دور نہیں بُلاؤں گا۔ خود تمہارے خواب میں آجاؤں گا۔"

گل نے ہمارے لوٹتے ہی کہا "کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں' چارلی چلا گیا" محسن بولا۔

"صرف یہ معلوم کرنے میں اتنا وقت لگتا ہے۔ بہت ہنس ہنس کے باتیں ہورہی تھیں۔ کاؤنٹر پر اتنا جھکے ہوئے تھے آگے کی طرف..."

"پیچھے کی طرف جھکنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا" محسن بولا "اور باتیں اس کی... آہ... مجھ سے تقریباً وہی کہہ رہی تھی جو ایک فلمی ہیروئن نے گا کے کہا ہے۔ نہ جاؤ سیاں چھڑا کے بیاں' قسم تمہاری میں رو پڑوں گی۔"

"وہ آپ سے نہیں مجھ سے کہہ رہی تھی" میں نے کہا۔

"خوش فہمی ہے آپ کی۔"

"غلط فہمی ہے تجھے۔ تو شادی شدہ ہے۔ تیرا عاشقانہ کیریئر ختم ہوچکا ہے۔"

"اور تو شادی شدہ نہیں ہے' تم نے سُنا رابعہ؟"

رابعہ ہنسنے لگی "میرا تو خیال ہے کہ تم دونوں آپس میں فیصلہ کرلو۔ ٹاس کرلو۔"

"ٹاس کیسا رابعہ باجی' انہیں شرم آنی چاہیے۔"

محسن نے کہا "تم رفتہ رفتہ روایتی بیوی بنتی جارہی ہو گُل۔ اپنے مولوی خادم حسین کی زوجہ نمبرایک جیسی۔"

"تم خود مولوی خادم حسین جیسے ندیدے ہو۔" گُل نے کہا "اس کی بھی رال ٹپکتی رہتی تھی مسرت نذیر اور نیلو کو دیکھ دیکھ کے۔ نقش اور وظیفے مانگتا تھا۔"

"بھئی تھا کا کیا مطلب' اب بھی خادم حسین وہی ہے۔ شادی کرکے ارمان اور حسرتیں دل میں رہتی ہیں" محسن نے کہا "اور ہمارے دل کے ارمان کیا ہیں اور حسرتیں کیسی ہیں' اس پر ہم سفر کے دوران تفصیل سے روشنی ڈالیں گے۔"

"بس۔ فی الحال تو سامان اٹھاؤ اور چلو" میں نے کہا "چارلی ہم سے پہلے ائرپورٹ چلا گیا۔"

"پھر ہمیں یہاں کیوں بُلایا تھا؟"

"بس بیوی' اس کافر حسینہ کا دیدار تھا نصیب میں" محسن نے پلٹ کے ایک آہ بھری "خیر' آج کا دن اچھا گزرے گا۔"

"گزرے گا تو میرے ہی ساتھ نا" گل نے کہا۔

محسن مُردہ لہجے میں بولا "پھر تو بس.... گزرے گا' جیسے تیسے۔"

دلاور بالکل چُپ چاپ بیٹھا تھا اُس کی نظریں ہم پر تھیں۔ شاید وہ ہماری باتیں بھی سن رہا تھا کیونکہ کبھی کبھی اس کے لبوں پر مسکراہٹ آجاتی تھی مگر اس کے خیالات بھٹک رہے تھے۔ ہر سانس کے ساتھ قریب آتی موت کو اس نے ایک ناگزیر حقیقت سمجھ لیا تھا اور اب شاید وہ کوشش کرتا تھا کہ جتنا وقت باقی ہے وہ اس کے بارے میں نہ سوچے۔ نہ پریشانی اس کے درد کا درماں تھی اور نہ خوف کے دامن میں اس کے لیے پناہ۔ جب مستقبل اچانک بے وجود ہو جائے' اس طرح جیسے رات کے وقت ہر روشنی بُجھا کے بند کمرے میں آنکھیں بند کرلینے کے لیے روشنی کا وجود نہیں رہتا۔ تو پھر اپنا ماضی ہی وہ دریچہ رہ جاتا ہے جس سے گزر جانے والے وقت کے ہر لمحے کو تصور میں زندہ کیا جاسکتا ہے یا پھر آدمی دوسروں کے لیے آنے والے وقت کے بارے میں سوچتا ہے کہ یوں ہی آباد رہے گی دنیا۔ رابعہ اور سکندر ایک پُرسکون اور خوابوں کو تعبیریں دینے والی زندگی کی خوشیوں کے پیچھے بھاگتے رہیں گے۔ رنگین تتلیوں کی طرح اُڑنے والے لمحوں کو پکڑتے رہیں گے اور وقت ان کے لیے ایک ایسا چمن ہوگا جس کی بہاروں کے لیے خزاں نہیں۔ جوانی میں اور کامیابی کی سمت میں سفر کرنے والا تو ایسے ہی سوچتا ہے۔ خود دلاور بھی سوچتا ہوگا' سوچنے سے کچھ نہیں ہوتا۔

مجھے بھی اب دلاور کی جسمانی حالت سے زیادہ اس کی ذہنی اذیت پر رحم آنے لگا تھا۔ قضا کے تیر نے دشمن کو شکار کرلیا ہو تو اس کو دم توڑتے دیکھنے میں طمانیت اور مسرت کا احساس کوئی کیسے پیدا کرسکتا ہے جو فتح کی صورت میں اپنے ہاتھوں سے اس کا کام تمام کرکے ملتا۔ اگر وہ پانی مانگے تو اسے انکار کون کافر کرسکتا ہے۔ یہ کہہ کے کہ کیا وہ تم نہیں تھے جس نے اپنی خون کی پیاس بُجھانے کے لیے مجھے خون کے رشتے سے محروم کردیا تھا۔

دلاور کے لیے اس احساس میں بھی اذیت تھی کہ وہ اپنوں کے نہیں' دشمنوں کے درمیان اور ان کے رحم و کرم پر تھا۔ وہ اس سے شرافت کے ساتھ پیش آرہے تھے۔ ابھی سے اس مقولے پر عمل کررہے تھے کہ مرنے والے کی نیکی بدی اس کے ساتھ گئی۔ دشمن اسے معاف کرکے دریادلی کا ثبوت دے رہا تھا۔ اطمینان حاصل کررہا تھا اور ثواب کمارہا تھا۔ دشمن اس کی بے چارگی پر ترس کھارہا تھا۔ اسے احساس دلارہا تھا کہ کینہ وہ تھا۔ دشمن تو شاید اس کے جنازے کو کاندھا بھی دے گا۔

میں دلاور کے قریب آگیا "کیسی طبیعت ہے تمہاری؟"

وہ تلخی سے مسکرا دیا "طبیعت بہت اچھی ہے اپنے سکندر اعظم صاحب' طبیعت کا حال کیا پوچھتے ہو۔"

"چلو پھر اٹھو' باقی سب لوگ گاڑی میں بیٹھ رہے ہیں۔ کیا تمہیں سہارے کی ضرورت ہے؟"

اس کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے نفرت کی چمک اُتری۔ وہ کہہ سکتا تو ضرور کہتا کہ سہارا میں لوں اور وہ بھی تمہارا۔ خدا وہ وقت نہ لائے' مگر وقت آگیا تھا۔ اس نے صرف اتنا کہا "نہیں' میں چل سکتا ہوں۔"

"تمہیں کسی دوا کی ضرورت تو نہیں....؟"

وہ ایک دم پھٹ پڑا "نہیں ہے مجھے کسی چیز کی ضرورت' موت کے سوا اور وہ تم مجھے نہیں دے سکتے۔ پھر کیوں پریشان ہو تم میرے لیے۔ کیوں اتنا خیال ہے تمہیں میرا۔ اس لیے کہ کہیں میں وقت سے پہلے نہ مرجاؤں۔ فکر مت کرو' مرتا آدمی اپنے وقت پر ہی ہے اور ابھی وقت ہے میرے پاس۔ میں تمہارے لیے نہیں' اپنے' اپنے بیوی بچوں کے لیے.... جیوں گا...." وہ چلّانے سے ہانپنے لگا تھا۔ پھر اس کے جذبات کا ناسور بہنے لگا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کے سسکیاں لے کر رونے لگا۔

لاؤنج میں موجود ہر شخص کی نظر مجھ پر مرتکز ہوگئی تھی۔ اچانک سب ہنسنا' مسکرانا اور باتیں کرنا بھول گئے تھے۔ جہاں ان کے سامنے ایک ان ہی جیسا انسان' جس نے زندگی کی نصف صدی پوری کرلی تھی۔ دکھ میں جلا تھا اور اس کا یہ دکھ اتنا شدید' لاعلاج تھا کہ وہ رو رہا تھا۔ لوگوں کی نظر میں ہمدردی تھی اور ایک خاموش سوال تھا۔ کیا ہم کچھ کرسکتے ہیں' یہ دکھ بانٹنے کے لیے۔ دکھ کے اس احساس اور اذیت کو کم کرنے کے لیے۔

دلاور نے فوراً خود کو سنبھال لیا۔ اس نے جیب سے رومال نکال کے اپنے آنسو صاف کیے "سوری سکندر۔ ایسا تماشا نہیں کرنا چاہیے مجھے یہ لیکن میں بالکل بے اختیار ہوگیا تھا۔"

میں نے سہلایا "تم میری ہمدردی کا غلط مطلب نکال کے شرمندہ ہونا چھوڑ دو۔ وہ وقت گزر گیا جب ہم دشمن تھے۔"

"ہاں۔۔۔ وقت گزر گیا" وہ میرے ساتھ چلنے لگا "اتنا وقت تھا.... مگر سب گزر گیا۔ وقت بڑی بے رحم چیز ہے سکندر' اب پتا چلا۔"

میں نے کہا "تمہیں کچھ دیر سے پتا چلا۔ مجھے اس سے آدھی عمر میں معلوم ہوگیا تھا۔ اس وقت جب لندن سے واپسی پر میں نے وزیر خان کے بجائے اس کی قبر کے کتبے کو دیکھا تھا۔"

اس کا چہرہ تاریک ہوگیا۔ "تم چاہو تو نام کے بجائے میرے کتبے پر لکھوا سکتے ہو' وزیر خان کا قاتل۔ اگر ایسے تمہیں کچھ تسکین حاصل ہو۔"

اس کی بات کا بُرا ماننا یا اسے جواب میں زیادہ تلخ بات کہنے سے کچھ حاصل نہ تھا۔ محسن کی کوشش سے ہوٹل کی ایک بس ہمیں ایئرپورٹ تک لے جانے کے لیے فراہم کردی گئی تھی۔ دلاور اس کی سب سے پیچھے والی لمبی سیٹ پر لیٹ گیا۔ اس نے پون گھنٹے کے طویل سفر میں صرف ایک بار دوا کھانے کے لیے پانی مانگا جو اسے بس ڈرائیور نے اپنی بوتل سے فراہم کیا۔ یہ پانی وہ ریڈی ایٹر میں ڈالتا تھا۔

رابعہ پہلے گُل کے ساتھ بیٹھی تھی۔ پھر محسن نے اس سے کہا

"یہ سیٹ میری ہے۔ بہتر ہے آپ شرافت سے اُٹھ جائیں۔"

رابعہ نے کہا "تمہاری کیسے ہوگئی یہ سیٹ؟"

"اس لیے کہ میری بیوی یہاں بیٹھی ہے' جو اس کا گھر وہ میرا' جو اس کی سیٹ وہ میری۔"

"اُفوہ۔ حد ہوتی ہے بے شرمی کی محسن۔" رابعہ نے کہا اور وہاں سے اُٹھ گئی۔

"بے شرمی کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ حد ہوتی ہے شرم کی۔ جیسے لاقانونیت کی حد نہیں ہوتی' قانون کی حد ہوتی ہے۔" محسن بولا "ویسے بھی تم کو اپنے ذاتی میاں کے ساتھ بیٹھنا چاہیے کم سے کم۔ زور کس پر ہوا' کم سے کم پر۔"

رابعہ نے مصنوعی غصّے سے کہا "تم مار کھاؤ گے۔"

محسن نے شور مچایا "سکندر۔ یار ڈوب مرنے کا مقام ہے تیرے لیے۔ سارے زمانے میں سکندر اعظم بنا پھرتا ہے۔ بیوی سرِ عام اعلان کررہی ہے کہ تم مار کھاؤ گے' ایمان سے میری گھر والی ایسا کہتی نا...."

"تو کیا کرتے جی تم؟" گل نے کہا۔

"میں سر جھکا دیتا" محسن مسکینی سے بولا "کہ مار دیا ہے تم نے پہلے ہی میری چھمک چھلو۔ پھر قتل کردو مجھے چھپّن چھُری' خوچے لالے دی جان۔ شیروانی تم پر قربان' کوٹ پتلون تم پر قربان۔"

"بالکل ہی پاگل ہوگئے ہو تم" گل نے میری اور رابعہ کی بے اختیار ہنسی پر خفت سے کہا اور باہر دیکھنے لگی۔

محسن اس کے ساتھ بیٹھ گیا اور کچھ دیر لڑنے کے بعد انہوں نے آہستہ آہستہ اپنی باتیں شروع کردیں اچانک ان کے ہنسنے کی آواز آجاتی تھی۔ پھر میں نے دیکھا تو وہ سو گئے تھے۔ محسن کا سر سیٹ کی پشت سے لگا ہوا تھا اور گُل کا سر اس کے کندھے پر آگیا تھا۔

میں نے کہا "تم بھی ایسے ہی سو سکتی ہو۔"

اس نے کہا "تم پھر جہاز گرادو گے .بحرالکاہل میں۔ مجھے ڈبو دو گے۔"

میں نے کہا "میں جاگتا رہوں گا۔"

"سکندر۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"کس سے' مجھ سے؟ بھئی اب تو ہمارے جملہ حقوق تمام عمر کے لیے تمہارے نام محفوظ ہوگئے۔"

"یہ دلاور۔ واقعی مرجائے گا۔"

میں نے کہا "اسے جگا کے پوچھ لو' بڑی ذہانت کا سوال ہے۔"

"یہ سب کیسے اچانک' اور کتنی آسانی سے ہوگیا۔ یہی ہے نا وہ شخص جس نے ہمارے لیے جینا مشکل کردیا تھا۔ اس جیسے شکاری کو شکار کرنا کتنا ناممکن لگتا تھا مگر دیکھو' وہ کیسے چُپ چاپ اور بے بس ہوا پڑا ہے۔"

"اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے؟"

رابعہ نے اپنا سر میرے کندھے پر رکھ دیا "پتا نہیں کیوں' مجھے یقین نہیں آتا کہ بالآخر میرے خوابوں کو تعبیر کی منزل ملنے والی ہے۔ آرزو نے ایسے فریب پہلے بھی دیے ہیں اور جب میں نے اُمیدوں کی بنیاد پر خواہشوں کے محل کھڑے کرنے کا سوچا تو مایوسی اور ناکامی کے طوفان نے سب کچھ بھلا دیا۔"

"اب ایسا نہیں ہوگا" میں نے اسے یقین دلایا۔

"ڈر اسی لیے لگتا ہے کہ.... کیا اتنی آسانی سے ہماری سب مشکلات' ساری پریشانیاں' سب آزمائش کے مرحلے' یہ سب واقعی ختم ہوجائیں گے؟ اس میں کوئی دھوکا نہیں ہوگا اس بار۔ تقدیر اور کوئی کھیل نہیں کھیلے گی' میرے ساتھ۔"

"کیسا کھیل' سانپ سیڑھی کا؟"

"ہاں۔ کئی بار میں بہت اوپر تک چلی گئی۔ جہاں سے مجھے ایسا لگتا تھا کہ میرے اور تمہارے گھر کی دہلیز تک بس اگلا قدم اور.... مگر اچانک ناکامی اور نامرادی کے کسی اژدہے نے میری اُمیدوں کو نگل لیا اور میں پھر بہت نیچے' اپنے گھر سے بہت دور کسی ویرانے میں پہنچ گئی۔"

میں نے اس کے بالوں کو سہلایا "چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز۔ پھر ہم اپنے گھر میں ہوں گے۔"

معلوم نہیں وہ کون سا ایئرپورٹ تھا۔ میں نے چارلی کا چھوڑا ہوا رقعہ ڈرائیور کو تھمادیا تھا۔ اس میں ٹھیک اسی جگہ کی نشاندہی کی گئی تھی جہاں ہمیں پہنچنا تھا۔ ڈرائیور نے وہ چھوٹی سی چودہ سیٹوں والی مگر خوب صورت اور آرام دہ بس روکی تو میں نے کھڑکی سے جھانک کے دیکھا۔

محسن نے بھی سر اُٹھا کے گل کو ہلایا "چلو اُٹھو' لاہور آگیا۔"

گل نے آنکھیں کھول کے کہا "مجھے..... نیند آرہی ہے۔"

محسن نے اسے ڈانٹا "ولایت میں چار دن کیا رہی ہو تمہارے دیدوں کا پانی ڈھل گیا ہے۔ یہ ایک قابلِ اعتراض فلمی سین تھا' تمہارا یوں سونا۔"

"مجھے تو بڑا مزہ آرہا تھا..." گل مسکرائی۔

"ہاں۔ تمہارے سر میں جتنی جُوئیں تھیں' سب مجھ پر چڑھ گئیں اور سر میں تیل کون سا اُنڈیلا تھا؟ ڈیزل آئل.... بیڑا غرق کردیا کوٹ کا۔"

گل نے کہا "واپس جاکے میں نازو سے جوڈو کراٹے سیکھوں گی۔"

"جُوئیں مارنے کے لیے؟"

"نہیں' جب تم ایسی باتیں کرو گے نا' تو تمہارا دماغ درست کروں گی" گل نے کہا۔

چارلی کا ہنوز کہیں پتا نہ تھا۔ میرا خیال تھا کہ ہوٹل کی گاڑی دیکھ کے وہ خود ہی ہمیں ریسیو کرنے آجائے گا۔ اتنے بڑے علاقے میں ہم اسے کہاں تلاش کرتے۔ مہذب ڈرائیور نے کوچ کا انجن

بند نہیں کیا تھا کہ اے سی چلتا رہے۔ اسے معلوم تھا کہ وہ ایک کینسر کے مریض کو لایا ہے۔

میں نے ڈرائیور سے کہا "میں دیکھ کے آتا ہوں کہ چارلی کہاں رہ گیا۔ تمہیں یقیناً واپسی کی جلدی ہو گی۔"

میری فرنچ نے اس کے دل میں ہمدردی کے جذبات کو دوچند کردیا "میں انتظار کر سکتا ہوں۔ کسی مریض کو سڑک کے کنارے نہیں چھوڑا جا سکتا۔"

میں اور محسن اُتر کے چند قدم ہی چلے ہوں گے کہ میری نگاہ نے چارلی کو تلاش کر لیا۔ وہ ٹیکسی اسٹینڈ کے داخلی .... راستے پر کھڑا ہوا تھا۔

"یہ تم کہاں سے ٹہلتے ہوئے آرہے ہو؟" اس نے ناراضگی سے کہا "اور پھر اتنی دیر سے...."

میں نے کہا "ہم آدھے گھنٹے سے بس میں بیٹھے تمہارا انتظار کر رہے تھے۔"

"بس... کون سی بس؟" وہ بولا۔

"ہوٹل کی بس" میں نے کہا۔

"میرا خیال تھا کہ تم ٹیکسی سے آؤ گے" وہ ہمارے ساتھ چل پڑا "میں یہ کیسے سوچ سکتا تھا کہ تم کو بس مل جائے گی۔ میں صحیح جگہ کھڑا ہوا تھا۔"

"تم بالکل غلط جگہ کھڑے تھے" محسن نے زبردستی بحث کی "وہ فٹ پاتھ کا کنارہ تھا۔ اگر تمہارا پاؤں سلپ کر جاتا۔ یا تمہیں چکر آجاتا تو تم سڑک پر گرتے اور ادھر سے آتی ہماری ٹیکسی تو نقصان کس کا ہوتا۔ ہماری چارٹرڈ فلائٹ کون لے کر جاتا" تمہارا باپ۔"

وہ ہنسنے لگا "ہاں۔ وہ مجھ سے کہتا 'اوکے سَن! تمہاری فلائٹ میں لے جاتا ہوں' میرے واپس آنے تک مرنا نہیں۔"

چارلی ہم سب کو ایک لاؤنج میں لے گیا۔ اس نے ہم سب کے پاسپورٹ اکٹھے کئے اور ان پر ویزا اسٹامپ لگوانے چلا گیا۔ جیسا کہ اس نے بتایا تھا۔ یہ ایک وی آئی پی فلائٹ بن گئی تھی اور مسافروں کی ذمّے داری چارلی پر عائد ہو چکی تھی۔ اخلاقاً اور قانوناً بھی۔ مزید یہ کہ اب ہم فرانس سے جارہے تھے چنانچہ امیگریشن والوں کے لیے جانچ پڑتال کی رسمی اہمیت بھی نہیں تھی۔ اگر کوئی فرانس میں داخل ہونا چاہے تو اس کی دستاویزات کو قانونی تقاضوں کی روشنی میں دیکھنا لازمی ہوتا ہے۔ پھر سب پاکستانی تھے جو فی الحال سنگاپور جارہے تھے۔ سنگاپور سے ہم جائیں جہنم میں 'انہیں کیا۔

چارلی کا باپ اس کے جانے کے کچھ دیر بعد آیا۔ چارلی کی صورت میں اس کی شباہت تھی مگر والد صاحب کی صحت قابلِ رشک تھی اور زندہ دلی میں وہ چارلی سے زیادہ جوان تھا۔ محسن کے الفاظ میں۔ زیادہ حرامی تھا۔ اس نے سب سے باری باری ہاتھ ملایا اور پھر بغل میں سے شیمپئن کی بوتل نکال کے لہرائی "تم سب خوب صورت مسافر میرے مہمان۔"

میں نے کہا "تھینک یو۔ لیکن ہم شراب نہیں پیتے۔"

"پھر کیا بوتل سے دودھ پیتے ہو۔" اس نے ایک گھونٹ لے کر قہقہہ مارا۔

میں نے کہا "ہمارے مذہب میں یہ حرام ہے۔"

"تو مذہب بدل لو۔ جیسے میں بدلتا تھا۔ جیسا دیس ویسا بھیس۔ انڈیا میں تھا تو میں ہندو بن گیا تھا۔ کیا کہتے ہیں اسے 'پنڈت۔ سر مُنڈوا کے ادھر تھوڑے سے بال چھوڑ دئے تھے۔ ایک لنگوٹی میں پھرتا تھا۔ لنگوٹی بڑا زبردست ڈریس ہے۔ بہت ایزی رہتا ہے آدمی۔" اس نے پھر ایک گھونٹ لیا "سیام گیا تو بدھ بھکشو بن گیا۔ جاپانی لڑکیاں مجھے بہت پسند ہیں۔ خیر یہ بھی اچھی ہیں جن کو تم سنگاپور لے جارہے ہو۔"

محسن نے کہا "یہ بیویاں ہیں ہماری۔"

اس نے ایک اور گھونٹ لیا "کم آن۔ آپس میں کیا جھوٹ۔"

محسن بگڑ گیا "جھوٹ بولنے والے پر لعنت۔"

وہ ہمیں حیرانی سے دیکھتا رہا اور پھر ہنستے ہنستے دُہرا ہو گیا "ہاؤ فنی۔"

میں نے کہا "اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟"

"ایسے بے وقوف میں نے پہلی دفعہ دیکھے ہیں جو سنگاپور جارہے ہیں اپنی بیویوں کے ساتھ۔ ہانگ کانگ 'بنکاک' یہاں بیوی کے ساتھ جاتے ہیں زن مرید' شریف آدمی۔"

"ہم شریف آدمی ہیں مگر زن مرید ہرگز نہیں۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "بُرا ماننے کی ضرورت نہیں۔ شریف آدمی کیوں کہلائے وہ اگر زن مرید نہ ہو۔ میرا بیٹا چارلی' اتنا شریف تو خیر نہیں ہے مگر میرے مقابلے میں.... افسوسناک حد تک ایڈیٹ ہے۔ مجھے شرم آتی ہے بعض اوقات.... جب میں اس کی عمر کا تھا...."

اس سے پہلے کہ وہ اپنی جوانی دیوانی کے سنسنی خیز واقعات کا پہلا باب شروع کرتا' چارلی لوٹ آیا "بوتل مجھے دو ڈیڈ۔ ورنہ میں تمہیں ساتھ نہیں لے جاؤں گا۔"

اس نے بوتل چارلی کو دے دی اور ہم سے فریادی ہوا "تم نے دیکھا۔ یہ میرا اپنا بیٹا.... حرامی.... مجھے بلیک میل کرتا ہے۔ جانتا ہے نا کہ اب مجھے کوئی ساتھ نہیں رکھتا۔ حالانکہ میں دنیا کا نمبرون پائلٹ تھا۔ مجھ سے سپرسانک جیٹ... تک سب اُڑائے ہیں میں نے۔ مچھر جانتے ہو تم؟ ایک انجن والا چھوٹا سا جہاز تھا۔ آج میں بوڑھا اور ناکارہ ہو گیا ہوں سب کے لیے۔"

"تم ناکارہ ہوئے شراب کی وجہ سے ڈیڈ۔"

"بکواس کرتے ہیں سب' جو کہتے ہیں میں ناکارہ ہوں۔ مجھے نیوی گیٹر تک نہیں رکھتے۔ یہ کل کے لونڈے جو پتنگ تک اُڑانا نہیں جانتے تھے۔ اس وقت جب میں...."

"اوکے' اوکے' یہ اجنبی تمہارے کارناموں میں بالکل دلچسپی نہیں رکھتے اور ان کی بیویاں تو فرنچ بھی نہیں جانتیں۔"

وہ پھر ہنس پڑا "چارلی۔ یہ اپنی بیویوں کے ساتھ سنگاپور جارہے ہیں' کیا زمانہ آگیا ہے۔"

"ڈیڈ۔ ان کے ساتھ ایک مریض ہے۔ جو مرنے والا ہے' اسے کینسر ہے' یہ اس کو ساتھ لے جارہے ہیں" چارلی نے چلا کے کہا۔

وہ ایک دم سیریس ہوگیا "اچھا۔ یہ بات ہے۔ آئی ایم سوری۔ مجھے معلوم نہیں تھا اور انہوں نے بھی نہیں بتایا مجھے۔ کہاں ہے وہ مریض۔ میں اس سے ملوں گا۔ اس سے پوچھوں گا کہ کیا ہم ایک ساتھ جہنم میں جاسکتے ہیں' کینسر مجھے بھی ہے۔"

اس انکشاف نے ہم سب کو سن کردیا۔ چارلی نے تصدیق کرنے کے لیے سرہلایا "شراب نے کی ہے ساری خرابی۔ جگر خراب ہوا' لیورا یبسس کا کیس تھا۔ یہ پرہیز اور احتیاط کرتا تو ٹھیک ہوجاتا۔"

"پرہیز اور احتیاط" اس کے باپ نے حقارت سے کہا "اور اس عمر میں۔ بہت دن جی لیا میں نے۔ اس سے کہیں زیادہ جتنی مجھے توقع تھی۔ ایک پائلٹ کی زندگی اور موت کے درمیان کتنا فرق رہتا ہے۔ ایک معمولی سی غلطی یا فنی خرابی کا جس سے جہاز اس وقت بھی کریش کرسکتا ہے جب آپ کی عمر آدھی ہو۔ میری عمر کا نصف یا اس سے بھی کم۔ میں بہت خوش قسمت تھا' کوئی غلطی نہیں کی میں نے۔ کوئی خرابی نہیں ہوئی کسی جہاز میں۔"

"چنانچہ تم نے خودکشی کرلی" چارلی نے تلخی سے کہا۔

"شٹ اپ۔ میں نے لائف کو انجوائے کیا۔ ڈر ڈر کے اور مر مر کے نہیں جیا میں ....۔ خدا کا شکر ہے کہ جسمانی معذوری سے پہلے مجھے کینسر ہوگیا۔ ورنہ سالوں مفلوج پڑے رہتے ہیں لوگ۔ کبڑے ہوجاتے ہیں' اندھے ہوجاتے ہیں' کیا ہے وہ ایلز امیر کی بیماری... جس میں دماغ بوڑھا ہو کے پہلے مرجاتا ہے یا جواب دے جاتا ہے۔ خودکشی میں کر نہیں سکتا تھا۔ کینسر سے اچھی کیا بات ہوسکتی ہے' دو چار مہینے میں چھٹی۔"

میں حیران تھا کہ اس شخص کو کیا سمجھوں۔ دیوانہ یا ہوشیار۔ جینے کے بھی اپنے اپنے انداز ہیں۔ ایک زندگی دلاور نے گزاری۔ ایک چارلی کے باپ نے۔ دونوں کا ایک ہی انجام ہوا لیکن جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے۔ خوف چوہدری دلاور کے رگ و پے میں' ہر بنِ مو میں اور ہر قطرۂ خوں میں شامل ہوگیا تھا اور اسے احساسِ پشیمانی مارے ڈالتا تھا کہ ایک عمر اس نے عبث گنوائی۔ ویسے تو... سکندر جب گیا دنیا سے دونوں ہاتھ خالی تھے مگر وہ اپنے ساتھ احساسِ جرم و گناہ کا بار بھی نہیں لے گیا تھا۔ اسے ملال نہ تھا کہ زندگی رائگاں گئی۔ دلاور نے دولت ضرور کمائی تھی مگر جینے کے بعد جینے کی طمانیت سے وہ محروم رہا۔ یہ خوشی اسے میسر نہ آئی کہ زندگی جس مقصد کے لیے ملی تھی وہ بطریق احسن حاصل ہوا اور اس نے دنیاوی ذمّے داریوں کی حد تک کامیاب ہونے کا ثبوت دیا اور جب وقت آیا تو نہ ملال تھا نہ پچھتاوا کہ وہ کہہ سکتا الحمدللہ' اب دنیا میں میرے کرنے کو کچھ نہ رہا تھا چنانچہ لبیک' اللھم لبیک۔ میں حاضر ہوں اے خدا۔

دوسرا چارلی کا باپ تھا جس کے پاس دلاور کی طرح آخرت کی کمائی کچھ نہ تھی مگر اسے زندگی سے بچھڑنے کا کوئی ملال نہ تھا اور نہ اس زندگی پر پشیمانی تھی جو اس نے دنیا میں گزاری۔ وہ مطمئن اور بے فکر تھا اور خوش تھا کہ اسے خوش قسمتی کے باعث بڑی لمبی عمر ملی جس کا اس نے بھرپور لطف لیا' یہاں تک کہ وہ اپنی موت پر بھی خوش تھا کہ وہ مجبوری اور معذوری کی طویل ذلت آمیز زندگی کے عذاب سے بچ گیا۔ وہ ایسے بات کررہا تھا جیسے لوگ چٹ منگنی اور پٹ بیاہ کا ذکر کرتے ہیں۔ چٹ بیماری' پٹ موت۔ کیا بات ہے!

جہاز تک پہنچنے میں ہمیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ ایک انجانا سا خوف اب بھی میرے دل میں چھپ کے بیٹھا ہوا تھا کہ کہیں پھر وہی 'اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے۔' والا معاملہ نہ ہو۔ کاکروچ یعنی سر رچرڈ گورڈن نے لائن تو کلیئر کرادی تھی مگر کیا کہا جاسکتا ہے کہ وہ بیچ بیچ فون پر دوسری طرف کسی سے مخاطب تھا یا بیوی کی خاطر ہماری مدد کا ڈراما کررہا تھا۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ ہمیں کوئی حد سے زیادہ فرض شناس پولیس آفیسر مل جاتا جو ہمیں شناخت کرلیتا کہ تم تو لندن پولیس کو مطلوب ہو۔ سر رچرڈ گورڈن' یہ کون مسخرا ہے؟ اور وہ ہوگا لارڈ لندن میں' مجھے کیا۔ شرافت سے میرے ساتھ آجاؤ۔

جہاز میں روپوش ہوجانے کے بعد میں نے خود کو بے حد ہلکا پھلکا اور آزاد محسوس کیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا جس نے ہماری باعزت اور بامراد واپسی کے امکانات اور اسباب پیدا کئے ورنہ ہم کیا' ہماری کوشش کیا' بساط کیا اور اوقات کیا۔

سوائے دلاور کے سب کا موڈ اچانک بے حد خوش گوار ہوگیا تھا۔ رابعہ اور گل بے اختیار ہنس رہی تھیں اور خوشی سے ان کے چہرے کھل اُٹھے تھے۔

"ہم واقعی واپس جارہے ہیں اپنے لاہور' اپنے گھر' اپنے پاکستان!" گل نے جہاز میں گھومتے ہوئے کہا "مجھے یقین نہیں آتا محسن۔"

"یقین تو مجھے بھی نہیں آیا ابھی تک۔" رابعہ بولی "جہاز اُڑ جائے پھر دو نفل پڑھوں گی شکرانے کے۔"

میں نے کہا "اور اگر میرے خواب کی تعبیر سچ ہوئی؟"

"کیوں بُری بات منہ سے نکالتے ہو" رابعہ بولی۔

محسن نے کہا "ہاں۔ اسی لیے تو کہتے ہیں کہ شکل خراب ہو بے شک مگر بندہ بات اچھی کرے۔"

لمبے اوور کوٹ اور فلیٹ ہیٹ والا ایک پادری ٹائپ باریش شخص جہاز میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے ایک لڑکی تھی جس کے حسن و شباب کی تعریف میں ایک پیراگراف بھی لکھا جاسکتا ہے۔ ایک صفحہ بھی۔ اس کی زلفوں اور پلکوں' لبِ لعلیں اور عارض کے گلابوں سے ساقِ سیمیں تک اور بدن کے ہر قوس و خم پر غزل کہی جاتی تو ایک ضخیم دیوان مرتب ہوجاتا چنانچہ میں نے اور محسن نے دم بخود رہ جانا کافی سمجھا۔

میں نے رابعہ کے کہنی مارنے پر کہا "آپ کی تعریف..."

رابعہ نے مجھے یاد دلایا "یہ اردو نہیں سمجھے گا۔"

گل نے بھی محسن کو کہنی ماری تھی' اس نے چلا کے کہا "آہ' یہ کیا حرکت ہے؟"

گل نے کہا "ذرا آپے میں رہو۔ کیا سوچے گی وہ۔ ایسے گھور رہے ہو دونوں۔ سراسر بدتہذیبی ہے یہ۔"

"غلط۔ وہ خوش ہوگی" محسن بولا "بس تم جل کے کوئلہ بن گئی ہو۔"

میں نے کہا "غالباً آپ غلط جہاز پر سوار ہوگئے ہیں' موسیو۔"

"تم فرنچ جانتے ہو" اس نے ایک خوش گوار حیرت کے ساتھ مجھ سے مصافحہ کیا "پھر تو کوئی مسئلہ نہیں۔ میں ڈاکٹر پال ہوں۔ چارلی نے مجھ سے کہا تھا کہ مجھے کسی مریض کے ساتھ سنگاپور تک جانا ہے۔ یہاں تو مجھے کوئی بھی بیمار نہیں لگتا۔"

میں نے اس سے سب کا تعارف کرایا۔ آخر میں دلاور کی باری آئی۔

رابعہ نے کہا "اگر یہ نرس ہے تو ڈاکٹر صاحب کی رنگین مزاجی کی داد دینا پڑے گی۔"

"یہ نرس نہیں ہوسکتی" گُل نے کہا "اس لباس میں...."

محسن نے کہا "کیا ہے اس لباس میں۔ بہت خوبصورت لباس ہے۔ جتنا بھی ہے' کفایت شعاری بھی اچھی عادت ہے۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر پال۔ آپ کے ساتھ ایک نرس کو آنا تھا۔"

اس نے کہا "ہاں' یہ ہے نا... جین پال۔"

میں نے اس سے ہاتھ ملایا "اچھا۔ تو آپ کی بیٹی ہی آپ کی معاون بھی ہیں۔"

اس نے ایک قہقہہ اور پھر میرے کندھے پر ہاتھ مارا "ینگ مین۔ یہ بیوی ہے میری۔ میرے تین بچوں کی ماں۔ اس پر فریفتہ ہونے کی کوشش بالکل مت کرنا۔"

جین مسکرائی "ہماری شادی کو گیارہ سال ہوگئے۔ پال میرا چوتھا شوہر ہے...."

میری عقل خبط ہوگئی "میرے حساب سے جتنی آپ کی عمر ہے' اس سے میں یہ سمجھنے پر مجبور ہوں کہ پہلی شادی آپ نے اسکول جانے کی عمر سے پہلے کی ہوگی۔"

جین کا خوش ہونا لازمی تھا مگر اس کے شوہر نے بھی اسے خراجِ تحسین سمجھا "جین میں اور مجھ میں صرف سات سال کا فرق ہے۔ میں ذرا بے پروا ہوں' یہ اپنا خیال رکھتی ہے۔ نرسنگ کی ٹریننگ اس نے میرا ساتھ دینے کے لیے حاصل کی۔"

"تم پر نظر رکھنے کے لیے" وہ بولی۔

وہ ہنسا "جین ٹھیک کہتی ہے۔ میں بہت دل پھینک تھا۔ اب بھی ہوں اور اس لیے جین میرے ساتھ جارہی ہے۔"

"اگر جین نے چار شادیاں کی تھیں تو دل پھینک ہونے کا اعتراف کرنے والے ڈاکٹر پال نے کتنی کی ہوں گی" محسن بولا۔

"کیا پوچھا تمہارے دوست نے؟" ڈاکٹر پال بولا۔

میں نے محسن کا سوال دُہرادیا' وہ خوب ہنسا "یہ احمقانہ سوال ہے۔ دل پھینک لوگ صرف عشق کرتے ہیں' شادی نہیں۔ جین البتہ گھر بسانا چاہتی تھی' بس اسے صحیح آدمی ذرا دیر سے ملا۔"

بالآخر چارلی نے ضابطے کی کارروائی مکمل کی اور جہاز رن وے پر دوڑنے لگا۔ یہ زیادہ بڑا جہاز نہیں تھا۔ اس میں سولہ افراد کے بیٹھنے کی جگہ تھی۔ عقبی حصّے میں کچن اور باتھ روم کے علاوہ ایک بیڈ روم بھی تھا جس میں نیچے تین طرف بینچ ٹائپ مگر انتہائی آرام دہ بیڈ تھے۔ تین فٹ اوپر دیوار کے ساتھ ساتھ چار بیڈ ایسے تھے جیسے ہماری ریلوے میں اوپر کی برتھ۔ ہر بیڈ ڈھائی فٹ چوڑا تھا۔ اس میں بیک وقت سات افراد سوسکتے تھے۔ دلاور نے نیچے والے ایک بیڈ کو ترجیح دی اور جہاز کے ٹیک آف کرتے ہی سوگیا۔

جین لباس بدل کے نمودار ہوئی تو ہم اسے پہچان ہی نہ سکے۔ وہ نرس کی یونیفارم میں تھی۔ اس نے اپنے ڈاکٹر شوہر کو دلاور کی کیس ہسٹری بتانے کے لیے ہم سے درخواست کی کہ ہم اسے تمام میڈیکل رپورٹس' نسخے اور فلمیں دے دیں۔ رابعہ نے دلاور کا سوٹ کیس کھول دیا۔ وہ اور ڈاکٹر پال عقبی حصّے میں بیٹھ کے ان کا مطالعہ کرنے میں مصروف ہوگئے۔

"کیا کمال کی عورت ہے" محسن نے کہا۔

"ہاں۔ جب آئی تھی تو اس کا کمال دیکھ کے تمہاری نگاہیں خیرہ ہوگئی تھیں" گل نے کہا "کمال اس کے جمال کا تھا۔"

"یہ بھی سچ کہا تم نے۔ مگر دیکھو وہی عورت اس وقت صرف ایک نرس ہے۔ کسی کی بیوی تک نہیں' اپنی پیشہ ورانہ ذمّے داری میں پوری تندہی اور نیک نیتی کے ساتھ منہمک۔ ان کی ساری توجہ کا مرکز ہے ان کا مریض۔ یہی ہے ڈسپلن کا کمال۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا "نجی زندگی بالکل الگ ہے۔"

گل نے کہا "اس میں کوئی ڈسپلن نہیں۔ جب چاہا شوہر پکڑلیا جب چاہا چھوڑ دیا۔"

میں نے کہا "تم اسے اپنے ماحول اور اپنی ذہنی تربیت کے حوالے سے پرکھ رہی ہو۔ یہاں عورت اتنی مجبور اور بے بس نہیں ہے۔ یہ اس کی خود اعتمادی ہے۔"

رابعہ نے کہا "چار شوہر کرنا خود اعتمادی کی دلیل ہے"

میں نے کہا "اس شوہر کے ساتھ وہ گیارہ سال سے ہے۔ اس کے تین بچے ہیں۔ وہ شوہر کی معاون نرس بھی ہے۔ اس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟"

"یہی کہ پہلے سوچے سمجھے بغیر شادیاں کرتی رہی۔"

"ہاں۔ فیصلہ غلط ہو جاتا ہے، غلط انتخاب ہو جاتا ہے مگر یہاں ایسی کوئی مجبوری نہیں کہ اب ساری عمر نبھاؤ۔ آخر اب نباہ کر رہی ہے وہ" میں نے کہا۔

محسن نے کہا "اور جو پہلے تین شادیاں ناکام ہوئیں۔ اس کا ذمّے دار صرف اسے ٹھہرانا بھی غلط ہوگا۔ جب تک کہ حقائق کا علم نہ ہو۔ کیا پتا وہ کیا حالات تھے، قصوروار کون تھا؟"

گل نے کہا "اتنے طرف دار بن رہے ہو اس کے، بُلا کے پوچھ لو۔ پتا چل جائے گا۔"

رابعہ نے کہا "چھوڑو ہمیں کیا، وہ بُرا مانے گی۔"

"وہ بالکل بُرا نہیں مانے گی" محسن بولا۔ اس نے جین سے کہا کہ جب وہ فارغ ہو تو ان کے پاس آجائے۔

"میں اتنی مصروف بھی نہیں ہوں ابھی" وہ فوراً آگئی۔ "ابھی تو ڈاکٹر کیس کو اسٹڈی کر رہا ہے۔"

میں نے کہا "ہماری بیویاں بہت افسوس میں مبتلا ہیں کہ تمہیں ایک صحیح آدمی سے شادی کرنے کے لیے تین غلط شوہر بھی بھگتنے پڑے۔"

وہ ہنسی "اس میں افسوس کی کون سی بات ہے" وہ بولی "دنیا میں سب کچھ ہوتا ہے۔ پہلی شادی کو میں شادی شمار ہی نہیں کرتی۔ جب میں اسکول کے آخری سال میں تھی تو ایک لڑکے کے لیے اتنی جذباتی ہو گئی تھی کہ اس سے فوراً شادی پر راضی ہو گئی۔ جیسے یہ لڑکا ہاتھ سے نکل گیا تو دوسرا کہاں ملے گا۔ ساری عمر انتظار کرتے گزر جائے گی۔ قانونی طور پر بھی وہ شادی نہیں تھی۔ میرا مطلب ہے اس کی رجسٹریشن نہیں ہوئی تھی۔ بس ایک دن ہم ایسے ہی چرچ میں گئے اور ہم نے آلٹر کے سامنے جا کے کہا کہ خداوند یسوع مسیح، آج سے ہم میاں بیوی ہیں اور تم کو گواہ بناتے ہیں۔ چھ مہینے بعد ہماری لڑائی ہو گئی۔"

میں اس کی بات کا ساتھ ساتھ ترجمہ کرتا جا رہا تھا۔

"دوسری شادی ضرور چل جاتی لیکن میری بدقسمتی کہ وہ جبری بھرتی کے قانون سے مجبور ہو کے ویت نام گیا اور لوٹ کے نہیں آیا۔ یہ شادی صرف چھ ماہ باقی رہی۔"

"کیا وہ لاپتا ہو گیا تھا.... یا وہیں کسی سے شادی کر لی تھی اس نے؟"

"نہیں، وہ مارا گیا تھا۔ مجھے بعد میں اس کے ایک ساتھی نے بتایا کہ ہم خندق میں بیٹھے موم بتی جلائے تاش کھیل رہے تھے کہ ہمارے درمیان ایک دستی بم آگرا۔ ویت نامی ایسی ہی گوریلا وار کے ماہر تھے۔ کھلی جگہ ہوتی تو ہم منہ کے بل لیٹ جاتے یا کچھ دور بھاگ جاتے۔ وہاں موقع ہی نہیں ملا۔ تین کے وہیں پرخچے اُڑ گئے، چوتھا میں تھا۔ میری صرف ایک ٹانگ گئی۔ میرا بچ جانا معجزہ تھا۔ خدا کے معجزے کسی کی سمجھ میں نہیں آتے۔ اس نے میرے شوہر کو کیوں نہیں بچایا آخر۔ اس کی جان نہ لیتا ٹانگ لے لیتا تو کیا تھا۔ وہ آرٹسٹ تھا۔ جنگ سے نفرت کرتا تھا اسے امن سے محبت تھی۔ اتنی ہی جتنی رنگوں سے، وہ انکار کرتا محاذ پر جانے سے تو اسے جیل جانا پڑتا۔ وہ واپس آجاتا تو ہم ہنسی خوشی رہتے۔ میں نے اس کی موت کے بعد اس کی تصاویر کی ایک نمائش کی تھی۔ وہ بہت کامیاب رہی۔ اس کی سب تصاویر سے مجھے اتنی قیمت مل گئی کہ میں نے ایک اپارٹمنٹ خرید لیا۔ آج کل اسی میں رہتی ہوں میں۔ اس کی چار تصویریں ہیں میرے پاس۔ ایک تصویر میری پورٹریٹ ہے۔ دوسری اس نے خود اپنی بنائی تھی۔"

میں نے کہا "کیا تمہارا شوہر امریکن تھا؟"

"ہاں۔ شادی کے بعد میں بھی لاس اینجلس چلی گئی تھی۔" وہ بولی "جب مجھے اس کے سارے واجبات وغیرہ مل گئے تو میں پیرس لوٹ آئی۔ ایک سال بعد میں نے تیسری شادی کی جو ایک سال چلی۔ پھر اچانک اسے ایک مالدار بیوہ سے بڑا جان لیوا عشق ہو گیا۔ اس پر لالچ غالب آگیا۔ وہ بہت بڑے مینشن میں رہتی تھی، اس کے پاس ایک سے ایک شاندار گاڑی تھی اور وہ حسین بھی تھی لیکن اصل بات یہ ہے کہ میرا وہ شوہر بہت ہینڈسم تھا۔ عورتیں اس پر مرتی تھیں۔ مجھے اس کو بچا کے رکھنا پڑتا تھا۔ مگر اس بیوہ کے معاملے میں اس نے خود ہی ایک غیر جذباتی سا فیصلہ کیا اور مجھے چھوڑ دیا۔ اس کی مرضی، میرے پاس تو آج بھی وہی اپارٹمنٹ ہے، میرے ساتھ اسے بھی کام کرنا پڑتا تھا، تب کہیں گزارا ہوتا تھا۔ اب وہ عیش کر رہا ہے۔ خیر جو بھی ہوا اچھا ہی ہوا کیونکہ اس صدمے سے میرا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا تھا۔ میرا اعتبار ہی اُٹھ گیا تھا مردوں پر سے اور ان کی محبت سے۔ اس زمانے میں میرا علاج پال نے کیا اور میرا دل جیت لیا۔ اس نے مجھ میں پھر جینے کی امنگ پیدا کی اور میرا اعتماد بھی بحال کر دیا۔ اب گیارہ سال بعد ہم حقیقی معنوں میں ایک دوسرے کے رفیق حیات ہیں۔ گھر میں ہی نہیں، باہر بھی ہم ایک دوسرے کی ہر ذمّے داری کو شیئر کرتے ہیں، میں نے نرسنگ سیکھ لی ہے۔ اس نے کھانا پکانا۔"

رابعہ اس کی باتوں سے متاثر ہوئی "بڑی باہمت عورت ہے۔"

گُل نے بھی تسلیم کیا "اچھی نظر تو نہیں آتی تھی مگر اچھی ہے۔"

"یہی تو ساری خرابی ہے کہ ہم ظاہر سے باطن پر فیصلہ صادر کرتے ہیں۔ ابھی جو لباس اس نے پہن رکھا تھا وہ ان کی معاشرت میں معیوب نہیں سمجھا جاتا اور یہ اس کا نجی معاملہ سمجھا جاتا ہے۔ وہ کیا پہنتی ہے کیا کرتی ہے اور کیا نہیں کرتی، دوسرے لوگ اس کے غلط یا صحیح کی بحث میں پڑتے ہی نہیں۔ فرد مکمل طور پر آزاد ہے جب تک اس کی آزادی سے دوسرے کسی فرد کی آزادی یا جذبات متاثر نہیں ہوتے۔ اب یہاں وہ عورتیں بہت ہوں گی جو مکمل لباس پہنتی ہیں مگر وہ جین اور اس جیسی تمام لڑکیوں کے نامکمل لباس کو غیر شریفانہ نہیں سمجھیں گی۔ اپنی اپنی پسند ہے... اور اس کا نام فیشن ہے۔" میں نے کہا۔

گل بولی۔ "پھر بھی تین بچوں کی ماں کو ایسے پھرنا زیب دیتا ہے؟"

"یہی تو فرق ہے سوچ کا۔ چلو یہاں کی بات چھوڑو۔ اپنے پاکستان اور بھارت جیسے ملکوں میں کیا ہوتا ہے۔ ایک الٹرا ماڈرن طبقہ ... سن ہمارے نزدیک معیوب ہے۔ کیونکہ ہم انہیں ... خلاقی اقدار سے پرکھتے ہیں۔ دوسرے ہم ماڈرن قسم ... ہمیں نچلے طبقے والے اچھا نہیں سمجھتے جس کی عورتیں برقع اوڑھے بغیر باہر نہیں آتیں۔"

محسن بولا "یہ الگ بات ہے کہ وہ سبزی والے سے، بس کنڈیکٹر سے یا ردّی خریدنے والے سے چوّنی کی خاطر لڑتی ہیں۔ گلی میں یا بس میں جہاں سب مرد دیکھتے ہیں۔ انہیں مردوں کے ہاتھوں سے چوڑیاں پہننے یا مرد دکانداروں سے سودا سلف خریدتے ہوئے پردے کا خیال تک نہیں آتا۔ تم یہاں آکے رہنے لگو تو ایسی ہی ہو جاؤ گی۔ بلکہ اس سے بھی دو ہاتھ آگے رہو گی جب آزادی ملے گی۔"

"اب میں کس کی غلام ہوں؟" گُل نے کہا۔

"تمہارے پاس اختیار ہی کیا ہے۔ اس عورت کے پاس اختیار ہے۔ ہمارے معاشرے میں تو مردوں نے عورتوں کے وہ حقوق تک غصب کر رکھے ہیں جو ان کو اسلام نے شرعی طور پر دے رکھے ہیں۔"

"تم جیسے مردوں نے؟" رابعہ بولی۔

"ہاں۔ اس معاشرے کا ایک مرد ہونے کی حیثیت سے میں یہ الزام قبول کرتا ہوں اور گل کو اجازت دیتا ہوں تمہیں گواہ بناتے ہوئے کہ وہ چاہے تو جین سے اس کا لباس مستعار لے کر یا خرید کر پہن لے۔"

گل کا چہرہ لال پڑ گیا "خدا نہ کرے.... اسے مبارک ہو یہ بے حیائی۔"

محسن بولا "بے حیائی کیسی، تم وہی گُل رہو گی۔ میرے جذبات بھی وہی رہیں گے تمہارے لیے۔ لباس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ لباس تو پیکنگ میٹیریل ہے۔ عورتیں شریف اور باکردار اس وقت بھی ہوتی تھیں جب چشم فلک ان کی جھلک نہیں دیکھ سکتا تھا اور آج بھی ہیں جب وہ فلک کی بلندی پر تنہا جہاز اُڑاتی پھرتی ہیں۔ کہیں اور نہیں ... اپنے پاکستان میں۔ لباس اور پیشے کا کردار سے کوئی تعلق نہیں۔ ایک ہیئر ڈریسر زیادہ باضمیر اور باکردار ہو سکتی ہے ایک ایم اے، پی ایچ ڈی پروفیسر یا ڈاکٹر کے مقابلے میں۔"

"اب نیند نہیں آرہی ہے تمہیں۔ ٹیکسی میں بیٹھ کے میرا جہاز بحرالکاہل میں ڈبو رہے تھے۔" رابعہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔

"یہ تمہیں سوچنا چاہیے کہ ایسا کیوں ہے۔ یہ تمہاری نالائقی کے سبب ہے" محسن بولا۔

"کیوں.... ہم نے منع کیا ہے سونے سے؟"

"تمہیں احساس نہیں ہے کہ تمہارے شوہران نامدار نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ تم تو ان کا دماغ کھا رہی ہو۔ بھوکے آدمی کو نیند آسکتی ہے۔"

میں نے کہا "اس فلائٹ پر کوئی ائرہوسٹس تو ہے نہیں۔ اب تم ہی ہمت کرو بی بی۔ ویسے اللہ نے تمہیں ہر صلاحیت سے نوازا ہے۔ تم جیسی حسین ائرہوسٹس دنیا کی کسی ائرلائن کو نصیب نہیں ہو سکتی۔"

"آگئے فوراً خوشامد پر...." رابعہ بولی۔

میں نے کہا "محسن کے یاد دلانے پر مجھے شدت سے احساس ہو رہا ہے کہ ہم کتنے بھوکے ہیں۔ ابھی تک کامیابی کی خوشی میں سب بھولے ہوئے تھے۔"

"ہم تو اپنے ساتھ کھانے پینے کے لیے کچھ بھی نہیں لائے تھے" گل نے کہا۔

"ٹرین کے سفر میں آدمی بندوبست کرتا ہے۔ ہم نے تو فرض کر لیا تھا کہ ائرلائن ہی سب کچھ فراہم کرے گی" رابعہ بولی۔

"یہ کمرشل ائرلائن نہیں ہے" محسن بولا "پرائیویٹ جہاز ہے۔"

"کرایہ تو کمرشل ائرلائن سے بھی زیادہ لیا ہے" رابعہ نے کہا "چار چھ مسافروں کے لیے سہولت کوئی نہیں۔ ہم کیا گھر سے کھانا پکا کے لاتے اور چائے تھرماس میں بھر کے۔"

"تم جا کے بات تو کرو جی اس چارلی چیپلن سے" گل نے کہا "سب بھوکے پیاسے بیٹھے ہیں۔ پندرہ ہزار پاؤنڈ میں سے سو پاؤنڈ خرچ کر دیتا ہم پر کیا دیوالیہ نکل جاتا اس کا۔"

میں نے کہا "لیڈیز۔ میں آپ کی ناراضگی کے جذبات سے ائرلائن کے کیپٹن چیئرمین مالک مسٹر چارلی چیپلن کو آگاہ کرتا ہوں، مگر حاصل کچھ نہیں ہوگا۔"

"یہ فاقہ تو سنگاپور تک چلے گا" محسن بولا۔

"کیوں، راستے میں فرینکفرٹ، روم اور استنبول سے لے کر کولمبو تک نہ جانے کتنے ائرپورٹ آئیں گے" رابعہ نے کہا "یہ کون سی نان اسٹاپ فلائٹ ہے۔ کم سے کم دو بار تو اسے فیول لینا پڑے گا۔"

"اوہ یس۔ تین چار گھنٹے بعد روم میں ناشتا، کیا بات ہے تمہاری بھی رابعہ، تم نے فاقہ کشی کے غم سے مرنے والوں کو بچا لیا" میں نے کہا۔

"پھر بھی تم چارلی سے بات کرو" گل نے اصرار کیا۔

میں اور محسن کریو کیبن میں گئے تو باپ بیٹا ایک دوسرے کو فحش لطائف سُنا رہے تھے اور زور زور سے ہنستے ہوئے ایک دوسرے کو بے تکلفی سے حرامی بھی کہہ رہے تھے۔ ان کے نزدیک یہ گالی نہیں ایک اچھے لطیفے پر تعریف کے مترادف تھا۔ ہماری بات سُن کے چارلی نے ایک اور قہقہہ مارا۔

"وہ قاتل نرس کہاں ہے جو چوتھے شوہر پر اپنے حُسن کی چھُری چلا رہی ہے" چارلی بولا۔

"اگر میں زندہ رہتا تو پانچواں ہونے کا اعزاز حاصل کرتا۔"

میں نے کہا "وہ ہوگی مریض کے پاس' ڈاکٹر کے ساتھ۔"

"تم نے کچن دیکھا ہے؟" چارلی بولا۔

"ہاں۔ کچن تو دیکھا ہے' کیا وہاں کچھ ہے؟"

"وہاں سب کچھ ہے۔" چارلی نے بتایا "اور یہ حسینہ صرف نرس ہی نہیں' اس سفر میں پارٹ ٹائم ائرہوسٹس بھی ہے۔ اس کام کا معاوضہ اسے الگ دیا جائے گا۔ تم اس سے کچھ بھی مانگ سکتے ہو۔"

"اس کے خوب صورت دل کے سوا" والد صاحب نے قہقہہ لگایا "یہ غلطی کی تو ڈاکٹر تمہیں سائنائیڈ کا انجکشن لگادے گا۔"

میں نے اور محسن نے باہر آکے دیکھا تو ڈاکٹر اکیلا چوہدری دلاور سے باتیں کر رہا تھا۔ اس کی بیوی نرس کی یونیفارم پر ایپرن باندھ کے کچن میں مصروف تھی۔ دروازہ کھولتے ہی آملیٹ کی اشتہا انگیز خوشبو نے میرے حواس پر حملہ کیا۔

"تم واقعی ناشتا لا رہی ہو؟" محسن نے کہا۔

"ہاں۔ تم دس منٹ انتظار کرو۔ دراصل اس مریض کو پہلے اٹینڈ کرنا ضروری تھا ورنہ اتنی دیر نہ ہوتی" وہ بولی۔

اس کے بعد صورتِ حال یکسر بدل گئی۔ گل اور رابعہ نے جین کے ساتھ مل کے تمام معاملات کو ایسے سنبھال لیا جیسے وہ جہاز میں نہیں اپنے گھر میں ہیں۔ اس سے پہلے کہ ہم رابعہ اور گل کو ان کی حرام خوری سے بیٹھ کر حکم چلانے اور اینڈنے پر شرمندہ کرتے انہیں خود اکیلی جین کو سارے کام خندہ پیشانی سے کرتا دیکھ کے شرم آئی اور یگانگت کی فضا پیدا ہوئی تو پھر بقول علامہ صاحب۔ بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے۔ جین کے خلاف خواتین کے حاسدانہ جذبات یوں بدلے کہ ان کے بس میں نہ تھا ورنہ وہ دوپٹہ بدل بہنیں بن جاتیں۔ جین دوپٹہ اوڑھتی ہی نہیں تھی۔

ناشتا ختم ہوا تو خمارِ گندم نے سب کو مدہوش کردیا۔ ہم بیڈ روم میں جاکے پڑ گئے اور ایسے سوئے کہ شام کی خبر لی۔ جین جیسی فرض شناس نرس کی اور اس کے ڈاکٹر شوہر کی موجودگی نے ہمیں تمام تفکرات سے بے نیاز کردیا تھا۔ ہمیں یہ خبر بھی نہ ہوئی کہ جہاز کہاں کتنی دیر کے لیے رُکا تھا۔ لندن سے سنگاپور تک ایک طویل ۔۔۔ کسی چھوٹے جہاز کے لیے بہت لمبی پرواز تھی۔ پھر ایک فرق ٹائم زون کا بھی تھا۔ چنانچہ یوں لگتا تھا جیسے یہ پرواز کبھی ختم نہیں ہوگی۔

جہاز انتہائی آرام دہ تھا۔ اس کی ائرکنڈیشننگ اچھی تھی اور یہ پوری طرح PRESSURISED بھی تھا۔ ہمارے لیے غسل کا اور سونے کا انتظام بھی بہترین ہی سمجھا جاسکتا ہے کیونکہ عام مسافر بردار طیاروں میں ہم زیادہ سے زیادہ پاؤں لمبے کرکے اور سیٹ پیچھے کرکے نیم دراز ہوسکتے تھے۔ یہاں ہم پاؤں پسار کے سوئے تھے اور ہمیں اندر گھومنے پھرنے کی آزادی اور پرائیویسی حاصل تھی۔ اس کے باوجود فضا میں معلق رہتے ہوئے پرواز کرنا ایک اعصاب شکن تجربہ تھا۔ باہر دیکھنے کو کچھ بھی نہیں تھا سوائے سمندر کے یا آسمان کی سپاٹ ویرانی کے۔ رات کو ہم نے بہت زیادہ سیاہ آسمان پر بہت زیادہ روشن ستاروں کا منظر دیکھا۔ غروب آفتاب کا منظر ہم پہلے ہی ملاحظہ کرچکے تھے۔ سورج نے ڈوبنے میں بڑی پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا۔ طلوع ہوتے وقت اس نے اتنی ہی سستی دکھائی اور جیسے بادل ناخواستہ اوپر اٹھا۔ بمبئی اور کچھ دیر بعد کولمبو میں ہمیں باہر آنے کا موقع ملا تو سب ایسے خوش ہوئے جیسے زنداں سے رہائی ملی ہو۔ ہم باہر نہیں جاسکتے تھے مگر ائرپورٹ کی حدود میں بھی بہت کچھ تھا۔ ہم نے کافی اور اسنیکس ضرور تناول کیے۔ رابعہ اور گل نے ڈیوٹی فری شاپ سے شوقیہ خریداری کی۔ پرفیوم' نقلی جیولری' گفٹ آئیٹم' ڈیکوریشن پیس۔

محسن نے ہر چیز پر اعتراض کیا "یہاں سے خریدنے کا فائدہ۔ یہ تو لاہور میں بھی ملتی ہے' اب اسے اٹھائے پھروگی۔"

گل نے تنگ آکے کہا "نہیں۔ میں جہاز سے نیچے گراؤں گی جو بھی قصبہ یا شہر نظر آیا۔"

"کسی کے سر پر لگی کوئی چیز تو یہ مرڈر بائی ائر ہوگا" محسن بولا "لواحقین بڑے دکھ سے بتائیں گے کہ چاچا بھنڈی لینے گئے تھے۔ اوپر سے ولایتی پرفیوم کی بوتل ماری کسی نے سر پر۔ افسوس تو یہ ہے کہ بوتل بھی ٹوٹ گئی۔"

"نقلی جیولری ملی کسی گوالے کو تو بھینس کے گلے میں ڈال دے گا" میں نے کہا۔

"اس میں کوئی حرج نہیں۔ اللہ میاں کی گائے پہنے یا بھینس" محسن بولا۔

"آخر کیا کریں ہم اگر شاپنگ بھی نہ کریں" رابعہ نے کہا۔

"بھئی وہی کرو جو ہم کر رہے ہیں" میں نے کہا۔

"تم تو نظربازی کر رہے ہو' لفنگوں کی طرح۔"

محسن ہنسا "سب ذوقِ جمال کی بات ہے۔ اللہ نے کسی کو اچھی صورت دی ہو تو اسے دیکھ کے خالق کی تعریف نہ کرنا گناہ ہے۔"

میں نے کہا "یار یہ کون ہے' ہیما مالنی یا زینت امان۔"

"وہ جو ہمیں پُرترغیب اشارے کر رہی ہے" محسن بولا "دراصل اسے معلوم نہیں کہ ہم نکاح شدہ حکم کے غلام ہیں۔ بے بس قیدی ہیں۔"

رابعہ ہنسی "دونوں کو چشمے کی ضرورت ہے۔ وہ تو چارلی ہے۔ واپس چلنے کے لیے ہاتھ ہلا کے بلا رہا ہے۔"

دلاور کی طرف سے اب خطرے کی کوئی بات نہیں رہی تھی۔ اس نے ہتھیار ڈال دئے تھے اور خود کو ہمارے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ وہ نہ فرار ہوسکتا تھا اور نہ ہمیں کوئی نقصان پہنچا سکتا تھا۔ اس کا زیادہ وقت سوتے یا پھر خاموشی سے روتے گزرا تھا۔ ڈاکٹر کی ساری توجہ اس پر تھی اور جین اس کے آرام کا پورا خیال رکھتی تھی۔ کئی بار میں اور محسن اس کے پاس جاکر بیٹھے اور اس سے بات کرنے کی کوشش کی مگر اس پر ڈیپریشن طاری تھا۔ وہ بات کرنے کے موڈ میں ہی نہیں تھا۔ وہ لیٹے لیٹے تھک جاتا تھا تو ٹہلنے کے لیے باہر آجاتا تھا یا کسی سیٹ پر بیٹھ کے کھڑکی سے باہر کا سپاٹ منظر دیکھتا رہتا تھا۔ بالآخر ہم نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

جہاز اب سنگاپور کے بیچ پر ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے پرائیویٹ رن وے پر اتر گیا تو مجھے ایسا لگا جیسے ساری کائنات تھم گئی ہو۔ فضا کا ارتعاش رک گیا۔ میرے پیروں کے نیچے زمین ساکت ہوگئی۔ اس کے باوجود باہر اُتر کے مجھے یوں محسوس ہوتا رہا جیسے میں اب بھی جہاز میں محوِ پرواز ہوں۔ بوئنگ جیسے بڑے جہاز میں یہ احساس نہیں ہوتا مگر چھوٹے جہاز میں انجن کی آواز اور اس کا ارتعاش کانوں کو اور اعصاب کو خاصا متاثر کرتا ہے۔

پہلے چارلی نے ہم سب سے مصافحہ کیا پھر اس کے باپ نے کہا "ہماری ذمے داری ختم ہوئی۔"

پھر یہی بات ڈاکٹر پال نے اور اس کی بیوی جین نے کہی "ہمارا سفر بہت اچھا رہا۔ اپنے مریض کی طرف سے غافل مت ہونا۔ وہ واقعی چند دن کا مہمان ہے۔"

"چند دن۔ تمہارے خیال میں کتنے دن؟" میں نے کہا۔

"زیادہ سے زیادہ ایک مہینہ۔ کوئی کچھ نہیں بتا سکتا پورے یقین کے ساتھ۔ ابھی وہ ٹھیک ٹھاک ہے اچانک COLLAPSE کر جائے اور پھر ہوش میں ہی نہ آئے۔"

"ایسا کوئی طریقہ..... یا علاج نہیں جس سے وہ کم سے کم پندرہ دن ایسے ہی گزارے" میں نے کہا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا "اس معاملے میں میڈیکل سائنس ابھی تک بے بس ہے۔"

"پھر تو ہمیں یہاں ایک دن بھی قیام نہیں کرنا چاہیے" محسن بولا۔

"ہم ابھی دو دن ریسٹ کریں گے۔ ڈاکٹر پال اور جین ہمارے ساتھ ہی واپس جائیں گے" چارلی نے کہا۔

"تم اسی ہوٹل میں رہوگے؟"

"ظاہر ہے جب ان کا ائرفیلڈ استعمال کیا ہے تو کہیں اور قیام کیسے کرسکتے ہیں۔ یہ تو ایسا ہی ہوگا کہ ہم کار پارکنگ ایک ریسٹورنٹ میں کریں اور کھانے کے لیے دوسرے میں چلے جائیں" وہ بولا۔

"تم کسی طرح آج کی فلائٹ پر ہمارے لیے بکنگ کرا سکتے ہو؟ تمہارے تعلقات ہوں گے" میں نے کہا۔

"یہ تعلقات کی بات نہیں۔ ٹریول ایجنٹ کو بلاؤ' وہ خود کرے گا تمہارا کام احسان مند ہوکے۔ اسے کمیشن کس بات کا ملتا ہے اور میری مانو تو آج رات تم بھی رُک جاؤ یہاں۔ اتنا لمبا سفر کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ کل کے لیے تمہیں بکنگ آسانی سے مل جائے گی۔"

ہوٹل کے ایک کمرے میں تین افراد نہیں رہ سکتے تھے۔ ہم دو ڈبل روم کے ساتھ تیسرا سنگل روم لینے پر مجبور تھے۔ محسن اور گل ایک میں ہوتے یا رابعہ اور گل ساتھ رہنا پسند کرتیں' ہر صورت میں تیسرا سنگل روم لینا لازمی تھا۔ ہم نے وضاحت کی کہ چوہدری دلاور کی بیماری کی نوعیت سنگین ہے اور یہ ضروری ہے کہ کوئی اس کے ساتھ رہے مگر انہوں نے معذرت کرلی۔ بالآخر طے یہ ہوا کہ رات کو میں اور محسن باری باری جاگ کے چوہدری دلاور کا خیال رکھیں گے اور جسے سونا ہوگا وہ تیسرے سنگل روم کا استعمال کرے گا۔

سنگاپور خوب صورت اور قابل دید بارونق شہر تھا جہاں دنیا بھر کے سیاح بھرے پڑے تھے مگر ان میں ہم شامل نہیں تھے۔ ہمارا ایک رات کا قیام مجبوری تھا اگر یہ ہمارے بس کی بات ہوتی تو ہم اسی جہاز کو سیدھا لاہور لے جاتے۔ مجھے دلاور کی طرف سے دھڑکا سا لگا ہوا تھا کہ کہیں اسے اچانک کچھ نہ ہوجائے۔ اس کے دماغ میں چھُپ کر بیٹھا ہوا عفریت خاموشی سے اپنے ہلاکت خیز پنجے ہر طرف پھیلا رہا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے رات کے اندھیرے میں دشمن کے کمانڈوز مختلف سمتوں میں پھیل کے اپنی اپنی تخریبی کارروائی میں مصروف ہوں۔ تم ریڈیو اسٹیشن پر قبضہ کرو۔ تم ٹی وی اسٹیشن پر۔ تم ائرپورٹ اور تم پاور ہاؤس پر۔ تم انٹرنیشنل ٹیلی فون ایکسچینج پر' اور اس وقت جب لوگ محوِ خواب ہوں یہ آپریشن مکمل ہوجائے۔ کسی کو سوچنے سمجھنے کی مہلت ہی نہ ملے اور کام تمام۔ اس کینسر کے خلئے بھی دماغ کے مختلف حصوں پر حملہ کرنے کے لیے بڑھ رہے تھے۔ ایک حصہ بصارت کا مرکز تھا۔ آنکھ جو کچھ دیکھتی تھی اس کا مطلب سیاق و سباق سے سمجھانے والا کمپیوٹر' سماعت کا حصہ تھا جہاں ہر آواز کا ریکارڈ تھا۔ کان جو کچھ سنتے تھے یہ کمپیوٹر فوراً اطلاع دیتا تھا کہ یہ تو فلاں کی آواز ہے۔ یہ فون کی گھنٹی ہے۔ یہ ٹیلی فون بیل۔ یہ گرج بادل کی ہے' ٹائر برسٹ ہوا ہے یا کار کا بیک فائر ہے۔ تیسرے حصے میں پورے جسم کی حرکات و سکنات کو کنٹرول کرنے والا نظام تھا۔ چوتھا سب سے اہم سینٹرل ریکارڈ تھا جہاں وہ سب کچھ محفوظ تھا جو عمر کے کسی بھی حصے میں سنا

دیکھا یا پڑھا گیا تھا۔ کیا جانے اندر کینسر کے خلیے اچانک کس حصے کو ناکارہ کردیں۔

ابھی دلاور کا کم سے کم مزید ایک ہفتہ ہوش و حواس میں رہنا ضروری تھا۔ قانونی سزا کا تصور اب بے معنی اور بے مقصد ہوچکا تھا۔ اب تو یہ اس کے اور ہمارے مشترکہ مفاد میں تھا کہ وہ مرنے سے پہلے صلح کے معاہدے پر دستخط کرجائے۔ نہ گنواؤ ناوکِ نیم کش۔ جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو کہ یہ جنگ ختم ہوئی۔ اس میں نہ کوئی ہارا نہ کوئی جیتا اور یہی جنگ کا دستور ہے۔ بالآخر ایک دوسرے کے علاقے پر قابض فوجیں لوٹ کے اپنی اپنی سرحد پر آجاتی ہیں۔ پلس ون مائنس ون بھی صفر۔ منفی دو جمع دو بھی صفر۔ دلاور کو اپنے بیوی بچوں کا تحفظ عزیز تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ ان میں ہم سے مقابلہ کرنے کی وہ صلاحیت ہی نہیں جو اس کی طاقت تھی۔ ایک نوجوان لڑکا اور اس کی ماں کیسے ایم آر ایس کو چیلنج کرسکتے تھے۔ جو دلاور کا ساتھ دینے والے تھے۔ کچھ... دنیا سے اٹھ گئے تھے۔ کچھ ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ ڈی سوزا' نواب خسرو جمشید۔ استاد پیڈرو اور ڈاکٹر شاہ اور ان گنت پیشہ ور مجرم اور ہسٹری شیٹر۔ زر خرید غلام اور پالتو شکاری کتے۔ جن کی مدد سے دلاور نے اپنی بدمعاشی کی سلطنت میں اپنے نام کا سکہ چلا رکھا تھا۔ وہ سلطنت ختم ہوئی۔ اب اسے خدا یاد آیا جب موت کے فرشتے نے اچانک دروازے پر یوں دستک دی جیسے مسلسل فرار ہونے والے مجرم کو آدھی رات کے وقت پولیس چھاپا مار کے گرفتار کرنے آجائے۔ اس وقت جب وہ خود کو محفوظ تصور کرتے ہوئے کسی خفیہ ٹھکانے پر بیوی بچوں کے ساتھ سو رہا ہو۔ وہ اور کیا کرسکتا ہے ہاتھ اُٹھانے کے سوا۔ دیکھو مجھے ماردو۔ یا پکڑلو' میں مجرم ہوں اور تمہیں پورا اختیار ہے۔ یہاں جو کچھ ہے' سب لے لو لیکن میرے بیوی بچوں کو چھوڑدو۔"

اب ہم خود بھی کسی حد تک دلاور کے محتاج تھے۔ اس کے اعترافِ جرم کی تحریر ہمیں قانونی مسائل سے بچاسکتی تھی اور اپنی زندگی میں اسے اختیار تھا کہ وہ ہمیں جو چاہے دے جائے۔ بعد میں اس کے وارثوں سے اپنا حق وصول کرنا ایک طویل قانونی جنگ تھی جس میں بالآخر ہم جیت جاتے مگر دیوانی مقدمات میں اُلجھنا دیوانگی کو دعوت دینا ہے۔ معاملات اس کے بغیر ہی طے ہوجائیں تو وکیلوں کے اور عدالتی اخراجات سے زیادہ قیمتی زندگی کا وقت بچ جاتا ہے۔

رات کو چوہدری دلاور کی حالت کھانے کے بعد خاصی بہتر تھی۔ اس نے اچانک مطالبہ کردیا کہ وہ اپنے بیوی بچوں سے بات کرے گا۔

"کل ہم لاہور پہنچ جائیں گے" میں نے کہا۔

"مجھے کل کا بھروسا نہیں" وہ بولا "میرا ایک ہفتے سے ان کے ساتھ رابطہ نہیں ہوا۔ وہ پریشان ہوں گے۔"

"ایک دن اور پریشان ہونے دو" میں نے کہا۔

"نہیں' مجھے بات کرنی ہے ان سے۔"

"ایسی کون سی ضروری بات ہے آخر؟" محسن بولا۔

"ضروری میرے لیے ہے۔ تم مجھے روک نہیں سکتے۔ میں خود آپریٹر سے کہہ سکتا ہوں۔ وہ کال ملادے گا" وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

میں نے اسے دھکیل کر بیڈ پر گرادیا۔ "ہماری مرضی کے بغیر۔"

"میں سب کچھ کرسکتا ہوں۔" وہ چیخ کے بولا "میں تم سے تعاون کررہا ہوں۔ اس لیے کہ ہمارے درمیان معاہدہ ہوگیا ہے اب تم میرے ساتھ یہ سلوک نہیں کرسکتے۔ اگر میں نے ہنگامہ کردیا تو ابھی پولیس آجائے گی۔ میرے ساتھ تم بھی پکڑے جاؤ گے۔ میں جہاز میں بھی تمہاری ایسی تیسی کرسکتا ہوں۔ ائرپورٹ پر پہنچ کے بھی۔"

میں اسے سکون سے دیکھتا رہا "اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم تمہارے ساتھ وہ سلوک کریں جس کے تم مستحق تھے۔ تم پر اعتبار کرنے کا رسک نہ لیں۔"

محسن نے کہا "اُلو کا پٹھا۔ حرام زادہ۔ ہمیں دھمکی دے رہا ہے کہ ہماری ایسی کی تیسی کردے گا۔ اچھا ہوتا اگر ہم اسے تابوت میں لاتے اور تابوت سیدھا لاہور پہنچ جاتا۔"

"اب ایسا ہی کرنا پڑے گا" میں نے سوچتے ہوئے کہا "تمہاری آواز پھر بلند ہوئی دلاور تو میں تمہیں ناک آؤٹ کردوں گا۔ جیسے پہلے کرتا تھا۔ تم بیمار ہو' مجھے اپنے ساتھ اس زیادتی پر مجبور نہ کرو۔"

دلاور کا وقتی اشتعال پانی کا بلبلہ ثابت ہوا۔ دراصل اس کے وجود میں ٹینشن ایسے بھر گئی تھی جسے پھوڑے میں فاسد مادہ بھر جاتا ہے۔ پھوڑا پھٹ جائے تو زخم باقی رہتا ہے مگر درد کو قرار آجاتا ہے۔ اس کے جذبات کا لاوا اچانک بہہ کے ختم ہوگیا تھا اور اب وہ ٹھنڈا پڑچکا تھا۔

محسن نے کہا "یہ نہیں سمجھے گا سکندر۔ پھر کہیں ایسی حرکت کرے گا۔ اسے میں انجکشن لگادیتا ہوں۔"

"نہیں... نہیں..." دلاور کانپنے لگا "خدا کے لیے معاف کردو۔ میں پاگل ہوگیا تھا۔ مجھے ہوش میں رہنے دو۔ موت سے پہلے ہوش کا وقفہ کم مت کرو' مجھے بہت کچھ سوچنا ہے۔ بہت کچھ کرنا ہے' مجھے انجکشن مت دو' میں ہاتھ جوڑتا ہوں تمہارے سامنے۔ تمہارے پاؤں پکڑ سکتا ہوں۔"

اس نے ہاتھ جوڑ کے محسن سے بات کرتے کرتے اچانک میرے قدموں پر گر کے میرے پاؤں پکڑلیے۔ وہ زارو قطار رو رہا تھا۔ رابعہ اور گل پر اس کا شدید جذباتی ردِعمل ہوا تھا۔ وہ گم صم اور غم زدہ بیٹھی تھیں۔ خود میں سخت مشکل میں پڑگیا تھا۔

میں نے اسے اُٹھایا "دلاور۔ یہ تم کیا کررہے ہو۔ اٹھو' مجھے گنہگار مت کرو۔"

وہ روتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گیا "مجھے..... اُن سے بات کرنی ہے"

رابعہ نے کہا "اچھا کرلینا۔ دیکھو تمہاری کیا حالت ہو رہی ہے"

گُل نے اسے پانی دیا "لو یہ پانی پی لو۔ اپنے آپ کو سنبھالو۔"

اس نے پانی کا ایک گھونٹ پی کے آستین سے آنسو صاف کیے۔ "رابعہ بہن۔ تم سفارش کرو۔ اس قابل تو نہیں میں کہ تم کو بہن کہوں مگر بُرے بھائی بھی تو ہوتے ہیں بہنوں کے۔ مجھ سے غلطی ہوئی' میں پتا نہیں کیا کہہ گیا۔"

رابعہ کا جذباتی ردِعمل فطری تھا "چلو کوئی بات نہیں دلاور۔ تم صبح بات کرلینا..."

"صبح نہیں' ابھی..... صبح تک..... نہ جانے کیا ہوجائے" وہ بولا "نہ جانے کیوں..... مجھے ایسا لگتا ہے کہ..... میں صبح تک زندہ نہیں رہوں گا۔"

میں نے کہا "ایسی کوئی بات نہیں۔"

رابعہ نے میری طرف دیکھا "سکندر۔ کیا حرج ہے اگر یہ ابھی بات کرلے۔"

محسن نے جھنجلا کے کہا "بس تم ہوگئیں جذباتی۔ سکندر کیسے ٹال سکتا ہے۔ تمہاری سفارش کو۔"

اب گل نے کہا "محسن اتنے سنگدل مت بنو۔"

محسن نے اپنے سر پر ہاتھ مارا "لو..... یک نہ شد دو شد۔ اب بتاؤ سکندرِ اعظم صاحب۔"

میں نے کہا "تم دوسرے کمرے سے ٹیلی فون ریسیور نکال لاؤ۔"

"تار کاٹ کے" محسن بولا "ہوٹل کے ایکس چینج کو پتا نہ چل جائے۔"

"انہیں کیسے معلوم ہوسکتا ہے۔ ہماری کوئی کال تو آ نہیں سکتی کہیں سے بھی اس فون کو یہاں لا کے جوڑ دو۔ اس ایکس ٹینشن پر ہم دونوں طرف کی گفتگو مانیٹر کریں گے۔ ہر بات سُنیں گے' تمہیں منظور ہے دلاور؟"

"نامنظور کہہ سکتا ہوں میں؟" وہ بولا۔

جب محسن دوسرا ٹیلی فون سیٹ جوڑ رہا تھا تو میں نے دلاور سے اس کے گھر کا نمبر لیا "اب یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ نہ رابعہ تمہاری بہن ہے اور نہ اس جذباتی حربے سے تم کو سفارش کا فائدہ حاصل ہوا ہے۔ ہم نے محض انسانی ہمدردی کی بنا پر تمہاری معافی قبول کرتے ہوئے اور تمہارے وعدے پر اعتبار کرتے ہوئے یہ اجازت دی ہے۔ تم ان سے ایسی کوئی بھی بات نہیں کہو گے جس سے ہماری پوزیشن خراب ہونے کا ڈر ہو۔ تم یہ نہیں بتاؤ گے کہ تم کہاں سے بول رہے ہو' نہ شہر کا نام نہ ہوٹل کا۔"

"یہ تو پاکستان میں ٹیلی فون آپریٹر ان کو بتادے گا کہ آپ کی کال ہے سنگاپور سے۔"

"خیر تم بتادینا کہ میں لندن سے ایک دن کے لیے آیا تھا اور ابھی کچھ دیر بعد واپسی کی فلائٹ ہے" میں نے کہا "اگر انہیں کسی طرح بھی شک ہوا تو وہ کال ٹریس کرلیں گے۔ یہ معلوم کرلیں گے کہ تم نے اس ہوٹل سے کال کیا تھا۔"

"میں شک پیدا نہیں ہونے دوں گا۔ انہیں تو ابھی تک..... میری بیماری کی نوعیت کا بھی صحیح علم نہیں..... میں نے یہ کہا تھا کہ ٹیسٹ ہو رہے ہیں۔"

"تم ان سے کہو گے کہ سب ٹھیک ہے۔ وہ فکر نہ کریں۔ ورنہ وہ کتنے پریشان ہوں گے۔ یہ تم اچھی طرح جانتے ہو" میں نے کہا "تم اپنے جذبات پر قابو رکھو گے۔"

میں نے آپریٹر کو نمبر دیا اور ہم سب کال ملنے کی گھنٹی کے انتظار میں بیٹھے رہے۔ ایک بوجھل خاموشی فضا پر محیط رہی۔ اعصابی کشیدگی کے آثار گل اور رابعہ کی صورت سے عیاں تھے۔ دلاور صوفے کے بازو کو مضبوطی سے پکڑے خلا میں گھورتا رہا۔

جب گھنٹی بجی تو ریسیور پہلے میں نے اُٹھایا اور پھر دلاور کو اشارہ کیا کہ دوسرا ریسیور اُٹھالے۔ چند سیکنڈ بعد آپریٹر نے کہا "پلیز ہولڈ کریں۔" اس کے ساتھ ہی کہیں فون کی گھنٹی بجنے لگی پھر کسی نے کہا "ہیلو۔"

دلاور نے کہا "بیٹا میں بول رہا ہوں۔"

اس کے بیٹے نے چلّا کے کہا "پاپا' کہاں ہیں آپ..... امی.....! پاپا کا فون ہے۔ جلدی آئیں' پاپا! کیا حال ہے آپ کا؟"

"میں ٹھیک ہوں بیٹا۔"

"ایک ہفتے سے آپ نے کال نہیں کیا۔ ہم اتنے پریشان تھے۔ آپ کا کوئی فون نمبر بھی نہیں تھا۔" اس کا بیٹا اب باپ پر غصہ ہو رہا تھا۔

"آئی ایم سوری بیٹا! کچھ مجبوری تھی..... میں اسپتال میں تھا۔"

"تو کیا اسپتال میں فون نہیں تھا؟ یا فون کرنے پر پابندی تھی۔ کیا ہوگیا تھا آپ کو آخر..... اسپتال میں کیوں داخل تھے آپ؟"

"آہستہ بیٹا آہستہ' ایک ساتھ اتنے سوال؟"

"یہ بہت غلط بات ہے پاپا! آپ فون کردیتے تو ہم آجاتے۔"

"اب میں آرہا ہوں۔ کل یا پرسوں تک..... پھر سب بتادوں گا۔ تمہاری ماں کہاں ہے' فون اسے دو۔"

"وہ سب سُن رہی ہیں۔ اسپیکر پر' لیں بات کریں۔"

اس کی بیوی نے روتے ہوئے کہا "کیا بات ہے جی' کس بات کی سزا دے رہے ہو ہمیں؟"

"سزا کیسی؟... اور تم رو کیوں رہی ہو آخر.....؟"

"آپ کچھ چھپا رہے ہیں مجھ سے۔ آپ نے کبھی مجھے دل کی بات نہیں بتائی۔ باہر کے معاملات میں بھی آپ کے لیے کیا نہیں

کیا میں نے مگر آپ نے....“

دلاور نے کہا ”چھوڑو یہ سب باتیں۔ اب گلے شکوے کرنے کا وقت نہیں رہا۔ میں مانتا ہوں کہ میں اتنا اچھا شوہر ثابت نہیں ہوا.... جتنی اچھی بیوی تم تھیں“ دلاور جذباتی ہونے لگا تھا۔

”ایک ہفتے سے زیادہ ہو گیا‘ آپ نے گھر کی خبر نہیں لی.... میں کیا بتاؤں کہ پریشانی سے میرا کیا حال رہا۔ رات کو نیند نہیں آتی تھی.... آتی تھی تو برے برے خواب آتے تھے۔ آپ ٹھیک تو ہیں نا؟“

”ہاں بھئی‘ مجھے کیا ہوا ہے؟“

”نہیں۔ میرا دل کہتا ہے کوئی بات ہے۔ میرا دل غلط نہیں کہتا۔“

”پاگل ہے تو بھی اور تیرا دل بھی۔ کل پرسوں تک میں آجاؤں گا تو خود ہی دیکھ لینا۔“

”اچھا اس وقت آپ کہاں ہیں‘ اپنا فون نمبر تو بتادیں۔ میں صبح پھر کال کروں گی۔“

دلاور نے کہا ”ایک دن کے لیے سنگاپور آیا تھا میں۔ ایک گھنٹے بعد واپس لندن جا رہا ہوں۔ وہاں پہنچنے کے بعد فون کروں گا.... ٹھیک۔“

”وہیں ٹھہریں گے نا آپ۔ ویسٹ اینڈ ہوٹل میں‘ جہاں ہمیشہ ٹھہرتے ہیں۔ فلائٹ کب پہنچے گی؟“

”میں نے کہا نا کہ میں پہنچتے ہی فون کروں گا اور دو دن بعد تو میں ویسے بھی آرہا ہوں۔“

”دیکھیں جی‘ آپ نے ہمیشہ اپنی کی‘ میری کبھی نہیں مانی۔“

دلاور ہنسنے لگا ”یہ تو سب بیویاں کہتی ہیں۔“

میں نے اور محسن نے تائید میں سرہلا کے گُل اور رابعہ کی طرف دیکھا۔

”خدا کے لیے اب سارے چکر چھوڑ دیں۔ اس کمینے سکندر کی خاطر آپ نے اپنی اور ہماری زندگی عذاب میں ڈالی۔ کیا مانگتا ہے وہ آخر۔ جو ہمارے پاس ہے سب لے لے بس ہماری جان چھوڑ دے۔“

اس نے کہا ”ہو جائے گا‘ یہ بھی ہو جائے گا۔“

”آپ دیکھتے نہیں‘ بیٹا آپ کے نقش قدم پر چل رہا ہے۔ ایک ہی بیٹا ہے ہمارا تو۔ کس راستے پر ڈال دیا ہے آپ نے اسے.... دو بیٹیاں بیٹھی ہیں گھر میں۔ انہیں کیا گھر میں بٹھائے رکھو گے۔ باپ بیٹے کی ایسی شہرت ہوگی اور یہ نیک نامی ہوگی تو کون آئے گا اس گھر میں ان کے رشتے مانگنے۔ کوئی شریف آدمی تو آئے گا نہیں۔ کیا وہ بھی ایسے ہی کسی گھر میں جائیں گی۔ میری طرح زندگی گزاریں گی.... رو رو کے.... مر مر کے....“

”رو مت بے وقوف۔ مجھے بھی معلوم ہے سب۔ میرا اور سکندر کا معاملہ طے ہو گیا ہے۔“

”صحیح کہہ رہے ہو؟“

”ہاں۔ میرے لاہور آنے کے بعد انشاءاللہ سارے مسئلے ختم ہو جائیں گے.... جو میرے دم سے تھے۔ تم سے بات کرکے تسلی ہو گئی‘ لڑکیاں کہاں ہیں....؟“

”پڑھ رہی ہیں اپنے کمرے میں.... بلاؤں؟“

”ابھی رہنے دے.... اچھا بلا لے۔“

یہ بڑا عبرت آموز انقلاب تھا۔ دلاور وہ پہلے والا دلاور نہیں رہا تھا۔ اس کی ساری رعونت ایسے ختم ہو گئی تھی جیسے چولہے میں بھڑکتی آگ اچانک پانی ڈالنے سے ٹھنڈی پڑ جائے۔ وہ جو اپنے آپ کو ناقابل تسخیر سمجھتا تھا‘ موت کی دستک سنتے ہی گھٹنوں کے بل گر گیا تھا۔ اس کی ساری بدمعاشی اور اکڑفوں غائب ہو گئی تھی۔ وہ ایک عام آدمی رہ گیا تھا۔ جو شوہر ہوتا ہے اور باپ ہوتا ہے۔ جسے فکر ہوتی ہے کہ بیٹا غلط راہ پر چل رہا ہے۔ اس کا انجام کیا ہوگا۔ جسے جوان بیٹیوں کو دیکھ دیکھ کے ان کا گھر آباد ہونے کا خیال آتا ہے۔

میں نے ریسیور رکھ دیا۔ اب دلاور نے ذہنی طور پر اپنی شکست کو پوری طرح تسلیم کر لیا تھا۔ انگریزی میں کہتے ہیں۔

DEATH IS THE LEVELLER

موت سب کو برابر کر دیتی ہے۔ تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے۔ زیر زمین سب ایک ہیں۔ امیر غریب‘ بدمعاش اور نیکوکار۔ گورا‘ کالا۔ سب رزق خاک ہیں۔ اربوں سال سے انسان‘ حیوان اور نباتات اسی مٹی سے پیدا ہو کے اسی میں مل رہے ہیں مگر مٹی وہی ہے۔ اتنی ہی ہے۔ ہوا بھی اور پانی بھی اتنے ہی ہیں۔ کھربوں انسانوں‘ جانوروں‘ حشرات الارض۔ درختوں اور پودوں کے استعمال کے باوجود۔ سمندروں سے اٹھنے والے بخارات بادل بن کے برس رہے ہیں۔ پہاڑوں پر برف پگھل رہی ہے اور پھر جم رہی ہے۔ دریا بہہ رہے ہیں۔ زمین پانی پی رہی ہے‘ پانی سیکڑوں فٹ گہرے کنویں کی تہ تک اتر جاتا ہے۔ ندی نالوں میں بہتا ہے۔ شبنم بن جاتا ہے تو برگ گل پر جگمگاتا ہے اور آنکھ سے بہتا ہے تو خون جگر لگتا ہے مگر پانی وہی ہے اور اتنا ہی ہے جتنا روز ازل تھا۔ سائنس کہتی ہے مادے کو فنا نہیں۔ مادہ پیدا بھی نہیں کیا جا سکتا۔ بس جو ہے سو ہے۔ مگر یہ آیا کہاں سے اور کیسے؟

بالآخر دلاور نے بھی فون رکھ دیا۔ میں اپنے خیالات میں محو تھا۔ میں نے نہیں سنا کہ اس نے اپنی بیٹیوں سے کیا بات کی۔ محسن نے بھی صرف دلاور کی باتیں سنی ہوں گی۔ میاں بیوی یا باپ بیٹی اور بھائی بہن کی گفتگو بہت پرائیویٹ ہوتی ہے۔ اسے چوری چھپے سننا ایک غیر اخلاقی فعل ہے۔ ہمارے بس میں ہوتا تو شاید ہم کمرے سے بھی نکل جاتے مگر اس مرحلے پر جب سارے کام ہماری مرضی کے مطابق ہو رہے تھے اور صورت حال پوری طرح ہمارے کنٹرول میں تھی‘ میں کسی کوتاہی کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔

دلاور بہت پرسکون تھا اور اپنا سر صوفے کی پشت سے لگائے آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔ اسے شاید احساس بھی نہیں تھا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل کے اس کے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔ اس کی شیو مسلسل بڑھنے سے داڑھی نظر آنے لگی تھی اور یہ داڑھی تقریباً سفید تھی۔ سر کے بالوں میں وہ ہیئر کلر لگاتا ہوگا۔ اب ایک سبب بیماری کا تھا۔ وہ اپنی عمر سے بہت زیادہ بوڑھا سے لگتا۔ مذاق کی بات سچ ہے کہ دل جوان ہو تو بڑھاپا کیسا۔ آدمی کا حوصلہ اور عزم جواں ہو تو جسم بھی جواں رہتا ہے۔

میں نے کہا ”بہتر ہے کہ اب تم سو جاؤ دلاور۔“

وہ چونکا ”آں.... ہاں.... تھینک یو سکندر۔ میرے دل کو اس وقت اتنا سکون ملا ہے.... کہ لگتا ہے میں ٹھیک ہو رہا ہوں“ وہ ہنسا ”اس وقت میں نے تم سے بہانہ نہیں کیا تھا۔ جھوٹ نہیں بولا تھا.... مجھے واقعی وہم ہو گیا تھا کہ یہ.... میری زندگی کی آخری رات ہے.... دماغ خراب ہو گیا ہے میرا۔ ساری خرابی ہی دماغ کی تھی.... پہلے بھی.... اور اب تو ثابت ہو گیا ہے۔“

اس نے خود ہی دوا لی اور سو گیا۔ اب وہ اکیلا سنگل روم میں تھا۔ رابعہ اور گل کو بھی ہم نے زبردستی سونے کے لیے بھیج دیا ورنہ وہ رونے کے اور باتیں کرنے کے موڈ میں تھیں۔

میں نے کہا ”محسن۔ کیا دلاور کے کمرے کو باہر سے لاک کر دیں؟“

اس نے سوچ کے ”کر دے یار‘ اب کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ تو سو رہا ہے۔ ہم بھی سکون سے سو سکیں گے۔“

مگر اپنے کمرے میں آکے ہم باتیں کرنے لگے کیونکہ سکون سے سونا فوری طور پر ممکن نہیں تھا۔ یہ گزرے ہوئے وقت کی باتیں تھیں اور اسی وقت کی باتیں تھیں جو آنے والا تھا۔ جو آئے گا اور ایسے گزر جائے گا کہ کل کی بات مہینوں پرانی ہو جائے گی۔ پھر سالوں پرانی۔ ہم نے ان سب کو یاد کیا جو آج ہمارے ساتھ نہیں تھے۔ دوسری دنیا میں دلاور کے منتظر تھے۔ یہ ناموں کی ایک طویل فہرست تھی۔ آشنا مہرباں چہروں کے نقوش سے سجی ہوئی پوری گیلری تھی۔ اس میں وزیر خان کے علاوہ بھی بہت سی تصویریں اب تصور کا حصہ تھیں۔ محسن کے والد شیروانی صاحب‘ اس کی ماں‘ ایس ایس پی انکل رضوی۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا اور فوزیہ.... ہم ہی میں تھی نہ کوئی بات‘ یاد نہ تم کو آسکے۔ تم نے ہمیں بھلا دیا ہم نہ تمہیں بھلا سکے۔ اس کو مجھ سے گلہ تھا‘ یاروں کا یار استاد نیڈی‘ جمال ہم نشیں در من اثر کرد۔ میں تو بدمعاش تھا‘ تم نے عزت اور محبت دی تو دیکھ لو کیا ہو گیا اور شہلا تھی.... وہ عشق جو ہم سے روٹھ گیا اب اس کا حال سنائیں کیا۔

رات کے دو بجے ہم نے کافی طلب کی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو ہم سنگاپور کی روشنیوں میں جواں رات کا نظارہ کرتے اور جیسے پیرس میں رابعہ اور گل کو بتائے بغیر غائب ہو گئے تھے ایسے ہی صبح تک رونق میلہ دیکھتے مگر دل میں جوش اور امنگ کی جگہ ڈر اور اضطراب تھا۔ دکھ تھا اس لاحاصل جدوجہد کا جس میں ہم نے بھی بہت کچھ گنوایا تھا۔ اضطراب تھا آنے والے وقت کی بے یقینی کا۔

ہم صبح سوئے ہی تھے کہ جگا دیئے گئے۔ دستک سن کے میں نے گھڑی دیکھی تو آٹھ بجے تھے۔ میں نے دروازہ کھولا تو رابعہ اور گل اندر آگئیں۔

”صبح صبح کسی شریف آدمی کی نیند خراب کرنا سخت بدتمیزی ہے“ میں نے منہ پھاڑ کے کہا۔

رابعہ نے کہا ”اس میں دو باتیں غلط ہیں۔ صبح صبح اور شریف آدمی۔“

”چنانچہ ہم نے بالکل ٹھیک کیا“ گل نے محسن کا کمبل کھینچ لیا۔

محسن نے آنکھیں کھولیں اور جمائی لے کر بولا ”تم.... تمہیں ہی دیکھ رہا تھا میں خواب میں۔“

”جھوٹ.... اٹھتے ہی جھوٹ.... آنکھ کھولتے ہی جھوٹ“ گل نے تکیہ اس کے سر پر مارتے ہوئے کہا ”اٹھو‘ نہیں تو فریج سے نکال کے پانی کی بوتل سر پر انڈیلتی ہوں۔“

”توبہ توبہ۔ کیسی بھیانک بلائیں چمٹ گئی ہیں ہم مسکینوں کی جان کو“ محسن نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”میں بھیانک بلا ہوں....“

”ہاں تم بھی اور یہ.... تمہاری رابعہ باجی بھی۔ سکندر سامنے نہیں کہہ سکتا تو کیا ہوا۔ اللہ کا قہر ہو دونوں....“

میں نے کہا ”ایک شعر بھی سن لو۔ قہر ہو یا بلا ہو جو بھی ہو۔ کاش کہ تم مرے لیے ہوتے۔“

رابعہ نے کہا ”اب بھی کاش کی بات ہے؟“

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا ”نہیں۔ اب تو نصیب کی بات ہے۔“

میں نے چابی لگا کے تالا کھولا تو دلاور بیڈ پر نہیں تھا۔ وہ صوفے پر لیٹا ہوا تھا۔ اس نے مجھے شکایتی نظروں سے دیکھا مگر شکایت نہیں کی کہ ہم نے اسے مقفل کیوں کر دیا تھا۔ اس نے ہمارے سلوک کو نوشتہ تقدیر کی طرح قبول کر لیا تھا۔

میں نے کہا ”تم خواہ مخواہ ڈر رہے تھے۔ دیکھ لو تم اتنے ہی زندہ ہو جتنا میں۔“

وہ تلخی سے مسکرا دیا ”واقعی؟ کیا میں اتنا ہی زندہ ہوں۔“

اس کی بات کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ میں اسے ناشتے کے لیے اپنے ساتھ لے گیا۔ ہوٹل کے اندر ہی ایک درجن سے زائد ٹریول ایجنٹ موجود تھے۔ ان میں سے ایک مسلمان تھا اور اس نے مذہب کی بنیاد پر میرے جذبات سے کھیلنے اور فائدہ اٹھانے کی کوشش کی لیکن میں اس کی باتوں میں آنے والا نہیں تھا۔ میں نے ایک غیر مسلم سے ”تھائی ائر“ کی بکنگ لے لی۔ یہ دین

کا نہیں دنیا کا معاملہ تھا اور کاروباری معاملات میں نیک نامی کی بنیاد ایمانداری پر رہتی ہے۔ یہ دیکھ کر افسوس ہوتا تھا کہ اس حقیقت کو معاشی مسابقت کے اس دور میں بھی مسلمان پوری طرح تسلیم نہیں کر رہے تھے۔

کسی دشواری کے بغیر ہمیں ہوٹل کی پک اینڈ ڈراپ سروس نے مقررہ وقت سے پہلے ائرپورٹ پہنچادیا۔ ٹریول ایجنسی کی نمائندگی ایک خوش اخلاق اور خوب صورت لڑکی کر رہی تھی۔ اس نے بورڈنگ کارڈز حاصل کرنے تک ہر مرحلے پر ہمارے لیے آسانی پیدا کی اور پھر خدا حافظ کہہ کے رخصت ہوگئی۔ یہ ہمارا تھائی ائر سے سفر کا پہلا تجربہ تھا جو انتہائی خوش گوار بھی رہا اور افسوس ناک بھی۔ افسوس ناک اس لیے کہ ہم اس سفر کا موازنہ اپنی قومی ائرلائن کے جہاز' عملے اور ان کی سروس کے معیار سے کرتے رہے۔ ہر شخص کی ایک قومی انا ہوتی ہے۔ وہ اپنی قوم اور اپنے ملک کو کسی طرح بھی کمتر سمجھنا نہیں چاہتا۔ ایک پاکستانی کی حیثیت سے میری خواہش ہوتی تھی کہ جہاں کہیں یہ نام آئے مجھے ندامت کے بجائے فخر محسوس ہو۔ ایسے ہی جہاز ہمارے پاس بھی تھے۔ ہمارے وسائل کم نہ تھے اور دعوؤں کی حد تک معیار بھی بلند تھے مگر حقیقت اس کے برعکس یہ تھی کہ ہم نیت کے خلوص سے محروم تھے۔ نتیجہ یہ کہ خود اہلِ وطن قومی ائرلائن سے شاکی تھے جہاں کوئی نیک نیتی سے کوشش ہی نہیں کرتا تھا کہ پی آئی اے کا نام دنیا میں پاکستان کا نام روشن کرے۔ ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا اور کیا نہیں ہوسکتا۔

کراچی تک کے سفر میں عملے نے دلاور کا خاص خیال رکھا۔ انہوں نے ہم سے پوچھا کہ کیا آپ میں سے کوئی ڈاکٹر بھی ہے اور ہمارے انکار پر ایک اعلان نشر کیا گیا کہ مسافروں میں کوئی ڈاکٹر ہو تو بتائیے۔ ممکن ہے اس کی خدمات کی ضرورت پڑے' اعلان کا مثبت نتیجہ برآمد ہوا۔ برموداشارٹ جو نیکر اور پتلون کے درمیان کی چیز ہوتی ہے اور افریقی شوخ پرنٹس والی بشرٹ میں بھوری داڑھی والے ایک شخص نے تسلیم کیا کہ وہ ڈاکٹر ہے حالانکہ حُلیہ دیکھ کے اسے ڈاکٹر تسلیم کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ وہ صورت سے بھی ہونق لگتا تھا اور اس کے ساتھ جو خاتون تھیں انہیں دیکھ کے مجھے ڈاکٹر پال اور جین کی جوڑی یاد آئی۔ دراصل وہ دونوں ہی ڈاکٹر تھے اور گھومنے پھرنے نکلے تھے چنانچہ اپنے اپنے من پسند حلیے میں تھے۔ سیر سپاٹے میں کپڑوں کا کیا ہے۔ جو جی چاہا پہن لیا۔ جو ملا کھالیا' یہی سیاحت کی اسپرٹ ہے۔ نہ ہم کسی کو دیکھ رہے ہیں اور کوئی ہمیں دیکھتا ہے تو ہم اسے بھی نہیں دیکھ رہے ہیں۔ ہم دنیا دیکھ رہے ہیں۔ وہ کام کرتے ہیں تو کام کے سوا سب بھول جاتے ہیں مگر آرام اور تفریح کی ضرورت اور اہمیت کو نظرانداز نہیں کرتے چنانچہ ہفتے میں دو دن اور دو چار سال میں ایک دو مہینے کے لیے گھر سے نکلنا اور معمولات سے بھاگ کے بے فکری سے گھومنا انہیں ذہنی و جسمانی طور پر صحت مند رکھتا ہے۔

ہم سے یہ بھی معلوم کیا گیا تھا کہ دلاور کے لیے کوئی خاص خوراک تو درکار نہیں ہوگی مگر ہم نے کہا کہ پرہیز کوئی نہیں۔ ڈاکٹر نے کئی بار دلاور کو چیک کیا مگر یہ عام قسم کا معائنہ تھا۔ نبض کی رفتار' بلڈ پریشر' دل کی دھڑکن وغیرہ۔ اس نے صاف کہا کہ مرض کی نوعیت کے پیشِ نظر وہ علاج میں دخل اندازی نہیں کرسکتا اور دلاور کو وہی دوا جاری رکھنی چاہیے جو وہ کھا رہا ہے۔ رپورٹیں بھی اس نے صرف مرض کو سمجھنے کے لیے دیکھی تھیں۔

ڈاکٹر اور اس کی بیوی سنگاپور' بنکاک اور کوالالمپور میں دو مہینے عیش کرنے کے بعد واپس کویت جا رہے تھے جہاں دونوں ایک آئل ریفائنری کے ساتھ چار سالہ معاہدے کی تکمیل کے دو سال گزار چکے تھے۔ دونوں امریکن تھے۔ انہیں کراچی سے کویت ائر کی فلائٹ لینی تھی۔ ہمارے ساتھ ہی وہ بھی اتر گئے اور بھیڑ میں گم ہوگئے۔

"عجیب بے مروت لوگ تھے۔" گل نے کہا "جاتے وقت خدا حافظ تک نہیں کہا۔"

میں نے کہا "یہ لوگ تکلفات میں نہیں پڑتے۔ اگر ہمیں ان کی خدمات کی ضرورت پڑتی تو یہ بالکل بھول جاتے کہ وہ چھٹی پر ہیں۔"

رابعہ نے کہا "یہاں سے سفر کا تیسرا مرحلہ شروع ہوگا مگر سوال ہے کہ کب ہوگا؟"

"جواب اس کا یوں ہے بی بی کہ جب ٹکٹ کے ساتھ سیٹ مل جائے گی۔ ایسا کب ہوگا' یہ آپ انکوائری سے پوچھیں۔"

"فوراً تو بکنگ نہیں ملے گی" رابعہ بولی۔

محسن نے کہا "غلطی ہوگئی ورنہ سنگاپور سے ہی آگے لاہور تک بکنگ کرالیتے' وہاں ٹریول ایجنٹ کے لیے یہ مشکل نہ ہوتا۔"

حسب توقع بکنگ مشکل ثابت ہوئی "پرسوں ہوں گی پانچ سیٹیں۔" ایک خاتون نے کمپیوٹر کے چند بٹن دبا کے ہانپتے ہوئے کہا۔ بٹن دبانا کوئی جان جوکھوں کا کام نہیں تھا۔ ان کا اصل مسئلہ موٹاپا تھا۔

میں نے کہا "ایک بار پھر کوشش کریں' شاید آج ہوں۔"

انہوں نے خفگی سے کہا "کیا کمپیوٹر سے کہوں کہ کوشش کرے۔"

میں نے کہا "کمپیوٹر صاحب سفارش سے تو متاثر ہوں گے۔ آخر پاکستانی کمپیوٹر ہے۔"

اس نے لہجہ بدل کے کہا "آپ چانس پر ٹرائی کرلیں۔"

میں نے اور محسن نے فرنچ شروع کی "ٹریول ایجنسی سے رجوع کرتے ہیں۔ یہ ان کو سیٹیں بیچ دیتے ہیں" محسن بولا۔

میں نے کہا "کیا حرج ہے دفعہ پر کانوے لگا کے دیکھ لیں۔"

محسن نے اتفاق کیا "رشوت کے علاوہ ایک طریقہ یہ بھی ہے؟"

کام نکالنے کا۔"

میں نے کہا "میڈم۔ اگر ابھی آدھے پونے گھنٹے میں خود چیئرمین صاحب آپ سے ہمارے لیے جگہ نکالنے کی درخواست کریں۔"

محسن بولا "چیئرمین کبھی درخواست نہیں کرتا' حکم دیتا ہے۔"

فرنچ نے خاتون کو پہلے ہی چوکنا کردیا تھا' وہ مستعد ہوگئی "دیکھیے' وہ مالک .... ہیں' ان کا کوٹا ہوتا ہے۔"

مجھے معلوم تھا کہ چیئرمین کا کوئی کوٹا نہیں ہوتا۔ خاتون کی بات کا صاف مطلب یہ تھا کہ جگہ ہے۔ "رابعہ۔ تم جاؤ اپنے برادران لا کے پاس۔ بھائی جی سے کہو...."

"رابعہ انہیں بڑے بھیا کہتی ہے" محسن نے تصحیح کی۔

رابعہ نے بُرا سا منہ بنایا "اچھا نہیں لگتا مجھے ذرا ذرا سی بات پر ان کا احسان۔ بھابی دس بار جتائیں گی۔"

"پلیز رابعہ۔ یہ مسئلہ ایسے ہی حل ہوگا۔"

بکنگ کلرک خاتون نے رابعہ کے روانہ ہونے سے پہلے ہی کہا "دیکھیے پلیز' اگر آپ نائٹ کوچ سے جانا پسند کریں۔"

میں نے سوچ کے کہا "اگر واقعی اور کوئی صورت نہیں۔"

"آج تو سر دو سیٹیں ایک فلائٹ پر ملیں گی' ایک شام کو...."

میں نے کہا "رابعہ۔ تم بڑے بھیا سے فون پر بات کرلو۔"

رابعہ نے پھر منہ بنایا "اب نائٹ کوچ سے جانے میں کیا تکلیف ہے۔ کچھ پیسے بھی بچ جائیں گے۔"

میں نے کہا "او کے خاتون۔ میری کفایت شعار بیوی کی خودی بہت بلند ہے۔ آپ نائٹ کوچ سے بکنگ دے دیں۔"

مسئلہ حل ہوگیا تو میں نے کہا "کمپیوٹر صاحب کا شکریہ ادا کریں ہماری طرف سے۔ اب ان کو یہ بتانے میں بھی کوئی حرج نہیں کہ ہم تو چیئرمین صاحب کے نام سے بھی ناواقف ہیں۔"

محسن نے کہا "یار' کمپیوٹر صاحب بُرا مانیں گے' آخر ان کے بھی جذبات ہیں۔"

بُرا خاتون نے مانا۔ بدمزگی کے آثار ان کی صورت سے عیاں تھے مگر وہ ہمیں قہرآلود نظروں سے گھورنے اور دل ہی دل میں کوسنے کے سوا کیا کرسکتی تھیں۔ ہم نے اچھا ڈراما پیش کیا تھا اور سب کی اداکاری بھی اچھی تھی۔

ابھی صبح کے دس بجے تھے یعنی ہمیں کم سے کم بارہ گھنٹے کہیں گزارنے تھے۔ کراچی میں اکرام شیخ بھی تھا۔ نازو کا سگا بھائی جو کبھی ہمارا دوست اور ساتھی تھا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ وہ بے وفا اور طوطا چشم بھی ثابت ہوسکتا ہے۔ وہ جب پولیس میں سب انسپکٹر تھا تو سب اسے ڈبل ایس آئی کہتے تھے۔ سب انسپکٹر سید اکرام۔ اس کی فرض شناسی اور اصول پرستی نے اس کی نوکری چھین لی تو وہ کراچی میں ٹیکسی بھی چلاتا رہا تھا۔ کاجل سے شادی کے بعد اس کے دن پھر گئے تھے۔ اس کی نظریں بھی پھر گئی تھیں۔ یہ وہی کاجل تھی جس کو ہم مشکل ترین حالات میں مشرقی پاکستان سے نکال کر لائے تھے کیونکہ وہاں اس کا کوئی بھی نہیں رہا تھا۔ اس نے کراچی میں ایک چھوٹے سے اسکول سے ابتدا کی تھی اور دیکھتے دیکھتے ایک بہت بڑے انگلش میڈیم اسکول کی مالک ہوگئی تھی جس کی دو شاخیں تھیں۔ جیسا کہ محسن مذاق میں کہتا تھا۔ کاجل میں علیحدگی پسندی کا رجحان پہلے سے تھا اور اکرام شیخ میں زن مریدی کا مگر یہ حقیقت تھی۔ غالب سے معذرت کے ساتھ۔ عقد نے ہم کو نکما کردیا۔ ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے۔

اب ہم میں سے کوئی بھی اکرام شیخ سے ملنے تک کا روادار نہ تھا۔ ورنہ اس کی کوٹھی پر ایک دن گزارنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ کوٹھی میں جگہ تھی مگر کاجل کے دل میں نہیں تھی۔ وہ اپنے شوہر کو ہم شرپسند عناصر سے محفوظ رکھنا چاہتی تھی چنانچہ ہم بھی اکرام شیخ کو بھول گئے تھے۔

صدر کے ہوٹل جبیس میں ہم نے دن بھر کے لیے دو کمرے حاصل کرنا کافی سمجھا۔ ہمیں وہاں رات نہیں گزارنی تھی۔ یہ فلم اسٹاروں اور اداکاروں کا پسندیدہ ہوٹل تھا اور اکثر اس کے سامنے شائقین کسی بھی سنسنی خیز خبر سے اکٹھے ہوجاتے تھے مثلاً یہ کہ ابھی ابھی شبنم آئی ہے' رابن گھوش بھی ساتھ تھا۔

فرسٹ فلور پر ہوٹل کا ریسٹورنٹ اور ڈائننگ ہال وسیع اور کشادہ تھا۔ اس کے بڑے بڑے شفاف شیشوں سے نیچے وکٹوریہ روڈ کی ساری ٹریفک اور گہما گہمی کا خاموش نظارہ دیکھا جاسکتا تھا۔ کافی ہم نے اپنے اپنے کمروں میں ہی پی تھی اور کچھ دیر بعد نہا دھو کے فریش ہوگئے تھے۔ ہم خیروعافیت کے ساتھ پاکستان لوٹ آئے تھے اور ایسا لگتا تھا کہ دستِ غیب نے ہمارے لیے ابتلا اور آزمائش کے دور کو ختم کرنے کی ذمے داری قبول کرلی ہے۔ اس میں ناخوش ہونے والی کوئی بات نہیں تھی مگر دلاور کا اچانک ٹرمینل کینسر میں مبتلا ہوجانا اس کھیل کے ایک ڈرامائی اختتام کی کڑی تھا جو برسوں سے جاری تھا اور ہنوز نتیجہ خیز تھا۔ اسے برین ٹیومر نہ ہوتا اور یہ یقین نہ آتا کہ اب واقعی اس کی زندگی کی مدت مختصر اور محدود ہو کے رہ گئی ہے تو شاید دلاور اس کھیل کو اتنی رسوائی کے ساتھ اپنی ہار پر ختم نہ کرتا۔ اس کے سامنے دوسرا راستہ بھی قانون کی بھول بھلیوں سے گزرنے کے بعد بالآخر ایک اندھے موڑ پر ختم ہونے والا تھا۔ فرار کے راستے مسدود ہوچکے تھے اور ہم واپس پہنچنے کے بعد ڈاکٹر شیلی مرڈر کیس میں اس حبشی جارج کو طلب کرلیتے تو وہ چشم دید گواہ کی حیثیت سے دہرے قتل کی اس واردات کے مجرم کو بھی شناخت کرلیتا جو لندن سے فرار ہوگیا تھا اور جس کے جرم کی سزا وہ بے سبب کاٹ رہا تھا اس کے بعد دلاور کو سزائے موت ہونی لازمی تھی۔

نہ جانے کیوں قدرت کو اس پر رحم آگیا۔ تھانہ' کچہری اور جیل سے پھانسی گھاٹ تک جانے والا راستہ طویل تھا۔

ذلت ورسوائی بہت تھی جس کا خمیازہ دلاور سے زیادہ اس کے ورثا کو بھگتنا پڑتا۔ کہنے کو یہ کینسر بھی عذاب الٰہی بن کے نازل ہوا تھا مگر اس طرح وہ دو چار سال امید و بیم کی کشمکش میں گزار کے ایک عام قاتل کی طرح موت کے اندھے کنوئیں میں دم توڑنے سے بچ گیا تھا۔ صرف دو ماہ میں وہ باعزت طور پر دنیا سے جاسکتا تھا۔ یہ زیادہ بہادرانہ موت تھی۔ وہ سب کی ہمدردیاں سمیٹ کے جاتا اور پس از مرگ رسوائی کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ اس کا اعتراف جرم عدالت کے ریکارڈ میں شامل ہوجاتا اور ہمارے مسائل بھی تمام ہوجاتے۔

تاہم چوہدری دلاور کے علاوہ بھی ایک کانٹا تھا جس کا وجود میرے لیے اتنا ہی ناقابلِ قبول تھا جتنا چہرے کا کوئی داغ جو کسی نفرت انگیز حادثے کی یاد دلاتا رہے۔ مجھے اس داغ کو بھی مٹانا تھا۔ اچانک مجھے یاد آگیا کہ اسی شہر میں استاد پیڈرو بھی ہے جو شیخ مختار کے نام سے باعزت زندگی گزار رہا ہے اور شاید اس خیال سے مطمئن ہے کہ اس کے ماضی کے جرائم پر وقت کی گرد پڑ گئی ہے۔ ایم آر ایس خواب وخیال ہوئی اور سکندر کے سر سے انتقام کا بھوت اتر چکا وہ اب محفوظ ہے۔ لیکن وہ ایسا سمجھتا تھا تو یہ اس کی غلط فہمی تھی۔ چوہدری دلاور کے معاملات سے فراغت پاتے ہی میں زیادہ یکسوئی کے ساتھ اس جنگی جرائم کے مرتکب آخری مفرور مجرم کو بھی ایم آر ایس کی عدالت میں اسی طرح پیش کردیتا جیسے ڈاکٹر شاہ کو لندن میں سرسری سماعت کے بعد سزا دے دی گئی تھی۔

دوپہر کے کھانے سے پہلے میں نے محسن سے اپنے ارادے کا ذکر کیا تو اس نے غور و خوض فرمانے کے بعد منصوبے کی منظوری دے دی "ویسے تو یہ کام فرصت ملنے پر اطمینان سے بھی کیا جاسکتا تھا مگر اس میں مقصدیت کے اعتبار سے عبرت کے اسباب زیادہ ہوں گے اگر چوہدری دلاور خود استاد پیڈرو کا انجام دیکھے اور اسے اندازہ ہو کہ ایم آر ایس کی عدالت میں انصاف کا عمل کتنا فوری اور موثر ہے اور مرنے سے پہلے استاد پیڈرو کو بھی پتا چل جائے کہ چوہدری دلاور کو کس عدالت سے سزائے موت دی گئی ہے۔ وہ جہنم میں جاکے بھی لڑتے رہیں کہ تونے مجھے مروایا اور دوسرا کہے تونے۔

"وقت کم ہے اور استاد پیڈرو کو قابو کرنا' بلکہ اغوا کرنا اتنا آسان نہیں ہوگا۔ ایک بار بچ کر نکل آنے کے بعد وہ یقیناً بہت محتاط ہوگا اور اس نے اپنے لیے حفاظتی انتظامات بھی سخت کردیے ہوں گے۔"

میں نے کہا "میرے ذہن میں ایک چال ہے۔ دام ہم رنگ زمیں۔"

اس نے کہا "یہ تو فارسی ہوگئی۔ اردو میں عرض کریں۔"

"وہ جال جو زمین کے رنگ کا ہو۔ شکار کو نظر ہی نہ آئے۔ اسے دلاور بلائے۔"

محسن اچھل پڑا "کیا یہاں تیرا منہ چومنا مناسب رہے گا۔"

"آپ کے پاس چومنے کے لیے ایک منہ ہے تو اِدھر اُدھر منہ مارنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"سوری۔ میں بھول گیا تھا کہ تیرے جملہ حقوق رابعہ کے نام محفوظ ہیں۔ خیر میں آپ کو ذہانت کا نوبل پرائز دیتا ہوں' آپ وصول کریں" محسن نے کہا۔

"چوہدری دلاور بھی اب پیڈرو کا دوست نہیں بلکہ دشمن ہی ہے۔ اسے پیڈرو کو فون کرکے بلانے میں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔"

محسن نے کہا "اور اگر اس نے انکار کیا...؟"

"وہ کیوں انکار کرے گا؟"

"اس خیال سے.... کہ مرنے سے پہلے کسی اور کو مروانے کا گناہ کیوں کیا جائے۔ آخر وہ برسوں ایک دوسرے کے ساتھ رہے تھے۔"

میں نے کہا "یہ دوستی وہ نہیں تھی جو میرے اور تیرے درمیان ہے۔ وہ غرض مندی کا تعلق تھا۔ دوستی کی عمر جتنی زیادہ ہو اس کی قدر و قیمت بڑھتی ہے۔ ان کے درمیان کینہ اور کدورت بڑھتا گیا یہاں تک کہ بات صرف ترک تعلق کی نہیں رہی' باقاعدہ دشمنی میں ڈھل گئی۔"

جب میں نے چوہدری دلاور سے بات کی تو کچھ دیر کے لیے وہ سوچ میں پڑ گیا۔ شاید پرانے وقت کی یادوں نے اسے اسیر کرلیا تھا مگر وہ بہت جلد اس کے سحر سے نکل آیا۔ اس کے دل میں پیڈرو کے لیے صرف نفرت تھی۔

"میں اسے فون کروں گا" دلاور نے کہا "اس لیے نہیں کہ تم اسے سزا دینا چاہتے ہو بلکہ اس لیے کہ میں اسے بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ میں تم پر بھروسا کرسکتا ہوں کہ تم نے وعدہ کرلیا تو تم میرے بیوی بچوں کے خلاف جذبات کو دل سے خارج کردوگے۔ وعدہ نہ لوں تب بھی تم کینہ پروری اور کمینگی میں اس حد تک نہیں گروگے کہ میرے بعد ان کے ساتھ دشمنی کا سلسلہ جاری رکھو۔ لیکن وہ کچھ بھی کرسکتا ہے۔ جب اسے معلوم ہوگا کہ دلاور اس دنیا میں نہیں رہا تو اس کا شیطانی ذہن کوئی خطرناک منصوبہ بنائے گا۔ انہیں بلیک میل کرنے کا یا انہیں پریشان کرنے کا۔ یہ بات میں نے پہلے بھی تسلیم کی ہے کہ تم شریف دشمن تھے۔ تم پر اعتبار کیا جاسکتا ہے۔ پیڈرو جیسے کمینے ساتھی پر نہیں۔"

"کیا وہ تمہارے بلانے سے آجائے گا؟"

"ہاں۔ وہ مجھے انکار نہیں کرسکتا" دلاور معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

"اسے یہاں بلاؤ" میں نے کہا "اپنے کمرے میں' اسے بتادو کہ تم یہاں ٹھہرے ہوئے ہو۔"

میں نے کہا "تم ریسٹورنٹ کے سڑک کی جانب والے شیشوں سے دیکھ سکتے ہو۔ جب وہ اندر آنے کے لیے گیٹ میں داخل ہو تو

اس کو زینے کے پہلے موڑ پر ریسیو کرو اور یہاں لے آؤ۔"

"اگر اس نے تمہیں دیکھ لیا؟"

میں نے کہا "ہم نیچے کسی گاڑی میں بیٹھ کے تمہارا انتظار کریں گے۔ ہوٹل سے کرائے کی گاڑی مل جائے گی۔ پیڈرو کے آنے سے پہلے تم دیکھ لینا۔ جب وہ آجائے تو اسے کہنا کہ چلو کہیں باہر جاکے بات کریں گے۔ اسے شک ہو تو اپنی تلاشی دے دینا۔ اسے یقین دلانے کے لیے کہ تم مسلح نہیں ہو اور اکیلے ہو۔"

"ممکن ہے وہ تمہاری اس احمقانہ خوداعتادی سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش بھی کرے اور تمہیں کہیں لے جاکے ٹھکانے لگانے کا سوچے" محسن بولا۔

دلاور مسکرایا "ایسا سوچ سکتا ہے وہ۔"

دلاور نے کمرے سے پیڈرو کو فون کیا۔ اس کا نمبر مجھے یاد نہیں تھا مگر میٹروپول ہوٹل میں واقع اس کے آفس کا نمبر ڈائریکٹری میں تلاش کرنا مشکل نہیں تھا۔ ہم نے دونوں کمروں کے فون جوڑ کے ساری بات سُنی۔

"مجھے شیخ مختار صاحب سے بات کرنی ہے۔"

پیڈرو نے کہا "میں بول رہا ہوں۔"

"پیڈرو۔ میں دلاور ہوں" چوہدری دلاور نے کہا۔

دوسری طرف چند سیکنڈ کی خاموشی نے پیڈرو کے ذہن کو پہنچنے والے شاک کی غمازی کی "دلاور۔ تم..... کہاں ہو؟"

"یہاں کراچی میں۔ جیبس ہوٹل دیکھا ہے۔"

"دیکھا ہے' مجھے کیوں فون کیا ہے؟" وہ نروس ہوگیا۔

"مجھے تم سے ایک کام ہے' فوراً آجاؤ' اسی وقت۔"

"دلاور۔ تم ایسے مجھے حکم نہیں دے سکتے۔ ابھی میں مصروف ہوں۔"

"پیڈرو۔ میں آج بھی حکم دے سکتا ہوں تمہیں اور آدھے گھنٹے میں تم نہ آئے تو میں ایک فون کال تمہارے پارٹنر کو کروں گا۔ دوسری ایک اور شخص کو۔ وہ تمہیں یہاں لے آئے گا' زندہ یا مُردہ... ابھی نہ سہی شام تک۔"

پیڈرو کی پھنسی پھنسی آواز آئی "اچھا.... میں آتا ہوں۔ تمہارے ساتھ اور کون ہے؟"

"کوئی بھی نہیں اور تم بھی اکیلے ہی آؤ گے۔" اس نے فون بند کردیا۔

دس منٹ بعد محسن نے اطلاع دی "ایک فیئٹ ملی ہے۔ گرے کلر کی۔ 1100-D۔"

دلاور نے کہا "نمبر بتاؤ۔"

"نمبر چھوڑو۔ سینٹرل کافی ہاؤس کے سامنے کھڑی ہے" محسن بولا "نمبر خود میں نے نہیں دیکھا۔"

"وہ اپنی گاڑی میں آئے گا" دلاور نے کہا۔

"ہاں.... اور وہ تمہیں اپنے ساتھ لے جائے گا" محسن نے کہا

"ظاہر ہے کہ گاڑی وہ چلائے گا۔ تم اس کے ساتھ بیٹھو گے' ہم تمہارے پیچھے رہیں گے۔"

"میں اس کو کہاں لے جاؤں گا؟"

"اولڈ کلفٹن۔ وکٹوریہ روڈ سے سیدھے۔ کلفٹن کے راؤنڈ اباؤٹ پر تم اس سے گاڑی روکنے کو کہو گے' کسی بھی بہانے اور اسی جگہ پہنچ کے ہم پیچھے بیٹھ جائیں گے۔ ٹا منک کا معاملہ ہم پر چھوڑ دو۔ اسے پتا بھی نہیں چلے گا کہ ہم تعاقب میں ہیں اور نہ وہ کچھ کرسکے گا۔ پھر ہم اپنی گاڑی وہیں چھوڑ دیں گے اور پیڈرو کی گاڑی میں آگے چلے جائیں گے۔ رائٹ؟"

دلاور نے سرہلایا "اگر تمہارے پیچھے بیٹھنے سے پہلے اس نے ریوالور نکال لیا؟"

میں نے کہا "اوّل تو ہم اسے اتنی مہلت نہیں دیں گے اور میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔ شاید وہ ایک فائر کرنے میں کامیاب ہوجائے' یہ رسک میں لوں گا۔ دوسرا فائر وہ نہیں کرسکے گا۔"

محسن نے کہا "مگر فائر کی آواز سب کو متوجہ کرے گی۔"

میں نے کہا "دلاور۔ تم پیڈرو کا مقابلہ تو نہیں کرسکتے۔ تم جسمانی طور پر بہت کمزور ہوچکے ہو۔ مگر تم اس کو ریوالور نکالنے سے روک سکتے ہو۔ چند سیکنڈ کی بات ہے۔ جیسے ہی گاڑی رُکے گی اور ہم پیچھے سے نمودار ہوں گے اس کا ہاتھ اپنے ریوالور کی طرف بڑھے گا۔ تم اس کا ہاتھ روک دو تو اچھا ہے ورنہ جب وہ ریوالور نکال لے تو اس پر اپنا ہاتھ ماردینا... آخر تم بھی پُرانے شکاری ہو۔"

دلاور مسکرایا "یہ سب تم مجھ پر چھوڑ دو۔ پیڈرو تمہارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے گا۔"

میں اور محسن پیچھے کھڑی ہوئی ٹیکسی کار میں جاکے بیٹھ گئے۔ مجھے اندازہ تھا کہ اوپر کون سے شیشے کے پیچھے دلاور موجود ہے مگر سیاہ شیشوں کے پیچھے سے وہ ہمیں دیکھ سکتا تھا۔ ہم اسے نہیں دیکھ سکتے تھے۔

دس منٹ بعد استاد پیڈرو اپنی سفید نئے ماڈل کی لمبی ڈاج ڈارٹ میں نمودار ہوا۔ گاڑی کو اس نے بڑی نخوت سے گیٹ کے سامنے روکا۔ اس طرح کہ قطار میں ترچھی کھڑی ہوئی بہت سی کاروں کا راستہ ڈبل پارکنگ سے بند ہوگیا۔ اگر ان کے مالک اپنی گاڑی نکالنا چاہتے تو نہیں نکال سکتے تھے۔

میں نے کہا "پیڈرو بڑا بزنس مین ہوگیا ہے۔ اس کی گاڑی بہت قیمتی ہے۔"

"اس نے سوٹ بھی پہنا ہے اس گرمی میں۔"

"بیتیس ہزار سے .... قیمت ہے اس گاڑی کی۔ وہ سوٹ کیوں نہ پہنے مگر سوٹ پہننے سے تمیز تہذیب نہیں آتی۔ ایسے گاڑی کھڑی کرنے والے پیڈرو جیسے نودولتیے ہوتے ہیں۔"

خلاف توقع چوہدری دلاور اور پیڈرو بہت جلد نیچے آ[illegible]

ان کے چہروں سے کسی قسم کے جذبات کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔ نہ دوستی کے نہ دشمنی کے۔ پیڈرو خاصی خود اعتمادی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ شاید اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ چوہدری دلاور کیا کرنے والا ہے۔ یہ بات اس کے ذہن میں آ بھی نہیں سکتی تھی کہ چوہدری دلاور اس وقت ہمارا آلۂ کار ہے۔ وہ ہم سے ملا ہوا ہے اور ہم اپنی جنگ ختم کر دینے والے حریفوں کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کر کے خیر سگالی کے جذبات کو فروغ دے رہے ہیں۔

چوہدری دلاور اسے طے شدہ پروگرام کے مطابق کلفٹن کی طرف لے گیا۔ گاڑی محسن چلا رہا تھا۔ اس نے ایک راؤنڈ اباؤٹ سے دو حصّوں میں تقسیم ہو جانے والی سڑک پر سفید کار کا تعاقب چھوڑ دیا۔ وہ دوسری سڑک پر چل پڑا اور اس نے رفتار ایک دم خطرناک حد تک بڑھا دی۔ میں نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ پلان اپنے ذہن میں رکھتے ہوئے جو بھی کر رہا تھا ٹھیک تھا' شاید ان سڑکوں کے بارے میں وہ مجھ سے زیادہ جانتا تھا۔

تقریباً ایک کلومیٹر کے بعد اس نے انتہائی تیز رفتاری سے دائیں جانب موڑ کاٹا۔ سامنے سے آنے والی ایک گاڑی کو بچانے کے چکر میں خود ہماری گاڑی ایک بنگلے کی دیوار سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ اس نے بریک لگا کے گاڑی کو دیوار کے ساتھ کھڑا کیا اور مجھے اشارہ کیا۔ میں اور وہ دیوار کی اوٹ میں کھڑے ہو گئے۔

سفید ڈاج کار مخالف سمت سے نمودار ہوئی۔ شاید دلاور پریشان ہو گا کہ پیچھے آتے آتے ہم اچانک کہاں غائب ہو گئے۔ پیڈرو کی نظر پیچھے عام ٹریفک کو دیکھتے ہوئے کیسے اندازہ کر سکتی تھی کہ گرے نیبٹ میں کون تعاقب کر رہا ہے۔

سفید گاڑی ہم سے پچاس ساٹھ گز کے فاصلے پر آہستہ ہوئی اور رُک گئی۔ دلاور کا سر آگے جھکا ہوا تھا اور پیڈرو اسے تشویش سے دیکھ رہا تھا۔ شاید اس نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ کیا تھا یا اس کی طبیعت واقعی بگڑ گئی تھی۔ وہ مسلسل دباؤ اور ٹینشن کو برداشت کر رہا تھا۔

میں نے اور محسن نے مخالف سمتوں سے یلغار کی۔ پیڈرو کو اس وقت ہوش آیا جب ہم اس کے سامنے پہنچ چکے تھے۔ اس نے شاک سے سنبھلنے میں بڑی پھرتی دکھائی اور اس کا ہاتھ ریوالور نکالنے میں بھی کامیاب رہا مگر پھر دلاور نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ مارا۔ پیڈرو کا ہاتھ کھڑکی پر لگا۔ میں اور محسن پیچھے والا دروازہ کھول کے اندر رفٹ ہو گئے۔ یہ سب مشکل سے آدھے منٹ میں ہوا اور یہ پہلا کمانڈو ایکشن اس اعتبار سے تاریخی رہا کہ اس میں ہمارا ساتھ دلاور نے بھی دیا۔ بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے۔ آج کے دوست کل کے دشمن اور کل کے دشمن آج کے ساتھی۔ پیڈرو کو بالآخر اُسی نے مروایا جس کی خاطر پیڈرو نے نہ جانے کتنے غیر قانونی کام کیے تھے۔ اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کے کبھی خطرناک جرائم پیشہ افراد سے اور کبھی قانون سے ٹکر لی تھی۔ دلاور کے ہر حکم پر سر جھکاتے ہوئے کسی دشمن کا سر اس کے قدموں میں لا ڈالا تھا مگر جیسا کہ محسن نے کہا تھا۔ یہ نیک نیتی اور خلوص کا تعلق نہیں تھا۔

پیڈرو کی کلائی کھڑکی پر لگی تھی اور ضرب اتنی شدید تھی کہ وہ بلبلا کے رہ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ سے چھوٹنے والا ریوالور اس کے قدموں میں کہیں پڑا ہوا تھا مگر اب وہ جھک کے اسے اٹھا بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ انگارے اور زہر برساتی نظروں سے دلاور کو دیکھ رہا تھا۔

"ہے نا تُو کسی طوائف کے..... کی اولاد۔" پیڈرو نے پھنکار کے دلاور کو ایک گالی دی "تجھ سے یہ امید نہیں تھی۔ مجھے تو یہ میری غلطی تھی۔"

دلاور نے اسے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے پیچھے سے کہا "یہ تمہاری پہلی غلطی نہیں تھی پیڈرو۔"

"تمہاری پہلی غلطی تھی تمہارا پیدا ہونا" محسن بولا "اب گاڑی آگے بڑھاؤ اور سیدھے لے چلو۔"

پیڈرو بیک ویو مرر میں ہمیں دیکھتا رہا "تم لوگ کیا چاہتے ہو؟" میں نے کہا "یہ محسن بتا چکا ہے۔"

اس نے مُردہ ہاتھوں سے گاڑی کو گیئر میں ڈالا اور گاڑی سست رفتاری سے چلنے لگی "تم کو سودا کرنا تھا تو مجھ سے کرتے دلاور۔"

"سودا برابر والوں سے ہوتا ہے۔ تم آج بھی کیا ہو؟" دلاور نے حقارت سے کہا "کل تک تم ایک معمولی شہدے تھے مگر خود کو بدمعاش سمجھتے تھے۔ میری غلامی میں آ کے تم دادا ہو گئے تھے۔ گلی کے کتے کو محافظ بنا لیا جائے تو آزاد ہو کے وہ شیر نہیں بن جاتا۔"

میں نے کہا "سودا تم نے ہم سے بھی کیا تھا۔ آج ہم اسی کو فائنل کرنے آئے ہیں۔ زندگی کا بھروسا نہیں' حساب صاف رہنا چاہیے۔"

محسن نے کہا "عبداللہ شاہ غازیؒ کے مزار سے آگے سیدھے ہاتھ پر سڑک نیچے جا رہی ہے۔"

پیڈرو سخت نروس ہو گیا تھا۔ اس کی چھٹی حس خطرے کو محسوس کر رہی تھی "تم سب میرے خلاف اکٹھے ہو گئے ہو..... تم مارنا چاہتے ہو مجھے۔"

اس نے ایک دم بریک دبا کے ایکسیلریٹر چھوڑ دیا۔ گاڑی ایک جھٹکا لے کر بند ہو گئی۔ میں اس کی کسی بھی غلط حرکت سے نمٹنے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ یہ دوپہر کے بعد کا وقت تھا جب اس علاقے میں رونق کم سے کم ہوتی ہے۔ پھر بھی مزار کے سامنے پھول بیچنے والے' فقیر اور حاجت مندوں کے علاوہ کچھ عقیدت گزار موجود تھے۔ پیڈرو چلّانے لگتا تو وہ سب جمع ہو جاتے۔

میں نے ناپ تول کے پیچھے سے اس کی گردن اور شانے کے درمیان کھڑی ہتھیلی کا وار کیا۔ اس کا ہاتھ دروازے کے ہینڈل کی طرف بڑھا تھا اور مجھ سے سیکنڈ کے دسویں حصے کی تاخیر ہو جاتی تو وہ

باہر جا گرتا اور گرتے ہی اُٹھ کے بھاگ کھڑا ہوتا۔

اچانک وہ سامنے جھک گیا۔ اس کا سر اسٹیئرنگ پر ٹھہر گیا اور اس سے ہارن کا ایک بٹن دب گیا۔ ہارن مسلسل بجنے لگا۔ میں تیزی سے نیچے اترا اور میں نے دروازہ کھول کر اس کا سر پیچھے کیا۔ ہارن کی آواز خاموش ہو گئی۔ بہت قریب کھڑے ہوئے ایک ملنگ نے استغراق کی یا چرس کے نشے کی کیفیت سے آنکھیں کھول کے دیکھا اور بولا "خیر ہے بابا۔ مرگی پڑ گئی ہے کیا؟ جوتی سنگھاؤ اس فقیر کو۔"

میں نے اس کے مفت مشورے کو نظر انداز کر دیا۔ چند دکانیں کچھ فاصلے پر تھیں جہاں موتی سیپ اور گھونگھے سے بنے ہوئے ہار بُندے اور بہت سی آرائشی اشیا کی فروخت ہوتی تھی مگر سہ پہر کے وقت وہاں کوئی خریدار نہیں تھا۔ اونگھتے دکان داروں کو بھی ہارن کی آواز نے متوجہ کر دیا تھا۔

میں نے ایک دکان دار سے پانی مانگا۔ "ڈرائیور کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے۔"

اس نے مجھے پانی کا گلاس اور دوسرا مفت مشورہ دیا "اس کو آگے مزار کی سیڑھی پر سے تھوڑی سی مٹی چٹا دو۔ ٹھیک ہو جائے گا۔"

میں نے کہا "ہم قریب ہی رہتے ہیں۔ گھر پہنچ کے ڈاکٹر کو بُلا لیں گے۔"

صرف دیکھنے والوں کو مطمئن کرنے کے لیے میں نے پیڈرو پر پانی کے چھینٹے مارے اور پھر اسے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر شفٹ کر دیا۔ پھر ڈرائیونگ میں نے سنبھالی اور گاڑی کو عبداللہ شاہ غازیؒ کے مزار سے ذرا آگے سیدھے ہاتھ پر اترنے والی سڑک پر لے گیا۔ یہ سارا غیر آباد اور سنسان علاقہ تھا۔ جہاں یہ پتلی سی سڑک ختم ہوتی تھی وہاں شام کو کچھ گاڑیوں والے آ جاتے تھے جو سمندر کے ساتھ والی مختصر سی سڑک پر ٹہلتے تھے اور کنارے پر بنی ہوئی دیوار پر بیٹھ کے سمندر کو دیکھتے رہتے تھے۔ اس زمانے میں یہاں نہ لائٹس تھیں اور نہ آبادی تھی چنانچہ چاندنی رات میں بھی لوگ زیادہ دیر نہیں رُکتے تھے۔

میں گاڑی کو بائیں طرف موڑ کے کافی آگے لے گیا۔ ایک نوجوان جوڑا جو غالباً عشق کے ابتدائی مراحل طے کر رہا تھا موٹر سائیکل کو ساحل کی گیلی ریت پر دوڑا رہا تھا۔ کبھی کبھی پانی کی لہر آگے آ جاتی تھی تو موٹر سائیکل کے پہیے چند انچ گہرے پانی میں چھینٹے اُڑاتے تھے مگر لڑکی ایسے چیخ مارتی تھی جیسے وہ گہرے سمندر میں ڈوب رہی ہے۔ مجھے ایک اور کار بھی نظر آئی جو ساحل کی ریت پر اکیلی کھڑی لگتی تھی۔ اگر اندر کوئی تھا تو اسے بند شیشوں کے پیچھے دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ میں نے کار کو ان سے ایک کلومیٹر آگے پانی کے اتنا نزدیک روکا کہ بعض اوقات لہریں سامنے والے بمپر سے اوپر ہیڈ لائٹس سے ٹکراتی تھیں تو پھوار سی ونڈ اسکرین پر بھی آتی تھی۔

پیڈرو کو تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہوش آ گیا۔ اس نے آنکھیں کھول کے محسن کو دیکھا اور پھر ایک دم اٹھ بیٹھا۔ اس کی نگاہ مجھ پر اور پھر دلاور پر گئی تو شاید اسے سب یاد آ گیا۔ اب وہ ڈرائیونگ سیٹ پر نہیں تھا اور گاڑی کسی سڑک پر نہیں سمندر میں کھڑی تھی۔

اس نے پھر وہی سوال کیا "تم..... کیوں لائے ہو مجھے یہاں۔ کیا چاہتے ہو آخر تم لوگ؟"

میں نے کہا "استاد محترم پیڈرو صاحب۔ ہمارے پاس وقت کم ہے۔ سوالات ہم کریں گے' تم صحیح جواب دے کر اپنا وقت بھی بچا سکتے ہو اور عذاب بھی۔ سچ ہم پہلے سے جانتے ہیں اس لیے جھوٹ مت بولنا۔"

محسن نے کہا "یہاں ہم سچ تمہاری زبان سے سُننا چاہتے ہیں۔ ورنہ ہم کلفٹن پر تفریح کے لیے اس وقت نہ آتے اور تمہارے ساتھ تو کبھی نہ آتے۔"

اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری "کیا بات پوچھنا چاہتے ہو تم؟"

میں نے باہر نکل کے کہا "تم بھی باہر آ جاؤ۔ گاڑی میں پیچھے مڑ کے تم سے بات کرنا مشکل کام ہے۔"

"نہیں..... میں باہر نہیں آؤں گا" وہ چلّانے لگا۔

محسن نے اسے باہر دھکیل دیا۔ میں نے اسے کھینچ کر ریت پر گرا دیا۔ وہ اُٹھ کر بھاگنے کی ہمت ہی نہیں رکھتا تھا۔ پانی کی ایک لہر اس کے اوپر سے گزری تو وہ کھڑا ہو گیا۔ اس کا سارا جسم خوف سے لرز رہا تھا۔ میں نے اسے پیچھے دھکا دے کر گاڑی کے بونٹ سے لگا دیا۔

"یہ ہو سکتا ہے کہ سچ بول کے تم اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو جاؤ۔ آخر دلاور سے بھی تو ہماری صلح ہو گئی ہے۔" میں نے کہا "تم دیکھ رہے ہو کہ تمہارا باس بھی ہمارے ساتھ ہے۔"

پیڈرو کے اوسان کچھ بحال ہوئے "میں تو بہت پہلے تم کو صلح کی پیش کش کر چکا تھا۔ پُرانی باتوں کو بھول جانا چاہیے۔"

"اگر کسی نے تمہارے باپ کو اتنی ہی بے رحمی سے قتل کیا ہوتا جیسے وزیر خان کو قتل کیا گیا تھا' تو کیا تم بھول سکتے تھے؟"

"لیکن..... اسے میں نے تو نہیں قتل کیا تھا۔"

"پھر کس نے قتل کیا تھا؟" میں نے کہا "تم دلاور پر الزام عائد کرتے رہے ہو اور دلاور تم کو اصل مجرم کہتا تھا۔ آج دونوں آمنے سامنے ہو۔ دلاور کیا تم بھی باہر آؤ گے؟"

دلاور نے کہا "مجھے..... پانی سے ڈر لگتا ہے۔"

"یہ کیسی مضحکہ خیز بات ہے دلاور۔ اب تمہیں موت کے سوا کسی سے بھی نہیں ڈرنا چاہیے۔ یہاں تم ڈوب نہیں سکتے۔"

دلاور ٹخنوں تک آنے والے پانی میں اُترا۔ اسے پانی کی

دیکھ کر چکر آرہے تھے۔ وہ بونٹ پر بیٹھ گیا۔

"چوہدری دلاور۔ بالآخر وہ دن آگیا جب تم دونوں ایک ساتھ ایم آر ایس کی عدالت میں حاضر ہو۔" میں نے کہا۔

"ایم آر ایس کی عدالت!" دلاور نے دہرایا۔ پیڈرو کا رنگ لاش کی طرح سفید ہوگیا۔

"مجرموں کے کٹہرے میں استاد پیڈرو ہے۔ اس پر وزیر خان کے قتل کا الزام ہے۔ میر شرافت علی کے اور بہت سے دوسرے لوگوں کے قتل کا الزام ہے۔ تم خود کو گواہوں کے کٹہرے میں سمجھو۔ پہلے یہ بتاؤ کہ میرے والد کو قتل کرانے والا کون تھا اور قتل کس نے کیا تھا؟"

"قتل کرانے والا میں تھا۔" چوہدری دلاور نے سکون سے کہا۔

"میں نے کہا تھا نا..... میرا کوئی قصور نہیں" پیڈرو بولا۔

"ابھی تم خاموش رہو" میں نے کہا "دلاور۔ تم نے کس سے کہا تھا کہ اسے قتل کردو؟"

"ڈی سوزا اور پیڈرو سے" دلاور نے کہا۔

"تم نے اس کا معاوضہ بھی ادا کیا ہوگا؟"

"ہاں۔ یہ میرے ملازم تھے۔ دونوں کو میں نے دس دس ہزار دیے تھے مگر بعد میں۔ انعام سمجھ لو اسے۔"

"قتل کرنے والا کون تھا؟"

"پیڈرو۔ اس نے خود مجھے بتایا تھا' ڈی سوزا کے سامنے۔"

"مگر تم نے حکم دیا تھا مجھے۔ میں انکار نہیں کرسکتا تھا" پیڈرو چلّایا۔

دلاور نے کہا "یہ جھوٹ ہے۔ تم انکار کرسکتے تھے۔ زبردستی کون کسی سے قتل کرا سکتا ہے۔ تم نے لالچ میں یہ کام کیا تھا۔"

اب میں نے پیڈرو کی طرف دیکھا "تم اقرار کرتے ہو کہ قتل تم نے کیا تھا؟"

اس کے حلق سے آواز بڑی مشکل سے نکلی "ہاں..... مگر۔"

اس نے قتل کب کیا..... کیسے کیا.....؟ یہ سب تفصیلات سننے کے لیے ہمارے پاس وقت نہیں تھا اور اب اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ پیڈرو کے اعتراف جرم کے ساتھ ہی میں نے فیصلہ سُنادیا "صرف اس ایک قتل پر تم کو سزائے موت دی جاتی ہے۔"

جملہ مکمل ہوتے ہی میرا ہاتھ تیزی سے حرکت میں آیا۔ پیڈرو کو اپنی جگہ سے ہلنے کا موقع بھی نہیں ملا۔ جلاد کی تلوار بن کے میرا ہاتھ اس کی گردن پر لگا۔ سمندر کے شور میں ہڈی ٹوٹنے کی آواز صاف سنائی دی۔ چوہدری دلاور کی حالت غیر ہوگئی۔ پیڈرو کا جسم بونٹ کے کنارے پر لڑھک گیا اور پھر نیچے گر کے پھڑکنے لگا۔ پانی کی ایک لہر اس کے اوپر سے گزری۔ اس نے میرے' محسن کے اور دلاور کے کپڑے بھگودیے۔ ہم سب ساکت وجامد کھڑے پیڈرو کو دم توڑتا دیکھتے رہے۔ اگلی لہر کے آنے تک اس کا بے جان جسم بھی ساکت ہوگیا تھا۔

شاید چالیس سال پہلے آنکھیں کھولنے والے پیڈرو کی آنکھیں اس وقت بھی کھلی ہوئی تھیں۔ دنیا میں آتے وقت وہ جتنا اکیلا تھا اس سے زیادہ تنہا اس وقت تھا۔ اس کی بیش قیمت سوٹ میں ملبوس لاش کراچی میں بحیرۂ عرب کے ساحل کی ریت پر لاوارث پڑی تھی۔ وہ سب خون کے رشتوں کا خون نہ کرتا تو یہ ہوسکتا تھا کہ اس کی میت اپنے گھر میں بے داغ کفن میں لپٹی ہوئی بہت سے رونے والوں کے درمیان رکھی ہوتی۔ بیوی بچے' بھائی بہن' دوست اور پڑوس والے روتے' بالآخر اچھے اور بُرے آدمی کے انجام میں اتنا ہی فرق رہ جاتا ہے۔

میں نے لاش کو گاڑی میں ڈالا اور اس کے شیشے چڑھادیے۔ پھر گاڑی کو لاک کیا اور چابی سمندر میں اتنی دور پھینک دی جتنی دور میں پھینک سکتا تھا۔

دلاور نے کہا "یہ تم نے کیا کیا..... ہم واپس کیسے جائیں گے؟"

میں نے کہا "اگر تم میں اتنا چلنے کی ہمت نہیں ہے تو تم یہاں ٹھہرو' میں جاکے اپنی گاڑی لے آتا ہوں۔"

دلاور نے انکار میں سرہلایا "نہیں' میں ساتھ چلوں گا۔"

ہم ٹخنوں سے اوپر پانی میں گاڑی چھوڑ کے واپس ہوئے' ہماری پتلونیں اوپر تک بھیگ چکی تھیں اور گیلی ریت جوتوں کے اندر پہنچ گئی تھی۔ اس حالت میں سڑک تک پہنچنا بھی دلاور کے لیے مشکل ثابت ہوا۔

موٹر سائیکل سوار نوجوان جوڑا ہمارے قریب سے گزرا تو لڑکی نے پھر چیخ ماری اور نوجوان نے قہقہہ مارا۔ ان کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے۔ خواب ان کی آنکھوں میں مسکرا رہے تھے۔ نوجوان نے موٹر سائیکل ہمارے پاس روکی۔

"کیا ہوا گاڑی کو؟" اس نے پوچھا۔

"خراب ہوگئی" میں نے کہا "کیا تم ہماری کچھ مدد کروگے؟"

اس نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

"ہمارا یہ ساتھی بیمار ہے' چل نہیں سکتا۔"

اس نے کہا "مگر..... میرے ساتھ تو..... میری بیوی ہے۔"

لڑکی کا رنگ اس دلنواز جھوٹ پر لال پڑگیا اور وہ مسکرانے لگی۔

میں نے کہا "سڑک پر عبداللہ شاہ غازیؒ کے مزار تک جاکے کسی ٹیکسی والے کو یہاں لے آؤ تو تمہاری مہربانی ہوگی۔"

لڑکی نے کہا "چلو نا۔ دو منٹ لگیں گے۔"

لڑکے نے سرہلایا "پھر ہم اُدھر سے ہی نکل جائیں گے۔ ٹیکسی والے کو بھیج دیں گے۔"

دس منٹ بعد خالی سڑک پر ایک ٹیکسی نمودار ہوئی۔ وہ ہمارے پاس آکے رک گیا۔ میں اور دلاور پیچھے بیٹھ گئے۔ "گاڑی خراب ہوگئی" اس نے بڑے افسوس سے سرہلایا "نئی گاڑی ہے؟"

میں نے کہا "ہاں۔ نئی ہو یا پُرانی' مشین ہے۔"

"رات ہونے سے پہلے گاڑی لے جانا۔ کسی مکینک کو شام تک لاؤگے تو گاڑی بچ جائے گی۔"

"ورنہ کیا ہوگا؟"

"ورنہ رات کو سمندر چڑھے گا۔ گاڑی ڈوب جائے گی۔ سُنا ہے گاڑی ریت میں دھنس کے غائب بھی ہوجاتی ہے۔ دیکھ لو اتنی دیر میں پہیے آدھے اندر چلے گئے ہیں۔ یہاں کوئی نشانی بھی نہیں ہوتی جس سے صبح سمندر اُترنے کے بعد پتا چلے کہ گاڑی کہاں تھی۔"

جب وہ اپنے تجربے کی بات بتارہا تھا تو مرزا غالب نے میرے کان میں کہا۔

ہوئے مرکے ہم جو رُسوا' ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا' نہ کہیں مزار ہوتا

میں ہنس پڑا "واہ چچا غالب۔" دلاور کا اتنی سنگین اور المیہ صورت حال میں مجھے ہنستا دیکھ کے حیران ہونا جائز تھا۔

محسن نے گاڑی چلاتے ہوئے کہا "آج دنیا کچھ۔ تھوڑی سی' معمولی سی بہتر جگہ محسوس ہوتی ہے۔ صرف اتنی کہ جتنی نیوٹن کو زمین اوپر اٹھی ہوئی لگی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ شاید آسمان ایک کاغذ کی موٹائی کے برابر نیچے ہوا ہے یا زمین اوپر۔ دراصل اس کی سیٹ کے نیچے کسی نے واقعی ایک کاغذ رکھ دیا تھا۔ اس کا کہنا غلط نہ تھا۔"

میں نے کہا "یہ تھوڑا سا فرق بھی بہت ہے۔ اگر ایسے ایک ایک کرکے سب پیڈرو مرجائیں۔"

"اور سب دلاور بھی....." چوہدری دلاور بڑبڑایا۔

محسن نے اپنی بات جاری رکھی۔ "تو دنیا یقیناً جنت بن سکتی ہے۔ عملی طور پر یہ ناممکن سہی' نظریاتی طور پر تو غلط نہیں۔"

ہوٹل واپس پہنچ کے میں نے دلاور کو اوپر کمرے میں بھیج دیا تھا کہ وہ لباس وغیرہ بدل کے اپنی حالت ٹھیک کرے۔ جسمانی تھکن کے علاوہ اس پر پیڈرو کی موت نے دہشت بٹھادی تھی۔ خود میں کوشش کے باوجود اپنے تصور سے وہ تصویر نہیں مٹا سکتا تھا جس میں پیڈرو کی لاش پر سے سمندر کی لہریں اٹکھیلیاں کرتی گزر رہی تھیں۔ شاید آج رات وہ اپنے شاہانہ آہنی تابوت' ڈاج ڈارٹ ماڈل ۱۹۷۱ء قیمت پینتیس ہزار سکہ رائج الوقت کے ساتھ ہی سمندر میں غائب ہوجائے گا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ یوں جیسے وہ تھا ہی نہیں۔ پھر جب صور پھونکا جائے گا تو کیا وہ وہیں سے برآمد ہوگا؟

محسن نے کار واپس کی تو سیلز مین نے حیرانی سے کہا "آپ اس وقت گئے تھے سمندر میں۔ کپڑوں سمیت نہائے تھے۔"

میں نے کہا "کیا کراچی کی انتظامیہ نے سمندر میں جانے کا کوئی وقت مقرر کردیا ہے؟ ہوسکتا ہے ہم آج رات سمندر میں چارپائی ڈال کے سوئیں؟"

محسن نے کہا "کپڑوں کے بغیر ہم اپنے گھر کے باتھ روم میں بھی نہیں نہاتے' اتنے شرمیلے ہیں۔"

وہیں سے میں نے منظر کو فون کیا۔ حسب توقع وہ رابعہ کے آفس میں وقار یوسف کے ساتھ موجود تھا۔ "کون بول رہا ہے" میں نے اس کی ہیلو پر ڈانٹ کے کہا۔

"تمہارا..... باپ بھوتنی..... کے۔ کہاں ہو تم سالے' اوپر کہ نیچے؟"

میں نے کہا "ہم آج رات وارد ہوں گے لاہور میں۔ نائٹ کوچ پر ہمارے استقبال کے لیے حاضر ہوجاؤ۔ پوری برات اور بینڈ باجے کے ساتھ۔"

اس نے قہقہہ مارا "ابے تو دیکھنا کیا منظر ہوگا۔ منظر کی اولاد ہوگی ایک قطار میں۔ تیری بھابی سے ابھی کہہ دیتا ہوں کہ خیر سے سولہ تو ہیں' ستر واں بھی رات بارہ بجے تک شامل ہوجانا چاہیے۔"

میں نے کہا "ایک مہمانِ خصوصی ہے ہمارے ساتھ۔ چوہدری دلاور!"

"اصلی یا نقلی' زندہ یا مُردہ؟"

میں نے کہا "یہ مذاق نہیں ہے۔ غالب اور نازو کو بتادینا۔ وہ سب انتظام کرلیں گے۔ ایک تو ایمبولینس چاہیے اور حفاظتی انتظامات بھی ایسے ہونے چاہئیں جو کسی وی آئی پی کے لیے ہوتے ہیں۔ کسی کو پتا نہ چلے۔"

"تو سیریس ہے؟"

"اگر تُو نے مجھے سیریس نہ لیا تو میں غالب سے بات کروں گا۔ اس وقت لمبی بات نہیں کرسکتا۔ بہت تھکا ہوا ہوں اس لیے خدا حافظ۔"

منظر اس مختصر گفتگو پر یقیناً حیران ہوگا۔ اسے یہ پوچھنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا کہ ہم سب لوگ کہاں ہیں لیکن نائٹ کوچ کے حوالے سے وہ سمجھ سکتا تھا کہ ہم کراچی سے وارد ہوں گے۔

شام کے وقت دلاور کی حالت کچھ بگڑی اور اس پر شدید ڈیپریشن طاری ہوگیا۔ یہ پیڈرو کی موت کا ردِعمل بھی تھا۔ اس کا آخری سپہ سالار بھی دنیا سے رخصت ہوگیا تھا۔ صرف وہ بچا تھا مگر اس کے لیے بھی کوچ کا نقارہ بج گیا تھا۔ میں نے ایک ڈاکٹر کو بُلایا تھا مگر دلاور نے انکار کردیا۔

"کوئی فائدہ نہیں۔ یہ ڈاکٹر اب کیا کریں گے۔ ساری دنیا کے ڈاکٹر بھی مل کے کچھ نہیں کرسکتے۔ بکواس ہے' جھوٹ ہے' سب میڈیکل سائنس کی ترقی۔ سارے اسپیشلسٹ اُلو کے پٹھے ہیں۔ وہ دلاور کی زندگی میں ایک دن کا اضافہ نہیں کرسکتے تو بے کار ہیں ان کی ساری ڈگریاں' ان سب کو گھاس کھودنے پر لگادینا چاہیے۔ تنور میں روٹیاں لگائیں سالے ماہر کی اولاد۔ آنکولوجسٹ" وہ اپنے آپے میں نہیں تھا۔

وہ ڈاکٹر واقعی کچھ نہیں کرسکتا تھا' وہ عام ڈاکٹر تھا۔

"یہ خطرناک علامات ہیں" اس نے دلاور کی باتیں سُن کے کہا "اس سے اگلے مرحلے میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ دماغ ناکارہ ہو سکتا ہے۔"

میں نے کہا "یہ ہم جانتے ہیں۔ جب خرابی دماغ کے اندر ہے تو دماغ ہی ناکارہ ہو گا مگر کس حد تک۔ یہ پاگل ہو جائے گا' بالکل.... یادداشت کھو بیٹھے گا یا ہوش و حواس؟"

"غالباً پہلے میموری متاثر ہو گی۔ ہذیانی کیفیت طاری ہو گی۔ اس میں یہ VIOLANT بھی ہو سکتے ہیں۔ ابھی تو ڈپریشن ہے۔"

میں نے کہا "یہ اثر ایک حادثے کا ہے۔"

"پھر میں ان کو ایک سکون آور انجکشن لگا دیتا ہوں۔ اس سے فرق پڑا تو یہ علامات دوبارہ نمودار نہیں ہوں گی' فوری طور پر۔"

ہم نے زبردستی انجکشن لگوا دیا۔ دلاور چند منٹ میں پُرسکون ہو کے سو گیا۔ ہم نے رات کا کھانا اپنے کمرے میں ہی منگوا لیا تھا۔ دلاور اس وقت ہی سویا تھا۔ ہم نے اسے نیند میں ہی اٹھا کے ایمبولینس میں شفٹ کیا جو ہوٹل والوں نے منگوا دی تھی۔ ائرپورٹ پہنچنے تک وہ جاگ گیا تھا مگر پوری طرح ہوش میں نہیں تھا۔ اس نے کھڑا ہونے کی کوشش کی تو گر پڑا۔ اسے جہاز تک لے جانے کے لیے وہیل چیئر استعمال کی گئی۔ وہ اس میں سر جھکائے اونگھتا رہا۔ جہاز کے ٹیک آف کرنے تک اس کی حالت کچھ بہتر ہو گئی تو اس نے اسنیکس لیے اور پھر کافی طلب کی۔

"میں اپنے گھر فون کرنا چاہتا تھا" اس نے کہا "موقع ہی نہیں ملا۔"

"تمہاری طبیعت جو خراب ہو گئی تھی۔"

"فیصل آجاتا اپنی ماں کے ساتھ مجھے ریسیو کرنے۔ میری دونوں بیٹیاں بھی آجاتیں" وہ بولا "خیر لاہور ائرپورٹ سے فون کروں گا۔ ورنہ ٹیکسی لے کر اچانک پہنچ کے انہیں حیران کر دوں گا۔"

میں نے بات گول کرنے کے لیے کہا "تم نے کبھی اپنی بیٹیوں کے بارے میں نہیں بتایا۔ وہ فیصل سے بڑی ہیں یا چھوٹی؟"

"دونوں چھوٹی ہیں' ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایک آرٹس پڑھ رہی ہے۔ شعر و شاعری کی شوقین ہے۔ اسے اچھے کپڑے پہننے اور ہلا گلا کرنے کا بہت شوق ہے۔ اس کی سہیلیاں بہت ہیں' آئے دن گھر میں ہنگامہ رہتا ہے۔ دوسری سائنس میں تیز ہے' کہتی ہے ڈاکٹر بنوں گی.... اور وہ بن جائے گی' تم دیکھ لینا۔ فرسٹ ایئر میں اس کے بیاسی فیصد نمبر تھے۔"

"جو آرٹس میں پڑھتی ہے وہ چھوٹی ہے؟"

"نہیں۔ وہ بڑی ہے۔ بی اے سال اوّل میں ہے۔ سکندر' میں نے ان کو بہت کم وقت دیا۔ جتنی محبت مجھے تھی ان سے۔ اتنا ٹائم نہیں تھا میرے پاس اور تم جانتے ہو' خود لڑکیوں کے پاس ٹائم کم ہوتا ہے۔ اٹھارہ بیس سال ہی رہتی ہیں وہ اپنے گھر میں۔ ماں باپ کے ساتھ۔ باقی زندگی وہ شوہر کی ملکیت رہتی ہیں۔ شوہر اچھا ہو یا بُرا' اپنی ملکیت سمجھتا ہے بیوی کو۔ جب وہ گھر سے چلی جاتی ہیں تو گھر سنسان ہو جاتے ہیں۔ خالی ہو جاتے ہیں۔ لڑکے تو باہر رہتے ہیں گھر سے ویسے ہی۔ پھر جب ان کی بیویاں آتی ہیں تو وہ ان کے ہو جاتے ہیں۔ بہو کبھی بیٹی کی جگہ نہیں لے پاتی۔ لے سکتی ہے مگر کہیں ہزاروں میں ایک۔ شاید وہ کمی پوری کرتی ہو جو بیٹی کے جانے سے ہوتی ہے۔ ابھی دو چار سال تھے مگر میں خود جا رہا ہوں.... ان سے پہلے۔"

میں نے کہا "ٹیک اِٹ ایزی۔ تم پھر رو رہے ہو؟"

"نہیں۔ یہ آنسو تو خود نکل آتے ہیں۔ ان پر اب میرا کنٹرول نہیں رہا۔ میرا دنیا کی کسی چیز پر کنٹرول نہیں رہا۔ وقت پر کنٹرول نہ رہے تو پھر ہر چیز بے قابو ہو جاتی ہے۔ ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ یہاں تم ہو' اور جہاز میں کتنے لوگ ہیں۔ میرے سوا سب کا وقت ان کے ساتھ ہے۔"

رات ڈیڑھ بجے کے بعد لاہور ائرپورٹ پر دلاور نے وہیل چیئر استعمال کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ خود اپنے پیروں پر چل کے باہر تک گیا۔ وہاں وہ سب موجود تھے۔ منظر' غالب اور وقار یوسف۔ مولوی خادم حسین نازو اور نکی۔ ان سب کی نگاہوں کے لیے یہ بہت عجیب منظر تھا کہ ہم چوہدری دلاور کے ساتھ باہر آرہے تھے۔ ایک موقع پر وہ لڑکھڑایا تو میں نے اسے سنبھالا۔

کوئی اور وقت ہوتا تو ہم ایسی بے تکلفی کے ساتھ گلے ملتے اور ایک دوسرے کا استقبال ایسی دوستانہ گالیوں سے کرتے کہ دوسرے لوگ بھی مسکرانے پر مجبور ہو جاتے مگر اس وقت اچانک ہم سے پہلے آگے بڑھ کے دلاور نے ان سب سے ہاتھ ملایا تو ماحول بوجھل ہو گیا۔ کسی نے بھی معقولیت کی حد سے بڑھ کے جذباتی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔ یہ بیک وقت ایک ڈرامائی صورت کا کلائمکس بھی تھا اور اینٹی کلائمکس بھی۔ ان کے لیے اپنی آنکھوں پر اعتبار کرنا بھی اتنا ہی دشوار ثابت ہو رہا تھا جتنا دلاور کے طرزِ عمل کو سمجھنا۔ شاید ان کے دل میں ایک مبہم سا اندیشہ تھا کہ یہ بھی دلاور کی کوئی چال نہ ہو۔ جس کی تمام عمر مکّاری' عیّاری اور جھوٹ' فریب سے عبارت رہی ہو۔ جو مشرق کا راستہ بتا کے مغرب کی سمت جاتا ہو۔ سیاہ کو سفید دکھا سکتا ہو اور جھوٹ کو سچ بتاتا ہو اور جس کے لیے زندگی اپنے ظاہر سے باطن کو چھپانے کی اداکاری ہو۔ وہ اتنی خاموشی اور سادگی کے ساتھ خود کو ہمارے حوالے کردے گا' شاید انہیں اس میں ہماری کوتاہی یا کمزوری کا پہلو نظر آتا ہو کہ ہم اس پر اعتبار کر چکے تھے۔

لیکن وہاں نہ سوال کرنے کا موقع تھا نہ جواب دینے کا۔ سوال سب کی نگاہوں میں تھے اور چہروں پر تھے۔ وہ دلاور سے بھی بہت کچھ کہنا چاہتے ہوں گے اور مجھ سے یا محسن سے بھی مگر ہماری خاموشی اور سنجیدگی نے سب کے لب سی دیے تھے۔

دلاور نے اِدھر اُدھر نگاہ ڈالی "سب کو لینے کوئی نہ کوئی آیا ہے.... دوست یا عزیز۔ مجھے لینے صرف میرے دشمن آئے ہیں۔"

منظر سے ضبط نہ ہو سکا "ابے تو بھوتنی ... کے۔ دشمن بنائے ہی کیوں تھے؟"

خادم حسین کو بھی موقع مل گیا "ہاں بھئی' یہ تو انسان کے اپنے اعمال ہیں جو اس کے سامنے آتے ہیں۔"

منظر بولا "مگر تمہارے بداعمال تو ہمارے سامنے آرہے ہیں مولوی خادم حسین' شامت اعمال بن کے۔"

غالب مجھ سے گلے ملنے کے بعد محسن سے مل رہا تھا۔ نکی اور نازو بھی رابعہ اور گل سے مل کے خوشی کے آنسو بہا رہی تھیں۔

میں نے کہا "کیا ہو گیا یار منظر....!"

"ابے یہ ٹھرکی مولوی' میری بیوی پر ڈورے ڈال رہا ہے۔ بہت دن سے دیکھ رہا ہوں میں" منظر بولا "یہ آنکھ مارتا رہتا ہے اسے۔"

"یا اللہ" خادم حسین نے اوپر منہ اٹھا کے فریاد کی "اس شرمناک الزام کا میں کیا جواب دوں.... توبہ' توبہ۔"

میں نے کہا "کیا خیال ہے' ہم چلیں۔ سب باتیں یہاں تو نہیں ہو سکتیں۔ تم ایمبولینس لائے ہو؟"

غالب نے کہا "بالکل لائے ہیں۔"

دلاور نے کہا "میں.... فون کر کے اپنے گھر سے فیصل کو بُلا لوں؟"

میں نے کہا "کیا ضرورت ہے؟ ہم تمہیں ڈراپ کر دیں گے۔"

اس نے میری' محسن کی اور غالب کی صورت کو دیکھا اور سہلا کے ہمارے ساتھ چل پڑا۔ ہم تو اس کی بگڑتی حالت کو ہر لمحہ دیکھ رہے تھے مگر ان سب نے جو دلاور سے طویل وقفے کے بعد ملے تھے اس کی افسوس ناک حد تک خراب ہو جانے والی صحت کو حیرانی اور افسوس کے ملے جلے جذبات کے ساتھ دیکھا۔

میں نے دلاور کو غالب اور نازو کے سپرد کر دیا۔

وہ پیچھے بیٹھ گئے۔ منظر اور وقار یوسف اپنی اپنی گاڑیاں لائے تھے۔ منظر کی کار میں رابعہ اور گل کے ساتھ نکی بھی بیٹھ گئی۔ میں اور محسن وقار یوسف کے ساتھ رہے۔

وقار نے گاڑی نکالتے ہوئے کہا "یہ تو واقعی مرنے والا ہے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ ہماری خوش قسمتی ہو گی اگر اس کا ارادہ نہ بدلا اور اس نے وہی کیا جو کہا تھا۔"

محسن بولا "اور اس وقت تک زندہ بھی رہا۔"

"کتنی ناقابلِ یقین اور عبرت ناک ہے یہ شکست۔ جیسے سربفلک عمارت اچانک گر کے زمیں بوس ہو جائے۔"

"زلزلہ اتنا شدید ہو کہ بنیادیں ہلا دے تو یہی ہوتا ہے" میں نے کہا۔

محسن بولا "اس وقت ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

وقار نے کہا "نکی نے اپنے ابا کی وہ عظیم الشان کوٹھی صاف کرا دی ہے جہاں ابھی تک ان کی بدروح بھٹکتی محسوس ہوتی ہے۔"

"نکی نہیں ہے نا تو زبان چل رہی ہے بیٹے" محسن نے کہا "نکی کا باپ تیرا بھی تو سسر تھا۔ ان کو بدروح کہتا ہے بدبخت۔"

وقار بولا "یار مجھے ایسا لگتا ہے۔ یہ جذبات کا مسئلہ ہے۔ نقوی صاحب بڑی توپ چیز تھے اور انہوں نے ساری توپوں کا رخ میری طرف کر دیا تھا۔ بڑی مخالفت کی تھی کہ یہ شادی نہ ہو۔ وہ تو نکی نے میدان نہیں چھوڑا ورنہ میری کیا بساط اور اوقات تھی۔ اس کے سامنے ایسی بات میں واقعی نہیں کر سکتا۔ اپنے باپ کے لیے اس کے جذبات کا احترام مجھ پر بھی لازم ہے۔"

میں نے کہا "بہت مناسب جگہ ہے۔ اب ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ساری قانونی کارروائی کم سے کم وقت میں پوری ہو جائے اور ہم دلاور کو اس کے لواحقین کے سپرد کر دیں۔"

وقار نے کہا "ہم نے تمام انتظامات کر لیے ہیں مگر...."

"مگر کیا؟"

"آپ خود کو قانون کے حوالے کریں گے۔ آپ بھی محسن اور غالب بھی.... اور نازو بھی۔"

میں نے کہا "ہاں۔ یہ تو کرنا پڑے گا۔"

"اس کا بھی بندوبست ہو گیا ہے کہ آپ لوگوں کی ضمانت فوراً منظور ہو جائے۔ ضمانت کی درخواست آپ لوگوں کی گرفتاری پیش کرتے وقت ہی لگا دی جائے گی۔ بار ایسوسی ایشن کی کوشش سے یہ ممکن ہوا ہے کہ ایک دو دن میں آپ لوگ رہا ہو جائیں۔"

میں نے کہا "حوالات میں بھی رہنا پڑے گا؟"

"صرف کہنے کو۔ ورنہ وہاں گھر جیسا آرام ملے گا۔ سب سے بات ہو گئی ہے۔ اخباری نمائندوں کا مسئلہ نہ ہوتا تو روزنامچے میں صرف اندراج ہوتا۔ آپ اپنے گھر میں سوتے مگر اس کیس میں پولیس ضابطے کی کارروائی کرنے پر مجبور ہو گی' دکھانے کے لیے۔"

گاڑی نقوی صاحب کے پُرانے قصرِ عالی شان کے گیٹ پر پہنچی تو مسلح گارڈ نے گاڑی میں جھانک کے دیکھا اور وقار کے اشارے پر گیٹ کھول دیا۔

"تم نے دیکھا' سیکیورٹی کتنی سخت ہے۔ میں نہ کہتا تو وہ گاڑی کو اندر بھی نہ جانے دیتا" وقار یوسف بولا "دوسری گاڑی میں نکی ہے۔"

"اور ایمبولینس اندر کیسے آئے گی؟"

اس نے کہا "اب تو ہم اندر ہیں' ہم کلیرنس دیں گے۔"

میں نے گاڑی سے اُتر کے دیکھا تو مجھے دوسرے گیٹ کے اندر بھی ایک مسلح گارڈ نظر آیا۔ تیسرا گارڈ برآمدے میں ایستادہ کھڑا

تھا۔

میں نے کہا "کیا پوری بٹالین کھڑی کردی ہے حفاظت کے لیے؟"

"یہ ڈی آئی جی صاحب کا انتظام ہے۔ وہ میرے مرحوم و مغفور سسر کے بڑے قریبی دوست تھے۔ نکی نے ان سے کہا کہ انکل مجھے دھمکی ملی ہے کہ میرے میکے کو تباہ کردیا جائے گا۔ آگ لگا کے اور بم سے اڑا کے۔ یہ وہی دلاور کے ساتھی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ دلاور کو ہم نے غائب کیا ہے۔ ہم سے مراد ہم لوگ۔ ڈی آئی جی بھی سب سمجھتا ہے۔ اس نے رسماً پوچھا تھا کہ کیا یہ غلط ہے؟ نکی نے کہا کہ آپ خود آکے دیکھ لیں۔ میرا کیا تعلق ان کے معاملات سے۔ سُنا ہے وہ سب لندن میں ہیں اور ڈی آئی جی صاحب نے فرمایا کہ سُنا تو ٹھیک ہے تم نے۔"

"ایسا کہا تھا ڈی آئی جی نے؟"

"ہاں۔ تمہارے فرار کی خبر بھی مل گئی تھی پولیس کو۔ پھر لندن سے کسی نے فون کرکے بتایا تھا کہ تم لوگ وہاں کیا کررہے ہو؟"

"یہ کس کی حرکت ہوسکتی ہے؟" میں نے کہا۔

"کیا خود دلاور فون نہیں کرسکتا تھا؟" وقار بولا۔

"یہ لوگ کہاں رہ گئے، نکلے تو سب ساتھ ہی تھے" محسن نے کہا۔

وقار کے ساتھ ہم نے وہ کمرا دیکھا جس میں چوہدری دلاور کے قیام یا باعزت اسیری کے ایام کو زیادہ سے زیادہ محفوظ اور آرام دہ بنانے کے لیے قابلِ تعریف انتظامات کئے گئے تھے۔ یہ بیڈ روم سے زیادہ کسی بہت اچھے اسپتال کا وی آئی پی روم لگتا تھا۔

"ساتھ والے ایک کمرے میں ڈاکٹر سلمان ہیں۔ بہت مشہور آنکولوجسٹ ہیں۔ نرس، دلاور کے ساتھ ہی رہے گی، دوسری طرف سیکیورٹی والے ہیں۔"

میں نے کہا "اس ڈاکٹر نے یہاں رہنا کیسے منظور کرلیا۔ یہ صرف فیس کی بات تو نہیں ہوگی۔"

"وزارتِ داخلہ میں کوئی ایڈیشنل سیکریٹری ہے۔ مجھے اس کا نام اس وقت یاد نہیں آرہا ہے۔ اس نے ہماری بہت مدد کی۔ مجھے نکی نے بتایا۔ کہ وہ غالباً رابعہ کا پہلا شوہر تھا۔"

"وہ نامرد...." محسن نے کہا "وہ ایڈیشنل سیکریٹری ہوگیا۔"

میں نے کہا "محسن... وہ ایک شریف اور مہذب انسان تھا۔ قدرت نے اسے جیسا بنایا، اس میں خود اس کا کیا قصور۔ اس نے سخت مجبوری میں شادی کرلی تھی مگر پھر خود ہی رابعہ کو سب بتادیا تھا۔ اسے انتہائی عزت اور احترام کے ساتھ رکھا تھا اور ماں کے مرتے ہی طلاق دے دی تھی۔ اس نے رابعہ کو چھوا تک نہیں تھا۔ یہ بات رابعہ نہ بتاتی تو مجھے بھی معلوم نہ ہوتی۔"

دونوں گاڑیاں اندر آئیں اور پھر باری باری سب لوگ اندر آکے کشادہ اور روشن ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔ دلاور کا موڈ بہت خراب تھا۔ یقیناً اس کی راستے میں نازو اور غالب سے بات ہوئی ہوگی۔ اس نے اپنے گھر کی طرف چلنے کو کہا ہوگا اور غالب نے کہا ہوگا کہ تم ہمارے ساتھ ہو تو ہمارے ساتھ ہی رہو گے۔

میں نے کہا "چوہدری دلاور...."

وہ ایک دم پھٹ پڑا "مجھ سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی سکندر۔ کیا تم میں ہمت نہیں تھی کہ مجھ سے یہ کہنے کی کہ میں آزاد نہیں ہوں۔ اپنی مرضی سے اپنے گھر نہیں جاسکتا۔"

میں نے کہا "تم قید میں نہیں ہو۔"

"قید نہیں تو پھر یہ کیا ہے؟" وہ بولا "کیا لندن سے یہاں تک کہیں بھی میں نے تمہارے اعتماد کو دھوکا دینے کی کوشش کی تھی؟"

"نہیں۔"

"پھر میرے ساتھ یہ سلوک کیوں؟ تمہارا کیا خیال ہے کہ میں بھاگ جاتا۔ کیا اس وقت میں بھاگنے کی پوزیشن میں ہوں؟ اگر نہیں تو پھر مجھے اپنے گھر کیوں نہیں جانے دیا گیا؟"

میں نے کہا "بس ایک دو دن کی بات ہے۔"

"سکندر۔ میں اپنے بیوی بچوں سے ملنا چاہتا ہوں" وہ رو پڑا "تم ایک دو دن کی بات کرتے ہو، مجھے ایک دو گھنٹے کا بھروسا نہیں۔"

میں نے کہا "اوکے، اوکے۔ ہم انہیں بُلالیں گے یہاں، صبح ہونے دو۔"

"ابھی کیوں نہیں.... یہ ظلم ہے سکندر۔ میں یہاں ہوں اور ان کو کچھ پتا نہیں۔ اگر میں ان کو پتا چلنے سے پہلے مرگیا...."

"ایسا نہیں ہوگا" میں نے کہا "اس وقت وہ سو رہے ہوں گے۔ تم اچانک ان کو بتاؤ گے...تو کیا حالت ہوگی ان کی صدمے سے... بہتر ہوگا کہ ابھی تم اپنے کمرے میں جاکے آرام کرو۔"

"اچھا میں انہیں فون کرلوں...؟"

وقار نے کہا "یہ کوٹھی بند تھی، فون بھی بند پڑے ہیں۔"

دلاور نے بے بسی سے ہم سب کی صورتوں کو دیکھا۔ اس کی نظر میں ہم سب جیلر تھے اور یہ جیل تھی۔ دشمنی کا رشتہ ختم نہیں ہوا تھا۔ اس کی نوعیت بدل گئی تھی۔ شاید ہمارے سپاٹ اور بے حِس چہروں کو دیکھ کے اس نے سمجھ لیا ہوگا کہ اس پر کسی کو رحم نہیں آئے گا۔

"اچھا.... تم کہتے ہو تو پھر ٹھیک ہے" وہ اُٹھ کھڑا ہوا "مجبور میں ہوں، تم نہیں ہو۔ اس لیے وہی ٹھیک ہے جو تم کہتے ہو۔ مجھے بتاؤ اس جیل میں میرا کمرا کون سا ہے؟"

"یہ میرا گھر ہے دلاور" نکی نے کہا "تمہیں یہاں کوئی تکلیف ہو تو مجھے بتانا۔ تم یہاں میرے والد سے ان کی زندگی میں مل چکے ہو۔"

"ہاں، مجھے یاد ہے" وہ بولا "مگر میں تمہارا مہمان نہیں ہوں۔"

اِسی وقت اندر کسی کمرے میں فون کی گھنٹی بجی۔ دلاور نے ایک قدم آگے بڑھایا اور پھر پلٹ کے ہم سب کی طرف دیکھا لیکن منہ سے کچھ نہیں بولا۔ اس کی نظروں نے پھر کہا۔ ٹھیک وہی ہے جو تم کہتے ہو کیونکہ تم مجبور نہیں ہو۔ ہم میں سے کسی نے اس سے نظر نہیں ملائی۔ غالب اسے اپنے ساتھ لے گیا۔

محسن نے وقار یوسف کو پکڑ لیا جو دوسرے کمرے سے فون سُن کے آیا تھا "حد ہے آپ کی عقلمندی کی۔ جھوٹ وہ بولا جو فوراً پکڑا گیا۔"

وقار ہنسنے لگا "یار رانگ کال تھی۔"

"پھر بھی اسے معلوم ہوگیا کہ فون بند نہیں ہے۔"

وقار نے کہا "بس اسی وقت میرے ذہن میں جو بات آئی وہ میں نے کہہ دی۔ یہاں کون ہے فون کرنے والا۔"

نکی نے بھی اس کی تائید کی "مہینوں سے کوٹھی بند پڑی تھی۔ فون میں بھی صرف لائن رینٹ آتا تھا جو ہم ادا کردیتے تھے تاکہ فون بند نہ ہو۔"

"مجھے ایسا لگتا ہے کہ رانگ کال نہیں تھی" وقار بولا "میرے عزیز از جان سسر مرحوم کی روح نے عالمِ بالا سے یاد کیا تھا، اپنی لختِ جگر کو۔"

"مگر فون اُٹھایا زخمِ جگر نے" محسن بولا۔

"وقار۔ مجھے ایسا مذاق پسند نہیں" نکی بولی۔

"یہ مذاق نہیں خیال ہے میرا۔ آخر غالب کا سسر بھی تو بھوت ہے۔ نقوی صاحب کو لوگ ان کی زندگی میں جن کہتے تھے۔"

اس سے پہلے کہ نکی کا موڈ مزید خراب ہوتا، منظر اور مولوی خادم حسین نے اندر قدم رنجہ فرمایا "تم سب کمینے ہو۔ ابھی تک کسی نے پوچھا نہیں کہ ہم کہاں رہ گئے تھے اور اتنی دیر سے کیوں پہنچے۔"

خادم حسین نے کہا "کار کا ٹائر فلیٹ ہوگیا تھا۔"

"جس سائڈ پر تم بیٹھے ہوئے تھے" منظر بولا "تمہارے گناہوں کے بارے تو ٹریکٹر کا ٹائر بھی برسٹ ہوجائے۔"

"آپ خود برسٹ ہونے والے ہیں۔ آپ کیا ٹریکٹر کے ٹائر سے کم ہیں۔" خادم حسین نے خوش دلی سے کہا اور منظر ہوہو کرکے ہنسنے لگا۔

"نکی ڈارلنگ۔" وقار نے بڑے پیار سے کہا۔

نکی نے اس کی نقل اُتاری "پلیز کافی بنالاؤ سب کے لیے۔"

"تم تو دل کا حال جانتی ہو" وقار نے سر کھجایا۔

"میں تم کو اچھی طرح جانتی ہوں" وہ بولی "تمہارے کہنے سے پہلے ہی میں الیکٹرک کیٹل کا پلگ لگاچکی تھی۔ مگر دیکھو.... میرے آنے تک کوئی ایسی بات نہیں ہونی چاہیے جو پھر دُہرانی پڑے، ورنہ میں نہیں جاتی۔"

رابعہ نے کہا "تم بیٹھو، میں کافی بنا کے لاتی ہوں۔"

رات کے تین بجے صورتِ حال پر غور فرمانے کے لیے ایم آر ایس کے مردانہ زنانہ ارکان کا ہنگامی اجلاس ہوا۔ اجلاس صبح کا اجالا پھیلنے تک جاری رہا۔ اس میں مستقبل کے لائحہ عمل پر بحث ہوئی جس میں سب سے اہم کردار وکیلوں کا تھا چنانچہ رابعہ، منظر اور وقار یوسف نے بحث میں بڑھ چڑھ کے حصہ لیا اور بالآخر وہ طریقہ وضع کرلیا گیا جو سب سے آسان تھا اور کم سے کم وقت میں سا۔۔۔ قانونی مسائل حل کئے جاسکتے تھے۔

غالب کی موجودگی میں ہی ڈاکٹر نے دلاور کا معائنہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر اس نے انکار کردیا تھا۔ وہ دوائیں کھا کے لیٹ گیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ نرس بھی کمرے سے چلی جائے مگر نرس بھی سیکیورٹی سسٹم کا حصہ تھی۔ اس نے لائٹس آف کرکے زیرو واٹ کے بلب کی برائے نام روشنی میں کرسی پر بیٹھنے کو ترجیح دی تھی۔

صبح کا ناشتا سات بجے ہی کرلیا گیا پھر منظر اور وقار یوسف رخصت ہوگئے۔ انہیں آج ایک دن میں بہت سے قانونی مسائل سے نمٹنا تھا۔ دستاویزات تیار کرنی تھیں اور بظاہر ان سب کاموں کے لیے ایک دن بھی کم محسوس ہوتا تھا مگر انہوں نے کہا کہ جیسے بھی ممکن ہوا وہ رات تک اپنا کام ختم کرکے آئیں گے۔ پھر گل، رابعہ اور نگی سوگئیں۔ مولوی خادم حسین اپنی گھر والی کو لینے چلا گیا۔ اس کا خیال تھا کہ یہاں وہ امورِ خانہ داری سنبھالنے میں معاون ثابت ہوگی۔

نیند مجھے اور محسن کو بھی آرہی تھی مگر ہم سو نہیں سکتے تھے۔ ڈاکٹر نے ایک کاغذ پر نیند بھگانے والی گولی کا نام لکھ کردیا۔ یہ گولی امتحانات کے زمانے میں وہ پڑھاکو قسم کے لڑکے بھی استعمال کرتے ہیں جو سارا سال کتابیں چاٹتے ہیں یا رٹتے ہیں اور پھر بھی کوئی خاص تیر نہیں مارپاتے کیونکہ ذہانت اور سمجھ کے ساتھ یادداشت کی خداداد صلاحیت ان کو ورثے میں نہیں ملتی۔ اس گولی کے مسلسل استعمال کے مضر۔۔۔ رساں اثرات ہیں مگر کبھی کبھار کے استعمال سے کوئی نقصان نہیں ہوتا۔

ساڑھے آٹھ بجے میں دلاور کے پاس گیا تو محسن اور غالب بھی میرے ساتھ تھے۔ حسبِ توقع وہ جاگ رہا تھا اور سخت چڑچڑا ہورہا تھا۔ نرس اسے ناشتا کرانے کی کوشش میں ناکام تھی۔

"جہنم میں گیا ناشتا۔ ناشتا کروں گا میں اس وقت جب میرے بیوی بچے آئیں گے۔ ان ہی کے ساتھ۔"

میں نے کہا "ہم انہیں بلا لیتے ہیں، فون کرکے۔"

اس نے ایک گہری لمبی سانس لی "میں نے رات بڑی اذیت میں گزاری ہے سکندر۔"

"میں سمجھ سکتا ہوں" میں نے اس کے سامنے ٹیپ ریکارڈر رکھ دیا۔

"اس کا میں کیا کروں؟" وہ بولا۔

"تم کو جو بھی فون پر کہنا ہے۔ اس میں ریکارڈ کردو۔"

وہ مشتعل ہوگیا "میں خود فون نہیں کرسکتا، آخر کیوں؟"

"آج اور زیادہ سے زیادہ کل کا دن۔ تم کو حوصلے اور صبر سے کام لینا ہے۔" میں نے کہا "اس کے بعد تم اپنی فیملی کے ساتھ جہاں بھی چاہو رہ سکتے ہو۔ تمہیں مکمل آزادی حاصل ہوگی۔ نہ تمہیں ہمارا خوف ہوگا اور نہ پولیس کا۔ زندگی تمہاری اپنی ہوگی، جتنی بھی ہے۔ کسی کو بھی تمہارے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوگا کہ تم یہاں ہو یا لندن میں یا کہیں اور۔۔۔"

"تم عزت کے ساتھ ہونے والے صلح کے سمجھوتے کو میری شکست کی ذلت میں بدلنا چاہتے ہو" اس نے کہا "حالانکہ یہ۔۔۔"

"چُپ کیوں ہوگئے تم؟ تم ابھی تک اسے شکست تسلیم نہیں کرتے؟ یہ سمجھوتا اور کیا ہے دلاور۔ عزت اور ذلت دینے والا خدا ہے" میں نے کہا "تم سمجھوتا نہ کرتے تو کیا کرتے۔ کیا فرق ہے تمہاری پیشکش میں اور ہتھیار ڈالنے میں۔ وقت تمہارے پاس کم ہے۔ ہمارے پاس بہت وقت ہے۔ تم دنیا کے سارے معاملات کو ایسے ہی چھوڑنا چاہو تو تمہاری مرضی۔ تم جیسے شکاری کو بھی ہم نے محصور کرکے شکار کرہی لیا تھا اسے کیا کہا جائے۔ یہ کس کی بدقسمتی تھی اور کس کی خوش قسمتی کہ ہم سب سے بڑے شکاری نے تمہیں ہم سے بھی چھین لیا۔ اس سے پہلے کہ ہم اپنی کامیابی کا جشن مناسکتے۔"

"جشن تم اب بھی مناسکتے ہو۔۔۔ اور مناؤگے۔۔۔" اس نے دھیمے مگر تلخ لہجے میں کہا "یہ شکست کیا تمہاری نہیں ہے کہ تم مجھے تختۂ دار تک پہنچانے میں ناکام رہے۔"

"یہ ہمارے عزائم کی اور ارادوں کی شکست ہے، اور دلاور اس سے مجھے حضرت علیؓ کا وہ قول پھر یاد آتا ہے کہ میں نے اپنے رب کو اپنے ارادوں کی شکست سے پہچانا۔ بندہ اپنے ہر ارادے میں کامیاب ہوجاتا تو خدا کی خدائی کو کیوں تسلیم کرتا۔ ہمیں تو اس نے بروقت خودفریبی اور گمراہی سے بچالیا ورنہ ہم تو واقعی سمجھ رہے تھے کہ ہم جیسے چاہیں تمہیں مارسکتے ہیں۔ اگر یہ شکست ہے تو ہم اس پر اپنے خدا کے سامنے شکر گزار ہیں۔"

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد دلاور نے کہا "مجھے بتادو کہ میں کیا کہوں، کیا نہ کہوں؟"

"تم خود سمجھ دار ہو۔ ہم انہیں لے آئیں گے مگر ان کو پتا نہیں چلے گا کہ ان کو کہاں لایا گیا ہے۔ اس کے لیے ہم کیا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ یہ ہم نے ابھی تک سوچا نہیں۔ ہم ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ کے بھی انہیں لاسکتے ہیں اور گاڑی کے شیشوں پر کالا کاغذ بھی چپکا سکتے ہیں۔ تم انہیں سمجھاؤ کہ وہ بحث نہ کریں اور اعتراض نہ کریں۔ مشتعل نہ ہوں اور دھمکی نہ دیں۔ اگر انہوں نے کوئی غلط قدم اٹھایا تو نقصان ان کا بھی ہوگا اور تمہارا بھی۔ یہاں آنے کے بعد ان کی مرضی کہ تم سے مل کر چلے جائیں یا تمہارے ساتھ ہی رہیں اور جب تمہیں قانونی معاملات سے

فراغت ہو تو اپنے ساتھ لے جائیں۔ یہاں ان کو ہر آسائش فراہم کی جاسکتی ہے۔ وہ تمہارے ساتھ اسی طرح رہ سکتے ہیں جیسے اپنے گھر میں رہتے تھے۔ بس ان کا باہر کی دنیا سے کوئی رابطہ نہیں ہوگا۔ ہم ان کے ساتھ مہمانوں جیسا سلوک کریں گے۔ ان کی عزت میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔ یہاں سے جانے کے بعد وہ بالکل آزاد ہوں گے۔ ہم ان سے رازداری کا جو وعدہ کریں گے، اس پر قائم رہیں گے۔"

دلاور نے سر ہلایا اور ٹیپ ریکارڈر لے لیا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے ریکارڈ کرنے والا بٹن دبادیا اور بولا "بیٹا فیصل۔ یہ میری مجبوری ہے کہ میں تم سے براہِ راست فون پر بات نہیں کرسکتا۔ آرام سے میری بات سُنو اور اپنی ماں سے بھی کہو کہ اسپیکر والے فون پر سُن لیں اور سمجھ لیں۔ میں کوئی بات دُہراؤں گا نہیں۔ سوال کوئی مت کرنا کیونکہ میں جواب نہیں دے سکتا۔ یہ ایک ٹیپ ریکارڈ کیا ہوا پیغام ہے۔ میں تم سے براہِ راست مخاطب نہیں ہوں اس لیے ہر بات دھیان سے سنو۔"

میرے اشارے پر اس نے وقفہ دیا۔ میں نے کہا "تم کہہ سکتے ہو کہ یہ ٹیپ انہیں دوبار سُنایا جائے گا۔"

دلاور نے آگے بولنا شروع کیا "ابھی ابھی مجھے بتایا گیا ہے کہ ٹیپ کو پھر چلایا جائے گا، ایک بار۔ ساری بات ٹھنڈے دل اور دماغ کے ساتھ سُن کے ویسا ہی کرنا جیسا میں بتاؤں۔ جذباتی یا مشتعل ہونے کی بالکل ضرورت نہیں۔ اپنی ماں سے بھی کہہ دو کہ ان ہدایات کی ذرا بھی خلاف ورزی کی گئی تو نقصان تمہیں بھی ہوگا اور مجھے بھی۔ ہوسکتا ہے پھر یہ ملاقات ٹل جائے۔ شاید کبھی نہ ہو، اگر تم نے میری بات مانی تو پھر کوئی مسئلہ نہیں۔ میں تمہارے ساتھ گھر چلوں گا۔ اپنی بہنوں کو بھی ساتھ ہی لے آنا۔ خطرے یا فکر کی کوئی بات نہیں۔ میں پولیس کی تحویل میں نہیں ہوں۔ ایسا میں صرف اپنی حفاظت کے خیال سے کررہا ہوں۔"

میں نے اسے پھر اشارے سے روک دیا "ان سے کہو کہ جو بھی یہ ٹیپ لے کر آئے اس کے ساتھ آجائیں۔"

"تم فون پر نہیں سُنواؤگے؟"

میں نے کہا "نہیں۔ ابھی ابھی میں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔"

"اس ٹیپ کو فون پر سُنوانے کا ارادہ میں نے بدل دیا ہے" دلاور نے کہا "جو بھی یہ ٹیپ لے کر آئے، تم اس کے ساتھ آجاؤ۔ میں بتا نہیں سکتا کہ وہ کون ہوگا مگر ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ اسے اپنا۔۔۔ ہمدرد سمجھو۔۔۔ اس کے ساتھ۔۔۔ شرافت سے پیش آنا۔ اور اس سے بحث مت کرنا اور کوئی سوال مت کرنا۔۔۔ کیونکہ اسے کچھ معلوم ہی نہیں ہوگا۔ اس کا کام صرف تمہیں یہاں لانا ہے۔ اگر تم نے پولیس کو یا کسی اور کو اطلاع دینے کی حماقت کی تو بہت خرابی ہوجائے گی، باقی ملاقات پر۔"

اس نے ٹیپ ریکارڈر کو آف کردیا "کیا تم مطمئن ہو؟"

"بالکل" میں نے کہا "خدا کرے کہ فیصل اور اس کی ماں بھی اتنی ہی سمجھداری سے کام لیں۔ اب اپنے گھر کا پتا سمجھادو۔"

"وہ میرا گھر نہیں ہے" دلاور بولا "مگر میں بتادیتا ہوں کہ وہ کہاں ملیں گے۔"

پتا سمجھنے کے بعد میرے، غالب اور محسن کے درمیان ایک اور اجلاس ہوا۔ ہم نے اتفاق رائے سے ایک طریقہ کار وضع کیا۔ دلاور کی فیملی کو لانے کے لیے غالب اور نازو جائیں گے۔ ہم پرانی گاڑی میں جو مرحوم نقوی صاحب کی رئیسانہ شان کی مظہر تھی اور اب نکی کے زیر استعمال رہتی تھی، ایک ساتھ روانہ ہوں گے۔ ریگل چوک سے غالب اور نازو ٹیکسی میں منتقل ہوجائیں گے اور دلاور کی فیملی کو لانے کے لیے یہ ٹیکسی استعمال ہوگی۔ واپسی پر بڑی گاڑی پلازا سینما کے مقابل کھڑی ملے گی۔ سب لوگ ٹیکسی کو چیئرنگ کراس پر چھوڑ دیں گے اور پلازا سینما تک پیدل آئیں گے۔ یہ گاڑی نکی چلائے گی۔"

محسن نے کہا "نکی کے ساتھ کون جائے گا، یہاں کون رُکے گا؟"

میں نے کہا "نکی کے ساتھ مرزا غالب جائیں گے اور ان کی نازلی بیگم۔ یہ دلاور کی فیملی کو تیار ہونے کے لیے دس منٹ دیں گے۔ نازو اندر جائے گی اور اس بات کا خیال رکھے گی کہ فیصل کوئی احمقانہ حرکت نہ کرے۔ مثلاً فون استعمال نہ کرے۔ مسلح نہ ہو، ظاہر ہے غالب کو باہر انتظار کرنا ہوگا۔ اسے کوئی ڈرائنگ روم میں تو بٹھائے گا نہیں، وہ ٹیکسی میں بیٹھا رہے۔"

نازو اور نکی کو جگا کے اس پروگرام سے آگاہ کیا گیا۔ انہیں ساری بات سمجھنے کے بعد تیار ہونے میں آدھ گھنٹا لگا۔ غالب اتنی دیر میں بازار سے ٹائپ رائٹر میں استعمال ہونے والے کاربن پیپر اور گوند کی شیشی لایا۔ یہ کاغذ اس نے کار کے شیشوں پر اندر کی طرف بڑی صفائی سے لگائے۔ اس نے پیچ کس سے اندر والے ہینڈل بھی نکال دیے۔ سیاہ کاغذ گاڑی کے پیچھے والے شیشے پر بھی لگادیا گیا مگر سامنے والے شیشے کو کالا نہیں کیا جاسکتا تھا۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھنے والے کو آگے سے سب کچھ نظر آتا تھا۔ اس مسئلے کو محسن نے یوں حل کیا کہ آگے اور پیچھے والی سیٹوں کے درمیان ڈوری سے پردہ تان دیا گیا۔ پردے کی ڈوری کا ایک کنارہ پیچھے اور آگے والے دروازے کے بیچ والے حصے سے باندھا گیا اور دوسرا اسی طرح دوسری طرف۔

جب وہ روانہ ہونے لگے تو محسن نے کہا "ہم کیا کریں گے گھر بیٹھ کے؟ انڈے دیں گے۔"

"ہم اپنی مرضی کے مالک ہیں، انڈے دیں یا بچے۔"

"کیوں نہ ہم ساتھ ہی چلیں۔ دوسری گاڑی میں" محسن بولا۔

"اور یہاں کون ہوگا؟"

"اپنے مولوی خادم حسین آچکے ہیں۔ اپنی زوجہ محترمہ کے ساتھ۔ ان کے ہاتھ میں طمنچہ دے جائیں گے کہ ضرورت پڑنے پر جسے چاہیں نشانہ لے کرداغ دیں۔ یا ویسے ہی دل چاہے تو..."

"دوسری گاڑی کون سی ہوگی؟"

"آپ کی اپنی، جو آپ کی بیوی جہیز میں لائی ہے۔ اسی رومانی داستان کا ایک ایسا ہی کردار جیسا سوہنی مینوال کی اسٹوری میں گھڑے کا تھا۔ رابعہ کی لال عروسی فاکس ویگن۔ وہ خود تو گئی ہے منظر کے ساتھ۔"

"پھر ٹیکسی کی ضرورت نہیں۔ نازو اور غالب فاکس ویگن میں جائیں۔"

محسن بولا "ہم نکی کے ساتھ چلتے ہیں۔ دس پندرہ منٹ کا وقفہ دے کر بلکہ بہتر یہ ہوگا کہ نازو ہمیں دلاور کی فیملی کے ساتھ روانہ ہونے سے پہلے فون کرکے اطلاع دے کہ سب ٹھیک ہے۔ ہم اس کے بعد جائیں۔"

غالب اور نازو کو یہ سمجھا کے فاکس ویگن دے دی گئی۔ ان کے جانے کے بعد میں نے مولوی خادم حسین کو ساری صورت حال سمجھائی اور ریوالور تھمادیا۔ "اس میں چھ گولیاں ہیں۔ پانچ سے تم خودکشی کرلینا یا اپنی منکوحہ کے ہاتھوں شوقیہ قتل ہو جاؤ۔ ہمیں اعتراض نہیں۔ مگر ایک گولی ضرور بچالینا دلاور کے لیے۔"

"ایسی بھیانک باتیں مت کریں جی، ... صاحب!" وہ بولا "اللہ بچائے حرام موت سے۔"

"دلاور کو بھی ایسے ہی غصے میں مت ماردینا۔ کہیں تم اس سے کہو کہ چل بے میرے پاؤں دبا۔ اور وہ انکار کرے تو تم دھائیں سے توپ چلادو۔ کشتوں کے پشتے لگادو۔"

"اور خبردار جو گولی چلانے سے کوئی شیشہ یا گل دان ٹوٹا" نکی نے بھی اسے ڈانٹنا ضروری سمجھا "تمہارا نشانہ ایسا ہی ہے۔"

"حد کرتی ہیں جی آپ بھی...." وہ خفا ہوگیا۔

محسن نے کہا "تمہیں شادیاں کرنے کا بھی بہت شوق ہے۔ کہیں تیسری کرنے کے چکر میں دوسری کو ٹھکانے مت لگادینا۔"

خادم حسین نے ریوالور پھینک دیا۔ "لعنت ہے ایسے کام پر جناب جس کی خاطر ایسی باتیں سُننی پڑیں۔ دلخراش اور جگر خراش۔"

"گردے خراش اور پھیپھڑے خراش....اور سمع خراش۔ یار مولوی خادم حسین، تم بغیر کانوں والے خرگوش ہو۔"

"گوش کہتے ہیں جی فارسی میں کان کو۔ بے گوش ہوا تو خر ہوگیا۔ مجھے گدھا سمجھتے ہیں آپ؟"

"آدمی کو حقیقت شناس ہونا چاہیے۔ خیر اب ہم جارہے ہیں اور اگر واپسی پر یہ ریوالور ہمیں یہیں ملا تو ہم اسے دے آئیں گے تمہاری پہلی بیوی کو۔ ہمیں معلوم ہے وہ کہاں رہتی ہے۔ اسے تمہارا پتا بھی بتادیں گے" محسن بولا۔

مولوی خادم حسین نے فوراً ریوالور اُٹھالیا "اگر اللہ مجھے ایک خون معاف کرے ناجی' تو مجھے سوچنا پڑے گا کہ منظر صاحب کو ہلاک کروں یا آپ کو۔"

میں نے کہا "ٹاس کرلینا یار۔ سوچنے کے لیے تو دماغ کی ضرورت پڑتی ہے۔ دس پیسے کا سکہ مجھ سے لے لینا۔"

فون کی گھنٹی بجی تو خادم حسین کی جان چھوٹی۔ فون نازو نے کیا تھا "سب ٹھیک ہے۔ تم پہنچ جاؤ۔"

"ردِ عمل کیسا رہا؟" میں نے کہا۔

"جیسا متوقع تھا مگر میں نے کنٹرول کرلیا۔ ہم دس منٹ میں روانہ ہوں گے۔"

میں نے کہا "ہم سوا دس منٹ میں وہاں پہنچ جائیں گے تم بات ختم کرکے فون کو قتل کردو' میرا مطلب ہے ڈیڈ کردو۔"

"غالب باہر سے یہ کام کرے گا" وہ بولی۔

"گھر کے ملازم چوکیدار وغیرہ سے تو اندیشہ نہیں۔"

نازو نے کہا "یہاں ایسی کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔ یہ ایک عام سی جگہ ہے۔ غالباً خفیہ پناہ گاہ۔ گھر میں صرف ایک ملازمہ ہے۔ اسے کچھ پتا نہیں" نازو نے کہا پھر لائن کٹ گئی۔

نکی نے محسن سے کہا تھا کہ گاڑی وہ چلائے مگر اس نے صاف انکار کردیا "مجھے یہ گاڑی آسیب زدہ لگتی ہے نکی' بُرا مت ماننا۔"

"پاگل ہو تم۔"

"نہیں' مگر میں نے بھی تمہاری بات کا بُرا نہیں مانا" محسن نے دانت نکال کے کہا۔

میں نے کہا "بات یہ ہے نکی کہ ہم پردے میں بیٹھیں گے۔ تم اے سی ضرور چلا دینا۔ تمہیں معلوم ہے نا پلازا سینما؟"

"کیوں نہیں معلوم۔ میں نے فلم چن ماہی یا شاید ماہی منڈا دیکھی تھی۔"

میں نے اپنا سر پکڑلیا "نکی۔ وہاں انگلش فلمیں چلتی ہیں۔ بیئرنگ کراس سے دائیں ہاتھ۔ اب یہ مت پوچھنا کہ بیئرنگ کراس کدھر ہے؟"

ہمارے پہنچنے کے پانچ منٹ بعد رابعہ کی فاکس ویگن نمودار ہوئی اور ہماری گاڑی کے متوازن رک گئی۔ اس کی پچھلی سیٹ پر دلاور کی فیملی کے چار افراد افسردگی' بے بسی اور اشتعال کے ملے جلے جذبات کی تصویر بنے بیٹھے تھے۔ میں اور محسن بائیں جانب والے دروازے سے نکل گئے۔ وہ چاروں دائیں دروازے سے نقوی صاحب کی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ دلاور کی بیوی پہلے کچھ گداز بدن تھی مگر اب باقاعدہ موٹی ہوگئی تھی اور اس پر جیسے اچانک عمر نے حملہ کردیا تھا۔ اس کا بیٹا فیصل باپ کا نقشِ ثانی تھا تو دونوں بیٹیاں ماں کے آغازِ شباب کی تصویر اور بے انتہا حسین تھیں۔ رونے سے ان کی آنکھیں کچھ لال اور سوجی ہوئی لگتی تھیں۔

فیصل نے مجھے قاتلانہ نظروں سے گھورا مگر ماں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے اسے یاد دلایا کہ وہ خود کو کنٹرول میں رکھنے کا پابند ہے۔ دلاور کی بیوی کی آنکھوں میں مجھے صرف شکایت اور مایوسی نظر آئی۔ وہ کم ہمت عورت نہیں تھی مگر اسے وقت نے اور نصیب نے زندگی کی بہت سی خوشیوں سے محروم رکھا تھا جو اسے مفت مل سکتی تھیں مگر انمول تھیں۔ ابھی تک اسے معلوم نہیں تھا کہ کچھ دیر میں اسے وہ خبر ملنے والی ہے جو اس کی زندگی کو ویران کردے گی اور اس کی دنیا اُجاڑ دے گی۔ اسے بیوہ اور اس کے بچوں کو یتیم کردے گی۔ اور یہ کسی دنیاوی عدالت کا نہیں' تقدیر کا فیصلہ ہوگا جو بہت پہلے سُنایا جاچکا تھا مگر وہ آج پڑھے گی۔

میں اور محسن فاکس ویگن میں جا بیٹھے۔ اس کی اگلی سیٹ پر سے اُتر کے نازو اب نکی کے ساتھ بیٹھ گئی تھی۔ نکی نے اپنی گاڑی آگے رکھی۔ غالب نے بتایا کہ کیسٹ سن کے فیصل نے ہنگامہ کیا تھا مگر اس کی ماں نے اسے کنٹرول کرلیا۔ لڑکیوں نے بہت رونا دھونا کیا تھا۔ ایک مرحلے پر فیصل غصے میں ریوالور نکالنا چاہتا تھا مگر نازو نے اسے لات مار کے دیوار سے لگا دیا تھا اور سمجھا دیا تھا کہ بدمعاشی بھول جائے۔ جیسے اس کا باپ ساری بدمعاشی بھول گیا ہے۔ اس کی بیوی نے کہا کہ کم سے کم بچوں کے سامنے ان کے باپ کو ایسا مت کہو۔ نازو نے کہا پھر کیا کہوں۔ پیکرِ شرافت وانسانیت اور مجموعۂ خوبی "فرشتہ سیرت' عالی حضرت قبلہ وکعبہ جناب چوہدری دلاور حسین صاحب مدظلہ کہوں۔ ویسے اندر سے سب کی حالت خراب ہے۔ ان کو اندازہ ضرور ہوگیا ہے کہ خبر اچھی نہیں۔ دلاور کی بیوی نے پوچھا تھا کہ تم لوگوں نے دلاور کو ماردیا ہے یا وہ مرنے والا ہے تو مجھے بتادو۔ نازو نے کہا کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ ہم نے اسے انگلی تک نہیں لگائی۔ کیسٹ میں اس کی آواز ہے۔ وہ کہنے لگی کہ کیسٹ سے تاریخ کا تو پتا نہیں چلتا۔

دونوں گاڑیاں آگے پیچھے نقوی صاحب کی کوٹھی کے پھاٹک سے گزر گئیں تو پھاٹک بند ہوگیا۔ اس کی فصیل آٹھ نو فٹ اونچی تھی اور فولادی پھاٹک بھی اتنا ہی بلند تھا۔ فیصل نے اور پھر اس کی ماں نے کار سے اُترنے کے بعد اِدھر اُدھر دیکھا تو انہیں مسلح محافظ نظر آئے۔ دونوں لڑکیاں بہت سلجھی ہوئی تھیں۔ نکی اور نازو انہیں اندر لے گئیں۔

ہم ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔ ایک محافظ نے فیصل کی مکمل تلاشی کے دوران ریوالور برآمد کرلیا جو اس نے اپنی جراب میں چھپالیا تھا۔ نرس نے عورتوں کے بیگ دیکھے اور ان کی جسمانی تلاشی لے کر انہیں دلاور کے کمرے میں جانے کی اجازت دے دی۔

دوپہر گزر گئی۔ مولوی خادم حسین کی بیوی نے سب کے لیے کھانا تیار کیا تھا۔ دلاور اور اس کی فیملی کے لیے لنچ کی ٹرالی وہ خود اندر چھوڑ کے آئی۔ پھر ہم سب نے بھوک نہ ہونے کے باوجود کھانے کی رسمی کارروائی پوری کی۔ اس صورتِ حال نے سب پر

ایک عجیب سی بوجھل اضطرابی کیفیت طاری کردی تھی۔ میں غالب اور محسن کے ساتھ ڈرائنگ روم کے قالین پر لیٹا اور سوگیا۔ ہم سب خاموش تھے اور آنے والے دن کے بارے میں سوچ رہے تھے جب ہمیں گرفتاری پیش کرنا تھی۔ جو شاید دلاور سے ہمارے تعلق کا آخری دن تھا۔ کمرے میں صرف اے سی کی خنک سرسراہٹ تھی۔

چار بجے نکی نے مجھے بیدار کیا۔ میں اُٹھا تو مجھے دلاور کی بیوی صوفے پر بیٹھی نظر آئی۔ وہ رو رہی تھی۔ دوسرے صوفے پر فیصل بیٹھا ہوا تھا اور وہ ساری رپورٹیں دیکھ رہا تھا جو لندن کے ماہر ترین ڈاکٹروں نے دی تھیں۔ اس کی ساری اکڑفوں ختم ہوگئی تھی اور چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

میں نے کہا "آئی ایم سوری۔۔۔"

"کیوں؟ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے سکندر۔ تمہارے دل کی مراد بر آئی۔"

"میں نے کبھی ایسا نہیں چاہا تھا۔"

وہ تلخی سے بولی "اچھا۔ اس بات کا افسوس ہے تمہیں کہ دلاور کو پھانسی لگوانے کی حسرت دل میں ہی رہ گئی۔"

میں نے کہا "اگر اس کا مقدمہ عدالت میں جاتا تو شاید وہ بچ جاتا۔ آپ اسے بچالیتیں۔ دنیا بھر کے قابل وکیل مل کے اسے بچالیتے' میں جانتا ہوں۔"

فیصل خلا میں دیکھتے ہوئے بولا "اگر ہم انہیں امریکا لے جائیں؟"

میں نے کہا "ضرور لے جاؤ۔ جہاں بھی اُمید کی کوئی کرن نظر آئے' وہاں ضرور جاؤ۔ تاکہ تمہیں پچھتاوا نہ رہے بعد میں کہ تم جو کچھ کرسکتے تھے وہ بھی نہیں کیا۔"

"کوئی فائدہ ہوگا اس سے۔۔۔؟"

"میری معلومات اور ڈاکٹروں کی رائے پر سو فیصد بھروسا مت کرو۔ خدا کی قدرت میں کیا نہیں ہے۔ بعض اوقات دوا کارگر نہیں ہوتی' دعا کام کرجاتی ہے۔ معجزے میڈیکل سائنس کی ہسٹری میں بھی رونما ہوجاتے ہیں۔"

"میں نے۔۔۔ اپنی بہنوں کو کچھ نہیں بتایا ہے۔۔۔ اس بیماری کے بارے میں؟" وہ بولا۔

"جیسی تمہاری مرضی؟" میں نے کہا۔

"سکندر۔۔۔" دلاور کی بیوی نے کہا اور پھر طویل خاموشی کے بعد بولی "تھینک یو!"

"کس بات پر؟" میں نے کہا۔

"تم نے اسے۔۔۔ میرے حوالے کرنے کی بات مان لی۔"

"لیکن کس قیمت پر آئی' یہ بھی دیکھو۔۔۔" فیصل بولا۔

"جسے تم قیمت کہہ رہے ہو' وہ میرا حق تھا۔ جو میں بہرحال لے سکتا تھا اور اگر قیمت سمجھتے ہو۔۔۔ تو اس کی قیمت سے اپنے پاپا کی زندگی خرید کے دکھاؤ مجھے فیصل' میں سب چھوڑ دوں گا تمہارے لیے۔"

"اس کی بات کا بُرا مت مانو' یہ نوجوان ہے لیکن تم جیسا نوجوان نہیں ہے۔ اس کا خون گرم ہے ابھی۔۔۔" دلاور کی بیوی نے کہا۔

"ہم پاپا کو یہاں سے لے کر جائیں گے" فیصل بولا۔

"ٹھیک ہے۔ اگر سمجھ سکتے ہو' تو اس گھر کو اپنا گھر سمجھو۔ یہ میرا گھر بھی نہیں ہے۔ پھر بھی یہ گھر ہے اور یہاں وہ سب کچھ تمہیں فراہم کیا جاسکتا ہے جو تمہارے اپنے گھر میں تھا۔۔۔ اور ہے۔"

رابعہ اور منظر کے ساتھ وقار یوسف شام کو ذرا سی دیر کے لیے آیا۔ پھر رابعہ رُک گئی۔ وقار یوسف اور منظر اپنے آفس چلے گئے۔ انہیں بہت سی دستاویزات تیار کرنی تھیں۔ دلاور نے وہیں سے فون کرکے اپنے دو وکیلوں کو ان کے ساتھ تعاون کرنے کے لیے کہا۔

"آپ خود کہاں ہیں سر؟" ایک وکیل نے کہا "بہت سی باتیں آپ کے طے کرنے کی ہیں۔"

دلاور نے کہا "تم رابعہ کے چیمبر میں جاکے صرف قانونی ضرورت پوری کروگے۔ سارے فیصلے وہ خود کریں گے۔ تم کسی فیصلے پر اعتراض نہیں کروگے۔ تمہیں فیس پوری ملے گی مگر تمہارے سوا کسی کو کچھ معلوم نہیں ہونا چاہیے ورنہ تم دلاور کو جانتے ہونا۔ میں صرف اطاعت چاہتا ہوں۔۔۔ غیر مشروط۔"

"یس۔۔۔ یس سر۔" اس نے کہا۔

رات آٹھ بجے نقوی صاحب کی اسٹڈی میں ایک قانونی دفتر کھُل گیا۔ وہاں دلاور کے دو سینئر وکلا موجود تھے جو منظر اور وقار یوسف کے ساتھ مل کر کام کررہے تھے۔ رابعہ ہر دستاویز کو خود بھی دیکھ رہی تھی۔ دلاور وہاں ایک گھنٹا موجود رہا اور اس نے اپنے وکیلوں کو مفصل ہدایات دیں۔ دلاور کی کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ جو کچھ وہ کررہا ہے' وہ کیوں کررہا ہے؟ مگر دلاور نے انہیں واضح الفاظ میں بتادیا تھا کہ اعتراض کی گنجائش نہیں۔ وہ یہاں صرف قانونی صورتِ حال کی وضاحت اور پیچیدگی دور کرنے کے لیے آئے ہیں۔ دلاور کو اچھا بُرا سمجھانے نہیں۔

خود میں نے یا محسن نے کسی معاملے میں دخل اندازی نہیں کی۔ اگر ہم کوئی بات کرتے تھے تو منظر شور مچاتا تھا "ابے دفع ہو یہاں سے بھوتنی کے' یہ قانونی معاملات ہیں' ان میں ٹانگ مت اَڑا۔"

"پھر کیا اُڑاؤں' یہ مولوی خادم حسین کہہ رہا ہے کہ میں آپ کے گھر چلا جاؤں۔۔۔ آج رات۔۔۔"

"ہاں ہاں۔۔۔۔ میں تو مصروف ہوں۔ مختار نامۂ عام لیتا جا مجھ سے۔ جب تک مجھے فرصت نہ ہو میرے تمام ازدواجی معاملات

اس کے..... کیوں ٹھیک ہے خادم حسین؟ قائم مقام شوہر بن جاؤ جائز طریقے سے۔ ناجائز تعلقات تو قائم کر ہی رکھے ہیں تم نے میری بیوی سے۔"

"استغفراللہ..... استغفراللہ کس قدر گناہ کی بات ہے۔ اللہ آپ کو معاف نہیں کرے گا منظر صاحب۔ آپ تو پاگل ہیں' ذہنی مریض ہیں۔"

"پھر تو اللہ معاف کردے گا مگر جو کچھ تم بقائمی ہوش وحواس کررہے ہو۔ اس پر اسپیشل سیل میں رکھا جائے گا تم کو۔ جہنم کا شاہی قلعہ سمجھ لو۔ خصوصی چھترول ہوگی تمہاری۔"

رات گیارہ بجے تمام دستاویزات تیار ہوگئیں۔ رابعہ اور منظر نے ان کو اوکے کیا پھر دلاور نے۔ دلاور کے وکیلوں نے اس کے دستخط کرانے کے بعد قانونی شناخت اور گواہی کے طور پر اپنے اپنے سائن کیے۔ ساڑھے گیارہ بجے کال بیل بجی تو منظر باہر گیا اور واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک اجنبی تھا۔ وہ مجسٹریٹ تھا۔

دلاور کی دونوں بیٹیاں ایک الگ بیڈ روم میں سوگئی تھیں۔ ان کو دلاور نے زبردستی سونے کے لیے بھیج دیا تھا۔ فیصل اور اس کی ماں جاگ رہے تھے۔ مجسٹریٹ کو اس کمرے میں لے جایا گیا جہاں دلاور کے ساتھ نرس اور ڈاکٹر بھی موجود تھے۔ اسے بتایا گیا تھا کہ ایک شخص مرنے سے پہلے مجسٹریٹ کے سامنے کوئی بیان دینا چاہتا ہے۔ وہاں جو کچھ ہورہا تھا پہلے سے طے تھا اور یہ منظر کے علاوہ رابعہ کے دیگر ساتھیوں کی کوشش کا نتیجہ تھا مگر قانونی ضابطہ کار کے خلاف کچھ نہیں تھا۔

"تم نے یہ بیان پڑھ لیا ہے؟" مجسٹریٹ نے کہا۔

"جی' پڑھ لیا ہے اور سمجھ لیا ہے۔ میرے وکیلوں نے سمجھادیا ہے۔"

"اور یہ دیگر دستاویزات!"

"یہ بھی میری مرضی اور منشا کے مطابق تیار کی گئی ہیں۔ کسی دباؤ کے بغیر' بقائمی ہوش وحواس۔"

دلاور نے دفعہ ۱۶۴ کے تفصیلی بیان پر' سیل ڈیڈ' گفٹ ڈیڈ' ٹرانسفر' لیز اور میوٹیشن کے سب کاغذات پر پہلے ہی دستخط کردیے تھے۔ مجسٹریٹ نے اپنی موجودگی میں اس سے ہر صفحے پر دستخط لیے اور پھر سارے بیانات کی تصدیق کردی۔ اس نے ہر صفحے پر مہر لگائی اور دستخط کیے۔ اس کارروائی میں رات کا ایک بج گیا۔ تاریخ بدل گئی۔ یہ ساری کارروائی مکمل خاموشی کی بوجھل فضا میں مکمل ہوئی تھی۔ کمرے میں ہم سب تھے۔ دلاور کی فیملی میں سے فیصل تھا اور اس کی ماں تھی جو مسلسل رورہی تھی۔ خود فیصل اسے چپ کرانے کی کوشش میں باربار آنسو صاف کرتا تھا۔

درمیان میں ڈاکٹر نے دلاور کا معائنہ کیا اور نرس نے انجکشن لگائے۔ دلاور کے وکیل خاموش کھڑے رہے۔ مجسٹریٹ کے لیے یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی کہ صورتِ حال سنگین ہے اور عین ممکن ہے یہ مریض کی زندگی کی آخری رات ہو۔ ڈاکٹر کے علاوہ وکیلوں کی موجودگی سے ثابت ہوتا تھا کہ کسی معاملے میں کوئی گھپلا نہیں۔ وہ سب وکیلوں کو ذاتی طور پر بھی جانتا تھا۔ وہ سینئر وکیل تھے' مجسٹریٹ رات کے ایک بجے رخصت ہوگیا۔

دلاور نے لیٹے لیٹے ہاتھ بڑھایا "مبارک ہو سکندر بخت!" پہلی بار اس نے مجھے اپنے سکندر صاحب یا سکندرِ اعظم کے بجائے سکندر بخت کہا تھا۔ اس کی بیوی نے ایک چیخ ماری اور جہاں کھڑی تھی وہیں گر کے بے ہوش ہوگئی۔

میں نے ایک لمحہ تذبذب میں گزارا پھر اس کا ہاتھ تھام لیا "یہ مبارک باد دینے کا کوئی موقع نہیں' افسوس کی بات ہے دلاور۔ کہ جو ہوا' اگر نہ ہوتا تو اچھا تھا۔ یہ سب بہت برا ہوا' بہت برا..... اللہ تمہیں معاف کرے۔"

دلاور کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے "تم نے مجھے معاف کردیا ہے نا؟"

"ہاں' میں نے اپنے باپ کا خون تمہیں معاف کردیا ہے" میں نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

باہر دروازے کے ساتھ ہی دیوار سے لگی رابعہ رورہی تھی۔ اسے چپ کرانے والی نگی بھی رورہی تھی۔ گل خاموش تھی اور محسن خاموش تھا۔ نازو غائب تھی۔ میں نے اسے ڈرائنگ روم میں روتے دیکھا۔ اسے غالب خاموش کرانے میں مصروف تھا۔ یہ عداوتوں اور نفرتوں کا لاوا تھا جو آج آخری بار بہہ رہا تھا۔ یہ ملامتوں اور دکھوں کے ناسوروں کا زہر تھا جو آخری بار بہہ رہا تھا۔ یہ ندامتوں اور پچھتاووں کا سیل اشک تھا جو آخری بار بہہ رہا تھا۔ جنگ کوئی شطرنج کی بازی نہیں ہوتی۔ کرکٹ نہیں جس میں فاتح کو ورلڈ کپ مل جائے۔ ٹینس کا میچ نہیں جس میں ومبلڈن کا چیمپئن وہ کہلائے جو اپنے حریف کو ہرادے۔ جنگ صرف جنگ ہوتی ہے۔ جنگ صرف تباہی اور خرابی لاتی ہے۔ اس کے لیے بھی جو سمجھتا ہے کہ وہ جیت گیا اور ہارنے والے کے لیے بھی۔ جنگ نفرت سے پھوٹنے والا ببول ہے جس میں صرف کانٹے نکلتے ہیں۔ یا ایھا الابصار۔ اے آنکھیں رکھنے والو! اور عقل رکھنے والو۔ تمہارے لیے اس میں سیکھنے کو اور سمجھنے کو بہت کچھ ہے۔ پھر تم کیوں امن اور محبت کے بیج نہیں بوتے۔ کیوں دلوں کی زمین کو ہوس سے پاک کرکے قناعت سے آبیاری نہیں کرتے کہ جب پیار کے خوش رنگ پھول کھلیں تو تم کو یہ دنیا بھی جنت ہی محسوس ہو۔

صبح ہم اپنے قانونی مشیران کے ہم رکاب ایسے اجتماعی گرفتاری پیش کرنے گئے جیسے سیاسی لیڈران سرکاری مہمان بنتے جاتے ہیں۔ رابعہ اور منظر نے ہمیں یقین دلایا کہ سب پہلے سے طے شدہ ہے۔ ادھر پولیس ہمیں گرفتار کرے گی ادھر عدالت میں ہماری پھر ضمانت کے لیے درخواستیں دائر کردی جائیں گی۔ عدالتِ عالیہ کے روبرو چوہدری دلاور کا بیان بعد میں پہنچے گا۔ پہلے اسے

ڈسٹرکٹ سیشن جج کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ ضمانت نامے تیار ہیں۔ ضامن تیار ہیں۔ وکیل سرکار کو آج ہی نوٹس جاری ہوگا اور کل تک ضمانت منظور ہوجائے گی۔

تھانہ انچارج پہلے سے یوں ہمارا منتظر تھا جیسے دلہن والے برات کی آمد کے منتظر ہوتے ہیں۔ وہ ایک پرانا پاپی تھا مگر اس کو ہر طرح سے سمجھادیا گیا تھا۔ مک مکا کے عوامی طریقے سے بھی اور اوپر والوں کے اشارے سے بھی چنانچہ اس نے ہمارا استقبال بھی دلہن کے ابا کی طرح کیا۔

"آؤ جی سرکار۔ خیراں نال پہنچ گئی جے سواری" اس نے مجھ سے مصافحہ کیا۔ پھر محسن' غالب اور نازو سے۔

میں نے کہا "ایک نہ ایک دن آنا ہی تھا جی لوٹ کے" میں نے کہا۔

"آپ سے بڑا شوق تھا ملنے کا۔ بڑے قصے سنے ہیں جی آپ کے۔ میں تو خیر ادھر رہتا ہوں مگر پرانے لوگ اپنے ہی ساتھی ہیں۔" وہ بولا۔

میں نے کہا "پہلے تم ہمیں گرفتار کرلو۔ باقی باتیں بعد میں۔"

"کیوں نہیں جی۔ جیسا حکم آپ کا۔ اوئے عزیز کو بولو روزنامچہ لائے۔" اس نے بہ آواز... بلند کہا "اور چائے شائے بھی۔"

باہر سے غائبانہ آواز آئی "لیں' سرجی۔"

رابعہ' منظر اور وقار یوسف نے کہا "ہم تو چلتے ہیں۔ عدالت میں بھی ہمارا انتظار ہوگا۔ ہم دیر کرنا نہیں چاہتے۔"

ایس ایچ او کے اصرار کے باوجود وہ چائے پیے بغیر چلے گئے۔ ہم بھی ناشتا کرکے آئے تھے مگر تھانے دار کے خلوص اور مہمان نوازی کے جذبات کو مجروح کرنا مجھے اچھا نہیں لگا۔

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے۔ مجھے وہ رات یاد آئی جب پہلی بار مجھ سے تھانے میں روایتی طریقے سے تفتیش کی گئی تھی۔ میرے سر کے اوپر بالٹی الٹی رکھ کے باہر اسے ڈنڈوں اور سریوں سے پیٹا گیا تھا اور اس شورِ محشر نے مجھے کئی بار بے ہوش کیا تھا۔ میرے اعصاب کا نظام وقتی طور پر مفلوج ہوگیا تھا اور میں نہ کھڑا ہوسکتا تھا اور نہ اپنی مرضی سے ہاتھ پاؤں ہلا سکتا تھا۔ مجھے پیشاب پاخانے پر کوئی کنٹرول نہیں رہا تھا۔ میں گوشت پوست کا ایک صحیح سالم نظر آنے والا بے ہنگم ڈھیر بن گیا تھا۔ وہ چوہدری دلاور کے در پر حاضری دینے والے پولیس افسران تھے جنھوں نے اس سے منہ مانگا معاوضہ لے کر مجھے دل کھول کے تختۂ مشق بنایا تھا اور میرے خلاف اس کی خواہش کے مطابق مقدمات درج کیے تھے۔

آج دلاور بظاہر صحیح سالم نظر آنے والا گوشت پوست کا ڈھیر تھا مگر قانون کے محافظ اس کی طرف داری چھوڑ کے میری حمایت کررہے تھے اور میری مرضی اور خوشی کے مطابق اسی طرح پیش آرہے تھے جیسے مالک کے اشارے کو سمجھ کے کتا دُم ہلاتا ہے۔ میں نے ایک ایک کرکے سارے دشمنوں کو ٹھکانے لگادیا تھا اور ساری مشکلات پر قابو پالیا تھا۔

مجھے اپنی داستان حیات میں مغل شہنشاہ ہمایوں کے حالات زندگی کی واضح جھلک محسوس ہوئی تھی جس نے ہندوستان میں مغل سلطنت کی بنیاد رکھی۔ پھر حکومت گنوائی' دربدر ہوا' جلاوطن ہوا۔ بڑی مشکل سے جان بچا کے ایران پہنچا اور پھر اپنے دوستوں کی مدد سے دوبارہ ہندوستان لوٹا۔ دشمنوں کو شکست دی اور پھر اپنی حکومت ایسے قائم کی کہ اس کا بیٹا اکبر اعظم ہوا۔ میں نے بھی سب کچھ گنوا کے پھر پایا تھا اور بڑی خواری برداشت کی تھی۔ مجھے میرا حق اور انصاف دلانے کی اس جدوجہد میں خدا کے بعد سب سے زیادہ میرے دوستوں کی مدد شامل تھی' جنھوں نے میری خاطر اپنا سب کچھ داؤ پر لگادیا تھا۔ جان ومال' عزت آبرو' مستقبل۔ ایم آر ایس تو ایک مذاق کی بات تھی مگر یہی وہ حقیقت بھی تھی جس کی طاقت نے مجھے اور میرے دوستوں کو سرخرو کیا تھا۔ یہ واقعی مائٹ از رائٹ سوسائٹی بن چکی تھی جس میں ہم اصول اور قانون کے کتابی نظریات اور پچھلی صدی کے اقوالِ زریں پر عمل کرکے نہیں جی سکتے تھے۔ ظلم کی کھیتی سدا پھلتی نہیں۔ ناؤ کاغذ کی سدا چلتی نہیں۔ آج مشکلات کے سارے دریا اور سمندر انہی کشتیوں سے عبور ہوئے تھے جو قائداعظمؒ کی تصویروں والے کاغذوں سے بنی ہو۔ ظلم کی کھیتی خوب پھل پھول رہی تھی۔ حق کا بول بالا اور دشمن کا منہ کالا' والی بات گوروں کے مہذب جمہوری اور ترقی یافتہ معاشرے میں بھی کالوں کو ان کا حق نہیں دلاتی تھی۔ اب چراغ تلے نہیں چراغ کے اوپر اندھیرا ہوتا تھا۔

ہمارے آرام کے لیے تھانے کا ایک کمرا مختص کردیا گیا تھا جہاں ویسے تو خود ایس ایچ او صاحب استراحت' تفتیش اور عیش کرتے تھے۔ حسبِ ضرورت۔ اس میں ایک بیڈ تھا' ایک صوفہ سیٹ اور اے سی جس کی خنکی میں اور اسی کمرے کی پرتکلف مہمان نواز فضا میں اس غلیظ' بدبودار اور اذیت ناک... حوالات کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا جس میں اس وقت بھی بہت سے بدبخت اور سکندر بخت پڑے تھے۔ کچھ گزشتہ شب تفتیش کے عمل سے گزر چکے تھے۔ کچھ پر آج کی رات بھاری تھی۔ ان کے ورثا پریشانی میں دوڑ بھاگ کررہے تھے۔ نذرانے لارہے تھے۔ سفارشیں لارہے تھے۔ کس پر کیا فردِ جرم عائد کی جائے۔ کس مجرم کے سارے گناہ معاف کردیے جائیں' مزید کتنے مجرم درکار ہیں۔ بھاؤ تاؤ' نرخ' سودے' تھانے کا سارا کاروبار اپنی ساری..... روایات کے ساتھ جاری تھا۔

رابعہ کے ساتھ منظر اور وقار یوسف شام کو لوٹے تو بہت خوش اور مطمئن تھے۔ چوہدری دلاور کی طرف سے تمام دستاویزات پیش کردی گئی تھیں اور قبول کرلی گئی تھیں۔ رجسٹرار کے دفتر میں بھی تمام کاغذات داخل ہوگئے تھے اور ان کی رسید مل گئی تھی۔

مجسٹریٹ نے چوہدری دلاور کے اقبالی بیان پر نوٹ لکھا تھا کہ اسے فلاں فلاں وکیل نے رات کے وقت کسی ایک قریب المرگ شخص کا بیان لینے کے لیے کہا اور اس کی اہمیت کے پیشِ نظر میں نے چوہدری دلاور نام بتانے والے اس شخص کا بیان ریکارڈ کیا جس کو وکیلوں نے شناخت کیا اور اس نے میری موجودگی میں اپنے دستخط ثبت کیے۔ بیان بلاجبر و کراہ اور بقائمی ہوش و حواس دیا گیا تھا اور اس کے گواہ بھی وکیل ہیں۔

اسی شام چوہدری دلاور کو اس کی بیوی بچے اپنے ساتھ لے گئے اور نقوی صاحب مرحوم کی وہ کوٹھی پھر ایسے بند کردی گئی جیسے کبھی کھولی ہی نہیں گئی تھی۔ عدالت کے حکم پر جب چوہدری دلاور کی گرفتاری کے لیے پولیس نے اس جگہ چھاپا مارا تو اسے گیٹ مقفل ملا اور عینی شاہدین نے بتایا کہ مذکورہ پتے پر اب کوئی نہیں رہتا۔ اس کے مالک نقوی صاحب کے انتقال کے بعد سے کوٹھی میں کسی نے رہائش اختیار نہیں کی۔ نقوی صاحب کے ورثا کے بارے میں کسی کو علم نہیں کہ وہ کہاں ہیں.... وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ چوہدری دلاور مفرور و مطلوب مجرم زیرِ دفعہ فلاں فلاں۔ ضابطہ فوجداری و دیوانی' ہنوز لاپتا ہے۔ پولیس اسی قسم کی رپورٹیں دیتی رہتی ہے۔ بعد میں وکیلوں نے کہا کہ سارے بیانات اور دستاویزات انہوں نے اپنے مؤکل کی ہدایت کے مطابق تیار کیے تھے اور یہ ہدایات انہیں ٹیلی فون پر نامعلوم مقام سے موصول ہوئی تھیں۔ ایسا فرض کیا جاسکتا ہے کہ چوہدری دلاور نے ایک دن کے لیے اس کوٹھی میں رسائی حاصل کرلی تھی جہاں مجسٹریٹ نے اس کے بیان کی تصدیق کی اور اس کے بعد وہاں سے نامعلوم مقام پر روپوش ہوگیا۔ عدالت اس کی باریابی کے لیے نئی ہدایات جاری کرسکتی ہے۔

آن دی ریکارڈ وہ رات ہم نے حوالات میں گزاری۔ آف دی ریکارڈ حقیقت یہ ہے کہ ہم سب نے وہ رات وقار یوسف کے گھر میں گزاری جہاں نکی نے ہم سب کے لیے ایک شاہانہ ضیافت کا اہتمام کر رکھا تھا۔ اس نے سارا دن انتظامات کے آرڈر دیتے گزارا تھا۔ اس نے اپنے گھر کی چھت پر یہ چھوٹی سی تقریب رکھی تھی۔ "یہ تمہید ہے" اس نے کہا "ان گنت شاندار تقریبات کے سلسلے کی۔ افوہ۔ میں تو سوچ سوچ کے پاگل ہو رہی ہوں کہ کیا مصروفیت کا زمانہ آنے والا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا یہ سب کیسے ہوگا۔ تم لوگ ایک شیڈول بنالو۔"

میں نے کہا "کیسا شیڈول؟"

"بھئی حد کرتے ہو تم بھی۔ کتنی شادیاں ہیں جو مجھے ارینج کرنی ہیں۔ تمہاری اور رابعہ کی' غالب اور نازو کی' گل اور محسن کی۔"

"ہمارے سوا سب شادی شدہ ہیں خاتون" غالب نے کہا۔

"اجی چھوڑو۔ ایسے ہوتی ہیں شادیاں۔ شادیاں جب ہوں گی نا تو پتا چلے گا سارے شہر کو۔ ہاں' نمبر لگالو' قرعہ اندازی سے یا چلو پہلے تم ہی کرلو۔ مگر بھئی ایک ہفتے میں ایک شادی۔"

خادم حسین نے منمنا کے کہا "ایک میری بھی تو ہے جی۔"

"تمہاری... ہاں' کیوں نہیں" نکی نے کہا "تم کیا ہم سے الگ ہو۔"

اس رات ہم سب خوش تھے۔ ہم نہیں جانتے تھے کہ چوہدری دلاور کہاں ہے۔ ہم سب ہنس رہے تھے' ایک دوسرے سے مذاق کررہے تھے۔ منظر اور خادم حسین لڑ نہیں رہے تھے۔ نازو اور غالب بھی نہیں لڑ رہے تھے۔ دنیا بدل گئی تھی۔ سب کے لیے' یا سب نے مل کے دنیا کو بدل دیا تھا۔

○☆○

حرفِ آخر

چھ ہفتے بڑی مصروفیت کے تھے۔ میں نے لندن سے واپس آنے کے بعد ایک ایسی زندگی گزاری تھی جس میں خانہ بدوشوں کی زندگی سے زیادہ بے ترتیبی اور انتشار کی کیفیت تھی۔ کوئی معمول اور نظم وضبط نہیں تھا۔ جینے کا کوئی سلیقہ اور قرینہ نہیں تھا۔ بس ایک مسلسل جدوجہد تھی جس کا حاصل دربدری اور جلاوطنی جیسی محرومی تھا۔ پریشانی اور پشیمانی کے تعاقب کرنے والے پُر آسیب سائے تھے۔ خوف اور بے بسی تھی۔ قرار کی خواہش میں فرار تھا' مسلسل فرار۔

اس زندگی کو عام لوگوں جیسی زندگی کی طرح معمولات کے دائرے میں لانا' جذبات اور خواہشات کے سارے رنگوں سے سجانا' اس میں رشتوں کی اور رفاقتوں کی ہم آہنگی اور مقصدِ حیات کا توازن پیدا کرنا یقیناً ایک مشکل کام تھا جو ہم سب نے ایک ساتھ کیا اور مل کے کیا۔ رابعہ نے اپنا آفس سنبھالا اور میں نے اپنا کاروبار منظم کیا۔

سب سے پہلے غالب اور نازو کی شادی ہوئی۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ دھوم دھام سے۔ پھر اس نے محسن کے ساتھ مل کے نقوی صاحب مرحوم کی پُرانی کوٹھی میں رہائش اختیار کی۔ اس شرط پر کہ وہ نکی کو اس کا کرایہ باقاعدگی سے ادا کریں گے۔ نکی نے انتہائی مجبوری کے عالم میں اسے ناگزیر سمجھتے ہوئے قبول کیا ورنہ ظاہر ہے اسے کرائے کی معمولی رقم کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اتنی بڑی کوٹھی تھی کہ محسن اور غالب کیا دو بڑے خاندان بھی اس میں گزارا کرسکتے تھے۔ اس کے سرونٹ کوارٹر میں جو تین کمروں پر مشتمل اچھا خاصا مکان تھا خادم حسین اور اس کی بیوی نے رہنا قبول کیا۔ وہ کسی طرح بھی کوٹھی کے ایک دو کمروں میں رہنے کے لیے تیار نہ تھا۔

غالب نے اپنے اخبار سے صحافت کا آغاز تو بہت پہلے ہی کردیا تھا۔ اب اسی اخبار میں نازو نے کرائم رپورٹر کی حیثیت سے شمولیت اختیار کی۔ اور بعد میں بڑی دُھومیں مچائیں۔

میں نے محسن کے ساتھ مل کے اپنے تمام اثاثوں کی ملکیت حاصل کی۔ جہاں کبھی وزیر خان نے وزیر انجینئرنگ کی بنیاد رکھی تھی جو بعد میں دلاور کے شامل ہونے سے ایم ڈبلیو ڈی کمپلیکس بن گیا تھا۔

وہاں اب ایک خیراتی شفاخانہ چل رہا تھا مگر درحقیقت یہ وہ شرمناک کاروبار تھا جو دلاور نے ڈاکٹر شاہ کے ساتھ مل کے چلایا تھا۔ ہم نے تمام مریضوں کو مینٹل اسپتال شفٹ کیا یا ماہرینِ نفسیات کے پاس بھیج دیا۔ ایک بار پھر یہاں زرعی مشینری کے پُرزے بنانے کی فیکٹری لگانے کا فیصلہ کیا گیا۔ پُرانی مشینری کا اب کہیں پتا نہ تھا۔ یہ سارا کام نئے سرے سے ہونے والا تھا۔ اس کے لیے سرمائے کی فراہمی کوئی مسئلہ نہیں تھی۔ محسن کے والد مرحوم شیروانی صاحب وزارتِ خزانہ کے فنانشل ایڈوائزر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے تھے۔ ان کے دو ہی وارث تھے۔ فوزیہ اور محسن۔ فوزیہ کے انتقال کے بعد سب کچھ محسن کو ملا تھا۔ اسلام آباد میں ان کی کوٹھی تھی اور بینک میں ریٹائرمنٹ کے بعد ملنے والا تمام پیسہ محفوظ پڑا تھا۔ فوزیہ کا مکان اور اس کے شوہر کے تمام واجبات بھی محسن ہی کو ملے۔ وہ برابر کے سرمائے سے کاروبار میں میرا پارٹنر بنا۔ اس کا نام ہم نے اتفاقِ رائے سے "ایم آر ایس" انجینئرنگ کمپلکس رکھا۔ محسن' رابعہ اینڈ سکندر اس کے پارٹنر تھے۔ رابعہ نے صرف سرمایہ فراہم کیا تھا۔ وہ ورکنگ پارٹنر نہیں تھی۔ اس نے وقار یوسف کو پارٹنر بنا کے رابعہ اینڈ وقار لاء ایسوسی ایٹس کے لیے اپنی ساری توانائیاں وقف کردیں۔

جس روز ہم اپنی ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی میں منتقل ہوئے اسی دن چوہدری دلاور کا سوئم تھا۔ رابعہ نے اس کوٹھی میں نیا رنگ و روغن کرایا تھا اور اسے نئے سرے سے ڈیکوریٹ کرنے میں بڑی محنت کی تھی۔ اس کام میں رابعہ کی مشیرِ خاص اور معاونِ خصوصی نکی تھی جس نے عملاً ساری خریداری کی اور کام کی نگرانی بھی۔ پھر اس نے اعلان کیا کہ شادیاں تو خیر ہوگئیں مگر اب ساری شادیوں کی خوشی میں ایک عظیم الشان جشن منعقد ہوگا اور ایک ایسی ضیافت ہوگی جسے لوگ یاد رکھیں گے۔ اس معاملے میں وہ ہم سے زیادہ پُرجوش تھی اور اس کا ساتھ دینے میں نازو اور گل بھی پیش پیش تھیں۔ یہ طے ہوگیا کہ جس دن میں اور رابعہ اپنے گھر میں منتقل ہوں گے اس دن یہ تقریب ہوگی۔ اس کے لیے نکی نے بہت خوب صورت دعوت نامے چھپوائے۔ لمبی چوڑی فہرست بنائی کہ کس کس کو بُلایا جائے گا۔ پھر مینیو کا فیصلہ کیا کہ سروس کس کی ہوگی اور کیٹرنگ کس کی۔ یہ فہرست اتنی طویل ہوگئی کہ کارڈ کم پڑگئے۔ گل اور خادم حسین کی بیوی سارا دن اس کے ساتھ پھرتی تھیں۔ نازو [illegible] طور پر فارغ تھی اور رابعہ نے صاف معذرت کرلی تھی کہ ابھی اس کے پاس ان کاموں کے لیے وقت نہیں ہے۔ نکی نے اس کا بہت بُرا مانا تھا اور "کام کام' جب بوڑھی ہوجاؤ گی پھر وقت ملا تو کس کام کا' بھاڑ میں گیا کام۔ بس یہ تقریب ہوجائے اس کے بعد تم لوگ جاؤ مری سوات' کاغان اور خپوار جو کسی نے سیزن ختم ہونے سے پہلے واپس آنے کا نام لیا" اس نے ایک دن رابعہ کو اور مجھے ڈانٹا۔

میں نے کہا "تم تو جگت ساس کا رول ادا کررہی ہو۔ ایک ساتھ چار بہوؤں پر حکم چلارہی ہو۔ رابعہ' گل' نازو اور خادم حسین کی منکوحہ۔"

"اس کی پانچویں بہو میں ہوں" وقار نے کہا۔

"کام تم لوگ کچھ کرتے نہیں' باتیں کرتے ہو۔ ابھی تک کسی نے فہرست پر ایک نظر نہیں ڈالی۔ بعد میں کہو گے فلاں کو تو بُلایا ہی نہیں۔"

میں نے کہا "نکی' شہر میں کون بچا ہے اب؟ سب کو تو تم بُلا رہی ہو۔"

"نو۔ صرف ایک ہزار مہمان تھے۔ اب گیارہ سو ہوگئے ہیں۔ کارڈ اور چھپوانے پڑیں گے" وہ بولی۔

"میری فکر مت کرو۔ میں کارڈ کے بغیر آجاؤں گا" وقار نے کہا۔

منظر نے کہا "اور میں بھی۔ اپنے سترہ بچوں اور ایک بیوی کے ساتھ۔ تمہارے انیس کارڈ بچ گئے نکی۔ بس اس بھوتنی کے مولوی خادم حسین کو مت بُلانا' اسے دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اتر آتا ہے۔ میرے سترہویں بچے کی صورت اس سے کتنی ملتی ہے۔ اس کے تو داڑھی بھی نکل رہی ہے ایسی ہی۔"

"لاحول ولاقوۃ۔ داڑھی چھوڑیں میری' یہ سخت گناہ ہے منظر صاحب۔ آپ اتنے بے شرم ہوگئے ہیں کہ خواتین اور خود اپنی اہلیہ کے سامنے ایسی باتیں کرتے ہیں' آپ کی وجہ سے میرا بلڈ پریشر بڑھ جاتا ہے۔"

جس رات یہ تقریب اپنے عروج پر تھی۔ ہماری ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔ باہر مہمانوں کی کاریں صف بستہ تھیں اور میرے ساتھ رابعہ پوری دلہن بنی آنے والوں کا استقبال کرنے کے لیے کھڑی ہوئی تھی۔ ایک گاڑی عین دروازے کے سامنے آ کے رُکی۔ میں رابعہ کے ساتھ آگے بڑھا۔ شوفر نے پیچھے والا دروازہ کھولا اور دلاور کی بیوہ نے باہر قدم رکھا۔ پھر فیصل اُترا۔ حیرت سے میں اور رابعہ اپنی جگہ منجمد ہو گئے۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ میں اسے خوش آمدید کہوں یا اس سے تعزیت کروں۔ دو دن پہلے ہی ہم دلاور کی تدفین میں شریک ہوئے تھے۔ اس کے انتقال کی خبر بھی ہمیں فیصل نے دی تھی اور ہم خاموشی سے قبرستان پہنچ گئے تھے جہاں شرکا کی تعداد افسوس ناک حد تک کم تھی۔

"آیئے مسز دلاور۔" میں نے بالآخر کہا۔

"کیا حال ہے فیصل!" رابعہ نے کہا۔

"میں بن بلائے آئی ہوں سکندر!" دلاور کی بیوہ نے کہا۔

"یور آر ویلکم مسز دلاور، پلیز اندر آیئے۔" میں نے کہا۔

رابعہ نے کہا "آپ کی بیٹیاں کہاں ہیں۔ انہیں کیوں نہیں لائیں آپ؟"

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے "میں ضرور لاتی۔ اگر آج ان کے باپ کا سوئم نہ ہوتا۔"

"اوہ۔ آئی ایم سوری میں بھول گیا تھا۔"

"میں ایک خاص مقصد سے آئی ہوں سکندر اور اس کے لیے یہی موقع مجھے مناسب لگا۔ تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ اس کے لیے میں نے خود کو کتنی مشکل سے تیار کیا۔ لیکن یہ ضروری تھا' ابھی میں عدت میں ہوں۔"

"آپ اندر آئیں ہم بیٹھ کے بات کرتے ہیں۔"

"نہیں' میں اندر نہیں جاؤں گی۔ میری مجبوری ہے" وہ بولی "تم یہیں میری بات سُن لو۔ تم انکار کرو گے تو کسی کو پتا نہیں چلے گا اور میں لوٹ جاؤں گی۔"

میں نے کہا "رابعہ' تم مہمانوں کو ریسیو کرو' میں ذرا ان سے بات کر لوں۔"

میں اس کے ساتھ گیٹ سے چند قدم دور چلا گیا جہاں ایک درخت کا سایہ تھا اور روشنی کم تھی "آپ بلا تکلف بات کریں۔ ماضی کو بھول کر' جو ہوا سو ہوا۔"

اس نے ایک گہری سانس لی "تمہاری بات سُن کے مجھے بڑا سکون ملا اور حوصلہ بھی۔ میں اسے تمہارے سپرد کرنے آئی تھی" اس نے فیصل کو آگے بڑھا کے میرے ساتھ کھڑا کر دیا۔

میں نے کہا "میں سمجھا نہیں مسز دلاور!"

"میں چاہتی ہوں' تم اسے ایک اچھا آدمی بنا دو۔ اپنے جیسا بنا دو۔ محسن اور غالب جیسا بنا دو۔ یہ تمہارا مجھ پر احسان ہو گا۔"

میں نے کہا "روئیں مت' احسان کی کوئی بات نہیں۔"

"اس کا باپ نہیں ہے سکندر۔ اس کی راہنمائی کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ یہ دیکھنے میں بڑا ہے مگر یہ بچہ ہے ابھی۔ تاریخ اپنے آپ کو نہیں دُہرائے گی۔ یہ میرا وعدہ ہے تم سے۔ تم اسے اپنا پارٹنر بنا لو۔"

میں بھونچکا رہ گیا "پارٹنر بنا لوں؟"

"ہاں' جیسے اس کا باپ اور تمہارا باپ پارٹنر تھے۔"

فیصل نے کہا "پلیز سکندر بھائی۔ امی کو انکار مت کریں۔ انہوں نے بہت دکھ اُٹھائے ہیں۔ ہمارا دنیا میں کوئی دوست بھی نہیں ہے۔ کوئی رشتہ نہیں ہے۔"

خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا۔ پھر میں نے فیصل کے کندھے پر ہاتھ رکھا "او کے فیصل۔ تم ہمارے ساتھ رہو گے۔ یہ ضمانت کوئی نہیں دے سکتا کہ تاریخ اپنے آپ کو نہیں دُہرائے گی لیکن عقل مند وہی کہلاتے ہیں' جو اپنی تاریخ پر صرف غور نہیں کرتے' اس سے سبق سیکھتے ہیں اور ماضی میں ہونے والی غلطی پھر نہیں کرتے۔ خدا تمہاری نیت میں خلوص دے۔ تمہیں حوصلہ دے اور اس عہد پر قائم رہنے کی توفیق عطا کرے۔"

"آمین۔" دلاور کی ماں نے کہا اور پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ پھر وہ ایک دم اپنی گاڑی کی طرف بڑھی۔

"ممی!" فیصل نے کہا مگر میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"تم کہاں جا رہے ہو" میں نے کہا "میرے ساتھ اندر آؤ۔"

دلاور کی بیوی نے پلٹ کے دیکھا اور سر ہلایا۔ کچھ فاصلے سے بھی میں اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک اور اس کے لبوں پر مسکراہٹ دیکھ سکتا تھا۔ وہ گاڑی میں بیٹھ گئی اور گاڑی آگے بڑھ گئی۔

میں فیصل کو اپنے ساتھ اندر اس جگہ لے گیا جہاں نگی نے ہماری شادی کو تماشائے عام بنانے کے لیے اسٹیج بنوایا تھا۔ اسٹیج کے ساتھ ہی ایک آرکسٹرا نغماتِ مسرت بکھیر رہا تھا۔ وسیع لان میں مہمانوں کے قہقہے گونج رہے تھے۔ ہر طرف رنگ تھے اور خوشبو تھی اور خوشیوں کے ستارے برس رہے تھے۔

"حضرات و خواتین!" میں نے آرکسٹرا کو خاموش کرانے کے بعد اعلان کیا "میں آپ سب کو آج کے مہمان خصوصی سے ملواتا ہوں۔ یہ ہیں مسٹر فیصل۔ مرحوم چوہدری دلاور کے وَلی عہد۔ اب یہ ہمارے بزنس پارٹنر ہیں۔"

اس غیر متوقع اعلان نے چند سیکنڈ کے لیے سب پر سکوت طاری کر دیا۔ پھر اچانک تالیوں کا شور اُٹھا۔

میں نے فیصل کی طرف دیکھا۔ وہ رو رہا تھا اور مسکرا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عزم تھا۔ ایک نئی تاریخ لکھنے کا' جس میں کوئی شکاری نہیں ہو گا۔

(ختم شد)